شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا

مُدیر

سیّد قاسم محمُود

شاہکار

بُک فاؤنڈیشن

جہالت کے خلاف جہاد

نمائندہ راولپنڈی اسلام آباد

محمد حفیظ خالد

۹۰۵ - ڈی - سیٹلائٹ ٹاؤن
راولپنڈی

نمائندہ لاہور

تنویر الحسن

۴۹۴-۲-بی نیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن
لاہور

59587

نمائندہ ملتان

شمس الدین

۶۱- [illegible] روڈ - [illegible] - ملتان
ٹیلیفون: ۷۵۸۸۸

طابع

خواجہ ناصر بشیر
بشیر سنز پرنٹرز
محمد بن قاسم روڈ آف چندریگر روڈ کراچی
ٹیلیفون:- ۲۱۲۶۶۳

مدیر و ناشر

سید قاسم محمود

قیمت :- تین سو روپے

شاہکار بک فاؤنڈیشن

بی ۴۳۷-۱۱- اے - شمالی کراچی ۳۶ ٹیلیفون: ۶۵۱۳۷۵

والدِ بزرگوار

سیّد ہاشم علی کے نام

فہرست مضامین ردیف وار

اشاریہ

فہرست مشتہرین ردیف وار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہارِ تشکر

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء جمعہ

آج میں دوسروں کی غلطیوں کے شاخسانے کے طور پر گورنر پنجاب جناب سردار عبدالرب نشتر کے رُوبرو حاضر تھا۔ پہلی غلطی تو جناب حکیم احمد شجاع سے ہوئی کہ انھوں نے میرے ایک خط کے جواب میں "مجلس زبانِ دفتری" کے چند مترجموں کی اسامیوں کے لیے مجھے بھی تحریری مقابلے میں بیٹھنے کا دعوت نامہ بھیج دیا، حالانکہ میں نے اپنے خط میں صرف اتنا عرض کیا تھا کہ میں نے اپنے شوق سے اٹھارہ سرکاری محکموں کی دفتری اصطلاحات کا ترجمہ مکمل کر رکھا ہے، وہ فائلیں میں "مجلس" کے سپرد کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ کام اداروں کے کرنے کا ہے۔ فرد کا نہیں۔ اس وقت میں صرف میٹرک پاس تھا اور ان اسامیوں کے لیے کم از کم "ایم اے" کے سند یافتہ حضرات درکار تھے۔

دوسری غلطی مقابلے کے شرکا سے سرزد ہوئی۔ یُوں کہ وہ اگرچہ سب ایم اے، ڈبل ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی وغیرہ کی مختلف جامعات کی سندیں رکھتے تھے، لیکن اُس روز انھوں نے پرچے اتنے کمزور کیے کہ مجھے درجۂ اوّل میں پاس کرا دیا۔ مجلس کے صدر نشین جناب جسٹس ایس اے رحمان نے خود فیصلہ کرنے کی بجائے معاملہ اپنی سفارش کے ساتھ مجلس کے سرپرست سردار عبدالرب نشتر کو پیش کر دیا۔ گورنر صاحب نے یونیورسٹی کے ایک معمولی جونیئر کلرک کو انٹرویو کے لیے طلب کر لیا۔ آج محرّم کی دس تاریخ تھی۔ شہر میں تعزیے نکلے ہوئے تھے۔ جناب نشتر کی آنکھیں مراثیِ انیس کے مطالعے سے اشکبار تھیں۔ انھوں نے مطالعہ روک کر نہ صرف میرا تقرر کیا بلکہ اپنے ذاتی دستخط سے میری بنیادی تنخواہ میں تین سالانہ اضافے بھی دیے اور ساتھ ہی فائل میرے حوالے کرتے ہوئے نصیحت فرمائی: "تم ابھی نوجوان ہو۔ پاکستان کی تقدیر اور اس کا مستقبل اب نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے ..... ہمارے اردو ادب میں جذبات نگاری تو بہت ہے لیکن ٹھوس علمی مواد کا فقدان ہے۔ کوئی لغت نہیں۔ کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں۔ ہو سکے تو اس طرف توجہ دینا۔"

یہ پہلا موقع تھا جب "انسائیکلوپیڈیا" کا مشکل اور ثقیل لفظ پہلی بار میرے کانوں میں پڑا اور وہ تقرر نامہ نہیں تھا، ایک فیصلہ تھا۔ جو بارود کے ڈھیر پر رکھ دیا گیا تھا۔ قافلے سے بچھڑے ہوئے ایک بے وقوف سے مہاجر لڑکے کی آئندہ زندگی کے لیے ایک راہ متعین کر دی گئی۔

۱۵ جون ۱۹۶۰ء جمعہ

لیکن سرکاری ملازمت کی سُست روی اس وادیٔ پُرخار میں مستانہ وار چلنے میں رکاوٹ ثابت ہوئی۔ اس لیے ۱۹۵۵ء میں ہمیشہ کے لیے اسے خیرباد کہہ کر اُردو کا ایک بڑا انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ ایک طرف مشقت کی چکّی چل پڑی اور دوسری مخالف سمت میں قلم کا کاروبار جاری ہو گیا۔ "انسائیکلوپیڈیا" میری بساط سے بڑا کام تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے مختلف علوم و فنون (مع مشاہیر متعلقہ) کی فہرستیں مدوّن کی جائیں اور پھر ان کو بنیاد بنا کر الگ الگ توضیحی ڈکشنریاں چھاپی جائیں۔ پھر خدا نے توفیق دی تو مرحلۂ ثانی پر "انسائیکلوپیڈیا" کی بھی راہ ہموار ہو جائے گی۔ اس منصوبے کا مجموعی نام "سلسلہ فرہنگ" رکھا اور چالیس فرہنگ شائع کرنے کا عزم کیا۔

آج اس سلسلے کی پہلی لغت "فرہنگ معاشیات" چھپ کر آئی۔ میں نے دو دو کاپیاں تبصرے کے لیے اُس وقت کے تمام اخبارات و جرائد کو فراہم کر کے یہ سمجھا کہ منزل قریب ہے۔ کسی بھی مدیر محترم نے اسے تبصرے کے لائق بھی خیال نہ کیا۔ فقط ایک اشفاق احمد صاحب نے اپنے رسالے "لیل و نہار" میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: "یہ زبردست علمی کام ہے جس پر افسانہ نگار قاسم محمود نے لطف کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس کی خوب پذیرائی ہونی چاہیے۔" لیکن اسے پذیرائی حاصل ہوئی نہ یہ مکمل ہو سکا۔ ایک ہی فرہنگ نے میری معاشیات کی کمر توڑ دی۔

۷ مئی ۱۹۷۰ء جمعرات

لیکن بارود کے ڈھیر پر فتیلہ موجود تھا اور آگ کے بھڑکنے کا امکان رہا۔ ناکامی کی آندھی تھمی تو میں نے معاملے کو مختصر اور چھوٹا کرنے کی بجائے

اب ایک ہی جست میں بڑے انسائیکلوپیڈیا پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا ۔ اشاریہ سازی اس کا اسلحہ خانہ تھا۔ چنانچہ آئندہ پانچ سال اشاریہ مرتب کرنے میں صرف ہوئے۔ پچھتر ہزار موضوعات کے لیے پچھتر ہزار کارڈ بنا لیے گئے۔ الف ممدودہ کے کارڈوں پر حوالہ جات بھی درج ہو گئے تو "معلومات" کے نام سے انسائیکلوپیڈیا کا اجرا ہوا جس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا: "اردو کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا قسط وار"

آج "انسائیکلوپیڈیا معلومات" کی پہلی قسط شائع ہوئی جس کے اداریے میں یہ اعلان درج تھا کہ یہ پچیس سال میں مکمل ہو گا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اخبارات و جرائد نے اس کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کا حوصلہ افزا خط موصول ہوا "قاسم محمود! میں سجدہ ریز ہو کر اور گڑگڑا کر تمھاری کامیابی کے لیے دعا مانگتا ہوں، کیونکہ تم بڑا اچھا اور وقیع کام کر رہے ہو"۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا: "آپ کے اس کام پر رشک آتا ہے۔ کاش انجمن یہ کام کر سکتی"۔ جناب جسٹس ایس اے رحمان نے خط لکھا: "آپ نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے بیچ منجدھار میں نہ چھوڑ دیجیے گا"۔

قسط نمبر ۲ چھپی تو جناب محمد عثمان ڈیپلائی (مدیر سندھ ٹائمز، حیدر آباد) نے لکھا: "کوئی غریب شاگرد اسے مشکل ہی سے خریدے گا (حالانکہ اس کی قیمت صرف پچاس پیسے تھی) کوئی غریب آدمی بھی مشکل ہی سے خریدتا ہو گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسے لائبریریوں میں پھیلایا جائے۔ چاہے وہ یونین کونسلوں کی ہوں، چاہے سکولوں کالجوں کی ہوں اور چاہے بڑے آدمیوں کی ذاتی ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پورے ملک میں ایک لاکھ سے کم نہیں۔ آپ کو چاہیے کہ حکومت سے رجوع کریں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو گی کہ کسی دن اشاعت ایک لاکھ ہو جائے اور یہ ہونی ہی چاہیے۔ ایسے انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت ایک لاکھ تو ہونی ہے ورنہ مضامین کو ترتیب دینا، لکھنا اور چھپوانا بھی کوئی کھیل نہیں۔ میرے خیال میں یہ خواب اس سے قبل لاہور کے دو نوجوان بھی چالیس سال پہلے دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن آپ نے صحیح قدم اٹھایا ہے۔ آپ مال دے رہے ہیں مٹی نہیں اور مال بھی وہ جو آج کی اہم ترین علمی و قومی ضرورت ہے۔ [illegible] منفعت اس [illegible]۔ آپ تو اسے پچیس سالہ منصوبہ کہتے ہیں لیکن یہ ایک دائمی چیز ہے۔ یہ تو دائم و قائم رہے گی۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں"۔

میں نے قسط نمبر ۳ کے اداریے میں ذرا ڈگمگانے کی بات کی تو بے شمار قارئین کرام کے علاوہ میاں محمد اکرم ایڈووکیٹ (کیمبل پور) نے لکھا: "اگر آپ نے یہ کام [illegible] ورنہ پھر کبھی پیدا نہ ہو سکے گا۔ آپ اس کی توسیع اشاعت کے بارے میں متفکر ہیں تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے مستقل [illegible] اپنے احباب اور اہل علم تک اس کو پھیلا دیں۔ بہرحال اس خیال کو دل سے نکال دیں کہ یہ بند کر دیا جائے گا"۔

حیدر آباد سے جناب محمد عثمان ڈیپلائی کا ایک اور طویل اور دردمند خط موصول ہوا کہ "بھائی! حکومت سے رجوع کریں"۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے حکومت کے کن کن ارباب اقتدار کے دروازے پر دستک دینی چاہیے۔ طبیعت نے صرف ان کو واپسی ڈاک سے جواب لکھنا گوارا کیا: "آپ بھی کیا الٹی بات کر رہے ہیں۔ میں حکومت سے رجوع کروں یا حکومت کو مجھ سے رجوع کرنا چاہیے۔ آپ خود انصاف کریں اور مجھے غلط مشورہ نہ دیں۔ میں اپنا فرض نبھا رہا ہوں، حکومت کو اپنا فرض نبھانا چاہیے"۔ میرے گستاخ جواب کی بنیاد پر انھوں نے "سندھ ٹائمز" میں اداریہ لکھ کر حکومتِ وقت کو اس کا فرض یاد دلایا۔ لیکن جو ہونا تھا، ہو کر رہا۔ اس زمانے میں صدر ایوب کے خلاف دھواں دھار تحریک اٹھی۔ ہر طرف مار دھاڑ کا غلغلہ ہوا۔ امن و امان درہم برہم ہوا۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کا المناک ڈرامہ برپا ہوا۔ بھارت سے جنگ ہوئی۔ توپوں کی گھن گرج اور راتوں کو بلیک آؤٹ میں بھی "معلومات" باقاعدگی سے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا رہا اور اٹھائیس مہینوں میں اٹھائیس قسطوں میں "آ" کے مضامین کی تکمیل کر کے بند ہو گیا۔

ہمارا مال گویا مٹی تھا، مٹی میں مل گیا۔ "معلومات" کا سٹاک بھی "فرہنگ معاشیات" کی طرح ردی کے بھاؤ تل کر فروخت ہوا۔ فرہنگ کا چڑھا ہوا قرضہ تو تین ماہ میں اتر گیا تھا، لیکن "معلومات" افروزی کے قرضے آئندہ تین ساڑھے تین سال تک اترتے رہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء بدھ

جس روز قرضہ بیباق ہوا، اسی رات حوصلے نے پھر انگڑائی لی اور پھر رتجگے شروع ہو گئے۔ میں نے غور کیا کہ "انسائیکلوپیڈیا معلومات" کامیاب ہونے کے باوجود کیوں ناکام اور تشنۂ تکمیل رہا۔ نتائج مرتب کیے۔ ایک نتیجہ بالکل واضح تھا کہ انسائیکلوپیڈیا پڑھنے سے زیادہ رکھنے کی چیز ہوتا ہے جس کے لیے ناشر، مدیر اور قاری کا صبر و تحمل دوسری نوعیت کا ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پڑھنے والے جن کو سنسنی خیز مواد کا عادی بنا دیا گیا ہے، وہ انسائیکلوپیڈیا کے خشک مواد کا مسلسل ۲۵ برس تک انتظار نہیں کر سکتے۔ پس میں نے از سر نو غور کر کے ردیف وار جلدوں کی بجائے موضوع وار جلدوں کا منصوبہ بنایا۔ یعنی بجائے ا۔ب۔پ۔ت کی جلدوں کے "اسلامیات، تاریخ، جغرافیہ، ادبیات، سائنس اور عمرانیات وغیرہ کی الگ الگ جلدیں ہونی چاہئیں اور ہر جلد کے مضامین آسان ماہوار قسطوں میں شائع کیے جائیں تاکہ غریب سے غریب طالب علم بھی اس کی خریداری کا متحمل ہو سکے اور جب قسطیں

مکمل ہو جائیں تو اُن کی نظرِ ثانی کر کے ان کو ایک جلد میں مجلّد کرا لیا جائے۔ سولہ علوم و فنون پر مشتمل سولہ جلدوں کا انسائیکلوپیڈیا اب زیرِ ترتیب تھا۔

گویا اب اشاریہ سازی کا موضوع وار کام از سرِ نو کرنا پڑا جس میں پھر تین سال لگ گئے۔

آج "شاہکار اردو انسائیکلوپیڈیا" کی پہلی جلد "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کی پہلی قسط چھپ کر آتی۔ اس کے اداریئے کی یہ سطور قابلِ ذکر ہیں "شہر آشوب کا یہ عالم ہے کہ تمام فاضلوں، عالموں، مفتیوں، دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، مصوّروں اور فن کاروں کے سر میں ایک ہی سودا سمایا ہے کہ کرسیِ اقتدار پر متمکن نہ ہوں تو نہ اسلام کا احیا ہو سکتا ہے نہ حق پرستی کا حق ادا ہو سکتا ہے ..... قلم کا زور صرف سیاست کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ علم کی عظمت عمل کی سیاست میں پست ہو رہی ہے ..... جب زمانہ ایسا گزر رہا ہو تو یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کام اُن کے کرنے کا ہے، وہ ہم جیسے حقیر فقیر طالب علم بھی نہ کریں چراغ تو بہرحال جلتے رہنے چاہئیں۔ ہمیں علم اور ہمہ دانی کا دعویٰ نہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اسلامیات جیسے وسیع اور نازک علم کے شعبے میں ہماری حیثیت ایک مبتدی کی بھی نہیں، لیکن ہمیں اپنے خلوص اور عشق پر ناز ہے۔ دربارِ علم کی جاروب کشی بھی ہمارے لیے قابلِ فخر اعزاز ہے۔ ان احساسات کے ساتھ ہم "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کی اشاعت کا آغاز کر رہے ہیں۔"

"اسلامی انسائیکلوپیڈیا" نام کے دو کام جو اُردو زبان میں پہلے ہو چکے تھے، ہمارے پیشِ نظر تھے۔ اوّل "پیسہ اخبار" کے مُدیر منشی محبوب عالم کا ترتیب دیا ہوا "انسائیکلوپیڈیا" جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں زیادہ تر عقائد اور دینیات پر توجہ صرف کی گئی۔ دوم، محمد عبدالمقیت نیموی کا "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" جو پٹنہ شہر سے ۱۹۴۰ء میں دو ماہی قسطوں میں چھپنا شروع ہُوا اور چھ قسطیں شائع کر کے بند ہوا۔ مدیرِ محترم نے اس کا ادارتی ڈھانچا انگریزی زبان کے اُس بڑے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" پر استوار کیا تھا جو ہالینڈ کے مشہور مطبع "بریل" سے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی چند علم دوست مستشرقین نے شائع کرایا تھا، جس کا بعد میں قاہرہ سے عربی ترجمہ چھپا اور جس کا اردو ترجمہ (ترامیم کے ساتھ) ۱۹۵۰ء سے پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام "اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" کے عنوان سے متعدد جلدوں میں اشاعت پذیر ہے۔

نمونہ مثل تو ہمارے سامنے تھا لیکن وسائل مہیا نہ تھے۔ ایک بہت بڑا کتب خانہ چاہیئے تھا۔ ہم اپنی استطاعت کے مطابق وقتاً فوقتاً کتب اور متعلقہ مواد خریدتے رہے۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور کے مہتمم ملک محمد اسلم اور محمد حنیف شاہد صاحب نے ہمیں غیر معمولی مراعات سے نوازا اور تحقیق و تفحص کے سلسلے میں ہمارا کام رکنے نہ دیا۔ الحمدللہ کہ جلد ہی ماہوار قسطوں کی عام اشاعت دس ہزار سے تجاوز کر گئی اور بیرونِ پاکستان بھی اس کام کی پذیرائی ہونے لگی لیکن اس کی معیاری اور بر وقت پیش کش میں چند انتظامی رکاوٹیں سدِّ راہ تھیں۔ نجی اشاعتی اداروں کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ پڑھنے لکھنے والے اہلِ ذوق حضرات سرکاری ملازمت کے حصول کی کوششوں کے دوران نجی اداروں میں محض وقت کٹی کے لیے بادلِ نخواستہ شریک ہوتے ہیں اور رضا کارانہ علمی کاموں کی جان ہوتی ہے، ان میں سرے سے موجود نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طویل علمی کام مختلف مزاجوں اور ہاتھوں کے زیرِ تصرف بننے کے باعث بدنظمی اور شتر گربگی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ کاتب حضرات بھی چونکہ "اُجرتی بورڈ" کے قوانین و مراعات کے تحت اخباروں میں پکی ملازمت کے طلبگار ہوتے ہیں، اس لیے کتابوں کا کام وہ جُز وقتی کرتے ہیں اور لمبی کتاب ہو تو اسے بیچ میں چھوڑ جاتے ہیں جس سے متن میں کئی کئی ہاتھ نظر آتے ہیں۔ اس کا علاج "نوری نستعلیق" کا عام اور ارزاں ہونا ہے۔

بہر صورت تمام دقتوں اور مشکلوں کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے "شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا" ۳۶ قسطوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا لیکن بجائے ۳۶ مہینوں میں مکمّل ہونے کے ۴۵ مہینوں میں اختتام پذیر ہوا جبکہ اصل منصوبہ اس کو ۲۴ ماہ میں ۲۴ قسطوں میں ختم کرنے کا تھا تاکہ آئندہ ۲۴ مہینوں میں دوسری جلد مثلاً "سائنس انسائیکلوپیڈیا" پر کام کیا جا سکے۔ ہر جلد کے لیے دو سال ذہن میں طے تھے لیکن اندازے سے دُگنی مدت میں یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ یعنی جو چیز بُری طرح خرچ ہو رہی تھی، وہ وقت تھا۔

پھر مجھ پر ایسا وقت پڑا کہ میں گویا پہاڑ کے نیچے آگیا۔ سرکتے سرکتے اس کے نیچے سے نکلا اور امان ملی تو سمندر کے کنارے ملی۔ اگست ۱۹۹۰ء میں یومِ آزادی منانے کے فوراً بعد اپنے محبوب لاہور سے ہجرت کر کے شہر کراچی میں پناہ لی۔ میرے سارے کاموں کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔ وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ شکستگی کا ایسا سخت مرحلہ تھا کہ عزت تو رہی ایک طرف، جینے کی بھی امید نہ رہی۔ ہارٹ اٹیک نے قدرے سکون کا وقفہ اور آرام سے سوچنے کا موقع دیا۔ میں ایسا پراگندہ خاطر تھا کہ "انسائیکلوپیڈیا" کا خیال بھی ذہن میں آتا تھا تو میں خوف سے کانپ اٹھتا تھا لیکن جانے کیونکر قدرت نے میرے قلب کے نہاں خانے میں اُمید کا ایک چراغ جلائے رکھا۔ جس کی روشنی میں میں شائع شدہ اقساط پر نظرِ ثانی کرتا رہا۔ لاہور کے مولانا سید عارف فیضی نے دقتِ نظر سے ایک ایک سطر میں غلطیاں تلاش کیں۔ کراچی میں مولانا شاہ حسین گردیزی نے نظرِ ثانی کے ساتھ ساتھ تقریباً پچاس نئے مضامین بھی قلمبند کیے۔

ذرا حواس قائم ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کو یک جلد شائع کرنے کا خیال دل میں پیدا کیا۔ اس خیال کو مزید پختگی میرے بھائی سید محمد علی شاہ اور میرے دوست خواجہ شاہد انور نے عطا کی۔ نظرِ ثانی کا کام مکمّل ہو چکا تھا۔ نئے مضامین کا اضافہ ہو چکا تھا۔ جزائی کا کام میرے بیٹے سید عاصم محمود نے اپنے ذمے لیا۔ ایک اشتہار دیکھ کر بے شمار حضرات و خواتین نے پیشگی قیمت ادا کر کے کاغذ کا بندوبست کر دیا اور یوں، ستمبر ۱۹۹۳ء کو اس کی کاپیاں

"بشیر سنز پرنٹرز" کے سپرد ہوئیں۔

یکم جنوری ۱۹۸۴ء
اتوار

آج "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" (یک جلد) کی تکمیل پر میرا وجود جیسے یادوں میں گھر کر رہ گیا ہے، جیسے دُور جاتی ہوئی یادوں کا ایک کارواں میرے قریب سے گھنٹیاں بجاتے ہوئے گزر رہا ہے۔ وہ تمام حضرات جنھوں نے اس کے تخیل، ترتیب، تدوین، تصنیف، اشاعت و طباعت اور توسیع کے طویل اور کٹھن مراحل میں دامے، درمے، سخنے میری مدد کی، حتیٰ کہ وہ احباب بھی جو مجھے "غیر مستقل مزاج" ہونے کا طعنہ دیتے رہتے ہیں اور وہ ہزاروں قارئین جو فی الحقیقت ایسے کاموں کی، کارِ ثواب سمجھ کر پذیرائی کرتے ہیں۔ وہ تمام مصنفین اور مؤلفین جن کی کتب سے ہم نے یہ "انسائیکلوپیڈیا" مرتب کرنے میں استفادہ کیا، اُن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اُن کا عرصہ ایک ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مصنف ہو جس نے اسلامیات پر کوئی اچھی کتاب لکھی ہو اور اس سے استفادہ نہ کیا ہو۔

جس خیال کی تحریک سردار عبدالرب نشتر نے کی تھی، اسے شعلہ فشاں کرنے والوں کی فہرست بہت طولانی ہے۔ چند نام ہونٹوں پر آ رہے ہیں:-
بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر تاثیر، علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، ابوالاثر حفیظ جالندھری، سید عابد علی عابد، جسٹس ایس اے رحمان، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سید وقار عظیم، صوفی تبسم، حکیم احمد شجاع، جناب شاہد احمد دہلوی، پروفیسر احمد الدین مارہروی، پروفیسر محمود احمد خان اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی مولانا حامد علی خان اور پروفیسر حمید احمد خان، مولانا نعیم صدیقی، سید سبطِ حسن، پروفیسر محمد عثمان، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب عبدالعزیز خالد، جناب مختار مسعود، جناب قدرت اللہ شہاب، جناب رشید احمد چودھری، جناب محمد حنیف رامے، جناب میرزا ادیب، جناب محمد عبداللہ قریشی، استادِ گرامی سید اشفاق حسین رزمی، جناب رشید میر ایڈووکیٹ، جناب محمد علیم خالد، خواجہ ظفر نظامی۔ ان لوگوں نے ہمیشہ اپنے مشفقانہ سلوک سے میرا حوصلہ بڑھایا اور اس کام کو کرتے رہنے کی ترغیب بھی دی اور مدد بھی کی۔ جناب محمود مرزا (مرزا بُک ایجنسی) کی رہنمائی مجھے قدم قدم پر حاصل رہی۔

مضامین کی تصنیف و تالیف کے کام میں جناب مولانا سید ابوبکر غزنوی، جناب عطش دُرّانی، جناب شریف اصلاحی، جناب اشرف تنویر، جناب سیف الدین حُسام، جناب ستار عابد، جناب شریف جاوید، جناب آذرمنا، پروفیسر سلیمان اظہر، جناب مولانا عبدالاعلیٰ رحمانی، جناب سید امتیاز حسین بخاری، جناب کفیل احمد صدیقی، جناب ڈاکٹر نظر علی راجہ، ڈاکٹر محمد گلستان، سید مظفر کاظمی اور جناب صہیب مرغوب کا قلمی تعاون حاصل رہا۔

اقساط چھپنے کے دوران میں متعدد حضرات ہر قسط پر گہری اور تنقیدی نظر ڈال کر غلطیوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے، بالخصوص جناب دلاور حسین لودھی، جناب مبارک ساغر اور صوبیدار پائندہ خان نے اس کام کو فرضِ جان کر انجام دیا۔ ابن انشا مرحوم درونِ ملک اور بیرونِ ملک جب بھی جہاں بھی موقع ملتا، اس کی تعریف و توصیف میں کالم ضرور لکھتے تھے۔ توسیع اشاعت کے کام میں پروفیسر صابر کلوروی (ایبٹ آباد) سید کاظم رضا (حیدرآباد) جناب احمد ضیا (نواب شاہ) الحاج محمد اسحاق قُرنی (فیصل آباد) اور سید طاہر حسین جعفری (کراچی) نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ خواتین میں محترمہ سلمیٰ یاسمین نجمی، محترمہ زاہدہ حنا، محترمہ شاہینہ بدر انصاری، محترمہ نور الکینہ قاضی اور والدہ مرحومہ کی پُرخلوص، دعائیں شاملِ حال رہیں۔ میری زوجہ سیدہ شمیم گیلانی اور میری ہمشیرگان کی دعائیں بھی قابلِ ذکر ہیں، کیونکہ انھوں نے بجائے میری کامیابی کے ہمیشہ یہ دعا مانگی کہ اللہ مجھے گمراہی سے بچائے، راہِ راست پر لائے اور کچھ دنیاداری کی بھی توفیق ارزانی کرے۔

پیشکش، خطاطی اور تزئین کے نفیس و لطیف امور میں، لاہور میں امام الخطاط حافظ یوسف سدیدی اور خطاط العصر سید نفیس رقم نے ہمیشہ میری دستگیری کی اور کراچی میں مجھے اُن کا بدل جادو نگار جناب محمد صدیق بھٹی کی صورت میں مل گیا۔ اس ساحلی شہر کے رستے ناپنے اور خاک چھاننے کے معاملے میں بھی میں اکیلا نہیں رہا۔ محمد سعید انصاری صاحب ہر قدم پر شریکِ سفر رہے۔

چھپتے چھپتے بھی دستِ شفقت کا سلسلہ دراز رہا۔ جناب حکیم محمد سعید (ہمدرد فاؤنڈیشن) جناب راجہ محمد ظفر الحق (وزیرِ اطلاعات) ریئر ایڈمرل جناب محمد اسحاق ارشد (چیئرمین، کراچی پورٹ ٹرسٹ) جناب سید حسین ہاشمی (اورینٹ) اور جناب خواجہ محمد بشیر مومنال نے خصوصیت کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔
"اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کی اشاعت کا یہ یادگار لمحہ میری حیاتِ مستعار کا لمحہ زرّیں ہے۔ اس موقع پر میرے لیے اپنے محسنین، اساتذہ، احباب اور قارئین کو یاد نہ کرنا ممکن نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے قلب میں ان کے لیے جو جذباتِ ممنونیت موجزن ہیں، ان کا اظہار کس پیرائے میں کروں۔

حق یہ ہے کہ تمام تعریفیں اور تمام جذباتِ تشکر اس ذاتِ بے نیاز کے لیے ہیں جو ہم سب کی شہ رگ سے بھی قریب ہے، جس نے ہم سب کو اچھے کاموں کی تکمیل میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کی تلقین کی، اور وہی ہے ہمارا رب، ہمارا پروردگار جس نے ہر شکستگی پر ہمیں حوصلہ دیا، بار بار گرتوں کو تھاما اور یقیناً وہی ہے جو ہمیں اس کی بقیہ پندرہ جلدیں بھی مکمل کرنے کی توفیق اور ہمت دے گا۔ آمین

احقر العباد
سید قاسم محمود

آ

آبِ حیات زندگی دینے والا پانی، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے پینے سے انسان امر ہو جاتا ہے۔ تلمیحی روایات کے مطابق حضرت خضرؑ ایک ایسے چشمے کے نگران ہیں، جس کا پانی پی کر انسان ابدی زندگی پا لیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چشمہ ایک نہایت گھنے اور تاریک جنگل میں تھا۔ جس میں دن کے وقت بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا۔ اسی لئے وہ عام انسانوں کی دسترس سے باہر تھا

اس چشمے کے متعلق بہت سے فرضی قصے مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یونانی بادشاہ سکندر حضرت خضرؑ کی رہنمائی میں اس چشمے تک پہنچا، مگر کسی وجہ سے وہ اس کا پانی نہ پی سکا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خضرؑ خود یہ پانی پی کر امر ہو گئے قرآن اور حدیث سے اس قصے کی تائید قطعاً نہیں ہوتی اور نہ کہیں آبِ حیات کا ذکر ہے

آبِ حیات کا یہ قصہ عام طور پر فارسی ادب میں ملتا ہے۔ وہیں سے اردو ادب میں تلمیح کی صورت میں رونما ہوا۔ اردو اور فارسی میں اس کے لئے دوسرے مترادفات بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً "آبِ حیواں" "آبِ بقا" "آبِ خضرؑ" "چشمہ حیواں" "چشمہ خضر" "چشمۂ زندگی" "ظلمات"، "رہ ظلمات" وغیرہ

آبِ زمزم زمزم کا پانی، کعبے کے کنوئیں کا پانی، بیرِ اسماعیل کا پانی، وہ پانی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خداوند کریم نے اپنی رحمت اور حکمت سے عرب کے تپتے ریگزاروں میں، خشک پتھروں کے درمیان تقریباً چار ہزار سال قبل حضرت اسمٰعیل کی تشنہ لبی اور خشک کامی کو دور کرنے کیلئے جاری کیا تھا

"زم زم" کے لغوی معنی مستند نہیں۔ چند ارباب دانش کے نزدیک اس کا مطلب ہے "ٹھہرا ہوا" اور کچھ ماہرین لسانیات کے نزدیک یہ عربی لفظ "زمزمہ" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "چھوٹے چھوٹے گھونٹ میں پانی پینا" یا "اوک سے پانی پینا"۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت ہاجرہؑ اور شیرخوار بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر عرب کے ریگستانوں میں آئے اور انہیں اس بے آب و گیاہ علاقے میں چھوڑ کر خود ملک شام کی طرف تشریف لے گئے بی بی ہاجرہؑ بچے کے ہمراہ وہیں رہنے لگیں کچھ روز میں حضرت ابراہیمؑ کا دیا ہوا مشکیزہ اور کھجوریں ختم ہو گئیں۔ جب حضرت اسماعیل کو پیاس لگی تو بی بی ہاجرہ کے پاس پانی نہ تھا۔ وہ پانی کی تلاش میں صفا نامی پہاڑی پر گئیں۔ ادھر اُدھر دیکھا اور پھر واپس پلٹیں اور دوسری طرف مروہ نامی پہاڑی پر پہنچیں۔ ہر طرف نظر دوڑائی مگر کچھ نظر نہ آیا۔ حضرت اسماعیلؑ زمین پر پڑے ہوئے پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے اور بی بی ہاجرہؑ اضطراب کے عالم میں صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ رہی تھیں

ساتویں چکر کے بعد جب بی بی ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کے پاس پہنچیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی سعی کے بدلے حضرت اسماعیلؑ کے قریب ہی ٹھنڈے، میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری فرما دیا ہے۔ انہوں نے ریت اور پتھروں کا بند بنا کر پانی کو روکنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی مصری زبان میں کہا "زم زم" یعنی "ٹھہر ٹھہر"۔ اسی لئے اس چشمے کا نام "زمزم" مشہور ہے

بعد ازاں بی بی ہاجرہ نے زمزم کے قریب ہی سکونت اختیار کر لی۔ قبیلہ جرہم کا ایک قافلہ ادھر سے گزرا اور پانی دیکھ کر وہیں ڈیرے ڈال دیئے البتہ چشمے کی ملکیت بی بی ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے پاس رہی۔ مکہ معظمہ کی یہ پہلی آبادی تھی

خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اہل فارس بھی ادھر آئے۔ ساسانیوں کے جد امجد ساسان ابن بابک نے بھی اس چشمے کی زیارت کی۔ اس کا تذکرہ قدیم ایرانی شاعری میں ملتا ہے۔

جب بنو جرہم مکہ سے جانے لگے تو انہوں نے قریش کے مشہور بتوں اساف اور نائلہ کے درمیان زمزم کے چشمے کو بند کر دیا اور اپنے تمام خزانے یہیں دبا دیئے مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے کہ یہ خزانے ان کے نہیں تھے کیونکہ بنو جرہم تو ایک غریب قبیلہ تھا۔ انہیں اہل فارس وہاں لائے تھے۔

محمد حسنین ہیکل لکھتا ہے کہ چاہ زمزم مضاض بن عمرو جرہمی کے زمانے میں خشک ہوا تھا۔ لیکن اس کا محل وقوع عربوں کے ذہن میں محفوظ رہا۔ اور کنواں کھودنے کی تمنا ان کے دل میں مچلتی رہی حتیٰ کہ حضور اکرمؐ کے دادا عبدالمطلب کو خواب میں یہ کنواں کھودنے کا حکم ہوا۔ انہوں نے اپنے بیٹے حارث کی مدد سے ایک مقام کا تعین کر کے کنواں کھودا تو وہاں سے نہ صرف پانی برآمد ہوا بلکہ دو طلائی ہرن اور تلواریں بھی نکلیں اس مال کی تقسیم کے لئے تیروں کے ذریعے قرعہ اندازی ہوئی۔ دو تیر قریش کی طرف سے، دو عبدالمطلب کی طرف سے اور دو

چاہ زمزم

کعبہ کی ذات سے بنائے گئے تاکہ جس کا تیر جس چیز کے نام پر نشانہ پر بیٹھے وہ اس کی ملکیت ہو جائے۔ قریش کے دونوں تیر خطا گئے۔ اور تلواریں عبدالمطلب کے حصے میں اور ہرن کعبے کے حصے میں آئے۔ عبدالمطلب نے تلواروں کی فروخت سے کعبے کا ایک دروازہ تعمیر کیا۔ اور طلائی ہرن اس میں محفوظ کر دیئے۔ اس کے بعد سے وہ آب زمزم کی سقائیگری کرنے لگے۔

۲۹۷ہجری/۹۰۹ء میں زمزم کا کنواں ابل پڑا۔ اور اس نے سیلاب کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ چاہ زمزم کی اس خصوصیت کا پہلے سے کسی کو علم نہیں تھا اس لئے اس کے گرد دیوار بنا دی گئی۔

موجودہ عمارت جس میں زمزم کا کنواں واقع ہے، ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں تعمیر کی گئی تھی۔

کنواں کعبے سے، جنوب مشرق کی طرف ۳۳ گز کے فاصلہ پر حجر اسود کی دیوار کے بالمقابل واقع ہے۔ یہ ۱۴۰ فٹ گہرا ہے۔ اس کے اوپر چوکور عمارت تعمیر کر دی گئی ہے۔ جس میں شمال کی جانب سے دروازہ ہے۔ کمرے میں خوب صورت سنگ مرمر سے پچی کاری کی گئی ہے۔ کنواں عین درمیان میں ہے جس کے ساتھ ہی ایک حوض ہے جو ہر وقت "آب زمزم" سے بھرا رہتا ہے۔ اس میں ایک کٹورا لوہے کی زنجیر سے بندھا تھا۔ ہر شخص کٹورے سے پانی پی سکتا تھا۔ کنوئیں کے گرد قبل از اسلام حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت عباسؓ انجام دیتے تھے۔ چنانچہ حوض انہی کے نام کی سبیل کے طور پر قائم ہے۔ اب وہاں اکثر پانی پلانے والے موجود رہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں لیٹر پانی نکلنے کے باوجود زمزم ختم ہونے میں نہیں آتا۔

آب زمزم کا ذائقہ قدرے نمکین ہے۔ تاہم یہ کئی امراض میں شفا بخش ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ہم نے جس مقصد کے لئے بھی آب زمزم پیا وہ پورا ہوا۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا کہ جو شخص بیت اللہ کا طواف کرے اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھے اور آب زمزم پیے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ آب زمزم ہر غرض کے لئے ہے۔ گویا ہر مرض کی شفا ہے، علماء نے آب زمزم کے مندرجہ ذیل خواص بیان کئے ہیں۔

۱۔ بخار کو رفع کرتا ہے۔
۲۔ درد سر کے لئے نافع ہے۔
۳۔ درد کو دور کرتا ہے۔
۴۔ آنکھوں کی بینائی بڑھتی ہے۔
۵۔ قلب کو تقویت دیتا اور اضطراب کو کم کرتا ہے۔
۶۔ دنیا کے پانیوں سے زیادہ بھاری ہے۔

ہر سال حج کے موقع پر لاکھوں حاجی آب زمزم پیتے اور اپنے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے میں بطور تبرک لے جاتے ہیں۔ اکثر حاجی اپنا اور رشتہ داروں کا کفن، آب زمزم میں دھوتے ہیں۔ اس لئے اکثر اوقات مسجد الحرام میں سفید کفن کے تھان سوکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کئی مسلمان آب زمزم سے روزہ افطار کرنا باعث ثواب و تقویت سمجھتے ہیں۔ عالم نزع میں مریض کے منہ میں زمزم کا پانی ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ اس وقت ابلیس کی طرف راغب نہ ہو جائے جو ٹھنڈے میٹھے پانی کا پیالہ بھرے مرنے والے کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ گویا آب زمزم ہر لحاظ سے متبرک، مقدس اور شافی ہے۔

آب کوثر کوثر کا پانی، چشمۂ کوثر یا حوض کوثر کا پانی۔ رسول اکرمؐ کے لئے جنت میں موجود حوض کوثر کا پانی۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "(معراج کی رات) میں جنت میں پھر رہا تھا کہ میرا گذر ایک نہر پر ہوا، جس کے دونوں طرف خالی موتیوں کے گنبد تھے۔ میں نے جبرائیلؑ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، تو انہوں نے جواب دیا، یہ کوثر ہے، وہ کوثر جس کو آپ کے پروردگار نے آپ کو عطا کیا ہے۔ میں نے دیکھا تو اس کی مٹی نہایت خوشبودار ہے"

حضرت ثوبانؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہؐ سے کوثر کے پانی کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا "اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ وہ پانی جس نے پی لیا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اس میں پانی کے دو پرنالے گرتے ہیں، جو حوض کو پانی سے لبریز رکھتے ہیں ایک پرنالہ چاندی کا اور ایک سونے کا ہے اور یہ پانی جنت سے آتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

حدیث ہے کہ قیامت کے روز حضورؐ اپنے حوض سے یہ پانی اپنے امتیوں کو پلائیں گے۔ حضرت سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس روز ہر نبی کا ایک حوض ہوگا اور انبیاء اس پر فخر کریں گے کہ کس کے حوض پر زیادہ آدمی آتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ میرے حوض پر زیادہ آدمی آئیں گے۔ (ترمذی)

حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ ہم سفر میں رسول اللہؐ کے ساتھ تھے کہ ایک مقام پر اترے۔ حضورؐ نے فرمایا "تم ان لاکھوں گروہوں میں سے ایک جزو ہو، جو حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے۔" لوگوں نے زید بن ارقمؓ سے پوچھا۔ تمہاری تعداد اس روز کیا تھی؟ "کہا" سات سو یا آٹھ سو" (ابوداؤد)

آب کوثر کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ اس کے معنی ٹھنڈے اور شیریں پانی کے لیے جاتے ہیں۔ "آب کوثر سے دھلی زبان" نہایت فصیح پاک اور شستہ زبان کے لیے کہتے ہیں۔ (نیز دیکھیے "کوثر" اور "حوض کوثر")

آتش پرستی مجوسیت، آگ کی پوجا، اگنی دیوتا کی پرستش۔ آگ کو روح کائنات اور خالق اعظم سمجھ کر اس کی پوجا کرنا اسلام کی رو سے شرک عظیم ہے۔ آگ محض ایک توانائی ہے اور قدرت کی نشانیوں میں سے ایک جدید دور میں آگ پر انسانی غلبے نے بنی نوع انسان کی تاریخ بدل دی ہے اور اب انسان آگ کو مختلف صورتوں میں استعمال کرنے لگا ہے۔

قدیم زمانے میں انسان آگ سے بہت ڈرتا تھا۔ اور اسے ایک مقدس قوت سمجھ کر پوجتا تھا۔ مذہبی تہواروں میں آگ کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی اور کسی ایسی تقریب کا تصور آگ کے بغیر محال ہوتا تھا۔

ہندوؤں کے قدیم ویدوں میں اگنی دیوتا کا ذکر ملتا ہے جو کائنات کی روح تھا یہ پروہتوں کے لئے مخصوص دیوتا تھا۔ خیال تھا کہ یہ لوگوں کو بہشت میں لیجاتا ہے۔

ایران میں آخش اور زرتشت کے مذہب میں آتش پرستی کو باقاعدہ مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اسے مجوسیت کہا جانے لگا۔ آخش مانی نے عناصر اربعہ (مٹی، پانی، آگ، ہوا) کو دنیا کا خالق تصور کرتا تھا اور زرتشت نے آگ کو مذہب کی روح، مرکز اور مقدس قوت قرار دیا تھا اس کے نزدیک یہ آہورمزدا یعنی خدا کا مظہر خاص ہے۔

آتش پرستی ظاہر ہے کہ مذہب زرتشت کی تعلیم نہیں تھی بلکہ اس نے عبادت کے طریقوں کو سادہ بنانے کے لئے جلتی ہوئی آگ کا سامنے رہنا ضروری قرار دیا تھا۔ عام طور پر یہ آگ صندل کی لکڑیوں سے جلائی جاتی اور اس کے سامنے مقدس منتر گائے جاتے بعد ازاں اس کے پیروکاروں نے اس کی تعلیمات کو بدل ڈالا اور پارسیوں کے معابد آتشکدے بن گئے۔

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے، بنی اسرائیل میں آگ کے دیوتا "ملوک" کی عبادت کی جاتی تھی۔ قدیم روما میں ہیسٹا کے معبد کی کنواریوں کے نام پر مقدس آگ ضرور جلتی تھی۔ یہ لوگ کہیں جاتے یہ آگ ضرور ساتھ لے جاتے۔ اسے آج بھی اولمپک کی آگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قدیم سائبیریا کے غیر مہذب کوریان اور چکچی قبائل اور قدرے مہذب بریات قبائل آگ کے دیوتا کی پرستش کرتے تھے اور اس کے احترام میں آتشکدہ اور چولہوں کو گندگی سے پاک رکھتے تھے۔

امریکا اور میکسیکو کے اکثر قبائل بھی آگ کی پوجا کیا کرتے تھے۔ قدیم یونانیوں کے ہاں بھی آگ تخلیق کا ذریعہ رہی ہے۔ ہیراکلیٹس اس نظریے کا پرچار کیا کرتا تھا۔ یونانی دیومالا میں پرومیتھوس کا قصہ بھی ہے۔ جس نے انسان کو روشنی سے محروم اور دنیا کو تاریک دیکھا تو مقدس اولمپس کی آگ چرا کر زمین والوں کے حوالے کر دی اور دیوتاؤں کی نظر میں معتوب ٹھہرا۔

آگ صدیوں تک مذہب کا حصہ رہی ہے۔ دیوتاؤں کے حضور قربانی پیش کرنے کا وسیلہ بھی آگ ہی ہوتی تھی۔ عہد نامہ عتیق میں بھی قربانی کی آگ کے کئی واقعات ملتے ہیں۔ کتاب پیدائش میں ہابیل اور قابیل کی قربانیوں کا قصہ موجود ہے۔ ہابیل کی قربانی کو آگ کے مقدس شعلے نے چھو کر جلا دیا اور اسے قبول کر لیا۔

آج بھی ہندو برہمنوں اور پارسیوں (مجوسیوں) کے ہاں قربانی کی آگ جلتی رہتی ہے۔ بھارت میں کئی مندر اگنی دیوتا کے نام سے منسوب ہیں اور اسی طرح پارسیوں کے آتشکدے ہیں، جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔

آتش زرتشت ایرانی مفکر اور مذہبی پیشوا زرتشت کی جلائی ہوئی آگ جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ہزاروں سال تک جلتی رہی اور جب حضور اکرمؐ کی ولادت ہوئی تو خود بخود بجھ گئی۔

زرتشت کے نزدیک آگ کا وجود چار مقدس عناصر ہوا، مٹی، پانی اور آگ میں سب سے زیادہ پاک اور مقدس ہے۔ اس لیے زرتشت نے معبدوں میں آگ جلائی تاکہ اس کے سامنے عبادت کی جا سکے رفتہ رفتہ صرف آگ ہی عبادت کا محور بنکر رہ گئی اور یوں آتش زرتشت کی وجہ سے پارسی آتش پرست بن گئے۔

آتش کدہ آتش پرستوں، مجوسیوں کا عبادت خانہ جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے اور آگ کو پوجتے ہیں۔ نیز پارسیوں کا معبد۔ زرتشت

نے ایرانی بادشاہ گشتاسپ کے عہد میں پہلا آتشکدہ بنوایا تھا جسے آذر زرتشت کہتے ہیں۔ بعد میں گشتاسپ نے بلخ میں ایک بہت بڑا آتشکدہ تعمیر کیا۔ جسے آذر گشتاسپ کہتے ہیں۔ دوسرے مشہور آتشکدوں کے نام یہ ہیں:۔ آذر بہرام آذر آئین، آذر برزین، آذر خردین۔ ایران میں بہت سے قدیم آتشکدے دریافت ہوئے ہیں، ان سب میں طرز تعمیر کا یہ پہلو مشترک ہے کہ ایک گنبد کے گوشوں پر ایک ایک محراب ہے۔ تمام مسقف حصے کے اردگرد ایک غلام گردش ہوتی ہے جس میں محرابیں کھلتی ہیں۔ آتش مقدس کی قربان گاہ گنبد کے کہیں نیچے ہوتی ہے

آتشِ موسیٰ ؑ وہ آگ یا روشنی یا تجلی جو حضرت موسیٰ ؑ کو کوہ طور پر نظر آئی تھی۔ سورۂ طٰہٰ میں آیا ہے جب اسے آگ دکھائی دی تو اپنے گھر والوں سے کہا، ٹھہر جاؤ، میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں تمہارے پاس اس میں سے ایک شعلہ لے آؤں یا اس آگ پر رستہ پاؤں" (آیت ۱۰)

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ ؑ مع اہل وعیال مدائن سے مصر کی طرف واپس آ رہے تھے۔ بکریاں ساتھ تھیں۔ کوہ طور کے قریب راستہ بھول گئے۔ اسی پریشانی کے عالم میں رات پڑ گئی۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس حالت میں بیوی کو درد زہ شروع ہوا۔ اچانک دور سے آپ ؑ کو آگ نظر آئی۔ چنانچہ اہل وعیال کو چھوڑ کر آگ لینے روانہ ہوئے۔

آپ ؑ طویٰ کی مقدس وادی میں پہنچ رہے تھے۔ یہاں آ کر آپ ؑ نے عجیب منظر دیکھا۔ ایک درخت سے پر ہیبت شعلے نکل رہے ہیں اور آگ جوں جوں بڑھتی ہے، درخت توں توں سرسبز ہوتا جا رہا ہے۔

یہ آگ کیسی تھی؟ روح المعانی میں درج ہے کہ آگ کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں نور ہے اور وہ جلاتی بھی ہے۔ جیسے دنیا کی آگ۔ ایک وہ جس میں نہ نور ہے نہ وہ جلاتی ہے جیسے درختوں کی آگ۔ ایک وہ جس میں نور نہیں مگر وہ جلاتی ہے۔ جیسے دوزخ کی آگ اور ایک وہ جس میں نور ہے اور وہ جلاتی نہیں۔ جیسے وہ آگ جو حضرت موسیٰ ؑ نے دیکھی تھی۔ وہ آگ نہ تھی، اللہ کا نور تھا، ہدایت کی روشنی تھی۔ آپ ؑ تذبذب کے عالم میں تھے کہ آواز آئی۔

"میں تیرا رب ہوں، سو تو اپنی جوتیاں اتار دے۔ تو طویٰ کی پاک وادی میں کھڑا ہے اور میں نے تجھے نبوت کے لیے چن لیا ہے، سو اب سن جو وحی کی جاتی ہے۔" (طٰہٰ: ۱۳)

اور موسیٰ نے کہا، میرے رب میرا سینہ کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے (طٰہٰ: ۲۶،۲۵)

آتش موسیٰ ؑ اس آگ کو بھی کہتے ہیں جو کوہ طور پر گری اور اسے جلا کر خاکستر کر گئی۔ جب بنی اسرائیل نے اپنی فطری کج روی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ جب تک ہم تیرے خدا کو آنکھوں سے دیکھ نہ لیں گے، ایمان نہ لائیں گے۔ ان کے اصرار پر حضرت موسیٰ ؑ ستر منتخب آدمیوں کو کوہ طور پر لے گئے اور سوال کیا۔

"میرے رب! مجھے اپنا آپ دکھا تاکہ میں تیری طرف دیکھوں۔ کہا۔ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ اپنی جگہ پر رہ جائے تو تو بھی دیکھ سکتا ہے۔ پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہا تو پاک ہے، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔" (الاعراف: ۱۴۳)۔ "اسی وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست بجلی (صاعقہ) نے تمہیں آ لیا۔ مگر پھر ہم نے تمہیں موت کی سی حالت کے بعد اٹھایا تاکہ شکر کرو۔" (البقرہ ۵۵، ۵۶)

آتشِ نمرود وہ آگ جسے نمرود نے حضرت ابراہیم ؑ کو زندہ جلانے کے لیے جلایا تھا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم ؑ ایک خدا کی عبادت کی تلقین کرتے تھے اور بابل کا بادشاہ نمرود بزعم خود خدا بنا بیٹھا تھا ان کی باتوں سے قوم ان کی مخالف ہو گئی اور ہر طرف سے آواز آنے لگی۔ "اسے مار ڈالو یا جلا دو" (العنکبوت: ۲۴)، "اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اسے جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو" (الانبیاء: ۶۸) "وہ بولے اس کے لئے ایک عمارت بناؤ۔ پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔" (الصفٰت ۹۷)

"لغات ہیرا" کے مطابق یہ آگ ایک فرسنگ (تقریباً نصف فرلانگ) کے احاطے میں جلوائی گئی تھی اور اس گرمی سے چار فرسنگ تک کوئی ذی حیات اس کے قریب نہ جا سکتا تھا۔

بابل کے لوگوں نے ہر طرف سے اس کے لئے لکڑیاں فراہم کیں۔ اس کام میں نمرود کے ہر ماننے والے نے اپنی ہمت اور بساط کے مطابق حصہ لیا، یہاں تک کہ عورتوں نے بھی ہاتھ بٹایا یہ لوگ عرصۂ دراز تک لکڑیاں اکٹھی کرتے رہے، حتیٰ کہ پہاڑ کے برابر لکڑیوں کا ڈھیر ہو گیا اور پھر ایک اونچی جگہ آگ جلا دی گئی۔ حضرت ابراہیم ؑ کے ہاتھوں کو باندھ کر انہیں اس آگ کے سپرد کر دیا گیا۔

آگ کی تپش نے حضرت ابراہیم ؑ کے ہاتھوں کی رسیوں کو جلا دیا۔ بارگاہ خداوندی سے حکم ہوا "اے آگ! سرد ہو جا! اور ابراہیم ؑ پر سلامتی بن" (الانبیاء: ۶۹)

چنانچہ آگ کی گرمی اور سوزش مفقود ہو گئی اور آگ کی جگہ گل و گلزار کھل گئے اس معجزے کو دیکھ کر نمرود حیران رہ گیا۔ مگر وہ ایمان پھر بھی نہ لایا۔ اس کے رویے سے تنگ آ کر حضرت ابراہیم ؑ نے فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی (نیز دیکھئے "ابراہیم" و "نمرود")

آثارِ قیامت قیامت کی نشانیاں، قیامت کب آئے گی۔ اس کا صحیح علم کسی کو حاصل نہیں، کچھ علامات اور نشانیاں بتا دی گئی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید اور دیگر صحائف میں موجود ہے اور جن کی تصدیق سائنس کے جدید نظریات سے بھی ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں آثار قیامت کا جگہ جگہ ذکر ملتا ہے۔ ایک سورت کا تو نام ہی "قیامت" ہے جس میں آیا ہے کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے کو خود سری کرتا چلا جائے۔ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہو گا۔ جب آنکھیں چندھیا جائیں اور چاند گہنا جائے۔ اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں۔ اس دن انسان کہے گا کہ اب کہاں بھاگ جاؤں بے شک کہیں پناہ نہیں۔ اس روز پروردگار ہی کے پاس ٹھکانا ہے۔ اس دن انسان کو جو عمل اس نے آگے بھیجے اور پیچھے چھوڑے ہونگے سب بتا دیئے جائیں گے۔ بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے۔ اگرچہ عذر و معذرت کرتا رہے (سورۃ القیامۃ)

قرآن شریف میں جا بجا واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ حضورؐ کی دنیا میں تشریف آوری قرب قیامت کی پہلی نشانی ہے

حضورؐ نے فرمایا "بھیجا گیا ہوں میں اور قیامت مثل دو انگلیوں کے یعنی انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کے" آثارِ قیامت کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ حضورؐ کی وفات۔ شہادت حضرت عثمان غنیؓ جنگ جمل۔ حضرت امام حسنؑ کی خلافت سے دستبرداری۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت۔ واقعہ حرّہ۔ فتنۂ ترک و تاتار۔ مال و دولت کی افراط۔ ارتفاع علم کثرت زلازل۔ حج کی بندش۔ و مدار ستارہ اور اس کے علاوہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ قربِ قیامت کی ۷۲ نشانیاں ہیں جب تم دیکھو کہ لوگوں نے نماز ضائع کرنا شروع کر دی۔ امانت میں خیانت کرنے لگے۔ سود کھانے لگے۔ جھوٹ کو حلال سمجھنے لگے۔ خون ریزی کو معمولی بات سمجھنے لگے۔ اونچے گھر بنانے لگے۔ دین کو دنیا کے بدلے فروخت کرنے لگے صلہ رحمی ترک کر دی۔ جھوٹ کو سچا سمجھا جانے لگا۔ مرد ریشمی کپڑے پہننے لگے ظلم کا ہر طرف دور دورہ ہونے لگا۔ طلاق کثرت سے ہونے لگی۔ موت ناگہاں آنے لگی۔ خائن امانت دار بن گئے۔ امانت دار خیانت کرنے لگے۔ آسمان سے آگ خون یا پتھر کی بارش ہونے لگی۔ بارش کم ہونے لگی۔ اولاد نالائق پیدا ہونے لگی بخیل لوگوں کی کثرت ہو گئی۔ سخی لوگوں کی کمی ہو گئی۔ امراء فاجر اور وزراء جھوٹے بن گئے۔ قاری فاسق بن گئے۔ بکریوں کا چمڑا پہننے لگے۔ دل مردار سے زیادہ بدبودار اور ایلوے سے زیادہ تلخ ہو گا۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو چاروں طرف سے گھیرے گا۔ سونے چاندی کی افراط ہو گی۔ واعظ اور خطیب بہت ہوں گے۔ مگر امر بالمعروف کم ہو گا۔ قرآن مجید کو زیورات پہنائیں گے۔ مسجدوں میں نقش و نگار بنائیں گے۔ منبر لمبے لمبے تیار کیے جائیں گے۔ شراب پی جائے گی۔ حدود معطل ہو جائیں گے۔ ننگے پاؤں ننگے بدن والے بادشاہ بن جائیں گے عورت شوہر کی تجارت میں شریک ہو گی۔ عورتیں مردوں کی ہم شکل بنیں گی۔ لوگ غیر اللہ کی قسم کھائیں گے۔ مرد بلا حجاب گواہی دیں گے۔ سلام صرف جان پہچان کے لوگوں کو کیا جائے گا۔ علم دین دنیا کمانے کے لیے حاصل کیا جائے گا۔ دین سے دنیا کمائی جائے گی۔ مال غنیمت کو دولت، امانت کو غنیمت سمجھا جائے گا۔ زکوٰۃ کو تاوان سمجھیں گے۔ قوم کا سردار رذیل اور کمین ہو گا۔ بیٹا باپ کا نافرمان ہو گا۔ دوست کو باپ پر ترجیح دے گا۔ شوہر بیویوں کی اطاعت کریں گے۔ فاسقوں کی آواز مسجد میں بلند ہو گی۔ لوگ گانے بجانے والی عورتوں کو پسند کریں گے۔ سرِ راہ شراب نوشی ہو گی۔ ظلم پر فخر کیا جائے گا۔ انصاف فروخت ہو گا۔ ظالموں کے مددگاروں کی کثرت ہو گی۔ لوگ قرآن کو موسیقی کی طرز پر پڑھیں گے۔ شیر چیتوں کی کھال بچھا کر بیٹھیں گے۔ پچھلی اُمت اگلی اُمت پر لعنت کرے گی۔ جس وقت یہ باتیں ظہور میں آئیں گی اس وقت سرخ آندھی، صورتیں مسخ ہو جانے اور آسمانی عذاب کا انتظار کرو۔ جس وقت صرف زبانی جمع خرچ رہ جائے۔ عمل کا نام نہ رہے گا۔ ظاہر میں لوگ موافق باطن میں مختلف ہوں گے۔ صلہ رحمی باقی نہ رہے گا۔ امام مہدی کا ظہور ہو گا۔ نزول عیسیٰ علیہ السلام ہو گا۔ یاجوج ماجوج کی قوم دنیا میں نکل پڑے گی اور افراتفری مچ جائے گی۔ مغرب سے آفتاب طلوع ہو گا۔ کوہ صفا زلزلہ سے پھٹ جائے گا۔ اور اس میں سے ایک عجیب و غریب صورت و شکل کا جانور برآمد ہو گا۔ دنیا میں کوئی مسلمان نہ ہو گا سب ایماندار مر جائیں گے۔ کانا دجال دنیا میں آ کر لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ لوگ زیادہ سے زیادہ اس سے مل جائیں گے اور اس کے کہنے پر چلنے لگیں گے۔ یہ نشانیاں ہیں قیامت کی۔

آخرت سب سے بعد کی دوسری زندگی، حیات بعد الموت، حشر کے بعد کی زندگی۔ آخرت کا لفظ "آخر" کا مؤنث ہے اور قرآن حکیم میں موت کے بعد کی زندگی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جو بالکل نئی طرح کی ہو گی ارشاد ہوتا ہے۔

"اور اللہ نے تمہیں زمین سے سبزہ کے طور پر اگایا۔ پھر وہ تمہیں اس میں لوٹا دے گا اور تمہیں ایک (نئی) پیدائش میں نکال کھڑا کرے گا" (نوح - ۱۷، ۱۸)

بعض مفسرین نے آخرت کو دار الآخرت (یعنی آخری گھر) بھی کہا ہے۔ جو وجود گھر یعنی دنیا کی ضد ہے نیز اسے دار البقا (باقی رہنے والا گھر) بھی کہتے ہیں جو دار الفنا (فنا ہونے والا گھر) کی ضد ہے۔

آخرت پر ایمان اسلام کا پانچواں اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان کے بعد جب تک موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہ لایا جائے، یہ مکمل نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔" (النحل - ۲۲)

آخرت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی شے یا انجام کے بعد [illegible] اسے آخرت کہا جاتا ہے۔ گویا عالم آخرت وجود رکھتا ہے [illegible] کے خاتمے کے بعد شروع ہو گا۔

اصطلاحاً موت سے لے کر قیامت تک کے وقفے کو عالم [illegible] اور قیامت سے لے کر ابد الآباد تک کے دور کو حشر کہا جاتا ہے۔ [illegible] مخلوقات کا حساب کتاب ہو کر اعمال کے مطابق جزا و سزا مل جائے [illegible] آخرت کا دور شروع ہو گا۔ جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا [illegible] گویا آخرت وہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔ جو دنیا میں کیے گئے اعمال کے [illegible]

خدا نے ہمیں آخرت کے متعلق بتایا ہے کہ وہی ہماری [illegible] وہی اصل مقام ہے۔ ہم اسی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں [illegible] وہیں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ دین اسلام کا حکم ہے کہ [illegible] اور متابعت ہیں اور اس کی دنیا کو پُرامن بنا کر [illegible] کے اعمال ہی اسے آخرت کے لیے تیار کرتے ہیں [illegible] کا اجر ملے گا۔ (نیز دیکھئے "جنت" "دوزخ")

آخرت کا تصور اسلام کے علاوہ بھی بہت سی مذاہب [illegible] بلکہ اگر یوں کہیں کہ مذہب کا آغاز ہی ایمان بالآخرت سے ہوا [illegible] ہو گا۔ قدیم ترا دوار کے انسان بھی کسی نہ کسی صورت میں موت کے بعد [illegible] یقین رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے تصورات پیچیدہ اور مختلف ہوتے تھے۔ قدیم لوگوں کے نزدیک انسان مرنے کے بعد روح کی شکل میں دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے۔

افریقی اقوام کے نزدیک نیک روحیں دیوتاؤں سے مل جاتی ہیں اور بدکاروں کی روحیں اس دنیا میں دوبارہ آتی اور جسم سے الجھتی رہتی ہیں۔ یہ بالعموم کتوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔

یہی حال امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل کا ہے۔ ان کے نزدیک روح کو بقاء حاصل ہے لیکن جزا و سزا نہیں ہوتی۔ البتہ روحیں ایک خاص مسکن کی طرف چلی جاتی ہیں۔

قدیم بابل اور آشوریہ کے لوگ بھی حیات بعد الموت میں یقین رکھتے تھے

ان کی تحریروں میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اگلی دنیا کیسی ہے؟ اور جنت کی زندگی کس قسم کی ہوگی؟ نیز دوزخ کو ایک تاریک مسکن بتایا گیا ہے۔ جس میں ہر وقت بھوت پریت اڑتے رہتے ہیں۔

قدیم مصریوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ عام تھا کہ روح غیر فانی ہے۔ البتہ مرنے کے بعد وہ پھر سے کسی خالی جسم میں سما جاتی ہے۔ زمانۂ مابعد میں ان کے عقیدے میں تبدیلیاں آتی رہیں اور روحوں کا مسکن کسی خاص مقام کو ٹھہرایا جانے لگا۔ کچھ لوگ اس بات کے قائل بھی تھے کہ روحیں ستاروں میں سکونت پذیر ہو جاتی ہیں۔ بعض مصری تحریروں سے جزا و سزا اور آخرت کے تصور کا بھی علم ہوتا ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں بھی آخرت کا تصور کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے۔ کنفیوشس اس بارے میں تذبذب کا شکار رہا، لیکن تاؤ پرست دیوتاؤں کے ساتھ آخرت کا ذکر کرتا ہے۔ اسے آخری گھر قرار دیتا ہے اور موت کو اس گھر کی طرف ایک کشادہ دروازہ سے تشبیہہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک دوسری زندگی نہایت خوشگوار ہے۔ اس میں نیک لوگ نہایت آرام کے ساتھ زندگی بسر کریں گے اور برے مزید برائی نہیں کر سکیں گے۔ البتہ وہ بروں کی سزا کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔

قدیم ہندوستان کے آریا قبائل بھی آخرت میں راسخ یقین رکھتے تھے۔ وہ لوگ تناسخ اور آواگون (یعنی روح کا جسم تبدیل کر لینا) پر ایمان نہیں رکھتے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی مذہبی کتاب رگ وید میں ایک بار بھی تناسخ کا ذکر نہیں آیا۔ البتہ ہندوؤں کے فلسفۂ ہندومت میں روح حقائق کے ذریعے مکتی (نجات) حاصل کر کے آتما (روح کائنات) سے مل جاتی ہے اور پھر آتما سے واپس نہیں آتی۔ ہندوؤں ہی کے ایک عقیدے کرم کے تحت روح اس دنیا میں بار بار آتی رہتی ہے اور یہ چکر اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ روح مکتی حاصل نہیں کر لیتی۔

زرتشت کے ہاں آخرت کا تصور زیادہ واضح ہو جاتا ہے اور وہ اسلامی تصور سے مماثل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی تشریح و تفسیر مختلف ہے۔ نیز اس کے نزدیک آخرت جسمانی بعثت پر مبنی ہوگی۔

آخرت کے اس عقیدے کو سمجھنے کے لئے انسان کے جوہر یعنی روح کا تجزیہ ضروری ہے۔ اخلاقیات اور مذہب میں ہم جن چیزوں کو شر اور خیر کہتے ہیں۔ انہیں سمجھنے کے بعد ہی ہم روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ (دیکھئے "روح") دین میں اس روح کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

۱- روح حیوانی

۲- روح الٰہی

قرآن پاک میں روح حیوانی کے لئے "نفس" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو مائل بتحریص اور بدی کے آگے جھک جاتا ہے۔ جب اسے موت آ جاتی ہے تو "روح الٰہی" زندہ رہتی ہے۔ یہی روح آخرت کا توشہ ہے، جو خیر کو برقرار رکھتی ہے اور بدی کی مزاحمت کرتی ہے۔ انسانی نفس اس دنیا میں تین حالتوں سے گذرتا ہے۔ (نیز دیکھئے "نفس")

۱- امّارہ (باغی اور نافرمان)

۲- لوّامہ (خود کو مجرم اور گناہگار سمجھنا)

۳- مطمئنہ (پاک اور اللہ کی رضا پر چلنا)

جب نفس آخری حالت یعنی نفس مطمئنہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تو گویا وہ روح الٰہی سے مل جاتا ہے۔ اور یوں روح الٰہی آخرت کے لئے پورے طور سے تیار ہو جاتی ہے اور موت کے بعد اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہے۔ جس کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں کہا جاتا ہے۔ تمہارے رب نے کیا اتارا؟ کہتے ہیں بھلائی۔ جو لوگ نیکی کرتے ہیں، ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر یقیناً بہتر ہے اور متقیوں کا گھر بہت ہی اچھا ہے" (النحل = ۳۰)

اب رہا یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں۔ روح کہاں جاتی ہے؟ کیا وہ جسم کو چھوڑ جاتی ہے؟ یا پھر سے اس کے ساتھ تعلق قائم کر لے گی؟ مولانا مودودی اس کا جواب یوں دیتے ہیں۔ "جہاں تک سائنس کا تعلق ہے یہ سوال اس کے دائرے سے قطعی خارج ہے جو شخص سائنس کا نام لے کر یہ کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں، وہ سائنس سے انحراف کرتا ہے ایک گنوار نے اگر راکٹ نہیں دیکھا تو وہ اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر ساری دنیا کے لوگوں نے بھی ایک شے کو نہ دیکھا ہو تو بھی اس کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔"

آگے چل کر مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ "...ان کی اخلاقی زندگی کے لئے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لئے ایک دوسرا انتظام عالم درکار ہے۔ جس میں اخلاق کا قانون حکمران ہو جس میں زندگی غیر محدود ہو، جہاں نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں عیش اسے ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے اور فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا نظام ضرور آئے مگر عقل اس دوسرے جہان کا ادراک نہیں کر سکتی۔"

جس خدا نے اتنا بڑا انتظام کائنات قائم کر رکھا ہے۔ جس نے اجرام فلکی کو اپنے قانون کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے۔ جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایک غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے۔ جن کے ادراک سے ہم عاجز ہیں، اس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ ہم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں کیسی بڑی خام خیالی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی جیسی بے جان شے سے تمہیں پیدا کیا ہے۔" (الحج = ۵) تو پھر جان لیجئے کہ "وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس کے لئے سہل تر ہے۔" (الروم = ۲۷)

اس عقلی استدلال اور قرآنی اثبات کے پیش نظر یہ جان لینا چاہیے کہ ایک اور عالم بھی ہوگا، جہاں مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے اس اُخروی زندگی کا تعلق محض فلسفیانہ نہیں بلکہ انسان کے اخلاقی اور عملی زندگی سے ہے۔ اسے ماننے پر لازم ہے کہ انسان خود کو ایک ذمہ دار ہستی سمجھے اور جواب دہی اور انجام کے خیال سے مستقبل کی سعادت اور اجر کو حاصل کرنے کی کوشش کرے متاع دنیا سے بے نیازی کرے اور یاد رکھے کہ:-

"دنیا کے ملکوں میں کفر کی روش اختیار کرنے والے لوگوں کا چلنا پھرنا تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے۔ پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے، جو بدترین جائے قرار ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے ایسے باغ ہیں

جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ۔ ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے ، ان کے لئے اللہ کی طرف سے سامان ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے ، نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے ۔" (آل عمران ۔ ۸ ۔ ۱۹۶) (نیز دیکھئے قیامت و حشر)

آخری چہار شنبہ مسلمانوں کا ایک تہوار ، جو ہر سال ماہ صفر کے آخری بدھ کے روز منایا جاتا ہے ۔ "چہار شنبہ" فارسی زبان کا لفظ ہے ۔ جس کے معنی "بدھ" کے ہیں ۔ یہ تہوار اس واقعہ کی یاد کے طور پر منایا جاتا ہے ۔ جب حضور اکرم طویل بیماری کے بعد صحت یاب ہوتے تھے ۔ آپ غسل صحت فرما کر شہدائے احد کے مزارات پر تشریف لے گئے اور ان کے لیے دعائیں فرمائیں ۔

اس تہوار کے پس منظر میں کچھ اور بھی واقعات ہیں ۔ کیونکہ مذکورہ واقعے کی کوئی تاریخی سند نہیں اور نہ ہی یہ تہوار عرب میں کبھی منایا گیا ۔ یہ صرف پاک و ہند کے مسلمانوں کی ایجاد ہے ۔
حضور کی علالت کا آغاز ماہ صفر کے بدھ سے ہوا ۔ مگر مدت علالت اور تاریخ وفات کی روایات میں اختلاف ہے ۔ مختلف روایات کے تحت وفات یکم دو اور بارہ ربیع الاول کو ہوئی ۔ عام متفقہ تاریخ یکم ربیع الاول ہی ہے ۔ کیونکہ علالت کی کل مدت تیرہ روز بتائی جاتی ہے جو چہار شنبہ ۱۸ صفر سے شروع ہوئی ۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ آپ کی علالت اس وقت شروع ہوئی جب صفر کی کچھ راتیں باقی تھیں ۔ شاہجہان بادشاہ کے ہاں ۱۲ ربیع الاول کی رات کو محفل میلاد منعقد ہوتی تھی ۔ بعد کے مغلیہ درباروں میں ۱۳ صفر بھی منایا جانے لگا ۔ اس روز قلعہ معلیٰ دہلی میں دربار لگتا اور شہزادے اور امرا شریک ہوتے ۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ۱۳ کا ہندسہ پورے سال کے لئے منحوس ہے شاید "آخری چہار شنبہ" کا تہوار اس کی نحوست کو دور کرنے کے لئے منایا جاتا تھا اسی لئے صفر کے مہینے کو "تیرہ تیزیاں" کا مہینہ کہا جاتا ہے ۔ ایرانیوں کے نزدیک بھی تیرہ کا ہندسہ منحوس خیال کیا جاتا ہے اور ان کے ہاں پہلے سے "سیزدہ بدر" کی رسم منائی جاتی تھی ۔ اس روز سب لوگ گھر سے باہر رہتے اور شام کو واپس آتے تھے ۔ خیال ہے کہ "تیرہ تیزیاں" کی رسم "سیزدہ بدر" سے مشتق ہے ۔

آخری چہار شنبہ منانے کی رسم نے زیادہ تر مغلیہ دور میں نشو و نما پائی ۔ منشی فیض الدین نے "بزم آخر" میں قلعہ معلیٰ دہلی کے آخری چہار شنبہ کا حال لکھا ہے جس میں بادشاہ ، شہزادے اور مکین دہلی ذوق شوق سے حصہ لیتے اور ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ۔ اس کا آغاز صفر کی تیرہ تاریخ سے ہوتا ہے ۔ جس میں گھنگھنیاں ابال کر بانٹی جاتیں ۔

صفر کے آخری بدھ کو بادشاہ دربار کرتا ۔ داروغہ سونے چاندی کے چھلے پیش کرتا ۔ چار چھلے بادشاہ پہن لیتا اور باقی شہزادے اور امرا میں تقسیم ہو جاتے تیسرے پہر کوری ٹھلیا میں تھوڑا سا پانی اور اشرفی کپڑے میں لپیٹ کر ڈالی جاتی اور بادشاہ کے آگے نیچے پھینک دی جاتی ۔ وہ ٹوٹ جاتی تو جمعدارنی اٹھا کر لے جاتی ۔ اب تھوڑا سا پھونس جلایا جاتا اور بادشاہ اسے پھلانگتا ۔ اب دوسری ٹھلیوں میں پیسے ڈالے جاتے ۔ انھیں جمعدارنیاں اٹھا کر لے جاتیں ۔ تیسرے پہر بادشاہ باغ میں جاتا ۔ شہزادوں کے استاد سنہری اور روپہلی پھول دار کاغذوں پر آخری چہار شنبہ کی عیدیاں لکھ کر لاتے انہیں عیدی کے طور پر روپے ملتے ۔

یہی رسوم پاک و ہند کے مسلمانوں میں رائج ہو گئیں ۔ اس روز عام تعطیل ہونے لگی ۔ اسلامی مکتبوں میں میاں جی نے سرخ کاغذوں پر سنہری عیدیاں چھپی ہوئی بچوں کو تقسیم کرنی اور نذرانے وصول کرنے شروع کئے ۔ زعفران ، سیاہی یا گلاب سے آم کے چھلکے یا کیلے کے پتوں پر سات سلام لکھے جاتے اور لوگ مصائب سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں دھو کر پیتے ۔ آج تک یہ رسم کم و بیش جاری ہے ۔ رفتہ رفتہ اس تہوار کی افادیت اتنی بڑھی کہ انگریزوں کو بھی اس کی اہمیت تسلیم کرنا پڑی اور اس روز عام تعطیل ہونے لگی ۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ رسم قائم رہی ۔ چنانچہ اکثر آخری چہار شنبے کی سرکاری تعطیل ہوتی رہی ہے ۔

آخز (AHAZ) (۷۶۲ ۔ ۷۲۶ ق م) سلطنت یہوداہ کا گیارھواں بادشاہ ، یوتام کا بیٹا ، حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے تھا صرف بیس برس کی عمر میں ۷۴۲ ق ۔ م میں تخت نشین ہوا ۔ اس وقت اسرائیل میں فقح کی حکومت تھی جو ۷۵۹ ق ۔ م میں تخت نشین ہوا ۔
یاد رہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو داخلی انتشار اور پھوٹ کا شکار ہو گئے ۔ قبائلی عصبیت کا عفریت غالب آ گیا اور وہ کوئی متحدہ ریاست قائم نہ رکھ سکے ۔ حضرت سلیمان کے بعد تو ان پر دنیا پرستی کا غلبہ بہت زیادہ ہوا اور یہ دو حصوں میں بٹ گئے ۔ شمالی فلسطین اور شرق اردن میں اسرائیل کی سلطنت قائم ہوئی جس کا پایہ تخت سامریہ تھا ۔ جنوبی فلسطین اور ارام کا علاقہ سلطنت یہوداہ کہلایا جس کا پایہ تخت یروشلم تھا ۔
آخز اسی سلطنت یہوداہ کا گیارھواں بادشاہ تھا ۔ اس کا دور حکومت سب سے برا دور حکومت مانا جاتا ہے ۔ "تواریخ بائبل" میں ڈاکٹر بلیکی لکھتے ہیں کہ اس کے دور میں اخلاقی تاریکی ایسی گہری ہو گئی تھی کہ اس سے قبل اس کی مثال ملنا مشکل ہو گیا ۔ بے دینی کے کام کھلم کھلا کئے جاتے ۔ اس نے دیوتا بعل زبول ، مکھیوں کے دیوتا کے بت اونچے مقاموں پر اور ٹیلوں پر بنائے اور ہر درخت کے نیچے قربانی کی حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو وادی ہنوم میں قربانی کے طور پر جلایا ۔
اس کی سزا کے طور پر ڈاکٹر بلیکی رقمطراز ہیں کہ جلد ہی عذاب الٰہی نازل ہوا اگرچہ اسرائیل کی سلطنت اس وقت آخری دموں پر تھی تاہم انہوں نے اپنی کمزوری کے باوجود شاہ آخز کو ایک جنگ میں عبرتناک شکست دی ۔ ان کے علاوہ ادومیوں نے بھی اسے تنگ کیا اور اگرچہ وہ یروشلم پر قابض نہ ہو سکے مگر آخز کو ایلات سے جو خلیج عقبہ پر واقع تھا نکال دیا اور یوں ہندوستان کی تجارت کے منافع سے محروم کر دیا ۔ اسی طرح ارامی اور فلسطینی بھی اسے تنگ کرتے رہے ۔
اس کے دور کے پیغمبر یسعیاہ تھے ۔ ان کے منع کرنے کے باوجود اس نے آشوری بادشاہ تگلت پلاسر سے مدد مانگی اور اس نے جواب میں دمشق پر حملہ کر کے اسے برباد کر دیا ۔ آخز وہ خود شاہ تگلت سے ملنے آیا ۔ لیکن اس نے اسے تنگ کیا اور کوئی کمک نہ دی ۔ ان آفتوں نے اس کے دل کو اور بھی سخت کر دیا اور اگر وہ جلد ہی چھتیس برس کی عمر میں فوت نہ ہو جاتا تو یہوداہ پر وہی تباہی آ جاتی جو اسرائیل پر آئی تھی ۔ لیکن اس کا بیٹا حزقیاہ ایک نیک سیرت شخص ثابت ہوا اور یہوداہ کی سلطنت کے لئے رحمت بن گیا ۔

آخزیاہ (AHAZIA) آخزیاہ یا یہوآخز نام کے دو شخص یہودیوں کی تاریخ میں گزرے

پہلا آخزیاہ سلطنت اسرائیل کا آٹھواں بادشاہ اور آخیاب کا بیٹا تھا اور دوسرا آخزیاہ سلطنت یہوداہ کے چھٹے بادشاہ کا ماموں تھا۔ سلطنت یہوداہ کے چوتھے بادشاہ یہوسفط کی تخت نشینی کے سترہویں برس ۸۹۰ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ اس نے صرف دو برس حکومت کی اور ۸۹۰ ق۔م میں مؤآبیوں نے اُسے تخت سے اتار دیا۔ اس کا دورِ حکومت اگرچہ بُرا تھا لیکن سلطنت یہوداہ سے صلح تھی۔

آخیاب کے ستر بیٹوں میں سے جو سمرون کی جنگ میں مارے گئے تھے، آخزیاہ ہی تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ باپ کی طرح بری خصلت کا مالک نہ تھا، تاہم وہ بت پرستی کی طرف مائل تھا۔ اس نے عقرون کے دیوتا "بعل زبول" کے پاس اپنا قاصد دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ آیا وہ چوٹ جو اُسے سمرون میں لگی ہے، مندمل ہو گی یا نہیں۔

ڈاکٹر ہلی لکھتے ہیں کہ ایلیاہ نبی (الیاس) کو حکم ہوا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اُسے اس بر ملا گستاخی سے روکے۔ بادشاہ نے پیغام سن کر الٹا ایلیاہ نبی کو پکڑنا چاہا لیکن دونوں دفعہ آسمان سے آگ گری اور بادشاہ کے پچاس آدمی بھسم ہو گئے۔ آخر ایلیاہ نبی خدا کے حکم سے خود ہی بادشاہ کے سامنے آگئے اور کہا کہ سچے خدا کی تحقیر کرنے کے بدلے میں اُسے شفا نصیب نہیں ہو گی۔

حال ہی میں ایک کتبہ دریافت ہوا ہے جس پر درج ہے کہ آخیاب کے مرنے کے بعد موآب کے علاقے کے لوگوں نے اسرائیل کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ کتبہ ایک ستون پر درج ہے اور موآبی پتھر کہلاتا ہے۔ موآبی بادشاہ میسا نے حملہ کر کے ان علاقوں کو جہاں اسرائیلی بادشاہ کے دستے موجود تھے، محاصرہ کر لیا اور سخت لڑائی کے بعد ... مطیع کر لیا اور موآبی شہروں کو پھر سے آباد کرنا شروع کر دیا، جنہیں اسرائیلیوں نے تباہ کر دیا تھا۔

آخزیاہ کے مرنے کے بعد اس کا بھائی یہورام حکمران ہوا اور اس نے بارہ برس حکومت کی۔

دوسرا آخزیاہ نامی شخص سلطنت یہوداہ کا چھٹا بادشاہ، یہورام بادشاہ یہوداہ کا بیٹا اور یہورام اور آخزیاہ بادشاہان اسرائیل کا بھانجا تھا۔ ۹۰۰ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۸۸۴ ق۔م کو قتل ہو گیا۔

یہوسفط بادشاہ یہوداہ کا یہ پوتا ۸۸۵ ق۔م میں بائیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے ماموں آخزیاہ شاہ اسرائیل کی طرح صرف ایک برس حکومت کی اور یہورام شاہ اسرائیل کے سپہ سالار یاہو نے اُسے ۸۸۴ ق۔م میں قتل کر دیا اور یوں اس نے شاہانہ زندگی کی شیرینی کا مزہ تھوڑی دیر کے لیے چکھا۔ اس کی ماں عتلیاہ، آخزیاہ بادشاہ اسرائیل کی بہن اور آخیاب بادشاہ اسرائیل کی بیٹی تھی۔ وہ گناہوں کا مجسمہ تھی، اس لیے اس کی بری صلاح نے آخزیاہ کو اپنے باپ یہورام کے تجربہ سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ وہ اپنے باپ کے بڑے نمونے پر چلا اور بُت پرستی کو ترقی دیتا رہا۔ اس نے اپنے ماموں یہورام کی حمایت کی جو اس وقت رامات جلعاد کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہورام شاہ اسرائیل اس لڑائی میں زخمی ہوا تو آخزیاہ اُسے یزرعیل میں دیکھنے چلا گیا۔ اس پر یہورام کے سپہ سالار یاہو کو ایک نبی نے آخیاب کے گھرانے کے خاتمے کے لیے کہا۔ بادشاہ کو پتہ چلا تو وہ آخزیاہ کے ہمراہ بغاوت فرو کرنے کے لیے باہر نکل آیا۔ چونکہ دونوں آخیاب کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے یاہو کی تلوار دونوں کے خون کی پیاسی تھی اس کے ایک تیر نے یہورام کا خاتمہ کر دیا۔ آخزیاہ بھاگ کھڑا ہوا لیکن وہ بھی مارا گیا۔ اس کے بعد یاہو نے بعل زبول دیوتا کے پجاریوں، کاہنوں اور ماننے والوں کو تہ تیغ کیا۔

آخزیاہ کے بعد اس کی ماں عتلیاہ تخت نشین ہوئی اور تخت پر بطور نشانی اپنے پوتے اور آخزیاہ کے بیٹے یوآس کو جو اس وقت سات برس کا تھا، بٹھا دیا۔

آخش

پارسیوں کا ایک مذہبی پیشوا، زرتشت سے بہت پہلے پیدا ہوا تھا اس نے مادہ پرستی کی تعلیم دی۔ وہ مادے کے عناصر اربعہ کو دنیا کا خالق تصور کرتا تھا لیکن اس کے پیروکاروں نے صرف آگ کو پوجنا شروع کیا، کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی عبادت خانے میں معبود یا اس کے مظہر کے طور پر صرف آگ کی پوجا ہو سکتی تھی۔ آخش کے معبدوں میں رکھی ہوئی آگ کو آذرِ آخش کہتے تھے۔ بعد ازاں زرتشت نے اپنی قوم کی اصلاح اور خدائے واحد پر ایمان لانے کی تعلیم دی۔ اس کے خیال میں یہ چاروں عناصر صرف قدرت کے مظاہر ہیں۔ اس لیے ان کا احترام کرنا چاہیے۔ (نیز دیکھیے "آتش پرستی")

آخیاب AHAB یا اخی اب

سلطنت اسرائیل کا ساتواں بادشاہ، عمری کا بیٹا اور آخزیاہ کا باپ تھا۔ ۹۱۸ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ اس کا نام مشاہیر تاریخ میں سے ہے۔ اس کے زمانے میں اسرائیل کی سلطنت بت پرستی کی طرف مائل ہو گئی۔ بت پرستی کو تحریک دینے والی اس کی بیوی ایزبل تھی جو ایک فنیقی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ یہ عورت فنیقیوں کے دیوتا بعل زبوب کی پوجا کو بڑی تیزی کے ساتھ ترقی دے رہی تھی۔ چنانچہ اس نے سمرون میں جو اسرائیل کا نیا پایۂ تخت تھا ایک مذبح اور ہیکل اس بت کے لئے تعمیر کیا۔ آخیاب نے صرف بائیس برس حکومت کی اور ۸۹۶ ق۔م میں ایک جنگ میں مارا گیا۔

"تواریخ بائبل" میں ہے کہ اس کے زمانے میں ایلیاہ (الیاس) نبی تھے۔ جنھوں نے آخیاب کو اس کی بت پرستی پر بارش نہ ہونے کی بددعا دی اور مکمل تین برس تک خشک سالی رہی۔ اس کے بعد خدا نے بارش عطا کی اور یوں ایلیاہ کو آخیاب پر فتح ہوئی لیکن ایزبل کے حسد اور غصہ نے ایلیاہ کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ سینا کی وادیوں کی طرف چلے گئے۔

تفہیم القرآن میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) نے دعا مانگی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا۔ تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا۔ ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں۔ سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔" (سلاطین باب ۱۹ آیت ۱-۱۰)

اسی اثنا میں آخیاب کی توجہ مذہبی معاملات سے اٹھ کر سلطنت کی حفاظت کی طرف مبذول ہوئی۔ بن ہدد شاہ ارام پھر اس مملکت پر حملہ آور ہوا۔ اس کے جھنڈے تلے تیس بادشاہ موجود تھے۔ اس نے سمرون کا محاصرہ کر لیا اور آخیاب کو اطاعت کرنے کا ایک ناشائستہ پیغام بھیجا۔ آخیاب نے غصے میں اسے رد کر دیا۔ اس پر گھمسان کی جنگ ہوئی اور بن ہدد نے شکست کھائی لیکن دوسرے ہی سال بن ہدد پھر حملہ آور ہوا۔ اس بار وہ پہاڑی علاقہ سے کنارہ کش ہو کر اسدرلان کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ بہت زور شور سے جنگ ہوئی اور بہت سے ارامی کام آئے۔ بن ہدد مجبور ہو کر آخیاب کے سامنے جھک گیا۔ لیکن آخیاب نے غلطی کی اور اسے معاف کر دیا۔ وہ تیسری بار پھر رامات جلعاد کے مقام پر نمودار ہوا جو اردن کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ آخیاب نے اپنے ہمسایہ شاہ یہوداہ یہوسفط کو بھی لڑائی میں شریک ہونے پر اکسایا۔

زدروں کی جنگ ہوئی، آخیاب اس لڑائی میں مارا گیا اور اُردن کی ان اطراف میں بن ہدد نے جو چاہا سو کیا۔ آخیاب کے بعد اس کا بیٹا اخزیاہ تخت نشین ہوا۔ "تواریخ بائبل" کی اطلاع کے مطابق آخیاب کے ستر بیٹے تھے جو سمرون کی اس جنگ میں مارے گئے۔

آداب اچھے اور پسندیدہ اطوار، جو کسی انسان کے اچھے اور مہذب ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کا قول ہے کہ آداب نیک خصلتوں کا جمع ہونا ہے۔ جو لوگ اچھی عادتیں اپنا لیتے ہیں اور نیکیاں کرتے ہیں باادب کہلاتے ہیں۔

اسلام نے پیدائش سے لے کر موت تک کے ہر موقع کے لیے آداب مقرر کیے ہیں۔ کوئی موقع اور محل ایسا نہیں، جس کے مطابق آداب کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ رسول اکرمؐ خود بھی آداب کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے، باتیں کرنے اور ملنے جلنے حتیٰ کہ زندگی کے ہر پہلو میں اس کے آداب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ احادیث اور اسلامی قوانین گویا وہ مسلمہ آداب ہی ہیں، جن کے تحت مسلمان کو اپنی پوری زندگی گذارنا چاہیے۔

آداب کی اقسام لکھتے ہوئے شیخ ابو النصر سراج کہتے ہیں۔ آداب میں لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اہل دنیا، جن کے نزدیک ادب فصاحت اور بلاغت علوم و فنون کی تحقیق و تدوین زمانے کے بادشاہوں کے قصے اور شعرا کے اشعار کا اچھا ذخیرہ حفظ کرنا ہے۔ دوسرے اہل دین کہ ان کے نزدیک ادب نفس کو ریاضت اور مجاہدہ کا عادی بنانا ہے۔ انہیں تادیب و حدود الٰہی کے ماتحت رکھنا اور نفسانی خواہشات کو ترک کرنا ہے۔ تیسرے اہل خصوصیت کہ ان کے نزدیک ادب دل کو پاک رکھنا، باطن کے بھید کی رعایت کرنا، عہد کو پورا کرنا، وقت کی نگہداشت اور خیالات پراگندہ کو کم کرنا ہے۔ اور پھر طلب و قرب کے مقامات اور حضوری کے اوقات میں سب سے اچھا ادب کرنا ہے۔

مختلف آداب مختلف عنوانات کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ دیکھیے "احرام" "اخلاق"، "بیت الخلاء"، "تجرد"، "جسم"، "جمائی"، "جہاد"، "چلنا پھرنا"، "چھینک"، "حج"، "روزہ"، "زکوٰۃ"، "سفر"، "سلام"، "صحبت"، "طعام"، "طہارت"، "غسل"، "گفتگو"، "لباس"، "مجلس"، "مزاح"، "مصافحہ"، "میت"، "میثاق"، "نشست"، "نکاح"، "نیکی"، "نیند"، "نماز"، "وضو"، "وعدہ"، "ہنسی" وغیرہ۔

آدم علیہ السلام ابو البشر، سب سے پہلے انسان، اولین پیغمبر، خلیفۃ اللہ فی الارض آج کی دنیا کے تمام لوگوں کے باپ، مسجود ملائک، لقب صفی اللہ۔

آدم کا لفظ اسم معرفہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر بعض اوقات مورث اعلیٰ کے طور پر بھی اور نسل انسانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی مٹیالے رنگ کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ آدم کو آدم اس لیے کہا گیا کہ اسے عقل و فہم دے کر تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی۔ گویا اسے آدم کہنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آدم کے معنی فضیلت کے ہیں۔ یا پھر آدمؑ کا نام اس لیے رکھا کہ اس میں مختلف عناصر اور متفرق قوی رکھے گئے اور ابن درید کے مطابق یہ لفظ اُدمۃ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "گندمی" کے ہیں۔ جب کہ امام راغب کے نزدیک "ادمۃ" کے معنی "ملانا جلانا" کے ہیں بعض علما کے نزدیک آدم کا لفظ "ادیم" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "سطح زمین" کے ہیں۔ طبرانی زبان میں "آدام" کا لفظ ہے، جو انسان اور نوع انسانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا آدم کا لفظ جد امجد اور نوع انسانی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں تخلیق آدم کا قصہ کوئی آٹھ سورتوں میں آیا ہے، اور آدمؑ کا لفظ کوئی پچیس بار استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ "آدم" کی جگہ "بشر" اور "انسان" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

انسان کی پیدائش کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس آرام کرے۔" (الاعراف = ۱۸۹)

قرآن حکیم میں حضرت آدم کا قصہ جن آٹھ سورتوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ "بقرہ" "آل عمران"، "اعراف" "حجر"، "بنی اسرائیل" "کہف" "طٰہٰ" اور "ص" اجمال اس تفصیل کی یوں ہے۔

جب ساری دنیا بنکر تیار ہوگئی۔ آسمان کی چھت تیار ہو چکی، زمین پر انواع و اقسام کی مخلوقات سانس لینے لگیں تو وقت آیا کہ ان تمام اشیاء سے استفادہ کرنے والا اور ان پر حکومت کرنے والا اس دنیا میں آئے، جو اللہ کے خلیفہ کے فرائض بھی انجام دے۔ قرآن مجید میں اس موقعہ پر مشیت الٰہی کا اظہار یوں ہوتا ہے۔

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کیا تو اس کو بناتا ہے۔ جو اس میں فساد کرے اور خون گرائے گا اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ فرمایا۔ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

بعض علماء کا خیال ہے کہ فرشتوں نے آدم سے پہلے کی مخلوق [illegible] خون خرابے کے پیش نظر یہ کہا کہ یہ نئی مخلوق بھی خون خرابہ کرے گی۔ [illegible] بنی نوع انسان حضرت آدمؑ سے پہلے بھی موجود تھی۔ اور [illegible]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت آدمؑ سے پہلے کوئی [illegible] ہوئی تھی؟ اور اگر تھی تو کیسی تھی؟ جواب ہے ہاں۔ قرآن [illegible] طرح یہ نہیں کہا کہ نسل انسانی کوئی چھ ہزار برس پہلے پیدا ہوئی [illegible] ہی آدمؑ پیدا ہوئے۔ امامیہ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے [illegible] سے پہلے تیس آدم پیدا کیے ہر ایک آدم اور آدم کے درمیان ایک [illegible] گذرے اور پھر ان کے بعد دنیا پچاس ہزار سال تک ویران رہی۔ [illegible] ہزار سال تک آباد ہوئی۔ پھر ہمارے جد امجد آدمؑ پیدا ہوئے۔ شیخ [illegible] میں لکھتے ہیں کہ ہمارے آدمؑ سے چالیس ہزار سال پہلے ایک اور آدم تھے [illegible] محمد بن علی الباقر سے روایت ہے کہ اس آدمؑ سے پہلے [illegible] دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے۔

قرآن حکیم نے جب ایک جان "یا نفس واحدہ" کا ذکر کیا ہے تو عام [illegible] پر اس سے حضرت آدمؑ مراد لیے جاتے رہے ہیں۔ امام رازیؒ نے قفال سے اسی کی مثل قول نقل کیا ہے کہ یہاں ہر انسان سے خطاب ہے کہ [illegible] ایک ہی انسان یعنی اس کے والد سے پیدا کیا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ خطاب اہل عرب اور ان کے مورث اعلیٰ سے ہے۔

بائبل میں تخلیق آدم کا قصہ یوں آتا ہے۔

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی

کرے اور زمین سے بخار اٹھتا تھا اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا۔ اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا، اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ سو آدم جیتی جان ہوا۔"

بائبل کے نزدیک تخلیق آدم کا مقصد محض کھیتی باڑی تھا۔ جبکہ قرآن کی رو سے ہم دیکھتے ہیں کہ آدم کو اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا شرف ملا ہے تاکہ وہ دیگر مخلوقات کو کام میں لائے اور اللہ کی نیابت کرے۔

غرضیکہ آدمؑ پیدا ہوئے تو انہیں قدرت کاملہ کی طرف سے علم بھی عطا ہوا۔ انہیں ناموں کا علم دے کر پھر فرشتوں کے سامنے کیا گیا اور کہا گیا "ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔" (فرشتوں) نے کہا تو پاک ہے۔ ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو علم والا، حکمت والا ہے۔ کہا اے آدم ان کے نام انہیں بتا دو۔ پس انہوں نے ان کے نام انہیں بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا! کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں! اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری (سجدہ) کرو تو انہوں نے فرمانبرداری (سجدہ) کی لیکن ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا، چنانچہ کافروں میں سے قرار پایا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے شیطان تو نے کیوں سجدہ نہ کیا۔ کس شے نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے روکا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا، تو نے تکبر کیا یا تو بڑوں میں سے ہے۔ کس بات نے منع کیا کہ میرے حکم کے باوجود بھی تو سجدہ نہ کرے۔ ابلیس (شیطان) نے کہا، کیا میں ایسے کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ میں اس سے بہتر ہوں، کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے کھنکتے گارے اور بدبودار کیچڑ سے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا، دور ہو یہاں سے تجھے نہیں چاہیے تھا کہ تکبر کرتا۔ یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل بے شک تو مردود ہے۔ اور بلاشبہ تجھ پر تاقیامت لعنت رہے گی تو بے شک ذلیلوں میں سے ہے۔

ابلیس نے کہا، اے رب، تاقیامت مواخذہ نہ کرنے کی مجھے مہلت دے اللہ تعالیٰ نے کہا، تجھے مہلت دی گئی وقت مقررہ تک۔ ابلیس نے کہا اے رب تجھے تیری قسم ہے کہ میں دنیا میں بری باتوں کو انہیں اچھا کر دکھاؤں گا اور ضرور ہی سب کو بہکاؤں گا اور ان کے لئے تیرے سیدھے راستے کی راہ ماری کرنے کے لئے گھات میں بیٹھوں گا، پھر ان کے آگے سے، پیچھے سے، اور ان کے دائیں سے بائیں سے ان پر آن پڑوں گا اور تو ان میں سے بہتوں کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔ ابلیس نے کہا، مجھے بتا، کیوں اس شخص کو مجھ سے برتری دی ہے۔ اگر تو نے تاقیامت مجھے مہلت دی تو اس شخص کی اولاد کو چند ایک کے سوا جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا اور تیرے خاص بندوں کے سوا کہ ان میں سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ خاص بندہ ہونا ہی مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ جو لوگ ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔ بلاشبہ تجھ سے اور ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا جنہوں نے ان میں سے تیری پیروی کی، جا پھر جو کوئی تیری پیروی کرے گا۔ تو بے شک جہنم تمہاری سزا ہو گی۔ پوری سزا، بہکا ان میں سے جسے تو بہکا سکے اپنی آواز سے، اور چڑھا لا ان پر اپنے سوار اور پیدل لے کر اور حصہ بانٹ لے ان کے مال میں اور اولاد میں اور ان سے وعدہ کر لے اور کوئی وعدہ ان سے شیطان دھوکے کے سوا نہیں کرتا۔ بلاشبہ میرے بندوں پر تجھے غلبہ نہیں، سوائے ان گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی۔

اے نبیؐ آپ کا رب ان کی کارسازی کے لئے کافی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے کہا۔ اے آدم تو اور تیرا جوڑا جنت میں رہو اور پیٹ بھر کر جہاں سے تم چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ، اگر تم جاؤ گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ اے آدم! یہ ابلیس بیشک تیرا اور تیرے جوڑے کا دشمن ہے۔ کہیں یہ تمہیں جنت سے نہ نکال دے کہ تم بدبخت ہو جاؤ۔ یہاں تو نہ تم بھوکے رہو گے اور نہ دھوپ میں جلو گے۔ پھر وسوسے میں ڈال دیا ابلیس نے انہیں، تاکہ جو پوشیدہ برائیاں ان میں تھیں انھیں ظاہر کر دے۔

ابلیس نے کہا اے آدمؑ میں تجھے ہمیشہ رہنے کا درخت اور نہ پرانی ہونے والی سلطنت کا کیا بتاؤں اور کہا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں سوائے اس کے اور کسی نے اس درخت سے منع کیا کہ تم فرشتے نہ جاؤ گے یا ہمیشہ ہو گے اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ بے شک میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ یہ کہہ کر انہیں دھوکے میں ڈال دیا۔ پھر جب انہوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور انہوں نے جنت کے درخت کے پتوں سے انہیں چھپانا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو للکارا کہ میں نے اس درخت کے کھانے سے روکا تھا اور تم سے نہیں کہا تھا کہ شیطان (ابلیس) تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔ پس اس نے تمہیں ڈگمگایا اور جس میں سے تھے اس میں سے نکال دیا۔

اللہ تعالیٰ نے کہا دور ہو آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لئے ایک وقت تک زمین پر رہنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے اس میں تم جیو گے اس میں تم مرو گے اور اس میں سے اٹھو گے۔ نافرمانی کی آدمؑ نے اپنے رب کی اور بہک گیا۔ پھر آدم کے دل میں اس کے رب نے چند باتیں ڈالیں پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے معاف کیا۔ وہ بلاشبہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔

آدمؑ اور اس کی بیوی (حوّا) نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور مہربانی نہ کرے گا تو بے شک ہم نقصان والوں میں ہوں گے پھر اس کے رب نے اسے پسند کیا اور اسے معاف کیا اور سیدھی راہ بتائی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تم سب یہاں سے دور ہو۔ پھر میرے پاس سے تمہارے پاس ہدایت پہنچے گی۔ پھر جو کوئی ہدایت کے مطابق چلے گا تو اسے کچھ خوف نہ ہو گا، نہ وہ رنجیدہ ہو گا نہ بھٹکے گا اور نہ بدبخت ہو گا۔

حضرت آدمؑ سے متعلق یہ قصہ جو قرآن حکیم کی مختلف سورتوں میں متعدد آیات پر پھیلا ہوا ہے، ہمارے سامنے چار کردار پیش کرتا ہے۔ ایک خدا دوسرے فرشتے تیسرے شیطان اور چوتھے آدمؑ۔ بقول سرسیدؒ کے انسان کی فطرت سے متعلق یہ حکایت ایک دلچسپ اور نہایت عمدہ بیان ہے لیکن عام لوگ چونکہ فطرت کے اس راز کو سمجھنے کے قابل نہ تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے اس راز کو ایک ایسے دلچسپ قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور انسان کی فطرت کے راز کا جو نتیجہ انسان کو حاصل ہونا چاہیے تھا وہ ہر شخص کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اس قصے کو دیکھتے ہوئے خواہ آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے درمیان ایک مباحثہ یا مکالمہ ہوا اور شیطان نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور آدم بھی درخت کا پھل کھا کر اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہوا۔ خواہ میں اسے یوں خیال کروں کہ اس بڑے تماشا کرنے والے (خدا) نے بھانمتی کا ایک تماشا بنایا ہے۔ اس کے راز کو اسی بھانمتی کی اصطلاح

میں بیان فرمایا ہے"۔ قرآن حکیم کے اس بیان سے حضرت آدمؑ سے متعلق جہاں اور بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں وہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ جب حضرت آدمؑ کے پاس اللہ تعالےٰ کے احکام کا سلسلہ جاری ہوا تو ان میں سب سے پہلا حکم یہی تھا کہ اس درخت کے پاس نہ جانا، مگر حضرت آدمؑ بشریت کے تقاضے سے مجبور ہوکر اس شجر ممنوعہ کے پاس چلے ہی گئے۔ اور پھر وہ سخت پریشان ہوئے کہ ان سے اللہ تعالےٰ کے حکم کی جو خلاف ورزی ہوئی ہے وہ کوئی اچھی بات نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں توبہ کی جسے اس نے ازراہِ کرم قبول کر لیا اور آئندہ کے لیے دنیا میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے انہیں پیغمبر منتخب کرکے ایک غیبی طریقے (وحی) سے ہدایت کا سلسلہ جاری کر دیا۔

اگرچہ قرآن حکیم میں احکام وقوانین کے ساتھ ساتھ کچھ قصے بھی اللہ تعالےٰ نے بیان فرمائے ہیں جیسا کہ حکایت آدمؑ سے واضح ہے، لیکن اس سے یہ ہرگز خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان قصوں کا خارج میں وجود ہی نہیں جنہیں اللہ تعالےٰ نے تمثیل یا روایت کے طور پر قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے۔ درحقیقت وہ حقائق جن کا بیان کرنا کسی قصے میں ضروری ہوا ہے، گہرے غور و فکر سے اگر ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہی ان کا خارجی وجود ہے، جسے پیش کرنے کے لیے قصے کا سہارا لینا پڑا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی اللہ تعالےٰ اور فرشتوں کے مابین مکالمہ ہوا۔ "قال" یعنی کہا کا لفظ عربی زبان میں اس بات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جو زبان سے نہ کہی گئی ہو۔ پھر اللہ تعالےٰ کا بندوں سے کچھ فرمانا الگ حیثیت رکھتا ہے اور فرشتوں سے دوسری حیوانات سے تیسری اور زمین و آسمان سے باتیں کرنا چوتھی حیثیت ہے۔ پھر انسانوں میں بھی الگ الگ رنگ اور زبانیں ہیں۔ انسان کے ساتھ اللہ تعالےٰ وحی، الہام، خواب، عقل اور نہ جانے کن کن طریقوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان یہ نہیں جان سکتا کہ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کے ساتھ کس طرح بات کی۔

دوسری بات یہ کہ فرشتوں کا یہ کہنا کہ آدم کو پیدا نہ کر یہ فساد پھیلاتا اور خون گراتا ہے، بطور مشورہ نہیں۔ کیونکہ مشورہ دینا فرشتے کا کام نہیں۔ بلکہ یہ محض ایک حالت کا اظہار ہے کہ انسان سے خون ریزی عمل میں آئے گی۔

آدم کو ناموں کا علم (علم الاسماء) عطا ہونے سے مراد طبعی علم ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ "الاسماء" سے مراد الفاظ، معانی، مفردات اور مرکبات سب ہیں نیز اشیا اور ان کی خصوصیات اور استعمال کا علم بھی اس میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس امر کی روشنی میں سارا علم حضرت آدمؑ ہی کو عطا نہیں ہوا تھا بلکہ بعض علما کے نزدیک یہاں آدم سے مراد پوری نوع انسانی ہے، جس نے علم بتدریج حاصل کیا۔ گویا اللہ تعالےٰ نے آدم کو مختلف اجزا سے پیدا کیا اور اس میں یہ استعداد رکھی کہ وہ قسم قسم کے مدرکات خواہ وہ معقولات ہوں یا محسوسات یا متخیلات یا موہومات ان سب کو ادراک میں لا سکے اور اشیاء کی ذات کی معرفت اور ان کے خواص، ان کے اسماء اور علم کے اصول اور صنعتوں کے قوانین اور آلات کی کیفیت اس کے دل میں ڈالی۔

آدمؑ کا فرشتوں کو اسماء بتانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدمؑ نے انہیں وہ علم دیا جو خدا نے نہ دیا تھا، بلکہ یہ ہے کہ انسان نے اشیاء پر تصرف کے ذریعے یہ ظاہر کر دیا کہ اسے کن کن باتوں کا علم ہے اور چونکہ انسان نے دنیا کی اشیاء پر تصرف

فرشتوں کا فرمانبرداری کرنا اور آدمؑ کو سجدہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ انسان نے فرشتوں کو بھی تسخیر کر لیا۔ یہاں سجدہ عبدیت برائے آدم نہیں بلکہ امام راغب کے نزدیک یہ سجدہ گویا فرشتوں نے آدمؑ کی معرفت خدا تعالےٰ کی قدرت کو کیا تھا۔ اسی سے آدمؑ کا کمال اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ فرشتوں کا یہ سجدہ صرف حضرت آدمؑ کو نہیں بلکہ ہر آدمی کو تھا۔ سورہ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے۔ "ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری صورتیں بنائیں، پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔" (۷: ۱۱) گویا ہر بشر کے لئے وہی کچھ ہے، جو ابوالبشر کے لئے ہے۔

اس وقت شیطان نے، جسے ابلیس (غمگین اور محزون) کہا گیا ہے، مایوس ہوکر کہا کہ وہ تو جنوں میں سے ہے اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے ہیں۔ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں کا سردار نہیں تھا اور نہ آدمؑ سے زیادہ علم رکھتا تھا۔ یہ محض اسرائیلی قصے ہیں جو مسلمانوں میں رواج پا گئے ہیں۔ البتہ وہ ایک ایسی قوت ہے جو لوگوں کو ورغلاتی ہے۔

سرسید نے بھی ابلیس سے مراد ایسی قوت واہمہ لیا ہے، جو لوگوں کو ورغلاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابلیس ایک علیحدہ وجود بھی رکھتا ہے، مگر انسانی ادراک سے مستور اور ماوراء ہے۔ (دیکھئے "ابلیس")

ابلیس کے متعلق ہے کہ وہ محرک بدی ہے اور سفلی خواہشات دل میں ڈالتا ہے اور یہ بنی آدم کے لئے ساتھ لگا ہوا ہے۔ حضرت رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ شیطان ان کے دم کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے مدد کی اور وہ آپؐ کا مطیع ہو گیا، گویا انسان کا مرتبہ یہی ہے کہ وہ ابلیس کو مطیع کرے اور خواہشات نفسانی کو قابو میں کرے۔

اللہ تعالےٰ نے آدمؑ ہی سے اس کا جوڑا یعنی حضرت حواؑ کو پیدا کیا۔ مگر اس طرح نہیں کہ آدمؑ کی ایک پسلی توڑی اور اس سے حواؑ کو پیدا کر دیا۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے ہی نفسوں سے تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔" (الروم : ۲۱) اور دوسری جگہ ارشاد ہے "اور اللہ نے تمہارے ہی نفس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں" (النحل : ۷۲) اس سے مراد یہ نہیں کہ آدمؑ کی پسلی سے حواؑ کو پیدا کیا گیا۔ بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ جہاں سے مرد پیدا ہوا ادھر ہی سے عورت پیدا ہوئی۔ اگرچہ بائبل میں حواؑ کا پسلی آدمؑ سے پیدا ہونے کا ذکر آتا ہے، مگر کسی حدیث سے یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی۔ بخاری شریف میں ایک حدیث ہے "عورت پسلی کی مانند ہے" ایک اور حدیث میں ہے "عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔" یہاں بھی مراد پسلی سے پیدا ہونا نہیں عورت کا پسلی کی طرح ٹیڑھے مزاج کا حامل ہونا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ تمام عورتیں پسلی سے پیدا نہیں ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے قرآن کریم آدمؑ اور حواؑ کے طریق تخلیق سے بحث نہیں کرتا۔ اس کا جواب قرآن نے انسان کے علم و تعقل پر چھوڑ رکھا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی جنت تھی، جہاں آدمؑ اور حواؑ کو رکھا گیا اور جس کا وعدہ اعمال صالحہ کی صورت میں ہے؟

مفسرین نے جنت سے مراد آرام و راحت کی حالت قرار دی ہے۔ گویا شیطان کے ورغلانے سے پہلے حضرت آدمؑ آرام و سکون کی حالت میں تھے اور محض شجر ممنوعہ کے قریب جانے اور پھل کھا لینے سے اضطرار اور بے چینی کی حالت

میں چلے گئے۔ (ممنوعہ پھل کے لیے دیکھیے "آدم کا پھل" "شجر ممنوعہ")

دائرۃ المعارف اسلامیہ میں ہے کہ "اس بنا پر جنت میں رہنے کا اور پھر وہاں سے نکالے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی پیدائش میں بہت سی حالتوں زمانوں اور کیفیتوں میں سے گذرتا ہے، جن میں سے پہلا زمانہ بچپن کا ہے، اس عمر میں رنج و غم پاس نہیں پھٹکتے" وغیرہ۔ گویا وہ ایک ایسے باغ میں ہے، جہاں گھنے درخت، پختہ میووں سے لدے ہوئے، موجود ہیں، نہریں بہہ رہی ہیں، پرندے گا رہے ہیں۔ جوڑے کا ذکر اس لیے کیا ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان اس حکم میں آجائے۔ آدم و حوا کو جنت میں رہنے کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ مذکر و مونث سب ایک حالت میں ہیں اور کھانے پینے کی چیزوں کی اجازت کا مطلب ہے کہ تمام پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور ایک خاص درخت سے دور رہنے کا مطلب ہے شر سے بچنا اور برائی سے دور رہنا۔ چنانچہ جنت سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کے قاعدے کو توڑ کر مشقت میں پھنس جاتا ہے پھر آدمؑ کی توبہ استغفار اسے پھر سے اس حالت میں لے جاتی ہے۔

آدم کے جنت سے نکالے جانے (ہبوط آدمؑ) کے متعلق امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کے معنی کسی مقام (قدر و منزلت) سے اترنے کے بھی ہیں۔ ابن اثیر [illegible] آدم [illegible] نقصان قرار دیتے ہیں۔ تفسیر "روح المعانی" [illegible] جاتا ہے۔
[illegible] اسرائیلی قصے داخل کر دیے ہیں [illegible] سانپ یا [illegible] جنت میں داخل ہوا۔ حالانکہ قرآن حکیم کا [illegible] وسوسہ اندازی تھا۔ نیز یہ جو [illegible] یہاں لغزش نہیں بلکہ ان کی [illegible] کا علاج یعنی توبہ استغفار بھی انسان [illegible] قدر و منزلت [illegible] لے۔

[illegible] بعد [illegible] نظر آنے سے مفسرین [illegible] باطنی عیوب ہیں۔ اس کے [illegible] جس کے معنی بری خصلتوں کے بھی ہیں۔ [illegible] شیطان نے وہ پردہ کھول دیا جو ان کی کمزوریوں اور بری خصلتوں پر [illegible]

جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے مراد یہ ہے کہ جب آدمؑ [illegible] لباس تقویٰ [illegible] ان کی کمزوریاں ظاہر ہو گئیں تو وہ اسے چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

تفاسیر اور قصص الانبیاء کی کتابوں میں قصہ آدمؑ کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچائی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے، اس لیے ہمیں زمانہ ما قبل تاریخ کے واقعات کی چھان پھٹک کرتے وقت عقل سلیم اور استدلال صحیح کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ امر واقعہ ہے تو کیا وہ مقام جہاں نافرمانی سے پہلے حضرت آدمؑ اور حضرت اماں حوا رہتے تھے، جسے جنت کہتے ہیں، خارج میں واقع تھی؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو کہاں واقع تھی؟ ہر چند اس سوال کا جواب قرآن حکیم کے حوالے سے بجز اس کے کہ "تھی" اور [illegible] نہیں ملتا۔ موجودہ تورات کا بیان ہے کہ حضرت آدمؑ کی جنت دو نہروں کے درمیان آباد تھی۔ اور یہ جگہ جیحون، سیحون کے دوآبے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس بیان کی صحت کی سند کے طور پر تورات میں حسب ذیل بیان پیش کیا گیا ہے کہ خدا نے مشرقی عدن میں ایک باغ لگایا اور اس میں آدم کو رکھا۔ عدن سے ایک دریا نکلتا ہے، جو اس باغ کو سیراب کرتا تھا۔ پھر وہاں سے تقسیم ہو کر اس سے چار دریا اور بہنے لگے (۱) ایک دریا فیشون، جو سرزمین حویلہ کو گھیرے ہوئے تھا۔ (۲) دوسرا دریائے جیحون، جو سرزمین کوس کو محیط تھا، تیسرا دریائے حرافل جو اشور کے مشرقی جانب رواں ہے اور چوتھا دریائے فرات۔

بعض مفسرین تورات کا خیال ہے کہ فیشون اصل میں بحر ہند کا نام ہے اور عدن کا باغ اس کے ساحل پر واقع ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دریائے جیحون اصل میں دریائے نیل کا نام ہے اور یہ مصر میں واقع ہے، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت آدمؑ کی جنت مصر میں واقع تھی۔ قطع نظر ان سب کے ماہرین آثاریات کی رائے یہ ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت اماں حوا شہر تیب حورا میں پیدا ہوئے جو بلاد النہرین کے شمال مشرق میں واقع ہے، کچھ عرصہ ہوا اس شہر کی کھدائی ہوئی تو پتہ چلا کہ اس جگہ کم و بیش آٹھ شہر آباد ہو کر مرور ایام سے تباہ ہو چکے ہیں۔

آدمؑ اور حواؑ جنت سے نکل کر کس مقام پر پہنچے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ خاموش ہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ وہ سراندیپ (لنکا) میں اتارے گئے (دیکھیے "آدم کا پل") اور حوا جدہ میں۔ پھر آدمؑ عرب میں آئے اور عرفات میں حواؑ سے ملاقات ہوئی۔ پھر وہ زمین پر ایک مدت تک رہے۔

المختصر محققین کی رائے یہ ہے کہ حضرت آدم کھیتی باڑی کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی بہت سی اولادیں ہیں، جن میں رشتہ ناطہ قائم کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑے بیٹے کا نام شیثؑ تھا۔ وہ مصر کی جانب دریائے نیل کے کنارے پر آباد ہوئے ان سے جو اولاد ہوئی وہ حضرت آدمؑ کی پہلی نسلیں کہلاتی ہیں۔ ان کا رنگ کالا تھا چنانچہ حبشی اور مدراسی لوگ اور اسی رنگ و روپ کے دوسرے تمام قبیلے حضرت آدمؑ کی پہلی نسلوں ہی کی اولادیں ہیں۔ پھر جب رنگ کچھ صاف ہو گیا تو منگول خون کے افراد آئے۔ سفید رنگ کی قوموں کا اجرا حضرت نوحؑ سے ہوا۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدم کا زمانہ تقریباً ایک ہزار سال کا تھا اور اس کے تخمیناً چھتیس برس بعد حضرت نوحؑ پیدا ہوئے۔ علمائے تاریخ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک کی نسلیں زمین کے محدود خطے تک آباد تھیں۔ پھر جب نوحؑ کے زمانے میں طوفان آیا تب وہاں سے ادھر ادھر بکھر گئیں۔

علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت نوحؑ کے تین بیٹے مشہور ہوئے۔ ایک سام، دوسرے حام، تیسرے یافث۔ سام کی اولاد نے صحرا نشینی اختیار کی اور اس سے آگے مختلف سامی قبیلے پیدا ہوئے۔ حام کی اولاد پہلی قوموں کو دھکیلتی ہوئی دریائے نیل کے ساحل پر آباد ہوئی اور اس کا تھوڑا سا حصہ ہندوستان میں گجرات اور کاٹھیاواڑ میں پایا جاتا ہے۔ مصر کے لوگ بعد میں حبشہ کی طرف دھکیل دیے گئے۔ یافث کی اولاد عرصے تک مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کے مغربی پہاڑوں میں ماری ماری پھرتی رہی پھر ان تینوں ہی اولادوں کے اختلاط سے ایشیائے کوچک میں ایک علیحدہ جغرافیائی قوم آباد ہوئی، جو آریہ کہلاتی ہے۔

آدم بابا صوبہ سرحد کے ایک بہت بڑے بزرگ صوفی، دسویں صدی ہجری کے اوائل میں علاقہ کوہاٹ میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ علاقہ خوست سے وہاں آئے تھے۔ والد کا نام لیسین بتایا گیا ہے۔ آپ کے صاحبزادے سید غالب تھے جو غالب بابا کے نام سے مشہور تھے۔ آپ سلسلہ سہروردیہ کے بزرگ تھے۔ بعد میں

آپ کا خاندان سلسلۂ چشتیہ سے منسلک ہو گیا تھا۔ آپ نے کوہاٹ کے موضع کربوغہ میں وفات پائی۔

آدم بنوری (و ۱۹ دسمبر ۱۶۴۳ء) صوفی عالم، مجدد الف ثانیؒ کے اکابر خلفاء میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی اسماعیل تھا۔ وہ بنور کے رہنے والے تھے، جو مضافات سرہند کا ایک قصبہ ہے۔

سید آدم بنوری پہلے شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ ترک ملازمت کر کے ملتان میں حاجی خضر روغانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نعمت باطنی حاصل کی۔ پھر حضرت مجدد الف ثانی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی، اور مختلف ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ "خلاصۃ المعارف" میں ہے کہ انہوں نے شیخ محمد طاہر لاہوری سے بھی فیوض باطنی حاصل کئے تھے جو ان کو شیخ سکندر سے حضرت کمال الدین کیتھلی کے ذریعے سے پہنچے تھے۔

سید آدم ابتداً اُمّی تھے، پھر انہوں نے ایک جذبے کے تحت قرآن مجید حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مشہور ہے کہ سید آدم بنوری کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ جن میں تقریباً ایک سو آپ کے خلفا تھے۔ جنہوں نے ظاہری علوم اور سلوک کی تکمیل کر کے آپ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا آپ جہاں جاتے ہزارہا پٹھان آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔

"تذکرہ آدمیہ" میں ہے کہ سید آدم بنوری ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں لاہور تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ دس ہزار مشائخ سادات اور پٹھان تھے۔ اس وقت شاہجہاں لاہور میں تھا۔ آپ کے معاندین نے شاہجہان کو یہ خبر پہنچائی کہ سید آدم بنوری کے ساتھ اتنی جمعیت ہے کہ اگر وہ چاہیں تو آپ کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ شاہجہاں نے اپنے وزیر سعد اللہ خان کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ آپ اسکے ساتھ نہایت بے توجہی سے پیش آئے اور بہت دیر تک اس سے بات نہ کی۔ پھر اس کو انہماک دنیوی ترک کرنے کی نصیحت فرمائی۔ نواب سعد اللہ خان نے واپس جا کر ساری کیفیت شاہجہاں سے بیان کی اور معاندین کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ پھر اُس نے شاہجہاں کو مشورہ دیا کہ مناسب یہ ہے کہ سید آدم کو کسی بہانے یہاں سے دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ شاہجہاں نے سید آدم سے کہلا بھیجا کہ وہ حج کے لیے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ اپنے ساتھیوں اور گھر والوں کے ساتھ حج کے لیے چلے گئے اور حج کے بعد مدینہ طیبہ میں مقیم ہو گئے۔ لیکن ہندوستان سے تشریف لے جانے کے بعد بھی آپ کے باطنی فیوض اور برکات کے سلسلے ہندوستان میں آپ کے خلفاء سے جاری رہے۔

سید آدم بنوری نے ۲۳ شوال ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳ء) کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ بن عفانؓ کے روضۂ مبارک کے قریب مدفون ہوئے۔ آپ کے رسائل میں "خلاصۃ المعارف" اور رسالہ "نکات الاسرار" مشہور ہیں۔

آدم سہروردی رح جونپور (ہندوستان) کے ایک بزرگ کامل حضرت مخدوم آفتاب ہندؒ کے رفقاء میں سے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ کا تمام وقت ریاضت اور عبادت میں گذرتا تھا۔ ۸۳۰ھ میں ابراہیم شاہ مشرقی کے عہد میں فوت ہوئے۔ آپ کی پختہ قبر محلہ سید واڑہ مظفر آباد برلب دریائے گومتی ناد گھاٹ پر واقع ہے جو ۱۸۸۶ء کے سیلاب سے ٹوٹ گئی تھی۔ آپ کی اولاد میں سے کچھ لوگ ملاپور پرگنہ انگلی ضلع جونپور میں آباد ہیں۔

آدم شہید رح ان بزرگان دین میں سے ہیں جو ابتدائی دور میں مسلمانوں کی آمد بنگال سے صدیوں پہلے سرزمین عرب سے مشرقی پاکستان میں وارد ہوئے اور دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ اس وقت رام پال، جو اب منشی گنج سب ڈویژن ضلع ڈھاکہ میں ہے، سین خاندان کے راجہ بلال سین کا پایۂ تخت تھا۔

"تذکرہ صوفیائے بنگال" کے مطابق بابا شہیدؒ مکہ معظمہ میں رہتے تھے اور یاد الٰہی میں مصروف تھے کہ کنائی چنگ نامی گاؤں کا ایک مسلمان راجہ بلال سینا کے مظالم سے تنگ آ کر مکہ معظمہ گیا اور وہاں آپ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آپ کو بتایا کہ راجہ بلال سینا گائے ذبح کرنے پر سخت سزائیں دیتا ہے۔ اس پر آپ چھ سو مریدوں کے ساتھ رام پال تشریف لائے۔ یہاں آپ نے گائے ذبح کی۔ اس پر راجہ برہم ہوا اور آپ سے جنگ شروع کر دی۔ لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آپ نے کہا کہ تم مجھے صرف میری تلوار سے مار سکتے ہو اور یہ کہہ کر تلوار راجہ کو دے دی۔ راجہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے آپ کو شہید کر دیا لیکن کچھ عرصہ بعد راجہ کے تمام خاندان کو آگ میں جل کر مرنا پڑا۔

اگرچہ مندرجۂ بالا حکایت کا کوئی تاریخی ثبوت تو نہیں لیکن ایک ہندو آنند بھٹا نامی نے سنسکرت کی ایک کتاب "بلال چرتیا" میں اس واقعہ کو درج کیا ہے۔

آپ کا مقبرہ رام پال میں ایک مسجد کے قریب ہے جسے سردار ملک کافور نے سلطان جلال الدین فتح شاہ کے دور میں ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء میں تعمیر کیا۔

آدم صوفی (۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء - ۱۱ صفر ۶۹۷ھ / ۲ نومبر ۱۲۹۷ء) صوفی بزرگ، خلیل ... عظیم آباد ہندوستان کے ایک بہت بڑے جید عالم سید ابراہیم چشتی کے صاحبزادے تھے۔ آپ نے ایک سو تیرہ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوت کی خدمت میں حاضر ہو کر خرقہ کبرویہ فردوسیہ سے فیضیاب ہوئے۔ مستقل اقامت عالم پور، نخلص پٹنہ ہندوستان میں اختیار کی۔ آپ کے صاحبزادے مخدوم حمید الدین (متوفی ۷۷۰ھ) آپ کے خلیفہ تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب سترھویں پشت میں حضرت امام زین العابدین سے جا ملتا ہے۔ آپ زیدی النسب سمجھے جاتے ہیں غالباً آپ کے اجداد میں حضرت محمد صوفی کے صاحبزادے امام زید ہیں۔ لیکن آپ زید شہید کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت مولانا مظفر بلخی اور مخدوم آدم صوفی پشتوں کے بعد متحد النسب ہوتے ہیں۔ حضرت مظفر بلخی کا شجرۂ نسب جو کتاب آثار ... میں درج ہے۔ اس طرح ہے۔

"شیخ مظفر بلخی بن شیخ الشمس، بن سلطان علی، بن سلطان حمید، بن سراج الدین بن محمود، بن سلطان ابراہیم ادہم، بن سید سلیمان، بن سید ناصر، بن سید محمد، بن سید یعقوب، بن سید احمد، بن سید اسحٰق، بن امام زید، بن محمد، بن قاسم، بن علی سوم بن امام زین العابدین۔"

اور مخدوم آدم صوفی کا شجرۂ نسب کچھ اس طرح ہے:

"مخدوم آدم صوفی، بن سید ابراہیم، بن سید جلال، بن سید حسن، بن سید محمود، بن سید ابراہیم ادہم، بن سید سلیمان بن سید ناصر بن سید محمود، بن سید

یعقوب، بن سید احمد، بن سید اسحٰق، بن امام زید، بن محمد، بن قاسم، بن علی اصغر بن امام زین العابدین۔"

یوں شیخ مظفر بلخی اور مخدوم آدم صوفی کا شجرہ نسب سید محمود پر جا کر ملتا ہے۔

آدم کا پل (ADAM'S BRIDGE) بھارت اور سیلون (لنکا) کے درمیان سمندر میں ریت اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی ایک تیس میل لمبی قطار چلی گئی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت آدمؑ جب جنت سے نکالے گئے تو وہ اسی راستے سے لنکا گئے تھے۔ اس روایت کے مطابق حضرت آدمؑ نے سب سے پہلے لنکا میں رہائش رکھی تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق جب رام چندر جی اپنی اغوا شدہ بیوی سیتا دیوی کو رہا کرانے کے لیے ہندوستان سے سیلون جا رہے تھے تو اپنی فوج کی سہولت کے لیے یہ پل بنایا تھا اور یہ اسی پل کے باقی ماندہ آثار ہیں۔

[illegible] کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ کہیں بھی پانی کی گہرائی تین چار فٹ سے [illegible] نہیں۔ ۱۹۰۲ء میں بحری آمد و رفت کے لیے راستہ صاف کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ [illegible]۔ ماہرین طبقات الارض اس بارے میں تصدیق کرنے کے بعد رائے دیتے ہیں کہ دراصل پانی نے لنکا کو برصغیر ہندوستان سے کاٹ کر جدا کر دیا ہے۔ اسی ریت اور پتھر کے ٹیلے کو آدم کا پل کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں [illegible] ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔

آدم کا پھل (ADAM'S APPLE) مختلف مذہبی کتابوں میں آیا ہے کہ جنت میں آدمؑ کو ایک خاص پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ یہ ممنوعہ پھل کونسا تھا؟ عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے ایک گروہ کے نزدیک یہ ممنوعہ پھل گندم تھا۔ اہل عرب میں ایک ایرانی کہانی مروّج ہے کہ وہ ممنوعہ پھل گیہوں تھا جو ایک ایسے درخت میں لگا تھا جس کا تنا سونے کا اور جس کی شاخیں چاندی کی طرح تھیں۔ ہر شاخ میں پانچ پانچ چمکتی ہوئی بالیاں تھیں اور ہر بالی میں پانچ پانچ دانے تھے جو شتر مرغ کے انڈے کے برابر تھے اور خوشبو میں مشک عنبر اور شیرینی میں شہد کا مزا رکھتے تھے۔ عیسائیوں کے نزدیک آدمؑ اور حواؑ نے باغ عدن (جنت) میں جو پھل کھایا تھا، وہ سیب سے مشابہ تھا۔ اسی لئے انگریزی زبان میں ایک اصطلاح "آدم کا سیب" استعمال ہوتی ہے۔

آرچ بشپ وٹے کا گمان ہے کہ انجیر اور درخت زندگی کے درخت سے مشابہ ہے جس کی تصاویر، بابل اور نینوا کے محلوں اور گرجاؤں پر منقش ہیں۔ ڈاکٹر لونگ اسٹون لکھتے ہیں کہ میں نے افریقہ کے جنگلوں میں لوگوں کو چند متبرک درخت پوجتے دیکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ درخت تمام افریقہ اور ہندوستان میں متبرک سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ٹیلی اس مضمون کے متعلق لکھتے ہیں کہ ربّی مائر کے مطابق یہ پھل گیہوں تھا لیکن جی ہُدہ کے خیال میں انگور، کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے جو بدمست کر دیتی ہے۔ ربّی آبا جنت کے سیب کو اور ربّی جوسی انجیر ہی کو ممنوعہ پھل قرار دیتے ہیں۔

آدم کا سانپ (ADAM'S DRAGON) روایت ہے کہ جنت میں شیطان سانپ کی صورت میں یا شاید اس پر بیٹھ کر، آدمؑ کے پاس آیا تھا اور انہیں ممنوعہ پھل کھانے پر اکسایا تھا۔ ایسی روایات عموماً بائبل اور دوسری مذہبی کتابوں میں ملتی ہیں۔ قرآن میں اس کے متعلق خفیف سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ صرف اتنا درج ہے کہ شیطان نے آدمؑ کو ممنوعہ پھل کھانے پر اکسایا۔ قصص القرآن میں ہے کہ شیطان کسی نہ کسی صورت جنت میں داخل ہو گیا۔ لیکن دیگر کتابوں میں شیطان کے جنت میں داخل ہونے کی صورت کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ایرانی روایات میں ہے کہ اہرمن (شیطان) نے پہلے آدمی اور پہلی عورت کے آرام و راحت سے جل کر باغ میں ایک اور درخت لگایا اور ایک بری روح بھیجی جس نے سانپ کی شکل اختیار کر کے انہیں بہکایا کہ اس نئے پھل کو کھائیں۔ اس پھل نے ان کو بدکار بنا دیا۔ کسدی روایات کے مطابق یہ سانپ یا اژدھا، سمندر اور ابتری کا بانی تھا اور وہ اُس ابتری اور بے ترتیبی کی روح ہے۔ جو دنیا کی پیدائش کے وقت دیوتاؤں کی مخالف تھی۔ اس کی شکل اژدھے کی مانند ہے، سر گوشت خور جانور کی مانند ہے۔ جسم پر مچھلی کی طرح چھلکے ہیں۔ پنجے عقاب کی مانند ہیں اور پشت پر دار ہے۔ مغربی اور مشرقی کہانیوں میں بھی اس بڑے سانپ کا ذکر کسی نہ کسی طور پر پایا جاتا ہے لیکن اسلام میں اس بات کا چنداں ذکر نہیں کہ شیطان سانپ کی صورت میں جنت میں داخل ہوا تھا۔

آدم کی چوٹی (ADAM'S PEAK) یہ جنوب وسطی لنکا میں واقع کولمبو سے ۴۵ میل جنوب مشرق کی طرف ایک پہاڑی ہے جس کی بلندی ۷۳۶۰ فٹ ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک ہموار سطح (۲۴ × ۷۴) فٹ ہے جس پر پانچ فٹ چار انچ لمبا اور دو فٹ چھ انچ چوڑا انسانی پاؤں کا نشان ہے۔ ہندو اسے شیوا جی اور مسلمان حضرت آدمؑ کا نقش پا خیال کرتے ہیں۔ بلکہ مسلمان تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم کرۂ ارض پر گرائے گئے تھے تو وہ اسی مقام پر گرے تھے۔ بدھ مت والے کہتے ہیں کہ یہ نشانی گوتم بدھ کے پاؤں کی ہے۔

آدم ملی شیخ آدم بن ملی۔ قبیلہ یوسف زئی کے صوفی مشاہیر میں سے تھے اور یوسف زئیوں کے مشہور ملک، ملک احمد خان کے ہمعصر اور ان کے رفقاء میں سے تھے۔ ان کے زہد کی یہ کیفیت تھی کہ ایک روز ایک شخص ایک چڑیا شکار کر کے آپ کی خدمت میں لایا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے یہ چڑیا کہاں سے شکار کی ہے۔ اس شخص نے اس جگہ کا پتا بتایا۔ آپ نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ وہاں کے لوگ رہزنی اور حرام خوری میں مشہور ہیں۔ شاید اس چڑیا نے ان کے دانوں میں سے کوئی دانہ کھایا ہو۔

شیخ آدم ملی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ انتظام اراضی بندوبست ہے جو انہوں نے ایک کتاب کی صورت میں دفتر کے نام سے مرتب کیا تھا اور اس کے مطابق قبائل یوسف زئی، مندنڑ اور ان کے معاون قبائل نے سابقہ گندھارا یعنی موجودہ وادئ پشاور بشمول ریاست ہائے صوبہ سرحد کی زمینوں کی تقسیم کی تھی۔ اس کی رُو سے قبائل میں اراضی کی تقسیم بذریعہ قرعہ اندازی ہوتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہر خیل کو دستور کی مقررہ مدت کے مطابق اس علاقے کی اراضی پر رہنا پڑتا تھا۔ یہ مدت بارہ سال کی تھی۔ اس مدت کے گذرنے پر دوبارہ قرعہ اندازی ہوتی تھی پھر جو اراضی جس قبیلے کے نام نکلتی تھی وہ قبیلہ اس اراضی پر منتقل ہو جاتا تھا۔ شیخ آدم ملی کے مرتب کردہ نظام میں زمین قومی ملکیت تھی، اور اس کا قابض مقررہ مدت کے مطابق اس کی پیداوار کا مالک ہوتا تھا۔

انگریزی حکومت کے قیام تک صوبہ سرحد میں شیخ آدم ملی کے مرتب کردہ دستور کے مطابق عمل ہوتا رہا اور آج بھی اس صوبے کے کوہستانی علاقے کے بعض قبائل مثلاً حسن زئی، اکازئی، نصرت خیل اور چغہ زئی وغیرہ میں شیخ ملی کے مرتب کردہ دستور کے مطابق عمل ہوتا ہے اور ان قبائل کے بہت سے معاملات اسی دستور کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خٹک نے اپنے ایک شعر میں شیخ ملی کے اس دستور کو سراہتے ہوئے کہا ہے :-

"سوات میں دو چیزیں جلی یا خفی موجود ہیں۔ ایک دردیزا کا مخزن اور دوسرا شیخ ملی کا دفتر۔" شیخ آدم ملی کا مزار ہشت نگر میں واقع ہے۔

آدمی آدم کی نسل سے تعلق رکھنے والا، آدم کا بیٹا، ابن آدمؑ (دیکھیے "انسان")

آدمیؒ، ابن عطا، عالم۔ ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل، ابن عطاء آدمیؒ صوفی بزرگ عالم۔ بغداد شریف سے تعلق رکھتے تھے۔ جنید بغدادیؒ اور ابراہیم مارستانیؒ جیسے بزرگوں کے ہم عصر اور ہم مجلس تھے۔ ۳۰۹ھ بمطابق ۹۲۱ء یا ۳۱۱ھ بمطابق ۹۲۳ء کو انتقال کیا۔ ابوسعید فراز لکھتے ہیں کہ میں نے تصوّف کا اہل صرف جنید بغدادیؒ اور ابن عطاء آدمیؒ کو پایا ہے۔

آراراط (ARARAT) پہاڑ جس مقام پر ترکی، ایران اور روسی آرمینیا کی سرحدیں ملتی ہیں۔ وہاں ترکی کے علاقے میں ایک آتش فشانی کوہ آراراط یا ارارت واقع ہے۔ اس کی شمالی اور مشرقی ڈھلان کی طرف آرس بہتا ہے، جو سطح سمندر سے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں بایزید کا میدان واقع ہے، جو سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ مغرب کی طرف چھوٹی چھوٹی آتش فشاں پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ ان میں سے ۷½ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹا سا درّہ گذرتا ہے۔ کوہ آراراط کی بیخ کا قطر ۲۵ میل ہے۔

کوہ آراراط دو چوٹیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا درمیانی پالان ۸۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ دونوں چوٹیوں کے درمیان سات میل کا فاصلہ ہے۔ بڑی چوٹی کی انتہائی بلندی ۱۶۹۴۵ فٹ ہے۔ چھوٹی چوٹی کی ڈھلوان ہموار اور مسطح ہے اور اس کی انتہائی بلندی ۱۲۸۰۰ فٹ ہے۔ ان دونوں چوٹیوں کے قریب دُور دُور تک کوئی اور چوٹی اتنی بلند نہیں ہے۔ دونوں چوٹیاں لاوے اور آتشی چٹانوں سے بنی ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں آتش فشانی کا عمل ہوتا ہوگا۔ لیکن اب تو اس پر ہمہ وقت برف جمی رہتی ہے اس کے اردگرد کے میدانوں میں عمدہ گھاس کے وسیع قطعات ہیں۔ یہاں کرد قبائل اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوہ آراراط کے دامن میں کہیں کہیں درخت بھی ملتے ہیں۔ لیکن پہاڑ سبزے سے خالی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں آبادی تھی۔ المقدسی لکھتا ہے کہ اس پر ایک ہزار گاؤں آباد تھے۔

آراراط کا نام سب سے پہلے بائبل میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوحؑ کی کشتی "آرک" اسی پہاڑی کی بڑی چوٹی پر آکر ٹھہری تھی۔ بائبل میں ہے "ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کو آراراط کی پہاڑیوں پر ٹک گئی"۔ (پیدائش ۸ : ۴)

اسے کوہ جودی اور جبل الحارث بھی کہتے ہیں۔ جودی کا قدیم نام اغری تاغ تھا۔ ابن قتیبہ نے آراراط ہی کو کوہ جودی ٹھہرایا ہے جس پر قرآن مجید کی رُو سے کشتی نوحؑ جا کر ٹھہری تھی۔ اسے جبل قرداد بھی کہا گیا ہے۔ اسکندر اعظم کے عہد کا مورخ بروسس لکھتا ہے کہ اُسے کوہ جودی کی چوٹی پر سے کشتی کے آثار بھی ملے تھے۔ ابن بطوطہ (۷۲۵ء) نے بھی اس پہاڑ کی زیارت کی تھی۔

آج بھی دنیا کے اکثر لوگوں کو یقین ہے کہ آراراط کی چوٹیوں پر جمی ہوئی ہزاروں برس پرانی برف کے نیچے نوحؑ کی کشتی موجود ہے۔ آرمینیا کے لوگ اس روایت پر یقین رکھتے ہیں کہ طوفان نوحؑ کے بعد دنیا میں بسنے والی پہلی قوم آرمینیا کے لوگ تھے۔ آراراط کے دامن میں ایک گاؤں "آگری" واقع ہے۔ روایت کے مطابق یہیں پر نوحؑ نے اپنی کشتی تعمیر کی تھی۔

آراراط کا عبرانی نام اُرادھو یا اُراتو تھا۔ نویں سے ساتویں صدی قبل مسیح تک آشور اور بابل کی سلطنتوں کی وسعت دجلہ و فرات سے لے کر کوہ آراراط تک تھی۔ آراراط کو فارسی میں کوہِ نوحؑ بھی کہتے ہیں۔ اس کے دامن میں آباد ایک گاؤں "سینٹ جیکب" کے لوگوں کا خیال ہے کہ آراراط پر چڑھنے والا عتاب خداوندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن ۲۷ ستمبر ۱۸۲۹ء میں ایک جرمن جان جیکب وان پیرٹ اس چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۸۴۵ء میں ایک اور جرمن ماہر ارضیات پروفیسر ہرمن آبیخ اس پر چڑھا۔ اس کے بعد تو یورپی لوگوں کا گویا تانتا بندھ گیا۔ ۱۹۰۰ء میں ایک یورپی ٹیم، آراراط پر اس غرض سے چڑھنے کے لیے آئی تھی کہ وہ کشتی نوحؑ کا پتا لگائے لیکن پاسپورٹ اور دوسری سرحدی رکاوٹیں ان کے درمیان حائل ہوگئیں۔

موجودہ کوہ آراراط تین ملکوں ترکی، روس اور ایران کے مابین سرحدی نشان کا کام دیتا ہے۔ البتہ یہ پورا علاقہ ترکی کے پاس ہے۔

آرام تورات کے مطابق حضرت نوحؑ کا پوتا۔ جس سے آرامی نسل چلی۔ آرام نوحؑ

کے بیٹے سام کا بیٹا تھا۔ چونکہ اس کی نسل میسوپوٹیمیا، شام اور شمالی عرب کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی، اس لئے اس تمام علاقے کو آرام کہا گیا ہے۔ (مزید دیکھئے "آرامی قبائل" اور "آرامی زبان")

آرامی زبان (ارسامی یا سریانی زبان)

کہتے ہیں کہ تمام انسانی نسلیں نوحؑ کے تینوں بیٹوں حام سام اور یافث سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سامی نسل عرب، ایشیائے کوچک عراق، شام، فلسطین اور فونیشیا میں پھیل گئی تھی۔ ان تمام ملکوں کی زبان کو سامی زبان کہتے ہیں۔ سامی زبان میں فونیقی، آشوری، کلدانی، عبرانی، بابلی اور حطی زبانیں شامل ہیں۔ سامی زبان زیادہ تر ملک شام میں بولی جاتی تھی۔ شام کو دمشق کی خوب صورتی اور زرخیزی کی وجہ سے ارم (بہشت) کہا جاتا تھا۔ اس لیے سامی زبان کو سریانی یا آرامی کہتے تھے۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں آرامی زبان مشرق وسطیٰ کی بین الاقوامی زبان بن گئی تھی۔ اس وقت یہ زبان فارس کی سرکاری زبان قرار دی گئی تھی۔ اس زبان کی وسعت اور عروج کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک کا ایک ہزار سالہ دور تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس کی جگہ عربی زبان نے لے لی۔ آرامی زبان کچھ عرصے کے بعد ہی دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی: مشرقی آرامی اور مغربی آرامی۔ بنیادی آرامی زبان کے نوشتے اور ثبوت مختلف صورتوں میں ملتے ہیں۔ اگرچہ اب یہ زبان عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں تقسیم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھی ہے۔ تاہم آج بھی مغربی آرامی زبان لبنان اور دمشق کے گرد و نواح اور مشرقی آرامی زبان جھیل ارمیہ اور آشور کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ فرانسیسی، لاطینی، انگریزی اور دیگر ہم یورپی زبانیں اسی زبان کی مغربی شاخ سے نکلی ہیں جبکہ فارسی اور کسی حد تک عربی زبانیں اسی زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آرامی زبان عربی سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔ اس کا اندازہ ان آرامی الفاظ اور ان کے معانی سے ہوگا۔

آب (باپ)، آتی (آنا)، کلب (کتا)، دباب (مکھی)، ارز (اناج)، [illegible]، عین (آنکھ)، لسان (زبان)، سین (دانت)، شمیّ (آسمان)، لیلا (رات)، [illegible] بیت (گھر)، سلام (امن)، [illegible] (نام)

انسان نے پیغام رسانی کے لئے سب سے پہلے مصوری کو رسم الخط بنایا تھا۔ جس بات کا اظہار مقصود ہوتا تھا اس کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ لیکن یہ تصویری رسم الخط اظہار مطلب کے لیے بہت محدود تھا۔ مثلاً [illegible] کی تصویر تو بن سکتی تھی لیکن [illegible] کی تصویر نہیں بن سکتی تھی۔ اس مشکل کا حل سب سے پہلے مشرق وسطیٰ کی ایک قوم فنیقی نے نکالا۔ انہوں نے مصر کے تصویری رسم الخط کو حروف ابجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ مثلاً بیل کے سر (▽) کو پہلا حرف (الف) قرار دیا اور گھر (⌂) کو دوسرا حرف (بیت) یعنی "ب" قرار دیا۔ ایسے ہی حروف سے آرامیوں نے ایک اور رسم الخط کا اجرا کیا۔ یہ رسم الخط تقریباً ایک ہزار سال ق۔م میں فنیقیوں کے رسم الخط سے اخذ کیا گیا تھا۔ اس میں بائیس حروف ابجد تھے۔ جن کی صحیح صورت اور ان کے تصویری معانی نقشے سے واضح ہیں۔

اسی رسم الخط نے بعد میں ترقی کر کے عربی اور فارسی رسم الخط کی صورت اختیار کر لی۔ حضرت رسول اکرمؐ نے شاہ مقوقس بادشاہ مصر کو جو خط ارسال کیا تھا، وہ اسی تبدیل شدہ آرامی۔ عربی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ اس سے بہت پہلے یہ خط بین الاقوامی تجارت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس رسم الخط کے کتبے ایشیائے کوچک سے دستیاب ہوئے ہیں۔ مصر سے ملنے والے چمڑے کے نوشتوں کی عبارت بھی اسی رسم الخط میں تحریر ہے۔ ایرانی بادشاہ جمشید کے پایہ سلطنت کے کھنڈرات سے ملنے والی تختیوں، نوشتوں، کتبوں اور برتنوں پر جو عبارتیں درج ہیں، وہ اسی رسم الخط میں ہیں۔ اس کے قدیم ترین نمونے ہخامنشی بادشاہ بلغکرت کے بیٹے بلغ دات کے سکوں پر محفوظ ہیں۔ بلغ دات کو سکندر اعظم نے ۳۲۳ ق۔م میں فارس پر تسلط کے بعد اس کے عہدے پر بحال رکھا تھا۔ اس کے دو کتبے ٹیکسلا اور دریائے کابل کے قریب جلال آباد (لغمان) سے بھی ملے ہیں۔ آرامی رسم الخط قدیم ترین اور بنیادی رسم الخط شمار ہوتا ہے۔

آرامی قبائل (ARAMEANS)

شمالی شام کے قبائل جو شمالی شامی زبان بولتے تھے۔ گیارہویں صدی سے آٹھویں صدی قبل مسیح میں شمالی شام کا علاقہ آرام کہلاتا تھا۔ اس دور میں یہاں کے قبائل میسوپوٹیمیا (عراق) اور مشرق کی طرف دور دور تک پھیل گئے۔ ان کی تاریخ کے ماخذ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) شمالی شام سے ملنے والے آرامی کتبے جو دسویں گیارہویں صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) آشوریوں کے ریکارڈ میں دیئے گئے آرامیوں کے حوالے اور

(۳) عہد نامہ عتیق (بائبل) کے حوالے۔

ان تمام حوالوں سے آرامیوں کی تاریخ سولھویں صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ بائبل کے مطابق یہ مشرقی لوگ فدوم کہلاتے تھے جو آرامی زبانیں بولتے تھے۔ (بحوالہ پیدائش ۲۹-۱) بائبل میں ہے کہ نوحؑ کے تین بیٹے سام، حام اور یافث تھے۔ بنی سام میں سے عیلام، اسور، ارفکسد، لود اور آرام پیدا ہوئے (پیدائش ۱۰-۲۲) بنی آرام آگے چل کر آرامی کہلاتے۔ ۱۳۷۵ ق۔م کے وقت یہ لوگ دریائے فرات تک پہنچ چکے تھے کیونکہ طل العمرنہ سے ملنے والے خط میں، جو ۱۳۷۵ ق۔م سے تعلق رکھتا ہے، ان کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے پچاس سال بعد یہ لوگ دریائے دجلہ تک بھی پہنچ گئے۔ لیکن آشوریوں نے انہیں پسپا کر دیا۔ تیرہویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں نے ان پر دوبارہ حملہ کیا۔ آشوری بادشاہ تگلت پلاسر اول (۱۱۱۶ ق۔م تا ۱۰۷۶ ق۔م) نے ان پر اٹھائیس حملے کیے تھے۔ گیارہویں صدی قبل مسیح کے آخر تک آرامیوں نے دریائے فرات کے ارد گرد بت ادینی کی ریاست قائم کر لی۔ اس کے بعد طل حلف اور بت طوپ کی ریاستیں بھی قائم کر لیں۔ ۱۰۳۰ ق۔م میں مشرقی آرامیوں نے میسوپوٹیمیا اور دوسری آرامی ریاستوں کے ساتھ مل کر اسرائیل کی سلطنت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ لیکن حضرت داؤدؑ نے انہیں تین جنگوں میں شکست دی۔ حضرت داؤدؑ کے بعد ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ (تخت نشینی ۹۷۳ ق۔م سے ۹۳۶ ق۔م تک) نے اپنی سرحدوں کو وسیع کرنا شروع کیا اور آرامیوں کو شکست دیتے ہوئے بت ادینی تک قبضہ کر لیا اور تدمیر تک بڑھتے چلے گئے۔ لیکن آرامی بادشاہ ریزن کے بیٹے بن ہدد اول اور بن ہدد دوم نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ بن ہدد دوم نے ساتھ آخیاب شاہ اسرائیل سے صلح کر لی تھی۔ اسدرلان کے میدان میں بن ہدد مجبور ہو کر آخیاب کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تاہم اس نے اپنے حملے جاری رکھے اور آخیاب کے مرنے کے بعد اردن کے اطراف میں اس کا عمل دخل بڑھ گیا (دیکھئے "آخیاب")

گیارہویں صدی قبل مسیح میں آرامی نہ صرف شام بلکہ وسطی اور زیریں فرات

اور بابل تک پھیل چکے تھے۔ نویں صدی قبل مسیح تک بابل سے ساحل سمندر تک کا تمام علاقہ آرامیوں کے تحت آگیا۔ جنہیں مشترکہ طور پر کلدانی کہا گیا ہے۔ آشوری بادشاہ آشور نصر پال دوم (تخت نشینی ۸۸۴ ق۔م سے ۸۵۹ ق۔م تک) نے بت باہیانی کا علاقہ واپس حاصل کر لیا اور شالما نصر سوم نے ۸۵۶ ق۔م میں بت ادینی کا علاقہ قبضے میں کر لیا۔ ۸۵۳ ق۔م میں کارکر کے مقام پر آرامیوں فنیقیوں اور اسرائیلیوں کے متحدہ محاذ کے خلاف لڑا اور ۸۴۳ ق۔م میں وہ فرات کے اردگرد کے علاقے واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

آخیاب سے تقریباً ایک صدی بعد اسرائیل اور دمشق کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ تگلت پلاسر سوم نے ارفاد کا علاقہ قبضے میں کر لیا جو آرامیوں کا مرکزی شہر تھا اور سارگن دوم کے حملوں سے ۷۲۰ ق۔م میں مغرب کی طرف آرامیوں کا عمل دخل ختم ہوگیا۔

زیریں فرات کے آرامیوں نے اپنی آزادی کو کافی عرصے تک برقرار رکھا۔ ایک کلدانی بادشاہ میرودخ بلدان نے ۷۲۲ ق۔م سے ۷۱۰ ق۔م تک بابل پر حکومت کی۔ اس کے مرنے کے بعد آشوریوں نے تقریباً اکیس لاکھ آرمینیوں کو جلاوطن کر دیا۔ اور ۶۸۹ ق۔م میں بابل پر قبضہ کر لیا۔ تاہم ۶۲۶ ق۔م میں کلدانی جرنیل نابوپلاسر نے خود کو بابل کا شہنشاہ کہنا شروع کر دیا اور میدیا اور سکا تھیوں کے ساتھ مل کر آشوریوں کو مار بھگایا۔ اس نئی بابلی سلطنت میں کلدانیوں آرمینیوں اور بابلیوں نے نمایاں طور پر حکومت کی۔

انہی لوگوں نے سب سے پہلے زبانوں کو وسعت دی اور فونیقی رسم الخط کو موجودہ رسم الخط کے قابل بنایا۔ (دیکھئے "آرامی زبان") بابلیوں اور آشوریوں کے ساتھ ملنے جلنے کے باوجود آرامیوں کا الگ مذہب تھا۔ ان کے دیوتا الگ تھے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا ہدد یارمن تھا جس کا سب سے بڑا معبد دمشق میں تھا۔ ان کی سب سے بڑی دیوی کا نام عتارگتی تھا۔ اس کا معبد شام میں ہیراپولس میں تھا۔ اس کے علاوہ وہ بابلیوں کے چاند دیوتا سن، عقل کے دیوتا نابو، سورج دیوتا شمس، دیوتاؤں کے دیوتا ایل، جنگ کے دیوتا ریشف کی پوجا بھی کرتے تھے ان کی کوئی الگ تہذیب اور ثقافت نہیں تھی بلکہ وہ بابلیوں، سمیریوں، فونیقیوں اور آشوریوں کی ثقافت میں گھل مل چکے تھے۔

آرخان

سلطنت عثمانی کا دوسرا فرمانروا، اپنے باپ عثمان کی وفات کے بعد ۱۳۲۶ء میں اناطولیہ کی ترک سلطنت کے تخت پر بیٹھا۔ وہ ارطغرل کا پوتا تھا۔ اس نے عثمانی سلطنت کو ایشیائے کوچک سے نکوسیا اور نکومیدیا تک پھیلا دیا۔ اور اپنے باپ کی زندگی ہی میں بروصہ کے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ یہی شہر عثمانیوں کی نئی حکومت کا صدر مقام قرار پایا تھا۔

آرخان نے بازنطینی کے کئی اہم شہر چھین لئے تھے چنانچہ ۱۳۴۵ء میں قسطنطنیہ کے بازنطینی فرمانروا نے آرخان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ لیکن ۱۳۵۷ء میں آرخان نے بازنطینی سلطنت سے گیلی پولی اور ۱۳۶۱ء میں ادرنہ کا شہر حاصل کر لئے۔

آرخان بلند مرتبہ فرمانروا تھا۔ عثمانی سلطنت کے آداب اور قاعدوں کی بنیاد آرخان کے زمانے ہی میں پڑی تھی۔ اس لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کا اصل بانی وہی تھا۔ وہ ملکی انتظام و انصرام کا بڑا سلیقہ رکھتا تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں کو کئی ضلعوں یا چھوٹے چھوٹے صوبوں میں بانٹ دیا۔ ہر ضلع سنجق کہلاتا تھا۔ اس کے معنی جھنڈے کے ہیں۔ ہر سنجق کے حاکم کو حدود سلطنت وسیع کرنے کی مقدور بھر کوشش کرنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ ہر حاکم کو نئی فوج بھرتی کرنے اور جاگیریں عطا کرنے کا بھی اختیار تھا۔ آرخان کے بعد اس کا بیٹا مراد ۱۳۶۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے جنوب مشرقی یورپ کا بہت سا علاقہ قبضے میں کر لیا ادرنہ کا شہر اسی کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔

آرک (ARK)

کشتی نوح۔ جس میں حضرت نوحؑ نے اپنے خاندان سمیت طوفان نوح سے پناہ لی تھی۔ مختلف مذہبی روایات اور قرآن حکیم (۲۹ : ۱۴) کے مطابق جب آپ کی عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوگئی۔ اور آپ کی امت نافرمانی کر کے عذاب کی مستحق ٹھہری تو اللہ نے آپ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا کہ میں دنیا کو طوفان سے تباہ کرنا چاہتا ہوں اور انہیں یہ حکم دیا کہ اپنے خاندان اور مویشیوں کو بچانے کی خاطر ایک کشتی تعمیر کر لیں۔ اس پر آبادی سے باہر دور آپ تشریف لے گئے۔ تختے اور میخیں فراہم کیں اور کشتی بنانے لگے۔ لوگوں کو پتا چلا تو آپ کا مذاق اڑانے لگے ان کا مذاق یہاں تک بڑھ گیا کہ انہوں نے بنی ہوئی کشتی کو گندگی سے بھر دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ انہیں ایک مہلک بیماری نے آن لیا۔ جس کا علاج اسی گندگی کو ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ بہت جلد کشتی دھل دھلا کر صاف ہوگئی۔ آخر ایک روز اللہ کے حکم سے التنور کے مقام سے پانی ابلنا شروع ہوا اور بہت جلد روئے زمین پر پھیل گیا۔ نوحؑ اور ان کے گھر والے اللہ کا نام لے کر کشتی میں بیٹھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام قوم تباہ ہوگئی سوائے کشتی والوں کے کہ انہوں نے نسل انسانی کا دوبارہ آغاز کرنا تھا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ نوحؑ کو حکم ملا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا۔ اور ان کے بارے میں مجھے کچھ نہ کہہ۔ جو غرق [illegible] کیے جائیں گے۔ (اور وہ کشتی بنانے لگا) (سورۃ ہود)

بائبل میں اس کشتی کو "آرک" کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر بلیق لکھتے ہیں کہ اس کشتی کی تیاری میں ایک سو برس صرف ہوئے تھے۔ کشتی کا طول ۳۰۰ ہاتھ عرض ۵۰ ہاتھ اور اونچائی ۳۰ ہاتھ تھی۔ اور اگر ایک ہاتھ کی لمبائی ۲۲ انچ مانی جائے تو یہ کشتی [illegible] لمبی ۹۱ فٹ چوڑی اور ۵۴ فٹ اونچی تھی۔ البیضاوی لکھتا ہے کہ اس کی تیاری [illegible] برس صرف ہوئے تھے۔ اس میں تین منزلیں تھیں۔ اس میں نوحؑ، ان کی بیوی [illegible] بیٹوں اور بہوؤں کے علاوہ مختلف اقسام کے پرندے اور [illegible] بھی جمع کئے گئے تھے۔ اس کے بعد طوفان شروع ہوا اور آن واحد میں تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، حتیٰ کہ پہاڑیاں بھی پانی میں چھپ گئیں۔ یہ طوفان چالیس دن تک برپا رہا۔ کئی ماہ تک کشتی سمندر میں بہتی رہی اور آخر سات ماہ بعد کوہ آرارات [illegible] قرآن مجید میں کوہ جودی درج ہے۔ (ہود : ۴۴) مفسرین کے مطابق [illegible] جودی نام کا جزیرہ واقع ہے۔ جہاں یہ پہاڑ موجود ہیں۔ اکثر علماء نے کوہ جودی [illegible] کہا ہے۔

قدیم سمیری داستانوں میں جو ان کی مٹی کی تختیوں پر رقم کی گئی تھیں [illegible] اس کے طوفان کا ذکر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کشتی کی چھ منزلیں اور سات درجے تھے۔ اور ہر منزل کے نو حصے اور یہ کشتی کوہ نصیر پر [illegible]۔ کسدی روایات میں ہے کہ ہیسدار جو اکیلا طوفان سے بچ گیا بیان کرتا ہے کہ بیا دیوتا مجھے دکھائی دیا۔ اس نے مجھے خبر دی۔ بنی آدم کو اس کے گناہوں کے سبب تباہ و برباد کرنے کی۔ سو تو ایک لمبی کشتی بنا۔ اپنا اناج، اسباب، دولت اور باندیاں۔ حیوانات بھی اس میں جمع کرے اس کا دروازہ میں خود بند کر دوں گا۔

قدیم مصریوں کے نزدیک نوحؑ کی کشتی کا نام "محل" تھا جو لکڑی کا بنا ہوا بہت بڑا تیرتا ہوا مکان تھی۔ آریا اور ہندی روایات میں دیوکلیان اور [illegible] کے خاندان [illegible]

سوا تمام لوگ تباہ ہو گئے۔ ایک صندوق اس کی حفاظت کے لئے مہیا کیا گیا تھا اور وہ جس وقت اس میں داخل ہو رہے تھے تو تمام جانور، چرند پرند بھاگتے ہوئے آئے اور اس میں داخل ہو گئے اور جب طوفان ختم ہو گیا تو کشتی پارناسس کی چوٹی سے جا لگی۔
قدیم پاک و ہند میں ہنود روایات ملتی ہیں۔ مہابھارت میں طوفان کے ہیرو رشی منو کا ذکر ملتا ہے۔ ایک مچھلی نے اسے طوفان سے آگاہی دی۔ اور کشتی بنانے کو کہا طوفان کے بعد کشتی [illegible] کی چوٹی سے جا لگی۔ تب منو کو پتہ چلا کہ مچھلی کے روپ میں برہما اس [illegible] تھا۔ یونانی روایات میں بھی ایک طوفان اور ایک جہاز کا ذکر ہے۔ ہرمیس کو دیوتا نے خوفناک بارش کی اطلاع دی ہے۔ تب زیوس نے اپنے ایک نیک شخص کو [illegible] کی لکڑی سے ایک جہاز تیار کرنے اور اس میں وافر مقدار میں اشیائے خوردنی جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب اس مرد ضعیف نے اور اس کی بیوی [illegible] نے جہاز میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تو زیوس نے طوفان برپا کر دیا۔ چالیس رات مینہ برسا آخر کشتی پارنا [illegible] چوٹیوں سے آن لگی۔

اسی طرح [illegible] بابل، سمیری داستانوں سے ملتی جلتی داستانیں موجود [illegible] ان کے دیوتا [illegible] نے [illegible] نامی ایک شخص کو صنوبر کا درخت کھوکھلا کر کے ایک کشتی [illegible] کہا تاکہ [illegible] بیوی بچوں سمیت آنے والے طوفان سے بچ سکیں۔ انہیں [illegible] کی ہدایت کی گئی تھی۔

[illegible] طوفان [illegible] کرلی [illegible] کشتی [illegible] آرک تھی۔ اس کے آگے [illegible] کے مشرق کی طرف [illegible] پانی کے نیچے ڈوبا ہوا تھا مشہور [illegible] کے علاوہ [illegible] اور اس کو [illegible]

[illegible] چوطرفہ کشتی [illegible] پہلے [illegible] تھا۔ [illegible] کھال دیا ہے [illegible]

آرنلڈ، سر تھامس (Arnold, Sir Thomas) ([illegible] اپریل ۱۸۶۴ء - [illegible] جون [illegible])

[illegible] اقبال کے استاد۔ پورا نام سر تھامس واکر آرنلڈ [illegible] تعلیم [illegible] میں [illegible] لندن میں مقیم ہو گئے۔ یہاں تھامس آرنلڈ [illegible] آف لندن [illegible] ۱۸۸۲ء میں حصول تعلیم کے لیے کیمبرج [illegible] مگڈلین کالج [illegible] داخل ہو گئے۔ یہاں یونانی اور لاطینی کلاسکس میں [illegible] کے لئے سکالرشپ ملا۔ کلاسکس کے علاوہ تھامس آرنلڈ نے علوم کے دوسرے شعبوں بالخصوص تاریخ اور مشرقی و اسلامی علوم میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور اس سلسلے میں کیمبرج کے علماء و فضلاء سے رابطہ پیدا کیا اور خاص طور پر پروفیسر کاویل اور پروفیسر رابرٹسن سمتھ سے فیضیاب ہوئے۔ یورپی زبانوں میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی پر مہارت کے علاوہ ڈچ، پرتگالی، روسی اور ہسپانوی پر بھی قدرت حاصل کر لی۔ نیز مشرقی زبانوں میں عربی، فارسی اور سنسکرت سے ان کی دلچسپی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔

۱۸۸۸ء میں ان کی خدمات ایم اے او کالج علی گڑھ کے لیے حاصل کی گئیں۔ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ان کی شخصیت پر اسلامی علوم و فنون اور تہذیب نے گہرے نقوش چھوڑے لیکن چونکہ انہوں نے فلسفہ اور عیسائی مذہب کی خصوصی تعلیم کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی تھی، اس لیے ابتدا میں ان کی توجہ اسلام اور تاریخ اسلام کی طرف عام یورپین مستشرقین کی طرح معاندانہ رہی۔ اور جیسے جیسے ان کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا ان کے مزاج میں اعتدال آتا گیا، یہاں تک کہ وہ اگرچہ کبھی ایمان کے شرف سے مشرف نہ ہوئے لیکن اسلام کے مداحوں میں شمار ہونے لگے۔ جب وہ علی گڑھ تشریف لائے مسلمان علماء خصوصاً شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی سے دوستی ہو گئی۔ مولانا موصوف نے ان سے فرانسیسی سیکھی اور انہوں نے مولانا شبلی نعمانی سے عربی زبان کے درس لیے یہی وجہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا استاد کہا کرتے تھے۔ جب ۱۸۹۶ء میں مولانا شبلی نے مصر، روم و شام کا سفر کیا تو آرنلڈ ان کے رفیق سفر تھے۔

۱۸۹۸ء میں آرنلڈ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جب اپریل ۱۸۹۹ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم۔ اے سٹائن مستعفی ہو کر بحیثیت پرنسپل مدرسہ کالج، کلکتہ چلے گئے تو ان کی جگہ قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۹۹ء تک یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر اے ڈبلیو سٹراٹن نے اورینٹل کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا اور آرنلڈ واپس گورنمنٹ کالج تشریف لے گئے۔ ۲۳ اگست ۱۹۰۲ء کو ڈاکٹر سٹراٹن کا انتقال ہو گیا۔ تو انہیں دوبارہ قائم مقام پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج کا عہدہ سونپا گیا اور جب اپریل ۱۹۰۳ء میں مسٹر اے سی وولنر کالج کے مستقل پرنسپل مقرر ہو کر آئے تو پروفیسر آرنلڈ پھر گورنمنٹ کالج چلے گئے۔

پروفیسر آرنلڈ کو علامہ اقبالؒ کے استاد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے فلسفہ کی تحصیل کے شوق میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو پروفیسر آرنلڈ سے فیضیاب ہوئے۔ اس ضمن میں سر عبدالقادر بانگ درا کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں
"[illegible] اساتذہ میں ایک نہایت شفیق استاد ملا جس نے فلسفہ کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر انھیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرز عمل سے حصہ دیں اور وہ اس ارادے میں بہت کچھ کامیاب ہوئے۔ پہلے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اب انھیں یہاں ایک اور جوہر قابل نظر آیا جس کے چمکانے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ اور جو دوستی اور محبت استاد و شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخر شاگرد کو استاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ ... آرنلڈ خوش ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لیے بھی باعث شہرت افزائی ہوا اور اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی، اور جسے درمیان میں [illegible] کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا، اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔"

۱۹۰۴ء میں پروفیسر آرنلڈ "انڈیا آفس لائبریری" میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے لندن گئے اور تھوڑے دنوں بعد یونیورسٹی کالج لندن میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔

۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان تشریف لے گئے اور ۱۹۰۸ء تک یورپ میں مقیم رہے۔ یہاں انھیں پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات کا موقع

اکثر و بیشتر ملتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں ان کے خیالات میں چند تغیرات رونما ہوئے جن میں سے ایک کا حال سر عبدالقادر نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری ترک کر دیں اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لئے ایسی مفید خداداد طاقت کا بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترک شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی قدر کرتے ہیں وہ ان کے لئے بھی مفید ہے۔ اور ان کے ملک و قوم کے لئے بھی مفید ہے۔ ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اس کا تو یوں خاتمہ ہوا۔"

۱۹۰۹ء میں پروفیسر آرنلڈ انڈیا آفس لائبریری کی طرف سے انگلستان میں ہندوستانی طلبا کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی اہم خدمات انجام دیں۔ (جس کا اردو ترجمہ "دائرۃ المعارف اسلامیہ" کے نام سے جامعہ پنجاب سے شائع ہو رہا ہے۔) انہی خدمات کے صلے میں ۱۹۲۱ء میں انہیں "سر" کا خطاب ملا۔ زندگی کے آخری ایام تک تحقیق و تصنیف و تدریس کا اہم کام جاری رہا۔

آرنلڈ نے علمی و ادبی اور تحقیقی مقالات کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں:۔

1. The Preaching of Islam, 1896.

(محمد عنایت اللہ دہلوی مرحوم نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو دعوت اسلام کے نام سے مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی کی طرف سے دوسری بار ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔)

2. Painting in Islam, 1928.
3. Court Painters of the grand Moghals, 1921.
4. Bihzad and his paintings, 1930.
5. The Caliphate, 1924.
6. Survivals of Sassanian and Manichaean Art in Persian Paintings, 1924.
7. Islamic book in collabroation with Prof. Grolomanm.

جناب عبدالمجید سالک مرحوم نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور پہلی بار ۱۹۶۱ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے "میراث اسلام" کے نام سے چھپی۔

آزاد، ابوالکلام (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء) عالم دین، انشا پرداز، سیاستداں۔ محی الدین احمد نام، آزاد تخلص تھا۔ آپ کا آبائی وطن دہلی اور مادری وطن مدینہ منورہ تھا۔ آپ کے والد مولانا خیر الدین جنگ آزادی کے بعد مکے میں مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے آپ کی والدہ سے مدینے میں شادی کیا۔ مولانا آزاد ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ آپ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا گیا۔

۱۸۹۸ء میں مولانا خیر الدین کلکتے چلے آئے۔ یہاں آ کر مولانا آزاد کی والدہ فوت ہو گئیں۔ والد نے آپ کو مشرقی علوم کی ابتدائی تعلیم دینا شروع [illegible] شریف مکہ معظمہ ہی میں ختم کرا دیا تھا۔ گھر کا ماحول مذہبی اور [illegible] بسا تھا اس لئے مولانا آزاد قبل از وقت سنجیدہ ہو گئے۔ [illegible] والد نے عربی اور فارسی کی تعلیم دینا شروع کی لیکن اردو کتابیں پڑھنا [illegible] دیں۔ تاہم مولانا چوری چھپے اردو کی کتابیں بھی پڑھتے رہتے۔

اسی زمانے میں مولانا کو شاعری کا شوق شروع ہوا [illegible] فارسی میں شعر کہنے شروع کئے۔ پہلی غزل جو دوسروں [illegible] مصرعہ یہ تھا ع

"ہم پوچھیں زمیں کی تو کہیں آسماں کی"

اس غزل پر عبدالواحد خاں نے آزاد تخلص تجویز کیا۔ [illegible] پہلی غزل بمبئی کے رسالے "ارمغان فرخ" میں شائع ہوئی۔ [illegible] "خدنگ نظر" لکھنو اور "پیام یار" لکھنو میں بھی باقاعدہ طور پر [illegible] غزلیں چھپنے لگیں۔

۱۹۰۰ء میں آپ نے فارسی تعلیم مکمل کر لی اور ۱۹۰۳ء میں درس نظامیہ سے فارغ ہو گئے۔ بعد ازاں دیگر علوم متداولہ میں خود بخود دسترس حاصل کر لی۔ پہلے فرانسیسی اور بعد میں انگریزی کی بہت سی علمی و ادبی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ چونکہ شاعری کا شوق بڑھ گیا تھا اس لئے خود ایک گلدستہ نکالنے کا خیال کیا۔ اس وقت آپ مولوی ظفر احسن شوق کی اصلاح لیتے تھے۔ چنانچہ "نیرنگ عالم" کے

نام سے یہ رسالہ جاری کردیا جو آٹھ ماہ تک برابر جاری رہا۔

اس وقت آپ کی قوت بیان اس قدر غضب کی ہوتی تھی کہ لوگ آپ کی عمر کے بارے میں شبہات ظاہر کرتے۔ ۱۹۰۴ء میں جب وہ مولانا شبلی سے ملے تو انھوں نے کہا "تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں۔" اس پر مولانا نے کہا "نہیں میں خود ہوں" آپ کی حاضر جوابی کو دیکھ کر مولانا شبلی حیرت زدہ رہ گئے۔

اسی زمانے میں مولانا نے ابن رشد، امام غزالی، سرسید اور مولوی محمد حسین آزاد جیسے مصنفین کا مطالعہ شروع کیا اور مختلف علوم کی کتابیں اکٹھی کرنا شروع کیں۔ چنانچہ حکیم عبدالرحیم دہلوی اور مولوی کبیرالدین مالک اردو گائیڈ پریس کلکتہ کے کتب خانے آپ نے خرید لیے۔

تحصیل علم کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر اور ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ ۱۹۰۱ء میں مولوی رضا علی وحشت نے "انیس الاسلام" کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس میں پہلی بار آپ نے باقاعدہ لیکچر دیا۔

مولانا کی صحافتی زندگی اگرچہ "نیرنگ عالم" سے شروع ہو چکی تھی لیکن باقاعدہ طور پر ماہنامہ "لسان الصدق" کلکتہ کو آپ کی صحافتی زندگی کا سنگ میل کہا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو جاری ہوا۔ اس رسالے نے اہل علم کے دلوں پر آپ کی فضیلت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی نے رسالہ "الندوۃ" کی ادارت کے لیے آپ کو منتخب کیا۔ یہاں آپ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک رہے۔ اسی زمانے میں شیخ غلام محمد نے امرتسر سے ایک اخبار "وکیل" نکالا تھا۔ اس نے حامد علی صاحب کے جانے کے بعد آپ کو بلا بھیجا۔ چونکہ "الندوۃ" میں آپ کو اپنے خیالات بیان کرنے کی پوری آزادی نہ تھی۔ اس لیے آپ نے "وکیل" کی ادارت قبول کر لی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے آپ والد کے اصرار پر کلکتہ واپس چلے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ اخبار "دارالسلطنت" کی ادارت بھی کی اور اس کے بعد پھر "وکیل" کو ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن ذاتی آزاد کی خاطر اپنا اخبار نکالنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کش مکش ہی میں تھے کہ ۱۹۰۹ء میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آخر ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء میں آپ نے اپنا ذاتی اخبار "الہلال" جاری کر دیا۔ اس کے صفحات پر ایسے قومی اور مذہبی مسائل زیر بحث آئے جن سے ملت اسلامیہ کے ذہنی نقشے بدل گئے۔ مولانا نے قدماء کے طرز سے ہٹ کر آزاد صحافت کو جنم دیا۔ اس میں حریت و صداقت کا پیغام دیا۔ اس پر حکومت وقت کی نظروں میں آپ کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ انہدام مسجد کانپور کے سلسلے میں "الہلال" کے مضامین نے حکومت کو بوکھلا دیا۔ اور ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو "الہلال" کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا کو بھی بنگال سے خارج کر دیا گیا۔

"الہلال" کے بعد مولانا نے "البلاغ" کو نئے رُخ پر نکالا۔ اس میں علمی نفسیات کا درس اور فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا پیغام دینا شروع کیا "البلاغ" کا سلسلہ بند ہوا تو ۱۹۲۱ء میں مولانا نے کلکتے سے ایک اور اخبار "پیغام" جاری کر دیا۔ ۱۹۲۷ء میں "الہلال" بھی دوبارہ جاری ہو گیا۔

بنگال سے نکالے جانے کے بعد مولانا کو رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب آپ نظر بندی سے باہر آئے تو رولٹ ایکٹ ملک میں آگ لگا چکا تھا۔ گاندھی جی عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کر چکے تھے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو آپ کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ یہیں مہاتما جی سے آپ کی عقیدت اور خلوص کا رشتہ قائم ہوا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران میں مولانا نے سینکڑوں تقریریں کیں۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو آپ نے صوبائی خلافت کانفرنس آگرہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو گاندھی جی کے ترک موالات کے اصول اختیار کرنے کی دعوت دی۔

اسی سال علی برادران پر مقدمہ چلایا گیا۔ چنانچہ تمام لیڈروں نے بیانات جاری کرنے شروع کیے۔ جس کی قرارداد میں مولانا کے دستخط گاندھی جی کے بعد تھے۔ جب حکومت نے لیڈروں کو گرفتار کرنا شروع کیا تو مولانا بھی لپیٹ میں آگئے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہوئے اور آپ کو ایک سال کی سزا دی گئی۔

۱۹۲۳ء میں جب آپ دوبارہ جیل سے واپس آئے تو آپ نے دیکھا کہ کانگریس میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔ موتی لال نہرو اور گاندھی جی میں اصولی اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لیے مولانا نے دسمبر ۱۹۲۳ء میں پہلی بار کانگریس کے جلسے کی صدارت کی۔

اسی زمانے میں کانگریس کی ساکھ بہت گر گئی۔ آخر کار ۱۹۲۴ء میں جب گاندھی جی جیل سے باہر آئے تو انھوں نے ایک سو گیارہ دن کا مرن بھرت رکھا۔ اس کے زیر اثر اتحاد کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس میں مولانا نے سمجھوتے کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب ہوئے۔

سائمن کمیشن کے خلاف اور آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا آزاد بے خوفی اور بے پرواہ "انفرادیت" سے تقریریں کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ کی تحریک اور گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد مولانا نے ایک بار پھر اپنی شخصی قیادت کا ثبوت دیا۔ بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد کے لاکھوں مسلمانوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد مولانا بھی گرفتار ہو گئے۔

۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد ایک بار پھر کانگریس کے صدر ہوئے۔ انھوں نے ستیہ گرہ کی مہم میں زور شور سے حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں اٹھارہ ماہ کی سزا پا کر جیل چلے گئے۔ جاپانیوں کے حملے نے شدت دکھائی تو حکومت ہند سیاسی لیڈروں کو رہا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ تاکہ ان کی ہمدردیاں حاصل کر سکے۔ چنانچہ مولانا کو بھی رہا کر دیا۔ ۱۹۴۱ء میں کرپس مشن ہندوستان آیا اور آزادی اور تقسیم ملک کی تجاویز پیش کیں لیکن آپ نے بحیثیت صدر کانگریس ان تجاویز کو نامنظور کر دیا جولائی ۱۹۴۲ء میں مجلس عاملہ کے اجلاس میں انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ ایک بار پھر بلند کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ۹ اگست کو انھیں گرفتار کر

ایا گیا۔ یہ گزٹ ساری ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد کے جلسوں میں انھوں نے تقسیم ملک کی حد درجہ مخالفت کی۔

۱۹۴۳ء میں آپ کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ نے کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۷ء میں دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے وزیر ہوئے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ آپ نے فرقہ پرستی کے ہولناک شعلوں میں قتل و خون کے مناظر دیکھے۔ بطور احتجاج آپ نے یکم ستمبر کو کلکتے میں اور جنوری ۱۹۴۸ء میں دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے مرن برت رکھا۔ اس وقت آپ ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔

۱۹۵۱ء میں پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں پہلے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ تعلیم، قدرتی ذرائع اور سائنسی تحقیق کے وزیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کو دوبارہ پارلیمنٹ میں کانگریس کا ڈپٹی لیڈر منتخب کیا گیا۔ اسی سال آپ کو یورپ اور مغربی ایشیا کے دو ماہ کے خیر سگالی کے دورے پر بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں دوبارہ گوڑگاؤں کے حلقۂ انتخاب سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیقات کے عہدے پر برقرار رہے۔ آخر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو برصغیر پاک و ہند کا یہ بطل جلیل انتقال کر گیا۔ آپ کو جامع مسجد دہلی کے سامنے کے میدان میں دفن کیا گیا۔ مادۂ وفات:

"قبر خدا دوست" ۱۳۷۷ھ

"لکلِ نفسٍ ذائقۃ الموت" ۱۹۵۸ء

مولانا آزاد کا سراپا خواجہ حسن نظامی نے خوب بیان کیا ہے: "دُہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سفید چھوٹی داڑھی، آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی اور ظرافت، دہلی کے رہنے والے ہیں، ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں، قوم سیّد، پیشہ آزادی اور بے نیازی، حافظہ کی قوت بے مثال، تصور کی حالت چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی۔ تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ، نازک مزاجی میں تاناشاہ، سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے آگے" پھر لکھتے ہیں: "اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے۔"

مولانا کی عظمت کے لئے خواجہ حسن نظامی کے یہ الفاظ کافی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسی مثال پیش کی جا سکے کہ کسی فرد نے چوبیس برس کی عمر میں بلند ترین مقام حاصل کر لیا ہو۔ مولانا کے قید و بند کے سلسلے میں ان کی گراں بہا علمی متاع بُری طرح تلف ہوئی۔ تاہم پھر بھی جو چند کتابیں موجود ہیں، بہترین سرمایۂ ادب ہیں۔

تصانیف: مولانا کی گرانقدر تصانیف میں سے تین تصانیف بہت اہم ہیں۔ ۱۔ "ترجمان القرآن" تفسیر کی یہ کتاب پہلی بار انھوں نے ۱۹۲۰ء سے پہلے لکھی تھی۔ لیکن نظربندی کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔ دوسری بار آپ نے جولائی ۱۹۳۰ء میں لکھی اور اس کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں چھپی۔ دوسری جلد ۱۹۳۶ء میں چھپی لیکن تیسری جلد کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔ دوسری اہم کتاب "البیان" تھی۔ اس میں قرآن مجید کے اہم مقامات و واقعات کی مفصل تفسیر بیان کی گئی ہے اور تیسری "البصائر" یعنی مقدمۂ قرآن۔ ان کے علاوہ آپ کی مشہور ادبی اور علمی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ "تذکرہ" ۲۔ "غبار خاطر" ۳۔ "خطابات" ۴۔ "جامع الشواہد" ۵۔ "مکاتیب" ۶۔ "قول فیصل" ۷۔ "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" ۸۔ "انڈیا ونز فریڈم" (آزادیٔ ہند) ۹۔ "اسلامی جمہوریت کے تقاضے" ۱۰۔ "اسلام اور آزادی" ۱۱۔ "حضرت یوسف" ۱۲۔ کاروانِ خیال" ۱۳۔ "مکالمات آزاد" ۱۴۔ "اصحاب کہف"

آزاد بلگرامی (۱۷۰۴ء تا ۱۷۸۶ء) مورخ، تذکرہ نگار اور شاعر میر غلام علی آزاد بلگرامی بن نوح الحسینی الواسطی الچشتی۔ ابن زید شہید بن امام زین العابدین۔ حسان الہند لقب تھا۔

جد امجد سلطان التمش کے وقت میں بلگرام آئے تھے۔ آپ ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ ۲۹ جون ۱۷۰۴ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میر طفیل محمد بلگرامی سے حاصل کی۔ عربی، فارسی اور دینیات کی تکمیل اپنے نانا عبدالجلیل بلگرامی سے کی اور فنون ادب میں اپنے ماموں سید محمد سے کسب کمال حاصل کیا۔

آپ کی زندگی کا ابتدائی حصہ سفر میں کٹا۔ ۱۱۳۷ھ، ۱۷۲۴ء میں میر سید لطف اللہ المعروف بہ شاہ لدھا بلگرامی سے بیعت کی۔ ۱۱۴۳ھ، ۱۷۳۰ء میں لاہور اور ملتان سے ہوتے ہوئے سیہوان شریف پہنچے۔ یہاں اپنے ماموں کی جگہ پر نیابت کی، جو وقائع نگار تھے۔ ۱۱۴۷ھ میں دہلی واپس آئے۔ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں پاپیادہ حج کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں نواب نظام الملک آصف جاہ سے ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب نے ان کی رباعی سن کر زاد راہ عطا فرمایا۔ چونکہ زمانہ حج ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے آپ مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں شیخ محمد حیات سندھی سے صحیح البخاری کی سند لی اور مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حج سے فارغ ہو کر شیخ عبدالوہاب طنطاوی سے فن حدیث کی تکمیل کی۔ علمائے مکہ نے آپ کی نعت، قصیدہ در شان حضور سن کر حسان الہند کا خطاب دیا۔

آپ ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں عرب سے واپس ہوئے اور اورنگ آباد آ گئے بقیہ زندگی یہیں گذار دی۔ نظام الملک آصف جاہ نے اپنی صحبت سے نوازا اور آپ اس کے دوسرے بیٹے نواب ناصر جنگ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ جب باپ بیٹوں میں جنگ ہوئی تو آزاد نے اس فتنے کو اپنے اثر سے ختم کیا اور ناصر جنگ کا قصور معاف کرایا۔ ناصر جنگ نے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں باپ کی جگہ پر تخت نشین ہو کر آپ کو آل تمغا موضوع ہرسول عطا کیا۔ نواب سید محمد خان صلابت جنگ نے آپ کی خدمات اور خیر خواہی ملک و رعایا کے سلسلے میں صدارت کل کی خدمت اور سراج المحدثین اور رئیس العلماء کا خطاب دیا۔

امراء میں خصوصاً میر عبدالرزاق المخاطب بہ شاہنواز خان شہید آپ کی محبت کے سزاوار تھے۔ شاہنواز خان کے قتل کے بعد آزاد نے اس کی کتاب مآثر الامراء کے مخطوطے جمع کئے اور انھیں از سر نو ترتیب دے کر کتاب مکمل کی۔ اس کے علاوہ اس کی تین اور کتابوں "تذکرہ بہارستان سخن" "موائد العوائد" از منشآت شہنواز خاں عرف صمصام الدولہ" کی بھی اصلاح کی۔

آزاد بلگرامی کی ایک مہر ہوا کرتی تھی۔ جس پر "فقیر آزاد" کندہ تھا۔ آپ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ ۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء میں وفات پائی۔ آپ کو خلد آباد دکن "احاطہ درگاہ امیر حسن سجزی دہلوی" میں اس مقبرے کے اندر جو آپ نے "خوابگاہ روش" کے نام سے ۱۱۹۱ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ دفن کیا گیا۔ مادۂ وفات "آہ غلام علی آزاد" ۱۲۰۰ھ ہے۔ آپ کے صاحبزادے نورالحسن نے آپ کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ پوتے الممالک امیر حیدر بلگرامی کی اولاد حیدرآباد دکن اور پاکستان میں موجود ہے

آزاد بلگرامی بلند پایہ شاعر، مورخ اور تذکرہ نگار تھے۔ زیادہ تر تصانیف

عربی اور فارسی میں حدیث، ادب، تاریخ، سوانح اور شعر کے موضوع پر ہیں۔

اہم عربی تصانیف میں سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، تالیف ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء حدیث و قرآن پر، جس میں ہندوستان کے علمائے دین کے سوانح اور سات سو اشعار بطور امثال درج ہیں۔ مظہر البرکات، عربی تصوف پر در بحر خفیف۔ السبعۃ السیارہ سات دیوانہائے عربی، قصائد اور اشعار پر ۱۱۹۴ھ میں ختم ہوئے۔ ان کے علاوہ تین اور دیوان بھی ہیں۔ شفاء العلیل، کلام متنبی پر اعتراضات اور کشکول وغیرہ شامل ہیں۔

فارسی میں دیوان، تقریباً نو ہزار اشعار۔ خزانۂ عامرہ، ۱۳۵ پرانے اور نئے تقریباً ۱۳۰ فارسی شعراء کا تذکرہ تالیف ۱۱۷۶ھ۔ مآثر الکرام ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء بلگرام کے ۸۰ فقراء اور ۴۳ فضلاء کے احوال پر۔ سرو آزاد۔ مآثر الکرام کی جلد دوم تالیف ۱۱۶۶ھ، ہندوستان کے ۱۴۳ فارسی اور اردو شعراء کے سوانح حیات۔ ید بیضا ۱۱۴۸ھ کی تصنیف ۵۳۲ شعرا کے حالات پر۔ روضۃ الاولیاء، خلد آباد کے چشتی اولیاء کے حالات پر۔ انیس المحققین، اولیائے بلگرام کے حالات کے علاوہ مکتوبات بھی ہیں۔

آزادی بر بنائے فطری حق۔ یعنی کوئی ذی روح اپنے ارادوں کو جس طرح چاہے پورا کرے اور اس پر کوئی دباؤ یا پابندی نہ ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہونا ناممکنات میں ہے۔ اگرچہ ہر انسان کو آزادی کا حق حاصل ہے لیکن منشا یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر دست درازی نہ کرے۔ کیونکہ آزادی صرف اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے۔ جب دوسروں کی آزادی کو مجروح نہ کیا جائے۔

اسلام میں آزادی کا تصور باقی اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے وہ گوارا نہیں کرتا کہ انسان انسان کے آگے سر جھکائے۔ مغربی مفکرین کے نزدیک آزادی یہ ہے کہ ایک قوم اپنے ملک اور نسل کے زعما کے بنائے ہوئے قوانین کا اتباع کرے لیکن جب ایک پرندہ دوسرے پرندے کے قوانین کا اتباع نہیں کر سکتا تو پھر انسان دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کا اتباع کیوں کرے۔؟

اسلام میں حقیقی آزادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کی محکومیت اختیار کرے اور اسی کو مقتدر اعلیٰ سمجھے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

"حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس کا حکم ہے کہ صرف اسی کی محکومیت اختیار کرو اور کسی کو اپنا حاکم نہ سمجھو۔ دین قیم یہی ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔" (۱۲: ۴۰)

سابقہ تاریخ کے تجربات سے واضح ہے کہ انسان اپنا واضع قانون بنانے سے قاصر ہے۔ اگر اسے دوسروں کی بندگی سے چھٹکارا مل بھی جائے تو یہ خود اپنی نفسانی خواہشات کا بندہ بن جاتا ہے۔ اس لئے اللہ کو حاکم اعلیٰ سمجھنے سے انسان اللہ کے بنائے ہوئے قوانین پر چلتا ہے۔ ان کاموں سے رُکتا ہے جن سے منع کیا گیا ہے اور ان پر چلتا ہے، جن کا حکم دیا گیا۔ یہی انسان کی آزادی ہے۔ اس طرح انسان قومیت، وطنیت، رنگ اور نسل کے بندھنوں سے نجات پاتا ہے اور اپنے عمل سے دوسروں کی آزادی محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح سے گویا وہ اپنی آزادی کو محفوظ رکھتا ہے۔ مگر... اللہ کے قوانین کے تابع رہ کر۔

فطری آزادی کے ساتھ ساتھ آزادی کا ایک مفہوم غیروں سے آزاد ہونا اور ایک قوم کی حیثیت سے خود اپنے ملک میں آزاد ہونا بھی ہے۔ اس قومی آزادی کا تصور اسلام میں مسلمان قوم کی حیثیت سے آزاد ہونا ہے یعنی جہاں وہ انفرادی طور پر فطری آزادی کے حامل ہوں اور خدا کی بندگی کریں۔ وہاں حیثیت قوم خدا کے احکام کی اطاعت کے لیے آزاد ہوں۔ مسلمانوں کو مکے میں عربی قوم کی حیثیت سے تو آزادی حاصل تھی۔ لیکن مسلمان قوم کی حیثیت سے آزادی مدینہ میں ملی۔

اسلام کے نزدیک پوری ملت اسلامیہ ایک قوم ہے۔ اس میں جغرافیائی تقسیم کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ ایرانی، عربی، ترکی، کالے اور گورے جیسی باتوں کی تمیز کو اسلام بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ پوری قوم کا اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اس آزادی کے تحت دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنے مذہبی قوانین نافذ کرنے اور اسلام پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

آزر حضرت ابراہیم کے والد کا نام، جو بت تراش اور بت فروش تھا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ "واذ قال ابراهيم لابيه آزر اتتخذ اصناما الهة" (سورۃ الانعام آیت ۷۶)

تورات میں ابراہیمؑ کے والد کا نام تارخ بتایا گیا ہے، جو نوحؑ کی آٹھویں پشت سے تھا اور بابل میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر بن تارح تھا اور وہ نمرود کا چچا زاد بھائی تھا۔ قرین قیاس یہی ہے کہ آزر تارح یا تارخ کا عربی تلفظ ہے۔ جیسے اسحٰق، اضحک یا آزر کا عربی تلفظ ہے۔ چنانچہ امام راغبؒ اصفہانی لکھتے ہیں کہ ان کے باپ کا نام تارخ تھا۔ جسے عربی میں آزر بنا لیا گیا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ آزر، ابراہیم کا چچا تھا اور چونکہ اس نے ان کی پرورش کی تھی، اس لیے قرآن میں اسے ابراہیمؑ کا باپ کہا گیا ہے۔ لیکن مولانا عبدالرشید نعمانی لکھتے ہیں کہ یہ لغو ہے کیونکہ صحیح بخاری میں ان کے والد کا نام آزر ہی بتایا گیا ہے۔ اوپر بیان شدہ نظریہ کی حمایت میں علماء یہ بیان دیتے ہیں کہ چونکہ کسی پیغمبر یا نبی کا باپ مشرک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آزر، ابراہیمؑ کا باپ نہیں ہو سکتا۔ امام رازی کی تصریح کے مطابق یہ عقیدہ شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ تارح یا تارخ اس کا نام ہو اور آزر لقب ہو۔ عربی مورخ ابن حبیب اسے تارح وہو آزر لکھتا ہے۔ چونکہ یہ عربی لفظ ہے اور اس کے معنی قوت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے قرآن کی اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا تو قوت کے سبب بُت بناتا ہے۔؟

کہتے ہیں کہ آزر نے ۲۰۵ برس کی عمر پائی۔ ابن حبیب نے اس کی عمر ۲۵۰ سال لکھی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ لکھتے ہیں کہ نمرود نے، جسے اہل عجم فرمیدوں کہتے ہیں، اپنے اعزہ میں سے سات افراد کو منتخب کر کے ان کا نام "الکوہبارین" رکھا اور انتظامی امور ان کے سپرد کیے۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ کا والد آزر بھی تھا۔ بائیبل میں ہے کہ ناحور انتیس برس کا تھا کہ تارح پیدا ہوا اور تارخ ستر برس کا تھا کہ ابراہیمؑ، ناحور اور حاران پیدا ہوئے۔ اور تارح نے اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لُوط کو، جو حاران کا بیٹا تھا اپنی بہو سارہ کو ساتھ لیا اور کنعان کی طرف روانہ ہوئے اور حاران تک آئے اور وہیں رہنے لگے اور تارح کی عمر دو سو پانچ برس ہوئی اور وہ حاران میں فوت ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے والد ہی کو دعوت حق دی قرآن

میں بڑا مفصل طور پر درج ہے۔ آذر پر ابراہیمؑ کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنے پیغمبر بیٹے کو دھمکی دی کہ اگر ان بتوں کی برائی سے باز نہ آئے گا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا۔ اس پر ابراہیمؑ اس سے الگ ہو گئے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:۔

قیامت کے روز حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کو خاک آلود سیاہ چہرے کے ساتھ پائیں گے۔ اس وقت آپ فرمائیں گے کہ کیوں میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میری نافرمانی نہ کر؟ آذر جواب دے گا آج میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔ اس پر ابراہیمؑ اپنے خدا سے عرض کریں گے کہ تو نے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تو مجھے رسوا نہیں کرے گا۔ اب اس سے بڑھ کر میری رسوائی اور کیا ہو گی۔ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ میں نے جنت کو کافروں پر حرام کر دیا ہے اور پھر کہا جائے گا کہ اے ابراہیم تیرے پاؤں تلے کیا ہے۔ اب جو دیکھیں گے تو ایک نجاست آلودہ گھنے بالوں والا خون سے لتھڑا ہوا کفتار پڑا ہے، پھر اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

آسا (ASA) سلطنت یہوداہ کا تیسرا بادشاہ ۹۱۳ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت عزریاہ بن عودا اور حنانی پیغمبر تھے آسا اپنے باپ ابیام کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس کا دور حکومت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے عہد سے مشابہ تھا۔ اسرائیل کی سلطنت سمرام کی لڑائی کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی۔ آسا نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بت پرستی کے ستونوں کو مسمار کرنا شروع کیا اور ان تمام جگہوں کو مرمت کرایا جنھیں شاہ مصر نے اس کے دادا رجبعام کے عہد میں برباد کر دیا تھا۔

تواریخ بائبل میں ہے کہ چند سال بعد ایک نیا خطرہ جنوب سے اٹھا۔ ایک حبشی شہزادہ، جس کا نام زارح تھا، دس لاکھ کی فوج لے کر تین سو گاڑیوں سمیت اس پر چڑھ آیا۔ آسا کی فوج نے صفاتہ کی وادی میں اس کا مقابلہ کیا آخر اسے شکست فاش دی۔ اور جرار تک ان کا تعاقب کیا۔ اگرچہ ان مقامات کی اصل جگہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکی۔ تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ لڑائی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ کی جائے رہائش کے قریب ہی کہیں ہوئی تھی۔ جہاں وہ ایک ہزار سال قبل رہا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی کا نتیجہ بہت مبارک رہا اور واپس آ کر عودا پیغمبر کی ترغیب پر آسا نے لوگوں کو جمع کیا۔ جن میں شمعون، افرائیم اور منسّی کے گھرانوں کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے اور اس موقع پر سب نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنے باپ دادا کے خدا کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے چنانچہ جب اسرائیل کا بادشاہ بعشاہ، رامہ کو اس لیے مضبوط کر رہا تھا کہ یہوداہ کی سلطنت کی آمد و رفت شمال کی جانب بند کر دے، اس وقت آسا نے فوج کا فوج سے مقابلہ کرنے کے خیال سے آرام کے بادشاہ بن ہدد سے امداد کی درخواست کی اور رشوت دے کر اس سے بعشاہ کی سرحد پر حملہ کرایا۔

اس وقت حنانی نبی کو جس نے آسا کو اس کے ایمان کی کمزوری سے آگاہ کیا تھا، قید میں ڈال دیا گیا۔ گمان غالب ہے کہ بادشاہ کے ایمان میں ضعف آتے ہی عوام پھر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ آسا ۸۷۳ ق م میں ۴۱ برس حکومت کر کے فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یہوسفط تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں سلطنت نے پھر وہی اقبال مندی حاصل کر لی جو اسے داؤدؑ کے زمانے میں حاصل تھی۔

آستر عہد نامہ عتیق میں ایک یہودی عورت کا نام جو بخت نصر کے حملے کے بعد بابل سے جلا وطن کر دی گئی تھی۔ ایران کے بادشاہ اخسویرس نے اپنی پہلی بیوی سے ناراض ہو کر اس سے شادی کر لی تھی۔ اس کے وزیر ہامان نے آستر کے سرپرست مردکے سے جو آستر کا چچا زاد بھائی تھا ناراض ہو کر تمام جلا وطن یہودیوں پر ظلم ڈھانے کا ارادہ کیا، تو آستر نے بادشاہ کے ذریعے رکوایا۔ یہ واقعہ انجیل مقدس کے پہلے حصے "عہد نامہ عتیق" کی نو کتابوں سے ایک میں آیا ہے۔ اس کتاب یا باب کا نام بھی آستر ہے۔

کتاب آستر دوسری قسم کی ان قدیم کتابوں میں شامل ہے۔ جن کی صحت کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف کا کوئی حال معلوم نہیں اور نہ تصنیف کے زمانے کا پتہ چلتا ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ انجیل اور اس کے یہ حصے کئی مصنفین کا کارنامہ ہیں۔ بعض عیسائی حضرات کا خیال ہے کہ یہ ان علماء کی تصنیف ہے، جو عزراؑ کے عہد سے سیمن کے زمانہ تک ہوئے ہیں۔

فلو نامی ایک یہودی کا قول ہے کہ یہ یہویاکین کی تصنیف ہے، جو یسوع کا بیٹا تھا۔ (یہویاکین یسوع کا بیٹا نہیں تھا بلکہ یہویقیم کا بیٹا تھا۔) اگسٹائن کہتا ہے کہ یہ عزیرؑ کی تصنیف ہے۔ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ تصنیف تیسری صدی ق۔م میں ہوئی۔

آسمان فلک، سماء، دنیا کے گرد نیلی فضاء، جس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ وہ دھواں تھا (۴۱ = ۱۱) یعنی دھوئیں کی طرح بنا ہے۔ کوئی ٹھوس شے نہیں۔ تمام ستارے اور سیارے جس فضا میں ... قرآن اسے آسمان قرار دیتا ہے۔ جب کہ فلک سیاروں کے چلنے کی جگہ کو کہا ... سورہ الانبیا کی ۳۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب فلک میں تیزی سے چل رہے ہیں۔"

آسمان کتنے عرصہ میں اور کب تخلیق ہوا؟ اس کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمان اور زمین چھ ایام (وقفوں) میں پیدا کیے، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا ... الخ" (... = ۵۴)

یہاں چھ ایام سے مراد چھ دن نہیں ہیں۔ ہمارا ایک دن صرف چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ لیکن یوم سے مراد وہ وقت ہے، جو واحد مدت ہو یعنی کسی وقت یا دور کو بھی یوم کہا جاتا ہے۔ ایک یوم پچاس ہزار سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ سورہ المعارج کی چوتھی آیت میں آیا ہے۔ "فرشتے اور روح اس کی طرف ایک یوم میں چڑھتے ہیں، جس کا اندازہ پچاس ہزار سال کا ہے۔"

آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ چھ مختلف ادوار میں پیدا ہوئے۔ یا پیدائش سے اب تک چھ مختلف زمانوں سے گذرے اب خواہ یہ زمانے دس ہزار سال کے تھے، پچاس ہزار یا پچاس لاکھ سال کے۔ ابن جریر کے مطابق ایک یوم ایک ہزار سال کے برابر ہے۔

ان چھ دنوں میں سے آسمان بنانے پر کتنی مدت صرف ہوئی؟ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

۔ سو سات آسمان دو دن میں بنائے اور ہر آسمان میں اس کا امر وحی کیا اور ہم نے آخری آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کی ۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے ۔" (۴۱ = ۱۲)

یہاں سات آسمان بنائے گئے ہیں، جن کا دو دن میں بنانے کا ذکر ہے سات آسمانوں سے مراد نظام شمسی کے سات بڑے سیارے ہیں جو اپنے فلک میں چکر لگا رہے ہیں اور ہر آسمان کو اس کا امر وحی کیا ، یعنی اس کا کام مقرر کر دیا ۔ ابن اثیر کے مطابق سات کا عدد "بہت" کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس لئے سات سے مراد یہاں بہت سے آسمان بھی ہو سکتے ہیں ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آسمان کیسے قائم کیا گیا ہے اور کس شئے کے سہارے معلق ہے ؟ ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ۔

"اللہ وہ ہے جس نے آسمان کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کیا ہے جنہیں تم دیکھتے ہو پھر عرش پر قرار پکڑا اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا ۔ ہر ایک ایک مقررہ وقت تک چل رہا ہے ۔ وہ کاروبار کی تدبیر کرتا ہے ، باتیں کھول کر بیان کرتا ہے ۔ تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو ۔" (۱۳ = ۲)

ابن عباس سے روایت ہے کہ آسمانوں کو اللہ تعالیٰ نے گویا ایسے ستونوں پر قائم کر رکھا ہے جو نظر نہیں آتے ۔ چونکہ یہاں بحث آنکھوں سے نظر نہ آنے پر ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی سورج اور چاند کے تعلق اور کام اور مقررہ وقت تک چلنے کا بیان ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آسمان کسی ایسی کشش کے نظام پر قائم ہے ۔ جسے قرآن غیر مرئی ستون کہتا ہے ۔ اور اس آسمان کے اندر اجرام فلکی اپنے مقررہ راستوں پر ایک معین مدت کے لئے چل رہے ہیں ۔

روز قیامت آسمان کس حالت میں ہوگا ؟ قرآن مجید میں قیامت کی نشانیوں کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے ۔ "اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی ۔" (۸۱ = ۱۱)

گویا آسمان کی حقیقت تب ظاہر کی جائے گی ۔ اس سے پہلے آسمان کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکے گی ۔ یہاں ایک اور معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں کہ قیامت تب آئے گی جب آسمان کی حقیقت لوگوں پر منکشف ہو چکی ہوگی ۔ خواہ یہ انکشاف علم کے ذریعے ہو یا کسی کے ذریعے ۔ یہ گویا علوم کی ترقی اور انتہا کی طرف اشارہ ہے ۔

واقعہ معراج میں حضور اکرمؐ کا ساتوں آسمانوں پر جانے کا ذکر ہے ۔ حضرت قتادہؓ اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ پہلے آسمان پر حضورؐ نے حضرت آدمؑ سے ملاقات کی ۔ دوسرے پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ ، تیسرے پر حضرت یوسفؑ ، چوتھے پر حضرت ادریسؑ ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کی ۔ اس سے آگے سدرۃ المنتہیٰ تھا ۔ حضرت ابن شہابؓ حضرت ابوذرؓ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ آسمانوں میں انبیاء کے ملنے کا ذکر ہے ، لیکن مدارج بیان نہیں کئے ۔ البتہ چھٹے آسمان پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی ۔

آسمانی کتب الہامی کتب ، وہ کتب جو ہر قوم اور ملت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعے نازل ہوئیں ۔ اکثر پیغمبروں پر محض وحی مصحف کرانے کی ہدایت ہوئی ۔ یعنی انہیں صحائف لکھنے کا حکم ملا ۔ اور چند پیغمبروں پر کتابیں نازل ہوئیں ۔ ایسی کتابیں ، جو ہمارے پیغمبروں پر اتریں ، آسمانی کتب کہلاتی ہیں ۔ یہ کتابیں تعداد میں چار ہیں ۔ زبور ، تورات ، انجیل اور قرآن ۔ بعض لوگ زرتشت کی کتاب ژند اوستا کو بھی آسمانی کتاب قرار دیتے ہیں ۔ یوں تو دنیا کے اکثر مذاہب میں کتابیں موجود ہیں ، لیکن وہ سب آسمانی یا الہامی کتب نہیں کہلاتیں ۔ آسمانی کتب کا ذکر ہم باری باری کریں گے ۔ تاہم سب سے پہلے ژند اوستا کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ اس کی نوعیت کو پرکھا جا سکے ۔ اس کے بعد یہودیوں ، عیسائیوں اور مسلمانوں کی آسمانی کتب کا ذکر کریں گے ۔

ژند اوستا : یہ کتاب زرتشت کی تعلیمات پر مبنی ہے ۔ زرتشت ۱۲۵ ق ۔ م یا ۶۰۰ ق ۔ م میں کہیں گذرا ہے ۔ اس کے پیرو اوستا کو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں ۔ ایک روایت کے مطابق زرتشت نے بیس کتابیں لکھی تھیں ، جو ایک لاکھ آیات پر مشتمل تھیں اور گائے کے بارہ سو یا بارہ ہزار چمڑوں پر تحریر تھیں ۔ سکندر اعظم نے انہیں تباہ کر دیا تھا ۔ چنانچہ تین یا چار سو سال بعد اس کی تدوین ثانی ہوئی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ اوستا اصل کتاب نہیں ، اب نہ اصل کتاب موجود ہے اور نہ اس کی تعلیمات ، اس لئے حتمی طور پر اس کتاب کو الہامی یا غیر الہامی نہیں کہا جا سکتا ۔

عہد نامہ عتیق : بنی اسرائیل وہ واحد قوم ہے ، جس پر خدا نے ہمیشہ فضل و کرم کیا ۔ لیکن یہ بداعمالیوں پر قائم رہی ۔ اس قوم پر تین آسمانی کتابیں تورات ، زبور اور انجیل ، اور بے شمار صحائف نازل ہوئے ۔ تورات حضرت موسیٰؑ پر ، زبور حضرت داؤدؑ پر اور انجیل حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی ۔ (نیز دیکھئے "عہد نامہ عتیق ، زبور ، تورات")

تالمود : یہودیوں کے ہاں ان کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب "تالمود" بھی آسمانی کتب کے زمرے میں شامل کی جاتی ہے ۔ اس میں حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کے اقوال درج ہیں ۔ اس کے دو حصے "مثناہ" اور "جمارا" ہیں "مثناہ" میں اقوال درج ہیں ، جو حضرت موسیٰؑ کی وحی سے منسوب ہیں اور "جمارا" میں ان کی تشریح ہے ۔

"تالمود" بھی دو ہیں ۔ ایک فلسطینی اور دوسری بابلی ۔ اول الذکر میں تاریخ ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ کے جواہر ریزے بکھرے پڑے ہیں ۔ اور دوسرے میں دقیق اور طویل عبارتیں ہیں ۔ اس کتاب کی وجہ سے یہودیوں میں ایک اور فرقہ "کریم" پیدا ہو گیا ہے ۔ جو "تالمود" سے منکر ہے ۔

عہد نامہ جدید (انجیل) : عیسائیوں کی مقدس کتابیں اناجیل کہلاتی ہیں ۔ انہیں "عہد نامہ جدید" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ ان کتابوں کی تعداد ۲۷ ہے ۔ اور "عہد نامہ عتیق" کی کتابوں کی طرح یہ بھی غیر خدائی کلام پر منحصر ہیں ۔ تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت عیسیٰؑ کوئی آسمانی کتاب اپنے پیروؤں کو دے گئے تھے ۔ یہ انجیلیں ان کے حواریوں کے بعد کے لوگوں نے لکھیں ۔ ان میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ کا ہم عصر نہیں تھا ۔ (نیز دیکھئے "عہد نامہ جدید" ، "انجیل")

قرآن مجید : دنیا میں آج صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے ، جو تصنیف و تالیف کے وقت سے لے کر آج تک اسی طرح محفوظ ہے کہ اس کے اعراب تک میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ۔ دیگر آسمانی کتب کے متعلق یہ روایت موجود ہے کہ یہ کتابیں یکمشت نازل ہوئی تھیں ، لیکن قرآن مجید کے متعلق ایسا کہنا غلط ہے ۔ اس کے نزول کا سلسلہ کم و بیش (۲۳) سال تک جاری رہا ۔ دیگر کتابوں کے برعکس اس میں کہیں بھی تضاد نہیں پایا جاتا ۔ خلاف عقل اور لغو باتوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہے ۔

پیغمبر اسلامؐ کی وفات تک ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے قرآن کو حفظ کر رکھا تھا اور کاتبوں نے تختیوں اور ہڈیوں پر لکھ رکھا تھا ۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت تدوین کا کام ہوا ۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے وقت قرآن مجید کا معیاری نسخہ شائع ہوا ۔ جس میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور آج تک اس کے ایک شوشے کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی ۔ (نیز دیکھئے "قرآن مجید")

آسیہ فرعون کی بیوی، نام آسیہ بنت مزاحم تھا۔ یہ وہ خاتون تھیں جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کی تھی۔ قرآن میں انھیں امرات فرعون کے نام سے پکارا گیا ہے۔ سورہ تحریم کی گیارہویں آیت میں آیا ہے" اور مسلمانوں کے لئے خدا فرعون کی بیوی کی مثال دیتا ہے کہ انھوں نے دعا کی، اے میرے خدا، میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے کردار سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے۔" آسیہ ان چار عورتوں میں سے ہیں۔ جن کا ذکر احادیث میں متعدد بار آیا ہے۔ وہ یہ ہیں مریم، خدیجہؓ، فاطمہؓ اور آسیہ حضرت رسول اکرمﷺ نے فرمایا کہ جنتی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہؓ، فاطمہؓ، مریمؑ اور آسیہ ہیں بلاشبہ عائشہؓ کو بھی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

آسیہ بڑی پارسا اور خدا پرست عورت تھیں۔ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے تابع تھیں۔ فرعون کے آدمیوں کو حضرت موسیٰؑ کے قتل سے انہی نے روکا تھا فرعون کو جب ان کے ایمان کا حال کھلا تو وہ انھیں طرح طرح کی اذیتیں دینے لگا۔ بیہقی نے اپنی کتاب "شعب الایمان" میں حضرت سلمانؓ سے روایت کیا ہے کہ انھیں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر کے اذیتیں دی جاتی تھیں اور جب لوگ ایذا دے کر ہٹ جاتے تو فرشتے اپنے بازوؤں سے ان پر سایہ فگن ہو جاتے اور انھیں جنت میں اپنا گھر نظر آنے لگتا۔

مسلمان مفسرین کا کہنا ہے کہ وہ خاتون جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکالا اور ان کی پرورش کی تھی آسیہ ہی تھیں۔ بائبل کی روایت کے مطابق وہ خاتون جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکالا اور پرورش کی، فرعون کی بیٹی تھیں۔ لیکن نام کے بارے میں بائبل بھی خاموش ہے۔ البتہ یہودی کہتے ہیں کہ فرعون کی بیٹی نے آپ کو دریا سے نکالا اور فرعون کی بیوی آسیہ نے آپ کی پرورش کی۔

اس وقت مصر پر رعمسیس دوم نامی فرعون حکومت کر رہا تھا۔ اس کا زمانہ ۱۳۰۴ ق۔م سے ۱۲۳۷ ق۔م تک تھا۔ یہودی مورخ جوزفس نے اس کی بیوی کا نام ترموطس لکھا ہے۔ جان ساؤتھ لکھتا ہے "موسیٰؑ کی پرورش انیسویں خاندان کے فرعون سیتی اول کی بیٹی نے کی۔" مصری آثار قدیمہ کے ماہر مورخ نے رعمسیس کی چار بیگمات کا نام۔ اسی نوفر، نوفردرا، نفریری امینمت بتایا ہے۔ خلنڈرس پٹری نے است نفرت۔ نفرتری اور نفرردنامی تین بیویوں کا نام بتایا ہے۔ ان میں سے اسی نوفریا است نفرت رعمسیس دوم کی سب سے محبوب بیوی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہی آسیہ ہو۔

آصف بن برخیاہ حضرت سلیمانؑ کا وزیر، روایت ہے کہ جب سلیمانؑ نے ملکہ سبا کا تخت منگانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ میں آنکھ جھپکنے میں اسے لاسکتا ہوں۔ سلیمانؑ کے والد داؤدؑ کے خسر حضرت طالوتؑ تھے۔ ان کی وفات کے چند ماہ بعد ان کی بیوہ سے برکیاہ یا برخیاہ پیدا ہوا۔ داؤدؑ نے اپنے برادر نسبتی برخیاہ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ آصف برخیاہ کا بیٹا تھا۔ اسے آصاف بن برخیا بھی کہا جاتا ہے۔

قرآن میں اس کی بابت ذکر آتا ہے۔

"اسے کتاب کا علم دیا گیا ہے۔" (النمل ۴۰)

ابن کثیر جیسے مشہور مفسر کے نزدیک وہ آصف بن برخیاہ تھا۔ سلیمانؑ کی صحبت میں اسے تورات، زبور اور اسمائے اسرار الٰہی کا علم حاصل تھا۔ ابن کلبی کی روایت کے مطابق آصف بن برخیاہ کا نام ناطورا تھا۔ خدا تعالیٰ نے آصف کی اولاد میں برکت عطا فرمائی

اسکے اٹھارہ لڑکے تھے جن کی طاقت اتنی بڑھی کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان سے زیادہ طاقتور قبیلہ بنی اسرائیل میں نہ تھا۔

آغا خان (اول تا چہارم) اسماعیلی فرقے کے امام کا اعزازی لقب جو سب سے پہلے آقائے حسن علی شاہ کو ملا۔ اس سلسلہ امامت میں اب تک چار آغا خان ہو چکے ہیں۔

آغا خان اول:۔ (۱۸۰۰ء۔ ۱۸۸۱ء) پورا نام حسن علی شاہ بن فتح علی شاہ قاچار (وفات ۱۸۳۴ء) کے منظور نظر داماد تھے۔ ان کے والد شاہ خلیل صوبہ کرمان کے گورنر تھے۔ ان کی وفات (۱۸۱۷ء) کے بعد شہنشاہ ایران فتح علی شاہ نے آغا حسن علی شاہ کو کرمان کا گورنر مقرر کیا اور ان سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ اس وقت سے ایران میں ان کے خاندان کا نام "آغا خان" پڑ گیا جو آگے چل کر خاندانی لقب بن گیا کرمان میں انھوں نے بڑی دانش مندی اور میانہ روی سے حکومت کی محمد شاہ قاچار (وفات ۱۸۴۸ء) کے عہد حکومت میں درباری سازشوں کے زیر اثر حسن علی شاہ نے ۱۸۳۸ء میں کرمان میں بغاوت کر دی۔ لیکن انہیں شکست ہوئی اور ۱۸۴۰ء میں وہ سندھ چلے آئے۔ جہاں انھوں نے سر چارلس نیپئر کو سندھ کی مہم (جنوری ۱۸۴۳ء) میں مدد دی۔ اور بالآخر وہ بمبئی میں آکر مقیم ہوگئے ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد سے بمبئی اسمٰعیلی فرقوں کے امام کا مستقر رہا۔

آغا خان اول

آغا خان دوم (وفات ۱۸۸۵ء) آغا خان اول کے بیٹے آغا علی شاہ ان کے جانشین ہوئے۔ وہ اپنی خدا ترسی اور علمیت کی وجہ سے اپنے وقت کی ایک مشہور شخصیت تھے اور محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ انھوں نے بمبئی کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے تعلیمی اداروں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ ان کے مقاصد کی توسیع اور ترقی میں قابل قدر کردار ادا کیا۔ ان غیر معمولی خدمات کے باعث وہ بلدیہ کی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ انہیں گھڑ سواری اور دوسرے کھیلوں

میں امتیاز حاصل تھا۔ آغا علی شاہ نے اپنی پہلی دو بیویوں کے انتقال کے بعد نواب

[illegible]

سر آغا خاں اپنے زمانے کے عظیم سیاست دان اور مدبر تھے۔ انھوں نے زمانت برصغیر پاک و ہند کی خوشحالی کے لیے عظیم خدمات انجام دیں بلکہ بین الاقوامی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانان ہند کا جو وفد وائسرائے سے ملا تھا اس کی قیادت سر آغا خاں نے کی تھی۔ اس وفد نے بڑے مؤثر انداز میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب اور اردو زبان کے تحفظ جیسے اہم مطالبات تسلیم کرائے تھے۔

سر آغا خاں نے اہم موقعوں پر مسلمانوں کی اہم سیاسی خدمات انجام دیں۔ پہلا موقع تو وہ تھا جب سائمن کمیشن کے معاملات میں اختلاف ہو گیا تھا۔ اس وقت سر آغا خاں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی صدارت کی اور سر محمد شفیع اور مولانا محمد علی جیسے بڑے سیاست دانوں کو متحد کیا۔ اسی کانفرنس میں قائداعظم نے اپنے مشہور چودہ نکات پیش کئے تھے، دوسرا اہم واقعہ وہ تھا جب لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں سر آغا خان نے مسلمانان برصغیر کی نمائندگی کی۔ ان کا شمار مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء تک اس کے مستقل صدر رہے اور مسلم لیگ کے اخراجات کی کفالت بھی کی۔ ان کی سیاسی رہنمائی اور خدمات صرف برصغیر کے مسلمانوں تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ ترکی کے یتیموں اور مجروحین کی امداد میں بھی پیش پیش تھے۔ جدید عرب ریاست کی تشکیل میں بھی ان کے سیاسی تدبر کو خاصا دخل رہا۔ سر آغا خان نے مسلمانوں کی سیاسی ترجمانی کی غرض سے سید امیر علی کی صدارت میں لندن میں برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی اور اس کے تمام اخراجات کی کفالت بھی کی۔ آپ اسلامی ممالک کے اتحاد کے زبردست حامی تھے اور جمال الدین افغانی کے ہم خیال تھے۔

سر آغا خاں کو اپنی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ تدبر کی وجہ سے دنیا کے ہر حصے میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ اپنی وسیع المشربی کی بنا پر عالمی شہرت رکھتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان کی کونسل آف سٹیٹ نے انھیں امن کا نوبل پرائز دینے کی سفارش کی۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی عالمی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں لیگ آف نیشنز کی جنرل اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت ایران نے انہیں ایرانی قومیت عطا کی اور ”والا حضرت ہمایوں“ کا اعزاز بخشا۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت شام نے انہیں ”نشانِ بنوامیہ“ عطا کیا۔ ۱۹۵۳ء میں انڈونیشیا نے ”گل سرخ و گل سفید“ سے نوازا۔

سر آغا خاں فرقہ اسماعیلیہ کے پہلے امام تھے جو اپنے مریدوں میں ہیرے جواہرات سونے اور پلاٹینم میں تولے گئے۔ اس کی قیمت ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۵ء میں ایک کروڑ ۹۵ لاکھ روپے کے قریب تھی۔ سر آغا خان نے اس رقم کا نوے فی صد حصہ اپنے فرقے کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔

سر آغا خاں کی چار بیویاں تھیں۔ ان کی پہلی شادی ۱۶ برس کی عمر میں ان کی چچازاد بہن سے ہوئی۔ دوسری شادی تھریسیا میگلیانو اور تیسری آندرے جوزفین لیونی کاغوں سے ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے ایوٹ لابروس سے آخری شادی کی۔ ان کا اسلامی نام ”ام حبیبہ“ تھا اور عام طور پر ”ماتا سلامت“ کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کی دوسری بیوی سے شہزادہ علی خان (وفات ۱۹۶۰ء) پیدا ہوئے اور تیسری بیوی کے بطن سے صدرالدین

تولد ہوئے۔ ـــــ

سر آغا خان ۱۱ر جولائی ۱۹۵۷ء کو سوئٹزرلینڈ میں ورسوا کے مقام پر فوت ہوئے اور اسوان (مصر) میں دفن ہوئے۔

آغاخان چہارم:۔ شہزادہ کریم آغاخان چہارم ۱۳ر جولائی ۱۹۵۷ء کو اسماعیلی فرقے کے انچاسویں امام چنے گئے۔ آپ سر سلطان محمد شاہ آغاخان سوم مرحوم کے فرزند اکبر شہزادہ علی خان کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی والدہ جون کنسل انگریز نژاد ہیں اور لارڈ ہرلسن کی بیٹی ہیں۔ شہزادہ کریم آغاخان ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مصطفیٰ کامل سے حاصل کی۔ اس کے بعد سوئٹزرلینڈ کے "لے روزا" سکول میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر تو چند سے انگلستان میں قیام رہا۔ ۱۹۵۴ء میں ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) میں داخلہ لے لیا۔ وہاں زیر تعلیم تھے کہ آغاخان سوم کی رحلت پر اسماعیلی فرقے کی امامت کا بار ان کے کندھوں پر آپڑا۔ آپ نے عملاً ثابت کر دکھایا ہے کہ آپ اس منصب جلیلہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے اور نبھانے کے پوری طرح اہل ہیں۔ آپ انگریزی، فرانسیسی، اردو، فارسی، اطالوی اور ہسپانوی زبانوں میں خاصی استعداد رکھتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ سے خاص شغف ہے۔ کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے۔ آغاخان سوم مرحوم شروع ہی سے انہیں امامت کے منصب پر فائز کرنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی دینی تربیت پر خاص توجہ کی اور ان میں اسماعیلی فرقے اور عام مسلمانوں کے دینی اور دنیوی مسائل سے دلچسپی لینے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں شہزادہ کریم خان نے اپنے چھوٹے بھائی امین کے ہمراہ مشرقی افریقہ، کینیا، یوگنڈا اور زمبیا کا دورہ کیا ۱۹۵۶ء میں لندن سے

آغا خان چہارم اور ان کی بیوی سلیمہ

کراچی تک کے سفر میں متعدد ملکوں کے اسماعیلیوں سے رابطہ پیدا کیا گیا۔ گدی نشین ہونے کے ایک ماہ بعد انھوں نے پیرس، بیروت، کراچی، ڈھاکہ، بمبئی، دہلی اور مشرقی افریقہ کا دورہ کیا اور مریدوں سے بیعت لی۔ شہزادہ کریم کے امامت پر فائز ہونے کی پہلی رسم ۱۳ر جولائی ۱۹۵۷ء کو جنیوا میں ادا ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹ر اکتوبر کو دارالسلام میں ۲۲ر اکتوبر کو نیروبی میں اور ۲۵ر اکتوبر کو کیپالا میں ادا ہوئی۔ اگلے برس ۲۳ر جنوری کو کراچی میں، ۱۱ر مارچ کو بمبئی میں اور مئی کو کانگو، مڈغاسکر اور افریقہ میں ان کی گدی نشینی کی رسوم ادا کی گئیں۔ شہزادہ کریم آغاخان اپنے جلیل القدر دادا آغاخان سوم کی طرح اصلاحی اور فلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ان پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ کراچی میں آغاخان نے مدارس کے قیام کی غرض سے ۵۰ لاکھ کی خطیر رقم وقف کی۔ ان مدارس میں تمام مسلمان بچے بلا امتیاز تعلیم حاصل کر رہے ہیں آپ نے حافظ آباد میں کالج ہال تعمیر کرنے کے لئے ۴۵ ہزار روپے اور پشاور یونیورسٹی کو آڈیٹوریم کی تعمیر کے لئے تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ آپ نے مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی بہبود کے لئے بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ اور وہاں سکولوں کے اجراء کے ایک جامع منصوبے کے نفاذ کا اہتمام فرمایا ہے۔ آپ نے مختلف ممالک کی ترقی کے لئے انڈسٹریل پروموشن سروسز جاری کی ہیں۔ آپ کی تحریک اور ایثار سے نیروبی میں ایک جنرل ہسپتال، تہران میں طلبا کا ہوسٹل، امریکی یونیورسٹی بیروت [illegible] شعبۂ اسلامیات، فلپائن میں اسلامی تحقیقی ادارہ اور سوئٹزرلینڈ میں اسلامی مرکز [illegible] قائم ہو چکی ہے۔ آپ نے پاکستان، کانگو، کینیا، تنزانیہ، آئیوری کوسٹ، یوگنڈا اور سوئٹزرلینڈ میں صنعتی ترقی کے مقصد سے انڈسٹریل پروموشن سروسز [illegible] اور ان میں خطیر سرمایہ لگایا ہے۔ پاکستان سے شہزادہ کریم آغاخان کو خاص [illegible] ہے جو آج کی دنیا میں اسلام کی بے پناہ خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے انھیں یقین ہے کہ اس میدان میں قیادت پاکستان ہی کے حصے [illegible] کہنا ہے کہ پاکستان دوسرے اسلامی ملکوں کے لئے بہت کچھ [illegible] کے باہمی تعاون سے ان کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور وہ [illegible] کے اور زیادہ قریب آ سکتے ہیں۔ شہزادہ کریم نہایت ذہین [illegible] ہیں وہ رواداری اور ایثار پیشگی کو انسان کی سب سے بڑی [illegible] دیتے ہیں۔ شہزادہ کریم آغا نے ۱۹۶۹ء میں ایک انگریز خاتون [illegible] اسلام قبول کر کے "سلیمہ" نام پایا۔

آفتاب پرستی

آفتاب پرستی سورج کی پوجا [illegible] سورج کی عبادت [illegible]

اور کوئی [illegible] نہیں ہو سکتی کہ جب قدیم انسان نے [illegible] ہوتے ہی ہر شے نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی [illegible] حرارت اور حرکت میں بدل ہو جاتی ہیں۔ سورج [illegible] دیتی ہے کہ وہ کچھ کام کاج کر کے [illegible] اور [illegible] بھر لے۔ ـــــ

قدیم انسان نے یہ بھی محسوس [illegible] ہے۔ سکوت اور ہو کا عالم ہو جاتا ہے۔ نیز بادلوں کے [illegible] بھی سورج انسانی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور [illegible] یہ باتیں اسے سورج کے مودار ہونے کی دعائیں مانگنے پر مجبور [illegible]

اگرچہ قدیم انسان قوانین قدرت سے اس طرح [illegible] سمانے بچے۔ اگرچہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ گرمیوں میں سورج [illegible] ہو کر غضب کی آگ نہیں برساتا۔ بلکہ موسم کی یہ تبدیلیاں ایک باقاعدہ [illegible] ہوتی ہیں۔ لیکن اسے اتنا تو ضرور علم تھا کہ کسی بھی شخص کی خوشامد [illegible] کرنے سے وہ مہربان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر سورج کی عبادت کی [illegible] طرح وہ اپنے سردار کی تعریف کرتا ہے۔ تو سورج اس پر مہربان ہو گا

عبادت کے طریقے:۔ یہ بتانا ممکن نہیں کہ قدیم انسان سورج کی عبادت کیونکر کرتا تھا۔ البتہ اس کی پرستش کا کافی ثبوت قدیم مذاہب میں ملتا ہے [illegible] ایسی اشیاء برآمد ہوئی ہیں جن میں سورج کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا

سکتا کہ قدیم انسان سورج کو بالکل ہی رب العالمین سمجھ بیٹھا ہو، البتہ کہیں کہیں توحید کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔ جن کا مقصد محض اس کی قوت حاصل کرنا اور حیات

سورج دیوتا: قدیم عراقیوں کے شمس، سورج، دیوتا نے مختلف قوموں کے ہاں مختلف نام پائے ہیں۔ یہاں ان تمام تفاصیل کا ذکر ممکن نہیں۔ تاہم ایک اجمالی سا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

وادیٔ عراق کے دیوتا: عراق کی قدیم وادیاں "میسوپوٹیمیا" آفتاب پرستی کا پہلا مرکز قرار دی جاتی ہیں۔ ابتدا میں عراق چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ جن کا اپنا اپنا مذہب تھا۔ ان میں ایک ریاست سمیر تھی۔ سمیریوں کے ہاں سورج دیوتا کا نام اُتو یا اُتھو تھا۔ اسی طرح سمیریوں کے بعد میں آنے والی ایک قوم اکادیوں کے ہاں سورج دیوتا نے اُدیا مد کا نام اپنا لیا تھا۔ یہ روشنی کا دیوتا تھا۔ اکادیوں کے شہر نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اور وہاں یہی دیوتا مختلف ناموں سے پہچانے جانے لگے اکادیوں کا دیوتا امردوک بابلیوں کے ہاں سورج دیوتا مردوک بن گیا۔ مختلف مذاہب کے دیوتا اپنا لینے سے بابل ہر ایک مظہر قدرت کے لیے بہت سے دیوتا پوجنے لگے انہی میں تو مرسانی دیوتا شمس ہے۔ ابتدا میں اسے دیوی کہا جاتا تھا۔ حمورابی اور اس کے عہد کے بعد دیوتاؤں میں تمیز کرنا مشکل ہو گئی، چنانچہ شمس دیوتا کے کاندھے پر [illegible] بنائی جاتی تھیں لیکن کسائی عہد میں دیوتاؤں کے مجسموں کو سرے سے ختم کر دیا [illegible] ستارے اور کرنوں والی تھالی سے شمس کی نمائندگی ہونے [illegible] علامتیں [illegible] ہو گئیں [illegible] شمس [illegible] ماہ دل گیا۔ چنانچہ شمس [illegible] سمجھا جاتا تھا۔

[illegible] بابلیوں سے [illegible] تھے۔ جو اشیر پرست تھے۔ ان کا ہر دیوتا بڑا تھا انہوں نے [illegible] ب۔ مردوک آگے چل کر آشور کے نام [illegible]

مصری دیوتا: قدیم [illegible] سورج کی پوجا کرتے تھے۔ ان کی آفتاب [illegible] ہے۔ مصریوں کا کائنات کا نظریہ عجیب و غریب تھا۔ کبھی [illegible] کہتے اور کبھی عورت۔ سورج کو کبھی آسمانی گائے کا سنہرا بچھڑا بتلایا جاتا [illegible] اور کبھی اسے عقاب کہتے ہیں۔ سورج کے دیوتاؤں [illegible] تیار کی جاتی تھی کہ ایک عقاب کے سر پر ایک سرخ تھال ہے مختلف اوقات میں اس کے مختلف نام ہوتے تھے۔ ہیلیوپولیس کے پروہتوں نے دیگر دیوتاؤں [illegible] دیوتا قرار دیا۔ مصر زیریں کے دیوتا ہورس کی پرستش جب بالائی مصر میں [illegible] تو اسے بھی سورج دیوتا قرار دیا گیا اور اس کی مورت میں عقاب کے ساتھ ساتھ سورج کی پردار تھالی کا اضافہ کر دیا گیا۔ اسی طرح مصری دیو مالا کے مشہور دیوتا رع، [illegible] کو بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح بے شمار خطابات سے نوازا گیا۔ وہ بنیادی طور پر سورج دیوتا تھا اور تمام دیوتاؤں کا باپ۔ اسے آتم بھی کہا گیا ہے۔ آمن بھی مصریوں کے سینکڑوں دیوتاؤں کی طرح سورج دیوتا تھا۔ جس کی پوجا ایک لمبے عرصے کے لیے ہوئی۔ لیکن وہ سورج دیوتا جسے ایک قلیل مدت تک پوجا گیا لیکن اس کی پرستش ناقص توحید کی مثال ہے۔

آتن کی پوجا شروع کرانے والے فرعون کا نام اخناتون تھا۔ اس نے دیگر تمام دیوتاؤں سے قطع کر کے صرف آتن کی پوجا کا حکم دیا۔ ادبی کا بھجن اسی دیوتا کی پوجا کے لیے اخناتون نے لکھا تھا۔ اخناتون کے مرتے ہی قدیم مذاہب مصر میں رائج ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اخناتون نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آتن دن کا تو دیوتا ہے مگر رات کو کہاں چلا جاتا ہے؟ اور رات پر کس کی حکمرانی ہے؟ تاہم قدیم مصری سورج ہی کو خالق عالم سمجھتے تھے۔ مصر کا بادشاہ بھی خود کو سورج کا بیٹا کہا کرتا تھا۔

یونانی دیوتا: قدیم یونانیوں کے مذاہب کے متعلق ہماری معلومات کا انحصار ہومر کی رزمیہ نظموں پر ہے۔ یہ نظمیں آٹھ سو سال قبل مسیح میں لکھی گئیں۔ اس سے پہلے کے مذاہب کا ہمیں چنداں علم نہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یونانیوں نے بظاہر فطرت کی جگہ ایسے دیوتاؤں کی پرستش شروع کی، جو انسانی شکل و صورت رکھتے تھے۔ البتہ ان کے کام اور قوتوں کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یوں سورج کی طاقت کبھی ہیلیوس کے پاس رہی اور کبھی اپالو دیوتا کے پاس آ گئی۔

روم اور دیگر یورپ اور امریکہ میں آفتاب پرستی: رومیوں کے ہاں ابتدائی قسم کی کثرت پرستی رائج تھی۔ انہوں نے جیوپیٹر (مشتری)، کو روشنی کا دیوتا قرار دیا تھا۔ رومیوں اور یونانیوں کا مذہب بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔

دیگر اقوام کی طرح قدیم یورپ میں بھی تقریباً ہر جگہ مظاہر قدرت کی پرستش کی جاتی تھی اور سورج کو دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ یورپ کی ان قوموں میں ٹیوٹانی، سالوی اور کیلٹ مذاہب اہم ہیں۔

مظاہر کی پرستش امریکی اقوام کی اہم خصوصیت ہے۔ ان میں سورج بھی ایک اہم معبود کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی عبادت کے لیے مختلف طریقے رائج تھے۔ سورج کے اظہار کے لیے ایک سنہری تھالی بنائی جاتی جس کے چاروں طرف کرنیں اور شعلے دکھلائے جاتے تھے۔ اسے انسانی مشابہت دی جاتی تھی۔

چین جاپان اور آسٹریلیا کے دیوتا: چینیوں کے ہاں مظاہر پرستی اب تک چلی آتی ہے اور یہ سورج چاند ستاروں کو اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جاپان والے بھی آبا پرستی اور فطرت پرستی پر زور دیتے ہیں۔ جاپانیوں کے نزدیک سورج ایک دیوی ہے جس کا نام اماٹیراسو ہے۔ اگرچہ یہ دیوی جاپانیوں کے ہاں اہم تھی مگر عبادت کے لحاظ سے دولت کا نام ڈیکوکو سبقت لے گیا تھا۔ جاپان کے بادشاہوں نے بھی اپنا سلسلہ نسب سورج سے ملا رکھا ہے۔ سورج کے بیٹوں کی حکومت کا آغاز ۶۶۰ ق۔م میں ہوا۔ تب سے آج تک اس ایک ہی خاندان کے ایک سو چوبیس بادشاہ جاپان کے حکمران ہو گزرے ہیں۔

چینیوں اور جاپانیوں کی طرح آسٹریلیا میں بھی مظاہر پرستی اور انسان پرستی رائج ہے۔ بیرونی جزائر کے باشندے ماؤئی آگ دیوتا کہتے تھے جس نے آسمان کو اٹھایا اور سورج کو قید کر لیا۔

قدیم عرب میں سورج کی پرستش: اب ہم پھر مشرق اوسط میں واپس آتے ہیں۔ ظہور اسلام سے پہلے جزیرہ نما عرب میں متعدد مذاہب کے پیروکار موجود تھے۔ دنیا کی دیگر قوموں کی طرح عربوں کے ہاں بھی مظاہر پرستی رائج تھی انہوں نے اجرام سماوی کی یہ پرستش اہل بابل سے سیکھی تھی۔ شمس پرستی کا رواج عام تھا سورج کی غلامی ظاہر کرنے کے لیے عبدالشمس جیسے نام قدیم عربوں کے ہاں ملتے ہیں حتیٰ کہ ایک قبیلہ ہی بنو شمس کہلاتا تھا۔ بعدازاں عرب ہی سے نکلنے والے مذہب اسلام نے سورج اور چاند کو خدائے واحد کی مخلوق بتایا۔

آفتاب پرستی اسلام کی رُو سے: اسلام میں آفتاب پرستی ممنوع اور کفر ہے خدا نے مختلف پیغمبروں کے ذریعے مظاہر پرستی کے خلاف احکام بھیجے۔ ان میں حضرت ابراہیم کی قوم سخت مظاہر پرست تھی۔ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا شمس تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم کو اس عبادت سے روکا اور فرمایا کہ چاند، ستارے اور سورج سب ڈوب جاتے ہیں اور یہ سب قانونِ قدرت کے ماتحت ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

یونانیوں کا سورج دیوتا - ہیلیوس"

" پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا، کیا یہ میرا رب ہے - ؟ یہ سب سے بڑا ہے - پھر جب وہ ڈوب گیا - کہا اے میری قوم میں اس سے بری الذمہ ہوں - جو تم شریک ٹھہراتے ہو - (الانعام - ۷۸)

اسلام میں مظاہر قدرت سورج، چاند، ستارے، درخت، پہاڑ وغیرہ سب کو قدرت کے پابند اور خدا کی مخلوق کہا گیا ہے - اس لیے ان کی عبادت نہ صرف کفر بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے -

آفتاب ہند سہروردی

رح (۱۲۶۳ء - ۱۳۹۱ء) مخدوم سید اسد الدین چشتی المعروف بہ آفتاب ہند سہروردی جونپور بنارس، ہندوستان کے ایک بہت بڑے ولی کامل اور مجاہد اعظم تھے - ۲۹ رجب المرجب ۶۶۱ھ / ۹ جون ۱۲۶۳ء کو واسط، عراق میں پیدا ہوئے - لڑکپن میں والدین کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے - کچھ عرصہ دہلی میں گذارا پھر کڑہ مانک پور، تحصیل منجھن پور الہ آباد میں آئے - بیس برس کی عمر میں تحصیل علوم ظاہری سے فراغت پائی - فقہ اصول تفسیر اور حدیث میں دسترس حاصل کی - حافظ قرآن اور قاری ہفت قرأت تھے -

آپ نے علوم باطنی کی تعلیم اپنے نانا مخدوم ضیاء الدین "کڑہ" سے حاصل کی پھر ملتان جا کر حضرت شاہ رکن الدین رکن عالم کے مرید ہوئے - وہیں سے آفتاب ہند کا لقب پایا - اور تبلیغ دین کی وصیت سے کر دہلی آئے اور حضرت نظام الدین اولیا سے مزید علم باطنی حاصل کیا - اس کے بعد کنتھ ضلع مرزاپور چلے آئے یہاں کا راجہ گھروار قوم سے تھا - آپ نے اُسے وعظ و نصیحت سے دعوت اسلام دی - لیکن مجبوراً جنگ کرنا پڑی - راجہ شکست کھا کر مسلمان ہو گیا - اس کے بعد آپ الہ آباد کے ایک گاؤں ساتھرڈیہہ میں چلے گئے - یہاں کا راجہ آسانی اسلام لے آیا - اس کے بعد بنادی ضلع اعظم گڑھ کے راجہ کے ساتھ چھ ماہ تک جہاد کیا بعد ازاں راجہ نے اسلام قبول کر لیا -

سب سے آخر میں آپ ظفر آباد آئے اور یہاں بھی مخدوم چراغ ہند کے ہمراہ ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء میں ایک بہت بڑا معرکہ سر کیا - اس میں غیاث الدین تغلق کا بیٹا ظفر خان چھ ہزار کی فوج لے کر آپ کی مدد کو آیا تھا -

۱۰ رجمادی الاول ۷۹۳ھ کو نماز عصر کے بعد ایک مجلس میں آپ کو شیخ سعدی کے اس شعر پر وجد آگیا اور رقت طاری ہو گئی - ؎

اگر ہلاکِ سعدی بہ تیغ فرقت تست
حلال باشد ایں خونے کہ دوستاں ریزند

اسی شب کو فالج نے حملہ کیا اور ۱۶ رجمادی الاول / ۲۱ اپریل ۱۳۹۱ء کو تہجد کے وقت انتقال کیا - آپ کے بعد آپ کے چھبیس خلفاء نے نیابت و سجادگی کا حق ادا کیا جب نواب آصف الدولہ کے بھائی نواب سعادت علی خان نے تمام جاگیر اور ضبط کر لیں تو یہ خاندان جونپور کے مفتی محلہ میں آکر آباد ہو گیا اور امامیہ مذہب اختیار کر لیا جس کے بعد سجادگی ختم ہو گئی -

حضرت مخدوم آفتاب ہند اپنے وقت کے امام طریقت تھے - آپ صاحب زہد و تقویٰ و اہل حال و قال تھے - تمام عمر عبادت اور ریاضت میں صرف کی - بادشاہ وزراء و امراء آپ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے آپ نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں ان میں "عشقیہ" فن سلوک و معرفت کی ایک اچھی کتاب ہے -

آلِ احمد، مولانا

(۱۸۰۸ء - ۱۸۶۹ء) پھلواری شریف، ہندوستان کے ایک بزرگ صوفی - مولانا آل احمد بن مولانا محمد امام [illegible] ۱۲۲۳ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۰۸ء کو پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی اور جد امجد محمد نعمت اللہ شاہ کے دست حق پرست پر ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۴۰ھ [illegible] ۱۸۲۵ء کو بیعت کی -

تحصیل علم کے شوق میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے [illegible] رہنے کے بعد ۲۷ رجب ۱۲۴۴ھ / فروری ۱۸۲۹ء کو حج [illegible] حرمین شریف میں مقیم رہ کر شیوخ حرمین سے [illegible] ہندوستان واپس آئے - اور حیدرآباد میں مولانا شجاع الدین کے [illegible] مامور ہوئے - ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں پھلواری شریف آکر اپنے چچا [illegible] تعلیم باطنی حاصل کی -

اگلے برس بنارس کا قصد کیا اور پھر سیر و سیاحت کرتے ہوئے [illegible] اور وہاں مولانا ہدایت اللہ کو مسند حدیث عطا کی - ۱۲۶۲ھ [illegible] شریف تشریف لا کر اپنے چچا مولانا ابوتراب کی صحبت سے استفادہ کیا [illegible] میں دوبارہ عرب تشریف لے گئے - جہاز کی خرابی کی وجہ سے حجاز نہ جا سکے [illegible] ۱۸۵۶ء میں حج پر تشریف لے گئے - ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء تک مدینہ رہنے کے بعد [illegible] پھلواری شریف آگئے - ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں دوبارہ مدینہ طیبہ آگئے [illegible] رمضان ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا اور جنت البقیع میں [illegible]

آل احمد مولانا ایک جید عالم اور کامل بزرگ تھے [illegible] نے اس سے اختلاف کیا ہے - آپ [illegible] سے جدا ہونا پسند نہ کرتے تھے -

روایت ہے کہ بارگاہ نبوی سے مولانا حبیب [illegible] ہندوستان جانے کا ارشاد ہوا اور حضور نے اُن کے سر پر دست مبارک [illegible] کرم جلد واپس آؤ گے - اس دن کے بعد انھوں نے [illegible] پر حضور نے دست مبارک پھیرا تھا -

آلِ حٰمٓ

قرآن مجید کی سات مکی سورتیں جن کے شروع میں حٰم آتا ہے [illegible] سورۃ المومن، سورہ حٰم السجدۃ، سورۃ الشوریٰ [illegible] سورۃ الجاثیہ اور سورۃ الاحقاف، قرآن میں ان کی ترتیب [illegible]

کی چالیسویں سورۃ ہے۔ ان ساتوں سورتوں کا مضمون ملتا جلتا ہے۔ ان میں تاریخ پر بہت کم زور دیا گیا ہے، زیادہ تر دشمنوں کی ناکامی اور ذلت کا ذکر کیا گیا ہے ان کا زمانۂ نزول حضورؐ کی مکی زندگی کا درمیانی حصہ معلوم ہوتا ہے۔

حٰم کے معنی مختلف مفسرین نے مختلف کیے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی "سب سے انتہا رحم کرنے والا ہے۔" اور بعض کے نزدیک "جو کچھ ہونے والا تھا اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔" ابن عباس کا قول ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سب سے اعظم ہے۔ یہ قسم ہے اور الرحمٰن کے حروف میں سے ہے۔ ابن مسعود کا قول ہے کہ یہ ساتوں سورتیں جنہیں آل حٰم کہا جاتا ہے۔ قرآن کا دیباچہ ہیں۔ اس لیے ان کی قدر و منزلت زیادہ ہونی چاہیئے۔

آل رسولؐ

رسولؐ کی اولاد، حضرت محمد صلعم کے نسب سے تعلق رکھنے والے لوگ۔ آل ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اس لفظ کے آجانے سے اس کے معنی قوم، اولاد، خاندان اور وارث کے مشہور ہیں۔ مثلاً آلِ ابراہیمؑ، آلِ یعقوبؑ، آل عمران، آل لوطؑ، آلِ ہارونؑ اور آلِ فرعون وغیرہ قرآنی تراکیب سے ظاہر ہے۔

[illegible] حکیم میں آل ابراہیمؑ، آل یعقوبؑ اور آلِ عمران وغیرہ الفاظ کی طرح آل رسول یا آل محمدؐ کے الفاظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوئے۔ تاہم تاریخی اور بدیہی [illegible] دنیا میں آل رسولؐ کا وجود قائم ہے اور جب تک دنیا آباد رہے گی [illegible] موجود اور برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ علمائے اسلام نے آل رسولؐ کے [illegible] سے بیان کیا ہے ایک جسمانی جس کا تعلق ماضی سے ہے اور دوسرا روحانی [illegible] سے ہے۔ مسلمانوں کا وہ گروہ جس کے نزدیک زیر بحث موضوع کا تعلق ماضی سے ہے [illegible] کے معنی [illegible] حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی [illegible] سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ بنت رسول اللہؐ، آپ کے [illegible] چچیرے بھائی، سیدنا علیؓ ابن ابی طالب، آپ کے دونوں نواسے سیدنا حسنؓ ابن علیؓ، سیدنا حسینؓ ابن علیؓ کی ذات والا صفات قرار دیتا ہے پھر اس کے ساتھ [illegible] کا ایک اور گروہ آنحضرتؐ کے محترم چچا سیدنا عباسؓ بن عبدالمطلبؓ، آپ کی [illegible] اور سیدنا علی ابن ابی طالب کے دونوں بڑے بھائیوں سیدنا عقیل ابن ابی طالب اور سیدنا جعفر طیارؓ، حضرت زیدؓ اور ان کی اولاد کو بھی آلِ رسولؐ قرار دیتا ہے [illegible] وہ لوگ جو اس لفظ کے روحانی پہلو کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں ان کے نزدیک علاوہ ان پاکیزہ نفوس کے جن کی تعظیم کرنا ہر مسلمان اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آنحضرتؐ کی تمام امت یعنی فرزندان توحید، ملت اسلامیہ پر آل رسولؐ کا اطلاق ہوتا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ نبوت و رسالت وہبی شے ہے کسبی شے نہیں جس سے خون اور جسم کی وراثت چل سکے۔

جب آنحضرتؐ نے وصال فرمایا تو اس وقت آپؐ کی صلبی اولاد میں صرف سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ اور آپؐ کے خاندان میں عم محترم سیدنا عباسؓ بن عبدالمطلب اور آپؐ کے داماد، چچیرے بھائی، سیدنا علی ابن ابی طالبؓ ابن عبدالمطلب اور آپؐ کی ازواج مطہرات یعنی آنحضرتؐ کا کنبہ اور آپ کے قریب ترین رشتے دار بقید حیات تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ روحانی طور پر آنحضرتؐ اپنی امت کے باپ اور جسمانی طور پر کسی مرد کے باپ نہیں جیسا کہ قرآن حکیم کی اس آیت سے واضح ہے **ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین** اور آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات، آپ کی امت کی مائیں کہلاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ چاہے وہ اللہ کے نبی حضرت نوحؑ کا حقیقی بیٹا کنعان ہو یا آنحضرتؐ کا چچا ابولہب ابن عبدالمطلب ایمان لانے کی سعادت سے جو بھی محروم رہا وہ آلِ رسولؐ سے خارج ہے۔ بخلاف اس کے جو صاحب ایمان ہے اسلام کی نسبت سے مسلمان ہے وہ آلِ رسولؐ میں داخل ہے۔ علمائے اسلام کی وہ کثیر جماعت جس کے نزدیک آنحضرتؐ کی تمام امت پر آلِ رسولؐ کا اطلاق ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل بھی پیش کرتی ہے کہ اسلام نے دنیا کی تمام قوموں اور نسلوں کو ایک ہی باپ حضرت آدمؑ کی اولاد بیان کیا ہے اور وہ لوگ جو اسلام کے دائرے میں داخل ہیں ایک اللہ کے بندے اور ایک باپ حضرت آدمؑ کے بیٹے ہونا اُن کی حقیقی قومیت قرار دی ہے وہ چاہے کسی نسل اور کسی ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس آنحضرتؐ جب اپنی تمام امت مسلمہ کے بمنزلۂ روحانی باپ ہیں۔ تو تمام ملت اسلامیہ آپؐ کی آل ہے۔

آل رسولؐ سے متعلق یہ خیالات کہ اللہ کے رسول، پیغمبر اسلام، حضور محمد عربی قرشی الہاشمی کی اُمت، فرزندانِ توحید، ملت اسلامیہ ہی آل رسولؐ کہلاتی ہے اہلِ سنت کے ہیں۔ اہل تشیع نے اس لفظ کے معنی اتنے محدود کر دیئے ہیں کہ ان میں صرف اہل بیت آتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے صلب سے حضرت خدیجہؓ کے دو بیٹے قاسم اور عبداللہ اور ماریہؓ کے ابراہیم پیدا ہوئے اسی لیے آنحضرتؐ کی کنیت ابوالقاسم تھی اور چار بیٹیاں سیدہ زینب۔ سیدہ رقیہ، سیدہ اُم کلثوم اور سیدہ فاطمۃ الزہرا پیدا ہوئیں۔ آنحضرتؐ کے بیٹے تو صغر سنی ہی میں انتقال کر گئے۔ البتہ آپؐ کی بیٹیاں عالم شباب کو پہنچیں۔ مسلمانوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ سوائے سیدہ فاطمہ بنت رسولؐ کے آپؐ کی کوئی اور بیٹی نہیں تھی۔ لیکن مسلمانوں کا سواد اعظم اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ آنحضرتؐ کی تین بیٹیاں سیدہ زینب، سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم چونکہ آنحضرتؐ کی زندگی ہی میں وفات پا گئیں اس لیے لوگوں کو تاریخ سے ناواقفیت کے باعث یہ گمان گذرا کہ سوائے سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا کے آنحضرتؐ کی کوئی اور بیٹی نہ تھی۔ پہلی بیٹی سیدہ زینب کی ولادت ظہور اسلام سے دس برس پہلے ہوئی اور آپ کی شادی بھی اعلان رسالت سے پہلے کم سنی ہی میں ان کے حقیقی خالہ زاد بھائی ابوالعاص ابن ربیع ابن عبدالعزیٰ ابن عبدالشمس بن عبدمناف بن قصی ابن کلاب قریشی سے ہوئی۔

حضرت ابوالعاصؓ کے صلب سے سیدہ زینب بنت رسولؐ اللہ کی دو اولادیں پیدا ہوئیں۔ ایک فرزند ارجمند علی اور ایک دختر نیک اختر امامہ جناب علیؓ ابن ابوالعاصؓ کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے سن بلوغ کو پہنچ کر اپنے والد حضرت ابوالعاص ہی کی زندگی میں انتقال کیا اور دوسری روایت جو ابن عساکر کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی ابن ابوالعاص جنگ یرموک تک زندہ رہے اور اسی جنگ میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔ حضرت امامہ بنت ابوالعاص یعنی آنحضرتؐ کی نواسی کے بارے میں تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ سیدہ فاطمۃ الزہرا کی وفات کے بعد، ان کی وصیت کے مطابق سیدنا علی ابن ابی طالب کے نکاح میں آئیں۔ لیکن ان سے کوئی نسل نہیں چلی۔

دوسری صاحبزادی سیدہ رقیہ بنت محمدؐ، نبوت کے اعلان سے سات برس پہلے پیدا ہوئیں۔ عبداللہ بن محمد بن سلیمان الہاشمی کی روایت کے حوالے سے ابوالعباس محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب سیدہ رقیہ کی ولادت ہوئی۔ آنحضرتؐ ۳۳ برس کے تھے۔

"طبقات" میں لکھا ہے کہ حضرت رقیہ کا پہلا نکاح آنحضرتؐ کے چچا ابولہب ابن عبدالمطلب کے بیٹے عتبہ سے ہوا تھا۔ جب چالیس برس کے سن کو پہنچ کر آنحضرتؐ

نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی رسالت و نبوت کا اعلان فرمایا تو اہل قریش جو اپنی محدود نظر کے مطابق اسے ایک ہاشمی ریاست کے قیام کی کوشش خیال کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی سخت مخالفت پر اتر آئے حتیٰ کہ انہوں نے ابولہب اور عتبہ دونوں کو مجبور کیا کہ وہ رقیہ بنت محمدؐ کو طلاق دے ڈالیں۔ "طبقات" میں لکھا ہے کہ حضرت رقیہ کا عتبہ ابن ابولہب سے ابھی صرف نکاح ہوا تھا۔ رخصتی نہیں ہونے پائی تھی کہ عتبہ ہاشمی نے اہل قریش اور اپنے والدین کے اصرار پر آپ کو طلاق دے دی۔

"طبقات" میں لکھا ہے کہ سیدہ رقیہ بنت محمد کا دوسرا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان بن ابوالعاص بن امیہ بن عبدالشمس بن عبدمناف قریشی اموی سے ہوا۔ سیدہ رقیہ کے سیدنا عثمان غنی سے ایک بیٹے عبداللہ پیدا ہوئے جو چھ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کے بعد سیدہ رقیہ کے پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ہجرت کے ایک سال سات مہینے گذر جانے کے بعد یعنی رمضان المبارک ۲ ہجری میں پھر خود سیدہ رقیہؓ بھی انتقال کر گئیں۔

سیدہ ام کلثوم بنت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب، آنحضرتؐ کی تیسری بیٹی تھیں۔ اور نبوت سے چھ برس پہلے پیدا ہوئیں۔ آپ کا نکاح بھی نبوت کے اعلان ہی سے پہلے آنحضرتؐ کے چچا ابولہب بن عبدالمطلب کے چھوٹے بیٹے عتیبہ سے ہوا تھا۔ اور عتیبہ نے بھی عتبہ کی طرح اسلام دشمنی کے جذبے سے مغلوب ہو کر حضرت ام کلثوم کو طلاق دے ڈالی۔ "اسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ ان کی ابھی رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ طلاق وقوع میں آگئی۔

سیدہ رقیہ کے انتقال کے بعد سیدہ ام کلثوم کا نکاح بھی ۳ ہجری میں سیدنا عثمانؓ بن عفان سے ہوا لیکن آپ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انھوں نے شادی کے پانچ سال بعد ۹ ہجری میں انتقال کیا۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ بنت محمدؐ کی شادی سیدنا علی ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب سے غزوہ احد کے بعد ۲ ہجری میں ہوئی۔ "استعیاب" میں لکھا ہے کہ نکاح کے وقت سیدہ فاطمۃ الزہرا پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی تھیں اور سیدنا علی المرتضیٰ اکیس برس ساڑھے پانچ مہینے کے تھے یعنی سیدنا علیؓ سیدہ فاطمہؓ سے عمر میں چھ سال بڑے تھے۔

سیدنا علی ابن ابی طالب سے، سیدہ فاطمہ بنت رسول اللہؐ کے دو بیٹے سیدنا حسنؓ اور سیدنا حسینؓ پیدا ہوئے اور دو بیٹیاں سیدہ ام کلثومؓ اور سیدہ زینبؓ پیدا ہوئیں۔ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ زرقانی میں لکھا ہے کہ ایک بیٹے محسن اور ایک بیٹی رقیہ بھی سیدہ فاطمہ ہی کے بطن سے تھے جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔

سیدہ فاطمہ بنت رسول اللہؐ کی جس طرح تین بہنیں عین جوانی کے عالم میں وفات پا گئیں اسی طرح سیدہ فاطمہؓ بھی عین عالم شباب میں آنحضرتؐ کی رحلت کے چھ مہینے بعد ۳ رمضان المبارک ۱۱ ہجری میں انتقال فرما گئیں۔

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے انتقال کے بعد سیدنا علی ابن ابی طالب نے آٹھ نکاح کئے یعنی سیدہ سمیت آپ کی کل نو ازواج مبارک ہوئیں۔ جن سے سترہ بیٹیاں اور چودہ بیٹے پیدا ہوئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ سیدہ فاطمۃ الزہرا بنت رسول اللہؐ کے بطن سے حضرت حسنؓ۔ حضرت حسینؓ۔ حضرت زینب الکبریٰؓ۔ حضرت ام کلثومؓ اور حضرت محسنؓ اور حضرت رقیہؓ جن کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

۲۔ ام البنین بنت حزام کے بطن سے۔ حضرت عباس علمدار۔ حضرت جعفر، حضرت عبداللہ اور حضرت عثمان۔

۳۔ لیلیٰ بنت مسعود کے بطن سے۔ حضرت عبیداللہ۔ حضرت ابوبکر۔

۴۔ اسماء بنت عمیس کے بطن سے حضرت محمد اصغر۔ حضرت یحییٰ۔

۵۔ امامہ بنت ابوالعاص کے بطن سے۔

۶۔ خولہ بنت جعفر کے بطن سے حضرت محمد حنفیہ۔

۷۔ صہبا بنت ربیعہ کے بطن سے۔ حضرت عمر الاطرار۔ حضرت رقیہ۔

۸۔ ام سعید بنت عروہ کے بطن سے حضرت ام الحسن۔ حضرت زینب الکبریٰ اور حضرت ام کلثوم صغریٰ۔

۹۔ محیاۃ بنت امرء القیس کے بطن سے۔ صرف ایک بیٹی کی ولادت ہوئی جس کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے علاوہ زینب صغریٰ امامہ۔ میمونہ۔ خدیجہ۔ فاطمہ۔ ام ہانی۔ ام الکرام۔ رملہ صغریٰ۔ ام سلمہ۔ ام کلثوم صغریٰ۔ ام جعفر۔ جمانہ اور نفیسہ۔ سیدنا علی ابن ابی طالب کی مختلف لونڈیوں سے پیدا ہوئیں۔

ہر چند سیدنا علی ابن ابی طالب کے چودہ بیٹے تھے۔ لیکن جن سے ان کی نسل چلی وہ پانچ بیٹے ہیں اور ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت حسنؓ۔ حضرت حسینؓ، حضرت عباس علمدارؓ۔ حضرت محمد حنفیہ اور حضرت عمر الاطرار۔ ان سب کی اولاد مسعود آل رسولؐ کہلاتی ہے۔

ہر چند آنحضرتؐ کے کسی بیٹے سے جو صلبی ہو آنحضرتؐ کی نسل سے نہیں چلی۔ تاہم لغت العرب کے مطابق چچا کے بیٹے بھی تمام قرابتوں پر قیاس کرتے ہوئے اولاد میں شامل ہیں اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام بنی ہاشم جو ایمان لائے۔ آل رسولؐ میں شامل ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم کی روایت سے ظاہر ہے اور یہ سبب ہے کہ تمام مومنین بنی ہاشم پر صدقہ حرام ہے۔

بنی ہاشم جس کی نسبت آنحضرتؐ کے پردادا ہاشم بن عبدمناف قریشی سے ہے آنحضرتؐ کے دادا عبدالمطلب ابن ہاشم، اسد ابن ہاشم، ابی صیفی ابن ہاشم اور نضلہ ابن ہاشم کی اولاد ہیں۔ ہاشم بن عبدمناف قریشی کی نسل چونکہ صرف عبدالمطلب ابن ہاشم ہی سے چلی ہے اس لئے دنیا میں اس وقت جتنے ہاشمی سادات ہیں وہ سب کے سب عبدالمطلب ابن ہاشم عبدمناف قریش ہی کی اولاد سے ہیں۔

حضرت عبدالمطلب ابن ہاشم کے دس بیٹے تھے۔ جن میں عبداللہ کے فرزند محمد رسول اللہؐ۔ عبدمناف المعروف ابوطالب کے فرزند، حضرت عقیل، حضرت جعفر طیار، اور حضرت علیؓ۔ حضرت عباسؓ کے فرزند۔ حضرت عبداللہ، حضرت عبیداللہ حضرت قثم۔ حضرت فضل، حارثؓ کے فرزند۔ ابوسفیان، مغیرہ، نوفل، ربیعہ عبدالشمس اور حضرت عبیدہ ہوئے۔ آنحضرت کے تایا زبیر کی نسل چونکہ اسلام کی تاریخ میں غیر معروف رہی اس لئے مورخین نے سید الشہدا حضرت حمزہؓ۔ مقوم۔ ضرار اور سیدانؓ وغیرہ ابنان عبدالمطلب کی طرح انہیں بھی لاولد لکھ دیا۔ سید الشہدا حضرت حمزہ کی صرف ایک بیٹی تھی۔ آنحضرتؐ کا دشمن اسلام چچا ابولہب اگرچہ کفر پہ مرا تاہم اس کی اولاد مشرف بہ اسلام ہوئی اور اس سے نسل چلی۔

تاریخ سے یوں تو عبدالمطلب ابن ہاشم کی نسل کا ان کے چار بیٹوں حارث، زبیر، ابوطالب اور حضرت عباس کی اولاد سے قائم ہونا ثابت ہے تاہم عبدالمطلب کے جن بیٹوں سے کثرت کے ساتھ اولاد بڑھی یہاں تک کہ افریقہ سے لے کر تمام وسط ایشیا تک دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اولاد عبدالمطلب (بنی ہاشم) یعنی آل محمدؐ پھیل گئی۔ وہ ابوطالب اور حضرت عباسؓ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روحانی

اور جسمانی دونوں اعتبار سے اللہ تعالٰی نے آلِ رسولؐ کو جو حقیقت میں آلِ ابراہیمؑ ہے۔ دنیا کے ہر خطے اور ملک میں پھیلا کر اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے کہ اے ابراہیمؑ! میں تیری آل کو وسعت اور ترقی دوں گا۔

آلِ زبیر زبیر کی اولاد، نسل، زبیر کے نسب سے تعلق رکھنے والے۔ اسلام کی تاریخ میں زبیر کے نام سے دو بزرگ حضرات کا تذکرہ اپنے کارناموں کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان میں ایک تو آنحضرتؐ کے تایا زبیر بن عبدالمطلب تھے۔ جو اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے کے باعث خاندان کے دستور کے مطابق ہاشمیوں کے سردار بنے۔

دوسرے جناب زبیر ابن العوام ہیں جو آنحضرتؐ کے محبوب چچا سید الشہدا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے حقیقی بھانجے اور ان کی بہن صفیہ بنت عبدالمطلب یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی کے بیٹے تھے۔

زبیر ابن عبدالمطلب کا زمانۂ حیات ظہور اسلام سے پہلے کا ہے اور حضرت زبیر ابن العوام کا زمانۂ حیات اسلام کی برکتوں سے تابندہ و درخشندہ ہوا۔ آپ کے پدر گرامی قدر عوام ابن خویلد زوجہ رسول مقبولؐ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے حقیقی بھائی اور سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا بنت رسولؐ کے حقیقی ماموں تھے۔ آپ کا نام نانی آپ کی والدہ محترمہ حضرت صفیہؓ نے اپنے بڑے بھائی زبیر بن عبدالمطلب کے نام پر زبیر رکھا اور آپ کی کنیت بھی اپنے ماموں زبیر کی کنیت ہی کے مطابق ابوطاہر تھی۔ اسی طرح حضرت زبیر ابن العوام بن خویلد قریشی اپنی والدہ محترمہ حضرت صفیہ کے رشتے سے آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

صحابہ رسول اللہؐ میں جو چار اشخاص شدید خیال کیے جاتے تھے یعنی حضرت حمزہ، حضرت علیؓ، حضرت سعد بن وقاص ان میں چوتھے صاحب حضرت زبیر ابن العوام ہیں اور آپ کو بارگاہِ رسالت سے خدمات جلیلہ کے انجام دینے میں حواری رسولؐ کا لقب عطا ہوا۔

حضرت زبیر ابن العوام کا نکاح ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی بڑی بہن سیدہ اسماء بنت ابوبکر صدیق سے ہوا۔ اس رشتے کی نسبت سے آنحضرتؐ کے ہم زلف بھی تھے۔ آپ کے عبداللہ، عاصم، عروہ، مصعب، اسحاق، حمزہ، خالد، عمرو، عبید، جعفر وغیرہ بیٹے اور خدیجہ وغیرہ بیٹیاں تھیں۔ جن سے اولاد کا سلسلہ جاری ہوا اور حضرت زبیر ابن العوام قریشی کی نسل چلی۔

آنحضرتؐ کے تایا زبیر بن عبدالمطلب کے باب میں اتنا کہنا بس ہے کہ اگرچہ وہ بھی اپنے بڑے بھائی حارث کی طرح جو عبدالمطلب کے سب سے بڑے بیٹے تھے اسلام کے ظہور سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ تاہم حلف الفضول جس میں آنحضورؐ نے بھی اپنی نوعمری کے زمانے میں شرکت فرمائی۔ ایک اعلیٰ ترین کارنامہ ہے جو آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ حلف الفضول ایک ایسا ہی تنظیمی ادارہ تھا جیسا کہ آج یو۔ این۔ او جس کی بنیاد ۱۹۴۵ء میں رکھی گئی اور اس کے اغراض و مقاصد بھی وہی تھے۔ جیسا کہ آج یو۔ این۔ او کے ہیں کہ دنیا سے جارحیت کا تصور مٹا کر امن و عافیت کی فضا پیدا کی جائے۔

اسلام کا زمانہ چونکہ زبیر بن عبدالمطلب کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے اس لیے آپ کے تفصیلی حالات نہ ملنے کے باعث آپ کی اولاد اسلام کی تاریخ میں جگہ نہ پا سکی اور اسی سبب سے غیر معروف رہ جانے کے باعث مؤرخین کو یہ گمان گذرا کہ زبیر بن عبدالمطلب کی نسل کا سلسلہ آگے نہیں بڑھا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت دیگر ہاشمی سادات کی طرح زبیر بن عبدالمطلب قریشی ہاشمی کی اولاد بھی دنیا میں موجود ہو۔

آلِ عبا حضرت رسول اکرمؐ نے ایک بار حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو اپنی عبا کے نیچے لے کر دعا فرمائی تھی۔ اس وقت سے انھیں آلِ عبا کہا جاتا ہے۔

آلِ عمران (سورۃ) قرآن مجید کی تیسری سورت، مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں ۲۰ رکوع اور ۱۹۹ آیات ہیں۔ اور یہ تیسرے سے چوتھے پارے تک پھیلی ہوئی ہے۔ عمران حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے والد ماجد کا نام ہے۔ چونکہ اس سورت میں نبوت کے موسوی سلسلہ سے رخصت ہونے اور اس سلسلے کے آخری نبی حضرت عیسیٰؑ کا ذکر اور ان کے پیروؤں کی غلطیوں کا بالتفصیل تذکرہ ہے، اس لیے اس کا نام سورہ آلِ عمران رکھا گیا ہے۔

ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورۃ بقرہ سے ہے سورہ بقرہ پہلے اور دوسرے سال ہجرت میں نازل ہوئی اور یہ تیسرے سال ہجرت کے بعد، چونکہ اس میں آیت مباہلہ موجود ہے جو نجران سے ۹ھ میں آنے والے وفد سے متعلق ہے، اس لیے اس کا کچھ حصہ ۹ھ کا نازل شدہ بھی ہے۔

اس سورت میں عیسائی مذہب کے دعوؤں کی تردید کی گئی ہے۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب نجران کے عیسائی مدینے کے یہودیوں کو حجت میں مدد دینے کے لیے حضور اکرمؐ سے مناظرہ و مباہلہ کرنے آئے تھے۔ مگر بعد ازاں عیسائی ڈر گئے اور مباہلہ نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس صورت میں عیسائی مذہب کے دعوؤں کی تردید ہے اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور ان شاء اللہ پھیلے گا نیز جنگ اُحد کا ذکر ہے۔ جس میں بظاہر مسلمانوں کی ناکامی نظر آتی ہے۔ درحقیقت یہ ان کی ایک عظیم الشان فتح تھی۔

آلوسی شہر آلوس کے باشندے جو دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ابوکمال اور رمادی کے درمیان واقع ہے۔ آلوسی دراصل ایک خاندان کا نام ہے۔ جس میں بہت سے علماء و فضلاء ہو گذرے ہیں۔ یہ لوگ حسنی اور حسینی سید ہیں۔ جب ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا تو ان کے آباؤ اجداد آلوس چلے آئے۔ پھر کہیں سترہویں صدی عیسوی میں یہ خاندان واپس بغداد ہو گیا۔

عبداللہ صلاح الدین (وفات ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) آلوسی خاندان کے جد امجد تھے ان کے فرزند ابوالثناء محمود شہاب الدین بن عبداللہ صلاح الدین (۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء - ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء) کئی سالوں تک بغداد کے مفتی رہے۔ وہ نامور مفسر، مفکر اور معلم تھے۔ ان کی مشہور تفسیر "روح المعانی" ہے جو نو جلدوں پر ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ عروض نحو اور سفرناموں پر انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔

ابوالثناء محمود آلوسی کا بھائی عبدالرحمان (وفات ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء) بغداد کا خطیب تھا۔ ان کا ایک اور بھائی عبدالحمید (۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء - ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) واعظ اور معلم تھا۔ اس کی ایک کتاب "نثر اللآلی علی نظم الامالی" تھی۔

ابوالثناء محمود آلوسی کا بڑا بھائی بہاؤ الدین آلوسی (۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء - ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء) بصرہ کا قاضی اور نحو، منطق اور تصوف پر چند کتابوں کا مصنف تھا ان کے علاوہ محمود آلوسی کے دوسرے بھائی، عبدالباقی سعد الدین (۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء

تا ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) قاضی کرکوک، نعمان خیرالدین ابوالبرکات (۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء - ۱۳۱۷ھ، ۱۸۹۹ء) مصنف کتاب فی محاکمۃ الاحمدین - محمد حمید (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء/۱۹۰۰ء - ۱۸۷۴ء) اور احمد شاکر آلوسی (۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء - ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء) بھی علامۂ عصر تھے
عبداللہ بہاؤالدین کے فرزند محمود شکری آلوسی بہت مشہور مصنف اور مورخ ہیں - وہ ۲۹ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ بمطابق ۱۴ مئی ۱۸۵۷ء کو پیدا ہوئے اور خاندان میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی - تاریخ، فقہ، سیرت لغت، بلاغت اور مباحث پر پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف بنے - ان کی وفات ۴ شوال ۱۳۴۲ھ بمطابق ۸ مئی ۱۹۲۴ء کو ہوئی - ان کی قابل ذکر کتابوں میں "بلوغ الارب" بہت مشہور ہے - یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں طبع ہوئی - یہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے متعلق لکھی گئی ہے - اس کے علاوہ "تاریخ نجد" "المسک الاذفر" "امثال العوام فی مدینۃ الاسلام" قابل ذکر ہیں - ایک کتاب "غایات الامانی" انہوں نے ایک فرضی نام سے شائع کی تھی - محمود شکری آلوسی کا شمار بدعت کی روک تھام کرنے والے عصر حاضر کے زیادہ باعمل اور سرگرم نمائندوں میں ہوتا ہے -

علی بن ابی علی بن محمد الثعلبی سیف الدین الآمدی

آمدی (۱۱۵۷ء - ۱۲۳۳ء) عالم دین، فلسفی، عراق کے شہر آمد میں ۵۵۱ھ/۱۱۵۷ء میں پیدا ہوا - پہلے حنبلی مسلک سے تعلق رکھتا تھا، بعدازاں امام شافعی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا - اور فلسفے اور علوم عقلیہ کے ذریعے تحقیق و تعلم جاری رکھا - قاہرہ میں القرافۃ الصغریٰ کے مدرسے میں رہا - جو امام شافعی کے مدرسے سے متصل ہے - ۵۹۲ھ/۱۱۹۵ء میں وہیں ایک مدرسے جامع الظافری میں صدر معلم ہو گیا - وہ علوم عقلیہ اور فلسفے کا اس قدر مداح تھا کہ دیگر علماء نے اس کے خلاف فتوائے کفر دے دیا، چنانچہ وہ حماۃ چلا گیا، جہاں ۱۲۱۸ء میں ایوبی سلطان الملک المنصور کی ملازمت اختیار کر لی - ۱۲۲۰ء میں المنصور کے بعد شرف الدین عیسیٰ نے اسے دمشق بلا کر مدرسۃ العزیزیہ کا صدر بنا دیا - مگر بعدازاں ۱۲۳۲ء میں اپنے سابقہ الزام کے پیش نظر معزول کر دیا گیا - وہیں صفر ۶۳۱ھ/نومبر ۱۲۳۳ء میں وفات پائی -
ابن ابی اصیبعہ اسی کا شاگرد تھا - وہ لکھتا ہے کہ آمدی اپنے زمانے کا ذہین انسان تھا - ابن خلکان بھی اس کا معترف ہے - اس نے کوئی بیس تصانیف چھوڑیں - اصول دین پر اس نے ایک کتاب "احکام الحکام" لکھی، جو شرف الدین کے نام معنون کی - دیگر کئی کتابیں مخطوطوں کی شکل میں ملتی ہیں -

شمالی افریقہ اور مصر کی عبیدیہ فاطمیہ خلافت کا دسواں

آمر باحکام اللہ (۱۰۹۶ء - ۱۱۲۹ء) خلیفہ ابوعلی المنصور آمر باحکام اللہ نام تھا اور ابوالقاسم مستعلی کا بیٹا تھا - ۱۳ محرم ۴۹۰ھ میں پیدا ہوا اور صرف پانچ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا - اسی سال صلیبیوں نے عکہ فتح کر لیا تھا اور پھر طرابلس، شام، رملہ، انطاکیہ اور بیت المقدس کی تین ریاستیں بھی ان کے قبضے میں چلی گئیں -
بیت المقدس پر قبضے کے بعد وہاں عیسائیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اس سے عیسائیوں کی قوت میں اضافہ ہو گیا - چنانچہ آمر باحکام اللہ کو عیسائیوں کے خلاف معرکہ آرائی کرنا پڑی لیکن اسے شکست ہوئی اور شام کے ساحل تک کا علاقہ اور بہت سا علاقہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا -
اس وقت آمر کا وزیر سلطنت افضل بن جلال تھا - جو مستعلی کے وقت سے مختار حکومت تھا - اس کے باپ نے علوی حکومت کو مضبوط کیا تھا اور خود افضل نے صلیبیوں سے جنگ کر کے انہیں مزید آگے بڑھنے سے روکا تھا ورنہ وہ مصر پر بھی قابض ہو جاتے مگر چونکہ آمر ایک عیاش اور محسن کش شخص تھا، جس نے اپنے بھائی کو قتل کروا دیا تھا - اس لیے خدام قصر کے کہنے سننے پر اپنے اس مربی و محسن کو ماہ رمضان ۵۱۵ھ میں قتل کروا دیا اور خود اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا -
بعدازاں جلال السلام کو اپنا وزیر مقرر کیا - مگر اپنی بزدلی اور عیاشی کے باعث اسے بھی قتل کروا دیا - تاہم خود بھی نہ بچ سکا - اس کی عیاشی عوام کے دلوں میں کھٹکنے لگی اور آخر چند ہی روز کے بعد علوی باطنی عقیدہ رکھنے والے ایک غلام قرامطہ نامی نے اسے ۲ ذی قعدہ ۵۲۴ھ بمطابق ۷ اکتوبر ۱۱۲۹ء کو قتل کر دیا - چونکہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی عبدالمجید تخت نشین ہوا -
آمر ایک عیاش طبع، بزدل اور کم ہمت شخص تھا - اپنی بدطینتی کی وجہ سے اپنے بھائی اور دو وزیروں کو مروا ڈالا - عوام اس سے نالاں تھے - ہر وقت خلوت کدے میں داد عیش دیتا رہتا تھا اور مہمات سلطنت سے بے خبر رہتا - تاہم اس کی طبیعت موزوں سخن تھی - جس کی وجہ سے وہ ایک اچھا شاعر بھی تھا - لیکن یہی شاعری اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی -

آمنہ رضہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ جو بڑی پرہیزگار اور خدا پرست تھیں - قریش کا خاندان جو عرب کے تمام قبائل میں معززترین قبیلہ تھا - اس سے تعلق رکھتی تھیں - والد وہب بن عبدمناف بن کلاب تھے اور والدہ برہ بنت عبدالعزیٰ بن کلاب تھیں - حضرت عبدالمطلب کے پیارے بیٹے عبداللہ سے نکاح ہوا - نکاح کے تھوڑے عرصہ بعد حضرت عبداللہ تجارت کے لیے شام کو روانہ ہوئے جب وہاں پہنچے تو بیمار ہو گئے اور بیماری کی حالت میں واپس آ رہے تھے کہ یثرب سے گزرتے ہوئے والد کے ننہال میں ٹھہر گئے - اور وہیں وفات پائی -
۲۰ اپریل ۵۷۱ء بروز پیر صبح کے وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آمنہ کو ایک بیٹا عطا کیا -
حضرت عبدالمطلب نے اپنے پوتے کی خوشی میں قربانی کے لیے [illegible] سارے عرب میں غریبوں کو کھانا کھلایا - اس موقع پر تمام قبائل کے [illegible] نے بھی بچے کو دیکھا اور حضرت عبدالمطلب کو مبارک باد دی - اس موقع پر آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے بچے کا نام محمد (یعنی بہت تعریف کیا گیا) رکھا -
حضور کی تاریخ ولادت کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے - یورپ میں ایک مشہور مورخ پرسی ول نے ۲۰ اگست ۵۷۰ء لکھی ہے - جبکہ سید امیر علی ۲۹ اگست ۵۷۰ء لکھتے ہیں - لیکن علامہ شبلی نعمانی مصر کے مشہور ہیئت دان محمود پاشا فلکی کی تحقیقات کی بناء پر صحیح تاریخ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تحریر فرماتے ہیں - دور حاضرہ کے تمام مورخین اس سے متفق ہیں -
حضور کی ولادت کے وقت عرب میں یہ رواج تھا کہ پیدائش کے بعد شرفا اپنے دودھ پیتے بچے کو اچھی تربیت اور پرورش کے لیے صحرا یا دیہات [illegible] کے حوالے کر دیتے تھے - تاکہ بچے باہر کی کھلی اور صحت بخش اور تازہ ہوا میں پرورش پا سکیں - جب حضور کی عمر مبارک چھ ماہ کی ہوئی تو آپ کو بھی قبیلہ بنی سعد کی ایک خاتون حضرت مائی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا - حضرت مائی حلیمہ آپ کو واپس مکہ حضرت آمنہ کے پاس لائیں مگر شہر میں وبا پھیلی ہوئی تھی - اس لیے حضرت آمنہ نے اپنے نور نظر اور لخت جگر کو دوبارہ حضرت مائی حلیمہ کے پاس سپرد کر دیا کہ چند دن اور شہر سے باہر کھلی اور صاف ہوا میں پرورش پا سکیں - تقریباً چھ سال بعد مائی حلیمہ آپ کو مکہ مکرمہ میں واپس لے آئیں - آپ بڑے توانا اور تندرست

تھے۔ آپ کو صحت مند دیکھ کر آپ کے دادا اور آپ کی والدہ محترمہ بہت خوش ہوئیں۔ اب حضورؐ اپنی والدہ کے ہمراہ رہنے لگے۔ حضرت آمنہ کو اپنے پیارے بیٹے کا بڑا خیال تھا۔ وہ آپ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتیں۔ حضورؐ کی عمر اس وقت ۶ برس کی تھی جب آپؐ کی والدہ ماجدہ آپؐ کو ساتھ لے کر یثرب (مدینہ) میں گئیں۔

حضرت عبداللہ کے انتقال کے بعد حضرت آمنہ ہر سال ان کی قبر کی زیارت کو مدینہ تشریف لے جاتیں۔ مدینہ میں ایک ماہ کے قیام کے بعد جب واپس تشریف لا رہی تھیں تو مدینہ اور مکہ کے درمیان مقام ابوا پر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں۔

آموص (AMOS) عہد نامہ قدیم کا ایک پیغمبر۔ ایک مذہبی کتاب جس میں وہ باتیں درج ہیں جو آموص پیغمبر نے کہی تھیں۔ کتاب آموص یا عاموس کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔

"تقوع کے چرواہوں میں سے آموص کا کلام جو اس پر شاہ یہوداہ عزیاہ اور شاہ اسرائیل یربعام بن یوآس کے ایام میں اسرائیل کی بابت بھونچال سے دو سال پہلے رویا میں نازل ہوا۔ (۱=۱)

شاہ عزیاہ، عزریاہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کا دور حکومت تقریباً [illegible] ق م سے [illegible] ق م تک بتایا جاتا ہے۔ شاہ یربعام کا دورِ حکومت تقریباً [illegible] ق م سے [illegible] ق م تک مانا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آموص نے پیغمبر کی حیثیت سے ایک مختصر سے عرصے میں اپنے فرائض ادا کئے۔ اس کے کلام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آموص یہوداہ کے لئے اسرائیل یعنی شمالی حکومت میں بھی کام کرتا رہا۔ جب کہ اس کا سابقہ مسکن تیکوداہ میں بھی رہا۔ جو بیت الحم کے قریب واقع ہے اور وہ وہاں گلہ بان تھا۔ آموص کے بارے میں، خود اس کے اپنے کلام سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ چرواہا تھا۔ مگر یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ وہ کوئی عام یا معمولی انسان نہیں تھا۔ آموص کا کلام یروشلم کے ان حلقوں میں محفوظ رہا۔ جو ہیکلوں اور مندروں سے متعلق ہے اور یوں اس کا کلام عہد نامہ عتیق میں شامل کر دیا گیا۔ اس نے جو پیش گوئیاں کیں وہ نہ تو اس نے خود قلم بند کی تھیں اور نہ ہی اس دور میں لکھی گئیں جب وہ اس کے منہ سے نکلی تھیں۔ تاہم بعد میں اس کے کلام کو قلم بند کر لیا گیا اور یوں یہ کلام عہد نامہ قدیم کا ایک اہم اور مستقل حصہ بن گیا ہے۔

کتاب آموص۔ ان بارہ کتابوں میں سے ایک ہے جو عہد نامہ قدیم کا حصہ ہیں۔ اور ان کو بارہ "چھوٹے پیغمبروں" سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل زبان عبرانی ہے۔ کل نو باب ہیں جو شاعری میں لکھے گئے ہیں تاہم اس کا تعارفی ابتدائیہ نثر میں ہے جو اوپر درج کیا گیا ہے۔ کتاب آموص میں جو پیش گوئیاں کی ہیں وہ زیادہ تر اسرائیل کی تباہی، روز قیامت، نحوس کے دن، تاریکی کے ایام اور تباہی کے بارے میں ہیں۔ کتاب آموص میں خدا کا جو تصور ملتا ہے وہ محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں عالمگیر تاثر پایا جاتا ہے۔ مذہبیات اور بالخصوص عہد نامہ قدیم میں یہ تصور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

آموص کا حوالہ بائبل اور انجیل میں ۲۔ سلاطین۔ تواریخ۔ یسعیاہ اور لوقا کی انجیل میں بھی ملتا ہے۔

آمین اصل میں یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جو منقول ہو کر عربی میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ آمین کے معنی عربی زبان میں ہیں۔ قبول فرما! یہ کلمہ سورہ فاتحہ کے خاتمے کے بعد پڑھا جاتا ہے۔ مگر تنزیل میں داخل نہیں ہے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے نسخہ قرآن مجید میں یہ لفظ نہیں تھا۔ تاہم یہ سنت ہے اور ہر دعا نیز خیر کے بعد اس کا پڑھنا مناسب سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی رائج ہے کہ ایک شخص اگر دعا مانگے تو دوسرے سامعین آمین کہتے ہیں تاکہ اس کی دعا شرف قبولیت حاصل کرے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ آمین مدارج جنت میں سے ایک درجہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ کا قائل جنت میں درجہ خاص حاصل کر لیتا ہے۔ نمازوں میں جب امام سورۃ فاتحہ پڑھ لیتا ہے تو مقتدین پوشیدہ طور پر آمین پڑھتے ہیں۔ ترکوں کے ہاں بچوں کو مکتب میں داخل کرانے کی رسم کا نام بھی آمین ہے۔ آمین کہنا اہل سنت کا طریقہ ہے۔ اہل تشیع سورۃ فاتحہ کے بعد آمین نہیں کہتے۔

آہنگر، شیخ موسیٰؒ (وفات ۹۲۵ھ) لاہور کے ایک معروف ولی اللہ تھے اس لئے آہنگر کے نام سے مشہور ہوئے۔ پہلے پہل انہوں نے حضرت شیخ شہر اللہؒ بن یوسف سجادہ نشین روضہ عالیہ حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی جب ان کی وفات کا وقت آیا تو حضرت شیخ موسیٰ آہنگر نے ان سے کہا کہ ابھی کئی ایسی باتیں رہ گئی ہیں جو وہ سیکھ نہیں پائے اس لئے وفات سے قبل وہ کوئی ایسی صورت بتا دیں جس سے وہ فیض یاب ہوں۔ حضرت شہر اللہؒ نے انہیں حضرت شیخ عبدالجلیلؒ قطب العالم سے رجوع کرنے کی تلقین کی جو لاہور میں مقیم تھے۔ اپنے مرشد کے انتقال کے بعد حضرت شیخ موسیٰ آہنگر لاہور آئے اور حضرت شیخ عبدالجلیلؒ کے حجرہ کے باہر دوسرے فقیروں کے ہمراہ خاموش بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں حضرت شیخ عبدالجلیلؒ کو احساس ہو چکا تھا کہ ملتان سے حضرت شیخ بہاؤالدینؒ نے ان کی طرف کسی کو بھیجا ہے۔ انہوں نے حجرہ کے اندر سے آواز دے کر کہا کہ ملتان سے موسیٰ نام کا جو شخص آیا ہے اسے اندر بھیجا جائے۔ حضرت شیخ موسیٰ کو اندر بھجوا یا گیا بات چیت ہوئی تو حضرت شیخ عبدالجلیلؒ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ جلد ہی وہ ان کے چہیتے مرید تھے انہوں نے قرب کی خاطر حضرت شیخ موسیٰ کو حجرے کے قریب ہی زمین دے دی۔ وہیں حضرت شیخ موسیٰ آہنگر نے رہنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اپنا پیشہ آہنگری بھی کرنے لگے۔ حضرت شیخ موسیٰ کا مزار لاہور کے قلعہ گوجر سنگھ میں ہے وہیں آپ کی آہنگری کی دکان ہوا کرتی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک دن ایک ہندو لڑکی آپ کی دکان پر آئی اور چرخے کا تکلا سیدھا کرنے کو کہا۔ انہوں نے تکلا آگ میں رکھ دیا اور خود لڑکی کو گھورنے لگے۔ لڑکی نے شرما کر کہا میں تو تکلا سیدھا کروانے آئی ہوں اور آپ مجھے گھورنے لگے۔ حضرت شیخ موسیٰ آہنگر اس کی باتیں سن کر چونکے اور لڑکی کو بتانے لگے۔ میں تمہیں تو نہیں دیکھ رہا میں تو خدا کے بنائے ہوئے ایک شاہکار میں محو ہوں۔ بلاشبہ خدا نے تم کو حسن و جمال کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اگر تجھے میری بات پر اعتبار نہیں تو دیکھ۔۔۔"

یہ کہہ کر انہوں نے آگ سے لڑکی کا تکلا نکالا جو گرم ہو کر سرخ ہو چکا تھا اور اپنی آنکھوں میں سرمے کی سلائی کی طرح پھیرنے لگے۔ اور کہا۔

"اگر میں نے تجھے نظر بد سے دیکھا ہو تو میری آنکھیں بے نور ہو جائیں۔"

لڑکی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی کیونکہ ان کی آنکھوں کو کچھ نہ ہوا بلکہ تکلا آنکھوں میں پھرتے ہی لوہے سے سونا بن گیا۔

لڑکی نے یہ کرامت دیکھی تو عشق حقیقی میں مبتلا ہو گئی۔ پاگلوں کی طرح گلی کوچوں سڑکوں اور بازاروں میں گھومنے لگی۔ اسی عالم میں انتقال کیا۔ حضرت موسیٰ آہنگر کو اپنے

روحانی ذرائع سے انتقال کی جزئی تواُس کے سرہانے پہنچے اور کہنے لگے کہ ابھی اس میں زندگی باقی ہے یہ کہنا تھا کہ وہ زندہ ہوگئی اور پھر اُس نے اپنی زندگی کے باقی دن اُن کی خدمت میں بسر کیے۔ انتقال کے بعد اُسے حضرت موسیٰ آہنگر کے روضہ کے متصل دفن کیا گیا۔ آہنگر صاحب کرامت بزرگ کی حیثیت سے بھی بڑی شہرت رکھتے تھے ان کی وفات سلطان ابراہیم لودھی کے زمانے میں ہوئی۔!!

آہ و بکا رونا پیٹنا، آہ وزاری کرنا، ماتم کرنا، نوحہ کرنا، یہ سب باتیں اسلام میں بری طرح منع کی گئی ہیں خصوصاً میت پر بین کرنا اور چیخنا چلانا اسلام میں گناہ ہے۔ البتہ آنسو بہانے کی ممانعت نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا "جو شخص منہ پیٹے بال نوچے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کا نوحہ کرے، بین کرے، وہ ہمارے راستے پر نہیں۔"

حضور اکرم صلعم نے نوحہ کرنے والی عورت اور نوحہ سننے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے (ابوداؤد) لیکن آنسو بہانے سے نہیں روکا۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ زینب بنت محمد صلعم کا انتقال ہوا تو عورتیں نوحہ کرنے لگیں، حضرت عمرؓ نے کوڑے سے انہیں مارنا شروع کیا تو آنحضرتؐ نے انہیں ہٹا کر فرمایا "عمر! نرمی اختیار کرو" پھر عورتوں سے فرمایا "خود کو شیطان کی آواز سے دور رکھو!" پھر فرمایا "لیکن آنکھ سے آنسو بہانا اور دل سے رونا اللہ کی طرف سے ہے اور وہ رحمت کے سبب سے ہے اور ہاتھ اور زبان سے رونا شیطان کی طرف سے ہے۔" (احمد)

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ حضورؐ نے تو یہاں تک فرمایا "ایسے جنازے میں بھی نہ جاؤ، جس میں نوحہ کرنے والیاں ہوں۔" (احمد، ابن ماجہ)

حضرت مغیرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "جس پر نوحہ کیا جاتا ہے، اس پر اس آہ و بکا کے سبب قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔"

آئین دستور، ضابطہ، قانون کے لیے مستعمل فارسی لفظ۔ پہلی بار یہ لفظ عباسی خلفاء کے عہد میں استعمال ہوا۔ اس سے اسلامی دستور کی تشریح بہت بعد کی بات ہے۔

دنیا میں سب سے پہلا آئین یا دستور سلطنت عہد نبوی میں احد میں حضور اکرمؐ نے مرتب کروایا۔ کسی حکمران کا پہلا تحریری آئین تھا۔ اس آئین کا متن مختلف کتب میں ملتا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو ایک مستقل سیاسی امت قرار دیا گیا۔ جن کے ماتحت غیر مسلم رعایا بھی تھی۔ راعی اور رعایا کے حقوق و فرائض، عدل و انصاف، قانون سازی جنگ و صلح، مذہبی آزادی، غیر مسلموں کے حقوق اور دیگر تمام شہری مسائل کا ذکر اس میں موجود تھا۔ جس کی اس دور کے مدینہ والوں کو ضرورت تھی۔

زمانہ حال میں اگرچہ کوئی بھی ریاست اسلامی نہیں کہلا سکتی اور نہ ہی اس کا دستور اسلامی ہے۔ تاہم پاکستان جیسے ممالک کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جہاں دستور میں اسلامی دفعات موجود ہیں۔

اسلامی آئین کا ماخذ قرآن حکیم اور شریعت محمدیؐ ہے۔ اسلامی ریاست اسے اس لیے نافذ کرے گی کہ وہ خدا کے قانون کا نفاذ کرے اور امیر المسلمین اس امر کا نگران ہوگا کہ وہ دیکھے کہیں اسلامی آئین کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔

اسلامی آئین کے تحت حکومت کا حق صرف خدا تعالےٰ کو ہے۔ خلیفہ مسلمانوں کا ایک منتخب نمائندہ ہے۔ جو اللہ کے احکام کو، اس کی مرضی کے مطابق، دستور اسلامی کے تحت نافذ کرے گا۔ نیز قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کی ذات کو حاصل ہیں۔ قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور حکومت خدا کے قانون کی پابند اور تابع ہے۔ ہر شخص کی بنیادی وفاداری شریعت سے ہے اور ریاست سے اس کی وفاداری اس وقت تک ہے جب تک کہ حکومت خدا اور اس کے رسولؐ کی وفادار ہے۔ نیز اسلامی ریاست میں کلیدی آسامیاں مسلمانوں کے پاس ہوں اور ان کی حدود شریعت میں رہتے ہوئے اطاعت کی جائے۔

(نیز دیکھیے۔ "اجتہاد"، "اشتراکیت"، "خارجہ پالیسی" "جمہوریت"، "حکومت" "خلافت"، "ریاست"، "شریعت"، "عدل"، "فقہ"، "قانون")

آیات الحفظ حفاظت کرنے والی آیات، قرآن مجید کی وہ آیات جن کی فضیلت و کرامت یہ بتائی جاتی ہے کہ انہیں پڑھ کر ابلیس اور دیگر آفات و بلیات سے پناہ ملتی ہے، ان میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کے علاوہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات شامل ہیں۔

سورۃ بقرہ آیۃ الکرسی (۲ : ۲۵۵) میں خصوصاً ولا یؤدہ حفظھما وھو العلی العظیم (۲ : ۲۵۵) (اور دونوں (آسمانوں اور زمینوں) کی حفاظت اس پر بوجھ نہیں اور بہت بلند عظمت والا ہے۔)

سورۃ یوسف ۱۲ : ۶۴ فاللہ خیر حفظاً وھو ارحم الراحمین (سو اللہ ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔)

سورۃ الرعد (۱۳ : ۱۱) ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ (جو اسے اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔)

سورۃ الحجر (۱۵ : ۱۷) حفظنھا من کل شیطن الرجیم (اور اسے شیطان رجیم سے محفوظ کیا)

سورۃ الصفات (۳۷ : ۷)، وحفظاً من کل شیطن مارد (اور ہر سرکش شیطان سے (ان کی) حفاظت کی)

آیا صوفیا (AYASOPHIA) استنبول، ترکی میں واقع ایک سابق گرجا، جو ۱۴۵۳ء سے وہاں کی سب سے بڑی جامع مسجد تھی اور اب ترکی کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے۔ مورخ احمد بن رُستہ اسے کنیسائے اعظم کے نام سے یاد کرتا ہے۔

آیا صوفیا کے معنی "دانش مقدسہ" کے ہیں۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ گرجا سب سے پہلے حضرت سلیمان کے وزیر آصف بن برخیاہ نے بنوایا تھا۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مطابق اسے قسطنطین اعظم کے بیٹے قسطنطیوس نے تعمیر کرایا تھا۔ اور ۱۵ فروری ۳۶۰ء کو اس کی رسم تقدیس ادا کی۔ اس کے کوئی پچاس سال بعد ۲۰ جون ۴۰۴ء کو یہ کنیسا آگ کی نذر ہو گیا۔ ۸ اکتوبر ۴۱۵ء کو اس کا دوبارہ افتتاح ہوا۔ ۱۴ جنوری ۵۳۲ء کو آیا صوفیا کے قدیم کنیسا کے دوبارہ جل جانے پر بادشاہ جسٹینین نے اسے موجودہ شکل پر گنبد اور قبے کی شکل پر بنوایا تاکہ آتش زنی سے محفوظ رہ سکے۔ ۲۷ دسمبر ۵۳۷ء کو اس خوب صورت ہیکل ما کنیسا کے افتتاح کے موقع پر جسٹینین یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"اے سلیمان! میں آپ سے بازی لے گیا۔"

خدا کو شاید یہ منظور نہ تھا کہ جسٹینین کا تعمیر کردہ ہیکل اسی شان و شوکت سے قائم رہتا۔ چنانچہ اسی کے عہد حکومت میں ایک زبردست زلزلے نے اس کے ہیکل

منبر اور قربان گاہ کو پاش پاش کر دیا۔

۲۴ دسمبر ۵۶۲ء کو کنیسا کا چوتھی بار افتتاح ہوا۔ اس بار اسے ۷۵ × ۷۰ میٹر کے رقبہ پر تعمیر کیا گیا۔ اصل دیواریں اور ڈاٹ کی چھتیں اینٹوں سے بنائی گئیں چنانچہ ۴۲۵ پادریوں اور تقریباً ایک سو دربانوں کو یہاں مامور کیا گیا۔

آیا صوفیا کنیسا کا فرش صلیب نما ہے۔ اس کے اوپر چار کردی مثلثوں والا تقریباً نیم کردی ۵۶ میٹر بلند گنبد بنایا گیا ہے۔ مغرب کی طرف وسط میں ایک صحن ہے۔ جو "ایٹریم" کہلاتا ہے۔ اس کے پہلوؤں میں کھلے ایوان ہیں۔ مشرق میں سمندر کی جانب شاہی محل بنا ہوا ہے۔ شمال کی طرف درباری گرجے اور شاہی عہدیداروں کے محلات ہیں۔ جنوب کی جانب اگستیوم ہے، جو قومی جشن منانے کے کام آتا ہے، اس میں گھڑ سوار جسٹینین کا مجسمہ تھا۔

ساخت کے اعتبار سے اہم چیزیں محرابیں اور ان کے ساتھ کے ستون ہیں۔ نیم کردی گنبد کے مشرق اور مغرب میں دو مزید نیم مدور کمرے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر تین نصف گنبد بنے ہوئے ہیں۔ ساری عمارت ۱۰۷ ستونوں پر قائم ہے جن میں سے ۴۰ نچلی منزل میں اور ۶۷ اوپری منزل میں ہیں۔ اوپری منزل کے ایوان عورتوں کے لیے مخصوص تھے۔

قرون وسطیٰ کا ایک زائر لکھتا ہے کہ اس میں آرائش و تزئین کی افراط تھی۔ رنگین سنگ مرمر سے دیواروں پر پچی کاری اور مصوری کی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ ان کے حواریوں اور فرشتوں کی تصاویر منقش ہیں۔

۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا تو یہاں کے لوگ بھاگ کر آیا صوفیا میں اس خیال سے جا چھپے کہ جب فاتحین قسطنطین اعظم کے مینار پر پہنچیں گے تو آسمان سے ایک فرشتہ اتر کر انھیں واپس دھکیل دے گا۔ مگر کوئی فرشتہ تو نہ اترا البتہ فاتحین نے ان محصورین کو گرفتار کر لیا۔ سلطان محمد فاتح گھوڑے سے اتر کر کنیسا کے اندر داخل ہوا اور یہاں نماز ادا کی جس کے بعد سے یہ گرجا مسجد میں تبدیل ہو گیا۔

مسلمانوں نے اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنے کے لیے بہت سی تعمیرات کیں۔ دیواروں اور چھتوں کی پچی کاری پر سرمئی قلعی کر دی گئی۔ قیمتی آرائش اور بت نشین دیوار ختم کر دی گئی۔

سلطان محمد ثانی نے جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ زبردست پشتے بنوائے اور گرجا کی شکل و صورت مسجد میں تبدیل کرنے کے لیے پہلا مینار تعمیر کرایا۔ اس کے بعد سلیم ثانی نے شمال کی جانب پشتے اور دوسرا مینار جو شمال مشرقی کونے میں ہے تعمیر کرایا۔ سلطان مراد ثالث نے باقی دو مینار اور مرمت کا سارا کام مکمل کرایا۔ اس نے صدر دروازے کے پاس اندر کی طرف سنگ جراحت سے دو بڑی بڑی نالیاں بنوائیں اور دو بڑے چبوترے تعمیر کرائے۔ جن پر قرآن پاک کی تلاوت ہوتی رہتی۔ نیز اس نے گنبد کی چوٹی پر سونے کا پترا چڑھایا۔ اس کا قطر ۱۴ فٹ ۶ انچ تھا اور یہ آدھے چاند کی شکل میں تھا۔

آیا صوفیا کے ساتھ ملحقہ قبرستان ہی میں اکثر عثمانی حکمرانوں کے مزار واقع ہیں سلطان سلیم ثانی، مراد ثالث، محمد ثالث، اس کے انیس بھائی (جنھیں اس نے قتل کروایا تھا)، مصطفیٰ اول اور اس کا بھتیجا ابراہیم یہیں دفن ہیں۔

سلطان مراد رابع (۱۶۲۳ء - ۱۶۴۰ء) نے مسجد کی خالی دیواروں پر مشہور خطاط مصطفیٰ چلپی سے بڑے بڑے سنہری حروف میں آیات قرآنی لکھوائیں۔ محمود اول (۱۷۳۰ء - ۱۷۵۴ء) نے وسیع چھت کا سلطانی راستہ، ایک خوبصورت فوارہ، ایک مدرسہ اور شمال میں ایک وسیع دار الطعام تعمیر کرایا۔ نیز مسجد میں ایک بیش قیمت کتب خانہ قائم کیا۔

سلطان عبدالمجید کے عہد میں مسجد کی عمارت کے جن حصوں کے منہدم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تجدید کی گئی۔ سلطان محمد فاتح کے تعمیر کردہ مینار کو بھی باقی میناروں کے مساوی بلند کیا گیا۔ مشہور خطاط مصطفیٰ عزت آفندی کی لکھی ہوئی آٹھ گول لوحیں بھی اس عہد میں نصب کی گئیں۔

۱۹۳۴ء میں صدر جمہوریہ ترکیہ مصطفیٰ کمال اتاترک کے ایک حکم سے آیا صوفیا کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ دیواروں پر سے قلعی کو صاف کر کے تصاویر کو اجاگر کیا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۶ء تک سابقہ کنیسا کی اکثر پچی کاری اور مصوری نظر آنے لگی اور یوں اب یہ عظیم عمارت محض آثار قدیمہ کی حیثیت سے جلوہ فروز ہے۔

آیا صوفیا کے بارے میں مسلمانوں نے بہت سی روایتیں اور داستانیں گھڑ لی ہیں۔ نیز کئی سابقہ داستانوں کو بھی نیا رنگ دے ڈالا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس عمارت کا نام قسطنطین اعظم کی بیوی آصفیہ کے نام پر پڑا تھا اور یہ اس کی وصیت کے مطابق تعمیر کی گئی، جس کی بنیادیں ۵۰ فٹ تک کھودی گئیں اور تعمیر پانی پر سے شروع ہوئی۔ اس میں جو سنگ مرمر استعمال کیا، اس کا علم صرف دیوؤں کو تھا۔ سخت پتھر کوہ قاف سے اور بڑے دروازے کے تختے کشتی نوحؑ سے لائے گئے تھے، جو حضرت سلیمانؑ بیت المقدس میں استعمال کر چکے تھے۔ کل خرچ تین لاکھ ساٹھ ہزار سونے کی سلاخیں ہوا تھا۔ زیادہ تر تعمیر کی نگرانی حضرت خضرؑ نے کی تھی۔ نیز "ٹھنڈی کھڑکی" سے آنے والی ہوا علوم دینی میں گہرائی اور پختگی پیدا کرتی ہے۔

آیا صوفیہ کی مشہور جامع مسجد

آیت

آیت: نشانی، علامت، سطر، مصرعہ، قرآن کا وہ حصہ جو اپنے معنی ایک حد تک مکمل کرے۔ جس کی ابتداء اور ایک انتہا ہو۔

آیت کا لفظ علامت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پوری کائنات کو ایک آیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور بعض مصائب بھی ایک آیت کہلا سکتے ہیں۔ قرآن میں آیت کا لفظ عبرت کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن کے ان جملوں کو بھی جو اپنا ایک واضح آغاز اور انجام رکھتے ہوں، آیت کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں کل کتنی آیات ہیں۔؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک عام اندازے کے مطابق یہ ۶۲۰۰ ہیں۔ بہت سی سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات ہیں، جنہیں بعض آیت میں شمار کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔ نیز بعض لوگ ہر سورت کے شروع میں آنے والی بسم اللہ الرحمان الرحیم کو بھی ایک آیت شمار کرتے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کی آیات کی تعداد مختلف طور پر بتائی گئی ہے۔

آیات کے تعین کا عمل قیاسی نہیں۔ جیسا کہ اوپر کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً الم (سورۃ بقرہ) اور المص (سورۃ اعراف) دونوں ایک آیت شمار ہوتے ہیں۔ مگر الر (سورۃ یوسف) ایک آیت نہیں مانی جاتی۔ نیز بعض جملے جواز خود کوئی حکم نہیں دیتے۔ آیت سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں الرحمان الرحیم اور بعض آیات نصف سے زیادہ صفحے پر پھیلی ہوتی ہیں جیسے آیت الکرسی۔

عام طور پر آیات ایک دوسرے سے جن حروف کے ذریعے الگ ہوتی ہیں وہ فاصلہ کہلاتی ہیں۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں "م" اور "ن" ہیں، یعنی سورۃ فاتحہ کی ہر آیت "م" یا "ن" پر ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں فاصلہ کے حروف "م، ن، د، ب، ر، ق اور ل" ہیں۔ اسی لئے بعض مستشرقین کو قرآن مجید پر شعر کا گمان گذرا ہے۔ جس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی کی جاتی ہے جبکہ ایسا نہیں۔ البتہ قرآن کی عبارت سجع (قافیہ آرائی) سے متشابہ ضرور ہے مگر یہ سجع کامل نہیں۔ اس لئے قرآن مجید کو حسب صورت مقفیٰ اور مسجع عبارت کہنا غلط ہے۔

آیت المفتح فتح کی آیت، سورۃ الانعام کی ۵۹ ویں آیت جس کی فضیلت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا وظیفہ کرے تو کامیابی ممکنات میں شامل ہوجاتی ہے۔ عام طور پر ہر نماز کے بعد اسے چالیس بار پڑھنے کا وظیفہ بتایا جاتا ہے۔

وعندہٗ مفاتح الغیب لا یعلمھآ الا ھو ویعلم ما فی البر والبحر وما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ولا حبۃ فی ظلمٰت الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتٰب مبین (۶ = ۵۹)

"اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں، سوائے اس کے ان کو کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے، جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اس کے علم کے سوا کوئی پتا نہیں گرتا اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ تر اور خشک، سوائے اس کے کہ وہ ایک کھلی کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔"

آیت الکرسی قرآن مجید کی وہ آیت جس کے بارے میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم نے فرمایا "جس شخص نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی، اُسے جنت میں جانے سے کوئی شے نہیں روک سکتی۔ اور جس نے رات سوتے وقت آیت الکرسی پڑھی تو خدا اسے، اس کے گھر اور ہمسایوں کو تمام رات حفاظت میں رکھتا ہے۔"

اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ ولا نوم لہ ما فی السموٰت وما فی الارض من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یحیطون بشیء من علمہ الا بما شآء وسع کرسیہ السموٰت والارض ولا یؤدہ حفظھما وھو العلی العظیم (۲ = ۲۵۵)

"اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہمیشہ زندہ خود قائم، قائم رکھنے والا ہے اس پر نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس کی اجازت کے سفارش کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے جو وہ چاہے۔ اس کی کرسی (علم) آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور ان دونوں کی حفاظت اس پر بوجھ نہیں اور وہ بہت بلند عظمت والا ہے۔"

کرسی کا لفظ عام طور پر اس شئے کے لئے بولا جاتا ہے جس پر بیٹھا جائے۔ مگر ابن عباس نے یہاں کرسی کے معنی علم کے لئے ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ کرسی کا اصل مفہوم علم ہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات اٹھنے بیٹھنے سے پاک ہے چونکہ آیت کے باقی معنوں میں بھی علم ہی کا ذکر ہے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ کرسی سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کا وسیع علم ہے، جو آسمانوں اور زمینوں پر حاوی ہے۔

ا

ابابیل پرندہ، جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ الفیل میں اصحاب فیل کے واقعے میں آیا ہے۔ اصل میں طیراً ابابیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اردو زبان میں چونکہ ابابیل ایک خاص قسم کے پرندے کو کہتے ہیں، اس لیے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ابرہہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں۔ لیکن عربی زبان میں ابابیل کے معنی ہیں "متفرق"۔ [illegible] سے متفرق گروہ جو پے در پے مختلف سمتوں سے آئیں، خواہ وہ آدمیوں کے ہوں یا پرندوں یا گھوڑوں، اونٹوں یا کسی اور جانور کے۔ عکرمہ اور قتادہ کا بیان ہے کہ ابرہہ کی فوج پر حملہ کرنے والے یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بحر احمر کی طرف سے آئے تھے۔ سعید بن جبیرؒ اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے تھے کہ نہ حجاز کے اور نہ تہامہ یعنی حجاز اور بحر احمر کے درمیانی ساحلی علاقے کے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کتے جیسے۔ عکرمہ کا بیان ہے کہ ان کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے۔ اور تقریباً سب راویوں کا متفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا، اور پنجوں میں دو دو کنکر۔ مکہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدت تک محفوظ رہے۔ چنانچہ ابونعیم نے نوفل بن ابی معاویہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب الفیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سرخ تھے۔ ابن عباسؓ کی روایت ابونعیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ بکری کی مینگنی کے برابر۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے، ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔

بعض علماء کے نزدیک پرندے کنکر لے کر نہیں آئے تھے بلکہ ابرہہ کی فوج میں کسی قسم کی بیماری پھیل گئی تھی جس کے باعث سپاہی پے در پے ہلاک ہونے لگے اور ان کی متعفن لاشوں پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے شاید گدھ وغیرہ لگے تھے۔ جنھوں نے انہیں اس طرح نوچ کھایا کہ وہ بھس کی مانند ہو گئے۔ (نیز دیکھئے "ابرہہ"، "اصحاب فیل" وغیرہ)

اباحیہ صوفیوں کا ایک باطل فرقہ، جو تمام چیزوں کو جائز اور مباح سمجھتا ہے۔ اباحیہ کا لفظ اباحت سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں "جائز کرنا"۔ اس فرقے کے نزدیک انسان کو گناہوں سے دور رہنے کی قدرت حاصل نہیں اور نہ دیگر مامورات بجالانے کی طاقت ہے۔ نیز اس دنیا کی کوئی شے کسی کی ملکیت نہیں۔ اس لیے مال اور بیویوں میں تمام لوگ شریک ہیں۔ اس فرقے کو دنیا کا بدترین فرقہ کہا جاتا ہے۔

اباضیہ خارجیوں کا ایک فرقہ، جس کا بانی عبداللہ بن اباض تھا۔ اس کا آغاز ۶۵ھ سے ہوا۔ آج کل اس فرقے کے لوگ مشرقی افریقہ، لیبیا اور جنوبی الجزائر کے علاوہ عمان میں ملتے ہیں۔

عبداللہ بن اباض نے انتہا پسند خوارج کے فرقہ ازارقہ سے علیحدہ ہونے کے بعد اس فرقے کی بنا ڈالی۔ اس کا دور اموی خلیفہ عبدالملک کا تھا۔ اس کا جانشین جابر بن زید الازدی ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اسی نے غالباً احادیث کا ایک قدیم ترین مجموعہ ترتیب دیا تھا۔

جابر کے بعد اباضیہ کی قیادت ابوعبیدہ مسلم کے سپرد ہوئی۔ یہ بھی محدث اور عالم تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد اس نے بصرے میں تبلیغی مرکز قائم کیا۔ اس کے بعد سے اباضیہ فرقہ کا زوال شروع ہو گیا۔

اباضی عام طور پر باغیانہ رجحانات کے مالک رہے ہیں۔ ۱۲۸ھ میں انہوں نے جنوبی عرب میں بغاوت کرانے کی ناکام کوشش کی۔ جو ۱۳۰ھ میں وادی القریٰ میں ان کی شکست کے بعد ختم ہو گئی۔ ۱۳۲ھ میں ایک بغاوت عمان میں برپا ہوئی۔ اس کا بھی خاتمہ ہوا۔ البتہ ۲۸۰ھ تک یہاں کے اباضی خودمختار رہے۔ طرابلس میں ایک اباضی ریاست قائم ہوئی تھی مگر اس کا خاتمہ ۱۴۱ھ ہی میں ہو گیا۔ بعد ازاں کئی مقامات پر اباضیوں نے بغاوت برپا کی اور بالآخر ۱۵۵ھ میں عباسیوں سے اور پھر چوتھی صدی ہجری میں فاطمیوں سے شکست کھانے کے بعد جنوبی افریقہ میں اباضیوں کی کمر ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔

اباضی اہل قبلہ میں سے اپنے تمام مخالفوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ البتہ غیر اباضیوں کے ساتھ نکاح کی اجازت ہے۔ امامت کا وجود ان کے نزدیک لازمی نہیں۔ اس لیے عموماً کتمان (بغیر امام کے حکومت) قائم کرتے رہے۔ البتہ بعض اوقات امام کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔ جو قرآن و سنت کا پیرو ہوتا ہے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ اور اکثر صحابہ کی فضیلت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ قرآن عہد نبوی میں خلق ہوا تھا۔ ان کے اہم فرقے وہبیہ، نکاریہ، نفاثیہ اور خلفیہ ہیں۔ ان کے علاوہ مزید آٹھ فرقوں کے وجود کا پتہ چلا ہے۔ ان میں وہبیہ وہ قدیم فرقہ ہے جو اب تک چلا آ رہا ہے۔

ابان بن سعید ابن العاص بن اُمیہ بن عبد شمس بن عبد مناف القرشی الاموی ایک صحابی ہیں جن کو آنحضرتؐ نے بعض سرایا میں امیر بنا کر بھیجا تھا، مثلاً سریہ نجد میں یہ امیر بنا کر بھیجے گئے۔ (سریہ وہ لشکر جس میں آنحضرتؐ خود شامل نہ ہوتے تھے بلکہ کسی صحابی کی ماتحتی میں روانہ کرتے تھے۔) رسول اکرمؐ نے ان کو مقام بحرین کے برّی اور بحری حصے کا عامل، علاء بن حضرمی کے اس عہدے سے معزولی کے بعد مقرر فرمایا تھا۔ ابان بن سعید آنحضورؐ کی وفات تک اس عہدے پر رہے۔ ان کے سات بھائی تھے۔ ان میں سے تین کے سوا باقی سب اسلام لائے اور صحبت نبویؐ سے مشرف ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔

ابان بن عثمان محدث اور فقیہہ، تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کے فرزند، اُم عمرو بنت جندب کے بیٹے، جنگ جمل (جمادی الاوّل ۳۶ھ / نومبر ۶۵۶ء) میں حضرت عائشہ کے ہمرکاب تھے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے انھیں مدینہ کا والی مقرر کیا، جہاں سات سال تین ماہ اور تیرہ دن رہے پھر ان کی جگہ ہشام بن اسماعیل کو مقرر کیا گیا۔ یزید بن عبدالملک کے عہد میں ۱۰۵ھ / ۷۲۳ء کو مدینہ میں انتقال کیا۔

ابان کی شہرت محدث اور فقیہہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ لوزی لکھتا ہے کہ ان کا شمار مدینے کے دس فقیہوں میں تھا۔ طبری کے بقول ۷۶ھ سے ۸۰ھ تک وہ امیر حج بھی بنے رہے۔ ایک کتاب بھی ان کی تصنیف کہی جاتی ہے۔

ابجد حروف تہجی، وہ حروف جن کی مدد سے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ عربی زبان کے حروف تہجی کی تعداد ۲۸ ہے۔

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ی۔

انہیں عام طور پر ملا کر اس ترتیب کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

ابجد، ھوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ۔

ایک روایت کے مطابق مدین کے چھ بادشاہوں نے ان میں سے پہلے چھ کلمات کو اپنے ناموں کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ نام ہفتے کے دنوں کے ہیں۔ لیکن ان کی روایت کی حیثیت افسانے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ دراصل اہل عرب چونکہ آرامی یا عبرانی زبانوں سے ناواقف تھے۔ اس لیے وہ حروف ابجد کی ابتدا سے ناواقف تھے اور اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے یہ افسانے گھڑ لیے جہاں تک اس ترتیب کا تعلق ہے اس کا قدیم ترین ذکر ایک تختی پر ہے۔ جس میں پہلے بائیس حروف (چھ کلمات) موجود ہیں۔ یہ مغربی شام کے ایک علاقہ لاذقیہ سے دریافت ہوئی ہے۔ یہ تختی چودھویں صدی قبل مسیح کے زمانے کی زبان اوگارت میں لکھی ہوئی ہے اور پہلی قدیم ابجدی تحریر ہے۔

عربی حروف ابجد سامی الاصل ہیں۔ اور ان کا رسم الخط بھی سامی (آرامی، رسم الخط سے) (دیکھیے "آرامی زبانیں") یہ رسم الخط فنیقیوں نے ایجاد کیا تھا۔

حروف تہجی کی "ابجد ھوز" ترتیب سے عربوں نے ایک اور کام لیا۔ انہوں نے ہر حرف کی قیمت رکھ دی۔ اور یوں علم الاعداد، فال اور رمل نے جنم لیا۔ ان کی قیمت یوں تھی۔

ا ب ج د ہ و ز ح ط ی ک ل م ن س ع ف ص

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۷۰، ۸۰، ۹۰

ق ر ش ت ث خ ذ ض ظ غ

۱۰۰، ۲۰۰، ۳۰۰، ۴۰۰، ۵۰۰، ۶۰۰، ۷۰۰، ۸۰۰، ۹۰۰، ۱۰۰۰

ابد اصطلاح، بمعنی "غیر فانی انجام" یا "آغاز کا اختتام" کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور ازل (ابتداء) کے مقابلہ میں آتی ہے۔ اس کے اصل معنی وقت یا زمانہ کے ہیں۔ اسلام میں ابد سے مراد وہ وقت ہے، جب یہ ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور آخرت کا دور شروع ہوگا (دیکھیے "آخرت") گویا یہ ایسا آغاز ہے جس کے بعد کوئی انجام نہیں۔

عقل پرستوں اور متکلمین کے نزدیک یہ دنیا از خود وجود میں آئی تھی اور از خود ختم ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعض کے نزدیک ازل (آغاز) اور ابد (انجام) کا وجود نہیں۔ لیکن ابوالہذیل (جو ایک متکلم تھا) نے کسی قدر اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ باری تعالیٰ کی قدرت کی ایک انتہا ہے۔ اس کے بعد نہ تو وہ مزید ایک ذرّے کو پیدا کر سکے گا اور نہ ایک پتے کو حرکت دے سکے گا۔ مگر علمائے دین نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یقیناً اس کائنات کا ایک ازل اور ایک ابد ہے۔ (دیکھیے "ازل") ورنہ اب تک ایک بہت بڑا عرصہ ماضی کی تاریخ بن چکا ہوتا۔ جب کہ ایسا نہیں ہے اور اسی طرح اس سارے عالم کا فنا ہونا بھی ممکن ہے۔ اس فنا ہونے والے اور خاتمے والے دن کا نام ابد ہے۔ جس کے بعد حشر برپا ہوگا۔ گویا ابد وہ زمانہ ہے جب وقت اور حرکت اپنی [illegible] کھو چکے ہوں گے اور اشیاء میں [illegible] ہو چکا ہوگا۔

ابدال تصوف کی اصطلاح، جو اولیاء کے مدارج میں سے ایک کے [illegible] استعمال ہوتی ہے۔ اصل معنی بدل یا متبادل کے ہیں [illegible] کے نزدیک ابدال [illegible] ولی ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا جاتا ہے تاکہ اس دنیا کا انتظام [illegible]۔

تصوف میں ولی کا سب سے بڑا درجہ قطب ہے۔ اس کے نیچے معاون [illegible] افراد اور پھر پانچویں درجے پر ابدال ہوتے ہیں۔

ابدال کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ کسی کے نزدیک [illegible] اور کسی کے نزدیک [illegible] اور اس سے بھی زیادہ مثلاً [illegible] ان میں سے [illegible] ملک [illegible] رہتے ہیں اور باقی دیگر ممالک میں۔ ان کا کام انتظام عالم [illegible] باران رحمت کا ملنا اور دشمن پر فتح پانا ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک مرجائے تو دوسرا [illegible] کی جگہ لے لیتا ہے۔

ابدال چشتیؒ، ابواحمد (۲۶۰ھ / ۸۷۴ء [illegible] ۳۵۵ھ / ۹۶۶ء) صوفی بزرگ [illegible] ابواسحاق شامی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ [illegible] فرزند تھے۔ ۹ رمضان ۲۶۰ھ / ۲۵ جون ۸۷۴ء کو پیدا ہوئے۔ [illegible] کی طرف رجحان طبع ظاہر ہو گیا۔ تیرہ برس [illegible] تصوف میں داخل ہوئے [illegible] خرقہ درویشی حاصل کیا۔ اس وقت سے وفات تک رشد و ہدایت جاری رکھی۔

آپ کے بیٹے کا نام ابومحمد تھا۔ جو آپ کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ [illegible] جمادی الثانی ۳۵۵ھ / ۲۵ مئی ۹۶۶ء کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ [illegible] کا مزار چشت میں ہے۔

ابدال چشتیؒ ایک کامل بزرگ اور صاحب کرامات تھے۔ [illegible] ایک بار کچھ ساتھیوں کے ساتھ دریائے دجلہ پر گئے۔ کشتی موجود نہ تھی۔ [illegible] کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔ اور ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔ اسی حالت میں سب [illegible] کنارے پر تھے۔ اس کرامت کو چند غیر مسلم بھی دیکھ رہے تھے، جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

حضرت ابواحمد ابدال چشتیؒ کی گفتگو بڑی فصیح و بلیغ تھی۔ زبان میں بڑی تاثیر تھی۔ قرآن کریم کے حافظ تھے۔ دن رات میں تین بار قرآن ختم کرتے۔ اس لیے [illegible] عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ پورے تیس برس تک پہلو زمین کے ساتھ نہیں لگا [illegible]

ابدالی افغانوں کا ایک قبیلہ جو اب دُرّانی کے نام سے مشہور ہے۔ احمد شاہ ابدالی اس قوم کا پہلا بادشاہ تھا۔ یہ افغانوں کی سربنی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔

روایت ہے کہ افغان طالوت بن داؤد کی اولاد میں سے ہیں۔ طالوت کی اولاد میں سے ایک شخص قیس بن عبدالرشید مسلمان ہو گیا تھا۔ ابدالی اسی کی اولاد میں سے ہیں روایت کے مطابق ان کی نسبت ابدال بن ترین بن شرجبون بن قیس کی طرف ہے۔ ابدال یہ اس لیے کہلایا۔ کیونکہ وہ شخص سلسلۂ چشتیہ کے ایک ولی خواجہ ابواحمد ابدالی چشتی کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ (دیکھیے "ابدال چشتی")

ابدالی قندھار کے علاقہ میں سکونت پذیر تھے۔ اس کے بعد ہرات میں منتقل ہوئے۔ یہ شاہ عباس اوّل کا دور تھا۔ اس نے ان کے ایک سردار سدو کو "امیر افغانہ" بنا دیا۔ اس لحاظ سے یہ سدوزئی مشہور ہوئے۔ نادر شاہ ایرانی نے، جسے غلطی سے درانی سمجھا جاتا ہے ابدالیوں کو زیر کر لیا۔ تاہم ان کے ساتھ نرمی کا سلوک رکھا۔ ان میں احمد خاں بھی تھا۔ نادر خان نے اس کی خدمات کے پیشِ نظر ابدالیوں کو قندھار کا علاقہ واپس دے دیا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر خان کے قتل ہونے کے بعد احمد خاں قندھار میں احمد شاہ ابدالی کے نام سے تخت نشین ہوا (دیکھیے "ابدالی، احمد شاہ") اسے ایک فقیر صابر شاہ نے "دُرِّ دوراں" کا لقب دیا، جو بعد ازاں مخفف ہو کر درّانی بن گیا۔ (دُرّانی قبیلے کے لیے دیکھیے "دُرّانی")

ابدالی، احمد شاہ (م ۱۷۷۳ء) افغانستان میں درانی سلطنت کا بانی۔ ابدالیوں کا پہلا بادشاہ، ہندوستان کا آخری فاتح۔ اس کی جائے ولادت کا تو علم نہیں۔ البتہ ملتان میں باغ لانگہ خاں میں ایک کتبہ درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی ملتان میں پیدا ہوا تھا۔ مگر تاریخ اس کی شہادت نہیں دیتی تاہم ملتان میں دُرانی قبائل اب بھی آباد ہیں۔

احمد شاہ ابدالی کا اصل نام احمد خاں تھا۔ شجرہ نسب یہ ہے۔

احمد خاں بن محمد زمان خان بن دولت خان۔ بن سرمست خان، بن شیر خان، بن خواجہ خضر خان۔ بن سدو خان۔ بن عمر بن معروف بن بہلول بن کانے بن بالے بن حبیب بن پوپل بن زیرک بن عیسٰی بن جسٹر بن ابدال۔

احمد خاں ایران کے بادشاہ نادر شاہ کی فوج میں افسر تھا۔ جب نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ جون ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کو کسی نے قتل کر دیا تو افغانی قبائل کی مجلس شوریٰ نے احمد خاں کو تخت نشین کیا۔ اور یوں اکتوبر ۱۷۴۷ء میں سلطنت ابدالیوں کے ہاتھوں میں چلی آئی۔

احمد خاں نے تخت نشین ہونے کے بعد احمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ایک فقیر درویش سید صابر شاہ نے اسے "دُرِّ دوراں" کا خطاب دیا۔ جس کی بنا پر اس کا قبیلہ درانی کے نام سے مشہور ہوا۔ (دیکھیے "ابدالی"، "درانی")

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کیے۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۴۹ء میں دوسرا حملہ کیا۔ ۱۷۵۰ء میں اس علاقے کی مالگذاری چودہ لاکھ روپیہ سالانہ وصول کرنا شروع کی۔ جب پنجاب کی افراتفری کے باعث رقم وصول نہ ہوئی تو دسمبر ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ نے تیسرا حملہ کیا اور لاہور کے علاوہ ملتان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس بار معین الملک سابقہ گورنر لاہور ہی کو گورنر مقرر کیا اور ۱۷۵۶ء میں معین کے فوت ہو جانے کے بعد مغلانی بیگم کی مدد کے لیے چوتھا حملہ کیا۔ اس بار احمد شاہ دہلی پہنچ گیا۔ اور اسے تاخت و تاراج کیا۔ اپریل ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور خود واپس افغانستان چلا گیا۔

۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے افغانیوں کو پنجاب سے نکال دیا۔ اس لیے اکتوبر ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ نے پانچویں بار حملہ کیا اور پورے پنجاب پر قبضہ کر کے اسے افغان سلطنت میں شامل کر لیا۔ جنوری ۱۷۶۱ء میں اس کا مرہٹہ افواج کے ساتھ پانی پت کے میدان میں مقابلہ ہوا جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی اور ان کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس بار احمد شاہ نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے تمام حکمران شاہ عالم دوم کو شہنشاہ تسلیم کریں۔

پنجاب میں سکھوں نے سر اٹھایا تو مارچ ۱۷۶۴ء میں ابدالی چھٹی بار سکھوں کی سرکوبی کے لیے حملہ آور ہوا۔ مگر اسے لاہور ہی سے واپس جانا پڑا۔ کیونکہ اس کے اپنے ملک میں حالات ابتر ہو رہے تھے۔

۱۷۶۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی آخری بار حملہ آور ہوا اور سکھوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی اپنی سلطنت میں ہونے والی سازشوں نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ جس کے بعد سے پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۷۷۳ء میں احمد شاہ ابدالی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

ابدیت ہمیشگی، لافانی حیثیت، حیات بعد الموت۔ کیا کوئی چیز ہمیشہ رہے گی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کا جواب اہلِ فکر و نظر نے بھی دینے کی کوشش کی ہے، جبکہ الہامی مذاہب نے اپنے تصورِ آخرت میں ابدیت کی واضح تشریح کر دی ہے۔ (نیز دیکھیے "آخرت"، "ابد"، "روح"، وغیرہ)

اللہ تعالیٰ کے بعد روحِ انسانی ہی ایک ایسی شے قرار دی گئی ہے، جو تا ابد زندہ رہے گی۔ علما کا ایک گروہ تو روح کو ابدی قرار دیتا ہے مگر دوسرے گروہ کے نزدیک موت کے بعد روح بھی ساکن یا مردہ ہو جاتی ہے اور صرف قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہو گی، ان کے نزدیک روح جسم سے علیحدہ کوئی شے نہیں۔

ابراہیمؑ نبی، پیغمبر، ابوالانبیاء، خلیل اللہ، امام الناس۔ ابن تارخ بن ناحور بن ساروغ بن ارعو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دوست برگزیدہ اور پیارے نبی کو قرآن مجید میں اُمّہ (النحل ۱۲۰)، امام الناس (البقرہ ۱۲۴)، حنیف اور مسلم (آل عمران ۶۷) کے نام سے بار بار یاد کیا ہے۔ اکثر انبیائے کرام انہی کی اولاد سے ہیں۔

ابراہیمؑ کے نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بائبل کا بیان ہے کہ خدا تعالیٰ ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہو گا۔ اور تیرا نام ابرام نہیں بلکہ ابراہام ہو گا۔ کیونکہ میں نے تجھے قوموں کا باپ بنایا ہے۔" (پیدائش ۱۷: ۵)

اکثر ماہرین کے نزدیک ابراہام یا ابراہیم عجمی لفظ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے آپ کا نام ابرام ہو اور پھر ابراہام یا ابورہام ہو گیا ہو۔

تورات کی رو سے حضرت ابراہیمؑ ۲۲۰۰ ق۔م میں عراق کے قصبہ عُر (اُر) میں پیدا ہوئے ناحور اور حاران ان کے بھائی تھے اور حضرت لوطؑ حاران کے بیٹے تھے قرآن حکیم اور تورات اس امر پر متفق ہیں کہ آپ کی قوم بت پرست تھی۔ آپ کے والد کا نام تورات میں تارخ لکھا ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے اسے صنم سازی اور بت تراشی کی وجہ سے آزر کہہ کر یاد کیا ہے۔ (دیکھیے "آزر")

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ اور آزر کے اختلاف عقائد کو جس طرح نمایاں کیا گیا ہے اور جس طرح آپ اپنی قوم کے شرک سے متنفر اور متصادم ہوئے۔ اس سے ہم آپ کی عظمت و جلالت کی حقیقت کو بھی پا سکتے ہیں۔ اور اپنے لیے شمع ہدایت بھی روشن کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو "ملتِ ابراہیمی" ہونے پر فخر ہے۔

قرآن حکیم کی رُو سے آپ کو بچپن ہی میں "رشد" (الانبیاء = ۵۱) اور "قلب سلیم" (الصافات ۸۴) عطا ہوا اور کائنات کے مشاہدے سے آپ کو یقین کامل حاصل ہوا۔ (الانعام = ۷۵) اور حیات بعد الموت کے راز سے آگاہی چاہی تو اللہ تعالٰی نے تشفی فرمائی۔ (البقرہ = ۲۶۰)

تالمود میں جو یہودیوں کی کتاب ہے، سیرت ابراہیمؑ کے عراقی دور کا حوالہ ملتا ہے۔ جو قرآن حکیم کے مقابلے میں خلاف واقعہ اور بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ تالمود کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر نمرود بادشاہ کو مشورہ دیا کہ تارخ کے ہاں جو بچہ پیدا ہو، اُسے قتل کر دے۔ چنانچہ نمرود حضرت ابراہیمؑ کے قتل کے در پے ہوا۔ مگر تارخ نے اپنے ایک غلام کا بچہ اس کے بدلے میں دے کر اپنے بچے کو بچا لیا۔ اس کے بعد تارخ نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں چھپا دیا، جہاں وہ دس برس تک رہے۔ گیارہویں سال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کے پاس بھیج دیا۔ جہاں وہ انتالیس برس رہے۔ وغیرہ وغیرہ (۱۱ = ۲۹، ۱۷ = ۱۷)

حضرت ابراہیمؑ شروع ہی سے بت پرستی کے خلاف تھے۔ ان کی قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا۔ آپ نے تبلیغ دین کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنے والد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بزرگ کا مباحثہ اس طرح سے مذکور ہے:۔

"اور کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کر، وہ صدیق نبی تھا۔ جب اس نے اپنے ابی سے کہا اے میرے بزرگ تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ تیرے کچھ کام آ سکتا ہے۔ اے میرے بزرگ مجھے وہ علم ملا ہے، جو تجھے نہیں ملا۔ سو تو میری پیروی کر، میں تجھے سیدھا رستہ دکھاؤں گا۔

اے میرے بزرگ! شیطان کی عبادت نہ کر، کیونکہ شیطان رحمان کا نافرمان ہے۔ اے میرے بزرگ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب آ پہنچے تو تو شیطان کا دوست بن جائے۔

اس نے کہا، اے ابراہیمؑ کیا تو میرے معبودوں سے منہ موڑتا ہے۔ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کروں گا اور تو ایک مدت مجھ سے الگ ہو جا۔

کہا، تجھ پر سلامتی ہو، میں اپنے رب سے تیرے لیے استغفار کروں گا، وہ مجھ پر بہت مہربان ہے اور میں تم سے اور ان سے جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، الگ ہوتا ہوں اور میں اپنے رب سے دعا کروں گا، امید ہے میں اپنے رب سے دعا کر کے محروم نہیں رہوں گا۔" (مریم = ۴۱ تا ۴۸)

حضرت ابراہیمؑ نے بت پرستی کو کن کن دلائل و براہین سے رد کیا، اس کی بھی ایک جھلک قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اور جب ابراہیمؑ نے اپنے ابی آزر سے کہا۔ تو بتوں کو معبود بناتا ہے، میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو۔

سو جب اس پر رات چھا گئی۔ اس نے ستارہ دیکھا۔ کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا، کہا، میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا، کہا، اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔

پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا۔ کہا، اے میری قوم میں اس سے بری ہوں جو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے یکسو ہو کر اپنا منہ اس کی طرف کیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا۔ کہا، کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، اور اس نے مجھے یقیناً ہدایت کی ہے اور میں اس سے نہیں ڈرتا، جس کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو، ہاں یہ کہ میرا رب کچھ چاہے۔ میرے رب کا علم تمام چیزوں کو لیے ہوئے ہے۔ پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔ اور میں کس طرح اس سے ڈروں جس کو تم شریک بناتے ہو اور تم نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ اسے شریک بنایا ہے، جس کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نہیں اتاری، پس (بتاؤ) دونوں گروہوں میں سے کون امن کا زیادہ حق دار ہے۔ اگر تم جانتے ہو۔" (الانعام = ۷۴ تا ۸۱)

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو شرک سے باز رکھنا چاہا اور جب وہ نہ مانے تو ایک بار جب سارے لوگ کسی تہوار پر گئے ہوئے تھے آپ نے تمام بتوں کو توڑ دیا اور کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس پر قوم چیخ پکار اٹھی اور آپ کے لیے سزا تجویز کرنے لگی۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

"جب اس نے اپنے ابی اور اپنی قوم سے کہا، یہ مورتیں کیا ہیں۔ جن کی تعظیم میں تم لگے ہو۔ (یعنی عبادت کرتے ہو) انھوں نے کہا ہم نے اپنے بڑوں کو اسی طرح عبادت کرتے ہوئے پایا۔ کہا، تم اور تمہارے بزرگ کھلی گمراہی میں تھے۔ انھوں نے کہا، کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے یا دل لگی کرنے والوں میں سے ہے؟ کہا، (نہیں) بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ جس نے انھیں پیدا کیا اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں اور اللہ کی قسم میں تمہارے پیٹھ پھیر کر چلے جانے کے بعد تمہارے بتوں کو تکلیف پہنچاؤں گا۔

سو اس نے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ مگر ان کے بڑے بت کو رہنے دیا۔

مسجد الخلیل اور مرقد ابراہیمؑ

تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ کہنے لگے: ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے یہ فعل کیا؟ یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔ (لوگوں نے) کہا، ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جسے ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ کہنے لگے، اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہی دیں۔ کہا، اے ابراہیمؑ کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟ اس نے کہا (نہیں)، بلکہ ان کا بڑا یہ ہے، سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں۔ سو انھوں

نے اپنے آپ کی طرف رجوع کیا اور کہنے لگے۔ تم خود ہی ظالم ہو۔ پھر اپنے سر اوندھے ڈال کر کہنے لگے (یعنی قائل ہو گئے) تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کرتے، کہا، تو کیا اللہ کو چھوڑ کر تم اس کی عبادت کرتے ہو، جو تمہیں کچھ نفع نہیں دیتا اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ تف ہے تم پر اور اس پر جس کی تم عبادت اللہ کے سوا کرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ کہنے لگے اسے جلا دو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو، اگر تم کرنے والے ہو۔" (الانبیاء = ۵۲ تا ۶۸)

تالمود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا اور جب ابراہیمؑ پچاس برس کے تھے، تو آپ حضرت نوحؑ کا گھر چھوڑ کر اپنے والد کے گھر آ گئے۔ جہاں بارہ مہینوں سے منسوب بارہ بتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ آپ نے پہلے تو والد کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن جب وہ نہ مانا تو آپ نے ان بتوں کو توڑ دیا تارخ نے اس کی شکایت نمرود سے کی کہ پچاس برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا آج اس نے یہ حرکت کی ہے۔ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو بلا کر باز پرس کی۔ آپ نے سخت لہجہ میں جواب دیا۔ نمرود نے آپ کو جیل بھجوا دیا۔ اور معاملہ کونسل کے سپرد کر دیا کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا بڑا الاؤ تیار کیا گیا اور حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آپ کے بھائی اور خسر حاران کو بھی آگ میں ڈال دیا گیا۔ کیونکہ نمرود نے جب تارخ سے یہ پوچھا کہ تیرے بیٹے کو تو ہم نے پیدائش کے روز ہی قتل کرنا چاہا تھا۔ مگر تو نے اسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں قتل کر لیا [illegible] سب کہا کہ میں نے حاران کے کہنے پر یہ حرکت کی تھی۔ اس لئے اسے بھی [illegible]

آگ [illegible] حاران جل [illegible] اور لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں [illegible] [illegible] ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم نے کہا اے آگ! ابراہیمؑ پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔" (الانبیاء [illegible])

[illegible] نمرود [illegible]

اسی نمرود نے بھی آپ سے مناظرہ کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ میرے معبود نے مجھے ملک و سلطنت بخشی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا میرا معبود اور پروردگار تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ نمرود نے کہا، میں بھی (جسے چاہوں) زندہ رہنے دوں اور [illegible] مار ڈالوں۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا، اچھا اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ آپ اسے مغرب سے نکالیں۔ اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔" (البقرہ = ۲۵۸)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے محفوظ رکھا تو آپ اپنے گھرانے سمیت جن میں حضرت لوطؑ بھی تھے۔ شام کی طرف ہجرت کر گئے لیکن آپ کے ساتھ آزر نہیں تھا جیسا کہ تالمود کا بیان ہے اس کی رو سے آپ کے والد تارخ (آزر) کی وفات حاران میں [illegible] آپ کے ہمراہ تھا۔

کنعان کے علاقے میں مقیم ہونے کے بعد آپ نے اولاد کے لئے دعا کی "اے میرے پروردگار! مجھے ایک نیک بیٹا عطا کر۔" (الصفّٰت = ۱۰۰)

سارہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ خوب صورت تو تھی لیکن بانجھ عورت تھی۔ جب آپ [illegible] تو فرعون مصر نے اس کی خوب صورتی کے پیش نظر اسے اپنے محل میں رکھنا چاہا۔ اس موقع پر تورات میں آپ کو کاذب کہا گیا ہے کہ آپ نے اپنی سترہ سالہ بیوی سارہ کو بہن کہہ کر مصریوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہا۔ بائیبل میں آیا ہے:۔

"جب ابرام مصر پہنچا۔ مصریوں نے اس کی عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اسے دیکھا اور فرعون کے حضور اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر لے گئے اور اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری یا گائے بیل، گدھے اور غلام لونڈی اور گدھیاں اور اونٹ ملے۔ پھر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان کو ابرام کی بیوی سری (سارہ) کے سبب بڑی مار دی۔ تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے مجھ سے کیا کیا؟ کیوں نہ بتایا کہ یہ میری بیوی ہے، تو نے کیوں کہا کہ یہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جورو بنانے کو لیا۔ دیکھ یہ تیری بیوی حاضر ہے۔ اسے لے اور چلا جا اور فرعون نے اس کے حق میں لوگوں کو حکم دیا۔ تب انہوں نے اسے اور اس کی بیوی کو، اور جو کچھ اس کا تھا روانہ کیا۔" (پیدائش = ۱۴ تا ۲۰)

یوسف ظفر اپنی کتاب "یہودیت" میں ابن خلدون اور تورات کے دیگر مفسرین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہ بھی آپ کی زوجیت میں دے دی۔ چونکہ دوسری بیوی رسم و رواج کے مطابق پہلی کی لونڈی بن کر رہتی ہے۔ اس لئے یہودیوں اور عیسائیوں نے حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہہ کر بتایا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ لونڈی کی اولاد ہونے کی وجہ سے حضرت اسحاق سے کمتر ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہؑ سے نکاح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے حضرت اسماعیلؑ سا فرزند عطا کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات سے سارہ جل اٹھی ہو اور حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم کے مطابق ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو گھر سے دور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے ماں اور بچے کو عرب کے تپتے ریگزار میں چھوڑ دیا۔ یہاں اللہ کی قدرت سے چشمہ پیدا ہوا اور آبادی بڑھتی دیکھتے [illegible] جب حضرت اسماعیلؑ جوان ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ واپس آئے اور مکہ کی آبادی دیکھ کر انھوں نے وہاں اللہ کا گھر (کعبہ) تعمیر کیا۔ چنانچہ اسی لئے کعبہ کی عظمت مسلمانوں کے دل میں ہے۔ کیونکہ یہ سب سے پہلی مسجد تھی، جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنی تھی۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا ذکر آتا ہے "جب یہ بچہ بڑا ہوا تو ابراہیم آئے تو انھوں نے کہا، اے میرے پیارے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ چنانچہ باپ بیٹا دونوں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا پر چھوڑ دیا، اس آزمائش میں جب ابراہیمؑ پورے اترے تو اللہ نے انھیں "امام للناس" کا خطاب دیا (البقرہ = ۱۲۴) اور انھیں ایک اور بیٹے اسحاق کی بشارت دی (الصفّٰت = ۱۰۱)

قرآن مجید میں آیا ہے جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر کعبے کی بنیادوں کو از سر نو تعمیر کرنا شروع کیا تو یہ دعا مانگی۔

"اے میرے رب اس شہر کو امن والا بنا۔" "اے ہمارے رب ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ بلاشبہ تو خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنا۔" (البقرہ = ۱۲۶ تا ۱۲۸)

ایک روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی تو ان کی عمر ۱۷۵ برس تھی اور وہ حبرون میں مکفیلہ کے غار میں دفن ہوئے۔ اب اس مقام کو "الخلیل" کہتے ہیں جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔

حضرت ابراہیمؑ دین توحید کے پرستار اور علمبردار تھے۔ ان کے بارے میں یہ تو کہیں وضاحت نہیں ہوئی کہ کیا وحی آپ پر نازل ہوئی تھی یا ان کی بعثت محض روحانی تھی؛ البتہ قرآن مجید میں ایک جگہ اس امر کی تصدیق ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے ہمکلام تھا۔ سورۂ بقرہ میں اس واقعے کا ذکر ہے، جب آپ کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ کرایا گیا۔

"اور جب ابراہیمؑ نے کہا، اے میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو کس طرح

مردے کو زندہ کرتا ہے۔ فرمایا، کیا (اس پر) تیرا ایمان نہیں؟ بولے۔ کیوں نہیں۔ (ایمان تو ہے) لیکن میں اپنے دل کے لئے اطمینان چاہتا ہوں۔ فرمایا! اچھا تو چار پرندے لے، پھر انہیں اپنے ساتھ مانوس کرلے، پھر ان میں سے ہر پہاڑ پر (ان کا گوشت کا) ایک ٹکڑا رکھ۔ پھر انھیں بلا وہ تیری طرف دوڑ کر آئیں گے اور یقین رکھ کہ اللہ بڑی عزت والا اور حکمت والا ہے۔ (۲ = ۲۶۰)

حضرت ابراہیمؑ کے دین کے بارے میں قرآن مجید میں کئی جگہ پر ارشاد ہوتا ہے کہ آپ موحد مسلم اور راست رو تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"پھر ہم نے تیری طرف (حضرت محمد صلعم کی طرف) وحی کی کہ ابراہیمؑ راست رو (مسلم) کے دین پر چل اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔" (النحل = ۱۲۳)

اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ حالانکہ توریت اور انجیل اس کے بعد ہی اتاری گئیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ سنو! تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے، جس کا تمہیں علم تھا، پھر اس میں کیوں جھگڑتے ہو، جس کا تمھیں علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا اور نہ عیسائی لیکن وہ راست رو اور فرمانبردار (مسلم اور حنیف) تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ یقیناً ابراہیمؑ کے بہت نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا ولی ہے۔" (آل عمران = ۶۵ تا ۶۸)

قرآن مجید کی تقریباً بائیس سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر آتا ہے۔ آپ ہمارے رسول مقبول حضرت محمد صلعم کے جدِ امجد ہیں۔ گویا مسلمان نہ صرف امت محمدیہ سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ امت براہیمیہ سے بھی متعلق ہیں۔ مسلمان حضور اکرمؐ کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر بھی درود بھیجتے ہیں۔

ابراہیم (سورۂ) قرآن مجید کی چودھویں سورت، اس میں سات رکوع اور ۵۲ آیات ہیں۔ اس کا آغاز آلرٰ سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے الرا کے مجموعہ میں یہ پانچویں سورت ہے۔ مکہ میں آنحضور صلعم کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ اس میں عمومی طور پر رسولوں اور ان کے اعدا کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے سمجھایا گیا ہے کہ حق ایک ایسی چیز ہے جو نابود نہیں ہوسکتی۔

سورہ ابراہیم کے چھٹے رکوع میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا ذکر ہے جو آپ نے مکہ اور اہل مکہ کے لئے کی تھی اور جس دعا میں یہ ذکر ہے کہ حضرت اسماعیل کو ایک خاص غرض کے لئے خانہ کعبہ کے قریب ایک وادی بیابان میں چھوڑا گیا اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کا اس طرح چھوڑا جانا سلسلہ نبوت میں ایک پر حکمت فعل تھا اس لحاظ سے اس سورت کا نام ابراہیم رکھا گیا ہے۔

ابراہیم بک مصر کا ایک مملوک امیر۔ تاریخ مصر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے محمد ابوذہب کا غلام تھا۔ اس نے آزاد کر کے اپنا بہنوئی بنا لیا اور بک (سردار) مقرر کر دیا۔ ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء میں اس نے امیر الحج کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء میں جب ابوذہب شام کی مہم پر گیا تو ابراہیم بحیثیت امیر شہر قاہرہ میں رہا۔ ابوذہب کی وفات کے بعد مصر کی حکومت میں شریک ہو گیا۔ اب وہ چھ سو مملوکوں کا بک (سردار) تھا اس وقت مصر پر محمد علی کی حکومت تھی۔ ابراہیم بک محمد علی سے بدگمان تھا۔ ۱۲ مارچ ۱۸۰۴ء میں محمد علی نے ابراہیم کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ ابراہیم فرار ہو گیا اور پھر اگلے برس اس نے محمد علی کی فوجوں پر زبردست حملے کئے اور انہیں نقصان پہنچایا۔ محمد علی نے اکثر بک سرداروں کو ایک چال کے ذریعے

قتل کروا دیا مگر ابراہیم اس کے ہاتھ نہ آیا یہاں تک کہ ربیع الاول ۱۲۳۱ھ/ فروری ۱۸۱۶ء کو اس کے انتقال کی خبر قاہرہ پہنچی۔

ابراہیم بن ادہم بزرگ صوفی اور متقی عالم، بلخ کے شہزادے تھے فقر و زہد میں بہت بلند مقام ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے بقول گروہ فقراء کے تمام علوم کی کنجیاں ابراہیم ادھم کے پاس ہیں۔

آپ مکے میں پیدا ہوئے۔ "انوار اصفیاء" کے مطابق آپ کی ولادت ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء کو ہوئی۔ مگر حلیۃ الاولیاء میں آپ کا سن وفات ۱۶۰ھ/ ۷۷۶ء درج ہے۔ جبکہ سفینۃ الاولیاء میں آپ کا سن وفات ۱۶۱ھ دیا گیا ہے اور "سیر الاقطاب" کے مطابق آپ کی تاریخ وفات جمعہ ۱۸ جمادی الاول ۱۸۲ھ/ ۲۶ جولائی ۷۹۸ء ہے۔

حضرت ابراہیم ادہمؒ بلخ کے شہزادے اور بعض روایات کے مطابق حاکم تھے کسی باطنی کیفیت کے تحت امارت و تخت کو ٹھکرا کر درویشی اور تصوف کو اپنایا اور پھر اس میں وہ بلند مقام حاصل کیا جسے اکثر صوفیا رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

"انوار حقیقیا" کے مطابق ایک رات آپ سوئے ہوئے تھے کہ آدھی رات کے وقت آنکھ کھلی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی چھت پر [illegible] رہا ہے۔ پوچھا:

"تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے۔"

جواب ملا "آپ کا دوست ہوں اور یہاں اپنا اونٹ تلاش کر رہا ہوں۔"

کہا "بھلا یہ ممکن ہے کہ شاہی محلات میں اونٹ آجائیں؟"

جواب ملا "بھلا یہ ممکن ہے کہ جامۂ اطلس پہننے والے کو خدا مل جائے؟"

یہ جواب سنکر آپ کے دل میں ایک خوف سا پیدا ہو گیا۔ دوسرے روز دربار میں ایک شخص بڑے رعب کے ساتھ اندر داخل ہوا اور آپ کے تخت تک آ پہنچا۔ امراء وزراء میں سے کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ نے نہایت تعجب کے ساتھ پوچھا:

"تو کون ہے اور یہاں کس طرح آیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اس سرائے میں ذرا دیر ٹھہرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "یہ سرائے نہیں، شاہی محل اور دربار ہے۔"

اس آدمی نے کہا۔ "آپ سے پہلے اس محل میں کون رہتا تھا؟"

فرمایا۔ "میرا باپ"

پھر پوچھا "تمہارے باپ سے پہلے کون تھا؟"

فرمایا۔ "میرا دادا"

پھر پوچھا "آپ کے بعد یہاں کون رہے گا۔؟"

فرمایا "میری اولاد"

جواب ملا "ذرا خیال کرو کہ جس مقام پر آتے آدمیوں کا آنا جانا ہو اور کوئی بھی مستقل قیام نہ کرتا ہو وہ مقام سرائے نہیں تو اور کیا ہے۔؟"

یہ سنتے ہی آپ بے قرار ہو کر اس کے پیچھے دوڑے۔ اس کے بعد آپ نے فقر کا راستہ اپنایا اور صحرا نوردی کرنے لگے۔ نواح نیشاپور کے ایک غار میں نو برس تک ریاضت کرتے رہے۔ روایت ہے کہ آپ چالیس برس تک گریہ و زاری اور صحرا نوردی کرتے رہے یہاں تک کہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ اور حج کیا۔ کئی برس تک حرم شریف کے مجاور رہے۔ روایت ہے کہ آپ کی وفات اس وقت ہوئی جب آپ یونانیوں کے خلاف ایک معرکہ میں مصروف تھے۔ ایک روایت کے مطابق آپ روم کے قلعہ سوقین میں اور دوسری روایت کے مطابق روم کے کسی جزیرے میں دفن ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق آپ ملک شام میں ۷۹۴ء کو فوت ہوئے۔ دائرہ المعارف اسلامیہ کے مطابق آپ کی وفات ۱۶۰ھ / ۷۷۶ء [illegible]

سے ۳ مدت رکے درمیان ہوئی۔

حضرت ابراہیم ادھم نے تصوف میں جس زہد اور توکل کو اختیار کیا وہ بعد کے صوفیانہ نظریات سے کئی درجے بہتر اور قرین اسلام تھا۔ آپ کے نزدیک خوراک کو "حلال" ہونا چاہیے۔ دیگر صوفیا کے برعکس آپ "توکل" کے معنی یہ نہیں لیتے کہ کسب معاش سے بھی انکار کردیں۔ آپ کا قول ہے کہ بھیک مانگنے والے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو دروازے پر سوال کر کے کچھ حاصل کریں، دوسرے وہ جو خاموش بیٹھے عبادت کریں، لیکن دوسروں کے دیئے ہوئے (نذرانے) کو قبول کرلیں۔ اس لئے آپ اکثر باغبانی، فصلوں کی کٹائی، گیہوں کی پسائی وغیرہ سے رزق حلال حاصل کرتے اور روایت کے مطابق ساری کمائی مریدوں پر خرچ کر دیتے تھے۔

تصوف اور فقر کے متعلق آپ کا قول یہ ہے "فقر وہ خزانہ ہے جسے اللہ نے آسمان میں رکھ چھوڑا ہے۔ اور وہ یہ خزانہ ان لوگوں کے سوا، جن سے وہ محبت کرتا ہے کسی کو عطا نہیں کرتا۔"

ایک بار بزرگوں نے آپ سے پوچھا۔ کیا سبب ہے کہ اللہ تعالےٰ ہماری دعاؤں کو قبول نہیں کرتا۔

آپ نے فرمایا "تم خدا تعالیٰ کو جانتے ہو لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلعم کو جانتے ہو مگر ان کی پیروی نہیں کرتے۔ قرآن کریم پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کی نعمت کھاتے ہو مگر شکر نہیں کرتے۔ جانتے ہو کہ دوزخ گناہگاروں کے لئے ہے مگر اس سے ڈرا نہیں کرتے۔ شیطان کو دشمن سمجھتے ہو مگر اس سے دور نہیں بھاگتے موت کو برحق سمجھتے ہو مگر اس کا سامان نہیں کرتے۔ خویش و اقارب کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرتے ہو لیکن عبرت نہیں پکڑتے۔ بھلا جو شخص اس حالت کا ہو اس کی دعا کیوں کر قبول ہو سکتی ہے۔"

ابراہیم بن عبداللہ

امام حسن کے پرپوتے اور عبداللہ بن حسن بن حسن کے فرزند۔ اپنے بھائی محمد کے ہمراہ خلافت کے امیدوار تھے جس کے باعث عباسی خلیفہ منصور کی نظر میں خطرناک تھے۔ ان کے بھائی محمد ماہ رمضان ۱۴۵ھ/ نومبر ۷۶۲ء کو مدینہ سے نکلے اور منصور کی فوجوں سے لڑتے ہوئے ۱۴ رمضان/۶ دسمبر کو شہید ہو گئے۔ جہاں سے منصور کی فوجیں ابراہیم بن عبداللہ کی طرف بصرہ اور دمشق کی جانب بڑھیں۔ اہل عراق ابراہیم کے حامی تھے۔ چنانچہ ابراہیم کی فوجوں نے اہواز، فارس اور واسط کو فتح کرنے کے بعد کوفہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ منصور کے سپہ سالار عیسیٰ کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ۲۵ ذی قعدہ ۱۴۵ھ/ ۱۴ فروری ۷۶۳ء کو ہوئی۔ باخمریٰ کے مقام پر زبردست جنگ کے بعد ابراہیم ۴۸ برس کی عمر میں شہید ہو گئے۔ ان کا سر کاٹ کر منصور کے دربار میں بھیج دیا گیا۔

ابراہیم بن محمدؐ

آنحضور صلعم کے آخری فرزند۔ ماہ ذی الحجہ ۸ھ/۲۹ مارچ ۶۳۰ء کو حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے بمقام عالیہ پیدا ہوئے حضورؐ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی سلمیٰ نے دایہ گیری کے فرائض انجام دیئے۔ سلمیٰ کے شوہر ابو رافعؓ نے آنحضرتؐ کو ولادت کا مژدہ سنایا تو آپؐ نے انھیں ایک غلام عطا کیا۔ ساتویں دن عقیقہ ہوا آپؐ نے بالوں کے برابر چاندی خیرات کی اور حضرت ابراہیمؑ کے نام پر نام رکھا۔

ابراہیم بن محمدؐ کو ام بردہ خولہ بنت منذر بن زید الانصاری نے دودھ پلایا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہ خدمت ام سیفؓ نے انجام دی۔ ہو سکتا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی شخصیت ہوں۔

ام سیفؓ مدینہ کے نواح میں رہتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق ابراہیم ۱۷ یا ۱۸ ماہ زندہ رہے اور ام سیف کے ہاں انتقال کیا۔ ابوداؤد اور بیہقی کے نزدیک صرف دو مہینے دس دن کے بعد انتقال ہوا۔ واقدی کے نزدیک ابراہیم نے ماہ ربیع الاول ۱۰ھ/جولائی ۶۳۱ء کو انتقال کیا۔

آنحضورؐ کو جب ابراہیم کے انتقال کی خبر ہوئی تو عبدالرحمان بن عوف کے ہمراہ تشریف لائے۔ انھیں گود میں اٹھالیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا۔ حضرت رسول اکرمؐ نے خود نماز جنازہ پڑھائی۔ اور جنت البقیع میں عثمان بن مظعون کی قبر کے ساتھ دفن کیا۔ قبر میں فضل بن عباسؓ اور اسامہ نے اتارا۔ آنحضورؐ باہر کھڑے رہے۔ اس کے بعد قبر پر پانی چھڑکا گیا اور ایک امتیازی علامت قائم کی گئی۔

اس موقعہ پر سورج گرہن بھی ہوا۔ چونکہ عربوں کے نزدیک یہ روایت مشہور تھی کہ بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر سورج گرہن لگتا ہے۔ اس لئے اس گرہن کو بھی ابراہیم کی موت سے منسوب کیا گیا۔ حضرت رسول اکرمؐ کو علم ہوا تو فرمایا۔ "چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں۔ کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگ سکتا۔"

ابراہیم بن مہدی

(ذی قعدہ ۱۶۲ھ/ جولائی ۷۷۹ء۔ رمضان ۲۲۴ھ/جولائی ۸۳۹ء) عباسی خلیفہ مامون الرشید کے مقابلے میں تخت کا دعویدار محمد المہدی کی حبشیہ کنیز شکلة کے بطن سے پیدا ہوا۔ جب المامون نے رمضان ۲۰۱ھ/ مارچ ۸۱۷ء کو امام علی رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا تو عباسیوں نے ذی الحجہ ۲۰۱ھ/جولائی ۸۱۷ء کو اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کو تخت نشین کر دیا۔ لیکن اس کی حکومت خزانے کی کمی کی وجہ سے دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ اور وہ زیادہ دیر تک مامون کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا چنانچہ مامون کے خراسان سے واپس آنے پر ذی الحجہ ۲۰۳ھ/ جون ۸۱۹ء کو خلافت سے دستبردار ہو کر گوشہ نشین ہوگیا۔ مامون نے اسے معاف کر دیا، جس کے بعد اس نے سامرہ میں وفات پائی۔

ابراہیم بن ولید

اموی خلیفہ، ولید بن عبدالملک کا بیٹا، ماہ ذی الحجہ ۱۲۶ھ/ ستمبر ۷۴۴ء کو تخت پر بیٹھا۔

یزید کی وفات کے بعد مروان بن محمد نے سر اٹھایا اور ابراہیم کی خلافت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے شام پر چڑھائی کر دی۔ صفر ۱۲۷ھ/ نومبر ۷۴۴ء کو عین الجر کے مقام پر ابراہیم کو شکست ہوئی اور مروان فتح کا پرچم لہراتا دمشق میں داخل ہوگیا۔ ابراہیم جان بچا کر بھاگنا چاہتا تھا، مگر مروان نے اسے معاف کر کے واپس طلب کر لیا اور یوں ابراہیم صرف چند ماہ تخت خلافت پر براجمان ہو سکا اس لئے اکثر مورخین اسے خلیفہ تسلیم نہیں کرتے۔

ابراہیم پاشا

تاریخ اسلام میں اس نام سے کئی شخصیتیں مشہور ہیں۔ (۱) عثمانی خلیفہ مراد ثالث کا داماد اور اس کے بیٹے محمد ثالث کا وزیر اعظم (صدر اعظم) (۹۸۲ھ/۱۵۷۵ء۔ ۹ محرم ۱۰۱۰ھ/۱۰ جولائی ۱۶۰۱ء) (۲) عثمانی خلیفہ محمد رابع کا وزیر اعظم (صدر اعظم) (۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء۔ شعبان ۱۰۹۷ھ/جولائی ۱۶۸۶ء)

(۳)۔ عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم کا وزیر اعظم (صدر اعظم) (قتل ۲۲ رمضان ۹۴۲ھ/۱۵ مارچ ۱۵۳۶ء)۔ اس کی شادی (۱۸ رجب ۹۳۰ھ/۲۳ مئی ۱۵۲۴ء) عثمانی تاریخ میں یادگار ہے۔ اس نے ہنگری کی مہم ۱۵۲۶ء، محاصرہ دی آنا (۲۷ ستمبر سے ۱۵ اکتوبر ۱۵۲۹ء تک) اور ۱۵۳۲ء میں ہنگری پر تیسرے حملے میں عثمانی فوج کی قیادت کی۔ نیز ایرانی مہم (۱۵۳۳ تا ۱۵۳۴ء) اور تبریز (۱۳ جولائی ۱۵۳۴ء) و بغداد (۳۱ دسمبر ۱۵۳۴ء) پر بھی فتح حاصل کی۔ ۸ جنوری ۱۵۳۶ء کو فرانسس اول کے ساتھ گفت و شنید کی اور پہلی بار فرانس کو مراعات

دینے کا معاہدہ کیا۔ مشہور و معزز انسان تھا۔ شاید اسی لیے خلیفہ کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا پھر خود بادشاہ بننے کی سوچ رہا ہوگا اور خلیفہ کو اس کا علم ہوگیا ہوگا۔

(۴)۔ مصر کے حاکم محمد علی کا بیٹا اور سپہ سالار (۱۷۸۹ء — ۱۰ر نومبر ۱۸۴۸ء) اپنے باپ کا زرہ پوش بازو تھا۔ محمد علی کے ساتھ اکثر جنگوں میں شریک ہوا اور اس کی سلطنت کو وسیع اور مستحکم کیا۔ ۱۸۱۱ء میں مملوکوں کے زبردست قتل عام اور مصر کے انتظام و انصرام کے صلے میں محمد علی کی طرف سے پاشا کا خطاب ملا۔

۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک وہابیوں کے خلاف محمد علی کی مہم میں ابراہیم پاشا نے نمایاں کردار ادا کیا اور دسمبر ۱۸۱۹ء کو قاہرہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔ ۱۶ر جنوری ۱۸۲۴ء کو اسے جزیرہ مورہ کی فتح کے لیے نامزد کیا گیا۔ یہ جزیرہ فتح کرنے کے بعد ابراہیم نے اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نوارینو کی جنگ میں حصہ لیا۔ جس میں انگریزوں، فرانسیسیوں اور روسیوں کے متحدہ بیڑے کے ہاتھوں شکست اٹھائی اور ۱۰ر اکتوبر ۱۸۲۸ء کو سکندریہ واپس پہنچ گیا۔

۱۸۳۱ء میں ابراہیم نے ترکوں کے خلاف شام کی مہم میں حصہ لیا اور بڑھتے بڑھتے کوتاہیہ کے مقام پر پہنچ گیا۔ ۶ر مئی ۱۸۳۳ء کو باب عالی اور محمد علی کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی رو سے ابراہیم کو شام اور آطنہ کے علاقے دے دیئے گئے۔ اس علاقے کا انتظام و انصرام خاصا مشکل تھا۔ چنانچہ جب ۱۸۳۹ء میں ترکی نے مصر کے خلاف دوبارہ جنگ شروع کی تو ابراہیم کو ۲۹ر دسمبر ۱۸۴۰ء کو شام کا علاقہ خالی کرنا پڑا۔

ابراہیم پاشا نے باقی ایام مصر کے انتظام و انصرام میں گذارے۔ جون ۱۸۴۸ء کو وہ مصر کا باضابطہ حاکم تھا۔ وفات کے بعد اسے امام شافعی کے مزار کے پاس دفن کیا گیا۔

ابراہیم حقی پاشا ترکی عثمانی سلطنت کا وزیراعظم، قسطنطنیہ کے صدر کونسل محمد رمزی کا بیٹا۔ قسطنطنیہ میں ۱۳ر اپریل ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوا، یہیں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۴ء تک سلطان عبدالحمید ثانی کے دربار میں مترجم کے عہدے پر فائز رہا۔ ۱۸۸۵ء ہی میں اپنے علم و فضل کی بدولت مدرسہ حقوق میں استاد تاریخ کی حیثیت سے فائز ہوچکا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں اسے "دستوری قانون" کی کرسی بھی دے دی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں "کرسی تاریخ" کی جگہ اسے "حقوق سیاسیہ" کی کرسی دے دی گئی۔ ۱۲ر ستمبر ۱۸۹۴ء کو باب عالی کا قانونی مشیر مقرر ہوا۔ یہاں وہ ۱۹۰۸ء تک رہا اور بہت شہرت حاصل کی۔ سلطان نے کئی بار سفارت پر بھی بھیجا۔ جب ۱۹۰۸ء میں دستوری حکومت قائم ہوئی تو اسے وزیر تعلیم مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ وزیر داخلہ بھی رہا۔ ۱۹۱۰ء میں اسے وزیر اور پھر وزیر اعظم، صدر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس نے خود کو عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے مثل قانون دان اور ماہر سیاسیات بھی ثابت کیا۔ اس عہدے پر وہ اکیس ماہ تک فائز رہا۔ اور ۲۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی کے اعلان جنگ پر مستعفی ہوگیا۔

حقی پاشا کی وزارت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ چیف آف سٹاف احمد عزت پاشا نے یمنی باغیوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں اور یمنی زیدیوں کے سردار امام یحییٰ سے صلح کا معاہدہ ہوگیا۔ جس کی بنیاد یمن کی مذہبی قانونی اور اقتصادی آزادی تھی۔ اس کے علاوہ ابراہیم مصنف کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ اس کی زیادہ تر تصانیف اصول قانون اور تاریخ پر ہیں۔ اس نے بین الاقوامی قانون کی تاریخ، مقدمہ اور تاریخ عمومی و اسلامی کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔

ابراہیم عثمانی (۱۲ر شوال ۱۰۲۴ھ / ۴ر نومبر ۱۶۱۵ء — رجب ۱۰۵۸ھ / ۸ر اگست ۱۶۴۸ء) ترکی کا اٹھارہواں عثمانی خلیفہ، سترہویں خلیفہ مراد رابع کا بھائی اور احمد اول کا سب سے چھوٹا بیٹا۔ عیش پرست اور کاہل حکمران ثابت ہوا۔ عنان حکومت اس کے وزیر قرہ مصطفےٰ کے ہاتھ میں رہی۔ ۳۱ر جنوری ۱۶۴۴ء کو قرہ مصطفےٰ قتل ہوگیا تو ملک کی حالت ابتر ہوگئی۔ رشوت اور بدنظمی نے ڈیرہ ڈال لیا۔ ۱۶۴۴ء میں ابراہیم نے وینس کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ مگر بار بار شکست کھائی۔ یہ جنگ ۲۵ سال تک جاری رہی۔ لیکن سلطان کی عیاشی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تو انھوں نے بغاوت کردی۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے پہلے اس کے وزیراعظم [illegible] احمد پاشا کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر ۲ر رجب ۱۰۵۸ھ / ۸ر اگست ۱۶۴۸ء کو ابراہیم کو تخت سے اتارا۔ چند روز بعد قید خانے میں جلاد نے اس کا کام تمام کردیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔

ابراہیم کے مختصر عہد حکومت میں دو اہم معرکے پیش آئے۔ ایک توازن کی مہم جو روسی قزاقوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ ۱۶۴۱ء میں ابراہیم نے اسے واپس لینے کے لیے فوج بھیجی۔ اس معرکے میں اسے کامیابی حاصل ہوئی اور دوسرے کریٹ کی مہم جو ۱۶۴۴ء میں وینس کی مہم کا حصہ تھی۔ اس میں بھی ترکوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور بالآخر محمد رابع کے عہد میں کریٹ کا جزیرہ سلطنت عثمانیہ میں داخل ہوگیا۔

ابراہیم لودھی ہندوستان میں لودھی [illegible] کا آخری فرمانروا، اپنے باپ سکندر کے انتقال کے بعد ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں تخت پر بیٹھا اور آگرہ میں کوئی نو سال حکومت کرنے کے بعد اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت [illegible] کے ہاتھوں مارا گیا۔

ابراہیم ایک نوجوان بادشاہ تھا۔ وزیروں سے مشورہ کئے بغیر [illegible] کرتا تھا۔ تند مزاج اور پر ہیبت شخص تھا۔ پہلے اپنے بھائی جلال [illegible] گیا۔ پھر اسے واپس بلا بھیجا۔ جلال الدین کو اپنے انجام کا علم تھا [illegible] گیا۔ ابراہیم نے اعظم ہمایوں شروانی کو فوج دے کر اسے گرفتار کرنے [illegible] مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور صوبجات متوسط میں گونڈوانہ چلا گیا [illegible] اسے پکڑ کر ابراہیم کے سامنے پیش کردیا جس نے اسے قتل کروا [illegible] کرنے پر اپنے دانشمند وزیر میاں بھورا کو بھی پہلے [illegible] اور پھر قتل کرا دیا۔ اعظم ہمایوں کو بھی کسی بات پر ناراض ہوکر قید کردیا۔ [illegible] نے بغاوت کی اور بابر کو مدد کے لئے بلا بھیجا جس نے [illegible] سرے سے خاتمہ کر ڈالا۔

ابراہیم متفرقہ ترکی میں طباعت کا موجد [illegible] ہنگری میں پیدا ہوا [illegible] آیا۔ بعد ازاں مسلمان ہوا اور عثمانی حکومت باب عالی کے [illegible] انجام دیتا رہا۔ ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۵ء کو وفات پائی۔ زیادہ تر شہرت طباعت [illegible] کی حیثیت سے ہے۔ ذی قعدہ ۱۱۳۹ھ / جولائی ۱۷۲۷ء کو [illegible] پہلا مطبع قائم کیا۔ اس مطبع کا پہلا کام قاموس وانقولی کی طباعت [illegible] ۱۱۴۱ھ / ۳۰ر جنوری ۱۷۲۹ء کو شائع ہوئی [illegible] اکتوبر ۱۷۴۲ء [illegible] مطبع [illegible] مگر چھ سال کے بعد شروع ہوا اور ۱۷۴۲ء کو پھر بند ہوگیا۔ اس عرصہ میں یہاں سے کل سترہ کتابیں شائع ہوئیں۔

ابرہہ یمن کا حبشی عیسائی حکمران جس نے صنعاء میں ایک عظیم [illegible]

تاکہ خانۂ کعبہ کی عظمت کم ہو اور لوگ اس گرجا کا حج کریں۔ مگر چونکہ اہلِ عرب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اس لیے اس نے مکہ پر چڑھائی کر دی۔ تاکہ خانۂ کعبہ کو گرا دے۔ ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں پر سوار تھا۔ اس لیے قرآن مجید میں اس کا ذکر اصحاب فیل کے نام سے سورۂ فیل میں آیا ہے۔ (دیکھیے "اصحاب فیل")

ابرہہ ایک بوزنطینی تاجر کا عیسائی غلام تھا۔ حبشہ کے بادشاہ کے مقرر کردہ حاکمِ یمن سمائفع کو قتل کرنے کے بعد تخت پر بیٹھا۔ بعد ازاں حاکم حبشہ کو خراج بھی ادا کرنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو عزیز (نائب السلطنت) کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اس کے ساتھ خود کو عتلی ملکن (جلالت الملک) بھی کہا کرتا تھا۔ اس نے ایران کے خلاف بھی مہمیں شروع کی تھیں۔ ۵۷۰ء میں اس نے کعبہ پر چڑھائی کی۔ جس میں ہاتھی بھی تھے۔ اس نے ہاتھی کو کعبہ کی طرف بڑھنے کے لیے ہانکا۔ لیکن وہ رک گیا اور آگے نہ بڑھا۔ بعد ازاں اصحاب فیل میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی اور ابرہہ ناکام و نامراد واپس لوٹ گیا۔ اس سال کو عرب میں "عام الفیل" کہا جاتا ہے۔

[illegible] میں ایک لونڈی کا نام بھی ابرہہ تھا۔ اسی نے ام حبیبہ کو آنحضرت رسول اکرم کی جانب سے نکاح کا پیغام پہنچایا تھا۔

ابشیہی بہاؤ الدین ابوالفتح محمد بن احمد بن منصور بن احمد بن عیسیٰ المحلی الشافعی مصری عالم (۷۹۰ھ/[illegible] – [illegible]) [illegible] قرآن حفظ کیا۔ ۸۱۴ھ/۱۴۱۲ء میں حج کیا [illegible] خطیب تھا [illegible] زبان [illegible] سے پاک شاعری بھی کیا کرتا تھا۔ [illegible] دو جلدوں [illegible] نامہ [illegible] فی المواعظ بھی ترتیب [illegible] تصنیف بھی کی تھا۔

ابلیس [illegible] ابو [illegible] عدو اللہ انکار کرنے والا ملعون رحمت [illegible] سے مایوس۔ وہ مخلوق جس نے آدمؑ کو تخلیق کے وقت سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

[illegible] جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ تو انھوں نے سجدہ کیا [illegible] ابلیس نے انکار کیا [illegible] اور وہ کافروں میں سے تھا۔ (البقرہ ۲: ۳۴)

ابلیس کا لفظ [illegible] سے نکلا ہے۔ ابلس اس غم کو کہتے ہیں، جو ناامیدی اور [illegible] سے [illegible]۔ [illegible] کا قول ہے کہ ابلیس وہ ہستی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے [illegible] سے دور کر دیا ہو۔

مفسرین کے نزدیک ابلیس فرشتوں کا سردار نہیں تھا۔ بلکہ جنوں میں سے تھا اور وہ آگ سے پیدا ہوا تھا۔ جبکہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے تھے۔ آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے پر وہ دربار خداوندی سے دھتکارا گیا۔ اور قیامت تک کے لیے اسے مہلت دی گئی۔ تب سے وہ آدمؑ اور اس کی اولاد کا دشمن بن گیا اور انھیں بدی کے لیے اکسانے لگا اسی وجہ سے اس کا نام شیطان پڑ گیا۔

قرآن مجید میں ابلیس کا ذکر سجدۂ آدمؑ کے ساتھ نو بار آیا ہے۔ طٰہٰ ۲۰: ۱۱۶، الحجر ۱۵: ۳۱، ۳۲، ص ۳۸: ۷۴، ۷۵، بنی اسرائیل ۱۷: ۶۱، الکہف ۱۸: ۵۰، الاعراف ۷: ۱۱، البقرہ ۲: ۳۴۔ اس کے علاوہ ذکر آیا ہے کہ ابلیس کے تمام تابع (ماننے والے) جہنم (دوزخ) میں پھینکے جائیں گے۔ (الشعراء ۲۶: ۹۵)

قرآن مجید میں آدمؑ کے مقابلے میں جہاں سجدہ نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں ابلیس کا لفظ استعمال ہوا ہے اور جہاں آدمؑ کی لغزش اور اسے ورغلانے کا ذکر ہے وہاں شیطان کا لفظ آیا ہے۔ بعض لوگ اس سے دو ہستیاں مراد لیتے ہیں۔ یعنی سجدے سے انکار کرنے والا ابلیس ہے اور بدی پر اکسانے والا شیطان ہے۔

گویا ابلیس ایک ایسے وجود کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا ہو اور جس سے نہ صرف بھلائی اور خیر کی امید نہ ہو بلکہ جو اپنے ساتھ شر رکھے، غم و اندوہ کا مارا ہوا افسوس کرتا پھرے اور حقائق الٰہیہ سے بے خبر ہو۔

سرسید کے بقول ابلیس ایک قوت واہمہ کا نام ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ مگر اکثر علماء اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ابلیس ایک خارجی وجود کا نام ہے، جو انسان کو مختلف حیلوں بہانوں سے ورغلاتا اور اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اس لیے اسے شیطان کہا گیا ہے۔ (نیز دیکھیے "شیطان")

ابن ابی جمہور محمد بن زین الدین ابی الحسن علی بن حسام الدین ابراہیم بن حسن بن ابراہیم بن ابی جمہور احسائی، شیعہ عالم، مجتہد، صوفی شیعی اور محدث ۸۷۹ھ/۱۴۷۵ء کو حج کے لیے گیا کرک نوح (شام) میں علی بن بلال کی شاگردی اختیار کی۔ قرأت کے سات طریقوں سے واقف تھا۔ آئین شیعی پر غور کرنے والوں میں سے تھا۔ اس نے تصوف اور فلسفہ میں علم کلام کے ذریعے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مزید برآں شیعی احادیث کی تدوین اور روایت کے طریقوں میں تسلسل پیدا کرنے کی سعی کی۔ مذہب امامیہ اور احادیث (فقہ) پر اس کی سو دو ستر کتابیں موجود ہیں۔

ابن ابی حدید (یکم ذی الحجہ ۵۸۶ھ/۳۰ دسمبر ۱۱۹۰ء – جمادی الآخر ۶۵۶ھ/جون ۱۲۵۸ء) مشہور کتابوں "شرح نہج البلاغت" اور الفلک الدائر علی المثل سائر" کا مصنف ادیب اور فقیہہ۔ بغداد کے کتب خانوں میں کاتب کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل محافظ دفتر (کاتب السلطنۃ) کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس کے دو بھائی موفق الدین اور ابوالبرکات محمد القاضی بھی مشہور کاتب اور ادیب تھے۔ امام رازی کی تین کتابوں "المحصل"، "المحصول" اور "الاربعین" کا رد لکھا حضرت علیؓ کے کلام "نہج البلاغت" کا دلدادہ تھا۔ اس کی شرح لکھی اور اس میں سے پیش گوئیاں تلاش کیں۔ یہ شرح ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء کی تصنیف ہے۔ اور بھی کئی تصانیف ہیں۔ جن میں سے "الفلک الدائر" ضیاء الدین ابن اثیر (۵۸۰ھ تا ۶۳۷ھ/۱۱۹۱ء تا ۱۲۳۹ء) کی تصنیف "المثل السائر" کا جواب ہے۔ ضیاء الدین نے عرب کے مشاہیر اہل قلم پر زبردست تنقید کی تھی۔ ابی حدید کی کتاب کا ایک جواب صلاح الدین الصفدی (۶۹۶ تا ۷۶۴ھ/۱۲۹۶ء تا ۱۳۶۳ء) نے بھی لکھا۔ اور چند اور لوگوں نے بھی ابی حدید کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ ابی حدید کے سات قصیدے بھی مشہور ہیں۔

ابن ابی زید قیروانی (۳۱۰ھ/۹۲۲ء – ۳۰ شعبان ۳۸۶ھ/۱۲ ستمبر ۹۹۶ء) مالکی فقیہہ اور عالم، قیروان میں رہے۔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اصول فقہ وضاحت کے ساتھ بیان کیے۔ اسی لیے مالکِ اصغر کہلاتے ہیں اور دین میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں سے "الرسالہ" (مالکی اصول فقہ کا خلاصہ) احادیث کا ایک مجموعہ اور ایک لغت اب تک باقی ہیں۔

ابن اثیر تین بھائی مجد الدین، عزالدین اور ضیاء الدین۔ جن میں سے منجھلا بھائی عزالدین ابن الاثیر کے نام سے بطور مورخ مشہور رہے۔ اور اکثر حوالوں میں آتا ہے۔

بڑا بھائی مجدالدین بن محمد ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء کو جزیرہ ابن عمر میں پیدا ہوا اور موصل میں ۳۰ ذی الحجہ ۶۰۶ھ/۲۶ جون ۱۲۱۰ء کو انتقال کر گیا۔ تفسیر، فقہ اور حدیث کا عالم تھا۔ چند کتابوں کا مصنف بھی تھا۔

دوسرا بھائی عزالدین ابوالحسن علی بن محمد الکامل فی التاریخ" (تاریخ کامل) کا مصنف تھا۔ جزیرہ ابن عمر میں ۴ جمادی الاوّل ۵۵۵ھ/۱۲ مئی ۱۱۶۰ء کو پیدا ہوا۔ اور موصل میں شعبان ۶۳۰ھ/مئی ۱۲۳۳ء میں انتقال کر گیا۔ تعلیم موصل میں حاصل کی۔ پھر بغداد اور شام کے سفر کئے۔ والیٔ موصل کی طرف سے سفیر بن کر بغداد گیا۔ یہیں اپنی کتابیں مکمل کیں۔ نومبر ۱۲۲۹ء میں ابن خلکان سے ملاقات ہوئی۔ "تاریخ کامل" بارہ جلدوں میں ہے، جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر ۶۲۸ھ/۱۲۳۱ء تک واقعات پر ختم ہوتی ہے۔ مستشرقین اس تاریخ کے بڑے مداح ہیں براؤن اسے دنیا کی تمام تاریخوں میں ممتاز قرار دیتا ہے۔

تیسرا بھائی ضیاءالدین ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء کو پیدا ہوا اور جمادی الآخر ۶۳۷ھ دسمبر ۱۲۳۹ء کو انتقال کر گیا۔ صاحب اسلوب ادیب اور نقاد تھا۔ اپنی کتاب "المثل السائر" کی وجہ سے مشہور ہوا۔ جس کا ردّ ابن ابی الحدید نے لکھا اور جس کی حمایت میں صلاح الدین الصفدی نے بھی ایک کتاب لکھی۔ عربی ادب کے بارے میں مستند سمجھی جاتی ہے۔

ابن اسحاق

(۸۵ھ/۷۰۴ء - ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) ابوعبداللہ محمد بن اسحاق بن یسار، مورخ، محدث، تابعی مدینہ میں پیدا ہوا۔ حدیثیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ مالک بن انس کی مخالفت کی وجہ سے ترک وطن کر کے مصر جانا پڑا۔ وہاں سے عراق کا رُخ اختیار کیا۔ پھر خلیفہ المنصور کے بلاوے پر بغداد آنا پڑا یہیں انتقال ہوا اور امام ابوحنیفہؒ کی قبر کے پاس مدفن ہوا۔ ہجرت تک کی سیرت نبوی کا مواد دو جلدوں میں "المبتدار" کے نام سے جمع کیا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب "الخلفاء" کے نام سے مشہور ہے۔

ابن اللہ

اللہ کا بیٹا (نعوذ باللہ) عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب۔ یہودی اور عیسائی خود کو بھی ابن اللہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا، وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اسی کا ہے، سب اس کے فرمانبردار ہیں۔" (البقرہ = ۱۱۶)

"اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں، ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں۔ کہہ دو پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے وہ تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم انھی انسانوں میں سے ہو جنھیں اس نے پیدا کیا۔۔۔ الخ" (المائدہ = ۱۸)

قرآن مجید اس عیسائی عقیدہ کی تردید کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اللہ تعالےٰ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ نہ تو اسے کسی نے جنا ہے اور نہ اس نے کسی کو جنا ہے۔ سورہ اخلاص اسی مضمون کو بیان کرتی ہے۔ اگر خدا کا کوئی بیٹا ہوتا تو عیسائی عقیدے ہی کے مطابق وہ اس کی خدائی میں شریک نہ ہو سکتا اور وہ بھی بہر حال مخلوق ہی ہوتا، پابند اور مجبور محض۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی ذات اس طرح کے رشتوں ناطوں سے پاک ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

"اگر اللہ چاہتا کہ بیٹا بنائے تو وہ مخلوق میں سے جسے چاہتا چن لیتا، وہ اللہ تو بے عیب ذات ہے، اکیلا سب کے اوپر ہے۔" (الزمر = ۴)

بعض مفسرین اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ابن اللہ یا ولد اللہ کا لفظ محض مجازی معنوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی صفات اپنے اندر سمو لیتے ہیں، وہ ایک گونہ مشابہت میں اللہ کے بیٹے ہی بن جاتے ہیں۔ ان مفسرین کا بیان سراسر غلط اور علم المعانی سے نابلد ہونے کی وجہ سے ہے۔ جدید دور میں ہر لفظ کا معنی محدود کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اب بیٹے یا ابن کا لفظ صرف اسی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں اللہ تعالےٰ اولاد سے پاک اور منزّہ ذات ہے۔

ابن الہیثم

(۳۵۴ھ/۹۶۵ء - ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء) ابو علی الحسن ابن الحسن ابن الہیثم یورپ میں ال ہیزن (ALHAZEN) کے نام سے مشہور ہے۔ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا مسلمان سائنسدان، ماہر فلکیات، ریاضی دان اور طبیب، بصرے میں پیدا ہوا اور علوم طب و فلسفہ و ریاضی میں کمال حاصل کیا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ الحاکم نے اس کی شہرت سے متاثر ہو کر اسے مصر بلایا تاکہ اسوان کے قریب دریائے نیل پر ایک بند بنانے کا منصوبہ تیار کرے۔ لیکن وہ یہ کام کسی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ خلیفہ کے سامنے اس نے دماغ کی خرابی کا بہانہ کئے رکھا۔ الحاکم کے انتقال کے بعد اس نے اپنی تصانیف کی طرف توجہ دی۔ اور علم ہیئت اور علم نور پر بنیادی سائنسی تحقیقات پیش کیں۔ اس لحاظ سے اسے بطلیموس ثانی کہا جاتا ہے۔

ابن الہیثم

ابن الہیثم کی تصانیف کی تعداد دو سو سے اوپر ہے۔ ان میں سے "المناظر" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس میں اس نے روشنی کی حقیقت پر سب سے پہلے صحیح خطوط پر کام کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ چیزیں اس لئے نظر آتی ہیں کہ ان کا عکس آنکھ کے پردے شبکیہ پر پڑتا ہے۔ روشنی جس زاویے سے آ رہی ہو کسی آئینے سے ٹکرا کر دوسری طرف اسی زاویے پر منعکس ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک شفق کی ابتدا اور انتہا اس وقت ہوتی ہے، جب سورج افق سے ۱۹ درجے نیچے ہو۔ نیز اس نے گرہن کی

صحیح صحیح توجیہ کی اور عدسہ کی قوت پر تحقیقات کیں۔ روشنی کے متعلق ابن الہیثم نے جو نظریات پیش کیے تھے، کم و بیش آج بھی صحیح مانے جاتے ہیں۔ اس کا یہ کہنا کہ روشنی ایک طرح کی توانائی ہے۔ آج بھی صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ نیز وہ اشیاء جن پر روشنی پڑتی ہے، تین طرح کی ہوتی ہیں۔ (۱) شفاف (۲) غیر شفاف (۳) نیم شفاف وغیرہ

ابن الہیثم کی دوسری اہم تصانیف "النور" "منظر شفق" اور "میزان الحکمت" ہیں۔ ان میں اس نے روشنی کی ماہیت، خلا کے وجود، اور نظریہ کشش ثقل پر بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہوا زمین سے دس میل کی بلندی تک موجود ہے اور اشیاء کا وزن لطیف اور کثیف فضاؤں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

ابن ام مکتوم (م ؟ / وفات ۱۵ھ/ ۶۳۶ء) نابینا صحابی، عبداللہ یا عمرو بن قیس نام تھا، مگر اپنی کنیت ابن اُم مکتوم کے نام سے مشہور تھے۔ مکہ ہی میں ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کر لیا۔ ایک بار حضور اکرمؐ قریش کے لوگوں کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتوم آ گئے۔ وہ حضورؐ سے کچھ عرض کرنا چاہتے تھے، مگر آپؐ شاید اس قدر منہمک تھے کہ توجہ نہ دے سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ عبس کی آیات نازل کیں۔ جس کے الفاظ اس طرح شروع ہوتے ہیں "تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا اس بات سے کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تجھے کیا خبر کہ شاید وہ پاکیزگی اختیار کرے۔" (دیکھیے عبس، سورۃ)

ان آیات کے نزول کے بعد حضرت رسول اکرمؐ ابن مکتوم کا خاص طور پر لحاظ فرماتے تھے۔ مدینہ منورہ آ جانے کے بعد انہیں مؤذن اور امام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ قرآن مجید کے حافظ اور قاری تھے۔ مدینے کے کئی لوگوں کو قرأت سکھاتے تھے۔ ابن بکار کے بقول جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے اور واقدی کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

ابن باجہ (وفات ۵۳۳ھ/ ۱۱۳۸ء) ابوبکر محمد بن یحییٰ، فلسفی، سائنسدان، طبیب اور اہل قلم۔ پانچویں صدی ہجری گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں سرقسطہ میں پیدا ہوا۔ حصول علم کے بعد سرقسطہ کے حاکم ابوبکر بن ابراہیم کا وزیر رہا۔ بعد ازاں ابوبکر بن یوسف تاشفین کی وزارت میں بھی رہا۔ جوانی ہی میں زہر دے دیا گیا جس سے موت واقع ہو گئی۔

سیوطی نے ابن باجہ کو فلسفے میں مغرب کا ابن سینا کہا ہے فلسفے اور منطق پر اسے پورا عبور حاصل تھا۔ اس کے علم و فضل کا اعتراف خود اسے کافر کہنے والوں نے بھی کیا ہے۔ فلسفے میں اس کا زیادہ تر انحصار فارابی اور ارسطو پر ہے۔ اس میں بھی وہ طبیعات ہی کو بنیاد بناتا ہے۔ گویا ایک طرح سے وہ عقلیت پسند مفکرین میں سے ہے

ابن باجہ تصوف کا مخالف اور عقل پرست متکلمین میں سے تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی تصانیف میں قرآن مجید اور احادیث کی طرف برابر رجوع کیا ہے اور یونانی طرز فکر پر اسلامی احکامات کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہی وہ شخص ہے جس کے بعد ابن طفیل اور ابن رشد نے پورے طور سے عقل پرستی کا اعلان کر دیا جن کے خلاف امام غزالی کو قلمی جہاد کرنا پڑا۔

ابن باجہ کی اہم تصانیف میں "تدبیر المتوحد"، "الاتصال"، "الوداع" اور "کتاب النفس" بے حد مشہور ہیں۔ قرون وسطیٰ میں یہ کتابیں مغرب میں عام پڑھی جاتی تھیں۔ ان کا مغربی مصنفین اور مفکرین پر گہرا اثر ملتا ہے۔ خصوصاً مغرب میں مذہب اور سائنس کی جنگ کی بنا انہی کتابوں کی وجہ سے پڑی۔

ابن بطوطہ (۱۴ رجب ۷۰۳ھ/ ۲۴ فروری ۱۳۰۴ء - ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء) ابو عبداللہ، شرف الدین محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابراہیم، افریقہ، ایشیا اور یورپ کے اکثر علاقوں کی سیاحت کرنے والا عظیم مسلمان سیاح اور جغرافیہ دان مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔

ابھی بائیس برس کا تھا کہ جون ۱۳۲۵ء میں حج کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ قافلے والوں نے اس کے زہد و تقویٰ کے باعث اُسے اپنا قاضی مقرر کر لیا۔ اس قافلہ کی راہ سکندریہ اور قاہرہ سے ہوتی ہوئی جدہ کی جانب تھی۔ سکندریہ میں ابن بطوطہ کی ملاقات برہان الدین سے ہوئی۔ جس نے اس کے دل میں چین اور ہندوستان کی سیاحت کا شوق پیدا کر دیا۔ بحیرہ احمر کو عبور کرنے کا کوئی انتظام نہ پا کر اسے شام کے بالائی علاقوں سے ہو کر مکہ آنا پڑا۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد ابن بطوطہ معلومہ دنیا کے اس عظیم سفر پر نکل کھڑا ہوا جس کی روداد آج بھی علمائے تاریخ و ادب کے لیے ماخذوں کے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابن بطوطہ کا اگلا سفر عراق اور فارس کے لیے تھا۔ موصل اور دیار بکر سے ہوتا ہوا وہ ایک بار پھر مکہ واپس آیا۔ اور حج کے بعد دو برس تک یہیں مقیم رہا۔ ۱۳۳۰ء میں جنوبی عرب، یمن اور عدن سے ہوتا ہوا، جنوبی افریقہ، عباسیہ اور مشرقی افریقہ تک گیا واپسی میں عمان اور ہرمز کی طرف آنکلا اور یہاں سے تیسری بار حج کے لیے مکہ کو روانہ ہوا

ابن بطوطہ کا چوتھا سفر مصر اور شام کے راستے ایشیائے کوچک (ترکی) کے لیے تھا۔ ان تمام جگہوں پر ہمیشہ اس کی عزت افزائی ہوئی۔ عام طور پر وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے رہتا۔ ایشیائے کوچک میں اس کی ملاقات سلطان محمد سے ہوئی۔ اور وہ اس کی بیوی کے جلو میں قسطنطنیہ پہنچا وہاں قیصر سوم سے ملاقات ہوئی۔ پھر ہندوستان جانے کے لیے دریائے دولگا سے گذر کر خوارزم بخارا اور خراسان ہوتا ہوا وہ ربیع الثانی ۷۳۴ھ/ ستمبر ۱۳۳۳ء میں کوہ ہندوکش کے راستے ہندوستان وارد ہوا دہلی میں محمد تغلق نے اس کی آؤ بھگت کی اور حنفی مسلک کا قاضی مقرر کیا۔ اگلے دو برس تک ابن بطوطہ نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی سیر کی اور یہاں کے رسم و رواج کا بغور مطالعہ کیا۔ ۱۳۴۲ء میں اسے ایک سفارت کے ہمراہ چین بھیجا گیا۔ مگر وہ صرف ساحل مالابار تک پہنچ سکا جزائر مال دیپ کے سلطان نے بھی اسے ایک بار پھر قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ یہاں ایک برس رہنے کے بعد وہ لنکا پہنچا۔ جہاں مشہور چوٹی آدم کی چوٹی پر بھی چڑھا۔ (دیکھیے۔ "آدم کی چوٹی")

۱۳۴۵ء میں ابن بطوطہ لنکا سے بنگال، سلہٹ اور کمبوڈیا کے راستے پیکنگ اور کینٹن کی طرف بھی گیا تھا۔

واپسی پر سماٹرا، مالابار، ظفار، عمان، جنوبی فارس اور بغداد سے ہوتا ہوا ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء میں وہ چوتھی بار حج کے لیے مکہ پہنچا۔ بغداد میں اُسے علم ہوا کہ پندرہ برس ہوئے اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ البتہ والدہ ابھی زندہ ہے۔ چنانچہ وہ شام اور مصر کے راستے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اور ۲۵ شعبان ۷۵۰ھ/ ۸ نومبر ۱۳۴۹ء میں چوبیس برس کے بعد طنجہ پہنچے۔

۷۵۴ھ/ ۱۳۵۲ء میں ابن بطوطہ اپنے آخری اور طویل تر سفر پر روانہ ہوا۔ تیونس، الجزائر اور نائیجیریا کے علاقوں سے ہوتا ہوا وہ ٹمبکٹو، مالی، اگدیز اور گوگو کے سبزہ زاروں اور جنگلوں کی سیر کرتا ہوا ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۴ء میں واپس مراکش پہنچ گیا۔ یوں اس کا یہ اٹھائیس سالہ طوفانی سفر ختم ہوا، جس میں اس نے مجموعی طور پر ۷۵ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا۔

فاس (مراکش) کے حکمران ابو عنان نے اسے آپ بیتی لکھنے کا حکم دیا۔ تو اس نے ابن

جزی، محمد بن محمد بن جزی، کو اپنے سفر کے احوال قلم بند کروائے۔ یہ آج "سفرنامہ ابن بطوطہ" کے نام سے ملتا ہے۔ اس کا ایک انگریزی ترجمہ (تلخیص) ۱۸۲۹ء میں ڈاکٹر سموئیل لی نے شائع کرایا۔ مکمل متن کی پہلی جلد پروفیسر گب نے ۱۹۵۸ء میں کیمبرج سے شائع کی اردو میں سب سے پہلے ڈاکٹر مولوی نازش علی نے سموئیل لی کے ترجمے سے اس کا ترجمہ کیا۔ پھر ۱۸۹۸ء میں محمد حسین نے لاہور سے اس کی جلد دوم کا ترجمہ شائع کیا۔ پہلی جلد کا ترجمہ محمد حیات الحسن نے ۱۸۹۷ء میں کیا تھا، جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

فاس میں ابن بطوطہ نے اپنے باقیماندہ ایام بطور قاضی گذارے اس کا کاتب ابن جزی اس سے پہلے ہی ۱۳۵۶ء میں فوت ہو گیا تھا۔ ابن بطوطہ کی وفات مراکش ہی میں ہوئی۔

ابن بیطار

(وفات ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) مسلمان سائنسدان، ماہر نباتات

مالقہ کے ابن بیطار خاندان میں چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ علم نباتات کے مطالعہ کی غرض سے افریقہ کے اکثر ممالک کی سیر کی۔ مصر میں الملک الکامل کی ملازمت اختیار کی۔ اس نے افسر ماہرین نباتات مقرر کیا۔ اس کے بیٹے الملک الصالح کے عہد میں بھی اسی عہدہ پر دمشق میں کام کیا۔ اس دوران میں جڑی بوٹیوں اور ادویہ پر تحقیقات کیں۔ ابن ابی

ابن بیطار - ماہر نباتات

اصیبعہ اسی کا شاگرد تھا۔ اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس کے ساتھ جایا کرتا تھا ابن بیطار کی دو کتابیں "کتاب الجامع فی الادویہ المفردہ" جس میں قدرتی ادویہ کے نسخے اور خواص حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہیں اور "المغنی فی العلاج بالادویہ المفردہ" ادویہ کے خواص پر زیادہ مشہور ہیں۔

ابن تومرت

(۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء - ۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء) مراکش کا ایک مصلح

جو امام مہدی ہونے کا دعویدار تھا۔ اس کے پیروکار الموحد کہلاتے تھے۔ باپ کا نام عبداللہ تھا۔ جو بربر قبیلے کا ایک سردار تھا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ یہ خاندان اپنی دینداری کے لیے مشہور تھا۔ ابن تومرت کو بچپن ہی سے تحصیل علم کا شوق تھا۔ مسجدوں میں جا کر بڑے شوق سے موم بتیاں جلانا اس کا مشغلہ تھا۔ بعدازاں وہ مشرق کی طرف سیر یا طلب علم کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس دور میں مغرب اور اندلس پر المرابطون کا خاندان حکمران تھا۔ امام مالک کی تعلیمات اس علاقے میں رائج تھیں۔ الغزالی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ ان حالات میں ابن تومرت نے الغزالی اور ابن حزم کی تعلیمات سے اثر لیا۔ چنانچہ اس نے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔

اپنے سفر کا آغاز اندلس سے کر کے وہ سکندریہ کے راستے دمشق تک پہنچا اور واپسی پر طرابلس میں تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہیں اسے عبدالمومن ملا۔ جس نے اس کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ اپنی تبلیغ کے اصولوں میں وہ شدت پسند ہو گیا بعدازاں اس نے مہدی ہونے کا دعوے بھی کر دیا۔ اپنے پیروکاروں کو منظم کرنے کے بعد اس نے تینمال شہر پر قبضہ کر کے حکومت قائم کر لی۔ ارد گرد کے قبائل اس کے پیروکار بن گئے جو الموحدون کہلائے۔ بعدازاں اس نے المرابطون کے ساتھ بھی جنگ کی جس میں شکست کھائی۔ اس کے انتقال کے بعد عبدالمومن نے اس کی تحریک جاری رکھی۔ مگر اس میں وہ زور شور نہ رہا، جو ابن تومرت جیسے ذہین اور چالاک آدمی کا مرہون منت تھا۔

ابن تیمیہ، امام

(۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ/۲۳ جنوری ۱۲۶۳ء - ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ/۲۶ ستمبر ۱۳۲۸ء) تقی الدین ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم بن مجدالدین عبدالسلام بن عبداللہ بن الخضر، بن محمد بن الخضر، بن علی بن عبداللہ بن تیمیہ الحرانی الحنبلی، عالم دین، فقیہہ اور مجدد، علما فضلا کے خاندان میں حران میں پیدا ہوئے۔ بیس ہی برس میں قرآن، فقہ اور مناظرہ و استدلال میں مہارت پیدا کر لی اور بڑے علماء میں شمار ہونے لگے۔ ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء میں حج کیا۔

یہ وہ دور تھا جب اسلام میں فرقوں کی بہتات ہو چکی تھی۔ بدعات عام تھیں۔ رسومات قبر پرستی اور پیر پرستی اپنے جوبن پر تھیں۔ مسلمان اسلام کی صحیح تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔ ابن تیمیہ نے ان تمام باطل عقائد کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کیا مخالفین نے آپ کو بہت اذیتیں دیں۔ کفر و الحاد کے فتوے لگائے اور حکمرانوں کے کان بھر کر قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا

۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء سے آپ حنبلی فقہ کے استاد تھے۔ ۶۹۸ھ/۱۲۹۹ء کو شافعی علماء کی مخالفت کی وجہ سے اس عہدے سے برطرف ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے مختلف فرقوں اور ان کی تعلیمات کے خلاف عملی و قلمی جہاد شروع کیا۔ ۱۸ شوال ۷۰۷ھ کو انھیں قاہرہ کے سلطان کے حکم سے حارۃ الدیلم میں قید کر دیا گیا ڈیڑھ دو برس کی قید کے بعد سلطان الناصر نے اپنے مدرسے میں ان کا تقرر کر دیا۔ ۷۱۲ھ میں دوبارہ دمشق پہنچے اور پھر سے مدرس کی جگہ سنبھال لی۔ رجب ۷۲۰ھ/اگست ۱۳۲۰ء کو طلاق کی قسم پر فتوی دینے سے باز نہ رہنے پر چھ ماہ کے لیے قید کر دیا گیا۔ شعبان ۷۲۶ھ/جولائی ۱۳۲۶ء میں ایک بار پھر قبر پرستی کے فتوے کے جرم میں قید کر دیا گیا۔ قید کے دوران میں انھوں نے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ دشمنوں کو یہ بھی پسند نہ آیا اور انھیں کتابوں، کاغذوں اور روشنائی وغیرہ سے محروم کر دیا۔ اس صدمے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھا دنیا کے ہر گوشے میں ان کے لیے نماز جنازہ پڑھی گئی۔

ابن تیمیہ قرآن و حدیث کی لفظی تفسیر کرتے تھے۔ خصوصاً خدا تعالے کی تجسیم کا نظریہ ان

کے ذہن میں راسخ تھا۔ اگرچہ امام حنبل کے پیروکار تھے۔ مگر خود کو مجتہد کہتے تھے۔ بہت سے مسائل میں فقہا سے اختلاف رکھتے تھے۔ صحابہ کرام کا ادب کرتے مگر انھیں معصوم قرار دینے میں دوسروں کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ خیال کہ صحابہ کرام محض سادہ ایمان و عقائد رکھتے تھے، انھیں تدبر و تفکر سے عاری قرار دینا ہے۔ دراصل صحابہؓ کو خود رسولؐ نے حقانیت کا سبق دے رکھا تھا۔ اس لیے وہ شک و شبہ میں مبتلا نہ ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک صوفیا اور متکلمین ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔

ابن تیمیہ کا اصول استدلال قرآن مجید کو اپنا ماخذ بناتا۔ اس کے بعد سنت و حدیث سے استنباط کیا جاتا۔ پھر روایت کے طریقے پرکھتے اور بعدازاں اصحابہ اور آئمہ کرام کے طریق سے اسے جانچتے۔

ابن تیمیہ شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ کے اشعار "البدایہ"، "فتاوی حلبیہ" اور "طبقات سبکی" میں موجود ہیں۔ یہ شاعری ان کے لیے کبھی بھی باعث افتخار نہیں تھی۔

اکثر علما نے ابن تیمیہ کو کافر اور ملحد قرار دیا ہے۔ بعض انھیں راہ راست سے بھٹکا ہوا سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ابن بطوطہ، عبدالوہاب، تقی الدین سبکی اور ابو حیان النحاسی کے نزدیک انھیں شیخ الاسلام کہنے والا بھی کفر کے دائرے میں داخل ہے۔ تاہم ان کی تعریف اور پیروی کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ ان کے شاگرد ابن قیم الجوزیہ نے ان کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلایا۔ ابن قدامہ، محمود آلوسی، محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ ولی اللہ، ابوالکلام آزاد اور باقی آگاہ ابن تیمیہ ہی کی تعلیمات اور تصانیف کے زیر اثر ملت اسلامیہ کی سعادت اور احیاء کے لیے کوشاں رہے۔

ابن تیمیہ نے تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، لغت، فلکیات، الجبرا، ریاضی، علوم عقلی و نقلی اور تقابل ادیان کے موضوعات پر پانچ سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ غلام جیلانی برق نے "ابن تیمیہ" میں ۲۰۰ کتب کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے دیئے ہیں۔ براکلمان نے ۵۳ محفوظ کتابوں کی فہرست دی ہے۔ "دائرۃ المعارف اسلامیہ" میں ۹۵ کتابوں کے نام درج ہیں۔

ابن جزری (۲۵ رمضان ۷۵۱ھ/۳۰ نومبر ۱۳۵۰ء – ۹ ربیع الاول ۸۳۳ھ/ ۲ دسمبر ۱۴۲۹ء) شمس الدین ابوالخیر محمد بن محمد۔ عالم دین تھا اور علم قرأت پر سند تھا۔ دمشق میں پیدا ہوا۔ جزیرہ ابن عمر کی طرف نسبت کی وجہ سے ابن جزری کہلایا۔ ۷۶۸ھ/۱۳۶۷ء میں مختلف قرأتوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اسی سال حج کر کے قاہرہ کا رخ اختیار کیا۔ ۷۷۴ھ/۱۳۷۳ء میں ابوالفدا اسماعیل بن کثیر کی طرف سے فتویٰ دینے کی اجازت ملی۔ ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء دمشق میں قضا کے عہدے پر مقرر ہوا۔ پانچ سال بعد سلطان بایزید کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں تیمور نے اسے سمرقند بھجوا دیا جہاں وہ درس عام دیتا رہا۔ بعدازاں خراسان، ہرات، اصفہان اور شیراز سے ہوتا ہوا مصر کے راستے مکہ اور مدینہ گیا۔ چند سال بعد شیراز لوٹ آیا اور وہیں انتقال کیا۔ "دائرۃ المعارف اسلامیہ" میں اس کی اکیس کتابوں کے نام دیئے گئے ہیں۔

ابن جماعت علما کے ایک خاندان کا نام۔ (۱) بدرالدین ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم (۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء – ۲۱ جمادی الاول ۷۳۳ھ/ ۸ فروری ۱۳۳۳ء) عرب فقیہہ۔ امام شافعی کے مزار کے پاس دفن ہوا۔ دمشق میں مدرس اور قاضی القضاہ رہا۔ آئینی قانون پر اس کی اہم تصنیف "تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام" ہے۔

(۲) ابو عمر عبدالعزیز، عز الدین، بدرالدین کا بیٹا (محرم ۶۹۴ھ/نومبر ۱۲۹۴ء – ۷۶۵ھ/ ۱۳۶۴ء) دمشق میں قاضی اور قاہرہ میں مدرس رہا۔

(۳) ابراہیم بن عبدالرحمان، بدرالدین کا پوتا (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء – ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) قاہرہ اور دمشق میں قاضی اور مدرس رہا۔

(۴) ابو عبداللہ محمد، عز الدین کا پوتا (۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء – ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء) قاہرہ میں طبیب اور مدرس رہا۔ تصانیف کی کافی تعداد ہے۔ ایک خودنوشت سوانح عمری بھی ہے۔

ابن جوزی (۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء – ۵۹۰ھ/۱۲۰۰ء) عبدالرحمان بن علی بن محمد ابوالفرج جمال الدین القرشی البکری الحنبلی، محدث اور مورخ۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا۔ تقریباً اسی اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ یہ گویا ان کے نزدیک بدرجہ عبادت تھی۔ وعظ و تذکیر کو پیشہ بنایا۔ اکثر خلفا ان پر بے حد مہربان رہے۔ ۵۷۰ھ میں بغداد کے درب دینار میں ایک مدرسے کی بنا رکھی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں انھوں نے اپنے سلسلہ مواعظ میں قرآن مجید کی تفسیر مکمل کی۔ اس لحاظ سے وہ عالم اسلام کے پہلے مفسر ہیں۔ ان کی محفلوں میں اکثر اوقات دس دس ہزار سے زیادہ لوگ جمع ہوتے تھے۔ یہ ان کی تاثیر وعظ ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک لاکھ سے زائد آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیس ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ آخری عمر میں حضرت عبدالقادر جیلانی کو نہ ماننے اور ان کے صاحبزادے کے ساتھ مخالفت کی وجہ سے شہر واسط میں قید کر دیئے گئے۔ پانچ سال بعد انہیں رہا کیا گیا جس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بغداد میں انتقال کر گئے۔

ابن جوزی کی تصانیف کی فہرست ابن رجب نے "ذیل طبقات الحنابلہ" میں دی ہے۔ یہ کوئی ساڑھے تین سو سے زائد تصانیف ہیں۔ ان میں مشہور ترین کتاب "المنتظم فی تاریخ الملوک والامم" ہے۔ یہ اس زمانے کے سلجوقیوں اور عباسیوں کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ دوسری اہم کتابیں "تلبیس ابلیس"، "کتاب القصاص والمذکرین"، "کتاب الیاقوتہ"، "کتاب عجب الخطب" اور "النطق المفہوم" وغیرہ ہیں۔ انہوں نے امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کو ضعیف احادیث سے پاک کر کے ایک نسخہ بھی مرتب کیا تھا۔

ابن جوزی حنبلی مسلک کے بڑے سخت حامی تھے۔ بدعتیوں کے ساتھ اتنی سختی کرتے کہ اکثر اوقات ان کے احباب کو فتنے کا خدشہ پیدا ہو جاتا۔ عربی ادب میں خطیب اور واعظ کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کثرت تصانیف بھی ایک طرح سے ان کی خوبیوں میں شامل ہے۔

ابن حجر العسقلانی (۱۲ شعبان ۷۷۳ھ/۱۸ فروری ۱۳۷۲ء – ۱۸ ذی الحجہ ۸۵۲ھ/ ۱۲ فروری ۱۴۴۹ء) ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد الکنانی العسقلانی المصری القاہری، شافعی مذہب کے مستند فقیہہ، محدث اور مورخ، قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ ایک تاجر زکی الدین الخروبی نے ان کی پرورش کی۔ نو ہی برس میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس دور کے مشہور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مسلسل دس برس تک زین الدین العراقی سے حدیث پڑھی۔ محرم ۸۲۷ھ/ دسمبر ۱۴۲۳ء کو قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور تقریباً اکیس برس تک اس عہدے کے ساتھ ساتھ تدریس و وعظ کا سلسلہ جاری رکھا۔

ابن حجر حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے، ان کی کتاب "فتح الباری فی شرح البخاری" خاصی مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ "دائرۃ المعارف اسلامیہ" میں بیس کے قریب کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

ابن حزم (۳۰ رمضان ۳۸۴ھ/ ۷ نومبر ۹۹۴ء – ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ/ ۱۵ اگست ۱۰۶۴ء) ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم، اندلس کا عالم دین، فقیہہ، مورخ اور

شاعر، قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس لیے قرطبی بھی کہلاتا ہے۔ باپ منصور الحاجب اور اس کے بیٹے مظفر کا وزیر تھا۔ چنانچہ ابن حزم نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ والد کے انتقال (۴۰۲ھ) کے بعد قرطبہ کو چھوڑ کر المریہ میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کے والی خیران العامری نے انھیں اپنے خلاف سازش کے شبہ میں پہلے تو قید رکھا اور پھر جلاوطن کر دیا۔ جب عبدالرحمان الرابع المرتضےٰ نے خلافت کا اعلان کیا تو ابن حزم اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ غرناطہ کے محاذ پر اسے دشمنوں نے قید کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد رہائی ملی تو قرطبہ واپس چلا آیا۔ پانچ سال یہاں رہنے کے بعد اسے ایک بار پھر حکومت میں وزارت کا عہدہ ملا۔ عبدالرحمان الخامس نے رمضان ۴۱۴ھ/دسمبر ۱۰۲۳ء میں اقتدار سنبھالا اور اپنے دوست ابن حزم کو وزیر مقرر کر دیا۔ مگر دو ہی ماہ بعد عبدالرحمان قتل ہو گیا اور ابن حزم کو قید خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ معلوم نہیں وہ کب تک قید رہا لیکن اتنا ضرور علم ہے کہ اس کے بعد اس نے علم و ادب کی طرف توجہ دی اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ وہ اکثر مناظرے پر تلا رہتا۔ اس لیے بہت سے علما اس کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ اسے اپنی خاندانی جاگیر منت لیشم میں جاگزیں ہونا پڑا۔ یہیں پر اس کا انتقال ہوا۔

ابن حزم کی تصانیف کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ شاگردوں کا ایک مختصر حلقہ بھی تھا۔ بیٹوں میں سے ابورافع الفضل، ابو اسامہ یعقوب اور ابوسلیمان المصعب کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں بہت سے علمائے ابن حزم سے استفادہ کیا۔ ابن عربی نے بھی اس کی کتابوں کی اشاعت کی۔

ابن حزم کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر قرطبہ میں سیویل گال کے قریب ۲۱ مئی ۱۹۶۳ء کو کانسی سے بنا ہوا ایک مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ یہ مجسمہ اس کی نوسویں برسی کی یادگار کے طور پر لگایا گیا ہے۔

ابن حزم نے ابتدا میں نفسیات، فلسفہ اور علم الاخلاق کی طرف توجہ دی۔ نفسیات میں اس کی کتاب "طوق الحمامہ" ہے۔ جس میں عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت چھوٹے چھوٹے قصوں اور مشاہدات کی بنا پر کی گئی ہے۔ علم الاخلاق میں اس کی کتاب "الاخلاق والسیر" بے حد اہم ہے۔

تاریخ کے موضوع پر ابن خلدون نے اس کی ایک کتاب "جمہرۃ الانساب" کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ المغرب اور اندلس کے عرب اور بربر خاندانوں کے انساب پر لکھی گئی ہے۔

ابن حزم کا مسلک ہمیشہ ایک نہیں رہا۔ پہلے پہل وہ شافعی مذہب کا بہت بڑا حامی تھا۔ پھر فرقہ ظاہریہ کا پیرو بن گیا۔ بعدازاں اس نے مخالفین پر شدت سے الزامات لگانے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ اس نے بعض راسخ العقیدہ اماموں کو بھی نہیں بخشا اور ان میں سے کئی مستند آئمہ پر کفر و الحاد کے الزامات لگائے۔ اشعریؒ، ابوحنیفہؒ اور مالکؒ خاص طور پر اس کی تنقید کا ہدف بنے رہتے تھے۔

ابن حزم نے اپنے اس نظریے کی پرزور حمایت کی ہے کہ فقہی استنباط کی ان جزئیات کو، جن کی بنیاد قرآن اور حدیث پر نہیں، رد کر دینا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اس کی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" خاصی اہم ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں ظاہری احکام فقہ پر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "الفصل فی الملل والاہوا والنحل" ہے جس میں دیگر فرقوں پر بڑی تنقید کی گئی ہے۔ "کتاب المحلیٰ" اور "کتاب الناسخ والمنسوخ" دیگر اہم کتابیں ہیں۔ جن میں قرآن اور حدیث سے بحث کی گئی ہے۔

ابن حوقل

(وفات ۳۵۰ھ/۹۶۱ء) ابوالقاسم محمد ابن حوقل، جغرافیہ دان، سیاح اور مورخ رمضان ۳۳۱ھ/مئی ۹۴۳ء میں بغداد سے سیاحت کے لیے نکلا۔ کئی ممالک کی سیر کی۔ اپنے پیش رو سیاحوں کی تصانیف کو پڑھا۔ اور چشم دید حالات لکھے۔ ۳۴۱ھ/۹۵۲ء میں اصطخری سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد اپنی کتابوں میں اصلاح کی اور ۳۶۷ھ/۹۷۷ء میں "المسالک والممالک" لکھی اس میں تیونس کے بحری بیڑے کی مہارت اور فسطاط کے اسلحہ خانے کا بھی ذکر ہے اور بادشاہوں کے نام اور ان کے بعض کارناموں کی تفصیل بھی درج ہے۔ مشہور جغرافیہ دان ادریسی نے اس تصنیف سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کی ایک اور کتاب "صورۃ الارض" ہے، جو علم الارض پر اہم حیثیت رکھتی ہے۔

ابن خرداذبہ

(۲۱۱ھ/۸۲۶ء - ۳۰۰ھ/۹۱۲ء) ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ مشہور جغرافیہ دان۔ خلیفہ المعتمد نے اسے اپنا گہرا دوست بنا لیا تھا۔ علم موسیقی کا شیدائی بھی تھا۔ دادا نے جو آتش پرست تھا، اسلام قبول کیا۔ باپ طبرستان کا والی تھا۔ اسحاق موصلی سے علم موسیقی حاصل کیا، جس کا ذکر المسعودی بھی کرتا ہے۔ خود محکمہ برید و اخبار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ المعتمد کی درخواست پر کتاب "المسالک والممالک" لکھی تھی۔ یہ کتاب ۲۳۲ھ/۸۴۶ء میں لکھی گئی تھی۔ مزید براں اس کی ایک کتاب "اللھو والملاہی" بھی ہے جو کھوان پر ہے اور اب ناپید ہے۔

ابن خطیب

(۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء - ۷۷۶ھ/۱۳۷۵ء) ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن خطیب لسان الدین۔ مورخ اور ادیب، سلطان ابوالحجاج یوسف اول کے دربار میں وزارت تعلیم اور وزارت دفاع کے دو عہدے حاصل کئے علمی اور سیاسی حیثیت سے بلند مرتبہ حاصل کیا تھا۔ غرناطہ میں سیاسی مخالفت کی بنا پر قید کیا گیا۔ ایک نائب وزیر سلیمان بن داؤد نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔

ابن خطیب کی تصانیف کی تعداد ساٹھ ہے، جو ادب، فلسفہ، تصوف، تاریخ، جغرافیہ اور طب کے موضوع پر ہیں۔ سب سے اہم تصنیف "الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ" ہے یہ مشاہیر اور علما کا ایک تذکرہ ہے۔ اس کی ایک تلخیص قاہرہ سے ۱۹۰۱ - ۱۹۰۰ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

ابن خلدون

عبدالرحمان ابن خلدون بطور مورخ اور بانی عمرانیات [illegible] عبدالرحمان ابوزید اور اس کا بھائی یحییٰ ابوزکریا مشہور [illegible] زیادہ مشہور رہے۔ ان کا خاندان تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی [illegible] سے ہجرت کر کے اندلس چلا گیا تھا اور ان کا پردادا الحسن تیونس میں مکونت پذیر [illegible]

عبدالرحمان ابن خلدون یکم رمضان ۷۳۲ھ / ۲۷ مئی ۱۳۳۲ء - ۲۵ رمضان ۸۰۸ھ / ۱۹ مارچ ۱۴۰۶ء اپنے باپ محمد کا دوسرا بیٹا تھا۔ تیونس میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ابوالحسن مرینی کے درباری علما سے بھی استفادہ کیا۔

۱۳۵۲ء میں اسے بھی دربار میں رسائی اور عہدہ حاصل کرنے کا موقع ملا [illegible] برس وہ بادشاہ کا کاتب مقرر ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ حاکم [illegible] کے پاس چلا گیا۔ مگر علما کی درخواست پر سلطان نے اسے دوبارہ [illegible] دعوت دی [illegible] ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں وہ ابوعنان فریں کا کاتب بن گیا۔ کامل دو برس بعد اس پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ قید خانے بھیج دیا گیا۔ نئے سلطان ابوسالم نے اسے رہائی دی اور عہدہ بھی پیش کیا۔ مگر اس نے غرناطہ کا رخ کیا۔ تاہم جلد واپس آ گیا اور تلمسان کے حکمران ابوحمو ثانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ بعدازاں مرین حکمران عبدالعزیز کی مصاحبت

اختیار کرلی۔

جلد ہی وہ ان سب سے تنگ آگیا اور قلعہ ابن سلامہ میں گوشہ نشین ہوکر تاریخ عالم لکھنا شروع کردی۔ ۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء میں کسی ضرورت کے تحت تیونس گیا۔ ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء میں اسے قاہرہ کے سلطان الظاہر برقوق نے مالکی قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ ۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء میں حج کیا اور واپس آنے کے بعد مدرس اور قاضی کے عہدوں پر کام کیا۔ اس اثنا میں تیمور نے دمشق پر حملہ کر دیا تو اس کے ساتھ گفت و شنید کے لیے اسے بھیجا گیا۔ ۱۴ جنوری ۱۴۰۱ء کو وہ رسوں کی مدد سے قلعہ دمشق کی فصیل پر سے اترا اور تیمور سے ملاقات کی۔ تیمور اس کی علمیت سے خاصا متأثر ہوا۔ واپسی پر وہ پھر قاہرہ

بابائے تاریخ ۔ ابن خلدون

میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔

عبدالرحمن ابن خلدون کی "کتاب العبر" اس زمانے کی اہم تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ خصوصاً اس کا "مقدمہ" علمی دنیا میں معرکۃ الآرا حیثیت کا مالک ہے۔ یہی وہ مقدمہ کتاب ہے جس نے عبدالرحمان ابن خلدون کو بام شہرت پر پہنچا دیا ہے۔ اس کی تاریخ تو شاید اتنی زیادہ مستند نہیں لیکن "مقدمہ" میں پہلی بار اس نے تاریخ و تمدن عالم کا سائنٹیفک تجزیہ کیا ہے۔ اور ان کے عروج و زوال کے بارے میں ایک واضح نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے خیال میں تاریخ بذات خود ایک زندہ اور فعال شے ہے قومیں ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتیں۔ اس لحاظ سے ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کا بانی ہے عصر حاضر کے مشہور مورخ ٹائن بی نے بھی اپنے نظریۂ تاریخ کو پیش کرتے ہوئے ابن خلدون سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "عیسائی دنیا اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ حتیٰ کہ افلاطون، ارسطو اور آگسٹن بھی اس کے ہم پایہ نہ تھے۔"

عمرانیات یعنی انسان اور معاشرے کے تعلق کا مطالعہ کرتے ہوئے ابن خلدون نے ہی اس علم کا صحیح معنوں میں آغاز کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ تمدن کی ایک بنیاد انسانی ضروریات اور دوسری بنیاد دفاعی ضروریات ہیں نیز معاشرہ پر دین عوامل دین، جغرافیائی حالات اور اسباب حیات کی فراوانی یا کمی بہرحال اثرانداز ہوتے ہیں۔ انہی سے قوموں کو عروج و زوال نصیب ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک محنت ہی انسانی اجرت کا معیار اور قیمت ہے۔ اس لیے رعایا سے صرف اتنی محنت وصول کرنی چاہیے جتنی سے ان کی صلاحیت کار پر کوئی اثر نہ پڑے غلامی اور بیگاری کو غیر طبعی ہونے کے باعث ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے نزدیک ہر قوم ایک عمر طبعی رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر قوم کی طبعی عمر ایک سو بیس سال ہوتی ہے، یہ تین حصوں پر منقسم ہوتی ہے، ان میں سے ہر حصے کو ایک "جیل" کہتے ہیں۔ یہاں ابن خلدون ایک اور بیان بھی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر قوم اپنے تصور حیات کیمطابق اپنی عمر میں کمی بیشی کرسکتی ہے، جس قوم کا نظریہ جتنا پائدار ہوگا اس قوم کی عمر اتنی زیادہ ہوگی۔

مذہب کے بارے میں لکھتے ہوئے ابن خلدون کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو معاشرے کی سمتیں بدل دیتا ہے۔ یہی قوم کو نظریۂ حیات بخشتا ہے جو مذہب معاشرے نے جس قدر کھلا ملا ہوگا، وہ اتنا ہی صادق ہوگا۔ اگر مذہب کا فلسفہ نظروں میں جچتا ہے اگر اس میں ہمہ گیری اور ابدیت ہے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے بصورت دیگر نہیں۔

نبوت کو ابن خلدون ایک خارق (معجزہ) قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک انسانی فکری ارتقاء کا قانون جاری ہے، زندگی کی ابتدا نباتات سے ہوئی، جس کا ارتقاء حیوانات کی صورت میں ہوا۔ انسان حیوانی ارتقاء کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ڈارون سے بہت پہلے ڈارونیت کا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ارتقاء کا یہ عمل جاری و ساری ہوتا ہے ہر نوع کا آخری سرا اگلی نوع کے ابتدائی سرے سے ملا ہوتا ہے۔ ابتدائی انسان نے آہستہ آہستہ ادراک و احساس کی منزلیں طے کیں حتیٰ کہ اس میں سے ایک ایسا انسان معرض وجود میں آیا، جس میں غور و فکر کی تمام صلاحیتیں جلوہ گر تھیں ـــــ

ابن خلدون کے نزدیک ارتقاء و تغیر کا قانون چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ یہیں نہ رکے بلکہ اور آگے بڑھے۔ اس لیے انسان سے بالا ایک اور ذات چاہیے جس میں ادراک صرف اور تعقل محض ہو۔ یہ ذات فرشتے کی ہے۔ اس کا ایک پہلو نفس انسان سے ملا ہوا ہے اور دوسرا جدا ہے۔ نبوت انہی دونوں جہتوں کی درمیانی صورت حال کا نام ہے۔ یعنی کبھی کبھی نفس بشری رفتہ رفتہ یا ایک ہی جست میں عالم بشریت سے قطع ہو کر ملائکہ تک پہنچتا ہے۔ یہ صورت کسی خاص خاص بشر کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ گویا انسان اپنی ذاتی کوشش سے نبی نہیں بن سکتا بلکہ جب خدا چاہتا ہے تو وہ کسی انسان کو عالم بشریت سے نکال کر عالم ملائکہ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیتا ہے، اس طرح کہ وہ بشر بھی رہتا ہے اور ملائکہ سے بھی ہم کلام ہوتا ہے البتہ انسان ریاضت و مجاہدہ سے ایسی صلاحیتیں حاصل کرسکتا ہے، جس سے وہ کسی حد تک عالم ملائکہ کو چھو لے یہ منزل اولیاء کی ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک نبوت، ولایت اور فلسفہ کی سرحدیں آخر میں کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں۔

تعلیم کے بارے میں ابن خلدون اس چیز کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ متعلمین کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے اور جسمانی مارپیٹ سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ کیونکہ اس سے طلبہ میں اونچے اور حوصلہ مند جذبات پیدا نہیں ہوتے۔

ابن خلدون نے "مقدمہ تاریخ" ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء میں لکھا تھا۔ پوری تاریخ کا اردو ترجمہ ۱۹۰۱ء میں الہ آباد سے احمد حسین نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ ابن خلدون کی دیگر کتابیں "شرح البردہ"، "الحساب" اور "المنطق" بڑی اہم ہیں۔

چھوٹا بھائی یحییٰ ابن خلدون (۷۳۴ھ/ ۱۳۳۳ء ـ رمضان ۷۸۰ھ/ دسمبر ۱۳۷۸ء) بھی مورخ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ بھی فاس میں اپنے بھائی کے ساتھ ابوسالم کے دربار میں موجود تھا اس نے بھی تلمسان اور بسکرہ کے حکمرانوں کے ہاں ملازمتیں اختیار کیں۔

۷۶۹ھ/ ۱۳۶۸ء میں اسے تلمسان کے حاکم ابوحمو نے کاتب الانشا کے عہدے پر فائز کیا۔ یہاں سے ایک بار پھر وہ مرینی کے سلطان عبدالعزیز کی ملازمت میں گیا مگر جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ مگر ابوحمو کے بڑے بیٹے ابوتاشفین نے اسے قتل کرادیا۔ اس کی کتاب "الرواد فی ذکر الملوک" بڑی اہم تاریخی کتاب ہے جو بنی عبدالواد کے حکمرانوں کی سیاسی تاریخ پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اسلوب نگارش خوب صورت اور مرصع ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم ادبی کتاب بھی ہے۔

ابن خلکان (۱۱ ربیع الثانی ۶۰۸ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۲۱۱ء – ۱۶ رجب ۶۸۱ھ/ ۳۰ اکتوبر ۱۲۸۲ء) شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن ابراہیم بن خلکان البرکی الشافعی، مورخ اور مصنف، موصل کے قریب پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم باپ سے حاصل کی۔ بعدازاں دمشق میں تعلیم پائی۔ ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۸ء میں قاہرہ پہنچا اور قاضی القضاۃ یوسف بن الحسن السنجاری کا نائب بن گیا۔ ۶۵۹ھ/ ۱۲۶۰ء میں دمشق میں قاضی بنا۔ بعدازاں موقوف ہوا اور قاہرہ کے مدرسہ الفخریہ میں سات سال تک مدرس رہنے کے بعد دوبارہ ملا۔ ۶۸۰ھ/ ۱۲۸۱ء میں دوبارہ چھن گیا۔ کچھ عرصہ مدرسہ الامینیہ میں مدرس کے فرائض انجام دیے۔ یہیں وفات پائی۔
ابن خلکان کی اہم تصنیف "وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان" ہے یہ کتاب ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء میں قاہرہ میں لکھنا شروع کی تھی۔ اور کوئی اٹھارہ برس میں مکمل ہوئی۔ ادب، تاریخ و سیر کے بارے میں یہ ایک اہم ماخذ ہے۔

ابن رشد (۵۲۰ھ/ ۱۱۲۶ء – ۹ صفر ۵۹۵ھ/ ۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء) عبدالولید محمد بن احمد بن محمد رشد، سپین کا سب سے بڑا عرب فلسفی اور سائنسدان، فلسفہ، طب، فلکیات اور فقہ کا بہت بڑا ماہر، قرطبہ میں پیدا ہوا۔ باپ دادا قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔
ابن رشد کے ابتدائی حالات کا تو علم نہیں۔ غالباً ابن طفیل نے اسے دربار میں الموحدون سے متعارف کرایا تھا اور اسی نے اسے تحصیل علم کی طرف راغب کیا تھا ۵۶۵ھ/ ۱۱۶۹ء میں ابن رشد اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوگیا اور ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۱ء میں وہ قرطبہ کا قاضی القضاۃ ہوگیا۔ ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲ء میں اسے ابویعقوب یوسف نے اپنے طبیب خاص کی حیثیت سے مراکش طلب کرلیا۔ یہاں علمائے دین نے اس کے ملحدانہ خیالات کے باعث سخت مخالفت کی، جس کے باعث اسے واپس قرطبہ آنا پڑا مگر یہاں بھی کفر کے فتووں نے اسے جلاوطن ہونے پر مجبور کردیا۔ ادھر خلیفہ نے بھی فلسفہ کی تعلیم پر پابندی لگادی مگر بعدازاں اس نے ابن رشد کو مراکش میں اپنے پاس بلالیا۔ جہاں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ابن رشد کا انتقال ہوگیا۔
ابن رشد کی تصانیف "تہافتہ التہافتہ" (جو امام غزالی کی کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" کا جواب ہے۔) ارسطو کی کتابوں کی شرحیں، افلاطون کی "سیاست" کی شرح اور طب پر "الکلیات" ہیں۔ ان میں سے "تہافتہ التہافتہ" سب سے زیادہ اہم ہے جس میں اس کے فلسفیانہ افکار کی جھلک ملتی ہے۔
ان افکار کی بنا پر ابن رشد کو نہ صرف مسلمان علمائے دین بلکہ عیسائی پادریوں نے بھی کافر ٹھہرایا ہے۔ دراصل ابن رشد علماء کے اس مکتب فکر سے تعلق تھا، جو متکلمین تو نہیں تھے مگر عقلیت پسند ہونے کے باعث مسلم عقائد کو فلسفے پر منطبق کرنا چاہتے تھے، چنانچہ الکندی، فارابی، ابن سینا، ابن باجہ اور ابن طفیل اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی آخری کڑی ابن رشد ثابت ہوا۔ مشرق میں چونکہ صوفیا کا زور رہتا، یعنی ابن عربی کے نظریات کا فروغ تھا اور وسطی ممالک میں امام غزالی نے اس دبستان فکر کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا، چنانچہ ابن باجہ اور ابن رشد جیسے عقلیت پسند مفکرین کو مغرب کے دامن میں پناہ لینا پڑی، جس نے انھیں بڑی فراخدلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ یہی وجہ ہے کہ علوم عقلیہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب نے اور تصوف میں مشرق نے بڑی ترقی کی اور ان میں اپنا اپنا تشخص حاصل کرلیا۔
ابن رشد کا دعویٰ تھا کہ مذہب کے الہامی اصول و عقائد کے سوا ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ اس طرح سے اس نے دنیا کو ارسطاطالیت کی راہ دکھائی اور دنیا نے اسے ارسطو کا سب سے بڑا شارح اور مفسر تسلیم کرلیا
الٰہیات میں ابن رشد کا نظریہ بڑا لچکدار ہے، چنانچہ وہ بھی کسی حالت میں منکر غیب نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا علم ایک برتر نوعیت کا حامل ہے۔ اور یہ انسانی علم کی مانند نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو اور لوگ بھی اس علم میں شریک ہو جائیں گے۔ اس طرح خدا اپنی ہستی کے اندر واحد نہیں رہتا۔ مزید برآں خدا کا علم انسان کے علم کی مانند نہیں۔ کیونکہ انسانی علم اشیاء سے ماخوذ ہے جبکہ خدا کا علم اشیاء کا محرک اور علت ہے، جو ایک مسلسل حیثیت سے اس کائنات کی تخلیق میں مصروف ہے۔ مگر اس کے نزدیک تمام اشیاء عدم سے ایک ہی بار پیدا نہیں ہوجاتیں بلکہ ارتقائی حیثیت اختیار کرتی ہیں اور ایک تخلیقی قوت اسے قائم رکھتی اور حرکت دیتی ہے۔ نیز مرنے کے بعد انسانی روح اس روح کل میں چلی جاتی ہے، جو اس کائنات میں ازل سے موجود ہے روز حشر یہ کسی اور مماثل صورت میں پیدا ہوگی مگر موجودہ مادی جسم میں نہیں ہوگی، کیونکہ موجودہ اجسام نامکمل ہیئت کے مالک ہیں، جبکہ آئندہ کامل اور مکمل اجسام کی ضرورت ہوگی
مذہب کی تعلیم کے بارے میں ابن رشد کا نظریہ یہ ہے کہ عوام الناس کو قرآنی قصص اور تمثیلات کا دینی مفہوم بتایا جائے، جس طرح سے وحی نے پیش کیا ہے۔ البتہ فلسفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان میں مضمر گہرے حقائق کو تلاش کرے البتہ انہیں عوام تک نہ پہنچائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک عوام میں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ دقیق مسائل کو سمجھ سکیں۔ اس طرح سے وہ انسان کی سمجھنے کی صلاحیتوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلی اور سب سے بڑی جماعت ان لوگوں کی ہے جو محض تبلیغ کے ذریعے ایمان لاتے ہیں۔ دوسری جماعت کے لوگ استدلال سے متاثر ہوتے ہیں اور تیسری قلیل تعداد ان لوگوں کی ہے جو محض ثابت شدہ دلائل پر اپنے عقائد کی

سب سے بڑا عرب فلسفی - ابن رشد

اساس رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کا قرآنہ خیالات کا حامل نہیں تھا البتہ وہ اس امر کا یقین رکھتا تھا کہ حقیقت کو مختلف طریقوں سے پیش کیا جاسکتا ہے۔
ابن رشد فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسدان اور ماہر فلکیات بھی تھا، وہ

پہلا شخص ہے جس نے پہلی بار سورج میں موجود دھبوں کا ذکر کیا تھا۔ جنہیں اس نے دوربین کے بغیر دیکھا تھا۔ طب میں بھی اس نے خاطر خواہ اضافے کئے تھے اور ادویات کے ان خواص کا ذکر کیا۔ جنہیں تجربات سے ثابت کیا جا چکا ہے۔

ابنِ زُہر اندلس کے مسلمان علماء کا خاندان۔ مورث اعلیٰ کا نام زُہر تھا۔ جس کا سلسلہ نسب عدنان تک پہنچتا ہے جو عرب قوم کے بانیوں میں سے تھا۔ اس کا ایک بیٹا مروان تھا، جو ابوبکر محمد جیسے عالم و فقیہہ کا باپ تھا۔ ابوبکر محمد نے ۴۲۱ھ/۱۰۳۱ء میں طلیطلہ میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ابو مروان عبدالملک ایک مشہور طبیب تھا۔ اس نے دانیہ میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ابوالعلاء زہر بن ابی مروان بھی طبیب تھا یوسف بن تاشفین کا وزیر رہا۔ اس کی وفات قرطبہ میں ہوئی۔ اس کا بیٹا ابو مروان عبدالملک عالم دین اور فقیہہ تھا۔ ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء کو اشبیلیہ میں پیدا ہوا۔ بعد ازاں طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کی دو کتابیں "الاقتصاد فی اصلاح الانفس" اور "التیسیر فی المداواۃ والتدبیر" بڑی اہم ہیں۔ یہی شخص مغرب میں حکیم ابن زہر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے تشریح الاعضاء کا آغاز کیا۔ اس نے سب سے پہلے مریض کی مشکلات دیکھنے کی سفارش کی اور رسولی بذریعہ آپریشن نکالنے کا طریقہ دریافت کیا۔ مگر خود ایک رسولی ہی کے ہاتھوں ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء میں وفات پائی۔ اس کا [illegible] ابوبکر محمد اور پوتی ابو محمد عبداللہ بھی اپنے باپ کے طبیب تھے۔ دونوں ہی سازش کا شکار ہوئے اور زہر خورانی کے باعث ہلاک ہوئے۔ ان کی اولاد نے بھی طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ گویا ایک طرح سے ابن زہر کا پورا خاندان طب کو اختیار کئے ہوئے تھا۔

ابن زیاد (وفات ۶۷ھ/۶۸۶ء) عبیداللہ بن زیاد، گورنر کوفہ، حادثۂ کربلا کا محرک، مسلم بن عقیل اسی کے حکم سے قتل ہوئے۔ جب انہوں نے کوفہ میں حضرت امام حسینؓ کے حق میں بیعت لینا شروع کی۔ اس وقت یزید نے ابن زیاد ہی کو بصرہ سے تبدیل کر کے کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ مسلم بن عقیل کے قتل کے بعد اس نے حُر کو ایک ہزار سوار دے کر حضرت امام حسینؓ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا۔ جب حضرت امام حسینؓ میدان کربلا میں خیمہ زن ہوئے تو ابن زیاد نے پہلے عمر بن سعد اور پھر شمر کو فوج دے کر ان کے مقابلے میں بھیجا۔ کربلا کا خونی معرکہ ۶۱ھ/۶۸۰ء میں ہوا۔ ٹھیک چھ برس بعد مختار بن ابی عبید ثقفی کے جرنیل کے ہاتھ ایک معرکہ میں ابن زیاد کو شکست ہوئی۔ اور وہ میدان جنگ ہی میں مارا گیا۔ قتل کے بعد اس کے سر کو کوفہ میں اسی مقام پر لا کر رکھا گیا جہاں چھ برس قبل اس نے حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک رکھوایا تھا۔

ابن سعد (۱۶۸ھ/۷۸۴ء — ۴ جمادی الثانی ۲۳۰ھ/۱۶ فروری ۸۴۵ء) ابوعبداللہ محمد بن سعد بن منیع البصری، مورخ، محدث اور ادیب "طبقات" اور "تاریخ اسلام" کے مصنف، بصرہ میں پیدا ہوئے۔ مشہور مورخ واقدی کے کاتب تھے، لیکن ان سے کہیں زیادہ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ قبیلہ بنی یربوع سے تعلق تھا۔ ابتدائی عمر میں غلام تھے۔ ابتدائی تعلیم بصرہ میں حاصل کی، پھر بغداد آگئے۔ آزاد ہوئے تو علم کی خدمت میں عمر گذاری۔ بغداد میں فوت ہوئے۔

"طبقات" نام کی دو کتابیں "صغیر" اور "کبیر" لکھیں۔ "طبقات صغیر" ان دنوں ناپید ہے۔ "طبقات کبیر" میں حضرت رسول اللہ صلعم سے لے کر صحابہ کرام، تابعین اور مولف تک کے زمانے کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور "طبقات ابن سعد" کے نام سے مشہور ہے۔ تیسری کتاب "تاریخ اسلام" بھی ان دنوں ناپید ہے۔

ابن سعود سعودی خاندان، ریاض اور موجودہ سعودی عرب کا حکمران وہابی خاندان بانی محمد ابن سعود تھا جو قبیلہ سالخ وُلدعلی سے تعلق رکھتا تھا۔ سعودیہ کا حکمران تھا۔ اس کی وفات کے بعد ۱۷۲۶ء سے ۱۷۶۵ء کے دوران محمد بن سعود تخت نشین ہوا۔ یہی خاندان اب تک برسر اقتدار ہے۔

اس خاندان کی تاریخ کے تین بڑے ادوار گذرے ہیں۔ ایک ابتدائی دور ہے جو ۱۸۲۰ء تک ہے۔ اس دور میں ریاض اور درعیہ کے علاقوں پر مصریوں کا قبضہ تھا۔ دارالحکومت درعیہ تھا۔ دوسرا دور ۱۸۹۶ء تک کا ہے، جس میں محمد بن عبداللہ کے پوتے ترکی اور اس کے بیٹے فیصل کے ہاتھوں سلطنت کا احیاء ہوا۔ اس دور میں دارالحکومت ریاض رہا۔ اس دور کا خاتمہ ابن رشید کے قبضہ پر ہوتا ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۲ء میں شروع ہوتا ہے جب عبدالعزیز نے حکومت ابن رشید کا تختہ الٹ دیا اور سلطنت ریاض قائم کی۔ موجودہ مملکت سعودی عرب کا بانی یہی عبدالعزیز تھا، جس کے بعد اس کے بیٹے شاہ سعود اور شاہ فیصل تخت نشین ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں شاہ فیصل کی شہادت کے بعد شاہ خالد بن عبدالعزیز حکمران ہوئے ہیں۔

۱۔ **محمد بن سعود** (۱۷۲۵ء — ۱۷۶۶ء) تقریباً ۱۷۴۴ء میں محمد بن عبدالوہاب (وہابی فرقے کا بانی) کو عیینہ سے نکال دیا گیا اور اس نے اپنے دوست محمد بن سعود کے پاس پناہ لی۔ ان دونوں نے مل کر تبلیغ اور تلوار کے زور سے اس فرقے کو پھیلایا۔ ۱۱۵۹ھ میں جو ۱۷۴۶ء سے شروع ہوتا ہے، گرد و نواح کے شہروں اور قبائلی اضلاع سے جنگ شروع ہو گئی اور جلد ہی بعض طاقتور پڑوسیوں مثلاً الحساء (الاحساء) کے بنو خالد اور نجران کے بنو مکرمی کو اس جنگ میں دخل انداز ہونا پڑا لیکن وہ وہابیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہ روک سکے۔ مکے کے "شریف" وہابی حاجیوں کو ایک علیحدہ فرقے کے پیرو خیال کرتے ہوئے انہیں مقامات مقدسہ کی زیارت کی اجازت نہ دیتے۔ "شریفوں" کی اطلاعات مرسلہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء کے ذریعے اس فرقے کے متعلق پہلی مرتبہ خبر قسطنطنیہ پہنچی۔ محمد بن سعود نے تقریباً تیس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں درعیہ میں وفات پائی۔

۲۔ **عبدالعزیز بن محمد بن سعود** (۱۱۷۹ھ/۱۷۶۶ء — ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) جو ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وفات پائی۔ اس کے عہد کے چند ابتدائی سال آس پاس کے شہروں اور قبائل، بنو خالد، بنو مکرمی اور بنو منتفق سے مسلسل جنگ میں گذرے ۱۷۹۵ء میں وہابیوں نے یورش کر کے الاحساء اور قطیف پر قبضہ کر لیا اور اس طرح وہ خلیج فارس کے ساحل پر بھی متمکن ہو گئے۔ وہاں سے ان کو نکالنے کے لئے بصرے اور بغداد کے ترکی والیوں نے اور ان کے حلیفوں، بنو منتفق کے شیخ ثوینی کی مہم اور ۱۷۹۸ء میں کیا علی پاشا کی مہم، لیکن یہ سب کوششیں ناکام رہیں۔ آخر ۱۷۹۹ء میں عبدالعزیز اور بغداد کے پاشا کے درمیان چھ سال کے لئے عارضی صلح کا معاہدہ ہو گیا۔

۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں مکے کے شریف سرور نے وہابیوں کو ایک مخصوص ٹیکس ادا کرنے پر مقامات مقدسہ میں داخلے کی اجازت دے دی، مگر اس کے جانشین غالب نے جس کا عہد حکومت ۱۲۰۲ھ سے شروع ہوتا ہے اس رعایت کو واپس لے لیا اور پھر ۱۷۹۰ء، ۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۸ء میں غالب نے حجاز کی جانب وہابیوں کی پیشقدمی روکنے کے لئے ناکام فوجی اقدامات کئے۔ لیکن ۱۷۹۸ء میں اسے ان سے صلح کرنی پڑی اور انہیں حج کی اجازت بھی دینی پڑی۔ شرط یہ طے پائی کہ آئندہ وہ شریف کے زیر علاقے پر کوئی

درازدستی نہیں کریں گے۔
شریف مکہ اور والیٔ بغداد کے درمیان یہ مصالحانہ تعلقات تھوڑی ہی مدت تک قائم رہے۔ وہابیوں کے ایک قافلے پر شیعی خزائل کے حملے کا بدلہ لینے کے لئے سعود بن عبدالعزیز نے ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء کو کربلا پر حملہ کر دیا۔ ۱۸۰۱ء میں سعود حج کے لئے گیا اور عسیر اور تہامہ کے قبیلے اور بنو حرب جواب تک شریف غالب کے ماتحت تھے۔ وہابیوں سے مل گئے جس کے نتیجے میں علی الاعلان لڑائی چھڑ گئی اور ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء کو وہابیوں نے طائف پر قبضہ کر لیا۔ اور سعود فاتحانہ مکے میں داخل ہو گیا۔ سعود کی واپسی پر شریف غالب نے مکے میں وہابیوں کی قلعہ نشین فوج کو نکال لیا۔ لیکن مجبوراً اسے وہابیوں کو مزید مراعات دینا پڑیں۔
۱۸۰۰ء ہی میں وہابیوں نے خلیج فارس کے جزیروں میں اپنی قوت بڑھانا شروع کر دی تھی اور آئندہ چند سالوں کے اندر اندر انہوں نے بحرین اور ساحلی قبیلوں یعنی راس الخیمہ کے جواسمی قبائل کو اپنا محکوم بنا لیا تھا۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء نومبر کی تین تاریخ کو ایک شیعی نے درعیہ کی مسجد میں عبدالعزیز کو خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔

۴۔ سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ تا ۱۲۲۹ھ) ۱۸۰۳ء سے ۱۸۱۴ء۔ بغداد اور عمان کے خلاف چھوٹے چھوٹے اقدامات کے بعد سعود نے شریف غالب کی حکومت کا خاتمہ کرنے کا پکا ارادہ کر لیا اور ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں مدینے اور ۱۸۰۶ء میں مکے پر قبضہ کر لیا۔ اپنے بچے کھچے اقتدار کو بچانے کے لئے غالب نے اپنے آپ کو کلیتہً وہابیوں کا مطیع بنا دیا۔ وہابیوں نے اب حجاز میں بھی اپنے مسلک کی اشاعت شروع کر دی۔ حاجیوں کے ان قافلوں کو جنہیں حکومت ترکی نے تیار کیا ہو حرم میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ سلطان ترکی کے نام کا خطبہ موقوف کر دیا گیا اور ایک رسمی خط میں سعود نے مطالبہ کیا کہ نہ صرف دمشق کے والی کو بلکہ خود سلطان ترکی کو بھی چاہیئے کہ وہ وہابی عقائد اختیار کر لے۔
دمشق کے پاشا کے پُرزور انکار کا جواب سعود نے یوں دیا کہ ۱۸۱۰ء میں حوران کو تاخت و تاراج کیا اور خلیج فارس کے ساحلی قبائل کی بحری قزاقی کو بڑے پیمانے پر منظم کر دیا۔ ۱۸۰۹ء میں حکومت برطانیہ نے جو ان دنوں ہندوستان پر مسلط تھی راس الخیمہ پر حملہ کر کے اس بڑے کو جو بقول حکومت برطانیہ سمندری لٹیروں کا بیڑا تھا، تباہ کر دیا۔ چونکہ باب عالی ترکی کی حکومت اپنی مملکت کو وہابیوں سے بچانے کے قابل نہ تھی اس لئے اس نے والیٔ مصر محمد علی پاشا کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ حجاز کو دوبارہ فتح کرے۔
لہٰذا مصری فوجوں کی پہلی مہم طوسون پاشا کے ماتحت ۱۸۱۱ء میں ینبوع البحر تک آئی کی دوبارہ فتح سے شروع ہوئی۔ لیکن جب طوسون پاشا مدینے کی جانب بڑھا تو ۱۸۱۱ء میں جدیدہ کے تنگ درّے میں سعود کے بیٹوں عبداللہ اور فیصل کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اسے ینبوع کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ اس کے بعد ۱۸۱۲ء میں اس نے دوبارہ فوجی کارروائیاں شروع کیں اور اس بار زیادہ کامیاب رہا۔ اسی سال نومبر میں مدینہ فتح ہو گیا اور ۱۸۱۳ء جنوری کے آخر میں مکے پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ پھر چند دنوں بعد طائف پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ برخلاف اس کے ۱۸۱۳ء کے موسم گرما میں تربہ کے مقام پر مصریوں کی مزید پیشقدمی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی سال اگست کے آخر میں محمد علی پاشا خود جدہ آیا اور سعود کی اس سے صلح کی گفت و شنید کی کوشش ناکام رہی۔ ۱۸۱۵ء تک طوسون پاشا تربہ کو فتح کرنے میں ناکام رہا۔ جبکہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں سعود درعیہ میں وفات پا چکا تھا۔

۴۔ عبداللہ بن سعود (۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء - ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) ۱۸۱۵ء کے شروع میں محمد علی پاشا تربہ پر حملہ کرنے کے لئے پھر روانہ ہوا اور وسط جنوری میں اسی سال شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ عسیر کی طرف بڑھا اور قنفذہ کے راستے سے مکے واپس آیا۔ مارچ میں طوسون پاشا حناکیہ کے راستے نجد میں داخل ہوا اور الرّس کے مستحکم شہر پر قبضہ کر لیا۔ جہاں عبداللہ بن سعود سے اس کی ملاقات ہوئی اور ایک خاصی طویل عارضی صلح ہوئی اور مصالحت کی یہ گفت و شنید ۱۸۱۶ء تک جاری رہی۔ اسی سال محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم پاشا نے عربستان کی اعلیٰ کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور اٹھارہ ماہ کی متواتر صعوبتوں اور شدید جنگ آزمائی کے بعد وہ اپنی فوج کو درعیہ کے دروازوں تک لے گیا۔ ۱۸۱۷ء میں ماویّہ کے مقام پر عبداللہ کو شکست ہوئی۔ تین ماہ کے مسلسل محاصرے کے بعد مصریوں نے الرّس پر قبضہ کر لیا اور [illegible] میں ضُرمہ کو فتح کیا۔ دارالحکومت کا محاصرہ، جس کی محافظت عبداللہ اور اس کے رشتہ دار کر رہے تھے، اپریل سے ستمبر ۱۸۱۸ء تک جاری رہا۔ شہر کے فتح ہو جانے کے بعد بھی عبداللہ نے قصر درعیہ میں ٹھہر کر چند دن اور مقابلہ کیا۔ بالآخر ستمبر کے وسط میں اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کے خاندان اور محمد بن عبدالوہاب کی اولاد کو قاہرہ روانہ کر دیا گیا۔ محمد علی پاشا نے عبداللہ کو اس کے کاتب اور خزانہ دار کو قسطنطنیہ روانہ کر دیا۔ جہاں ۱۷ دسمبر ۱۸۱۸ء کو ان سب کے سر قلم کر دیئے گئے۔

۵۔ مشاری بن سعود مقتول عبداللہ کا بھائی، جب ۱۸۱۹ء میں ابراہیم پاشا نجد سے چلا گیا تو درعیہ میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اپنا نام العارض میں رکھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد حسین بک نے جسے محمد علی پاشا نے اس کے خلاف بھیجا تھا۔ اسے گرفتار کر کے [illegible] ۱۸۲۰ء کو راستے ہی میں مر گیا۔

۶۔ ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود مصری حملے کے وقت [illegible] سدیر چلا گیا تھا اور مشاری بن سعود کی وفات کے بعد اس نے ریاض میں [illegible] قائم کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن مصریوں نے اسے وہاں سے نکال دیا [illegible] میں وہ ریاض کی کمزور مصری قلعہ نشین فوج پر اچانک حملہ کرنے [illegible] اور حجاز کے والیوں کے خلاف کبھی کامیاب اور کبھی ناکام جنگ کرنے کے بعد بالآخر اس نے محمد علی پاشا کو خراج دینا منظور کر لیا۔ ۱۸۳۰ء [illegible] کے ضلعے پر قبضہ کر لیا۔ جہاں ۱۸۱۳ء میں ترک متصرف ہو گئے تھے [illegible] میں بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب درعیہ کی بجائے وہابیوں نے ریاض کو دارالحکومت بنایا کیونکہ درعیہ ویران ہو چکا تھا۔ اسے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں مشاری بن عبدالرحمان بن مشاری بن حسن بن مشاری بن سعود نے قتل کر دیا۔

۷۔ مشاری بن عبدالرحمٰن بن مشاری بن حسن بن مشاری بن سعود
اس پر چالیس دن بعد شفقوف میں حملہ کر دیا گیا اور فیصل نے جو ترکی بن [illegible] محمد بن مسعود ۱۶ کا بیٹا تھا، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۸۔ فیصل بن ترکی (پہلا دور حکومت ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء - ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) ۱۸۳۰ء میں سعود بن عبدالعزیز ۳ کے بیٹے خالد نے [illegible] کی مدد سے اس کے خلاف بغاوت کر کے درعیہ پر قبضہ کر لیا اور اسے ریاض [illegible] پر شکست دی۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مصری فوج کے سپہ سالار خورشید پاشا نے [illegible] کے مقام پر دوبارہ شکست دی اور قید کر کے مصر بھیج دیا۔ لیکن ۱۲۵۹ھ میں [illegible] بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور [illegible] القصیم اور العارض پر قابض ہو گیا۔

۹۔ خالد بن سعود (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء - ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء) ابراہیم پاشا سے جنگ کے بعد اس نے مصر میں پرورش پائی تھی۔ اس نے محمد علی پاشا کی امداد سے ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۵ء میں فیصل بن ترکی پر حملہ کیا اور ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء
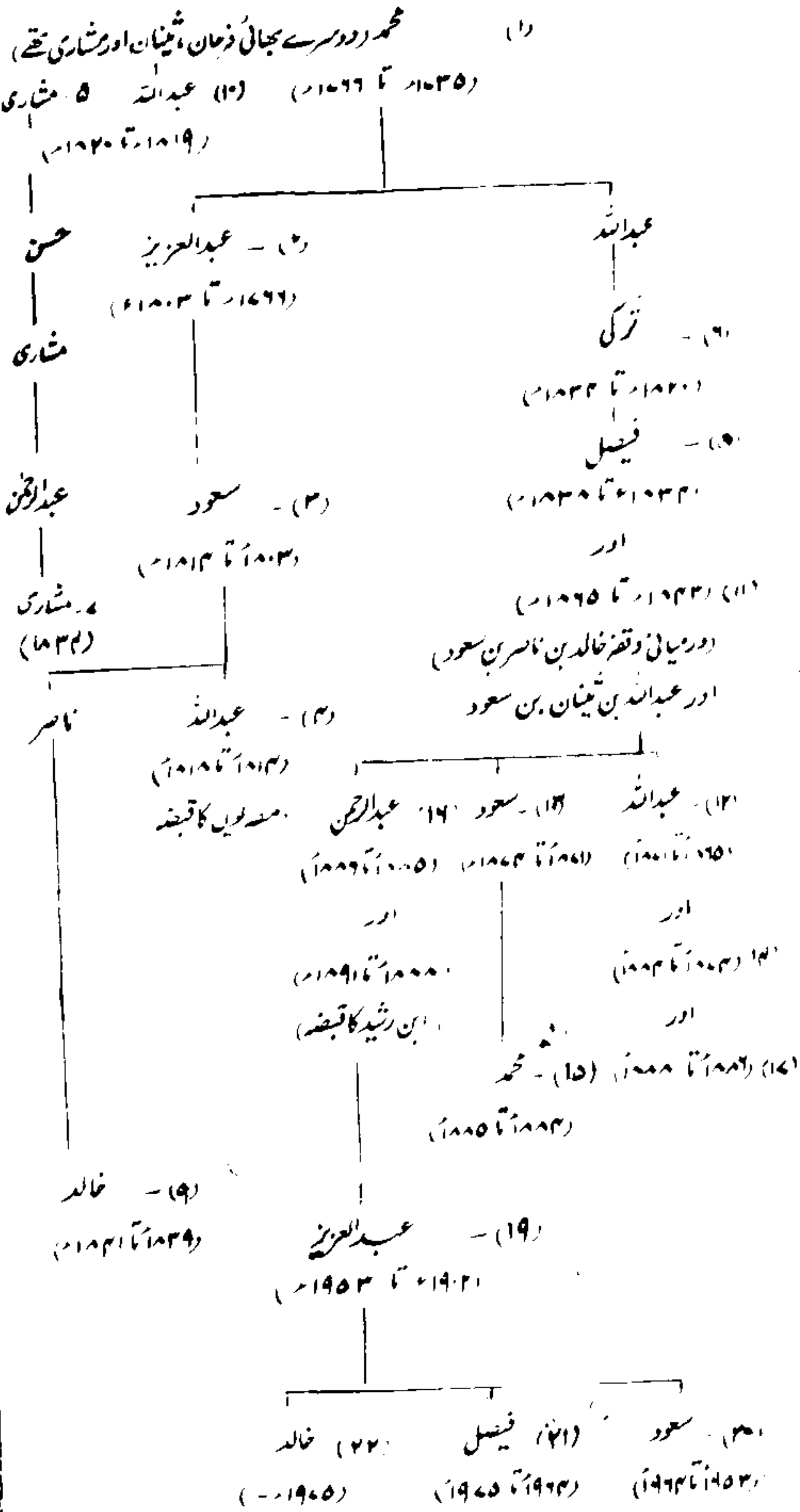
میں اس پر فتح پائی اور امام مسقط سے بھی خراج کا مطالبہ کیا۔ ۱۸۴۰ء میں مصری فوجوں کی واپسی کے بعد عبداللہ بن ثنیان نے اُسے ۱۸۴۱ء میں ریاض سے نکال دیا۔ اس کے بعد حالات اس کے مخالف ہو گئے اور پہلے ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں الدمام، پھر کویت اور وہاں سے مکے ہوتا ہوا جدہ چلا گیا۔ جہاں ۱۸۶۴ء میں فوت ہو گیا۔

۱۰۔ عبداللہ بن ثنیان بن سعود (۱۲۵۷ھ/۱۸۴۲ء – ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) پہلے اس نے خالد (۹) کی اطاعت کر لی تھی لیکن پھر مخالف ہو گیا۔ وہ محض ایک سال ہی حکومت کر پایا تھا کہ فیصل (۸) نے جو ۱۸۴۱ء میں رہائی حاصل کر چکا تھا ریاض میں اس کا محاصرہ کر کے اسے قید کر لیا اور قید خانے ہی میں اس نے ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔

۱۱۔ فیصل بن ترکی (دوسرا دورِ حکومت ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء – ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) اپنے عاقلانہ اور امن پسندانہ تدبر سے اُس نے اپنے خاندان کی حکومت نجد میں قائم کر لی۔ اس کے زمانے میں جبل شمر کے حاکم ابن رشید نے جو اس کے حلیف تھے اُبھرنا شروع کیا۔ مصر اور سلطان ترکی کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء میں فیصل ریاض میں ہیضے سے مر گیا۔ آخری عمر میں اس کی بصارت جاتی رہی تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ عبداللہ، محمد، سعود اور عبدالرحمان

۱۲۔ عبداللہ بن فیصل بن ترکی پہلا دورِ حکومت (۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء – ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء) اپنے والد کی وفات پر مسند نشین ہوا۔ ۱۲۸۷ھ میں اس کے بھائیوں نے اسے مسند سے اُتار دیا۔

۱۳۔ سعود بن فیصل بن ترکی (۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء – ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء) اس کے عہد کے آغاز میں ترکوں نے عبداللہ کی دعوت پر جو علاوہ وطن تھا الاحساء اور قطیف پر قبضہ کر لیا۔ اور سعود کی انہیں واپس لینے کی متواتر کوششوں کے باوجود وہ ان جگہوں پر قابض رہے۔

۱۴۔ عبداللہ بن فیصل بن ترکی دوسرا دورِ حکومت ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء – ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۴ء) مسعود (۱۳) کی وفات پر اس نے دوبارہ تخت حاصل کر لیا اور محمد اور سعود کے بیٹوں کے علی الرغم جو اس کے دعوے دار تھے وہ اس پر قابض رہا۔ ۱۸۸۳ء میں حائل کے حکمران محمد بن رشید سے اس کی جنگ چھڑ گئی اور اس کے بھتیجوں یعنی سعود (۱۳) کے بیٹوں نے ۱۸۸۴ء میں اسے جلا وطن کر دیا۔

۱۵۔ محمد بن سعود ۱۸۸۴ء میں یہ تخت نشین ہوا اس کی حکومت تھوڑے عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد اس کا چچا اس کا جانشین ہوا

۱۶۔ عبدالرحمن بن فیصل یہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء میں فوت ہوا۔ یہ شاہ فیصل شہید کا دادا تھا۔ وہ دو بار تخت نشین ہوا۔ پہلے اپنے بھائی سعود کے بعد لیکن ایک سال کے بعد ہی اس نے اپنے بھائی عبداللہ کے لیے تخت خالی کر دیا۔ بہرحال وہ ایک بار پھر برسرِ اقتدار آ گیا۔ لیکن محمد بن رشید نے اسے معزول کر کے اس کی جگہ

۱۷۔ عبداللہ بن فیصل کو تیسری مرتبہ ۱۸۸۹ء میں تخت پر بٹھا دیا۔ عبداللہ غالباً ۱۸۸۹ء میں انتقال کر گیا اس کے بعد ریاض حائل کی ماتحتی میں آ گیا۔ اس کے باوجود کہ عبدالرحمان نے خالی تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی۔ ۱۸۹۱ء میں محمد بن رشید نے ریاض کو فتح کر لیا۔ اور ۱۸۹۲ء میں اس نے فیصل کے تیسرے بیٹے محمد بن فیصل کو ریاض کا امیر مقرر کیا۔

۱۸۔ محمد بن فیصل ۱۸۹۲ء کو ریاض کا امیر مقرر کر دیا۔ (محمد کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔) محمد کے بعد ریاض پر ابن رشید کے عمال کی حکومت رہی۔

۱۹۔ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے شیخ کویت مبارک کی مدد سے، جس کے پاس اس کے والد نے پناہ لی تھی۔ حکومت کا تختہ الٹ کر ریاض پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور ... کے ابن

شجرہ ابن سعود (آلِ سعود)

سعود بن محمد بن مقرن (وفات ۱۷۳۵ء تقریباً)

(۱) محمد (دوسرے بھائی فرحان، ثنیان اور مشاری تھے)
(۱۷۳۵ء تا ۱۷۶۶ء)

(۱۰) عبداللہ — ۵ مشاری (۱۸۱۹ء تا ۱۸۲۰ء) — حسن — مشاری — عبدالرحمٰن — ۷۔ مشاری (۱۸۳۴ء) — ناصر — (۹) خالد (۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۱ء)

(۲) عبدالعزیز (۱۷۶۶ء تا ۱۸۰۳ء)
(۳) سعود (۱۸۰۳ء تا ۱۸۱۴ء)
(۴) عبداللہ (۱۸۱۴ء تا ۱۸۱۸ء) مصریوں کا قبضہ

عبداللہ
(۶) ترکی (۱۸۲۰ء تا ۱۸۳۴ء)
(۸) فیصل (۱۸۳۴ء تا ۱۸۳۸ء) اور (۱۱) (۱۸۴۳ء تا ۱۸۶۵ء)
(درمیانی وقفہ خالد بن ناصر بن سعود اور عبداللہ بن ثنیان بن سعود)

(۱۲) عبداللہ (۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۱ء) اور (۱۴) (۱۸۷۴ء تا ۱۸۸۴ء) اور (۱۷) (۱۸۸۶ء تا ۱۸۸۸ء)
(۱۳) سعود (۱۸۷۱ء تا ۱۸۷۴ء) — (۱۵) محمد (۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۵ء)
(۱۶) عبدالرحمٰن (۱۸۸۵ء تا ۱۸۸۶ء) اور (۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۱ء) (ابن رشید کا قبضہ)

(۱۹) عبدالعزیز (۱۹۰۲ء تا ۱۹۵۳ء)

(۲۰) سعود (۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۴ء) — (۲۱) فیصل (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۵ء) — (۲۲) خالد (۱۹۷۵ء –)

رشید کے مقابلے میں اس پر برابر قابض رہا۔ انھوں نے بالآخر ترکوں کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ تاہم اس بدنظمی کی بدولت جو عرب میں پھیل رہی تھی اور عام لوگوں کی مدد سے جنہیں سعود کے خاندان سے محبت تھی، عبدالعزیز سلطنتِ ریاض کے اقتدار کو از سرِ نو قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ موجودہ مملکت سعودی عرب کا بانی یہی عبدالعزیز ہے جو ابن سعود کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ (دیکھیے "ابن سعود، عبدالعزیز")

۲۰۔ سعود بن عبدالعزیز ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا اور باپ کی وفات پر نومبر ۱۹۵۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا بھائی فیصل بن عبدالعزیز حجاز کا والی، ولی عہد اور وزیرِ اعظم و وزیر خارجہ بنا۔

۲۱۔ فیصل بن عبدالعزیز ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور اپنے بھائی سعود کی معزولی پر نومبر ۱۹۶۴ء میں تخت نشین ہوئے۔ ان کی شخصیت بڑی پُر اثر اور قابلِ توجہ رہی۔ بین الاقوامی سیاسیات میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اسلامی اتحاد کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے پاکستان کا دورہ کیا، جس میں ان کا بے مثل استقبال کیا گیا۔ اجتماع ملت اسلامیہ (اسلامی کانفرنس) ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء میں ان کا کردار اور بھی اہم ہو گیا تھا۔ مسلمانانِ عالم نے ان سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن فرشتۂ اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔ اور ۱۹۷۵ء میں ان کے بھتیجے فیصل نے ذاتی رنجش کی بنا پر انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ بعد ازاں قاتل کو بھی سزائے موت دی گئی۔ (دیکھیے "فیصل بن عبدالعزیز")

۲۲۔ خالد بن عبدالعزیز ۱۹۷۵ء سے سعودی عرب کی حکومت ایک اور ذی وقار اور فطین شخصیت خالد بن عبدالعزیز کے ہاتھ آئی ہے۔ شاہ فیصل کے قتل کے بعد انھوں نے سعودی حکومت کا انتظام بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رکھا ہے۔ اور اپنے بھائی کے اس مشن کے لیے سرگرم عمل ہیں جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

۲۳۔ فہد بن عبدالعزیز ۱۴ جون ۱۹۸۲ء کو شاہ خالد کے انتقال کے بعد ان کے بھائی شاہ فہد سعودی عرب کے نئے فرمانروا بن گئے۔

ابن سعود، عبدالعزیز

(۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء — ۲ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ/ ۹ نومبر ۱۹۵۳ء)

عبدالعزیز بن عبدالرحمان بن فیصل، موجودہ مملکت سعودی عرب کا بانی، ریاض میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ صرف ریاض کا حکمران تھا، جسے محمد بن رشید نے معزول کر کے ۱۸۸۷ء میں عبداللہ بن فیصل کو تخت پر بٹھا دیا تھا جس کے انتقال کے بعد حکومت ابن رشید کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں اس نے فیصل کے تیسرے بیٹے محمد کو ریاض کا امیر مقرر کر دیا اور عبدالرحمان اپنے خاندان سمیت کویت کے شیخ مبارک کے ہاں چلا گیا۔

۱۹۰۲ء میں عبدالعزیز نے اپنے باپ کا تخت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دو سو آدمیوں کے ہمراہ ریاض میں داخل ہو کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ابن رشید کی حمایت میں ترکوں نے اپنی فوج بھیج دی۔ مختلف مقامات پر جھڑپیں ہوتی رہیں بالآخر ۱۹۰۶ء میں محمد ابن رشید کی وفات کے بعد عبدالعزیز کی فوجوں کی راہ میں مزید مزاحمت باقی نہ رہی۔

اگلے کئی برس عبدالعزیز نے نجد کے اکثر علاقوں کے انتظام و انصرام میں گذارے۔ اس نے قبائلی نظام کا خاتمہ کرنے کے لیے عرب قومیت کے نعرے کو پروان چڑھایا اور "اخوان" نام کی مختلف کالونیاں قائم کیں، جہاں عدل و انصاف کے لیے "شریعت" کو نافذ کیا گیا یہ سب کچھ وہابی مسلک کی رُو سے کیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر مکہ میں حجاز کی سلطنت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ شریف مکہ حسین بن علی نے انگریزوں کی شہ پر "حرما" کو قبضے میں کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں اس کی جھڑپ عبدالعزیز کے ساتھ ہو گئی۔ یہ جھڑپیں بڑھتی گئیں، جن میں حسین کو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور وہابی فوجیں حجاز کے مختلف شہروں پر قابض ہوتی چلی گئیں۔ ستمبر ۱۹۲۴ء میں وہابیوں نے طائف پر قبضہ کر لیا۔ حسین اپنے بیٹے علی کے حق میں دستبردار ہو گیا، جو وہابیوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر مکہ سے فرار ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں عبدالعزیز مکہ میں داخل ہوا۔ ایک سال کے بعد مدینہ بھی وہابیوں کے قبضے میں آ گیا۔

۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو عبدالعزیز نے بادشاہ حجاز ہونے کا اعلان کیا اور ابن سعود کا لقب اختیار کیا۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۷ء کو اس کے اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے برطانیہ نے مملکت نجد و حجاز کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۲ء میں اس مملکت کا نام "سعودی عرب" رکھا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں یمن کے ساتھ بھی ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے دونوں ملکوں نے اپنی اپنی سرحدوں کا تعین کیا۔ اسی طرح کا ایک دوستانہ معاہدہ ۱۹۴۲ء میں شیخ کویت سے بھی ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے تخت نشینی کا پچاس سالہ جشن (جوبلی) منایا۔ تین برس بعد مکہ میں وفات پائی۔ اس کا بڑا بیٹا سعد بن عبدالعزیز السعود (۱۹۰۵ء — ۱۹۶۳ء) تخت نشین ہوا اور فیصل بن عبدالعزیز (۱۹۰۶ء — ۱۹۷۵ء) نے ولی عہد کی حیثیت سے امور خارجہ کا قلمدان سنبھالا۔

ابنِ سینا، بوعلی

(صفر ۳۷۰ھ/اگست ۹۸۰ء — ۴ رمضان ۴۲۸ھ/ ۱۸ جون ۱۰۳۷ء)

ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا، دنیائے اسلام کا نامور طبیب شہرہ آفاق سائنسدان، جامع العلوم فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات۔ ملقب بہ الشیخ الرئیس۔ بخارا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ مغرب میں اوی سینا (AVICENA) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی کتاب "القانون فی الطب" مدتوں تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہی۔ اور کتاب "الادویہ" طب کی انجیل بنی رہی۔

ابو علی ابھی چھ برس کا تھا کہ وہ بخارا پہنچا اور تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ باپ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا، اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی مسلک کی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہا، لیکن ہونہار بروا نے دس برس میں قرآن، فقہ اور ادب کا مطالعہ ختم کر لیا۔ اور اب دیگر علوم عقلیہ کی طرف مائل ہوا۔ ابو عبداللہ الناتلی سے اس نے منطق فلسفہ اور ریاضی

کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ خود ہی طب اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کیا اور بہت جلد اپنے اساتذہ پر سبقت لے گیا۔

سولہ سترہ برس کی عمر میں ابوعلی ابن سینا نے بخارا کے حکمران نوح بن منصور کا علاج بڑی کامیابی کے ساتھ کیا۔ جس کے عوض اسے کتب خانہ شاہی کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ ذہن رسا پایا تھا، چنانچہ ایک ہی برس میں سارا کتب خانہ چھان مارا۔ براہ راست مشاہدں اور تجربات کی مدد سے وہ اپنی معلومات کی تکمیل بھی کرتا رہا۔ اگلے ہی برس حاکم بخارا فوت ہوگیا اور ابن سینا کو اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ لیکن اس اثنا میں وہ تحصیل علم کی تکمیل کر چکا تھا۔ اور اب تصنیف و تالیف کے میدانوں میں کود پڑنے والا تھا۔

۱۰۰۱ء میں ابن سینا خوارزم پہنچا اور علی بن مامون کے دربار میں داخل ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات اس دور کے دیگر عظیم علماء و فضلاء سے ہوئی۔ البیرونی، العراقی اور ابوالخیر کے ساتھ اکثر مباحثے ہوتے رہتے۔ یہاں سے عراق اور ۱۰۰۹ء میں جرجان کا رخ کیا۔ ان تمام جگہوں پر وہ کبھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ ۱۰۱۵ء میں اس نے رے کا رخ اختیار کیا۔ رے کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں مختلف حیثیتوں سے درس و تدریس اور مشورے دیتے ہوئے ۱۰۲۲ء میں اصفہان کے امیر علاء الدولہ کے ہاں اسے [illegible] علاء الدولہ اکثر اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ عمر کے آخری چودہ برس اس نے [illegible] کے ہاں گزارے۔ اگرچہ ان میں بھی وہ زیادہ عرصہ بیمار ہی رہا۔ اور بالآخر

شہرۂ آفاق سائنس دان اور طبیب ۔ ابنِ سینا

ہمدان میں مرض قولنج کے ہاتھوں فوت ہوگیا۔

ابن سینا نے فلسفہ، منطق، ریاضی اور سائنس کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں فلسفہ پر "الشفاء"، طب میں "القانون" اور "الادویہ" انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں ان کے تراجم یورپی زبانوں میں ہوئے اور اگلی کئی صدیوں تک یہ اسلامی اور یورپی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ دیگر کتابوں میں "النجات"، "الاشارات"، "الھدایت"، "رسائل فی الحکمت والطبیعیات" زیادہ مشہور ہیں۔

ابن سینا کے نزدیک علم کی دو اقسام ہیں۔ ایک نظری یا نظریاتی اور دوسرے عملی۔ نظری علوم محسوس سے مجرد کی طرف بڑھتے ہیں مثلاً طبیعیات، ریاضیات، اور مابعد الطبیعیات، وغیرہ اور عملی علوم اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ ہیں۔

ابن سینا کے نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ ذات اور وجود دو الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح روح اور جسم دو الگ الگ حیثیتوں کے مالک ہیں۔ روح مادے کی نہیں بلکہ صورت کی ایک قسم ہے۔ لیکن روح جسم کے بغیر بے کار ہے۔ اس کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں لیکن یہ جسم کے تابع بھی نہیں بلکہ اسے اپنا ادراک حاصل ہے۔ عقل اس کا ایک ملکہ ہے، اس کی ایک خصوصیت ہے اور عقل کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ نہ صرف خود کو پہچانتی ہے بلکہ مسلسل ترقی بھی کرتی ہے، جبکہ جسم ایک خاص عمر کے بعد زوال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ مادے اور صورت کی تبدیلی کے باوجود روح یا عقل میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

ہر مادہ ایک صورت رکھتا ہے اور ہر صورت کے لئے مادہ ہونا لازمی ہے۔ گویا صورت اور مادہ ایک دوسرے کے لیے علت (وجہ) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علت کی اس کے نزدیک چار اقسام ہیں۔ علت مادی، علت صوری، علت غائی (آخری) اور علت حرکی (تحریک دینے والی)۔ ابن سینا کے نزدیک ان تمام علتوں کے آخر میں ایک اور علت نکل آتی ہے، جو ان سب کو حرکت دیتی ہے۔ اسی علت العلل کو وہ خدا کی ہستی قرار دیتا ہے۔ جو بیک وقت علت فاعلہ (یعنی کام کرنے والی علت) اور علت الغایت (آخری علت) ہے گویا ایک ایسی علت کا وجود لازم ہے، جس سے تمام علتیں نکلتی ہیں، یہی وہ عقل اول ہے جس سے اتنی عظیم الشان کائنات قائم ہی۔ گویا اس کے وجود سے بے شمار وجود ظہور میں آئے مگر اس کی ذات واحد ہے، اس طرح سے ابن سینا ذات اور وجود کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیتا ہے، وجود کے لئے ذات تو لازم ہے لیکن ذات کے لئے وجود لازم نہیں۔ اگر خدا صرف ممکن حیثیت رکھتا ہے، تو وہ ذات محض ہے، جس کے لئے وجود لازم نہیں اور اگر وہ وجود رکھتا ہے تو اس کے لئے ذات لازم ہے۔ ہر دو صورتوں میں خدا عین ذات ہے۔ وہی عقل مطلق ہے جسے اپنی ذات کا شعور بھی ہے اور کائنات کا شعور بھی، اور اگر خدا واجب ہے (یعنی ممکن کی حد سے آگے نکل کر لازم ہے) تو اس کا وجود بھی ہے اور ذات بھی۔ ممکن تو ایک ایسا وجود ہے، جس کی کوئی علت ہونا لازم ہے تبھی ممکن وجود پذیر ہوگا۔ لیکن واجب وہ لازمہ ہے، جس کے لیے کسی قسم کی علت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ ممکن کی ایک علت کو بھی ممکن ہی تسلیم کیا جائے گا اور اس کی آگے پھر ایک علت ہوگی اور پھر وہ علت ممکن ہوگی اس طرح سے ثابت ہوا کہ ممکن کے وجود کی مثبت دلیل نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ ایک ایسا وجود ہونا چاہیئے، جو ممکن سے پاک اور واجب ہو۔ اس فلسفیانہ چکر سے تھک کر ابن سینا اقرار کرتا ہے کہ عقل و برہان کے ذریعے خدا کی ہستی کا ادراک ناممکن ہے۔ بس یہی سمجھ لیں کہ خدا ہے، اس کی نہ تو کوئی علت ہے نہ دلیل نہ تعریف بلکہ یہ کائنات اور موجودات اسے ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہاں ابن سینا کی عقلیت ایک بار پھر فلسفے کے دائرہ سے نکل کر مذہب کی راہوں پر آجاتی ہے۔ وہ خدا کی ہستی کو تسلیم بھی کرتا ہے مگر اسے کائنات سے الگ تھلگ بے جسم، بغیر مادہ، بغیر حیات کے ایک ہستی قرار دیتا ہے۔ وہ کامل ہستی ہے جسے حرکت نہیں کرنا پڑتی۔ حرکت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہستی کائنات کا علم نہیں رکھتی جبکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ خبیر و بصیر ہے اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ یہاں ابن سینا کہتا ہے کہ خدا دنیا سے باخبر تو ہے لیکن اس کے جزئیات کا علم عمومی نوعیت کا ہے۔ اس لیے وہ موجودات پر فیضان کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی خوبی موجودات میں سے منعکس ہو۔

ابن سینا کے نزدیک خیر اور شر دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ تاہم اس کے نزدیک خیر ہی اوّل اور خیر ہی آخر ہے، شر محض جہالت، نادانی اور رنج و غم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جب اسے علم، تعقل اور مسرت حاصل ہوتی ہے تو یہ خیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ابن سینا عقل اور ایمان کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتا ہے۔ تاہم وہ عقل کو ایمان کی ابتداء اور ایمان کو عقل کی انتہا قرار دیتا ہے۔ اس طرح سے اس کے نزدیک پیغمبروں کا درجہ فلسفیوں اور عقل پرستوں سے افضل ہے۔ اور وحی کی حیثیت ادراک کی قوت سے بلند تر ہے۔ اس کا قول ہے کہ منطق اور علم ہمیں اتنی جلد خدا کے قریب نہیں کرتے جتنا ایمان اور تصوّف۔ گویا زہد، تقویٰ اور ریاضت سے خدا کی ہستی کا علم عقل و منطق کی بہ نسبت جلد اور بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح سے ابن سینا فلسفے اور منطق کی راہوں سے ہوتا ہوا الٰہیات کی منازل تک چلا آتا ہے۔

طبیعیات میں ابن سینا نے نور، حرارت، خلا، قوت، حرکت اور ذرّات کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے نزدیک روشنی کی ایک رفتار مقرر ہے اور ہر شے اپنا ایک مخصوص وزن رکھتی ہے۔ ابن سینا کیمیاگری کا سخت مخالف تھا۔ اس کے نزدیک عناصر ایک دوسرے میں تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔ معدنیات پر اس کا رسالہ مدّتوں یورپی علوم کا ماخذ رہا۔ اسی طرح ارضیات کے میدان میں بھی اس نے پہلا قدم اٹھایا اور متحجرات اور پہاڑوں کی ساخت کی وضاحت کی۔

علمِ طب میں ابن سینا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ علم نہیں تھا تو بقراط نے اسے جنم دیا، جب یہ مر گیا تو جالینوس نے حیات نو بخشی، جب یہ بکھر گیا تو رازی نے سمیٹا لیکن یہ ناقص تھا اور ابن سینا نے اس کی تکمیل کی۔

ابنِ صیّاد ایک یہودی کا بیٹا، جسے دجّال سمجھا جاتا رہا تھا۔ اس کا اسلامی نام عبداللہ تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ساحر تھا اور مسلمان ہو گیا، اور مکّہ اور مدینہ میں آتا جاتا رہا۔ حضرت رسول اکرمؐ نے اس سے ملاقات کی تھی انہیں شک تھا کہ شاید دجال یہی ہو لیکن آپؐ نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ ابن صیاد ہی دجال ہے۔

دجال کے متعلق احادیث سے علم ہوتا ہے کہ قیامت آنے سے پہلے اس کا فتنہ ظہور پذیر ہوگا۔ وہ ایک آنکھ سے کانا شخص ہوگا اور لوگوں سے اپنی خدائی منوائے گا۔ اکثر لوگ اسے خدا تسلیم کریں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ مر جائے گا۔ حضرت رسول اکرمؐ نے مزید فرمایا کہ اگر وہ میرے زمانے میں ظاہر ہوا تو میں اس سے نبٹ لوں گا اور اگر وہ بعد میں آیا تو اللہ اپنے مومنوں کا حامی و ناصر ہوگا۔

ابن صیاد کی ایک آنکھ میں پھولا تھا اور وہ عین اس وقت پیدا ہوا جب مسلمان ذکرِ دجال سن چکے تھے۔ حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ دجال کا باپ تیس سال تک لاولد رہے گا، پھر ایک کانا لڑکا پیدا ہوگا جس کے دانت لمبے ہوں گے اور وہ اپنے ماں باپ کے حق میں نفع رساں نہ ہوگا۔ اس کی آنکھیں سوتی ہوں گی لیکن دل جاگتا ہوگا۔ پھر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اس کا باپ لمبا مگر دبلا ہوگا اور اس کی ناک چونچ کی مانند ہوگی اور اس کی ماں بھاری جسم اور لمبے ہاتھوں والی ہوگی۔ ابوبکرہؓ کہتے ہیں، اس وقت مدینہ میں ایک یہودی کے گھر ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی تو میں اور ابن عوام دونوں دیکھنے گئے تو دیکھا کہ وہ ویسا ہی تھا جس کے متعلق آنحضورؐ نے پیش گوئی کی تھی اور وہ تیس سال بعد ہی اپنے والدین کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ (ترمذی)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضور صلعم ابن صیاد کے گھر گئے دیکھا کہ وہ بستر پر چادر لپیٹے کچھ بے معنی باتیں کر رہا ہے۔ اس کی ماں نے آنحضورؐ کو جب دیکھا تو پکار اٹھی۔ "عبداللہ! یہ ابوالقاسم صلعم آئے ہیں۔" یہ سن کر اس نے چادر سے منہ نکالا۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ "اگر اس کی ماں تھوڑی دیر خاموش رہتی تو بہت سی باتوں کا انکشاف ہو جاتا۔"

عبداللہ بن عمرؓ اور دیگر اصحاب سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت رسول اکرمؐ ان کے ہمراہ ابن صیاد کے پاس سے گذرے۔ وہ اس وقت بنی مغالہ کے محلے میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ابن صیاد بالغ ہونے والا تھا۔ اسے آنحضرت صلعم کے آنے کی خبر نہ ہوئی تو آپؐ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ "کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟" تو اس نے جواب دیا کہ "ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ [illegible] (ان پڑھوں) کے رسول ہیں۔ نیز کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں [illegible] آنحضور صلعم نے اسے جھنجھوڑا اور فرمایا۔ "میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہوں۔ (اگر تو بھی ہوتا میں ایمان لاتا)" پھر فرمایا۔ "کیا تجھ پر غیب سے کچھ آتا ہے؟" اس نے کہا "ہاں! کبھی صحیح اور کبھی غلط۔" پھر آپؐ نے دل میں ایک آیت [illegible] السماء بدخان مبین" اور اس سے پوچھا "میں نے دل میں کیا سوچا ہے [illegible] دیا۔ "دُخ (دھواں)" اس نے ایک ہی لفظ بتایا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ [illegible] اور عرض کی کہ اگر آپؐ اجازت دیں تو اس کی گردن مار دوں۔ آپؐ نے [illegible] اگر یہ دجال ہے تو پھر تو اس پر قابو نہ پائے گا۔ اور اگر یہ دجال نہیں تو [illegible] کرنا واجب نہیں۔"

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے ابن صیاد کا [illegible] نے مجھے کہا کہ لوگوں سے میں نے تکلیف پائی ہے کہ وہ مجھے دجال کہتے [illegible] ہو کہ ایسا نہیں کیونکہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دجال لاولد ہوگا [illegible] ہے اور یہ بھی فرمایا کہ دجال کافر ہوگا اور میں مسلمان ہوں۔ پھر آپ نے [illegible] وہ مکّہ مدینہ میں داخل نہ ہوگا اور میں مکّہ سے مدینہ کو جا رہا ہوں پھر [illegible] دجال کی پیدائش کا وقت اور مکان جانتا ہوں اور اس کے ماں باپ [illegible] ہوں۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ اس کی آخری باتوں نے مجھے شبے میں ڈال [illegible]

ان احادیث کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صیاد [illegible] بعد میں مسلمان ہو گیا۔ اس کی ظاہری علامات سے مسلمانوں نے [illegible] یہ بات ثابت نہ ہو سکی۔ بعد ازاں اس نے حج بھی کیے اور صاحب اولاد [illegible]

ابنِ طفیل (۴۹۴ھ ۱۱۰۰ء - ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) ابوبکر محمد ابن عبدالملک [illegible] مسلمان فلسفی، طبیب اور مشہور رمزی فلسفیانہ افسانے "حی بن یقظان" کا مصنّف، اندلس کے شہر غرناطہ کے قریب وادی آش میں پیدا ہوا [illegible] میں طبابت کرتا رہا بعد ازاں اندلس کے الموحد حکمران ابویعقوب یوسف [illegible] کا طبیب مقرر ہوا۔ یہیں اس نے مشہور فلسفی ابن رُشد کو اس وقت متعارف کرایا تھا جب کہ وہ ابھی نوجوان تھا۔ اسی نے ابن رُشد کو ارسطو کی تصانیف کی تشریح لکھنے کے لیے اکسایا تھا۔

ابن طفیل نے طب پر بہت سی کتابیں لکھیں لیکن اس کی شہرت کا دارومدار اس کے افسانے "حیّ بن یقظان" پر ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں رمز و ایماء کے پردے میں دراصل ابن طفیل نے اپنے مکتبِ فکر کے خیالات کی وضاحت

میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنی زندگی کے ابتدائی ۵۰ سال ایک ویران جزیرے پر گذارتا ہے۔ وہ کائنات کے اسرار کھوجتا اور اپنا علم بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ فلسفہ کا علم اور شریعت کا علم دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں اور الہامی مذاہب بھی وہی کچھ ہیں جن تک فلسفیانہ عقیدہ پہنچ گیا ہے۔ (دیکھئے "حیّ بن یقظان")

دراصل اس کہانی کے پردے میں ابن طفیل اس مکتب فکر کا موقف واضح کرتا ہے، جو الکندی سے شروع ہو کر ابن رشد تک ختم ہوتا ہے۔ یہ لوگ عقل پرست ہیں۔ تاہم مذہبی امور کو فلسفے کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابن طفیل کے نزدیک چونکہ فلسفہ عام لوگوں کے ذہنوں سے بالا ہے۔ اس لئے اسے قصے کی شکل میں بیان کرنا چاہیے۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ابن طفیل فلسفے ہی کو [illegible] مقصد [illegible] بلکہ اس کے نزدیک شریعت اور تصوف ہی وہ [illegible] ہے۔ جو [illegible] عوام الناس بلکہ حی بن یقظان جیسے مفکرین کے لئے بھی [illegible] کیونکہ حی بن یقظان عوام سے بددل ہو کر واپس اسی جزیرے [illegible] چلا جاتا ہے تاکہ [illegible] کی زندگی گذارے۔

[illegible] نے اس افسانے کا عبرانی زبان میں [illegible] اندلس نے عبرانی سے اس کا لاطینی [illegible] لاطینی [illegible] پوکوک نے ۱۶۷۱ء میں شائع کیا۔ [illegible] شائع [illegible] دیگر زبانوں میں بھی ترجم [illegible] زبان [illegible] شہد اسی افسانے [illegible]

ابن طقطقی [illegible] الدین ابو جعفر محمد بن تاج الدین ابی [illegible] طباطبا کے واسطے سے [illegible] خاندان علی کے [illegible] وزیر الجوینی کے اشارے پر ۷۰۰ھ [illegible] کربلا کی نقابت ان کے [illegible] سفر کے دوران میں کتاب الفخری [illegible] اسلامی تاریخ بیان ہے۔ ان کی تاریخ وفات [illegible] طباطبا سے کرتے تھے۔ اس لئے انہیں ابن طباطبا بھی [illegible] طقطقی کے معنی [illegible] بولنے والے کے ہیں۔

ابن عباد (۳۲۶ھ [illegible] ۳۸۵ھ/۹۹۵ء) ابوالقاسم، کافی الکفاۃ اسماعیل بن عباد بن العباس بن عباد بن احمد ادریس الطالقانی عالم و ادیب، طالقان (اصفہان) میں پیدا ہوا۔ [illegible] الدولہ بن رکن الدولہ بویہی کا وزیر تھا۔ تعلیم بغداد [illegible] کی اور [illegible] میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۳۴۷ھ/۹۵۸ء میں وزیر ابو علی الصفا کی ملازمت میں چلا گیا پھر ابوالفضل بن العمید کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۳۶۰ھ/ ۹۷۰ء میں اس کا تقرر [illegible] الدولہ بن رکن الدولہ کے وزیر کی حیثیت سے ہوا۔ کافی الکفاۃ کا لقب [illegible] الدولہ ہی نے دیا۔ ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں اسے ہمدان میں عضد الدولہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ ۳۷۳ھ/۹۸۳ء میں موید الدولہ بغیر فیصلہ جانشینی کئے فوت ہو گیا تو ابن عباد کی سفارش پر اس کے بھائی فخر الدولہ کو بادشاہت قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس کے دربار میں بھی ابن عباد کا اثر و رسوخ بے مثل تھا۔ اس نے فخر الدولہ کو عراق و عرب فتح کرنے پر بھی اکسایا لیکن وہ ناکام رہا۔

ابن عباد کی اصل شہرت اس کے علم و فضل کی وجہ سے ہے۔ وہ اٹھارہ کتابوں کا مصنف بھی تھا، جن میں سے اب چار دستیاب ہیں۔ اس کے کتب خانے کی فہرست کتب دس جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس نے رے ہی میں وفات پائی۔

ابن عبدالبر (۲۵ ربیع الثانی ۳۶۸ھ/۲۹ نومبر ۹۷۸ء — ۱۹ ربیع الثانی ۴۶۳ھ/۲۴ جنوری ۱۰۷۱ء) ابو عمر یوسف بن عبدالبر، فقیہہ اور محدث، قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ حدیثوں کے اکٹھا کرنے کا شوق تھا جو بعد میں علمی حیثیت اختیار کر گیا۔ حدیثیں جمع کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔ فقہ میں بے حد مہارت حاصل تھی اور اس ضمن میں اندلس کے علماء میں افضل سمجھے جاتے تھے۔ شاطبہ کے مقام پر وفات پائی۔ تصانیف میں "استیعاب"، "کتاب الصغیر (قبائل عرب اور ان کے نسب)"، "الاستذکار (موطا کی شرح)"، "تمہید الموطا" (۷۰ جلدوں میں) اور "بہجۃ المجالس و انس المجالس" (تین جلدوں میں اقوال و لطائف) زیادہ مشہور ہیں۔

ابن عبدالحکم (وفات ۲۵۷ھ/۸۷۱ء) عبدالرحمان بن عبداللہ بن عبدالحکم، مصر کا عرب مورخ۔ تاریخ و جائے ولادت کا علم نہیں۔ اس کے والد عبداللہ فقیہہ اور حدیث کے عالم تھے اور مصر میں مالکی مذہب کے امام تھے۔ یہ بھی بعد میں امام بنے۔ چونکہ ان لوگوں نے عقیدہ خلق قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے خلیفہ الواثق باللہ نے ۲۳۷ھ/۸۵۱ء میں اس خاندان پر غبن کا مقدمہ چلایا۔ جس پر یہ لوگ بدنام ہوئے۔

ابن الحکم کو حدیث سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے "فتوح مصر" مرتب کی، جو سات جلدوں پر ہے۔ سیوطی کی کتاب "حسن المحاضرہ" بھی زیادہ تر اسی سے نقل ہے۔ خود اس کا مواد مدنی روایات پر مشتمل ہے۔ فسطاط میں وفات پائی۔

ابن عذاری ابوعبداللہ محمد ابن عذاری، مورخ۔ تاریخ پیدائش و وفات کا علم نہیں المراکشی مشہور ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں بقید حیات تھا، کیونکہ اس کی تصنیف میں ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء تک کے واقعات ملتے ہیں۔ لیکن تصانیف سے حالات کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ ایک کتاب "تاریخ مشرق" اب ناپید ہے اور دوسری کتاب "البیان المغرب فی اخبار المغرب" ہے (۶۹۴ھ/۱۰۶۸ء تک کے واقعات کے چند اجزا چھپ چکے ہیں۔ ڈوزی نے اس کا ترجمہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء کے دوران میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ نیا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بعض اوراق گزشتہ کے اقتباسات ہیں۔ اس لئے اس کی تاریخی اہمیت بے انتہا ہے۔

ابن عربی (۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء — ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) شیخ ابوبکر محی الدین محمد ابن علی، شیخ الاکبر، مرسیا میں پیدا ہوئے، عرب کے قدیم قبیلہ طے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۵۶۸ھ/۱۱۷۳ء میں آپ اشبیلیہ چلے گئے اور تیس برس تک حصول علم میں سرگرداں رہے۔ اکثر صوفیاء سے یہیں ملاقات کی۔ ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء میں بلاد مشرق کو روانہ ہوئے یہ سرزمین انہیں اس قدر پسند آئی کہ پھر کبھی واپس نہ گئے۔ مصر، مشرق قریب، ایشیائے کوچک اور عرب کے مختلف شہروں کی سیر کی اور بالآخر ملک شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ شہر دمشق ہی میں وفات پائی۔

آپ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ان میں خاص خاص

کتابیں یہ ہیں :-

۱- "فتوحات مکیہ" اس میں مختلف مذاہب اور مسالک پر بحث کی گئی ہے -

۲- "فصوص الحکم" تصوف اور فلسفے کے مسائل اور الٰہیات پر ایک معرکتہ الآرا کتاب ہے

۳- "ذخائر الاعلاق" اشعار کا دیوان ہے جس میں حبِ الٰہی کی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے

بعض بزرگوں کی رائے ہے ابن عربی کامل ولی، قطبِ زمان اور علم باطنی میں ایسی سند تھے جس میں کلام ہی نہیں ہے - دوسری جانب کا گروہ کہتا ہے کہ وہ بدترین قسم کے ملحد تھے - ان کے مداحوں میں جلیل القدر علماء بھی تھے جنھوں نے ان کے عقائد کی تائید میں کتابیں بھی تالیف کیں - ایسے علماء میں سراج الدین المخزومی، الفخر الرازی، الجلال السیوطی مجد الدین فیروزآبادی اور عبدالرزاق الکاشانی شامل ہیں - متاخرین میں سے عبدالوہاب الشعرانی بھی تھے - ان کے بعض مشہور و ممتاز مخالفین میں رضی الدین بن الخیاط الذہبی، ابن تیمیہ، ابن ایاس، علی القاری اور جمال الدین محمد بن نور الدین صاحب "کشف الغطاء عن ھذہ الامۃ" شامل تھے - بعض بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں مثلاً ابن تیمیہ، ابن خلدون اور ابن حجر عسقلانی ان کے بعد بھی مخالفت میں سرگرم رہے -

آج بھی ان کی تصانیف کے بارے میں اس قسم کا متضاد رویہ اختیار کیا جاتا ہے - بعض ان کی تصانیف کے مطالعہ کا حکم دیتے ہیں اور بعض ان کی تصانیف پڑھنے سے منع کرتے ہیں - ان کی بیشتر تصانیف کا موضوع تصوف ہے - اس وسیع و بسیط موضوع کے علاوہ ابن عربی نے حدیث، تفسیر، سیرت النبی، ادب - جس میں متصوفانہ شاعری بھی شامل ہے علوم طبیعی بالخصوص گیہاں شناسی، ہیئت اور علوم مخفیہ پر قلم اٹھایا ہے - ان کے اسلوب بیان میں یکسانیت نہیں ہے اور انداز فکر بھی وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے - چاہیں تو واضح اور سلیس انداز اختیار کر لیتے ہیں - اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انہوں نے کس موضوع پر قلم اٹھایا ہے - اور وہ موضوع مذہبی نقطہ نظر سے کتنی اہمیت کا حامل ہے - ان کے ہاں شاعرانہ رنگین بیانی بھی ملتی ہے اور سادہ نثر بھی -

ان کی آخری تصانیف بالخصوص "فصوص" مبہم ترین ہیں - اس کا اسلوب رمزیہ ہے اور انداز بیان انتہائی اصطلاحی - ان امور کو جنہیں بڑی سادگی اور سلاست سے بیان کیا جا سکتا تھا جان بوجھ کر گنجلک اور پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس طرح تنگ خیال، راسخ العقیدہ اور راہ تصوف سے بے خبر لوگوں کی نظر سے اپنے "وحدت الوجودی عقائد" کو چھپایا ہے - ان کی درست اعتقادی کے بارے میں جو اختلاف رائے دنیائے اسلام میں پایا جاتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے پردے میں اپنے اصل خیالات کو چھپانے میں صرف ایک حد تک ہی کامیاب ہوئے ہیں - ایک اعتبار سے "فصوص" کو تفسیر قرآن بھی کہا جا سکتا ہے - انہوں نے تفسیر کے لئے جن آیات کو چنا ان کی تاویل اس طرح کی ہے کہ ان سے وہی معانی نکل سکیں جو وہ انہیں پہنانا چاہتے ہیں بعض اوقات قواعد نحوی و اشتقاق کے علی الرغم بھی قرآن کو فلسفۂ "وحدت الوجود" کے ایک مسلسل و مربوط نظام فکر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دونوں کو اس طرح ملتبس کر دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا - ذرا کم درجہ تک یہی طریقہ انہوں نے احادیث نبوی کے لئے بھی استعمال کیا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں - وہ صوفی ہونے کے علاوہ ایک اچھوتا انداز فکر بھی رکھتے تھے - وہ ایک نئے دبستان فکر کے مؤسس تھے - لیکن ان کا فلسفہ کچھ بے ترتیب سا ہے - وہ ایک بہت بلند تخیل اور گہرے صوفیانہ جذبات بھی رکھتے ہیں - وہ انتہا درجے کے خواب و خیال کی دنیا میں بسنے والے شخص تھے - اُن کا فکر اُن کے تخیل کے ذریعے سے کام کرتا ہے مگر اس میں استدلال کی ایک گہری رو بھی جاری رہتی ہے - یہ الگ بات ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کا تسلسل ٹوٹتا رہتا ہے - استدلالی اور تصوفی و خیالی، یہ دو پہلو ان کے فکر میں دوش بدوش نظر آتے ہیں -

اپنے خیالات کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کبھی تو انہیں ثابت کرنے کے لئے رسمی جدلیاتی استدلال استعمال کیا اور کبھی اسے نظر انداز کر گئے - بعد ازاں یا تو الہام کے قطعی ثبوت کے لئے صوفیانہ وجدان کا حوالہ دے دیا اور یا ان کے متعلق محض ایک تخیلی بیان مہیا کر دیا - اپنی نفسیات میں وہ متخیلہ کو بہت اونچا درجہ دیتے ہیں - ان کے نزدیک یہ ایک ایسی قوت ہے جس سے حقیقی علم حاصل کیا جا سکتا ہے - وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے تخیل میں ایسی اشیاء کا مشاہدہ کیا ہے جو ان کے لئے موجودات خارجہ جیسی، بلکہ ان سے بھی زیادہ حقیقی تھیں - انہوں نے دنیا کے سامنے متصوفانہ فلسفے کا ایک نظام ضرور پیش کیا ہے، مگر اس نظام فکر کے عناصر ترکیبی ہر ممکن ماخذ سے لے گئے ہیں - ان کے سامنے یونانیوں کا وہ سارا گنجینۂ افکار موجود تھا جو مسلم فلسفیوں اور متکلمین کے واسطے سے اُن تک پہنچا تھا - وہ تمام اسلامی علوم سے آشنا اور صوفیہ متقدمین کی تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں - انہوں نے اپنے نظام فلسفہ کے لئے جو شئے مناسب نظر آئی وہ اُن تمام ماخذ میں سے مستعار لے لی -

وہ بنیادی اصول جس پر ابن عربی کے سارے متصوفانہ فلسفے کا دارومدار ہے عقیدۂ وحدت الوجود ہے - انہوں نے اس عقیدے کا اظہار ان چند الفاظ میں کر دیا ہے "بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا - اور جو خود ان کا جوہر اصلی (اعیانہا) ہے -" پھر یوں کہا - "اے کہ تو نے تمام اشیاء کو اپنی ذات میں خلق کیا، تو جمع کرتا ہے ہر اس چیز کو جسے تو پیدا کرتا ہے، تو وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کا وجود تیری ذات میں رہ کر کبھی فنا نہیں ہوتا - اور اسی طرح تو تنگ بھی ہے اور تو ہی وسیع بھی ہے -"

ابن عساکر

کئی عرب مصنفین کا نام جن میں سے درج ذیل دو زیادہ معروف ہیں -

ابن عساکر (۱) مورخ دمشق - علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ، ابوالقاسم، ثقۃ الدین الشافعی - ۴۹۹ھ/۱۱۰۵ء میں دمشق میں پیدا ہوئے - بغداد اور ایران کے بڑے بڑے شہروں میں علم حاصل کیا - دمشق کے مدرسۃ النوریہ میں مدرس رہے [illegible] ۵۷۱ھ/۱۱۷۶ء کو وفات پائی - "الانساب" کے مصنف السمعانی ان کے [illegible] میں سے تھے جنہوں نے ۵۶۲ھ میں وفات پائی - ان کی سب سے بڑی کتاب "تاریخ مدینۃ الدمشق" ہے جو اسی جلدوں پر مشتمل تھی -

(۲) [illegible] کا بیٹا، القاسم ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء میں پیدا ہوا اور ۶۰۰ھ [illegible] وفات پائی - علاوہ دیگر تصانیف کے اس نے "الجامع المستقصی فی فضائل المسجد الاقصی" بھی لکھی -

ابن عسال

قبطیوں میں مذہبی اور علمی تحریک کے بانی تین بھائی [illegible]

ابن عسال (۱) الفاضل الحکیم الاسعد، ابوالفرج ہبۃ اللہ [illegible] مشہور [illegible] اس نے قبطی زبان کی صرف و نحو پر ایک کتاب عربی زبان میں لکھی اور [illegible] کے ایک منتخب عربی نسخے کو بھی طبع کیا - جس میں وہ اپنے آپ کو الکاتب المصری کے نام سے موسوم کرتا ہے - رسائل پولوس کا ایک مقدمہ بھی لکھا

(۲) - الصفی، الشیخ الفاضل، ابوالفضائل اسعد - ماہر قوانین کلیسا تھا اور مناظروں میں حصہ لیا کرتا تھا - دینیات پر متعدد رسائل لکھنے کے علاوہ اس نے مذکورہ قوانین کا ایک مختصر مجموعہ "المجموع الصفوی فی القوانین" والی قوانین تکلیسیہ بھی مرتب کیا -

(۳) - مؤتمن الدولہ ابواسحاق - بظاہر وہ سب سے چھوٹا ہے - وہ [illegible]

سرکاری عہدے پر مامور تھا۔ چنانچہ اُسے المؤتمن الدولہ والدین المسیحی لکھا جاتا ہے۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "سُلّم المقفیٰ اوذھب کلابۃ المصفیٰ" یعنی ایک قبطی، عربی فرہنگ ہے، جس میں وہ الفاظ درج ہیں جو مسیحی عبادات میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اور جنھیں ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔

متذکرہ تینوں بھائی تیرہویں صدی میلادی کے نصف اوّل میں گذرے ہیں ان کے والد کو جو القابات دیئے گئے تھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب حیثیت اور ایک اچھے خاندان کے افراد تھے۔ یہ ایک عالیشان مکان کے مالک بھی تھے۔ ان بھائیوں کے بارے میں ابھی بہت کچھ تحقیق طلب ہے۔

ابنِ عسکر محمد بن علی بن عمر بن حسین ابن مصباح سیاح، مصنف اور قاضی القضاۃ مراکش کے قصبہ القصبط میں پیدا ہوا۔ اسے اپنی تصنیف "دوحۃ الناشر لمحاسن من کان من المغرب من اہل القرن العاشر" کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی جو ۵۰۰ادمر کے لگ بھگ مرتب کی گئی تھی۔ یہ ان اولیاء اور علماء کی سیرت کا مجموعہ ہے جن سے وہ واقف تھا یا پھر دوسرے لوگوں کی وساطت سے متعارف ہوا۔ اس کا تعلق ادریسیہ کی ایک شاخ سے تھا۔ نوجوانی میں مملکت جبالہ کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ کچھ دنوں تطوان اور فاس میں مقیم رہا۔ ۱۵۶۲ء میں وہ پھر سیاحت پر نکلا۔ ۱۵۷۳ء میں فاس میں حسن شریف محمد بن علی نے اسے قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ جو الغالب کا بیٹا تھا۔ اور اس کے چچا عبدالملک کے نزدیک خلافِ دستور تخت نشین ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ابن عسکر نے حسن کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ پرتگال چلا گیا تاکہ ڈون سباستیان سے کمک طلب کرے۔ مراکش میں واپسی پر دونوں کے درمیان وادی المخازن میں شدید جنگ ہوئی۔ جس میں ڈوم حسنی اور ابن عسکر سب مارے گئے۔ حتیٰ کہ عبدالملک بھی جو ابتدائے جنگ ہی میں لقمۂ اجل ہو گیا تھا۔

ابنِ عطاءُ اللّٰہ احمد بن محمد ابو الفضل تاج الدین الاسکندری الشاذلی عرب صوفی (المالکی اور شاید شافعی) جو ابن تیمیہ کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھا۔ ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں قاہرہ کے مدرسہ المنصوریہ میں وفات پائی۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، نحو اور اصول میں درجۂ فضیلت کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی کمال پیدا کیا۔ ابتداء میں صوفیاء سے دور دور رہے لیکن پیر شیخ الشیوخ ابو العباس المرسی کی صحبت نے انہیں تصوف کے رنگ میں رنگ دیا۔ قاہرہ میں ہی رہتے ہوئے الازہر میں حلقۂ درس قائم کیا۔ حلقۂ ارادت بڑا وسیع، کلام پُراثر، اقوال و آثار سے پُر تھا۔ تصانیف میں اسرار و معارف اور رموزِ علم و حکمت نظم و نثر دونوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

ابنِ علقمی (۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء - ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) مؤیّد الدین ابو طالب محمد ابن احمد بن محمد بن علی الاسدی، البغدادی، بنو عباس کا آخری وزیر۔ مذہباً شیعہ تھا۔ پہلے وہ عباسی خلیفہ المستنصر باللہ کے عہد میں شمس الدین ابن الناقد کی معزولی کے بعد استاد دار مقرر ہوا۔ پھر المعتصم باللہ نے اپنے عہد میں نصیر الدین الناقد کی وفات کے بعد ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں قلمدانِ وزارت سونپ دیا۔ یہ چودہ برس اس عہدے پر متمکن رہا۔ حتیٰ کہ تاتاریوں کے سیلاب نے خلافت بنو عباس ہی کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے ہلاکو خان کو بغداد پر حملہ آور ہونے کی دعوت اسی نے دی تھی۔ اس غرض کے لیے اس نے اپنے ایک بھائی اور ایک مملوک کو ہلاکو کے پاس بھیجا اور صاحب موصل الملک الرحیم بدر الدین لؤلؤ (متوفی ۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء) کے خطوط جنہیں اس نے تاتاری سیلاب کے لمحہ لمحہ بڑھنے کی خبر دی تھی، خلیفہ تک نہ پہنچنے دیئے۔ اس عظیم سازش کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلیفہ کے منظور نظر دوات دار سے اس کے اختلافات تھے۔ جس کے باعث اسے اقتدار متزلزل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ علاوہ ازیں بغداد کے محلہ کرخ میں جب شیعہ سُنّی فساد ہوا تو حکومت نے شیعوں کو سختی سے دبا دیا۔ اس بات کا بھی ابن علقمی کو رنج تھا۔ بہرحال وہ تاتاریوں کو بلا تو بیٹھا لیکن جلد ہی افسوس و ندامت نے اُسے گھیر لیا۔ مگر پھر ہو کیا سکتا تھا؟ پانی سر سے گذر چکا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا — "قضاء و قدر کے فیصلے میری تمناؤں کے خلاف ہوئے"۔ بغداد پر قبضے کے بعد ہلاکو نے شہر کا انتظام علقمی کے حوالے کر دیا اور اس کی کوششوں سے شہر کی حالت جلد سنبھل بھی گئی۔ مگر اس نقصان کی تلافی ممکن نہ تھی۔ رنج و ندامت نے اس کی زندگی کے دن مختصر کر دیئے اور چند ماہ بعد ہی مر گیا۔

ابن علقمی عالم، فاضل، نامور ادیب اور کتابوں کا عاشق تھا۔ اس کے کتب خانے میں دس ہزار کتب تھیں۔ ابن ابی الحدید نے "نہج البلاغۃ" اسی علقمی کے کہنے سے لکھی تھی الصغانی کی "العباب" بھی اسی کے کہنے پر لکھی گئی۔ العلقمی دراصل اس کے دادا کا لقب تھا۔ اس لیے کہ خلیفہ کے احکام کی تعمیل میں دریائے فرات کے مغربی سمت میں العلقمی نام کی نہر اس نے تیار کروائی تھی۔

ابنِ عمّار ابو طالب امین الدولہ، الحسن طرابلس کا شیعی قاضی جس نے پانچویں صدی ہجری کے تقریباً وسطی زمانے میں طرابلس کے فاطمی عامل مختیار الدولہ ابن نحال کی موت پر زمام حکومت خود سنبھال لی اور خلیفۂ مصر کی سیادت سے آزاد ہو گیا۔ اس کے عہد میں طرابلس نے خوب ترقی کی اور وہ سرزمینِ شام کا علمی مرکز بن گیا۔ ابن عمّار نے یہاں ایک کتب خانہ اور مدرسہ بھی قائم کیا۔ کتب خانہ میں ایک لاکھ کتابیں تھیں۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا جلال الملک ابو الحسن علی بن محمد بن عمّار تاج و تخت کا وارث ہوا اور اپنی وفات ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء تک برابر اس پر متصرف رہا اور پھر اس کے بعد اس کا بھائی ابو علی فخر الملک عمّار بن محمد ۴۹۲ھ میں تخت نشین ہوا۔ لیکن امن اس کے پیشروؤں کی بدولت ہوا تھا دیر تک قائم نہ رہا۔ اس لیے کہ طرابلس جیسے دولت مند شہر پر صلیبیوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ ۴۹۵ھ/۱۱۰۲ء میں ریمنڈ سینٹ گائیلز نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ اور گو وہ ادائے خراج کے عہد سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکا۔ بایں ہمہ اس نے شہر کے بالمقابل "تل الحجاج" پر ایک قلعہ تعمیر کر دیا تاکہ طرابلس کے خلاف پھر کبھی قدم اُٹھ سکے ابن العمار چند سال کامیابی سے شہر کا دفاع کرتا رہا لیکن ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء میں جب ریمنڈ مر گیا اس کے جانشین نے شہر طرابلس کے گرد اور بھی سختی سے گھیرا ڈال دیا۔ اس پر ابن عمّار سلجوق سلطان سے مدد حاصل کرنے کے لیے بغداد روانہ ہو گیا۔ اور اس کی عدم موجودگی بڑی تباہ کن ثابت ہوئی۔ اہلِ شہر نے شہر کو فاطمی خلیفے کے حوالے کر دیا۔ مگر خلیفہ نے بجز اس کے کچھ نہ کیا کہ عمّار کے غزانوں، اس کے ساتھیوں اور اہل و عیال پر مستولی ہو جائے یوں طرابلس اپنے جملہ وسائل اور بہترین محافظوں سے محروم ہو گیا۔ عمّار بھی سلطان کو مدد کے لیے تیار نہ کر سکا۔ لہٰذا وہ بھی واپس طرابلس نہ آیا۔ برعکس اس کے وہ دمشق کے اتابک طغتگین کی مدد سے کچھ عرصہ جبلہ پر قابض رہا۔ لیکن ۵۰۲ھ میں جبلہ اور طرابلس دونوں فرنگیوں کے قبضے میں آ گئے۔ اس پر کچھ دن ابن عمّار طغتگین کے دربار میں حاضر رہا تاآنکہ اس نے الزبدانی جو وادی بردی میں تھی جاگیر میں دے دی۔ بعد ازاں وہ امیر موصل مسعود کے ہاں منصب وزارت پر متمکن ہو گیا اور ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء تک وہیں رہا۔ آگے چل کر اس نے عباسی خلیفہ کی ملازمت اختیار کر لی۔

ابنِ عوام ابوزکریا یحییٰ بن محمد بن احمد بن العوام الاشبیلی علم زراعت پر ایک مضبوط رسالے "کتاب الفلاحت" کا مصنف، جسے اس موضوع پر اسلامی اندلس ہی نہیں بلکہ ازمنہ وسطیٰ کی بہترین تصنیف کہا گیا ہے۔ یہاں اس کے حالات زندگی، سوائے اس کے کہ وہ اشبیلیہ میں رہتا تھا، معلوم نہیں۔ اس سے ایک صدی پہلے عمر بن حجاج نے جو کچھ کہا تھا، ابن عوام نے اپنی کتاب میں محض اسی کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ تاہم اس نے اپنے اور معاصرین کے مشاہدات اور تجربات کو زیادہ تر پیش نظر رکھا ہے۔ اس کی کتاب کے چونتیس ابواب ہیں۔ پہلے تیس ابواب کا موضوع زراعت ہے اور باقی چار مویشیوں کی پرورش، مرغی خانے اور شہد کی مکھیوں کی پرورش کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اس نے ۵۸۵ پودوں اور پچاس سے زائد میوہ دار درختوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان کے معالجے نیز زمین اور کھاد کے علاوہ پیوندکاری پر تحقیق کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ابنِ فرح الاشبیلی (۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء - ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء) شہاب الدین ابوالعباس احمد بن فرح بن احمد بن محمد الاشبیلی، شافعی محدث تھے، اشبیلیہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء میں جب قسطالیہ کے حکمران فرڈیننڈ ثالث کی زیر قیادت ہسپانویوں نے الموحدون کے اندلسی دارالسلطنت اشبیلیہ کو فتح کیا، تو انہیں قید کر دیا گیا۔ لیکن یہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں قاہرہ پہنچے۔ وہاں شیخ الاسلام عزالدین عبدالسلام کمال العز بزاز اور دوسرے نامور علماء سے استفادہ کے بعد دمشق چلے گئے۔ اور وہاں بھی ممتاز علماء سے پڑھتے رہے۔ بعد ازاں وہیں سکونت اختیار کر لی اور حدیث کے ایک بڑے عالم کی حیثیت سے جامع اموی میں درس دینے لگے۔ جب انہیں دارالحدیث النوریہ میں استادِ حدیث کا عہدہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔

ان کے تلامذہ میں الدمیاطی، المقاتلی، النابلسی ابومحمد ابن الولید اور البرزالی کے علاوہ الذہبی جیسا تاریخ و حدیث کا مستند عالم بھی شامل تھا۔ انہوں نے تربت ام الصالح میں اسہال کے عارضے سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کا مشہور ترین علمی کارنامہ علم حدیث کی ۲۰ اصطلاحوں کی تعبیر میں ایک پند آموز نظم (لامیہ غزلیہ) ہے، جو بحر طویل کے بیس شعروں پر مشتمل ہے۔

ابنِ فوطی (۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء - ۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء) کمال الدین ابوالفضل عبدالرزاق بن احمد بن محمد الحنبلی محدث، مورخ اور فلسفی معن بن زائدہ الشیبانی کی اولاد سے تھے اور اپنے نانا موفق الدین عبدالقاہر البغدادی الحنبلی کی نسبت سے الفوطی کہلاتے تھے جو سندھ کے دھاری دار کپڑے (فوط) کا بیوپار کرتے تھے اور جنہیں ۶۵۶ھ کے سانحہ بغداد میں پکڑ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ ابن الفوطی کا آبائی وطن مرو تھا۔ بغداد کے محلہ خاتونیہ میں تولد ہوئے۔ بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا اور محی الدین یوسف بن ابی الفرج عبدالرحمن ابن الجوزی سے جو المستعصم باللہ کے استاد تھے اور تاتاریوں کے حملے کے وقت کلواذی کی فصیل کے باہر شہید کر دیئے گئے تھے، اور ان کے طبقے کے دیگر مشائخ سے مزید علم حاصل کیا۔

سقوط بغداد کے وقت ابن الفوطی کی عمر چودہ برس کی تھی۔ اس قیامت خیز ابتلا میں دوسروں کے ہمراہ یہ بھی گرفتار ہوئے تھے۔ لیکن انھیں جلد ہی رہائی مل گئی۔ ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء میں خواجہ نصیرالدین الطوسی نے انہیں اپنے سایہ شفقت میں لے لیا اور اپنے پاس مراغہ بلا لیا۔ جہاں انھوں نے منطق، فلسفہ، نجوم اور دیگر علوم عقلیہ سیکھے۔ مراغہ میں خواجہ طوسی کے علاوہ مبارک بن الخلیفہ المعتصم (متوفی ۶۶۶ھ) بھی ان کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ آپ عربی اور فارسی میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ علم ہیئت اور نجوم میں انھوں نے اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ خواجہ طوسی نے "ایلخانیہ" لکھتے وقت ان سے بھی مشورہ لیا۔

۶۶۹ھ/۱۲۷۱ء میں آپ خواجہ طوسی کے خزانۃ الرصد کی کتابوں کے خازن بنائے گئے اس لائبریری میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ ابن الفوطی ان کتابوں سے استفادہ کرتے رہے اور یہیں آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا۔ ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں "الصاحب" علاؤالدین عطاء ملک الجوینی کی فرمائش پر آپ بغداد آئے جہاں انھیں المدرسۃ المستنصریہ کے کتب خانے کا خازن مقرر کر دیا گیا۔ اپنی وفات تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ بغداد میں واپسی پر آپ پھر محلہ خاتونیہ میں سکونت پذیر رہے۔ شونیزیہ میں دفن کیے گئے۔ ۶۸۰ھ/۱۲۸۲ء میں آپ کوفے میں تھے۔ ۷۰۰ھ/۱۳۰۱ء میں آپ سلماس اور ۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء میں ہمدان میں تھے ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں اران اور ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں تبریز میں تھے۔ ان کا یہ سفر غالباً تاریخی معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں تھا۔ انہوں نے تراسی کتب تصنیف کیں جن میں سے چار اب تک باقی ہیں۔ "مختصر اخبار الخلفاء العباسیین" دس جلدوں میں تھی۔

ابنِ قاسم (وفات ۱۹۱ھ/۸۰۶ء) ابوعبداللہ عبدالرحمان بن القاسم العتقی فقیہ۔ امام مالکؒ کے ممتاز ترین شاگرد تھے۔ بیس برس تک امام مالک سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد انھیں سب سے بڑا مالکی شیخ تسلیم کیا گیا۔ مصر میں مالکی مسلک انھی کے ذریعے پھیلا۔ وہاں اب بھی اسی مسلک کے لوگ آباد ہیں۔ آپ کی وفات قاہرہ میں ہوئی۔

آپ کی ایک اہم تصنیف "المدونۃ (الکبریٰ)" ہے، یہ [illegible] جلدوں پر [illegible] میں مصر میں شائع ہوئی ہے۔ اسے اسد بن الفرات نے مرتب کیا ہے۔ [illegible] مشتمل ہے۔ جو ابن القاسم نے مالک بن انسؒ کے مسلک کے بارے میں [illegible] کے دیئے تھے اور جنھیں قاضی قیروان سحنون ابوسعید التنوخی (وفات ۲۴۰ھ [illegible]) کتاب کی صورت میں قلم بند کیا ۱۸۸ھ/۸۰۴ء میں جب قاضی صاحب [illegible] گئے تو آپ نے ان کے مرتب کردہ نسخے میں بکثرت اصلاحات کیں [illegible] مختلف اور متعدد مالکی علماء نے کی ہے۔

ابنِ قتیبہ (۲۱۳ھ/۸۲۸ء - ۲۷۶ھ/۸۸۹ء) ابومحمد عبداللہ بن مسلم الدینوری القتیبی [illegible] ادب [illegible] والد کی جائے پیدائش کی نسبت سے المروزی بھی کہلاتے [illegible] میں دینور کے قاضی بھی رہے۔ بعد ازاں بغداد کے [illegible] ہاں۔ اپنے ہمعصر ابوحنیفہ الدینوری اور الجاحظ کی طرح ان [illegible] تمام علوم پر حاوی تھا۔ [illegible] زمانے کی [illegible] کے شک آمیز رویے کے خلاف قرآن اور حدیث کی حمایت [illegible] پرچی الحدوثہ شک ہوگیا اور انہیں مشبہہ کے خلاف ایک کتاب [illegible] کو اس فرقہ کے پیرو ہونے کے الزام سے بچا سکیں تاسف [illegible] میں ان کی [illegible] "ادب الکاتب" اور "معانی الشعر" ہیں۔ جو بارہ حصوں میں ہے [illegible] ان کی سب سے بڑی کتاب "عیون الاخبار" ہے۔ جو دس جلدوں میں [illegible] جس کے زمانے کی بعد میں اکثر نقل کی گئی۔ ان کی ایک کتاب "المسائل والجوابات" جو مسائل حدیث کے متعلق ہے۔ "الامامۃ والسیاسۃ" جو ایک نیم تاریخی تالیف ہے ان کے اساتذہ میں ابوحاتم السجستانی اور تلامذہ میں ابن درستویہ کے نام [illegible]

ابن قدامۃ الحنبلی چھٹی صدی ہجری کے وسط میں جماعیل (فلسطین) کے دو گھرانے (خانوادۂ ابن قدامہ اور ابن سرور) ہجرت کرکے دمشق آباد ہو گئے۔ ان دونوں گھرانوں میں مدت تک آپس میں قرابتداری قائم رہی۔ ان میں سے خانوادۂ ابن قدامہ زہد و تقویٰ میں مشہور تھا اور اس کے افراد نے فقہ حنبلی کی بہت خدمت کی۔ منصب قضا پشتوں تک اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا۔ اس خاندان کی چند خواتین نے بھی علمی دنیا میں نام پایا ہے۔ یہ خواتین درس دیتی تھیں اور علماء نے ان سے علم حاصل کیا ہے۔

۱۔ **ابو عمر محمد بن احمد بن محمد قدامۃ** ۵۲۰ھ میں جماعیل میں پیدا ہوئے اور ۵۵۱ھ میں جب فلسطین میں [illegible] کا زور بڑھا تو انہوں نے اپنے والد اور دیگر افراد کے ساتھ دمشق کی جانب ہجرت کی جہاں وہ پہلے باب شرقی کے باہر مسجد ابی صالح (الصالحیہ) میں آکر ٹھہرے لیکن کچھ مدت کے بعد جبل قاسیون میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ابو عمر بڑے عالم، عامل اور عابد و زاہد تھے۔ ظہر اور عصر کے درمیان ایک منزل کی تلاوت ان کا روز کا معمول تھا [illegible] کے بعد ورد کرتے۔ آیات الحرس، یٰسین، تبارک، واقعہ، معوذتین [illegible] تھے [illegible] نماز فجر کے بعد سے ضحیٰ تک۔ لوگوں کو [illegible] کے بعد زیارت تبرکاً کیا کرتے۔ ہر دو شنبہ اور جمعرات [illegible] لوگوں اور نادار بیواؤں کو آٹا اور درہم پہنچایا [illegible] ہوتے تھے۔ زود نویس اور [illegible] خط [illegible] مظفری دمشق کے خطیب [illegible] سلطان صلاح الدین ایوبی کے ساتھ [illegible] جب کو بیت المقدس میں لشکر اسلام [illegible] صلاح الدین ایوبی [illegible] کے خیمے میں زیارت کے لئے آئے [illegible] آپ نے [illegible] کے ساتھ اور [illegible] سلطان سے ملاقات کی۔ آپ نے ۶۰۷ھ میں وفات پائی۔ [illegible] تھے عبدالرحمان اور عبداللہ۔

۲۔ **[illegible] ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ الحنبلی المقدسی الصالحی** خاندان ابن قدامہ کے [illegible] ۵۴۱ھ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ہجرت دمشق کے وقت ان کی عمر [illegible] تھی۔ ۵۶۱ھ میں اپنے خالہ زاد بھائی عبدالغنی بن عبدالواحد بن علی ابن سرور المقدسی [illegible] کے ساتھ بغداد گئے۔ جہاں آپ تقریباً چار سال تک رہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی (متوفی ۵۶۱ھ) ہبۃ اللہ [illegible] بن بلال الدقاق (متوفی ۵۶۲ھ) اور ابالسعادات [illegible] متوفی ۵۶۳ھ جیسے علماء سے استفادہ کرتے رہے۔ ۵۶۷ھ میں آپ پھر لوٹ کر بغداد آئے اور ابوالفتح نصر بن فتیان بن مطر بن المنی (متوفی ۵۸۳ھ) سے فقہ میں درس لیتے رہے ۵۷۳ھ میں آپ مکے گئے اور ۵۷۴ھ میں حج کیا اور مبارک بن علی بن الطباخ الحنبلی سے فقہ پڑھی۔ ۵۷۵ھ میں ابن طباخ کی وفات کے بعد آپ بغداد چلے گئے۔ جہاں آپ ابن المنی کے درس میں پھر شامل ہو گئے۔ ایک برس کے بعد عازم دمشق ہوئے تو ابن المنی نے کہا بغداد کو ان کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ نہ رکے اور دمشق آکر "المغنی" کی تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ۶۰۷ھ میں بھائی (۱) کی وفات کے بعد جامع مظفری کے خطیب بنائے گئے۔ آپ اپنے بھائی کی طرح عدیم المثال تھے اور شکوہ و وقار میں ممتاز۔ آپ تفسیر، حدیث، فقہ کے علوم میں امام زمانہ تھے۔ اور نحو، حساب اور نجوم میں بھی دسترس رکھتے تھے

اپنی پگڑی میں ریت کی پڑیا رکھتے اور جب فتویٰ یا اجازۃ لکھتے تو تحریر کو ریت سے خشک کر لیا کرتے۔ اس سلسلے میں ایک شب کسی مجلس میں جبکہ خاصہ مجمع تھا ان کی پگڑی کھل کر پڑیا کے ہمراہ ہی گر پڑی اور ایک منچلے نے پگڑی اٹھالی۔ آپ نے فرمایا میاں پڑیا رکھ لو اور پگڑی دے دو کہ میں اسے باندھ لوں۔ اس شخص نے جب دیکھا کہ کاغذ میں کچھ بدنی چیز ہے تو پڑیا جیب میں ڈال لی۔ اور پگڑی انھیں لوٹا دی۔ آپ ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں فوت ہوئے۔ محمد بن عبدالرحمان العلوی سے روایت ہے کہ "ہم جبل بن ہلال میں تھے کہ اچانک دیکھا کہ قاسیون میں روشنی ہو رہی ہے۔ ہم یہ سمجھے کہ دمشق میں آگ لگ گئی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موفق فوت ہو گئے۔"

موفق الدین کے تین بیٹے تھے محمد، یحییٰ اور عیسیٰ۔ یہ تینوں ہی ان کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ عیسیٰ کے دو بیٹے ہوئے جو لاولد فوت ہو گئے اور یوں موفق کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کی تالیفات کی تعداد پچیس سے اوپر ہے۔ ان کی کتاب المغنی نصف سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب تعصب سے بالا ہے اور اس میں صرف مسائل اجتماع ہی بیان کئے گئے ہیں جو ہر مسلمان پر واجب ہیں۔ اگر کسی مسئلے میں انھوں نے حنبلی مسلک کی طرف میلان ظاہر کیا ہے تو دلیل اور حجت کو ترجیح کی بنیاد بنایا ہے۔ المغنی میں جا بجا تقلید محض سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے ان کی کتاب "المقنع" بھی بہت مقبول ہے۔

۳۔ قاضی القضاۃ شمس الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن محمد بن قدامہ الحنبلی الصالحی

۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء میں قاسیون میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے والد اور چچا موفق الدین اور دیگر علماء وقت سے علم حاصل کیا۔ آپ بڑے وجیہہ اور باوقار تھے۔ حلیم اور بردبار بھی تھے اور رقیق القلب بھی تھے۔ فخر الدین البعلبکی (متوفی ۶۸۸ھ) کا قول ہے کہ "میں ۵۰ برس سے جانتا ہوں کہ شمس الدین کبھی غصے نہیں ہوئے۔"

۶۵۸ھ میں الملک الظاہر نے دمشق میں بھی الگ الگ مسلک کے قاضی مقرر کئے شافعیوں کے قاضی ابن خلکان تھے۔ احناف کے قاضی الاذرعی تھے اور حنابلہ کے قاضی عبدالرحمان ابن قدامہ تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں قاضی شمس الدین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ چنانچہ بعض شعراء نے اپنے کلام میں انہیں "شموس الشام" کہہ کر پکارا ہے۔ [illegible] قاضی عبدالرحمان ۱۲ سال تک کرتا نبھاتے رہے۔ انھوں نے الشافی "الشرح الکبیر" جو موفق الدین کی المقنع پر ایک مبسوط شرح ہے لکھی۔ آپ ۶۹۲ھ/۱۲۹۳ء میں فوت ہوئے۔ تقی الدین ابن تیمیہ اور مجدالدین اسماعیل بن محمد الحرانی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی ایک کتاب کا نام "تسہیل المطلب فی تحصیل المذہب" ہے۔

ابن قوطیہ لغوی، نحوی، مورخ، شاعر۔ قاضی ابوبکر محمد بن عمر بن عبدالعزیز بن ابراہیم بن عیسیٰ بن مزاحم جسے بالعموم ابن القوطیہ، یعنی قوطی عورت کا بیٹا اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے جد اعلیٰ عیسیٰ، مولیٰ عمر بن عبدالعزیز نے سارہ نامی ایک ہسپانوی شہزادی سے جو قوطی بادشاہ ادباس کی بیٹی اور وطیزا کی پوتی تھی، شادی کر لی تھی۔ سارہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے پاس اپنے چچا اردبشت کے خلاف شکایت کرنے دمشق گئی تھی۔ عیسیٰ کو اس کی بیوی کے ہمراہ ہسپانیہ بھیج دیا گیا اور اس کی اولاد اشبیلیہ میں رہنے لگی۔ ابن القوطیہ خود قرطبہ میں پیدا ہوا تھا اور اپنے آبائی وطن اشبیلیہ میں محمد بن عبداللہ ابن القون، حسن بن عبداللہ الزبیری اور سعید بن جابر وغیرہم سے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اور وہاں طاہر بن عبدالعزیز، محمد ابن عبدالوہاب بن مغیث، محمد بن عمر بن لبابہ، قاسم ابن اصبغ، محمد بن عبدالملک بن ایمن وغیرہم سے تکمیل تعلیم کی۔ قاضی ابوالحزم خلف بن عیسیٰ الوشقی اور مورخ ابن الفرضی اس کے شاگردوں میں سے تھے۔ ابو علی القالی نے

جاالامال" کے مصنف تھے ۔ اس کا تعارف خلیفہ الحکم ثانی سے کرایا اور اسے اپنے ملک کا سب سے بڑا فاضل بتایا۔ کچھ عرصے تک خلیفہ نے اسے قاضی کے عہدے پر رکھنے کے بعد اسے قرطبہ کا صاحب الشرطہ (انسپکٹر پولیس) بنادیا ۔ اسے حدیث اور فقہ میں زیادہ درک حاصل نہ تھا ۔ اس کی دو تصانیف کے بارے میں معلوم ہو سکا ہے ۔ ایک تاریخ جس کا نام "تاریخ فتح الاندلس" ہے اور دوسری کتاب الافعال"۔

ابن قیم (۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء - ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرعی ۔ حنبلی، محدث، فقیہہ، دمشق میں پیدا ہوئے اور دمشق ہی میں ۶۰ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ ان کے والد دمشق کے مدرسہ الجوزیہ کے قیم (مہتمم) تھے ۔ اسی لیے ابتدا میں انھیں ابن قیم الجوزیہ کہا جاتا تھا ۔ بعد میں صرف ابن القیم کے نام سے مشہور ہوئے ۔ ان کے والد ابو بکر بن ایوب علم الفرائض کے ماہر تھے ۔ انھوں نے یہ علم اپنے والد سے سیکھا اور ایک مدت تک جملہ علوم و فنون کی تکمیل اپنے دور کے مشہور شیوخ سے کی ۔ ۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء میں جب ابن تیمیہ مصر سے مراجعت کر کے دمشق میں مقیم ہوئے تو آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۷۲۸ھ تک جب ابن تیمیہ نے وفات پائی، متواتر ان کے پاس رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی ان سے جدا نہ ہوئے اس طویل صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن تیمیہ کا رنگ ان پر غالب آگیا ۔ وہ ابن تیمیہ کے صحیح جانشین اور ان کے علوم کے صحیح معنوں میں حامل تھے ۔

ابن تیمیہ کے بعد انھوں نے ان کی کتابوں کی تہذیب و تبویب کی اور ان کی نشر و اشاعت بھی ان ہی کی بدولت ہوئی ۔ مسئلہ "شد الرحل لزیارت قبر الخلیل" اور مسئلہ "طلاق ثلاثہ" میں امام ابن تیمیہ کی رائے جمہور علما سے مختلف تھی ۔ اور ابن القیم ان مسائل میں ابن تیمیہ کے ہمنوا تھے ۔ علمائے وقت نے ان مسائل کی بنا پر کئی دفعہ ان کے خلاف ہنگامے کھڑے کیے اور کئی دفعہ انہیں محبوس ہونا پڑا ۔ سب سے آخری بار جب امام ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعے میں قید کر دیا گیا تو ابن القیم بھی امام صاحب کے ساتھ تھے ۔ چونکہ آپ امام صاحب کے خاص الخاص شاگرد تھے ۔ اس لیے انہیں خاص طور پر نشانہ ستم بنایا گیا ۔ اور اونٹ پر سوار کر کے سارے شہر میں پھرایا گیا اور بعد ازاں قلعہ دمشق میں ابن تیمیہ سے علیحدہ قید کر دیا گیا ۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد انھیں رہائی ملی ۔ لیکن مسلک امام تیمیہ کی تائید و حمایت پر انھیں دوبارہ پہلی سی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں ۔

ابن القیم تقلید شخصی کے سخت خلاف تھے ۔ بہر حال مسائل میں ان کا میلان اپنے استاد کی طرح امام احمد ابن حنبلؒ کی طرف تھا ۔ اصول و عقائد میں آپ حنبلی المذہب تھے لیکن فروع میں آزاد تھے ۔ اپنے استاد کی طرح وہ فلسفیوں، معتزلیوں، جہمیوں، حشویوں اور وحدت الوجودیوں کے سخت مخالف تھے اور کلام، عقائد اور تصوف کے مسائل میں سلف صالحین کے نقطہ نظر کے حامی تھے ۔ آپ محدثات و بدعات کو ناپسند کرتے تھے اور مسلمانوں کو ابتدائی دور کے سادہ اسلام کی طرف لے جانا چاہتے تھے عیسائیوں اور یہودیوں کے عقائد باطلہ کی تردید میں بھی انھوں نے متعدد کتابیں تحریر کیں ۔

ابن القیم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ۔ ان میں سے بیشتر آج ناپید ہیں ان کی ۴۵ کتابوں کی فہرست ابن العماد الحنبلی نے اپنی کتاب "شذرات الذہب" میں دی ہے ۔ اور بعد میں وغیرہ ذالک بھی لکھا ہے ۔ براکلمان نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات عربی" میں ان کی ۵۲ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ ان کی ۲۳ کتابیں دستیاب ہیں ۔ —

ابن کثیر (۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء - شعبان ۷۷۴ھ/فروری ۱۳۷۳ء) اسماعیل بن عمر عماد الدین ابو الفدا ابن الخطیب القرشی، مورخ، محدث اور مفسر، امام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے ۔ دمشق میں درس حدیث دیتے رہے ۔ ان کی سب سے بڑی تصنیف "البدایۃ والنہایۃ" ہے، جو ابتدائے عالم سے ان کے دور تک کی تاریخ ہے ۔ قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی اور احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ۔

ابن کلبی کوفے کے علما کا ایک خاندان، جو ابو النضر محمد بن ملک بن سائب بن بشر کے نسب سے تھا ۔ بشر اور سائب جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے طرفدار تھے اور ملک بن سائب، مصعب بن الزبیر کی طرف سے لڑتے ہوئے کام آئے تھے ابو النضر نے ۸۲ھ/۷۰۱ء میں عبدالرحمان بن محمد بن الاشعث کے پیروکار کی حیثیت سے جنگ دیر الجماجم میں حصہ لیا تھا ۔ بعد ازاں علم و ادب کی راہ اختیار کی ۔ سلیمان بن علی کو قرآن کی تفسیر کا درس دیا ۔ ۱۴۶ھ/۷۶۳ء میں وفات پائی ۔ اس کے بیٹے ابو المنذر ہشام نے زیادہ تر تاریخ اور حدیث پر کام کیا ۔ ابن حجر العسقلانی، ابن عساکر اور امام دارقطنی وغیرہ نے اس کی تدوین کردہ احادیث میں اکثر کو کذب و رفض اور متروک کہا ہے، بعد میں کئی علما نے اس کے کام کو [illegible] سراہا ۔ اس کی ۱۴۰ تصانیف تھیں، جن میں "الجمہرۃ فی النسب" اور "کتاب الاصنام" زیادہ مشہور ہیں ۔

ابن ماجد عرب جہاز ران اور مصنف ۔ شہاب الدین احمد ۔ جو پندرھویں صدی میلادی میں ہوا ۔ اس کی کتاب میں بحر ہند، [illegible] فارس، بحیرہ چین کے مغربی حصے اور مجمع الجزائر میں جہاز رانی کے متعلق [illegible] ہیں ۔ ۱۴۹۸ء میں جب واسکوڈی گاما مشرقی افریقہ کے ساحل پر [illegible] وہاں ایک ایسا بحری ناخدا مل گیا جس نے اسے براہ راست کالی کٹ [illegible] دیا ۔ یہ واقعہ مختصر طور پر اس مہم کے ملاحوں میں سے ایک نے [illegible] درج کیا ہے اور اس کی تفصیل مزید سولھویں صدی کے پرتگالی مورخ [illegible] کی ہے ۔ خاص طور پر یہ مورخ اس بحری معلم کا نام معلم کنکا [illegible] سے جہاز رانی کے فن کا استاد) بتاتے ہیں ۔ اس روایت کی [illegible] "البرق الیمانی فی الفتح العثمانی" مؤلفہ قطب الدین النہروالی سے بھی [illegible] میں پرتگالیوں کے اس رہنما کا نام احمد ابن ماجد لکھا ہے ۔ قطب الدین [illegible] ملعون پرتگالیوں کا، جو ملعون فرنگیوں کی ایک شاخ ہیں، [illegible] داخلہ ۔ ان کا ایک گروہ سبتہ کی تنگنائے میں جہازوں پر سوار [illegible] میں داخل ہو کر کوہ قمر (معنی سفید) کے پیچھے سے گذرتا اور [illegible] جاتا ۔ یاد رہے کوہ قمر ہی میں دریائے نیل کا سرچشمہ ہے ۔ اور [illegible] تنگنائے میں سے ایک ایسے مقام سے گذرتا تھا جس کی ایک جانب [illegible] جانب بحر ظلمات ہے ۔ اس مقام پر سمندر میں بہت تلاطم رہتا تھا جس سے ان کی [illegible] نہ سکتی تھیں بلکہ ٹوٹ جاتی تھیں اور ان میں سے کوئی ملاح زندہ نہ [illegible] عرصہ تک جاری رہا اور وہ اس مقام پر ہلاک ہوتے رہے اور ان میں سے کوئی [illegible] بحر ہند میں نہ پہنچ پایا ۔ تا آنکہ ان کی ایک کشتی بحر ہند میں پہنچ گئی ۔ یہ لوگ اس سمندر کی تلاش میں رہے تا آنکہ ایک ماہر ملاح نے جس کا نام احمد بن ماجد تھا ان کی رہنمائی کی ۔ فرنگیوں کا سردار اس کے ساتھ ملندی تک گیا اور اسے اپنے ساتھ نے لوٹنی میں شراب [illegible] کیا ۔ اس نے (ابن ماجد) نشے کی حالت میں اسے راستہ بتا دیا ۔ اور ان سے کہا کہ تم کے ساحل کے قریب نہ جاؤ بلکہ کھلے سمندر میں داخل ہو جاؤ پھر مڑ جاؤ تو موجوں سے تمھیں نقصان نہ پہنچے گا ۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو ان کے بہت سے جہاز ٹوٹنے سے بچ [illegible]

گے۔ پس بحرِ ہند میں ان کی کثرت ہوگئی۔ اور انھوں نے شہر گوآ کی بنا رکھی۔

مدہوشی کا یہ قصہ گھڑ لیا گیا ہے اور یہ بظاہر ایک دروغ مصلحت آمیز ہے۔ تاکہ مسلمان کے اس فعل کا عذر تراشا جائے جو مسلمانانِ مکّہ کی نظر میں غداری کا مترادف تھا۔ (قطب الدین مکّہ ہی کا رہنے والا تھا) برخلاف اس کے یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ اس عرب معلّم نے پرتگالی بیڑے کی رہنمائی اس وعدے پر کی تھی کہ اسے اس کی خدمات کا بھاری معاوضہ دیا جائے گا۔ پرتگالی تذکرہ نگار جنہیں اس واقعہ کو چھپانے کی ضرورت نہ تھی اس سے بالکل مختلف قصہ بیان کرتے ہیں۔

باروس پرتگالی جس نے اس واقعہ کو سب سے زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہتا ہے — جن دنوں واسکوڈی گاما ملندی میں مقیم تھا وہاں کھمبائت (علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ) کے کچھ بنیئے امیر البحر سے ملنے آئے۔ ان ہندوؤں نے حضرت مریمؑ کے بت کی بڑی تعظیم و تکریم کی تو امیر البحر یہ سمجھا کہ ان (ہندوؤں) کا تعلق شاید ان عیسائیوں سے ہے جو سینٹ ٹامس کے زمانے سے ہندوستان میں موجود تھے۔ ان بنیوں کے ہمراہ گجرات کا ایک مُور بھی آیا تھا جسے وہ "معلّم کنکا" کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ساتھ جہازرانوں کی صحبت میں بڑا خوش رہتا۔ علاوہ ازیں ملندی کے حکمران کی خواہش تھی کہ پرتگالیوں سے وہ ان کا رہنما بن کر جائے اور انھیں ہندوستان کا راستہ دکھائے [illegible] اس بات کے لئے رضامند ہوگیا۔ واسکوڈی گاما نے اس سے بات چیت کی تو اس کی معلومات سے بہت خوش اور مطمئن ہوا۔ خاص طور پر جب اس مُور نے ہندوستان کے پورے ساحل کا ایک نقشہ بھی دکھایا۔ یہ نقشہ عربی نقشوں کی طرز پر بنا ہوا تھا اور اس میں درجات طول بلد اور عرض بلد بڑی تفصیل سے دکھائے گئے تھے لیکن اس نقشے میں [illegible] کے چلنے کی سمتوں کے بارے میں کچھ نہ دکھایا گیا تھا۔ بہرحال اس نقشے سے شمال جنوب اور شرق غرب میں چلنے والی ہواؤں کی بدولت ساحل کا رخ نہایت صحت سے [illegible] بتایا گیا تھا [illegible] ہواؤں کی سمتوں کو دکھانے کی علامتوں کی بھرمار ہے [illegible] نقشوں کا [illegible] اور [illegible] کی دوسری بھی نقل کرتے ہیں۔ واسکوڈی [illegible] اسطرلاب دکھایا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور وہ اسطرلاب بھی جو دھات کے [illegible] تھے جن سے سورج کے ارتفاع کی پیمائش کی جاتی تھی۔ لیکن اس مُور نے ان آلات کو دیکھا تو وہ ذرا بھی متعجب نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ بحر قلزم کے عرب [illegible] قطب تارے کا ارتفاع معلوم کرنے کے لیے مثلث شکل کے پیتل کے آلات [illegible] اور [illegible] (مقیاس الزاویہ) سے کام لیتے ہیں اور جہازرانی میں ان سے [illegible] اٹھاتے ہیں۔

[illegible] اس نے [illegible] خود [illegible] کھمبائت اور سارے ہندوستان کے ملاح چند شمال و جنوب کے ستاروں [illegible] نمایاں ستاروں کی مدد سے جو مرکزِ آسمان کو شرقاً غرباً عبور کرتے ہیں جہازرانی کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ واسکوڈی گاما کے دکھائے ہوئے آلات سے ارتفاع معلوم نہیں کرتے بلکہ ایک اور آلے کے ذریعے ارتفاع معلوم کرتے ہیں۔ وہ آلہ جا کر لے آیا اور واسکوڈی گاما کو دکھایا۔ اس نے یوں محسوس کیا کہ اسے ایک بہت بڑا اعزاز مل گیا ہے۔ لہٰذا وہ اپریل ۱۴۹۸ء میں جہاز لے کر ارضِ ہند کی جانب روانہ ہوگیا۔ یہ عرب مُور "معلّم کنکا" ملاشک و شبہ وہی احمد بن ماجد ہے جس کا ذکر البرق الیمانی میں آیا ہے۔ یہ معلّم عربی نژاد تھا جو جلفار میں پیدا ہوا اور یہی واسکوڈی گاما کا رہنما تھا۔

ترکی امیر البحر سیدی علی کہتے ہیں کہ "میں نے بصرے میں اپنے پانچ ماہ کے قیام کے دوران میں (۱۵۵۴ء) جو شروع برسات تک قائم رہا اور پھر بصرے سے ہندوستان کے سفر کے دوران میں جو آٹھ ماہ تک رہا ان ساحلی راہنماؤں اور مقامی ملاحوں سے جو میرے جہاز پر موجود تھے، میں نے جہازرانی کے مسائل پر گفتگو کی۔ یوں مجھے معلوم ہوا کہ ہرمز اور ہندوستان کے پرانے بحری راہنما لیث بن کہلان، محمد بن شاذان اور سہل بن ابان بحرِ ہند میں کس طرح سفر کیا کرتے تھے۔ میں نے وہ کتابیں بھی جمع کیں جنھیں جدید معلّموں نے لکھا ہے۔ مثلاً صوبہ عمان کے مقام جُلفار کے احمد بن ماجد اور علاقہ جُرز (جنوبی عرب) شحر نامی مقام کے سلیمان بن احمد نے "کتاب الفوائد" اور "الحاویۃ" (مؤلفہ ابن ماجد) "تحفۃ الفحول" "منہاج" "قلادۃ الشموس" (تالیفات سلیمان) کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے بغیر بحرِ ہند میں سفر کرنا غیر معمولی طور پر مشکل ہو جاتا۔ اجنبی کپتان اور ملاح یہاں کی جہازرانی سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا انھیں کسی رہنما کی ناگزیر ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے اپنے پاس کوئی معلومات نہیں ہوتیں۔"

سیدی علی نے اپنی کتاب "المحیط" میں ابن ماجد کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ اسے ملاحوں میں معتبر ترین معلّم بحرِ ہند اور جدید مؤلفینِ ہدایاتِ جہازرانی میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد بتاتا ہے۔ سیدی علی کی یہ کتاب "المحیط" دراصل ابن ماجد اور سلیمان کے راہ ناموں اور اصول جہازرانی کے ایک حصے کا ترکی ترجمہ ہے۔ ابن ماجد کی کتاب "الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد" (جسے سیدی علی صرف "الفوائد" کہتا ہے) نثر میں ہے۔ اس کے بارہ الباب ہیں اور ۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء میں لکھی گئی تھی۔ ابتدائی اوراق میں جہازرانی اور مقناطیسی سوئی کے افسانوی آغاز سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد ابن ماجد ۲۸ منازل قمر کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح ان ستاروں کا جو قطب نما کی بتیس جہات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور بحرِ ہند کے سمندری راستوں کا اور اس سمندر اور مغربی بحرِ چین کی چند بندرگاہوں کے عرض بلد کا اور خشکی کے قریب ہونے کی ان علامتوں کا جو پرندوں اور ساحل کی ہیئت کذائی سے ظاہر ہوتی ہیں، اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر خشکی تک پہنچنے کی گذرگاہوں کا اور دس مشہور جزیروں یعنی جزیرہ نمائے عرب، جزیرہ قُمر (یا مدغاسکر) سمطرہ، جاوہ، الغور (فارموسا) سیلان، زنجبار، بحرین یعنی اوال، خلیج فارس کے جزیرۂ ابن جاوان اور سقطری کا، (ضمناً بحرین اور جہرہ کے تاریخی اور سیاسی حالات، نیز لوئی صدی بحری کے ربع چہارم کی خانہ جنگیوں وغیرہ کے حالات کا) اور سفر کے لیے موزوں موسمی ہواؤں اور ان میں سے ہر ایک کی تاریخ کا فارسی تقویم کے لحاظ سے ذکر کرتا ہے۔ اس سمندر بحرِ ہند کے مقامات لنگراندازی، اُتھلے حصے پانی میں ڈوبی یا پانی سے نکلی ہوئی چٹانوں کا بھی پوری تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔

ابن ماجد کی دوسری تالیف "حاویۃ الاختصار فی اصول البحار" (جسے سیدی علی "حاویۃ" کہہ کر کرتا ہے) ہے۔ گیارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۸۶۶ھ میں لکھی گئی۔ تیسری کتاب "المعربۃ" ہے ابن ماجد نے اسے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں لکھا۔ یہ خلیج عدن میں جہازرانی سے متعلق ہے۔ کتاب "قبلۃ الاسلام فی جمیع الدنیا" یہ کتاب ان شہروں کے لئے ہے جو سمندر کے قریب واقع ہیں۔ یہ ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء میں تالیف کی گئی۔ کتاب "ارجوزۃ برالعرب فی خلیج الفارس" جو خلیج فارس میں ساحل عرب کے ساتھ ساتھ جہازرانی کے متعلق ہے۔ الغرض ابن ماجد نے کل ۳۲ کتابیں تالیف کیں۔ ابن ماجد ازمنۂ جدیدہ کے مؤلفینِ علم جہازرانی میں بلحاظ تاریخ قدیم ترین ہے اور اس کی یہ کتابیں قابلِ داد ہیں۔ موسمی، مقامی ہواؤں سارے بحرِ ہند کو عبور کرنے کے راستوں اور عرضہائے بلد کے متعلق اس نے جو معلومات دی ہیں وہ اتنی ہی واضح اور مفصل ہیں جتنی اس زمانے میں متوقع ہو سکتی تھیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ملکوں کے موسم آہستہ آہستہ بدلتے رہتے ہیں۔

ابن ماجہ (۲۰۹ھ/۸۲۴ء - ۲۲ رمضان ۲۷۳ھ/۱۸ فروری ۸۸۶ء) محدث اور مفسر، ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ الربعی القزوینی۔ المعتمد علی اللہ کے دورِ خلافت میں فوت ہوئے۔ سوائے امام نسائی (وفات ۳۰۳ھ) کے تمام مصنفین

صحاح ستہ کی وفات اسی خلیفہ کے عہد میں ہوئی۔ ابن ماجہؒ کی تصنیف "سنن ابن ماجہ" صحاح ستہ کی چوتھی عظیم الشان کتاب ہے جس میں ۴۳۴۱ احادیث ہیں۔ ان میں سے ۳۰۰۲ حدیثیں تو وہ ہیں جو صحاح کی باقی پانچ کتابوں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی) میں بھی موجود ہیں اور باقی ۱۳۳۹ احادیث ایسی ہیں جو زوائد ابن ماجہ ہیں۔ سب سے پہلے ابو الفضل محمد بن طاہر (متوفی ۵۰۷ھ) نے اس کتاب کو صحاح ستہ میں شمار کیا تھا۔ متاخرین میں سے السیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، عبدالغنی النابلسی (متوفی ۱۱۴۳ھ) عبدالغنی المجددی (متوفی ۱۲۹۵ھ) اور تمام محدثین اور مصنفین اطراف و رجال نے اسے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہی عام متاخرین کا فیصلہ ہے۔ لیکن ابن السکن (متوفی ۳۵۳ھ) ابن مندہ (متوفی ۳۹۵ھ) ابو طاہر (متوفی ۵۷۶ھ) ابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ)، ابن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ) النووی (متوفی ۶۷۶ھ) اور المزی (متوفی ۷۴۲ھ) ایسے علماء اسے صحاح ستہ میں شامل نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے بجائے یا تو وہ صحاح خمسہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور یا بعض لوگ امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) کی "موطا" کو صحاح ستہ کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ عبدالغنی النابلسی کہتے ہیں کہ چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے۔ اہل مشرق کے نزدیک وہ سنن ابن ماجہؒ ہے، اور اہل مغرب کے نزدیک موطا امام مالکؒ ہے۔

آپ کی پیدائش ایران کے صوبہ آذربائیجان کے مشہور شہر قزوین میں ہوئی جو ان دنوں مرکز علم بنا ہوا تھا۔ تکمیل علم کے بعد آپ نے حدیث نبوی کی تلاش و تدوین کے لیے زندگی وقف کر دی اور اسی وجہ میں خراسان، عراق، حجاز اور مصر و شام میں معروف شہروں میں بکثرت سفر کیے۔ جن جن شہروں میں آپ حصول حدیث اور علم کے لیے گئے، ان میں کوفہ، بصرہ، بغداد، واسط، سامرا، جرجرایا، حدیثہ، باکسادیہ، دمشق، حمص، عسقلان، ایلہ، بیت المقدس، بالس، طیولس، رقہ، حران، اہواز، رے، اصفہان، ہمدان، دامغان، نیشاپور، مرو، بلخ وغیرہ اہم ہیں۔

ابن ماجہؒ نے ایک ضخیم کتاب بھی مرتب کی تھی۔ جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے سلسلے میں احادیث و آثار کو بالاسناد جمع کیا گیا ہے۔ جمال الدین مزی نے "تہذیب الکمال" میں سنن ابن ماجہ کے علاوہ اس تفسیر کی اسانید کے راویوں کے حالات لکھے ہیں۔ ابن کثیرؒ اور السیوطی نے بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی تیسری تالیف "التاریخ" ہے۔ یہ صحابہ کرامؓ سے لے کر مصنف کے عہد تک کی تاریخ ہے۔ ابن خلکان نے اسے "تاریخ ملیح" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور ابن کثیر اسے "تاریخ کامل" کہتے ہیں۔ آپ کی یہ تاریخ اور تفسیر دونوں ناپید ہیں۔ حاجی خلیفہ نے بھی "کشف الظنون" میں ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے "تاریخ قزوین" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی مستقل کتاب نہ ہو۔ اور محض ایک رسالے کی حیثیت رکھتی ہو۔

ابن مَسَرّۃ قرطبہ کا ایک معتزلی ملحد۔ محمد بن عبداللہ بن مَسَرّۃ بن نَجیح، قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس نے کن اساتذہ سے تعلیم پائی اس سلسلے میں اس کے سیرت نگاروں نے بہت کم لکھا ہے۔ وہ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں یہ قرطبہ میں موجود تھا اور اپنے مریدوں کے حلقے میں گھرا رہتا تھا۔ اس کے زیادہ قریبی مرید اس کے ساتھ ایک خانقاہ میں رہتے تھے۔ یہ خانقاہ جبال قرطبہ کے کنارے واقع تھی اور اس کی ملکیت تھی۔ ابن مسرۃ اس خانقاہ میں انتہائی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی انتہائی رازداری کی تھی۔ اس لیے وہ جس قانون کے پابند تھے اس کا سختی سے خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقائد کی تلقین عوام تک نہ پہنچ سکی بیرونی دنیا کو محض یہی معلوم ہو سکا کہ وہ خود مرشد اور اس کے مرید بڑی پرہیزگاری اور فقر کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد عوام کے شکوک بڑھنے لگے اور گمان ہونے لگا کہ مذہب اور تقشف کے پردے میں کچھ اور تو پوشیدہ نہیں۔

پھر یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ ابن مسرۃ معتزلی الحاد کی تلقین کرتا ہے اور اس لیے اختیار (قدر) کا قائل ہے۔ جب لوگ یہ سنتے کہ اس کے نزدیک "عذاب" کی کوئی حقیقت نہیں تو وہ حیران ہو جاتے۔ البتہ پڑھا لکھا طبقہ یہ کہنے لگا کہ وہ قدیم یونانی فلسفی ایمپی ڈوکلیس کے فلسفہ "ہمہ اوست" یعنی کفر کی تعلیم دیتا ہے۔ اور پھر جلد ہی اس پر کفر کا الزام عائد کر دیا گیا جو اس کے مسلک کے لیے مفید ثابت نہ ہوا۔ وہ ان افواہوں کو سن کر افریقہ پہنچ گیا۔ پھر عبدالرحمان الثالث کے عہد میں وہ قرطبہ واپس آیا اور پھر اپنا سلسلہ درس و تدریس جاری کر دیا۔ جو صرف چند برس ہی چل سکا۔ اس انتہائی دماغی محنت، غور و فکر، مطالعے، مناظرے نیز متقشفانہ مذہبی زندگی کے باعث اس کی ہمت اور طاقت جواب دے گئی۔ اور ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں قرطبہ کی خانقاہ ہی میں انتقال کیا۔

ابن مسرۃ کی تعلیمات کا کوئی پرزہ بھی موجود نہیں ہے لہٰذا اس کے بارے میں تمام معلومات بالواسطہ ہی ہم تک پہنچی ہیں۔ ابن حزم نے اس کے فلسفیانہ نظریات کو بیان کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں قاضی ابن صاعد جن کا علم و فضل اور دیانت مسلّم ہے اور قابلِ وثوق مصنف ہیں، اپنی تصنیفات میں مسرّی نظام فکر کا ابتدا اور اس کی عام خصوصیات کا حال محفوظ کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن مسرۃ ایمپی ڈوکلیس کے فلسفے کا بڑا پرجوش حامی تھا۔ اپنے عقائد کے باعث وہ قرآن کی ہر آیت کی [illegible] تفسیر کرنے پر مجبور تھا جس کا لفظی مفہوم ان سے بالکل مختلف ہوتا۔ وہ کہتا تھا کہ انسان اپنی سعی اور کوشش سے منازل کمال طے کر سکتا ہے جس سے اُسے یقین تھا کہ انسان تنہا الوہیت کی سطح تک پہنچ سکتا ہے بلکہ اس قابل ہے کہ اپنے اعمال حسنہ کی جزا کے طور پر نبوت اور اس سے متعلقہ جملہ صفاتِ عالیہ بھی حاصل کرے۔

اس سلسلے میں آخری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اندلس میں تصوف کی اجتماعی تنظیم کے آثار ابن مسرۃ ہی کے زمانے سے نمودار ہونے لگے۔ اس نے جبال قرطبہ میں جو [illegible] جمعیت قائم کی تھی اُسے بطور مثال سامنے رکھتے ہوئے ایسے ہی منتقد [illegible] کے زیر ہدایت مختلف سلسلے اور جمعیتیں قائم ہونے لگیں۔ جو [illegible] نے اپنے زہد و ورع اور ریاضت کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے بلکہ باعتبار [illegible] اُن کا درجہ بڑا بلند تھا۔ اور انھیں یہ قدرت حاصل تھی کہ تحریر و تقریر [illegible] کو اپنی طرف مائل کریں۔ الزرکلی الاعلام نے اسے اسماعیلی داعی بتایا ہے اور [illegible] ایک مقالے کا حوالہ دیا ہے جو تونس کے مجلۃ الندوۃ میں چھپا تھا اور جس میں [illegible] ابن مسرۃ عبیدلیوں (فاطمیۂ مصر) کے جاسوسوں میں سے تھا۔

ابن مسعود صحابی، محدث اور مفسر عبداللہ بن مسعود نام تھا۔ زیادہ تر [illegible] مشہور ہیں۔ (دیکھیے "عبداللہ بن مسعودؓ")

ابن مسکویہ (۳۳۰ھ/۹۴۲ء - ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ [illegible] بہت بڑا فلسفی، مورخ اور ادیب، وزیر المہلبی کا ملازم تھا [illegible] اس وقت اس کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ المہلبی کی وفات ۳۵۰ھ/۹۶۱ء کے بعد آل بویہ کے وزیر الحمید کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اس کے شہرہ آفاق کتب خانے [illegible] خازن رہا۔ ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں جب خراسان کے غازی رومیوں اور ارمنوں [illegible] کے لیے رے میں داخل ہوئے اور اسے لوٹا اور تباہ و برباد کر دیا تو مسکویہ [illegible] کو تباہی سے بچا لیا۔ ابن العمید کی وفات ۳۶۰ھ/۹۷۰ء میں اس نے اس [illegible] بیٹے ابو الفتح

ابن العمید کی ملازمت اختیار کر لی اور پھر اس کی وفات پر ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں دیلمی تاجدار عضد الدولہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اُس نے عضد الدولہ اور آل بویہ کے دوسرے تاجداروں کے دربار میں اہم مراتب حاصل کئے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو الصاحب ابن عباد سے رتبے میں کم نہ سمجھتے تھے۔ محمد باقر الخوانساری لکھتا ہے کہ ان کی قبر شہر اصفہان کے محلہ خواجو میں ہے۔

ابن مسکویہ نے ایک تاریخ "تجارب الامم وتعاقب الہمم" لکھی جسے طوفان نوح سے شروع کر کے ۳۱۹ھ/۹۳۱ء پر ختم کیا۔ اس کا سب سے بڑا ماخذ ایک تو طبری کی تاریخ ہے۔ اور دوسرا محمد بن یحیٰ الصولی کی "اوراق" اور تیسرا ماخذ ثابت ابن سنان کی "وقائع"۔ ابن مسکویہ نے جملہ حالات لکھنے سے اجتناب کیا ہے اور محض ایسے واقعات قلم بند کئے ہیں جو اس کے نزدیک احسن یا اضمحلال و زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ابن مسکویہ کے نزدیک تاریخ تجربوں کے ایک مجموعے کا نام ہے جس سے لوگ ہر وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کی اس تاریخ کا وہ حصہ جو ۳۴۰ھ سے ۳۶۹ھ تک کے حالات پر ہے اس کے اپنے مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ میں ایک بات یہ ہے کہ ابن مسکویہ نے اسناد کا طریقہ ترک کرتے ہوئے توجہ صرف حوادث پر رکھی ہے۔ وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ راوی کون تھا۔ وہ اس واقعہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے [illegible] اور خبر کی تلخیص بھی ہو گئی ہے جو بجائے خود فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

ابن مسکویہ کی ایک کتاب "آداب العرب والفرس" ہے جو ایرانیوں، ہندوؤں، عربوں اور رومیوں [illegible] کے حکیمانہ اقوال کا مجموعہ ہے۔ تیسری مشہور کتاب [illegible] "تہذیب الاخلاق" ہے جس کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اور یہ سات مقالوں پر مشتمل ہے۔ [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انہوں نے نفس یعنی روح کی ماہیت اور صفت [illegible] سے بحث کی ہے۔ بعد کے مقالوں میں انہوں نے خلق اور اس کی انواع [illegible] کی ماہیت ان کے باہمی فرق اور اقسام، فضائل، الفت اور اجتماع [illegible] النفس کی بیماریوں، ان کی صحت اور محافظت وغیرہ پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی [illegible] مشہور کتاب "الفوز الاصغر" ہے جو تین مسائل پر مشتمل ہے۔ صانع، خالق [illegible] النفس یعنی روح اور نبوت۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں کہ روح [illegible] زندگی روح سے ہے۔ اندریں صورت روح کے سلسلے میں حیات بعد الموت [illegible] اور آخر الامر نبوت کا کمال انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی چوتھی مشہور کتاب "الشوامل" ہے جو ابو حیان التوحیدی کے سوالات "الہوامل" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ کل سوالات ایک سو اسی ہیں۔ جو اخلاقی، لغوی، کلامی، فقہی، فلسفی اور [illegible] مسائل کے متعلق ہیں۔ ابو حیان التوحیدی ان کا معاصر تھا۔ وہ ان کا عجیب و غریب نقشہ کھینچتا ہے۔ [illegible] ان سے ملا بھی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابن مسکویہ کا ذہن فلسفیانہ غور و فکر سے عاری تھا۔ گو اس کی یہ کوشش تھی کہ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرے اس کی ساری توجہ علم کیمیا پر تھی۔ جس میں اس نے ابو الطیب الرازی الکیمیائی کے ساتھ اپنی ساری عمر، دولت اور محنت حجر اعظم کی تلاش میں صرف کر دی۔ ابن سینا کے بھی جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابن مسکویہ فلسفے سے نابلد اور ایک کم فہم انسان تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایات حسد کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ان کے متعلق ہی دوسری روایات ایسی بھی ہیں جن سے ابن مسکویہ کی فلسفیانہ بلندی اور کمالِ ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔

حقیقت کچھ بھی ہو وہ ایک آزاد خیال مفکر تھے۔ انہوں نے تاریخ کا مطالعہ ایک فلسفی اور سائنسدان کی حیثیت سے کیا۔ لہٰذا انہیں واقعات سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ ان کے حقیقی اسباب و علل سے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ قوموں کی زندگی اور ان کے عروج و زوال میں جو افراد حصہ لیتے ہیں ان کے اعمال و افعال کے محرکات کیا ہیں! کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو کیوں؟ یہ واقعہ پھر کبھی رونما ہو سکتا ہے؟ لہٰذا تاریخ کا تعلق اگرچہ ماضی سے ہے لیکن اس میں مستقبل کے لیے بھی ایک سبق ہے جس سے افراد ویسے ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے پہلے افراد اٹھا چکے ہیں۔ تاریخ گویا ہمارے ارادوں اور ہمارے مقاصد میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اور اگر ہم نے اسے ٹھیک سے سمجھ لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان غلطیوں سے محترز نہ رہیں۔ جو دوسروں کے لئے ناکامی کا سبب بنیں۔ تاریخ گویا آئینہ ہے اس اجتماعی عمل، اس کے محرکات، اسباب اور نتائج کا جس سے قوموں کا گذر ہوتا ہے۔

ابن مسکویہ کی نظر میں تاریخ کو افسانوں اور معجزات سے الگ رکھنا چاہیے۔ تو ٹھیک ہے مگر وجود نبوت کی فضیلت کے اعتبار سے وہ تاریخ میں اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے جو ایک افسوسناک فروگذاشت ہے۔ ان کے نزدیک ہر ہستی کے اندر ایک شوق ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے کمال کی طرف حرکت کرے۔ یہی حرکت خیر و فضیلت ہے۔ انسان کا کمال چونکہ انسانیت میں ہے۔ جو حیوانات میں نہیں۔ لہٰذا انسان کی فضیلت اسی میں ہے کہ وہ اس مرتبے کو حاصل کرے۔ لیکن اس مرتبے تک پہنچنے کی استعداد سب انسانوں میں یکساں نہیں۔ ان میں کچھ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو فطرتاً خیر یعنی کمالِ انسانیت کی طرف حرکت کرتی ہیں۔ ان میں اشرار بھی ہیں جو فطرتاً شر کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ اکثر انسان ان دونوں قسموں کے بین بین ہیں۔ اور تربیت کے زیر اثر خیر یا شر کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انسان خواہ اُن کی استعداد کچھ بھی ہو۔ فرداً فرداً محض اپنی کوشش سے خیر کو حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ باہم مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اندریں صورت ضروری ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو۔

نظم و نثر میں بھی ابن مسکویہ کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ اپنے دور کے بڑے بڑے ادیبوں مثلاً بدیع الزمان الہمدانی سے اُن کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ ابو حیان التوحیدی بھی، جو فلسفے میں اگرچہ اسے بے حقیقت سمجھتا ہے۔ اس باب میں خاص طور پر اس کی بزرگی کا معترف ہے۔

ابن معین (۱۵۸ھ/۷۷۵ء – ۲۲ ذی الحج ۲۳۳ھ/۲۸ جولائی ۸۴۸ء) یحیٰ بن معین محدث اور فقیہہ، انبار کے قریب ناقیہ کے رہنے والے تھے۔ والد رے میں افسر خراج تھے۔ اس لئے وراثت میں کوئی ڈیڑھ لاکھ درم حاصل ہوئے، جو سب کے سب تحصیل حدیث میں صرف کر دیئے۔ آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ پہننے کو جوتا بھی نہ رہا تھا۔

ابن معین کا کہنا ہے کہ انھوں نے کوئی چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ایک سو تیس صندوق کتابوں سے بھرے نکلے۔ ان کے علاوہ چار گڑونچیوں پر کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ بخاری، مسلم اور ابو داؤد جیسے محدثین ان کے شاگردوں میں سے تھے اور امام احمد بن حنبل معاصر اور دوست تھے۔

ابن ملجم حضرت علیؓ کا قاتل، عبدالرحمان نام تھا۔ خارجی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دو اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ، معاویہؓ، عمرو بن العاصؓ، کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ انھیں حضرت علیؓ پر وار کرنے کا موقع مل گیا اور ۱۷ رمضان ۴۰ھ/۲۴ جنوری ۶۶۱ء کو اس نے حضرت علیؓ کے سر پر وار کیا، جس سے آپؓ سخت زخمی ہو گئے اور تین روز بعد انتقال فرمایا۔ ابن ملجم کے حالات زندگی نہیں ملتے۔

ابنِ ہشام (وفات ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری، مورخ اور ادیب، سیرۃ کے مصنف، فسطاط میں فوت ہوئے۔ انھوں

نے ابن اسحاق کی سیرت کو نئے سرے سے لکھا۔ اس کے علاوہ انجیل اور جنوبی عرب کے قصوں اور افسانوں کا ایک مجموعہ "کتاب التیجان" لکھا۔

دنیا میں سیرت ابن اسحاق آج سیرت ابن ہشام ہی کے نام سے ملتی ہے۔ تاہم ابن ہشام نے دیگر ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس نے زیادہ تر اپنی سیرت کو زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی (وفات ۱۸۳ھ) کے واسطے سے روایت کیا ہے۔ بکائی کا جو درجہ محققین کے نزدیک ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امام بخاریؒ کے استاد علی بن محمد فرماتے ہیں کہ بکائی ضعیف الروایت ہے۔ اس لیے میں نے اس سے کوئی روایت نہیں لی۔ حضرت ابوحاتم اور امام نسائی بھی بکائی کو غیر مستند اور ضعیف کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ اور امام بخاریؒ بھی اسے غیر مستند قرار دیتے ہیں۔ نیز مولانا شبلی کے نزدیک بھی بکائی کا مقام یہی ہے۔ تاہم ابن ہشام کی "سیرۃ" تاریخی ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی، سید

(۱۹۰۳ء۔ ۱۹۷۹ء) رواں صدی کی عظیم مذہبی شخصیت۔ گزشتہ نصف صدی سے وہ تبلیغ اسلام کے لیے سرگرم ہیں۔ وفادار، متوکل اور خدا ترس انسان ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی پورا نام ہے۔ سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا رشتہ سلسلہ چشتیہ سے ملتا ہے، اسی واسطے ان کا نسب امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد ابتداً ہیرات (جنت) کے باسی تھے۔ نویں صدی میں ہجرت کی اور ہندوستان آئے۔ اپنے خاندان میں سب سے پہلے ہجرت کرنے والوں میں مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ پہلے پہل کرنال کے قریب میں قصبہ براس میں مقیم ہوئے۔ یہ زمانہ سکندر لودھی کا تھا۔ وہاں سے مغل بادشاہ شاہ عالم کے زمانے میں دہلی چلے گئے۔

آپ ۳ رجب ۱۳۲۱ھ بمطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی احمد تھے جو وکیل پیشہ تھے، مگر بعد میں انہوں نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا اس لیے کہ یہ جائز کمائی نہیں۔ آپ کا گھرانہ مذہبی تھا۔ والد خود مذہبی تعلیم دیتے۔ پانچ برس کی عمر میں آپ اپنے والد کے ساتھ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے۔ اسی عمر میں تیس کے لگ بھگ آیات بامعنی ازبر کر چکے تھے۔ اسی دوران روزے رکھنا شروع کیے۔ نو سال کی عمر تک آپ کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں مولوی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد والد انہیں حیدر آباد لے گئے۔ وہاں حیدر آباد کے دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں چھ ماہ بعد والد بیمار ہوئے۔ آپ کی تعلیم منقطع ہوئی۔ مختصر علالت کے بعد والد خدا کے واحد سے جا ملے۔ چنانچہ آپ نے عملی زندگی کا آغاز کیا اور صحافیہ پیشہ اختیار کیا۔ اخبار "مدینہ" (یوپی) تاج (جبل پور) اور جمعیت العلمائے ہند کا روزنامہ "الجمعیۃ" (دہلی) میں صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔

شدھی تحریک، ترک موالات، تحریک خلافت، تحریک ستیہ گرہ میں آپ نے پرجوش حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے عربی ادب، حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ و منطق پڑھی۔

۱۹۲۵ء میں آپ نے "الجمعیت" کی ادارت ترک کی اور حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اسی زمانے میں بہت سی کتب تصنیف کیں۔ معروف اسلامی پرچہ "ترجمان القرآن" بھی یہیں سے ۱۹۳۲ء میں جاری کیا۔ اس کے تین سال بعد آپ نے بعنوان "پردہ" ایک کتاب تصنیف کی تاکہ اس کے خلاف لوگوں کا منہ بند کیا جا سکے۔

۱۹۳۸ء میں جب کانگریس نے "ہندو مسلم ایک" کی تحریک چلائی تو آپ نے بھی دو قومی نظریہ کی حمایت کی۔ اسی سال جب چوہدری نیاز علی نے پٹھانکوٹ میں دارالسلام کی بنیاد رکھی تو آپ بھی علامہ اقبال کے کہنے پہ اس سے وابستہ ہو گئے۔ اسی زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے صدر مولانا مناظر گیلانی نے آپ کو یونیورسٹی میں دینیات کی پروفیسری پیش کی، مگر آپ [illegible] کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ ۲۶ [illegible] اگست ۱۹۴۱ء [illegible] اس میں "جماعت اسلامی" کے قیام کا اعلان کیا [illegible] کے دین کے قیام کے لیے متحد ہو جاؤ۔"

ان دنوں مطالبہ پاکستان شدت اختیار کر رہا تھا [illegible] بھی اس سے بچاؤ کے لیے رات رات بھر پہرہ دیتے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ نے اسلامی دستور کے نفاذ کے [illegible] قائد اعظم کے بعد آپ کے جریدے "کوثر" [illegible] دن بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں آپ اپنے [illegible] ماہ نظر بند رہے۔ ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کے خلاف تحریک [illegible] فوجی عدالت سے "قادیانی مسئلہ" نامی کتابچہ لکھنے پر [illegible] اور بیرون سے سزائے موت کے خاتمے کے لیے [illegible] نے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ آپ کی غیرت نے رحم کی اپیل [illegible] یا جب آپ تختہ دار کھڑے ہوتے۔ عین اسی وقت [illegible] موت ختم کی جاتی ہے۔ اسی وقت سعودی عرب کی اپیل [illegible] یوں سزائے موت عمر قید میں تبدیل کی گئی۔ تاہم [illegible] سال [illegible] رہا کر دیے گئے۔

۱۹۵۸ء میں "ضبط ولادت" نامی کتاب خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف لکھی، جو بحق سرکار ضبط ہوئی۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک مولانا مرحوم نے ذوالفقار علی بھٹو کی [illegible] کی تحریک کی ہر سطح پر زبردست مزاحمت کی۔ بالآخر ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو وفات پائی۔

آپ کی دیگر تصانیف میں تفسیر القرآن (چھ جلدیں)، دینیات، سنت کی [illegible]

آئینی حیثیت'، 'معاشیاتِ اسلام'، 'پردہ'، 'مسئلہ ملکیت زمین'، 'شہادتِ امام حسینؓ'، 'سرورِ عالم'، 'معراج کی رات'، 'سوشلزم اور سیاسی جماعتیں'، 'انسان کے بنیادی حقوق'، بہت مشہور ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف کے عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے اور آپ کی جماعت نے متعدد گشتی شفاخانے و اسلامی مراکز قائم کیے۔

ابوالبرکات (۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء — ۵۶۰ھ/۱۱۶۴ء) ھبۃ اللہ بن علی بن ملکا البغدادی، فلسفی اور طبیب۔ موصل کے قریب بلد کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتداءً یہودی اور غلام تھے۔ بعدازاں خلفائے بغداد اور سلجوق سلاطین کے طبیب بنے۔ خاصی بڑی عمر میں پہنچ کر اسلام قبول کیا۔ آخری عمر میں نابینا ہو گئے اور بغداد میں انتقال کیا۔ البیہقی نے تاریخ وفات ۵۶۰ھ/۱۱۶۱ء لکھی ہے۔ آپ کی خاص تصنیف 'کتاب المعتبر' ہے جس میں منطق، طبیعات بشمول نفسیات اور مابعد الطبیعیات کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے تورات کے صحیفہ [illegible] پر جو مفصل تفسیر لکھی ہے، وہ بھی خاص فلسفیانہ دلچسپی کی حامل ہے جس میں نوفلاطونی فلسفے پر زور دیا گیا ہے۔

ابوالبرکات [illegible] ۱۹۰۰ء، مفتی، محدث، مبلغ۔ [illegible]

[illegible] ۱۹۲۲ [illegible] تو آپ اپنے [illegible] ابوالحسنات قادری [illegible] جیسے علماء کے ہمراہ [illegible] ۱۹۰۰ [illegible] انتقال کیا۔ [illegible] تدریس میں [illegible]

ابوالحسنات، حکیم (وفات ۱۹۶۱ء) سید محمد احمد قادری، خطیب مسجد وزیر خان لاہور، مولانا سید دیدار علی کے صاحبزادے تھے۔ درس نظامی اور دیگر علوم کی تحصیل اپنے والد اور صدر الافاضل مرادآبادی سے کی۔ قرآن مجید کے بہترین قاری اور حافظ تھے۔ طب نواب حامی الدین مرادآبادی سے پڑھی۔ شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے لیے کام کیا اور جمعیت علمائے ہند کی مخالفت کی اور ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علمائے پاکستان کی تشکیل کی۔ ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں جو مجلس عمل بنی، اس کے صدر رہے۔ ایک سال کے لیے جیل گئے۔ داتا گنج بخش کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ مشہور تصانیف 'اوراقِ غم'، 'طیب الوردہ شرح قصیدہ بردہ'، 'رفیق السفر' اور 'تفسیر الحسنات' ہیں۔

ابوالحسن العامری (وفات ۲۷ شوال ۳۸۱ھ/۶ جنوری ۹۹۲ء) محمد بن یوسف، المشہور ابوالحسن بن ابی ذر، نیشاپوری، فلسفی، ابوزید احمد بن السہل بلخی کا شاگرد۔ ابتدائی تعلیم خراسان میں حاصل کی۔ بعدازاں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ وہ سہل البلخی، مسکویہ، الرازی اور ابونصر الفارابی کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ لیکن اس کے حالات و اقوال کچھ بھی بیان نہیں کرتا۔

ابن تیمیہ نے العامری کا دوبار ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "محمد بن یوسف العامری" جو فلسفیوں کا ایک مصنف ہے، ذکر کیا ہے کہ قدمائے فلاسفہ شام میں آئے اور حضرت داودؑ اور حضرت سلیمانؑ کے پیروؤں سے بہت کچھ سیکھا۔ فیثاغورس جو سقراط کا استاد تھا۔ لقمان کی تعلیمات سے مستفید ہوا اور یہ سقراط افلاطون کا استاد ہے اور افلاطون ارسطو کا استاد ہے۔" العامری کی طرف ۲۴ کتابوں کی فہرست منسوب کی جاتی ہے جن میں سے آج ایک بھی دستیاب نہیں ہے۔ البتہ اس کی وفات کے متعلق مؤرخین نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ دو دفعہ بغداد گیا۔ رے میں پانچ برس گذارے۔ وہ علوم شرعیہ اور علوم فلاسفہ کی تطبیق کا قائل تھا۔ اس نے ارسطو کی اکثر کتابوں کی شرح کی ہے۔ بوعلی سینا نے اس کے بعض اقوال کو سختی سے رد کیا ہے۔ اور اسے احمق، کودن، کندۂ ناتراش اور خشک مغز تک کہا ہے۔

ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی اس کا نام "ابوالحسن العامری" دینے پر اکتفا کرتا ہے۔ اسے یعقوب بن اسحاق الکندی، حنین بن اسحاق، ابوسلیمان السجزی، ابوزید احمد بن سہل البلخی... واقعہ لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ احمد بن الحسین ابن مہران ابوبکر الکنیشاپوری المقری کی، جو اپنے زمانے میں ماہر قرأت تھا اور ابوالحسن العامری صاحب الفلاسفہ کی وفات ایک ہی تاریخ کو ہوئی۔ اسی رات احمد بن الحسین کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟۔

انہوں نے جواب دیا کہ اللہ نے ابوالحسن العامری کو میرے سامنے لا کھڑا کیا اور کہا کہ جا تجھے اس کے طفیل میں نے دوزخ سے نجات دی۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے دین کے ہاں ان لوگوں کی کتنی وقعت تھی جو فلسفہ و حکمت کو پھیلانے اور اسے شریعت کے ساتھ تطبیق دینے میں کوشاں تھے۔ حاکم نیشاپوری نے اس خواب کو نقل کرنے کے بعد ایک مستند حدیث بروایت ابوموسیٰ الاشعری نقل کی ہے کہ ــــ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ اس امت کے ہر ایک شخص کے ساتھ کفار کے ایک آدمی کو یہ کہہ کر بخش دے گا کہ تجھے اس کے طفیل میں بخشا گیا۔

ابوالحسن علی فاس کے خانوادہ مرینیہ کا دسواں حکمران، چونتیس برس کی عمر میں ۱۳۳۱ء میں اپنے والد ابوسعید عثمان کے بعد وارث تخت و تاج ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ جسمانی طور پر بہت طاقتور تھا۔ اس میں ایک عظیم حکمران کی سی مستعدی اور وسعتِ نظر بھی موجود تھی۔ بہت سی عوامی عمارات اس کی دینداری اور عظمت و شان پر شاہد ہیں۔ اس کے عہد میں نہ صرف بنومرین اپنے انتہائی عروج کو، اور اس کے خاندان کی مملکت اپنی انتہائی وسعت کو پہنچ گئی بلکہ ان کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا۔

اندلس میں اس نے ۱۳۳۳ء میں جبل الطارق کو عیسائیوں سے چھین لیا۔ لیکن ایک بحری فتح حاصل کرنے کے بعد اسے طریف کے نزدیک وادیٔ بکہ کے مقام پر تباہ کن ہزیمت برداشت کرنا پڑی، جس سے عیسائیوں کے خلاف مرینیوں کے جہاد کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۳۴۰ء میں بلادِ بربر میں اس نے عظیم الشان موحد سلاطین کی توسیعی حکمت عملی کو دوبارہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس نے تلمسان کا محاصرہ کیا۔ فوجی مستقر المنصورہ کو از سر نو تعمیر کیا اور تین سال کے بعد بالآخر خانوادہ عبدالواد (بنو زیان) کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ مفتوحہ تلمسان میں اسے مصر کے مملوک سلطان اور شاہِ سوڈان کے پیغاماتِ تہنیت موصول ہوئے۔ اپنے حلیف، تونس کے حفصی بادشاہ، کی حمایت میں اس نے افریقہ پر فوج کشی

کی۔ لیکن فتح و کامیابی کے ایک دور کے بعد اسے (القیروان) کے نزدیک عرب بدوؤں کی ایک متحدہ جماعت نے شکست فاش دی (۱۳۴۸ء)۔ تونس سے وہ سمندر کے راستے روانہ ہوا لیکن اس کا بیڑا ڈوب گیا۔ اس نے الجزائر میں اتر کر اپنی سلطنت، جس پر اس کے بیٹے ابوعنان نے قبضہ کر لیا تھا دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۷۵۲ھ/۱۳۵۲ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور ابوعنان نے اسے تلمسان میں دفن کیا۔

ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء—) عالم دین، مفکر، مصنف، محقق۔ آپ مولانا حکیم سید عبدالحی کے فرزند ہیں جو لاثانی کتاب "نزہۃ الخواطر" کے مصنف ہیں۔ نو سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی کے زیر کفالت آ گئے۔ آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں تفسیر و ادب عربی کے استاد کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھال لی۔ اپنے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں نظامت تعلیم و تربیت اور دوسری ثقافتی سرگرمیوں کا شعبہ بھی سنبھال لیا۔ ایک عرصے سے ندوۃ العلماء کے ناظم کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ لکھنؤ میں ایک "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" بھی قائم کی۔

مولانا ندوی ہند و بیرون ہند کے نمایاں ادبی، علمی اور ثقافتی اداروں سے مختلف حیثیتوں میں گہرا ربط اور تعلق رکھتے ہیں۔ آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ (شبلی اکیڈمی) اور سہ بہ اتر پردیش (ہندوستان) کی دینی تعلیم کی کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ مجمع علمی دمشق کے رکن، اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ کی مجلس اعلیٰ کے رکن، رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے بانی رکن، عرب یونیورسٹیوں کی فیڈریشن کی مجلس انتظامیہ (مراکش) اور اردن کی مجمع علمی کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ اور دمشق یونیورسٹی میں استاد زائر کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ آپ کی بعض عربی تصانیف کئی عرب ممالک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ آپ نے عالم اسلام اور عالم عرب کے علاوہ مغربی دنیا کے بھی کئی دورے کئے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں اسلام کے لئے آپ کی بیش بہا خدمات کے اعتراف کے طور پر "شاہ فیصل ایوارڈ" کے مستحق قرار پائے۔

مولانا ندوی کا مقام عصر حاضر کے علماء و مفکرین میں بہت اونچا ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی تحریر و تقریر کے ذریعے عالم اسلام کے دینی، اخلاقی اور ثقافتی نشاۃ ثانیہ کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ مولانا ندوی ہمیشہ اسلامی تعلیمات کی تشریح و توضیح کرتے وقت عصر حاضر کے مسائل اور تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ آپ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وحی الٰہی کو مشعل راہ بنا کر انسانیت کو اپنے الجھے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

مولانا ندوی کی تصانیف بے شمار ہیں۔ لیکن زیادہ مشہور یہ ہیں: "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش"، "تاریخ دعوت و عزیمت"، "نبی رحمت"، "نقوش اقبال"، "پرانے چراغ"، "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"۔

ابوالخیر ازبک حکمران ازبک قوم کے اقتدار کا بانی۔ یہ جوچی کے سب سے چھوٹے بیٹے شیبان کی اولاد میں سے تھا۔ ۱۴۱۲ء میں پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ پہلے شیبان کے ایک اور خلف جمدق خان کا ملازم تھا۔ جمدق ایک بغاوت کے دوران مارا گیا۔ ابوالخیر گرفتار ہوا لیکن کچھ عرصے بعد اسے سترہ برس کی عمر میں علاقہ تورا (موجودہ سائبیریا) کا خان بنا دیا گیا۔ خاندان جوچی کے ایک اور خان کو شکست دینے کے بعد قبچاق کے زیادہ تر لوگ اس کے مطیع ہو گئے

۱۴۳۰ء میں اس نے خوارزم کی مملکت اس کے صدر مقام ارگنج سمیت سر کر لی۔ اور اسے تاراج کر ڈالا۔ لیکن جلد ہی اس نے یہ مملکت واپس کر دی۔

اس کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ابوالخیر نے دو اور امیروں محمود خان اور احمد خان کو شکست دی۔ اردو بازار کا شہر سر کیا اور کچھ عرصے کے لئے "بالو کے تخت" پر بھی قبضہ جما لیا۔ سلطان شاہرخ کی وفات (۱۴۴۷ء) سے کچھ عرصہ پہلے ابوالخیر نے دریائے سیحوں کے کنارے کے سغناق (موجودہ سُنَق قرغن کے آثار) آرقوق، سُزَق، آق قرغن اور ازکند نامی قلعوں کو سر کر کے اپنا اقتدار اچھی طرح قائم کر لیا۔ اس کا یہ کارنامہ ازبکوں کی آئندہ تاریخ کے لئے اس کے عہد حکومت کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس کے بعد سغناق اس کا صدر مقام قرار پایا۔ ابوالخیر نے اس علاقے کے جنوب میں کوئی پائیدار فتح نہیں کی حتیٰ کہ قریب کا شہر یسی (موجودہ ترکستان) بھی تیموریوں کے زیر نگیں رہا۔ البتہ لوٹ مار کی مہمیں بخارا اور سمرقند جیسے دور افتادہ اقطاع تک بھی بارہا روانہ کی گئیں۔

۱۴۵۱ء میں ابوالخیر پہلے سے بھی بھاری لشکر لے کر امیر ابوسعید کے حلیف کی حیثیت سے سمرقند کے حکمران عبداللہ کے خلاف ایک مہم میں شامل ہوا۔ اس کی مدد سے عبداللہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا اور ابوسعید کو سمرقند کا حکمران بنا دیا گیا۔ الغ بیگ کی بیٹی رابعہ سلطان بیگم ابوالخیر کے عقد میں آئی۔ ابوالخیر نے آل تیمور کے باہمی جھگڑوں میں دخل دینے کی ایک اور کوشش کی۔ جس کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہ نکلا۔ محمد جوکی کو جسے ابوسعید کے خلاف ابوالخیر کی حمایت حاصل تھی، شروع میں تو کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن ابوسعید کی آمد ۱۴۶۰ء میں اسے سمرقند کا محاصرہ اٹھانا اور اس علاقے کو چھوڑنا پڑا جسے ابوالخیر کی امدادی افواج زیر قیادت برکہ سلطان نے تاراج کر ڈالا تھا اور آخر کار ۱۴۶۳ء میں ابوالخیر کی طرف سے کوئی امداد نہ ملنے پر اسے حریف کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس واقعے سے کچھ عرصہ پہلے غالباً ۱۴۵۶ء کے قریب جبکہ ابوالخیر کا پوتا محمود جو ۱۴۵۵ء میں پیدا ہوا تھا، تین برس کا تھا، ابوالخیر کے اقتدار کو قلمقوں (کلموں) کے ہاتھوں زبردست دھکا لگا۔ ابوالخیر نے کھلے میدان میں شکست کھائی اور سغناق کی طرف بھاگ نکلا۔ دشمن نے سیر دریا تک اس کا سارا علاقہ تاراج کر ڈالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۶۵ء کے لگ بھگ ازبکوں کے درمیان وہ مشہور افتراق رونما ہوا جس کے باعث گیا جسان کے اصل بانی جو اسی وقت سے قازق کہلاتے ہیں، قوم کے باقی ماندہ حصے سے الگ ہو گئے۔ ۱۴۶۸ء میں ابوالخیر کا انتقال ہوا۔ جس سلطنت کی بنیاد ابوالخیر نے رکھی تھی اسے ایک مختصر وقفے کے بعد اس کے پوتے محمد شیبانی نے بحال کر لیا اور اسے مزید وسعت دی۔

ابوالخیر کے سوانح حیات جو مسعود ابن عثمان الکوہستانی نے ۱۵۴۳ء کے قریب لکھے تھے۔ اس کے مندرجات برٹش میوزیم کے نسخے کے عین مطابق ہیں۔ مسعود نے ابوالخیر کے بیٹے سونچ خاں (متوفی ۱۵۲۵ء) سے سنے ہوئے زبانی بیانات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جس نے اپنی معلومات ابوالرزاق سمرقندی کی کتاب "مطلع السعدین" سے حاصل کی تھیں۔ ابوالخیر کے متعلق مزید معلومات ان تواریخ میں سے مل سکتی ہیں جو اس کے پوتے شیبانی اور اس کے جانشینوں کے متعلق لکھی گئیں۔ بالخصوص تواریخ نصرت نامہ ہیں اور ان تحریرات میں جو اس تصنیف پر مبنی ہیں۔

ابوالخیر الاشبیلی، ماہر اشجار، فن زراعت پر ایک کتاب کے مصنف۔ ان کا لقب الشجار ہے۔ یہ اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہیں ہے۔ ابن العوام نے جو بارہویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں، ان کی کتاب سے اقتباس کیا ہے۔ اس لئے کہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ان سے پہلے

گذرے ہیں۔ امکان غالب ہے کہ یہ گیارہویں صدی عیسوی کے ان اطبّاء کے معاصر تھے جو علم نباتات اور فن باغبانی کے بھی فاضل تھے۔ مثلاً ابن وافد اللخمی، ابن بصال، ابن حجاج الاشبیلی الطغری۔

ان کی کتاب "الفلاحۃ" مخطوطے کی شکل میں پیرس کے کتب خانے نیز تونس کی مسجد زیتونہ اور شمالی افریقہ کے بعض نجی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ ان کی کتاب کے خاص مضامین یعنی پودے لگانے کے متعلق عام باتیں، موزوں مہینے، پودوں پر چاند کے اثرات، وہ [illegible] جو پودوں کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں درکار ہوتا ہے، اشجار کی عمر، نقصانات، موسم، جانور، آگ اور پانی، اور زیتون، انگور، انجیر اور کھجور کی مخصوص غور و پرداخت، مثلاً اشجار، جھاڑیاں، غلہ، بیج، ٹہنی لگانا، کاٹ چھانٹ، پیوندکاری، پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے، خوشبودار پودے، پھول، سن اور کپاس، کیلا اور گنا وغیرہ۔ جانور، پالتو، باغ کے بالخصوص کبوتر، شہد کی مکھی اور جنگلی جانور، ضرر رساں جانور [illegible] رینگنے والے، کترنے والے جانور، کیڑے مکوڑے، بالآخر "تجارب العام" پر دو صفحات جن میں موسم اور جوتش کی پیش گوئیاں درج ہیں۔

ابوالخیر کی تحریریں ان ذاتی تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی ہیں جو انہوں نے ضلع اشبیلیہ کے علاقہ [illegible] کے باغوں، [illegible] بالوں، کھیتوں، تاکستانوں اور جنگلوں میں کئے تھے۔ ادبی اسناد میں وہ [illegible] بالواسطہ حسب ذیل کتب سے حوالے دیتے ہیں۔ ابو حنیفۃ الدینوری کی کتاب النبات [illegible] جس کا ذکر [illegible] میں ملتا ہے۔ "نفح الطیب"، ابن وحشیہ کی کتاب الفلاحۃ النبطیۃ [illegible] کے واسطے سے۔ بالعموم یہ کتاب ایک ایسی عملی تحقیق اور تصنیف ہے جو [illegible] تجربات پر مبنی ہے۔ لیکن [illegible] سے متعلق عام [illegible] کی طرح یہ بھی توہمات عامہ سے [illegible] طلسمات اور [illegible] الفوس بھی درج ہیں۔

ابوالدرداء

عویمر بن زید بن قیس، صحابی اور حافظ قرآن، قبیلہ خزرج کے خاندان بلحارث سے تھے۔ جنگ بدر کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ اپنے گھرانے میں سب سے آخر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہ کے جو وظائف مقرر کئے تھے ان میں ان کا وظیفہ اصحاب بدر کے برابر تھا۔

ایک روایت ہے کہ آپ غزوۂ احد میں شریک ہوئے تھے۔ میدان جنگ میں ان کی جانبازی دیکھ کر نبی اکرمؐ نے فرمایا عویمر کیا ہی اچھا سوار ہے۔ جب آنحضرت صلعم نے مہاجرین اور انصار میں بھائی چارہ قائم کیا تو آپ سلمان فارسیؓ کے بھائی کے طور پر منتخب ہوئے۔

ابوالدرداء سے مختلف احادیث مروی ہیں جو "ذخائر المواریث" میں درج ہیں۔ صوفیا انہیں اصحاب صفہ میں شمار کرتے ہیں اور ان کے زہد و تقویٰ کے مضمون پر مشتمل بہت سے اقوال نقل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "طبقات" میں انہیں فقیہ، زاہد اور صاحب علم کہا گیا ہے۔ ان کی شہرت کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ آپ حافظ قرآن اور اس کے بارے میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔

ابوالسرایا

(وفات ۱۰ ربیع الاوّل ۲۰۰ھ / ۱۸ اکتوبر ۸۱۵ء) السری منصور الشیبانی ایک شیعہ باغی، جو پہلے گدھے ہانکا کرتا تھا اور پھر ڈاکو بن گیا۔ یزید بن زید الشیبانی کا ملازم بنا۔ بعد ازاں حج پر جانے کے بہانے اس سے الگ ہو کر باغی ہو گیا۔ الرقہ میں محمد ابراہیم طباطبا سے ملا۔ اور پھر ان کے ساتھ مل کر کوفے میں الحسن بن سہل کو شکست دی۔ طباطبا کے فوت ہو جانے کے بعد علویوں کی باگ ڈور دراصل ابوالسرایا کے ہاتھ آ گئی۔ جب اس نے بغداد پر چڑھائی کی تو ہرثمہ نے الحسن بن سہل کی مدد کرتے ہوئے ابوالسرایا کو شکست دے کر کوفہ میں محصور کر لیا۔ ۱۶ محرم ۲۰۰ھ / ۲۶ اگست ۸۱۵ء کو ابوالسرایا آٹھ سو سواروں کے ہمراہ بھاگ نکلا۔ الحسن بن سہل کے آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا، اور الحسن نے اس کا سر قلم کروا کر لاش بغداد کے پل پر برائے عبرت عام لٹکا دی۔

ابوالعاص رضؓ

حضرت خدیجہؓ کے بھانجے، لقیط نام تھا، زمانہ جاہلیت میں بہت بڑے لیکن ایماندار تاجر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی فرمائش پر آنحضرتؐ نے اپنی بیٹی زینبؓ کا نکاح ان سے کر دیا۔ عرصہ تک مسلمان نہ ہوئے۔ اس لئے جب غزوہ بدر میں قید ہو کر حضور اکرمؐ کے پاس پہنچے تو آپؐ نے اس شرط پر رہا کیا کہ اپنی زوجہ زینبؓ کو مدینہ بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حسب وعدہ زینبؓ کو مدینہ بھجوا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ مسلمان ہوئے اور مدینہ چلے آئے۔ چونکہ آپ کا کاروبار مکہ ہی میں تھا اس لئے دوبارہ مکہ لوٹ گئے۔ ۱۰ھ میں حضرت علیؓ کی سرکردگی میں یمن جانے والے سریہ میں شریک ہوئے۔ واپسی پر اس علاقے کے عامل بنائے گئے۔ ۱۲ھ میں انتقال کیا۔

ابوالعباس السفاح

(دیکھئے "ابوعباس السفاح")

ابوالفداء

(۲ جمادی الاوّل ۶۷۲ھ / نومبر ۱۲۷۳ء – ۲۳ محرم ۷۳۲ھ / ۲۷ اکتوبر ۱۳۳۱ء) اسماعیل علی بن محمود بن محمد بن تقی الدین مؤرخ اور جغرافیہ دان شامی امیر تھا۔ دمشق میں پیدا ہوا۔ ۶۹۸ھ / ۱۲۹۹ء میں جب حماۃ کی ایوبی ریاست ختم ہوئی تو ابوالفداء نے ریاست کے مملوک عمال کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸ جمادی الاوّل ۷۱۰ھ / ۱۴ اکتوبر ۱۳۱۰ء کو امیر العرب کنا شیخ آل فضل کے کہنے پر حماۃ کا صوبیدار مقرر ہوا۔ ۷۱۹ھ / ۱۳۲۰ء میں اس نے سلطان محمد کے ہمراہ حج بیت اللہ کا قصد کیا۔ سلطان نے اسے شام کے سب حاکموں سے زیادہ درجہ عطا کیا۔ چنانچہ اپنی وفات تک وہ بڑی شان و شوکت سے رہا۔

ابوالفداء کی شہرت کا دارومدار دو تصانیف پر ہے۔ ایک "مختصر تاریخ البشر" ہے جس میں عہد قبل از اسلام سے ۷۲۹ھ / ۱۳۲۹ء تک کی عمومی تاریخ ہے اور جو زیادہ تر ابن اثیر کی کتابوں سے ماخوذ ہے اور دوسری "تقویم البلدان" ہے، جو جغرافیہ پر ایک اہم تصنیف ہے اس میں طبیعی اور ریاضی کی معلومات کا اضافہ جدولوں کے ساتھ کیا گیا ہے یہ کتاب ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء کو پایۂ اختتام کو پہنچی۔ اکثر مصنفوں نے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ یورپ میں سترھویں صدی عیسوی سے اب تک اس کتاب کا بڑا چرچا رہا ہے۔ علم جغرافیہ کی تاریخ میں یہ کتاب ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابوالفضل، شیخ

(۶ محرم ۹۵۸ھ / ۱۴ جنوری ۱۵۵۱ء – ۴ ربیع الاوّل ۱۰۱۱ھ / ۲۲ اگست ۱۶۰۲ء) اکبر بادشاہ کے مشہور نورتن میں سے ایک علامہ فیضی کا چھوٹا بھائی اور شیخ مبارک ناگوری (وفات ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۳ء) کا بیٹا آگرے میں پیدا ہوا۔ ۱۵۷۲ء میں اپنے بھائی کے ذریعے دربار اکبری میں رسائی حاصل کی۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کے انتہائی قریب ہو گیا اور ترقی کرتا ہوا صدر الصدور کے عہدے پر پہنچ گیا۔

ابوالفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں اثرانداز ہو کر اسے اس امر کا یقین دلا دیا کہ

مذہب کے متعلق اس کے نظریات معاصر علماء سے کہیں بہتر ہیں۔ چنانچہ اکبر نے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۵ء میں ایک "عبادت خانہ" بنوایا جس میں علماء کے مناظرے سنا کرتا تھا۔ بعدازاں اکبر نے "دین الٰہی" جاری کیا تو اسے قبول کرنے والا پہلا رتن یہی ابوالفضل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "دین الٰہی" کا محرک بھی یہی تھا۔ (دیکھیے "دین الٰہی")

شیخ ابوالفضل

ابوالفضل کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھ کر شہزادہ سلیم نے اسے قتل کرا دیا۔ اکبر کو اس واقعے سے سخت افسوس ہوا اور اس روز سے وہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے بدظن رہا۔ اس صدمے سے اس نے تین روز تک کھانا بھی نہ کھایا۔ ابوالفضل کا ایک بیٹا عبدالرحمان اس کے قتل کے بعد ۱۶۱۳ء تک زندہ رہا اور صوبہ بہار کا حاکم مقرر ہوا۔

ابوالفضل ایک عالم فاضل شخص تھا اور علامی تخلص کرتا تھا۔ اس کی تصانیف میں سب سے اہم "اکبر نامہ" اور "آئین اکبری" ہیں۔ اکبر نامہ میں عہد اکبری کی مبسوط تاریخ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں خاندان تیموریہ کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں عہد اکبری کی تاریخ ہے۔ بعض لوگ "آئین اکبری" کو اکبر نامہ کی تیسری جلد کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں سلطنت اکبری کے نظم ونسق رسوم ورواج اور عقائد کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ابوالفضل نے "عیار دانش"، "مہابھارت کے فارسی ترجمے کا دیباچہ "رزم نامہ"، بائیبل کا فارسی ترجمہ "انجیل"، ایک طویل نظم "مناجات"، "انشائے ابوالفضل" بھی تصنیف کی ہیں۔ آخری کتاب اس کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے نجی خطوط کا ایک اور مجموعہ "رقعات ابوالفضل" بھی ہے۔

ابوالقاسم حضرت رسول اکرمؐ کی کنیت، جو آپؐ کے بڑے بیٹے قاسم کے نام پر ہے۔ حضرت قاسمؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن میں سے تھے اور شیر خوارگی میں انتقال کر گئے تھے۔ (نیز دیکھیے "محمدؐ")

ابوالمعالی قادری، شیخ (۱۰ ذی الحجہ ۹۶۰ھ/ ۱۷ نومبر ۱۵۵۲ء - ۱۷ ربیع الاول ۱۰۲۴ھ/ ۱۶ اپریل ۱۶۱۵ء) خیرالدین کرمانی لاہور کے مشہور صوفی بزرگ، شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے مرید اور داماد کا نام میر سید فتح اللہ شاہ تھا پیدائش کے وقت ہندوستان پر ہمایوں کی حکومت تھی۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سے سید فیض اللہ اپنے بیٹے سید مبارک کے ہمراہ ۸۹۶ھ میں کرمان سے ہندوستان آئے تھے اور اُچ شریف میں مقیم ہوئے۔ بعدازاں ملتان کے نواح میں داؤد جال قصبے میں سکونت اختیار کی۔ ۹۴۰ھ میں یہ خاندان ستگھرہ (شیر گڑھ) میں منتقل ہو گیا۔

شیخ ابوالمعالی اپنے مرشد کے حکم سے لاہور تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر پچاس برس تھی۔ یہاں آپ قطب الاقطاب کے درجے پر فائز تھے۔ ایک کرامت آپ سے منسوب ہے کہ جو بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا، اسے رات خواب میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی زیارت نصیب ہوتی۔

آپ کی تصانیف میں "دیوان غربتی" (غربتی آپ کا تخلص تھا) "تحفۃ القادریہ"، "رسالہ گلدستہ باغ ارم"، "رسالہ مونس جان" اور "زعفران زار" مشہور ہیں۔ آپ کا مزار لاہور میں میکلوڈ روڈ کے قریب واقع ہے۔ مزار کے قریب ایک کنواں اور مسجد ہے۔ مزار پر بہت سے کبوتروں کا ڈیرہ ہے۔ سال بھر میں چار عرس لگتے ہیں۔ پہلا عرس ۱۷ ربیع الاول کو اور پھر عید، بقر عید اور شب برات کو بھی میلے لگتے ہیں۔ ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

ابوالوفا البوزجانی (یکم رمضان ۳۲۸ھ/ ۱۰ جون ۹۴۰ء - رجب ۳۸۸ھ/ جولائی ۹۹۸ء) محمد بن محمد بن یحییٰ بن اسماعیل بن العباس۔ بہت بڑا ریاضی دان، قہستان کے شہر بوزجان میں پیدا ہوا۔ ایرانی النسل تھا۔ ۳۴۸ھ/ ۹۵۹ء میں عراق چلا گیا اور اپنی وفات تک وہیں رہا۔ ابن خلکان کے نزدیک ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں فوت ہوا۔ ریاضی میں اس کی معرکۃ الآرا تصنیف "الکامل" ہے۔ جس میں اس نے علم مثلث کو باقاعدہ علم کی حیثیت دی۔ غالباً اسی نے پہلے جیب الزاویہ کا دعویٰ قائم کیا۔ [illegible] کی تبدیلیوں کو دریافت کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ تاہم بعض محققین [illegible] کرتے ہیں۔ دوسری کتاب "عمال من علم الحساب" ہے اور تیسری "الہندسہ" [illegible] دونوں زبانوں میں ہے۔ یہ پیرس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ [illegible] اور دیوفنطوس اور خوارزمی کی کتابوں پر شرحیں بھی لکھیں جو آج نایاب ہیں۔

ابوالہول (SPHINX) "خوف والا" مصر کے آثار قدیمہ کا ایک بت، جو غزہ کے علاقے میں ایک چٹان تراش کر بنایا گیا ہے۔ یہ شیر کی شکل کا [illegible] اور ۶۵ فٹ اونچا مجسمہ ہے، جس کے پنجے اور دھڑ شیر کے ہیں اور سر انسان کا ہے۔ پہلے صرف اس کا سر نظر آتا تھا۔ باقی مجسمہ زمین میں دبا ہوا تھا۔ ۱۸۱۶ء میں اس پر سے ریت ہٹائی گئی، استداد زمانہ کے باعث اس کی صورت کافی بگڑ چکی ہے۔ ڈاڑھی اور ناک ٹوٹ چکی ہے جس کی بنا پر یہ خوفناک منظر پیش کرتا ہے، شاید اسی لیے اس کا نام "ابوالہول" پڑ گیا ہے۔

"ابوالہول" کا بت اہرام مصر میں سے ایک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک پروار شیر کا بت ہے، جو قوم جن میں سے تھا اور مختلف شکلیں بدلا کرتا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے علم حاصل کیا تھا اور لوگوں کو سوالات کے ذریعے خوفزدہ کر دیا کرتا تھا۔ اس کا اہم سوال یہ تھا کہ وہ کون سا جانور ہے جو صبح کو چار ٹانگوں اور دوپہر کو دو ٹانگوں اور شام کو تین ٹانگوں پر چلتا ہے۔ یونانی دیومالا میں ہے کہ ایڈیپس نے اس کا جواب دیا کہ وہ جانور انسان ہے جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اس پر اس انسانی شکل کے شیر نما جن نے خودکشی کر لی۔

یونانیوں کے ہاں اس بت کا نام "سفنکس" ہے۔ اسے فرعون مصر خفری نے ۲۵۵۰ ق م میں بنوایا تھا۔ قبطیوں کے ہاں اس کا نام "بلہیب" تھا، جو بگڑ کر "بلہول" یا "ابوالہول" بن گیا۔ المقدسی کے بیان کے مطابق ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں اس کا چہرہ ٹوٹ

ابوالہول کا بت

چکا تھا۔ ... ۱۳۰۰ء میں عزت کے تلاش کرنے والوں نے اسے مزید توڑ پھوڑ دیا۔ کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دریائے نیل کی دولت کا محافظ اور طغیانی رد کرنے والے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے اس میں سے دولت تلاش کرنا شروع کر دی۔ بعدازاں ... نے اسے مذہبی افکار کی بنا پر نقصان پہنچایا اور اس کے پتھر مسجد کی تعمیر میں لگا دیے۔

ابوامامہؓ ایک صحابی۔ صدی نام تھا۔ ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہوئے۔ غزوہ حدیبیہ بیعت رضوان میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی کوششوں سے ان کا قبیلہ باہل مسلمان ہوا۔ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ پھر شام میں سکونت اختیار کی۔ ۹۶ھ/۷۰۵ء میں سو برس سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔ احادیث کی تبلیغ میں سرگرم رہا کرتے تھے۔ بڑے بڑے صحابہ حدیث کا درس لینے آیا کرتے تھے۔ ان سے ۲۵۰ حدیثیں مروی ہیں۔

ابوایوبؓ انصاری خالد بن زید بن کلیب النجاری، جلیل القدر صحابی۔ ہم عام الفیل یعنی ہجرت نبوی سے ۳۱ برس قبل پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام ہند بنت سعد تھا۔ عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانی کے درمیانی وقت میں اسلام قبول کیا۔ جب مصعب بن عمیرؓ دیگر ۷۳ انصاری مردوں کو لے کر ۱۲ نبوی میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت ابوایوب بھی ان میں شامل تھے۔ جب حضورؐ نے ہجرت فرمائی تو مسجد نبوی کی تعمیر تک ان کے ہاں قیام فرمایا۔ مواخات میں ابوایوبؓ کے بھائی مصعب بن عمیرؓ بنائے گئے تھے۔

حضرت ابوایوبؓ نے عہد نبوی کے تمام غزوات میں حصہ لیا۔ حجۃ الوداع میں آپ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد تمام عمر جہاد میں شریک رہے۔ امیر معاویہ کے زمانے میں قسطنطنیہ کی مہم میں شرکت کی اور شہادت پائی۔ وصیت کے مطابق آپ کو قسطنطنیہ کے شہر پناہ سے متصل دفن کیا گیا۔ سلطان محمد فاتح نے ایک مسجد بھی بطور یادگار تعمیر کرائی جو ترکی کی قدیم مساجد میں سے ہے۔ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۰ء میں آتک جی زادہ احمد پاشا نے مسجد میں توسیع کرائی۔ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں اس میں دو نئے میناروں کا اضافہ کیا گیا۔ اس وقت سے اس مزار کے تین حصے ہیں۔ جامعہ ایوبؓ، مزار ایوبؓ اور قبرستان ایوبؓ (جس میں کئی ممتاز ترک اور عثمانی حکمران مدفون ہیں۔) سلطان محمد فاتح کے وقت سے اس مزار اقدس کو یہ اہمیت حاصل رہی کہ سلاطین عثمانیہ کی تاجپوشی کے موقع پر ہر سلطان یہاں آتا اور شیخ الاسلام اس کی کمر میں بانی خاندان سلطان عثمان خان کی تلوار حمائل کرتا۔

حضرت ابوایوبؓ حافظ قرآن تھے اور پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ آپ کی طرف ۱۵۰ احادیث منسوب ہیں۔ جن میں سے پانچ متفق علیہ ہیں۔ آپ نے اپنے پیچھے تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔

ابوبصیرؓ مکہ کے مسلمان باشندے تھے، جو صلح حدیبیہ کی شرائط کی رو سے مکہ میں رہنے پر مجبور تھے۔ مگر کفار کی سختیوں کی تاب نہ لا کر مدینہ بھاگ آئے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو حضورؐ نے معاہدہ کی شرط کی رو سے انھیں دو آدمیوں کے ہمراہ واپس کر دیا۔ ابوبصیر نے راستہ میں ایک کو تو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ گیا اور واپس آ کر مدینہ میں حضورؐ سے اس امر کی شکایت کی۔ ابوبصیرؓ بھی مدینہ چلے آئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے واپس کر کے آپ بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ اب جو کچھ کیا ہے اس کا میں خود ذمہ دار ہوں"۔ اس کے بعد وہ مدینہ سے نکل کر عیص میں مقیم ہو گئے۔ مکہ کے دیگر مسلمان بھی بھاگ بھاگ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے اور یوں ان کی ایک خاصی جمعیت بن گئی۔ انھوں نے انتقاماً قریش کے قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ بالآخر قریش نے مجبور ہو کر معاہدہ کی اس شرط سے ہاتھ اٹھایا۔ اور ابوبصیرؓ دیگر ساتھیوں سمیت مدینہ میں آ بسے۔

ابوبکر بن ظفر خان ہندوستان میں تغلق خاندان کا پانچواں فرمانروا۔ سلطان فیروز شاہ کے بیٹے فتح خان کا پوتا ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء کو تغلق شاہ بن فتح خان کے بعد تخت پر بیٹھا۔ باغیوں پر قابو پانے کے بعد ملتان لاہور اور دوسرے علاقوں کے حاکموں کو سلطانی عہدیداروں کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ فسادات شروع ہو گئے۔ کسانوں نے لگان ادا کرنا بند کر دیا۔ اور محمد شاہ بن فیروز شاہ کی زیر قیادت اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ محمد شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا۔ ادھر اس کا بیٹا شہزادہ ہمایوں خان بھی حملہ آور رہا۔ ابوبکر ڈیڑھ سال کی فرمانروائی کرنے کے بعد فرار ہو گئے

ابوبکر بن عبدالرحمان (وفات ۹۴ھ/۷۱۲ء) محمد ابوبکر بن عبدالرحمان، فقیہہ اور محدث، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے ایک تھے۔ احادیث پر کامل عبور تھا۔ اکثر احادیث زبانی یاد تھیں اس بنا پر خلفاء قدردانی کرتے تھے۔ خصوصاً اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان آپکا بڑا مداح تھا

ابوبکر تفادی (۱۹۱۲ء-۱۹۶۶ء) نائیجیریا کے پہلے وزیر اعظم اور قائد، ایک گاؤں تفاوی بلیوا کے غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ شمالی نائیجیریا میں اکثر امراء ہی کو اقتدار حاصل رہا۔ اس ہونہار بردا نے نائیجیریا میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد

اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی جھلک دکھانا شروع کی۔ انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملکی سیاست اور فلاحی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ ابتدا میں ملک میں خواندگی کم ہونے اور باشعور لیڈر نہ ہونے کے احساس کے پیش نظر آزادی کی مخالفت کرتے رہے اور یہ اعلان کیا کہ اگر برطانیہ نے نائیجیریا کو آزاد کر کے حکومت وہاں کے ترقی یافتہ قبائل ایبو اور یوروبا کے ہاتھ منتقل کی تو وہ ان کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر ۱۹۵۵ء میں وزیر تعمیرات کی حیثیت امریکہ کا دورہ کرنے کے بعد ان کے دل میں بھی آزادی کی خواہش اور نظریات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے آزادی کا نعرہ لگایا اور اس کے لیے میدان میں کود پڑے۔ آزادی کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء کو انھیں نائیجیریا کا پہلا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں وہاں پہلے انتخابات کے بعد بھی انھی کو دوبارہ وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں ملک میں بغاوت ہوگئی اور باغیوں نے انھیں اغوا کر کے ہلاک کر دیا۔ بعد میں جب فوج نے اقتدار سنبھالا اور جنرل ارونسی نے امن و امان قائم کیا تو ابوبکر کی لاش کو تلاش کر کے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ان کے گاؤں میں دفن کر دیا گیا

ابوبکر صدیق رضؓ خلیفہ اول، یارِ غار رسولؐ، حضرت عائشہؓ کے والد ماجد، آنحضورؐ کے خسر والدین نے عبداللہ نام رکھا تھا۔ ابوبکر کنیت اور عتیق اور صدیق لقب تھا۔ والد کا نام عثمان اور کنیت ابوقحافہ تھی۔ والدہ ماجدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی۔ قریش کی ایک شاخ تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ شجرہ نسب یہ تھا۔ عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ۔

حضرت ابوبکر کی ولادت سن ہجری سے پچاس برس قبل یعنی ۵۷۰ء میں ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ آنحضرت صلعم سے تین برس چھوٹے تھے۔ آپ کے والد ابوقحافہ نے فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا اور ۱۴ھ/۶۳۵ء کو ۹۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی والدہ بہت پہلے اسلام لے آئی تھیں اور آپ کے زمانہ خلافت کے بعد تک زندہ رہیں۔ تاہم والد سے قبل انتقال کر گئیں طبری نے حضرت ابوبکر کے دو اور بھائیوں معتق اور عتیق کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ ترمذی شریف کے مطابق عتیق حضرت ابوبکر کا لقب تھا، جو آنحضورؐ نے دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے دوزخ سے آزاد ہونا طبری ہی کی ایک روایت ہے کہ عتیق آپ کا لقب تھا۔ جبکہ آپ کا دوسرا لقب صدیق تھا۔ طبقات ابن سعد کے مطابق یہ لقب بھی آپ کو آنحضورؐ کی طرف سے ملا تھا جس کے معنی ہیں تصدیق کرنے والا۔" اس لقب کے محرک جبرئیل امین تھے۔ جب شب معراج میں آنحضورؐ نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ "میری قوم میں اس واقعہ کی تصدیق کون کرے گا۔" تو انہوں نے جواب دیا۔ "ابوبکر آپ کی تصدیق کریں گے۔ وہ صدیق ہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ کا پیشہ تجارت تھا۔ آپؓ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؓ نے پہلا سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا۔ یہ کاروبار نفع آور ثابت ہوا۔ جس سے آپؓ بڑے دولت مند اور صاحب ثروت ورائے ہو گئے۔ ابن ماجہ کا بیان ہے کہ آپؓ قریش میں سب سے بڑے متمول تاجر تھے۔ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور عقل و فہم اور اصابت رائے میں بھی مشہور تھے۔ اکثر اوقات قتل کے مقدمات آپ کے پاس پیش ہوتے تھے۔ علم الانساب اور علم تاریخ کے ماہر تھے۔ ایک روایت ہے کہ شعر بھی کہتے تھے۔ مگر اسلام کے بعد شاعری ترک کر دی۔

حضرت ابوبکرؓ زمانۂ جاہلیت سے با اخلاق اور عصمت و عفت کے محافظ تھے فقرا اور مساکین کی دستگیری کرتے، مہمان نوازی اختیار کرتے، حافظ ابن عبدالبر اور جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ "ابوبکرؓ نے عہد جاہلیت میں بھی شراب اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ اسلام لانے کے بعد آپ کے اخلاق و اوصاف میں دوگونہ اضافہ ہوگیا۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر آپ نے ایسا دوست تلاش کیا جو لہو و لعب سے کوسوں دور اور اخلاق و آداب میں آپ سے بڑھ کے تھا۔ یہ عظیم شخصیت جس کا دوست بننے پر آپ کو فخر تھا۔ آپ کے چچیرے بھائی حضرت محمدؐ تھے۔ جن کا دامن آپ نے ایک دفعہ تھامنے کے بعد پھر کبھی نہ چھوڑا اور جن کی قابل فخر رفاقت اور رہنمائی میں آپ نے وہ بلند مقام حاصل کر لیا، جو رہتی دنیا تک جمہوریت کے علمبرداروں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا رہے گا۔ یہ اخلاق و فضائل کی مماثلت ہی تھی، جس نے دونوں عظیم ہستیوں کو باہم رفاقت و دوستی کے رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ آنحضورؐ صبح و شام دونوں وقت آپ کے مکان پر ضرور تشریف لاتے اور یہ دستور بعد اسلام بھی قائم رہا

آنحضورؐ پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ [illegible] گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر سرداران قریش نے آپ سے آنحضورؐ کے دعوائے نبوت کا ذکر کیا۔ [illegible] کر آپ کا قلب صادق تڑپ اٹھا اور آپ اسی وقت اپنے بہترین رفیق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا جھجک پکار اٹھے "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ واحد اور لاشریک ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔" اس لحاظ سے مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوا۔ اسی شام سعد بن ابی وقاص نے بھی اسلام قبول کیا

ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی تمام دولت، قوت، قابلیت، اثر و رسوخ، جان اور اولاد۔ غرضیکہ جو کچھ آپ کے پاس تھا، سب کچھ دین حق کی راہ میں وقف کر دیا۔ مگر اپنی عظمت و وجاہت، اثر و رسوخ اور مال و دولت کے باوجود کفار کے ظلم و ستم کے ہاتھوں محفوظ نہ تھے۔ جب ظلم و ستم حد سے بڑھ گئے تو آنحضورؐ نے ہجرت حبشہ کا حکم دیا۔ پہلی بار گیارہ مرد اور چار عورتیں اور دوسری بار اس سے کچھ زیادہ افراد نے ہجرت کی۔ آپ بھی حبشہ کی طرف روانہ ہوئے مگر مصائب سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ عبادت الٰہی کے لیے بہتر گوشے کی تلاش میں۔ لیکن ابھی مکہ سے یمن کی جانب تین روز کی مسافت ہی طے کی تھی کہ برک الغماد کے قریب قبیلہ القارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا "ابوبکر! کہاں کا ارادہ ہے؟" آپ نے کہا "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے۔ [illegible] الگ جا کر عبادت کروں۔" ابن الدغنہ نے کہا "تم جیسا شخص نہ نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے۔" ابن الدغنہ آپ کو مکہ واپس لے آیا۔ آپ مکہ میں [illegible] ہجرت مدینہ کا وقت آگیا۔ جب آنحضورؐ نے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا [illegible] بھی اپنے لیے اجازت چاہی۔ آنحضورؐ نے فرمایا "ذرا ٹھہرو! [illegible] مجھے بھی اجازت مل جائے گی۔"

آخر نبی اکرمؐ کی زندگی کا سب سے نازک وقت آیا اور یہ وقت [illegible] ابوبکرؓ کے فضائل کا سب سے درخشاں باب شروع ہوتا ہے [illegible] جانب ہجرت کرتے وقت انھی کو اپنا رفیق سفر بنایا۔ اس اہم واقعہ [illegible] الانفال: ۳۰) میں بھی آیا ہے ہجرت کا واقعہ ایک پرخطر راز تھا۔ لیکن ابوبکرؓ کے خاندان کے سینے اس راز کا مدفن بن گئے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے [illegible] آپ کا کنبہ جو بظاہر ام رومانؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت [illegible] مشتمل تھا ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گیا۔ آپ کے والد ابوقحافہ [illegible] عبدالرحمان نے تو بدر اور احد میں مسلمانوں کے خلاف جنگ بھی کی۔ [illegible] اسلام قبول کر لیا۔ مدینہ میں آپ کو بنو حارث بن خزرج کے درمیان [illegible] میں مکان ملا۔

مواخاۃ میں آپ کے انصاری بھائی حضرت خارجہؓ بن زید تھے [illegible] کے خسر بھی ہو گئے۔ مدینہ میں جو سب سے پہلے مسجد تعمیر ہوئی اس کی [illegible] نے ادا کی۔ یہ رقم ان پانچ ہزار درہم میں سے تھی جو آپ مکہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے [illegible]

کی یہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی جنھوں نے برضا و رغبت یہ زمین بلا قیمت دینا چاہی تھی لیکن آنحضورؐ نے مناسب نہ سمجھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ آخری پونجی تھی جو اسلام پر قربان کر دی گئی۔

مسلمانوں میں آپ کی مخصوص حیثیت اس سے اور نمایاں ہوگئی کہ آنحضورؐ نے آپ کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی کر لی۔ مدینہ میں آپؓ آنحضرتؐ کے تمام غزوات و مشاہدات میں شامل رہے اور ہمیشہ حضورؐ کے پہلو میں حاضر رہتے۔ نازک اور پر خطر لمحات میں آپؓ ایک چٹان کی مانند مستقل مزاج رہتے اور کبھی ہمت نہ ہارتے تھے۔ آپ کے اور قائد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حیرت انگیز اتفاق اور ہم آہنگی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہؐ نے الحدیبیہ پر صلح کرنے اور الطائف کا محاصرہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا تو آپؐ کے ان فیصلوں پر اعتراض ہوا۔ جنھیں اس رائے سے اختلاف تھا ان میں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت شامل تھے جو حضرت ابوبکرؓ سے کبھی [illegible] ہوتے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے بلاتامل اور پورے خلوص کے ساتھ حضورؐ کے فیصلوں کی تائید کی۔ یہ صرف اور صرف حضرت ابوبکرؓ ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے [illegible] کے بعد اس مہم کی حقیقی غرض و غایت کو جان لیا تھا جو [illegible] [illegible] فتح مکہ پر منتج ہوئی۔ بالفاظ دیگر آپ رسول اللہ کے مشیر خاص تھے۔ [illegible] دو جنگیں جن میں آنحضرتؐ شامل نہ ہوئے حالانکہ وہ آپؐ کے عہدِ رسالت میں ہوئیں، [illegible] چند ایک کی امارت آپ نے کی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر صلحنامے پر آنحضرتؐ کے بعد [illegible] نام ابوبکر صدیقؓ کا تھا۔

[illegible] ہجری میں جب مکہ فتح ہوا تو اس موقع پر آنحضرتؐ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ کے ساتھ ابوبکرؓ بھی قصواء نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ ۹ ہجری میں حضورؐ نے آپ کو امیر حج مقرر فرمایا۔ آنحضرتؐ کی آخری بیماری کے دوران حضورؐ کے حکم پر آپ نے مسجد نبوی میں نماز کی امامت کی۔

رسول اللہؐ کی وفات کا دن نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لیے ایک نازک دن تھا۔ انصارِ مدینہ نے اپنے میں سے کسی کو رئیس بنانے کے لیے صلاح مشورہ شروع کر دیا لیکن حضرت عمرؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے اچانک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت [illegible] کر لی۔ [illegible] مسجد نبوی میں [illegible] ۶۳۲ء ابوبکرؓ کے ہاتھ پر عام بیعت ہوئی۔ بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد پہلا خطبہ دیا جو رہتی دنیا تک [illegible] کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔

"اے لوگو! تمہارا حاکم تو بنا دیا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں نیک کام کروں تو اس میں میری مدد کرو اور اگر برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلوا دوں۔ تمہارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اس کے ذمے جو حق ہے وہ اس سے نہ لے لوں۔ جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی ہے اس پر اللہ ذلت و خواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اب نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔"

بیعت کے اختتام پر رسول اللہؐ کی تدفین کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ زمام خلافت سنبھالنے کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کے سامنے سب سے پہلے اسامہؓ کا معاملہ آیا جسے آنحضرتؐ شام پر لشکر کشی کا حکم دے چکے تھے لیکن یہ مہم وصالِ رسولؐ کے باعث رکی پڑی تھی۔ ادھر جونہی رسول اللہ کی وفات کی خبر پھیلی تو قبائل عرب میں ارتداد کی لہر دوڑ گئی اور بدویوں نے فوراً حکومت مدینہ کا جوا کندھوں سے اتارنے اور بعثت نبوی سے قبل کی بدویانہ اور غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور پھر نفاق کا ستارہ اوج پر پہنچ گیا یہودیوں اور نصرانیوں کی بن آئی اور چاروں طرف مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اہل مکہ تک نے اسلام سے روگردانی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حتیٰ کہ عتابؓ بن اسید کو جو رسول اللہ کی طرف سے مکہ کے عامل تھے، خوف کے مارے روپوش ہونا پڑا۔ اس وقت سہیلؓ بن عمرو نے اہل مکہ سے کہا۔

"اس واقعہ سے اسلام کی شان و شوکت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ جو شخص اسلام کے متعلق شک و شبہ کو اپنے دل میں جگہ دے گا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔" اور پھر مجمع عام میں کہا۔

"اے اہل مکہ! تم وہ لوگ ہو جو سب سے آخر میں ایمان لائے ہو۔ اب سب سے زیادہ ارتداد اختیار کرنے والے نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ اس دین کو ضرور غلبہ عطا فرمائے گا جیسا کہ وہ اپنے رسولؐ سے وعدہ کر چکا ہے۔" سہیلؓ کی اس تقریر سے اہل مکہ بدستور اسلام پر قائم رہے۔

ادھر فتنہ ارتداد اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کی سرکشی کی وجہ سے صحابہؓ نے ابوبکرؓ کو رائے دی کہ اسامہؓ والی مہم کو فی الحال روک دیا جائے۔ لیکن سیدنا ابوبکرؓ اس مہم کو روکنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ جس کا آغاز خود نبی اکرمؐ نے کیا تھا۔ اس لیے صحابہؓ کی رائے کے خلاف جن میں سیدنا عمرؓ بھی تھے آپ نے کہا: "بخدا اگر مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آکر میری ٹانگ کھینچ لیں تب بھی میں اس مہم کو نہیں روک سکتا جس کے بھیجنے کا رسول اللہؐ نے فیصلہ فرمایا ہے۔" چنانچہ آپ نے یہ مہم روانہ کر دی۔ ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ زیادہ تر ارتداد کی تحریک سے نمٹنے میں گزرا۔ ایسی مختصر مدت میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام پائے جن پر تاریخ اسلام کو ناز ہے۔ یہ تحریک جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، جو عرب مورخین نے اسے دیا۔ ان کے نزدیک ابتداءً یہ ایک مذہبی تحریک تھی۔ لیکن عہدِ حاضر کے یورپین نے بالخصوص یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تحریک حقیقتاً "ایک سیاسی تحریک" تھی۔ دراصل رسول اللہؐ کے بعد دفعتاً حالات نہایت سنگین اور پیچیدہ بن گئے تھے۔ بعض قبیلے حکومت اور مذہب دونوں سے باغی ہو گئے تھے اور بعض صرف حکومت کے باغی تھے اور مذہب کے باغی نہ تھے۔ ایسی حالت میں ہر ایک حکومت کا سب سے مقدم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ بہرصورت فتنہ و فساد کو ختم کر کے امن و امان برقرار رکھے۔ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ بغاوت کس طرف سے ہو رہی ہے، نوعیت کیا ہے اور قیادت کون کر رہا ہے۔ اس بنا پر ابوبکرؓ نے باغیانہ سرگرمیوں کو کچلنے میں نہایت چابکدستی دکھلائی۔ اور راہ کی تمام جذباتی چیزوں اور شکایتوں کو نظر انداز کر دیا۔ حتیٰ کہ اگر حضرت خالدؓ بن ولید کی طرف سے بعض ایسے اقدام کی جرأت جس کو عام طور پر پسند نہ کیا جاتا تھا۔ تو لوگوں کی تالیف قلوب و تسکین خاطر کا ایک حد تک ضرور خیال رکھا اور خالدؓ بن ولید پر بھی آنچ نہ آنے دی۔

اغلب ہے کہ اس تحریک کی سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتیں تھیں۔ مدینہ ایک ایسے معاشرتی اور سیاسی نظام کا مرکز بن گیا تھا جس کا ایک جزو لاینفک مذہب بھی تھا لہٰذا یہ بات ناگزیر تھی کہ اس نظام کے خلاف جو ردعمل پیدا ہو وہ مذہبی رنگ بھی اختیار کر لے۔ اس ردعمل کے چند بڑے مرکز تھے۔ ان میں سے چار مرکزوں میں تحریک ارتداد کے قائدین مذہبی کردار کے حامل تھے۔ جنھیں عام طور پر جھوٹے نبی کہا جاتا ہے۔ یعنی یمن کا الاسود العنسی، یمامہ کے قبیلہ حنیفہ کا مسیلمہ کذاب، اسد اور غطفان کے قبیلوں میں طلیحہ اور قبیلہ تمیم کی کاہنہ سجاح۔ ارتداد کی صورتیں ہر مقام پر وہاں کے حالات و کوائف کے مطابق مختلف تھیں۔ ان میں بنیادی طور پر مدینے کو بھیجے ہوئے عاملوں کا حکم ماننے سے انکار اور مدینے کو بھیجے والے محاصل

سے انکار بھی شامل تھا۔

یمن میں تحریک ارتداد حضرت نبی کریمؐ کی وفات سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور جب سیدنا ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالی تو قیس بن (عبیرہ بن عبدیغوث) المکشوح، اس سو کی جگہ لے چکا تھا۔ اور جن دنوں مسلمانوں کا لشکر اسامہؓ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ملک شام کو گیا ہوا تھا تو بعض نواحی قبائل نے مدینہ پر حملہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بالآخر ذوالقصہ کے مقام پر انھیں شکست ہوئی۔ اسلامی لشکر شام کی مہم سے واپس آ گیا تو خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔

سب سے پہلے طلیحہ کو بزاخہ کی لڑائی میں شکست دی گئی اور اس علاقے کو از سر نو اسلام کا مطیع بنایا گیا۔ اس کے بعد جلد ہی قبیلہ تمیم نے سجاح کا ساتھ چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اختیار کر لی۔ ردّہ کی اہم ترین جنگ یمامہ کی لڑائی تھی جو عقربا کے مقام پر لڑی گئی۔ جسے طرفین کی کثرت اموات کی وجہ سے "حدیقۃ الموت" کا نام دیا گیا۔ (لگ بھگ ربیع الاوّل ۱۲ ہجری / مئی ۶۳۳ء) یہاں مسلمانوں کے سب سے خطرناک دشمن مسیلمہ کذاب نے شکست کھائی۔ وہ مارا گیا اور وسطی عرب کا علاقہ دوبارہ عربوں کے زیر نگیں آ گیا۔ بعد ازاں خالد بن ولید خود تو عراق کی جانب کوچ کرنے سے پہلے یمامہ میں امن قائم کرتے رہے اور اپنے ماتحت سپہ سالاروں کو ضمنی مہموں میں بحرین اور عمان اور مہرہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ یمن اور حضرموت میں اہل ردّہ کو المہاجرؓ بن ابی امیہ نے شکست دی۔

ابوبکرؓ نے اسیر سرداروں سے بعض کے ساتھ نہایت نرمی اور ملاطفت کا سلوک کیا اور ان میں سے اکثر دین اسلام کے سرگرم حامی اور مؤیدین گئے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ردّہ کی تحریک ۱۱ ہجری کے اختتام (مارچ ۶۳۳ء) تک دبائی جا چکی تھی۔ لیکن مستشرقین کو اس سے اختلاف ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک ۱۲ھ / ۶۳۴ء تک جاری رہی۔ بہرحال جب وسطی عرب میں مسیلمہ کذاب کا خاتمہ ہو گیا تو ابوبکرؓ نے خالد بن ولیدؓ کو عراق کی جانب بڑھانے میں ذرا بھی غفلت سے کام نہ لیا۔ یوں عہد ابوبکر صدیقؓ میں ملکوں کی فتح عظیم کا آغاز ہوا۔ سیدنا حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے وقت صورت حال بظاہر یہ تھی کہ خالد بن ولیدؓ قبیلہ بنو بکر بن وائل کے ایک لشکر کے ساتھ مل کر، جو المثنیٰؓ کی قیادت میں تھا، عراق میں پیش قدمی کر رہے تھے، اور حیرہ کا قدیم شہر ان کی زد میں آ گیا تھا۔ لیکن اس شہر کے لوگوں نے ساٹھ ہزار درہم دے کر امان پائی۔

پھر المثنیٰؓ تو اسی محاذ پر رکے رہے لیکن خالدؓ نے دمشق کی طرف اپنی شہرۂ آفاق یلغار کی اور ان تین اسلامی دستوں سے جا ملے جو یزیدؓ بن ابوسفیان، شرجیل بن حسنہ اور عمرو بن العاص کے زیر قیادت فلسطین میں کامیابی سے لڑتے رہے تھے۔ لیکن اب ایک اپنے سے بڑے بوزنطی لشکر کے مقابلے میں دب رہے تھے۔ مسلمانوں نے جمادی الاوّل کے آخر میں جولائی ۶۳۴ء میں یروشلم (القدس) اور غزہ کے درمیان الاجنادین (غالباً الجنابتین کی بگڑی ہوئی شکل) کے مقام پر دشمن کو شکست دی۔ اسی طرح ایرانی سلطنت میں اسلام کی توسیع کا آغاز بھی سیدنا ابوبکرؓ نے کیا۔ لیکن پھر بھی ان کی زیادہ تر توجہ ملک شام ہی کی طرف مرکوز تھی۔

حضرت ابوبکرؓ جمادی الآخر ۱۳ھ / اگست ۶۳۴ء کو مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ اس روز اتوار تھا، چاند کی ساتویں اور اگست کی ۸ تاریخ تھی۔ بعض روایات میں مرض کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حارث بن کلدہ کے ساتھ مل کر ایک یہودی نے حضرت ابوبکرؓ کو چاولوں میں ملا کر زہر کھلا دیا تھا۔ جس کا اثر آہستہ آہستہ جڑیں پکڑتا گیا اور بالآخر ایک سال بعد آپ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ بعض کے نزدیک حضورؐ کی جدائی کے غم نے اندر ہی اندر آپ کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

مرض کے دوران میں حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اور حضرت عثمانؓ بن عفان، یکے بعد دیگرے آپ سے جانشینی کے بارے میں گفتگو کرنے آئے تو آپ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ بعد ازاں آپ نے حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی جانشینی کا پروانہ لکھانا شروع کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اسے لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔ آپؓ نے لوگوں سے پوچھا "کیا تم انھیں (حضرت عمرؓ کو) قبول کرتے ہو؟" سب نے بیک آواز کہا "ہاں!"۔ تب آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور دعائیں نصائح شروع کیے۔

حضرت مثنیٰؓ جب عراق سے مزید فوج طلب کرنے آئے تو حضرت ابوبکرؓ اس وقت تک حضرت عمرؓ کو اپنا خلیفہ نامزد کر چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰؓ کی درخواست پر حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ سب کام چھوڑ کر عراق مزید فوج بھیجنے کا بندوبست کریں۔

ملک و ملت کے کاموں سے فارغ ہو کر آپؓ نے نجی معاملات کی طرف توجہ دی۔ حضرت عائشہؓ کو ایک قطعہ اراضی آپ نے عنایت فرمایا تھا۔ اسے دیگر وارثوں میں بھی تقسیم کیا۔

اب اپنے بارے میں سوال کیا: "مجھے اب تک بیت المال سے کتنا وظیفہ ملا ہے؟" جواب ملا: "چھ ہزار درہم" حکم فرمایا: "میری فلاں زمین فروخت کر کے یہ روپیہ بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔" پھر دریافت کیا: "میرے مال میں خلافت کے دور میں کتنا اضافہ ہوا ہے؟" معلوم ہوا کہ ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھلاتا ہے اور مسلمانوں کی تلواریں چمکاتا ہے دوسرے ایک اونٹنی ہے تیسرے ایک چادر ہے۔ ارشاد ہوا: "یہ تینوں چیزیں وفات کے بعد خلیفۂ وقت کی خدمت میں بھیج دی جائیں۔" جب حکم کی تعمیل ہوئی اور یہ چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچیں تو بے ساختہ جی امنڈ آیا۔ حضرت عمرؓ روتے جاتے اور کہتے تھے: "اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کے لیے بہت دشوار کام چھوڑ گئے ہو۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ پندرہ روز علیل رہ کر منگل کی رات کو ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ / ۲۳ اگست ۶۳۴ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے غسل دیا۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبدالرحمان بن ابوبکرؓ نے قبر میں اتارا۔ آپ کی لحد حضورؐ کے پہلو کے بائیں جانب اس طرح بنائی گئی کہ آپ کا سر حضور اقدسؐ کے شانۂ مبارک کے مقابل تھا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی اور مدت خلافت دو برس تین ماہ اور کچھ روز تھی۔ (۱۱ھ / ۶۳۲ء تا ۱۳ھ / ۶۳۴ء)

حضرت ابوبکرؓ نے حکومت کے دستور کی اساس قرآن مجید پر رکھی تھی۔ جب کوئی حکم نہ ملتا تو حدیث اور سنت نبوی کی طرف رخ کرتے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس کے بارے میں حدیث سے بھی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو مسلمانوں کی مجلس شوریٰ سے رجوع کرتے۔ اس مقصد کے لیے مہاجرین اور انصار میں مساوات قائم رکھتے۔

آپ نے پوری مملکت اسلامیہ کو صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر صوبے کا ایک حاکم مقرر کر دیا تھا جس سے سختی سے بازپرس ہوتی تھی۔ آپ کے عہد حکومت میں صوبوں کے نام یہ تھے۔ مکہ، طائف، صنعا، حضرموت، خولان، زبید و رمع، جند، بحرین، نجران، دومۃ الجندل، عراق، جرش، حمص، اردن، دمشق اور فلسطین۔ آپ عمال حکومت کی دلجوئی کرتے اور ان کا پورا احترام ملحوظ رکھتے۔

آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سب سے بڑے عامل تھے۔ بدعات کو آپ شرعاً اور طبعاً ناپسند کرتے اور ان کی روک تھام میں مصروف رہتے۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کو آپ نے اپنی زندگی کا بڑا مقصد بنا رکھا تھا۔ اس ضمن میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جمع قرآن تھا۔ جنگ یمامہ میں حفاظ قرآن کی بڑی تعداد کے شہید ہو جانے کے باعث حضرت

قرآن کے مسودہ دینے پر قرآن مجید کو مختلف اشیاء، کھپریلوں، درخت کی چھالوں اور کھجور کے پتوں پر جمع کرایا اور یوں پہلی بار قرآن کا مکمل نسخہ وجود میں آیا۔

حضرت ابوبکرؓ کا حلیہ حضرت عائشہؓ نے اس طرح سے بیان فرمایا ہے: "وہ گورے چٹے دبلے پتلے آدمی تھے۔ دونوں رخسار دھنسے ہوئے تھے۔ کمر ذرا خمیدہ تھی۔ تہمد کمر پر رک نہیں سکتا تھا کھسک کر نیچے آجاتا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ پیشانی بلند، انگلیوں کے جوڑ گوشت سے خالی تھے۔ پنڈلیاں اور رانیں پرگوشت نہیں تھیں۔ [illegible] مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔"

طبری میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کل چار نکاح کئے۔ دو اسلام سے پہلے اور دو اسلام لانے کے بعد۔ ازواج کے نام یہ تھے۔ قتیلہ بنت عبدالعزیٰ، ام رومان بنت عامر بن عمیرہ، اسماء بنت عمیس اور حبیبہؓ بنت خارجہ۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے پانچویں بیوی کی روایت ہے کہ آپ نے بنو کلب کی ایک عورت ام بکر سے شادی کی تھی اور ہجرت کے وقت طلاق دے دی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی اولاد کی تعداد چھ تھی۔ تین لڑکے عبدالرحمان، عبداللہ اور محمد اور تین لڑکیاں اسماء، عائشہ اور ام کلثوم تھیں۔ عبدالرحمان نے حدیبیہ کے وقت اسلام قبول کیا [illegible] عبداللہ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا۔ جب غار ثور میں [illegible] عبداللہ ہی انہیں روزانہ شہر کی خبریں پہنچایا کرتے تھے [illegible] حضرت ام رومانؓ حضرت [illegible] تیسرے صاحبزادے محمد حجۃ الوداع کے سال [illegible] سے نکاح کرلیا تو انہیں [illegible] کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسماء بنت ابوبکر [illegible] حضرت زبیر بن عوام کے نکاح میں تھیں۔ ان کے [illegible] حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی [illegible] اور شعر کا ستھرا ذوق رکھتی تھیں۔ حضرت ام کلثومؓ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے امور خلافت کے لیے ایک مہر بنوا رکھی تھی جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔ نعم القادر اللہ۔

ابوحر قندھاری سالار اور صوفی بزرگ۔ محمود غزنوی کے دور میں افغانستان سے ہندوستان تشریف لائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ سادات کا ایک خاصا مجمع تھا۔ سادات بگرام اور سادات بیانہ ان کے ہمراہ آئے۔ قلعہ بیانہ [illegible] اس زمانے میں وجے مندر گڑھ کہلاتا تھا۔ وہ انہی کے ہاتھوں فتح ہوا جس کے لئے ایک دوہا مشہور ہے:

سمت گیارہ سو تیرا، بھاگ تیج روپ دار
وجے مندر گڑھ توڑیاں ابوحر قندھار

روایت مشہور ہے کہ قلعہ کسی صورت فتح نہ ہو رہا تھا۔ کسی کو بشارت ہوئی کہ جس چبوترے پر چراغ جل رہا ہے، وہ اس قلعے کا فاتح ہے۔ دیکھا گیا تو وہ ابوحر قندھاری کا خیمہ تھا۔ دوسرے دن حملہ ہوا اور قلعہ فتح ہوا۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ جب ابوحر قندھاری نے حملہ کیا تو اپنا سر کاٹ کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیا تھا۔ ہندوؤں میں مشہور تھا کہ ایسا بے سر آدمی قلعہ کو فتح کرے گا۔ دو جگہ ان کے مزار ہیں۔ ایک جگہ وہ ہے جہاں دفن ہوئے اور ایک وہ جگہ جہاں شہید ہوئے۔ مرجع خلائق وہ جگہ ہے جہاں شہید ہوئے۔

ابوبکر وراق ملتان میں مدفون صوفی بزرگ، خواجہ معین الدین کے پیر بھائی اور خواجہ عثمانی کے خلیفہ تھے، لقب تاج العارفین ہے۔ اول اول قیام اجمیر شریف کے قریب موضع تاراگڑھ میں تھا۔ ایک مرید کی امداد کے لئے گھوڑے پر نکلے اور کفار سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ سر وہیں پڑا رہا اور گھوڑا آپ کا جسم نئے موضع دہلوا(ملتان) میں ایک شخص امام الدین کے گھر کے باہر آن کھڑا ہوا۔ امام الدین نے آپ کی تدفین کا انتظام کیا۔ اس کی اولاد روضہ کی مجاور ہے۔ جسے اورنگ زیب نے ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔

وراق لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ کے پیر و مرشد آپ کو روزانہ ایک لکھا ہوا ورق دیتے، جسے دریا میں ڈالنے کا حکم ہوتا تھا۔ واپسی پر دریا سے ایک ورق ملتا تھا۔ جو آپ پڑھے بغیر اپنے مرشد کو دے دیا کرتے تھے۔ نہایت خدا رسیدہ اور عزلت گزین بزرگ تھے۔ مزار پر آج بھی عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

ابوبکرہؓ وفات ۵۱ھ/۶۷۱ء صحابی رسولؐ، بہت سی احادیث کے راوی ہیں۔ پہلے طائف میں ثقیف کے غلام تھے ۸ھ/۶۳۰ء میں حضور اکرمؐ کے دورۂ طائف کے دوران آپ سے آن ملے تھے۔ اسی لیے حضورؐ نے "عتیق النبیؐ" کہتے تھے۔ بعد ازاں طہارت کا پیشہ اختیار کیا اور حضور کے بعد مدین اور پھر بصرہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کی زرگی اور بیٹوں اور پوتوں کی تعداد تین سو سے اوپر ہوگئی۔ تمام عمر دینی علوم خصوصاً علم حدیث کی ترویج میں مشغول رہے۔ مسلم، ابوداؤد اور بخاری جیسے علماء نے انہیں ثقہ اور معتبر مانا ہے۔

ابوتاشفین اوّل عبدالرحمان بن ابی حموّ۔ خاندان عبدالواد کا پانچواں بادشاہ جو ۲۳ جمادی الاوّل ۷۱۸ھ/۲۲ جولائی ۱۳۱۸ء کو اپنے والد ابوحموّ اوّل کے قتل کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے تمام لواحقین کو جو تخت کے دعویدار تھے یا ہوسکتے تھے جلاوطن کرکے اندلس بھیج دیا۔ اور اس طرح اسے اپنی سلطنت کو قسطنطنیہ اور بجایہ کے محاصرے کے بعد مشرق کی جانب وسعت دینے کی آزادی مل گئی۔ لیکن بنوحفص نے بنومرین سے اتحاد کرلیا۔ اور مرینی سلطان ابوالحسن نے ابوتاشفین کے مقبوضات پر تسلط کرکے ۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء میں تلمسان کا محاصرہ کرلیا۔ دو سال بعد پایہ تخت ایک حملے میں مفتوح ہوگیا اور بادشاہ لڑائی میں کام آیا۔

ابوتاشفین ثانی بن ابی حموّ موسیٰ خاندان عبدالواد کا بادشاہ۔ یہ ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور اس کے شباب کا زمانہ ندرومہ میں گذرا۔ ابوحموّ ثانی کے تونس کی طرف فرار کے بعد مرینی سلطان ابوعنان نے اسے فاس بھیج دیا۔ اور پھر تلمسان میں ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء ہی واپس آسکا۔ باوجود ان مراعات کے جو اس کے والد نے اسے دے رکھی تھیں تخت حاصل کرنے کی بے صبری نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ابوحموّ کا خاتمہ کردے۔ لیکن ابوحموّ جسے اوران میں محبوس کردیا گیا تھا قید سے نکل بھاگا اور جب اسے حج پر بھیجا گیا تو وہ فتح کے پھریرے لہراتا ہوا فتح و کامیابی کے ساتھ تلمسان میں داخل ہوا۔ بالآخر تاشفین نے ایک مرینی فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس فوج نے ابوحموّ کو شکست دی اور ابوتاشفین کو ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں تخت نشین ہونے کا موقع مل گیا۔ مرینیوں کے باجگزار ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اسے تفویض تھے انہیں یہ پوری وفاداری سے سرانجام دیتا رہا۔ اس نے ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں وفات پائی۔

ابوجندلؓ صلح حدیبیہ کے وقت کفار کی قید سے بھاگ کر آنے والے معزز صحابی، سہیل بن عمر کے بیٹے تھے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ان

کے والد قریش مکہ کی طرف سے صلح کے لئے آئے تھے۔ جب شرائط لکھی جاری تھیں تو ابوجندل، جو اسلام قبول کر چکے تھے اور جنہیں کفار نے بیڑیوں میں قید کر رکھا تھا حضورؐ کی خدمت میں پابہ زنجیر حاضر ہوئے اور اپنے زخم دکھا کر مدینے لے جانے کی درخواست کی۔ آنحضورؐ کو بھی اس کی حالت پر بے حد رحم آیا اور آپؐ نے سہیل سے اسے آزاد کر دینے کی درخواست کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہ کی مخالفت کے باوجود، صلح کی شرائط بموجب ابوجندلؓ کو کفار کے حوالے کر دیا تاکہ مسلمانوں کے ایفائے عہد پر کوئی حرف نہ آئے۔ چنانچہ ابوجندلؓ کفار کے ظلم و ستم کا شکار رہے۔ بعدازاں جب مسلمانوں نے عیص کے مقام پر ایک جائے پناہ بنالی تو یہ بھی وہاں چلے گئے اور معاہدے کے خاتمے پر مدینہ چلے آئے۔

ابوجہل ابوالحکم عمرو بن ہشام بن المغیرہ۔ قریش کے خاندان بنو مخزوم کا ایک فرد حضورؐ کا سب سے بڑا دشمن جو اپنی ماں ام الحلاس اسماء بنت مخربۃ کی نسبت سے ابن الحنظلیۃ بھی کہلاتا ہے۔ بنو مخزوم قریش کا ایک ممتاز خاندان تھا۔ قصی بن کلاب سے پہلے قریش کے تمام اعزازات اسے حاصل تھے۔ قصی نے غالب آ کر تمام اعزازات ان سے چھین لئے اور صرف قبہ یعنی خیمہ و خرگاہ کا انتظام اور اعنۃ یعنی سواروں کی سپہ سالاری کا اعزاز ان میں باقی رہ گیا۔

ابوجہل ۵۷۰ء میں یا اس سے کچھ بعد پیدا ہوا۔ اس کی والدہ اسلام لائیں اور ۱۳ھ ۶۳۴ء کے بعد تک زندہ رہیں۔ ہجرت نبویؐ سے چند سال قبل ابوجہل الولید بن المغیرہ کی جگہ بنو مخزوم اور ان کے حلیف قبائل کا سربراہ بن گیا تھا۔ الولید کے مقابلے میں ابوجہل رسول اللہؐ کا شدید دشمن تھا۔ اس لئے کہ عمر رسیدہ الولید کی نسبت رسول اللہؐ کے ہاتھوں مکے کے معاملات میں اس کی حیثیت زیادہ معرض خطر میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہاشم اور المطلب کے مقاطعے کا خاتمہ اس کی شکست تھی اور اسے اس وقت ایک کامیابی حاصل ہوئی جب ابوطالب کے انتقال کے کچھ ہی عرصے کے بعد بنوہاشم کی سرداری ابولہب کے ہاتھ آئی اور وہ ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط کی ترغیب پر آنحضرت (اپنے بھتیجے) کو پناہ دینے سے دستکش ہو گیا۔

ابن اسحاق سے مروی ہے کہ۔ "مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ صفا کے مقام پر تشریف فرما تھے۔ ابوجہل بن ہشام وہاں آیا۔ اس نے آپ کو ستایا، گالیاں دیں، آپ کے دین کی مذمت کی اور کہا کہ تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔ لیکن رسول اللہؐ نے جواباً ایک لفظ بھی اسے نہ کہا۔ عبداللہ بن جدعان التیمی کی ایک آزاد کردہ لونڈی صفا کے اوپر اپنے مکان میں بیٹھی تھی۔ اور یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ ابوجہل یہ کہہ کر اور رسول اللہؐ کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر پلٹا اور قریش کی چوپال میں جا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد حضرت امیر حمزہؓ بن عبدالمطلب کمان کاندھے پر ڈالے شکار کھیل کر واپس آئے۔ آپ قریش میں سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ جب آپ اس لونڈی کے گھر کے پاس سے گذرنے لگے تو اس لونڈی نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ اے ابوعمارہ! اگر تم کچھ دیر پہلے یہاں آئے ہوتے تو ابوالحکم بن ہشام یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تمہارے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ جو گستاخی اور بیہودگی کی ہے وہ تم دیکھ لیتے۔ اس نے ان کو ستایا اور گالیاں دیں اور بہت ہی برا سلوک کیا اور اس کے جواب میں محمدؐ نے اسے کچھ نہ کہا اور وہ چلا گیا۔

یہ سنتے ہی امیر حمزہؓ پر شدید جوش اور غضب طاری ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل پڑے اور راستے میں کہیں بھی نہ رکے۔ خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ان کی نظر ابوجہل پر پڑی۔ آپؓ سیدھے اس کے بالمقابل پہنچے اور اپنی کمان سے اس کے سر پر ایک شدید ضرب لگائی۔ وہ لہولہان ہو گیا اور بری طرح زخمی ہوا۔ حضرت حمزہؓ نے فرمایا تو ان کو گالیاں دیتا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ میں ان کا ہم مذہب ہوں، ان کے عقائد کا قائل ہوں، اگر ہمت ہے تو اب کہہ، کیا کہتا ہے۔ بنو مخزوم کے چند آدمی ابوجہل کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن ابوجہل نے انھیں روکتے ہوئے اعتراف کیا کہ اس نے واقعی محمدؐ سے نازیبا سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت حمزہؓ سیدھے دربار رسالت مآب میں پہنچے اور ایمان لے آئے۔ اب کسی کی مجال نہ تھی کہ آنحضورؐ کو دق کرے

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ آنے لگے تو راستے میں آپ کی مکہ کے ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے اس سے کہا۔ "کیا تم میرا پیغام جہاں میں بھیجوں پہنچا دو گے۔" اس نے کہا بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "تم اخنس بن شریق کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ محمدؐ تم سے کہتے ہیں کہ تم مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دو تاکہ میں اللہ کا پیغام تم کو سناؤں۔" اُس شخص نے آپؐ کا پیغام اخنس کو جا کر دیا۔ اس نے جواب دیا۔ "میں چونکہ حرب کا حلیف ہوں اس لئے ان کی مخالفت میں کسی کو اپنے پاس نہیں بلا سکتا۔" اس نے واپس آ کر اخنس کا پیغام دے دیا۔ آپ نے فرمایا "تم پھر جا سکتے ہو؟" اس نے کہا ہاں۔ تو پھر آپ نے فرمایا۔ "تم سہیل بن عمرو کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم سے محمدؐ کہتے ہیں کیا تم ان کو اپنے پاس بلا سکتے ہو تاکہ وہ اللہ کا پیغام تم کو سنائیں۔" اس شخص نے آپ کا پیغام جا کر سہیل بن عمرو کو دیا۔ سہیل بن عمرو نے جواب کہلا بھیجا کہ۔ "بنی عامر بن لوی، بن کعب کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے" اس شخص نے یہی آ کر آنحضورؐ سے کہہ دیا۔ آپؐ نے پھر اس سے کہا۔ "اب تم مطعم بن عدی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ محمدؐ تم سے کہتے ہیں کہ کیا تم پناہ دے سکتے ہو تاکہ وہ اپنے رب کے احکام اور پیام تم کو سنائیں۔" مطعم بن عدی نے جواب دیا کہ ہاں میں اس کے لیے تیار ہوں۔ وہ مکہ میں آ جائیں۔ اس شخص نے جا کر رسول اللہؐ سے جا کر اس کی اطلاع کر دی

دوسرے دن صبح کو مطعم بن عدی اور اس کے بیٹوں اور بھتیجوں نے اسلحہ زیب تن کیا اور وہ سبھی مسجد میں آ گئے۔ ابوجہل نے انھیں دیکھ کر پوچھا۔ "پیرو ہو یا پناہ دینے والے؟" مطعم بن عدی نے کہا۔ "محمدؐ کو پناہ میں نے دی ہے۔" ابوجہل بولا۔ "اچھا جسے تم نے پناہ دی اُسے ہم نے پناہ دی۔" رسول اللہؐ آ گئے۔ ایک دن آپ تشریف لائے تو مشرک کعبہ کے پاس جمع تھے۔ ابوجہل نے آپؐ کو دیکھ کر کہا۔ "اے بنی عبد مناف یہ تمہارے نبی ہیں؟" اس پر عتبہ بن ربیع بولے۔ "مگر اس بات سے انکار کیوں کیا جائے کہ ہم میں سے کوئی نبی یا بادشاہ ہو" نبی صلعم کو اس کی اطلاع دی گئی یا خود ہی آپؐ نے یہ بات سن پائی۔ آپؐ قریش کے پاس آئے اور فرمایا۔ "اے عتبہ بن ربیع! یہ بات تم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت میں نہیں کی بلکہ غرور قومی میں کہی ہے اور اے ابوجہل بن ہشام! کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ تو ہنسے گا کم اور روئے گا بہت اور اے اہل قریش! بہت جلد مجبوراً بادل نخواستہ تم اس دعوت میں شرکت کر دگے جس سے اب تم انکار کرتے ہو۔"

جب اہل قریش نے آنحضورؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھی تو آپس میں مل بیٹھے تاکہ مشورہ کریں۔ اس محفل میں ابوجہل بن ہشام نے کہا کہ ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے جس پر اب تک تم میں سے کسی کا خیال نہیں گیا۔ اہل مجلس نے بیک زبان کہا ابوالحکم کہو تم نے کیا تجویز کیا ہے؟ ابوجہل نے کہا میری رائے یہ ہے کہ تم ہر قبیلہ میں سے ایک ایک نہایت دلیر نجیب اور شریف مرد کا انتخاب کرو۔ پھر ان جوانمردوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک شمشیر براں دے دو۔ یہ جماعت اس کے پاس جائے اور سب مل کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیں۔ اس طرح ہم کو ہمیشہ کے لئے اس سے نجات مل جائے گی اور چونکہ ایک جماعت بیک وقت اسے قتل کرے گی۔ (نعوذ باللہ) اس لئے اس کا قصاص تمام

قبائل کے ذمے ہوگا۔ کسی ایک کے ذمے نہ رہے گا۔ اور بنو عبد مناف میں پھر یہ قدرت نہ ہوگی کہ اس کے لئے سب قبیلوں سے لڑیں۔ وہ لامحالہ دیت قبول کرنے پر مجبور ہوں گے اور ہم خوشی سے اس کا خون بہا سب کی طرف سے ادا کر دیں گے۔ اس تصفیہ پر مجلس برخواست اور منتشر ہوگئی۔

اسی روز حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہؐ سے آکر کہا۔ حضورؐ آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ چنانچہ حسب قرارداد عشاء کے بعد آپ کے دروازے پر جمع ہوگئے۔ اور تاک میں لگے رہے کہ جب آپؐ سو جائیں تو وہ حملہ کر کے آپؐ کو ختم کر دیں (نعوذ باللہ)۔ رسول اللہؐ نے جب دیکھا کہ کفار آگئے ہیں تو انہوں نے حضرت علیؓ سے فرمایا: تم میرے بستر پر سو جاؤ اور میری سبز حضرمی اونی چادر اوڑھ لو۔ تم کو ان کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ رسول اللہؐ جب سوتے تھے تو ہمیشہ اس چادر کو اوڑھا کرتے تھے۔

محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ — اس غرض سے جو لوگ جمع ہوئے تھے ان میں ابوجہل بن ہشام بھی تھا۔ یہ سب رسول اللہؐ کے دروازے پر جمع تھے۔ ابوجہل نے اس وقت ان سے کہا۔ محمدؐ کہتے ہیں کہ اگر تم اس کی بات مان کر اس کے پیرو ہو جاؤ تو عرب اور عجم کے مالک ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے اور تم کو اردن کے ایسے باغ دیئے جائیں گے اور اگر تم میری بات نہ مانو گے تو ذبح کر دیئے جاؤ گے اور مرنے کے بعد زندہ کئے جاؤ گے اور پھر تم کو آگ میں جلایا جائے گا۔ اتنے میں رسول اللہؐ برآمد ہوئے۔ آپؐ نے ایک مٹھی مٹی اٹھائی اور پھر فرمایا۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں اور جو آگ میں جلائے جائیں گے ان میں کا ایک تو ہے۔ آپؐ نے وہ مٹی ان پر پھینکی۔ اللہ نے ان سب کو اندھا کر دیا۔ آپؐ ان کو نظر نہ آئے۔ آپؐ یہ تلاوت کرتے ہوئے جا رہے تھے: لیسین والقرآن الحکیم۔ سے تمام سورت تلاوت فرمائی ... اور رکھ دیئے ان کے سامنے اور عقب سے ایک دیوار حائل کر دی اور پھر ان کفار کو اندھا کر دیا۔ کچھ نہیں دیکھ پاتے تھے۔ جب آپؐ ان آیات سے فارغ ہوئے تو ان کفار میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا کہ آپؐ نے اس کے سر پر مٹی نہ ڈال دی ہو۔ پھر آپؐ جہاں جانا چاہتے تھے چلے گئے۔

حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے جانے کے بعد قریش کے کچھ لوگ جن میں ابوجہل بن ہشام بھی تھا ہمارے ہاں آئے اور ہمارے دروازے پر آن کر کھڑے ہوگئے۔ میں اندر سے نکل کر ان کے پاس آئی۔ انھوں نے پوچھا تمہارا باپ ابوبکرؓ کہاں ہے؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرے ابو کہاں ہیں۔ اس پر ابوجہل نے جو بہت ہی خبیث اور بدبخت تھا میرے گال پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ میرے کان کی بالی گر پڑی۔

ابوجہل جنگ بدر میں ایک نوجوان مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ حضرت معاذ بن عمرو کا بیان ہے کہ سب سے پہلے وہ ابوجہل کے پاس پہنچے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنگ بدر کے دوران ایک جھاڑی کی اوٹ میں ابوجہل اور مشرکین کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ ابوجہل تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔ میں نے یہ سنتے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ ضرور اس پر حملہ کروں۔ میں فوراً اس پر جھپٹ پڑا اور موقع پاتے ہی میں نے اس پر حملہ کر دیا اور تلوار کی ایک ضرب سے نصف ساق سے اس کا پاؤں قطع کر دیا۔ اس کے بیٹے عکرمہ نے میرے شانے پر وار کیا اور میرا ہاتھ اڑا دیا۔ صرف جلد کے سہارے وہ میرے پہلو میں لٹکا رہا۔ مگر اس زخم کی وجہ سے میں ابوجہل سے زیادہ نہ لڑ سکا۔ تمام دن میں لڑتا رہا۔ میرا بے کار ہاتھ میرے پیچھے جھولتا رہا۔ جب اس کی تکلیف زیادہ ہونے لگی تو میں نے اس پر پاؤں رکھ کر اسے جسم سے چیر کر الگ کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد معاذؓ زندہ رہے اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں وفات پائی۔

جب ابوجہل زخمی پڑا ہوا تھا تو معوذؓ بن عفراء اس کے پاس سے گذرے۔ انہوں نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا اور مردہ سمجھ کر آگے بڑھ گئے اور پھر لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ اس کے بعد جب رسول اللہؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ابوجہل کو تلاش کرو۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے گھٹنے پر زخم کا نشان ہوگا جو بچپن میں اسے میرے دھکا دینے سے لگا تھا۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ اسی زخم کے نشان پر میں نے ابوجہل کی لاش تلاش کی۔ اس میں ابھی رمق جان باقی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ اس نے مکہ میں مجھے خوب مارا تھا۔ پھر اس نے پوچھا کہ بتاؤ فتح کس کی ہوئی ہے۔ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔ اس نے شیخی سے کہا کہ اے بکریاں چرانے والے تو بہت اونچی جگہ پر چڑھا ہے۔ پھر اس نے ابوجہل کا سر کاٹ لیا۔ اور اسے رسول اللہؐ کی خدمت میں لے کر آیا اور عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ دشمن خدا ابوجہل کا سر ہے اور وہ سر آنحضرتؐ کے سامنے ڈال دیا۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے حکم دیا کہ مشرکین کے مقتولین کو کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔ اور پھر وہ کنوئیں میں ڈال دیئے گئے۔ انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے وسط شب میں رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ "اے کنوئیں والو! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! اے امیہ بن خلف! اے ابوجہل بن ہشام!" اسی طرح آپؐ نے ان تمام مقتولین کے نام لئے جو اس کنوئیں میں ڈالے گئے تھے۔ اور پھر فرمایا۔ "جو وعدہ تمہارے رب نے تم سے کیا تھا اسے تم نے ٹھیک پایا؟ بے شک جو وعدہ میرے رب نے مجھ سے کیا تھا اسے میں نے سچا پایا۔" صحابہؓ نے آپؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ آپ ان مردوں کو پکارتے ہیں کہ جو گل سڑ گئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: "جو کچھ میں کہتا ہوں اسے تم ان سے کچھ زیادہ نہیں سنتے البتہ ان میں جواب دینے کی استطاعت نہیں ہے۔"

ابوجہل نے دو شادیاں کی تھیں۔ ام مجالد سے حضرت عکرمہؓ پیدا ہوئے اور دوسری سے دو لڑکیاں۔ بڑی لڑکی جویریہؓ اور چھوٹی کا نام حنفاؓ تھا۔ یہ تینوں بچے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ابوحاتم بن حبان (وفات ۳۵۴ھ) محمد تمیمی ابن حبان ابن احمد ابن حبان۔ محدث، فقیہ اور عالم۔ اوائل عمری سے تحصیل علم کے شوق میں عراق، شام، حجاز، خراسان، ماوراءالنہر اور ترکستان کے سفر اختیار کئے۔ فقہ و حدیث میں ابوبکر محمد بن اسحاق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم طب اور نجوم میں بھی دسترس حاصل کی۔ سمرقند اور سایر میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ تحصیل علم کے بعد تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ حدیث، فقہ اور تاریخ پر مختلف تصانیف ہیں۔ سیستان میں انتقال کیا اور بست میں دفن ہوئے۔ اہم تصانیف "کتاب الصحابہ" (۸ جلدیں)، "کتاب التابعین" (۱۲ جلدیں)، "اتباع التبع" (۱۰ جلدیں)، "اتباع التابعین" (۱۵ جلدیں)، "الفصل بین النقلہ" (۱۰ جلدیں)، "علل اوہام اصحاب التواریخ" (۱۰ جلدیں) ہیں۔

ابوحذیفہؓ ہشیم بن عتبہ۔ صحابیٔ رسول۔ ابتداء میں اسلام قبول کر لیا۔ بڑی خواہش کرتے تھے کہ باپ بھی مشرف بہ اسلام ہو جائے۔ مگر اسے یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ وہ جنگ بدر میں قریش کا سپہ سالار بنا اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ ابوحذیفہؓ حبشہ کو دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ وہاں سے لوٹ کر مدینہ ہجرت کی۔ عہد نبوی کے تمام اہم معرکوں میں شریک ہوئے۔ جنگ بدر میں تو اپنے باپ کو بھی للکارتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں شریک ہوئے اور اسی میں ۵۴ برس کی عمر میں شہادت پائی۔ ایک عظیم انسان اور بے مثل صحابی تھے۔ اخلاق حسنہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے نہایت

حق پسند اور حق گو تھے۔ مذہبی جوش اور حمیت بے حد تھی۔ اسی لئے تمام غزوات میں شریک رہے۔ —

ابوحفص تاریخ میں کئی اہم شخصیتوں کی کنیت تھی۔ رسول اللہؐ کے ایک مشہور صحابی بھی ابوحفص تھے۔ ابوحفص البخاری، بخارا کے ایک مفتی تھے۔ انہیں ابوحفص کبیر کہا جاتا ہے اور ان کے بیٹے کو صغیر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دونوں اپنے دور کی اہم شخصیت تھے۔ ابوحفص عمر بن احمد ایک بہت بڑا مصنف تھا اس کی تصانیف کی تعداد ۳۳۰ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ "ترغیب"، "تفسیر" اور "مسند" بے حد اہم ہیں۔ اس نے ۳۸۵ھ/۹۹۶ء میں وفات پائی۔

ابوحفص عمر غزنوی، سراج الدین (وفات ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء) عربی کی ایک مشہور کتاب "زبدۃ الاحکام" کا مصنف تھا۔ اس میں اہل سنت والجماعت کے چار بڑے فرقوں کے طریق اور احکام کا بیان ہے۔

ابوحفص عمر بن جمیع، ایک اباضی عالم تھا اس نے ۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء میں جربہ میں وفات پائی۔ اس نے المغرب کے اباضیہ کی پرانی کتاب "عقیدہ" کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔

ابوحفص عمر بن شعیب قرطبہ کا ایک باشندہ تھا۔ جس نے جزیرہ اقریطش میں ایک نئے خانوادے کی بنیاد رکھی۔ الربض کی بغاوت کے بعد جو قرطبہ میں ۲۰۲ھ/۸۱۸ء میں ہوئی، جسے الحکم اول نے سختی کے ساتھ فرو کیا تھا۔ چند ہزار اندلسیوں نے وہاں سے نقل وطن کرکے جزیرہ اقریطش میں اپنے سردار ابوحفص کی زیر قیادت ایک نیا اقتدار قائم کیا۔

ابوحفص عمر بن یحییٰ الموحد تھا اور ابن تومرت کا سب سے بڑا رفیق تھا۔ اسی کے پوتے امیر ابوزکریا نے ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں افریقہ میں مومنیہ خاندان کی اطاعت ترک کرکے "بنو حفص" کی بنیاد رکھی۔

ابوحمو اول موسیٰ بن ابی سعید عثمان بن یغمراس، خاندان عبدالواد کا چوتھا حکمران تھا جو ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں پیدا ہوا اور ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اپنے بھائی ابوزیان کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس نے سلطنت کو مستحکم کیا اور مغراوہ پر اپنا اقتدار از سر نو قائم کرنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بھی پیش قدمی کی۔ چونکہ اس کی زیادہ تر توجہ فوجی مہمات کی طرف رہی۔ اس لیے عوام کے ساتھ اس کا سلوک بہتر نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بیٹے ابوتاشفین نے اسے قتل کر دیا۔

ابوحمو ثانی موسیٰ بن ابویعقوب بن عبدالرحمان بن یحییٰ بن یغمراس، خاندان عبدالواد کا ایک حکمران، ۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء میں پیدا ہوا۔ جب مرینیوں اور حفصیوں کے تعلقات خراب ہوگئے تو اسے ایک لشکر کا سردار بنا دیا گیا۔ اس نے از سر نو تلمسان کو فتح کیا اور ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں وہاں کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں مرینیوں نے پھر قبضہ کر لیا۔ مگر دو ہی سال کے بعد ابوحمو نے اقتدار حاصل کر لیا۔ اس کا بیٹا ابوتاشفین ثانی بھی اس کا مخالف تھا۔ مگر ابوحمو مرینیوں کے ساتھ لڑتا ہوا ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء کو مارا گیا۔

ابوحمید ساعدی رضؓ عبدالرحمان ساعدی صحابئ رسولؐ۔ ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ مدینہ کے قبیلہ خزرج کی شاخ ساعدہ سے تعلق رکھتے تھے بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ امیر معاویہ کے آخری ایام خلافت میں وفات پائی۔ آپ کا شمار جلیل القدر انصار میں ہوتا ہے۔ اکثر احادیث کی روایات آپ سے منسوب ہیں۔ سنت رسولؐ کی پیروی آپ کا خاص شعار تھا۔ آپ نے آنحضور صلعم کے طریقہ نماز کو اپنایا تھا۔ دیگر اصحابہ نے یہ طریق آپ ہی سے سیکھا۔

ابوحنیفہؒ امام (۸۰ھ/۶۹۹ء - ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) النعمان ابوحنیفہ بن ثابت بن زوطی بن ماہ، مسلمانوں کے امام اعظم، اہل سنت کا ایک فرقہ انھی کے نام پر حنفی کہلاتا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ آپ عجمی النسل تھے۔ آپ کے دادا زوطی کابل سے آئے تھے اور انھوں نے اسلام قبول کرکے نعمان نام رکھا۔ حضرت علیؓ نے انھیں اور ان کے بیٹے ثابت کو دعائے خیر دی تھی۔

امام ابوحنیفہ کا بچپن ایک پر آشوب دور تھا۔ حجاج بن یوسف عراق کا حاکم تھا اور مذہبی تصادم اپنے عروج پر تھا۔ عبدالملک اور اس کے بعد ولید کے عہد [illegible] میں اکثر [illegible] ایسے ہی سفاک اور ظالم قسم کے حکمرانوں کی تھی۔ اس کے بعد [illegible] عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اسلامی دنیا کو کسی قدر سکون نصیب ہوا۔ [illegible] ظالم عمال حکومت معزول کر دیے گئے اور علوم مذہبی کی طرف [illegible] توجہ دی گئی [illegible] جو مرتب کیا۔ غرضیکہ امام ابوحنیفہ کے لئے [illegible] موقع تھا کہ آپ [illegible] سب توجہ دے سکیں۔ ان دنوں آپ کوفہ [illegible] اس کی تجارت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ [illegible] میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں آپ نے علم کلام اور فقہ کی [illegible] کے انتقال کے بعد کوفہ میں فقہ پر سب سے زیادہ [illegible]

امام اعظمؒ نے اگرچہ حماد کے علاوہ اور علما سے بھی فقہ [illegible] خاص فن حماد ہی سے تربیت پائی تھی۔ یہی وجہ ہے [illegible] تھے۔ اگرچہ فقہ میں امام موصوف نے زیادہ تر حماد ہی کا حلقۂ درس کافی [illegible] علم حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی۔ [illegible] سکتا تھا۔ بلکہ درایت کے ساتھ روایت [illegible] اس وقت نہایت پریشان اور غریب مرتبت تھیں۔ [illegible] کو بھی دو چار سو سے زائد احادیث یاد نہ تھیں۔ اور یہ تعداد [illegible] سے بھی ناکافی تھی۔

علاوہ ازیں یہ طریق روایت [illegible] اختلافات پیدا ہو گئے تھے [illegible] جب تک متعدد طریقوں سے معلوم نہ [illegible] تھا۔ امام اعظمؒ کو حماد کی صحبت اور [illegible] اس لیے نہایت سعی و انتظار سے حدیثوں کو [illegible] میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام موصوف نے [illegible] آپ کو ان مختلف اور متعدد وسائل سے اگرچہ احادیث کا [illegible] کی سند حاصل کرنے کے لیے آپ نے حرمین کا [illegible] اور بڑے مراکز تھے۔

جس زمانے میں امام اعظمؒ مکہ معظمہ پہنچے درس و تدریس کا [illegible] عطا بن ابی رباح کا حلقۂ درس سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا۔ امام موصوف استفادہ کی خاطر حاضر خدمت ہوئے تو عطا بن ابی رباح نے آپ سے پوچھا:

"تمہارا عقیدہ کیا ہے؟"

"میں اسلاف کو برا نہیں کہتا، گنہگار کو کافر نہیں سمجھتا، قضا و قدر کا قائل ہوں [illegible]"

عطا بن ابی رباح نے امام موصوف کو اجازت دے دی کہ وہ ان کے حلقۂ درس [illegible]

میں شامل ہوا کریں۔ روز بروز ان کی ذہانت و طباعی کے جوہر ظاہر ہوتے گئے۔ اور پھر یہ عالم تھا کہ جب وہ حلقۂ درس میں جاتے تو عطاؒ بن ابی رباح آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ امام اعظمؒ جب مدینہ منورہ پہنچے تو آپ سالمؒ بن عبداللہ بن عمرؓ بن خطاب اور سلیمان سے بھی ملاقی ہوئے۔ اور ان سے احادیث بھی روایت کیں۔ امام موصوف کی طلبِ علم کی مسافت کوفہ مدینہ منورہ تک محدود رہی تاہم آپ نے تحصیل علم کا سلسلہ آخر زندگی تک جاری رکھا۔ آپ اکثر حرمین جاتے اور پھر مہینوں وہاں پر قیام کرتے۔

حج کی تقریب پر ممالک اسلامیہ کے ہر گوشے سے بڑے بڑے اہل علم اور صاحبان کمال آکر جمع ہوتے۔ امام اعظمؒ اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے آپ کو قیاس میں مشہور کر دیا تھا۔ ان ہی دنوں آپ کے شاگرد عبداللہ ابن مبارک نے بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعیؒ سے فن حدیث کی تکمیل کریں۔ پہلی ہی ملاقات پر انہوں نے عبداللہ ابن مبارک سے پوچھا کہ کوفہ میں ابوحنیفہ کون ہے جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے؟

ابن مبارک نے کچھ جواب نہ دیا اور واپس چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد کچھ اجزا اپنے ساتھ لیتے گئے۔ امام اوزاعی نے وہ اجزا لے کر پڑھے، ان کی ابتدا میں قال نعمان بن ثابت لکھا تھا۔ دیر تک غور سے دیکھتے رہے پھر پوچھا یہ نعمان کون بزرگ ہیں؟

عراق کے ایک شیخ ہیں جن کی صحبت میں میں رہا ہوں۔ جن کو آپ مبتدع بتاتے تھے۔ امام اوزاعی کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔ حج کے لیے جب امام اوزاعی مکہ تشریف لے گئے تو امام اعظمؒ سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے عبداللہ ابن مبارک بھی وہاں موجود تھے۔ ان مسائل پر امام اعظمؒ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ امام اوزاعی حیران رہ گئے۔ امام اعظمؒ کے جانے کے بعد عبداللہ سے کہا۔ اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا۔ بے شبہ میری بدگمانی غلط تھی جس کا مجھے افسوس ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ امام اعظمؒ نے فن حدیث میں امام اوزاعیؒ کی شاگردی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے کہ آپ امام اوزاعی سے [illegible] میں شامل ہوئے۔

سیدنا امام باقرؒ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہؒ دوسری بار مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ سیدنا امام باقرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: ہاں تم ہی قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو؟

امام اعظمؒ نے نہایت ہی ادب سے عرض کیا۔ حدیث کی مخالفت کون کر سکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں۔ سیدنا امام باقرؒ تشریف فرما ہوئے تو درج ذیل گفتگو ہوئی۔

ابوحنیفہؒ: مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقرؒ: عورت۔

ابوحنیفہؒ: وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟

امام باقرؒ: مرد کا۔

ابوحنیفہؒ: میں قیاس سے کام لیتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس پر زیادہ ملنا چاہیے۔ پھر عرض کیا نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقرؒ: نماز

ابوحنیفہؒ: اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونی چاہیے نہ روزہ کی حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔

سیدنا امام باقرؒ اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر امام اعظمؒ کی پیشانی چوم لی۔ امام ابوحنیفہؒ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ آپ اس خصوصیت سے مشہور ہیں کہ آپ کے شیوخ حدیث بے شمار تھے۔ ابوحفص کبیر کا دعویٰ ہے کہ امام اعظمؒ نے کم از کم چار ہزار اشخاص سے احادیث روایت کی ہیں۔ اندلس کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو امام اعظمؒ کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔ مختصراً یہ کہ آپ کی استادی کے حدود خلیفۂ وقت کے حدودِ مملکت کے برابر تھے۔

عباسی خلافت کا سلسلۂ جنبانی جو ایک مدت سے ہو رہا تھا مروان الحمار کے عہد میں نہایت زور پکڑ گئی۔ ابومسلم خراسانی نے تمام ملک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مروانی حکومت کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ چونکہ زیادہ تر فساد کا مرکز عراق اور عراق میں بالخصوص کوفہ تھا۔ اور یہیں پر امام ابوحنیفہؒ تشریف فرما تھے۔ مروان الحمار نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو عراق کا گورنر مقرر کیا تو اس نے امام موصوف کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہا۔ لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا۔ یزید بن عمر نے کہا کہ جبراً آپ کو منظور کرنا ہوگا۔ آپ کو ہم صحبت بزرگوں نے بھی سمجھایا مگر آپ اپنے انکار پر ہی قائم رہے اور فرمایا: "اگر یزید بن عمر کہے کہ مسجدوں کے دروازے گن دو تو بھی مجھے منظور نہیں چہ جائیکہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر لگا دوں۔"

یزید بن عمر نے غصے میں آکر حکم دیا کہ ہر روز آپ کو دس دُرّے لگائے جائیں تاوقتیکہ آپ اس عہدے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوتی رہی لیکن امام اعظمؒ اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر یزید بن عمر نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ ۱۳۲ ہجری میں حکومت نے دوسرا پہلو بدلا یعنی خلافت بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباس وارث تخت و تاج ہوئے۔ اس خاندان کے پہلے حکمران ابوالعباس السفاح نے چار برس حکومت کی اور ۱۳۶ ہجری میں اس کا بھائی المنصور عباسی تخت نشین ہوا۔ السفاح اور المنصور اعتدال کی حدوں سے دور نکل گئے۔ خاص طور پر منصور نے یہ ستم کیا کہ سادات و علویین کی بیخ کنی شروع کر دی۔ محمدؒ بن ابراہیمؒ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ ان بے رحمیوں کی داستان بڑی طویل ہے اور پیش نظر مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

آخر تنگ آکر ۱۴۵ھ میں ان ہی مظلوم سادات میں سے محمد نفسؒ زکیہ نے مدینہ منورہ میں خروج کیا اور نہایت بہادری سے لڑ کر جنگ میں کام آئے۔ تو ان کے بھائی ابراہیمؒ نے علم بغاوت بلند کیا۔ امام اعظمؒ نے بھی ابراہیم کی تائید کی اور بجز اس کے کہ جنگ میں شریک نہ ہو سکے اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ ابراہیم بھی دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اب المنصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جنہوں نے ابراہیمؒ کا ساتھ دیا تھا۔ ۱۴۶ ہجری میں اپنے پایۂ تخت بغداد پہنچ کر منصور نے امام اعظمؒ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً حاضر ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے کہ وہ حجابت کا عہدہ رکھتا تھا۔ آپ کو دربار میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دنیا میں آج سب سے بڑے عالم ہیں"

منصور: آپ نے کس سے تحصیل علم کی؟

ابوحنیفہ نے اپنے استادوں کے نام بتائے تو منصور نے آپ کے لیے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔

منصور: (غصے میں) تم جھوٹے ہو۔

ابوحنیفہ: اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعوے ضرور سچا ہے کہ میں عہدۂ قضا کے اہل نہیں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی نہیں ہو سکتا۔

منصور: (قسم کھا کر) تم کو یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا۔

ابوحنیفہؒ: (قسم کھا کر) ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

ربیع: (غصے میں) ابوحنیفہ! تم امیر المومنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو۔

ابوحنیفہؒ: ہاں، کیونکہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے

۱۴۶ھ میں المنصور نے امام اعظمؒ کو قید کر دیا۔ بلاشبہ اس کے پیچھے کچھ سیاسی اسباب

تھے اور عباسی حکومت ان کے ان حالات سے خائف تھی جو آپ اہل بیت، نفسِ زکیہ اور ابراہیمؒ کے متعلق رکھتے تھے۔ منصور کو بحالت قید بھی آپ کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ اس گرفتاری اور قید نے اُن کے اثر اور قبول عام کو کم کرنے کی بجائے اور زیادہ کر دیا تھا۔ منصور نے گو ان کو قید کر رکھا تھا لیکن کوئی امراان کے ادب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔ قید خانے میں آپ کا سلسلۂ تعلیم بھی برابر جاری تھا۔ امام محمدؒ نے جو فقہِ حنفی کے دست و بازو ہیں قید خانے ہی میں امام اعظمؒ سے تعلیم پائی۔

بالآخر ۱۵۰ھ میں بے خبری میں آپ کو زہر دلوا دیا۔ جب آپ کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو آپ نے سجدہ کیا اور اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قاضی شہر [illegible] بن عمارہ نے غسل دیا۔ غسل سے فراغت ہوتے ہوتے لوگوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ پہلی نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اس پر آنے والوں کا سلسلہ ابھی قائم تھا۔ یہاں تک کہ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی اور عصر کے قریب آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ الخطیب لکھتا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ آپ کی نماز جنازہ پڑھا کیے۔ قبولِ عام کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہو گی کہ سلطان الپ ارسلان سلجوقی [illegible] نے ۴۵۹ھ میں آپ کی قبر پر ایک قبہ اور اس کے قریب ہی ایک مدرسہ تعمیر کروایا۔ یہ مدرسہ مشہد ابوحنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے۔

امام اعظمؒ کے علم کی طرح آپ کی ذہانت اور طباعی بھی ضرب المثل تھی۔ اس غیر معمولی ذہانت نے عظیم الشان ذخیرۂ علم پر تصرف کر کے آپ کو بانیان علوم کی صف میں لا کھڑا کیا۔ امام ابن مبارکؒ کے الفاظ ہیں۔ "آثار اور فقہ فی الحدیث کے لیے ایک مقیاس صحیح پیدا کرنا وہ لازوال علمی کارنامہ ہے جو ہمیشہ امام ابوحنیفہؒ کے نام سے منسوب رہے گا۔" اس کو بعض محدثین نے "رائے" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اس "مقیاس" اور اس "رائے" نے فقہ کے متعدد ابواب مرتب کروائے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جس قدر مسائل مدون کیے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زائد ہے۔ امام اعظمؒ نے جس طریقے سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا تھا وہ نہایت وسیع اور دشوار کام تھا۔ اس لیے آپ نے اتنے بڑے اور اہم کام کو محض اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اسی غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چالیس نامور اشخاص منتخب کیے اور ان کی ایک مجلس بنائی۔ الطحاوی [illegible] نے ان میں سے تیرہ کے نام دیے ہیں۔ جن میں امام ابویوسفؒ [illegible] اور امام زفرؒ دو انتہائی نمایاں شخصیتیں تھیں۔ اس طرح فقہ کا گویا ایک ادارہ علمی تشکیل پذیر ہو گیا۔ جس نے امام ابوحنیفہؒ کی سرکردگی میں تیس برس تک کام کیا۔ امام اعظمؒ کی زندگی ہی میں اس مجلس کے فتاویٰ نے حسن قبول حاصل کر لیا تھا۔ جیسے جیسے یہ فتاوے تیار ہوتے جاتے ساتھ ہی ساتھ تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیلتے جاتے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اصول تحقیق خود لکھے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"میں کتاب اللہ سے اخذ کرتا ہوں۔ اگر وہاں کوئی مسئلہ مجھے نہیں ملتا تو سنت رسول اللہؐ سے لیتا ہوں اور جب وہاں بھی نہ ملے تو صحابہؓ میں سے کسی کا قول مان لیتا ہوں اور ان کا قول چھوڑ کر دوسروں کا قول نہیں لیتا۔ اور جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین اور عطا پر آ جائے تو یہ لوگ مجتہد تھے۔ اس وقت میں بھی ان ہی لوگوں کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔"

امام ابوحنیفہؒ اپنے افکار و خیالات کے متعلق اپنے شاگردوں سے بحث کیا کرتے تھے اور انہیں لکھوا بھی دیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان ہی شاگردوں کی چند کتابیں، خصوصاً امام ابویوسفؒ کی "اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ" اور "الرد علی سیر الاوزاعی" "الشیبانی کی "الحج" اور موطا امام مالکؒ کا نسخہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے اہم ماخذ ہیں۔ (رسمی اسناد "الشیبانی عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ" جو الشیبانی کی متعدد تصانیف میں پایا جاتا ہے، اور جو صرف شاگرد اور استاد کے عام تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس ضمن میں مفید مطلب نہیں ہے۔) جو عقائد خود ابوحنیفہؒ نے حمادؒ سے حاصل کیے ان کے بڑے ماخذ ابویوسفؒ کی "الآثار" اور الشیبانی کی "الآثار" ہیں۔ ابوحنیفہؒ کے جانشینوں کے ساتھ ان کے پیش رووں کا مقابلہ کر کے ہم ان کے ان کارناموں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو انہوں نے فقہ اسلامی کے فکر و عقیدے کو نشوونما دینے میں سرانجام دیئے۔

مجموعی طور پر امام ابوحنیفہؒ کا فقہی فکر اپنے ہمعصر ابن ابی لیلیٰ [illegible] کے فقہی فکر سے بدرجہا ارفع تھا۔ جو آپ کے عہد میں کوفے کے قاضی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ابن ابی لیلیٰ اور اس عہد کے عام کوفی طریق استدلال کا تعلق ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے ایک نظریاتی منظم کام انجام دیا۔ اور اصطلاحی فکر فقہ کو بھی معتدبہ ترقی دی۔ چونکہ آپ قاضی نہ تھے اس لیے اُن کا فقہی فکر عملی مصالح سے اس حد تک مقید نہ تھا جس قدر ابن ابی لیلیٰ کا تھا اس کے ساتھ ہی وہ نظم و نسق عدالت کا اس قدر لحاظ نہ رکھتے تھے۔ عام طور پر امام اعظم کا مسلک باقاعدہ اور یک رنگ تھا۔ اور یہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کا فقہی تفکر اپنے سے بزرگ معاصرین کی بہ نسبت وسیع تر بنیادوں پر قائم ہے اور اس کا عملی انطباق زیادہ مکمل طور پر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اصطلاحی اعتبار سے بھی وہ زیادہ بلند، محتاط، جامع اور منجھا ہوا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فقہی مسائل میں رائے اور قیاس کو اُسی حد تک استعمال کرتے تھے۔ جس حد تک کہ ان کے زمانے کے دیگر فقہی مذاہب کا دستور تھا۔ اور وہ دیگر مذاہب مثلاً فقہائے مدینہ کی طرح خبر آحاد کی بنا پر رد ایسی عقیدے کو ترک کرنے پر بھی مائل نہ تھے۔ یعنی کسی ایسی حدیث کی بنا پر جسے ایک زمانے میں صرف ایک شخص نے روایت کیا ہو۔ [illegible] احادیث امام ابوحنیفہؒ کی زندگی، یعنی دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں [illegible] میں رائج ہونے لگی تھیں۔ اور جب دو پشتوں کے بعد زیادہ تر الشافعی کی بدولت [illegible] سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ تو ابوحنیفہؒ پر خارجی وجوہ کی بنا پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ حدیث رسولؐ کے مزاحم ہوتے ہیں۔ مزید براں آپ پر یہ اعتراض بھی وارد کیا گیا کہ آپ فقہ کے [illegible] میں اپنی ذاتی رائے استعمال کرتے تھے اور ان کی طرف بہت سے ایسے اقوال منسوب کر دیئے گئے جو متاخرین کے ذوق کے لیے سخت ناگوار تھے۔

اعتقادی دینیات کا ایک مقبول عام طریقہ آپ سے منسوب ہے [illegible] اسلامی، اس جمعیت کے اصول اتحاد، یعنی سنت نبوی اور ان مسلمانوں کی [illegible] کے تصورات پر جو درمیانی راستے پر گامزن ہیں اور افراط و تفریط سے بچتے ہیں۔ [illegible] گیا ہے۔ اور جو دلائل عقلی سے زیادہ دلائل منصوصہ پر مبنی ہے۔ [illegible] "العالم والمتعلم" جسے غلط طور پر ابوحنیفہؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ [illegible] میں کی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کے حلقے میں تصنیف ہوئیں۔ بعد کے ادوار میں اسی مسلک کی ترجمانی علمائے دین کی کتابوں میں سے [illegible] (متوفی ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) کی "عقیدہ" اور ابواللیث سمرقندی [illegible] (متوفی ۳۹۳ھ/ [illegible] ۹۹۳ء) کی عقیدہ، جو سوال و جواب کی شکل میں ہے بھی شامل ہے۔ موخرالذکر کتاب [illegible] اور انڈونیشیا میں بھی بہت مقبول ہے۔ حالانکہ یہ وہ علاقہ ہے جو فقہی امور [illegible] شافعی مذہب کا پیرو ہے۔

اسی مکتبی روایت کی نشوونما رجعی تحریک کے عوامی پس منظر میں ہوئی [illegible] ابوحنیفہ خود بھی شامل تھے۔ امام رازیؒ نے "مناقب الشافعی" میں [illegible] کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ "الفہرست" میں ابن ندیم نے آپ کی چار کتابوں کا نام لکھا ہے۔ "الفقہ الاکبر"۔ عثمان البستی کے نام خط۔ "العالم والمتعلم" "الرد علی القدریہ"۔ "مسند" جو خوارزمی نے مرتب کی۔ اس کا ذکر الفہرست میں نہیں ہے۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد میں سے آپ کے بیٹے حماد اور پوتے

اسماعیل نے جو قاضی بصرہ اور قاضی رقہ تھے (متوفی ۲۱۲ھ/۸۲۷ء) فقہ اسلامی میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ آپ کے اہم ترین شاگردوں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔ زفر بن الھذیل (متوفی ۱۵۸ھ/۷۷۵ء)، داؤد الطائی (متوفی ۱۶۵ھ/۷۸۱ء) ابویوسف، ابومطیع، الشیبانی، اسد بن عمرو (متوفی ۱۹۰ھ/۸۰۶ء) اور حسن بن زیاد لولوی (متوفی ۲۰۴ھ/۸۱۹ء) محدثین میں سے عبداللہ بن المبارک (متوفی ۱۸۱ھ/۷۹۷ء) امام اعظم کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

خلافت عباسیہ میں اگرچہ خلفاء خود مدعی اجتہاد تھے۔ تاہم ہارون الرشید کے عہد میں فتاوی ابی حنیفہ ساری قلمرو میں قانون سلطنت کی حیثیت سے نافذ تھے مغلوں کے سیلاب بدتمیزی کے بعد جو خاندان برسر اقتدار آئے ان میں سے اکثر حنفی تھے سلجوقی، محمود غزنوی جس کی فقہ حنفی پر کتاب "التفرید" مشہور ہے۔ نورالدین زنگی، ... جرکسی، ہندوستان کے آل تیمور سب حنفی المذہب تھے۔ اورنگ زیب کے عہد کی فتاوی عالمگیری فقہ حنفی کی عمدہ کتاب ہے۔ سب سے آخر میں ترکی کے خلفاء جن کی خلافت ۶۲۵ برس تک رہی عموماً امام اعظم کے مسلک پر تھے موجودہ افغانستان کی حکومت اور عوام حنفی المذہب ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اکثریت حنفیوں کی ہے۔

ابوحیان التوحیدی

علی بن محمد بن عباس۔ غالباً التوحیدی کی نسبت [illegible] ہے جو کھجور کی ایک قسم ہے) امام [illegible] ان کے والد بغداد میں التوحید [illegible] ۹۲۲ء اور ۹۳۲ء کے درمیان [illegible] صدی ہجری دسویں صدی عیسوی [illegible] یا بغداد میں کہیں پیدا ہوئے۔ البتہ بغداد میں [illegible] شافعی فقہ قاضی ابوحامد المروالروزی [illegible] حدیث ابوبکر [illegible] پڑھی۔ علاوہ ازیں صوفی مشائخ کی صحبت سے [illegible] پیشہ کتابت ان کا ذریعہ معاش تھا۔

[illegible] کے وزیر [illegible] ابن العمید کے پاس قسمت آزمائی کے لیے پہنچے اور [illegible] کے نام ایک پر تکلف [illegible] بھی لکھا۔ لیکن اس وزیر کے خلاف ان کے معاندانہ جذبات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ۹۷۰ء سے ابن عباد نے نقل نویس کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بھی یہ کامیاب نہ رہے جس کی بڑی وجہ یقیناً ان کے کردار کی ناسازگاری اور ان کا احساس برتری تھا۔ مثلاً انہوں نے اپنے آقا کے مکتوبات کے ضخیم مجموعے کو نقل کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنے سے انکار کر دیا اور بالآخر انہیں برطرف کر دیا گیا۔ انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی رہی ہے۔ اور اس کا انتقام انھوں نے ایک رسالہ "ذم یا مثالب یا اخلاق الوزیرین" لکھ کر لیا۔ جس میں ابوالفتح ابن العمید اور ابن العباد دونوں کی تضحیک کی گئی ہے۔

۹۸۱ء سے ۹۷۵ء کے دوران میں انہوں نے اپنی ادبی منتخبات کی کتاب "البصائر القدماء" جو دس جلدوں میں ہے تالیف کی جسے "البصائر والذخائر" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جلدیں آج بھی کتب خانہ استنبول میں موجود ہیں۔ یہ رَے کا واقعہ ہے کہ انھوں نے ابن مسکویہ [illegible] کو وہ سوالات بھیجے جن کا جواب اس نے اپنی کتاب "الھوامل والشوامل" میں دیا۔

۹۸۱ء میں جب یہ بغداد میں واپس آئے تو زید بن رفاعہ اور ابوالوفا البوزجانی نے ان کی سفارش عبدالرحمان بن احمد بن سعدان سے کر دی (جو عارضی سیاہ ہونے کی وجہ سے العارض بھی کہلاتا تھا) ابن سعدان کے لیے انھوں نے دوستی کے موضوع پر اپنی کتاب "الصداقۃ والصدیق" (مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ) لکھنا شروع کی جو تیس سال کے بعد جا کر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس دوران میں آپ ایک ایسے شخص کے پاس مسلسل جاتے رہے جو ان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔ یہ ابوسلیمان المنطقی تھے جنھیں یہ فلسفیانہ مسائل میں بالخصوص اور ہر نوعیت کے موضوع پر بالعموم سب سے بڑی سند اور حجت سمجھتے تھے۔ ابن سعدان کو صمصام الدولہ نے ۹۸۳ء میں اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ ابن حیان اس وزیر کا حاشیہ باش درباری تھا اور اس کی شام کے وقت کی مجالس میں داخل ہوا کرتا تھا۔ جہاں انھیں لسانیات، ادب، فلسفہ اور درباری اور ادبی موضوعات پر وزیر کے بہت سے متنوع سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ یہ اکثر موضوع زیر بحث پر ابوسلیمان کے افکار و خیالات بیان کر دیا کرتے تھے

۹۸۵ء میں ابن سعدان معتوب ہو کر قتل کر دیا گیا اور اب بظاہر ابوحیان بغیر کسی سرپرست کے رہ گیا۔ یہیں ان کی زندگی کے آخر دور کے حالات بہت کم معلوم ہیں لیکن بظاہر یہی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے آخری ایام مفلسی میں گزارے۔ انھی آخری سالوں میں انھوں نے اپنی کتاب "المقابسات" مرتب کی تھی۔ جو مختلف فلسفیانہ موضوعات پر ۱۰۶ مکالموں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ ممبئی میں ۱۸۰۹ء اور ایک نسخہ قاہرہ میں ۱۹۲۹ء میں طبع ہوا تھا۔

ان مکالموں میں سب سے بڑا متکلم ابوسلیمان ہی ہے۔ لیکن ان میں بغداد کے فلسفیانہ حلقوں کے باقی سب ارکان بھی سامنے آتے ہیں۔ "المقابسات" اور "الامتاع والمؤانسۃ" کتابیں اس دور کی حیات فکری کے متعلق وسیع معلومات کے ذخیرے ہیں۔ اور علمائے بغداد کے افکار و عقائد کو از سر نو مرتب کرنے کے لیے بہت بیش قیمت ثابت ہو سکتی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ابوحیان نے اپنی کتابیں نذر آتش کر دیں اس کی وجہ انھوں نے وہ کس مپرسی بتائی ہے جس میں آخری بیس برس انھوں نے بسر کیے قبرستان شیراز کی ایک گائیڈ بک میں درج ہے کہ ابوحیان کی قبر شیراز کے قبرستان میں ہے اور اس پر ان کی تاریخ وفات ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء درج ہے۔

ابوخطاب اسدی

محمد بن ابی زینب، رفض اور بدعت کا بانی، کوفے کا رہنے والا تھا۔ امام جعفر صادقؒ کے بڑے داعیوں میں سے ایک تھا۔ مگر گمراہ ہو کر کاذب عقائد کی تلقین کرنے لگا۔ نتیجۃً امام نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ کوفہ کے والی عیسیٰ بن موسیٰ کے حکم پر اسے گرفتار کیا گیا۔ اس کے ستر پیروکار اس ہنگامے میں مارے گئے۔ اسے بھی سولی پر لٹکا کر اس کا سر خلیفہ منصور کے دربار میں بھیجا گیا۔ اسے ماننے والے نصیری کہلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیعوں کا اسماعیلی فرقہ اسی کی تعلیمات کی بنا پر ظہور میں آیا۔ مگر فاطمی دور کی اکثر تحریروں میں اس کی مذمت ہی کی گئی ہے۔

ابوخطاب معافری

عبدالاعلیٰ بن السمح، اباضیوں کا پہلا منتخب امام یہ ان پانچ مبلغین میں سے ایک تھا، جسے اباضیوں کے پیشوا ابو عبیدہ نے المغرب بھیجا تھا۔ (دیکھیے "اباضیہ") وہاں طرابلس میں اباضیوں نے ۷۵۷ء میں اسے اپنا امام منتخب کر لیا۔

ابوخطاب نے طرابلس کا سارا ملک فتح کر لیا اور بعد ازاں اسی شہر میں رہنے لگا۔ اس کی فتوحات کے پیش نظر افریقہ میں اباضی سلطنت قائم ہو گئی۔ مصر کے حاکم ابن الاشعث

نے ۱۹۱ء میں اباضی سلطنت پر حملہ کیا۔ ابوخطاب مقابلے کے لئے نکلا مگر اپنے چودہ ہزار ساتھیوں سمیت مارا گیا اور الاشعث نے قیروان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

ابوخطار حسام بن ضرار کلبی، اندلس کا والی، وہاں اس کا استقبال ہر مکتبۂ فکر اور ہر گروہ نے کیا۔ اس نے قرطبہ پہنچتے ہی سب سے پہلے بربر قیدیوں کو رہا کیا۔ بعد ازاں کئی معززین کو مختلف حیلوں بہانوں سے جلاوطن کر دیا۔ اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ نوآرد شامیوں کا تھا۔ ابوالخطار نے انھیں جلاوطن کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور انھیں اندلس کے مختلف شہروں میں آباد کر دیا۔ اس حکمت عملی کی بنا پر اندلس میں امن وامان کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں ابوخطار نے غیر جانبداری کے ساتھ حکومت کرنا چاہی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک فیصلے میں کسی یمانی کی طرفداری کرنے کی بنا پر اس کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں نے ثوابہ بن سلمہ کو نیا امیر نامزد کر دیا۔ دونوں امیروں کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ادھر امیہ بن عبدالملک نے بھی حملہ کر دیا۔ چنانچہ ابوخطار نے شکست کھائی اور ثوابہ امیر اندلس نامزد ہو گیا۔

ابوداؤدؒ، امام (۲۰۲ھ/۸۱۷ء - ۲۷۵ھ/۸۸۹ء) سلیمانؒ ابن الاشعث مشہور محدث تھے۔ آپ نے تحصیل علم کے لئے دور دراز کے سفر کئے اور علم وتقویٰ کے باعث شہرت پائی۔ بالآخر آپ نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی اس وجہ سے بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی نسبت ایک گاؤں سجستان سے ہے۔ جو بصرے کے قریب واقع ہے، نہ کہ ولایت سجستان سے۔

آپ کی اہم کتاب "سنن ابوداؤد" ہے جو صحاح ستہ کی تیسری کتاب ہے۔ امام موصوف نے اسے پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب اور اقتباس فرمایا اور نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد ان میں سے صرف ۴۸۰۰ احادیث لے کر اپنی اس کتاب میں درج فرمایا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی یہ کتاب امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں پیش کی اور انھوں نے اسے پسند فرمایا۔ ابن داسہ کہتا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے یہ کتاب پانچ لاکھ روایتوں کے طومار میں سے چن کر مرتب کی تھی۔ اور اس کتاب میں بقول امام موصوف، انھوں نے ایسی احادیث درج کیں جو صحیح ہیں یا بظاہر صحیح ہیں یا صحیح احادیث کے قریب ہیں۔

امام ابوداؤدؒ نے یہ بھی فرمایا تھا۔ "میں نے اپنی کتاب میں ان احادیث کی وضاحت کر دی ہے جو بہت ضعیف ہیں اور جن کے بارے میں میں نے کچھ نہیں لکھا، وہ اچھی و صالح ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض دوسروں کی نسبت زیادہ مستند ہیں"۔ یہ قول ان حواشی کے متعلق ہے جن میں آپ نے احادیث کے متعلق اپنی رائے دی ہے۔ امام مسلمؒ حجاج القشیری نیشاپوری نے اپنی تالیف "صحیح مسلم" کے آغاز میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں جرح وتعدیل کے عام مسائل پر بحث کی ہے۔ لیکن امام ابوداؤدؒ پہلے محدث ہیں جنھوں نے ایسے مفصل حواشی لکھے ہیں جن سے آپ کے شاگرد ترمذیؒ کے لئے ان احادیث پر فرداً فرداً زیادہ منظم طریقے پر نقد وتبصرے کا راستہ کھل گیا جو انھوں نے اپنی جامع میں درج کئے ہیں۔

امام داؤدؒ بعض ایسے راویوں سے بھی احادیث نقل کرتے ہیں جن کا ذکر صحیحین میں نہیں ملتا۔ کیونکہ ان کا اصول یہ ہے کہ تمام ایسے راویوں کو ثقہ سمجھنا چاہیئے جن کے غیر ثقہ ہونے کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہیں۔ آپ کی تالیف میں زیادہ تر مفروض مباح اور ممنوع چیزوں کا ذکر ہے اور اسے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ابوسعید بن الاعرابی فرماتے ہیں "جو شخص قرآن اور سنن ابوداؤدؒ کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتا، وہ بھی ایک بڑا عالم ہے۔" محمد بن مخلد کہتے ہیں۔ "محدثین سنن ابوداؤدؒ کو اسی طرح بلا چون وچرا مانتے ہیں جس طرح قرآن کو۔"

ابوداؤد الطیالسیؒ (۱۳۳ھ/۷۵۰ء - ۲۰۴ھ/۸۱۹ء) سلیمان داؤد ابن الجارود بصری مشہور محدث، ایرانی الاصل تھے۔ لیکن بصرے میں سکونت پذیر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی طرف منسوب "مسند" ان کی اپنی مرتبہ نہیں ہے۔ بلکہ خراسانیوں میں سے کسی نے اس میں وہ احادیث جمع کی تھیں جو امام موصوف سے یوسف بن حبیب نے بیان کی ہیں۔ "کشف الظنون" کا یہ قول کہ "سب سے پہلی مسند انھوں نے مرتب کی۔" درست نہیں ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ الطیالسیؒ کی اور مرویات بھی ہیں۔ روایت ہے کہ ان میں سے چالیس ہزار احادیث اصفہانیوں نے لکھی تھیں۔

امام موصوف کی یہ مسند کتب احادیث کے تیسرے طبقے میں شمار ہوتی ہے۔ یہ تیسرا طبقہ ان جوامع اور مصنفات کا ہے جو امام بخاری اور امام مسلم کے زمانے سے قبل یا بعد میں تصنیف ہوئیں۔ اور وہ صحیح، حسن، ضعیف، معروف، غریب، شاذ، خطا وصواب اور ثابت ومقلوب ہر نوع کی احادیث پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ ان سے اجنبیت مطلقہ زائل ہو گئی ہے تاہم علمائے دین میں ان کی شہرت ومقبولیت ویسی نہیں ہو سکی جیسی کہ طبقہ اولیٰ و ثانیہ کی کتابوں کی ہوئی ہے۔ ان میں مختلف معیار کی کتابیں ہیں۔ بعض کتابیں بعض سے زیادہ قوی ہیں۔ ان کتابوں کے کچھ نام درج ہیں۔ مسند امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ)، سنن ابن ماجہؒ (متوفی ۲۷۳ھ)، مسند دارمی (متوفی ۲۵۵ھ)، مسند ابو یعلیٰ موصلی (متوفی ۳۰۷ھ)، مصنف عبدالرزاق (متوفی ۲۱۱ھ)، مصنف ابن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ)، مسند عبد بن حمید (متوفی ۲۴۹ھ)، مسند ابوداؤد طیالسی (متوفی ۲۰۴ھ)، سنن دارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ)، صحیح ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ)، مستدرک حاکم (متوفی ۴۰۵ھ)، کتب بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ)، کتب طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) اور تصنیفات طبرانی (متوفی ۳۶۰ھ)۔

ابودجانہؓ آنحضرتؐ کے جاں نثار صحابی، سماک نام تھا، قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ ہجرت سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس کے بعد ہر غزوہ میں شرکت کی خصوصاً اُحد کے میدان میں بے مثل شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ نبی کریم صلعم نے اس میدان کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی شمشیر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کون ہے جو یہ شمشیر لے اور پھر اس کا حق بھی ادا کرے؟ یہ شمشیر ابودجانہؓ کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے سر پر سرخ پٹی باندھ لی اور میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے لگے۔ چند مسلمانوں کی غلطی سے جب جنگ کا پانسہ پلٹا اور آنحضورؐ دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے۔ اس وقت جن چند جاں نثاروں نے آپؐ کی حفاظت کی، ان میں ابودجانہؓ بھی شامل تھے۔ جو تیر آنحضورؐ کی طرف آتا تھا، اس کا ہدف ان کا جسم بنتا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں جب لشکر اسلام خالد بن ولید کی قیادت میں مسیلمہ کذاب سے نبرد آزما ہوا تو ابودجانہؓ بھی ساتھ تھے۔ مسلمانوں کے بے پناہ جوش اور حملے کی تاب نہ لا کر مسیلمہ کذاب مع فوج کے ایک باغ میں گھس گیا۔ جس کے گرداگرد فصیل کھنچی ہوئی تھی اور دروازہ بند کر لیا۔ باغ میں داخل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ابودجانہ نے کہا کہ مجھے اٹھا کر باغ میں پھینک دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ گرنے پر گو آپ کا پاؤں ٹوٹ گیا۔ مگر آپ نے دروازہ کھول دیا اور اسلامی فوج باغ میں داخل ہو گئی۔ مسیلمہ کذاب مارا گیا۔ اسلامی لشکر کو فتح ہوئی۔ مگر ابودجانہؓ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ابوذر غفاریؓ نبی کریم صلعم کے صحابی، صوفی اور بزرگ۔ نام جندب بن جنادہ بن

کیا جاتا ہے۔ قبول اسلام سے قبل بھی خدائے واحد کے پرستار تھے انہیں جب حضرت محمد صلعم کی بعثت کی خبر ملی تو مکہ معظمہ آکر مشرف باسلام ہوئے۔ غزوہ خندق تک آپ اپنے قبیلہ میں رہے۔ اس کے بعد مدینہ چلے آئے اور سوائے غزوہ تبوک کے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں آپ شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں آپ کو امراء کا طرزِ زندگی پسند نہ آیا۔ آپ کی تنقید سے امیر معاویہؓ بھی نہ بچ سکے۔ حضرت عثمانؓ کو اس امر کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپ کو مدینہ واپس بلا لیا۔ یہیں ذی قعدہ ۳۲ھ/مئی ۶۵۳ء میں انتقال فرمایا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ ایک بہت بڑے زاہد اور صاحب کشف و حال تھے طبیعت میں حلم اور انکساری تھی۔ نہایت عالم فاضل شخص تھے۔ ان سے ۲۸۱ احادیث کی روایت کی جاتی ہے۔ دولت اور اس کی تقسیم کے بارے میں ان کے نظریات کی طرف آج کل خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

ابو رافع ان کا اصل نام اسلم تھا۔ حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔ بعد میں انھیں آنحضورؐ کے سپرد کر دیا گیا۔ حضرت عباسؓ کے قبول اسلام پر انھیں آزاد کر دیا گیا تو رونے لگے لوگوں نے کہا: یہ تو خوشی کا مقام ہے، تم رو رہے ہو۔ کہا: میں اس لئے رو رہا ہوں کہ آج ... نبوت سے محروم ہو گیا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد بھی آستانہ نبوت کو نہ چھوڑا اور ... خدمت کرتے رہے ... کا خیمہ ... نصب کرتے تھے۔ جنگ بدر کے بعد ابو رافع ... سے ... وغیرہ تمام ... میں شریک ہوئے۔ حضرت علیؓ کے ابتدائی ... خلافت میں فوت ہوئے۔ ان سے ۶۰ حدیثیں مروی ہیں۔

ابو رغال ایک شخص ... کی قبر پر ... پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے: جمرہ) ... ابن حنبل کی روایت کے مطابق ابو رغال قوم ثمود کا وہ ... شخص تھا، جو ہلاک ہونے سے بچ گیا ... کے وقت وہ مکہ میں موجود تھا۔ ... کی ایک روایت کے مطابق یہ شخص طائف کے قبیلے بنو ثقیف کا جدِ امجد بیان کیا گیا ہے ... اور المسعودی نے اسے بنو ثقیف کا مخالف قرار دیا ہے، جسے بنو ثقیف نے قتل کر دیا تھا۔ وہ کوئی بھی شخص تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ابرہہ کی مکہ کی جانب رہنمائی کی تھی۔ اسی لئے اب اس کی قبر پر پتھر مارے جاتے ہیں۔

ابو زیان تلمسان کے حکمران خاندان عبد الواد کے تین حکمران، جو تاریخ میں مشہور ہیں۔

ابو زیان اول (۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء - ۲۱ شوال ۷۰۷ھ/۱۴ اپریل ۱۳۰۸ء) کی بادشاہت کا آغاز ۲ ذی قعدہ ۷۰۳ھ/۶ جون ۱۳۰۴ء سے ہوا۔ نام محمد بن ابی سعید عثمان ابن یغمراسن تھا۔ اس نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اپنے دارالحکومت پر سے مرینی فوج کا محاصرہ اٹھا دیا۔

ابو زیان ثانی (متوفی ۸۰۱ھ/۱۳۹۹ء) ابو حمو ثانی کا بیٹا محمد، جو باپ کی زندگی میں الجزائر کا والی تھا۔ محرم ۷۹۶ھ/نومبر ۱۳۹۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بھائی ابو محمد عبد اللہ نے پانچ ہی برس بعد اسے بے دخل کر کے قتل کر دیا۔

ابو زیان ثالث، آخری سے پہلا حکمران تھا۔ نام احمد بن ابو محمد عبد اللہ تھا۔ ہسپانیوں کی دوسری مہم میں اس کے بھائی ابو عبد اللہ محمد نے شکست کھائی، جس پر ابو زیان کے لیے تخت حاصل کرنا آسان ہو گیا۔ اس نے ۳۰ ذی قعدہ ۹۴۹ھ/۷ مارچ ۱۵۴۳ء سے اپنی وفات ۹۵۰ھ/۱۵۵۰ء تک تلمسان پر حکومت کی۔

ابو سعود (۱۷ صفر ۸۹۶ھ/۳۰ دسمبر ۱۴۹۰ء - ۵ جمادی الاول ۹۸۲ھ/۲۳ اگست ۱۵۷۴ء) محمد بن محی الدین محمد بن العماد، خواجہ چلپی، مشہور مفسر اور شیخ الاسلام قسطنطنیہ کے قریب پیدا ہوئے۔ سلطان محمد ثانی کے آٹھ مدرسوں میں سے ایک میں مدرس تھے۔ بروسہ، استنبول اور رومیلیہ میں قاضی رہے۔ ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء میں سلطان سلیمان اوّل نے انھیں مفتی اعظم بنا دیا۔ بقیہ زندگی انھوں نے اسی عہدے پر گزاری۔ وفات کے بعد استنبول میں ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

ابو سعود نے جو سب سے بڑا کام انجام دیا، وہ قانون کو شریعت اسلامی کے مطابق کرنا تھا۔ اس میں وہ خاصے کامیاب رہے اگرچہ وہ انتہا پسند صوفیوں کے خلاف قتل کا فتوے بھی دے دیتے تھے مگر راسخ العقیدہ صوفیا کی قدردانی بھی کرتے تھے۔ ان کی تفسیر جو زیادہ تر البیضاوی سے ماخوذ ہے "ارشاد العقل السلیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی کئی شرحیں کی گئیں اور یہ متعدد بار طبع ہوئی۔

ابو سعید فضل اللہ (یکم محرم ۳۵۷ھ/۷ دسمبر ۹۶۷ء - ۴ شعبان ۴۴۰ھ/۲۲ جنوری ۱۰۴۹ء) ایران کے مشہور صوفی خراسان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ابوالخیر تھا، جو دوا فروش تھے۔ ابو سعید نے طریقت کا پہلا سبق ابوالقاسم بشر یاسین سے لیا، جو شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے ابو سعید کو بھی شاعری کی طرف راغب کیا۔ جوان ہونے پر آپ مرو میں عبد اللہ حضری اور ابو بکر قفال کے درس میں شریک ہوئے۔ یہاں سے شافعی مذہب میں تکمیل کرنے کے بعد تفسیر، حدیث اور عقائد کی تعلیم کے لئے سرخس میں ابو علی ظاہر کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ابو سعید مشہور صوفی ابوالفضل محمد بن حسن السرخسی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان کے حکم پر ایک اور بزرگ السلمی سے خرقہ حاصل کیا۔ ابوالعباس القصاب نے بھی انھیں خرقہ عطا کیا۔

علوم باطنیہ کی تکمیل کے بعد ابو سعید میہانہ لوٹ آئے اور بقیہ عمر نفس کشی اور زہد و طہارت میں گذاری۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں سنت رسولؐ کی پیروی کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتے رہے۔ چالیس سال تک زہد و ریاضت میں مصروف رہنے کے دوران میں ان پر خدمت درویشاں کی اہمیت منکشف ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے مسجدوں میں جھاڑو دینے، فقیروں کی خدمت کرنے اور غریبوں کی مدد کرنے کو اپنی زندگی کا نمایاں اصول بنا لیا۔ ان کا خاص ملکۂ کشف قلوب تھا۔ اس کے ذریعے دشمنوں تک کے دلوں کے مخفی محرکات ان پر منکشف ہو جاتے۔ مریدوں کی ضیافتیں بڑے پر تکلف انداز میں کرتے تھے، اس لئے اکثر اوقات مقروض رہتے۔ تاہم انھوں نے اپنی ذات پر کبھی خرچ نہ کیا اور نہ ہی کوئی جائیداد بنانے کی کوشش کی۔

ابو سعید سماع اور شاعری کے بے حد دلدادہ تھے۔ اکثر اوقات وجد کی حالت میں اکثر کپڑے پھاڑ دیا کرتے تھے۔ منصور حلاج کی طرح وہ بھی حقیقت الٰہیات سے واقف تھے، مگر سوائے اس کے کہ "اس جبّے کے اندر اللہ ہے" سے زیادہ کچھ بھی زبان سے نہ نکالا۔ ابن سینا نے بھی شیخ ابو سعید سے ملاقات کی۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔

ابو سعید نے اپنی زیادہ تر زندگی قصبہ میہانہ میں گذاری، اس لئے میہنوی کہلائے۔ انھوں نے اپنے پیچھے پس ماندگان کی ایک بہت بڑی تعداد چھوڑی جنھوں نے تقریباً ایک صدی تک مزار کی دیکھ بھال کی۔

شیخ ابو سعید کے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔

بزیر قبا القدیس مست مستانند کہ ہر چہ ہست ہمہ صورت خدا دانند

رباعی

مجنوں تو کوہ راز صحرا نہ شناخت،
دیوانۂ عشق تو سراپا نشناخت
ہر کس بتورہ یافت زخود گم گردید
آنکس کہ ترا شناخت خود را نشناخت

غزوۂ حنین، وطائف میں شریک رہے۔ ۲۰ھ/۶۴۱ء کو فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

ابوسفیان بن حرب، قریش کے کنبے "عبدشمس" کے ایک رکن تھے۔ ان کا نام صخر تھا اور ولادت عام الفیل سے دس سال قبل مکہ میں ہوئی ہے۔ اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے مگر ان کے دل پر اسلام کی حقانیت واضح ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ ان کی مخالفت اتنی شدید نہ رہی جتنی کہ ابوجہل کی تھی۔ ابوسفیان، ابوجہل اور اخنس کے بارے میں ایک

ابوسعید مجددی

(وفات: ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء) ہندوستان کے صوفی اور صاحب کرامت بزرگ۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت شیخ سیف الدینؒ کے واسطہ سے حضرت خواجہ محمد معصومؒ و حضرت امام ربانی سے ملتا ہے۔ ابتدائے عمر ہی سے طبیعت فقیری کی طرف مائل تھی۔ دس برس کی عمر ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ علوم ظاہری فقہ اور حدیث میں بھی کمال حاصل کیا۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے بھی فیض پایا۔ باطنی علوم کے لیے حضرت درگاہی شاہؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور غلام علی شاہؒ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ پندرہ برس تک غلام علی شاہ کی خدمت میں رہے اور ان کے بعد خانقاہ مجددیہ میں ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ جب حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے تو وہاں کئی بزرگان دین سے ملے۔ واپسی پر ریاست ٹونک کے نواب نے اپنے پاس بلا لیا۔ وہیں بیمار ہوئے اور انتقال کیا۔ لحد مبارک دہلی میں حضرت غلام علیؒ کی خانقاہ میں بنائی گئی۔

ابوسفیان

تاریخ اسلام میں مشہور تین اشخاص، جن میں سے ایک زمانۂ قبل از اسلام میں جبل الرزاویہ میں البارہ کا بادشاہ تھا۔ یہاں ایک قلعہ بھی ابوسفیان کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اسے قتل کر دیا تو سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا۔

ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب حضرت رسول اکرمؐ کے چچا زاد بھائی تھے نام مغیرہ تھا۔ انھیں عام طور پر ابوسفیان بن حرب بن امیہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے، جو فتح مکہ تک بڑے دشمن سلام رہے۔ ابوسفیان بن حارث بھی فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے واقعہ مشہور ہے کہ ایک رات ان تینوں نے آنحضرت صلعم کے دولت خانے کا رخ کیا۔ تینوں ایک دوسرے سے بے خبر تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر آنحضورؐ کی تعلیم ہے کیا؟ رات کا بیشتر حصہ ان کے کانوں میں قرآن مجید کی تلاوت کی آواز آتی رہی صبح سویرے تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ادھر نہیں آئیں گے مگر اگلے روز پھر کوئی نامعلوم ساجذبہ انہیں در مصطفیٰؐ پر لے آیا۔ اس روز بھی انھوں نے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کی مگر تیسرے روز وہ پھر چلے آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا ان کے دلوں پر کتنا اثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

قریش کے قافلوں کی قیادت اکثر اوقات خود ابوسفیان کرتے تھے۔ ۲ھ/۶۲۴ء میں ان کا قافلہ شام سے لوٹ رہا تھا کہ انھیں مدینہ سے مسلمانوں کے حملے کا خدشہ پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اہل مکہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس پر ابوجہل ایک ہزار کا لشکر لے کر وہاں پہنچا۔ ابوسفیان پرامن رہنا چاہتا تھا مگر ابوجہل کی ضد اہل مکہ پر

جنگ بدر کی تباہی لانے کا موجب بنی۔ ابوسفیان کا بیٹا حنظلہ اس جنگ میں مارا گیا اس کے بعد ابوسفیان نے جنگ احد اور جنگ خندق میں کفار کے لشکر کی قیادت کی صلح حدیبیہ کی تنسیخ پر اظہار ندامت کے لیے اہل مکہ نے ابوسفیان ہی کو مدینہ بھیجا تاکہ معاہدے کی تجدید کی جا سکے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ فتح مکہ کے وقت ابوسفیان نے مکہ سے باہر آکر اطاعت قبول کر لی تھی، جس پر اعلان ہوا تھا کہ ابوسفیان کا گھر بھی جائے امن ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد ابوسفیان نے غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف میں شرکت کی جس میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ طائف میں لات کا مشہور بت توڑنے میں بھی ابوسفیان شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۲ھ/۶۵۳ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۸ برس کی تھی۔ ان کا بیٹا یزید ایک مسلمان سپہ سالار تھا اس کی وفات ۱۸ھ/۶۳۹ء کے بعد ابوسفیان کے دوسرے بیٹے حضرت معاویہؓ بنی امیہ کے پہلے خلیفہ بنے ان کا بیٹا یزید تھا جس کے [illegible] حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت کو کربلا کا اندوہناک واقعہ پیش آیا۔

ابوسلمہؓ عبداللہ بن عبدالا[illegible] [illegible] [illegible] کی والدہ حضرت برہؓ رسول پاک کی پھوپھی تھیں۔ [illegible] ہجرت حبشہ [illegible] اپنی اہلیہ [illegible] ہوئے حبشہ میں دونوں بار ہجرت [illegible] واپس آکر [illegible] اور احد میں حصہ لیا۔ جنگ احد [illegible] زخم آیا جس [illegible] کو وفات پائی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی اہلیہ [illegible]

ابوطالبؓ (۸۵ قبل ہجری [illegible] ۳ قبل ہجری [illegible]) [illegible] حضرت [illegible] عبداللہ اور آنحضور صلعم [illegible] کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت کا حق [illegible] کے [illegible] عبدالمطلب اس [illegible] نے آپ کو اپنی سرپرستی میں لیا [illegible] اور آخر کفالت کا حق [illegible] سے اپنے بچوں سے بھی زیادہ [illegible] کرتے تھے۔ محمد [illegible] عبدالمطلب کے سب سے [illegible] بیٹے نہ تھے [illegible] عبدالمطلب [illegible] میں نبی کریمؐ کی کفالت انھیں [illegible] دی گئی۔ حارث [illegible] صاحب ثروت و دولت نہ تھے [illegible] کے پاس وسعت [illegible] یہی وجہ ہے کہ کعبہ کے متعلق [illegible] سقایت کا منصب [illegible] عبدالمطلب کی طرح ابو[illegible] بھی اپنے بھتیجے پر [illegible] کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو ابو[illegible] کے تجارت کی غرض سے [illegible] کی صعوبتیں اس امر میں مانع [illegible] پیارے بھتیجے کے اصرار [illegible] میں بصرے کے سفر پر انہیں [illegible] لے لیا۔

حضرت ابوطالب کو عا[illegible] اس سفر تجارت میں کوئی نفع [illegible] انھوں نے تمدن نہیں کیا اور محدود زندگی ہی میں محصور رہے۔ [illegible] کے ساتھ آنحضورؐ کی نکاح کی [illegible] چیت بھی ابوطالب ہی نے کی اور ان نے نکاح [illegible] کا خطبہ بھی ابوطالب ہی نے [illegible]

بعثت کے بعد ابوطا[لب] نے خود تو اسلام قبول نہ کیا، مگر اپنے بھتیجے کی [illegible] کرتے اور ان کی حفاظت کے لیے آمادہ رہے۔ ان حالات میں سرداران قریش ابو سفیان کی معیت میں ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ کا بھتیجا ہمارے خداؤں [illegible]

کی مذمت اور ہمارے دین پر اعتراض کرتا ہے۔ اسے سمجھا دیجیے کہ ہم سے تعرض نہ کرے یا پھر اسے ہمارے حوالے کر دیجیے۔ ہم خود نبٹ لیں گے۔ اس پر ابو طالبؓ نے آنحضرت صلعم کا یہ جواب سن کر کہ بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں تب بھی اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ابو طالب نے کہا "بھتیجے! جاؤ اور جس کام میں لگے ہوئے ہو اسے سرانجام دو۔ میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔" یہی جواب قریش مکہ کو بھی ملا۔ اس پر قریش نے ابو طالب کے سماجی مقاطعے کا اعلان کر دیا اور یہ خاندان ابو قبیس کی پہاڑی کے ایک درّے میں محصور ہو گئے۔ جو شعب ابی طالب کے نام سے موسوم ہے۔ پورے تین برس تک آپ اس میں بھوک اور مصائب برداشت کرتے رہے۔ بالآخر خود کفار ہی کی کوششوں سے یہ مقاطعہ ختم ہوا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ابو طالبؓ انتقال کر گئے۔ اس وقت حضرت رسول اکرمؐ ۴۹ برس ۸ ماہ کے تھے۔ حضرت مسیبؓ کی ایک روایت ہے کہ آخری وقت میں آنحضورؐ نے کہا کہ چچا کلمہ پڑھ لیجیے۔ مگر ان کے آخری الفاظ یہ تھے "عبدالمطلب کے مذہب پر"۔ ابن حجر کے نزدیک اگرچہ حضرت ابو طالبؓ کا اسلام ثابت نہیں مگر حضرت عباسؓ کی روایت کے مطابق آخرت میں ابو طالبؓ کی سزا اور اس میں امداد رسولؐ کی وجہ سے تخفیف ہے۔ شیعی مسلک کے مطابق ابو طالبؓ نے مسلمانوں کی موت پائی تھی۔ شبلی نعمانی بھی اس مسلک کے قائل ہیں۔

ابو طالبؓ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ یہ مسلمان ہوئیں۔ ان سے طالب، ام ہانی، عقیل، جعفر، جمانہ، علی اور ام طالب پیدا ہوئیں۔ دوسری بیوی سے طلیق پیدا ہوا۔

ابو طالبؓ شاعر اور خطیب کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ایک چھوٹا سا دیوان ان سے منسوب ہے جو طبع ہو چکا ہے۔ اس میں چار سو اکیس اشعار ہیں جن کے ساتھ ایک لامیہ قصیدہ بھی شامل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قصیدہ آپ کا کلام نہ ہو۔

ابو طلحہؓ انصاری صحابی۔ زید نام تھا۔ خاندان نجار کی شاخ عمرو بن مالک سے تعلق رکھتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانی میں مسلمان ہوئے۔ غزوۂ احد میں حضرت رسول اکرمؐ کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے اور تیر چلاتے رہے۔ غزوۂ حنین میں بیس اکیس آدمیوں کو قتل کیا۔ حدیث میں ان کی فضیلت مہمان نوازی کی حیثیت سے ہے۔ کیونکہ انہوں نے حضورؐ کے مہمان کو کھانا کھلایا مگر خود بال بچوں سمیت اندھیرے میں بیٹھے رہے اور بھوکے رہے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد شام میں مقیم ہو گئے۔ ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔

ابو عبس بن جبیرؓ عبدالرحمان بن جبیر ممتاز صحابی، خاندان حارثہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ہجرت سے قبل اسلام لائے اور کعبہ کے بتوں کو توڑنے میں حصہ لیا۔ غزوۂ بدر کے وقت ۴۸ برس کے تھے۔ بڑھاپے میں ایک آنکھ کی بینائی کھو گئی تھی جس پر حضورؐ نے اپنا عصا مرحمت فرمایا، جس کے سہارے چل پھر لیا کرتے تھے۔ ۳۴ھ میں فوت ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کا شمار ممتاز صحابۂ حدیث میں ہوتا ہے۔ عالم، فاضل اور صاحب روایت تھے۔

ابو عبید البکری عبداللہ بن عبدالعزیز بن محمد بن ایوب۔ پانچویں صدی ہجری گیارہویں صدی عیسوی کا مشہور مسلمان جغرافیہ دان۔ تیس برس کی عمر میں اپنے باپ کے ساتھ قرطبہ چلا گیا۔ یہاں تھوڑے ہی دنوں میں ادیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ یہاں اس نے اندلس میں المرابطون خاندان کی عسکری اور سیاسی مداخلت کو غور سے دیکھا۔ یہیں شوال ۴۸۷ھ/ اکتوبر ۱۰۹۴ء میں انتقال کیا۔

البکری کو تقریباً تمام علوم میں مہارت حاصل تھی۔ مگر اسے شہرت صرف جغرافیہ دان ہونے کی حیثیت سے ملی۔ اس کے علاوہ وہ الٰہیات اور نباتیات وغیرہ کا بھی عمدہ ذوق رکھتا تھا۔

ابو عبید کی جغرافیائی تصانیف صرف دو ہیں۔ ایک "معجم ما استعجم" اور دوسری "المسالک والممالک"۔ ان میں سے پہلی کتاب زیادہ تر ایک فہرست کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری کتاب، جس کا ابھی ایک ہی حصہ دستیاب ہوا ہے، عام جغرافیے اور مسلم قومیت پر بحث کرتی ہے، اس میں مختلف مقامات کی سیاحتی معلومات درج ہیں۔

الٰہیات میں اس کے نام ایک کتاب منسوب ہے، جو پیغمبر اسلام کی رسالت کی نشانیوں کو بیان کرتی ہے اور نباتیات میں اس کی کتاب "النبات" اہم ہے۔ اس پر ابن بیطار نے بھی خامہ اٹھایا تھا۔

ابو عبیدہؓ (۔ ۱۸ھ/۶۳۹ء) عامر بن عبداللہ بن جراح۔ صحابی و سپہ سالار۔ ابتدا ہی میں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ آنحضرت نے انھیں امین الامت کا لقب دیا تھا۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ مکہ میں کفار کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرنے کے بعد جب مدینہ ہجرت فرمائی تو حضرت کلثوم بن ہدم کے ہاں قیام فرمایا۔ تقریباً تمام غزوات میں شرکت کی۔

عہد رسالت ہی میں ابو عبیدہؓ مختلف مہمات کے سپہ سالار بنے۔ صلح حدیبیہ میں بطور گواہ دستخط کیے۔ غزوہ الفتح میں فوج کے ایک حصے کی قیادت ان کے سپرد تھی۔ آنحضورؐ انھیں مختلف جگہوں پر صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ نجران اور بحرین میں اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے۔ خلافت کے سوال پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی پیش کیا تھا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمر کے ساتھ آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایران اور شام کے محاذ پر اسلامی لشکر کی قیادت ابو عبیدہؓ کے سپرد ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے انہیں خالد بن ولید کی جگہ شام کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا۔ ان کے کارناموں میں دمشق، حلب، حمص، حماۃ اور لاذقیہ کی فتح اہم ہے۔

حضرت ابو عبیدہ حمص میں تھے کہ انھیں ہرقل روم کے حملے کی اطلاع ملی چنانچہ آپ دمشق روانہ ہو گئے۔ چونکہ جزیرہ حمص کی حفاظت نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے ابو عبیدہؓ نے جزیے کی ساری رقم اہل حمص کو واپس کر دی۔ اس کے بعد ہر کوئی جانتا ہے کہ جنگ یرموک میں ہرقل نے شکست کھائی اور شام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گیا۔

یرموک اور اس کے بعد انطاکیہ فتح کے بعد ابو عبیدہ بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے اس قبلہ اول کو حضرت عمرؓ کے آنے پر مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ھ میں عیسائیوں نے حمص پر دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ یہ آخری معرکہ تھا، جو حضرت ابو عبیدہؓ نے انجام دیا۔

۱۸ھ میں شام میں طاعون کی وبا پھیلی۔ حضرت عمر کے کہنے کے باوجود حضرت ابو عبیدہؓ وہاں سے نہ نکلے اور بالآخر اسی مرض کی لپیٹ میں آ گئے۔ اور اسی میں بعمر ۵۸ برس انتقال کیا۔ ان کی قبر کے بارے میں صحیح معلومات موجود نہیں۔ شاید دمشق ہی میں دفن ہوئے۔

حضرت ابو عبیدہؓ صف اول کے صحابہ میں شامل تھے۔ انھیں مہاجرین اور انصار دونوں میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ زبردست سیاسی اور جنگی سوجھ بوجھ کے حامل تھے۔ اس لیے دونوں ابتدائی خلفاء نے ان کی صلاحیتوں سے کما حقہ

فائدہ اٹھایا۔

فوجی اور انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ابوعبیدہؓ اسلام کی اشاعت اور تربیت الناس سے بھی غافل نہیں رہے۔ تقویٰ، سادگی، زہد اور انکسار، شجاعت اور ہمت کیساتھ ساتھ ان میں بے حد نمایاں تھا۔ اطاعت اللہ اور اتباع رسولؐ میں ہمیشہ پیش پیش رہے

ابوعثمان سعید (وفات ۲۷۲ھ/۹۸۳ء) ابوعثمان سعید بن اسلام مغربی، مشہور صوفی، ولی، کامل، شیخ ابوالحسن صائغ دینوری کے مرید اور شیخ ابوعلی کاتب کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ شروع میں بے حد دولت مند تھے۔ "انوار اصفیا" کے مطابق ایک کنیز کی وفات دیکھ کر دنیا داری چھوڑ دی اور مجاہدہ شروع کر دیا۔ کامل تیس برس عبادت ریاضت کے بعد مکہ معظمہ کا قصد کیا۔ وہاں رہ کر مجاوری بھی کی اور حبیب مغربی اور ابویعقوب نہرجوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ وہاں سے نیشاپور واپس آئے اور وہیں انتقال کیا۔ ابوعثمان حری اور ابوعثمان لعلی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوعمرو ابراہیم زجاجی آپ کے مرید تھے۔

ابوعثمان سعید کے نزدیک تصوف علائق دنیاوی کو منقطع کرنا ہے۔ اس راہ میں صرف دو باتیں راہنمائی کرتی ہیں، نبوت اور حدیث نبوت۔ نبوت تو ختم ہو گئی حدیث نبوت باقی ہے اور مجاہدہ کا راستہ کھلا ہے۔ آپ کے نزدیک صوفی کے لئے لازم ہے کہ محنت و مشقت سے اپنے لئے رزق حلال پیدا کرے تاکہ امیروں سے رجوع کرے کیونکہ جو درویش امیروں سے رجوع کرتا ہے، اسے فلاح نہیں۔

ابوعلی رودباری رح (وفات ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) ابوعلی احمد بن محمد رودباری صوفی، محدث، فقیہہ اور ادیب، شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید اور "اخبار الصالحین" کے مطابق اپنے وقت کے امام، اپنی قوم کے سردار اور حضرت ابوعبداللہ رودباریؒ کے ماموں تھے۔ شیخ ابوعلی کاتب کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص میں ابوعلی رودباری سے زیادہ علم شریعت و حقیقت کو جمع نہیں دیکھا آپ بغداد سے مصر گئے اور وہیں وفات پائی۔ نزع کے وقت ایک شعر ورد زبان تھا۔ "تیرے حق کی قسم جب تک تجھے دیکھتا رہوں گا۔ تیرے سوا کسی پر محبت کی نظر نہ ڈالوں گا۔" (ترجمہ)

"تذکرۃ الاولیاء" میں ہے کہ ابوعلی رودباری کے نزدیک تصوف یہ ہے کہ صوفی صوف کا لباس پہنے اور نفس کو جفا اور بلا میں مبتلا کرے اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر رسولؐ کی سنت پر چلے۔

ابوعلی کاتب رح (وفات ۳۴۶ھ/۹۵۷ء) صوفی بزرگ اور ولی کامل مصر کے مشائخ عظام میں سے تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ سلسلہ بیعت ابوعلی رودباریؒ کے ذریعے حضرت جنید بغدادی تک پہنچتا ہے۔ ابوبکر مصری سے بھی فیض حاصل کیا۔ "انوار اصفیاء" کے مطابق مصر ہی میں وفات پائی۔

ابوفرج اصفہانی (۲۸۴ھ/۸۹۷ء — ۱۴ ذی الحج ۳۵۶ھ/۲۰ نومبر ۹۶۷ء) علی بن حسین بن محمد بن احمد القرشی، مورخ، ادیب اور شاعر، ایران میں پیدا ہوا۔ شیعی زیدی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ تعلیم بغداد میں حاصل کی اور اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ وہیں گذارا۔ مرنے سے پہلے دیوانگی میں مبتلا ہوا اور بغداد ہی میں فوت ہوا۔

اس کی سب سے اہم تصنیف "کتاب الاغانی" ہے، جس میں معروف مغنیوں کے نغمے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے عربی ثقافت کی ایک بہت بڑی تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے، اس کا پہلا ایڈیشن بولاق سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔

دوسری کتاب "مقاتل الطالبین واخبارہم" تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے اس میں آل ابوطالب کے نیک اور صالح افراد کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب تہران سے ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء اور قاہرہ سے ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی ہے

ابوقبیس ایک پہاڑی کا نام، جو مکہ معظمہ میں مسجد حرام سے چند سو میٹر کے فاصلے سے شروع ہوتی ہے۔ حجر اسود اس پہاڑی کی سمت نصب ہے یہ پہاڑی اچانک اس طرح بلند ہوئی ہے کہ اس سے ساری مسجد نظر آجاتی ہے اب اسے چاروں طرف سے عمارتوں نے گھیر رکھا ہے۔ کوہ صفا بھی اسی کے دامن میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی مکہ معظمہ کے مشرق میں واقع ہے۔

ابوقبیس کی وجہ تسمیہ کا علم نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ پہاڑی تاریخی لحاظ سے خاصی مشہور ہے۔ ۶۴ھ/۶۸۳ء میں خانہ کعبہ پر جس منجنیق کے ذریعے آگ برسائی گئی تھی، وہ اسی پہاڑی پر نصب تھی۔ قرون وسطیٰ میں اس کی چوٹی پر ایک قلعہ بنایا گیا تھا۔ اگرچہ اب اس کے نشانات باقی نہیں رہے۔ سنوسی سلسلے کا پہلا زاویہ ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۷ء میں اسی پر تعمیر ہوا تھا۔ اب پہاڑی پر سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی مسجد نظر آتی ہے۔ ایسی بہت سی مساجد پورے شہر میں موجود ہیں

ابوقتادہ (وفات ۵۴ھ/۶۷۴ء) حارث بن ربعی انصاری خزرجی، صحابی رسول، ان سے ڈیڑھ سو احادیث کی روایت کی جاتی ہے۔ ہجرت سے دس سال قبل مدینہ میں پیدا ہوئے اور عقبہ ثانیہ کے بعد اسلام لائے۔ بہترین تیر انداز اور شہسوار تھے۔ اس لئے تمام غزوات میں بڑی بہادری سے لڑے۔ یہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے مال غنیمت بیچ کر اپنے لئے ایک باغ خرید شکار کا بھی بے حد شوق رکھتے تھے۔ مدینہ میں انتقال کیا۔ نماز جنازہ حضرت علیؓ نے پڑھائی۔

ابوقیس حرمہ رضؓ صحابی رسول، جن کی روزہ داری کی حالت دیکھ کر یہ آیت نازل ہوئی کہ "تم طلوع فجر تک کھانا کھا سکتے ہو۔" یہ جو بخاریں سے تھے ابتدا ہی سے بت پرستی کے مخالف تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے قبل بھی ایک ایسی عبادت گاہ بنائی تھی جس میں کسی نجس مرد اور عورت کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہجرت کے بعد جب حضور اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو اگرچہ ضعیف و ناتواں تھے، اس کے باوجود بڑے جوش وخروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور اسلام سے مشرف ہوئے۔ نہایت پاک صاف زاہد اور عابد تھے۔ دن کو محنت مزدوری کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ روزہ رکھتے تھے۔ اس وقت تک سحری کے وقت کھانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ ان کی خراب حالت دیکھ کر ان کی اہلیہ حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا ماجرا بیان کیا۔ اس پر حکم باری نازل ہوا اور مسلمانوں کو صبح کے وقت کھانا پینے کی اجازت مل گئی۔

ابوقبیس کی پہاڑی

ابولہب ابولہب بن عبدالمطلب بن ہاشم، حضرت رسول اکرمؐ کا چچا اور بہت بڑا دشمن اسلام۔ اس کا نام عبدالعزیٰ تھا اور کنیت ابوعتبہ تھی۔ قرآن مجید میں اس کے نام پر ایک سورت بھی اتری جس میں اسے ملعون ٹھہرایا گیا ہے۔ ابولہب کے معنی ہیں "شعلے والا"۔

جب آنحضورؐ نے اہل مکہ کو دعوت اسلام دی تو ابولہب نے اٹھ کر کہا تھا "تو ہلاک اور رسوا ہو۔ کیا تو نے ہمیں اسی غرض سے جمع کیا تھا۔" آنحضورؐ خاموش رہے مگر قرآن کی ایک سو گیارہویں سورۃ اللہب نازل ہوئی۔

"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹے اور وہ ہلاک ہوا۔ نہ اس کا مال کام آیا اور نہ اس کی جدوجہد۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔"

اگرچہ بعثت نبوی سے پہلے ابولہب کے تعلقات خوشگوار تھے اور آنحضورؐ کی صاحبزادیوں رقیہؓ اور ام کلثومؓ کا نکاح یا منگنی ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ ہونا بتایا گیا ہے۔ مگر اعلان نبوت کے بعد سے یہ شخص آنحضورؐ کا سب سے بڑا دشمن ہوگیا تھا۔ اس کے بیٹے عتبہ نے حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی۔ اگرچہ وہ بعد میں ۸ھ ۶۳۰ء کو مسلمان ہوگیا۔ اور عتیبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا۔ جب ابوطالب اور ان کا خاندان ایک گھاٹی میں محصور ہوگیا تو ابولہب نے بنی ہاشم سے علیحدگی اختیار کرلی مگر اس مقاطعے کے خاتمے اور ابوطالب کی وفات کے بعد خاندان کا سربراہ بن بیٹھا۔

غزوۂ بدر کے بعد ابولہب نے وفات پائی۔ وہ اس طرح مرا کہ چیچک سے اس کا سارا جسم داغ دار تھا۔ اس کے نزدیک کوئی نہ جاتا تھا، حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی اس پر وہی کوٹھڑی گرا دی گئی، جس میں اسکی لاش پڑی سڑ رہی تھی اس کی بیوی کی موت بھی بڑی دردناک اور سبق آموز ہے۔ وہ آنحضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھایا کرتی تھی۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ اسے قیامت کے روز فرشتے کھجور کی رسی کے ساتھ گھسیٹتے پھریں گے، چنانچہ وہی ہوا اور لکڑیوں کے گٹھے کی رسی سے اس کا گلا گھٹ گیا، جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

ابومحجن ثقفیؓ ایک بہادر مسلمان سپاہی اور شاعر، عمرو نام تھا، سب سے آخر میں اسلام قبول کیا۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر کہیں شراب پی لی جس پر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے گرفتار کرکے اپنے مکان میں قید کردیا۔ سعدؓ علالت کے باعث جنگ میں شریک نہ ہوسکے تھے البتہ چھت پر سے تماشا دیکھ رہے تھے ادھر ابومحجن قید خانے میں پڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا اور شعر پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں حضرت سعدؓ کی بیوی وہاں سے گذریں تو انہوں نے منت سے کہا کہ میری بیڑیاں کھول دو۔ جنگ کے بعد میں شام کو خود آکر بیڑیاں پہن لوں گا۔ اس پر ان کا دل پسیج گیا اور انھوں نے اس کی بیڑیاں کھول دیں۔ ابومحجن قید خانے سے نکلا اور میدان جہاد میں شجاعت کے جوہر دکھانے لگا۔ حضرت سعد نے ایک نوجوان کو اس طرح بےجگری سے لڑتے دیکھا تو پوچھا کہ کون ہے۔ پتا چلا کہ وہ ابومحجن ہے جو جنگ کے خاتمے کے بعد قید خانے میں پھر سے آبیٹھا تھا۔ اس پر حضرت سعدؓ نے اس کا قصور معاف کردیا۔ مگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں اکثر جلاوطنی کی سزا پاتا رہا۔ کیونکہ اس کے اشعار میں عام طور پر شراب

کے جائز کرنے کا خیال ملتا ہے۔

ابومدین شعیب (۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء ـ ۵۹۴ھ/۱۱۹۷ء) شیخ الشیوخ، صوفی اور بزرگ۔ اشبیلیہ کے قریب ایک قصبے قطنیانہ میں پیدا ہوئے آبائی پیشہ بافندگی تھا۔ تکمیل علم کے لئے شمالی افریقہ گئے اور فاس میں ابو یعزیٰ اور علی بن حرزہم جیسے اساتذہ سے تحصیل علم کیا۔ پھر مشرق کی طرف سفر کے دوران میں انھوں نے الغزالی جیسے علماء سے بھی استفادہ کیا اور واپس آکر بجایہ میں سکونت اختیار کرلی یہیں انتقال کیا اور تلمسان کے نواح میں دفن ہوئے۔

ابن عربی کے نزدیک ابومدین کا درجہ شیخ الشیوخ کا ہے۔ ان کی قدر و منزلت کا زیادہ تر سبب ان کے اقوال ہیں۔ ان کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی واردات قلبی کو بڑے سلیس اور عمدہ طریقے سے لوگوں تک پہنچایا۔ ان کے ساتھ بہت سی کرامات بھی منسوب ہیں۔ تلمسان کے لوگ انھیں اپنے شہر کا داتا خیال کرتے ہیں ان کا مزار آج بھی مرجع ہر خاص و عام ہے۔

ابومسعود بدری (وفات ۴۰ھ/۶۶۰ء) عقبہ نام، صحابی، عقبۂ ثانیہ میں مشرف با اسلام ہوئے۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔ بدر میں کچھ عرصہ رہنے کی وجہ سے بدری کہلائے۔ جنگ صفین میں حضرت علیؓ نے انھیں کوفہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس عہدے کے خاتمے کے بعد آپ مدینہ واپس لوٹ آئے۔ ان کی ایک لڑکی کی شادی حضرت امام حسینؓ سے ہوئی۔ جن سے زیدؓ پیدا ہوئے

ابومسلم خراسانی (قتل ۱۳۷ھ/۷۵۴ء) ایک ایرانی جرنیل، جس نے امام ابراہیم بن محمد کے ایماء پر خراسان میں بغاوت کا آغاز کیا۔ اور یوں عباسی خلافت کے لئے راہ ہموار کی۔ یکم شوال ۱۲۹ھ/۱۵ جون ۷۴۷ء کو اس نے بغاوت کا علم بلند کردیا۔ مرو پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اموی افواج کو پے در پے شکستیں دیں اور یوں پہلے عباسی خلیفہ سفاح کی خلافت کا اعلان ہوا جس کے بعد بھی ابومسلم والی مملکت کی حیثیت سے موجود رہا۔ بنو عباس اس کی طاقت سے ہمیشہ خائف رہے چنانچہ خلیفہ المنصور نے اسے قتل کرادیا۔

ابونعیم اصفہانی (رجب ۳۳۶ھ/فروری ۹۴۸ء ـ ۱۲ محرم ۴۳۰ھ/۲۲ اکتوبر ۱۰۳۸ء) احمد بن عبداللہ بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران، صوفی اور فقیہہ، اصفہان میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر سے جعفر خلدی اور الاصم سے تعلیم کا آغاز کیا۔ ۳۵۶ھ/۹۶۷ء میں عراق اور خراسان کا سفر کیا اور چودہ برس ہی میں ان کا شمار حدیث کے اساتذہ میں ہونے لگا۔ انہوں نے اصفہان ہی میں وفات پائی۔

ابونعیم کی کتاب "حلیۃ الاولیا و طبقات الاصفیا" بے حد مشہور ہے جو انہوں نے ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں لکھی اور قاہرہ سے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۶۴۹ صوفیا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسری بڑی تصنیف "اخبار اصفہان" ہے جو اصفہان کی ایک مختصر سی تاریخ ہے، اس میں بھی زیادہ تر علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ابوہذیل العلاف محمد بن الہذیل بن عبداللہ بن مکحول، معتزلہ فرقے کا پہلا متکلم عالم، البصرہ میں پیدا ہوا۔ تاریخ پیدائش ۱۳۵ھ/۷۵۲ء سے ۲۰۳ھ/۸۱۸ء کے درمیان کہیں ہوئی۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۸۱۹ء میں اس نے بغداد میں سکونت اختیار کی اور خلیفہ الواثق کے عہد میں فوت ہوا۔

ابوہذیل العلاف پہلا شخص ہے، جس نے الٰہیات میں نظری مباحث کا آغاز کیا۔ اس میں اس نے طبیعیات کے اصولوں اور تصورات خصوصاً روح، مادہ جنس، حواس وغیرہ کے حادث ہونے اور جوہر کے وجود کے تصور کو استعمال کیا تاہم دہریت کا بھی پورے زور شور سے مقابلہ کیا۔

ابوہذیل کے نزدیک خدا ایک ہے اور مخلوق سے الگ تھلگ غیر مشابہ کوئی ہستی ہے۔ لیکن اس کا جسم نہیں اور نہ ہی کوئی صورت اور کوئی حد ہے وہ علیم بصیر اور قدیر بھی۔ حیّ اور قیوم بھی ہے اور ابدیت کے ساتھ ابدی ہے۔ اس کا علم اور قدرت عین ذات ہیں۔ وہ ہر جگہ حاضر ہے اور ہر شے میں جاری و ساری ہے حتیٰ کہ عالم آخرت میں بھی وہ ہر شے میں موجود اور غیر مرئی رہے گا۔ اسے ان مادی آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

ارسطو کے نزدیک کائنات جسے خدا نے حرکت دی ہے ابدی ہے۔ اسی طرح حرکت بھی اپنے محرک یعنی خدا کے ساتھ ابدی ہے۔ ابوہذیل اس حرکت کو مخلوق بتاتا ہے۔ جو اپنی انتہا کو پہنچ کر رک جائے گی۔ اسی کے بعد اگلا جہان شروع ہوگا جس کے بعد ہر شے دائمی حیثیت اختیار کرجائے گی۔ جنت اور دوزخ بھی دائمی حیثیت کے مالک ہوں گے، جس میں بسنے والے ایک حالت سکون میں قائم ہو جائیں گے

ابوہذیل کے ان عقائد کا اثر زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ خود اس نے بھی اپنے عقائد کو منسوخ کرنا شروع کردیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ تعالٰی شر کے ارتکاب پر بھی قادر ہے لیکن اپنے خیر محض ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا۔ البتہ انسان شر کا ارتکاب کرتا ہے، جس پر وہ قادر بھی ہے۔

ابوہریرہؓ (وفات ۵۸ھ/۶۷۶ء) عمیر بن عامر، صحابی رسول اور محدث۔ نام عبدالرحمٰن بن صخر بھی بتایا جاتا ہے۔ ہریرہ کا لفظ ہرہ (بلی) سے نکلا ہے۔ اس کنیت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ دل بہلانے کے لئے ایک بلی کا بچہ ہمیشہ ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اس لئے ابوہریرہ (بلی والا) کے نام سے مشہور ہوئے۔

۷ھ/۶۲۹ء میں جب آنحضور صلعم غزوہ خیبر میں مصروف تھے تو ابوہریرہؓ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس تھی۔ مدینہ آئے تو اصحاب صفہ میں شریک ہوگئے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بحرین کے عامل مقرر ہوئے۔ سن وفات ۵۸ھ یا ۵۹ھ/۶۷۹ء ہے۔ ولید نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے

اگرچہ صحابی کی حیثیت سے بہت تھوڑا عرصہ حضورؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا لیکن آپؓ نے اقوال و احادیث کو ازبر کئے رکھتے تھے۔ اس لئے آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ "ابوہریرہ" علم کا ظرف ہے۔

ابوہریرہؓ سے ۵۳۷۵ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۳۲۵ متفق علیہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے ان کی روایات ۳۱۳ صفحات میں قلم بند کی تھیں۔ امام ابوداؤد کے نزدیک ابوہریرہ کچھ فارسی بھی جانتے تھے اور انھیں تورات سے بھی واقفیت تھی۔ امام بخاری کی "کتاب العلم" میں ہے کہ ایک بار ابوہریرہؓ نے آنحضورؐ سے عرض کی کہ جو کچھ سنتا ہوں، بھول جاتا ہوں تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ جب میں گفتگو کروں تو تم اپنا جبہ پھیلا دیا کرو اور جب میں بات ختم کرچکوں تو اسے اپنے گرد لپیٹ لیا کرو۔ چنانچہ ابوہریرہ نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد سے وہ کبھی کوئی بات نہ بھولے۔

ابو یعقوب یوسف مراکش کے الموحدون، مومنی خاندان کا دوسرا حکمران۔ عبدالمومن کا بیٹا، جس نے ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء سے ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء تک حکومت کی۔ اس کے بڑے بھائی محمد کی ولی عہدی کا اعلان ہو چکا تھا، مگر اسے غیر قانونی طور پر حکومت پر براجمان ہونے کا موقع مل گیا۔ لیکن اس کے خلاف اکثر صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی۔ اس لیے اس نے امیر المومنین کا لقب اختیار نہ کیا۔

یوسف کے دور میں پرتگالی فوجوں نے شہر بطلیموس پر حملہ کر دیا۔ یوسف نے اپنی ساری فوج جمع کی اور اندلس پہنچ گیا۔ قرطبہ میں بیٹھ کر اس نے معرکے کی قیادت شروع کر دی۔ اندلس میں اس کے تقریباً تمام معرکے ناکام ثابت ہوئے۔ ۵۷۰ھ/۱۱۷۵ء کے بعد یوسف واپس مراکش چلا گیا۔ اس کے بہت سے بھائی فوت ہو چکے تھے نیز مختلف قبائل نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ ادھر فرڈیننڈ نے بھی الموحدون کے ساتھ دوستی کا معاہدہ منسوخ کر دیا تھا۔ قشتالہ اور لیون کی مملکتوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ فرڈیننڈ ان کی مدد پر آیا۔ یوسف کے لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس دوران میں یوسف زخمی ہو گیا اور ۱۸ ربیع الثانی ۵۸۰ھ/۲۹ جولائی ۱۱۸۴ء کو اشبیلیہ کی شاہراہ پر فوت ہو گیا۔

ابو یوسفؒ، امام (۱۱۳ھ/۷۳۱ء – ۵ ربیع الاوّل ۱۸۲ھ/۲۷ اپریل ۷۹۸ء) یعقوب بن ابراہیم انصاری، فقیہ، محدث اور مورخ، حنفی دبستان کے امام، اور امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد خاص۔ امام مالکؒ بن انس سے بھی فقہ اور حدیث میں تعلیم حاصل کی۔ بچپن انتہائی کسمپرسی میں گذرا۔ ابن اسحاق سے المغازی سنتے تھے۔ دوبار کوفے سے بصرہ گئے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کے علم اور رتبے کا بڑا خیال رکھا اور انہیں بغداد میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور کیا۔ یہاں وہ اپنی وفات تک رہے۔ امام شیبانی، امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، طیالسی، مدینی اور جاحظ آپ کے شاگردوں اور پیروکاروں میں سے تھے۔

امام ابو یوسف کی تصانیف میں سے صرف "کتاب الخراج" بچی ہے، جو ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس میں نظام عدل و نظام محاصل وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب الآثار (کوفی احادیث کا مجموعہ)، کتاب اختلاف ابی حنیفہ و ابن لیلیٰ (فقہ کے دو مکاتب خیال کا موازنہ) اور کئی مناظرانہ رسالے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ حنفی مسلک کے سب سے بڑے اور پرجوش مبلغ ہیں۔ اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کے برعکس وہ احادیث پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں اور کئی مقامات پر ابو حنیفہؒ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود مسلک حنفیہ کے بانیوں میں گنے جاتے ہیں۔ ایک اہم بات جو ہمیں امام ابو یوسف کے فقہ میں نظر آتی ہے یہ ہے کہ ان کے ہاں استدلال کے عام طریقے اور تلخ مناظرے ملتے ہیں۔ چونکہ وہ اکثر اپنی رائے بدلتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کا اپنا کوئی دبستان قائم نہ ہو سکا۔ اور ان کے شاگردوں نے اکثر اوقات ان سے اختلاف کیا۔

ابو یوسف یعقوب مراکش کے الموحدون خاندان کا تیسرا حکمران، ابو یعقوب یوسف کا بیٹا، جس نے ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء سے ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء تک حکومت کی۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کا طرز حکومت آمرانہ تھا۔ تاہم عدل و انصاف کے لیے کوشاں رہا۔ اسی دوران میں بنو غانیہ کے المرابطون نے بجایہ پر قبضہ کر لیا۔ ابو یوسف نے فوراً جوابی قدم اٹھایا اور ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء کو الجزائر، بجایہ اور دیگر مقامات جو المرابطون کے قبضے میں چلے گئے تھے، از سر نو فتح کر لیے۔ اس وقت علی بن غانیہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، چنانچہ ابو یوسف ادھر بڑھا۔ علی محاصرہ چھوڑ کر توزر کی طرف پلٹا اور طرابلس کے قراقوش کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ ابو یوسف نے ان باغیوں کو دبانا چاہا لیکن شکست کھائی تاہم تین ہی ماہ بعد ۹ شعبان ۵۸۳ھ/۱۴ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو اس نے الحمی کے مقام پر بدلہ لے لیا اور ایک بار پھر افریقہ کا سارا جنوبی حصہ اس کے قبضہ میں آ گیا۔

ابو یوسف اپنے سارے دور حکومت میں باغیوں اور پرتگالیوں کے ساتھ لڑنے میں مصروف رہا۔ نیز اسے عیسائی ہسپانیہ کے خلاف بھی کئی مہمات لڑنا پڑیں۔ الفانسو ہشتم نے اشبیلیہ پر حملہ کر دیا تھا۔ ۹ شعبان ۵۹۱ھ/۱۹ جولائی ۱۱۹۵ء کو الارک کی مشہور جنگ ہوئی۔ جس میں ابو یوسف کو فتح نصیب ہوئی اور اس نے اشبیلیہ میں آ کر المنصور باللہ کا لقب اختیار کیا۔

اس مہم کے بعد بھی ابو یوسف کئی مہمات میں مگن رہا مگر دو تین ہی برس بعد بیماری کی بنا پر اپنے بیٹے محمد کو ولی عہد مقرر کر کے سلطنت کے کاموں سے سبکدوش ہو گیا اور شاید ربیع الاوّل ۵۹۵ھ/جنوری ۱۱۹۹ء میں فوت ہوا۔

ابو یوسف ایک قابل حکمران اور جری سپاہی تھا۔ اسے خیراتی کاموں کا بے حد شوق تھا، چنانچہ اکثر ہسپتال اور خیرات کے مراکز قائم کرتا رہتا۔ اس نے بہت سی شاندار عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔ جن میں سے مراکش کی جامع مسجد الکتبیین اور رباط کی جامع حسان بے حد مشہور ہیں۔

اتاترک (۱۸۸۱ء – ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) غازی مصطفیٰ کمال پاشا، جمہوریہ ترکی کے بانی اور پہلے صدر سلونیکا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی رضا آفندی اور والدہ کا نام زبیدہ خانم تھا۔ والد سلونیکا میں عسکر ملّیہ کے دفتر میں ملازم تھے۔ بعد ازاں تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ ابھی مصطفیٰ چھوٹے ہی تھے کہ والد انتقال کر گئے۔ والدہ نے ان کی پرورش دینی درسگاہ کی تعلیم سے شروع کی۔ محلے کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مصطفیٰ کمال نے شمسی آفندی کے مکتب میں داخلہ لے لیا جو جدید طرز کا نیا سکول تھا۔ ۱۸۹۵ء میں عسکری رشدیہ کا نصاب ختم کر کے انہوں نے مناستر کے فوجی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۹ء میں استنبول کے مدرسہ حربیہ اور ۱۹۰۲ء میں فوجی اکیڈمی میں داخلہ لیا۔

اتاترک کی فوجی زندگی کا آغاز ۱۱ جنوری ۱۹۰۵ء سے ہوتا ہے۔ جب وہ مرکز شام میں پانچویں فوج کے کمانڈر بنے۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی سے مصطفیٰ کمال کو سیاسی امور سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ مدرسہ حربیہ سے نکلتے ہی انھوں نے اپنے دوستوں سمیت ایک خفیہ سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی۔ جس کا علم سلطان عبدالحمید کے کارکنوں کو ہو گیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لیے اسے ختم کر دیا گیا۔ اپنے قیام شام کے دوران میں انہوں نے "وطن و حریت" کے نام سے ایک خفیہ انجمن قائم کی۔

۲۰ جون ۱۹۰۷ء کو مصطفیٰ کمال لفٹیننٹ ہو گئے۔ اور ماہ ستمبر میں تیسری فوج میں منتقل ہو کر سلونیکا آ گئے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء کو مصطفیٰ کمال کو ناظر کی حیثیت سے استنبول بلا لیا گیا۔ اسی سال ۶ ستمبر کو سلونیکا میں تیسری فوج کے پیدل افسروں کی اکیڈمی کے کمانڈر اور ۳۸ ویں پیادہ رجمنٹ کے کمانڈر مقرر ہوئے اس زمانے میں ارناؤط وادی میں ۹ جنوری ۱۹۱۲ء کو مصطفیٰ کمال نے طرابلس العرب میں طبروق کے حملے شروع کرنے کا انتظام کیا۔ کیونکہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اطالویوں نے طرابلس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس جنگ کے اختتام پر انہیں صوفیا میں ملٹری اتاشی مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں بخارسٹ بلغراد اور چتینا میں بھی اسی عہدے پر فائز رہے۔ یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو انھیں لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی مل گئی اور ۲ اگست ۱۹۱۴ء کو انہیں ترکی کے اعلان جنگ

کے ساتھ ہی پہلی عالمی جنگ میں شرکت کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور شہرت حاصل کی۔ گیلی پولی کے معرکے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اری بورنو کی فوجوں کی پوری کمان انھیں دے دی گئی۔ ۱۹ر مئی ۱۹۱۵ء کو انھیں کرنل کے عہدے پر ترقی مل گئی۔

چونکہ اکثر اوقات ہائی کمان کی ہدایات کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی اکثر جواب طلبی ہوتی رہتی۔ انہوں نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے کوئی بھی آدمی نہیں۔ مگر ان کا استعفیٰ قبول نہ کیا گیا البتہ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۶ء کو مصطفیٰ کمال نے ادرنہ میں پوری لشکر کی کمان شروع کر دی۔ ۱۰ر اپریل کو انہیں جنرل کے عہدے پر ترقی ملی اور قفقاز کے محاذ پر متعین ہوئے۔ یہاں نمایاں کارنامے انجام دینے کے بعد انھیں شمشیر زریں کا تمغہ عطا ہوا۔

۵ر جولائی ۱۹۱۷ء کو مصطفیٰ کمال ساتویں فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے عصمت پاشا کے ساتھ مل کر حکومت کو ملک کی خراب اور خستہ حالت کی طرف متوجہ کیا۔ نیز فوجوں کی مکمل قیادت اجنبیوں (جرمنوں) کے ہاتھ میں چھوڑ دینے کی مخالفت کی۔ ان تجاویز پر عمل کروانے اور حکومت کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر آپ نے ایک بار پھر اپنا استعفیٰ پیش کیا لیکن یہ منظور نہ ہوا۔ اس کے باوجود آپ رخصت لے کر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو استنبول چلے گئے۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو مصطفیٰ کمال ولی عہد وحید الدین کے ہمراہ جرمنی کے دورے پر گئے۔ یہاں سے بیس روز بعد واپسی ہوئی۔ ۷ر اگست ۱۹۱۸ء کو انھیں فلسطین کی ساتویں فوج کا دوبارہ کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اور ۲۶ر اکتوبر کو انھوں نے دشمن کے حملے کو حلب کے نواح میں ترکی کی موجودہ سرحدوں کی طرف پسپا کر دیا۔

۳۰ر نومبر ۱۹۱۸ء کو مودروس کا متارکۂ جنگ طے پایا اور اس کی رو سے جرمن فوجوں کو ترکی سے خارج کر کے انھیں یلدرم گروپ کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ سلطان سے گفت و شنید کے بعد انھیں پتا چلا کہ سلطان کو فوجی بغاوت کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ان دنوں فوجوں میں بھی سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ خود مصطفیٰ کمال بھی سیاسی سرگرمیوں کا محور تھے۔ انھی دنوں عصمت پاشا سے گفت و شنید ہوئی اور دونوں نے اناطولیہ چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔

۳۰ر اپریل ۱۹۱۹ء کو نویں فوج کے مفتش مقرر ہوئے۔ سیواس، وان اور طرابزون کا علاقہ انہیں سپرد کیا گیا۔ ۱۵ر مئی کو یونانیوں نے ازمیر پر حملہ کر دیا۔" مصطفیٰ کمال نے سلطان کو تسلی و تشفی دینے کے بعد اناطولیہ کا رخ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ خلیفہ کی فوجیں ناکام ہو چکی ہیں، ان کے حلیف اپنی طاقت کھو چکے ہیں اور ازمیر پر یونانیوں کا قبضہ ہو چکا ہے، حکومت، سلطنت اور خلافت کے الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں مصطفیٰ کمال کے نزدیک ان سب مصائب سے رہائی کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی ایک نئی آزاد ریاست کی تشکیل۔ جس کے لئے انہوں نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ قسطنطنیہ میں ایک مجلس شوریٰ منعقد کی گئی۔ ادھر حکومت نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ترکی کی حفاظت کی ذمہ داری کسی بڑی طاقت کے سپرد کر دی جائے۔ مصطفیٰ کمال کو اس ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے فوراً وزیر اعظم کو احتجاجی تار روانہ کیا۔ کچھ روز بعد پیرس کانفرنس میں شرکت کے لئے وزیر اعظم ترکی کے نمائندے کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھتے ہوئے محبان وطن کی ایک کانگریس منعقد کی، جس میں حریت اور آزادی کا پروگرام طے کیا گیا اور اسے ملک کے طول و عرض میں شائع کر دیا گیا۔ سلطان نے جواب طلبی کے لئے بلایا تو انہوں نے استعفیٰ لکھ بھیجا۔ اس کے فوراً بعد ۲۳ر جولائی ۱۹۱۹ء کو آپ کانگریس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس مجلس میں یہ قراردادیں پیش کی گئیں۔

۱۔ حدود ملت کے اندر وطن کی وحدت کو تقسیم نہیں ہونے دیا جائے گا۔

۲۔ عثمانی حکومت کے معطل ہو جانے کی صورت میں پوری ملت مدافعت کے لئے تیار رہے گی۔

۳۔ اگر مرکزی حکومت آزادی کو برقرار نہ رکھ سکی تو اس عرصہ میں ایک عارضی حکومت کا نفاذ کانگریس کرے گی۔

۴۔ اس حکومت کی بنیاد عامل اور حاکم ہوگی۔

۵۔ غیر ملکیوں کو ایسے حقوق حاصل نہ ہوں گے، جن سے وہ سیاست پر اثر انداز ہوں۔

۶۔ کوئی حمایت یا سپردگی قبول نہ کی جائے گی۔

۷۔ کانگریس کے تمام ارکان حکومت کے کاروبار کو انجام دینے کی کوشش کرینگے

اس قرارداد کے بعد کانگریس کا اجلاس ۴ر ستمبر کو سیواس میں ہوا۔ اس بار بھی مصطفیٰ کمال ہی صدر منتخب ہوئے۔ سیواس سے ایک اخبار ارادۂ ملیہ کے نام سے جاری کیا گیا اور ۱۲ر اور ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۹ء [illegible] رات کو سب فوجی افسروں اور والیوں کے نام احکامات جاری کئے گئے [illegible] وہ اپنے آپ کو صرف ہیئت تمثیلیہ کا تابع سمجھیں اور اس اقدام کی اطلاع [illegible] بھی دی گئی۔

یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو فرید پاشا کی وزارت [illegible] ہو گئی اور علی رضا [illegible] صدر منتخب ہوئے۔ نئی حکومت سے بھی کہا گیا کہ وہ ارض روم اور سیواس کانگریس کو تسلیم کرے۔ اس کے جواب میں حکومت کے ساتھ یہ شرائط طے ہوئیں کہ

۱۔ مرکزی حکومت اور تشکیلات ملی میں اتفاق رہے گا اور آئندہ کوئی مناقشت نہ ہوگی۔

۲۔ وکلائے ملت کا انتخاب آزادانہ اور بلا کسی مداخلت کے ہوگا

۳۔ مرکزی حکومت کے موافق یا مخالف کوئی [illegible] نہ کھی جائے گی

۴۔ سیواس کانگریس کی قراردادیں، البتہ طلیکہ مجلس مبعوثین [illegible] اساسی طور پر درست سمجھی جائیں گی۔

۵۔ قسطنطنیہ میں مجلس ملی کا افتتاح ہوگا۔

ان شرائط کی رو سے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو قسطنطنیہ میں اجلاس ہوا [illegible] مصطفیٰ کمال ارض روم کی طرف سے وکیل ملت منتخب ہوئے۔ ۴ر نومبر ۱۹۱۹ء [illegible] اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ اگر حکومت نے فرانس کے ساتھ گفت و شنید کو [illegible] تو حکومت کا انتظام سنبھال لیا جائے گا۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو مصطفیٰ کمال انقرہ میں داخل ہوئے اور وہاں [illegible] کر دیا۔ یہاں سے حاکمیت ملی نام کا جریدہ بھی شائع کیا۔ اس اثنا میں عصمت [illegible] بھی استنبول سے آکر ان کے شریک کار ہو گئے۔

یونانیوں کے حملوں سے بوکھلا کر علی رضا کی وزارت مستعفی ہو گئی [illegible] پاشا نے نئی وزارت بنائی۔ مجلس اقوام نے قسطنطنیہ پر رسمی قبضہ کر لیا اور قوم پرست وکلائے مجلس کو برطرف کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے اس کے خلاف سب ملکوں اور قومی مجلسوں سے احتجاج کیا اور ساتھ ہی انقرہ میں ایک نئی مجلس ملی کے انعقاد کا بندوبست کیا۔

۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال نے انقرہ میں بیوک ملت مجلسی کا افتتاح کیا اور ۲۴ر اپریل کو صدر مجلس منتخب ہوئے اور اعلان کیا گیا کہ اب حکومت کی تنہا ذمہ دار یہی مجلس ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ۱۱ر مئی ۱۹۲۰ء کو حکومت استنبول کی طرف سے

مصطفٰے الکمال کے لیے موت کی سزا کا حکم جاری کیا گیا، جو سلطان کی طرف سے ۱۴ر مئی ۱۹۲۰ء کو صادر ہوا۔

یونانیوں کے حملوں کو روکنے کے لیے مجلس آگے بڑھی اور مصطفٰے الکمال نے مجلس کی طرف سے علی فؤاد کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ مگر یونانی مسلسل آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ دوسری طرف عثمانی حکومت نے معاہدہ سیورے منظور کر لیا تھا۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۲۰ء کو مجلس کی فوجوں کو آرمینیا میں فتح حاصل ہوئی اور ۱۸ر اکتوبر کو آرمینیوں نے صلح کی درخواست کی۔ اس طرح جو صلح نامہ تیار ہوا وہ ترکی کی قومی حکومت کی طرف سے پہلا صلح نامہ تھا۔ انگریزوں سے باطوم کا شہر بھی لے لیا گیا۔

۲۰ر جنوری ۱۹۲۱ء کو مجلس نے فیصلہ دیا کہ حاکمیت بلا قید و شرط ملت کا حق ہے اور صرف بیرک مجلس ہی ملک پر حکومت کر سکتی ہے۔ لندن کانفرنس میں بھی مجلس ملی کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس میں بکر سامی نے شرکت کی مگر اس کانفرنس کی تجاویز کو مجلس نے رد کر دیا۔

۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء کو یونانیوں نے پھر حملہ کر دیا۔ اس بار ۱۲ر اگست سے مصطفٰے کمال نے فوج کی کمان خود سنبھالی۔ ۲۳ر اگست ۱۹۲۱ء کو یونانی آگے بڑھے اور ترکی فوج کے ساتھ خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ اس جنگ میں جو جنگ سقاریہ کہلاتی ہے، یونانیوں کو مکمل شکست ہوئی۔ چنانچہ مصطفٰے کمال کو مارشل کا منصب اور غازی کا خطاب [illegible] اس فتح سے دور رس اثرات پیدا ہوئے، جس کی روشنی میں اتحادی قوتوں [illegible] فرانس نے ترکی میثاق ملی کو تسلیم کر لیا۔

[illegible] یونانیوں کے مکمل نکالنے کے لیے مصطفٰے الکمال نے گفت و شنید شروع کی۔ [illegible] اقوام کے ساتھ مذاکرات ہوتے رہے مگر ناکامی اٹھانے کے [illegible] ترکی فوجوں کو آگے بڑھایا اور بالآخر ۹ر ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترکی کی فوج ازمیر [illegible] ہو گئی اور اسی سال [illegible] نے ترکی کی [illegible] کو پورے طور پر آزاد کرا لیا۔

[illegible] عظیم کامیابی کے بعد مصطفٰے الکمال نے عثمانی حکومت کے خاتمے کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔ چنانچہ مجلس کی منظوری کے بعد ۴ر نومبر ۱۹۲۲ء کو استنبول کی حکومت [illegible] ہو گئی۔ [illegible] نومبر ۱۹۲۲ء کو عصمت پاشا ترکی وفد کے قائد کی حیثیت سے لوزان میں [illegible] کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچے۔ ادھر خلیفہ کو بھی سیاسی اور قانونی [illegible] سے محروم کر دیا گیا۔

مصطفٰے الکمال نے اپنی ایک علیحدہ سیاسی جماعت "خلق فرقہ سی" (پیپلز پارٹی) [illegible] دسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک اخباری کانفرنس منعقد کر کے اپنا سیاسی منشور واضح کر دیا۔

۲۳ر اپریل ۱۹۲۳ء کو لوزان کانفرنس کا دوبارہ اجلاس ہوا۔ اور ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو صلح نامہ پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے معاہدۂ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مجلس کی حکومت کے جمہوری ہونے کا اعلان ایک سو ایک توپوں کی گرج کے ساتھ کیا گیا، جس کی رو سے جمہوری حکومت کے پہلے صدر مصطفٰے الکمال بنے اور وزیر اعظم عصمت پاشا مقرر ہوئے۔ ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا اور عثمانی خاندان کو ترکی سے جلاوطن کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔

اب مصطفٰے الکمال نے ترکی حکومت اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنے نظریے کے مطابق جدید ترکی معاشرہ قائم کرنے کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ ترکی کے آئین سے مملکت کا مذہب اسلام ہونے کی شق خارج کر دی۔ بعد ازاں مدارس کے نصاب تبدیل کیے گئے۔ مدارس میں مذہبی تعلیم کی ممانعت کر دی گئی۔ عورتوں کا پردہ ختم کر دیا گیا۔ عورتوں اور مردوں کے مشترکہ اجتماعات کو فروغ دیا گیا۔ قدیم یونانی اور ترکی لباس متروک قرار دیے گئے اور لوگوں کو یورپی ٹوپی پہننے پر مجبور کیا گیا۔ ملک سے درویشوں، فقیروں اور مجذوبوں کا قلع قمع کرنے کی مہم چلائی گئی۔ پیری مریدی ممنوع قرار دے دی گئی۔ تمام تکیوں اور ڈیروں کو ختم کر دیا گیا۔

ترکی کی تاریخ کو نئے سرے سے مدون کرانے پر مصطفٰے الکمال نے سب سے زیادہ زور دیا۔ اس میں ترکی قومیت پر زور دیا گیا اور اس کا آغاز زمانۂ قدیم سے کیا گیا۔ اسلامی تاریخ کو رد کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں انقرہ میں پہلی تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی رو سے فیصلہ کیا گیا کہ ترکی کی تاریخ محض عثمانی تاریخ نہیں بلکہ ترک قوم اس سے بہت پہلے موجود تھی۔

مصطفٰے الکمال نے جو دوسب سے زیادہ اہم کام کیے۔ وہ یہ تھے کہ نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی ممانعت کر دی گئی اور قرآن، نماز وغیرہ ترکی میں پڑھنے کا فیصلہ کیا گیا بلکہ ترکی زبان کا رسم الخط بھی عربی رسم الخط سے بدل کر رومن کر دیا گیا۔ اس کے لیے اکثر اوقات مصطفٰے الکمال خود ملک کے دورے کرتے اور لوگوں کو مثالوں کے ذریعے سمجھاتے مزید براں جمعہ کی رخصت منسوخ کر کے اتوار کی رخصت کا فیصلہ کیا گیا۔ ہجری اور رومی تقویم بھی منسوخ کر دی گئیں۔ ان کی جگہ عیسوی تقویم کا آغاز کیا گیا۔

کمال اتاترک

۳ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو استنبول میں مصطفٰے الکمال کا پہلا مجسمہ نصب ہوا اور یکم نومبر ۱۹۲۷ء کو انقرہ میں دوسرا مجسمہ نصب ہوا۔

۴ر مئی ۱۹۳۱ء کو غازی مصطفٰے الکمال تیسری بار صدر جمہوریہ ترکی مقرر ہوئے۔ ۱۲ر جون ۱۹۳۲ء کو بادشاہ عراق امیر فیصل انقرہ آئے اور مصطفٰے کمال سے ملاقات کی۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو یوگوسلاویہ کے بادشاہ الیگزنڈر نے مصطفٰے کمال سے استنبول میں ملاقات کی۔ ۱۶ر جون ۱۹۳۴ء کو بادشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے انقرہ میں مصطفٰے کمال سے ملاقات کی۔

۲۴ نومبر ۱۹۳۴ء کو ترکی مجلس کی طرف سے غازی مصطفیٰ کمال کو اتاترک کا خطاب دینے کی منظوری دی گئی۔ یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو انھیں چوتھی بار صدر جمہوریہ منتخب کیا گیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اتاترک (ترکوں کا باپ) اپنی قوم سے جدا ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء کے آتے آتے اتاترک خاصے علیل ہو گئے۔ ۳۱ مارچ کو سیکرٹری جنرل کی طرف سے صدر جمہوریہ کی علالت کا رسمی بلیٹن شائع ہونا شروع ہوا۔ ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو انہوں نے اپنا وصیت نامہ تحریر کرایا جو ان کی وفات ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کے بعد ۲۵ نومبر کو کھولا گیا۔ جس کی رو سے انھوں نے اپنے اثاثے کا بیشتر حصہ "انجمن لسان و ترک تاریخ" کے نام وقف کر دیا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۳۸ء کو اتاترک کے جسد کو تابوت میں بند کیا گیا۔ ۱۹ نومبر کو پروفیسر شرف الدین نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۲۱ نومبر کو یہ تابوت استنبول کے اتنوگرافی میوزیم میں دفن کر دیا گیا۔ بعد ازاں انقرہ لے جایا گیا، اور اب وہیں ان کا مزار ہے۔ ۲۶ دسمبر کو جمہوریہ ملیہ پارلیمان نے اتاترک کو ابدی صدر (ابدی قائد) کے لقب سے یاد کیا اور اپنے ایک مخصوص اجلاس میں اس لقب کو منظور کر لیا۔

اتاترک صحیح معنوں میں مصلح قوم تھے۔ اگرچہ انھوں نے مذہب کی بے جا مخالفت کی، مگر یہ انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ترکی قوم جسے یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا، ایک بار پھر ابھر کر سامنے آ گئی۔ ترکی معاشرے میں دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس لیے اگر ترکی قوم نے انھیں اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب دیا تو یہ بالکل بجا تھا۔

اتحاد اکٹھا ہونا، ہم ہونا، ایک شے بن جانا۔ متکلمین کے نزدیک اتحاد کی دو اہم قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی اتحاد، دوسرا مجازی۔ حقیقی اتحاد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا اطلاق ایسی دو چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک ہو جائیں مثلاً دودھ یا تو پانی ہو جائے یا پانی دودھ ہو جائے۔ دوسری وہ جو نئی صورت اختیار کرے، مثلاً دو مختلف رنگ مل کر ایک نیا رنگ بن جائیں۔ مگر چونکہ متکلمین کے نزدیک دوسرا اتحاد ممکن نہیں کیونکہ نیا رنگ ایسا ہونا چاہیے جس میں دونوں رنگوں کی خصوصیات بالکل نہ ہوں۔ اس لیے اس قسم کے اتحاد کا وجود ہی نہیں ہے۔

اتحاد مجازی کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شے کسی دوسری شے میں تبدیل ہو جائے۔ مثلاً پانی ہوا بن جائے۔ دوسرے کوئی شے اتحاد کر کے بالکل نئی شے بن جائے مثلاً دو رنگوں سے بننے والا رنگ ایک نیا رنگ ہو گا مگر سابقہ دونوں رنگ کی خصوصیات رکھتا ہے۔ تیسرا مجازی اتحاد کوئی نئی شکل اختیار کرنا ہے جیسے جن انسان کی صورت اختیار کرلے۔

صوفیاء کے نزدیک اتحاد مخلوق کا خالق سے مل جانا ہے۔ مگر بعض کے نزدیک چونکہ خدا کے سوا کوئی اور وجود حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لیے ہمہ اوست کے نظریے کی رو سے اتحاد وجود ہی میں نہیں آتا۔ کیونکہ اتحاد کے لیے لازم ہے کہ ملنے والی دونوں اشیاء علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی ہوں۔ اس لیے صوفیاء کے نزدیک اتحاد کا تعلق مشیت ایزدی کے ماتحت اور مطابق ہو جاتا ہے۔

اتسز (وفات ۹ جمادی الآخر ۵۵۱ھ/۳۰ جولائی ۱۱۵۶ء) اتسز بن محمد بن خوارزم شاہ، اپنے باپ کی جگہ خوارزم میں تخت نشین ہوا۔ سلجوق سلطان سنجر کا باجگزار تھا، مگر اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیبوں میں مصروف رہا، چنانچہ اس نے بحیرہ خزر سے بحیرہ ارال کے درمیان علاقے کو فتح کر لیا، جس کے بعد سنجر کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء کو سنجر نے اسے شکست دی اور اپنے بھتیجے سلیمان بن محمد کو خوارزم شاہ بنا دیا۔ ایک ہی برس ۵۳۸ھ/۱۱۴۳ء میں سنجر نے اتسز کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اتسز ایک بار پھر سنجر کا وفادار ہو گیا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد دریائے اترک کے کنارے فوت ہو گیا۔ وہ پہلا حکمران ہے جس نے خوارزم کی مملکت کو مضبوط اور مستحکم کر دیا۔

اثناء عشریہ بارہ والا۔ اصطلاحاً اہل تشیع کا وہ فرقہ، جو بارہ اماموں حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت علی زین العابدینؒ، امام محمد باقرؒ، امام جعفر صادقؒ، امام موسیٰ کاظمؒ، امام علی رضاؒ، امام محمد تقیؒ، امام علی نقیؒ، امام حسن عسکریؒ اور امام مہدی کو مانتا ہے۔ ان کے مقابلے میں دوسرا شیعی فرقہ اسماعیلیہ ہے جو پہلے چھ اماموں کو مانتا ہے۔

اثنا عشریہ کے عقیدے کے مطابق حضرت رسول اکرمؐ خاتم النبین ہیں اور حضرت علیؓ امام اوّل ہیں۔ آخری بارہویں امام مہدی کی ولادت ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ ۳۰ جولائی ۸۶۸ء کو ہوئی اور آپ ۲۶۱ھ/۸۷۴ء کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ چنانچہ ان کے دوبارہ آنے کا انتظار ہے۔

اب اس فرقے میں بھی کئی مکاتیب فکر پیدا ہو چکے ہیں۔ اور ان کے بھی کم از کم ایک درجن گروہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ ان کے علیحدہ نام ہیں اور سبھی خود کو اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ تاہم ان کے عقائد میں یہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ امام حسن عسکری فوت نہیں ہوئے محض غائب ہو گئے ہیں۔

۲۔ امام موصوف فوت ہو گئے ہیں اور لاولد ہیں۔ وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔

۳۔ امام موصوف نے اپنے بھائی جعفر کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

۴۔ جعفر لاوارث انتقال کر گئے۔

۵۔ محمد بن جنید بن علی امام برحق ہیں۔

۶۔ امام حسن عسکری کی وفات سے دو برس قبل ان کے صاحبزادے محمد المہدی پیدا ہوئے۔

۷۔ امام موصوف کے ہاں صاحبزادے پیدا تو ہوئے لیکن ان کی وفات کے آٹھ ماہ بعد۔

۸۔ امام موصوف لاولد فوت ہو گئے۔ اس لیے اب کوئی امام نہیں۔

۹۔ امام موصوف کے ایک فرزند ضرور تھے مگر وہ امام نہیں تھے۔

۱۰۔ امام کے متعلق علم نہیں کہ وہ امام حسن کی اولاد میں سے ہیں یا نہیں۔

۱۱۔ امام علی رضا کے بعد کوئی امام نہیں آیا۔ اب صرف آخری امام کا انتظار ہے۔

اجارہ جائداد کا کرائے پر دینا یا لینا۔ اس میں پٹہ اور ٹھیکہ بھی شامل ہے۔ سو، اس میں زمین اجارے پر دینے اور لینے کی اجازت ہے۔ عبداللہ بن معقل نے ثابتؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے مزارعت کو منع فرمایا۔ اور کہا ہے کہ اجارہ میں کوئی حرج نہیں۔ (مسلم)

اجارہ کی دستاویز اس وقت تک قابل عمل نہیں ہوتی جب تک کہ اشیاء اور معاوضے کا پورا پورا علم نہ ہو۔ نیز اجارہ پر اشیاء لینے والے شخص پر اس کے تمام حقوق اور واجبات قابل ادا ہوں گے، جو اجارہ کی تاریخ اجراء کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ نیز شے لینے والا شخص واپسی کے وقت اسے صحیح و سالم دینے کا پابند ہوگا۔ اس عرصہ میں ہونے والے تمام تر نقصانات کی ذمہ داری اجارہ پر چیز لینے والے شخص پر ہوگی۔

اجازۃ رخصت، اجازت، علم حدیث کی ایک اصطلاح، جس کے معنی ہیں اپنے علم حدیث کو آگے پہنچانے کی اجازت دینا۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل

ہے کہ اجازۃ حاصل کرنے والا، اجازۃ دینے والے کا نام بھی سند کے طور پر پیش کرے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ دونوں کی ملاقات بھی ہو، گویا اجازۃ تحریری بھی ہو سکتا ہے۔

عملی طور پر اجازۃ کی روایت اتنی آگے بڑھی کہ لوگوں نے علماء کو سر بازار گھیر کر اجازے حاصل کرنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ مسافر علماء کو بھی نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ اس پر نوبت یہاں تک پہنچی کہ علماء نے وصیتیں شروع کر دیں کہ ان کی بیان کردہ احادیث کو روایت کرنے کا اجازۃ تمام مسلمانوں کو حاصل ہے۔

اجازے عموماً نثر میں سیدھے سادے اسلوب میں لکھے جاتے تھے۔ بعد ازاں رنگین اور مرصع اسلوب کو استعمال کیا جانے لگا۔ کئی اجازے منظوم صورت میں بھی لکھے گئے۔

اجتہاد وہ کوشش جو فقیہ کے مسائل کو حل کرنے اور کوئی حکم شرعی تلاش کرنے کے لئے ذاتی رائے سے کی جائے گویا جب کسی مسئلے کا حل قرآن اور سنت سے نہ ملے تو اسلامی احکامات اور صراط مستقیم کے پیش نظر قیاس لگانے اور ظن غالب قائم کرنے کا نام اجتہاد ہے۔

اس کے بارے میں مشہور حدیث معاذؓ بن جبل کی ہے:۔

حضرت نے جب معاذؓ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا! کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا! اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم اس کے متعلق نہ ملے تو؟ عرض کیا: سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا! اگر وہاں بھی نہ ملے؟ عرض کیا کہ تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ حضورؐ نے معاذؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا! اس خدا کے لئے حمد ہے جس نے رسول خدا کے اس فرستادہ کو رسول خدا کی مرضی کے مطابق چلنے کی توفیق بخشی۔ (ابوداؤد، ترمذی) اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

(۱) کتاب و سنت کی روشنی میں اجتہاد عین مرضی رسولؐ ہے۔

(۲) یہ اجتہاد کچھ معاذؓ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو فیصلہ کرنے کے منصب پر فائز ہو۔ اگر صرف معاذؓ ہی کے ساتھ یہ خصوصیت ہوتی تو کوئی خاص ذکر ہوتا۔ گویا قاضی یا امام کے لئے اجتہاد سے کام لینا عین اسلام ہے۔ ایک اور حدیث ہے۔

"اگر کوئی قاضی اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے تو اس کے لئے دو اجر ہیں ایک صحیح ہونے کا دوسرا اجتہاد کا۔ اور اگر وہ اجتہادی فیصلے میں غلطی کر جائے تو اسے ایک اجر ملے گا (صرف اجتہاد کا)" (ابوداؤد)

اس حدیث سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضورؐ ایسے حکام و قضاۃ کو اجتہاد کی ترغیب دیتے ہیں اور خطا کے خوف سے بے پروا کر کے ایک اجر کی بشارت دیتے ہیں۔

اجتہاد ایک طرح کا فن ہے جس کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ اس کا ایک فنی پہلو یہ ہے کہ مجتہد قرآن و سنت، اصول فقہ، اقوال، فیصلوں اور آراء سے باخبر ہو اور جانتا ہو کہ الفاظ میں اشتراک معنی کس طرح ہوتا ہے؟ نیز ایک بات سے مختلف مفہوم کیوں کر لئے جا سکتے ہیں؟ نیز وہ عبارت آرائی کے فن سے واقف ہو۔

مجتہد کی ذمہ داریاں بڑی کٹھن اور شدید ہیں۔ اس کی ایک غلطی پوری امت کو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے۔ چنانچہ مجتہد کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف جلیل القدر ہستی اور امام ملت ہو بلکہ صحیح معنوں میں مومن بھی ہو۔

مولانا رئیس احمد "سیاست شرعیہ" میں لکھتے ہیں۔ "اجتہاد۔ اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ہے، جو اس نے دنیائے انسانیت کو عطا فرمایا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایسی قوم بنا دیا، جس نے مختصر ترین عرصہ میں دنیا پر اپنی سلطانی کا سکہ جمالیا اور یہی وہ چیز ہے، جسے چھوڑنے کے بعد وہ انحطاط کے گڑھے میں گر گئے۔

وفات رسولؐ کے بعد یہی وہ راستہ تھا، جس پر خلفائے راشدین چلے انہوں نے حکومت کے معاملات میں کوئی نص نہ دیکھی تو اجتہاد رائے سے کام لیا.....۔ اس عہد گرامی کے بعد، دور آیا کہ فقیہہ مجتہدوں نے اجتہاد کا ایک خاص طریقہ وضع کر لیا۔ چنانچہ اجتہاد کا دائرہ تنگ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ لوگ آئمہ کرام کی تقلید پر مجبور ہو گئے رفتہ رفتہ اجتہاد کا دروازہ سرے ہی سے بند ہو گیا اور صرف پچھلے آئمہ کرام پر ہی اکتفا کر لیا گیا۔

کیا اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے؟ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی اس کا جواب لکھتے ہیں کہ "نہ تمام افراد مجتہد ہو سکتے ہیں اور نہ ہر فرد کے لئے مقلد ہونا ضروری ہے.... حقیقت میں ہر دور میں مقلدین کے ساتھ مجتہدین بھی ہوتے ہیں اور اجتہاد سے بھی کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔" اپنی کتاب "اجتہادی مسائل" میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ ہر کس و ناکس کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ کسی دور میں اجتہاد وہی لوگ کریں گے، جو اس دور کے ارباب حل و عقد ہوں اور پھر اہل حل و عقد بھی ان ہی مسائل کے ہوں جن میں اجتہاد مطلوب ہو۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اجتہاد کا حق صرف مولویوں کو حاصل ہے۔"

تاہم اجتہاد کا مطلب اماموں (آئمہ کرام) سے انکار یا ترک یا ان سے سرتابی نہیں بلکہ ان کی مساعی اور قابل قدر کوششوں ہی سے فائدہ اٹھانے کا نام اجتہاد ہے۔ اسی ضمن میں عمر فاروق اعظمؓ کی ایک تحریر جو آپ نے قاضی شریح کو لکھی، بڑی لطیف اور سبق آموز ہے "اے شریح! تم کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اگر وہاں نہ ہو تو سنت رسول اللہؐ سے فیصلہ کرو۔ اگر ان دونوں میں بھی نہ ہو تو صلحاء کے فیصلوں کے مطابق کرو۔ اگر صلحاء کے فیصلے میں بھی نہ ہو تو خواہ بر وقت ہی خود فیصلہ کر لو یا ذرا غور و فکر کے بعد کرو اور میری رائے میں تمہارے لئے ذرا غور و فکر کر لینا ہی بہتر ہے۔"

اس فرمان سے جو نکات سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

۱۔ کتاب اللہ کو ہر حال میں مقدم رکھنا چاہیئے۔

۲۔ اس کے بعد سنت رسولؐ میں تلاش کرنا چاہیئے۔

۳۔ اس کے بعد صالحین کے فیصلوں سے استفادہ کیا جائے۔

۴۔ اپنے غور و فکر کو کام میں لایا جائے۔

۵۔ اجتہاد فوراً نہ کیا جائے۔

۶۔ بعض اوقات خود اپنے ہی قیاس سے اجتہاد کرنا پڑتا ہے۔

۷۔ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اگلے بزرگان دین کے سامنے یہ باتیں نہ تھیں؟ پھر انہوں نے اجتہاد کا دروازہ کیوں بند کیا؟ علامہ خضری نے "اصول فقہ" میں اس کی وجہ یہ بتائی ہے۔

"جس دور میں اجتہاد کا دروازہ بند کیا گیا، اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بیسیوں مدارس خیال پیدا ہو جاتے اور باہم سخت تصادمات ہوتے، اور ہر شخص مجتہد بنکر گمراہی پھیلاتا۔ ایسی حالت میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے

کا یہ فائدہ ہوا کہ امت زیادہ انتشار سے بچ گئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی کسی معاملے میں اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی۔"

اجتہاد کو قانون کا درجہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔ "اس کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ تمام اُمت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔ دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس کی پیروی شروع کر دیں، جس طرح مثلاً فقہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے قانون کے طور پر مان لیا۔ تیسری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے، مثلاً عثمانی سلطنت نے فقہ حنفی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔ چوتھی یہ کہ سیاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہل علم کریں، ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں۔ رہے قاضیوں کے فیصلے تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور نافذ ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کئے ہوں اور انھیں نظائر کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے۔"

اجر بدلہ، معاوضہ، صلہ۔ قرآن مجید کے مطابق یہ لفظ اس صلے کے معانی میں استعمال ہوا ہے، جو نیکیوں کے بدلے میں آخرت کے روز ملے گا، سورۃ الانعام کی ۱۶۰ ویں آیت میں آیا ہے:-

"جو کوئی نیکی کرتا ہے۔ تو اس کے لئے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی بدی کرتا ہے تو اس کی مثل ہی اسے سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اگرچہ اس آیت میں اجر کا لفظ نہیں آیا مگر احادیث میں بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے کہ اجتہاد میں ہے (دیکھئے "اجتہاد")

اجر بیویوں اور بچوں کو خورد و نوش کے لئے دی گئی رقم کو بھی کہتے ہیں اور فقہ کے نزدیک مزدوری، معاوضے اور کرائے کے لئے بھی اجر ہی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ گویا محنت کے معاوضے کا نام اجر ہے، اب خواہ یہ محنت جسمانی، ذہنی، روحانی یا اخلاقی ہو۔ اس کا معاوضہ خواہ کسی شکل میں ہو، اجر ہی کہلائے گا۔

اجل میعاد، مدّت، وقت مقررہ، نہ ٹلنے والا وقت۔ موت کا وقت۔ گویا یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سورہ الشوریٰ میں آیا ہے۔

"..... اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے سے ایک وقت مقررہ ہو چکی ہوتی ....." (۴۲-۱۴)

یہاں اجل کا لفظ "وقت مقررہ" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح سورہ ہود میں آیا ہے:-

"اور اپنے رب سے بخشش مانگو پھر اسی کی طرف رجوع کرو۔ وہ تمہیں ایک وقت مقررہ تک اچھے سامان سے فائدہ پہنچائے گا اور ہر ایک بزرگی والے پر اپنا فضل کرے گا......" (۱۱-۳)

ایسی بہت سی مثالوں سے یہ بات عیاں ہے کہ قرآن حکیم کے نزدیک اجل اس وقتِ مقررہ کا نام ہے، جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ گویا یہ ایسا اصول ہے جس میں نہ تقدیم ہے اور نہ تاخیر، نہ اس سے پہلے کچھ ہو سکتا ہے اور نہ بعد میں۔ نہ اس میں کچھ وقت گھٹایا جا سکتا ہے اور نہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ گناہ، ثواب، بدی یا نیکی، توبہ یا استغفار کسی بھی وجہ سے اجل ٹل نہیں سکتی۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ کیا موت اجل ہے؟ اس کے بارے میں متعدد بیانات ہیں۔ بعض بزرگان دین کے نزدیک موت کا وقت مقرر ہے اس لئے یہ اجل ہے اور بعض کے نزدیک ایسا نہیں مثلاً خودکشی کی صورت میں بقیہ زندگی گناہ کی صورت میں مسلط ہے۔ (دیکھئے "موت")

اجماع کسی امر پر جمع ہونا، متفق ہونا، فقہ کی اصطلاح میں اسلام کے مجتہدین کا کسی ایسے مسئلے پر متفق ہونا، جس کا حل قرآن و حدیث سے قطعی طور پر ثابت نہ ہو۔ اجماع کا اظہار الفاظ سے، افعال سے، خاموشی سے یا باتوں سے کیا جاتا ہے۔ انہیں علی الترتیب اجماع بالقول، اجماع بالفعل، اجماع بالسکوت یا اجماع بالتقریر کہا جاتا ہے۔ ابن جریر طبری اور رازی کے نزدیک اکثریت کا قول بھی "اجماع" ہے۔

اجماع کا ایک عام اصول شروع ہی سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ اگر کسی مسئلے پر غیر شعوری طور پر مختلف صحابہ یا علماء کا اتفاق رائے رہا ہو تو اسے مذہب کا حصہ بنا لیا جائے آنے والی نسلوں کے لئے اجماع صحابہ کی پیروی عملاً واجب سمجھی جاتی رہی ہے۔

اگرچہ اجماع کے ذریعے قانون سازی کی ایک راہ نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہرگز نہیں کہ مسلمان اجماع کے ذریعے کسی بھی غیر اسلامی فعل کو جائز قرار دے لیں۔ کیونکہ حدود شرعی اور قرآن و سنت کے خلاف کوئی بھی اجماع مستند نہیں نیز حضرت رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ

"میری امت کبھی بھی کسی غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی۔"

اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور جدید کے مسائل اجماع کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذریعے مسلمان اسلام کو جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں۔ اگرچہ اجماع کے ذریعے بہت سی بدعات اب روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ شافعی فقہ کی کتابوں میں یہ بیان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ قرآن یا حدیث کی فلاں فلاں عبارت اجماع سے پہلے فلاں فلاں حکم کی بنیاد ہے، لیکن آج کل اہلحدیث اس اصول کی عمومیت کو رد کر کے اسے محض اجماعِ صحابہؓ تک محدود مانتے ہیں۔ در ظاہر ہے کہ شیعی یا [illegible] ایسے مخصوص فرقے سنیوں کے اجماع سے بالکل باہر ہیں۔ چنانچہ خود اہلسنت و جماعت کا بھی اس بارے میں باہم اختلاف ہے۔ اثنا عشریوں کے نزدیک ہر اجماع میں کسی امام کی موجودگی ضروری ہے، لیکن غیبت کبریٰ کے بعد سے اجماع کا دروازہ بالکل مسدود ہو چکا ہے۔ اباضی اپنے مجتہدین کے فیصلوں کو اجماع کا رتبہ دیتے تھے۔

اجماع فقہ اسلامی کا تیسرا ماخذ ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اپنے مشہور زمانہ چھ خطبات میں انہوں نے اجماع کے متعلق جو تصورات پیش کئے، بعینہٖ یہاں درج کئے جاتے ہیں

"عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگرچہ صدر اسلام میں نظری اعتبار سے تو خوب بحثیں ہوتی رہیں، لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہیں بڑھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لیتا۔ شاید اس لئے کہ خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارے کی شکل دی جاتی۔ اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین کے ہاتھ ہی میں رہے، بجائے اس کے کہ اسے مجلس کی صورت میں، جو ان سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیتی۔ بہرحال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں، کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس

کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی زا قدم ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لئے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل۔ مزید براں غیر علماء بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہوں۔ اس میں حصہ لے سکیں گے۔"

گویا علامہ اقبال کے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظام فقہ میں خوابیدہ ہے، از سرِ نو بیدار کر سکتے ہیں۔

یہاں ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہوگا کہ کیا اجماع کے ذریعے قرآنی احکامات کو منسوخ کیا جا سکتا ہے؟ مستشرقین نے اس معاملے میں بڑی زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ علامہ ہی کے بیان کے مطابق یہ سراسر غلط ہے اور کسی بھی صورت میں اجماع خلاف قرآن وسنت نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ سوال کہ مجلس قانون ساز میں اجماع کا طریق کار کیا ہو؟ اس کا حسن جواب علامہ اقبال نے یوں دیا ہے کہ مجلس قانون ساز میں علماء کو بھی ایک مؤثر جزو کے طور پر شامل کر لیا جائے اور علماء قانونی امور میں مجلس کی رہنمائی کریں۔

اجمیر شریف شہر جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا مزار واقع ہے ۱۱۰۰ء میں آباد ہوا۔ ۱۱۹۰ء میں محمد غوری نے اسے فتح کیا۔ اور ۱۱۹۵ء میں قطب الدین ایبک نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۳۹۸ء سے یہ شہر راجپوتوں کے قبضے میں رہا اور ۱۴۵۵ء سے ۱۵۳۰ء تک مالوہ کے سلاطین کے قبضے میں رہا۔ اکبر نے ابتدا ہی میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ وہ اکثر مزار کی زیارت کے لئے یہاں آیا کرتا تھا۔ ۱۷۲۰ء میں اس پر راجپوتوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں یہ مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنہوں نے ۱۸۱۸ء میں اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

(جامع مسجد اجمیر)

خواجہ معین الدین چشتی کا مزار ۱۴۵۵ء میں سلاطین مالوہ نے تعمیر کرایا تھا۔ بعد ازاں اکبر اور شاہجہان نے مزید تعمیرات کیں۔ خصوصاً دو مسجدیں عہد مغلیہ کی یادگار ہیں۔ یہ عمارت ہندوانہ طرز پر تعمیر شدہ ہے۔ اس میں ایک چوکور صحن ہے، جس کے چاروں طرف ہندوانی طرز کی مسقف غلام گردشیں ہیں۔ چاروں کونوں پر ستارے کی شکل کے چار برج ہیں۔ ایک ۲۴۴ فٹ لمبا اور ۴۰ فٹ چوڑا ستون دار دالان ہے، جو نو حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں پانچ قطاروں میں ستون ہیں۔ ایک سمت دیوار ہے جس میں سات محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب بڑی ہے اور اس پر دو مینار ہیں۔

اجمیر کی دیگر تاریخی عمارتوں میں سے ایک اکبر کا قلعہ بند محل ہے، دوسرا جہانگیر کا بنایا ہوا ایک باغ اور تیسرا شاہجہان کا تعمیر کردہ پشتہ ہے زیادہ تر عمارتیں ہندوانہ طرز تعمیر کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ تاہم کئی عمارتیں اسلامی۔ ہندی امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔ بازار سیدھے اور کشادہ ہیں۔ شہر سے کچھ فاصلے پر پشکر ایک چھوٹی سی جھیل ہے جو خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔

آثار قدیمہ کے نقطۂ نگاہ سے اجمیر کی سب سے اہم عمارت "اڑھائی دن کا جھونپڑا" ہے جو دراصل ایک قدیم درس گاہ تھی۔ جسے بعد میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کی تعمیر دہلی کے قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام سے مشابہ ہے۔

اجنادین فلسطین کا ایک مقام، جہاں جمادی الثانی ۱۳ھ / اگست ۶۳۴ء کو مسلمانوں اور یونانیوں کے مابین جنگ ہوئی تھی۔ مسلمان افواج کی قیادت خالدؓ بن ولید کر رہے تھے۔ جن کی ماتحتی میں تین افواج جمع تھیں۔ ان میں سے ایک کے امیر عمرؓو بن عاص تھے اور یونانیوں کا سپہ سالار قیصر روم ھرقل کا بھائی تھیوڈورس تھا۔ دونوں اطراف کی تعداد دس ہزار تک تھی۔ مسلمان افواج تین ماہ سے وادیٔ فرات سے آکر یہاں جمع تھیں اور فلسطین کے اردگرد جنگی کارروائیوں میں مصروف تھیں۔ اس جنگ میں یونانیوں کو شکست ہوئی اور پورا فلسطین مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

اُچ شریف ایک قدیم تاریخی اور اسلامی اہمیت کا شہر۔ بہاولپور سے جنوب مغرب کی طرف اڑتیس میل کے فاصلے پر پنجند کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کا نام غالباً قصبے کے اونچے ہونے یعنی بلندی کی وجہ سے پڑا تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہاں قدیم ہندوؤں کی دیوی اوسا کا مندر تھا اور دوسری روایت کے مطابق راجہ ہود کے صوبیدار بچ نے یہاں ایک تالاب کھدوایا۔ اس کی مٹی سے جو ٹیلا تیار ہوا، اس پر بسنے والے شہر کا نام اُچ پڑا۔ مسلمانوں کی ایک روایت کے مطابق سید جلال الدین شیر شاہ بخاری ترکستان سے یہاں آئے اور انھوں نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس شہر کا نام اُچ (بلند) رکھا۔

اب یہ شہر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی وجہ سے مشہور ہے۔ ابن بطوطہ اس شہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ دریائے سندھ کے کنارے واقع ایک بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ بازار عمدہ اور عمارتیں مضبوط ہیں۔ اس کا یہ کہنا مبالغہ آمیز معلوم نہیں ہوتا۔ آج بھی یہاں کی آب و ہوا صحت مند ہے۔ البتہ پرانا شہر ہونے کی وجہ سے مندروں، مزاروں اور مقبروں کے سلسلے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، جو اس کی سابقہ عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ موجودہ قصبہ تین چھوٹی چھوٹی بستیوں اچ بخاری، اچ گیلانی اور اُچ مغلہ پر مشتمل ہے۔ شہر سڑک کے ذریعے پاکستان کے دیگر شہروں سے ملا ہوا ہے۔ قریب ترین ریلوے سٹیشن احمد پور شرقیہ ہے، جو یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

محمد بن قاسم کی فتح کے وقت یہ شہر سیاسی اور معاشی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی بے مثل تھا۔ محمود غزنوی کے زمانے سے یہاں اسلامی علوم کی آمد ہوئی اور مولانا صفی الدین گازرونی کی زیر ادارت ایک اسلامی درسگاہ

کی بنیاد رکھی گئی۔ رفتہ رفتہ اچ کا علمی مرتبہ اتنا بڑھا کہ پورے برصغیر میں اس سے بہتر شہر کوئی نہ سمجھا جاتا تھا۔ منگولوں کے حملوں کے دور میں علماء و فضلاء میں سے اکثر نے اچ کا رُخ کیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی۔ اگرچہ منگولوں نے اس شہر کو کئی بار تاراج کیا مگر اس کی اہمیت اور حیثیت پر کبھی کوئی فرق نہ آیا۔

۱۳۹۸ء میں جب تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ اُچ ہی کے راستے دہلی روانہ ہوا۔ ہمایوں کے عہد میں یہ شہر دہلی کے ماتحت آ گیا۔ تاہم مغلیہ عہد کے اواخر خصوصاً اورنگ زیب کے بعد سے اس شہر کی اہمیت، تجارت، آبادی وغیرہ میں فرق آنے لگا۔ رنجیت سنگھ نے اس شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ البتہ بہاولپور کے عباسیوں نے اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔

علمی لحاظ سے اس شہر نے صوبہ سندھ میں پورے ہندوستان کو فیضان عطا کیا۔ شیخ صفی الدین کے بعد قاضی منہاج السراج کا مدرسۂ فیروزی درس و تدریس کا اہم مرکز تھا۔ یہاں کے اکابر صوفیاء میں ساداتِ بخارا کے سید جلال اعظم، ان کے صاحبزادے سید احمد کبیر بخاری اور ان کے صاحبزادے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے علاوہ بعض اور بزرگوں مثلاً شیخ جمال الدین خنداں عالم حدیث اور شیخ بہاؤ الدین قاضی اُچ کی بدولت یہاں علم و عرفان کے منبعے جاری ہوئے۔

ساداتِ بخارا کے علاوہ ساداتِ گیلان کے بزرگ حضرت شیخ بندگی اور ان کی اولاد نے بھی دیر تک یہاں سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رکھا، شیخ رضی الدین گنج علم، جن کے علم کے معترف حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بھی تھے۔ اُچ ہی کے رہنے والے تھے۔

یہاں کی خانقاہوں اور مزاروں کی ایک بڑی فہرست "تاریخ اُوچ" مرتبہ محمد حفیظ الرحمان میں دی گئی ہے۔ مختصراً یہاں کے مزار حضرت شیخ صفی الدین حقانی، خانقاہ حضرت سید جلال اعظم سرخ پوش بخاری، مزار سلطان احمد کبیر، خانقاہ اور مزار حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، خانقاہ حضرت مخدوم راجن قتال، خانقاہ بی بی جیوندی، مزار پیر منّاں، خانقاہ حضرت بہاول حلیم، مسجد شریف اچ گیلانی، مزار شریف جمال الدین قتّال، خانقاہ حضرت حسن دریا اور خانقاہ، حضرت بندگی محمد غوث قابلِ ذکر ہیں۔

احابیش حبشیوں کی جمع۔ وہ حبشی قبائل جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اہل قریش کو ہر قسم کی امداد مہیا کی۔ ان میں بنو حارث، بنو مصطلق، بنو حیا بن سعد، بنو ھون، بنو قارہ، بنو قارظ شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بنو حارث کا ایک شخص مکہ آیا تو اس نے ایک گھر سے پانی پینے کے لئے مانگا۔ یہ محلہ بنو مخزوم کا تھا گھر سے ایک عورت نکلی تو تاجر نے شرمندہ ہو کر کہا "کسی بچے کو کیوں نہ بھیجا؟" عورت نے جواب دیا۔ "بنو بکر بن عبد منات نے ہمیں اس قابل کہاں رکھا ہے کہ ہمارے مرد حرم میں رہیں۔" وہ شخص اپنے قبیلہ میں واپس گیا تو اسے ترغیب دی کہ قریش کی مدد کی جائے۔ ابن ابی ثابت سے روایت ہے کہ جب قصی نے مکے پر قبضہ کیا تو قریش کو اپنی تعداد میں کمی کے باعث بے چینی پیدا ہوئی۔ اس پر عبد مناف بن قصی نے بنو ھون اور بنو حارث کو حلف کی دعوت دی، جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ بعد ازاں دیگر قبائل بھی حلف میں شریک ہوئے۔ حمّاد راویہ کا بیان ہے کہ یہ حلف قصی کے زمانے ہی میں اٹھایا گیا۔ یہ حلف خانہ کعبہ میں حجرِ اسود پر ہاتھ رکھ کر اٹھایا گیا تھا۔

احابیش نے حلف اٹھانے کے بعد اہل قریش کو ہر طرح سے مدد دی۔ طبری کی روایت کے مطابق ابرہہ کے حملہ کے خلاف مدافعت میں بھی احابیش نے ہر ممکن امداد دی اور چوتھی جنگ فجار میں بھی جو آنحضورؐ کی نوجوانی کے دور میں ہوئی۔ انہوں نے اہل قریش کا ساتھ دیا۔

مسلمانوں کے خلاف پہلی بار احابیش نے مقاطعہ ابو طالب میں ابو جہل وغیرہ کا ساتھ دیا اور مسلح طور پر جنگ احد میں کفار مکہ کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس معرکے میں جب یکے بعد دیگرے دس قریشی علمبردار مارے گئے تو کسی کو علم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، حتیٰ کہ بنو حارث کی عمرۃ بنت علقمہ نے علم اٹھا لیا اور آخری دم تک لئے اٹھائے رہی۔ اسی طرح جنگ خندق میں احابیش کی ایک کثیر تعداد نے اہل قریش کا ساتھ دیا۔

البتہ جب صلح حدیبیہ کے واقعہ میں قریش نے سید الاحابیش حلیس بن علقمہ کو سفیر بنا کر بھیجا تو اس نے مسلمانوں کے قربانی کے جانور اور عمرہ کا ارادہ دیکھ کر اہل قریش کو ڈانٹا کہ اگر مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روکا گیا تو احابیش مسلمانوں کی مدد کریں گے۔ فتح مکہ کے وقت یہی لوگ تھے، جو جوق در جوق مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوتے گئے اور یہی احابیش تھے جنہوں نے فتح مکہ کے وقت مکہ کی گلیوں میں حضرت خالد بن ولید کے ساتھ جنگ کی تھی۔

اُحد ایک پہاڑ، جو مدینہ کے شمال میں تین میل کے فاصلے پر [illegible] واقع ہے۔ اس کے دامن میں مشہور جنگ احد ہوئی تھی جس [illegible] آنحضورؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ دیکھئے احد، غزوہ۔

احد کے پہاڑ کی انتہائی شمالی چوٹی جبل ثور کہلاتی ہے۔ پہاڑ کے [illegible] وادی قناۃ ہے۔ اس پہاڑ سے صرف ایک دشوار گذار پگڈنڈی [illegible] کی شکل کی وادی سے ہو کر اس کی بلند چوٹیوں تک چلی گئی ہے اس وادی میں [illegible] سا پہاڑی ٹیلہ ہے، جسے غالباً چشموں کی وجہ سے جبل عینین کہتے ہیں [illegible] نے یہاں تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تھا۔

مدینہ سے اُحد کی طرف چلیں تو شور زدہ مٹی کے میدان [illegible] آگے سیاہ پتھروں کا میدان شروع ہو جاتا ہے [illegible] کے بعد ہی وادی قناۃ آتی ہے، جس کی دوسری سمت [illegible] چند میل اوپر [illegible] جھیل ہے، جس میں سے ایک ندی نکل کر [illegible] ہوئی طائف کی طرف چلی جاتی ہے۔ بارش ہو تو [illegible]

اُحد کی وجہ تسمیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ پہاڑ [illegible] تنہا اور واحد نظر آتا ہے۔ اس پر روئیدگی بالکل نہیں [illegible] پہاڑ میں کہیں کوئی درہ یا گذرگاہ سوائے ایک پگڈنڈی کے [illegible] ہلالی شکل کا خم ہے، جس کا قطر تقریباً تین سو گز ہے۔ [illegible] ڈالا تھا۔ اس کے باہر پانی کے دو چشمے ہیں [illegible] مدفن ہے۔ نیز دو حجروں میں شہدائے اُحد کی قبریں ہیں۔ ایک طرف [illegible] حمزہؓ کی قبر ہے۔

اُحد، غزوہ شوال ۳ھ [illegible] مارچ ۶۲۵ء میں مدینہ کے قریب واقع پہاڑ احد کے [illegible] میں ہونے والی مشہور اسلامی جنگ، کفار مکہ کے ساتھ ہونے والی یہ دوسری بڑی جنگ تھی۔ جس میں آنحضورؐ نے اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ لشکر کفار کا مقابلہ کیا تھا۔

اس جنگ کی بنیادی وجہ سابقہ غزوۂ بدر (۲ھ/۶۲۴ء) میں مشرکین مکہ کو ملنے والی شکست تھی۔ قریش مکہ نے اس کا انتقام لینے کے لئے اڑھائی لاکھ درہم کی رقم سے جنگ کی تیاریاں شروع کردیں اور تقریباً اتنی ہی رقم سے اسیران بدر کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑایا۔ مکے میں رضاکار فوجوں کی تیاری کے علاوہ، سرداران قریش نے اپنے حلیفوں احابیش وغیرہ کو بھی مدینہ منورہ پر حملے کی دعوت دی، اس طرح بقول ابن ہشام ایک سال کے عرصہ میں تین ہزار کا لشکر جرار تیار ہوا، جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھڑ سوار شامل تھے۔

اس تیاری کی خبریں آنحضورؐ تک بھی مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت عباسؓ نے اس کی اطلاع مدینہ بھجوائی۔ چونکہ مسلمانوں کی حالت اللہ کے فضل اور آنحضورؐ کے تدبر سے بہتر ہو چکی تھی، اس لئے مسلمانوں کو اس تیاری پر ذرا بھی تشویش نہ ہوئی جبکہ اہل قریش نے اپنے لشکر کو کیل کانٹے سے لیس کرنے کے ساتھ ساتھ مقتولین بدر کی بیواؤں اور دیگر رشتہ دار عورتوں، نیز بڑے بڑے سرداروں کی بیویوں کو ساتھ لے کر چل لیا۔ تاکہ رجز خوانی کے ذریعے یہ عورتیں اہل لشکر کو جوانمردی دکھانے پر مجبور کریں۔

غزوۂ اُحد

راستہ مکہ کی طرف
جبل اُحد
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
خالد کے حملے کے بعد کا پیچھا
اونٹ پر خبر رسان
حضرت حمزہؓ کا مورچہ
تیر اندازوں کا حملہ
اسلامی فوج
وادی قناة
خالد کے رسالے کے حملے کی سمت
کفار کا جوابی حملہ
کفار کا مورچہ
جبل عینین
نخلستان
0 25 50 75 100

اس لشکر نے اپنے سفر کا آغاز شوال ۳ھ کے ابتدائی دنوں میں کیا اور پہلا پڑاؤ عابہ کے قریب ڈالا تاکہ چارہ اور پانی سے ان کے اونٹ اور گھوڑے تازہ دم ہو جائیں ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ لوگ وادی قناة میں اترے جو شور زدہ زمین ہے۔ چونکہ مسکن نبویؐ تک پہنچنے کے لئے گنجان باغوں اور لاوے کے سنگلاخ میدانوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اسی لئے کفار کا یہ لشکر مدینہ کے شمال میں وادی قناة میں جا پہنچا جب یہ لشکر ذوالحلیفہ کے مقام پر تھا تو اس میں جانباز دستے جاسوسی کی غرض سے شامل ہو گئے اور مسلسل اپنی اطلاعات مدینہ پہنچاتے رہے۔

لشکر کفار کے آنے کی اطلاع ملی تو آنحضورؐ نے مسلمانوں سے رائے طلب کی۔ عبداللہ بن ابی سلول نے مشورہ دیا کہ آپ مجاہدین کو لے کر مدینہ سے باہر نکلیں۔ چند صحابہؓ نے مدینہ میں قلعہ بند ہو کر لڑنا مناسب خیال کیا۔ مگر نوجوان مسلمان نیز حضرت حمزہؓ متشدد اصرار کرتے رہے کہ باہر نکل کر حملہ کیا جائے۔

جمعہ کے روز ۱۴ شوال ۳ھ/ ۲۰ مارچ ۶۲۵ء کو آنحضورؐ نے مسلمانوں کو شہر کے باہر جمع ہونے کا حکم دیا۔ عورتوں کو آطام میں بھیج دیا گیا۔ البتہ چند خواتین جن میں حضرت عائشہؓ اور ام عمارہؓ وغیرہ شامل تھیں۔ زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کے لئے شریک رہیں۔

معاہدے کی رو سے یہودیوں پر بھی دفاع مدینہ کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی لیکن انہوں نے سبت (ہفتہ) کے روز لڑنے سے انکار کر دیا۔ ابن سعد کے قول کے مطابق صرف بنی قینقاع کے یہودیوں نے ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ مگر آنحضورؐ نے انھیں واپس کر دیا۔

ایک ہزار مجاہدین کا یہ لشکر مدینہ سے باہر نکلا تو شوط کے قریب پہنچ کر عبداللہ بن ابی بن سلول جیسا منافق شخص اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا اور واپس مدینہ چلا گیا۔

اگلی صبح آنحضورؐ نے باقی سات سو مجاہدوں کا جائزہ لیا اور کمسن بچوں کو واپس کر دیا۔ اب باقی لشکر کا یہ حال تھا کہ صرف ایک سو مجاہدوں کے پاس زرہیں تھیں۔ اور گھوڑوں کی تعداد دو یا تین تھی۔ دیار بنی حارثہ سے ایک قابل اور تجربہ کار شخص کو ساتھ لیا گیا، جس کی سرکردگی میں لشکر اسلام دشمن کے عقب میں جبل احد کے محفوظ درے میں اس طرح پہنچ گیا کہ دشمن کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ یہاں آپؐ نے بنی عمرو بن عوف کے سردار عبداللہؓ بن جبیر کو تیر اندازوں کا افسر بنا کر جبل عینین کے قریب تعینات کیا مصعبؓ بن عمیر کو علم دیا گیا۔ تیر اندازوں کو یہ حکم دیا گیا کہ خواہ حالات کچھ بھی ہوں وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے تاکہ دشمن عقب سے میدان جنگ پر حملہ نہ کر دے۔

کفار نے اپنے لشکر کی صف آرائی اس طرح سے کی کہ سواروں کا ایک دستہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں عقبی جانب روانہ کیا تاکہ وہ پہاڑ کے اوپر سے چکر کاٹ کر مسلمانوں کے عقب پر اس طرح حملہ کرے، گویا وہ نئی اور تازہ دم فوج ہے لیکن مسلمان تیر اندازوں نے اس دستے کو بڑی کامیابی سے ساتھ روکے رکھا۔

دشمن کے میسرہ کا افسر عکرمہ بن ابوجہل تھا۔ جنگ کا آغاز اسی نے کیا، اس کے ساتھ ہی خالد بن ولید نے بھی جبل عینین کی طرف حملہ کیا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت زبیرؓ نے خالد بن ولید کے دستے پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ خالد بن ولید کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر عکرمہ کے دستوں میں ہراس پھیل گیا اور وہ مسلمانوں کے آگے جم نہ سکے۔ عکرمہ شکست کھا کر پسپا ہوا تو مسلمانوں نے دھاوا بول دیا۔ کفار کی عورتیں، جو دف بجا کر رجزیہ اشعار گا رہی تھیں، سب کچھ پھینک کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ یہ

فتح کی طرف پہلا قدم تھا۔ چنانچہ کچھ مسلمانوں نے مالِ غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا۔ بلندی پر موجود مسلمان تیر اندازوں نے جب دشمن کو بھاگتے اور مسلمانوں کو مالِ غنیمت سمیٹتے دیکھا تو انہیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ فتح عام ہو چکی ہے۔ اس لئے ان میں سے اکثر نے اپنا مورچہ چھوڑ کر نیچے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی، جسے خالد بن ولید جیسے تجربہ کار سالار نے بھانپ لیا اور فوراً مسلمانوں پر ان کے عقب سے حملہ کر دیا۔ بچے کھچے مسلمان تیر انداز اس حملے کی تاب نہ لا سکے۔ حضرت حمزہؓ اس صورت حال کو دیکھ کر پلٹے اور خالد کے حملے کا جواب دیا۔ مگر وہ خود ایک وحشی کے نیزے سے شہید ہو گئے۔

دوسری طرف بھاگتے ہوئے کفار نے جو صورت حال بدلتی ہوئی دیکھی تو وہ بھی پورے جوش سے پلٹے۔ اب مسلمان دونوں اطراف سے گھر گئے تھے۔ اس وقت آنحضرتؐ اپنے چند جاں نثاروں کو لے کر پہاڑ کی بلندی کی طرف بڑھے۔ دشمن نے سارا زور آپ کی طرف کر دیا تھا۔ مگر آپؐ کے ساتھیوں نے آپؐ کو اپنی حفاظت میں اس طرح سے لے رکھا تھا کہ آپؐ کی طرف آنے والے ہر تیر اور نیزے کو اپنے جسموں پر روکتے تھے۔ اس اثناء میں ایک پتھر آپؐ کے دندان مبارک پر لگا اور دو دانت ٹوٹ گئے نیز ایک جگہ ٹھوکر لگنے سے آپؐ ایک گڑھے میں گر گئے۔ اس پر مشرکین نے شور مچا دیا کہ محمدؐ مارے گئے ہیں۔

یہ سنتے ہی کئی مسلمان حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ کچھ الجھنے میں اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ تاہم کچھ لوگ بے جگری سے لڑتے رہے اور اس طرح کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ صحیح بخاری کے مطابق کل ستر مسلمان شہید ہوئے۔ کفارِ مکہ کے سردار ابوسفیان نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کی شہادت کے بعد ان کا مقصد حل ہو گیا ہے۔ اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اس نے اپنے ساتھیوں کو اسباب باندھ کر مکہ چلنے کا حکم دیا۔

ادھر آنحضورؐ اپنے ساتھیوں کو لے کر احد کے شمال مشرق میں خاصی بلندی پر موجود ایک غار میں تشریف لے گئے۔ جوں جوں مسلمانوں کو آپؐ کی سلامتی کی خبر ملی، وہ غار کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں ذرا دم لینے کے بعد مسلمان ایک بار پھر لشکر کفار کی طرف بڑھے۔

اگرچہ ابوسفیان کو علم ہو چکا تھا کہ آنحضورؐ بسلامت ہیں۔ اور اب مسلمان تازہ دم ہو کر پھر سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس نے غنیمت اسی میں جانی کہ وہ فتح کا علم اڑاتا وہاں سے جلد از جلد کوچ کر جائے۔ البتہ اس نے جاتے جاتے یہ اعلان کیا کہ مسلمانو! اگلے سال پھر بدر میں مقابلہ ہو گا۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے بعد کہ کفار ابھی مدینہ پر دوبارہ حملہ نہیں کریں گے آنحضورؐ نے زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کی تدفین کا حکم دیا۔ شہداء کو ان کے مقام شہادت پر ہی دفن کر دیا گیا۔ آنحضورؐ نے فرداً فرداً ہر ایک کی نمازِ جنازہ پڑھی۔

اگلے روز ۱۶ شوال کو آنحضرتؐ مدینہ میں تشریف لائے اور ایک عام اعلان کے ذریعے مسلمانوں کو دشمن کے تعاقب کا حکم دیا۔ کیونکہ خبر ملی تھی کہ دشمن کا لشکر احد سے نکل کر ٹھہر گیا ہے اور ابوسفیان کے نزدیک مدینہ پر حملے کئے بغیر مسلمانوں کو شکست دینا ناممکن ہے۔

آنحضرتؐ کے حکم پر مجاہدین اسلام ایک بار پھر جمع ہو گئے۔ آپؐ انھیں ساتھ لیکر حمراء الاسد پہنچے۔ یہاں آپؐ نے بنو خزاعہ کے سردار معبد کو، جو مسلمانوں کا حلیف تھا لشکر کفار کی طرف بھیجا۔ اس نے جا کر ابوسفیان کو ایک طرح سے خبر دی کہ مسلمان دوبارہ مدینہ سے نکل کر ان پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اس بار ان کا لشکر بہت بڑا ہے نیز کئی حلیف قبائل بھی مدد کو آ رہے ہیں۔ میں نے ان جیسی شان اور بہادری کسی میں نہیں دیکھی۔ یہ سنتے ہی ابوسفیان کے ہوش باختہ ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فتح کی شہرت شکست کی خبر میں تبدیل ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنا لشکر لے کر مکہ واپس چلا گیا۔

اگرچہ میدان اُحد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر اسے کسی بھی طرح مسلمانوں کی شکست نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ فتح و شکست جنگ کے آخری نتائج کا نام ہے۔ اگرچہ مسلمانوں سے غلطیاں ہوئیں اور انھوں نے لوٹ مار کی ہوس میں اپنی جگہ چھوڑ دی، جس سے ان کی ترتیب بگڑ گئی۔ مگر اس سے انھیں وقتی طور پر نقصان پہنچا، جس کے فوراً بعد وہ سنبھل گئے۔ چوٹ دونوں طرف برابر کی تھی۔ اس لئے کفار کا لشکر فتح و شکست کا فیصلہ کئے بغیر لوٹ گیا۔ ورنہ ابوسفیان اگلے برس بدر میں لڑنے کی دعوت نہ دیتا۔

جنگ احد ایک طرح سے دفاعی جنگ تھی۔ اس میں دشمن کو کامیاب نہ ہونے دینا ہی دراصل فتح کا دوسرا نام ہے۔ میجر جنرل محمد اکبر خاں اپنی کتاب "حدیث دفاع" میں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "جنگ احد کے آخری دور میں بلاشبہ مشرکین کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ انہوں نے فتح حاصل کئے بغیر میدان چھوڑ دیا اور اس کی بڑی وجہ سپہ سالار ابوسفیان کی اخلاقی کمزوری تھی۔ وہ پہاڑ پر آنحضرتؐ کے آخری مورچے تک آیا مگر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ پیچھے ہٹنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ اسے اس کا یقین و اطمینان نہیں تھا کہ اس کے ماتحت سالار اس کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ وہ واپسی کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ مگر اسے اپنی کوتاہی اور کمزوری کا احساس ہے۔ چنانچہ وہ پہلے ہی پڑاؤ پر پہنچتا ہے تو مسلمانوں اور میدان جنگ سے دور ہونے کی وجہ سے اپنے خیالات پر پچھتاتا ہے اور آخری چارۂ کار کے طور پر جوابی حملے کی تیاری کا حکم دیتا ہے مگر ہمت ساتھ نہیں دیتی اور معبد کے کہنے پر واپس مکہ چلا جاتا ہے۔

معرکۂ کارزار میں ہوش و حواس قائم رکھنا بڑا ضروری ہے۔ اکثر و بیشتر فتح و شکست کا مدار اسی پر ہوتا ہے۔ سپہ سالار کے ہوش و حواس گم ہوئے اور فوج ختم ہوئی۔ کثرت تعداد اور حرب و ضرب کے سامان کی بہتات کچھ کام نہیں آتی۔ لیکن آنحضرتؐ کے اطمینان و استقلال اور حاضر دماغی کو دنیا کا کوئی سالار نہیں پہنچتا۔ تیر اندازوں کی غلطی سے احد میں مسلمانوں کے خلاف پانسہ پلٹ تو کچھ جاں نثاروں نے پکار کر کہا۔ "رسول اللہؐ جان بچاؤ!" مگر آپؐ بصیرت کی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ خالد کے سائے سے محفوظ ہیں اور باقی لشکر کفار کو ابتدائی ہزیمت کے اثرات سے سنبھلنے اور جوابی حملہ کرنے میں وقت لگے گا۔ آپؐ نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ دشمن کے کئی ماتحت سالاروں کو ابوسفیان کی قابلیت پر شبہ ہے۔ آپؐ اپنی جگہ قائم رہے اور نہ صرف قائم رہے بلکہ ایک طرف کمان بھی فرماتے رہے اور دوسرے دست بدست مقابلہ بھی کرتے رہے۔ البتہ آپؐ نے بارگاہ ایزدی میں یہ دعا ضرور فرمائی کہ "الٰہی میری قوم والوں کا قصور معاف کر دے" اور یہ بھی اسی اطمینان و استقلال کی علامت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد جو جوابی حملہ فرمایا تو دشمن بھاگتا نظر آیا۔ نہ اس کی جمعیت قائم رہی، نہ عزم و حوصلہ" چنانچہ جنگ کا قطعی نتیجہ کفار کے حق میں نہیں بلکہ مسلمانوں کے حق میں نکلا۔ چنانچہ فتح کا نام انھی کے لئے ہے۔

اِحرام "حرام قرار دینا" حج کے موقعہ پر ارضِ حرم میں داخل ہونے کے لئے ارکانِ حج ادا کرنے کی حالت میں آنا۔ چنانچہ احرام گویا اس حالت کا نام ہے۔ جس میں انسان

عمرہ یا حج کرتا ہے۔ اس حالت میں آنے کے لئے کہ معظمہ سے ایک مقررہ فاصلے پر کچھ مقامات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ ان مقامات کو میقات کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر صرف دو کپڑے

حاجی احرام باندھے ہوئے

... بند اور باندھ لئے جاتے ہیں۔ یہ کپڑے ان سلے ہوتے ہیں۔ ایک چادر ناف سے گھٹنوں تک باندھی جاتی ہے اور دوسری جسم پر اس طرح لپیٹ لی جاتی ہے کہ کسی حد تک دونوں کندھے، پیٹ اور سینہ ڈھک جائے۔ اس دوسری چادر پر بعض دفعہ گرہ لگا دی جاتی ہے اسے ردا کہتے ہیں۔ عورتوں کے لئے البتہ احرام کا کوئی الگ اور مخصوص لباس مقرر نہیں۔ لیکن انہیں عموماً ایک لمبی ردا سے خود کو لپیٹنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ مگر یہ چادر رنگین نہیں ہونی چاہیئے۔

احرام کی یہ رسم زمانۂ قدیم ہی سے چلی آتی ہے اور سنتِ ابراہیمی کی غماز ہے۔ احرام باندھنے والا محرم کہلاتا ہے۔ احرام کی ابتدا غسل ورنہ وضو سے کی جاتی ہے۔ پھر احرام باندھا جاتا ہے۔ خوشبو لگائی جاتی ہے اور حاجی دو رکعت نفل ادا کرتا ہے۔ احرام باندھنے والا حج یا عمرے کی نیت کا اعلان کرتا ہے۔ اگر صرف حج کی نیت کی جائے تو اسے افراد کہتے ہیں اور صرف عمرے کی نیت کو بھی افراد کہا جاتا ہے۔ اگر نیت عمرے کی ہو اور ساتھ حج بھی کیا جائے تو اسے تمتع کہا جاتا ہے اور اگر بیک وقت دونوں کی نیت کی جائے تو اسے قران کہتے ہیں۔ نیت کے بعد تلبیہ کی ابتدا کی جاتی ہے۔ یعنی حاجی بلند آواز کے ساتھ لبیک

کہتا ہے۔ یہ سلسلہ ذی الحجہ کی دس تاریخ تک چلتا ہے۔ جب بال اتروائے جاتے ہیں۔

احرام کی حالت میں مندرجہ ذیل امور حرام قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ (۱) جماع کرنا (۲) شہوانی باتیں کرنا (۳) فسق و فجور (۴) دنگا فساد (۵) خشکی کا شکار کرنا یا اس کا پتا دینا (۶) سلا ہوا کپڑا پہننا (۷) کرتہ، پاجامہ، دستار، ٹوپی، جبہ اور موزے پہننا۔ (۸) سر ڈھکنا مگر عورت کے لئے جائز ہے (۹) ۔ ڈھانپنا (۱۰) خوشبو لگانا (۱۱) سر یا بدن کے بال مونڈنا (۱۲) داڑھی کے بال کتروانا (۱۳) خوشبودار رنگ میں رنگا ہوا کپڑا پہننا وغیرہ۔

احسان نیکی کرنا۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں سب سے زیادہ جس اخلاقی قدر کے بارے میں تاکید کی گئی ہے۔ وہ احسان ہی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق "اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" (آل عمران - ۳: ۱۳۴) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے "اور احسان کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں سے پیار کرتا ہے" (بقرہ ۱۹۵)

سورۃ النحل میں احسان کرنے کے بارے میں اللہ تعالٰی کا واضح حکم ہوا ہے کہ "اللہ تمہیں عدل اور احسان قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔" (۱۶ : ۹۰)

احسان کرنے اور پھر انہیں زیادہ تر قریبی رشتہ داروں کو دینے سے قرآن مجید کی منشا یہ ہے کہ نیکی انسان کی فطرت بن جائے۔ کیونکہ جب انسان رشتہ داروں کو کچھ دیتا ہے تو فطری محبت کے تحت دیتا ہے۔ اس طرح جب احسان کرنا اس کی فطرت بن جائے تو وہ عام انسانوں کے ساتھ بھی اس کا اعادہ کرتا ہے اور اسلام کے نزدیک یہی صفت احسن ہے۔

احصار حج سے روکا جانا۔ یعنی اگر کوئی شخص حج یا عمرے کا ارادہ کر کے احرام باندھ لے اور کسی بیماری، رکاوٹ یا آفت کی وجہ سے حج یا عمرے سے رک جائے تو اسے احصار یعنی "روکا جانا" کہتے ہیں۔ اس موقع پر احرام کا توڑ دینا جائز ہے البتہ حج یا عمرے کے لئے ایک ایک قربانی اور دونوں کے لئے دو قربانیاں دینا واجب ہے۔ جنہیں حرم میں ان کی طرف سے ذبح کیا جائے گا۔ سورۃ بقرہ میں آیا ہے:

"اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ قربانی آسانی میسر آئے کر دو اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ منڈاؤ، یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ دکھ ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی سے دے۔ پھر جب تم امن میں ہو تو جو کوئی حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اٹھائے تو جو قربانی آسانی سے میسر آئے کر دے اور جو نہ پائے تو تین دن کے روزے حج میں رکھے اور لوٹ کر آنے کے بعد سات۔ اس طرح پورے دس ہوئے۔ یہ اس کے لئے ہیں، جس کے اہل خانہ مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔" (۲ : ۱۹۶)

احمدؐ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مبارک نام، جبکہ دوسرا مبارک نام محمدؐ ہے۔ یہ نام عہد نامہ عتیق کے "فارقلیط" کے ہم معنی ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس کے معانی "خدا کی زیادہ سے زیادہ تعریف کرنے والا" ہیں۔ سورۃ الصف میں اس نام کا ذکر انجیل اور حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے آیا ہے۔

"اور جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا، اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق کرتا ہوں، جو میرے سامنے توریت سے ہے۔ اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمدؐ ہے، سو جب وہ ان کے پاس

کھلی دلیلیں لے کر آیا تو انھوں نے کہا یہ صریح جادو ہے ۔" (۶۱ = ۶)

حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کا ذکر انجیل میں متعدد بار آتا ہے ۔ مثلاً "اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ وہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے ۔" (یوحنا ۱۴ - ۱۶) ۔ "لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا" (یوحنا ۱۵ - ۲۶) "اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا ۔" (یوحنا ۱۶ - ۷)

یہاں جس لفظ کا ترجمہ "مددگار" کیا گیا ہے ۔ اسے یونانی میں فارقلیط یا پیراکلیٹ کہتے ہیں اسے آرامی زبان میں "منحمنا" کہا جاتا ہے ، جو محمد سے صوتی مماثلت رکھتا ہے ، جبکہ عام مسلمان فارقلیط کا مطلب احمد سمجھتے ہیں ۔

احمد کا لفظ عربوں میں زمانۂ قدیم ہی سے مستعمل تھا ، خصوصاً شام کے عیسائیوں میں اس نوعیت کے نام ملتے ہیں ۔ لیکن کسی نبی کا نام احمد صرف حضرت محمد رسول اللہ کا رکھا گیا ۔ اسم علم کی حیثیت سے اس لفظ کا استعمال ۱۲۵ھ / ۷۴۳ء سے شروع ہوا مسلمانوں میں بطور نام اس کا استعمال آنحضرتؐ کے زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا اور اب بھی لوگ اسے تبرکاً نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔

احمد الاحسائی ، شیخ

(رجب ۱۱۶۶ھ / مئی ۱۷۵۳ء - ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ / ۲۲ ستمبر ۱۸۱۸ء) احمد بن زین الدین بن ابراہیم بن صقر بن ابراہیم الاحسائیؒ ، ایک فقہی سلسلے شیخیہ کے بانی ، عرب کے ایک مقام احساء کے قریب پیدا ہوئے ۔ بچپن ہی سے متقی اور پرہیزگار تھے ۔ غور و خوض کی طرف بڑی رغبت تھی بیس برس کی عمر میں دینی علوم کی تکمیل سے فارغ ہوتے اور عتبات عالیہ چلے گئے ۔ یہاں اکثر بحرین اور بصرے کے دورے پر جاتے رہتے ۔ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں یہاں سے ایران روانہ ہوئے اور کچھ عرصہ یہاں درس و وعظ کے بعد خاندان قاچار کے دوسرے بادشاہ فتح علی شاہ سے ملاقات کی ۔ شاہ نے تمنا کی کہ شیخ تہران ہی میں رہیں ۔ لیکن شیخ نے عذر پیش کر کے بادشاہ کی درخواست قبول نہ کی اور یزد میں دو سال رہنے کے بعد امام رضاؑ کے روضے کی زیارت کے لیے گئے ۔ ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں حج کا ارادہ کیا اس دوران میں اکثر اوقات عتبات عالیہ کی مجاوری کرتے رہے ۔ آخری عمر میں ارادہ حج کے لیے روانہ ہوئے مگر بیمار پڑ گئے اور مدینہ منورہ کی راہ میں انتقال کیا ۔ ان کی تربت البقیع کی دیوار کے پیچھے ہے ۔

شیخ احمد احسائی نے اپنی سیاحتوں اور مجاوری کے دوران میں مختلف کتب تصنیف کیں ان کی بیشتر تحریریں رفع شبہات کے لئے ہیں ۔ ان کی تعداد تین سو چار بیان کی جاتی ہے ۔ لیکن ان میں سے ایک سو چار کی طباعت کا ذکر ملتا ہے ۔ تقریباً بانوے رسائل "جوامع الکلم" کے نام سے دو بڑی بڑی جلدوں میں ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء میں تبریز سے چھپ چکی ہے ۔ یہ تمام تصانیف عربی میں ہیں اور ارکام الٰہی ، اعتقادات ، سیر و سلوک اصول فقہ ، تفسیر ، فلسفہ ، حکمت ، ادبیات اور دیگر متفرق موضوعات کو محیط کرتی ہیں شیخ احمدؒ کے ماننے والوں نے انھیں مجتہد کے مقام پر فائز کیا ہے اور ان کا فرقہ شیخیہ کہلاتا ہے ۔ شیخ احمد کے نزدیک ہر مسلمان کے عمل کی بنیاد قرآن ، سنت اور ضرورت اسلام پر ہونی چاہیے ۔ اور حقیقی تقلید یہ ہے کہ مسلمان کے تمام اعمال امام کی فرمائش کے مطابق اور اس کی پیروی میں ہوں ۔ ان کی تحریروں سے یہ بات مسلّمہ طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ استنباط ہے ، جو ہمہ طور قابل قبول نہیں ہو سکتا ۔

حیات بعد الموت کے بارے میں شیخ احمد کا نظریہ قابل غور ہے ۔ ان کے نزدیک تمام موجودات ایک نور سے پیدا ہوتے اور دوبارہ وہیں واپس ہوتے ہیں تخلیق کا اختلاف (مادی) اور صوری دونوں طرح سے ہوتا ہے ۔ ہر موجود اپنے وجود کے مراحل و مراتب اعلیٰ سے گزر کر ادنیٰ مرتبے کی طرف نزول کرتا ہے ۔ یہ ادنیٰ مرتبے عرضی ہیں ۔ یہ اعراض اس دنیا سے مخصوص ہیں اور جو کچھ آخرت میں ہو گا وہ اصل جسم ہے نہ کہ اعراض کیونکہ عنصری (مادی) جسم واپس نہیں ہو گا اور جسم اصلی وہ ہے جو ابتدا سے طفل سے آخر عمر تک رہتا ہے اور پھر عناصر کے بکھر جانے ، خاک میں مل جانے اور روح نباتی کے رخصت ہو جانے کے بعد کچھ رہتا ہے ۔ گویا صفاتی حیثیت [illegible] جسم ہے ۔

واقعہ معراج کے بارے میں شیخ کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ کی [illegible] شریف ترین ارواح تھی اور آپؐ کا روحانی پہلو جسمانی درجے پر غالب تھا اس [illegible] ہر جگہ اصلی و حقیقی جسم سمیت موجود ہوتے تھے ۔ چنانچہ آپؐ اعراض سے جدا اور مادہ [illegible] اس طرح کا وجود چونکہ زمان و مکان کی قید میں نہیں ہوتا اس لئے آپؐ آسمانوں [illegible] ہوتے تھے اور زمین پر بھی جلوہ افروز تھے اسی دلیل کی بنیاد پر کہا جاتا ہے [illegible] کا معراج جسمانی تھا ۔

فرقۂ شیخیہ کے نزدیک آئمہ کرام [illegible] کائنات کی [illegible] حقیقی ہے ، جن کے توسل سے دیگر مخلوق [illegible] بنیادی ارکان چار ہیں [illegible] توحید الٰہی [illegible] اولیاء اللہ اور ان کے دشمنوں سے [illegible] شیخ کے نزدیک باری بار رشد کو [illegible] مسلمان اکثر [illegible] ہوں مگر ایک ان میں سے کامل تر اور [illegible]

احمد المنصور

([illegible] ۹۵۶ھ / [illegible]) کا چھوٹا سعدی حکمران [illegible] زرع میں کی عہدوں پر رہ کر [illegible] عبدالملک نے تحت نشین ہوتے ہی [illegible] سال بعد احمد نے وادی مخازن کی [illegible] اور قید کر لیے گئے ۔

سلطان عبدالملک کے فوت ہونے پر [illegible] کی حکومت کو تسلیم کر لیا [illegible] نے تمام مراحل [illegible] اس میں احمد نے [illegible] تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا

سوڈان کی فتح کا [illegible] پڑا کیونکہ اس ضمن میں اسے بے شمار [illegible] اس کے بعد سلطان نے زیادہ تر توجہ اپنا محل تیار کروانے پر صرف کر دی [illegible] میں بیٹے کی بغاوت اور بیٹوں کی سازش نے اسے پریشان رکھا مگر بہت [illegible] سے چھوٹ گیا اور ملک کے شمال کی طرف سفر کرتے ہوئے فوت [illegible]

احمد اوّل

(۲۲ جمادی الثانی ۹۹۸ھ / ۱۸ اپریل ۱۵۹۰ء - ۲۳ ذی قعدہ ۱۰۲۶ھ / ۲۲ نومبر ۱۶۱۷ء) چودھواں عثمانی سلطان ، محمد ثالث کا بڑا بیٹا ۱۸ رجب ۱۰۱۲ھ / ۲۱ دسمبر ۱۶۰۳ء کو تخت نشین ہوا ۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی دادی صافیہ کو قدیم سرائے سلطان میں نظر بند کر دیا کیونکہ حکومت

کی اصل روحِ رواں وہی تھی۔

احمد نے اپنے عہد میں شاہ عباس اوّل کی ایرانی فوجوں سے گنجہ اور شیرواں حاصل کر لیا۔ تاہم ہنگری کی سمت ترکی فوجوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ جس کے بعد ۱۱ نومبر ۱۶۰۶ء کے ایک معاہدے کی رو سے آسٹریا کا وہ سارا علاقہ ترکوں کے قبضے میں رہا جو انھوں نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہونے والی بغاوتیں کامیابی کے ساتھ فرو کی جاتی رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فرانس، انگلستان اور وینس کے ساتھ تجدید عہد ہوتی رہی۔

احمد اوّل کا سب سے بڑا کام "قانون نامہ" کی ترتیب کی طرف توجہ دینا ہے۔ جس کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کے انتظامی امور تجارتی ضوابط کو ایک مستند قانون کی صورت میں منضبط کرنا مقصود تھا۔ ۱۶۰۹ء سے ۱۶۱۶ء کے دوران میں احمد اوّل نے آت میدان استنبول میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا انتقال دو ماہ کی علالت کے بعد ہوا۔ اپنی عمر میں اس کا زیادہ تر رجحان دین داری کی طرف رہا۔ اس نے بہت مذہبی ادارے قائم کیے اور کعبہ شریف کی تزئین و زیبائش میں بھی حصہ لیا۔

احمد بابا ([illegible] ذی الحجہ ۹۶۳ھ/ ۲۶ اکتوبر ۱۵۵۶ء - ۶ شعبان ۱۰۳۶ھ/ ۲۲ اپریل ۱۶۲۷ء) [illegible] العباس احمد بن احمد، مالکی فقیہہ اور سوانح نگار، سوڈان کے صنہاج [illegible] میں پیدا ہوئے [illegible] خاندان امامت یا قضاء کے عہدوں پر فائز رہا۔ خود بھی بہت [illegible] کے طور پر مشہور ہو گئے۔ جب احمد المنصور نے سوڈان فتح کیا تو دیگر علماء کے ساتھ آپ کو بھی [illegible]

[illegible] ۹۹۵ء [illegible] احمد بابا اسی سال میں مراکش پہنچے کہ آپ کی کتابیں ضائع [illegible] ہو چکا تھا۔ یہاں آپ نے فقہ اور حدیث میں درس دینا شروع کیا [illegible] چودہ برس بعد احمد المنصور کی وفات پر آپ ٹمبکٹو واپس آئے۔ راستہ ہی میں آپ [illegible] اور پھر وطن واپس آتے ہی انتقال کر گئے۔

احمد بابا فاس میں [illegible] بھی رہے۔ تاہم اس دوران میں تصنیف و تالیف [illegible] اور تقریباً پچاس کتابیں لکھیں۔ ان میں سب سے بڑی تصنیف فقہائے [illegible] مالکیہ کے اس تذکرے کا ضمیمہ ہے جسے چودھویں صدی عیسوی میں ابن فرحون نے تصنیف کیا تھا۔ احمد بابا کی تصنیف کا نام "ابتہاج بتطریز دیباج" تھا۔ یہ کتاب [illegible]ھ/ ۱۸۹۹ء میں فاس سے چھپی۔ اس میں مالکی مذہب کے فقہاء کے علاوہ اس زمانے کے بڑے بڑے مراکشی اولیاء کے متعلق بھی کسی قدر معلومات موجود ہیں۔

احمد بدوی (۵۹۶ھ/ ۱۱۹۹ء - ۱۲ ربیع الاول ۶۷۵ھ/ ۲۴ اگست ۱۲۷۶ء) مصر کے بہت بڑے صوفی، بزرگ اور ولی کامل، جنھیں عوام "السید" اور "بدوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ فاس میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ شجرۂ نسب حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ نوجوانی میں خاندان کے ساتھ مکہ معظمہ حج کے لیے گئے۔ وہاں والد انتقال کر گئے۔ آپ نے شہسواری کے ہنر دکھا کر العطاب کا لقب پایا۔ ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء سے آپ نے شافعی فقہ کا مطالعہ اور قرات سبعہ میں مہارت حاصل کرنا شروع کی۔ آپ پر عبادت گذاری کا رنگ اس طرح سے چڑھا کہ آپ رفتہ رفتہ لوگوں سے علیحدہ ہو کر خلوت نشین ہوتے چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو عراق جانے کا اشارہ ملا، چنانچہ آپ اپنے بڑے بھائی حسن کے ہمراہ عراق گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں آپ نے ناقابل تسخیر فاطمہ بنت بری کو مغلوب کیا، جس کی درخواستِ نکاح کو بعد ازاں ٹھکرا دیا گیا۔

عراق سے احمد البدوی نے مصر کا رخ کیا۔ یہاں آپ نے شہر طنطا میں سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ آپ کی قدر و منزلت اتنی بڑھی کہ دیگر اولیاء سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ایک لڑکا عبد العال اپنی دکھتی آنکھیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر وہیں رہنے لگا۔ آپ کی وفات کے بعد وہی آپ کا خلیفہ بنا۔

شاید آپ کے سلسلہ تصوف میں شدت تھی۔ یا بقول تعلیم یافتہ طبقہ کے آپ کے پیرو صحیح اسلامی تعلیمات سے اس قدر دور چلے گئے اور اپنے معتقدات میں اتنے شدید ہوتے چلے گئے کہ کئی بار علماء اور ارباب ریاست کے ہاتھوں پریشانیاں اٹھاتے رہے۔ دو دفعہ آپ کے سجادہ نشین قتل بھی ہوئے۔ سلطان الظاہر نے تو آپ کے مزار کی زیارت ہی ممنوع قرار دے دی۔ مگر حکومت کا یہ رویہ عوام کے اعتقاد کو متزلزل نہ کر سکا۔ آپ کے بارے میں اتنے قصے اور کرامتیں مشہور ہو گئیں کہ رفتہ رفتہ آپ کو مصر کا والی اور داتا تسلیم کیا جانے لگا۔ چنانچہ اب تک لوگ حج پر جانے سے قبل آپ کے مزار پر حاضری دینا فرض اوّلین سمجھتے ہیں۔ اور آپ کو "باب النبی" (نبی تک رسائی کا دروازہ) سمجھتے ہیں۔

پورے مصر میں احمد البدوی کے عرس منائے جاتے ہیں، جو تقریباً سارا سال جاری رہتے ہیں۔ یہ مذہبی تہوار دراصل بڑے بڑے میلے ہیں، جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور مختلف تقریبات منعقد کرتے ہیں۔

احمد بلخی (۲۲۵ھ/ ۸۴۰ء - ۳۲۲ھ/ ۹۳۴ء) ابو زید احمد بن سہل بلخی، اسلامی دور کا ایک مشہور جغرافیہ دان اور ماہر ریاضی، شامستیاں کے اسی قصبے میں پیدا ہوا۔ جلد ہی اس کا خاندان بلخ اٹھ آیا، جہاں اس نے علوم حکمیہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ احمد بلخی اسماعیلی فرقے کا ایک رکن تھا۔ پروفیسر حمید عسکری لکھتے ہیں کہ اس کے زمانے میں بلخ میں ایک فقیہہ ابو معشر جعفر بن محمد رہتا تھا جو بغداد کے مشہور سائنسدان یعقوب کندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ یعقوب کندی خاصا مشہور ہو گیا اور احمد بلخی نے اس کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کا ارادہ کر لیا۔

اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ بغداد ہی میں آباد ہو گیا۔ اسے ریاضی اور جغرافیے سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اس لیے اس کی پہلی کتاب ریاضی پر تھی، لیکن بعد میں اس نے اپنے آپ کو جغرافیے کی تحقیق کے لیے وقف کر لیا۔ جغرافیے کا سارا مضمون زمین کے مختلف خطوں کے نقشوں سے وابستہ ہے۔ اسی لیے احمد بلخی نے ان نقشوں کی طرف توجہ کی اور عہد اسلامی کی سب سے پہلی جامع اٹلس مرتب کی۔ اس کے ہر ورق پر ایک طرف نقشہ اور دوسری طرف اس کی تشریح ہوتی تھی۔ اس کا نام "صورۃ الاقلیم" رکھا گیا۔ عرصہ تک بطور معیاری تصنیف استعمال ہوتی رہی۔

احمد بن ادریس (وفات ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء) مراکش کے صوفی اور حاکم سلسلۂ ادریسیہ کے بانی، عسیر میں رہے اور وہیں وفات پائی۔ آپ نے طریقۂ سنوسیہ کے بانی کو اپنے مریدوں میں داخل کیا۔ رفتہ رفتہ آپ کی مذہبی عقیدت اتنی بڑھی کہ آپ ایک قسم کی نیم مذہبی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے پرپوتے محمد کے بیٹے علی کو ۱۹۲۳ء سے سعودی عرب کی سیادت اور حمایت قبول کرنا پڑی۔ آپ کے ماننے والے اٹلی میں بکثرت موجود ہیں۔

احمد بن حابط ایک عالم، جو بدعات کے موجد کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ اس کا شمار معتزلہ میں ہوتا ہے۔ اس نے ۲۲۲ھ/ ۸۳۶ء

...اپنے مذہب کو رضح کیا۔ اس کے نزدیک تناسخ ارواح کا نظریہ درست ہے اور اس کے پانچ مرحلے ہوتے ہیں۔ (۱) ملعونیت (دوزخ)، (۲) آزمائش (دنیا)، (۳)، اور (۴) برائے مکافات اعمال (۵) بہشت، جہاں ابتدا میں ارواح تخلیق ہوئی تھیں۔ اس کے نزدیک حیوانات بھی عمل تناسخ سے گذرتے ہیں۔ اس کے انہی خیالوں کی بنا پر اکثر علماء اسے اسلام سے خارج کرتے ہیں۔

احمدؒ بن حنبل، امام

(ربیع الثانی ۱۶۴ھ/دسمبر ۷۸۰ء - ربیع الاول ۲۴۱ھ/جولائی ۸۵۵ء)

احمد بن محمد بن حنبل، فقہ حنبلی کے بانی، عالم دین، فقیہ اور محدث، ابن تیمیہ کے استاد اور اصلاحی تحریکوں کے محرک، امام بغداد اور ابن حنبل کے نام سے مشہور ہیں۔

احمد بن حنبل نسلاً عرب تھے اور بنو شیبان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندان کی سکونت پہلے بصرے میں تھی۔ مگر آپ کے دادا حنبل بن ہلال شہر مرو میں چلے گئے۔ آپ کے والد محمد بن حنبل بغداد چلے آئے۔ آپؒ وہیں پیدا ہوئے۔ آپ نے لغت، فقہ اور حدیث کی ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ بعد ازاں عراق، حجاز، یمن اور شام کے سفر کئے۔ تاہم آپ کا زیادہ تر قیام بصرہ میں رہا۔ پانچ بار حج بھی کیا یعنی ۱۸۷ھ/۸۰۳ء، ۱۹۱ھ/۸۰۶ء، ۱۹۶ھ/۸۱۲ء، ۱۹۷ھ/۸۱۳ء، اور ۱۹۸ھ/۸۱۴ء۔ اس دوران میں روضۂ رسولؐ کے مجاور بھی رہے۔ ۱۹۹ھ/۸۱۵ء تک آپ وہیں رہے۔

امام احمدؒ بن حنبل کے اساتذہ میں بغداد کے قاضی ابو یوسف، دبستان حجاز کے سفیان بن عیینہ بصرے کے عبدالرحمان بن مہدی اور کوفے کے وکیع بن جراح زیادہ اہم ہیں بقول ابن تیمیہ علم فقہ میں آپ نے زیادہ تر اہل حدیث اور دبستان حجاز سے تحصیل علم کیا۔

جب مامون الرشید نے فرقہ معتزلہ کی حمایت کا اعلان کر دیا تو احمدؒ بن حنبل کے دور محنت و ابتلا کا آغاز ہوا۔ آپ نے مامون کی سختیوں کے برعکس خلق قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہیں گرفتار کر کے مامون کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ابھی آپ راستہ ہی میں تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ آپ کو واپس بغداد کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ اگرچہ نیا خلیفہ المعتصم اس سزا کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر سرکاری عمال کے ڈر اور مشوروں کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکا۔

ایک بار امام احمدؒ بن حنبل کو خلیفہ المعتصم کے سامنے پیش کیا گیا، جہاں آپ نے دوبارہ خلق قرآن کے عقیدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آپ کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ تاہم آپ کو زنداں سے رہائی مل گئی۔ اور آپ اپنے گھر چلے گئے۔ جس کے بعد المعتصم کے سارے عہد حکومت میں گوشہ نشین رہے۔

۲۳۲ھ/۸۴۷ء میں جب خلیفہ متوکل برسر اقتدار آیا اور معتزلیہ کا دور ختم ہوا تو احمدؒ بن حنبل نے بھی اپنا سلسلہ درس و تدریس دوبارہ شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ پر ظلم و ستم کروانے والے لوگوں میں ایک معتزلی قاضی احمد بن ابی دواد بھی تھا۔ جسے اب معزول کر دیا گیا۔ ۲۳۷ھ/۸۵۲ء میں متوکل نے آپ کو سامرا میں طلب کیا تاکہ آپ سے ترویج سنت اسلام کے لئے مدد لے سکے۔ سامرا پہنچنے پر حاجب نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایتاخ کے پرتکلف محل میں ٹھہرایا۔ شہزادہ المعتز سے بھی ملاقات ہوئی مگر آپ کی عمر اور صحت کے پیش نظر آپ سے کوئی خدمت نہ لی جا سکی۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد اور خلیفہ سے ملاقات کئے بغیر آپ بغداد چلے آئے۔ جہاں ۷۵ برس کی عمر میں وفات پائی اور شہیدوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

امام احمدؒ بن حنبل کی دو منکوحہ بیویوں سے ایک ایک بیٹا صالح اور عبداللہ پیدا ہوئے۔ اور ایک لونڈی کے بطن سے چھ بچے پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیمات کا زیادہ تر حصہ صالح سے منقول ہے، جو بغداد میں ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶۶ھ/۸۹۹ء میں فوت ہوئے اور آپ کے ادبی کام کا زیادہ تر حصہ عبداللہ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے، جو بغداد میں ۲۱۳ھ/۸۲۸ء کو پیدا ہوئے اور ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں فوت ہوئے۔

امام احمدؒ بن حنبل کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے، جنہوں نے بقول ابن تیمیہ احادیث و اخبار کے انبار میں سے اپنا مسلک خود تلاش کیا اور اپنی ذاتی رائے کے ساتھ حدیثوں کا صحیح مفہوم سمجھا اور ان سے پیدا شدہ نتائج کا استخراج کیا۔

آپ کے شاگردوں میں اسحاق بن منصور، ابوبکر الاثرم، حنبل بن اسحاق، الملک المیمونی ابوبکر المروزی، ابوداؤد السجستانی، حرب الکرمانی اور ابراہیم بن اسحاق حربی نے آپ کے جوابات اور فتاوے کو تحریر کرنے کا فریضہ انجام دیا۔

امام حنبلؒ کی مشہور و معروف تصنیف مجموعۂ احادیث ہے جسے مسند کہتے ہیں۔ اس میں آپ کے فرزند عبداللہ نے کئی اضافے کئے۔ یہ احادیث راویوں کے نام سے مرتب کی گئی ہیں۔ جو حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے بعد سلسلہ وار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اور پھر انصار، اہل مکہ، اہل مدینہ، اہالیان کوفہ، بصرہ اور شام کی مسند احادیث مندرج ہیں۔

دو اہم رسالے "الرد علی الجہمیہ" اور "کتاب السنت" ابن حنبل کے اصول و عقائد کو سمجھنے میں بے حد مدد دیتے ہیں۔ پہلے رسالے میں جہم بن صفوان کے عقائد کی وضاحت اور تردید ہے اور دوسری میں بعض دینی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اور کتاب "الصلوٰۃ" نماز با جماعت اور اس کی ادائیگی کے بارے میں ہے۔ آپ کے تمام فتاوے اور جوابات کو ابوبکر المروزی کے شاگرد ابوبکر الخلال نے کتاب "الجامع العلوم الامام احمدؒ" میں جمع کر دیا۔ ابن قیم لکھتے ہیں کہ اس کی بیس جلدیں تھیں۔ جن میں سے صرف کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ابن قیم نے امام موصوف کی ایک اور تصنیف تفسیر القرآن کا ذکر بھی کیا ہے، جو ایک لاکھ بیس ہزار احادیث پر مبنی تھی، مگر اب ضائع ہو چکی ہے۔

حنبلی فرقے کے اصول و قواعد کے بارے میں محققین نے بہت کم لکھا یا اس میں دلچسپی لی، چنانچہ ابن حنبل کی تعلیمات کے متعلق مسلم رائے یہ پیدا ہو چکی ہے کہ وہ ایک تشدد پسند تشبیہی مذہب ہے۔ دیگر مخالف فرقوں نے اسے اس قدر دبا دیا ہے کہ اس میں زندگی کی حرارت نظر نہیں آتی۔ مگر غیر جانبدارانہ طور پر دیکھنے سے صاف پتا چلتا ہے کہ امام احمدؒ بن حنبل کی اصل تعلیمات کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔

دائرۃ المعارف اسلامیہ کے نزدیک امام ابن حنبلؒ کے نزدیک خدا، قرآن کا خدا ہے۔ خدا پر ایمان رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اسے اسی طرح مانا جائے جیسا کہ خدا نے اپنے آپ کو خود قرآن میں بیان کیا ہے۔ اس لیے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات مثلاً سمع، بصارت، کلام، قدرت کاملہ، مشیت اور علم و حکمت وغیرہ کو حقیقی ماننا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان تمام متشابہات پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جن میں خدا کے ہاتھ اور عرش اور اس کے حاضر و ناظر ہونے اور مومنین کو حشر کے دن اس کا دیدار نصیب ہونے کا ذکر ہے۔ احادیث کے مطابق اس بات کی بھی تصدیق کرنا لازم ہے کہ خدا ہر رات کے تہائی حصے میں سب سے نچلے آسمان پر نزول فرماتا ہے تاکہ جو لوگ اس کی عبادت کرتے ہیں، ان کی معروضات سماعت فرمائے، مگر ان سب باتوں کے ساتھ اس بات کا اقرار بھی ضروری ہے کہ قرآن پاک کے لفظی متن کے مطابق اللہ تعالیٰ واحد اور صمد ہے، اس دنیا میں اپنی کسی مخلوق کے ساتھ مماثل یا متشابہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ابن حنبلؒ بڑے زور شور کے ساتھ جہمیہ کے سبھی عقائد اور ان کی قرآن و حدیث کی بصورت استعارہ تفسیر کی تردید کرتے ہیں اور اسی تائید اور سختی کے ساتھ وہ مشبہ کے عقیدے کو بھی باطل گردانتے ہیں۔ جو خدا اور انسان کے مشابہ بتاتے ہیں۔

گویا ابن حنبل کے نزدیک انسان کو خدا کی ذات کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیئے اور اسے بعینہٖ تسلیم کرے۔ جس کا تصور قرآن مجید سے ملتا ہے۔ یہ راز اسی کی ذات پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ کیا ہے اور کیسے ہے علم کلام کی بے سود اور خطرناک موشگافیوں کو بالکل ترک کر دینا چاہیئے۔

قرآن مجید کے بارے میں ابن حنبل کا نظریہ واضح ہے کہ قرآن کلام الہٰی ہے اور غیر مخلوق ہے مگر اس عقیدے کی کوئی قطعی اور اثباتی صورت آپ نے بیان نہیں کی۔ جس سے آپ کے پیروؤں کو خاصی الجھن پیدا ہوئی۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ آپ قرآن مجید کے لفظی مفہوم اور تفسیر کے قائل ہیں۔

احادیث کے بارے میں ابن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ صرف وہی احادیث قابل قبول ہوتی ہیں جن کے متعلق یہ یقین ہو کہ آنحضرت صلعم سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس لئے آپ نے وہی احادیث جمع کیں جو اس زمانے میں مسلّم ہو چکی تھیں۔

ابن حنبلؒ کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کا مرتبہ دینی لحاظ سے سب سے بلند ہے اس کے بعد حضرت عمرؓ کا اور پھر وہ چھ اصحاب شوریٰ جنھیں حضرت عمرؓ نے مقرر فرمایا تھا اور جو سب کے سب خلافت کے اہل تھے۔ یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔ اس کے علاوہ غازیان جنگ بدر اور مہاجرین و انصار کا درجہ ہے خلافت کا حق آپ کے نزدیک صرف اہل قریش کا تھا۔ تاہم آپ نے انھیں [illegible] کا مستحق نہیں سمجھا چنانچہ۔ کتاب السنت [illegible]

[illegible] ہے کہ [illegible] کے حقوق کا پاس کریں۔ ان کے مدارج کو تسلیم [illegible] خدمات کا اعتراف کریں [illegible] رسول خدا سے جو محبت ہے [illegible] واجب ہے [illegible] کی ہتک کرنا یا ان سے [illegible]

[illegible] ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی [illegible] آپ یہ جائز سمجھتے ہیں کہ خلیفہ [illegible] جا سکتا ہے۔ [illegible] کے مستند نمائندوں کو حق کہ کلام اللہ [illegible] امام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مفاد عامہ کی خاطر [illegible] جاری کرے جو اس کے نزدیک ضروری ہوں۔ افراد ملت پر امام کی [illegible] ہے۔ تاہم اگر حکمران احکام خداوندی کے خلاف چلنے کا حکم دے تو [illegible] اس کی اطاعت سے انکار کر دینا چاہیئے۔ لیکن مسلح بغاوت اس [illegible] ناجائز ہے۔ جب تک کہ امام روزمرہ کی نمازیں باقاعدگی سے ادا کرتا رہے حنبلی مذہب کے سب سے بڑے شارح امام ابن تیمیہؒ تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کی زیادہ تر تعلیمات کا ماخذ انھی کی تحریریں ہیں۔ جن کے زیر اثر بعد میں کئی اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ انھی میں سے ایک امام محمدؒ بن وہاب کی تھی۔ جنھیں ماننے والے وہابی کہلاتے ہیں۔

احمد بن خالد

(۲۲ ذی الحج ۱۲۵۰ھ / ۲۰ اپریل ۱۸۳۵ء — ۱۶ جمادی الاوّل ۱۳۱۵ھ / ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۷ء) ابوالعباس شہاب الدین احمد بن [illegible]، مراکشی مورخ، سلا میں پیدا ہوا۔ وہیں تعلیم پائی۔ چالیس برس کی عمر میں احمد ان مراکشی حکومت کے عدالتی شعبے میں منتظم جاگیر مقرر ہوا۔ اس کے بعد مختلف سرکاری [illegible] پر فائز رہا۔ مگر آخری ایام میں اپنے وطن واپس آ گیا اور تدریس و تصنیف میں منہمک ہوا۔

احمد بن خالد کی مشہور تصانیف جنھوں نے مراکشی علم و ادب پر گہرا اثر چھوڑا، یہ تھیں :۔ ۱۔ ابن الونان کی نظم "شمقمقیہ" کی شرح

۲۔ تعظیم المنہ بنصرۃ السنہ

۳۔ طلعت المشتری فی النسب الجعفری (زاویہ ناصریہ کی ایک مستند اور عمدہ تاریخ)

۴۔ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ۔ یہ کتاب قاہرہ سے ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی اور احمد بن خالد کی سب سے بڑی اور اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس میں علوی خاندان کی تاریخ خصوصاً بیان کی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیاسی تاریخ کے ان تمام متفرق اجزا کو مربوط کر دیا گیا ہے جو اس سے پیشتر مختلف کتابوں میں بکھری پڑی تھیں۔ اس میں مراکش کے تقریباً تمام حکمران خاندانوں کی تاریخ درج ہے۔

احمد بن طولون

(رمضان ۲۲۰ھ / ستمبر ۸۳۵ء — ذی قعدہ ۲۷۰ھ / مارچ ۸۸۴ء) طولون خاندان کا بانی، مصر کا پہلا حکمران، جس نے شام کے ساتھ الحاق کیا۔ فوجی تعلیم و تربیت سے بچپن کا آغاز ہوا۔ سامرا میں تربیت پائی اور اپنی شجاعت بہادری کی بدولت بہت جلد خلیفہ المستعین کی نظروں میں مقبول بن گیا۔ ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء میں خلیفہ المعتز نے احمد کے سوتیلے باپ باکباک کو مصر کا ملک عطا کیا اور احمد کو اس کا نائب مقرر کیا۔

باکباک کے قتل کے بعد صوبۂ مصر یرجوخ کو عطا ہوا۔ جس نے اپنی بیٹی کا نکاح احمد ابن طولون سے کر دیا۔ اس نے اسے نائب کے عہدے پر بھی مستقل کر دیا۔ ابن طولون نے کثیر تعداد میں غلام خرید کر اپنی ذاتی فوج بنائی اور یہی اس کے اقتدار کے لئے ایک بنیاد بنی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنا اقتدار اتنا مستحکم کر لیا کہ خلیفہ یرجوخ یا کسی اور کو لکھنے کی بجائے ابن طولون کو لکھا کرتا تھا کہ مصر کا خراج روانہ کیا جائے۔ چونکہ خلیفہ یہ چاہتا تھا کہ مصری خراج کی رقم اس کے ذاتی مصارف میں رہے اور اس کے بھائی الموفق کو اس بات کا علم نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس نے احمد بن طولون کو مصر و شام کے سرحدی علاقوں کے مالیات کا پورا انتظام بھی دے دیا۔

۲۵۸ھ / ۸۷۲ء میں خلیفہ کا بیٹا جعفر یرجوخ کی جگہ مصر کا حاکم بنا۔ نیز خلیفہ نے اپنے بھائی الموفق اور بیٹے المفوض کے درمیان مملکت کو تقسیم کر دیا۔ جس سے الموفق کو مشرقی علاقے بشمول مصر ملے۔

الموفق چاہتا تھا کہ ابن طولون سے زیادہ سے زیادہ خراج حاصل کرے لیکن اس کی طاقت کے خوف سے وہ اس پر دباؤ نہ ڈال سکا۔ ادھر ابن طولون نے شام پر بھی قبضہ کر لیا اور سکوں پر اپنا نام بھی کندہ کرانا شروع کر دیا۔ تاہم ابن طولون خلیفہ کی سرپرستی کو قبول کرتا رہا۔

۲۶۹ھ / ۸۸۲ء میں احمد نے خلیفہ کو مصر آ کر پناہ گزین ہونے کی دعوت دی تاکہ مرکزی اقتدار مصر منتقل ہو جائے۔ مگر الموفق نے خلیفہ کو بے بس کر دیا اور اسحاق بن کنداج کو مصر کا حاکم مقرر کیا۔ احمد نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ فقہا کے ذریعے الموفق کی وراثت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد الموفق نے احمد کو ہر طرح سے قابو میں کرنے کی کوشش کی مگر وہ رام نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

احمد بن طولون ایک مدبر اور قابل حکمران تھا۔ اس کے بعد اس کا خاندان عرصہ تک مصر پر حکومت کرتا رہا، اس کی وجہ یہی تھی کہ احمد نے حکومت کی بنیادیں اتنی مضبوط بنا دی تھیں کہ اس کے بعد وہ مرکزی خلیفہ کی دست اندازی سے بچی رہیں۔ اس کی فوج ایک طاقتور فوج تھی۔ مزید براں اس نے فسطاط کے شمال میں القطائع کے نام سے ایک

نئی بستی بھی آباد کی، جہاں مسجد ابن طولون آج بھی پوری شان و شوکت کیساتھ موجود ہے مصر میں زرعی اصلاحات کا آغاز کرنے والا شخص احمد بن طولون ہی تھا۔ اس نے حکام کے غلط طریقوں کو ختم کر دیا اور کسانوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر بہت جلد خوش حال ہو گیا۔

احمد بن عیسیٰ (وفات ۳۴۵ھ/۹۵۶ء) احمد بن عیسیٰ بن محمد بن علی بن العریضی بن جعفر صادقؑ، صوفی، بزرگ، حضرمی سادات کے مورث اعلیٰ۔ المہاجر کے لقب سے مشہور تھے۔ ۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں محمد بن سلیمان اور سالم بن عبداللہ کے ہمراہ بصرے سے روانہ ہوئے اور معزلی یمن میں جا کر آباد ہو گئے۔ ۳۴۰ھ/۹۵۱ء میں آپ اپنے بیٹے عبداللہ کے ہمراہ حضرموت چلے گئے۔ حسیسہ کے شہر میں صوف کا علاقہ خرید کر رہنا شروع کیا اور وہاں سنی عقائد کی تبلیغ شروع کر دی یہیں انتقال کیا اور حسیسہ کے باہر دفن ہوئے۔ علوی خاندان کے مورث اعلیٰ علوی آپ کے پوتے تھے۔

احمد بے تیونس کے خاندان حسینیہ کا دسواں حکمران، اپنی فوج کا سالار اعظم۔ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۵ء تک حکمران رہا۔ سب سے پہلے اسی نے اپنے فوجیوں کو یورپ میں تربیت دلائی اور اپنی حدود مملکت کا نقشہ تیار کروایا۔ ۱۸۳۸ء میں اس نے ایک دار الفنون بھی قائم کیا، جس میں ماہرین فن اور انتظامی افسروں کو تربیت دی گئی۔ بحری فوج کے لیے بارہ جہاز بھی خریدے گئے مگر یہ فوج کبھی بھی مستحکم نہ ہو سکی۔

۱۸۴۶ء میں احمد بے فرانس گیا تاکہ ترکیہ کے خلاف اس سے مدد لے سکے اور اسے ترکی سلطنت کو خراج ادا نہ کرنا پڑے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ترکی کے باب عالی نے اسے خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیا۔

احمد بے ایک فضول خرچ انسان تھا۔ اس کے اسراف کی بدولت بہت جلد تیونس کا خزانہ خالی ہو گیا۔ ظاہری شان و شوکت کو برقرار رکھنے کی وجہ سے تیونس کی مالی حالت بہت جلد گرنے لگی۔ اور اس کے آخری ایام تک تیونس کی مالی ساکھ بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ فرانسیسی اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔

احمد تتوی، ملا (قتل ۲۵ صفر ۹۹۶ھ/۲۵ جنوری ۱۵۸۸ء) اکبری دور کے فاضل ٹھٹھہ کے شیعی عالم، تفسیر کشاف کے مطالعے کے بعد مذہب امامیہ اختیار کیا، ورنہ آباؤ اجداد حنفی تھے۔ ان کے والد نصر اللہ دیبلی ملا ٹھٹھوی کے نام سے مشہور تھے۔ اکیس بائیس برس کی عمر ہی میں تمام علوم سے فراغت حاصل کر لی تبدیلی مذہب کے بعد مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گئے۔ وہاں مولانا افضل قاینی سے فقہ امامیہ اور ریاضی میں دسترس حاصل کی۔ یزد اور شیراز میں جا کر ملا کمال الدین طبیب اور ملا میرزا جان شیرازی سے "کلیات قانون" اور "شرح تجرید" اور اس کے حواشی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازیں تبریز، عراق کی زیارت گاہوں، حرمین شریفین اور بیت المقدس کا سفر کیا۔ پھر سمندر کے راستے وارد دکن ہوئے اور گولکنڈہ کے والی قطب شاہ کے پاس آئے

ملا احمد تتوی اکبری دور کے فضلاء میں سے تھے۔ دربار اکبری تک رسائی حکیم ابوالفتح گیلانی کے توسط سے ہوئی۔ یہاں انھیں "تاریخ الفی" مرتب کرنے کا کام ملا۔ مگر بہت جلد میرزا فولاد خاں برلاس کے ہاتھوں لاہور میں قتل ہو گئے۔ قتل کا سبب مذہبی تعصب بیان کیا گیا ہے۔ ملا احمد کو خطیرۂ حبیب اللہ میں دفن کیا گیا۔

ملا تتوی کی صرف دو تصانیف "خلاصۃ الحیات" اور "تاریخ الفی" ملتی ہیں۔ پہلی کتاب فلسفیوں کے احوال اور اقوال پر مشتمل ہے۔ کتاب نامکمل حالت میں ہے یہی حال تاریخ الفی کا ہے۔ اس کتاب میں بھی بہت تھوڑا حصہ ملا کا لکھا ہوا ہے۔ یہ اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ لکھنے کی ایک کوشش تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ تاہم اس میں مغلیہ دور کا حال تفصیل سے درج ہے۔

احمد ثالث (۱۰۸۳ھ/۱۶۷۳ء – ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء) ترکی کے عثمانی سلاطین کا تیسواں بادشاہ، محمد رابع کا بیٹا، اپنے بھائی مصطفےٰ ثانی کی جگہ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/۲۲ اگست ۱۷۰۳ء کو تخت پر بیٹھا۔ فوراً ہی اس نے فوج کی طاقت توڑنے کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ فوجی بغاوت نہ ہو سکے۔ اگلے بارہ تیرہ برس تک اس نے یکے بعد دیگرے کئی صدر اعظم تبدیل کیے۔ محرم ۱۱۱۸ھ/مئی ۱۷۰۶ء میں چورلولو علی پاشا کا تقرر بطور صدر اعظم عمل میں آیا۔ تب کہیں جا کر ملک میں امن و سکون کی حالت پیدا ہوئی۔

نومبر ۱۷۰۹ء کو بالطہ جی محمد پاشا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ۲۰ نومبر کو روسیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ جنگ کا آغاز جولائی ۱۷۱۱ء میں ہوا جس میں زار نے شکست کھائی اور قرار پایا کہ زار بحر ازوف سے دستبردار ہو جائے گا اور ترکی کی سرحد پر موجود قلعوں کو منہدم قرار دے گا۔ مگر زار اپنے عہد پر [illegible] نہ رہ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس کے خلاف تین مرتبہ اعلان جنگ ہوا (دسمبر ۱۷۱۱ء، نومبر ۱۷۱۲ء، اپریل ۱۷۱۳ء) مگر جنگ کی نوبت نہ آئی۔ بالآخر جون ۱۷۱۳ء میں ادرنہ میں ایک عہد نامے پر دستخط ہو گئے جو طویل مدت کے لیے تھے۔

۲۷ اپریل ۱۷۱۳ء کو احمد کا منظور نظر داماد سلاحدار علی پاشا وزیر اعظم مقرر ہو چکا تھا۔ یہ اس کی حکمت عملی تھی کہ روس سے اس طرح دوبارہ صلح [illegible] عالی اس قابل ہو جائے کہ کارلووٹز کے میدان میں چھینا ہوا علاقہ وینس سے [illegible] سکے۔ جنگ کا اعلان ۹ دسمبر ۱۷۱۴ء میں ہوا اور آئندہ موسم گرما میں دو مہینے کے اندر ایک ترکی لشکر نے، جس کی قیادت خود سلاحدار علی پاشا کے ہاتھ میں تھی اور جس کے ساتھ سلطان کا بحری بیڑا بھی کام کر رہا تھا، سارا صوبہ دوبارہ فتح کر لیا اور کوئی سخت لڑائی بھی نہ ہوئی۔ وینس کے خلاف ترکیہ کی اس کامیابی کو دیکھ کر آسٹریا کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں سلطان کی فتوحات کا دائرہ بہت زیادہ نہ پھیل جائے۔ اس نے وینس کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ ۱۷۱۶ء میں سلاحدار علی پاشا کو شکست ہوئی اور وہ شہید ہوا۔ سیوائے کے حاکم یوجین نے بلغراد کا محاصرہ کر لیا۔ اور اس نے بڑی ترکی فوج کو شکست دی، جو محاصرہ توڑنے آئی تھی۔ بالآخر جولائی ۱۷۱۸ء کو صلح ہو گئی، جس کی رو سے بلغراد اور اس کے قریبی علاقے آسٹریا کے حوالے کر دیے گئے، جبکہ وینس سے موریہ اور اقریطش کی بندرگاہیں ترکی کو واپس مل گئیں۔ مزید برآں ایک تجارتی معاہدہ بھی تینوں ملکوں کے مابین ہوا۔

اس دوران میں احمد ثالث کا داماد ابراہیم پاشا وزیر اعظم بنا اور اگلے بارہ برس تک دربار پر حاوی رہا۔ اس کے عہد میں یورپی فن تعمیر، موسیقی اور ادب ترکی میں مروج ہو گیا۔ مساجد اور مقبروں کے مقابلے میں کوشک اور باغ زیادہ بنائے جانے لگے اور عوام کا رخ حکمرانوں سمیت عیش کوشی کی طرف پلٹ گیا۔ اسی دور میں ابراہیم متفرقہ نے پہلا مطبع خانہ قائم کیا اور پہلی مرتبہ ترجمہ کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ باب عالی نے فرانسیسی انجینئروں کو دعوت دی کہ وہ مغربی اصولوں کے مطابق ترکی افواج کی

اصلاح کی تجاویز تیار کریں۔

احمد ثالث کی حکومت کا یہ دور "دورِ لالہ" کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں گل لالہ کی کاشت کی طرف زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ اس دورِ لالہ کی ممتاز تعمیری یادگاروں میں سے جو اب تک موجود ہیں، ایک تو وہ مسجد ہے جو احمد ثالث نے اپنی والدہ کے نام سے اُسکودار میں تعمیر کرائی تھی اور دوسرے اس کا چشمہ، جو طوپ قپو سرائے کے باب ہمایوں کے باہر ہے۔ اس کا قطعۂ تاریخ اس نے خود لکھا تھا۔

اسی دوران میں ایران میں ابتری پھیلی۔ روس اور ترکی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دربند، باکو اور گیلان پر روس نے اور گرجستان، اریوان، شیروان، آذربائیجان اور ہمدان کے مغرب میں موجود تمام علاقوں پر ترکی نے قبضہ کر لیا۔ اگلے دو برس بعد یعنی ۱۷۲۵ء میں جب اشرف افغان شاہ ایران بنا تو اس نے ترکی سے یہ علاقے خالی کر دینے کا مطالبہ کیا اور باب عالی کے انکار پر نومبر ۱۷۲۶ء میں اس نے احمد پاشا کو شکست دی۔ تاہم ترکی کے مقبوضات برقرار رہے حتیٰ کہ ۱۷۳۰ء میں نادر شاہ نے یہ علاقے واپس لے لیے۔

ان امور کے پیش نظر ترکی عوام بھی احمد ثالث کے مخالف ہو گئے۔ فوج میں بھی بغاوت کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور بالآخر ۲۸ ستمبر ۱۷۳۰ء کو چند گھنٹوں ہی میں ایک [illegible] میدان میں جمع ہو گیا۔ دو روز تک باغیوں کے ساتھ گفت و شنید ہوتی [illegible] سرکردہ عہدیداروں کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ وزیر اعظم اور شیخ الاسلام [illegible] باغیوں کے حوالے کر دی گئیں۔ احمد خود اس شرط پر تخت سے دستبردار ہو گیا کہ اس کی اور اس کے بیٹوں کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ [illegible] ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو اس کی جگہ اس کا بھتیجا محمود اول تخت [illegible] بعد [illegible] اس کے انتالیس بیٹوں میں سے ایک مصطفیٰ عثمان ثالث کے [illegible] ہوا۔

احمد ثانی

(۲۵ ذی الحجہ ۱۰۵۲ھ/۲۵ فروری ۱۶۴۳ء - ۲۲ جمادی الآخر ۱۱۰۶ھ/ [illegible] فروری ۱۶۹۵ء) ترکی کے عثمانی سلاطین کا اکیسواں بادشاہ، سلطان ابراہیم [illegible] کا بیٹا، اپنے بھائی سلیمان کی جگہ ۲۶ رمضان ۱۱۰۲ھ/۲۳ جون [illegible] کو ادرنہ میں تخت نشین ہوا۔

[illegible] احمد پاشا نے صدر اعظم مصطفیٰ پاشا کو اس کے عہدے پر مستقل [illegible] نے آسٹریا اور ہنگری پر [illegible] حملہ کر دیا۔ اس کے مرنے پر عربجی علی پاشا [illegible] کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حاجی علی پاشا کا تقرر ہوا۔ اس نے ۱۶۹۲ء میں [illegible] انتظام کے سلسلہ [illegible] آغاز کیا۔ اسی سال وینس نے کینیڈیا پر حملہ کیا جس کی بنا پر حاجی علی پاشا کو معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ بوزوق مصطفیٰ پاشا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس نے بلغراد کا محاصرہ اٹھوا دیا تو اسے بھی برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ سورملی علی پاشا کا تقرر کیا گیا۔

احمد ثانی کے عہد میں عراق اور حجاز میں سرکشی و بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے اور مغرب میں تیونس پر لیبیا اور الجزائر نے حملہ کر دیا مگر وہ ان سے عہدہ برآ بھی نہ ہوا تھا کہ استسقا کے مرض کے ہاتھوں انتقال کر گیا اور سلطان سلیمان قانونی کے مقبرے میں دفن ہوا۔

احمد جام

(۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء - محرم ۵۳۶ھ/اگست ۱۱۴۱ء) شہاب الدین ابو نصر احمد بن ابی الحسن، ایران کے صوفی، جو احمد جامی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ امام غزالی اور سنائی کے ہمعصر تھے۔ شجرہ نسب حضرت جریرؓ بن عبداللہ سے ملتا ہے۔ قہستان کے ایک گاؤں نامق میں پیدا ہوئے۔ نوعمری میں شراب کے رسیا تھے کہ اچانک کسی قلبی کیفیت کے تحت عزلت نشینی اختیار کر لی اور بزد جام کے پہاڑوں میں مقیم ہو گئے۔ یہاں آپ نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔

۴۸۱ھ/۱۰۸۹ء میں احمد جام ایک گاؤں معدآباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں آپ نے ایک خانقاہ اور جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہاں سے مختلف مشرقی شہروں کی سیاحت کے لیے جاتے رہے مگر انتقال یہیں فرمایا اور معدآباد کے باہر دفن ہوئے۔ اس وقت آپ کے انتالیس بیٹوں میں سے چودہ باقی تھے۔ ان میں سے برہان الدین نصر خلیفہ بنے۔ شمس الدین جامی انھی کی ایک بیٹی کی اولاد میں سے تھے۔

احمد جام کوئی باقاعدہ تعلیم یافتہ اور بیعت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ آپ نے معرفت الٰہی کا راستہ بذات خود تلاش کیا اور جو کچھ آپ نے کہا یا تصنیف کیا وہ محض کشف کے ذریعے حاصل ہوا۔ تاہم آپ کا علم دین زیادہ تر قرآن و سنت پر مبنی ہے۔ اور آپ باشریعت صوفی تھے۔ آپ کے عقیدۂ طریقت میں تزکیۂ نفس کے مدارج کو تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ کے نزدیک نفس مطمئنہ ایک نیام ہے، جہاں دل ٹھہر سکتا ہے۔ آپ کے صوفیانہ نظریات آپ کو ایک وجدانی وحدت الوجودی ظاہر کرتے ہیں جو اپنی الوہیت کے نشے میں مست و سرشار ہے۔

احمد جام کی تصانیف زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔ ان میں "انس التائبین"، "سراج السائرین"، "مفتاح النجات"، "فتوح القلوب"، "مجار الحقیقت" اور "کنوز الحکمت" زیادہ مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے کتب خانے میں احمد جام کی ساری تصانیف موجود تھیں۔ آپ کے سوانح نگار آپ کے نام سے نظموں کا ایک دیوان بھی منسوب کرتے ہیں۔

احمد جودت پاشا

(۲۶ جمادی الآخر ۱۲۳۸ھ/۲۲ مارچ ۱۸۲۲ء - ۳۰ ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ/۲۵ مئی ۱۸۹۵ء) ترکی کا معروف ادیب اور سیاستدان۔ شمالی بلغاریہ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں استنبول کے ایک مدرسے میں تعلیم پانے چلا آیا۔ سند اجازۃ حاصل کرنے کے بعد ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۵ء میں قاضی مقرر ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں مصطفیٰ رشید پاشا وزیر اعظم ہوا تو اس نے جدید قوانین مرتب کروانے کے لئے انھیں بلا لیا۔ اس ملازمت کے دوران میں اس نے سیاسی امور کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۵۰ء میں اسے دار المعلمین کا ناظم مقرر کیا گیا۔ مزید برآں انھیں مجلس معارف کا دبیر اعلیٰ بھی بنا دیا گیا۔

مارچ ۱۸۵۲ء میں فواد پاشا کی زیر سرکردگی احمد جودت پاشا نے "تاریخ وقائع دولت علیہ" کا آغاز کیا۔ جب یہ کتاب سلطان عبدالمجید کی خدمت میں پیش کی گئی تو اسے منصب سلیمانیہ پر فائز کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اسے اعلیٰ عدالتی حکام میں منصب مکہ عطا ہوا۔ ۱۸۶۱ء تک وہ مختلف علمی عہدوں پر کام کرتا رہا۔

فواد پاشا نے اسے مشورہ دیا کہ سرکاری ملازمت قبول کر لے اور ودن کے والی کا عہدہ قبول کرے، مگر اس نے یہ مشورہ قبول کرنے میں آٹھ برس لگا دیئے۔ چنانچہ کہیں ۱۸۶۶ء میں جا کر اس نے علمی منصب ترک کر دیئے اور ولایت حلب کا والی مقرر ہوا۔ دو برس بعد اسے دیوان احکام عدلیہ کے وزیر کی حیثیت سے واپس بلا لیا گیا۔ چنانچہ اس کی کوششوں سے نظامی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس عہدے پر وہ اپریل ۱۸۷۰ء تک کام کرتا رہا۔ اس دوران میں حنفی فقہ کی پانچ جلدیں مرتب کر کے شائع کر چکا تھا۔ اس تاریخ کو اسے معزول کر دیا گیا۔ جس کے بعد اس نے مجلہ کی چھٹی جلد شائع کی، جس کی بنا پر اسے دوبارہ بلا لیا گیا۔ اپریل ۱۸۷۳ء میں اسے وزیر تعلیم کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ اس ملازمت کے دوران میں اس نے نصاب تعلیم کی طرف

زیادہ توجہ دی اور تین کتابیں خود بھی لکھیں۔ ۱۸۷۵ء میں اسے دوبارہ وزیر اوقاف مقرر کیا گیا۔ یہاں ابھی چھ ماہ ہی نہ گذرے تھے کہ معزول کر دیا گیا اور تیسری بار وزیر تعلیم مقرر ہوا۔ ۱۸۹۰ء تک مختلف وزارتوں اور عہدوں پر تبدیل ہوتے رہنے کے بعد وہ سیاست سے مستعفی ہو گیا۔ اور آخری تیرہ چودہ برس مختلف ادبی کاموں میں گذارے۔

جودت کی شہرت زیادہ تر اس کی تاریخ کی تصانیف کی وجہ سے ہے۔ اس کی مشہور کتابوں میں "قصص انبیاء و تواریخ خلفاء" (بارہ جلدیں)، "تاریخ جودت" (بارہ جلدیں ۱۷۷۴ء سے ۱۸۲۶ء تک ترکی تاریخ) "تذاکیر جودت" (مختلف یادداشتیں) زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے ترکی زبان و ادب میں بھی قابل ذکر کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ جن میں نظموں کا مجموعہ "دیوانچہ" اور "قواعد عثمانیہ" زیادہ مشہور ہیں۔

احمد خاں، سر سید

(۵ ذی الحج ۱۲۳۲ھ/۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء - ۵ ذی قعدہ ۱۳۱۵ھ/۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) مسلمانوں کے عظیم مصلح، رہنما اور مصنف علیگڑھ یونیورسٹی کے بانی، دہلی میں ایک درویش صفت شخص میر تقی ولد سید ہادی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف ہرات سے شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے تھے والد نقشبندی بزرگ شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ اور نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ تھے، جو پہلے کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اور پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر ہو گئے۔ سید احمد خان بچپن ہی سے والد کے ہمراہ ونانا کے دربار میں جایا کرتے تھے۔

سید احمد خاں کی تربیت زیادہ تر ان کی والدہ نے کی، جو بڑی دانشمند خاتون تھیں۔ بچپن کے مذہبی ماحول نے ان پر خاصا اثر کیا۔ دہلی میں ان دنوں علوم اسلامی کے دو بڑے مراکز تھے۔ ایک شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ دوسرا مرزا مظہر جانجاناں کے جانشین شاہ غلام علی کی خانقاہ۔ سید احمد خاں نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ شاہ غلام علی ہی نے ان کا نام احمد رکھا تھا۔ اور ان کی بسم اللہ کی تقریب بھی شاہ صاحب ہی کے ہاتھوں ہوئی۔

سید احمد خاں کی تعلیم بھی انھی پرانے اصولوں پر ہوئی۔ پہلے قرآن مجید پڑھا پھر فارسی کی درسی کتابیں مثلاً کریما، خالق باری، آمد نامہ، گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، مختصر معانی اور معلول کا کچھ حصہ پڑھا۔ ہندسہ اور ریاضی کی تعلیم اپنے ماموں زین العابدین خاں اور طب کی تعلیم حکیم غلام حیدر سے حاصل کی۔

والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر بائیس سال تھی۔ اس وقت ان کے خالو خلیل اللہ خاں صدر امین دہلی تھے۔ یہ بھی ان کے پاس بطور سررشتہ دار ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد آگرے کے کمشنر کے دفتر میں نائب منشی ہوئے۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے مین پوری میں جج بن گئے اور پھر ترقی کرتے کرتے "جج سمال کاز" (منصف عدالت خفیفہ) ہو گئے۔ اس حیثیت سے فتح پور سیکری، دہلی، رہتک، بجنور، مراد آباد، غازی پور، علیگڑھ اور بنارس میں تھوڑا تھوڑا عرصہ رہے اور ۱۸۶۹ء میں انگلستان میں بھی گئے۔ ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو کر اپنے مشن کی تکمیل کے لیے علیگڑھ میں مقیم ہو گئے۔

حکومت وقت کی طرف سے انھیں سر کا خطاب ملا تھا۔ اس لیے سر سید کے نام سے مشہور ہوتے۔ ۱۸۷۸ء میں امپیریل کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے رکن رہے اور ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں انھیں کے سی ایس آئی کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آخری برسوں میں ان کی صحت خاصی خراب رہتی تھی۔ اسی حالت میں کام کرتے رہے اور بالآخر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

سر سید نے اپنی ملازمت کے پینتالیس سال بڑی نیک نامی سے بسر کئے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ترویج علوم کے لئے بھی وقت نکالا تھا۔ لیکن سرکاری ملازمت کو جب اپنے مشن کی راہ میں حائل دیکھا تو اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مذہبی اور قومی مصلح کی حیثیت سے سرگرم عمل ہو گئے۔

سر سید کی زندگی تین حیثیتوں سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ مصنف بھی تھے مذہبی مصلح بھی اور قومی رہنما بھی تھے۔ مصنف کی حیثیت سے انھوں نے تاریخی اور مذہبی مباحث سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کی مشہور کتابیں انھی مضامین کے متعلق ہیں۔ دوران ملازمت انھوں نے یہ کتابیں لکھیں۔ "انتخاب الاخوین یعنی قواعد دیوانی کا خلاصہ"۔ "قول متین در ابطال حرکت زمین"، "تسہیل فی جر الثقیل"

سر سید احمد خاں

رسالہ اسباب بغاوت ہند" اور "آثار الصنادید" (۱۸۴۷ء) جو دہلی [illegible] کی تحقیقی تاریخ ہے۔ اسے دیکھ کر انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کا [illegible] کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سر سید نے "آئین اکبری" اور "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح کی۔ "تزک جہانگیری" کو شائع کرایا اور "تاریخ سرکشی بجنور" کو مرتب کیا۔

مذہبی تصانیف میں سر سید زیادہ تر سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید سے متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسالہ "راہ سنت و بدعت" (۱۸۵۰ء) طریقہ محمدیہ کی تائید اور اہل تقلید کی تردید میں لکھا۔ "تحفہ حسن" شاہ عبدالعزیز کی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کے باب نمبر ۱۰، ۱۲ کا ترجمہ رد شیعہ میں اور "کلمۃ الحق" (۱۸۴۹ء) پیری مریدی کے خلاف لکھا۔

شروع میں سر سید کا مسلک یہ تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کی نفرت دور کرنے ہی میں بہتری ہے۔ چنانچہ انھوں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار

کرنے کے لیے تصانیف کا سہارا لیا۔ "تحقیق لفظ نصاریٰ"، رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" (۱۸۶۸ء) کے علاوہ بائیبل کی تفسیر "تبیین الکلام" بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی بھی قائم کی، جس نے اخبار "علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے جاری کیا۔

ملازمت کے بعد سرسید نے نتیجہ خیز تصانیف کا ایک ڈھیر سا لگا دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں "خطبات احمدیہ" (۱۸۷۰ء) تصنیف کی۔ اس کے بعد تفسیر القرآن لکھی جو نامکمل رہی۔ یہ تفسیر سترھویں پارے تک لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ اسی دور میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجرا ہوا جو ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء سے شروع ہوا اور چھ سال کے بعد بند ہو گیا۔ اس کا دوسرا دور دو سال پانچ ماہ کا ہے اور تیسرا دور تین برس کا ہے۔ اس رسالے میں دیگر اہل فکر کے ساتھ ساتھ سرسید کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ جو زیادہ تر [illegible] اصلاحی اور قومی مقاصد کے حامل ہوتے تھے۔

[illegible] مصلح کی حیثیت سے سرسید سب سے پہلے مجتہد تھے۔ جنھوں نے جدید علم کلام کی ضرورت کو محسوس کیا۔ [illegible] جب مغرب میں سائنسی اور مادی ترقی [illegible] بڑھی اور اہل یورپ مذہب اور سائنس کو دو الگ الگ خانوں میں رکھ چکے تھے [illegible] مسلمانوں پر بھی ہو رہا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اسلام ترقی کی راہ میں [illegible] عیسائی مشنریوں کا بڑھتا ہوا رسوخ تھا اور [illegible] مستشرقین [illegible] بیان کردہ باتوں سے غلط خیالات پیدا [illegible] عقل مذہب سمجھے گئے تھے۔ اس وقت سرسید نے [illegible] سرسید نے قرآن کے تمام مندرجات کو [illegible] مثلاً معراج اور شق صدر کو خواب کا فعل [illegible] کے متعلق تمام قرآنی ارشادات کو [illegible] خارجی وجود، حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا [illegible] آسمان پر زندہ [illegible] جنوں کو بھوتوں کی قسم کی مخلوق ماننے [illegible]

سرسید کے ان اقدامات کی بنا پر ان پر کفر کے الزامات لگائے گئے [illegible] ہونے سے ہرگز باز نہ آئے [illegible] بے شک سرسید [illegible] اس امر کا اعتراف ضروری [illegible] ہمدردی کے خیال سے کیا۔ خود ان ہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں: [illegible]

"[illegible] صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے، نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھے برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے ائمہ کبار درکنار، مولوی حجو کی بھی تقلید کافی ہے۔ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کہہ لینا ہی ایک طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔"

گرچہ سرسید نے کئی مسائل میں جمہور علماء سے اختلاف بھی کیا ہے، مگر ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ ایسا اختلاف بڑے بڑے علماء و مشائخ نے کیا ہے اور اگر اختلافات کی بنا پر آدمی کافر ٹھہرایا جائے تو پھر اسلام میں کوئی بھی قابل ذکر ہستی مسلمان نہیں رہتی۔

اردو ادب پر بھی سرسید کا گہرا اثر پڑا۔ ان کی بدولت ایک نئے دبستان کا آغاز ہوا۔ جس نے سادہ و سلیس انداز میں نثر نگاری شروع کی اور عقلیت اور مقصدیت، ٹھوس اور جامع مسائل کو عام فہم انداز میں بیان کرنا شروع کیا۔ اردو میں انشائیہ نگاری اور تحقیق و تنقید کی شاخوں کا اجرا ہوا۔ اردو میں علمی اور سنجیدہ نثر نگاری کے وہ خود بانی تھے، جسے ان کے رفقاء نے بہت ترقی دی۔ ادب میں حقیقت، سچائی اور فطرت کی تحریک انھی نے اٹھائی، جس کی بنا پر انھیں "نیچری" (فطرت پرست) بھی کہا گیا۔

بحیثیت رہنمائے قوم سرسید کا سب سے اہم کارنامہ ان کی تعلیمی تحریک ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے مصائب کا حل تعلیمی ترقی میں مضمر جانا اور پھر اس کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ لندن سے واپسی پر انھوں نے ایک کمیٹی برائے خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کے نام سے قائم کی اور تعلیم کے موضوع پر مضامین لکھوا کر ایک درس گاہ کا آغاز کیا۔ مئی ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں اس مدرسے کا افتتاح ہوا۔ دو سال بعد یعنی جنوری ۱۸۷۷ء میں اسے کالج کا درجہ ملا اور اگلے برس سے یہاں کالج کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ یہ ایک طرح کی اقامتی درس گاہ تھی، اس لیے اس کے ساتھ ہوسٹل بھی تھے۔ طلبا کی ہر طرح سے تربیت کی جاتی تھی۔ کہنے کو تو یہ کالج تھا مگر حقیقت میں مسلمانوں کا ایک اہم سیاسی مرکز تھا۔ سرسید مسلمانوں کے سیاسی امور کے رہنما تھے۔

سرسید کی سیاسی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ دو قومی نظریے کا واضح اعلان انھی نے کیا۔ یہ چیز اردو ہندی زبانوں کے جھگڑے سے چلی اور پھر سرسید جو پہلے اتحاد مذاہب کے قائل تھے، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی حقوق لینے کے لیے تل گئے۔ ان کی اس سیاست کی تربیت گاہ علیگڑھ کالج ہی تھا۔ اگرچہ یہ کالج بڑے بڑے علماء تو تیار نہ کر سکا جیسا کہ سرسید نے کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ کا تاج سر پر ہوگا، لیکن یہاں سے ایسے طلبا تربیت پا کر نکلے جو سیاسی میدانوں کے ماہر ثابت ہوئے۔

جہاں تک سرسید کے کردار کا تعلق ہے، آج تک کسی نے بھی اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ وہ دیانت دار، مخلص اور صاف گو شخص تھے۔ ان کا جذبہ مستقیم اور راستبازی کا تھا۔ خود کو اکثر "نیم چڑھا دہلوی" کہتے تھے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ وہ معاملات کو جیسا صحیح سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ اب اگر لوگ انھیں غلط سمجھیں تو اس کی انھیں پرواہ نہیں۔ انھوں نے جو جاہ و اقتدار حاصل کیا، اس سے اگر اپنی ذات کے لیے کچھ کرنا چاہتے تو مشکل نہ تھا۔ وہ اتنی اہم شخصیت کے مالک تھے کہ حکومت وقت سے ایک مستقل ریاست بطور جاگیر لے سکتے تھے۔ مگر بقول آرنلڈ نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو اور جب وہ مرا تو اس کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک پیسہ بھی گھر سے نہ نکلا۔ یہ شان قلندری نہ تھی تو اور کیا تھا۔؟

احمد رودلوی

(وفات ۱۵ رجمادی الثانی ۸۳۷ھ/۲۷ جنوری ۱۴۳۴ء) شیخ عبدالحق احمد صوبہ اودھ میں قصبہ رودلی کے صوفی، عمر فاروق اعظمؓ کی اولاد میں سے تھے۔ سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ جدامجد بلخ کے رہنے والے تھے ہلاکو کی تباہ کاریوں کے بعد ہندوستان میں آ گئے اور پھر یہیں مقیم ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ احمد بچپن ہی سے عبادت گذار تھے۔ بارہ برس کی عمر میں گھر سے تحصیل علم کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ پانی پت میں شیخ جلال الدین سے بیعت کی اور عبدالحق خطاب پایا۔ مرشد کی وفات کے بعد رودلی میں تشریف لے آئے اور تبلیغ دین کا کام شروع کر دیا۔ یہیں انتقال فرمایا۔

شیخ احمد زہد اور ریاضت میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ

نے تیس برس تک تکیہ پر سر نہ رکھا تھا اور تمام عمر صرف ایک خرقہ پہننے کے لیے رکھا، جہاں سے پھٹ جاتا، پیوند لگا لیتے۔ اکثر اوقات محو و استغراق میں رہتے، یہاں تک کہ اکثر اوقات اسے پہچاننے سے انکار کر دیتے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند شیخ احمد عارف سجادہ نشین ہوئے، جو ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں پیدا ہوئے اور ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں انتقال کیا۔

احمد شاہ تاریخ میں کئی بادشاہوں کا نام ؛-

(۱) - احمد شاہ ابدالی یا درّانی یا ابدالی کے لیے دیکھیے ابدالی احمد شاہ

(۲) احمد شاہ بہادر مجاہد دین ابو النصر، محمد شاہ کا بیٹا، بادشاہ دہلی ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء کو پیدا ہوا اور ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں تخت نشین ہوا، اس کے عہد میں عنانِ حکومت عموماً نواب اودھ صفدر جنگ کے ہاتھ میں رہی۔ جسے نئے شہنشاہ کا وزیر اعلیٰ بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔ روہیلوں کے خلاف اس نے مرہٹوں سے امداد طلب کی، جنہوں نے معاوضے کے طور پر لوٹ مار مچا دی، جس کی وجہ سے احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ احمد شاہ ایک نا اہل حکمران تھا۔ ایک وزیر عماد الملک غازی الدین خان نے اسے قید کر کے آنکھیں نکلوا دیں۔ یہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں فوت ہوا۔

(۳) - بہمنی خاندان کے تین حکمران احمد شاہ اوّل، ثانی اور ثالث کے نام سے مشہور ہوئے۔

(۴) - احمد شاہ بن محمد شاہ شمس الدین بنگال کا حاکم تھا (۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء تا ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء تک)

(۵) - گجرات کے بادشاہ احمد اوّل اور احمد شاہ ثانی۔

احمد شہید، سید (۶ صفر ۱۲۰۱ھ/۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء - ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/۶ مئی ۱۸۳۱ء) سید احمد، بالاکوٹ کے معرکے کے مشہور معروف مجاہد، شہید، صوفی اور بزرگ، اودھ کے قصبہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلہ نسب چھتیسویں پشت میں حضرت امام حسنؓ سے ملتا ہے۔ سلطان التمش کے زمانے میں آپ کے جد امجد سید قطب الدین محمد ہندوستان آئے اور شیخ الاسلام کا عہدہ پایا۔ ان کی اولاد میں سے آگے چل کر سید احمد سید عرفان کے صلب سے پیدا ہوئے۔

سید احمد نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ مگر آپ نے تعلیم حاصل کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ البتہ سپاہیانہ کھیلوں سے رغبت تھی۔ چنانچہ بچپن ہی میں بندوق چلانے اور تیر کمان میں مہارت حاصل کر لی تھی، جب ذرا بڑے ہوئے تو مخلوق خدا کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ سترہ برس کی عمر میں ملازمت کے لئے لکھنؤ کی طرف نکلے اور پھر وہاں سے دہلی پہنچ گئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادر کے پاس بھجوا دیا۔ یہاں آپ نے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ آپ کے "میزان" سے لے کر کافیہ اور مشکوٰۃ تک پڑھ لینے کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں سید احمد اپنے وطن واپس ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز نے وہ گدڑی بھی آپ کو تھما دی، جو ان کے دادا شاہ عبدالرحیم کے زمانے میں رائے بریلی سے آئی تھی۔ یہاں آتے ہی آپ کی شادی زہرہ نامی ایک خاتون سے کر دی گئی۔

اسی زمانے میں آپ نے امیر الدولہ، نواب ٹونک کے پاس ملازمت اختیار کر لی۔ یہ وہ دور تھا، جب مغلوں کی حکومت آخری دموں پر تھی۔ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم چکے تھے۔ مرہٹے ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ اسلامی حکومت کا زوال آپ کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ ایسے میں آپ کو امیر خاں کے علاوہ اور کوئی نواب نظر نہ آیا، جو انگریزوں اور سکھوں کے اثر سے پاک تھا۔

غالباً ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں سید احمد شہید امیر خاں کے پاس پہنچے اس کے لشکر میں شامل ہوتے ہی آپ نے لشکریوں کی دینی حالت سدھارنا شروع کر دی۔ چنانچہ لشکریوں نے آپ کی عزت و توقیر شروع کر دی۔ خود امیر الدولہ نے بھی آپ سے اصلاح و ہدایت لینا شروع کی۔ مگر ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے معاہدے کی ٹھانی تو آپ اس سے علیحدہ ہو گئے اور سیدھے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچے۔ یہاں آپ اکبری مسجد میں ٹھہرے اور سلسلہ رشد و ہدایت شروع کر دیا۔ یہیں آپ کے ہاتھ پر شاہ اسماعیل نے بیعت کی۔

اسی زمانے میں آپ نے تبلیغ جہاد کا کام شروع کیا اور [illegible] پھلت گنگوہ، مظفر نگر، دیوبند، کاندھلہ، سلون، آلہ آباد، بنارس، سلطان پور، کانپور، لکھنؤ اور دوسرے مقامات کا سفر کیا، تاکہ مسلمانوں کے عقیدہ [illegible] اور عمل کی اصلاح کی جائے۔ اور ان میں جہاد کا شوق پیدا کیا جائے۔ نواب امیر خاں کے لشکر سے علیحدگی کے بعد آپ کا سارا وقت لوگوں کو جہاد کا شوق دلانے اور انھیں [illegible] زمانے میں گذر رہا تھا اور خیال تھا کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے مقام پر چلے جائیں گے جہاں آزادی سے مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار کر سکیں۔ لیکن اچانک آپ نے ایک روز اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے سفر حج کا اعلان کیا۔

شوال ۱۲۳۶ھ/جولائی ۱۸۲۱ء کو آپ چار سو ساتھیوں سمیت حجاز کے لئے روانہ ہوئے۔ کلکتہ سے گیارہ جہازوں کا انتظام کیا گیا۔ ۲۸ شعبان ۱۲۳۹ھ/[illegible] ۱۸۲۴ء کو آپ فریضۂ حج سے واپس وطن پہنچے۔

حج سے واپس آ کر سید احمد کا سارا وقت جہاد کی تیاریوں میں [illegible] قوم پر بہت نازک وقت آن پڑا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور [illegible] تھی، جس سے مذہب اسلام کو نقصان کا اندیشہ تھا۔ لوگوں [illegible] رنگ رلیاں پھیل رہی تھیں۔ کامل دو برس تک آپ [illegible] جہاد کی [illegible] مختلف عزیزوں، دوستوں اور حکمرانوں کے نام خطوط لکھے۔ ان کے [illegible] آپ نے اندازہ لگایا کہ پنجاب کے شمال مغرب ہی میں کوئی [illegible] جسے مرکز جہاد بنایا جائے۔

جب مجاہدین کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی تو آپ [illegible] ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء سے ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر [illegible] گوالیار [illegible] اجمیر، پالی، امرکوٹ، حیدرآباد سندھ، پیرکوٹ، شکارپور [illegible] غزنی، کابل اور جلال آباد کے راستے پشاور پہنچے راستے میں لوگوں [illegible] میں شرکت کی دعوت دیتے چلے آئے۔

ربیع الاوّل ۱۲۴۲ھ/نومبر ۱۸۲۶ء میں آپ پشاور سے چارسدہ [illegible] پہنچے۔ یہاں سے آپ نے حاکم پنجاب رنجیت سنگھ کو شرعی حکم کے مطابق [illegible]

۱- بہتر ہے کہ اسلام قبول کر لو اور ہمارے بھائی بن جاؤ۔

۲- یا ہماری اطاعت قبول کر کے جزیہ دینا پسند کرو۔ ہم [illegible] مال کی حفاظت کریں گے۔

۳- اگر یہ منظور نہیں تو لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس پر رنجیت سنگھ نے اپنے کمانڈر [illegible] کو دس ہزار کا لشکر دے کر سید صاحب کے مقابلے میں بھیجا۔ اس نے آتے ہی نوشہرہ کے قریب اکوڑہ میں [illegible] ڈالا۔ اس کے سپاہیوں کے پاس ہر قسم کا ہتھیار موجود تھا۔ بلکہ مجاہدین کی [illegible]

تھی کہ سب کے پاس بندوقیں بھی نہ تھیں۔ چنانچہ مجاہدین نے شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔

۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ / ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نو سو غازیوں نے سکھوں پر شب خون مارا۔ مجاہدوں کے سب سے پہلے شہید شیخ باقر علی عظیم آبادی تھے۔ اس معرکے میں جو گھنٹے تک جاری رہا۔ تقریباً سات سو سکھ مارے گئے اور بیاسی مجاہدین شہید ہوتے۔ سکھ لشکر اکوڑہ سے بھاگ کر شیدو میں پناہ گزین ہو گیا۔

اس جنگ سے سکھوں اور مجاہدوں دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ مسلمان منہ کا نوالہ نہیں جنھیں آسانی کے ساتھ نگلا جا سکے۔ اس وقت خادے خاں رئیس ہنڈ اور اشرف خاں رئیس زیدہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خادے خاں آپ کو مع لشکر ہنڈ کے قلعے میں لے گیا۔ وہاں سے حضرو کے سکھوں پر چھاپہ مارا گیا اور بہت سامان غنیمت ہاتھ آیا۔ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ / ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو ہنڈ میں [illegible] صاحب کے ہاتھ پر امامت [illegible] کی بیعت ہوئی۔ [illegible] کے والی سرداروں [illegible] سلطان محمد [illegible] بھی بیعت کی اور بیعت کی حامی بھری۔ اب تک [illegible] ہزار مجاہدین اکٹھے ہو چکے تھے

[illegible] جنگ شروع کیں۔ انھوں نے سازشوں [illegible] کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یار محمد خاں نے [illegible] صاحب سکھوں کے ساتھ شیدو کے جنوب [illegible] سید احمد جا بر تو ہو گئے لیکن یہ جنگ [illegible] جب کہ مسلمان فتح یاب ہونے والے [illegible] جس کی بنا پر نا اتفاقی پیدا [illegible]

[illegible] ایک سکھ اور دوسرے سرداران [illegible] رہی تھی۔ [illegible] سے مجاہدین کے [illegible] سے جا ملا تھا [illegible] یار محمد زیدہ کی جنگ میں [illegible] خاں مارا گیا اور سید احمد نے [illegible] تک پورا علاقہ ایک [illegible] سلطان محمد کی درخواست پر پشاور کی حکومت [illegible] سے خفیہ سازشوں کے [illegible] کو شہید کرا دیا۔ جو سید صاحب کے بقول [illegible] کا لب لباب تھے۔

یہ دیکھ کر سید صاحب نے اپنی تحریک کا مرکز سرحد کی بجائے کشمیر کو بنانے کا خیال کیا۔ چنانچہ مجاہدین کا مرکز پنجتار سے منتقل ہو کر امب آ گیا۔ انھی دنوں رنجیت سنگھ نے سرحد کا سارا علاقہ آپ کے حوالے کرنے کی پیش کش کی تاکہ وہ آپ کے حملوں سے محفوظ ہو جائے۔ مگر آپ تو خالصتاً جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے تھے۔ اس لیے آپ نے مولانا شاہ اسماعیل کو کہا کہ وہ بالاکوٹ چلے جائیں۔ انھی دنوں برف باری کا موسم شروع ہو گیا، جس کے فوراً بعد آپ ۲۲ رمضان ۱۲۴۶ھ / ۲۰ [illegible] ۱۸۵۱ء [illegible] چلے گئے۔

مظفر آباد سے مولانا خیرالدین نے اطلاع بھیجی کہ سکھوں نے شیر سنگھ سے کمک مانگی ہے۔ جو مانسہرہ اور مظفر آباد کے درمیان دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ چکر کاٹ رہا تھا۔ ادھر بالاکوٹ سے حبیب اللہ کی عرضی پہنچی کہ شیر سنگھ بالاکوٹ پر حملہ کرنے والا ہے۔

۱۷ اپریل ۱۸۳۱ء کو سید احمد پکھلی سے بالاکوٹ روانہ ہوئے۔ وہاں شاہ اسماعیل نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے جاتے ہی دفاعی مورچوں کو مضبوط کیا۔ ادھر شیر سنگھ بالاکوٹ سے دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو ایک لمبا چکر دے کر پہاڑی راستے کے ذریعے مٹی کوٹ کے ٹیلے تک پہنچا دیا جو بالاکوٹ کے عین سامنے واقع ہے۔

۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ / ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو جمعہ کے روز بالاکوٹ اور مٹی کوٹ کے درمیان جنگ ہوئی جو تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ سید صاحب بڑے جذبے سے لڑتے رہے۔ جب زور کا رن پڑا تو سکھوں کو مارتے مٹی کوٹ کے نالے میں دامن کوہ کے قریب پہنچ گئے۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو لوگوں نے انھیں کہیں نہ پایا۔ بعد ازاں ان کی نعش نالے میں پائی گئی۔ جہاں وہ سکھوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ لاش اس حالت میں ملی کہ سر تن سے جدا تھا۔ چنانچہ دونوں کو ملا کر دفن کیا گیا۔

شیر سنگھ کے چلے جانے کے بعد وحشی سکھوں کی ایک جماعت نے قبر کھود کر لاش کو ندی میں ڈال دیا۔ سر اور تن ایک بار پھر جدا ہو گئے۔ لاش تیرتی ہوئی تلہٹہ پہنچی۔ جہاں کے لوگوں نے انھیں کھیت میں دفن کر دیا اور سر بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ پہنچ گیا۔ وہاں کے خان نے اسے نکلوا کر دفن کروا دیا۔ اب وہاں ایک پختہ قبر ہے۔ بالاکوٹ میں سید احمد شہید کا جو مزار ہے۔ وہ وہی ہے، جہاں انھیں پہلی بار دفن کیا گیا۔ اب اس میں ان کا جسد مبارک موجود نہیں۔ سر کی قبر گڑھی حبیب اللہ میں ہے جسے ۱۹۴۸ء میں پوری قبر کے برابر بنایا گیا۔

سید احمد شہید تحریک پاکستان (تحریک آزادی وطن) کے وہ عظیم مجاہد تھے جنھوں نے اپنے خون کے ساتھ اس تحریک کو حیات نو بخشی۔ آج اس سرزمین سے انگریز اور سکھ دونوں رخصت ہو چکے ہیں۔ مگر سید احمد شہید کی تحریک کی عظمت اسی طرح قائم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب اور ان کے رفقاء نے اس تحریک کے ذریعے جو خالصتاً احیائے دین کی تحریک تھی، عوام کے اذہان کو تیار کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی اور حق کے پیغام کو اس سرزمین میں پھیلانے اور ذہنی تربیت کے لیے جو وقت بھی انھیں ملا، اس میں بڑی سعی کی۔

بعض مصنفین ان درجات اور اس شہرت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جو سید احمد شہید کو حاصل ہوئی بلکہ اس کے برعکس ان کا یہ خیال ہے کہ ایک تو وہ زیادہ تعلیم یافتہ اور فیض یافتہ نہیں تھے اور دوسرے وہ انگریزوں کے دشمن نہیں بلکہ ان کے ایجنٹ تھے اور ان کی ملی بھگت سے کارروائی کرتے تھے۔ اس رائے کے حامل مصنفین میں شاہ حسین گردیزی پیش پیش ہیں۔

سید احمد شہید نے مسلمانوں کی ہدایت کے لیے چند کتابیں بھی تحریر کیں۔ ان میں سے "صراط مستقیم" ایسی کتاب ہے، جسے مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحئی نے آپ کے ارشادات کو سن کر مرتب کیا۔ اس کے علاوہ "تنبیہ الغافلین"، "رسالہ نماز"، "رسالہ در نکاح بیوگان" اور "ملہمات احمدیہ فی طریق المحمدیہ" دیگر تصانیف ہیں۔

احمد علی سہارن پوری (۱۲۲۵ھ -) محدث۔ میرٹھ میں قرآن حکیم حفظ کیا۔ شیخ وجیہہ الدین، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور شاہ عبدالقادر دہلوی سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ ۱۲۶۵ھ میں مطبع احمدی کے نام سے دہلی میں ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جو جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو گیا تو کلکتہ چلے گئے جہاں دس برس تک مسجد حافظ جمال الدین

ہیں علوم دینیہ کی تدریس کیا۔ ۱۲۸۳ھ میں مظاہر السلام سہارنپور میں دورہ حدیث پڑھانے کا آغاز کیا جو آخر وقت تک جاری رہا۔ طلبہ دور دراز سے علم حدیث پڑھنے کے لئے آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوتے۔ بڑے وسیع النظر تھے۔ ان کے بعض مشاہیر تلامذہ کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیری، مولانا احمد حسن کانپوری، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی، مولانا وصی احمد محدث سورتی۔ مولانا دیدار علی شاہ الوری۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی۔ مولانا قاسم نانوتوی اور دیگر علما نے آپ کے علمی تبحر اور تقویٰ میں اعلیٰ مقام کی وجہ سے دارالسلام دیوبند کی بنیاد آپ سے رکھوائی۔ صحیح بخاری، ترمذی اور مشکوۃ المصابیح پر گرانقدر حواشی تحریر فرمائے جو پاک و ہند کے ہر علمی خانوادے سے دادِ تحسین پا چکے ہیں۔

احمد علی لاہوری، مولانا

(۲ رمضان ۱۳۰۴ھ/۲۵ مئی ۱۸۸۷ء - ۱۷ رمضان ۱۳۸۱ھ/۲۲ فروری ۱۹۶۲ء) شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عبید اللہ سندھی کے شاگرد خاص، دین اسلام کے بلند پایہ مفکر، مفسر قرآن اور عالم، گوجرانوالہ کے ایک قصبہ جلال میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ گھرانہ پہلے ہی صوم و صلوٰۃ کا ذوق رکھتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید والدہ ہی سے پڑھا۔ بعد ازاں قریبی گاؤں کوٹ سعد اللہ اور قصبہ تلونڈی میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد والدین نے گوجرانوالہ میں مولانا عبدالحق کے پاس تعلیم دین کے لیے بھیج دیا۔ وہیں مولانا عبید اللہ سندھی سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے ان کی روحانی تربیت کی ذمہ داری قبول کر لی اور اپنے ساتھ سندھ لے گئے۔ راستے میں خانپور کے قریب ان کے مرشد مولانا غلام محمد سے بھی نیاز حاصل کیے۔ سندھ میں حضرت عبید اللہ سندھی نے مولانا احمد علی کی روحانی و دینی تربیت کی اور جب آپ مدرسہ دارالارشاد میں معلمی کے فرائض انجام دے رہے تھے تو اپنی صاحبزادی کی شادی بھی آپ سے کر دی۔ انھی دنوں آپ کے بھائی مولانا محمد علی بھی علوم دینی کی تعلیم کے لیے وہاں تشریف لائے تو حضرت سندھی نے اپنی دوسری صاحبزادی کی نسبت ان سے طے کر دی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کے دیگر بھائی عزیز احمد، رشید احمد اور والدہ محترمہ بھی آپ کے پاس آ گئے، کیونکہ آپ کے والد انتقال کر چکے تھے۔ چنانچہ ان سب نے گوٹھ پیر جھنڈا میں رہائش اختیار کر لی۔ شادی کے ایک سال بعد حضرت مولانا احمد علی کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام حسن رکھا۔ بچہ سات ہی روز بعد انتقال کر گیا اور اس سے اگلے روز آپ کی اہلیہ بھی انتقال کر گئیں۔ انھی دنوں مولانا سندھی نے جمعیت الانصار کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ یہ کامیاب نہ ہو سکی تو حضرت مولانا سندھی دہلی چلے گئے اور وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کر کے حضرت مولانا احمد علی کو بھی وہیں بلا لیا۔

محرم ۱۳۳۰ھ/اگست ۱۹۱۲ء کو مولانا ابو محمد احمد کی صاحبزادی سے حضرت مولانا احمد علی کا دوسرا نکاح ہوا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کے ایک شاگرد انیس احمد آپ کو علیگڑھ لے گئے۔ وہاں آپ نے کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا سندھی کابل تشریف لے گئے تو مدرسہ نظارۃ المعارف کا نگران اعلیٰ آپ کو بنا گئے۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے آپ کا ماہانہ وظیفہ دو سو روپے مقرر کر دیا۔ اور آپ خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

کابل سے حضرت مولانا سندھی نے خطوط کی تحریک چلائی۔ جن کے پکڑے جانے پر حکومت نے ہندوستان میں موجود ان کے تمام ساتھیوں کو بشمول مولانا احمد علی لاہوری گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ شملہ میں رکھا گیا اور پھر لاہور، جالندھر اور پھر راہوں (ضلع جالندھر) میں نظر بند کر دیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو لاہور رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چنانچہ آپ کو ضمانت پر رہائی ملی اور آپ شیرانوالہ گیٹ میں رہائش پذیر ہو گئے۔ یہیں آپ لائن سبحان خاں کی مسجد میں درس دیتے رہے۔

۱۹۱۷ء میں حضرت مولانا احمد علی لاہور میں تشریف لائے تھے۔ اگلے برس حج کے لیے تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو تحریک خلافت زوروں پر تھی اور لوگ جوق در جوق افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ آپ بھی مع اہل و عیال کابل کی طرف ہجرت کر گئے۔ ۱۹۲۰ء میں کابل سے واپس آ کر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے "انجمن خدام الدین" قائم کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مدرسہ قاسم العلوم کا اجرا کیا گیا۔ انجمن کی امارت کا منصب بھی آپ کے سپرد ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ درس قرآن، ترجمہ اور تفسیر دینے لگے۔ یکم رمضان سے ذی قعدہ کے آخر تک تفسیر کا خصوصی سبق ہوتا تھا۔ جس میں باہر سے آئے ہوئے علما کی ایک معتد بہ جماعت شریک ہوتی اور کامیاب ہونے والے علماء کو مطبوعہ اسناد دی جاتیں۔

حضرت مولانا احمد علی کی زندگی ہی میں ہفت روزہ "خدام الدین" جاری ہوا اور آپ اس کی تیاری میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ لوگوں نے آپ کو بس اسی کام کے لیے وقف سمجھنا شروع کر دیا۔ اسی جریدے کے ذریعے آپ نے تحریک خاکسار کی خامیوں اور تحریک مرزائیت اور غلام احمد پرویز کی تعلیمات کی مخالفت کی اور نہ صرف یہ کہ قلم بلکہ قول و فعل کے ذریعے بھی ان کی مخالفت میں سرگرم عمل رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انجمن حمایت اسلام کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ تا دم آخر ان کا یہی معمول رہا۔

حضرت مولانا کی نماز جنازہ ان کے فرزند مولانا عبید اللہ انور نے پڑھائی اور انھیں لاہور میں میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین آپ کے فرزند ہیں۔ بڑے فرزند مولانا حافظ حبیب اللہ مہاجر مکی ہیں، جو قیام پاکستان سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ سب سے چھوٹے فرزند مولانا حافظ حمید اللہ بھی درس و تدریس کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری ایک متواضع سیرت کی مالک شخصیت رکھتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ آپ کا حلیہ یہ تھا کہ "کھدر کا لباس پہنے ہوئے۔ لمبا کرتا، لمبی شلوار۔ سر پر کھدر کی ٹوپی یا عمامہ لانبا قد، چوڑے شانے۔ گھنی داڑھی جو بعد میں بہت لمبی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں مناسب حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ رعب دار، رنگ سانولا، مگر چہرے پر بڑی نورانی کیفیت۔ یہ ممکن نہ تھا کہ دیکھنے والا متاثر یا مرعوب نہ ہو۔ بات میں نرمی و شفقت۔ مگر جب جی چاہے کہ ٹوک دیں تو گرجدار ہو جاتی۔ وقت کی باقاعدگی میں بے مثال۔ ضوابط و آداب میں سختی تھی۔ میں ڈھیلے پن نام کو کبھی نہ تھا۔ سخت کوشی، جفاطلبی میں اپنے شاگردوں سے بھی آگے تھے۔ جہاں کے لیے جس قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے وہ سب سے پہلے آپ کو تیار رکھتے تھے۔"

حضرت کو چودہ بار حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ آخری دنوں میں مع اہل و عیال سفر حجاز پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ تمام زندگی نماز تہجد پڑھتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھرپور علمی زندگی گزاری بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ آپ نے قال و قول، حال و فعل، درس و تدریس، سیاست و تبلیغ، تصنیف و تالیف غرض ہر سانس کو ہر طریقے سے اللہ کی یاد میں وقف کر رکھا تھا۔

علمی طور پر مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کا سلیس و رواں ترجمہ ہے۔ حاشیہ پر قرآن پاک کے مضامین کا خلاصہ اردو زبان میں تحریر کیا۔ مزید برآں چونتیس کے قریب چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر کیے ہیں۔ جن میں سے "تذکرہ رسوم اسلامیہ"، "اسلام میں نکاح بیوگان"، "توحید مقبول"، "فرقہ کا شرعی فیصلہ" اور "تفسیر سورہ

قریش وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ مزید برآں آپ نے "مشکوٰۃ" کا ایک خلاصہ بھی تیار کیا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب حال صوفی بزرگ بھی تھے۔ اکثر اوقات ذکر کا شغل کیا کرتے۔ ماسٹر لال دین نے اپنی کتاب "النورِ دلایت" میں لکھا ہے کہ آپ نے "اپنی زندگی میں اتنا ذکر کیا کہ اگر اس کا ذکر کیا جائے تو سننے والا یقین نہ کرے کہ آیا ایک آدمی دن میں اتنی مرتبہ ذکر کر سکتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ حضرت نے ایک ایک دن میں کئی اذکار سوا لاکھ مرتبہ کئے اور متواتر کئے۔" آپ سے کشف و کرامات کے کئی واقعات منسوب ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ باکمال صوفی تھے۔

احمد کثیر فرغانی

ابو عباس احمد بن محمد بن کثیر فرغانی، نامور سائنسدان، عہد مامون ترکستان کے شہر فرغانہ میں پیدا ہوا۔ اس کا شمار مامون الرشید کے نامور ماہرین ہیئت و ریاضی میں ہوتا تھا۔ اس نے اپنے مشاہدات کو ایک کتاب میں قلم بند کرکے اس کا نام "جوامع علم النجوم" رکھا۔ اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ پہلی بار بارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔

احمد کثیر دھوپ گھڑی کی ایک ترقی یافتہ قسم کا موجد تھا۔ نیز اس نے دریا کی طغیانی ناپنے کا آلہ بھی ایجاد کیا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ کرۂ زمین کے محیط کی پیمائش ہے جسے اس نے مامون کے حکم سے دیگر سائنسدانوں کے ساتھ سرانجام دیا۔ اس کام میں وہ خوارزمی کے ساتھ شامل تھا۔ پروفیسر حمید عسکری لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دور میں آلات مثلاً اسطرلاب وغیرہ اعلیٰ قسم کے نہ تھے۔ اس لیے ان سے پہلے کے لوگوں کی پیمائش اصل سے بہت زیادہ غلط نکل گئی۔ لیکن انھوں نے جو پیمائش کی، وہ جدید دور کی پیمائش کے عین مطابق ہے۔ اہل یونان کی پیمائش میں ۲۰ فیصد غلطی تھی اور اہل ہند کی پیمائش سے بارہ فی صد غلطی کا پتہ چلا مگر احمد کثیر اور اس کے ساتھیوں کی پیمائش میں آج کے اعتبار سے ایک فیصد غلطی نظر آتی ہے۔

احمد ولولو

(وفات ۱۸۴۴ء) شیخ احمد سکوا احمد ولولو، مراکش کے ایک مذہبی پیشوا جو سلسلہ قادریہ کے عقائد کے مطابق تعلیم دیتے رہے۔ قبیلہ بربری فل کے رکن تھے۔ اہل مراکش نے ان کے علم و فضل سے بدظن ہو کر انھیں جلا وطن کر دیا تو وہ سیبرا میں چلے آئے۔ یہاں انہوں نے ایک طرح سے مذہبی حکومت قائم کر لی۔ رفتہ رفتہ یہ حکومت دریائے نائجر سے ٹمبکٹو تک وسیع ہو گئی۔ انہوں نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر کے سلطان عثمانیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر لیے۔ اپنے علاقوں کا انتظام بھی انہوں نے مذہبی اصولوں کی بنا پر کیا اور بہت جلد اپنی سلطنت کو ایک مثالی دینی ریاست بنا کر رکھ دیا۔ ان کے بعد ان کا بیٹا احمد ثانی تخت نشین ہوا۔ ۱۸۵۲ء میں احمد ثانی کا بیٹا احمد ثالث تخت پر بیٹھا جسے ۱۸۶۲ء میں الحاج عمر حمد اللہ نے شکست دی اور اس کے قتل ہونے پر احمد ولولو کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

احمد یسوی، خواجہ

(وفات ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء) ترکی کے مشہور صوفی شاعر اور درویشی سلسلے کے بانی، خواجہ فریدالدین عطار نے انھیں "پیر ترکستان" کا لقب دیا تھا۔ ترکستان کے شہر سیرام میں پیدا ہوئے۔ باپ کے انتقال پر یسی شہر چلے گئے۔ بخارا میں شیخ یوسف ہمدانی سے تحصیل علم کیا۔ انھی کی سند حاصل کی اور واپس یسی چلے آئے۔

خواجہ احمد یسوی نے جاہل اور اجڈ ترکوں تک اسلام کی تعلیمات پہنچانے کے لئے انھی کی زبان میں شاعری کی اور یوں ترکی ادب میں صوفیانہ شاعری کا ایک معتدبہ حصہ چھوڑ گئے۔ آپ کی بیٹی گوہر شہناز کی اولاد میں سے خاندان یسوی چلا، جس میں شیخ زکریا، تمغدی اولیا چلبی جیسے علماء گذرے ہیں۔

شیخ احمد یسوی کے طریقہ تصوف کی بابت کچھ کہنا بڑا مشکل ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ والے انھیں اپنا بزرگ مانتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یسوی طریقہ تصوف موجودہ درویشی سلسلوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کے خلفاء نے آگے چل کر مختلف سلسلے قائم کئے۔ ان لوگوں کے ناموں میں ایک لفظ عطا مشترک ہے۔ مثلاً پہلا خلیفہ ارسلان بابا کا بیٹا منصور عطا تھا، اس کا جانشین اس کا بیٹا عبدالملک عطا ہوا۔ اس کی اولاد میں سے زنگی عطا اور دوسرے خلفاء خوارزمی سعید عطا، سلیمان حکیم عطا، اوزون حسن عطا، سید عطا، صدر عطا، اور بدر عطا کا نام ملتا ہے۔

تصوف کی تاریخ میں احمد یسوی ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں، جنھوں نے مریدوں اور پیروں کے کئی سلسلوں کو جنم دیا۔ ان سے منسوب دیوان "حکمت" نے صوفیانہ طرز زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ خصوصاً نقشبندی سلسلے نے اپنی تعلیمات کا ماخذ اسی دیوان کو بنایا۔

احمدیہ جماعت

پاکستان اور ہندوستان کی ایک مذہبی جماعت، جو مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنا پیشوا مانتی ہے۔ پاکستان کے مسلمان عوام انہیں اسلام سے خارج اور کافر سمجھتے ہیں۔ مرزا غلام احمد نے قادیان ضلع گورداسپور، پنجاب سے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا اور پھر لاہور میں یہ سلسلہ تا وفات جاری رکھا۔ انہیں ماننے والے احمدی یا قادیانی کہلاتے ہیں۔

۱۹۰۰ء میں احمدیوں نے انگریزی حکومت سے درخواست گذاری کر کے اپنا وجود بطور ایک اسلامی فرقہ کے منوالیا، چنانچہ اس وقت سے مردم شماری میں انہیں علیحدہ فرقے کی حیثیت دی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے مرکز لاہور اور ربوہ میں قائم ہوئے اور مرزا غلام احمد کے بعد یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

احمدیوں کی زیادہ تر تعداد پنجاب میں آباد ہے تاہم یہ لوگ صوبہ بمبئی، ہندوستان کے علاوہ دنیا کے اکثر ممالک میں پھیل چکے ہیں، سوائے چند اسلامی ممالک افغانستان، ایران، عرب اور مصر کے، جہاں ان کا داخلہ ممنوع ہے، احمدیوں نے اکثر ممالک میں اپنے کاروبار پھیلا رکھے ہیں۔ یہ لوگ جہاں جاتے ہیں مساجد ضرور قائم کرتے ہیں۔

۱۹۰۲ء سے قادیان سے ان کا ایک انگریزی رسالہ "ریویو آف ریلجن" نکلتا ہے اس کے علاوہ کئی اخبار اور رسالے ان کی زیر نگرانی شائع ہوتے ہیں۔ ان کی ایک علیحدہ مذہبی کتاب "براہین احمدیہ" ہے، جو مرزا غلام احمد کی تصنیف ہے، یہ تصنیف پہلی بار ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے مجدد وقت، مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا دعوے کیا ہے۔ (یہ دعویٰ ۴ مارچ ۱۸۸۹ء کو کیا گیا) مصنف کے ان دعوؤں کو ماننے کے علاوہ احمدیوں کے دیگر عقائد کا عام مسلمانوں سے کوئی خاص اختلاف نہیں۔ سوائے اس کے کہ احمدی جہاد کے سراسر خلاف ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ جی اٹھنے یا صلیب سے بچ نکلنے پر ہندوستان چلے آئے تھے اور کشمیر میں ایک سو برس گذارنے کے بعد فوت ہوئے اور ان کا مزار سری نگر میں کسی جگہ موجود ہے۔ اس بات کے پیش نظر احمدیوں کا دعوے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہندوستان سے ہے اور مسیح موعود غلام احمد ہی کو کہا جاتا ہے۔

احمدیوں کے خلاف سب سے پہلا فتوے کفر مولانا محمد حسین نے شائع کیا، جس

میں کہا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد کی تعلیمات قرآن و سنت کے سراسر منافی ہیں۔ جبکہ احمدیوں کا دعوے ہے کہ وہ حکومت وقت کے ماتحت پرامن رہنا چاہتے ہیں، اسی لئے جہاد کی مخالفت کرتے ہیں۔

مرزا غلام احمد نے نہ صرف مہدی اور مسیح ہونے کا دعوے کیا ہے بلکہ محمدؐ اور کرشن ہونے کا بھی دعوے کیا ہے۔ اس پر عیسائی مشنریوں اور ہندوؤں نے بھی اس جماعت کی سخت مخالفت کی۔ کئی بار مرزا غلام احمد کو عدالت میں بلایا گیا۔

مرزا غلام احمد نے اپنی زندگی ہی میں انجمن احمدیہ کی تشکیل کر دی تھی۔ مرزا کے بعد ۱۹۰۸ء میں نورالدین کو اور ۱۹۱۸ء میں مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیرالدین محمود احمد کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ ان لوگوں کے بعد احمدیہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی نے لاہوری جماعت کی بنیاد رکھی جبکہ دوسرے لوگ قادیانی کہلائے۔ لاہوری جماعت کے نزدیک مرزا غلام احمد کی حیثیت محض مجدد کی ہے، جبکہ قادیانی جن کا مرکز ربوہ میں ہے، مرزا غلام احمد کو نبی موعود مانتے ہے۔ لاہوری جماعت کا نام "احمدیہ انجمن اشاعت اسلام" ہے۔ مولوی محمد علی نے قرآن مجید کا ایک ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ جو خاصا مقبول ہوا ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام یورپ اور افریقہ میں کئی مشنری ادارے اور مساجد کام کر رہے ہیں۔

قادیانی جماعت بھی مشنری معاملات میں بہت مستعد ہے۔ مرزا بشیرالدین نے اس جماعت کے لیے ایک تبلیغی رسالہ "احمدی سچے مسلمان ہیں" شائع کیا ہے۔ اس مشنری نے بھی دنیا بھر میں اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں جو تبلیغ میں دن رات مصروف ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے یہ جماعت ربوہ میں اپنے مراکز قائم کئے ہوئے ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں احمدیوں کی تعداد کئی لاکھ ہے۔ (دیکھئے قادیانی۔ ختم نبوت)

احنف بن قیس (۳ قبل ہجری/۶۱۹ء - ۶۷ھ/۶۹۱ء) ابو بحر صخر بن قیس بنی تمیم کے ایک شیخ، بصرے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے یتیم ہو گئے۔ پیدائشی اپاہج تھے۔ اسی لئے احنف کہلائے۔ یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے بنو تمیم کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ وہ بصرہ کے بڑے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس لئے وہاں کی محفلوں کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے خود بھی ایک علمی ادبی اور سیاسی انجمن قائم کی تھی۔ ۲۳ھ/۶۴۴ء اور ۲۹ھ/۶۴۹ء میں قم، کاشان اور اصفہان کی فتح میں حصہ لیا۔ عبداللہ بن عامر کے بہترین سپہ سالاروں میں تھے۔ ہرات مرو اور بلخ کے علاقے انھی کے ہاتھوں فتح ہوئے۔ جنگ جمل (۳۶ھ/۶۵۶ء) میں جو حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ہوئی۔ احنف بن قیس غیر جانب دار رہے۔ تاہم جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ رہے۔

احنف بن قیس ایک طرح سے بصرے کے چوٹی کے سیاست دان تھے۔ یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد اہل بصرہ کے مطالبات منوانے اور عوام کو متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔ جب قائد المختار ثقفی نے ان کے مقابلے میں حمایت حاصل کر لی تو انہوں نے اسے شہر سے نہ صرف باہر نکال دیا بلکہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے کوفے کی طرف کوچ کیا۔ اسی راہ میں انتقال کر گئے۔ بنی تمیم نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ انہیں بہت بڑا قائد سمجھا ہے۔ وہ اس قدر حلیم تھے کہ ضرب المثل بن گئے۔ چنانچہ آج بھی کہا جاتا ہے "احلم من الاحنف" (احنف سے بھی زیادہ حلیم) ان کے بے شمار اقوال بھی مشہور رہ چکے ہیں ——

اخلاص خالص ہونا، صاف رکھنا، سچا ہونا، اسلام میں مطلقاً اللہ کی طرف رجوع کرنے اور خالصتاً اسی کی عبادت کرنے کو اخلاص کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں آیا ہے:۔

"مگر وہ جو توبہ کریں اور اصلاح کریں اور اللہ (کے احکام) کو مضبوط پکڑیں اور اپنی فرمانبرداری کو اللہ کے لئے خالص کریں، تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور عنقریب اللہ مومنوں کو بڑا اجر دے گا۔" (۴ = ۱۴۶)

"کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے آپ کو ہر سجدے کے وقت میں سیدھا رکھو اور فرمانبرداری کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے اسے پکارو جسطرح تم کو پہلے بنایا تم لوٹ کر آؤ گے۔" (۷ = ۲۹)

"کہ مجھے حکم ہے کہ میں اللہ کی ہی اس کے لئے اپنی فرمانبرداری کو خالص کرتا ہوا عبادت کروں۔" (۳۹ = ۱۱)

ان سب آیات میں خدا کی عبادت کے خالص اور لاشریک ہونے پر زور دیا گیا ہے اسی مقصد کے لئے سورۃ الاخلاص نازل ہوئی۔ (دیکھیے "الاخلاص") صوفیاء کے نزدیک اخلاص سے مراد خدا سے قریب تر ہونے کی کوشش ہے۔ اخلاص کا تقاضا ہے کہ انسان دینی اعمال کیلیے غرض ہو اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو۔ کوئی بھی ایسی بات نہ آئے جو اللہ کی خالص عبادت میں خلل انداز ہو۔

اخلاق معاشرتی معاملات طے کرنے کا اصول، وہ بات جو بھلائی اور برائی کی تمیز پیدا کرے، جو فضائل و رذائل کا علم بخشے، ایسا ضابطہ جس کی پابندی کے بغیر اجتماعی زندگی کا تصور محال ہے۔ علم اخلاق ایک ایسا علم ہے جو لوگوں کو بتاتا ہے کہ انہیں آپس میں کس طرح سے معاملہ کرنا چاہیے۔ اور کس مقصد کو پیش نظر رکھ کر آگے چلنا چاہیے۔

قرآن مجید دنیا کی وہ عظیم کتاب ہے جس نے انسانی زندگی کے معاشرتی پہلو پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے اور سب سے زیادہ اچھے طریقے سے یہ سمجھایا ہے کہ قوم و فرد کی زندگی میں کس قسم کے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاق کے حدود کیا ہیں اور ان کا مرجع اور ماخذ کیا ہونا چاہیے۔ یہ پوری کتاب فلسفۂ اخلاق پر بحث کرتی، مثالیں دیتی اور اصول مقرر کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جسے مکمل ترین کہا جا سکتا ہے۔ اس کی نظر پوری انسانی زندگی پر ہے۔

اخلاق، جس سے قرآن مجید بحث کرتا ہے، ایک باقاعدہ علم ہے اور فلسفہ کی شاخ ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے سامنے خیر و شر اور نیکی بدی کا پیمانہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ علم انسان کو جبری طور پر نیک نہیں بناتا بلکہ اسے نیکی کی افادیت واضح کرتا ہے۔ یہ علم انسان کو اچھے برے کی تمیز سکھا دیتا ہے۔ اب آگے انسان کی قوت ارادی کا کام ہے کہ وہ علم اخلاق کے مطابق چلے یا نہ چلے۔

اسلام کے نظریہ اخلاق سے بحث کرنے سے پہلے ہم دیگر فلسفیوں کے نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے بڑھیں گے۔ قدیم یونانی فلسفی خیر و شر کو سمجھنے کے لئے دلیلیں دیتے چلے آتے رہے۔ سوفسطائی فلسفیوں کا کہنا ہے کہ انسان بجائے خود اخلاق، مذہب اور رسوم کا معیار ہے۔ خیر و شر کا مسئلہ پورے معاشرے کا نہیں بلکہ افراد کا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بھلے برے کا فیصلہ کرے۔ اس لئے ہر شخص کا اپنا اسلوب اخلاق ہو سکتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک نیکی اور برائی کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک اس دنیا کی حقیقت واضح نہیں ہو جاتی۔ یہ دنیا حقیقت میں موجود ہے تو عقل کو معیار اور کسوٹی بنایا جا سکتا ہے۔ چونکہ حقیقی عالم کہیں اور ہے۔ اس لئے خواہشات اور جذبات کی رو میں بہنا ہی اصل برائی ہے۔ ارسطو کے نزدیک کسی

عظیم ہستی کی تلاش کرنا چاہیئے۔ جو خیر محض ہے، جس سے نیکی کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں، اسی کی طرف رجوع کرنے سے خیر و شر کا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تلاش چونکہ فکر و دانش کا کام ہے اور انسان فکر و دانش کے ساتھ ساتھ جذبات اور جسمانی خواہشات کا مرکب بھی ہے، اس لئے ان تینوں کے مرکب کی درمیانی راہ ہی کا نام اخلاق ہے۔

موجودہ حکماء میں ہابس چونکہ مادیت کے نقطۂ نظر سے بات کرتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک خیر و شر کا تعلق انسان کے انفرادی فعل سے ہے۔ ڈیکارٹ کے نزدیک عقل ناقص ہی برائی کی ذمہ دار ہے۔ لاک کی رائے میں اخلاق معاشرے اور اس کی تعیر و اقدار سے ابھرتا ہے۔ اس کے نزدیک ان اخلاقی اقدار کا قائم رکھنا معاشرے کے وجود کے ساتھ ساتھ انسان کی خوشی کے لئے بھی انتہائی ضروری ہے۔ یہی تصور جان ڈیوی کا ہے۔ تاہم وہ فرد کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ ضابطۂ اخلاق کی تشکیل کرے۔

دنیا کے دیگر مذاہب نے بھی اخلاقی ضابطے پیش کئے۔ لیکن وہ کوئی ٹھوس فلسفہ کبھی بھی دنیا کے سامنے نہ لا سکے۔ عیسائیت کئی خانوں میں بٹ گئی اور یہودیت کے اخلاقی ضابطے ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوگئے۔ یہ فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے ضابطۂ اخلاق بھی پیش کیا اور اس کا فلسفہ بھی بیان کیا۔ عیسائیت نے محبت کے لطیف جذبات کو اخلاق کی کسوٹی سمجھا اور یہودیت نے قانون، تشریع اور لفظی پابندی کو اخلاق کی بنیاد بنایا۔ عربوں میں شجاعت اخلاق کا معیار تھی۔ اسی طرح جدید دور میں منفعت کو اخلاق کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ تمام جزئیات ہیں۔ کل کی طرف کسی کی نگاہ نہیں گئی۔ اسلام نے وہ جامع پیمانہ اختیار کیا، جو ان سب سے بڑھ کر ہے اور وہ ہے "تقویٰ" یا پرہیزگاری۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"مومنو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں حق و باطل میں امتیاز کرنے کی قوت و صلاحیت بخش دے گا۔" (الانفال: ۲۹)

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ:-

"جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا، اللہ اس کے کاموں میں سہولت پیدا کردے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا اور اللہ سے ڈرے گا، اور تقویٰ کو اپنائے گا، اس کو جان لینا چاہیئے کہ یہی لوگ فائز اور کامیاب ہیں۔" (النور: ۵۲)

تقویٰ کیونکر اخلاق کی بنیاد بن سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں مولانا محمد حنیف ندوی اپنی کتاب "اساسیات اسلام" میں لکھتے ہیں:-

"جب کوئی شخص تقوے کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے فائق سطح پر محبت و اطاعت کے رشتوں کو استوار کر لیتا ہے یا جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے اور اس کی صفات کمال کی روشنی میں قدم فرسا ہونے کی خو پیدا کر لیتا ہے تو علاوہ اس بات کے کہ وہ دنیا کے رنج و محن اور ابتلاء و آزمائش کی صعوبتوں سے مخلصی حاصل کر لیتا ہے۔ اور توفیق ایزدی کے انعام کو پالینے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے ایسے اسلوب فکر و نظر سے بھی بہرہ مند ہو جاتا ہے، جو اس کو رضائے الٰہی کے حسین سانچوں میں ڈھال دیتا ہے اور اس کی سیرت و کردار کے گوشوں کو چمکا اور سنوار دیتا ہے، جو ہر عمل میں اس کی رہنمائی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتا ہے اور ترغیبات و ترہیبات میں اس کے لئے سپر ثابت ہوتا ہے۔ تقویٰ نہ صرف اعمال کو سنوارتا اور جلا دیتا ہے بلکہ اس میں اخلاق و احسان کا بھی رنگ بھرتا ہے، اس میں لطافت و معنویت بھی پیدا کرتا ہے اور انسان کو اس کی محدود، فانی اور ادنیٰ سطح سے اٹھا کر عشق الٰہی کے اس افق بلند تک اچھال بھی دیتا ہے جو غیر فانی اور غیر محدود وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے تقوے سے اتصاف پذیر شخص کے سامنے اخلاقیات کا یہ اشکال نہیں رہتا کہ اسے برائیوں سے احتراز کرنا اور گناہوں سے باز رہنا ہے۔ اس کا درد سر یہ امر بھی نہیں رہتا کہ فائدہ اور لذت کی بڑی سے بڑی مقدار کو کیونکر مرتکز کیا جائے۔ اس کی طلب و آرزو کا ہدف یہ چیز قرار پاتی ہے کہ وہ کیا جتن اختیار کرے۔ جس سے زیادہ سے زیادہ محبت الٰہی کی نعمت کا سزاوار ٹھہرے۔ یعنی جس سے اس کے اعمال میں اور حسن اور کمال اور نکھار ابھر آئے۔"

تقوےٰ اسلامی نقطۂ نگاہ سے عمل و کردار کی اساس ہے، محرک و سرچشمہ بھی ہے اور روح جان بھی۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ہر ہر اقدام و سعی سے پہلے سوچنا چاہیئے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کی تہ میں کہیں نفس کی ادنےٰ خواہشات تو کارفرما نہیں، ریا اور دکھاوا تو نہیں اور یہ بات تو نہیں کہ اعمال کے ظاہری حسن و کشش نے اسے اس عمل پر آمادہ کیا ہو اور ان اعمال کے باطن میں جو روح اور معنی پنہاں ہیں، اس سے اس کی نظریں اوجھل ہوں۔ تقویٰ ہر ہر عمل میں دقتِ نظر اور حسنِ نظر چاہتا ہے۔

یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ تقویٰ کے معنی اللہ کے ساتھ دلی تعلق قائم کرنا نہیں، جیسا راہب اور دنیا ترک کرنے والے لوگوں کا نظریہ ہے۔ بلکہ یہ ایک تہذیبی عمل ہے اور اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ یقیناً بندوں سے پیار و محبت کا رشتہ استوار کرے گا۔

فلسفۂ اخلاق کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ اسلام کے نزدیک اخلاق کا سب سے بڑا ماخذ خدا کی کتاب اور اسوۂ حسنہ رسولؐ ہے، جن سے ہمیں چھوٹے چھوٹے خانگی معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست تک کے مسائل کا حل ملتا ہے۔ انسان کے اندر اخلاق کا مبداء اسلام کے نزدیک انسانی فطرت ہے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:-

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (العلق: ۴)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔

اسی طرح حدیث مبارک ہے کہ "انسان کی فطری پیدائش اسلام ہے، لیکن ماں باپ کی تربیت اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتی ہے۔" (بخاری)

گویا انسان فطرتاً بے داغ اور معصوم پیدا ہوتا ہے۔ یہ معاشرہ ہی ہے، جو اسے مختلف اچھائیوں اور برائیوں کی تربیت دیتا ہے۔ یعنی انسان فطرتاً اچھے اخلاق پر پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ کوئی برائی کرتا ہے تو اپنی فطرت کے اصولوں کا غلط استعمال کرتا ہے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:- "مذموم اعمال کی طرف نفس کی کشش اور میلان انسانی فطرت اور طبیعت کے خلاف ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے بعض بچوں کو چوری چھپے مٹی کھانے کی عادت ہو جاتی ہے، مگر اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عبادت و معرفت کی طرف نفس کی کشش ایسی ہے، جس طرح کھانے اور پینے کی طرف، کیونکہ یہ فطرت و طبیعت کے عین مطابق ہے اور قلب کی عین آرزو ہے اور قلب کیا ہے، ایک امر الٰہی ہے، جس کا مقتضیاتِ شہوت کی طرف میلان اس کی حدِ ذات سے خارج اور اس پر عارض و طاری ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی کوئی قوت بری نہیں بلکہ اس کا اچھا یا برا استعمال اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ اسلام نے جو ضابطۂ اخلاق پیش کیا ہے اس کا منشا کبھی بھی یہ نہیں کہ انسان کے ایسے جذبات و احساسات مثلاً غصہ، جذبہ، ولولہ، شہوت وغیرہ کو دبا دیا جائے تو بظاہر شر کا باعث بنتے ہیں، بلکہ اسلام ان کے صحیح استعمال پر زور دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیت کو داخل کر دیتا ہے کہ "اعمال کا دارومدار نیت ہے"

غرض نیک نیتی اسلام میں تقویٰ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔ جس کا مقصد رضائے الٰہی کو حاصل کرنا قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بھی اسلام معروف ہی کو لیتا ہے اور منکر سے

رکھتا ہے۔ یعنی اسلام میں صرف وہی اصول اخلاق ہیں، جو معروف ہیں۔

اسلامی ضابطۂ حیات انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے، جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو۔ اس کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے، انھیں قائم کرے اور پروان چڑھائے اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آئی ہے، اس کی بیخ کنی کرے۔ اس دعوت پر جنھوں نے لبیک کہا، ان کو جمع کرکے اس نے ایک امت بنائی، جس کا نام امت اسلامیہ رکھا۔

اخلاق کے اسلامی نکتۂ نظر کی اس بحث سے یہ ثابت ہوگیا کہ اخلاق کی بنیاد فطرت انسان ہے اور اس کا ذریعہ تقویٰ ہے، جو خدا اور بندے کے باہمی رشتے سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے، جو انسانوں کے درمیان قائم ہوتے ہیں۔ قرآن وسنت میں ان باتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جو خدا کو پسند اور ناپسند ہیں۔ ان میں سے چند پسندیدہ صفات صبر، سچائی، عدل، امانت داری، عفو اور درگذر، رواداری، احسان، مساوات، اخوت اور تقویٰ ہیں۔ ناپسندیدہ صفات میں حرص، غرور، بخل، عیب جوئی، چغل خوری، خیانت، جھوٹ، فحش کلامی، خود پسندی، شہرت طلبی، تنگ نظری، تنگ ظرفی، حرص وطمع، تصنع، اسراف، غیبت، کینہ، بغض، حسد، وعدہ خلافی، رشوت ستانی، فساد، نفاق، حیلہ سازی، قبائلی عصبیت، غضب، احسان فراموشی، ذخیرہ اندوزی، ظلم، حقوق غصب کرنا اور فرائض سے روگردانی وغیرہ شامل ہیں۔

اسلام نے ان اخلاقی تعلیمات کو رائج کرنے کے لئے متعدد طریقے اور اسالیب اختیار کئے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں اخلاق حسنہ کو عمدہ تشبیہوں اور اخلاق رذیلہ کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں پیش کیا ہے اور اچھے اور برے اخلاق کے نتائج کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

اچھے اخلاق میں سے کسی کو بھی پیدا کرنے کے لئے اسلام نے ریاضت ومشق پر بہت زور دیا ہے، کسی اخلاق کو اپنانے سے جب وہ فطرت کا ایک جزو بن جائے گا تو دیگر صفات بھی پیدا ہوں گی۔

تربیت اور اصلاح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو اس کی برائیاں اور اچھائیاں معلوم ہوں۔ اس چیز کو علامہ اقبال نے خودی کا نام دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک اس سے قبل کہ قیامت میں تمہارا محاسبہ ہو اپنا محاسبہ اس دنیا میں خود کرلو۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی نفس کو اچھائیوں اور برائیوں کو پرکھنے کا ملکہ دیا گیا ہے۔ اسی کو لوگ ضمیر یا نفس لوامہ کہتے ہیں۔ یعنی جب ہم کوئی فعل کرنے لگتے ہیں تو ہمارا وجدان ہمیں اس کی قدر بتاتا ہے ضمیر کی اس آواز پر لبیک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو فعل یا حرکت ہم کرنے لگیں، پہلے اس کا اطلاق خود اپنی ذات پر کرکے دیکھیں، اگر ہم اس سے تنگ نہیں ہوتے تو یقیناً یہ دوسروں کے لئے بھی مفید ہوگا۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ کوئی اچھا برا کام کرنے سے پہلے اسے پرکھ لے۔

تاہم اسلام اخلاق پر عمل کرنے کے لئے انسانی ضمیر ہی کو ذریعہ نہیں بناتا بلکہ تعلیمات اور تربیت کو بھی ایک عامل سمجھتا ہے۔ اخلاقی تعلیم کو رائج کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تربیت ہے۔ اگر تربیت ابتدا ہی سے اچھی ہو تو یقیناً انسان آگے چل کر بھی اعمال صالحہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

اخوان الصفا

ایک مذہبی وسیاسی جماعت جو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں باہمی تعاون اور ایمان کے قیام کے لئے وجود میں آئی۔ اس کی تعلیمات رسائل کے ایک مجموعے سے ملتی ہیں، جو ابوسلیمان محمد، ابوالحسن علی بن ہارون، محمد بن نہرجوری اور زید بن رفاعت کی تصانیف ہیں دراصل یہ دانشمندوں کی ایک جماعت تھی، جس کی سیاسی سرگرمیوں کا تو علم نہیں مگر علمی ودینی خدمات کے لئے سرگرم نظر آتی تھی۔ اس جماعت کے مطابق یہ دنیا خدا سے بنی ہے، جس طرح روشنی سورج سے۔ خدا کے بعد عقل وجود میں آئی۔ پھر روح، پھر مادہ، پھر عالم فطرت، پھر کرّوں کی دنیا، پھر عالم ارض کے عناصر، پھر معدنیات، حیوانات، انسان وغیرہ۔ گویا یہ ایک ارتقائی عمل کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک موت ایک قیامت صغریٰ ہے اور یوم آخرت کے بعد جب روح خدا کی طرف لوٹ جائے گی تو قیامت کبریٰ وجود میں آئے گی۔

اخوان الصفا کے رسائل کی تعداد باون (۵۲) ہے۔ جنھوں نے ایک طرح سے انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس میں ریاضی، منطق، طبیعات، نفسیات، مابعدالطبیعیات، تصوف، نجوم اور سحر وغیرہ پر اسی ترتیب سے رسائل [illegible]

اخوان المسلمین

مصر کی سیاسی و دینی [illegible] جسے حسن البنا نے مارچ ۱۹۲۸ [illegible] میں قائم کیا۔ وہ ایک [illegible] سکول میں استاد تھے۔ [illegible] ۱۹۲۸ء کو انھوں نے اس تحریک کا باقاعدہ [illegible] کیا۔ [illegible] میں اس [illegible] تھا۔ بعد ازاں قاہرہ [illegible] منتقل ہوگیا [illegible] تحریک [illegible] میں بھی قائم ہوگئی۔ اس کا مقصد اسلامی [illegible] فلسطین کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کرنا [illegible] مقبول ہوگئی۔ جنگ عظیم دوم کے دوران [illegible] کی جدوجہد نے عروج کو پہنچ گئی۔

فلسطین کی کشمکش میں الاخوان [illegible] کی جنگ فلسطین میں الاخوان نے عرب [illegible] اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ ان کے بہت سے [illegible]

۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مصری حکومت نے الاخوان کو [illegible] اور ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو حسن البنا شہید کر دیئے گئے۔ [illegible] کوشش کی کہ اس تحریک کو کچل ڈالا جائے۔ [illegible] کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا اور ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ء کو [illegible] نے فوراً اپنی تاسیس نو کا کام شروع کردیا [illegible] میں بھرپور حصہ لیا۔

حسن البنا کے بعد تحریک کی قیادت [illegible] صالح العشماوی اس تحریک کے قائد رہے۔ [illegible] مرشد حسن الہضیبی کا تقرر بطور قائد ہوا [illegible] ہوگئی۔ تاہم سیاسی [illegible]

الاخوان کے ارکان [illegible] فوجی افسران [illegible] اس جماعت کی تائید کرتا تھا۔ چنانچہ ۲۳ [illegible] کونسل نے حسن الہضیبی [illegible] پورے احترام کے [illegible] کو جمال عبدالناصر [illegible] آئے تو ان دینی [illegible] سرا کھارا اور تحریک [illegible] شروع کردی۔ [illegible] جب ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو صدر ناصر [illegible] تو اس میں الاخوان کو ملوث [illegible] اور تحریک کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ چیدہ کردہ فضلاء اور قائدین کو پھانسی دے دی گئی [illegible] طویل المیعاد قید [illegible] کا حکم ہوا اور دس ہزار سے زیادہ کو مختلف [illegible]

اس وقت سے لے کر اب تک یہ تحریک زیر زمین کام کر رہی ہے۔

۱۹۳۷ء سے اس تحریک کی شاخیں بیرون ممالک بھی کھلیں۔ اس سال دمشق میں ایک شاخ قائم ہوئی جو بیرونی شاخوں میں مضبوط ترین کہی جاتی ہے۔ یروشلم میں ۱۹۴۶ء میں اس کی شاخ قائم ہوئی اور فلسطین میں اس کا کام زور شور سے شروع ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء تک مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس وقت بھی دنیا کے اکثر ممالک خصوصاً اسلامی ممالک میں اس کی شاخیں، نمائندے اور ہمدرد موجود ہیں۔

الاخوان خالصتاً اسلامی نظام قائم کرنے کی حامی ہے۔ اس کے نزدیک جمہوریت آمریت، شہنشاہیت یا کوئی بھی طرز حکومت اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ہی سرمایہ داری اور اشتراکیت دنیا کا مسئلہ حل کر سکتی ہے۔ صرف اور صرف اسلامی اقدار پر مبنی معاشرہ ہی ایک بہترین معاشرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسلام ایک ایسا عالمگیر اور دائمی ضابطۂ حیات ہے، جو زمان و مکان کی قیود سے ماورا اور ہر رنگ و نسل کے لوگوں کے لئے قابل عمل ہے۔

الاخوان کے نزدیک معاشی مساوات غیر فطری ہے۔ تاہم صنعتوں کو قومی ملکیت میں ہونا چاہیے اور امیر و غریب کے فرق کو دور کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے الاخوان اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں بڑے بڑے مصنفین پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے [illegible] تصانیف شائع کیں۔

عملی طور پر الاخوان نے سیاسی اور دینی خدمات کے ساتھ ساتھ فلاحی اور سماجی خدمات [illegible] ان کے مراکز نے غریبوں اور محتاجوں کی مدد، روزگار فراہم کرنے [illegible] قرضے کی سہولت، مریضوں کا مفت علاج اور [illegible] [illegible] کے ساتھ ساتھ زرعی ترقی کے لئے مشورے بھی دینا شروع کیے۔ تحریک [illegible] غیر قانونی قرار دیئے جانے سے قبل پانچ سو کے قریب مراکز کام کر رہے تھے۔

[illegible] تعلیمی میدان میں بھی اخوان نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۸ء میں حسن البنا نے [illegible] کے نام سے [illegible] تنظیم قائم کی۔ ۱۹۴۰ء میں اس کے ارکان کی تعداد [illegible] ہزار تک [illegible] ان لوگوں نے دینی جماعتوں میں سماجی منصوبوں [illegible] لوگوں کی روحانی تربیت پر زور دیا۔ اس نظام کی بنیاد بھائی [illegible] [illegible] فرائض کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی [illegible] اجتماعات ہوتے تھے۔ جن کے الگ پروگرام تھے اور مدارس [illegible] بچوں کی [illegible] قائم تھیں۔ کھیلوں اور جسمانی تربیت کا شعبہ بھی [illegible] تحریک کے غیر قانونی قرار دیئے جانے سے پہلے ان کے بڑے بڑے [illegible] ٹورنامنٹ مصر کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے۔ [illegible] الاخوان کی [illegible] فٹ بال کی، تیس والی بال کی، اٹھائیس ٹیبل ٹینس کی، انیس [illegible] باکسنگ کی، نو کشتی کی اور [illegible] کی تھیں۔ طبی خدمات کا شعبہ [illegible] ۱۹۴۴ء کو قائم ہوا تھا۔ جس نے کئی شفاخانے قائم کیے۔ ۱۹۴۷ء میں ان میں زیر علاج مریضوں کی تعداد [illegible] ہزار تھی اور اس کا بجٹ [illegible] ہزار پاؤنڈ تھا۔

الاخوان کی طرف سے مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی کتابیں، رسالے اور اخبارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں "الاخوان المسلمون" ان کا روزنامہ اخبار ہے۔ دیگر چھ ہفت روزے اور دو ماہنامے ان کے ترجمان کے طور پر اور تین ہفت روزے اور ایک ماہنامہ نقیب کے طور پر شائع ہوتے ہیں۔

ملکی دولت کو بڑھانے اور [illegible] اقتصادیات کا شعبہ قائم کرنے کے لیے الاخوان نے مختلف اوقات میں سات بڑی کمپنیاں قائم کیں۔

۱۔ اسلامی معاملات کمپنی (۱۹۳۹ء) جس نے ٹیکسٹائل کی ایک فیکٹری اور ٹرانسپورٹ سروس کا کام شروع کیا۔ ۲۔ عربی کان کنی کمپنی (۱۹۴۷ء) ۳۔ کارخانہ پارچہ بافی (۱۹۴۸ء) ۴۔ مطبع خانہ۔ ۵۔ ٹریڈنگ انجینئرنگ کمپنی۔ ۶۔ ٹریڈنگ انجینئرز۔ ۷۔ عربی اشتہارات کمپنی وغیرہ۔

اخوند پنجو بابا (۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء - ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء) سید عبدالوہاب پنجو بابا۔ جنہیں ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں شیخ پنجو سنبھلی لکھا ہے۔ پشاور میں سلسلہ چشتیہ کے مشہور صوفی ہیں۔ چونکہ آپ بنیادی طور پر اسلام کے پانچوں ارکان کی تعلیم دیتے تھے، اس لئے پنجو بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے آباؤ اجداد سنبھل کے رہنے والے تھے۔ جب ابراہیم لودھی نے پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھوں شکست کھائی اور افغان امراء اور فوجی افسروں کا زوال شروع ہوا تو ان میں سے اکثر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ جن میں آپ کے والد سید غازی بابا بھی صوبہ سرحد کی طرف تشریف لائے اور مردان میں گوجر خان باندہ کے یوسف زئیوں میں سکونت اختیار کی۔ یہیں حضرت پنجو بابا پیدا ہوئے۔

حضرت پنجو بابا نے علوم ظاہریہ کی تکمیل موضع چوہا گجر اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کی۔ روہیل کھنڈ میں ایک موضع لو سلجام ہے اس کی مناسبت سے آپ کو لوسلجانی بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ آپ کے والد پشاور کے قریب موضع شاہ ڈھنڈ میں سکونت پذیر ہو چکے تھے، اس لیے آپ بھی وہیں چلے گئے۔

۵۴ برس کی عمر میں حضرت پنجو بابا نے موضع اکبرپورہ کی سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا آغاز کیا۔ میر احمد شاہ رضوانی اپنی کتاب "تحفۃ الاولیا" میں لکھتے ہیں کہ آپ کی درسگاہ سے تقریباً تین سو علماء علم کا آفتاب بن کر نکلے۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں آپ نے شیخ جلال الدین تھانیسری کے خلیفہ میر ابوالفتح قنباچی کے دست پر بیعت کی اور سلسلہ چشتیہ سے اپنا تعلق قائم کیا۔

"خزینۃ الاصفیاء" کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ پنجو پشاوری اگرچہ گوجر قوم سے تھے لیکن اپنے وقت کے مشائخ کاملین میں سے تھے۔ عبادت و عشق میں غرق اور اہل چشت کے طریقے کو پھیلانے میں سرگرم عمل اور ساعی تھے۔ ان کا طریقہ مولانا درویزا پشاوری کے طریقے کے مطابق تھا، وہ ان کی تصنیف "مخزن الاسلام" کو بہت عزیز رکھتے تھے اور لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ اگرچہ افغانی زبان میں گفتگو کرتے، لیکن فارسی زبان میں شعر کہتے اور ہندی (اردو) میں گفتگو فرماتے تھے۔ ان کے مریدوں میں مولانا چاک میانہ، شیخو شاہجہانپوری اور شیخ علی وغیرہ مشہور ہیں۔ جنہوں نے علوم دینی سے آپ کی خدمت میں رہ کر بڑا حصہ حاصل کیا۔

حضرت اخوند پنجو بابا کا مزار اکبرپورے کے قریب مصری پورہ میں ہے۔ جہاں آج بھی ۲۷، ۲۸ رجب کو آپ کا عرس بڑے اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ کے صاحبزادے عثمان، سلیمان، لقمان اور فریدالدین تھے، جن میں سے پہلے تین صاحبزادوں کی اولاد عثمان خیل، لقمان خیل، سلیمان خیل اور میاں گان کے نام سے مشہور ہے خلفاء میں علی خان، ایک صاحب، لوڈا بابا، اخوند سالاک اور اخوند سباک وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔

اخوند درویزا (۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء - ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء) پشاور کے مشہور صوفی، سلسلۂ نسب گدائی بن سعدی بن درغان بن احمد بن متہ بن جیون بن جنتی سے تھا۔ جیون بن جنتی لمعان کی جانب سے ننگرہار آیا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب تاجک ترکوں

اور سلاطین بلخ سے ملتا ہے۔ اس کی اولاد میں سے درغان علاقہ یوسف زئی میں آیا اور جب شیخ آدم ملی نے سوات کا بندوبست اراضی کیا تو اس کے بیٹے سعدی کو بھی زمین ملی۔ مغلوں کی لڑائی کے بعد اس کے بیٹے گدائی نے اسماعیل خیل میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں اخوند درویزا پیدا ہوئے۔

حضرت اخوند درویزا بچپن ہی سے زہد و ریاضت کی طرف مائل تھے۔ شب و روز گریہ وزاری اور صوم وصلوٰۃ میں گذارتے۔ "تذکرۃ الابرار والاشرار" میں آپ نے اپنے بچپن کے حالات بکمال بیان کئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل ملا مصر احمد طارنگی اور ملا جمال الدین ہندوستانی سے حاصل کی اور علوم باطنی کے لیے سید علی غواصؒ کے دست مبارک پر بیعت کی اور سلسلہ کبرویہ چشتیہ سے منسلک ہو گئے

حضرت اخوند درویزا نے خلافت حاصل کرتے ہی افغانوں میں دین کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور بڑا رسوخ حاصل کر لیا۔ انھی دنوں ایک یوسف زئی بزرگ ملک دولت موتی زئی نے اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دے دی۔ اس علاقے میں علم کی کمی اور گمراہی کو دیکھتے ہوئے حضرت اخوند درویزا نے پشتو اور فارسی میں کتابیں لکھنا شروع کر دیں تاکہ اتباع شریعت میں علم کو سہارا بنایا جائے۔

آخری عمر میں آپ پشاور میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں وفات پائی۔ آپ کا مزار موضع ہزار خانی کے قریب واقع ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے اخوند کریم داد آپ کے بعد شہید بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت اخوند درویزا کی تصانیف حسب ذیل تھیں۔

(۱) "مخزن اسلام" یہ کتاب پیر روشاں کی مشہور کتاب "خیر البیان" کے جواب میں اسی طرح چار زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ جیسے پیر روشاں کی کتاب چار زبانوں میں ہے۔ پیر روشاں بایزید افغانوں کا ایک شیخ تھا۔ ضمناً اس کتاب میں اسلام کے دیگر فرقوں اور افغانوں کے تاریخی واقعات بھی آ گئے ہیں۔ یہ کتاب صوبہ سرحد کی مشہور ترین مذہبی کتاب ہے۔

(۲) "ارشاد الطالبین" فارسی کی ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں توحید، ایمان، نماز، توبہ پیر کامل کی علامات، سلوک، اخلاق، صبر و شکر، علامات قیامت اور مختلف مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں مطبع پشاور سے چھپی۔

(۳) "تذکرۃ الابرار والاشرار" یہ حضرت کی سوانح عمری ہے، جس میں آپ نے اس دور کی اسلامی تحریکات، سید علی غواص کے مناقب اور اپنے حالات کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کے اکثر صوفیاء کے حالات دیئے ہیں۔

دیگر کتابیں (۴) "شرح قصیدہ امالی"۔ (۵) "تلقین المریدین" اور (۶) "ارشاد المریدین" وغیرہ ہیں۔ جو پشتو زبان میں ہونے کی وجہ سے پشتو ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔

اخوند صاحبؒ

(۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء - ۲۶ ذی الحج ۱۲۹۵ھ/۱۲ جنوری ۱۸۷۷ء) عبدالغفور بن عبدالوحید، سوات کے مشہور صوفی، علاقہ شامیزئی کے موضع جبڑی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ پھر آپ تحصیل علم کے لیے گجرگڑھی ضلع مردان تشریف لائے اور وہاں اس دور کے مشہور عالم مولانا عبدالحکیم سے تعلیم حاصل کی۔ پھر کچھ زمانہ آپ نے چکنی اور کاکا صاحب میں بسر کیا۔ بعد ازاں حضرت جی کی خدمت میں رہ کر ان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد موضع توردھیر ضلع مردان تشریف لائے اور مولانا محمد شعیب کے ہاتھ پر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہو گئے۔

سکھوں اور درانیوں کی جنگ میں اخوند صاحب نے درانیوں کا ساتھ دیا۔ اور تحریک مجاہدین میں سید احمد شہید کے مخلص رہے۔ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خان نے پشاور کا علاقہ واپس لینے کے لیے اخوند صاحب سے مدد کی درخواست کی تو آپ معتقدین کی ایک بڑی جماعت لے کر پہنچے مگر اسے شکست ہوئی اور آپ واپس سوات چلے گئے۔

آپ نے موضع سبیل پانڈی کے قبیلہ اکوزئی میں شادی کی، جن سے آپ کے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں آپ نے سیدو میں سکونت اختیار کر لی جو آپ ہی کی وجہ سے آج کل سیدو شریف کہلاتا ہے۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی "تذکرۂ صوفیائے سرحد" میں لکھتے ہیں کہ حضرت اخوند صاحب نہ صرف عظیم المرتبت درویش تھے بلکہ ایک بلند پایہ سیاستدان جذبۂ حریت سے سرشار اور ملت کے سچے خدمت گذار تھے۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں آپ نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے اس علاقے کے سرداروں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی اور تنظیم و اتحاد ملت کا منصوبہ ان کے سامنے رکھا۔ تاکہ ایک امیر کو منتخب کر کے سب متحد ہو جائیں۔ لوگوں نے آپ کی بات مان لی اور آپ ہی کو امیر منتخب کرنا چاہا مگر آپ نے حضرت سید علی غواصؒ کی اولاد میں سے سید اکبر کو امارت کے لیے پیش کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی چنانچہ شریعت اسلامیہ کے نام سے اس اسلامی ریاست نے کام شروع کر دیا۔ اس کا پہلا دارالحکومت غالیگی قرار پایا۔

سید اکبر شاہ نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو عین اس وقت وفات پائی جبکہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ چونکہ ان کے بعد کوئی بہتر حکمران نہ مل سکا۔ اس لیے انگریزوں کو سرحد کی طرف سے ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔ تاہم حضرت اخوند کی کوشش سے عوام کا جذبہ جہاد بیدار ہوا اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو جنگ امبیلہ کا آغاز ہوا۔ جس میں مجاہدین بڑی جانبازی، شجاعت اور بہادری کے ساتھ لڑے۔ اخوند صاحب بھی اپنے مریدوں اور ساتھیوں سمیت اس میں شریک ہوئے۔ اس جنگ کا خاتمہ انگریزوں کی سازشوں کی بدولت مگر ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ہوا۔

جنگ کے بعد وفات تک آپ تبلیغ و تدریس میں مگن رہے۔ سیدو شریف میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کے بعد اخوند صاحب کے پوتے میاں گل عبدالودود نے حکومت کا منصب حاصل کیا۔ ۱۹۲۶ء میں عبدالودود کی حکومت کو برطانیہ نے تسلیم کر لیا ۱۹۴۷ء میں انھوں نے سوات کو پاکستان کے ساتھ ملحق کر دیا۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اپنے بیٹے عبدالحق جہاں زیب کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے ان کی ریاست کو رسمی طور پر تسلیم کر لیا۔ مگر صدر یحییٰ خاں نے ۱۹۶۹ء میں اس ریاست کی علیحدہ حیثیت ختم کر کے اسے مالاکنڈ ڈویژن کا نام دے دیا

اخی سراجؒ

(وفات ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء) سراج الدین اخی سراج بنگال کے بزرگ صوفی، جنھوں نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی اشاعت کی۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے خلیفہ تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ ہر سال کے اختتام پر اپنی والدہ کی زیارت کے لیے لکھنوتی تشریف لے جاتے اور پھر حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں آ رہتے۔ چنانچہ آپ کی عمر کا زیادہ تر حصہ حضرت محبوب الٰہی کے جماعت خانہ میں گذرا۔ یہاں آپ نے مولانا فخر الدین زرادی، مولانا رکن الدین اندرپتی سے علوم ظاہری میں تحصیل کی۔ اپنے مرشد کے بعد تین سال تک دہلی میں تعلیم حاصل کی جب سلطان محمد بن تغلق نے مشائخ کو جبراً دیوگری بھیجنا چاہا تو وہ سلطان المشائخ کے کتب خانے سے اپنے مطالعے کی چند کتابیں اور جامۂ خلافت لے کر اپنے وطن لکھنوتی چلے گئے وہیں آپ نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی اور وہیں وفات پائی۔ آپ کا مزار

سعداللہ پور میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کے خلفاء میں سے شیخ علاؤالحق والدین بن اسعد بنگالی سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔

ادب تربیت، تنظیم، اچھی تعلیم، عمدہ تربیت، خلق اور اخلاص، ایک طرح کا طرزِ عمل، جسے اسلام پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسے عام طور پر جمع کے صیغہ "آداب" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے "آداب"۔

ادب کے معنی ثقافتی ورثے کے بھی لیے جاتے ہیں۔ زندگی کا اظہار جب ماورائے زندگی طریقوں سے کیا جاتا ہے، تو ادب کہلاتا ہے یعنی علم، دانش، شعر، خطابت، روایات، بلاغت، نحو یا لغت یہ سب کچھ ادب کے احاطہ میں آتا ہے اور ان کا حامل ادیب کہلاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات بھی جب ماورائے حیات ذرائع سے ظاہر ہوتی ہیں تو ادب کے احاطہ میں آتی ہیں۔

اسلامی ادب کا سب سے پہلا اور کامل نمونہ قرآن مجید ہے۔ اس کا بالکل جداگانہ دل‌ربا اسلوب ہے۔ اگرچہ یہ ایک کتاب ہے، مگر اس میں خطابت کا حسن بھی شامل ہے۔ ایک ایک مضمون سو سو رنگ سے اس طرح باندھا گیا ہے کہ اکتاہٹ کی بجائے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ترنم کے پیرائے بدلتے اور عبارت کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔ اگرچہ قرآن ایک استدلالی اور عقلی پیرایہ کا حامل ہے، لیکن خشک فلسفہ اور جامد تصورات کی بجائے معنی خیز اشاروں، تمثیلوں اور استعاروں سے کام لیتا ہے۔ پوری کتاب میں ایک جملہ اور ایک لفظ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں۔ اس کا ہر لفظ اور ہر محاورہ انقلابات زمانہ کے باوجود آج تک متروک نہیں ہوا۔ اس کا اسلوب آج بھی عربی کا معیاری ادب اور اس کی زبان فصاحت آج بھی عربی کی فصاحت مانی جاتی ہے۔ مزید دیکھئے: ادبِ اسلامی

ادبِ اسلامی وہ ادب جو اسلام کی عظیم الشان تحریک کے زیر اثر تخلیق ہوا۔ اس کا زیادہ تر حصہ عربی زبان میں ہے۔ کچھ فارسی اور کچھ اردو زبان میں ہے۔ دنیا کی تقریباً اکثر زبانوں میں اسلامی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔

عربی ادب مستشرقین کے نزدیک قدیم عربی ادب شاعری پر مشتمل تھا۔ مگر اسلام اس کے زوال کا سبب بنا اور اہل عرب نے نثر کی طرف کما حقہ توجہ دی اور اسے اس قدر پروان چڑھایا کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ نثری ادب جس زبان میں تخلیق ہوا ہے وہ عربی کے سوا اور کوئی نہیں۔ تاہم زمانۂ اسلام شاعری سے بالکل ہی مبرا نہیں رہا۔

اسلام سے پہلے عربی شاعری حسن و عشق، نسلی تفاخر، قبائلی تعصب اور انتقام اور مبارزت طلبی پر مشتمل تھی۔ اسلام نے ان حد بندیوں کو توڑ دیا۔ قرآن مجید نے لہو و لعب اور عیش و تنعم کو یکسر ختم کر دیا اور اس کی جگہ توحید، عدل اور اخوت کا حکم دیا۔ حضرت رسول کریمؐ کے دور میں حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن زہیر اور لبیدؓ شعراء ہی تو تھے، مگر انھوں نے شعر و شاعری ترک نہیں کیا البتہ موضوعِ سخن بدل گیا۔

نثر میں عربی ادب کی سب سے پہلی کتاب قرآن مجید ہے۔ اس کی بلاغت کی معجز بیانی کے سامنے بڑے بڑے اہلِ سخن دنگ رہ گئے۔ چونکہ قرآن مجید انسانی کلام نہیں، اس لیے ہم اسے انسانی ادب کے دائرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ کہنے میں باک نہیں کہ قرآن مجید نے عربوں پر علوم کے دروازے کھول دیئے۔ سمع و بصر سے کام لے کر علوم و فنون کے میدانوں میں آگے بڑھنے تک کو قرآن نے ہر مسلمان پر فرض قرار دے دیا۔ عرب پہلے لکھنے پڑھنے سے عاری تھے۔ جب قرآن جمع ہوا تو تحریر لازمی قرار پائی۔ گویا عربی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا آغاز جمع قرآن ہی سے ہوتا ہے۔ (نیز دیکھئے "قرآن مجید"، "تفسیر"، "حدیث")

قرآن نے علماء کو تفاسیر لکھنے کی طرف مائل کیا۔ فرمودات رسولؐ یعنی احادیث جمع کی گئیں ان کی صحت کو پرکھنے کے لیے علم اسماء الرجال اور تذکرہ نویسی کی بنیاد پڑی۔ چونکہ آیات قرآنی کے لیے صحیح تاریخی واقعات، منطقی استدلال اور حقائق شناسی کی ضرورت تھی اس لیے مسلمانوں میں تاریخ، فلسفہ اور سائنس جیسے علوم سے رغبت بڑھی۔

اگرچہ بنی امیہ کے دور میں عربی نثر میں معدودے چند کتابیں ملتی ہیں البتہ شاعری کو خوب فروغ ہوا اور ایک بار پھر زمانۂ جاہلیت کی شاعری کی پیروی میں قصیدے اور نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اس دور کے چار مشہور شعراء عمر بن ابی ربیعہ، اخطل، فرزدق اور جریر تھے۔ یہی حال موسیقی کا ہوا۔ عجمی (ایرانی) اثرات کے پیش نظر مکہ اور مدینہ میں بھی عرب موسیقار پیدا ہو گئے "کتاب الاغانی" میں درجنوں موسیقاروں کے نام درج ہیں۔ اس زمانہ کے مشہور ماہرین موسیقی معبد، غریض، ابن سریج، طویس اور ابن عائشہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ نثر کے میدان میں عابد بن شریہ کی کتاب "الملوک واخبار الماضین" اس دور کی اہم تاریخی اور لسانی تصنیف ہے۔ سیرت کے موضوع پر ابن اسحاق کی "سیرت النبیؐ"، حدیث پر اسد بن موسیٰ کی "کتاب الزہد" بھی اس دور کی مشہور کتب ہیں۔

عربی ادب کا سنہری دور خلافت بنو عباس سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب غیر عرب اقوام بڑی تعداد میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوئیں اور ان کے لئے عربی زبان میں لغت اور نحو کی کتابیں ضروری خیال کی گئیں اور علوم و فنون کی اشاعت کے لئے عظیم درسگاہوں کی بنیاد پڑی۔ پہلا مرکز بصرہ تھا، جہاں سب سے پہلے حسن بصری کے ایک شاگرد واصل بن عطاؒ نے فرقہ معتزلہ کی بنیاد ڈالی۔ اسی درسگاہ میں عربی کی سب سے پہلی لغات الخلیل اور اس کے شاگرد سیبویہ نے مرتب کی۔ دوسرا بڑا علمی مرکز کوفہ تھا، جہاں سیبویہ کی تصنیف "الکتاب" پر تنقید کی جانے لگی اور تیسرا بڑا مرکز بغداد تھا۔ جو بعد میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا اور اہم علمی مرکز بن گیا۔

پروفیسر براؤن نے "تاریخ ادبیات ایران" میں عربی ادب کے اس عہد زریں کے ۵۴ مشہور اہل قلم کی فہرست دی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ابن المقفع کی تصنیف "کلیلہ و دمنہ" اہم ہے۔ جو فارسی سے عربی زبان میں ترجمہ ہونے کے باوجود ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فقہ اسلامی کی تدوین کی۔ حماد بن سابور نے قدیم شعرائے عرب کے سات قصائد مرتب کئے۔ محمد بن عبداللہ نے فتح شام کی تاریخ لکھی۔ خلیل بن احمد نے علم عروض کو مرتب کیا۔ سیبویہ نے نحو پر "الکتاب" لکھی قاضی ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ بن انس نے فقہ کی تدوین کی۔ عباس بن احنف اور ابونواس نے ہارون الرشید کے دربار میں عشقیہ شاعری میں نام پایا۔ یحییٰ بن بطریق نے ارسطو اور دوسرے یونانی فلسفیوں کا کتب کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ہشام بن الکلبی نے تاریخ لکھی۔ امام شافعیؒ نے فقہ میں ایک الگ دبستان فکر کی بنیاد ڈالی۔ واقدی نے اسلامی فتوحات پر بے شمار تاریخی کتب لکھیں۔ ابو عبیدہ معمر اور ابوالعتاہیہ اس دور کے مشہور شعراء تھے۔ ابن قتیبہ صف اول کے مورخوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی کتاب "المعارف" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ الاصمعی مشہور زبان دان اور لغوی تھا۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی "سیرت النبیؐ" کو دوبارہ مرتب کیا۔ الکندی مشہور فلسفہ دان اور طبیب تھا۔ ابن عربی اپنے دور کے مستند ماہرین نحو و زبان میں شامل تھے اور ابو تمام مشہور شاعر تھا، جس نے الحماسہ مرتب کی۔

عہد عباسیہ کا دوسرا علمی دور المتوکل کی تخت نشینی، ۸۴۷ء سے شروع ہو کر ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی ۱۲۵۸ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں علم و ادب کا مرکز صرف بغداد ہی نہیں بلکہ ہسپانیہ اور قاہرہ بھی تھا۔ اس دور کو ہم کئی ضمنی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا ضمنی

دور تین باتوں کے لیے بے حد مشہور ہے۔ ۱۔ اس دور میں علمائے حدیث نے کتب حدیث کو از سر نو نہایت احتیاط سے مرتب کیا۔ ۲۔ علم کلام کی بنیاد پڑی اور (۳) صوفیاء کے چند غلط عقائد کی اصلاح کی گئی۔

علمائے حدیث نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں نے اکثر احادیث گھڑ لی ہیں، جن سے بے راہ رویوں کا جواز نکل آتا ہے تو انھوں نے انھیں پرکھنے اور مرتب کرنے کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ اس نتیجہ میں چھ مستند کتابیں تیار ہوئیں۔ جنھیں "صحاح ستہ" کہا جاتا ہے یہ چھ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بخاری۔ مرتبہ ابوعبداللہ محمد بن ابی الحسن اسماعیل البخاری۔

۲۔ مسلم۔ ابوالحسین مسلم بن حجاج القشیری۔

۳۔ ابن ماجہ۔ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی۔

۴۔ ابوداؤد۔ سلیمان بن اشعث الازدی۔

۵۔ ترمذی۔ حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الضحاک۔

۶۔ نسائی۔ ابوعبدالرحمان احمد بن علی۔

اہل تصوف ابتدا میں وحدت پرستی کے قائل رہے۔ مشہور صوفی شاعرہ رابعہ بصری کا کلام جذبہ عشق الٰہی کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد عقیدہ "ہمہ اوست" رنگ دکھانا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ منصور حلاج کے "انا الحق" کی صورت میں نکلا۔ اس کے خلاف علماء کا اتنا شدید ردعمل ہوا کہ صوفیاء کا ایک گروہ اشعری مدرسہ فکر سے ہم آہنگ ہو گیا۔

اس دور میں تاریخ کی مشہور کتب لکھی گئیں۔ چار بڑے مورخ بلاذری، یعقوبی، طبری اور مسعودی اسی دور میں ہوئے۔ جغرافیہ دانوں میں ابن خردادبہ سب سے زیادہ مشہور ہے، اسی نے نقشہ نویسی کی ابتدائی۔ طب میں حکیم رازی کے تحقیقی رسائل اور "الحاوی" جیسا طبی انسائیکلوپیڈیا اسی دور میں تصنیف ہوا۔ یہ دور مجموعی طور پر نثر کی طرف مائل رہا، جس میں ایسی تصانیف وجود میں آئیں جو زیادہ تر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی تھیں نثر نگاروں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف الجاحظ تھا۔ جس نے نثر نگاری کے نئے اسالیب ایجاد کیے۔ اس کی کتاب "الحیوان" مدتوں تک یورپی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ دوسری مشہور تصانیف میں ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء" تنقید کی پہلی جامع کتاب تھی۔ السجستانی اور ابن درید کی لغات اور ثعلب اور ابن انباری کی نحوی کتب بہت مشہور ہوئیں۔ اس دور کے شعراء میں ابن رومی اور ابن المعتز نے خاصا نام پایا۔

عہد عباسی کا دوسرا ضمنی دور علم الکلام کے فروغ کے لیے مشہور ہے۔ اس دور میں اشعری کے مکتب فکر کو فارابی اور قشیری جیسے علماء کی حمایت حاصل ہوئی۔ تمام عالم اسلام میں علوم و فنون اور علم و ادب کے مراکز قائم ہو گئے۔ یونانی فلسفہ اور طب پر مزید تحقیقات کی گئیں اور ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس دور کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "ہمہ جہتی" قسم کی کتب تصنیف ہوئیں۔ دراصل ہر ادیب کے لیے لغت، نحو اور روایت شعری کا علم ناگزیر تھا چنانچہ ان ادیبوں میں ابوالفرج اصفہانی نے "کتاب الاغانی" اور ابن ندیم نے "الفہرست" لکھ کر شہرت حاصل کی۔

اس دور میں متعدد لغات تیار ہوئیں۔ جن میں مترادفات اور اصطلاحات کی لغات بھی شامل تھیں۔ نیز دیگر زبانوں مثلاً فارسی، یونانی، بربری اور ہسپانوی کے الفاظ بھی عربی میں شامل ہوئے۔ سائنس پر متعدد کتب لکھی گئیں۔ نیز افسانوی ادب اور قصص نگاری میں دنیا بھر کے ادب کو کھنگالا جانے لگا۔ اس سے عربی نثر میں ایک نئے اسلوب "سجع" کا رواج ہوا۔

تاریخ کے موضوع پر ابوریحان البیرونی کی کتاب "تاریخ ہند" کے علاوہ کوئی قابل ذکر کتاب نہیں، البتہ جغرافیہ میں اصطخری کی "مسالک الممالک" اور مقدسی کی "کتاب احسن التقاسیم" نے خاصی شہرت پائی۔ نثر نگاروں میں ابوالفرج الاصفہانی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ جس کی کتاب "الاغانی" شعرائے قدیم و جدید، خلفاء، مشاہیر اور دیگر فنکاروں کے تذکرہ کے لیے بے حد مشہور ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ عربی کے مطالعہ کے لیے مجھے صرف "کتاب الاغانی" ہی کافی ہے۔ اسماعیل بن عباد کی کتاب "المحیط" اس دور کی مشہور لغت تھی۔ دیگر مصنفین میں سے خوارزمی، ابواسحاق صابی، بدیع الزمان ہمدانی، ابوعلی القالی اور ابن زہری کی کتب قابل ذکر ہیں۔ تنقید کے موضوع پر اس دور میں ثعالبی کی "یتیمۃ الدہر" اور ابن رشیق کی "عمدہ" قابل ذکر کتابیں ہیں۔

براؤن کے نزدیک اس دور کی سب سے بڑی اور اہم کتاب "الفہرست" ہے جسے اسحاق ابن ندیم نے ۹۸۸ء میں مرتب کیا۔ اس میں مؤلف نے تمام علوم پر لکھنے والے مصنفین کا تذکرہ، ان کی کتب کے نام اور اکثر کے ملخط کے ساتھ ساتھ اقوام عالم کی تاریخ، انساب، زبانوں، رسم الخط اور مذاہب کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

اس دور کے مشہور شعراء میں المتنبی، ابوفراس اور ابوالعلامعری ہیں۔

عہد عباسیہ کا آخری علمی اور ادبی دور، جو ہلاکو خاں کے حملے پر ختم ہوتا ہے، چند علمی و ادبی کاموں کے لیے مشہور ہے۔ اس میں سلجوقیوں کے وزیر نظام الملک نے "سیاست نامہ" مرتب کی اور "درس نظامیہ" کے نام سے نظام تعلیم قائم کیا۔ دینی درسگاہوں میں آج تک یہی نظام چلا آتا ہے۔

تاریخ کے موضوع پر اس دور نے عماد الدین اصفہانی اور عزالدین ابوالحسن علی ابن اثیر جیسے مورخ پیدا کیے۔ اوّل الذکر کی تالیفات "الفتح القدسی"، "البرق الشامی"، "نصرۃ الفطرت" اور "خریدۃ العصر" اور موخرالذکر کی کتب "الکامل"، "اسدالغابہ" اور "تحفۃ العجائب" عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ شہروں اور صوبوں کی مقامی تاریخ میں ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا نام سرفہرست ہے۔ تذکرہ اور سوانح نگاری میں ابن خلکان اور ابن ابی اصیبعہ، سمعانی اور جمال الدین القفطی کے نام قابل ذکر ہیں۔

علم جغرافیہ کو یاقوت نے "معجم البلدان" کے ذریعے بہت آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ ادریسی، ابوعبید بکری، ابوعبیداللہ المازنی اور ابن جبیر نے اسی دور میں گراں قدر کتب لکھیں۔

شاعری میں عمر ابن الفارض، زہیر، ابن قلاقس، سناء الملک، ابن سناء، سعد بن علی ابوالمعالی، ابن حلاوی، صلاح الدین، الابیوردی اور ابن قصاری مشہور ہیں۔ انھوں نے عربی شاعری میں مختلف اصناف کی طرح ڈالی اور مترادفات اور صنائع کا بہتر استعمال کیا۔

نثر نگاروں میں اس کے مشہور مصنفین میں سے الحریری "مقامات"، زمخشری "المفصل فی النحو"، "الفائق"، "مقامات" اور "اطواق الذہب"، ابن حاجب نحوی کی کتب "الکافیہ" اور "الشافیہ"، ابن اثیر ضیاء کے حصن "المثل السائر فی ادب الکاتب" فی علم البیان اور "تاریخ الکامل" کی وجہ سے مشہور ہیں۔

علمائے علوم اسلامیہ میں ابن حزم، امام غزالی اور ابن عربی مشہور ہیں۔ ابن حزم نے اسی ہزار اوراق پر مشتمل چار صد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں جمہرۃ النسب، "ابطال القیاس والرائے" اور "الناسخ والمنسوخ" بہت اہم ہیں۔ امام غزالی ان علمائے کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے عہد کے علماء پر خاصا اثر ڈالا۔ آپ کی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" ہے۔ جس نے علوم دینیہ کا رخ موڑ دیا۔ اس کے علاوہ آپ کی مشہور ترین کتب "کیمیائے سعادت" اور "تہافۃ الفلاسفہ" ہیں۔ تصوف کے میدان میں شیخ محی الدین ابن عربی کی تصانیف کو تقدیم حاصل ہے۔ ان کی صوفیانہ کتب کی ...

انھیں "شیخ الاکبر" کہا جاتا ہے۔ خصوصاً ان کی کتاب "فتوحات" کو بے حد شہرت حاصل ہے۔ منگولوں کے حملے کے بعد بغداد کی علمی شان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اس کے ایک صدی بعد امیر تیمور نے بھی بڑے بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور درسگاہوں اور کتب خانوں کا نام بھی باقی نہ رہا۔ بچا کھچا علمی سرمایہ قاہرہ منتقل ہو گیا۔ ترکی اور فارسی زبانیں اہمیت اختیار کرنے لگیں۔ تاہم عربی کو بہر حال علمی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک کا یہ دور تاریخ اور اسلامی علوم کے لئے بے حد مشہور ہے۔

اس دور کے علمائے تاریخ میں ابن خلکان، الصفدی، ابن حجر عسقلانی، تقی الدین المقریزی، الذہبی، ابن خلدون، ابوالفداء، ابن ابی اصیبعہ، ابن شاکر، ابن کثیر، ابوالفرج، ابن سعید اور الخطیب صف اول میں آتے ہیں۔ ابن خلکان کی کتاب "وفیات الاعیان" ہے، جو خلفاء، وزراء، علماء، شعراء اور شہروں اور علاقوں کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ الصفدی کی "الوافی فی الوفیات" اپنی تفصیلات اور جزئیات کے لیے مشہور ہے۔ ابن حجر کی "المجمع المؤسس"، "رفع الاصر"، "الاصابہ" اور "فتح الباری" اہم ہیں۔

تقی الدین المقریزی کی مشہور تصنیف "مواعظ الاعتبار" جغرافیائی معلومات پر مبنی ہے [illegible] مشہور کتاب ہے۔ حافظ الذہبی کی "تاریخ الاسلام"، "تہذیب التہذیب"، [illegible] اور [illegible] فی اخبار [illegible] ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ابن خلدون فن تاریخ [illegible] جاتا ہے [illegible] مقدمہ بے حد شہرت حاصل کر چکا ہے [illegible] ابوالفداء کی "تقویم البلدان" [illegible]

[illegible] ابن بطوطہ ہے، جس کا سفر نامہ عالمی [illegible] محمد [illegible] کی کتاب "عجائب المخلوقات" اور [illegible]

[illegible] علمائے [illegible] ابن تیمیہ کا نام سرفہرست ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ [illegible] منہاج السنۃ النبویہ، الواسطیہ، الصارم المسلول [illegible] ان کی [illegible] ہیں۔ محب الدین طبری کی "الریاض النضرۃ" [illegible] کی "مختصر [illegible] الباب" اور "سیرت النبوۃ"، سعد الدین التفتازانی کی "تہذیب المنطق والکلام" اور "مقاصد الطالبین" اس دور کی مشہور کتب ہیں۔

فلسفہ [illegible] ریاضیات اور نجوم میں قطب الدین شیرازی اور [illegible] ابن نفیس کی تصانیف خاصی مشہور ہیں۔ خصوصاً ابن [illegible] کی کتاب "المختار [illegible]" [illegible] درسی کتاب کی حیثیت کی مالک [illegible] ابن منظور، ابو الفضل اللہ اور سیوطی تفسیر، حدیث، بیان، [illegible] لغت، تاریخ اور ادب کے مشہور مصنفین میں سے تھے۔

۱۵۱۷ء سے ترکی کے عثمانی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں کو اندلس سے نکال دیا گیا اور وہاں کے علمی ذخائر تباہ کر دیئے گئے۔ چنانچہ اسلامی ممالک تین حصوں میں منقسم ہو گئے۔ شمالی افریقہ، مصر، شام اور ترکی کا علاقہ ترکوں کے زیر نگیں تھا۔ ایران، عراق اور خراسان پر صفوی حکمران تھے اور افغانستان اور ہندوستان پر مغلوں کا راج تھا۔ چنانچہ ہم بھی عثمانی دور کے تحت عربی ادب، ایرانی ادوار کے تحت فارسی ادب اور ہندوستانی ادوار کے تحت ہندوستانی ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔

عثمانی دور مجموعی طور پر عربی ادب کے انحطاط کا دور ہے۔ شعراء اور ادباء فحش نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ تاہم اکثر علما نے تصنیف و تالیف کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی مگر نئی تصنیف اتنی کم ہوئیں اور شرحیں اس کثرت سے لکھی گئیں کہ تاریخ ادب کے بعض علمائے اسے "شرح و حواشی" کا دور کہا ہے۔

اس دور میں وہابی اور سنوسی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ محمد بن عبدالوہاب کی کتب "تفسیر الشہاب"، "لمع الشہاب" اور "التوحید" نے مسلمانوں پر خاصا اثر ڈالا۔ تاریخ و سیرت میں محمد بن علی بن طولون کی "الجواہر المضیئہ"، شمس الدین شامی کی "سیرت الشامیہ"، المقری کی مشہور تاریخ اندلس "نفح الطیب"، اور احمد بن مصلح الدین طاش کبیری زادہ کی "الشقائق النعمانیہ" اور "مفتاح السعادت" اہم ہیں۔

یہاں اندلس کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوتا ہے۔ جو آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا تہذیبی و علمی مرکز رہا۔ جہاں کا تقریباً ہر باشندہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ جہاں کی یونیورسٹیاں خصوصاً قرطبہ کی یونیورسٹی دنیا کی بہترین درسگاہ تھی۔ اموی دور میں یہاں ابن عبد ربہ کی "عقد الفرید" تصنیف ہوئی، جو مختلف علوم و فنون پر ایک گراں قدر انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس دور کے مشہور مورخ ابوبکر الرازی اور ابن قطلیہ ہیں۔ انھوں نے سپین (اندلس) کی مفصل تاریخ لکھی۔ گیارھویں صدی کے اندلسی علماء میں ابن حزم، ابومروان ابن حیان اور البکری قابل ذکر ہیں۔ ابن حیان نے ساٹھ جلدوں میں تاریخ ہسپانیہ "المتین" کے نام سے لکھی۔

اندلس کا علمی دور گیارھویں سے تیرھویں صدی کے وسط تک پھیلا ہوا ہے اس میں فلسفہ کے جلیل القدر علماء ابن ماجہ، ابن رشد، ابن طفیل اور موسیٰ بن میمون، علمائے کلام ابن حزم اور ابن حزم، علمائے تاریخ ابن خاقان، ابن بسام اور ابن بشکوال، جغرافیہ دان ادریسی اور ابن جبیر اور اطباء میں ابن زہر اور ابن بیطار قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی تحریروں سے مغرب نے استفادہ کیا اور ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ ان میں سے ابن رشد کی تصانیف "المسائل فی منطق"، "تہافۃ التہافہ" اور "فصل المقال" اور ابن طفیل کی "الاسرار" خاصی اہم ہیں۔

جدید دور میں عربی ادب کے مرکز زیادہ تر مصر اور شام میں ہیں۔ تاہم دیگر ممالک کے مصنفین نے بھی عربی ادب پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ خصوصاً جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد محمد عبدہ کی تحریروں نے اپنے دور کے ادیبوں کو خاصا متاثر کیا ہے۔ اس دور کے علماء اور ادباء زیادہ تر دو گروہوں میں منقسم رہے۔ ان میں سے ایک گروہ جو مصر و شام کو متحد رکھنا چاہتا تھا، مصطفیٰ الکمال (۱۹۰۰ء) اور ادیب فارس الشدیاق (۱۸۰۴ء تا ۱۸۸۷ء) کی تحریریں قابل ذکر ہیں۔ مراکش کے شہاب الدین السلاوی (۱۸۹۷ء) نے بھی عالم اسلام کے مجموعی اتحاد و مفاد کے لئے بہت کچھ لکھا۔ سلیم تقلا نے ۱۸۷۵ء میں مصر میں مشہور روزنامہ "الاہرام" کی بنیاد رکھی۔ ادیبوں اور شاعروں کے دوسرے گروہ میں، جو مصر کی خود مختاری کا علمبردار تھا، اخبار "المشیر" کا ایڈیٹر سلیم سرکیس (۱۸۶۹ء تا ۱۹۲۶ء) پیش پیش تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ اعتدال پسند گروہ میں مجلہ "جامعہ عثمانیہ" کا مدیر فرح انطون (۱۸۷۴ء تا ۱۹۲۲ء) اور "المنار" کا اسلام پسند ایڈیٹر رشید رضا (۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۵ء) بھی خاصے سرگرم ہیں۔ ادیب اسحاق (۱۸۵۶ء تا ۱۸۸۵ء) اور مشہور شاعر اور ادیب جرجی زیدان (۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۴ء) بھی اسی گروہ میں تھے۔ اس دور کے شعراء میں بطرس کرامہ شامی (۱۷۷۴ء تا ۱۸۵۱ء)، عبدالباقی العمری عراقی (۱۷۹۰ء تا ۱۸۹۲ء) اور لبنانی شاعر ناصف الیازجی (۱۸۰۰ء تا ۱۸۷۱ء) اہم ہیں۔

عربی ادب پر مغرب کا بھی بے حد اثر ہوا۔ خدیو مصر محمد علی پاشا (۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۸ء) نے کچھ طلبا کو حصول تعلیم کے لئے فرانس بھیجا۔ ان میں نغز گو شاعر رفاعہ الطہطاوی (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۳ء) اور خلیل مطران شامل ہیں، جنہوں نے شاعری میں طرز جدید کی نمائندگی کی۔ ۱۹۰۸ء میں خلیل مطران کا دیوان "الخلیل" شائع کیا۔

۲۴ راپریل ۱۹۱۳ء عربی ادب میں ناقابل فراموش اہمیت کا حامل ہے۔ اس روز، احمد شوقی، حافظ ابراہیم، ابراہیم صابری، جرجی زیدان، شکیب ارسلان، امین ریحانی، جبران خلیل جبران، بری زیادۃ، انطون الجمیل، محمد لطفی جمعہ، عباس محمود العقاد، محمد کرد علی اور خلیل مطران جیسے بلند پایہ ادیب و شاعر جمع تھے۔ اس روز کے بعد سے عربی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ نثر میں ڈرامے اور ناول کا اضافہ ہوا۔ یورپی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے تراجم شائع ہوئے اور مصری صحافت مغربی صحافت کے معیار پر آگئی۔

مغرب کی اندھا دھند تقلید کے ردِ عمل کے طور پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے گروپ نے ماضی کے خزینے کھنگالنے شروع کیے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الادب الجاہلی" نے ادبی حلقوں میں دھوم مچادی۔ ان کے ساتھیوں میں سے پروفیسر احمد امین کی کتب "فجر الاسلام" اور "ضحی الاسلام"، اسی دور میں منظر عام پر آئیں۔ احمد حسن الزیات کے پرشکوہ اندازِ تحریر نے دوسرے ادیبوں پر بے حد اثر ڈالا۔ مصطفیٰ لطفی منفلوطی اور مصطفیٰ صادق الرافع کی نثر نے عربی زبان کو بے حد وسعت دی۔

اس نئے دور میں علوم اسلامیہ پر اتنی اہم تصانیف نہیں لکھی گئیں جو جدید نظریات کے اثرات کو زائل کرتیں۔ تاہم ادب و تحقیق کے میدانوں میں ابراہیم بک، علی یوسف، حافظ ابراہیم، احمد شوقی، محمد حسین ہیکل اور توفیق حکیم وغیرہ نام قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً محمد حسین ہیکل کی تحقیقی کتب "ابوبکرؓ"، "عمر فاروقؓ" اور "حیات رسولؐ" نے نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔

فارسی ادب

پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد جہاں عربی ادب کی ترویج ہوئی۔ وہیں نومسلم ادیبوں نے پہلوی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ عربی کا اس زبان پر بے حد اثر ہوا اور اس کے الفاظ پہلوی میں شامل ہوتے چلے گئے۔ یہی زبان اب فارسی کہلاتی ہے۔ خط پہلوی بھی عربی رسم الخط میں بدل گیا اور عربی اسلوب بھی فارسی میں داخل ہوا۔ اس قدیم فارسی زبان میں ادب کا آغاز عہد سامانیہ سے ہوتا ہے، جس کا مشہور شاعر رودکی ہے۔ اس کا انداز سبک خراسانی کہلاتا ہے۔ اس نے قصیدے میں شہرت حاصل کی۔ اس دور کی اہم نثری تصانیف میں ابومنصور بن عبداللہ العمری کا "مقدمہ شاہنامہ"، ابوعلی محمد کا ترجمہ "تاریخ طبری"، چند علماء کا مشترکہ ترجمہ تفسیر طبری، اور ابوالمؤید بلخی کی "عجائب البلدان" خاصی مشہور ہیں۔

طبرستان کی آل زیار حکومت کی سب سے بڑی تصنیف "قابوس نامہ" ہے، جو قابوس بن وشمگیر کے پوتے امیر عنصر المعالی کیکاؤس کی تالیف ہے۔ اسی دور کا مشہور مصنف ابوریحان البیرونی ہے۔ جس نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتب لکھیں اس نے غزنوی حکمرانوں کے دربار میں سکونت اختیار کرلی۔ پروفیسر براؤن محمود غزنوی کو علماء کا اغوا کنندہ لکھتے ہیں۔ بلاشبہ محمود غزنوی کے دربار میں اس دور کے چوٹی کے علماء مثلاً البیرونی، بوعلی سینا، ابوسہل، ابوالحسن خمار طیب اور ابونصر موجود تھے۔ البیرونی کی زیادہ کتب عربی میں تھیں ان میں سے "کتاب الہند" اور "قانون مسعودی" زیادہ اہم ہیں۔ ابن سینا کی طبی کتب "القانون"، "الشفاء" اور منطق، دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں عرصہ تک پڑھائی جاتی رہیں۔

عہد غزنوی میں فارسی نظم و نثر کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ نظم میں فردوسی کا شاہنامہ عظیم شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار اشعار ہیں، جو مختلف داستانوں واقعات اور مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اس کا اثر فارسی ادب کے احیاء کے سلسلے میں نمایاں ہے۔ کیونکہ فردوسی نے اس میں عربی الفاظ کو جان بوجھ کر چھوڑا ہے۔ نثر میں ابوالفضل بیہقی کی کتاب "تاریخ بیہقی" خاصی شہرت رکھتی ہے، جو ایک غیر جانبدار مورخ کا عظیم تاریخی کارنامہ ہے۔ ابن سینا کی "دانش نامہ علائی"، اور البیرونی کی "تفہیم" اس دور کی رواں اور سلیس فارسی نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔

دور سلجوقیہ، جو غزنوی دور کے بعد شروع ہوتا ہے۔ علم و ادب کی ترقی کے لیے بے حد اہم ہے۔ سلجوقی سلاطین علم و ادب کے بڑے محسن تھے۔ الپ ارسلان کا وزیر نظام الملک طوسی ایک بڑا مدبر، سیاست دان اور متبحر عالم تھا۔ عربی زبان و ادب کی طرف خصوصی طور پر متوجہ تھا۔ "سیاست نامہ" اس کی تصنیف تھا۔ اسی نے مدرسہ نظامیہ کی داغ بیل ڈالی۔ اس دور میں ناصر خسرو، عمر خیام، الوری، قطران، حکیم سنائی اور خواجہ عطار جیسے شعراء اور راوندی جیسے مورخ پیدا ہوئے۔

عمر خیام کا سب سے بڑا کارنامہ "رباعیات" ہے۔ جو فلسفیانہ اور صوفیانہ رموز کی آئینہ دار ہیں۔ مزید براں اس نے نجوم، ریاضی اور فلسفے میں بھی قابل قدر کتابیں اور رسالے لکھے۔ حکیم ناصر خسرو نے نثر اور شاعری کو مذہبی عقائد کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنایا۔ اس کی نثری تصانیف "سفر نامہ" اور "زاد المسافرین" اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا دیوان بھی فلسفہ، اخلاق اور عقل و دانش کے موضوعات کو محیط کرتے ہوئے خاصی شہرت اختیار کرچکا ہے۔ اسی دور میں امام غزالی نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کیمیائے سعادت لکھی۔

ایران کے جن تین نامور شعراء نے تصوف کو اپنے کلام کا باقاعدہ موضوع بنایا ان میں سب سے پہلے حکیم سنائی ہیں۔ ان کے بعد خواجہ [illegible] اور پھر مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ حکیم [illegible] کی مثنویوں میں "حدیقۃ الحقیقت" بہت مشہور ہے۔ نثر کی کتابوں میں رشید [illegible] وطواط کی "حدائق السحر"، نظامی عروضی کی "چہار مقالہ"، زین الدین جرجانی کی "ذخیرہ خوارزم شاہی"، ابوبکر بلخی کی "مقامات حمیدی"، ابوبکر محمد [illegible] کی "تاریخ بخارا" اور [illegible] کی "کلیلہ و دمنہ" خاصی مشہور ہیں۔ مغلوں کے دور میں خواجہ فریدالدین عطار کی تالیف "تذکرۃ الاولیاء" اور مثنوی "منطق الطیر" اور مولانا جلال الدین رومی کی "مثنوی" فارسی ادب میں اہم ترین مقام رکھتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم کو علامہ اقبال نے پہلوی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر قرار دیا ہے۔ یورپ کے اکثر مستشرقین نے اس مثنوی کے ترجمے کیے ہیں۔ اسی طرح شیخ سعدی کی "گلستان" اور "بوستان" اخلاقی و مذہبی ادبیات میں بے نظیر مقام کی حامل ہیں۔ سعدی غزل کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا دیوان کلیات کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی کے دوسرے عظیم شاعر جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں امیر خسرو ہیں، جن کے پانچ دیوان، دس مثنویوں اور غزلیات کے دیوان کے ساتھ نثر کی چند کتابیں "تاریخ علائی"، "اعجاز خسروی"، "افضل الفوائد"، "قصہ چہار درویش" اور "انشائے خسروی" بے حد مشہور ہیں۔ امیر خسرو کا کلام بھی [illegible] ہے۔ اگرچہ آپ ہندوستانی شاعر ہیں۔ لیکن فارسی کے [illegible] دور میں شمار [illegible]

ایلخانی دور کی نثر میں "جامع التواریخ" سب سے اہم کتاب ہے۔ [illegible] اور ایلخانیوں کا عظیم تاریخی کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مؤلف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی ہے۔ سعدی شیرازی کی "گلستان" نثر و نظم کی خوب صورت پیوند کاری ہے [illegible] میں آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ سے بھی زینت آرائی کی گئی ہے۔ یہ عمدہ [illegible] حکایتوں پر مشتمل ایک اہم ادبی کتاب ہے۔

تیمور کے عہد سے تیموری دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے سب سے بڑے شاعر محمد حافظ شیرازی ہیں۔ ان کی زندہ جاوید یادگار تصنیف ان کا دیوان ہے۔ جس نے نہ صرف فارسی ادب پر گہرا اثر چھوڑا بلکہ اہل یورپ میں اسی سے "مشرقی تحریک" کا آغاز ہوا۔ جس کا نمائندہ جرمن شاعر گوئٹے ہے۔ اس دور کے دوسرے بلند مرتبہ شاعر اور دانشور نورالدین عبدالرحمان جامی ہیں۔ انہوں نے نثر اور نظم دونوں میں کتابیں لکھیں۔ ان کی تعداد ۴۶ بتائی گئی ہے۔ جو زیادہ تر تصوف، عروض، موسیقی وغیرہ پر ہیں۔ ان کی "نفحات الانس"، "تحفۃ الاحرار" اور مثنوی "یوسف زلیخا" و "لیلیٰ مجنوں" زیادہ مشہور ہیں

ادب اسلامی

ایران میں صفوی عہد علم و ادب کے لحاظ سے پسماندہ رہا۔ تاہم قاچاری دور میں بابیہ تحریک نے فارسی ادب میں ایک بار پھر جان ڈال دی۔ اس دور کی مشہور بابی شاعرہ قرۃ العین تھی، جس نے پہلی بار آزادیٔ نسواں کا نعرہ لگایا اس دور میں نثر میں بھی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔

ہندوستان میں مغلیہ عہد میں فارسی ادب کا آغاز ملا احمد تتوی کی کتاب "تاریخ الفی" سے ہوتا ہے جو اکبر اعظم کی فرمائش پر لکھی گئی۔ دیگر مشہور کتابیں "تاریخ فرشتہ" مؤلفہ محمد قاسم فرشتہ، "منتخب التواریخ" مولف ملا عبدالقادر بدایونی "اکبر نامہ"، "آئین اکبری" اور انشائے ابوالفضل" مولفہ ابوالفضل، "تزک بابری" مولف بادشاہ بابر اہم ترین ہیں

ہندستانی و اردو ادب

فارسی زبان و ادب کے زیر اثر ہندوستان میں ہندی اور اردو زبان میں اسلامی ادب کا آغاز ہوا۔

غزنوی عہد کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اس عہد میں ہندوستان کے عظیم صوفی مصنف حضرت داتا گنج بخش تھے، جنھوں نے فارسی زبان میں تصوف کے موضوع پر ایک عظیم کتاب "کشف المحجوب" لکھی۔ عہد قطب الدین ایبک میں نثر کی مشہور کتابیں نظامی نیشاپوری کی "تاج المآثر" اور مدبر غزنوی کی "تاریخ فخر الدین مبارک شاہ" ہیں۔ سلطان التمش کے زمانے میں بہت سے اہل علم ہندوستان آئے۔ انھوں نے فارسی زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ تصوف کے موضوع پر خواجہ معین الدین اجمیری کا کلام مکتوبات رسائل میں "اصول طریقت" وغیرہ اہم ہیں۔ قاضی حمید الدین ناگوری کی "طوالع الشموس" رسالہ عشقیہ اور عہد تغلق میں ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" اور شہاب الدین سہروردی کی "عوارف المعارف" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اردو زبان میں اسلامی ادب کا آغاز طوطی ہند امیر خسرو سے ہوتا ہے۔ انھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ قدیم ہندی یا اردو زبان میں دوہے، گیت، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ کہیں۔ [illegible] سے بڑے صوفی حضرت بابا فرید گنج شکر تھے۔ آپ کے ملفوظات کے دو مجموعے شائع ہوئے جو فارسی اور قدیم اردو زبان میں ہیں۔ آپ کے خلیفہ حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات کا فارسی مجموعہ "فوائد الفواد" ہے۔ جس نے اشاعت اسلام میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح پاک و ہند کے دیگر صوفیا نے فارسی کے علاوہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں بہت سی تصانیف تحریر کیں۔ مگر وہ پہلے صوفی جنھوں نے فارسی کے علاوہ ہندی یا اردو زبان میں بھی باقاعدہ تصانیف لکھیں، حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز تھے۔ ان کی کتابوں میں سے "معراج العاشقین" اردو زبان کی قدیم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان کا مغلیہ عہد اسلامی ادب کا زریں عہد ہے، جس میں ابوالفضل فیضی حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، دارا شکوہ، اورنگ زیب عالمگیر شاہ ولی اللہ اور ملا نظام الدین جیسے بلند پایہ علما پیدا ہوئے جنھوں نے زیادہ تر فارسی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھیں۔ عہد اکبری علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کے لیے مشہور ہے۔ مزید برآں فنون لطیفہ مثلاً شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کو فروغ بھی اسی زمانے میں ہوا۔ اس دور میں ابوالفضل کے علاوہ، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور ملا نظام الدین کی "طبقات اکبری" خاص اہم ہیں۔ ابوالفضل اکبر کے دین الٰہی کا موجد تھا۔ جس کا قلع قمع حضرت مجدد الف ثانی نے کیا۔ انھوں نے مختلف امرا کو خطوط جو "مکتوبات امام ربانی" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کا طرز تحریر پرجوش اور پرتاثیر ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور کتاب عربی میں "لمعات" ہے۔ یہ "مشکوٰۃ" کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ "جذب القلوب فی دیار المحبوب"، "مدارج النبوۃ" اور "شرح فتوح الغیب" خاصی مشہور ہیں۔

عہد شاہجہانی میں شہزادہ دارا شکوہ کی فارسی کتابیں "سفینۃ الاولیاء"، "سکینۃ الاولیاء" اور "مجمع البحرین" وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ عہد عالمگیری کا سب سے بڑا عالم خود اورنگ زیب عالمگیر تھے۔ انھوں نے اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم کو نئے سرے سے مدون کروایا۔ نیز فقہ کی طرف خصوصی توجہ دی اور ملک کے قابل حنفی علماء سے "فتاویٰ عالمگیری" مرتب کروائی۔ اس عہد کی دو تین اور کتابیں بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک ملا محسن کی "رد شیعہ" ہے اور محمد مصطفیٰ کی "نجم القرآن" ہے۔ جس میں کلام مجید کے الفاظ کا اشاریہ دیا گیا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان کے ایک عظیم عالم حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ جنھوں نے فقہ، تفسیر، حدیث، تصوف، تاریخ، علم الکلام غرضیکہ ہر شاخ علم میں بیسیوں کتابیں لکھیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک تفسیر "فوز الکبیر" کے نام سے بھی لکھی۔ اسرار شریعت میں آپ کی تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ"، اجتہاد کے موضوع پر "عقد الجید" تصوف پر "لمعات" خاصی مشہور کتابیں ہیں۔ فرنگی محل لکھنؤ کے ملا نظام الدین بھی اسلامی ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی زیادہ شہرت مدرس کی حیثیت سے ہے۔ آپ نے ہندوستان میں درس نظامیہ کی بنیاد رکھی اور اسے ایک پائیدار نصاب تعلیم بنا دیا۔

مغلوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد سے فارسی کی جگہ اردو اور ہندی زبانوں نے لینا شروع کی۔ چنانچہ اسلامی ادب نے اشاعت کے لیے اردو زبان کا دامن تھاما۔ یہ وہ دور تھا جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنا پڑی۔ اسی زمانے میں حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم شائع کیے۔ شاہ عبدالقادر نے ایک تفسیر "موضح القرآن" کے نام سے بھی شائع کی۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے بھی بے شمار کتابیں لکھیں، جن کے نتیجے میں اردو نثر کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ سید احمد بریلویؒ کے دست راست مولانا محمد اسماعیل شہید کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کلمہ طیبہ کی بے نظیر تفسیر ہے ان کے مقلدین اہل حدیث کہلاتے۔ جنھوں نے بے شمار تصانیف تحریر کیں۔ ان میں نواب صدیق حسن قنوجی اور سید نذیر حسین محدث کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے مقابلے میں مولوی احمد رضا خاں بریلویؒ کی تصانیف وجود میں آئیں۔

یہ دور مسلمانوں کے انحطاط کا دور تھا۔ جسے دور کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کے روح رواں سر سید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار تھے۔ سرسید کی تحریروں نے مسلمانوں پر خاصا اثر ڈالا۔ اور مسلمان ایک بار پھر اپنے قدم جمانے میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ مولانا شبلی ورثہ ماضی کو کھنگالنے اور تحقیق کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اور مولانا حالی قوم کو جاگنے کا درس دینے لگے۔ سرسید کی تحریک کے سلسلے میں جدید علم الکلام کا آغاز ہوا، جس کے بانی سرسید اور ان کے مقلدین سید سلیمان ندوی، مولوی چراغ علی، سید امیر علی، مرزا غلام احمد، مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، علمائے دیوبند، مولانا احمد علی لاہوری، علامہ اقبال، غلام احمد پرویز اور سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے علماء، متکلمین اور مفسرین پیدا ہوئے۔ ان کی تصانیف نے اسلامی ادبی دولت میں کما حقہ اضافہ کیا۔ چنانچہ سرسید کی "تفسیر قرآن"، "تبیین الکلام" اور "خطبات احمدیہ" مولوی چراغ علی کی "تحقیق جہاد" اور رسائل، سید امیر علی کی قانونی کتب خصوصاً "سپرٹ آف اسلام"، مرزا غلام احمد کی "براہین احمدیہ" (جس سے جماعت احمدیہ وجود میں آئی)، سید سلیمان ندوی کی تحریریں، علمائے دیوبند خصوصاً حاجی

امداد اللہ کی "تحفۃ العشاق"، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم اور مولانا محمود الحسن کے درس، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحق، مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفاسیر اور مباحث، مولانا شبلی نعمانی کی "الکلام" اور "سیرت النبی" ابوالکلام آزاد کا اخبار "الہلال" اور دیگر مذہبی تصانیف، علامہ اقبال کا کلام اور چند خطابات، مولانا عبیداللہ سندھی کے مقالات اور افکار، مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے مضامین، مولوی محمد علی کا ترجمہ "بیان القرآن"، غلام احمد پرویز کی تصانیف اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف اور تفسیر "تفہیم القرآن" نے اسلامی ادب کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا ہے کہ وہ علمی تحقیق اور ادبی ہر لحاظ سے عالمی ادب کا مقابلہ کرتا ہے۔

اردو زبان کے شعرا میں، جنھوں نے اسلامی تعلیمات کو موضوع سخن بنایا یوں تو بے شمار شعرا کی فہرست آتی ہے۔ تاہم اس میں محمد حسین آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی اکبر الہ آبادی، شبلی، اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، نعیم صدیقی، شورش کاشمیری، عبدالعزیز خالد کے نام قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً کلام اقبال، حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام"، ماہر القادری اور عبدالعزیز خالد کی نعتیں اردو اسلامی ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے علاوہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں بھی اسلامی ادب کو فروغ حاصل ہے۔ قرآن مجید کے تراجم تو تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہی حال اسلامی کتابوں کا ہے۔ خصوصاً انگریزی زبان میں بہت سی اسلامی ادب تخلیق ترجمہ ہو چکا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا

اسلامی علوم کو باقاعدہ طور پر مدون کرنے کا کام بھی زمانہ قدیم سے انجام دیا جاتا رہا ہے۔ اس قسم کی تدوین شدہ تصانیف کو انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف کا نام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا پہلا انسائیکلوپیڈیا الفارابی کی احصاء العلوم تھی جس میں دنیا کے تمام علوم کی ذخیرہ بندی کی گئی تھی۔ مگر خالصتاً اسلام کے موضوع پر سب سے پہلا انسائیکلوپیڈیا امام غزالی کی "احیائے علوم" تھی جس میں علم الکلام، فلسفہ، منطق، علوم شرعیہ اور علوم عقلیہ کی تقسیم کی گئی تھی۔ جدید دور میں الفابائی ترتیب سے پہلا اسلامی انسائیکلوپیڈیا "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے نام سے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۴ء تک قسط وار شائع ہوا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور مستند ترین انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جسے ایم ٹی ہوٹزما نے فرانسیسی زبان میں چار جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۸ء کے دوران میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۰ء تک اس کا نیا انگریزی ایڈیشن بائیس قسطوں میں شائع ہوا۔ اس کا ترکی ایڈیشن ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۷ء تک شائع ہوا۔ اس کے مضمون نگاروں میں سے ایک مستشرق ایچ آر گب نے جے ایچ کرامر کے ساتھ مل کر ایک جلد میں ایک مختصر سا انسائیکلوپیڈیا "شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا۔ عربی زبان میں بڑے انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ ۱۹۳۳ء سے چھپنا شروع ہوا اور ابھی تک مکمل نہیں ہو سکا۔ اس کا اردو ترجمہ جس میں مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اکثر مضامین نئے سرے سے لکھوائے جاتے ہیں ۱۹۵۰ء سے لاہور سے "دائرۃ المعارف اسلامیہ" کے نام سے قسط وار شائع ہونا شروع ہوا ہے ابھی اس میں بھی نصف کام باقی ہے اس سے پہلے جنوری ۱۹۴۰ء میں اسے اردو میں شائع کرنے کا کام جدید پریس پٹنہ نے شروع کیا، مگر چند قسطوں کے بعد ختم کر دیا۔ منشی محبوب عالم نے پہلی بار اپنی طرف سے مرتب کردہ ایک جلد میں انسائیکلوپیڈیا "اسلامی سائیکلوپیڈیا" کے نام سے پیسہ اخبار لاہور سے کوئی پچاس سال پیشتر شائع کیا تھا۔ یہ تمام انسائیکلوپیڈیا علما کے استفادے کے لیے تھے۔ اب پہلی بار اکتوبر ۱۹۷۵ء سے شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا قسط وار شائع کرنا شروع کیا جو جولائی ۱۹۷۹ء میں ختم ہوا۔ مکتبہ شاہکار کے اس انسائیکلوپیڈیا کا مخاطب عام تعلیم یافتہ مسلمان ہے۔ اب مکمل نظر ثانی، اضافوں اور ترامیم کے بعد یک جلدی صورت میں شائع کیا گیا ہے (نیز دیکھیے حدیث، تصوف، تفسیر، فقہ، قرآن مجید)

ادرنہ

(ADRIANOPLE) ترکی کا ایک تاریخی شہر۔ یہ ترکی کی مغربی سرحد کے قریب واقع ہے۔ چند میل کے فاصلے پر ترکی۔ بلغاریہ اور یونان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ دریائے تنزہ اور دریائے مرلیہ کے سنگم کے قریب تنزہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ادرنہ ترکی کے صوبہ ال کا صدر مقام ہے۔ یہ صوبہ ترکی کے اس حصے پر مشتمل ہے جو برّاعظم یورپ میں واقع ہے۔ ادرنہ استنبول سے ۱۴۵ میل دور ہے۔

اپنے مخصوص ذرائع کی بدولت یہ شہر ہر دور میں اہم رہا ہے۔ ماضی کے حملہ آور ادرنہ کے قریب مذکورہ بالا دریاؤں کو عبور کرتے تھے۔ شہر کے وسط میں بنا ہوا ایک مضبوط

ادرنہ میں سلیم دوم کی تعمیر کردہ جامع مسجد

قلعہ اس کے تاریخی کردار کا آئینہ دار ہے۔ یورپ کو ایشیا سے ملانے والی مشہور شاہراہ ادرنہ سے گذرتی ہے۔ ادرنہ ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ یہ یوگوسلاویہ کے دارالحکومت بلغراد اور بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ کو استنبول (اور یوں ایشیا) سے ملانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ ادرنہ استنبول کے علاوہ صوبے کے تمام اہم شہروں اور قصبوں سے بذریعہ سڑک ملا ہوا ہے۔

مسلمان حکمرانوں کی بنائی ہوئی خوب صورت مسجدیں، دارالحدیث، ایک قدیم مذہبی کالج، اور کارواں سرائے یہاں کی مشہور تاریخی عمارات ہیں۔ یوں تو ادرنہ نے کئی بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا ہے لیکن یہاں لڑی جانے والی دو جنگیں بہت مشہور ہیں پہلی جنگ ۳۲۳ء میں لڑی گئی جس میں قسطنطین اعظم نے لیسینیئس کو شکست دی۔ دوسری اور زیادہ مشہور جنگ ۳۷۸ء میں ہوئی جس میں رومیوں نے گوتھوں کے ہاتھوں عبرتناک

شکست کھائی۔ رومیوں کی دو تہائی فوج گاجر مولی کی طرح کٹ گئی اور بادشاہ ویلنز بھی مارا گیا۔ اس کی لاش تک نہ مل سکی۔ یہیں سے رومیوں کا زوال شروع ہوا۔

دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں رومی بادشاہ ہیڈریان نے ادرنہ کی بنیاد رکھی۔ اہل روم کی دو عظیم جنگوں کے بعد ادرنہ پر کئی یورپی قومیں حملہ آور ہوئیں۔ ۱۳۶۲ء میں اسے سلطان مراد نے فتح کیا۔ اس وقت سے یہ شہر زیادہ تر ترکوں کی عملداری میں رہا ہے۔ ۱۳۶۵ء سے ۱۴۵۳ء تک یہ سلطان ترکی کی جائے رہائش رہا ہے۔ ۱۸۲۹ء سے ۱۸۷۸ء تک روسی فوجیں ادرنہ پر قابض رہیں۔ جنگ بلقان میں یہ بلغاریہ کے تسلط میں چلا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں ۱۵۵ دن کے محاصرے کے بعد ترکی نے اسے واپس لے لیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ یونان کے تسلط میں چلا گیا لیکن صرف سوا دو سال بعد ایک بار پھر ترکی کو مل گیا۔ تب سے یہ ترکی کے قبضے میں ہے۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں اس کی آبادی ایک لاکھ تک جا پہنچی تھی لیکن آج کل نصف لاکھ سے بھی کچھ کم ہے۔ جنگ وجدل کا مرکز رہنے کے باعث اس کی آبادی ہر دور میں کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہی ہے۔

ادرنہ صوبہ اس کی پیداوار گندم اور پھلوں کی منڈی ہے یہ مکھن کی پیداوار کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ استنبول کو دودھ، مکھن اور گوشت ادرنہ فراہم کرتا ہے۔ یہاں صابن سازی، زردار رنگنے، قالین بافی، سوتی اور اونی کپڑا بنانے کے کئی کارخانے ہیں۔ کبھی یہ خام ریشم کی بہت بڑی منڈی تھی۔

ادریسؑ اللہ تعالے کے ایک پیغمبر۔ قرآن مجید میں ان کی بابت یوں ذکر آیا ہے۔ "اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ بڑے سچے نبی تھے۔" (مریم ۱۹)

بائیبل میں ان کے بارے میں یوں ذکر آتا ہے۔

"وہ خدا کے ساتھ چلتے تھے۔ اور نابود ہو گئے۔ کیونکہ خدا نے انہیں لے لیا۔" (پیدائش ۵: ۲۴)

بائیبل میں انھیں حنوک یا اخنوخ کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس کے بیان بموجب ادریس اور حنوک یا اخنوخ کا ایک ہونا ثابت ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ حضرت نوحؑ سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہوئے اور یہ حضرت آدمؑ کے بعد پہلے نبی ہیں۔ بائیبل میں پولس لکھتا ہے۔ "ایمان ہی سے حنوک اٹھا لیا گیا تاکہ موت کو نہ دیکھے" (عبرانیوں ۱۱: ۵) اسی وجہ سے ہمارے مفسرین نے بھی لکھ ڈالا کہ حضرت ادریسؑ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ یہ محض اسرائیلی افسانے ہیں، جو مسلمانوں نے نقل کر دیے۔

طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس بن مالک کے بقول معراج کی شب چوتھے آسمان پر حضرت رسول اکرمؐ کی ملاقات حضرت ادریسؑ سے ہوئی۔ حضرت ابوذرؓ نے بھی حضرت ادریسؑ کی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ مگر حضرت ادریسؑ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کی بابت کہیں کچھ نہیں آتا۔

حضرت ادریسؑ کہاں پیدا ہوئے؟ کب پیدا ہوئے اور کس قوم میں مبعوث ہوئے؟ اس کی بابت پورے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسرائیلی افسانے اس قدر کمزور اور بودے ہیں کہ تحقیق کی عمارت ان پر کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ادریسؑ اللہ کے ایک برگزیدہ اور صالح نبی تھے اور حضرت نوحؑ کے زمانے کے قریب کہیں مبعوث ہوئے۔

ادریس اول (وفات یکم ربیع الثانی ۱۷۷ھ/۱۶ جولائی ۷۹۳ء) ادریس بن عبداللہ بن عبداللہ بن الحسن، المغرب میں علوی ادریسیہ خاندان کا بانی، عباسیوں سے بچ کر مغرب کی طرف آیا اور بربر سردار اسحاق بن محمد کی تحریک پر ۴ رمضان ۱۷۲ھ/۵ فروری ۷۸۹ء کو اوربہ قبیلہ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بعد ازاں مراکش کے دیگر قبائل بھی اس کے مرید ہوتے چلے گئے۔ ادریس نے امام کا لقب اختیار کر کے یہودیوں نصرانیوں وغیرہ پر حملے شروع کر دیے۔ ۱۷۴ھ/۷۹۰ء میں مشرق میں تلمسان پر قبضہ کر لیا۔ اور باقاعدہ حکومت کا آغاز کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک شخص سلیمان نے اسے زہر دیا۔

ادریس ثانی (یکم جمادی الآخر ۱۷۷ھ/۱۳ ستمبر ۷۹۳ء - ربیع الاول ۲۱۳ھ/جون ۸۲۸ء) ادریس اول کا بیٹا اور جانشین، ایک کنیز کنزہ کے بطن سے تھا، باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا۔ گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے عربوں پر شفقت اور مہربانیاں کر کے بربروں کو اپنا مخالف کر لیا۔ جب وہ پندرہ برس کا ہوا تو اس نے اپنے باپ کے معتمد اسحاق بن محمد کو قتل کرا دیا۔ اس وقت تیونس کے حکمران ابراہیم بن اغلب اور ادریسیہ کی چپقلش جاری تھی۔ ادریس نے اس کی سلطنت میں بغاوتیں اور شورشیں شروع کرا دیں اور خود بھی بربروں پر چڑھ دوڑا تاہم ۳۶ برس کی عمر ہی میں فوت ہو گیا۔ اس کی شہرت فاس شہر کے بانی ہونے کی حیثیت سے ہے۔ مراکش کے فقیر آج بھی اس کے نام سے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

اذان اعلان کرنا، خبردار کرنا، وہ کلمات کہنا جو نماز کی دعوت کے لئے کہے جاتے ہیں اس کے سات کلمات ہیں، جن میں سے پہلا کلمہ چار بار دہرایا جاتا ہے۔ باقی کلمات دو دو بار اور آخری کلمہ صرف ایک بار کہا جاتا ہے۔ کلمات یہ ہیں۔

(۱) اللہ اکبر (۲) اشہد ان لا الٰہ الا اللہ (۳) اشہد ان محمداً رسول اللہ (۴) حی علی الصلوٰۃ (۵) حی علی الفلاح (۶) اللہ اکبر (۷) لا الٰہ الا اللہ۔

صبح کی اذان کے وقت "حی علی الفلاح" کے بعد ایک اور کلمے "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا اضافہ کر لیا جاتا ہے۔ اسے بھی دو بار کہا جاتا ہے۔ یہ مسلک حنبلی اور حنفی کے مطابق ہے۔ شافعی اور مالکی فرقے میں دوسرا اور تیسرا کلمہ چار چار بار دہرایا جاتا ہے شیعوں کے نزدیک ان کلمات میں ایک اور کلمہ "حی علی خیر العمل" کا اضافہ کر لیا جاتا ہے۔ شیعوں کا ایک فرقہ مفوضہ اذان میں تیسرے کلمے کے بعد "اشہد ان امیر المومنین علیاً ولی اللہ وصی رسول اللہ وخلیفہ بلا فصل" شامل کر لیتے ہیں۔ لیکن راسخ العقیدہ اہل تشیع اس کے قائل نہیں۔

اذان سنت مؤکدہ ہے۔ لیکن حنبلیوں کے نزدیک یہ فرض کفایہ ہے۔ اس کا جواب دینا مستحب ہے۔ یعنی جب اذان سنیں تو زیر لب وہی کلمات دہرائیں۔ البتہ نماز، خطبہ سننے، حیض ونفاس، جماع، بیت الخلاء، ناپاکی اور علم دین پڑھانے کی حالت میں اذان کا جواب دینا فرض نہیں۔ چوتھے اور پانچویں کلمے کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا جاتا ہے اور فجر کی اذان کے اضافی کلمے کے جواب میں "صدقت وبررت" کہنا چاہیے۔

اذان دینا صرف مرد پر فرض ہے۔ عورت اذان نہیں دے سکتی۔ اگرچہ اذان کے لئے کوئی خاص لے مقرر نہیں تاہم مؤذن کا خوش الحان ہونا ضروری ہے۔ موذن کو پچپن نمازوں کے برابر ثواب ملتا ہے اور دو نمازوں کے درمیان گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص متواتر بارہ برس تک اذان دے گا، اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے جو شخص اذان کا مکمل جواب دیتا ہے، اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور بقول حضرت ابوہریرہؓ وہ جنت میں جائے گا۔

اذان کے بعد اور نماز سے پہلے بھی یہی کلمات دہرائے جاتے ہیں۔ انھیں اقامت صلوٰۃ کی اذان کہا جاتا ہے۔ (دیکھیے "اقامت") اذان سننے کے بعد البتہ دعا ضروری ہے۔ اس کے کلمات حسب ذیل ہیں۔

اللھم رب ہذہ الدعوۃ التامہ والصلوٰۃ القائمۃ ات محمد الوسیلہ والفضیلہ والبعثہ مقاماً محمود الذی وعدتہ وارزقنا شفاعتہ یوم القیامۃ انک لاتخلف المیعاد ۔

(اے اللہ تو اس پوری اذان اور اس نماز کا جو پڑھی جانے والی ہے پروردگار ہے۔ حضرت محمد صلعم کو وسیلہ اور بزرگی اور بلند درجہ عطا فرما اور ان کو مقام محمود میں کھڑا کر، جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن ان کی شفاعت نصیب فرما۔ بے شک تیرا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا۔"

اذان کے کلمات کیوں کر وضع ہوئے؟ اس کے بارے میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نماز کے لیے اطلاع دینے کا سوال سامنے آیا کہ سب کو بوقت نماز کیسے اکٹھا کیا جائے تو صحابہؓ نے ناقوس اور آگ جلانے کی رائے دی کہ نصاریٰ اسی طرح لوگوں میں اعلان کرتے۔ چنانچہ بلال کو حکم دیا گیا کہ کلمات دو دو بار کہیں۔

حضرت عبداللہ اور حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ انہیں اذان اور اقامت سکھا رہا ہے۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ آپؐ کو بھی وحی کے ذریعے یہی طریق بتایا گیا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت بلال کو بلا کر اذان دینے کا حکم دیا۔

امام مالک کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس موذن صبح نماز کے لیے اٹھانے آیا۔ اور بولا "الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے۔) اس پر حضرت عمرؓ نے اس سے کہا "یہ الفاظ بھی اذان میں شامل کر دو۔"

اذن اجازت لینا، قریب جانے یا گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینا۔ قرآن حکیم کا فرمان ہے :-

"اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوائے (دوسروں) کے گھروں میں داخل نہ ہو، جہاں تک کہ اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کر لو۔ پھر اگر ان میں سے کسی کو نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہو، جب تک کہ تمہیں اجازت نہ دی جائے اور اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ۔ وہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔" (النور ۲۷، ۲۸)

اے ایمان والو! تمہارے غلام جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں اور وہ جو تم میں سے سن بلوغ کو نہیں پہنچے، چاہیے کہ تین دفعہ تم سے (اندر آنے کی) اجازت لے لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور نماز عشاء کے بعد کہ یہ تین اوقات تمہارے پردے کے ہیں۔ ان کے بعد نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے۔" (النور ۵۸)

گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینے کا مقصد صرف یہی ہے کہ خلوت کا تقدس اور احترام برقرار رہے۔ حضرت کلاہ بن حنبل سے روایت ہے کہ صفوان بن امیہ نے ایک بار مجھے ایک ہرن کا بچہ، دودھ اور ایک ککڑی دے کر آنحضرت صلعم کے پاس بھیجا۔ اس وقت حضور صلعم وادی کے اوپر کے حصہ میں تشریف رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں حاضر ہوا مگر میں نے نہ کوئی سلام کیا اور نہ اندر آنے کی اجازت مانگی۔ تو آپؐ نے فرمایا "واپس جاؤ! اور کہو۔ السلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتا ہوں" (ترمذی، ابوداؤد)

حضرت عطاء بن سیار سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے پوچھا۔ میں اپنی ماں کے پاس بھی جانے کے لیے اجازت لیا کروں؟ ۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! عرض کیا! میں تو ان کے ساتھ ہی گھر میں رہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "پھر بھی اجازت لے لیا کرو۔" اس نے عرض کیا "میں ان کا خدمت گذار ہوں۔" تو فرمایا "پھر بھی اجازت لے لیا کرو۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنی ماں کو ننگا دیکھو!" عرض کیا "ہرگز نہیں۔ فرمایا "لہٰذا اندر جانے کی اجازت لے لیا کرو۔" (مالک)

اذن حکم کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں یہ انھی مقامات میں آیا ہے جہاں اس سے اللہ کا حکم (اذن اللہ) مراد لیا گیا ہے۔

ارتداد اپنے مذہب سے پھر جانا، خصوصاً دین اسلام سے منکر ہو جانا، مسلمان ہو کر کسی اور مذہب کی طرف چلے جانا۔ ارتداد کے لفظی معنی اس طریق پر لوٹ جانا ہیں، جس سے ایک شخص آیا تھا۔ اس لیے یہ لفظ اسلام سے کفر کی طرف اور کفر سے اسلام کی طرف لوٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا "جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔" گویا مرتد یعنی پھر جانے والے کی سزا قتل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے عورتوں کو البتہ اس سزا سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اکثر فقہا کے نزدیک مرتد کا نکاح باطل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی بیوی آزاد ہو جاتی ہے۔ مگر عورتوں کے مرتد ہونے سے ان کا نکاح ٹوٹنے کے بارے میں کوئی واضح فتوے موجود نہیں۔

حضرت رسول اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی دنوں میں شاید ہی کوئی مسلمان مرتد ہوا ہو گا آپؐ کی زندگی کے آخری ایام میں اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور طلیحہ نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے اور ان کی قومیں یعنی بنو مدلج، بنو حنیفہ اور بنو اسدان کی وجہ سے مرتد ہو گئیں لیکن یہ فتنہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ابھرا اور انھوں نے ان کی سرکوبی کی۔ ان کے علاوہ فزارہ، غطفان، بنو سلیم، بنو یربوع، سجاح کی قوم، کندہ، بنو بکر بن وائل جیسے قبائل نے بھی حضرت رسول اکرمؐ کے فوراً بعد ارتداد کا اظہار کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بدولت یہ لوگ پھر سے اسلام میں داخل ہوئے۔

ارتقا جاری رہنا، آگے کی طرف بڑھنا۔ فلسفیوں اور حکیموں کے نزدیک یہ ساری کائنات ایک مسلسل ارتقا کا نتیجہ ہے جس نے کسی زمانے میں عدم سے وجود لیا اور پھر یہ وجود مختلف شکلیں تبدیل کرتا ہوا ... اس کی آخری کڑی انسان ہے۔

مسلمان فلسفیوں میں سب سے پہلا حکیم جاحظ تھا۔ جس نے سب سے پہلے فلسفہ ارتقا اور ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا، جو نقل مکانی سے جانوروں میں ... ہو جاتی ہیں۔ اور جسے آگے چل کر المسعودی، بیرونی، ابن مسکویہ اور ابن خلدون نے ... شکل میں پیش کیا ہے۔ یہاں ہم ابن مسکویہ کے نظریہ ارتقا کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

ابن مسکویہ کہتا ہے۔ نباتات کی زندگی پر نظر ڈالیے تو ارتقا کے ... میں نہ تو ان کی پیدائش اور نمو کے لیے بیج کی ضرورت ہوتی ہے ... کے لیے انھیں اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر ... اور معدنیات میں یونہی فرق کریں گے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں نباتات ... حرکت کی طاقت مل جاتی ہے اور پھر اعلیٰ انواع کی صورت میں برابر ... رہتی ہے تا آنکہ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ پودے شاخیں نکالتے اور بیجوں کے ذریعے ... نوع کا تسلسل قائم رکھتے ہیں۔ لیکن پھر حرکت کی اس قوت میں رفتہ رفتہ ... رہتا ہے۔ حتیٰ کہ درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے تنے ہوتے ہیں اور وہ برگ و بار لاتے ہیں، اب اس سے جب آگے بڑھے تو نباتات کے ارتقا کا آئندہ مرحلہ وہ ہے جس میں ایسی انواع کا ظہور ہوگا، جن کے لیے زیادہ بہتر زمین اور ... کی ضرورت ہوگی۔ انگور اور کھجور ارتقائے نباتی کی آخری منزل ہیں، جس کے ڈانڈے گویا حیوانی زندگی

سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ کھجور کے اندر تو جنسی اختلاف بھی واضح طور پر نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ کھجور میں جڑوں اور ریشوں کے علاوہ وہ شے بھی نشو و نما پاتی ہے، جس کا وظیفہ کچھ ویسا ہی ہوتا ہے، جیسے دماغ کا اور جس پر گویا اس کی سلامتی اور حفظ و بقا کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ نباتات کی زندگی میں ارتقاء کا آخری درجہ ہے یا یوں کہیئے کہ حیوانی زندگی کی تمہید ہے۔ حیوانی زندگی کا پہلا قدم زمینی پیوستگی سے آزادی ہے، جسے گویا شعوری حرکت کی ابتداء سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ [illegible] حیوانی زندگی کا آغاز کیجیئے، جس میں اول حس لامسہ اور باقی حواس [illegible] کا نشو و نما ہوتا ہے۔ مگر پھر جب حواس نشو و نما حاصل کر لیتے ہیں، تو حیوانات نقل و حرکت میں آزاد ہو جاتے ہیں، مثلاً حشرات الارض، رینگنے والے جانور، چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں۔ چوپایوں میں گھوڑا حیوانیت کا مظہر اتم ہے اور پرندوں میں عقاب [illegible] جب بندروں کا ظہور ہوتا ہے تو حیوانیت گویا انسانیت کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ [illegible] ارتقاء انسان سے صرف ایک [illegible] پیچھے ہے۔ [illegible] ارتقاء کے [illegible] میں کچھ ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، جن کے پہلو بہ پہلو [illegible] کی قوت تمیز [illegible] انسانیت میں بھی [illegible] رہتا ہے، تا آنکہ وحشت کی [illegible] اور انسان تہذیب [illegible] کی دنیا میں قدم رکھ دیتا ہے۔

[illegible] نے پیش کی ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ انسان پہلے جمادات [illegible] پھر نباتات یعنی خورد حیاتیات جو [illegible] اور پودے وغیرہ [illegible] کے بعد حیوانات کے [illegible] آیا اور بالآخر [illegible] سے ترقی کر کے انسان [illegible] وہ قوت عقل [illegible] تھی جس نے آدمی کو انسان بنے [illegible] ارض کا [illegible] اس تشکیل میں تجربے اور عقلی [illegible]

[illegible] قرار دیتا ہے [illegible] جاتے ہیں جن کی [illegible] رہا ہے اسے یوں دیکھئے [illegible] کی [illegible] ارتقائی [illegible] سے اور [illegible] نباتات کے بعد [illegible] حقیقی اور [illegible] جیسے [illegible] جیسے [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] ان میں سے کوئی ایک کڑی تکوین و تدریج [illegible] نہیں [illegible] انسان اور اس [illegible] کے ابتدائی [illegible] کے بعد وہ انسان معرض وجود میں آتا ہے جس میں [illegible] مشاہدہ کا آخری نقطہ ہے۔

[illegible] ارتقاء کا قانون چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ یہیں رک کے بلکہ [illegible] ایک ذات اور [illegible] جس میں ادراک صرف اور تعقل [illegible] عالم ملائکہ ہے۔ اس کا ایک افق تو انسان سے ملا ہوا ہے اور دوسرا افق جدا اور بلند ہے (دوسرا افق مقام الوہیت سے ملا ہوا ہے۔) اب ہوتا یہ ہے کہ کبھی کبھی نفس انسانی ایک ہی جست میں بشریت سے جدا ہو کر اس نوری طبقے میں پہنچ جاتا ہے جسے ملائکہ کا طبقہ کہا گیا ہے۔ یہ مقام نبوت کا ہے۔ گویا نبی انسانی ادراک کے ارتقاء کی اگلی منزل ہے، جو بیک وقت انسان بھی ہوتا ہے اور طبقہ ملائکہ میں بھی اس کا گذر ہوتا ہے۔ ابن خلدون نبوت کے اس دائرے میں اولیاء اور صوفیاء کو بھی شامل کرتا ہے۔

اب ہم جدید دور کے فلسفہ ڈارون کو دیکھتے ہیں۔ ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں اپنا فلسفہ ارتقاء پیش کیا کہ کائنات کی ہر شے متحرک ہے کوئی شے ترقی کی طرف گامزن ہے

تو کوئی تنزل کی طرف۔ نا اہل اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ آئندہ نسل صرف اہل ہی بڑھا سکتے ہیں۔ تمام ذی روح اشیاء آج جس شکل میں نظر آتی ہیں۔ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھیں۔ اہل نسل کو بھی زمانے کے حالات کے تحت اپنے آپ کو بدلنا ہوتا ہے کمزور اور نااہل اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اگلی نسلیں مختلف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ادنیٰ جانور اعلیٰ جانوروں میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ مگر یہ تبدیلی رفتہ رفتہ ہوتی ہے۔ آدمی نے بھی اسی اصول کے تحت ترقی کی ہے اور کیڑے مکوڑے کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کر کے مختلف جانوروں کا روپ دھارتا، آج کا انسان بنا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کے نزدیک اس بات کا بین ثبوت کیا ہے کہ ساری مخلوقات ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں نا کہ دست قدرت نے انہیں آن واحد میں پیدا کر دیا۔ اس کا جواب علم تاریخ سے تو قطعاً نہیں مل سکتا کیونکہ ہمارا موجودہ علم تاریخ ہمیں پانچ چھ ہزار برس سے زیادہ پیچھے نہیں لے جاتا۔ تاریخ کا انحصار تحریروں، اور کتبوں پر ہوتا ہے اور پہلی انسانی تحریر صرف سات ہزار برس قبل وجود میں آئی تھی جبکہ انسانی بستیاں اس سے بہت پہلے کی ہیں۔ علم آثار قدیمہ کا تعلق بھی زیادہ تر ان قدیم انسانی بستیوں سے ہے۔ لے دے کے علم الارض ہی رہ جاتا ہے، جس کی وساطت سے ہم لاکھوں کروڑوں برس پرانی تاریخ ارض کا پتا چلا سکتے ہیں۔

ماہرین ارضیات کے نزدیک آج سے لاکھوں کروڑوں برس قبل، اس کرۂ ارض پر کئی تغیر و تبدل ہوئے، جن کی وجہ سے سطح زمین پر کی بعض اشیاء زیر زمین چلی گئیں۔ ان میں پتھر، جنگل اور مردہ جانور بھی تھے۔ سال ہا سال گذر جانے کے بعد یہ سب کچھ پتھر بن گیا۔ ان پتھروں کو متحجرات کہا جاتا ہے۔ ان طوفانوں سے سطح ارض پر مختلف تہیں بنتی چلی گئیں۔ اب ہمیں بآسانی علم ہو سکتا ہے کہ کون سے متحجرات کس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ علم الارض کی رو سے ان طوفانوں کے ادوار کی تاریخ صحیح صحیح طور پر معلوم ہے۔ اب یہ متحجرات جس دور کی پرت سے نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ ماہرین ارضیات ان متحجرات میں پائی جانے والی فلورین کی مقدار اور ان کی تابکاری سے ان کی عمر کا اندازہ لگاتے ہیں ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے نظریہ ارتقاء کے حامی مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔ اول یہ کہ موجودہ تمام مخلوق شجر حیات کی کوئی نہ کوئی شاخ قرار پائی چاہیئے قدیم ادوار کا ہر جانور جدید دور کے جانوروں کا جد قرار پائے گا یا اس کی نسبت کہا جائے گا کہ وہ لاولد مر گیا۔ نسل کا سلسلہ اگر ایک دفعہ منقطع ہو جانے کے بعد نئے سرے سے چلے تو وہ ارتقاء نہیں بلکہ تخلیق خاص ہو گی۔ ارتقاء کی رو سے کوئی پیش رو حیوان اپنے بعد میں آنے والے نمونے سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سب دودھ پلانے والے جانور اپنے پیش رو رینگنے والے جانوروں کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اس زمانے کے اندر جس میں بطن زمین میں پتھر کا کوئلہ بن رہا تھا، اور روئے زمین پر کہیں رینگنے والے سانپ، اژدہا کا نام و نشان بھی نہ تھا ہمیں پتھر کے کوئلے کی کان میں گھوڑے یا شیر کی کھوپڑی مل جائے تو نظریہ ارتقاء کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے گا۔ اس طرح اگر ہم پتھر کے کوئلے کی کسی تہ میں انسانی دانت پڑا ہوا پائیں تو یقین کر لیں گے کہ ساری مخلوق آن واحد میں تیار ہوئی تھی۔ اسی طرح اگر کسی قدیم دور کی پرت میں کسی جدید دور کے جانور کا متحجر شدہ ڈھانچہ مل جائے تو ہم باور کر لیں گے کہ نظریہ ارتقاء قطعاً باطل ہے۔ لیکن تاریخ ارض کے اس تسلسل میں بھی ہمیں ارتقاء ہی نظر آتا ہے۔ ہر دور کی طوفانی پرت

میں صرف اسی دور کے جانوروں کی ہڈیاں ملتی ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قدیم مخلوق کے جو متحجرات دریافت ہوئے ہیں ان میں بھی ایک تسلسل اور نظم ہونا ضروری ہے کہ فلاں قسم کی مخلوق سے قبل فلاں طرح کی مخلوق کا وجود لازم ہے۔ ڈارون کے سامنے اس قسم کے ثبوت موجود نہ تھے۔ اس لیے اس کا نظریہ ایک طرح سے ناقص رہا۔ نتیجہ عیسائی چرچ نے ڈارونیت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ ان لوگوں کی دلیل تھی کہ ایک پرت کی مخلوق اور دوسری پرت کی مخلوق کی درمیانی مخلوق کہاں ہے؟ وہ مدارج کہاں ہیں جنھوں نے ایک دور کی مخلوق کو اپنی شکل بدلنے پر مجبور کیا۔ مگر اب ماہرین ایسے آثار تلاش کر چکے ہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر تمام حیوانات آنِ واحد میں پیدا ہوئے تو یقیناً قدرت کا فیض ان کے ماحول کے مطابق ہوا ہوگا۔ یعنی ان حالات کی رُو سے جن میں کوئی خاص مخلوق رہتی ہے، اگر کسی حیوان کو کوئی خاص عضو درکار ہے تو عقل کہتی ہے کہ اسے ضرور ملنا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بلی کے پر نہیں ہیں، حالانکہ وہ پرندوں کا شکار کرتی ہے۔ یہی حالت اس کے ارتقائی بھائی شیر کی ہے، مگر وہ پرندوں کا شکار نہیں کرتا، گویا ارتقا یقیناً واقع ہوا ہے اور بعض جانوروں کو کچھ اعضا اپنے بڑوں سے ورثے میں ملے ہیں، خواہ ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو اور بعض اعضا نئے ماحول کے تقاضوں کے مطابق ملے اور یوں ایک نئی طرح کی مخلوق پیدا ہو گئی۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اگر ارتقاء حیات واقع ہوا ہے تو روئے زمین پر نباتات اور حیوانات کی تقسیم کسی خاص ترتیب سے عمل میں آئی ہے۔ اگر کوئی خطہ ایسا ہے جہاں کوئی حیوان بخوبی رہ سکتا ہے اور وہ وہاں موجود نہیں بلکہ کسی اور مقام پر پایا جاتا ہے تو نظریۂ ارتقاء کی رُو سے جو حیوان کسی خاص خطے میں تدریجاً پیدا ہوا، وہ دوسرے علاقے میں کسی مجبوری کے تحت نہ پہنچ سکا۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ کیا حضرت انسان عام ارتقائی عمل کے تابع ہیں یا وہ اس نظریے سے الگ تھلگ کوئی خاص مخلوق ہیں۔ یہ مسئلہ خاصا متنازعہ فیہ رہا ہے۔ جس کا جواب وقتاً فوقتاً مختلف اہل علم نے دیا ہے۔

اکثر لوگ جنھیں مسئلہ ارتقاء کا بخوبی علم نہیں، کسی فکر میں غلطاں ہوئے بغیر یہ کہہ دیتے ہیں کہ "خدا نے لفظ کُن کہا اور ایک تھوڑی دیر کے لیے یہ کائنات تیار ہو گئی۔" اب اسی لفظ کُن کو لیجیے اور ایک تھوڑی دیر کے لیے فرض کیجیے، حیاتیات کی رُو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پوری کائنات چند شمسی دنوں میں نہیں بنی بلکہ اس بزم ہستی نے بننے اور سنورنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس صرف کیے ہیں تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کبریٰ نے اس کی پرورش و تخلیق سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس سے جو بات واضح ہوتی ہے۔ یہی ہے کہ وہ "کُن" اور حرف آفرینش جو اللہ تعالیٰ کے حکم و امر سے تعبیر ہے اگرچہ اس طرح کے دس ہزار عالم رنگ و بو آن کی آن میں پیدا کر سکتا ہے۔ تاہم اس کی حکمت و تدبیر کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں تدریج و ارتقاء کی سنت کارفرما ہو۔ یعنی یہ دنیا بجائے اس کے کہ ایک لمحے اور ثانیے میں معرضِ ظہور میں آ جائے سات تکوینی دنوں یا مرحلوں میں سطح وجود پر جلوہ طراز ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ ارتقاء نے اللہ تعالیٰ کے وجود کی نہ صرف نفی نہیں کی بلکہ قدرت کے پہلو بہ پہلو اس کی عظمت و دانائی کے پہلو کو اور اجاگر کیا ہے۔ غور فرمایئے جو ذات مستودہ صفات، ارتقاء کی ایک ایک کڑی کو پیدا کرتی ہے۔ ایک ایک مرحلے کے تقاضوں کی پرورش کرتی ہے اور زمان و عصر کے ہزاروں اور لاکھوں

ناصلوں سے گزرنے کے بعد اس عالم کو خاص اور متعین رنگ عطا کرتی ہے بھلا وہ اس لائق ہے کہ اس کو بھلا دیا جائے؟ یہ سمجھ لیا جائے کہ نظریہ ارتقاء کے انکشاف سے کائنات سے متعلق دین کا قائم کردہ تصور غلط ثابت ہوتا ہے۔

مسئلہ ارتقاء کو مان لینا کسی بھی صورت میں قرآن مجید کی کسی تصریح کے خلاف نہیں جیسا کہ اکثر حضرات کا خیال ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: "اور اس [illegible] تمھیں مختلف حالات میں سے گزار کر پیدا کیا" [illegible] البتہ ممکن ہے کہ نظریہ [illegible] جو مختلف [illegible] سے پیش کیا ہے، خود ہمارے [illegible] بیان کیا ہے۔ کیونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک ساری کائنات، ایک [illegible] حیوان اور انسان بس لمحہ بھر ہی میں تخلیق ہو گئے تھے۔ اگرچہ اللہ [illegible] کو تخلیق [illegible] یہی کہنا کافی ہے کہ "کن" ہو جا اور وہ "فیکون" یعنی ہو جاتی ہے۔ مگر بقول [illegible] کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے قول (WORD OF GOD) اور اللہ کے فعل (WORK OF GOD) میں کوئی فرق ہو؟ علامہ اقبال کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے حسم زدن میں تخلیق سے فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا تھا بلکہ تخلیق مسلسل میں مصروف [illegible] اور اس کا یہ عمل جو ب [illegible] کی تلاش میں ہے، اسی کا نام ارتقاء ہے۔ [illegible] کہ [illegible] ارتقاء کے مغربی مفکرین [illegible] کا وجود مشکل ہی سے مانتے ہیں مگر ان کی [illegible] ہے نظریۂ ارتقاء [illegible] کائنات میں ارتقاء کا عمل یقیناً جاری ہے مگر [illegible] ایک عامل [illegible] یقیناً موجود ہے، جس کے ہاتھ میں ارتقاء کا پورا عمل ہے [illegible] جب اللہ چاہتا ہے، جب مخلوقات کے [illegible] عالم [illegible] ہے۔ یقیناً یہی طریقہ تخلیق آدم کا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ [illegible] کے اژدہام میں اسے اچانک لا کھڑا کیا۔ کو یا ہر قسم کی مخلوق [illegible] یوں زمانہ متحرک رہا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ اللہ نے ساری مخلوقات ایک [illegible] اگرچہ وہ اس فعل پر بھی قادر ہے، مگر ایسا کرتے وہ خود [illegible] کی نفی کر دے گا، جو اسے یقیناً پسند نہیں۔

زمین کی کیا عمر ہے؟ ستارے کب اور کیونکر [illegible] ہوئے ہیں؟ زندگی نے پہلا قدم کیونکر اٹھایا ہے؟ اور تدریج و ارتقاء کی [illegible] کو طے کیا ہے؟ یہ سارے مسئلے ایسے ہیں کہ براہ راست ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ براہ راست ان کا تعلق علم الارض سے ہے، علم [illegible] نجوم سے ہے اور حیاتیات سے ہے۔ اس لیے اس علم کی چھان بین اور تحقیق کے نتیجے میں اگر کچھ نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو انھیں ان ہی علوم کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں کے اہل علم شاید اس بنیادی نکتہ سے آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول سمیتھ نظریہ ارتقاء کے انکشاف سے جہاں مغرب [illegible] اور دانشوروں میں شدید نوعیت کی جھڑپیں ہوئیں اور مخالفت و عناد کے [illegible] اٹھے وہاں مسلمانوں میں اس کا ردعمل بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک اور بڑی وجہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں یہ [illegible] نوعیت کا نہیں تھا اس سے پہلے ابن خلدون خالص حیاتیات کی اصطلاحوں میں [illegible] بیان کر چکے تھے کہ کائنات میں ہر سافل سطح عالی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ابن مسکویہ بھی اپنی تصانیف میں اس کی نشان دہی کر چکے تھے اور رومی نے تو اس مضمون پر پوری غزل کہہ ڈالی تھی جس کی وجہ سے ناممکن تھا کہ اسلامی شعور [illegible] اس مسئلہ کے بارے میں ناآشنا ہے اور جب ڈارون "اصل انواع" [illegible] کرے تو عالم اسلام میں اچنبھے کی ایک لہر دوڑ جائے۔

عیسائیت نے مسئلہ ارتقاء کے بارے میں تین موقف اختیار کیے۔ ان کے

پہلے ردِ عمل نے استہزا کا روپ دھارا، طعن و تشنیع کی صورت اختیار کی اور تکفیر و عقوبت کی سرزنشوں کی شکل میں اس کے خلاف دینی حلقوں میں نفرت و حقارت کے جذبات کو ابھارا اور جب یہ دیکھا کہ یہ مسئلہ طعن و تشنیع سے حل نہیں ہوتا اور مختلف تجربات و شواہد اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ اس عالم میں ارتقا اور تدریج کے تقاضوں کو تسلیم کیا جائے تو تاویل کی آڑ لی، لیکن تاویل اتنی بھونڈی اور غیر علمی تھی کہ پہلے ہی قدم پر ٹھکرا دی گئی۔ تاویل یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ نے اس عالم کو نظام ترتیب اس ڈھب سے دیا ہے کہ اس سے نظریۂ ارتقا پر استدلال ہو سکے حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح [illegible] کا امتحان لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کون [illegible] سے دھوکہ کھاتا ہے اور کون ایمان کے معاملے میں ثابت قدم رہتا ہے۔ تاویل کے اس انداز نے اور کئی شبہات اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فکر و استدلال کے تقاضوں کو تو ایک خاص ڈھب سے ترتیب دے اور نتائج کو ان سے بالکل علیحدہ اور مختلف انداز سے پیش کرے! [illegible] اور استدلال کی راہیں جدا جدا ہیں؟ اور کیا آزمائش و امتحان کی یہ صورت [illegible] خطرناک نہیں اور کیا اگر کوئی شخص ان دلائل کی روشنی میں سچ مچ ارتقا پر ایمان لے آئے جس کو خود اللہ تعالےٰ نے [illegible] اور نمایاں کیا ہے تو وہ کس قاعدہ اور قانون کی رو سے مجرم گردانا جا سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ عیسائیت کا تیسرا اور آخری ردِ عمل یہ تھا کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کیونکہ اس وقت کا چرچ آفرینش کائنات سے متعلق جن خیالات و افکار کو مانتا چلا آیا ہے ان کو علم و تحقیق کے معیار پر ثابت کرنا مشکل ہے۔

[illegible] کے تجربات و مشاہدات سے جو انکشافات ہوئے ہیں [illegible] حیوان اور انسان [illegible] پیدا ہوا۔ پھر جب [illegible] پانی سے زندگی کی نمود ہوئی اور بلاشبہ [illegible] تحقیق [illegible] اس [illegible] کی حیثیت رکھتی ہے جیسا [illegible] زندگی [illegible] ہے کی۔ پھر سب پانی نے [illegible] اور زمین کا وسیع خلا پانی سے پُر ہو گیا اور سمندر بن گیا۔ تب مختلف [illegible] پہلے نباتات ظہور میں آئے۔ پھر حیوانات!

[illegible] علاوہ ازیں [illegible] کی روشنی میں اب علما نے تحقیق اس نتیجے پر پہنچ چکے [illegible] تمام نباتات اور حیوانات خلیوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان خلیوں میں بعض واحد الخلیہ [illegible] یہ خلیے سمندر کے اس ایک تہ [illegible] مادے سے پیدا ہوئے [illegible] جو سمندر کے ساحل پر ملتا ہے [illegible] کی یہ ہے کہ ایک صبح اللہ تعالےٰ کی قدرت سے کیچڑ اور پانی کے ماحول میں ایک ذرے نے کروٹ لی اور وہ ہرا ہو گیا جس سے نباتی زندگی نمودار ہوئی اور اس [illegible] سے آگے نسل بڑھانے کا سلسلہ چل نکلا یعنی [illegible] ایک سے دو، پھر دو سے چار ہونے اور چار سے آٹھ ہوتے گئے اور یوں نسل بڑھتی گئی حتیٰ کہ [illegible] زندگی بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی زمین پر طرح طرح کے میوے، پھل اور بڑے بڑے درختوں کی شکل تک جا پہنچی اور ان سے زمین کی فضا خوشبودار ہو گئی۔ پھر ایک صبح ایسا ہوا کہ نباتی ذرے نے اپنا ہرا لباس اتار پھینکا اور آگے چل پڑا۔ اس سے آگے ایسا پیدا ہوا جس سے حیوانی زندگی نمودار ہوئی۔ پھر [illegible] آگے بڑھنے لگی جس پر نباتاتی زندگی نے اپنے ارتقا کے مرحلے طے کئے تھے۔ ایسا ایک چھوٹا سا حیوان ہے جو خوردبین کے بغیر دکھائی نہیں دے سکتا۔ یہ ایک واحد الخلیہ حیوان ہے اور صرف کیچڑ ہی میں ملتا ہے، پھر اس کے بعد اس کے وجود سے لاکھوں کروڑوں خلیوں کے حیوان پیدا ہوتے چلے گئے جن میں زمین پر رینگنے والے کیڑے، پانی میں تیرنے والی مچھلیاں، دریا کے کنارے راگ الاپنے والے مینڈک، ہوا میں اڑنے والے پرندے اور جنگلوں میں چوکڑیاں بھرنے والے چوپائے، غرض حیوان و انسان سبھی شامل ہیں اور انسان کی یہ تحقیق بلاشبہ قرآن حکیم کے اس قول کی صداقت پر شاہد ناطق ہے کہ انا خلقنٰھم من طین لازب۔ ہم نے انہیں لیس دار کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔

جیسا کہ علمی تحقیقات اور برسوں کے تجربات و مشاہدات کے بعد حتمی طور پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ موجودہ انسان جو ہزاروں مراحل اور لاکھوں ارتقائی منازل طے کر کے تمام حیوانات کی پیدائش سے کروڑوں سال بعد اتنے بڑے درجے کو پہنچا ہے کہ اشرف المخلوقات کہلائے اور زمین پر اللہ تعالےٰ کا نائب بنے، بلاشبہ وہ بھی اسی واحد الخلیہ حیوان سے پیدا ہوا ہے، جس سے انسان سے پہلے نباتی اور حیوانی زندگی کی نمود ہوئی۔ حقیقت میں یہ علمی تحقیقات بھی قرآن حکیم ہی کے اس بیان کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا۔ تمہارے رب نے تمہیں نفس واحدہ (یعنی واحدۃ الخلیہ حیوان) سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کی زوجہ (مادہ) نکالی ہے ——

علاوہ ازیں اب علما نے تحقیق آفرینش انسان سے متعلق اللہ تعالےٰ کے مذکورہ بالا قول کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت کا بھی کھلم کھلا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح زندگی سمندر و پانی [illegible] سے ذرہ پا کر مختلف مرحلوں اور منزلوں سے گذرتی ہوئی اپنے اس کمال کو پہنچی کہ جسے آج انسانی ذات کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح کا ایک سلسلہ ارتقا اللہ تعالےٰ کی حکمت سے اس کی قدرت کاملہ کی بدولت ماں کے رحم میں بھی موجود ہے اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں روئے زمین پر زندگی کیونکر ظہور پذیر ہوئی؟ درحقیقت علما کے تحقیق نے یہ دریافت بھی قرآن حکیم کے اس بیان ہی کے ذریعے کی ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے انسان کی آفرینش کا نقشہ حسب ذیل کلمات میں یوں پیش کیا ہے۔

ہم نے ابتدا میں انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا اور اب اس سلسلۂ تولید کو ماں کے رحم کے بار دار کر دیا ہے۔ پہلے ہم نطفے کو جونک (علقہ) کی شکل میں تبدیل کرتے ہیں پھر جونک کو گوشت کا لوتھڑا (گھوٹے) سے ملتا جلتا بناتے ہیں۔ پھر ہڈیاں پیدا کر کے ان پر گوشت پوست چڑھاتے ہیں پھر اس کے بعد انسان (آدمی) کی صورت دے کر ہم اسے ماں کے رحم سے باہر نکال لاتے ہیں۔ وہ بہترین خالق کس قدر تعریف کے لائق ہے ...

(۲۳: ۱۲ تا ۱۴) ——

مطلب یہ کہ علما نے تحقیق آفرینش کے باب میں اپنے وسیع ترین تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں جو بات آج کہہ رہے ہیں کہ نطفہ ماں کے رحم میں ایک خلیہ سا ہوتا ہے، پھر اس کے بعد چند مدارج طے کرتے ہوئے جونک کی، پھر مینڈک کی شکل اختیار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ پھر اس کے بعد اس کے پرندوں کی طرح ایک چونچ سی دکھائی دینے لگتی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ چوپاؤں کی سی صورت اختیار کرتا ہے۔ چوتھے مہینے اس کے سر اور بازو کے ساتھ ایک چھوٹی سی دم ظاہر ہوتی ہے جو پانچویں مہینے میں غائب ہو جاتی ہے، پھر جب چھٹا مہینہ آتا ہے تو "نر" اور "مادہ" کا پتہ چلتا ہے۔ آٹھویں مہینے میں آنکھیں کھلتی ہیں اور سر پر بال نکل آتے ہیں۔ اگر ہم انصاف سے کام لیں تو حقیقت میں یہ تحقیق بھی اللہ تعالےٰ کے انہی مذکورہ بالا واضح اشارات کی مرہونِ منت ہے جنھیں وہ آج سے چودہ سو برس پہلے قرآن حکیم میں بیان فرما چکا ہے۔

اُردن، مشرقِ بعید میں واقع ایک اسلامی مملکت جو اسی نام کے دریا کے کنارے

واقع ہے۔ اس کے شمال میں شام، مشرق میں عراق اور سعودی عرب اور مغرب میں اسرائیل جیسے ممالک واقع ہیں۔ قدیم نام یردن تھا جسے انگریزی میں (JORDEN) بھی کہا جاتا ہے۔ کل رقبہ ۳۷،۷۳۷ مربع میل اور آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ دارالحکومت عمان ہے، جس کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ سرکاری مذہب اسلام اور زبان عربی ہے۔ سکہ کا نام دینار ہے۔

اردن ایک غریب ملک ہے، جہاں آئینی بادشاہت قائم ہے۔ نصف سے زیادہ علاقہ سوکھے اور لاوے کے صحراؤں پر مشتمل ہے۔ مغرب کی سمت زرخیز علاقے پر ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے قبضہ جما لیا تھا۔ یہاں کا اوسط درجہ حرارت ۴۵ف سے ۷۰ف تک ہے اور عام طور پر سارا سال بارش نہیں ہوتی۔ چنانچہ گرمیوں میں درجہ حرارت ۱۲۰ف تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں زراعت صرف دس فیصد علاقے پر ہوتی ہے۔ جہاں عام طور پر سبزیاں اور پھل ہوتے ہیں۔ زیادہ تر برآمدات بھی سبزیوں اور پھلوں وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

اردن کا طرز حکومت موروثی بادشاہت ہے۔ بادشاہ کو بہت زیادہ اختیار حاصل ہیں۔ قومی نمائندوں پر مشتمل ایک ایوانِ زیریں ہے جسے صرف مرد چار سال کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ ایوان بالا کے اراکین کو بادشاہ خود نامزد کرتا ہے۔ اس ملک کو اقوام متحدہ اور عرب لیگ کی رکنیت حاصل ہے۔

عام طور پر اردن کی تاریخ قدیم عبرانیوں سے شروع کی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اس علاقے کو ابتدائے اسلام ہی میں فتح کر لیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے ۱۴ھ/۶۳۵ء میں اس کے تقریباً تمام شہروں کو فتح کیا تھا۔ چند شہر حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص نے فتح کیے تھے۔ اس زمانے سے یہ علاقہ عربوں کے صوبہ اردن کی حیثیت سے مشہور رہا۔ اس میں وادیٔ اردن اور شرق اردن کا مغربی حصہ شامل تھے۔ المامون کے عہد میں اس صوبہ کا سالانہ خراج ایک لاکھ دینار کے قریب تھا۔ سلطان صلاح الدین کے خاندان نے اسے سلطنت کی حیثیت دے دی۔ چنانچہ اس دور کا اردن مرج سے عکہ، صور اور صیدا تک کے شہروں پر مشتمل تھا۔ ۱۵۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک یہ علاقہ عثمانی خلافت کا ایک حصہ رہا اور جنگ عظیم اول کے بعد فرانسیسی مقبوضہ کی حیثیت سے مملکت شام کا حصہ رہا۔ ۱۹۲۳ء میں موجودہ اردن کو برطانوی زیر انتداب نیم آزاد حیثیت ہوئی۔ امیر عبداللہ بن حسین نے برطانوی حاکم کی حیثیت سے علاقے کا نظم و نسق سنبھالا۔ اگلے

بیس برس تک آزادی کی جدوجہد جاری رہی۔

۱۹۴۶ء میں برطانیہ نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے، جس کی رُو سے اردن کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں اردن نے اسرائیل کے خلاف عرب متحدہ محاذ میں شرکت کی اور ۱۹۴۹ء میں امیر عبداللہ نے اس مملکت کا نام "ہاشمی اردن" رکھا۔ ۱۹۵۱ء میں امیر عبداللہ کی علیحدگی کے بعد ان کے بیٹے طلال کو تخت نشین کیا گیا۔ لیکن اس کی نااہلی کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں حسین بن طلال نے نظام حکومت سنبھالا۔ ان کے دور میں دوبارہ اسرائیل کے ساتھ جنگ ہوئی اور ہر بار فلسطین سے آنے والے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد اردن کی معیشت پر نیا بار بن گئی۔

اسرائیل اور اردن کے مابین دریائے اردن ہی سرحد کا کام دیتا ہے۔ ۱۹۶۷ء

اردن کا دارالحکومت عمان

شہر عمان کی مرکزی شارع

کی جنگ سے قبل یروشلم کا شہر اسرائیل اور اردن کے مابین تقسیم کیا گیا تھا۔ مگر ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں یروشلم کا پورا شہر اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

دریائے اردن جو مملکت اردن کے مغرب میں واقع ہے تین دریاؤں، الحسبانی نہرادان اور نہر بانیاس پر مشتمل ہے۔ وادی اردن جس میں سے یہ دریا گذرتا ہے۔ جنوب

یروشلم کا دمشقی دروازہ

کسان اپنے کھیتوں میں

میں یہ سلسلہ نیچی ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ بحیرہ طبریہ جس میں سے دریائے اردن گذرتا ہے سطح بحر روم سے ۶۸۲ فٹ نیچی ہے آگے چل کر یہ دریا بحرِ مُردار میں جا گرتا ہے، جو عام سطح سمندر سے ایک ہزار(۱۲۹۲) دو سو بانوے فٹ نیچا ہے۔

اردو: پاکستان اور ہندوستان کی واحد زبان، جو درۂ خیبر سے چاٹگام اور رنگون سے قلات تک بولی، پڑھی لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس کے مختلف نام رکھے گئے۔ مثلاً ہندی، ہندوی، ہندوستانی، انڈوستانی، ریختہ، گجراتی مورس وغیرہ۔ اردو کے لغوی معنی لشکر کے ہیں۔

اردو کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے محمد عطا حسین خان تحسین نے "نوطرز مرصع" میں استعمال کیا ہے۔ بعد ازاں میرامن نے "باغ و بہار" مولفہ ۱۸۰۱ء میں اسے زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ ایک طرح کی مخلوط زبان ہے۔ جس میں حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ اور واحد جمع تک کے اصول اگرچہ اس کے اپنے ہیں۔ لیکن اس کی تخلیق عربی اور فارسی زبانوں کے مقامی بولیوں (پراکرتوں) کے ساتھ میل جول سے ہوئی۔ عربی زبان کا اثر محمد بن قاسم کے بعد سے سندھ کے راستے گجرات تک پہنچا اور فارسی زبان کا اثر محمود غزنوی کے ذریعے پنجابی پر ہوا۔ جو بعد ازاں اس نئی بولی کو گنگا جمنا کے دوآبے میں لے گئے۔ جب دلی اسلامی حکومتوں کا مستقر بنا تو مقامی باشندوں کے ساتھ میل جول بڑھا۔ عربی، فارسی اور ان کی مخلوط زبان نے مقامی زبان پر اثر ڈالا اور یوں اس اختلاط کے ذریعے ایک نئی زبان وجود میں آگئی، جسے بعد میں اردو کا نام دیا گیا۔

جب علاؤالدین خلجی نے دکن کو فتح کیا اور محمد بن تغلق نے دہلی کو خالی کرا کے دولت آباد (دکن) آباد کیا تو سندھ، پنجاب اور دہلی کے علاقے کی مخلوط زبان (اردو) گجرات اور حیدرآباد میں داخل ہو گئی۔ ہر چند کہ پنجاب اور دوآبہ کے علاقوں میں یہ نئی زبان ترقی پذیر تھی اور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت امیر خسروؒ جیسے بزرگوں نے اس میں نظم کا آغاز بھی کر دیا۔ مگر دکن پہنچ کر اس زبان کو جو ترقی کی فضا نصیب ہوئی۔ اس سے پہلے کہیں نہ تھی۔ شمالی گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں تک اس کی قدر ہوئی۔ چنانچہ اس عہد کی سب سے پہلی کتاب حضرت سید محمد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین" سمجھی جاتی ہے۔ ان کی اور بھی کئی تصانیف اردو زبان میں ہیں۔ اسی زمانے کے ایک صوفی بزرگ میراں جی شمس العشاق ہیں۔ ان کے کئی منظوم رسالے ہیں۔ ان کے فرزند برہان الدین جانم بھی کئی منظوم رسالوں کے مصنف تھے۔ یہ لوگ عادل شاہی دور کے صوفیا تھے۔ اس عہد کا سب سے بڑا شاعر نصرتی ہے۔

اردو ایک ایسی زبان ہے، جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ جنم لیا اور جس کا تحفظ بھی ہمیشہ مسلمانوں ہی نے کیا۔ اگرچہ چند ہندو مصنفین کے نام بھی ہمارے سامنے آتے ہیں، مگر یہ بدیہی حقیقت ہے کہ اردو کی ابتدا صوفیا کرام کے ہاتھوں ہوئی اور اس کی پرورش و نگہداشت، نیز اس کے تحفظ و بقا کی ذمہ داری مسلمانوں کو نبھانا پڑی۔ پاکستان بننے سے اس زبان کے تحفظ کی ایک راہ نکل آئی ورنہ کانگریس کے زیر اثر متعصب ہندوؤں نے اس میں سے فارسی اور عربی الفاظ نکال کر سنسکرت کے الفاظ بھرتی کر لیے اور اسے ہندی کا نام دے دیا۔ تحریک پاکستان میں ہندی اردو کا قضیہ ایک مستقل باب رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک پاکستان اور اردو لازم و ملزوم چیزیں بن گئے تھے۔

اردو کے سلسلے میں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ یہ زبان قرآن مجید کے ترجمے سے لے کر تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام، سیرت، اخلاقیات، عبادات اور تاریخ و تحقیق تک کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ ہمارا قدیم ثقافتی اور مذہبی ورثہ اگرچہ عربی اور فارسی زبانوں ہی میں ہے اور نہ صرف اردو دان کے لیے ان زبانوں کو پڑھنا اور سمجھنا آسان ہو جاتا ہے بلکہ اردو میں موجود بے شمار اسلامی ادب کا مطالعہ بھی جامعیت اختیار کر جاتا ہے۔

ارشاد حسین رام پوری (۱۴ صفر ۱۲۴۸ھ - ۱۵ جمادی الآخر ۱۳۱۱ھ) حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ درس نظامی کی کتابیں رام پور اور لکھنؤ کے علمائے سے پڑھیں۔ مولانا محمد نواب خان مجددی سے علوم اسلامیہ کی تکمیل کی۔ حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ سے بیعت کی اور خلافت سے نوازے گئے۔ اور مرشد طریقت کے حکم سے رامپور میں مستقل قیام فرمایا۔

عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تدریس کی۔ علم فقہ میں شہرت رکھتے تھے۔ زہد و اتقا میں بلند مقام تھا۔ علمائے عصر آپ کے فضائل و کمالات کے معترف تھے۔ مولانا احسان حسین، مولانا مسعود حسین اور مولانا ریحان حسین رامپوری آپ کے جلیل القدر فرزندان گرامی تھے۔ آپ کے تلامذہ میں بعض بہت مشہور ہوئے مثلاً مولانا دیدار علی شاہ الوری، مولانا سلامت اللہ رامپوری۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا ظہور الحسین رامپوری، مولانا عبدالغفار رامپوری، مولانا عنایت اللہ رامپوری۔

ارض: زمین۔ فقہ کی اصطلاح میں جائداد، اراضی (ارض بمعنی کرۂ زمین، جس پر ہم رہتے

ہیں، دیکھیے "گا عنوان" زمین) فقہ میں مفتوحہ زمین ریاست کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ البتہ غیر مذاہب کے لوگ اپنی اراضی کی ملکیت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ البتہ اس کی حفاظت کے لیے انھیں جزیہ دینا پڑتا ہے۔ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان کا جزیہ معاف ہو جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اسلامی ریاست میں غیر مذاہب کی مفتوحہ زمین ریاست کی ہی ملکیت رہتی ہے۔ البتہ ان کے اسلام لے آنے پر ان کی ملک ہو جاتی ہے مسلمان لشکریوں کے لیے حکم ہے کہ جب ان کا گذر دشمن کی سرزمین پر سے ہو تو وہاں کے کھیتوں کو برباد نہ کریں اور نہ ہی کوئی چیز قیمت ادا کیے بغیر ان سے حاصل کریں۔

زیرِ کاشت اراضی پر اسلام نے ٹیکس عائد کر رکھا ہے۔ تاکہ اسلامی ریاست فلاحی ریاست بن سکے۔ یہ ٹیکس یا زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ یعنی "عشر" کہلاتا ہے۔ البتہ لکڑی، بانس اور گھاس وغیرہ پیداوار کے ضمن میں نہیں آتے۔

اراضی کی خرید و فروخت اور ملکیت اسلام میں جائز ہے۔ اور اس میں حدِ ملکیت یا حدِ قیمت کا قطعاً کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ البتہ اجماع کے ذریعے علماء اس پر فتوے دے سکتے ہیں۔ اراضی کی خرید و فروخت کے وقت اس میں موجود تمام درخت بھی شامل کیے جائیں۔ البتہ ان درختوں کا پھل اور زمین کی فصل خرید و فروخت کے معاہدوں سے مستثنیٰ ہوں گے، کنوئیں وغیرہ بھی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

اراضی ٹھیکے پر بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ واپسی کے وقت اراضی کی حالت کم از کم وہی ہو، جو ٹھیکے پر لینے کے وقت تھی۔ (نیز دیکھیے "اجارہ")

ارضِ مقدس وہ علاقہ، جس میں بنی اسرائیل وعدہ اطاعت کے بعد داخل ہوئے۔ اسے ارضِ موعودہ بھی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں آتا ہے:-

"اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی نعمت تم پر یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا۔ اے میری قوم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ۔ جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے اور پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس نہ آنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ انھوں نے کہا اے موسیٰ! اس میں قوی ہیکل لوگ ہیں۔ اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اس میں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں! اگر وہ اس جگہ سے نکل جائیں، تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ ان میں سے جو ڈرتے تھے، دو شخصوں نے، جن پر اللہ نے انعام کیا تھا، کہا، ان پر دروازے سے داخل ہو جاؤ۔ سو جب تم داخل ہو جاؤ گے تو یقیناً تم ہی غالب رہو گے اور اللہ پر توکل کرو، اگر تم مومن ہو۔

انھوں نے کہا اے موسیٰؑ! ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ وہ [illegible] میں ہیں۔ پس تو اور تیرا رب جاؤ! اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔

(موسیٰؑ) نے کہا، اے میرے رب! میں سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ سو ہم میں اور ان نافرمانوں میں فیصلہ کر دے۔ (اللہ) نے کہا اب وہ (زمین) ان پر چالیس برس کے لیے حرام کر دی گئی ہے۔ اسی زمین میں [illegible] رہیں گے، سو تو ان نافرمانوں پر افسوس نہ کر!" (المائدہ ۲۰-۲۶)

یہ ارضِ مقدس سرزمینِ شام ہے جس میں فلسطین، بیت المقدس [illegible] ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک وہ دمشق اور فلسطین ہے اور بعض [illegible] کا علاقہ بھی اس میں شامل ہے۔ عام طور پر یہ کنعان [illegible] ہے [illegible] اس کا ذکر یوں آتا ہے:

ارضِ مقدس میں گنبدِ صخریٰ — یروشلم میں مسجدِ عمرؓ کا ایک منظر

اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کر وہ ملک کنعان کا جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، حال دریافت کریں۔" (گنتی ۱۳ : ۲)

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس میں داخل نہ ہونے پر چالیس برس کی صحرا نوردی کی سزا دی تو جب تک موجود نسل کے تمام بالغ مر نہیں گئے۔ وہ [illegible] تیہ میں بھٹکتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اس عرصہ میں تین لاکھ سے زیادہ یہودی ہلاک ہوئے۔ بیت المقدس میں وہ اس کے دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

حضرت موسیٰؑ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین حضرت یوشعؑ کی سرکردگی میں بنی اسرائیل دریائے اردن عبور کر کے یروشلم سے بیس میل کے فاصلے پر واقع شہر القریہ [illegible] پر قبضہ کیا۔ ۱۲۰۰ ق م میں وہ ارضِ مقدس پر قابض ہو گئے۔ بعد ازاں ان کے بارہ قبائل [illegible] یہ ملک تقسیم ہو گیا۔ ساڑھے تین سو برس تک بنی اسرائیل کی حکومت [illegible] بالآخر طالوت [illegible] بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر [illegible] سے [illegible] سلطنت [illegible] ان کے بعد حضرت داؤدؑ اور پھر ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ [illegible] حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل دو حکومتوں [illegible] یہودی [illegible] اور بابل کی شکست و نابود ہو گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ [illegible] ۶۳۷ء میں فتح کیا۔ جدید دور میں ایک بار پھر یہود [illegible] کے نام سے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ [illegible] بیت المقدس [illegible] شام، فلسطین، یروشلم

ارطغرل [illegible] کی [illegible] دو شخصیتیں مشہور ہیں

[illegible] عثمانی سلطنت کے بانی عثمان اول کا باپ اور سلیمان شاہ کا بیٹا [illegible] ایشیائے کوچک میں آکر بطور جاگیردار رہنے لگا۔ [illegible] سلطنت [illegible] زندگی بھر کی جنگ [illegible] فتوحات ہوا [illegible] سے جنگ کر کے بہت جلد [illegible] سلطنت [illegible] میں کامیاب ہو گیا۔

۲۔ سلطان بایزید اول کا بڑا بیٹا ۷۷۰ھ / ۱۳۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد نے [illegible] اس کے متعدد ضلعوں کا والی مقرر کیا۔ اس نے ۷۹۸ھ / ۱۳۹۰ء میں [illegible] میں اپنی تعمیر شدہ مسجد میں دفن ہوا۔ ایک روایت کے مطابق اسے [illegible] ۷۹۰ھ / ۱۳۹۰ء میں قید کر لیا تھا اور بعد میں قتل کرا دیا۔

ارقم [illegible] جن کا مکان اسلام کا ابتدائی مرکز رہا، وہیں حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا۔ عام طور پر ارقم بن ابی ارقم کے نام سے مشہور ہیں۔ والد [illegible] تھا اور وہ قبیلہ مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت ہی کم عمر میں مسلمان ہوئے [illegible] کوہ صفا پر واقع تھا، جہاں حضرت رسول اکرمؐ مسلمانوں کو تعلیم دیا کرتے تھے [illegible] کے لیے بھی ابتدا میں انھی کا گھر منتخب کیا گیا تھا۔ انھوں نے آنحضورؐ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت بھی کی اور غزوہ بدر کی مہم میں بھی شریک ہوئے، ان کا گھر بعد میں "بیت الخیزران" کے نام سے مشہور ہوا۔ انکی وفات ۵۳ھ یا ۵۵ھ / ۶۷۳ء یا ۶۷۵ء میں ہوئی۔

ارکانِ اسلام اسلام کے ستون، وہ بنیادی اعمال، جن پر دین اسلام کی عمارت قائم ہے۔ اگرچہ احادیث میں عام طور پر ارکان کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ تاہم مندرجہ ذیل پانچ امور کو دین اسلام کے بنیادی ارکان سمجھا جاتا ہے۔ (۱) کلمہ (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا "دین پانچ باتوں کا نام ہے ان میں سے کوئی بھی کسی کے بغیر قبول نہیں کی جاتی۔ یہ شہادت کہ اللہ ایک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اس کے عبد اور رسولؐ ہیں اور ایمان [illegible] اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں اور جنت اور دوزخ اور حیات بعد الموت پر۔ یہ ایک بات ہوئی۔ صلوٰۃ پنجگانہ دین کا ستون ہے۔ یہ دوسری بات ہوئی۔ زکوٰۃ گناہوں سے پاکیزگی کا دوسرا نام ہے، یہ تیسری بات ہوئی۔ جس نے ان پر عمل کیا اور رمضان کے روزے آ گئے اور اس نے عمداً انہیں ترک کر دیا تو اللہ نہ تو اس کا ایمان قبول کرے گا نہ نماز نہ زکوٰۃ اور جس نے ان چاروں پر عمل کیا تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے حج نہ کیا اور نہ اپنے حج پر ایمان لایا اور نہ اس کی طرف سے اس کے اہل میں سے کسی نے حج کیا تو اللہ اس سے نہ تو ایمان قبول کرے گا، نہ صلوٰۃ، نہ زکوٰۃ اور نہ روزہ۔"

یہ پانچوں ارکان جنہیں ارکانِ خمسہ بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل ارتقائے حیات و تکمیل فکر کی وہ پانچ بنیادیں ہیں، جن پر معاشرہ آگے [illegible] تہذیب و تمدن کی بنا رکھتا ہے۔ انھی کو اسلام نے عبادات کا مرتبہ دیا ہے۔ کیونکہ اسلام کا تصورِ عبادت رہبانیت نہیں۔ خدا کو تھوڑی دیر کے لیے پوجنے کا نام ہی عبادت نہیں بلکہ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے اور بندہ ہونے کی حیثیت سے وہ زمین پر خدا کا نائب بھی ہے۔ نائب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ اختیارات عطا کیے ہیں۔ کچھ ذمہ داریاں دی ہیں اور کچھ خدمتیں سپرد کی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہی اصل عبادت ہے۔ یعنی جب انسان لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے تو اس پر یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے۔ اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے اور اب ہم دیکھیں گے کہ ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کیسے قائم کرتا ہے۔

۱۔ **توحید**: توحید کا پہلا اور عظیم اثر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد اور احسن ہے۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہے کہ اس سے کائنات، معاشرہ اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں جو ایک طرح کی اجنبیت ہے، وہ دور ہو جاتی ہے۔ انسان پر یہ آشکار ہو جاتا ہے کہ جس خدا نے یہ نظام قائم کیا ہے، اسی نے انسانی فکر اور خواہشات کو بھی تخلیق کیا ہے۔ ناسازگاری حالات، بیماری، شر وغیرہ اسی نظام کا ایک حصہ ہیں اور یہ سب کچھ مشیت ایزدی میں شامل ہے۔ جب کائنات کے بارے میں یہ حسن ظن پیدا ہو جائے تو توحید اس سے آگے بڑھ کر یہ یقین بھی دلاتی ہے کہ تمہاری جدوجہد میں خدا برابر تمہارے ساتھ ہے۔ چنانچہ توحید کا سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن منطقی طریق فکر اختیار کر لیتا ہے اور توہمات وغیرہ سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔

۲۔ **نماز**: نماز عبادت کا ایک مکمل مظہر ہے۔ اس سے ذہن میں یہ شعور تازہ رہتا ہے کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اسے نماز ہر وقت اس بات کی یقین دہانی کراتی رہتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے اپنی زندگی ایک مخصوص ڈھب پر گزارنی ہے۔ یہ نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ چونکہ انسان کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ہر قدم پر خدا کے احکامات کو بجا لائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں فرض شناسی اور مستعدی ہی نہ پیدا ہو بلکہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ گویا یہ وہ پل ہے جس پر سے گزر کر آدمی کفر سے ایمان کی سرزمین میں آ جاتا ہے۔ نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے، جو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی روح کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور پھر ایک ایک

حرکت ، ایک ایک فعل اور ایک ایک قول، جو نماز سے متعلق ہے گویا اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود انسان کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں دعوےٰ کیا گیا ہے کہ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے۔ نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑا [illegible] لیے رکھا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر پوری طرح قابو پا لے۔ اور اسے اپنے ارادے کے مطابق چلانے میں ماہر ہو جائے۔ انفرادی زندگی کے علاوہ نماز انسان کی اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مسجد میں تمام انسانوں کے مساوی درجے کا سبق ملتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص امام بھی بن سکتا ہے، مگر شرط دینی تقویٰ کی ہے پھر یہ امام بھی ایسا ہو، جسے کسی سنگین غلطی پر ہٹایا بھی جا سکتا ہو۔

۳۔ **روزہ**: قدیم امتوں ہی سے روزہ عبادات کا لازمی جزو رہا ہے۔ اسلام میں ایک ماہ کے روزے سال بھر کے لیے انسان کو نظم و ضبط کا عادی بناتے ہیں۔ روزے سے جہاں انسان کے اندر احساس بندگی، اطاعت امر، تعمیر سیرت اور ضبط نفس پیدا ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے اندر مختلف روحانی کیفیات بھی ابھرتی ہیں، جو اسے حیوانیت سے ربوبیت کی طرف مائل بہ پرواز کرتی ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ایک اجتماعی تقدس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جس میں تقویٰ اور پاکیزگی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

۴۔ **زکوٰۃ**: نماز کے بعد زکوٰۃ کو دین اسلام کا سب سے بڑا رکن سمجھا گیا ہے۔ نماز حقوق اللہ کی غمازی کرتی ہے تو زکوٰۃ حقوق العباد (یعنی بندوں کے حقوق) کی دلالت کرتی ہے۔ اگر ہم بغور جائزہ لیں تو زکوٰۃ کے تین اہم مقاصد نظر آتے ہیں۔ جن میں تزکیہ نفس حقیقی اور بنیادی مقصد ہے۔ زکوٰۃ دینے سے مال و دولت کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ دوسرا بڑا مقصد امداد باہمی ہے تاکہ ملت کے نادار افراد کی مدد کی جائے۔ یہ ایک طرح سے دین اسلام کا معاشی پہلو بھی ہے۔ زکوٰۃ کا تیسرا بڑا مقصد دین کی امداد ہے۔ یہ گویا اللہ کی راہ میں مال کے ذریعے جہاد ہے۔

۵۔ **حج**: ہر مسلمان پر زندگی میں کم از کم ایک بار حج فرض ہے۔ اس کا بھی اپنا ایک فلسفہ ہے۔ احرام سے لے کر قربانی تک ہر رسم مسلمانوں کو ایک ملت میں باندھتی ہے۔ احرام کا لباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی بھی قوم کے کسی بھی لباس کی خدا کے دربار میں کوئی اہمیت نہیں اور ہر مسلمان خدا کے ہاں فقیرانہ جذبے اور بندگی کے احساس کے ساتھ حاضر ہو رہا ہے۔ جب سارے مسلمان ایک ہی نعرہ "لبیک" بلند کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ حضرت ابراہیمؑ کی منادی کا جواب دے رہے ہیں۔ کعبے پر نظر پڑتے ہی ہر مسلمان خود کو اس عظیم ملت اسلامیہ کا رکن تصور کرنے لگتا ہے۔ جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے سلامتی کی دعا کی تھی۔ طواف کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اپنے رب کے دربار میں سراپا کیف و مستی بن گیا ہے اور ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ ایک ہی لباس پہنے شمع توحید کے گرد پروانہ وار چکر لگا رہے ہیں۔ حجر اسود کا بوسہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بندے نے اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے تابع کر دیا ہے۔ صفا مروہ کی سعی یہ ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا راستہ ہمارا ہی راستہ ہوگا۔ عرفات کے میدان میں حاجیوں کا جمع ہونا عظیم تر اجتماع ملت اسلامیہ کا اظہار کرتا ہے۔ جمرہ پر کنکریاں پھینکنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر ہم کے لشکر کی طرح ہم اس دشمن دین کا منہ پھیر دیں گے، جو کسی نیت بد کے تحت آگے بڑھے گا۔ قربانی دینے سے جہاں ایک طرف سنت ابراہیمی پر عمل کیا جاتا ہے وہیں اللہ کی بارگاہ میں ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

حج ایک طرح سے جامع العبادات ہے۔ اس میں خالص توحید کا پرتو بھی ملتا ہے اور ذکر مسلسل بھی ہے۔ نماز بھی ہے اور زکوٰۃ و قربانی بھی ہے یہ ایک طرح سے روزہ بھی ہے۔ کیونکہ روزے کی طرح اس میں بھی بہت سی نفسانی خواہشات کو ترک کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ گویا حج میں تمام ارکان اسلام کی روح آجاتی ہے۔

ارم [illegible] جس [illegible] وہ [illegible] ذات العماد [illegible] کا [illegible] کے کنارے واقع ہے [illegible] تعمیر [illegible]

ارم ذات العماد [illegible] قرآن [illegible] میں آیا ہے۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے کیا کیا عاد ارم ذات العماد [illegible] کی مانند شہروں میں کوئی نہ تھا۔

روایات [illegible] سنگ مرمر کے بڑے بڑے ستون تھے [illegible] ایک مقام کے دو نام قرار دیا ہے۔ اس [illegible] اس جنت کو تعمیر کرایا تھا جس میں سنگ مرمر کے خوبصورت [illegible] بعض لوگوں کے نزدیک شداد کی جنت [illegible] دریاں تھی [illegible] کہا [illegible] ارم عاد بن ارم [illegible] قسم [illegible] ویران ہو گئے۔

ارمیاؑ ایک نبی جن کا [illegible] میں کوئی ذکر نہیں [illegible] مسلمانوں [illegible] روایات مشہور ہیں۔ ایک قصہ یہ ہے کہ حضرت ارمیاؑ [illegible] ہوئی۔ اس وقت آپ قید خانے میں تھے [illegible] آنے والی تباہی کی پیش گوئی کی تھی اور بادشاہ نے آپ کو قید کر [illegible] جب یروشلم [illegible] تو آپ کو رہا کیا اور [illegible] تعظیم کے ساتھ [illegible] تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے [illegible] کی صورت میں آپ کے پاس بھیجا کہ آپ یروشلم کے [illegible] کریں۔ اس وقت آپ دیوار بیت المقدس پر بیٹھے تھے [illegible] اگر یہ لوگ نیک ہیں تو انھیں باقی رکھ اور اگر [illegible] اس دعا کے ساتھ ہی بجلی گری اور شہر کا [illegible] ہو کر [illegible] اور بعد ازاں تباہ شدہ لوگوں کے ساتھ [illegible]

حضرت ارمیاؑ کو حضرت خضر بھی کہا جاتا ہے۔ جن کی [illegible] میں چلے گئے تھے اور اب بھی کبھی کبھی [illegible] کو مل [illegible]

[illegible] چشمۂ آب حیات کے نگراں بھی ہیں۔

ازارقہ خوارج کا ایک فرقہ جس کا بانی نافع بن ازرق تھا۔ اس نے یزید بن معاویہؓ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے فسادات سے فائدہ اٹھایا۔ جب خوارج کو بصرہ سے باہر نکال دیا گیا تو نافع نے باہر ٹھیرے فوائد اور مزید لشکر جمع کرکے عمر بن عبید اللہ کو شکست دی جو عبداللہ بن زبیر کا بھیجا ہوا والی تھا۔ اس موقع پر بصرہ کے بین خوارج کے [illegible] پیدا ہوا اور وہ دو فرقوں ازارقہ اور اباضیہ میں منقسم ہو گئے۔ ازارقہ نے اپنے مخالفین کو قتل کرنا شروع کر دیا تو المہلب نے ان پر حملہ کیا اور انہیں دجلہ [illegible] کے [illegible] میں شکست فاش دی۔ اس کے بعد ازارقہ ایران کی [illegible] مختلف علاقوں میں سرگرم رہ کر اہواز پر قبضہ کر لیا۔ اس [illegible] [illegible] انھیں نہ صرف روکے رکھا بلکہ انھیں کافی حد [illegible] ان فتنے کا خاتمہ ہوا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قرآن مجید میں اس کے [illegible]

[illegible] صاف ذکر کیا گیا [illegible]

[illegible] اگر تمھیں خوف ہو کہ [illegible]

[illegible] زیادہ واضح [illegible]

[illegible] سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا [illegible] تو بیا ضرورتاً یا بلا ضرورت [illegible] کرنے کا حکم [illegible] ایک وقت نکاح [illegible] اور اگر ایسا ہو [illegible] تعداد ازدواج کی اجازت ہے [illegible] کی حالت میں ہے نہ کہ بلا ضرورت۔

جب [illegible] تو آنحضورؐ نے مسلمانوں کو اپنی ازدواج کی [illegible] کا حکم دیا [illegible] جب اہل عرب بیس بیس اور تیس تیس عورتوں کے ساتھ شادی کرتے تھے۔ ابن ماجہ، ترمذی، دارقطنی اور امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ [illegible] بن معاویہ ایمان لائے تو ان کے ہاں پانچ بیبیاں تھیں آنحضورؐ نے حکم دیا کہ چار رکھ لو اور ایک کو طلاق دے دو یا جب غیلان بن سلمہ ایمان لائے تو ان کی دس بیبیاں تھیں اور نبی کریمؐ نے انھیں چار رکھ کر باقی کو طلاق دینے کا حکم دیا۔ چونکہ مرد عام طور پر دو یا زیادہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے فرمان خداوندی یہی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ ایک دوسری جگہ فرمان ہوتا ہے کہ "تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو خواہ تم کتنا ہی چاہو" (النساء: ۱۲۵)۔

تعداد ازدواج مقرر کرنے سے اسلام کا مقصد اوّلین کیا ہے؟ یہ ایک واضح بات ہے کہ معاشرے میں بدکاریوں کے خاتمے کے لیے اسلام نے نکاح کا حکم دیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ یہ عمل اتنا آسان ہو کہ بدکاری اس سے زیادہ مشکل امر نظر آئے اور جو مرد ایک سے زیادہ عورتوں کی خواہش کرے تو اسے بآسانی مہیا ہو سکیں لیکن اس کی بھی ایک حد ہو تاکہ وہ اپنی خواہشوں میں حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔

تعداد ازدواج مقرر کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس دور کے اہل عرب کی ازدواجی حالت اعتدال پر آگئی۔ مسلمان کئی کئی بیویوں کو چھوڑ کر تھوڑی تعداد پر اکتفا کرنے لگے اس طرح عرب میں موجود عورتوں کی قلت کم ہوگئی، جس کی بنا پر بلا نکاح رہنے والے مردوں کی تعداد بھی کم ہوگئی اور یوں معاشرے میں بدکاریوں کے امکانات بہت حد تک تھوڑے ہوتے چلے گئے۔

ازواج مطہرات وہ پاک بیبیاں، جو حضرت رسول اکرمؐ کے نکاح میں آئیں انھیں امہات المومنین، یعنی مومنوں کی مائیں بھی کہا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "سیرت رسولؐ" میں تعداد ازواج چودہ بیان کرتے ہیں۔ ایک روایت تیرہ، گیارہ اور نو کی بھی ہے۔ آنحضورؐ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح سب سے پہلے کیا اور پچاس سال کی عمر تک ان کی رفاقت میں رہے۔ باقی نکاح اس کے بعد کیے۔

۱۔ **حضرت خدیجہؓ بنت خویلد**: لقب طاہرہ، کنیت ام ہند ہے۔ ان کا پہلا نکاح ابوہالہ بن نباش تمیمی سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد دوسرا نکاح عتیق بن عابد مخزومی سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد چالیس برس کی عمر میں رحمت اللعالمینؐ سے نکاح ہوا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضورؐ کی عمر مبارک تیئس سال تھی لیکن اکثر روایات میں آپؐ کی عمر مبارک پچیس سال بیان ہوئی ہے۔ آپؐ سے نکاح کے وقت حق مہر پانچسو طلائی درہم طے ہوا۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے ان کی رفاقت میں تریپن اور اکثر روایات کے مطابق پچاس سال گزارے۔ آپؓ گیارہ رمضان ۱۰ نبوی ہجرت سے تین سال قبل انتقال کر گئیں۔ چونکہ اس وقت نماز جنازہ شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے نعش مبارک کو اسی طرح دفن کر دیا گیا۔

۲۔ **حضرت سودہؓ بنت زمعہ**: والدہ کا نام شموس تھا۔ والدہ بنو نجار خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا۔ یہ سابقون الاوّلون میں سے تھے۔ حضور اکرمؐ سے ۱۰ نبوی میں نکاح ہوا۔ مہر چار سو درہم ادا کیا گیا۔ ان کا تعلق عام قریش کے خاندان سے تھا۔ نکاح کے وقت آپؓ کی عمر تیس سال تھی۔ ان کا انتقال حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہوا۔ پہلے شوہر سے ایک بیٹا عبدالرحمٰنؓ شہید جنگ جلولا ہوئے۔

۳۔ **حضرت عائشہؓ بنت ابوبکرؓ**: صدیقہ اور حمیرا لقب تھا اور کنیت ام عبداللہ ہے۔ والدہ کا نام زینب ہے جن کی کنیت ام رمان ہے۔ غنم بن مالک قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپؓ کی پہلی نسبت جبیر بن مطعم کے لڑکے سے ہوئی تھی۔ حضورؐ پر ایمان لانے پر نسبت قطع کر دی گئی۔ حضورؐ سے نکاح سات سال کی عمر

۴۔ حضرت حفصہؓ بنت حضرت عمرؓ:۔ آپؐ بعثت رسولؐ سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ عدی قریش خاندان سے تعلق تھا۔ پہلے شوہر خنیس بن حذافہ خاندان بنو سہم سے تعلق رکھتے تھے۔ غزوہ بدر میں شہید ہوئے۔ والدہ کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ شعبان ۴۵ھ کو انتقال ہوا۔

۵۔ حضرت ام سلمہؓ ھند بنت خذیفہ:۔ سلسلہ نسب ہند بنت ابی امیہ سہیل بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم ہے۔ پہلے شوہر کا نام عبداللہ بن عبدالاسد ابوسلمہ ہے۔ شہید اُحد ہیں۔ نکاح کے وقت ان کی عمر انتیس سال تھی۔ وفات پہلی روایت کے مطابق ۵۹ھ اور دوسری روایت میں ۶۱ھ بعمر چوراسی سال ہے۔

۶۔ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ: آپؐ کو ام المساکین بھی کہتے ہیں عامر بنو صعصعہ قریش خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلے شوہر کا نام حضرت عبداللہؓ تھا جو شہید بدر تھے۔ حضرت نبی کریمؐ سے نکاح کے وقت آپؐ کی عمر تیس سال تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ سے نکاح کے دو سال بعد انتقال فرمایا۔ ایک دوسری روایت میں حضورؐ سے نکاح کے بعد دو ماہ زندگی پائی۔ اور ۳ھ کو وفات پائی۔ آپؐ نے مہر بارہ اوقیہ ادا فرمایا۔

۷۔ حضرت زینبؓ بنت جحش:۔ حضورؐ کے چچا ابوطالب کی بیٹی تھیں پہلا نکاح آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے ہوا والدہ کا نام امیمہ تھا۔ حضرت زیدؓ سے طلاق ۵ھ میں ہوئی۔ ۳۸ سال کی عمر میں حضورؐ سے نکاح ہوا۔ آیت حجاب ان کی دعوت ولیمہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی

۸۔ حضرت جویریہؓ بنت حارث بن ضرار:۔ قبیلہ مصطلق خزاعہ تھا پہلا شوہر مسافع ابن صفوان جنگ میں مارا گیا۔ گرفتار ہو کر حضرت ثابتؓ انصاری کے حصہ میں آئیں۔ حضورؐ کی مدد سے مقررہ رقم ادا کر کے آزاد ہوئیں اور بیس سال کی عمر میں حضورؐ سے نکاح کیا۔ اصل نام برہ تھا آپؐ نے نکاح کے وقت ان کا نام بدل کر جویریہ رکھا۔

۹۔ حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان:۔ اصل نام رملہ ہے کنیت ام حبیبہ ہے۔ شمس قریش خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کی والدہ صفیہ بنت ابی العاص حضرت عثمانؓ کی سگی پھوپھی تھیں۔ ہجرت حبشہ کے موقع پر ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں تو پہلے شوہر عبداللہ بن جحش وہیں مرتد ہو کر عیسائی ہو گئے۔ حضورؐ نے وہیں ان کو نکاح کا پیغام بھیجا نجاشی نے آپؐ کا نکاح کر دیا اور آپؐ کی طرف سے چار سو دینار مہر ادا کیا۔ ۴۴ھ میں ۷۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

۱۰۔ حضرت صفیہؓ بنت حیؓ:۔ اصل نام زینب عرف صفیہ ہے۔ بنو نضیر یہودی قبیلہ سے تعلق تھا۔ پہلے شوہر سلام بن مشکم یہودی نے طلاق دی تو کنانہ سے نکاح ہوا۔ کنانہ خیبر میں مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ آپؐ گرفتار ہو کر دحیہ کلبی کے حصہ میں آئیں۔ حضورؐ نے ان کو فدیہ ادا کر کے آزاد فرمایا اور نکاح کر لیا۔ اس وقت حضرت صفیہؓ کی عمر ۱۷ سال تھی۔

۱۱۔ حضرت ریحانہؓ بنت زید نضریہ:۔ ان کا خاندان بنی قریظہ سے تھا۔ پہلا نکاح بنی قریظہ کے ایک شخص سے ہوا۔ مسلمان جب بنی قریظہ پر غالب آئے تو یہ مال غنیمت کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔

ابن سعد سے مروی ہے کہ آپؐ نے آزاد فرما کر بارہ اوقیہ مہر دے کر نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ محرم ۶ھ کا ہے۔

سوائے دو مورخوں ابن سعد اور حافظ ابن حجر کے دیگر تمام ارباب سیر بالاتفاق حضرت ریحانہؓ کے حضورؐ سے نکاح کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک آپؐ نے انہیں بطور ملک حرم میں رکھا اور نکاح نہیں فرمایا تھا۔ حضورؐ کی وفات سے دس سال قبل وفات پائی۔

۱۲۔ حضرت ماریہؓ قبطیہ:۔ یہ مصری تھیں۔ حضورؐ سے بیس سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ آپؐ باندی تھیں۔ ان سے حضورؐ کے ہاں ایک بیٹا ابراہیم پیدا ہوا جو چھوٹی عمر میں ہی وفات پا گئے۔

۱۳۔ حضرت میمونہؓ بنت حارث:۔ ان کا پہلا نکاح مسعود بن عمر بن عمیر سے ہوا۔ طلاق کے بعد ابورہم بن عبدالعزیٰ سے نکاح کیا۔ جس نے ۷ھ میں انتقال کیا تو آں حضرتؐ سے نکاح ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ یہ آنحضورؐ کی آخری منکوحہ تھیں۔ انھوں نے ۵۱ھ میں انتقال کرکیا۔

ازواج مطہرات کا ذکر قرآن مجید میں بھی متعدد [illegible] ہے۔ سورہ الاحزاب [illegible] ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو تو عام عورتوں کی مانند نہیں ہو پس تم اپنے لہجے میں ایسی نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے [illegible] میں مبتلا ہو جائے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں [illegible] گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کی مانند [illegible] اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ [illegible] اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتی رہو [illegible] دور رکھے اے نبی کے گھر والو! [illegible] اور تمہارے گھروں میں [illegible] آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں [illegible] اللہ لطیف و خبیر ہے۔"

"اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو اگر تم [illegible] تمہیں متاع حیات [illegible] کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت [illegible] تم میں سے خوب طلب کرنے والیوں کے لئے اجر تیار رکھا ہے [illegible]"

علامہ ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد میں لکھتے ہیں [illegible] کے ساتھ نہایت محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ نماز [illegible] کہ آپؐ تمام ازواج کے ہاں تشریف لے جاتے [illegible]

ازہر جامعہ قاہرہ کی عظیم اسلامی درسگاہ جس کی [illegible] صدی عیسوی میں فاطمی خلفاء کے زمانے میں رکھی گئی یہاں اسماعیلیت کی تعلیم دی جاتی [illegible] سلطان [illegible] کے عہد سے [illegible] بن گیا۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں اس جامعہ کو ترقی کا موقع [illegible] سب سے بڑا جامعہ بن گیا۔ اس وقت [illegible] وسعت [illegible] اردگرد کی جہت [illegible] جن میں سے ساڑھے چار ہزار [illegible] تھے

مسجد ازہر کی تعمیر [illegible] ۳۵۹ھ [illegible] رمضان ۳۶۱ھ [illegible] ۹۷۲ء [illegible] جامع القاہرہ بھی کہتے تھے۔ خلیفہ حاکم بامر اللہ نے اس کی عمارت میں [illegible] کے بعد تقریباً ہر خلیفہ نے کسی نہ کسی قدر اضافہ کیا [illegible] سلطان [illegible] جامع الازہر کی شان و شوکت کو زوال آنا شروع ہو گیا

پہلی بار سلطان [illegible] نے جامعہ کی [illegible] طرف [illegible] اس میں دوبارہ جمعہ پڑھنے کی اجازت [illegible] اس کے ساتھ [illegible] بھی رکھے گئے [illegible] جامعہ میں ایک بار پھر جان پڑ گئی [illegible] کے بعد سے آج تک اس کے استحکام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا

[illegible] میں یہاں صرف [illegible] کو ہی داخلہ ملتا تھا۔ اگرچہ یہاں کے نصاب کا زیادہ تر حصہ فقہ پر مشتمل تھا۔ اس اعتبار سے جامعہ ازہر کی تدریسی تاریخ قابل ذکر ہے۔ ابتدائی دور کے نصاب اور تدریس کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں ملتیں۔ فاطمی عہد میں علی بن نعمان کا پتا چلتا ہے جو ۳۶۵ھ/۹۷۵ء میں یہاں اسماعیلی فقہ کا درس دیتا تھا [illegible] جامعہ ازہر [illegible] ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں یہاں ایک جماعت شافعی فقہ کا درس دیا کرتی تھی۔ ۷۶۱ھ/۱۳۵۹ء میں فقہ حنفی کا اجرا بھی کر دیا گیا۔ المقریزی لکھتا ہے [illegible] ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں یہاں ۷۵۰ بیرونی طلبا ٹھہرے ہوئے تھے، جو المغرب سے لے کر [illegible] کے باشندے تھے۔ یہ قرآن پڑھتے، فقہ، حدیث، تفسیر اور نحو کی تعلیم حاصل کرتے اور وعظ و ذکر کی مجالس منعقد کرتے تھے۔

عثمانی ترکوں کے دور میں جامعہ ازہر علوم کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس کے اسباب [illegible] اوقاف کا بے جا اسراف اور صوفی خانقاہوں کا غلبہ اہم تھے۔ لیکن عثمانی دور کے اندر ہی جامعہ ازہر کا احیا شروع ہوا۔ مگر اس کے نصاب میں [illegible] مدار محض پرانی کتب کے مواد [illegible] طلبا کو محض متن رٹنے پر مجبور [illegible] کی تعلیم ابتدائی کتابوں تک [illegible] شیخوں کی پہلی تاریخ معین کرنے [illegible] الگ ہوتا تھا البتہ پورے جامعہ کا شیخ حکومت [illegible] معلم [illegible] اور یورپ [illegible] تفسیر، حدیث، فقہ [illegible] زبان پڑھائی جاتی تھی۔ دیگر علوم کی تعلیم [illegible] پڑھتے تھے۔ نصاب [illegible] سے رخصت ہونے والے طلبا [illegible] طالب علم کو استاد [illegible]

[illegible] میں [illegible] معلمین اور [illegible] طلبا کی تقسیم اس طرح سے تھی:

مسلک	معلم	طلبا
شافعی	[illegible]	۵۶۵۱
مالکی	۹۹	۳۸۲۶
حنفی	[illegible]	۱۲۰۸
حنبلی	۲	۲۵

[illegible] جامعہ ازہر ایک طرح سے دینی درس گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر [illegible] جامعہ کہلانے کی مستحق نہ تھی۔ جہاں عصر حاضر کے [illegible] سب علوم کی تعلیم دی جاتی ہو جو ملک کی بیداری کے لیے ضروری تھے۔ [illegible] میں حکومت نے ایک فرمان کے مطابق "عالم" کی سند جاری کی گئی۔ جو ہر سال زیادہ سے زیادہ چھ طلبا گیارہ مضامین میں امتحان پاس کر سکتے تھے۔ انھیں جامعہ میں درس دینے کا استحقاق حاصل ہو گا۔

[illegible] میں ایک دار العلوم قائم کیا گیا، جہاں سے کچھ طلبا تخصص کی سند لے کر جدید مدارس میں پڑھانے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں محمد عبدہ کی درخواست پر مجلس ادارۃ الازہر قائم ہوئی۔ اسی سال طنطا، دمیاط اور دسوق کی درسگاہوں کو ازہر سے ملحق کر دیا گیا۔ اساتذہ کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ جامعہ میں داخلے کی کم از کم عمر پندرہ برس مقرر کی گئی۔ داخل ہونے والے کے لیے پڑھنا لکھنا اور نصف قرآن کا حفظ ہونا شرط قرار دیا گیا۔ دو امتحانات مقرر کیے گئے۔ پہلا امتحان آٹھ سال بعد لینا قرار پایا، جس میں کامیاب ہونے والوں کو "اہلیت" کی سند ملتی تھی اور دوسرا بارہ سال بعد، جس کے کامیاب طلبا "عالم" کہلا سکتے تھے۔ نصاب میں جدید دور کے مضامین بھی شامل کیے گئے، ان میں سے ریاضی وغیرہ لازمی قرار پائے اور تاریخ اسلام، انشا، جغرافیہ وغیرہ اختیاری مضامین تھے۔ تعطیلات صرف موسم گرما، رمضان اور عید قربان کی مقرر کی گئیں۔ نصاب تعلیم کی مقررہ کتب کی فہرست بنا لی گئی۔ اس قانون کے نفاذ میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۰۳ء میں سکندریہ میں درسگاہ قائم کی گئی، جو ازہر سے ملحق تھی۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں شرعی عدالتوں کے لیے قضاۃ کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا۔ ۱۱ صفر ۱۳۲۶ھ/۱۶ مارچ ۱۹۰۸ء کے ایک قانون کی رو سے ازہر کی تعلیم تین درجوں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ میں تقسیم کر دی گئی۔ ہر درجے کی میعاد تعلیم چار سال مقرر ہوئی اور ہر درجے کے آخری امتحان کے بعد سند ملنے لگی۔ ۱۸۹۶ء کے اختیاری مضامین لازمی بنا دیے گئے۔ اس قانون کو ازہر کی خود مختاری کے لیے ایک ضرب شدید سمجھا گیا اور اس کے خلاف شدید مظاہرے ہوئے۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں مغربی طرز کی آزاد یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۱۴ مئی ۱۹۱۱ء کے قانون کی رو سے قرار پایا کہ شیخ الازہر کو خدیو مصر نامزد کیا کرے گا۔ جامعہ میں داخلے کی شرائط میں عمر کی شرط دس تا سترہ سال کر دی گئی۔ باقی دفعات وہی رکھی گئیں، جو ۱۸۹۶ء کے قانون میں تھیں۔ علوم حاضرہ کے درس میں اضافہ کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں داخلے کے لیے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ نصف قرآن کی بجائے پورا قرآن حفظ ہو۔

۲ محرم ۱۳۵۵ھ/۲۰ مارچ ۱۹۳۶ء کے قانون کی رو سے طالب علم کے داخلے کی عمر بارہ سے سولہ سال تک قرار پائی اور کسی مضمون کی تخصیص حاصل کرنے کے لیے دو سال کی مدت مقرر کی گئی۔ جدید دور کی تعلیم جامعہ کا حقیقی مقصد بن گیا۔ اس میں انگریزی و فرانسیسی زبانیں، اصول دین، فلسفہ، قانون وغیرہ کا مطالعہ لازم ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء میں دار العلوم کو ایک کلیے کی حیثیت سے قاہرہ یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں دار العلوم محض ازہریوں کے لیے مخصوص نہ رہا بلکہ اس میں دوسرے سرکاری مدارس کے طلبا بھی داخل کیے جانے لگے۔ ۱۹۵۴ء میں لڑکیوں کے لیے بھی ایک شعبہ کھولا گیا۔

جامع ازہر کے شیوخ کی فہرست ۱۱۰۰ھ/۱۶۹۰ء سے محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۴ء تک جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ محمد بن عبداللہ الخرشی (وفات ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء)
۲۔ محمد النشرتی (وفات ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء)
۳۔ عبدالباقی القلینی (ان کی نامزدگی پر چپقلش ہوئی۔)
۴۔ محمد شنن (م ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء)
۵۔ ابراہیم بن موسیٰ الفیومی (م ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۵ء)
۶۔ عبداللہ الشبراوی (شاعر اور ظریف تھا)
۷۔ محمد بن سالم الحفناوی الخلوتی (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء)
۸۔ عبدالرؤف السجینی (م ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۹ء)
۹۔ احمد بن عبدالمنعم الدمنہوری (۱۱۹۲ھ/۱۷۷۹ء)
۱۰۔ عبدالرحمان العریشی (شافعی دباؤ کے تحت جلد معزول ہو گیا۔)
۱۱۔ احمد العروسی (م ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء)
۱۱۔ عبداللہ الشرقاوی (م ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء)
۱۳۔ محمد الشنوانی (اپنے حریف المہدی کو معزول کروایا) (م ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء)

۱۴ ـ محمد العروسی (وفات ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء)
۱۵ ـ احمد بن علی (وفات ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء)
۱۶ ـ حسن بن محمد العطار (وفات ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء)
۱۷ ـ حسن القویسنی (وفات ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء)
۱۸ ـ احمد الصائم السقطی (وفات ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء)
۱۹ ـ ابراہیم بن محمد الباجوری (وفات ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء)

اس کے بعد چار برس کا خالی وقفہ آتا ہے، جس دوران میں چار ناظموں کی ایک مجلس الازہر کا انتظام چلاتی رہی۔

۲۰ ـ مصطفیٰ العروسی (۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء)
۲۱ ـ محمد عباس المہدی، اس کی جگہ محمد الانبابی نے عارضی طور پر جگہ سنبھالی جب عرابی پاشا نے خروج کیا۔ بالآخر اس نے ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء کو اپنا عہدہ چھوڑ دیا۔
۲۲ ـ محمد الانبابی (۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں علیحدہ ہوا)
۲۳ ـ حسونہ النواوی (۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں الازہر کی مجلس انتظامیہ کی صدارت سے مستعفی ہوا۔)
۲۴ ـ عبدالرحمان قطب النواوی (۲۳ کا بھائی، اسی سال فوت ہو گیا۔)
۲۵ ـ سلیم البشری (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء، محمد عبدہ کا سب سے بڑا مخالف)
۲۶ ـ علی البیلاوی (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں مستعفی ہوا۔)
۲۷ ـ عبدالرحمان الشربینی (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں مستعفی ہوا۔)
۲۸ ـ حسونہ النواوی (دوسری دفعہ مقرر ہوا اور ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں مستعفی ہوا)
۲۹ ـ سلیم البشری (دوسری دفعہ، وفات ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء)
۳۰ ـ محمد ابوالفضل الجیزاوی (وفات ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء)
۳۱ ـ مصطفیٰ المراغی (محمد عبدہ کا شاگرد ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں مستعفی ہوا)
۳۲ ـ محمد الاحمدی الظواہری (۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں مستعفی ہوا)
۳۳ ـ مصطفیٰ المراغی (دوسری دفعہ، وفات ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء)
۳۴ ـ مصطفیٰ عبدالرزاق (شاہ فاروق نے نامزد کیا۔ اس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں فوت ہوا۔)
۳۵ ـ محمد مامون الشناوی (وفات ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء)

اس کے بعد سے شیخ الازہر کے عہدے پر تقرر کی مختصر میعادیں مصری سیاست کے اندرونی محرکات سے مطابقت رکھتی ہیں، حکومت نے اس کے بعد کے اکثر شیوخ سے جبری استعفے لیے۔

۳۶ ـ عبدالمجید سلیم (۴ ستمبر ۱۹۵۱ء کو مستعفی ہوا)
۳۷ ـ ابراہیم حمروش (۱۰ فروری ۱۹۵۲ء کو مستعفی ہوا۔)
۳۸ ـ عبدالمجید سلیم (دوسری بار، ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو مستعفی ہوا)
۳۹ ـ محمد الخضر حسین (جنوری ۱۹۵۴ء میں مستعفی ہوا)
۴۰ ـ عبدالرحمان تاج (۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو نامزد ہوا۔)

الازہر میں جو علمی کام ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں سے زیادہ تر کا موضوع اسلامیات ہے۔ اساتذہ نے عربی زبان اور فقہ اسلامی کے روایتی موضوعات کو سہل تر شکلوں میں دوبارہ پیش کیا ہے۔ بعض قدیم کتابوں کے متن شائع کیے گئے ہیں جو مسلمانوں اور اہل علم کے لیے بیش قیمت ہیں۔ طلباء سے بھی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھوائے جاتے ہیں۔

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ (وفات رجب ۵۴ھ/جون ۶۷۴ء) ابن زید بن حارثہ بن شرحبیل الکلبی الہاشمی۔ ابو محمد اور ابو زید کنیت تھی۔ حضرت برکتہ ام ایمن کے بطن سے پیدا ہوا۔ ان کے والد آنحضور صلعم کے منہ بولے بیٹے تھے۔ اسلام کی گود میں پرورش پائی۔ فتح خیبر کے بعد آپ کا وظیفہ مقرر ہوا، اسی پر گذارہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب فوت ہوئے تو وراثت میں کچھ نہ چھوڑا۔

اسامہ بن زید نے پہلی بار جس غزوہ میں شرکت کی، وہ فتح مکہ تھی۔ اس سے پہلے غزوہ اُحد میں انھیں عمر کم ہونے کی وجہ سے اجازت نہ ملی تھی۔ ۱۱ھ میں آنحضورؐ نے انھیں اس رسالے کا سردار مقرر کیا، جو موتہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد تیار کیا گیا۔ اس رسالے کا مقصد رومی علاقے پر یلغار کرنا تھا آنحضورؐ نے اپنے دست مبارک سے علم دے کر روانہ کیا۔ ابھی آپ پہلی منزل پر پہنچے تھے کہ آنحضورؐ کی علالت کا سن کر لوٹ آئے۔ مگر جب آپ مدینہ پہنچے تو مرض میں کسی قدر افاقہ تھا۔ آپ دوبارہ مہم پر روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہؓ اور متعدد صحابہ شریک لشکر تھے۔ ابھی اُسی منزل پر پہنچے تھے کہ آنحضورؐ کے مرض الموت کی خبر پہنچی۔ چنانچہ یہ لشکر واپس آگیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں یہ لشکر اپنی مہم پر روانہ ہوا۔ اس کی کامیابیاں تسخیر شام کی تمہید تھیں۔ ابنیٰ تک کے علاقے کو فتح کرنے کے بعد آپ مدینہ لوٹ آئے ان دنوں حضرت ابوبکرؓ فتنہ ردہ کو فرو کرنے کے لیے ابرق کی طرف روانہ ہوئے تو انھوں نے آپ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

حضرت عمرؓ نے آپ کا وظیفہ اپنے بیٹے کی نسبت زیادہ مقرر کر رکھا تھا ان کے عہد خلافت سے آپ معاملات سیاست سے الگ تھلگ رہے۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں آپ نے اپنا دامن فتنہ و فساد سے بچائے رکھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے تنازعات میں بھی غیر جانب دار رہے۔ اگرچہ آپ نے حضرت علیؓ کی بیعت نہ کی تاہم انہیں برحق سمجھتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں انتقال ہوا اور مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔

حضرت اسامہ کی ساری تربیت گہوارہ اسلام اور آغوش نبویؐ میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ آپ کبھی کفر و شرک کی آلودگیوں میں ملوث نہیں ہوئے۔ زہد و تقویٰ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ آنحضورؐ کے محبوب اور راز دار تھے۔ جب حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے اپنے وظیفہ کے کم مقرر کیے جانے پر اعتراض کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "وہ رسول اللہ صلعم کو تجھ سے زیادہ عزیز تھے اور ان کا باپ تیرے باپ سے زیادہ عزیز تھا۔"

استادسیس ایران کی ایک ملحدانہ تحریک کا رہنما، جو عباسیوں کے خلاف تھی اس کا آغاز سجستان سے ہوا، جہاں کے لوگوں نے استادسیس کو اپنا اوتار سمجھنا شروع کیا۔ ۱۵۰ھ/۷۶۷ء کو اس کا آغاز ہوا۔ اور بہت جلد اس کے پیروؤں کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی۔ خلیفہ المنصور کے بیٹے المہدی نے اس کی مزاحمت کی اور اپنے سپہ سالار خازم کو بیس ہزار فوج کے ساتھ باغیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی شکستوں کے بعد خازم اس بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ استادسیس پہاڑوں میں جا چھپا، مگر بہت جلد گرفتار ہوا اور اپنے بیٹوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ تاہم اس کی پیروکار رہا کر دیے گئے۔

استبراء فقہ کی اصطلاح، جس سے مراد وہ مدت ہے جس میں خریدی جانے والی کنیز کے حمل کا پتا چلایا جاتا ہے۔ کیونکہ از روئے شریعت کنیز کیساتھ

اس وقت تک صحبت منع ہے، جب تک کہ اس کے بارے میں علم نہ ہو جائے کہ وہ پہلے سے حاملہ نہیں ہے۔ مدت استبراء پہلے حیض یا حمل ہونے کی صورت میں بچے کی پیدائش تک ہے۔ یہ امام مالک، امام شافعی اور امام حنبل سب کا قول ہے کہ حیض سے فراغت تک لونڈی سے تمتع ممنوع ہے۔ مذہب حنفی کی رُو سے بھی استبراء واجب ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اولاد کے نسب میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔

استحسان فقہ کی اصطلاح، جس سے مراد وہ دلیل جسے اجتہاد کے کسی خصوصی موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ کوئی منطقی دلیل نہ سوجھتی ہو لیکن اس امر کا ادراک مجتہد کے ذہن پر وارد ہو چکا ہو۔ امام شافعی کے نزدیک استحسان شرعی نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی بھی دلیل استحسان کی راہ پا سکتی ہے اور یوں ایک ہی مسئلے پر مختلف اور من مانی کارروائیاں کرنے کا راستہ نکل جاتا۔ ظاہر ہے مفتی استحسان کی آڑ لے کر کوئی بھی فتوے دے سکتا ہے۔ امام غزالی نے بھی استحسان پر اعتراض کیا ہے۔ امام مالک کے نزدیک استحسان وہ امر ہے، جس کے بارے میں ہمیں اپنے اسلاف سے کوئی ہدایت نہیں ملی۔ مذہب حنفی میں یہ ایک ایسا قیاس ہے، جو کسی دوسرے قیاس کا مخالف ہے۔ کیونکہ کسی قیاس کی مخالفت ذاتی رجحان کے تحت نہیں کی جاتی بلکہ مضبوط اور ٹھوس دلیلوں کی بنا پر جن کی گنجائش قانون میں موجود ہوتی ہے۔ یہ گویا ایک حنفی قیاس ہے جو ظاہری قیاس سے انحراف کرتا ہے چونکہ اس کی علت کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب حنفی کے نزدیک حدود شریعت سے تجاوز کا امکان ہے۔

استخارہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے اللہ تعالےٰ کی مدد طلب کرنا تاکہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کی قوت عطا کرے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو کوئی مشکل پیش آئے تو دو رکعتیں پڑھے پھر کہے۔ "اے اللہ! میں تجھ سے تیرے علم کی بنا پر خیر کا طالب ہوں اور تیری قدرت چاہتا ہوں، تجھ سے فضل عظیم مانگتا ہوں، تجھی کو قدرت ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا اور تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا اور تو غیب کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔ الٰہی! تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین اور معاش اور انجام کار میں میرے لیے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر! اور میرے لیے میسر کر! پھر اسے میرے لیے مبارک کر! اور اگر تو جانتا ہے کہ وہ میرے لیے میرے دین اور معاش اور انجام کار میں برا ہے تو اسے مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے بھلائی مقدر کر، جیسے بھی ہو اور مجھے اس پر راضی رکھ!"

استخارے پر تقریباً تمام مسلمان یقین رکھتے ہیں اور اس کے عامل ہیں۔ انھوں نے اسے قسمت معلوم کرنے کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش بھی کی ہے اور بہت سی باتیں ایسی شامل کر دی ہیں، جن کے بارے میں کوئی سند نہیں مثلاً یہ کہ مسجد میں جانا ضروری ہے۔ یا یہ کہ استخارہ رات کو سوتے وقت کرنا چاہیے اور پھر جو خواب نظر آئے وہ امر ربّی ہے، تاہم اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان تقریباً ہر کام کے لیے استخارہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی استخارے کا رواج تھا۔ آنحضورؐ بھی استخارہ کیا کرتے تھے۔ طبری اور ابن سعد نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اکثر خلفاء، محدثین اور آئمۂ کرام بھی استخارہ کیا کرتے تھے۔ اب بعض لوگوں نے اس کی کئی اور صورتیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً استخارے کے بعد خواب دیکھنا، قرآن مجید سے فال لینا تسبیح کے دانوں سے فال لینا نیز رمل اور نجوم وغیرہ۔

استرابادی کئی مسلمان علماء کا نام، جو ایران کے شہر استراباد کی نسبت سے مشہور ہیں۔ یہ شہر بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی گوشے سے تقریباً ۶۳ میل مشرق میں واقع ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے عہد میں اس شہر کا نام گرگان رکھ دیا گیا۔ اس لیے اب بعض لوگ اپنی نسبت گرگانوی بھی کرتے ہیں۔

استرابادی علماء میں امام ابونعیم عبدالملک بن عدی (وفات ۳۲۰ھ/۹۳۲ء) قاضی الحسین بن الحسین بن محمد بن الحسین (۴۱۲ھ/۱۰۲۲ء) قاضی ابونصر سعد بن محمد بن اسماعیل (وفات ۵۵۰ھ/۱۱۵۶ء) رضی الدین استرابادی اور رکن الدین استرابادی مشہور ترین ہیں۔ ان میں سے رضی الدین اور رکن الدین کا ذکر ذیل میں ہے

رضی الدین محمد بن الحسن (وفات ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء) ابن حاجب کی نحوی تصنیف "الکافیہ" کی شرح کا مصنف ہے۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ مذہباً شیعی تھا۔

رکن الدین الحسن بن محمد بن شرف شاہ العلوی (وفات ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء)۔ شافعی عالم۔ اس نے بھی "الکافیہ" پر ایک شرح لکھی، جس کا نام "الوافیہ" ہے وہ مراغہ میں فلسفہ پڑھاتا تھا اور وہاں اس نے طوسی کی "تجرید العقائد" اور "قواعد العقائد" پر شرحیں تالیف کیں۔ اسے نصیر الدین طوسی کی سرپرستی حاصل رہی اور اسی کے ساتھ وہ بغداد گیا۔ بعد ازاں وہ موصل چلا گیا، جہاں مدرسہ نوریہ میں پڑھاتا رہا۔ آخری عمر میں سلطانیہ چلا گیا، جہاں فقہ شافعی کا درس دیتا رہا۔

استسقاء پانی طلب کرنا۔ اسلام میں وہ نماز جس کے ذریعے بارش طلب کی جائے۔ اس کے لیے بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، پھر قبلہ رو ہو کر دعا مانگی جاتی ہے۔ اس نماز کے لیے اذان اور اقامت کی قید نہیں اور نہ ہی یہ نماز واجب ہے۔ تاہم سنت ضرور ہے۔ کیونکہ آنحضورؐ نے کئی بار نماز استسقاء پڑھی۔ حتیٰ کہ مشرکین کے لیے بھی بارش کی دعا مانگی۔ عام طور پر اس نماز کو کھلے میدان میں امام کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس نماز میں غیر مسلم بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ مگر شرط صرف یہ ہے کہ انھیں ناقوس وغیرہ بجانے کی اجازت نہیں۔

استصحاب فقہ کی ایک اصطلاح، جس میں دلائل کے ذریعے یہ طے کیا جاتا ہے کہ کسی چیز کا وجود اب بھی قائم ہے یا نہیں۔ تاآنکہ تبدیلی حالات سے اس میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ یہ گویا وہ دلیل عقلی ہے جس کی بنا نہ نص پر ہے نہ اجماع پر اور نہ قیاس پر۔ استدلال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک استدلال منطقی۔ دوسری استدلال عقلی۔ جسے اصطلاحاً استصحاب الحال کہا جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھا جائے گا کہ اگر کوئی امر دلیل (یعنی نص، اجماع یا قیاس کی) موجود نہیں تو پھر اسی سے کام لیا جائے۔ امام شافعیؒ کے متبعین میں سے اکثر مثلاً المزنی، الصیدنی اور الغزالی ایسے ہی امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے اکثر پیرو اور اسی طرح شیعہ امامیہ خاص خاص صورتوں میں استصحاب کے قائل ہیں، البتہ حنفیوں میں سے بعض کو اور متکلمین کی ایک جماعت کو اس سے انکار ہے۔

ابن قیم نے استصحاب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ اس سے مراد جو ثابت ہے، اس کا اثبات اور جس کی نفی ہو چکی ہو۔ اس کی نفی کو قائم رکھنا ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

قسم اوّل (استصحاب البرأۃ الاصلیہ) کا مطلب ہے برأۃ کو باقی رکھنا، ان معنوں میں کہ کسی شخص پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہو گی، جب تک کوئی دلیل شرعی اسے اس کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔ لہٰذا علمائے اصول اور فقہ میں سے بعض، مثلاً ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں استصحاب "دفع" کے لئے ہے۔

دوسری قسم کسی ایسی کیفیت کو جو شرعاً ثابت ہے قائم اور برقرار رکھنا ہے تاوقتیکہ اس میں تبدیلی ثابت نہ ہو جائے۔ یوں ماضی کا حکم حال میں باقی رکھا جاتا ہے، جسے المحصانی نے استصحاب الماضی بالحال سے تعبیر کیا ہے بقول ابن قیم الجوزیۃ یہ استصحاب ایک حجت ہے۔ جب تک کہ اس کی نفی کسی دوسری حجت سے نہ ہو جائے۔ مثلاً نکاح کے معاملے میں کہ جب تک اس کی نفی نہ ہو جائے باقی رہے گا۔

قسم ثالث کے بارے میں علمائے اصول کی دو رائیں ہیں۔ بعض کے نزدیک حکم اجماع حجت ہے، مثلاً المزنی، الصیدلی ابوعبداللہ الرازی وغیرہ کے نزدیک۔ بعض اُسے حجت تسلیم نہیں کرتے، مثلاً ابوحامد، ابوالطیب اور قاضی ابوالعلی وغیرہم۔ لیکن اس اختلاف میں دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ جس اجماع کے بارے میں نزاع ہے اس کی صورت کیا تھی۔ گویا اس میں فیصلہ کن امر خود اس اجماع کی نوعیت ہے کہ اسے حجت سمجھا جائے یا نہیں۔

شق اوّل یہ ہے کہ اگر کوئی وجہ تخصیص موجود نہ ہو تو حکم عام کی عمومیت برقرار رہے گی۔ بالفاظ دیگر عام نص کا حکم عام ہی ہو گا۔ تاوقتیکہ کوئی دوسرا نص بعض افراد کی تخصیص نہ کر دے لہٰذا یہ جائز نہ ہو گا کہ ایک ایسے حکم میں جو عام ہے بوجوہ کوئی استثنا کر دی جائے۔

شق ثانی یہ ہے کہ جو قطعی نص ہے۔ اس کا حکم حال میں باقی رکھا جائے تاوقتیکہ کوئی دوسری نص اسے منسوخ نہ کر دے۔

استصحاب القلب یا استصحاب الحال فی الماضی سے وجوہ المحصانی کے نزدیک استصحاب کی پانچویں قسم ہے۔) کا مطلب ہے کسی ایسی چیز کے وجود یا عدم وجود کو جو زمانہ حال میں ثابت ہے۔ زمانہ ماضی میں بھی ثابت ٹھہرانا۔ ہمارے سامنے ایک مروّج الوقت دستوری ضابطہ ہے اور سوال یہ کہ آیا یہ ضابطہ حضور رسالت مآب صلعم کے زمانے میں بھی مروّج تھا تو اس کا جواب اثبات میں ہو گا۔ تاوقتیکہ ہمیں اس کے خلاف کوئی دلیل مل جائے لیکن بقول المحصانی اس قسم کے استصحاب کو دلیل ترجیحی کہنا غلط ہو گا۔

یہاں ضمناً ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شریعت اسلامی اسلام سے قبل کی شریعتوں کو منسوخ کرتی ہے۔ اس کے جواب میں الآمدی کہتے ہیں کہ سوائے ان احکام کے جن کو شریعت اسلام نے برقرار رکھا باقی سب احکام منسوخ تصور ہوں گے۔ علمائے اصول کا یہی قول ہے۔

مختصراً یہ کہ جو امر جس حالت میں ہے اور از روئے شرع بھی اس کے لئے ایک خاص حکم ہے اسے اسی طرح باقی رکھا جائے گا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس حالت میں تغیر واقع ہو گیا ہے۔ ایسے ہی جس امر کے حکم کی نفی ثابت ہے۔ نہ بقا تو استصحاب الحال کا تقاضا ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے کیونکہ اس دوسری حالت کے باعث اس کا وجود قائم رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ اس میں تبدیلی کی کوئی دلیل نہ ملے اگر مل جائے تو حکم بھی بدل جائے گا۔ استصحاب الحال میں کوشش یہ کی جاتی ہے کہ حکم اور حال میں ربط تلاش کیا جائے۔ لہٰذا یہ بھی احکام کو قائم رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔

استصلاح فقہ کی ایک اصطلاح، جس کے معنی مصلحت چاہنا ہے۔ یہ بھی استحسان کی طرح ایک قسم کا قیاس خفی ہے، مگر اس کی نسبت زیادہ محدود اور مسلّم ہے۔ اس کے مطابق اگر کسی دنیوی مسئلہ کے بارے میں شریعت خاموش ہے تو مصلحت عامّہ سے استصواب کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعیؒ نے اگرچہ استصلاح کا ذکر نہیں کیا، مگر استحسان کی مخالفت میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے [illegible] ہوتا ہے کہ انھیں استصلاح سے اختلاف تھا، کیونکہ اگر [illegible] عقل اور استدلال کو معیار ٹھہرایا جائے تو امت شریعت کی راہ سے [illegible] جائے گی اور استصلاح میں خصوصاً اگر ذہن [illegible] مصلحتوں سے کام [illegible] تو یہ بھی امکان ہے کہ بآسانی غلطیوں کا [illegible] جائے۔ امام غزالی نے [illegible] سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس [illegible] [illegible] اور مفاد کے عین مطابق ہے۔ اگر [illegible] [illegible] ت کے تقاضے کے پیش نظر کوئی کام [illegible] کل ہونا لازم ہے۔ امام موصوف کے نزدیک [illegible] جو شرعاً معتبر ہے۔ دوسری وہ جو شرعاً باطل ہے [illegible] ہیں شریعت خاموش ہے۔ ان کے نزدیک [illegible] مقاصد شرعی کی حفاظت اور وہ یوں کہ ان [illegible] ان کی نسل اور ان کا مال محفوظ رہے۔

اب سوال یہ پیدا [illegible] ہے کہ جب شریعت [illegible] کیا تو استصلاح کے نام سے ایک دلیل کا [illegible] دلیل ہے تو قیاس میں پہلے سے موجود ہے [illegible] باقی نہیں رہ جاتی۔

استعانت مدد مانگنا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے [illegible] (سورۂ فاتحہ: ۵) ہم [illegible] عبادت کرتے [illegible] مانگتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے [illegible] اور صبر کرو۔ ملک تو سب اللہ ہی کا ہے [illegible] اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک روز [illegible] آنحضور صلعم [illegible] نے فرمایا [illegible] لڑکے! خدا کے حق کی حفاظت کر [illegible] تیری حفاظت کرے گا۔ خدا کے حق کی حفاظت کر تو [illegible] اور جب تجھے کچھ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگ [illegible] مدد مانگ اور جان لے کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے کسی چیز [illegible] نفع تو نفع نہیں پہنچا سکیں گے مگر اس چیز سے جو خدا نے [illegible] جمع ہو کر تجھے کسی چیز سے نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکیں گے [illegible] سے جو خدا تیرے حق میں مقدر لکھ چکا اور کاغذ خشک ہو گئے [illegible]

استنبول استانبول یا قسطنطنیہ، ترکی کا ایک شہر، جو [illegible] یورپ میں واقع ہے۔

اس کا نام قسطنطین اعظم کے نام پر ۱۱ رمئی ۳۳۰ء کو رکھا گیا تھا۔ جبکہ اس کا قدیم نام استنبول یا اسمبول تھا۔ اسلامی دور میں اسے قسطنطنیہ کے نام سے پکارا گیا البتہ عثمانی حکمرانوں احمد ثالث سے سلیم ثالث تک سکوں پر اسلامبول لکھا ہوا ملتا ہے۔

استنبول کے شہر پر مسلمانوں کا پہلا حملہ ۵۱ھ/۶۷۲ء میں یزید بن معاویہؓ کے ہاتھوں ہوا۔ سات سال کے محاصرے کے بعد وہ ناکام لوٹ گیا۔ اس محاصرے کو اس لحاظ سے شہرت حاصل ہے کہ اس میں ابو ایوب انصاریؓ شہید ہوئے۔ اور شہر کی دیوار کے تلے دفن ہوئے۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں بھی استنبول پر حملہ کیا گیا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ۷۸۲ء میں خلیفہ المہدی کے فرزند ہارون نے اپنے لشکر کے ہمراہ قیادت کرتے ہوئے کوپیک سے کوچ کیا اور ملکہ ایرین سے خراج وصول کیا۔ اس نے شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ مگر شہر پر قبضہ کی پہلی کوشش عثمانی سلاطین کے عہد میں ہوئی جبکہ بایزید اول نے ۱۳۹۶ء میں اس کا شہر محاصرہ کیا۔ جو چند ماہ تک جاری رہا۔ مگر فرانسیسیوں کی کمک کی خبر سن کر محاصرہ اٹھا لیا۔ اگرچہ اس کے بعد اسے وہاں ایک مسجد کی تعمیر کی اجازت مل گئی مگر تیمور کے حملے کے پیش نظر بایزید قسطنطنیہ کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا۔

قسطنطنیہ کی فتح مراد ثانی کے بیٹے محمد ثانی کے ہاتھوں ہوئی۔ اگرچہ مراد ثانی نے جون ۱۴۲۲ء سے ستمبر ۱۴۲۲ء تک شہر پر حملے کیے مگر سب ناکام رہے۔ محمد ثانی نے جسے محمد فاتح بھی کہا جاتا ہے، سمندر کی طرف سے سامان رسد اور ہر ممکن کمک کا راستہ روکنے کے لئے ۱۴۵۲ء میں باسفورس کے یورپی ساحل پر قلعہ رومیلی حصار بنایا۔ محاصرہ ۵ اپریل ۱۴۵۳ء کو شروع ہوا اور جمعرات ۲۹ مئی کو ختم ہوا۔ حملے کا رخ خشکی کی فصیلوں کی طرف تھا، جہاں گولہ باری کے باعث فصیلیں منہدم ہو چکی تھیں۔ ترکی بحری بیڑے کو خشکی پر سے گھسیٹ کر دوسری سمت کے سمندر شاخ زریں میں اتارا گیا۔ شہر فتح ہونے کے بعد تین روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ اس کے بعد سلطان شہر میں داخل ہوا اور آیا صوفیا میں جمعے کی نماز پڑھی۔

عثمانی حکمرانوں کے قبضے میں آجانے کے بعد صرف تین بار بیرونی فوج وہاں نمودار ہوئی۔ پہلی بار ۲۰ فروری ۱۸۰۷ء کو انگریزی امیر البحر ڈک ورتھ جو کہ اہم حملہ کے چند ہی روز بعد واپس ہو گیا اور دوسری بار ۱۸۷۸ء میں روسی لشکر کا حملہ ہوا جس نے شہر پر تو قبضہ نہ کیا البتہ اس کے اطراف میں ڈیرہ ڈال لیا۔ تیسری بار ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو انگریزی اور فرانسیسی فوجوں نے کچھ عرصہ کے لئے شہر پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے استنبول ترکی کا مرکزی شہر اور پایہ تخت نہ رہا۔ نئی جمہوری حکومت نے انقرہ کو دارالحکومت بنایا۔ آج کل یہ شہر جمہوریہ ترکی کے ایک صوبے کا مرکز ہے جس میں خلیج باسفورس کے دونوں طرف کا علاقہ اور جزیرہ نمائے بوزبرون کا شمال مغربی حصہ شامل ہے۔ اس صوبے کا مجموعی رقبہ ۵۲۹۰ مربع کیلومیٹر ہے۔ اس میں سے یورپی علاقہ ۳۳۰۲ مربع کیلومیٹر اور ایشیائی علاقہ بشمول جزائر ۵۴۱۰ مربع کیلومیٹر ہے۔ ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق استنبول کی آبادی ۱۳۶۶۵۲۵ نفوس پر مشتمل تھی۔

سمندر کا وہ حصہ جسے شاخ زریں کہا جاتا ہے۔ یورپی استنبول کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک کا نام غلطہ اور دوسرے کا پیرا ہے۔ اب دو پلوں کے ذریعے دونوں حصوں کو ملایا گیا ہے۔ ایک پل کا نام غلطہ اور دوسرے کا اتاترک ہے۔

استنبول (قسطنطنیہ) کا شہر پچھلے سولہ سو برس سے رومی، بزنطینی اور عثمانی حکومتوں کا دارالحکومت رہا۔ اس دوران میں اٹھنے والی تمام تر تہذیبوں کی عکاسی اسی شہر میں کی گئی۔ تعلیم و تعلم، طرز تعمیر، آرٹ، علوم اور عجائب میں دنیا کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خصوصاً عثمانی دور میں اسلامی ثقافت اور تہذیب کے بیشمار نمونے معرض وجود میں آئے۔ نتیجۃً بہت جلد یہ شہر اپنے علم و فضل اور تہذیب و ثقافت کی بنا پر دنیا بھر میں اہم ترین مقام حاصل کر گیا۔

استنبول میں دو یونیورسٹیاں (جن میں سے ایک صنعتی علوم کی یونیورسٹی ہے) فنون لطیفہ کی اکیڈمی، اقتصادیات و تجارت کا ایک اعلیٰ مکتبہ اور ہر قسم کی صنعت و حرفت سے متعلق متعدد مدارس موجود ہیں۔ یہاں بے شمار کتب خانے اور عجائب گھر ہیں صنعتی لحاظ سے بھی یہ شہر ترکی کا اہم ترین شہر ہے۔ ترکی کی کل صنعتوں کا چھٹا حصہ اسی شہر میں ہے۔

ساحل استنبول پر جامع دولما باغچہ

استنبول کے اکثر بازار مسقف ہیں۔ ان میں سے بڑے بازار کی بنیاد محمد ثانی نے ڈالی تھی۔ ۱۰ جولائی ۱۸۹۴ء کو اسے زلزلے سے سخت نقصان پہنچا۔ اس سے ملتا جلتا بازار مصری بازار ہے۔ جسے سلیمان اول نے ۱۵۶۰ء میں بنایا تھا اور جسے آگ لگ جانے کے بعد ۱۶۰۹ء میں احمد اول نے دوبارہ پتھر سے بنایا۔ یہ جامع ینی کے قریب بندرگاہ کی جانب واقع ہے۔

استنبول ہوٹلوں اور سراؤں کا شہر ہے۔ قدیم ترین سرائیں ان سڑکوں پر ہیں جو بندرگاہ سے بڑے بازار کو جاتی ہیں۔ سرائے والدہ خان جو چار سو کمروں پر مشتمل ہے قدیم ترین سرائے ہے۔ اسے کوسم والدہ سلطان نے تعمیر کرایا تھا۔ ایسی تقریباً دو سو عمارتیں تھیں جنہیں کسی زمانے میں کاروان سرائے کی حیثیت حاصل تھی، مگر اب ناپید ہو چکی ہیں۔

قدیم ترین عمارتوں میں سب سے اہم شاہی محلات ہیں۔ بزنطینی عہد کے ویران شاہی محلات اب بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اسلامی عہد کا سب سے قدیم محل محمد ثانی نے شہر کے عین درمیان کی تیسری پہاڑی پر تعمیر کرایا۔ ۱۸۷۰ء میں اسے گرا کر نئی عمارت اس کی سرائے کے نام سے تعمیر کی گئی۔ محمد فاتح کی تعمیر کردہ عمارات میں اب صرف چینی کوشک باقی ہے جو ستمبر ۱۴۷۲ء میں بن کر تیار ہوئی۔ بعد کے سلاطین نے محلات کا ایک پورا سلسلہ قائم کیا۔ ان میں سے مشہور ترین بغداد کوشک، جسے مراد رابع نے تعمیر کرایا، اینجلی کوشک، بحیرہ مارمورا پر اور یالی کوشک شاخ زریں پر ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر اب معدوم ہو چکے ہیں۔

استنبول مساجد کا شہر ہے۔ جہاں عثمانی عہد کا طرز تعمیر اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں آیا صوفیا کی مسجد، جو پہلے عیسائیوں کا گرجا تھی، اب عجائب گھر ہے

غلطہ پل جو کبیرۂ فاسفورس کے دونوں کناروں پر شہر استنبول کو ملاتا ہے

تبدیل ہو چکی ہے (دیکھیے "آیا صوفیا")، دیگر مساجد میں سلطان فاتح کی تعمیر کردہ "جامع محمدیہ" (تعمیر ۸۶۷ھ/۱۴۶۲ء) اہم ترین ہے۔ اس میں بہت سے اوقاف اور آٹھ مدرسے ہیں۔ اسی میں سلطان محمد فاتح کی قبر بھی ہے۔ ۱۷۷۱ء میں اس مسجد کی تعمیر نو ہوئی۔ مسجد بایزید ثانی، جس میں اس کی قبر بھی ہے، بڑے بازار میں واقع ہے یہ مسجد ۱۵۰۶ء میں تعمیر ہوئی جامع سلیمیہ کو سلیمان اوّل نے ۱۵۲۲ء میں مکمل کرایا۔ اس میں سلطان عبدالمجید اور سلیم اوّل کی قبریں ہیں۔ شہر کی سب سے اونچی اور شاندار مسجد جامع سلیمانیہ ہے۔ اسے سلیمان اوّل کی فرمائش پر ۱۵۵۷ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس سے وابستہ چار مدرسے اور ایک لنگر خانہ ہے۔ سلیمان اوّل، سلیمان ثانی اور احمد ثانی کی قبریں اسی میں ہیں۔ احمد اوّل کی ۱۶۱۷ء کی تعمیر کردہ جامع احمد آت میدان میں واقع ہے۔ اس میں احمد اوّل احمد ثانی، مراد رابع اور اس کی ماں کوسم والدہ کی قبریں ہیں۔ شاخ زریں کے ساحل پر جامع یکی ہے، جسے کوسم والدہ نے تعمیر کرایا۔ یہ مسجد ۱۶۶۴ء کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں محمد رابع، مصطفیٰ ثانی، احمد ثالث اور عثمان ثالث کی قبریں ہیں، مسجد نور عثمانیہ دوسری پہاڑی پر بڑے بازار کے پاس ہے، اسے محمود اوّل نے ۱۷۴۸ء میں شروع کیا اور عثمان ثالث نے ۱۷۵۵ء میں مکمل کیا۔ شہر کے اندرون حصہ میں مسجد لالہ لی ہے جسے ۱۷۶۳ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہاں سلیم ثالث کی قبر ہے۔

استنبول میں شاہی مسجدوں کے علاوہ کل پانچسو مساجد ہیں۔ جن میں آیا صوفیا کو چھوڑ کر چند ایک مساجد قابل ذکر ہیں۔ ان میں محمد فاتح کی تعمیر کردہ جامع زیرک، محمود پاشا کی جامع مسجد، مراد پاشا کی جامع مسجد، بایزید ثانی کی جامع وفا، داؤد پاشا کی جامع مسجد مصطفیٰ پاشا کی جامع مسجد، علی پاشا کی جامع مسجد، مہر ماہ سلطان کی جامع مسجد، رستم پاشا کی جامع مسجد، محمد پاشا کی مسجد، مراد ثالث کی جامع فتحیہ، جراح محمد پاشا کی مسجد اور کلیسا جامع جسے بایزید ثانی کے عہد میں مسجد بنا یا گیا، زیادہ اہم ہیں۔

مزارات میں سے حضرت ایوب انصاری کا مزار گورستان ایوب میں ہے، جو ایوان سرائے کے سامنے واقع ہے۔ ۸۶۳ھ/۱۴۵۹ء میں اسی مقام پر محمد فاتح نے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ مقبرے کی آخری بار مرمت محمود ثانی ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں کی۔ اس میں تبرکات نبوی موجود ہیں، جن میں سے آنحضور کا نقش قدم اور علم قابل ذکر ہیں۔ اس گورستان میں سلطان عبدالحمید اوّل، مصطفیٰ چہارم، محمود ثانی اور عبدالعزیز کے مقبرے بھی ہیں۔

قدیم شہر قسطنطنیہ کے گرداگرد بزنطینی حکمرانوں نے فصیلیں تعمیر کی تھیں جن میں سے اکثر منہدم ہو چکی ہیں۔ محمد ثانی نے فتح کے چند سال بعد ان کی مرمت کی اور سات برجوں کا قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۴ ستمبر ۱۵۰۹ء کے بڑے زلزلے نے انھیں نقصان پہنچایا تو بایزید ثانی نے انکی مرمت کرائی۔ مراد رابع اور احمد ثالث نے بھی انھیں مرمت کرایا۔ بخراب شکستہ حالت میں آثار قدیمہ کی حیثیت سے قائم ہیں۔

شاخ زریں پر غلطہ اور سرائے مابین سلطان محمود ثانی نے پہلی بار کشتیوں کا پل تعمیر کرایا تھا اب وہاں پختہ پل موجود ہے۔ اس سے پہلے بزنطینی عہد میں اس خلیج کا راستہ دشمن کے بیڑوں کو روکنے کے لیے ایک زنجیر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

استنبول کے عجائب گھروں میں آیا صوفیا کا عجائب گھر اور طوپ قپو کی سرائے اہم ہیں، یہاں رومی، بزنطینی اور عثمانی عہد کی سینکڑوں قیمتی اشیا رکھی گئی ہیں، خصوصاً طوپ قپو میں عثمانی سلطانوں کے آثار، جواہرات، ملبوسات اور اشیائے آراستگی وغیرہ کے علاوہ چینی، جاپانی، عربی اور یورپی عجائبات بھی رکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آثار قدیمہ کا ایک عجائب گھر اور ایک فوجی عجائب گھر بھی ہے، جہاں تمام متعلقہ اشیا موجود ہیں۔ آثار قدیمہ کا عجائب گھر "اوقاف" کہلاتا ہے، یہاں اسلامی اور ترکی آرٹ اور ادب کے بے شمار نمونے رکھے گئے ہیں۔

استنجا پاکیزہ ہونا۔ فقہ کی رو سے ہر مسلمان کے لیے قضائے حاجت کے بعد استنجا

واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک استنجا پانی کے ساتھ کرنا مستحب ہے۔ تاہم مٹی کے ڈھیلے وغیرہ کافی ہیں۔ اگر نجاست زیادہ نہ ہو تو ڈھیلے سے استنجا کر لینا کافی ہے اور اگر یہ نفاست مزاج کے خلاف ہو تو ڈھیلوں کے بعد پانی سے استنجا کرنا واجب ہے۔ لیکن کاغذ، ہڈی، شیشہ، کھانے کی چیز، ٹھیکرا، نمک، گوبر اور دوا میں لتھڑ وغیرہ سے استنجا کرنا ممنوع ہے۔

اسحاق ؑ اللہ کے برگزیدہ نبی، حضرت ابراہیم کے دوسرے فرزند، حضرت سارہ کے بطن سے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ سے عمر میں چودہ یا بیس برس تک چھوٹے تھے۔ جبرون "الخلیل" میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کی بشارت سارہ کو بڑھاپے کے سالوں میں ملی۔

روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بے حد مہمان نواز تھے۔ جب تک مہمانوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا نہیں کھلا لیتے تھے خود کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ پندرہ روز تک کوئی مہمان نہ آیا تو تین اجنبی وہاں آئے۔ قرآن مجید میں اس موقعے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا تیرے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر آئی؟ جب وہ داخل ہوئے اور سلام [illegible] نے جواب میں سلام کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں۔ پس وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف [illegible] ایک موٹا بچھڑا لے آیا۔ سو اسے ان کے نزدیک کیا۔ کہا کیا تم کھاتے نہیں؟ [illegible] دل میں ان سے ڈرا، انہوں نے کہا ڈرو نہیں اور [illegible] کی خوشخبری دی۔ [illegible] عورت چیخ مار کر سامنے آئی اور اپنے

[illegible] جبرون میں حضرت اسحاق کا مزار

سر پر ہاتھ مار کر کہا میں تو بانجھ بوڑھی عورت ہوں۔" (الذریات - ۲۴ تا ۲۹)

اسرائیلی روایات میں بھی یوں ہے کہ چند لوگ آئے اور ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی خوشخبری دی۔ سارہ کے اسحاقؑ پیدا ہوئے اور جب وہ آٹھ دن کے ہوئے تو ابراہیمؑ نے ان کا ختنہ کرایا اور ابراہیمؑ اس وقت سو برس کے لگ بھگ تھے اور سارہ نے کہا، اللہ نے میرے لیے ہنسی مقدر فرمائی اور جو شخص میرا معاملہ سنے گا ہنسے گا۔ حضرت اسحاقؑ کچھ بڑے ہوئے تو عہد نامہ قدیم کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کی قربانی پیش کی۔ جب کہ مسلمانوں کے نزدیک یہ شرف حضرت اسماعیلؑ کو حاصل ہوا۔

چالیس برس کی عمر میں حضرت اسحاقؑ کی شادی رفقہ نامی خاتون سے ہوئی جو حضرت بوا کی بیٹی تھیں۔ بعض انہیں تنویل کی بیٹی بتاتے ہیں۔ ان کے بطن سے عیسو اور پھر یعقوب پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے ملک میں قحط پڑا، جس پر حضرت اسحاقؑ فلسطین کے علاقے جرار میں اقامت پذیر ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ آخر عمر میں بئر السبع منتقل ہو گئے، جہاں "بیت ایل" کے نام سے ایک ہیکل تعمیر کیا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کی عظمت اور بزرگی کے لیے دعا فرمائی۔ جس کے نتیجے میں عیسو کو حکومت اور یعقوب کو نبوت آپ کی زندگی ہی میں مل گئی۔ آپ کا انتقال جبرون میں ہوا اور وہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ان کے مزار مکفیلہ کے غار میں ہیں۔ جس پر "الخلیل" کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔

اسحاق بن ندیم (جمادی الآخر ۲۹۶ھ / مارچ ۹۱۰ء — ۲۰ شعبان ۳۸۵ھ / ۱۹ ستمبر ۹۹۵ء) محمد بن اسحاق بن ندیم وراق، مورخ اور فہرست نویس۔ بغداد میں تعلیم پائی۔ عمر کا بڑا حصہ وہیں گذارا۔ اکثر علوم میں مہارت پیدا کی۔ کیمیاگری کا شغف بھی تھا۔ پیشہ کتب فروشی تھا۔ کتابوں کی تصحیح اور نقل کا کام کیا کرتے تھے۔ اسی لیے وراق کہلائے۔ ان کی تصنیف "الفہرست" دنیا کا پہلا اور بڑا گراں بہا تذکرہ ہے۔ جس میں چوتھی صدی ہجری تک عربی میں دستیاب کتابوں کی تفصیل ملتی ہے۔ صرف و نحو کی تدوین اور کلام اللہ کی تالیف کی بھی کچھ تفصیلات اس میں ہیں۔ "الفہرست" میں جن کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تاتاری حملے میں تباہ ہو گئیں۔ اس لیے اس تذکرے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

اسد، بنو (غزوہ) ایک عرب قبیلہ، جس کے ساتھ آنحضرت صلعم کو غزوہ پیش آیا۔ یہ خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ تھا جو شمال عرب کے اس مقام سے [illegible] تھا، جہاں کسی زمانے میں بنو طے آباد تھے۔ قبیلہ طے اور قبیلہ غطفان کے ساتھ ان کے مستقل اور پائدار تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ مگر عرصے کے بعد ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے، جنہیں اسلام ہی نے دور کیا۔

غزوہ احد کے بعد آنحضرت صلعم کو یہ خبر ملی کہ خویلد کے لڑکے طلیحہ اور بنی اسد کے سردار سلمہ اپنے قبیلے کو مدینہ پر حملہ کرنے اور مسلمانوں کا مال و متاع لوٹنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ انھیں یہ جرأت اس لیے ہوئی کہ وہ غزوہ احد کے بعد مسلمانوں کو کمزور سمجھنے لگے تھے۔ آنحضرت صلعم نے حضرت ابوسلمہؓ کو ڈیڑھ سو مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ قبیلہ بنی اسد کی طرف جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ رات کو سفر جاری رکھے اور دن میں نقل و حرکت کا راز پوشیدہ رہے اور غیر معروف راستے سے سفر کرنا چاہیے۔ ابوعبیدہ سعدؓ بن ابی وقاص اور اسید بن حضیر بھی غزوہ میں شریک تھے۔ حضرت ابوسلمہؓ نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ایک روز بے خبری کے عالم میں بنی اسد پر حملہ بول دیا۔

یہ ۴ھ / ۶۲۵ء کا واقعہ ہے۔ بنو اسد نے، جو قطن میں تھے، مسلمانوں سے شکست اٹھائی۔ ابوسلمہؓ خود وہیں ٹھہرے اور مسلمانوں کی ایک جمعیت کو مفرورین کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ بنی اسد کے کچھ لوگ گرفتار کر لیے گئے اور ان کا مال قبضے میں لے لیا گیا۔ خمس نکال کر غنیمت کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں نے کسی حد تک اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر لیا۔

روایت ہے کہ بنو اسد کے سردار طلیحہ نے مدینہ کے اس محاصرے میں حصہ لیا، جو

عام طور پر غزوہ خندق کے نام سے مشہور ہے۔ رسول اللہ کے خلاف بہت سی ناکام لڑائیوں کے بعد بنو اسد میں قحط پڑ گیا اور طلیحہ نے ۹ ھ/ ۶۳۰ء کے شروع میں مدینے میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ مگر آنحضورؐ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ فتنہ ارتداد کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید نے اسے شکست فاش دی اور پہلی بار اس کا علاقہ اسلامی ریاست میں شامل ہوا۔ طلیحہ نے دوبارہ اسلام قبول کرنے کے بعد عراق اور ایران کی مہمات میں حصہ لیا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک بنو اسد نے حلہ اور خوزستان کے علاقوں میں حکومت اختیار کرلی۔ اس کے بعد یہ دو قبیلوں بنو مزید اور بنو دبیس میں تقسیم ہو گئے۔ سلطان محمد ثانی کے عہد کے بعد سے یہ ایک بار پھر متحد ہو گئے آج کل یہ لوگ عراق میں منتشر ہیں۔ ان کا سردار شیخ سالم ہے، جسے ۱۹۲۵ء میں شاہ عراق فیصل کی مخالفت کے جرم میں گرفتار کرکے بلد وزمیں جلاوطن کر دیا گیا۔

اسرار احمد، ڈاکٹر عالم دین، خطیب، مفسر قرآن۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علوم پر دسترس حاصل ہے۔ ابتدا میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی سے اثر قبول کیا اور کچھ عرصہ عملی وابستگی بھی رہی۔ پھر کچھ اختلاف ہونے کے باعث الگ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب دینی امور و مسائل پر شگفتہ انداز میں اپنے مخصوص اسلوب میں تقریر کرتے ہیں۔ انداز تحریر بھی سادہ اور دلنشیں ہے۔ تنظیم اسلامی کے سربراہ اور ماہنامہ "میثاق" لاہور کے مدیر ہیں۔

اسرافیل ایک بزرگ فرشتے کا نام۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق خدا نے انہیں صور پھونکنے پر مامور کیا ہے۔ جب قیامت آئے گی اسرافیل صور پھونکیں گے۔ تو تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے اور دوبارہ صور پھونکیں گے تو حشر برپا ہو جائے گا اور سب مخلوقات زندہ ہو کر میدان حشر کی طرف دوڑیں گی۔

قرآن مجید میں صور پھونکنے کا ذکر ہے مگر اسرافیل کا نام کہیں نہیں آیا۔ طبری، نسائی اور غزالی وغیرہ نے صور پھونکنے کے تفصیلی احوال لکھے ہیں، عبرانی زبان میں بھی ایک فرشتے کا نام سیرافین یا سیرافیل ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ساتویں زمین سے بھی نیچے کھڑا ہے اور اس کا سر عرش پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے چار پر ہیں جن میں سے ایک مشرق کو اور ایک مغرب کی سمت پھیلا ہوا ہے اس کے ذمے خدا تعالےٰ کے احکامات کو لوح محفوظ سے پڑھنا اور انہیں دیگر فرشتوں تک پہنچانے کا کام ہے۔ وہ دن میں تین بار اور رات کو تین بار دوزخ میں جھانکتا ہے اور غمزدہ ہو کر آنسو بہاتا ہے کہا جاتا ہے ذوالقرنین کی اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی، جب وہ بحر ظلمات کے پاس ایک پہاڑی پر کھڑا تھا اس کے منہ میں صور تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہودیوں کے ہاں صور پھونکنے کا عقیدہ نہیں پایا جاتا بلکہ یہ صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

اسراء رات کے وقت لے جایا گیا۔ اصطلاحاً اس کا تعلق قرآن مجید کے اس حوالے سے ہے، جس میں آنحضورؐ کے معراج کے بارے میں ذکر آتا ہے:۔

سبحن الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی برکنا حولہ (بنی اسرائیل ۱:) پاک ہے وہ ذات ہے، جس نے رات کے وقت اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر کرایا۔ جہاں ہم نے اپنی برکتیں نازل کیں۔

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق آنحضور صلعم معراج کی رات مکہ سے بیت المقدس کی طرف لے جائے گئے تھے اور وہاں سے آپؐ کو معراج نصیب ہوا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسراء اور معراج ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ معراج کا لفظ عروج سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر جانے کے ہیں اور اسراء، رات کے وقت لے جانے کو کہتے ہیں۔ گویا مکانی حیثیت سے یہ معراج ہے اور زمانی اعتبار سے اسراء۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معراج دو دفعہ ہوئی۔ ایک کا نام اسراء ہے اور دوسری کا معراج۔ ان کے نزدیک اسراء مکہ سے بیت المقدس تک ہوا اور معراج زمین سے آسمان تک۔ معراج ابتدائے بعثت میں ہوئی اور اسراء ہجرت سے ایک یا دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ چنانچہ ابن سعودؓ، عائشہؓ اور ام سلمہؓ کی روایات میں صرف بیت المقدس تک جانے کا ذکر ہے۔ (نیز دیکھیے تفصیلی بحث بعنوان "معراج")

اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا لقب، جس کا ذکر قرآن مجید میں صرف ایک بار آیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ہر قسم کا کھانا، بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا، سوائے اُن چیزوں کے جنہیں اسرائیل نے تورات کے نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔" (۳=۹۳)

عہد نامہ عتیق میں حضرت یعقوب کے اسرائیل لقب رکھے جانے کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ اپنے بھائی [illegible] گئے اور رات کو دریا پار کر رہے تھے تو ایک آدمی ان کے ساتھ رات بھر کشتی کرتا رہا دونوں میں سے کوئی بھی غالب نہ ہوا تھا پو پھٹنے پر اس نے کہا:۔ "مجھے جانے دے، کیونکہ پو پھٹ چلی" یعقوب نے کہا جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہ دوں گا تب اس نے اس سے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا "یعقوب" اس نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں ہوگا۔ بلکہ اسرائیل ہوگا۔ کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔" (پیدائش ۳۲۔ ۲۶ تا ۲۹)

اسرائیل کے معنی اللہ کی طرف رات کے وقت چلنے یا بڑھنے کے ہیں۔ [illegible] یہ لقب اسرائیل اس لیے پڑا کہ عہد نامہ عتیق کے مطابق حضرت یعقوب نے [illegible] دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی زمین پر کھڑی ہے اور اس کا سرا آسمان تک پہنچا ہے اور خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں اور خداوند اس کے اوپر کھڑا کہہ رہا ہے کہ میں خداوند تیرے باپ ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا ہوں۔ [illegible] تو لیٹا ہے، تجھے اور تیری نسل کو دوں گا۔ (پیدائش ۲۸۔ ۱۳۔ ۲۰)

حضرت یعقوب کی نسل بنو اسرائیل کہلائی۔ سینکڑوں برس [illegible] بیسویں صدی میں یہ قوم اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ قرآن مجید میں [illegible] بنو اسرائیل کا باقاعدہ ذکر آیا ہے اور ایک سورت بھی اسی نام سے ہے۔ [illegible] یہودیت ہے جس کی بنا پر انھیں یہودی کہا جاتا ہے۔ (نیز دیکھیے "اسرائیل، حکومت" "اسرائیل، بنو" "بنی اسرائیل، سورۂ" "صیہونیت" "یہودہ" "یہودیت")

اسرائیل یہودیوں کی قوم اور ملک کا نام، جو ارض مقدس، فلسطین وغیرہ پر قابض تھی۔ ایشیا میں موجودہ مملکت بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ تقریباً دو ہزار برس تک بھٹکنے کے بعد یہودیوں کی موجودہ سلطنت اسرائیل کا قیام ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عمل میں آیا ہے۔ یہ قیام سرزمین عرب پر ایک غاصبانہ قبضہ ہے، جسے ابھی تک مسلمانوں اور ان کی حکومتوں نے تسلیم نہیں کیا۔

اسرائیل کے شمال میں لبنان، مشرق میں شام اور اردن، جنوب میں خلیج عقبہ [illegible] مغرب میں مصر کا صحرائے سینا اور مغرب میں بحیرہ روم واقع ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے اسرائیل کی حدود میں اضافہ ہوا اور اردن کا کچھ علاقہ بشمول یروشلم، شام کا کچھ حصہ اور مصر کے صحرائے سینا کا کچھ علاقہ ناجائز طور پر قبضہ میں کر لیا ہے۔

تاریخی پس منظر: مملکت اسرائیل کی تاریخ یہودیوں کی تاریخ ہے۔ جو تین ہزار سال سے زائد کی مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے فراعنۂ مصر کے پنجۂ استبداد سے نکال کر لائے اور انہیں ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ مگر بنی اسرائیل نہ مانے اور خدا کے حکم سے چالیس برس تک وادی تیہ میں بھٹکنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے مگر وہ کبھی بھی اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد آنے والے نبی شموئیل نے ۱۰۳۰ ق م میں حضرت طالوت (ساؤل) کو بادشاہ مقرر کردیا حضرت شموئیل نے یہودیوں کے بارہ قبائل کو متحد کردیا جو اس سے پہلے قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔

حضرت طالوت کے بعد ۱۰۰۴ ق م میں حضرت داؤدؑ تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور حکومت میں بیت المقدس فتح ہوا۔ حضرت داؤدؑ نے تابوت سکینہ کو محفوظ کرنے کے لیے کہ اس میں ... رکھے جاتے تھے، ہیکل تعمیر کرنے کا آغاز کیا اور ۹۶۵ ق م میں جب ان کا انتقال ہوا تو حضرت سلیمانؑ تخت نشین ہوئے۔ ان کی سلطنت ایک طرف یمن اور دوسری طرف فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۹۶۰ ق م میں انہوں نے ہیکل کی تعمیر شروع کرائی۔ انہوں نے ایک مضبوط بحری بیڑہ بھی بنایا، جو نہایت فعال اور مستحکم تھی۔

حضرت سلیمانؑ کا انتقال ۹۲۵ ق م میں ہوا اور اس کے ساتھ ہی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ جنوبی سلطنت یہودہ کا پایۂ تخت یروشلم تھا اور اس میں جنوبی فلسطین اور ادوم شامل تھا۔ شمالی سلطنت کا دارالحکومت سامرہ (نابلس) تھا اور یہ شمالی فلسطین اور مشرق اردن پر مشتمل تھی۔ اسرائیل کا حکمران یربعام بن نباط تھا۔ دونوں سلطنتیں عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہیں۔ یربعام کی حکومت بائیس برس تک رہی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ندب اسرائیل کا بادشاہ بنا۔ تیسرے برس اسے اخیاہ کے بیٹے بعشا نے قتل کیا اور اس کی جگہ حکومت کرنے لگا۔ اس نے چوبیس برس تک حکومت کی۔ اس کا بیٹا ایلہ اسرائیل کا حاکم بنا تو دو ہی برس کے بعد اس کے خادم زمری نے اسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ سات ہی روز بعد اسے اسرائیلیوں کے سپہ سالار عمری نے گھیر کر اپنے محل میں زندہ جلوا دیا۔ عمری نے بارہ برس تک حکومت کی۔ اس کے بیٹے اخیاب نے بائیس برس تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں اسرائیل کی سلطنت بت پرستی کی طرف مائل ہوگئی تھی۔ شاہ ارام بن ہدد سلطنتِ اسرائیل پر حملہ آور ہوا۔ ان لڑائیوں میں اخیاب مارا گیا اور اس کا بیٹا اخزیاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی یورام تخت نشین ہوا۔ اس نے بارہ برس تک اسرائیل پر حکومت کی۔ اس کے دور میں بھی بن ہدد اسرائیل پر چڑھ آیا اور سامریہ کا محاصرہ کرلیا۔ مگر بہت جلد محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گیا اسے یاہو نے قتل کیا اور تخت نشین ہوا۔ یاہو کے زمانے میں سلطنت اسرائیل کی حدود کم ہونے لگیں۔ اس نے اٹھائیس برس تک حکومت کی، جس کے بعد اس کا بیٹا یہوآخز تخت نشین ہوا۔ اس نے سترہ برس حکومت کی۔ اس کے عہد میں ارامیوں کے قبضے سے اسرائیل کے اکثر علاقے واپس ہو گئے۔ اس کے بعد اس کے بیٹے یوآس نے سولہ برس تک حکومت کی۔ اس نے یہودہ کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں اس کے بیٹے یربعام نے بھی ان جنگوں کو جاری رکھا۔ یربعام نے اکتالیس برس تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زکریا تخت نشین ہوا۔ اس نے صرف چھ ماہ ہی حکومت کی تھی کہ یبیس کے بیٹے سلوم نے اس کے خلاف سازش کر کے اسے قتل کردیا اور تخت پر قبضہ کرلیا اس نے صرف مہینہ بھر حکومت کی کہ اسے بھی ایک شخص مناحم بن جادی نے قتل کردیا اور اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس نے دس برس حکومت کی تھی کہ آشوریہ کا حکمران اسرائیل پر چڑھ دوڑا اور بے شمار دولت لے کر لوٹا۔ مناحم اسی غم میں مرگیا تو اس کا بیٹا فقحیاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے ایک سردار فقح بن رملیاہ نے اس کے خلاف سازشوں کا آغاز کردیا دو ہی برس بعد وہ اسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے دور میں آشوری بادشاہ تگلت پلاسر ایک بار پھر اسرائیل پر چڑھ دوڑا اور اس نے عیون، قادس، جلعاد اور نفتالی تک کے سارے علاقے پر قبضہ کرلیا اور یہودیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ فقح بن رملیاہ کے خلاف بھی سازشوں کا آغاز ہوا اور ہوسیع بن ایلہ نے اسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ اس نے کل نو برس حکومت کی۔ اس نے تگلت پلاسر کی اطاعت قبول کرلی۔ تگلت پلاسر نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے گرفتار کرلیا اور اس کی حکومت کے نویں برس اسرائیل پر قبضہ کرلیا۔ اس نے اسرائیلیوں کو غلام بنا کر سامریہ سے نکالا اور آشوری شہروں میں لے گیا اور انکی جگہ بابلیوں کو سامریہ کے شہروں میں لا بسایا۔ اس وقت صرف یروشلم میں یہودیوں کی حکومت یہودہ قائم تھی۔ یہ سلطنت بھی عرصہ تک آشوریوں کی ماتحت رہی حتیٰ کہ آشوری بادشاہ نبوکدنضر نے یروشلم پر حملہ کردیا۔ اس نے ہیکل سلیمانی کا نام و نشان تک مٹا ڈالا اور یہودہ کے بادشاہ صدقیاہ سمیت سارے یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ (دیکھیے: یہودہ)

عہد نامہ عتیق کی رُو سے نبوکدنضر کے حملے کے ستر برس بعد شاہِ فارس کسریٰ (خورس) نے بابل پر حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو آزاد کرایا۔ یہ لوگ اس کے ساتھ ہی اپنے شہروں کو واپس آئے۔ انھوں نے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کیا جسے نبوکدنضر کے فوجیوں نے جلا ڈالا تھا۔ اس کے بعد سے بیسویں صدی تک کبھی بھی یہودیوں کو خود مختار حکومت نصیب نہ ہوئی ابتدا کچھ عرصہ وہ ایرانیوں اور پھر رومیوں کے ماتحت رہے۔ سکندر اعظم کی وفات کے بعد یروشلم یونانیوں کے قبضے میں آیا۔ یہودیوں کے لیے تباہی مقدر ہو چکی تھی۔ رومیوں اور یونانیوں کے پے در پے حملوں نے ان کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر ڈالی۔ اسی دوران میں حضرت عیسیٰؑ نے جنم لیا۔ انہوں نے یہودیوں کی اصلاح کے لیے تبلیغ شروع کی مگر یہودی جرائم جن کی گھٹی میں پڑ چکے تھے، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور انہوں نے عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کردیا۔ ان کے بعد عیسائیت نے فروغ پایا اور یہودی اپنے تعصب اور احساس تفاخر کے تحت محدود ہوتے چلے گئے۔ قیصر روم نے یہودیوں کے نسلی تفاخر کو دبانے کے لیے یروشلم پر حملہ کیا اور اس کے سپہ سالار طیطس نے بیت المقدس کو جلا ڈالا، جس میں ہزاروں یہودی بھی زندہ جل مرے۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ تباہی اتنی مکمل تھی کہ کوئی یہودی باقی نہ رہا، جو یہ بتا سکتا کہ ہیکل کا وجود

کہاں تھا۔

۱۰۱ء سے لے کر ۲۳۶ء تک مختلف برسوں میں یہودی یروشلم میں دوبارہ آباد ہوئے انہوں نے عیسائیوں کو بے دریغ قتل کیا مگر اقتدار پھر بھی حاصل نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ ۳۲۶ء میں رومی حکمران قسطنطین نے بیت المقدس کو عیسائی ریاست میں شامل کر دیا۔ سارا شہر عیسائی ہوگیا۔ ۳۹۵ء میں بیت المقدس روم کی مشرقی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس وقت

شہر عکہ کی جامع مسجد

سے لے کر کامل ڈیڑھ صدی تک یہودیوں کی وجہ سے یہ شہر حرام کاری اور بدکاری کے عروج پر رہا۔ بالآخر رومی حکمران ہرقل نے انھیں نکال دیا۔ چنانچہ یہودیوں نے ایرانی بادشاہ خسرو ثانی کی پناہ لی اور اس کے ساتھ مل کر بیت المقدس سے عیسائی قبضہ ختم کرایا۔ چودہ برس بعد روم کے شاہ ہرقل نے عیسائیوں کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے حملہ کیا اور خسرو شاہ ایران کی فوجوں کو شکست دی۔ اصلی صلیب یروشلم لے گیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال باہر کیا۔

یہ وہ وقت تھا، جب عرب میں آفتابِ نبوت ضیاء بار ہو چکا تھا اور فتح روم کی بشارت مل چکی تھی۔ سورۂ الروم میں یہ بشارت موجود ہے، سرداران عرب مسلمانوں اور آنحضرت صلعم کا مذاق اڑاتے تھے۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ بشارت شہادت میں تبدیل ہوئی اور ہرقل نے یروشلم پر قبضہ کر لیا تو سرداران عرب اور خصوصاً یہودیوں کے حوصلے پست ہوگئے شاہ ہرقل کی کامیابی سے لے کر ۶۳۷ء تک یعنی جب بطریق نے ستر روز تک یروشلم کے محاصرے کے بعد یہ شہر مسلمانوں کے حوالے کیا، یہ شہر عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت سے لے کر، جب بخت نصر نے یہودیوں کو یروشلم سے نکالا، اب تک یہ لوگ مخصوص ذہنیت، متعصبانہ فطرت اور احساس برتری کی وجہ سے ہر دور میں معتوب رہے۔ یہ دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں میں بھٹکتے رہے، مگر الگ تھلگ رہنے کی خواہش کی وجہ سے کہیں بھی قومیت کے حقوق حاصل نہ کر سکے اور نہ کسی ملک کی تحریک ہی میں شریک ہو سکے۔ علیحدگی کے اس احساس کے تحت خفیہ تحریکیں چلانا اور سازشیں کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ چنانچہ صیہونیت بھی ان کی ایک خفیہ سازش اور تحریک ہے اور صیہونیوں سے مراد وہ یہودی ہیں، جو صیہون (یروشلم کا ایک پہاڑ) کا رخ کر کے فلسطین میں قومی حکومت کے خواہاں اور اس مقصد کے لیے کوشاں رہے۔

(دیکھیے صیہونیت)

صیہونیت کا منظم طور پر آغاز سترہویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ اس کا پہلا ہیڈ کوارٹر وی آنا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں لندن کے ایک یہودی نے اسی مقصد کے لیے ایک کمپنی قائم کی اور ۱۸۷۶ء میں جارج ایبٹ نے "چول سائن" کے نام سے ایک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا مقصد فلسطین میں یہود کی نوآبادیاں قائم کرنا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں وی آنا کے ایک یہودی صحافی ڈاکٹر ہرزل نے "ریاست یہود" کا ٹھوس تصور پیش کیا۔ اس کی رہنمائی میں ۱۷ اگست ۱۸۹۷ء کو سوئٹزرلینڈ کے شہر بیسل میں صیہونیوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں میں ہجرت فلسطین کی تحریک باقاعدہ شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے روس سے کچھ یہودی ارض مقدس پہنچے۔ برطانیہ نے ان لوگوں کی بڑی مدد کی۔ انگریزوں نے ترکی سلطان عبدالحمید کے ساتھ ڈاکٹر ہرزل کی گفت و شنید میں یہودیوں کی خود مختاری تسلیم کرانے کی کوشش کی مگر سلطان نے واضح الفاظ میں انکار کر دیا۔

۱۸۹۸ء میں یہودیوں نے سلطان عبدالحمید پر پھر سے بیرونی طاقتوں کا دباؤ ڈلوایا اور دوسری طرف اس کا تختہ الٹنے کی سازشوں میں بھی مصروف ہوگئے۔ ۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر ہرزل کی موت کے بعد یہودیوں نے دونمہ اور فری میسن کی تحریکوں کے ذریعے اپنی سازشیں تیز تر کر دیں اور بالآخر ۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس تاریخی انقلاب کے بعد ترکی میں جو وزارت بنی، اس کے تین ارکان بصاریہ آفندی، بلسیم مزیک اور جاوید بے یہودی تھے۔ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں یہودیوں کو ملکیتِ زمین کا حق دلا دیا۔ برطانیہ نے بھی یہودیوں کا ساتھ دیا اور ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو یہودی وطن بنانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ یہ اعلان یا وعدہ تاریخ میں "اعلان بالفور" کے نام سے مشہور ہے، جو برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ان الفاظ میں کیا:-

"ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔"

اعلانِ بالفور کے ساتھ ہی دنیا کے تمام ممالک سے یہودیوں کا ایک سیلاب فلسطین کی طرف امڈ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فلسطین میں آباد چھبیس سو یہودی تراسی ہزار کی ایک منظم اور خوشحال قوم میں تبدیل ہوگئے۔ عربوں کی زمینیں دھڑا دھڑ ان کے نام منتقل ہونے لگیں۔ اس موقع پر صیہونی لیڈر ڈاکٹر ویز نے کہا:-

"اگرچہ ہم فلسطین کو خالص یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود جو عرب فلسطین میں رہنا چاہیں گے۔ انہیں اس کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن جو نہ رہنا چاہیں گے ان کے لیے مصر ہے، شام ہے اور موآب کی پہاڑیوں کے افق کے اس پار وسیع صحرا ہے جہاں سے آ کر وہ یہاں آباد ہوئے تھے۔"

برطانیہ کے سایہ عاطفت میں فلسطین میں یہود کی مسلسل درآمد جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب مجلس اقوام نے فلسطین کو انگریزوں کی نگرانی (انتداب) میں دیا، تو اس وقت یہاں

مسلمان عرب ۶۶ ہزار، عیسائی عرب ۱۰ ہزار اور یہودی ۸۳ ہزار سے زیادہ تھے۔ انتدابی فلسطین کی سرحدوں میں ۱۰۱۶۳ مربع میل کا خشک علاقہ بھی شامل تھا۔ جب کہ مجموعی رقبہ ۱۰۴۳۵ مربع میل تھا۔ برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سموئیل نے ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ تیس سالہ دورِ انتداب کے خاتمے پر یہودی فلسطین کی ۵۰۰ فی صد اراضی کے مالک

ـ روشلم میں صیہونی دھماکے کا ایک منظر

بن چکے تھے۔ اس کے علاوہ سموئیل نے یہودیوں کو حکومت کے نظم و نسق میں برابر کا شریک کیا اور ان کے سپرد تعلیم اور زراعت کے شعبے ہوئے۔ یہودیوں کو زمینوں کی آبادکاری کے لیے قرضوں اور دوسری سہولتوں سے نوازا گیا۔ سرکاری اراضی یہودیوں کو مفت دی گئی۔ عربوں کے گاؤں کے گاؤں بے دخل کر کے وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ نتیجۃً ۱۹۳۶ء تک یہودیوں کی آبادی ساڑھے چار لاکھ سے اوپر ہو گئی۔

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے فلسطین کو مجلس قانون ساز عطا کی۔ اس کے بائیس ارکان میں سے صرف گیارہ مسلمان تھے۔ عربوں نے اس ناانصافی پر ۱۹ مارچ کو ہڑتال کر دی جسے تشدد سے دبایا گیا۔ مگر جب ہڑتال کے نتائج سامنے آئے اور خود انگریز افسر بھوکوں مرنے لگے تو انگریزوں نے ایک نئی چال چلی اور عرب شیوخ کی مداخلت پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو یہ ہڑتال ختم ہوئی۔

معاملات کو طے کرنے کے لیے لارڈ پیل کی قیادت میں ایک شاہی کمیشن قائم ہوا۔ عربوں نے جس کا بائیکاٹ کیا۔ مگر اس کمیشن نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت فلسطین کو یہودی اور عرب دو حصوں میں تقسیم کرنے اور بیت المقدس کے علاقے کو برطانیہ کے زیرِ انتداب رکھنے کی تجویز پیش کی۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ اگر عرب نہ مانیں تو مارشل لا جاری کر دیا جائے اور ان سے ہتھیار چھین لیے جائیں۔ اس کے ردِعمل کے طور پر ۱۹۳۷ء میں شام کے ایک قصبہ بلوزان میں عرب قومی کانفرنس ہوئی، جس میں اعلان بالفور، انتداب، درآمدِ یہود اور تقسیم فلسطین کی مخالفت اور استرداد کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں قومی تحریک شروع ہوئی، جسے سختی سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ عربوں نے تمام ظلم و ستم مردانہ وار برداشت کیے۔ اس پر برطانیہ نے عربوں سے وعدہ کیا کہ دس سال کے اندر اندر فلسطین میں ایک آزاد حکومت قائم کر دی جائے گی۔ مگر جونہی امریکا اتحادیوں کی صف میں شامل ہوا، یہودیوں کو ایک اور مؤثر طاقت کی امداد مل گئی اور انھوں نے امریکا کی شہ پر عربوں کے خلاف قتل و غارت گری کی مہم شروع کر دی۔ ان کا تشدد اور تخریبی کارروائیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو خود برطانوی حکومت نے اپنے ایک بیان میں صیہونیت کی مذمت کی۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو برطانیہ اور امریکہ کی ایک مشترکہ کمیٹی "اینگلو امریکن" نے فوری طور پر ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخلے کی اجازت دے دی۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا جائے۔ اس موقع پر امریکا نے اپنی فوجی اور سیاسی خدمات پیش کرنے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی مخالفت پر برطانیہ اس اجازت کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو گیا مگر یہودیوں کے زیرِ اثر وہ اس معاملے کو اقوامِ متحدہ میں لے گیا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۷ء کو اقوامِ متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی برائے فلسطین قائم کیا۔ اس گیارہ رکنی کمیٹی میں سے کینیڈا، چیکوسلواکیہ، گوئٹے مالا، نیدرلینڈ، پیرو، سویڈن، یوراگوئے وغیرہ نے تقسیمِ فلسطین کا حل پیش کیا اور ہندوستان، ایران اور یوگوسلاویہ نے وفاقی حل تجویز کیا۔ جبکہ آسٹریلیا غیر جانبدار رہا۔ اس پر ۲ اگست کو دو ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ کمیٹی نمبر ایک کو تقسیم کے منصوبے کی تفصیلات طے کرنے کے لیے کہا گیا، جبکہ کمیٹی نمبر دو جو پاکستان، سعودی عرب، افغانستان، عراق، مصر، لبنان، شام اور یمن پر مشتمل تھی، تقسیم کی تجویز کا پابند رہتے ہوئے اپنی سفارشات مرتب کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کمیٹی نے تقسیم کی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ مگر انصاف و امن کی علمبردار اس انجمن نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو ایک قرارداد کے ذریعے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ تینتیس ۳۳ ملکوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا، جبکہ تیرہ ۱۳ مخالف اور دس ۱۰ غیر حاضر تھے۔ امریکا اور روس نے تقسیم کی زبردست حمایت کی۔

اقوامِ متحدہ کی قرارداد کے فوراً بعد یہودیوں نے دہشت گردی کا آغاز کر دیا اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں سترہ ہزار عربوں کو شہید اور تقریباً تین لاکھ کو بے گھر کر دیا۔ ابھی جنرل اسمبلی کی بحث جاری تھی کہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے فلسطین سے دست کش ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ اسی وقت تل ابیب میں یہودیوں نے حکومت اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ اقوامِ متحدہ نے ابھی اس کی اجازت نہیں دی تھی مگر امریکا اور روس نے فوراً ہی اس حکومت کو تسلیم بھی کر لیا۔

حکومت قائم کرتے ہی یہودیوں نے نصف بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی عرب علاقوں پر بھی حملے کر دیے۔ گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو یہودیوں کے اس ظلم و ستم سے بچانے کے لیے اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دیں۔ وہ تل ابیب تک پہنچنے ہی والی تھیں کہ بڑی طاقتوں نے اقوامِ متحدہ کی مداخلت کے ذریعے جنگ بند کرا دی۔ عرب لیگ نے ۱۱ جون ۱۹۴۸ء کو عالمی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے عارضی صلح کے طور پر چار ہفتوں کے لیے جنگ بند کر دی۔ ۱۷ ستمبر کو اسرائیلیوں نے پھر جنگ چھیڑ دی اور جب پھر انھیں شکست ہونے لگی تو اقوامِ متحدہ کے ذریعے مارچ ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی کرا دی گئی۔ اُس وقت اسرائیل چھہتر فیصد علاقے پر قبضہ کر چکا تھا۔

۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو یہودی ریاست کی حدود کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر عاری الکمان نے کہا تھا۔ "عظیم تر اسرائیل عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہے۔" اسرائیل کے لیڈر ڈیوڈ بن گوریان نے بھی کچھ انہی الفاظ میں اسرائیلی سلطنت کی حدود کا تعین کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا، جس کے جواب میں مصر نے نہر سویز کو اسرائیلی جہازوں کے لیے بند کر دیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں ایک بار پھر عربوں اور اسرائیل کے مابین زبردست جنگ ہوئی۔ مصر نے خلیج عقبہ تک کے علاقے کی ناکہ بندی کر دی مگر امریکی امداد کے پہنچ جانے پر اسرائیل نے نہ صرف نہر سویز تک کے علاقے کو بلکہ شام کی پہاڑیوں، اردن کے خاصے علاقے اور پورے شہر یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس بار بھی اقوامِ متحدہ نے اسرائیل کے حق میں جنگ بندی کرائی۔

اگست ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصیٰ کے نذرِ آتش کرنے کا واقعہ پیش آیا جس پر پورے عالم اسلام میں غم و غصے کی زبردست لہر دوڑ گئی۔ تمام عرب ممالک نے متحد ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ امن کی سیاسی شرائط، جو عرب پیش کرتے ہیں، اسرائیل کے

فلسطین کے شہر غزہ کی ایک اہم شارع کا منظر

لیے ناقابل قبول ہیں اور جن شرائط پر اسرائیل امن کا خواہاں ہے، وہ عربوں کو پسند نہیں ۱۹۶۷ء میں مقبوضہ عرب علاقوں میں سے، جن میں دریائے اردن کے مغربی کنارے کے علاقے، غزہ اور گولان کی پہاڑیاں شامل ہیں، پچاس ہزار مسلمان روزانہ ان علاقوں سے عرب ممالک میں دھکیل دیئے جاتے رہے۔ اس پر اردن کے شاہ حسین نے فلسطین اور اردن کے وفاق کی تجویز پیش کی، جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد سے جناب یاسر عرفات کی پرجوش قیادت میں آزادیٔ فلسطین کے مجاہدین سرگرم عمل ہو گئے بلیک ستمبر جیسی تنظیموں نے اسرائیلیوں کو بطور یرغمال استعمال کر کے اپنے مطالبے منوانے کا آغاز کر دیا۔ جب کہ دوسری طرف اسرائیلی حکومت کو امریکا سے دھڑا دھڑ فوجی اور سیاسی امداد مل رہی ہے اور دنیا بھر سے لاکھوں یہودی اسرائیل پہنچ رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک اسرائیل میں یہودیوں کی تعداد پچیس لاکھ کے قریب پہنچ چکی تھی جو ۱۹۷۵ء میں تیس لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ جبکہ ۱۹۴۸ء میں پورے فلسطین میں صرف ساڑھے چھ لاکھ یہودی تھے۔

جغرافیائی و اقتصادی معلومات: نام نہاد اسرائیل کا موجودہ رقبہ (جس میں مقبوضہ عرب علاقے شامل نہیں) ۷۹۹۲ مربع میل، ۲۰،۷۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ کل آبادی ۱۹۷۱ء میں تیس لاکھ چھیاسٹھ ہزار تھی۔ موجودہ دارالحکومت یروشلم ہے اور سب سے بڑا شہر سابق دارالحکومت تل ابیب ہے۔ عبرانی اور عربی وہاں کی عام زبانیں ہیں، سرکاری مذہب یہودیت ہے۔

پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان کی وفات کے بعد مسز گولڈا میئر وزیر اعظم منتخب ہوئیں۔ اسی سال مصر، شام اور عراق سے جنگ ہوئی جسے "چوتھی عرب اسرائیل جنگ" کہا جاتا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں نئے منتخب وزیر اعظم بیگن اور امریکہ کے صدر جمی کارٹر کے مابین مذاکرات ہوئے، جس کے نتیجے میں مصر اور اسرائیل کے درمیان "کیمپ ڈیوڈ معاہدہ" طے پایا۔ جس کی رو سے اسرائیل نے صحرائے سینائی خالی کر دیا۔

۱۹۸۱ء میں اسرائیل نے اچانک عراق پر حملہ کر کے بغداد کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے جنوبی لبنان اور بیروت پر بری، فضائی اور بحری حملے کر کے بالآخر ... "تنظیم آزادیٔ فلسطین" کو ہجرت کر کے الجزائر رخصت ہونے پر مجبور کر دیا ... ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا جس پر پوری دنیا نے اسرائیل کے خلاف ... منظور کیں۔ اشک شوئی کے لیے اسرائیل کی پارلیمنٹ نے اپنے وزیر دفاع کو برطرف کر دیا۔

اسرائیل کے تجارتی تعلقات زیادہ تر امریکا، مغربی جرمنی، اٹلی، برطانیہ، فرانس، نیدرلینڈ، جاپان اور بلجیم کے ساتھ ہیں۔ درآمدات برآمدات کی نسبت زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل کو دنیا بھر کے یہودیوں کی مالی و اقتصادی مدد پہنچتی رہتی ہے۔ معیشت کا زیادہ تر دارومدار ماہی گیری، زراعت، معدنیات اور صنعت پر ہے۔ اسرائیل کی سالانہ قومی آمدنی تین ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ یہ دنیا بھر کے تمام ممالک سے زیادہ ہے یعنی یہاں فی کس سالانہ آمدنی ۹۵۰ ڈالر ہے۔

اگرچہ اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن ہے، تاہم چند ممالک کو چھوڑ کر اکثر اسلامی ممالک اور ان کے حلیفوں نے اس کے ناجائز وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ پاکستان بھی ان ممالک میں شامل ہے اور عربی علاقوں پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کے خاتمے کے لئے کوشاں ہے۔

اسرائیل، بنو حضرت یعقوبؑ کی اولاد، جو ان کے لقب اسرائیل کی بنا پر بنو اسرائیل کہلائی۔ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں کی اولاد بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں تقسیم ہوئی:۔ ان بیٹوں کے نام یہ تھے۔ روبن، شمعون، لاوی، یہودہ، زبولون، اشکار، دان، جد، آشر، نفتالی، یوسف، بنیامین۔ ان میں سے حضرت یوسفؑ پہلے ہی مصر میں غلام کی حیثیت سے موجود تھے اور جب انہیں فرعون مصر کے ہاں حکومت مل گئی تو ان کے والد حضرت یعقوب اپنے سارے بیٹوں اور ان کی اولاد کے ساتھ وہاں گئے۔ عہد نامہ عتیق کے مطابق بنو اسرائیل برومند کثیر التعداد اور نہایت زور آور ہو گئی اور وہ ملک ان سے بھر گیا۔ حضرت یوسف کی وفات کے بعد مصری لوگ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی طاقت کی بنا

پران کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کرنا شروع کیا، ان سے سخت محنت لیتے اور ان کے بیٹوں کو مار ڈالتے۔ نوزائیدہ بیٹوں کے قتل کا حکم فرعون مصر کی طرف سے باقاعدہ طور پر جاری ہوا تھا۔ مگر قدرت خدا کی کہ بنی اسرائیل کے لاوی قبیلے کے ہاں پیدا ہونے والا ایک بچہ فرعون کے ہاں پلا بڑھا۔ یہ موسیٰؑ تھے۔ انہیں خدا نے نبوت سے سرفراز کیا اور کتاب "تورات" دی۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائی اور خدا کے حکم پر مصر سے نکال لائے۔ عہد نامۂ عتیق کی رو سے اس وقت بنی اسرائیل کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ تھی اور انہوں نے مصر میں کل چار سو تیس برس گذارے تھے۔

بنی اسرائیل کے ہاں بارہ قبائل اور ان کے سرداروں کا ذکر قرآن مجید میں یوں آتا ہے:۔

(مصر سے بنی اسرائیل کا خروج)
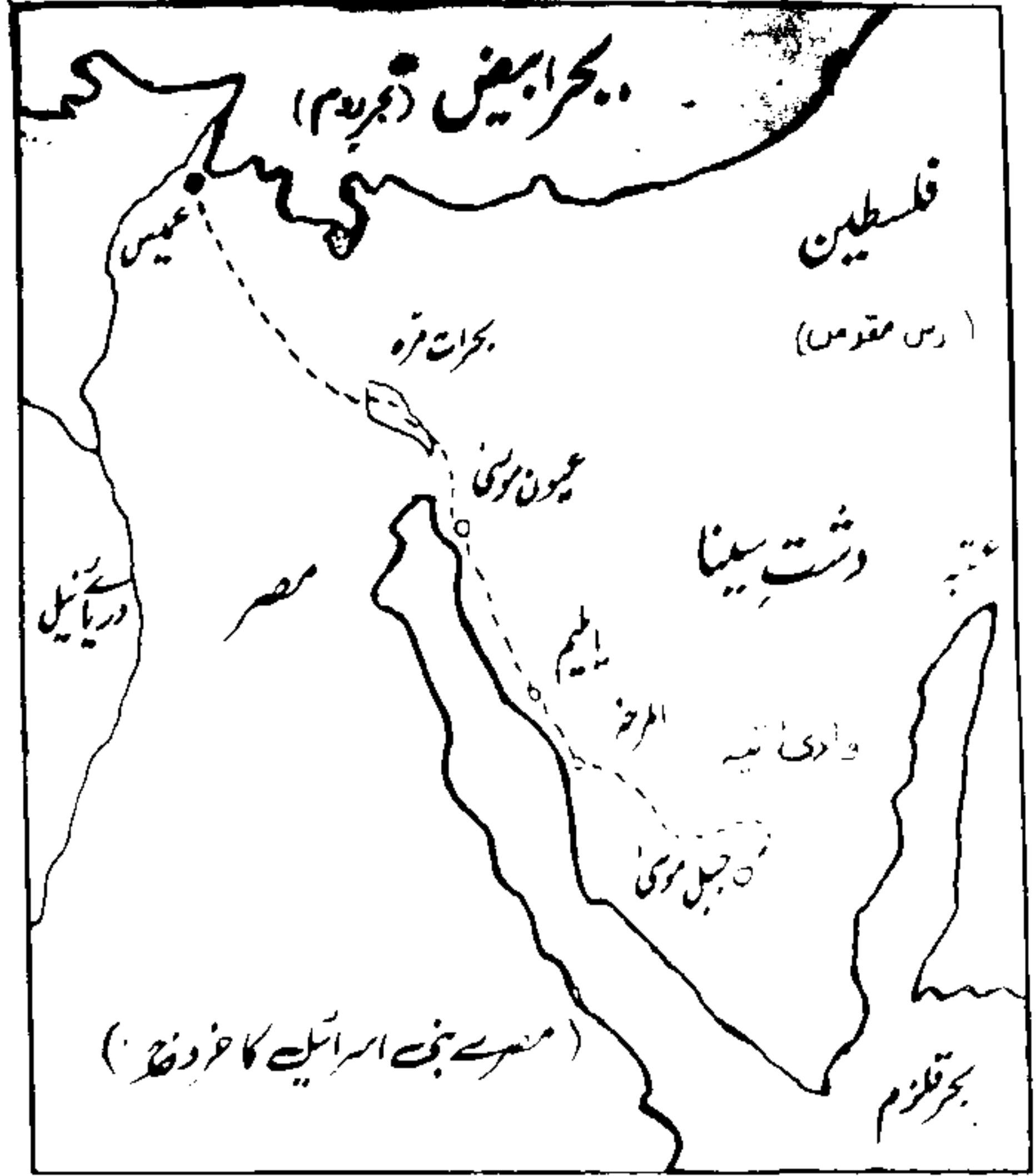
"اور یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا۔ اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کئے اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اچھا مال (بطور قرض) اللہ کو دو گے تو میں بالضرور تمہاری برائیاں تم سے دور کروں گا اور بالضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پس جو کوئی تم میں سے اس کے بعد انکار کرے تو وہ بلاشبہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا۔" (المائدہ ۱۲)

مصر سے نکلنے سے پہلے اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل سے خدا کے احکام پر چلنے کا وعدہ لیا۔ مگر فلسطینیوں سے لڑنے کی بجائے اس قوم نے ہمیشہ نافرمانیاں کیں۔ جس پر بنی اسرائیل چالیس برس تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے۔ یہاں ان پر آسمان سے من و سلوےٰ اترا کرتا تھا اور یوں خدا تعالےٰ نے اس قوم پر نعمتوں کی بارش کئے رکھی۔ اس دوران میں ان کی آزمائش بھی کی جاتی رہی تاکہ دیکھا جائے کہ وہ شریعت پر کتنا عمل کرتے ہیں، مگر یہ نافرمان قوم بداعمالیوں سے باز نہ آئی۔ حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰؑ خدا سے ہمکلام ہونے کے لیے کوہ طور پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں انہوں نے گائے کی پرستش شروع کر دی اور جب انھیں ان کی مقدس ارض موعود دکھا کر کہا گیا کہ یہ وہ ملک ہے۔ جس کا وعدہ تم سے کیا گیا تھا، سو اس میں داخل ہو جاؤ تو بنی اسرائیل، شرارت اور کاہلی جن کے وجود میں داخل ہو چکی تھی، کہنے لگے کہ موسیٰؑ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور اس ارض مقدس کے لوگوں سے لڑو۔ کیونکہ وہ بڑے جابر اور طاقتور لوگ ہیں۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ جب یہ ملک ان سے خالی ہو جائے گا تو ہم آجائیں گے۔

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی خدا کو ناگوار گذری اور اس نے انھیں یہ سزا دی کہ جب تک موجود نسل کے تمام بالغ مر نہیں گئے، وہ وادی تیہ میں بھٹکتی رہی۔ طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصے میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے جانشین نبی حضرت یوشعؑ کی سرکردگی میں بنی اسرائیل دشت سینا سے نکل کر ارض کنعان کی طرف بڑھے اور اس پر فتح حاصل کی۔ ابن اثیر کے مطابق یہ معرکہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر ان کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اس نے حکم دیا کہ غرور نہ کرنا بلکہ توبہ استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا۔ مگر فتح کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور خدا نے اپنے حکم کی خلاف ورزی پر ان پر عذاب نازل کر دیا۔ یہ واقعہ سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

حضرت یوشعؑ آخر عمر تک بنی اسرائیل کی نگرانی اور اصلاح حال میں مصروف رہے ان کے باہمی جھگڑوں کے تصفیے کے لیے قاضیوں کو مقرر کیا گیا تاکہ وہ آئندہ بھی اس طرح اپنا نظام قائم کر رکھیں۔ یہ نظام حضرت موسیٰؑ کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال بعد تک قائم رہا کہ ان کے قبیلوں پر حکومت سردار کرتے اور ان کے فیصلے قاضی انجام دیتے اس عرصے میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لئے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے کبھی عمالقہ ان پر چڑھ آتے، کبھی فلسطینی، کبھی مدائنی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی آجاتے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں انبیا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا، جو حضرت عیسیٰؑ پر آکر ختم ہوتا ہے۔ ان کی صحیح تعداد کا علم خدا تعالےٰ کی ذات ہی کو ہے۔ مگر بعض کا ذکر عہد نامہ عتیق اور قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کی تاریخی ترتیب کا بھی صحیح علم نہیں طبری کی روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارونؑ اور ان کے بعد حضرت یوشعؑ منصب نبوت پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد جس ہستی کو نبوت کا درجہ ملا، وہ حضرت حزقیل تھے۔ ان کے نام قرآن مجید میں کہیں بیان نہیں ہوئے مگر مفسرین کی رو سے بعض قصوں کے ضمن میں ان کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ ان کے جانشین حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) کا ذکر سورۂ انعام (۸۵)، اور سورۂ الصافات (۱۲۱ - ۱۳۳) میں آیا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو فنیقیوں کے دیوتا بعل زبوب کی عبادت سے روکا۔ ان کے چچازاد بھائی الیسع بھی بنی اسرائیل پر مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید نے اگرچہ ان کے حالات پر روشنی نہیں ڈالی مگر سورۂ انعام اور سورۂ صٓ میں ان کا نام ضرور آیا ہے۔

گیارھویں صدی قبل مسیح کے آخر میں عیلی کاہن کے زمانے میں عزہ کے فلسطینیوں نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور ان سے "تابوت سکینہ" کا مقدس صندوق چھین کر لے گئے جس میں بروایت تورات کا اصل نسخہ، اور حضرت یوسفؑ کا جسد تھا۔ اسی دور میں ان کے ایک قاضی اشموئیلؑ کو اللہ کی طرف سے منصب نبوت عطا ہوا۔ ان کا عربی نام اسماعیل ہے۔ اس دور میں عمالقہ کے جالوت نامی بادشاہ نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے ان کے بہت سے سرداروں اور معززین کو گرفتار کر لیا۔ بنی اسرائیل نے حضرت اشموئیلؑ سے درخواست کی کہ ان کا بھی ایک سلطان ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے خدا سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل سے ساؤل (طالوت) کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے اس مطالبے اور بعد ازاں رد و کد کا تفصیلی ذکر سورۂ بقرہ میں یوں آیا ہے:۔

"کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں، جس نے موسیٰؑ کے بعد اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجیے۔ نبی نے کہا۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا ہے تو تم لڑنے

سے انکار کردو! سرداروں نے کہا۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے جا چکے اور اپنی اولاد سے علیحدہ کیے جا چکے ہیں؟ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی اور اللہ بے انصافوں سے خوب واقف ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا۔ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو مقرر کردیا ہے، جب انہوں نے یہ بات سنی تو کہنے لگے، وہ ہم پر کیسے حکمران بن سکتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمران بننے کے حقدار ہیں۔ علاوہ بریں اسے مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے فرمایا! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کی قابلیت و استعداد میں تم پر اسے برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اسے وسعت عطا فرمائی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے، اپنا ملک دیتا ہے اور اللہ فراخی والا، جاننے والا ہے۔" (۲۴۶، ۲۴۷)
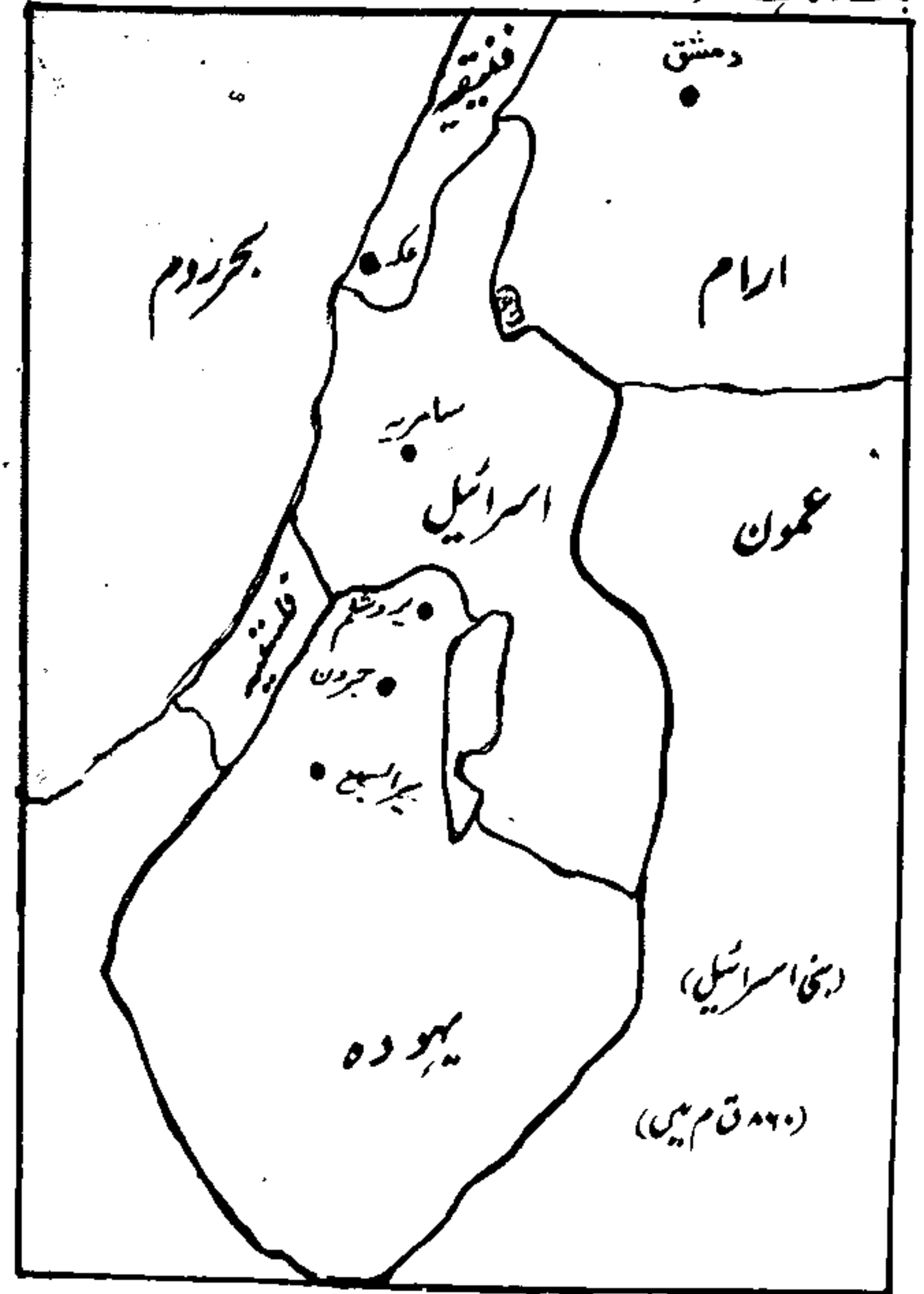
طالوت کے دور میں تابوت سکینہ بنی اسرائیل کو خود بخود واپس مل گیا۔ اس کے بعد طالوت اور جالوت کے درمیان جنگ بھی ہوئی، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ ان کے ایک نوجوان سپاہی داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا تو طالوتؑ نے انہیں اپنا داماد بنا لیا۔ ان کے بعد حضرت داؤدؑ ہی نبوت اور بادشاہت کے منصب پر فائز ہوئے۔ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ (۲۰۱، ۲۵۱)، نساء (۱۶۳)، مائدہ (۷۸)، انعام (۸۴ تا ۹۰) انبیاء (۷۸ تا ۸۲) نمل (۱۵ تا ۴۴) سباء (۱۰، ۱۴) اور ص (۱۷ تا ۲۶، ۳۰ تا ۴۰) میں ان کا ذکر آتا ہے۔ ان پر کتاب "زبور" اتری ان کے بعد حکومت ان کے بیٹے سلیمانؑ کے ہاتھ میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بھی نبوت کا مقام ملا۔ ان کے دور میں بنی اسرائیل کو بے حد قوت و دولت حاصل ہوگئی۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر سورۂ بقرہ (۱۰۲)، نساء (۱۶۳)، انعام (۸۵) انبیاء (۷۸، ۷۹، ۸۱)، نمل (۱۵ تا ۲۰، ۳۶، ۴۴)، سبا (۱۲) اور ص (۳۰ - ۳۴) میں آیا ہے۔ سابقہ نبیوں کی طرح بنی اسرائیل نے حضرت سلیمانؑ پر بھی بہتان طرازیوں کا آغاز کردیا۔ انہیں جادوگر مشہور کیا گیا۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں اسرائیل اور یہودہ میں تقسیم ہوگئی۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہے۔ ان پر مختلف نبی مبعوث ہوتے رہے مگر یہ قوم اپنی سرکشی اور کج روی سے کبھی باز نہ آئی۔ حتیٰ کہ شاہ بابل بخت نصر نے ان کے شہروں کو لوٹا اور ان کی سلطنت کو ویران کیا۔ اس دوران میں ان کے ہاں حضرت ایوبؑ حضرت یونسؑ (یوحنا)، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جیسے پیغمبر آئے، جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ اس کے علاوہ عہد نامۂ عتیق میں بہت سے نبیوں اور رسولوں کا ذکر آتا ہے، جو وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر مبعوث ہوتے رہے۔ ان میں عزرا، ایوب، نحمیاہ، یسعیاہ یرمیاہ (ارمیاہ)، دانیال، زکریا اور یوسیع اہم ہیں۔ اس سلسلے کے آخری نبی حضرت عیسیٰؑ تھے، جو رومی شہنشاہ، ہیرود اعظم کے عہد میں پیدا ہوئے۔ یہودیوں نے اس معصوم نبی کی تعلیمات کو نہ صرف یہ کہ جھٹلایا بلکہ انہیں صلیب پر بھی چڑھا دیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کوئی دو ہزار سال تک ادھر اُدھر بھٹکتے رہے اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں ناجائز ذرائع اور اپنی سازشوں کی بدولت ارضِ مقدس میں اپنی غاصبانہ حکومت "اسرائیل" کے نام سے قائم کرلی۔ لیکن وہ ناپیدار ثابت ہوگی، کیونکہ اس کی بنیاد میں سازش اور بے انصافیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

نیز دیکھئے: "اسرائیل" - "اسرائیل، حکومت" - "بنی اسرائیل، سورہ" - "تالمود" "تورات" - "زبور" - "صیہونیت" - "عہد نامۂ جدید" - "عہد نامۂ عتیق" - "یہودہ" - "یہودیت"

اسقاط گرانا، ساقط کرنا۔ اصطلاحاً حمل گرا دینے سے متعلق ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کے بارے میں صراحت کے ساتھ کوئی حکم نہیں آیا۔ البتہ تفاسیر اور علم فقہ میں اس کے بارے میں چند امور ملتے ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری کے مطابق جب بچے کے اعضاء بن چکے ہوں تو حمل گرانا ناجائز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نزدیک چار ماہ سے زیادہ کے حمل کو کسی تدبیر سے گرانا خونِ ناحق میں شمار ہوتا ہے۔ اکثر فقہا نے افلاس اور کثرت عیال کی صورت میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ مگر چند روایات کے مطابق اگرچہ یہ قتل نہیں مگر اس سے اللہ کی رزاقیت پر عدم توکل ظاہر ہوتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ضبط تولید اور اسقاطِ حمل کی تدابیر گناہ میں شامل ہیں۔

اسلام صلح و امان، سلامتی اور اطاعت و فرمانبرداری کی حالت۔ اصطلاح میں دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا۔ یہ لفظ سلم سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا ہے۔ شریعت میں اسلام دو طرح سے ہے۔ ایک زبانی اقرار اور دوسرا دلی اعتقاد کے ساتھ خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور سپرد کردینا۔ مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرتا ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے۔ یہ فرمانبرداری اور اخلاص کیونکر ہوتا ہے؟ اس کا جواب دنیا کے اکثر مذہب و نظام فکر نے دیا ہے۔ لیکن اگر ہم مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر مذہب میں سلامتی کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے۔ مگر ان میں موجود دیگر بدعات اور شرک کی وجہ سے ہم انہیں اسلام نہیں کہہ سکتے۔ نیز مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے سے یہ بات عیاں ہوکر سامنے آ جاتی ہے کہ ہر مذہب نے سلامتی کی راہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ سعی مختلف ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی قرآن مجید کی راہنمائی میں مکمل ہوتی ہے، جو حضرت محمدؐ کے قلب مبارک پر وحی ہوا۔ گویا اسلام وہ صراطِ مستقیم ہے، جو ہر مذہب نے دکھانے کی کوشش کی۔ مگر اس پر چھائی ہوئی کفر و الحاد کی دھند شریعت محمدی ہی کے باعث دور ہوئی اور اسلام نکھر کر

سامنے آگیا۔ اسی لئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا:۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً۔" "آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں راضی ہوا۔" (المائدہ = ۳)

یہ آیت حجۃ الوداع کے روز میدان عرفات میں نازل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام پہلے سے موجود تھا، جو اپنے کمال اور عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں کامل ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ جو غرض مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی وہ اس دین کی وجہ سے پوری ہو گئی ہے۔ اب کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ آنحضرتؐ سے پہلے جتنے انبیاءؑ آئے، چونکہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف خاص خاص زمانوں میں مبعوث ہوئے تھے، اس لئے دین کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ ایسے نبیؐ اور دین کی ضرورت تھی، جو پوری دنیا کو ایک راہ پر ڈال سکے۔ جس کی شہادت بائیبل میں حضرت عیسیٰؑ نے یوں دی تھی: "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم انہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب روح حق آئے تو وہ تمہیں صداقت کی ساری راہ بتا دے گی۔" (یوحنا ۱۶: ۱۲، ۱۳) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت محمدیؐ ہے۔ پہلے کوئی شریعت کامل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ساری دنیا کا مذہب بن سکتی۔ چنانچہ اسلام کا نام شریعت محمدیؐ کا حق ٹھہرا۔

ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک پورا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کرے اور اس کی پیروی کرے۔ کیونکہ خدا کے قانون کے آگے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام ہی اسلام ہے اور قرآن مجید کے مطابق "جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا، اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔" (آل عمران ۸۵)

دین اسلام کی تعلیمات نہایت سادہ، ہمہ گیر اور جامع ہیں۔ اسلام عقائد سے لے کر معاملات تک انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ہر طرح سے ہدایات دیتا ہے۔ اس دنیا میں اس میں معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی زندگی کو بھی اتنی اہمیت حاصل ہے، جتنی اخلاق اور عبادات کی ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی اصول متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے اور حالات کے تحت قوانین مدون کئے جا سکتے ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ ساری کائنات کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں بلکہ منظم سلطنت ہے، جسے اللہ نے بنایا ہے، وہی اس کا مالک اور وہی اس کا حاکم ہے۔ اس کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ طبعی دنیا تو اللہ کے اس لگے بندھے اصولوں کے ماتحت چل رہی ہے جسے سائنس نے دریافت کرنا شروع کیا ہے، مگر اخلاقی دنیا میں انسان کو اپنا نائب بنایا، اسے علم اور تقدیس دی۔ تمام قوتیں اس کی مطیع کیں، مگر شیطانی اور بدی کی قوت اس کے آگے نہ جھکی۔ اب نائب ہونے کی وجہ سے انسان کا فرض ہے کہ وہ صرف خدا کا ماتحت رہے۔ خدا کی دی ہوئی اشیاء کو اس کے حکم اور مرضی کے مطابق استعمال میں لائے۔ اس کا عمل خدا کے دیئے ہوئے قانون کے مطابق ہو۔ اب اس امر نیابت کا تقاضا ہے کہ دنیا میں رہنے کے دوران میں انسان نے جو غلطیاں کی ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی اشیاء کو امانت نہ سمجھا ہو۔ ان میں جو خیانت کی ہو اور بدی کی قوت کے آگے جتنا سر جھکایا ہو، اس کی اسے سزا ملے اور فرض کی ادائیگی جتنے احسن طریقے سے کی ہو اس کا انعام ملے۔

مذاہب عالم کا مطالعہ کریں تو ان میں سے کوئی بھی اپنی موجودہ شکل میں انسانی زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سے محیط نہیں کرتا۔ ان میں سے اکثر محض عبادات پر زور دیتے ہیں یا پھر انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی سے الگ کرتے ہیں۔ یہ محض دین اسلام کی برکت ہے کہ اس نے واضح طور پر ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کر دیا ہے۔

مکمل ضابطۂ حیات کی صورت میں اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک مکمل الہامی دین ہے، جب کہ دیگر مذاہب کی الہامی تعلیمات مسخ شدہ ہیں اور ان میں سے کوئی ایک اپنی صحیح صورت میں موجود نہیں۔ اسلام کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت اس کا منظم ضابطہ ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ اس کی ہدایات سے محروم نہیں رہا کیونکہ اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں کہ محض عبادات پر زور دیا جاتے اور یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہو کر رہ جائے۔ تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایمان اپنی کامل صورت میں موجود ہے۔ یہ ایمان خدا پر، اس کے رسولوں پر، اس کے فرشتوں پر اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر اور حیات بعد الموت پر ہے۔ اس دین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے دین اور دنیا کی مصنوعی علیحدگی کو ختم کر دیا اور ترک دنیا کر کے تلاش خداوندی کو رد کر دیا۔ اسی لئے آنحضورؐ نے فرمایا: "اسلام میں ترک دنیا کا کوئی مقام نہیں۔" نیز "دنیا سے اپنا حصہ لینا نظرانداز نہ کرو۔" ایک اور خصوصیت جس سے اسلام کی امتیازی شان ابھر کر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ اس نے انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان بڑا توازن قائم کر رکھا ہے۔ یہ ہر انسان کو فرداً فرداً ذمہ دار ٹھہرا کر خدا کے سامنے جواب دہ بناتا ہے اور اسے ریاست میں گم ہونے سے روکتا ہے۔ دوسری طرف یہ فرد میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ معاشرے کی بھلائی کے لئے کام کریں۔ مالدار زکوٰۃ دیں فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں اور وقت پڑنے پر اسلامی ریاست کے تحفظ کے لئے جان کی قربانی تک پیش کر دیں۔ یہی وہ توازن ہے جسے آنحضورؐ نے عین اسلام کہا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

"میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عائلی زندگی بھی گذارتا ہوں، پس اللہ سے ڈرو۔ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل وعیال کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے، ہر حق اس کے حقدار کو ادا کرو، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو، اور سویا بھی کرو۔"

اسلام نے اعمال کی اساس ایمان کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا ایمان ہی اسلام ہے یا یہ اسلام کا جزو ہے۔ تاہم ایک امر یقینی ہے کہ عقیدہ بغیر ایمان و یقین کے، عمل کے لئے محرک نہیں بن سکتا۔

اسلام میں عقائد کو صریح الفاظ میں پانچ اصولوں پر مبنی رکھا گیا ہے۔ خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر ایمان۔ ان حقائق کا اقرار زبان سے کرنا اور یقین دل سے کرنا ضروری ہے۔ انسان سے اسلام کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے پھر ارکان اسلام پر عمل کرے جو تعداد میں پانچ بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی اللہ کی توحید اور آنحضورؐ کی رسالت کا اقرار اور تصدیق کرے۔ اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ سمجھے۔ اس کی عبادت نماز کی صورت میں ادا کرے۔ نفس کشی کے لئے رمضان کے روزے رکھے۔ مال محبت دور کرے اور غریبوں اور مساکین کی مدد کرے، جس کے لئے زکوٰۃ دے اور من حیث القوم واحدہ بیت اللہ کا حج کرے۔

بعض علماء کے نزدیک ارکان ایمان اسلام کے پہلے رکن کا جزو ہیں اور بعض علماء ارکان ایمان کو ارکانِ اسلام سے الگ جانتے ہیں۔ اس ضمن میں اہل تشیع کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام اور ایمان میں فرق یہ ہے کہ اسلام اقرار توحید اور تصدیق رسالت کا نام ہے۔ اس کے بعد نکاح، میراث اور تحفظ کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ایمان اس سے ایک درجہ بلند ہے۔ یہ اسلام کے دل میں بیٹھ جانے اور عمل کے اظہار کا نام ہے۔ اس کی مثال کعبے اور حرم سے یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص اگر حرم میں موجود ہے تو لازم نہیں کہ وہ کعبے میں ہو اور اگر وہ کعبے میں موجود ہے تو حرم میں اس کا ہونا لازم ہے۔ گویا اسلام لانے والے کا ایمان

ظاہر نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے والے کا اسلام لانا ثابت ہے۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے اسلام اور ایمان کے اختلافات کا اظہار ہوتا ہے: "بعض عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ ہم اسلام لائے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔" (الحجرات - ۱۴)

ابن حزم، امام غزالی اور امام احمد بن حنبل جیسے علماء نے ان اختلافات پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگرچہ ایمان اور اسلام دل کی دو مختلف کیفیات اور واردات کا نام ہے مگر یہ دو مختلف چیزیں ہیں، یا ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں یا دونوں ایک ہی شے ہیں ــــ قسطلان کے نزدیک یہ حکماً جدا جدا نہیں، البتہ مفہوم میں مختلف ہیں۔ ایمان کا مفہوم تصدیق قلب ہے اور اسلام کا مفہوم اظہارِ عمل یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کو مسلم نہ کہا جائے اور مسلم کو مومن نہ کہا جائے۔

اسلام کے شرعی معنوں کی تشکیل مسند احمد کی بیان کردہ اس حدیث سے ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ "ایک دن ہم رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگاہ ایک شخص نمودار ہوا، جس کے کپڑے بہت اجلے اور سفید اور بال نہایت سیاہ تھے۔ اس شخص پر سفر کا کچھ اثر معلوم نہ ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ آنحضورؐ کے پاس پہنچ گیا اور اس نے اپنا زانو آنحضور صلعم کے زانو سے ملا دیا اور اپنی ہتھیلیاں زانوؤں پر رکھ کر عرض کرنے لگا۔

"اے محمدؐ! مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے؟" آپ نے فرمایا" اسلام یہ ہے کہ تو اس امر کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ تو نماز قائم کرے اور یہ کہ تو زکوٰۃ دے اور یہ کہ تو رمضان کے روزے رکھے اور یہ کہ اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔" اس شخص نے کہا: "آپ نے درست فرمایا!" حضرت عمرؓ نے کہا کہ "ہم اس پر متعجب ہوئے کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کی تصدیق کرتا ہے"۔ پھر اس نے پوچھا، "آپ مجھے ایمان سے واقف کیجیے!" آنحضورؐ نے فرمایا" ایمان یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت پر اور نیک و بد تقدیر پر ایمان لائے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس پر وہ شخص بولا" آپؐ نے سچ فرمایا۔" پھر اس شخص نے پوچھا" اب مجھے احسان کے بارے میں کچھ بتائیے!" آنحضورؐ نے فرمایا" احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے، جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت میسر نہ ہو تو کم از کم تو یہ محسوس کرے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" اسکے جانے کے بعد آنحضورؐ نے پوچھا۔"اے عمرؓ! جانتے ہو کہ وہ سائل کون تھا؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا، "اللہ اور اللہ کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔" اس پر آپؐ نے فرمایا" وہ جبریل تھا اور تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آیا تھا۔"

اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا فرض صرف رسولؐ ہی کے ذمے نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو آخری نبی کہہ کر یہ فرض پوری امتِ مسلمہ کو سونپ دیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ کے بعد بھی تبلیغ دین کی کوششیں جاری رہیں۔ قرآن حکیم نے تبلیغ دین کے سلسلے میں واضح طور پر یہ ہدایت کر دی تھی کہ "اللہ کی راہ میں دعوت عقل و حکمت، موعظہ حسنہ اور بہتر طریقے سے بحث کے ذریعے دو"۔ (النحل - ۱۲۵) مذہب قبول کرنے کے بارے میں کسی قسم کے جبر سے منع کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے "لا اکراہ فی الدین"۔ "دین میں کوئی زبردستی نہیں۔" (البقرہ - ۲۵۶)۔ یہ بجا ہے کہ حق کی حمایت میں تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جہاد کا مقصد لوگوں میں تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانا ہے۔

اسلام میں مذہب کسی خاص طبقے یا فرقے کی اجارہ داری نہیں۔ اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسلام میں تہتر فرقے ہوں گے اور ان میں سے صرف ایک اسلام پر ہو گا۔ اس کی بنا پر ہر فرقہ اور طبقہ خود کو صراطِ مستقیم پر سمجھتا ہے۔ مگر چونکہ تبلیغ اسلام کی تلقین ہر مسلمان کو کی گئی ہے اس لیے مسلمان جہاں کہیں گئے، تبلیغ کا کام بھی کرتے رہے۔ علماء، فقراء اور صوفیاء کا تو کام ہی تبلیغ دین تھا۔ تاجر اور سیاحوں کے علاوہ عام مسلمان بھی اس فریضہ کو ادا کرتے رہے ہیں۔

دین اسلام کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھی بلکہ دیگر مذاہب پر بھی اس کا اثر پڑا اور ان میں اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ مارٹن لوتھر نے عیسائیت میں اصلاح اسلام ہی سے متاثر ہو کر کی۔ ہندوستان میں اسلام ہی کے عقیدۂ توحید نے ہندومت کی صورت بدل کر رکھ دی۔ یہاں بھگتی تحریک سکھ مت اور آریا سماج تحریک نے اسلامی عقیدۂ توحید ہی سے متاثر ہو کر رواج پایا۔

اسلام کو پیش کرنے کا طریقہ چونکہ عقلی اور فکری ہے اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ عقلی دلائل ہی کے ذریعے اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسلام کی وسیع اشاعت کا سبب بھی یہی عقلی دعوت ہے اس کا اثر علمی و فکری دنیا پر بھی ہوا۔ یونانیوں نے کائنات کے بارے میں غور و فکر کی بنیاد استدلال کو بنا رکھا تھا، جبکہ قرآن مجید نے بار بار مشاہدہ، تدبر اور تجزیے پر زور دے کر تجرباتی تحریک کو ابھارا، جس نے آگے چل کر جدید سائنس کو جنم دیا۔

یوں تو علوم عقلیہ اسلام سے پہلے بھی رائج تھے، لیکن ہر شخص محض اپنی ضرورت اور شوق کے مطابق جس علم کو چاہتا تھا اور جس قدر چاہتا تھا حاصل کرتا تھا۔ درسگاہیں قائم تھیں لیکن مذہب نے علم حاصل کرنے کی پابندی نہیں لگائی تھی۔ اسلام اور صرف اسلام ہی وہ پہلا دین ہے، جس نے تمام علوم حاصل کرنا مذہب میں داخل کیا اور انہیں ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ تمام دنیا میں گھوم پھر کر مختلف علوم حاصل کرنا، انہیں قلم کے ذریعے ضبط تحریر میں لانا، کتابوں کی صورت میں محفوظ کرنا، اور علوم کی اشاعت کرنا مسلمانوں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ یہ اسلام ہی کا اثر تھا کہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ مشہور مستشرق بریفالٹ لکھتا ہے کہ اہل یورپ ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی طور پر اسلامی تہذیب و تمدن ہی کے مرہونِ منت ہیں۔

(تفصیلات کے لیے دیکھیے متعلقہ مضامین نیز: ارکان اسلام، ایمان، جہاد وغیرہ)

اسلام آباد پاکستان کا وفاقی دارالحکومت، جس کے قیام کی سفارش فروری ۱۹۵۹ء میں صدر پاکستان محمد ایوب خاں کے قائم کردہ کمیشن نے کی اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں منظور کر لیا گیا۔ فروری ۱۹۶۰ء میں اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا اور اکتوبر ۱۹۶۱ء میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

اسلام آباد کا شہر پنجاب میں راولپنڈی سے آٹھ میل شمال میں مرگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کے شمال مشرق کی سمت مشہور صحت افزا مقام مری ہے اور مغرب کی جانب ٹیکسلا کا تاریخی شہر ہے۔ اس وفاقی علاقے کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے، جو سطح سمندر سے ۱۶۵۰ سے دو ہزار فٹ تک بلند ہے۔ یہاں کی آب و ہوا معتدل اور مناظر انتہائی دلفریب ہیں۔ موسم سرما میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۶۲٫۳ ف اور کم سے کم ۳۰٫۴ ف ہوتا ہے گرمیوں میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۱۰۳٫۵ ف اور کم سے کم ۵۰٫۹ ف تک ہوتا ہے۔ سالانہ بارش کی اوسط ۴۵ انچ ہے۔ اب تک یہاں کی کل آبادی کئی لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔

اسلام آباد سے پہلے پاکستان کا مرکزی دارالحکومت کراچی کو قرار دیا گیا تھا۔ پاکستان بنتے ہی کراچی میں سندھ کی صوبائی حکومت نے [illegible] اپنے سیکرٹریٹ کی عمارت خالی کر دی اور اس میں مرکزی سیکرٹریٹ قائم کیا گیا۔ مگر کراچی کی آب و ہوا، اس میں بڑھتی ہوئی آبادی اور لوگوں کی تاجرانہ ذہنیت کی بدولت مرکزی حکومت کسی اور مقام پر منتقل ہو جانے کی کوشش میں تھی۔ بقول صدر محمد ایوب خاں مرکزی حکومت کسی صحت بخش مقام کو منتقل ہو جانے پر غور کر رہی تھی اور اس سلسلے میں کراچی سے کوئی بیس میل دور ایک مقام گڈاپ کا نام لیا جا رہا تھا مگر بعض لوگوں کے دباؤ کے باعث کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ فوجی انقلاب کے بعد اس طرف توجہ دی گئی اور جنرل یحییٰ خاں کی نگرانی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس نے راولپنڈی کے قریب

ایک مقام کو اس کام کے لئے چنا۔
اس وقت اسلام آباد میں وفاقی اسمبلی، سکرٹریٹ، دیگر دفاتر، رہائشی سہولتوں اور بنیادی

اسلام آباد میں سیکرٹریٹ کی ایک عمارت

ضرورتوں سے علاوہ اسلام آباد یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور قائد اعظم یونیورسٹی اور نیشنل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی عمارتیں اور بہت سی عمارتیں مکمل ہو چکی ہیں۔ دیگر عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ ان سب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں باغبانی اور شجر کاری۔ اسلام آباد کی سڑکوں، پارکوں اور عمارتوں کے علاوہ تمام علاقوں پر بھی شجر کاری کی گئی۔ تاکہ ایک طرف تو سبزہ زاروں کا قیام عمل میں آئے اور دوسری طرف شہریوں کے لئے ذوق باغبانی کا اظہار ہو۔ موجودہ آبادی تین لاکھ سے زیادہ ہے۔

اسماء الحسنیٰ اچھے نام۔ اسمائے الٰہی۔ جو تقویٰ اور ہر عیب سے پاک، صفاتی ہر لحاظ سے اچھے، مرغوب اور دل پسند ہیں۔ عام طور پر ان کی تعداد ننانوے تسلیم کی جاتی ہے۔ بعض محدثین نے ۹۹ ناموں کی فہرست دی ہے۔ جبکہ بعض علماء کے نزدیک تین سو اور بعض کے نزدیک ایک ہزار ہیں۔ اکثر علماء اور صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے ناموں کی تعداد انبیاء کی تعداد کے برابر ہے۔ کیونکہ ہر نبی کو ایک خاص اسم عطا کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ خداوند تعالےٰ کی بارگاہ میں امداد کا طالب ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان ناموں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

اللہ کے سب نام اچھے ہیں۔ اس لئے اسے اچھے ہی نام سے پکارو۔ (اعراف ۱۸۰)
اللہ کے یہ نام اس کی مختلف صفات کی بنا پر پکارے جاتے ہیں، مگر ان سے اس کی وحدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ نام اس کی ذات لاشریک ہی کی غمازی کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام سے قبل مختلف ناموں سے مختلف خداؤں کے وجود کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے ہاں تو ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہیں۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے، جس نے خدائے واحد کی ذات کی تبلیغ کی اور اسے "اللہ" کہا۔ یہ اس کا ذاتی نام ٹھہرا اور دیگر نام اس کی صفات اور کاموں کی بنا پر صفاتی اور فعلی کہلاتے ہیں۔ اکثر صوفیا اور علماء کے نزدیک "اللہ" اسم اعظم ہے اور جب اللہ کی کوئی نہ کوئی صفت سامنے آتی ہے تو اس کے مطابق کوئی نہ کوئی لفظ بطور اسم استعمال کیا جاتا ہے۔
ذیل میں وہ اسمائے حسنیٰ دیے جاتے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم خود بھی اللہ تعالےٰ کی کسی صفت کے

مطابق اس کا کوئی نام رکھ کر اسمائے حسنیٰ میں اضافہ کر سکتے ہیں؛ معتزلہ اور کرامیہ کے نزدیک ایسا جائز ہے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک یہ امر تو بہرحال ناجائز ہے کہ اپنی عقل و فہم کے مطابق اللہ تعالےٰ کا کوئی نام رکھیں تاہم اگر کسی ایسے مفہوم کا تعین ہو، جس سے ذات الٰہیہ پر کسی ایسے مفہوم کا اطلاق ہو سکے تو اس کا جواز پیدا ہوتا ہے کہ ہم کوئی نام رکھیں، ورنہ نہیں۔ نیز ایسے نام جن کی تصریح اللہ تعالےٰ کے کمال مطلق کے خلاف ہے، سو انہیں سرے سے رد کر دینا ہی چاہیے مثلاً ہم اللہ تعالےٰ کو عارف نہیں کہہ سکتے۔
ننانوے اسماء الحسنیٰ اور ان کا مفہوم جو شارحین نے دیا ہے، درج ذیل ہے ان میں سے ۲ سے ۲۲ تک اسماء کی ترتیب وہی ہے، جو قرآن مجید میں سورۃ حشر کی آیات ۲۲ تا ۲۴ میں دی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ نام آتے ہیں، جو باعتبار ترخیم ترتیب دیے گئے ہیں۔ اکیسویں سے چھبیسویں نام یعنی القابض سے المذل تک کا مادہ تو قرآن مجید میں موجود ہے مگر بعینہٖ نہیں اس لئے انہیں اسمائے حدیث خیال کیا جاتا ہے اور ان کا دو دو کا جوڑا ہے، جن کا مفہوم ایک دوسرے کی ضد ہے۔ اکثر فہرستوں میں اسم "الواحد" بھی موجود ہے۔ مگر امام غزالیؒ جیسے علماء نے اسے حذف کر دیا ہے یا پھر اسے اسم "الاحد" سے ملا دیا گیا۔

۱۔ **اللہ** یہ خدا تعالےٰ کا ذاتی نام ہے۔ عربی کے علاوہ اور کسی زبان میں اللہ کا اسم ذات نہیں۔ (دیکھئے "اللہ")

۲۔ **الرحمان** ۔ ۳۔ **الرحیم** بخشنے والا، رحم کرنے والا کہ اس کے سوا اور کوئی بخشنے والا نہیں۔ اہل عرب ان ناموں سے واقف نہیں تھے۔ (نیز دیکھئے "رحمت")

۴۔ **الملک** مالک، صاحب ثروت، بادشاہ، جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے جس کے سوا کوئی مالک حقیقی نہیں۔ وہی سچا اور حقیقی بادشاہ ہے، وہی شہنشاہ ہے۔

۵۔ **القدوس** پاک منزہ، ہر عیب سے مستثنیٰ، سب سے الگ ذات۔ حتیٰ کہ روح اور ملائکہ سے بھی ارفع اور پاک ذات ہے۔

۶۔ **السلام** سلامت رہنے والا اور مخلوق کی سلامتی رکھنے والا۔ راحت اور سکون دینے والا وہی ہے جو سلامتی دیتا ہے اور اسلام پر چلاتا ہے۔

۷۔ **المومن** حفاظت کرنے والا، امن دینے والا، کلیتہً مامون ذات، اپنی ذات کی گواہی خود دینے والا، وہی ایمان دیتا ہے اور وہی امن بخشتا ہے۔ فساد کو مٹانا اور دل کو اطمینان بخشتا ہے۔

۸۔ **المہیمن** نگہبان، مخلوق کے رزق اور موت سے واقف اور خیال رکھنے والا۔ لفظی معنی ہیں۔ چھپا لینے والا۔ گویا وہ اپنی رحمت میں مخلوق کو چھپا لیتا ہے اور اس کی نگہداشت کرتا ہے۔

۹۔ **العزیز** عزت والا، بے نظیر، صاحب قوت، یکتا۔ امام غزالیؒ کے نزدیک نادر، مشکل الحصول، جسے چاہے سزا دے۔

۱۰۔ **الجبار** سب سے بڑا حاکم، بڑی قوت والا۔ بگڑے ہوئے کام بنانے والا، جس کی حکمت کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ جبر کے معنی درستگی کے ہیں۔ یعنی شکستہ دلوں کو ڈھارس دینے والا۔

۱۱۔ **المتکبر** بہت بڑا، جس کے مرتبے کو کوئی شے نہیں پہنچ سکتی۔ خاص و عام سے بے نیاز اور اس سے بلند و برتر کہ عقل و فہم اس کی قدر معلوم کر سکے۔

۱۲۔ **الخالق** ۔ خلق کرنے والا، اپنی مشیت و حکمت کے مطابق پیدا کرنے والا۔

۱۳ - البارئ :- مخلوق کو پیدا کرنے والا - (مفہوم میں الخالق کے نزدیک) عدم سے وجود میں لانے والا

۱۴ - المصوّر صورت دینے والا - ترتیب و تزئین کرنے والا - عدم سے وجود میں لانے والا - وہ ذات جس نے سب کو جُدا جُدا صورتیں عطا کیں -

۱۵ - الغفار گناہ بخشنے والا - سزا میں کمی کرنے والا - مخلوق کے عیب چھپانے والا قصور معاف کرنے والا - غفر کے معنی چھپانے والے کے ہیں -

۱۶ - القہّار مغلوب کرنے والا ، غالب کہ تمام عالم اس کی قدرت کے مقابلے میں عاجز اور مغلوب ہے - قہر کے معنی غلبہ کے ہیں - قاہر غلبہ رکھنے والے کو کہتے ہیں - قہار سب سے زیادہ غالب -

۱۷ - الوہاب بلا معاوضہ بہت کچھ اور مسلسل دینے والا - ہبہ یعنی عطیہ دینے والا - وہاب کا تعلق رحمت سے ہے -

۱۸ - الرزاق روزی پیدا کرنے اور مخلوقات تک پہنچانے والا - ہر ایک کو اپنی مشیت کے مطابق دینے والا -

۱۹ - الفتاح فتح مند ، رحمت کا دروازہ کھولنے والا ، حکم سنا کر فیصلہ کرنے والا ، انسانوں کے قلوب اور اذہان کھولنے والا -

۲۰ - العلیم ہر بات کو جاننے والا - خواہ وہ باتیں کھلی ہوں یا چھپی ہوں - علم دینے والے کو بھی علیم کہا جاتا ہے - وہ ذات جو جزئیات اور مستقبل کا مکمل علم رکھتی ہے

۲۱ - القابض روک لینے والا ، قبضے میں کر لینے والا - کائنات کی ہر شے پر محیط -

۲۲ - الباسط کشادہ کرنے والا - رزق وسیع کرنے والا - علم یا طاقت پھیلانے والا -

۲۳ - الخافض :- پست کرنے والا - کافروں کو عاجز کر دینے والا -

۲۴ - الرافع :- بلند کرنے والا - ایمان لانے والوں کو مرتبہ میں بڑھانے والا -

۲۵ - المعزّ :- عزت دینے والا - اپنی مخلوق کو طاقت اور عزت بخشنے والا -

۲۶ - المذل :- ذلت دینے والا - کافروں کا درجہ گھٹانے والا -

۲۷ - السمیع سننے والا - ہر ظاہر اور چھپی بات اور دعا کو سننے والا ہر مخلوق کی بات کو سننے والا ، خواہ وہ مخلوق بے زبان ہو -

۲۸ - البصیر دیکھنے والا - ہر اچھے اور برے کام کو دیکھنے والا ، مخلوقات کی نگرانی کرنے والا - ادراک رکھنے والا - بصارت دینے والا -

۲۹ - الحکم :- حکم دینے والا ، اپنے احکامات کی بنا پر فیصلہ کرنے والا -

۳۰ - العدل :- انصاف کرنے والا ، سب سے بڑا منصف -

۳۱ - اللطیف لطف اور مہربانی کرنے والا ، باریک بین ، نیکی اور نرمی کرنے والا - کرم کرنے والا نیتوں کو جاننے والا -

۳۲ - الخبیر خبر رکھنے والا ، بھید جاننے والا ، ہر ظاہر اور پوشیدہ بات اور کام سے آگاہ - جملہ واقعات کی خبر اسی ذات کو ہے -

۳۳ - الحلیم حلم والا ، بردباری کرنے والا - گناہوں کو معاف کر دینے والا - جلد عذاب نہ دینے والا -

۳۴ - العظیم بزرگ و برتر - سب سے بڑا ، جس کی بڑائی کو فہم انسانی بھی نہ پہنچ سکے اس عظمت والا ، جس کے سامنے ہر بڑی شے ہیچ ہے

۳۵ - الغفور مغفرت کرنے والا ، چشم پوشی کرنے والا ، مطلق بخشنے والا - بے انتہا بخشش کرنے والا -

۳۶ - الشکور :- قدردان ، زیادہ اجر دینے والا - قبول کرنے والا - توفیق شکر دینے والا -

۳۷ - العلی :- بلند مرتبہ ، بلند ترین درجے پر فائز ، جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا جو سب سے برتر ہے

۳۸ - الکبیر :- سب سے بڑا بزرگ ترین ہستی - زمان و مکان میں ارفع و اعلیٰ -

۳۹ - الحفیظ :- مخلوقات کی حفاظت کرنے والا - ہوشیار ، نگہبان ، جو ہمہ وقت محافظ ہے -

۴۰ - المقیت زندگی کے لوازم دینے والا ، قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا - ہر بات کو جاننے والا - قوت دینے والا - تقویت عطا کرنے والا -

۴۱ - الحسیب حساب لینے والا ، فیصلہ کرنے والا ، توازن رکھنے والا - کفایت کرنے والا وہی ذات کافی ہے - اس کے سوا کسی اور کی پناہ کی ضرورت نہیں -

۴۲ - الجلیل :- صاحب جلال ، بزرگ ، پُرشکوہ

۴۳ - الکریم کرم کرنے والا ، مہربان ، بخشش و عطا کرنے والا - فیاض ، خطا بخشنے والا ، صاحب کرامت -

۴۴ - الرقیب :- نگہبان - (الغزالی کے نزدیک اس کا مفہوم الحفیظ کے قریب ہے) سلامتی اور حفاظت دینے والا

۴۵ - المجیب :- جواب دینے والا ، دعا سننے والا - پکارنے والوں کی مدد کو پہنچنے والا -

۴۶ - الواسع فراخ ، ہر جگہ موجود ، ہر شے اور ہر ... تک پہنچنے والا - دنیا کی ہر شے پر قادر جس کا علم اور رحمت ہر شے کو محیط ہے -

۴۷ - الحکیم حکمت والا ، (العلیم کا مترادف) حقائق و اسرار کا جاننے والا - تدبیر کرنے والا - دانش و حکمت دینے والا -

۴۸ - الودود بہت زیادہ محبت کرنے والا ، دوستوں کا سب سے بڑا دوست - وہ ذات جو محب بھی ہے اور محبوب بھی - یہ اس کی صفت ہے ... نہیں -

۴۹ - المجید :- عالی شان ، اپنی ذات اور افعال میں بزرگ ، ثنا کا مستحق

۵۰ - الباعث :- دوبارہ زندہ کرنے والا ، مُردوں اور غافلوں کو اٹھانے والا -

۵۱ - الشہید :- گواہ ، واقف ، ظاہر و باطن ہر حاضر - علم اور خبر رکھنے والا - علم اور ... دینے والا

۵۲ - الحق سچا ، حقیقی ، خدائی کے لائق ، واجب الوجود - سچائی کا مالک ، جس کے ... ہر شے باطل اور معدوم ہے -

۵۳ - الوکیل بندوں کا کارساز ، ضرورتوں کا خیال رکھنے والا - مرادیں پوری کرنے والا - نعمتیں دینے والا -

۵۴ - القوی :- قوت والا جس کے زیر قوت ہر شے ہے - نیز قوت دینے والا کہ تمام قوتیں اسی سے حاصل ہوتی ہیں -

۵۵ - المتین :- استوار ، مستحکم ، جسے ہٹایا نہیں جا سکتا - جس کے کاموں میں ... کی رکاوٹ نہیں -

۵۶ - الولی :- دوستوں کا مددگار ، ساتھی ، مالک و محافظ - قریبی ، محبت کرنے والا ، ... درجہ کا مالک -

۵۷ - الحمید :- شکر اور تعریف کے لائق ، ثنا کا مستحق - اسی ذات و صفت کی تعریف کرنے والا تمام تعریفیں اسی ذات کے لئے ہیں -

۵۸ - المحصی :- گھیرنے والا ، ہر شے پر محیط ، ہر شے کو جاننے والا ، صاحب ادراک

۵۹ - المبدئ :- پہلی بار پیدا کرنے والا ، خالق مطلق -

۶۰ - المعید :- دوسری بار پیدا کرنے والا ، دوبارہ زندہ کرنے والا -

۶۱ - المحی :- زندہ کرنے والا ، حیات دینے والا زندگی پیدا کرنے والا - احیاء کرنے والا

۶۲ - الممیت :- موت دینے والا ، خالق باری جو مارتا اور جلاتا ہے -

۶۳ - الحی :- ہمیشہ زندہ ، یہ نام صفات ذاتی میں شمار ہوتا ہے نیز زندگی اسی سے ہے -

۶۴ - القیوم :- اپنی ذات پر قائم - خود بخود قائم ، قائم رکھنے والا -

۲۴ ۔ المنان :۔ احسان کرنے والا ، جس کے کثیر انعامات کا بار مخلوق پر ہے ۔
۲۵ ۔ الکفیل :۔ ذمہ داری لینے والا ، کفالت کرنے والا ۔ حاجتیں پوری کرنے والا ۔
۲۶ ۔ المحیط :۔ چھپایا ہوا ، گھیرے ہوئے ۔ ساری کائنات کا محافظ جس کی قدرت ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۔
۲۷ ۔ الرفیع :۔ رفعت والا ، بلندیوں والا بلندی عطا کرنے والا ۔
۲۸ ۔ الشاکر :۔ شکر والا ، شکر گذاری قبول کرنے والا ۔ شکر کی طاقت اور توفیق عطا کرنے والا ۔
۲۹ ۔ الاکرم :۔ شرف اور بزرگی والا ۔ ہر شے پر کرم اسی کی طرف سے ہوتا ہے ۔
۳۰ ۔ القدیر :۔ ہر فعل اپنی قدرت سے کرنے والا ، ہر شے پر قادر ۔
۳۱ ۔ الخلاق :۔ بہت بڑا خالق ، پیدا کرنے والا ، تخلیق کرنے والا ۔
۳۲ ۔ الفاتح :۔ کھولنے والا ، فتح و نصرت کے دروازے وا کرنے والا ۔ دل و دماغ روشن کرنے والا ۔
۳۳ ۔ المثیب :۔ ثواب دینے والا نیکی اور دعا کو قبول کرنے والا ۔
۳۴ ۔ العالم :۔ علم رکھنے والا ہر شے کو جاننے والا ۔ عالم مطلق ۔
۳۵ ۔ المولیٰ :۔ مددگار ، احتیاج پوری کرنے والا آقا ، مالک ۔ جو اعانت و نصرت عطا کرتا ہے
۳۶ ۔ النصیر :۔ نصرت دینے والا ، عون و مدد دینے والا ، فتح عطا کرنے والا ۔
۳۷ ۔ ذوالطول :۔ جود و سخا والا ، مہربان ، رحیم
۳۸ ۔ ذوالمعارج :۔ بلندیوں والا ۔ عروج پر پہنچا ہوا ۔
۳۹ ۔ ذوالفضل :۔ فضل والا ، بزرگی والا ، افضل ، متفضل ۔
۴۰ ۔ المبین :۔ وہ ذات جس کے ساتھ ہمیشگی ہے ۔ پاس آنے والا ۔ ہر شے اسی سے پیدا اور آشکارا ہے ۔
۴۱ ۔ الالٰہ :۔ معبود ، لائق عبادت (دیکھئے "اللہ")
۴۲ ۔ المدبر :۔ تدبیر کرنے والا ۔ پس پردہ فاعل حقیقی
۴۳ ۔ الفرد :۔ ذات واحدہ لاشریک ۔ منفرد
۴۴ ۔ السریع :۔ انتہائی سرعت کے ساتھ ، تیار ۔
۴۵ ۔ المتفضل :۔ فضل کرنے والا ، افضل ذات
۴۶ ۔ الغافر :۔ چھپانے والا ، مغفرت کرنے والا ۔ بخشنے والا ۔ غفور رحیم
۴۷ ۔ القابل :۔ قبول کرنے والا ۔ عبادت و ثنا کے لائق ۔
۴۸ ۔ الملیک :۔ مالک ، بادشاہ ۔ بلا شرکت غیرے قابض ۔
۴۹ ۔ المعین :۔ مددرساں ، اعانت کرنے والا ۔
۵۰ ۔ الحاکم :۔ حکمت والا ، اصل حاکم
۵۱ ۔ الغالب :۔ برتر ، چھپایا ہوا ، قابض ، غلبہ کا مالک
۵۲ ۔ الاعلیٰ :۔ ہر شے سے برتر ، نہایت بلند اور اعلیٰ
۵۳ ۔ الحفی :۔ بہت مہربان ، ساری کائنات پر مہربان
۵۴ ۔ المنعم :۔ انعام کرنے والا ، نعمت دینے والا ، عطا کرنے والا ۔
۵۵ ۔ المستعان :۔ مدد دینے والا (امام جعفر صادق کے نزدیک یہ اسم الحسنیٰ میں اہم ہے ۔)

قرآن مجید کی بعض آیات میں مندرجہ اسماء بھی ملتے ہیں

واسع المغفرۃ (مغفرت کو وسعت دینے والا) ، اہل التقویٰ (تقویٰ کا مالک) اہل المغفرۃ (مغفرت کا مالک) احکم الحاکمین (سب حاکموں سے بڑھ کر حکم دینے والا) احسن الخالقین (سب سے بہتر تخلیق کرنے والا) کاشف الضر (نقصان دور کرنے والا) اسرع الحاسبین (سب سے جلد تر حساب کرنے والا) المجیر (پناہ دینے والا) المرھوب (ہیبت والا) المستجار (جس سے پناہ مانگی جائے) ، المستعار (جس سے عرض کیا جائے) المعاذ (پناہ) الملجا (ٹھکانا) المنجی (نجات دہندہ) المستغاث (فریاد سننے والا) دائم المعروف (ہمیشہ سے بخشش کرنے والا) قاضی الامور (معاملات کا فیصلہ کرنے والا) مقلب القلوب (دلوں کو بدل دینے والا)

(صفات الٰہیہ کے لئے مزید دیکھئے "اللہ")

اسماء الرجال ایک فن ، جس میں حدیث کی تحقیق کے لئے راویوں کے سوانحی حالات پوری تنقید کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں ۔ فن سیرت نگاری و تذکرہ [illegible] ذیل میں آتے ہیں ۔ اس کی ضرورت ، احادیث کی پرکھ اور تحقیق کے لئے پیش آئی اور بقول ڈاکٹر اسپرنگر حضرت محمد صلعم کے حالات و واقعات جمع اور فراہم کرنے کے لئے مسلمان مصنفین اور محققین نے تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں کے سوانحی حالات و واقعات مرتب اور مدون کئے ۔

آنحضور صلعم کی سیرت ، اور اسوۂ حسنہ کو مسلمانوں نے جس طرح سے محفوظ کیا ، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اسی کے واسطے سے احادیث بیان کرنے والوں کی سیرت اور حالات بھی تاریخ کا حصہ بنتے گئے ۔ ان میں صحابہ [illegible] تابعین ، تبع تابعین اور جو تقریباً [illegible] ہجری تک کے لوگ شامل ہیں ۔ ان میں بارہ ہزار [illegible] ہیں ، جنہیں اپنی زندگی میں آنحضور [illegible] سے ملنے اور گفتگو کرنے کی سعادت نصیب [illegible] ان میں سے ہر ایک نے [illegible] ذکر [illegible] ضرور حاصل کیا ، کوئی نہ کوئی بات [illegible] کا کوئی نہ کوئی واقعہ نظر سے گذرا ۔ یہ سب باتیں کسی [illegible] مطابق کہ مجھ سے جو کچھ سنو وہ دوسروں تک پہنچاؤ ۔ [illegible] صحابہ کرام کا یہی کام تھا ۔ ان کے بعد آنے والے تابعین [illegible] حوالے سے ان روایات کو آگے پہنچایا ۔ ان کے بعد آنے والے [illegible] بھی اسی کام پر کاربند ہوئے ۔ یوں یہ سلسلہ ایک راوی سے دوسرے [illegible] محدثین نے ، جنہوں نے اسے باقاعدہ علم کی حیثیت دی ۔ ان کا [illegible] کی پرکھ کرنے کے لئے روایت کرنے والوں کے حالات و واقعات بھی [illegible] اسلام کا کوئی گوشہ ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہے ۔

اسماء الرجال میں حدیث و سیرت کے راویوں کی زندگی کے حالات [illegible] کی جاتی ہے اور جو نقص یا عیب راوی میں پایا جائے اسے [illegible] اس امر میں کسی شخصیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا ۔ اس سے [illegible] کہ ہر حدیث کے متعلق دیکھا جائے کہ اس کا روایت کرنے والا اور بیان کرنے [illegible] اور دیانت کا شخص ہے ۔ کہیں وہ جھوٹا اور فریبی [illegible]

اس فن میں سب سے پہلی کتاب یحییٰ بن سعید القطان کی تصنیف [illegible] ان کا سال وفات ۱۹۸ھ/۸۱۲ء ہے ۔ بعد میں یہ فن بڑھتا اور ترقی کرتا رہا [illegible] کے مطابق عقیلی ، امام رازی ، امام دارقطنی اور ابن عدی کی کتب [illegible] ہیں ، مگر بعد کی تصنیفات کا بنیادی ماخذ یہی ہیں

فن اسماء الرجال کی قدیم ترین کتابوں میں "طبقات" ابن سعد کو [illegible] محدثین نے اسے نہایت مستند اور صحیح کتاب سمجھا ہے ۔ اس میں آنحضور [illegible] تابعین کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے ۔ ان کے بعد اس فن کی نادر الوجود کتاب [illegible] کی "تاریخ" ہے ۔ جو تین جلدوں (کبیر ، اوسط اور صغیر) میں لکھی گئی ۔ ان کے بعد امام مسلم نے "المفردات والوحدان" کے نام سے ایک کتاب لکھی ۔ ان کی زندگی ہی میں احمد بن عبد اللہ العجلی (۲۶۱ھ/۸۷۵ء) نے اس فن میں ایک مفید کتاب "الجرح والتعدیل" لکھی ۔ امام عبد الرحمان بن ابی حاتم الرازی (۳۲۷ھ/۹۳۹ء) کی کتاب کا نام بھی "الجرح والتعدیل" تھا ۔ علامہ ابو احمد عبد اللہ بن محمد ابن قطان (۳۶۵ھ/[illegible]) کی کتاب "الکامل" اس فن میں وقیع تر سمجھی جاتی ہے اور سب سے زیادہ جامع [illegible]

مستند ترین کتاب "تہذیب الکمال" ہے جو علامہ مزی یوسف بن زکی کی تصنیف ہے علامہ ذہبی نے اس کی تلخیص کی ہے۔ صحاح ستہ کے راویوں کے بارے میں یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کی ایک شرح علامہ ابن حجر نے بھی لکھی جس کا نام "تہذیب التہذیب" ہے۔ ان کے بعد اس فن پر لکھنے والوں میں سے ابن عبدالبر، بیہقی، ابن اثیر، ابن جوزی، حافظ ذہبی، علامہ سیوطی اور السخاوی اہم ہیں۔ اس کے بعد یہ دبستان ختم ہو جاتا ہے اور اسماء الرجال کی کتابوں کا انداز سیرت کی عام کتابوں کی مانند ہو جاتا ہے۔

اہل تشیع کے ہاں اس فن پر لکھنے والوں میں عبداللہ بن حسین الششتری، ابو محمد عبداللہ بن جبلہ الواقفی، ابو جعفر احمد بن محمد البرقی، ابو عبداللہ محمد بن الحسن المحاربی، ابو عمرو محمد بن عمر الکشی، ابن بابویہ القمی، ابن الکوفی، عبداللہ بن محمد بن عبداللہ المامقانی اور محمد استر آبادی قابل ذکر ہیں۔

اسماء بنت ابی بکر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی، ملقب بہ ذات النطاقین ہجرت سے ستائیس سال قبل قتیلہ بنت عبدالعزیٰ کے بطن سے مکہ معظمہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا شمار اسلام لانے میں سبقت لے جانے والوں میں ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلعم نے اپنے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہجرت [illegible] غار ثور کو اپنا پہلا مسکن بنایا تو حضرت اسماءؓ رات کے وقت [illegible] خورد و نوش بہم پہنچایا کرتی تھیں۔ جب آنحضورؐ نے غار ثور سے مدینہ کی [illegible] خورد و نوش باندھنے کے لئے کوئی چیز [illegible] اپنا کمر بند پھاڑ کر اس کے دو حصے کئے [illegible] کا منہ بند کیا۔ محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ دوسرا [illegible] آنحضورؐ کو پسند آیا اور آپ نے حضرت اسماءؓ کو ذات النطاقین کے لقب سے نوازا۔

[illegible] کی شادی حضرت زبیرؓ بن العوام سے ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد [illegible] میں قیام فرمایا [illegible] آپ کے بطن سے عبداللہ بن زبیرؓ [illegible] مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے [illegible] حضرت اسماءؓ کے ہاں کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ آخری عمر میں حضرت زبیرؓ نے [illegible] کے باعث انھیں طلاق دے دی۔ حضرت اسماءؓ اپنے [illegible] کے ہاں چلی آئیں اور تادم مرگ یہیں قیام فرمایا۔ ان کی زندگی ہی میں حضرت زبیرؓ واقعہ جمل سے واپس آتے ہوئے ابن جرموز کے ہاتھوں اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حجاج بن یوسف کے مقابلے میں شہید ہوئے۔ ان کی لاش تین روز تک سولی پر لٹکی رہی۔ حضرت اسماءؓ نے یہ منظر بڑے تحمل سے دیکھا۔ مگر چند ہی روز بعد خود بھی انتقال کر گئیں۔ آپ کا شمار جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔ آپ بڑی خوددار، جرأت مند اور باہمت خاتون تھیں۔ حجاج جیسے ظالم و جابر کے دبدبے کو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ طبعاً بڑی فیاض اور ہمدرد تھیں۔ ان کے [illegible] کے بارے میں اکثر روایات ملتی ہیں۔

اسماءؓ بنت عمیس قبیلہ کنانہ کی ایک خاتون صحابیہ، جن کا شمار اول اسلام لانے والوں میں ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کے نکاح میں آئیں۔ حبشہ کی ہجرت میں بھی شریک ہوئیں اور کئی برس تک وہاں اقامت پذیر رہیں۔ فتح خیبر کے بعد مدینہ آئیں۔ ۸ھ میں حضرت جعفر طیارؓ نے جنگ موتہ میں شہادت پائی تو اس کے کوئی چھ ماہ بعد آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے انتقال کیا تو وصیت کے مطابق ان کی میت کو آپ ہی نے غسل دیا۔ اس کے بعد آپ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں اور ان کی شہادت کے بعد انتقال کیا۔

اسماعیل علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے پیغمبر، ذبیح اللہ، بنو قریش کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کے بڑے فرزند، حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھے اسرائیلی روایات کے مطابق ان کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی برس تھی ان کے تیرہ یا چودہ برس بعد حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔

عبرانی زبان میں اسماعیل کو شموع ایل کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں "اللہ کا سنا" گویا اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن کر انھیں فرزند عطا کیا۔ (دیکھئے ابراہیمؑ)

حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ دو واقعات منسوب ہیں۔ ایک واقعہ ذبح و فدا اور دوسرا ان کے ذریعے چشمہ زمزم کا وجود میں آنا۔ روایت کے مطابق حضرت اسماعیلؑ ذرا بڑے ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اللہ کی خوشنودی کے لئے ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بلا تامل خود کو اللہ کی راہ میں قربانی کے لئے پیش کر دیا۔ چنانچہ ان کا لقب "ذبیح اللہ" ہوا

یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک یہ سعادت حضرت اسحاقؑ کو حاصل ہوئی تھی۔ لیکن خود اسرائیلی تصریحات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کو ذبح کے لئے پیش کیا۔ جب کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے قبل حضرت اسمٰعیلؑ ہی اکلوتے فرزند تھے۔ قرآن مجید میں اس واقعے کا ذکر یوں آتا ہے:-

"پس جب وہ مقام سعی پر پہنچے تو حضرت نے کہا، اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیلؑ نے کہا، اے میرے باپ! آپ کو جو حکم ملا ہے، آپ اس کی تعمیل کریں انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ پس جب دونوں نے خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا تو باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔ اس وقت ہم نے آواز دی، اے ابراہیم! تو نے خواب سچا کر دکھایا اور ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یہ ایک آزمائش تھی اور ہم نے فدیہ کے طور پر ذبح عظیم سے اسے چھڑا لیا۔" (۳۷: ۱۰۱ تا ۱۰۷)

حضرت اسماعیلؑ نوجوان ہوئے تو اس وقت تک حضرت اسحاقؑ پیدا ہو چکے تھے شاید کسی خانگی چپقلش یا بیویوں کی رقابت کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو عرب کے ریگزاروں میں اس مقام پر چھوڑ آئے، جسے آج کل مکہ کہا جاتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس وقت حضرت اسماعیلؑ شیر خوار تھے اور ذبح و فدا کا واقعہ اس سے بعد کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ان کے لئے تھوڑا سا سامان خورد و نوش، کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک مشکیزہ چھوڑ گئے۔ جب یہ سامان ختم ہو گیا تو حضرت ہاجرہؑ ادھر اُدھر دوڑیں۔ اس عالم پریشانی میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے سات چکر لگائے۔ اسی اثنا میں اللہ کے حکم سے اس مقام پر زمزم کا چشمہ ابلنے لگا، جہاں حضرت اسماعیل لیٹے ہوئے تھے۔ (دیکھئے "آب زمزم")

آب زمزم پر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کی ملکیت تھی اور آتے جاتے قبائل ان سے اشیائے خورد و نوش کے بدلے میں پانی حاصل کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک قبیلہ بنی جرہم تھا۔ جو وہیں آباد ہو گیا۔

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنو جرہم کی ایک لڑکی کے ساتھ حضرت اسماعیل کا عقد ہوا اور اس مقام پر جہاں بعد میں کعبے کی تعمیر ہوئی، سکونت اختیار کر لی۔ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب ان سے ملنے آئے تو حضرت اسماعیلؑ وہاں موجود نہ تھے۔ آپ نے

ان کی بیوی سے دریافت کیا، گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ اس نے نفی میں جواب [illegible] پر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا جب تمہارے شوہر آجائیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور پیغام دینا کہ گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ حضرت اسماعیلؑ گھر آئے تو بیوی نے یہ پیغام دیا۔ [illegible] حضرت اسماعیلؑ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اسی قبیلہ کی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا۔ اتفاق سے حضرت ابراہیمؑ پھر ان سے ملنے کے لئے آئے۔ اس روز بھی حضرت اسماعیلؑ گھر پر نہیں تھے۔ ان کی بیوی نے بڑے سلیقے اور احترام کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کا خیر مقدم کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے وقتِ رخصت یہ پیغام دیا کہ جب شوہر آئیں تو کہنا، تمہارے گھر کی چوکھٹ بہت خوب ہے۔

اس دوسری بیوی سے حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے ہوئے۔ جن کی اولاد عرب میں پھیلی اور مستعربہ کہلائی۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے ساتھ مل کر خدا کا گھر تعمیر کرنا شروع کیا۔ اس وقت انہوں نے یہ دعا مانگی تھی "اے ہمارے رب! تو اسے ہم سے قبول فرما! بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد سے ایک امت پیدا کر، جو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں ہمارے مناسک سکھا اور ہماری توبہ قبول کر۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" (البقرہ: ۱۲۷، ۱۲۸)

مشہور مورخ ابوالفدا لکھتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کو قبائل یمن اور عمالیق کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ انہوں نے تمام عمر اللہ کا پیغام اہل عرب تک پہنچایا، اور انھیں بیت اللہ کے حج کے لئے دعوت دی۔ اسی بیت اللہ کے گرد بعد میں شہر بسا، جسے آج مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ ۱۳۷ برس کی عمر میں مکہ میں فوت ہوئے اور اپنی والدہ کے پاس حطیم میں مدفون ہیں۔

اسماعیلؒ، امام

امام جعفر صادقؒ کے بڑے فرزند۔ والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ ان کے نام سے شیعوں کا ایک فرقہ اسماعیلیہ وجود میں آیا۔ اس کے نزدیک اسماعیل ساتویں امام ہیں۔ نہ کہ امام موسیٰ کاظم، جیسا کہ امامیہ (اثنا عشری) عقیدہ ہے۔ اسماعیل، امام جعفر صادقؒ کی وفات سے پانچ سال قبل ہی ۱۴۳ھ / ۷۶۲ء میں مدینہ منورہ میں فوت ہو گئے اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے جبکہ اسماعیلیوں کے نزدیک امام جعفرؒ کی وفات کے پانچ سال بعد بھی امام اسماعیلؒ زندہ تھے (نیز دیکھئے "اسماعیلیہ")

اسماعیل اوّل

(۸۹۲ھ/[illegible]ء۔ ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) ایران کے صفوی خاندان کا بانی۔ سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے۔ مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین (وفات ۱۳۳۴ء) بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کے جانشینوں میں سے شیخ جنید نے شیعیت کا رنگ اختیار کیا۔ نیز شیخ کی بجائے شاہ کہلانے لگے۔ شیخ جنید نے اپنے مریدوں کے ذریعے ترکمان فرمانروا جہان شاہ کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ ان کے مارے جانے کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین شیخ حیدر کا بھی یہی انجام ہوا۔ اور دوسرے بیٹے شاہ اسماعیل کو جو اس وقت ایک برس کے تھے، مریدوں نے حفاظت میں رکھا۔

شاہ اسماعیل نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں اردبیل کا رخ کیا اور جہان شاہ کو گلستان کے مقام پر شکست فاش دی۔ باکو، ارزنجان اور تبریز پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ اسماعیل نے ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء کو رسم تاجپوشی ادا کی۔ نیز ایک حکم کے تحت سرکاری مذہب امامیہ قرار دیا اس اعلان سے سنی رعایا بددل ہو گئی اور یوں اس کا عہد حکومت بھی طوائف الملوکی کا دور رہا۔ ۱۵۰۸ء میں جا کر کہیں وہ اس قابل ہوا کہ اپنی حکومت کو مستحکم کر سکے۔ اس دوران میں تیموری حکمران بابر بھی اس کا حلیف رہا اور دونوں مل کر ہرات پر حملہ آور ہوئے۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے سنیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا، جس میں بڑے بڑے علما مارے گئے۔ عثمانی ترکوں کے ہاں اس کے خلاف زبردست غم و غصہ کی لہر پائی جاتی تھی۔ جس کے نتیجے میں سلطان سلیم نے ایشیائے کوچک میں پیدا ہونے والی بغاوت میں ہزاروں شیعوں کو انتقاماً قتل کروا دیا اور بالآخر دونوں قومیں بھی آپس میں ٹکرا گئیں۔ تبریز کے قریب اسماعیل نے شکست کھائی اور ترکی لشکر تبریز پر قابض ہو گیا۔ اس کے باوجود ایران میں شیعی حکومت قائم رہی۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس شیعی سنی تصادم کی بدولت مسلمانوں کی قوت کو ضعف پہنچا، جس کے نتیجے میں یورپی اقوام کو ایران اور ترکی کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔ شاہ اسماعیل نے شہنشاہ میکسیملین اوّل کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کئے تاکہ وہ عثمانیوں سے بدلہ لے سکے۔ دوسری طرف عثمانی حکومت بھی صفویوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہی۔

اسماعیل پاشا

(۱۸۳۰ء۔ ۲ مارچ ۱۸۹۵ء) خدیو مصر۔ ابراہیم پاشا کا دوسرا بیٹا تعلیم پیرس میں حاصل کی۔ نوجوانی میں مختلف سفارتوں پر فائز رہا۔ ۱۸۶۱ء میں سوڈان کی ایک بغاوت فرو کی۔ دو سال بعد چچا کا جانشین ہوا اور والی مصر بنا۔ ۱۸۶۷ء میں سلطان عبدالعزیز نے اسے خدیو مصر کا لقب عطا کیا اور آئندہ سے جانشینی کا حق صلبی بیٹے کو دیا گیا۔ ۱۸۷۳ء کے ایک فرمان کے مطابق اسے خود مختار بادشاہ بنا دیا گیا۔

اسماعیل پاشا ایک ترقی پسند حکمران تھا۔ اس نے رفاہ عامہ اور انتظام مملکت پر اتنا پیسہ خرچ کیا کہ ۱۸۷۶ء تک اس کا ملک دس کروڑ پونڈ کا مقروض ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ ۱۸۷۸ء میں ان غیر ملکیوں نے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا۔ جس نے اسماعیل پاشا کو محض آئینی حکمران بننے پر مجبور کر دیا۔ اس کی وزارت میں انگریز اور فرانسیسی وزرا بھی شامل تھے تاہم فروری ۱۸۷۹ء میں [illegible] پاشا کی فوجی شورش کے پیش نظر اس نے یورپی وزرا کو معطل کر دیا۔ ۲۶ جون ۱۸۷۹ء کو [illegible] معزول کر دیا گیا۔ وہ قاہرہ سے نیپلز روانہ ہو گیا، جہاں اٹلی کے بادشاہ نے [illegible] کی حیثیت سے ٹھہرایا۔ بعد ازاں وہ قسطنطنیہ چلا گیا۔ جہاں اس نے وفات پائی۔

اسماعیل ثانی

ایران کا صفوی بادشاہ، اسماعیل اوّل کا پوتا [illegible] باپ کی وفات کے بعد [illegible] جمادی الاوّل ۹۸۴ھ / ۲۲ اگست ۱۵۷۶ء کو تخت نشین ہوا۔ [illegible] باپ نے ولی عہد بنانے سے انکار کر دیا تھا اور [illegible] میں قید کر رکھا تھا۔ اگلے ہی برس اس نے خاندان کے [illegible] سے ایک سال بعد ۱۳ رمضان ۹۸۵ھ / نومبر ۱۵۷۷ء میں [illegible]

اسماعیلؒ شہید، شاہ

(۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ / ۲۹ اپریل ۱۷۷۹ء [illegible] ۱۲۴۶ھ / ۶ مئی ۱۸۳۱ء) سید احمد شہید بریلوی کے [illegible] شاہ ولی اللہ کے پوتے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ [illegible] شاہ عبدالغنی کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ تھا، جو مولوی علاء الدین [illegible] تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ابھی دس برس کے تھے [illegible] کہ آپ کے والد انتقال کر گئے۔ ان کے بعد آپ کے چچا شاہ عبدالقادر نے آپ کی [illegible] اور تربیت کی۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی نواسی سے، جن کا نام کلثوم تھا [illegible] شادی کر دی۔ نیز جائداد میں سے بھی ایک حصہ عطا فرمایا۔

شاہ اسماعیل بچپن ہی سے ذکی الطبع تھے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک [illegible] علوم رسمیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ بڑے بڑے علما آپ سے [illegible] مسائل پوچھتے [illegible]

دینا بعض عالموں سے مشکل ہوتا تھا۔ لیکن آپ ایسا شافی جواب دیتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ علوم کے ساتھ ساتھ وقت کے رواج کے مطابق فنون حرب بھی سیکھ لیے تھے۔

۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں جب سید احمد بریلوی نواب امیر خاں سے الگ ہو کر دلی پہنچے تو شاہ اسماعیلؒ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کر لی۔ اس وقت سے لے کر دم آخر تک آپ نے سید احمد کا دامن نہ چھوڑا اور ساری زندگی انھی کی طرح تبلیغ دین، اعلائے کلمۃ الحق اور جہاد میں گزار دی۔ سید صاحب نے تنظیم جہاد کی غرض سے جتنے دورے کیے شاہ اسماعیل ان میں برابر کے شریک رہے۔

۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں حضرت سید احمد بریلوی کے ساتھ حج کا قصد کیا۔ وہاں انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کیا۔ دو سال بعد واپس وطن لوٹے اور سید احمد کے ساتھ مل کر انگریزوں اور سکھوں کے خلاف تحریک جہاد کا بھرپور آغاز کیا۔ [illegible] جنوری ۱۸۲۶ء کو وہ سید صاحب کے ساتھ راہ خدا میں ترک وطن کر کے صوبہ سرحد کی طرف جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔

جہاد کے دوران میں [illegible] سید صاحب کے خاص مشیروں میں سے تھے۔ [illegible] نے سید [illegible] منتخب بطور امام کر لیا۔ جنگ شیدو میں سید صاحب کی حفاظت حضرت شاہ اسماعیل نے اپنی جان پر کھیل کر کی اور جنگ مردان میں فتح [illegible] [illegible] نواب وزیر الدولہ کا بیان ہے کہ بعض اوقات [illegible] کی تعلیم [illegible] جب سید صاحب کا حکم کسی جنگی مہم [illegible] ہتھیار سنبھال کر [illegible] تیار ہو جاتے۔

[illegible] بالاکوٹ [illegible] شہادت پائی۔ آخری وقت ان کے سر سے [illegible] گولی [illegible] اور اس [illegible] مغربی سمت [illegible] کوٹ کے نشیبے کے کنارے [illegible] ہے۔

حضرت شاہ [illegible] حالت جذب میں [illegible] چھوڑی، سوائے [illegible] ان میں سے [illegible] تقویۃ الایمان [illegible] اردو زبان میں [illegible] منصب امامت (فارسی)، ایضاح الحق [illegible] فارسی زبان میں تقویۃ الایمان [illegible] (عربی میں حقائق تصوف کا ذکر) [illegible] خطبات کا مجموعہ نواب صدیق حسن خاں نے شائع کرایا۔

اسماعیلیہ شیعوں کا ایک فرقہ جو سات اماموں کو مانتا ہے۔ اس لیے سبعیہ بھی کہلاتا ہے۔ اس کے اسماعیلی کہلانے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ امام جعفر صادقؒ نے اپنے بڑے فرزند اسماعیل کی جگہ دوسرے فرزند امام موسیٰ کاظمؒ کو ولایت عطا کی۔ اس پر ان کے ماننے والوں کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک سابق امامیہ جو اثنا عشری بھی کہلاتا ہے اور دوسرا سبعیہ یا اسماعیلی کہلایا جو اسماعیلؒ کی امامت کا قائل ہے۔ امام اسماعیلؒ چونکہ والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ اس لیے اسماعیلیہ نے ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل کو ساتویں امام کی جگہ پر فائز تسلیم کر لیا۔ مختلف علاقوں میں یہ فرقہ مختلف ناموں سے مشہور رہا۔ قرامطہ، دروزیہ اور باطنیہ اسی فرقے کی مختلف شاخیں ہیں۔ ایران میں اس فرقہ کے لوگ اسماعیلی یا آغا خانی ہندوستان میں خوجے اور بوہرے وغیرہ کہلاتے ہیں۔

اس فرقے کے عقائد کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے کہ مسیحؑ دوبارہ آئیں گے، جو مہدی موعود بھی ہوں گے۔ چنانچہ اہل تشیع نے حضرت علیؓ کی اولاد کو اس کا مستحق ٹھہرایا۔ ان میں سے ایک فرقہ کے نزدیک امامت اہل بیت ہی کا حق ہے، جو نسل در نسل چلتی ہے۔ یہ فرقہ امامیہ کہلایا۔ آگے چل کر یہ دو گروہوں اثنا عشری اور اسماعیلی میں تبدیل ہو گیا۔ اسماعیلیوں کے نزدیک اس سلسلے کے آخری امام محمد بن اسماعیل بن جعفر ہیں، جو امام جعفرؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد غائب ہو گئے ہیں۔ تقریباً سو برس تک یہ لوگ اسی عقیدے کے قائل رہے۔ ۲۷۶ھ/۸۹۹ء میں ان کے ایک قائد احمد بن قرمطہ نے بہت شہرت حاصل کی اور یہ لوگ قرامطہ کہلانے لگے۔ ۲۶۰ھ/۸۷۴ء میں جب اثنا عشریوں کے بارہ امام پورے ہو گئے تو اسماعیلیوں نے بھی اپنے عقائد میں تبدیلی اختیار کی اور امامت کے تسلسل کا دوبارہ اجراء کر دیا۔ اس ضمن میں جو لوگ پرانے عقائد پر قائم رہے قرامطہ کہلائے۔ اس نئے اسماعیلی عقیدے کو فاطمیوں نے اختیار کیا اور ۲۹۷ھ/۹۰۹ء میں شمالی افریقہ میں اپنی خلافت کی بنیاد ڈالی۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط تک یہ فرقہ اسلامی دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ خصوصاً ایران میں اسے خاصا استحکام حاصل تھا۔ یہیں اس کے مشہور علماء ابو حاتم رازی، ابو یعقوب السجستانی، حمید الدین کرمانی اور المؤید الشیرازی وغیرہ پیدا ہوئے۔ یہیں باطنیہ دروزیہ یا حاکمیہ مستعلیہ اور نزاریہ شاخوں نے جنم لیا۔ مصر اور شمالی افریقہ میں یہ فرقہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ غائب ہوا اور یمن، ایران اور ہندوستان میں پھیلنے لگا۔ گیارہویں صدی ہجری سترھویں صدی عیسوی میں یمن کی جماعت سلیمان بن حسن کو اپنا امام یا داعی تسلیم کرنے لگی اور ہندوستان کی جماعت داؤد بن قطب شاہ کی تابع فرمان ہو گئی اور اسے اپنا ستائیسواں داعی تسلیم کر لیا۔

فاطمی خلیفہ المستنصر (وفات ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) کے بیٹے نزار کو تخت سے محروم کر دیا گیا تو اس کے حمایتی نزاری کہلائے۔ انھی میں سے ایک شخص حسن بن صباح کے نام سے مشہور ہے، جو نزار کے پوتے المہتدی کو الموت کے قلعے میں لے آیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا القاہر باحکام اللہ حسن علانیہ طور پر تخت نشین ہو گیا۔ اس نے ظاہری عبادت کی جگہ باطنی عبادت کو فرض کیا۔ ادھر حسن بن صباح نے اپنے مریدوں کو فریب دینے کے لیے الموت میں ایک جنت بھی تعمیر کی۔ اس کے بعد علاء الدین، جلال الدین ثانی اور رکن الدین خور شاہ نے حسن بن صباح کا منصب سنبھالا۔ یہ فرقہ سیاسی تحریکوں کی وجہ سے خطرناک تھا۔ اس کے اس زور و شور کا خاتمہ منگولوں نے کیا۔

رکن الدین خور شاہ کے بعد نزاریوں کی قوت ختم ہو گئی اور اس کے بیٹے شمس الدین محمد کو عوام الناس کی نظروں سے چھپا دیا گیا۔ بعد ازاں اس کے جانشین صوفی شیوخ کی صورت میں سامنے آتے رہے۔ انہوں نے صفوی خاندان کے ساتھ راہ و رسم بڑھائے اور بڑے بڑے عہدے حاصل کیے۔ نادر شاہ کے عہد میں ان کا جانشین سید علی حسن بیگ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ان کے ایک اور جانشین سید حسن علی نے وفات پائی تو اس کا جانشین اس کا بیٹا خلیل اللہ دوم ہوا، جو ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے حسن علی شاہ کی شادی فتح علی شاہ قاچار شاہ ایران کی بیٹی سے ہوئی اور وہ کرمان میں گورنر مقرر ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد بغاوت برپا ہونے کی وجہ سے انہیں ہندوستان آنا پڑا۔ تاریخ میں انہیں آغا خان اوّل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بیٹے آغا علی شاہ آغا خاں دوم کے نام سے ۱۸۸۱ء میں جانشین ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں ان کے فرزند سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم کے نام سے جانشین بنے۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء میں وفات پائی تو ان کے پوتے کریم آغا خاں چہارم کے نام سے اسماعیلی فرقے کے انچاسویں امام چنے گئے۔ (دیکھئے "آغا خاں")

تاریخ کے ہر دور میں اسماعیلی فرقے کے عقائد مختلف نظر آتے ہیں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس فرقے کے پیروؤں نے اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر عقائد میں تبدیلی روا رکھی ہو ۔ تاہم اسماعیلیہ کے باطنی عقائد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک تاویل ہے جس سے مراد قصص قرآن اور صور عبادات کے گہرے اندرونی معاملات کا انکشاف ہے اور یہ صرف اماموں ہی کا حق ہے ۔ دوسرے حقائق جو علوم و فلسفہ نے منکشف کئے ہیں ۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ میں کوئی ایسی صفت نہیں جن کا تصور حواس کے ذریعے سے پیدا ہو ۔ مگر اس ہستی کو عقل فعال کے ساتھ کچھ اس طرح سے گڈمڈ کر دیا گیا ہے کہ نہ تو اس میں بطلیموسی تصور ملتا ہے اور نہ افلاطونی خیالات کی مکمل عکاسی ہوتی ہے ۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مذہب اور فلسفے کا ایک معجون مرکب تیار کر کے رکھ دیا ہے ، جسے سمجھنے کی ضرورت کسی بھی مقلد کے لئے ضروری نہیں بلکہ یہ صرف امام کا کام ہے اور یہ ضروری نہیں کہ امام اس کا انکشاف بھی کرے ۔ عام انسان صرف اسی صورت میں فلاح پا سکتا ہے کہ وہ امام کے ساتھ اپنا قریبی تعلق قائم کرے جو شخص امام وقت کو تسلیم کئے بغیر مر جائے اوہ کافر کی موت مرے گا ان تصورات میں نزاریوں نے کسی حد تک ترمیم کی ہے ۔ انہوں نے روحانی زندگی پر زور دیا ہے ۔ تاہم ان کے نزدیک بھی دنیا کبھی امام سے خالی نہیں رہی ۔ امامت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہتی ہے ۔

اسود بن کعب عنسی جھوٹا نبی ، جس نے آنحضور صلعم کی زندگی ہی میں دین اسلام ترک کیا اور حاکم یمن بدھان یا باذام کی وفات کے بعد بزرگی حاکم بن بیٹھا ۔ وہ جادوگری کا مدعی تھا اور لوٹنے ٹوٹکوں سے کام لیتا تھا ۔ اس کا دعوے تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے ، الرحمان کی طرف سے کہتا ہے ۔ اس کا اصلی نام عیہلہ بتایا جاتا ہے مزید برآں وہ ذوالخمار (گدھے والا) کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ اس وقت یمن کے لوگ اسلام کے دامن سے منسلک ہو چکے تھے ۔ حاکم یمن کی درخواست پر آنحضور ؐ نے اپنے عمال یمن بھیجے ۔ اواخر ۱۰ھ/۶۳۲ء میں اسود عنسی نے قبیلہ مذحج کو ساتھ ملا کر بغاوت کر دی اور نجران سے آنحضور ؐ کے دو عمال خالد بن سعید اور عمرو بن حزم نکال دیئے ۔ اس وقت وہاں بدھان کا بیٹا شہر مقیم تھا ۔ اسود نے اسے قتل کروا کر اس کی بیوی سے زبردستی شادی کر لی اور اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی ۔ آنحضور ؐ نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی اور یہ فرمان بھجوایا کہ اگر ممکن ہو سکے تو اسود عنسی کو گرفتار کر لیا جائے ، ورنہ کسی ترکیب سے قتل کر دیا جائے ۔ چنانچہ اس کے رفقا ہی میں سے چند لوگوں نے اس کی بیوی کے ساتھ مل کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

اشبیلیہ سپین یا ہسپانیہ یا اندلس کا ایک شہر ۔ اسی نام کے صوبے کا دارالحکومت ۔ ۹۴ھ ۷۱۲ء میں اس پر مسلمانوں نے قبضہ کیا ۔ یہ دریائے اعظم کے کنارے سپین کے جنوب مغربی ساحل پر واقع ہے ۔ صدر مقام میڈرڈ اس سے ۳۵۵ میل شمال مشرق کی سمت واقع ہے یہاں زیادہ تر مسلمانوں کی تعمیر کردہ قدیم عمارات ہیں اور اسی لئے یہ شہر دنیا بھر میں مشہور ہے اشبیلیہ کے فاتح موسیٰ بن نصیر نے یہاں عیسیٰ بن عبداللہ کو پہلا حاکم مقرر کیا تھا ۔ مگر عیسائیوں کی شورش کے پیش نظر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر اسے قطعی طور پر [illegible] اس کا عامل بن گیا ۔ اس کے قتل کے بعد قرطبہ نے مرکزی شہر کی حیثیت اختیار کر لی [illegible] بھی جو کبھی اشبیلیہ اور کبھی حمص کہلایا ۔ اندلس کے متمول ترین شہروں میں شمار ہوتا رہا ۔ عبدالرحمان ثانی نے اس شہر کے اردگرد ایک پختہ فصیل اور ایک بڑی مسجد بھی بنوائی ۔ اسی کے عہد میں نارمن بحری لٹیروں نے ۲۲۰ھ/۸۴۴ء میں پہلی بار اس پر قبضہ کیا ۔ چنانچہ اسے دوبارہ فتح کرنے کے بعد یہاں تیز رفتار جہازوں کا ایک بیڑا بھی رکھا گیا ۔ عبدالرحمان ثالث کے دور میں یہ شہر امن و سلامتی کے دور میں داخل ہو گیا ۔

۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء سے عبادیوں کے خود مختار خاندان نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا (محمد ثانی المعتمد کے عہد میں اشبیلیہ اپنے دور کے بہترین علما ، فضلا کا مرجع بن گیا ۔ ۴۸۴ھ ۱۰۹۱ء میں المغرب کے حکمران یوسف بن تاشفین کی فوجوں نے اس پر قبضہ جمالیا ۔ المعتمد کو جلاوطن کر دیا گیا ۔ یوسف کا سپہ سالار سیر بن ابی بکر عرصے تک یہاں حکومت کرتا رہا ۔ المرابطون کے بعد یہ شہر الموحدون کے قبضے میں رہا ۔ ابو یعقوب یوسف عرصے تک اس کا عامل رہا ۔ اس کا بیٹا ابو یوسف یعقوب بھی کافی مدت تک یہاں متمکن رہا ۔ اسی اقامت کے دوران میں اس نے ابن رشد کو قید میں ڈلوایا ۔

۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء میں المنصور کے جانشین الموحد محمد الناصر نے اشبیلیہ کی فصیل کے [illegible] لشکر جمع کیا ، جس نے آگے چل کر اندلس کا عیسائی مقبوضہ حصہ فتح کرنا تھا ۔ ۶۲۶ھ ۱۲۲۹ء میں محمد بن یوسف نے الموحدون کو اس شہر سے باہر نکال دیا اور اپنی حکومت قائم کر لی ۔ [illegible] شعبان ۶۴۶ھ/ ۱۹ نومبر ۱۲۴۸ء کو فرڈیننڈ سوم نے اس شہر کو [illegible] فتح کر لیا مسلمانوں نے کئی بار شہر کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر سلطان ابوالحسن علی کے شکست اٹھانے کے بعد یہ شہر ہمیشہ کے لئے مسلمانوں سے چھین لیا اور [illegible] مسلمانوں کو اس علاقے سے نکال دیا ۔

کولمبس کی دریافت امریکہ کے بعد سے یہ شہر ہسپانوی تجارت کا اہم مرکز بن گیا ۔ امریکہ کی طرف جانے والے جہاز یہیں سے روانہ ہوتے تھے ۔ ۱۸۰۰ء میں یہاں [illegible] جس سے تقریباً [illegible] ہزار افراد موت کے گھاٹ اتر گئے ۔ اور ۱۸۱۰ء میں [illegible] فوجوں نے تاراج کیا ۔ ۱۹۳۶ء کی خانہ جنگی میں یہ قوم پرستوں کے قبضہ میں رہا [illegible] سے دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے ایک پرکشش مقام کی حیثیت رکھتا ہے ۔ [illegible] اپنے میلوں کی وجہ سے مشہور ہے ۔

اشتراکیت ایک اقتصادی نظام جسے ایک یہودی مفکر کارل مارکس نے [illegible] اور اینجلز اس کے شارحین میں سے ہیں ۔ اس کا فلسفہ [illegible] میکانکی تصور حیات پر مبنی ہے ۔ اس فکر کا پہلا عنصر تاریخ کی مادی تعبیر ہے ۔ [illegible] کسی عہد کا معاشی نظام ہی اس عہد کی معاشرتی زندگی کی اصل بنیاد ہے ۔ [illegible] فلسفہ حیات ، فنون لطیفہ سب اسی کا عکس ہیں ۔ فکر معاش کی جستجو ہی انسان کی [illegible] غیر مجرد کیفیتوں کو متحد و مربوط کرتی ہے ۔ صرف پیٹ کا تقاضا ہی بنیادی تقاضا ہے ۔ [illegible] ہر آن ہوتی رہتی ہیں ۔ اس لیے پیداوار کے طریقے بدلتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ [illegible] اخلاقی تصورات بھی بدل جاتے ہیں اور یوں اخلاقیات ایک اضافی [illegible] صداقتیں اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں ۔ اور یوں نیک و بد اور حق و باطل کی تمیز بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔

اشتراکیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر معاشی نظام جب ترقی کر کے ایک [illegible] پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے زمانے کے [illegible] پیداوار سے متصادم ہو جاتی ہیں اس نزاع کو طبقاتی کش مکش کا نام دیا گیا ہے ۔ ہر انقلاب [illegible] کش مکش کا نتیجہ تھا ۔

اشتراکیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہو ۔ چنانچہ اس شے کی قیمت کا واحد حقدار صرف مزدور ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ اس دور میں مزدور کو قیمتی آلات پیدائش خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی ۔ اس لیے وہ مجبور ہے کہ صرف اس پر قناعت کرے ، جو صنعت کار اسے بخش دے ۔ جبکہ ایک شے کی [illegible] مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ۔ جسے قدر زائد کہتے ہیں [illegible] یہ مزدور کا حصہ ہے ۔

اشتراکیت کا چوتھا اصول ریاست سے متعلق ہے ۔ اس کے مطابق ریاست ایک

ایسا ادارہ ہے جس کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ دولت مندوں اور برسرِ اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی کرے۔ ہر معاشرتی ادارے کی طرح ہر سیاسی ادارہ بھی اس کے نزدیک مروجہ نظامِ معیشت کا خارجی اظہار ہے۔

اشتراکیت کے ان اصولوں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ عالمِ امثال (تصورات) کی کوئی حقیقت نہیں۔ مادہ اور صرف مادہ ہی حقیقتِ اول و حقیقتِ آخر ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ مذہب اور تصوریت کا خاتمہ کر کے خالص مادی بنیادوں پر معاشرے کا نظام اپنے ہاتھوں [illegible] لے کیونکہ مسائل زمین کے ہیں اور زمین ہی پر حل ہونے چاہئیں نہ کہ آسمان پر۔ اس فلسفے کی رُو سے سرمایہ دارانہ نظام کی دھجیاں بکھر کر رہ گئی ہیں اور ان ملکوں میں جہاں سرمایہ دارانہ [نظام] ترقی پر ہے، غریب عوام اور مزدوروں کا بھلا ہوا ہے۔ کیونکہ کارل مارکس کے نزدیک جب [محنت کش عوام] ہی کی تخلیقی کوششوں سے تہذیب و تمدن کی آسائشات وجود میں آتی ہیں تو تہذیب [و تمدن] کی افادیت بھی ان کے حصہ میں آنی چاہیے۔ جبکہ ادھر سرمایہ داروں کے نزدیک سرمایہ [illegible] ارتقاء اور فروغ کا باعث ہے اور جب مزدوری کا تعین ہو جاتا ہے تو مزدور کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

[illegible] وہاں مزدور کو صرف ضروریاتِ زندگی [illegible] کر لیا جاتا ہے [illegible] پیداوار کے ذرائع [illegible] حاصل شدہ [illegible] اجتماعیت کے نام پر حکومت کے [illegible] مختلف مدوں میں تقسیم کرتی ہے۔

[illegible] بات ملتی ہے اور یہ اشتراکی ممالک [illegible] اسلام نے ذاتی ملکیت [illegible] بہت بڑی اہمیت بھی دی ہے۔ اسلام کے [illegible] کہ معاشرے میں ایسے [illegible] تقسیم [illegible] کوئی شخص [illegible] تقسیمِ دولت [illegible] کیونکہ اسلام یہ دیکھتا ہے [illegible] دولت [illegible]:

[illegible] خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے [illegible] جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں [گرم] کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشت داغی جائے گی، یہ [illegible] اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سو جو تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔ (توبہ ۳۵)

[دولت] کو خرچ کرنے کے لیے قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

جو مال اللہ تعالیٰ نے فتح کے نتیجے میں دیہات والوں سے دلوایا ہے، وہ خدا کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں اور یتیموں اور حاجت مندوں کے لیے ہے تاکہ [illegible] جو لوگ دولت مند ہیں، مال انھی کے ہاتھوں میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔ (حشر ۷)

جدید دور میں اشتراکیت کو اسلام میں سمونے کے لیے ایک اور اصطلاح وضع ہوئی ہے۔ اسلامی سوشلزم۔ اس کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ جدلی مادیت کا تصور ختم ہو رہا ہے۔ انسان اپنے ضمیر اور اخلاق سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اب اشتراکیت لادینی نظام نہیں رہا۔ چونکہ اسلام دنیا کا سچا مذہب ہے، اس لیے اس کے پیروکاروں کو چاہیے کہ محنت کشوں کے استحصال کے خاتمے کے لیے اشتراکیت کو اسلام میں سمو لیں اور یوں اسلامی سوشلزم کا نفاذ کر دیں۔ جبکہ اکثر علمائے دین کے نزدیک اسلام کا اپنا ایک اقتصادی نظام ہے، جو سرمایہ داری، اشتراکیت یا اشتمالیت سے بڑھ کر ہے اس لیے اسلام اور سوشلزم (اشتراکیت) کی پیوندکاری ایک غلط اور معیوب بات ہے۔ ان کے نزدیک جب اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا تو کسی قسم کے "ازم" کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اشربہ پینا۔ پینے والی چیزیں۔ اسلام میں پانی پینے کے لیے آداب مقرر کیے گئے ہیں۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لوگو! تم میں سے کوئی بائیں ہاتھ سے ہرگز کھانا نہ کھائے اور نہ بائیں ہاتھ سے پانی پیئے۔ کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔ (مسلم)

مشکوٰۃ شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ تین سانس میں پانی پیا کرتے تھے اور ہر سانس لینے میں پانی کے برتن کو منہ سے علیحدہ کر لیا کرتے تھے۔ نیز ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے مشک کے منہ سے پانی پینے کی ممانعت کی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی صلعم نے اس سے منع کیا ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر پانی پیئے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسولِ خدا نے فرمایا، جو شخص چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے، وہ اپنے پیٹ میں آتشِ دوزخ کو گھونٹ گھونٹ اتارتا ہے۔ حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ پانی پلانے کا آغاز دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے کرنا چاہیے۔

اشرف جہانگیرؒ سمنانی

(۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء - ۲۷ محرم ۸۰۸ھ/۶ جولائی ۱۴۰۵ء)

اشرف جہانگیرؒ سمنانی صوفی اور بزرگ، خراسان کے ایک مقام سمنان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد ابراہیم اس علاقے کے حاکم تھے۔ والدہ کا نام خدیجہ تھا، جو احمد یسوی کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اور چودہ برس میں تمام علوم پر عبور حاصل کر لیا۔ راہِ سلوک کی طرف مائل تھے، اس لیے اس دور کے مشہور صوفی علاء الدولہ سمنانی سے بیعت کی۔ روایت ہے کہ خواب میں ہونے والے ایک اشارے کی وجہ سے حکومت اپنے بھائی سلطان محمد کے سپرد کی۔ اور والدہ سے اجازت لے کر ہندوستان چلے آئے۔ ماوراءالنہر سے ہوتے ہوئے بخارا اور سمرقند کے راستے اُچ شریف پہنچے۔ یہاں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے فیض حاصل کیا اور پھر دہلی روانہ ہو گئے۔ وہاں کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور بہار کے قصبہ منیر میں آئے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں مشہور بزرگ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا جنازہ رکھا تھا۔ آپ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بعد ازاں بنگال کا رُخ اختیار کیا۔ اس وقت بنگال میں مشہور چشتی بزرگ شیخ علاء الدین علاء الحق مقیم تھے۔ آپ نے ان کی خدمت میں بارہ برس رہ کر خرقۂ خلافت اور جہانگیری کا لقب حاصل کیا۔

حضرت جہانگیر سمنانی مختلف علاقوں میں تبلیغ و ہدایت فرمانے کے بعد فیض آباد سے اسّی کیلومیٹر دور ایک قصبہ کچھوچھہ (روح آباد) میں مقیم ہو گئے۔ یہاں سے آپ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ، مدینہ، کربلا، نجف، ترکی، دمشق، بغداد، کاشان، سمنان، مشہد اور غزنہ سے ہوتے ہوئے ملتان اور دہلی کے راستے واپس روح آباد پہنچے۔ اس دوران میں آپ نے گلبرگہ میں خواجہ سید گیسو دراز سے بھی ملاقات کی۔ آپ کا مزار روح آباد ہی میں ہے۔

آپ کی تعلیمات ان تین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ۱۔ "بشارت المریدین"۔ ۲۔ "مکتوبات اشرفی"۔ ۳۔ "لطائف اشرفی"۔ آخری کتاب آپ کے مرید نظام الدین یمنی کی تالیف کردہ ہے۔ آپ کے نزدیک وحدت کی دو اقسام مطلق اور باری ہیں۔ وحدت

مطلقہ صرف ایک ذات ہے، جو اپنی صفات کے ساتھ موجود ہے، اور وحدت باری یہ ہے کہ خدا موجود تھا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ولی کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ جاہل نہ ہو اور شریعت کا پابند ہو۔ اس کی لطافت زبان، حسن اخلاق اور فیاضی وغنا اوصافِ مصطفوی کے تابع ہو۔ ولی کے لیے ضروری ہے کہ کسب معاش کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرے اور کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرے۔

اشرفؒ علی تھانوی

(۱۲ ربیع الاوّل ۱۲۸۰ھ/ ۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء — ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ/ ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء) اشرف علی بن عبدالحق فاروقی ممتاز عالم دین اور صوفی، ہندوستان میں تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق تاریخ پیدائش ۵ ربیع الثانی ہے۔ بچپن ہی سے دینی علوم کی طرف مائل تھے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ حافظ حسین علی دہلوی سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تھانہ بھون آکر مولانا فتح محمد سے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں پھر دیوبند پہنچ کر باقی نصاب کی تکمیل مولانا منفعت علی سے کی اور فارسی زبان میں پورا عبور حاصل کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء میں یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر کانپور کے مدرسہ فیض عام میں تدریس کا کام شروع کیا۔ وہیں مدرسہ جامع العلوم قائم کیا۔ ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء ہی میں حج بیت اللہ کیا۔ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی۔ ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء میں دوبارہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور کئی ماہ اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ واپس لوٹنے کے چند سال بعد ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۸ء میں عمر بھر کے لیے تھانہ بھون میں سکونت پذیر ہو گئے۔

اس گوشۂ عافیت میں بھی طالبان ہدایت نے آپ کو تنہا نہ رہنے دیا۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے لوگ پروانہ وار آئے اور اس چشمۂ ہدایت سے فیض حاصل کرنے لگے۔ لوگوں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ حکومت نے قصبہ تھانہ بھون کے لیے ایک مستقل ریلوے سٹیشن بنا دیا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل آپ کو معدہ و جگر کی تکالیف نے عاجز کر رکھا تھا۔ آخری دنوں میں بھوک بالکل ختم ہو گئی اور اسی عالم میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ نے دو نکاح کیے تھے۔ جن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کی تصانیف ہی آپ کا وہ قیمتی ورثہ سمجھی جاتی ہیں جن سے ہر مسلمان استفادہ کر رہا ہے۔

مولانا کو حکیم الامت اور مجدد الملت کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے علمی و دینی فیوض و برکات متنوع ہیں۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں، مجدد ہیں، مفسر ہیں، علوم و حکم کے شارح ہیں۔ اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدث تھے فقیہ تھے، خطیب تھے اور شریعت و طریقت کے مجادلہ کا خاتمہ کرنے والے تھے، وہ مصلح امت تھے۔ ان کی تصانیف میں خواص کے لیے "تفسیر بیان القرآن" اور "شرح مثنوی مولانا روم" اور عورتوں کے لیے "بہشتی زیور" ایسی گراں بہا ہیں، جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے اسلامی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

مولانا کی تصانیف کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۹ء میں ان کے ایک خادم مولوی عبدالحق فتح پوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی، جو بڑی تقطیع کے ۹۸ صفحات کو محیط ہے۔ تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے وہ امام ابن جریر طبری، امام فخر الدین رازی، حافظ ابن جوزی اور حافظ جلال الدین سیوطی کے زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا کی بیشتر کتب اردو زبان میں ہیں۔ البتہ تیرہ یا چودہ رسائل و کتب عربی اور تین فارسی زبان میں ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: "سبق الغایات فی نسق" ، "انوار الوجود" ، "التجلی العظیم" ، "حواشی تفسیر بیان القرآن" ، "تصویر المقطعات" ، "التلخیصات العشر" ، "[illegible] ماثورہ ورود الخطب الماثورہ" ، "وجوہ المثانی" ، "سبع سیارہ" ، "زیادات" ، "جامع الآثار" ، "تائید الحقیقۃ" ، "خطبات الاحکام"۔ اور تین فارسی میں یہ ہیں: "مثنوی زیر و بم" ، "تعلقات فارسی" ، "عقائد بانی کالج"۔ ان میں سے نظم میں مولانا کی تصنیف صرف مثنوی ہے، جو طالب علمی کے زمانے میں لکھی۔

تجوید و قرآت و متعلقات قرآنی کے ضمن میں مولانا نے حسب ذیل تصانیف فرمائیں: "جمال القرآن" ، "تجوید القرآن" ، "رفع الخلاف فی حکم الاوقاف" ، "زیادات علی کتب الروایات" ، "[illegible] لمافی الروایات" ، "یادگار حق القرآن" ، "متشابہات القرآن تراویح رمضان" ، "آداب القرآن" ، "وجوہ المثانی" ، "تنشیط الطبع فی اجراء السبع"۔

مولانا کا سب سے بڑا علمی کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ یہ تفسیر بارہ جلدوں میں اڑھائی سال میں مکمل ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اضافہ اور نظر ثانی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۵ء میں تھانہ بھون سے شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ سلیس و بامحاورہ اور حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ اور پھر آیت کی تفسیر جس میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح بھی کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی تراکیب کی تحقیق کی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادیؒ کی تفسیر "روح المعانی" پر اعتماد کیا گیا ہے۔

عورتوں کی ضروریات کے لیے اسلامی معلومات کا مکمل خزینہ "بہشتی زیور" ہے جو پہلے دس جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں گیارہویں جلد "بہشتی گوہر" کے نام سے [illegible] کے لیے لکھی۔ یہ کتاب کئی بار پاکستان اور ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اب بھی [illegible] مانگ بہت ہے۔

مولانا کے فتاوے کا ایک مجموعہ بھی گیارہ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ [illegible] تفسیر، احادیث، منطق، کلام، عقائد اور تصوف پر بھی مسلمانوں کی [illegible] کے لیے بھی آپ نے بے شمار کتب تحریر کیں۔ ان میں "اصلاح الرسوم" ، "[illegible]" ، "اصلاح امت" اور "حیات المسلمین" اہم ہیں۔

اشعث بن قیس

ابو محمد معدی کرب بن قیس، حضرموت کے [illegible] ۱۰ھ/ ۶۳۱ء میں ایک وفد کے ساتھ آنحضرتﷺ کی خدمت میں [illegible] مگر آپؐ کی وفات کے بعد باغی ہو گیا۔ اسلامی فوج نے قلعہ النجیر [illegible] کا محاصرہ کر کے اسے قید کر کے مدینہ بھیج دیا۔ حضرت ابو بکرؓ صدیق نے [illegible] بہن قریبہ کی شادی بھی اس سے کر دی۔ روایت ہے کہ شادی [illegible] بعد ازاں وہ شام اور عراق کی مہموں میں شریک رہا۔ غزوہ یرموک میں اس کی [illegible] تھی۔ شمالی عراق فتح ہونے کے بعد وہ کوفہ میں مقیم ہو گیا۔ شیعی روایات میں اسے [illegible] کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے جنگ صفین میں حصہ لیا۔ صلح کی بات چیت میں حضرت علیؓ [illegible] اصول تحکیم منظور کرنے اور عراق کی جانب سے ابو موسیٰ اشعری کو حکم مقرر کرنے [illegible] نے حضرت امام حسنؓ کے عہد میں وفات پائی۔

اشعری، ابو الحسن

(۲۶۰ھ/ ۸۷۴ء — ۳۲۴ھ/ ۹۳۶ء) ابو الحسن علی بن اسمٰعیل مشہور عالم دین اور اہل سنت کے علم الکلام کے بانی [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ابو موسیٰ اشعری کی نویں پشت میں سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق [illegible]

کا شجرۂ نسب یوں ہے۔ علی بن اسماعیل بن عبداللہ بن موسیٰ بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ رض۔ [illegible] سے پہلے وہ معتزلہ عقائد کے پیرو اور الجبائی کے شاگرد تھے۔ روایت ہے کہ خواب میں انھیں آنحضور صلعم کی زیارت ہوئی اور آپ نے انھیں حکم دیا کہ صحیح سنت کی پیروی کریں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جامع بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر تبدیلیٔ عقائد کا اعلان کیا اور اہل سنت کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے امام احمد بن حنبل کا مسلک اختیار کیا۔ آخری ایام میں بغداد میں سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔

[illegible] تک انھوں نے جو مستقل کتابیں تحریر کیں جن کی فہرست خود اپنی کتاب العمد میں دی ہے۔ [illegible] کتابیں تالیف کیں۔ ابن عساکر نے ان کی تعداد [illegible] بتائی ہے۔ قاضی ابوالمعالی کا قول ہے کہ انھوں نے تین سو کتابیں لکھیں، جو زیادہ تر [illegible] ابتدائی کتابیں [illegible] مذہب [illegible] خارجیہ، جہمیہ، شیعہ اور غیر مسلموں کے عقائد کے رد میں [illegible] بڑی کتابوں میں سے صرف مقالات الاسلامیین ہم تک پہنچی ہے جو [illegible] ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی فرقوں اور اہلسنت والجماعت کے عقیدوں [illegible] دوسرے حصے میں علم کلام کے دقیق مسائل ہیں اور تیسرے حصے میں [illegible] صفات باری اور قرآن کے [illegible] میں مختلف فرقوں کے اقوال بیان کئے گئے ہیں۔ دیگر [illegible] کتابوں میں سے [illegible] الابانہ عن اصول الدیانہ، اللمع اور رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام [illegible]

[illegible] اللہ کی صفات [illegible] علم، بصر، کلام وغیرہ ازلی و ابدی ہیں اور [illegible] اس لئے قرآن غیر مخلوق ہے۔ نیز اللہ کا دیدار [illegible] ان کی حقیقت اور کیفیت سے ہم ناواقف ہیں۔ ہر چیز اللہ [illegible] اللہ کی مشیت [illegible] تاہم مسلمان اپنے جرم [illegible] اشعریہ۔

اشعری، ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس الاشعری، آنحضور کے صحابی اور [illegible] ہجرت سے چند سال قبل یمن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے [illegible] خیبر میں آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ [illegible] غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ [illegible] معاذ بن جبل کے ساتھ یمن میں تبلیغ کے لئے بھیجے گئے۔ اور اسی علاقے کے عامل مقرر ہوئے۔ [illegible] ۶۳۸ء میں حضرت عمرؓ نے انھیں بصرہ کا عامل [illegible] ۶۴۲ء [illegible] کوفہ کا عامل مقرر کیا، مگر جب مغیرہ کو ان کے منصب پر بحال کیا گیا تو انھیں دوبارہ بصرہ کی ولایت پر بھیج دیا گیا۔ یہاں سے انھوں نے خوزستان کو فتح کیا۔ نیز الجزیرہ کی تسخیر میں بھی حصہ لیا۔ [illegible] ۶۴۴ء میں انھوں نے کردوں کی ایک زبردست بغاوت کو فرو کر دیا۔ اس اثنا میں کچھ لوگ ان کے مخالف ہو چکے تھے، ان کی شکایات دربار خلافت میں پہنچیں اور حضرت عثمانؓ نے انھیں کوفہ کا والی مقرر کر دیا۔ حضرت علیؓ کے انتخاب پر ابوموسیٰؓ نے کوفیوں کی طرف سے ان کی بیعت کی۔ مگر جنگ جمل میں غیر جانبدار رہے۔ جس کی بنا پر شیعان علیؓ نے انھیں شہر بدر کر دیا۔ چند ماہ بعد امیر المومنین نے انھیں امان دے دی۔ بعد ازاں جنگ صفین میں انھیں حضرت علیؓ کی طرف سے ثالث مقرر کیا گیا تاکہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے مابین تنازعہ کا حل تلاش کریں۔ حضرت علیؓ کے حق میں فیصلہ دینے کے بعد وہ مکہ معظمہ چلے گئے اور جب معاویہؓ نے بُسر کو مکہ پر قبضہ کرنے بھیجا تو وہ وہاں سے کوفہ چلے گئے۔ ان کی تاریخ وفات یقینی نہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے [illegible] اور [illegible] کے درمیان کبھی وفات پائی۔

اشعریہ ایک مکتب فکر، جسے اشاعرہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی اساس ابوالحسن اشعریؒ کی تعلیمات ہیں۔ اپنی عمر کے آخری دنوں میں اشعریؒ نے اپنے گرد بہت سے تلامذہ اکھٹے کر لئے اور یوں ایک دبستان وجود میں آ گیا۔ اگرچہ اشعری حنبلی مسلک کے حامی تھے، مگر ان کے پیروعموماً شافعی دبستان کے حامی رہے ہیں۔ جبکہ ان کے حریف زیادہ تر حنفی مسلک کے مرید ہیں۔ بانی مسلک کی وفات کے بعد الباقلانی وہ پہلا شخص ہے جس نے اشعریہ کے عقائد کو منضبط کیا۔ اس کے علاوہ ابن فورک، اسفرائنی، البغدادی، السمنانی، الجوینی، الغزالی، ابن تومرت، الشہرستانی، فخرالدین رازی، الایجی اور الجرجانی اس مسلک کے ائمہ اور مشاہیر میں سے ہیں۔

پانچویں صدی گیارہویں صدی عیسوی تک اشاعرہ کے طریق کار میں تبدیلی واقع ہوئی اور امام غزالیؒ جیسے مجتہد و مجدد پیدا ہوئے۔ انھوں نے فلسفیانہ مباحث کا آغاز کیا۔ اس صدی کے سلاطین کے ہاتھوں اس مسلک کے پیروکاروں نے بہت اذیتیں اٹھائیں۔ مگر سلجوقیوں کے برسراقتدار آنے پر اور نظام الملک طوسی جیسے وزیر کی سرپرستی حاصل ہونے کے بعد انھیں فروغ حاصل ہوا اور تقریباً آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی تک یہ مکتب فکر اہل سنت والجماعت کے ساتھ متحد رہا۔ الجرجانی کے بعد سے یہ دبستان بالکل ہی ختم ہو کر رہ گیا اور بالآخر علماء خود کو اشعریہ سے وابستہ کرنا معیوب سمجھنے لگے۔

اشموئیل سموئیل یا سماعیل، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے بعد بنی اسرائیل کے ایک اہم نبی، جنہوں نے اسرائیل کی حکومت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بائبل میں ان پر دو مستقل کتابیں بھی ان کے نام سے ہیں۔ ان کی رو سے ان کے باپ کا نام القانہ تھا، جو بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ اشموئیل رامہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بچپن عیلی کاہن کے پاس سیلا میں بسر ہوا۔ وہیں انھیں نبوت ملی اور انھوں نے بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کی راہ دکھانا شروع کی۔

اشموئیل وہ پہلے نبی ہیں، جن کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے ساؤل (طالوت) کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ بائبل میں آیا ہے کہ اسرائیل بزرگ جمع ہو کر رامہ میں ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ بڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کے بیٹے آپ کے نقش قدم پر نہیں۔ اب آپ کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دیں، جو ہم پر حکومت کرے۔ چنانچہ انھوں نے الٰہی ہدایت کے مطابق ساؤل بن قیس کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔ پھر لوگوں کو آداب سلطنت بتائے اور اس کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ باسٹھ برس کی عمر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قرآن مجید میں بھی اشموئیلؑ کا ذکر ہوا ہے۔ اگرچہ ان کا نام نہیں لیا گیا۔ سورہ بقرہ میں اس واقعے کا ذکر یوں آیا ہے:۔

"جب بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے ایک نبی سے کہا۔ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔" (۲ – ۲۴۶)

مفسرین نے یہاں نبی اشموئیل ہی مراد لیا ہے۔ قرآن مجید نے ان کے مقرر کردہ بادشاہ کا نام طالوت بتایا ہے۔ جسے بائیبل میں ساؤل لکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس انتخاب پر اعتراض کیا اور کہا یہ شاہی خاندان سے نہیں اور نہ اس کے پاس زیادہ دولت ہے۔ اللہ نے اس کا جواب یوں دیا۔ اول تو اللہ نے اس کی نیکی اور تقوے کی وجہ سے اسے چنا ہے، دوسرے وہ علم زیادہ رکھتا ہے اور تیسرے اسے جسمانی قوت و طاقت حاصل ہے۔

عہد نامہ عتیق میں سموئیل کے نام سے جو دو کتابیں شامل ہیں۔ ابتداء میں ایک تھی۔ ان میں کل پینتالیس الباب ہیں، جن میں اسرائیل کی وہ تاریخ ہے، جو قاضیوں کے عہد کے اختتام سے شروع ہوتی ہے اور حضرت داؤدؑ کے بیان پر ختم ہوتی

ہے۔ اس کتاب کے اندازِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت بعد کے زمانے کی تالیف ہے۔

اصحاب الاخدود "خندق والے لوگ" جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ کے بڑے بڑے گڑھوں میں پھینکا تھا۔ قرآن مجید میں سورۂ البروج میں اس کا ذکر یوں آیا ہے :-

"مارے گئے اس خندق والے، جس میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی، جبکہ وہ اس کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے۔" (۸۵ : ۴ تا ۷)

مفسرین نے اصحاب الاخدود کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔ ابن اسحاق لکھتا ہے کہ یہ واقعہ نجران کے عیسائیوں کو پیش آیا۔ کیونکہ یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے کوئی بیس ہزار حق پرستوں کو آگ کے گڑھوں میں زندہ جلا دیا۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۸ء میں پیش آیا، جس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد نجاشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذونواس اور اس کی سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔ دوسرا واقعہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک ایرانی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر لیے اور لوگوں کے لیے بھی محرمات سے نکاح کرنا حلال کر دیا۔ لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو اس نے مخالفین کو آگ کے گڑھوں میں پھنکوانا شروع کر دیا۔

ابن کثیر نے اصحاب الاخدود پر تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ایسے بہت سے واقعات گزرے ہوں۔ مثلاً ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ اخدود کا معاملہ ایک تو یمن میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین کے زمانے میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق میں بخت نصر کے زمانے میں پیش آیا، جس نے ایک بت بنا رکھا تھا اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اسے سجدہ کریں اور جو سجدہ نہ کرتا، اُسے آگ میں جھونک دیا جاتا .... البتہ نجران میں جو واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد تحریرات میں نجران کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض عین زمانۂ واقعہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں تین کتابوں کے مصنف پروکوپیوس کوسموس اور یوحنس ملالا اس واقعہ کے ہمعصر ہیں۔ جدید دور کا مورخ فلبی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے، جہاں "اصحاب الاخدود" کا واقعہ پیش آیا تھا۔

اصحاب الایکہ "جنگل والے لوگ"، جن پر حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر چار مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ الحجر : ۷۸، سورۂ الشعراء : ۱۷۶، سورۂ صٓ : ۱۳ اور سورۂ قٓ : ۱۴

بعض مفسرین نے اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کو ایک ہی قوم قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک یہ دو مختلف قومیں تھیں مگر ان پر ایک ہی نبی مبعوث ہوئے۔ مدین خلیج عقبہ کے قریب ایک بستی تھی، جسے حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے مدین نے آباد کیا تھا۔ اس کے قریب ہی کہیں اصحاب الایکہ تھے، جو شاید تبوک میں آباد ہوئے۔ یاقوت نے تبوک کا پرانا نام ایکہ رکھا ہے، جس کے گرد جنگل واقع تھا۔

اصحاب الایکہ کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے :-

"اصحابُ لئیکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب شعیب نے ان سے کہا تھا۔ کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے امانت دار رسولؐ ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔" انھوں نے کہا۔ "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں ہے، مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔" شعیبؑ نے کہا "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔" انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔" (الشعراء : ۱۷۶ تا ۱۸۹)

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ اصحاب مدین اور [illegible] کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کئے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی [illegible] سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد [illegible] شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ ان [illegible] دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی [illegible] اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ اس قوم کو اللہ کے عذاب [illegible] کی طرح ان پر چھایا رہا اور جب تک پوری قوم تباہ نہ ہو گئی یہ عذاب ان پر [illegible]

اصحاب الحجر "پتھروں والے لوگ"۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر [illegible] "اور حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور [illegible] اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے منہ پھیر لینے والے بنے اور وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے تھے۔ صبح ہوتے ہی انھیں سخت آواز نے آن لیا پس جو کچھ وہ کرتے تھے ان کے کسی کام نہ آیا۔" (الحجر : ۸۰ تا ۸۴)

الحجر قوم ثمود کا مسکن تھا، جو پہاڑوں کو کھود کر مکان بناتی تھی۔ یہ علاقہ مدینہ کے شمال کی طرف واقع ہے۔ آج بھی اس علاقے کو الحجر اور مدائن صالح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت صالحؑ اس قوم پر مبعوث ہوئے تھے۔ قوم ثمود نے ان کو جھٹلایا اور راہ راست پر نہ آئی۔ جس کے نتیجے میں عذاب نے انھیں آن لیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے: ثمود)

اصحاب الرس کنوئیں والے لوگ۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں دو بار آیا ہے۔ سورۂ فرقان (۳۸) اور سورۂ ق (۱۲) میں عاد، ثمود اور دیگر منکر قوموں کے ساتھ آیا ہے۔ ابن جریر طبری کی رائے میں اصحاب الرس دراصل اصحاب الاخدود ہی ہیں۔ بعض کے نزدیک قوم عاد سے صدیوں پہلے گزرنے والی ایک قوم کو اصحاب الرس کہا ہے۔ یہاں ایک پیغمبر حنظلہؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس قوم نے نہ صرف انھیں جھٹلایا بلکہ انھیں قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کی پاداش میں وہ ہلاک کر دیے گئے۔ ابن ابی حاتم کے نزدیک یہ کنواں آذربائیجان کے قریب کہیں تھا اور قتادہ کے نزدیک یہ یمامہ کے [illegible] فلج نامی بستی میں تھا۔ مسعودی کا کہنا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے تھے اور یمن میں آباد تھے۔

اصحاب بدر بدر والے لوگ [illegible] صحابۂ کرام جنھوں نے آنحضورؐ کے [illegible] قرآن مجید میں ان کا ذکر سورۂ آل [illegible] سورۂ التوبہ (۱۰۰) سورۂ الدھان [illegible] آیا ہے۔

[illegible] اصحاب بدر [illegible] انھیں فتح اور غلبہ دے گا۔ حق بات [illegible] ایک ہزار ملائکہ اصحاب بدر [illegible] فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ مدد کے لیے [illegible] پانچ ہزار [illegible] (۱۲۵) اللہ تعالے نے ملائکہ کو حکم [illegible] اور اللہ تعالے نے [illegible] کفار [illegible] ملائکہ اہل بدر کے ساتھ مل [illegible] ان کی پور پور کاٹ ڈالیں (۸: ۱۲)

اصحاب بدر [illegible] دیگر صحابہ سے بلند کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں رفاعہ بن [illegible] سے روایت ہے کہ جبرئیلؑ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ پوچھا آپ اہل بدر کو مسلمانوں میں کیسا سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ سب مسلمانوں سے افضل۔ [illegible] فرشتوں میں سے جو فرشتے بدر میں حاضر ہوئے، ان کا درجہ ملائکہ میں بھی [illegible] جاتا ہے۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالے نے اہل بدر کو دیکھا اور فرمایا اب تم جو چاہو کرو میں تمہیں بخش چکا ہوں۔ چنانچہ اصحاب بدر مغفور ہیں اور ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اصحاب بدر کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے تو [illegible] سب سے پہلے اصحاب بدر سے بیعت لی۔

اصحاب بدر کی تعداد میں اختلاف ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ ۳۱۳ تھے۔ ان میں سے [illegible] مہاجر اور باقی انصار تھے۔ ان میں آٹھ کو آپؐ نے پیچھے لوٹا دیا۔ ان کے نام یہ ہیں: عثمانؓ بن عفان، طلحہؓ بن عبید اللہ، سعیدؓ بن زید، ابولبابہ رفاعہؓ بن عبدالمنذر، عاصمؓ بن عدی، الحارثؓ بن الصمہ اور خوات بن جبیر۔ ان سب کو اصحاب بدر میں شریک سمجھا جاتا ہے۔

زرقانی نے شہدائے بدر کے ناموں کی فہرست دی ہے۔ وہ یہ ہیں: مہجعؓ بن صالح، عبیدہؓ بن حارث، عمیرؓ بن ابو وقاص، عاقلؓ بن بکیر، عمیرؓ بن عبد عمیر، عوف یا عوذؓ بن عفرا، معوذؓ بن عفرا، حارثہؓ بن سراقہ، یزیدؓ بن حارث، رافعؓ بن معلی، عمیرؓ بن حمام، عمارؓ بن زیاد، مسعدؓ بن خیثمہ اور مبشرؓ بن عبدالمنذر۔ دیگر اصحاب بدر کے نام اور مختصر سوانحی حالات قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری نے اپنی کتاب "اصحاب بدر" میں دیے ہیں۔ (نیز دیکھیے: بدر، غزوہ)

اصحاب صُفّہ "سائبان والے"، "چبوترے والے"، "اہل صفہ"۔ مسجد نبویؐ کے شمالی سرے پر موجود ایک چبوترے پر بیٹھنے والے فقرا کا ایک گروہ۔ انھیں تصوف اور زہد و تقوے کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اکثر صحابہ مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کا کاروبار کرتے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے، جنھوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت صلعم کی تربیت پذیری کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ لوگ دن کے وقت بارگاہ نبوی میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترے پر سو رہتے۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی انھی لوگوں میں تھے۔ طلحہؓ بن عمرو سے روایت ہے، جب کوئی شخص آنحضورؐ سے ملنے کے لیے مدینہ میں وارد ہوتا اور کوئی اس کی جان پہچان والا مدینے میں ہوتا تو اس کے پاس ٹھہرتا ورنہ اصحاب صفہ کے پاس چلا جاتا۔

اصحاب صفہ ان مہاجرین کا نام تھا، جن کا کوئی گھر بار اور ذریعہ معاش نہ تھا۔ احادیث میں ان کے لیے "اضیاف اسلام" کے الفاظ استعمال ہوئے۔ یہ لوگ اپنا زیادہ تر وقت عبادات اور صحبت رسول میں بسر کرتے تھے۔ آنحضورؐ ان صحابہ کو اکثر اپنے ساتھ شریک طعام کرتے تھے۔ حلیۃ الاولیاء میں ہے کہ آنحضورؐ صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے۔ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہے، وہ اصحاب صفہ میں سے ایک کو اپنے ساتھ شامل کرلے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اصحاب صفہ بھیک مانگنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ ان میں سے ایک گروہ جنگل میں جاکر لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور بیچ کر اپنے ساتھیوں کی خدمت کرتا۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ اصحاب صفہ کے پاس کھڑے ہوئے اور ان کی مفلسی اور مجاہدہ اور ان کے دلوں کا اس حالت میں خوش ہونا دیکھا تو فرمایا۔ اے اصحاب صفہ! تمھیں بشارت ہے۔ پس جو شخص میری امت میں سے، اس صفت پر باقی رہے گا، جس پر تم ہو۔ بشرطیکہ تم اس حالت پر راضی ہو۔ وہ جنت میں میرے رفیقوں میں سے ہوگا۔" قرآن مجید کی آیات البقرہ (۲۷۳، ۲۷۴)، الانعام (۵۲)، الکہف (۲۸)، الشوریٰ (۲۶) میں انھی کے متعلق رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔

شیخ ابوعبدالرحمان سلمی نے اہل صفہ کی تاریخ لکھی ہے۔ جس میں سے حضرت داتا گنج بخش نے اصحاب صفہ کے بائیس ناموں کی ایک فہرست "کشف المحجوب" میں دی ہے۔ اس کی رُو سے بلالؓ بن رباح، سلمانؓ فارسی، ابوعبیداللہؓ بن عامر الجراح، عمارؓ بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، مقداد بن اسود، خبابؓ بن ارث، صہیبؓ بن سنان، عقبہؓ بن غزوان، زیدؓ بن خطاب، ابوکبشہؓ، کنانہؓ بن حصین، سالمؓ، عکاشہؓ بن محصن، مسعودؓ بن ربیع، ابوذرؓ غفاری، عبداللہؓ بن عمر، صفوانؓ بن بیضا، ابودرداؓ ابن عامر ابولبابہؓ بن عبدالمنذر اور عبداللہؓ بن بدر الجہنی اصحاب صفہ میں شمار ہوتے ہیں (نیز دیکھیے: "تصوف"، "صوفی")

اصحاب فیل "ہاتھی والے لوگ"۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ الفیل میں

یوں آیا ہے :-

"کیا تم نے نہیں دیکھا، کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے، جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر ان کا یہ حال کر دیا، جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا۔" (۱۰۵ : ۱ تا ۵)

روایت ہے کہ صنعا کے والی ابرہہ نے عیسائیت کو پھیلانے کے لئے ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے شاہ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔ اس کے اس اعلان پر کچھ عرب مشتعل ہو گئے۔ چنانچہ ابرہہ نے قسم کھائی کہ اب وہ کعبہ کو ڈھائے بغیر نہ رہے گا۔

اس اعلان کے بعد ابرہہ ہاتھیوں پر سوار فوج لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ روایت ہے کہ اس کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہ اور تیرہ ہاتھی تھے۔ جب وہ طائف کے نزدیک پہنچا تو ایک شخص ابورغال اس کے ساتھ ہو لیا تاکہ مکہ کی طرف رہنمائی کرے۔ مکہ سے تین کوس کے فاصلے پر وہ شخص مر گیا اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ یہ شخص بنی ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔

ابرہہ نے ایک ایلچی اہل مکہ کی طرف بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا بلکہ اس گھر کو ڈھانے آیا ہوں، جو عربوں کا مرکز و محور بنا ہوا ہے۔ اس وقت مکہ کے سردار عبدالمطلب تھے۔ انھوں نے جواب دیا، "ہم ابرہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اللہ اپنے گھر کو خود ہی بچائے گا۔" ایک اور روایت کے مطابق عبدالمطلب نے ابرہہ کو اس کام سے باز رہنے کے لئے ہر طرح سے ترغیب دی۔ مگر وہ نہ مانا۔

ابن ہشام لکھتا ہے کہ اس موقعے پر عبدالمطلب نے کعبے کا دروازہ پکڑ کر دعا مانگی "خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔"

یہ دعا مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی پہاڑوں میں چلے گئے اور دوسرے روز ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لئے بڑھا۔ مگر اس کا خاص ہاتھی محمود دیکا یک بیٹھ گیا۔ اسے آنکسوں سے کچوکے دیئے گئے مگر وہ نہ ملا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ (ابابیل) اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انھوں نے اس لشکر پر ان کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ سنگریزہ گرتا، وہ ہلاک ہو جاتا۔ ابن اسحاق اور عکرمہ کی روایت ہے کہ ان سے چیچک کا مرض پھیلا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عطا بن یسار کے نزدیک سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہوئے بلکہ کچھ بھاگ گئے ہوئے اور کچھ راستے میں مرے۔ ابرہہ بھی کہیں اور جا کر مرا۔

عربوں کے لئے یہ واقعہ بہت بڑا تھا۔ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز کہا۔ بہت سے شعرا نے قصیدے کہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی ان ۳۶۰ بتوں کا ذکر نہیں کیا، جو خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ حضرت زبیرؓ بن عوام کی روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا۔ "قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔" جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہل عرب اسے عام الفیل "ہاتھیوں کا سال" کہتے ہیں۔ اسی سال آنحضورؐ کی ولادت ہوئی۔ عیسوی سن کے لحاظ سے یہ سال ۵۷۰ء ہے۔

یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ اس دور کے مورخین کے ہاں اچھی طرح محفوظ ہے۔ اگرچہ جدید دور کے مستشرقین لکھتے ہیں کہ واقعہ صرف یہ ہے کہ ابرہہ دمیول کی مدد کے لئے فوج لے کر نکلا۔ راستے میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہو گئی مگر اس ضمن میں وہ کسی قسم کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کرتے۔ (نیز دیکھئے "ابابیل" "ابرہہ")

اصحاب کہف والرقیم

"غار والے کتبے والے لوگ"۔ قرآن مجید میں ان کے بارے میں سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا ہے

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف والرقیم ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؛ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزین ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔" تو ہم نے انھیں اسی غار میں تھپک کر سال ہا سال کے لئے سلا دیا پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔

ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے، جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔ (پھر انھوں نے آپس میں کہا۔) یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو [illegible] دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل [illegible] لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا [illegible] اور کون ہو سکتا ہے۔ جو اللہ پر جھوٹ [illegible] اب جبکہ تم ان سے اور ان [illegible] ان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو [illegible] غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور [illegible] مہیا کر دے گا۔

تم انھیں غار میں دیکھتے تو تمہیں یوں نظر آتا کہ سورج [illegible] غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا [illegible] جانب اتر جاتا ہے۔ اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ [illegible] کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ جسے اللہ ہدایت دے [illegible] اور جسے اللہ بھٹکا دے۔ اس کے لئے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے [illegible] دیکھ کر یہ سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے [illegible] بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کتا غار کے دہانے پر [illegible] بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انھیں دیکھتے تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے کی دہشت بیٹھ جاتی۔

اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انہیں [illegible] اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں ان میں سے ایک نے پوچھا "کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسرے نے [illegible] "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے۔" پھر وہ بولے "[illegible] جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گذرا۔ چلو اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کیلئے لائے اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں موجود ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو سنگسار ہی کر ڈالیں گے۔ یا پھر زبردستی ہمیں [illegible] ملت میں واپس لے جائیں گے اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آ کر رہے گی۔ اس وقت (لوگ) آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ "ان پر ایک دیوار چن دو، ان کا رب ہی ان کے معاملے کو بہتر جانتا ہے۔" مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے۔ انہوں نے کہا "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

" کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو سال اور بڑھ گئے تم کہو! اللہ تعالےٰ ان کے قیام کی مدت زیادہ جانتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں۔" (۱۸: ۱۹ تا ۲۶)

اس قصے کی تعبیر مختلف علماء نے مختلف صورتوں میں کی ہے۔ بعض کے نزدیک الرقیم اس بستی کا نام ہے، جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور بعض کے نزدیک الرقیم سے مراد وہ کتبہ ہے، جو غار پر اصحاب کہف کی یادگار کے طور پر لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک یہ وہی شہر ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہی شہر آگے چل کر "پیٹرا" اور عربی میں [illegible] کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مقام عرب کے شمال میں عقبہ کے قریب واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عیسائی ہونا جرم تھا، جس کی سزا سے بچنے کے لئے اصحاب کہف غار میں جا چھپے تھے۔ مولانا مودودی کے نزدیک رقیم سے مراد کتبہ ہے۔ سریانی زبان میں ایک عیسائی پادری [illegible] نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔ جسے طبری نے مختلف اسناد کے [illegible] کہ [illegible] کے ظلم سے تنگ آ کر وہ لوگ غار کی طرف آئے تھے۔ اس [illegible] بحیرہ [illegible] کے مغربی ساحل کی ایک اہم [illegible] بادشاہ حکمران تھا۔ اس نے ۴۹ء سے ۱۵۱ء [illegible] اصحاب کہف جا گے۔ اس کا نام [illegible] تھیوڈوسیس رومی رہا۔ اصحاب کہف [illegible] اس کا نام مفسرین نے [illegible] اصحاب کہف کی غار میں رہنے والی مدت ۱۹۶ سال بنتی [illegible] دنیا بدل چکی تھی۔ زبان [illegible] دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنے [illegible] تو لوگوں پر سارا حال کھلا۔ یہ [illegible] اب جو اصحاب کہف لیٹے تو [illegible] لوگوں نے وہاں کتبہ لگا دیا۔

اصحاب کہف کی تعداد کیا تھی؟ اور وہ کتنے برس سوتے رہے۔ اس کے بارے میں [illegible] اختلافات ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک چونکہ قرآن مجید میں آخری ذکر سات کی تعداد کا ہے اور اسے رد نہیں کیا گیا۔ اس لئے اصحاب کہف کی تعداد سات ہی تھی اور مدت خواب ۳۰۹ برس تھی۔ البیرونی نے ۳۰۰ شمسی اور ۳۰۹ قمری سال بیان کئے ہیں۔ جب کہ مولانا مودودی کے نزدیک یہ قول خدا کا نہیں بلکہ لوگوں سے منسوب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اس مسئلے پر بہت بحث مباحثہ کیا تھا کہ اصحاب کہف کی تعداد کیا ہے اور کتنے برس سوتے رہے۔ مگر قرآن حکیم نے ان باتوں کو سرسری کہا ہے اور واقعے کا اصل مدعا یہ ظاہر کیا ہے کہ نصیحت پکڑی جائے اور قیامت پر ایمان لایا جائے۔ تاہم قرآن مجید میں اس قصے میں کتبے (رقیم) کا اضافہ ہے، جو مسیحی روایات میں مذکور نہیں۔ چونکہ اصحاب کہف کے واقعے کے متعلق یہودیوں نے آنحضور ﷺ سے استفسار کیا تھا، اس لئے اس موقع پر سورۂ الکہف نازل ہوئی۔

اصفہان ایران کا ایک شہر، جو اپنی حسین مسجدوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک زمانے میں صفویوں کا دارالحکومت تھا۔ اسے بابل کے حکمران نبوکد نضر نے یہودیوں کو بسانے کے لئے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے حضرت عمرؓ کے دور میں ۱۹ھ/۶۴۰ء میں فتح کیا تھا۔ طبری کے نزدیک فتح کا سال ۲۱ھ/۶۴۲ء ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق ابوموسیٰ اشعریؓ نے نہاوند کے بعد اصفہان کو فتح کیا۔ المعتز کے عہد میں ایک بغاوت کے بعد ۲۴۷ھ/۸۶۱ء میں اسے دوبارہ فتح کیا گیا۔ اس بار شہریوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی۔ اس وقت وہاں ایک قلعہ نما عمارت موجود تھی۔ نیز شہر کے گرد فصیل تھی، جس میں چار دروازے اور ایک سو منارے تھے۔ شہر کے قرب و جوار میں چاندی، تانبے، جست اور سرمے کی کانیں تھیں۔

۳۰۱ھ/۹۱۳ء میں یہ شہر سامانیوں کے قبضے میں آیا، ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں غزنویوں کی قلمرو میں شامل ہوا۔ مغلوں کے حملے کے دوران میں شاہ خوارزم سلطان جلال الدین منگو کے زیر کمان اس شہر کی دیواروں تلے ایک بہت بڑی جنگ لڑی گئی۔ بعد میں یہ شہر مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ تیمور نے یہاں ستر ہزار شہریوں کا قتل عام کیا۔ اس کے بعد کئی

اصفہان میں مسجد مدرسہ نادر شاہ

حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں کا قتل عام جاری رکھا۔ نادر شاہ کے عہد میں (۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء) کہیں جا کر یہاں امن ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ شہر عالمی طاقتوں کی آویزش کا مرکز رہا۔ ۱۹۱۷ء میں اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تاریخ میں اس شہر کو پہلی بار کسی حکومت کا مرکزی شہر بننے کا شرف عباس اوّل (۱۵۸۹ء تا ۱۶۲۸ء) کے عہد میں حاصل ہوا۔ اس نے ایک خوب صورت شہر بنا دیا۔ اس نے دریائے زندہ رود پر تین خوبصورت پل تعمیر کرائے۔ نیز ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کرائی۔ شاہ صفی اوّل نے اس پر چاندی کے پترے چڑھوائے۔ بعد کے کئی حکمرانوں نے یہاں خوب صورت عمارات تعمیر کرائیں۔ جن میں گھنٹہ گھر، شاہی محلات، کاروان سرائے، منار خواجہ عالم، قلعہ تبرک اور مدرسہ نادر شاہ وغیرہ اہم ہیں۔

بیسویں صدی کا اصفہان ایک صنعتی شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کپڑے کے بیشمار کارخانے قائم ہیں۔ نیز دھات کا بہترین کام ہوتا ہے۔ جس میں چاندی، تانبے اور جست کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔ موجودہ آبادی ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ ہے۔

اصنام پرستی بت پوجنا، بُت پرستی۔ اسلام میں اسے شرک سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایک

ناپاک فعل قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ الحج میں ارشاد ہوتا ہے
"پس بتوں کی گندگی سے بچو۔" (۲۲ : ۳۰)
گویا بت پرستی ایک طرح کی غلاظت ہے، جس سے پاک صاف انسان کو گھن آتی ہے۔ اسلام نے اس سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ معبود حقیقی غیر مرئی ہستی ہے اور اس کی تجسیم کرنا یا اس کا بت بنانا بھی غلط اور ناپاک فعل ہے، چہ جائیکہ بہت سے دیوی اور دیوتاؤں کے بت بنائے جائیں۔

بت یا مورتیاں بنانے کا رواج زمانہ قبل از تاریخ ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ایشیائے کوچک، مصر، عراق اور وادیٔ سندھ کے آثار قدیمہ سے ایسی مورتیاں ملی ہیں جن کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ مورتیاں زیادہ تر نسوانی ہوتی تھیں۔ شاید قدیم انسان کا خیال یہ تھا کہ خالق مطلق عورت کے روپ میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں عبادات کے لیے کسی الوہی مظہر کی ضرورت محسوس ہوئی تو انسان نے مختلف نشانات سے کام لینا شروع کیا۔ بعدازاں مصوری نے اس کی جگہ لی اور پھر سنگ تراشی کی صورت سامنے آئی۔ جس کی بدولت انسان نے اپنے دیوی دیوتاؤں کے بت تراش کر سامنے رکھ لیے۔ ان بت پرستوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ بت کو خدا نہیں سمجھتے بلکہ ان کے ذریعے خدا کی تجسیم کی جاتی ہے اور ان سے خدا کی خدائی کا ظہور ہوتا ہے۔

بت پرستی کی رسوم کے متعلق ماہرین تاریخ و آثار کا ظن ہے کہ یہ روم اور یونان سے شروع ہوئی۔ بلاشبہ اب بھی دنیا میں بت پرستی رائج ہے، خصوصاً ہندومت، جین مت اور بدھ مت میں۔ تاہم اس بارے میں بھی پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ میں بت پرستی کا مکمل آغاز اسرائیلیوں یعنی یہودیوں نے کیا۔ قرآن مجید اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنی اسرائیل ہی وہ قوم ہے، جس نے خدا کی واضح ہدایت کے باوجود گائے کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ مشہور قدیم مؤرخین ہیرو ڈوٹس اور لوزیبئس وغیرہ لکھتے ہیں کہ قدیم لوگ بت پرست نہیں تھے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کے لوگ بت بناتے اور ان کی پوجا کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کی بت پرستی کی تصریح موجود ہے۔ مگر خود یہودی اور عیسائی مؤرخین کا کہنا ہے کہ بت پرستی کی ابتدا صحیح معنوں میں قدیم یہودیوں سے ہوئی۔ آج بھی یہودی اور عیسائی مختلف بت بناتے اور اپنے معبدوں میں سجاتے ہیں۔

یوں تو بت پرستی دنیا بھر میں کسی نہ کسی طور رائج رہی، لیکن اس شرک کی لپیٹ میں سب سے زیادہ ہندی، یونانی اور عرب اقوام آئیں۔ ہندوستان میں سینکڑوں دیوی دیوتاؤں کے بت تراشے گئے۔ دراوڑیوں، آریاؤں، برہمنوں اور بدھ مت کے پیروکاروں نے مذہبی عبادات کے لیے بت کو اہم حیثیت دی۔ ہر ذات اور ہر گھرانے کے لیے علیحدہ بت پوجنا مذہب کا حصہ ٹھہرا اور یوں ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ تاہم ان کے تین بڑے دیوتا برہما، وشنو اور شیو تھے۔ بدھ مت اور جین مت میں گوتم بدھ اور مہابیر کے بت بنا کر پوجے گئے۔

یونانیوں کے ہاں انسانی شکل و صورت کے دیوتاؤں کے بت بنائے جاتے تھے۔ یہ تعداد میں بارہ تھے۔ ان میں سات دیوتا اور پانچ دیویاں تھیں۔ آسمان کے دیوتا کو یورانس اور زمین کی دیوی کو "گے" کا نام دیا گیا تھا۔ دیگر دیوتا زیوس، پوزیڈان، اپالو، ہرمیس، ہیفیسٹس، ایریس، دایونیس اور دیویاں ہیرا، دیمیٹر، آرٹمیس، ایتھنی اور ایفروڈائٹ تھیں۔

بت پرستی کے سلسلے میں عربوں کے طریقے مختلف تھے۔ ان میں بت پرستی کو فروغ عیسائیوں اور یہودیوں کی باہمی آویزش سے ہوا۔ عیسائیوں کے ہاں مصر و یونان کی بت پرستی کے آثار نمایاں تھے۔ کلیساؤں میں اکثر صنم رکھے ہوتے تھے۔ یہی چیز عربوں کے ہاں در آئی۔ اور ہر قبیلے نے عبادت کے لیے بت تراشنے شروع کر دیئے۔ انھیں صنم اور نصب کہا جاتا تھا۔ عام خیال تھا کہ یہ بت آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بت خدا اور بندگان خدا کے درمیان وسیلہ کا باعث ہیں۔ مرکزی اتحاد کی خاطر مختلف قبائل نے اپنے بت لا کر خانہ کعبہ میں رکھ دیئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد فتح مکہ کے وقت تین سو ساٹھ تھی۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ عربوں میں بت پرستی کا آغاز کرنے والا شخص عمرو بن لحی تھا، جو شام کی سرزمین میں تجارت کے لیے گیا۔ اسے عمالیقیوں کی بت پرستی پسند آئی اور وہ ان سے ہبل نامی ایک بت لے آیا جسے خانہ کعبہ کی چھت پر رکھ دیا گیا تاکہ عرب اس کی عبادت کریں۔ دوسرے بتوں میں سے لات قبیلہ ثقیف کا، عزیٰ بنو قریش و کنانہ کا، منات قبیلہ اوس اور خزرج کا، یغوث بنو غطیف کا، یعوق جنوبی عرب کے قبائل کا، سواع بنو ہذیل کا اور ود ایک جنگی دیوتا تھا۔ ان میں سے ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ ان کے بتوں کی پرستش طوفان نوح کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے ہو رہی تھی، جسے عربوں نے فروغ بخشا۔ اسلام نے نہ صرف بت پرستی کا قلع قمع کیا بلکہ عرب کی سرزمین کو ان بتوں کے وجود سے بھی پاک کر ڈالا۔

اصول طریقہ، وزن، رکن، دلیل، علامت، [illegible] سبب، قواعد اور ضابطہ کو اصول کہتے ہیں۔ علوم دینیہ میں مبادیات تحقیق [illegible] کا نام اصول رکھا گیا ہے۔ [illegible] تعداد میں چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع امت [illegible] فقہ [illegible]
(مزید دیکھیے "اجماع"، "تفسیر"، "حدیث"، "فقہ"، "قرآن")

اطاعت گردن جھکانا، فرمانبرداری کرنا۔ یہ خاص [illegible] اور پھر اسی کے حکم کے مطابق عمل کرنا [illegible] مجید میں سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے:
"کہہ دے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ پھر جائیں [illegible] والوں سے محبت نہیں کرتا۔" (۳ : ۳۲)
ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:
"اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے [illegible]
بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہر انسان پر فرض ہے۔
سورۂ النساء میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:
"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی [illegible] صاحبان امر کی اطاعت کرو۔" (۴ : ۵۹)
ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ کی اطاعت [illegible] کے بعد اس کے رسولؐ کا حکم ماننا ضروری ہے اور پھر اپنے حاکم [illegible] اللہ کی اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ اللہ پر ایمان کامل ہو اور عمل [illegible] تبھی ہو سکتا ہے کہ شریعت محمدی پر چلا جائے اور اطاعت رسولؐ [illegible] پر رکھا جائے۔
رسولؐ کی اطاعت کا مطلب ہے کہ رسولؐ جو کچھ کہے [illegible] اور رسولؐ جو کچھ کرے اس کی پیروی کی جائے۔ گویا اللہ کی کتاب کے بعد سنت رسولؐ کی پیروی فرض عین ہے۔
ایک گروہ تفریط میں مبتلا ہو کر یہ کہتا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت بھی شرک [illegible] ہے۔ جبکہ اس اطاعت کا حکم خود اللہ دے رہا ہے اور جب کہ ہم اللہ کی اطاعت رسول ہی کے واسطے سے کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے سے ہم نے اللہ کو سچا مانا تو یقیناً ہم نے رسولؐ کو سچا مانا۔ گویا رسول جو کچھ کہتا اور کرتا ہے اللہ ہی کے حکم سے کرتا ہے۔ ثابت ہوا کہ اللہ کی اطاعت تبھی ہو سکتی ہے اگر رسول کی اطاعت کی جائے۔ اس کے بارے میں اللہ نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔

سورہ النساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔
"جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔" (۴:۸۰)
اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد امیر وقت کی اطاعت لازم ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے۔ "اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے، جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔" (مسلم) مگر یہ اطاعت نیک اور اچھے کاموں میں ہے۔ برے کاموں میں نہیں۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے "معصیت میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔" (بخاری و مسلم) نیز یہ اطاعت [illegible] کا ذاتی فعل نہیں بلکہ اس پر لازم ہے، خواہ وہ دل سے اپنے امیر کو ناپسند کرتا ہو۔ ارشاد نبوی ہے۔ "ہر ایک مسلمان پر سمع و اطاعت لازم ہے، خواہ برضا و رغبت کرے یا بکراہت۔ تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ تب نہ تو سمع ہے نہ طاعت۔" (بخاری و مسلم)

امیر وقت کو قرآن مجید میں اولی الامر کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک ان سے مراد وہ امیر ہیں، جو نبی کریم صلعم کے زمانے میں مقرر کئے گئے تھے اور بعض کہتے ہیں [illegible] اور بعض کے نزدیک امر معروف کرنے والے۔ ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے مراد فقہا اور اہل دین ہیں۔ امام راغب کے نزدیک اولی الامر میں [illegible] شامل ہیں۔

احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولی الامر کے احکام کی پابندی کی اصل [illegible] ہے۔ صحیحین میں ہے کہ جو شخص اپنے امیر کی کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے [illegible] صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر ہٹتا ہے، پھر [illegible] جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ [illegible] ایسا حکم بھی دے، جو کسی شخص کو [illegible] اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو [illegible] جن کی بعض باتوں کو تم معروف [illegible] اور بعض کو منکر، تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا، وہ بری الذمہ [illegible] ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے [illegible] پوچھا، "جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے [illegible]" آپ نے فرمایا "نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔" (مسلم)

اعتکاف ٹھہر جانا، رک جانا، پابند ہونا۔ شرعی اصطلاح میں ایک طرح کی عبادت جو کچھ مدت کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہو کر مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔ رمضان کے آخری دنوں میں اس کا ادا کرنا کتب میں نیک اور مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ [illegible] اس کی مدت کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ رمضان کا آخری عشرہ ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ بھی اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے۔ اعتکاف ایک مستحسن اور ثواب کا فعل ہے۔ اعتکاف کے لئے مسجد میں ایک علیحدہ [illegible] صبح کی نماز پڑھ کر وہاں داخل ہوتے ہیں اور ضروری حاجت کے سوا مسجد سے باہر نکلنا ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ کسی کی عیادت کو بھی نہ جائیں۔ البتہ راستے ہی میں کھڑے ہوئے کسی بیمار کی عیادت کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح دفن میت اور نماز جنازہ کے لئے بھی باہر جانا درست نہیں۔ اس دوران میں قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا، دینی تعلیم دینا، حجامت و غسل کرنا، کپڑے بدلنا اور مختصر باتیں کرنا وغیرہ جائز ہے۔ لیکن بیوی کے ساتھ اختلاط کرنا منع ہے۔

اعتکاف کا آغاز عام طور پر رمضان کی اکیس تاریخ سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ لیلۃ القدر ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ یا ۲۹ ویں راتوں میں سے کوئی ایک ہے۔ اکثر علماء کا یہی خیال ہے، چونکہ لیلۃ القدر کی عبادت دیگر عبادتوں سے افضل قرار دی گئی ہے، اس لئے احتیاطاً اعتکاف کا آغاز ۲۱ ویں رمضان سے پہلے یعنی ۲۰ رمضان کی صبح سے کیا جاتا ہے اور اس کا اختتام عید کا چاند نظر آنے پر کیا جاتا ہے۔

اعراف عرف کی جمع، جس کے معنی بلند جگہ ہیں۔ قرآن مجید نے جنت اور دوزخ کے درمیان ایک حد فاصل کو اعراف کہا ہے۔ جہاں کچھ لوگ ہیں اور یہ بلند جگہ ہے۔ سورۃ الاعراف میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:۔
"ان دونوں گروہوں (جنت اور دوزخ والوں) کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر۔ یہ لوگ جنت میں داخل تو نہ ہوئے ہوں گے مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے، اے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔" (۷: ۴۶، ۴۷)
حذیفہؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ کا خیال ہے کہ اعراف میں وہ لوگ شامل ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ بعض مفسرین اور مستشرقین کے نزدیک اعراف کے لوگ پہچاننے والے، نگران ہوں گے اور ہوسکتا ہے کہ یہ اشارہ انبیاء کی طرف ہو جو اس وقت بھی خیر کو شر سے علیحدہ رکھنے پر مقرر کئے جائیں گے۔ "لسان العرب" میں حضرت ابن عباسؓ کا قول درج ہے کہ اعراف والے سرداران اہل جنت ہوں گے۔ واللہ علم بالصواب۔

اعوذ باللہ اللہ کی پناہ مانگنا۔ قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ "میں شیطان مردود رجیم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔" اس کا حکم قرآن مجید میں سورۃ النحل میں یوں دیا گیا ہے:۔
"پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔" (۱۶: ۹۸)
امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور چند دیگر اصحاب کے نزدیک "اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم" پڑھنا بہتر ہے۔ امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ان اللہ ھو السمیع العلیم" کی ترکیب بہتر ہے۔ یہ بسم اللہ سے قبل پڑھا جاتا ہے۔ اعوذ باللہ پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ شیطان کے شر سے محفوظ کرے تاکہ اس کی وسوسہ اندازیاں اس ہدایت سے محروم نہ کردیں، جو قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے۔ شیطان سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کرے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرے۔

افغان ایک قوم، جو پشاور اور کابل کے علاقوں میں رہتی ہے۔ عام طور پر یہ لفظ درانی اور زیزئی قبائل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جنہیں عام طور پر پٹھان سمجھ لیا جاتا ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ پٹھان کا اطلاق جو غالباً لفظ پشتون یا پختون کی بگڑی ہوئی شکل ہے، پشتو زبان بولنے والے ان تمام قبائل پر ہوتا ہے، جو صوبہ سرحد میں رہتے ہیں۔ وہ افغان جو اس زمرے میں آتے ہیں، پٹھان کہلاتے ہیں، جبکہ افغانستان کے دیگر افغان فارسی بولتے ہیں۔ عام طور پر لوگ پٹھانوں اور افغانوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور جب پٹھانوں کے مختلف قبائل کا نسلی اختلاف نظر آتا ہے تو اسے افغانوں کا نسلی اختلاف

قرار دیتے ہیں

افغان اپنا سلسلۂ نسب اسرائیل کے پہلے بادشاہ طالوت (ساؤل) کے پوتے افغانؔ سے ملاتے ہیں۔ اس کی نسل سے ایک شخص قیس عبدالرشید حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ اس کے تین بیٹے سربن، بٹنؔ اور غرغشت تھے۔ تمام افغان قبائل انھی کی اولاد ہیں۔

افغان قبائل میں سب سے زیادہ طاقتور قبیلہ درانی ہے، جو ہرات اور قندھار کی وادیوں میں آباد ہے۔ ان کے بعد غلزئی ہیں، جو جلال آباد تک کے علاقے میں آباد ہیں۔ اس کی ایک اہم شاخ سلیمان خیل ہے، جو موسم سرما میں سندھ کے زیریں علاقوں تک چلے جاتے ہیں اور موسم بہار میں واپس آجاتے ہیں، یہ بلوچستان کے ان علاقوں میں بھی آباد ہیں جہاں ترین اور کاکڑ آباد ہیں۔ دریائے کابل سے پیشاور تک کے علاقے پر مہمند قابض ہیں، سوات اور دیر کے علاقوں میں یوسف زئی اور مندان قبائل آباد ہیں۔ دریائے کرم کی بالائی وادی میں بنگش، اورکزئی اور خیبر و کوہاٹ کے دروں میں آفریدی آباد ہیں۔

افغانوں کی قدیم تاریخ ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے۔ تاریخ میں ان کا ذکر پہلی بار چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ انھیں سیاسی قوت بارہویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی۔ جب ان کے علاقوں پر غزنوی حکمران تھے۔ یہ غوریوں اور مغلوں کی فوج کا ایک حصہ رہے۔ برنی لکھتا ہے کہ افغانوں نے پہلی بار ملتان میں محمد بن تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ان کے ایک سردار دولت خاں لودھی نے اقتدار حاصل کرنا شروع کیا اور ۱۴۵۰ء میں بہلول لودھی نے پایۂ تخت دہلی پر قبضہ کیا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں لودھیوں کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ مگر شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۵ء تک کے مختصر عرصے کے لیے ایک بار پھر افغانوں کو حکومت پر بٹھا دیا۔ بعد میں اورنگ زیب نے انھیں جاگیریں دینا شروع کیں اور یوں ہندوستان میں آنے والے افغان رفتہ رفتہ مقامی آبادیوں میں گھل مل گئے۔

قندھار میں غلزئیوں کی ایک شاخ توخی نے اپنی خودمختاری برقرار رکھی۔ اسی میں سے ایک فرد ملجی کو اورنگ زیب نے تمام غلزئیوں کا سلطان تسلیم کیا۔ یہ لوگ امیر عبدالرحمان خاں کے عہد تک برسر اقتدار رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ابدالیوں (درانیوں) نے بھی ہرات اور قندھار میں اپنی خودمختار سلطنت قائم کرلی۔ ۱۷۰۵ء/۱۳۴۶ء کے لگ بھگ ان کے ایک سردار ملک سلیمان زیرک بن عیسیٰ نے اس سلطنت کو وسیع کیا۔ انھی میں سے ایک مشہور سردار احمد شاہ ابدالی تھا، جو ایران کے بادشاہ نادر شاہ کا سپہ سالار تھا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۷۰ء تک افغانستان میں افغانوں کی حکومت قائم رہی ہے۔ (نیز دیکھیے " افغانستان ")

افغانستان ایشیا کا ایک ملک۔ اس کے شمال میں روس، شمال مشرق میں چین، جنوب مشرق اور جنوب میں پاکستان اور مغرب میں ایران جیسے ممالک واقع ہیں۔ پورا ملک پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے۔ مشرق میں کوہ ہندوکش (۲۰ ہزار فٹ تک بلند)، کوہ بابا اور کوہ سپید (۱۵ ہزار فٹ تک بلند) کے سلسلے واقع ہیں۔ میدانی علاقے سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ جو سطح مرتفع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورے ملک میں چار بڑے دریا بہتے ہیں۔ ان میں سے آمو دریا شمال مشرقی پہاڑی سلسلے سے نکل کر روس کی سمت بہتا ہے۔ ہندوکش کے شمال میں زمین کی سطح آمو کی وادی کی طرف تیزی سے نیچے ہوتی چلی گئی ہے اور جنوبی جانب اس کے نشیب کے آخر میں سیستان کی ارتفاعی سطح واقع ہے، جس میں بہتے ہوئے دریائے ہلمند اور دریائے ہامون ایک جھیل میں جا گرتے ہیں۔ دریائے ہلمند کابل کے قرب و جوار سے نکلتا ہے۔ بائیں جانب سے دریائے ارگنداب بھی اس میں آملتا ہے۔ دریائے ہامون ایک طاس ہے، جو طغیانی کے زمانے میں جنوب کی طرف بے حد پھیل جاتا ہے۔ اس وقت صرف کوہ خواجہ ایک جزیرے کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ دس سال میں ایک بار کبھی کبھی یہ طاس امنڈ پڑتا ہے اور پھر اس کا کچھ پانی ایک نالے کی راہ سے بہت زیادہ نشیبی علاقے گود زرہ میں جا پہنچتا ہے۔ کابل کے اردگرد سے ایک اور دریا بھی نکلتا ہے، جو دریائے کابل کے نام سے مشہور ہے اور مشرق کی سمت دریائے سندھ میں جا ملتا ہے۔

افغانستان ایک ایسا ملک ہے، جس میں دونوں طرح کے موسم مل جاتے ہیں۔ سیستان کے علاقے گرمیوں میں گرم ترین ہیں اور پہاڑی سلسلے سردیوں میں سرد ترین ہوتے ہیں، جہاں تند برفانی طوفان بھی آتے ہیں۔ پہاڑوں پر عام طور پر صنوبر اور بلوط کے درخت اور عشق پیچاں اور گلاب کے پودے پائے جاتے ہیں۔ چھوٹی پہاڑیوں پر پستہ، زیتون، انگوزہ اور ہینگ کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام میدانوں میں چنار، بید مجنوں، گل سوسن، گل لالہ، گلنار اور پھل دار درخت پائے جاتے ہیں۔

افغانستان سیاسی طور پر کابل، قندھار، سیستان، ہرات، ہزارستان، ترکستان، بدخشاں اور نورستان کے صوبوں میں منقسم ہے۔ یہاں افغان، تاجیک، ایرانی، منگول اور ہند آریائی نسلوں کے لوگ بستے ہیں۔ یہ لوگ کیارہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ جن میں سے اکثریت پشتو اور فارسی بولتی ہے۔ قبول اسلام کے وقت سے پوری آبادی مسلمان ہے، جن میں سے بہت بڑی اکثریت سنیوں کی ہے۔ یہ لوگ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس لیے احمدیوں اور عیسائی مشنریوں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ تاہم ہندوؤں کے ساتھ رواداری برتی جاتی ہے۔

تاریخ:- افغانستان ایک قدیم تاریخی ملک ہے۔ اگرچہ اسے موجودہ سیاسی حیثیت اٹھارویں صدی میں ملی۔ اس سے پہلے یہ مختلف سیاسی حصوں میں منقسم تھا [illegible] کوئی سیاسی وحدت نہ تھی۔ ان علاقوں کو چھٹی صدی قبل مسیح میں [illegible] کوروش یا خسرو نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ [illegible] فتح کیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد یوچی قبائل نے ان پر قبضہ کیا۔ [illegible] پشاور اور سوات شامل تھے۔ [illegible] کے لگ بھگ یہ علاقے [illegible] میں تھے۔ یہ تمام حکمران ایرانیوں کے باجگزار رہے۔ [illegible] منتقل کیا جانے لگا۔ ایرانیوں پر حاکم ہوئے تو انھوں نے [illegible] کیا۔ ایرانی حکمران نوشیرواں (خسرو اوّل) نے انھیں شکست دے کر [illegible] کردیا۔ اس کے بعد کافی عرصے تک ان علاقوں کے [illegible] ۶۵۹ء سے ۱۰۷۱ء تک یہاں [illegible] کا تسلط برقرار رہا۔

یہ وہ دور تھا جب افغانستان [illegible] مرکب تیار ہو رہا تھا۔ زرتشت، بدھ اور برہمن کے [illegible] گندھارا اور ارگنداب آرٹ اپنے عروج پر تھے۔ [illegible] قیس نے ایرانی بادشاہ یزدگرد کو شکست [illegible] اور خراسان کو فتح کرلیا۔ عہد عثمانی میں فتوحات کا [illegible] فتح کرلیا۔ حضرت عثمانؓ نے احنف بن قیس کو [illegible] کو مغربی ترکستان میں اور عبداللہ بن عمیر کو سیستان [illegible] امارات [illegible] جنھوں نے یہاں [illegible] اسلام کی تبلیغ [illegible] عربوں کو بھی بسایا۔ [illegible] ۶۶۴ء میں ان امرا کی [illegible] کے حوالے کردیا۔ [illegible] میں قتیبہ بن مسلم [illegible] انھوں نے طخارستان کے علاقے میں تمام باغی عناصر کو کچل [illegible] ۹۶ھ / ۷۱۴ء تک شمالی افغانستان ہر طرح کی مخالفت سے پاک ہوگیا۔ [illegible] ساتھ ہی قتیبہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ اموی خلیفہ ولید نے [illegible]

[illegible] ۶۶۳ء میں حضرت معاویہؓ کی طرف سے
[illegible] ۶۶۴ء میں کابل فتح کیا۔ ۴۴ھ/۶۶۵ء
[illegible] کی وجہ سے یہاں اسلامی قوانین نافذ
[illegible] ۹۶ھ/۷۱۴ء تک سلامی فتوحات کا
[illegible] کے باشندے برابر مقابلہ کرتے رہتے۔
[illegible] باثر شخص عبدالرحمان ابومسلم کو دے گیا اور
[illegible] ۱۲۹ھ/۷۴۶ء میں اس نے مرو سے
[illegible] حاصل کر کے بنو عباس کی خلافت کا اعلان کر دیا
[illegible] بنو امیہ کی خلافت ختم ہو گئی۔ عباسیوں نے افغانوں کی بغاوتوں
[illegible] ۱۶۵ھ/[illegible] میں یزید بن سعید نے سیستان کا حاکم مقرر ہو
[illegible] کے خلاف جنگ لڑی اور اس کے بھائی کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا۔
[illegible] ہارون الرشید اپنے لشکر کے ہمراہ خراسان آیا۔ اس وقت رَد
[illegible] بن عبداللہ سیستان اور ہرات پر قابض تھا۔ وہ تیس ہزار کا
لشکر لے کر [illegible] کی طرف بڑھا۔ مگر خلیفہ کی وفات کے باعث لڑے بغیر لوٹ گیا۔
اس تمام عرصہ کے دوران میں اگرچہ افغانستان پر باقاعدہ اسلامی حکومت تو قائم نہ ہوئی مگر اسلامی تہذیب کی چھاپ پورے ملک کے طول و عرض پر لگ چکی تھی دین اسلام نے یہاں کے تمام مذاہب باطلہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی اور عربی زبان اور رسم الخط پورے ملک میں پھیل گیا تھا۔ عربی اور پہلوی کے اختلاط سے فارسی زبان نے جنم لیا۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً بلخ، ہرات، غزنہ اور زرنج میں اسلامی علوم کے مکاتب کھل گئے۔ اس سرزمین سے کئی مشہور صوفیا اور علما نے جنم لیا۔ ان میں سے امام اعظم ابو حنیفہؒ، محمد بن کرام، ابواسحاق جوزجانی، ابراہیم ادھم، ابوسلیمان موسیٰ، ابوداؤد سجستانی، ابومعشر بلخی، ابن قتیبہ مروزی، ابراہیم بن طہمان محدث باشانی اور ابراہیم بن رستم مروی قابل ذکر ہیں۔ کابل، غزنہ، بخارا، قندھار، ہرات، خراسان اور سمرقند کے شہروں کے مابین آزادانہ تجارت ہوتی تھی۔ یہاں کی مصنوعات پوری دنیا میں اہم تجارتی مقام رکھتی تھیں۔ زراعت، آب پاشی کانکنی اور صنعت و حرفت کو عروج حاصل تھا۔ تاہم یہ علاقے مختلف حکمرانوں کے مخلوط طور پر باجگزار رہے۔ اموی اور عباسی خلفاء کے سکے بھی یہاں کے غیر اسلامی سکوں کے ساتھ رائج تھے۔ خراسان سے کابل تک کا علاقہ پنجاب اور سندھ ولایت عراق و عجم میں شامل تھا۔ اموی خلفاء کی طرف سے یہاں دو حاکم ہوتے تھے۔ ایک حاکم خراسان اور دوسرا حاکم کابل، جو پنجاب اور سندھ کا بھی والی ہوتا تھا۔ عہد عباسیہ میں یہاں تین والی مقرر کیے گئے تھے۔ خراسان، سیستان اور توران و مکران صحابہ کرام اور تابعین کو یہاں بطور قاضی مقرر کیا جاتا تھا، جو سیاسی اثر سے پاک فیصلے کیا کرتے تھے۔

۲۰۵ھ/۸۲۲ء سے عباسیوں کے مقرر کردہ امیر خراسان طاہر بن حسین نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سے شمالی افغانستان آل طاہر کے ماتحت رہا۔ جنوبی و مشرقی اطراف پر ابھی تک کابل شاہی ہندو حکمران موجود تھے۔ ۲۵۹ھ/۸۷۲ء میں خوارجیوں کے ایک رکن یعقوب نے آل طاہر کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور کابل، پشاور، ملتان، مکران وغیرہ کے تمام بادشاہوں کو اپنا مطیع بنا لیا۔ وہ پہلا حکمران ہے، جس کی قلمرو میں موجودہ افغانستان کا تمام علاقہ شامل تھا۔ اس کے جانشین اہل صفاریہ کہلائے۔ ان پر غزنویوں غوریوں اور مغلوں نے وقتاً فوقتاً حملے کیے۔ مگر ۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء تک یہاں صفاری حکمران رہے۔ خواہ انھیں مختلف سلطنتوں کا باجگزار بن کر رہنا پڑا۔

۲۷۵ھ/۸۸۸ء میں ماوراءالنہر کے امیر نصر بن احمد بن سامان کے بھائی اسماعیل

نے ماوراءالنہر اور خراسان پر قبضہ کر لیا تھا ۔ ۲۸۰ھ/۹۰۰ء میں اس نے طخارستان سے مردار ہرات تک اور مغربی افغانستان کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اس کے بعد ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء تک اس کی اولاد آل سامان کے نام سے افغانستان کے مختلف حصوں پر حکمران رہی ۔ سامانیوں کے دور میں فارسی ادب اور زبان کے ساتھ ساتھ دین اور تمدن اسلام کا بھی کافی پھیلاؤ ہوا ۔ تیسری صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی میں کوہ سلیمان پر افغانوں کے جد امجد عبدالرشید قیس کی حکومت تھی ۔ اس کے تین بیٹے غرغشت ، بٹنی اور سربن تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کوہ غور سے کوہ سلیمان تک کے علاقے پر قابض رہے کہا جاتا ہے کہ افغان قوم انھی تینوں کی اولاد میں سے ہے (دیکھیے : افغان) دریائے آمو کی وادی پر گوزگانیوں کے ایک خاندان فریغونیاں کی حکمرانی تھی ۔ اس خاندان کا پہلا شخص احمد فریغونی ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں بلخ کا حکمران تھا ۔ ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء تک اس کی اولاد گوزگان کے علاقے پر حکمران رہی ۔ ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں جب سامانی حکمرانوں پر زوال آ گیا اور غزنہ پر لودی حکمران سبکتگین کی حکومت قائم ہو گئی تو فریغونیوں کی حکومت بھی ختم ہو گئی ۔ سبکتگین کے بیٹے محمود غزنوی نے شمالی افغانستان کو بھی فتح کر کے بلخ کو اپنا پایۂ تخت بنایا ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک موجودہ ملک افغانستان کا پورا علاقہ غزنویوں کی سلطنت میں شامل رہا ، اگرچہ صفاری حکمران غزنویوں کے باجگزار کی حیثیت سے موجود رہے ۔ اس دور میں یہاں سے ہندو مذہب اور تہذیب پوری طرح نابود ہو گئے اور اسلام پوری سلطنت میں رائج ہو گیا ۔ اس عہد میں البیرونی ، ابن سینا ، ابن مسکویہ ، ابوالفضل بیہقی ، نصراللہ ، موفق ہروی ابوالحسن ہجویری (داتا گنج بخش) ، فردوسی ، طوسی ، عنصری ، منوچہری ، سنائی ، ناصر خسرو ابوالفرج رونی اور مختاری غزنوی جیسے فاضلین نے جنم لیا اس دور میں فنون لطیفہ اور مصنوعات نے بحیثیت مجموعی بے حد ترقی کی ۔

غزنویوں کے ہاتھ سے نیشاپور اور بہت سے دیگر علاقے طغرل بیگ سلجوقی کے ہاتھ میں چلے گئے تھے ۔ چنانچہ اس نے ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء تک سیستان سے بلخ و طخارستان کے علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا ۔ اس کی اولاد آل سلجوق یا سلاجقہ کہلائی ۔ اس سلسلے کے ایک سلطان سنجر نے غزنوی حکمران بہرام ارسلان کے ماتحت غزنہ سے لاہور تک کے علاقے پر حکومت کی ۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں اس کے اپنے باغیوں نے کر دیا ۔ انھی میں سے ایک سردار اتسز نے اپنی حکومت قائم کر لی اور اس کا خاندان آل خوارزم شاہ کے نام سے ۶۱۳ھ/۱۲۱۵ء تک حکمران رہا ۔ خوارزم شاہیوں اور غوریوں کے مابین کئی بار تصادم ہوئے ۔ اس وقت سیستان کے امرا نے سر ابھارا ۔ انھوں نے سلجوقیوں ، غوریوں اور غزنویوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے تھے ۔ خوارزم شاہ کے بعد انھوں نے سیستان پر خود مختارانہ حکمرانی کی ۔ اس وقت غور پر غوری یا سوری حکمران تھے ، جو یہاں حضرت علیؓ کے عہد سے حاکم چلے آتے تھے ۔ ان میں قطب الدین حسن ، جو سلاطین غور کا جد امجد تھا ، ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں باغیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ اس کے بیٹے عزالدین حسین اور سات پوتوں نے خراسان ، غور ، زابل ، غزنہ ، بامیان اور طخارستان پر خود مختارانہ حکومت کی ۔ ان کے بعد ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء میں غیاث الدین تخت پر بیٹھا ۔ اس نے بہت سے علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کیا ۔ ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء میں اس کی سلطنت ہندوستان سے عراق تک پھیل چکی تھی اور خلیفۂ بغداد نے اسے قانونی حکمران تسلیم کر لیا تھا ۔ اس کے بھائی سلطان محمد غوری کی سلطنت بنارس سے خراسان اور خوارزم سے بحیرۂ عرب تک پھیل چکی تھی ۔ اس کی شہادت کے بعد غوری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ۔ مختلف علاقوں میں مختلف امرا کی حکومت قائم ہو گئی ۔ انھی میں سے ایک سلطان قطب الدین ایبک نے چالیس روز تک غزنہ پر حکومت کی ۔ اس کے بعد سے خوارزم شاہیوں نے شمالی علاقوں اور ملوک سیستان نے جنوبی علاقوں پر قبضہ کر لیا ۔

غوریوں کا دور علمی و ادبی لحاظ سے افغانستان کا ایک سنہرا دور ہے ۔ اس دور میں فن تعمیر نے بڑی ترقی کی ۔ پشتو ادبی زبان بنی ، امام فخرالدین رازی ، نظامی عروضی ، قاضی منہاج سراج ، ابونصر فراہی ، محمد عوفی وغیرہ اس دور کے مشاہیر میں سے ہیں ۔

اس تہذیب کو ، جو ابھی عروج کی طرف مائل تھی ، ۶۱۶ھ/۱۲۲۰ء میں تاتاری حملہ آور چنگیز خاں نے اپنے گھوڑوں کے قدموں تلے روند ڈالا ۔ اس وقت افغانستان کے علاقوں پر خوارزم شاہی حکمران تھا ۔ تاتاریوں نے خوارزم شاہ کو شکست دے کر اسلامی مملکت کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا ۔ علاؤالدین کے بیٹے جلال الدین نے دو ہی برس بعد ایک لشکر جرار جمع کیا اور پروان کے مقام پر چنگیزی لشکر کو شکست دی ۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں چنگیز خاں کی موت کے بعد افغانستان پر اس کا بیٹا طولی خاں حکمران ہوا ۔ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک بار پھر اسلامی تمدن کو ملیامیٹ کرنا شروع کیا اور تاتاری قوانین نافذ کیے ۔

تاتاریوں نے اپنے ہاں مسلمان منشی بھی ملازم رکھے تھے ، جو اسلامی احکام و آداب کی نگرانی کرتے تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ تاتاری تمدن کو بھی فروغ ہوا ۔ چین کے فن نقاشی معماری اور پارچہ بافی کو رواج ہوا ۔ اس دور کے فضلا اور علما میں مولانا رومی ، نصیرالدین طوسی ، شیخ فریدالدین عطار ، مولانا جامی ، امیر حسین غوری اور سلیمان ہاکو وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء میں تاتاری حکمران منکو [illegible] نے اپنے ایک درباری اور محمود غزنوی کے [illegible] رشتہ دار ملک شمس الدین محمد بن ابی کرت کو [illegible] سے خراسان تک کا حاکم مقرر کر دیا ۔ [illegible] خاندان آل کرت کے نام سے حکمران رہا جس کا خاتمہ [illegible] ۱۳۰۵ء میں [illegible] حکمران امیر تیمور نے کیا ۔ تیمور نے اپنے پوتے محمد خان کو [illegible] بیٹے شاہ رخ کو ولایت خراسان کی بادشاہی دے دی ۔ تیمور [illegible] اور پوتے خلیل بن میران شاہ نے غزنہ کی حکومت پر قبضہ کر لیا [illegible] افغانستان کے تمام علاقے اپنی قلمرو میں شامل کرتے [illegible] جھگڑتے رہتے ۔ افغانستان کا آخری تیموری حکمران بابر [illegible] کے بعد تمام علاقے الگ الگ حکومتوں میں بٹتے گئے ۔

آل تیمور کے عہد میں علوم و فنون شہرۂ عام کو پہنچ گئے [illegible] مولانا جامی ، حسین واعظ کاشفی ، میر خواند ، [illegible] اور [illegible] دور میں شہر ہرات اپنے عروج و کمال کو پہنچا ہوا تھا [illegible] آباد ہوئے اور اسی دور میں شیخ آدم [illegible] نے تفسیر [illegible] کتاب لکھی ۔

چنگیز خاں کی نسل سے ایک شخص شیبانی خان [illegible] ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء کے وقت سمرقند پر قابض ہو گیا ۔ ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء میں اس [illegible] نے بیشتر افغانستان کے علاقوں کا رخ کیا ۔ جہاں اس دور [illegible] تھا ۔ [illegible] بیگ کو شکست دے کر [illegible] نے کابل پر بھی حکومت کی ۔ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں [illegible] ۱۵۱۰ء میں ایران کی سلطنت صفویہ کے بانی اسماعیل اول سے [illegible] شیبانی خاں مارا گیا ۔ اور ہرات تک کا علاقہ اسماعیل صفوی کے [illegible] کے ساتھ الحاق کیا ۔ جس پر ازبکوں نے بابر کے خلاف بغاوت کر دی [illegible] قبائل نے بھی کروٹ لی اور متعدد مقامات پر انھوں نے سر اٹھایا جسے بابر نے سختی کے ساتھ کچل دیا ۔

اگلے کئی برس تک کابل کا شہر ازبکوں ، مغلوں ، صفویوں اور افغانوں کی باہمی آویزش کا مرکز بنا رہا ۔ شمالی علاقے پر مغلوں اور جنوبی خراسان پر صفویوں کا قبضہ تھا ۔ ازبکوں نے ہرات پر قبضہ جما لیا تھا ۔ فرید خاں (شیر شاہ) سوری (غوری) کی زیر قیادت افغانوں نے کچھ عرصے کے لیے ہندوستان کا تخت چھین لیا ۔ اس وقت شہزادہ کامران بدخشان سے قندھار

کابل سے سندھ تک کے علاقے پر حکمران تھا۔ ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے قندھار کو فتح کر لیا اور اگلے ہی برس کابل بھی اس کی دسترس میں آگیا۔ یہیں سے اس نے ہندوستان دوبارہ فتح کیا۔ اکبر کے عہد میں کابل پر شہزادہ محمد حکیم حکمران تھا۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں اکبر کابل آیا۔ اس کے بعد سے کابل کا علاقہ اکبری سلطنت کا مستقل حصہ بن گیا۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء میں شاہ عباس صفوی نے قندھار کو فتح کر لیا۔ عہد اکبری کے آخری دور میں پشین کے ایک رئیس حسن خان ترین کے بیٹے شیر خان ترین نے صفوی اور مغل حکومتوں کے درمیان ایک [illegible] ۱۶۳۸ء میں شاہجہان نے قندھار کا شہر صفویوں سے [illegible] ۱۶۴۹ء میں ایران کے شاہ عباس ثانی نے قندھار پر دوبارہ قبضہ [illegible] کے عہد میں افغان حکمرانوں نے اپنی سلطنت کو مستحکم کر لیا۔ ۱۱۵۱ھ [illegible] افغانستان میں تیموری سلطنت کا خاتمہ کروا دیا [illegible] قندھار کے ابدالیوں کو [illegible] قندھار پر حکمران تھے [illegible] ہرات کے حکمران تھے [illegible] دوبارہ حکومت قائم [illegible] کابل فتح کیا۔ کابل ہی سے [illegible] کے بعد احمد خان ابدالی جو [illegible] سے حکمران بن گیا

[illegible] یہ شخص سدوزئی [illegible] کر لی۔ صلاحیت [illegible] لاہور، ملتان، بہاولپور [illegible] وہ پہلا شخص تھا جس نے افغانوں کی پہلی مستحکم [illegible] احمد شاہ بابا کے لقب سے [illegible] لیکن اس کے بعد سے [illegible] اگرچہ احمد شاہ کے پوتے زمان شاہ کے عہد [illegible] کے ہاتھ سے نکل گئی [illegible] کے ہاتھ میں چلی گئی تھی [illegible] فتح خان سدوزئی [illegible] کابل سے نکال دیا اور [illegible] کے قبضہ میں چلے [illegible] سکھوں کے حوالے کر دیا۔ سندھ کے امراء نے [illegible] اب دوست محمد ایک مختصر مگر مستحکم حکومت [illegible] ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں انگریزی فوجوں نے درہ بولان کے راستے قندھار [illegible] سے فتح کر کے شاہ شجاع کو حکمران بنا دیا۔ ایک سال کے بعد امیر دوست [illegible] نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ افغانوں نے اس کے بیٹے محمد اکبر خان کی [illegible] آغاز کر دیا۔ انگریزی فوجوں کا ایک بڑا حصہ اور شاہ شجاع ان مجاہدین کے [illegible] میں کابل پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور انھوں نے امیر دوست محمد خان کو دوبارہ تخت کابل پر متمکن کر دیا۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے۔ اس کے بعد اس کے بیٹے شیر علی نے روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ جس کی بنا پر ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء تک انگریزوں اور افغانوں کے درمیان شدید جنگ ہوتی رہی۔ نتیجے کے طور پر درہ بولان اور درہ کرم کا کچھ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد کابل میں بغاوت برپا ہو گئی۔ جس کی بنا پر انگریزوں نے دوبارہ کابل فتح کر لیا۔ اب انھوں نے حکومت عبدالرحمان کے سپرد کی اور قندھار کو الگ ریاست کی حیثیت دے دی۔ کچھ عرصہ بعد شیر علی کے بیٹے محمد ایوب کی طاقت توڑنے کے بعد قندھار بھی عبدالرحمان کے حوالے کر دیا گیا اور ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں ساری انگریزی فوج ہندوستان واپس چلی آئی۔ عبدالرحمان نے افغانستان کو واقعی ایک خودمختار اور مستحکم مملکت بنا دیا۔ اس نے انگریزوں سے امداد بھی حاصل کیے رکھی۔ اور ڈیورنڈ لائن کو سرحد بھی تسلیم کرایا مگر اس کے بیٹے امیر حبیب اللہ نے سوات، چترال، وزیرستان، خیبر، باجوڑ، چمن پشین پاڑا چنار اور کرم کے علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ نیز معاملات خارجہ بھی انگریزوں کے سپرد کر دیے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا بیٹا امان اللہ خان تخت نشین ہوا تو اس نے انگریزوں سے اپنے علاقے واپس لینے کے لیے جنگ شروع کر دی۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں روس نے حکومت افغانستان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا جس پر ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو برطانیہ نے افغانستان کی آزاد حکومت کو تسلیم کر کے معاملات خارجہ سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۲۳ء میں انتظامی آئین مرتب ہوا اور افغانستان کی تنظیم جدید اصولوں پر کی جانے لگی۔ ۱۹۲۶ء میں امان اللہ خان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ امان اللہ خان کی بعض تجاویز اور قوانین کے نفاذ سے عوام بددل ہو گئے اور ایک تاجیک سردار حبیب اللہ بچہ سقا نے جنوری ۱۹۲۹ء میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ امان اللہ اٹلی کی طرف فرار ہو گیا۔ اس کے سپہ سالار محمد نادر خان درانی نے ایک لشکر فراہم کر کے بچہ سقا کو گرفتار کر لیا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بچہ سقا کو [illegible] نے موت دی گئی۔ اس کے بعد نادر شاہ نے ہر شعبہ میں اصلاحات نافذ کرانا شروع کر دیں۔ اس نے قوم کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ اکثر اوقات خود اسناد تقسیم کیا کرتا تھا۔ اسی طرح کی ایک تقریب کے دوران میں امان اللہ خان کے حامی ایک طالب علم نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ جس پر اس کے حامیوں نے اس کے انیس سالہ بیٹے ظاہر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

۱۹۳۴ء میں افغانستان جمعیت اقوام کا رکن بنا۔ اگلے دو تین برس تک روس، ترکی، عراق اور ایران کے ساتھ تجارتی اور سیاسی معاہدے ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کی طرح دوسری عالمی جنگ میں بھی افغانستان غیر جانبدار ملک رہا۔ ۱۹۴۸ء میں روس اور ایران کے ساتھ سرحدی تنازعات طے کیے گئے۔ سیاسی نظام پارلیمانی بادشاہت قرار دیا گیا پاکستان قائم ہونے کے بعد افغانستان نے بھارت، برطانیہ اور روس کی شہ پر نام نہاد مسئلہ پختونستان کا آغاز کر دیا۔ جبکہ صوبہ سرحد انگریزوں کے زیر انتظام کرانی کئی رائے شماری کے تحت پاکستان میں شامل ہوا تھا۔ یہ سرحد کبھی موجودہ مملکت افغانستان کا حصہ نہیں رہا۔ ۱۹۶۲ء میں اسی تنازعہ کی بنا پر کچھ عرصہ کے لیے پاکستان اور افغانستان کے سفارتی تعلقات بھی منقطع رہے۔ اس وقت افغانستان کی وزارت عظمیٰ سردار داؤد خان کے پاس تھی جو پاکستان کا سب سے بڑا مخالف اور مسئلہ پختونستان کا شدت سے حامی تھا۔ مگر اس کی سبکدوشی کے بعد تعلقات پھر سے بہتر ہو گئے۔ ظاہر شاہ نے اپنی توجہ زیادہ تر داخلی امور پر مبذول کر لی۔

۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ اس کے برادر نسبتی لیفٹیننٹ جنرل سردار داؤد خان نے الٹ دیا اور بادشاہت کا خاتمہ کر کے اور جمہوریت کا اعلان کر کے خود صدر اور وزیر اعظم بن بیٹھا۔ ۱۹۷۸ء میں بائیں بازو کے روس نواز فوجی گروپ نے بغاوت کر کے سردار داؤد خان کو قتل کر دیا جس کے نتیجے میں نور محمد ترہ کئی صدر اور وزیر اعظم مقرر ہوا۔ جس کے خلاف عام مسلمانوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ مارچ ۱۹۷۹ء میں ترہ کئی کا بھی خاتمہ ہوا۔ اور اس کی جگہ حفیظ اللہ امین نے لی۔ لیکن چند ماہ کے بعد اسے بھی ٹھکانے لگا دیا گیا اور اس کی جگہ روس کی شہ پر ببرک کارمل کو صدر مملکت مقرر کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں ایک

لاکھ سے زیادہ مسلح روسی فوج نے کابل پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے اب تک افغانستان کے عوام اور غیر ملکی فوج کے مابین کھلی جنگ ہو رہی ہے۔ لاکھوں مفلوک الحال افغان مہاجرین نے پاکستان میں پناہ لے رکھی ہے جن کو حکومت پاکستان اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک کی طرف سے ہر طرح کی مادی امداد دی جا رہی ہے۔

معیشت اور انتظامی امور:۔ ۱۹۷۵ء تک افغانستان میں آئینی امور متنازعہ فیہ بنے رہے ہیں۔ عوام کی اکثریت اور علماء و فوجی افسران صدر داؤد کی حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ موجودہ افغانستان کا کل رقبہ ۲۵۰،۰۰۰ مربع میل (۶۴۹۵۰۰ مربع کلومیٹر) ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی ایک کروڑ چھتر لاکھ تھی۔ جس میں افغان یا پختون ۵۹ فیصد ہیں۔ یہاں کا روپیہ افغانی ہے، جس میں دس گرام چاندی ہوتی ہے اور یہ سو پیسوں (پول) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں افغانستان نے کافی حد تک ترقی کی ہے۔ کابل یونیورسٹی ۱۹۳۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں مدارس اور کالج قائم کیے گئے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت ہے۔ عدالتی قوانین زیادہ تر شرعی ہیں۔ تجارت زیادہ تر روس، جرمنی، بھارت، برطانیہ اور پاکستان کے ساتھ ہوتی ہے۔ زیادہ تر برآمدات تازہ اور خشک پھلوں، روئی، اون اور کھالوں پر مشتمل ہے۔ پورے ملک میں سڑکیں ہی ذریعہ مواصلات ہیں۔ مگر ریلوے لائن ابھی تک قائم نہیں ہوئی۔ سامان تجارت ابھی تک اونٹوں اور ٹٹوؤں پر لایا جاتا ہے۔ مرکزی شہر اور دارالحکومت کابل ہے۔ جو سڑکوں کے ذریعے دیگر اہم شہروں قندھار، سبزوار، ہرات، بلخ، مزار شریف، فیض آباد اور جلال آباد سے ملا ہوا ہے۔

افغانی، جمال الدین، سید

(۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء ۔ ۵ شوال ۱۳۱۴ھ/ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء) اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی، دنیائے اسلام کی نمایاں ترین شخصیت۔ بقول اقبال، مسلمانوں کے عظیم رہنما اور بقول براؤن مفکر، مصنف اور صحافی لیکن ان سے بڑھ کر یہ کہ ایک بہت بڑے سیاستدان۔ افغانستان کے ایک قصبہ اسعد آباد (ضلع کابل) میں پیدا ہوئے۔ ایک اور روایت کے مطابق اسعد آباد کا قصبہ ایران کے شہر ہمدان کے قریب واقع ہے خاندان ترمذی، سادات سے اور حنفی مسلک کا پابند تھا۔ بچپن اور جوانی کے ایام کابل میں بسر ہوئے۔ جہاں آپ نے اٹھارہ برس تک تمام علوم دینی کی تحصیل سے فراغت حاصل کرکے فلسفہ اور سیاسیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان میں بھی کچھ وقت گذارا اور یہیں سے ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ افغانستان واپسی پر آپ امیر دوست محمد خاں کے ساتھ ہرات کی مہم میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد آپ امیر محمد اعظم خاں کے وزیر رہے۔ انگریزوں کی سازش سے وہاں بغاوت ہوئی تو آپ ہندوستان [illegible] چلے آئے۔ یہاں دو ماہ بھی نہ ٹکنے دیا گیا تو آپ ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء میں دوبارہ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں سے آپ قاہرہ گئے اور جامعہ ازہر کے علماء و شیوخ سے ملاقات کی۔ یہیں آپ نے "اسلامی قومیت" کے نظریے پر خطبات دینے شروع کیے۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں آپ قسطنطنیہ (استنبول) تشریف لے گئے۔ آپ کی شہرت اور عظمت کی بنا پر ترکی کے لوگوں نے آپ کو جگہ جگہ خوش آمدید کہا۔ یہاں آپ نے آیا صوفیا اور احمدیہ مسجد میں مختلف خطبات دیے۔ ترکی کے شیخ الاسلام حسن فہمی کی رقابت کے پیش نظر آپ کو قاہرہ واپس آنا پڑا۔

قاہرہ میں سید جمال الدین افغانی نے تدریس کا شغل اختیار کیا۔ حکومت نے بھی آپ کی خدمات کو سراہا اور باقاعدہ وظیفہ مقرر کردیا۔ اب آپ کا حلقۂ اثر بے حد وسیع ہو چکا تھا اور آپ کے نظریات کی تبلیغ زور و شور سے ہو رہی تھی۔ آپ کی تعلیمات سے متاثر ہوکر عربوں کے ہاں قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس سے اسلامی ملکوں میں انگریزوں کے مفادات پر ضرب پڑنے لگی۔ جامعہ ازہر میں آپ کے شاگرد اور دست راست

محمد عبدہ تھے۔ بقول ڈبلیو ایس بلنٹ یہاں سے بھی آپ کو [illegible] ہندوستان لے جایا گیا۔ حیدرآباد میں ایک مضمون بعنوان [illegible] کو ہندوستان بھی چھوڑنا پڑا۔ اور آپ امریکا تشریف لے گئے۔ [illegible] لندن آئے اور پھر اپنے شاگرد محمد عبدہ کے پاس پیرس چلے آئے۔ [illegible] اخبارات و جرائد نے آپ کی نگارشات شائع کرنا شروع کیں۔

پیرس ہی میں آپ نے رینان کے مقالہ [illegible] واضح کیا کہ اسلام سائنس کی قطعی مخالفت نہیں کرتا [illegible] کے جاری کردہ عربی رسالے عروۃ الوثقیٰ [illegible] ۱۵ جمادی الاوّل ۱۳۰۱ھ/ ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء میں شائع [illegible] کے نظریے کا ترجمان تھا۔ جسے برطانوی مقبوضات میں ممنوع قرار [illegible] باوجود یہ طالبین تک پہنچتا رہا۔ اس کا آخری شمارہ ۲۶ ذی الحج [illegible] میں شائع ہوا۔ یوں آٹھ ماہ میں اس کے کل اٹھارہ شمارے شائع [illegible] نے دنیائے اسلام میں گویا ایک آگ سی لگا دی۔ [illegible] لگا۔ شاہ ایران نے اس سے متاثر ہوکر سید جمال الدین کو اپنے ہاں [illegible] دی۔ اور پھر آپ کے مداحین اور مریدین کی کثرت کو دیکھتے ہوئے آپ کو وہاں سے چلے جانے پر مجبور کردیا۔ وہاں سے آپ روس تشریف لے گئے۔ ۱۸۸۹ء میں [illegible] ایک نمائش میں شاہ ایران سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ آپ نے اپنے نظریات [illegible] پر واضح کیے تو وہ آپ کو اپنے ہمراہ ایران لے آیا۔ آپ نے اس کے عدالتی نظام میں اصلاحات کی تجاویز پیش کیں، جس پر ایران کا وزیر مرزا علی اصغر آپ کے مخالفین کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ آپ نے عتاب شاہی سے بچنے کے لیے دور دراز قصبات کے

دور سے شروع کر دیے اور بالآخر تہران میں شاہ عبدالعظیم کے مزار کی مجاورت کرنے لگے۔ سات ماہ بعد ایک شاہی فوجی دستے نے آپ کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور آپ کو پاپیادہ ترکی کی سرحد کی طرف لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ جہاں سے آپ انگلستان چلے گئے۔

ایران میں آپ کے ساتھ اس ظالمانہ رویے پر زبردست احتجاج ہوا اور اسی سے ایک اصلاحی جماعت نے بھی جنم لیا۔ مارچ ۱۸۹۰ء میں جب ایران نے برطانوی [illegible] کو تمباکو پر محصول معاف کیا تو سید جمال الدین نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔ نیز آپ نے سامرہ کے مجتہد مفتی مرزا حسن شیرازی کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی جس کے نتیجے میں ایک فتوے جاری ہوا۔ اس کی رو سے مسلمانوں پر تمباکو نوشی ممنوع قرار دے دی گئی۔ عوام نے اس فتوے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نیز سید صاحب کے ایک جوشیلے [illegible] نے شاہ ایران [illegible] رضا شاہ کو [illegible] مارچ ۱۸۹۶ء میں قتل کر دیا۔

اس اثنا میں سلطان ترکی عبدالحمید نے آپ سے قسطنطنیہ میں سکونت پذیر ہو جانے کی درخواست کی۔ نیز آپ کی رہائش کے لیے ایک مکان اور [illegible] ترکی پاؤنڈ کا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ آپ وہاں چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں گزاری۔ آخری عمر میں سلطان نے آپ کو نظر بند کر دیا۔ اسی حالت میں آپ سرطان کے مرض میں مبتلا ہوئے [illegible]

جمال الدین کی تحریروں میں [illegible] جدید مادیت کے خلاف، تتمۃ البیان [illegible] بستانی کے دائرۃ المعارف میں [illegible] مقالات جمالیہ کے نام سے فارسی میں [illegible] زعماء کے نام لکھے گئے [illegible]

[illegible] افغانی [illegible] رینان [illegible] کا حامل [illegible] ابن رشد جیسا فلسفی [illegible] آپ کے کردار ایسی ذہین اور عہد [illegible] مذہب اور فکر کے احیائے [illegible]

[illegible] آپ ایک نامور سیاسی رہنما سے بڑھ کر [illegible] کہ آپ کی سیاسی مصروفیات کی بنا [illegible] نظریاتی تھی۔ یہی نہیں کہ آپ نے اپنی زندگی [illegible] عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں گزار دی [illegible] مواد موجود ہے کہ آپ کی اصلاحی فکر نے انیسویں صدی [illegible] جو تحریک پیدا کی تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں [illegible] ۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم اسلام کی تمام جدید تحریکوں کا مبدا [illegible] افغانی کی تعلیمات ہیں۔ بقول کینٹول سمتھ افغانی نے پہلی بار عالم اسلام کے لیے بڑھتے ہوئے مغربی تسلط کے خطرے کو پہچانا اور اس سے سب کو خبردار کیا۔ اور بقول علامہ اقبال اسلام کو بحیثیت ایک نظام فکر دنیا سے متعارف کرانے کا [illegible] سید جمال الدین افغانی ہی نے ادا کیا۔ ان کی انتھک کوششیں صرف اسی امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوع انسانی کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے۔ تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے۔

ایران، ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کی ذہین شخصیات جس طرح افغانی سے متاثر ہوئیں، وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ محض ایک سیاسی رہنما نہیں بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ایک بہت بڑے مفکر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اگرچہ آپ کی تحریریں بہت کم ہیں، مگر خود آپ ان کے بقول آپ "زندہ کتابیں" تصنیف کرتے رہے۔ جنھوں نے عالم اسلام میں جدید رجحانات پیدا کیے۔

تجدیدیت کے علمبردار کی حیثیت سے افغانی نے سب سے پہلے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ اور اس کی بنیادی کمزوری کو پہچانا۔ اس سے آپ کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ فلسفے کے مطالعے کو بھی پوری ملت اسلامیہ کی سطح بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ دوسرے علوم کے حصول کی طلب پیدا ہو۔ مگر محض جدیدیت کی خاطر انگریزوں سے مفاہمت آپ کے نزدیک غلط بات تھی۔ اسی لیے آپ نے سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک پر زبردست تنقید کی۔

آپ نے مسلمانوں کے سیاسی و دینی تنزل کے دو اسباب تلاش کیے۔ ایک خارجی نوعیت کا یعنی مغربی ممالک کی استحصالی کارروائیاں، دوسرا داخلی یعنی مسلمانوں کا اسلامی اصولوں سے انحراف۔ سیاسی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان فوجی اعتبار سے طاقتور ہو جائیں۔ اور داخلی طور پر مسلمانوں کی اخلاقی، تعلیمی اور مذہبی اصلاح کے لیے ایک منظم تحریک کے تحت کام شروع کیا جائے۔ ان کے نزدیک جب تک مسلمان سائنسی تعلیم سے آراستہ نہیں ہو جاتے، ان کی ترقی ممکن نہیں۔ مسلمان حکومتوں کی کمزوری کے اسباب آپ کے نزدیک یہ ہیں کہ اولاً مسلمان سلاطین آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہر مسلمان حکومت کا با اقتدار طبقہ قومی مفادات کو نظر انداز کیے جا رہا ہے۔ دوم علماء نے جدید دور کی ضروریات کو دین کے مطابق پورا کرنے کا فرض بھلا دیا ہے۔

اس تجزیے کے پیش نظر افغانی نے اتحاد اسلامی کے نعرے سے عالم اسلام کو روشناس کرایا۔ آپ کے نزدیک یہ اتحاد محض سیاسی نہیں ہوگا۔ بلکہ علماء کی ایک مرکزی تنظیم کی تشکیل بھی اس میں شامل ہوگی۔ آپ اس تنظیم کا مرکز بیت اللہ کو قرار دیتے تھے۔ تاکہ وہاں مختلف ممالک کے علماء اپنے اجتماعی اور اتحادی مسائل پر سوچ بچار کر سکیں اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کر سکیں۔

افک تہمت، بہتان۔ اصطلاح میں ایک واقعہ، حضرت عائشہؓ پر لگائے گئے بہتان کو کہا جاتا ہے۔ یہ بہتان ایک منافق عبداللہ بن ابی نے لگایا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ غزوہ بنی مصطلق میں حضرت عائشہؓ حضورؐ کے ہمراہ تھیں۔ واپسی پر سب لوگ ابھی مدینے سے ایک منزل دور تھے اور رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حضرت عائشہؓ اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئیں ان کے آنے تک قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت ہودے میں بیٹھ جاتی تھیں اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ چونکہ آپ جسمانی طور پر ہلکی پھلکی تھیں اس لیے کسی کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ آپ اس میں نہیں۔ جب آپ پلٹیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر آپ اس امید پر چادر اوڑھ کر لیٹ رہیں کہ کوئی نہ کوئی تو ڈھونڈنے آئے گا۔

صبح کے وقت وہاں سے صفوان بن معطل سلمی گزرے۔ انھوں نے آپ کو پہچان کر کہا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" اور اپنا اونٹ آپ کے پاس بٹھا کر الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ اونٹ پر سوار ہو گئیں اور وہ پاپیادہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے وقت آپ لشکر میں پہنچ گئیں۔ اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دیے۔ عبداللہ بن ابی ان میں پیش پیش تھا۔ بعد میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے مسطح بن اثاثہ نے بھی اس بات کو خوب ہوا دی۔ حسان بن ثابت، حمنہ بنت جحش اور

دیگر چند مسلمانوں نے بھی اس بات پر یقین کر لیا۔
آنحضورؐ اس الزام سے سخت اذیت میں مبتلا تھے۔ آپؐ نے اپنے طور پر تمام تحقیقات کریں اور حضرت عائشہؓ کو بے قصور پایا تو مسلمانوں سے فرمانے لگے۔ "کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے، جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے سخت اذیت میں مبتلا کیا ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں، جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔" اس پر اسیدؓ بن حضیر اور بعض روایات کے مطابق سعدؓ بن معاذ نے اٹھ کر کہا "یا رسول اللہ! اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں۔ ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔" یہ سن کر ایک خزرجی اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ انصار کے دونوں قبائل اوس اور خزرج آپس میں لڑ پڑتے، آنحضورؐ نے انھیں ٹھنڈا کیا۔
اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔ آخر ایک روز آنحضورؐ حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس پورے عرصہ میں آپؐ ان کے نہ بیٹھے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "عائشہ! مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری برأت فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔" حضرت عائشہؓ نے جواباً عرض کیا۔ "آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تو آپ لوگ نہ مانیں گے اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کر لوں، جو میں نے نہیں کی۔ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی۔ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ اب میرے لیے اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فصبر جمیل"
اس کے فوراً بعد آنحضورؐ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو بے گناہ قرار دیا۔ سورۂ نور کی آیت ۱۱ سے ۲۱ تک اس موقع پر نازل ہوئیں، جن میں حضرت عائشہؓ کی برأت کا اظہار کیا گیا تھا۔

اقامت

دوسری اذان، جس سے نماز باجماعت شروع ہونے کا اعلان ہوتا ہے جب نماز کا آغاز کرنے کے لیے مؤذن یا کوئی دوسرا مسلمان امام کے پیچھے کھڑا ہو کر اذان اقامت کے کلمات ادا کرتا ہے۔ "حی علی الفلاح" کے بعد ایک کلمے "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ ہوتا ہے، جسے حنفی مسلک کے تحت دوبار دہرایا جاتا ہے۔ اکثر کتب فقہ میں اقامت کا کہنا سنت قرار دیا گیا ہے۔ حنفی مسلک میں اقامت کے کلمات تعداد میں اذان کے کلمات کے مطابق ہیں۔ دیگر مسالک میں انھیں اذان سے نصف تعداد میں دہرایا جاتا ہے اور مالکی مسلک کے مطابق اقامت کے کلمات یہ ہیں۔ اللہ اکبر (دوبار) اشھد ان لا الٰہ الا اللہ (ایک بار)، اشھد ان محمداً رسول اللہ (ایک بار) حی علی الصلوٰۃ (ایک بار)، اللہ اکبر (دوبار) لا الٰہ الا اللہ (ایک بار)۔

اقبال، علامہ شیخ محمد

(۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ/۹ نومبر ۱۸۷۷ء - ۲۰ صفر ۱۳۵۷ھ/۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) جدید دنیائے اسلام کے بہت بڑے مفکر، فارسی اور اردو زبان میں مسلمانوں کے قومی شاعر، تصور پاکستان کے خالق، حکیم الامت، فلسفی، وکیل اور معلم۔ سیالکوٹ میں سپرو گوت کے کشمیری شیخ نور محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاندان اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ اور دادا مستقل طور پر سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ والد بزرگوار اگرچہ ان پڑھ تھے، لیکن مزاج صوفیانہ اور فلسفیانہ تھا۔ دست کاری ذریعہ معاش تھی اقبال کی پیدائش سے پہلے ایک ڈپٹی کے ہاں ملازم ہو گئے تھے۔ اقبال دو بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ پھر سکاچ مشن سکول سیالکوٹ سے میٹرک کیا۔ ایف اے کا امتحان سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ سابقہ تمام امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا تھا۔ بی اے میں انگریزی اور عربی کے مضامین میں دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا اور اوّل رہے۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم میں مولانا میر حسن کی تربیت کا بڑا حصہ ہے۔ مولانا [illegible] فارسی کے استاد تھے۔ پہلے سکاچ مشن سکول اور پھر کالج میں پڑھاتے تھے۔ [illegible] جوہر قابل دیکھ کر انھوں نے ان پر خصوصی توجہ دی۔ اقبال کو بھی ان سے [illegible] تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکومت نے [illegible] شمس العلماء کا خطاب [illegible] اسے اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک [illegible]
گورنمنٹ کالج میں اقبال کو اپنے استاد فلسفہ [illegible] آرنلڈ سے [illegible]
[illegible] کہ ان کے انتقال [illegible]
۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد [illegible]
مقرر ہوئے۔ نیز اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج [illegible]
اسی زمانے میں انھوں نے علم الاقتصاد پر کتاب [illegible]
کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے [illegible]
لیے کر انگلستان چلے گئے۔
اقبال کی شاعری کا آغاز طالب علمی ہی سے [illegible]
سے اصلاح لیتے رہے۔ انھوں نے بہت جلد [illegible]
۱۸۹۵ء میں حکیم امین الدین کے [illegible] مشاعرے [illegible]
غزل پڑھی۔ دہلی کے مرزا ارشد گورگانی [illegible]
اقبال کے اس شعر پر مرزا ارشد تڑپ اٹھے:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

۲۴ نومبر ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے [illegible]
نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ اس پر قدردانوں [illegible]
کی بارش ہونے لگی۔ اس کی ایک ایک مطبوعہ کاپی [illegible]
کے بعد اقبال ہر جلسہ میں کوئی نہ کوئی نظم پڑھتے [illegible]
شہرۂ آفاق نظم "ہمالہ" [illegible] اپریل ۱۹۰۱ء [illegible]
کیا، جس میں یہ نظم شائع ہوئی گویا یہاں سے اقبال کی [illegible]
اور یہ سلسلہ ان کے انگلستان جانے تک جاری رہا۔
انگلستان میں کیمبرج یونیورسٹی اور جرمنی میں میونخ یونیورسٹی [illegible]
میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ وہیں انگلستان کے [illegible] مستشرق پروفیسر [illegible]
[illegible] استفادہ کیا۔ انھی دنوں وہاں سے بیرسٹری [illegible] کے [illegible]
[illegible] سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے جو مقالہ لکھا تھا وہ [illegible]
مابعد الطبیعات [illegible] کے نام سے چھپ چکا ہے۔ لندن یونیورسٹی میں [illegible]
عرصہ تک ڈاکٹر آرنلڈ کی جگہ پر عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہیں کیکسٹن ہال میں [illegible] پر ایک لیکچر بھی دیا اور وہیں ان کی فارسی شاعری کا آغاز ہوا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے آرنلڈ۔

اقبال تین سال یورپ رہنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور وکالت کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر بھی تھے۔ حکومت آپ کی عظمت کی اس قدر معترف تھی کہ ہائیکورٹ کو اپنا کام دن کے پچھلے اوقات میں کرنا تھا تا کہ اقبال کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے سکیں۔ اور ان کے مقدمات ان [illegible] پیش ہوا کریں۔ ڈیڑھ برس کے بعد آپ نے پروفیسری بھی چھوڑ دی۔ [illegible] سے منسلک رہے اور وکالت ہی کو بطور مستقل [illegible] اختیار کر لیا۔

یورپ سے واپس آ کر اقبال کی قومی نظموں کا آغاز ہو چکا تھا۔ "شکوہ" "جواب شکوہ" [illegible] "خضر راہ" وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں آپ کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" شائع ہوئی اور تین برس بعد "رموز بے خودی" شائع ہوئی [illegible] آپ نے اپنا مشہور فلسفہ خودی پیش کیا۔ اس کے بعد آپ کے فارسی اور اردو [illegible] شائع ہوتے [illegible] ارمغان حجاز آپ کی زندگی میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند [illegible]

[illegible]

[illegible] عمر بھر سرگرم عمل [illegible] ہندوستان سے باہر [illegible] بلکہ انگریزی [illegible] دنیا تک علامہ کا اثر پہنچ چکا ہے۔

علامہ کی تمام شاعری تصانیف ۱۹۷۳ء میں کلیات اقبال کے نام سے مجموعی طور پر شائع ہو چکی [illegible] سے پہلے یہ علیحدہ علیحدہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ "بانگ درا" پہلی اردو نظموں کا انتخاب ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔
۲۔ "بال جبریل" اردو نظموں کا انتخاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔
۳۔ "ضرب کلیم" اردو نظمیں جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔
۴۔ "اسرار خودی" (فارسی مثنوی) ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔
۵۔ "رموز بے خودی" (فارسی مثنوی) ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔
۶۔ مجموعہ "اسرار و رموز" (دونوں مثنویوں کا مجموعہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا)
۷۔ "پیام مشرق" (فارسی نظم، جرمنی کے شاعر گوئٹے کے جواب میں ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی)
۸۔ "زبور عجم" (فارسی نظمیں) جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔
۹۔ "جاوید نامہ" (فارسی نظم) اٹلی کے شاعر دانتے کے جواب میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔
۱۰۔ "مسافر" (فارسی) سفرنامہ افغانستان۔ تھوڑی تعداد میں چھپی۔
۱۱۔ "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" (فارسی مثنوی) پہلی بار ۱۹۳۶ء میں مسافر کے ساتھ چھپی۔
۱۲۔ "ارمغان حجاز" (فارسی اور اردو نظمیں) نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔
۱۳۔ "علم الاقتصاد" ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔
۱۴۔ "THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA" پہلی بار لندن میں شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۹ء میں "فلسفہ عجم" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایران میں مابعد الطبیعات کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ ہے۔
۱۵۔ The Reconstruction of Religious Thought in Islam
یہ ستہ سات لیکچروں کا مجموعہ ہے جن میں پہلے چھ لیکچر ۱۹۳۰ء میں لاہور سے چھپے دوسری بار سالویں لیکچر سمیت ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے اور تیسری بار اس کا اردو ترجمہ لاہور سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔
۱۶۔ مکاتیب اقبال کے مختلف مجموعے اور ان کے علاوہ متعدد اردو انگریزی مضامین لیکچر اور نظمیں "باقیات اقبال" کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے تمام افکار کا منبع و محور ایک ہی تصور ہے، جسے اقبال نے خودی کا نام دیا ہے۔ اس فلسفے کی تشریح میں اگرچہ شارحین میں اختلاف موجود ہے۔ تاہم یہ لوگ اس امر

پرمتفق ہیں کہ اقبال کے فلسفہ میں خودی سے مراد وہ شعور ہے، جو خود شناس اور خود آگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو۔ لیکن یہاں شعور کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں بلکہ وہ چیز ہے، جس کا خاصہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے۔ یہ ایک لازوال قوت ہے، جو زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہے۔ یہ وہی قوت ہے، جو انسان کو مشکلات پر غالب آنے کی ترغیب دیتی ہے۔ "اسرار خودی" کے دیباچے میں خود علامہ نے بھی اس لفظ کی تشریح کر دی ہے:۔

"یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم محض احساس نفس یا یقین ذات ہے۔" اس کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ ہے کہ وہ ہماری ذہنی حالتوں میں وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا کو چاہتی ہے اور انسان کو مقام حیوانیت سے نکال کر مقام ربوبیت کی طرف مائل کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی وہی ہے جو سچی بے خودی یعنی ہجرت الی الحق کی طرف مائل ہو جائے، انسانی ذات میلانات اور رجحانات کو چھوڑ کر اللہ تعالٰی کے احکام کا پابند ہو جائے اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبط، نفس اور نیابت الٰہی۔ "رموز بے خودی" میں فرد و ملت کے روابط اور ملت اسلامیہ کی زمانی و مکانی لا انتہائیت کی بحث ہے۔

اقبال نے یقیناً ایک ایسے دور کا آغاز کیا، جس کی ضرورت ملک و ملت ہی کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو بھی تھی۔ آپ نے اپنی شاعری میں پوری دنیا کو راز حیات سے آگاہ کیا۔ آپ کی دور رس نگاہیں دیکھ چکی تھیں کہ مغربی تہذیب جو آج نوع انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہو رہی ہے، دنیا کے لیے مفید نہیں۔ ان کی مخاطب ہر وہ قوم ہے، جو دنیا میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ان تمام اقوام کو آپ ایک عالمگیر اخوت میں جکڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں یہ اخوت دوسرے لفظوں میں اسلام کا نام ہے۔

اسلامی تعلیمات کے فکری پہلوؤں کو سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اقبال نے اپنے مشہور زمانہ چھ خطبات دیئے۔ اقبال کے نزدیک مذہب، فلسفہ اور سائنس کا اختلاف محض سطحی اور ہنگامی ہے۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں اس پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام، جدید سائنس اور فلسفہ کے مابین ربط پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے پیشرو فلاسفہ کی تقلید کی ہے۔ اس کوشش کی ابتدا الکندی نے کی تھی اور یہ سلسلہ اسی وقت سے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اسلام کی جو جدید ترجمانی کی ہے۔ وہ محض قیاسی اور نظریاتی نہیں سراسر سائنسی اور تجرباتی ہے۔ الٰہ آباد کے اجلاس مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں خود فرماتے ہیں:۔

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اس کی شریعت، اس کی سیاست اس کے تمدن، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ روح اسلام کے ساتھ اس وابستگی نے مجھے ایسی فراست عطا کی ہے، جس سے میں اس عظیم الشان حقیقت کا اندازہ کر سکتا ہوں، جو اسلام کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر حاصل ہے۔"

علامہ کے خطبات ہی کی بدولت اسلامی فکر کی روایت پھر سے تازہ ہوئی۔ جس کا سلسلہ پندرھویں صدی عیسوی کے بعد سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اس فکر کی اساس قرآن مجید پر ہے۔ اہل یورپ اس امر کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ علم و فکر کی تاریخ میں اسلام کا نام نہ آنے پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام بذات خود کوئی نظام فکر نہیں۔ "خطبات" میں اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا اور بتایا کہ درحقیقت فلسفے اور سائنس کا کمال وہیں ہو گا، جہاں سے اسلام کے نظام فکر کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو، جو سر دست ہمیں معلوم نہیں۔

اقرار اعتراف، ماننا، تسلیم کرنا۔ اسلامی قانون کے مطابق اقرار جرم کے بعد ملزم سزا کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ اقرار کی ضرورت نکاح، طلاق، رشتہ داری، تعلق، مقدمات اور تسلیم اولاد کے ضمن میں ہوتی ہے۔ اقرار کرنے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ بالغ اور سلیم الحواس ہو نیز اس پر کسی قسم کا اخلاقی یا قانونی دباؤ یا خوف نہ ہو۔ اور وہ یہ اقرار اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کرے۔

اقرع بن حابس (وفات ۳۱ھ/۶۵۱ء) فراس بن حابس بن عقال بن محمد بن سفیان آنحضورؐ کے صحابی، زمانۂ جاہلیت کے عرب سربراہ، ثالث اور حکیم تھے۔ بنو تمیم میں سے تھے۔ اسلام لانے کے بعد فتح مکہ، غزوۂ حنین، اور محاصرۂ طائف میں شریک رہے۔ آنحضورؐ کے مقربین میں سے تھے۔ آپؐ نے انھیں بنو دارم بن مالک کے صدقات کی فراہمی کے لیے عامل مقرر فرمایا۔ جب بنو تمیم کے قبیلہ بنو عنبر کے چند قیدی مدینہ لائے گئے تو انھیں چھڑانے والے وفد کی قیادت اقرع ہی کر رہے تھے۔ انھوں نے شدت جذبات اور اضطراب میں آنحضور صلعم کو آوازیں دینا شروع کیں۔ اس پر سورۂ الحجرات کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جس کے بعد اقرع پشیمان ہوئے۔ تاہم انھی کی کوششوں سے بنو تمیم کا وفد مسلمان ہوا۔ وہ نجران کے وفد کو دیئے گئے امان نامہ کے شاہدوں میں شامل تھے۔ نیز خالدؓ بن ولید کے ساتھ جنگ یمامہ اور شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ دومۃ الجندل میں بھی شریک ہوئے۔ فتح انبار کے وقت مقدمۃ الجیش کی قیادت بھی اقرع کر رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں جوزجان فتح کیا اور وہیں وفات پائی۔

اقصیٰ، مسجد بیت المقدس (یروشلم) کی ایک عمارت۔ مسلمانوں کا قبلہ [illegible] پر اسرائیل کی حکومت نے جون ۱۹۶۷ء میں قبضہ کر لیا [illegible] دیواریں گرانے کا آغاز کیا۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو یہودیوں نے اسے [illegible] کوشش کی۔ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں آیا ہے:۔

"پاک ہے وہ رب، جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت [illegible] اقصیٰ کی طرف۔" (۱۷:۱)

مسجد اقصیٰ شہر کے مشرقی سمت ایک احاطہ میں واقع ہے [illegible] کے نام سے اور یہودی بیت الہیکل کے نام سے پکارتے ہیں [illegible] مقامات بھی اسی میں واقع ہیں [illegible] واقع ہے، یہودی روایت کے مطابق وہاں [illegible] تھا، جسے بابل کے بادشاہ بخت نصر نے [illegible] نے اس ہیکل کو از سر نو تعمیر کروایا [illegible] کر دیا۔ ۱۶ھ/۶۳۷ء میں جب حضرت عمر فاروق بیت المقدس [illegible] جگہ پر ملبے اور غلاظت کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ [illegible] جہاں سے آنحضورؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے [illegible] ہاتھوں سے ہٹانا شروع کر دیا اور حکم فرمایا [illegible] مسجد کی [illegible] حضرت بلالؓ نے یہاں پہلی اذان دی۔ اور حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی [illegible] پر یہاں ایک سادہ سی مستطیل شکل کی مسجد تعمیر ہوئی اور اس مقام پر [illegible] معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے، گنبد صخریٰ یا قبۃ الصخریٰ تعمیر ہوا۔ اکثر مغربی مصنفین گنبد صخریٰ ہی کو مسجد عمرؓ کا نام دیتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی موجودہ عمارت کی تعمیر پانچویں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۷۲ھ/۶۹۰ء میں شروع کرائی۔ اس کے ادھورے کام کو اس کے بیٹے ولید نے مکمل

مسجد اقصیٰ کا بیرونی منظر

[illegible] ساتھ [illegible] ہوئے۔ اس کے چار مینار تھے، دروازہ [illegible]
[illegible] خدمت گار مقرر کیے گئے تھے۔ ۲۹۶
[illegible] سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ ۴۵۱ھ
[illegible] ایک بار پھر عمارت زمین بوس ہوئی تو منصور
[illegible] دوبارہ تعمیر کرایا۔

[illegible] مسجد اقصیٰ سے [illegible] موجود ہیں جس میں مینار، گنبد
[illegible] معتبر علما سے کہ مسجد اقصیٰ بیت المقدس
[illegible] مورخ ناصر خسرو لکھتا ہے کہ مسجد کی صحن
[illegible] کی مغربی دیوار ایک سو پچاس گز اور عرض ایک سو پچاس
[illegible] سنگ مرمر سے مسجد کی زینت بڑھائی گئی ہے
[illegible] مشرقی دیوار میں [illegible] اور عرض یعنی شمالی دیوار میں پانچ دروازے ہیں
[illegible] ایک دروازہ پیتل کا ہے۔

[illegible] ۱۰۹۹ء کو جب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تو انھوں نے صحن مسجد میں مسلمانوں اور یہودیوں کا خون بے تحاشا بہایا۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ میں [illegible] تبدیلیاں کیں اور اسے اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں اسے عیسائیوں سے واگزار کرایا۔ اس نے عمارات کو پہلی حالت میں درست کرایا اور مسلمانوں نے اسے سات روز تک پانی اور عرق گلاب سے دھویا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۲ء تک مسجد کی مرمت وسیع پیمانے پر ہوئی ہے لیکن اس سے نقشہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ موجودہ مسجد میں شمال کی طرف سات اور مشرق کی طرف ایک دروازہ ہے۔

۱۹۴۸ء تک فلسطین برطانیہ کے زیر انتداب رہا اور جب انگریز رخصت ہوئے تو یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی گولہ باری سے مسجد کی چوبی چھت، کھڑکیوں اور شمال مغربی دیوار کا ایک اہم حصہ شہید ہوگیا۔ نیز کئی غازی بھی شہید ہوئے۔ جنگ بندی کے بعد حکومت اردن نے مسجد کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا مختلف اسلامی حکومتوں کے چندے سے ۱۹۵۸ء میں مرمت کا آغاز ہوا۔ مسجد کے گنبد پر سیسے کی جگہ المونیم اور پیتل کی آمیزش سے تیار کردہ خول چڑھایا گیا۔ اور بھی کئی تبدیلیاں کی گئیں مگر یہ اہتمام رکھا گیا کہ رنگ، سلیقے اور جائے وقوع میں کوئی فرق نہ آئے۔

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے پورے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور ۲۷ جون کو اسے اسرائیلی حکومت کا ایک جزو قرار دے دیا۔ ۱۷ جولائی کو ان کے یہودی بریگیڈیر شلومو غدریں نے اعلان کیا کہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمان تعمیر کیا جائے گا۔ چنانچہ مسجد سے ملحقہ تمام عمارتوں کو مسمار کردیا گیا۔ جبکہ ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ بیت المقدس کی سابقہ حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو ایک المناک سانحہ پیش آیا۔ اس روز تقریباً چار گھنٹوں تک مسجد اقصیٰ میں آگ بھڑکتی رہی۔ اس سے جنوب مشرقی جانب چھت کا ایک حصہ گر گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یادگار منبر جل کر راکھ ہوگیا۔ اسرائیل نے اپنا جرم چھپانے کے لیے ایک شخص روہن کو آتش زنی کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور معمولی سزا دی گئی۔ لیکن اس سے یہودیوں کے ان عزائم کو نہیں چھپایا جا سکتا، جو ہیکل کی تعمیر نو سے تعلق رکھتے ہیں۔

اقطاع حکومت کی طرف سے عطا کردہ زمین۔ اسلامی فقہ کی رو سے آبادکار عشر ادا کرنے تک اس زمین کا مالک ہوگا۔ اس کی کئی صورتیں ہیں کہ یا تو حکومت نے یہ قطعہ زمین اسے ہمیشہ کے لیے بخش دیا ہو یا پھر تاحیات عطا کیا گیا ہو اقطاع کا جواز صرف اس زمین پر ہوسکتا ہے۔ جو کسی ملکیت نہ ہو۔ مملوکہ زمینوں کا اقطاع جائز نہیں۔ غیر آباد زمین پر حکومت کو تین سال تک کوئی رقم ادا نہیں کی جاتی اگر اس دوران میں زمین آباد نہ ہو تو حکومت اسے واپس لے سکتی ہے۔ مفتوحہ زمین بھی اقطاع کے تحت دوسروں کو دی جاتی۔ وہ زمین جس کا کوئی وارث نہ ہوتا۔ حکومت کے قبضے میں چلی جاتی اور پھر اقطاع کے ذریعے کاشت کاروں کی ملک قرار دی جاتی

اقطاع خراجی یا عشری ہو سکتا ہے۔ خراج کے تحت ایک علاقہ کسی کو خراج پر دے دیا جاتا تھا اور عشر کے تحت کاشتکار پیداوار کا دسواں حصہ ادا کرتا تھا۔

اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء) اردو کے شاعر۔ سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، لسان العصر لقب، خان بہادر خطاب۔ والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ مورث اعلیٰ سید علی عرب نیشاپور (ایران) سے ۱۶۳۲ء میں ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ اس لیے فلسفہ اور تصوف کا غلبہ ہو گیا۔ انگریزی کی استعداد انھوں نے خود پیدا کر لی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد نائب تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں منصف ہو گئے۔ پھر ۱۸۸۸ء میں سب ججی پر ترقی دی گئی۔ ۱۸۹۴ء میں سیشن جج ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن لی اور ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں انتقال کیا۔

اکبر بذلہ سنج اور ظریف تھے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی وحیدالدین وحید شاگرد مصحفی سے تلمذ تھا۔ اکبر اردو شاعری میں ایک نئی طرز کے موجد تھے۔ وہ اس رنگ کے بانی بھی تھے اور خاتم بھی۔ ادب اور معاشرے کے نقاد اور حکومت و سیاست کے نکتہ چیں تھے۔ ان کی شاعری ان تمام ادبی اور معاشرتی رجحانات کی حامل ہے جو ہندوستان میں مغرب کے اولین اثرات کے ردعمل سے پیدا ہوئے۔ اگر ایک طرف وہ حالی اور شبلی کی طرح "حال کے شاعر" تھے تو دوسری طرف وہ اقبال کی طرح "مستقبل کے شاعر" بھی تھے۔ اکبر کی شاعری کا سطحی ہمارے معاشرے کی ذہنیت کا ایسا زندہ مرقع پیش کرتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی شاعری محض گل و بلبل کی شاعری نہ تھی بلکہ اس کا ایک نصب العین تھا۔ وہ نشاۃ اسلام کے زبردست محرک و مؤید تھے۔ طنز اور ظرافت کے بادشاہ تھے۔ ان کی شاعری کے اندر ایک وسیع کائنات پوشیدہ ہے۔ مطبوعہ کلام تین کلیات پر مشتمل ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے یاروں میں، معاذ اللہ کہہ دینا

رزولیوشن کی شورش ہے، مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں، اور کھانا نہیں آتا

فلسفی کو بحث کے اندر خدا نہیں ملتا
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا نہیں ملتا

اکبر، جلال الدین (۵ رجب ۹۴۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء - ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء) ابوالفتح، جلال الدین محمد اکبر ابن ہمایوں ابن بابر۔ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا تیسرا حکمران۔ عمرکوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا۔ یہ دور ہمایوں کی جلاوطنی کا تھا۔ اکبر نو ماہ کا تھا کہ ہمایوں ایران کی طرف فرار ہوا۔ اس دوران میں اکبر شہزادہ کامران کے پاس رہا۔ جو بعد ازاں اس کا مخالف ہو گیا۔ ہمایوں نے کابل میں اس پر فتح پائی اور یوں بیٹا واپس آیا۔ اکبر کی تعلیم کا مستقل انتظام تو نہ ہو سکا لیکن اس نے دیگر فنون حرب ضرور سیکھ لیے۔ [illegible]

میں اس کا اتالیق بیرم خان جیسا سپاہی [illegible]
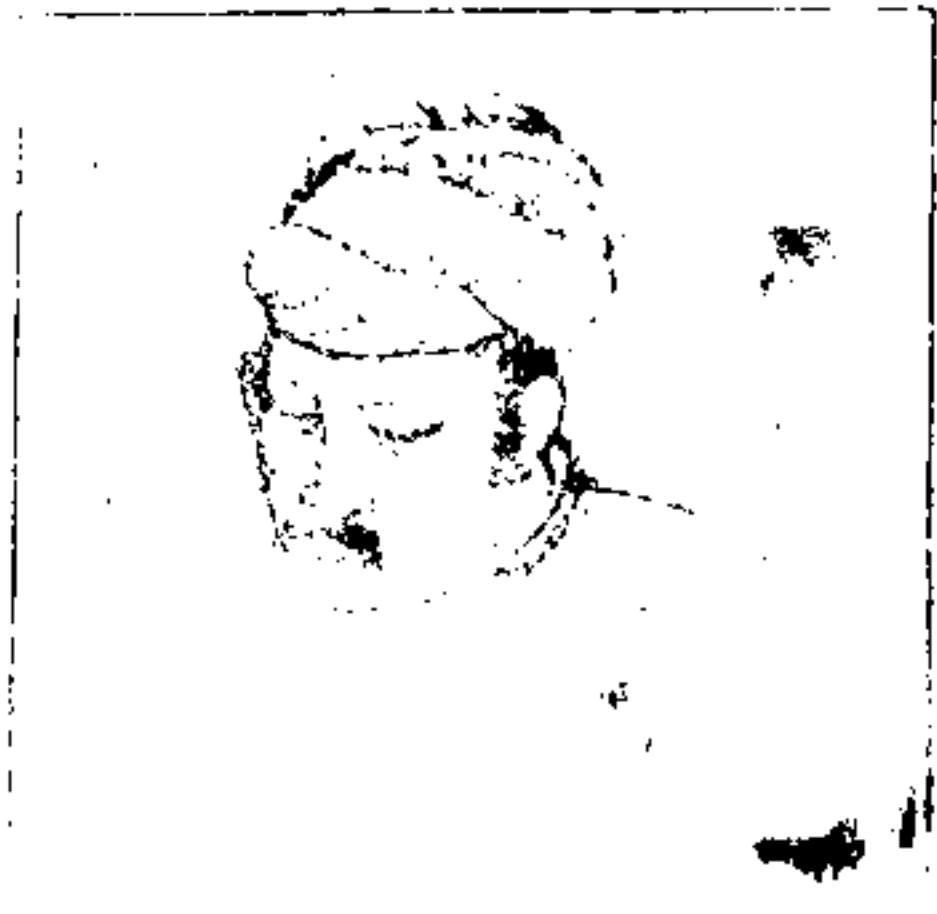
ہمایوں نے ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو وفات [illegible]

کا اعلان کر دیا۔ ادھر عادل شاہ سوری کا [illegible]

کو یہاں سے نکال دے۔ پانی پت [illegible]

دے کر اس کے توپ خانے پر قبضہ کر [illegible]

کے میدان میں دوسری بار بھی بقال [illegible]

کی موت کے بعد دہلی اور آگرے پر اکبر کا [illegible]

کے بعد اکبر نے جیپور، گوالیار، لکھنؤ، الہ آباد [illegible]

میں مبارک خان کے ہاتھوں مارا گیا [illegible]

اکبر نے بیرم خان سے ملک گیری [illegible]

میں لڑتے ہوئے آٹھ سال کے قلیل [illegible]

کے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لیے۔ [illegible]

کھل کر مستحکم مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ [illegible]

۱۵۹۴ء میں بلوچستان اور ۱۵۹۵ء میں قندھار کو فتح [illegible]

علاقے پر حکمران ہو گیا۔

سلطنت کو عسکری لحاظ سے مستحکم کرنے کے بعد [illegible]

ہوا۔ اس نے نظام سلطنت کو مضبوط بنایا۔ [illegible]

محاصل کا انتظام درست کیا۔ آزاد عدلیہ کو رواج دیا۔ اور علوم و فنون کی [illegible]

اکبر نے کل انچاس سال آٹھ ماہ حکومت کی۔ آخری عمر میں [illegible]

صدمات برداشت کرنے پڑے۔ راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کے بعد [illegible] فاضل ساتھی ابوالفضل سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شہزادہ مراد اور شہزادہ دانیال کی موت نے بھی اسے بے حد کمزور کر دیا۔ آخری وقت میں اس نے شہزادہ سلیم کو اپنا جانشین مقرر کیا اور تریسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوا۔

اکبر ایک ذہین فطین حکمران تھا۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود بہت بڑا عالم تھا۔ انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں اس نے کئی ایجادات کیں۔ ان میں سب سے بڑی

شہنشاہ اکبر کا بنایا ہوا قلعہ ۔ آگرہ

[illegible] تھے [illegible] بندی کے تحت آئندہ دس [illegible] [illegible] مدد [illegible] زراعت کو ترقی دینے [illegible] حسابات کی حالت درست [illegible] کرتے تھے۔ اکبر نے پہلی بار تنخواہ [illegible] کی سختی سے پابندی کرائی۔ اور [illegible] کے سامنے مسلمانوں [illegible] اور ان [illegible] اشیائے خوردنی [illegible] محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔ [illegible] کے نام سے مشہور ہے۔ اکبر نے اپنے [illegible] مختلف تجاویز کے ذریعے [illegible] جائے تاکہ [illegible] اس کے اقتدار [illegible] کی دل جوئی [illegible]

[illegible] ابوالفضل، فیضی، عبدالقادر بدایونی، [illegible] نقیب خاں، [illegible] ملا مبارک اور میر فتح اللہ شیرازی جیسے عالم تھے جنھوں نے علم و ادب کی [illegible] خدمت کی۔ عرفی، نظیری، شکیبی اور حیدری تبریزی جیسے [illegible] شعرا اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ چونکہ اکبر نے فن تعمیر کی بھی قدردانی کی اس لیے کئی مصور اور ماہر تعمیر بھی یہاں کھنچے آئے۔ ان میں میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد، شرف خاں، ملا یعلی، میر حسین، رام داس، میاں چاند، محمد حسین کاشمیری اور تان سین جیسے موسیقی قابل ذکر ہیں۔ اس کی تعمیر کردہ عمارات میں مقبرہ ہمایوں دہلی، مقبرہ سلیم چشتی [illegible] لاہور، الٰہ آباد، فتح پور سیکری، آگرے اور اٹک کے قلعے قابل دید ہیں۔

اکل طعام، کھانا۔ قرآن مجید میں زمین کی عمدہ اشیاء جائز قرار دی گئی ہیں۔ ان میں سبزیاں، پھل، گوشت، دودھ اور شہد قابل ذکر ہیں اور کچھ اشیاء حرام اور ناجائز ہیں۔ مثلاً سور کا گوشت، بتوں کی نذر چڑھائی گئی چیزیں، خون، مردہ اور حرام جانور وغیرہ۔ گوشت صرف انھی جانوروں کا جائز ہے جو حلال ہوں اور انھیں ذبح کرکے گردن سے خون بہایا گیا ہو۔

کھانا صرف اسی قدر مباح ہے، جس سے آدمی کی قوت بڑھے اور آسودگی حاصل ہو اس سے زیادہ کھانا حرام ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں، پھر بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کریں۔ کھانا دائیں ہاتھ سے کھایا جائے۔ اور دوران طعام خاموش رہا جائے اور صرف اپنے سامنے سے کھایا جائے۔ رزق کی عزت لازم ہے۔ اگر لقمہ دستر خوان پر گر جائے تو اسے اٹھا کر کھا لینا چاہیے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد الحمد للہ کہنا چاہیے۔ ہاتھ کی انگلیاں چاٹ کر صاف کی جائیں اور اس کے بعد ہاتھ دھوئے جائیں۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے انگلیوں کے چاٹنے اور پیالے کو پونچھنے اور صاف کرنے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ یہ اس لیے کہ تمھیں معلوم نہیں کون سے لقمے میں برکت ہے۔ کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جناب رسولؐ خدا تین انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا کرتے اور اپنے ہاتھ کو پونچھنے سے پہلے چاٹ لیا کرتے اور [illegible] دھو ڈالا کرتے تھے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کھانے کو برا نہیں کہا۔ اگر اچھا لگا کھا لیا، ناپسند ہوا تو چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا نے فرمایا "مل کر کھانا کھایا کرو۔ الگ الگ نہ کھایا کرو۔ کیونکہ برکت جماعت کے ساتھ ہے۔"

احادیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے ڈکار لی۔ حضورؐ نے فرمایا جو لوگ دنیا میں بہت پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ وہ قیامت کے روز بہت بھوکے ہوں گے۔ نیز حضورؐ کا ارشاد ہے کہ رات کا کھانا کھاؤ، خواہ کچھ ناقص کھجوریں ہی ہوں۔ کیونکہ رات کا کھانا نہ کھانا، کمزوری لاتا ہے۔ جب تمھاری دعوت کی جائے تو اسے قبول کرو۔ اگر کسی شخص کی دعوت کی جائے اور وہ قبول نہ کرے تو اس نے اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کی اور جو بن بلائے گیا، وہ گویا چوری کرنے گیا۔ نیز فرمایا کہ جب تک سب لوگ نہ کھا لیں، دستر خوان سے نہ اٹھیں۔ اشد ضرورت میں معذرت کرکے اٹھنا چاہیے۔

الاحزاب، سورۃ قرآن مجید کی ۳۳ ویں سورت، جو غزوۂ احزاب شوال ۵ھ اور غزوہ بنی قریظہ ذی قعدہ ۵ھ اور حضرت زینب کے ساتھ آنحضورؐ کے نکاح سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں نو رکوع اور ۷۳ آیتیں ہیں۔

پہلے رکوع کا زمانۂ نزول غزوۂ احزاب سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نبی کا تعلق مومنوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔ دوسرے اور تیسرے رکوع میں جنگ احزاب کا ذکر ہے۔ اس میں اصل غرض اس بات سے ہے کہ مسلمانوں کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اس لیے تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم مسلمانوں کے لیے ایک کامل نمونہ ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کا نمونہ کام دیتا ہے۔ چوتھے رکوع سے آیت نمبر ۳۵ تک دو مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو، جو اس تنگی و عسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ دنیا اور اس کی زینت یا خدا، رسول اور آخرت میں سے کسی کا انتخاب کر لیں۔ دوسرے حصہ میں اس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے، جس کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس اصلاح کی ابتدا نبی صلعم ہی کے گھر سے کرتے ہوئے ازواج مطہرات کو حکم دیا گیا کہ وہ وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مردوں کے ساتھ بات کرنے سے سخت احتیاط کو ملحوظ رکھیں۔ آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ آنحضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہے تاکہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو آپ کے متبنیٰ بیٹے زیدؓ کی بیوہ سے نکاح کرنے کی صورت میں پیدا ہوئیں۔

آیت ۴۹ میں قانون طلاق کی ایک دفعہ بیان ہوئی ہے۔ آیت ۵۰ سے ۵۲ میں آنحضورؐ کو ان متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا، جو ازدواجی زندگی کے معاملے میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی تھیں۔ آخری آیات میں معاشرتی اصلاح کے دوسرے اقدامات بیان کیے گئے ہیں، جن میں ازواج مطہرات اور مومن عورتوں کے بارے میں پردے کے احکامات بھی شامل ہیں۔ نیز افواہ بازی اور بہتان تراشی پر زبردست زجر و توبیخ کی گئی ہے، جو منافقین نے اس وقت برپا کر رکھی تھی۔

الاحقاف، سورۃ قرآن مجید کی ۴۶ ویں سورت، احقاف کے معنی ٹیلے یا تودے کے ہیں۔ اس میں قوم عاد کی مثال دی گئی ہے۔ یہ کل چار رکوع اور ۳۵ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے جب آنحضورؐ طائف سے واپس تشریف لائے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب آنحضورؐ کفار ان مکہ و طائف کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکے تھے۔ مگر اس پوری سورت میں کہیں بھی آنحضورؐ کے دلی جذبات کا علم نہیں ہوتا۔ اور یہی بات قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

اس سورت کا موضوع کفار کو ان گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کرنا ہے، جن میں وہ نہ صرف مبتلا تھے بلکہ بڑے اصرار اور غرور کے ساتھ ان پر جمے ہوئے تھے۔ اور الٹا اس اس شخص کو ہدف ملامت بنا رہے تھے جو انہیں ان گمراہیوں سے نکالنے کے لیے کوشاں تھا۔ توحید کی دعوت ان کے نزدیک باطل تھی۔ وہ قرآن کے متعلق یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اس سورت میں انھی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی مدلل تردید کی گئی ہے اور کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم عقل و دلیل سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر قرآن کی دعوت اور محمد صلعم کی رسالت کو رد کرو گے تو تم ہی تباہ و برباد ہو گے۔ نیز اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو یہ خوشخبری سنائی کہ انسان خواہ آپ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جن اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔

الاخلاص، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۲ ویں سورت۔ اس میں کل چار آیتیں ہیں اور یہ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ جس میں خالص توحید بیان کی گئی ایسی بہت سی روایات احمد، ترمذی، بیہقی، بخاری اور طبری کے ہاں ملتی ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق یہودیوں کے ایک گروہ نے اللہ کی ربوبیت کے بارے میں سوال کیا تھا جس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ایسی بہت سی دیگر روایات سے پتا چلتا ہے کہ مختلف مواقع پر لوگوں نے آنحضورؐ سے اللہ کی ماہیت و کیفیت دریافت کی تھی اور ہر موقع پر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انھیں جواب میں یہی سورت سنائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورت بہت ابتدائی زمانۂ نزول کی حامل ہے۔

سورۂ اخلاص کا مضمون اللہ تعالیٰ کی وحدت اور لاشریک ذات کو بیان کرتا ہے "کہہ دے! وہ اللہ ہے، یکتا، اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ (اور سب اس کے محتاج ہیں)، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

یہ وہ وقت تھا جب مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ اس کے اوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ خدا کو مانتے تھے، مگر وہ اس کی خدائی میں ایک بیٹے کو شریک کرتے تھے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ یہودیوں کے نزدیک بھی حضرت عزیرؑ خدا کے بیٹے تھے۔ جب ان تمام لوگوں کو اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا، جسے تمام ارباب کو چھوڑ کر ماننا چاہیے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے چند جملوں میں اللہ کی ذات کا واضح تصور پیش کر دیا ہے۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایت ہے کہ آنحضورؐ نے مختلف مواقع پر لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت فضیلت کے اعتبار سے تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اسی مسلمان نماز میں اکثر اسی سورت کو پڑھتے ہیں۔

الاسود، حجر کالا پتھر۔ خانۂ کعبہ میں لگا ہوا مقدس پتھر، جسے حاجی دوران طواف بوسہ دیتے ہیں۔ یہ خانۂ کعبہ کی جنوب مشرقی دیوار میں [illegible] نصب ہے۔ پتھر کا عرض تقریباً سات انچ ہے۔ قریب سے دیکھیں تو [illegible] ٹکڑوں میں منقسم نظر آتا ہے، جنھیں کسی مصالحہ سے جوڑ دیا گیا ہو۔ [illegible] یہ ٹوٹ گیا ہو اور اسے دوبارہ جوڑا گیا تھا۔ پتھر کی ہیئت معلوم کرنا [illegible] کیونکہ امتداد زمانہ اور حجاج کے بوسوں سے اس کی سطح عجیب سی [illegible] بھی مٹیالا سا ہو چکا ہے۔ اس کے گرد چاندی کا گول حلقہ بنا ہوا ہے [illegible] آمیزش کی گئی ہے۔

حجر اسود کہاں سے آیا؟ اس کی بابت مکمل معلومات حاصل نہیں [illegible] ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ نے فرمایا کہ حجر اسود جنت سے آیا تھا۔ اس وقت یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔ عہد نامہ عتیق میں بھی ایک پتھر کا ذکر آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہی ہو۔ کتاب زبور میں اشارہ ہے "وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا ہے، کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ یہ خداوند سے ہوا، جو ہماری نظروں میں عجیب ہے۔" (۱۱۸ : ۲۲، ۲۳) متی کی انجیل میں بھی اس رد کیے گئے پتھر کا ذکر ہے کہ مسیحؑ نے بنی اسرائیل سے کہا "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی۔ اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے، دی جائے گی۔ جو اس پتھر پر گرے گا، چور ہو جائے

کا۔ پر جس پردہ گرے گا، اسے پیس ڈالے گا۔ (۲۱ و ۲۲، ۲۳۰)۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسی پتھر کی طرف اشارہ کیا ہو، جسے حجرِ اسود کہا جاتا ہے۔

خانۂ کعبہ کی تعمیرِ اوّل ہی کے وقت سے یہ پتھر اس میں موجود تھا۔ ۶۰۶ء میں جب آنحضورؐ کی عمر ابھی پچیس برس تھی، سیلاب سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا اور قریش نے اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ جب دیواریں قدِ آدم کو پہنچ گئیں تو حجرِ اسود رکھنے کا مسئلہ آیا تو قبائل میں جھگڑا ہو گیا۔ ہر قبیلے کی خواہش تھی کہ یہ سعادت اسے ہی نصیب ہو۔ رسول اللہؐ نے اس قضیے کو طے کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حجرِ اسود کو ایک چادر میں رکھا اور تمام سرداران قبائل سے کہا کہ وہ چادر کے کونے پکڑ کر اٹھائیں۔ چنانچہ سب نے مل کر چادر کو اٹھایا اور جب چادر اس مقام پر پہنچی، جہاں اسے رکھا جانا تھا تو آپؐ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے دیوارِ کعبہ میں نصب کر دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانے میں کعبے [illegible] جس سے حجرِ اسود کے تین بڑے ٹکڑے ہو گئے۔ نیز کئی چھوٹے چھوٹے [illegible] جنھیں ابن زبیر نے چاندی میں مڑھوایا۔ ۱۲۶۸ء میں سلطان عبدالمجید [illegible] سونے کے فریم میں مرقع دیا۔ ۱۲۸۱ء میں سلطان عبدالعزیز نے [illegible] ۱۳۶۶ء میں اس فریم کی اصلاح کی گئی۔

[illegible] سورت۔ اس میں چوبیس رکوع اور دو سو [illegible] ان لوگوں کا ذکر ہے، جو جنت [illegible] کا نام [illegible] رکھا گیا ہے [illegible] سورتوں میں سے ہے۔ [illegible] سے تعلق رکھتا ہے۔ اس [illegible] ہے کہ تم روش [illegible] اختیار کر [illegible] مل گیا۔ آخر [illegible] ایک جگہ تمام دنیا کے [illegible] علامات سے کہ اب حق قریب ہے [illegible] نصیحت کی [illegible] کے مقابلے میں صبر و ضبط سے [illegible] جو اصل مقصد کو ختم کرے [illegible] سورۂ الانعام اور سورۂ الاعراف کا تعلق ظاہر ہے۔ وہاں توحید [illegible] ہے اور یہاں نبوت کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ توحید کے بعد نبوت [illegible] سورۂ انعام کے فوراً بعد سورۂ اعراف ترتیب میں آئی ہے۔ [illegible] نبوت سے انسان جب توحید پر پہنچ سکتا ہے، وہ محض ایک خشک عقیدہ ہے۔ مگر نبوت [illegible] توحید پر اعتبار کرتی ہے، وہ ایک تجربہ دار ہے۔

الاعلیٰ، سورۃ قرآن مجید کی ۸۷ ویں سورت۔ اس میں کل انیس آیات ہیں اور یہ ابتدائی مکی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے ہی سے انسان عالی مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

اس سورت کی چھٹی آیت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دورِ نزول سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس کے الفاظ کہ "ہم تمھیں پڑھا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے۔" یہ بتاتے ہیں کہ یہ اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب آنحضورؐ کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں تھی اور نزولِ وحی کے بعد آپؐ کو اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں آپؐ ان الفاظ کو بھول نہ جائیں۔

اس سورت میں توحید، آخرت اور ہدایات برائے رسولؐ مقبول ہیں۔ ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام سے یاد کیا جائے، جو اپنے معانی اور مفہوم کے لحاظ سے مکمل ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ہستی کی ماہیت بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد آنحضورؐ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کسی فکر میں نہ پڑیں۔ اس قرآن کو جو آن پر نازل کیا جا رہا ہے، حافظے میں محفوظ کر دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ آخر میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ فلاح صرف نیک اور صالح لوگوں کے لیے ہے۔ اصل فکر آخرت کی کرنا چاہیے۔ کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت کی نعمتیں دنیا کی آسائشات سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

الانبیاء، سورۃ قرآن مجید کی اکیسویں سورت۔ اس میں انبیاء کرام کا ذکر ہونے کی بنا پر اس کا نام الانبیاء ہے۔ یہ لفظ کسی آیت میں نہیں آیا۔ اس میں سات رکوع اور ۱۱۲ آیات ہیں۔ اس کا زمانۂ نزول مکے کا درمیانی دور ہے۔ یہ ہجرتِ حبشہ کے قریب قریب کہیں نازل ہوئی۔

سورت کی ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ لوگ خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں اور انھیں آخرت کی کوئی پروا نہیں۔ جب انھیں کوئی جگانے والا آتا ہے تو اسے پریشان کرتے ہیں۔ کبھی اس کی تعلیم کو افترا قرار دیتے ہیں۔ کبھی اسے شاعر قرار دیتے ہیں اور کبھی جادوگر۔ جب کہ رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتے ہیں۔ آگے چل کر انبیاء کی عظمت ان کے مخالفین کی ہلاکت، دشمنوں کے ہاتھوں سے ان کی نجات۔ اور متبعین کا وارث زمین ہونا مذکور ہے۔ خصوصاً عصمتِ انبیاء کا مضمون نہایت صفائی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ وہ قول و فعل دونوں میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے ماتحت ہوتے ہیں۔ مضامین کا خاتمہ اس بات پر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم دنیا میں ناکام نہیں ہو سکتے اور آخر کار آپ کی نبوت پھیلے گی۔ اس میں اسی بات کو واضح کیا گیا ہے کہ انبیاء اور راست باز ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں اور دشمنوں کے افترا کے باوجود حق غالب ہو کر رہتا ہے۔

اس سورت میں انبیاء علیہم اسلام کی عصمت و عفت کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تمام پیغمبر انسان تھے، خدائی کا شائبہ بھی ان میں نہیں تھا۔ ان پر بھی طرح طرح کے مصائب آتے اور ان کے مخالفین نے انھیں برباد کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے یہ کہ ان کا دین ایک تھا اور وہ وہی دین تھا جسے محمد رسول اللہ پیش کر رہے ہیں۔ یہی اصل دین ہے، مگر لوگ گمراہ ہوتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اس کی پیروی میں ان کی نجات ہے، وہی زمین کے وارث بنیں گے، جو اس پر چلیں گے۔

الانسان، سورۃ قرآن مجید کی ۷۶ ویں سورت۔ اس کا نام سورۃ الدہر بھی ہے یہ الفاظ ابتدائی آیت کے الفاظ "ھل اتی علی الانسان" اور "من الدھر" سے ماخوذ ہیں۔ اس میں دو رکوع اور اکتیس آیات ہیں۔ اس میں انسان کی روحانی ترقیوں کا ذکر ہے۔ اکثر مفسرین نے اسے مکی سورت قرار دیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سورت ہے تو مکی مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئیں۔ امام رازی اور حافظ ابن کثیر جیسے مفسرین نے اسے مکی ہی لکھا ہے۔

اس کا موضوع انسان کو اس کی حیثیت یاد دلانا ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ موجود نہ تھا۔ پھر ایک مخلوط نطفے سے اس کی ابتدا کی گئی۔ اس بات کی خبر کسی کو نہ تھی اور پھر اسے کئی مراحل سے گزار کر انسان بنایا گیا۔ اس کے بعد اُسے خبردار کیا گیا ہے کہ تیری تخلیق اسی طرح کر کے تجھے یہ ہم نے اس لیے بنایا کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش و گوش رکھنے والا بنایا گیا ہے

تیرے سامنے نیکی اور بدی کے دونوں راستے رکھ دیے گئے ہیں۔ اب تو خواہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ نیک اور شکر گزار لوگوں کے لیے خدا کے ہاں اجرِ عظیم ہے۔ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ اعمال کیا ہیں، جن کی بنا پر وہ اس جزا کے مستحق ہوں گے۔

دوسرے رکوع میں آنحضورؐ کو مخاطب کر کے تین باتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کر رہے ہیں تاکہ کفار جان جائیں کہ نعوذ باللہ اسے محمدؐ خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے بلکہ اس کے نازل کرنے والا "اللہ تعالیٰ" ہے اور یہ بات اس کی حکمت میں داخل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے رب کا فیصلہ ہونے میں خواہ کتنی دیر لگے، تم صبر کے ساتھ اپنا فرض ادا کیے جاؤ۔ تیسری بات یہ کہ شب و روز اللہ ہی کو یاد رکھو، نماز پڑھو اور اس کی عبادت میں گزارو۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار آخرت کو بھول چکے ہیں۔ انھیں یہ علم نہیں کہ انھیں خدا نے بنایا ہے، وہ چاہتا تو انھیں پیدا ہی نہ کرتا، یا ان کی شکلیں بگاڑ دیتا یا ہلاک کر کے کسی اور قوم کو اس کی جگہ لے آتا۔ یہ نصیحت کی بات ہے۔ اب جو چاہے اسے قبول کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے، اپنی رحمت میں جسے چاہتا ہے داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

الانشقاق، سورۃ

قرآن مجید کی ۸۴ ویں سورت۔ اس کا نام پہلی آیت سے مشتق ہے۔ اس میں پچیس آیات ہیں۔ انشقاق کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ یہ سورت مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی ظلم و ستم کا دور شروع نہیں ہوا۔ البتہ قرآن مجید کی دعوت کو جھٹلایا جا رہا ہے اور لوگ یہ ماننے سے انکار کر رہے ہیں کہ قیامت کبھی آسکتی ہے۔

ابتدائی پانچ آیات میں قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ اس روز آسمان پھٹ جائے گا اور زمین اپنی تمام اشیا نکال دے گی۔ یہ ان کے لیے رب کا حکم ہوگا۔ اگلی دس آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان شعوری یا لاشعوری طور پر اس کی طرف چلا جا رہا ہے، جہاں اسے رب کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہاں سب انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جن کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ معاف کر دیے جائیں گے۔ دوسرے وہ جن کا نامہ اعمال پیٹھ سے پکڑایا جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ انھیں موت آ جائے مگر مرنے کے بجائے وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ یہ بات اسی طرح سچ ہے جیسے شام کا سرخ ہونا، رات کا آنا یا چاند کا کامل ہونا۔ ایسے لوگوں کو جو قرآن کو جھٹلاتے ہیں، دردناک عذاب کی خبر دے دی جائے۔

الانعام، سورۃ

قرآن مجید کی چھٹی سورت۔ اس کے رکوع ۲۰ میں بعض الانعام (مویشیوں) کی حرمت کے متعلق اہل عرب کے توہمات کی تردید کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "الانعام" رکھا گیا ہے۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے یہ بہت پہلے کی مکی سورت ہے۔ اس میں بیس رکوع اور ۱۶۶ آیات ہیں۔ اس کا اصل مضمون توحید الٰہی بیان کرنا ہے۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ پوری سورت مکہ میں یک وقت نازل ہوئی تھی۔ حضرت معاذؓ بن جبل کی چچا زاد بہن اسماؓ بنت زید کہتی ہیں کہ جب یہ سورت آنحضورؐ پر نازل ہو رہی تھی اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ روایات میں اس کی تصریح بھی ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی۔ اسی رات کو آپ نے اسے قلم بند کرا دیا۔

چوپایوں کے متعلق اہل عرب میں عجیب مشرکانہ رسوم مروج تھیں۔ بعض اقسام کے جانوروں کو متبرک و معزز سمجھا جاتا تھا۔ ان کی یہ رسوم شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اسلام نے توحید کی جو دعوت دی، وہ اس وقت تک پوری نہ ہو سکتی تھی۔ جب تک کہ ان مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی نہ کی جائے۔

اس سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی ہے اور اول تا آخر اسی ایک مضمون پر زور دیا گیا ہے۔ ہاں ضمناً کہیں رسالت کا ذکر آ گیا ہے [illegible] جھوٹوں کی انجام کار ناکامی اور مومنین کی تدریجی [illegible] بھی ذکر ہے۔

پہلے رکوع میں شرک کی مذمت کی [illegible] ہے۔ اس کے [illegible] اور اس کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے [illegible] دید کی گئی ہے۔ تیسرے میں بتایا گیا [illegible] ایک وقت آئے گا کہ وہ خود [illegible] فطرت انسانی کی شہادت کی طرف بھی توجہ [illegible] کا۔ پانچویں عذاب استیصال کا ذکر ہے۔ [illegible] الغم کا ذکر ہے۔ ساتویں اور آٹھویں میں [illegible] گیا ہے۔ نویں میں بتایا گیا ہے کہ [illegible] ان کی اپنی قوم سے بحث کا ذکر ہے۔ دسویں [illegible] توحید کی تھا۔ گیارھویں میں آنحضرت [illegible] اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر کر کے [illegible] کامیابی کا ذکر ہے۔ [illegible] شرک [illegible] تعالیٰ کا [illegible] سے پاک ہونا [illegible] کی مخالفت اور بد [illegible] سترھویں میں شرک اور [illegible] تعداد اور مشرکوں کے باطل [illegible] بیان کیا کہ غرض صرف ایک [illegible] صول زندگی پر عمل پیرا ہونا [illegible] کے حصول [illegible] کرنے پیش کیا [illegible] [illegible] تو دوسری طرف آخرت [illegible] [illegible] ان پر حکومت [illegible] ہے اور ساتھ [illegible] وہ بادشاہت تم سے چھین لی جاسکتی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے اس سورت کو دو سات بڑے بڑے [illegible] تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ شرک کا ابطال اور عقیدہ آخرت۔

۲۔ عقیدہ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس

یہی دنیا کی زندگی ہے۔

۳۔ جاہلیت کے ان توہمات کی تردید، جن میں لوگ مبتلا تھے۔
۴۔ ان بڑے بڑے اصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا ہے۔
۵۔ رسول اکرمؐ اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب
۶۔ طویل جد و جہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت صلعم اور عام مسلمانوں کے اندر اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی، اس پر تسلی دی گئی۔
۷۔ منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت اور سرشاری پر نصیحت اور تنبیہ۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو اللہ کے رسولؐ کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ملک چھوڑ چکی تھی اور حبشہ کی ہجرت کر گئی تھی۔ اس وقت آپؐ ہر قسم کے دنیوی سہارے سے محروم تبلیغ رسالت کا فریضہ ادا کرتے چلے جا رہے تھے۔

الانفال، سورة قرآن مجید کی آٹھویں سورت۔ اس میں دس رکوع اور ۷۵ آیات ہیں۔ انفال کے معنی مال غنیمت کے ہیں اور یہ سورت جنگ بدر [illegible] ہجرت کے نازل ہوئی۔ یہ سب سے پہلی جنگ [illegible] دشمن سے مال غنیمت ہاتھ آیا اور [illegible] ایک تجارتی قافلہ [illegible] تھا کہ اس قافلے پر حملہ کرے [illegible] مال [illegible] قرار دیا۔ اس [illegible] لیکن مال کا حاصل کرنا اصل [illegible] جنگ کی اصل غرض نہیں ہے۔

اس سورت میں جنگ بدر کا ذکر کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان جنگوں کا [illegible] اصلاح و اطاعت ہے۔ آپس میں اصلاح کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ کا ذکر کرو۔ نمازیں قائم کرو۔ زکوٰۃ دو تو سچے مومن [illegible] جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے حق کو ثابت [illegible] نابود کرنا چاہتے ہیں، ان کا استیصال [illegible] جنگ بدر میں فتح کا اور ان اسباب کا جن سے فتح ہوئی [illegible] بتایا کہ غلط کی حقیقی راہ [illegible] جنگ بدر کے بعد بھی کفار لڑیں گے [illegible] اور مسلمان خانہ کعبہ کے متولی ہونے کے [illegible] ورنہ مسلمانوں [illegible] بڑی جمعیت سے مقابلہ کے لئے نکلتے۔ چھٹے میں مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رہنے کی نصیحت کی تاکہ نصرت الٰہی کے جاذب بنیں۔ ساتویں میں کفار کی بدعہدیوں کا ذکر۔ آٹھویں میں بتایا کہ دشمن کے مقابلے کے لئے ہر وقت مستعد اور تیار رہنا چاہئیے۔ نویں میں تسلی دی کہ کفار کی تعداد سے نہ گھبرائیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دگنی اور دس گنی تعداد پر بھی غالب کر دکھائے گا۔ اور اسی میں آخر پر یہ بتایا گیا کہ قیدی یا مال غنیمت باقاعدہ جنگ کی صورت میں لئے جا سکتے ہیں۔ دسویں میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات قوی بتائے اور فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اگر کفار مسلمانوں پر زیادتی کریں تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں۔ سوائے اس صورت کے کہ ایسی کافر قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو۔ پھر قانون جنگ و صلح کے متعلق وہ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں، جن کی توضیح اس مرحلے میں دعوت اسلامی کے داخل ہو جانے کے بعد ضروری تھی تاکہ مسلمان اپنی صلح و جنگ میں جاہلیت کے طریقوں سے بچیں اور دنیا پر ان کی اخلاقی برتری قائم ہو اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام روز اول سے اخلاق پر عملی زندگی کی بنیاد رکھنے کی جو دعوت دے رہا ہے۔ اس کی تعبیر واقعی عملی زندگی میں کیا ہے پھر اسلامی ریاست کے دستوری قانون کی بعض دفعات بیان کی گئی ہیں، جن سے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں کی آئینی حیثیت ان مسلمانوں سے الگ کر دی گئی ہے، جو دارالاسلام کی حدود سے باہر رہتے ہوں۔

الانفطار، سورة قرآن مجید کی ۸۲ویں سورت۔ اس میں ۱۹ آیات ہیں۔ یہ مکی سورت ہے۔ انفطار کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے، جس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جو شخص چاہتا ہے کہ روز قیامت کو اس طرح دیکھ لے، جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے، تو وہ سورہ تکویر اور سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کو پڑھ لے۔"

اس سورت میں قیامت آنے کی کیفیات درج کی گئی ہیں۔ پہلی تین آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے جب آسمان پھٹ جائے گا اور تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر بہا دیے جائیں گے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ بیان کیا گیا ہے جب قبریں کھول دی جائیں گی اور انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد احساس دلایا گیا ہے کہ انسان کو کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا تھا کہ اس کا حساب کتاب نہ ہوگا جب کہ انسان پر نگران مقرر ہیں، جو اس کے ہر فعل کو درج کر لیتے ہیں۔ یعنی جس چیز نے دھوکے میں ڈالا، وہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے بلکہ ایک احمقانہ خیال ہے۔ اس روز یہ لوگ نہ بچ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرے گا اور نیک لوگوں کو جنت کا عیش اور بدکار لوگوں کو جہنم کا عذاب نصیب ہوگا۔ اس روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ سوائے انسان کے اپنے عمل کے۔

البانیہ یورپ میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والی ایک بلقانی ریاست ترکی زبان میں اسے آرناؤدلق کہتے ہیں، آج کل یہاں کمیونسٹ پارٹی حکمران ہے۔ سرکاری نام عوامی جمہوریہ البانیہ ہے۔ اس کے شمال اور مشرق میں یوگوسلاویہ جنوب مشرق میں یونان۔ جنوب میں بحیرہ روم اور مغرب میں آبنائے اوٹرنٹو اور بحیرہ [illegible] کے پار اٹلی واقع ہے۔ اس کا صدر مقام تیرانا ہے۔ کل رقبہ ۱۱۱۰۰ مربع میل (۲۸۷۴۸ مربع کلومیٹر) ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کل آبادی ۲۲،۲۹،۰۰۰ تھی۔ یہاں البانوی زبان بولی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ یہاں کی بیس فیصد آبادی آرتھوڈکس عیسائی اور بارہ فی صد رومن کیتھولک ہے۔ البانیہ کا دو تہائی رقبہ پہاڑی ہے۔ دریا بہت کم ہیں۔ مغربی نشیبی علاقوں میں کچھ زرخیز میدان ملتے ہیں۔ بلند مقامات کی آب و ہوا سرد خشک ہے۔ البتہ ساحلی علاقوں میں گرم مرطوب آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ دروز یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔

تاریخ: البانوی لوگ ترکوں کے نزدیک نسلی اعتبار سے دو گروہوں گیغ اور طوسق میں منقسم ہیں۔ یونانیوں کے زیر اثر ان کے ہاں بھی یونانی ثقافت کا رواج ہوا۔ چودہویں صدی عیسوی میں ترکوں نے اس علاقے پر حملے شروع کیے۔ یہ حملے کامل ایک صدی تک برقرار رہے اس دوران میں بہت سے البانوی باشندے نقل مکانی کر کے اٹلی اور یوگوسلاویہ کے علاقوں کی طرف چلے گئے۔ ۱۹۹۰ء میں البانویوں نے زرخیز میدانوں میں آکر چھوٹے چھوٹے قطعات پے

پڑے رہے اور یہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ عثمانی دستاویزات سے علم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا باقاعدہ راج ۷۹۶ھ/۱۳۴۹ء سے شروع ہوا اور اس میں استحکام سترہویں صدی میں آیا۔ حکومت عثمانیہ میں اکثر صدر اعظم البانوی تھے۔ جنہوں نے عوام کو زیادہ سے زیادہ سرکاری زمینیں دینا شروع کیں۔ اس طرح یہاں نیم خود مختار جاگیردار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ انھی میں ایک علی پاشا تھا۔ ۱۸۰۲ء جب مرکزی حکومت نے اس کے خلاف کارروائی کی تو اس نے بغاوت کر دی۔ اس کے جانشین محمود ثانی کو ۱۸۳۲ء میں عثمانیوں نے شکست دی۔

دروز کی جامع مسجد میں نماز جمعہ

۱۲ جون ۱۸۷۸ء کو البانویوں نے اپنی ایک سیاسی لیگ قائم کر لی۔ جسے عثمانیوں نے ۱۸۸۱ء میں منتشر کر دیا۔ مگر زیر زمین ان کی تحریکات جاری رہیں۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کے خلاف زبردست اعلانات کیے۔ اس کے ساتھ ہی کوہستانی

البانیہ کی اہم بندرگاہ دروز کی جامع مسجد

قبائل نے بغاوت کر دی۔ جنگ بلقان کے باعث حالات بدل گئے اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی نومبر ۱۹۱۲ء میں ان کے ایک رہنما اسماعیل کمال نے البانیہ کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ۲ راگست ۱۹۲۰ء میں اٹلی کی حکومت نے البانیہ کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ ۱۹۲۴ء تک قومی حکومت داخلی معاملات میں الجھی رہی۔ ۲۴ ردسمبر کے انتخابات میں مجلس مقننہ نے احمد زوغ کو پہلا صدر منتخب کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ۶ راپریل ۱۹۳۹ء کو اٹلی نے پہلی بار اس پر حملہ کیا تو زوغ ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس کے بعد سے البانیہ اٹلی کا ایک حصہ رہا۔

۱۹۴۲ء میں محاذ قومی آزادیٔ البانیہ نے کمیونسٹوں کے زیر اثر استحکام حاصل کر لیا۔ اس کا رہنما انور ہوگزا تھا۔ جس نے ۱۹۴۴ء میں ملک کا اقتدار حاصل کر لیا۔ روس نے البانیہ کو ہر قسم کی اقتصادی و سیاسی مدد دینا شروع کی۔ تاہم ۱۹۶۰ء کی روس چین جنگ میں البانیہ نے چین کی حمایت کی۔ اور اس کے بعد البانیہ نے چین کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے۔ ۱۹۷۲ء تک عملاً اقتدار انور ہوگزا کے ہاتھ ہی میں رہا۔ ۱۹۷۲ء میں البانیہ کے صدر ہاگزی لیشی تھے۔

اقتصادی معلومات :- البانیہ ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ جہاں تعلیم لازم ہے۔ تیرانا صدر مقام ہے، جہاں ایک یونیورسٹی قائم ہے۔ یہاں تیرہ ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ البانیہ کی تجارت زیادہ تر چین چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے ساتھ ہوتی ہے۔ برآمدات میں ایندھن، معدنیات، دھاتیں، سبزیاں، پھل اور تمباکو شامل ہے۔ زرعی پیداوار میں گندم، رول، آلو، تمباکو اور انگور وغیرہ اہم ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں بھیڑ بکریاں پالی جاتی ہیں۔ جن کی اُون برآمد ہوتی ہے۔ ملک میں پٹرولیم، تانبے اور سیمنٹ کی صنعتیں قائم ہیں۔

البروج ، سورۃ قرآن مجید کی ۸۵ ویں سورت۔ اس میں ۲۲ آیات ہیں۔ اس کا مضمون ابتدائی مکی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں ستاروں کے برجوں کو نشان بنا کر بتایا گیا ہے کہ ان کی روشنی کی طرح اسلام کی روشنی بھی کفر کی تاریکیوں میں چمکے گی۔ یہاں تین چیزوں کو گواہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اول برجوں والا آسمان، دوم یوم موعود یعنی روز قیامت، سوم شاہد اور مشہود ہیں۔ اس کا موضوع کفار کو اس ظلم و ستم کے برے انجام سے خبردار کرنا ہے جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے اور اہل ایمان کو یہ تسلی دینا ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ لے گا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اصحاب الاخدود کا قصہ سنایا گیا ہے، جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلا دیا تھا۔ اس قصے میں چند باتیں مسلمانوں اور کافروں کو ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اصحاب الاخدود کی طرح مکہ والے بھی ویسے ہی عذاب کے مستحق ہو رہے ہیں۔ دوسرے اہل ایمان کو بھی اسی طرح ثابت قدم رہنا چاہیے جس طرح گڑھوں میں ڈالے جانے والے۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے تھے وہ زبردست اور حمید ہے۔ وہ سب پر غالب ہے۔ اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔ فرعون اور ثمود کے لشکر [illegible] اسے جھٹلایا۔ مگر انھوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ [illegible] کیے ہوئے ہیں۔ انھیں خبر ہونی چاہیے کہ اللہ نے انھیں گھیرے میں لے رکھا ہے [illegible] کے جھٹلانے سے اس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا۔

البقرہ ، سورۃ قرآن مجید کی دوسری اور سب سے بڑی سورت۔ اس میں [illegible] رکوع اور ۲۸۶ آیات ہیں۔ بقرہ کے معنی گائے کے ہیں۔ اس سورت میں ایک جگہ اس گائے کا ذکر آیا ہے، جسے بنی اسرائیل کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔ کچھ حصہ بعد کے مدنی دور میں نازل ہوا ہے۔ سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہوتا ہے۔ وہ ہجرت سے پہلے کی نازل شدہ ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورہ فاتحہ سے ہے۔ سورہ فاتحہ میں سیدھا راستہ دکھانے کی دعا کی گئی ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب بے شک

پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ نیز اصل میں مضامین قرآن کا آغاز اسی سورت سے ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں اسلامی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ اس لیے شروع ہی میں بتادیا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے، جو ماضی حال و مستقبل کی ہر بات کو جانتا ہے۔ پھر وہ اصول بتادیے گئے ہیں، جن پر چل کر انسان ہدایت پا سکتا ہے۔ یہ کل پانچ اصول ہیں: تین عقائد کے رنگ میں یعنی ایمان بالغیب، وحی من جانب اللہ پر ایمان اور آخرت کی جزا و سزا پر ایمان اور دو عمل کے رنگ میں حقوق اللہ (نماز اور دعا وغیرہ) اور حقوق العباد (اپنے مال اور اخلاق کو اللہ اور مخلوق کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا)۔

مولانا مودودی نے "تفہیم القرآن" میں اس سورت کا جو تاریخی پس منظر بیان کیا ہے اس سے [illegible] ہوتا ہے کہ یہ سورت یہودیوں کی عملی اور عیسائیوں کی علمی غلطیوں کی اصلاح کے لیے نازل ہوئی تھی۔ اگرچہ اس میں خطاب مشرکین عرب سے ہے، جن کے لیے اسلام کی آواز نئی اور غیر مانوس تھی۔ چونکہ ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا، جن کی بستیاں مدینہ [illegible] متصل تھیں۔ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے انھیں شریعت موسوی سے [illegible] ان کے عقائد میں غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی۔ انھیں اس [illegible] سے ایسی [illegible] ہو گئی تھی کہ وہ کسی اصلاح کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ حقیقت [illegible] انسان تھے [illegible] ان کی اس اخلاقی و مذہبی حالت پر اس سورت میں زبردست [illegible] دین حق کے بنیادی اصول کیا ہیں۔

[illegible] مضمون یہ ہے کہ مسلمان کس طرح سے ایک کامیاب اور [illegible] کا ذکر کیا گیا ہے، جو اسلام کی [illegible] ہوں گے، وہ کامیاب ہوں گے اور جو ان کی [illegible] رکوع میں ایک اور گروہ منافقین کا ذکر [illegible] تیسرے رکوع میں اللہ [illegible] کی توحید کے دلائل دیے اور اس [illegible] انسان کے کمال کا ذکر فرمایا اور اس [illegible] حاصل نہیں کر سکتا۔ پانچویں [illegible] اگلے چار رکوع انعامات اور [illegible] بنی اسرائیل کے میثاق اور ان [illegible] غلطی نہ کریں۔ گیارہویں رکوع [illegible] جو شخص نے اسلام پر کیے اور ان کا [illegible] بارہویں رکوع میں ان کی عداوت [illegible] کو منسوخ کرنے اور ان سے بہتر [illegible] سے تعلق رکھتا ہے۔ نیز بتایا گیا کہ نجات تو صرف اللہ [illegible] کے ساتھ احسان کرنے سے ملتی ہے۔ چودہویں رکوع [illegible] سچائی ہر مذہب میں ہے مگر اسلام کامل صداقتوں [illegible] رکوع میں حضرت ابراہیم کے ساتھ کیے گئے وعدہ کا ذکر ہے [illegible] کی، جس کا ایک حصہ وہ مکہ معظمہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ [illegible] قبلہ قرار دیا جائے گا۔ سولہویں رکوع میں عیسائیوں اور یہودیوں کی [illegible] کا ذکر ہے۔ جس سے بچ کر اس نبیؐ نے ملت ابراہیمی کا احیا کیا ہے۔ اگلے دو رکوع بھی ان ہی مضامین سے متعلق ہیں اور مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ یہ قبلہ ہی تمہارے اتحاد کا مرکز ہے۔ نیز بتایا گیا کہ کامیابی کے لیے مسلمانوں کو مال و جان کی بہت سی قربانیاں کرنا پڑیں گی۔

اگلے بارہ رکوع شریعت محمدیؐ کی تفصیلات طے کرتے ہیں۔ ان میں غذاؤں کے حرام و حلال، قصاص، وصایا، صیام، جنگ، حج، شراب، جوا، یتامیٰ، طلاق بیواؤں اور رضاعت کا ذکر کر کے چونتیسویں رکوع میں اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب وہ اپنے نام لیواؤں کو زندگی بخشے گا اور انھیں بڑی قوم بنائے گا۔ مگر وہ دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہیں کریں گے۔ پینتیسویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اللہ مردہ قوموں کو کس طرح سے زندہ کرے گا۔ اگلے دو رکوع اس مضمون کو بیان کرتے کہ ساری کامیابیوں کی اصل بنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس کا اجر عظیم ہے۔ اڑتیسویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قربانی و ایثار کے بعد جب دولت تمہارے پاس آجائے تو سود نہ کھانا۔ کیونکہ سود خور قومیں بالآخر تباہ ہو جاتی ہیں اور اخلاق فاضلہ سے عاری ہو جاتی ہیں۔ انتالیسواں رکوع یہ بتاتا ہے کہ اپنے حقوق کی نگہداشت بھی فرض ہے اور لین دین کے معاملات کو لکھ لینا ضروری ہے۔ آخری رکوع میں سب رسولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ کر کے فرمایا ہے کہ کامیابی اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ کامل اطاعت نہ کرو اور اس کے ساتھ خدا سے دعائیں نہ مانگو۔ اپنی ہمت بھی باندھو اور اللہ کے حضور بھی گرے رہو تبھی کافروں کے خلاف تمہاری مدد کی جائے گی۔

البیرونی، ابوریحان (۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ/۹ ستمبر ۹۷۳ء۔ ۳ رجب ۴۴۰ھ/۱۳ ستمبر ۱۰۴۸ء) محمد بن احمد الخوارزمی البیرونی۔ بہت بڑا مسلمان سائنسدان۔ ماہر ارضیات و تاریخ و لسانیات و ریاضی و نجوم۔ وسط ایشیا کی ریاست خیوا (خوارزم) کے مضافات میں پیدا ہوا۔ اس وقت وہاں آل عراق کی حکومت تھی۔ شاہ خوارزم احمد بن محمد کے چچا زاد بھائی ابو نصر منصور بن علی نے البیرونی کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور تعلیم دلائی۔ کچھ عرصہ بعد جب آل عراق کی حکومت ختم ہو گئی تو البیرونی ترک وطن کر کے جرجان کے حکمران قابوس بن وشمگیر کے دربار میں آگیا۔

مشہور سائنس دان ابوریحان البیرونی

۹۹۵ء میں البیرونی جرجان پہنچا اور پذیرائی حاصل کی۔ یہیں اس نے اپنی

پہلی عظیم تصنیف "آثار الباقیہ" ۱۰۰۰ء میں لکھی اور اسے قابوس کے نام پر معنون کیا۔ خوارزم میں حالات بہتر ہوگئے تو البیرونی وہاں چلا آیا اور علی بن ماموں کے دربار میں زندگی بسر کرنے لگا۔ یہیں اس کی ملاقات بوعلی سینا سے ہوئی۔ دونوں اپنے عہد کے عظیم دانشور تھے۔ علی بن ماموں کی وفات کے بعد دونوں اس کے بھائی ابوالعباس ماموں کے دربار سے وابستہ رہے جو ۱۰۰۹ء میں خوارزم کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۰۱۶ء میں عوام نے اسے قتل کر دیا اور اگلے برس محمود غزنوی نے خوارزم کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ بوعلی سینا اور دوسرے علماء تو وہاں سے ترک وطن کر گئے۔ مگر البیرونی محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ ہوگیا

۱۰۱۷ء میں البیرونی غزنہ آیا۔ اگلے سال اس نے یہاں ایک رصد خانہ قائم کیا۔ اور دو برس مطالعہ میں گزارنے کے بعد ہندوستان کی راہ لی۔ اس اثناء میں محمود غزنوی ہندوستان فتح کر چکا تھا۔ البیرونی نے یہاں زیادہ تر وقت اجمیر میں گذارا۔ یہاں ہندوستان کے مشہور ہندو عالم اور پنڈت جمع تھے۔ البیرونی نے ان سے قدیم علوم اور سنسکرت زبان سیکھی۔ نیز ہندی تہذیب و ثقافت کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوؤں کے علوم حاصل کرنا ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔ مگر ہندو البیرونی کے ایسے گرویدہ تھے کہ اسے "ودیا ساگر" (علم کا سمندر) کہنے لگے۔ البیرونی نے ان کی مذہبی کتاب بھگوت گیتا کو عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ہندی تہذیب پر ایک کتاب "کتاب الہند" لکھی۔

البیرونی ایک ماہر ہیئت دان تھا۔ اس لئے وہ اس دوران میں ہیئت کے مشاہدات سے غافل نہیں رہا۔ اس نے پنجاب کے مشہور شہروں لاہور، جہلم سیالکوٹ، ملتان نیز پشاور کے عرض بلد اور وہاں سے قطبی تارے کی بلندی معلوم کرنے کا کام انجام دیا۔ ان شہروں میں زیادہ تر اس کا قیام ملتان اور پھر جہلم میں ہوا۔ جہلم میں تحصیل پنڈ دادن خاں کے قصبے نندنا کے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر اس نے زمین کے محیط اور قطر کی پیمائش کی۔ جو بالکل ٹھیک تھی۔

۱۰۲۹ء میں البیرونی ہندوستان سے واپس ہوا اور اگلے برس محمود کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مسعود غزنوی تخت نشین ہوا تو البیرونی اس کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ اسی کے دربار میں اس نے ہیئت اور نجوم کی ایک کتاب لکھی اور اس کا نام مسعود کے نام پر "قانون مسعودی" رکھا۔ ۱۰۴۰ء میں مسعود قتل ہوا اور اس کا بیٹا مودود تخت نشین ہوا۔ البیرونی کا تعلق اس کے دربار سے بھی رہا۔ یہیں اس نے جواہرات کے خواص پر ایک رسالہ لکھا۔ آٹھ برس یہاں رہنے کے بعد دنیا کا یہ نامور فرزند اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مورخ شہرزوری لکھتا ہے کہ البیرونی ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتا۔ اس کا ہاتھ قلم کو، آنکھ مطالعے کو اور دل غور و فکر کو صرف کھانے کے اوقات میں چھوڑتا تھا۔ تصانیف ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ ہیں۔ مورخ یاقوت لکھتا ہے کہ اس نے وقف جامع مرو میں البیرونی کی کتابوں کی فہرست دیکھی جو ساٹھ اوراق پر مشتمل تھی۔

البیرونی کی تصانیف میں "آثار الباقیہ" ایک اہم تاریخی، مذہبی اور علمی مسائل پر تنقیدی کتاب ہے۔ اس کا عربی متن ۱۸۷۸ء میں لیپزگ (جرمنی) سے شائع ہوا اور انگریزی ترجمہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ "کتاب الہند" اصل عربی میں لیپزگ سے ۱۸۸۷ء میں انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۸۸ء میں اور اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ "قانون مسعودی" کا اصل عربی متن حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ اس کے بعض متن یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ دیگر اہم تصانیف میں "تاریخ خوارزم"، "تاریخ محمود غزنوی"، "کتاب التفہیم"، "کتاب الصیدنہ فی الطب"، "کتاب الجماہر الجواہر" اور "کتاب الدستور" قابل ذکر ہیں۔

علم و فضل میں البیرونی کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ علم ہیئت کے مطالعے کے لیے اس نے اصطرلاب بھی ایجاد کیا تھا۔ اس کے علاوہ نظام شمسی یعنی سیاروں کو اپنے اپنے محور پر اور سورج کے گرد گردش کا حساب لگایا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جغرافیائی تبدیلیوں کی وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ وہ علم جفر اور دست شناسی کا بھی ماہر تھا اور محمود غزنوی کو مستقبل کے واقعات بتایا کرتا تھا۔ حساب میں اکائی، نسبت تناسب کے قاعدے، جذر نکالنے کا طریقہ اور قبلہ کی سمت کا تعین کرنے اور جیومیٹری کے بہت سے مسائل اسی کے دریافت کردہ تھے۔ اس نے زمین کا محیط ۲۴۷۰۹ میل نکالا تھا جو جدید پیمائش سے صرف ۹۰ میل کم ہے۔ اسی نے سب سے پہلے علم تقسیم الارض کا آغاز کیا۔ وہ ریاضی کی ایک شاخ کیلکولس کا بھی موجد تھا۔ طبیعیات میں اس نے مائعات کے خواص کا مطالعہ کیا اور بتایا کہ پانی فوارے میں کیوں چڑھتا ہے۔ نیز سطح ہموار کیوں ہوتی ہے۔ اس نے قیمتی پتھروں، زمین کی مختلف تہوں اور چٹانوں اور معدنیات کی اقسام کا مطالعہ بھی کیا تھا اور زمین کی عمر بھی حساب لگا کر نکالی تھی۔

تاریخ اور مذاہب کے میدان میں البیرونی آنکھیں بند کر کے چلنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ اس کی ذات ادب اور سائنس کا سنگم تھی۔ ایک طرف عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، سریانی اور عبرانی زبانوں کا ماہر تھا اور دوسری طرف ریاضی کے پیچیدہ مسائل سے آگاہ تھا۔ اس نے ہر مذہب کا مطالعہ اس کی مقدس کتاب اور براہ راست اسی کی زبان میں کیا۔ اس کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس نے اپنی طویل زندگی میں کبھی بھی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ استغنا اس قدر تھا کہ اپنے علمی مشاغل کا معاوضہ ضروریات سے زیادہ لینا اپنی توہین سمجھتا اور یہی اس کی فضیلت کا باعث بنا۔ پاکستان میں ۲۶ نومبر سے ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء تک البیرونی کی یاد میں بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی۔ جس میں [illegible] عظیم دانشور کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

البیّنہ، سورۃ قرآن مجید کی ۹۸ ویں سورت۔ البینہ کا لفظ اس کی پہلی آیت [illegible] ہے۔ اس میں کل آٹھ آیات ہیں۔ اس کے مکی اور مدنی ہونے [illegible] ابن زبیرؓ اور عطاء بن یسار کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے [illegible] عائشہؓ [illegible] ہیں مگر نفس مضمون سے اس پر کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس سورت میں [illegible] کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری ہے۔

اس سورت کا موضوع آنحضورؐ کی رسالت کی صداقت [illegible] قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ رسول کو بھیجنے کی ضرورت کیوں [illegible] کے لوگ، خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے۔ جس کفر کی حالت [illegible] اس سے ان کا نکلنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک رسول بھیجا جاتا [illegible] پر روشن دلیل ہو۔ نیز اہل کتاب کی بعض گمراہیوں کی وضاحت کی گئی ہے کہ [illegible] راستوں پر بھٹکنے کا واضح بیان ان کے پاس آ چکا ہے۔ اب بھی اگر وہ بھٹکتے [illegible] لیے جہنم کی آگ مقدر ہو چکی ہے اور جو صحیح دین کو اختیار کرے۔ خالص اللہ کی بندگی [illegible] قائم کرے اور زکوٰۃ دے تو اس کے لئے رب کے ہاں دائمی قیام کے باغ ہیں [illegible] ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

الپ ارسلان [illegible] محرم ۴۲۰ھ/۲۰ جنوری ۱۰۲۹ء [illegible] ربیع الاول ۴۶۵ھ/[illegible] دسمبر ۱۰۷۲ء [illegible] عضد الدولہ محمد بن داؤد چغری بیگ سلجوقی سلطنت کا دوسرا حکمران [illegible]

آں میں اپنے والد کے ساتھ جنگی مہموں میں شرکت کرنے لگا۔ بالخصوص آل غزنہ کے خلاف بڑی کامیابی سے افواج کی قیادت کی۔

۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں ایران میں ابراہیم ینال نے بغاوت کر دی۔ اس دوران میں الپ ارسلان نے اپنے چچا طغرل بیگ کی جان بچائی۔ تین سال بعد اپنے باپ چغری بیگ کی جا سنبھالی اور ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں طغرل بیگ کا جانشین بھی ہو گیا۔ کیونکہ طغرل بیگ لاولد تھا۔

اب تمام سلجوقی سلطنت اس کے ہاتھ [illegible] چکی تھی۔ اس نے اپنے سوتیلے بھائی اور طغرل بیگ کے منتخب سلیمان سے بڑی آسانی سے نجات حاصل کر لی۔ خلیفہ القائم نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور تمام امتیازات عطا کیے۔

[illegible] مقام [illegible] چچا بیغو کو اطاعت کرنے پر مجبور کر کے اپنے والد کے ایک چچا زاد بھائی قتلمش کو شکست دی۔ اپنے بڑے بھائی قاورد سے بھی ۴۵۷ھ/۱۰۶۵ء [illegible] ۱۰۶۹ء تک [illegible] بار جنگ کی اور آخر اسے [illegible] پر کرمان کا حاکم رہنے دیا اور [illegible] میں اس نے سلجوقی سلطنت کو بہت مضبوط کر دیا۔

الپ ارسلان کی زیادہ تر شہرت [illegible] اس کے حملوں کی وجہ سے [illegible] تخت نشینی [illegible] کے بعد اس نے بازنطینیوں [illegible] کے خلاف حملوں کا ایک سلسلہ شروع [illegible] قبضہ کر لیا۔ ان مہمات کی وجہ سے آذربائیجان [illegible]

[illegible] سلطنت کی شامی اور ارمنی سرحدوں پر [illegible]

[illegible] فاطمی مصر کی طرف بڑھا [illegible] حاصل [illegible] بازنطینی شہنشاہ رومانوس [illegible] ذی قعدہ ۴۶۳ھ/اگست [illegible] اور شام سے پہلے ہی [illegible] فتوحات [illegible] کے سامنے [illegible] کے اس [illegible]

[illegible] ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء [illegible] زخمی ہو گیا۔ اور عین جوانی کے عالم میں اپنے [illegible]

الپ ارسلان [illegible] کے نزدیک وہ کریم النفس [illegible] ثقافت اور تہذیب [illegible] مرقع [illegible] ایک کتاب "ملک نامہ" تصنیف [illegible] کا سراغ لگانے اور حالات لکھنے کی سعی کی تھی۔

عیسائی مؤرخ الپ ارسلان کو شفیق القلب اور عالی ظرف [illegible] تھے۔ اس کا خراسانی وزیر نظام الملک طوسی [illegible] ایک [illegible] شخص تھا۔ جس نے سلجوقی سلطنت کے نظم و نسق [illegible] بنیادوں [illegible] ایک کتاب "سیاست نامہ" لکھی۔ الپ ارسلان نے خراسان [illegible] بعض جاگیروں اور مفتوحہ [illegible] کو اپنے خاندان کے ممتاز شہزادوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس لئے اسے اپنی سلطنت کے اندر قائم ہونے والی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قائم ہونے پر [illegible] اعتراض نہ تھا۔ البتہ وہ ان پر کڑی نظر ضرور رکھتا تھا۔

ترکی میں الپ ارسلان کے معنی بہادر شیر کے ہیں۔ اس کے بہادر ہونے میں کلام نہیں صورت شکل سے سچ مچ شیر معلوم ہوتا تھا۔ ملازگرد کا واقعہ بہت سخت تھا۔ رومانوس کے لشکر میں فرانس، نارمنڈی، مقدونیہ اور بلغاریہ کے سپاہیوں کے علاوہ بہت سے حبشی قبائل بھی شامل تھے۔ سلطان نے اس موقع پر سفید لباس پہنا، عطر لگایا۔ نماز پڑھی۔ پھر ترکمان لے کر بڑی بہادری سے لڑا اور جیت گیا۔ آرمینیا اور ایشیائے کوچک سلجوقی سلطنت میں شامل ہو گئے اور ایشیا کا کوئی علاقہ رومیوں کے قبضے میں نہ رہا۔

البلد قرآن مجید کی ۹۰ویں سورت۔ ایک رکوع اور بیس آیات پر مشتمل ہے۔ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ بلد شہر کو کہتے ہیں اور البلد سے مراد مکہ معظمہ ہے۔

اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے آرام کی جگہ نہیں ہے کہ وہ صرف عیش کرتا رہے بلکہ اس دنیا میں اس کی پیدائش مشقت کی حالت میں ہوئی ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اس کے سامنے برائی اور بھلائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں اور ان میں سے ایک راستہ تو پستی کی طرف جاتا ہے اور اس پر جانے کے لئے کوئی مشقت نہیں اٹھانا پڑتی دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے۔ وہ ایک دشوار گذار گھاٹی کی طرح ہے۔ اس پر چلنے کے لئے انسان کو اپنے نفس پر بڑا جبر کرنا پڑتا ہے

آخر میں بتایا گیا ہے کہ وہ گھاٹی جس سے گذر کر آدمی بلندیوں کی طرف جا سکتا ہے، یہ ہے کہ آدمی ریاکاری اور جھوٹی نمائش پر خرچ کرنے کو چھوڑ کر اپنا مال یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرے۔ اللہ پر ایمان لائے اور ایمان والوں کے ساتھ شامل ہو کر خلق خدا پر رحم کھائے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ جو شخص یہ رویہ اختیار کرتا ہے وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہے اور جو اس کے مخالف راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا انجام آتش جہنم ہے۔ جس سے وہ نہیں نکل سکے گا۔

الپتگین (وفات ۳۵۲ھ/۹۶۳ء) غزنوی خاندان کا بانی۔ خراسان کے سامانی حکمران نوح کے زمانے میں سپہ سالار تھا۔ سیاست نامہ کے مصنف نظام الملک طوسی لکھتے ہیں کہ وہ ایک ترک غلام تھا اور اسے احمد اسماعیل نے خریدا تھا۔ نوح کے زمانے میں اسے خراسان کی سپہ سالاری ملی۔ چنانچہ بادشاہ عبدالملک اول کے دور حکومت میں اختیارات کی اصل باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اسے دارالحکومت سے دور کرنے کے لئے بادشاہ نے ذی الحجہ ۳۴۹ھ/فروری ۹۶۱ء میں خراسان کا حاکم مقرر کر دیا۔ شاہ منصور ابن نوح نے اسے اپنے عہدے سے برطرف کر دیا تو وہ بلخ کی طرف ہٹ آیا۔ ربیع الاول ۳۵۱ھ/مئی ۹۶۲ء میں اسے سامانی لشکر کو شکست دی اور خود غزنہ چلا گیا۔ اس نے یہاں کے حکمران کو معزول کر کے ایک خود مختار شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی۔

الپتگین ایک اچھا حوصلہ مند اور جری حکمران تھا۔ طوسی نے اپنی کتاب میں اسے بے مثل حکمران ظاہر کیا ہے۔ اس کے دور حکومت کی ایک مثال بہت مشہور ہے۔ جس میں اس نے یہ حکم نافذ کر دیا کہ کسی کو بغیر قیمت ادا کئے کوئی چیز نہیں لینی چاہیے۔ ورنہ اسے سزا دی جائے گی۔

الپتگین کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق ابراہیم سامانیوں ہی کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد فوجی سردار بلکاتگین اور پری تگین وغیرہ تخت نشین ہوئے اور آخر میں الپتگین کے داماد سبکتگین کو شعبان ۳۶۶ھ/اپریل ۹۷۷ء میں تخت نشین کر دیا گیا۔

التمش (وفات ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) شمس الدنیا والدین، ابوالمظفر ہندوستان میں خاندان غلاماں کا دوسرا حکمران۔ قطب الدین ایبک کا داماد اور جانشین۔ ترکستان میں قبیلہ البری کے رئیس ایل خاں کے ہاں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں بردہ فروشوں نے پکڑ کر بخارا میں صدر جہاں کے اقربا کے پاس فروخت کر دیا۔ چنانچہ ابتدائی تربیت وہیں ہوئی۔ وہاں سے ایک شخص جمال الدین چست قبا نے اسے خرید کر ایک لاکھ جیتل میں سلطان قطب الدین

برصغیر ہند و پاکستان
۱۲۳۶ء میں
التمش کی سلطنت دہلی

ایبک کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ سلطان نے بیٹوں کی طرح پرورش کی اور اپنا داماد بنالیا۔ گوالیا کی تسخیر کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ بعد ازاں بدایوں کا مالک بنا دیا۔

التمش نے اکثر معرکوں میں شجاعت و مردانگی، فراست اور فرزانگی کا ثبوت دیا۔ بارہا قطب الدین کے ہمرکاب دلیری و بہادری کے کارنامے دکھائے۔ بالآخر سلطان نے اسے امیر الامرا بنا دیا۔ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں ایبک ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ التمش بدستور بدایوں کا حاکم رہا۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں ایبک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ایک نا اہل حکمران ثابت ہوا۔ سپہ سالار امیر اسماعیل اور دوسرے ارکان حکومت کی ترغیب پر التمش بدایوں سے دہلی پہنچا اور ۶۰۸ھ/۱۲۱۲ء میں تخت نشین ہو گیا۔

حاکم سندھ ناصر الدین قباچہ اور حاکم غزنہ تاج الدین یلدوز بغاوت پر تل چکے تھے جب خوارزم شاہ نے غزنہ پر قبضہ کیا تو یلدوز وہاں سے نکل کر پنجاب آیا اور ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں قباچہ کو شکست دے کر یہاں کا حاکم بن بیٹھا۔ یہاں سے اس نے دہلی کی طرف پیشقدمی کی مگر التمش سے شکست کھائی اور قید ہوا۔ ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں قباچہ نے بھی صلح کر لی۔ اس کے بعد التمش نے بنگال کے حاکم غیاث الدین عوض کو شکست دی اور اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے انتقال کے بعد عوض کا بیٹا حسام الدین خلجی حاکم بنگال بن بیٹھا۔ اس کی بغاوت فرو کرنے کے بعد التمش نے علاء الدین جانی کو حاکم بنایا اور ۱۲۳۰ء میں دہلی پہنچا۔

۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں التمش نے ریاست رنتھمبور کو فتح کیا۔ اس کے بعد مندور، اوچ، گوالیار اور بھلسہ پر فوج کشی کی۔ دہلی واپس ہونے پر التمش بیمار ہوا اور اسی حالت میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کا مزار مسجد قوت الاسلام دہلی میں موجود ہے۔

شمس الدین التمش ہندوستان کا پہلا مستقل حکمران تھا۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے مختلف ریاستوں کو ملا کر مملکت واحدہ کا تصور پیدا کیا۔ علم نوازی، تعمیرات، حسن انتظام اور رعایا پروری کے لحاظ سے اس نے اپنے ملک کو قابل فخر بنا دیا۔ بے شمار اہل علم و فضل اس کے دربار میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ ...
کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے ...
ہاتھ میں ہیں۔ عام انسان تو درکنار، خود اللہ کے نبی کو بھی ...
گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ...
معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی ...
نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت ...
ضرورت اس امر کی ہے کہ نبی کے اسوۂ حسنہ ...

التمش کا مقام اولیا و اصفیا کی صف ...
ہے کہ اگرچہ بظاہر بادشاہی سے تعلق تھا۔ مگر دل سے ...
راتوں کو عموماً بیدار رہتا۔ غلاموں اور نوکروں میں سے کسی ...
گدڑی پہن کر رات کی تاریکی میں شہر کے ...
لیے باعث عزت سمجھتا۔ کتاب طبقات ناصری ...
مقابلے میں کروڑ بخشنے کا طریقہ جاری کیا ...
حکمران تھا۔

التحریم، سورہ قرآن مجید کی ۶۶ویں سورت ... نام التحریم اس واقعہ سے لیا گیا ہے، جو ... آیا یعنی واقعہ ایلاء۔ جس میں آپؐ نے ازواج مطہرات کے رویے ... ناراضگی اختیار کر لی تھی۔ اس سورت کا نزول ... وقت ہوا تھا۔

سورت کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے "اے نبیؐ! تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو ... منشائے الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین بے لاگ ہے۔ ... ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے، جس کا وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔

التغابن، سورۃ قرآن مجید کی ۶۴ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۱۸ آیات ہیں۔

تغابن کے معنی کمی ظاہر ہونے کے ہیں، جو اعمال کے سلسلے میں انسان سے ہوگی۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس اور عطا بن یسار کہتے ہیں کہ پہلی تیرہ آیات مکی ہیں اور باقی پانچ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مگر مفسرین کی اکثریت اسے مدنی قرار دیتی ہے۔

اس سورت کی پہلی چار آیات میں تمام انسانوں سے مخاطب ہو کر بتایا گیا ہے۔ اللہ ہی اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے۔ تمام اشیا اسی کی تسبیح کر رہی ہیں اسی نے تمھیں پیدا کیا۔ تمھاری صورت بنائی۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہوا اور کوئی مومن اور آخری وقت تمھیں وہیں پلٹنا ہے۔ اگلی چھ آیات میں ان لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے، جو قرآن کی دعوت نہیں مانتے اور اس کے بعد آخری آیات میں ان لوگوں سے خطاب ہے، جو اس دعوت کو مانتے ہیں۔ انھیں یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ دنیا کی ہر مصیبت اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ جو ثابت قدم رہتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے۔ نیز مومن کے لیے اس کا مال اور اس کے اہل و عیال ایک بہت بڑی آزمائش ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر انھی کی محبت انسان کو ایمان و اطاعت کی راہ سے منحرف کرتی ہے اس لیے اہل ایمان کو اپنے اہل و عیال سے ہوشیار رہنا چاہیے اور اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی راہ پر مال و دولت کو صرف کرنا چاہیے۔

التکاثر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۲ ویں سورت۔ اس میں کل آٹھ آیات ہیں۔ پہلی آیت کے لفظ تکاثر سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔ تمام مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کثرت مال و دولت کی خواہش اور ترتیب انسانی کو اصل مقصد زندگی سے غافل رکھتی ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابوبریدہ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی حرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کی بڑائی بیان کی پھر قبرستان جا کر اپنے اپنے مرے ہوئے لوگوں کی بڑائی بیان کی۔ اس پر یہ ارشاد الہٰی نازل ہوا۔ مولانا مودودی کی رائے میں یہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے فعل پر یہ سورۃ چسپاں کی گئی ہو۔

اس سورت میں لوگوں کو دنیا پرستی کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ جاہ و حشم حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور ان پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور انھیں علم نہیں کہ وہ غفلت میں ہیں اور ایک نہ ایک روز ان نعمتوں کے بارے میں ضرور جواب طلبی کی جائے گی۔

التکویر، سورۃ قرآن مجید کی ۸۱ ویں سورت۔ اس میں ۲۹ آیات ہیں اور اس میں قیامت کے دن مذاہب کی صف لپیٹنے کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کا نام التکویر ہے یہ سورت ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے دو موضوع ہیں۔ آخرت اور رسالت پہلی چھ آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب سورج بے نور ہو جائے گا، جب تارے بکھر جائیں گے، جب پہاڑ اکھڑنے لگیں گے اور جب لوگوں کو اپنے مال و متاع کا ہوش نہیں رہے گا۔ جنگلوں کے بدحواس جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر بھڑک اٹھیں گے۔ پھر سات آیات میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے، جب روحیں از سر نو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی۔ نامۂ اعمال کھول دیے جائیں گے۔ جرائم کی بازپرس ہوگی۔ آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور دوزخ جنت سب چیزیں نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ اس وقت ہر انسان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا۔ ۴۔ اس کے بعد رسالت کا مضمون بیان ہوا ہے۔ اس میں اہل مکہ کو کہا گیا ہے کہ تمہارے یہ رفیق (محمد صلعم) مجنوں نہیں اور نہ یہ کوئی بے پر کی ہانکتے ہیں۔ نہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے۔ بلکہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے بزرگ پیغامبر کا بیان ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ پھر یہ لوگ کیوں نہیں سنتے؟ اور اس پیغام سے منہ موڑ کر کدھر چلے جا رہے ہیں۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔

التوبہ، سورۃ قرآن مجید کی نویں سورت۔ یہ البراءۃ کے نام سے بھی مشہور ہے اس میں کل ۱۶ رکوع اور ۱۲۹ آیات ہیں۔ البراۃ کا لفظ پہلی آیت میں ہے توبہ اس لحاظ سے کہ اس میں ایک جگہ بعض اہل ایمان کے قصوروں کی معافی کا ذکر ہے اور براۃ اس لحاظ سے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے یہ وہ سورت ہے جس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی۔ امام رازی کے بقول خود آنحضورؐ نے بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی۔ اس کا زمانۂ نزول ۹ھ کے لگ بھگ ہے۔ اس میں پہلے پانچ رکوع حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر کر کے روانہ کرنے کے بعد نازل ہوئے۔ اگلے چار رکوع غزوہ تبوک کی تیاری کے وقت نازل ہوئے اور باقی آیات غزوہ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئیں۔ گویا پہلے پانچ رکوع سب سے بعد میں نازل ہوئے وہ امور جن کے پیش نظر سورۂ توبہ نازل ہوئی یہ تھے۔

۱۔ چونکہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ مخالف قوتوں اور قدیم نظام کا خاتمہ کر دیا جائے اور رسوم جاہلیت کا قلع قمع کیا جاسکے۔

۲۔ ہمسایہ ممالک کو دین حق کی دعوت دینا اور انھیں پرچم اسلام تلے لانا ضروری ہو چکا تھا۔

۳۔ داخلی امور پر توجہ دی جانا ضروری تھی۔ تاکہ منافقین کی بیخ کنی کی جائے۔ اسی لیے آنحضورؐ نے غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانے میں سویلم کے گھر میں آگ لگوا دی۔ جہاں یہ لوگ جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور اسی پالیسی کے تحت تبوک سے واپسی کے بعد مسجد ضرار کو ڈھانے اور جلانے کا حکم دیا۔

۴۔ مسلمانوں میں عزم صمیم بیدار کرنا اور کفر و اسلام کی کش مکش میں انھیں اسلام کے لیے جان و مال فدا کرنے کے لیے پرجوش بنانا۔

جیسا کہ اس سورت کے نام البراۃ سے ظاہر ہے۔ پہلے رکوع میں کفار کی شرارتوں کا سد باب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان سے علیحدگی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بار بار کی عہد شکنی تھی۔ دوسرے رکوع میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کے ساتھ ابھی جنگ ہونے والی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیا تھا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ مسلمانوں کو اسلام کی خاطر مال و جانی قربانیاں دینا چاہئیں۔ چوتھے رکوع میں بتایا کہ اپنی کثرت پر کبھی ناز نہ کرنا۔ تمھیں صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت کامیاب کر رہی ہے۔ نیز فرمایا کہ مشرکوں کو خانہ کعبہ کے قریب نہ آنے دو۔ پانچویں رکوع میں اہل کتاب کی اسلام کے خلاف کوششوں کا ذکر کر کے اسلام کے آخری غلبہ کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ چھٹے رکوع میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے۔ ساتویں میں منافقین کے پیچھے رہ جانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اسلام کو تباہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آٹھویں رکوع میں منافقوں کی ایذا رسانی اور نویں میں نفاق کا انجام ناکامی بیان کیا گیا ہے۔ دسویں میں منافقوں سے جہاد کا اور گیارہویں میں ان سے کامل قطع تعلق کا حکم ہے۔ بارہویں اور تیرہویں میں منافقوں اور ان کے گروہوں کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو دوہرا عذاب ملے گا۔ یہیں

مسجد ضرار کا ذکر ہے۔ چودھویں اور پندرہویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ مومنوں کا خدا کے ساتھ کیا عہد ہے اور انھوں نے اپنی خدمات کو کس طرح سے انجام دینا ہے کہ آنحضورؐ دنیا کو گناہ اور ہلاکت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ اسی پر سورت کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

التین، سورۃ قرآن مجید کی ۹۵ ویں سورت۔ اس میں آٹھ آیات ہیں۔ اس میں انجیر، زیتون، طور سینا اور امین کے شہر کو گواہ ٹھہرا کر انسان کو بہترین صورت پر پیدا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اس کا موضوع جزا و سزا ہے۔ یہاں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو بہترین نمونے پر پیدا کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے۔ یہ چیز کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں۔ پھر بتایا گیا کہ اکثر انسانوں میں کچھ برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور انسان اخلاقی پستی میں گر کر جانوروں سے بھی نیچ ہو گیا ہے۔ مگر وہ جو نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ مخلوق میں بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔ یہ خدا کا انصاف ہے اور وہ سب سے بڑا حاکم ہے۔

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی سورہ التین پڑھے اور آخری آیت کے اختتام پر پہنچے تو کہے بلیٰ وانا علیٰ ذلک من الشّٰھدین۔ (ہاں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔)

الجاثیہ، سورۃ قرآن مجید کی ۴۵ ویں سورت، اس میں کل چار رکوع اور ۳۷ آیات ہیں۔ اس میں توحید و آخرت سے متعلق کفار مکہ کے شبہات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ سورت مکہ کے درمیانی دور میں نازل ہوئی تھی۔

سورت کے آغاز میں زمین و آسمان کی بے شمار نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ تم جدھر بھی نگاہ ڈالو گے، ہر چیز اسی کی توحید کی شہادت دے رہی ہوگی۔ اس ساری کائنات کو بنانے والا وہی اکیلا فرمانروا ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی خدمت میں آنے والی تمام اشیاء اسی خدا کی نعمتیں ہیں اگر انسان عقل سے کام لے تو یقیناً پکار اٹھے کہ وہی خدا انسان کا محسن ہے۔ اس کے بعد کفار مکہ کو ان کی ہٹ دھرمی پر ملامت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل کی مثال دی گئی ہے کہ انھوں نے کلام الہٰی کی قدر نہ کی۔ تو یہ دولت ان سے چھن گئی پھر عقیدہ آخرت سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ محض گمان ہے کہ انسان دوبارہ زندہ نہیں ہوگا۔ انکار آخرت ان لوگوں کے لیے تباہ کن ہے اور یہ لوگ گمراہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ان کے اعمال ان کے سامنے آ چکے ہیں۔

الجایتو خدابندہ (وفات ۲۸ رجب ۷۱۶ھ/ ۲۶ دسمبر ۱۳۱۶ء) ایران کا آٹھواں ایل خانی حکمران۔ ارغون خان کا پوتا تھا۔ چوبیس برس کی عمر میں ۷۰۳ھ/ ۱۳۰۳ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کا نام خربندہ تھا اور مذہباً عیسائی تھا۔ بعدازاں مسلمان ہوا اور محمد خدابندہ نام رکھا۔ یہ غازان کا جانشین تھا۔ اس کی طرح اس نے بھی یورپ کی عیسائی سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے پہلے اس کا میلان شیعوں کی طرف تھا۔ بعدازاں اس نے سنی مسلک اختیار کر لیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بعد میں شیعہ ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ علمی ادبی مشاغل کی قدردانی کرتا تھا۔ تیرہ سال حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا اور سلطانیہ میں مدفون ہوا۔ جسے اس نے پایہ تخت بنا رکھا تھا۔ اس کا بیٹا ابوسعید آخری ایل خانی حکمران ثابت ہوا۔

الجزائر شمالی افریقہ میں موجود اسلامی ملک۔ جس کے شمال میں بحر روم، مشرق میں تیونس، جنوب میں نائیجر یا اور مالی اور مغرب میں مراکش واقع ہیں جنوب کا زیادہ تر علاقہ صحرا پر مشتمل ہے کل رقبہ ۹۶۵ ۸۰۸ مربع میل (۲۳۲۲۱۹۲ مربع کلومیٹر) ہے۔ آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۴۶۲۰۰ تھی۔ سب سے بڑا شہر اور صدر مقام الجزیرہ ہے۔ زبان عربی ہے۔

تاریخ:۔ سولھویں صدی عیسوی میں اس علاقے پر ترکوں کی حکمرانی تھی۔ مسلمان یہاں ساتویں صدی عیسوی / پہلی صدی ہجری میں پہنچے تھے۔ ترکوں کے قبضے سے ایک صدی پہلے یہاں الموحدون کی حکومت تھی۔ ترکوں کی طرف سے یہاں پاشا حاکم مقرر ہوتے رہے۔ ان کے بعد آغا اور ڈے منتخب ہوتے جو تین تین سال تک حکومت کرتے تھے۔ ترکوں کو الجزائر کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور نظم و نسق کی درستی کا موقع نہ مل سکا۔ ہسپانیہ نے کئی بار اس پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ۱۸۱۶ء میں فرانس نے الجزائر پر پہلا حملہ کیا۔ ۱۸۳۰ء میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ سید محی الدین الحسنی نے مختلف ریاستوں کو باہم ملانے کی کوشش کی اور فرانس کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اس تحریک کو ان کے فرزند امیر عبدالقادر نے ۱۸۴۷ء تک سنبھالے رکھا۔ فرانس نے سازشوں کے ذریعے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور امیر عبدالقادر کو فرانس میں نظربند کر دیا گیا۔ جسے ۱۸۵۲ء میں نپولین سوم نے رہا کیا۔

اس زمانے میں الجزائر کی آبادی نصف لاکھ سے بھی کم تھی۔ حکومت فرانس نے یہاں آبادکاری کا سلسلہ شروع کیا۔ نیز مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کیں۔ اس اثنا میں بھی مسلمانوں نے علم جہاد سرنگوں نہ ہونے دیا۔ ان کی تحریک آزادی برقرار رہی۔ جس کے دباؤ میں آ کر حکومت فرانس نے الجزائر کو نظم و نسق کی داخلی خودمختاری دے دی۔ اگرچہ اس کی براہ راست باگ ڈور حکومت فرانس کے ہاتھ میں رہی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے فیصلے کی رو سے مسلمانوں کو فرانسیسی قومیت اختیار کرنے کا حق مل گیا۔ ۱۹۰۰ء میں شہر الجزائر کی پنچایت نے انقلابی سلطنت قائم کر لی اور مکمل مالی اور انتظامی آزادی ۱۹۰۰ء میں حاصل کر لی۔ ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۵ء کی جنگ میں الجزائر نے نمایاں حصہ لیا۔ یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو محاذ حریت وطنی نے فرانسیسی حکومت کے خلاف علانیہ جنگ شروع کر دی

ستمبر ۱۹۵۸ء میں قاہرہ میں آزاد الجزائر حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۶۲ء فرانسیسی اور آزاد حکومت کے مابین بات چیت شروع ہوئی۔ ۷ اپریل ۱۹۶۲ء کو عبدالرحمان فارس کی صدارت میں ایک عارضی حکومت قائم ہوئی اور اس کے حق میں استصواب کرایا گیا۔ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو صدر ڈیگال نے الجزائر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۲۵ ستمبر کو مجلس ملی کے اجلاس میں فرحت عباس کو صدر اور بن بیلا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں بن بیلا

[illegible] منتخب کیا گیا۔ ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کی فوجی بغاوت کے بعد کرنل بومحی الدین (بومدین) نئی حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں بومدین کے انتقال کے بعد شاذلی صدر منتخب ہوئے۔

جغرافیائی اور اقتصادی معلومات: الجزائر میں سفید بربر نسل کے لوگ بستے ہیں۔ کچھ ترک اور کچھ عرب ہیں۔ فرانسیسی آباد کار بھی یہیں رچ بس گئے ہیں۔ یہاں مالکی فقہ رائج ہے۔ جس کا اپنا سلسلہ تصوف ہے۔ سلام الجزائر کی معاشرتی زندگی کے اندر سرایت کر گیا ہے۔ زیادہ تر لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تل کے زرخیز میدانوں میں کہیں کہیں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ تین چوتھائی زمین میں گیہوں کی فصل اور زیتون کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں کھجور اور انجیر کے درخت بھی وافر تعداد میں ملتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر گیہوں، جو، جوار، آلو، تمباکو، کھجور، انگور، نارنگیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ چراگاہوں میں مویشی پالے جاتے ہیں۔ ملک کی برآمدات میں مٹی کا تیل اور کھجور ہیں۔ زیادہ تر تجارت فرانس، مغربی جرمنی، امریکا، اٹلی اور روس سے ہوتی ہے۔ ملک کے شمالی حصّے میں ریلیں اور سڑکیں موجود ہیں۔ تیل، گیس، برقی اشیاء اور فولاد کی صنعتیں قائم ہیں۔ ان تمام ذرائع کی بناء پر الجزائر ایک خوشحال ملک گنا جا سکتا ہے

الجمعہ، سورۃ قرآن مجید کی ۶۲ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور گیارہ آیات ہیں یہ سورت ۷ھ کے قریب مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں نماز جمعہ کے احکامات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس سورت کے دونوں رکوع الگ الگ زمانوں میں نازل ہوتے۔ اس لیے ان کے مضامین بھی الگ الگ ہیں۔ پہلے رکوع میں یہودیوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ انھوں نے اس رسولؐ کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے توریت کے احکامات پر عمل نہ کیا اور آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے رہے۔ اگر وہ واقعی اللہ کی چہیتی قوم ہے تو انھیں یقین ہوتا کہ اللہ کے ہاں بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے۔ یہ لوگ اپنے کرتوتوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار رہیں گے۔ دوسرے رکوع میں اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کے سبت کے مقابلے میں مسلمانوں کو جمعہ کا دن عطا فرمایا اور یہ حکم دیا کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو یہودیوں نے سبت کے ساتھ کیا تھا

الجن، سورۃ قرآن مجید کی ۷۲ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۲۸ آیات ہیں۔ اس میں جنوں کا ذکر آتا ہے۔ جنھوں نے مکہ میں آنحضورؐ سے قرآن سنا اور پھر اپنے لوگوں میں جا کر اس کی تبلیغ کی۔ اس سورت کا زمانہ نزول آنحضورؐ کے سفر طائف سے تعلق رکھتا ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ بازار عکاظ تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں نخلہ کے مقام پر آپ نے صبح کی نماز پڑھائی۔ اس وقت جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ مزید روایات میں یہ مذکور ہے کہ آنحضورؐ سفر طائف کے بعد نخلہ میں ٹھہرے تھے۔

سورت کا موضوع جنوں کے قرآن سننے سے بحث کرتا ہے۔ ان کے ایک گروہ نے اسے غور سے سنا اور پھر کہا "ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے۔ جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔" ان لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ آسمان سے ہدایات ملنا بند ہو گئی ہیں اور وہ کوئی آسمانی خبر نہیں پا رہے تو اس کی تلاش میں نکلے اور جب ہدایت سنی تو ایمان لے آئے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ میں کہا گیا ہے کہ لوگ شرک سے باز آ جائیں اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہیں تو ان پر اللہ کی نعمتوں کی بارش ہو گی۔ ورنہ اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہو گا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۳ تک کفار کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ کا رسولؐ دعوت کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں حالانکہ رسولؐ کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچا دینا ہے۔ اگلی دو آیات میں کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آج وہ رسولؐ کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب انھیں علم ہو جائے گا کہ حقیقت میں بے یار و مددگار کون ہے۔ اس وقت کا رسولؐ کو بھی علم نہیں مگر وہ وقت ضرور آئے گا۔ آخر میں اللہ کے عالم الغیب ہونے کا ذکر ہے۔ وہ اپنے غیب سے کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ سوائے اس رسولؐ کے جسے اس نے

منتخب کر لیا ہو۔ رسول بھی اللہ کے حکم سے سر مو اختلاف نہیں کرتا۔

الحاد انحراف، کج روی، گمراہی، سیدھی بات سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرنا اگر تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کی بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں اسے الحد السہم الہدف کہتے ہیں۔

عام طور پر الحاد کے معنی کفر کے لئے جاتے ہیں۔ جبکہ الحاد وسط سے ہٹ جانے شدت اختیار کرنے اور منحرف ہونے کو کہتے ہیں اور یہ سب کچھ کفر کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ (دیکھئے "کفر") قرآن مجید میں سورۃ حم السجدہ میں بیان ہوتا ہے:

"جو لوگ ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں، وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ...." (۴۱ : ۴۰) اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص آیات الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب نہ لے اور مختلف غلط معنی انہیں پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے وہ الحاد کا مرتکب ہوتا ہے۔ کفار مکہ قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لئے جو چالیں چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات میں تحریف و تعریف کرتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے۔ یہ لوگ ملحد اور مشرک تھے اور ہر معاملے میں راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ کی ذات کے ساتھ بھی الحاد کرتے تھے ان کے بارے میں قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے۔ اسے اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں الحاد کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔" (۷ : ۱۸۰)

خدا کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ نہ کو ایسے نام دیئے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، یا جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں یا جن سے اس کی ذات اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔ نیز مخلوقات میں سے کسی کا ایسا نام رکھنا جو صرف خدا کے لئے ہی موزوں ہو، الحاد ہی کہلاتے گا۔ (نیز دیکھئے "شرک"، "کفر")

الحاقۃ، سورۃ قرآن مجید کی ۶۹ ویں سورت، مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ اس میں دو رکوع اور باون آیات ہیں۔ اس کے نام میں اشارہ اس طرف ہے جو کچھ بدی کا اور اللہ تعالےٰ سے قطع تعلق کا نتیجہ ہے۔ وہ کسی صورت میں نہیں ٹل سکتا۔ یہ وہ دور تھا جب کفار کی مخالفت نے اتنی شدت اختیار نہیں کی تھی۔

پہلے رکوع کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آئے گی اور جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ بالآخر خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہیں۔ دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کسی شاعر اور ساحر کا کلام نہیں یہ منجانب اللہ ہے اور رسول کو یہ طاقت نہیں کہ وہ اس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی گھٹا دے یا بڑھا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ بھی سزا سے نہیں بچ سکے گا۔

الحج، سورۃ قرآن پاک کی ۲۲ ویں سورت، اس میں دس رکوع اور ۷۸ آیات ہیں۔ اس میں حج کا موضوع بیان ہوا ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی، مفسرین میں نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔ مولانا مودودی کے نزدیک اس کا ابتدائی حصہ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوا اور ۲۵ ویں آیت سے آگے مدینہ میں نازل ہوئی۔

ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ حق کی مخالفت کرنے والی قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ نیز حق کی فتح یقینی ہے اور کوئی دنیا کی طاقت اس کی نصرت کو نہیں روک سکتی۔ اس کے تیسرے رکوع میں ان مسلمانوں کے اچھے انجام کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے۔ اس کے چوتھے رکوع میں فرضیت حج کا ذکر ہے۔ اگلے رکوع میں قربانی کی اصل غرض بتائی گئی ہے۔ چھٹے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ مالی قربانیوں کے ساتھ جان کی قربانی بھی دی جائے۔ کیونکہ اب اس کا وقت آ چکا ہے۔ اگلے رکوعات میں حق کے دشمنوں کو ان کے انجام سے باخبر کیا گیا ہے اور مومنوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی سب قوموں کو توحید کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ دین بھی اسی کی تعلیم دیتا ہے۔ نیز [illegible] کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کو انجام خیر کی بشارت دی گئی ہے اور ساتھ ہی سمجھایا گیا ہے کہ کامیابی کا انحصار اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور [illegible] ہے۔

الحجر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۵ ویں سورت [illegible] میں چھ رکوع اور ننانوے [illegible]

حجر کے معنی پتھر کے ہیں۔ اس سورت [illegible] قوم کا ذکر ہے [illegible] وادی میں رہتی تھی۔ اور قوم ثمود کی [illegible] [illegible] تو ان لوگوں [illegible] آپ کی راہ [illegible] ہمت افزائی بھی کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں [illegible] دوسرے رکوع میں [illegible] بتایا گیا ہے کہ [illegible] شیطان کے پیچھے [illegible] ہے اور متقی لوگ کامیاب رہتے ہیں [illegible] قوم ثمود کی تباہی اور بربادی کا ذکر کر کے [illegible]

الحجرات، سورۃ قرآن پاک کی [illegible] مدینہ میں نازل ہوئی [illegible] ہے اور اس کے نازل ہونے [illegible] ہے۔

اس سورت میں مسلمانوں کو آداب [illegible] کے معاملے میں ملحوظ رکھنے چاہئیں [illegible] کر لینا چاہیے۔ اگر کسی فرد یا قوم کے [illegible] تحقیق کر لی جائے۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ [illegible] ان میں اصلاح کی کوشش کریں اور ظالم گروہ [illegible] تیار رہیں۔ [illegible] کرتی ہیں اور آپس کے تعلقات کو بگاڑتی ہیں [illegible] مذاق اڑانے اور طعن و تشنیع کرنے سے منع [illegible] امتیازات کی یہ کہہ کر کہ تمام انسانوں کی اصل [illegible] میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کا زبانی دعوے کچھ وقعت نہیں رکھتا [illegible]

الحدید، سورۃ یہ قرآن مجید کی ۵۷ ویں سورت ہے مدینہ میں نازل ہوئی [illegible] چار رکوع اور انتیس آیات ہیں [illegible] سورت میں [illegible] کا ذکر ہے کہ جب لوگ حق کو نیست و نابود کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو [illegible] کو بھی نوا اٹھا پڑتی ہے [illegible] سورت میں مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں مالی قربانیاں [illegible]

کے لیے آمادہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس زمانے میں سورت نازل ہوئی اُس وقت مسلمانوں کا کفار کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ برپا تھا۔ لہٰذا حکم دیا گیا کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ کی راہ میں خوب دل کھول کر مال خرچ کیا جائے۔ نیز یہ کہ مال خرچ کرنے کی قدر و قیمت مختلف مواقع کی نزاکت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے جو لوگ جتنے زیادہ کڑے وقت میں قربانی دیتے ہیں ان کا درجہ دوسرے لوگوں سے اتنا ہی زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال تو اللہ کے ذمہ ایک قرض ہے اور یہ کہ زندگی تو چند روزہ ہے پائیدار زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس دنیا میں راحت اور مصائب جو کچھ بھی آتے ہیں وہ اللہ کے ہاں پہلے سے لکھے ہوئے نوشتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ مصیبت میں مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے اور آرام و آسائش ملنے پر اترا نہ جائے۔

الحشر، سورۃ: قرآن مجید کی ۵۹ ویں سورت۔ مدینہ میں نازل ہوئی اس میں تین رکوع اور چوبیس آیات ہیں۔ اس کو سورت بنی نضیر بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سورت میں بنی نضیر کی جلاوطنی کا ذکر ہے۔ [illegible] یہ ان کی ریشہ دوانیوں اور شرارتوں کی سزا تھی جو وہ مختلف اوقات میں مسلمانوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس تعلق [illegible] بات سمجھائی گئی ہے کہ یہود کا ایک بڑا قبیلہ جس کی افرادی قوت [illegible] کی [illegible] جن ان سے ہاں کر لی کی [illegible] چند روز کے محاصرے [illegible] ایسی بغیر جان لڑائی کے چھوڑ کر چلے جانے پر آمادہ ہو [illegible] رسول سے بر سر پیکار ہوتے تھے۔

[illegible] اور علاقے جو جنگ کے بعد مسلمانوں کے [illegible] نیز منافقین کے بارے میں بتایا گیا [illegible] بنی نضیر کا ساتھ جنگ کے موقع پر [illegible]

[illegible] اور نفس میں کیا فرق ہے اور ایمان [illegible] اہمیت ہے۔

الحمد للہ: [illegible] تعریف ہے۔ یعنی تعریف کی مستحق صرف ذات باری ہے۔ سورۃ [illegible] حمد وہ تعریف ہے جو فضیلت کی [illegible] یعنی ان خوبیوں کی وجہ سے جو دوسرے کو مسخر کر لیتی ہیں

[illegible] کی تعریف دو وجوہ سے کی جاتی ہے ایک یہ کہ اس میں بجائے خود حسن و خوبی [illegible] یہ کہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعتراف نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیوں کا ذکر کریں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حیثیتوں میں صاحب تعریف ہے۔ مسلمان جب کبھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے خواہ وہ کھانے کے بعد ہو یا کسی کام کے [illegible] الحمد للہ کے الفاظ ہی استعمال کرتا ہے۔

حمد کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ حمد قولی: زبان سے شکر ادا کرنا۔

۲۔ حمد فعلی: جسم کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرنا۔ جیسے نماز، روزہ۔

۳۔ حمد حالی: اللہ کی تعریف خلوص دل اور سچی روح کے ساتھ۔

الحمراء: غرناطہ (سپین) میں اسلامی تمدن کی یادگار عمارت، جس میں سرخ رنگ کا ایک قلعہ اور ایک محل اب تک ایستادہ ہیں۔ قلعہ کا ذکر پہلے امیر اندلس عبداللہ کے عہد (۲۷۷ھ/۸۹۰ء) میں ملتا ہے۔ محل کی تعمیر ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں محمد بن الاحمر نے شروع کرائی۔ اس کے خلفاء نے اس میں وسعت دی۔ چنانچہ ابو عبداللہ محمد (۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء)، ابو الحجاج یوسف اول (۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء) اور محمد خامس (۷۹۰ھ/۱۳۵۹ء) اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً یوسف اول نے اس کی آرائش و تزئین پر کروڑوں روپے خرچ کیے۔

۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں جب اندلس سے اسلامی تہذیب کی صف لپیٹ دی گئی اور الحمراء عیسائیوں کے قبضے میں آیا تو انہوں نے اس کے قیمتی نوادر یا تو چوری کر لیے یا انہیں

الحمراء میں قاعۃ السباع کا منظر

جلا دیا منقش دیواروں پر سفیدی کرا دی گئی اور بہت سے حصوں کو منہدم کر دیا گیا۔ چارلس پنجم (۱۵۱۹ء۔ ۱۵۵۶ء) نے ایک حصے کو توڑ وا کر وہاں اپنا محل تعمیر کرا لیا۔ ۱۸۱۲ء میں اس کے کئی مینار گرا دیے گئے اور رہی سہی کسر ۱۸۲۱ء کے زلزلے نے پوری کر دی۔

الحمراء غرناطہ کی بیرونی سمت پہاڑی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس کی دیواریں سرخ رنگ کی ہیں اور چکنی مٹی، چونے اور بجری سے تعمیر ہوئی ہیں۔ فن تعمیر کے لحاظ سے یہ اسلامی عہد کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اندرونی حصے میں پر تکلف نقش و نگار ہیں اور طغرائی گلکاری کی گئی ہے ان کے اوپر کتبات ہیں۔ جن میں مختلف اشعار اور آیات قرآنی درج ہیں۔

الحمراء میں داخل ہونے کے لئے باب العدل میں سے گذرنا پڑتا ہے، جسے ۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء میں یوسف اول نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے سامنے بائیں ہاتھ پر قلعہ کا منظر ہے اور دائیں طرف محل ہے۔ محل دو وسیع دالانوں پر مشتمل ہے۔ ایک "قاعۃ البرکت" کہلاتا ہے اس کے مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد "زکیتا" واقع ہے۔ دوسرا دالان "قاعۃ السباع" (شیروں کا صحن) ہے۔ فن کے لحاظ سے اس میں تعمیر شدہ حوض قابل ذکر ہے۔ صحن کے عین مرکز میں بارہ شیر ایک دائرے کی صورت میں ایستادہ ہیں اور ایک نلکی کے ذریعے پانی ہر ایک کے منہ سے خارج ہوتا ہے۔ اس کے قریب "ساحۃ الاختین" (دو بہنوں کا ایوان) اور "ساحۃ بنی سراج" (مقبروں کا ایوان) ہے۔ ایک طرف "ساحۃ القف" (عدالت کا

ایوان) ہے۔ محل کے جنوب میں محمد ثالث کی تعمیر کردہ ایک بڑی سی مسجد تھی۔ اس کی جگہ سراب ماریا کا کلیسا تعمیر ہے۔ اگرچہ اس عمارت میں بہت سی تبدیلیاں روا رکھی گئی ہیں تاہم اسلامی عمارات میں سے اتنی قدیم عمارت کوئی نہیں جو اب تک اتنی اچھی حالت میں ہو۔ حکومت سپین نے محل کے اردگرد موجود باغ کو اور بھی زیادہ قابل دید بنا دیا ہے اور آج کل یہ ایک تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔

الدُّخان، سورۃ

قرآن مجید کی ۴۴ویں سورت، مکہ میں نازل ہوئی اس میں تین رکوع اور ۵۹ آیات ہیں۔ دُخان کے عام طور پر معنی دھواں کے ہیں۔ لیکن اس سورت میں اس سے مراد قحط اور خشک سالی لیا گیا ہے۔

جب قریش مکہ کی مخالفت حد سے بڑھ گئی تو آنحضرتؐ نے خدا سے دعا کی کہ حضرت یوسفؑ کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ آنحضرتؐ کا خیال تھا کہ شاید اس طرح ان کفار کو خدا یاد آئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا قبول کی اور پورے علاقے میں اس زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اُٹھے۔ چنانچہ قریش نے ابوسفیان کو آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیجا اور آپؐ سے دعا کی درخواست کی کہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائیں اس موقع پر یہ سورت نازل ہوئی۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے نیز یہ کہ یہ ایک مبارک بات ہے کہ اللہ نے تم ہی میں سے ایک رسول اور کتاب تمہاری ہدایت کے لیے بھیجی۔ اور اب تم جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر رسول اللہ اور اس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے بالکل غلط ہے۔ پھر یہ کہ تم خود اللہ کو اس پوری کائنات کا خالق و مالک مانتے ہو اور زندگی اور موت کا بھی اسے ہی مختار مانتے ہو لیکن پھر بھی تم دوسروں کو معبود بناتے ہو حقیقت میں تمہارا رب ایک ہی ہے اور تمہیں اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

یہ باتیں سمجھانے کے بعد قحط کے معاملے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور رسول اللہ کو بتایا گیا کہ لوگ ایسی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں سے کہاں سبق لینے والے ہیں ان پر سے اب عذاب ٹل جائے گا تو ان کی گردنیں پھر پہلے کی طرح اکڑ جائیں گی اسی ضمن میں فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا کہ وہ بھی بار بار کی تنبیہہ کے بعد نہ سمجھ سکا اور آخر کار وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نمونہ عبرت بن کر رہا۔

سورت کے آخر میں آخرت کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا ایک حکیمانہ نظام ہے اور یہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں جو لوگوں سے کوئی محاسبہ ہی نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے سامنے ہر شخص جواب دہ ہے۔ نیز جو لوگ مجرم ہوں گے ان کا انجام بہت بُرا ہوگا اور جو اچھے کام کریں گے وہ کامیاب ہوں گے۔

الذّٰریٰت، سورۃ

قرآن حکیم کی ۵۱ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ساٹھ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ ذاریات ان ہواؤں کو کہا جاتا ہے جو اُڑا کر پھیلانے کا کام کرتی ہیں۔ یعنی بیج کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ پہنچا دیتی ہیں حق کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور اس کے مخالف اسے نہیں روک سکتے۔ اس کا بڑا حصہ آخرت کے بارے میں ہے اور لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ نبیوں کی بات کو نہ ماننا اور اپنے جاہلانہ نظریات پر اڑے رہنا خود ان کے لئے تباہ کن بات ہے۔ نیز یہ کہ آخرت کے بارے میں جو کچھ نبی کہہ رہا ہے اس پر انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور نہ صرف نظام کائنات بلکہ اپنے وجود پر بھی نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا اس علم کے صحیح ہونے کی شہادت ہر طرف سے دی جا رہی ہے یا نہیں۔

آخر [illegible] میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں دوسروں کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور وہی اکیلا رب تمہارا رزاق ہے اس سلسلہ بیان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ اپنے انبیاء کا مقابلہ کسی معقول بنیاد اور حقائق پر نہیں کرتے بلکہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر کرتے ہیں [illegible] ساتھ ہی نبی اکرمؐ کو کہا گیا ہے کہ ان جاہلوں سے التفات نہ کریں اور اپنی دعوت دیتے جائیں اور اگر نہ مانے توان کے حصہ کا عذاب بھی تیار ہے۔

الرّعد، سورۃ

قرآن مجید کی ۱۳ویں سورت جس میں چھ رکوع اور ۴۳ آیات ہیں۔ یہ المرا مجموعہ کی چوتھی سورت ہے۔ سورت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے آخری دور میں نازل ہوئی جب کہ آپ کے خلاف [illegible] ترقی پر تھے۔ لیکن آیت ۴۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی کامیابی اب [illegible] لگی تھی۔ غالباً مدینہ میں اسلام پھیل جانے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے اکثر مفسرین نے اسے مدنی لکھا ہے۔ [illegible] اسلام کی دعوت [illegible] ایک مدت گذر چکی تھی اور مخالفین آپؐ کو طرح [illegible] تکالیف دیتے اور آپؐ کے مشن کو [illegible] ناکام کرنے کے لیے طرح طرح کی چالیں [illegible] کی خواہش ہے کاش کوئی ایسا معجزہ ہو [illegible] دیکھیں ولی تب [illegible] اور یہ اسلام کو [illegible] اللہ تعالیٰ نے [illegible] نہیں اور اگر حق کے ان دشمنوں کی رسی دراز ہو رہی [illegible] بات سے گھبرا اٹھو۔ اس سورت کا مدعا شروع ہی [illegible] پیش کر رہے ہیں وہی حق ہے اور جو لوگ اس کو نہیں [illegible] سورت اسی مضمون کے گرد گھومتی ہے [illegible] دیا گیا ہے اور مختلف طریق سے توحید [illegible] اس کے ساتھ ہی اہل ایمان کو بھی [illegible] رہے تھے اور بے چینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے [illegible]

الرّوم، سورۃ

قرآن پاک کی ۳۰ویں سورت [illegible] مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت کے آغاز میں [illegible] اشارہ کیا گیا ہے کہ [illegible] ہیں لیکن چند سال بعد وہ پھر غالب آ جائیں گے اور رومیوں [illegible] اب [illegible] کی سلطنت کا خاتمہ قریب ہے [illegible] وقت مسلمانوں کے [illegible] غلبے کا ہوگا۔ اس سورت میں غلبہ [illegible] پیشگوئی [illegible] لیے کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں رومیوں کے [illegible] کرکے اس کی میعاد نو سال قرار دے کر اس بات کی [illegible] کامیابی کا وقت بھی یہی ہوگا۔

دوسرے رکوع میں مومن اور کافر کے انجام کا [illegible] میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے [illegible] میں بتایا گیا ہے کہ اسلام ہی فطرت انسانی کے قریب ہے اور جو مذہب فطرت انسانی کے قریب ہوتا ہے بالآخر وہی غالب آ کر رہتا ہے۔

پانچویں اور چھٹے رکوع میں بتایا گیا کہ اسلام کے آنے سے ایک زبردست انقلاب کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ نیز یہ کہ حق کی مخالفت بالآخر دور ہو کر رہے گی۔

الزُّخرف، سورۃ قرآن حکیم کی ۴۳ ویں سورت۔ اس میں سات رکوع اور ۸۹ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

زخرف کے معنی "سونا" کے ہیں۔ لوگ عموماً دنیوی سامانِ آرائش، مثلاً سونے چاندی، مال و دولت پر فریفتہ رہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ سورت کے آغاز میں کفارانِ مکہ سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ لوگ اپنی شرارتوں اور غلط عزائم سے یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس قرآن کے نزول کو روک دیا جائے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے مخالفین کی وجہ سے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کے نزول کو روک دیا ہو۔ الٹا وہ مخالفین ہی ہلاک ہو گئے جو نبیوں کی جانوں کے درپے تھے۔ لہٰذا وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ رسول کی جان کا خاتمہ کر کے چین سے بیٹھ جائیں گے۔ بلکہ رسول خواہ زندہ رہے یا نہ رہے اللہ انھیں ضرور سزا دے کر رہے گا۔ دوسرے رکوع میں شرک کا ابطال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ شرک کے لیے نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ کوئی نقلی ۔

تیسرے رکوع میں کہا گیا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ رسول مالدار ہو لیکن اس کی نظر میں اس مال کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

چوتھے رکوع میں مخالفت رسول پر سزا کا ذکر ہے پانچویں میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی مثال سے اسے واضح کیا گیا ہے۔

چھٹے رکوع میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل جیسی برگزیدہ قوم بھی رسول کی مخالفت کر کے [illegible] سے گر گئی ہے۔ اس لیے کوئی قوم خواہ وہ کیسی ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو [illegible] کی مخالفت کر کے عزت کے مقام پر فائز نہیں رہ سکتی۔

[illegible] رکوع میں مخالفین رسول کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ ان کے لیے دنیا میں بھی ناکامی ہے اور آخرت میں بھی۔

الزلزال، سورۃ قرآن کریم کی ۹۹ ویں سورت۔ اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیات ہیں۔ [illegible] مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن مسعود [illegible] [illegible] کی ہے لیکن [illegible] [illegible] اس کے [illegible] ہونے کی تائید کی ہے۔

اس سورت کا [illegible] موت کے بعد دوسری زندگی کے بارے میں ہے جبکہ انسان [illegible] اس کے سامنے آ جائے گا جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہو گا۔ ابتدائی آیات میں [illegible] کہ موت کے بعد دوسری زندگی کس طرح واقع ہوگی اور وہ زندگی انسان کے لیے کیسی [illegible] ہوگی۔ [illegible] بتایا گیا ہے کہ انسان جو اس زمین کو بے جان سمجھ کر نہ جانے اس پر کیا کچھ کرتا رہتا ہے اس وقت اللہ کے حکم سے یہ بول پڑے گی اور سب کچھ بیان کر دے گی [illegible] بتایا گیا ہے کہ انسان اس دن گروہ در گروہ اپنی قبروں سے نکل کر آئیں گے اور ان کو ان کے اعمال دکھا دیے جائیں گے اور کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہوگی۔ ہر انسان [illegible] نیکی اور بدی کا حساب بھی پائے گا۔

الزُّمر، سورۃ قرآن مجید کی ۳۹ ویں سورت، جو آٹھ رکوع اور پچھتر آیات پر مشتمل ہے مکہ میں ہجرت حبشہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں زیادہ تر کفار قریش کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں اہل ایمان کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سورت میں آنحضرتؐ کی دعوت کا اصل مقصد بتایا گیا ہے کہ انسان خالصتاً اللہ کی بندگی اختیار کرے اس اصل الاصول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زوردار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج اور شرک کی غلطی اور اس کے بُرے نتائج کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو جائے تو اس کی وسیع زمین میں اپنا دین اور ایمان بچانے کے لیے کہیں اور طرف نکل جانا چاہیئے اور اللہ تعالےٰ صبر کا بدلہ دے گا۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ کفار کو اس بات سے بالکل مایوس کر دو کہ اُن کا ظلم و ستم صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔

الشّعراء، سورۃ قرآن حکیم کی ۲۶ ویں سورت۔ اس میں ۱۱ رکوع اور ۲۲۷ آیات ہیں قیامِ مکہ کے درمیانی دور میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں شعراء کا ذکر آیا ہے یہی اس کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت کے آغاز میں رسول اللہؐ کو کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کے پیچھے جو ایمان نہیں لاتے اپنی جان کیوں گھلا رہے ہو۔ ان کے ایمان لانے کی وجہ یہ نہیں کہ انھیں کوئی نشانی درکار ہے بلکہ یہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ ہے اور جب ان کے سامنے کوئی ایسی نشانی آ جائے گی تو خود بخود انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو بات انھیں کہی جا رہی تھی وہ کیسی برحق تھی مگر معاملت [illegible] کا ہے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جو اسی ہٹ دھرمی سے کام لیتے رہے تھے۔ یہ بات ذہن نشین کرا کر کہا گیا ہے کہ اب فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے ان کی حجتیں بھی ایک ہی طرح کی تھیں۔ آخر کار ان کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہوا۔ اس کے مقابلے میں تمام انبیاء کی تعلیم بھی ایک ہی تھی۔

آخری رکوع کی آیات میں کہا گیا ہے کہ اگر نشانیاں ہی دیکھنا ہیں تو خوفناک نشانیاں دیکھنے پر اصرار کیوں کرتے ہو۔ بلکہ ان کی بجائے قرآن کو دیکھو جو ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ آنحضرتؐ کو دیکھو ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا محمدؐ اور ان کے ساتھی تمہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر لوگ اور ان کے ساتھی ہوا کرتے ہیں اور تم ضد چھوڑ کر سیدھے راستے کی طرف آؤ جبکہ تم جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کا کاہن اور شاعر ہونے سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

الشّمس، سورۃ قرآن کریم کی ۹۱ ویں سورت ایک رکوع اور پندرہ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔

سورت کے ابتدائی حصہ میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور ان کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو جسم، حواس اور ذہن کی مختلف قوتیں دے کر بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعے سے انسان کے شعور میں نیکی اور بدی بھلے اور بُرے کا فرق اتار دیا گیا ہے نیز یہ کہ اگر انسان اچھے رجحانات کو ابھارے اور بُرے رجحانات کو دبائے تو فلاح پائے گا اور اگر اس کے برعکس کرے گا تو خسارے میں رہے گا۔

سورت کے دوسرے حصے میں قوم ثمود کی تاریخی نظیر کو پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے اور یہ کہ جب انھوں نے حضرت صالحؑ کو جو ان کی طرف مبعوث کیے گئے تھے اپنے نفس کے شر میں مبتلا ہو کر جھٹلا دیا اور ان کا منہ مانگا معجزہ اونٹنی کی شکل میں سامنے آ گیا اور پھر پوری قوم کے مشورے سے اسے قتل کر دیا تو پوری قوم تباہ کر کے رکھ دی گئی۔ اس واقعے کو پیش کرنے کا مقصد کفار مکہ کو یہ بتانا ہے کہ اگر انھوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو ان کا حال بھی یہی ہو گا۔

الصّف، سورۃ قرآن مجید کی ۶۱ ویں سورت اس میں دو رکوع اور چودہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

سورت کا اصل مضمون غلبہ دین اسلام ہے۔ یعنی یہی مذہب دوسرے تمام مذاہب پر غالب ہو کر رہے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دینا ہوں گی۔

سورت کے آغاز میں اہل ایمان کو بتایا گیا ہے کہ اللہ کا غضب ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ تو وہی لوگ محبوب ہیں جو راہ حق میں اپنی جان تک لڑا دیں۔

درمیانی آیات میں بتایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے ساز باز رکھنے والے منافقین اللہ کے نور کو بجھانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کر لیں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

آیات ۱۰ تا ۱۳ میں اہل ایمان کو بات سمجھائی گئی ہے کہ کامیابی کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر سچے دل سے ایمان لائیں۔

آخری آیت میں مومنین کو کہا گیا ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں ان کا ساتھ دیا۔ اسی طرح تم بھی اللہ کے مددگار بنو تاکہ کافروں کے مقابلے میں تم کو بھی ویسی ہی اللہ کی تائید حاصل ہو جیسے پہلے مومنین کو حاصل تھی۔

الصّٰفّٰت، سورۃ قرآن پاک کی ۳۷ ویں سورت۔ اس میں پانچ رکوع اور ۱۸۲ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کا نام اس کی پہلی آیت والصّافّات سے لیا گیا ہے۔

سورت کے پہلے رکوع میں توحید کے آخری غلبہ کا بیان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جس پیغمبرؐ کا تم مذاق اڑا رہے ہو عنقریب تم دیکھو گے کہ وہی تم سب پر غالب ہو گا۔

دوسرے رکوع میں موحدین اور مشرکین کے انجام کا ذکر اور مقابلہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور جھٹلانے والوں کو کس طرح کی سزا دی ہے۔ باقی کے رکوعات میں پہلے رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کا بھی اسی طرح مقابلہ کیا گیا جس طرح یہ لوگ اس وقت آنحضرتؐ کا کر رہے ہیں مگر اللہ کو مصیبت کے وقت جس نے بھی پکارا اللہ نے اسے نجات دلائی۔ اسی سلسلے میں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا بھی ذکر ہے۔ اس سے مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ ایک مومن کو کس طرح اللہ کی رضا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آخری آیات میں یہ پیشین گوئی بھی کی ہے کہ رسول اللہ ہی آخر کار فتح مند ہوں گے اور مومنوں کو ان کے مخالفوں پر غالب کیا جائے گا۔

الضّحیٰ، سورۃ قرآن کریم کی ۹۳ ویں سورت ایک رکوع اور گیارہ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں براہ راست آنحضورؐ سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ سورت نازل ہونے سے پہلے کچھ عرصہ تک وحی کے نزول کا سلسلہ رک گیا تھا۔ آنحضرتؐ کو پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو گئی۔ اس سورت میں آپؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ نزول وحی کا سلسلہ کسی ناراضگی کی وجہ سے نہیں روکا گیا تھا بلکہ عنقریب تمہارا رب تمہیں خوش کر دے گا اور جن مصائب سے آپؐ کو سابقہ پیش آرہا ہے۔ اب تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ نیز یہ کہ تم نے یہ بات کیسے سوچی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا اور ہم تم سے ناراض ہیں نہیں بلکہ ہم تو تم پر شروع ہی سے مہربانیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم یتیم تھے اور ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہتر انتظام کیا تم ناواقف راہ تھے اور ہم نے تمہیں ہدایت بخشی تم نادار تھے ہم نے مالدار کر دیا۔ بھلا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نے تمہیں بھلا دیا ہو۔

آخر میں نبی کریمؐ کو بتایا ہے کہ جو احسانات تم پر کیے گئے ہیں۔ ان کے جواب میں تمہارا برتاؤ خلق خدا کے ساتھ بہتر ہونا چاہیئے اور اس طرح تمہیں ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

الطّارق، سورۃ قرآن مجید کی ۸۶ ویں سورت اس میں ایک رکوع اور ۱۷ آیات ہیں مکہ میں ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ دوسرا یہ کہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے جس کو کفار کی کوئی چال نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

ابتدائی آیات میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی نگہبانی ایک علیم و خبیر ہستی نہ کر رہی ہو۔

بعد میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصل حقیقت کیا ہے وہ کس طرح گندے پانی کی ایک حقیر بوند سے پیدا کیا گیا ہے اور جو خدا ایک ایسی حقیر چیز سے انسان کو بنا سکتا ہے تو کیا وہ اس کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

آخری آیات میں ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح بارش کا برسنا اور درختوں وغیرہ کا زمین سے اگنا کوئی کھیل نہیں اسی طرح سے قرآن جو باتیں پیش کر رہا ہے وہ بھی اٹل ہیں اور کفار جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی چالوں سے قرآن کی دعوت کو روک دیں گے اور اس کو زک پہنچا سکیں گے یہ ان کا خیال خام ہے اور اپنی شاطرانہ چالوں سے قرآن کو زک نہیں پہنچا سکتے۔

الطّور، سورۃ قرآن مجید کی ۵۲ ویں سورت اس میں دو رکوع اور ۴۹ آیات ہیں۔ مکہ میں اس موقعہ پر نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعتراضات والزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

اس سورت میں کوہ طور کا ذکر آیا ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملی تھی یہی اس کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔

سورت کی ابتدائی آیات میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ پر جو وحی کوہ طور پر اتاری گئی تھی اس کی مخالفت کرنے والوں کا جیسا انجام ہوا اگر کفار قریش بھی تمہاری مخالفت کرنے سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی ہلاکت ہو گا۔ نیز رسولؐ کو تاکید کی گئی کہ مخالفین حق کی پرواہ کئے بغیر اپنی دعوت لوگوں کو پہنچاتے رہیں۔ آخری آیات میں بتایا گیا ہے کہ صبر کے ساتھ ان تکالیف اور مزاحمتوں کا مقابلہ کیے چلے جاؤ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ نہ آجائے اور اس نے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ دیا وہ تمہاری نگہبانی کر رہا ہے۔ جب تک فیصلے کی گھڑی نہ آجائے سب کچھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور اپنے رب کی حمد و تسبیح سے قوت حاصل کرتے رہو یہی وہ قوت ہے جو ان حالات میں دین کا کام کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

العٰدیات، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۰ ویں سورت۔ اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی مگر حضرت انسؓ بن مالک اور قتادہ کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ بقول مولانا مودودی سورت کا مضمون اور انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی

پستی میں جا گرتا ہے نیز یہ کہ آخرت میں صرف ان کے ظاہری افعال ہی کی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں بھی جو کچھ چھپا ہوگا اس کی بھی جانچ پڑتال ہوگی۔ گویا انسان آخرت کی جوابدہی سے غافل ہو کر اپنے رب کا ناشکرا ہو گیا ہے اور وہ اس کی عطا کی ہوئی قوتوں کو ظلم و ستم اور غارت گری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ یہ جانتا ہوتا کہ قبروں سے ایک دن زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا تو اس کی یہ روش ہرگز نہ ہوتی جس میں وہ اب مبتلا ہے۔

العصر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۳ ویں سورت اس میں ایک رکوع اور تین آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اکثر کے نزدیک یہ مکہ ہی میں نازل ہوئی۔

بقول سید مودودی یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر چند جچے تلے الفاظ میں معانی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جسے بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جا سکتا ہے

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ وقت نکلا جا رہا ہے اور جو شخص اس کی قدر نہیں کرتا اور زندگی کی مہلت میں جو مہلت اسے ملی ہے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا کر اچھے عمل نہیں کرتا وہ [illegible] رکھا ہے۔

مفسرین سے [illegible] ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک اس سورت کی اتنی اہمیت تھی [illegible] اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک یہ سورت ایک دوسرے کو [illegible] سنا لیتے۔

العنکبوت، سورۃ قرآن مجید کی ۲۹ ویں سورت [illegible] میں سات رکوع اور ۶۹ آیات [illegible] میں نازل ہوئی [illegible] اس سورت کی ایک آیت میں [illegible] [illegible] تشبیہ دی گئی ہے [illegible] [illegible] عنکبوت رکھا گیا۔

[illegible] رکوع میں [illegible] کی تکالیف کا ذکر کیا گیا ہے جس میں وہ مبتلا تھے [illegible] اللہ تعالیٰ کی مصلحت سے [illegible]۔ [illegible] نہیں بچ سکتا۔

[illegible] انسان کو [illegible] داری کرنی چاہیے اور اگر وہ ایمان کے خلاف [illegible] کو کبھی [illegible] یہ بات نہ مانی جائے۔

[illegible] تیسرے اور چوتھے رکوع میں مختلف انبیاء کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ ان [illegible] اپنے مخالفین کے ہاتھوں تکالیف اٹھانا پڑی ہیں۔ بالآخر اللہ نے انہیں کامیاب کیا۔

پانچویں رکوع میں کفار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے لیے کہتے ہیں [illegible] انھیں بتایا گیا کہ اگر تمہاری روش یہی رہی تو عذاب ضرور آکر رہے گا۔

چھٹے رکوع میں بتایا گیا کہ اگر مصائب سے تنگ آ جاؤ تو ایمان چھوڑنے کی بجائے جگہ چھوڑ [illegible] زمین بہت کھلی ہے اور جہاں بسو وہ یہاں بھی جائیں گے اللہ تعالیٰ ان کے رزق کا بندوبست فرمائے گا۔

آخری رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمام تکالیف عارضی ہیں اور ایک روز ختم ہو کر رہیں گی اور مومنین بالآخر کامیاب ہو کر رہیں گے۔

الغاشیہ، سورۃ قرآن مجید کی ۸۸ ویں سورت ایک رکوع اور ۲۶ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ غاشیہ کے معنی ڈھانک لینے والی چیز کے ہیں۔

اس سورت میں ان لوگوں کو جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے کہا گیا ہے کہ تمھیں اس آفت کا بھی علم ہے جو ساری کائنات پر چھا جائے گی اور انسان اس وقت دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا ایک جہنم میں سخت عذاب جھیلے گا تو دوسرا جنت میں مزے کرے گا۔ آیات ۱۷ تا ۲۰ میں اس بات کا ذکر ہے کہ کیا انسان اپنے اردگرد کی چیزوں سے جن کے ساتھ اس کو ہر وقت سابقہ پیش آتا ہے۔ سبق نہیں لیتا کہ وہ کیسے بنائی گئی ہیں اور وہ خدا جو ان سب کا خالق ہے وہ اس بات پر کیوں قادر نہیں ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر سکے۔

آخری آیات میں رسول اللہ سے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ ہٹ دھرم لوگ بات نہیں مانتے تو نہ مانیں آپ کا کام یہ نہیں کہ انھیں زبردستی منوا کر چھوڑیں، آپ تو صرف نصیحت کر دیں بعد میں اللہ تعالیٰ ان سے خود نمٹ لے گا۔ اور ایسے لوگوں کو سخت سزا دے گا۔

اُلغ بیگ، (۷۹۶ھ/۱۳۹۳ء - ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء) محمد تورغای ابن شاہرخ تیموری سلطان۔ سلطانیہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ پندرہ برس کی عمر میں مازندران کا حاکم مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے باپ نے سمرقند بھی اسے دلا دیا۔ سمرقند کو اس نے بہت جلد اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا دیا۔ باپ کی وفات کے بعد ۲۵ ذی الحج ۸۵۰ھ ۱۲ مارچ ۱۴۴۷ء کو تخت کا وارث بنا۔ اس کے بیٹے عبداللطیف نے بھی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ الغ بیگ نے اسے معاف کر کے بلخ کا حاکم مقرر کیا اور دوسرے دعویداروں میرزا بابر اور علاء الدولہ سے بھی مصالحت کرنے کی کوشش کی۔

۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء میں خراسان کا سارا علاقہ بابر میرزا کے قبضے میں آ گیا۔ علاء الدولہ کو اس نے تون کا حاکم مقرر کیا۔ بعد ازاں قید کر دیا۔ یہاں سے کسی طور فرار ہو کر علاء الدولہ بیٹے جہان محمد میرزا کے پاس سیستان پہنچا اور دونوں نے مل کر بابر میرزا پر حملہ کیا اور جام کے مقام پر شکست دی۔ ادھر عبداللطیف نے بھی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی تھی شاہ رخیہ کے مقام پر الغ بیگ نے شکست کھائی۔ اور ۱۰ رمضان ۸۵۲ھ/۲۷ اکتوبر ۱۴۴۹ء کو دو سال آٹھ ماہ کی حکومت کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ بعد ازاں عبداللطیف بھی قتل ہو گیا۔

الفاتحہ، سورۃ قرآن مجید کی پہلی سورت ایک رکوع اور سات آیات پر مبنی ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی۔ اس سورت کے بہت سے نام ہیں۔ مثلاً ام القرآن، ام الکتاب، سبعاً من المثانی، سورۃ الدعاء، الصلوٰۃ، الشفاء، الکنز، الحمد وغیرہ امام سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں اس کے ۲۵ نام گنائے ہیں۔ صحیح احادیث میں اس کو سب سے عظمت والی سورت کہا گیا ہے۔ ہر نماز میں اس سورت کو دہرایا جاتا ہے۔

سورت کی پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی چار بڑی صفات (ربوبیت، رحمانیت رحیمیت اور مالکیت) کا ذکر ہے۔

چوتھی آیت میں بتایا گیا ہے کہ عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے جس ذات کی تعریف پہلی تین آیات میں آئی ہے اور اسی سے ہر قسم کی مدد مانگی جا سکتی ہے۔

آخری تین آیات میں راہ راست پر چلنے اور تفریط و افراط سے بچنے کی دعا ہے۔

اور بقول مولانا مودودی سورہ فاتحہ ایک دعا ہے بندے کی جانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔

الفائز بنصر اللہ، ایک فاطمی خلیفہ، جو ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں پیدا

ہوا۔ وہ خلیفہ الظافر کا بیٹا تھا۔ اس کا اصلی نام ابوالقاسم عیسیٰ تھا۔ اس کے باپ کے قتل پر وزیر سلطنت عباس اُسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر باہر لایا اور تخت پر بٹھا دیا اس وقت اس کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ ان ایام میں اس نے، جو ہولناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، بالخصوص جب عباس کے حکم سے اس کے چچا یوسف اور جبریل قتل کئے گئے۔ ان سے اس بدنصیب بچے کا دماغ اس قدر متاثر ہوا کہ اس پر مسلسل دورے پڑنے لگے حتیٰ کہ وہ کم سنی ہی میں وفات پاگیا۔ اس کے ششش سالہ دورِ خلافت میں عنانِ حکومت طلائع بن رزیک کے ہاتھ میں رہی۔ عباس کی موت اور اُس کے بیٹے نصر کی سزائے موت کا واقعہ اسی زمانے میں پیش آیا۔ الفائز ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔

الفتح، سورۃ قرآن مجید کی ۴۸ ویں سورت۔ اس میں چار رکوع اور ۲۹ آیات ہیں مدینہ میں نازل ہوئی۔ صلح حدیبیہ میں جو عظیم الشان فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھی اس فتح پر اس سورت کا نام ہے۔

ظاہراً یہ کوئی فتح نہ تھی بلکہ بہت سے صحابہ اس صلح پر مغموم تھے لیکن جب یہ سورت نازل ہوئی تو سب کے دل خوشی سے لبریز ہوگئے۔

پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ صلح حدیبیہ ایک کھلی فتح ہے جو اسلام کے لیے بہت سی برکتوں کا موجب ہوگی۔

دوسرے رکوع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مشکلات کے وقت ساتھ نہیں دیتے تھے اور ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے لئے سخت سزا تیار کی ہوئی ہے۔

تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہ صلح عظیم الشان اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ہے جو مومنین کو حاصل ہوں گی۔

چوتھے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ آخر اسلام دنیا کے تمام ادیان باطلہ پر غالب آکر رہے گا۔

الفجار ۔ گناہ اور محرمات کا ارتکاب کرنا۔ عربوں کے ہاں دستور تھا کہ چار حُرمت والے مہینوں (ذی قعد، ذوی الحج، محرم، رجب) میں جنگ اور لڑائی نہیں کرتے تھے، لیکن ۵۰۵ء میں قریش اور قیس عیلان میں انھی حُرمت والے مہینوں میں ٹھن گئی اور یہ جنگ چار مرتبہ پیش آئی۔ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ شاہ حیرہ نعمان بن منذر کا ایک قافلہ خوشبو اور ریشم وغیرہ لے کر حجاز میں پہنچا اور اس کی سربراہی عروۃ الرحال بن عتبہ بن جعفر بن کلاب کے سپرد ہوئی، جس نے یہ ذمہ لیا کہ وہ قافلے کو بخیر و عافیت منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ براض بن قیس بن رافع کو یہ بات ناگوار گزری، کیونکہ وہ خود بھی اس قافلے کی سربراہی کا امیدوار تھا۔ چنانچہ براض نے عروۃ الرحال پر اچانک حملہ کرکے اُسے قتل کر دیا۔ اور خود قافلے کی سربراہی سنبھال لی۔ جب ذوی الحج میں عکاظ کا میلہ منعقد ہوا تو عروہ کے قتل کی خبر پھیل گئی۔ بنو ہوازن نے قریش پر حملہ کر دیا۔ فریقین کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ قریش بہرحال مکہ میں داخل ہوگئے، اور جنگ بغیر صلح کے عارضی طور پر بند ہوگئی۔ ایک روایت ہے کہ اس جنگ کے وقت آنحضورؐ کی عمر چودہ برس تھی۔ یہ سلسلہ جنگ چار پانچ سال تک جاری رہا۔ یہ سارے معرکے ہر سال ذوالحج کے مہینے میں پیش آتے رہے اور یہ وہ مقدس مہینہ ہے کہ قریش اس میں جنگ کرنا حرام سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے کہا: — "قَدْ فَجَرْنَا" (ہم نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے) اسی وجہ سے اس سلسلۂ جنگ کا نام "حروب الفجار" مشہور ہوا۔ جنگ کا انجام قریش کے حق میں ہوا۔

زمانۂ جاہلیت میں اوس و خزرج کے درمیان جو جنگیں ہوئیں، اُن میں بھی ایک یوم الفجار اوّل اور دوسری یوم الفجار ثانی کے نام سے مشہور ہے۔

الفجر، سورۃ قرآن مجید کی ۸۹ ویں سورت، ایک رکوع اور ۳۰ آیات پر مشتمل ہے، مکہ میں نازل ہوئی۔ فجر کے معنی روشنی پھوٹنے کے ہیں۔

اس سورت کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فجر اور دس راتوں اور جفت اور طاق اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا [illegible] ہے کہ [illegible] کا انکار کر رہے ہو کیا یہ چیزیں جن کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینے [illegible] کافی نہیں کہ یہ بات حق ہے اور کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ قیامت برپا کرکے انسان سے اس کے اعمال کی بازپرس کرے۔ چھٹی سے چودہویں آیات میں قوم عاد و ثمود اور فرعون کا انجام بتایا گیا کہ انھوں نے انکار کیا تو انھیں کیسی سزا دی گئی۔ اگلی آیات میں بتایا گیا ہے کہ نہ تو دولت کی فراوانی کوئی انعام ہے اور نہ رزق کی کمی کوئی سزا ہے بلکہ ان دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لیتا ہے۔ نیز یہ کہ لوگوں کا ناجائز طریقوں سے دولت اکٹھا کرنا ظلم و ستم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک روز ضرور حساب لے گا۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ آج جن لوگوں کو اس محاسبے کی سمجھ نہیں آرہی روزِ حساب وہ نادم ہوں گے اور کہیں گے کاش ہم دنیا میں اس کے لیے کوئی سامان کر لیتے مگر اس وقت اس ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نیز یہ کہ جن لوگوں نے خدا کی ہدایت کی پیروی کی ہوگی ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور ان کے لئے جنت ہے۔

الفجیرہ ۔ عرب میں شیوخ کی اُن سات ریاستوں میں سے ایک جو [illegible] جنگ کی پابند ہیں۔ یہ ریاست تمام کی تمام جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی جانب واقع ہے [illegible] خلیج فارس اور خلیج عمان کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ یہ چھوٹی سی ریاست کبھی آزاد و خود مختار تھی [illegible] سے کلبہ کا علاقہ شارجہ کی ریاست کا حصہ بن گیا جس کا شیخ متارکۂ جنگ کا پابند [illegible] علاقہ الفجیرہ اور سلطان مسقط کے مقبوضات کے مرکزی حصے کے درمیان واقع ہے [illegible] قصبہ وادیٔ حام کے دہانے پر ہے اور سمندر سے دو میل دور ہے۔ قصبہ [illegible] کے باشندے الشرقیون کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

الفجیرہ عرصہ دراز تک راس الخیمہ [illegible] [illegible] ۱۸۷۵ء سے قابض چلے آرہے تھے۔ بالآخر الفجیرہ ۱۹۰۲ء میں [illegible] [illegible] ۱۹۵۲ء میں برطانیہ نے اس کی آزادی تسلیم کرلی اور ریاست کے فرمانروا [illegible] حمد الشرقی نے ان معاہدات پر دستخط کر دیے جن پر برطانیہ [illegible] شیوخ کی ریاستوں کے مابین عملدرآمد ہو رہا تھا۔

الفرقان، سورۃ قرآن پاک کی ۲۵ ویں سورت [illegible] آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہ فرقان تمام دنیا [illegible] ہے۔ اسی رکوع میں کفارانِ قریش کے جو اعتراضات رسول اللہ کے [illegible] تھے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قرآن [illegible] جواب موجود ہے جو کفار آئے دن رسول اللہ پر کرتے رہتے ہیں [illegible] بدر میں مخالفین کی قوت کو توڑنے کی پیشگوئی کی گئی ہے۔

چوتھے رکوع میں پہلی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی عرب کی اس حالت کو بیان کیا ہے جو آنحضرتؐ سے پہلے تھی وہ لوگ کس طرح حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے پانچویں رکوع میں آفتاب کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ جس طرح آفتاب کے طلوع ہونے

سے سایہ گھٹتا چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح سے یہ دعوت جوں جوں پھیلے گی ظلم و ستم گھٹتا چلا جائے گا اور ایک روز صرف حق ہی کی روشنی ہوگی۔

چھٹے رکوع میں مومنین کو اپنی تربیت کرنے کے لئے اللہ نے اپنے خاص بندوں کی صفات بتائی ہیں نیز بتایا گیا ہے کہ یہ انقلاب کیا عظیم الشان ہے کہ جس کی وجہ سے رسول اللہ اپنے پیروؤں کو پستی کی حالت سے نکال کر کس بلندی پر لے آتے ہیں۔

الف لام میم (الٓمٓ) قرآن مجید کی بعض سورتوں کے شروع میں آنے والے یہ حروف "مقطعات" کہلاتے ہیں۔ یہ چھ سورتوں البقرہ، آل عمران، العنکبوت، الروم، لقمان اور السجدہ کے شروع میں آتے ہیں۔ یہ حروف الفاظ کے قائم مقام بتائے جاتے ہیں۔ حروف کے ذریعے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا۔ مگر کوئی ایسا قاعدہ مقرر نہ تھا جس سے حروف کے معانی کی طرف اشارہ ہوتا، تاہم سامعین اس کا مطلب سمجھ لیتے تھے۔ بعد ازاں یہ اسلوب متروک ہوگیا اور مفسرین کے لئے ان کے معنی کا تعین کرنا مشکل ہوگیا۔ [illegible] ایک عام ناظر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان کی تحقیق میں [illegible]

الفلق، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۳ ویں سورت، ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے [illegible] نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کی رائے [illegible] سورت الناس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ [illegible] ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا اگر ممکن [illegible] ان دونوں سورتوں کی قرأت چھوٹنے نہ پائے۔ ایک [illegible] فرمایا کیا میں تمہیں دو [illegible] سورتیں نہ بتاؤں جو ان بہترین سورتوں میں سے ہیں جنہیں لوگ پڑھتے ہیں [illegible] تو آپ نے یہی دو سورتیں پڑھیں نیز فرمایا کہ [illegible] جب سوکر اٹھو تو ان سورتوں کو پڑھا کرو۔ ایک اور جگہ [illegible] کے نزدیک [illegible] سورۃ الفلق سے زیادہ نافع [illegible] نہیں ہے۔ اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی دعا کرنی چاہیئے۔ اوّل ہر چیز کے شر سے جو اللہ نے پیدا کی ہے۔ مثلاً آگ، پانی وغیرہ [illegible] دوسرے اندھیرے سے پناہ مانگنے کے لئے کیونکہ تاریکی میں ہر قسم کے مصائب ہوتے ہیں تیسرے کام میں جو رکاوٹیں ڈالتے ہیں ان سے اور چوتھے مرحلے پر حاسدوں کے شر سے۔

الفیل، سورۃ قرآن پاک کی ۱۰۵ ویں سورت۔ ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں اصحاب فیل کی طرف اشارہ ہے۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ابرہہ نامی عیسائی بادشاہ جس نے شاہ حبش کی برائے نام پیروی اختیار کی ہوئی تھی۔ صنعاء میں ایک گرجا بنوایا اور چاہا کہ اہل عرب خانہ کعبہ کی بجائے اس گرجا میں جمع ہوا کریں تاکہ اس طرح سے آہستہ آہستہ انہیں عیسائی بنایا جا سکے۔ چونکہ اہل عرب نے اس گرجا کی کوئی پرواہ نہ کی تو اس نے خانہ کعبہ کو گرانا چاہا۔ اور ایک لشکر جرار کہ جس میں ہاتھی بھی شامل تھے، مکہ پر چڑھائی کردی، قریش چونکہ اس کی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، یہ کہتے ہوئے کہ "اے اللہ تو خود اپنے گھر کی حفاظت فرما" قریب کی پہاڑیوں پر چلے گئے۔

قبل اس کے کہ ابرہہ کا لشکر خانہ کعبہ تک پہنچے، اللہ تعالیٰ نے ابابیل کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو اپنے پنجوں اور چونچوں میں کنکریاں لاکر لشکر ابرہہ پر گراتے رہے۔ اور اس کا سارا لشکر کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہوگیا۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے اگر کفار قریش نے بھی رسول اللہ کو ختم کر دینے کے لئے کسی طاقت سے کام لیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ (نیز دیکھئے ابابیل، ابرہہ، اصحاب فیل)

القارعہ، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۱ ویں سورت، اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں قیامت کا نقشہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ گھبراہٹ اور بدحواسی میں اس طرح بھاگے بھاگے پھر رہے ہوں گے۔ جیسے روشنی پر پروانے ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہیں۔ اس دن پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور روئی کے گالوں کی طرح بن جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی بتایا گیا کہ انسانوں کے حساب کتاب کے لئے اللہ تعالیٰ عدالت لگائے گا اور فیصلہ اس بات پر ہوگا کہ جس کے اعمال اچھے ہوں گے اور برے اعمال سے وزنی ہوں گے وہ لوگ عیش میں ہوں گے اور اس کے برعکس جن کے برے اعمال زیادہ ہوں گے ان کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

القدر، سورۃ قرآن پاک کی ۹۷ ویں سورت۔ ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں ابتدائی آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کلام کو اللہ نے نازل کیا ہے۔ یہ رسول اللہ کی اپنی تصنیف نہیں ہے۔

بعد کی آیات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جس رات میں اس قرآن کو نازل کیا گیا ہے، وہ بڑی عظمت اور قدر والی رات ہے۔ جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے اور اس رات کے علاوہ کبھی انسان کی بھلائی کے لئے ایسا کام نہیں ہوا تھا جو اس رات میں ہوا ہے۔

آخری آیات میں بتایا گیا ہے کہ اس رات کو فرشتے اور جبرئیلؑ اپنے رب کی اجازت سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ اور یہ رات شام سے صبح تک انسانوں کے لئے سراسر سلامتی کی رات ہے اور اس میں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ سراسر بھلائی کے لئے ہوتے ہیں۔

القریش، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۶ ویں سورت۔ یہ ایک رکوع اور چار آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

چونکہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت ابرہہ اور اس کے لشکر کا انجام تمام قریش اور اہل عرب کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے گھر کو بچایا۔ اس وجہ سے کہ پھر قریش کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ بلا خوف و جھجک عرب کے ہر حصہ میں اپنے تجارتی قافلے لے جاتے اور کوئی ان سے الجھنے کی جرات تک نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس سورت میں اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان چار مختصر آیتوں میں بتایا ہے کہ جب اہل مکہ جانتے ہیں کہ اللہ کا گھر ہے نیز یہ کہ اس نے اس گھر کے طفیل امن عطا کیا ہے اور ان کی تجارتیں فروغ پا رہی ہیں مزید یہ کہ بھوک و ننگ سے بچا کر خوشحالی عطا کی ہوئی ہے تو پھر ان کو چاہیئے کہ اللہ ہی کی عبادت کریں اور بتوں کی پرستش سے باز آئیں۔

القصص، سورۃ قرآن مجید کی ٢٨ ویں سورت۔ اس میں نو رکوع اور ٨٨ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

قصص کے معنی ترتیب وار واقعات بیان کرنے کے ہیں۔ سورت کی آیت ٢٥ میں القصص کا لفظ آیا ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس سورت میں ان شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اس وقت رسول اللہ کی رسالت پر کئے جا رہے تھے اس سلسلے میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اس کے لیے غیر محسوس طریقے سے اسباب فراہم کر دیتا ہے۔ فرعون اس قوم کو تباہ کرنا چاہتا تھا جسے اللہ تعالیٰ ابھارنا چاہتا تھا۔ کس طرح اس نے حضرت موسیٰؑ کی فرعون کے دربار ہی میں پرورش کرائی اور آخر کار فرعون کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے دوسرے رکوع میں حضرت موسیٰؑ اور قبطی کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں حضرت موسےؑ کے مصر سے نکلنے کا بھی ذکر ہے۔ تیسرے رکوع میں حضرت موسےؑ کے مدین جانے اور وہاں دس سال تک ٹھہرنے کا ذکر ہے۔ چوتھے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو کسی جشن وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب تم رسولؐ اللہ کی نبوت کے بارے میں سوچتے ہو کہ انھیں بیٹھے بٹھائے کہاں سے نبوت مل گئی تو حضرت موسیٰؑ کے بارے میں غور کرو کہ راستے میں آگ لینے چلے تھے اور نبوت سے سرفراز ہوئے نیز یہ کہ جب خدا کسی بندے سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو اس کے پاس کوئی اتنا بڑا لاؤ لشکر نہیں ہوتا لیکن اس کے مقابلے میں بڑے بڑے ساز و سامان رکھنے والے بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ موسیٰؑ اور فرعون کی مثال تمہارے سامنے ہے۔

پانچویں رکوع میں کفار کے اس مطالبے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو وہ رسولؐ اللہ سے کیا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح آپ بھی اللہ کی نشانیاں دکھائیں۔ چنانچہ بتایا گیا کہ جس طرح فرعون نے وہ نشانیاں دیکھ کر اور انہیں جادو کہہ کر انکار کر دیا تھا اور پھر اس کی اُسے کیا سزا ملی تھی۔ تو کیا ضروری ہے کہ تم بھی وہی مطالبہ کر کے اپنی شامت کو آواز دو۔ سورت کے پانچویں رکوع میں حضرت موسیٰؑ کی آنحضرتؐ سے مماثلت کی گئی ہے اور ماحول کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ بالکل حضرت موسےؑ اور فرعون کے زمانے جیسا ہو چکا۔ چھٹے رکوع میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ نہ صرف آنحضورؐ اور حضرت موسیٰؑ کی وحی میں بلکہ دوسرے انبیاء کی وحیوں میں بھی مماثلت ہے اور ان کی تعلیمات کے اصول بھی ایک جیسے ہیں۔

ساتویں رکوع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو بزعم خود رہنما بن کر دوسرے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک سخت عذاب دیکھ کر رہیں گے۔

آٹھویں رکوع میں قارون کا ذکر ہے کہ اس نے بھی اپنے مال و دولت پر فخر کر کے دوسروں کو گمراہ کیا اس کا انجام کیسا ہولناک ہوا۔ سورت کے آخری رکوع میں کفار مکہ کے اس عذر کا کہ اگر وہ اسلام قبول کریں گے تو ان کی قیادت و سیادت ختم ہو جائے گی۔ حکیمانہ انداز میں یہ بتایا گیا کہ دنیوی مفاد کی غرض سے حق اور باطل کا فیصلہ کرنا غلط ہے۔

القصواء حضرت رسول اکرمؐ کی سواری میں آنے والی اونٹنی کا نام۔ آنحضورؐ نے اسی پر مدینہ کی طرف سفر ہجرت فرمایا تھا۔ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی خاص مقصد کے لئے پال رکھا تھا۔ مدینہ میں ورود کے بعد القصواء آنحضرتؐ کو لیے ہوئے ایک جگہ پر بیٹھ گئی۔ جو دو یتیموں کی ملکیت تھی۔ آنحضورؐ نے وہ زمین خرید لی اور یہاں مسجد نبوی کی بنیاد رکھی۔

القلم، سورۃ قرآن مجید کی ٦٨ ویں سورت۔ اس کے دو رکوع اور ٥٢ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت کو ن بھی کہا جاتا ہے اس کے نزول کے وقت آنحضورؐ کی مخالفت کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

سورت میں تین مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ اول یہ کہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب، دوسرے مخالفین کو تنبیہ اور نصیحت تیسرے آنحضورؐ کو صبر کی تلقین۔

ابتدائی آیات میں آنحضورؐ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپؐ کے مخالفین جو انھیں دیوانہ کہہ رہے ہیں غلط ہے اور جس مرتبے پر آپؐ فائز ہیں وہ کوئی چھوٹا رتبہ نہیں اور تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔

اگلی آیات میں ایک مثال کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جس طرح ان باغ والوں نے اللہ کی نعمت پا کر ناشکری کی تھی اور اپنے ایک بہتر شخص کی بروقت نصیحت کو نہ مانا تھا یہاں تک کہ انھوں نے اس کی بربادی کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا۔ اسی طرح اگر تم نے بھی رسولؐ اللہ کی ہدایت کو بروقت نہ مانا تو تمھیں بھی ایسے [illegible] سے دوچار ہونا پڑے گا۔ سورت کے دوسرے رکوع میں بتایا گیا کہ بھلائی [illegible] بندوں کے لئے ہے۔ اور نافرمانوں کا انجام ذلت والا ہوگا۔ قرآن کو جھٹلا کر وہ عذاب [illegible] سے نہیں بچ سکتے۔

آخری آیات میں رسولؐ اللہ کو فرمایا گیا ہے [illegible] تبلیغ کی راہ میں جو مصائب بھی آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہیں اور حضرت [illegible] کی طرح بے صبری سے بچیں۔

القمر، سورۃ قرآن مجید کی ٥٤ ویں سورت۔ اس کے [illegible]

سورت میں شق القمر کا واقعہ بیان ہوا ہے [illegible]

سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ کفار ایسے [illegible] اثر نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ لوگ تاریخ سے کوئی سبق حاصل کرتے [illegible] شق القمر جیسی واضح نشانیاں ہی دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ یہ لوگ [illegible] قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس کے ساتھ [illegible] لوطؑ اور فرعون کا مختصراً حال بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ [illegible] کیسے دردناک عذابوں سے دوچار ہوئیں۔ اب اگر تم نے بھی [illegible] عذاب عظیم سے نہیں بچ سکو گے۔

آخری آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قیامت کے لانے میں کسی [illegible] ضرورت نہیں بلکہ اس کا حکم ہوتے ہی برپا ہو جائے گی۔ لیکن یہ اپنے وقت پر [illegible] اور کفار اپنی غلط اعمالیوں کا نتیجہ بھگتیں گے۔

القیامۃ، سورۃ قرآن مجید کی ٧٥ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور [illegible] ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں قیامت کا ذکر ہے اور منکرین آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک اعتراض اور شبے کا جواب دیا گیا ہے۔ دلائل کے ساتھ آخرت کے بارے میں [illegible] گیا ہے کہ وہ ضرور آ کر رہے گی۔ نیز یہ کہ جو لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ وہ اپنی خواہشات کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔ [illegible] وہ وقت ضرور آئے گا جب تمہارا سارا کیا دھرا تمہارے سامنے ہوگا۔ اور جو تم اس دنیا میں کرتے رہے ہو۔ ساتھ ہی رسولؐ اللہ کو فرمایا گیا ہے کہ وہ وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں کیونکہ اس کو یاد کرانا اللہ کے ذمہ ہے۔

الکافرون، سورۃ قرآن مجید کی ١٠٩ ویں سورت ایک رکوع اور چھ آیات پر مشتمل ہے۔

مفسرین میں اس کے مکہ میں نازل ہونے میں اختلاف ہے۔
لیکن اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ مکی ہے اس سورت کی اہمیت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ اخلاص کو پڑھتے تھے۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ جب سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹو تو یہ سورت پڑھا کرو۔ اسی مضمون کی اور بھی کئی احادیث ہیں جو اس سورت کی اہمیت کے بارے میں ہیں اس سورت میں توحید کا عملی رنگ پیش کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان تمام چیزوں کی عبادت سے بیزار ہیں جو کفار کرتے تھے۔ اس سورت میں اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں کافروں سے کسی قسم کی مصالحت نہیں کی جا سکتی اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خالصتاً اللہ کی عبادت کریں اور اس میں کسی قسم کی شرک کی آلائش نہیں ہونی چاہیے۔

الکندی (۱۸۵ھ/۸۰۰ء - ۲۵۲ھ/۸۶۶ء) ابویوسف یعقوب بن اسحاق بن صباح الکندی، مشہور مسلمان سائنسدان۔ اسلامی دور میں فلسفے اور سائنس کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ البصرے میں پیدا ہوا۔ والد بصرہ کا رئیس اور کوفے کا گورنر تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم بصرے ہی میں حاصل کی اور بعد ازاں بغداد میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی۔ اس نے بہت جلد فلسفے اور سائنس پر مہارت حاصل کر لی اور المامون اور پھر المعتصم کا دربار میں مقرب بن گیا۔
بعد میں الکندی کے ہمعصروں میں سے موسیٰ بن شاکر اور اس کے بیٹے اس سے معاندانہ رویہ رکھتے تھے۔ انھوں نے خلیفہ المتوکل سے کہہ سن کر اسے دربار سے نکلوا دیا۔ اپنی وفات سے پہلے کے بارہ برس اس نے گوشۂ عافیت میں بسر کئے۔ وہ بغداد ہی میں انتقال کیا۔
الکندی ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے ریاضی، طبیعیات، فلسفہ، ہیئت، موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ وہ یونانی اور سریانی زبانوں کا ماہر بھی تھا۔ اس کی کتابوں کا زیادہ تر علم بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ترکی سے دریافت ہونے والے ذخیرے سے ہوا۔ "الفہرست" میں اس کی تصانیف کی کل تعداد دو سو چالیس ہے۔ ان میں اس کا معروف رسالۃ العقل بھی ہے۔ جس نے مغرب پر گہرا اثر ڈالا۔ ریاضی میں اس کی چار تصانیف اعداد اور ان کی خاصیتوں پر تھیں۔ بصریات پر اس کی مشہور کتاب اقلیدس کی بصریات کے نظرثانی شدہ نسخے پر مبنی ہے۔ دیگر کئی مباحث پر بھی اس نے رسالے تصنیف کئے۔ اس کی شہرت بعض سائنسی اور فلسفیانہ تحریروں کے لاطینی میں ترجمہ ہو جانے کے باعث مغرب میں بھی پھیل گئی۔ خصوصاً علم احکام نجوم کے باب میں اسے ایک لاثانی سند کی حیثیت حاصل ہے۔
الکندی ایمان و عقل کے باہمی تعلق پر اعتقاد رکھتا تھا۔ تاہم اس میں کچھ امتیازی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ فلسفے کے ضمن میں وہ اثینی مکتب نوفلاطونی کے نزدیک تر تھا۔ اور مذہب کے معاملے میں اس کی ہمدردیاں معتزلی علم کلام کے ساتھ تھیں۔ وہ علم کو الوہی اور انسانی کی اقسام میں بانٹتا تھا۔ پہلے کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی رسائی ان حقائق تک ہے۔ جہاں تک علم انسانی خود اپنے ذرائع سے کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا ایسے حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ گویا فلسفہ اور سائنس کو وحی کے تابع قرار دے دیا گیا۔ گویا الکندی نے ایک ایسے دبستان فکر کو جنم دیا، جو عقلی تناظر پر قائم ہے اور اسلام کے مجموعی مشاہدۂ کائنات کی حدود میں رہتے ہوئے وجود میں آتا ہے۔ اس کے شاگردوں میں ابومعشر بلخی اور احمد ابن طیب السرخسی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اس کے اثر کو سائنس کے حوالے سے پھیلایا۔

الکوثر، سورۃ قرآن پاک کی ۱۰۸ویں سورت، ایک رکوع اور تین آیات پر مشتمل ہے مفسرین میں اس سورت کے نزول کے بارے میں اختلاف ہے اور بعض کے نزدیک یہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن اکثریت کے نزدیک مکی ہے۔
سورت کی شان نزول یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے دو صاحبزادے تھے۔ کچھ عرصے بعد دونوں وفات پا گئے تو کفار قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمدؐ تو ابتر ہو گئے یعنی ان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں جو بعد میں ان کی وارث ہو گی اور آپؐ کے بعد اہل قریش اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے جس میں وہ اب مبتلا ہیں۔ کفار کی ان باتوں پر اللہ تعالےٰ نے یہ سورت نازل کی اور آنحضورؐ سے فرمایا کہ کفار کی باتوں پر نہ گھبرائیں۔ عنقریب کامیابی آپؐ کے قدم چومے گی اور اللہ تعالےٰ وہ کچھ عنایت فرمائے گا جو کسی اور کو نہ ملا ہے اور نہ ملے گا اور یہ مخالفین جو ان دنوں خوشیاں منا رہے ہیں۔ ایک روز یہی بے نام و نشاں ہوں گے۔

الکہف، سورۃ قرآن مجید کی ۱۸ویں سورت۔ اس میں ۱۲ رکوع اور ۱۱۰ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔
یہ سورت مشرکین مکہ کے ان تین سوالوں کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے آنحضرتؐ سے کئے تھے۔ یعنی اصحاب کہف قصہ خضر و موسیٰ اور قصہ ذوالقرنین۔ یہ ایسے قصے تھے جن کا عرب میں چرچا تھا اور عیسائی ان سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے آنحضورؐ کا امتحان لینے کی غرض سے کہ آیا ان کے پاس غیب کا علم بھی ہے یا نہیں، یہ سوالات پوچھے۔ اللہ تعالےٰ نے نہ صرف ان کے جوابات دیئے بلکہ ان کو اس وقت کے حالات پر اسی مطابقت سے چسپاں کر دیا۔
اصحاب کہف کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بھی اسی توحید کے قائل تھے جس کی تبلیغ اسلام کر رہا ہے اور ان کی قوم کا رویہ بھی قوم قریش کے رویہ سے مختلف نہ تھا۔ نیز مسلمانوں کو اس واقعے میں یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ اگر حالات اس قدر خراب ہو جائیں کہ دین کی تعلیمات پر عمل کرنا دشوار ہو جائے تو پھر انہیں کسی اور جگہ نکل جانا چاہیئے۔ اس قصے میں یہ بات بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جس طرح اصحاب کہف کو موت کے بعد زندہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح تمام لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کیا جائے گا۔
قصہ خضر و موسیٰؑ میں یہ بات بتائی ہے کہ اللہ تعالےٰ کا یہ کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے وہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور جو کچھ اس دنیا میں ہو رہا ہے بالکل ٹھیک ہو رہا ہے قصہ ذوالقرنین میں بتایا گیا ہے تم لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی سرداریوں پر اکڑ رہے ہو۔ ذوالقرنین کو دیکھو وہ کتنا بڑا اور زبردست فرمانروا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی حقیقت کو نہیں بھولا تھا اور ہمیشہ اپنے خالق کے آگے جھکا رہتا
آخری آیات میں دوبارہ ان باتوں کو دہرایا گیا ہے جو آغاز میں کہی گئی ہیں یعنی توحید و آخرت حق ہیں اور تمہاری بھلائی بھی اسی میں ہے کہ تم اسے تسلیم کرو۔
(نیز دیکھئے "اصحاب کہف")

الکیمیا کیمیاگری، علم کی ایک اہم شاخ، جسے مسلمانوں نے یونانیوں کے ہاں سے لیا اور دنیا کو جدید علم کیمیا کی صورت میں عطا کیا۔ اس علم کا آغاز اس نظریے سے ہوا کہ دنیا کی تمام اشیاء معدنیات، دھاتیں وغیرہ ارتقائی ہیئت کی حامل ہیں خصوصاً دھاتوں میں سب سے اعلیٰ ارتقائی صورت سونے کو حاصل ہے۔ دیگر ادنیٰ دھاتوں

مثلاً تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے اس نظریے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اور یوں الٹے سیدھے تجربات کا آغاز ہو گیا۔

زمانۂ قدیم میں کیمیا گروں کو ساحر، جادوگر وغیرہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہی لوگ حکیم، طبیب اور سنیاسی وغیرہ کہلائے۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی ایسی عمل انگیز شے ضرور موجود ہے، جسے دھاتوں کے ساتھ ملایا جائے تو وہ ترقی کر کے سونا بن جاتی ہیں۔ اس عمل انگیز یا بوٹی کا نام انھوں نے "سوما" رکھا اور پھر اس نامعلوم بوٹی کی تلاش میں دنیا کا کونا کونا چھان مارا۔ ان کیمیا گروں کا یہ خواب تو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا البتہ طب، ادویہ سازی اور علم کیمیا نے ضرور جنم لیا۔

الکیمیا کا آغاز قدیم یونانیوں کے ہاں تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح ہی سے ہو چکا تھا۔ مگر اس موضوع پر ان کی پہلی تحریریں تیسری صدی عیسوی ہی میں وجود میں آئیں۔ اس نظریے کی بنیاد میں ارسطو کا عناصر اربعہ کا نظریہ کام کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ دنیا مٹی، پانی، آگ اور ہوا کے آمیزے سے بنی ہے۔ اسی دور میں کیمیا گر دو گروہوں عملی اور سنیاسی میں تقسیم ہو گئے۔ عملی کیمیا گر تجربات اور ایجادات کی طرف مائل ہو گئے اور انھوں نے باقاعدہ علم کی بنیادیں رکھنا شروع کر دیں۔ مگر سنیاسی قسم کے کیمیا گر الف لیلوی داستانوں کی مانند سونا بوٹی کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے۔

مسلمانوں میں سے جس نے سب سے پہلے ان علوم کی طرف توجہ دی۔ وہ خالد بن یزید اموی تھا۔ اس نے فلسفہ اور کیمیا کی بعض کتابوں کے تراجم کیے۔ اس کے بعد دوسرا مشہور کیمیا دان جابر بن حیان تھا۔ یہ خالد بن یزید کا شاگرد تھا۔ اس نے علم کیمیا پر خاصا کام کیا اس کی کتابوں کی تعداد سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے۔ اس نے تبخیر، تقطیر، تصعید اور قلماؤ کے مروجہ طریقوں کی اصلاح کی اور کشتہ سازی کا نیا طریقہ ایجاد کیا جو اسی کے نام سے مشہور ہے جابر سونا بنانے والی کیمیا گری کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تاہم اس نے ایسا تیزاب ایجاد کیا جو سونے کو بھی گلا دیتا تھا۔ علم کیمیا میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ شورہ اور گندھک کا تیزاب اور ماء الملوک (آب سلطانی) کی دریافت ہے۔ اس کے علاوہ اس نے گندھک کے مرکبات سے سنکھیا، سفیدہ وغیرہ کے علیحدہ کرنے کے طریقوں کو بھی مفصل طور پر بیان کیا۔ غرضیکہ علم کیمیا کا کوئی ایسا حصہ نہیں چھوڑا۔ جس پر اس نے تحقیقات نہ کی ہوں۔ کیمیا میں اس کی انھی خدمات کے پیش نظر اسے "بابائے کیمیا" کہا جاتا ہے۔

جابر بن حیان کے بعد مسلمانوں کا مشہور کیمیا دان محمد بن زکریا رازی تھا۔ وہ عہد عباسیہ کا ممتاز ترین عالم تھا۔ اس نے معدنی مادوں کی تقسیم نباتات، حیوانات، جمادات وغیرہ میں کی۔ اس کے برعکس جابر مادوں کو اجسام، نفوس اور ارواح میں منقسم کرتا ہے۔ علم کیمیا پر اس کی مشہور کتاب "کتاب الاسرار" ہے۔

اس دور میں الجاحظ، جس نے جانوروں کے فضلہ سے امونیا تیار کیا۔ الکاثی جس کی کتاب عرصہ تک علم کیمیا کی معیاری کتاب سمجھی جاتی رہی۔ ابن سینا، جس نے کیمیا گری کے سنیاسی نظریے کو مسترد کیا اور کہا کہ کم قیمتی دھاتوں کو کسی صورت میں بھی سونے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، البیرونی اور طغرائی نے علم کیمیا پر بے شمار کتابیں لکھیں اگرچہ ان کے ساتھ ساتھ کیمیا گری کا قدیم نظریہ بھی قائم رہا اور لوگ اس پر بے تحاشا وقت دولت، صحت اور زندگی ضائع کرتے رہے۔ مگر دوسری طرف مسلمانوں نے علم کیمیا کا کوئی ایسا شعبہ نہیں چھوڑا۔ جس میں انھوں نے کچھ نہ کچھ کام نہ کیا ہو تحقیقات نہ کی ہوں اور اس کے نظری و عملی پہلوؤں پر یکساں توجہ نہ دی ہو۔

رابرٹ بریفالٹ جیسا مستشرق لکھتا ہے کہ "عربوں کی تجربی تحقیق نے ان اسالیب کی بنیاد رکھی، جنھوں ریاضی تجزیہ کے ساتھ مل کر زمانۂ حال کے علم کیمیا کو جنم دیا۔ اس علم کی ابتدا ان عملیات سے ہوئی جو مصر کے ماہرین فلزات اور زرگر لوگ استعمال کرتے تھے۔ یعنی دھاتوں کو ملا کر مختلف قسم کی مرکب دھاتیں تیار کرنا اور انھیں ایسے طریق سے رنگ دینا کہ وہ سونے سے مشابہ معلوم ہوں یہ عملیات مدت دراز تک پیشوایان مذاہب کے خفیہ اجارے کے طور پر محفوظ رکھے گئے تھے اور پراسرار افسوں، جادو، سحر وغیرہ کے ساتھ ملفوف تھے۔ لیکن جب وہ عربوں کے ہاتھ آیا تو ان میں تحقیق کا وسیع اور منظم جذبہ پیدا ہوا، جس سے عربوں نے تقطیر تبخیر اور تصعیہ کے طریقے ایجاد کیے۔ اس کے علاوہ الکحل، شورے کا تیزاب، گندھک کا تیزاب، القلی، پارے کے نمک سرمہ اور بسمتھ کو دریافت کیا اور بعد کے مکمل علم کیمیا کی تحقیق کی بنیاد رکھی۔

اللہ

اللہ معبود حقیقی، خالق و مالک کائنات، جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اللہ اس عظیم ہستی کا اسم ذات ہے، جو دونوں جہانوں کی پالنے والی ہے اور جو زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا یہ اسم موجود ہے اور یہ ۲۶۹۷ بار مذکور ہوا ہے۔ اس لفظ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی حرف الگ کر دیں اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مثلاً الف دور کرنے سے للہ باقی رہے گا۔ پہلا لام دور کرنے سے الہٗ رہ جائے گا۔ الف لام دور کر دینے سے لہٗ اور الف لام لام دور کرنے سے ہُو رہ جائے گا۔ ہر حالت میں اس میں سے خدا کے پاک نام پر اطلاع ملتی ہے۔

یہ صرف اسی لفظ کی خوبی ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں خدا کی ہستی کا مفہوم دینے والا کوئی لفظ نہیں اور عربی زبان میں بھی یہ لفظ کسی اور ہستی کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ قدیم عربوں کے ہاں بھی اللہ اسی عظیم ہستی کے لیے مستعمل تھا۔ جو تمام دیوتاؤں کا خدا ہے۔ یہ بھی اسی لفظ کا اعجاز ہے کہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کے تمام حروف اور الفاظ اسی سے نکلتے ہیں۔ یہ بھی اس لفظ کی خاصیت ہے کہ اس پر تائے قسم داخل ہوتی ہے۔ ورنہ حرف تہ بمعنی قسم اور کسی اسم پر وارد نہیں۔ یہ اسی اسم کا خاصہ ہے کہ الحمد کا استعمال اسی لفظ کے ساتھ ہوتا۔ الحمد للرحمٰن یا الحمد للرحیم کی تراکیب وجود میں نہیں آئیں۔

تفسیر کی رو سے اللہ کا لفظ اول الہت سے مشتق ہے۔ جس کے معنی تسکین دینے کے ہیں۔ دوم الہٗ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی وارفتگی کے ہیں۔ سوم یہ لاہ سے مشتق ہے، جس کے معنی بلند شان کے ہیں۔ چہارم لاہ یلوہ سے مشتق ہے، جس کے معنی احتجاب کے ہیں۔ پنجم الہ التفصیل سے مشتق ہے جس کے معنی احتیاج مند کے ہیں اور ششم الہ الٰہ سے بنا ہے، جس کے معنی اس سے ڈرتا ہے کے ہیں۔ البیضاوی نے چار اقوال درج کیے ہیں۔ ایک کے مطابق اللہ کا لفظ الٰہ سے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ ال کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس سے اس میں خصوصیت پیدا ہو گئی۔ ال وہی معنی دیتا ہے، جو انگریزی میں THE کے ہیں۔ دوسرے قول کے مطابق یہ اللہ کی ذات کا اسم علم ہے اور اسی سے خاص ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ایک صفاتی نام تھا، مگر خدا کی ذات کے ساتھ مختص ہو کر رہ گیا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اصل میں یہ سریانی لفظ لاہا سے نکلا ہے۔ مگر اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کے بقول "اللہ کی صفات کے بارے میں تمام وصفی نام تحیر میں زبانوں کے توڑ گم ہو کر رہ گئے ہیں۔"

قرآن مجید میں اللہ کا لفظ اسم ذات کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسلام سے پہلے معبود کے لیے الٰہ کا لفظ مستعمل تھا۔ یہ معبود خواہ باطل ہو یا حقیقی قرآن مجید میں بھی ذات باری کے لیے الٰہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ کا لفظ مالک کائنات کے لیے استعمال

ہوتا تھا۔ قرآن مجید کی رُو سے دعا اور پرستش کے لائق اور نفع و ضرر کی مالک صرف ایک ہی ہستی ہے۔ اور اس ہستی کا نام اللہ ہی ہے۔

کلمۂ طیبہ سے اللہ تعالٰی کے وجود کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور ملتا ہے، جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں۔ کہیں اسے صرف محبت کہا گیا ہے اور کہیں وہ صرف رافع حاجات ہے۔ کہیں اس کی ذات کو تقسیم کر دیا گیا ہے اور کہیں اسے تجسیم، تشبیہ اور تناسل سے آلودہ کیا گیا ہے۔ کہیں وہ نیلے آسمان کے پار کسی تخت پر براجمان نظر آتا ہے اور کسی مذہب کی رُو سے اس نے انسانی بھیس اختیار کر لیا ہے۔ ان تمام تصورات کی نفی قرآن مجید نے اس طرح سے کر دی ہے کہ الٰہ صرف وہی ہو سکتا ہے، جو بے نیاز، بلند مرتبہ والا، ہمیشہ قائم اور ہمیشہ رہنے والا ہو، جو قادر مطلق ہو اور حاکم اعلٰی ہو۔ جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب، جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو، جو زندگی بخشنے والا، وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو، جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو۔ اس کی بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں۔ اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو، وہی سب کا حساب لینے والا ہو اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو۔ وہ نہ تو ہماری مادی اشیا [illegible] رکھتا ہے اور نہ اس کی صورت کو کسی شے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

اب سوال [illegible] ہے کہ کیا ایسی ہستی مطلق کا وجود بھی ہے؟ اٹھارہویں صدی کے مادہ پرستوں نے [illegible] قرار دیا تھا۔ انیسویں صدی کی سائنس نے تو یہاں تک [illegible] غلط [illegible] مگر بعد کے واقعات نے ثابت [illegible] جلدی کرتا ہے۔

[illegible] سائنس نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے کہ سائنس کے ثابت کردہ موجودہ [illegible] حقائق [illegible] نہیں رکھتے اور ان میں نئی تحقیق سے تغیر و تبدل ظہور [illegible] سائنس کا نیا رُخ [illegible] مذہب اور اللہ کے وجود کی سمت [illegible] آئن سٹائن جیسے بڑے سائنسدان کی رُو سے تو مذہبی [illegible] مشہور فلسفی جوڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے [illegible] سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے۔"

[illegible] کو ماننے والے بھی اس مسئلہ پر جتنا غور کرتے ہیں انھیں ایک خالق [illegible] کی ضرورت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ان کے نزدیک کیا عقل اسے ماننے کے لیے تیار ہے کہ یہ [illegible] محض ایک حادثے یا اتفاق کی بدولت واقع ہوا اور ایسا خود [illegible] خود بخود کیا ہے؟ کیا اس خود بخود قوت ہی کو ہم قدرتِ خداوندی قرار [illegible] سکتے ہیں؟

قرآن مجید نے اس خالق باری کے وجود پر جس طرح سے استدلال کیا ہے، وہ ہمارے مفکرین کے لیے رہنما کا کام دیتا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والا اللہ میں کوئی شک ہے؟" (۱۴: ۱۰)

اگر اس میں شک ہے تو ذرا غور کرو کہ

"کیا وہ خود بخود بن گئے یا اپنے پیدا کرنے والے وہ خود ہیں یا انھی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (نہیں بلکہ) انھیں یقین نہیں (طور ۵۲: ۳۵، ۳۶)۔ اس قسم کی سینکڑوں آیات ہیں، جن میں عموماً ذیل کی تین اقسام کے دلائل ہیں۔

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔
۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔
۳۔ کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

اللہ کے تصور کے سلسلے میں اقوام عالم نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بقول مولانا نعیم صدیقی بہت سے جدید معاشروں میں بھی خدا کا تصور یہ رہا ہے کہ اگرچہ وہ آخری اقتدار کا مالک ہے، لیکن اسے اپنے بندوں کی زندگی اور مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اس نے محض تخلیق کا ایک کھیل رچا رکھا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے، جیسے کوئی بچہ پھلجڑی چھوڑ کر مزا لیتا ہے۔ خدا کے بارے میں یہ تصورات انسان کے ناقص شعور کے مظہر ہیں۔

قرآن مجید سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کی روزمرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے سے اتنا گہرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے، مختلف سرگرمیوں کے بھلے اور برے پہلو نمایاں کرتا ہے، قدم قدم پر ہدایات دیتا ہے۔ وہ کہیں عدل، احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے کہیں نفاق اور بزدلی اور مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ کہیں وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضا کو قائم رکھنے میں سبق دیتا ہے، کہیں رضاعت اور میراث کے معاملات میں انھیں پریشانیوں سے نکالتا ہے۔ کہیں آداب مجلس سکھاتا ہے۔ کہیں حدود و تعزیرات اور قوانین متعین کرتا ہے۔ الغرض دکھ درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین استاد ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ایسے خدا کو ماننے سے جو اعتماد، یقین اور پختہ شعور حاصل ہوتا ہے، وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

اللہ تعالٰی کی ہستی کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے۔

"اللہ ایک ہی تو ہے، وہ بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ہے۔ نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ (۱۱۲: ۱ تا ۴)، وہ لاشریک (۹: ۹۱) بے نظیر (۴۲: ۱۱) ہر نقص اور کمزوری سے پاک (۵۹: ۲۳)، اس کے لیے نہ تھکن ہے (۵۰: ۳۸) نہ زوال نہ فنا (۵۵: ۲۷) نہ موت (۲۵: ۵۸) نہ ہلاکت (۲۸: ۸۸)، وہ حی و قیوم، بزرگ و برتر ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ ایسا کون ہے، جو سفارش کرے اس کے پاس، مگر اجازت کے ساتھ۔ وہ جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ سب اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا کہ وہ چاہے اس کا علم (کرسی) آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور انھیں تھامنا اسے گراں نہیں اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔" (۲: ۲۵۵)۔

وہ ہر شے کا رب ہے (۶: ۱۶۴) جو چاہے پیدا کرے (۳: ۴۷) اور جیسے چاہے اضافہ کرے (۳۵: ۱) سب اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں (۳۰: ۲۶) کوئی نہیں جو اس کی بندگی سے آزاد ہو (۱۹: ۹۳) اسی کے ہاتھ میں ہر شے کی حکومت ہے (۲۳: ۸۸) یہ ہے اللہ رب برحق (۱۰: ۳۲)۔ اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں (۱: ۲) وہی اول ہے، وہی آخر، وہی ظاہر ہے، وہی باطن (۵۷: ۳)۔ اسی کے لیے ہیں اسماء الحسنیٰ (۲۰: ۸) اسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن۔ اس کے نام اچھے ہی ہیں۔ (۱۷: ۱۱۰)

قرآن مجید کے پیش کردہ تصور الوہیت اور اسماء الحسنیٰ کو صفات الٰہیہ سے تعبیر کرنے سے ذات باری کا ایک ایسا تصور قائم ہو جاتا ہے، جو ہر لحاظ سے مکمل، مرغوب، مطلوب اور ادراک و وجدان کے مطابق ہے۔ ہمارے حواس اور مشاہدات اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ اور یوں ایمان باللہ ایک اصول حیات کی صورت میں دلوں میں گہری جگہ پا لیتا ہے۔

یونانی فلسفہ اور عجمی اثرات کے پیش نظر مسلمانوں نے ذات الٰہیہ کی عقلی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔ اس توجیہ میں کچھ لوگ تو بھٹک گئے اور کچھ نے ایسی ایسی موشگافیاں

گئیں، جو ہمیں حقیقت سے دور لے جاتی ہیں۔ عقلیت پسندوں کی طرح اہل تصوف نے بھی اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔ عقلیت پسندوں میں سرفہرست معتزلہ ہیں جنھوں نے جبر و قدر، اور ذات و صفات کے مسائل پر منطقی اندازِ فکر کی روشنی میں ایک مکمل نظام فکر تیار کر لیا۔ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ اس تحریک کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا تو اشعری مکتب فکر نے جنم لیا۔ انھوں نے صفات کو عین ذات نہ مانا۔ یہ لوگ عقل کا رد نہیں کرتے تھے مگر انھوں نے یونانیت کے خلاف کامیابی کیساتھ احتجاج کیا۔ ان کے قائم کردہ تصورات آج بھی مفکرین اسلام کے لئے قابلِ قدر ہیں۔ ان دونوں مکاتب کے بین بین ایک اور مکتبِ فکر ماتریدیہ نے جنم لیا۔ اہل تصوف کی طرف نظر کریں تو ان کے ہاں اللہ تعالےٰ کی ہستی میں کامل یقین اس کی معرفت اور اس سے تقرب کی آرزو میں زندگی کا ایک اور ہی مسلک نظر آتا ہے، جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ذات کے اثبات اور معرفت کا راستہ علم اور عقل کی بجائے صوفیانہ وارداتِ قلبی کی بدولت طے ہوتا ہے۔ بعض امور پر آکر دونوں طرح کے اندازِ فکر کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ مثلاً ابن عربی کے ہاں فلسفہ اور تصوف کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان سے نظریۂ وحدت الوجود منسوب کیا جاتا ہے۔ جس کی رُو سے وجود اور ہستی صرف اللہ کی ہے۔ باقی سب اسی کا ظہور ہے، چونکہ اس میں مخلوق کی انانیت اور انفرادیت کی نفی ہوتی تھی۔ اس لئے ایک ایسا ردِ عمل شروع ہوا جسے آج عجمی تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے سب سے بڑے مبلغ حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کا پرتو ہے۔ مگر وہ خود اس سے الگ ہے۔ گویا ذاتِ الٰہیہ ہر شے کا عین نہیں۔

الٰہیات اسلامیہ پر کام کرنے والے دیگر مشاہیر میں امام غزالی، ابن حزم، ابن تیمیہ ابن خلدون اور الشہرستانی قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً ابن تیمیہ اور امام غزالی کا ذکر کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابن تیمیہ کی ذات میں تمام مکاتب فکر جمع ہو چکے تھے ان کے استنباط نتائج سے مغرب نے اور امام غزالی کی تصانیف سے فلسفۂ حاضر نے خاصا اثر لیا۔ جدید دور میں شاہ ولی اللہ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد علامہ اقبال آتے ہیں، جنھوں نے مشرق و مغرب کے افکار و خیالات، علمی و مذہبی رجحانات و تحریکات کا جائزہ لینے کے بعد الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کی۔ ان کے نزدیک ذاتِ الٰہیہ ایک مطلق "انا" (خودی) ہے۔ ان سے ہمارا ذہن مولانا روم کی طرف جاتا ہے۔ جنھوں نے الٰہیات کے بنیادی اور متفق علیہ امور کو پیش کیا ہے۔

یہی وہ امر تھا، جس کی بنا پر ملت اسلامیہ مختلف مکاتب فکر میں بٹ گئی اور ان کے متبعین کی شدتِ پیروی نے فرقہ پرستی کو جنم دیا۔ تاہم ان سب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور بنیادی امور میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالےٰ واحد ہے، موجود ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے علیم و خبیر اور رحمان و رحیم ہے۔

(نیز دیکھئے "اسماء الحسنیٰ"، "توحید" اور دیگر متعلقہ عنوانات)

اللہ اکبر "اللہ بہت بڑا ہے" کلمۂ تکبیر۔ نماز اور اذان کے آغاز میں یہ کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ نیز حلال جانوروں کو ذبح کرنے کے شرعی حکم کو کرنے، اعلان جہاد کرنے اور اظہار تعجب کرنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (نیز دیکھئے "تکبیر")

اللہب، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۱ ویں سورت۔ ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے مکہ کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اسے سورۂ تبت بھی کہتے ہیں

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ حق سے دشمنی کرتے ہیں ان کا انجام ہلاکت ہے چنانچہ ابولہب جو آنحضرتؐ کا چچا تھا حق کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ جب آنحضرتؐ کو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ اپنے رشتہ داروں کو ڈراؤ تو آپؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر سب قبیلوں کو آواز دی جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک دستہ حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم لوگ اسے سچ مانو گے سب نے کہا کہ ہم نے آپؐ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اس پر ابولہب نے کہا کہ تو ہلاک ہو۔ تو نے ہمیں صرف اس لئے جمع کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ کو اپنے محبوبؐ کی شان میں اس کی یہ گستاخی پسند نہ آئی اور یہ سورت نازل ہوئی۔ اس سورت میں ابولہب اور اس کی بیوی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان دونوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو شخص بھی حق کی مخالفت کرے گا اس کا یہی انجام ہوگا۔

اللّٰھم "یا اللہ"، "اے اللہ"۔ ندائیہ کلمہ جو مالک حقیقی کو پکارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اسے کبھی لاہم بھی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ تاکید اور سوال کے جواب کو سامع کے ذہن میں اتارنے کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ بعض مستشرقین کے نزدیک اللّٰھم عرب کے عام معبودوں سے مختلف اور بلند تر معبود (اللہ) کے لئے مخصوص تھا عرب میں معاہدات کا آغاز عام طور پر باسمک اللّٰھم سے کیا جاتا تھا۔

اللیل، سورۃ قرآن پاک کی ۹۲ ویں سورت۔ اس میں ایک رکوع اور اکیس آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔

اللیل کے نام میں اشارہ ہے کہ جس طرح رات اور دن ایک جیسے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح سے نیک کام کرنے والا اور نیکی کی تصدیق کرنے والا اس شخص سے بالکل مختلف ہے جو حق کو جھٹلاتا ہے۔ سورت میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی تو وہ ہے جو اپنا مال دیتا ہے اور پرہیزگاری اختیار کرتا ہے نیز یہ کہ اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرا شخص بخل کرتا ہے اور خدا کی رضا کی پرواہ نہیں کرتا نیز بھلی بات کو جھٹلاتا ہے۔ ان خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ پہلی تین خصوصیات کے حامل لوگوں کے لئے اللہ تعالےٰ نیکی کی زندگی آسان کر دے گا۔ اور ان کے لئے نیکی کرنا آسان ہو جائے گا۔ اسی طرح سے دوسری خصوصیات کے حامل لوگوں کے لئے اللہ تعالےٰ بدی کا راستہ آسان کر دے گا۔ اور ان کے لئے بدی کرنا اور نیکی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ آیت ۱۱ سے ۱۲ تک میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے رسول اور کتاب بھیج کر یہ بتا دیا ہے کہ سیدھا راستہ کونسا ہے اور ٹیڑھا کونسا۔ نیز یہ کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہے تم دونوں میں سے جس کو بھی طلب کرو گے وہی تمہیں مل جائے گی اور جو اس بھلائی کی دعوت کو جھٹلائے گا اس کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور جو اس بھلائی کو قبول کرے گا اس کو اللہ تعالےٰ خوش کر دے گا اور خود بھی اس بندے سے راضی ہو جائے گا۔

الماعون، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۷ ویں سورت ایک رکوع اور سات آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔ بعض مفسرین نے اسے مدنی کہا ہے۔

ماعون کے معنی زکوٰۃ اور خیرات کے ہیں۔ اس سورت کے آخر میں یہ لفظ آیا ہے اسی کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتا۔

اس کے اندر اس قسم کی عادات پیدا ہوتی ہیں کہ وہ یتیم کو دھکے مارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا اور خیرات کو روکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی منافقین کا حال بتایا گیا ہے کہ جو لوگ محض دوسروں کو دکھانے کی خاطر نماز پڑھتے ہیں اور اس کی اصل روح سے ناواقف ہیں اور ایک بوجھ سمجھتے ہوئے یہ کام کرتے ہیں ان کے لئے تباہی ہے
اصل میں اس سورت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ عقیدہ آخرت کے بغیر مضبوط اور پاکیزہ کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔

المائدہ، سورۃ قرآن مجید کی پانچویں سورت۔ اس میں ۱۶ رکوع اور ۱۲۰ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔ مائدہ کے معنی "خوان" کے ہیں۔

جس زمانے میں یہ سورت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کی ایک اپنی علیحدہ تہذیب بن چکی تھی۔ جو دوسروں سے بالکل الگ تھی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی نشست و برخاست، بول چال، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے بالکل مختلف ہو چکے تھے۔ چنانچہ مسلمان اب [illegible] مقام پر تھے جہاں انہیں اسلامی تہذیب کو بالکل علیحدہ شکل دینے میں مزید تعلیمات اور ہدایات کی ضرورت تھی۔ لہذا اس سورت میں مسلمانوں کو اس بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

اس سورت میں مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے بارے میں مزید احکامات دیئے گئے ہیں مثلاً آغاز میں حلال و حرام کی قطعی حدود قائم کی گئی ہیں۔ اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ وضو، غسل اور تیمم کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ عیسائیوں کے اس عقیدے کی اصلاح کی گئی ہے جو ان کا حضرت مسیح کے بارے میں تھا۔ بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے یا خدا نہیں ہیں اور اگر خدا انہیں اور ان کی ماں کو ہلاک کر دینا چاہتے تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اللہ کو اس ارادے سے باز رکھ سکتا۔

چوری اور زنا کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ نیز شراب، جوا قطعی حرام قرار دیا گیا قسم توڑنے کا کفارہ بتایا گیا اور گواہی کے سلسلے میں مزید چند باتیں بتائی گئی ہیں۔
حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا ذکر کر کے مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ موسیٰ کی قوم کے لوگوں جیسا طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو کہہ دیا تھا کہ تم خود اور تمہارا اللہ جا کر ان سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔
اب چونکہ مسلمان ایک حکمران گروہ بن چکے تھے اور طاقت اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے اس لیے بتایا گیا کہ وہ عدل پر قائم رہیں اور کسی دوسری قوم پر زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ نیز یہ کہ انہوں نے جو عہد اللہ سے کیا ہے اس پر کاربند رہیں اور اہل کتاب کی طرح اس عہد کو توڑ کر اس ذلت والے انجام سے دوچار نہ ہوں جو انجام انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام معاملات کے فیصلے کرتے وقت کتاب الٰہی کے پابند رہیں۔ اور منافقت سے کام نہ لیں۔
سورت کے آخری حصہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کو مخاطب کر کے ان کے غلط عقائد پر بحث کی گئی ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ اب بھی وہ اپنی پرانی روش کو ترک کر کے آنحضورؐ کی رسالت پر ایمان لے آئیں۔
آخری آیت میں بتایا گیا ہے کہ ساری زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ کے لئے ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

المجادلہ، سورۃ قرآن مجید کی ۵۸ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ۲۲ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

سورت کے پہلے رکوع میں ایک خاتون کا ذکر کیا گیا ہے جس نے اپنے شوہر کے ظہار کا معاملہ رسولؐ اللہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ ظہار کے شرعی احکامات بیان کئے گئے ہیں۔
دوسرے رکوع میں مسلمانوں کو مجلس کے آداب بتائے گئے ہیں اور ان برائیوں کو دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس میں پہلے لوگ اور اس وقت کے لوگ مبتلا تھے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی کسی اہم شخصیت کے ہاں جائے تو وہاں جم کر بیٹھ نہ جائے۔ کیونکہ اس بات سے آنحضورؐ کو بھی سابقہ پیش آتا تھا۔ اور کئی ضروری کام رک جاتے تھے۔
تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ سچے اور مخلص لوگ مسلم معاشرے میں کون سے ہیں۔ اور مخلص ہونے کا معیار بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کے بارے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے خواہ ان کا کوئی باپ، بھائی، بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ کی جماعت میں شامل ہونے کا شرف انہی کو ہے اور ان ہی سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور وہی فلاح پائیں گے۔

المدثر، سورۃ قرآن پاک کی ۷۴ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۵۶ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ کی ابتدائی سات آیات دوسری وحی کی ہیں جو آنحضورؐ پر نازل ہوئی۔ پہلی وحی کے نزول کے بعد کچھ عرصہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا۔ آنحضرتؐ بہت پریشان رہنے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس وقت آپؐ پر شدید غم و رنج کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ جبرئیلؑ آپؐ کے پاس آتے اور کہتے کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ آپؐ نے خود فرمایا ہے کہ ایک روز میں راستے سے گذر رہا تھا تو میں نے آسمان سے یکایک ایک آواز سنی اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر آ کر کہا کہ مجھے اڑھاؤ۔ مجھے اڑھاؤ۔ گھر والوں نے مجھے کمبل اڑھا دیا۔ اس وقت یہ سورت نازل ہونا شروع ہوئی
سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اے "اوڑھنے والے" اٹھ اور خبردار کر اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ نیز منکرین حق کو بتایا گیا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا برا انجام وہ قیامت کے روز دیکھیں گے۔ اسی رکوع میں اس شخص کا بھی ذکر ہے جس نے آنحضورؐ کو جادوگر قرار دیا تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ قوم سے انعام لینا چاہتا تھا حالانکہ وہ انعام کا نہیں جہنم کا سزاوار ہے
دوسرے رکوع میں جہنم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کیسی ہے اور کون سے لوگ اس کے مستحق ہیں۔ نیز کفار کے انکار کی اصل وجہ بتائی گئی ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اس لئے بے خوف ہیں اور اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔
آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کو کسی کے ایمان کی ایسی ضرورت نہیں کہ وہ کفار کی شرطیں پوری کرے۔ بلکہ قرآن تو ایک نصیحت ہے جو لوگوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ جو چاہے اسے قبول کرے۔ نیز اس بات کا صرف اللہ مستحق ہے کہ لوگ اس سے ڈریں اور وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

المرسلت، سورۃ قرآن مجید کی ۷۷ ویں سورت۔ اس میں ۲ رکوع اور پچاس آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ مرسلات سے مراد رسولوں کی جماعتیں ہیں۔
سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قیامت جس کی خبر آنحضرتؐ نے لوگوں کو دی ہے ضرور آ کر رہے گی۔ اس بارے میں دلائل بھی دیئے گئے ہیں کہ اللہ جو اس سارے نظام کو قائم کئے ہوئے ہے۔ اس کے لئے قیامت قائم کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ نیز کفار مکہ کے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ وہ قیامت کو تب مانیں گے جب

وہ آئے گی۔ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ قیامت کوئی کھیل اور تماشا نہیں ہے کہ جونہی اس کے دکھانے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ دکھا دی جائے۔ بلکہ اس کا ایک دن مقرر ہے اور جب لوگ اسے دیکھیں گے تو حواس کھو بیٹھیں گے۔

سورت کے دوسرے رکوع میں ان لوگوں کے بارے میں ذکر ہے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کر کے اپنی عافیت سنوار لی۔ اس کے ساتھ جیسا کہ قرآن کا اسلوب ہے ان لوگوں کو مخاطب کر کے جو آخرت کے منکر تھے کہا گیا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے لہٰذا جتنے مزے اڑانا چاہو اڑا لو آخر انجام کار اس عذاب میں داخل ہو گے جو بہت المناک ہے۔

المریم، سورۃ

قرآن پاک کی ۱۹ ویں سورت۔ اس میں چھ رکوع اور ۹۸ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ جب چند مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور جب ان کی پیشی نجاشی کے دربار میں ہوئی تو حضرت جعفر طیار نے یہی سورت بھرے دربار میں پڑھی تھی۔

سورت کے پہلے رکوع میں حضرت یحییٰؑ کا ذکر ہے نہ صرف ان کی بے گناہی ثابت کی گئی ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے حضرت عیسیٰؑ ہی تنہا نہ تھے بلکہ حضرت یحییٰؑ کو بھی اس قوم کی ہدایت پر مامور کیا گیا۔

دوسرے رکوع میں حضرت عیسیٰؑ کے حمل مریم میں آنے، پیدا ہونے اور نبی ہونے کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ وہ صرف انسان اور اللہ کے نبی تھے اس سے زیادہ ان کی حیثیت کچھ نہیں تھی۔

تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انہیں بھی اپنے اہل وطن کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنے وطن سے نکلنا پڑا تھا۔ دوسری طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہیں اور تم لوگ بالکل ان ظالموں کی مانند ہو جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کے گھر سے نکالا تھا۔ نیز ہجرت کرنے والوں کو یہ بھی بشارت دی گئی کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ وطن سے نکل کر ناکام اور تباہ و برباد نہیں ہوئے تھے بالکل اسی طرح مہاجرین کا انجام بھی اچھا ہی ہو گا۔

چوتھے رکوع میں مختلف انبیاء کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نبوت کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے انسان پیدا ہوا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گئی۔

پانچویں اور چھٹے رکوع میں کفار مکہ کی گمراہیوں پر تنقید کی اور آخر میں اہل ایمان کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ ان مخالفین اسلام کی کوششوں کے باوجود تم بالآخر اللہ کے محبوب بن کر رہو گے۔

المطففین، سورۃ

قرآن مجید کی ۸۳ ویں سورت۔ ایک رکوع اور ۳۶ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں بے ایمان تاجروں کی اس ذہنیت کا ذکر ہے جس میں [illegible] تو پورے ناپ تول سے لی جاتی ہیں اور دیتے ہوئے گھٹا کر دیا جاتا ہے۔ نیز اسی طرح کی دوسری برائیوں کی وجہ ان کا آخرت پر ایمان نہ ہونا قرار دیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اس وقت تک آدمی برائیوں سے بچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کا یہ ایمان نہ ہو کہ ایک روز اس نے اپنے خالق حقیقی کے پاس جانا ہے اور وہاں اس دنیا میں کیے گئے تمام اعمال کی جواب دہی ہونا ہے۔ نیز یہ کہ بدکار لوگوں کو آخرت میں سخت تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور ان کے مقابلے میں نیک لوگوں کے انجام کا بھی ذکر ہے۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ مخالفین جو آج اہل حق کی تحقیر و تذلیل کر رہے ہیں قیامت کے روز اپنا انجام بہت برا دیکھیں گے۔

المعارج، سورۃ

قرآن مجید کی ۷۰ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۴ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں ایک طرف تو مومنوں کو بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ان صفات کو جن کا اس سورت میں ذکر ہے تزکیۂ نفس کے لیے اپنے اندر داخل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے بہت بلند درجات ہیں۔ دوسری طرف ان کفار کو جو آنحضورؐ کی دعوت کا مسلسل انکار کیے چلے جا رہے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ کا عذاب مانگنے کی بجائے وہ بھی ان صفات کو اپنے اندر پیدا کریں۔

ابتدائی آیات میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ عذاب جس سے ہمیں ڈرایا جاتا ہے جلا لے آ۔ ان پر وہ عذاب ضرور آ کر رہے گا اور جب وہ عذاب ان پر آ جائے گا تو کوئی اسے ان پر سے ٹال نہیں سکے گا لیکن اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کے ساتھ ہی آنحضورؐ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ کئی آیات میں قیامت کا نقشہ کھینچ کر بتایا گیا ہے، جس کا [illegible] مذاق اڑا رہے ہیں جب وہ ان پر آ جائے گی تو اس پر انہیں معلوم ہو گا کہ وہ کیا [illegible] اس وقت یہ لوگ [illegible] سے عزیز ترین چیز اس کے فدیہ میں دینے کے [illegible] کے مگر ان سے کوئی [illegible] اس عذاب کے بدلے میں قبول نہیں کی جائے گی [illegible] عذاب سے [illegible] نہیں بچ سکیں گے۔

سورت کی درمیانی آیات میں ان صفات کا ذکر ہے [illegible] ہاں بلند درجات پائیں گے۔ مثلاً خدا خوفی، آخرت پر ایمان [illegible] بندوں کا اپنے مال سے حصہ ادا کرنا، بدکاریوں سے اپنے [illegible] کرنا۔ اپنے وعدوں کا پاس کرنا۔ سچی گواہی دینا وغیرہ۔

آخر میں کفار مکہ کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ اگر وہ آنحضورؐ [illegible] سے باز نہیں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایک اور قوم [illegible] فرمانبردار ہو گی۔ نیز رسول اللہ کو بتایا گیا کہ آپ ان لوگوں کی پرواہ [illegible] حالت میں پڑا رہنے دیں۔ حتیٰ کہ یہ اپنا برا انجام دیکھ لیں۔

الملک، سورۃ

قرآن مجید کی ۶۷ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور تیس آیات ہیں [illegible] میں نازل ہوئی۔

سورت کے نام میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایک خدا کا ملک [illegible] چلتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔

اس سورت میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ [illegible] نقص نہیں ملے گا اور جسے خدائے واحد ہی عدم سے وجود میں لایا ہے [illegible] بلکہ وہ یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے [illegible] کرنے والوں کو ان نتائج سے خبردار کیا گیا ہے جن سے آخرت میں [illegible] تم لوگ نبی کی بات مان کر اپنے اعمال درست نہیں کرتے تو تمہیں آخرت میں [illegible] گی اس کے مستحق ہونے کا تم خود اعتراف کرو گے۔ نیز اس بات کی وضاحت بھی کی گئی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال سے جو وہ کرتے ہیں بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ ان کے دلوں کے حال تک سے واقف ہے۔ لہٰذا جو اس ان دیکھے خدا کی باز پرس سے ڈر کر نیک اعمال کرے گا وہی بھلائی کا مستحق ہو گا۔

سورت کے آخری نصف حصہ میں بتایا گیا ہے کہ ان چیزوں سے تمہیں [illegible]

کرنا چاہیے جو ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے ہیں۔ ایک زمین ہی کو لے لو جس پر تم اطمینان سے چلتے پھرتے ہو اور اس سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ اس خدا ہی نے اسے تمہارا مطیع کیا ہوا ہے ورنہ اس میں ایسا زلزلہ آسکتا ہے جو تمہیں بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ پرندوں کی طرف دیکھو کہ اللہ ہی ہے جو انہیں فضاؤں میں تھامے ہوئے ہے۔ اگر وہ تمہیں عذاب میں ڈال دے تو اور کون ہے جو تمہیں اس عذاب سے بچا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے کہ اگر وہ تمہارا رزق بند کر دے تو کوئی اور تمہیں دے سکے۔ چنانچہ لازماً تمہیں اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ نبی کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ اس وقت کے آنے سے قبل تمہیں خبردار کر دے۔ نیز یہ کہ تم جو رسول اللہ اور ان کے اصحاب کی ہلاکت کی دعائیں مانگتے ہو اس سے تمہیں کیا۔ چاہیے وہ ہلاک ہوں یا نہ ہوں تم اپنی فکر کرو کہ اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے گا تو تمہیں کون بچائے گا۔

سورت کے بالکل آخر میں کفار کے سامنے ایک سوال رکھ کر انہیں غور کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی جس پر تمہاری ساری زندگی کا انحصار ہے زمین میں اتر کر غائب ہو جائے تو پھر اللہ کے سوا اور دوسرا کون ہے جو تمہیں لاکر دے سکتا ہے؟

الممتحنہ، سورۃ

قرآن مجید کی ۶۰ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور تیرہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

سورت کی دسویں آیت میں ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں ان کا امتحان لیا جائے۔ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام الممتحنہ رکھا گیا ہے۔

اس سورت میں ایک صحابی حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی جو انہوں نے محض اپنے اہل و عیال کو بچانے کی خاطر کی تھی۔ اس نے آنحضورؐ کے ایک نہایت اہم جنگی راز سے کفار کو مطلع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ کوشش بروقت ناکام نہ ہو جاتی تو فتح مکہ کے موقع پر بڑی خونریزی کا باعث بنتی۔ چنانچہ اس سورت میں تعلیم دی گئی کہ مومنوں کا کفار کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق خواہ وہ کسی غرض کے لئے ہو ناجائز ہے۔

اس سورت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ مسلمان عورت کے لئے کافر مرد حلال نہیں ہے اور مسلمان مرد کے لئے کافر عورت جائز نہیں۔ یہ مسئلہ اس وقت بہت پیچیدگی پیدا کر رہا تھا جب کہ مکہ سے بہت سی مسلمان عورتیں ہجرت کر کے کسی نہ کسی طرح مدینہ پہنچ رہی تھیں اور اسی طرح مدینہ میں بہت سے مسلمان ایسے تھے جن کی بیویاں کافر تھیں اور مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔

اس سورت میں رسول اللہ کو ہدایت دی گئی کہ جو عورتیں اسلام قبول کریں ان سے آپ ان بڑی بڑی برائیوں سے بچنے کا عہد لیں جو عرب معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان سے یہ اقرار لیا جائے کہ وہ بھلائی کے ان تمام طریقوں کو اختیار کریں گی جن کا حکم اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے۔

المنافقون، سورۃ

قرآن مجید کی ۶۳ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور گیارہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں منافقوں کا ذکر ہے جو منہ سے کچھ کہتے تھے اور دل میں کچھ رکھتے تھے۔

سورت کے پہلے رکوع میں منافقین کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ جب آنحضورؐ کے سامنے آتے ہیں تو قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یقیناً آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں لیکن انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ نیز بتایا گیا کہ یہ پکے دشمن ہیں ان سے بچ کر رہیں۔ اس رکوع میں آنحضورؐ کو مخاطب فرما کر کہا گیا کہ آپؐ خواہ ان کے لئے مغفرت کی کتنی ہی دعائیں کریں اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

دوسرے رکوع میں مومنوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو غافل ہو جاتے گا وہی خسارہ مند ہوگا۔ قبل اس کے کہ جب مہلت پوری ہونے کا وقت آجائے جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔ اللہ کی یہ سنت نہیں کہ وہ وقت پورا ہو جانے کے بعد کسی کو مزید مہلت دے۔

الم نشرح، سورۃ

قرآن مجید کی ۹۴ ویں سورت۔ ایک رکوع اور آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

ابتدا میں ان تین نعمتوں کا جو رسول اللہ کو دی گئی تھیں ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے آپ کو دل شکستہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کا سینہ کھول دیا ہے۔ دوسری یہ کہ جو بوجھ نبوت سے پہلے آپؐ کی کمر توڑے دے رہا تھا وہ اتار دیا۔ تیسرے یہ کہ آپؐ کا ذکر سب سے بلند کیا گیا ہے۔

ان نعمتوں کو گنوا کر رسول اللہ کو اطمینان دلایا گیا ہے یہ دور جس سے آپؐ کو اب واسطہ ہے لمبا نہیں ہے بلکہ اس تنگی کے دور کے ساتھ ہی آسانی کا دور بھی آنے والا ہے۔ سورت کے آخر میں رسول اللہ کو بتایا گیا ہے کہ ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے جو اس وقت آپؐ کو پیش آرہی ہیں آپؐ اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر عبادت کی مشقت اور ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ سے لو لگالیں۔

الموت

قزوین سے شمال مشرق کی سمت واقع پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا قلعہ جو ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء سے ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء تک ایک شیعہ ریاست کا مرکز اور حسن بن صباح کی بنائی ہوئی جنت رہا۔ کہتے ہیں کہ کسی دیلمی بادشاہ نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ حسن علوی نے ۲۴۶ھ/۸۶۰ء میں اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں اسماعیل نزاری فرقہ کے بانی حسن بن صباح نے اس پر قبضہ کیا۔ اس فرقے کو حشیشین بھی کہا جاتا ہے۔ ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں منگولوں نے حشیشین کو شکست دی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶۷۴ھ/۱۲۷۵ء میں حشیشین نے اسے دوبارہ فتح کیا۔ مگر بہت جلد یہ ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ آج کل یہ قلعہ کھنڈر ہو چکا ہے۔ تاہم اس کے اردگرد کے علاقے اور صوبے کا نام الموت ہی ہے۔

النازعات، سورۃ

قرآن پاک کی ۷۹ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۶ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ نازع کے معنی اپنے آپ کو کھینچ کر نکال لینے والی جماعت۔

اس سورت میں قیامت اور حیات بعد الموت کے ثبوت دیئے گئے ہیں نیز بتایا گیا کہ رسولوں کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

شروع سورت میں مختلف فرشتوں کی قسم کھا کر بتایا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہو گی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور آکر رہے گی۔ نیز لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام جسے تم ناممکن سمجھ رہے ہو اللہ تعالےٰ کے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے، جس کے لئے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو صرف ایک جھٹکا دنیا کے تمام نظام کو درہم برہم کر دے گا۔ اور دوسرے لمحے میں تم اپنے آپ کو اللہ کے سامنے موجود پاؤ گے اور وہ لوگ جو اس کا انکار کر رہے ہیں خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔ سورت کی آیت ۱۵ تا ۲۶ تک حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ رسول کو جھٹلانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا اس عظیم الشان کائنات کی تخلیق؟۔ نیز یہ کہ آخرت ہوگی تو انسان کے ابدی اور دائمی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس نے دنیا میں بندگی کی حد سے تجاوز کرکے دنیاوی فوائد اور لذتوں کو مقصود بنالیا۔ اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے خوف سے اپنی ناجائز خواہشات کو پورا ہونے سے روکا۔ اس کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ قیامت کے آنے کا وقت صرف اللہ ہی کو معلوم ہے کسی اور کو نہیں۔ رسول کا کام صرف لوگوں کو خبردار کردینا ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کی اپنی مرضی ہے کہ جو چاہے سیدھا راستہ اختیار کرے اور اپنے اعمال درست کرے اور جو چاہے شتر بے مہار کی طرح چلتا رہے۔

الناس، سورة

قرآن مجید کی ۱۱۴ ویں اور آخری سورت یہ ایک رکوع اور چھ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ لوگوں کا حقیقی تربیت کرنے والا اور حقیقی بادشاہ صرف خدائے واحد ہے اور لوگوں کو اسی رب کی پناہ میں رہنا چاہیئے۔

اس سورت میں سورت الفلق کے مضمون کی تکمیل ہے۔ کیونکہ دونوں سورتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوئیں۔ اس سورت میں صرف ایک چیز سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ یعنی خناس کے وسوسہ کی شرارت سے بتایا گیا ہے کہ شیطان کا وسوسہ سب سے زیادہ چیز ہے جو انسانوں کو خیرات سے محروم کردیتا ہے۔ اس سورت میں شیطان کو خناس کہا گیا ہے۔ (نیز دیکھیے سورہ الفلق)

النبأ، سورة

قرآن مجید کی ۷۸ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۰ آیات ہیں۔ النباء کے معنی اس خبر کے ہیں جس سے عظیم الشان فائدہ حاصل ہو۔

آنحضورؐ نے جب مکہ میں تبلیغ کا آغاز کیا تو دعوت کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی ایک یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسرے یہ کہ آنحضورؐ کو اللہ نے رسول مقرر کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس دنیا کا آخرکار ایک روز خاتمہ ہوجائے گا اور اس کے بعد دوسرا عالم برپا ہوگا۔

ان تینوں باتوں میں سے اگرچہ پہلی بات اہل مکہ کو سخت ناگوار تھی لیکن پھر بھی وہ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ جھگڑا صرف اس بات پر تھا کہ خدائی صفات میں اللہ کیساتھ اور بھی شریک ہیں۔

دوسری بات بھی اگرچہ وہ لوگ ماننے کو تیار نہ تھے۔ مگر یہ بات ان کے لیے ممکن نہ تھی کیونکہ نبوت سے چالیس سال پہلے کی زندگی آنحضورؐ نے انہی کے درمیان بسر کی تھی اور اس پوری زندگی میں انہوں نے آپؐ کو جھوٹا یا فریب کار یا اپنی نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ لہٰذا انہیں نہ صرف دوسروں کو باور کرانے میں بلکہ خود بھی اپنا یقین اس بات پر رکھنے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی کہ دوسرے تمام معاملات میں تو آپؐ سچے ہیں اور صرف نبوت کے دعوے میں جھوٹے۔ لیکن یہ دونوں باتیں ان کے لیے تنی الجھن کی باعث نہ تھیں۔ جتنا کہ تیسری جونہی یہ بات ان کے سامنے پیش کی گئی انہوں نے سب سے زیادہ اس کا مذاق اڑایا۔

چنانچہ اس دور کی سورتوں میں بار بار اس مضمون کو دہرایا گیا ہے۔ اس سورت کے شروع میں آخرت کے منکروں سے پوچھا گیا ہے کہ یہ زمین جس پر تم چلتے پھرتے ہو اور یہ بلند و بالا پہاڑ جو تمہیں نظر آتے ہیں اور یہ کہ خود تمہیں عورتوں اور مردوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا۔ نیند جس سے تم کام کرنے کے قابل ہوتے ہو اور رات کا آنا جانا۔ آسمان جو مضبوطی سے قائم کیا گیا ہے۔ سورج جس کی بدولت روشنی اور حرارت ملتی ہے اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کو بھی دیکھ کر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ تمام چیزیں بلا مقصد نہیں بنادی گئیں کہ انسان جو چاہے کرے اور اس سے کوئی باز پرس ہی نہ کی جائے۔ لہٰذا فیصلے کا ایک دن ضرور اپنے مقررہ وقت پر آکر رہے گا۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہوگے گروہ در گروہ اپنا حساب دینے کے لیے آکھڑے ہوگے۔ جو لوگ اس بات کے قائل نہیں انہیں جہنم کا ایندھن بننا ہے۔ نیز وہ جو اپنے آپ کو اس کائنات میں ذمہ دار اور جوابدہ سمجھ کر اچھے اعمال کرتے ہیں انہیں بتایا گیا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے انعام تیار کیا ہوا ہے جو ان کے اجر سے کہیں زیادہ ہوگا۔

سورت کے آخر میں اللہ کی عدالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے کہ وہاں کوئی بلا اجازت اپنی زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ نیز بتایا گیا ہے کہ وہ وقت جس کے آنے کی تمہیں خبر دی جارہی ہے۔ ضرور آکر رہے گا۔ جو اسے مان کر سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہے اختیار کرے۔ ورنہ پھر پچھتانے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

النجم، سورة

قرآن مجید کی ۵۳ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ۶۲ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ نجم کے معنی ستارے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقبال کا ستارہ غروب ہونے کو ہے۔

سورت کے ابتدائی حصہ میں بتایا گیا ہے کہ آنحضورؐ بہکے ہوئے یا بھٹکے ہوئے آدمی نہیں ہیں اور وہ جو دعوت پیش کررہے ہیں انھوں نے اپنے پاس سے گھڑی ہے۔ بلکہ وہ جو کچھ پیش کررہے ہیں خالصتاً وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔ اور جو حقیقتیں وہ تمہارے سامنے پیش کررہے ہیں ان کو انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اس کے بعد کفار مکہ کے عقائد پر تنقید کی گئی ہے جو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ رکھے تھے۔ مثلاً لات عزیٰ وغیرہ کو معبود ٹھہرانا۔ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنانا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اس ساری کائنات کا مالک و مختار اللہ ہی ہے اور وہ ہر نیک اور بد کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔ نیز اسی سورت میں وہ چند باتیں جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بیان کی گئی تھیں بتائی گئی ہیں۔ تاکہ لوگ آنحضورؐ کی تعلیمات کو نرالی اور نئی تعلیمات نہ سمجھ بیٹھیں ساتھ ہی عاد اور ثمود اور قوم نوحؑ اور قوم لوط کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ اتفاقی حادثات کا نتیجہ نہ تھا

آخر میں لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ فیصلے کا وقت اب قریب آگیا ہے اور اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اور اب تمہیں بھی قرآن مجید اور آنحضورؐ کے ذریعے ان پہلے لوگوں کی طرح خبردار کیا جارہا ہے کہ جو روش تم لوگوں نے اختیار کی ہوئی ہے اس سے باز آجاؤ۔ نیز اس سورت کو جب کفار اور مسلمانوں کی محفل میں سنا کر آنحضورؐ نے سجدہ کیا تو تمام کفار بھی بے اختیار سجدہ میں گر پڑے۔

النحل، سورة

قرآن مجید کی ۱۶ ویں سورت۔ اس میں سولہ رکوع اور ۱۲۸ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ نحل کے معنی شہد کی مکھی کے ہیں

سورت کا آغاز ایک تنبیہی جملے سے کیا گیا ہے کیونکہ کفار مکہ بار بار آنحضورؐ سے کہتے تھے کہ جب ہم تمہاری دعوت کو جھٹلا چکے ہیں تو وہ عذاب ہم پر کیوں نہیں آجاتا جس کی دھمکی ہمیں بار بار دی جاچکی ہے۔ ان کے اس مطالبے پر فرمایا گیا کہ خدا کا عذاب تو تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ اب اس کے آجانے کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ بلکہ جو مہلت دی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

دوسرے رکوع میں توحید الٰہی پر صحیفۂ قدرت کی شہادت بیان فرمائی ہے میرے

رکوع میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کا منکر ہی عملاً توحید کا منکر ہے۔ چوتھے رکوع میں اس حق کے خلاف جو وحی الٰہی کے ذریعے آیا ہے۔ کفار کی تدبیروں کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

پانچویں رکوع میں مشرکین کے غلط بہانوں کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ عذر ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔

چھٹے رکوع میں حق کے دشمنوں کی سزا کا ذکر ہے اور بتایا گیا کہ کس قسم کے عذاب ان پر آئیں گے۔

ساتویں رکوع میں بتایا کہ فطرت انسانی شرک کو قبول نہیں کرتی۔ آٹھویں میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا سے ظلم کو دور کرنے اختلافات مذاہب کو دور کرنے کے لئے ہے۔ نویں رکوع میں وحی الٰہی کی ضرورت کو تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

دسویں رکوع میں اللہ نے اپنی مختلف نعمتوں کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کیا ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی تم لوگ دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔

گیارہویں رکوع میں بتایا گیا کہ قیامت کے برپا ہونے میں کوئی لمبا عرصہ درکار نہیں [illegible] اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔

[illegible] رکوع میں ان لوگوں کا ذکر کر کے جو آج حق کا انکار کرتے ہیں بتایا گیا ہے [illegible] ان منکرین کو کوئی حجت پیش کرنے کا موقعہ نہیں دیا جائے [illegible] استغفار کرنے کی اجازت ہوگی۔

[illegible] رکوع میں قرآن کریم کی [illegible] کا ایک نمونہ بتایا اور اس پر قیام کی ضرورت [illegible] کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ [illegible] رکوع میں کفار مکہ کو بتایا گیا کہ ان کی امن و اطمینان کی حالت [illegible] جائے گی۔

[illegible] کا ذکر کر کے مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ انہیں [illegible] حکمت عملی اختیار کرنا چاہیے۔ نیز بتایا گیا کہ اللہ کی معیت ان لوگوں کے ساتھ [illegible] ہیں اور دوسروں پر احسان کرتے ہیں۔

النساء، سورۃ قرآن مجید کی چوتھی سورت۔ اس میں ۲۴ رکوع اور ۱۷۶ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں عورتوں کے حقوق اور معاشرت اور خانہ داری کے بارے میں جس تفصیل سے کہا گیا ہے اور کسی سورت میں نہیں۔

سورت کے پہلے رکوع میں یتیموں کے حقوق اور دلہنوں کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے رکوع میں حقوق وراثت پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں اور جن رشتہ داروں کے حقوق اسلام مقرر کرتا ہے بیان کئے گئے ہیں۔

تیسرے رکوع میں عورتوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں تعلیمات دی گئی ہیں۔ چوتھے رکوع میں ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ پانچویں رکوع میں کچھ نصیحتیں بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے اموال ناحق مت کھاؤ۔

چھٹے رکوع میں بتایا گیا کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ساتویں رکوع میں تزکیہ نفس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا کہ نماز تزکیہ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ نیز نماز، وضو اور تیمم کے بارے میں کچھ امور کا ذکر کیا گیا ہے۔

آٹھویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اپنے معاملات اہل لوگوں کے سپرد کرنے چاہئیں نیز اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے

اگلے رکوع میں بتایا گیا کہ جو اللہ اور رسول کے فیصلے کو نہ مانیں وہ منافق ہیں اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں ان کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ کن انعامات کے مستحق ہیں

دسویں رکوع میں بتایا گیا کہ حفاظت کے لئے جنگ کی ضرورت ہے لیکن منافقین مصائب سے بچنے کی خاطر جنگ سے جی چراتے ہیں۔ گیارہویں رکوع میں منافقین کا ہی حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح رسولؐ کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلاتے ہیں۔

بارہویں رکوع میں بتایا گیا کہ منافقین کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ تیرہویں رکوع میں مومن کے قتل کی سزا بتائی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا کہ ان لوگوں کا مرتبہ جو جہاد میں شامل نہیں ہوتے اُن لوگوں سے بہت کم ہے جو جہاد میں شامل ہوتے ہیں

چودہویں رکوع میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی کمزوری کی بنا پر ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے۔

پندرہویں رکوع میں یہ بات بتائی گئی کہ جنگ کے میدان میں بھی نماز ترک نہیں کرنی چاہیئے اور دوران جہاد نماز ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ سولہویں اور سترہویں رکوع میں منافقین کے خفیہ مشوروں کا ذکر کیا گیا ہے

اٹھارہویں رکوع میں شرک کے ہر پہلو سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ انیسویں رکوع میں دوبارہ یتامیٰ اور عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی ہدایت کی گئی۔

بیسویں رکوع میں بتایا گیا کہ عدل کا دامن کبھی تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے خواہ اپنا ہو یا غیر ہو۔ نیز بتایا گیا کہ جو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی راہ اختیار کرتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

اکیسویں رکوع میں منافقوں کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔ بائیسویں رکوع میں یہودیوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح انہوں نے ایک پاک دامن مریمؑ پر بہتان لگایا اور کس طرح حضرت عیسٰیؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اللہ تعالیٰ نے انؑ کو بدبختوں کے ہاتھ سے بچا لیا۔

تیسویں رکوع میں آنحضورؐ کی صداقت کی طرف توجہ دلائی اور بتایا گیا کہ جس طرح دوسرے انبیاء سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے اسی طرح سے اس نے اپنی رضا کی راہیں آنحضورؐ کے لئے کھول دی ہیں۔ نیز یہودیوں کی طرح عیسائیوں کے غلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انہوں نے بھی ایک بندے کو خدا بنا لیا ہے۔

آخری رکوع میں بتایا گیا کہ حضرت مسیحؑ کی شان اللہ کے بندہ ہونے میں ہے نہ کہ خدا ہونے میں۔ اور ساتھ ہی پھر وراثت کا ایک مسئلہ چھیڑا گیا ہے۔

النصر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۰ ویں سورت۔ ایک رکوع اور تین آیات پر مشتمل ہے۔ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ لیکن بلحاظ زمانہ یہ مدنی ہے اور بقول حضرت ابن عباس یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے جس کے بعد کوئی مکمل سورت آنحضورؐ پر نازل نہیں ہوئی اس سورت میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آنحضورؐ کو ان کی وفات کی خبر دی گئی ہے یعنی اس سورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب عرب میں فتح اسلام مکمل ہو جائے اور لوگ فوج در فوج اس دین میں داخل ہونے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کارِ عظیم جس کے لئے آپؐ کو مبعوث کیا گیا تھا مکمل ہو چکا ہے اور اب آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں اور دعا کریں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں اگر کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو اسے اللہ معاف کر دے۔

النمل، سورۃ قرآن مجید کی ۲۷ ویں سورت۔ اس میں سات رکوع اور ۹۳ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ نمل کے معنی چیونٹی کے ہیں۔ اس سورت میں چیونٹیوں کی وادی کا ذکر آیا ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں آخرت کا انکار سب چیزوں سے زیادہ رکاوٹ ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس کتاب کی تعلیمات پر عمل نہیں کر سکتا ہے

اس کے ساتھ ہی مختلف لوگوں کی ذہنیتوں کے چند نمونے بتلائے گئے۔ ایک نمونہ فرعون ثمود اور قوم لوط کے سرداروں کا ہے جو آخرت کی فکر سے بالکل بے نیاز تھے اور اللہ کی بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے اور جنہوں نے انہیں خیر کی طرف بلایا یہ اُنھی کے دشمن ہو گئے اور یہاں تک کہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر رہے۔ دوسرا نمونہ جو اس سورت میں پیش کیا گیا ہے حضرت سلیمانؑ کا ہے جن کو اللہ نے ہر طرح کی دولت و حکومت اور شان و شوکت سے نوازا تھا۔ اور جس کا سرداران مکہ کے پاس عشرِ عشیر بھی نہ تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جھکائے رکھتے تھے اور اپنے نفس کے غرور میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔

ایک تیسرا نمونہ جو اس سورت میں پیش کیا گیا ہے وہ ملکۂ سبا کا ہے جو عرب کی ایک دولت مند قوم پر حکمران تھی اور اُسے وہ تمام سامانِ عیش مہیا تھے جن کی وجہ سے ایک شخص غرور اور کبر میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اس پر بھی جب حق واضح ہو گیا تو پھر کوئی چیز اس کو قبولِ حق سے نہ روک سکی۔ پانچویں رکوع میں کفارِ مکہ کی اس مرض کو بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان میں یہ سب بگاڑ پیدا ہو رہا تھا اور وہ آخرت پر ایمان کا نہ ہونا ہے۔ اس بحث کا مقصد ان لوگوں کو جھنجھوڑنا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں رکوع میں مخالفین کے انکار کا ذکر کر کے وہ باتیں کہی گئی ہیں۔ جن سے ان لوگوں کا احساس بیدار ہو سکے اور انہیں غفلت برتنے کے نتائج سے متنبہ کیا گیا ہے۔

آخر میں قرآن کی دعوت یعنی ایک اللہ کی بندگی کو مختصر اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اس کو ماننا تمہارے لئے ہی بہتر ہے اور اس کا رد کرنا تمہارے لئے ہی نقصان دہ ہے۔

الواح تختیاں۔ اصطلاحاً وہ تختیاں جن پر مذہبی کتاب تورات لکھی گئی تھی۔ قرآن مجید میں سورۃ الاعراف میں اس کا ذکر یوں آتا ہے:۔

"اور ہم نے اس کے لئے الواح میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل فرض کر دی۔ سو اسے مضبوطی سے پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کی بہترین باتیں پکڑے۔ میں تمہیں نافرمانوں کا گھر دکھا دوں گا۔" (۷ : ۱۴۵)

ان تختیوں کی تعداد کیا تھی اور ان میں کن اشیاء کی تفصیل تھی۔ اس کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ عام طور پر ان کی تعداد سات سے دس تک بتائی جاتی ہے۔ نیز تورات میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز جن کی انہیں اس وقت حاجت تھی۔

(نیز دیکھئے "دس احکام")

الواقعہ، سورۃ قرآن مجید کی ۵۶ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ۹۶ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات کو دور کیا گیا ہے ان کے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ یقین چیز قیامت تھی۔ ان کے نزدیک یہ بات ایک افسانہ تھی کہ قیامت برپا ہوگی اور زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور جو لوگ مر جائیں گے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ ان کے نزدیک یہ سب باتیں خیالی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں بتایا ہے کہ یہ واقعہ ضرور پیش آ کر رہنا ہے اور جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو انسان تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو مقربین بارگاہِ الٰہی ہیں۔ دوسرے دائیں بازو والے اور تیسرے بائیں بازو والے۔ بعد میں بتایا گیا کہ کامیاب و کامران ہونے والے مقربین دائیں بازو والے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرح طرح کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور تیسرا گروہ جو بائیں بازو والا ہوگا وہ خسارے میں رہے گا اور برے عذاب میں پھنسا ہوگا یہ وہ شخص ہوگا جو اس دنیا میں آخرت کا منکر ہے۔

الٰہ معبود۔ جس کی عبادت کی جائے۔ یہ لفظ معبودِ مجازی اور معبودِ حقیقی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ معبودِ مجازی کے طور پر اسے دیوی دیوتاؤں اور فرضی خداؤں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور معبودِ حقیقی کے طور پر یہ اللہ تعالیٰ [illegible] تھا۔ عرب کے دورِ جاہلیت میں الٰہ اور اللہ کے الفاظ عام طور پر استعمال ہوتے تھے [illegible] اسمِ نکرہ کے طور پر اور اللہ اسمِ معرفہ کے طور پر استعمال [illegible] عام طور پر اس ہستی کو الٰہ [illegible] جو (۱) پُراسرار ہو (۲) ملجا و ماویٰ ہو۔ (۳) [illegible] سے غائب [illegible]۔ قرآن مجید میں [illegible] لا الٰہ الا اللہ سے بیان کیا گیا ہے کہ الٰہ [illegible] اللہ ہے۔ [illegible] کے سوا [illegible] الٰہ نہیں۔

الہام علم و ادراک کا ایک ذریعہ۔ امام راغب اصفہانی لکھتے [illegible] الہام کے معنی کسی کے دل میں کوئی بات القاء [illegible] لفظی معنی ہیں [illegible] جذب کر دینا۔

ابن خلدون نے الہام کو وجدان کی ایک صورت [illegible] الہام جبلت کا مترادف ہے۔ ابن اثیر اور سیوطی نے لکھا ہے کہ [illegible] سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سرفراز [illegible] اندر ہوتا ہے۔ یہ اس قسم کی وحی قرار دی جاتی ہے۔ جو [illegible] کے طور پر دل میں اترتی ہے۔ زمخشری کے نزدیک الہام کے معنی [illegible] قرآن مجید کی ایک آیت میں [illegible] ہے:۔

فالھمھا فجورھا وتقوٰھا (۹۱ : ۸) [illegible] جو نیکی اور بدی میں تمیز کر سکتا [illegible] علم کا ایک ذریعہ ہے۔ [illegible] لکھتے ہیں کہ انسان کا نفس [illegible] ذریعہ تزکیہ اختیار کر لیتا ہے تو اسے فرشتوں کے ساتھ اتصال [illegible] جس قدر یہ اتصال قوی یا ضعیف ہوتا ہے اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ [illegible] کے دروازے اس پر کھول دیتا ہے جو دوسروں کی قدرت سے باہر [illegible] حالت میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے [illegible] نفسِ لطیف [illegible] مادیات کے تعلق سے منقطع ہوتا ہے۔ اس کے بعد [illegible] علومِ غیب [illegible] کے پانچ ذرائع بتائے ہیں۔ جن میں پہلا ذریعہ الہام ہے۔ [illegible] غیر مادی سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک یہ حالت کسبی نہیں [illegible] محنت سے حاصل ہو سکتی ہے یہ قدرتِ خداوندی کا عطیہ ہے اور وہ [illegible] میں ودیعت کر دیتا ہے۔ (نیز دیکھئے "وحی")

الیاسؑ اللہ تعالیٰ کے ایک نبی۔ طبری کے بقول بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر دو جگہ (۶ : ۸۵، ۳۷ : ۱۲۳) پر نام کے ساتھ آیا ہے۔ ان

آیات میں حضرت الیاسؑ کی نبوت کا ذکر کیا گیا ہے، جب بنی اسرائیل اللہ تعالےٰ سے برگشتہ ہو کر بعل زبوب کے پرستار ہو گئے۔ سورہ انعام میں حضرت الیاسؑ کو حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے قرار دیا گیا ہے۔ بعض روایات میں انھیں حضرت ادریسؑ ہی قرار دیا گیا ہے جب کہ قرآن مجید میں حضرت الیاسؑ اور حضرت ادریسؑ کا تذکرہ جدا جدا ناموں کے ساتھ ہوا تھا۔

عبرانی زبان اور بائبل میں ایلیاہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جسے مفسرین نے الیاسؑ ہی کا نام قرار دیا ہے۔ ایلیاہؑ کا تعلق تشبہ نام کے کسی گھرانے سے تھا۔ آپ نے جلعاد کے مقام پر سکونت اختیار کر لی اور پوری زندگی دولت و ثروت اور جاہ و جلال سے بے نیاز ہو کر بسر فرمائی۔ ان کے زمانے میں آخیاب اسرائیل کا بادشاہ تھا۔ اس کی بیوی مشرک تھی اور اس نے دیوتا بعل کی عبادت رائج کی۔ یہی زمانہ تھا جب ایلیاہؑ منظر عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے جلعاد سے آکر آخیاب کو نوٹس دیا کہ دیکھ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا۔ چنانچہ قحط برپا ہوا جو ساڑھے تین برس تک جاری رہا۔ آخیاب کے ہوش ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت ایلیاہؑ کو بلوایا۔ انھوں نے لوگوں کے سامنے ثابت کیا کہ بعل جھوٹا دیوتا ہے۔ اس کے بعد بارش کے لیے دعا مانگی جو فوراً قبول ہوئی۔ آخیاب کی بیوی ایزبل آپ کی دشمن ہو گئی۔ چنانچہ آپ وہاں سے نکل کر کوہ سینا پر چلے گئے۔ اسی زمانہ میں یہودہ کے حاکم یہورام نے آخیاب کی بیٹی سے شادی کر لی اور یہ اثرات وہاں سے نکل کر یہودہ میں بھی پھیلنے لگے۔ حضرت ایلیاہؑ نے [illegible] اور آگاہ کیا مگر وہ بھی نہ مانا اور عذاب الٰہی کا مستحق ٹھہرا۔ چند برس بعد حضرت ایلیاہؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے آخیاب اور پھر اس کے بیٹے [illegible] کی کوشش کی۔ مگر کچھ نہ ہو سکا اور آپ کی بددعا سے آخیاب [illegible] کے بعد اللہ تعالےٰ نے اپنے اس نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

[illegible] کے زمانہ میں یہودی بائبل کی رو سے آنے والے [illegible] کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاسؑ [illegible] تیسرے وہ نبی۔ جب حضرت [illegible] اور انھوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے [illegible] نے ان کے پاس جا کر پوچھا کیا تم مسیح ہو یا ایلیاہ یا وہ نبی؟ انھوں نے کہا میں [illegible] سے کوئی بھی نہیں۔ جب حضرت عیسیٰ تشریف لائے تو یہودیوں نے یہی [illegible] انھوں نے جواب دیا۔ ایلیاہ تو آ چکا۔ مسیح میں ہوں اور وہ نبی [illegible]

الیاس دہلوی، مولانا

۱۳۰۲ھ / ۱۸۹۶ء — ۲۲ رجب ۱۳۶۳ھ / [illegible] ۱۹۴۴ء مشہور عالم دین اور تبلیغی جماعت کے بانی۔ تاریخی نام اختر الیاس تھا۔ والد کا نام محمد اسماعیل تھا۔ [illegible] ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ بعد میں دہلی آ بسے۔ والدہ [illegible] مظفر حسین کاندھلوی کی نواسی تھیں۔ خاندانی دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ بعد ازاں بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ اپنے ساتھ گنگوہ لے آئے اور خود ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی آپ کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ گنگوہ اس وقت بڑے بڑے علماء و صلحاء کا مرکز بنا ہوا تھا، چنانچہ اُن کی تعلیم و تربیت اسی مقدس ماحول میں ہوئی۔ طالب علمی کے زمانہ میں بہت سخت بیمار ہوئے۔ جب بیماری دور ہوئی تو پھر پڑھنا شروع کیا اور دیوبند میں شیخ الہند محمود الحسن صاحب سے ترمذی اور بخاری شریف کی سماعت کی۔

مولانا الیاس نے گنگوہ میں طالب علمی کے زمانہ ہی میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کر لی تھی۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد، مولانا کا زیادہ تر وقت خلوت اور مراقبہ میں بسر ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے بڑا مجاہدہ کیا۔

مولانا عبدالقادر رائے پوری کہتے تھے کہ مولانا الیاس سے تبلیغ و اشاعت دین کا جو کام لیا گیا اور انہیں جو مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اسی مجاہدے کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں مظاہر العلوم سہارنپور میں بطور مدرس تقرری ہوئی۔ بعد میں اپنے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب کی وفات پر دہلی میں اپنے والد اور بھائی کی مسند اور مدرسہ کو سنبھالا۔

میواتیوں کو مولانا سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کیونکہ بہت سے میواتی ان کے والد اور بڑے بھائی کے شاگرد و مُرید تھے۔ انہوں نے مولانا سے میوات تشریف لے جانے کو کہا۔ میوات کا علاقہ غیر متمدن تھا اور اب تک تعلیم سے محروم تھا۔ مولانا نے اُن لوگوں کی بات اس شرط پر قبول کی کہ وہ میوات میں دینی مدرسے قائم کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام کرنے کی شرط قبول کی۔ اگرچہ یہ ان کے لئے بڑی دشوار گزار بات تھی۔ چنانچہ مولانا میوات تشریف لے گئے۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد میوات کے علاقہ میں دینی مدارس کی تعداد سو کے لگ بھگ ہو گئی جو مولانا الیاس کے اخلاص اور سوز کا نتیجہ تھی۔ لیکن بعد میں مولانا کی طبیعت مکاتیب سے غیر مطمئن ہو گئی، کیونکہ طالب علم پڑھائی کے بعد اکثر اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتے تھے اور دین کی کوئی زیادہ خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ اس بات کا ذکر مولانا نے سید عطاء اللہ بخاری سے بھی کیا ہے۔

۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء میں مولانا دوسرے حج کے لئے گئے۔ حج کے بعد کچھ عرصہ مدینہ میں رہے۔ اس قیام کے دوران میں مولانا کو خواب میں امر ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ مولانا نے کچھ دن اس پریشانی میں گزارے کہ میں کمزور آدمی کیا کر سکوں گا۔ چنانچہ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء میں حج سے واپسی کے بعد تبلیغی گشت کیا اور لوگوں کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر اسلام کے اوّلین ارکان، کلمہ توحید اور نماز وغیرہ کی تبلیغ کریں۔ شروع شروع میں تو لوگوں میں کچھ حجاب رہا، بعد میں رفتہ رفتہ میواتی لوگ اس کام سے مانوس ہونے اور میوات کے علاقے سے بہت سی تبلیغی جماعتیں باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ گھروں میں اور کاروبار میں رہ کر لوگ دین نہیں سیکھ سکتے۔ لہٰذا یہ کچھ عرصے کے لئے باہر رہیں۔ کچھ خود سیکھیں اور کچھ دوسروں کو سکھائیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب ان پڑھ میواتی گاؤں کے لوگ اہل دین کی خدمت میں رہ کر دین سیکھ کر آئے تو اُن کی حالت ہی بدل گئی اور اُن میں دین کا علم سیکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا۔

مولانا کا اس کام کے بارے میں نقطۂ نظر بہت بلند تھا۔ اُن کے سامنے صرف اتنی سی بات نہ تھی کہ صرف عوام الناس نماز، روزہ سیکھ جائیں اور ذکر و اذکار کے پابند ہو جائیں بلکہ مولانا پوری ملت اسلامیہ کو بیدار کرکے، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کو اسلامی بنانے کی فکر رکھتے تھے۔ خود مولانا کے الفاظ میں :

”ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے، اسلام کے پُورے علمی و عملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا۔ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت۔ سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نماز کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پُورے نصاب کی ا ب ت ہے۔“

مولانا نے ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء میں نکاح کیا تھا۔ اولاد میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد یوسف اور ایک صاحبزادی تھی جو مولانا محمد زکریا سے بیاہی گئی۔

مولانا پست قد تھے۔ گندمی رنگ اور دُبلا جسم تھا۔ داڑھی گھنی تھی۔ زبان میں قدرے لکنت، آواز پُرجوش، طاقت ور اور عالی ہمت کہ تبلیغ کے سلسلے میں پہاڑیوں پر چڑھتے۔ تیز دُھوپ اور گرم لُو برداشت کرتے۔ مئی جون کی گرمی میں میوات کا دورہ کرتے۔ سخت سردیوں میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتے۔

مولانا الیاس کو دیکھ کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں

جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابۂ کرامؓ یاد آجاتے ہیں ۔

الیسع ؑ ایک نبی۔ جو تورات کے مطابق ایلیاہؑ (الیاسؑ) کے بعد مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر نام کے ساتھ دو جگہ (۶ = ۸۶ تا ۸۹) اور (۳۸ = ۴۸) پر آیا ہے۔ صاحب شریعت تھے۔ عہد نامہ عتیق میں انھیں الیشع لکھا گیا ہے۔ کتاب سلاطین اول کے ایلیاہؑ نے اپنی چادر سافط کے بیٹے الیشع پر ڈال دی۔ تب سے وہ ایلیاؑ کی خدمت میں رہنے لگے۔ سلاطین دوم میں الیسعؑ کے معجزات کا ذکر ملتا ہے۔ جب آپ کی بعثت ہوئی یورام شاہ اسرائیل تھا۔ اور آخر یاہ شاہ یہودہ اور وفات کے وقت یوآس شاہ یہودہ تھا "تاریخ سے تورات کے بیانات کی بہت کم تصدیق ہوتی ہے۔ تاہم یہ پتا چلتا ہے کہ الیسعؑ نے ارامیوں سے جنگ کے تاریک ایام میں بنی اسرائیل کی معاونت اور حوصلہ افزائی کی تھی۔

اُمّ ابی ھریرہؓ امیمہ بنت صبیح بن حارث، مشہور صحابیہ، حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ آنحضورؐ نے خود ان کے مسلمان ہونے کے لئے دعا فرمائی تھی۔ ایک دن انہوں نے آنحضورؐ کی شان میں نامناسب الفاظ کہے۔ ابوہریرہ کو سخت صدمہ ہوا اور روتے ہوئے آپؐ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ میری ماں کے لئے دعا فرمائیں کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی۔

اُمّ الفضلؓ لبابہ بنت حارث بن حزن، مشہور صحابیہ، ام المومنین حضرت میمونہؓ اور حضرت اسماءؓ بنت عمیس کی بہن تھیں اور آپکی ماں ہند بنت عوف تھیں۔ آپ آنحضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے بیاہی گئیں۔ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ کے بعد ایمان لائیں۔ اپنے شوہر حضرت عباسؓ کے ایمان لانے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ آپ کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں میں فضل، عبداللہ، معبد، عبیداللہ، قثم، عبدالرحمان اور بیٹی اُم حبیبہ ہیں۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ نماز جنازہ حضرت عثمان غنیؓ نے پڑھائی۔

آپ سے تیس احادیث مروی ہیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا ام الفضلؓ، سلمیٰؓ، میمونہ اور اسماءؓ چاروں مومنہ بہنیں ہیں۔" نہایت پرہیزگار و عبادت گذار تھیں۔ حضرت امام حسینؓ کو اپنا دودھ پلایا اور ان کی کفیل بن گئیں۔ اس وجہ سے سارا خاندان نبوت ان کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت ام الفضلؓ کو رسول کریمؐ کے ساتھ حج کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

اُمّ القریٰ بستیوں کا مرکز۔ عام طور پر مکہ معظمہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد بار (۶ = ۹۲)، (۴۲ = ۷)، (۲۸ = ۵۹) آیا ہے اکثر مفسرین کا قول ہے کہ اس سے مراد مکہ معظمہ ہی ہے۔ کیونکہ دہی قدیم دنیا میں ایک مرکزی شہر کی حیثیت رکھتا ہے بیت اللہ بھی وہیں ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا مرکز رجوع بھی وہی ہے۔ ابن درید کا قول ہے کہ مکہ معظمہ کو ام القریٰ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ دنیا کے وسط میں ہے۔ (نیز دیکھئے مکہ معظمہ)

اُمّ الکتاب اصل کتاب، اساسی کتاب عام طور پر اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ تین بار (۳ = ۷)، (۱۳ = ۳۹) (۴۳ = ۴) آیا ہے۔ تفسیر "روح المعانی" میں ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ بھی ہے۔ نیز وہ آیات جو اپنے مطالب کی توضیح کے لئے کسی دوسری چیز کی محتاج نہیں اور اپنی جگہ راسخ اور مستحکم ہیں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ام الکتاب اول تا آخر قرآن مجید ہے (نیز دیکھئے قرآن مجید)

اُمّ المومنین مومنوں کی ماں۔ اس کی جمع امہات المومنین ہے۔ یعنی مومنوں کی مائیں۔ یہ خطاب ازواج مطہراتؓ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ "نبیؐ سے مومنوں کو اپنی جان سے زیادہ لگاؤ ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔" (۳۳ = ۶)

ام المومنین کا لقب آنحضورؐ کی ہر زوجہ مطہرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور پہلی بار حضرت زینبؓ بنت جحش کے نکاح (یکم ذی قعدہ ۵ ھ / ۲۲ مارچ ۶۲۷ء) کے موقع پر استعمال ہوا۔ چونکہ آنحضورؐ کے بعد آپؐ کی ازواج کے ساتھ کسی اور کے نکاح کو منع قرار دے دیا گیا ہے اور نہ ہی انھوں نے ایسا کیا اس لئے انھیں امہات المومنین کہا گیا ہے اور یہ حکم بھی دیا گیا کہ نبیؐ کے قرب میں رہ کر واجب ہے کہ ان کے گھروں میں اللہ کی اور دانائی کی باتیں ہوں۔

امام راہنما، ہادی، پیش رو، (جمع ائمہ) متکلمین کے نزدیک وہ شخص ہے، جو دین کو قائم رکھنے میں رسول اللہ کا خلیفہ (نائب) ہو۔ محدثین کے نزدیک امام سے مراد محدث اور شیخ۔ مفسروں کی اصطلاح میں حضرت عثمانؓ کے حکم پر لکھے گئے قرآن مجید کے نسخے امام کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید کی رُو سے لوح محفوظ، راستے اور علم دار اشخاص کو بھی امام کہا جاتا ہے۔

امام کا لفظ خاصے وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ عام طور پر اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی پیروی کی جائے، جس کی اقتدا کی جائے۔ اس لحاظ سے متقی اور حق پرست قائدین امام کہلانے کے مستحق ہیں۔ مسجد میں نماز پڑھانے والے کو بھی امام کہا جاتا ہے اور جہاد [illegible] سپہ سالار کو بھی امام ہی کہا جاتا ہے۔ نیز دینی علوم کے ان ماہرین کو بھی امام کہا جاتا ہے۔ جنہوں نے اجتہاد سے کام لے کر فقہ، حدیث، تفسیر، کلام وغیرہ کی علمی بنیادیں استوار کیں۔

اہل تشیع کے نزدیک امام کا خطاب حضرت علیؓ کے لئے مخصوص ہے۔ ان [illegible] اثنا عشری حضرت علیؓ کے بعد ان کی اولاد میں سے پہلے گیارہ افراد کو امام برحق [illegible] فرقہ سبعیہ کے نزدیک اس کے مستحق پہلے سات امام ہیں۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ [illegible] ان ائمہ کرام میں شامل کیا جاتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک امام کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔ چار ائمہ مجتہد فی الشرع [illegible] امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل۔ کچھ مجتہد فی المذہب [illegible] امام ابن تیمیہ، امام ابویوسف، امام ابوداؤد، امام بخاری وغیرہ۔ دیگر علماء [illegible] امام غزالی، امام رازی وغیرہ۔ لغات و لسانیات کے کچھ علماء بھی امام کہلاتے ہیں [illegible] امام راغب اصفہانی۔

عام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ایک امام غائب ہیں جو قیامت کے نزدیک مہدیؑ کی صورت میں ظہور پذیر ہوں گے۔ انھیں امام مہدی کہا جاتا ہے۔ [illegible] تشیع) کے نزدیک امام غائب ہر صدی میں پیدا ہوتا ہے۔ اسماعیلی فرقے میں [illegible] تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ (نیز دیکھئے "ابن تیمیہ" [illegible] "ابوحنیفہ" [illegible] "ابویوسف"، "اثنا عشریہ"، "احمد بن حنبل"، "اسماعیلی"، "اسماعیلیہ" [illegible] "امامیہ"، "بخاری"، "جعفر صادق"، "جوینی، امام الحرمین"، "حسن بن علی"، "حسن عسکری"، "حسین بن علی"، "رازی، فخر الدین"، "راغب اصفہانی" [illegible] "علی رضا"، "علی نقی"، "غزالی"، "موسیٰ کاظم"، "مہدی امام")

امام باڑہ (اماموں کا احاطہ)، امام کوٹ۔ برصغیر پاکستان و بھارت میں اہل تشیع کے مجالس خانے، جہاں محرم کی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ وہاں تعزیے بھی رکھے جاتے ہیں۔ اکثر اوقات اس عمارت کے تعمیر کرانے والے کا نام بھی بطور

بانی تک جاتا ہے اور اس خاندان کے مقبرے بھی یہیں بنائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے امام باڑے عام طور پر لکھنو اور لاہور وغیرہ میں ہیں۔

امامت امام کا فریضہ، امارت، نماز پڑھانا، آنحضورؐ کی خلافت کے فرائض امامت کے لیے جس شخص کو منتخب کیا جاتے۔ اس کے لئے عاقل بالغ، مرد اور آزاد ہونا ضروری ہے۔ اشعریہ کے نزدیک امام کا قریشی ہونا شرط ہے مگر خارجیہ اور معتزلہ اس کے خلاف ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

نماز کی امامت کے لئے ایسے شخص کو مقرر کیا جانا چاہیے جو پرہیزگار، متقی، دانشمند، عاقل، عالم، بالغ، شجاع اور تندرست ہو۔ علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ امام کا پیرو شریعت ہونا سب سے اہم شرط ہے۔ (نیز دیکھئے "امام")

امام شاہ (۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء - ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) امام الدین عبدالرحیم بن حسن گجرات (بھارت) کے ست پنتھی فرقے کا بانی۔ اُچ کے مقام پر [illegible] اس کے ابتدائی حالات کا علم نہیں۔ البتہ عہد شباب میں پنجاب سے گجرات [illegible] لوگوں کو اپنا مرید بنانا شروع کیا۔ اسے ست پنتھی کتابوں کا مصنف [illegible] احمد آباد کے [illegible] کے مقام پر فوت ہوا۔ اس کے بعد [illegible] پر بہت جلد ہندو اثرات چھا گئے [illegible] ایک فرقہ [illegible] رہ گیا۔

امامہ بنت ابوالعاص آنحضورؐ کی نواسی۔ آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی بیٹی۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ آنحضورؐ نے [illegible] کا ایک ہار ہدیہ کہ ان کے گلے میں ڈالا تھا کہ اپنے خاندان میں اس [illegible] سب سے زیادہ عزیز ہے۔ نیز ایک بار آپؐ نے اس حالت میں نماز [illegible] کہ وہ آپؐ کے دوش مبارک پر تھیں۔

امامہ کی پرورش ان کے والد کے بعد حضرت زبیرؓ نے کی اور حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد ان کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ ان کے بطن سے [illegible] پیدا ہوئے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کا نکاح مغیرہ بن نوفل سے ہوا اور ان سے یحیٰ بن مغیرہ کی ولادت ہوئی۔ ان کا انتقال صفر کے مقام پر ہوا۔

امامیہ اہل تشیع کا ایک فرقہ، جس کے نزدیک سلسلہ نبوت کے خاتمے کے بعد امامت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک پہلے امام حضرت علیؓ ہیں۔ ان کے بعد حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور پھر امام زین العابدینؒ علی الترتیب امام ہیں۔ ان کے بعد امامیہ کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے اثنا عشریہ بارہ اماموں کا سلسلہ، سبعیہ سات اماموں اور اسماعیلیہ حاضر سلسلہ کو مانتے ہیں۔ البغدادی نے امامیہ کے پندرہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ کاملیہ، محمدیہ، باقریہ، ناؤسیہ، شمیطیہ، عماریہ، اسماعیلیہ، مبارکیہ، موسویہ، قطعیہ، اثنا عشریہ، ہشامیہ، زراریہ، یونسیہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ نزاریہ، قرامطیہ، زیدیہ، کیسانیہ وغیرہ بھی کئی فرقے ہیں۔

امان حفاظت، پناہ، امن، جاں بخشی، عہد، ذمہ۔ اگرچہ اسلام سے قبل بھی امان دینے کا رواج تھا لیکن یہ امتیاز دین اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی کو امان دے تو پوری امت مسلمہ پر لازم ہو جاتا تھا کہ اس امان کو قائم رکھے۔ اس ضمن میں متعدد احادیث مروی ہیں۔ شرعاً اس پروانہ امان کو کہتے ہیں جس کی رو سے کسی غیر ملکی دشمن یا غیر مسلم باشندے کی جان و مال ایک محدود مدت کے لئے محفوظ ہو جائے۔ یہ پروانہ حکومت کی طرف سے بھی جاری ہو سکتا ہے اور ہر آزاد و بالغ مسلمان مرد اور عورت بھی جاری کر سکتا ہے۔ بڑے علاقے کے لوگوں کو امام پروانہ امان دے سکتا ہے۔ پھر وہ لوگ مامون ہیں۔ لیکن اگر امان لینے والے مسلمانوں کے خلاف مفاد کام کریں یا کسی جرم کے مرتکب ہوں تو ان کی امان ختم ہو جائے گی مگر انھیں جائے امن تک پہنچانے کا بندوبست کرنا لازم ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں، جن میں امان نامے جاری کئے گئے۔ جو تجارتی، ذاتی، سفارتی اور سیاسی غرض کے ہر قسم کے ہوتے تھے۔

امان اللہ خان (یکم جون ۱۸۹۲ء - ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء) شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کے تیسرے بیٹے لغمان میں پیدا ہوئے۔ جب ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو ان کے والد کو قتل کیا گیا تو وہ کابل میں موجود تھے۔ ان کے چچا سردار نصر اللہ خان نے بادشاہت کا اعلان کر دیا مگر دار الحکومت پر ان کا قبضہ آئے آیا اور یوں وہ تخت شاہی پر متمکن ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے ایک معاہدہ مرتب کیا جس کی رو سے افغانستان پر سے برطانوی اثرات کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے افغانستان کو پہلا دستور عطا کیا اور ۱۹۲۶ء میں انہوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

امان اللہ خان صدق دل سے افغانستان کی ترقی چاہتے تھے۔ مگر عوام جدید اصلاحات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر میں شورش اور ہیجان برپا ہو گیا۔ بدنظمی کا ایک سیلاب سا امنڈ پڑا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں ایک قبائلی سردار حبیب اللہ بچہ سقا نے بغاوت کر دی۔ امان اللہ خان نے اسے فرو کرنے کی بے حد کوشش کی۔ مگر ناکام رہے اور ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو تخت پر بچہ سقا کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے یورپ میں سیاسی پناہ حاصل کی پھر کبھی واپس نہ آئے اور وہیں سوئٹزر لینڈ میں انتقال کیا۔

اُمِّ ایمنؓ آنحضورؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کی کنیز، نام برکہ اور اُمِّ ایمن کنیت تھی۔ آنحضورؐ کی پرورش بھی انہی نے کی۔ پہلا نکاح حضرت عبیدؓ بن زید سے ہوا۔ آپ کے جنگ حنین میں شہید ہونے کے بعد آنحضورؐ نے ان کا نکاح زیدؓ بن حارثہؓ سے کر دیا۔ حبش کی طرف ہجرت کرنے والوں میں شامل تھیں۔ وہیں سے مدینہ ہجرت کی۔

آپ کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جو غزوات میں مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ آنحضورؐ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے اور امی کہہ کر خطاب فرماتے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ یہ میرے اہل خانہ میں سے ہیں۔ حضرت اُمِّ ایمن کے صاحبزادے ایمن بن عبیدؓ نے جنگ خیبر میں شہادت پائی تو آپ نے بڑے صبر و ضبط سے کام لیا۔

آنحضورؐ نے آپ کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ جب آپ کے خاوند حضرت عبیدؓ بن زید نے وفات پائی تو آنحضورؐ نے فرمایا "جو شخص جنت کی عورت سے عقد کرنا چاہے وہ اُمِّ ایمن سے نکاح کرے۔"

آنحضورؐ کی وفات پر آپ بہت روئیں جب صحابہؓ نے تسلی دی تو کہنے لگیں کہ میں اس لئے روتی ہوں کہ آج وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی وفات پر فرمایا "آج اسلام کمزور ہو گیا۔"

آپ کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے پہلے شوہر سے ایمنؓ اور دوسرے شوہر سے حضرت اسامہؓ، جو کم عمری ہی میں صحابہؓ میں نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے

دورِ خلافت میں وفات پائی۔

اُمّت

قوم، جماعت، جو کسی مشترک نصب العین کے لیے سرگرم عمل ہو۔ اس کے معنی دین، سنت، شریعت، مدت اور زمانہ کے بھی ہیں۔ یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی مستعمل ہے، جو نبی مبعوث کو مانتے ہیں۔ گویا کسی بھی نبی کے پیروکار اس کی اُمّت کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے ایک معنی بے نظیر انسان اور خیر کی تعلیم دینے والے کے بھی ہیں۔ نسل انسانی کی وحدت کو بھی اُمّت ہی قرار دیا گیا۔ سورۃ بقرہ میں آیا ہے "سب انسان ایک ہی امت تھے۔ (۲ : ۲۱۳)

مسلمان بھی دینی اعتبار سے امتِ واحدہ کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید نے انھیں امتِ وسط قرار دیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں آیا ہے "اسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو۔ اور رسول تم پر گواہ ہو..... (۲ : ۱۴۳) اس سے مراد ایک ایسی قوم ہے جو اوسط اور میزان کی طرف مائل رہتی ہے اور عدل و انصاف پر قائم رہتی ہے۔ نیز رسول کریمؐ کے بعد ان کی تعلیمات کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ اس لحاظ سے گویا امتِ وسط ایک زندہ شہادت ہے۔ جو اپنے قول و عمل، برتاؤ اور راست روی کو دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کرے اور دنیا کی معصیت، ظلم اور گمراہی کا خاتمہ کرے۔

اُمِّ حبیبہ رضہ

(وفات ۴۴ھ / ۶۶۴ء) ام المومنین رملہ بنت ابوسفیان بعثتِ نبوی سے سترہ سال قبل مکہ میں پیدا ہوئیں۔ والدہ کا نام صفیہ بنت ابوالعاص تھا۔ حضرت امیر معاویہ کی سوتیلی بہن تھیں۔ پہلا نکاح عبیداللہ بن جحش سے ہوا۔ دونوں نے اکٹھے اسلام قبول کیا۔ ہجرت حبشہ میں شرکت کی۔ شوہر کے عیسائی ہو جانے پر علیحدگی اختیار کر لی۔ آنحضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے شاہ حبش نجاشی کے ذریعے پیغام نکاح بھجوایا۔ نجاشی نے حضرت جعفر طیارؓ کو بلا کر رسم نکاح ادا کی۔ یہ زمانہ چھ یا سات ہجری کا ہے۔ اس وقت ام حبیبہؓ کی عمر چھتیس ۳۶ برس تھی۔ وہاں سے آپ مدینہ پہنچیں اور پھر آنحضورؐ کی خدمت ہی میں رہیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد سیاسی امور سے کنارہ کش رہیں۔ پہلے شوہر سے آپ کی ایک صاحبزادی حبیبہ پیدا ہوئیں جن کی پرورش آغوش نبوی میں ہوئی۔ آپ امیر معاویہؓ کے عہد میں فوت ہوئیں۔ آپ سے ۶۵ حدیثیں مروی ہیں۔ آپ نے تمام عمر زہد و تقویٰ میں بسر کی۔ اسلام کی خاطر ہجرت کی تکالیف برداشت کیں۔ ایسے وقت میں ایمان لائیں جب ان کے والد دشمنانِ اسلام کے قائد تھے۔ روایت ہے کہ فتح مکہ سے قبل ان کے والد ان سے ملنے آئے تو وہ رسول اللہؐ کے بستر پر بیٹھنے لگے۔ حضرت ام حبیبہؓ نے آپؐ کا بستر الٹ دیا۔ باپ کو یہ بات ناگوار گذری اور کہا تمہیں اس بچھونے پر اپنے باپ کا بیٹھنا بھی پسند نہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ رسولؐ پاک کے بستر پر ایک مشرک نہیں بیٹھ سکتا۔ ابوسفیان خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

اُمِّ حرام

مشہور صحابیہ، مدینہ میں پیدا ہوئیں۔ باپ کا نام ملحان بن خالد اور ماں کا نام ملیکہ بنت مالک تھا۔ انصار کے مشہور قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار سے تھیں۔ ام سلیمؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ آنحضورؐ کی رشتے میں خالہ تھیں۔ پہلا نکاح عمروؓ بن قیس انصاری سے ہوا جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد دوسرا نکاح عبادہؓ بن صامت سے ہوا۔ آنحضورؐ سے آپ کو بہت عقیدت تھی۔ اسلام کی سچی شیدائی اور راہ خدا میں شہادت کی آرزو مند تھیں۔ آنحضورؐ جب قبا تشریف لے جاتے تو ام حرام کے گھر ہی کھانا کھا کر قیلولہ کرتے۔ ایک روز جب آپؐ بیدار ہوئے تو مسکراتے ہوئے فرمایا "ام حرام میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میری اُمّت کے کچھ لوگ جہاد کے ارادے سے کشتیوں میں سوار سمندر میں چلے جا رہے ہیں۔" تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! میرے لیے بھی آپ دعا کریں کہ میں ان میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر سکوں۔" آپؐ نے دعا فرمائی۔

اور جب حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ نے جزیرہ قبرص پر حملہ کرنے کے لیے ایک بحری بیڑہ تیار کیا۔ جس میں جلیل القدر صحابہ نے شرکت کی اور ام حرام بھی اپنے شوہر عبادہ بن صامت کے ساتھ شامل ہوئیں۔ فتح حاصل کرنے کے بعد جب مجاہدین واپس لوٹے ام حرام بھی سواری پر بیٹھنے لگیں تو جانور نے زمین پر گرا دیا اور آپ اسی صدمے سے وفات پا گئیں۔

پہلے شوہر سے دو لڑکے قیس اور عبداللہ پیدا ہوئے اور دوسرے شوہر سے ایک لڑکا محمد پیدا ہوا۔ آپ سے چند احادیث مروی ہیں۔ راویوں میں انس بن مالک جیسے محدثین ہیں۔

اُمِّ حکیم رضہ

مشہور صحابیہ، مکہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام حارث بن ہشام اور والدہ کا فاطمہ بنت ولید تھا۔ حضرت خالد بن ولید کی بھانجی اور قریش کے خاندان بنی مخزوم سے تھیں۔ ان کا خسر ابوجہل اور شوہر عکرمہ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ غزوہ احد میں انہوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف اپنے شوہر کے ہمراہ بڑے زور شور سے حصہ لیا۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر اپنی والدہ فاطمہ بنت ولید کے ہمراہ مشرف باسلام ہوئیں۔ لیکن شوہر جان بچا کر یمن بھاگ گیا۔ جب آنحضورؐ نے عام معافی کا اعلان فرمایا تو انہوں نے یمن جا کر اپنے شوہر سے سارا ماجرا سنایا اور وہ بھی اپنی جان بخشی کے متعلق سن کر آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صدق دل سے اسلام قبول کیا اور جس شدت سے اسلام کی مخالفت کرتے تھے اسی جوش کے ساتھ اسلام کی خدمت شروع کی۔ کئی معرکوں میں نہایت جانبازی سے رومیوں کے خلاف جہاد کیا۔ اور آخرکار اجنادین کی لڑائی میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

دوسرا نکاح حضرت خالدؓ بن سعید بن عاص سے ہوا۔ یہ بھی بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی عیسائیوں سے جھڑپیں ہو رہی تھیں اور مسلمان دمشق کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ ابھی دعوت ولیمہ سے لوگ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ رومیوں نے حملہ کر دیا۔ حضرت خالدؓ بن سعیدؓ کی طرح [illegible] اور نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ام حکیم یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھیں چنانچہ انھوں نے بھی نہایت جوش سے اپنے کپڑوں کو باندھا اور خیمہ کی چوب اکھاڑ کر لڑائی میں شریک ہو گئیں۔ اس معرکہ میں سات رومی آپ کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے۔ اس معرکے کے بعد خلافت فاروقی کے عہد میں آپ جنگ یرموک میں بھی شریک ہوئیں۔ اور وہاں بھی دوسری خواتین کے ساتھ نہایت دلیری سے جنگ لڑی۔

امداد اللہ مہاجر مکی رحہ

(۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ / [illegible] جنوری ۱۸۱۸ء ۔ [illegible] جمادی [illegible] / ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء) بہت بڑے بزرگ، [illegible] صوفی [illegible] دین۔ نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمد امین تھا۔ نسب [illegible] سے فاروقی تھے۔ والد نے امداد حسین نام رکھا۔ لیکن مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی نے امداد حسین کی بجائے امداد اللہ کے نام سے نوازا۔ تاریخی نام ظفر احمد ہے۔ والدہ آپ سے دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ آپ سے محبت کرتی تھیں۔ ابھی سات سال کے

سکتے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی پڑھائی پر کچھ خاص توجہ نہ دی خود تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے باطنی شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دی۔ اگرچہ بعض رکاوٹیں ایسی آئیں جو قرآن مجید حفظ کرنے میں مانع رہیں۔ سولہ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی نانوتوی (جن سے آپ کا ننھیالی تعلق تھا) کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا اور اسی زمانہ میں چند مختصرات فارسی اور کچھ صرف و نحو کی تحصیل کی۔ مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی سے پڑھا۔ اور "حصن حصین" "فقہ اکبر" مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے پڑھی۔ اسی زمانہ میں آپ نے خواب دیکھا کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ لیکن جلال کی وجہ سے قدم آگے نہیں بڑھتا۔ اچانک ان کے جدامجد حضرت بلاقی تشریف لائے اور ہاتھ پکڑ کر آنحضورؐ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آنحضورؐ نے ہاتھ لے کر حضرت میانجیوؒ کے حوالے کر دیا۔ اس خواب کے بعد ایک عرصہ تک اضطرار کی حالت میں رہے۔ کئی سال بعد ان کے ایک استاد مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں لے گئے۔ چنانچہ ایک مدت تک حضرت میانجیوؒ کی خدمت میں رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور خلافت عطا ہوئی ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں زیارت حرمین شریف سے مشرف ہوئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کے ہاں قیام کیا اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضری دی اور دل کو تسکین نصیب ہوئی۔ [illegible] قیام کیا اور ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں وطن واپس لوٹے۔ [illegible] کے بعد اپنے پیر بھائی حافظ محمد ضامن کے شدید اصرار پر بیعت لینا شروع کی۔ علماء میں سب سے پہلے مولانا رشید احمد گنگوہی نے بیعت کی۔ ان کے علاوہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی [illegible] مولانا اشرف علی تھانوی مولانا احمد حسن کانپوری مولانا [illegible] الہ آبادی۔ مولوی صفات احمد غازی پوری۔ مولوی محمد شفیع۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری۔ مولانا محمد افضل ولایتی [illegible] سمیع [illegible]۔ مولانا مفتی لطف اللہ علیگڑھی [illegible] مولانا محمود الحسن۔ مولانا حسین احمد مدنی وغیرہم نے بیعت کی۔ علماء میں سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے خاص تعلق تھا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ جس طرح مولانا روم [illegible] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قاسم نانوتوی کو میری زبان بنایا ہے۔

[illegible] ۱۸۵۷ء میں آپ نے ہندوستان سے بدنظمی کے باعث ہجرت کی اور زندگی کے باقی ماندہ سال مکہ مکرمہ میں گذارے۔ اسی وجہ سے آپ کو مہاجر مکی کہا جاتا ہے [illegible] سلاسل کے جس قدر مشائخ مقیم تھے ان سب میں آپ کو نمایاں مقام حاصل [illegible] آپ کی خدمت میں حاضری دے کر فیوض باطنی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ایک روایت میں آپ کے کشف کا ذکر ہے کہ خواجہ پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی حج کے لئے گئے اور مکہ میں آپ سے شرف بیعت ہوئے اور مستقلاً وہیں رہنے کا اظہار کیا۔ آپ نے خواجہ صاحب کو اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہونے والا ہے تم ضرور اپنے وطن واپس جاؤ۔ اگر تم ہندوستان میں خاموش بھی بیٹھے رہو گے تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا اور ملک میں سکون رہے گا۔ خواجہ پیر صاحب نے آپ کے اس کشف کو فتنہ قادیانیت سے تعبیر کیا ہے چنانچہ انہوں نے قلم اور زبان سے قادیانیوں کے عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی۔

مرض الموت میں استغراق کے ساتھ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کروٹ بدلنا مشکل ہوگیا تھا۔ بھوک بالکل ختم ہوگئی تھی۔ وفات کے بعد آپ جنت المعلیٰ میں مولانا رحمت اللہ کی قبر کے ساتھ مدفون ہوئے۔

آپ کثیر المروت اور عظیم الاخلاق انسان تھے۔ کلام میں شیرینی تھی ہر ایک کے ساتھ بالکمال بشاشت سے پیش آتے تھے اور جب کسی سے گفتگو کرتے تو تبسم آپ کے ہونٹوں پر کھیلتا رہتا تھا۔ اخلاق رذیلہ سے بالطبع نفرت تھی اور اتباع سنت گویا عادت بن گئی تھی۔ آپ حجاز سے واپس آئے تو ارشاد و تلقین کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندوستان کو منور کر دیا۔ بعض لوگ بظاہر تو کم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ سنت کی اتباع میں اور اپنی عملی زندگی کی وجہ سے وہ ایسا مقام حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے تربیت روحانی حاصل کرتے ہیں۔ امت محمدیہ میں ایسے سینکڑوں افراد گذرے ہیں لیکن آفاقی شہرت رکھنے والی دو ہی شخصیتیں ہیں ایک مولانا جلال الدین رومی اور دوسرے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔

آپ کی تصانیف میں "مثنوی مولانا روم پر فارسی زبان میں حاشیہ" "غذائے روح" "جہاد اکبر" "مثنوی تحفۃ العشاق" "درد نامہ غمناک" "ارشاد مرشد" "ضیاء القلوب" "وحدۃ الوجود" "فیصلہ ہفت مسئلہ" "گلزار معرفت" "مرقومات امدادیہ" اور "مکتوبات امدادیہ" شامل ہیں۔

اُمّ درداءؓ خیرہ بنت ابوحدرد، مشہور اور فاضل صحابیہ قبیلہ اسلم سے تعلق تھا حضرت ابودرداءؓ کی زوجہ تھیں۔ عورتوں میں بڑی صاحب الرائے تھیں نہایت عابدہ اور سنت کی اتباع کرنے والی تھیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ابودرداءؓ کی وفات سے دو سال پہلے ملک شام میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور میں فوت ہوئیں۔

امر حکم۔ معاملہ۔ حاجت۔ قرآن مجید (۲ = ۵۴)، (۱۴ = ۸۵)، (۱۶ = ۴۰)، (۵۴ = ۵۰) میں امراللہ کے معنی عذاب الٰہی، قیامت اور حکم ربی کے لئے گئے ہیں۔ زمخشری کے نزدیک حکمت اور تدبر کے معنی بھی مراد ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ۲، بار آیا ہے۔ اس سے بعض مقامات پر مفسرین اور مستشرقین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ عام طور پر اسے خلق کے معنوں میں نہیں لیا جاتا بلکہ اس کے مقابل تسلیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ انگریزی میں خلق اور امر کے لئے ایک ہی لفظ (CREATION) ہے اور خلق کے معنی پیدا کرنے اور امر کا مفہوم ہدایت اور رہنمائی کے طور پر لئے جاتے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک امر اور مشیت میں فرق ہے۔ بعض اوقات مشیت الٰہی کچھ اور ہوتی ہے اور امر الٰہی کچھ اور۔

اُمّ رومانؓ (وفات ۹ھ/۶۳۰ء) بنت عامر بن عویمر بن عبدشمس مشہور صحابیہ حضرت ابوبکرؓ کی زوجہ اور حضرت عائشہؓ کی والدہ بنو کنانہ کے خاندان فراس سے تھیں پہلا نکاح عبداللہ بن حارث سے ہوا اور انہیں کے ساتھ مکہ آکر سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد عبداللہ بن حارث نے وفات پائی تو حضرت ابوبکرؓ نے نکاح کر لیا پہلے شوہر سے ایک لڑکا طفیل پیدا ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ سے حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ہی مشرف باسلام ہوئیں اور سابقون الاولون میں شمار ہوئیں۔

وفات کے بعد آنحضورؐ نے آپ کو قبر میں اتارا اور فرمایا جو شخص عورتوں میں حور عین کو دیکھنا چاہے وہ ام رومان کو دیکھے۔

اُمّ سلمہؓ (۲۸ قبل ھ/۵۹۵ء - ۵۹ھ/۶۷۹ء) ام المومنین ہند بنت ابوامیہ حذیفہ بنی مخزوم سے تھیں۔ والدہ کا نام عاتکہ تھا۔ پہلا نکاح چچیرے بھائی ابوسلمہ بن عبدالاسد سے ہوا۔ آغاز نبوت ہی میں دونوں میاں بیوی اسلام لائے۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ اور اصلاح احوال کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئیں۔ جب مدینہ کی طرف ہجرت کی

اجازت ملی تو ابو سلمہ کے ساتھ آپ بھی نکلیں لیکن سسرال والے ان کے بیٹے کو چھین کر لے گئے۔ دوسری طرف بنو مغیرہ آپ کے راستے میں حائل ہو گئے۔ چنانچہ ابو سلمہ نے اکیلے ہی ہجرت کی۔ آپ شام کو اس جگہ پہنچ جاتیں جہاں شوہر سے جدائی ہوئی تھی اور رو تی تھیں چند روز بعد بنو مغیرہ نے ان کا بچہ ان کے حوالے کر دیا اور انہیں مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔

ابو سلمہؓ سے آپ کے دو لڑکے سلمہ اور عمر اور دو لڑکیاں زینب اور رقیہ تھیں۔

عدت گزرنے کے بعد نکاح کے بہت سے پیغام آتے رہے لیکن آپ انکار کرتی رہیں یہاں تک کہ آنحضورؐ نے آپ کو پیغام بھجوایا اور ۴ھ کو ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں۔ آپ آنحضورؐ کے آرام کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

امہات المومنین میں سب سے زیادہ عمر آپ ہی نے پائی۔ وفات کے بعد بقیع میں دفن ہوئیں۔ آپ بڑی بلند سیرت اور فیاض تھیں۔ نہایت دانا اور معاملہ فہم تھیں۔ فہم مسائل میں خاص ملکہ تھا۔ آنحضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ صنف نازک کی پوری تاریخ اصابت رائے میں ام سلمہ کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ میں آپ سے ۳۷۸ احادیث مروی ہیں۔

اُمّ ِسلیمؓ رملہ یا سہلہ بنت ملحان بن خالد۔ مشہور صحابیہ اُمّ ِحرامؓ کی بہن تھیں۔ ام سلیم اور ام انس کنیت تھی۔ غمیصا اور رمیصا لقب تھا۔

پہلا نکاح مالک بن نضر سے ہوا جو ان کے ہم قبیلہ تھے۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ انہی سے پیدا ہوئے۔ شوہر مسلمان نہ ہوا بلکہ ان کے اسلام قبول کرنے پر خفا ہوا۔ یہی بات کشیدگی اختیار کر گئی۔ وہ ناراض ہو کر شام چلا گیا اور وہیں فوت ہوا۔ حضرت انسؓ کو آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یا رسول اللہ اس کو اپنے خادموں میں جگہ دیں۔

دوسرا نکاح ابو طلحہؓ سے ہوا۔ یہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ نکاح کا پیغام بھیجنے کے بعد مسلمان ہوئے۔ ام سلیم نے اپنا مہر اسلام قرار دیا۔ حضرت ابو طلحہ سے ام سلیم کے دو فرزند ابو عمیر اور عبداللہ پیدا ہوئے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

آپ بڑی اولو العزم اور شجاع صحابیہ تھیں۔ غزوات میں آنحضورؐ انہیں چند اور دوسری عورتوں کو اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ خواتین لوگوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

فتح خیبر کے موقع پر جب حضرت صفیہؓ بنت حی نے آنحضورؐ کے نکاح میں آنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو آنحضورؐ نے انہیں آپ ہی کے سپرد کیا کہ نہلا دھلا کر دلہن بنائیں۔ کیونکہ جنگ کی صعوبتوں نے حضرت صفیہ کو نہایت خستہ حال کر دیا تھا۔

ام سلیمؓ اپنی جاں نثاری اور عقیدت کی وجہ سے آنحضورؐ کی نظروں میں بے حد محترم تھیں۔ آپؐ اکثر خود چل کر ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے مجھے ام سلیمؓ پر رحم آتا ہے۔

ایک مرتبہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ میں جنت میں گیا تو مجھے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی میں نے پوچھا یہ کون ہے تو لوگوں نے بتایا یہ غمیصاؓ بنت ملحان ہیں۔

حضرت ام سلیمؓ سے حضرت انس عبداللہ ابن عباس۔ زید بن ثابت اور عمرو بن عاصم نے احادیث روایت کی ہیں۔ لوگ آپ سے اکثر مسائل دریافت کرتے تھے اور اسی طرح اپنے شکوک رفع کرتے تھے۔

اُمّ ِعطیہؓ نسیبہ بنت حارث۔ مشہور صحابیہ۔ مدینہ میں پیدا ہوئیں آنحضورؐ آپ پر بہت شفقت اور اعتماد کرتے تھے۔ ان خواتین میں سے تھیں جنہیں آپؐ غزوات میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ آپ سات غزوات میں شامل ہوئیں۔ آپ مجاہدین کے لئے کھانا پکاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ اگر لشکر اسلام میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو آپ نہایت تندہی سے اس کی تیمارداری کرتی تھیں۔

ان کی وفات کے بارے میں کہیں کچھ نہیں لکھا ہے اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ خلافت راشدہ میں حیات تھیں۔

ام عطیہ آنحضورؐ کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرتی تھیں اور آپؐ کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے صحابیات رسولؐ میں انکا درجہ بہت بلند تھا۔

۸ھ میں جب آنحضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینب کی وفات ہوئی۔ تو انہیں ام عطیہؓ ہی نے غسل دیا۔ آنحضورؐ نے ان کو نہلانے کا طریقہ بتایا۔ یہی وجہ ہے کہ غسل میت کے بارے میں ان کی حدیث بہت معتبر مانی جاتی ہے۔

اُمّ ِعمارہؓ نسیبہ بنت کعب۔ مشہور صحابیہ بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہجرت نبوی سے تقریباً چالیس سال قبل مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں۔

پہلا نکاح زیدؓ بن عاصم سے ہوا۔ ان سے دو لڑکے عبداللہؓ اور حبیبؓ پیدا ہوئے دوسرا نکاح عربہ بن عمرو سے ہوا اور ان سے بھی دو بچے پیدا ہوئے۔

جب آنحضورؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ میں دوسرے بار [illegible] مسلمانوں کے ساتھ تبلیغ کے لئے بھیجا تو ان کی کوششوں سے جو لوگ پہلے پہل مسلمان ہوئے ان میں ام عمارہ بھی ہیں۔

غزوہ احد میں حضرت ام عمارہؓ اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کے ساتھ شامل تھیں [illegible] مشکیزہ میں پانی بھر بھر کر مجاہدین کو پلاتی تھیں۔ اس غزوہ میں جب [illegible] بھی تلوار اور ڈھال سنبھال کر آنحضورؐ کی حفاظت کے لئے کھڑی ہو گئیں [illegible] جب کوئی آنحضورؐ کے قریب حملہ کرنے کے لئے آتا تو اس کا وار [illegible] اس کے گھوڑے کے پاؤں پر ایسا بھرپور وار کرتیں کہ وہ گر پڑتا۔ آنحضورؐ [illegible] آواز دیتے تو وہ دونوں اپنی ماں کے قریب جا کر دشمن رسولؐ کو [illegible] کا ارشاد ہے کہ میں نے غزوہ احد میں ام عمارہ کو اپنے دائیں اور بائیں [illegible] اسی غزوہ میں ابن قمیہ کے وار سے ام عمارہ کا کندھا زخمی ہو گیا [illegible] لگا۔ آنحضورؐ نے ان کے زخم پر پٹی بندھوائی اور کسی [illegible] عمارہ نے ان سب سے بڑھ کر بہادری دکھائی ہے [illegible] تجھ میں ہے کسی اور میں کہاں ہو گی۔ آپ آنحضورؐ کی رحلت کے بعد [illegible] میں شریک ہوئیں۔ اور اس معرکہ میں انہیں گیارہ زخم آئے [illegible] ام عمارہ کی وفات کے بارے میں معلومات کہیں نہیں ملتیں۔ البتہ حضرت عمر [illegible] عہد میں آپ زندہ تھیں۔ اور حضرت عمرؓ نے ایک قیمتی ذر کا دوپٹہ جو [illegible] انہیں عطا کیا تھا۔ آپ سے چند احادیث بھی مروی ہیں۔

اُمّ ِکلثومؓ بنت خدیجہؓ [illegible] قبل بعثت [illegible] حضرت فاطمہؓ سے بڑی اور حضرت رقیہؓ سے چھوٹی تھیں مکہ میں پیدا ہوئیں۔ پہلا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوا۔ لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی سورۂ لہب کے نازل ہونے کے بعد ابولہب کے کہنے پر عتیبہ نے طلاق دے دی۔

آپ کی پرورش آنحضورؐ اور حضرت خدیجہؓ کی آغوش شفقت میں ہوئی۔ حضرت سودہؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ بڑی بہن حضرت رقیہ کے انتقال کے بعد آپ کا نکاح ۳ھ ۶۲۴ء میں حضرت عثمانؓ سے ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر [illegible] سال تھی۔ شادی کے ساڑھے چھ سال بعد وفات پائی۔ آنحضورؐ کو آپ کی وفات سے بہت صدمہ ہوا۔ نماز جنازہ آپؐ ہی نے پڑھائی۔ آپ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

اُمِ کلثوم بنت عقبہ مشہور صحابیہ۔ انتہائی ناسازگار حالات میں اسلام قبول کیا۔ باپ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کا موقعہ ملا۔ اور گھر والوں کو خبر کئے بغیر پا پیادہ بنی خزاعہ کے ایک شخص کی معیت میں مدینہ چل دیں۔ جب گھر والوں کو اطلاع ہوئی تو ان کے دونوں بھائی تعاقب میں نکل پڑے خوش قسمتی سے ام کلثوم مدینہ پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے آنحضورؐ سے مطالبہ کیا کہ صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق ہماری بہن کو ہمیں واپس کر دیں۔ امّ کلثوم نے فریاد کی کہ یا رسولؐ اللہ مجھے ان ظالموں کے چنگل میں دوبارہ نہ دیں۔ کیونکہ میرا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا آپ کو فکر ہوئی کیونکہ معاہدے میں عورت کی واپسی کا ذکر نہیں تھا۔ اسی وقت قرآن کی یہ آیت اتری کہ اے مومنو جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو۔ اللہ ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے حوالے نہ کرو۔"

آنحضورؐ نے ان کا نکاح اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثؓ سے کر دیا اور جب انہوں نے غزوہ موتہ میں شہادت پائی تو حضرت زبیر بن العوام سے ان کا دوسرا نکاح ہوا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمروؓ بن عاص کے عقد میں آئیں اس وقت حضرت عمروؓ بن عاص مصر کے حاکم تھے۔ نکاح سے ایک ماہ بعد امّ کلثوم وفات پا گئیں۔ حضرت زبیر سے ایک لڑکی زینب اور حضرت عبدالرحمان بن عوف سے چار لڑکے ابراہیم، حمید، محمد اور اسماعیل پیدا ہوئے۔ ام کلثوم سے کئی احادیث مروی ہیں۔

اُمِ کلثوم بنت فاطمہؓ وفات ۵۴ھ / [illegible] حضرت علی کی صاحبزادی اور آنحضورؐ کی نواسی۔ پہلا نکاح حضرت عمر فاروقؓ [illegible] ایک لڑکا [illegible] اور ایک لڑکی رقیہؓ کو جنم دیا۔ اہل تشیع ان کا نکاح [illegible] فاروق کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد [illegible] نکاح عون بن جعفر بن ابی طالب سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد محمد بن [illegible] اور جب وہ بھی شہید ہو گئے تو عبداللہ بن جعفرؓ کے [illegible] میں۔

اُمِ ورقہ بنت عبداللہ مشہور صحابیہ۔ انصار کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب آنحضورؐ نے مدینہ ہجرت کی تو انھوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر کی تیاری ہونے لگی تو امّ ورقہ نے بھی آنحضورؐ سے غزوہ میں شرکت کی اجازت مانگی اور شہادت کی آرزو کی۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ تم گھر میں رہو۔ اللہ تم کو یہیں شہادت عطا کر دے گا۔" آپ کی یہ پیش گوئی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں پوری ہوئی۔

ام ورقہ قرآن پڑھی ہوئی تھی آنحضورؐ نے انہیں گھر کی عورتوں کا امام بنایا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت امّ ورقہ نے اپنے ایک غلام اور لونڈی سے فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو۔ ان دونوں کی نیت خراب ہو گئی۔ اور رات کو چادر ڈال کر اپنی مالکہ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت عمر فاروقؓ صبح کو ان کی آواز نہ سن کر گھر میں گئے تو آپ کی نعش دیکھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے دونوں مجرموں کو پھانسی کا حکم دیا۔

اُمِ ولد وہ کنیز جو مالک کے بچے کو جنم دے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کنیزوں کے ساتھ نکاح کے بغیر تمتع جائز ہے۔ جبکہ اسلامی شریعت کی روح اس سے منع کرتی ہے۔ ان کے ساتھ نکاح ہی کیا جا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں اولاد پیدا ہو۔ ایسی کنیز آزاد قرار دی جاتی ہے۔ خواہ اس کا بچہ ساقط ہی کیوں نہ ہو، اسے نہ تو فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز وہ ترکے کی وارث ہوتی ہے گویا وہ مالک کی بیوی قرار دی جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے "کنیز")

اُمِ ھانی بنو فاختہ بنت ابوطالب، حضرت علیؓ کی بہن، مشہور صحابیہ تھیں۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔ ۸ھ کو فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام قبول کیا۔ نکاح ہبیرہ بن عمر مخزومی سے ہوا۔ لیکن وہ اسلام نہ لایا اور نجران کی طرف بھاگ گیا امیر معاویہ کے دور حکومت میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھیں۔ بیٹوں میں عمرو، ہانی، یوسف اور جعدہ مشہور ہیں۔

فقہ میں دلچسپی رکھتی تھیں اور آنحضورؐ سے مختلف مسائل دریافت کرتی رہتی تھیں ام ھانی نے حضرت رسول اکرمؐ سے چھیالیس احادیث روایت کی ہیں راویوں میں حضرت علیؓ، عبداللہ بن عباس۔ عبداللہؓ بن حارث جیسے اصحاب شامل ہیں۔

اُمّی ناخواندہ، ان پڑھ، حضرت رسول اکرمؐ کا لقب، جو قرآن مجید میں دو بار (۷: ۱۵۷، ۱۵۸) آیا ہے۔ کیونکہ آپ نے کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ بعض نے امی کو عامی کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی جو عامۃ الناس کی صفت پر ہو اور بعض کے نزدیک اُمّی، اُم (ماں) سے منسوب ہے یعنی وہ شخص جو بچپن میں باپ کے سائے سے محروم ہو کر ماں یا دایہ کے پاس پرورش پائے اور اسے کوئی علم و فن یا نوشت و خواندہ سیکھنے کا موقعہ نہ ملے۔ اس طرح مجازاً ناخواندہ کو امی کہا جانے لگا۔ امام باقر کے قول کے مطابق امی کی نسبت "ام القرای" کی طرف ہے جو کہ معظمہ کا لقب ہے اور آنحضورؐ کا مولد۔ چونکہ اہل مکہ بحیثیت مجموعی ناخواندہ اور ان پڑھ تھے اس لئے مجازاً ناخواندہ کو بھی امی کے لفظ سے پکارا گیا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے تصریحاً آنحضورؐ کی یہ صفت بیان کی ہے کہ "اس سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ ورنہ یہ باطل پرست یقیناً شبے میں پڑھ جاتے۔" (۲۹: ۴۸) چنانچہ یہ آپ کی صفت مدح ہے جو کسی دوسرے میں نہیں۔ کہ کسی سے پڑھنا لکھنا سیکھے بغیر آپ پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ اور بلاشبہ امی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف و عزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔

امیر فرماں روا، حاکم، سپہ سالار۔ احادیث میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ سے پوچھا گیا۔ آپ کے بعد کس کو امیر بنایا جائے؟ آنحضورؐ نے فرمایا "اگر ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو اسے امین پاؤ گے" اسی طرح سے عبداللہ بن جحشؓ الاسدی کے بارے میں اوّل امیر فی الاسلام کے الفاظ آئے ہیں۔

انہیں آنحضورؐ نے ایک فوجی دستے کا قائد مقرر کیا تھا۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں مسلمانوں کے اجتماع کے بارے میں جو روایات ہیں ان میں امیر کا لفظ ملت اسلامیہ کے سربراہ اعلیٰ کے معنی میں آیا ہے۔ فوج کے ایک حصے کے سالاروں کو بھی امیر یا امیر الجیش یا امیر الجند کہا جاتا تھا۔ اسی طرح صوبے کے والیوں کو بھی امیر کہا جاتا تھا اور ان کے اپنے صوبے میں وہی اختیارات ہوتے تھے جو خلیفہ کو پوری مملکت میں حاصل ہوتے تھے۔ بنو عباس کے دور میں امیر کا کام زیادہ تر امن و امان کا قیام اور بروقت وصول محاصل ہوتا تھا۔ لوگوں کی بے اطمینانی کے باعث امیر معزول بھی ہو سکتا تھا۔

امیر الامراء ۔ امیر اعلیٰ فوج کے سالارِ اعظم کو کہا جاتا تھا ۔ ابتداء میں یہ عہدہ صرف اور صرف قیادت کے ساتھ مخصوص تھا ۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ فوجی زور پکڑتے چلے گئے اور خلفاء بے بس ہوتے چلے گئے ۔ یہاں تک کہ یہ امراء حقیقی حکمران بن گئے اور خلفاء اپنے سابقہ اقتدار کا محض سایہ بن کر رہ گئے ۔

امیر الحج :۔ حج کی غرض سے مکہ معظمہ جانے والے لوگوں کی جماعت کا سردار آنحضورؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ۹ھ / ۶۳۰ء میں امیر الحج بنایا تھا ۔ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں آنحضورؐ نے بنفس نفیس امارت حج کے فرائض انجام دیئے ۔ آپؐ کی وفات کے بعد یہ فریضہ خلفاء سے متعلق ہوگیا ۔ خلفاء بذات خود سرانجام دیتے یا کسی عہدے دار کو اپنا قائم مقام نامزد کر دیتے تھے

امیر المسلمین :۔ مسلمانوں کا امیر ۔ یہ لقب سب سے پہلے المرابطون نے امیر المومنین کے مقابلے میں اختیار کیا ۔ المرابطون کو بنو عباس کی برتری تسلیم تھی اور اسے پسند نہ تھا کہ وہ خلیفہ کا لقب اختیار کرے ۔ بعد میں افریقہ اور اندلس کے حکمران، جب وہ مکمل خود مختار نہ ہوتے تو یہ لقب استعمال کرتے ۔

امیر المومنین :۔ مومنوں کا امیر یا حاکم ۔ یہ لقب سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اختیار فرمایا ۔

اہل تشیع کا فرقہ امامیہ " امیر المومنین کا لقب صرف حضرت علیؓ سے مخصوص سمجھتا ہے اسماعیلیوں کا ہر فرقہ اسے اپنے اپنے مسلمہ خلفاء کے لیے استعمال کرتا ہے ۔ زیدی شیعوں کے نزدیک ہر وہ علوی جو بزور شمشیر اپنے اقتدار کو منوا لے خود کو امیر المومنین کہلوا سکتا ہے ۔

امیر حسینی

(وفات ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء) حسین بن عالم بن ابی الحسین، "سیر العارفین" میں پورا نام صدر الدین احمد بن نجم الدین المعروف بہ سید حسین ہے ۔ مشہور صوفی بزرگ غور (ہرات) کے ایک گاؤں کزلو میں پیدا ہوئے ۔ نواح خراسان میں علم و عرفان کی شمعیں روشن کیں پھر ملتان تشریف لائے اور شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کی خدمت میں فیضیاب ہوئے ۔ بیعت کے بارے میں مختلف روایات ہیں ۔ بعض کے نزدیک شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور بعض نے شیخ ابو الفتح رکن الدین کا مرید بتایا ہے ۔ سیر العارفین کے مطابق شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے مرید ہیں ۔

نظم و نثر میں ان کی کئی ایک تصانیف ہیں جو مقبول خاص و عام ہیں ۔ جن میں "نزہت الارواح " اور "طرب المجالس" صراط مستقیم نثر میں اور "زاد المسافرین" ، "کنز الرموز" نظم میں بہت مشہور ہیں ۔ یہ سب کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور ان کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں تمام کتابوں کا موضوع معرفت اور سلوک و طریقت ہے جو تصوف سے متعلق ہیں ۔

امیر علی، سید

(۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء) قانون دان اور مصنف ۔ اہل تشیع میں سے تھے ۔ پہلے محسنیہ کالج ہگلی (جو کلکتہ کے نزدیک تھا) سے تعلیم حاصل کی ۔ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۳ء تک انگلستان میں تعلیم پائی اور بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۔ ۱۹۰۴ء میں بنگال ہائی کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد انگلستان میں سکونت اختیار کرلی ۔ ان کی سرگرمیاں بہت سے میدانوں میں نمایاں تھیں مثلاً بحیثیت قانون اسلامی کے پروفیسر، وکیل، جج ، سماجی کارکن ۔ نیز حکومت کے نظم و نسق میں سیاست میں اور مصنف کی حیثیت میں ۔

ان کی بعض تصانیف اسلامی قانون کے سلسلے میں ANGLO . MOHAMMEDAN LAW ۔ میں جو انگریزوں کے عہد میں مدون ہوا تھا ۔ مستند تصور کی جاتی تھیں ۔ ۱۸۸۳ء کی وائسرائے کونسل میں تین ہندوستانی ممبروں میں واحد مسلمان ممبر تھے ۔

۱۹۰۹ء میں لندن کی پریوی کونسل کی قانونی کمیٹی کے پہلے ہندوستانی رکن مقرر ہوئے لندن میں برطانوی ہلال احمر سوسائٹی کے سرکردہ بانیوں میں سے تھے ۔ کلکتہ میں نوعمر لڑکوں کے لیے ایک دارالاصلاح بھی قائم کیا تھا ۔

۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور پہلی عالمی جنگ کے بعد لندن میں تحریک خلافت کے قائد بنے ۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ان کی شخصیت کو چار چاند لگانے والی ان کی ایک تصنیف "THE SPIRIT OF ISLAM" ہے ۔ جسے وہ اپنی زندگی میں ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۲ء تک کئی بار ترامیم و اصلاح کے بعد شائع کرتے رہے ، ان کی وفات کے بعد ان کی یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی ۔ مغربی ممالک اور اسلامی دنیا میں اس کا اب تک نمایاں اثر ہے ۔ ترکی زبان میں بھی اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے ۔

دوسری اہم تصنیف A SHORT HISTORY OF THE SARACENS ہے جس میں گذشتہ اسلامی تاریخ کے بارے میں مغربی مفکرین کے غلط نظریات کو ختم کر کے ایک نیا انداز فکر دیا ہے ۔

اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں دنیا کے سامنے اسلام کی حقانیت کو پیش کیا ہے اور نہ صرف یورپ میں اسلام کے متعلق ایک سازگار فضا تیار کی بلکہ مغرب زدہ مسلمانوں میں اسلام کو بنظر استحسان دیکھنے کا جذبہ پیدا کیا ہے ۔

امین

وہ شخص جس پر دوسرے لوگ اعتماد اور بھروسہ کر سکیں جسے بطور امانت کوئی چیز سپرد کی جائے ۔ نگران ۔ ناظم ۔ آنحضورؐ کا لقب ہے جو مکہ میں قریش نے دیا تھا ۔ امین الوحی حضرت جبرئیلؑ کا لقب ہے یعنی وہ جسے وحی سونپی گئی ۔ یہ لفظ اکثر القاب میں استعمال ہوتا رہا ہے ۔ مثلاً امین الدولہ ۔ امین الدین ۔ امین الملک اور امین السلطنت ۔ نیز امین کی اصطلاح مختلف قابل اعتماد عہدے رکھنے والوں کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے

امین الحسینی

(۱۸۹۳ء ۔ ۴ جولائی ۱۹۷۴ء) مفتی اعظم فلسطین ۔ یروشلم کے حسینی خاندان میں مفتی طاہر الحسینی کے ہاں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی ۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ ازہر میں داخل ہوئے ۔ وہاں سید رشید رضا ، سعد زغلول پاشا اور مصطفیٰ منفلوطی جیسے مشاہیر کا قرب حاصل کیا ۔ ۱۹۱۳ء میں فریضہ حج ادا کیا ۔ جہاد حاصل کیا اور بقیہ تعلیم کے بہانے عثمانیہ فوجی کالج استنبول میں داخلہ لیا ۔ یہاں سے فارغ ہو کر عثمانی فوج کے ۴۶ ویں ڈویژن میں کمیشن حاصل کیا ۔ کچھ عرصہ کے [illegible] سمرنا یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے ۔ فوجی ملازمت کے دوران میں بحیرہ [illegible] جنگی محاذ پر اہم خدمات بھی سرانجام دیں ۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد آپ فلسطین واپس آئے ۔ [illegible] کے فتنوں اور مصائب کے دروازے کھل گئے ۔ اعلان بالفور ہوا ۔ یہودیوں کی [illegible] کا آغاز ہوگیا ۔ امین الحسینی نے ان کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا ۔ برطانوی عدالت نے [illegible] دس سال قید کی سزا سنائی ۔ مفتی صاحب وہاں سے فرار ہو کر شام اور اردن [illegible] میں تبلیغ جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے ۔ ۱۹۲۱ء میں جب سزا منسوخ ہوگئی تو واپس یروشلم تشریف لائے ۔ انہی دنوں آپ کو اپنے بڑے مرحوم بھائی محمد کامل الحسینی کی جگہ مفتی اعظم مقرر کیا گیا ۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے سپریم مسلم کونسل اور عرب اعلیٰ کمیٹی کی صدارت کی ۔ ان ایام میں انہوں نے ایسے مشکل کام کیے کہ ان کے دشمن بھی ان کی صلاحیتوں

کارواں گئے اور اپنے پرانے عشق کرتے تھے۔ انہوں نے اس امر کے لئے بھرپور کوشش کی کہ فلسطین اسرائیل نہ بن سکے۔ دنیا بھر کو اس قضیے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے انہوں نے فلسطین ہی میں کانفرنسیں کرنا کافی نہ سمجھا بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی وفود بھیجے اور خود بھی شام، مصر، عراق، امارت خلیج، ایران، افغانستان اور ہندوستان کا دورہ کیا۔ ہر جگہ اسرائیلی ایجنٹ آپ کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ کئی بار آپ پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ زر و مال کے ذریعے انہیں خریدنے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر آپ جادۂ مستقیم پر گامزن رہے۔

۱۹۳۱ء میں مفتی اعظم نے بیت المقدس میں دس روزہ اسلامی کانفرنس طلب کر لی۔ تمام مسلمان ملکوں کے نمائندے یہاں پہنچے اور انہیں فلسطین میں یورپی عوام اور یہودی دسیسہ کاریوں کی تفصیلات کا علم ہوا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان سے علامہ اقبال، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا شوکت علی شامل تھے۔

۱۹۳۶ء میں مفتی اعظم اور ان کے رفیق کار مجاہد شیخ عز الدین القسام نے فلسطین میں علم جہاد بلند کر دیا۔ [illegible] انگریزوں نے "بغاوت عظمیٰ" کا نام دیا۔ چھ ماہ کے اندر [illegible] حالت دگرگوں ہو گئی اور اگر اسے اندرونی سازشیں ختم نہ کر دیتیں تو ۱۹۳۶ء [illegible] آزاد ہو جاتا۔ سعودی عرب، عراق، یمن، اردن وغیرہ کے سربراہان نے [illegible] بغاوت ختم کرا دی۔ برطانیہ نے کانفرنس کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لارڈ پل [illegible] فلسطین کو [illegible] یہودیوں میں تقسیم کر دینے کی سفارش

مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی

[illegible] ۱۹۳۷ء میں بغاوت کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔ برطانوی فوج نے مفتی اعظم کو گرفتار کرنے کے لئے ان کا محاصرہ کر لیا۔ مفتی اعظم اپنے دفتر سے نکل کر مسجد اقصےٰ میں چلے گئے۔ تین ماہ تک مسجد اقصےٰ کا محاصرہ رہا۔

ایک روز مفتی اعظم اس زبردست محاصرے سے نکل کر لبنان پہنچ گئے اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ ۱۹۳۹ء تک آپ ملک در ملک پھرتے رہے اور عالمی سیاست کے زیر اثر کہیں بھی جم کر کام نہ کر سکے۔ لبنان سے آپ شام چلے گئے اور دوسری جنگ عظیم میں جب فرانس نے انہیں برطانیہ کے حوالے کرنا چاہا تو آپ عراق پہنچ گئے۔ یہاں فلسطینیوں کی فوجی تنظیم کی اور رشید علی کو عربوں کی مدد کے لیے اکسایا۔ انگریزی جاسوس آپ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں آپ ایران چلے گئے۔ جب برطانیہ نے یہاں بھی حملہ کر دیا تو آپ افغانستان چلے گئے۔ یہاں قادیانیوں کی سازشوں کے پیش نظر آپ استنبول، صوفیا، بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری سے ہوتے ہوئے اٹلی جا پہنچے۔ مسولینی کو آپ نے اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے عربوں کی مدد کرے گا۔ نیز آپ نے لیبیا پر اٹلی کے قبضے کو ختم کرنے کا بھی وعدہ لیا۔ یہاں سے آپ جرمنی گئے اور صیہونی سازشوں کے خلاف بے پناہ کام کیا۔ مگر جرمنی جنگ ہار گیا اور آپ دل برداشتہ ہو کر سوئٹزرلینڈ اور پھر وہاں سے فرانس تشریف لے جا رہے تھے کہ ۱۹۴۶ء میں آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔

فرانس کی بدترین جیل میں آپ کے ساتھ تشدد کیا جانے لگا۔ نیز آپ پر نازیوں کے ایجنٹ ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ یوگوسلاوی حکومت نے ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کر دیا۔ مگر ایک روز پورا یورپ دنگ رہ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ مفتی اعظم جیل سے نکل کر قاہرہ پہنچ گئے ہیں۔

مفتی اعظم کی زندگی کا تیسرا دور ۱۹۴۶ء کے نصف سے شروع ہو کر ۱۹۷۴ء کے نصف پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ آپ نے مصر اور لبنان ہی میں گزارا۔ مسلم کونفیشن کے رکن کی حیثیت سے آپ نے کئی بار پاکستان کے دورے بھی کیے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں بھی آپ نے شرکت کی اور پھر چند ہی ماہ بعد عالم اسلام کا یہ بطل جلیل اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

امین الرشید (۱۷۰ھ/۷۸۶ء - ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) عباسی خلیفہ۔ اپنے باپ ہارون الرشید کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ ہارون الرشید نے ۱۷۵ھ/۷۹۲ء میں پانچ سالہ امین کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ ۱۸۳ھ/۷۹۹ء میں اپنے دوسرے بیٹے مامون کو اپنا دوسرا ولی عہد نامزد کیا۔ جب ہارون الرشید نے ۱۹۳ھ/۸۰۹ء میں وفات پائی تو امین کو سلطنت کے طول و عرض میں خلیفہ تسلیم کر لیا گیا اور المامون اپنے علاقہ خراسان میں چلا گیا۔ ۱۹۵ھ/۸۱۰ء کے اواخر میں اس نے المامون کے باغی ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے بعد اپنے بیٹے اور اپنے تیسرے بھائی المعتصم کو بلا واسطہ خلیفہ نامزد کر دیا۔ اس کے بعد اس اقدام سے عراق اور خراسان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ آخر کار ۱۹۸ھ/۸۱۳ء ۲۴، ۲۵ محرم کی درمیانی شب میں مامون کے سپہ سالار طاہر بن الحسین کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ اس کے اس چار سالہ دور میں کوئی خاص کارنامہ نظر نہیں آتا۔

امیہ بن عبد شمس امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف قریش مکہ کے قبیلہ بنو امیہ کا مورث اعلیٰ عبد المطلب بن ہاشم کا چچا زاد بھائی۔ طویل عمر پائی۔ سردار کی حیثیت سے امیہ بھی اپنے والد عبد شمس کی طرح مختلف جنگوں میں اہل مکہ کی قیادت کرتا رہا۔ کیونکہ ان کے جد امجد قصی نے جب مکہ میں شہری ریاست قائم کی تھی تو سپہ سالاری کی ذمہ داری اسی قبیلے کے حصہ میں آئی تھی اور امیہ کے بعد اس کے بیٹے حرب اور حرب سے اس کے بیٹے ابوسفیان کو منتقل ہوئی۔ ان کی اولاد بنو امیہ کہلاتی ہے۔

امیہ، بنو قریش کا ایک خاندان، جس سے اموی خلافت کا آغاز ہوا۔ امیہ بن عبد شمس اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ حضرت علیؓ کے دور حکومت

میں معاویہؓ بن ابوسفیانؓ بن امیہ نے، جو اس وقت شام کے حاکم تھے، خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا اور اموی خلافت کا آغاز کر دیا۔ حضرت علیؓ کے ساتھ اس کی جنگیں بھی ہوئیں۔ حضرت علیؓ کے بعد حضرت امام حسنؓ نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تو اسلامی حکومت امیر معاویہؓ کے ہاتھ آ گئی۔ معاویہ کے بعد اس کا بیٹا یزید حکمران ہوا۔ اس کے دور میں سانحہ کربلا پیش آیا اور حضرت امام حسینؓ شہید کیے گئے۔ یزید

عبد مناف
- عبد شمس
  - امیہ
    - حرب
      - ابوسفیان
        - معاویہ
          - یزید
- نوفل
- مطلب
- ہاشم
  - عبد المطلب
    - عبداللہ
      - محمدؐ
        - حسنؓ
        - حسینؓ
    - ابوطالب
      - علی
    - عباس (خلفائے عباسیہ)
    - حمزہ
    - ابولہب

کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تین ماہ حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان کوئی اکیس برس تک اموی خلافت پر براجمان رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید دس برس تک حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان کوئی اکیس برس تک اموی خلافت پر براجمان رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید دس برس تک حکمران رہا۔ اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک اور پھر عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ ہوئے۔ عمر بن عبدالعزیز کے دو سالہ دورِ حکومت نے ایک بار پھر سے خلافت راشدہ کی یاد دلا دی۔ ان کے بعد یزید ثانی بن عبدالملک پھر ہاشم بن عبدالملک پھر ولید بن یزید بن عبدالملک پھر یزید ثالث بن یزید پھر ابراہیم بن ولید حکمران ہوئے۔ ان کے بعد مروان بن محمد بنو امیہ کا آخری خلیفہ ہوا۔ جس نے ۱۳۲ھ/۷۵۰ء تک حکومت کی۔ اس طرح خلافت بنی امیہ کے نوّے برس میں کل چودہ حکمران گذرے۔ ان کے عہدِ حکومت اسلامی سلطنت اتنی وسیع ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ نیز دیکھیے "تاریخ"۔

انبیائے کرام وہ نیک بندے، جو خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے وقتاً فوقتاً اس دنیا میں آتے رہے ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں بھیجا۔ اللہ کے یہ نیک بندے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ خدمت خلق کے لئے وقف کئے رہتے ان کے اس وعظ و نصیحت پر قوموں نے انہیں برا بھلا کہا اور تکلیفیں دیں مذاق اڑایا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور بستی ایسی نہیں جس میں اس نے اپنا نبی اور رسول نہ بھیجا ہو (۲۵ : ۲۴) ہر نبی اور رسول ایک ہی تعلیم لے کر آیا۔ قرآن مجید نے بعض انبیاء کا ذکر کیا ہے اور بہت سے ایسے نبی ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ ایک حدیث میں انبیاء کی تعداد قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ قرآن اور دوسری آسمانی کتب میں جن انبیاء کا ذکر ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت آدمؑ۔ حضرت نوحؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ۔

حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت اسحاقؑ۔ حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت شعیبؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت ادریسؑ۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت داؤدؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت ہارونؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت زکریاؑ۔ حضرت یحییٰؑ۔ حضرت یونسؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت الیاس۔ حضرت الیسع۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کے علاوہ اور بہت سے انبیاء ایسے ہیں جن کا ذکر بھی قرآن میں نہیں ملتا۔ بعض حضرات نے زرتشت کنفیوشس۔ گوتم بدھ ذوالکفل وغیرہ کو بھی نبیوں میں شمار کیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے حکم ہے کہ وہ ان تمام انبیاء کی بعثت پر ایمان لائیں اور انہیں برحق جانیں۔

انجیل عیسائیوں کی مذہبی کتاب، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں اسے بشارت قرار دیا گیا ہے (۶۱ : ۶) یونانی زبان میں بھی اس کے معنی بشارت ہی کے ہیں۔ یہ وہ فرامین اور خطبات ہیں جو یسوع مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں ارشاد فرمائے۔ انہیں آپ کی زندگی میں لکھا گیا یا نہیں۔ اس کے بارے میں ہمارے پاس [illegible] ذریعہ معلومات نہیں۔ کیونکہ ابتدا [illegible] حواریوں اور ان کے شاگردوں کی ایک بڑ[illegible] عماد موقع و محل جو لوگوں کے سامنے [illegible] بات و ارشادات بیان کر دیا کرتے تھے [illegible] معتقدین کو یہودیوں سے الگ امت قرار دے دیا گیا اور انہیں [illegible] لگا تو انہوں نے مسیح علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات [illegible] کیں جو ان مصنفین تک زبانی روایات کے ذریعے [illegible] اپنی الگ کتاب تصنیف کی اور اسے انجیل کا نام دیا [illegible] جا پہنچی۔ ان میں سے صرف ایک یعنی انجیل یہود [illegible] دیگر اناجیل یونانی زبان میں تھیں۔ ان اناجیل کی فہرست [illegible]

طفولیت متی، پطرس، اوّل یوحنا، دوم [illegible] اوّل توما، دوم توما، یعقوب، نیقودیس، [illegible] برناباس، لوقا، متی، مخفی ڈیمس، پال، [illegible] جوڈ، مارشین، ناصرین، ٹاتیان، ولن ٹینس [illegible] مریم، جوڈرس اور کالمیسٹ کی اناجیل۔

ان اناجیل میں سے کوئی بھی [illegible] کی لکھی ہوئی نہیں۔ [illegible] ۶۰ء میں قلمبند ہوئی۔ انجیل یہودیہ تو اسی ابتدائی دور میں ناپید ہو گئی۔ [illegible] ایک بڑی تعداد ایسے مکاتیب کی ہے، جو حواریوں کے ساتھ منسوب ہیں [illegible] میں ۱۱۳ تھے۔ آج کل عیسائیوں کے نزدیک بنیادی طور پر چار اناجیل [illegible] اور یوحنا اور تیرہ مکاتیب مروج ہیں۔ باقی اناجیل اور مکاتیب [illegible] والی عیسائی پیشواؤں کی مجلس نیقیہ نے متروک قرار دے دیں۔ ان [illegible] مکاشفات شامل کر کے ان کا نام عہد نامہ جدید رکھا۔

موجودہ بائبل میں شامل چاروں اناجیل ان یونانی زبان بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں، جو حضرت عیسےٰؑ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰؑ کے اقوال و اعمال کی تفصیلات زبانی ہی پہنچی تھیں۔ مزید یہ کہ ان اناجیل کا کوئی بھی اصل نسخہ اس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے۔ جس میں ابتداءً یہ تصنیف ہوئیں۔ اس معاملہ کو جو چیز خصوصاً مشتبہ بنا دیتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی اناجیل میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ یا غیر دانستہ طور پر تغیر و تبدل کو بالکل جائز سمجھتے رہتے۔ یہ تغیرات صریحاً کچھ لوگوں نے بالقصد کئے جنہیں اصل کتاب

میں شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا۔ بہت سے ایسے اضافے دوسری صدی عیسوی ہی میں کیے گئے۔

ان اناجیل میں بھی دس لاکھ سے زیادہ اور شدید اختلافات بلکہ تضادات موجود ہیں انھیں دور کرنے کے لیے بار بار کانفرنسیں منعقد ہوتی رہیں اور مستند نسخے شائع کیے جاتے رہے۔ اس کے باوجود اختلافات نمایاں رہے۔ ۱۵۴۵ء سے ۱۵۶۳ء تک منعقد کونسل ٹرینٹ نے ولگیٹ کے نسخہ کو الہامی قرار دے دیا اور ایک کمیٹی کے ذریعے ایک نئے نسخے کو مرتب کیا گیا مگر اس میں بھی بار بار ردوبدل کیا جاتا رہا اور ایک متن پر اتفاق کی بجائے اس میں اور بھی اختلافات در آئے۔ ۱۷۰۷ء میں مل اور ۱۷۵۱ء میں وٹیسٹائن نے یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل زبردست تحریف و تصریف کا شکار ہوئی ہے۔

انجیل میں تحریف ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو سریانی اور یونانی زبانوں کے حروف کی مشابہت ہے۔ غافل انجیل نگاروں نے کسی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھ کر مفہوم میں اختلاف پیدا کر دیا۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ سارے انجیل نویس نے اسے اپنی جانب سے تذکرے کی صورت میں لکھا جس سے مسیحی تعلیمات

cxix.

The Gospell off Sancte Jhon.

The fyrst Chapter.

In the begynnynge was that worde/ãd that worde was with god:and god was thatt worde. The same was in the begynnynge wyth god. All thyngs were made by it and with out it was made noo thige that made was. In it was lyfe/ And lyfe was the light of me/ And the light shyneth i darcknes/ãd darcknes cõprehended it not.

There was a mã sent from god whose name was Jhon. The same cã as a witnes to beare witnes of the light/that all men through him myght beleve. He was nott that light: but to beare witnes of the light. That was a true light/ which lighteneth all men that come ito the worlde. He was in the worlde/ãd the worlde by hi was made:and the worlde knewe hym not.

He cã ito his awne/ãd his receaved hi not. vnto as meny as receaved hi gave he power to be the sõnes of god: i that they beleved õ his name: which were borne not of bloude nor of the will of the fleshe/ nor yet of the will of men:but of god.

And that worde was made fleshe and dwelt emonge vs/and we sawe the glory off yt as the glory off the only begotten sonne off the father

انگریزی انجیل کا ایک ورق

مسخ ہو کر رہ گئیں۔ تیسرا بڑا سبب یہ تھا کہ [illegible] نے جب مفہوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی تو از خود بہت سی تبدیلیاں کر دیں۔

انجیل کے موجودہ دور کے شارحین میں سے ایک بڑا طبقہ بائبل کو لفظ بلفظ خدا کی الہامی کتاب سمجھتا ہے۔ چند عیسائی علماء ایسے بھی ہیں جو انجیل کو محض معتقدات اخلاق کی رہنما سمجھتے ہیں۔ جب اٹھارہویں صدی کے فلسفے نے حقیقی وحی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ اپنے مطالب کا اظہار ایسے طریق سے کرے جو ایک عام آدمی کے فہم کے عین مطابق ہو اور عہد نامہ جدید اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو ایک طبقہ ایسے آزاد خیال علماء کا پیدا ہوا، جسے ٹوبنگن سکول کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق عہد نامہ جدید سینٹ پال کے خیالات کا آئینہ دار ہے اور زیادہ تر حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے آخری تین برسوں کے گرد گھومتا ہے۔ معاملات دنیا کا فقدان ہے اور کسی بھی طرح اسے اصل انجیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن مجید میں جس انجیل کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ کتاب یا تعلیمات ہیں جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ امام رازی کے بقول زمانہ ابتری میں اصل انجیل ضائع ہو گئی۔ مولانا عبدالحق حقانی لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں دراصل تورات اور انجیل موجود نہ تھی چنانچہ قتادہ جیسے تابعین کے بقول انجیل سے وہ کتاب یا احکامات الٰہی مراد ہیں، جو حضرت عیسیٰؑ پر بذریعہ وحی نازل ہوئے۔

اب ہم اناجیل اربعہ کا تھوڑا سا ذکر کریں گے۔ ان میں انجیل مرقس قدیم ترین ہے۔ اس کا مصنف یونان کا ایک یہودی مارک تھا۔ یہ پال اور برناباس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ پھر اس نے پطرس کی رفاقت اختیار کر لی۔ پطرس کے قتل کے بعد مرقس نے یہ انجیل لکھی۔ اس کی تصنیف کا زمانہ ۶۵ء سے ۷۰ء تک کا ہے۔ یہ انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی۔ یہ سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ انجیل متی کے متعلق محققین کا خیال ہے کہ اس کا مصنف متی تھا۔ مگر اس کا لکھا ہوا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ موجودہ کتاب کسی اور کی لکھی ہوئی ہے اس کا زمانہ تالیف بھی ۶۹ء سے ۸۰ء کے درمیان ہے۔ پروفیسر ہارنک کے نزدیک یہ ۸۰ء سے ۱۰۰ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔ اس میں اٹھائیس ابواب ہیں۔ لوقا کی انجیل کا زمانہ تالیف ۸۰ء سے ۹۰ء کا ہے۔ اسے اٹلی کے باشندے لوقا نے لکھا تھا، جو پولوس کا طبیب بھی تھا۔ اس میں چوبیس ابواب ہیں۔ عہد نامہ جدید کا حصہ "رسولوں کے اعمال" بھی اسی کا تصنیف کردہ ہے۔ چوتھی انجیل اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد یوحنا سے منسوب ہے لیکن جدید محققین کے نزدیک اس کا مصنف یوحنا کوئی اور شخص تھا جو ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا۔ اسلوب اور مضامین کے لحاظ سے یہ انجیل بالکل مختلف ہے۔ اس میں آسمانی حکومت کا ذکر ہے۔ نیز فلسفہ یونان کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۰ء سے ۱۲۰ء کا درمیانی دور ہے۔ ایک اور انجیل جس کا تذکرہ آج کل بہت زیادہ ہے اور جو اصل انجیل کے زیادہ قریں ہے انجیل برناباس ہے۔ مگر عیسائی علماء اسے سرے سے ماننے ہی سے انکار کرتے ہیں۔ (مزید دیکھیے "آسمانی کتب"، "انجیل برناباس"، "بائبل"، "عہد نامہ جدید"، "عیسیٰؑ"، "عیسائیت")۔

انجیل برناباس

حضرت عیسیٰؑ کے حواری برناباس کی لکھی ہوئی انجیل۔

انجیل برناباس قدیم عیسائی ادب میں اس کا ذکر ایک گمشدہ کتاب کی حیثیت سے ملتا ہے۔ مسیحی کلیسا نے جن اناجیل کو متروک قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک انجیل برناباس بھی تھی۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا تھا کیونکہ اس میں عیسائیت کا موجودہ ایوان منہدم ہو جاتا ہے۔ ۱۷۰۹ء میں شاہ پروشیا کے ایک مشیر کرومر کو اس کتاب کا نسخہ ایمسٹرڈم کے کسی کتب خانے سے ملا۔ یہ اطالوی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے یہ نسخہ شہزادہ آیوجین سافوی کو تحفے کے طور پر دے دیا۔ ۱۷۳۸ء میں یہ آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کے شاہی

کتب خانے میں منتقل ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی کے ابتدا میں ہالینڈ کے مقام پر ڈاکٹر طلوں کو انجیل برنا باس (اطالوی) کا اور نسخہ دستیاب ہوا۔ یہ ہسپانوی زبان میں تھا۔ یہ نسخہ مشہور مستشرق جارج سیل کو ملا جس نے اس سے اپنے ترجمۂ قرآن میں مختلف اقتباسات نقل کئے۔ یہ نسخہ گم ہوچکا ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۰۴ء میں یہ ڈاکٹر ہیوٹ کے پاس آگیا تھا اور اس نے اپنے لیکچروں میں بتایا ہے کہ دونوں نسخوں میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے۔

۱۹۰۷ء میں اس نسخے کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر منکہوس نے کیا۔ پھر مصر کے ایک عیسائی ڈاکٹر خلیل سعادت نے اسے عربی میں منتقل کر دیا۔ جو ۱۹۰۸ء میں سید رشید رضا نے شائع کیا۔ یہ عربی ترجمہ ہندوستان پہنچا تو مولوی محمد حلیم انصاری ردولوی نے اس کا اردو ترجمہ ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع کیا۔

عیسائی ادب میں جہاں کہیں بھی انجیل برنا باس کا ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے، جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برنا باس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے، جو شاید اس لئے بولا جاتا ہے کہ اس میں جگہ جگہ بشارات آنحضور ﷺ کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اسے پڑھتے ہی علم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف ہرگز نہیں۔ دوسرے اس کا ذکر کہیں بھی مسلمانوں کے ہاں نہیں ملتا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم وغیرہ کسی نے بھی انجیل برنا باس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ ابن ندیم کی "الفہرست" میں بھی اس کا تذکرہ موجود نہیں۔

دوسری طرف آنحضور ﷺ کی پیدائش سے پچھتر برس قبل پوپ گلاسیس اوّل کے زمانہ میں گمراہ کن کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی اس میں انجیل برنا باس بھی شامل تھی۔ خود عیسائی محققین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قدیم عیسائی ادب میں انجیل برنا باس کا ذکر ملتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ گلاسیس اوّل نے انجیل برنا باس کو گمراہ کن کیوں کہا تھا اور اس کا پڑھنا ممنوع کیوں قرار دیا گیا تھا! صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس انجیل میں عام عیسائی نظریات کے خلاف مواد موجود تھا اور یہ بات خود عیسائی علماء نے تسلیم کی ہے کہ شام، سپین، مصر وغیرہ کے ابتدائی کلیساؤں میں ایک مدت تک انجیل برنا باس مروج رہی ہے۔

موجودہ بائبل کی اناجیل اربعہ لکھنے والا کوئی بھی شخص حضرت عیسےٰؑ کا حواری نہیں تھا اور نہ ان میں کسی نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے۔ نیز انہوں نے اپنی معلومات کی روایت کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ جب کہ انجیل برنا باس کا مصنف کہتا ہے کہ وہ مسیح کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہے اور شروع سے آخر تک مسیح کے ساتھ رہا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سنے اقوال درج کر رہا ہے۔ "کتاب اعمال" میں لوقا نے برنا باس کا ذکر کیا ہے۔

انجیل برنا باس اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے کہ یہ اس شخص نے لکھی جو حضرت عیسےٰؑ کے عہد میں تھا اور اس میں ان کے متعلق زیادہ مواد ملتا ہے۔ نیز اس میں حضرت عیسےٰؑ کی زبانی پیغمبر آخر زماں کی تشریف آوری کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ اس میں صاف طور پر آنحضور ﷺ کو محمد رسول اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اندلس ہسپانیہ کا بہت بڑا کہستانی علاقہ جو بحر اوقیانوس آبنائے جبل الطارق اور بحیرہ روم سے ملحق ہے۔ مسلمانوں نے اس علاقے پر آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ اندلس کا نام کافی پرانا ہے۔ ۷۰۸ھ/۱۶۔۷۱۵ء کے ایک دینار پر عربی اور لاطینی الفاظ میں اندلس کے لئے لفظ ہسپانیہ استعمال کیا گیا ہے۔ ہسپانوی لاطینی مورخ مسلم سپین اور مسیحی سپین کے لئے یہ نام سپانیہ یا ہسپانیہ استعمال کرتے ہیں لیکن عرب مصنف جب بھی الاندلس لکھتے ہیں تو اس سے مراد اسلامی سپین ہی لیتے ہیں۔ خواہ اس کی جغرافیائی حدود کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

طبعی محل وقوع: جزیرہ نمائے آئی بیریا یورپ کے جنوب مغرب میں خشکی کا ایک وسیع و عریض ابھرا ہوا علاقہ شکل کے لحاظ سے پانچ گوشہ ہے ایک طرف یہ کوہستان پیرینیز (PYRENEES) کے ذریعے براعظم یورپ سے ملا ہوا ہے۔ اور بقیہ اطراف میں بحیرہ اوقیانوس اور بحیرہ روم سے ملحق ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۲۲۹۰۰۰ مربع میل ہے۔ جزیرہ نمائے سپین یورپ کے سب سے زیادہ ہموار علاقوں میں سے ہے۔ اس کے [illegible] طور پر تین حصے ہیں۔ وسط میں ایک وسیع سطح مرتفع جس نے پورے رقبے کا [illegible] حصہ گھیر رکھا ہے۔ [illegible] طرف کینٹبریا کا کوہستانی سلسلہ ہے۔ [illegible] زلزلوں کی وجہ سے ایک بڑا [illegible] ہوگیا ہے۔ جسے الالئی اندلس کہا [illegible] رکھا ہے۔

آب وہوا: جزیرہ نما کی آب [illegible] سرما میں شدید سردی اور گرما میں شدید گرمی ہوتی ہے اور سالانہ اوسط ۲۲ انچ [illegible] انچ سے بھی کم ہوتی ہے۔ اس سے [illegible] مغرب جسے نیز عام طور پر بحر اوقیانوس کے قریب [illegible] معتدل رہتا ہے کیونکہ اس تمام علاقے [illegible] معدنیات میں سیسہ، چاندی، لوہا، تانبا [illegible] میں مختلف قسم کے قدرتی نمک۔ شورہ، [illegible] سرمہ پھٹکڑی اور کہربا بھی بڑی مقدار میں موجود [illegible] صنوبر درخت صنوبر اور کارک، شاہ بلوط کے درخت [illegible] دیہی علاقے سال بھر جنگلوں اور چراگاہوں کی وجہ سے [illegible]

تاریخ: چوتھی صدی ہجری میں مسعودی [illegible] حصہ تھا جس کے متعلق مشرقی دنیا کو بہت کم معلومات [illegible] خلافت کے شروع ہونے کے بعد سے اندلس کے حالات [illegible]

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ طوفان نوح کے بعد [illegible] تو اس ملک میں جو قوم آباد ہوئی اس کا نام اندلش تھا [illegible] کو اس نے بدل دیا۔ اندلس کی اس وقت کی آبادی [illegible] نے اپنے وقت میں بڑی ترقی کی۔ مگر جیسے ہر عروج کے بعد زوال لازمی ہوتا ہے اس مجوسی قوم پر بھی زوال آیا۔ متواتر ایک سو سال تک بارش نہ ہونے [illegible] ساری قوم موت کی آغوش میں چلی گئی اور اس کی جگہ ایک نئی قوم نے [illegible] سے جلاوطن کی گئی تھی۔ یہ قوم صدیوں اندلس میں آباد رہی اس کی آبادی [illegible] انگلستان تک جا پہنچی۔ اس قوم کے زمانہ میں طالقہ اندلس کا دارالسلطنت تھا [illegible] قوم پہلے تو خوب بڑھی اور پھیلی۔ مگر ایک سو ستاون برس بعد اس کے قوے [illegible] مضمحل ہوگئے اور ایک نئی قوم نے جو روما سے اٹھی تھی۔ یہ ملک چھین لیا۔ [illegible] قوم کے بادشاہ کا نام اشبانیہ تھا۔ اس کی وجہ سے اس ملک کا نام بھی اندلس کی [illegible] اشبانیہ ہوگیا۔ طلوش رومی نے اشبانی بادشاہوں کو ختم کر کے ان کی جگہ لے لی اور

۴ - عبدالرحمان ثانی بن الحکم اوّل ۲۰۶ھ/۸۲۲ء تا ۲۳۸ھ/۸۵۲ء - علم وفنون کا دلدادہ تھا - موسیقی سے اسے خاص لگاؤ تھا - رفتہ رفتہ موسیقی سے دلچسپی اندلس کے عربوں کی قومی خصوصیت بن گئی اس کے عہد میں رعایا فارغ البال تھی - ملک بھر میں عالیشان محلات سڑکیں - شاہراہیں - مساجد مدرسے اور شفا خانے تعمیر ہوئے ڈاک کا بہترین انتظام کیا گیا - ملک کے دفاع کے لیے ایک شاندار بحری بیڑہ تیار کرایا - قرطاجنہ اور قادلیس کے مقامات پر اسلحہ سازی کے کارخانے کھولے گئے - اس عہد کی شاندار تہذیبی روایات اور عربوں کی خوش وضعی کے انداز دیکھ کر یورپ والوں نے بھی اپنے تہذیبی ڈھانچہ میں عربوں کا تہذیبی رنگ بھرا

۵ - محمد اوّل بن عبدالرحمان ثانی :- ۲۳۸ھ/۸۵۲ء تا ۲۷۳ھ/۸۸۶ء - اس نے اندلس کی حکومت کو باقاعدہ اصولوں پر منظم کیا - ملکی انتظامات کے لیے قواعد وضوابط مرتب کیے - مختلف مناصب پر متشرع لوگوں کو مقرر کیا - اس کے عہد میں حنبل فقہ کے پیروکاروں کو عروج نصیب ہوا - متعصب عیسائیوں اور باغیوں کے سلسلے میں اس نے باپ کی نرم روی کو ترک کر دیا - چنانچہ طارق کے عہد کے بعد سے جتنے گرجے عیسائیوں نے تعمیر کیے تھے انہیں موسیٰ بن نصیر کے عہدنامے کی رو سے مسمار کرا دیا - متعصب یولوجیس اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرایا - باغیوں اور بیرونی حملہ آوروں کو بری طرح شکست دی - اس کا عہد مسلسل بدعنوانیوں اور مصائب کا دور بنا رہا - اندرونی بغاوتوں کے علاوہ ملک میں زلزلے وبا اور قحط سالی کی بلائیں نازل ہوتی رہیں - مگر ان مصائب سے بھی وہ نہ گھبرایا اور سلطنت کو روبہ تنزل ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا رہا -

۶ - منذر بن محمد اوّل ! ۲۷۳ھ/۸۸۶ء تا ۲۷۵ھ/۸۸۸ء

چالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا - اس کی عمر جنگی معرکوں میں گذری تھی - اس لیے اسے مہمات ملکی کا تجربہ تھا - مگر اس کے عہد میں ملکی حالت بہت بگڑ گئی - سرحدی عیسائیوں نے سرحدی قلعوں پر قبضہ کر لیا - ابن حفصون نے پھر سر اٹھایا - ابھی اس سے کشمکش جاری تھی کہ منذر کے سوتیلے بھائی عبداللہ نے سازش کر کے اسے مروا دیا

۷ - عبداللہ بن محمد اوّل ! ۲۷۵ھ/۸۸۸ء تا ۳۰۰ھ/۹۱۲ء

اس کے دور میں ملک میں افراتفری بہت حد تک بڑھ گئی تھی - اندلس کے بہت بڑے حصے میں عرب امراء نے جابجا خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں - اس کی حکومت کے ابتدائی پندرہ برسوں میں عیسائیوں نے جابجا شورشیں برپا کیں - آخری نو سال کچھ سکون سے گذرے اور تجارت زراعت اور صنعت کو ترقی نصیب ہوئی - ان خانہ جنگیوں کے باوجود مسلمانوں کے اندر اتنی ہمت باقی تھی کہ انہوں نے یورپ میں اپنی مہمات کو جاری رکھا - اور پیڈی مانٹ - لنگوریا اور سوئٹزرلینڈ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا - فرانس میں جوس - مارسیلز - گرینوبل اور نیس کے علاقوں کو بھی تسخیر کر لیا -

۸ - عبدالرحمان ثالث ! ۳۰۰ھ/۹۱۲ء تا ۳۵۰ھ/۹۶۱ء

عبداللہ نے اپنے بیٹوں کی موجودگی میں اپنے پوتے عبدالرحمان الثالث کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا - یہ اکیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا - اس نے اپنی قابلیت اور سیاستدانی کا پورا پورا ثبوت دیا - اپنے اخلاق و تدبر سے کچھ ہی عرصہ میں قرطبہ کے لوگوں اور اپنے رشتہ داروں کو اپنا حقیقی خیر خواہ بنا لیا - عیسائی حکمرانوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں - تجربہ کار جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بڑا عالم و فاضل بھی تھا - علم و ہنر کی سرپرستی کرنا وہ اپنا فرض عین سمجھتا تھا - اس کا پچاس سالہ عہد اندلس کی تاریخ میں اسلامی عہد کا سنہری دور ہے -

۹ - الحکم ثانی بن عبدالرحمان ثالث ! ۳۵۰ھ/۹۶۱ء تا ۳۶۶ھ/۹۷۶ء

یہ جب تخت نشین ہوا تو لیون - نویرہ اور قشتالہ کے کاؤنٹ نے جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں - مگر حکم نے انہیں عبرتناک شکستیں دیں - اس نے نصف اندلس خود کو

مملکت لیون
لیون
برغش
بنبلونہ
مملکت نبارہ
سرقسطہ
برشلونہ
طرکونہ
مملکت ارغون
مملکت قشتالیہ
دریائے دویرہ
طلمنکہ
مملکت البرتقال
دریائے تاجہ
طلیطلہ
قونکہ
بلنسیہ
جزائر میورقہ
بحیرۂ روم
اشبونہ
دریائے یانہ
قرطبہ
اشبیلیہ
مرسیہ
غرناطہ
المیریا
مالقہ
قادس
طریف
جبل الطارق
پیمانہ
۵۰
۱۰۰ میل

مستحکم کیا بلکہ اسے وسعت بھی دی یہ بڑا علم دوست حکمران تھا۔ اس کے دربار میں علماء اور فلسفیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

۱۰۔ ہشام ثانی! ۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء تا ۳۹۹ھ/ ۱۰۰۸ء بار دیگر ۴۰۰ھ/ ۱۰۱۰ء تا ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۳ء گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ کم سن تھا اس لیے وزیر طالع محمد بن ابی عامر اس کا سرپرست بنا۔ بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنے مخالف امراء کو قتل کرانے کے بعد خلیفہ کو نظر بند کر دیا اور اس طرح تمام سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ خلیفہ پر قابو پانے کے بعد طالع محمد بن عامر حاجب المنصور کے لقب سے ملک پر حکومت کرنے لگا۔ خطبے میں خلیفہ کے [illegible] کے ساتھ اس کا نام شامل کر لیا گیا۔ تمام احکامات اسی کے [illegible] نے تھے۔ ۳۹۴ھ/ ۱۰۰۲ء میں انتقال کیا۔

اندلس میں طوائف الملوکی اور اموی خلافت کا زوال:۔ منصور حاجب کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عبدالملک کو ہشام ثانی نے اپنا حاجب مقرر کیا اور [illegible] کے خطابات سے نوازا۔ چھ سال تک اس نے سلطنت کا وقار قائم رکھی [illegible] کے خلاف [illegible] کامیابی سے جہاد کیا۔

[illegible] وفات پائی۔ اس کے بعد ہشام نے اس کے بھائی عبدالرحمٰن [illegible] حاجب مقرر کیا [illegible] جلد سلطنت کا مختار کل بن گیا اور اس نے ہشام [illegible] ولی عہدی کا اعلان کرا دیا۔ [illegible] کے حامیوں کو یہ بات [illegible] کے پڑپوتے محمد ثانی بن ہشام بن عبدالجبار [illegible] ھ/ [illegible] تخت پر بیٹھا دیا اور [illegible] منصور [illegible] سنتے ہی قرطبہ واپس آیا مگر حالات [illegible] کا سر قلم کر کے محمد ثانی مہدی [illegible] سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد الثانی کے [illegible] تعلقات [illegible] مہدی نے بربریوں کی طرف داری [illegible] سلیمان بن عبدالرحمان ثالث کو مستعین باللہ کے [illegible] ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۳ء تا ۴۰۷ھ/ ۱۰۱۶ء میں تخت پر بٹھایا۔ سلیمان [illegible] الفانسو [illegible] شکست دے کر قرطبہ پر قبضہ کر لیا۔ مہدی نے الفانسو [illegible] سلیمان [illegible] شکست دی اور قرطبہ پر دوبارہ [illegible] نے مہدی کو قتل کر دیا اور ہشام الثانی کو دوبارہ [illegible] خلیفہ بنایا۔ ہشام نے واضح عامری کو [illegible] حاجب مقرر کیا مگر سلیمان بن الحکم اور لفانسو [illegible] قرطبہ [illegible] محاصرہ کر لیا اور اسی دوران میں واضح عامری قتل ہو گیا اور [illegible] روپوش ہو گیا [illegible] سلیمان قرطبہ پر قبضہ کر کے دوبارہ خلیفہ بن گیا [illegible] کے زمانے میں جا بجا خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ۴۰۷ھ/ ۱۰۱۶ء تک سلیمان قرطبہ اور اس کے مضافات پر حکومت کرتا رہا۔ آخر مراکش کے ادریسی خاندان کے ایک [illegible] علی بن حمود نے سلیمان کو شکست دے کر قتل کر دیا اور قرطبہ میں اپنی حکومت قائم کر لی مگر ایک سال بعد صقلبی غلاموں نے بغاوت کی اور اسے قتل کر دیا اور اس کے بھائی قاسم کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ مگر یحییٰ بن علی نے کافی کش مکش کے بعد قاسم کو ۴۱۴ھ/ ۱۰۲۳ء میں شکست دے کر قید کر لیا۔ تقریباً نصف صدی تک سیاسی انتشار و فساد کے باوجود خاندان بنو حمود کے افراد اہل قرطبہ پر حکومت کرتے رہے۔ خیران جو شروع میں علی بن حمود کا خیر خواہ تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ علی بن حمود ہشام کی طرح خلیفہ بننا نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ منصور کی طرح ان کا حاجب بن سکتا ہے۔ اسے ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو خلافت کا دعوےٰ کرے۔ بہت سے اندلسیوں نے اسے مدد دینے کا وعدہ کیا ان میں سے سرقسطہ کا حاکم منذر بھی تھا۔ جو خاندان بنی ہاشم کی یادگار تھا۔ چنانچہ منذر اور خیران نے ۴۰۸ھ/ ۱۰۱۸ء میں اپنے ہم خیال سرداروں کی ایک مجلس بلائی۔ عبدالرحمان رابع بن محمد بن عبدالملک بن عبدالرحمان ثالث کو خلیفہ چنا اور تینوں غرناطہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے ناکا کو خط لکھا کہ میں خلیفہ ہوں اور میری ماتحتی قبول کر۔ لیکن اس نے اس کا سخت جواب دیا۔ تو عبدالرحمٰن رابع نے جنگ کا ارادہ کیا۔ ادھر خیران اور منذر نے بھی انہیں اپنے مطلب کا آدمی نہ پاتے ہوئے بے وفائی کی اور میدان جنگ میں عبدالرحمان رابع کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔ عبدالرحمان کو دشمن کے آدمیوں

[illegible] مدینۃ الزہرا کا ایک بیرونی منظر

نے قتل کر دیا۔ اواخر رجب ۴۱۴ھ/ ۱۰۲۳ء میں یحییٰ بن علی بن حمود نے اپنے چچا قاسم بن حمود کو شکست دی تو اہل قرطبہ نے خود مختار ہونے کے بعد پھر خواہش ظاہر کی کہ بنو امیہ میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے۔ چنانچہ ۴۱۴ھ/ ۱۰۲۳ء میں انہوں نے ایک مجلس منعقد کی اور تین آدمیوں کے نام خلافت کے لیے پیش کیے۔ جن میں سے عبدالرحمان خامس بن ہشام بن عبدالجبار کو خلیفہ چنا گیا۔ ابھی مسند خلافت پر بیٹھے سات ہفتے بھی پورے نہ گذرے تھے کہ عبدالرحمان خامس قتل کر دیے گئے اور اس کے بعد محمد ثالث بن عبدالرحمان بن عبیداللہ بن عبدالرحمان ثالث (۴۱۴ھ/ ۱۰۲۳ء تا ۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء) کو خلیفہ چن لیا گیا۔ اس بادشاہ نے دولت مناسب تقسیم کر کے ناموری حاصل کرنا چاہی اس کا دور حکومت بہت قلیل رہا۔ لوگوں کا پہلے ہی خیال تھا کہ وہ ایک برا فرمانروا ثابت ہوگا اور یہی ہوا۔ ربیع الاوّل ۴۱۶ھ/ مئی ۱۰۲۵ء کو ایک بلوہ ہوا اور لوگوں نے اس کے محل کا محاصرہ کر لیا اس نے زنانہ لباس پہن کر اور منہ پر نقاب ڈال کر دو عورتوں کے ساتھ محل سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کے ایک ساتھی نے اسے زہر دے کر ختم کر دیا اور چھ ماہ تک قرطبہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ ایک مجلس اپنے طرز پر شہر کا انتظام کرتی تھی۔ ملک کے حالات جس طریق سے ڈھب پر آ سکتے تھے وہ یہ تھا کہ کوئی مطلق العنان بادشاہ چنا جائے اب سوال یہ تھا کہ کیا بنی امیہ میں سے ایسا کوئی بادشاہ مل سکتا ہے۔؟ یہ تجربہ بھی عبدالرحمان کو خلیفہ مقرر کر کے کیا جا چکا تھا اور اب بنو امیہ میں سے کسی کے پاس فوجیں بھی نہ تھیں اس لیے یہ قرار پایا کہ سلطنت یحییٰ بن حمود کے سپرد کر دی جائے لیکن یہ فیصلہ بھی صحیح ثابت نہ ہوا۔ اور اب پھر بنو امیہ کے کسی فرد کی تلاش شروع

ہوئی۔ قرعہ فال ہشام ثالث بن محمد بن عبدالملک بن عبدالرحمان ثالث کے نام نکلا اور وہ ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں خلیفہ چن لیا گیا۔ قرطبہ کے لوگوں نے بیعت کرلی۔ تین برس تک وہ اس راہ کی مشکلات کو دور کرتا رہا۔ بالآخر ۴۲۰ھ ۱۰۲۹ء تا ۴۲۲ھ ۱۰۳۱ء کو قرطبہ پہنچا۔ مجلس قرطبہ کی مجلس انتظامیہ نے شاہانہ طریقے پر استقبال کیا لیکن یہ بھی لوگوں کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا اور ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں تخت سے اتار دیا۔ یوں بنوامیہ کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

اندلس میں طوائف الملوکی دور

۱۔ بنوحمود کا خاندان !۔ ان کا دور ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور تقریباً نصف صدی تک سیاسی انتشار کے باوجود اس خاندان کے افراد اہل قرطبہ پر حکومت کرتے رہے۔ مگر ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں اشبیلیہ کے بادشاہ ابوالقاسم بن عباد نے بنوحمود کی حکومت کا خاتمہ کیا۔

مسجد قرطبہ کا اندرونی دالان

۲۔ بنوعباد کا خاندان !بنوعباد کی حکومت کا مرکز اشبیلیہ کا شہر تھا۔ جو خلیج سے ۶۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں قاضی ابوالقاسم محمد بن اسماعیل بن عباد لخمی نے اہل اشبیلیہ کی مرضی سے آزاد حکومت قائم کرلی۔ قاضی ابوالقاسم بیس سال تک حکومت کرتا رہا۔ ابوالقاسم کے بعد اس کا بیٹا ابوعمر عباد معتضد کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بدقسمتی سے غرناطہ کے بادشاہ سے لڑائی شروع کردی اور مسلمانوں کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۴۴۴ھ/۱۰۵۵ء میں فرڈیننڈ اول نے اشبیلیہ پر یلغار کرکے اس کو اپنا باجگزار بنالیا۔ ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں معتضد کا بیٹا معتمد تخت نشین ہوا۔ اس نے عیسائی بادشاہ الفانسو کو خراج دینا بند کردیا۔ زلاقہ کے مقام پر عیسائیوں اور مسلمانوں کی زبردست جنگ ہوئی۔ جس میں عیسائیوں کو عبرتناک شکست ہوئی۔ ان کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ مگر مسلمانوں نے اس سے چنداں فائدہ نہ اٹھایا اور باہمی لڑائی جھگڑوں میں لگے رہے ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں بنوعباد کی حکمرانی کا دور ختم ہوگیا۔

۳۔ مرابطین کا دور !گیارھویں صدی کے وسط میں دو نامور اشخاص یحییٰ بن ابراہیم اور عبداللہ بن یاسین علوم اسلامیہ کی تحصیل کی غرض سے مکہ معظمہ آئے۔ علوم کی تحصیل کے بعد ان اشخاص نے تبلیغ اسلام کی خاطر افریقہ کا رخ کیا جہاں کوہ اطلس کی اقوام ان کی پرہیزگاری سے متاثر ہوکر ان کی گرویدہ ہوگئیں یہاں ان لوگوں نے ایک حکومت کی بنیاد رکھی اور مرابطین کہلائے۔ زلاقہ کی لڑائی کے بعد تین سال کے عرصہ میں یوسف بن تاشفین نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور عیسائی علاقوں کو فتح کرکے انہیں مرابطین کی سلطنت میں شامل کرلیا۔ ۴۸۵ھ/۱۰۹۳ء میں اندلس مراکش کے مرابطین کا ایک صوبہ بن گیا۔ یوسف بن تاشفین نے پندرہ سال حکومت کی۔ یوسف کی وفات کے بعد ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء میں اس کا بیٹا علی بن یوسف تخت نشین ہوا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح مرد مجاہد ثابت ہوا اور پرتگال کے پایہ تخت لزبن اور متعدد عیسائی شہروں کو فتح کیا۔ ۵۳۷ھ/۱۱۴۳ء میں علی بن یوسف نے وفات پائی۔ علی بن یوسف کے بعد ابومحمد تاشفین مراکش کے تخت پر بیٹھا یہ تخت پر بیٹھتے ہی موحدین سے الجھ پڑا ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء میں ابومحمد عبدالمومن کے ہاتھوں سخت ہزیمت اٹھا کر انتہائی مایوسی کے عالم میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق ابراہیم تخت نشین ہوا مگر ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں عبدالمومن نے اسے شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں موحدین نے اندلس کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔

۴۔ موحدین کا دور حکمرانی !۔ محمد بن عبداللہ بن تومرت سلسلہ موحدین کا بانی تھا۔ ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تک اندلس کے تمام امراء نے عبدالمومن کی اطاعت کا حلف اٹھالیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوسعید اندلس کا حاکم مقرر ہوا۔ کچھ مدت کے بعد یہ اپنے باپ سے ملنے گیا تو اس کی غیر حاضری میں ابراہیم نامی ایک سردار نے غرناطہ پر قبضہ کرکے موحدین کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عبدالمومن نے جب یہ خبر سنی تو ایک زبردست بربری فوج ابوسعید کی امداد کے لیے روانہ کی۔ ابراہیم نے معافی مانگ لی اور ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء میں ان کی حکومت سارے ہسپانیہ میں مضبوط ہوگئی۔ ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء میں عبدالمومن کا انتقال ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یوسف تخت پر بیٹھا۔ اس نے بحیرہ روم کے متعدد جزیرے اپنی قلمرو میں شامل کیے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں سلطان یوسف نے وفات پائی۔ ابن رشد۔ ابن طفیل۔ ابوبکر ابن ماجہ جیسے نابغہ روزگار اشخاص اسی کے دور میں گذرے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان یعقوب تخت پر بیٹھا۔ ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء میں وفات پائی۔ اس کے عہد کی فتوحات اور لوگوں کی خوشحالی اسلامی اندلس کی عظمت کی آخری تصویر تھی۔ سلطان یعقوب کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تخت نشین ہوا اور ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء میں فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے بیٹے سلطان یوسف ابویعقوب کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے بیٹے سلطان یوسف ابویعقوب کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء میں اس نے وفات پائی اس کے بعد اس کا بھائی عبدالواحد تخت پر بیٹھا لیکن نو ماہ کے بعد ہی اس کو قتل کردیا گیا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء تک موحدین کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

۵۔ بنوھود کا خاندان !۔ ۶۲۵ھ میں ہود خاندان پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ اسی سال ہود خاندان کا ایک نامور رئیس محمد یوسف جو سرقسطہ کے چوتھے بادشاہ احمد مستعین کی پشت سے تھا۔ اشبیلیہ کا حکمران بن بیٹھا۔ اس کے بعد وہ غرناطہ مالقہ۔ اور قرطبہ کو فتح کرکے سارے اندلس کا بادشاہ بن گیا۔ ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء میں المیریہ

پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے ملوک الطوائف

اشبیلیہ : بنی عباد

ابو القاسم محمد (اوّل) بن اسماعیل
(۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء تا ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء)
ابو عامر عباد بن محمد المعتضد
(۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء تا ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء)
ابو القاسم محمد بن عباد المعتمد
(۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء تا ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء)

قرطبہ : بنی جہوَر

ابو الحزم جہوَر
(۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء)
ابو الولید محمد بن جہور
(۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۵۰ھ/۱۰۶۴ء)
عبد الملک بن محمد
(۴۵۰ھ/۱۰۶۴ء تا ۴۶۲ھ/۱۰۷۰ء)
(قرطبہ سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا)

مالقہ : بنی حمود

ادریس اوّل
(۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء تا ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء)
یحییٰ (۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء)
حسن (۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء تا ۴۳۴ھ/۱۰۴۱ء)
ادریس ثانی (۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۳۹ھ/۱۰۴۷ء)
محمد اوّل (۴۳۹ھ/۱۰۴۷ء تا ۴۴۵ھ/۱۰۳۵ء)
ادریس ثالث (۴۴۵ھ/۱۰۳۵ء)
ادریس ثانی (۴۴۵ھ/۱۰۳۵ء تا ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء)
محمد ثانی (۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء تا ۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء)
(مالقہ کا الحاق سلطنتِ غرناطہ میں ہو گیا)

جزیرۃ الخضراء : بنی حمود

محمد ابن قاسم ابن محمد
(۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء تا ۴۴۰ھ/۴۹-۱۰۴۸ء)
قاسم ابن محمد (۴۴۰ھ/۴۹-۱۰۴۸ء تا ۴۵۰ھ/۱۰۵۷ء)
جزیرۃ الخضراء سلطنتِ اشبیلیہ بنو عباد میں شامل کر لیا گیا۔

غرناطہ : بنی زیری

زاوی ابن زیری (۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء)

حبوس (۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء تا ۴۲۰ھ/۱۰۲۸ء)
بادیس (۴۲۰ھ/۱۰۲۸ء تا ۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء)
عبد اللہ (۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء تا ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء)

قرمونہ : بنی رزال

عبد اللہ ابن اسحاق (۴۳۴ھ/۴۳-۱۰۴۲ء)
محمد ابن عبد اللہ (۴۳۴ھ/۴۳-۱۰۴۲ء تا ۴۶۰ھ/۱۰۶۰ء)
ابن حیان کے مطابق، ابن عبد اللہ (یعنی عبد اللہ بن محمد) نے قرمونہ میں اس وقت حکومت کی جبکہ ہشام ثالث قرطبہ میں فرمانروا تھے۔
(۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء تا ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء)
اور ابن حیان ہی کے مطابق، ابن عبد اللہ کا جانشین اسحاق ابن عبد اللہ ہوا۔

رندہ

ابو نور ابن ابی قرہ (۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء تا ۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
ابو نصر ابن ابو نور (۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
رندہ کا الحاق سلطنتِ اشبیلیہ سے ہو گیا۔

مورُور

نوح (۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء تا ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء)
ابو مناد (۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء تا ۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
مورور سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

ارکش

ابن فرزون (۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
ارکش سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل ہو گیا

دلبہ : بنی بکر

ابو زید محمد ایوب (۴۰۲ھ/۱۲-۱۰۱۱ سے ابتدا ہوئی تا)
ابو المصعب عبد العزیز (۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء)
دلبہ کا الحاق سلطنتِ اشبیلیہ سے ہو گیا۔

لبلہ : بنی یحییٰ

ابو العباس احمد ابن یحییٰ یحصبی
(۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء تا ۴۳۲ھ/۱۰۴۱ء)
محمد ابن یحییٰ یحصبی (یعنی ابو العباس کا بھائی)، تا
فتح ابن خالد ابن یحییٰ (محمد ابن یحییٰ کا بھتیجا) ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء
لبلہ سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

شلب : بنی مزین

ابو بکر محمد ابن سعید ابن مزین
(۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء تا ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء) تا
ابو الاصبغ عیسیٰ (۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء)
شلب کی ریاست اشبیلیہ کی سلطنت میں شامل کر لی گئی

شنت ماریۃ الغرب

ابو عثمان ابن ہارون
(۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء)
محمد ابن ابو عثمان سعید ابن ہارون
(۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء)
شنت ماریۃ الغرب ریاستِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

مرتلہ

ابن طیفور (۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء)
مرتلہ، اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

بطلیوس

سابور

بنی الافطس

ابو محمد عبد اللہ ابن محمد ابن سلمہ (المنصور اوّل)
ابو بکر محمد (المظفر) ۴۶۱ھ/۱۰۶۸ء
یحییٰ (المنصور ثانی)
عمر (المتوکل) ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء

طیطلہ

یعیش (۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء)

بنی ذی النون

اسماعیل الظافر (۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء)
ابو الحسن یحییٰ بن المامون
(۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء)

یحیی بن اسماعیل ابن یحیی القادر
(۴۶۸ھ / ۱۰۷۵ء تا ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء)

سرقسطہ : بنی تجیب

منذر بن یحیی تجیبی (۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء)

بنی ہود:

ابوایوب سلیمان ابن محمد المستعین
(۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء تا ۴۳۸ھ / ۱۰۴۶ء)

احمد المقتدر
(۴۳۸ھ / ۴۷-۱۰۴۶ء تا ۴۷۴ھ / ۱۰۸۱ء)

یوسف موتمن
۴۷۴ھ / ۱۰۸۱ء تا ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء)

احمد المستعین ثانی
(۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء تا ۵۰۴ھ / ۱۱۱۰ء)

عبدالملک عماد الدولہ (۵۰۴ھ / ۱۱۱۱ء)

السہلہ

(دارالحکومت شنت ماریہ بنو رزین (بنی رزین)

ابومحمد ہذیل اوّل ابن خلف ابن لب ابن رزین (۴۰۲ھ / ۱۰۱۱ء) سے

ابومروان عبدالملک اوّل ابن خلف

ابومحمد ہذیل ثانی عزّ الدولہ پسر ابومروان عبدالملک اوّل۔ ابومروان عبدالملک ثانی حسام الدولہ تیحیلے۔
(۴۹۷ھ / ۱۱۰۳ء) تک۔

البونت : بنی قاسم

عبداللہ اوّل، ابن قاسم الفہری نظام الدولہ
(۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء)

محمد یمین الدولہ

احمد عضد الدولہ (۴۴۰ھ / ۴۹-۱۰۴۸ء)

عبداللہ ثانی جناح الدولہ برادر احمد عضد الدولہ
(۴۴۰ھ / ۴۹-۱۰۴۸ء تا ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ء)

بلنسیہ

مبارک اور مظفر صقالبہ

لبیب صقلبی صاحب طرطوشہ

عبدالعزیز المنصور (۴۲۱ھ / ۱۰۲۱ء تا ۴۵۳ھ / ۱۰۶۱ء)

عبدالملک المظفر ۴۵۳ھ / ۱۰۶۱ء تا ۴۵۸ھ / ۱۰۶۵ء

ریاست بلنسیہ کا الحاق ریاست طیطلہ سے ہوگیا۔

مامون (صاحب طیطلہ) ۴۵۸ھ / ۱۰۶۵ء تا ۴۶۰ھ / ۱۰۶۷ء۔

بلنسیہ کا تعلق ریاست طیطلہ سے قطع ہوگیا۔

ابوبکر ابن عبدالعزیز
(۴۶۸ھ / ۱۰۷۵ء تا [illegible]ھ / ۱۰۸۵ء)

قاضی عثمان بن ابی بکر [illegible]ھ ۱۰۹۵ء)

قادر (سابق بادشاہ طیطلہ) ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء تا
تا ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء

ریاست بلنسیہ جمہوری حکومت ہو جاتی ہے۔

ابن جہاف ، صدر مجلس

دانیہ

ابوالجیش مجاہد الموفق (۴۳۶ھ / ۱۰۴۴ء)

علی اقبال الدولہ (۴۳۶ھ / ۱۰۴۴ء تا ۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء)۔

مقتدر، صاحب سرقسطہ نے علی اقبال الدولہ کو تخت سے اتار دیا اور ریاست دانیہ کو سرقسطہ میں شامل کرلیا۔

مقتدر (صاحب سرقسطہ)

(۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء تا ۴۷۴ھ / ۱۰۸۱ء)

مرسیہ

خیران (صاحب المریہ)
(۴۰۷ھ / ۱۰۱۶ء تا ۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء)

زہیر (صاحب المریہ)
(۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء تا ۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء)

عبدالعزیز المنصور (صاحب بلنسیہ)
(۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء تا ۴۵۳ھ / ۱۰۶۱ء)

عبدالملک المظفر (صاحب بلنسیہ)
(۴۵۳ھ / ۱۰۶۱ء تا ۴۵۸ھ / ۱۰۶۵ء)

اوپر کے آخری تین بادشاہوں کے زمانہ میں ابوبکر احمد بن طاہر [illegible] حاکم رہے۔

اُن کا انتقال [illegible] ۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء

اُن کے بعد اُن کا [illegible] ابو عبدالرحمٰن محمد ان کا جانشین ہوا
(۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء تا ۴۷۱ھ / [illegible])

معتمد [illegible] بادشاہ [illegible]

ابن عمار

ابن رشیق [illegible]

المریہ

خیران (۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء)

زہیر (۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء تا ۴۳۰ھ / [illegible])

عبدالعزیز المنصور (صاحب بلنسیہ)

۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء تا ۴۳۳ھ / [illegible]

بنی صمادح: ابوالاحوص معن [illegible]

۴۴۳ھ / ۱۰۵۱ء محمد معتصم ۴۴۳ھ / ۱۰۵۱ء تا [illegible]

۱۰۹۱ء عز الدولہ [illegible]

کے حاکم ابن الرمیمی نے بغاوت کی، اس کی سرکوبی کے لیے محمد بن یوسف روانہ ہوا مگر راستے ہی میں دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس طرح بنو ہود کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

۹۔ غرناطہ:۔ غرناطہ کی سلطنت کا بانی یوسف ابن الاحمر تھا۔ اس نامور شخص نے ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء میں غرناطہ کی آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اگلے تیس سالوں میں اس نے المیریہ اور لارنقہ کے علاقوں پر اپنے اقتدار کا سکہ بٹھا دیا۔ ۶۷۱ھ / ۱۲۷۲ء میں اس نے وفات پائی۔ نصر بن یوسف اور اس کے انیس جانشینوں نے غرناطہ پر ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء سے ۸۹۷ھ / ۱۴۹۲ء تک حکومت کی۔ کافی عرصے تک ان مسلمان حکمرانوں کا عیسائی بادشاہوں سے جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا جس کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔

غرناطہ کا اٹھارہواں حکمران سلطان ابوالحسن ایک باہمت [illegible] ۸۷۰ھ / ۱۴۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ ۸۸۰ھ / [illegible] میں جب [illegible] ابوالحسن سے خراج کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ موجودہ وقت [illegible] غرناطہ کی ریاست میں طلائی سکوں کی بجائے [illegible] کرنے کے لیے ڈھالی جا رہی ہیں۔ وقت کے تقاضے کے سبب [illegible] نے چپ سادھ لی۔ مگر چھ برس بعد دونوں حکمرانوں میں جنگ چھڑ گئی [illegible] سلطان ابوالحسن نے لوشہ کے مقام پر فرڈی نینڈ کو شکست فاش دی۔ [illegible] میں سلطان ابوالحسن کے بیٹے ابوعبداللہ نے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔ ابوالحسن مالقہ چلا گیا اور اسے پایہ تخت بنایا۔ عیسائیوں نے اس بات سے فائدہ اٹھایا اور ایک شدید جنگ میں ابوعبداللہ

کو شکست دے کر قید کر لیا۔ ابوالحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اندھا ہو گیا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں اس نے اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو تخت پر بیٹھا دیا۔ عیسائی حکمران ابوعبداللہ زغل کے زمانہ میں عیسائیوں نے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں غرناطہ پر فوج کشی کی لیکن شکست کھائی۔ مسلمانوں میں جنگ کرانے کے لیے انہوں نے ابوعبداللہ کو بھی قید سے رہا کر دیا۔ اور وہ رہائی پاتے ہی اپنے چچا ابوعبداللہ زغل کے پایہ تخت مالقہ پر قابض ہو گیا۔ یوں چچا اور بھتیجے کے درمیان لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرڈی نینڈ نے مالقہ پر قبضہ کر کے ابوعبداللہ زغل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور ابوعبداللہ سے غرناطہ اور قصر الحمراء کا مطالبہ کیا۔

ابوعبداللہ نے عیسائیوں سے جنگ کرنے پر کمر باندھی۔ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں فرڈی نینڈ اور ازابیلا کی متحدہ فوجوں نے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور تقریباً سات سال تک انہوں نے صلیبی بہادروں کو آگے بڑھنے سے روکا مگر سامان خوراک کی کمی کے باعث محصورین نے ہتھیار ڈال دینے کا [illegible] ابوعبداللہ نے اپنے وزیر کی وساطت سے غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کرنے کے متعلق خفیہ معاہدہ کیا۔ جس پر کہ ربیع الاول ۸۹۷ھ/ [illegible] غرناطہ پر قبضہ کرنے کے بعد فرڈی [illegible] ظلم و ستم شروع کر دیے۔ مسلمانوں [illegible] معمولی باتوں پر انہیں قتل کر دیا [illegible] اندلس کی متعدد مذہبی عدالتیں انہیں [illegible] کے عیسائی حکمران [illegible] رہے اور پھر تقریباً سو [illegible] کے بعد مسلمان [illegible] تاریخی حقیقت ہے۔ ۱۰۱۸ھ/۱۶۱۰ء [illegible] ایک بار کل نکل جانے کا حکم دیا [illegible] عیسائی حکمران مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کا [illegible] چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان افریقہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

تہذیب و ثقافت:۔ دنیا کا کوئی بھی مورخ خواہ وہ کسی مذہب اور ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جب مسلمان اندلس میں آئے تھے تو سارا یورپ جہالت تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ یورپ میں نہ کوئی ماہر تھا نہ طبیب نہ کوئی کیمیاگر تھا۔ اور نہ کوئی سائنسدان۔ مسلمانوں نے آتے ہی اس ملک کی کایا پلٹ دی۔ ہر طرف علم و ہنر کی شمعیں روشن کیں۔ درس گاہوں کے دروازے کھولے۔ صنعت سازی کو عروج بخشا۔ زراعت میں حیرت انگیز ترقی کی۔ مسلمانوں نے اس ملک میں علم کی جو خدمت کی ہے اس کا ذکر تفصیل چاہتا ہے۔ اندلس کے مسلمان بادشاہ خود بڑے عالم اور علم دوست انسان تھے جس کا اندازہ ان باتوں سے لگایا جا سکتا ہے الحکم ثانی کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ جن میں سے اکثر مختلف فنون پر لکھی گئی تھیں جن میں سے اکثر مختلف فنون پر لکھی گئی تھیں۔ سرقسطہ کے بادشاہ المقتدر اپنے وقت کا سب سے بڑا ماہر علم ہندسہ اور ریاضی دان تھا۔ بطلیموس کے بادشاہ المظفر نے پچاس جلدوں میں ایک انسائیکلوپیڈیا تصنیف کیا تھا۔ ان بادشاہوں کو علم سے اتنی محبت تھی جتنی تاج و تخت سے یہی وجہ ہے کہ اندلس کی کوئی بستی ایسی نہ تھی جہاں مکتب موجود نہ ہو بارہویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں ایک ہزار بڑی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے ایسے تھے جہاں ثانوی اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابن

ہاتھی دانت کی صناعی

رشد۔ زرقالی۔ ابوالوفا۔ ابو اسحاق اشبیلی۔ ابوالحسن علی۔ ابن ابی صلت۔ ابن یونس۔ المازنی۔ جابر کوزی جابر ابن افلح۔ ابن زہر۔ ابوالقاسم۔ ابن سعید خطیب اور محمد التمیمی جیسے اساتذہ فن تعلیم و تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ جن کی نظیر دنیا آج تک پیدا نہ کر سکی۔

ہر یونیورسٹی کے ساتھ بڑے بڑے کتب خانے بھی ہوتے ان کتب خانوں میں ہر مضمون کی کتابیں جمع رہتیں ایک ایک مضمون پر ہزاروں کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ یہ کتب خانے بیک وقت اشاعت خانے بھی تھے۔ ایک ایک کتب خانے میں کئی کئی ہزار خطاط اور خوش نویس ملازم تھے۔ صرف شاہی کتب خانہ میں ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار خطاط کام کرتے تھے۔ ہر قسم کے موضوع پر تحقیق و تصنیف کی جاتی۔ اندلس کے مسلمانوں کو زراعت کے فن میں جو کمال حاصل تھا وہ آج تک یورپ تک کسانوں کو نصیب نہیں ہوا۔

زراعت کی طرح اندلس کے مسلمانوں نے صنعت و حرفت میں بھی بہت ترقی کی۔ اس وقت بجلی کی بے پناہ قوت انسان کے کنٹرول میں نہیں آئی تھی۔ مسلمانان اندلس نے یہ کام پانی کی روانی سے لیا۔ وہ دریاؤں پر عجیب و غریب قسم کے بند باندھ کر پانی کو زمین کی سطح سے بہت اونچا اٹھا کر اسے آبشار کی صورت اور اس کی روانی میں جو شدت پیدا ہوتی اس سے اپنے کارخانے چلاتے۔ سب سے زیادہ شہرت کپڑا بننے میں پائی۔ ریشمی کپڑا بننے میں تو آج تک ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سارے اندلس میں ریشم بننے والے کارخانوں کی تعداد آٹھ سو تھی۔ مالقہ اور المیریا میں ریشم کے سب سے بڑے کارخانے تھے۔ ان کا بنایا ہوا کپڑا ایک کروڑ کے قریب افراد استعمال کرتے تھے۔ گویا دنیا بھر میں کپڑا یہیں سے جاتا تھا۔

دنیا کا خوب صورت اور نفیس کاغذ بھی اندلس ہی میں تیار ہوتا تھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک بھر میں کتابوں کے تاجروں کی تعداد ایک لاکھ تھی تو کتنا کاغذ تیار ہوتا ہوگا۔ کاغذ تیار کرنے والی مشینیں پانی کے زور سے چلتی تھیں۔

یورپی تحقیق نے اندلس کی جس صنعت کو دنیا بھر میں بے مثل قرار دیا تھا۔

وہ ظروف سازی کی بھی، شیشے، چینی اور دھات کے خوب صورت اور نفیس برتن دنیا بھر میں فروخت ہوتے تھے۔ خصوصاً مالقہ اور المیریا کے برتنوں کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

لوہے کے صندوق بنانے میں بھی اندلس کے مسلمان ساری دنیا سے بازی لے گئے تھے۔ نیز ان کی چابیاں کوئی دوسرا تیار نہ کر سکتا تھا۔ ان صندوقوں پر صناعی اور گلکاری کی جاتی تھی۔ اندلس کے کاریگر فانوس بنانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ نیز خطاطی اور آرائش و تزئین ان کے دل پسند مشغلے تھے۔

فن تعمیر میں اندلس کے مسلمان دنیا بھر میں بازی لے گئے تھے۔ ان کی تعمیر کردہ عمارات آج بھی اسی شان و شوکت کے ساتھ ایستادہ ہیں۔ خصوصاً اشبیلیہ کا مینار، قرطبہ کی جامع مسجد، الحمرا کا محل، قرطبہ کا قصر الزہرا اور اندلس کی اکثر مساجد جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اندلس کے ان معماروں کو پتھروں کو نئی وضع سے تراشنے، جوڑنے اور نئے نئے مسالے لگانے میں کمال حاصل تھا۔ قرطبہ میں ان کی تعمیر کردہ سات سو مساجد میں سے آج صرف ایک مسجد باقی ہے۔ جسے حکومت سپین نے عجائب گھر بنا رکھا ہے۔

انڈونیشیا ایشیا کے جنوب مشرق میں واقع آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک، جو چار ہزار سے زائد جزیروں پر مشتمل ہے۔ خشکی کا کل رقبہ ۱۰۲۷۰۸۷ ۱ مربع کلومیٹر (۶۵۸، ۲۰۲، مربع میل) اور آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۹۹ء۱۲،۳۱ء۱۱۹ ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں اعظم آسٹریلیا واقع ہے۔ قدیم ادوار میں اس کا نام جزائر شرق الہند تھا، جسے ۱۹۲۱ء میں حریت پسندوں نے انڈونیشیا کا نام دیا۔ تین بڑے بڑے حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) مغربی جزائر، جن میں جاوا، سماٹرا، بنکا، مادورا، بورنیو، بلیتون وغیرہ شامل ہیں (۲) جزائر سوندا جن میں بالی، لمبوک، سومبا، تیمور، رونی، فلورس اور سمباوا جیسے جزائر شامل ہیں۔ (۳) مشرقی جزائر، جن میں سلاویسی اور مالوکے جزائر شامل ہیں۔ (۴) مغربی ایریان، نیوگنی وغیرہ۔

انڈونیشیا کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت جکارتا ہے۔ جس کی آبادی ۱۹۷۱ء میں ۴،۵۷۶،۰۰۹ نفوس پر مشتمل تھی۔ سرکاری زبان انڈونیشی ہے۔ مذہباً مسلمان اکثریت میں ہیں۔ چند فیصد آبادی عیسائیت اور بدھ مت سے تعلق رکھتی ہے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء کے انتخابات کے بعد سے جنرل سہارتو صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے دوسری بار سربراہ مملکت ہیں۔ وزیر خارجہ آدم مالک ہیں۔

تاریخ :- انڈونیشیا کی تاریخ زمانۂ قبل از تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ ماہرین نسلیات کا خیال ہے کہ قدیم انسانی نسلیں جو بندر کی شکل و صورت رکھتی تھیں انڈونیشیا میں آباد تھیں۔ جاوا سے تقریباً ۵ لاکھ سال پرانے انسانی متحجرات ملے ہیں۔ اس وقت یہ ملک جزائر پر منقسم نہیں تھا اور بر اعظم ایشیا کا ایک جزو تھا۔ حجری دور میں یہاں سیاہ فام لوگ آباد رہے۔ ان کا مذہب مظاہر پرستی تھا۔ یہ لوگ ... کی تدفین کرتے اور جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ پوری آبادی ایک سردار کے ماتحت ہوتی تھی۔ کوئی دو ہزار سال قبل مسیح میں ان کے ہاں کھیتی باڑی کا آغاز ہوا۔ ... ۵۰۰ ق م میں کانسی کا استعمال شروع ہوا اور ۲۰۰ ق م میں ... سے آنے والے سوداگروں نے انھیں لوہے کا استعمال سکھایا۔ اسی زمانے میں ہندوؤں نے یہاں آنا شروع کیا اور ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک یہاں ہندو مت اور بدھ مت کی ترویج ہوئی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ... سماٹرا میں قائم تھی۔ اس دور کی سرکاری زبان سنسکرت تھی۔ ... بدھ مت کے ایک پیرو سلینڈر کے ہاتھوں ... صدی عیسوی میں یہاں فنون لطیفہ خصوصاً فن تعمیر نے خاص ترقی کی یہاں کی ... بھی قابل ذکر ہے، جو گیارھویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر تھی۔ ... دور میں مسلمانوں نے ان جزائر پر قدم رکھا۔ اگلی دو صدیوں میں یہاں ... خاصا فروغ پایا اور اگرچہ یہاں ہندو ثقافت ہی کا دور دورہ رہا ... حیرت انگیز طریقے سے یہاں پھیلا۔ اس پر آج بھی مستشرقین ...

بحیرہ جنوبی چین
فلپائن
سولو
ملیشیا
بحیرہ سلیبیز
بورنیو
نیو گنی
بحیرہ جاوا
بحیرہ فلورز
بحیرہ باندہ
بحیرہ تیمور
بحیرہ آرافورا
آسٹریلیا
بحر ہند
دارالحکومت
مشہور مقامات

انڈونیشیا میں اسلامی تبلیغ کے سب سے بڑے داعی شیخ عبداللہ عارف تھے۔ انہوں نے سماٹرا کے چند باشندوں کو مسلمان کیا۔ ان کے خلیفہ شیخ برہان الدین نے آچے کے علاقے میں مدرسہ قائم کیا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ۱۲۰۵ء میں یہاں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ چودھویں صدی عیسوی میں حجاز سے شیخ اسماعیل کی قیادت میں کچھ مبلغین آئے۔ پندرھویں صدی کے آغاز تک یہاں کے مشہور علما مولانا ابراہیم سونان نعیل، سونان بونانگ، سونان کالی جاگا [illegible] میں جاوا کے حکمران مجاپاہت کو شکست دے کر یہاں پہلی اسلامی حکومت قائم کی اس کے تھوڑے ہی عرصہ میں دیگر جزائر میں بھی اشاعت اسلام کا آغاز ہو گیا۔

[illegible] صدی میں انڈونیشیا میں مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ سلطنت سماٹرا میں قائم [illegible] یہاں کا راجا مسلمان ہو کر سلطان ملک الصالح کے نام سے مشہور [illegible] میں جب [illegible] یہاں [illegible] ملک الصالح کا پوتا سلطان زین العابدین [illegible] مسلمانوں کی دوسری بڑی سلطنت آچے ۱۴۹۶ء میں قائم ہوئی۔ [illegible] میں [illegible] ۱۹۰۰ء تک یہاں کے مسلمان ولندیزیوں کے ساتھ [illegible] والی اسلامی سلطنت [illegible] ۱۵۰۰ء تک باقی [illegible] سلطنتیں [illegible]

[illegible] ملوکا پر حملہ کر کے وہاں پرتگالی [illegible] ۱۵۹۵ء میں پرتگالی [illegible] انہوں نے [illegible] بنیاد رکھی [illegible] مسلسل ہو رہی تھی [illegible] کے گرد [illegible] سازشوں کا آغاز [illegible] جاوا سے نکال دیا [illegible] ولندیزیوں کے [illegible] ایک بار پھر جمنے [illegible] ۱۶۲۰ء میں باندا [illegible] ۱۶۴۳ء میں [illegible] ۱۶۶۵ء میں [illegible] ۱۶۶۴ء میں بورنیو [illegible] میں بالی اور [illegible] جزائر [illegible] کے قبضے میں چلے گئے۔ انہوں نے بٹاویہ کو اپنا دارالحکومت [illegible] صوبوں میں تقسیم کر دیا اور اس پر حکومت کرنے لگے۔

[illegible] میں ہالینڈ میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو کمپنی کو توڑ دیا گیا اور انڈونیشیا کے جزائر براہ راست ولندیزی حکومت کے ماتحت چلے گئے۔ ۱۸۱۱ء میں برطانیہ [illegible] کی جنگ کے دوران میں لارڈ منٹو گورنر جنرل ہندوستان نے ایک بحری [illegible] کے ذریعے جاوا پر قبضہ کر کے ولندیزیوں کو انڈونیشیا سے نکال دیا۔ اگلے [illegible] سمفورڈ ریفلز انگریزوں کی طرف سے یہاں کا حاکم رہا۔ اس نے ملک کو ترقی کی طرف گامزن کیا۔

۱۸۱۶ء میں لنکا، ملایا اور شمالی بورنیو پر برطانیہ کا قبضہ اور جاوا سماٹرا اور دیگر مشرقی جزائر پر ہالینڈ کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۰۷ء تک مقامی مسلمان ان کے خلاف برسرپیکار رہے۔ مگر رفتہ رفتہ تمام جزائر ولندیزیوں کے ہاتھ آ گئے اور انہوں نے ان کا نام الندیزی شرق الہند رکھا۔ ولسیبی حکمرانوں کے اختیارات سلب کر لیے گئے اور غیر ملکیوں کے ساتھ ولسیبی باشندوں کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے مخصوص عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ ۱۹۱۵ء میں گورنر کو مشورہ دینے کے لیے ایک کونسل قائم کی گئی جس کے اڑتیس ارکان میں سے پندرہ ملکی باشندے ہوتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ارکان کی کل تعداد اکسٹھ ہو گئی جن میں سے تیس ملکی ہوتے تھے۔

[illegible] کے ساتھ ساتھ

انڈونیشیا میں آباد ہونے والے ان غیر ملکیوں نے اسے اپنا ملک ہی بنا رکھا تھا اور کبھی یہ تصور بھی نہ کرتے تھے کہ ان کا اپنا ملک یورپ میں کہیں واقع ہے اس مقصد کے لیے انہوں نے مقامی لوگوں سے زمینیں خرید کر فارم قائم کرنا شروع کیے۔ تجارت اور صنعت تو پہلے ہی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان زمینوں میں انہوں نے کافی، چائے، تمباکو، سنکونا، سیمل، ربڑ، کساوا، وغیرہ کاشت کی۔ ماہی گیری اور معدنیات کی طرف بھی توجہ دی گئی اور یوں اگرچہ دو تین صدیوں ہی میں انڈونیشیا ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ مگر اس ترقی کا سارا ثمرہ ولندیزیوں ہی کو حاصل رہا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے مقامی لوگوں کے اندر آزادی کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں آچے کے ایک ممتاز عالم امام بونجول نے اعلان جہاد کر دیا۔ انہوں نے منگ کباؤ کے علاقے سے ولندیزیوں کو نکال دیا ۱۸۳۷ء میں وہ گرفتار ہو کر فوت ہوئے تاہم تحریک جاری رہی۔ ۱۸۲۵ء میں جاوا کے ایک شہزادے دیپونگورو نے علم جہاد کو بلند کیا مگر ۱۸۳۰ء میں سازشیوں نے انہیں گرفتار کروا دیا۔ سماٹرا میں محمد ساماں نے ۱۸۹۱ء تک اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ منگ کباؤ کے آخری حکمران بھی ۱۹۰۷ء میں لندیزی سازش کا شکار ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں آچے کے ایک اور عالم تیکو عمر نے اس سلسلے کو برقرار رکھا۔ ۱۸۹۹ء میں وہ شہید ہو گئے تو ان کی بیوہ اور تیکو محمد داؤد نے لڑائی جاری رکھی۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی بیوہ اور ۱۹۰۷ء میں تیکو محمد داؤد گرفتار ہو گئے اور یوں یہ تحریک آزادی ختم ہو گئی

تحریک مجاہدین کے اختتام سے قبل ہی کئی دوسری تحریکوں نے بھی جنم لے لیا تھا۔ انھی میں امداد باہمی کی تحریک، جو دیہاتیوں کے مابین خود بخود قائم ہوئی تھی ثانی تحریک، جسے ۱۸۹۰ء میں جاوا کے ایک باشندے ثامن نے کاشت کاروں کے مفاد کے لیے شروع کیا اور جو ۱۹۱۷ء میں فوج کی مدد سے دبا دی گئی تھی، اسلامی تجارتی انجمن جو ۱۹۰۸ء میں حاجی عمن ہدی نے تجارت کی آزادی کے لیے شروع کی اور دیگر کئی مذہبی تعلیمی اور سیاسی تحریکیں میں شامل ہیں۔

۱۹۱۳ء میں اسلامی تجارتی انجمن کے رکن حاجی عمر سعید نے دینی اور معاشرتی اصلاح کے لیے ایک انجمن "شرکت اسلام" کے نام سے بنائی۔ جب اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوگئی تو انھوں نے سیاسی امور کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۱۹ء میں اراکین کی تعداد ۲۵ لاکھ سے بڑھ گئی تو کامل آزادی کا نعرہ بلند کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اشتراکی عناصر نے "شرکت رعیت" کے نام سے علیحدہ جماعت قائم کر کے بغاوت کر دی۔ جسے دبانے کے بعد حکومت نے تمام جماعتوں کو ختم کر دیا۔ اس وقت کی بہت سی دیگر دینی جماعتیں مثلاً نہضۃ العلما، مجلس خلافت، جمعیت اتحاد اسلامی اور موتمر اسلامی شرق الہند قابل ذکر ہیں۔

۱۹۰۸ء میں انڈونیشی طلبا نے جمعیت شرق الہند قائم کی جسے ۱۹۲۴ء میں مجلس انڈونیشیا کا نام دیا گیا۔ اس کے صدر محمد حتا تھے۔ ان کی کوششوں سے یورپ میں ان کے کئی حامی پیدا ہو گئے۔

۱۹۲۸ء میں احمد سوکارنو کی قائم کردہ جماعت انڈونیشی قومی پارٹی نے ایک ملک، ایک قوم اور ایک زبان انڈونیشیا کا نعرہ بلند کیا۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں ان کے گرفتار ہو جانے کے بعد یہ جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ کئی ممتاز رہنما گرفتار ہو چکے تھے اور تمام جماعتوں میں پژمردگی پھیل رہی تھی۔ چنانچہ ایک رہنما حسنی تہمرن نے تمام جماعتوں کو متحد کر کے ایک وفاقی احزاب سیاسی انڈونیشیا (گاپی) کے نام سے قائم کیا۔ اس جماعت نے دوسری عالمی جنگ کے بعد اس امر پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر وہ اپنے اس وعدے میں پوری نہ اتر سکی۔ اور سیاسی جماعتوں اور عوام نے دل برداشتہ ہو کر مجلس رعیت انڈونیشیا قائم کر لی۔

اکثر ملکی رہنماؤں نے جاپان سے آزادی کا وعدہ لے کر اس کی مدد کرنا شروع کر دی۔ یہ قبضہ ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ سوکارنو اور حتا کھلم کھلا جاپانیوں کی حمایت کرنے لگے اور ان کے معاون شہریر، آدم ملک اور شریف الدین نے ملک بھر میں خفیہ تنظیموں کا جال پھیلا دیا۔ سوکارنو اور حتا نے جاپانیوں سے ہر قسم کی مراعات حاصل کر لیں، جن میں انڈونیشی عوام کی فوجی تربیت بھی شامل تھی۔ ۱۹۴۴ء میں حکومت جاپان نے ملک کو آزادی دینے کی تدبیریں اختیار کرنا شروع کیں۔ اگلے برس انڈونیشی مجلس برائے اہتمام آزادی قائم ہوئی۔ جس نے سوکارنو کی تجویز پر پنج شیلا (پانچ اصول) ۱۔ خدا پر ایمان۔ ۲۔ قومی آزادی۔ ۳۔ عوام کی حکومت۔ ۴۔ انسانیت کے اصولوں پر عمل۔ ۵۔ معاشرتی انصاف کا نفاذ) کو آزادی کی اساس بنایا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں کو شکست ہوگئی تو انڈونیشیا اتحادیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ مگر تین ہی روز بعد ۱۷ اگست کو انڈونیشی رہنماؤں نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اگلے روز سوکارنو کو صدر اور حتا کو نائب صدر کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا اور ملک کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کر کے نظم ونسق قائم کر دیا گیا۔

ولندیزیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو اتحادیوں کی طرف لپکے اور بالآخر ان کی کوششوں سے ۲۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ماؤنٹ بیٹن کی زیر قیادت انگریزی فوج انڈونیشیا پر حملہ آور ہوئی۔ جاوا، سماٹرا اور بالی میں شدید جنگ شروع ہوگئی۔ سورابایا کے مقام پر انگریزوں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے پیش نظر دسمبر ۱۹۴۵ء میں روس نے انڈونیشیا کا مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔ ولندیزیوں نے نیم خود مختار ریاست کے قیام کی پیش کش کی۔ مگر حریت پسندوں کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور بالآخر اگست ۱۹۴۶ء میں ولندیزی کمیشن نے آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ۱۵ نومبر سے دونوں حکومتوں کے مابین مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بالآخر طے پایا کہ جاوا اور سماٹرا کے علاوہ دیگر جزائر میں ولندیزی حکومت قائم ہوگی، جو ہالینڈ کی حکومت کے ماتحت ہوگی۔ ولندیزیوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے پہلے انھیں نکالا گیا تو وہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے۔ انڈونیشی حریت پسند نہ مانے تو ولندیزیوں نے ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو حملہ شروع کر دیا۔ سلامتی کونسل کے ایما پر ۵ اگست کو جنگ بند ہوئی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کے راضی نامہ رینول کی رو سے جاوا اور سماٹرا کے کچھ علاقوں کے سوا باقی تمام علاقے ولندیزیوں کے پاس چلے گئے۔ محمد حتا نے ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو نئی وزارت بنائی تاکہ ولندیزیوں کے ساتھ مذاکرات قائم کیے جا سکیں۔ ولندیزیوں نے ہر قسم کے

جاوا میں [illegible]

معاہدے بالائے طاق رکھتے ہوئے مئی ۱۹۴۸ء میں عارضی وفاقی حکومت قائم کر لی۔ جون اور ستمبر میں مصالحت کی چند کوششیں ناکام رہیں اور دسمبر کو ولندیزیوں نے جمہوریہ انڈونیشیا کے اکثر علاقوں پر حملہ کر دیا۔ سوکارنو، حتا اور شہریر گرفتار کر لیے گئے۔ وزیر مالیات ظفر الدین نے نئی عارضی حکومت قائم کر لی اور ملکی دفاع کو تیز تر کر دیا۔

۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو سلامتی کونسل نے فریقین کو جنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ سلامتی کونسل کے اصرار پر ہالینڈ نے ۷ مئی ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی، جمہوریہ کی بحالی اور ہیگ میں گول میز کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں ایک بیان جاری کیا۔ ۶ جولائی کو انڈونیشی رہنما رہا ہوئے اور ۱۱ اگست کو جاوا اور ۱۵ اگست کو سماٹرا میں جنگ بند ہوگئی۔ ۲۳ اگست سے ۲ نومبر تک ہیگ میں

ہونے والی کانفرنس میں طے پایا کہ ۳۰ دسمبر سے قبل ہالینڈ، نیوگنی کے سوا تمام جزائر کا اقتدار جمہوریہ انڈونیشیا کو دے دے گا۔ یہ انتقال اقتدار ۲۷ دسمبر کو ہوا۔ ۱۶ دسمبر کو سوکارنو کو صدر منتخب کیا گیا۔ محمد حتا وزیرِ اعظم نامزد ہوئے۔ جکارتہ وفاقی دارالحکومت قرار پایا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۰ء کو سیاسی جماعت ماشومی کے ایما پر تمام ریاستیں ایک متحدہ مملکت کی تشکیل پر رضامند ہو گئیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء کو پارلیمان [illegible] آئین منظور ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ انڈونیشیا وجود میں آگئی۔ ۲۹ ستمبر کو [illegible] اقوام متحدہ میں رکنیت حاصل ہو گئی۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں پارلیمنٹ نے انتخابی قانون منظور کیا۔ جس کی رو سے ستمبر ۱۹۵۵ء میں انتخابات منعقد ہوئے۔ پارلیمنٹ کی ۲۷۲ نشستوں میں سے ماشومی نے ۵۷، قومی پارٹی نے ۵۷، نہضۃ العلماء نے ۴۵ اور اشتراکی پارٹی نے ۳۹ نشستیں حاصل کیں۔ چنانچہ ماشومی کو حزبِ اختلاف میں رکھتے ہوئے باقی جماعتوں کی ایک مخلوط وزارت قائم کر دی گئی۔ ۱۹۵۹ء میں صدر سوکارنو نے [illegible] اور ۱۹۶۰ء میں پارلیمنٹ توڑ دی۔ نیا دستور نافذ کیا گیا، جس میں [illegible] سوکارنو کو انقلاب کا عظیم قائد قرار دیا گیا اور ۱۹۶۳ء میں انہیں تاحیات صدر [illegible] ان کے تمام ساتھی ان سے الگ ہو گئے [illegible] نے بورنیو اور ملایا کے اشتراک سے ملائشیا کو جنم دیا۔ [illegible] اقوام متحدہ سے مستعفی ہو گیا۔ امریکہ نے [illegible] دوسری طرف روس نے امداد کے بہانے اشتراکی [illegible] ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اشتراکیوں نے حکومت پر قبضہ کرنے [illegible] حکومت کے گھاٹ اتار دیا۔ حکومت نے اس [illegible] اور ہزاروں اشتراکیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے ساتھ [illegible] سوکارنو کے اختیارات بھی سلب کر لئے۔

[illegible] ۱۹۶۶ء میں جنرل سوہارتو نے صدر مملکت مقرر ہوئے۔ قومی [illegible] اشتراکی پارٹی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ ۵ جولائی کو [illegible] صدارت اور ۲۵ جولائی کو وزارت عظمیٰ منسوخ کر دی گئی۔ [illegible] صدارت کا نظام عمل میں آیا۔ ۱۱ اگست کو ملائشیا کے ساتھ تعلقات [illegible] کر لئے گئے اور ۲۸ ستمبر کو انڈونیشیا دوبارہ اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ ۲۲ [illegible] ۱۹۶۷ء سے جنرل سوہارتو ملک کے باقاعدہ صدر بن گئے۔ مارچ ۱۹۶۸ء [illegible] مارچ ۱۹۷۳ء میں جنرل سوہارتو اسمبلی کے ذریعے صدر منتخب ہوئے انہوں نے [illegible] مارچ ۱۹۷۳ء کو نئی کابینہ تشکیل دی۔

اقتصادی معلومات: انڈونیشیا ۱۹ صوبوں پر منقسم ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:- شمالی سماٹرا، مغربی سماٹرا، ریو، جمبی، جنوبی سماٹرا، مغربی جاوا، وسطی جاوا، مشرقی جاوا، مغربی کالی منتان، جنوبی کالی منتان، مشرقی کالی منتان، وسطی کالی منتان، شمالی سلاویسی، بالی، مغربی نوساتنگارا، مشرقی نوساتنگارا، مالوکا، مغربی ایریان ان تمام علاقوں کی تعلیمی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں یہاں صرف چھ فیصد باشندے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور ۱۹۷۵ء میں صرف پرائمری سکول کے طلباء کی تعداد ڈیڑھ کروڑ ہو چکی تھی۔ جکارتا، بوگور، یوگ یکارتا، بیتنگی، بنجرماسین، امبون، میڈان، مکاسر، بینڈونگ، گاجہ میڈا سورابایا، جالانگ بالی، پاجاکمبوہ، پادانگ اور تونداٹو میں یونیورسٹیاں ہیں جہاں ایک لاکھ کے قریب طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بینڈونگ میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور یوگ یکارتا میں اسلامی یونیورسٹی قائم ہے۔

انڈونیشیا کا ایک گاؤں

انڈونیشیا کا سکہ روپیہ کہلاتا ہے، جو پاکستانی دو پیسوں کے برابر ہے۔ ۱۹۷۵ء میں یہاں چاول دو کروڑ میٹرک ٹن مکئی، تیس لاکھ ٹن اور کسارا ایک کروڑ ٹن پیدا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شکرقند، ناریل، کھجور، سنگترہ، گنا، چائے کافی، کوکو، گرم مسالے، ساگودانہ اور تمباکو یہاں کی اہم پیداوار ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ربڑ یہیں پیدا ہوتی ہے۔

انڈونیشیا کی معدنیات میں پٹرول، لوہا، نکل، تانبا، قلعی، مینگنیز، کوئلہ سونا، چاندی، ہیرے، چونا، فاسفیٹ اور باکسائیٹ اہم ہیں۔ مشرقِ بعید میں سب سے زیادہ پٹرول انڈونیشیا ہی میں نکلتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں یہاں ساڑھے تین کروڑ کیوبک میٹر پٹرول نکالا گیا، جس کا ساٹھ فیصد منافع حکومت کے پاس اور باقی اینگلو ڈچ اور امریکی کمپنیوں کے پاس ہوتا ہے۔

ملک بھر میں جہاز سازی، کپڑا بننے، ربڑ، ٹائر، ٹیوب، سیمنٹ، کاغذ دیاسلائی، شیشے اور بجلی کا سامان تیار کرنے کے کارخانے قائم ہیں۔ جن سے ملک کی دس فیصد آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

ملک بھر میں ریلوں، سڑکوں، بحری اور ہوائی راستوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بحری بیڑہ تین سو جہازوں پر مشتمل ہے، جو جکارتا، ایمسٹرڈیم، ہمبرگ اور لندن کے علاوہ اندرونِ ملک بھی چلتے ہیں۔

انڈونیشیا کی برآمدات میں ربڑ، چائے، کافی، تمباکو، ناریل، کھجور،

بالی قبیلے کا ایک لڑکا

پیٹرول، قلعی اور دیگر معدنی اشیاء شامل ہیں۔ جب کہ درآمدات میں مشینری کپڑا، کاغذ، چاول اور کیمیائی اشیاء سرفہرست ہیں۔ زیادہ تر تجارت جاپان امریکا، مغربی جرمنی اور فلپائن سے ہوتا ہے۔ ان ملکوں کی زیادہ تر مانگ ربڑ ہے، جو انڈونیشیا پوری کرتا ہے۔

انسان آدمی، ابن آدم، نسل انسانی سے تعلق رکھنے والا، اشرف المخلوقات اس کی تخلیق اسی عالم آب و گل سے ہوئی ہے۔ جس کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اور ہم نے انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سے، سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا تھا پیدا کیا اور جنوں کو ہم نے تیز آگ سے پیدا کیا اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی، سیاہ متغیر کیچڑ سے پیدا کرنے والا ہوں اور جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ کرنا اور سارے فرشتوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرے فرمایا! اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا!؟ اس نے کہا مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں ایک انسان کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے سوکھی ہوئی مٹی سے، جو متغیر ہو چکی ہے، پیدا کیا ہے، کہا! تو اس سے نکل جا کیونکہ تو مردود ہو گیا ہے اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔ اس نے کہا! میرے رب تو مجھے اس دن تک مہلت دے، جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔ کہا کہ تجھے مہلت ہے، ایک معلوم وقت تک۔ اس نے کہا، میرے رب جس طرح تو نے مجھے گمراہ ٹھیرایا! ہے (اسی طرح) میں انہیں زمین میں خوب صورت بن کر دکھاؤں گا اور ان سب کو ناکام رکھوں گا۔ سوائے تیرے خاص بندوں کے فرمایا، یہ سیدھا راستہ ہے میری طرف کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہو گا مگر وہ جاہلوں میں سے ہوں اور تیرے پیچھے جائیں، اور یقیناً ان سب کی جگہ دوزخ مقرر ہے اس کے سات دروازے ہیں ہر ایک دروازے کیلئے ان میں سے ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ متقی جنتوں اور چشموں میں ہیں گے ان میں سلامتی سے امن کیساتھ داخل ہو جاؤ اور جو ان کے دلوں میں کچھ کدورت ہو گی ہم اسے نکال دیں گے وہ بھائیوں کی طرح آمنے سامنے تختوں پر ہوں گے۔ انہیں ان میں کوئی تکلیف نہ ہو گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے میرے بندوں کو خبر دیدے کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں اور یہ کہ میرا عذاب دردناک ہے" (۱۵ : ۲۶ تا ۵۰)

انسان کی جسمانی پیدائش کے نکات بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر زیر بحث آئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:۔

"اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ جی اٹھنے میں شک ہے تو (غور کرو) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے، پھر لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے، جو پورا اور ادھورا بن جاتا ہے تاکہ تمہارے لیے کھول کر بیان کر دیں اور ہم جو چاہتے ہیں رحموں میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں کوئی ایسا ہے جو وفات [illegible] اور کوئی تم میں سے وہ ہے، جو نکمی عمر (بڑھاپے) کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد وہ بے علم ہو جائے...." (۲۲ : ۵)

"کیا انسان نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ لوتھڑا [illegible] پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کئے پھر اس سے مرد [illegible] (اور عورت) کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مرے ہوؤں کو پھر سے زندہ کر دے!" ([illegible] ۳۶ تا ۴۰)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دیگر تمام مخلوقات میں [illegible] تر ین مقام دیا ہے اور اسے اپنی [illegible] مخلوق قرار دیا ہے۔ جسے بہترین صورت و ہیئت [illegible] ہوا ہے: "یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا [illegible] خداوندی کی مطابق خدا کی اپنی فطرت ہے حدیث شریف [illegible] کو اپنی صورت پر بنایا۔ یہ صورت اللہ کی فطرت ہے [illegible]

اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا [illegible] نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے [illegible]

بخاری شریف میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا [illegible] ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں۔

ان مباحث سے انسان کی تخلیق [illegible] سب پڑتی ہے انسان نے کبھی کبھی بذات خود یہ کوشش [illegible] اس نے خود کو بالکل ہی بے بس اور مجبور مخلوق تصور [illegible] کبھی [illegible] بن بیٹھا۔ اسلام کے نزدیک ان دونوں انتہاؤں کے [illegible] بتایا گیا ہے کہ اس مختصر سے عرصۂ حیات میں انسان خود کو [illegible] پڑتا اور نہ ہی اس کے ساتھ ساتھ یہ فرمان خداوندی [illegible] میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔

"ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں [illegible] چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کیں [illegible] کی فضیلت عطا کی ہے۔" ([illegible])

انسان اس دنیا میں خدا کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس کائنات [illegible] کا حقدار ہے۔ اس فرض نیابت کو ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان [illegible] اور کسی کے آگے نہ جھکے دنیا کی اشیاء کو خدا کے احکام کی حدود میں رہتے ہوئے [illegible] انہیں امانت سمجھے۔ اپنے اعمال خدا کے قانون کے مطابق انجام دے اور قیامت کے روز جوابدہی کو پیش نظر رکھے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کسی خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے گویا اس کا کوئی اپنا نصب العین ہے، جس کے لئے اسے زندگی بسر کرنا ہے

انسان پرستی انسان کی پوجا کرنا، انسان کو خالق اور رازق سمجھنا، انسان کے آگے سر جھکانا۔ زمانۂ قدیم میں مردہ انسانوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ روح کے بارے میں قدیم انسان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اور جب چاہے جسم میں واپس آسکتی ہے۔ مردوں سے خوف محسوس ہونے لگا کہ نہ جانے یہ کب زندہ ہو کر واپس آجائیں اس لیے وہ ان کی ضروریات مادی ان کی قبروں میں رکھ دیتے تھے بلکہ اگر کوئی سردار یا بزرگ مر جاتا تو اس کی بیوی اور غلاموں کو بھی قتل کر کے اس کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ مردوں سے ڈرنا اور دنیاوی مصائب کو ان کی طرف منسوب کرنا شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مردوں کو فوق الفطری قوت تسلیم کیا جانے لگا۔

قدیم انسان کو بہت جلد اپنے فانی ہونے کا احساس ہو گیا۔ خوف نفسی نے اسے زندہ انسان کے احترام اور پرستش کی طرف مائل کیا۔ خصوصاً طاقتوروں اور سرداروں کو فوق الفطری قوتوں کا مالک سمجھا جانے لگا۔ یہ احترام اس قدر بڑھا کہ ان کی طرف دیکھنا، ان کی نشست پر بیٹھنا بے ادبی اور جرم قرار دیا گیا۔ سرداروں کے ساتھ ساتھ پروہتوں، کاہنوں اور جادوگروں کی پرستش کا رواج بھی عام ہونے لگا۔

[illegible]

انسان پرستی کا باقاعدہ آغاز مصر سے ہوا۔ ان کے ہاں دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ مردہ پرستی بھی رائج تھی۔ یہ مردہ پرستی آگے چل کر انسان پرستی میں تبدیل ہو گئی۔ مصر کے بادشاہ خود کو سورج دیوتا کا مظہر سمجھتے۔ بادشاہ کے جسم کو دیوتا کا جسم قرار دیا جاتا تھا جو وفات کے بعد اوسیرس بن جاتا۔ قدیم مصر کی تحریروں سے ایسے خطابات کا پتہ چلتا ہے، جن میں بادشاہ کو خدا بلکہ اس سے اعلیٰ مرتبے کا حامل قرار دیا جاتا تھا۔ دیوتاؤں کے تعاقب میں سب سے زیادہ قوی اور مقدس بادشاہ کی ذات تھی۔ مصری حکمرانوں میں فراعنہ خاندان کے اکثر بادشاہوں نے یہ القاب استعمال کر رکھے تھے۔ چند ایک فرعونوں کو چھوڑ کر دیگر تمام فراعنہ خدا بنے بیٹھے تھے۔ یہی حال بابل کے بادشاہوں کا تھا۔ ان میں سے نمرود کا ذکر اکثر صحائف میں آیا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ دیوتا انسانی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ وشنو، نرسنگھ، کرشن، رام وغیرہ جیسے اوتار بھگوان ہی کا روپ قرار دیے گئے۔ نیز یہ بھی سمجھا گیا کہ بھگوان کسی بھی روپ اور کسی بھی ذات میں پیدا ہو سکتا ہے اور اسے دنیوی خواہشات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی بنا پر جوگیوں، سنیاسیوں اور ملنگوں کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ یہی چیز آگے چل کر مسلمانوں میں در آئی اور بھنگیوں، ملنگوں اور مست و مجذوب لوگوں کے آگے سر جھکایا جانے لگا۔

مصر کے بعد شاہ پرستی سب سے زیادہ یونان اور پھر جاپان میں رہی۔ قدیم یونانیوں میں ہر سال بادشاہ کی سالگرہ بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ مرنے کے بعد بھی اس کی پوجا برقرار رہتی بلکہ اسے دیوتاؤں میں شامل کر لیا جاتا۔ ہومر کی کتابوں میں ایسے دیوتاؤں کا تذکرہ ملتا ہے جو انسان تھے اور اس کے باوجود غیر فانی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے متعلق یہ عقیدہ عام تھا کہ وہ قادر مطلق ہیں اور جب چاہیں خود کو دنیا میں ظاہر کر دیں۔ قدیم یونان کے اس عقیدہ پر یونانی فلسفے نے کاری ضرب لگائی۔ تالیس، فیثاغورث، ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں کے افکار نے دیوتاؤں کو نظام کائنات سے بے دخل کر دیا۔ انسان کو مجبور محض قرار دے دیا گیا اور دیوتاؤں کے غیر فانی ہونے کے عقیدے کی جگہ عناصر اربعہ کی بقا نے لے لی۔

یونانیوں سے انسان پرستی اور شاہ پرستی کا عقیدہ رومیوں نے لیا۔ ان کے سلاطین مسجود خلائق بن گئے۔ سکندر اعظم کے باپ فلپ مقدونی کی پرستش اس کی زندگی ہی میں ہونے لگی تھی۔ اس نے شاہ پرستی کو باقاعدہ قانونی شکل دے دی۔ آگسٹس کے مرتے ہی سینٹ نے فیصلہ صادر کر دیا کہ اسے خداؤں کے زمرے میں شامل کر لیا جائے۔ بادشاہ کی پرستش سے انکار کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔ آگے چل کر ان بادشاہوں کے باقاعدہ مجسمے تیار ہوتے۔

رومیوں کی طرح یورپ کی اکثر اقوام بھی انسان پرستی کی قائل تھیں۔ خصوصاً ٹیوٹانی لوگ دیوتاؤں کے بار بار انسانی روپ میں پیدا ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ بادشاہوں کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ ان کا زبردست احترام کیا جاتا تھا۔ ان کے عتاب سے بچنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جاتے۔ قربانیاں پیش کی جاتیں، نذرانے چڑھائے جاتے۔

مشرق بعید میں انسان پرستی کی سب سے بڑی مثال بدھ مت کے پیروکاروں اور جاپانیوں کے ہاں ملتی ہے۔ بدھ مت کے پیروکاروں نے مہاتما بدھ کو خدا ہی کا مظہر قرار دے رکھا ہے۔ اور اس کے مجسموں کی پرستش کرتے ہیں۔ جاپانیوں کے ہاں بادشاہ کی پوجا اب تک رائج ہے۔ وہاں بادشاہ کو امَاتِرسو دیوی کی اولاد قرار دیا گیا اور یوں وہاں سب سے پہلے جس بادشاہ کی پوجا شروع ہوئی اس کا نام جیمو ٹینو تھا۔ شاہی محل قومی مذہب کا مرکز بن گیا اور بادشاہ کو "آسمان کا بیٹا" قرار دے کر اختیارات اس کے ہاتھ میں دے دیے گئے۔ تاریخ میں اس سے بڑی مثال اور نہیں مل سکتی کہ آج سے اڑھائی ہزار سال پیشتر جس خاندان نے اپنا شجرہ نسب دیوتاؤں سے ملایا تھا، آج تک وہی خاندان وہاں اسی طمطراق کے ساتھ حکمران ہے۔

انسانِ کامل مکمل انسان۔ تصوف کی ایک اصطلاح جو انسانیت کے اعلیٰ ترین نمونے کے لیے استعمال ہوتی ہے "وہ انسان جس نے ذات باری سے اپنی بنیادی وحدت کا احساس پورے طور پر کر لیا ہو، وہ انسان جو بعض اسمائے

الٰہیہ سے متصف ہو۔" ابن عربی نے غالباً سب سے پہلے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ عبدالکریم بن ابراہیم الجیلی کی ایک مشہور تصنیف کا نام "الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر والاوائل" ہے۔ انہوں نے اس نظریے کو بڑے اچھے اور باضابطہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک "ذات وہ ہے جس کی طرف اسماء و صفات منسوب کئے جاتے ہیں۔ گویا ذات اور صفاتِ ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ موجود ہوں اور عین ممکن ہے وہ موجود نہ ہوں۔ موجود یا تو وجود محض (خدا) ہے یا وہ جس میں ممکن الوجود بھی شامل ہو (مخلوق اشیاء)، وجود مطلق یا وجود محض اصل میں صفتِ ذات بلا انکشاف اسماء و صفات و مورزم سے عبارت ہے اور عمل انکشاف کا مطلب بساطت کے درجے سے نیچے اترنے کا عمل ہے ــــــ

آخری درجہ تجلی ذات کا ہے جس سے انسان کامل میں الوہیت کے انداز پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس درجہ میں پہنچ کر وہ کائنات کا قطب اور اسے قائم و برقرار رکھنے کا وسیلہ بن جاتا ہے اور اس طرح خدائی اور انسانی دونوں صفتوں سے متصف ہو کر وہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان ایک رابطہ بن جاتا ہے۔ اس کا قلب اللہ تعالیٰ کے عرش کا اس کی عقل اللہ تعالیٰ کے قلم (کلام) کی اس کا نفس لوح محفوظ اور فطرت عناصر کا مرادف بن جاتا ہے۔ اور وہ الحق ہو جاتا ہے۔" اسی چیز کو علامہ اقبال نے بھی پیش کیا ہے۔ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

یہی بات قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور نہیں پھینکا تو نے بلکہ اللہ نے پھینکا۔" (۸: ۱۷) آنحضورؐ تمام انسانوں میں اکمل ترین انسان ہیں۔ گویا انسانِ کامل آنحضورؐ کا خطاب ہے

انسؓ بن مالک (۱۰ قبل ہجری ــ ۹۳ھ) ماں کا نام امِ سلیم ہے۔ کنیت ابوحمزہ قبیلہ خزرج سے تھے، صحابی خادمِ رسولؐ۔ امام۔ مفتی قاری و معلمِ قرآن۔ محدث۔ نامور راوی۔ ان کے والد مالک نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ والدہ اسلام لائیں ہجرت کے بعد انہیں آنحضورؐ کی خدمت میں لے کر آ گئیں اور خادم کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ انسؓ آنحضورؐ کی وفات تک آپؐ کی خدمت گذاری میں رہے۔ آنحضورؐ نے ان کی والدہ کے کہنے پر ان کے لیے دعا کی جو قبول ہوئی اور انہوں نے ایک لمبی عمر پائی۔ ان کی اولاد تقریباً ایک سو کے قریب ہے بعض کے نزدیک اسی ہے جن میں سے ۷۸ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ مشہور بصری محدث ابوعمیر عبدالکریم بن محمد بن عبداللہ بن حفص بن ہشام انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے لیکن کم سنی کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہ لیا۔ آٹھ جنگوں میں شرکت کی۔ بصرہ میں ۱۰۳ سال کی عمر میں صحابہ کرام میں سب سے آخر میں وفات پائی۔

حضرت انسؓ نے آنحضورؐ اور کبار صحابہ سے کثرت سے احادیث روایت کی ہیں قریباً سو راویوں نے ان سے روایت کی ہے۔ ان سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد ۲۲۸۶ ہے۔

انسؓ بن نضر صحابی۔ حضرت انسؓ بن مالک کے چچا اور مدینہ کے خاندان بنجار کے رئیس تھے۔ غزوۂ احد میں جب آنحضورؐ تنہا میدان میں رہ گئے اور تمام جاں نثاروں کے قدم اکھڑ گئے تو آنحضورؐ کو بچانے کے لئے آگے بڑھے تقریباً پورے جسم پر ۸۰ زخم کھائے۔ کفار نے ان کی لاش کو بری طرح مسخ کیا۔ ان کی بہن ربیعہ بنت نضر نے ان کو انگلی سے پہچانا۔

انشاء اللہ "اگر اللہ نے چاہا" یہ الفاظ خواہش یا امید کے موقع پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ان الفاظ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ زمانہ مستقبل کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں تو اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے بارے میں قرآن مجید میں اس طرح سے آیا ہے "کسی کام کی نسبت ہرگز نہ کہنا کہ میں اسے کل کر دوں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے [illegible]" اسی طرح قرآن مجید میں یہ الفاظ مختلف مواقع پر آئے ہیں "اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔" (۱۸: ۶۹) (۱۲: ۹۹) (۴۸: ۲۷) [illegible]

انصار مددگار۔ اصطلاح میں وہ لوگ جو دین کی مدد کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو جیسے عیسیٰؑ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کون اللہ کے راستے میں میرے مددگار ہیں۔" (۶۱: ۱۴) پھر ارشاد ہے:۔

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا۔ جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی [illegible] سب آپس میں رفیق ہیں۔" (۸: ۷۲)

یہ یثرب (مدینۃ النبی) کے اوس و خزرج قبائل کا اسلامی نام تھا [illegible] کی تشکیل کے بعد انصار ہی کو یہ فضیلت نصیب ہوئی کہ آنحضورؐ نے ان کی دعوت پر مدینہ ہجرت فرمائی۔ انہوں نے دین کی مدد کی اللہ اور اس کے رسولؐ کے [illegible] نے مہاجرین کو پناہ دی اور نصرت دین میں مال و جان سے [illegible] اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

اوس و خزرج نامی دو قبیلے صدیوں سے یثرب میں آباد تھے [illegible] میں عام رائے یہ ہے کہ بنو غسان کی طرح وہ بھی دراصل [illegible] بنو کہلان کی ایک شاخ ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ بھی [illegible] کی اولاد ہیں اور جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے کہ بنو غسان کی طرح [illegible] تھے اور یثرب میں آباد ہو گئے تھے۔ اوس و خزرج [illegible]

اوس خزرج قبیلے بھی [illegible] رہتے تھے اور ان میں بھی کبھی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں [illegible] دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے [illegible] کہ جیسا موقع ہوتا قبائل ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے [illegible] خزرج کے مقابلہ میں کمزور ہو گیا تو انہوں نے [illegible] کی اور چند سرداروں کو قریش کی خدمت میں بھیجا آنحضورؐ [illegible] پاس تشریف لے گئے اور انہیں اسلام کی دعوت دی [illegible] یہ کام اس سے بہتر ہے جو تم انجام دینے آئے ہیں چنانچہ [illegible] خزرج کے چھ افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ انصار کے [illegible]

۱۳ نبوی کو بہتر افراد پر مشتمل ایک گروہ جس میں دو عورتیں بھی [illegible] ہیں اوس خزرج دونوں قبائل کے افراد شامل تھے بیعت کے لیے آئے حضرت عباسؓ نے ان سے کہا کہ آنحضورؐ تمہارے پاس آنا چاہتے ہیں اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی جواب دے دو [illegible]

نے کہا کہ ہم لوگ تلواروں کی گود میں جوان ہوئے ہیں۔ ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ابوالہیثم نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ ایسا تو نہ ہوگا کہ آپؐ کو قوت و اقتدار حاصل ہو تو آپ ہمیں چھوڑ کر پھر مکہ واپس آجائیں۔ آنحضور نے فرمایا نہیں میرا اور تمہارا حزن ایک ہو چکا ہے تم مجھ سے ہو اور میں تم سے۔

آنحضور نے مکہ سے ہجرت کر کے یثرب میں قدم رکھا تو ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ آپ اس کے ہاں ٹھہریں۔ بالآخر مہمان نوازی کا یہ شرف حضرت ابوایوب انصاری کو [illegible] ہوا۔ پھر آپ نے انصار اور مہاجرین میں مواخات کا رشتہ قائم کیا اور دونوں کو اس طرح یکجا کر دیا جیسے وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ مسجد نبوی کی تعمیر سے فارغ ہو کر آنحضور نے انصار کو طلب فرمایا اور مہاجرین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا [illegible] یہ تمہارے بھائی ہیں۔

[illegible] غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو مہاجرین کی طرح انصار نے بھی ہر [illegible] میں جان و مال سے حصہ لیا۔ انہوں نے بغیر کسی غرض اور ذاتی منفعت کے ہر نازک مرحلے پر آنحضور کا ساتھ دیا۔ غزوہ بدر میں آنحضور نے مہاجرین اور انصار سے مطالبہ فرمایا اور رائے طلب کی تو انصار خاموش رہے آپ کے [illegible] سمجھے تھے کہ آنحضور مہاجرین سے مخاطب ہیں کیونکہ [illegible] کا عہد کر چکے تھے اور ہم تو ہر طرح [illegible]

[illegible] مقام پر آنحضور نے قیام فرمایا [illegible] تقسیم کیا تو انصار میں بعض [illegible] کے مقابلے میں [illegible] کا حصہ کم رکھا ہے۔ [illegible] کہ آنحضور ان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں [illegible] فرمایا اور آخر میں فرمایا کہ "اے [illegible] لوگوں کے حصہ میں آئے لیکن [illegible] اس فرمان پر انصار بے اختیار [illegible] آنحضور کے ساتھ مدینہ جا رہے ہیں [illegible] نصرت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور اس راہ کی بڑی سے بڑی [illegible] اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں [illegible] ہے۔

[illegible] سے محبت ہے۔ مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے [illegible] وہ [illegible] نہیں ہوتے اگرچہ انہیں خود فاقہ برداشت کرنا پڑے جس نے اپنے نفس کو [illegible] سے محفوظ رکھا وہ فلاح پانے والوں میں سے ہے (۵۹ : ۹)۔
آنحضور نے [illegible] سے قبل مہاجرین کو بالخصوص وصیت فرمائی [illegible] انصار سے [illegible] کریں۔ آپ نے فرمایا [illegible] مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی لیکن انصار کم ہوتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے مجھے پناہ دی [illegible] سے [illegible] خطاؤں سے درگذر کرو۔" آنحضور نے ایک اور ارشاد میں فرمایا ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص انصار سے بغض نہیں رکھ سکتا۔

انطاکیہ جنوب [illegible] ترکی کا ایک شہر دریائے عاصی کے کنارے بحیرۂ روم کے ساحل سے چودہ میل دور واقع ہے۔ اس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب ہے۔ [illegible] سلیوکس اول نے اس کی بنیاد رکھی تھی [illegible]

قبل مسیح میں پومپی کے اس شہر پر قابض ہونے کے بعد سے ایشیا میں رومیوں کا سب سے اہم شہر اور سلطنت روما کی ایشیائی ولایات کا صدر مقام بن گیا۔ اس شہر کے انحطاط کی تاریخ ایران میں ساسانیوں کی سلطنت کے قیام سے شروع ہوتی ہے۔ جس نے دجلہ اور فرات کی وادی میں انطاکیہ کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت کو بہت گھٹا دیا تھا اور ایران کے پے درپے حملوں کا تختۂ مشق بنا دیا۔ شاہ پور اول نے اسے پہلے ۲۵۸ء میں اور پھر ۲۶۰ء میں فتح کیا اور یہاں کے بہت سے بسنے والوں کو ولایت سوسیانہ کے شہر جندی شاہ میں لے گیا۔ ۲۶۶ء سے ۲۷۲ء تک اس پر تدمر کی ملکہ زنوبیہ کا قبضہ رہا لیکن باوجود مسلسل داخلی جھگڑوں اور تباہ کن زلزلوں کے جو اس علاقے میں عموماً آتے رہتے اس شہر کی زیب و زینت قائم رہی۔ آخر کار ۵۴۰ء میں خسرو اول (نوشیروان) نے اس کا محاصرہ کیا اور بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال کر دوبارہ ایرانی سلطنت میں منتقل کر دیا۔

قیصر روم جسٹینین نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا مگر ایرانی لشکروں نے اسے ۶۰۲ء اور ۶۱۱ء میں پھر تاراج کیا اور بالآخر ۱۶ھ/ ۶۳۷ - ۶۳۸ء میں عربوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ خلفائے اسلام کے ابتدائی دور میں اس کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ تاہم یہ شہر عربوں کے سرحدی فوجی نظام العواصم کا صدر مقام اور ایک علمی خطہ بنا رہا۔ ۲۶۵ھ/ ۸۷۸ء میں احمد بن طولون نے شمالی شام کے ساتھ اس شہر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور یہ ۲۸۵ھ/ ۸۹۸ء تک اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہا۔ پھر ۳۳۳ھ/ ۹۴۴ء میں سیف الدولہ آل حمدان کے قبضے میں آگیا۔ ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء میں بزنطینی سالار نے اسے فتح کر لیا اور ۴۷۷ھ/ ۱۰۸۴ء تک اس پر بزنطینی قبضہ رہا۔ [illegible] اس کے بعد یہ سلجوقی سلطان سلیمان بن قتلمش کے زیر نگیں آگیا۔ اس [illegible] سلیمان کو اس کے ایک رشتہ دار نے ایک جنگ میں شکست دے کر مار ڈالا تو سلجوقی سلطان ملک شاہ کو مداخلت کرنا پڑی اور اس نے انطاکیہ کو اپنے ایک ترک امیر کے جس کا نام یاغی سیان تھا دے دیا۔ ۴۹۱ھ/ ۱۰۹۸ء میں صلیبیوں نے یہ شہر اسی امیر سے چھینا تھا اور نارمن خاندان جو بوہیمان کی اولاد میں سے تھا یہاں حکومت کرنے لگا یہاں تک کہ ۶۶۶ھ/ ۱۲۶۸ء میں مملوک سلطان بیبرس بندق داری نے دوبارہ فتح کر کے تباہ و برباد کرا دیا۔ اس کے بعد انطاکیہ حلب کی مملوک نیابت میں رہا اور ۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی افواج نے اس پر قبضہ کر کے شام کے انتداب میں شامل کر لیا۔ ۱۹۲۸ء میں اسکندرونہ کی سنجاق کے لیے الگ حکومتی نظام قائم کیا گیا تو انطاکیہ اس کا صدر مقام بنا۔ لیکن فرانس نے یہ سنجاق ۲۳ جون ۱۹۳۹ء میں جمہوریہ ترکی کے حوالے کر دی۔ انطاکیہ میں حبیب النجار کی ایک درگاہ کے سوا مسلمانوں کی اور کوئی اہم یادگار باقی نہیں ہے۔

جدید انطاکیہ کا اہم حصہ دریائے عاصی (اورونٹس) کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ جدید ترین علاقے مغربی کنارے پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ قدیم شہر کی گلیاں زیادہ تر تنگ ہیں۔ جدید شہر کی سڑکوں کا نظام بھی مناسب نہیں۔ عمارات زیادہ تر ایرانی طرز کی ہیں۔ ایک عجائب گھر بھی ہے، جہاں مسلمانوں کے اکثر باقیات جمع ہیں۔ شہر کی معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے، جو ملحقہ میدانوں میں ہوتی ہے۔ اہم پیداوار گندم، کپاس، انگور، چاول، سبزیاں اور پھل ہیں۔ صنعتوں میں صابن سازی اور روئی بیلنے کے کارخانے اہم ہیں۔

انطاکیہ بحیرۂ روم کے ساحل اناطولیا خلیج کے شمال مغربی گوشے میں واقع

ایک شہر جس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں تین چوتھائی مسلمان ہیں۔ قدیم کتابوں میں آتالیہ اور نئی یورپی زبانوں میں ادالیہ کے نام سے درج ہے۔ برگمہ کے حاکم آتالوس ثانی کو اس شہر کا پہلا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا محل وقوع ایک ایسی خلیج کے سرے پر ہے جو خشکی میں دور تک اندر چلی گئی ہے۔ لہٰذا یہ بحیرہ روم سے اناطولیا کے اندر جانے کے لیے بہت موزوں ہے۔ جنوبی اناطولیا کے پہاڑ جو عام طور پر ساحل سے بہت قریب اور متوازی چلے جاتے ہیں یہاں سیدھے اندر کی طرف رخ کر لیتے ہیں اور یوں ان کے درمیان خلیج کے سرے پر ایک وسیع سرسبز میدان نکل آتا ہے۔ یہ میدان دور تک پھیل گیا ہے۔ سمندر کے کنارے بیس تیس میٹر بلند پہاڑیاں ہیں ان پہاڑیوں کے درمیان ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ جس کے اندر از منہ وسطیٰ کے جہازوں کا اچھا خاصا بیڑا سما سکتا ہے۔ چونکہ اس کے آس پاس کے دوسرے قصبوں میں ایسے سازگار حالات موجود نہ تھے۔ اس لیے یہ شہر دوسرے قصبوں اور شہروں سے بہت جلد ترقی کر کے بازی لے گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سلطنت روما نے خاندان اتالوس کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح یہ سمندری قزاقوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۷۹ء قبل مسیح میں سرویلیوس نے ان ڈاکوؤں کا خاتمہ کر کے رومائی حکومت کا عملاً آغاز کیا۔ بزنطینی زمانہ میں اس شہر نے بے حد ترقی کی اور بحیرہ روم کی بندرگاہ بن گیا۔ مسلمانوں نے ابتدائی دور میں اسے اپنے بحری حملوں کی آماجگاہ بنائے رکھا اور بالآخر ۲۴۶ھ/۸۶۰ء میں المتوکل کے امیر البحر فضل بن قارن نے جو ترکی النسل تھا سمندر کی طرف سے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ گیارہویں صدی میں جب ترکوں نے سارے کا سارا اناطولیا فتح کر لیا تو شہر انطالیہ پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۱۰۳ء میں شہنشاہ کومنن کی فوجوں نے اسے دوبارہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ کچھ عرصہ بعد ترکوں نے پھر اس پر قبضہ جما لیا۔ ۱۱۲۰ء میں شہنشاہ نے پھر سے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۱۸۱ء میں سلطان قلیج ارسلان ثانی نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن فتح نہ کر سکا۔ ۶۰۳ھ/۱۲۰۷ء میں سلطان غیاث الدین کیخسرو اوّل نے اس پر قبضہ کیا اور قبرص کا ولی جو فرنگیوں کی ایک جمعیت لیے ساتھ آیا تھا، ناکام ہو گیا۔ لیکن ۱۲۱۵ء میں اس نے قبرص سے آ کر انطالیہ پر قبضہ کر لیا اور ترکوں کو تہ تیغ کر دیا۔ لیکن اناطولیا کے سلطان عزالدین کیکاؤس اوّل نے دوبارہ انطالیہ پر فتح حاصل کر کے تمام فرنگیوں کو نیست و نابود کر دیا اس کے بعد ترکوں نے اس شہر کی مرمت کی۔ بندرگاہ کی پرانی گودی اور پشتوں کو دوبارہ بنایا۔ ساتھ ہی جہاز سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا۔ انطالیہ اناطولیا کے سلجوقیوں کے اس بیڑے کا مرکز بن گیا جو بحیرہ روم میں متعین تھا۔ یہاں کے ترک حاکموں کا لقب امیر السواحل یا ملک السواحل ہوتا تھا۔

جب سلجوقی حکمرانوں کا زوال ہوا تو یہ علاقہ حمید اوغلو خاندان کے ہاتھ آیا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں الیاس بے کے بیٹے دندار بے نے انطالیہ پر قبضہ کر لیا اور ۱۳۶۱ء تک انہیں کی حکومت رہی حتیٰ کہ ۱۳۶۱ء میں قبرص کے بادشاہ پیئر نے انطالیہ پر اپنا اقتدار جما لیا۔ اور حمید اوغلو شکست کھا کر شمال کی طرف پسپا ہو گئے ۱۳۷۳ء میں محمد بے نے پھر انطالیہ پر قبضہ کر لیا۔

اولیا چلبی نے جو ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء میں اس شہر میں آیا تھا، انطالیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ شہر کے گرد ۴۰۰۰ قدم لمبی ایک فصیل تھی۔ اور فصیل میں اسّی برج تھے۔ شہر کے اندر تین ہزار سے زائد مکان تھے۔ فصیل کے باہر شمال کی طرف بیس ترکی اور چار یونانی محلّے تھے۔ شہر کے تین اطراف میں باغات تھے۔ بندرگاہ کم از کم دو سو جہازوں کے لیے ایک مکمل اور محفوظ جائے پناہ تھی۔ گیارہ بڑی مسجدیں، سات بڑے مدرسے، بہت سی خانقاہیں اور سرائیں تھیں سلجوقی زمانہ میں اس شہر کو جو اہمیت حاصل تھی وہ اس کے پرانے کھنڈرات سے معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر بعد کے زمانہ میں بالکل ہی کھنڈر ہو چکے ہیں۔

موجودہ انطالیہ سمندر سے سیدھی بلند ہوتی ہوئی چٹانوں کے درمیان ایک ہموار میدان میں واقع ہے۔ اگر سمندر سے دیکھا جائے تو قطار در قطار سرخ ٹائلوں کے سفید مکان اور ان کے گرد ہرے بھرے باغیچے اور پس منظر میں جو پہاڑ واقع ہیں بہت خوش نما نظارہ پیش کرتے ہیں۔ ساحلی چٹانوں کے اوپر سے سمندر میں گرتے ہوئے آبشار اس منظر کو اور بھی دوبالا کر دیتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا میں بحیرہ روم کی امتیازی خصوصیات نمایاں ہیں۔ یہ میدان تین اطراف سے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ موسم گرما میں بہت گرم ہوتا ہے۔ اس لیے آبادی کا بہت بڑا حصہ موسم گرما گذارنے کے لیے آس پاس کی پہاڑی چراگاہوں اور گرد و پیش کے باغوں میں چلا جاتا ہے اس موسم میں یہاں بارش نہیں ہوتی۔ موسم سرما خوشگوار اور معتدل ہوتا ہے۔

اب تک اس شہر کا بیرونی دنیا کے ساتھ رابطہ زیادہ تر سمندر کے راستے ہی سے ہے۔ بڑے بڑے جہاز پرانی بندرگاہ کے ساتھ باآسانی لنگر انداز ہو سکتے ہیں استنبول کے ساتھ ڈاک کے دخانی جہازوں کی آمد و رفت باقاعدہ قائم ہے۔ غیر ملکی جہازوں کے ذریعے انطالیہ کا زیادہ تر رابطہ اٹلی، مصر اور شام کی بندرگاہوں سے قائم ہے۔

اِنفَاق

کسی چیز کو ہاتھ سے نکال دینا۔ اصطلاح میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنا۔ اسلام میں اس کی بہت اہمیت ہے نماز کے ساتھ اس کا حکم دیا گیا ہے اور مومن کی نشانی بتائی گئی ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے تاہم انفاق کو اللہ تعالیٰ نے قرض حسنہ سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ کون ہے جو اللہ کو قرض دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔ (۲: ۲۴۵)

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ تم جو اپنے مال خرچ کرتے ہو اس سے تمہاری دولت میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز بتایا گیا کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (۲: ۲۱۹) اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا ضائع نہیں ہو گا بلکہ آخرت میں تمہارے لیے ذریعہ نجات بنے گا۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا کرتا ہے (۲: ۲۶۱) گویا اللہ کے ہاں ایک کے بجائے سات سو گنا زیادہ ملے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ نہ کرنے والوں کے بارے میں قرآن مجید میں بڑی سخت وعید سنائی گئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "دردناک سزا کی وعید دے دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔ (۹: ۳۴-۳۵)

انفاق کرنے کو اللہ کے تقرب کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: "اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول کی طرف سے دعائیں لینے

کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔" (۹: ۹۹)

انفاق فی سبیل اللہ کا مصرف کیا کیا جائے۔؟

"والدین پر، رشتے داروں پر یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے" (۲: ۲۱۵)

ایک روایت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ مگر تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔" (۲: ۲۷۳)

انقرہ انگورہ یا انگولا، جمہوریہ ترکی کا دارالحکومت اور اسی نام کا صوبہ۔ شہر انقرہ بحیرۂ اسود سے ۱۲۵ میل کے فاصلے پر سطح سمندر سے ۴۰۰۰ فٹ بلند اور دو دریاؤں کے ملاپ سے ... فٹ بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں اتاترک نے اسے صدر مقام کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں اس کی کل آبادی آٹھ لاکھ کے قریب تھی اور ... کی کل آبادی ... لاکھ کے قریب تھی۔ ان میں ستانوے فیصد مسلمان ہیں۔

انقرہ ... قدیم اور جدید میں منقسم ہے۔ قدیم شہر پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر شدہ ہے ... جس کی اکثر خستہ حال عمارات رفتہ رفتہ جدید عمارات میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ تاہم ابھی تک بہت سی قدیم عمارات باقی ہیں۔ ... انقرہ، رومی عمارات، حمام اور دیوان خانے، بازنطینی ستون۔ ... ان عمارات کے قریب انقرہ کا قومی عجائب گھر (۱۹۵۱ء) ہے ... کے پاس ہی مسجد علاؤالدین ہے۔

اتاترک کا مجسمہ

جدید شہر میں سب سے زیادہ قابل دید شے اتاترک کا مجسمہ ہے۔ پہاڑی کے مغرب ہی میں اتاترک کا مزار بھی ہے، جو ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوا تھا۔ یہ شہر کے ہر حصے سے نظر آتا ہے۔ جدید شہر میں سرکاری دفاتر اور رہائشی کالونیوں کے علاوہ یونیورسٹی (قائم شدہ ۱۹۴۶ء)، قومی لائبریری، قومی تھیٹر، سٹیڈیم، ریڈیو سٹیشن، کالج اور سکول ہیں، انقرہ شہر ریل اور سڑک کے ذریعے استنبول اور ازمیر جیسے بڑے بڑے شہروں سے ملا ہوا ہے۔ شہر سے سولہ میل کے فاصلے پر ہوائی اڈا ہے۔ جہاں سے بین الاقوامی پروازیں چلتی ہیں۔

تاریخ: انقرہ کی بستی زمانہ قبل از تاریخ سے موجود ہے۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں حجری دور کے آثار ملے ہیں۔ دیگر کئی آثار سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے یہاں حتی ... قائم ہوئی۔ ... یہ اس کا صدر مقام تھا۔ اس وقت اس کا نام انکلا تھا۔ تقریباً آخری صدی قبل مسیح میں یہاں فریجی قوم آباد تھی۔ ۳۳۴ ق م میں جب سکندر اعظم اپنی مہمات پر نکلا تو یہاں سے بھی گزرا۔ اس کی وفات کے بعد سے نصف صدی تک اس پر سلوکیوں کا قبضہ رہا۔ ان کے بعد غلاطی تیسری صدی قبل مسیح میں جزیرہ نمائے بلقان سے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں رومی انقرہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے غلاطیہ سمیت انقرہ کو روم کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ رومیوں کے عہد میں یہاں بہت سے معبد ایک ہپوڈروم (رأت میدان) حمام اور شہنشاہوں کے لیے محل تعمیر کرائے گئے اور اس کو اہم فوجی مرکز بنایا گیا۔ رومی دور میں انقرہ اناطولیہ کے متمدن ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔

۳۳۴ء سے ۱۰۷۳ء تک تقریباً سات سو سال سے زائد عرصہ انقرہ مشرقی رومی سلطنت کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس دوران میں یہ شہر نئی نئی عمارات سے مزین ہوا اور خاص طور پر ساتویں صدی عیسوی سے جب کہ انقرہ کو عربوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی از سر نو تعمیر جاری رہی۔ اس پر ساتویں صدی میں پہلا حملہ ایران کے شاپور اور بعد ازاں خسرو پرویز نے کیا ——— عربوں نے ۶۵۴ء میں انقرہ کو فتح کر لیا تھا لیکن وہاں قیام نہ کیا یہاں تک کہ ۸۰۹ء میں ہارون رشید ... نے انقرہ پر از سر نو قبضہ کیا۔ ۸۳۹ء میں معتصم اس پر قابض ہوا۔ ۱۰۷۱ء میں سلطان الپ ارسلان نے اسے ترکی کی سلطنت میں شامل کر لیا اور آہستہ آہستہ اس کے تمام علاقوں پر سلطنت ترکی کا تصرف ہو گیا۔ ۱۱۲۷ء میں یہ امیر غازی کے قبضہ میں آیا اور اس کے بیٹے محمد غازی کی وفات کے بعد انقرہ پر قونیہ کے سلجوقی حاکم مسعود اوّل کا قبضہ ہو گیا۔ مدت دراز تک حکومت کرنے کے بعد جب قلیچ ارسلان ثانی کی سلطنت کو اس کے گیارہ بیٹوں میں تقسیم کیا گیا تو انقرہ محی الدین مسعود کے حصہ میں آیا۔

۱۲۱۰ء میں عزالدین کیکاؤس انقرہ پر حکومت کرتا رہا اور ۱۲۱۹ء میں علاؤالدین کیقباد حاکم ہوا جس کا دور سلجوقی سلطنت کا سنہری دور تھا۔ سلجوقی سلاطین انقرہ کی فوجی اہمیت سے واقف تھے اور اسی لیے وہ اس کی فصیلوں کے استحکام میں سعی و اہتمام کرتے رہے۔

تیرھویں صدی سے پہلے انقرہ میں اسلامی طرز زندگی نے زیادہ رواج نہ پایا تھا۔ نیز بعد کے ادوار میں بھی سلاطین نے یہاں خود مسجدوں یا مدرسوں کی قسم کی مذہبی یا ثقافتی عمارات نہیں بنائیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انقرہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا رہا اور اسے صرف ایک سرحدی شہر ہی سمجھا گیا

تیرھویں صدی کے آغاز سے تقریباً نصف صدی تک انقرہ پر ایلخانیوں کی بھی عمل داری رہی ۱۳۵۴ء میں اورخان غازی کے بیٹے سلیمان پاشا نے انقرہ

کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور اس وقت انقرہ کا آخری الخانی والی ملک ناصر تھا۔

عثمانی سلطنت کی صوبہ بندی کے دنوں میں انقرہ اندلو کی بڑی ایالت کا صدر مقام مقرر ہوا۔ بعد ازاں صدر مقام کوتاہیہ میں منتقل ہو گیا اور انقرہ صرف ایک صوبے کا مرکز رہ گیا۔ یہ صوبہ یا سنجاق عموریہ بھی کہلاتا تھا۔

سولہویں سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک انقرہ کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ بالخصوص جنوب کی سمت خاص طور پر یہ رومی بازنطینی شہر کی حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اسے ایک اہم مرکزی شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

۱۶۴۸ء کے انقرہ کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان کے مطابق شہر کی اندرونی فصیل سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اس کے ایک دوسرے سے بلند چار طبقے تھے۔ پائیں شہر کی اطراف کو بھی جلالی حملوں کے خوف سے حصار بند کر دیا گیا تھا۔ بازار شہر کے بالائی حصہ میں تھے۔ انقرہ کی چراگاہیں اچھی نسل کے جانوروں خصوصاً بکریوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان بکریوں کی اون جس کی تعریف میں مقامی مصنفوں نے کہا ہے کہ وہ "دودھ کی طرح سفید" "ریشم کی مانند نرم اور ہیرے کی مثل چمک دار ہوتی ہے۔ کات کر اس کے دھاگے سے کپڑا بنا جاتا تھا اور یہاں کے لوگوں کا یہی ذریعہ معاش تھا اور اس کی ملک سے باہر مصر اور یورپ کے بازاروں میں بھی بہت مانگ تھی۔ ۱۸۱۲ء تک انقرہ میں کپڑا بننے کے تقریباً ایک ہزار کارخانے چل رہے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں کپڑے کے ایک دو کارخانے رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز انقرہ کی جو بکریاں جنوبی افریقہ میں لے گئے تھے ان کی پرورش ایک طبعی ماحول میں مکمل ضروری شرائط کے ساتھ عمل میں آئی تو ان کی اون نے اس صدی کے اواخر میں منڈیوں میں خاص اہمیت حاصل کر لی اور پھر یہی تجربہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی ہوا اور نتیجہ میں انقرہ کی اون کی قیمت بالکل گھٹ گئی۔

چونکہ بلقان کی جنگ کے بعد روم ایلی کے صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے اس طرح ترکی کی سرحدیں استنبول کے بہت صرف دو سو کیلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئیں اور اسی زمانے میں یہ بات بھی مشکوک نظر آنے لگی کہ یہ بندرگاہ (استنبول) بحری سلطنتوں کے کسی حملے کا مقابلہ کر سکے گی۔

چنانچہ یہ تجویز مختلف طریقوں سے زیر غور رہی کہ عثمانی سلطنت بیرونی تعرضات سے محفوظ ہو۔ چنانچہ جب ۱۹۲۰ء میں استنبول پر فتح مند سلطنتوں کا قبضہ ہو گیا اور تشکیلِ ملی کے لیے کوئی اداری مرکز تلاش کیا جانے لگا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک اعلان کے ذریعے پوری مملکت ترکیہ کو اس فیصلے کا پابند کر دیا گیا جو انقرہ کی "فوق العادت صلاحیت کی مالک" مجلس کے ایک اجتماع میں کیا گیا تھا اور اس فیصلے کے مطابق انقرہ مجلس ملیہ کبیر ترکی کی حکومت کا حقیقی مرکز بن گیا۔

جدید انقرہ:۔ انقرہ کو نئی ترکیہ کا مرکز بنانے کے فیصلے کے بعد اس کو آباد کرنے کے لیے بہت کچھ سعی و کوشش کرنا پڑی۔ لیکن آبادی کے کام کو ایک منظم لائحہ عمل کے مطابق آگے بڑھانا کہیں ۱۹۲۸ء میں جا کر ممکن ہوا۔ نئے انقرہ میں سب سے مقدم مجلس ملی کی عالیشان عمارت اس کے علاوہ سرکاری دفاتر کا ایک محلہ۔ باغیچوں والے مکان اور ایک ایسا ثقافتی محلہ تھا جس کے اندر زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی ادارے آ جائیں۔ اور شہر کے صنعتی حصے اس کے مضافات میں بنائے جائیں اور شہر کے مختلف حصوں کو ملانے کے لیے بڑی سڑکیں تعمیر کی جائیں۔ چنانچہ نیا انقرہ اسی طریق پر بنایا گیا ہے۔ پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے انقرہ سے شمالی سمت میں بارہ کیلومیٹر کی مسافت پر ایک بڑا بند تعمیر کیا گیا جو دو سو میٹر چوڑا اور اٹھتر میٹر بلند ہے اور اس میں ایک سو ملین مکعب میٹر

کیونکہ پانی جمع رہتا ہے۔ یہ بند ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔

حال میں انقرہ کی آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شہر ترقی کر رہا ہے۔ ۱۹۴۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ ستاون ہزار دو سو باون تھی جو ۱۹۶۰ء میں ساڑھے چھ لاکھ ہو گئی۔

قلعہ انقرہ دو قلعوں پر مشتمل ہے۔ اندرونی قلعہ پہاڑی کے بلند ترحصے پر واقع ہے اور بیرونی قلعہ اندرونی قلعے کو شمال جنوب اور مغرب سے گھیرے ہوئے ہے۔ بیرونی قلعے کے تقریباً بیس برج ہیں جن میں سے پندرہ برج اور ان کی درمیانی دیوار [illegible] کا ایک بڑا حصہ اب تک اچھی حالت میں باقی ہے۔ اس کے دو دروازے باہر کی جانب کھلتے ہیں۔ اندرونی قلعہ پہاڑی کی چوٹی کے پچاس ہزار مربع میٹر مستطیل شکل کے رقبے پر مشتمل ہے۔ بیرونی قلعے کی دیواروں کا ایک حصہ بیک وقت اندرونی قلعے کی [illegible] بھی بناتا ہے۔ اندرونی قلعے کی دیواروں کے نچلے حصے سنگ مرمر اور سنگ اسود کے ٹکڑے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اندرونی قلعے کا محیط گیارہ سو پچاس میٹر ہے اور دیواریں چودہ سے سولہ میٹر تک بلند ہیں۔ دیواروں کے اوپر بیالیس برج [illegible] گوشہ میں دیو اٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے انیس برج قلعے کی مغربی سمت [illegible] ایک ایسے جہازی بیڑے کا منظر پیش کرتے ہیں جو ایک قطار میں آگے بڑھ رہا ہو۔

انگشتری

(انگوٹھی، خاتم) اسلامی شریعت کی رو سے مردوں کے لیے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے کیونکہ مردوں کے لیے سونے اور ریشم کا استعمال حدیث شریف میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ایک چاندی کی انگوٹھی [illegible] دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے جس پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔ آنحضور [illegible] انگوٹھی سے اپنے نام کی مہر کا کام لیتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ [illegible] ایک چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔

موجودہ دور میں مسلمان اکثر دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں چاندی کی [illegible] استعمال کرتے ہیں۔ جس میں عقیق کا نگینہ جڑا ہوتا ہے۔ [illegible] انگوٹھی پہننے پر خواہ وہ سونے کی ہو یا کسی اور دھات کی کوئی قید نہیں ہے۔

انور پاشا

(۲۲ نومبر ۱۸۸۱ء — ۴ اگست ۱۹۲۲ء) مشہور ترکی جرنیل [illegible] اور سیاسی رہنما احرار ترکوں کا مشہور رسالہ جب ترکی نہایت [illegible] دور سے گذر رہا تھا تو اس نے اپنے جانباز ساتھیوں کی مدد سے [illegible] خطروں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ والد کا نام احمد [illegible] والدہ کا نام عائشہ [illegible] کے محلہ دیوان یولو میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا۔ آبائی وطن مناستر تھا۔ [illegible] کے مکتبہ حربیہ میں داخل ہوا اور فوجی افسروں کے ترمیتی نصاب کے علاوہ [illegible] کے اعلیٰ نصاب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں ترکی کی تیسری فوج کے جنرل سٹاف میں بطور کیپٹن تقرر ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں میجر ہو کر تیسری فوج کے صدر [illegible] منتقل ہوا۔ یہیں پر انجمن اتحاد و ترقی کا رکن بنا۔

انور پاشا ہی کی کوششوں سے سلطان نے ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو ۱۸۷۶ء کا دستور بحال کر دیا اور جب سلطان نے دستور ختم کرنا چاہا تو اسے معزول کر کے اس کے بھائی محمد رشاد خاں کو محمد خامس کے لقب سے ترکی کا سلطان بنانے والوں میں بھی انور پاشا ہی کا ہاتھ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں انور پاشا کو برلن کے ترکی سفارت خانے میں فوجی اتاشی مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں اس نے یہاں جرمن فوج کا مطالعہ کیا اور وہاں کی فوجی تربیت

میں مہارت و استعداد پیدا کی۔ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے یکا یک طرابلس پر حملہ کیا تو اس نے فوجی اتاشی کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور رضاکارانہ طور پر مملکت کے دور افتادہ حصے کی حفاظت کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ انور اور اس کے رفیق جن میں کمال اتاترک اور عصمت انونو خاص طور پر قابل ذکر ہیں بھیس بدل کر طرابلس پہنچے اور وہاں کے مقامی عربوں کو منظم کر کے اطالویوں پر یورش کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے ترکی پر حملہ کرا دیا تو انور پاشا طرابلس چھوڑ کر واپس بلقان [illegible] اس وقت ترکی کا وزیر اعظم کامل پاشا تھا جو عملاً برطانیہ کا ہی آدمی تھا۔ برطانیہ نے اسے جنگ ملتوی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن انور پاشا اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس ایوان میں پہنچا جہاں کامل پاشا کی وزارت کا اجلاس ہو رہا تھا اور جا کر کہا کہ یا تو جنگ جاری رکھی جائے یا وزارت مستعفی ہو جائے۔ بات زیادہ بڑھ گئی اور بالآخر کامل پاشا اور اس کے ساتھی مستعفی ہو گئے اور نئی وزارت نے جنگ از سر نو شروع کر دی۔ اس طرح ترکوں نے اپنے کافی علاقوں کو بچا لیا۔

[illegible] جنوری ۱۹۱۴ء کو سعید حلیم پاشا کی وزارت میں انور پاشا وزیر جنگ کے عہدے [illegible] ہوا اور پاشا کے منصب سے نوازا گیا۔ وزیر جنگ ہونے کے بعد اس نے [illegible] پر فوجی اصلاحات شروع کر دیں۔ اسی اثنا میں پہلی عالمی جنگ چھڑ [illegible] ترکوں کے لیے اتحادیوں کے خلاف شرکت کے سوا کوئی [illegible] اگرچہ پہلی جنگ عظیم میں انور اور اس کے رفقاء نے خوبی سے حصہ [illegible] ۱۹۱۸ء میں جب استنبول پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا تو سلطان [illegible] جو اتحادیوں کے زیر اثر تھا۔ ۱۹۱۹ء میں انور طلعت [illegible] ملک سے باہر تھے موت کی سزا سنائی گئی۔ ۱۹۲۰ء [illegible] مشرقی قوموں کی ایک کانفرنس میں انور پاشا نے [illegible] انور پاشا ایران اور روس [illegible] یونانی فوجوں نے انقرہ پر حملہ کیا ہے تو یہ [illegible] وہاں انجمن اتحاد و ترقی کے [illegible] اجلاس میں مجلس انقرہ [illegible] انجمن کے ارکان سے مخالفت کا برتاؤ ترک کر دیا جائے۔ اس [illegible] یونانی فوجوں کو سقاریہ میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا [illegible] کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

[illegible] کے لیے انور پاشا [illegible] نومبر کو افغانی سرحد کی [illegible] روانہ ہوا۔ [illegible] شاہ آباد کے بسمچی رہنما ابراہیم نے اسے دھوکے سے گرفتار کر کے تقریباً چھ ہفتوں تک قید رکھا۔ دوسرے بسمچیوں نے اسے آزاد کرایا [illegible] انہوں نے استالن آباد پر حملہ کر کے ۱۳ فروری ۱۹۲۲ء کو روسی فوج کو وہاں سے [illegible] دیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات پر جنگیں ہوتی رہیں۔ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو [illegible] نامی گاؤں کے معرکے کے دوران میں انور پاشا نے شہادت پائی۔

انور پاشا کی شادی سلطان محمد خامس اور سلطان محمد سادس کی بھانجی امینہ ناجیہ سلطان سے ہوئی تھی۔ اولاد میں ایک بیٹا انور علی اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

انور ایک شجاع اور بہادر، نہایت خلیق، بردبار، شیریں گفتار، نیک خصلت آدمی تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انور پاشا نے جنوبی و عربی محاذ جنگ کا دورہ کیا۔ اس دوران [illegible] نے مدینہ منورہ میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک خصوصی گاڑی [illegible] اسٹیشن پر سواری کا انتظام تھا لیکن انور نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم غلاموں کی حیثیت میں یہاں آئے ہیں۔ چنانچہ پیدل مسجد النبی گیا اور روضہ اطہر کی زیارت کی۔

اس میں تنظیمی صلاحیتیں بے پناہ تھیں۔ اپنے دوستوں اور رفیقوں میں گہری اور پائدار وفاداری پیدا کر لینے کا اس میں خاص ملکہ تھا اس کے حریف بھی اس کی دیانت اور حب الوطنی کے معترف ہیں۔ اگرچہ ترکی اس کی مادری زبان تھی لیکن اس کے علاوہ بھی کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ جن میں فرانسیسی، جرمن، انگریزی، عربی روسی زبانیں شامل ہیں۔

انور شاہ کاشمیری، مولانا

(۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ/ ۲۶ نومبر ۱۸۷۵ء - ۲ صفر ۱۳۵۲ھ/ ۲۰ مئی ۱۹۳۳ء) مشہور عالم دین اور محدث۔ والد کا نام مولانا محمد معظم شاہ تھا جو بہت بڑے عالم زاہد و عابد اور پیر تھے۔ موضع دودھوان (علاقہ لولاب کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور ابتدائی فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کی علمی صلاحیتوں کا ظہور بچپن ہی میں ہونے لگا تھا۔ ایک بزرگ نے انہیں دیکھ کر کہا کہ یہ بچہ بڑا عظیم الشان عالم بنے گا اور آئندہ زمانہ میں اس کی علمی عظمت مسلم ہو گی۔ انور شاہ کاشمیری نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا اور بارہ سال کی عمر میں فتاوے دینے لگا تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں ہزارہ سے دیوبند آئے اور مولانا محمود الحسن، مولانا خلیل، مولانا محمد اسحاق، مولانا غلام رسول ہزاروی کی علمی صحبتوں سے چار سال تک استفادہ کیا۔ دیوبند سے فارغ ہو کر گنگوہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کئے۔

گنگوہ سے آپ دہلی آئے اور مدرسہ امینیہ میں مدرس اول مقرر ہو گئے۔ تین چار سال بعد کشمیر چلے گئے اور وہاں سے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے۔ حجاز سے واپسی پر بارہ مولا کے مقام پر ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور تین چار برس بعد دیوبند دارالعلوم میں مدرس ہو گئے۔ کئی برس تک بغیر تنخواہ کے حدیث کا درس دیتے رہے۔ مولانا انور کاشمیری شادی کرانا نہیں چاہتے تھے تاکہ خانہ کعبہ کی طرف ہجرت کر سکیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے آپ کو ہندوستان میں رکھنے کی تجویز سوچی کہ آپ کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ گنگوہ کے سادات میں آپ کا نکاح کرا دیا۔

آپ ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء تک دیوبند میں صدر مدرس رہے۔ اس کے بعد آپ نے دیوبند سے قطع تعلق کر لیا اور ڈابھیل میں جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۵۱ھ تک درس حدیث دیتے رہے اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دیوبند میں وفات پا گئے۔ آپ کے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔

شاہ صاحب نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ بہت کم دی۔ تاہم مندرجہ ذیل تصانیف اہم ہیں۔

۱۔ "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام"۔
۲۔ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح"
۳۔ "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین"۔
۴۔ "تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسےٰ علیہ السلام"۔
۵۔ "خاتم النبیین" (فارسی)
۶۔ "فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب"
۷۔ خاتمۃ الکتاب فی فاتحۃ الکتاب (فارسی)

اس کے علاوہ آپ کی مشہور ترین تقریر فیض الباری سید بدر عالم میرٹھی نے چار جلدوں میں تحریر کی ہے۔ اسی طرح دوسری تقاریر العرف الشذی درس جامع ترمذی کی املا ہوئی جسے مولانا چراغ محمد نے اور "انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد" کو مولانا محمد صدیق نے

منضبط کیا ہے۔

شاہ صاحب کا حافظہ بلا کا تھا۔ آپ کسی کتاب کا ایک مرتبہ مطالعہ کر لیتے اور جب کبھی برسوں بعد اس کتاب کے بارے میں کوئی بات چھڑتی تو اس کے مضمون کو حوالوں کے ساتھ اس انداز سے بیان فرماتے کہ سننے والے ششدر رہ جاتے۔

آپ نے خود ایک مرتبہ فرمایا کہ "جب میں کسی کتاب کا مطالعہ سرسری نظر سے کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا تب بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے حفظ ہو جاتے ہیں۔"

مولانا اشرف علی تھانوی نے شاہ صاحب کے بارے میں کہا ہے "میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل انور شاہ کاشمیری کا امتِ مسلمہ میں وجود ہے۔"

مولانا عبدالقادر رائے پوری نے فرمایا "واقعی حضرت شاہ صاحب" "آیۃ من اللہ" تھے۔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے الفاظ میں "میرے جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کر سکتا ہے۔ البتہ صرف اتنا کہہ سکتا ہے کہ صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا یہ پیچھے رہ گئے۔" علامہ شبیر احمد عثمانی نے آپ کی وفات پر کہا تھا "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء شیخ عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے۔ کیونکہ صرف زمانے کا تقدم و تاخر ہے ورنہ علامہ انور شاہ بھی چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا آج انتقال ہوا ہے۔"

علامہ اقبال مرحوم نے لاہور کے ایک تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے"

آپ میں خدا ترسی حد درجہ کی تھی۔ اکثر ملنے والے بہت سی سنتوں کو شاہ صاحب کے عمل سے معلوم کر لیا کرتے تھے۔ آپ کے چہرہ سے اس وقت خاص طور پر خشیت الٰہی کا اظہار ہوتا تھا جب آپ اپنے وعظ میں خوف و خشیت والی آیات یا اشعار پڑھتے اس لمحے آپ کی آنکھیں خوف خداوندی سے تر ہو جاتی تھیں۔ آپ بڑے پر وقار اور متین تھے اس کے ساتھ وجاہت۔ دلکشی اور جاذبیت بھی آپ میں بدرجہ اتم موجود تھی ـــــ

انہارِ جنت جنت کے معنی باغ کے ہیں۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں جنت کی تعریف کی گئی ہے وہاں اس کے ساتھ نہروں کا ذکر بھی آیا ہے۔ باغ کی زینت اور لطف کو دوبالا کرنے کے لیے پانی کے ذخیرے کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ان نہروں میں سب سے زیادہ مشہور سلسبیل ہے۔ روایت ہے کہ ان نہروں میں بعض میں پانی رواں ہے جو ہمیشہ خوشذائقہ رہے گا اور کبھی بدبودار نہ ہوگا اور بعض میں دودھ اور بعض میں شراب طہور بہتی ہوگی جو بہت خوشذائقہ ہوگی اسی طرح شہد کی نہریں بھی ہوں گی۔ قرآن میں ان کی تعداد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے جنت کا سوال کیا کرو تو فردوس کا سوال کیا کرو۔ کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ اور درمیانی حصہ ہے اور وہیں سے جنت کی نہروں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ (صحیحین)

اوتاد کھونٹے اور ستون۔ صوفیاء کی ایک اصطلاح۔ ولایت کا ایک خاص درجہ جس میں چار اولیاء کو دنیا کے چاروں گوشوں کا محافظ تصور کیا جاتا ہے۔

اوتار نیک، فرشتہ خو، مقدس، ولی، خدا رسیدہ آدمی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق خدا کا کسی جسم میں داخل ہو کر مخلوق کی اصلاح کے لیے دنیا میں آنا۔ ہندو دھرم میں ویدی دیوتا وشنو کو خدا سے بزرگ و برتر بتایا گیا ہے۔ اس کے حلقہ اثر میں بہت سے دیوتا شامل کر لیے گئے ہیں۔ مقامی دیوتا یہاں تک کہ گوتم بدھ کو بھی وشنو کے حلقہ میں شامل کر لیا گیا اور یہ سب دیوتا وشنو کے اوتار کہلانے لگے۔ ان اوتاروں کی تعداد دس بتائی جاتی ہے جن میں سے نو آ چکے ہیں اور دسواں اوتار ابھی آئے گا۔ مشہور اوتار مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **نرسنگھ:** یہ وشنو کا چوتھا اوتار ہے۔ یہ ہرنیہ کشیپ کا ایک خود سر راجہ تھا جو خدائی کا دعویدار تھا۔ لیکن اس کا لڑکا پرہلاد انتہائی دیندار تھا۔ جو خدا پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اس کے باپ نے اسے مروانا چاہا اور اسے پہاڑی کی چوٹی سے پھنکوا دیا لیکن کسی غیر مرئی قوت نے اسے روک لیا۔ بعد ازاں اسے زہر دیا گیا۔ اس پر زہر کا اثر بھی نہ ہوا پھر آگ میں ڈالا گیا۔ اور آگ بھی اسے جلا نہ سکی۔ تو اس نے اپنے لڑکے کو بلا کر پوچھا کہ تو میری برتری کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ لڑکے نے جواب دیا میں کائنات کے حکمران کو برتر جانتا ہوں۔ باپ یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ تیرا خدا کہاں ہے؟ لڑکے نے کہا ہر جگہ ہے۔ اس نے تلوار ہاتھ میں لے کر پوچھا کیا اس تاج میں بھی ہے؟ لڑکے نے کہا "ہاں" اس نے تاج کو ٹھوکر سے دور کر دیا۔ پھر کہا "کیا اس کھمبے میں بھی ہے؟" پرہلاد نے پھر کہا ہاں۔ اس نے ٹھوکر کھمبے پر بھی مارا اور کہا کہ "اپنے مالک سے کہہ کہ وہ تجھے بچا لے۔" اسی وقت وشنو کھمبے سے نکلا اور اس ظالم کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے سچے عاشق کو بچا لیا۔ ہندو اس کا تہوار ہولی میں مناتے ہیں کہ نرسنگھ کو آگ نے نہیں جلایا۔

۲۔ **رام چندر:** یہ ساتواں اوتار ہے۔ اس کا ذکر رامائن جیسی رزمیہ نظم میں کیا گیا ہے۔ یہ اجودھیا کے راجہ دسرتھ کا بڑا لڑکا تھا۔ لیکن اس کی سوتیلی ماں نے اپنے بیٹے بھرت کو تاج و تخت کا مالک بنوا دیا اور رام چندر کو جلا وطن کروا دیا۔ جلا وطنی کے دوران میں اس کی بیوی سیتا کو لنکا کے راجہ نے اغوا کر لیا۔ ہنومان کی مدد سے رام چندر نے لنکا پر حملہ کیا اور سیتا کو واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی فتح کی یاد میں دسہرے کا تہوار منایا جاتا ہے۔ ہندو رام کی بڑی عزت کرتے ہیں اور مرتے وقت آخری لفظ جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے رام ہے۔ رام کی پرستش وشنو کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔

۳۔ **کرشن:** یہ وشنو کا آٹھواں اوتار ہے۔ یہاں وشنو کا تصور ترقی کے اعلیٰ درجے پر جا پہنچا ہے۔ اگرچہ کرشن کی پوجا بہت پہلے زمانے سے کی جاتی تھی۔ لیکن وشنو کا اوتار قرار پانے کے بعد اس کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ کرشن متھرا میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں متھرا کا راجہ بہت ظالم شخص تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک لڑکا اس کی چچی دیوکی کے بطن سے پیدا ہوگا اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی راجہ کے حکم سے دیوکی کے تمام بچے قتل کر دیے گئے۔ دیوکی نے کرشن کو ایک چرواہے کی بیٹی سے بدل کر بچا لیا۔ کرشن نے چرواہوں میں پرورش پائی۔ ان کی بہادری کے تمام لوگ قائل ہو گئے تھے۔ چرواہوں کی لڑکیوں اور عورتوں کو کرشن سے عشق تھا اور ان ہی عورتوں میں سے رادھا تھی جو کرشن کی بیوی بنی۔ نیز دیکھیے پیغمبر۔

اوحدالدین کرمانی (وفات ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) بہت بڑے صوفی اور عالم دین

شیخ رکن الدین سنجاسی کے مرید تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی سے بھی بغداد میں قیام کے دوران میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ محی الدین ابن عربی کے پاس بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ نہایت سادگی پسند تھے۔ کئی ایک مرید بھی تھے۔ بعض کرامات کا جو ان سے صادر ہوئیں شیخ فریدالدین شکر گنج نے اپنی کتاب راحت القلوب میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ شیخ فرید نے بھی آپ کی خدمت میں کچھ دن رہ کر فیض حاصل کیا۔ آپ اشعار بھی کہتے تھے۔ بغداد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر (۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ / ۳ نومبر ۱۶۱۸ء — ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ / ۳ مارچ ۱۷۰۷ء) ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا عظیم آخری تاجدار جس نے ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء سے ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء تک حکومت کی۔ وہ شاہجہان کا تیسرا بیٹا اور ملکہ ممتاز محل کے بطن سے تھا۔ گجرات میں دوحد کے مقام پر پیدا ہوا۔ عربی، فارسی، قرآن اور حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مادری زبان اردو تھی تاہم اس نے ہندی اور ترکی میں بھی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۳۶ء میں شاہجہان نے اسے دکن کا حاکم مقرر کیا۔ لیکن اپنے بڑے بھائی داراشکوہ کی بغاوت کے موقع پر ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں اس نے دکن کی حکومت چھوڑ دی۔ اگلے برس اسے گجرات کا حاکم مقرر کیا گیا۔ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں شاہجہان نے اسے بلخ اور بدخشاں کے انتظام و انصرام کے لیے بھیجدیا۔ یہاں اس نے ازبک قبائل کی بہت سی بغاوتوں کو فرو کیا۔ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں وہ قندھار کی طرف بڑھا تاکہ اسے ایرانیوں کے محاصرے سے نجات دلائے۔ لیکن بدقسمتی

سے قندھار اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ایرانیوں کے ہاتھ چڑھ چکا تھا۔ ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء میں اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اسی برس اسے واپس دکن بھیج دیا گیا جہاں اس نے نظام محاصل کی تدوین نو کی۔ ۱۶۵۶ء میں اس نے گولکنڈہ اور ۱۶۵۷ء میں بیجاپور کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرنے کے لیے کامیاب حملے کیے، مگر شاہ جہان کے حکم سے ان مہمات کو ادھورا چھوڑ دینا پڑا۔

ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہ جہان بری طرح بیمار ہو گیا اور اس کے بیٹوں کے مابین حصول تخت کے لیے چپقلش بڑھ گئی۔ جون ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے شاہجہان کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا جہاں وہ اپنی وفات ۱۶۶۶ء تک نظر بند رہا۔ ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے عالمگیر کا لقب اختیار کر کے سلطنت مغلیہ پر فرمانروائی کا آغاز کر دیا۔

اورنگ زیب نے اپنی طویل تخت نشینی کے دور میں زیادہ وقت مختلف مہمات میں گذارا۔ ۱۶۶۲ء میں اس نے مغربی آسام کا محاصرہ کیا جو ۱۶۶۷ء میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۶۶۶ء میں اس نے چٹاگانگ اور ۱۶۶۷ء میں کابل کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ خصوصاً کابل پر اسے زیادہ توجہ دینا پڑی۔ ۱۶۷۲ء اور ۱۶۹۰ء میں دوبارہ سے پٹھانوں کی شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۶۷۹ء میں اس نے مروار (جودھپور) اور میواڑ اور جے پور کی سلطنتوں پر دو کامیاب حملے کیے۔ ان میں سے مروار اس کے قبضے میں آ گیا۔ لیکن میواڑ کے ساتھ ۱۶۸۱ء میں معاہدہ امن طے ہوا۔ ۱۶۸۵ء میں اس نے بیجاپور اور ۱۶۸۶ء میں گولکنڈہ کی ریاستوں پر دوبارہ کامیاب حملے کیے اور انہیں سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ یوں پہلی بار سلطنت مغلیہ ساحل چٹاگانگ سے لے کر کوہ ہندوکش کے دامن تک پھیل گئی۔

اگلے کئی برس اس نے سلطنت کے انتظامی امور میں گذارے مگر بدقسمتی سے وہ ایک اچھا منتظم ثابت نہ ہو سکا۔ مرکز سے مسلسل غیر حاضری نے مقامی سرداروں کو سر اٹھانے کا موقع دیا۔ خصوصاً مرہٹوں نے اسے کبھی بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اکبر کے برعکس اورنگ زیب ایک پکا سنی العقیدہ مسلمان تھا۔ جب اس کا بھائی دارا شکوہ ملحدانہ عقائد کا حامل سمجھا جاتا [illegible] اس نے اسلامی قوانین کو اقوال آئمہ کی روشنی میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ [illegible] نظام عدلیہ میں بے شمار تبدیلیاں کیں مختلف قسم کے فتاویٰ کے مجموعے مرتب

کرائے [illegible] اس بنا پر بہت سے آزاد خیال مسلمان اور متعصب ہندو اس کے مخالف ہو گئے۔ مسلمانوں کو سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ اورنگ زیب نے سکوں پر سے کلمہ طیبہ کے حروف حذف کرنے کا حکم دیا تھا اور ہندوؤں کو اس بات سے چڑ تھی کہ اس نے ذبیحہ گاؤ اور ہندوانہ طرز سلام کے متعلق اکبر کے قوانین کو منسوخ کر دیا تھا۔ ہندوؤں نے اس پر بت شکنی اور مندر شکنی کے الزامات بھی عائد کیے [illegible]

اورنگ زیب چاہتا تھا کہ ہندوستان ایک صحیح قسم کی اسلامی سلطنت بن جائے جہاں غیر مسلم یا تو دین اسلام کو قبول کر لیں یا پھر ذمی بن کر رہیں [illegible] کے لیے اس نے جزیہ کا نظام جاری کرنے کا حکم دیا جس پر غیر مسلم اکثریت اس کی مخالف ہو گئی اور جب وہ احمد نگر کے مقام پر فوت ہوا تو ہندوستان کے ہر گوشے میں کہیں نہ کہیں شورشوں نے سر اٹھایا ہوا تھا۔

شاہ جہان نے آخری عمر میں سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ اس نے اپنی سلطنت کو مختلف بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا [illegible] ہوتے ہی ہر بیٹے نے پوری سلطنت پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ [illegible] دارا شکوہ ولی عہد تھا اور سلطنت کے سیاہ سفید کا مختار تھا [illegible] سخت مخالف تھا۔ اس نے شاہ جہان کو ہمیشہ اورنگ زیب [illegible] بھڑکائے رکھا اور اس کی [illegible] مہم بھی کامیاب [illegible] کو کچھ اور ہی منظور تھا اورنگ زیب کے اعلان تخت نشینی [illegible] نے اورنگ زیب کے ساتھ جنگ شروع کر دی [illegible] شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مہم کی فتح یابی کے فوراً بعد [illegible] نے دوسرے بھائیوں کی طرف توجہ کی اور ان پر فتح حاصل کر [illegible] انتظام مملکت کی طرف متوجہ ہوا۔

اکبر اعظم کی پالیسی نے برصغیر [illegible] اسلام [illegible] اورنگ زیب کی پالیسی اپنے پردادا کے [illegible] زمانے میں غیر اسلامی عناصر اتنی تقویت پکڑ چکے تھے [illegible] تھا اورنگ زیب کے زمانے میں [illegible] ہو چکی تھی۔ اسلام کے تحفظ کے [illegible] مجدد الف ثانی اور ان کے جانشین [illegible] چلا رہے تھے۔ اورنگ زیب [illegible] نے اپنے نظریات کو [illegible] میں بھی جاری [illegible]

عالمگیر نے [illegible]

[illegible] سے پہلے [illegible] میں سادگی پیدا کی [illegible] موقوف کر [illegible] کردی۔ جشن نوروز [illegible] علاوہ محرم کے جلوس [illegible] کردی۔ موسیقی [illegible] عالمگیر [illegible] بھی [illegible]

[illegible] کا پابند [illegible] کے آمدنی [illegible] جس نے عالمگیر کی زیر سرپرستی [illegible] نمونہ ہے۔

اورنگ زیب پر ہندو کشی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کی پالیسی بلاشبہ اسلامی تھی لیکن [illegible] نے ہندوؤں پر کبھی تشدد نہ کیا۔ مخالفین یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس نے جزیہ دوبارہ عائد کیا اور ہندوؤں کے مندر دوبارہ منہدم کرائے۔ اصل میں اورنگ زیب نے ٹیکس اسلامی شریعت کے مطابق لگائے۔ اس سلسلے میں اس نے [illegible] ٹیکس معاف کر دیے۔ جزیہ اسلامی شریعت کے مطابق صاحب حیثیت ہندوؤں پر لگایا [illegible] کی شرح بہت معمولی تھی۔ اس کے سبب ہندو [illegible] فوجی بھرتی سے مستثنیٰ [illegible] تھے۔ جب کہ اسلامی شریعت کے مطابق فوجی خدمت ہر مسلمان پر لازم [illegible] سکتی ہے۔

[illegible] کے زمان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے صرف دو مندر گرائے [illegible] تعمیر کرنے [illegible] اس کے ساتھ [illegible] متعدد ہندو [illegible] کو زمین معاف [illegible] ہندوؤں پر تشدد اس کا [illegible] تعداد [illegible] کے ملازم تھے۔ [illegible] کا یہ قول تھا کہ [illegible] مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ قابلیت کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

[illegible] اس کی زندگی [illegible] روایات کے [illegible] زندگی [illegible] سرکاری خزانہ کو [illegible] ذاتی مصارف پورے کرنے [illegible] تمام زندگی [illegible] رہ کر [illegible] خدا [illegible] اور محنت [illegible] حد تک [illegible]

ادرنوس [illegible] غازی [illegible] باپ کا نام عیسیٰ [illegible] تھا۔ [illegible] ۲۲۲ [illegible] عثمانی [illegible] کا نام [illegible] کی فہرست میں موجود [illegible] کی زیرنیابت [illegible] مدد کے لیے بھیجی تھی [illegible] عثمانی مؤرخوں کے نزدیک ۷۵۹ھ [illegible] [illegible] اس وقت اس کے ساتھ [illegible] ۷۶۳ھ/۱۳۶۲ء میں [illegible] کے بعد سے شہر اپسالہ اور کوملجنہ پر چڑھائی کیا [illegible] روانہ کیا اور ساتھ ہی مفتوحہ علاقوں کا حاکم بھی مقرر کیا [illegible] جنگ مارتزہ میں بھی شرکت کی۔

غازی ادرنوس

خضر شاہ	عیسیٰ	سلیمان	علی	یعقوب	برق	بیگجہ
چلبی محمد	محمد					
یوسف		ادرنوس	شمس الدین	احمد حسین		
		سلیمان	موسیٰ	عیسیٰ		

۷۶۴ھ/۱۳۶۲ء میں ادرنوس فرحاک فتح کرنے نکلا۔ یورپی اسکیجہ اور عورت

حصاری کے علاقوں کو قبضہ میں لے کر ان پر خراج عائد کر دیا تو سلطان نے ۱۳۷۴ء میں اسے سیرس کا علاقہ انعام کے طور پر دیا جو خود اس نے فتح کیا تھا۔ ۷۸۴ھ یا ۷۸۷ھ/۱۳۸۲ء یا ۱۳۸۵ء میں مقدونیۃ العظمیٰ کی تسخیر میں شریک ہوا۔ مناستر کو بھی فتح کیا۔ وہ مراد اول کی آخری مہم میں اس کا مشیر تھا۔ اسکوب پر قبضہ کر کے اور برانقوصوہ کی مہم سے قبل دشمن کو ایک درہ کوہ میں کچل کر ناموری حاصل کی۔ ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں المورہ کی مہم میں اور ۷۹۸ھ/۱۳۹۶ء میں جنگ نکوپولی میں شریک ہوا اور ان فتوحات کو سر کرنے کے بعد اس نے البانیہ کی طرف قدم بڑھائے۔ جنگ انقرہ میں بھی شریک رہا۔ ایک لمبی عمر پانے کے بعد ینیجہ وارداء میں وفات پائی۔

ادرنوس بے انتہا فیاض تھا۔ اپنی دولت کا بڑا حصہ خیراتی کاموں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ ادرنوس کے سات بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں ان میں سے ایک کی شادی خلیل پاشا سے ہوئی جو چندرلی کا وزیر اعظم تھا۔ نویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ادرنوس میں جن لوگوں کے نام ملتے ہیں ان میں سب سے نمایاں نام عیسیٰ بن ادرنوس کے بیٹے محمد کا ہے اس نے ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء میں دراج پر قبضہ کیا تھا۔ ایک اور مشہور نام خضر شاہ کے بیٹے ادرنوس کے پوتے یوسف کا ہے جو سلیم اول کی مصر پر فوج کشی میں شریک تھا۔ یہ خاندان جو ادرنوس اوغلاری کے نام سے مشہور ہوا۔ روم ایلی پر حملوں میں اس نے بڑا نام پیدا کیا لیکن دسویں صدی کے وسط کے بعد قائدین عساکر کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو بیٹھا جبکہ عثمانی خاندان کے عروج میں اس خاندان کا بڑا ہاتھ تھا۔

اوزاعی، امام (۸۸ھ/۷۰۷ء – ۱۵۷ھ/۷۷۴ء) ابو عمرو عبدالرحمان بن عمرو مشہور فقیہ اور عالم، دمشق میں پیدا ہوئے۔ اوزاعی نسبت دمشق کے ایک قصبہ اوزاع سے ہے جو عرب کے کسی قبیلے کی وجہ سے اوزاع مشہور ہو گیا تھا۔ کیونکہ ابن حجر کے قول کے مطابق امام اوزاعی نے وہاں سکونت اختیار کی اور اسی [illegible] سے مشہور ہوئے۔ حالانکہ آپ اوزاع قبیلے سے نہیں تھے۔ ابن تعلیم کا کچھ دور یمامہ میں گذارا اور وہیں سرکاری ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد بیروت چلے گئے اور ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا مزار حنتوس میں ہے۔

انہوں نے امام زہری اور عطاء بن رباح سے حدیث روایت کی ہے۔ اور ان سے امام مالک اور سفیان ثوری نے روایت کی۔

اوزاعی کی تصانیف میں سے جو وہ اپنے شاگردوں کو قلم بند کرا دیتے تھے۔ "الفہرست" میں کتاب "السنن فی الفقہ" اور کتاب "المسائل فی الفقہ" کا ذکر ہے۔ انہوں نے ایک "مسند" بھی تالیف کی۔ ایک تصنیف "السیر" جو ان کے شاگرد نے تیار کی تھی ستر ہویں صدی عیسوی میں موجود تھی۔

امام اوزاعی امام ابو حنیفہ کے ہم عصر تھے۔ ان کا مذہب قدیم عراقی فقہا کے مسلک کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک بھی جو عمل آنحضورؐ سے شروع ہوا اور جسے خلفائے راشدین نے قائم رکھا اور ان کے بعد بھی قائم رہا۔ سنت رسول ہے خواہ وہ آنحضورؐ سے باقاعدہ احادیث میں مروی ہو یا نہ ہو۔ فقہ اسلامی کے جس طرح دوسرے دبستان آئمہ سے منسوب ہیں بالکل اسی طرح قدیم شامی فقہ کا دبستان الاوزاعی کے نام سے منسوب ہوا اور یہ مسلک نہ صرف شام بلکہ المغرب اور اندلس میں بھی رائج ہوا اور اوزاعی کے فتوے اندلس میں حکم بن ہشام کے دور تک چلتے رہے

امام اوزاعی کو بنو عباس کے دور میں بھی وہی احترام نصیب تھا جو امیہ کے دور میں تھا۔ ان کے شاگردوں میں سے ولید بن مزید بہت مشہور ہیں۔

اُوزُون حَسَن (وفات ۸۸۲ھ/۱۴۷۸ء) حسن بیگ بن علی بیگ بن قرہ عثمان، ترکوں کے ایک شاہی خانوادے کا امیر۔ ایک بڑی ریاست کا بادشاہ اپنے بلند قد و قامت کی وجہ سے اوزون کہلاتا تھا ۔ اس کی والدہ سارہ ایک مدبر خاتون تھی۔ ابتداً دیار بکر ان کا خاندانی مسکن تھا۔ والد کی وفات کے بعد اس کا بڑا بھائی جہانگیر تخت نشین ہوا۔ جس نے قرہ قوینلو کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ حسن بیگ نے جہانگیر کے مخالفوں کو شکست دی اور کردستان کے بیگوں کی کثیر تعداد کو مغلوب کر لیا۔ چونکہ حسن بیگ بھی جہانگیر سے ناراض تھا۔ اس فتح کے بعد اس نے ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء میں قلعہ دیار بکر میں جہانگیر کو محصور کر دیا۔ لیکن والدہ کے کہنے پر واپس دیار بکر لوٹ گیا۔ جلد ہی حسن نے ارزنجان اور ترجان پر حملہ کر کے اپنے بھائی کے عامل عربشاہ کو وہاں سے نکال دیا اور اس کے بعد قرہ جہ طاغ پر حملہ کیا۔ ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء میں جہانگیر کے حلیفوں کو شکست کھانا پڑی اور جہانگیر نے اپنا بیٹا یرغمال کے طور پر دیا۔ دوسرے بھائی نے بھی حسن بیگ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی دریائے دجلہ کے کنارے قلعہ حصن کیفا ایوبی خاندان کے کرد ملکوں سے چھین کر اپنے لڑکے جلیل کو دے دیا اور اس کے بعد سعرت اور ھتیم پر بھی قابض ہو گیا۔ اوزون حسن کو بہت جلد کامیابیاں حاصل ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں اس کا حریف جہان شاہ قرہ قویونلو جو اس وقت پورے ایران کا حاکم تھا۔ دیار بکر پر حملہ آور ہوا۔ یکم ربیع الثانی ۸۷۲ھ/۱۴۶۷ء کو جہان شاہ موش اور چپاخ چور پہنچ چکا تھا یہاں اوزون حسن کے بیٹے خلیل نے اس کی ہراول فوج کو شکست دی۔ سخت سردی کی وجہ سے جہان شاہ نے اپنی فوج کے اکثر سپاہیوں کو ان کے گھر واپس کر دیا۔ لیکن اوزون حسن نے ۱۲ ربیع الثانی ۸۷۲ھ/۱۱ نومبر ۱۴۶۷ء کو اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ جہان شاہ مارا گیا اور اوزون حسن نے میدان صاف پا کر وہ علاقے فتح کرنا شروع کر دیئے جن کا اب کوئی مالک نہ تھا وہ موصل ہوتا ہوا بغداد پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر آذربائیجان میں جہان شاہ کے بیٹے حسن علی نے ایک کثیر فوج جمع کی اور اس کے ساتھ ہی ابو سعید تیموری سے بھی مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ بھی حسن علی کی مدد کو آ گیا۔ ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء کو ابو سعید گرفتار ہوا اور اس کے حریف شہزادے یادگار محمد بن سلطان محمد نے اُسے قتل کر دیا۔ اس کی وفات کے بعد خراسان میں تیموری امراء کی حیثیت مقامی ہو کر رہ گئی تھی۔ اوزون حسن کے امراء نے بقیہ ایران پر بھی قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ہمدان پر اور موصل پر بھی امیر خلیل بیگ نے قبضہ کر لیا۔

اب اوزون خان ایشیا میں ایک بڑی طاقت بن گیا تھا جو عثمانیوں کی پیشقدمی کی راہ میں حائل تھی۔ تفلس سے واپسی پر تبریز کے مقام پر بیمار ہوا اور یہیں چونتیس برس کی عمر میں وفات پائی۔

اوزون حسن کی تین بیویاں تھیں۔ بڑی ملکہ کا نام سلجوق شاہ بیگم تھا۔ اس نے کاروبار حکومت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔

دوسری بیوی کا نام دسپینا تھا۔ جس سے اوزون حسن نے چونتیس سال کی عمر میں شادی کی تھی۔ یہ عیسائی تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا یعقوب اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ تیسری بیوی کرد ام ولد تھی۔

اوزون حسن کے لڑکوں کے نام محمد، سلطان خلیل، یعقوب یوسف، زین العابدین ہیں۔

اوزون حسن بڑا عادل اور انصاف پرور بادشاہ تھا۔ اس کے اوصاف و تقویٰ کی تعریف سب کرتے ہیں۔ اس نے بہت سے سلسلہ ہائے خیر شروع کیے تھے تبریز میں اس کی بنائی ہوئی مسجد اب بھی موجود ہے۔

اَوس، بنو مدینہ منورہ کا ایک قبیلہ جو یمن سے نکلا اور یثرب (مدینہ) میں آ بسا۔ اوس کے معنی عطیہ کے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں اوس الات اور اوس منات مشہور تھے۔ ایک اور قبیلہ خزرج تھا۔ اوس اور خزرج دونوں قبائل اسلام سے پہلے آپس میں لڑتے اور جھگڑتے رہتے تھے۔ یہ دونوں قبیلے اسلام سے قبل اپنی ماں قیلہ کے نام پر بنو قیلہ اور ہجرت نبوی کے بعد انصار کہلائے۔

ابن سعد کے مطابق ان کا نسب نامہ یہ ہے۔ اوس بن ثعلبہ بن عمرو بن عامر بن حارثہ بن امری القیس بن ثعلبہ بن مازن بن الازد بن الغوث بن نبت بن مالک بن زید بن کہلان بن سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

الاوس
مالک
النبیت (عمرو) — عوف — امرا القیس — جشم — مرۃ
النبیت (عمرو): الخزرج
الخزرج: الحارث — ظفر کعب
الحارث: حشم
حشم: عبد الاشہل — حارثہ (ذعورا)
امرا القیس: السلم — واقف (سالم)
السلم: غنم
جشم: خطمہ
مرۃ: عامر — قیس — زید
غطیمہ — وائل — امیہ
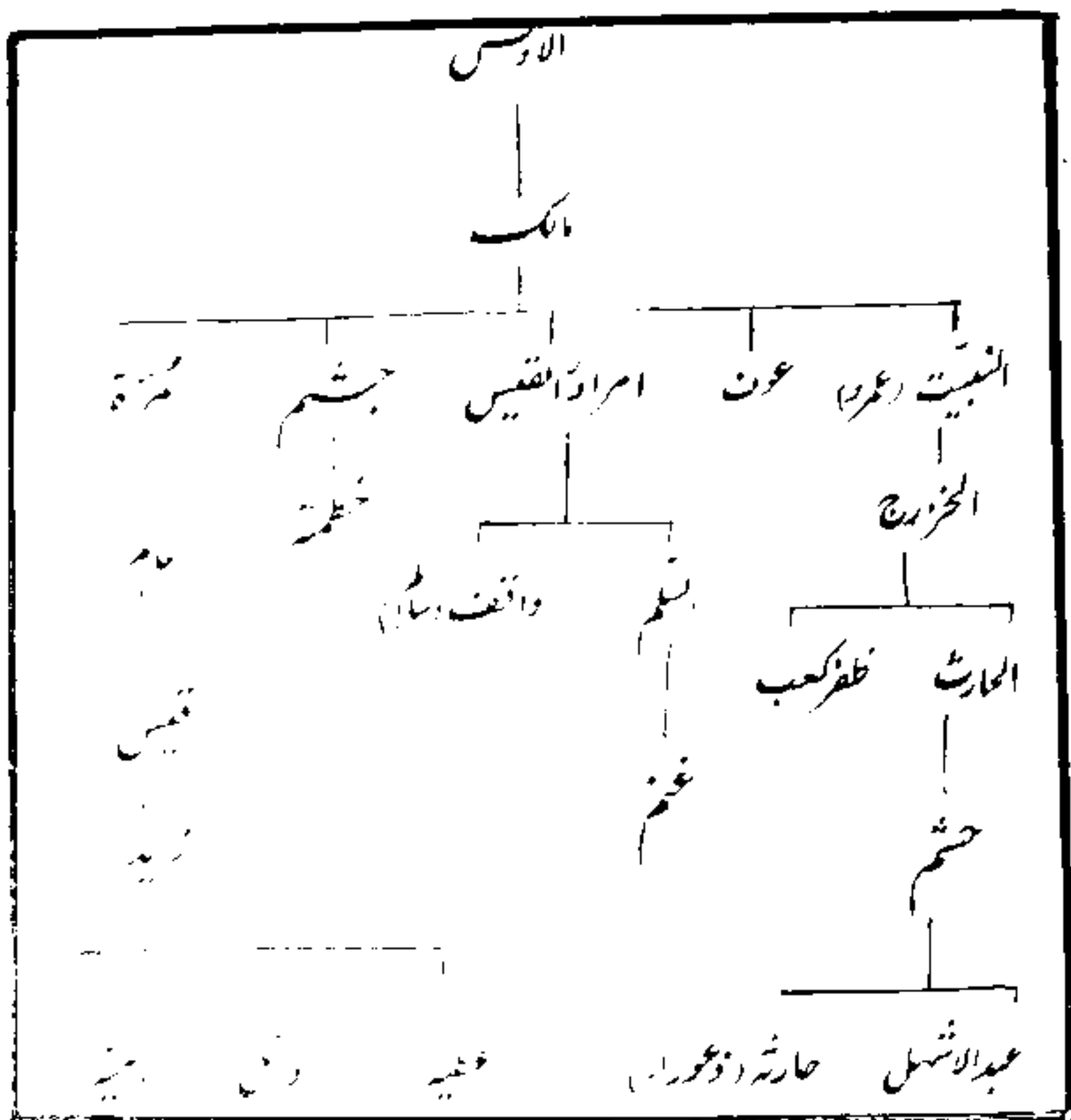
ہجرت سے قبل حضیر بن سماک بنو الاوس کا سردار تھا۔ جنگ [illegible] اس لڑائی میں اوس کے قبیلے نے خزرج کے قبیلے کو شکست دی تھی۔ [illegible] دونوں قبیلوں میں صلح نہیں ہو سکی تھی لیکن [illegible] کا سلسلہ [illegible] پہلے خزرج اور پھر اوس سے گفت و شنید کی [illegible] قبول کر لیا۔

اوس کی تعداد خزرج سے کم تھی لیکن [illegible] جنگ [illegible] سو تیس انصار میں سے ۶۱ اوسی تھے۔

بنی اوس کا مسکن مدینہ سے باہر کچھ فاصلے پر تھا [illegible] ہے۔ اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک [illegible] تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے تم آگ کے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے۔ پس اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ (۳: ۱۰۳) (نیز دیکھیے: انصار)

اوقات نماز عبادت کرنے کے اوقات معراج کی رات آنحضور کی امت پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ ۱۔ فجر صبح صادق سے طلوع آفتاب تک

۱۔ ظہر: سورج کے زوال سے لے کر سایہ کے ایک مثل تک بالاتفاق اور بعض ائمہ کے [illegible] ایک دو مثل (دوگنا) تک۔ ۲۔ عصر: سایہ کے دو مثل ہونے سے شروع ہو کر غروب آفتاب تک۔ ۳۔ مغرب: غروب آفتاب سے لے کر غروب شفق تک۔ ۵۔ عشاء: غروب شفق سے لے کر صبح صادق تک رہتا ہے۔

صحیح مسلم کی [illegible] حدیث میں اوقات نماز کے بارے یوں فرمایا گیا ہے۔ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اوقات نماز کے متعلق بارگاہ نبوی میں سوال کیا۔ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا [illegible] تم ہمارے ساتھ نماز پڑھتے رہو، تو تم سمجھ جاؤ گے چنانچہ آفتاب ڈھلنے کے بعد بلال کو اذان کا حکم دیا۔ اور سورج غارب ہونے پر نماز مغرب پڑھی اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھی۔ اس وقت شفق چھپ چکی تھی اور پھر دوسرے دن صبح صادق ہی میں نماز فجر ادا فرمائی اور اس دن بلال کو ظہر کی نماز کے لیے ذرا ٹھنڈے وقت اذان کہنے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد نماز عصر پہلے دن کے مقابلے میں ذرا دیر سے پڑھی [illegible] شفق غائب ہو جانے سے پہلے نماز مغرب پڑھی اور تہائی رات گذرنے پر عشاء پڑھی اور نماز فجر دن کے روشن ہونے پر ادا کی۔ اس کے بعد آنحضورؐ نے فرمایا کہ وہ سائل [illegible] نے نماز کے اوقات کے بارے میں پوچھا تھا کہاں ہے؟ اور فرمایا [illegible] ان دونوں [illegible] کے اوقات کے درمیان [illegible] کسی وقت بھی نماز ادا کر سکتے [illegible]

[illegible] نماز کے اوقات موجود [illegible]۔ یہودیوں کے ہاں تین اوقات [illegible]

[illegible] ۱۴ : ۱۷)

[illegible] کہ وہ ہر روز تین بار اپنے گھٹنوں کے بل [illegible] البتہ عیسائیوں کے [illegible] اوقات [illegible]

[illegible] نام [illegible] جسے علۃ الاولیٰ کہا جاتا [illegible] کوئی چیز موجود نہیں [illegible] زمانی لحاظ سے مقدم ہو [illegible] کے لحاظ سے مقدم [illegible] کسی چیز کے بنانے [illegible]

اولاد [illegible] نہ صرف والدین کے مابین محبت استوار اور [illegible] کا ذریعہ ہوتی ہے۔ بلکہ یہ خیر و برکت کا ذریعہ بھی [illegible] ہے۔

[illegible] شریعت [illegible] اولاد کی تعلیم و تربیت اور اس کی جسمانی اور اخلاقی صحت کے [illegible] بہت سی ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً جب لڑکا یا لڑکی پیدا ہو تو اسے نہلا دھلا [illegible] دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر اقامت کہنا سنت ہے۔ اگر بچے میں برداشت [illegible] دیکھیں تو ابتدائی ایام ہی میں اس کی ختنہ کرا دینی چاہیئے۔ ورنہ جب اس میں [illegible] پیدا ہو جائے تو فوراً یہ کام کرے۔ بچے کی پیدائش سے ساتویں روز اس کا عقیقہ کرنا [illegible] ہے لڑکے کے لئے دو بکرے اور لڑکی کے لئے ایک بکرا ذبح کرنا [illegible] گوشت یا تو کچا ہی تقسیم کر دیا جائے یا پکا کر احباب، و فقراء کی ضیافت کر دی [illegible] بچے کے بالوں کے برابر چاندی وزن کر کے خیرات کر دینا اور سر مونڈنے کے [illegible] لگانا [illegible] ہے۔ حسن سمرہ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا [illegible] لڑکا [illegible] عقیقے کے بدلے رہن ہے۔ ساتویں روز اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اور اسی روز اس کا نام رکھا جائے اور سر منڈوایا جائے۔ (ترمذی)

زمانہ جاہلیت میں عرب اولاد کے حقوق کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے بلکہ لڑکیوں کو تو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ اسلام نے اولاد کے بھی حقوق متعین کئے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: "افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مارنا بڑا بھاری گناہ ہے۔" (۱۷ : ۳۱) تعلیم و تربیت اولاد کا بہت بڑا حق ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ "والدین کا بہترین عطیہ اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت ہے۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا کہ آدمی کا اپنی اولاد کو ادب دینا ایک صالح خیرات کرنے سے بہتر ہے۔ (ترمذی)

ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا "لوگو! اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جائیں اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ترک نماز پر انہیں مارو اور اس وقت ان کے سونے کی جگہ الگ الگ کر دو۔" (ابو داؤد)

شفقت و مہربانی بھی اولاد کا حق ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت حسنؓ کو چوما اور پیار کیا اس موقع پر اقرع بن حابس تمیمی بھی موجود تھے انہوں نے کہا میرے دس فرزند ہیں مگر میں نے تو ان میں سے ایک کو بھی کبھی نہیں چوما تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی پر مہربانی نہیں کرتا۔ اس پر خدا بھی مہربانی نہیں کرتا۔" (بخاری)

اسلام والدین پر اولاد کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ایک فریضہ کی صورت میں عائد کرتا ہے۔ سورۃ التحریم میں بتایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ (۶۶ : ۶)

اولادِ شیخ بنو حمویہ صوفیا اور شافعی فقہاء کا ایک ایرانی خاندان اس کی ایک شاخ ہجرت کر کے شام چلی گئی اور متاخر ایوبی سلاطین الکامل اور اس کے بیٹوں کے عہد سلطنت میں خوب شہرت حاصل کی۔ اس قبیلے کا سب سے پہلا بزرگ ابو عبداللہ محمد بن حمویہ الجوینی ہے جس نے ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء میں وفات پائی جو ایک بہت بڑے صوفی فقیہہ اور تصوف کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اس خاندان کی شہرت کا دار و مدار صدر الدین کے بیٹوں اور خصوصاً فخرالدین یوسف پر ہے۔ وہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں پیدا ہوا۔ اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ الکامل نے ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں اسے اپنا سفیر مقرر کیا۔ جلد ہی اس نے ایک ماہر مدبر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۹ء میں ہوہن سٹاؤفن شہنشاہ فریڈرک ثانی کے دربار میں الکامل کا سفیر رہا اور بعد میں شہنشاہ کا دوست بن گیا۔

الکامل کے آخری عہد میں فخرالدین یوسف کئی جلیل القدر عہدوں پر فائز رہا الصالح نجم الدین ایوب بن کامل نے اسے مصری فوج کا سپہ سالار مقرر کیا نوران شاہ نجم الدین کا یہ نائب سلطنت مقرر ہوا۔ ۶۴۷ھ/ ۱۲۵۰ء میں ایک جنگ میں کام آیا۔ اس کے دوسرے بھائی عماد الدین عمر، کمال الدین احمد اور معین الدین حسن نے بھی اپنی سیاسی سرگرمیاں الکامل کے آخری دور میں جا کر شروع کیں۔ الکامل کی وفات کے بعد یہ تینوں بھی شاہی مجلس کے رکن چن لئے گئے۔

اولجہ، جنگ ایک جنگ جو صفر ۱۲ھ/ اپریل ۶۳۳ء میں مسلمانوں نے ایرانیوں کے ساتھ حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں بصرے سے پچاس میل کے فاصلے پر لڑی تھی۔ اولجہ، کسکر کے قریب خشکی کا علاقہ تھا، اسے وُلجہ بھی کہا جاتا

تھا۔ روم اور ایران کی زبردست سلطنتیں عرب کی دیرینہ دشمن تھیں۔

آنحضورؐ کی وفات کے بعد جب عرب کے اطراف میں فتنۂ ارتداد اور فتنۂ منکرین زکوٰۃ کے باعث بدامنی اور افراتفری کا بازار گرم ہوا تو ان دونوں حکومتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ ہرقل قیصر روم نے شام میں اور اردشیر حکمران ایران نے عراق میں فوجیں جمع کرنی شروع کردیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے انتہائی تدبر سے کام لے کر پہلے ہی مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی سرکردگی میں ایک دستۂ فوج عراق کی طرف روانہ کر رکھا تھا۔ اب مثنیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عراق پر حملہ آور ہونے کی باقاعدہ اجازت مانگی اور کہا کہ خالد بن ولید کو ان کی امداد کے لئے روانہ کریں۔ چنانچہ خالد بن ولید مدعیان نبوت اور مرتدین کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ابھی واپس نہ لوٹے تھے کہ راستے ہی میں فرمانِ خلیفہ کے مطابق فوجوں کا رخ عراق کی طرف پھیر دیا اور ابلہ میں مثنیٰ سے آکر مل گئے۔

جنگ ذات السلاسل اور جنگ تارن میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی اور ایران کی فوجوں کا بہت بڑا حصہ مارا گیا۔ اس تباہی خیز شکست کی خبر جب دربار ایران میں پہنچی تو اردشیر غم و غصہ سے بھر گیا اور فوراً ایک نامور جنگ جو اندرزگر کے زیر قیادت ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ جب اولجہ پہنچا تو ایک اور بہادر بہمن جازویہ کی سرکردگی میں دوسرا زبردست لشکر بھیجا۔ حضرت خالد بھی اطلاع پاکر مقابلے کے لیے یہاں آ گئے اور گھمسان کی جنگ شروع ہوئی اور آن کی آن میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ایرانیوں کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ ان کا سردار اندرزگر میدان جنگ میں پیاس کی شدت سے مرگیا۔ اس جنگ میں بہت سے عیسائی عربوں نے بھی شامل ہوکر ایرانیوں کی مدد کی تھی۔ ان کی بھی کثیر تعداد کام آئی۔

اولیاء

ولی کی جمع، دوست رفیق، اصطلاحاً خدا رسیدہ اور اہل اللہ۔ اللہ تعالےٰ کے دوست جنہیں قرب خداوندی حاصل ہے قرآن مجید کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے۔ "سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں ہے۔ (۶۲:۱۰) (نیز دیکھئے "ولی")

اولیا چلبی

(۱۰ محرم ۱۰۲۰ھ/۲۵ مارچ ۱۶۱۱ء — ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء)

اولیا چلبی (قلمی نام)، بن درویش محمد، مشہور مسلمان سیاح، استنبول میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد کوتاہیہ سے ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ کے بعد استنبول آئے تھے۔ استنبول کے قریب قاضی کوئی میں چلبی کا ایک انگور کا باغ تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی مالی حالت اچھی تھی۔ اسی چیز نے اسے سیاحت کا شوق پورا کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد سات سال تک شیخ الاسلام حامد آفندی کے مدرسے کا طالب علم رہا گیارہ سال مدرستہ القرآن میں قرأت کی مشق کرتا رہا اور قرآن مجید کو نہایت خوش الحانی سے پڑھنے میں شہرت حاصل کی۔ اسی وجہ سے سلطان مراد رابع کے شاہی دربار میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں دربار میں ایک سپاہی کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔

تقریباً چالیس برس سے بھی زیادہ عرصہ تک ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء سے جب کہ اس نے استنبول میں سیاحت کرنی شروع کردی تھی وہ اپنی ان طویل سیاحتوں کے حالات لکھتا رہا۔ جو اس نے کبھی نجی حالت میں اور کبھی سرکاری طور پر اور پھر امرائے دولت عثمانیہ کی ہم رکابی میں سلطنت عثمانیہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کیں۔ اس نے یہ حالات "سیاحت نامہ" کی دس جلدوں میں درج کیے۔

جلد اوّل میں استنبول کے خاص شہر اور اس کے گرد و نواح کا جلد دوم میں برسہ، ازمید، باطوم، طرابزون، انجازیہ، اقریطش، ارض روم، آذربائیجان جارجیا وغیرہ کا۔

تیسری جلد میں دمشق، شام، فلسطین، اردمیہ، سیواس، کردستان آرمینیا، رومیلیا (بلغاریہ، دوبرجا) کا۔

چوتھی جلد میں وان، تبریز، بغداد، بصرہ وغیرہ کا۔

پانچویں جلد میں وان، بصرہ، اوکزکوف، ہنگری، روس، اناطولیہ، بروسہ دردانیال، ادرنہ (اڈریانوپل)، مولڈیا، ٹرانسلوینیا، بوسینا، دلمانیہ، سوفیا وغیرہ کا۔

چھٹی جلد میں ٹرانسلوینیا، البانیا، ہنگری، اجوار، بلغراد، ہوٹسے گووینا، رگوسا، مانٹی نیگرو، کینزسا، کروشیا کا۔

ساتویں جلد میں ہنگری، بودا، ارلاد، تمسوار، بنت، روم، منصوار ٹرانسلوینیا، ولاچیا، مالڈیویا، کریمیا، قازق، جنوبی روس، قفقاز، داغستان اور ازق کا۔

آٹھویں جلد میں ازق، کافا، باغیچہ سرائے (کریمیا) استانبول، اقریطش مقدونیا، یونان، ایتھنز، ڈوڈی کنیز، پیلوپونیس، البانیہ، ویلونا، البصان اوکریڈا، ادرنہ کا۔

نویں جلد میں (سفر حج بسوئے مکہ) جنوب مغربی اناطولیہ، سمرنا، افیسس مدینہ، مکہ اور سویز کا۔ اور۔

دسویں جلد میں مصر (تاریخی مقامات کی سیر کے ساتھ) قاہرہ، بالائی مصر سوڈان، ایبے سینیا کا ذکر کیا ہے۔

اولیا چلبی نے مصر میں تقریباً آٹھ نو سال تک قیام کیا اور اپنے سفرنامے کی دسویں جلد بھی یہیں مکمل کی۔ اپنی زندگی کے آخری دن اس نے یہیں بسر کیے اور اپنی کتاب کی ترتیب میں مشغول رہا۔

اس کے سیاحت نامہ میں اگرچہ تفریحی باتیں بہت زیادہ ہیں اور کئی تفصیلات میں اس کا تخیل کارفرما ہے۔ مبالغہ آمیزی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ تاہم ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ تصنیف تاریخ ثقافت، عوامی روایات اور جغرافیہ سے متعلق معلومات کا ایک بھرپور خزانہ ہے

اولی الامر

صاحبان حکم۔ با اختیار لوگ۔ اولی الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں۔ ان میں ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علما، سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، ملکی انتظام کرنے والے حکام، عدالتی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی اور معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار شامل ہیں۔ یہ سب اطاعت کے مستحق ہیں۔ ان سے نزاع کرکے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں سے ولی الامر ہوں۔ پھر اگر تم میں کسی معاملے میں اختلاف ہوجائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو۔ (۴:۵۹)

اس آیت میں اولی الامر کے لئے مسلمان ہونا اور خدا اور رسول کا مطیع ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ان شرائط کو مختلف احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آنحضورؐ نے فرمایا۔

"مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند تا وقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے کچھ نہ سننا چاہیے اور نہ ماننا چاہیے۔"

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے صحابہ سے منجملہ دوسری باتوں کے اس بات کا بھی عہد لیا کہ "ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے دلیل موجود ہو۔"

گویا اولی الامر کا حکم اس صورت میں مانا جا سکتا ہے جب کہ وہ قرآن اور حدیث کے تابع ہو۔ اگر ایسا نہیں تو اس کا حکم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (نیز دیکھئے "اطاعت")

اونٹ

تشریح و محل: [illegible] قرآن مجید میں کفار کی توجہ جہاں مختلف چیزوں کی تخلیق کی طرف دلائی گئی ہے وہاں اونٹ کی خلقت کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے کہ کیا انہوں نے اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر سوچا کہ یہ اونٹ کیسے [illegible] ہے اور اس کو ٹھیک ٹھیک ان خصوصیات کے مطابق بنایا گیا جن خصوصیات کے [illegible] عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالے [illegible] "کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے۔" (۸۸: ۱۷)

[illegible] اونٹ کی قربانی جائز ہے۔ اسے ذبح کرنے کے فعل کو نحر کہتے ہیں [illegible] کی نالیوں کے درمیان میں گردن پر سے کاٹتے ہیں۔ یہاں سے [illegible] چاہیے جو ان ترجموں [illegible] سکے۔

اوہام جاہلیہ

دور جاہلیت کے غلط عقائد، جو گمان کے علاوہ کسی دلیل پر مبنی نہیں ہوتے۔ نیز ایسے عقائد جو سراسر انسانی ذہن کی تخلیق ہوں اور جنہیں کسی قسم کی وحی سے کوئی سند حاصل نہ ہو۔ اسلام ایسے تمام باطل عقائد و اوہام کی تردید کرتا ہے۔ ان عقائد کی بنا پر انسان شرک اور کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

یہ اوہام تقریباً ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں عربوں کے اوہام جاہلیہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں شگون لینا، جھاڑ پھونک، ستارہ پرستی، بت پرستی، انسان پرستی، جادو سحر اور قتل اولاد وغیرہ شامل ہیں۔

اوہام پرستی کا آغاز زمانہ قبل از تاریخ ہی سے ہوتا ہے۔ اس دور کا انسان تمام واقعات کو ان دیکھے اسباب کی طرف منسوب کیا کرتا تھا۔ قدیم آسٹریلیا کے لوگوں کے اوہام عجیب و غریب تھے۔ مثلاً قاتل کو تلاش کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ مقتول کی قبر کے پاس زمین کو صاف کر دیا جاتا تھا۔ ان پر جب کسی جانور کے پنجوں کے نشانات ملتے تو اس کے جانے کی سمت میں قاتل کے مسکن کا پتا ملتا تھا۔ اور مقتول کا کوئی عزیز اس سمت چل پڑتا۔ یہاں تک کہ راستے میں کوئی آبادی آجاتی۔ جہاں کے لوگوں کو وہ کھانے پر مدعو کرتا اور جسے بھی کھانے کے دوران میں کھانسی آجاتی، وہی قاتل سمجھ لیا جاتا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا جاتا۔ یہ لوگ جادوگروں کو مافوق قوتوں کے مالک سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ لوگ مرنے کے بعد سفید ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ تناسخ ارواح کے قائل تھے۔

جزائر مڈغاسکر کے لوگ سمجھتے تھے کہ زہر ہی شئے خدا ہے۔ یہ سرداروں، پروہتوں اور جادوگروں کو مخصوص قوتوں کے حامل سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خداؤں نے انسان سے ہمکلام ہونے کے لئے سب سے پہلے پرندوں کو بھیجا تھا۔ افریقی قبائل کے نزدیک ان کے آباؤ اجداد کی روحیں سانپوں میں رہتی ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کسی شخص کو کرمچھ کاٹ لے یا اس پر چھینٹیں ڈال دے تو وہ معتوب اور مردود ہے۔ قدیم امریکا کے قبائل کا بھی یہی حال تھا۔

وادی سندھ کے قدیم باشندے درختوں میں روح کے وجود پر عقیدہ رکھتے تھے۔ قدیم آریا جادو، منتروں، جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکوں پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی آواگون یا تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ ہندوؤں کے ہاں بہت سے اوہام نے رواج پایا۔ مثلاً اگر کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سفر میں تکلیف پہنچے گی اور اگر ہفتے کے روز فلاں کام کیا تو راحت ہوگی وغیرہ۔

ایران کے زرتشتی، مانوی اور مزدکی مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں عجیب اوہام پسند ہوتے تھے۔ مثلاً گوشت خوری روحانی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

قدیم عربوں کے اوہام جاہلیہ کے متعلق معلومات کا سب سے بڑا ماخذ قرآن مجید اور اس کی تفاسیر ہیں۔ اہل عرب میں یہ عقیدہ رائج تھا کہ چاند کی بعض تاریخیں اچھے اور بعض برے شگون کی حامل ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں تیرہ تاریخ کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ ایک اور رسم ان کے ہاں یہ رائج تھی کہ جب حج کے لئے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ گھر کے پیچھے سے دیوار پھاند کر یا ایک کھڑکی سی بنا کر داخل ہوا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے اوہام پر ضرب لگائی گئی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے۔

"لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔ نیز ان سے کہو: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے" (۲: ۱۸۹)

یہودیوں اور قدیم عربوں کے ہاں یہ رسوم رائج تھیں کہ ایام ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھایا جاتا تھا اور نہ اس کے ہاتھ سے پانی پیا جاتا تھا۔ گویا ان دنوں میں عورت اپنے گھر میں اچھوت قرار دی جاتی تھی۔ عربوں کے ہاں ٹونے ٹوٹکے اور شگون لینے کا اعتقاد عام تھا۔ کسی مصیبت یا بلا کے نزول پر پتھر کی کنکریاں پڑھ کر پھونکی جاتیں۔ ان کے عقائد کی رو سے اس طرح بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ جانوروں کے بولنے اور اڑنے کو نیک اور منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی جانور کسی کام پر جاتے ہوئے کسی شخص کا راستہ بائیں سے دائیں کاٹ جاتا تو اسے نیک شگون خیال کرتے اور اسے "سانح" کہتے اور اگر دائیں سے بائیں طرف راستہ کاٹ جاتا تو ان کے نزدیک یہ بدشگونی تھی۔ اسے "بارح" کہا جاتا۔ مرنے والے کی قبر کے ساتھ اونٹ باندھ دیا جاتا تو بھوک اور پیاس سے مر جاتا۔ ایسے اونٹ کو "بلیہ" کہا جاتا۔ خشک سالی کو دور کرنے کے لئے پہاڑوں میں ایک گائے کو لے جایا جاتا تھا اور اس کی دم کے ساتھ سوکھی گھاس باندھ کر اسے آگ لگا دیتے تھے اور پھر گائے کو پہاڑوں میں ہانک دیتے۔

"خون کا بدلہ خون" یہ قدیم عربوں کا خاص شعار تھا۔ ان کے عقیدہ کی رو سے اگر خون کے بدلہ میں خون نہ لیا جائے تو مقتول کے سر سے ایک چھوٹا سا کیڑا

نکل کر آسمان میں "قصاص" چیختا رہتا ہے۔ اس کیڑے کو ہامہ اور صدی کہتے تھے۔

جانوروں کا دودھ دوہنا ان کے نزدیک عورتوں کے لئے معیوب تھا۔ اگر کسی قبیلہ کی کوئی عورت دودھ دوہتے ہوئے دیکھی جاتی تو وہ خاندان لوگوں کی نظروں سے ہمیشہ گر جاتا۔ جس آدمی سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا۔ اسے گرم ریت پر بٹھا دیتے۔ مردہ جانوروں کا گوشت عموماً کھایا جاتا، جو اونٹنی بھیڑ یا بکری دس بچے جن لیتی۔ اسے چھوڑ دیا جاتا۔ اس کے مرنے پر اس کا گوشت صرف مردوں کے حصے میں آتا۔ عورتوں کو ایسا گوشت کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ کسی کام کی تکمیل پر اونٹوں کو کھلا چھوڑ دینے کی منت ملتے تھے۔ اگر کسی بکری کے مادہ بچہ پیدا ہوتا تو مالک اسے رکھ لیتا اور نر پیدا ہونے کی صورت میں اسے بتوں کی نذر کر دیا جاتا۔

قدیم عربوں کے ہاں قسم لینے کا طریقہ یہ تھا کہ آگ جلا کر نمک اور گندھک پیس کر ڈالتے۔ یہ آگ "ہولہ" کہلاتی۔ اس پر قسم کھائی جاتی۔ فال نکالنے کے لئے خانہ کعبہ میں سات تیر رکھے ہوئے تھے۔ ہر تیر پر ایک علامت بنی ہوتی تھی۔ یہ علامات بعض امور کی انجام دہی کے لئے اور بعض کاموں سے منع کرنے سے متعلق تھیں۔ ان تیروں سے فال نکالنے کو "ازلام" کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ بتوں کو جملہ قدرتوں کا مالک سمجھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ روح ایک پرندہ یا جانور ہے، جو انسان کی پیدائش کے وقت جسم میں گھس جاتا ہے اور پرورش پاتا رہتا ہے، جب انسان مر جاتا ہے تو پرندہ قبر کے گرد چیختا ہے۔ یہاں تک کہ ایک الّو کے برابر ہو جاتا ہے۔

مشرکین عرب بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے تھے اور انہیں مقدس سمجھتے اور طرح طرح کے توہم پرستانہ عقائد ان کے ساتھ وابستہ کر دیتے تھے ایسے ہی چار جانوروں کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ المائدہ میں آیا ہے:۔

"بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام میں سے کوئی بھی خدا نے نہیں ٹھہرائی۔ لیکن جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، وہ اللہ پر جھوٹ کہہ کر افترا کرتے ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں، جو سمجھ بوجھ سے محروم ہیں۔" (۵: ۱۰۳)

مولانا مودودی "تفہیم القرآن" میں لکھتے ہیں کہ بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے تھے، جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ پیدا ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا تھا نہ اس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اون اتارا جاتا۔ اسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیئے۔ سائبہ اس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ کے نذر کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیئے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو، اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ اس بکرے کو کہتے تھے، جو بکری کا پہلا نر بچہ ہوتا تھا، اسے خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا تھا۔ اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کی بجائے چھوڑ دیا جاتا تھا اور اسی کا نام وصیلہ تھا۔ اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بوڑھے اونٹ کو حام کہہ کر چھوڑ دیا جاتا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفہ سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔ اسے بھی حام کہا جاتا تھا۔

غیر مرئی ارواح کو اہل عرب "جن" کہا کرتے تھے۔ جنوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ حسب خواہش ہر شکل میں نمودار ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ آج بھی اکثر مسلمانوں میں رائج ہے۔ عربوں کا جنوں کی بابت یہ خیال تھا کہ وہ جسم رکھتے ہیں۔ جن کے اوپر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں، جنوں کو اتنی قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جو شکل چاہیں اختیار کر لیں، ان کا مسکن ویرانے، پہاڑ، درخت، کنوئیں اور وادیاں بتلائے جاتے تھے۔ عربوں نے ان جنوں کی بہت سی قسمیں کر رکھی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک "غول" تھی۔ غول کے لفظی معنی حملہ کرنے یا برباد کرنے کے ہیں یہ غول مذکر اور مؤنث دونوں جنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤنث جن سعلاۃ کہلاتے تھے۔

قدیم عربوں کا ایک اور وہم سب سے زیادہ قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رزق کی کمی اور اولاد کی زیادتی کے باعث یہ لوگ قتل اولاد کو جائز سمجھتے تھے۔ خصوصاً بیٹیاں پیدا ہوتیں، تو انہیں اس باطل نظریے کے تحت، زندہ دفن کر دیا جاتا تھا کہ وہ بیاہی جائیں گی اور ان کے ہاں داماد کا رشتہ جڑے گا۔

یہودیوں کے ہاں بھی عربوں کی طرح بہت سے اوہام رائج تھے۔ مثلاً نیا چاند نمودار ہونے پر قربانی پیش کرنا۔ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو متبرک اور مقدس سمجھنا وہ یہوداہ کا کفارہ بکروں کی صورت میں پیش کیا کرتے تھے اور ان بکروں کو جنگل کی طرف دھکیل دیا جاتا۔ یہ لوگ بیل، گائے اور سانپ کی پرستش کرتے تھے۔ اسرائیلی معابد میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی۔ اس آگ میں قربانی کے جانور پورے کے پورے ڈال دیئے جاتے تھے۔ خشکی کی تلافی کے طور پر قربانی دی جاتی تھی۔ ہفتہ کا روز "سبت" کہلاتا تھا۔ یہ روز مقدس ہوتا تھا اور اس روز یہودی کوئی بھی کام نہ کرتے۔ ان کے یہاں سات کی گنتی بہت مقدس سمجھی جاتی تھی۔ ہر ساتواں مہینہ اہم ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر ساتویں سال زمینیں بلا کاشت چھوڑ دی جاتی تھیں۔ ہر پچاسویں سال جوبلی منائی جاتی۔ اس روز زمینیں اصل مالکوں کو لوٹا دی جاتیں۔ فال نکالنے کے لئے یہودی پانسے پھینکتے تھے۔ نیز جادو ٹونے کا بھی ان کے ہاں عام رواج تھا۔

اگرچہ مذہب اسلام نے ہر طرح کے اوہام کو باطل قرار دیا ہے اور ان کی بیخ کنی کرنا چاہی۔ لیکن اکثر مسلمان آج بھی ان اوہام کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ناخواندہ اور نیم خواندہ طبقے کا تو ذکر کیا، خواندہ مسلمانوں کے ہاں بھی اوہام پرستی کی بہت سی باتیں مل جاتی ہیں۔ اوہام جاہلیہ کو اس طرح فروغ دینے میں صنف نازک کا ہاتھ بڑا ہے اور اسی چیز نے مسلمانوں میں تعویز گنڈے، دم درود اور جھاڑ پھونک کو رواج دیا ہے۔

اویس اوّل

اویس اوّل ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء - ۷۷۵ھ/۱۳۷۴ء، خاندان جلائریہ ایلکان کا دوسرا بادشاہ۔ باپ کا نام حسن بزرگ اور والدہ کا دلشاد خاتون بنت دمشق خواجہ چوپان تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۵ء میں بغداد کا تخت نشین ہوا۔

اس وقت تبریز پر قبچاق کے خان جانی بیگ کا قبضہ تھا۔ ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء میں جب اویس کو معلوم ہوا کہ جانی بیگ اخی جوق کو اپنا نائب بنا کر چلا گیا تو اویس نے اس پر حملہ کر دیا اور تبریز پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بعض غلط حکمت عملیوں کی وجہ سے دوبارہ بغداد کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں شیراز کے محمد مظفر نے اخی جوق کے خلاف لشکر کشی کر کے اسے تبریز سے نکال دیا۔ لیکن جونہی اسے معلوم ہوا کہ اویس اس کی طرف آ رہا ہے تو وہ وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور تبریز دوبارہ اویس کے قبضہ میں آ گیا۔

۷۶۵ھ/۱۳۶۳ء میں بغداد کے والی خواجہ کی بغاوت پر اویس کو بغداد آنا پڑا۔ اور گیارہ مہینے تک بغداد میں قیام کر کے اس نے بغاوت کو فرو کیا۔ مغرب کی طرف بڑھا اور بیرام خواجہ کے بھائی سے موصل چھین لیا۔ اس کے بعد ماردین پر قبضہ کر لیا اور قرہ کلیسا کے راستے تبریز واپس آیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ والی شیروان

دو مرتبہ ترن باغ کے باشندوں کو اس کی غیر حاضری میں زبردستی شیرواں لے گیا۔ چنانچہ ادریس کے سپہ سالار بیرم بک نے کاؤس کو شیروان کے قلعے میں محصور کر لیا۔ جسے ادریس نے تین ماہ بعد دوبارہ اپنے ایک باجگزار کی حیثیت سے بحال کر دیا۔

ادریس نے تپ دق کی بیماری میں وفات پائی۔ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو بالکل ایرانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ادریس ایک جذباتی آدمی تھا۔ بہت حسین و جمیل تھا۔ جب وہ باہر نکلتا تو بغداد کے لوگ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق دوڑتے تھے۔ رحم دل، عادل اور جری تھا۔ علم و ادب کا شائق تھا۔ وہ بلند مرتبہ خطاط، انشا پرداز اور شاعر تھا۔

تبریز میں ایک بڑی شاندار عمارت "دولت خانہ" کے نام سے بنوائی۔ اس کے پانچ بیٹے حسن، جلال الدین حسین، شیخ علی، غیاث الدین احمد ناصر اور بایزید اور ایک بیٹی شندو تھی۔

اویس قرنی

رح اویس بن عامر تابعین کے سردار، یمن کے رہنے والے تھے۔ آنحضور کی حیات میں موجود تھے اور غائبانہ اسلام [illegible] روایات کے مطابق اپنی ضعیف والدہ کی خدمت میں [illegible] آنحضور [illegible] زندگی تاریخ میں [illegible] اویس قرنی [illegible] ۶۳۹ء میں [illegible] حضرت عمر فاروق سے ملاقات کی۔ پھر [illegible] حضرت عمر [illegible] کی [illegible]

[illegible] حضرت علی کی جانب سے [illegible] دمشق میں وفات [illegible]

[illegible] کہ تابعین میں سب سے بہتر ہیں

[illegible] تیر [illegible] شکل میں دریائے نیل کی [illegible] میں موجود ہیں۔ اس طرز کی تعمیرات کے نمونے مصر کے علاوہ [illegible] ہندوستان [illegible] انڈ [illegible] ملتے ہیں۔

اہرام مصر [illegible] تعمیرات کا سلسلہ [illegible] لمبی مدت تک مصر کے پہلے حکمران خاندان سے لے کر ۲۰۰۰ برس بعد تک کے بطلیموسی دور تک ہے۔ تقریباً ۲۳۰۰ ق م سے پہلے کی چار صدیاں اہرام کی تعمیر میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ عام طور پر مقبرے اینٹوں یا چوکور پتھروں سے بنائے جاتے تھے۔ تیسرے خاندان کے بادشاہ جوزر کے عہد میں امحوطپ نامی ماہر تعمیرات نے پہلی بار ان میں چوکور پتھروں کا استعمال کیا۔ اس نے جوزر کے لیے جو اہرام تعمیر کیا، اس کی بلندی ساٹھ میٹر، جو بنیاد پر لمبائی اور چوڑائی علی الترتیب ایک سو بیس اور ایک سو آٹھ میٹر [illegible] چوتھے خاندان کے پہلے فرعون سنوفرو کا مقبرہ ۹۸ میٹر بلند اور ۱۸۸ میٹر چوڑا ہے۔

غزہ کے مقام پر موجود تین اہرام، قاہرہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں یہ چوتھے خاندان کے تین فرعونوں خوفو، خعفرع اور منکورع کے مقبرے ہیں۔ فرعون خوفو کا مقبرہ سب سے پرانا اور سب سے بڑا ہے۔ بنیاد پر یہ مربع شکل میں ہے جس نے تیرہ ایکڑ کے رقبے کو گھیر رکھا ہے۔ اس کا ہر ضلع ۲۳۰ میٹر ہے اور اصل بلندی ۱۴۶ میٹر ہے جو اب ۱۳۷ میٹر رہ گئی ہے۔ ہر سمت کا زاویہ ۵۱ درجے ہے۔ اس کی تعمیر زرد رنگ کے چونے کے پتھر سے ہوئی ہے۔ اس کے اندرونی ہال میں جہاں فرعون کی لاش رکھی گئی تھی تقریباً ۲۳ لاکھ گرینائٹ کی سنگی اینٹیں چنی گئی ہیں۔ اندر داخل ہونے کے لئے شمال کی جانب زمین سے اٹھارہ میٹر بلند دروازہ ہے۔ جو ایک زمین دوز سرنگ میں کھلتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کی تعمیر پر ایک لاکھ مزدور کوئی بیس برس تک مصروف رہے تھے۔

دوسرے مصری اہرام میں سے الوسر کے مقام پر پانچویں مصری خاندان کے تین اہرام ہیں۔ ان میں سب سے بڑا نفرر کیبر کا ہے جو ۷۰ میٹر بلند، ۱۰۶ میٹر لمبا چوڑا ہے۔ صقاریہ کے مقام پر پانچویں خاندان کے آخری بادشاہ، چھٹے خاندان کے چار بادشاہ اور تین ملکہ اور ساتویں خاندان کے فرعون رابی کے مقبرے ہیں۔ مغربی تھیبس کے علاقے میں موجود فرعون منتوحوطپ کا اہرام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں نہ کوئی ایوان ہے اور نہ کوئی دروازہ ہے۔ اسی طرح لشط کے مقام پر سیسوترلیس اوّل کا اہرام بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی بیرونی دیواروں کے اندر ریت اور دوسرا ملبہ بھر دیا گیا تھا۔ تاکہ محنت کی بچت ہو۔

بارہویں فرعون خاندان کے اہرام دہشور، الاہون اور ہوارا میں موجود ہیں جو مٹی کی اینٹوں سے تعمیر کردہ ہیں۔ ابی دوس کے مقام پر اٹھارہویں خاندان

کے پہلے بادشاہ آحمس اول نے اپنی بیوی تیطیسری کے لئے تعمیر کرایا تھا اس کے بعد چوبیسویں خاندان تک کسی اور فرعون نے ایسے مقبرے تعمیر نہیں کرائے۔ پچیسویں خاندان نے سوڈان میں اپنے لئے ایسے بہت سے اہرام بنوائے جن میں سے اکثر شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں۔

اہلِ بیت گھر والے، رشتہ دار، کنبے کے لوگ۔ اصطلاح میں آنحضورؐ کے گھر والوں کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اہلبیت کا لفظ دو جگہوں پر آیا ہے۔ "ابراہیم کے گھر والو، تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔" (۱۱: ۷۳)

"اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔" (۳۳: ۳۳)

اس سورت میں یہ اصطلاح ازواج مطہرات اور اولاد نبی کے لئے خصوصا اور قریبی رشتہ داروں کے لئے عموماً استعمال ہوئی ہے۔ البتہ بعض کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے اور وہ تمام کے تمام بنو المطلب بلکہ بنو ہاشم کو بھی اہل بیت میں شامل کرتے ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک اہل بیت سے مراد صرف آنحضورؐ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہیں۔ ابن جریر، ترمذی، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ "یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی۔ اس وقت گھر میں یہ چاروں حضرات موجود تھے آنحضورؐ نے ان چاروں کو کمبل میں لے لیا اور فرمایا کہ یہ میرے اہلبیت ہیں" علامہ قرطبی اور حافظ ابن کثیر نے اہل بیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ ان چاروں حضرات کو بھی شامل کیا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت زینبؓ کی شادی کے موقعہ پر آنحضورؐ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے تو فرمایا "السلام علیکم اہل البیت ورحمۃ اللہ" (بخاری کتاب التفسیر آیت ۲۲: ۳۳) (نیز دیکھئے "آل رسول")

اہلِ حدیث ایک خاص مسلک کے پیروکار۔ ان کے علاوہ یہ ترکیب کبھی اہل الحدیث، اہل سنت، اہل الاثر، سلفی اور اثری کے معنوں میں اور کہیں اسی خاص مسلک کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

تقریباً تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی میں اس نام (اہل حدیث) کی ابتدا ہوئی۔ اگرچہ اس مسلک کے حامل کہتے ہیں کہ "یہ مسلک آنحضورؐ کے زمانے سے موجود ہے اور ہر دور میں موجود رہا۔" لیکن بطور ایک منظم اور مخصوص جماعت کے، اہل حدیث کی اصطلاح اور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند میں اس وقت اپنائی گئی جب بعض مخالف لوگوں نے انہیں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد کے ساتھ اشتراک کی بنا پر نجدی کہنا شروع کیا۔ مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی نے ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں ہندوستان میں اس مسلک کو پھیلایا اور ان کے سینکڑوں شاگردوں نے اسے تحریک کی شکل میں ملک کے دور دراز علاقوں میں پہنچا دیا۔

اہل حدیث حضرات کے نزدیک حدیث و سنت قرآن مجید کے ساتھ اسلامی شریعت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ وہ دین و شریعت کے معاملات میں کسی شخص کی تقلید کے قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے پیروکار محمد بن عبدالوہاب کے ہم مسلک ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ نجدی امام احمد بن حنبل کے مقلد ہیں۔ لیکن یہ کسی امام کے مقلد نہیں۔

اس کے علاوہ توحید کے مسئلے میں بھی اہل حدیث کا ایک خاص تجریدی نظریہ ہے وہ ہر اس رسم اور عقیدے کے خلاف ہیں جو ذرا سا بھی توحید کے تصور پر اثر انداز ہوتا ہو۔ وہ انبیائے کرام کی عصمت اور عبودیت و بشریت کے شدت سے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کو ہے نیز مجالس میلاد، زیارت مقابر اور عرس وغیرہ سب بدعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب نہیں مانتے۔ نہ انبیاء کو ان کی ظاہری قبروں میں زندہ مانتے ہیں۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاضر و ناظر نہیں جانتے۔

نماز میں رفع یدین کرتے ہیں۔ ہاتھ سینے پر باندھتے ہیں امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھتے اور آمین اونچی آواز سے کہتے ہیں۔ جہری نمازوں میں بسم اللہ بھی اونچی آواز سے پڑھتے ہیں۔ رمضان میں تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھتے ہیں۔ وتر نماز میں دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھتے ہیں۔ ایک ہی دفعہ تین طلاقوں کے قائل نہیں بلکہ ان تینوں کو ایک ہی طلاق تصور کرتے ہیں۔ اذان میں ترجیع و تثویب کے قائل ہیں۔

یہ مسلک بیسویں صدی کے آغاز میں ہند و پاک میں ایک تحریک کی شکل میں پھیلنا شروع ہوا۔ دہلی میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے ایک ملکی تنظیم قائم کی گئی جس نے مکتبوں اور درسگاہوں کے قیام، مبلغوں کے وعظ اور جلسوں کے ذریعے پورے برصغیر میں اس مسلک کو عام کیا۔ اس وقت پاکستان میں جمعیت اہل حدیث کے نام سے ان کی مشہور تنظیم ہے۔

یہ لوگ شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، سید احمد بریلوی کو بھی اپنا ہم مسلک قرار دیتے ہیں۔

اہلِ حق مغربی ایران میں ایک مذہبی گروہ ہے جس کے اکثر عقائد باطنی اور مخفی ہیں۔ حروفی فرقے کے لوگ بھی اس اصطلاح کو اپنے لئے استعمال کرتے ہیں اسی طرح بعض صوفی لوگ بھی اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس فرقے کی بہت سی شاخیں ہیں۔ لیکن ان سب کے معتقدات میں کوئی وحدت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔

ان کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کئی بعد دیگرے سات تجلیوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اس کی اس جلوہ گری کو یہ اس کے تجسیم ذکی [illegible] جودہ بہتا، بیٹا ہے۔ ہر مرتبہ جب خدا کا اس طرح سے ظہور ہوتا ہے تو [illegible] چار فرشتے ہوتے ہیں جو اس سے قریبی طور پر منسلک ہوتے ہیں۔

انفرادی نماز کا ذکر ان کے ہاں برائے نام ہے لیکن اجتماع [illegible] ہیں۔ جس میں ہر قسم کی مشکلات کا حل مل جاتا ہے۔ یہ اجتماعات [illegible] بعد نیز تمام اہم واقعات کے سلسلے میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان اجتماعات میں [illegible] قرآن پاک موسیقی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

مذہبی تقریبات پر مجالس ذکر منعقد ہوتی ہیں اور بعض درویشوں پر موسیقی کی دھنوں سے وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان پر حالت بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اس حالت میں جلتے ہوئے کوئلوں پر چل سکتے ہیں اور انہیں اپنے ہاتھ میں اٹھا سکتے ہیں۔

ان کے ہاں ایک رسم "سبز نمودن" ہے جس کے معنی زندہ کرنا یا روح پھونکنا کے ہیں۔ چنانچہ ان اجتماعات کی لازمی خصوصیت نذر و نیاز ہے۔

"فرقان" میں چودہ قسم کی خون والی اور بے خون قربانیوں کا ذکر ہے۔ قربانی کے مراسم مقرر ہیں۔ مثلاً ہڈیوں سے گوشت جدا کر کے ہڈیوں کو زمین میں دفن کر دیا

جاتا ہے اور ابلا ہوا گوشت اور دوسری نذر و نیاز شکر روٹی وغیرہ حاضرین میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

ایک اور رسم "سرسپردن" ہے جس طرح ہر درویش کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک روحانی معلم (مرشد) ہو اسی طرح ہر اہل حق کا سر ایک پیر کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس رسم کو ادا کرتے وقت پانچ افراد جو فرشتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس بچے کے اردگرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسم ادا کرنے والا سر کے صدقے میں ایک مسقطی جوز توڑ دیتا ہے پھر اسے تعویز کے طور پر چاندی کی ایک تختی کیساتھ جسے جوزہ کہتے ہیں۔ اس پر شیعی کلمہ شہادت لکھا ہوتا ہے پہن لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس بچے اور شیخ کے درمیان خونی رشتے جیسا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

اخلاقی تکمیل کو حاصل کرنے کے لئے ایک مرد اور عورت کے درمیان اخوت داری قائم کر دی جاتی ہے اور انہیں بہن بھائی کہا جاتا ہے۔ اس رسم کو شرط اقرار کہا جاتا ہے۔

ان کے نزدیک روزے صرف تین ہیں جنکو بڑی پابندی سے رکھا جاتا ہے یہ دن موسم سرما میں آتے ہیں۔

یہ لوگ مغربی ایران میں لرستان، کردستان اور آذربائیجان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ایران میں تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔ عراق میں کرکوک اور سلیمانیہ کے کرد اور ترکمان قبائل میں بھی یہ لوگ موجود ہیں۔ موصل میں بھی ان کی کچھ تعداد ہے۔

اہلِ ذکر وہ لوگ جن کا ذکر کیا یا جو ذکر کرتے ہیں۔ ذکر کے معنی یاد میں لانے حفاظت کرنے، پند و نصیحت اور ثنا و تعریف کے ہیں۔ ذکر دو طرح کا ہوتا ہے۔ قلبی۔ لسانی

اہل ذکر کی ترکیب قرآن میں دو جگہ پر آئی ہے۔

سورۃ النحل میں کہا گیا ہے "اے محمدؐ ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے اہل ذکر سے پوچھ لو۔ اگر تم خود نہیں جانتے۔" (۱۶: ۴۳)

سورۃ الانبیاء میں ہے۔ "اور اے محمدؐ تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔" (۲۱: ۷)

قرآن مجید میں ذکر کا لفظ کئی جگہوں پر قرآن کے لئے آیا ہے۔ "یقیناً ہم نے ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (۱۵: ۹)

گویا اہل ذکر کے معنی قرآن مجید کے ماننے والوں کے بھی ہیں۔

امام جعفرؒ کا قول ہے کہ "اہل ذکر ہم ہیں" حضرت ابن عباسؓ، عبداللہ بن سلام اور سلمانؓ نے اہل ذکر سے مراد یہودی اور نصاریٰ لیے ہیں۔ امام بغوی کے نزدیک اہل ذکر سے مراد اہل کتاب ہیں جو ایمان لا چکے ہیں۔ الازہری اور الزجاج نے اہل ذکر سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جنہیں امتوں اور ادیان کا علم ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

مولانا مودودیؒ نے اہل ذکر سے مراد اہل کتاب ہی لیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل ذکر سے مراد وہ تمام علماء ہیں جنہیں قرآن مجید اور ادیان سابقہ کی کتابوں کا علم ہے۔

اہلِ ذمہ غیر مسلم، ذمی جو اسلامی ریاست میں رہیں اور جزیہ ادا کریں۔ جزیے کے عوض ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اسلامی ریاست کا فرض ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست میں اہل ذمہ مندرجہ ذیل حقوق رکھتے ہیں۔

۱۔ ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے گا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمانوں کے قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔

۲۔ تعزیرات میں ذمی اور مسلمان کا درجہ برابر ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمی کو بھی دی جائے گی۔

۳۔ دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے حضرت علیؓ کا ارشاد ہے ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں۔" یعنی ان کے مال کی حفاظت ویسی ہی ہونی چاہیئے جیسی مسلمانوں کے مال کی ہوتی ہے

۴۔ ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا اس کو گالی دینا، مارنا پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔

۵۔ عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں۔

۶۔ ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا مسلمان کو قتل کرنا وغیرہ بھی ان کے حق میں ناقض ذمہ نہیں ہے۔

۷۔ ذمیوں کے شخصی معاملات ان کی شریعت کے مطابق طے کئے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ البتہ جن افعال کی حرمت ان کے مذہب میں بھی ثابت ہے ان سے تو بہر حال انہیں روکا جائے گا۔

۸۔ خالص اسلامی آبادیوں میں ذمیوں کی جو عبادت گاہیں پہلے سے موجود ہیں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنالینے کا حق ہے لیکن نئی عبادت گاہیں بنانے کا حق نہیں ہے

۹۔ وہ مقامات جو خالص اسلامی آبادی میں نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔

۱۰۔ جزیہ و خراج کی وصولی میں ذمیوں پر تشدد کرنا منع ہے۔ ان کے ساتھ نرمی کی تاکید کی گئی ہے اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے وہ نہ اٹھا سکیں۔ جزیہ کی مقدار مقرر کرنے میں بھی ان پر تشدد کرنا منع ہے۔

۱۱۔ جو ذمی محتاج اور فقیر ہو جائیں انہیں نہ صرف یہ کہ جزیہ معاف کر دیا جائے گا بلکہ ان کے لیے اسلامی خزانہ سے وظائف بھی مقرر کئے جائیں گے۔

۱۲۔ اگر کوئی ذمی مر جائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ورثہ پر اس کا بار ڈالا جائے گا۔

۱۳۔ مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموالِ تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائے گا۔

۱۴۔ ذمیوں سے فوجی خدمت نہیں لی جا سکتی۔ دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کا فرض ہے۔

اہلِ رائے قیاس کرنے والے ذاتی رائے رکھنے والے۔ اہل حدیث

اس اصطلاح کو اپنے مخالف فقہاء کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ رائے کا مطلب "صاحبِ رائے" تھا۔ فقہاء مسائل فقہی میں فیصلے کرنے کے لیے قیاس اور رائے سے مدد لیتے تھے اور اس کا اطلاق انسانی دلیل کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن اہل حدیث اس بات کو ناجائز سمجھتے تھے کہ رسول اللہ سے مروی احادیث کو رائے کی بناء پر رد کر دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جو کسی خاص مسئلے میں اپنی ذاتی رائے کو دوسرے گروہ کے علماء کے مقابلے میں استعمال کرتے تھے اصحاب الرائے یا اہل الرائے کہا جانے لگا۔ اگرچہ فقہا میں کوئی دبستان بھی اپنے آپ کو اہل الرائے کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ اہل حدیث کے نقطۂ نظر کے مطابق امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مقلدین اسی طرح امام مالکؒ اور ان کے مقلدین خاص طور پر اہل الرائے ہیں۔ اہل حدیث کے اس طعن کی وجہ سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا کہ اہل الرائے حنفیوں ہی کا لقب ہے۔ حالانکہ خود امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ کسی حدیث کے مقابلے میں میری رائے پتھر پر دے مارو۔ جبکہ امام شافعیؒ اور ابن قتیبہ وغیرہ کے نزدیک حنفی ہی اہل الرائے ہیں۔

اہلِ سنت والجماعت سنت رسولؐ اور آثار صحابہؓ پر عمل کرنے والے مسلمانوں کا سوادِ اعظم۔ اپنے جامع مفہوم میں اسلام کے دو بنیادی فرقوں میں سے ایک۔ جن لوگوں نے اسلامی جمہوریت و خلافت، سنتِ رسولؐ اور آثار صحابہؓ پر عمل پیرا ہونے کا دعوے کیا اہلسنت کہلائے اور جو لوگ سنت سے انکار کرتے تھے، خوارج اور معتزلہ کہلاتے۔ خوارج اور معتزلہ کا عروج دوسری صدی ہجری میں ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد یہ فرقے ختم ہو گئے۔ تاہم مسئلہ خلافت پر ایک اختلافی گروہ شیعان علیؓ کا تھا، جو آگے چل کر اہل تشیع یا شیعہ کہلاتے۔ اہل سنت پیروکاروں کے معنی میں سنی بھی کہلاتے ہیں۔ جبکہ خوارج اور معتزلہ کی تعلیمات آگے چل کر عراق اور ہندوستان میں نمودار ہوئیں۔ انہیں منکرین حدیث یا اہل قرآن کہا جاتا ہے۔ انکارِ سنت کا یہ دوبارہ آغاز تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں ہوا۔

ہندوستان میں اس کی ابتدا کرنے والے سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی تھے۔ عام طور پر مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع ہیں۔ انہیں ماننے والے بالترتیب سنی اور شیعہ کہلاتے ہیں۔ جبکہ اہل سنت والجماعت بہت سے دیگر عقائد رکھنے والے لوگوں کو اپنے دائرہ میں شامل نہیں کرتے۔ البغدادی کے نزدیک اہل سنت وہ لوگ ہیں جو آنحضورؐ کے طریقے (سنت) اور اصحاب کے مسلک پر ہیں۔ اس نے اہل الرائے اور اہل حدیث ہر دو گروہوں کو شامل کیا ہے۔" امام ابن تیمیہ نے اہل سنت والجماعت کو ائمہ اربعہ سے بھی پہلے کا قرار دیا ہے اور وہ صحابہ کی جماعت کو اسی گروہ میں شامل کرتے ہیں۔ الزھبی کے بقول ابوالحسن اشعری کی تحریک اشعریہ ماننے والوں نے خود کو اہل سنت والجماعت قرار دیا۔ ان کے بعد سے یہ اصطلاح عام ہو گئی۔

البغدادی نے اہل سنت والجماعت کے عقیدے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو حدوث عالم، خالق کائنات کی وحدانیت، اس کے تشبیہ و تجسیم سے پاک ہونے اور انسانوں کے لیے کافی اور برحق ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ قرآن شریعت کے احکام کا ماخذ و منبع ہے اور کعبہ ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان باتوں کے ساتھ انہیں کسی ایسی بدعت میں ملوث ہونا پسند نہیں، جو کفر کا باعث ہو۔"

البغدادی نے اہلسنت والجماعت کی آٹھ اصناف بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ ارباب علم جو توحید، نبوت، احکام، وعد و وعید، ثواب و عقاب، اجتہاد اور امامت و قیامت کے بارے میں صحیح اور کامل معلومات سے بہرہ ور ہیں اور خوارج وغیرہ اور تشبیہ و تعطیل کے معتقد متکلمین سے الگ راہ پر چلے ہیں۔

۲۔ فقہا، جو قرآن و سنت اور اجماع صحابہ سے استنباط احکام کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان میں ائمہ کرام مالک، ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، شافعی، اوزاعی، ثوری وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ علمائے حدیث۔

۴۔ علمائے ادب و نحو، مثلاً خلیل بن احمد، ابوعمرو بن العلاء، سیبویہ، اخفش، اصمعی، المازنی اور ابوعبید وغیرہ۔

۵۔ مندرجہ بالا عقائد کے مفسرین اور قرا وغیرہ۔

۶۔ مندرجہ بالا مسلک کے مؤید صوفیاء اور اولیائے کرام۔

۷۔ مجاہدین اور شمشیر بکف محافظین دین۔

۸۔ عام پیروکاران اہل سنت والجماعت۔

اس جماعت کے عقائد کو مختلف خلفاء اور سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی [illegible] مسلمانوں کی تحقیق کے مطابق کہ خلفائے راشدین بھی اسی مسلک کے پیروکار تھے [illegible] کے دور میں اس مسلک کو بہت فروغ حاصل ہوا [illegible] ایوبی اور اس کے وزیر القاضی الفاضل نے اس مسلک کو سرکاری [illegible] دیا۔ مغربی افریقہ اور اندلس میں بھی اس مسلک کو سرکاری حمایت حاصل [illegible] تومرت جب اقتدار میں آیا تو اس نے بھی الموحدون میں اس مسلک کا نفاذ کیا [illegible] طرح سلطان محمود غزنوی نے بھی اسے سرکاری مسلک کی حیثیت دی [illegible] اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت اور ٹیپو سلطان کے [illegible] میں اکثریت حنفی اہلسنت کی ہے لیکن یہاں کسی قسم کا سرکاری مسلک [illegible] پاکستان کے آئین میں جمہوریت کو سرکاری مسلک [illegible]

اہلِ کتاب کتاب والے۔ اصطلاح میں اہل کتاب سے [illegible] کتاب کے ماننے والے لوگ، خصوصاً تورات [illegible] ماننے والے۔

قرآن مجید اہل کتاب کو مشرکوں سے الگ گروہ قرار [illegible]

"یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے دعوت حق قبول کرنے سے [illegible]

اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں [illegible]

اہل کتاب سے اگرچہ مراد یہود و نصاریٰ ہے [illegible] مجوسی، صابی [illegible] ہیں۔ الشہرستانی یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب اور مجوسیوں [illegible] "مشبہ اہل کتاب" قرار دیتا ہے نیز جو کسی الہامی کتاب کے [illegible] جو احکام و حدود شرعی کو نہیں مانتے مثلاً فلاسفہ [illegible] کا ذکر [illegible]

اسلام اپنے پیروکاروں کو پہلے تمام انبیاء اور کتابوں پر ایمان لانے کو [illegible] قرار دیتا ہے۔ "یہ سب اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں [illegible] رسولوں کو مانتے ہیں" (۲: ۲۸۵) تفسیر روح المعانی کے مطابق [illegible] کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تمام انبیاء و کتابوں پر ایمان نہ لائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی کتابوں میں تحریف ہو گئی ہے اور قرآن آنے کے بعد پہلی کتابیں منسوخ ہو گئی ہیں۔ [illegible]

"اب اس میں تمام ضروری اور قائم رہنے والی تعلیمات موجود ہیں۔" (۹۸: ۳)
بخاری شریف میں ہے کہ آنحضورؐ کا اہل کتاب کے بارے میں فرمان ہے کہ نہ تو ان کی باتوں کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔

اسلام اہل کتاب کے ساتھ نہ صرف کھانا پینا جائز قرار دیتا ہے بلکہ ان کی عورتوں سے نکاح کی بھی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ "آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔" لیکن یہ دونوں حکم بعض پابندیوں کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ کھانا کھانے میں اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی چھوت چھات نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حلال چیز ہو۔ شراب، سور وغیرہ نہ ہو۔ اسی طرح ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت بھی اس شرط پر دی گئی ہے کہ وہ محصنات (محفوظ عورتیں) ہوں لیکن مسلمان عورت کسی اہل کتاب مرد سے نہیں بیاہی جا سکتی۔ کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ کہیں مرد اس کو دین بدلنے پر مجبور نہ کر دے۔

ایاز (وفات ربیع الاول ۴۴۹ھ مئی ۱۰۵۷ء) ابوالنجم ایاز، ہندوستان کے فاتح سلطان محمود غزنوی کا محبوب امیر اور سپہ سالار ابتدائی حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔ مورخ بیہقی کے مطابق یہ سلطان محمود کے ان آٹھ غلاموں میں سے تھا جن کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور ان کی خدمت و آسائش کے لئے خدمت گار مقرر کئے جاتے تھے۔ سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کے فرزند محمد کو غزنہ میں موجود تھا۔ تخت پر بٹھلانے والے امراء میں ایاز کا نام بھی شامل ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب اکثر علماء اور محل سرا کے غلام اس سے بدظن ہو گئے تو ایاز نے سلطان محمود کے دوسرے بیٹے مسعود سے جا ملنے کا فیصلہ کیا۔ جو اس وقت رے ماوراء النہر اور غزنوی ایران کا والی تھا۔ اس نے محمد کے حاجب بزرگ علی ... کو اپنے ساتھ ملایا اور شاہی غلاموں کے ایک بڑے گروہ کو اپنی معیت میں لے کر اور محمد کے سپاہیوں کو شکست دے کر مسعود کے پاس نیشاپور پہنچ گیا۔ مسعود ایاز کے اس عمل سے بہت خوش ہوا اور بست، مکران، قزدار اور ماہیہ اس کے صلے میں ایاز کو عطا کیا۔ ذی قعدہ ۴۲۷ھ اگست ۱۰۳۶ء میں جب مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا نائب السلطنت مقرر کیا تو امیر ایاز کو اس کا اتالیق بنا کر اس کے ساتھ لاہور بھیجا۔ تاریخ نویسوں کے بقول ایاز ہی اس ولایت کا اصل حکمران تھا۔ اس کو ولایت ہند کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ایاز تقریباً چھ سال دارالحکومت لاہور میں منصب اتابکی پر فائز رہا۔

ایاز کی قبر لاہور میں پرانی شہر پناہ کے باہر رنگ محل کے ساتھ سڑک کے سامنے ایک بلند احاطے میں بنی ہوئی ہے۔ شمالی بازو میں ایک مسقف (چھتا ہوا) دالان ہے۔ اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔

ایاز اسلامی دنیا اور خصوصیت کے ساتھ وسطی و جنوبی ایشیا میں بہت مشہور ہے۔ خوش صورتی کی وجہ سے سلطان محمود کا محبوب غلام ہونے کے ساتھ ساتھ وفاداری کی وجہ سے اس کا نام ضرب المثل بن گیا ہے۔ چنانچہ "زلف ایاز"۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" وغیرہ ضرب الامثال اسی ایاز سے متعلق ہیں۔ اس کے بارے میں ادب میں بہت سی حکایات بھی ملتی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ سلطان محمود کے پاس ایک بہت قیمتی اور بیش بہا موتی آیا اس نے اپنے ہر امیر سے اسے توڑنے کے لئے کہا لیکن ہر ایک نے ایسے گوہر یکتا کو توڑنے سے انکار کر دیا مگر جب اس نے ایاز سے اسے توڑنے کی فرمائش کی تو اس نے اسے فوراً توڑ دیا۔ اس سے ایاز کی حکم پرستی اور آقا پرستی ظاہر ہوتی ہے۔

ایام بیض روشن دن، قمری مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ ان دنوں چاند کی خوب روشنی ہوتی ہے۔ آنحضورؐ ایام بیض کے روزے کبھی ترک نہ فرماتے تھے۔ خواہ گھر میں ہوں یا سفر میں۔ (مشکوٰۃ کتاب الصوم اداب روزہ نفل فصل الثالث حدیث ۴۴)

ایام تشریق ذی الحج کی گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں تاریخ وہ تین دن جو حاجی لوگ حج کے دوران قربانی کے بعد منا میں گذارتے ہیں ان دنوں کو ایام تشریق اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں اہل عرب منا میں قربانی کا گوشت سکھایا کرتے تھے۔

ذی الحج کی نویں تاریخ سے لے کر تیرھویں تاریخ عصر تک فرض نماز وں کے بعد تکبیرات تشریق با آواز بلند پڑھی جاتی ہیں۔ وہ تکبیرات یہ ہیں۔ (اَللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر وَلِلّٰہِ الْحَمْد) یہ تکبیرات ہر مرد پر جو مقیم ہو اور باجماعت نماز پڑھے واجب ہیں۔ عورتیں اگر امام کے پیچھے نماز ادا کریں تو ان پر بھی پڑھنا واجب ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے۔

ایبک، امیر صلخد (وفات ۶۴۶ھ/۴۹-۱۲۴۸ء) عزّ الدین ابوالمنصور ایبک المعظمی الیوبی سلطان شرف الدین عیسےٰ کا مملوک تھا۔ جس نے ۶۰۸ھ ۱۲-۱۲۱۱ء میں ایبک کو حوران میں صلخد شہر اور اس کے ملحقہ علاقوں کا مختار کار مقرر کیا۔ سلطان شرف الدین کی وفات پر اس کے بیٹے الناصر داؤد کے عہد میں دمشق کا نائب السلطنت بنا اور حکومت کے تمام سیاسی اور انتظامی امور کا مالک ہو گیا۔ الناصر کے چچا الملک الاشرف نے دمشق پر قبضہ کیا تو ایبک کو اس عہدے سے ہٹا دیا اور اس کے بعد اس پر غداری کے شبہ کی بنا پر اسے سیاسی اقتدار سے بالکل محروم کر دیا گیا۔ ایبک نے اپنے سلطان شرف الدین عیسےٰ کی معیت میں صلیبی جنگوں میں بھی حصہ لیا۔

قاہرہ میں وفات کے بعد اس میت کو دمشق لا کر ایک مقبرے میں دفن کیا گیا یہ مقبرہ اسی کے لئے تعمیر ہوا تھا۔

ایبک کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ اس نے تین حنفی درسگاہیں دمشق میں اور ایک بیت المقدس میں تعمیر کرائی۔ ریگستان کا قلعہ الازرق اسی نے تعمیر کرایا۔ سالہ میں ایک بہت بڑی سرائے (خان) بنائی۔ اس کے علاوہ اس نے صلخد میں ایک سرائے، صلخد کے قلعے میں ایک برج اور صلخد کی مسجد میں محراب وار دالان اور مینار۔ قلعہ الازرق میں ایک حصار، زرعہ میں ایک خان۔ عاین میں ایک مسجد اور سالہ کی مسجد اس کی اہم تعمیرات ہیں۔

ایبک، قطب الدین (وفات ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ خاندان غلاماں کا بانی۔ ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہونے کی وجہ سے ایبک کہلاتا تھا۔ بعض کے نزدیک ایبک ترکوں کی ایک شاخ ہے قطب الدین ایک غلام تھا۔ بچپن میں اسے ترکستان سے نیشاپور لایا گیا اور حاکم

نیشاپور نے اسے خرید کر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ جب چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں سلطان معز الدین غوری کے پاس غزنین میں آیا تو وہ زمانہ اس کی جوانی کا زمانہ تھا۔ سلطان غوری نے اس کی قابلیت اور لیاقت دیکھ کر چھوٹے چھوٹے عہدے تفویض کئے۔

ترائین کی دوسری لڑائی کے بعد معز الدین سلطان غوری نے مملکت پاک و ہند کا نظم و نسق اور اس کی توسیع کا کام بڑی حد تک قطب الدین کے حوالے کر دیا۔ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں ایبک نے ہانسی میں ہندوؤں کی بغاوت فرو کی۔ ہانسی کی از سر نو قلعہ بندی کی گئی۔ دریائے جمنا عبور کر کے ایبک نے بلند شہر اور میرٹھ پر قبضہ کر لیا اور جب اسے دہلی کے باجگزار راجہ کی خفیہ تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو دہلی پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر لیا ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں ایبک نے دہلی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ جب پرتھوی راج کے بھائی ہری راج نے چوہان راجپوتوں کی ایک فوج جمع کر کے رنتھمبور پر حملہ کیا تو ایبک فوج لے کر وہاں پہنچا اور چوہانوں سے رنتھمبور اور اجمیر خالی کرا لئے۔ ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء میں علی گڑھ فتح کیا۔ اور اس کے بعد اپنے آقا سلطان غوری کے ساتھ قنوج اور بہار کی مہموں میں شرکت کی بعد ازاں علی گڑھ اور اجمیر کی بغاوتوں کو فرو کرنے میں لگا رہا اور اجمیر کو پوری طرح سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۵۹۵ھ / ۱۱۹۷ء میں ایبک نے کوہ آبو کے پاس چالوکیہ فوج کو شکست دی اور آگے بڑھ کر ان کی راجدھانی انہل واڑہ کو تاراج کیا لیکن دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے اس پر مستقل قبضہ نہ رہ سکا۔ ۵۹۵ھ / ۱۱۹۷ء ہی میں بدایوں بنارس اور قنوج پر قبضہ ہو گیا۔ ۵۹۹ھ / ۱۲۰۳ء میں اس نے چندیلوں کی راجدھانی کالنجر پر بھی فتح حاصل کر لی۔

مغربی پنجاب کے غیر آباد علاقوں میں مختلف قومیں رہزنی کرتی رہتی تھیں ان میں کھوکھر خاص طور پر مشہور تھے اور کبھی کبھی ان کی سرکشی بہت شدت اختیار کر جاتی تو سلطان کو خود ان کی تادیب کے لیے آنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ۶۰۱ھ / ۱۲۰۵ء میں جب ان کی شورش بہت حد تک بڑھ گئی تو سلطان کو دوسری مہمات چھوڑ کر ایک بار پھر پنجاب کا رخ کرنا پڑا۔ اس مہم میں ایبک اور اس کی فوجوں نے بھی حصہ لیا۔ ان شورشوں کی سرکوبی کے بعد سلطان نے ایبک کو الملک کا خطاب دیا۔

سلطان غوری کے ترک افسروں میں قطب الدین ایبک۔ ناصر الدین قباچہ اور تاج الدین یلدوز نمایاں امتیاز کے مالک تھے۔ ایبک کی حیثیت ہندوستان میں حاکم اعلیٰ کی تھی اور اسے دوسرے ترک امرا پر فوقیت حاصل تھی سلطان کی وفات کے بعد سلطان محمود غوری نے ایبک کو خطاب اور چتر سلطانی بھیج کر باضابطہ ہندوستان کا بااختیار بادشاہ تسلیم کر لیا۔ چنانچہ لاہور والوں کی دعوت پر وہ دہلی سے لاہور آیا۔ چنانچہ ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ / ۲۷ جون ۱۲۰۶ء کو ہندوستان کے سب سے پہلے مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ اس سے پہلے ایبک کی اور اس کے ساتھ خود مملکت ہند کی قانونی حیثیت واضح نہ تھی۔ ایبک ابھی تک غلام تھا۔ چنانچہ سلطان محمود غوری کے شاہی فرمان کے بعد سلطان کا لقب عطا ہوا اور وہ قید غلامی سے بھی آزاد ہو گیا۔

قطب الدین ایبک کو شمال مغربی سرحد پر خطرے کی وجہ سے اکثر لاہور میں رہنا پڑا اسی دوران میں ایک بار شہر سے باہر چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہو گیا اور چار سال بعد وفات پا گیا۔ اس کا مقبرہ انارکلی بازار سے ملحقہ گلی میں ہے جو کہ قبہ دار تھا اور اب صرف قبر محفوظ رہ گئی ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے اس مقبرے کی دوبارہ تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔

ایبک بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ ہندوستان کی بیشتر فتوحات اس کے ہاتھ سے یا اس کی سرپرستی میں ہوئیں۔ وہ بڑا ہوشیار اور مستعد فوجی رہنما تھا۔ اپنی چار سالہ حکومت میں اس نے سلطنت دہلی کو بیرونی آفات سے بچانے کی پوری کوشش کی وہ بڑا فیاض تھا۔ جب انعام دینے پر آتا تو ہزاروں اور لاکھوں کی نوبت پہنچ جاتی۔ اس لیے وہ "لکھ بخش" کے لقب سے مشہور تھا۔

ایبک کی تعمیر کردہ وہ عمارتیں جو آٹھ سو سال کی طویل مدت کے بعد بھی کلی یا جزوی طور پر آج تک باقی ہیں۔ یادگار تہذیبی کارنامہ ہیں۔ ان عمارات میں مسجد قوۃ الاسلام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے مشرقی دروازے پر سال بنا (۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء) درج ہے۔ مسجد کا رقبہ پچاس ہزار مربع فٹ تھا جس کو التمش نے تین گنا بڑا کرایا جو اب ایک لاکھ چوالیس ہزار چار سو مربع فٹ میں ہے۔ صدر دروازے پر بیس فٹ قطر کا گنبد ہے

ایک رفیع الشان مینار بھی تعمیر کرایا جو عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا نام قطب مینار ہے۔ اور بقول فرگوسن یہ مسلمانوں کی فتح ہند کا علم تھا پتھوار کے اندر ایک محل قصر سفید کے نام سے تعمیر کرایا جو غالباً ایبک کی بادشاہی کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔

اس کے علاوہ ایبک کی دوسری بڑی شاندار اور پرتکلف تعمیر اجمیر کی جامع مسجد ہے۔ یہ مسجد ۵۹۶ھ / ۱۲۰۰ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ بھی مسجد قوۃ الاسلام کی طرح نقش و نگار سے مزین ہے اور اس کی نظیر کہیں اور نہیں ہے۔

ایثار دوسرے کے فائدے کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا۔ دوسرے کو نفع پہنچانا۔ اپنے مال میں سے کچھ حصہ دوسرے کو دینا۔ یہ کمال سخاوت کا درجہ ہے۔ اسلام دوسروں کے لیے ایثار کی بہت زیادہ تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"وہ مال جو بلا جنگ ہاتھ آیا ہے، وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرت میں مقیم تھے یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ وہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں (۵۹:۹)

ایثار کی مثالیں مسلمانوں میں عام ملتی ہیں۔ بخاری شریف میں ابراہیم بن سعد سے ایک روایت ہے جو انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ جب مہاجرین مدینہ میں آئے تو آنحضور ﷺ نے عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن ربیع میں بھائی چارا کرا دیا تھا۔ سعد بن ربیع نے عبدالرحمان بن عوف سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ مالدار ہوں تم میرے مال کو نصف کر لو اور میری دو بیویاں ہیں تم انہیں دیکھو تمہیں ان میں سے جو اچھی لگے اس کا نام بتا دو میں اسے طلاق دے دوں اور جب عدت گذر جائے تو تم اسے نکاح میں لے آنا۔ حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا کہ خدا تمہارے مال اور اہل میں برکت دے۔ مجھے تو کوئی بازار بتا دو کہ میں وہاں جا کر تجارت کروں چنانچہ لوگوں نے انہیں بنی قینقاع کا بازار بتا دیا۔

صوفیاء کے نزدیک ایثار یہ ہے کہ صحبت و رفاقت میں انسان اپنے ساتھی اور دوست کے حق کا خیال رکھے۔ حضرت داتا گنج بخش اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ایثار دوسروں کی مدد کرنا اور ساتھ ہی اس امر میں مشغول ہونا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ درگذر

اختیار کیجیے، اور نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض فرمائیے۔ یہ ایثار دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو صحبت میں، جیسا کہ اس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور دوسرے محبت میں۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی چیز کی خواہش کرے، جب اسے مل جائے تو اُسے ترک کر دے اور دوسرے شخص کو اپنے آپ پر ترجیح دے تو اللہ تعالےٰ اسے بخش دیتا ہے۔

ایثار خدا کی راہ پر کیا جاتا ہے، خواہ دوست کے لیے ہو، عام مخلوق کے لیے، قوم کے لیے یا فی سبیل اللہ۔ یہ ایثار جان، مال، اولاد، علم، نفس اور جذبات وغیرہ سے بھی کیا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایثار کی سب سے بڑی مثال آنحضورؐ کے رفیق غار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پیش کی تھی کہ انہوں نے صحبت یار کے لیے گھر بار، اولاد، مال و دولت غرضیکہ سب کچھ چھوڑ دیا اور پھر جب کبھی بھی داعیٔ اسلام کو ضرورت محسوس ہوئی اپنے پاس موجود ہر شے لا کر آنحضورؐ کے قدموں میں رکھ دی۔ ایسی ہی مثالیں حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ مرتضےٰ سے ملتی ہیں۔ اسلام کا یہ اولین دور صحابہؓ کرام کے ایثار و قربانی اور انفاق فی سبیل اللہ کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ (نیز دیکھیے "انفاق"، جہاد، قربانی)

ایجاب و قبول

شرعی اصطلاح، جس کے معنی بیع یا نکاح کے وقت اقرار کے ہیں، یعنی بیع یا نکاح کے فریقین اقرار خرید و فروخت یا اقرار نکاح کے جو الفاظ دہراتے ہیں، انہیں ایجاب و قبول کہا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ میں نے فلاں چیز اتنے داموں میں تمہارے ہاتھ بیچی، مرد کہے کہ میں اتنے مہر کے عوض تجھے نکاح میں لینا چاہتا ہوں یا عورت کہے کہ میں اتنے مہر کے عوض تمہارے نکاح میں آتی ہوں، یہ ایجاب کہلائے گا۔ یہ الفاظ فریقین میں سے کوئی بھی ادا کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف سے جو رضامندی ہوگی اسے قبول کہا جاتا ہے۔ ایجاب و قبول کے الفاظ کا ماضی کے صیغے میں ہونا ضروری ہے۔ مستقبل کے صیغے میں ایجاب و قبول نہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میں تمہارے آگے یہ چیز فروخت کروں گا یا تم سے نکاح کروں گا تو یہ ایجاب نہ ہوگا اور اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ میں تمہاری یہ چیز خریدوں گا یا تمہارے نکاح کو قبول کر دوں گا تو یہ قبول نہ ہوگا۔

(نیز دیکھیے "نکاح")

ایجی، عضد الدین

(۷۰۰ھ / ۱۲۸۱ء - ۷۵۶ھ / ۱۳۵۵ء) عضد الدین، عبدالرحمان الایجی بن احمد بن عبدالغفار بہت بڑا ماہر علم الکلام۔ فارس کے قصبہ ایج میں پیدا ہوا، شجرہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد درس و تدریس اور قضا کا شغل اختیار کیا۔ مشرق کے اسلامی ممالک میں اسے شافعی مسلک کا سب سے بڑا عالم گنا جاتا تھا۔ وہ سلطان ابوسعید ایلخانی کا استاد بھی رہا ۱۳۳۶ء / ۷۳۶ھ میں غیاث الدین محمد کے قتل کے بعد سلطانیہ سے شیراز آ گیا۔ اور یہاں بھی اپنا درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنی مشہور ترین کتاب "المواقف" یہیں تالیف کی اور شیراز کے فرمانروا ابو اسحاق اینجو کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کی۔ ۷۵۴ھ / ۱۳۵۳ء میں جب مبارز الدین محمد نے شیراز پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تو شیراز کے بادشاہ نے الایجی ہی کو اس کے دربار میں بطور سفیر بھیجا۔ تاکہ جنگ رک جائے۔ مبارز الدین نے اس کا حد درجہ احترام کیا اور پچاس ہزار دینار خرچ کے لیے اور دس ہزار دینار خدام کے لیے دیئے۔ اگرچہ صلح نہ ہو سکی اور مبارز الدین نے شیراز کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے سے تنگ آ کر الایجی شہر سے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آیا۔ مبارز الدین کے دربار میں بھی اسے ویسا ہی اعزاز و احترام حاصل رہا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب الایجی شبانکارہ چلا گیا تو وہاں کے حکمران اردشیر نے اسے گرفتار کر کے اردیمان کے قلعے میں قید کر دیا۔ اس نے اسی قلعے میں وفات پائی۔

الایجی کی بہت سی تصانیف ہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں

۱۔ تحقیق التفسیر فی تکثیر التنویر۔ ۲۔ الرسالۃ العضدیۃ فی علم الوضع۔ ۳۔ المواقف فی علم الکلام۔ ۴۔ العقائد العضدیۃ۔ ۵۔ شرح مختصر ابن الحاجب۔ ۶۔ اشراق التواریخ۔ ۷۔ رسالۃ الاخلاق۔

ایجی بڑا سخی اور بہت نیک دل آدمی تھا۔ حکمرانوں اور وزیروں کے عطیات کی بدولت بہت دولت مند تھا۔ اس دولت کو وہ طلبہ کی اعانت پر اور لوگوں سے حسن سلوک پر خرچ کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس کا شہرہ اس کی زندگی ہی میں دور دور تک پہنچ گیا تھا۔

ایران

مغربی ایشیا کا ایک اسلامی ملک، جو ۱۹۳۵ء تک فارس کہلاتا تھا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو حکومت تہران نے فیصلہ کیا کہ اس مملکت کا سرکاری نام ایران ہوگا۔ اس کے شمال میں روس اور بحیرۂ کیسپین، مشرق میں افغانستان اور پاکستان جنوب میں خلیج فارس اور مغرب میں عراق اور ترکی واقع ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۶۳۶۲۹۳ مربع میل (۱۶۴۸۰۰۰ مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۸۲ء کی مردم شماری کی رُو سے ۳۰۱۵۱۰۰۰ ہے

ایران کے تین اطراف میں سوائے مشرقی سمت کے سات سے اٹھارہ فٹ تک بلند پہاڑ ہیں۔ وسطی علاقے میں کہیں کہیں صحرا ہیں۔ ملک بھر میں متعدد چھوٹی چھوٹی ندیاں ہیں۔ جہاں زراعت ہوتی ہے۔ اکثر علاقوں میں درجہ حرارت گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ باقی علاقے سطح مرتفع کے ہیں۔ جن میں قدیم قافلوں کے راستے اب بھی باقی ہیں۔ آمدورفت کے اکثر راستے مشرقی قفقاز، ارمیہ کے مغربی دروں سے، شہرزور اور حلوان کی گھاٹیوں سے اور بصرہ سے ہو کر گذرتے ہیں۔

موجودہ ایران کے بڑے بڑے شہر تہران (دارالحکومت)، آبادان، اہواز اصفہان، مشہد، رشت، شیراز اور ہمدان ہیں۔ جہاں ایرانی عربی اور ترکی نسلوں کے لوگ رہتے ہیں۔ دیہات میں زیادہ تر قدیم ایرانی نسلیں ہی آباد ہیں۔

ایران مذہباً شیعہ ملک ہے۔ تقریباً ۹۰ فیصد شیعہ فرقہ امامیہ سے اور پانچ فیصد اسماعیلیہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پانچ فیصد فرقہ شیخیہ اور نقطویہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض شہروں میں بابی اور بہائی بھی آباد ہیں۔ ماکو کے قریب کچھ یزیدی بھی رہتے ہیں۔ سنی مسلمان صرف کردوں، عربوں اور افغانوں میں ملتے ہیں۔ ان میں سے شافعی مسلمان صرف کردوں اور عربوں میں اور حنفی مسلمان ترکمانوں اور افغانوں میں ملتے ہیں۔ دیگر مذاہب میں سے مجوسی (زرتشتی) اہم ہیں۔ جو کچھ کچھ تعداد میں یزد کرمان، تہران، شیراز اور کاشان میں ہیں۔

تاریخ: ایران کی تاریخ کا آغاز نویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے جب آریانسل میڈیا کے علاقوں میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ ماد کہلائے۔ ان کا آخری بادشاہ آستیاکس تھا۔ جس پر ہخامنشی خاندان کے کوروش اعظم نے فتح پائی اور ۵۵۰ ق م سے پورے ایشیائے کوچک پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کا جانشین کیوجیہ تھا، جس نے ۵۲۹ ق م سے ۵۲۱ ق م تک حکومت کی۔ اس کا جانشین زرکسیس تھا۔ دوم (۴۸۵ ق م سے ۴۶۶ ق م تک حکمران رہا۔ دوسرے حکمران اردشیر ۴۶۵ ق م سے ۴۲۵ ق م، داریوس دوم ۴۲۴ ق م سے ۴۰۴ تک، اردشیر دوم ۴۰۴

ق۔م سے ٣٨٥ ق۔م اردشیر سوم ٣٥٨ ق۔م سے ٣٣٨ ق۔م تک اور داریوش سوم ٣٣٦ ق م تا ٣٣٠ ق م تھے۔ ٣٣٠ ق۔م میں سکندر اعظم یونانی نے داریوس سوم کو شکست دی اور ہخامنشی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ سکندر کے بعد ایران سلیوکس کے حصے میں آیا اور ١٨٥ ق م تک وہاں سلیوکی سلطنت قائم رہی۔

اصفہان کی شاہی مسجد

٢٤٩ ق۔م میں خراسان میں اشکانی خاندان کے مورث اعلیٰ ارشک اول نے اشکانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ کوئی پانچ صدیاں بعد اس سلسلے کے آخری بادشاہ اردوان کو ساسانیوں کے اردشیر بابک نے ٢٢٠ء میں شکست دی اور ساسانی عہد کی بنیاد رکھی اس کے جانشین شاپور اول نے ٢٥٨ء میں ایشیائے کوچک پر چڑھائی کر کے انطاکیہ فتح کیا اور قیصر روم کو گرفتار کر لیا۔ اس خاندان کے دوسرے حکمران شاپور اعظم (٣٠٩ء تا ٣٧٩ء)، بہرام گور (٤٢٠ء تا ٤٤٠ء)، قباد (٤٨٧ء تا ٥٣١ء) نوشیرواں عادل (٥٣١ء تا ٥٧٩ء) خسرو پرویز (٥٩٠ء تا ٦٢٨ء) اور یزدگرد سوم (٦٣٤ء تا ٦٥٢ء) مشہور ہیں۔ خسرو پرویز کو آنحضورؐ نے اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور یزدگرد سوم کو مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شکست دے کر فارس کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔

١٤ھ/٦٣٥ء میں قادسیہ کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں شہر مدائن کو بھی فتح کر لیا۔ ٢١ھ/٦٤٢ء میں نہاوند کا شہر بھی فتح ہوا اور یزدگرد وہاں سے فرار ہو کر اصفہان، اصطخر، کرمان اور سجستان کی راہ سے مرو پہنچا۔ یہاں ٣١ھ/٦٥٢ء میں وہ ایک شخص مرزبان کے ہاتھوں مارا گیا۔ ١٧ھ/٦٣٨ء میں ابوموسیٰ اشعری کی قیادت میں خوزستان فتح ہوا جس کے فوراً بعد نیشاپور، قم اور کاشان کے علاقے بھی مسلمانوں کے قبضے میں آئے ٢٣ھ/٦٤٤ء کو عبداللہ بن بدیل کے ذریعے اصفہان فتح ہوا۔ اگلے تین برس میں ابوموسیٰ اور عثمان بن ابی العاص نے مل کر ارجان، شاپور، شیراز اور اصطخر فتح کیے۔ ایک اور مسلمان سپہ سالار عبداللہ بن عامر نے اصطخر کے بعد ٢٩ھ/٦٥٠ء میں خراسان پہنچے۔

حضرت علیؓ کے عہد میں ایرانیوں نے عربوں کی خانہ جنگی میں بھرپور حصہ لیا۔ مگر حضرت معاویہؓ کے دور میں مسلمان ایک بار پھر ایرانیوں کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دور میں مسلمان افغانستان تک پہنچ گئے۔

ایرانیوں کے ساتھ مسلمانوں کا طرز سلوک ان کے شایان شان ہی رہا تھا معاہدات میں ادائے خراج کے عوض مذہبی آزادی اور ذاتی املاک کی حفاظت دی جاتی تھی۔ پوری آبادی نے شاذ ہی اسلام قبول کیا۔ زیادہ تر زرتشتی مذہب کا زور رہا۔ ایرانی شہروں میں صرف مسلمان فوجی دستے ہی مقیم ہوئے تھے، جو پہلے وہاں مسجد تعمیر کرتے اور پھر سکونت اختیار کرتے تھے حجاج بن یوسف کے عہد تک ایران کی سرکاری زبان پہلوی فارسی ہی تھی۔ اس کے دور سے یہاں کا نظم و نسق عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔ خلیفہ ہشام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو یکساں حقوق دے کر یہاں کے مختلف عناصر کو باہم گھلنے ملنے میں بڑی مدد دی۔

١٢٩ھ/٧٤٧ء میں ابومسلم خراسانی نے بغاوت کر کے نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔ جس کے فوراً بعد عباسی خلفاء کا دور شروع ہو گیا۔ ان کے عہد میں زرتشتی روایات اور نظریات نے زور پکڑا۔ دین اسلام میں ان عجمی اثرات کی بدولت اسلامی فکر کا رخ ایک اور ہی سمت مڑ گیا۔ ابومسلم کی بغاوت کے بعد اگرچہ اعلیٰ طبقے کے ایرانیوں نے دین اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ایران میں بہت سی فکری تحریکوں اور جھوٹی نبوت کے سلسلوں کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ سنباذ مجوسی (١٣٧ھ/٧٥٥ء) استادسیس (١٤٩ھ/٧٦٦ء)، المقنع (١٦١ھ/٧٧٧ء) بابک خرمی (٢٠١ھ/٨١٦ء) وغیرہ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ خلیفہ الہارون نے ان تحریکوں کو فرد کرنے میں خود حصہ لیا۔ اس کے بعد المامون تو ٢٠٢ھ/٨١٧ء تک خراسان ہی رہا۔ المامون کا سپہ سالار طاہر بن الحسین ٢٠٥ھ/٨٢٠ء میں خراسان کا والی مقرر ہوا۔ طاہر کے جانشین طاہریہ یا آل طاہر کے نام سے خراسان سے رے تک کے علاقے پر ٢٠٥ھ/٨٢٠ء سے ٢٥٩ھ/٨٧٢ء تک نیم خود مختار حکمران بن کر رہے۔ ان کے بعد صفاریہ خاندان حکمران ہوا۔ جب اس کے حکمرانوں نے بغداد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تو عباسیوں نے انہیں ٢٩٥ھ/٩٠٨ء میں زبردست شکستیں دیں۔ اس کے فوراً بعد ایران میں کامل خود مختار حکومتیں وجود میں آنا شروع ہو گئیں۔ ان میں دلنیہ اور رودینی اہم ہیں۔ اس دور میں دیلمیوں کی حکومت زیاریہ کی تھی۔ جنہوں نے ٣١٦ھ/٩٢٨ء سے لے کر ٤٣٣ھ/١٠٤٢ء تک رے، اصفہان اور اہواز میں حکومت کی۔ اور بالآخر یہ سمٹ سمٹ کر طبرستان اور جرجان کے علاقوں تک رہ گئی۔ ان کے فوراً بعد خاندان آل بویہ نے عروج حاصل کیا۔ اس خاندان نے ٣٢٠ھ/٩٣٢ء میں بغداد کو خراج دینا بند کر دیا اس خاندان کے ایک رکن احمد بن بویہ نے ٣٣٤ھ/٩٤٥ء میں بغداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بھائیوں میں سے عضد الدولہ اور اس کا بیٹا بہاء الدولہ ٤٠٣ھ/١٠١٢ء تک عراق، فارس اور کرمان پر حکومت کرتے رہے۔ اس دوران میں شمالی اور مغربی ایران پر ساجدیہ، مسافریہ، شدادیہ اور روادیہ وغیرہ خاندانوں کی حکمرانی رہی۔

دسویں صدی عیسوی میں غزنہ کے حکمرانوں الپتگین اور سبکتگین سے ایرانی حکمرانوں کے لیے خطرات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ محمود غزنوی (٣٨٨ھ/٩٩٨ء تا ٤٢١ھ/١٠٣٠ء) کو خراسان میں ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھنے کا موقع مل گیا۔ بعد ازاں اس نے نصف سے زیادہ ایران پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ بغداد نے اسے یمین الدولہ کا خطاب دیا۔ اس کے عہد میں ایران میں علمی و تہذیبی روایات اپنے عروج پر پہنچیں۔ ابن سینا، البیرونی اور فردوسی جیسے

مشاہیر اسی کے دربار سے منسلک تھے۔

۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں ترکوں نے آکر ایران میں بسنا شروع کیا۔ ان کے سلجوقی سردار طغرل نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں ایران پر حملہ کیا اور سترہ برس کے اندر اندر اس نے بغداد سے اپنی حکومت تسلیم کرالی۔ طغرل کا خاندان ۵۴۲ھ/۱۱۵۰ء تک سنجر کے عہد تک آل سلجوق یا سلاجقہ کے نام سے ایران پر حکمران رہا۔ ان کے دور میں بھی اہلسنت والجماعت کی روایات برقرار رہیں۔ نظام الملک طوسی اور امام غزالی آل سلجوق ہی کی سرپرستی میں کام کرتے رہے۔ اسی دور میں قلعہ الموت میں حسن بن صباح جیسے اسماعیلیوں نے قوت پکڑی جسے دبانے کی کوششیں ناکام رہیں۔ آل سلجوق کے بعد ایران کے مختلف علاقوں پر خوارزم شاہ اور غوری خاندان حکمران رہے۔ چنگیز خاں نے ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء کے بعد ماوراءالنہر پر قبضہ کیا۔ تاتاریوں کے حملوں کے بعد اسلامی، عربی اور فارسی تہذیب و تمدن کے بہت سے آثار مٹ گئے۔ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں خلافت بغداد اور اسماعیلی فرقے کی قوت کا خاتمہ ہو گیا سارا ایران تاتاریوں کے زیر نگیں آگیا۔ اب ایران پر ایلخانی حکمران تھے، جنہوں نے [illegible] اسلامی علوم اور ادب کے فروغ میں دلچسپی لینا شروع کی۔

ایلخانیوں کے بعد ۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء سے لے کر ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء تک فارس اور کرمان کے علاقوں پر ایران کے [illegible] مظفری خاندان کی حکومت رہی۔ اس خاندان کا خاتمہ چنگیز خاں کی نسل سے تعلق رکھنے والے حکمران تیمور نے کیا۔ ۷۷۱ھ/۱۳۷۰ء سے ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء تک اس نے یکے بعد دیگرے بلخ، خراسان، سیستان، مازندران، آذربائیجان، عراق عجم اور بالآخر فارس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے خراسان اور سیستان کی حکومت اپنے بیٹے شاہ رخ اور آذربائیجان کی حکومت اپنے بیٹے میران شاہ کے سپرد کر دی۔ باپ کی وفات کے بعد بیٹوں میں حصول تخت کے لیے جنگ چھڑ گئی، جس سے مغرب سے آنے والے قرہ قوینلو خاندان نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس خاندان نے ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء سے ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء تک ایران کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ۸۶۴ھ/۱۴۶۰ء سے ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء تک ایران پر مشہور تیموری سلطان حسین بایقرا حکمران رہا۔ اس کا پایہ تخت ہرات تھا۔ اور وہ خراسان، سیستان اور جرجان پر حکومت کرتا رہا۔

قرہ قوینلو خاندان کے قرہ یوسف نے ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں تبریز فتح کر کے اپنی حکومت قائم کی اور اس کے جانشینوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ ان میں سے ایک جہان شاہ تھا۔ جسے آق قوینلو خاندان کے سردار اوزون حسن نے ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء میں شکست دے کر ایران پر قبضہ حاصل کیا اور آخری تیموری بادشاہ ابوسعید کو بھی شکست دے کر پورے ایران پر قابض ہو گیا۔ اوزون حسن کے جانشینوں کا تصادم صفوی خاندان کے پیشواؤں سے ہوا اور ایران پر یہ خاندان قابض ہوتا چلا گیا۔ شاہ اسماعیل صفوی اول نے مستحکم حکومت قائم کی اور اہل تشیع کی حمایت اور اہل سنت کی زبردست مخالفت کی۔ صفوی خاندان نے ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء تک حکومت کی۔ اس خاندان نے اپنے طویل دور حکومت میں ایران کو مذہباً اور تہذیباً دیگر مسلمانوں سے الگ تھلگ رکھا۔ عباس اول (۹۸۵ھ/۱۵۸۸ء تا ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء) کے زمانے میں شاہی فوج کو تشکیل کیا گیا اور شیعی مسلک کی زبردست حمایت کی گئی یہی وجہ ہے کہ صفوی دور کا فارسی ادب بقول براؤن بالکل بے مایہ ہو کر رہ گیا۔ اسی کے عہد میں ایران نے پہلی بار مغربی ممالک برطانیہ، نیدرلینڈ اور فرانس وغیرہ سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ عباس کے دیگر بہت سے کارناموں نے افغانوں کے

اندر ایک خاص طرح کا ردّعمل پیدا کر دیا، جو بالآخر مملکت افغانستان کی صورت میں نمودار ہوا۔

۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں میر محمود کی افغان فوج نے اصفہان فتح کر لیا۔ جسے آٹھ برس بعد صفوی جانشین نادر قلی نے ختم کیا اور ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء میں نادر شاہ کے نام سے ایران کا بادشاہ بن گیا۔ مشہور افغان حکمران احمد شاہ درّانی اسی کا جانشین اور سپہ سالار تھا۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور اصل طاقت شیراز کے کریم خاں زند کے ہاتھ آگئی۔ اس نے ایران کو ایک متحد حکومت بنا دیا۔ اس کے بیٹے نااہل ثابت ہوئے اور استرآباد کے قاچار قبیلے کے آغا محمد خاں نے پوری سلطنت پر قبضہ جما لیا۔ ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۶ء میں وہ تخت نشین ہوا اور ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء میں مارا گیا۔ اس کا خاندان ۱۹۲۵ء تک ایران پر حکمران رہا۔

ایران پر ترکیہ اور روس کے حملے اکثر ہوتے رہے تھے۔ نادر شاہ نے انہیں کئی بار پسپا کیا تھا۔ آغا محمد خاں نے بھی انہیں کئی ضربیں لگائیں۔ لیکن اس کے بعد انگلستان اور فرانس کی باہمی کشمکش نے ایران کو الجھا کر رکھ دیا۔ نپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایران سے دوستی چاہتا تھا، جبکہ یہ انگریزوں کے مفاد کے خلاف تھا۔ ۱۸۱۴ء میں انگلستان نے ایران کے ساتھ عہد نامہ طے کر لیا۔ ادھر روس کے ساتھ ایران کی جنگ شروع ہو چکی تھی اور ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں صلح نامہ ترکمان چائی کی رو سے ایران کو دریائے ارس کے شمال میں پورے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ۱۸۵۶ء میں ایران نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ تو برطانیہ نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں ان کے مابین صلح ہوئی، جس کی رو سے ایران کو ہرات چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ روسی اثر اتنا بڑھ گیا کہ ایران کے بہت سے علاقے روس کے ہاتھ چلے گئے۔

ناصر الدین قاچار کے عہد حکومت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۹۶ء) میں ایران کے حالات پرسکون رہے۔ مگر مظفر الدین کے عہد میں روس اور برطانیہ کی مداخلت معاہدہ ۱۹۰۷ء کی صورت اختیار کر گئی۔ جس کی رُو سے ایران دو حصوں شمالی اور جنوبی میں بٹ گیا۔

ایران میں شیعی مسلک نے بہت سی راہیں نکالیں۔ یہاں بہت سے شیعی فرقے نمودار ہوئے۔ ان میں شیخیہ اور بابی اہم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں نے بھی جنم لینا شروع کیا۔ مظفر الدین ہی کے عہد میں جمال الدین افغانی نے تحریک اتحاد اسلامی کی داغ بیل ڈالی۔ عوامی سیاست بھی بیدار ہونا شروع ہوئی۔ جس کے دباؤ کے تحت اکتوبر ۱۹۰۶ء میں بادشاہ کو دستوری حکومت کا افتتاح کرنا پڑا۔ انقلابی تحریکیں اپنے عروج کی طرف بڑھنے لگیں تو حکومت کو مجبوراً غیر ملکیوں کی مدد لینا پڑی۔ پہلی عالمی جنگ میں ایران غیر جانب دار رہا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روسی طاقت کم پڑ گئی تو برطانوی افواج خلیج فارس میں اتر آئیں۔ جنگ کے خاتمے پر ایران مجلس اقوام کا رکن بن گیا۔

۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے ساتھ ایران کا معاہدہ ہوا اور اس سال سے ایران میں برطانوی سیادت قائم ہو گئی۔ ادھر انقلابی قوتیں بھی تیز تر ہو گئیں اور بالآخر سید ضیاء الدین اور رضا خان نے قوت کے بل پر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ رضا خاں وزیر جنگ بن گیا۔ ۱۹۲۳ء میں اسے وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مجلس ملی نے احمد شاہ قاچار کو معزول کر دیا اور ۱۳ دسمبر ۱۹۱۵ء کو رضا خاں نے پہلوی کا لقب اختیار کر کے شہنشاہ ایران ہونے کا اعلان کر دیا۔

رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت میں ایران نے خاطر خواہ ترقی کی اور جدیدیت کی طرف محسوس قدم اٹھایا۔ سابقہ تمام معاہدات منسوخ کر دیے گئے۔ ملکی صنعت کو ترقی دی گئی۔ قومی بینک قائم کیا گیا اور آمدنی کے ذرائع قومیا لیے گئے۔ ۸ جولائی ۱۹۲۷ء کو سعد آباد کے معاہدے کی رو سے ایران، ترکی اور افغانستان کا اتحاد

اصفہان میں [illegible]

قائم ہو گیا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کو رضا شاہ اپنے بیٹے محمد رضا کے حق میں تخت سے [illegible] ہو گیا۔ اس وقت دوسری عالمی جنگ چھڑ چکی تھی اور ۲۶ اگست سے [illegible] فوجیں ایران میں داخل ہو چکی تھیں۔ ایران نے اپنی سالمیت [illegible] کی ضمانت پر اتحادیوں کو ملک کے تمام ذرائع مواصلات سے [illegible] دے دی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانوی اور [illegible] فوجیں رخصت ہو گئیں [illegible] رہے۔ بالآخر سلامتی کونسل کے فیصلے کی رو سے مئی ۱۹۴۶ء [illegible] رخصت ہو گئے۔

محمد رضا شاہ پہلوی نے اپریل ۱۹۵۱ء میں ملک میں تیل کی صنعت [illegible] کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم تھے [illegible] پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ مصدق نے مجلس کو توڑ دیا [illegible] مجبور کر دیا گیا لیکن اپریل ۱۹۵۵ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا [illegible] خود سنبھال لیے۔

شہنشاہ محمد رضا خاں پہلوی کی زیر قیادت ملک [illegible] ۱۹۶۲ء کے ایک فرمان کی رو سے ایران میں زبردست معاشرتی انقلاب لایا گیا اسے "سفید انقلاب" کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کا آغاز شہنشاہ نے اپنے ہاتھ سے کیا اور سب سے پہلے اپنی ذاتی کو شہنشاہی سے سرکاری اراضی کو کسانوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ اس کی بنا پر اصلاحات اراضی کا مسودہ پیش کیا گیا۔ [illegible] مقرر کر دی گئی۔ جنگلات کو قومی ملکیت قرار دیا گیا۔ سرکاری کارخانے [illegible]

عوام میں فروخت کیا گیا۔ کارخانوں کے منافع میں مزدوروں کی شرکت کا اہتمام کیا گیا، قانون انتخابات میں ترمیم کی گئی نیز سپاہ دانش کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اصلاحات کی مخالفت اعلیٰ طبقے کی طرف سے ہوئی لہٰذا ۲ جنوری ۱۹۶۲ء کو شہنشاہ نے انہیں عوام کے سامنے استصواب رائے کے لئے پیش کر دیا۔ جسے بھاری اکثریت نے منظور کیا۔

قانون اصلاحات اراضی کو دو مرحلوں میں نافذ کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں ہر زمیندار [illegible] جائیداد کا صرف دسواں حصہ اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ باقی جائداد حکومت نے خرید کر دوسرے مرحلے کے تحت کسانوں کے ہاتھ فروخت کر دی۔ زمینداروں کو ان کا معاوضہ دس سال میں دیا گیا اور کسانوں سے زمین کی قیمت پندرہ سال میں وصول کی گئی۔

دوسرا بڑا کارنامہ سپاہ دانش کا قیام تھا۔ اس سپاہ کا مقصد تعلیم بالغاں کا فروغ تھا تاکہ جہالت اور بے علمی کے خلاف جہاد کر کے گاؤں کے رہنے والوں کی بہبود [illegible] کا اہتمام کیا جائے، [illegible] معاشرت کے جدید طریقوں سے آشنا کیا جائے اور زراعت کے جدید طریقے سکھائے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ایران کی [illegible] آبادی خواندہ ہو چکی ہے۔

[illegible] کے [illegible] صحت اور آبادکاری کی سپاہ بھی قائم کی گئیں [illegible] کو تربیت دی جاتی اور انھیں دیہات میں بھیج [illegible]

[illegible] دیگر معلومات:- ایران ایک آئینی بادشاہت ہے [illegible] دسمبر ۱۹۰۶ء میں وجود میں آیا تھا۔ [illegible] ۱۹۵۰ء میں [illegible] کی رو سے مجلس ملی کے ارکان [illegible] انتخاب چار سال [illegible] مارچ ۱۹۷۵ء کو شہنشاہ نے [illegible] ۱۹۷۵ء میں امیر عباس ہویدا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا [illegible] استان گیلان، مازندران، مشرقی آذربائیجان، مغربی آذربائیجان، رضائیہ، کرمان [illegible] فارس، شیراز، کرمان [illegible] کردستان، سیستان، بلوچستان، زنجان [illegible] تمام استان ڈویژنوں پر مشتمل ہیں جنہیں [illegible] پر فرمانروا حکومت کرتا ہے۔ یہ شہرستان مزید بخشوں [illegible] کا حاکم [illegible] کہلاتا ہے۔ یہ اضلاع کہلاتے ہیں، جو دہستانوں میں تقسیم [illegible] ان کے حاکم دہدار کہلاتے ہیں۔

ایران [illegible] آئین کا ایک اہم رکن ہے۔ ایران کا سرکاری مسلک [illegible] اثنا عشریہ ہے۔ تمام مساجد اور مزار محکمہ اوقاف کے ماتحت ہیں اور تمام مدارس محکمہ تعلیم کے ماتحت ہیں۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں لازمی پرائمری تعلیم نافذ کی گئی تھی۔ [illegible] میں تقریباً اسی فیصد بچے سکول جاتے تھے۔ اس وقت خواندگی [illegible] ۵۰ [illegible] کے قریب ہے۔ نظام تعلیم پر فرانسیسی اثر غالب ہے۔ تہران [illegible] کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ شیراز، تبریز، [illegible] مشہد اور اہواز میں بھی یونیورسٹیاں اور فنی تعلیم کے ادارے ہیں۔

ایران [illegible] سکہ ریال ہے، جو سو دیناروں پر منقسم ہے۔ چوتھے پنجسالہ منصوبے ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۳ء پر چھ کھرب دس ارب ریال صرف کیے گئے۔ اس کا آٹھ فیصد تعلیم اور تیرہ فیصد زراعت پر صرف کیا گیا۔

ملک کی برآمدات میں مٹی کا تیل، اون، کپاس، ریشم، پھل، بادام، خشک میوہ، سبزیاں، عمارتی لکڑی، تانبا، کوئلہ، قالین، کھالیں، سمور، تمباکو اور پلاسٹک کی اشیاء شامل ہیں۔ زیادہ تر آمدنی مٹی کے تیل سے ہوتی ہے۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کے ساتھ ہوتی ہے ملک بھر میں ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ کئی کمپنیاں ہوائی اور بحری جہاز چلاتی ہیں۔

محمد رضا شاہ پہلوی کا محل

لیکن شہنشاہ کی بڑھتی ہوئی آمریت اور ظالمانہ اقدامات کے خلاف ایک زبردست تحریک نے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں حالات کا رخ بدل دیا۔ ۱۹۷۹ء میں شاہ ایران ملک سے فرار ہو گئے اور جلا وطن عوامی رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی نے عوامی تائید و حمایت کے ساتھ ملک کا کنٹرول کامیابی کے ساتھ سنبھال لیا۔ ان کی لائی ہوئی جمہوریت گوناگوں مسائل کے باوجود جاری و ساری ہے۔

الفائے عہد

وعدے یا عہد کا پورا کرنا۔ اسلام میں الفائے عہد و وعدہ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اور (اے پیغمبر) قرآن میں اسماعیل کا ذکر (بھی لوگوں سے بیان) کرو کہ وہ وعدے کے بڑے سچے تھے اور (ہمارے) بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔" (۱۹:۵۴)

حدیث میں آتا ہے۔ عبداللہ بن ابی الحسام سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی بعثت سے پہلے ایک چیز خریدی تھی اور بیع کی کچھ قیمت میرے ذمے رہ گئی تھی میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ باقی قیمت اسی جگہ حاضر کرتا ہوں اور تین روز کے بعد وعدہ یاد آیا (گیا تو دیکھا) آپ اسی جگہ تشریف رکھتے ہیں۔ (مجھے دیکھ کر) فرمایا عبداللہ تو نے مجھے سخت تکلیف دی میں تین روز سے اسی جگہ بیٹھا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ (ابوداؤد)

وعدہ ایفا کرنے کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جو ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو اپنے بھائی سے جھگڑا مت کر اور نہ اس سے (اس درجہ) مزاح کر (جس سے اسے تکلیف ہو) اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کر جسے پورا نہ کر سکے۔ (ترمذی)

ایلاء قسم کھانا۔ اصطلاح میں مرد کا قسم کھانا کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اگر مرد یہ قسم کھا لینے کے بعد چار مہینے کے اندر اندر اپنی عورت کے پاس چلا جائے تو وہ حانث ہو جائے گا۔ یعنی قسم ٹوٹ جائے گی اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اور اگر چار مہینے گذر جائیں اور عورت کے پاس نہ جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت مرد سے جدا ہو جائے گی۔ کیونکہ اس عرصہ کا گذر جانا ہی عورت کے حق میں طلاق بائنہ ہے۔ مگر دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چار مہینے گذرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی اور عورت مرد سے جدا نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک مرد کو یہاں تک قید رکھا جائے گا کہ وہ یا تو عورت کی طرف رجوع کرے اور قسم کا کفارہ دے دے یا طلاق دے کر عورت کو چھوڑ دے۔ اس صورت میں اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے گا تو قاضی عورت کو طلاق دے دے گا۔

ایلاء کے بارے میں قرآن مجید میں یوں آیا ہے:-

"جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں انہیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر اس مدت میں، اگر رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کی ٹھان لیں تو بھی اللہ سنتا اور جانتا ہے۔" (۲: ۲۲۶) (نیز دیکھئے "طلاق")

ایل خانیہ مغل خاندان جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں ایران پر حکمران رہا۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں ابوسعید کی وفات پر (کیونکہ اس کے اولاد نرینہ نہ تھی) اس خاندان کی اصل شاخ ختم ہو گئی۔

ایل خانیوں کی حکمرانی میں دریائے جیحون سے بحر ہند تک اور دریائے سندھ سے دریائے فرات تک کا علاقہ اور اس کے علاوہ ایشیائے کوچک کا بہت سا حصہ اور کوہ قاف کے علاقے بھی شامل تھے۔ بعد میں بعض مشرقی علاقے چغتائیوں کے قبضے میں آ گئے۔ ایل خانیوں نے جنوبی ایران اور ایشیائے کوچک کے ان خانوادوں کو بھی آہستہ آہستہ ختم کر کے ان کی جگہ اپنے عامل مقرر کر دیئے۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں سلطان مصر سے شام کا علاقہ لینے کی کوشش بھی کی جو اگرچہ ناکام رہی ان تمام خامیوں کے باوجود جو اکثر فرمانرواؤں کی انتظامی معاملے میں تھیں یہ دور ایران میں بڑا ترقی کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ غازان خان کے عہد میں جب فاتحین نے مکمل طور پر اسلام قبول کر لیا تو اس دور میں کئی نئے شہر آباد ہوئے۔ تبریز اور سلطانیہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ سلطانیہ میں الجائتو کے مقبرے جیسی عالیشان اور خوب صورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اس دور میں ایران میں تاریخ نویسی نے وہ ترقی کی جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس دور میں ہیئت۔ طب اور ریاضی کے علوم میں خاص طور پر ترقی ہوئی۔

ایلغازی ارتقی خاندان کے شمالی عراق عرب پر حکومت کرنے والے دو حکمران

۱۔ نجم الدین ایلغازی: ارتقی خاندان کا پہلا فرمانروا۔ باپ کا نام ارتق تھا۔ ایران کی سلجوق سلطنت حاصل کرنے کے لیے تتش کا مددگار رہا۔ تتش کی شکست اور وفات کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ بیت المقدس کی طرف چلا گیا۔ جہاں سے مصریوں کے چالیس دن محاصرہ کرنے کے بعد نکلنا پڑا۔ ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء میں وہ نئے فرمانروا سلطان محمد کا رفیق بن گیا۔ جس نے اسے ۴۹۴ھ/۱۱۰۰ء میں بغداد کا والی مقرر کر دیا۔ اور چار سال کے بعد اس عہدے سے معزول کر دیا گیا تو سلطان سے بگڑ بیٹھا۔ ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء اور ۵۰۱ھ/۱۱۰۷ء میں ماردین کا نہایت اہم قلعہ فتح کیا۔ ۵۰۴ھ تا ۵۰۸ھ/۱۱۱۱ء تا ۱۱۱۵ء میں ایلغازی نے صلیبی جنگ میں شرکت سے نہ صرف انکار کر دیا۔ بلکہ انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرنے پر بھی راضی ہو گیا۔ اور تقریباً دس ہزار مسلمانوں کی فوج لے کر انگریزوں کی حمایت کے لیے آیا۔ اگرچہ جنگ نہ ہوئی۔ سلطان محمد کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمود کی جانشینی کے بعد ایل غازی نے سلجوقی حکومت سے تعلقات پیدا کر لیے۔ ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں حلب اس کے قبضے میں آ گیا۔ حلب پر حکمران ہونے کے بعد وہ فرنگیوں کا ہمسایہ بن گیا اور اب ان کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۵۱۳ھ/۱۱۱۹ء میں اس نے بیس ہزار فوج لے کر تل عفرین کی وادی میں فرنگیوں کی کم تعداد فوج کو زیر کیا۔ فرنگی فوج کی اکثریت یا تو قتل کر دی گئی یا کچھ کو قید کر لیا گیا انطاکیہ کا حاکم بھی مارا گیا۔ اس فتح کے بعد ایل غازی کی فوجی قابلیت کا دور دور چرچا ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ سلطان محمود نے عیسائی گرجستانوں کے خلاف اسلامی لشکر کی کمان اس کے سپرد کی۔ لیکن اس معرکے میں اس نے شکست کھائی اور تفلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء میں سلطان نے ان علاقوں کے علاوہ جو پہلے ایل غازی کے پاس تھے۔ میافارقین بھی اسے دے دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ساٹھ سال کی عمر میں رمضان ۵۱۶ھ/نومبر ۱۱۲۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

ایل غازی نے پہلی شادی طغتگین کی بیٹی ایل خاتون سے کی۔ دوسری شادی حلب کے سابق حاکم رضوان کی بیٹی فرخندہ خاتون سے کی جب کہ وہ حلب کا حاکم تھا۔ وہ بہت بہادر اور اولوالعزم آدمی تھا۔ وہ ان مسلمان امراء میں سے تھا جنہوں نے نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی سے پہلے شمال اور مشرق میں صلیبیوں کی یلغار کو روکا۔

۲۔ قطب الدین ایلغازی ثانی ا۔ ارتقی خاندان کا دوسرا فرمانروا۔ [illegible] باپ نجم الدین ایلغازی کے بعد ماردین۔ میافارقین اور راس العین کا حکمران [illegible] ۷۷-۱۱۷۶ء میں جانشین بنا۔ اس نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کے [illegible] کے ضلع کی طرف پیش قدمی کی۔ تاریخ میں اس کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴ء میں اپنے ماموں سقمان ثانی اور موصل کے حاکم عزالدین مسعود اول کے اتحاد میں شامل ہو گیا کہ کسی طرح صلاح الدین کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ لیکن ماموں کی وفات کے بعد صفر ۵۸۰ھ/مئی ۱۱۸۴ء میں اس کی فوجیں سلطان صلاح الدین کی فوجوں میں شامل ہو گئیں۔ جمادی الآخر ۵۸۰ھ/ستمبر ۱۱۸۴ء میں اس نے وفات پائی۔ اس نے کانسی کے سکے جاری کیے اور اس پر خود کو ملک الامراء لکھوایا۔

ایلہ خلیج عقبہ کے شمالی سرے پر واقع ایک بندرگاہ، جس پر آج کل اسرائیل کا ناجائز قبضہ ہے۔ تورات میں اس کا نام ایلات ہے جو عربی میں ایلۃ ہے۔ عصیون جابر اور ایلات ایک ہی مقام کا نام ہے۔ اس پر حضرت سلیمانؑ کے عہد سے یہودیوں کا قبضہ ہو گیا اور چوتھی صدی قبل مسیح تک ان ہی کا قبضہ رہا۔ تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں جنوب مشرق کی جانب تھوڑے فاصلے پر اسے آباد کیا گیا۔ اسلامی فتوحات تک اسی مقام پر واقع تھا۔ بطلیموس کے زمانہ میں ایلہ بلاد عرب اور حبشہ کے درمیان تجارتی بندرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ رومیوں کے عہد میں یہ دسویں سرحدی لشکر کی قلعہ نشین

فوج کا مقام بنا۔ ۳۲۵ء میں ایلہ ایک اسقف کا صدر مقام بن گیا۔ ظہور اسلام سے کچھ پہلے یہ غسّان کے قبائلی ملوک کے علاقے میں شامل تھا۔ دورِ اسلامی میں ایلہ کا ذکر سب سے پہلے ۹ھ/ ۶۳۰ء میں آیا جب آنحضورؐ تبوک سے واپس آ رہے تھے تو اس شہر والوں نے اپنے اسقف یوحنا بن رؤبہ کی سرکردگی میں امن و امان کے ساتھ آنحضورؐ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور سالانہ ایک دینار فی مرد اور عورت جزیہ دینا منظور کیا تھا۔ جو کہ کل تین سو دینار بنتے تھے۔ مسلمانوں کے دور میں یہ جگہ مصر اور شام سے آنے والے حاجیوں کا مقام اتصال بن گیا جس کی وجہ سے یہاں تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ یہ شہر ملک شام کے متعلقات میں شمار ہوتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ نہایت خوشحال اور بارونق شہر تھا۔ ۴۱۵ھ/ ۱۰۲۴ء میں عبداللہ بن ادریس اور بنو الجراح کے کچھ آدمیوں نے ایلہ کو تاراج کیا اور کہا جاتا ہے کہ یہ شہر ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲-۷۳ء میں زلزلے سے بالکل تباہ ہو گیا۔

ایلہ عرصہ دراز تک صلیبی جنگوں میں کش مکش کا مرکز بھی بنا رہا۔ شاید اسی وجہ سے اس کا زیادہ حصہ کھنڈروں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ۵۱۰ھ/ ۱۱۱۶ء میں شاہ یروشلم بالڈون اوّل نے اس پر قبضہ پا لیا اور اس کو لاطینی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ ۵۶۶ھ/ ۱۱۷۰ء میں سلطان صلاح الدین نے لاطینیوں کو اس سے نکال باہر کیا۔ مگر ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲ء میں تھوڑے عرصہ کے لیے دوبارہ اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور بالآخر ۵۷۹ھ/ ۱۱۸۳ء میں یہ مسلمانوں کے قبضہ میں مکمل طور پر آ گیا اگرچہ اس کی حالت بہت زیادہ خراب و خستہ تھی۔ اس وقت اس شہر میں صرف ساحل کے قریب ایک قلعہ باقی رہ گیا تھا۔

ایمان

ایمان کا مطلب ہے ماننا، اطمینان کرنا، تسلیم کرنا۔ امام راغب کے نزدیک اس کا مطلب ہے زبان سے اقرار کرنا، دل سے تصدیق کرنا اور عمل سے ظاہر کرنا۔ اسلامی اصطلاح میں ایمان کفر کی ضد ہے اور اسلام کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ مگر قرآن مجید کی بعض آیات سے اسلام اور ایمان الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایمان کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے اللہ پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، اس کے فرشتوں پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان"۔ مختلف احادیث سے بھی ایمان کی پانچ ہی شاخوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض دیگر روایات میں بہت سے نیک اعمال کو بھی ایمان میں شامل کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "ایمان کی ستر سے بھی زیادہ شاخیں ہیں اور ان میں اوّل ترین درجہ لا الٰہ الا اللہ کا ہے اور ادنیٰ ترین درجہ راستے سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دینا ہے۔ نیز حیا اور غیرت بھی ایمانی صفات میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔" (بخاری، مسلم)

کیا ایمان اور اسلام ایک ہی ہے ہیں یا دو مترادف اصطلاحیں ہیں۔ اس کے لئے نیز دیکھیے "اسلام" تاہم یہاں ایک بات واضح کرنے کی ضرورت ہے ایمان اسلام کا بنیادی جزو ہے اور ایمان کے بغیر اسلام مکمل نہیں ہوتا۔ گویا ایک شخص مسلمان تو ہے لیکن مومن تبھی ہو سکتا ہے جب اس کا ایمان کامل ہو۔ امام غزالی کے نزدیک اعمال صالح ایمان کو تقویت دیتے ہیں۔

بنیادی پانچ ایمانیات میں سب سے پہلا اللہ تعالےٰ پر ایمان ہے کہ وہ اس دنیا کا مالکِ حقیقی اور واحد ہے۔ وہی ہر ظاہر و باطن سے آگاہ اور مقصودِ عبادات ہے اس کے حکم کے مطابق ہمیں زندگی بسر کرنا ہے اور وہی ہمیں محاسبۂ اعمال اور ذاتِ الٰہیہ کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔

دوسرا جزو یہ ہے خدا کے رسولوں پر ایمان لایا جائے کہ خدا اپنے احکامات انہی بندوں کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔ یہ تمام انبیاء سچے، راست باز اور معصوم تھے اور بذات خود نیکی کا نمونہ تھے۔

تیسرا جزو یہ ہے کہ فرشتوں کے وجود پر ایمان لایا جائے۔ نیز یہ کہ فرشتے خدا اور رسولوں کے مابین قاصد اور سفیر ہیں اور نظام کائنات کو قانون الٰہی کے مطابق چلا رہے ہیں اور ہمارے اعمال کے نگران ہیں۔

چوتھا جزو یہ ہے کہ پیغمبروں نے خدا کے پیغام کو کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ ان کے وجود پر ایمان لایا جائے۔ جو کچھ ان کتابوں میں موجود ہے، اسے برحق اور راہ ہدایت مانا جائے۔

پانچواں اور آخری جزو یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے اور وہاں اعمال کی باز پرس کو برحق مانا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ روز جزا ہی انسانیت کی فلاح ہو گی۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے۔ اسلام کا انسان سے یہی مطالبہ ہے کہ وہ ایمان لائے کیونکہ اعمال کی اساس یہی ہے۔ اگر ہم عقلی طور پر ایمانیات کی توجیہ کریں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریہ ہے کہ:

۱۔ کائنات کا نظام ایک ایسی ہستی چلا رہی ہے، جو اپنے ارادے اور تصرف میں بالکل آزاد ہے۔ وہی خالق ازل ہے، وہی قادر مطلق ہے۔

۲۔ نظام کائنات کو چلانے کے لئے اس ہستی ازل نے بے شمار دوسری ہستیاں پیدا کر رکھی ہیں، جو اس کائنات میں اس کے احکامات نافذ کر رہی ہیں

۳۔ انسان میں قدرت نے دو قوتیں خیر اور شر کی رکھی ہوئی ہیں اور اسے دونوں کے اختیار کی قوت ہے۔ تاہم اسے سیدھی راہ دکھانے کے لیے اس خالق ازل نے چند بہترین انسانوں کو علم عطا کیا اور انہیں ہدایت کے لئے مامور کیا

۴۔ قادر مطلق نے انسان کو جو ہدایات دیں وہ کسی نہ کسی صورت میں کتاب یا صحیفے کی شکل میں ہیں۔

۵۔ بالآخر اس کائنات کو ختم ہونا ہے اور ہر فرد کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ گویا یہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ موت کے بعد چلے گی۔

اب رہی ان تمام باتوں کو ماننے کی تو اس کے بغیر چارہ نہیں کہ خواہ خدا کی حقیقت ہمارے سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اس کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے

ملائکہ کا وجود سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن نظام کائنات کو چلانے والی چند نادیدہ قوتوں کے وجود کو ماننا پڑتا ہے۔ پیغمبروں اور الہامی کتابوں پر خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے لیکن ان کے وجود سے منکر نہیں ہو سکتا اور اس بنا پر انہیں جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا کہ آخر دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم کے پیغمبر نے ایک سا پیغام ہی کیوں دیا ہے۔ رہا موت کے بعد کی زندگی اور محاسبۂ اعمال کا سوال تو اس کا جواب اتنی سی بات میں مضمر ہے کہ موجودہ انسانی زندگی ناکافی ہے کہ اس میں کسی قسم کا نظام اخلاق قائم ہو سکے اور کسی کے جرم کی پوری پوری سزا مل سکے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی دوسرا جہان ہو اور یہ زندگی موت کے بعد آئے تاکہ اعمال کا پورا پورا صلہ مل سکے۔

اسلامی تہذیب و تمدن میں ایمانیات کا حصہ بنیادی ہے بقول مولانا مودودی ایمانیات کے تصور سے ایک عقلی نتیجے کے طور سے یہ قرار پایا ہے کہ انسان کی زندگی کا نصب العین اپنے خالق اور آقا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے۔

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر اور ناہی حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے اختیار کو احکام خداوندی کے تابع کر دے۔

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انھی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے نامکمل نتائج سے دھوکا نہ کھائے۔

(نیز دیکھیے "آخرت"، "آسمانی کتب"، "ارکان اسلام"، "توحید"، "تہذیب اسلامی"، "رسالت"، "عبادت"، "عقیدہ"، "عمل صالح"، "فرشتہ" اور دیگر متعلقہ عنوانات)

ایمن بن خریمؓ صحابی، فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ مسلمانوں میں باہم جو جنگیں ہوئیں ان سے الگ تھلگ رہے۔ خلفائے بنو امیہ سے ان کے گہرے اور دوستانہ تعلقات تھے۔ خاص کر مروان سے بہت گہرے مراسم تھے اور وہ مروان کے دربار میں بلا روک ٹوک ہر وقت آتے جاتے تھے۔ اسی راہ و رسم کی بنا پر لوگ انہیں خلیل الخلفاء کہتے تھے۔ شاعر تھے لیکن صرف رزمیہ اشعار کہتے تھے۔ آپ نے آنحضورؐ سے چند احادیث روایت کی ہیں۔

اینال سیف الدین العلائی الملک الاشرف سلطان مصر و شام۔ سلطان برقوق کا غلام۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء سے ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء تک حکمران رہا۔ سلطان برقوق نے اسے فوج کے مملوک دستے میں بھرتی کر لیا تھا۔ بعد ازاں سلطان کے بیٹے سلطان الناصر فرج نے اسے آزاد کر کے جمدار کی فوج میں شامل کیا۔ ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں اس کو خاصکی کا عہدہ عطا ہوا۔ سلطان المؤید کی وفات پر دس مملوکوں کا امیر مقرر کیا گیا۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء تا ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء سلطان برس بے کے عہد حکومت میں وہ اور بڑے عہدوں پر فائز ہوا۔ چنانچہ وہ رئیس طبلخانہ، رئیس نوبت، وغیرہ کے عہدوں پر فائز رہا۔ ۸۳۲ھ/۱۴۲۸ء میں غزہ کا والی مقرر کیا گیا۔ ۸۴۰ھ/۱۴۳۶-۳۷ء میں صفد کا حاکم بنا۔ ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں قاہرہ واپس آیا اور سلطان جقمق نے اسے ایک ہزاری امیر لغیر کسی عہدے کے مقرر کیا۔ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں وہ ادوار کبیر بنا دیا گیا۔ ۸۴۸ھ/۱۴۴۰ء میں سلطان جقمق کے بیٹے کی جگہ اینال کو ۷۳ سال کی عمر میں سلطان منتخب کیا گیا۔ اس کا دور حکومت بڑا خیر و برکت والا تھا۔ اس نے اپنے پیشروؤں کے ڈھالے ہوئے چاندی کے ناقص سکے واپس لے کر نئے اور بہتر سکے جاری کیے۔ ملک کے خارجی معاملات میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔ انہی تعلقات کی وجہ سے جو قبرص اور مصر کے مابین تھے۔ اینال یورپ کی سیاست میں بھی حصہ لینے لگا۔

اینال بہت نرم طبیعت اور رحم دل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی رعایا پر عدل اور نرمی کے ساتھ حکومت کی۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے احمد کو اپنا جانشین تسلیم کر لیا تھا۔ وہ بڑا دور اندیش حاکم تھا۔ احمد سرکش مملوکوں پر قابو نہ پا سکا اور اس طرح وہ چار ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔

ایوبؑ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی۔ جن کا صبر بہت مشہور ہے اور ضرب المثل بن چکا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے نسب سے تھے اور بقول ابن عساکر ان کی والدہ حضرت لوطؑ کی بیٹی تھیں۔ تورات کے اکثر محققین کے نزدیک حضرت ایوبؑ عربی تھے۔

قرآن شریف میں حضرت ایوبؑ کا ذکر سورۃ النساء، الانعام، الانبیاء اور ص میں آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

"اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔" ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اسے دور کر دیا۔ اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گذاروں کے لیے۔" (۲۱: ۸۳ تا ۸۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

"اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مارو! یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔ ہم نے اسے اس کے اہل و عیال واپس دیے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر۔ اور (ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک گٹھا لے اور اس سے مار دے اپنی قسم نہ توڑ۔ ہم نے اسے صابر پایا۔ بہترین بندہ اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہے۔" (۳۸: ۴۱ تا ۴۴)

عہد نامہ قدیم میں اس قرآنی شخصیت سے مماثلت رکھنے والی ایک شخصیت کا ذکر موجود ہے۔ بائبل میں ان کا نام جوب (Job) ہے اور ان کی طرف ایک صحیفہ منسوب ہے۔ بائبل میں جو کتاب ایوب کے نام سے منسوب ہے وہ بعد کی تصنیف ہے۔

حضرت ایوبؑ کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اسی وجہ سے آپ بہت زیادہ خیرات اور صدقات کرتے تھے۔ آپ غریبوں، مصیبت زدوں کی [illegible] کرتے تھے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ اجنبیوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ کی زندگی میں بڑی بڑی آزمائشیں آئیں آپ ان آزمائشوں میں صابر رہے اور [illegible] کامران رہے۔

ایوبؑ کے بارے میں زیادہ تر معلومات بائبل سے ماخوذ ہیں [illegible] میں درج ہے کہ "عوص کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا۔ وہ [illegible] تھا اور خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔" [illegible] "تواریخ" میں ایک اور نام یوباب آتا ہے۔ محققین کے نزدیک یہ [illegible] کے دو نام ہیں۔ جب کہ تورات کے مطابق یوباب اور ایوب دو جدا شخصیتیں [illegible] یوباب بنی یقطان سے ہیں اور ایوبؑ بنی ادوم (عیسو) سے ہیں۔ [illegible] ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے [illegible] حضرت ایوبؑ عرب تھے۔ عرب ہی میں ظاہر ہوئے اور کتاب ایوب [illegible] عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں [illegible] سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایوبؑ بنی ادوم میں سے ہیں اور ان کا زمانہ [illegible] ۷۰۰ ق۔م کے درمیان ہے۔ ان کی تائید مشہور مؤرخ یعقوبی کے قول سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یوباب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں۔ بعض دیگر محققین کے نزدیک حضرت ایوب کا زمانہ ۱۵۰۰ ق۔م سے ۱۳۰۰ ق۔م کی حدود میں ہے۔ امام بخاری نے "کتاب الانبیاء" میں حضرت ایوبؑ کا ذکر حضرت یوسفؑ کے بعد اور حضرت موسیٰؑ سے پہلے کیا ہے۔

قرآن مجید کے مندرجہ حوالہ جات سے یہ علم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب ایک پاک اور مقدس انسان تھے اور مصائب کے ذریعے ان کا امتحان لیا گیا تھا۔ جس میں وہ [illegible]

رہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایوب علیہ السلام تیرہ تک مصائب میں مبتلا رہے۔

اسرائیلیات کے مطابق شیطان حضرت ایوبؑ کی پرہیزگاری اور خداترسی سے جل بھن اٹھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے حضرت ایوب کو آزمانے کے لیے اجازت مانگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تین مراحل میں حضرت ایوبؑ کو آزمانے کی اجازت دی گئی۔ سب سے پہلے ان کا سارا مال تباہ و برباد ہو گیا لیکن آپؑ نے اس پر صبر کیا تو پھر آپ کی ساری آل اولاد ختم ہو گئی۔ حضرت ایوبؑ نے اس پر بھی صبر کیا تو پھر ان کے جسم کو بیماری سے آزمایا گیا۔ سارے جسم میں کیڑے پڑ گئے اور کوئی ان کے قریب نہ آتا تھا۔ سوائے ایک بیوی کے جو ان کی خدمت گذار تھی۔ یہاں تک کہ آپ کو اس جگہ پر پھینک دیا گیا جہاں گندگی پڑتی ہے۔ اس وقت بھی بیوی نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا جب اس آزمائش میں بھی آپ کے پاؤں میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی تو شیطان نے آپ کو اس طرح بہکانے کی کوشش کی جس طرح حوا کے ذریعے آدم کو بہکایا تھا لیکن آپ شیطان کی اس چال کو سمجھ گئے اور قسم کھائی کہ اگر بیوی نے شیطان کی بات پر کان دھرا تو اسے پیٹیں گے۔ بالآخر جبریلؑ ان کے نہانے کا پیغام لائے کہ آپؑ ایک کراماتی چشمے کے ذریعے اس مصیبت سے نجات پائیں گے۔ چنانچہ آپ نے اس چشمے کا پانی پیا اور اس میں نہائے اور اس طرح صحت یاب ہو گئے۔ آپ کا مال آپ کی جائیداد آپ کے بچے پہلے سے بھی دوچند ہو کر آپ کو واپس مل گئے۔ آپؑ کے اس صبر و تحمل سے صبرِ ایوب کی ترکیب بنی ہے۔ اور اس مقام پر جہاں آپ نے زندگی گذاری تھی، طبری کے بقول ۹۳ برس کی عمر میں حضرت ایوب کی روح ۲۰۰ برس میں وفات پائی۔

حضرت ایوبؑ حضرت یوسفؑ کے بعد نبوت پر سرفراز ہوئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت سلیمانؑ کے بعد آپ کا ذکر آتا ہے۔ آپ نے حوران میں دین کی تبلیغ کی۔ یہ علاقہ عرب میں تھا اور غالباً یہ وہی علاقہ ہو گا جو قوم عاد کا مسکن تھا۔ دمشق کے نزدیک نوے کے مقام پر آپ کا مقبرہ زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ یہاں پر اب تک وہ چٹان موجود ہے جس پر آپ نے اپنی آزمائش کا زمانہ گذارا تھا اور وہ چشمہ بھی ہے جس کے پانی سے غسل کر کے آپ تندرست ہو گئے تھے۔

روایتوں میں آیا ہے کہ جب لوگوں کے مختلف گروہ جنت میں داخل ہو رہے ہوں گے تو حضرت ایوبؑ صبر کرنے والے لوگوں کے سردار ہوں گے۔

ایوب بن ابی عتیمہ (وفات ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء) ابوبکر ایوب بن کیسان ابی عتیمہ، علم و فضل میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ عنزہ کے غلام تھے۔ ان کے ہم عصر تمام علماء اور فقہا ان کی علمی وجاہت کو تسلیم کرتے تھے۔ خواجہ حسن بصری نے انہیں بصرہ کے اہل علم کا "سردار" کہا ہے۔ ان کا شمار بصرہ کے ممتاز ترین حفاظ حدیث میں ہوتا تھا۔ ان کی مرویات کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچتی ہے۔ بصرہ ہی میں طاعون کی بیماری سے وفات پائی۔

ایوب خاں، محمد (۱۴ مئی ۱۹۰۷ء — ۲۰ اپریل ۱۹۷۴ء) پاکستان کے سابق صدر اور فیلڈ مارشل ضلع ہزارہ (صوبہ سرحد) کے گاؤں ریحانہ کے ایک متوسط فوجی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد میر داد خاں ہوڈسن کے رسالدار میجر تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں پائی۔ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کر کے علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے۔ جون ۱۹۲۶ء میں فوجی تعلیم رائل ملٹری کالج سینڈہرسٹ (انگلستان) سے حاصل کر کے ۱۹۳۲ء میں برطانوی ہندی فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ ایک سال تک رائل فیوسیلرز میں خدمات انجام دیں پھر پنجاب رجمنٹ میں کرنل کمانڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر آپ برما کے محاذ پر بھیج دیئے گئے۔ وہاں اپنے دستے کے کمانڈر رہے ۱۹۴۷ء میں کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔

قیام پاکستان کے بعد کرنل محمد ایوب خاں کو وزیرستان میں بریگیڈیر مقرر کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں انہیں مشرقی پاکستان میں میجر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ جہاں وہ پہلے پاکستانی جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر ہوئے۔ تقریباً ۱۹۵۰ء کے وسط میں آپ پاکستان میں ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء میں آپ بری فوج کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے آپؒ بہت سے ملکوں کے خیر سگالی دورے پر گئے۔ ان میں ایران عراق، عرب، اردن، ترکی، امریکا، اسکنڈے نیویا وغیرہ اہم ہیں۔ وہاں آپ نے پاکستان کے لیے سیاسی و فوجی دوستی کی راہیں ہموار کیں۔ اسی بنا پر آپ کو پاکستان کی سیاست میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔

۱۹۵۴ء کے اواخر میں محمد علی بوگرا نے گورنر جنرل کی دعوت پر نئی وزارت تشکیل کی۔ اس میں سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خاں کو بھی شامل کیا گیا۔ اسی وزارت نے وحدت مغربی پاکستان کا منصوبہ تیار کیا۔ جب سکندر مرزا صدر پاکستان بنے تو انہوں نے ملکی سیاسی صورت حال کے پیش نظر، ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کیا۔ جنرل محمد ایوب خاں کا تقرر سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کیا گیا مارشل لاء کے تحت تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دی گئیں۔ سیاست دانوں پر ایبڈو۔ کا قانون نافذ کیا گیا۔ تاکہ وہ دوبارہ سیاست میں داخل نہ ہوں۔ ملک کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر اندیشہ تھا کہ اگر سابقہ نظام سیاست بحال کیا گیا تو وہی ابتری پھیل رہے گی۔ اور ملک کو چنداں کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہ دیکھتے ہوئے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل محمد ایوب خاں نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ پرامن فوجی انقلاب برپا ہوا اور سکندر مرزا مستعفی ہو کر ملک سے باہر چلے گئے۔ اب جنرل محمد ایوب خاں پاکستان کے صدر بھی تھے۔

صدر محمد ایوب خاں نے جس تیزی سے ملکی صورت حال کو سنبھالا، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ خانہ جنگی سر پر مسلط تھی، ہر طرف لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ ملکی اقتصادیات کا دیوالیہ نکل چکا تھا اور قومی مستقبل خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ اس حالت میں صدر محمد ایوب خاں نے ملکی دانشوروں کو احیائے ملک و قوم کے کام پر لگا دیا۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو فوج نے صدر جنرل محمد ایوب خاں کو اعلیٰ ترین عہدہ فیلڈ مارشل پیش کیا۔ اسی روز ملک میں بنیادی جمہوریت کا نظام قائم کیا گیا۔ جس کے تحت بالغ رائے دہی کے اصول پر دونوں صوبوں سے دس ہزار ارکان منتخب ہوئے۔ اگلے برس سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں آئین کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کی رپورٹ کی روشنی میں یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا نفاذ کیا گیا۔ یہ آئین جمہوری، وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا تھا۔ اس میں پاکستان کے دونوں صوبوں (مغربی اور مشرقی) کو مساوی نمائندگی دی گئی۔

۸ جون ۱۹۶۲ء کو مارشل لاء ختم کر کے نیا آئین نافذ کیا گیا اور صدر ایوب نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا۔ سیاسی عہدہ صدارت پر فائز ہوتے ہی صدر ایوب نے ملکی اصلاحات نافذ کرنا شروع کیں۔ زرعی اصلاحات کے تحت ملک سے پہلی بار جاگیرداری کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ زمین کی حد ملکیت مقرر کی گئی۔ تقریباً سوا بائیس لاکھ ایکڑ رقبہ ڈیڑھ لاکھ کسانوں میں تقسیم کیا گیا۔ پانی، بیج اور کھاد کی

ایوب خان

تقسیم کا بہتر نظام قائم کیا گیا۔ مشینی کھیتی باڑی کو فروغ دیا گیا۔ ملک کے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچادی گئی۔ سندھ طاس کا پرانا جھگڑا ختم ہوچکا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں بھارت اور پاکستان کے مابین دریائی پانی کا معاہدہ ہوگیا۔ جس کی رو سے ۱۹۷۰ء میں بھارت نے تین مشرقی دریا راوی، بیاس اور ستلج کا پانی بند کرلینا تھے۔ عالمی بینک سے پاکستان کو متبادل نہری نظام قائم کرنے کے لئے قرضہ دیا گیا اور یوں دنیا کے سب سے بڑے بند (منگلا اور تربیلا) اور سب سے بہتر نہری نظام وجود میں آئے۔ یوں ملک کا اقتصادی نظام پہلی بار صحیح بنیادوں پر استوار ہوا۔ ماہرین معاشیات نے صدر ایوب کے دور کو پاکستانی معیشت کا سنہری دور کہا ہے۔

جنوری ۱۹۶۵ء میں نئے آئین کے تحت دوبارہ انتخابات ہوئے۔ تقریباً اسی ہزار دوٹروں نے ووٹ ڈالے۔ صدر ایوب نے پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو کی اور اس کے صدر کی حیثیت سے انتخابات میں شریک ہوئے۔ تمام سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ متحدہ حزب مخالف نے قائد اعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو مشترکہ صدارتی امیدوار کی حیثیت سے سامنے لائی۔ اگرچہ صدر ایوب نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی لیکن مشرقی پاکستان اور خصوصاً ڈھاکہ میں محترمہ فاطمہ جناح بھاری اکثریت سے کامیاب رہیں۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان کی سرحد پر حملہ کردیا۔ فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان کی کمان میں پاکستان افواج نے بھارت کو زبردست شکست دی شکست خوردگی کے بعد بھارت اقوام متحدہ کی طرف امن کے لئے بھاگا اور بالآخر ۲۳ ستمبر کو سلامتی کونسل کی ہدایت پر جنگ بندی ہوئی۔

دونوں ملکوں کے مابین صلح کرانے کے لئے روس نے اپنی خدمات پیش کیں اور ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں صدر پاکستان محمد ایوب خان اور وزیر اعظم بھارت لال بہادر شاستری نے دستخط کردیئے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو صدر ایوب کے ہمراہ تھے۔ اس معاہدے کی رُو سے دونوں ملکوں کی فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء والی سرحدوں پر چلی گئیں۔ چونکہ اس اعلان سے مسئلہ کشمیر پھر سے کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اس لئے عوام میں بڑی مایوسی اور بددلی پھیل گئی۔ جگہ جگہ پر مظاہرے ہوئے۔ ائر مارشل اصغر خان اور جسٹس محبوب مرشد عوام کی رہنمائی کے لئے میدان میں نکل آئے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو بھی جو اعلان تاشقند کے مخالف تھے عوامی رہنمائی کے لئے میدان میں آ گئے۔ حکومت نے مظاہروں کو دبانے کی کوشش کی، جس سے عوام کا یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ ان کے جمہوری حقوق سلب کر لئے گئے ہیں اور ملک میں نوکر شاہی کا دور دورہ ہے۔ ۱۹۶۸ء میں تمام مخالف سیاسی جماعتوں نے تحریک جمہوریت کا آغاز کیا۔

ادھر ۱۹۶۸ء کے اواخر میں صدر محمد ایوب خان کی حکومت نے دس سالہ ترقیاتی جشن منایا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء کو سب جماعتوں کے نمائندوں نے آٹھ نکاتی مطالباتی پروگرام پیش کیا اور کہا کہ جب تک انہیں پورا نہیں کیا جاتا وہ اگلے انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ ۷ فروری کو صدر ایوب نے گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی پیشکش کی۔ ۲۲ فروری کو جمہوری مجلس عمل کی خواہش پر ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ ۲۶ فروری کو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جن میں ائر مارشل اصغر خان اور جسٹس محبوب مرشد شامل تھے۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی اور عبدالحمید بھاشانی (صدر نیشنل عوامی پارٹی) نے شرکت سے انکار کردیا۔ عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمان نے بھی اپنا چھ نکاتی پروگرام پیش کردیا تھا۔ انہیں کچھ ہی عرصہ پہلے اگرتلہ سازش کیس سے رہائی دلوائی گئی تھی۔

عوامی ردعمل کے طور پر پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ منظم ترین جماعتیں بن چکی تھیں ۱۷ مارچ کو بھاشانی نے "گھیراؤ جلاؤ" کا نعرہ لگایا۔ ملک بھر میں ہڑتالوں اور بلوؤں کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ ملک میں ہر طرف انتشار پھیل چکی تھی۔ چنانچہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب نے پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا۔ اس کے ساتھ ہی صدر ایوب مستعفی ہوگئے اور آغا جنرل محمد یحییٰ خان صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جن کے دور اقتدار میں بھارت کے ساتھ جنگ ہوئی اور مشرقی پاکستان کا صوبہ پاکستان سے کٹ کر بھارت کی [illegible]

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کیا اور تادم مرگ اپنے گھر پر ریٹائرڈ زندگی گذارتے رہے۔ پاکستان کے [illegible] جناب ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کی وفات ہوئی انہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ان کے گاؤں ہی میں دفن کیا گیا۔

ایوب خان ایک قابل اور مدبر شخصیت کے مالک تھے۔ علیگڑھ کے گریجویٹ اور اعلیٰ فوجی تربیت یافتہ تھے۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑی اور [illegible] اور کمانڈر تھے۔ تدبر اور ذہانت میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے۔ اپنی تقریریں خود ہی تیار کرتے۔ انگریزی اور اردو میں روانی کے ساتھ [illegible] لہجے میں تقریریں کیا کرتے۔ ان کی ہر تقریر بسم اللہ اور السلام علیکم سے شروع ہوتی۔ دراز قد، مناسب اور مضبوط بدن، حسین، پرکشش اور بارعب چہرے کے مالک فیلڈ مارشل محمد ایوب خان دنیا بھر میں مقبول شخصیت تھے۔

صدر ایوب نے اپنی خودنوشت سوانح عمری انگریزی میں لکھی۔ جو اردو میں "جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی" کے نام سے ترجمہ ہوئی۔ اس کے مطالعے سے ہمیں ایک سچا مسلمان، دردمند پاکستانی، ماہر فوجی، مدبر سیاستدان اور شفیق رہنما نظر آتا ہے۔ اگر ان سے چند سیاسی غلطیاں نہ ہوجاتیں تو بلاشبہ وہ عظیم رہنما کہلا سکتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو جس غیر جانبدارانہ اصول پر کاربند کیا تھا۔ اس سے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند ہوگیا تھا۔ ان کے

عہد حکومت کو دنیا بھر کے ماہرین معاشیات نے بلاشبہ بہترین دور کہا ہے ملک مہنگائی اور چور بازاری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور شاید یہ انہی کے تدبر کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں عام اشیائے خوردنی مہنگی ہونے کی بجائے سستی ہوتی چلی گئیں۔ اس بات سے انکار مشکل ہے کہ ان کے دور میں ملک نے زرعی اور صنعتی لحاظ سے بے مثل ترقی کی۔

چند ماہرین سیاسیات اور دانشوروں نے صدر ایوب کے دور اور ان کے آئین کو غیر جمہوری قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں صدر ایوب ایک آمرِ مطلق تھے اور اسی حیثیت سے ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے دور میں عوام کو سیاسی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان کی رائے کے بالمقابل کسی دوسری رائے کی کوئی اہمیت تھی۔ انہوں نے ہر امر کو طے کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھایا تھا مثلاً تعلیمی، زرعی، آئینی، اسلامی مشاورتی کمیشن وغیرہ اور انہی کمیشنوں کی رپورٹ میں رد و بدل کے بعد اصلاحات نافذ کیں۔ ان کے دور کو کمیشنوں کا دور بھی کہا جاتا ہے۔

ایوبیہ مسلمان سلاطین کا خاندان جو چھٹی صدی ہجری کے بارہویں صدی عیسوی میں مصر، شام، فلسطین اور یمن پر حکمران رہا۔ اس خاندان کا بانی صلاح الدین ایوبی تھا۔ اس کا باپ نجم الدین ایوب بن شاذی بن مروان [illegible] آرمینیا کا [illegible] معزز کرد تھا۔ [illegible] شاذی عراق میں جاگیردار تھا۔ یہیں صلاح الدین پیدا ہوا۔ ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں صلاح الدین نے فاطمیہ کو ختم کر کے ایوبی [illegible] کی بنا رکھی۔ وہ نورالدین زنگی کا باج گزار تھا۔ اس کی وفات کے بعد صلاح الدین نے [illegible] اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اسے خلیفۂ بغداد کی طرف سے بھی [illegible] شام کی حکومت کی سند مل گئی [illegible] ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں شام آیا تاکہ صلیبیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حفاظت کرے۔ اس نے یروشلم کے عیسائی حکمرانوں [illegible] سے بے دخل کر دیا۔ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں اس نے ایک بار [illegible] کو صلیبیوں سے آزاد کرایا۔

اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی حصے میں صلاح الدین نے بازنطینیوں، [illegible] کے بحری بیڑوں کے خطرے کا سامنا کیا۔ ان کے ساتھ جنگوں [illegible] نہیں ہوئی۔ ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ/۲ ستمبر ۱۱۹۲ء کو صلح نامہ [illegible] کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ جس کے بعد صلیبیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔

صلاح الدین کے بعد اس کا بھائی الملک العادل اور پھر بھتیجا الملک الکامل تخت نشین ہوئے۔ ان کا دور مجموعی طور پر امن و امان کا دور رہا ہے۔ لیکن الکامل کی وفات کے بعد خاندانی اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں العادل کے بیٹے الاوحد نے ارمنی علاقے کو ایوبی سلطنت میں شامل کر لیا۔ صلاح الدین ہی کے وقت سے سلجوقیوں اور ایوبیوں کے درمیان ٹکراؤ ہو رہے تھے۔ انہوں نے حلب کے ایوبیوں کی سرپرستی کی اور مصر کے ایوبیوں کے خلاف نبرد آزما ہو گئے دوسری طرف ایوبیوں کی توجہ صلیبیوں کی طرف مبذول تھی۔ صلاح الدین کے بعد ایوبیوں نے صلح کن پالیسی اختیار کر لی تھی۔ ۶۰۱ھ/۱۲۰۴ء میں العادل نے تمام ساحلی مقامات فرنگیوں کو لوٹا دیئے۔ حلب کے ایوبیوں نے مصر کے ایوبیوں سے بچنے کے لیے کبھی الجزیرہ، حمص اور حماۃ کے ایوبیوں کا وسیلہ تلاش کیا اور کبھی روم کے سلجوقیوں کا فرانس اور اٹلی کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات بحال ہو چکے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوبی سلطنتیں کبھی بھی شیر و شکر نہ ہو سکیں لیکن ان کے عہد میں اسلام نے کما حقہٗ فروغ پایا۔ اعلیٰ پائے کے مدارس قائم ہوئے جس میں فقہ کے چاروں مسالک کا درس ہوتا تھا۔ تصوف کے سلسلوں کا بھی احترام کیا گیا۔ مختلف خانقاہیں تعمیر کرائی گئیں۔ قاضیوں اور علماء کو کاروبارِ حکومت میں زیادہ سے زیادہ شریک کیا جاتا تھا۔ ان کے عہد کا ایسا ہی ایک خاندان اولادِ شیخ کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ الظاہر غازی کے عہد میں مشہور صوفی شہاب الدین سہروردی کے قتل کا واقعہ ظہور پذیر ہوا لیکن اس سے ایوبیوں کی مذہب پرستی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

الکامل کی وفات پر ایوبیوں کا حقیقی دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ تاہم اس کے بعد العادل بھی ایک اچھا حکمران رہا۔ اس وقت کیفا کی حکومت اس کے بڑے بھائی الصالح کے پاس تھی۔ عملی طور پر الصالح ہی ایوبیوں کا آخری حکمران تھا۔ اس کا بیٹا توران شاہ اپنی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء مملوک نام کے نئے دورِ حکومت کا آغاز ہو گیا۔ اس حکومت کی داغ بیل ڈالنے والا درحقیقت الصالح ہی تھا۔ رفتہ رفتہ تمام علاقوں پر ایوبیوں کی حکومت ختم ہوتی چلی گئی۔ تفصیل کے لیے شجرہ دیکھیے۔ صرف حماۃ کی ریاست اپنے فرمانروا ابوالفدا کے باعث ۷۴۲ھ/۱۳۴۲ء تک قائم رہی۔ اس خاندان کا خاتمہ آق قیونلو خاندان کے ہاتھوں ہو گیا۔

ب

باب دروازہ، داخلے کا ذریعہ، ٹوٹا ہوا حصہ، مقررہ حصہ، سمت، طرف، امام کا خاتم۔ اسلامی تعمیرات میں باب کا لفظ قلعوں اور مساجد کے دروازوں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ نیز اسلامی تاریخ میں ایک مذہب کے بانی کا نام بھی ہے، جس کی بناء پر بابی مذہب نے جنم لیا۔ اس لقب نے علی محمد شیرازی کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ (دیکھئے "باب، علی محمد"، "بابیت")

دروازے کے معنوں میں باب دو طرح سے مستعمل ہے۔ نمبر ا مساجد اور مقبروں کے لیے اور نمبر ۲ قلعوں کے لیے۔ ابتدائی مساجد میں داخلے کے لیے کسی قسم کا دروازہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ تقریباً تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک کسی مسجد کا دروازہ تعمیراتی فن کا شاہکار نہیں تھا۔ یہ دروازے عموماً سادہ نوعیت کے ہوتے تھے۔ سب سے پہلا باب فاطمیوں کے عہد میں المہدیہ مسجد میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ۳۰۸ھ/۹۲۰ء میں تعمیر ہوا۔ بعد میں اسی طرز کی تعمیرات مصر میں ہونا شروع ہوئیں۔ ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں حلب کے مدرسہ شادبخت کا دروازہ ایک نئی طرز پر تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد دروازے نئی نئی طرز پر بنائے جانے لگے۔ دمشق کی

قلعوں کے نیم مدوّر دروازے

جامع التوبہ کا دروازہ ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں تعمیر ہوا۔ گہرے طاق نما دروازوں کے اوپر ایک ایک نیم گنبد ہوا ہوتا تھا۔ یہ طرز تعمیر شام میں آئی تو گنبدوں کو سہارا دینے کے لیے نئی نئی تراکیب استعمال کی گئیں۔

بلند قوسی طرز کے دروازے چودہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہونا شروع ہوئے۔ ایران میں اس قسم کے دروازے عام ہوتے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں ابوالنصر پارسا کے مقبرے کا دروازہ نہایت ہی قابل دید بنایا گیا۔ ہندوستان میں اسی کا طرز تعمیر مروج ہوا۔ اس میں ایک اونچا محراب دار کھانچا ہوتا ہے۔ داخل ہونے کا راستہ پیچھے کی طرف ہے۔ اس کے بازو دو منزلہ اور عبائیں درجے کے زاویے پر کاٹ دیئے گئے ہیں۔ ہر منزل میں ایک نوکدار محراب کا طاق ہے۔ فتح پور سیکری اور دہلی کی جامع مساجد کے دروازے اسی طرح کے ہیں۔

قلعوں کے دروازے ابتداء میں سیدھے راستے ہوتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے دونوں طرف دو نیم مدوّر برج بنا دیئے جاتے تھے۔ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں اخیضر کے مشہور قلعے میں دروازے کی ایک خاص طرز کو اختیار کیا گیا۔ اس میں داخلے کی تین میٹر چوڑی محراب کو دو مدور برجوں کے درمیان ۹۱ سنٹی میٹر پیچھے ہٹا کر بنایا گیا ہے۔ دونوں طرف میں سنٹی میٹر چوڑی گلی ان برجوں کے اندرونی گوشوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس محراب کے پیچھے ۹۵ میٹر کے فاصلے پر ایک اور محرابی راستہ ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک غلام گردش ہے۔ جس پر سرنگ نما ڈاٹ کی چھت ہے۔ سیدھے دروازے، جو محرابی کھانچوں میں بنائے گئے۔ بعد کے قلعوں میں دروازے خم دار بنائے گئے المغرب میں انہی دروازوں نے فروغ پایا۔

باباطاہر (وفات ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء یا ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء) ایران کا صوفی شاعر۔ اس کے متعلق معلومات "راحت الصدور" میں ملتی ہیں۔ سلجوقی سلطان طغرل اور حکیم ابن سینا سے صحبت رہی۔ باباطاہر کو بعض نے ہمدانی اور بعض نے لُری کہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ باباطاہر دونوں جگہ رہا ہو کیونکہ گیارہویں صدی عیسوی میں ہمدان اور لُرستان کے لوگوں میں بہت میل جول تھا۔ خرم آباد میں ایک محلہ باباطاہر کے نام سے موسوم ہے باباطاہر کا مقبرہ محلہ تن بازار میں شہر کی شمال مغربی جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ہے۔ مقبرے کی عمارت معمولی سی ہے اور اس میں کوئی خاص بات نہیں اس کے پہلو میں اس کی عقیدت مند فاطمہ اور مرزا علی نقی کوثری کی قبریں ہیں

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

بابا طاہر کی زبان جس میں اس نے رباعیات کہی ہیں۔ فصیح فارسی زبان کے قریب تر ہے۔ اس کی رباعیات میں ایک خاص علامت پائی جاتی ہے رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہے بابا طاہر کے کلام کے نام سے بعد میں جو مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں بہت سا حصہ بابا کے نام سے شامل کر دیا گیا ہے جو حقیقت میں بابا کا کلام نہیں ہے۔

بابا طاہر اکثر اپنی شاعری میں اپنا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو آوارہ درویش اور قلندر ظاہر کرتا ہے جس کے سر پر گھر کی چھت نے کبھی سایہ نہ کیا ہو اور جو پتھر کو تکیہ بنا کر سوتا ہو اور جس کو روحانی پریشانیوں نے ستا رکھا ہو۔ بابا طاہر کے کلام میں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے جذبات تر و تازہ ہیں اور عام صوفیانہ رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہیں۔ اس کی تشبیہات بے ساختہ ہیں۔ زبان و بیان میں سادگی ہے۔

بابا طاہر ایک صوفی بھی تھا۔ وہ بائیس فلسفیانہ رسائل کا مصنف تھا آکسفورڈ اور پیرس میں بابا طاہر کے اقوال کی شرحیں موجود ہیں۔ مکمل رسالہ الکلمات القصار، ارمغان کے ایڈیشن میں چھپ چکا ہے۔ جس میں ۳۶۶ اقوال مقولے ہیں جو تئیس ابواب میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ اس رسالے نے صوفیا کے حلقوں میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

گرمیز کے مطابق ذوالحق کے لرک بالخصوص بابا طاہر کی صوفی ہونے کی حیثیت سے تعریف کرتے ہیں اور اس کی بہن بی بی فاطمہ کو بھی بہت قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں۔

باب السلام امن کا دروازہ۔ مسجد حرام کے ایک دروازے کا نام ہے جو مشرقی جانب ہے۔ جب قریش میں اس بات پر جھگڑا ہوا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ کون سا نصب کرے تو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے آنحضور اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ یہ دروازہ باب بنی شیبہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ بنو شیبہ، شیبہ بن عثمان کا خاندان ہے جسے آنحضور نے خانہ کعبہ کی چابی عنایت فرمائی تھی۔ ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں اس کی دوبارہ عمارت بنائی گئی۔

باب النساء عورتوں کا دروازہ۔ یہ لفظاً آنحضور کی ازواج مطہرات کے گھروں کے دروازوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ آنحضور کے سوا کسی اور آدمی کو ان دروازوں سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دروازے اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ آنحضور ان سے ہو کر آسانی کے ساتھ مسجد میں آجاتے تھے۔ ہر زوج مطہرہ کا گھر علیحدہ تھا۔

بابائی ایک مذہبی اور مجلسی تحریک کا نام جس کا پیشوا بابا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ تحریک ترکی میں منگول کے حملہ سے کچھ عرصہ پہلے برپا ہوئی اور اس نے ایشیائے کوچک میں ترکی کے مراکز میں ہل چل مچا کر رکھ دی۔ اس تحریک کا ترکوں کی ثقافتی اور مجلسی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ تحریک ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی تک بہت زور پکڑ چکی تھی۔ اور سلطنت کا انتظامی اور ثقافتی ڈھانچہ اس تحریک سے وجود میں آچکا تھا۔ جو ایرانی اثرات کا نتیجہ تھا۔ ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء کے قریب سرحد شام کے علاقے کفر سود سے ترکمانوں کے علاقوں میں ایک بابا جو خود کو نبی کہتا تھا آیا اور اس نے ان علاقوں میں وعظ تلقین شروع کر دی۔ دیہاتی اور سرحدی علاقوں کے ترکمان جو قدیم ترکی روایات کے زیادہ پابند تھے۔ اس تحریک کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ اور اسی طرح سے ترکمان عنصر اور حکومت کے درمیان اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ ان اختلافات کی وجہ سے سلجوقی حکومت بہت کمزور پڑ گئی۔ تو بابا (عوامی واعظ) نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور کئی بڑے لشکروں کو یکے بعد دیگرے شکست دی۔ آخر کار کرائے کے سپاہیوں کی مدد سے بابا کو شکست دی گئی اور قید کر لیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس تحریک کو دبایا نہ جا سکا۔

بابر (۶ محرم ۸۸۸ھ/۱۴ فروری ۱۴۸۳ء - ۶ جمادی الاوّل ۹۳۷ھ/۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) ظہیر الدین محمد ابن عمر شیخ مرزا ہندوستان کا پہلا مغل شہنشاہ والدہ کا نام تغلق نگار خانم تھا۔ باپ کی طرف سے اس کا نسب تیمور سے اور ماں کی طرف سے چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ فرغانہ میں پیدا ہوا۔ باپ کی وفات کے بعد رمضان ۸۹۹ھ/جون ۱۴۹۴ء میں فرغانہ کے تخت پر بیٹھا۔ ترکستان کے سیاسی حالات نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اپنے رشتہ داروں کی سنگدلی اور ناخدا ترسی کی وجہ سے وہ چند جاں نثاروں کے ساتھ دشوار گزار پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء تک اس نے سمرقند کے حاکم اور اپنے چچا سلطان احمد اور تاشقند کے حاکم اور اپنے ماموں سلطان محمود سے اپنی ریاست واپس حاصل کر لی۔ ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں اس نے فرغانہ کی ریاست کو اپنے اور اپنے بھائی جہانگیر کے درمیان تقسیم کر لیا۔ اسی سال اس کی شادی ہوئی۔ اگلے سال بابر نے سمرقند پر حملہ کر کے اسے شیبانی سے چھین لیا۔ لیکن ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء میں شیبانی نے بابر کو سرپل کے مقام پر شکست دی۔ سمرقند پر حملہ کرنے سے پہلے بابر اندیجان اپنے بھائی کو دے آیا تھا۔ اس لیے اب اس کے لیے کوئی مقام نہیں رہ گیا تھا جہاں وہ واپس چلا جاتا۔ کابل پر قبضہ کرنے کے وقت تک بابر خانہ بدوشوں میں اپنی زندگی کے دن گزارتا پھرتا رہا۔ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں اس نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ جمادی الآخر ۹۲۸ھ/مئی ۱۵۲۲ء میں قندھار اس کے قبضہ میں آگیا۔ اس وقت دہلی پر سکندر لودھی حکمران تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ ابراہیم نے ناتجربہ کار اور تیز طبیعت ہونے کی وجہ سے پٹھان سرداروں کو اپنا مخالف کر لیا تھا۔ چنانچہ دولت خان لودھی اور ابراہیم کے چچا عالم خاں نے بابر کو ابراہیم کے خلاف ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت۔ اس دعوت پر بابر نے ہندوستان پر پانچ حملے کیے۔ مغربی پنجاب پر بابر کا قبضہ پہلے چار حملوں میں ہو گیا تھا۔ آخری حملہ میں اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں جو پانی پت کی تیسری لڑائی کے نام سے مشہور ہے شکست دے کر دہلی اور آگرے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں وہ ہندوستان کا حکمران بن گیا ۹۳۳ھ/۱۵۲۷ء میں بابر نے رانا سانگا والی میواڑ کو شکست دی۔ ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء بابر نے گوگرہ اور گنگا کے مقام اتصال پر مشرقی افغانوں کو شکست دے کر اپنا اقتدار بنگال تک بڑھا لیا۔ اس کے فوراً بعد بابر نے آگرے میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہتے ہیں کہ ہمایوں ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گیا اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ تو ابوالبقا نے صدقہ دینے کے لیے کہا۔ بابر نے

کہاکہ ہمایوں کی جان کے بعد مجھے اپنی جان پیاری ہے اس لئے میں اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کا صدقہ دیتا ہوں شاید یہ صدقہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے۔ چنانچہ بابر نے علیحدگی میں خدا سے دعا کی کہ یا اللہ اس نذر کو قبول فرمالے۔ اس کے بعد اس نے ہمایوں کی چارپائی کے گرد تین چکر لگائے۔ اس روز سے ہمایوں کی صحت بحال ہونے لگی اور بابر پر بیماری کے آثار نظر آنے لگے اور بالآخر وہ اس بیماری سے وفات پاگیا۔ اس کی لاش کو پہلے آگرے میں بطور امانت دفن کیا گیا اور پھر کئی سال بعد کابل میں دفن کیا گیا۔ جو اب تک کابل میں ہے۔

بابر بڑا باہمت اور تلوار کا دھنی تھا۔ اس زمانے کی یورشوں اور دشمنوں پر اس کی یلغاروں میں اس کی کامیابیاں اس کی ان ہی صفات کی مرہون منت تھیں۔ اس میں گرنے کے بعد سنبھلنے کی ہمت۔ انتظام و اہتمام کی صلاحیت۔ بہادری۔ ہشاش بشاش طبیعت نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ ایک نہایت محتاط سپہ سالار تھا۔ ان تمام صفات کے ساتھ وہ ایک بہترین شاعر اور انشا پرداز بھی تھا "تزک بابری" اس بات کا ثبوت ہے۔ وہ باغوں اور گلزاروں کا نہایت شوقین تھا بابر کا اپنا وطن اندی جان دامن کوہ میں ایک بہت ہی خوب صورت شہر تھا۔ جہاں چشموں کے پانی کی بہتی ہوئی نہریں سرو وصنوبر کے بلند پایہ درخت اور گل ولالہ کے نکہت بار تختے فردوس بریں کا منظر پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بابر مناظر قدرت کا بہت ہی دلدادہ تھا۔ وہ قدرت کی ہر جمیل وحسین شے سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا قدرت کے ان حسین وجمیل مناظر کی تلاش میں رہتا۔ جب ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس نے یہاں بھی ایسے ہی مناظر تلاش کرنا چاہے جو ہندوستان میں مفقود تھے۔ چنانچہ جب اس نے آگرہ کو اپنا پایہ تخت بنالیا تو یہاں اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے چار باغ تعمیر کرایا۔ جو آج کل باغ ارم کے نام سے مشہور ہے بابر ان باغوں میں بلند مقامات پر بیٹھ کر وہاں سے دریاؤں کے بہنے، نہروں کے چلنے اور باغوں کے حسن کا نظارہ کرتا انہیں اپنے روزنامچے تزک بابری میں لکھتا

بابر کی تصانیف میں "تزک بابری" جس میں اس نے ترکی زبان میں اپنے بچپن سے لے کر آخری ایام کے حالات درج کئے ہیں۔ اس کی دوسری کتاب "عروض رسالہ سی" ہے جو علم العروض پر لکھا گیا ہے۔ تیسری تصنیف "مبین" ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے اور اس میں حنفی فقہ کے بعض مسائل ہیں۔ بابر کی ایک اور تصنیف جو "رسالہ والدیہ" کے نام سے ہے، دراصل ان کے ایک خاندانی صوفی کی تصنیف ہے۔ بابر نے اس کا چغتائی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ بابر کی پانچویں تصنیف اس کا "دیوان" ہے جس کا اکثر حصہ ترکی زبان میں ہے اور جو نظم کی ہر صنف سخن پر مشتمل ہے اس میں چند نظمیں فارسی زبان میں بھی ہیں۔

باب، علی محمد

باب، علی محمد یکم محرم ۳۶ - ۱۲۳۵ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۸۱۹ء علی محمد باب شیرازی ابن محمد رضا۔ ۲۸ شعبان ۱۲۶۶ھ/ ۹ جولائی ۱۸۵۰ء) ایران کی بابی تحریک کا بانی، اس کی والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا، شیراز کے ایک شیعہ گھرانے میں جس کا پیشہ تجارت تھا پیدا ہوا۔ دو سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ماموں آغا سید علی کی کفالت میں آیا۔ چھ برس کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بزازی کا پیشہ شروع کیا۔ بائیس سال تک اسی کاروبار میں لگا رہا۔ اس کے بعد وہ باطنی اشغال۔ ریاضتوں اور مراقبوں میں مشغول ہوگیا۔ کیونکہ بچپن ہی سے اس کا ذہن وظائف اور مراقبوں کی طرف تھا۔ وہ بسا اوقات اپنے بچپن میں گرمیوں کے موسم میں گھنٹوں ننگے سر دھوپ میں کھڑا ہو کر وظائف پڑھتا رہتا تھا۔ ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں شیخ احسائی کے خلیفہ کاظم رشتی سے دو سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کے غالی مریدین میں شامل ہوگیا۔ کاظم رشتی کے عقیدے کے مطابق امام غائب کے ظہور کا وقت آگیا تھا۔ کاظم رشتی نے اپنے مریدوں کو امام کی تلاش میں سارے ایران میں پھیلا دیا۔ اسی دوران میں اس کی موت کا وقت آگیا اور وہ کسی کو اپنا جانشین بنائے بغیر مرگیا۔ اس کے ایک اور مرید نے جو علی محمد کا ہم مکتب بھی تھا، علی محمد کو حقانیت کا باب" قرار دیا۔ اسی وجہ سے بابی ملا حسین کو "اوّل من آمن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعے کے بعد علی محمد اپنے دوسرے پیر بھائیوں کو لے کر مراقبہ اور ریاضت کی غرض سے کوفے کی ایک مسجد میں چلا گیا۔ ۵۔ جمادی الاوّل ۱۲۶۰ھ/ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو اس نے چوبیس پچیس سال کی عمر میں باب ہونے کا دعوے کردیا۔ جب اس کے ماننے والوں کی تعداد اٹھارہ ہوگئی تو اس نے انہیں "حیٔ" کہنا شروع کیا۔ کیونکہ حیٔ لفظ کے عدد بھی اٹھارہ ہیں اور خود کو ان میں شامل کرنے کے بعد اس مجموعے کو "واحد" اوّل کا نام دیا۔ اور جب اس کے تصدیق کرنے والے تین سو اکسٹھ ہوگئے تو ان کو "کل شیٔ" کے نام سے موسوم کیا۔ جب اس کے مریدین کی تعداد کچھ بڑھ گئی تو اس نے اس روایت کو پورا کرنے کے لئے کہ امام غائب مکہ مکرمہ سے اپنے دعوے کا آغاز کرے گا، اپنے ایک مرید کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ کا قصد کیا اور اسلامی ممالک میں خطوط لکھے کہ لوگ کوفے میں جمع ہو جائیں لیکن اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا اور کسی نے بھی اس کی دعوت پر لبیک نہ کہی دو ماہ کے بعد وہ جدہ پہنچا اور اپنے قیام حرم کے دوران میں ایک کتاب، جس میں اپنی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا تھا، تصنیف کی۔ اس کی تمام حرکات پر حکومت کی نظر تھی۔ اور خاص طور پر اس کے پروگرام کے مطابق ایک خاص وقت پر ایک شہر میں ممالک اسلامیہ کے دور دراز کے لوگوں کو جمع کرنے والے پیغام سے سخت تشویش تھی لیکن اسی دوران میں اس کے پیروؤں نے اذان میں یہ کلمے میں اقرار کرتا ہوں کہ علی نبیل (علی محمد باب) سے بقیۃ اللہ آئینہ انفاس خداوندی ہے۔" کا اضافہ کیا اس پر عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور اس کے مریدوں کو گرفتار کر کے گورنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے انہیں سزا دے کر شہر سے نکال دیا۔ باب پر بعض پابندیاں بھی لگا دی گئیں۔ رمضان ۱۲۶۱ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۵ء کو اسے گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اپنے دعوے کی تردید کردی اور شیراز کی مسجد وکیل میں بھی اپنے باب نہ ہونے کا اعلان کرا دیا۔ اس کے ماموں کی ضمانت پر صرف اس کی نظر بندی کا حکم دے دیا گیا۔ بعد میں اسے اصفہان کے کچھ لوگ خفیہ طور پر اصفہان لے گئے لیکن ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں اسے دوبارہ گرفتار کر کے آذربائیجان کے کوہستانی قلعے ماہ کو میں قید کردیا گیا۔ ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء تک وہ اسی قلعے میں قید رہا اور یہیں اس نے "بیان" اور دلائل السبعہ کتابیں تالیف کیں۔ اس قید کے دوران میں انہوں نے ایک کانفرنس بلائی جس کو بدشت کانفرنس کے نام سے موسوم کیا گیا جو بائیس روز جاری رہی۔ اس کانفرنس میں اس نے اپنے پیروکاروں کو مختلف القاب بھی عطا کئے۔ جب حکومت کو اس کانفرنس کا علم ہوا تو اس نے باب کو چہریق جیل میں منتقل کردیا۔ دوران سفر میں علی محمد نے اپنے دعوے سے توبہ کرلی۔ یہ قید پہلی قید سے زیادہ سخت تھی۔ تاہم اس کا مریدین سے خط وکتابت کا سلسلہ پوشیدہ طور پر جاری رہا۔ بدشت کانفرنس کے بعد ایران کے مختلف علاقوں میں زبردست فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ

ایران کی وفات کے بعد تو فسادات کا بازار گرم ہوگیا۔ بابیوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ آئندہ برس دنیا میں باب کی حکومت ہوگی۔ اس دور میں انہوں نے عوام پر بہت ظلم وستم ڈھائے۔ اگر کوئی کاشتکار ان کے مطالبات پورے نہ کرتا تو اسے جلا کر راکھ کر دیتے تھے۔ شہنشاہ ایران کی وفات کے بعد باب نے مختلف علاقوں میں اپنے پیروکاروں کی امداد کے لئے مریدین کو بھیجا۔ جب ان لوگوں کی سرگرمیاں کافی حد تک بڑھ گئیں اور سارے ایران میں فسادات کا بازار گرم ہوگیا تو حکومت نے بابی تحریک کے سرغنہ کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ باب علی محمد کو قید خانے سے تبریز بلایا گیا اور اسے دو دوسرے ساتھیوں سمیت گولی سے اڑا دینے کی سزا دی گئی۔ ان کا جلوس تبریز کے بازاروں سے گذارا گیا تو راستے میں لوگ انہیں گالیاں دیتے اور مارتے پیٹتے تھے۔ ان میں سے ایک نے توبہ کرلی۔ اور بالآخر باب اور اس کے مرید محمد علی کو ۲۸ شعبان ۱۲۶۶ھ/ ۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں تبریز چھاؤنی کے ایک چوراہے [illegible] گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ کئی روز تک لوگ اس کے جسم کو بازاروں میں گھسیٹتے پھرتے رہے۔ اور بعد میں شہر سے باہر پھینک دی گئی۔ بعض لوگوں کا [illegible] ہے کہ اسے جانور کھا گئے اور بابیوں کے نزدیک اس کے مریدرات کی تاریکی [illegible] وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور پچاس سال بعد عبدالبہاء کے دور [illegible] اس لاش کو ایران سے فلسطین [illegible] اور کوہ کرمل پر ایک جگہ دفن کر دی گئی [illegible] وہاں موجود ہے اور اسے مقام اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ مرنے سے ایک رات [illegible] باب [illegible] کو تلقین کی تھی کہ دیکھو کل جب تم سے میرے بارے میں [illegible] جائے تو تجھے سے کام لینا، میرا انکار کر دینا بلکہ مجھ پر لعنت بھیجنا کیونکہ [illegible] ہی ہے۔

قتل کے وقت باب کی عمر اکتیس سال سے کچھ زائد تھی۔ اس نے چھ سال [illegible] کی سیاسی [illegible] کو مکدر کئے رکھا۔ بائیس سال کی عمر میں اس کی شادی [illegible] بچہ پیدا ہوا جو بچپن ہی میں مر گیا۔ [illegible] باب ہونے کے دعوے سے [illegible] اپنی تمام جائداد [illegible] اور بیوی کے نام کر دی تھی۔

[illegible] کا اس وقت خاتمہ ہوگیا جب کہ ابھی وہ اپنے مذہب کی بنیاد ڈال [illegible] کے سبب وہ اپنے ماننے والوں کو نہ تو آئندہ کے لئے [illegible] کوئی جامع دستور ان کے سامنے پیش کرسکا۔ چونکہ ابتداء [illegible] سے تحریک تھی اس وجہ سے یہ ناکام ہی رہا۔ اس [illegible] اپنے پیشوا کی محبت تھی۔ اس کی موت [illegible] والے دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔ اکثریت والی جماعت [illegible] بہائی مذہب کو مستقل [illegible] دے دیا اور اس طرح بابی مذہب کی تاریخ [illegible] میں تقسیم ہوگئی۔ نبوت کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مامور من اللہ [illegible] باب نے مرنے سے پہلے مرزا یحییٰ کو جسے اس نے صبح ازل کا لقب [illegible] اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ ازلی مرزا یحییٰ کو اپنا خلیفہ مانتے ہیں اور بہائی بہاء اللہ کو مانتے ہیں۔

خرمی تحریک کا سرغنہ ۸۱۶ء تا ۸۳۸ء میں خلیفہ المامون اور المعتصم [illegible] کے دور حکومت میں ایک نیم مذہبی وسیاسی تحریک برپا ہوئی جس کا [illegible] بانی تھا۔ یہ تحریک تقریباً ۲۰ سال تک عالم اسلام کے لئے شدید [illegible] ان تحریکوں میں سے ایک تھی جو مزدکیوں نے ایران میں جاری کر رکھی تھیں اور جو ہر وقت بغاوت کا موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ اس تحریک کی سرگرمیاں خفیہ تھیں۔ السعودی کی روایت کے مطابق بابک کا اسلامی نام حسن تھا۔ الدینوری کے نزدیک اس کے باپ کا نام مطہر بن فاطمہ بنت ابی مسلم تھا۔ نیز الطبری کے قول کیمطابق بابک مطر نامی ایک صعلوک (کرائے کا سپاہی) کا ناجائز بچہ تھا۔ بابک کے مذہب اور نسب کے بارے میں مختلف فیہ روایات ہیں۔ ان روایات کی رو سے جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ بابک کی پیدائش آذربائیجان میں ہوئی اور وہ دس سال تک اپنی ماں کے ساتھ ہی رہا۔ اس کے بعد ۱۸ سال کی عمر تک مویشی وغیرہ چراتا رہا اور بعد میں دوبارہ اپنی ماں کے پاس آگیا۔

ایک دن جاویدان بن سہرک جو خرمی قائد تھا بابک کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اس کی ماں کے پاس سے اپنے ساتھ لے گیا۔ جاویدان کی بیوی کو بابک سے عشق ہو گیا تھا اور جب جاویدان اور ابوعمران میں جنگ ہوئی اور جس میں جاویدان بھی تیر لگنے سے وفات پاگیا تو جاویدان کی بیوی نے فوراً ایک افسانہ گھڑا کہ اس کے خاوند نے مرتے وقت اس سے یہ کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد میری روح بابک کے جسم میں داخل ہوجائے گی۔ لہٰذا تم پر اس کی اطاعت کرنا لازمی ہوجائے گی۔ اس طرح بابک خرمیوں کا قائد بن گیا۔ ۲۰۱ھ/ ۸۱۶ء میں اس نے بغاوت کر دی اور آذربائیجان کی مسلم آبادی پر حملہ کر دیا اور ان کی املاک کو خوب لوٹا۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کو بھی تہہ تیغ کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد خرمی اس کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہوگئے اور مسلمانوں کو مراغہ میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ جب بابک کی بغاوت نے بہت شدت اختیار کرلی تو المامون نے یحییٰ بن معاذ کو آرمینیا کا والی مقرر کر کے بغاوت کا قلع قمع کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یحییٰ کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ۲۰۵ھ/ ۸۲۰ء میں عیسےٰ ابن محمد آذربائیجان کا حاکم بنایا گیا۔ لیکن اسے بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ المامون کے بعد المعتصم نے اسحٰق بن ابراہیم کی قیادت میں خرمیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے افواج بھیجیں ان فوجوں نے خرمیوں کو شکست دی۔ ۲۲۰ھ/ ۸۳۰ء میں المعتصم نے افشین کو بابک کا مقابلہ کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ افشین کے بذ میں داخل ہونے کے بعد جو خونریز معرکے ہوئے ان میں خرمیوں کی بڑی تعداد تہ تیغ ہوگئی اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بابک نے راہ فرار اختیار کی اور اس کی کئی بیویاں اور بچے اسیران جنگ میں شامل ہوئے جب بابک فرار ہونے کے بعد اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا تو ایک کسان نے اسے پہچان کر والی اران کو اطلاع کر دی۔

بابک کو شکار کے بہانے افشین کے حوالے کر دیا گیا۔ چنانچہ افشین محرم ۲۲۳ھ دسمبر ۸۳۷ء میں بابک کو اپنے ساتھ لے کر سامرا میں بڑی شان کے ساتھ داخل ہوا اور اس وقت کے دستور کے مطابق عالم اسلام کے اس دشمن کو ہاتھی پر بٹھا کر اور پیادہ سوار فوج کی قطاروں میں سے گذار کر خلیفہ کے دربار میں لایا گیا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر دیا گیا اور اس کا سر خراسان بھیجا گیا اور مختلف شہروں میں تشہیر کی گئی۔ اس کا دھڑ سامرا کے ایک محلے میں لٹکا دیا گیا۔ بابک کی موت کے بعد خرمیوں میں سے اکثر مسلمان ہوگئے اور بعض نے قرامطہ اور اسماعیلیہ فرقوں کے مذہب کو اپنا لیا۔

بابک کی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مضبوط ارادے والا شخص تھا۔ قتل کرتے وقت جب اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو اس نے وہ خون اپنے چہرے پر لگا لیا تاکہ مرتے وقت انسان کے چہرے پر جو زردی چھا جاتی ہے وہ لوگوں کو دکھائی نہ دے تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ موت سے اس کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔

بابک نے بڑی دولت اکٹھی کی تھی۔ اس کی بے شمار بیویاں تھیں جن کے ساتھ وہ شراب ولعب کی مجلسیں منعقد کرتا تھا۔

بابک اور اس کے پیروکاروں کے مذہب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ تناسخ ارواح کا تھا اور المقدسی کے قول کے مطابق اس کے پیرو بابک کو پیغمبر مانتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک دنیا میں ہر وقت ایک نبی موجود رہے گا۔ نیز نبوت کا منصب موروثی ہے۔ یا عمل تناسخ کے ذریعے منتقل ہوتا رہتا ہے۔

بابل بابلیہ یا بابلیون (موجودہ نام حلّہ) میسوپوٹیمیا (عراق) کا قدیم ترین شہر، جو اسلامی تاریخ میں مشہور بادشاہ نمرود اور پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے وجود کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ شہر دریائے فرات کی ایک شاخ پر جنوبی عراق میں واقع ہے۔ بابلی حکمران حمورابی کے عہد سے یہ شہر دنیا بھر میں اہم حیثیت اختیار کر گیا۔ اس نے اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں اسے اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ بعد میں آشوریوں اور اکادیوں کے حملوں کے دوران یہ شہر کئی بار تاخت و تاراج ہوا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح کا مشہور مورخ بادشاہ سارگان دوم اسے جلا ہوا شہر لکھتا ہے۔ اس نے یہ شہر دوبارہ تعمیر کرایا جسے سینا چرب نے ۶۸۹ ق۔م میں پھر زمین بوس کر دیا۔ نیا شہر بادشاہ اسارہدون نے تعمیر کرایا۔ ۶۴۸ ق۔م میں آشوریہ کے بادشاہ آشور بنی پال نے اس کا محاصرہ کر کے اسے قبضہ میں لے لیا۔

آشوری سلطنت کے خاتمہ کے بعد بابل پر آزاد اور خود مختار حکمرانوں نے عرصہ تک حکومت کی۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں نبوپلاسر اور پھر اس کے بیٹے بنوکدنصر (بخت نصر) کے دور میں بابل کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ اسی دور میں بابل میں پہلی بار یہودی قیدی لائے گئے جنہیں فارس کے بادشاہ داریوس اوّل نے رہائی دلائی۔ داریوس اوّل اور ارتخشتا کے عہد میں بابل کو دوبارہ لوٹا اور جلایا گیا۔ بعد ازاں یونانیوں نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ سکندر اعظم اسی شہر میں بخت نصر کے محل میں مرا۔

بابل میں عرصہ دراز تک بت پرستی رائج رہی۔ وہاں کا سب سے بڑا دیوتا مردوک تھا۔ شمس اور عشتار بھی بلاشبہ بڑے دیوی دیوتاؤں میں سے تھے۔ دیوتاؤں کی کثرت کی وجہ سے اس شہر کا نام باب ایلی یا باب ایل (دیوتاؤں کا دروازہ) پڑا تھا، جو بعد ازاں بابل کہلایا۔ بابل ہی میں تاریخ انسانی کا تحریری آغاز ہوا۔ دنیا کا قدیم ترین رسم الخط میخی یا تکونی کہلاتا ہے۔

بابل اپنے صوبہ بابلیون کا مرکزی شہر تھا۔ اس صوبے میں جو آگے چل کر خود مختار سلطنت بنا، مشہور شہر اردو (ابو شہرائین)، اُرد عُریا (تل المقایر)، لارسا (تل سنکارہ)، ادب (بسمیاہ)، برسیپا (نمرود)، بابل (حلہ)، کرتویا کتھا، اشنون اور دیر تھے۔

بابیت ایران میں بابیوں کی ایک مذہبی و سیاسی تحریک جس کا زمانہ انیسویں صدی کا پہلا ربع ہے۔ اس کا سرغنہ علی محمد باب تھا۔ جو اپنے آپ کو خدا کا نبی کہتا تھا۔ اور جس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالےٰ اس سے کلام کرتا ہے اور اس پر وحی آتی ہے۔ اس کے بعد مرزا یحییٰ ملقب بہ صبح ازل اس کا خلیفہ بنا وہ بڑا نرم مزاج تھا اور حکومت سے بھی الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ اس تحریک نے ابتدا ہی میں حکومت سے ٹکر لے لی تھی۔ لیکن شاہ ایران پر ان کے قاتلانہ حملے کے بعد اس ٹکراؤ نے شدت اختیار کر لی۔ بابیوں نے سازش کر کے شاہ کو قتل کرا دیا اور یہ براہ راست اس قتل میں ملوث تھے۔ اس حملے کے بعد بابیوں کو مصائب اور مشکلات سے بہت زیادہ دوچار ہونا پڑا۔ اور جب حکومت نے ان کی گرفتاریاں شروع کیں تو بہت سے دوسرے ممالک میں چلے گئے اور اکثر نے بھیس بدل لیا۔ حسین علی نوری جو بہاء اللہ کے لقب سے ملقب تھا۔ گرفتار کر کے تہران بھجوا دیا گیا۔ صبح ازل بھاگ کر بغداد چلا گیا۔ بعد میں

بہاء اللہ بھی ۱۸۵۲ء میں وہاں چلا گیا۔ اور اس کے ساتھ بہت سے بابی بھی عراق چلے گئے۔ اس طرح سے بابیت کا مرکز ایران کی بجائے ترکی کے مقبوضات بن گئے۔ اس کے دس سال بعد بابیوں نے ایرانی حکومت کو پھر پریشان کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ ایران حکومت کی درخواست پر بہاء اللہ اور صبح ازل کو ترکی حکومت نے ادرنہ میں جلا وطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ یہ دونوں ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۸ء تک جلا وطنی کی زندگی بسر کرتے رہے اسی دوران میں دونوں میں ایک بات پر اختلاف ہوگیا۔ کیونکہ بہاء اللہ نے صبح ازل کو ادرنہ روانہ ہونے سے پہلے ایران جانے کے لئے کہا تھا۔ جسے اس نے ماننے سے انکار کردیا اس طرح یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور بہاء اللہ کے پیروکار بہائی کہلائے اور صبح ازل کے پیچھے چلنے والوں کو ازلی کہا جانے لگا۔ بہائی اکثریت میں تھے دونوں نے ایک دوسرے کو زہر دینے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش تو اگرچہ کامیاب نہ ہو سکی لیکن صبح ازل کے بہت سے مریدوں کو بہائیوں نے زہر دے کر مروا ڈالا۔ ترکی حکومت نے ان کے اس باہمی فتنہ و فساد کو دیکھ کر بہاء اللہ کے ساتھیوں کو عکہ منتقل کردیا اور ازلیوں کو صقلیہ کی طرف بھیج دیا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو صبح ازل نے وفات پائی۔ اس نے آقا مرزا محمد ہادی کے لڑکے کو اپنا جانشین بنایا۔ بابیوں کی تعلیمات کے بارے میں کوئی واضح معلومات نہیں ملتیں۔ علی محمد شیرازی کے دعوے باب کے پانچ سال بعد ان پر بابیوں میں اختلاف ہوگیا تھا اور اکثر نے اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کو ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں ختم کردیا ہے۔ انکے نزدیک باب کی فارسی کتاب بیان، قرآن کی طرح اللہ کا کلام ہے۔ نیز باب کا مرتبہ پہلے تمام نبیوں سے بڑھ کر ہے۔ وہ قرآن مجید کا آخری شریعت ہونے سے انکار کرتے ہیں اور قرآن کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ حج بیت اللہ کا مقام بھی ان کے نزدیک مکہ معظمہ نہیں اور نہ ہی یہ لوگ بیت اللہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے نزدیک گذشتہ شریعت منسوخ ہوچکی ہے۔ نماز روزہ اور دوسری عبادات اور نبی پر درود و سلام بھی بیکار ہے ان کے نزدیک ہر ہزار سال بعد شریعت تبدیل ہوجاتی ہے۔ لہٰذا آنحضورؐ کی شریعت اب ختم ہوچکی ہے اب بابیت پر عمل کرنا لازم ہے اور یہ بھی ایک ہزار سال بعد بدل جائے گی۔

ان کے نزدیک آدمؑ سے باب کے عہد تک دنیا کی عمر ۱۲۲۱۰ سال ہے ان کے نزدیک قرآن نے توحید کا مضمون تو بیان کردیا لیکن اس کی مکمل تشریح جس انداز سے باب نے کی ہے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

بابیوں کے عقیدے میں ہستی مطلق کے تین عالم ہیں۔ ایک جوہر یزدانی کا عالم ہے جو یکسر ناقابل فہم اور ادراک سے ماوراء ہے۔ دوسرا کائنات اور انسانیت والا عالم تیسرا عالم تمثال کا ہے یعنی وہ آئینہ شفاف جس میں انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتا ہے۔ ان کے ہاں انیس کا عدد بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے سال کو بارہ کی بجائے انیس حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے اور ہر مہینے کے انیس دن مقرر کئے۔

ان کے ہاں جرائم کی سزائیں انتہائی معمولی ہیں سب سے بڑی سزا قتل کی ہے اسی میں مقتول کے ورثا کو گیارہ ہزار مثقال سونا ادا کرنا اور متواتر انیس برس تک مقاربت سے پرہیز کرنا ہے۔ اس تحریک کی تاریخ دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے ایک دور وہ ہے جو اس مذہب کے شروع ہونے سے اس تشدد پر ختم ہوتا ہے جس کا سلسلہ ناصر الدین قاچار پر بابیوں کے قاتلانہ حملے سے شروع ہوا اور دوسرا دور وہ ہے جسے صلح پسندانہ دور کہا جاسکتا ہے اور یہ پہلے دور کے اختتام سے اب تک جاری ہے۔ بابیت کا دوسرا نام اہل بیان بھی ہے جو بابیوں کا لقب ہے۔

باتو، خانوادہ ایک خاندان جس نے روس کے مغربی علاقوں پر ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء سے ۹۰۷ھ / ۱۵۰۲ء تک حکومت کی۔ اس کا مورث اعلیٰ باتو خاں چنگیز خان کے بڑے لڑکے جوچی کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس نے ۱۲۳۶ء سے ۱۲۴۱ء تک وسیع تر علاقہ فتح کیا۔ ان فتوحات سے جو مغربی منگول سلطنت قائم ہوئی اس کا مرکز باتو نے پہلے اپنے آباد کردہ شہر سرائے قدیم اور پھر سرای جدید کو قرار دیا۔ ان شہروں میں منگول اور روسیوں کی مخلوط آبادیاں تھیں روسی اس نئی سلطنت کو اردوئے طلا کہتے تھے۔ باتو نے ۱۲۵۵ء میں وفات پائی۔ باتو کے بعد اس کا بھائی برکہ تخت پر بیٹھا، وہ پہلا منگول فرمانروا تھا جس نے اسلام کو قبول کیا اور اہلسنت مسلک کے تحت تاتاریوں کو دائرہ اسلام میں

چنگیز خاں (م ۱۲۲۷)
جوچی (م ۱۲۲۷ء)
اوردا (اردوئے سفید کبود) — باتو (م ۱۲۵۶) — برکہ (۱۲۵۷ تا ۱۲۶۶ء) — مغل
اوردا ← چھ پشتیں ← اوروس خان، تل خوجہ
اوروس خان ← تین پشتیں ← کوچک محمد (۱۳۶۵ - ۱۳۷۷ تا ۱۳۹۵)
تل خوجہ ← تقتمیش
کوچک محمد ← (لغایت ۱۴۳۵ تا ۱۴۶۵) ← احمد (لغایت ۱۴۶۵ تا ۱۴۸۱) ← سید احمد (۱۴۸۱ء تا ۱۵۰۲ء)
باتو ← ایک پشت ← منگکے تیمور (۱۲۶۶ تا ۱۲۸۰ء) ← ترقت (۱۲۹۱ء تا ۱۳۱۲ء)، طغرل جہ
طغرل جہ ← اوزبیگ (۱۳۱۳ء تا ۱۳۴۱ء) ← جانی بیگ (۱۳۴۲ء تا ۱۳۵۷ء) ← بردی بیگ (۱۳۵۷ء تا ۱۳۵۹ء)
مغل ← ایک پشت ← نوحای

داخل کرنا شروع کیا۔ برکہ نے مصر کے مملوک حکمرانوں سے ایران کے منگول ایلخانیوں کے خلاف باہمی اتحاد کا ایک معاہدہ کیا۔ یہ منگول ابھی تک بدھ مذہب پر قائم تھے۔ اور ۱۲۵۸ء میں انہوں نے خلافت بغداد کے خلاف جنگ کرکے برکہ کی دشمنی مول لے لی تھی۔

۱۲۶۱ء میں برکہ نے رومی شہنشاہ سے بھی ایک معاہدہ کیا۔ ان تمام دوستانہ معاہدوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلامی اثرات خصوصاً ترکی ثقافتی اثرات اردوئے طلا تک پہنچ گئے۔

برکہ کے تمام جانشین سُنّی مذہب کے پیروکار تھے۔ ۱۲۹۹ء میں اس کا جانشین نوغائی ایک لڑائی میں مارا گیا تو آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں سیاسی صورت حال بدل گئی۔ ایل خانی اب مسلمان ہو چکے تھے چنانچہ ۱۳۲۳ء میں اردوئے مطلا اور ایل خانیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس صلح نامے کی وجہ سے مصر اور اردوئے مطلا کے درمیان تجارت میں بے حد کمی واقع ہوگئی۔ ۱۳۳۵ء میں جب ایلخانی سلطنت کو زوال آگیا تو اردوئے مطلا کو ازبیگ کی سرپرستی میں ایک اہم مقام حاصل ہوگیا ازبیگ مسلمان تھا اور اس نے والگا کے علاقے میں اسلام کی بنیاد کو مستحکم کرنے کی انتہائی کامیاب کوششیں کیں۔ اس کے بعد والگا کے تاتاریوں کی اکثریت سنی مسلک کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ مغربی ملکوں کی طرف سے مسیحیت کو پھیلانے کی کوششیں بالکل بے سود رہیں۔ اور وہ اردوئے مطلا کو متاثر نہ کر سکیں۔

ازبیگ کے بعد جانی بیگ خان اور پوتے بردی بیگ خان نے آذربیجان کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس دور کے بعد اردوئے مطلا کے متعدد مدعیان حکومت کی باہمی آویزشوں نے اس سلطنت کو بے حد کمزور کر دیا اور بالآخر ۱۳۸۰ء میں پہلی بار ایک روسی فوج نے تاتاری فوجوں کو شکست فاش دی۔

۱۳۷۵ء میں اردوئے مطلا کے حکمران تقتمیش نے ساری سلطنت کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے ۱۳۹۱ء میں تیمور کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی تیمور نے شہر سرای بھی برباد کر ڈالا۔ اب سالار ایدگو اردوئے مطلا کا حکمران بنا اور ۱۴۱۹ء تک اس کی حفاظت کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور بالآخر ۱۵۰۲ء میں اردوئے مطلا کو جو اب اردوئے عظیم کے نام سے مشہور تھی۔ آخری بار فیصلہ کن شکست ملی اور خانوادوں کا خاتمہ ہوگیا۔

باجہ دو شہروں کا ایک نام۔ ان میں سے ایک افریقہ میں اور دوسرا اسپین میں ہے۔ افریقہ کا شہر تونس میں مغرب کی سمت تقریباً ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۵۰ ہزار ہے یہ قدیم ترین شہر ہے پورے اسلامی دور میں اسے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسے اناج کا گھر کہا جاتا ہے۔ از منہ وسطیٰ میں اس شہر کو افریقہ اور اندلس کے دوسرے شہروں سے ممتاز کرنے کے لئے باجۃ القمح (غلے والا باجہ) کہا جاتا ہے۔ البکری کے الفاظ میں یہ شہر القیروان سے تین دن کی مسافت پر واقع ہے عین الشمس کا چشمہ شہر کو سیراب کرتا ہے۔ شہر کی فصیل کو ایک اور بیرونی دیوار تعمیر کر کے مستحکم کر دیا گیا ہے اور اس بیرونی دیوار کے اندر شہر کے نئے محلے آ گئے ہیں۔ قلعہ جو "القصبہ" کہلاتا ہے ایک قدیم عمارت ہے جسے پتھر کی مضبوط سلوں سے مضبوطی سے تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑی مسجد ایک ٹھوس عمارت ہے جس کے قبلے کی طرف شہر کی فصیل ہے۔ ایک بازنطینی قلعہ جو قیصر کے عہد میں کاونٹ پالوس نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے علاوہ اس شہر میں پانچ حمام متعدد مسافر سرائیں اور تین کھلے میدان ہیں جہاں غلہ منڈی لگتی ہے۔ سواد شہر شاندار باغات سے پُر ہے۔ اور ان باغات کو ندیاں سیراب کرتی ہیں

۷۶ھ / ۶۹۵ء میں جب حسان بن النعمان نے قرطاجنہ کا محاصرہ کیا تو بازنطی سپاہ کے ایک حصے نے اسی شہر میں آکر پناہ لی اور جب حسان نے اس شہر کو بھی فتح کر لیا تو باجہ عرب لشکر کا ایک اہم فوجی مرکز بن گیا۔ الہروی کے قول کے مطابق اس شہر میں آنحضورؐ کے چچا زاد بھائی معبدؓ بن عباس نے وفات پائی۔ یہاں ان کا مزار بھی ہے

بنو اغلب کے دور حکومت میں باجہ تونس کے سارے شمال مغربی ضلع کا اہم صدر مقام بن گیا۔ فاطمیوں کے عہد میں ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں ابویزید صاحب الحماد کے بربری لشکر نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن یہ شہر اپنی زرعی پیداوار کی بدولت جلد ہی دوبارہ خوشحال ہوگیا۔ ترکی عہد دسویں اور گیارھویں صدی ہجری سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں اس شہر میں ایک مسجد تعمیر کی گئی اور اس کے علاوہ بعض یادگار عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں ایک قلعہ قابل ذکر ہے جس کا نام باردو رکھا گیا۔

اس شہر نے متعدد عالموں فقیہوں شاعروں اور مقامی مورخوں کو پیدا کیا۔ اس شہر کے علاوہ تونس کے دو اور شہروں کا نام بھی باجہ تھا۔ اور ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے ایک "باجۃ الزیت" (تیل والا باجہ) اور دوسرے کو باجۃ القدیمۃ کہتے کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اوّل الذکر شہر ضلع رُصعہ میں تونس کے ساحل پر زیتون کے جنگل کے درمیان مہدیہ سے الجان جانے والی سڑک پر الجان سے تیرہ کیلومیٹر مشرق کی طرف واقع تھا۔ جس علاقے میں یہ شہر واقع تھا اسے اب بھی وادی باجہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شہر بنو ہلال کے حملے تک بڑا خوشحال تھا۔ اس کے بعد اس پر زوال آنا شروع ہوا اور بنو حفص کے دور میں بالکل برباد اور ناپید ہوگیا۔ موخر الذکر باجۃ القدیمہ کے نام سے ایک چھوٹی سی بستی تھی جو اب ناپید ہو چکی ہے۔ یہ بستی موجودہ شہر منوبہ کے قریب تونس کے شمال مغرب میں واقع تھی۔ اس بستی کی شہرت اس وجہ سے تھی کہ یہ بستی ایک جلیل القدر صوفی ابوسعید خلف بن یحیٰ التمیمی الباجی کی جائے پیدائش ہے۔

اسلامی سپین (اندلس) کا ایک شہر اور ضلع بھی باجہ کے نام سے مشہور ہے جو آج کل جنوبی پرتگال میں بیجا کہلاتا ہے۔ اس شہر کو موسیٰ بن نصیر نے ۹۳ھ میں فتح کیا۔ ۱۴۲ھ / ۷۶۳ء میں مصری فوج کے سالار العلاء بن مغیث نے بغاوت کر دی۔ ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء میں شمال یورپ کی ایک قوم وائکنگ نے بھی باجہ پر حملہ کیا تھا۔ بعد میں مقامی سنر فامہ کے ایک خاندان طیفوریہ نے اپنی خود مختاری کو کچھ مدت تک اپنی آزادی برقرار رکھی۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک یہ شہر شلب کے زیر نگین رہا۔ ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں یہ شہر اشبیلیہ کے بنو عباد کی عملداری میں چلا گیا۔ اس شہر کو بعض اوقات باجۃ الزیت بھی کہا جاتا رہا۔ موجودہ زمانے میں یہ پرتگال کے صوبہ المستیجو کا صدر مقام ہے اور موجودہ دارالحکومت لزبن سے جنوب کی جانب بیاسی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

بادشاہ نبی وہ نبی جو اپنے وقت میں حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں دو طرح کے نبی مبعوث فرمائے ہیں۔ ۱۔ معلم نبی مثلاً حضرت موسیٰؑ اور ۲۔ بادشاہ نبی مثلاً حضرت سلیمانؑ۔

معلم نبی کا جانشین کوئی نہیں ہوتا کیونکہ وہ نبوت کا کام جو کرتا ہے وہ جس پر وحی نازل ہوتی ہے اس لئے اگر اس کا کوئی جانشین ہو تو اس پر بھی وحی نازل ہونی چاہیئے۔ پہلا نبی اس وقت اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے جب وہ فرائض نبوت پوری انجام دے چکتا ہے اور اس کے بعد فوراً اس کے جانشین نبی کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ لیکن بادشاہ نبی کے انتقال پر فرائض نبوت کی بجا آوری کے لئے تو واقعی اس کا کوئی جانشین نہیں ہوتا۔ البتہ امور سلطنت میں اس کا جانشین ہونا ناگزیر ہے۔ آنحضورؐ بادشاہ نبی تھے۔ کیونکہ وہ نبی اور ختم الرسل ہونے کے علاوہ ایک ریاست اور بیشتر اپنی مجموعہ قوانین بھی دے کر آئے تھے لہذا آپؐ کے وصال کے بعد امور سلطنت

میں آپؐ کا جانشین ہونا قطعی طور پر لازمی تھا۔

بادشاہ نبیوں میں آنحضورؐ کے علاوہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام قابل ذکر ہیں۔

بادشاہی مسجد عالمگیری مسجد، لاہور پاکستان میں واقع دنیا کی سب سے بڑی مسجد اس کے صحن میں ایک لاکھ کے قریب افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ عید کی نماز کے موقع پر یہاں تقریباً پانچ لاکھ افراد کا اجتماع ہوتا ہے جو اردگرد کے باغات میں دور دور تک صفوں کی صورت میں پھیلا ہوتا ہے۔ مسجد لاہور کے اکبری دروازہ کے سامنے مغرب کی جانب عام سطح زمین سے پندرہ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر لاہور کا شاہی قلعہ واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری

بادشاہی مسجد لاہور

ہے۔ جسے حضوری باغ بھی کہتے ہیں۔ مسجد اور یہ چار دیواری مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس لئے اسے عالمگیری مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ چار دیواری اورنگ زیب کی سرائے کہلاتی تھی۔ اس پر مغلیہ دور کا چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ منشی سجان رائے بٹالوی مصنف "خلاصۃ التواریخ" کی رائے کے مطابق اس پر ملتان کا خراج وقف تھا۔

مسجد کے دروازہ کے اردگرد حجرے ہیں، جہاں شاہی محافظ دستے رہا کرتے تھے، جب بادشاہ نماز پڑھنے جاتا تو یہ دستے گرز اور عصا اٹھا کر آگے آگے چلتے تھے مسجد کے صدر دروازہ میں داخل ہونے سے پیشتر بائیس سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں سب سے نچلی سیڑھی کا طول ۱۲۶ فٹ اور عرض ½۹ فٹ ہے اور سب سے اوپر والی سیڑھی کا طول ۷۹ فٹ اور عرض ۴۳ فٹ ہے۔ ان سیڑھیوں میں کابل سنگ ابری استعمال ہوا تھا اور اب سنگ سرخ لگا دیا گیا ہے۔ سیڑھیوں کے دائیں بائیں حجروں کے آگے خالی چبوتروں پر علامہ اقبال اور سر سکندر حیات خاں کی قبریں ہیں۔

بادشاہی مسجد کا دروازہ شان و شوکت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ یہ سنگ رخام اور سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ ڈیوڑھی تقریباً مربع ہے، جس کا طول ۶۶ فٹ ۷ انچ اور عرض ۶۲ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ اوپر دو منزلہ عمارت ہے، جس میں کبھی خطیب اور امام رہا کرتے تھے۔ مگر اب تبرکات اور باقیات محمدیہ برائے نمائش رکھے ہوئے ہیں۔ دروازے کی محراب کے دونوں جانب نہایت خوبصورت کنگرے بنے ہیں، جو سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے بنے ہیں۔ دروازے پہ یہ طغرا درج ہے:

"لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ
مسجد ابوالظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی
سنہ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت
باہتمام کمترین خانہ زادان فدائی خاں کوکہ"

ڈیوڑھی سے گذرنے کے بعد وسیع صحن آتا ہے۔ جو تقریباً مربع ہے۔ اس کا طول شمالاً جنوباً ۵۲۸ فٹ ۸ انچ اور عرض شرقاً غرباً ۵۲۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس کا فرش پہلے پختہ اینٹوں کا تھا اور نمازیوں کی سہولت کے لئے سنگ موسیٰ اور سنگ رخام سے مصلے بنے تھے۔ اب سنگ سرخ کی سلیں لگا دی گئی ہیں۔

صحن کے عین وسط میں مربع شکل کا ایک حوض سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ اس کا ہر ضلع ۵۰ فٹ ہے۔ حوض میں پانی ٹیوب ویل کے ذریعے لایا جاتا ہے۔ تازہ مرمت کے بعد حوض کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا ہے۔ وضو خانہ صدر دروازے کے دائیں بائیں جانب والے حجروں کے اوپر بنا دیا گیا ہے، جہاں ۱۲۸ ٹونٹیوں کا انتظام ہے۔ پینے کے پانی کے نل علیحدہ لگائے گئے ہیں۔ حوض سے گذر کر دو زینے بلند ایک چبوترہ ۲۲۵ فٹ لمبا ۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مسجد کی عمارت شروع ہوتی ہے جسے درگاہ بھی کہتے ہیں یہ بلند محرابوں اور تین سفید سنگ مرمر کے گنبدوں پر مشتمل ہے۔ جن کے سنہرے کلس سورج کی روشنی میں خوب چمکتے ہیں۔ اس دالان کا طول ۲۲۵ فٹ اور عرض ۱۱۵ فٹ ہے اس کی کرسی مسجد کے فرش سے کوئی چھ فٹ بلند ہے۔ چھت نہایت خوب صورت ہے دیواروں پر مختلف قسم کے پتھروں اور رنگوں سے نقاشی اور پچی کاری کی گئی ہے۔ تمام عمارت قابوسی ہے۔ اس میں لکڑی استعمال کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا خیال ہے کہ اس قسم کی پرچین کاری یعنی پتھر پر پتھر ہی کے نقوش بھرے گئے ہوں اور پھر ابھرے ہوئے ہوں، دنیا بھر کی کسی عمارت میں نہیں ملتے۔

سب سے بڑے اور درمیانی گنبد کے نیچے سنگ مرمر کا بنا ہوا نہایت خوبصورت منبر ہے۔ جس پر چڑھ کر خطیب جمعہ اور عیدین کے خطبے پڑھتا ہے۔ مسجد کے اس حصے میں فرش پر مرمریں سلیں استعمال کی گئی ہیں دیواروں پر موٹی تہہ کی ستر کاری جس میں سیمی نقوش ابھرے ہوئے ہیں ازارہ سنگ ابری کا ہے۔ جس کا حاشیہ کالے اور زرد رنگ کے پتھر سے پچیکاری کیا ہوا ہے ایوان کے منڈیر پر کنگرے اور کونوں پر سنگ مرمر کی شرفہ دار برجیاں ہیں جو بہت خوب صورت معلوم ہوتی ہیں

مسجد کے چاروں کونوں پر چار نہایت بلند مینار کھڑے ہیں جو پورے سرخ پتھر سے بنے ہیں۔ یہ مینار اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے اگرچہ سادہ ہیں مگر میلوں سے نظر آتے ہیں۔ اور مسجد کی عظمت اور خوب صورتی میں چار چاند لگاتے ہیں ہر ایک مینار کی بلندی ۱۷۶ فٹ ۴ انچ اور سیڑھیوں کی تعداد ۲۰۴ ہے۔ چوٹیوں پر سنگ مرمر کے گنبد بنے ہیں۔ چھتری والی منزل تنہا ۱۳ فٹ ۹ انچ بلند ہے اور آٹھ آٹھ ہشت پہلو ستونوں پر کھڑی ہے۔ یہ مینار مقبرہ جہانگیر کے میناروں سے کچھ عجیب نسبت رکھتے ہیں۔ اور اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ اگر کسی بھی مینار پر چڑھ کر مقبرہ کے میناروں کو دیکھا جائے تو وہ چار کی بجائے تین نظر آتے ہیں اور ایک اوجھل رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مقبرہ کے کسی مینار پر چڑھ کر دیکھا جائے تو شاہی مسجد کے بھی تین ہی مینار نظر آتے ہیں۔ ان میناروں کی چار چار منزلیں۔ دور باہر کی جانب سے ۶۷ فٹ اور اندر کی جانب سے ½۸ فٹ ہے۔ اوپر والی منزل جن پر گنبد دار

چھت ہے۔ ۱۸۴۰ء کے زلزلہ میں ناکارہ ہوگئی تھیں۔ اس وجہ سے گرادی گئی تھیں اور میناروں کی بلندی ۴۴ فٹ رہ گئی تھی۔ اب تازہ ترین مرمت کے بعد اصلی حالت پر آگئے ہیں اور ان پر روشنی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ یہ مینار لاہور کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۸۴۱ء میں جب شیر سنگھ نے قلعہ لاہور کے محاصرہ کے لیے اپنے آدمی متعین کیے تو انہوں نے انہی میناروں سے آتش بازی کرکے مہارانی چندی کور کی ڈوگرہ فوج کو شکست دی۔ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد جب سردار ہیرا سنگھ سندھانوالہ نے لاہور کا محاصرہ کیا تو اس نے بھی ان ہی میناروں پر زنبورہ توپیں نصب کیں اور قلعہ والوں کو شکست دے کر وزارت حاصل کی۔

سکھوں کے آخری دور میں مسجد کے صحن سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر اس کے دروازے بند تھے۔ انگریزوں کے آنے تک مسجد کی حالت انتہائی خراب خستہ ہوچکی تھی، ۱۸۵۶ء میں سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے مسجد مسلمانوں کے حوالے کردی اور اس میں ایک مرتبہ پھر سے اللہ کا نام گونجنے لگا۔

مسجد کے شمال جنوب میں چھوٹے چھوٹے حجرے ہیں ان حجروں میں وہ طالب علم رہا کرتے تھے جو دور دراز علاقوں سے علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ مسجد کے نام پر جو جاگیریں وقف تھیں ان کی آمدنی ان طلباء کی خورد و نوش پر خرچ ہوتی تھی۔

مسجد کے شرقی دروازے پر ایک منزل میں آنحضورؐ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور غوث اعظمؒ کی چند یادگاریں تبرکاً رکھی ہیں۔ جو شیشوں میں محفوظ ہیں۔ ان تبرکات کی مجموعی تعداد ۲۳ ہے۔ ایک آنحضورؐ کا سبز عمامہ مع ٹوپی ہے۔ ایک سبز جبہ، سفید پاجامہ، نعلین، نقش قدم مبارک، سفید علم جس پر قرآنی آیات منقوش ہیں۔ حضرت علیؓ کے قرآن مجید کا سپارہ اوّل جو کوفی خط میں لکھا گیا ہے۔ عمامہ مع کلاہ اور ایک تعویذ اور حضرت سیدۃ النساء کا رومال جائے نماز امام حسینؓ کا صندلی عمامہ، کلاہ، علم اور خون آلودہ رومال۔ جناب غوث اعظمؒ کا عمامہ، لحاف اور جائے نماز کربلائے معلیٰ کی سرخ مٹی اور خواجہ اویسؒ قرنی کا شکستہ دانت اور دیگر بہت سے تبرکات شامل ہیں۔

مورخین نے اس مسجد کی تاریخ بنا کے متعلق عجیب عجیب قصے بیان کیے ہیں ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جس جگہ مسجد واقع ہے یہاں دارا شکوہ کا وہ کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر ویدانت اور سنسکرت کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ جب دارا شکوہ قتل ہوگیا تو اورنگ زیب نے ان کتابوں کو اکبر آباد منگا کر مختلف علماء میں تقسیم کردیا اور کتب خانہ کی عمارت جو کہ ایک شوالہ کی طرز پر بنی ہوئی تھی ڈھا کر یہ مسجد تعمیر کرائی

جسٹس محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ کے مزار کی عمارت کے لیے یہ پتھر جمع کیا تھا۔ جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ پتھر مسجد کی عمارت پر صرف کردیا اور ایک سادہ سی عمارت میاں میر کے مزار پر بنا دی لیکن دوسرے نقادوں نے ان کی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ کیونکہ آپ کے مزار کی عمارت شاہجہان دور کی عمارات سے ملتی جلتی بنی ہوئی ہے۔ نیز آپ نے اس مسجد بننے سے چالیس سال پہلے وفات پائی تھی۔ اس طرح کی کئی ایک اور روایات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر نے خاص اس مسجد کے لیے تمام پتھر اجمیر اور جے پور سے منگوایا تھا۔ اور اسے بڑے شوق سے بنوایا تھا اور اس میں نماز بھی ادا کی تھی۔ اس مسجد کی امامت و خطابت کے لیے حنفی عقیدہ کے نامور عالم مامور رہے ہیں۔

سکھوں کے غلط استعمال کی وجہ سے مسجد کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اس کا قبضہ مسلمانوں کو دلایا تو یہ کافی مرمت طلب تھی۔ فرش نماز پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور کے مسلمانوں نے مسجد کی صفائی اور روشنی کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۶۹ء میں خان بہادر برکت علی خان کی تحریک سے انجمن اسلامیہ قائم ہوئی جس نے مسجد کی انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر چندے کی اپیل کی۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں ہزاروں روپے کے صرف سے فقط دروازہ درست ہوسکا۔ اگلے سال حکومت نے پانچ ہزار روپیہ دینا منظور فرمایا اور شرط لگائی کہ اس کا دوچند چندہ لوگوں سے لیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہندو عیسائی اور سکھوں نے بھی چندے دیئے۔

۱۹۳۹ء میں مسجد کی خستہ حالی کے پیش نظر پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں نے سرکاری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کرایا۔ جو اکیس سال تک مسلسل ہوتا رہا اور ۱۹۶۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ انہوں نے اس مسجد کی مرمت کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلمان زمینداروں پر خاص ٹیکس لگایا۔ پہلے یہ کام محکمہ آثار قدیمہ کو سونپا گیا۔ لیکن بعد میں مرکزی محکمہ تعمیرات عامہ کو منتقل کردیا گیا۔ آزادی کے بعد یہ کام صوبائی محکمہ تعمیرات نے انجام دیا۔

اس طرح مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش لاؤڈ سپیکر اور روشنی کے جدید انتظامات غسل خانوں اور وضو خانوں کی تعمیر معمولی کنوؤں کی بجائے ٹیوب ویل سے پانی کی بہم رسانی اور دیگر تبدیلیوں پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے یہ رقم مسجد کی تعمیر کی اصل لاگت سے دس گنا زیادہ ہے۔ مگر اس سے ایک بار پھر مسجد کو نئی زندگی نصیب ہوگئی ہے اور اب عمارت اپنی عمر سے زیادہ جوان دکھائی دیتی ہے۔

اس مسجد کی دیکھ بھال کا فریضہ پہلے انجمن اسلامیہ پنجاب سرانجام دیتی تھی اب صوبائی محکمہ اوقاف اس کا انتظام کرتا ہے اور مسجد کی ملحقہ املاک بھی اسی کے تصرف میں ہے۔

بادیس (م ۴۰۶ھ/۱۰۱۶ء - ۳۰ ذو القعدہ ۴۰۶ھ ۱۰ مئی ۱۰۱۶ء المومن د.) نصیر الدولہ، بادیس بن المنصور بن بلقین بن زیری افریقہ کا تیسرا زیری حکمران ۱۶ ربیع الاوّل ۳۸۶ھ/۸ اپریل ۹۹۶ء کو تخت نشین ہوا۔ بادیس نے مشرقی افریقہ کا انتظام اپنے ایک نائب کو سونپ دیا اور خود زناتہ قبائل کے خلاف نبرد آزمائی شروع کی چنانچہ تیارت سے بڑھتا ہوا وہ طرابلس تک جا پہنچا۔

۳۸۹ھ/۹۹۹ء میں اسے مغراوہ کے امیر زیری ابن عطیہ کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار اس نے اپنے دشمن کو شکست دی۔ ۳۹۰ھ/۹۹۹ء سے ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء تک طرابلس کے علاقے میں فاطمیوں کی مداخلت کے خلاف نبرد آزما رہا۔ ۴۰۶ھ ۱۰۱۵ء میں اس نے المغرب میں القلعہ کے بانی حماد کی بغاوت کا خاتمہ کیا اور شلف کے میدان میں اسے فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ اگرچہ وہ چھ ماہ محاصرہ کرنے کے باوجود قلعہ فتح نہ کرسکا اور اسی مہم میں وفات پاگیا۔

باربروسہ عربی اور ترکی زبان میں باربروسہ کے معنی سرخ داڑھی والے ملاح یا امیر ہیں۔ مسلمانوں میں دو مشہور بھائی امیر البحر اور باربروسہ کے نام مشہور ہیں۔

۱۔ امیر البحر عروج باربروسہ

والد کا نام یعقوب تھا۔ جس کے چار بیٹے تھے۔ تین بیٹوں نے بحری فوج میں ملازمت اختیار کی جن میں سے عروج اور خضر جو بعد میں خیر الدین باربروسہ کے نام سے مشہور ہوا ہے بیحد ترقی کی اور امیر البحر کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے۔ عروج نے جنوبی یورپ کی عیسائی حکومتوں کے جنگی بیڑوں کو عبرتناک شکست دی اور ان کی بحری طاقت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

عیسائی دنیا کا سب سے بڑا مذہبی رہنما پوپ کہلاتا تھا۔ اس کا اپنا بہت مضبوط بیڑا تھا۔ یہ بیڑا اتنا مضبوط تھا کہ اب تک کسی مسلمان سلطنت نے اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کی تھی۔ ایک بار جب اچانک امیر البحر عروج کو پوپ کا بیڑہ بحیرۂ روم میں نظر آگیا تو ان سے رہا نہ گیا اور اسی وقت حملہ کر کے سارے جہاز گرفتار کرنے اور یورپ کے سارے ملاحوں اور سپاہیوں کو بھی گرفتار کر لیا۔ جس سے یورپ میں ایک ہلچل مچ گئی۔ امیر البحر عروج نے ان سارے ملاحوں کو جو ساری عیسائی دنیا کے قابل ترین ملاح تھے۔ تونس کی بحریہ کی ملازمت پیش کی جس کو انہوں نے قبول کر لیا اور اس طرح تونس کی بحری قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد عروج نے اپنے مختصر بیڑے کی مدد سے بحری ڈاکوؤں کی کئی ٹولیوں کو شکست دی۔ عروج نے تونس کی بندرگاہ کو جو دنیا کی بہترین بندرگاہوں میں سے ایک ہے اپنا مستقر بنایا۔ عروج کے یہاں پہنچنے کے بعد تونس کا ساحل محفوظ ہو گیا۔ آخر سلطان تونس نے عثمانی سلطان سے اجازت لے کر عروج کو تونس کا امیر البحر بنا دیا۔ اس عہدے پر فائز ہوتے ہی عروج نے تونس کے بحری بیڑے کی تنظیم نو کی۔ جہاز سازی کے کارخانے کھولے۔ بحری علوم کی درسگاہیں قائم کرائیں۔ بندرگاہوں کی توسیع اور مرمت کرائی۔ اور عیسائی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی جنگ کا فیصلہ لیا۔ انہوں نے اس جنگ کی تیاری خاموشی سے کرنے کی بجائے کھلم کھلا اعلان کی ایک ... ... کہا جاتا تھا کہ اسپین کی عیسائی حکومت کا پورا جنگی بیڑا ایک جگہ اکٹھا ہو جائے چنانچہ ... کے قریب دونوں بیڑوں میں خوفناک تاریخی جنگ ہوئی جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور اسپین کی سمندری طاقت کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس فتح نے ساری دنیا میں عروج کا نام بہت مشہور کر دیا۔ اور سلطان تونس نے خوش ہو کر جربہ نامی ایک جزیرہ انہیں بخش دیا تاکہ وہ مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ عروج نے اپنے جہازوں کو جربہ میں رکھا جبکہ حلق الوید کی بندرگاہ میں تونس کے آٹھ سو جنگی جہاز ہر وقت اس کے حکم کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اسپین کے ساحل پر بوجیہ نامی ایک چھوٹی سی عیسائی ریاست تھی جس پر اسپین کی حکومت نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں کے حاکم نے عروج سے مدد کی درخواست کی۔ عروج نے سلطان تونس سے اجازت لے کر حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ اسپین کی بحری طاقت تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اسلئے بحری لڑائی کی نوبت نہ آئی اور اسلامی لشکر بوجیہ کے ساحل پر اتر گیا۔ عیسائیوں نے پسپا ہونے کے بعد ایک قلعہ میں پناہ لے لی۔ مسلمانوں کی فوجیں دس روز تک مسلسل گولہ باری کرتی رہیں لیکن قلعہ کی فصیل بہت زیادہ مضبوط ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اس دوران میں امیر البحر عروج شدید طور پر زخمی ہو گیا اور اسے علاج کے لئے افریقہ بھیج دیا گیا۔ اسلامی فوج ناکامی کے ساتھ تونس سے واپس چلی آئی۔ عروج کی بیماری کے دوران میں اس کا بھائی خیر الدین باربروسہ اس پورے بیڑے کا انچارج بنا۔ اس نے جزیرہ جربہ پہنچ کر بحری بیڑہ درست کیا۔ اس عرصہ میں عروج صحت یاب ہو کر آگیا اور دوبارہ اسپین کے ساحل کا رخ کیا۔

اس مرتبہ مسلمان قلعہ سر کرنے کی تیاریاں کر کے آئے تھے اور چند روز کی لڑائی کے بعد فتح کے آثار نظر آنے لگے لیکن اس وقت اسپین کی تازہ بحری کمک پہنچنے سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اور مسلمان لشکر کو پسپا ہونا پڑا۔ عروج نے حکم دے کر اپنے زائد جہازوں کو آگ لگوا دی تاکہ دشمن کے قبضہ میں نہ جائیں۔

۱۵۱۶ء میں امیر البحر عروج نے الجزائر کے دارالحکومت الجزیرہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اسی دوران مسلمانوں کی فوج میں ایک بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی جسے فرو کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ قلعے کے عیسائی حاکم نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر حاکم اسپین سے مدد منگوائی۔ جو سات ہزار فوجوں پر مشتمل تھی لیکن عروج نے اپنی حکمتِ عملی سے عیسائی بیڑے کو چار گھنٹے کے اندر اندر تباہ و برباد کر کے عیسائیوں کو عبرتناک شکست دی۔

اس فتح کے بعد عروج کی مقبولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس نے ایک بڑی فوج بھی تیار کی جس کی مدد سے سلطان سلیم کو شکست دے کر الجزائر پر قبضہ کر لیا اور اسپین والوں کے قبضے سے وہ تمام قلعے بھی لے لئے جن پر انہوں نے سلطان سلیم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر قبضہ کر لیا تھا۔ الجزائر پر قبضہ سے اسپین کے تجارتی بیڑوں کا کام بند ہو کر رہ گیا۔ وہاں کے تاجر اپنی حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ عروج کا زور توڑنے کے لئے کارروائی کرے مگر ان میں ہمت ہی باقی نہ تھی۔ بالآخر جب چارلس پنجم نے اسپین کی حکومت سنبھالی تو اس نے چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور اچانک جبکہ عروج پندرہ سو سپاہی لے کر دارالحکومت سے دور شکار کے لئے گیا ہوا تھا، پندرہ ہزار بحری اور دس ہزار بری فوج لے ساتھ الجزائر پر حملہ کر دیا۔ عروج اپنی مختصر سی جمعیت کے باوجود مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

یورپین مورخوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پندرہ سو آدمیوں میں سے ایک نے بھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ سب کے سب شہید ہو گئے اور انہیں میں امیر البحر عروج باربروسہ بھی شامل تھا۔ شہادت کے وقت اس کی عمر چوالیس برس تھی۔

۲۔ خیر الدین پاشا باربروسہ

دنیائے اسلام کے سب سے بڑے اور عظیم ترین امیر البحر۔ وہ امیر البحر عروج کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے بھائی سے زیادہ شہرت پائی۔ لفظ باربروسہ حالانکہ دونوں کے نام کا جز تھا۔ مگر تاریخ میں جہاں صرف باربروسہ لکھا ہو، وہاں امیر البحر خیر الدین پاشا ہی مراد ہوتے ہیں۔ ابتدا میں وہ ذاتی جہاز لے کر بحیرۂ روم میں عیسائی تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے بعد میں جب ان کی طاقت بڑھ گئی تو انہوں نے افریقہ کے ساحلوں پر حملے شروع کئے اور الجزیرہ شہر اور آس پاس کے علاقے پر قبضہ کر لیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی حکومت نہیں چلا سکیں گے، انہوں نے یہ علاقے ترکی کے عثمانی سلطان سلیم کے حوالے کر دئے۔ سلطان سلیم مشہور عثمانی سلطان محمد فاتح کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا سلیمان اعظم قانونی تخت پر بیٹھا تو اس نے خیر الدین پاشا کو پورے عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر کیا۔

عثمانی ملازمت کے دوران میں انہیں سب سے پہلے شہنشاہ چارلس کے بیڑے پر حملے کا حکم دیا گیا۔ خیر الدین پاشا باربروسہ نے عیسائیوں کے اس زبردست بیڑے کو تباہ کر کے کورن پراس اور دوسرے ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اٹلی کے ساحلوں پر کئی حملے کئے اور بہت سا علاقہ فتح کر کے عثمانی سلطنت میں شامل کر دیا۔ چارلس کے مشہور امیر البحر اندریا ڈوریا کو انہوں نے متعدد بار شرمناک شکستیں دیں۔

اس عہد میں تونس کی الگ حکومت تھی لیکن شمالی افریقہ میں ملا ہوا اس سے الجزائر سلطنتِ ترکی کا علاقہ تھا۔ امیر البحر خیر الدین پاشا باربروسہ نے سلیمان اعظم کی ہدایت پر تونس پر حملہ کیا اور سلطان حسن کی بحری اور بری طاقت کو شکست دے کر اسے الجزائر میں شامل کر دیا۔ تونس کے حکمران سلطان حسن اور عیسائی شہنشاہ چارلس کے درمیان مشترکہ دفاع کا معاہدہ موجود تھا۔ اس کے تحت سلطان حسن نے اس سے مدد کی درخواست کی۔ عیسائی شہنشاہ چارلس پانچسو جہازوں کا زبردست جنگی بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا۔ عیسائی فوجوں کی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ خیر الدین پاشا کو شکست کھا کر تونس سے نکلنا پڑا۔ چارلس نے تونس میں تیس ہزار مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرا دیا۔ اور ہزاروں خاندان جان بچانے کے لئے عیسائی بن گئے۔

اس شکست کے بعد سلیمان اعظم نے مصلحتاً فرانس سے بحری معاہدہ کر لیا جس کے مطابق دونوں حکومتوں نے بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ دن بعد فرانس اور شہنشاہ چارلس کے درمیان ایک بڑی جنگ چھڑ گئی جس میں یورپ کی تقریباً تمام طاقتیں فوراً خیر الدین پاشا کو ایک مضبوط بیڑا دے کر فرانس کی مدد کے لئے روانہ کیا۔ وہ اپنی پچھلی شکست کا انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا اور ان کی بحری فوج کا جوش و خروش

بہت بڑھا ہوا تھا۔ کارفو نامی ایک جزیرے میں چارلس کا بہت بڑا بحری اڈہ تھا۔ خیرالدین پاشا نے کارفو کا محاصرہ کر لیا اور چند ہی روز میں اُسے فتح کرکے اس پر سلطان ترکی کا پرچم لہرا دیا۔ جنگ میں وینس کی حکومت بھی چارلس کی طرف سے شریک تھی۔ لہٰذا خیرالدین پاشا نے بحیرہ ایجین کے تمام جزیروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔ یہ سارے جزیرے وینس کے ماتحت تھے۔ کچھ عرصے بعد فرانس اور چارلس کے درمیان نیس کے مقام پر عارضی صلح ہو گئی مگر ترکی نے جو علاقے فتح کر لئے تھے ان پر اسی کا قبضہ رہا۔ اس جنگ میں ترکی کو بہت سے مفتوحہ علاقے، اہم بندرگاہ، اور ایسے جزیرے ہاتھ آئے جن کی وجہ سے سمندروں پر سلطنت عثمانیہ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں پوپ فرڈیننڈ نے جو ہنگری کا شہنشاہ بھی تھا، جمہوریہ وینس اور شہنشاہ چارلس سے مل کر ترکوں کے خلاف "اتحادِ مقدس" قائم کیا۔ پوپ نے ایک فتوے کے ذریعہ اس جنگ کو مذہبی لڑائی یعنی صلیبی جنگ قرار دیا۔ چنانچہ یورپ کی دوسری عیسائی حکومتوں اور عام لوگوں نے بھی اتحادیوں کی مدد کی۔ اس طرح جو بحری بیڑہ فراہم کیا گیا وہ عثمانی بیڑے سے کئی گنا زیادہ بڑا تھا۔ اس کی کمان عیسائی دنیا کا سب سے بڑا امیرالبحر انڈریا ڈوریا کر رہا تھا۔

عثمانی بیڑے کے انچارج امیرالبحر خیرالدین پاشا باربروسہ تھے۔ جزیرہ پریویسا کے قریب یہ مشہور تاریخی جنگ ہوئی جس میں اتحادی بیڑے کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ان کے سارے بحری مقبوضات ترکی کے زیر نگیں آ گئے۔ اسپین کے شہنشاہ چارلس کو اس شکست کا انتقام لینے کی فکر پڑ گئی۔ پھر الجزائر کی طرف سے نہ صرف اسپین بلکہ اپنے اطالوی ساحلی مقبوضات کے لئے بھی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ اس لئے ۹۴۶ھ میں اس نے ایک بڑا بحری بیڑہ الجزائر پر حملے کے لئے روانہ کیا لیکن خیرالدین پاشا نے اُسے بری طرح شکست دے کر بھگا دیا۔ اس سے اگلے سال فرانس نے نیس کا معاہدہ ختم کرکے چارلس کے خلاف اعلانِ جنگ دوبارہ کر دیا۔ اس جنگ میں بھی ترکی نے معاہدے کے مطابق فرانس کا ساتھ دیا اور خیرالدین پاشا نے شہر نیس فتح کر لیا۔ ترک بیڑے کی ان خدمات کے اعتراف کے طور پر شہنشاہ فرانس نے از خود اپنی طولون کی بندرگاہ ترکی کے حوالے کر دی۔

۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء تک خیرالدین پاشا نے بحیرۂ روم میں متعدد لڑائیوں میں حصہ لیا اور سب میں کامیابی حاصل کی۔ یورپ والے انہیں ناقابلِ شکست سمجھنے لگے اور پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ عیسائی ملاح اور سپاہی بحری فوج میں بھرتی کے وقت سے پہلے یہ شرط رکھنے لگے کہ انہیں باربروسہ سے لڑنے کو نہیں کہا جائے گا۔

۹۵۳ھ کے آخر میں امیرالبحر خیرالدین پاشا باربروسہ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ترکی کو سب سے بڑی بحری طاقت بنا دیا تھا۔ بحیرۂ روم، بحیرۂ احمر اور بحیرۂ عرب میں ان کے نام کے ڈنکے بجتے تھے اور جبل الطارق سے لے کر ہندوستان کے مغربی ساحل تک ان کا نام انتہائی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ عیسائی تجارتی جہاز لوٹنے کا کام کیا کرتے تھے اس طرح انہوں نے بیشمار دولت اکٹھی کی تھی۔ پھر سلطنت عثمانیہ کی ملازمت کے دوران میں بھی انہوں نے تنخواہ کے علاوہ انعام و اکرام میں بڑی دولت حاصل کی۔ شہنشاہ فرانس نے بھی بہت کچھ دیا۔ یہ ساری دولت انہوں نے اپنے ساتھیوں میں بانٹ دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سپاہی اور ملاح لوگ ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اور جہاں اُن کا پسینہ گرتا وہاں خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ مرتے وقت اُن کی عمر نوے سال تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بیحد چاق و چوبند تھے اور سخت سے سخت عملی محنت سے نہیں گھبراتے تھے۔

انتقال کے بعد سلطان نے ان کا مزار سمندر کے کنارے اس طرح سے بنوایا کہ اس کی لہریں ہر وقت مزار کی دیوار چومتی رہیں۔ درۂ دانیال میں شاخ زریں کے سرے پر کستاش میں انکا یہ مزار آج بھی موجود ہے اور ترکی کا بحری بیڑہ جب بھی درۂ دانیال سے گزرتا ہے تو دنیا کے اس عظیم امیرالبحر کو سلامی پیش کرتا ہے۔

بارودی (۲۷ رجب ۱۲۵۵ھ/ ۶ اکتوبر ۱۸۳۹ء - ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) محمود سامی مصری سیاستدان۔ مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں "ایتای البارود" میں پیدا ہوا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء میں قاہرہ کے فوجی ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء میں باش جاویش (کوارٹر ماسٹر سارجینٹ) کا درجہ حاصل کرکے سکول سے فراغت لی۔ اسی زمانے میں اس نے ذوق شعر گوئی کی طرف خاص توجہ دی اور اس کو مصر کی ادبی نشاۃ ثانیہ میں ایک رہنما کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نے اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ترکی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کا مطالعہ کیا۔ کچھ عرصہ قسطنطنیہ میں بھی گذارا جبکہ وہ مصری امور خارجہ کے سیکرٹری کی حیثیت سے وہاں مامور تھا۔

۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء میں البارودی خدیو مصر کی خاص شاہی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ محرم ۱۲۸۰ھ/ جولائی ۱۸۶۳ء میں باٹین کمانڈر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور وہ خدیو اسماعیل کے محافظ دستے کا کمانڈر ہو گیا۔ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں جب وہ مصری فوجی وفد کے ساتھ جو فرانس اور لندن گیا تھا واپس آیا تو اس کو محافظ دستے کی تیسری رجمنٹ کا قائم مقام (لیفٹیننٹ جنرل) کے عہدے پر ترقی دی گئی اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کو محافظ دستے کی چوتھی رجمنٹ کا امیر الای (کرنل) کا عہدہ مل گیا۔

البارودی اقریطش کی جنگ میں ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں شریک ہوا جہاں اس کی خدمات کے عوض اسے ترکی نشان وسام عثمانی درجہ چہارم [illegible] عطا کیا گیا۔ کچھ مدت بعد خدیو اسماعیل نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں [illegible] کے بعد اس کے کارہائے نمایاں کے عوض بریگیڈیر جنرل بنا دیا گیا۔ ۱۲۹۶ھ [illegible] ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں وہ عام فوجی افسروں کی تنظیم میں مشغول رہا اور [illegible] اوقاف کے عہدے پر فائز رہا۔ اس دوران میں اس نے بہت سے رفاہ [illegible] کام کئے۔ مثلاً مساجد اور مکانات کی تعمیر کرائی۔ خدیو کی کتب خانے کی [illegible] ۱۸۸۱ء میں لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا اور [illegible] وزیر جنگ بھی مقرر کر دیا گیا۔

جب مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا تو تحریک آزادی کے [illegible] کو بھی دوسرے رہنماؤں مثلاً عرابی پاشا اور شیخ محمد عبدہ [illegible] وہ سترہ سال تک ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۰ء تک جزیرہ سیلون میں رہا۔ [illegible] میں اس نے انگریزی کا مطالعہ کیا [illegible] بیشتر حصہ یہیں مکمل کیا۔ [illegible] بعد مصر واپس آیا تو اس کے پاس منتخب اشعار کا بہت بڑا ذخیرہ [illegible] کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی تصانیف میں مختارات البارودی [illegible]

اولذکر البارودی کی وفات کے بعد چار جلدوں میں چھپی۔ [illegible] ۱۹۰۹ء میں اور آخری دو جلدیں ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئیں۔

اس کا دیوان تین جلدوں پر مشتمل ہے جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

بارہ سید سید ابوالفرح کی اولاد، جو سادات بارھہ [illegible] لوگ عراق کے شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ ان کا سلسلہ زید شہید کے واسطے سے سترہویں پشت میں جا کر حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ [illegible] ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں اپنے بارہ بیٹوں کے ہمراہ ہندوستان آئے اور پٹیالے کے قریب چار گاؤں میں آباد ہو گئے۔ ان کے چار بڑے خاندان انہی چار گاؤں (چھت بنور، کندلی، جگنیر یا جھجری) کے نام سے

موسوم ہوئے۔

بارھہ کے لفظ کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات کی ہیں بعض کے نزدیک یہ "باہر" سے مشتق ہے اور اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ان سادات نے دہلی کے "مینا بازار" کی عیاشی والی طرز زندگی سے بیزار ہو کر شہر سے باہر کی رہائش کو زیادہ پسند کیا اور بعض کے نزدیک یہ کہ یہ شیعہ تھے اور بارہ اماموں کو مانتے تھے طبقات اکبری اور تزک جہانگیری کے مطابق یہ ضلع مظفر نگر کے ان بارہ گاؤں سے مناسبت رکھتا ہے۔ جن میں یہ لوگ آباد تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں یہ سادات ہر بڑی مہم میں پیش پیش رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت تک یہ لوگ فوج میں مختلف عہدوں پر رہے ہیں "تاریخی شہرت رکھنے والے سید برادران اسی خاندان سے متعلق تھے۔ اٹھارھویں صدی کے ابتدائی ربع میں انہیں "بادشاہ گر" کا لقب ملا بہادر شاہ کے بیٹے شہزادہ عظیم الشان کے دور میں انہیں بہت عروج حاصل ہوا ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں جاجو کی لڑائی میں انہیں جوانمردی کے جوہر دکھانے کے صلے میں الہ آباد اور پٹنے کی حکومتیں عطا ہوئیں۔ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۳ء میں جب انہوں نے فرخ سیر کو تخت پر بٹھایا تو اس نے بھی انہیں بڑے بڑے اعزازات سے نوازا۔ فرخ سیر نے سات سال حکومت کے بعد جب لوگوں سے آنکھیں پھیرنا چاہیں تو انھوں نے [illegible] اسے گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ ۱۷۱۹ء میں ان بادشاہ گروں نے [illegible] بادشاہ بنایا [illegible] تھوڑے ہی عرصہ بعد دربار میں ان کے خلاف سازشیں اٹھ کھڑی ہوئیں [illegible] سادات نے جب اپنا اقتدار خطرے میں دیکھا [illegible] نظام الملک کو جو تورانی سرداروں کا قائد تھا ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی ان کی فوج [illegible] سے تھوڑے سے فاصلے پر تھی کہ حسین علی کو قتل کر دیا گیا۔ [illegible] جب روہیلوں نے جولی گڑھ کو تباہ و برباد کیا تو ان دونوں [illegible] کے دوران کو قتل کر دیا۔ [illegible] سادات کے اقتدار کو زوال آنا شروع ہو [illegible] کے دوران [illegible] بالآخر گاؤں میں واپس آ گئی۔

بارہ وفات آنحضورؐ کا یوم وفات [illegible] ربیع الاول کے لئے [illegible] میں بولی جاتی ہے کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آنحضورؐ کا یوم وفات [illegible] ربیع الاول ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کی رائے میں ۲ ربیع الاول [illegible] یوم وفات ہے۔ [illegible] کے مطابق بارہ وفات سے مراد یکم ربیع الاول سے ۱۲ ربیع الاول [illegible] یعنی ربیع الاول کے ابتدائی بارہ دن جن میں آنحضورؐ نے علیل ہو کر وصال فرمایا [illegible] گھروں اور مسجدوں میں فاتحہ خوانی ہوتی ہے اور نیازیں تقسیم کی جاتی ہیں۔

اس دن کو یوم عید میلاد النبیؐ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ اس روز آنحضورؐ کی پیدائش مبارکہ بھی ہوئی تھی۔ مسلمان اب اس دن کو ایک خوشی کے طور پر [illegible] ہیں۔ جگہ جگہ آنحضورؐ کی سیرت پر جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں۔ مساکین اور یتیموں میں کھانے تقسیم کئے جاتے ہیں بازاروں، دکانوں اور راستوں کو [illegible] سے سجایا جاتا ہے پاکستان میں [illegible] عام تعطیل ہوتی ہے۔ [illegible] کے دن کی طرح آپؐ کی پیدائش [illegible] اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک آپ کا یوم پیدائش ۹ ربیع الاول ہے

باطل [illegible] حق اور باطل کا ہمیشہ سے اس دنیا میں وجود رہا ہے۔ جب [illegible] پس پردہ ہوتا ہے تو پھر باطل ہی کا راج ہوتا ہے۔ لیکن باطل کی یہ خاصیت ہے کہ جب بھی حق سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے تو پھر باطل میدان سے بری طرح بھاگتا ہے۔ قرآن مجید میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو مٹنے والا ہی تھا۔" (۸۱:بنی اسرائیل)

جو شخص حق کے ہوتے ہوئے باطل کی پرستش کرتا ہے اس کو باطل پرست کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اہل حق کو باطل کے مقابلے پر ڈٹ جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالٰی کو باطل پرستوں کی سرکوبی ہی کرنی ہوتی تو وہ اس کام کے لئے اہل حق کا محتاج نہیں تھا۔ یہ کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان چشم زدن میں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے پیش نظر تو یہ ہے کہ جو حق پرست ہوں باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے مقابلہ میں مجاہدہ کر کے اپنے آپ کو سونے کی طرح آگ کی بھٹی سے گذار کر زر خالص کر لیں۔

باطن ایک وادی کا نام جو شمال مشرقی عرب میں ہے یہ وادی شمال مشرق کی جانب ۸۵۰ کلومیٹر لمبی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ بہتے ہوئے پانی و قدرتی نالہ تھا جو وادی رمہ کے ذخیرے سے آتا تھا۔ یہ وادی غیر معمولی طور پر یکساں ہے۔ یہ کناروں سے دس یا تیرہ کلومیٹر اور تہ سے دو یا تین کلومیٹر چوڑی ہے۔ الباطن بصرہ سے حجاز جانے والی ایک تاریخی شاہراہ کے طور پر کام دیتی رہی ہے۔ چند آثار قدیمہ باقی رہ گئے ہیں اور ان میں نمایاں ترین آثار بیس گندے کنوئیں ہیں جو حفرالباطن نامی گاؤں کے پاس ہیں۔ حفرالباطن میں کل دو سو گھر اور ایک دارالامارت قلعہ ہے۔ اور یہ امارت مشرقی صوبے الدمام کے زیر انتظام ہے۔ ۱۹۲۲ء سے العقیر کے مقام پر ہونے والے معاہدے کے تحت وہ مقام جہاں الباطن اور اس کی معاون ندی الوجا آپس میں ملتی ہیں۔ سعودی عرب، کویت، عراق کی حدود کی ملنے کی جگہ ہے۔

باطنہ مشرقی عرب کا ایک زیریں سطح کا ضلع۔ یہ ضلع خلیج عمان کے سمندر ساحل اور الحجر کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ شمال کی طرف خلفہ ملاحہ کی راس اور جنوب میں جبل الاعمر کے گاؤں اس کی حدود کا کام دیتے ہیں۔ اس ضلع کا عرض دس سے بیس میل ہے۔ ساحل کے قریب زمین ریتلی ہے اور اس میں کم گہرائی کے کثرت کنوئیں ہیں۔ اس ضلع کے طول و عرض کو متعدد بہتی ہوئی ندیاں قطع کرتی ہیں جو ساحل کی طرف بہتی چلی گئی ہیں۔ الباطنہ کے مفہوم میں پست سطح کے خطے کے معنی پوشیدہ ہیں۔ یہ کھجوروں کی کاشت اور ماہی گیری کے لئے ایک مخصوص خطہ ہے۔ اس کا اندرونی علاقہ چند نیم خانہ بدوش لوگوں اور ان کے مویشیوں کی کفالت کرتا ہے۔ سمندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ کھجور کے درختوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ اور جو بعض جگہ اندرونی علاقے میں سات میل دور تک اندر پھیل گیا ہے۔ یہ ضلع گیہوں، کپاس، جو، نیشکر، لوسرن، چارہ، آم، کیلے انجیر، خربوزے اور زیتون کی کاشت کے لئے مشہور ہے۔ آب پاشی کا کام کنوؤں سے لیا جاتا جو کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

پالتو جانوروں میں بھیڑیں، بکریاں، گدھے اور اونٹ ہیں جو عمان کے اونٹ کو عمانی نسل کے اونٹوں کی تینوں مشہور نسلوں سے زیادہ ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ چھوٹی کشتیوں سے ماہی گیری کا کام لیا جاتا ہے۔ اور بڑی کشتیاں تجارت کے لئے استعمال ہوتی ہیں جو خلیج فارس، جنوبی زنجبار اور پاکستان تک جاتی ہیں۔

ابوزید الانصاری اور عمرو بن العاص نے سب سے پہلے ۸ھ/۶۲۹ء میں الباطنہ کو اسلام سے مشرف کیا۔ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں ایرانیوں نے اس علاقے کو دو مرتبہ اپنے حملوں کی آماجگاہ بنایا اور عرصہ تک اس علاقے پر قبضہ جمائے رکھا

بالآخر ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں پرتگالیوں کی وجہ سے انہیں یہاں سے نکلنا پڑا۔ نادرشاہ کے دور میں ایرانیوں نے ایک مرتبہ پھر الباطنۃ پر قبضہ جمانا چاہا جو کہ ابوسعید کے احمد بن سعید کی مدافعت کی وجہ سے ناکام رہے۔

الباطنۃ کی مستقل آبادی ۱۹۰۸ء کے اندازے کے مطابق ایک لاکھ پانچ ہزار کے قریب تھی۔ آبادی کی اکثریت مذہبی اعتبار سے اباضی ہے۔ بلوچیوں اور حبشیوں کا میلان سنی مذہب کی طرف ہے۔

باطنیہ اسماعیلیہ فرقے کی ایک شاخ۔ یہ لوگ قرآن مجید اور احادیث ظاہری الفاظ کے "باطنی" معنوں پر زور دیتے ہیں۔ یعنی لفظی معنوں کو تو رد کرتے اور باطنی معنوں پر زور دیتے ہیں مثلاً ابومنصور العجلی کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ "السموات" سے مراد امام اور "الارض" سے امام کے پیرو مراد لیتے ہیں۔

باطنیوں کے چار بنیادی تصورات ہیں۔

۱۔ باطن۔ ۲۔ تاویل۔ ۳۔ خاص و عام۔ ۴۔ تقیہ

ان کے خیال کے مطابق ہر مقدس متن کے کچھ باطنی معنی بھی ہوتے ہیں جو ظاہری معنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر نبی جس کو کتاب دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک وصی ہونا بھی لازمی ہے اور اس وصی کا کام یہ ہے کہ وہ خفیہ طریقے سے اس کلام کی تاویل قابل لوگوں کے ایک خاص گروہ جو اسے وصی مانتا ہو کے سامنے کرے۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک حضرت علیؓ آنحضورؐ کے وصی ہیں اور انہیں آنحضورؐ کے متقابل تاویل ملی ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک خواص جو باطن کو جاننے والے دوسرے عوام۔

ان کے نزدیک باطن محض اس لئے باطن نہیں کہ وہ ظاہر نہیں ہے بلکہ اس لئے بھی باطن ہے کہ وہ بھید ہے اور اس کا علم وحی کی ظاہری پیروی کرنے والوں کو نہیں ملتا۔

باطنیوں میں یہ عقیدہ خاص طور پر بار بار ابھرتا رہا کہ جو لوگ امام کے صحیح منصب اور باطن کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں ان کے لئے شریعت اور اس کے ظواہر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ (نیز دیکھیے: "اسماعیلیہ")

باعباد حضرمی علماء اور مشائخ کا خاندان؛ یہ خاندان حضرت ہودؑ کے حرم کا خادم ہے۔ اس خاندان کے ارکان میں زیادہ مشہور عبداللہ بن محمد عبدالرحمٰن باعباد الحضرمی — جس نے ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں وفات پائی ۲۔ محمد بن عمر بن محمد ابن عبدالرحمٰن جس نے ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں وفات پائی، ہیں۔ ان دونوں کے مزار شبام میں ہیں۔

باعلوی جنوبی عرب کے سادات اور صوفیاء کا ایک بڑا اور بارسوخ خاندان۔ اس خاندان کی نسبت ایک مشہور بزرگ علوی سے ہے۔ اس خاندان کی اکثریت حضرموت میں شہر تریم کے قرب و جوار میں سکونت پذیر ہے۔ عیدروس۔ بافقیہ۔ الجفری۔ الحبشی۔ الحداد، السقاف الشلی وغیرہ اس کی شاخیں ہیں۔ اس خاندان کی سب سے بڑی شاخ کے ممتاز ترین افراد مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ علوی بن عبداللہ (یا عبیداللہ) بن احمد بن عیسےٰ المہاجر بن علی العریضی بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن زین العابدینؓ بن الحسینؓ بن علی ابن ابی طالبؓ۔ یہ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ہے۔

۲۔ علی ابن علوی بن محمد بن علوی۔ یہ اس خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے تریم میں ۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء میں سکونت اختیار کی۔

۳۔ محمد بن علی۔ اس نے مشہور بندرگاہ رباط میں سکونت اختیار کی۔

۴۔ محمد بن علی بن محمد۔ ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء تا ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء یہ جنوبی عرب کے سلاسل تصوف کا مرجع و مرکز اور خاص علوی طریقے کا بانی تھا۔

۵۔ علوی بن محمد ۶۶۹ھ/۱۲۷۰ء یہ اور اس کا بیٹا عبداللہ باعلوی ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء تا ۷۳۱ھ/۱۳۳۰ء دونوں بہت مشہور صوفی ہو گئے ہیں۔

۶۔ محمد بن علی بن علوی ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء تا ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء تریم میں پیدا ہوا اور وہیں وفات پائی۔ اس نے حضرت ہودؑ کے مقبرے کے پاس ایک جگہ مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی وجہ سے لوگ اسے مولائے دویلہ (پرانے شہر کا ولی) کہتے تھے۔ اس کے بیٹے عبدالرحمٰن السقاف سے سقاف اور عیدروس شاخیں چلیں۔

۷۔ عمر بن عبدالرحمٰن بن محمد بن علی بن محمد بن احمد بن محمد ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء تا ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء اس نے الحمراء گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ اس نے کتاب فتح اللہ الرحیم الرحمٰن فی مناقب عبداللہ بن ابوبکر بن عبدالرحمٰن لکھی۔

۸۔ احمد بن عبداللہ بن علوی بن حسن بن احمد بن محمد بن حسین بن علی بن محمد ام ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء اس نے ایک تاریخی کتاب "تاریخ شنبل" لکھی۔

۹۔ عمر بن محمد بن احمد بن ابوبکر باشیبان ابن محمد اسد اللہ بن حسن بن علی بن محمد ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء تا ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء۔ یہ تریاق القلوب الواف بذکر حکایات السادۃ الاشراف کا مصنف ہے۔ اس میں ۲۵۵ علوی سیدوں کے حالات درج ہیں۔

۱۰۔ محمد بن علی بن علوی بن محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ بن علوی ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء تا ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء۔ یہ الوسائل۔ النفحات۔ غرر البہاء الضوئی فی مناقب السادۃ بنی علوی۔ کتابوں کا مصنف ہے۔

۱۱۔ سلیم بن احمد بن شیخان بن علی بن ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ عبود بن علی بن محمد ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء تا ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء۔ اس کی تصنیفات میں سے مشہور ترین بلغۃ المرید و بغیۃ المستفید۔ الجواہر الخمس کے حصہ ۴، ۵ کی شرح۔ السفر المسطور للدرایۃ فی درر المنثور للروایۃ۔ مصباح السر اللامع بمفتاح الجفر الجامع۔ غرر البیان عن عمر الزمان۔ البرہان المعروف فی موازین الحروف ہیں۔

۱۲۔ عقیل بن عمر بن عمران بن عبداللہ بن علی ابن عمر بن سلیم بن محمد بن عمران علی بن احمد بن محمد ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء تا ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء۔ اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں: العقیدہ۔ فتح الکریم الغافر فی شرح حلیۃ المسافر۔

۱۳۔ محمد بن زین بن سمیط علوی بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن محمد سمیط ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء تا ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء اس نے جو کتب لکھیں درج ذیل ہیں۔ غایۃ القصد والمراد۔ قرۃ العین بہجۃ الفؤاد۔ لب اللباب۔ منظومات کا ایک دیوان۔

۱۴۔ اس خاندان کے قریبی زمانہ کے چند افراد کے نام یہ ہیں۔

(ا) عبداللہ بن حسین بن طاہر بن محمد الجاوری ام ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء۔ اس نے سلم التوفیق الی محبۃ اللہ علی التحقیق جو مرقاۃ صعود التصدیق کی شرح ہے تصنیف کی۔

(ب) عبدالرحمٰن بن محمد بن عمر ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء یہ حضرموت کے مفتی اور بغیۃ المسترشدین فی تلخیص فتاوے بعض الائمۃ المتأخرین۔ غایۃ تلخیص المراد من فتاوے ابن زیاد کے مصنف ہیں۔

(ج) فضل بن علوی محمد بن سہل مولد الدویلہ ام ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء اس کی تصنیف کردہ کتب یہ ہیں۔ سبیل الاذکار والاعتبار۔ عقد الفرائد من نصوص العلماء الاماجد۔

(د) ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن محمد المعروف بہ ابن شہاب ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء تا ام ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء اس کی تصانیف ۹ کتابوں کے عنوانات کے ساتھ ہندوستان میں طبع ہوئیں۔

(ہ) محمد بن عقیل بن علی بن یعقوب ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء تا ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء۔ یہ العطب الجمیل کا مصنف تھا۔

باغ چمن، چمن زار، گل زار، مرغزار، پھلواڑی، گلستان، بوستان، روضہ، جنت فردوس، حدیقہ، زمین کا وہ قطعہ جس کو جمالیاتی ذوق کے مطابق انسانی ہاتھوں سے درخت یا پھول یا آرائشی پودے و سبزہ اُگا کر آراستہ اور مزین کیا گیا ہو۔

باغات کو تہذیب انسانی میں ابتداء سے ہی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی پیدائش کے ساتھ ہی باغ کا بھی ذکر ملتا ہے قدیم ترین باغوں کے وجود کا ثبوت ہمیں مصریین اور یونان کی تاریخ کے مطالعے سے ملتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

"پھر ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ۔" (۲:۳۵)

کرۂ ارض پر باغات کا وجود مختلف صور و اشکال میں پایا جاتا ہے۔ ان مختلف صور و اشکال کے لیے لغت کی کتب میں کئی ایک الفاظ مختص کئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ عربی، فارسی اور رومی زبانوں سے متعلق ہیں۔

"اور خداوند نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدمؑ کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی۔"
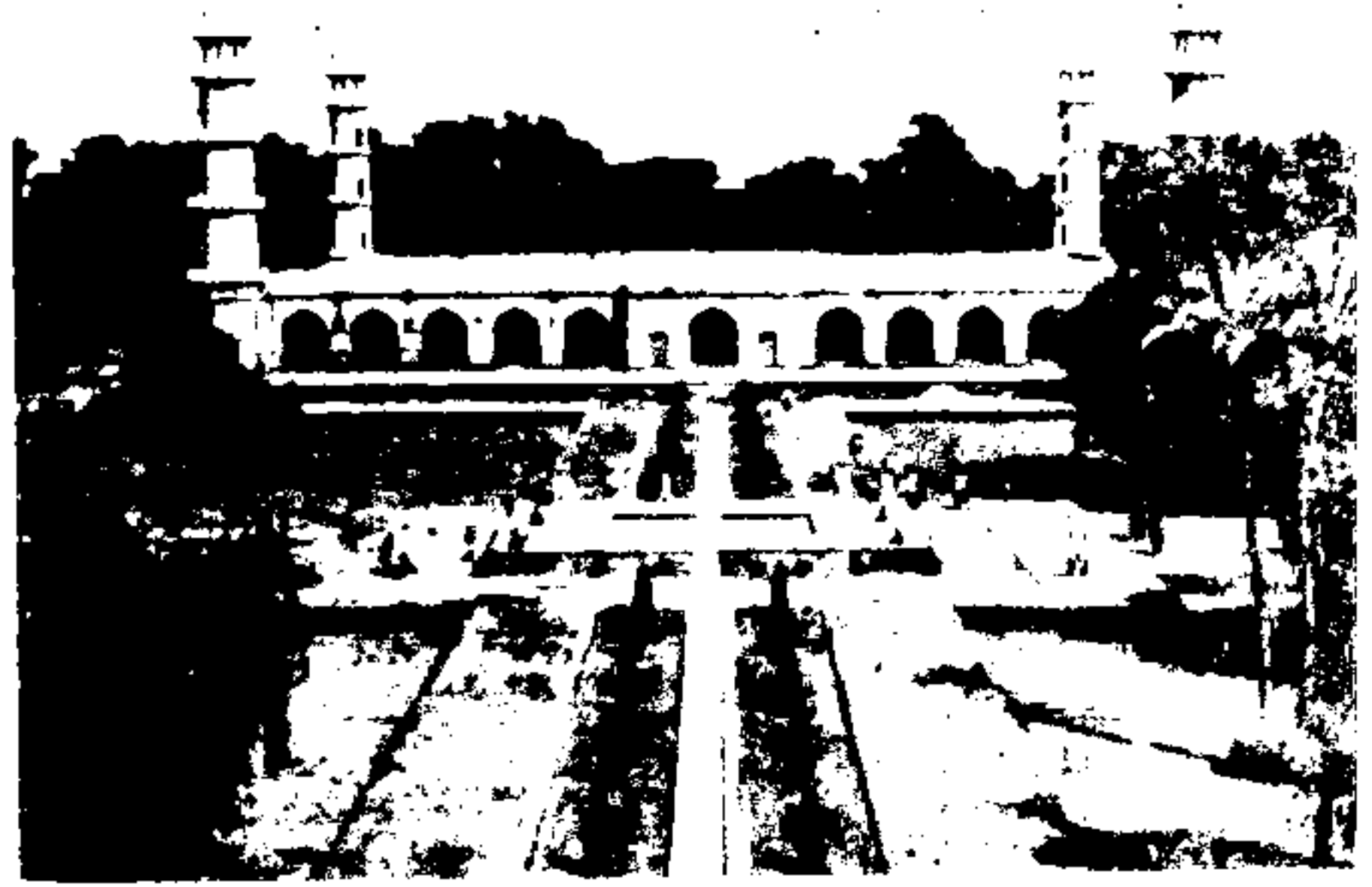
لاہور میں مقبرہ جہانگیر کا باغ

(کتاب پیدائش ۲:۸ بعد)

قرآن مجید میں کئی بار مختلف جگہوں پر جنت اور باغات کا ذکر آیا ہے۔ وہ مقامات درج ذیل ہیں:۔

(۵:۶۵، ۶۱، ۹۹، ۱۴۱) (۹:۷۲) (۱۳:۳۵) (۱۸:۳۱) (۱۹:۶۲) (۲۳:۸) (۲۵:۱۵، ۱۶، ۲۴) (۲۹:۵۸، ۱۴) (۳۴:۱۶) (۳۵:۳۳) (۳۶:۵۵) (۳۸: ۵۰، ۵۱) (۴۰:۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹) (۴۳:۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳) (۵۵:۴۶ تا ۷۶) (۵۶:۲۱، (۶۲:۱۲) (۶۹:۲۱ تا ۲۴) (۷۶:۱۱ تا ۱۴) (۷۸:۱۶) (۸۹:۱۰ تا ۱۶)

مندرجہ بالا آیات میں باغات کے بارے میں جو باتیں بتائی گئی ہیں مسلمانوں نے اس سے متاثر ہو کر باغات لگانے کے بارے میں خصوصی توجہ دی۔

اگرچہ اسلام سے قبل بھی بعض عرب حکومتوں کے زمانے میں محلات کے ساتھ باغات لگائے جاتے تھے۔ لیکن جس تیزی کے ساتھ مسلمانوں نے ان کی طرف توجہ دی وہ ان ہی کے حصہ کی بات ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ شام جو امیوں کا دارالخلافہ تھا اسلامی فن تعمیر اور ملحقہ باغوں کا مرکز تھا۔ اموی خلفاء نے شہروں سے باہر جابجا محل اور شکارگاہیں تعمیر کرائی تھیں۔ اور ان میں سے اکثر کے ساتھ باغ لگائے تھے ان باغوں کو دیواروں سے محصور کیا گیا تھا۔ چنانچہ قصر الحیر جس کو ۷۲۹ء میں ہشام نے تعمیر کرایا تھا اسی طرز کا ایک باغ قصیر عمرہ کے ساتھ تھا اس کو ولید اوّل نے ۷۱۲ - ۷۱۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ایک اور قصر المشتی جو موسم سرما بسر کرنے کے لیے بنایا گیا تھا ولید ثانی نے بنوایا تھا جو شکار وغیرہ کا بڑا شوقین تھا۔ نیز خربۃ المنیہ نامی ایک اور باغ بھی ولید ثانی ہی نے تیار کرایا تھا۔ جب امویوں کا دورِ حکومت ختم ہو گیا اور ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل جس نے پہلے تو ایک باغ میں پناہ لی اور پھر اندلس پہنچ کر اموی سلطنت قائم کی تو اس نے اپنی حکومت کا نظام دمشق کے نمونہ پر ہی کیا۔ چنانچہ اندلس میں باغات لگانے کا کام جو اسلامی عہد میں ہوا اس کا اعتراف خود مغربی مورخوں نے کیا ہے۔ باغبانی میں اندلسی مسلمانوں نے جو بےمثال ترقی اور کامیابیاں حاصل کیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں علم نباتات کا وسیع علم تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان خلفاء نے یکے بعد دیگرے باغبانی کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے فن باغبانی میں بےانتہا شہرت حاصل کی اور اندلس میں باغات کی بہت زیادہ جہتات ہو گئی چنانچہ دریائے ابرو اس وجہ سے پھلوں کا دریا کہلاتا تھا کہ اس وادی میں پھلوں کے بکثرت باغات تھے۔ سرقسطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، المریہ وغیرہ کے گرداگرد میلوں تک باغات پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان کی فصیلوں کے برج پر چڑھ کر دیکھنے والوں کو حدِ افق تک باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔ اندلس کے بڑے بڑے شہروں کے قریب پہنچ کر میلوں تک پھلدار باغات اور پھلواریوں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔

اموی خلفاء کی طرح عباسی خلفاء کو بھی باغات سے ایک خاص انس تھا۔ جب دریائے دجلہ پر بغداد تعمیر ہوا تو اس شہر میں بھی اور دوسری جگہوں پر بھی باغات لگائے گئے۔ عضدالدولہ کے باغ کی جو کہ بغداد میں تھا بڑی شہرت تھی۔ اس عہد کے مشہور باغوں میں بستان طاہر، بستان حفص، البستان طاہر مشہور ہیں۔ جب منصور نے الرصافہ تعمیر کرایا تو اس میں باغات کا خاص خیال رکھا گیا اور وہ اسی شہر کا ایک اہم حصہ بنے باغبانی کا یہ شوق بغداد سے غزنہ پہنچا اور وہاں بھی اسی شوق نے اسلامی اثرات کے تحت نشوونما پانا شروع کیا۔ چنانچہ غزنہ بھی کچھ عرصہ بعد عظیم الشان محلات اور باغات کا شہر بن گیا۔ اگرچہ مصر میں باغبانی کا رواج بہت پہلے سے تھا لیکن جب مسلمان ۱۸ھ/۶۳۹ء میں وہاں پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے باغات کی طرف توجہ دی۔ فاطمی خلفاء کو بھی باغات لگانے کا شوق تھا۔

مغرب کے علاقوں افریقہ میں جس دور میں عباسیوں کی طرف سے اغلبی امیر حکومت کرتے تھے تو انہوں نے بربروں کے سارے علاقے میں بغداد کے طور طریقے رائج کر دیئے تھے۔ چونکہ عباسی خلفاء کے زمانہ میں باغات نے بہت ترقی کی تھی لہٰذا افریقہ میں بھی یہ شوق اسی شدومد سے آیا۔ اسی دور میں مراکش میں مرینی بادشاہوں نے دیواروں سے گھرے ہوئے بہت سے سبزہ زار اور باغات تیار کئے۔ ایران میں باغبانی کا فن زمانہ اسلام سے بہت پہلے رواج پا چکا تھا۔ اور اس کا ثبوت عہدِ وسطیٰ کی ایرانی مصوری کے نمونوں میں پایا جاتا ہے لیکن دورِ عباسی میں جس طرح ایرانی زندگی عباسیوں کی طرز سے بود و باش سے متاثر ہوئی اسی طرح ایرانیوں کے فن باغبانی پر بھی عباسیوں کا اثر ہے۔ ایران میں ہر امیر غریب اپنے حالات کے مطابق اپنے اپنے گھروں کے ساتھ باغ بناتے تھے۔ جب تیموریوں کا دور ختم ہوا تو صفویوں نے بھی باغات کی روایات کو برقرار رکھا اور انہوں نے جابجا باغات لگوائے۔ جب اصفہان کو شاہ عباس نے اپنا دارالخلافہ تجویز کیا تو وہاں اور مزید باغات کا اضافہ ہوا۔ شیراز میں بھی بہت سے باغ لگوائے۔

پاک و ہند میں باغات کی اسلام سے قبل کوئی اہمیت نظر نہیں آتی۔ جب مسلمان فاتحین نے اس برصغیر میں قدم جمائے تو انہوں نے اپنے رہنے سہنے کے لیے محلات اور حفاظتی قلعے وغیرہ تعمیر کئے اور ان کی زیبائش کے لیے چھوٹے چھوٹے قطعات کی صورت میں پھولدار پودے لگائے۔ یہی چیز بعد میں باغات کے ارتقاء کا سبب بنی۔

فن باغبانی نے مغلوں کے عہد حکومت میں بہت زیادہ ترقی کی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جدت پسند طبیعتوں سے اس خطہ کو گلزار ارم بنا دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے جابجا نہریں کھدوائیں، جنگل کٹوا کر زمین صاف کرائی اور اس کو زراعت کے قابل بنایا۔

بابر مناظر قدرت کا بہت ہی دلدادہ تھا۔ فرغانہ اس کا وطن تھا جس کو قدرت نے عجیب و غریب مناظر سے مالا مال کر رکھا تھا۔ بقول بابر "یہ شہر حقیقت میں باغوں کا شہر تھا وہاں قدم قدم پر باغ اور چپہ چپہ پر باغیچے لگے ہوئے تھے۔" ان چیزوں نے بابر کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ جہاں بھی جاتا ان چیزوں کو تلاش کرتا۔ جب وہ ہندوستان میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس نے یہاں بھی اس قسم کے مناظر تلاش کئے۔ بابر سے پہلے یہاں کے باغات کچھ اچھی قسم کے نہ تھے۔ ان میں نہ تو کوئی بارہ دری ہوتی تھی جس میں آرام کیا جائے اور نہ آہستہ آہستہ بہنے والے چشمے ہوتے تھے اور بقول سی۔ سٹوارٹ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ باغ کا جدید تصور یہاں مغلوں ہی کے ساتھ آیا جنگ پانی پت میں اپنی شاندار فتح کی یادگار کے لئے بابر نے کوئی مینار یا عمارت تعمیر نہ کرائی بلکہ ایک باغ لگوایا۔ جسے کابلی باغ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ
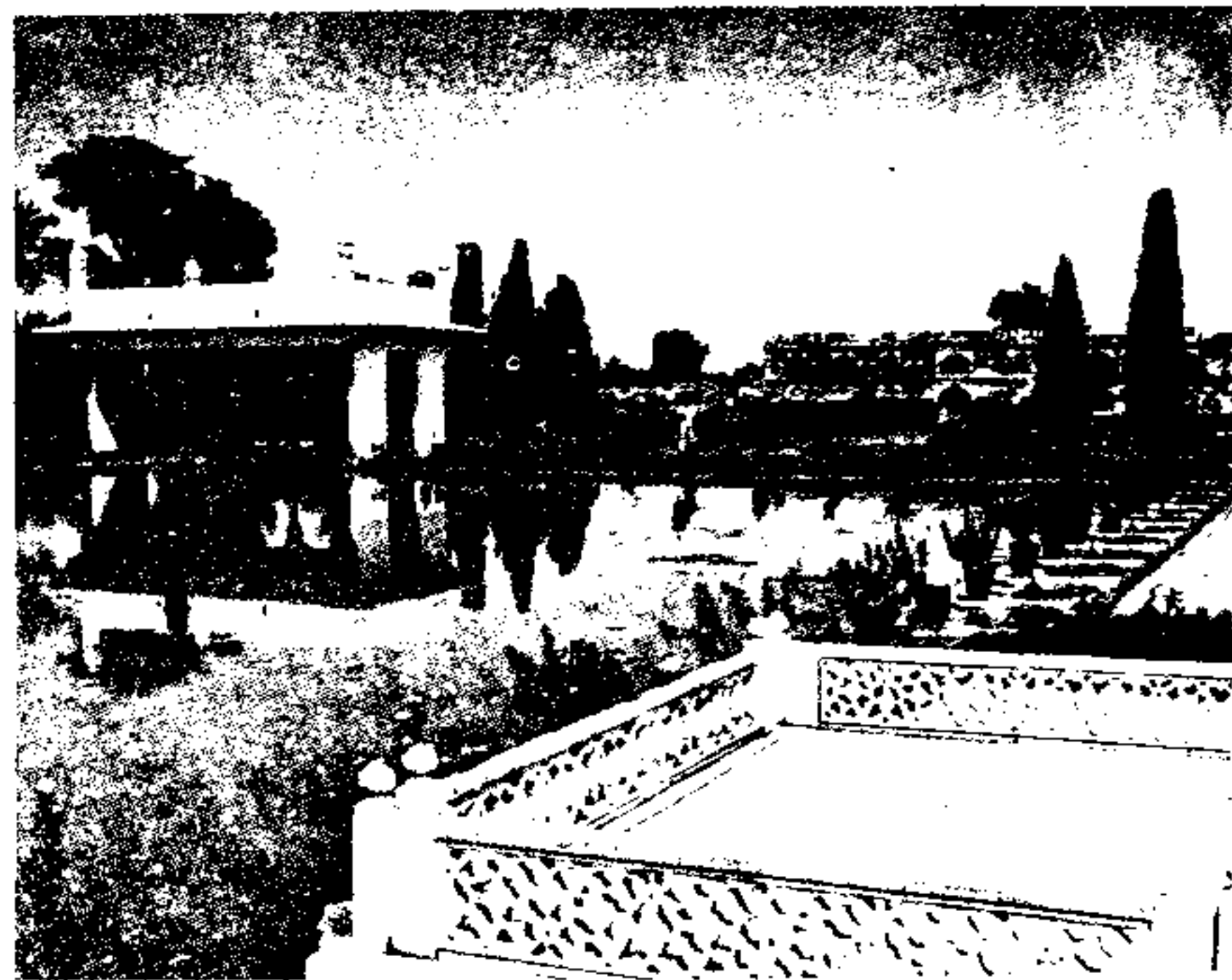
شالامار باغ لاہور

دوسری فتوحات کی یادگاریں بھی اس نے باغوں کی شکل ہی میں چھوڑیں۔ جب اس نے آگرہ کو اپنا پایہ تخت بنایا تو یہاں بھی اپنے مذاق کی تسکین کے لئے چہار باغ تعمیر کرایا۔ جسے آج کل رام باغ کہتے ہیں۔ یہ باغ جمنا کے کنارے واقع ہے اور تیموریوں کے ذوق چمن سازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس باغ میں اس نے ہشت نشینی حمام، حوض، پانی کے جھرنے اور نہریں بنوائیں۔ بابر نے باغ صفت بہشت اور زھرہ باغ تعمیر کرائے۔ ان کے بچے کھچے نشانات آج بھی آگرہ میں موجود ہیں۔ بابر کی تقلید اس کے امیروں نے بھی کی اور کئی باغ باغیچے لگوائے۔ بابر نے اپنے بیٹوں میں سے نصیر الدین ہمایوں کو تو اپنا جانشین بنایا اور دوسرے بیٹوں مرزا کامران اور مرزا عسکری کو الگ الگ صوبوں کا والی مقرر کیا۔ ہمایوں کو ہندوستان کے سیاسی حالات نے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اس کی عمر کا بیشتر حصہ دشت نوردی اور جلاوطنی میں بسر ہوا۔ اس لیے وہ فطرت پسندی کے جوہر کا مظاہرہ کہیں نہ کر سکا۔ البتہ مرزا کامران کے دو باغوں سے جو اس نے لگوائے ثابت ہوتا ہے کہ کامران کو بھی اپنے باپ کی طرح مناظر قدرت سے دلی لگاؤ تھا۔ کامران نے لاہور آتے ہی دریائے راوی کے کنارے ایک باغ تعمیر کرایا۔ یہ باغ آگرے کے باغ زرفشاں کے نقشہ کے مطابق تھا۔

ہمایوں کے بعد اکبر اعظم تخت نشین ہوا۔ جو در حقیقت سلطنت تیموریہ کا بانی ہے اس نے حقیقی معنوں میں وہ تہذیب یہاں پر رائج کی جس پر آج برصغیر پاک و ہند ناز کر رہا ہے۔ اس نے لاہور اور کشمیر میں کئی باغ لگوائے۔ جن کے اب فقط نام باقی رہ گئے ہیں۔ جہانگیر بابر کی طرح فنون لطیفہ کا دلدادہ اور باغوں کا شیدائی تھا وہ جہاں کوئی حسین و جمیل منظر دیکھتا اس کا قلم ایک ماہر مصور کے موقلم کی طرح اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا۔ چنانچہ اس نے بھی فن باغ کی طرف خاص توجہ دی اور کشمیر کا شالامار باغ اور ویری ناگ۔ کابل کا باغ شہر آرا۔ لاہور کا باغ دل افروز اسی نے تعمیر کرائے تھے۔

شاہجہان جہانگیر کا بیٹا تھا وہ عمارات کا دلدادہ تھا مگر مناظر قدرت سے اسے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا جہانگیر کو۔ اس نے لاہور میں شالامار باغ اور آگرہ میں روضہ تاج محل، گنج لافانی، انبالے کا باغ پنجور، برھان پور میں زین باغ وغیرہ یادگاریں چھوڑیں۔ کشمیر اور دہلی میں بھی اس نے کئی باغ لگوائے۔

شاہجہان حقیقی معنوں میں باغوں کا زبردست معمار ہے اس کے لگائے ہوئے باغ اگرچہ آج اپنی اصلی عظمت اور حسن صورتی کھو چکے ہیں لیکن پھر بھی سیاحوں [illegible] سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں [illegible] چنداں فروغ حاصل نہ ہوا مگر اورنگ زیب نے بھی باغات کا [illegible] سے لطف اندوز ہونے کا ملکہ ورثہ میں پایا تھا۔ احمد آباد میں اس نے [illegible] رابعہ درانی کے روضے کی صورت میں چھوڑی ہے۔

کشمیر کو قدرتی مناظر کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل [illegible] کی بہترین آب و ہوا۔ پانی کی فراوانی اور چاروں طرف پہاڑوں [illegible] کی تعمیر کے لیے قدرتی طور پر مواقع پیدا کر دی [illegible] فائدہ اٹھا کر کشمیر کو فردوس بر روئے زمین بنایا۔ [illegible] کے عہد میں باغوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ [illegible] نہروں کی تقسیم اور ان کے کنارے عمارت کی زیبائش [illegible] ان باغوں میں ڈل جھیل، چشمہ شاہی، نشاط باغ اور شالامار باغ [illegible]

باغی

بغاوت کرنے والا۔ نافرمان۔ سرکش۔ بچھڑا ہوا۔

اصطلاح میں جب کوئی جماعت اپنا مسلک جدا [illegible] اور مسلمانوں سے اپنا علیحدہ تشخص قائم کرے۔ باغی کہلاتی ہے۔

اگر باغی اطاعت امیر سے سرتابی نہ کریں اور نہ ہی مسلمانوں سے الگ [illegible] بلکہ ادھر ادھر متفرق طور پر آباد ہوں اور مسلمانوں کا ان پر اقتدار و اختیار ہو تو ان کے ساتھ لڑائی نہیں کی جاسکتی۔ جب خارجی حضرت علیؓ کے خلاف ہو گئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا ہم تمہیں تین رعایتیں دیتے ہیں:

۱۔ مساجد میں نماز اور عبادت ربی سے نہیں روکا جائے گا۔
۲۔ تمہارے ساتھ لڑائی کی ابتدا نہیں کی جائے گی۔

شرط ہے۔ مالکیوں کے نزدیک یہ عمر اٹھارہ سال، حنبلیوں اور شافعیوں کے نزدیک پندرہ سال ہے۔

اسلام میں پورے قانونی حقوق کے لئے فرد کا بالغ ہونا شرط ہے۔ صوفیا کے نزدیک آدمی اس وقت تک بالغ نہیں ہوتا جب تک اس میں چار خصلتیں کامل نہ ہوں یعنی اقوال، افعال، معارف اور اخلاق حمیدہ اس کے بعد ہی انسان کمال بلوغ کو پہنچتا ہے۔

ہر شخص پر بالغ ہونے پر ہی فرائض کی انجام دہی لازم ہوتی ہے اور وہ حدود و قصاص میں جوابدہ ہوتا ہے۔ لیکن معاملات اور ملکیت کے حقوق و فرائض کے سلسلے میں محض عاقل بالغ ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے رُشد یعنی صلاحیت اور فعل و عمل میں ذمہ داری کا احساس بھی ضروری ہے۔ حنفیوں کے علاوہ دوسرے مذاہب فقہ نے عاقل بالغ کو اس کے مال پر قابض بنا دینے کی عمر کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پچیس سال کی عمر پر اس کا مال اسے مل جانا چاہیئے۔ مالکیوں کے نزدیک عورت کے لئے رشد اور عاقل کی شرط کے علاوہ کسی کے عقد میں آ جانا اور ولی کا اسے باضابطہ اجازت دینا بھی ضروری ہے۔

قرآن میں بالغ کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے (۲:۲۳۵؛ ۲۲:۵؛ ۲۴:۵۹)۔

بانت سعاد [illegible]

[illegible]

باہلہ [illegible] ایک قبیلے کا علاقہ ریاض سے کوکو سیدن [illegible] باہلہ مالک بن اعصر کے ایک [illegible] باہلہ کے دو بڑے قبیلوں قتیبہ اور وائل کے درمیان سیاسی مخالفت تھی۔ یہ دونوں قبیلے اپنا خاندان کے حوالے سے معروف تھے۔ یہ زمانہ جاہلیت میں عزت [illegible] ان کی سکونت یمامہ میں تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے بعد یہ لوگ بصرہ سے باہر چلے گئے اور بئر الحضیر میں جا بسے۔ اسلامی عہد میں اس قبیلے کے بعض افراد نے بہت ناموری پائی۔ ان میں ابوامامہ الصدی بن عجلان حدیث کے راوی ہیں۔ سلمان بن ربیعہ کبار تابعین میں سے تھے جنہوں نے آذربائیجان کی فتوحات میں نمایاں حصہ لیا۔ اور کوفے کے قاضی بھی رہے۔ قتیبہ بن مسلم الباہلی مشہور فاتح، سپہ سالار اور خراسان کے حاکم رہے۔ عمرو بن مسلم الباہلی اور بصرہ کے مشہور عالم الاصمعی بھی اسی خاندان سے تھے۔

باہلی (وفات ۲۳۱ھ / ۸۴۵ء) ابونصر احمد ابن حاتم، ایک ماہر لسانیات اور مصنف پہلے بغداد میں رہتا تھا پھر اصفہان چلا گیا۔ بعد میں بغداد ہی میں سکونت اختیار کی۔ ابوزیاد، الاصمعی اور ابوعبیدہ کا شاگرد تھا۔ بغداد میں وفات پائی۔ اس نے درختوں، پودوں، پرندوں، اونٹوں، گھوڑوں، اناجوں وغیرہ پر مختلف کتابیں لکھیں۔ اس نے سب سے پہلے مذیوں پر کتاب لکھی تھی۔ اس کی اکثر تصانیف ضائع ہو گئیں۔ مشہور تصانیف میں "ضرب الامثال"، "اعلام" اور "غلط العوام" ہیں۔

بائبل "کتاب"۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی مقدس اور مذہبی کتاب۔ یہ دراصل بہت سی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں زبور، تورات اور انجیل بھی شامل ہیں۔ کتاب دو بڑے حصوں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید پر مشتمل ہے۔ "عہد نامہ عتیق" میں حضرت عیسیٰؑ سے قبل کے تذکرے، تاریخیں، صحیفے اور مذہبی کتابیں جو تعداد میں ۳۹ ہیں شامل ہیں اور "عہد نامہ جدید" میں چار اناجیل، رسولوں کے اکیس خطوط، رسولوں کے اعمال اور یوحنا عارف کا مکاشفہ دیئے گئے ہیں۔

یہ تمام کتابیں صدیوں میں تیار ہوئیں اور بائبل میں شامل ہوتی رہیں۔ یہ زیادہ تر تین زبانوں عبرانی، آرامی یا یونانی میں لکھی گئیں۔ ان کے مصنفین اپنے زمانے کے

BIBLIA

بائبل کا ولندیزی نسخہ (۱۶۳۷)

عالم فاضل لوگ تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نبی نہیں تھا۔ زبور، تورات اور انجیل کے نام سے جو کتابیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی اپنی طرف سے لکھی ہوئی ہیں۔

مغرب میں بائبل کو محض مذہبی کتاب کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ اس کی ادبی حیثیت

بھی مسلّم ہے اور اس کا مطالعہ باقاعدہ نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس کی بہت سی تمثیلیں، محاورے اور روزمرے مغربی زبانوں میں عام ہیں۔ اگرچہ بائبل کو ایک ادب پارے کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔

بائبل کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ زیادہ تر پچھلی دو صدیوں میں ہوا ہے۔ یونانی زبان میں عہدنامہ عتیق کا سب سے پہلا ترجمہ تیسری صدی قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن بائبل کا مکمل ترجمہ سب سے پہلے ۴۰۴ء میں لاطینی زبان میں ہوا۔ جسے پوپ کلیمنٹ ہشتم کے نام پر ۱۵۹۲ء میں کلیمنٹ ولگیٹ کا نام دے کر شائع کیا گیا۔ انگریزی زبان میں اس کے تراجم سولہویں صدی ہی میں شروع ہوئے۔ عہدنامہ جدید کا مکمل انگریزی ترجمہ ۱۵۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ پوری بائبل کا ترجمہ ۱۵۳۵ء میں شائع ہوا اور مستند ترین ترجمہ ۱۶۱۱ء میں شائع ہوا۔ جرمن زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ۱۴۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ فرانسیسی میں مکمل ترجمہ ۱۵۳۰ء میں، اطالوی زبان میں ۱۴۷۱ء میں اور ہسپانوی زبان میں ۱۷۹۳ء میں پہلا مکمل ترجمہ شائع ہوا۔

مشرقی زبانوں میں اٹھارہویں صدی تک بائبل کے تراجم صرف شامی، آرمینی قبطی، فارسی اور عربی میں ہوئے تھے۔ مشرق بعید اور ہندوستان میں پہنچنے والی مشنریوں نے یہاں کی زبانوں میں تراجم کا آغاز کیا۔ ۱۷۱۵ء میں گرنڈلر نے تامل میں عہدنامہ جدید اور شلز نے ۱۷۵۸ء میں ہندوستانی (دکھنی اردو) میں یوحنا کی انجیل کا ترجمہ کیا تھا اس کے بعد دنیا بھر کی زبانوں میں بائبل کے ترجمے ہونے لگے۔ جن کے لیے بائبل سوسائٹیاں مصروف عمل تھیں۔ ۱۹۶۰ء تک دنیا بھر کی ۲۱۹ زبانوں میں بائبل کے مکمل ترجمے شائع ہو چکے تھے۔

(نیز دیکھیے "انجیل"، "تورات"، "زبور"، "عہدنامہ جدید"، "عہدنامہ عتیق")

بایزید انصاری (۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء - ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) پیر روشان یا پیر تاریک' پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک عجیب وغریب صوفی، افغانوں کی تحریک روشنائیہ کے بانی، باپ کا نام عبداللہ اور ماں کا نام امینہ تھا۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ نسلاً پٹھان اور قبیلہ ارمڑ سے تھے۔ سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے جاملتا ہے۔ ابھی سات سال کے تھے کہ عبداللہ نے بایزید کی ماں کو طلاق دے دی۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم گھریلو کام کاج میں مصروفیت کی وجہ سے ناتمام ہی رہ گئی تاہم جب کبھی موقع ملتا تو تھوڑا بہت مطالعہ کر لیتے تھے۔ ان کی زیادہ تر توجہ صوفیانہ ریاضتوں اور دوسرے مذہبی فرائض کی معلومات حاصل کرنے کی طرف رہی۔ چنانچہ سولہ برس کی عمر میں خواجہ اسماعیل سے ملاقات ہوئی۔ بایزید خواجہ اسماعیل کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے والد انہیں قاضی بنانا چاہتے تھے۔ بالآخر ایک روز بایزید نے اپنے والد سے کہا کہ میں دین کے معاملے میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گا اس کے بعد انہوں نے خواجہ اسماعیل کے مریدین کی طرح سوکھی روٹی کھانا اور کم سونا شروع کر دیا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے بایزید کا جوگیوں کی صحبت میں رہنے کا بھی ذکر کیا ہے ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ خود بھی پیر کامل ہیں۔ چنانچہ انہیں خواب نظر آنے لگے۔ ایک خواب میں انہوں نے خضرؑ سے ملاقات کی اور ان سے آب حیات لے کر پیا۔ اس واقعے کی یاد ان کے مرید روزہ رکھ کر مناتے ہیں۔ اسی دوران میں انہیں غیب سے آوازیں سنائی دینے لگیں اور اس طرح انہوں نے روحانی ترقی کے مختلف مدارج طے کیے۔ اب بایزید ذکر خفی میں منہمک ہو گئے اور ایک عرصہ تک اسم اعظم کا ورد بھی کیا۔ اکتالیس سال کی عمر میں انہیں تبلیغ کا حکم ملا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان جانے کا قصد کیا لیکن قندھار ہی سے واپس جنوبی وزیرستان آ گئے۔ جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے ایک زمین دوز حجرہ تیار کرا کے اپنی بیوی اور چند دوسرے مریدین کے ساتھ چلہ کشی شروع کی۔ پانچ سال کی چلہ کشی کے بعد بایزید نے دوسرے لوگوں کو معرفت کی دعوت دینا شروع کی۔ اس دعوتی تحریک کو شروع کرتے ہی بایزید کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مخالفت میں ان کے والد، بھائی اور والد کے شاگردوں نے خاص طور پر حصہ لیا۔ وہ بایزید کو ناقص علم کے ساتھ کلام الٰہی کی تفسیر کا حق نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح اس کے دعوئے مہدویت اور امام ربانی پر بھی معترض تھے۔ نیز دوسرے مسلمانوں کو کافر یا منافق کہنے پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ بایزید ان اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہے اور ان کے مریدوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ بایزید انہیں اپنے خلفاء بنا کر تبلیغ کے لیے مختلف مقامات پر بھیجتے۔ جہاں کسی مقام پر ان کا مقامی پیروں سے جھگڑا بھی ہو جاتا۔

بایزید نے تبلیغ کا کام شروع کیا تو ان کی بہت زیادہ مخالفت ہوئی تاہم ان کی قبائل بنگش تک رسائی ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے اورکزئیوں تیراہیوں اور آفریدیوں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اسی طرح پشاور سے گذرتے ہوئے وہاں کے بیشمار قبائل کے لوگ اس کے حامی اور مرید ہو گئے۔ بالآخر ان کے خلاف کابل کے دربار میں شکایات پہنچیں تو بایزید نے اپنے جوابوں سے لوگوں کی تسلی کی اور تب انہیں پشاور جانے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح ان کے ایک داعی نے [illegible] کے علاقے میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور وہاں چند سال تبلیغ کرنے کے بعد حیدرآباد سندھ کے نزدیک سعید پور کے مقام پر اپنا تبلیغی مرکز قائم کیا۔ بایزید نے [illegible] پھیلانے کے لیے امراء اور علماء کے پاس اپنے داعی بھیجے ان میں سے ایک داعی [illegible] اکبر کے دربار میں بھی بھیجا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض دور اندیش لوگوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ لگا کر یہ تصور قائم کر لیا کہ اب بایزید خونریزی کرنے پر [illegible] ہے۔ نیز ان کے بعض مریدوں نے ایک قافلے کو جو ہندوستان سے کابل جا رہا تھا طیش میں آ کر یہ لوگ بایزید کا مذہب اختیار نہیں کرتے لوٹ لیا۔ کابل کے حاکم نے پر حملہ کیا اور ان مریدوں کے گاؤں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے ان کے [illegible] لیا۔ بایزید نے اس واقعے کے بارے میں جب احتجاج کیا تو حاکم نے ان کو [illegible] گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ لیکن وہ بچ کر یوسف زئی کے علاقے میں ایک پہاڑی پر چلے گئے اور جب اس علاقے کا بھی محاصرہ کر لیا گیا تو وہ کامیابی سے مقابلہ کرتے ہوئے [illegible] علاقے میں جا پہنچے۔ ان جنگوں کے شروع ہونے کے دوران سال بعد بایزید نے وفات پائی۔ انہیں پہلے ہشت نگر، وزیرستان، میں دفن کیا گیا۔ بعد ازاں بڑے بیٹے نے نعش وہاں سے نکلوالی اور بھٹہ پور میں جو کافی گرم تھی دفن کی۔ کچھ فاصلے پر تھا، دفن کی گئی۔

بایزید نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں جن میں انہوں نے اپنے فرقے کے [illegible] عقائد کو بڑی تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان میں "خیر البیان"، "مقصود المومنین"، "صراط التوحید" اور "حال نامہ" بہت مشہور ہیں۔

بایزید کی اولاد میں سات لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ ان کے نام شیخ عمر، کمال الدین، خیر الدین، نور الدین، جلال الدین، اللہ داد، دولت خان اور [illegible] بی بی ہے۔ بایزید کے بعد ان کا بیٹا شیخ عمر خلیفہ ہوا۔

بایزید کے نزدیک اللہ کی حقانیت کا ماننا فرض عین ہے۔ اس معرفت کے بغیر عبادت، خیرات اور عمل صالح، خدا کی نظروں میں غیر مقبول ہیں اور یہ معرفت پیر کامل

کے توسط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک پیر کامل وہ ہے، جو صاحبِ شریعت، طریقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت ہو۔ ہر انسان پر اس پیر کامل کی تلاش اور اطاعت فرض ہے۔ اس کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ پیر کامل خود بایزید ہے جیسے یہ بات خوابوں اور الہاموں میں بتائی گئی ہے۔ نئے سالکوں کے لیے تو حجرہ نشینی، سال بھر میں ایک بار چلہ کشی، ذکر خفی، مراقبے اور اس طرح کی دوسری ریاضتوں پر زور دیا گیا ہے۔

بایزید نے اپنی تعلیمات کا خلاصہ "صراط التوحید" میں لکھا ہے۔ آغاز میں انہوں نے سرداروں اور امیروں کو تین نصیحتیں کی ہیں۔ پہلی نصیحت عقل کی فضیلت اور خالق کائنات کی قدرت پر غور و فکر کرنے اور معرفت کے حصول میں کوشاں ہونے کے بارے میں ہے۔ دوسری نصیحت میں علم باطن کے حصول، ضرورت شیخ، شریعت کے اوامر و نواہی اور تقوے، خوف و رجا سے بہرہ ور ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ تیسری نصیحت میں صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے تزکیۂ نفس کو ضروری قرار دیا ہے۔

بایزید نے مرید کے لیے حسب ذیل مراتب طے کرنے ضروری قرار دیے۔

۱۔ شریعت :۔ شریعت کے اوامر و نواہی کی پوری پوری تقلید اور قرآنی احکام و سنت کی پیروی۔

۲۔ طریقت :۔ شرعی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسری عبادتوں کی طرف بھی توجہ دینا، کیونکہ شریعت اور طریقت ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔

۳۔ حقیقت :۔ ایک لمحے کے لیے بھی ذکر خفی، طہارت قلب اور یاد خدا سے غافل نہ رہنا۔

۴۔ معرفت :۔ اس کی بنیاد قوت عقل و فکر اور مشاہدے پر قائم ہے۔

۵۔ قربت :۔ جو بلند مراتب طے کرنے اور نفس پر قابو پا لینے کا نام ہے۔

۶۔ وصلت :۔ انسان اپنی ہستی کو بھلا کر اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرے۔

۷۔ وحدت :۔ توحید میں خود کو فنا کر کے ذات حق کو دل میں بسا لینا۔

۸۔ سکونت :۔ جو تحقیق کی آخری منزل۔

بایزید کے مریدوں نے اس کی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل دی۔ انہوں نے تحریک روشنائیہ کا نام دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تحریک کا مقصد افغانوں کی ایک داخلی اور خود مختار حکومت قائم کرنا تھا۔ لیکن خود بایزید کی تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد پٹھانوں میں تزکیۂ نفس، حسن اخلاق، بلندی سیرت و کردار، تفکر و تعقل اور حصول علم کے جذبات ابھارنا تھا۔ ابتدا میں اس تحریک کا مرکز کانی گرم وزیرستان ہی تھا۔ یہاں ان کے مریدوں میں ملا ارزانی، ملا عمر، ملا علی محمد، ملا پائندہ، ملا دولت اکوزئی اور ملا دولت مہمند زئی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ تحریک کا دوسرا مرکز ہوڈھیر ضلع مردان تھا جہاں سے بایزید نے مختلف لوگوں کو دعوت نامے بھجوائے جن میں اخوند درویزا کے مرشد سید علی غواص بھی شامل ہیں۔ ان دونوں مشاہیر کے درمیان مناظرے بھی ہوئے۔ بایزید کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد عمر نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی۔ کتاب "تذکرۃ الابرار والاشرار" کا بیان ہے کہ یوسف زئی قبیلے نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ ان کے درمیان جنگ ہوئی۔ جس میں بایزید کی بیوی اور بچے قید کیے گئے۔ بیوی کو ایک میراثی کے سپرد کر دیا گیا اور بایزید کی نعش کا تابوت توڑ کر کچھ ہڈیاں جلا دی گئیں اور کچھ کو دریا کے سپرد کر دیا گیا۔ بایزید کا چوتھا لڑکا جلال الدین جلالہ تھا، جو ۹۰۰ھ/۱۵۵۸ء میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اکبر سے رعایتیں حاصل کیں اور بعد ازاں اسی کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد تحریک روشنائیہ کا علم بایزید کے پوتے یعنی شیخ عمر کے بیٹے شیخ احداد نے سنبھالا۔ اس نے ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء تک آفریدی، اورک زئی اور سوری قبائل کے ساتھ مل کر اکبر کے ساتھ جنگ کی۔ احداد کی وفات کے بعد اس کے لڑکے عبدالقادر نے سلطنت کا دعوے کیا، وہ بھی مارا گیا۔ اس کی لڑکی کی شادی شاہجہان نے اپنے وزیر سعداللہ خاں سے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک روشنائیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

بایزید انصاری کی شخصیت ہمیشہ متنازع فیہ رہی ہے۔ ان کے حامی انہیں پیر روشان اور ان کے مخالفین انہیں پیر تاریک کا خطاب دیتے ہیں۔ ان کے مریدوں کے نزدیک یہ ولی کامل اور مخالفوں کے نزدیک کافر مطلق تھے۔ اس دور کی ایک کتاب "حالنامہ" سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں بایزید کے مخالفین ان پر یہ اعتراضات کرتے تھے:۔

۱۔ بایزید نے علم حاصل نہیں کیا۔ پیر نہیں رکھتا اور غیر شرعی کلمات کہتا ہے۔

۲۔ وہ خود کو ہادی اور رہنما کہتا ہے۔

۳۔ وہ الہام ہونے کا دعوے کرتا ہے۔

۴۔ اس کے نزدیک دیگر مخلوق منافق ہے۔

۵۔ وہ اپنے والدین اور عزیزوں کی عزت نہیں کرتا۔

ان باتوں کا جواب بھی بایزید نے تسلی بخش دیا تھا۔ اور مناظروں میں کبھی بھی شکست تسلیم نہ کی۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک بلند پایہ مقرر اور خطیب بھی تھے۔ نیز وہ ایک صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ ان کے طرز نگارش کی خوبیوں نے نہ صرف ان کے معتقدین کو بلکہ ان کے مخالفین کو بھی متاثر کیا تھا۔

بایزید اوّل (۷۵۸ھ/۱۳۵۴ء ۔ ۱۴ شعبان ۸۰۵ھ/۸ مارچ ۱۴۰۳ء) بایزید یلدرم والد مراد اوّل ترکی میں آل عثمان کا ایک جلیل القدر سلطان ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں قرہ مانیوں کے خلاف جنگ میں شجاعت اور بہادری دکھانے پر اسے یلدرم کا لقب ملا۔ اسی شہرت کی بنا پر اماسیہ کا والی مقرر کیا گیا۔ جمادی الآخر ۷۹۱ھ/جون ۱۳۸۹ء میں مراد اوّل قوصوہ کے میدان میں سخت زخمی ہونے پر اسے جانشین مقرر کیا گیا۔ اسی اثنا میں اناطولیہ کے باج گزار امراء نے بغاوت کر دی۔ چنانچہ اس نے فوراً دارالحکومت بروصہ کا رخ کیا۔ سرپا والوں نے صلح کر لی اور سردار لازار جو مراد اوّل کے ساتھ جنگ کرتا ہوا میدان کارزار میں مارا گیا تھا کی بیٹی اولیورا کو بایزید کے عقد میں دے دیا نیز ایک امدادی فوج بھی بھیجنے کا وعدہ کیا۔

۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء میں بایزید فلاڈلفیا کو فتح کرنے اور ترکی ریاستوں کا اناطولیا سے الحاق کرنے میں مصروف رہا۔ اسی عرصہ میں اس نے قونیہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایشیائے کوچک کی اکثر ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں۔ اب بایزید نے باقیماندہ علاقے پر بھی قبضہ کرنا چاہا۔ سب سے پہلے ایدین پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ پھر امنتشا اور صاروخان کا رخ کیا۔ اور انہیں بھی سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ ان فتوحات کے بعد اس نے درہ دانیال کو عبور کیا اور ادرنہ چلا گیا۔ سات ماہ کے محاصرے کے بعد والی قسطنطنیہ کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ولاچیا کا رخ کیا اور اسے بھی اپنا باج گزار بنا لیا۔ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں بایزید نے اپنے بڑے لڑکے کو بلغاریہ کی طرف روانہ کیا۔ بلغاریہ کا جنوبی حصہ سلطنت عثمان کے تحت مراد اوّل کے وقت سے چلا آتا تھا بایزید نے شمالی حصہ پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہا۔ شاہ سلیمان نے مقابلہ کیا لیکن تین ہفتے کے محاصرے کے بعد بایزید ترنوو پر قابض ہو گیا۔ اب پورے علاقے پر عثمانیوں کا تسلط ہو گیا تھا۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں بایزید نے سیواس سمسون اور اماسیہ کی طرف اپنی فوجیں روانہ کیں اور ان علاقوں کو بھی فتح کر لیا۔ اب صرف قسطمونی سلطنت باقی تھی جہاں دوسری مفتوحہ ریاستوں کے امراء جا کر پناہ لیا کرتے تھے بایزید نے اس پر بھی حملہ کیا

اور اناطولیہ کی اس آخری ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔
۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں اس نے ہنگری پر حملہ کیا اور راستے میں ٹیٹل بلبگرک منسور، کراشودا اور مہدیہ کے قلعوں پر بھی قبضہ جمایا۔ بایزید کی ان فتوحات نے ہنگری اور وینس کو ایک اتحادی معاہدہ طے کرنے اور یورپ میں ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا چنانچہ ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں جب بایزید قسطنطنیہ فتح کرنے کی مہم میں مشغول تھا۔ تو صلیبیوں نے نکوپولس کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں عبرتناک شکست دی اس کے بعد بایزید اناطولیا کی طرف لوٹا اور آق چای کے میدان میں قرہ مان اوغلو کو ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء میں شکست دے کر قتل کر دیا۔ اس علاقے کو قونیہ میں ضم کر دیا گیا۔

اس جنگ کے بعد بایزید کے بعض فوجی افسروں نے ایشیائے کوچک کے مشرق میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس طرح سلطنت عثمانیہ کی سرحد جارجیا تک پہنچ گئی تھی۔ دوسری طرف تیمور کی حکومت پہلے ہی ان علاقوں میں قائم ہو چکی تھی اب دونوں سلطنتوں کے ہم سرحد ہو جانے کی وجہ سے ان کے درمیان تصادم ہونا ناگزیر تھا تیمور کے بعد بایزید ہی کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت تھی۔ بایزید نے اپنی طاقت کے نشے میں تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا۔ اور سرحدی جھگڑوں کے علاوہ ایک دوسرے کے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ دینے سے دونوں ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ آخر کار نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کر لیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس شہر پر قبضے کے بعد بایزید اور تیمور کے درمیان خط و کتابت دوبارہ شروع ہوئی۔ جس کے نتیجے میں دونوں فریقین نے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا۔ چنانچہ ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ تیمور نے فوجی نقطۂ نظر سے میدان کے بہترین حصے پر پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیمور کی عصبیت ابھارنے کی چال نے بایزید کی فوج کا ایک حصہ اس سے توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جنگ شروع ہوئی تو تیمور کی فوجی قابلیت اور اس کی فوج کی کثرت کے سامنے بایزید کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں بالآخر بایزید نے راہ فرار اختیار کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اور گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے تین بیٹے میدان جنگ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بیٹا گرفتار ہو گیا اور ایک کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

بایزید کو قید کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ تیمور نے اسے عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ اور بہت سی نصیحتیں کیں۔ بایزید نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تیمور نے بایزید کے رہنے کے لیے ایک خیمہ اپنے نزدیک نصب کرایا۔ نیز اس کی بیوی بیٹی اور بیٹے کو بھی اس کے پاس بھجوا دیا۔ بایزید کو اس کی سابق عظمت و سطوت کی یاد نے ایک لمحہ بھی چین نہ لینے دیا۔ اور وہ اسی غم میں مبتلا ہو کر آٹھ ماہ بعد وفات پا گیا۔ تیمور نے اس کے بیٹے کو آزاد کر کے بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ کو روانہ کی۔ جہاں اسے سابق تاجداران عثمانی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

بایزید ایک نہایت ہی قوی اور بہادر تاجدار تھا۔ موت نے صرف بایزید کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی موت سلطنت عثمانیہ کی موت تھی کیونکہ اس کے بعد سلطنت عثمانیہ کا استحکام ہمیشہ خطرے میں رہا اور یہ سلطنت مائل بہ زوال رہی۔

بایزید بسطامی رحؒ (۱۲۸ھ/۷۴۶ء – ۲۶۱ھ/۸۷۴ء یا ۲۶۴ھ/۸۷۸ء) ابویزید طیفور ابن عیسیٰ بن سروشان، تیسری صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ۔ بسطام میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سروشان نے مجوسی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا بایزیدؒ کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تصوف کی تعلیمات ابو علی السندی سے حاصل کیں۔ ابو علی السندی عربی نہیں جانتے تھے۔ بایزید نے انہیں قرآن کی چند آیات سکھائیں۔ جس کے بدلے میں انہوں نے بایزید کو تصوف کے رموز سے آگاہ کیا۔ اور وہ تصوف کے انتہائی درجے تک پہنچے۔ احادیث نبویؐ کے متعلق ان کی روایات نہایت اعلیٰ تھیں۔ انہوں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ تاہم ان کے پانچ صد کے قریب اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ یہ اقوال ان لوگوں نے نقل کیے ہیں جو بایزید سے ملے تھے یا ان کے حلقۂ ارادت میں تھے۔

بایزیدؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں بارہ سال جنگلوں میں اپنے نفس کے حق میں لوہار بنا رہا۔ اور نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدہ کی آگ سے نرم کر کے ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا۔ اور پانچ سال تک اپنے نفس کو آئینہ بنانے میں صرف کیے اور طرح طرح کی عبادات و ریاضات سے اس آئینے کو خوب چمکاتا رہا۔ پھر ایک سال اسے اغیار کی نظر سے دیکھا۔ پھر بھی اسے غرور اطاعت کے زیر دست اور عمل کی خود پسندی میں مبتلا پایا۔ تو پانچ سال اور کوشش کی پھر جب دیکھا ... چنانچہ چار تکبیر نماز جنازہ پڑھی اور فارغ ہوا۔ ان کی قبر بسطام میں ہے ... مرجع خلائق ہے۔ ۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء میں ایلخانی سلطان الجائتو محمد خدا بندہ نے ان کی ... پر ایک قبہ تعمیر کرایا تھا۔

بایزیدؒ ایک باطنی صوفی تھے۔ وہ معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ وہ نوع انسانی کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے ان کی جگہ خود تکلیف اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بایزیدؒ کی ذات ... ہم میں ایسی ہے جیسے جبرائیلؑ کی فرشتوں میں۔ نیز تمام سالکان راہ توحید کی انتہا ... کی ابتدا ہے۔"

شیخ احمد حضرت خضرویہ کہتے ہیں کہ "میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں ... سنا کہ سب لوگ مجھ سے کچھ طلب کرتے ہیں لیکن بایزید مجھ سے مجھ ہی کو طلب ...

بایزید ثانی (۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء – ۱۰ ربیع الاول ۹۱۸ھ/۲۶ مئی ۱۵۱۲ء) ... سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا، محمد ثانی کا بیٹا اور جانشین تھا۔ باپ ... میں اماسیہ کا حاکم رہا۔ چھوٹا بھائی جم کرمانیہ کا حاکم تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ... میں تخت نشینی کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ینی چری امرا ... بایزید کو تخت پر بٹھا دیا۔ جم نے علم بغاوت بلند کیا بالآخر شکست کھا کر ... کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے مصری فوج کی مدد کے ساتھ دوبارہ واپس آیا ... بار بھی منہ کی کھانا پڑی۔ اس بار اس نے روڈس کا رخ اختیار کیا۔ ... نے ایک بھاری رقم (پینتالیس ہزار دوکات سالانہ) کے عوض جم کو اپنے ہاں نظر بند کر ... اور بایزید سے یہ رقم حاصل کرتے رہے۔ تیرہ سال کی اسیری کے بعد اس شہزادے کو مار ڈالا گیا۔

بایزید ثانی کا عہد حکومت فتوحات اور توسیع سلطنت کے لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتا۔ ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں باجگزار ریاست ہرزیگووینا کو بایزید نے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔
ہنگری سے کئی سال تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا بالآخر

دونوں حکومتوں کے درمیان صلح ہوگئی۔ ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء میں مولداویہ کی مہم کے دوران میں قلعہ کلیہ اور قلعہ آق کرمان پر بھی بایزید کا قبضہ ہوگیا۔ البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء میں چھڑی، اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ زیادہ اہم تھی۔ مملوکوں کے خلاف جنگ میں ناکامیوں نے بایزید کو اپنی فوج کے نئے سرے سے مسلح کرنے کے بعد وینس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں وینس کے بیڑے کو زبردست شکست دے کر لیپانٹو کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں موڈن۔ کورن اور نیونیزنو موریا میں ترکوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ نیز ۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء میں اہل وینس نے تمام ترکی مقبوضات سے دستبردار ہو کر صلح کر لی۔

اس اثنا میں صفویہ نامی مذہبی فرقے کے رہنما اسماعیل نے ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں فتوحات کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا اور سارے ایران پر قابض ہوگیا۔ چنانچہ بایزید کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ایشیائے کوچک کے بڑے بڑے علاقے ترکوں کی اطاعت سے نہ نکل جائیں۔ اس خطرے کے پیش نظر بایزید نے ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء میں بہت سے عناصر کو ایشیائے کوچک سے موریا کے فتح کیے ہوئے علاقوں میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ ۹۰۳ھ/۱۵۰۰ء میں بایزید کو اپنی مشرقی سرحد پر بڑی تعداد میں فوج متعین کرنا پڑی۔

اسی زمانے میں سلطنت عثمانیہ میں خانہ جنگی کا فتنہ [illegible] کھڑا ہوا۔ بایزید کے بیٹوں نے اپنے باپ کے سامنے ہی تخت نشین ہونے کا فیصلہ کیا۔ بایزید احمد کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا مگر سلیم فوج میں مقبول تھا۔ وہ اپنی فوج ورنیا لے آیا اور بایزید سے بلقان کے ایک صوبے کی حکومت کا مطالبہ کیا۔ بایزید نے اس کی خواہش کو بادل نخواستہ قبول کر لیا۔ بعد کے حالات نے سلطان بایزید کو سلیم کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس فیصلے کے بعد عزلت نشینی کے لیے بایزید نے دیموٹیکا کی طرف کوچ کیا لیکن راستے ہی میں وفات پا گیا۔

بایسنغر (... ذی الحجہ ۸۰۲ھ/۲۵ ستمبر ۱۳۹۹ء - ... جمادی الاول ۸۳۷ھ/۱۹ دسمبر ۱۴۳۳ء) غیاث الدین بن شاہ رخ بن تیمور، استرآباد کا حاکم۔ ہرات میں پیدا ہوا۔ باپ نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں دربار کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کیا۔ قرہ یوسف ترکمان کی وفات پر ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں تبریز پر قبضہ کر لیا۔ ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء میں استرآباد کا حاکم بنا۔ ساری عمر تخت پر نہ بیٹھا۔ اور پوری زندگی عیش و عشرت میں گذاری جس کی وجہ یہ تھی کہ نجومیوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ چالیس سال سے زائد زندہ نہیں رہ سکتا۔ چھتیس برس کی عمر میں وفات پائی۔ اور گوہر شاد کے مقبرے میں دفن ہوا۔

بایسنغر بہت بڑا ماہر فن تھا۔ اور ہر فنکار کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے کتب خانے میں چالیس خطاط ہر وقت مخطوطات کی نقل کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

اسی نام کا ایک اور بادشاہ ایران کے آق قویونلو خاندان سے تھا۔ وہ سلطان یعقوب کا بیٹا تھا۔ اس نے مختصر عرصہ حکومت کی اور اس کے چچازاد بھائی رستم نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

بپتسمہ اصطباغ، عیسائیت میں اس کے معنی بچے کو زرد رنگ میں رنگنے کے ہیں۔ یہ رسم یہودیوں کے ہاں چلی آ رہی تھی کہ جب کوئی شخص ان کے مذہب کو اختیار کرتا تو یہودی اسے غسل دیتے تھے۔ اس غسل سے ان کے نزدیک اس شخص کے سارے گناہ دھل جاتے تھے۔ اور گویا وہ زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کرتا تھا۔ بعد میں یہی رسم عیسائیوں نے بھی اختیار کر لی۔ اور اسے اپنی اصطلاح میں اصطباغ کہنے لگے۔ یہ اصطباغ نہ صرف ان لوگوں کو جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں دیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے ہاں ہر نومولود بچے کو زرد رنگ کے پانی میں غسل دے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک گویا اس طرح بچے پر عیسائیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس رسم کو صبغہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

"کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا۔" (۲: ۱۳۸) یعنی اللہ کا رنگ (طور طریقہ) اختیار کرو جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے

بتانی، ابو عبد اللہ (۲۴۴ھ/۸۵۸ء - ۳۱۷ھ/۹۲۹ء) ابو عبد اللہ محمد بن جابر ایک بہت بڑا مسلمان ہیئت دان، حران کے قریب پیدا ہوا۔ خاندان صابی مذہب سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ مسلمان تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی الرقہ میں گذاری۔ ۲۶۴ھ/۸۷۷ء سے اس نے اجرام فلکی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ اس مطالعے کی غرض سے اسے بغداد جانا پڑا جہاں سے واپسی پر وہ قصر الجص کے مقام پر انتقال کر گیا۔

اس کی تصانیف میں ۱۔ کتاب معرفۃ مطالع البروج فی ما بین ارباع الفلک۔ ۲۔ رسالہ فی تحقیق اقدار الاتصالات۔ ۳۔ شرح المقالات الاربع لبطلیموس۔ ۴۔ الزیج۔

سب سے اہم تصنیف الزیج ہے جو علم ہیئت پر ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔ اس رسالے میں مشاہدات کے نتائج درج ہیں۔ بارہویں صدی میں اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ ۱۲۸۲ء میں الفونسو دہم شاہ قشتالہ نے اس کا عربی سے ہسپانوی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اس نے اس کتاب میں بطلیموس کے نظریے کو بالکل رد کیا ہے۔ سورج کے ظاہرہ زاویہ وار قطر کے انحراف اور سالانہ گرہنوں کے امکان کو ثابت کیا ہے۔ نیز رویت ہلال کی شرائط کا ایک نیا اور بہت ہی نادر نظریہ پیش کیا ہے۔

بت تراشی بت بنانا۔ مٹی یا پتھر کے صنم تراشنا۔ اسلام میں اس قسم کے آرٹ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بت تراشی کسی بھی صورت میں اسلامی روح کے مطابق نہیں کیونکہ اس سے بت پرستی جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے۔

جہاں تک بت تراشی کے آرٹ کے آغاز کا تعلق ہے۔ یہ زمانہ قدیم ہی سے چلا آ رہا ہے۔ تہذیب کے آغاز سے بھی بہت قبل کے انسان نے تصویر کشی اور بت تراشی کا آغاز کر دیا تھا۔ مذہبی رسوم کو ادا کرنے کے لئے معبود کی ضرورت پیش آئی تو جاہل انسان نے تصویر اور بت کو اس کا متبادل اور مترادف ٹھہرایا۔ رفتہ رفتہ یہی تصاویر اور بت لوگوں نے معبود ٹھہرا لیے۔

فرانس کے میگڈالینی غاروں سے جانوروں کے بت ملے ہیں، جنھیں زمانہ قبل از تاریخ کا انسان پوجا کرتا تھا۔ یورپ کے علاوہ افریقہ اور ایشیا سے بھی ایسے شواہد ملے ہیں۔

قدیم مصر میں عام طور پر فرعونوں کے مجسمے تراشے جاتے تھے۔ جنھیں فرعون کی قائم مقام حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ انھیں سجدہ کرنا، فرعون ہی کو سجدہ کرنا ہوتا تھا اس دور میں مردوں کے ساتھ ان کے مجسموں کو بھی دفن کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بت تراشی کے فن نے خاصا عروج حاصل کیا۔

میسوپوٹیمیا (عراق) کے علاقے میں سمیری، بابلی، آشوری، کلدانی اور فارسی تہذیبوں میں بت تراشی کو ایک فن کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت ابراہیم کے وطن عُر میں بت تراشی کا فن چار ہزار سال قبل مسیح سے رائج تھا۔ یہاں آدمیوں اور جانوروں کے بت بنائے

جاتے تھے۔ جس کے لیے پتھر، مٹی، دھات اور لکڑی وغیرہ استعمال کی جاتی تھی۔ نینوا شہر میں ۵۰۰ قبل مسیح کا بت تراشی کا نمایاں دور تھا۔ تقریباً ہر گھر میں بت سجے رہتے تھے۔ جنگی واقعات کو مجسموں کی شکل دینا اسی دور سے شروع ہوا۔

قدیم یونان میں بت تراشی کا فن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مقدونیہ اور کریٹ کی ریاستوں میں انیسویں صدی قبل مسیح ہی میں خوب صورت مجسمہ سازی ہوتی تھی۔ مجسمہ سازی میں یونانی ماہرین اس قدر آگے بڑھ چکے تھے کہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یونان علوم کا باغ ہے اور مجسمہ سازی اس باغ کا خوبصورت ترین پھول ہے۔ انھوں نے سنگ مرمر اور ہاتھی دانت کے خوبصورت بت تراشے۔

یونان سے یہ فن ایران پہنچا اور یہاں فرہاد جیسے مشہور مجسمہ ساز پیدا ہوئے۔ یہیں سے یہ فن ہندوستان آیا۔ سکندر اعظم کے حملوں کے بعد شمالی ہندوستان میں گندھارا آرٹ نے جنم لیا۔ بدھ مت کے پیروکاروں نے اس فن کو ترقی دی۔ کرشن، رام وغیرہ کے مجسموں کے ساتھ ساتھ مہاتما بدھ کے مجسمے بھی تراشے گئے۔ ہندوستان سے یہ فن بدھ مت کے پیروکاروں کے ہمراہ چین اور جاپان میں گیا۔ اگرچہ قدیم چینی ادوار شانگ اور چاؤ میں ہمیں بت تراشی کے عمدہ نمونے نہیں ملتے لیکن ہن دور جو دوسری صدی قبل مسیح سے شروع ہوا چینی مجسمہ سازی کے عروج کا دور تھا۔ اسی دور میں جاپانی مجسمہ سازی کا آغاز ہوا جو آج تک پورے جوش و خروش سے جاری ہے۔

یورپ میں یونانیوں کے بعد رومیوں کا دور آیا اور چھ صد دراز تک اسلامی فتوحات کی وجہ سے بت تراشی کا فن عنقا رہا۔ یورپ کے تاریک دور میں کہیں کہیں رومی آرٹ کی بازگشت سنائی دے جاتی تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں فرانس میں اس فن کا احیا ہوا اور پھر اس نے باقاعدہ سنگ تراشی کے فن کی حیثیت اختیار کر لی۔

قدیم عربوں کے ہاں بت تراشی بطور فن کبھی رائج نہیں رہی۔ وہ بت پرست تو تھے لیکن بت تراش نہیں تھے۔ ان کے ہاں بت دوسرے ملکوں سے آتے تھے۔ خانہ کعبہ میں رکھے گئے تین سو ساٹھ بت زیادہ تر بابل آشور اور مصر کے علاقوں سے لائے گئے تھے۔

بجایہ الجزائر کا ایک مشہور شہر اور بندرگاہ۔ جبل جرایہ کی نچلی ڈھلانوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ البکری نے اس شہر کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک بہت پرانا شہر اور خوشگوار رہائشی مقام ہے۔ جہاں اہل اندلس آباد ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں بنو حماد نے بجایہ پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ چنانچہ الناصر حمادی نے اپنے نام پر اس کا نام الناصریہ رکھا۔ اس کی توسیع کی اور ایک محل بنوایا۔ ۴۹۳ھ/۱۰۹۹ء میں المنصور نے اس شہر کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ اس نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی۔ باغات لگوائے امیمون اور قصر الکوکب کے نام سے دو محل تعمیر کرائے۔ پانی کا بہتر طریق پر انتظام کیا گیا۔ بجایہ کی بندرگاہ کی وجہ سے اس شہر کے سمندر پار کے ممالک سے تجارتی اور ثقافتی روابط قائم تھے۔ اسی وجہ سے اس شہر نے ایک ایسے مرکز کی حیثیت حاصل کر لی جو علم و ہنر اور تہذیب و تمدن میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اور اس کی تہذیب کی شعاعیں یورپ کی عیسائی دنیا بالخصوص صقلیہ اور ہسپانیہ میں پھیلیں۔

۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں اس شہر پر عبدالرحمان کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس طرح اب یہ مراکش کا صدر مقام بن گیا۔ لیکن نئے فرمانرواؤں کو کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں بنو غانیہ نے بجایہ پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اور انھوں نے دولت مرابطون کو بحال کرنے کے لیے اپنی فوج کو وہاں اتارا۔ ان کی نظر میں یہ شہر ایک جنگی مستقر تھا۔ بعد میں الموحدون نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ ان کے بعد بجایہ تونس کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے تلمسان کے سلطان عبدالواد نے بھی اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہا۔ اور اس مقصد کے لیے اس پر کئی حملے بھی کیے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حملوں کے باوجود اس شہر کی حیثیت ایک دولت مند تجارتی شہر ہی کی رہی۔

۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء میں پیڈرو دی نوارو نے بجایہ پر حملہ کیا۔ اب یہ ایک ہسپانوی شہر بن گیا۔ اہل ہسپانیہ اس پر ۴۵ سال تک قابض رہے۔ لیکن اس سارے عرصے میں انھیں چین سے رہنا نصیب نہ ہوا۔ اور بالآخر انھیں یہ سارا علاقہ واپس کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ سارا علاقہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بعد میں بجایہ الجزائری ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۸۳۳ء میں جب فرانسیسی فوج اس شہر میں داخل ہوئی تو شہر ایک معمولی سی بستی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی آبادی دو ہزار تھی۔ موجودہ شہر بجایہ میں ماضی کے بہت کم نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ جن سے اس شہر کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ قلعہ برل نے قصر الکوکب کی جگہ لے لی ہے۔ اور قصر اللؤلؤ کی جگہ اب برجیہ کے فوجی حجرے بن گئے ہیں۔ ماضی میں یہ شہر اس سے کہیں زیادہ روشن تھا، جتنا اب ہے۔

بجکم (وفات ۲۱ رجب ۳۲۹ھ/۲۱ اپریل ۹۴۱ء) ایک ترک امیر جو اصلاً غلام تھا۔ یہ ماکان کا خادم تھا۔ بعد میں طبرستان اور جیلان کے حاکم مرداویج کا ملازم ہو گیا اور مرداویج کے قتل کے بعد ترک غلاموں کا سردار رہا۔ ۳۲۴ھ/۹۳۶ء میں جب خلیفہ الراضی نے ابن الرائق کو امیر الامرا بنایا تو بجکم اس کا دست راست بن گیا۔ ۳۲۵ھ/۹۳۶ء میں جب خلیفہ اور بجکم بغداد واپس آئے تو اسے مشرقی صوبوں کا والی مقرر کیا گیا۔ بجکم نے البریدی کی فوجوں کو دو مرتبہ شکست دی اور سارے خوزستان پر قابض ہو گیا۔ البریدی نے بھاگ کر بصرے میں پناہ لی۔ اس فتح کے بعد ابن الرائق نے بجکم کو واپس بلا لیا۔ البریدی نے فارس میں خوزستان کو دوبارہ واپس لینے کی کوشش کی۔ وہ ابن الرائق نے البریدی سے معاہدہ کر لیا کہ اگر دارالخلافہ اس کے ہاتھ آ گیا تو واسط کی ولایت البریدی کو مل جائے گی۔ دوسری طرف ابن الرائق کے سابق وزیر ابن مقلہ نے اس سے بدلہ لینے کی خاطر بجکم سے خط و کتابت شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی خلیفہ الراضی سے سفارش کر کے بجکم کو ابن الرائق کا جانشین بنوا دیا۔ بعد میں بجکم نے ابن مقلہ کو ابن الرائق کے حوالے کر دیا۔ ۳۲۶ھ/۹۳۸ء میں فوجوں کی تنخواہ وصول کرنے کے بہانے بجکم نے بغداد کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ جب بجکم بغداد میں داخل ہوا تو ابن الرائق نے اپنی جان بچانے کے لیے اسے امیر الامرا بنا دیا۔ ۳۲۷ھ/۹۳۸ء میں بجکم کو موصل کے گورنر حسن بن عبداللہ سے مال واجبات وصول کرنے کے لیے جانا پڑا۔ دوسری طرف ابن الرائق ایک فوج لے کر بغداد میں داخل ہو گیا جو اس شرط پر واپس ہوا کہ الفرات اور عواصم وغیرہ کی حکومت اسے عطا کی جائے۔ بعد وقت بجکم نے ... اس طرح ۹۳۹ء میں خلیفہ اور بجکم دوبارہ دارالخلافت بغداد میں آ گئے۔ ... کی حکومت مل گئی اور البریدی نے اپنی ایک لڑکی جس بجکم سے بیاہ دی۔ لیکن بجکم اور ... میں تھوڑے ہی عرصے بعد اختلافات پیدا ہو گئے۔ ۳۲۸ھ/۹۴۰ء میں بجکم نے ... کو وزارت کے عہدے سے ہٹا دیا۔ ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں جب الراضی فوت ہوا تو ... میں تھا۔ خلیفہ المتقی نے اسے امیر الامرا کے عہدے پر قائم رکھا۔ ... میں بجکم کو ... سے اپنے نائبین کی مدد کے لیے جانا پڑا۔ راستے میں معلوم ہوا کہ البریدی کو شکست ہو گئی ہے چنانچہ بجکم نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ واپسی پر ...

بجکم عربی زبان جانتا تھا۔ وہ علما کا ادب کرتا تھا۔ اسے اقتدار اور دولت ... کی آرزو تھی۔ چنانچہ ان کے حصول کے لیے وہ ہر طرح کے فریب رشوت ... سے کام لیتا تھا ...

کر دیے [illegible]

[illegible] نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا۔ جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں۔ ورنہ چلتا ہی رہوں گا۔ [illegible]

محمد ثانی نے فتح قسطنطنیہ کے بعد اپنے لئے سلطان البرین والبحرین کا لقب اختیار کیا تھا۔ آل عثمان کے بعض سلاطین نے بھی یہ لقب اختیار کیا ہے۔

بحیرا ایک عیسائی راہب اور عالم تورات و انجیل [illegible] سے آنحضورؐ کی [illegible] سال ہوئی۔ بچپن میں آنحضورؐ اپنے چچا ابو طالب کی معیت [illegible] ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ملک شام کے سفر پر گئے۔ اس قافلے نے بصریٰ میں پڑاؤ کیا تھوڑے ہی فاصلے پر ایک [illegible] جس میں بحیرا نامی ایک راہب رہتا تھا۔ روایت ہے کہ [illegible] نے ایک بادل دیکھا جو آنحضورؐ پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ [illegible] وقت کے نیچے آپ نے قیام کیا اس کی [illegible] سرسبز و شاداب ٹہنیاں [illegible] آپ پر جھکی ہوئی تھیں۔ بحیرا نے یہ دیکھ کر [illegible] الہامی کتابوں میں [illegible] اس راہب نے تمام اہل قافلہ کی دعوت کا انتظام کیا۔ قافلے والے آنحضورؐ کو کم عمری کی وجہ سے سامان [illegible] راہب کے ہاں گئے۔ راہب نے پوچھا کہ تو لوگوں میں سے [illegible] قافلے والوں نے جواب دیا [illegible] سامان کے پاس [illegible] راہب نے [illegible] اس دوران میں [illegible] سب لوگ کھانا کھا کر چل دیے تو بحیرا راہب [illegible] سوالات [illegible] نے آپ [illegible] قافلے والے یہ تمام باتیں [illegible] اور راہب نے کہا کہ [illegible] راہب نے [illegible] دیا کہ یہ [illegible] نہیں ہو سکتا۔ اس [illegible] ابو طالب نے ساری تفصیل بتائی۔ راہب نے [illegible] واپس چلے جاؤ اور یہودیوں سے محتاط رہنا۔ [illegible] اس کے حالات تاریخی کتابوں [illegible] آنحضورؐ کو کسی سفر پر لے کر نہیں گئے۔

[illegible] تاریخ اور حدیث کی [illegible] کتابوں میں کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ درج [illegible] کی کثرت کے پیش نظر بحیرا راہب سے آنحضورؐ کی ملاقات [illegible] درست ہے لیکن بعض تفصیلات میں اختلاف ہے۔ جن کی محدثین اور علما نے [illegible] کی ہیں۔ بحیرا راہب کے بارے میں اس سے زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔

بحیرہ چرے ہوئے کانوں والی اونٹنی یا بھیڑ اور بکری۔ جاہلیت کے اوہام میں سے [illegible] ایک رسم۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے۔

بحیرۃ اور سائبۃ اور وصیلۃ اور حام میں سے کوئی ایک چیز بھی خدا نے نہیں ٹھہرائی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ اللہ پر جھوٹ کہہ کر افترا کرتے [illegible] اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ سے محروم ہیں (۵: ۱۰۳)

[illegible] اوہام جاہلیہ)

بخارا روس میں جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ ازبکستان کا ایک شہر اور اسی نام کا صوبہ۔ اسلام سے قبل بخارا شہر کا ذکر شاذ ہی ملتا ہے۔

اسلامی ماخذ میں بخارا کے مقامی حکمران خاندان کو بخار خدات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جس سے وہاں کی صغدی زبان میں شاہ بخارا مراد ہے۔ اس شہر

بخارا کی ایک مسجد کے زیر سایہ [illegible]

پر مسلمانوں نے سب سے پہلے ۵۴ھ/۶۷۴ء میں عبیداللہ بن زیاد کی سپہ سالاری میں حملہ کیا۔ ۹۱ھ/۷۱۰ء میں قتیبہ بن مسلم اپنے دشمنوں کو شکست دے کر شاہ بخارا کے لقب سے تخت نشین ہوا اور بخارا میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں امرائے خراسان نے اپنا صدر مقام نیشاپور منتقل کر لیا۔ تو بخارا کا نظم و نسق ماوراء النہر کے باقی حصوں سے الگ ایک والی کی تحویل میں رہا جو طاہریوں کو براہ راست جواب دہ ہوتا تھا۔ اہل طاہر کے زوال کے بعد بخارا سامانیوں کی ماتحتی میں آگیا اور نصر بن احمد سامانی (جو سمرقند پر حکومت کر رہا تھا) کا چھوٹا بھائی اسماعیل بخارا کا والی بن گیا۔ اور پھر اسکے بھائی نصر کی وفات پر ماوراء النہر کا سارا علاقہ بھی اسی کے قبضے میں آگیا۔ اور خلیفہ نے بھی اسی کو امیر خراسان بنا دیا۔ یوں بخارا ایک بہت بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہو گیا اگرچہ بخارا کے رقبے میں کئی مرتبہ توسیع کی گئی لیکن وہ جب بھی نئے سرے سے تعمیر کیا گیا پرانے ہی محل و وقوع پر تعمیر ہوا۔ بخارا کے جغرافیہ نویسوں نے تین بڑے حصے کئے ہیں۔ ۱۔ قلعہ۔ ۲۔ خاص شہر۔ ۳۔ مضافات شہر۔

قلعہ پرانے زمانے سے اسی جگہ واقع ہے جہاں اب ہے۔ بخارا خدات کا محل یہیں واقع تھا۔ اسی قلعے میں قدیم ترین جامع مسجد بھی جو قلعہ کے دروازہ پر واقع تھی۔ یہ قلعہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری/بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں کئی مرتبہ تباہ ہو کر نئے سرے سے تعمیر ہوا۔

عربوں کی فتح کے وقت پورا شہر صرف شہرستان پر مشتمل تھا۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں ارسلان خان نے شہرستان میں ایک نئی جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔ قلعے کے محل کے علاوہ ریگستان میں بھی ایک محل موجود تھا جو عربوں کے زمانے سے پہلے کا تھا۔ ابونصر نے بھی ایک محل اس جگہ بنوایا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر بہت گنجان آباد تھا۔ سامانیوں کے زوال کے بعد بخارا کی قدیم سیاسی اہمیت بھی بہت کم ہوگئی۔ لیکن اس انحطاط کے زمانہ میں بھی بخارا اسلامی علم و دانش کا مرکز رہا۔ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں علماء کے ایک خاندان نے آل برہان کے نام سے ایک دینی حکومت قائم کی۔ قطوان کی جنگ ۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء کے بعد بخارا میں قراختائی فرمانروا سربراہ خاندان کے ذریعے حکومت کرتے رہے۔

۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں ایک عوامی بغاوت کی وجہ سے انہیں اس شہر سے نکلنا پڑا۔ اور یہ شہر محمد بن تکش خوارزم شاہ کے زیر حکومت آگیا۔ ۶۱۹ھ/۱۲۲۰ء میں چنگیز خان نے بخارا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے حملے سے شہر تباہ و برباد ہوگیا۔ لیکن جلد ہی بخارا نے پھر سے اپنی پرانی شان و شوکت حاصل کر لی۔

۶۷۱ھ/۱۲۷۳ء میں ایران کے مغول ایلخان آباقا نے بخارا پر قبضہ کیا تو یہ شہر پھر تباہ و برباد ہوگیا۔ بعد میں دوبارہ تعمیر ہوا۔ ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء میں بخارا ایک بار پھر ایران کے مغولوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔

۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء کے اختتام پر بخارا پر ازبکوں کا قبضہ ہوگیا اور روس کے انقلاب تک اس پر انہیں کا قبضہ رہا۔ ان کی بدولت بخارا دوبارہ سیاسی و فکری زندگی کا مرکز بن گیا ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء تا ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء کا زمانہ اس شہر کے لیے ایک عظیم الشان زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں بخارا پر نادر شاہ کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۸۵ء میں روسی ماوراء النہر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے اور امیر بخارا نے بھی کئی بار شکست کھانے کے بعد روسیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ یہاں کا آخری مسلمان فرمانروا امیر عالم تھا جو ۱۹۱۰ء میں اپنے والد عبدالاحد کا جانشین بنا تھا۔ جب انقلاب روس برپا ہوا تو اس نے افغانستان میں پناہ لی۔ انقلاب کے بعد بخارا ازبکستان کا ایک صوبہ بن چکا ہے جس کا صدر مقام تاشقند ہے۔

بخارا میں مساجد اور مسلمانوں کے مدرسوں کو قانوناً بند کر دیا گیا ہے۔ یہاں کی آبادی میں عرب۔ افغان اور یہودی ملے جلے ہیں۔

بخارسٹ جمہوریہ اشتراکیہ رومانیہ کا دارالحکومت، یہ دریائے ڈینیوب سے پچاس کیلومیٹر شمال میں ایک ندی پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۹۷۰ مربع میل اور آبادی ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کی رو سے سولہ لاکھ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ شہر ولاشیا کا پایہ تخت بن گیا۔ ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء میں راڈو نے جو سلطان محمد ثانی کی وساطت سے تخت پر بیٹھا تھا۔ اپنے آپ کو اس شہر میں ترکی کی قلعہ نشین فوج کی حفاظت میں خوب مستحکم کر لیا تھا۔ دو سو سال تک یہ شہر رومانوی حکمرانوں کے باب عالی کے ساتھ وابستہ رہا۔ سولھویں صدی کے خاتمے پر بخارسٹ پر سنان پاشا کا تسلط ہوگیا۔ ترکوں کے خلاف بغاوتوں، مختلف وباؤں اور آتش زدگیوں کی وجہ سے اس شہر کی تاریخ بڑی پر آشوب ہے۔ ۱۸۷۷ء میں جب معاہدہ برلن پر دستخط ہوئے تو اس شہر پر سے ترکی کی سیادت بالکل ختم ہوگئی۔

اس شہر کے ابتدائی حالات کے بارے میں معلومات بالکل مفقود ہیں۔ مختلف ماخذوں سے یونانی، ارمن اور مقامی تاجروں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۵۰۰ء/۱۶۴۰ء کے قریب اس شہر میں بارہ ہزار کے قریب مکانات تھے۔ لیکن پندرہ سال بعد ان کی تعداد چھ ہزار رہ گئی۔ اولیا چلبی نے اس کے بارہ ہزار مکانوں اور ایک ہزار دکانوں کا ذکر کیا ہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں بخارسٹ کی کل آبادی پچاس ہزار تھی اور انیسویں صدی کے اوائل میں اس کی آبادی پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان کم و بیش ہوتی رہی۔

تین سو سال تک یہ شہر ترکی سلطنت میں شامل رہا اور اسی وجہ سے بخارسٹ نے ایک ایشیائی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ شہر یونانی زبان کی تعلیم کے لیے ایک اہم مرکز بن گیا۔ جب اس پر آسٹریلیا اور روس کا قبضہ ہوا تو یہاں مغربی اثرات پھیلنے لگے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ شہر رومانیہ کے سیاسی اتحاد کے لیے جدوجہد کا مرکز بن گیا۔ اور اسی جدوجہد کی بدولت مولداویا اور ولاشیا کا وفاق [illegible] میں آیا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ شہر رومانیہ کی نئی سلطنت کا دارالحکومت بنا۔ ۱۸۶۶ء میں [illegible]

جدید بخارسٹ کا ایک منظر

شہزادہ چارلس کے تخت پر بیٹھنے کے بعد اس شہر نے بڑی تیزی سے ترقی [illegible] ہوا اور اسے قلیل عرصے میں یورپ کے صدر مقامات میں ممتاز حیثیت حاصل [illegible] اس شہر کی فصیل جو گیارہ سال میں تعمیر ہوئی یورپ کی مضبوط ترین فصیلوں [illegible] تھی۔ یہ فصیل ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۶ء کے عرصہ میں تیار ہوئی لیکن ۱۹۱۶ء میں [illegible] کی تاب نہ لا سکی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بخارسٹ پر جرمن قابض ہوگئے۔ یہ شہر تعلیم، تجارت اور صنعت کا اہم مرکز ہے۔ ایک یونیورسٹی اور ایک قومی کتب خانہ ہے جو مشرقی علوم کی کتابوں کے لیے بہت مشہور ہے۔ پٹرول، عمارتی لکڑی اور زرعی پیداوار یا اناج مثلاً گندم اور مکئی کی ایک بڑی منڈی ہے۔ شراب کشید

کرنے، پٹرول صاف کرنے، چمڑا رنگنے، تیل نکالنے اور مختلف مشینیں تیار کرنے کے بیسیوں کارخانے ہیں۔ شہر سے چار میل دور ایک ہوائی اڈا ہے۔ یہاں ہر سال سات روز کے لیے ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔

جدید بخارسٹ میں بلند و بالا عمارتوں نے قدیم طرز تعمیر کی جگہ لے لی ہے۔ قدیم شاہی محل اگرچہ اب بھی موجود ہے، مگر اب وہاں رومانیہ کا عجائب گھر قائم کر دیا گیا ہے۔

بخاریؒ، امام محمد

(۱۳ شوال ۱۹۴ھ/ ۲۰ جولائی ۸۱۰ء – یکم شوال ۲۵۶ھ/ ۳۱ اگست ۸۷۰ء) ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم ایک بہت بڑے عالم اور امام حدیث بخارا میں پیدا ہوئے۔ والد حدیث کے ثقہ راویوں میں سے تھے۔ امام بخاری ابھی بچے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کی زیر نگرانی پرورش پائی جو بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ بچپن میں آنکھوں کی بینائی ضائع ہو گئی تھی۔ لیکن والدہ کی گریہ زاری اور دعاؤں کے سبب اللہ تعالیٰ نے بینائی کو دوبارہ بحال کر دیا۔ بچپن ہی میں انھیں علم سے بہت زیادہ رغبت تھی۔ قدرت کی طرف سے حافظہ بھی کمال کا عطا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم بخارا کے جلیل القدر اساتذہ محمد بن سلام بیکندی، محمد بن یوسف بیکندی، عبداللہ بن محمد مسندی اور ابراہیم بن الاشعث سے حاصل کی۔ امام بخاری نے بلا کا حافظہ پایا تھا گیارہ برس کی عمر تھی کہ علامہ داخلی جیسے متبحر عالم اور محدث کو ایک سند پر ٹوک دیا اور تصحیح کر دی۔ سولہ سال کی عمر میں عبداللہ بن المبارک اور وکیع ابن الجراح کی کتابوں کو حفظ کیا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں سولہ روز بغداد میں رہے اور اس مختصر عرصے میں پندرہ ہزار سے زائد احادیث حفظ کر لیں۔

امام بخاری نے علم کے سلسلے میں شام، مصر اور جزیرہ کا دو مرتبہ اور بصرے کا چار مرتبہ سفر کیا۔ چھ سال مکہ میں سکونت اختیار کی۔ کوفے اور بغداد میں تو کثرت سے آنا جانا رہا۔ انھوں نے ایک ہزار سے زائد شیوخ سے حدیث لکھی۔ انھیں چھ لاکھ احادیث یاد تھیں۔

امام بخاریؒ نے روسی ترکستان کے ایک شہر خرتنک میں باسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ انکے علم و فضل کا اعتراف صرف متاخرین ہی کو نہیں بلکہ ان کے دور کے اساتذہ اور شیوخ نے بھی انھیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کی ذہانت اور حافظے کا اعتراف علوم و فنون حدیث کے ماہرین نے بھی کیا ہے۔

امام بخاریؒ مجتہد کے بلند مقام پر فائز تھے اور بقول ابن حجر عسقلانی وہ فقہ حدیث میں دنیا کے امام ہیں۔ انہیں علل حدیث میں بڑی مہارت تھی۔ دوسرے سے احادیث لینے میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ انہیں معلوم ہوا کہ ایک دور دراز مقام پر ایک شخص آنحضورؐ کی احادیث بیان کرتا ہے۔ چنانچہ کئی کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ شخص خالی توبڑا ہاتھ میں لیے ہوئے اپنے بھاگے ہوئے جانور کو بلا رہا ہے۔ امام بخاریؒ اس سے ملے بغیر دل میں یہ سوچ کر واپس چلے آئے کہ جو شخص ایک جانور کو دھوکہ دے سکتا ہے وہ مجھے بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔

امام بخاریؒ کی تصانیف میں صحیح بخاری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تصانیف التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر، کتاب الضعفاء الصغیر، الادب المفرد، جزء رفع الیدین، جزء قراءۃ، التاریخ الاوسط، کتاب الاشربہ، اسامی الصحابہ، برالوالدین، التفسیر الکبیر، الجامع الکبیر، خلق افعال العباد، کتاب العلل، فقایۃ الصحابہ والتابعین، کتاب المسند الکبیر، کتاب الوحدان، کتاب المبسوط، کتاب الہبہ، سنن الفقہاء شیخہ، کتاب الفوائد ہیں۔ (نیز دیکھیے "بخاری شریف")

بخاری شریف

احادیث کا ایک مجموعہ جو امام محمد بن اسماعیل البخاری کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا نام "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" ہے۔ اسے جامع یا الجامع اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ہر قسم کے مسائل کی احادیث مثلاً عقائد، احکام، آداب، تفسیر، تاریخ، سیر، شمائل، فتن، علامات قیامت، مناقب و مثالب درج ہیں۔

امام بخاری نے جب اپنے سے پہلے محدثین کے احادیث کے مجموعوں کو پڑھا تو انھوں نے محسوس کیا کہ عام آدمی کے لیے ان سے استفادہ کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ ان کتابوں میں ہر قسم کی ضعیف، شاذ، منکر بلکہ بسا اوقات موضوع روایات بھی درج ہو گئی تھیں چنانچہ امام بخاری اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک مجموعہ ایسا ہونا چاہیے جو صرف صحیح احادیث پر مشتمل ہو۔ ان کے اس عزم کو ان کے استاد اسحاق بن راہویہ نے اور بھی مضبوط کر دیا۔ انہی دنوں امام بخاری نے ایک خواب بھی دیکھا کہ وہ آنحضورؐ کو پنکھا جھل رہے ہیں۔ علما نے اس کی تعبیر یہ کی کہ امام بخاری آنحضورؐ کی طرف غلط طور پر منسوب روایات کو دور فرمائیں گے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایک روز امام بخاری اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھے۔ وہاں ذکر ہوا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو یہ توفیق دے کہ وہ سنن میں ایک ایسا مختصر تیار کرے جس میں فقط اعلیٰ درجے کی صحیح احادیث درج ہوں تاکہ عمل کرنے والا بلا خوف و تردد اور مجتہدین کی طرف مراجعت کیے بغیر اس پر عمل پیرا ہو سکے۔ امام بخاری کے دل میں استاد کی یہ بات جاگزیں ہوئی اور سولہ سال کی محنت شاقہ کے بعد چھ لاکھ احادیث کے اس ذخیرے میں سے جو ان کے پاس موجود تھا، یہ کتاب تالیف کی اور اس میں صحیح ترین احادیث پر اکتفا کیا۔"

امام بخاریؒ خود فرماتے ہیں "میں نے اس کتاب کو کعبے میں بیٹھ کر مرتب کیا۔ ہر حدیث کے لکھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتا اور استخارہ کرتا۔ جب یقین ہو جاتا تو میں اسے "الجامع الصحیح" میں درج کر لیتا۔ پھر جب حدیثوں کو ان کے مضمون کے مطابق ترتیب دینے کا ارادہ کیا تو مدینہ منورہ میں قبر مبارک اور منبر رسولؐ کے درمیانی مقام میں اس اہم کام کو سرانجام دیا۔"

امام بخاریؒ نے "جامع" کے مکمل ہونے پر اسے اپنے شیخ علی بن مدینی، احمد بن حنبل، ابن معین وغیرہم کی خدمت میں پیش کیا تو سب نے اس کی تحسین کی۔ اور اس کی صحت کی شہادت دی۔ البتہ صرف چار احادیث پر اختلاف کیا۔ وہ بھی تحقیق کے بعد امام بخاریؒ کی شرائط پر صحیح ہیں۔ متاخرین نے اس کتاب کی جملہ روایات پر صحت کا حکم لگایا ہے۔

امام بخاری کی حسن نیت اور انتھک کوشش کا نتیجہ تھا کہ یہ جامع اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی زندگی ہی میں اسے نوے ہزار آدمیوں نے امام بخاریؒ سے بلاواسطہ سنا۔

محدثین اور علمائے امت نے اس کتاب کو قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامیہ میں صحیح ترین کا لقب دیا ہے۔ صحاح ستہ میں بخاری شریف کا پہلا نمبر

ہے اس کے بارے میں دارقطنی کا قول ہے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ الباری الجامع الصحیح البخاری"۔

وقت شدت خوف دشمن، سختی مرض، قحط سالی اور دیگر بلاؤں میں اس کتاب کا پڑھنا تریاق کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ امت اسلامیہ میں ختم قرآن کی طرح ختم بخاری شریف کا بھی رواج ہے۔

بخاری شریف کی ایک خاص خصوصیت اس کے عنوانات کے ابواب کی ایک صحیح انداز سے ترتیب ہے، جس سے امام بخاری کی وسعت علمی اور مہارت فقہ کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ہر باب کا آغاز قرآنی آیات سے کرتے ہیں اور ان سے فقہی احکام کو مستنبط کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ صحیح بخاری کی مرویات کی کل تعداد بمع مکررات، تعلیقات اور متابعات کو شامل کر کے ۹۰۸۲ ہے صحیح بخاری میں موصول احادیث بلا تکرار ۲۶۰۲ ہیں عجیب بات ہے کہ ابواب کی تعداد اس سے زیادہ یعنی ۳۴۵۰ ہے۔

اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اسکی ان شروح تعلیقات اور حواشی سے ہوسکتا ہے۔ جو ہر دور کے علماء اس کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے لکھتے رہے ہیں اور تیسری صدی ہجری سے لے کر آج تک اس کتاب پر علماء کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ بخاری شریف کی شروح و حواشی کی تعداد دو سو سے زائد ہے علمائے حدیث نے حافظ ابن حجر العسقلانی کی شرح "فتح الباری" کو بہترین شرح قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری کے مختلف زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں بخاری شریف کے ترجمے اور شروح میں مولوی وحید الزمان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کتاب کے افادی پہلو کے پیش نظر علماء نے اس کے کئی مفتاح مرتب کئے ہیں۔ اس کتاب کے موجودہ دور میں کئی مختصر نسخے بھی شائع کئے گئے ہیں۔

بخت خان (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء - ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) محمد بخش ابن عبداللہ ہندوستان کی جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں آزاد فوجوں کا سپہ سالار اعظم، تخت بلند کا خطاب بہادر شاہ ظفر نے عنایت کیا۔ سلطان پور (اودھ) میں پیدا ہوا۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں "آٹھویں پیدل توپ خانہ" فوج میں بطور صوبیدار شامل ہوا۔ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۲ء جنگ افغانستان کے دوران میں نہایت شاندار کارنامے سرانجام دیئے اور ان شاندار خدمات کے صلے میں بہت سے تمغوں اور امتیازات سے نوازا گیا۔ بخت خان نے ۳۱ رمئی، ۱۸۵۷ء میں بریلی کو برطانوی تسلط سے آزاد کرا کے خان بہادر خان کو "نواب ناظم" بنایا تو اسے بریگیڈیر کا عہدہ ملا۔ نیز ۲ر جولائی، ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے اسے شاہی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنا کر فرزند کے خطاب سے نوازا۔ ۹ر جولائی، ۱۸۵۷ء میں دس ہزار فوج کے ساتھ انگریزوں کو شکست فاش دی۔ اسی کے ایماء پر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ شائع کیا گیا۔ بعض خود غرض افراد اور شہزادوں کی وجہ سے جو بخت خان کے مخالف تھے اور انگریزوں سے خفیہ طور پر گٹھ جوڑ کرنے پر شاہی فوجوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور آخر کار ۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء میں بخت خان دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلا گیا۔ اس کے بعد بخت خان کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ملتیں۔ ایک روایت اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ وہ اودھ کے قصبہ نواب گنج میں ۱۸۵۹ء میں مارا گیا۔

بخت خان تقریباً چالیس سال تک فوجی ملازم رہا۔ یورپی مورخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ ایک بلند قامت، نہایت ذہین اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔

بخت نصر بنوکد نضر یا نبوکدریزر، قدیم سلطنت بابل کے تیسرے خاندان کا دوسرا بادشاہ۔ باپ کا نام نبوپلاسر (بخت پلاسر) تھا قدیم میخی خط میں اس کا نام "نبوکدری اُسر" مندرج ہے۔

بخت نصر کے باپ نے جدید بابل سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ ۶۲۵ قبل مسیح سے آشوریوں کی طرف سے بابل کا گورنر تھا۔ اسی سال اس نے آشوریوں کی اطاعت کا جوا گلے سے اتار پھینکنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۶۰۶ ق۔م میں اپنے بیٹے بخت نصر کے ساتھ مل کر مشترکہ حکومت شروع کر دی۔ ۶۰۵ ق۔م میں نبوپلاسر کی وفات کے بعد بخت نصر بلا شرکت غیرے بابل کا حکمران بن گیا۔

بخت نصر کلدانی نسل سے تھا۔ اس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سلیمان ؑ اور ملکہ سبا کی نسل سے تھا۔ اس کی شادی ماد کی ایک شہزادی امو ہیلے سے ہوئی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے طاقت اور استحکام کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ بہت جلد وہ اردگرد کی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اسرائیل اور یہودہ کی سلطنتوں پر بھی زبردست حملے کیے۔ ۵۹۸ ق۔م میں اس نے یروشلم سمیت پوری سلطنت یہودہ پر قبضہ کر لیا۔ یہودہ کا بادشاہ صدقیاہ اس کا قیدی بن کر رہا۔ ۵۸۷ ق۔م میں بخت نصر نے ایک اور حملہ کیا اور یہودیہ کے تمام شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح سے پیوند خاک کیا کہ اُن کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو وہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک روایت کے مطابق اٹھارہ ہزار قیدی بخت نصر کی قید میں تھے۔

بخت نصر نے ۵۶۱ ق۔م میں وفات پائی۔ بائبل میں اس کا نام تقریباً ایک سو مرتبہ آیا ہے۔ اسی سے ایک تقویم کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ بائبل میں کتب تواریخ میں بخت نصر کی فتح یروشلم کا ذکر اس طرح سے کیا گیا ہے:

"یہویقیم پچیس برس کا تھا۔ جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے گیارہ برس یروشلم میں سلطنت کی اور اس نے وہی کیا جو خداوند اس کے خدا کی نظر میں برا تھا۔ اس پر شاہ بابل نبوکدنضر نے چڑھائی کی اور اسے بابل لے جانے کے لئے اس کے بیڑیاں ڈالیں اور نبوکدنضر خداوند کے گھر کے کچھ ظروف بھی بابل کو لے گیا اور انہیں بابل میں اپنے مندر میں رکھا۔

یہویاکین آٹھ برس کا تھا۔ جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے تین مہینے دس دن یروشلم میں سلطنت کی اور اس نے وہی کیا جو خداوند کی نظر میں برا تھا اور نئے سال کے شروع ہوتے ہی نبوکدنضر بادشاہ نے اسے خداوند کے گھر کے نفیس برتنوں کے ساتھ بابل کو بلوا لیا اور اس کے بھائی صدقیاہ کو یہوداہ اور یروشلم کا بادشاہ بنایا۔

صدقیاہ اکیس برس کا تھا۔ جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے وہی کیا جو خداوند اس کے خدا کی نظر میں برا تھا۔ اور اس نے یرمیاہ نبی کے حضور جس نے خداوند کے منہ کی باتیں اس سے کہیں، عاجزی نہ کی۔ اور اس نے نبوکدنضر بادشاہ سے بھی، جس نے اسے خدا کی قسم کھلائی تھی، بغاوت کی۔ وہ گردن کش ہو گیا۔ اس نے اپنا دل ایسا سخت کر لیا تھا کہ خداوند اسرائیل کے خدا کی طرف رجوع نہ لایا۔

______ انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں کی ہنسی اڑائی۔ یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ وہ کسدیوں کے بادشاہ ذبوکدنضر کو ان پر چڑھا لایا۔ جس نے ان کے مقدس گھر میں ان کے جوانوں مردوں، کنواریوں اور بڈھوں کو تلوار سے قتل کیا ______ اور جو تلوار سے بچے، وہ ان کو بابل لے گیا اور وہاں وہ اس کے اور اس کے بیٹوں کے غلام رہے۔ جب تک کہ فارس کی سلطنت شروع نہ ہوئی۔" (تواریخ دوم ۳۶ : ۱۶ تا ۲۱)۔ قرآن مجید میں اس واقعے کا ذکر یوں آیا ہے :-

"پھر جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے، جو نہایت زور آور تھے اور [illegible] تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔" ([illegible] ۵)

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہولناک تباہی ہے جو [illegible] بابل کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر نازل ہوئی۔ حضرت یسعیاہ [illegible] کے باوجود [illegible] بت پرستی اور بداخلاقیوں سے [illegible] کر دیا۔

[illegible] تھا [illegible] تھی [illegible] کی طرف جبھی توجہ [illegible] باقی [illegible]

[illegible] بہت سے [illegible] مختلف سفروں اور مشائخ کی ملاقاتوں [illegible] ایک صاحب نظر بزرگ سے ملاقات کی پھر [illegible] شیخ اوحد الدین کرمانی، خواجہ [illegible] ابو اللیث سمرقندی، شیخ برہان الدین چشتی اور شیخ محمد اصفہانی سے شرف [illegible] معلوم ہوا کہ خواجہ معین الدین چشتی خراسان سے ہندوستان جا [illegible] ہندوستان کا قصد کیا۔ اور اپنے پیر و مرشد کی بیعت میں [illegible] پیر و مرشد نے اجمیر سے دہلی جانے کا حکم دیا۔ دوران سفر ملتان [illegible] حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملاقات کی۔ دہلی پہنچنے پر سلطان شمس الدین [illegible] استقبال کیا۔ جن دنوں آپ کا قیام کیلوکھری میں رہا۔ سلطان ہفتے میں دو مرتبہ [illegible] حاضر ہوتا تھا۔ سلطان کے بار بار عرض کرنے پر شہر دہلی کے اندر قیام کرنے پر رضا مند ہو گئے اور ملک علی الدین کی مسجد میں مقیم ہوئے۔ اہل دہلی کی خاص

محبت اور انسیت کی وجہ سے تمام عمر یہیں بسر کی۔

حضرت بختیار کاکیؒ میں استغنا کی شان بے انتہا تھی۔ اگرچہ بادشاہ وقت ان کا ارادتمند تھا لیکن اس کے باوجود ان کے گھر میں اکثر فاقہ رہتا۔ جب کئی کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تو ان کی حرم اپنی ایک پڑوسن سے خورد و نوش کا سامان ادھار لے لیتی تھیں۔ ایک روز اس پڑوسن نے طنز سے کہا کہ اگر میں تمہیں قرض نہ دوں تو تمہارے بچے بھوکوں مر جائیں۔ جب آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے پڑوسن سے قرض لینے کو منع کر دیا اور کہا کہ حجرہ کے طاق میں سے جس قدر کاک کی ضرورت ہو نکال لیا کرو اور بچوں کو کھلا دیا کرو۔ اسی وجہ سے ان کا لقب کاکی مشہور ہوا۔

آپ کو سماع (قوالی) سے بے انتہا رغبت تھی۔ اکثر سماع کی مجلسیں منعقد کرایا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں ایک شعر سے آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور آپ سات روز بے ہوش رہے۔ نماز کے وقت ہوش آجاتا اور بعد میں پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اسی طرح ایک اور محفل سماع میں قوالوں نے جب یہ شعر پڑھا ؎

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

تو آپ پر وجد طاری ہو گیا اور تین روز تک یہی حالت رہی بالآخر اسی عالم میں وفات پا گئے۔ نماز جنازہ سلطان التتمش نے پڑھائی۔

آپ کے نام سے ایک دیوان اور ایک کتاب "فوائد السالکین" منسوب ہے۔ اس کتاب میں آپ نے تصوف اور سلوک کی تعلیمات درج کی ہیں۔

ان کے خلفاء میں شیخ فریدالدین گنج شکر۔ سید بدرالدین غزنوی۔ شیخ برہان الدین بلخی۔ شیخ ضیاء الدین رومی۔ شمس الدین التتمش۔ شیخ بابا سنجری بحر دریا۔ مولانا فخرالدین حلوائی۔ شیخ محمود بہاری۔ مولانا محمد جاجرمی۔ سلطان نصیرالدین غازی۔ قاضی حمیدالدین ناگوری۔ مولانا شیخ محمد ہیں۔

ان کا مزار جامع مسجد دہلی سے گیارہ میل دور پرانی دہلی میں قصبہ مہرولی میں واقع ہے۔ یہ قصبہ عام طور پر قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے یہاں بہت سے ولی اللہ مدفون ہیں۔ مزار کھلا ہوا، کچا اور بہت وسیع ہے جس کے چاروں طرف سنگ مرمر کا جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہے۔

بخل کنجوسی۔ تنگ دلی۔ اسراف کی ضد اپنے حاصل کیے ہوئے مال کو وہاں خرچ کرنے سے روکنا جہاں اسے روکنا نہیں چاہیے۔ بقول مولانا مودودی "بخل سے مراد وہ بخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیہ جمع کر کے رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہو نہ اپنے بال بچوں پر بلکہ بخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صرف نہ کرنا ہے۔ اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر اپنے عیش و آرام پر اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر لٹاتا ہے مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا۔ یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام و نمود، حکام رسی یا کسی اور قسم کی کتنی منفعت حاصل ہوگی۔"

بخل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان خود اپنی چیزوں کو روک لے اور انہیں ضرورت کی جگہ پر صرف نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ اوروں کو بھی ایسا کرنے کی تلقین کرے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالے کا ارشاد ہے :-

"اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے

ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۴: ۳۷)

مندرجہ بالا آیت میں بخل کو کفرِ نعمت کہا گیا ہے۔

اسلام جو تعلیمات اس بارے میں اپنے پیروکاروں کو دیتا ہے ان کی روشنی میں انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنی جائز ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اسے رفاہ عامہ کے لیے نکھلا رکھے۔

"پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں کہو! جو کچھ تمہاری ضروریات سے زیادہ ہو۔" (۲: ۲۱۹) لیکن بخل اس تعلیم کی ضد ہے۔

انسان اپنے بخل ہی کی وجہ سے دوسروں کی ضروریات اور تکالیف کا کوئی احساس نہیں کرتا۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دولت کسی طرح بھی صرف نہ ہو اور اگر ہو تو صرف اسی کی اپنی ذات پر۔ اس طرح بخیلوں کی وجہ سے دولت ایک خوشحال معاشرے میں ممد و معاون بننے کی بجائے ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے۔

"دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔ انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو" (۹: ۳۵)

اسی طرح ایک اور مقام پر یہ فرمایا گیا "جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے۔ اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ (۳: ۱۸۰)

بخل سے رذالت۔ خیانت۔ بے مروتی۔ بے رحمی۔ بدسلوکی۔ خود غرضی۔ تنگ نظری۔ کم ہمتی۔ حرص اور طمع وغیرہ قسم کی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں بخل اور بخیل کی بڑے سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے "جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو چکنا چور کرنے والی جگہ پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی۔ (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں دگھرے ہوئے ہوں گے) (۱۰۴: ۲ تا ۹)

نیز "جو شخص یتیم کو دھتکارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا وہ دین کو جھٹلاتا ہے۔" (۱۰۷: ۱ تا ۳)

نیز "اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ اور فخر جتلاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں۔ (۵۷: ۲۳، ۲۴)

بخیل کی سب سے بڑی مثال قرآن مجید میں قارون کی دی گئی ہے جو بخل کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

"یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰؑ کی قوم کا ایک شخص تھا پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پھول مت! اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو اس نے کہا، یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔ کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے۔ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔ ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے" کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے یہ تو بڑا نصیبے والا ہے۔ "مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے "افسوس تمہارے حال پر اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔"

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ (۲۸: ۷۶ تا ۸۱)

بخل کی شدت ایمان کو بھی ضائع کر کے رکھ دیتی ہے اور اسی بخل کی وجہ سے دلوں میں نفاق پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

"جب انہیں اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا تو اس میں بخل سے کام لیا اور اعراض کرتے ہوئے پھر گئے۔ سو اللہ نے انہیں بدلہ دیا کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا۔ (۹: ۷۶، ۷۷)

سورۃ محمد میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جو قوم بخل سے کام لیتی ہے اس کی بساط زندگی لپیٹ دی جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ (۴۷: ۳۸)

احادیث میں بھی بخل کی مذمت کی گئی ہے۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ سچے مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بد خلقی (ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں بخل کو سب سے بڑی بیماری کہا گیا ہے۔ (بخاری)

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ بخیل جنت کا وارث نہیں ہو سکتا (احمد، الحاکم)

آنحضورؐ سے جو دعائیں منقول ہیں ان میں سے ایک دعا یہ بھی ہے کہ اے اللہ! مجھے بخیل ہونے سے بچا۔ (بخاری)

بَدَاءُ (۱) ظاہر ہونا، وجود میں آنا۔ اصطلاح میں کسی امر کے سلسلے میں نئی یا دوسری رائے کا وجود میں آنا۔ الجوہری کے بقول پہلی رائے کو بدل کر نئی رائے [illegible] الفراء نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "پہلی رائے یا ارادے سے [illegible] رائے یا ارادہ ظاہر ہونا۔ عربوں میں ایسا شخص جس کے دماغ میں بہت سی آراء [illegible] ہیں، محتاط اور دوراندیش سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کو ذو بدوات کہا جاتا ہے۔ [illegible] مسئلہ کا تقدیر کے مسئلے سے بہت گہرا تعلق ہے [illegible] تقدیر معلق [illegible]

قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

"پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ان کی رائے ظاہر ہوئی [illegible]

اہل تشیع کے نزدیک اس سے مراد افعال باری تعالےٰ [illegible] پذیر ہونا ہے جو کسی مصلحت سے پہلے پوشیدہ تھے [illegible] کے بقول بداء کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس معنی میں کسی چیز کا صادر ہونا اور جب اللہ کی جانب سے ہو [illegible] ہونے کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اس صورت میں بداء کا مقصد عام زمان کے [illegible] کو زائل کرنا یا علم کو پختہ کرنا ہے۔

۲۔ کسی شخص کو ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا علم پہلے سے عام زمان کو بھی نہ تھا۔

۳۔ کسی شخص کے لیے کوئی ایسا عجیب و غریب امر ظہور پذیر ہو جو اس سے پہلے اکثر لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

۴۔ کسی شخص کے لیے ایسی شے کا ظہور پذیر ہونا جو پہلے اس سے پوشیدہ تھی۔ شیعی عقائد میں اسے بڑی اہمیت ہے۔ امام ابو عبداللہ سے روایت ہے کہ اس

وقت تک کوئی نبی نہ بھیجا گیا جب تک کہ اس نے اللہ کے لئے ان پانچ باتوں بداء مشیت سجود، عبودیت اور اطاعت کا اقرار نہ کر لیا۔

بعض مستشرقین کا یہ دعوےٰ ہے کہ بداء کو بطور عقیدہ سب سے پہلے مختار نے پیش کیا۔ اس عقیدے کی سب سے زیادہ مخالفت یہودنے کی چونکہ وہ شریعت کے نسخ کے قائل نہ تھے۔ اس سے علمائے یہود نے اس سلسلے میں مسلمان علماء سے مناظرے بھی کئے ہیں۔

بدایوں بداؤں یا بدایوں ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کا ایک شہر اور ضلع ہے۔ یہ شہر دریائے سوت کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ ۲ میل جنوب مغرب کی سمت واقع ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۶۱ء میں ساٹھ ہزار تھی۔

روایت کے مطابق اس شہر کی بنا ۹۰۵ء میں ایک ہندو راجہ بدھ نے ڈالی تھی۔ ۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں اسے مسعود سالار غازی نے (جو محمود غزنوی کا بھانجا یا بھتیجا تھا۔) فتح کیا۔ ۵۹۴ھ/۱۱۹۷ء میں قطب الدین ایبک نے اس پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں التمش نے تاج الدین یلدوز کو [illegible] کے قریب شکست دی اور گرفتار کر کے بدایوں بھیج دیا۔ خلجیوں کے زمانہ [illegible] بدایوں [illegible] کی صورت اختیار کر گیا۔ [illegible] ۱۲۹۱ء میں جلال الدین خلجی [illegible] کر دیا۔ چھجو کی بغاوت دور کرنے کے لئے بدایوں پہنچا۔ ۹۰ھ [illegible] نے [illegible] کی بغاوت کو فرو کر کے قبول خان [illegible] بدایوں کا فوجی [illegible]۔ ۵۵ھ [illegible] میں سلطان علاء الدین نے [illegible] کے بعد اپنی بقیہ ساری عمر بدایوں ہی میں گزاری [illegible]۔

[illegible] بنا دیا گیا۔ اور یہاں نائب [illegible] قائم کیا گیا۔ ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء میں [illegible] ایک زبردست آتش زدگی ہوئی جس میں سارا شہر جل گیا اور [illegible] کی ایک بڑی تعداد جل کر ہلاک ہوگئی۔ شاہجہان نے بدایوں اور سنبھل کو [illegible] دیا اور اس کا نام کٹھیر رکھا۔ بریلی [illegible] کا صدر مقام بنایا گیا [illegible] کے زوال کے بعد بدایوں پر روہیلوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۱۹۲ھ/ [illegible] کے قبضے میں آ گیا اور ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں [illegible] گئے۔ ۱۸۳۸ء میں [illegible] ضلع کی حیثیت دی گئی۔

[illegible] عبدالقادر بدایونی کا مسکن تھا۔ نظام الدین اولیاء [illegible] رضی الدین حسن الصغانی کی ولادت بھی اسی شہر میں ہوئی۔ اس شہر میں چند تاریخی عمارات ہیں [illegible] جو اب بالکل کھنڈر بن چکا ہے۔ مسجد قطبی، جامع مسجد شمسی کے علاوہ کئی ایک مساجد اور مقبرے ہیں ان میں سلطان علاء الدین [illegible] خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

بدایوں کا [illegible] کے نام سے مشہور ہے، جو بریلی سے متھرا [illegible] ریلوے لائن پر واقع ہے۔ یہاں پر چھوٹی صنعتوں کی چند فیکٹریاں [illegible] کی کل آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۱۳۱۰۲۲۶ تھی [illegible] میل میں آباد ہے۔ فصلوں میں زیادہ تر گندم [illegible] ہیں۔

بدایونی، عبدالحامد، مولانا (۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء — ۱۹ جمادی الاوّل ۱۳۹۰ھ

۲۱ جولائی ۱۹۷۰ء) ممتاز عالم دین اور بلند پایہ مقرر۔ والد کا نام حکیم محمد عبدالقیوم تھا۔ والدہ سید بہار الدین دہلوی کی صاحبزادی تھیں۔ بدایوں میں پیدا ہوئے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی اہل سنت والجماعت کے ممتاز اکابر میں سے تھے۔ انہوں نے تحریک خلافت۔ تحریک پاکستان۔ تحریک شدھی۔ تحریک ختم نبوت۔ عالم اسلامی کے اتحاد اور مسئلہ کشمیر کو عالم اسلام میں روشناس کرانے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ انہیں مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ نواب محمد اسماعیل خاں۔ نواب لیاقت علی خاں۔ قائداعظم۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی وغیرہم کے ساتھ مل کر کام کرنے کا شرف حاصل تھا۔ ۱۹۴۵ء میں قائد ملت لیاقت علی خاں کے ایما پر حیدرآباد دکن گئے۔ اور نواب میر عثمان علی خان تاجدار دکن سے ملے اور قائداعظم محمد علی جناح کی ملاقات کے لئے راہ ہموار کی۔ ۱۹۴۶ء میں مکہ معظمہ پہنچ کر مسلمانان عالم کو تحریک پاکستان سے آگاہ کیا۔

مولانا ابوالحسنات قادری کی وفات پر جمعیت علمائے پاکستان کے صدر بنے۔ فالج کے حملے سے کراچی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا ایک پرجوش اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ آواز میں ترنم تھا۔ تقریر مخصوص الفاظ میں جھوم جھوم کر اس طرح سے کرتے کہ سارے مجمع پر اثر چھا جاتا۔

مولانا سچے صوفی مشرب مسلمان تھے۔ آنحضور کے آستانہ پاک سے گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بائیس حج کئے۔ ان کی تصانیف میں اسلام کا معاشی نظام اور سوشلزم کی مالی تقسیم۔ اسلام کا زراعتی نظام۔ تصحیح العقائد۔ عبادات سلامی کتاب وسنت غیروں کی نظر میں۔ تاثرات روس۔ دورہ آزاد کشمیر۔ حرمت سود۔ عائلی قوانین۔ الجواب المشکور فی اشد القبور مشہور ہیں۔

بدایونی، عبدالقادر (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء تا ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) ایک مشہور عالم اور مورخ۔ والد کا نام ملوک شاہ تھا۔ ریاست جے پور کے قصبہ ٹوڈا میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے لئے سنبھل میں شیخ حاتم اور شیخ ابوالفتح کی شاگردی اختیار کی۔ بعد میں اپنے والد کے ساتھ آگرہ چلے گئے۔ اور وہاں شیخ مبارک کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے۔ قاضی ابوالمعالی سے فقہ حنفیہ پڑھی۔ والد کی وفات کے بعد ۹۶۹ھ/۱۵۶۱ء میں بدایوں آگیا۔ ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء سے پٹیالہ میں حسین خان کی ملازمت میں بحیثیت صدر نو سال صرف کئے۔ ۹۸۱ھ/۱۵۷۴ء میں ایک شاہی طبیب کی کوششوں سے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اکبر نے اسے بحیثیت بیست سواری منصب دار گھوڑوں کو داغ دینے کا حکم دیا۔ جب ابوالفضل کو اکبر کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تو اس کے سامنے بدایونی کا چراغ نہ جل سکا۔ اور اس نے دل برداشتہ ہو کر دربار سے تعلق ختم کر لیا۔ بعد میں ایک مرتبہ پھر اس نے دربار میں اپنا سابق مرتبہ حاصل کرنا چاہا لیکن ناکامی ہوئی۔ کیونکہ ابوالفضل کے زیر اثر اکبر کا ذہن جس طرح سے بدلا اور دربار اکبری میں الحاد کا جو نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بدایونی کا اسلامی ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ دربار سے قطع تعلق کے باعث قریب تھا کہ اس سے زمین بھی چھن جاتے لیکن خواجہ نظام الدین کی سفارش اور کوششوں سے اس کی زمین محفوظ رہی اور اکبر اسکے بعد اس سے برابر علمی خدمات لیتا رہا۔

بدایونی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ کتاب الحدیث۔ ۲۔ نامۂ خرد افزا۔ ۳۔ رزم نامہ۔ ۴۔ ترجمہ راماین۔ ۵۔ تاریخ الفی۔ ۶۔ نجات الرشید۔ ۷۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی کے ترجمہ تاریخ کشمیر کی اصلاح اور اختصار۔ ۸۔ رشید الدین کی جامع التواریخ کا ملخص ترجمہ۔ ۹۔ بحر الاسمار

کی تکمیل۔ ۱۰۔ منتخب التواریخ وغیرہ۔

بدخشاں روسی ترکستان کا ایک شہر اور علاقہ، جو آمو دریا کے بالائی علاقے میں بائیں کنارے پر واقع ہے۔ بدخشاں ایک قسم کے لعل کا نام ہوتا ہے جو اسی علاقے میں ملتا ہے۔ اسی بنا پر اس کا نام بدخشاں پڑا۔ مارکوپولو لکھتا ہے کہ بدخشاں اس علاقے کا نام ہے اور لعل کا نام علاقے کی نسبت سے ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس علاقے پر منگولوں نے قبضہ کیا۔ طبری کے مطابق ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں اس علاقے میں اسلامی فتوحات ہوئیں۔ پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں مشہور شاعر ناصر خسرو یہاں آیا اور اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کی۔ اگلی چار صدیوں تک یہ علاقہ مقامی شاہی خاندان کے زیر اثر رہا۔ تیموری سلطنت کے ساتھ اس کا الحاق تیمور کے پرپوتے ابو سعید کے عہد میں ہوا۔ سولہویں صدی عیسوی میں ازبکوں نے اس علاقے پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو بدخشاں کے تخت پر بٹھایا، جسے ۹۳۵ھ/۱۵۲۹ء میں واپس بلا لیا اور سابق والی مرزا خان کے بیٹے سلیمان کو بدخشاں کا حاکم تسلیم کر لیا۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں اس کے پوتے شاہ رخ نے اسے نکال باہر کیا۔ ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں بدخشاں کو ازبکوں نے عبداللہ خاں کی سرکردگی میں فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہاں ازبکوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ان کے شہزادے میر کے لقب سے یاد کیے جاتے رہے۔ ۱۸۷۳ء میں حکومت افغان نے ازبک میر محمود شاہ کو معزول کر کے کابل بھیج دیا تو اس علاقے کو افغانستان میں شامل کر لیا گیا تاہم عملاً اس پر روس کا عمل دخل رہا۔

۱۸۹۱ء کی ایک فوجی جھڑپ کے بعد روس نے مشرقی پامیر کا تمام علاقہ قبضے میں کر لیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۹۵ء کو برطانیہ اور روس کے درمیان ہونے والے معاہدے کی رو سے بدخشاں شہر کو چھوڑ کر باقی علاقہ روس کے سپرد کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں روس میں "خود مختار علاقہ گورنو بدخشاں" قائم کیا گیا اور اسے ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء میں سوویت جمہوریہ اشتراکیہ تاجکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔

بدخشاں کا علاقہ اپنے لعل، زمرد، نیلم، فیروزہ، سونے اور تانبے کی دولت کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ اس معدنی دولت سے روس بے حد فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے صنعتی کارخانے بھی قائم ہیں۔ گورنو بدخشاں کا مرکزی مقام خاروغ ہے۔ اس علاقے کی معیشت زیادہ تر قدیم طرز پر استوار ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں باغات اور ریشم کی افزائش کے سلسلے بھی شروع کیے گئے ہیں۔

بدر سعودی عرب کا ایک مقام، جہاں کفر اور اسلام کے مابین پہلی جنگ ہوئی۔ اس علاقے کا نام ایک چشمے کی وجہ سے پڑا۔ جو مدینہ منورہ سے کوئی اسی میل مکہ کی جانب واقع ہے۔ بدر اور مدینہ کے درمیان نخلستان ہیں جو میٹھے پانی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے زمانہ قدیم میں قافلے ادھر سے ہو کر گزرتے تھے۔ بدر کا پانچ میل لمبا اور چار میل چوڑا میدان چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ساڑھے پانچ میل لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا ہے۔ یہاں ریتلی چٹانیں اور گھاٹیاں ہیں۔ پہاڑوں کے دوسری طرف دس میل کے فاصلے پر بحر احمر ہے۔

جس مقام پر آنحضورؐ کا خیمہ نصب ہوا تھا، اب وہاں ایک جامع مسجد ہے۔ قریش مکہ کے پڑاؤ کے مقام پر اب نخلستان واقع ہے۔ ترکی دور کے والی حجاز شریف عبدالمطلب کا بنایا ہوا قلعہ بھی کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کئی مساجد بھی ہیں، جن میں سے اکثر ویران ہو چکی ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں یکم ذی قعدہ کو بدر کے مقام پر میلہ لگتا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا، مگر زیادہ تر لوگ میلے کی وجہ سے آتے تھے۔ اس وقت یہاں بنو حمزہ آباد تھے۔ ان کی ایک شاخ بنو غفار تھے۔ آج بھی یہاں ہر جمعہ کو مسلمانوں کا میلہ لگتا ہے۔

بدر، غزوہ مسلمانوں اور کفار قریش کے مابین پہلی جنگ، جو ۲ھ/۶۲۳ء کو ہوئی۔ ہجرت کے بعد بھی جب کفار نے آنحضورؐ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا تو مسلمان کفار سے لڑنے پر مجبور ہو گئے۔

یثرب (مدینہ) میں مسلمانوں کے روز افزوں استحکام سے اہل مکہ کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کا زور توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کی وجوہات یہ تھیں۔

۱۔ وہ کعبہ کی پاسبانی کے مدعی تھے۔ بت پرستی ان کا دین تھا اور اس کی حفاظت وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ وہ عرب کی روحانی پیشوائی سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

۲۔ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انہیں ہر سال حج کے دنوں میں بے شمار منافع حاصل ہوتا تھا۔ اسلام کی مخالفت نہ کر کے وہ یہ منافع کھونا نہیں چاہتے تھے۔

۳۔ مسلمانوں کی ہجرت ان کے لیے ذلت انگیز شکست تھی۔ کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا تھا۔

۴۔ انہیں ڈر تھا کہ مسلمانوں کی قوت بڑھنے سے مکہ پر حملہ یقینی ہے۔

۵۔ اہل اسلام پر مکہ، اس کے اطراف اور جنوبی علاقوں میں تجارت بند تھی۔ [illegible] باوجود مسلمان تاجروں نے اطراف عرب میں اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ اس [illegible] کو اپنی تجارت ڈوبتی نظر آئی۔

۶۔ کرز بن فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر غارت کی۔ آنحضورؐ نے خود بدر تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

۷۔ عبداللہ بن جحش کو حضورؐ نے ایک دستہ دے کر گشت کے لیے بھیجا۔ [illegible] دستے نے قریش کے ایک تجارتی قافلے پر حملہ کر کے عبداللہ بن الحضرمی کو ہلاک کر دیا۔ آپؐ نے خبر ہونے پر اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

۸۔ قریش نے عبداللہ بن حضرمی کے قتل کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور زور و شور سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ابوسفیان ایک تجارتی قافلے کر شام گیا۔ واپسی پر اسے مسلمانوں کی طرف سے قافلہ لوٹ لینے کا اندیشہ ہوا۔ اس نے یہ اطلاع مکہ بھجوائی تو اہل مکہ نے ایک ہزار نوجوان عتبہ بن ربیعہ کی کمان میں مدینہ کی طرف بھیجے۔

جب آنحضورؐ کو دشمن کے منصوبوں اور مکہ سے لشکر کی روانگی کی اطلاع ملی تو آپؐ نے صحابہ کبار سے مشورہ کیا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ نے تقاریر کیں۔ بعد میں انصار کی طرف سے سعد بن عبادہؓ نے کہا کہ "اللہ کی قسم آپ سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو کود پڑیں۔" ساتھیوں سے مشورہ کے بعد آنحضورؐ تین سو سے کچھ زائد جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ ابھی قریش کا لشکر بدر سے کافی دور تھا کہ ابوسفیان راستہ بدل کر آگے نکل گیا اور قریش لشکر کو یہ پیغام بھیجا کہ میں خطرہ سے نکل آیا ہوں۔ اس پر لشکر میں اختلاف ہو گیا۔ بعض واپس جانا چاہتے تھے۔ اور بعض مثلاً

ابوجہل وغیرہ جنگ کرنے پر مصر تھے، لیکن بنو زہرہ حضورؐ کے ننھیالی خاندان نے ابوجہل کی بات نہ مانتے ہوئے پچاس آدمیوں سمیت علیحدگی اختیار کر لی۔

۱۷ رمضان ۲ھ/۱۴ مارچ ۶۲۳ء میں دونوں لشکر میدان بدر میں داخل ہوئے اسلامی لشکر شمال کی طرف اور قریشی لشکر جنوب کی طرف اترا۔ آنحضورؐ نے بڑی دانشمندی سے پانی کے چشمے پر قبضہ کر لیا۔

نقشہ جنگ بدر

شام کی طرف
مدینہ کی طرف
قافلہ
اسلامی لشکر
کفار کی فوج
نخلستان
ریگستان
شمال
مکہ کی طرف

حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ چاہتے تھے کہ جنگ ٹل جائے۔ حکیم بن حزام ابوجہل کے پاس واپسی کی تجویز لے کر گیا تو اس نے عتبہ بن ربیعہ کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ اس پر عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو لے کر مبارزت کے لیے نکلا۔ مقابلہ پر تین انصاری آئے تو عتبہ نے یہ کہتے ہوئے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا کہ ہمارا مقابلہ قومی ہمسروں سے ہے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کو بھیجا۔ مقابل کے تینوں مشرک ہلاک ہو گئے۔ حضرت عبیدہؓ زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔ اس کے بعد لشکر قریب آ گئے۔ ایک طرف شیطانی ہجوم ہتھیاروں میں غرق تھا۔ اور دوسری طرف اللہ کے فرمانبردار بندے اور توحید کے پروانے تھے۔ آپؐ نے اس میدان میں رقت سے یہ دعا کی: "اے اللہ اپنا وعدہ پورا کر، کیا تو چاہتا ہے کہ آج کے بعد تیرا نام نہ لیا جائے۔" بے خودی میں چادر مبارک کندھے سے گر گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے اٹھا کر آپؐ کے کندھوں پر دوبارہ رکھا۔ اور عرض کی: "آپؐ بہت زاری کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائیں گے۔" اس کے بعد وہ آیات نازل ہوئیں جن میں فرشتوں کی مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔

یہ لڑائی دنیا کی عجیب ترین لڑائی تھی۔ بھائی بھائی کے خلاف اور باپ بیٹے کے سامنے تلوار سونتے ہوا تھا۔ مقابلہ بڑے زور و شور سے ہو رہا تھا۔ آنحضورؐ نے مٹھی بھر کنکریاں قریش کی طرف پھینکیں اور مجاہدین کو بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دشمن حواس کھو بیٹھے۔ فرشتے مدد کے لیے میدان میں آ گئے۔ اور مشرکین کے سردار کھیت ہونے لگے۔ ابوجہل کو دو انصاری نوجوانوں نے قتل کیا۔ حضرت زبیرؓ کے سامنے ایک آہن پوش آیا جس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ آپؓ نے نیزہ اس کی آنکھوں میں مارا اور اس کے سینہ پر پاؤں رکھ کر اسے نکالا۔ نیزہ مڑ گیا تھا۔ حضورؐ نے یہ نیزہ یادگار کے طور پر کافی عرصہ تک محفوظ رکھا۔

مشرکین بھاگ نکلے اور ستر مردے چھوڑ گئے۔ ستر مشرکین گرفتار ہوئے۔ مال غنیمت میں بہت سے اونٹ اور تقریباً تیس گھوڑے ہاتھ لگے۔

آپ نے مشرکین کے سب مردے ایک گڑھے میں دفن کیے۔ فتح کی خوشخبری دو قاصدوں کے ذریعے مدینہ بھیجی۔ لوگ یہ سن کر حیران ہوئے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ مگر جب قیدی پہنچے تو وہ بے حد حیران ہوئے۔

اسیران جنگ مدینہ پہنچے تو حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے ان کے بارے میں مشورہ کیا۔ بعض صحابہ قتل کے حق میں تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہاں تک کہا کہ ہر مسلمان اپنے قرابت دار کی گردن خود مارے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی جو آپؐ نے منظور فرمائی۔ فدیہ کی رقم اسیروں کے مقدور کے مطابق طے ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ شرح چار ہزار تک پہنچی۔ صرف عقبہ بن معید اور نضر بن حارث کو قتل کروا دیا گیا۔ آپؐ نے دیگر قیدیوں کو صحابہؓ میں تقسیم کر کے ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا۔

قیدیوں میں سے سہیل بن عمرو بے مثل مقرر تھا۔ وہ آنحضورؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے اس کے دانت اکھاڑنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار فرمایا کہ اگر میں اس کا بدن بگاڑوں گا تو اللہ تعالیٰ میرا بدن بگاڑے گا۔ شاید کسی مجلس میں یہ ایسی گفتگو کرے جو تمہیں بری نہ لگے۔" آنحضورؐ کی یہ پیشگوئی آپؐ کی وفات کے بعد پوری ہوئی۔ فتنہ ارتداد کے خلاف موثر اور پرجوش خطبے سہیلؓ نے دیے۔

جو قیدی فدیہ نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں مفت رہا کیا گیا۔ جو پڑھے لکھے تھے ان کے بارے میں دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا کر آزاد ہو جانے کا فیصلہ ہوا۔

بدرالدینؒ بدر (وفات ۲۰ رجب ۸۴۴ھ/۲۲ دسمبر ۱۴۴۰ء) بدرالدین بدر عالم ابن فخرالدین ثانی سلسلہ جنیدیہ کے ایک صوفی میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے پردادا شیخ فخرالدین زاہد نے ایک بہت بڑی خانقاہ قائم کی ہوئی تھی۔ ان کے دادا شیخ شہاب الدین حق گو کو محمد بن تغلق نے قتل کرا دیا تھا۔ انہوں نے روحانی تعلیم اپنے والد اور سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ سید جلال الدین بخاری سے حاصل کی۔

شیخ شرف الدین یحییٰ نے انہیں بہار آنے کی دعوت دی۔ مگر جب بہار پہنچے تو شیخ کا انتقال ہو چکا تھا۔ پہلی شادی بہار کے ایک ہندو گھرانے میں کی۔ دوسری شادی جونپور کے حکمران خاندان میں ہوئی۔ مشرقی بنگال میں انہوں نے ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اور سنار گاؤں (ڈھاکہ) میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ کچھ عرصہ چٹاگانگ میں بھی قیام رہا۔ سمندروں اور دریاؤں پر حکمرانی ان کے خاندان کی خاص روحانی صفت مانی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال ملاح سمندر میں کشتی ڈالنے سے پہلے ایک نعرہ "اللہ۔ نبی۔ پانچ پیر۔ بدر۔ بدر" لگاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سنار گاؤں (ڈھاکہ) کے پانچ پیر کے ساتھ مل کر پانی پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ فخرالدین زاہد نے ایک جماعت کو دریائے جمنا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ ان کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک چٹان پر تیرتے ہوئے چٹاگانگ پہنچے تھے۔ بہار اور بنگال کے باشندوں کو ان سے بڑی عقیدت ہے۔ انہوں نے بہار میں وفات پائی اور ان کا مقبرہ چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے

بدرالدین بن قاضی (یکم محرم ۷۶۰ھ/۲ دسمبر ۱۳۵۸ء - شوال ۸۱۹ھ/۱۸ دسمبر ۱۴۱۶ء) ایشیائے کوچک کا ایک مشہور فقیہہ اور صوفی نیز اشتراکی رہنما۔ والد کا نام قاضی غازی اسرائیل تھا۔ سمارنہ میں پیدا ہوا۔ زمانہ شباب ادرنہ میں گذارا۔ فقہ اسلامی کی تعلیم اپنے والد اور دیگر علماء یوسف اور شاہدی وغیرہ سے حاصل کی۔ تکمیل علم کا شوق بروسہ میں کھینچ کر لے گیا۔ وہاں منطق اور علم ہئیت پڑھا۔ اس کے بعد بیت المقدس میں ابن العسقلانی سے فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ آکر مبارک شاہ المنطقی۔ حاجی پاشا طبیب۔ علی بن محمد السید الشریف الجرجانی جیسے علماء اور فضلاء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے۔ ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں حج کا قصد کیا اور حج سے واپس آنے کے بعد مملوک سلطان برقوق کے بیٹے فرج کا اتالیق مقرر ہوا۔ مملوک سلطان کے دربار میں اس کی ملاقات صوفی شیخ حسین اخلاطی سے ہوئی۔ ان سے تصوف کے بارے میں آگاہی حاصل کی۔ اور شیخ کی وفات کے بعد ان کا جانشین ہوا۔ لیکن اپنے پیر بھائیوں سے اختلافات کی وجہ سے قاہرہ چھوڑ کر ایشیائے کوچک کی جانب تبلیغ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس نے ابن العربی کے نظریات کی تبلیغ شروع کر دی۔ نیز اس نے مشترکہ ملکیت کے نظریے کی بھی تبلیغ کی۔ جس کی وجہ سے ایشیائے کوچک کے بہت سے مفلوک الحال لوگ اس کے مرید ہو گئے۔ ۱۴۱۰ء میں موسیٰ سلطنت موسیٰ نے اسے قاضی عسکر بنا دیا۔ سلطان محمد اول نے فتح حاصل کی تو اس نے اسے انتہائی ذلت آمیز رویے کے ساتھ جلا وطن کر دیا۔ چنانچہ ازنیق میں وہ ایک بار پھر تصنیف و تدریس میں مشغول ہو گیا۔ اسی زمانہ میں اس کا تعارف اشتراکیت کی ایک خفیہ تحریک سے ہوا۔ اور جس کی بدولت ۱۴۱۶ء میں ایک بہت بڑی بغاوت رونما ہوئی۔ اس تحریک کا نظریاتی اعتبار سے بدرالدین کو سربراہ کہا جاتا ہے۔ بغاوت سختی سے دبا دی گئی۔ اور شاہی فوج بدرالدین کو گرفتار کر کے گھسیٹتی ہوئی سیرس لے گئی۔ چنانچہ مقدونیہ میں اس پر مقدمہ چلا اور غداری کے الزام میں برسرعام پھانسی دے دی گئی۔

بدرالدین نے پچاس کے قریب جامع کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں سے اکثر فقہ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ تصوف پر اس کی اہم ترین کتابیں "واردات" اور "نور القلوب" ہیں۔ اس کے تین بیٹے احمد۔ اسماعیل اور مصطفیٰ تھے۔ اس کے پوتے خلیل بن اسماعیل نے اس کے حالات زندگی پر ایک کتاب لکھی ہے۔

بدعت نئی بات یا نئی رسم نکالنا۔ یعنی ایسی بات نکالنا جس کا کتاب و سنت تو کجا آثار صحابہ تک میں پتا نہ چلتا ہو۔

بدعت اور اجتہاد میں زمین آسمان کا فرق ہے، بدعت ضلالت (بدی) ہے اور اجتہاد دین کی ضرورت ہے۔ دین میں نئی بات نکالنا کوئی معمولی برائی نہیں ہے۔ اس پر شدید وعید اس لئے آئی ہے کہ بدعت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ سے کچھ ایسی باتیں بیان کرنے سے رہ گئیں جن کے کرنے سے آخرت میں بڑا ثواب ہو گا۔ اور آخرت میں ترقی ہو گی۔ آنحضورؐ کو بدعت سے نہ صرف نفرت تھی بلکہ ایذا اور تکلیف بھی ہوتی تھی۔ بدعت ایک مہلک اور متعدی مرض ہے۔ اس کے مریضوں سے دور رہنا چاہیئے۔ قیامت کے دن آنحضورؐ اپنی امت کے بدعتیوں کو دیکھ کر فرمائیں گے۔ "جنہوں نے میرے بعد دین میں کوئی تبدیلی کی اور بدعت پھیلائی وہ مجھ سے دور رہیں۔"

بدعت کے بارے میں آنحضورؐ نے فرمایا: "جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا۔ "بہترین باتوں کی کتاب قرآن ہے اور بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے اور بدترین امور وہ ہیں جو دین میں نئے نکالے جائیں۔ اور دین میں ایجاد کی ہوئی ہر نئی چیز گمراہی ہے۔" (مسلم)

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص صاحب بدعت سے محبت رکھے گا اللہ تعالےٰ اس کا عمل ختم کر دے گا اور اس کے قلب سے ایمان کی نورانیت سلب کرے گا۔ اے مخاطب تو جب کسی کو اس راستہ پر چلتا دیکھے تو تو دوسرا راستہ اختیار کرے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے ایک قول کی بنا پر بدعت کی دو قسمیں "النہایہ" میں بیان کی گئی ہیں: ۱۔ بدعت حسنہ ۲۔ بدعت سیئہ۔ جو نئی بات اچھی ہو اور قرآن و سنت اجماع یا اثر کے خلاف نہ ہو وہ بدعت حسنہ ہے اور جو ان ماخذوں کے خلاف ہو وہ بدعت سیئہ ہے۔ تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے اس بدعت کے حسنہ ہونے کا ایک نکتہ اور اصول بتا دیا ہے۔ تراویح آنحضورؐ کے زمانہ میں بھی پڑھی جاتی تھی اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔ مگر آنحضورؐ نے باقاعدہ تراویح کے طریق پر ہمیشہ عمل نہیں فرمایا۔ یہ پورا سلسلہ مسنون تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس طریقہ مسنونہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک جان [illegible] قائم نہیں رہتی [illegible] اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پچھلی امتوں نے شرک و بدعات [illegible] کے ذریعے دین کو مسخ کر دیا تھا۔ بدعت کوئی ایسی شکل [illegible] معمولی برائی نہیں [illegible] نظر انداز کر دیا جائے۔

بدلیس مشرقی اناطولیہ کا ایک مرکزی شہر جو دریائے بدلیس کے کنارے [illegible] سے ۵۴ کلومیٹر جنوب مغرب کی سمت واقع ہے۔ [illegible] عمارتوں سے بنا ہوا یہ شہر پہاڑوں کی ڈھلانوں اور دریا کے [illegible] سخت قسم کی آب و ہوا رکھتا ہے۔ تاریخ میں یہاں سب سے پہلے [illegible] کا علم ہوتا ہے۔ اس شہر کا نام سکندر کے سپہ سالار بدلیس کے نام پر رکھا گیا [illegible] نے اسے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں فتح کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد [illegible] میں شامل کر لیا گیا تو حضرت امیر معاویہؓ نے اسے دوبارہ فتح کیا مگر [illegible] ہاتھ سے نکل گیا۔ اور عہد عباسیہ میں ہاتھ آیا۔ [illegible] دور حکومت میں ایک سرحدی شہر بنا رہا۔ مروان کے عہد میں [illegible] ہو گئے۔ ۱۰۸۴ء میں جب فخر الدولہ محمد بن جہیر دیار بکر کا حاکم بنا تو [illegible] کی حکومت کا خاتمہ کر کے ان کے علاقے کو ترکوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ [illegible] دلیج کے حصہ میں آیا۔ اور اس کی اولاد اس پر ۱۱۹۲ء تک حکمران رہی۔ [illegible] اس شہر پر اخلاط کے امیر نے قبضہ کر لیا۔ ۱۲۰۷ء میں ان دونوں شہروں [illegible] قبضہ ہو گیا۔ انھوں نے اس علاقے میں کردوں کی ایک بڑی تعداد [illegible]

۱۲۲۹ء میں جب اخلاط جلال الدین خوارزم شاہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو [illegible] خوشحال ہو گیا۔ یہ شہر علم و فضل کا ایک خاص مرکز بن گیا۔ انیسویں صدی تک [illegible] پر مختلف ادوار میں تیموریوں، قراقوینلو، آق قوینلو، صفویوں اور عثمانیوں کا قبضہ رہا۔

۱۸۷۷ء - ۱۸۷۸ء کی جنگ میں یہ ایک صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ [illegible] اس کی آبادی ایک لاکھ آٹھ ہزار تھی۔ جس میں ستر ہزار مسلمان، تئیس ہزار [illegible] شامی یعقوبی عیسائی اور ایک ہزار یزیدی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران [illegible] پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں بے حد کمی ہو گئی۔

۱۹۵۰ء میں اس شہر کی آبادی گیارہ ہزار ایک سو باون تھی۔ جب ترکی میں جمہوریت

قائم ہوئی تو بدلیس کے چاروں سنجاق کے الگ الگ صوبے بنا دیئے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں بدلیس کو دوبارہ ولایت بنا دیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں اس کی آبادی ایک لاکھ تھی۔

بدو خانہ بدوش، گلہ بان، چرواہے، خصوصاً عرب کے صحرائی علاقوں کے لوگ، جو تلاشِ معیشت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے ہیں۔ صحراؤں میں یہ تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح سے آباد ہیں۔ ۱۱۰۰ ق م میں انہوں نے اونٹ سے کام لینا شروع کیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ سے صرف دو تین صدیاں پہلے گھوڑا ان کے استعمال میں آیا۔ اس وقت یہ لوگ کاشت کاری، گلہ بانی اور تجارت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اسلام سے قبل عربوں کی بدوی زندگی اپنے عروج پر تھی۔ انہیں اہل بادیہ کہا جاتا ہے۔ ان کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم بحر ہند کے کنارے آباد ہے اور سامی زبان بولتی ہے۔ دوسری قسم کے بدو دریائے دجلہ و فرات کے قریبی صحراؤں میں آباد ہیں اور کاشت کاری کرتے اور مویشی پالتے ہیں۔ تیسری قسم کے بدو صحراؤں کے کناروں پر آباد ہیں [illegible]۔ چوتھی قسم کے بدو خاص بدو کہلاتے ہیں جو صحراؤں میں آباد ہیں۔ اونٹوں کا زیادہ تر استعمال یہی بدو کرتے ہیں۔ ان کا قدیم ترین قبیلہ صلیب [illegible] کے درمیان رہتے ہیں۔

بدو عام طور پر خیموں میں رہتے ہیں۔ بکری کے بالوں سے بنا ہوا سیاہ خیمہ انہیں گرمی، دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا سامان کرتا ہے۔ [illegible] برتن عموماً دھات اور [illegible] قہوہ پینے کے لیے چینی کے پیالوں کا سیٹ [illegible] صاف اور کشادہ ہوتا ہے۔ جو سردیوں میں [illegible] سرد رہتا ہے۔ ان کی عورتیں عام طور پر نقاب پہنتی ہیں۔

بدو قبائل عام طور پر ایک ہی خاندان کے مختلف افراد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شجاعت اور قصاص کے اصولوں پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ مذہباً سنی مسلمان ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے زیادہ تر مالکی ہیں اور کچھ حنبلی ہیں جو [illegible] کے ساتھ وہابی ہیں۔

عربوں کی طرح دیگر قوموں میں بھی بدوی (خانہ بدوش) ہیں جو گلہ بانی، زراعت اور چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ ان میں سے وہ بدوی جو گھوڑے پالتے ہیں۔ منگولیا کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نیم منظم لٹیرے اور جنگجو ہوتے تھے۔ انہوں نے کئی بار اپنے مسکن سے نکل کر ارد گرد کے علاقوں پر یورش کی۔ ہلاکو خان اور چنگیز خان ایسے ہی منگول بدوؤں کے سردار تھے۔ عربوں اور خصوصاً مسلمانوں کو اہل یورپ نے عموماً بدویوں کے خطاب سے پکارا ہے۔ اس کے لیے وہ مور (MOOR) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سپین کے فاتح مسلمانوں کو مور ہی کہا گیا ہے۔ حالانکہ بدو صرف خانہ بدوش لوگوں کو کہا جاتا ہے، جو صحرائے عرب میں آباد ہوئے تھے۔ اور کبھی کبھی شہروں کے ارد گرد بھی آ بستے تھے۔ مگر مقامی بستیوں کے عرب مثلاً مکہ، یثرب، طائف صنعا وغیرہ کے لوگوں کو کبھی بھی بدو نہیں کہا گیا۔ نیز ان میں کافر بھی تھے۔ مسلمان بھی، یہودی بھی اور عیسائی بھی۔ اس لیے محض مسلمانوں کو بدو کا خطاب دینا نسلی اور مذہبی تعصب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

بدھستوا بدھ مت میں اوتار کا نام ہے۔ یہ بدھ سے نچلا درجہ ہے۔ یہ ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نروان (اعلیٰ جنم) میں داخل ہونے والا ہو یعنی بدھ بننے والا ہو لیکن کسی وجہ سے اس درجے کو نہ پہنچا ہو۔ بدھ مت کے فرقے مہایان میں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بدھستوا اس لیے بدھ کا مرتبہ حاصل نہ کر سکے کیونکہ وہ مصیبت زدہ انسانوں سے بے حد متاثر تھے اور ان ہی کی ہمدردی کی وجہ سے انہوں نے نروان کا قدم نہیں اٹھایا۔ بدھ بن جانے کے بعد وہ ان کی امداد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نروان کے بعد مکمل فنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بدھستوا آسمان سے مصیبت زدوں کی نگرانی کرتے ہیں اور اکثر اوقات مختلف بھیس میں زمین پر ان کی مدد کرنے آتے رہتے ہیں۔ بدھستوا کی اعلیٰ محبت اور ہمدردی کے بے شمار افسانے مشہور ہیں، جن میں وہ مصیبت زدوں کی نجات کے لیے کام کرتے ہیں۔

سب سے پہلا بدھستوا گوتم تھا۔ ان کے بعد بھی بے شمار بدھستوا آتے رہے ہیں کچھ عرصہ سے تین بدھستواؤں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ پہلا بدھستوا میتریا ہے، جو رحم دل ہے۔ اس کے بہت سے بت تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کی مورتی ایک موٹے آدمی کی ہوتی ہے، جو ہنس رہا ہوتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ اور دوسرے میں تھیلا ہوتا ہے۔ مہایان عقیدے کے مطابق یہ بدھستوا پانچ ارب ستر کروڑ سال بعد اس دنیا میں پھر آئیں گے۔ دوسرا بدھستوا منجوسری کہلاتا ہے۔ یہ جرأت اور عقل کا مجسمہ ہے۔ اس کی پیشانی پر پانچ بل دکھائے جاتے ہیں۔ اسے گوتم کا لڑاکا پیشرو اور کبھی کبھی ان کا چھیتا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ تیسرا اوالوکتسوار کہلاتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ محترم ہے اسے رحم اور مہربانی کا مجسمہ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانیت کو مصائب اور آلام سے بچانے کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس کی پرستش برعظیم ہند و پاک میں تیسری سے بارہویں صدی عیسوی تک بڑے زوروں پر تھی۔ تبت میں اسے دلائی لامہ کا نام دیا گیا ہے۔ آٹھویں صدی سے قبل چین میں اس کی پرستش کے آثار نہیں ملتے۔ یہاں اسے نسوانی شکل و صورت دی گئی ہے۔ اور کوان ین نام دیا گیا۔ جاپان میں اسے کوان نون کہتے ہیں۔

بدھستوا کے عقیدے سے بدھ مت میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ اسی کے ذریعے مشرکانہ عقائد نے اس مذہب میں راہ پائی۔ قدیم بدھ مت میں خود غرضانہ نجات کا حصول ہی بنیادی مقصد ہے۔ جس کی وجہ سے ہمدردی اور تعاون نام کو نہ تھا۔ لیکن بدھستوا کے عقیدے نے اس خامی کو دور کر دیا۔ عبادات کا طریقہ بھی رائج ہوا۔ بدھستوا معبود بن گئے۔ راہب پروہتوں کے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ خانقاہیں مندر بن گئیں۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں پجاری جمع ہو جاتے۔ عبادت کی رسوم اور اوقات مقرر ہوئے۔ بدھستوا کو بدھ کا مظہر کہا گیا ہے، جو اعلیٰ حقیقی شے ہے۔ پوری کائنات جس بدھ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے دھیانی بدھ کہا جاتا ہے۔ اس سے پانچ دھیانی بدھستوا پیدا ہوئے ہیں، ہر بدھستوا کے لیے اس دنیا میں ایک انسانی بدھ موجود ہے۔ (نیز دیکھئے "بدھ گوتم" "بدھ مت")

بدھ، گوتم (۵۶۳ ق م۔ ۴۸۳ ق م) مہاتما گوتم بدھ، ہندوستان کے قدیم مذہب بدھ مت کے بانی، اجودھیا (نیپال) کے راجہ سدھودان کے بیٹے تھے جو کپل وستو کے مقام پر حکومت کرتا تھا۔ یہ خاندان سلیا (کھشتری) سے تعلق رکھتا تھا۔ گوتم بدھ کپل وستو کے قریب ترائی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ والدین نے سدھارتھ (کامیاب) نام رکھا۔ ساتویں روز والدہ مایا انتقال کر گئیں۔ بچپن میں گوتم نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی۔ وید پڑھے اور سنسکرت زبان میں مہارت پیدا کی۔ سولہ سال کی عمر میں یسودھا نامی عورت سے شادی ہوئی۔ دس سال تک خوشگوار متاہلانہ زندگی بسر کی۔ ایک لڑکا

راہل بھی پیدا ہوا۔

بچپن ہی سے گوتم کے مشاہدات انسانی زندگی کے بارے میں بہت گہرے تھے۔ انہوں نے ایک مریض، ایک بوڑھے اور ایک میت کو دیکھ کر محسوس کیا کہ انسانیت مصائب اور آلام سے گھری ہوئی ہے۔ انہوں نے سوچنا شروع کردیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔ شاہی محل کی پرتعیش زندگی، بے شمار دولت، حکومت، بیوی کی الفت اور بچے کی محبت بھی انھیں اس امر سے باز نہ رکھ سکی اور انتیس برس ہی کی عمر میں وہ ان تمام مسرتوں کو ٹھکرا کر حقیقی مسرت کی تلاش میں جنگل کی طرف چلے گئے ان کی اس کوشش کو نروان حاصل کرنے کی کوشش کہا گیا ہے، انھوں نے دو، مذہبی راہبوں سے تعلیم حاصل کی لیکن حقیقت کا پتا نہ چل سکا۔

تھائی لینڈ میں مہاتما بدھ کے یادر کے
نشان کی خانقاہ

گوتم کی رہبانیت کی یہ زندگی چھ برس کو محیط ہے۔ بالآخر ایک پیپل کے درخت تلے بیٹھے گیان دھیان کرتے ہوئے اچانک ان پر "انکشاف" ہوا اور انھوں نے زندگی کے ان مسائل کا "حل" دریافت کرلیا۔ اس روز سے انھیں بدھ (روشنی پانے والا) کہا جانے لگا۔ اور اس درخت کو، جس کے تلے انھوں نے نروان حاصل کیا تھا۔ بدھی درکش کہا گیا۔

زندگی کے بقیہ برس گوتم نے تبلیغ میں گذارے۔ ان کے بہت سے پیرو ان کے ساتھ اس تبلیغ میں شامل ہوتے۔ انھیں بھکشو کہا جانے لگا۔ آخری عمر میں ایک راہب دیوادات نے گوتم کی مقبولیت ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

گوتم بدھ کے نزدیک یہ دنیا تین طرح کے مصائب سے گھری ہوئی ہے۔

۱۔ رنج والم، جن سے انسان آئے دن دوچار ہوتا رہتا ہے۔ جن میں بیماری بڑھاپا اور موت بہت اہم ہیں۔

۲۔ عارضی زندگی، یعنی دنیا فانی ہے اور کسی چیز کو قرار حاصل نہیں۔

۳۔ غیر حقیقی۔ دنیا کی تمام چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ کیونکہ اگر یہ حقیقی ہوتیں تو فانی نہیں ہوسکتیں۔

ان مصائب کی روشنی میں گوتم نے زندگی کی چار اعلیٰ صداقتیں "آریہ ستیہ" بتلائی ہیں:۔

۱۔ زندگی دکھ ہے۔

۲۔ دکھ کا سبب خواہشات ہیں۔

۳۔ خواہشات سے خود کو بچایا جائے۔

۴۔ سخت ریاضت اور بے جا تعیش کا درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

گوتم کے نزدیک انسان کے مصائب نہ صرف زندگی میں برقرار رہتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی سکھ نہیں ملتا اور وہ دوسرے وجود میں دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان سے بھی بڑھ کر مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ گویا یہ بدھی اواگون کا نظریہ ہے۔ اس کے نزدیک انسان پانچ عناصر سے مل کر بنتا ہے۔ ۱۔ مادی جسم۔ ۲۔ احساسات ۳۔ شعور۔ ۴۔ رجحانات۔ ۵۔ افکار و تصورات۔ جب انسان مرجاتا ہے تو یہ عناصر بکھر جاتے ہیں۔ صرف اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو نئے عناصر کو پیدا کرتے ہیں جن سے نئی شخصیت وجود میں آتی ہے۔

فہم و فراست کے لیے گوتم مطالعہ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی اصولوں کی پابندی بھی لازمی قرار دی گئی ہے اسکے نزدیک غور و فکر کے ذریعے اس زنجیر کو کاٹ دینا چاہیے۔ جس نے اس وجود کو باندھ رکھا ہے۔

خواہشات سے بچنے کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آٹھ باتوں کی تاکید کی گئی ہے۔

۱۔ صحیح علم و عقیدہ۔ خیالات ہر قسم کے مغالطے سے پاک ہوں۔

۲۔ صحیح ارادہ۔ زندگی کا صحیح مقصد سامنے ہو۔

۳۔ صحیح کلام۔ گفتگو واضح اور نرم ہو۔

۴۔ صحیح عمل۔ امانت اور دیانت کے ساتھ ہر کام کیا جائے۔

۵۔ صحیح سلوک۔ کسی جاندار کو تکلیف نہ دی جائے۔

۶۔ صحیح جدوجہد۔ خود پر قابو پایا جائے۔

۷۔ صحیح یادداشت۔ تمام تجربات کو ہر وقت ذہن نشین کیا جائے۔

۸۔ صحیح غور و فکر۔ زندگی کی گہرائیوں کے متعلق غور و فکر۔

ان آٹھوں کو حاصل کرنے کے لئے چار مرحلے بتائے گئے ہیں۔

۱۔ داخلہ کا مرحلہ۔ جب انسان یہ عہد کرلیتا ہے کہ وہ اس طریقے کو اپنائے گا خواہ کامیابی کے لئے اسے ایک بار زیادہ جنم حاصل کرنا پڑیں۔

۲۔ ایک بار پھر آنے کا مرحلہ۔ جب انسان آخری جنم سے پہلے ایک جنم لیتا ہے۔ اس وقت انسان کے فاسد خیالات دور ہوجاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر انسان بہت کچھ ترقی کرلیتا ہے۔

۳۔ تیسرا مرحلہ آخری جنم کا ہے۔ اس میں باقی ماندہ توہمات کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کوئی جنم نہیں۔

۴۔ چوتھا مرحلہ حقائق کی آگاہی اور موت کا درمیانی وقفہ ہے۔ موت کے ساتھ ہی انسان نروان حاصل کرلیتا ہے۔

گوتم کا کہنا ہے کہ خلوص اور محبت کی زندگی بسر کرکے ہر کس و ناکس اعلیٰ ترین نجات یعنی مکتی حاصل کرلیتا ہے۔ (نیز دیکھئے "بدھ ستوا"، "بدھ مت")

بدھ مت ایک مذہب، جس کا بانی گوتم بدھ تھا۔ یہ دراصل ہندوستان کے

برہمن مذہب کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ جو چھٹی صدی قبل مسیح میں برہمنی مذہب کے نقائص کو دور کرنے کے لئے وجود میں آیا۔ گیارہویں صدی عیسوی تک مشرق بعید میں پوری قوت سے پھیلا۔ اگرچہ بعد ازاں بہت سے بدھ مسلمان ہو گئے مگر آج بھی پوری دنیا کی آبادی کا گیارہ فیصد ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ بدھ برما (۹۰٪) تھائی لینڈ (۸۰٪) لنکا (۷۰٪) اور جاپان (۶۰٪) میں ہیں۔ [illegible] ہندوستان میں [illegible] اور بنگلہ دیش میں [illegible] ہیں۔ علاوہ بریں کمبوڈیا، انڈونیشیا، نیپال، [illegible] اور تبت میں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں اور کچھ تعداد یورپ اور امریکہ میں بھی آباد ہے۔

فلسفہ: بدھ مت بنیادی طور پر ہندو مت ہی کی ایک صورت ہے۔ کثرت پرستی اور ذات پات [illegible] بنیادی چیزیں تھیں، جو ہندو دھرم کی اشاعت پر ضرب کاری [illegible] نقائص کو دور کرنے پر صرف کر دیا۔ [illegible] فلسفیانہ افکار کی آمیزش سے بدھ مت نے جنم لیا [illegible] طریق عبادات و تزکیہ نفس تھا۔ [illegible] جن پر کاربند [illegible]

[illegible] نجات کے حصول [illegible] مذہب [illegible] دراصل [illegible] پنشد کے تیار [illegible] کی گئی ہے تو دوسری [illegible] خالق مخلوق کے خلاف [illegible] کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کے [illegible] کے تحت چل رہا ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی عبادت [illegible] عبادت، قربانی، توبہ، کفارہ وغیرہ کا [illegible] سے [illegible]

گوتم نے اپنی تعلیمات میں آٹھ باتوں کے صحیح ہونے کی تاکید کی تھی۔ وہ یہ ہیں علم، ارادہ، گفتار، عمل، سلوک، جدوجہد، یادداشت، غور و فکر۔ اس راستے پر گامزن ہونے والوں سے بدھ مت چند چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ شہری زندگی کو خیرباد کہہ دیں۔ گھر، خاندان، پیشہ، سماج وغیرہ سب کو چھوڑ کر آوارہ گردی کی زندگی بسر کی جائے یا ترک الدنیا لوگوں کی مصاحبت اختیار کی جائے۔ جائے رہائش کا آبادی سے دور ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے لباس بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ جو تین کپڑوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک تہبند ایک اوپر کی دھڑ کا کپڑا اور ایک چادر شامل ہے۔ سر اور داڑھی کے بال بالکل مونڈ دیئے جاتے ہیں۔ خوراک بھیک مانگ کر حاصل کی جاتی ہے۔ محنت اور مزدوری ممنوع قرار دی گئی ہے۔ بھیک مانگنے کے آداب مقرر ہیں۔ ابتدا میں گوشت خوری کی اجازت تھی۔ بعد ازاں یہ ممنوع قرار دے دی گئی۔

اس راہبانہ زندگی میں ہر شخص داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے رنگ و نسل ذات پات وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ البتہ چند لوگوں پر اس کے دروازے بند ہیں مثلاً غلام اور مخصوص بیماریوں میں مبتلا۔

ان راہبوں کو بھکشو کہا جاتا ہے۔ ان کے لئے دس اصول مقرر ہیں، جن پر انہیں سختی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ یعنی قتل، سرقہ، زنا، جھوٹ، منشیات، شام کا کھانا رقص و سرود۔ آرائش و زیبائش۔ بلند مسند اور سونا چاندی وغیرہ سے اجتناب۔ ان کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی کئی چیزیں ہیں۔ جن سے اجتناب ضروری ہے۔ بھکشو کے لئے حکم ہے کہ وہ ہر مہینے میں دو بار احتساب نفس کرے اور دیکھے کہ کہیں ان احکام کی خلاف ورزی تو نہیں ہوئی۔ احتساب نفس کے دن کو "اپاستھ" یعنی روزے کا دن کہا جاتا ہے۔ ان تمام عبادتوں کا صلہ صرف داخلی سکون اور اطمینان "نروان" ہے چونکہ ایسی سخت ریاضت ہر کوئی نہیں کرسکتا اس لئے عام لوگوں کے لئے پہلی پانچ چیزوں سے اجتناب اور نیک چلنی کی زندگی بسر کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ نروان تو حاصل نہیں کرسکیں گے مگر اگلی زندگی میں بھکشو کا مرتبہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ہندوستان میں بدھ مت ہی وہ پہلا مذہب ہے، جس نے عورت کو مذہبی امور کی ادائیگی میں شریک کیا۔ ورنہ برہمنوں نے تو اسے مذہبی معاملات سے بہت دور رکھا تھا۔

کتب: ابتداء میں گوتم بدھ کی تعلیمات سینہ بسینہ چلتی رہیں۔ گوتم کی وفات کے بعد انہیں کتابوں کی صورت میں مدون کیا گیا۔ بدھ مت کے پیروؤں کے مابین مذہبی اختلافات ختم کرنے کے لئے مگدھ کے قریب ایک مقام راجا گاہ میں اجتماع ہوا اور گوتم کے چیلوں نے اس موقع پر گرو کے احکامات سنائے۔ ایک شاگرد کسیاپ نے گوتم کے فلسفیانہ اقوال لوگوں کے سامنے دہرائے۔ ایک اور شاگرد اپالی نے ضبط نفس کے اصول و قوانین لوگوں کے سامنے پیش کئے۔ نیز ان حالات کی نشاندہی بھی کی جن کے تحت قوانین وضع کئے گئے تھے۔ اور سب سے مشہور شاگرد آنند نے گوتم کی مختلف تقاریر کو دہرایا جو بعد میں سُت کہلائیں۔ یہ تمام امور طے کئے گئے لیکن انہیں لکھا نہ گیا۔ ۲۴۲ ق۔م میں اشوک نے انہیں ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ ابتداء میں دو حصے "ونیان پٹاک" اور "ست پٹاک" لکھے گئے۔ اول الذکر میں راہبانہ زندگی کے اصول بیان ہوئے اور موخر الذکر میں گوتم کی تقاریر اور تعلیمات درج کی گئیں۔ بعد ازاں تیسرا حصہ "ابی دھرم پٹاک" بھی شامل کیا گیا اور اس کتاب کا نام "تری پٹاک" رکھا گیا۔ ابتداء میں اسے پالی زبان میں لکھا گیا۔ جو اس دور کی عوامی زبان تھی۔ بعد ازاں گوتم کی تعلیمات کے خلاصے کے طور پر "دھم پد" اس کے نام سے ایک اور کتاب لکھی گئی جو دراصل "ست پٹاک" کی تلخیص تھی۔

تاریخ: ہندوستان میں برہمنوں کے مذہب نے ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری اور ذات پات کی تفریق کی وجہ سے عوام نالاں تھے۔ اس نئے مذہب کی غیر معمولی خصوصیات نے عوام کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر یہ حیرت انگیز رفتار کے ساتھ مشرق بعید میں پھیلتا چلا گیا۔ تین سو سال قبل مسیح میں یہ مذہب شمالی ہندوستان پر چھا چکا تھا۔ ہندو بادشاہ اشوک (۲۷۳ ق۔م تا ۲۳۲ ق۔م) نے بدھ مت قبول کر لیا تو اس کی سرکاری اشاعت کا آغاز ہوگیا۔ اشوک نے پتھروں اور ستونوں پر کتبے لکھوا لئے۔ اس وقت بہت سے راہب اور برہمن بھی شاید سرکاری اثر یا خوف کے باعث اس میں داخل ہوگئے۔ جس کی بنا پر بد اعتقادیوں نے جنم لیا۔ ان کے ازالے کے لئے اشوک نے ایک کونسل طلب کی، جس میں مذہب کی تطہیر عمل میں آئی۔ اشوک نے مبلغین کی ایک جماعت بھی بھیجی، جو جنوبی ہند اور لنکا کے علاوہ جنوبی اور مشرقی ایشیا میں بدھ مت پھیلانے کا سبب بنی۔ اشوک کے بعد کنشک نے بھی اس مذہب کی اشاعت کی۔ اس نے بدھوں کی چوتھی کانفرنس منعقد کرائی۔ جس میں بدھ مت پر تشریحی اور تفسیری قسم کی کتابیں لکھی گئیں۔

بدھ مت کے عروج کا زمانہ چھٹی سے آٹھویں صدی عیسوی تک ہے۔ اس دور

میں ہندو مت کی امتیازی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور ہندوستان میں ہر طرف بدھ مت ہی چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ رفتہ رفتہ برہمنوں نے اسے بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۷۸۸ء سے ۸۲۰ء تک ایک برہمن کماریل بھٹ نے ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا۔ بدھوں پر زبردست مظالم روا رکھے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان سے بدھ مت سرے ہی سے غائب ہو گیا۔ صرف اڑیسہ، بہار اور کشمیر کے علاقوں میں کہیں کہیں اس کے پیروکار موجود تھے۔ بارہویں صدی عیسوی میں اسلام کے آنے کے بعد یہ مذہب سرزمین ہندوستان سے عنقا ہو گیا۔ تاہم دیگر ممالک مثلاً تبت، چین، جاپان اور مشرق بعید کے اکثر ممالک میں اس مذہب کو اپنا لیا گیا۔ تبت میں یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی میں پہنچا۔ چین میں یہ بہت پہلے سے موجود تھا مگر یہاں اس مذہب کی اشاعت بڑی سست رفتاری سے ہوئی۔ اس کی وجہ یہاں تاؤ مت اور کنفیوشس مت کا اثر تھا۔ ایک وقت آیا کہ عوام نے تینوں مذاہب کو بیک وقت قبول کر لیا۔

چینی بدھ مت کثرت پرستی اور آبا پرستی کا شکار رہے۔ گوتم ان کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔ دیگر دیوتا ان کے آبا و اجداد ہیں۔ اگرچہ یہاں قدیم بدھ مت کے احیا کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں مگر اس تحریک سے سوائے ایک نئے فرقہ "دوری کیان" کے جنم لینے کے اور کچھ بھی وجود میں نہ آیا۔ یہ فرقہ سولہویں صدی میں بہت طاقتور بن گیا۔ یہ لوگ گوتم پر عقیدہ رکھتے ہیں مگر اس کی پرستش نہیں کرتے۔ گوتم کی مورتی رکھنے کے شدید مخالف ہیں۔ پاکیزگی کے حصول کا ذریعہ ان کے نزدیک صرف دھیان یا مراقبہ ہے۔ ان کے یہاں پجاری کا وجود نہیں۔ اس میں کسی حد تک تاؤ مت کے اثرات موجود ہیں۔

چین سے بدھ مت کوریا پہنچا اور ساتویں صدی کے اوائل میں یہ جاپان میں پروان چڑھا۔ شنٹو مذہب والوں کے دیوتاؤں کو انہوں نے بدھستوا کا درجہ دیا۔

مذہبی معاملات میں جاپان عرصہ تک چین کا دست نگر رہا۔ لیکن بعد ازاں خود کفیل ہو گیا۔ ۱۸۶۸ء تک بدھ مت سرکاری مذہب کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن بعد ازاں شنٹو مذہب نے یہ خصوصیت اس سے چھین لی۔

ہندوستان میں بدھ مت اب صرف بنگال کے علاقے یا نیپال وغیرہ میں موجود ہے البتہ لنکا میں اس مذہب کی جڑیں بے حد مضبوط ہیں۔ وہاں نفیس خانقاہیں تعمیر ہیں۔ بے شمار رسومات نے بھی راہ پالی ہے۔ مورت کی پرستش کا آغاز ہو گیا ہے۔ گوتم کی مورت خانقاہوں کا اہم جزو ہے۔ ان خانقاہوں کو ویرا کہتے ہیں۔ ہر ویرا میں پیپل کا ایک درخت ضرور ہوتا ہے۔ یہاں عبادت کا طریقہ یہودیوں کی طرح کا ہے۔ لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور راہب مقدس کتابیں پڑھ کر حاضرین کو سناتے ہیں۔

فرقے: بدھ مت کے دو بڑے فرقے مہایان اور ہنایان ہیں۔ کنشک کے دور میں بلا نگی کونسل سے جو مذہب وجود میں آیا اسے مہایان یعنی "بڑی گاڑی" کا نام ملا جبکہ اس کے مخالفوں یعنی قدیم بدھ مت والوں کو ہنایان یعنی "چھوٹی گاڑی" کا نام دیا جاتا ہے

مہایان ایک ایسا مذہب ہے جس میں عوام کی تکالیف کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس امر کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ بدھ مت میں انسانی جذبات کو متاثر کرنے والے امور شامل کئے جائیں۔ کیونکہ بدھ مت کے بنیادی اصول ایک فلسفی کو تو مطمئن کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے دل دادہ لوگوں کی تعداد ہر زمانے میں کم رہی ہے۔ بدھ مت میں اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے دور دراز کے باشندے بھی اس اصلاح یافتہ مذہب میں شامل ہو گئے۔ مہایان نے بدھ مت میں خدا کے تصور کو داخل کیا۔ جس کے بارے میں انہوں نے دعوے کیا کہ وہ بدھ کی صورت میں نمودار ہوا تھا

اس کی غیر مرئی صورت علم کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ علم یا بدھی بھی تین صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پہلا دھرم کایا کہلاتی ہے، یعنی دنیا کی عارضی نمو کے پیچھے کوئی دائمی اور غیر فانی شے موجود ہے۔ لیکن دھرم کایا جب خود کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو کوئی روپ دھار لیتا ہے، جو نرمان کایا کہلاتا ہے۔ تیسری صورت سمبھوگ کایا کی ہے۔ یعنی یہ رحمت کی قوت ہے جو گوتم کے پیروؤں میں کام کرتی رہتی ہے۔ ان تینوں کو استری کایا کہا جاتا ہے۔ خدا کو انہوں نے بدھستوا کا نام دیا۔ ان کے عقیدے کی رو سے بدھستوا گوتم کے علاوہ اور بھی صورتوں میں آ رہا ہے۔ چنانچہ جاپان کے مہایان فرقے میں اس وجہ سے کثرت پرستی نے راہ پالی ہے۔ تاہم اس کا ازالہ اخلاقی اصولوں کی صورت میں کر دیا گیا ہے۔ مہایان نے نروان کے حصول کے بعد کی زندگی کا واضح تصور پیش کیا ہے۔ گوتم نے نروان ہی کو اصل مقصد قرار دیا تھا۔ جبکہ مہایان نے آخرت اور جزا کا تصور بھی پیش کیا ہے۔

مہایان نے صرف اخلاقی اور سماجی اصولوں ہی کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اعلیٰ دماغ اور تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بھی تسکین کا سامان ہے۔ گوتم نے فلسفیانہ خیالات کی توضیح و تشریح کے لئے بے شمار موضوعات پر بحث کے دروازے کھول دیئے جس کی وجہ سے مہایانی فلسفہ نہایت دقیق ہو گیا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ دنیا ویسی نہیں جیسی ہمیں نظر آتی ہے۔ ایک طبقے کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ دنیا کا وجود صرف ہمارے ذہن میں ہے، خارج میں نہیں۔ چنانچہ گوتم نے وجود کی جو تین بنیادی صفات بیان کی تھیں۔ (۱) مصیبت زندگی۔ (۲) عارضی پن (۳) غیر حقیقی پن۔ ان کی جگہ یہ تین نئی صفات ۱۔ خالی پن۔ ۲۔ بے صفتی ۳۔ بلا خواہش وجود۔

یہ مذہب شمالی علاقوں نیپال، تبت، چین، منچوریا، کوریا، منگولیا، جاپان میں بے حد مقبول ہوا۔ تبتی مہایان زندہ بدھوں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے پروہت کو "لاما" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ گوتم کی روح لاما میں حلول کر گئی ہے یا گوتم بدھ ان لاماؤں کے بھیس میں بار بار جنم لیتے ہیں۔ تبتی مذہب میں ہندو دیوتاؤں کی پرستش بھی شامل ہو گئی ہے۔ چین میں مہایان نے تاؤ اور کنفیوشس کے ساتھ اشتراک کر لیا۔ یہاں کثرت پرستی کا آغاز ہوا۔ چینی راہب عام طور پر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں بالعموم بچپن ہی میں خانقاہوں میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں انہیں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ لوگ [illegible] کی صورت میں خیرات مانگنے نکلتے ہیں۔ ان کا لباس پیلے رنگ کا ہوتا ہے اور سر [illegible] بار مونڈا جاتا ہے۔ جاپان میں مہایان سے ایک اور فرقے زین بدھی نے جنم لیا۔ اس کا دعوے ہے کہ مقدس کتابوں کے ذریعے حق تک رسائی ممکن نہیں [illegible] صداقت ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ اس کے جاننے کے لئے یوگ [illegible] کی ضرورت ہے۔ وہ ہدایت کا ذریعہ وجدان کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک [illegible] اور رنج دونوں صورتوں میں عزت اور وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

ہنایان اس کے برعکس قدامت پسند فرقہ ہے۔ یہ جنوبی علاقوں [illegible] میں پھیلا۔ اس نے کسی حد تک گوتم کی تعلیمات کو برقرار رکھا ہے۔ [illegible] تین کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ جن کی تعلیم گوتم نے دی تھی۔ کسی حد تک [illegible] عقائد مثلاً بت پرستی وغیرہ بھی اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ نروان کے متعلق ہنایان فرقے والوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد روح کو مکمل سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ [illegible] مذہب کی نمایاں خصوصیت سادگی ہے۔ سوائے چند بڑے بڑے شہروں [illegible] کینڈی، رنگون اور بنکاک کے۔ ان کی خانقاہیں سادہ طرز تعمیر کی حامل ہیں۔ البتہ لنکا کے ہنایان کے ہاں نفاست اور آرائش نے جگہ پالی ہے۔ ان کی مذہبی کتابیں پالی زبان میں ہیں۔ (نیز دیکھئے "بدھستوا، بدھ، گوتم")

بدی برائی۔ بدخواہی۔ شر۔ متضاد اچھائی، نیکی۔ اسلام نے بدی یا شر کا کوئی مستقل وجود نہیں مانا ہے بلکہ بدی جو کچھ محض ان قویٰ کے غلط استعمال کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں۔ اس لیے بدی اور نیکی کا خالق ایک ہی ہے۔ کیونکہ جو چیزیں اچھے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہیں انہی کے برے استعمال کا نام بدی ہے۔

زرتشت کے مذہب میں بدی اور نیکی کے دو الگ الگ خالق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے بدی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان غالب نہ آ سکے۔ بلکہ انسان کی ساری جدوجہد کی اصل غرض یہی ہے اور یہی اس کا نصب العین بھی ہونا چاہیے کہ وہ بدی پر غالب آئے اور ایسے لوگوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے بدی پر غلبہ حاصل کیا۔

نیکی سے روکنے والے شیاطین بدی کو ایسا خوب صورت کر کے بتاتے ہیں کہ بدکار سمجھتے ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں اور جب انسان بدی میں بہت زیادہ مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اسے اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح نور فطرت بالکل دب جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ان کے دلوں پر اس نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کام کرتے تھے (۸۳: ۱۴) یعنی انسان کے اپنے عمل جس طرح دل پر زنگ ہو جاتے ہیں۔ مہر بھی کر دیتے ہیں۔ زنگ کا لگنا پہلا درجہ ہے اور مہر لگ جانا آخری درجہ۔ آنحضورؐ نے فرمایا: جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لے تو اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ گناہ کرتا چلا جائے تو وہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ (ترمذی)

لوگوں کی روشنی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی تھی بدی کے سبب بالکل دب جاتی ہے۔ اگرچہ یہ بات ضرور ہے کہ بدی میں خواہ انسان کو کتنا ہی لطف آتا ہو اس کے اندر نفسِ لوامہ ملامت کرتی رہتی ہے اور خواہ یہ فطرت صحیحہ اس کے اندر کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو گئی ہو۔

بدی کے نتائج جب انسان کے سامنے آئیں گے تو اس وقت وہ شخص گویا قرآن کی اس آیت کا مصداق ہو گا۔ یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے ہٹا دیا پس تیری نگاہ آج تیز ہے۔ (۵۰: ۲۲) اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بدی کے نتائج بد تو یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں مگر انسان کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑا ہوتا ہے اور وہ لذات دنیا میں مشغول ہونے کی وجہ سے انہیں نہیں دیکھتا۔

بدی کی سزا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب وہ کچھ نیکیوں کیساتھ ملی ہوتی ہے اس وقت تک کھلے طور پر بدی کی سزا ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک قوم کی کثرت بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے نتائج کھلے رنگ میں ظاہر ہو جاتے ہیں اس قوم کی تباہی لازمی ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ایسی بہت سی قوموں کا ذکر موجود ہے جنہیں اپنی بدکاریوں کی وجہ سے تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔

قرآن مجید نے بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اسے دور کرنے کے لیے بہترین طریق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ (۲۳: ۹۶) اور یہ بہترین طریق بعض اوقات بالمقابل نیکی کا اختیار کرنا ہے اور بعض اوقات صرف بدی سے درگزر کرنا۔ اسی طرح بعض اوقات اس پر ملامت کرنا اور بعض اوقات اس کی سزا دینا ہے۔
(نیز دیکھیے "شر"، "گناہ")

بدیع الدین شاہ مدارؒ (۱۵/ ۱۳۱۵ء - ۱۰ جمادی الاول ۸۴۴ھ / اکتوبر ۱۴۴۰ء) شاہ مدار بدیع الدین قطب المدارؒ بن سید علی، ہندوستان کے ایک مشہور ولی۔ حلب میں پیدا ہوئے۔ ان کے نسب میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ کی اولاد میں سے تھے اور بعض انہیں یہودی النسل بتاتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک وہ امام محمد باقرؒ کی نسل سے تھے۔ ان کی تعلیم بڑے اچھے طریقے سے کی گئی۔ ان کے متعدد مرشد تھے جن میں سے شام کے صوفی طیفور الدین بھی تھے۔

شاہ مدار نے ایک دنیا کی سیر و سیاحت کی۔ کئی بار حج کیے۔ ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے بغداد، نجف اور کاظمین کی زیارت کی۔ انہوں نے کانپور سے چالیس میل دور مکن پور نامی گاؤں میں سکونت اختیار کی اور یہیں وفات پائی۔

شاہ مدار بہت ہی خوب صورت تھے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رکھتے تھے جونپور کا سلطان ابراہیم شاہ ان کی بڑی عزت و احترام کرتا تھا۔ اس نے ان کی قبر پر نہایت شاندار مزار تعمیر کرایا۔ عرس کے موقع پر عقیدت مند پیدل چل کر آتے ہیں اور لمبے لمبے بانسوں پر رنگ برنگے کپڑے اور رومال وغیرہ باندھ کر لاتے ہیں انہیں شاہ مدار کی چھڑیاں کہا جاتا ہے۔

بُدیلؓ بن ورقا (وفات ۱۰ھ/ ۶۳۱ء) صحابی۔ قبیلہ بنو خزاعہ کے سردار تھے، جو مکہ معظمہ کے نزدیک سکونت رکھتا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اور کفاران قریش کے منصوبوں سے مسلمانوں کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ جب آنحضورؐ عمرے کے ارادے سے مکہ تشریف لائے تو قریش نے احابیش کے اجتماع میں اعلان کیا کہ آپؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک لشکر تیار کیا۔ اس موقع پر بدیل چند رفقاء کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر آئے اور قریش کے منصوبوں سے آپؐ کو آگاہ کیا۔ آنحضورؐ نے ان کے ذریعے قریش کو پیغام بھجوایا کہ مسلمان جنگ کے لیے نہیں آئے محض عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور اس کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے آنحضورؐ کا یہ پیغام قریش کو پہنچا دیا اور اس کے بعد کچھ سفیروں کے تبادلے ہوئے اور یوں صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا گیا۔

فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں بدیلؓ نے اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام کے وقت بدیلؓ کی عمر ستانوے سال کی تھی۔ لیکن بال سیاہ تھے۔ آنحضورؐ نے انہیں دعا دی کہ خدا تمہارے جمال اور بالوں کی سیاہی میں ترقی دے۔

بدیلؓ ایک اچھے سیاستدان اور مدبر تھے۔ شروع ہی سے آنحضورؐ کے حلیف رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے بدیلؓ کے گھر کو بھی امان کا مقام قرار دیا فتح مکہ کے بعد بدیلؓ نے غزوہ حنین میں شرکت کی اور اس موقع پر مال غنیمت اور مشرک قیدیوں کی نگرانی انھی کے سپرد ہوئی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر وہ آنحضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ اور آپؐ کے ارشاد کے مطابق منیٰ میں روزہ نہ رکھنے کا اعلان کرتے پھر رہے تھے۔

حضرت بدیلؓ کو آنحضورؐ نے ایک خط بھی تحریر فرمایا تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

انہوں نے آنحضورؐ کے وصال سے قبل وفات پائی۔　اولاد میں عبداللہؓ

نافعؓ اور ایک تیسرا بیٹا تھا جو حضرت عثمانؓ کے محاصرین میں شامل تھا۔ ان سے تین احادیث روایت کی جاتی ہیں۔

بڈشاہ (دورِ حکومت ۸۲۲ھ/۱۴۲۰ء - ۸۷۲ھ/۱۴۷۰ء) زین العابدین شاہ رخ مرزا بڈشاہ یعنی بڑا بادشاہ کشمیر میں شاہ میری سلاطین کا آٹھواں حکمران، والد کا نام سلطان سکندر تھا۔ نوجوانی میں مولانا کبیر شاہی خان سے تفسیر اور حدیث پڑھی۔ ۱۳۹۹ء میں جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ اپنے والد کی طرف سے تیمور کی خدمت میں تحفے تحائف لے کر حاضر ہوا اور اس کے ساتھ ہی سمرقند چلا گیا۔ وہاں سات سال بسر کرنے کے بعد واپس لوٹا۔ ۸۱۹ھ/۱۴۱۷ء میں اپنے بڑے بھائی علی شاہ کا وزیرِ اعظم بنا۔ ۸۲۱ھ/۱۴۱۹ء میں اس نے علی شاہ سے حکومت چھین لی۔ علی شاہ نے اپنے خسر (جموں کے راجہ) سے مل کر کشمیر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اوڑی کے مقام پر بڈشاہ نے اسے شکست فاش دی اور باقاعدہ طور پر تخت نشین ہو گیا۔
بڈشاہ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد خان کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ اور اس کی وفات کے بعد اپنے بیٹے حیدر خان کو وزیرِ اعظم بنایا۔ اس کی سلطنت پشاور سے سرہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دہلی کو فتح کرنے کی بھی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ۱۴۶۰ء اور ۱۴۷۰ء کے درمیانی عرصہ میں اس نے کاشغر، لداخ، سکردو اور کلو کے علاقے فتح کئے وہ پنجاب کو فتح کرنے کے دوران میں امرتسر بھی ٹھہرا۔ باون سال حکومت کرنے کے بعد اس نے وفات پائی۔ اس کا مزار قبرستانِ سلاطین سری نگر میں ہے
ابوالفضل لکھتا ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے تک کا علاقہ بڈشاہ کے زیر اثر تھا۔ اس کی فوج ایک لاکھ پیدل اور تیس ہزار سوار افراد پر مشتمل تھی۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ایک ضابطہ قانون بنایا اور خاص خاص قوانین پیتل کی تختیوں پر کندہ کروا کر مختلف شہروں اور دیہات میں لگوا دیئے۔ اسے عمارتیں، باغات اور پل بنانے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے جامع مسجد بارہ مولا، جامع مسجد سری نگر مسجد کالدہ یار، جامع مسجد نوشہرہ، خانقاہ چرار شریف، خانقاہ برخوردار سری نگر خانقاہ شیخ العالم خانقاہ سید مدنی، باغ زینہ گر، باغ نوشہرہ، باغ زینہ پور، باغ زینہ کوٹ وغیرہ اور پلوں میں زینہ کدل، پل نالہ مار، بڈشاہی ہفت پل وغیرہ تعمیر کرائے۔
ڈیری ناگ پر اس نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کرائی جو زینہ لنکا کے نام سے مشہور ہے۔ نوشہرہ میں بارہ منزلہ دربارِ عام بنوایا جسے زینہ دب کہتے ہیں۔
اس کے بیرونی ممالک سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن میں خراسان، ترکستان، آذربائیجان، گیلان، سیستان، ترکی، مصر، دکن، مالوہ، خاندیش، گجرات اور سندھ شامل ہیں۔
بڈشاہ علم دوست بادشاہ تھا۔ فارسی، تبتی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ اس کا ایک بڑا ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس نے دارالحکومت میں ایک بہت بڑا دارالعلوم قائم کیا، جس میں دوسرے ممالک کے طلبا تعلیم پاتے تھے
اگرچہ بڈشاہ ایک نرم دل بادشاہ تھا لیکن قانون کے معاملے میں وہ اپنے بیٹے اور بھائی سے بھی رعایت نہ کرتا تھا۔ اس نے غلاموں کو داغنے کا رواج ختم کرایا غیر مسلموں سے بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اس نے وہ تمام قوانین، جو ہندوؤں کے خلاف تھے منسوخ کر دیئے۔ ہندوؤں سے جزیہ لینا بھی بند کر دیا۔ اس نے ہندو پنڈتوں کے وظائف مقرر کئے۔ ہندوؤں کی دلجوئی کی خاطر گاؤکشی بھی بند کرا دی۔ کئی پرانے مندروں کی مرمت کرائی۔ ہندوؤں سے عہد لیا کہ اپنے مذہبی قوانین کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ان کے لئے ہندو عدالتیں قائم کیں۔ ہندوؤں کی کتابوں کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اسی وجہ سے اسے ہندی میں بڈشاہ (ہندوؤں کا بادشاہ) بھی کہا جاتا ہے۔
روایت ہے کہ اس نے کئی مرتبہ زینہ لنکا میں چلہ کشی کی اور لوگوں کو کشف و کرامات دکھائے۔ اکثر لوگ اسے ولی سمجھتے تھے۔ اس کی نگاہ کبھی کسی نامحرم عورت پر نہ پڑی تھی اور وہ شاہی خزانے سے کچھ نہ لیتا تھا۔ عوام کے حالات کا پتا لگانے کے لئے راتوں کو بھیس بدل کر شہر میں گھوما کرتا تھا۔
بڈشاہ کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے اولادِ نرینہ نہ تھی۔ دوسری بیوی سے چار بیٹے تھے۔ اس کے بعد حاجی خان سلطان حیدر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

براءؓ بن عازب (۱۲ قبل ہجری ۶۱۰ء - ذی قعدہ ۷۲ھ مارچ ۶۹۲ء) آپ کی کنیت ابو عمارہ، بنو حارثہ سے تعلق تھا۔ مدینہ میں اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر اور احد میں کم عمری کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے لیکن ان کے بعد تقریباً پندرہ غزوات میں اور دیگر اسلامی جنگوں میں بھی شرکت کی۔ رے اور قزوین کو انہوں نے اسلامی مقبوضات میں شامل کیا۔ مسلمانوں کے مابین ہونے والی جنگوں میں انہوں نے حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں شرکت کی
آخر عمر میں کوفہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ اس دوران [illegible] جاری رہی۔ کوفے میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے تھے جو کوفہ کے محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔

براءؓ بن مالک (وفات ۲۰ھ/۶۴۰ء) صحابیِ رسولؐ۔ حضرت انسؓ بن مالک کے بھائی تھے۔ ہجرت سے پیشتر اسلام [illegible] غزوہ بدر کے سوا ہر غزوے میں شریک ہوئے۔ صلح حدیبیہ میں بیعتِ رضوان کے موقعہ پر آنحضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جنگ یمامہ میں جو مسیلمہ کذاب سے ساتھ ہوئی تھی انھوں نے کمال جرات کا مظاہرہ کیا۔ [illegible] انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے اس باغ میں [illegible] جس میں دشمن محصور ہو کر لڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دشمن کی صفوں میں جا گھسے۔ سخت حملہ کیا۔ اور بہادری سے لڑتے ہوئے باغ کا دروازہ کھول دیا اس طرح مسلمان باغ میں داخل ہو گئے۔ اس دوران [illegible] سے زائد زخم آئے اور حضرت خالدؓ بن ولید ایک ماہ تک ان کے زخموں کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ اور بالآخر شفا پائی۔
حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جب عمر فاروقؓ کے حکم کے مطابق لشکر لے کر بصرہ کے محاذ پر گئے تو براءؓ بھی اسی لشکر میں شامل تھے۔ [illegible] میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔ ۲۰ھ میں تستر (فارس) [illegible] کے دوران میں انھوں نے اسلامی لشکر کے میمنہ [illegible] کی قیادت کی جب مسلمانوں نے سرنگ کے ذریعے شہر میں داخل ہونے [illegible] حضرت براءؓ حضرت مجزاہؓ کو ساتھ لئے ہوئے شہر کے وسط میں جا نکلے موخر الذکر کو تو دشمنوں نے دیکھتے ہی ایک پتھر مار کر شہید کر دیا لیکن [illegible] کر مقابلہ کیا اور تقریباً ۱۰۰ کافروں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد شہید ہوئے۔
حضرت براءؓ آنحضورؐ کے صحابہ خاص میں سے تھے۔ ہر وقت کی صحبت کے باعث سینکڑوں احادیث سننے کا موقع ملا تھا۔ مختلف کتب حدیث میں ان سے کئی احادیث روایت ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی بہادری کے سبب انہیں [illegible]

کا خطاب دیا تھا۔

براءؓ بن معرور صحابی رسولؐ۔ ابو بشر کنیت۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ اور رئیس قبیلہ تھے۔ آنحضورؐ نے ان کو بنو سلمہ کا نقیب مقرر فرمایا۔ ۶۲۲ء میں حج کے موقع پر جو بہتر انصار آنحضورؐ کی بیعت کرنے آئے تھے، ان میں سے سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھے۔ ان سب کی طرف سے آنحضورؐ کی حفاظت و نصرت کا عہد انھوں نے ہی کیا تھا۔ یہ پہلے ہی سے خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بعد میں آنحضورؐ کے ارشاد کے مطابق بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ مرنے سے پہلے وصیت کی کہ میری میت قبلہ رُخ رکھنا۔ آنحضورؐ کی ہجرت مدینہ سے ایک ماہ پہلے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ہجرت کے بعد آنحضورؐ نے ان کی قبر پر صحابہ کی معیت میں دعائے مغفرت کی۔ اور ان کے بیٹے حضرت بشر کو جو بدری صحابی تھے ان کی جگہ بنو سلمہ کا سردار نامزد فرمایا۔ حضرت براءؓ نے وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرے مال کا تیسرا حصہ رسول اللہ جس طرح چاہیں تقسیم فرمائیں۔ چنانچہ آنحضورؐ نے وہ مال ان کے وارثوں میں تقسیم فرما دیا۔ ان کے بھائی قیس بن معرور بھی صحابی تھے۔

براءۃ آزاد ہونا۔ بیزاری کا اظہار کرنا۔ بری ہونا۔ کسی ذمہ داری اور پابندی سے سبکدوش ہو جانا۔ نیز قرآن مجید کی نویں سورت کا نام بھی ہے جسے سورۃ التوبہ بھی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ تین مرتبہ آیا ہے۔ "اعلان براءۃ ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان مشرکین کے لیے جن سے تم نے معاہدے کیے تھے" (۹:۱)۔ یہ اعلان اس وقت نازل ہوا جب آنحضورؐ حضرت ابوبکرؓ کو حج کے لیے روانہ کر چکے تھے۔ ان کے پیچھے جب یہ فرمان نازل ہوا تو صحابہ کرام نے آنحضورؐ سے عرض کیا کہ اسے ابوبکرؓ کو بھیج دیجیے تاکہ وہ حج میں اس کو سنا دیں لیکن آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ کا اعلان میری طرف سے میرے ہی گھر کے کسی آدمی کو کرنا چاہیے۔ پھر آپ نے حضرت علیؓ کو اس خدمت پر مامور کیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ حاجیوں کے مجمع عام میں سورت سنانے کے بعد حسب ذیل چار باتوں کا اعلان بھی کریں۔ ۱۔ جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہو گا جو دین اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔ ۲۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ ۳۔ بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔ ۴۔ جن لوگوں کے ساتھ رسولؐ کا معاہدہ باقی ہے یعنی جو نقض عہد کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ان کے ساتھ مدت معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔ قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوا۔

"کیا تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لیے کوئی براءۃ (معافی) لکھی ہوئی ہے۔" (۵۴:۴۳)

اسی طرح سورۃ الممتحنہ میں ہے۔ "ہم تم سے اور ان سے، جن کی تم عبادت کرتے ہو، براءۃ کرتے ہیں، یعنی بیزار ہیں۔" (۶۰:۴)، (نیز دیکھیے "سورۃ توبہ")

بُراق شب معراج میں آنحضورؐ کی سواری۔ قرآن مجید کی آیت کے ضمن میں مفسرین نے بُراق کا ذکر کیا ہے۔

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی۔ تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے (۱۷:۱) کے ضمن میں مفسرین نے براق کا ذکر کیا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے اس سواری کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ایک جانور ہے جو خچر سے کچھ چھوٹا اور گدھے سے ذرا بڑا سفید رنگ کا تھا اس کا نام براق تھا۔ اس کا ایک ایک قدم حد نظر تک رکھا جاتا تھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

اس کی مزید تفصیل یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کا رنگ سفید تھا یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ لمبا تھا (مسلم) اس کے کان لمبے تھے۔ (ابن سعد) اس کے دو پر تھے۔ (مجمع البحار)

بعض احادیث میں ہے کہ جب آنحضورؐ اس پر سوار ہونے لگے تو جبرائیلؑ نے فرمایا کہ اے براق بخدا ایسا بلند مرتبت انسان تجھ پر کبھی سوار نہیں ہوا۔ آنحضورؐ سے قبل دوسرے انبیاء نے بھی اس پر سواری کی ہے۔

بہت سے مصوروں نے اس کی تصویر کشی کی ہے اور بالآخر اس کو ایک پری نما گھوڑے کی شکل دے دی گئی۔

براکلمان (۱۸۶۸ء۔۱۹۵۶ء) جرمنی کا مشہور مستشرق، روستوک میں پیدا ہوا۔ اس کی شہرت اس کی جرمن کتاب "تاریخ ادب عربی" کی وجہ سے ہے۔ جس کا عربی ترجمہ عبدالحلیم النجار مصری نے ۱۹۵۹ء میں مصر سے شائع کیا۔ نیز اس نے "طبقات الکبیر" کی تین جلدیں ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۷ء مرتب کر کے شائع کرائیں۔ اسی طرح اس نے تیس کے قریب اسلامی کتب مرتب اور مدون کر کے شائع کیں۔ ان میں زکریا رازی کے پچاس رسائل۔ ابن اثیر کی کتاب کامل اور طبری کی تاریخ ملوک کے تعلق پر مقالہ، دیوان لبید، ابن جوزی کی کتابیں، ابن حزم کی "طوق الحمامہ" استنبول، پیٹروگراڈ، آیا صوفیا، برسلاؤ اور ہیمبرگ جیسے شہروں کے کتب خانوں کی فہرستیں اور تاریخ الشعوب والدول الاسلامیہ (پانچ جلدوں میں) شائع کیں۔ اس نے لائڈن سے چھپنے والے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں بھی ایک سے زیادہ مقالات لکھے۔ نیز اس نے برسلاؤ، برلن، کونزبرگ اور ہالہ کی یونیورسٹیوں میں بھی کام کیا۔ بہت سے جدید محققین اور مصنفین نے اس کی مطبوعات سے فائدہ اٹھایا ہے۔

برامکہ آل برمک۔ مشہور ایرانی خاندان جس کے افراد سلطنت عباسیہ کے ابتدائی دور میں کاتب اور وزیر رہے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ بلخ کے آتشکدہ نوبہار کا متولی برمک تھا۔ اس کا بیٹا خالد برمکی عالم و فاضل، دانا، مدبر، اولوالعزم اور بہادر تھا۔ عباسی تحریک کو اس سے بہت تقویت ملی۔ پہلی صدی ہجری میں نوبہار اور اس کے بڑے پجاریوں کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ نوبہار پر امیر معاویہ کے زمانے میں حملہ کیا گیا۔ ۱۰۷ھ/۷۲۵ء میں خلیفہ ہشام کے عہد میں برمک کی کوشش سے اسے دوبارہ بسایا گیا۔ بعض کے نزدیک برمک نے اسی دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ بعد میں اس کے بیٹے خراسان سے عراق چلے گئے اور بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ خالد اور اس کے بھائیوں سلیمان اور الحسن نے یہیں اسلام قبول کیا۔

خالد بن برمک:۔ خالد کے ابتدائی حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔ سب سے پہلے عباسی تحریک کے سلسلے میں اس کا نام آتا ہے۔ خلیفہ السفاح کے عہد میں اسے

وزیر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ خلیفہ کی نظروں میں اس کا مرتبہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی بیٹی کو خلیفہ کی بیوی نے اور خلیفہ کی بیٹی کو اس کی بیوی نے دودھ پلایا۔ خالد کو فارس کا گورنر بھی مقرر کیا گیا۔ جہاں وہ دو سال تک مقیم رہا۔ اس کے بعد اسے طبرستان کا والی مقرر کیا گیا اور تقریباً سات سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے نام کے سکے بھی ملتے ہیں جو تقریباً ۱۵۰ھ/۷۶۷ء اور ۱۵۴ھ/۷۷۱ء کے ہیں اس نے قلعہ اُستوناوند پر جو د ماوند کے قریب ہے، قبضہ کر لیا۔ اور وہاں ایک شہر منصورہ بسایا۔ خالد کو موصل کے صوبے کا والی بھی بنایا گیا۔ سمالو کے محاصرے میں بھی اس نے اور اس کے بیٹے یحیٰ نے بڑا نام پیدا کیا۔ ۱۶۵ھ/۷۸۲ء میں پچہتر سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(۲) یحیٰ برمکی: اس نے بھی حسن قابلیت سے دربار میں بہت رسوخ حاصل کر لیا تھا مہدی نے اسے اپنے بیٹے ہارون کا اتالیق بنایا۔ جب ہارون الرشید تخت نشین ہوا تو اس نے وزارت کے لیے یحیٰ بن خالد کا انتخاب کیا۔ وہ شروع ہی سے اپنے والد کا نائب رہا۔ ۱۵۸ھ/۷۷۵ء میں آذربائیجان کا والی مقرر ہوا۔ مہدی کے آغاز خلافت تک اپنے والد ہی کے ساتھ علاقہ فارس میں رہا۔ ۱۶۱ھ/۷۷۸ء میں ہارون کے زمانہ شہزادگی میں اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ الہادی کا خیال تھا کہ یحیٰ ہارون کا طرفدار ہے اور اسے تخت سے دستبردار نہ ہونے پر اکساتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس نے یحیٰ کو قید کرا کے موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم دیا۔ جس رات اسے سزائے موت ملنے والی تھی اسی رات الہادی اپنے محل میں مُردہ پایا گیا۔ ہارون نے تخت نشین ہوتے ہی امور سلطنت کا انتظام اس کے سپرد کر دیا اور وزیر کا لقب دیا۔ اس نے اپنے دو بیٹوں کو بھی اپنے انتظامی اور سرکاری فرائض میں شامل کر لیا۔ یحیٰ اس عہدے پر ۱۷۰ھ/۷۸۶ء سے ۱۸۷ھ/۸۰۳ء تک فائز رہا۔ اس دوران میں درحقیقت وہ حکومت کے تمام اداروں کا سربراہ رہا۔ اس کا تعلق ہارون سے اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس نے اپنی ذاتی مہر بھی اس کے حوالے کر دی تھی۔ یحیٰ کے چار بیٹے تھے فضل، جعفر، موسیٰ اور محمد۔ موخرالذکر دو بیٹوں کا کوئی کارنامہ قابل ذکر نہیں ہے۔ تاہم فضل اور جعفر خاصی اہمیت رکھتے ہیں:

(۳) فضل برمکی: ہارون کا رضاعی بھائی تھا۔ ہارون نے اسے متعدد عہدوں پر فائز کیا۔ ۱۷۶ھ/۷۹۲ء میں یا اس سے کچھ عرصہ قبل اسے ایران کے مغربی صوبوں کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ بعد میں خراسان کا والی بنایا گیا۔ اس نے کابل کے علاقے میں امن و امان قائم کیا اور ایک مقامی لشکر بھرتی کیا جس کا ایک حصہ بغداد بھیجا۔

۱۸۱ھ/۷۹۷ء میں جب اس کا باپ حج کے لیے گیا تو اس کی عدم موجودگی میں سلطنت کا انتظام اسی کے سپرد ہوا۔ ہارون نے اسے امین کا معلم بھی مقرر کیا۔ فضل کی شہرت جس رفتار سے بام عروج کو پہنچی اسی رفتار سے وہ خلیفہ کے التفات سے محروم ہوگیا۔ ہارون اس سے اتنا ناراض ہوا کہ تمام عہدے اس سے چھین لیے۔

(۴) جعفر برمکی: غیر معمولی قابلیت اور کمالات کے باعث اپنے تمام بھائیوں سے برتر تھا۔ ہارون کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ۱۷۶ھ/۷۹۲ء میں وہ مغربی صوبوں کا والی بنا۔ خراسان کا عارضی طور پر گورنر مقرر کیا گیا۔ خلیفہ کے ذاتی محافظ دستے کا سردار بنایا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاک اور ٹکسال کے محکمے بھی اسی کے سپرد ہوئے۔ اسے المامون کا اتالیق بھی مقرر کیا گیا۔ وہ خلیفہ کا منظور نظر بھی تھا۔ ۱۸۶ھ/۸۰۲ء میں جب خلیفہ حج کر کے واپس آیا تو اس نے برامکہ کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ یکم صفر ۱۸۷ھ/۲۸ جنوری ۸۰۳ء کی رات کو جعفر کو قتل کرا دیا گیا اور اس کی لاش کافی عرصہ تک بغداد میں منظر عام پر لٹکتی رہی۔ یحیٰ کو بھی نظر بند کر دیا گیا۔

بعد میں اسے بھی الرقہ میں قیدی کی حیثیت میں اس کے دوسرے بیٹوں کے پاس جہاں وہ قید تھے بھیج دیا گیا۔ اور اسی قید میں ۱۹۰ھ/۸۰۵ء میں یحیٰ نے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۹۳ھ/۸۰۸ء میں الفضل نے پینتالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور الفضل اور اس کے بھائیوں کو قید کر لیا گیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔

برامکہ نے یہاں تک عروج حاصل کیا کہ وہ سلطنت کے سارے نظم و نسق پر چھا گئے۔ اہل علم اور ارباب کمال کے لیے خزانے کا منہ کھول دیا۔ اور رعایا ان پر جان چھڑکنے لگی۔ جب ہارون کی حیثیت صرف ایک کٹھ پتلی کی ہوگئی تو برامکہ نے پر پرزے نکالے وہ اس حد تک خودسر ہوگئے کہ خلیفہ کے احکام کو بھی بالائے طاق رکھنے لگے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہارون کو ضرورت کے لیے خزانہ سے معمولی رقم بھی ملنا مشکل ہوگئی۔ ان تمام باتوں کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ برامکہ کو عباسیوں کے حریف ائمہ اہل بیت کے ساتھ عقیدت تھی۔ اور وہ ان سے ایسا سلوک کرنے لگے جو عباسی سیاست کے لیے نقصان دہ تھی۔

برامکہ نے حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر اپنے ہی خاندان کو مامور کر دیا تھا۔ اس وجہ سے رعایا انہی کو بادشاہ سمجھنے لگی تھی۔ اس وجہ سے ہارون کے دل میں سخت بدگمانی پیدا ہوئی۔ ان وجوہات کی بناء پر برامکہ زوال پذیر ہو گئے۔

براؤن، ای جی

(۷؍ فروری ۱۸۶۲ء - ۵ جنوری ۱۹۲۶ء) ایڈورڈ گرینول براؤن، صف اول کا مستشرق۔ ۱۸۸۴ء میں طب کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ اسلامی ادبیات سے شغف ہونے کی بناء پر فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کی تحصیل کی۔ ۱۸۸۴ء میں وہ السنۂ مشرقیہ میں اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد بارتھولومیوز کے ہسپتال میں طب کی عملی تعلیم کے لیے چلا گیا۔ یہاں سے کیمبرج یونیورسٹی نے اُسے عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے بلا لیا۔ تو اس نے طب کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ ۱۸۸۷ء میں وہ ایران گیا اور کامل ایک برس تک یہاں رہ کر مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران" لکھی اس سال کی سرگزشت بھی "ایک سال ایرانیوں کے ساتھ" کے نام سے لکھی۔ دوسری کتابوں میں "انقلاب ایران" ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک کی سرگزشت ہے۔ "ایران جدید میں پریس اور شاعری" میں آزادی پسند شعراء کا کلام ہے۔ بابی مذہب کی کتاب "مقالہ سیاح" کا متن و ترجمہ اس نے ۱۸۹۱ء میں شائع کرایا۔ اسی طرح میرزا حسین ہمدانی کی کتاب "تاریخ جدید" کا ترجمہ ۱۸۹۳ء میں اور میرزا جانی کاشانی کی کتاب نقطۃ الکاف" کا متن ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔ ان کے علاوہ تذکرۃ الشعراء، "تاریخ طبرستان (۱۹۰۵ء)" "تذکرہ لباب الالباب" (۱۹۰۳ء) کے متن شائع کیے۔ ۱۹۱۹ء میں نظامی عروضی سمرقندی کے "چہار مقالہ" کا ترجمہ شائع کرایا اور فارسی کے بعض نامور شعراء کے منتخب کلام کا ترجمہ "بیاض فارس" کے نام سے ۱۹۲۷ء میں شائع کیا۔

ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۰۴ء میں اپنے دوست ای جے گب کی یاد میں گب میموریل ٹرسٹ قائم کیا۔ ٹرسٹ کے زیر اہتمام متعدد ضخیم کتابیں اور تراجم شائع کیے۔ اس کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایران و یورپ کے مستشرقین نے اپنے محققانہ مضامین کا مجموعہ "عجب نامہ" مرتب کر کے ۷ فروری ۱۹۲۲ء کو براؤن کے نام معنون کیا۔

براہوئی پاکستان میں قلات ڈویژن کے باشندے، جو براہوئی زبان بولتے ہیں۔ یہ تیس سے کچھ زیادہ قبائل پر مشتمل ہیں یہ خود کو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ گوجرا قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ براہوئی کے لفظی معنی پہاڑی آدمی کے بھی ہیں، اس لیے کچھ لوگوں کے نزدیک یہ نام محض علاقائی نسبت سے ان قبائل کو دیا گیا ہے۔ اکثر مورخین نے انھیں کرد، ایرانی گوجر، ترک مغول اور بلوچ بتایا ہے۔ گریرسن کے نزدیک چونکہ ان کی زبان دراوڑی ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ یہیں کے مستقل باشندے یعنی دراوڑی ہی ہوں۔ ان قبائل میں رئیسانی، شاہوانی، رند، مری بگٹی، نوشیروانی، مینگل، بزنجو، مگسی، دیناری اور زہری مشہور ہیں۔

براہوئیوں کی معاشرتی تنظیم طبقہ وار ہے۔ یعنی سب سے پہلے خاندان (پرا) کی تشکیل ہوتی ہے جس کا سربراہ آمر مطلق ہوتا ہے۔ جب بہت سے خاندان مل کر رہیں تو وہ برادری (شلوار) کی تشکیل کرتے ہیں برادری کا قائد منتخب ہوتا ہے۔ بہت سی برادریوں کے اجتماع کو ٹھکر کہا جاتا ہے اور اس کے قائد کو سردار کہا جاتا ہے۔ اس طرح ایک قبیلہ ٹھکروں شلواروں اور پروں کی طبقاتی تنظیم کے طور پر تشکیل پاتا ہے۔ اپنے اسی اٹل معاشرتی نظام کی وجہ سے براہوئی معاشرہ شکست و ریخت سے بچا رہا ہے۔

براہوئیوں کا معاشرتی نظام نو اصولوں پر مبنی ہے۔ (۱) انتقام لینا (۲) پناہ گزین کی حفاظت کرنا (۳) امانت داری (۴) مہمان نوازی (۵) عورت یا بچے کو مارنے سے اجتناب (۶) مجرم کو اگر قبیلے کی عورت کی سفارش پر معاف کر دینا (۷) کسی بزرگ کے مزار پر کسی کو نہ مارنا (۸) اگر کوئی عورت قرآن مجید سر پر رکھ کر آ ملے یا تیر آ جائے تو لڑائی بند کر دینا۔ (۹) سیاہ کار مرد و عورت کو قتل کر دینا وغیرہ۔ اس نظام میں عورت کی توقیر ایک خاص مقام تک کی جاتی ہے۔ عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔

اسلام سے قبل براہوئیوں کا مذہب مظاہر پرستی تھا جن میں آتش پرستی قابل ذکر ہے۔ یہ لوگ انتہائی مذہب پرست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو قرآن مجید کی بے حد عزت و توقیر کرنے لگے۔

جس دور میں مغلوں کی یلغاریں اپنے عروج پر تھیں، براہوئی قبائل نے خود کو متحد کر کے ایک میر کے ماتحت کر دیا۔ پہلا میر، میرو قمبرانی تھا۔ جس نے نہ صرف قبائل کو منظم اور متحد رکھا اور اسے مستحکم بنایا بلکہ جاٹوں کے ساتھ لڑ کر ان کے ہاتھ سے علاقے بھی چھین لیے۔ اس وقت سے لے کر ۱۶۶۶ء تک کی براہوئی تاریخ بہت الجھی ہوئی ہے۔ اس عرصے میں کم و بیش چار میر مشہور ہیں۔ میرو، عمر، بجار اور حسن۔ یہی لوگ ریاست قلات کو تشکیل کرنے والے تھے۔

۱۶۶۶ء سے میر احمد خان اول کی زیر قیادت ریاست قلات کا دوسرا مستحکم دور شروع ہوا۔ میر نصیر خان اول (۱۷۴۹ء - ۱۷۹۴ء) کے دور میں یہ ریاست اپنے عروج پر تھی۔ اس نے خانی نظام کو فروغ دیا۔ جس میں میر کے ماتحت محض چند خان ہوتے تھے جو کئی قبیلوں کے حکمران ہوا کرتے تھے۔ یہ میر بلوچوں میں اتنا مقبول ہوا کہ آج تک اسے ولی اور بزرگ سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۱۷ء سے بلوچستان پر انگریزوں کا قبضہ ہونا شروع ہوا تو محراب خان دوم براہوئیوں کا پہلا شہید بنا۔ انگریزوں نے قلات پر قبضہ کرنا چاہا، مگر عوام کی مخالفت ہمیشہ ان کی مدافعت کرتی رہی۔ تاہم میر محمود خان دوم کے دور تک انگریزی اقتدار اس علاقے پر چھا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں سر شمس شاہ میر محمود خان دوم وزیر اعظم بنا۔ اس کے خلاف سردار محمد خان گرگناڑی، سردار محمد خان زرک زئی، سردار نورالدین مینگل اور سردار سلطان محمد نے بغاوت کر دی۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے نورالدین مینگل کو گرفتار کر لیا تو یہ تحریک بظاہر ختم ہو گئی اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس تیزی سے ابھری کہ انگریزوں نے مجبور ہو کر سردار نورالدین کو رہا کر دیا۔ ۱۹۳۳ء سے میر احمد یار خان ریاست کے خان ہوئے اور انھوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۴۷ء سے اس علاقے پر توجہ دی گئی۔ کراچی سے کوئٹہ تک خضدار کے راستے ایک سڑک، مستونگ اور خضدار میں ڈگری کالج بنائے گئے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد میں بھی اس علاقے کی ترقی پر زور دیا گیا لیکن ۱۹۷۳ء کی بگٹی تحریک کے بعد سے یہاں ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ریاست قلات کا علاقہ مکران سے کوئٹہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کوہ کرتھار ہے۔ جس کا قریبی علاقہ سراسر پہاڑی ہے۔ اسے سراوان اور جنوبی میدانی علاقے کو جھلاوان کہتے ہیں۔ بیشتر آبادی خانہ بدوش ہے۔ بقیہ لوگ وادیوں اور کاریزوں کے قریب آباد ہیں۔ اقلیت انتہائی امیر اور اکثریت انتہائی غریب ہے بارش بے حد ہوتی ہے۔ اس لیے دور دور تک بے آب و گیاہ میدان، ٹیلے اور صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔

براہوئی زبان و ادب: براہوئی زبان دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ یہ نہ تو جدید زبانوں کی طرح پیچیدہ گرامر کی مالک ہے اور نہ چینی جاپانی زبانوں کی طرح یک لفظی ہے۔ یہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کو باہم اس طرح سے جوڑ دیتی ہے کہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملتے، البتہ ایک معنی ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ اس زبان کا زیادہ تر دارومدار انھی مرکبات پر ہے۔ زبان پر فارسی کا بے حد اثر ہے۔ اس کی لغت میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار الفاظ ہیں اور عام زندگی میں دو تین ہزار الفاظ ہی مستعمل ہیں۔ یہ زبان تقریباً بیس لاکھ براہوئی بولتے ہیں۔

براہوئی کا کلاسیکی ادب زیادہ تر غیر تحریری ہے۔ ریورینڈ میئر نے ۱۹۰۷ء میں اس ادب کی طرف توجہ کی اور سترہ کہانیاں، ایک ناول اور آٹھ نظمیں جمع کیں۔ ۱۹۱۵ء میں لاہور سے "تحفۃ العجائب" چھپی، جو براہوئی ادب کی قدیم ترین کتاب ہے اسے براہوئی کے ایک بہت بڑے عالم مولانا نبو خان نے مرتب کیا۔ اس میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد بہشت، دوزخ، فوائد علم دین، نماز، ایمان، فقہ مسائل اور ادعیہ درج ہیں۔ اشاعت اسلام کے لیے اس زبان کا استعمال سب سے پہلے ملا ملک داد نے کیا تھا۔ اس کی تصنیف کا اتنا اثر ہوا کہ نصیر خان نوری نے ۱۷۷۶ء میں متعدد شرعی اصلاحات نافذ کیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں درخان سے ایک تحریک اٹھی، جس نے اشاعت اسلام کے لیے بہت کام کیا۔ انیسویں صدی میں یہاں عیسائی مبلغین آئے، ان کے رد کے طور پر محمد فاضل رئیسانی جیسے شیخ پیدا ہوئے، جنھوں نے پہلے تو انگریزوں اور ان کے حواریوں کو تاخت و تاراج کیا، پھر سندھ میں ہالوں کے دینی مدرسے اور عبدالغفور ہمایونی سے درس پا کر درخان پہنچے اور درس و تدریس کے علاوہ روحانی فیض کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کے مریدوں میں سے محمد عبداللہ، ملا نبو خان، عبدالحی وغیرہ نے تصانیف کے انبار لگا دیئے

عبدالحی نے قرآن مجید کا براہوئی ترجمہ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء میں شائع کرایا۔ ان کے صاحبزادے بھی کثیر تعداد کتابوں کے مصنف تھے۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی مشنریاں کروڑوں روپوں کے اسراف اور سرکاری سرپرستی کے باوجود ایک بھی براہوئی کو عیسائی نہ بنا سکیں۔ (نیز دیکھیے "بلوچ")

بربر ایک قوم اور علاقہ جو مصری سرحد سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک ہے۔ زمانۂ قدیم میں ایک عربی قبیلے کو بربر کہا جاتا تھا جو دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ اس علاقے کو بربرستاب بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے حاکم سنار کے فنج سلطان کے باجگزار رہے۔ بربروں کا یہ علاقہ ایک اہم تجارتی مرکز رہا تاہم انیسویں صدی کے اوائل تک اس علاقے میں بہت کم آمد و رفت ہوتی رہی۔ ۵ مارچ ۱۸۲۱ء کو ترکی اور مصری فوجوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اپریل ۱۸۸۴ء سے مہدی سوڈانی کے زیر انتظام اس علاقے کا نظم و نسق ایک فوجی حاکم کے سپرد تھا۔ یہاں کا آخری مہدوی حاکم محمد الزکی عثمان تھا۔ ستمبر ۱۸۹۷ء میں ان کے علاقے پر انگریزی اور مصری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

بربری مصری سرحد سے لے کر دریائے نائیجر کے موڑ تک آباد ہیں۔ یہ تین مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ انھیں بربری بولیاں کہتے ہیں۔ یہ قوم زمانۂ قدیم ہی سے یہاں آباد ہے۔ عام طور پر قدیم افریقی قبائل کو بھی بربری کہا جاتا رہا ہے۔ چونکہ یہ ہمیشہ منتشر رہے۔ اس لیے کسی ایک علاقے کی قوم کو بربری نہیں کہا گیا۔ عرف عام میں افریقہ کے کالے وحشیوں کو بربری کا نام دیا گیا۔ مگر جب بربری علاقوں میں گورے رنگ کی نسلوں کا بھی سراغ ملا تو یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ بربری کوئی واحد نسل ہیں چنانچہ اب شمالی افریقہ کے بسنے والے قدیم خانہ بدوش باشندوں کو بھی بربری کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

۴۲ء میں افریقہ پر رومی سلطنت کا قبضہ ہوا جو پانچویں صدی عیسوی تک رہا۔ اس دوران میں بربروں پر رومی تمدن کی چھاپ لگ گئی۔ تاہم باوجود ان اثرات کے سماجی طور پر یہ نیم وحشی اور اکھڑ مزاج کے حامل رہے۔ چنانچہ ظلم و تشدد کو بربریت کا نام دیا جانے لگا۔ جو آج بھی مستعمل ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کے اواخر تک پورا بربری علاقہ آغوش اسلام میں آ گیا انھوں نے جوق در جوق اسلام قبول کیا اور پھر بڑی تیزی سے اس کی تبلیغ کی۔ ان کے دو حکمران خاندانوں المرابطون اور الموحدون نے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے شمالی افریقہ پر اپنی حکومت قائم کی۔ ان لوگوں نے نویں صدی عیسوی میں جا کر کہیں اسلام قبول کیا تھا۔ انھیں عبداللہ بن یاسین المرابطی نے اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا تھا۔ بہت جلد ان حکمرانوں کی فتوحات دیگر علاقوں پر بھی محیط ہو گئیں۔ ابوبکر بن عمر نے شہر مراکش کی بنیاد رکھی اور ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء کے فوراً بعد یوسف بن تاشفین نے عیسائیوں کو عبرتناک شکستیں دے کر پورے اسلامی اندلس پر قبضہ کیا۔ یہ حکمران المرابطون کہلائے۔ ان کے خلاف ردعمل کے طور پر دیگر بربر عبدالمومن کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں المرابطون کو مغلوب کر کے الموحدون کے نام سے سلطنت قائم کر لی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد بربروں میں پھوٹ پڑ گئی اور صرف ایک صدی میں یہ خاندان بھی مٹ گیا۔ نیز مراکش، تلمسان اور بجایہ وغیرہ میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کے آتے آتے بربر ایک بار پھر اپنے نیم صحرائی اور نیم وحشی تمدن کی طرف لوٹ گئے۔ اور ان کے پاس اسلام کے چند ابتدائی تصورات کے سوا اور کچھ نہ رہا۔

آج کل بربر قبائل لیبیا، تیونس، الجزائر، صحرا، مراکش اور موریطانیہ میں آباد ہیں۔ لیبیا میں یہ کل آبادی کا چوبیس فیصد ہیں اور ان کی زبان عربی ہے۔ تیونس کے بربر قبائل ابھی تک اپنی بولی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ الجزائر کے بربر بھی اپنی قدیم زبان بولتے ہیں۔ اور یہ کل آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ مراکش میں کل آبادی کا دس سے پندرہ فیصد کے علاوہ باقی تمام بربر ہیں، جن میں سے نصف ابھی تک قدیم زبان اور تہذیب کے ساتھ زندہ ہیں۔ صحرا، موریطانیہ اور دیگر افریقی علاقوں کے بربر ابھی تک قدیم وحشی تہذیب کو اپنائے ہوئے ہیں۔

بربہاریؒ (وفات ۳۲۹ھ/۹۴۱ء) ابومحمد الحسن بن علی بن خلف بربہاری بغداد کے ایک مشہور عالم دین۔ حنبلی فقیہ، حدیث کے عالم حنبلی فقہ کی تعلیم امام احمد بن حنبل کے شاگرد رشید ابوبکر المروزی سے حاصل کی۔ معتزلہ اور شیعہ کے خلاف مہم چلانے پر خلیفہ نے انہیں گرفتار کرنے کا حکم دیا مگر وہ روپوش ہو گئے۔ اسی عالم میں وفات پائی اور اپنی بہن کے گھر دفن ہوئے۔

بربہاری عقل کے استعمال کے مخالف نہیں تھے بلکہ اسے ایک نعمت سمجھتے تھے۔ وہ ظاہر کے مقابلے میں باطن کو قطعی طور پر مسترد نہیں کرتے بشرطیکہ اس باطن کی بنیاد قرآن و سنت پر قائم ہو۔ خلافت کے بارے میں وہ قریش کے حق کے زبردست حامی تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حکمران طبقے کی اطاعت پر بھی زور دیتے تھے۔ سوائے اس صورت میں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو۔ وہ تلوار کے ذریعے امن قائم کرنے کے مخالف تھے ان کے نزدیک قانون اور امن عامہ کی بحالی کے لیے دعوت امن [illegible] اور امر بالمعروف" سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنے اصول و عقائد میں بڑے پختہ تھے انھوں نے معتزلہ اور شیعہ کے خلاف شخصی طور پر زبردست مہم چلائی۔

ان کے حامیوں کی شورش نے الراضی کے ابتدائی دور خلافت میں شدت اختیار کر لی اور حنبلیوں کی قانونی دفعات کو نافذ کرنے کی غرض سے تجارتی کاروبار میں مداخلت کی۔ شراب فروشوں اور گانے والوں پر حملے کیے گئے اور موسیقی کو ترک کر دیا گیا۔ اس ہنگامے کے بعد خلیفہ کے سرکاری عہدے داروں نے بربہاری کے حامیوں کو لوگوں سے ملنے، تعلیم دینے اور مسلمانوں کو کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے روک دیا جو حنبلی عقیدہ رکھتا ہو۔ جب ان کا جوش و خروش ان پابندیوں سے بھی کم نہ ہوا تو خلیفہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت حنبلیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا خلیفہ کے اس فرمان سے حنبلی مظاہرے کچھ عرصہ کے لیے رک گئے۔ مگر ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں اس کے حامیوں نے بغداد میں اپنی شورش تیز کر دی، جو بربہاری کی موت کے بعد تک [illegible]

بربہاری کی تصانیف میں کتاب السنۃ خاص مشہور ہے جو [illegible] کی نمائندہ کتاب ہے۔ اس کتاب کا متن قاضی ابوالحسین کی تصنیف [illegible] کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ انھوں نے اپنی دوسری کتاب العقیدہ میں [illegible] بدعات کو مذموم قرار دیا ہے۔ دلائل اور بڑے پرزور انداز میں اس دین عتیق کی طرف لوٹنے کی تلقین کی ہے۔ جس پر پہلے تین خلفاء کے عہد میں عمل ہوتا رہا۔

برتن ظروف، جن میں کھانے پینے کی اشیاء رکھی جائیں۔ اسلام میں انہیں صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے نیز بتایا گیا کہ ایسے برتن، جو محض آرائش اور تعیش کے کام آئیں اور جن سے بے جا امارت ظاہر ہو ممنوع ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ

سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جو شخص چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آتشِ دوزخ کو گھونٹ گھونٹ کرکے اتارتا ہے"۔ دوسری حدیث میں چاندی اور سونے کے برتن میں کھانے پینے کی ممانعت ہے۔

آنحضورؐ نے کھانے کے بعد برتن کو انگلی سے صاف کرنے کا حکم فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ تمہیں نہیں معلوم کہ کون سے لقمے میں برکت ہے۔

ایک بار آپؐ کے سامنے بھیگے ہوئے ٹکڑوں کا برتن لایا گیا فرمایا "لوگو! پیالے کے اردگرد سے کھاؤ کیونکہ برکت برتن کے بیچ میں سے اترتی ہے"۔ (ترمذی)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب رات کا آغاز ہو تو اپنے پانی کے برتنوں کو ڈھانک دیا کرو اور ڈھانکتے وقت خدا کا نام لیا کرو۔ اور اگر ڈھانکنے کے لئے کوئی چیز نہ پاؤ تو لکڑی وغیرہ ہی عرضاً رکھ دیا کرو"۔ (بخاری)

آنحضورؐ نے جب شراب کی حرمت کا حکم دیا تو جن برتنوں میں عرب شراب ڈالتے تھے، اُن کے استعمال کی بھی ممانعت کر دی تھی۔

بُردہ شریف اونی کپڑے کی دھاری دار چادر جو آنحضورؐ اوڑھا کرتے تھے۔ اس قسم کی ایک چادر خصوصی شہرت کی حامل ہے حضورؐ نے کعبؓ بن زہیر کو ان کے ایک قصیدے پر بطور انعام عطا فرمائی۔ بعد میں حضرت امیر معاویہؓ نے یہ چادر حضرت کعبؓ کے بیٹے سے خرید کر محفوظ کر لی تھی خلفائے بنو امیہ کے بعد بنو عباس کے خلفاء کے زمانہ میں بھی محفوظ رہی اور چنگیز خان کے حملہ کے وقت اسے جلوا دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دراصل چادر اب بھی [illegible] میں محفوظ ہے۔

بوصیری کے قصیدے کا نام بھی بردہ ہے اور اسے قصیدہ بردہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ آنحضورؐ نے خواب میں یہی چادر مبارک بوصیری کے شانوں پر ڈال دی تھی۔ بوصیری کو فالج تھا۔ اس چادر کے اوڑھنے سے معجزانہ طور پر شفایاب ہو گیا چنانچہ اس نے یہ قصیدہ کہا۔ عربی کی کسی اور نظم کو اتنی شہرت حاصل نہیں ہے آج تک بھی اسے ورد وظائف کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کی نوے سے زائد شرحیں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔

اس قصیدے کا پورا نام "الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ" ہے لیکن بردہ کے نام سے مشہور ہے۔

برزالی، علم الدین (جمادی الآخر ۶۶۵ھ، ۱۱ اپریل ۱۲۶۶ء – ۴ ذی الحج ۳۹ھ، ۱۲ جون ۱۳۳۹ء) علم الدین القاسم بن محمد بن یوسف ایک شامی مورخ اور عالم حدیث برزالی قبیلہ بنو برزال سے تھا۔ شام میں پیدا ہوا۔ علماء کے گھرانے سے اس کا تعلق تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے والد اور دوسرے مشہور علماء سے دین کی گھر پر ہی تعلیم حاصل کی۔ علمِ دین کی تحصیل کے لئے اس نے شام کے دوسرے شہروں اور مصر کا سفر کیا۔ عمر بھر اس کے طلبِ علم کے شوق میں کمی نہ آئی۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ دمشق کی جامعات میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے گذارا۔ کئی بار خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ خلیص کے مقام پر وفات پائی۔ اس کے تمام بچے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بہت سے شاگرد اور رفقا تھے جن میں الذھبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

البرزالی غیر معمولی طور پر دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ بہت خوب صورت، منکسر المزاج اور اپنے علم اور کتابوں کے بارے میں بے حد فیاض تھا۔ بہترین خطاط تھا۔

اس کی تصانیف کی کوئی فہرست نہیں ملتی اور نہ ہی اسکی کوئی کتاب ہی اب تک چھپ سکی۔ اس کی ایک کتاب "تاریخ کبیر" کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ ایک کتاب "المنتقیٰ" ہے جو مخطوطے کی شکل میں ہے۔ ایک "معجم" جو اس نے اپنے اساتذہ کے حالات پر لکھی ہے، دمشق میں محفوظ ہے۔ حدیث کے موضوع پر اس کی تصانیف بانکی پور میں محفوظ ہیں۔

بَرزَخ حائل، درمیانی، وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو، مانع ہو، رکاوٹ ہو۔ حدیث میں "قبر" کا لفظ مجازاً عالم برزخ کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد وہ عالم ہے، جس میں روح موت کی آخری ہچکی سے لے یوم حشر میں دوبارہ جی اٹھنے تک رہے گی۔ یہ فارسی لفظ پردہ کا معرب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انسانوں کے اور دنیا کے درمیان ایک روک ہے جو انہیں واپس نہیں جانے دے گی اور قیامت تک یہ دنیا اور آخرت کے درمیان کی اس حد فاصل میں ٹھہرے رہیں گے۔

بقول مولانا مودودی "مرنے کے بعد قیامت تک کا زمانہ خالص عدم اور نیستی کا زمانہ نہیں جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ اس زمانے میں جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی ہے اور کلام سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے اور اہلِ دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔"

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ عالم عدم محض کا عالم ہے جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا۔ اور کسی قسم کا عذاب ثواب نہ ہوگا۔ لیکن قرآن اس عقیدے کی نفی کرتا ہے۔ جب آدمی مرکر عالم برزخ میں چلا جاتا ہے تو ہر نیک و بد کو موت کی ساعت سے لے کر قیامت تک نیک اور بد انجام دکھایا جاتا رہتا ہے۔ قرآن مجید میں فرعون اور آلِ فرعون کے بارے میں ارشاد ہے کہ "ایک سخت عذاب ان کو گھیرے ہوئے ہے یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو"۔ (۲۳ : ۴۵ - ۴۶)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص بھی مرتا ہے اسے صبح و شام اس کی آخری قیام گاہ دکھائی جاتی رہتی ہے خواہ وہ جنتی ہو یا دوزخی۔ اس سے کہا جاتا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں تو اس وقت جائے گا۔ جب اللہ تجھے قیامت کے روز دوبارہ اٹھا کر اپنے حضور بلائے گا۔"

قرآن مجید میں ایک مقام پر آتا ہے "یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجاتی ہے تو کہنا شروع کرتا ہے کہ اے میرے رب مجھے اس دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ کر آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ ہرگز نہیں یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔ اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ دوسری زندگی کے دن تک حائل ہے (۲۳ : ۹۹، ۱۰۰)

تصوف میں برزخ کا اطلاق مرشد کی صورت پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی صورت خداتعالیٰ اور مرید کے درمیان واسطہ ہوتی ہے مرید خدا کی عبادت کرنے کے وقت اپنے مرشد کی صورت اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر کر لیتے ہیں اور اس کی برکت سے انہیں بارگاہ ایزدی میں قرب حاصل ہو جاتا ہے۔

برزخ کا اطلاق اس خطہ پر بھی ہوتا ہے جو بہشت اور دوزخ کے درمیان حدِ فاصل ہوگا۔

قرآن مجید میں چند اور جگہوں پر بھی برزخ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً "اور وہی ہے جس نے دریاؤں کو ملایا، ایک کا پانی میٹھا مزے دار اور ایک کا) کھاری کڑوا اور دونوں میں ایک روک اور آڑ بنا دی"۔ (۲۵: ۵۳)

"اسی نے (اس طرح کے کھاری اور میٹھے) دو سمندر بنا نکالے کہ آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے"۔ (۵۵: ۱۹تا۲۰)

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اشارہ شط العرب کے میٹھے پانی کی طرف ہے جو کھاری سمندر میں ملے بغیر دور تک بہتا چلا گیا ہے۔ یہاں رکاوٹ سے مراد قانونِ فطرت ہے جو خدا کا قائم کردہ ہے۔

برشلونہ اسلامی اندلس (سپین) کا ایک شہر جو اب برسیلونا کہلاتا ہے۔ رومی دور میں یہ شمال مشرقی ہسپانیہ کا دارالحکومت تھا۔ ادریسی اور البکری نے اس کا ذکر کیا ہے ان کی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ برشلونہ ان کے زمانہ میں ایک بڑا شہر تھا۔ جس کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی اور اس کی بندرگاہ چٹانوں سے پُر تھی۔ شاہ افرنجہ اپنے اسی دارالحکومت میں رہتا تھا۔

برشلونہ کی قدیم عمارتیں آج بھی قائم ہیں

اس شہر کو ۹۲ھ/ ۷۱۱ء تا ۹۸ھ/ ۷۱۷ء میں عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی سپہ سالاری میں مسلمانوں نے فتح کیا۔ عربی میں اس شہر کو برشلونہ کہتے ہیں ۱۸۵ھ/ ۸۰۱ء میں شارلیمان کے بیٹے لوئی نے اسے فتح کیا اور اس کے بعد فرنجی سلطنت کے ہسپانوی سرحدی علاقے کا دارالحکومت بن گیا۔

۲۴۲ھ/۸۵۶ء میں برشلونہ پر عربوں کا قبضہ ہوا لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ ۳۷۵ھ/ ۹۵۸ء میں آخری بار المنصور اعظم نے اسے فتح کیا۔ لیکن ۴۰۴ھ/ ۹۸۷ء میں یہ ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بالآخر بارہویں صدی میں اسے نئے سرے سے مملکت ارغون میں شامل کیا گیا۔

آج کل برسیلونا شمال مشرقی سپین کا ایک اہم شہر اور صوبہ ہے۔ جسے ۱۸۳۳ء سے یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ یہ ایک اہم بندرگاہ، تجارتی مرکز اور عیسائی بشپ کا شہر ہے۔ شہر کی آبادی ۱۹۷۱ء میں بیس لاکھ کے قریب تھی۔ شہر کا قدیم حصہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں رومی اور اسلامی طرز تعمیر کے بیشتر نمونے آج بھی نظر آتے ہیں۔ جدید شہر میں پارک، عجائب گھر اور یونیورسٹی واقع ہے۔ یہاں کی زیادہ تر برآمدات ریشم، اون اور روئی کی اشیاء، کھاد اور کاغذ ہیں۔

برصیصا ایک عیسائی راہب اور نیم تاریخی شخصیت۔ اس کا زمانہ سینٹ انطونی کا عہد قرار دیا جاتا ہے ابن بطوطہ نے طرابلس اور اسکندریہ کے درمیان ایک قصر "برصیصا العابد" دیکھا تھا۔ ارامی زبان میں برصیصا کے معنی اعلیٰ ترین منصب کاہن کے ہیں۔ مسلمان مصنفین کے ہاں برصیصا سے مراد وہ راہب ہے جس نے ایک طویل عرصے تک زہد و تقویٰ کی زندگی اختیار کیے رکھی اور پھر شیطان کی بار بار کی ترغیب کے تحت زیر ہو گیا اور اس طرح خدا کے وجود سے منکر ہو گیا۔ اس حالت کے بعد شیطان اسے اکیلا چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔

اس روایت کا تعلق قرآن مجید کی اس آیت سے بتایا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ (یہ ایسے ہیں) جیسے شیطان کی وہ حالت جب وہ انسان سے کہے کہ کفر کر۔ پھر جب وہ کفر کرے تو کہے میں الگ ہوں تجھ سے۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو رب ہے سارے جہان کا (۵۹: ۱۶) لیکن یہ توجیہ عجیب سی نظر آتی ہے۔

اس آیت کی تفسیر کا تعلق خواہ نسل انسانی سے ہو یا کسی ایک خاص فرد و آدمی سے، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ البتہ علامہ طبری اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں انسان ایک خاص شخص کے معنی میں لیا گیا ہے جو یا تو کوئی [illegible] یا عابد یا کوئی عیسائی پادری ہے۔ اس شخص کی کہانی جو طبری نے لکھی ہے [illegible] اور وہ یہ ہے کہ تین بھائی ایک بیمار عورت کو ایک متقی اور [illegible] ایک سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ ان کے بعد وہ متقی یا راہب شیطان کے [illegible] میں آکر گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے بعد میں اپنے اس جرم کو چھپانے کے لیے عورت کو قتل کر دیتا ہے اور ایک پوشیدہ مقام پر اس کی لاش کو دفن کر دیتا ہے۔ جب اس عورت کے بھائی سفر سے واپس آتے ہیں تو [illegible] کی بات کا یقین کر لیتے ہیں کہ ان کی بہن طبعی موت مری ہے [illegible] خواب میں آکر راہب کا جرم فاش کر دیتا ہے جب راہب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جرم فاش ہو گیا ہے تو وہ بہت خوفزدہ ہوتا ہے۔ اس وقت شیطان اس کے پاس آکر کہتا ہے کہ اگر تو مجھے سجدہ کرے اور خدا کا انکار کر دے تو میں تجھے بچا لوں گا اور جب راہب یہ بھی کر گزرتا ہے تو شیطان اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ الطبری کے بعد کے راویوں کے ہاتھ برصیصا کا نام رکھا اور انھوں نے اس کہانی کے مرکزی کردار پر برصیصا کا نام چسپاں کر دیا۔

برغش (دورِ حکومت ۷ اکتوبر ۱۸۷۰ء تا ۲۷ مارچ ۱۸۸۸ء) برغش بن

سعید بن سلطان زنجبار کا سلطان۔ اس نے پہلے ۱۸۵۶ء میں اپنے والد کے انتقال پر اور پھر ۱۸۵۹ء میں حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی انگریزوں کی مداخلت کی وجہ سے ناکام رہا اور دو سال تک بمبئی میں رہا۔
بالآخر ۱۸۷۰ء میں اپنے بھائی کی وفات پر تخت پر بیٹھا۔ ۱۸۷۳ء میں برغش غلاموں کی تمام منڈیاں بند کرنے اور دوسرے ممالک بلکہ اپنی حدود مملکت میں بھی غلاموں کی برآمد بالکل ممنوع کر دینے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ برطانوی حکومت نے اس کی تخت نشینی کی حمایت کی تھی اس لیے ایک برطانوی ایجنٹ کرک برغش کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ زنجبار کی ایک بااثر شخصیت بن گیا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ برطانوی ایجنٹ واپس گیا۔
[illegible] کے عقبی علاقے میں برغش کا اقتدار نہ ہونے کے برابر تھا۔ ۱۸۷۷ء میں ساحل اور وکٹوریا نائی آنزا کے درمیانی علاقے کی ترقی کے سلسلے میں مراعات کے سوال پر جب سر ولیم میکینن سے بات چیت ناکام ہو گئی تو برغش کے ہاتھ سے اندرون ملک میں اپنا اقتدار قائم کرنے کا بہترین موقع بھی نکل گیا۔
اور برطانیہ نے اس کی یہ تجویز بھی کہ بادشاہت ہمیشہ اسی کے خاندان میں رہے [illegible] ۱۸۸۰ء میں جرمنی کے ایجنٹ نے ان سرداروں سے (جن کے علاقے [illegible] جانے والی تجارتی شاہراہ کے ساتھ ساتھ واقع تھے) بارہ [illegible] زیر حفاظت لے لیا۔ جبکہ برغش ان کی سیادت کا [illegible] جب برغش نے اس پر احتجاج کیا تو اس نے جواب میں جرمنی کے پانچ جنگی جہاز [illegible] بھیج دیے اور برغش کو تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد [illegible] نے اپنے نمائندوں کا ایک کمیشن بھیجا جس نے [illegible] کی حدود متعین [illegible] برغش کو برطانیہ کے دباؤ کے تحت یہ فیصلہ ماننا پڑا [illegible] سے [illegible] کے ایک سفر سے واپسی پر اس کا انتقال ہو گیا۔
[illegible] ایک [illegible] بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے ملک کے [illegible] اس نے سستے غلے درآمد کرنے کا [illegible] پانی کا بھی بندوبست کیا۔ لیکن برطانیہ کی پالیسیوں کے سامنے [illegible] نہ چل سکی۔

برق بابا [illegible] ترک درویش جسے باراق بابا کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک سلجوقی شہزادہ تھا۔ ایک یونانی پادری نے اسے عیسائی بنا لیا تھا۔ بعد ازاں دوبارہ مسلمان ہوا اور برق کا خطاب پایا۔ عربی [illegible] سے اس کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ اس کا باپ ایک اعلیٰ سرکاری [illegible] تھا اور اس کا چچا ایک مشہور کاتب تھا۔
برق بابا نے ایلخانیوں کے عہد میں کافی شہرت حاصل کی۔ اس کے مریدوں کو برقی کہا جاتا ہے۔ وہ ترکی سے ایران گیا اور وہاں اس نے غازان اور الجایتو پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ دمشق پہنچا۔ اس کے بعد یروشلم گیا اور بعد میں ایران واپس آ گیا۔ ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء میں اس نے الجایتو کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ اسے تبلیغ کے لیے گیلان بھیج دے۔ وہاں چند مخالفوں نے اسے قتل کر دیا۔

برکات چار شرفین مکہ مکرمہ جو برکات کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔
(۱) برکات اول:۔ ابن حسن بن عجلان۔ اس کا تعلق قتادہ بن ادریس کی ساتویں پشت سے تھا۔ شریفین مکہ کے آخری سلسلے کا بانی۔ جوانی میں ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء سے ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء تک اپنے والد کے ساتھ حکومت میں شریک رہا۔ والد ضعیف العمری کے سبب تخت سے دستبردار ہو گیا تو اپنے بھائیوں کی مخالفت کے باوجود ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء سے ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء تک مکہ کا حکمران رہا۔ ۸۴۵ھ/۱۴۴۲ء میں خاندان کے لوگوں نے اسے تخت سے سبکدوش کر دیا۔ لیکن اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ دوبارہ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء سے ۸۵۹ھ/[illegible] تک حکومت پر قابض رہا۔ برکات اول کے بعد اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا اس کا دور حکومت ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء تا ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء ہے۔
برکات ثانی:۔ یہ برکات اول کا پوتا تھا۔ اپنے والد کے عہد حکومت میں شریک سلطنت رہا۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء سے ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء تک اپنے بھائیوں سے برسر پیکار رہا۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں اسے مصر میں نظر بند کر دیا گیا بالآخر ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں اسے بحال کر دیا گیا اور اس طرح ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء سے ۹۳۱ھ/۱۵۲۵ء تک یہ شریف مکہ رہا۔
برکات ثالث:۔ ابن محمد ابراہیم جو ذوی (قبیلہ) برکات کے مورث اعلیٰ کا پڑپوتا تھا۔ [illegible] ۱۶۰[illegible]ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت کے [illegible] زمانہ میں محمد ابن سلیمان نے کئی ایک بڑی اہم اصلاحات کیں۔ جن کا مقصد تھا کہ تعداد [illegible] کے طبقوں کے مقابلے میں غریبوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے یہ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء اپنی وفات کے وقت تک برسر اقتدار رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سعید تخت نشین ہوا۔
برکات رابع:۔ ابن یحیٰ، برکات ثالث کا پوتا۔ اس نے [illegible] سے بھی کم مدت تک حکومت کی۔ اپنے باپ کی حکومت سے دستبرداری کے بعد مسند نشین ہوا۔ لیکن قبیلہ زید نے اسے شکست دی اور دونوں باپ بیٹا بھاگ کر مصر چلے گئے۔

برکت نمو، افزائش، بڑھوتری، اسلامی روایات میں اس سے رفعت عظمت خیر اور بھلائی کا مفہوم بھی لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اللہ تعالےٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف کی ۵۴ویں آیت میں ارشاد ہے۔ "بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا پروردگار" اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں۔ بے حد و حساب خیرات اس سے پھیل رہی ہے اور وہ بہت بلند و برتر ہستی ہے۔ کہیں جا کر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی۔ اس کی یہ بھلائی و رفعت ہمیشہ ہے۔ عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال آئے۔
عام میل جول میں لفظ مبارک استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالےٰ تمہارے کام اور مال میں برکت دے۔

برکھارٹ (۲۴ نومبر ۱۷۸۴ء۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء) ایک نامور مستشرق اور سیاح سوئٹزرلینڈ کے مشہور شہر لوازن کے قریب گاؤں کرخگارٹن میں پیدا ہوا۔ لیپزگ اور جرمنی میں عربی اور علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ تین سال تک لنڈن اور کیمبرج میں مزید تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۰۹ء میں حلب (شام) پہنچا۔ یہاں اپنے قیام کے دوران میں اس نے ترکی زبان سیکھی۔ اور قرآن مجید کے مطالب اور فقہ اسلامی میں خاص دسترس پیدا کی۔ یہاں اس نے دو سال تک قیام کیا اس

کے بعد اس نے شیخ ابراہیم بن عبداللہ اللوزانی کا نام اختیار کر کے مصر کا قصد کیا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں حج کیا اور دو تین ماہ مکہ مکرمہ میں گذارے اور مدینہ منورہ کی زیارت کرتے ہوئے ۱۸۱۵ء میں قاہرہ پہنچا۔ جہاں بیمار ہوا اور وفات پائی۔ اسے قاہرہ ہی میں دفنایا گیا۔

برکہارٹ کے مختلف مقالوں اور مضامین کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے جو تقریباً ساڑھے تین سو مجلدات کی شکل میں کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

برکیارُوق (۴۸۶ھ/۱۰۹۲ء [illegible] - ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء) ایک سلجوقی سلطان ملک شاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں باپ کی وفات کے وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی۔ سوتیلی ماں نے اپنے ایک چار سالہ لڑکے کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ ملک شاہ کے مشیر نظام الملک کے ساتھیوں نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ برکیاروق کے خلاف ہو گئے ہیں تو وہ اسے اصفہان سے اغوا کر کے اپنے مرکز رے میں لے گئے اور وہاں اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف برکیاروق کے ماموں اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی تخت کا دعوے دار ہونے کا موقع مل گیا اور اس طرح ایک پیچیدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ بالآخر برکیاروق غالب آیا۔ اور ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء کے بعد سے خلیفہ نے اسے اپنی سلطنت کے عربی صوبوں اور ایران کی سرزمین مرتفع کا حکمران تسلیم کر لیا۔ لیکن برکیاروق کے مصائب مکمل طور پر ختم نہ ہو سکے۔ محمد اور سنجر کو جو اس کی سوتیلی ماں سے تھے نظام الملک کے بیٹے مؤیدین نے انہیں ورغلایا کہ وہ برکیاروق کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکیں اور بغاوت کر دیں۔ لیکن طرفین کے معتدل عناصر کی کوششوں سے [illegible] معاہدہ [illegible] ہے دیا۔ اس معاہدے کی رو سے محمد کو "ملک" کا خطاب ملا اور اسے برکیاروق کے زیر سایہ آذربائیجان کا جس میں آرمینیا بھی شامل تھا، حکمران بنا دیا گیا اور برکیاروق کو بلا شرکت غیرے سلطان تسلیم کر لیا گیا۔ محمد کو یہ معاہدہ پسند نہ آیا اور اس نے دوبارہ لڑائی شروع کر دی لیکن آخر کار اسے مجبور ہو کر آرمینیا کی طرف بھاگنا پڑا۔ برکیاروق بیمار تھا اور لڑائی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس [illegible] وہ سلطنت کی عملی تقسیم پر راضی ہو گیا۔ اصفہان، نصف عراق اور آذربائیجان سے لے کر شام تک کے پورے سرحدی علاقے کا فرمانروا محمد کو تسلیم کر لیا گیا۔ برکیاروق نے ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء میں ۲۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے دور سے حسن بن الصباح کے اسماعیلی نزاریوں نے فائدہ اٹھایا اور شمالی ایران کے پہاڑوں اور اصفہان کے قرب و جوار میں موجود ناقابل تسخیر قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

برگوی، محمد بن پیر علی (۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء - ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) ایک ترک عالم۔ بالی کسری میں پیدا ہوا۔ بعض نے تاریخ پیدائش ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء بیان کی ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ بعد میں استنبول چلا گیا۔ جہاں اس نے محمد افندی اور قاضی عسکر عبدالرحمان افندی سے تعلیم کی تکمیل کی۔ بعد میں استنبول کے مدارس میں پڑھاتا رہا اور اسی دوران میں شیخ عبدالرحمان قرہ مانی سے بیعت کی۔ اسی دوران میں فوج میں بھی ملازمت اختیار کر لی۔ جلد ہی وہ ان تمام مصروفیات کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا لیکن اپنے مرشد کے حکم پر تبلیغ و تدریس کا سلسلہ منقطع نہ کیا اور جب عطاء اللہ افندی نے برگی میں اپنے مدرسے میں اسے بطور استاد رکھنا چاہا تو اس نے منظور کر لیا اور برگی کی نسبت سے اسے برگوی کہا جاتا ہے۔ یہیں پر طاعون کی بیماری سے وفات پائی۔

برگوی امام ابن تیمیہ کی طرح ہر بدعت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ وہ مذہبی معاملات میں بڑا متشدد تھا۔ اور اپنے اسی تشدد کی وجہ سے شریعت سے ذرا سا انحراف بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ کسی کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وزیر اعظم محمد پاشا کی بعض بے قاعدگیوں کی اصلاح کرنے کی خاطر استنبول کا سفر کیا۔

اس کی تصانیف میں "وصیت نامہ" بہت مشہور ہے۔ اس کتاب کی کئی ایک شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب مذہبی مسائل کے بارے میں اب بھی ترکی عوام کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ برگوی نے صرف و نحو پر بھی [illegible] تصنیف کیں ان میں سے ایک کا نام "اظہار" ہے دوسری کا [illegible] کتابیں ایک عرصہ دراز تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ [illegible] الطریقۃ المحمدیہ ہے اس کتاب میں برگوی کے عربی مواعظ اور خطبے [illegible] یہ کتاب اہل علم میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کتاب کی [illegible] خادمی محمد افندی اور عبدالغنی النابلوسی نے لکھی ہیں۔

برناباس حضرت عیسیٰ [illegible] کا حواری جس نے [illegible] برناباس کے نام سے مشہور ہے۔ برناباس [illegible] کی کتاب [illegible] ذکر آتا ہے [illegible] رسولوں نے برناباس یعنی نصیحت [illegible] کی تھی۔ اس کا ایک کھیت تھا جسے اس نے بیچ [illegible] پر رکھ دی۔ (۴: ۳۶ - ۳۷) یہودی شخص تھا [illegible] حواریوں سے کرایا۔ کتاب عمل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے [illegible] درازتک آیا۔ دوسرے کے ہمسفر [illegible] کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد [illegible] کے [illegible] پولس اور برناباس مرقس کو ساتھ لے کر [illegible] قبرص کی طرف [illegible] کا انتقال ہوا۔

عیسائی علما برناباس کو ایک [illegible] نزدیک برناباس کی لکھی ہوئی انجیل کا کوئی وجود [illegible] زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گئی اور موجودہ [illegible] کی تصنیف ہے۔ (دیکھئے انجیل برناباس)

برنی، ضیاء الدین [illegible] ایک مورخ [illegible] کے بیٹے [illegible] خان کا نائب تھا [illegible] برنی کے تعلقات دہلی کے امرا کے ساتھ [illegible] دور حکومت میں برنی کی عمر [illegible] میں یادداشتیں ذہن میں محفوظ رکھ سکے۔

برنی تقریباً سترہ سال اور تین ماہ تک سلطان محمد بن تغلق [illegible]

جب فیروز خان تغلق تخت نشین ہوا تو برنی کو دربار سے برطرف کر دیا گیا اور کچھ مدت کے لیے اسے ایک قلعے میں قید رکھا گیا۔ برنی نے اپنی عمر کا باقی حصہ بڑی کس مپرسی اور غربت میں گذارا وہ اس دور میں تصنیف و تالیف میں مشغول رہا۔ ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء کے کچھ مدت بعد اس کا انتقال ہوا۔ اسے غیاث پور میں نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔

ضیاءالدین برنی کی تصانیف میں مشہور ترین چار ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی اس کتاب میں برنی نے خلفائے راشدین کو معیاری فرمانروا [illegible] کرتے ہوئے اپنے [illegible] کے بادشاہوں کو [illegible] کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ ہونے کی صورت میں اسلام [illegible] فرائض عائد [illegible] ہے۔ یہ کتاب بلبن کے دور سے لے کر فیروز تغلق کے [illegible] کے واقعات پر مشتمل ہے [illegible] اس نے علاؤالدین خلجی کو [illegible] بادشاہ شمار کیا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو مطیع کیا۔ فتنہ و فساد [illegible] قرار دیا۔

[illegible] دوسری کتاب فتاوٰے جہاںداری میں برنی نے [illegible] شریعت [illegible] اور صرف صاحب [illegible] لوگوں کو ملازم رکھنے [illegible] خداخوفی اور عجز و نیاز [illegible] انکسار [illegible] اور حق [illegible] ہے

برونی [illegible]

[illegible] بہتر تھا [illegible]

[illegible]

برونی پر سولہویں صدی عیسوی میں والندیزیوں نے قبضہ کیا اور ۱۸۸۸ء میں یہ برطانیہ کی سرپرستی میں چلا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں اس کی عنان حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور سلطان محض آئینی حکمران تھا۔ ۱۹۶۳ء میں برونی کو ملائیشیا میں شامل کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اب تک یہ برطانوی دولت مشترکہ کے ماتحت ایک خود مختار سلطنت ہے۔

برونی کا موجودہ آئین ۲۹ ستمبر ۱۹۵۹ء سے سلطان کی طرف سے نافذ شدہ ہے ۶ فروری ۱۹۶۵ء کو اس میں ترمیم ہوئی، جس کے تحت مقننہ کے انتخابات ہوئے۔ یہ اکیس ارکان پر مشتمل ہے، جن میں سے دس منتخب اور پانچ نامزد ہوتے ہیں کابینہ کا سربراہ سلطان ہوتا ہے۔ ۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ۲۸ ویں سلطان کو معزول کر کے اس کے بیٹے حسن البولکیہ معزالدین کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یکم اگست ۱۹۶۸ء کو اس کی تاجپوشی کی رسوم ادا ہوئیں۔

اقتصادی اور دیگر معلومات:۔ برونی کی آب و ہوا منطقہ حارہ سے تعلق رکھتی ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ دارالحکومت اور مضافات میں رہتا ہے۔ اندرونی علاقے میں زیادہ تر جنگلات ہیں۔ جن کی وجہ سے عمارتی لکڑی کثرت سے دستیاب ہے۔ چاول اور ربڑ اہم پیداوار ہے۔ معیشت کا زیادہ تر دارومدار مٹی کے تیل پر ہے۔ جو اس کی برآمدات کا تراسی فی صد ہے۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کیساتھ ہوتی ہے۔

بُرہان قطعی دلیل، حجت۔ بقول امام راغب "بُرہان وہ دلیل ہے جو تمام دلائل میں سب سے زیادہ قوی اور پختہ ہو۔ نیز یہ دلیل ہمیشہ صدق و یقین اور قطعیت کی مقتضی ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں بھی "برہان" قطعی حجت اور روشن دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

"ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔" (۲: ۱۱۱)

"کیا انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا لیے، اے محمدؐ ان سے کہو کہ لاؤ اپنی دلیل" (۲۱: ۲۴)

"اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ان کاموں میں حصہ دار ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔" (۲۷: ۶۴)

"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔" (۲۳: ۱۱۷)

"اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے پھر کہیں گے کہ "لاؤ اب اپنی دلیل" اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف سے ہے اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔" (۲۸: ۷۵)

"یہ دو نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔" (۲۸: ۳۲)

"وہ (زلیخا) اس کی طرف بڑھی اور یوسفؑ بھی اس کی طرف بڑھتا۔ اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔" (۱۲: ۲۴)

اسی طرح اللہ کے رسولوں، ان کے معجزوں، دین اسلام اور قرآن کریم کو بھی نور اور برہان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے اور

ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔" (۴: ۱۷۴)

حدیث میں صدقے کو بھی برہان کہا گیا ہے کیونکہ دل اور مال کا بڑا گہرا رشتہ ہے اور جو شخص آسانی سے راہ خدا میں اپنا مال دیتا ہے تو یہ اس کے پاکیزہ دل اور سخی ہونے کی دلیل ہے۔

برہان کے اصطلاحی معنی منطقی استدلال اور قیاس کے ہیں۔ فلاسفہ اور متکلمین نے برہان کو منطقی استدلال اور قیاس کے معنی میں بکثرت استعمال کیا ہے

برہان الدینؒ، غریب

(۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء - ۷۳۸ھ/۸ر ستمبر ۱۳۳۷ء) ہندوستان کے ایک بزرگ، صوفی، جو قطب المدار اور بایزید ثانی کے القابات سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ انوار الاصفیا میں آپ کا شجرہ نسب اس طرح سے درج ہے۔ برہان الدین غریب بن شیخ محمد بن محمود بن ناصر ہانسوی بن سلطان منظفر بن سلطان ابراہیم بن شیخ ابوبکر بن شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرشید بن شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالسلام بن امام اعظم ابوحنیفہؒ۔

آپ کا خاندان روحانی لحاظ سے بہت اونچے مقام پر فائز تھا۔ جو ہانسی میں آباد تھا۔ حضرت برہان الدین کی پیدائش ہانسی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا سے پائی۔ وقت کے جید علماء سے فقہ، معانی، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کا شمار اس زمانے کے جید علماء میں ہوتا ہے۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔

طریقت میں محبوب الٰہیؒ سے فیض پانے کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ جن کے مریدوں میں امیر خسرو، امیر حسن سجزی، مولانا ابراہیم طشت دار، سید خاموش، خواجہ مبشر اور سید حسین وغیرہ تھے۔ انھوں نے شیخ برہان الدین کو باورچی خانے کا نگران مقرر کیا۔ جب شیخ برہان الدین نے سلوک و منزلت کی تمام منزلیں طے کرلیں تو حضرت محبوب الٰہی نے آپ کو اپنی خلافت سے نوازا۔ بایزید کا خطاب آپ کو انھوں نے ہی دیا تھا۔ شیخ صاحب کو بھی اپنے مرشد سے حد درجہ محبت تھی۔ اور آپ ان سے جدا ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ جب آپ کے بھائی منتخب الدین کا انتقال ہوا تو مرشد نے آپ کو دکن جاکر تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ تو آپ نے عرض کی کہ نعلین مبارک سے جدا ہوجاؤں گا مرشد نے فرمایا نعلین ساتھ لے جاؤ پھر عرض کی مجلس سے الگ ہوجاؤں گا۔ مرشد نے حکم دیا کہ جتنے لوگ مجلس میں حاضر ہیں انہیں بھی ساتھ لے جاؤ۔ اس وقت سات سو کے قریب افراد مجلس میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ ان سب کو ساتھ لے کر دولت آباد روانہ ہوگئے اور اٹھائیس انتیس سال وہاں پر قیام کرنے کے بعد وفات پائی۔ آخر عمر میں بہت کمزور ہوگئے تھے۔ تین سال تک بیمار رہے لیکن عبادت و ریاضت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ آپ کا مزار روضہ خلد آباد میں ہے بعض کے نزدیک آپ نے ۱۴۱ھ/۱۳۴۰ء میں وفات پائی۔

آپ اور آپ کے ساتھیوں نے دکن میں نہ صرف بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا بلکہ عام مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کو بھی سدھارا۔

آپ کی شخصیت بہت جاذب تھی۔ آپ کا کلام عشق آمیز اور گفتگو دلفریب اور پُرتاثیر تھی۔

سماع سے آپ کو بے حد انسیت تھی۔ برھان پور کو جب ناصر خان فاروقی نے آباد کیا تو اسے آپ ہی کے نام پر موسوم کیا۔

ایک مرتبہ اپنے مریدوں سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ "دنیا سائے کی مانند ہے جب آدمی سائے کی طرف منہ کرتا ہے تو وہ آگے ہی آگے چلتا ہے اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو سایہ پیچھے پیچھے آتا ہے۔"

آپ اپنے مریدوں کو اکثر نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کی راحت کے لیے کوشاں رہیں۔ آپ فرماتے ہیں جس طرح ایک درخت خود تو دھوپ میں کھڑا رہتا ہے اور دوسروں کو سایہ دیتا ہے۔ لکڑی خود جلتی ہے اور دوسروں کو آرام پہنچاتی ہے۔ اسی طرح آدمیوں کو بھی چاہیے کہ خود تکلیف اٹھاکر دوسروں کو راحت پہنچائے۔

آپ کے ملفوظات میں سے "حصول الوصول"، "ہدایت القلوب"، "نفائس الانفاس" اہم ہیں۔ ایک رسالہ جو "رسالہ غریب" کے نام سے موسوم ہے آپ کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔

برہان الدین، قطب عالم

(۱۴ر رجب ۷۹۰ھ/۱۹ر جولائی ۱۳۸۸ء - ۸ر ذوالحجہ ۸۵۷ھ/۱۰ر دسمبر ۱۴۵۳ء) ابومحمد برہان الدین بن ناصر الدین مخدوم جہانیاں، سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ۔ قطب عالم اور ثانی مخدوم جہانیاں کے نام سے مشہور تھے۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے مشہور و معروف مشائخ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اُچ شریف (بہاولپور) میں پیدا ہوئے ابھی دس سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے چچا شاہ راجو قتال نے اپنے ذمہ لے لی۔ چودہ سال کی عمر میں ان کے چچا نے "ارشاد اہل گجرات" کا کام ان کے ذمہ لگایا اور انھوں نے گجرات ہی میں سکونت اختیار کرلی۔ ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں پٹن گئے۔ جہاں سلطان منظفر اوّل بڑی عزت و احترام سے پیش آیا۔ یہاں پر انھوں نے مولانا علی شیر گجراتی کی خدمت میں علوم ظاہری کا مطالعہ کیا۔ ۸۱۳ھ/۱۴۱۱ء میں احمد آباد کے قریب اساول کہنہ کی بستی میں قیام پذیر ہوئے لیکن بعد میں بٹوہ میں سکونت اختیار کرلی اور اپنی وفات تک یہیں رہے۔

ان کے شیوخ میں شیخ احمد کھٹو بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے خرقہ خلافت عطا کیا تھا۔ اپنے شیوخ سے فیض حاصل کرنے کے بعد قطب عالم نے گجرات اور احمد آباد کے لوگوں کی رشد و ہدایت کا کام شروع کردیا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عالم اور ان کے مریدین نے سلسلہ سہروردیہ کو بہت ترقی دی۔ اہل گجرات میں ان کے بارے میں بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ اہل گجرات کے شاہی سلاطین ان کے بہت زیادہ معتقد تھے۔ جہانگیر اور اس کے بعد کے مغل شہنشاہ مشائخ گجرات سے فیض حاصل کرتے رہے اور ان کی اولاد کو مختلف مناصب سے نوازتے رہے ہیں۔

برہان الدین نے گجرات سے چھ میل دور بٹوہ میں وفات پائی۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کا مزار امرائے گجرات نے بنوایا تھا۔ اور اب تک اہل گجرات کے لیے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ان کی اولاد میں بارہ بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں۔

برہان الدینؒ، مرغانی

(۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء - ۱۴ر ذی الحجہ ۵۹۳ھ/۲۰ر اکتوبر ۱۱۹۷ء) ابوالحسن علی بن ابی بکر بن عبدالجلیل۔ لقب برہان الدین ایک مشہور حنفی فقیہ عالم۔ صوبہ فرغانہ کے شہر مرغان میں پیدا ہوئے شجرۂ نسب حضرت ابوبکرؓ صدیق سے ملتا ہے۔

تحصیل علم کی خاطر آپ نے مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے فیضان حاصل کیا۔ سمرقند میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے آپ نے اپنی زندگی ہی میں شہرت کی اعلیٰ منازل طے کر لی تھیں۔ امام، فقیہہ، حافظ، محدث، جامع العلوم، ضابطہ الفنون، محقق اور فاضل وغیرہ کے الفاظ آپ کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

علامہ عبدالحی لکھنوی نے آپ کو حنفی علماء کے صاحب ترجیح علماء میں شامل کیا ہے۔ یعنی وہ علماء جو حسن درایت کی بناء پر بعض روایات کو بعض پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

آپ کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں
۱۔ کتاب مجموع النوازل ۲۔ کتاب التجنیس والمزید ۳۔ کتاب فی الفرائض ۴۔ کتاب المنتقی ۵۔ مناسک الحج ۶۔ بدایہ المبتدی۔ ۷۔ کفایۃ المنتہی ۸۔ الہدایہ لیکن جو شہرت اور عظمت "ہدایہ" کو نصیب ہوئی وہ دوسری کتب کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہ کتاب حنفی مسلک کے مطابق تحریر کی گئی ہے دوسرے ائمہ کے مسائل کا تذکرہ بھی دیا گیا ہے ساتھ ساتھ ان کے دلائل بھی ہیں لیکن مصنف نے دوسرے ائمہ کے دلائل کے شافی و وافی جواب دے کر اپنے مسلک کی تائید کی ہے۔

ہدایہ، بدایۃ المبتدی کی شرح اور کفایۃ المنتہی کی تلخیص ہے۔ آپ نے اس کتاب کی ابتدا ۵۷۳ھ میں کی اور پورے تیرہ برسوں میں اس کی تکمیل ہوئی اس عرصے میں آپ مسلسل روزے رکھتے رہے اور گھر والوں کو بھی اس کا علم تک نہ ہوا اس کا انگریزی ترجمہ وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ہوا اور ۱۷۹۱ء میں لندن میں شائع ہوا فارسی ترجمہ مولوی غلام یحییٰ خان نے کیا جو ۱۸۰۷ء میں کلکتہ میں شائع ہوا ان کی کتاب [illegible] کا انگریزی ترجمہ ہدایہ ملٹن کے نام سے مشہور ہے ایک رسالہ جو مختصر پر نظم کیا اور بدایۃ المبتدی کے نام سے تصنیف کیا۔ یہ رسالہ مختصر ہے بعد میں اس رسالے کی ایک مفصل شرح کفایۃ المنتہی کے نام سے بھی جو اسی (۸۰) جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مصر کے کتب خانے میں قلمی نسخے کی شکل میں موجود ہے۔

بریدہؓ بن حصیب

(وفات ۶۰ھ/۶۸۰ء یا ۶۳ھ/۶۸۳ء) ابو عبداللہ بریدہؓ بن حصیب صحابی رسولؐ۔ قبیلہ اسلم بن افصی کے سردار تھے۔ جب آنحضورؐ ہجرت کے لیے مدینہ تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں بستی الغمیم میں ٹھہرے۔ اسی وقت حضرت بریدہؓ اسی خاندانوں کے ساتھ جو ان کے ہمراہ تھے ایمان لائے۔ بعض روایات کے مطابق غزوہ بدر کے بعد اسلام قبول کیا۔ غزوہ احد کے بعد بریدہؓ مدینے میں آبسے۔ اور تمام غزوات میں شامل رہے۔ ۹ھ/۶۳۰ء میں بنو اسلم اور بنو غفار سے صدقات وصول کرنے پر مامور کیا گیا اور اس کے بعد انہیں غزوہ تبوک میں بنو غفار اور بنو اسلم کو شرکت کی دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا۔

آنحضورؐ کی وفات کے بعد بریدہؓ مدینے ہی میں مقیم رہے۔ بعد میں جب بصرہ آباد ہوا تو وہاں ایک مکان بنا کر رہنے لگے۔ اس کے بعد فوج کے ساتھ خراسان چلے گئے اور مرو میں سکونت اختیار کر لی وہیں وفات پائی۔

حضرت بریدہؓ بڑے صاف گو منصف مزاج اور خدا ترس تھے۔ آپ سے تقریباً ایک سو پچاس احادیث مروی ہیں۔

بری، امام عبداللطیف

(وفات ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء) راولپنڈی (پاکستان) کے ایک صوفی بزرگ والد کا نام شاہ محمود تھا۔ موضع جوبایاں کرسال ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت کی طرف مائل تھے۔ والد نے بھینیں چرانے کا کام سپرد کیا۔ اس کام کے ساتھ ساتھ ریاضت و عبادت میں مشغول رہے۔ آپ کے والد نے بعض مخالفتوں کی وجہ سے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر باغ کلاں علاقہ گرلیہ ضلع راولپنڈی میں سکونت اختیار کر لی اور آپ کو تعلیم کے حصول کے لیے کیمبل پور کے موضع غورغشتی میں بھیج دیا۔ آپ نے حضرت حیات المیر قادری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جو حضرت غوث الاعظم کے پوتے تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ ادائیگی فریضہ حج کے لیے حرمین الشریفین تشریف لے گئے۔ واپسی پر اس جگہ پر جہاں آج کل اسلام آباد ہے مقیم ہو کر رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔ آپ کے فیض سے لاکھوں افراد بہرہ مند ہوئے۔ ان ہی کی کوششوں سے یہاں دو قبیلوں ڈھونڈ اور ستی میں اسلام پھیلا۔ ان کا گاؤں "چورپور" اب "نورپور" کہلاتا ہے۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء آپ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"شاہ لطیف بری قادری بزرگان پنجاب سے تھے۔ حضرت کے ہزاروں خوارق و کرامات مشہور ہیں۔ آپ بڑے عابد و زاہد، گوشہ نشین، مست و مجذوب تھے۔ ہزاروں مرید مدارج تکمیل کو پہنچے۔ آپ نے نعمت باطنی حضرت حیات المیر زندہ پیر سے پائی۔ جو غوث الاعظم کے پوتوں سے ہیں۔"

آپ کے خلفاء میں شاہ بہلول قادری ہیں جن سے سلسلہ بہلول شاہی چلا۔ ان کے علاوہ شاہ حسین بھی آپ کے خلفاء میں سے ہیں۔

بریرہ

رضی اللہ عنہا صحابیہ رسولؐ۔ حضرت عائشہؓ کی آزاد کردہ لونڈی۔ حضرت بریرہؓ کا آقا ایک غیر مسلم تھا۔ جسے انھوں نے اس شرط پر راضی کر لیا تھا کہ اگر وہ نو یا پانچ سالانہ قسطیں یک مشت ادا کر دیں تو آزاد ہو جائیں گی۔ اپنے آقا سے یہ شرط منوا لینے کے بعد وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور مدد کی درخواست کی۔ حضرت عائشہؓ نے انہیں پوری رقم ادا کر کے خرید لیا اور آزاد کر دیا لیکن انھوں نے حضرت عائشہؓ کی خدمت ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا نکاح ایک حبشی غلام مغیث سے ہوا تھا۔ اور آنحضورؐ نے انھیں مغیث کے ساتھ رہنے کی سفارش بھی کی۔ لیکن جب انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تو انھیں حکم دیا گیا کہ ایک مطلقہ عورت کی طرح عدت پوری کریں اور مغیث ان کی جدائی میں مدینہ کی گلیوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔

حضرت بریرہؓ سے چند احادیث مروی ہیں اور وہ حضرت عائشہؓ، ابن عباسؓ اور عروہ ابن زبیرؓ سے روایت کرتی ہیں۔ ان کا انتقال یزید اول کے عہد میں ہوا۔

بریلوی تحریک

برعظیم پاکستان و بھارت میں اہلسنت کے ایک گروہ کی تحریک جو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی سے منسوب ہے اور جس کا آغاز بریلی شہر سے ہوا۔ اس گروہ کو "حزب الاحناف" بھی کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے یہ پیروکار اگرچہ الگ فرقے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن بعض مسائل میں دوسرے مسالک سے اختلاف کی بناء پر ان کا الگ تشخص قائم ہو گیا ہے۔ یہ اسلاف میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خیالات سے متفق ہیں اور محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید کے بعض افکار کے خلاف ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے یہ حنفی ہیں اور بنیادی طور پر وہابی اور دیوبندی مسلک کے ردعمل کے طور پر ایک تحریک کی صورت

میں رونما ہوئے ہیں۔

بریلوی تحریک کا آغاز "جامعہ منظر الاسلام" بریلی سے ہوا۔ جس کی بنیاد اعلیٰ حضرت نے ڈالی تھی۔ بریلی کے بعد اس تحریک کا دوسرا بڑا مرکز مراد آباد تھا۔ جہاں ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں شیخ محمد نعیم الدین مراد آبادی نے "دارالعلوم نعیمیہ" کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کی۔

صحیح معنوں میں بریلوی تحریک کا آغاز ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء سے ہوتا ہے۔ جب گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔ اعلیٰ حضرت نے اس سے اختلاف کیا اور مسلمانوں کو اس اتحاد کے مضرات سے آگاہ کیا۔ ان کے معتقدین نے "جماعت رضائے مصطفیٰ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس "کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ جس کا دوسرا نام "جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ" رکھا گیا۔

۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی بریلوی تحریک اپنے زوروں پر آگئی۔ چنانچہ ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا چار روزہ اجلاس (۲۷ تا ۳۰ اپریل) بنارس میں منعقد ہوا۔ اس میں متفقہ طور پر مطالبہ پاکستان کی حمایت کی گئی۔

سیاسی محاذ سے قطع نظر بریلوی تحریک کا تشخص بطور مسلک بھی کیا جاتا ہے۔ آزاد خیال، فطرت پسند اور سائنٹیفک طرز فکر بریلوی حضرات کے نزدیک مردود ہے خصوصاً وہ ندوۃ العلماء، دیوبند اور علیگڑھ جیسی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہابی، نجدی اور دیوبندی ایک ہی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ انہیں اہل سنت سے نہیں گردانتے اور اکثر اوقات ان عقائد کے حامل افراد پر فتویٰ کفر بھی صادر کیا گیا ہے۔

برعظیم پاکستان و بھارت میں ان کی سینکڑوں درسگاہیں ہیں۔ جن میں سے اکثر اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے ناموں سے منسوب ہیں۔ لاہور میں جامعہ نظامیہ رضویہ جامعہ نعیمیہ اور دارالعلوم انجمن حزب الاحناف، کراچی میں دارالعلوم امجدیہ اور جامعہ تبلیغیہ ملتان میں مدرسہ انوار العلوم، لائلپور میں مدرسہ منظر الاسلام اور جامعہ رضویہ، مراد آباد (بھارت) میں جامعہ نعیمیہ اور بریلی میں مدرسہ منظر الاسلام قابل ذکر ہیں۔

بریلوی عقائد سے دیگر مسلمان اختلاف رکھتے ہیں خصوصاً دیوبندی عقائد کی رو سے یہ بدعتیں ہیں اور قابل مذمت ہیں۔ جبکہ بریلوی حضرات کے نزدیک یہ ایمان کا جزو اور عین اسلام ہیں۔ عقائد میں بریلوی تقلید کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک عقائد صرف وہی ہو سکتے ہیں، جو قدیم مجتہدین نے وضع کیے تھے۔ غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے مجتہد امام کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک عقائد کے لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک ایک ہیں۔ ان میں فرق صرف فروعی مسائل میں اختلاف سے ہے۔

بریلوی عقائد میں توحید سے مراد سے مراد اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اس کے محبوب پیغمبر آخر الزمان آنحضور صلعم کی عزت و عظمت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم بالذات ہے اس کے بتائے بغیر کسی کو ایک حرف کا علم بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا علم اس کی صفت ہے اور واجب ہے۔ وہ ہر ترکیب، زمان و مکان اور ہر عیب سے پاک ہے۔ وہ ہر چیز کا ہمیشہ سے جاننے والا ہے۔ اس کا علم واجب اور قدیم ہے۔

انبیائے کرام رب کا آئینہ ہیں آواز اور زبان ان کی ہوتی ہے اور کلام رب کا ہوتا ہے۔ عام انبیاء مرد اور بشر تھے۔ جن، فرشتہ، عورت وغیرہ نبی نہیں ہوتے۔ نیز نبی ہمیشہ اعلیٰ خاندان سے اور عالی نسب ہوتا ہے اور نہایت عمدہ اخلاق کا مالک ہوتا ہے نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ نبوت عطائے الٰہی ہے کوئی شخص اپنی عبادات اور اعمال سے نبوت کا درجہ نہیں پا سکتا۔

آنحضور صلعم آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد نبوت کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا آنحضور انسانوں میں سے تھے۔ مگر مظہر نور خدا تھے۔ اس لیے آپ کو بشر کہنا یا بھائی یا برابری کے لقب سے پکارنا حرام ہے۔ آپ بشر ظاہری تھے۔ اور یہ بشریت دوسروں سے مختلف تھی۔ آپ کے جسم مبارک کا سایہ تک نہ تھا۔ اور آپ کے پسینے سے خوشبو آتی تھی۔ آپ کو پانچ غیبوں کی جزئیات کا علم دیا گیا تھا۔ آپ کا علم ساری خلقت سے زیادہ ہے۔ آپ کو حقیقت روح اور متشابہات قرآن کا بھی علم عطا ہوا تھا۔ نیز آپ کو لوح محفوظ پر لکھے ہوئے تمام واقعات کا بھی علم تھا۔ آپ تمام مخلوق الٰہی میں بڑے عالم ہیں۔ آپ کے کسی وصف پاک کو اسے چیزوں سے تشبیہ دینا یا ان کے برابر بتانا صریح توہین ہے اور یہ کفر ہے۔ آنحضور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ روز قیامت آپ شفاعت کریں گے۔ نیز اس دنیا میں بھی آپ مسلمانوں کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ آپ سے مدد مانگنا اور یا رسول اللہ کا نعرہ لگانا جائز ہے۔

اولیائے کرام نور خدا سے دیکھتے ہیں۔ انہیں بالواسطہ انبیائے کرام سے کچھ علوم غیب ملتے ہیں۔ وہ درجے میں نبوت سے کم ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی معجزات اور کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ ان کی کرامات موت کے بعد بھی بدستور رہتی ہیں وہ بھی حاضر و ناظر ہوتے ہیں اور ان سے بھی مدد مانگی جاتی ہے۔ اگرچہ حقیقی مدد خدا سے مانگی جاتی ہے لیکن اولیاء اسی کے مظہر ہیں اور مدد مانگتے ہوئے انہیں وسیلہ بنایا جاتا ہے۔

صوفیاء اور اولیاء امت کے ستون ہوتے ہیں۔ چالیس ابدال ہر وقت دنیا میں موجود ہوتے ہیں، جو آفتوں کو ٹالتے رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے خلق کی حاجات روزی اور تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔

بدعت دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ بدعت حسنہ کی [illegible] جائز، مستحب اور واجب ہیں۔ اسی طرح بدعت سیئہ کی دو اقسام ہیں۔ مکروہ [illegible] مثلاً فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا اور عمدہ عمدہ کھانوں میں وسعت کرنا جائز ہے۔ مسافر خانوں اور مدرسوں کا بنانا مستحب ہے۔ علم نحو کا سیکھنا اور [illegible] واجب ہے اور مسجدوں کو فخریہ زینت دینا مکروہ اور جبریہ مذہب [illegible]

بریلویوں کے نزدیک جائز امور میں بلند آواز سے درود شریف پڑھنا [illegible] اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دینا، نیاز دینا، ان سے مدد مانگنا [illegible] بدنی اور مالی عبادات دوسرے مسلمانوں کو بخشنا۔ فاتحہ، تیجہ، چالیسواں [illegible] میت کے لیے دعا کرنا، خواہ وہ نماز جنازہ سے پہلے ہو یا [illegible] پیچھے آگے کلمہ طیبہ یا درود شریف پڑھنا، میت کے ساتھ [illegible] غلاف کعبہ، شجرہ یا عہد نامہ رکھنا، تدفین کے بعد اذان دینا [illegible] مشائخ کے مزار بنانا، قبروں پر پھول چڑھانا، چراغ جلانا [illegible] جانور پالنا، عبدالنبی یا عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا، اچھے [illegible] گیارھویں شریف وغیرہ کا ختم دلانا شامل ہیں۔

مستحب امور میں محفل میلاد منعقد کرنا، ولادت پاک کی خوشی منانا [illegible] کے موقع پر خوشبو لگانا، گلاب چھڑکنا، شیرینی تقسیم کرنا، غرضیکہ خوشی کا اظہار کرنا اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا، ان کے تبرکات، لباس اور بال وغیرہ کو بوسہ دینا اور ان کی تعظیم کرنا، موذن کے اشھد ان محمد الرسول اللہ کہنے پر سننے والوں کا دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا شامل ہیں۔

یہ عقائد صرف بریلوی تحریک ہی کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہوئے بلکہ عامۃ الناس میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ بریلوی مکتب فکر نے اسے جلا بخشی اور تقویت عطا کی۔

بریلی ہندوستان کے صوبہ اترپردیش کے دو مشہور شہر۔ ایک رائے بریلی اور دوسرا بانس بریلی کہلاتا ہے۔ رائے بریلی سے سید احمد شہید نے اپنی تحریک جہاد کا آغاز کیا اور بانس بریلی میں اعلیٰحضرت احمد رضا بریلوی نے اپنے مدرسہ "جامعہ منظر الاسلام" کی بنا ڈالی، جہاں سے بریلوی تحریک کا آغاز ہوا۔ رائے بریلی کے لئے دیکھئے عنوان "رائے بریلی"۔

بانس بریلی شہر دہلی سے ایک سو تیس میل جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہ روہیل کھنڈ ڈویژن اور ضلع بریلی کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہاں کی آبادی سوا تین لاکھ تھی یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔

بانس بریلی کی بنیاد ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء میں رکھی گئی۔ اس کے نزدیک ہی بانس کا ایک قدیم جنگل ہے، جو اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ مغل بادشاہ اکبر نے یہاں ایک قلعہ بنوایا تھا۔ بعد میں اس قلعے کے گرد لوگ بسنا شروع ہو گئے اور یہ ایک قصبے کی شکل اختیار کر گیا۔ شاہجہان کے دور میں اسے روہیل کھنڈ کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوؤں نے یہاں سے مغلوں کے صوبے دار کو نکال کر حکومت خود سنبھال لی مگر بہت جلد ان میں پھوٹ پڑ گئی اور حکومت کی باگ ڈور روہیلہ سردار علی محمد خاں کے ہاتھ آ گئی۔ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں حافظ رحمت خاں اس کا جانشین بنا۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں سعادت یار خاں وزیر اودھ کے ماتحت اس شہر کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں یہ شہر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء اور ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۲ء میں یہاں زبردست ہندو مسلم فسادات ہوئے اور ۱۸۵۸ء تک یہ شہر انگریزوں کی عملداری سے باہر رہا۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں کی اکثر مسلمان آبادی پاکستان ہجرت کر گئی۔

بریلی کی قابل ذکر عمارات میں جامع مسجد تعمیر شدہ ۱۶۶۰ء، مقبرہ رحمت خاں ۱۷۷۵ء، کمپنی باغ اور مرزائی باغ اہم ہیں۔

بریلی سڑکوں اور ریل کے ذریعے اردگرد کے تمام شہروں سے ملا ہوا ہے۔ دہلی سے لکھنؤ جانے والی ریلوے لائن کا جنکشن ہے۔ یہاں کی اہم صنعت شکر سازی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ماچس، کپڑے اور لکڑی سے بننے والی مصنوعات خصوصاً فرنیچر اور دریاں بنانے کی فیکٹریاں بھی کام کر رہی ہیں۔

ضلع بریلی ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے جو جنوب کی طرف بتدریجاً ڈھلوان ہوتا جاتا ہے۔ ضلع کی کل آبادی ۱۹۷۱ء میں بیس لاکھ کے قریب تھی۔ ۱۵۹۱ مربع میل پر آباد ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز ہے اور گنگا سے نکلنے والی نہروں سے سیراب ہوتی ہے۔ اہم فصلیں گندم، چاول اور گنا ہیں۔

روہیل کھنڈ ڈویژن بجنور، بدایوں، مراد آباد، پیلی بھیت، رام پور، شاہجہانپورہ اور بریلی کے ضلعوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۹۷۱ء میں ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی۔

بزرگ امید، کیا (وفات ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء) قلعہ الموت کا اسماعیلی حاکم، جو ۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء سے ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء تک یہاں کا حاکم رہا۔ اس نے یہ قلعہ تین اور سرداروں کی معیت میں حسن بن صباح کے لئے فتح کیا کیونکہ اس پر جن لوگوں کا قبضہ تھا انہوں نے اسماعیلیوں کے ساتھ معاہدہ توڑ کر سلجوقی امیر نوشتگین شیرکو وہاں بلانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد بزرگ امید نے وہاں کے مقامی مزدوروں کو بیگار میں پکڑ کر اس قلعے کو از سر نو تعمیر کرایا اور پانی وغیرہ کا بندوبست کر کے ایک عمدہ باغ بھی لگوایا۔ اس نے اسی قلعے میں ۱۱۱۷ء میں تتر کے حملے کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

حسن بن صباح نے اپنی وفات کے وقت ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء میں بزرگ امید کو اپنے فرقے کا داعی اور اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس کے دور حکومت میں اسماعیلی ریاست نے نئے حملوں کے باوجود اپنی خود مختاری قائم رکھی۔ اس نے کئی جدید جنگی قلعے تعمیر کرائے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کیا محمد داعی بنا۔ اور پھر اس کی اولاد الموت کا ایک سربرآوردہ خاندان بن گئی تھی۔

بزنطینی بازنطینی یا بوزنطی، مشرقی روم (اٹلی) کی ایک سلطنت اور اس سے متعلقہ چیزوں کا نام جو قرون وسطیٰ کی سب سے بڑی یورپی سلطنت تھی اس سلطنت کی بنیادیں قدیم ہیلی سلطنت میں گڑی ہیں۔ اس سلطنت نے اسلامی ترک یلغاروں کا بڑی حد تک مقابلہ کیا اور تاریخ تہذیب پر انمٹ اور گہرے نقوش چھوڑے۔ گیارہویں صدی میں اس کا تمدن شان و شوکت کے عروج پر تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد لاطینیوں اور نارمنوں کے حملوں کے بعد یہ سلطنت کمزور ہونا شروع ہوئی اور بالآخر سولہویں صدی کے بعد زوال پذیر ہو گئی۔

عام طور پر قسطنطین اعظم اول (۲۷۴ء تا ۳۳۷ء) کو اس سلطنت کا پہلا حکمران سمجھا جاتا ہے اور قسطنطین یازدہم (۱۴۴۹ء-۱۴۵۳ء) کو اس کا آخری حکمران گردانا جاتا ہے ان کے حکمران ارکیڈیس نے ۳۹۵ء میں یونانی شہر بزنطیم کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یوں ایک طرح سے اسی کے عہد سے بزنطینی سلطنت کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دور میں اہل روما اور فارس کے درمیان زبردست جنگیں ہوتی رہیں۔ جن کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ طلوع اسلام کے وقت فارس اور روم ہی دو بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، جو آپس میں ٹکرا کر اس قدر کمزور اور پست حوصلہ ہو گئیں کہ بہت جلد مٹھی بھر مسلمانوں نے انہیں شکست فاش دینا شروع کر دی۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بحیرہ روم میں کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دیں اور بزنطینی صوبوں مثلاً شام، مصر اور شمالی افریقہ کو فتح کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمانوں نے ایشیائے کوچک (ترکی) پر چڑھائی کر دی۔ قسطنطین پنجم (۷۴۱ء - ۷۷۵ء) نے کسی قدر سخت مدافعت کا مظاہرہ کیا۔ اور مسلمانوں کو اس کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑا۔ تاہم مسلمانوں نے استنبول (قسطنطنیہ) پر قبضہ کر لیا۔ اور دوسری طرف بلغاریوں نے بزنطینی سلطنت پر دھاوے بولنا شروع کر دیئے۔ کچھ عرصہ بعد اس کے حصے بخرے ہونا شروع ہو گئے اور یہ سلطنت لاطینی شہنشاہوں کی عملداری میں چلی گئی۔

۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں اسلامی سلطنت عثمانیہ کی بنا پڑی۔ ارطغرل کا بیٹا عثمان خان اول تخت نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور ایشیائے کوچک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے اس سے بہتر موقع عثمان کو نہیں مل سکتا تھا لیکن اس نے اپنی زیادہ تر توجہ بزنطینی علاقوں کی طرف مبذول رکھی۔ اور اس کے چند ایک اسباب تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ خود اس کی جاگیر بزنطینی سرحد سے متصل واقع تھی۔ اور بزنطینی سلطنت کی کمزوری روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری وجہ اسلام کی تبلیغ تھی۔ بزنطینیوں سے برسرپیکار ہونے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ عثمان کے لئے دوسری جانب قدم بڑھانے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ سلجوقی امراء جنہوں نے خودسر حکومتیں قائم کر لی تھیں طاقت میں اس سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ عثمان نے تخت نشین ہوتے ہی حملے شروع کر دیئے۔ ابتدا میں اس کی لڑائیاں مدافعانہ تھیں بزنطینی قلعہ دار دولت سلجوقیہ کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔

سلطان قونیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے عثمان کو ان حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے لگے بڑھنا پڑا اور پہلے ہی سال قراجہ حصار کا معرکہ پیش آیا۔ عثمان نے اس قلعہ کو فتح کر کے بزنطینیوں کو آئندہ کے لئے متنبہ کر دیا۔ سلطان علاء الدین نے قراجہ حصار اور اس کے قرب وجوار کا سارا علاقہ جو عثمان نے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا جاگیر کے طور پر عثمان کو بخش دیا۔ ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء میں جب سلجوقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو عثمان ایک آزاد اور خود مختار فرمانروا بن گیا۔ اس طرح سلجوقی امرا اور عثمان کے درمیان جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود عثمان کی نظر بزنطینی سلطنت کے زرخیز مقبوضات پر مرتکز رہی۔

دوسرے ترک سرداروں نے بزنطینی قلعداروں سے اتحاد کر کے اس کے مقبوضات پر حملہ آور ہوئے۔ اس طرح جنگ کا جو سلسلہ ۶۹۷ھ/۱۲۹۸ء میں چھڑا وہ ابتداً عثمان کی طرف سے بالکل مدافعانہ تھا۔ اگر اس نے ان سب حملہ آوروں کو شکست دی اور بزنطینی قلعے یکے بعد دیگرے فتح کئے۔ اور بالآخر ینی شہر پر قبضہ کر کے اسے اپنی سلطنت کا پایہ تخت بنایا۔ ۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء میں عثمان کو نکومیدیا سے متصل قیون حصار کے مقام پر پہلی بار شہنشاہ قسطنطنیہ کی باقاعدہ افواج سے مقابلہ پیش آیا جس میں عثمان کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور اس طرح بزنطینی قلعے پے در پے مسخر ہوتے چلے گئے۔ بروصہ، نائقیا اور نکومیدیا کے گرد عثمان کی فوجی چوکیوں کا ایک مضبوط حصار قائم ہوگیا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے بزنطینیوں نے تاتاریوں کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ لیکن عثمان کے لڑکے آرخان نے انہیں شکست دی اور بزنطینیوں کی امید کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔

۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء میں عثمان نے بروصہ کا محاصرہ کیا جو بزنطینیوں کا ایشیائے کوچک میں ایک نہایت ہی اہم شہر تھا۔ یہ محاصرہ تقریباً دس سال تک رہا اور بالآخر محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اس طرح ایک اہم بزنطینی شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

اس کے بیٹے آرخان نے تخت نشین ہوتے ہی نکومیدیا پر قبضہ کر لیا۔ اب بزنطینی سلطنت کے ایشیائی مقبوضات میں صرف ایک ہی بڑا شہر نائسیارہ باقی رہ گیا تھا جو اپنی عظمت واہمیت کے لحاظ سے قسطنطنیہ سے دوسرے درجے پر تھا۔ آرخان نے اسے بھی ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اگرچہ آرخان نے اس شہر کے باشندوں کو عام اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا تمام مال واسباب لے کر دوسرے شہر میں چلے جائیں لیکن بروصہ کے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی بکثرت مسلمان ہوگئے اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہے۔ ۱۴۵۳ میں مراد دوم نے قسطنطنیہ (استنبول) کو فتح کر لیا اور اس کے ساتھ ہی بزنطینی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

بزنطینی سلطنت نے تہذیب وتمدن پر جو نقوش چھوڑے، وہ انمٹ ہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ عنوان "روم" کے تحت ملے گا۔ تاہم اتنا ضرور درج کیا جا سکتا ہے کہ بزنطینی آرٹ اور طرزِ تعمیر نے اسلامی تمدن کو بے حد متاثر کیا اور ان کی تعمیرات پر بھی بزنطینی فن تعمیر کا اثر چھا گیا۔ جن میں محراب اور گنبد کی صورتیں شامل ہیں۔ یہ اثرات پندرھویں صدی عیسوی تک اپنے عروج کو پہنچ چکے تھے۔ خصوصاً آرمینیا بلقان، روس اور ترکی میں اب بھی اس تہذیب کے اثرات ملتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی آرٹ اور فن تعمیر زیادہ تر بزنطینی آرٹ اور فن تعمیر کا مرہون منت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ (نیز دیکھئے "تعمیرات"، "روم")

آٹھویں صدی عیسوی کی اسلامی تعمیرات میں بزنطینی آرٹ کی ایک جھلک

بساسیری، ابو الحارث (وفات ۸ ذوالحجہ ۴۵۱ھ/۱۵ جنوری ۱۰۶۰ء) ایک ترک غلام جو عہد آل بویہ کے آخری دور کا اعلیٰ فوجی قائد تھا۔ اس کا پہلا آقا فارس کے ایک مقام بسا کا رہنے والا تھا۔ اسی لیے ابو الحارث کا لقب بھی بساسیری پڑا۔ بہاء الدولہ نے اسے خرید لیا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے بلندترین منصب تک پہنچا۔ سب سے پہلے اس کا نام جلال الدین اور موصل کے عقیلیوں کے مابین ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء میں ہونے والی جنگوں کے درمیان آتا ہے۔ جن میں بساسیری نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ بغداد میں اس کا ایک طاقتور دشمن خلیفہ کا وزیر رئیس الرؤسا ابن المسلمہ تھا۔ جس نے طغرل بیگ سے پینگی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ جب ترک سرداروں اور خلیفہ کے درمیان اختلافات ہوئے تو بساسیری نے ابن المسلمہ پر طغرل کے حامی غزوں کو طلب کرنے کا الزام لگایا۔ اس نے فاطمی خلیفہ سے قاہرہ جانے کی اجازت مانگی تو خلیفہ نے فاطمی امداد کے لیے بساسیری کی درخواست منظور کر لی۔ اور لکھا کر بغداد کو میرے نام پر مسخر کیا جائے۔ المستنصر نے بساسیری کو رحبہ کا گورنر مقرر کر دیا اور پانچ لاکھ دینار، اتنی ہی مالیت کے کپڑے، پانسو گھوڑے دس ہزار کمانیں اور ایک ہزار تلواریں نیزے اور زرہ بھیجے ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں بساسیری نے سنجار کے علاقے پر حملہ کیا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد فتح پائی اور اس طرح موصل میں بھی فاطمی خلیفہ المستنصر کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ بعد میں طغرل نے جوابی حملہ کیا اور دوبارہ موصل پر اس کا قبضہ ہو گیا اور بساسیری رحبہ لوٹ آیا۔ ابراہیم ینال اپنے بھائی طغرل کی سلطنت پر قبضہ جمانا چاہتا تھا اس نے بساسیری کو خط لکھا اور بھائی کی سلطنت لینے کے لیے اس سے روابط بڑھائے تاکہ فاطمیوں کی مدد حاصل ہو سکے۔ بساسیری نے چار ماہ محاصرہ کرنے کے بعد موصل فتح کر لیا۔ اور دوبارہ رحبہ واپس لوٹ آیا۔ طغرل نے دوبارہ موصل اپنے قبضے میں لے لیا۔

۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں بساسیری شہر بغداد کے مغربی حصہ میں چار سو سواروں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس نے جمعہ کے روز مسجد منصور میں فاطمیوں کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور مسجد رصافہ میں بھی خلیفہ مستنصر کی خلافت کا اعلان کرایا۔ اگرچہ عباسی خلیفہ قائم نے قصر خلافت کی قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ لیکن بساسیری کو نہ صرف کرخ کے شیعوں کی حمایت حاصل تھی بلکہ بہت سے سنی بھی مال غنیمت کے لالچ میں آکر اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ یکم ذی الحجہ ۴۵۰ھ/۱۵ جنوری ۱۰۵۹ء کو بساسیری نے قصر خلافت پر حملہ کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد بساسیری نے واسط اور بصرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ مستنصر چاہتا تھا کہ بساسیری عباسی خلیفہ القائم کو اس کے حوالے کرے لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا تو اسے بساسیری پر بہت غصہ آیا۔ بساسیری کی قاہرہ سے ہر قسم کی امداد بند کر دی۔ ادھر طغرل سے بھی بساسیری کا معاملہ طے نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ۴۵۱ھ/۱۰۶۰ء میں بغداد سے کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ طغرل نے اس کا پیچھا کیا۔ دونوں کے مابین جنگ ہوئی اور وہ الفرات کے مقام پر مارا گیا۔

بستانی لبنان کا ایک خاندان، جس نے ادبی لحاظ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس خاندان کا تعلق مارونی فرقے سے تھا۔ اس خاندان کے چند مشہور علماء یہ ہیں۔

۱۔ **پطرس البستانی**:۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں بیروت کے ایک گاؤں الدبیّہ میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام بولوس بن عبداللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم ایک مسیحی مدرسے میں حاصل کی۔ ۱۸۴۰ء میں بیروت کے امریکی مشن ہائی سکول میں داخل ہوا۔ یہیں پر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا۔ ۱۸۶۰ء میں عبیہ میں عربی کا مدرس ہوا۔ دو سال قیام کرنے کے بعد بیروت چلا گیا اور وہاں پر اس نے انجیل کا عبرانی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۸۳ء میں بیروت میں اس جہان سے چل بسا۔

اس کی تصانیف میں ۱۔ "کشف الحجاب" (فی علم الحساب) جو اس نے عبیہ میں اپنے دو سالہ قیام کے دوران میں لکھی۔ ۲۔ انجیل کا عبرانی سے عربی میں ترجمہ۔ ۳۔ "محیط المحیط" عربی زبان کی فیروزآبادی کی القاموس میں اضافے کر کے دو جلدوں میں تیار کی۔ ۴۔ "قطر المحیط" میں "محیط المحیط" کا اختصار کیا گیا جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ ۵۔ "الجنہ و الجنینہ" یہ دو مجلے تھے جو بعد میں ماہنامہ "الجنان" میں مدغم ہو گئے۔

۶۔ "قاموس الاعلام" اس میں بستانی نے مختلف لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ "دائرۃ المعارف" یہ البستانی کا ایک عظیم کام تھا، جو عربی ادب میں اس کے پیش روؤں کے تجربوں پر مبنی تھا۔ یعنی تمام اقسام علوم کا ایک ضخیم مجموعہ معلومات۔ اس کی چھ جلدیں مکمل طور پر طبع ہو چکی تھیں اور ساتویں جلد کی طباعت شروع ہو چکی تھی کہ بستانی چل بسا۔ اس کے بعد یہ دائرہ گیارہ جلدوں تک شائع ہو سکا جس میں اس کے بیٹوں اور دوسرے لوگوں کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ آخری جلد عنوان "عثمانیہ" تک پہنچی تھی جو ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی تھی۔

۲۔ **سلیمان البستانی** (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۵ء) لبنان کے گاؤں بکشتین میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا مطران سے حاصل کی۔ بعد میں پطرس البستانی کے قائم کیے ہوئے مدرسہ الوطنیہ میں بڑے بڑے اساتذہ سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں ماہنامہ "الجنہ" کے ادارہ تحریر میں شامل ہوا۔ دائرۃ المعارف میں بھی مضامین لکھے بعد میں قاسم زہیر نے اسے بصرے بلا کر ایک نئے ادبی مجلے کی ادارت اس کے سپرد کی لیکن یہ کام ایک سال تک جاری رہ سکا۔ اس کے بعد اس نے مختلف عرب ممالک کی سیاحت کی اور ۱۸۸۵ء میں بیروت آگیا یہاں پر اس نے دائرۃ المعارف کا کام سنبھالا۔ ۱۸۸۸ء میں مصر چلا گیا اور وہاں اس کی عربی مختصر نویسی کی ایجاد کا بہت خیر مقدم کیا گیا۔ اس نے ایران و ہندوستان کی بھی سیاحت کی اور ان دونوں ملکوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس نے بغداد اور قسطنطنیہ کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۰۴ء میں اپنی مشہور کتاب "الیاذہ ھومیروس" جو "ایلیڈ" کا منظوم عربی ترجمہ ہے قاہرہ سے شائع کرائی اور اس طرح عرب کے شعراء کے ذہنوں کو یونانی شاعری سے آشنا کیا۔ ادب عربی ۱۹۰۸ء میں وہ بیروت کے نمائندے کی حیثیت سے نوجوان ترکوں کی مجلس ملی میں شامل ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں سینٹ کا رکن منتخب کیا گیا اور اس بلند پایہ جماعت کا دوسرا صدر چنا گیا۔ بعد میں اپنے اس منصب سے استعفیٰ دے کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۲۵ء میں اس نے وفات پائی۔

۳۔ **ودیع البستانی** (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۴ء) لبنان کے ایک گاؤں ربیہ میں پیدا ہوا۔ اس نے مشرقی ادب کا مطالعہ کیا اور مشرق و مغرب کے دور دراز ممالک کی سیاحت کی۔ اور اس طرح اپنے علم کو وسعت دی۔ ہندوستان اور فلسطین میں بھی کافی عرصہ قیام کیا۔ اسرائیلی غاصبانہ تحریک کے خلاف مختلف مضامین لکھے۔ رباعیات عمر خیام اور داستان مہابھارت کے ایک بڑے حصہ کا عربی میں ترجمہ کیا۔

بعض افراد نے اس ادب دوست خاندان کی اعلیٰ روایات کو اب بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ جن میں بطرس البستانی، جو بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں ادب کا پروفیسر ہے اور "ادباء العرب" اور "التوابع والزوابع" کا مصنف ہے۔ اسی طرح سعید البستانی

ہے جو پیرس یونیورسٹی میں عربی کا استاد ہے۔

بُسرؓ بن ارطاۃ ایک عرب سپہ سالار اور صحابی رسولﷺ۔ قریش کی شاخ بنو عامر سے تھے۔ ہجرت سے دس سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے۔ تشیعی روایات میں انھیں صحابہؓ کرام میں شامل نہیں کیا جاتا۔

شام کی طرف جو امدادی فوج حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں گئی تھی اس میں حضرت بُسرؓ شامل تھے۔ اور وہاں پر انہوں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فتح افریقہ میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں ان کی بہادری کے سبب دعا دی تھی اور انعام سے بھی نوازا تھا۔ مسلمانوں کی باہمی جنگ میں انہوں نے امیر معاویہؓ کا ساتھ دیا۔ جنگ صفین میں بھی وہ شامی لشکر میں شامل تھے جب عمروؓ بن العاص نے مصر کو امیر معاویہؓ کے لیے دوبارہ فتح کیا تو بُسرؓ نے ان کی اعانت کی۔

یمن میں انھوں نے عبیداللہ اور ابن عباس کے دو نو عمر بیٹوں کو ہلاک کیا جب حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبرداری اختیار کی تو اس وقت ایک جمعیت امیر معاویہؓ کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ بسرؓ اس ہراول فوج کے سپہ سالار تھے۔ اس صلے میں انہیں بصرہ کا عامل بنایا گیا۔ وہ عراق میں ایک قلیل عرصہ رہے۔ اس کے بعد بسرؓ نے بزنطینی سلطنت کے خلاف کئی بحری مہمات کی قیادت کی۔ ۵۰ھ/۶۷۰ء میں امیر معاویہؓ نے انہیں اپنا نائب مقرر کیا اس دوران میں یہ کبھی سپہ سالار اور کبھی امیر البحر کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ امیر معاویہؓ کی وفات تک ان کے دربار میں رہے۔ ولید کے عہدِ حکومت میں انہوں نے افریقی فوج کشی میں دوبارہ حصہ لیا۔ بعض کے نزدیک انہوں نے عبدالملک کے دور میں مدینہ میں ایک طویل عمر پاکر وفات پائی۔ ان کی اولاد میں بڑے نامور محدث گزرے ہیں جن سے امام بخاریؒ اور امام مسلم نے صحیحین میں روایت کی ہے۔

بسرؓ کی شخصیت بڑی نمایاں تھی۔ وہ قدیم طرز کے بدوی سرداروں کا نمونہ تھے۔ سخت گیر کے طور پر مشہور تھے۔ انہیں جب حضرت علیؓ کے حامیوں کے مقابلے میں اندرون عرب بھیجا گیا تو وہ بڑی بے جگری سے لڑے اور جہاں جہاں مخالفین عثمانؓ کے ٹھکانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ بنو امیہ کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔

بسط پھیلاؤ، بڑھنا۔ تصوف کی ایک اصطلاح۔ جو قبض کی متضاد ہے اور اس کا اطلاق اس روحانی کیفیت پر ہوتا ہے جسے حال کہا جاتا ہے۔ اور جو مقام امید میں طاری ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

"تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور بڑھانا بھی اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔" (۲:۲۴۵)

صوفیاء کے نزدیک حال کا شخصی اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک احساس مسرت ہے جو صوفی کو اللہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ صوفیاؒ کی نظر میں بسط کا درجہ قبض سے کم تر ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کو خدا کا وصل حاصل نہ ہو جائے اور انسان اس کی ذات میں گم نہ ہو جائے اس وقت تک یاس کے سوا کوئی اور احساس مناسب ہی نہیں۔ جنید بغدادیؒ نے بسط کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: "خوف خدا مجھ میں قبض پیدا کرتا ہے اور اس کی بارگاہ سے امید مجھ میں بسط پیدا کرتی ہے جب وہ خوف کے ذریعے مجھ میں قبض پیدا کرتا ہے تو میں اپنی خودی سے باہر ہو جاتا ہوں لیکن وہ رجا (امید) کے ذریعے مجھ میں بسط پیدا کرتا ہے تو میں اپنی خودی میں واپس آجاتا ہوں۔"

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں "قبض سے مراد ہے حالت حجاب میں دل کا سکڑ جانا اور بسط سے مراد ہے حالت کشف میں اس کا پھیل جانا۔"

ابن الفارض نے اس صوفی نکتے کو اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے جس کا مطلب ہے "بسط" کے حال میں جو رحم ہے، میں اس میں سراپا خواہش بن جاتا ہوں اس کی وجہ سے تمام دنیا کی خواہشات وسیع ہو جاتی ہیں۔ "قبض" کی حالت میں جو دہشت ہوتی ہے اس میں مجسم ہیبت بن جاتا ہوں اور جس کسی پر میری نظر پڑتی ہے اس کی گردن میرے سامنے احتراماً جھک جاتی ہے۔

بسم اللہ خدا کے نام سے (آغاز) ایک آیت کے ابتدائی الفاظ۔ پوری آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے جس کے معنی ہیں شروع اس کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ قرآن مجید میں سوائے "سورۃ التوبہ" کے ہر سورۃ کا آغاز اس کلمے سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ متن قرآن میں یہ آیت ایک مقام پر مکمل کلمے کی شکل میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کے ضمن میں آئی ہے "یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے اور یہ اللہ کے نام سے شروع ہوتا ہے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے" (۲۷:۳۰)

دوسری جگہ اختصار سے آئی ہے "حضرت نوحؑ نے لوگوں سے کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا اللہ کے نام سے ہے" (۱۱:۴۱)

فقہ اسلامی میں کلمہ بسم اللہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے کہ آیا وہ ان سورتوں کی ایک آیت یا جزو ہے یا نہیں۔ اس بارے میں مختلف آرا ہیں۔ اس بنا پر سورتوں کی آیات میں بھی اختلاف ہے۔

قراء حضرات سورۃ التوبہ کے سوا ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا ضروری قرار دیتے ہیں البتہ جب مسلسل تلاوت قرآن جاری ہو اور ایک سورت کے بعد دوسری سورت شروع ہو تو اس سورت میں بسم اللہ پڑھنے میں قراء میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک بغیر بسم اللہ پڑھے دو سورتوں کو وصل جائز ہے اور بعض کے نزدیک ناجائز۔

جہری نمازوں میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حنفیوں کے نزدیک بسم اللہ اونچی آواز کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس مسئلہ میں بھی علماء میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن ہے یا نہیں اس سلسلے میں علماء کے تین مسلک ہیں۔ جن میں سے ایک مسلک معتدل ہے اور دو انتہا پسند ہیں۔

بسم اللہ پڑھنا حصول برکت کی غرض سے، کھانا کھانے سے پہلے، پانی پینے، کپڑے پہننے سے پہلے غرض ہر کام کے شروع میں مستحسن ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس کام کو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ ادھورا اور بے برکت ہو جاتا ہے۔ نیز ذبیحہ کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا چاہیے اور جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔

بشارت خوشخبری، مژدہ۔ بقول مولانا مودودی: مایوسی، مغویت

اور پژمردگی کے مقابلے میں پُرامید بنانا حوصلہ بڑھانا اور مایوسی کو دور کرنا بشارت دینے کے لفظ میں یہ سب معنی شامل ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہوں پر آیا ہے۔ مثلاً۔

"اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔" (۱۰: ۸۷)

اسی طرح دیگر مقامات پر ارشاد ہے۔

اور [illegible] بشارت دے دے عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو۔ جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو انکے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے۔ اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا [illegible] خرچ کرتے ہیں۔" (۲۲: ۳۴ - ۳۵)

اور [illegible] بشارت دے دے نیکوکار لوگوں کو۔" (۲۲: ۳۷)

"اس دن جب تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ آج بشارت ہے تمہارے لئے جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں [illegible]" (۵۷: ۱۲)

[illegible] بشارت [illegible] کے لئے ارشاد ہے:۔

"[illegible] جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں [illegible] جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے [illegible] ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان [illegible] ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے [illegible] وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے [illegible] وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو [illegible] راضی ہوئے [illegible] کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ [illegible] فلاح پانے والے ہیں۔" (۵۸: ۲۲)

[illegible] بشارت کا لفظ [illegible] معنوں میں بھی آیا ہے [illegible] مشتقات [illegible] ابراہیم کو اسحاق کو بشارت دی۔ [illegible] بشارت کا لفظ خوشخبری کے معنوں ہی میں استعمال ہوا ہے۔

بشر [illegible] انسان کی [illegible] مولانا مودودی انسان کی [illegible] لفظ انسان [illegible] اس کا ذکر [illegible] ہے [illegible] یعنی جس کی جلد دوسرے حیوانات [illegible] صوف یا بالوں اور پروں سے ڈھکی نہ ہو۔

[illegible] یہ لفظ کئی بار استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

"جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں [illegible]" اور اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:۔

"کسی [illegible] یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے وہ برتر اور حکیم ہے۔" (۴۲: ۵۱)

اور کہیں منکرین نبوت کی اس دلیل کے سلسلے میں جس میں وہ کہتے تھے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ آیا ہے۔

"بستی والوں نے کہا تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر اور خدائے رحمان نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم جھوٹ بولتے ہو۔" (۳۶: ۱۵) (نیز دیکھئے انسان)

بشر بن براءؓ صحابی رسولؐ۔ قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنو سلمہ سے تھے۔ مدینہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے والد کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا اور بیعت عقبہ کے موقع پر [illegible] کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بدر، احد، خندق اور خیبر کے غزوات میں بھی شریک رہے۔ خیبر میں جب ایک یہودیہ نے آنحضورؐ کو زہر ملا بھیڑ کا گوشت کھانا چاہا تو آنحضورؐ نے تو چکھ کر زہر معلوم کر کے گوشت تھوک دیا لیکن بشرؓ نے کھا لیا اور اسی کے اثر سے وفات پا گئے۔ بعض کے نزدیک گوشت کھانے کے فوراً بعد انتقال کیا اور بعض کے نزدیک ایک سال بیمار رہنے کے بعد وفات پائی۔ بشرؓ بڑے پرجوش اور بہادر مسلمان تھے۔ تیراندازی میں بڑے مشہور تھے۔ آنحضورؐ انہیں قبیلہ بنو سلمہ کے سید کے نام سے یاد فرماتے تھے۔

بشر بن غیاث (م [illegible] ھ ۸۳۳ء) ابو عبدالرحمان بشر بن غیاث بن ابی کریمہ ابو عبدالرحمان [illegible] فرقے کا ایک مشہور عالم۔ فقہ کی تعلیم امام ابو یوسف سے حاصل کی۔ حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ اور دوسرے محدثین سے حدیث کی سماعت کی۔ الہیات میں [illegible] مرجیہ کے مسلک کا حامی تھا۔ قرآن کو مخلوق [illegible] چونکہ خلق قرآن کا عقیدہ سب سے پہلے اسی جہم بن صفوان نے پیش کیا تھا اسی وجہ سے بشر کو جہمی بھی کہا جاتا ہے [illegible] معتزلہ کا عقیدہ بھی قرآن کے بارے میں یہی تھا۔ اس بنا پر اسے معتزلی بھی کہا گیا ہے۔

بشر نے ایمان کی تعریف یوں کی ہے۔" دین اسلام کا قلب و زبان سے اقرار کرنا ایمان ہے۔ اور جو شخص تصدیق نہیں وہ ایمان بھی نہیں۔" اس کے نزدیک خدا کی نافرمانی کے [illegible] افعال گناہ کبیرہ ہیں۔

مشیت الٰہی کی بھی اس نے دو [illegible] قسمیں بتائی ہیں۔ تقدیر کے بارے میں اس کا مسلک دو [illegible] پسند [illegible] عقیدوں جبریہ اور قدریہ کے بین بین ہے اور یہی مسلک اہل سنت والجماعت کا بھی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اسے معتزلہ سے الگ گردانتے ہیں۔

بشر کے بارے میں کئی روایات بیان کی جاتی ہیں ایک روایت میں ہے کہ اس کے عقائد کی وجہ سے اس پر جبر و تشدد کیا گیا اور تقریباً وہ بیس سال تک روپوش رہا۔ ایک روایت میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام شافعیؒ اپنے قیام بغداد کے دوران میں بشر اور ان کی والدہ کے ہاں مقیم رہے۔ بعض روایات کے تحت بشر نے زندگی کے آخری ایام راسخ العقیدہ [illegible] کی حیثیت میں بسر کی۔ اگرچہ حنبلی انہیں مسلمانوں [illegible] رئیس الملاحدہ (کافروں کا امام) ہی خیال کرتے ہیں۔

بشر بن مُعتمر معتزلہ عقیدہ کا ایک عالم۔ بغداد میں پیدا ہوا۔ وہاں سے بصرہ گیا۔ بصرے میں اس نے بشر بن سعید اور ابو عثمان الزعفرانی سے معتزلہ مذہب کے اصول سیکھے۔ معمر بن عباد السلمی بھی اس کے اساتذہ میں سے تھا۔ جب بصرے سے واپس بغداد آیا تو اس نے بہت سے لوگوں کو معتزلی مذہب کے پیروکار بنا دیا۔ جس پر ہارون الرشید نے اسے قید میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے زمانہ اسیری میں مذہب معتزلہ کے تین بنیادی اصولوں "عدل"، "توحید"، "وعید" پر بیس ہزار کے قریب اشعار نظم کئے۔ یہ اشعار زندان سے نکل کر زبان زد عام ہو گئے

تو ہارون الرشید نے اسے مزید قید میں رکھنا مناسب خیال نہ کیا۔ کیونکہ قید کے دوران میں لوگوں پر اس کا اثر زیادہ تھا۔

بشر ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا خطیب بھی تھا اس نے مصنفوں اور شاعروں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا ہے "شاعر کو الفاظ کا خفیہ تأثر محسوس کر لینا چاہیے اور ایسے نفیس و جمیل الفاظ منتخب کرنا چاہئیں جو سادہ اور ادائے مطلب میں واضح ہوں۔"

بشر نے معتزلی مذہب پر کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں سے چند اجزا محفوظ رہ گئے ہیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے التولد (افعال زائیدہ) پر بحث کی ہے اس کے نزدیک عقل جونہی بلوغت کی حد تک پہنچتی ہے وہ نیکی اور بدی میں کسی وحی سے بھی پہلے تمیز کر سکتی ہے اور اسی وجہ سے کسی خوبی یا عدم خوبی کا انحصار انسانوں پر ہی ہوتا ہے۔ اس کے قول کے مطابق "اس شخص کی خوبی زیادہ ہے جو خود اپنے ہی وسائل سے نیکی کرتا ہے۔ بہ نسبت اس کے جسے خدا کے فضل سے مدد ملی ہو۔" اس کے نزدیک توبہ کرنا بے سود ہے۔ جب تک توبہ کے ساتھ یہ ارادہ اور عزم نہ ہو کہ دوبارہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا اور اس پر مزید اصرار نہیں کیا جائے گا۔

بشر کے شاگردوں میں سے ابو موسیٰ المردار، ثمامہ، احمد بن ابی دواد وہ لوگ ہیں جو بعد میں معتزلہ عقائد اور تعلیمات کے استاد بنے۔

بشر حافی (۱۵۲ھ/۷۶۹ء - ۲۲۷ھ/۸۴۱ء) ابو النصر بشر بن حارث بن عبد الرحمان عراق کے ایک صوفی بزرگ۔ مرو کے قریب ایک گاؤں مابرسام یا بکرد میں پیدا ہوئے۔ ان کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ وہ ایک محدث تھے اور غالباً حدیث کے شوق میں انہوں نے کئی ایک سفر بھی کئے جب پہلی دفعہ بغداد پہنچے تو کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مالک بن انسؒ کے حلقۂ درس میں بھی بیٹھے اور ان کے ساتھ حج کے لیے خانہ کعبہ کا سفر بھی کیا۔ بعض حضرات نے ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی شاگردی میں بھی رہے۔ ان کے تصوف اختیار کرنے کے بارے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک شخص اسحاق المغازلی نے ایک خط میں اُن سے پوچھا کہ اگر تمہاری بصارت اور سماعت جاتی رہے اور تم ٹکلے بنانے کے قابل نہ رہو تو کیسے روزی کماؤ گے۔ اس روز سے انہوں نے پاکیزہ زندگی گذارنے کا عہد کر لیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی تعلیمات سے ترک تعلق کر کے اپنی لکھی ہوئی احادیث کو دفن کر دیا اور اپنی پوری توجہ تصوف پر مبذول کر دی ان کے صوفیانہ زہد و تقویٰ کی بنیاد شریعت اسلامی تھی۔ اہل بیت سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا احترام امام احمد بن حنبل اور المامون دونوں کی نظروں میں بہت زیادہ تھا۔ بشر اپنی زاہدانہ زندگی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے ہمیشہ ڈرتے رہے۔ ان کی تعلیم تھی کہ انسان فقر کو صبر و سخاوت کے ساتھ قبول کرے۔ ان کے نزدیک کسی انسان کی یہ خواہش کہ لوگوں میں اس کے نیک کاموں کا چرچا ہو دنیادارانہ ذہنیت کا مظہر ہے اور وہ اس معاملے میں اس قدر حد سے گذر چکے تھے۔ لوگ ان کی تعلیمات کو بہت حد تک ملامتیہ فرقے کی تعلیمات کے قریب شمار کرتے ہیں۔ بشر عمل کو علم پر سبقت دیتے تھے۔ ننگے پاؤں رہنے کی وجہ سے انہیں حافی کہا جاتا ہے۔ بغداد میں وفات پائی۔

بشیر خوشخبری دینے والا۔ بشارت دینے والا۔ آنحضورؐ کے ناموں میں سے ایک۔

قرآن مجید میں آنحضورؐ کے لیے بشیر کا لفظ کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کو لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اس بات کی خوشخبری کہ اگر انسان نیک عمل کرے گا تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے جہاں وہ آرام و سکون کی زندگی گذارے گا۔ نیز اس بات کی خوشخبری کہ جو لوگ اس دنیا میں نیک عمل کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے جو انہیں جنت کی صورت میں ملے گا۔

قرآن مجید میں بشیر اور نذیر دونوں الفاظ ایک ساتھ آنحضورؐ کے لئے استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً سورۃ سبا میں ہے۔

"اور ہم نے تجھے سب لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (۳۴: ۲۸)

بشیرؓ بن سعد (وفات ۱۲ھ/۶۳۳ء) صحابی رسولؐ۔ مدینہ کے قبیلہ بنو خزرج سے تھے۔ سابقون الاولون میں سے تھے بیعت عقبۂ ثانیہ کے موقع پر موجود تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور دو موقعوں پر سپہ سالار بھی بنائے گئے ان میں سے ایک تو ۷ھ/۶۲۸ء [illegible] کے خلاف مہم پر انہیں سردار بنا کر فدک کی طرف بھیجا گیا۔ لیکن اس میں ناکام [illegible] نہ ہوئے اور زخمی ہوئے دوسری مرتبہ بنو غطفان کے خلاف بھیجا گیا [illegible] کامیاب رہے اور بہت سا مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ جب آنحضورؐ صلح حدیبیہ کے مطابق عمرے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت بشیرؓ اس مسلح دستے کے سردار تھے جو آنحضورؐ کی [illegible] طرح ثقیفہ بنو ساعدہ میں جب انصار اور مہاجرین اکٹھے ہوئے تو [illegible] کی بجائے قریش کے دعوے کی حمایت کی۔ اور انصار میں سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کی۔ انہوں نے عراق کی مہم میں بھی شرکت کی اور جب [illegible] بن ولید نے الحیرہ فتح کیا تو حضرت بشیرؓ اس [illegible] میں بھی شریک تھے [illegible] عین التمر کے مقام پر وفات پائی۔ ان کے بارے میں [illegible] کہ آیا وہ میدان جنگ میں شہید ہوئے یا [illegible] وفات پائی۔

حضرت بشیرؓ ان صحابہ میں سے تھے جنہیں لکھنا آتا تھا۔ [illegible] النخعی کے بیٹے تھے۔

بشیر شہاب ثانی [illegible] شہاب۔ ایک لبنانی امیر [illegible] پیدا ہوا [illegible] والد کا انتقال ہو گیا۔ نوجوان ہوتے ہی اس نے سیاست میں ہاتھ پاؤں [illegible] شروع کیے اور لبنان کی گورنری [illegible] کے لوگوں کی نظریں بشیر پر پڑیں [illegible] میں سیدون، طرابلس، شام اور دمشق کے ترک بادشاہوں [illegible] ٹیکسوں سے تنگ آ کر لبنان کے گورنر امیر یوسف شہاب نے ملک کے ممتاز افراد پر مشتمل ایک وفد کو مشورت کے لیے طلب کیا اور اسی [illegible] میں لوگوں کی رائے کے مطابق بشیر کا گورنر لبنان کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔

بشیر ایک ذہین، محتاط اور دور اندیش انسان تھا۔ سب سے پہلے [illegible] نے جنبلاطوں اور امراء کے ذریعے نکد سرداروں کو قتل کرایا۔ بعد میں جنبلاطوں کی مدد سے امدا امراء کو لبنان چھوڑنے اور کہیں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کر دیا اور پھر جنبلاطوں

کو ۱۸۲۴ء میں شکست دے کر بھگا دیا۔ اور مقامی دستوں کو مضبوط کر کے انہیں شام و فلسطین میں سب سے زیادہ طاقتور فوج بنا دیا۔ دوسری طرف عیسائی بطریقوں اور اسقفوں کو کثیر امدادی رقمیں دے کر فرانسیسی قونصل کی حمایت حاصل کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا دین بھی تبدیل کر لیا اور عیسائی ہو گیا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مقامی ترکوں کی سازشوں کا خاتمہ کر کے لبنان کی تاریخی خود مختاری محفوظ کرے۔ چنانچہ جس وقت نپولین نے فلسطین میں پیش قدمی کی تو اس نے ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے واضح طور پر نہ تو اس کی حمایت کی اور نہ مخالفت اور جونہی فرانسیسی فوجیں مصر کی طرف ہٹیں اس نے وزیر اعظم سلطنت عثمانیہ کے مستقر العریش جا کر ایک شاہی فرمان حاصل کر لیا۔ جس کی رو سے لبنان براہ راست باب عالی کے ماتحت آگیا۔ اگرچہ وزیر اعظم کی وفات کے بعد اس فرمان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی اور بشیر کو دوسرے ذرائع اختیار کرنا پڑے۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں باب عالی کے سفیروں نے محمد علی پاشا حاکم مصر کے خلاف بشیر سے مدد حاصل کرنا چاہی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور لبنانی فوجوں نے طرابلس میں عثمان پاشا سے لڑائی اور دمشق پر حملہ کرنے والے لشکر میں بھی شامل ہوئیں۔ نیز شمال جانب حلب تک مصری لشکر کے سلسلہ رسد و رعقب کی حفاظت کی۔ اس کے صلے میں محمد علی پاشا نے لبنان کے خود مختار حقوق تسلیم کر لئے اور وعدہ کیا کہ وہ داخلی مسائل میں براہ راست مداخلت نہیں کرے گا۔ لیکن بدقسمتی سے محمد علی پاشا کو جب فوج کے لئے مزید آدمیوں اور روزافزوں اخراجات کے لئے مزید روپے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے لبنان پر بھی ٹیکس لگانے کا مطالبہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لبنان دوران کے [illegible] برپا ہو گئی اور بیس ہزار عیسائیوں کا خون بہا۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مشرقی لبنان کے اندر [illegible] کو ایک بار پھر تباہ و برباد ہونا پڑا۔

۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں اتحادی بحریہ کے دستے لبنانی سمندروں میں پہنچ گئے۔ اور ایک ترکی فوج خلیج جونیہ کے کنارے اتر آئی۔ لبنانی فوج نے جس نے امیر بشیر کے خلاف بغاوت کر دی تھی، ترکی اور غیر ملکی دستوں کے ساتھ مل کر ابراہیم پاشا کو شکست دے کر بشیر ثالث کو لبنان کا گورنر بنانے کا اعلان کر دیا۔ بشیر ثانی نے اپنے آپ کو برطانیہ کے حوالے کر دیا جسے جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد بشیر کو [illegible] میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس کا انتقال [illegible] غلطہ استانبول کے آرمنی کیتھولک کلیسا میں دفن کیا گیا۔ اور جب [illegible] میں لبنان نے آزادی حاصل کی تو لبنان کی جمہوری حکومت نے ۱۹۴۷ء میں اس کی باقیات منگوا کر بیت الدین کے خاندانی قبرستان میں دفن کیں۔

بصرہ اسلامی ممالک میں موجود تین شہروں کا نام۔ ان میں سے شام کا شہر عام طور پر بُصریٰ لکھا جاتا ہے۔ دوسرا شہر عراق میں شط العرب کے کنارے بغداد سے شمال مشرق میں ۴۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ موجودہ دور میں اس کا محل وقوع کچھ اور ہو گیا ہے۔ تیسرا شہر مراکش میں ہے، جس کا نام عراق کے شہر بصرہ کے نام پر رکھا گیا ہے۔

عراق کے شہر بصرہ کے بارے میں خیال غالب یہ ہے کہ یہ اسلامی بستی دہشت آباد جو اردشیر نامی ایرانی بستی تھی، کے آثار و کھنڈرات پر بنائی گئی۔ ۱۴ھ/۶۳۵ء میں آنحضورؐ کے صحابی عتبہؓ بن غزوان قدیم ایرانی چوکی کے انہی کھنڈرات پر خیمہ زن ہوئے تھے۔ ۱۷ھ/۶۳۸ء میں حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے اس مقام کو فوجی چھاؤنی کا درجہ دے دیا گیا۔ اور چھاؤنی قصبے کی شکل اختیار کر گئی۔ شروع میں یہاں کے لوگ سرکنڈوں کے جھونپڑے بنا کر رہتے تھے۔ بعد میں کچی اینٹوں سے اس کی تعمیر ہوئی۔ زیاد بن ابیہ کے عہد میں یہ ایک پختہ اینٹوں والے قصبے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۵۵ھ/۷۷۱ء - ۷۷۲ء تک یہ قصبہ کافی ترقی کر گیا اس وقت یہاں ایک جامع مسجد، دارالامارۃ، شہر پناہ اور گرداگرد ایک خندق تھی۔
عراقی بصرہ شروع ہی سے فاتح عربوں کے لئے فوجی چھاؤنی کا ایک مرکز رہا ہے۔ چنانچہ اہل بصرہ نے جنگ نہاوند میں جو ۲۱ھ/۶۴۲ء میں ہوئی حصہ لیا اس کے علاوہ اصطخر، فارس، خراسان اور سجستان کی تسخیر میں بھی شریک رہے۔ اس قصبے میں ۳۶ھ/۶۵۶ء میں جنگ جمل لڑی گئی۔ ۳۷ھ/۶۵۷ء میں جنگ صفین کے موقعہ پر اہل بصرہ حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑے۔ یہیں سے خارجیوں نے جنم لیا۔ ۴۱ھ/۶۶۲ء میں حضرت امیر معاویہؓ نے اس شہر پر نئے سرے سے اپنی حکومت کو بحال کیا اور ۴۵ھ/۶۶۵ء میں زیاد کو وہاں کا امیر مقرر کیا۔ زیاد کی وفات کے بعد ۶۴ھ/۶۸۳ء میں بصرہ میں شدید فسادات برپا ہوئے اور مختلف شورشیں برپا رہیں۔ بنو امیہ ان شورشوں کو دبانے میں مصروف رہے۔ جب عباسیوں کا دور آیا تو بصرہ بھی ان کے زیر نگیں ہو گیا۔

اس دور میں بصرہ کی حیثیت میں کافی کمی آئی اس کی وہ نیم خود مختار حیثیت ختم ہو گئی جو اسے شروع سے حاصل تھی۔ اس دوران میں بصرہ میں وقتاً فوقتاً سماجی قسم کی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ان بغاوتوں کی وجہ سے اس علاقے میں دہشت اور خوف و ہراس کا دور جاری رہا۔ ان بغاوتوں میں سب سے بڑی بغاوت قرامطہ کی تھی جس نے ۳۱۱ھ/۹۲۳ء میں بصرہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ بصرہ جب بنو مزید کے زیر اقتدار آیا تو اس نے اپنی خوشحالی دوبارہ حاصل کر لی۔ ان کے گرد و نواح کے بدویوں نے یہاں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے برباد کیا۔ بقول ابن حوقل متعدد عمارات منہدم کر دی گئیں۔ ایک مسجد (جو مسجد علیؓ کے نام سے مشہور ہے) نیز حضرت طلحہؓ، زبیرؓ، ابن سیرینؒ اور حسن بصریؒ کے مزارات کے سوا قدیم بصرے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ قرون وسطیٰ میں بصرہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ یہ ایک تجارتی مرکز بھی تھا۔ اسلحہ سازی کے کارخانوں نے بصرہ کو ایک صنعتی مرکز بنا دیا تھا۔ ایک اعتبار سے یہ ایک زرعی مرکز بھی تھا کیونکہ یہاں بہت سی اقسام کی کھجوریں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بصرہ دینی اور علمی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ یہیں سے عربی صرف و نحو نے جنم لیا۔ اور اس شہر نے بڑے بڑے صرفی و نحوی پیدا کئے۔ آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی کے وسط میں بصرہ شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بعض بڑی عمارات باقی تھیں لیکن بصرہ شہر اپنی پرانی جگہ سے موجودہ مقام پر منتقل ہونا شروع ہوا جو پہلے مقام سے بارہ میل دور تھا۔ ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں یہ علاقہ تمام عراق کے ساتھ ایک قلیل عرصے کے لئے شاہ اسماعیل کی ایرانی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا۔
بصرہ اپنی نئی حالت میں بڑی نہر کے ساتھ دو میل اوپر کی جانب واقع تھا۔ اور اس میں بحری بندرگاہ تھی۔ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں عراق پر عثمانی فتح کا بصرہ پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔

بارہویں، تیرہویں صدی ہجری/اٹھارویں، انیسویں صدی عیسوی میں بصرہ جنوبی عراق کا صدر مقام اور ملک کی واحد بندرگاہ رہا۔ کھجور کی تجارت کا مرکز اور عرب، خوزستان اور خلیج فارس کے شہزادوں کے لئے دروازے کا کام دیتا رہا۔ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں بصرہ کو "ولایت" قرار دیا گیا اور اس کے ممتاز خاندانوں اور شخصیتوں میں بڑھتی ہوئی عرب قومیت کا ظہور ہوا۔ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں عراق

پر برطانیہ کے قبضہ کے دوران میں بصرہ نے بہت زیادہ ترقی کی اور وہ ایک جدید شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ بندرگاہ کو جدید ترین طرز پر تعمیر کیا گیا۔ شط العرب کے دہانے پر ایک گہری سد بار کھود دی گئی۔ شہر کے مضافات کو مختلف سڑکوں اور عمارتوں سے آراستہ کیا گیا۔ اسے عراق ریلوے کا آخری اسٹیشن قرار دیا گیا۔ اور ایک بہترین ہوائی مرکز بھی بنایا گیا۔

عراق حکومت کے تحت ایک "لوا" کا صدر مقام قرار دیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کی آبادی دو لاکھ تھی۔ ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء میں تیل کا ایک بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ اس کے بعد "لوا" میں کئی ذخائر دریافت ہوئے۔ جس سے بصرہ نے صنعتی میدان میں بہت جلد ترقی کی۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں مفقیہ میں تیل کو صاف کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا۔ اور اس طرح تیل کی بدولت بصرہ ایک مالدار شہر بن گیا۔ اس وقت بصرہ عراق کی خارجی تجارت کا اہم مرکز ہے۔ شہر کے اردگرد بہت سے کارخانے موجود ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں شہر کی کل آبادی ساڑھے چار لاکھ تھی۔

بصرہ لوا (صوبہ) کویت کے ساحل سے لے کر ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ ۴،۷۴ مربع میل کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کا زیادہ تر رقبہ صحراؤں پر مشتمل ہے۔ تاہم مزروعہ علاقے میں کھجور چاول اور باجرے کی اچھی خاصی پیداوار ہوتی ہے۔

بُصریٰ جنوبی شام کا ایک شہر۔ آج کل اسے بصریٰ الحریری قصبے سے ممتاز کرنے کے لیے بصریٰ اسکی شام کہتے ہیں۔ یہ صوبہ حوران کے زرخیز میدان نقرہ میں اردن کی موجودہ سرحد سے انیس میل شمال کی جانب اس سڑک پر ہے جو درعہ اور سلخد کو ملاتی ہے۔ یہ قدیم ترین شہر ہے سب سے پہلے اس شہر کا ذکر چھٹی صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ اس کے ماخذ میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک قدیم اور مستحکم شہر تھا اس کے گرد عرب بادشاہوں (نبطیوں) نے دمدمے بنا دیئے تھے۔ تورات کی کتاب مکابیس میں اس شہر کو بصورہ کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۰۵ء تا ۱۰۶ء میں جب کارنیلیس نے قدیم نبطی سلطنت کا رومن سلطنت کیساتھ الحاق کیا تو بصریٰ کو رومن سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اور ٹراجن کی تحریک پر بصریٰ کی از سر نو تنظیم کی گئی لیکن اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ شہر رومیوں نے بنایا تھا۔ ملالس کے نزدیک اس شہر کی بنیاد آگسٹس نے رکھی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں بصریٰ ایک مستحکم شہر بن گیا۔ اس شہر نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور بوسترا کے نام سے صوبہ عرب کی حکومت کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اہم تجارتی مرکز بھی بن گیا۔ اس میں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں تھیں جن کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ بزنطینی عہد میں بصریٰ کی حیثیت ایک سرحدی منڈی کی تھی۔

صدر مقام ہونے کی وجہ سے بصریٰ میں ملکی عمال اور عہدے داروں کی کثیر آبادی تھی۔ اسی دور میں یہاں پر حضرت مریم، سرجیوس اور بعض گمنام پادریوں کے کنیسے بنائے گئے۔ یہاں ایک بڑا گرجا بھی تعمیر ہوا۔ اس گرجے کی محراب اور دیواریں اب تک باقی ہیں۔ روایت ہے کہ اس گرجے میں بحیرا راہب کا مسکن تھا جس نے آنحضورؐ کے پیغمبر ہونے کی گواہی دی تھی۔ جب بصریٰ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور بنو امیہ کی سلطنت قائم ہو گئی تو اس شہر کی پہلی اہمیت جو اسے ایک صوبائی صدر مقام اور سرحدی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے حاصل تھی ختم ہو گئی۔ سلجوقیوں کے دور حکومت میں اس شہر کی نئے سرے سے مرمت ہوئی کیونکہ قرامطہ نے اسے تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سلاطین سلجوق یہاں کی مساجد وغیرہ کی وقتاً فوقتاً درستی اور مرمت کراتے رہے۔

ایوبیوں کے دور حکومت میں فوجی نقطۂ نظر سے اس شہر میں از سر نو تعمیرات ہوئیں۔ ان تعمیرات میں بصریٰ کا قلعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں منگولوں کے حملوں کے دوران میں یہ شہر تباہ ہو گیا۔ اس شہر کی آبادی بہت کم ہو گئی اور یہ بالکل گمنام سا ہو کر رہ گیا۔ پندرہویں صدی میں اس شہر کو دوبارہ اہمیت حاصل ہوئی۔ جب عثمانی ترکوں کو اس شہر پر قبضہ حاصل ہو گیا تو بصریٰ ایک چھوٹا سا صوبائی شہر بن گیا۔ دسویں صدی ہجری اور سولہویں صدی عیسوی میں اسے حوران کے دارالحکومت میں منتقل کر دیا گیا۔

آج کل بصریٰ نفیس گیہوں کی کاشت کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس شہر کو آثار قدیمہ کا شہر کہا جاتا ہے۔

بطال غازی سید ابو محمد عبداللہ، ایک افسانوی کردار، جس کا ذکر عربی اور ترکی رزمیہ کہانیوں میں آتا ہے۔ عام طور پر اسے مسلمانوں کا ایک سپہ سالار قرار دیا جاتا ہے۔ جو بزنطینیوں کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا۔ مختلف قوموں نے اسے اپنے گمنام ہیرو کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ بطال کے معنی بہادر کے ہیں اور شاید ہر بہادر سپاہی کو لقب دیا جاتا رہا ہے۔ تاریخی طور پر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاویہ بن ہشام کے ہراول دستے کے سالار کی حیثیت سے ۱۰۹ھ/۷۲۸ء خنجرہ کا فاتح ہوا۔ کچھ لوگ اسے انطاکیہ کا باشندہ قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے شام کا رہنے والا بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بطال غازی ایک گمنام سپاہی ہے جس کے فوجی کارناموں کو عربی اور ترکی ادب میں لوک حیثیت حاصل ہے۔

بطروجی نورالدین ابو اسحاق، اندلس کا ایک عرب ہیئت دان، ابن طفیل کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے نظریہ ہیئت میں ارسطو کے فلسفے سے رجوع کیا ہے اگرچہ اس انداز فکر کی ابتداء ابن باجہ، ابن طفیل اور جابر بن افلح کر چکے تھے۔ اس نظریے میں قوت محرکہ کے اصول کو دوسری بار داخل کیا گیا ہے۔ نیز اس میں سے فلک التدویر اور دوائر خارج از مرکز کے تصور اور اس نظریہ کو جس کی رو سے آسمانی دوائر مختلف محوروں پر گھومتے ہیں اور اس عمل سے حرکت لولبی پیدا کرتے ہیں۔ ترک کر دیا گیا۔

یہ اصول بطروجی نے اپنی کتاب "کتاب فی الہیئت" میں بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

بطلیموس یونانی مفکر، فلسفی اور سائنسدان، یونانی شہر برقی میں پیدا ہوا اور اسکندریہ میں درس دیتا رہا۔ ۱۰۸ء سے ۱۲۷ء کے دوران میں فوت ہوا۔ اس کی کتاب "المجسطی" نے مسلمان سائنسدانوں پر خاصا اثر ڈالا ہے علم ہیئت کے ضمن میں سارٹن کے بقول اس کتاب کو سب سے پہلے سہل طبری نے عربی میں ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ علم نجوم، دمدار تاروں، زائچوں، کرہ فلکی کے ۳۶۰ درجوں، جغرافیہ، موسیقی، مناظر اور قیمتی پتھروں پر اس کی تقریباً تمام کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا اور پھر انہی سے لاطینی اور دیگر زبانوں میں تراجم ہوئے۔

بطلیوسی (۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء - رجب ۵۲۱ھ/جولائی ۱۱۲۷ء) ابو محمد عبداللہ بن محمد بن السید۔ ایک مشہور اندلسی فلسفی اور نحوی بطلیوس میں پیدا ہوا۔

ابن رزین اس کا مخالف تھا۔ چنانچہ وہ اس کا معتوب ہونے کی وجہ سے بلنسیہ میں آکر پناہ گزین ہوگیا تھا۔ یہاں اس کا ایک بڑا مشہور و معروف شاگرد تھا۔ جس کا نام ابن بشکوال تھا۔ بطلیوسی تقریباً بیس کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں
۱۔ ابن قتیبہ کی ادب الکاتب کی شرح۔ ۲۔ کتاب الحدائق۔ ۳۔ فہرسیہ۔ ۴۔ شرح موطا امام مالک۔ ۵۔ المحری۔ ۶۔ الانصاف۔ اس نے بلنسیہ میں وفات پائی۔

بُعاث مدینہ کے جنوب مشرقی حصہ میں بنو قریظہ کے علاقے میں واقع ایک مقام۔ جہاں تقریباً ۶۱۷ء میں مدینے کے قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے کنبوں میں جنگ ہوئی۔ اس میں ایک طرف تو قبیلہ اوس جس کے طرف دار یہودی قبیلے قریظہ اور النضیر اور ایک بدوی قبیلہ مزینہ تھا۔ اور ان کا سردار حضیر بن سماک تھا۔ دوسری طرف خزرج قبیلے کی ایک بڑی تعداد اور بنو جہینہ اور بنو اشجع کے کچھ بدوی تھے۔ ان کا سردار عمرو بن النعمان تھا۔
اس جنگ میں دونوں اطراف کے سردار ہلاک ہو گئے اور قطعی فیصلہ نہ ہوا۔ ایک عارضی صلح پر اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

بَعث [illegible] روانہ کرنا، برپا کرنا، مسلط کرنا نبی یا رسول مبعوث کرنا۔ [illegible] کا مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔
[illegible] بعد موت کا عقیدہ جو [illegible] ایمان میں شامل ہے۔
[illegible] حیات بعد الموت [illegible]
[illegible] مبعوث کرنا [illegible] دیکھیے [illegible]

بَعل [illegible] جو زمین کے اندرونی آبی ذخائر سے [illegible] کی قوم کے دیوتا کا نام قرآن مجید میں [illegible]
[illegible] نے علان کی ہے اگر موت کے اس [illegible] اپنی زوجیت میں واپس [illegible]
[illegible] ہے لڑ [illegible] رمان کو میں [illegible] شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے [illegible]
۴۔ [illegible] کو کسی پر غالب نہ ہونے دیں مگر اپنے [illegible] کے باپوں پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے [illegible] بیٹوں پر [illegible]
[illegible] دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مشرکین کے دیوتا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ کیا تم احسن الخالقین کو چھوڑ کر مشکل پڑنے پر بعل کو پکارتے ہو (۳۷:۱۲۵)
[illegible] بعل یا بعلی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور یہ لفظ ابتدائی ہجری صدیوں میں بغیر سیراب مزروعہ زمین کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا۔ [illegible] یہ لفظ پیداوار پر معینہ زکوٰۃ یا صدقے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے [illegible] صدی ہجری [illegible] صدی عیسوی کی قانون عامہ کی تصانیف میں بعل کا لفظ زمین کے لگان و خراج کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔
دیوتا کی حیثیت سے بعل کی پوجا بنی اسرائیل کے علاوہ بھی بہت قدیم قوموں میں رائج رہی ہے۔ خصوصاً یہ اہل کنعان کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ بنی اسرائیل اکثر اوقات اس دیوتا کی پرستش کے شکار رہے۔ اسے یہوہ اور ہدد کا نام دیا گیا ہے۔ شمالی شام کے علاقے راس شمرا سے ملنے والی مٹی کی تختیوں سے علم ہوتا ہے کہ بعل دیوتا کو موت و حیات، خوراک، زراعت اور مویشیوں کا دیوتا تھا۔ اسے بارش برسانے اور فصلیں اگانے کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا حریف دیوتا ایل کہلاتا تھا۔

بعلبک لبنان کا ایک چھوٹا سا شہر۔ جو بقاع کی سطح مرتفع کے کنارے تقریباً تین ہزار آٹھ سو پچاس فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور باغوں کے ایک نخلستان سے گھرا ہوا ہے۔ بعلبک [illegible] ریلوے لائن اور سڑک کے ذریعے بیروت

بعلبک کے کھنڈرات۔ بعل دیوتا کا مندر

اور دمشق سے ملا ہوا ہے۔ زراعت اور سیاحت یہاں کے خاص ذرائع آمدنی ہیں۔ اس کی آب و ہوا کی تر و تازگی اور مرغزاروں کی تعریف پر اکثر عرب مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے۔ جس کے کھنڈرات آج بھی اس شہر میں اکثر پائے جاتے اور انہی کھنڈرات کی وجہ سے یہ شہر مشہور بھی ہے۔
اس شہر کے نام کے بارے میں کئی باتیں منسوب ہیں بعض کے نزدیک یہ سامی دیوتا بعل کے نام پر رکھا گیا ہے۔ سکندر اعظم کے بعد اس مقام کو ہیلیوپلس کا نام دیا گیا۔ یہ شہر چونکہ دمشق سے حمص کو جانے والی شاہراہ پر مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے یہ تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ عیسائیوں اور عربوں کی فتح کے بعد یہ شہر قلعے کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ اور اس کی اہمیت زیادہ ترفوجی ہوگئی۔
۱۶ھ/۶۳۷ء میں ابو عبیدہؓ نے جب دمشق فتح کیا تو اس کے تھوڑے عرصے کے بعد بعلبک پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ جو بعد میں دمشق کے اموی مقبوضات

ین شامل ہے جب عباسی خلفاء کا زمانہ آیا تو یہ ان کے اقتدار میں آگیا۔ ۳۹۱ھ/۹۴۲ء میں خلیفہ المعتز نے یہاں اپنا ایک عامل مقرر کیا۔ ۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں بزنطینی حکمران جان زمسکس کا اور ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں حلب کے بادشاہ صالح ابن مرداس کا اس شہر پر قبضہ رہا۔ اس کے بعد سلجوقی سلطان تتش نے ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء میں اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۵۰۳ھ/۱۱۱۰ء بعلبک بوریوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء میں اس پر زنگی کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس نے اسے صلاح الدین ایوبی کے والد ایوب کے قبضے میں دے دیا۔ ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں نورالدین نے اسے دوبارہ فتح کیا۔

۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء میں بعلبک پر صلاح الدین کا قبضہ ہو گیا اور اس شہر کو اپنے مختلف درباریوں اور خاندان کے بعد افراد کو یکے بعد دیگرے جاگیر کے طور پر دیتا رہا۔ ۶۵ھ/۱۲۶۰ء میں بعلبک مصریوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اگرچہ مصری مملوکوں سے قبل منگول بھی اس شہر کو فتح کر چکے تھے اور چند ماہ ان کا قبضہ بھی اس شہر پر رہا۔
۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں یہ شہر عثمانی ترکوں کے قبضے میں چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ شہر لبنان ریاست کے ساتھ فرانسیسی حکومت کے زیر انتداب آگیا اور اب جمہوریہ لبنان کا ایک شہر ہے۔ ۱۹۵۶ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی گیارہ ہزار سات سو تھی۔

جس زمانے میں اس شہر میں ہیلیوپولیسی تثلیث کو فروغ دیا گیا تو اس سے کئی شاندار خانقاہیں وجود میں آئیں۔ آج بھی ان یادگاروں کا بڑا حصہ جن میں دو بہت بڑے اور لمبے چوڑے مندر، دو حسن رخ کے بڑے بڑے دروازے ہیں، اور حصار شہر شامل ہیں، دیکھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈالتی ہیں۔ عربوں کے دور میں ان عمارتوں کو ایک مضبوط قلعے کی شکل دی گئی۔ قدیم آثار کو دیکھنے سے قرون وسطیٰ میں عربوں کی فوجی تعمیرات کے نہایت دلچسپ آثار نظر آتے ہیں۔ راس العین کی چھوٹی مسجد اور شہر کے اندر بڑی مسجد جو قلعے کے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ اس شہر کی پرانی یادگاروں میں سے ہیں۔

بغداد عراق کا ایک مشہور شہر اور دارالحکومت۔ یہ شہر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ بغداد کے نام کے بارے میں مختلف خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا نام ایک بت بغ کے نام پر رکھا گیا ہے اور بعض کے نزدیک بغداد دراصل باغ داد ہے۔ یعنی وہ باغ جہاں نوشیرواں مظلوموں کی دادرسی کرتا تھا۔ بعض کے نزدیک یہ ایک آرامی لفظ ہے جس کے معنی بھیڑوں کا باڑہ کے ہیں۔ ابوجعفر المنصور نے ۱۴۵ھ/۷۶۲ء میں ساسانی گاؤں بغداد کی جگہ پر ایک شہر بسایا اور اس کا نام مدینۃ السلام رکھا۔ المنصور نے اس شہر کی تعمیر پر ایک بیان کے مطابق ایک کروڑ اسی لاکھ دینار خرچ کیے تھے اور ایک بیان کے مطابق دس کروڑ درہم خرچ کیے گئے تھے۔ شروع زمانے میں بغداد ایک بڑا قلعہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک بڑی اور گہری خندق تھی۔ اس کے بعد اینٹوں کا ایک پشتہ اور پھر اس کی پہلی فصیل تھی۔ اس کے آگے کچی اینٹوں کی ایک فصیل تھی اور ہر دو دروازوں کے درمیان اٹھائیس بڑے برج تھے اور ہر دروازے پر ایک قبہ بنا ہوا تھا جہاں سے سارا شہر نظر آتا تھا۔ اس فصیل کے بعد ایک چوڑا میدان تھا جس میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک تیسری سادہ سی دیوار تھی اور اس کے اندر یہ عمارات بنی ہوئی تھیں: قصر خلافت، جامع مسجد، متعدد دیوان، خلیفہ کی اولاد کے مکانات اور دو سقیفے

شہر کو دو سڑکوں کے ذریعے چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ سڑکیں یکساں فاصلہ رکھنے والے دروازوں سے آتیں اور وسط شہر میں ایک دوسرے کو قطع کرتی تھیں۔ شہر کے شمال مشرق میں باب خراسان اس کے مقابل جنوب مغرب میں باب البصرہ شمال مغرب میں باب الشام اور جنوب مشرق میں باب الکوفہ تھے۔ اس طرح اندرونی حلقے میں جانے کے لیے پہلے خندق کو پار کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد پانچ دروازوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یعنی باہر کی دیوار کے دو دروازے دو بڑی فصیل کے [illegible] دروازے اور ایک اندرونی دیوار کا دروازہ۔ باب الذہب کے نام سے جو محل تعمیر ہوا تھا اس میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا اور دریا تک کی تزئین [illegible]

الف لیلوی شہر بغداد [illegible]

بغداد نے ترقی کی منازل بہت جلد طے کیں [illegible] چہل پہل اور ثروت و آبادی میں بڑھتا چلا گیا۔ [illegible] کے نام سے بنوایا۔ جعفر نے بغداد کے [illegible] کرایا۔ الامین نے قصر الخلد کے نام سے ایک محل [illegible] دجلہ کے کنارے ایک مسجد بنوائی۔ ایک [illegible] ام جعفر میں تعمیر کرائی۔ اسی ملکہ نے قصر الخلد کے [illegible] سے تعمیر کرایا۔ بغداد کو شعرا نے فردوس ارضی [illegible] سرسبز دیہات۔ اونچے اونچے عالیشان عمارات [illegible] درجے کے نقش و نگار سے آراستہ [illegible] مزین تھے۔ بہت مشہور ہیں۔

بغداد کو امین اور مامون کے باہمی جنگ و قتال [illegible] پہنچا۔ چودہ ماہ کے سخت محاصرے کے بعد [illegible] تنگ آکر طاہر سے مقابلہ کرنے والوں [illegible] کے محلے کے محلے تباہ ہو گئے۔ بقول طبری [illegible] جاتی رہی۔ بعد میں المامون کے عہد میں بغداد نے دوبارہ [illegible] سنبھال کر لی۔ بغداد کو ترکوں کے ہنگاموں سے بھی بہت نقصان [illegible] ۸۶۵ء میں المعتز کی فوج نے سال بھر بغداد کا محاصرہ کیے رکھا۔

۲۷۸ھ/۸۹۱ء میں معتضد نے جب اپنی حکومت مستقل طور پر بغداد [illegible] اس نے اس شہر کی طرف بھی توجہ دی۔ المعتضد نے اس کے شمال [illegible] ایک قصر ثریا تعمیر کرایا اور ایک زمین دوز راستے کے ذریعے قصر [illegible] ۲۸۹ھ/۹۰۱ء میں المکتفی نے قصر التاج تعمیر کرایا۔ ایک مسجد جامع القصر [illegible]

جب المقتدر کا دور حکومت آیا تو بغداد میں شاہی محلات اور نئی نئی عمارات کا اضافہ ہوا۔ اس دور میں بغداد تجارت کا بھی ایک اعلیٰ مرکز بن گیا تھا۔ یہاں تجارتی منڈیاں قائم کی گئیں اور ہر جنس تجارت کا الگ بازار بنایا گیا۔ منڈیوں کی نگرانی کے لیے محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔ یہاں کے سوتی اور ریشمی کپڑے خصوصاً رومال اور عمامے وغیرہ کی دوسرے ممالک میں بڑی مانگ تھی۔ اس دور میں بغداد آبادی کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی شہر بن گیا تھا۔ یہاں مختلف نسلوں، رنگوں اور مذہبوں کے لوگ آباد تھے۔ اس کی آبادی کی تعداد کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ مساجد اور حماموں کی تعداد کے بارے میں بھی مبالغے پائے جاتے ہیں۔

الموفق کے زمانہ میں تین لاکھ مساجد اور ساٹھ ہزار حماموں کا ذکر ملتا ہے جبکہ ۳۸۲ھ/ ۹۹۲ء میں حماموں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی اور روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ ایک حمام [illegible] نوکروں کے کام آتا تھا۔ مسجد کے رقبے کی پیمائش کے پیش نظر جمعۃ الوداع کے دن جامع منصور اور جامع [illegible] میں نمازیوں کی تعداد کا اندازہ جو نسطور [illegible] کیا گیا ہے [illegible] ہیں یہاں کی آبادی کا اندازہ پندرہ لاکھ بیان [illegible]

[illegible] مسلمانوں کی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی مساجد علوم [illegible] نہایت [illegible] میں دوسری زبانوں کی کتب [illegible] سب سے زیادہ [illegible]

۳۰۸ھ/ ۹۲۰ء میں کرخ کی آتشزدگی سے بغداد کو کافی نقصان پہنچا۔ ۳۳۲ھ/ ۹۴۴ء کی آتشزدگی کے آثار تو ایک عرصے تک نظر آتے رہے ہیں۔

آل بویہ کے دور حکومت میں بغداد زوال پذیر ہوگیا۔ عضد الدولہ کے زمانہ میں یہ شہر بدحالی کا شکار تھا۔ عضد الدولہ نے حکم دیا کہ مکانات اور بازار نئے سرے سے تعمیر کیے جائیں۔ نیز اس نے جامع مسجدوں کی تعمیر بھی نئے سرے سے کرائی۔ ان تمام باتوں کے باوجود آل بویہ کے دور میں بغداد نے کوئی خاص ترقی نہ کی۔ عوام کی شورشوں اور مسلمانوں کے فرقوں کے باہمی اختلافات نے بغداد کو بہت نقصان پہنچایا اور اس کے ساتھ ساتھ اس شہر کو آتشزدگی، سیلاب اور جنگوں کی تباہ کاریوں سے بھی کافی نقصان پہنچا۔ حکومت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ نظم و ضبط قائم رکھنا اس کے بس میں نہ تھا۔

۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر منگولوں نے حملہ کیا یہ حملہ بڑا سخت تھا۔ بغداد کے باشندے ایک ہفتے سے زیادہ تک بے دریغ قتل کیے جاتے رہے۔ مقتولوں کا اندازہ آٹھ لاکھ سے بیس لاکھ تک لگایا گیا ہے۔ الغرض پورے بغداد میں ایک تباہی مچا کر رکھ دی گئی۔ اور بغداد کی ثقافت کو سخت نقصان پہنچا۔ اس کی سیاسی اہمیت ختم ہوگئی اور یہاں کی معیشت تباہ و برباد ہوکر رہ گئی۔

اب بغداد صرف ایک صوبے کا صدر مقام ہوکر رہ گیا۔ ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۱ء میں تیمور نے [illegible] دوسری بار حملہ کیا۔ یہ حملہ پہلے حملے سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ باشندوں کا بے دریغ قتل عام کیا گیا اور بہت سی سرکاری عمارتیں اور محلے ویران کر دیے گئے۔ یہ حملہ بغداد کی ثقافت پر ایک کاری ضرب تھی۔ ۸۱۳ھ/ ۱۴۱۰ء میں بغداد قرہ قویونلو ترکمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ترکمانوں کی عملداری میں اس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ بہت سے باشندے شہر کو چھوڑ کر چلے گئے۔ بار بار سیلاب آنے سے بڑی تباہی پھیلی۔ ۸۳۱ھ/ ۱۴۲۷ء میں المقریزی نے بغداد کا نقشہ یوں بیان کیا ہے کہ بغداد تباہ ہوگیا۔ اس میں کوئی مسجد نہیں رہی نہ مجمع ہوتا ہے نہ کوئی بازار ہے۔ اس کی اکثر نہریں خشک ہوچکی ہیں اب اسے مشکل ہی سے شہر کہا جاسکتا ہے۔

۹۱۴ھ/ ۱۵۰۸ء میں یہ شہر شاہ اسماعیل صفوی کے قبضے میں آگیا تو ایرانیوں اور عثمانیوں میں اس کے قبضے کے لیے لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ ۹۷۸ھ/ ۱۵۷۰ء میں بغداد میں مراد پاشا نے نئے سرے سے کچھ مساجد اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔

۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء تا ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۴ء بغداد پر نیم مختار ۲۴ پاشاؤں کی حکومت رہی۔ اس زمانہ میں شہر کی دیواروں اور مسجدوں کی مرمت کرائی گئی۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں حسن پاشا کا تقرر ہوا تو بغداد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وہ ینی چریوں کا زور توڑنے کے لیے مملوکوں کو لایا۔ اور اس طرح مملوکوں کے اقتدار کی بنیاد پڑی۔ حسن پاشا کے بعد اس کا بیٹا احمد پاشا تخت نشین ہوا تو اس نے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے جس نے بغداد کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ ۱۷۴۷ء میں احمد پاشا کی وفات کے بعد باب قسطنطنیہ نے دوبارہ بغداد پر اپنا قبضہ جمانا چاہا لیکن مملوکوں کی مزاحمت آڑے آئی۔ ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۹ء میں سلیمان پاشا پہلا مملوک تھا جو بغداد کا والی بنایا گیا۔ ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء سے عثمانی عہد کے خاتمے تک بغداد براہ راست حکومت قسطنطنیہ کی ماتحتی میں رہا۔ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں مدحت پاشا نے ایک جدید نظام ولایت جاری کیا اور ولایت کو سات سنجاقوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس نے بغداد شہر کی فصیلیں گروا دیں۔

۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۹ء تک بغداد تین ایالتوں موصل، بصرہ اور بغداد کا صدر مقام تھا ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء میں موصل اور ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء میں بصرہ علیحدہ کر دیے گئے اور بغداد تین متصرفلکوں کا صدر مقام رہ گیا۔ ۱۸۵۳ء میں اس کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار تھی
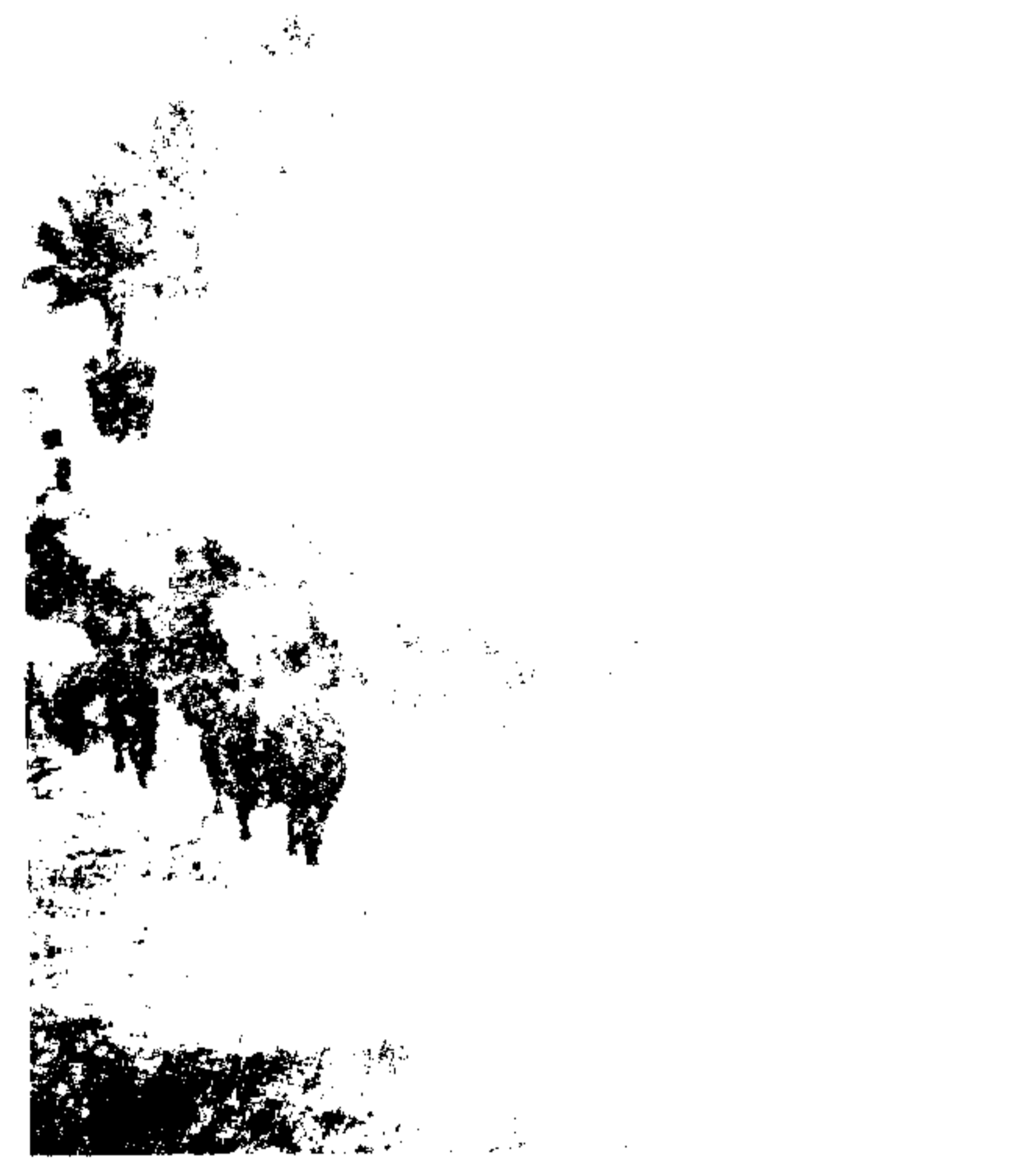
فصیل بغداد کے باہر زبیدہ خاتون کا مقبرہ

۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں اس کی آبادی کا اندازہ ستر سے اسی ہزار تک ہے۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں بغداد کی آبادی دو لاکھ کے قریب تھی۔ موجودہ بغداد بہت کچھ بدل چکا ہے اب وہ شمال کی طرف اعظمیہ اور کاظمین سے مشرق میں ہند سے جنوب میں دجلہ کے بڑے موڑ سے اور ادھر المطار المدنی اور قریبی مضافات منصور اور مامون کے شہروں سے جا ملا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی آبادی چار لاکھ چھیاسٹھ ہزار سات سو تینتیس تھی جو ۱۹۶۷ء میں بائیس لاکھ ستر ہزار ہو گئی۔ قدیم عمارتوں کی طرز کی بجائے شہر کے باہر نئے مکان مغربی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ پرانی آبادیوں کی طرز رفتہ رفتہ بدلتی جا رہی ہے۔ چار پختہ پل تعمیر ہو گئے ہیں۔

یہ شہر ایک معاہدے کی وجہ سے بھی جو معاہدہ بغداد کے نام سے مشہور ہے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ معاہدہ ترکی، عراق، ایران، پاکستان اور برطانیہ کے درمیان ۲۴ فروری ۱۹۵۵ء میں طے پایا تھا۔ اس معاہدے کی رُو سے غیر ملکی جارحیت کا مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت کیے بغیر ایک دوسرے کا باہمی تحفظ کرنے کی کوشش کی جانا قرار پائی ہے۔ ۱۹۵۹ء کے بعد عراق کے الگ ہو جانے اور امریکا کی رکنیت اختیار کر لینے سے بغداد کی بجائے انقرہ کو اس معاہدے کا مرکز بنایا گیا ہے اور اس کا نام سینٹو رکھا گیا ہے۔

بغداد خاتون

زوجہ امیر حسن جلائری جو شیخ حسن بزرگ کے نام سے مشہور ہے بغداد خاتون تاتاری حاکم امیر الامراء چوبان کی بیٹی تھی۔ امیر حسن سے اس کی شادی ۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء میں ہوئی۔ یہ زمانہ ابوسعید بن الجائتو کی بادشاہت کا تھا۔ سلطان ابوسعید بغداد خاتون سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس نے کوشش کی کہ امیر حسن اسے طلاق دے دے لیکن امیر چوبان نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ چنانچہ ابوسعید نے غیاث الدین کرت سے ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء میں امیر چوبان کو قتل کرا دیا۔ اور اس کے بعد ابوسعید نے بغداد خاتون کو امیر حسن سے طلاق دلا کر خوب دھوم دھام سے شادی کی۔ بغداد خاتون نے جلد ہی بڑے اثر و رسوخ کا مقام حاصل کر لیا اور اسے خداوندگار (فرمانروا) کا لقب ملا۔ ابوسعید خود عورتوں کا ... بالکل بغداد خاتون کے قبضے میں آ گیا۔ بعد ازاں دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے جس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ امیر حسن بغداد خاتون سے مل کر سلطان ابوسعید کو قتل کرانے کی سازش کر رہا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ۷۳۴ھ/۱۳۳۳ء میں ابوسعید نے بغداد خاتون کی بھتیجی دلشاد خاتون سے شادی کر لی تو دلشاد بیگم ابوسعید کی منظورِ نظر ہو گئی۔ اس بات نے بغداد خاتون کو بہت کبیدہ خاطر کیا اور ابوسعید بھی اس سے ناخوش رہنے لگا۔ جب ۱۳ ربیع الآخر ۷۳۶ھ/۳۰ نومبر ۱۳۳۵ء کو ابوسعید کا اچانک انتقال ہو گیا تو بغداد خاتون پر یہ شبہ کیا گیا کہ اس نے ابوسعید کو زہر دے کر مارا ہے۔ ارپا خان نے جو ابوسعید کا جانشین ہوا اسی شبے کی بنا پر بغداد خاتون کو قتل کرا دیا۔

بغدادی، عبدالقاہر

(وفات ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء) ابو منصور عبدالقاہر ابن طاہر الشافعی البغدادی شافعی مسلک کے مشہور عالم دین والد انہیں تعلیم کے لیے نیشاپور لے گئے فارغ ہونے کے بعد عبدالقاہر نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے شاگردوں میں خراسان کے علماء و فضلاء کی بڑی کثیر تعداد تھی۔ عبدالقاہر سترہ مضامین کی تعلیم دینے کی قابلیت رکھتے تھے۔ جن میں سے فقہ، اصول، حساب، قانون، وراثت خاص طور پر ان کے قابلِ ذکر مضامین ہیں جب نیشاپور میں ترکمانوں نے فتنہ و فساد کا بازار گرم کر دیا تو عبدالقاہر وہاں سے اسفرائین چلے گئے اور کچھ عرصہ بعد وہیں انتقال کیا۔

وہ بے حد دولتمند تھے۔ اہل علم کی بڑی مدد کیا کرتے تھے۔ فقہ، حساب اور وراثت کے موضوع پر ان کی تصانیف بہت مقبول تھیں۔ ان میں سے اکثر ضائع ہو چکی ہیں۔ تصانیف میں "کتاب الملل والنحل"، "اصول الدین"، "الفرق بین الفرق"، "انعام الی الہذیل"، "اغلاط ابن کرام" مشہور ہیں۔

بُغطوری

مقرین بن محمد، اباضی مورخ اور سوانح نگار۔ بغطورہ (القطلورہ) میں پیدا ہوا۔ یہ ابو یحییٰ توفیق بن یحییٰ اجناونی اور محمد عبداللہ بن محمد بن عبداللہ مجولی (جو فرقہ اباضیہ کی تاریخ و سیر کے وہ علماء تھے) کا شاگرد تھا۔ بغطوری نے ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء - ۱۲۰۳ء میں اباضی مشاہیر کی سوانح پر مشتمل ایک اہم تصنیف تحریر کی۔ یہ کتاب ان مشاہیر کی سوانح تھی جو جبل نفوسہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ کتاب "کتاب سیر مشائخ نفوسہ" اور زیادہ تر "السیر" کے نام سے مشہور تھی۔ [illegible] شماخی نے اسے اپنی کتاب "کتاب السیر" کا بنیادی ماخذ بنایا تھا۔

بغوی، رکن الدین

(وفات ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء) ابن خلکان کے [illegible] ابو محمد الحسین رکن الدین بن [illegible] لقب، شافعی مذہب کے عالم، محدث اور مفسر [illegible] بغشور میں پیدا ہوئے۔ فقہ کی تعلیم قاضی الحسین بن محمد [illegible] نے محدثین کی ایک جماعت سے [illegible] وفات پائی۔

قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کی [illegible]

[illegible]

بغوی کی دوسری [illegible]

بغوی کے نام سے [illegible]

بقا و فنا

[illegible]

قرآن مجید میں یہ دونوں الفاظ [illegible]

[illegible]

لغوی اعتبار سے بقا و فنا کے معنی [illegible]

کے اعتبار سے بقا تین قسم کی ہے۔

اول، وہ بقا کہ [illegible] فنا نہ ہو [illegible]

عالم ناسوت کہ وہ ابتدا میں بھی نہ تھا اور انتہا میں بھی نہ ہوگا۔ اور فقط اس وقت باقی ہے۔
دوسرے وہ بقا کہ پہلے کبھی نہ تھی اور بعد میں موجود ہوگئی اور کبھی فانی نہ ہوگی جیسے بہشت و دوزخ اور عالم عقبیٰ اور اس کے رہنے والے کہ ابتدا میں نہ تھے نیست [illegible] ہوئے اور ان کی ہستی پر کبھی عدم طاری نہ ہوگا۔
تیسری وہ بقا کہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی یعنی کوئی ایسا وقت نہیں ہوا کہ وہ نہ تھی اور نہ کوئی ایسا وقت ہوگا کہ وہ نہ ہو وہ ذات حق اور اس کی صفات ازلی و ابدی کی بقا ہے وہ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور اس کی بقا سے مراد اس [illegible] وہ ہمیشہ رہتا ہے۔ کوئی بھی اس کی صفات میں اس کے ساتھ شریک نہیں۔
[illegible] کہ ان حیاں سے کہ دنیا فانی ہے اور بقا کا علم یہ ہے کہ آخرت [illegible] باقی ہے۔

[illegible] فنا [illegible] ہے کہ جب [illegible] فانی ہو جاتے [illegible] فانی ہو جاتی ہے تو طاعت یعنی بندگی [illegible] حاصل [illegible] ہے تو ذکر حق کے باقی رہنے [illegible] اولیائے متقدمین کے نزدیک [illegible] ہے اوصاف کو [illegible]

[illegible] اصطلاح نافذ کرنے والا ابو [illegible] کو دیکھنے سے فانی ہو [illegible] کے ساتھ باقی رہتا ہے (نیز دیکھیے فنا)

[illegible] قدیم حکما کی سوانح [illegible] انہوں نے قرآن شریف کی ایک تفسیر [illegible]

بقراط [illegible] ایک مشہور و معروف یونانی طبیب۔ اسے طب کا [illegible] ایشیائے کوچک کے قریب جزیرہ قوس [illegible] تعلیم [illegible] حاصل کی بعد ازاں [illegible] تحصیل اور تصنیف کی ورزش کا سلسلہ [illegible] میں مشغول رہا۔ [illegible] کے مقام پر بہت بڑائی کے عالم میں فوت ہو گیا۔
[illegible] بقراط کی بہت شہرت تھی۔ وہ بقراط کی بہت سی تصانیف [illegible] ان میں [illegible] کی تصانیف کے مشہور مترجم حنین بن اسحاق، قسطا بن لوقا [illegible] عبدالرحمٰن بن علی تھے۔ مسلمان اطبا نے اس کی کتابوں سے بہت سی معلومات حاصل کیں۔
حنین نے [illegible] کی کتاب "[illegible] امراض کی کتاب" کا ترجمہ کیا۔ اس کی تصنیف [illegible] اور امراض شدیدہ میں غذا" کا ترجمہ عیسیٰ بن یحییٰ نے کیا اور اس کا عربی نام "کتاب الامراض [illegible]" [illegible] مشرقی دانشوروں نے اس عظیم یونانی طبیب کی کتابوں کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ [illegible] شرحیں بھی لکھیں۔ عرب مصنفین بقراط کا زمانہ اسکندر سے تقریباً سو سال قبل بتاتے ہیں۔ تاریخ [illegible] کے مطابق بقراط کی سکونت حمص میں تھی بعد میں دمشق میں قیام پذیر ہو گیا۔
بقراط کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے ایک مرتبہ ایرانی مملکت میں ایک وبا نے تباہی برپا کر رکھی تھی۔ ایران کے بادشاہ ارتخشتا نے بقراط کو جو قوس میں مقیم تھا بہت کچھ اعزاز و اکرام اور بھاری رقمیں پیش کیں اور اس وبا کے لیے اس کی خدمات حاصل کرنا چاہیں لیکن بقراط نے یہ کہہ کر اپنی خدمات پیش کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے ملک کے دشمنوں کی خدمت نہیں کرے گا بلکہ اس کا اولین فرض اپنے ہم وطنوں کی خدمت ہے۔

بقلیہ عراق میں عام مسلمانوں سے مختلف ایک فرقہ جسے بورانیہ بھی کہا جاتا ہے اس فرقے کو عام طور پر قرامطہ سے منسلک سمجھا جاتا ہے ابو حاتم نامی ایک شخص نے شرعی ارکان کی پابندی کو ختم قرار دیا اور اس کے ساتھ ہی لہسن، پیاز اور چقندر کھانے اور جانور ذبح کرنے کی بھی ممانعت کر دی۔
اس فرقے نے ۲۹۱ھ / ۹۰۲ء میں اپنے متعدد فدائین اور خاص طور پر مسعود بن حریث اور عیسیٰ بن موسیٰ کی زیر قیادت ابو طاہر کی مہم فسادات کے زمانے میں کوفے اور واسط کے علاقوں میں بڑا عروج حاصل کیا۔ ابتدا میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی لیکن بعد میں خلیفہ مقتدر باللہ کے سالار ہارون بن غریب نے ان کا خاتمہ کر دیا

بقی بن مخلد (۲۰۱ھ / ۸۱۷ء - ۲۷۶ھ / ۸۸۹ء) ابو عبدالرحمان اندلسی قرطبہ کے ایک مشہور مفسر اور محدث۔ انہوں نے مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں مختلف ائمہ حدیث خصوصاً امام احمد بن حنبل اور ابوبکر بن ابی شیبہ سے حدیث کی تحصیل کی۔ تحصیل علم کے لیے وہ پینتیس سال تک مشرق میں قیام پذیر رہے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد دو سو چوبیس بتی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر واپس قرطبہ پہنچے۔ جہاں تھوڑے سے عرصے میں انہوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ اور جلد ہی اندلس کے مجتہد اور امام کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان کے حلقہ درس کی سارے قرطبہ میں دھوم مچ گئی مجتہد ہونے کے باوجود ان کا رجحان حنبلی مکتبہ فکر کی طرف تھا۔ فقہی اختلافات اور دوسروں کی رقابت کی وجہ سے ان کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی جو امیر مراد اول کی مداخلت سے ختم کر دی گئی۔
وہ اپنے زمانے کے ایک ایسے عالم تھے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بڑے صالح اور عابد و زاہد تھے۔ بقول عبداللہ الزاہد "انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے زہد و تقویٰ کے باعث بڑی شہرت پائی۔ اور تقدس کے درجے تک جا پہنچے" ابن حزم نے علم حدیث کے میدان میں امام بخاری اور دوسرے نامور محدثین کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں لیکن اس وقت ناپید ہو چکی ہیں۔

بکتاشیہ ترکی درویشوں کا ایک سلسلہ جس کے بانی حاجی بکتاش ہیں ان کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ تر افسانوی روایات سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں حاجی بکتاش خراسانی کا طہرانا طولیہ کے زمرہ درویشاں میں ہوا اور وہ درویش غالب بابا اسحاق کے مرید تھے۔ جنہوں نے ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں بغاوت کی۔ فواد کوپرولو کی تحقیق کے مطابق یہ سلسلہ حاجی بکتاش کے اپنے حلقہ مریدین سے معرض وجود میں آیا۔ بہرحال یہ سلسلہ آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی میں موجود تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شیخ سلسلہ بالم سلطان "پیر دوم" نے اس سلسلہ کو اس کی معین شکل دی۔ مغربی ترکستان ترک درویشوں کے اداروں کو ان کے مخصوص خدوخال احمد یسوی نے دیئے تھے۔ اناطولیا میں یہ ادارے وسیع ہوتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں بدعتی رجحانات بھی داخل ہوتے گئے۔ بعض علاقوں میں ان لوگوں نے عیسائیوں کو بھی اپنے سلسلہ میں

داخل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جنوبی اناطولیا اور البانیا میں ایک مخلوط قسم کا مذہب پیدا ہو گیا۔ جو اسلامی اور عیسائی عناصر پر مشتمل تھا۔

بکتاشی اسلامی رسوم و عبادات حتیٰ کہ نماز تک سے غایت درجے کی لاپروائی برتتے ہیں لیکن شیعی عقائد کے حامل ہیں۔ وہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور خصوصاً امام جعفر صادق کا بڑا احترام کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کو آنحضورؐ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا کر ایک طرح کی تثلیث کے قائل ہیں۔ یکم محرم تا دس محرم ماتمی راتیں مناتے ہیں۔ فضل اللہ کی تالیف "جاویدان" اور فرشتہ اوغلو کی تصنیف "عشق نامہ" ان کے نزدیک قانون شرعی کا درجہ رکھتی ہیں۔

جب ان کے گروہ میں کوئی نیا شخص داخل ہوتا ہے تو اس موقع پر شراب روٹی اور پنیر تقسیم کرتے ہیں۔

بکتاشی لوگ اپنے روحانی پیشواؤں کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں ان میں کچھ لوگ تمام عمر شادی نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کرنے کی خاطر اپنے کانوں میں بالیاں پہنے رہتے ہیں ان کا مرشد اعظم علیحدہ ہوتا ہے۔

یہ لوگ کسی ایک تنہا خانقاہ کے صدر کو بابا اور اس سلسلے میں مکمل طور پر داخل ہونے والے کو درویش کہتے ہیں۔ جس نے پہلی قسم اٹھائی ہو اسے محب، اور جو ابھی اس سلسلے میں داخل نہ ہوا ہو اسے عاشق کہتے ہیں۔

یہ لوگ ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنتے ہیں جو چار گوشیہ یا بارہ گوشیہ ہوتی ہے چار کے عدد سے ان کا اشارہ چار ابواب شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی طرف ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے وہ لوگوں کے بھی چار طبقات بناتے ہیں۔ عابد، زاہد، عارف اور محب۔ بارہ کا عدد بارہ اماموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ تسلیم طاشی (سنگ تسلیم)، جس پر بارہ گول ابھری ہوئی لکیریں ہوتی ہیں، گلے میں پہنتے ہیں۔

بکتاشیہ سلسلے کی بڑی بڑی خانقاہیں چار حصوں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ میدان اوی۔ اصل خانقاہ جس میں عبادت گاہ بھی ہوتی ہے۔
۲۔ اکمک اوی، تنور خانہ اور مستورات کے رہنے کی جگہ۔
۳۔ آتش اوی، باورچی خانہ۔
۴۔ مہمان اوی، مہمان خانہ۔

بکتاشیوں کے اس درویشی سلسلہ نے ترک عوام کے دینی رجحانات پر گہرا اثر کیا۔ بکتاشیوں نے عثمانی حکومت کے خلاف درویشوں کی متعدد بغاوتوں میں بھی حصہ لیا ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں سلطان محمود ثانی نے ینی چری فوجیوں کو تباہ کیا تو جماعت بھی جو ینی چریوں سے منسلک تھی متاثر ہوئی۔ ان کی بہت سی خانقاہیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ ۱۹۲۵ء میں تمام درویش سلسلوں کے ساتھ بکتاشیہ سلسلے کو بھی ختم کر دیا گیا۔ آج کل یہ لوگ جزیرہ نمائے بلقان اور خاص طور پر البانیا میں موجود ہیں۔ جہاں ان کی بڑی خانقاہ تیرانہ میں ہے۔ سرکاری گنتی کے مطابق ۱۹۵۲ء میں ترکی میں ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔

بکر بن وائل ایک عربی قبیلہ۔ جو دراصل بہت سے قبائل پر مشتمل ہے۔ بنو بکر بھی انھی میں شامل ہیں۔ بنو ثعلبہ، بنو عجل، بنو قیس اور بنو حنیفہ بھی چند ایسے ہی قبائل ہیں۔ جو مجموعی طور پر بنو بکر ہی کہلاتے ہیں۔ بکر بن وائل کے لوگ یمامہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ انکے درمیان اکثر خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے خانہ بدوشی اختیار کر لی تھی۔ بنو بکر اور بنو تغلب کے درمیان ایک طویل خانہ جنگی کبھی چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں جا کر ختم ہوئی بنو بکر عراق کے وسیع میدانوں میں آباد ہو گئے اور دس سال بعد بنو تمیم اور بنو یربوع الحزن میں خیمہ زن ہوئے۔ بنو عجل مغرب میں کوفہ کے قریب، بنو شیبان خلیج کویت کے قریب اور بنو قیس راس العین کے قریب آباد ہوئے۔ یہ لوگ گاہ بگاہ عربی نخلستانوں (بحرین وغیرہ) کی طرف جاتے رہتے تھے۔ ۶۰۵ء میں ذوقار کی مشہور جنگ لڑی گئی جس میں بنو شیبان نے ایرانی دستوں کو مار بھگایا یہ مقام عین صید اور البوغر کے درمیان طف میں واقع ہے۔ اس جنگ کے فوراً بعد ایرانیوں نے بنو بکر کو دبا لیا اور بنو بکر اور بنو تمیم کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ بنو بکر کے کچھ قبائل نے عیسائیت اختیار کر لی آنحضورؐ نے یمامہ کے والی ہوذہ بن علی کو دعوت اسلام دی تو اس نے [illegible] کیا۔ الحجر میں اس کا جانشین مسیلمہ تھا۔ انہی لوگوں میں ذہل بن شیبان کے ایک قائد مثنیٰ ابن حارثہ نے اسلام قبول کیا اور حضرت خالد ابن ولید کے ساتھ الحیرہ کو اسلام کے لیے فتح کیا۔ انہوں نے شام کی مہمات میں بھی کارنامے انجام دیئے۔

۶۴۲ء میں بنو عجل اور بنو حنیفہ نے جنگ نہاوند میں حصہ لیا۔ ۶۸۹ء میں بنو بکر اور بنو تمیم کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی۔ ۶۹۰ء میں [illegible] اطمینان نصیب ہوا۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے آتے آتے [illegible] ہو کر رہ گئے۔ بنو عجل خانہ بدوش ہی رہے اور بنو شیبان کوفے کے [illegible] منتقل ہو گئے۔ اور بعد ازیں موصل کے قریب آباد ہو گئے۔ نویں صدی عیسوی میں [illegible] موصل کے میدانی علاقوں پر چھا گئے تو ۸۹۳ء میں خلیفہ المعتضد نے ان کے خلاف ایک مہم روانہ کی۔ جس کے بعد وہ غائب ہو گئے [illegible] کے نام سے ظاہر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ سعودی [illegible] تعلق رکھتے ہیں۔

بکیر بن ماہان ابو ہاشم [illegible] خلافت بنو امیہ کے [illegible] کا داعی۔ سجستان کا رہنے والا [illegible] امیہ کا مخالف ہو گیا اور میسرہ العبدی کی جماعت کے ساتھ ہو گیا [illegible] بعد ۱۰۵ھ/۷۲۳ء میں جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں اس کے سپرد [illegible] خراسان میں اپنے بہت سے معاونین پیدا کیے۔ ۱۰۷ھ/۷۲۵ء [illegible] کی ایک جماعت روانہ کی جو خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ [illegible] گھاٹ اتار دی گئی۔ ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں بکیر نے عمار بن یزید کو ایک جماعت [illegible] جس نے مرو میں اپنا صدر مقام بنایا اور [illegible] کا لقب اختیار کیا [illegible] خرمیہ فرقے کے عقائد اختیار کر لیے تو اسد بن عبداللہ والی خراسان کے حکم سے [illegible]

چنانچہ ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں بکیر کو خداش کے عقائد کا [illegible] کرنے کے لیے مرو بھیجا گیا۔ ۱۲۴ھ/۷۴۱ء میں جب بکیر [illegible] واپس آیا تو [illegible] کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد ۱۲۶ھ/۷۴۳ء میں امام محمد کی وفات کا اعلان کر [illegible] بنو عباس کے حامیوں سے امام محمد کے بیٹے ابراہیم کی بیعت لینے [illegible] پہنچا۔ عراق واپس آنے کے چند ہی روز بعد ابو سلمہ حفص بن سلیمان کو [illegible] نامزد کر کے انتقال کر گیا۔

بگوی بگہ (علاقہ تحصیل بھیرہ ضلع سرگودھا) کے رہنے والے [illegible] خاندان جو پنجاب پر رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں [illegible] زیادہ مشہور علماء یہ ہیں۔

۱۔ مولانا غلام محی الدین بگوی: [illegible] حافظ نور حیات بن حافظ محمد شفا بن حافظ نور محمد گڑگری [illegible] ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں بگہ میں پیدا ہوئے [illegible]

سے خاموش تبع تھے۔ مختصر سے عرصہ میں حافظ حسن صاحب سے قرآن مجید پڑھ لیا۔ نوجوانی ہی میں اپنے چھوٹے بھائی احمد الدین بگوی کو ساتھ لے کر دلی کی طرف روانہ ہوا اور وہاں بارہ برس تک مختلف علماء مثلاً مولانا محمد اسحٰق، شاہ عبدالعزیز وغیرہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔ وہیں شاہ غلام علی کے ہاتھ پر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے بیعت ہو گئے۔

وطن واپسی پر خود کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین کی فرمائش پر لاہور آئے اور مسجد بازار حکیماں میں شمع علم فروزاں کی جہاں درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ ان سے فیض پانے والوں نے پنجاب بھر میں دینی درسگاہیں قائم کیں۔ لاہور میں آپ کا قیام تیس برس تک رہا جس میں ہزاروں تشنگان علم کو سیراب کیا۔ آخری ایام میں بیمار ہو کر وطن تشریف لے گئے اور چودہ برس بیمار رہ کر ۳ شوال ۱۲۷۳ھ/۲۲ جون ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا۔ آپ کے دو بیٹے مفتی غلام محمد [illegible] اور مولانا عبدالعزیز بگوی علمی دنیا میں بڑے مشہور ہوئے۔ اول الذکر عرصہ تک شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے اور دوسرے بھیرہ کی جامع مسجد میں خطیب رہے۔

۲۔ [illegible] احمد الدین بگوی [illegible] رحمن الدین [illegible]

[illegible] ابتدائی تعلیم اپنے [illegible]

[illegible]

[illegible] غلام علی [illegible]

[illegible] مستقلاً [illegible]

[illegible] انتقال ۱۲۸۶ھ [illegible]

[illegible] تصنیف [illegible]

[illegible] علوم و فنون [illegible]

[illegible] محمود [illegible]

[illegible] بگوی [illegible] رحمن الدین بگوی کے فرزند [illegible]

[illegible] سلسلہ [illegible]

[illegible]

[illegible] مولانا شاہی مسجد کے خطیب اور دلی [illegible]

[illegible] کے [illegible] ایک

[illegible] میں [illegible] بگویوں کی مہ

[illegible] مولانا محمد ذاکر بگوی [illegible] پر

[illegible] آپ [illegible]

[illegible] انتقال کیا اور بگہ میں دفن ہوئے

[illegible] محمد [illegible] وفات ۱۳۴۳ھ/۱۱۲۵ [illegible] خطیب جامع [illegible] خطیب شاہی [illegible] خدا ترس اور متقدر فقیہ تھے۔

۳۔ مولانا محمد ذاکر بگوی: مولانا غلام رحمن الدین بگوی کے پوتے اور مولانا عبدالعزیز بگوی کے [illegible] ۱۲۶۰ھ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کرنے کے بعد تحصیل علم کے لیے دلی چلے گئے جہاں حکیم عبدالمجید خان سے طب کی تعلیم [illegible] مولانا غلام رشید [illegible] سے [illegible] ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں لاہور کے مدرسہ حمیدیہ [illegible] کے مدرس مقرر ہوئے۔ طبعاً صوفی منش تھے۔ اس لیے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں خواجہ محمد دین سے بیعت کر کے سلسلہ چشتیہ سے منسلک ہو گئے۔ آپ لاہور میں شاہی مسجد کے خطیب تھے۔ پرنس آف ویلز کے جلوس شاہی میں معزز مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ/۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء کو آپ نے چند روز بیمار رہنے کے بعد انتقال کیا۔ میت لاہور سے بھیرہ پہنچائی گئی۔ جہاں آپ کو بگہ کے قبرستان میں دفن کیا۔

بگوی خاندان نے دینی [illegible] میں مولانا عبدالعزیز بگوی بھیرہ کی جامع مسجد کے خطیب اور دینی درسگاہ کے مہتمم رہے۔ الحاج نصیر الدین بگوی، شفیق احمد بگوی اور ظہور احمد بگوی علمی اعتبار سے بہت بلند مرتبہ کے علماء تھے۔ لاہور کی دینی اور علمی تاریخ میں ان بگوی علماء کا اہم حصہ ہے۔ [illegible] کوئی دینی فیصلہ، فتوے یا کتاب اس وقت تک مستند اور مکمل نہیں مانی جاتی تھی جب تک کہ ان علماء میں سے کسی ایک کی تصدیق ان پر ثبت نہ ہوتی۔ انہوں نے [illegible] سے [illegible] کی اور یا انگریزوں کی کشمکش اور مسلمانوں کی علمی پامالی کا [illegible] ادا کر دیا تھا۔

بلا تصوف کی اصطلاح [illegible] کے معنی اولیاء کے جسم کو طرح طرح کی تکالیف، بیماریوں اور ابتلاء میں ڈالنے کے ہیں۔

بندے پر جس قدر مصیبت زیادہ قوی ہوتی ہے اسے اللہ تعالٰی کا قرب بھی اُسی نسبت سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ مصیبت اولیاء کا لباس، برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیاء کی غذا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: "ہم انبیاء کا گروہ سب لوگوں سے زیادہ مصیبت میں ہوتے ہیں۔" نیز فرمایا: "سب سے زیادہ مصیبت میں انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء پھر وہ لوگ جو زیادہ بزرگ ہیں۔"

بقول حضرت داتا گنج بخشؒ بلا اس رنج کا نام ہے جو بندہ مومن کے دل اور جسم پر ظاہر ہو اور جس کی حقیقت نعمت ہو اور اس لیے کہ اس کا بھید بندہ پر پوشیدہ ہوتا ہے اس کے رنج برداشت کرنے کی وجہ سے اسے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ لیکن وہ مصیبت جو کافروں پر پڑتی ہے بلا نہیں ہوتی بلکہ بدبختی ہوتی ہے اور کافروں کو بدبختی سے شفا نہیں ہوتی پس بلا کا مرتبہ امتحان کے مرتبے سے زیادہ بزرگ ہے کیونکہ امتحان کا اثر صرف دل پر پڑتا ہے اور بلا کا اثر دل اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔

بلاذری (۲۰۳ھ/۸۱۹ء - ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) ابوالحسن، احمد بن یحیٰی بن جابر بن داؤد۔ ایک عرب مؤرخ ماہر انساب، جغرافیہ نگار، شاعر اور خوشنویس غالباً بغداد میں پیدا ہوا۔ بعض کے نزدیک وہ ایرانی النسل ہے اور اس کی تعلیم عربی [illegible]۔ بعض اسے عربی النسل قرار دیتے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ بغداد میں گذارا، تحصیل علم کی خاطر دمشق، انطاکیہ اور حمص بھی گیا۔ المدائنی، ابن سعد اور مصعب الزبیری جیسے مشہور مورخین کی شاگردی اختیار کی۔

خلیفہ المتوکل سے اس کے دوستانہ مراسم تھے وہ المعتز کا اتالیق رہا۔ جعفر بن قدامہ اور ابن ندیم بھی اس کے شاگردوں میں تھے۔ بلاذری کا دربار میں اثر و رسوخ بظاہر المستعین کے عہد تک قائم رہا لیکن المعتمد کے دورِ حکومت میں اس کی قسمت کا ستارہ بڑی سرعت کے ساتھ غروب ہونا شروع ہوا۔

بلاذری کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ اس نے شام، الجزیرہ (عراق) اور ثغریت میں کافی عرصہ تک سیاحت کی۔ مرنے سے پہلے جنون کا شکار ہو گیا تھا۔

بلاذری کی تصانیف میں دو عظیم کتابیں جو مرور زمانہ کے ہاتھوں سے بچ گئی ہیں۔ "فتوح البلدان" اور "انساب الاشراف" ہیں۔ فتوح البلدان ایک مختصر تاریخ ہے جس کا آغاز غزوات نبوی سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا شمار تاریخ

اسلام کے ابتدائی اہم ماخذوں میں ہوتا ہے۔ بلاذری نے چالیس جلدوں میں ایک مبسوط تاریخ لکھنی چاہی تھی لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

بلاذری کی دوسری کتاب "انساب الاشراف" ایک بہت ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اس کی ترتیب "انساب وار" دی گئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز آنحضور ﷺ کے حالات زندگی سے ہوتا ہے اور اس میں آپؐ کے اہل بیت سے لے کر ولید بن عبدالملک کے دور تک کے تاریخی حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔

بلاط الشہداء

ایک جنگ، جو چارلس مارٹل کی زیر قیادت فرنگی فوجوں اور اندلس کے عامل امیر عبدالرحمان بن عبداللہ کے درمیان ١١٤ھ/٧٣٢ء میں لڑی گئی۔

اس جنگ کے لیے بلاط الشہداء کی اصطلاح پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے اندلسی مؤرخوں نے استعمال کرنا شروع کی۔ ابن حیان نے اس جنگ کو "وقعۃ البلاط" کا نام دیا ہے۔

زمانۂ وسطیٰ کے عرب مؤرخوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمان اور ان کے امیر عبدالرحمان وہاں شہید ہو گئے۔

یورپی مورخوں اور جدید عرب مورخوں کے پیش نظر اس جنگ کا صحیح محل وقوع ایک خاص مسئلہ رہا ہے۔

متون کے مطالعے، پائسٹرز اور طورس کے درمیانی خطے کی چھان بین سے محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ لڑائی پائسٹرز کی رومی شاہراہ پر شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً بیس کلومیٹر پر لڑی گئی۔
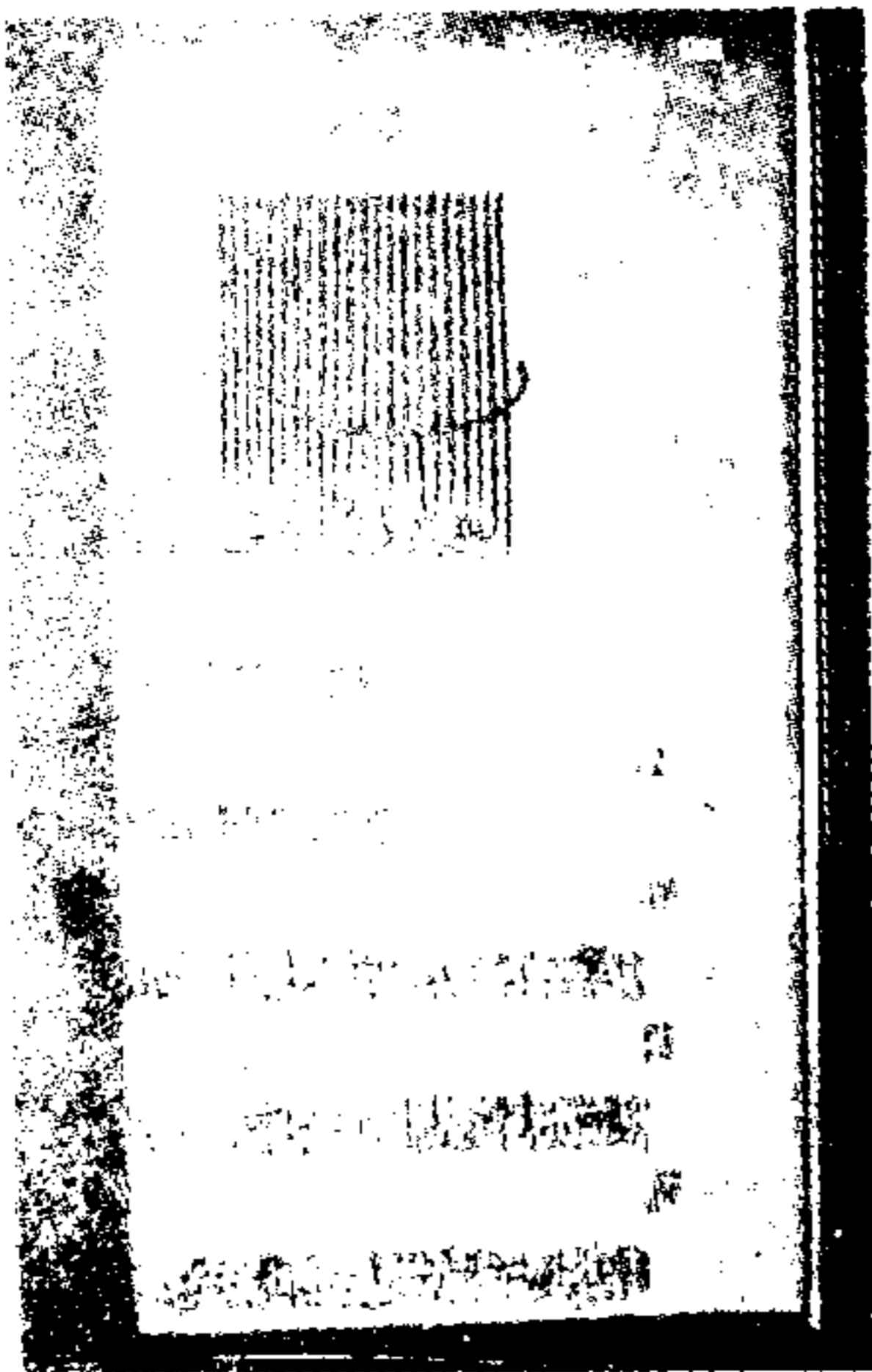
بلالؓ بن رباح

آنحضور ﷺ کے موذن، صحابی۔ جنھیں ان کی والدہ کی نسبت سے بلال ابن حمامہ بھی کہتے ہیں۔ اور عام مسلمانوں میں وہ بلال حبشیؓ کے نام سے مشہور ہیں۔ مکہ مکرمہ میں سراۃ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بعض روایات میں امیہ بن خلف کے غلام بتائے گئے ہیں۔ سابقون الاولون میں سے تھے۔ کافر کا غلام ہونے کی وجہ سے انہوں نے سخت تکالیف اٹھائیں اور خصوصاً امیہ بن خلف نے تو انہیں بہت ایذائیں پہنچائیں۔ حضرت بلالؓ ان تمام مصائب کو بڑے صبر کے ساتھ جھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ اس کے بعد سے بلالؓ آنحضور ﷺ کی خدمت میں رہے۔

ہجرت کے بعد آنحضور ﷺ نے ابو رویحہؓ سے ان کا سلسلہ مواخات قائم کر دیا جب ہجرت کے پہلے سال نماز کے لیے اذان کہنے کا فیصلہ کیا گیا تو انہیں موذن مقرر کیا گیا۔ بلالؓ آنحضور ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہے۔ غزوہ بدر میں انہوں نے امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو قتل کیا۔ وہ آنحضور ﷺ کے موذن کے علاوہ آپؐ کے عصا بردار، خازن اور ذاتی خادم بھی تھے۔

فتح مکہ کے موقع پر کعبے کی چھت پر چڑھ کر پہلی دفعہ اذان کہنے والے بھی بلالؓ ہی تھے۔ وہ آنحضور ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں بھی موذن رہے لیکن حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں شام کی مہمات میں چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں بسر کی۔ بعض روایات کی رو سے آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد ہی سے موذن کا منصب چھوڑ دیا تھا اور صرف دو موقعوں پر اذان کہی تھی۔ یہ دونوں موقعے رقت انگیز تھے۔

حضرت بلالؓ کا قد لمبا اور کسی قدر جھکا ہوا تھا۔ رنگ سیاہ، چہرہ پتلا اور بال گھنے تھے۔ جن میں بہت سے بال سفید تھے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ مختلف روایات کی رو سے انھوں نے ١٧ھ/٦٣٩ء یا ١٨ھ/٦٤١ء یا ٢٠ھ/٦٤٢ء یا ٢١ھ/٦٤٣ء میں وفات پائی اور حلب یا دمشق یا داریا میں دفن کیے گئے۔ حضرت بلال کو ان کی زندگی ہی میں بڑی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ صحابہ کرامؓ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ انہیں سیدنا بلالؓ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بلبن، غیاث الدین

(دور حکومت ٦٦٤ھ - ٦٨٦ھ/١٢٦٦ء تا ١٢٨٧ء) سلطنت دہلی کا فرمانروا، خاندان غلاماں کا ایک نامور بادشاہ ترکوں کے قبیلہ بری سے تعلق رکھتا تھا۔ بلبن کا باپ اپنے قبیلے میں اچھی حیثیت کا مالک تھا۔ لڑکپن میں اسے منگول پکڑ کر لے گئے اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ ایک روایت کے مطابق بلبن منگولوں کے حملے میں گرفتار ہوا اور بغداد میں خواجہ جمال الدین بصری نے خریدا جو اسے دہلی لے آئے۔ یہاں شمس الدین التتمش نے اسے خرید لیا اور اس کی ذہانت و قابلیت کی بنا پر اپنے غلامان چہل گانہ میں شامل کر لیا۔ رضیہ سلطانہ نے بلبن کو امیر شکار بنایا۔ بہرام نے اسے ریواڑی اور ہانسی بطور جاگیر عطا کی۔

مسعود اور ناصر الدین محمود کی حکومت میں بلبن کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں بادشاہ اس کے داماد تھے۔ خود بلبن التتمش کا داماد تھا۔ [illegible] کا گھرانہ التتمش کے گھرانے میں مدغم ہو گیا تھا۔ ناصر الدین محمود نے بلبن کو اپنا نائب بنایا۔ اس سے قبل بلبن منگولوں کے حملوں کو کامیابی سے روک [illegible] اور سرکش امراء کے خلاف اپنے حسن تدبیر اور سیاست کا [illegible] ہو کر وہ سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد [illegible]

بلبن کی نظر میں بادشاہ کا مقام بہت اعلیٰ اور ارفع تھا۔ [illegible] کہ بادشاہی نام ہے عزت و عظمت اور حرمت و حشمت کا [illegible] جب بادشاہ کی ارفع حیثیت تسلیم نہ ہو گی لوگوں میں اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ پیدا نہ ہو گا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اپنے کردار اور اخلاق کو

سدھارا تاکہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس نے عام لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اپنے امراء مصاحبین اور افسروں کے انتخاب میں وہ خاندانی وجاہت پر بہت زور دیتا تھا۔

بلبن نے اپنے مخالفوں اور سرکشوں کو بڑی سختی سے دبایا۔ جس نے ذرا بھی سر اٹھایا بلبن نے اسے کچل کر رکھ دیا۔ اپنی سلطنت کو منگولوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شمالی اور شمال مغربی سرحدوں کو خوب مستحکم کیا ۶۶۹ھ / ۱۲۷۰ء میں خود لاہور آ کر شہر اور قلعے کو از سر نو مستحکم کیا اور ان سرحدوں کو اپنے لڑکے شہزادہ محمد کے سپرد کیا۔

التتمش کے بعد تیس سال تک سلطنت دہلی افراتفری کا شکار رہی۔ بلبن نے امن و امان قائم کرنے کے لیے مؤثر انتظامات کیے۔ اس نے اپنے آپ کو [illegible] سے باخبر رکھنے کے لیے خفیہ خبر رسانی کا انتظام کیا۔ ہر صوبے اور ہر شہر میں خبر رساں مقرر کیے۔ ان کے ذریعے بلبن اپنے امراء، گورنروں اور افسروں کے [illegible] اور کاموں سے مطلع رہتا۔ نیز ملک کو قزاقوں اور رہزنوں سے پاک کرنے کے لیے بڑے بڑے اقدامات کیے اور اودھ کے بڑے بڑے جنگل کٹوا کر [illegible] آباد [illegible] سے پاک کیا۔

[illegible] اور جسے اس کی شجاعت کی وجہ سے [illegible] [illegible] بغاوت بلند کیا۔ سلطان مغیث الدین کے [illegible] [illegible] اس کی سرکوبی کے لیے بھیجے [illegible] شکست کھا کر واپس آیا تو خود بلبن اس [illegible] [illegible] کی طرف بھاگ نکلا۔ بعد ازاں [illegible] [illegible] سے اس بغاوت کو ختم کیا۔ طغرل [illegible] بلبن نے [illegible] سزائیں دیں۔ اور اپنے بیٹے [illegible] [illegible] میں بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد جو بارہ برس [illegible] [illegible] منگولوں کے حملوں کا دفاع کر رہا تھا ایک [illegible] [illegible] نے بلبن کی کمر ہمت توڑ دی۔ بلبن کو [illegible] [illegible] میں بلبن کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے [illegible] [illegible] سال سے زیادہ تھی اور مدت حکومت بیس سال تین ماہ تھی۔

[illegible] ایک غیر معمولی شخصیت کا انسان تھا۔ جس شان و شوکت اور دبدبہ سے [illegible] [illegible] کی وہ بہت کم فرمانرواؤں کو نصیب ہوئی ہے۔ اس نے [illegible] سے سلطنت دہلی کو قوت اور وقار بخشا۔ یہ بات بھی از حد مستحسن [illegible] جہاں سرکش اور شورش پسند لوگ اس کی درشت مزاجی [illegible] تھے وہاں عام رعایا کے لیے وہ مشفق باپ کی طرح تھا [illegible] رعایا اور امراء نے چالیس روز تک سوگ منایا۔ بلبن نے سلطنت [illegible] رکھنے میں محفوظ و مامون کیا جب منگولوں نے ساری اسلامی دنیا کو تہ و بالا [illegible] تھا۔

بلبن کی نظر میں سلطنت کا استحکام اس کی توسیع سے زیادہ وقعت رکھتا تھا۔ وہ ایک مدبر اور باہمت سپہ سالار اور بعد میں ہوش مند اور رعب و جلال والا حکمران ثابت ہوا۔ وہ شوکت و دبدبہ کو لازمہ جہانداری سمجھتا تھا۔ وہ ایک نیک اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ مشائخ اور اہل علم کا احترام کرتا تھا۔ علماء اور مواعظ کی مجالس میں شریک ہوتا تھا۔ اسے ہندوستان کے عظیم معماروں میں شمار کیا گیا ہے۔

بلخ افغانستان کا ایک قدیم شہر جنوب میں واقع پہاڑیوں کے دامن سے دو میل اور دریائے آمو (جیحون) سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے آثار اب بھی مزار شریف کے ایک گاؤں کے اطراف میں موجود ہیں۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد بلخ نامی شہر ایک یونانی باختری ریاست کے صدر مقام کی حیثیت سے [illegible] آیا ۶۴۲ء میں ایک چینی بدھ بھکشو ھوان سانگ یہاں آیا اس کے قول کے مطابق اس شہر میں بدھوں کی تقریباً ایک سو عبادت گاہیں تھیں۔ البزید البلخی نے اپنی کتاب "مسالک الممالک" اور تاریخ بخارا میں اس شہر کو اسلام سے پہلے بدھ مت کا مرکز بتایا ہے۔

حضرت عثمان کے عہد خلافت ۳۲ھ / ۶۵۲ء میں احنف بن قیس نے اس شہر کا محاصرہ کر کے اسے تاراج کیا۔ لیکن اسے امان مل گئی اور دستبرد سے محفوظ رہا۔ ۴۲ھ / ۶۶۳ء میں قیس بن ہیثم نے پورے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور نو بہار جو بدھ مت کے مندروں کا مجموعہ تھا کو تباہ کر دیا۔ برمک کو جو نو بہار پر حکومت کرتا تھا اپنی جاگیر کو بچانے کے لیے عربوں کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔ سیستان اور طاس طلمند کے بادشاہ نیزک ترخان نے بھی بظاہر اسلام قبول کر لیا جو بعد میں مرتد ہو گیا۔ اور اس نے بلخ کو عربوں کے قبضے سے نکال لیا۔ ۹۲ھ / ۷۱۰ء میں اس شہر پر مسلمانوں کے مکمل قبضہ ہو جانے سے پہلے اس پر مختلف لوگوں کا قبضہ رہا۔ ۱۰۷ھ / ۷۲۵ء میں اسد بن عبداللہ والی خراسان نے اپنی محافظ فوجوں اور صوبائی حکومت کو مرو سے بلخ منتقل کر دیا اور اس شہر کی تعمیر شروع کرائی۔

۲۸۷ھ / ۹۰۰ء میں بلخ پر سامانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ سامانیوں کے دور حکومت میں اس شہر نے بہت ترقی کی اور بلخ ماوراءالنہر، ترکستان اور ہندوستان کی باہمی تجارت کا مرکز بن گیا۔ اس دور میں یہ شہر دو حصوں میں بنا ہوا تھا۔ اندرون شہر شہرستان یا مدینہ کہلاتا تھا۔ اور ربض (مضافات شہر) ایک بڑی نواحی بستی تھی۔ اس کے گرد فصیل تھی۔ ایک بڑی دیوار بھی تھی جس میں سات دروازے تھے۔ شہر کی ایک بڑی مسجد شہرستان میں تھی۔ بڑے بڑے بازار ربض میں تھے۔

المقدسی کے بقول دوسرے ایرانی شہروں کے مقابلے میں بلخ کی سڑکیں زیادہ چوڑی تھیں۔ اس کی مسجد بھی خوبصورتی میں بے نظیر تھی اس کے گھروں کے صحن وندالقان کے علاوہ خراسان کے تمام شہروں کے صحنوں سے زیادہ کشادہ تھے۔ ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں بلخ پر چغری بیگ نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلجوقیوں کا اس شہر پر [illegible]۔ ۵۵۰ھ / ۱۱۵۵ء میں غزوں نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ بلخ کے گورنر امیر قماج نے ایک نئی جگہ تمار میدان میں شہر کو از سر نو تعمیر کرایا۔

۵۹۴ھ / ۱۱۹۸ء تک یہ شہر قراختائیوں کے ہاتھوں میں رہا اور اس کے بعد غوریوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۶۰۳ھ / ۱۲۰۶ء میں خوارزم شاہ نے بلخ پر قبضہ جما لیا۔ ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء میں اس شہر کو چنگیز خان نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی کے شروع میں کپک خان نے اسے پھر سے تعمیر کرایا۔ جب اس شہر پر تیمور کا قبضہ ہوا تو قدیم ربض (مضافات) بھی از سر نو تعمیر ہوا۔ ان تعمیرات کی وجہ سے ہرات اور سمرقند کے بعد بلخ وسط ایشیا کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔

ازبکوں کے دور حکومت میں پرانے بلخ کے شمال مشرق میں نئے بلخ کے نام سے ایک قصبہ بنایا گیا۔ محمود بن ولی نے ان تمام تفریح گاہوں، باغوں، محلوں، نہروں، مسجدوں، مدرسوں کے مفصل حالات لکھے ہیں جو بلخ میں ازبک خوانین کے عہد میں بنائے گئے۔

دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں بلخ کو زوال آنا شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ یہ شہر ویران ہوتا چلا گیا۔ شہر کی آبادی کا بڑا حصہ شہر مزار شریف میں منتقل ہو

گیا اور بلخ کے بجائے یہ نیا شہر آباد ہو گیا۔ بلخ کی حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی رہ گئی تھی۔ جس میں صرف چند سو مکان تھے۔ ١١٦٢ھ/١٧٤٩ء میں احمد شاہ ابدالی کے وزیر اعظم شاہ ولی خان نے بلخ، تخارستان کے علاقوں یعنی افغانستان کے شمالی حصے کو سلطنت احمد شاہی میں شامل کر لیا اور وہاں افغانی حکام متعین کر دیے۔

١٣١٩ھ/١٩٠١ء سے موجودہ زمانے تک مزار شریف اور بلخ افغانستان کی ایک ولایت ہیں۔ مزار شریف میں ایک گورنر مقرر ہوتا ہے جو پوری ولایت پر حکمرانی کرتا ہے۔ اب بلخ مزار شریف کی ولایت میں ایک ضلع ہے جو مزار شریف سے بائیس کلومیٹر اور کابل سے ٤٢٣ کلومیٹر ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی گیارہ سو پچاس میٹر ہے۔

نئے بلخ کی بنا ١٣١٢ھ/١٩٣٣ء میں افغانستان کے وزیر داخلہ گل محمد خاں نے ڈالی نئے شہر کو وزیر آباد کہا جاتا ہے۔ اس میں بازار، حکومتی مراکز اور تجارت خانے بنائے گئے ہیں۔ ضلع میں دولت آباد، کشندہ، شورتپہ، چمتال اور متعدد دوسرے مواضع شامل ہیں یہاں کے رہنے والے ازبک، تاجیک اور پختون ہیں۔ جو ازبکی، فارسی اور پشتو زبان بولتے ہیں۔ ١٩٧٣ء میں شہر کی آبادی تیرہ ہزار تھی۔ بلخ کی اہم پیداوار گیہوں، جو، جوار، باقلا، ماش لوبیا، چنا اور کپاس وغیرہ ہیں۔

یہاں کا مشہور پھل خربوزہ ہے جو بہت شیریں ہوتا ہے۔ قراقلی، قالین، شال برک، ریشمی ابرہ یہاں کی مشہور مصنوعات ہیں جو دوسرے ممالک میں بھیجی جاتی ہیں پالتو جانوروں میں گھوڑے بہت مشہور ہیں۔ لوگوں کا پیشہ زراعت اور قرہ قلی بھیڑیں پالنا قالین بافی اور گھوڑے پالنا ہے۔

یہاں موسم گرما میں سخت گرمی اور موسم سرما میں سخت سردی پڑتی ہے۔ بلخ میں بہت سے قدیم بزرگان اسلام کے مزار موجود ہیں جن میں خواجہ ابو النصر پارسا، خواجہ عکاشہؓ، امام محمد حنیفہؒ، امام ابو حفص شیخ الاسلام، امام ابو عبداللہ اسماعیل، ابو القاسم انصاری امام ضحاک فقیہ حنفی، شفیق بلخی اور بعض کے نزدیک حضرت علیؓ کا مزار بھی ہے لیکن لوگ اسے فرضی مزار کہتے ہیں۔

بلخی، ابو القاسم (وفات ٣١٩ھ/٩٣١ء) عبداللہ بن احمد بن محمود معتزلی عالم بلخ میں پیدا ہوا۔ اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بغداد میں گذارا۔ بغداد میں اس نے ابو الحسن الخیاط معتزلی سے علم حاصل کیا۔ اس نے نسف میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس نے بلخ ہی میں وفات پائی

بلخی اگرچہ معتزلی عقائد سے اتفاق کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ معتزلہ کے اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اللہ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں۔ اس کا نظریہ تھا کہ عدم وجود، جس میں وجود کی صلاحیت ہے ایک خارج از وجود مسلمہ شے یعنی ایک جوہر بسیط ہے۔ وہ ذرے کو محدود اور زائد صفات سے معرا سمجھتا تھا۔ جسم کی صفات چونکہ ذرات کے مجموعے سے حاصل ہوتی ہیں لہٰذا وہ واجب نہیں بلکہ حادث ہیں۔ اس نے احساس اور تاثر میں فرق کیا ہے۔ اس کے نزدیک اختیاری فعل قطعیت اور تذبذب کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ دونوں باتیں انسان ایسی ناقص ہستی کا خاصہ ہیں بخلاف اس کے ذات باری میں یہ بالکل معدوم ہیں۔ امامت کے بارے میں اس کا نظریہ تھا کہ امامت قریش ہی کا حق ہے اور انہی کو ملنی چاہیے لیکن اگر اس سلسلے میں کسی سازش کا اندیشہ ہو تو غیر قریشی بھی امام بن سکتا ہے۔

بلخی، ابوزید (٢٣٦ھ/٨٥٠ء۔ ذیقعدہ ٣٢٢ھ/اکتوبر ٩٣٤ء) احمد بن سہل ایک مشہور عالم اور جغرافیہ نویس۔ صوبہ خراسان میں بلخ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سجستان کا ایک مدرس تھا۔ فکری لحاظ سے فرقہ امامیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ نوجوانی میں اس نے مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عراق کا سفر کیا اور آٹھ سال تک عراق میں مقیم رہا۔ اس نے الکندی کی شاگردی بھی اختیار کی اور قریبی ملکوں کی سیاحت بھی کی۔ اس نے عراق میں فلسفہ، نجوم ہیئت، طب اور علوم طبیعیات کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مذہبی علوم کو بھی پڑھنا شروع کر دیا اور دونوں میں مہارت پیدا کر لی۔ الشہرستانی نے بلخی کا شمار حکمائے اسلام میں کیا ہے۔

بلخی نے تقریباً ساٹھ کے قریب کتابیں لکھی ہیں۔ یاقوت نے چھپن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تصانیف میں "نظم القرآن"، "صور الاقالیم"، "الاسلامیہ"، "مصالح الابدان والانفس" اور "صورۃ ماموںیہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بلعم بن باعور ایک غیر اسرائیلی عالم یا پیغمبر۔ جو بائیبل کی رو سے کتاب [illegible] کے مطابق [illegible] شخص تھا۔ جسے بالاق، شاہ موآب نے اس سے طلب کیا تھا کہ وہ بنو اسرائیل کے حق میں بددعا کرے۔ لیکن خدا کے حکم سے اس کی زبان سے بار بار ان کے حق میں دعا ہی نکلی۔ (گنتی ٢٢ تا ٢٤)

نیز انہی روایات کی رو سے بعد ازاں بلعم کے کہنے پر مدیانیوں نے [illegible] کو بنو اسرائیل کے پاس بھیجا تاکہ وہ آمادہ گناہ ہو کر عتاب الٰہی کے مورد ہوں۔ چنانچہ اسی پاداش میں دوسرے مدیانیوں کے ساتھ بلعم بھی [illegible] بن [illegible] کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اسرائیلی روایات کے مطابق بلعم، ادوم کا بادشاہ بالع بن بعور [illegible] کموئیل اور یعقوب کا خسر لابن ایک ہی شخص تھا۔

قرآن مجید میں کسی مقام پر بھی بلعم بن باعور کا نام نہیں آیا۔ لیکن بعض [illegible] نے کہا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں "اور اے محمدؐ! ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا۔ مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے۔ مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہتا ہے۔ اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں۔" (الاعراف ٧: ١٧٥، ١٧٦)

ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے طبری نے جو روایات بیان کی ہیں ان کی رو سے بلعم بنی اسرائیل یا مدینۃ الجبارین میں سے یا اہل یمن یا کنعانیوں میں سے تھا۔

مولانا مودودی اس آیت کے ضمن میں تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں [illegible] سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور کوئی متعین شخص ہو گا جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی یہ انتہائی اخلاقی بلندی ہے کہ وہ جب کبھی کسی کی برائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر اس کی بری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اسے رسوا کیے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ اس لیے نہ قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے مفسرین نے عہد رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کیا ہے۔ کوئی بلعم بن باعور کا نام لیتا ہے کوئی امیہ بن ابی الصلت کا اور کوئی صیفی بن

الراہب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردہ میں ہے جو اس تمثیل میں پیش نظر تھا۔ البتہ یہ تمثیل ہر اس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔ وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا۔ یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جسے وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے لیکن وہ دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا۔ خواہشات نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے ان کے آگے سپر ڈال دی۔"

انجیل کی رُو سے بلعم نے نہ صرف خود گمراہی اختیار کی بلکہ بالاق کو بتوں کی قربانیاں کرنے اور زناکاری کی بھی تعلیم دی۔ (پطرس ۲: ۱۵)

بعض کے نزدیک بلعم علمائے بنی اسرائیل میں سے تھا اسے حضرت موسیٰ نے دعوت دین دینے کے لئے مدین کے بادشاہ کے پاس بھیجا جس نے اسے کئی گاؤں اور بہت سا انعام و اکرام دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور اس نے دین موسوی ترک کر دیا۔

بلعمی وفات [illegible] ۳۲۹ھ [illegible] نومبر ۹۴۰ء، دو سامانی وزرا جو اس نسبت سے مشہور ہیں۔

[illegible] ابوالفضل محمد بلعمی بن عبید اللہ [illegible] عبد اللہ البلعمی التمیمی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ بلعمی نسبت [illegible] کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بعض کے نزدیک یہ نسبت [illegible] ایک مقام تھا۔ ابوالفضل بلعمی سامانی امیر اسماعیل [illegible] ۳۲۲ھ [illegible] میں نصر ثانی بن احمد کا وزیر مقرر ہوا۔ نصر کا وزیر [illegible] ابوالفضل کا ذکر [illegible] لیکن اس کے بعد اس کا اکثر ذکر کیا گیا ہے [illegible] بلعمی کے [illegible] بخارا میں ایک دروازہ بھی اس کے [illegible] ۳۲۹ھ [illegible] نومبر ۹۴۰ء کو فوت ہوا۔ بلعمی نہایت قابل [illegible] انسان تھا۔ جن ماخذوں میں اس کا ذکر موجود ہے تمام کے تمام اس کی لیاقت [illegible] اعتراف کرتے ہیں۔ علماء کی حد سے زیادہ عزت کرتا تھا اور ان سے بڑی مروت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

[illegible] ابو علی محمد بن محمد [illegible] ابوالفضل محمد بلعمی کا بیٹا تھا۔ عبدالملک اول کے آخری عہد میں صاحب تھا۔ الپتگین کے اثر و رسوخ سے وزیر بن گیا۔ بعد میں منصور [illegible] کا، جو عبدالملک اول کا جانشین تھا دوبارہ وزیر مقرر ہوا اور اسی کے حکم سے طبری کی مشہور تاریخ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فارسی نثر کی قدیم ترین تصانیف میں سے ہے۔ اس نے اس ترجمے میں سلسلہ اسناد کو حذف کر دیا ہے اور وہ ایک ہی واقعے کو کئی بار متبادل بیانات کے تحت نہیں لاتا جیسا کہ طبری نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ یہ ایک ایسی نئی بات تھی کہ بعد کے آنے والے عرب مورخین نے اس طرز کو اختیار کیا ہے۔

بقول گردیزی ابو علی محمد بلعمی نے ۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک اس نے مندرجہ بالا تاریخ کے کافی عرصے بعد وفات پائی۔

بلغاریا جنوب مشرقی یورپ کی ایک ریاست جو جزیرہ نما بلقان کی شمالی مغربی ریاست تھی۔ تقریباً مستطیل شکل کے اس ملک کو شمال میں رومانیہ سے دریائے ڈینیوب جدا کرتا ہے، اور مشرق میں بحیرہ اسود سے ایشیا سے الگ کر دیتا ہے۔ جنوب اور مغرب میں ترکی، جرمنی اور یوگوسلاویہ کی کچھ کچھ سرحدیں اس سے ملتی ہیں۔ بلغاریہ کی نسبت ایک ترکی النسل قوم بلغار سے ہے جس نے اوائل قرون وسطیٰ میں دریائے والگا اور دریائے ڈینیوب کے کنارے [illegible] ریاستوں کی بنیاد ڈالی۔ اس قوم کا تذکرہ پہلی بار ۴۸۲ء میں ملتا ہے۔ جب [illegible] نے [illegible] کے ساتھ لڑائی میں شہنشاہ زینو کی مدد کی تھی۔ ۶۴۲ء میں [illegible] کی وفات کے بعد غالباً [illegible] منتشر ہوئی۔ سلطنت خزر کے دباؤ کے تحت بلغاروں کے اتحاد کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا ایک حصہ دسویں صدی عیسوی تک دریائے کیوبن کے کنارے اور میاوٹس میں اپنی قدیم آبادیوں ہی میں مقیم رہا۔ بلغاروں نے تاریخ میں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ بعد ازاں یہ لوگ اس علاقے میں آباد ہونے والی دوسری قوموں میں مدغم ہو گئے۔ اور اپنی الگ حیثیت ختم کر بیٹھے۔ بلغاریوں کا دوسرا گروہ ۶۷۹ء میں اسپرخ کی زیر قیادت دوبروجہ پر حملہ آور ہو کر موسیہ کے بزنطی صوبے میں ایک خودمختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس قوم نے کلیسائے یونان کی مسیحیت قبول کر کے ۸۶۵ء میں بلقان میں ایک مستحکم ریاست قائم کی۔ جو دریائے ڈینیوب سے بحیرہ ایڈریاٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک گروہ دریائے کاما اور والگا کے سنگم کے قریب آباد ہو گیا۔ جہاں انہوں نے فن لینڈ کے باشندوں کو اپنا مطیع کر لیا اور ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اسی گروہ کو عربی ماخذ میں بلغار لکھا جاتا ہے۔

۳۱۰ھ/۹۲۲ء میں خلیفہ مقتدر باللہ نے شاہ بلغار کے پاس جو سفارت بھیجی اس میں ابن فضلان جیسا مورخ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد بلغار کے حالات کے بارے میں اور بھی بہت سے ماخذ ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں البیرونی، بیہقی، ابن ندیم، ابن بطوطہ، ابن الاثیر، ابوالفدا وغیرہ ہیں۔

بلغار کئی گروہوں میں منقسم تھے۔ مسلمان مصنفین نے ان کا ذکر مختلف ناموں کے تحت کیا ہے جو برصولہ، اسکل، بلکار، قبیلہ سوار، البرنجار وغیرہ ہیں۔

بلغاریا میں اسلام پہلے پہل وسط ایشیا سے پہنچا۔ ۱۰۱۸ء سے ۱۱۸۶ء کے مابین بزنطینی سلطنت میں ضم ہو جانے کے بعد بلغاریا کی حیثیت دو صوبوں کی رہ گئی۔ ایک صوبہ بلغاریا دوسرا سیرمیان۔ ۱۱۸۵ء تا ۱۲۷۹ء ڈینیوب کے نچلے علاقے میں کمانوں کے حملے اور ان کے وہاں آباد ہو جانے سے بلغاریا سلطنت کے قیام کا راستہ ہموار ہو گیا جو دوسری بلغاروی سلطنت کہلانے لگی۔

۱۲۶۲ء میں بزنطینی شہنشاہ مائیکل ہشتم نے بلغاریوں سے انکیالس اور مسمبریہ چھین کر دوبروجہ میں اناطولی ترکوں کو لا بسایا جنہوں نے عزالدین کیکاؤس ثانی کی معیت

میں بزنطہ میں پناہ لی تھی۔ اناطولی کے "غازی" ترکوں کا بلغاریوں سے واسطہ اس وقت پڑا جب آیدین اوغلو امور قانتاقوزن کا حلیف بنا۔ ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء میں امور نے قانتاقوزن کو پہلے بلغاروی زار الیون الیگزنڈر کے خلاف مدد دی۔ آل عثمان کو جنہوں نے قانتاقوزن کے حلیف کی حیثیت سے امور کی جگہ لے لی، ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء میں بلغاریوں سے واسطہ پڑا بلغاروی قانتاقوزن کے حریف یان پنجم کی حمایت میں تھے۔ ایک عام رائے یہ ہے کہ ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء میں بزنطینیوں اور بلغاریوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کا تعلق عثمانیوں اور بلغاریوں کے معاہدے سے تھا۔ ۷۶۶ھ/۱۳۶۵ء میں زار الیون الیگزنڈر نے اپنی سلطنت کو اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک بیٹے کو ودین کا حکمران بنا دیا اور دوسرے کو ترنوو کی حکومت دے دی۔ اسی سال ہنگری نے ودین پر قبضہ کر لیا اور ترنوو پر بھی دست درازی کی۔ چنانچہ ششمن نے ودین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے عثمانیوں سے فوجی امداد مانگی اس نے اپنی بہن بھی عثمانی سلطان مراد اوّل کے نکاح میں دے دی۔ چنانچہ عثمانی فوج ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں فتوحات حاصل کرتی ہوئی بلقان کے بڑے دروں تک جا پہنچی۔ ۷۸۰ھ/۱۳۸۵ء میں نش پر بھی عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں جب مراد اوّل نے سربیا پر چڑھائی کی اور اس نے دیکھا کہ اس کے باجگزار یعنی بلغاریا میں ششمن اور دوبروجہ میں ایوان اس کا ساتھ نہیں دے رہے تو اس نے اپنے عقب کے تحفظ کے لئے علی پاشا کی کمان میں ایک فوج روانہ کی ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء میں علی پاشا نے پرودیڈینہ

جامع مسجد بنیا باشی - صوفیہ

ونچی، مدیرہ اور شمنی پر قبضہ کر لیا۔ اور یخشی بیگ کو ابن دوبروجہ کے مقابلے پر روانہ کیا جو ورنہ میں مقیم تھا اور خود سلطان کے پاس یان بولی میں چلا آیا۔ ششمن بھی سلطان کی خدمت میں معافی مانگنے کے لئے حاضر ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنے وعدے کے مطابق سلسترہ عثمانیوں کے حوالے نہ کیا۔ اس پر علی پاشا، ششمن کے دارالحکومت ترنوو کے سامنے آن دھمکا۔ کفار نے شہر کی کنجیاں اسے پیش کر دیں۔

۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں بایزید نے ترنوو پر بزور شمشیر قبضہ کیا۔ اور دوبروجہ اور سلسترہ کو بھی تسخیر کر لیا۔ لیکن ششمن کو باجگزار کی حیثیت سے نکوپولی میں رہنے دیا۔ بعد میں ششمن نے سجسمنڈ کے سامنے دست طلب دراز کیا یہی بات بایزید کے ترانسلوانیا پر حملے کا باعث بنی اور بالآخر ۷۹۸ھ/۱۳۹۶ء میں جنگ نکوپولی نے بلغاریہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور اگلے برس تک بلغاریہ ترکوں کے قبضہ میں آگیا۔

۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تک بلغاریہ پر عثمانیوں کا بہت گہرا رنگ چڑھ گیا مشرقی بلغاریہ میں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں تھی۔ ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء میں بلغاریہ جو ودین، صوفیہ، سلسترہ، نکوپولی اور ودین کے سنجاقوں میں منقسم تھا روم ایلی کی ایالت یا صوبے میں داخل تھے۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں نکوپولی اور سلسترہ کے سنجاق اوزی کی نئی ایالت میں شامل کر دیئے گئے اور اس جدید صوبے کا صدر مقام اوزو اور سلسترہ تھا۔

۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں بلغاریا میں سلطنت عثمانیہ کا مخصوص نظم و نسق رائج کر دیا گیا۔ دور عثمانی سے قبل کا عسکری گروہ بیشتر عثمانیوں کی عسکری تنظیم میں مدغم ہو گیا اور بلغاریہ عوام کو ذمی رعایا کی حیثیت دے دی گئی۔ ۱۴۵۰ء سے ۱۵۹۵ء تک بلغاریا بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں سے بالکل محفوظ رہا۔ بلغاروی قصبے بالخصوص صوفیہ اور سلسترہ جو روم ایلی جانے والی بڑی بڑی شاہراہوں پر واقع تھے۔ فوجی اور تجارتی مراکز ہونے کی وجہ سے بہت ترقی کر گئے۔ ان شہروں میں نئے مسلمان بسائے گئے۔ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں ٹیکس بڑھا دیئے گئے تو بلغاروی رعایا نے مقامی اہل کاروں اور سپاہیوں کے استحصال کی شکایات کرنا شروع کر دیں۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں ترنوو کے مقام پر پہلی عوامی شورش برپا ہوئی۔ سنان پاشا نے اس بغاوت کو فرو کیا لیکن اس کے بعد سے بلغاریا کی رعایا پر بیرونی دشمن سے جب وہ حملہ کرتا تو اس کے ساتھ مل جاتی تھی اور جب وہ حملہ آور واپس چلا جاتا تو بلغاروی رعایا کے بڑے بڑے گروہ اس کے ساتھ ہو لیتے جبکہ عثمانی حکومت انہیں ہر طرح سے مطمئن کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ مختلف زمانوں میں مختلف شہروں کی رعایا مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہو گئی۔ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں ستر ہزار بلغاروی سربیا میں آباد ہونے کے لئے روس کی فوج کے ساتھ چل دیئے ۔۔۔ میں دس ہزار بلغاروی اپنا وطن چھوڑ کر کریمیا میں جا بسے۔

اٹھارہویں صدی کے آخری پچاس سالوں میں بلغاریا میں اعیان خاص طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ یہ اعیان بلغاریا کی رعایا سے مالگزاری وصول کرنے کے ٹھیکیدار اور سرکاری اراضی پر قابضوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ۔۔۔ کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی ذاتی فوجیں رکھنا شروع کر دیں۔

ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاسبان اوغلی عثمان نامی ایک فوجی نے بلغاریا کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور ۱۷۹۴ء سے ۱۸۰۶ء تک بلغاریہ پر حکمران رہا۔ بالآخر سلطان محمود ثانی نے ان اعیان کا خاتمہ کر کے بلغاریا میں مرکزی حکومت کا نظم و نسق قائم کیا۔ ۱۸۴۷ء میں بلغاریا کی از سر نو تشکیل کی گئی اور اسے سلسترہ، ودین اور نش کی ایالتوں (صوبوں) میں تقسیم کر دیا گیا۔ صوبائی مجالس شوریٰ قائم کی گئیں اور بلغاروی نمائندوں کو بھی نمائندگی دی گئی لیکن ان تمام اصلاحات سے بلغاریوں کی بے چینی ختم نہ ہو سکی اور بغاوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں ودین کے علاقے میں ایک زبردست بغاوت برپا ہوئی۔ اکثر مبصروں نے ان بغاوتوں کی وجہ یہ بتائی ہے کہ بلغاریا میں ایک ۔۔۔

آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور فلبہ، ودین، شمنی، روسچق، رازغراد، درنہ، پلونہ عثمان بازار، اسکی جمعہ، یکی زغرہ کے شہروں میں مسلمان اکثریت میں اور گردو نواح، نش، صوفیہ، ترنووا اور قرین اواسی میں اقلیت میں تھے۔ جب جنگ کریمیا کے بعد عثمانی حکومت نے بلغاریا میں تقریباً ہزار چرکسی اور تقریباً ایک لاکھ تاتاری لاکر آباد کیے تو ان کے اور بلغاریوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ بلغاریوں کی انقلابی ... سے خوب ہوا دی۔ چنانچہ اسی زمانے میں بلغاریوں کی انقلابیوں کی سرگرمیاں کا نتیجہ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء کی عظیم بغاوت کی صورت میں نکلا اور ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کی ... اور روس کی جنگ کا سب سے بڑا میدان بلغاریا بنا۔ اس کے سبب سے مسلمان آبادی جنوب کی طرف منتقل ہوگئی۔ اسی دوران میں معاہدہ سان سٹیفانو کے تحت روس نے کوشش کی کہ دریائے ڈینیوب سے ... تک ایک عظیم بلغاریا حکومت بنائی جائے۔ لیکن اس معاہدے کی جگہ معاہدہ برلن نے لے لی۔ جس کے تحت بلغاریا کی ایک ریاست بلغارستان ... پر سلطان کی سیادت تسلیم کر لی گئی اور صوبہ مشرقی رومیلی کو خود مختاری دے دی گئی۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں ایک انقلاب کے نتیجے میں یہ دونوں علاقے متحد ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب استنبول کے بعد فرڈینینڈ اور آسٹریا کے فرانسس جوزف اوّل کے مابین مفاہمت ہوگئی۔ ۵ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو فرڈینینڈ نے بلغاریا کی آزادی کا اعلان کر دیا اور خود زار کے لقب سے تخت نشین ہوگیا۔

صوفیا کا مشہور گرجا — سینٹ الیگزینڈر نیوسکی

... مارچ ۱۹۱۲ء کو بلغاریا اور سربیہ کے مابین اور ۲۹ مئی ۱۹۱۲ء کو بلغاریا اور یونان کے مابین چند خفیہ معاہدے ہوئے تاکہ ترکی کے متروکات کو باہم تقسیم کیا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ان اتحادیوں نے ترکی پر یلغار کر دی اور ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو ترکی اپنے تمام یورپی مقبوضات سے دستبردار ہوگیا۔

۱۹۱۸ء میں فرڈیننڈ کو تخت سے اتار دیا گیا اور زار بورس سوم ۱۹۴۳ء تک حکومت پر فائز ہوا۔ اس کے بعد زار سائمن دوم تخت نشین ہوا۔ جسے ۸ ستمبر ۱۹۴۶ء کو جمہوری استصواب رائے کے سامنے سرجھکانا پڑا اور یوں بلغاریا ایک جمہوریہ قرار پائی۔

۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء کو بلغاریا کی قومی اسمبلی نے ریاست کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔ سابقہ آئین کی جگہ (جو ۱۸۷۹ء سے نافذ تھا) نیا آئین نافذ کیا گیا جو ۱۸ مئی ۱۹۷۱ء تک کارآمد رہا۔ جب ایک اور نیا آئین منظور کر لیا گیا۔

نئے آئین کی رو سے ایک ایوانی مقننہ عمل میں آئی۔ عاملہ کونسل میں چیئرمین دو اوّل نائب چیئرمین اور چار نائب چیئرمین ایک سیکرٹری اور سترہ ارکان پر مشتمل ہے جنہیں قومی اسمبلی منتخب کرتی ہے۔ قومی اسمبلی چار سو ارکان پر مشتمل ہے جو پانچ برس تک کے لیے منتخب ہوتی ہے۔ آئینی طور پر سربراہ مملکت کوئی نہیں عاملہ کی کونسل ہی انتظام حکومت چلاتی ہے۔ تاہم ۱۹۷۱ء کے انتخابات کی رُو سے دوزر ژیوکوف کونسل کے چیئرمین ہیں۔

اقتصادی و دیگر معلومات :- بلغاریا کا کل علاقہ ۴۲۸۲۳ مربع میل (۱۱۰۹۱۱ مربع کلومیٹر) ۱۹۷۴ء کی مردم شماری کی رُو سے یہاں کی آبادی ۸۷۰۶۰۰۰ ہے جن میں ۶۰۰۸ ہزار ترک ۸۸ ہزار بلغاری ہیں۔ کل آبادی کا صرف سات فیصد مسلمان ہیں۔ تمام مسلمان ایک مفتی اعظم اور ۶ علاقائی مفتیوں کی ایک مجلس کے ماتحت ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں بلغاریا میں کل ۱۱۸۰ مساجد تھیں، جہاں باقاعدہ جماعت ادا کی جاتی ہے ملک میں عقیدہ کی آزادی ہے، لیکن حکومت کے مذہبی فنڈ سے صرف عیسائیوں کو امداد فراہم کی جاتی ہے۔

بلغاریا میں سات سے سولہ سال تک کے بچوں کے لیے تعلیم لازم اور مفت ہے۔ ۱۹۷۴ء میں یہاں ۶۹۲۴ کنڈرگارٹن سکول (۲۴۵۸۲ طلبا) ۹۳۲ ابتدائی سکول، ۲۰۳۰ پرائمری سکول، ۵۰ ثانوی سکول، ۱۰ پیشہ ور سکول، ۲۶۵ ٹیکنیکل کالج، ۲۵ عام کالج ۲۴ اعلیٰ تعلیمی ادارے اور تین یونیورسٹیاں ہیں۔ دو برس کی فوجی خدمت اور تین برس بحریہ لازمی ہے۔

اقتصادیات کا دارومدار زراعت پر ہے۔ مزید براں جنگلات، ماہی گیری، پٹرولیم اور معدنیات کی صنعتیں آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کے ساتھ ہے۔ ۱۹۷۴ء میں دونوں مملکتوں کے درمیان تجارتی معاہدہ ہوا جس کے تحت معیشت، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں دس برس تک ایک دوسرے کی معاونت کی جائے گی۔

بلغراد یوگوسلاویا (سابقہ سربیا) کا دارالحکومت۔ دریائے ڈینیوب اور دریائے ساوا کے سنگم پر واقع ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی سات لاکھ ستر ہزار تھی۔ اس مقام پر کلٹی سکورڈیسی نے ایک بستی آباد کی تھی اور سلطنت روما کے عہد تک اس شہر کا نام سنگیڈونیم رہا۔ نویں صدی عیسوی میں بلغاریوں نے اپنے دور حکومت میں اس شہر کا نام سلافی زبان میں رکھا۔ ترکوں کے دور میں اسے بلغراد کہا جانے لگا۔

پہلی عالمی جنگ میں بلغراد وسطی یورپ سے مشرق قریب کو جانے والی شاہراہ پر ایک اہم قلعہ بند شہر تھا۔ ایک اہم جنگی مقام ہونے کی وجہ سے گذشتہ زمانے میں یہ اہم تاریخی واقعات کا مرکز رہا۔ قرون وسطیٰ میں اس شہر پر بزنطینی، بلغار، ہنگروی اور سرب کے مختلف فرمانروا حکومت کرتے رہے۔ ۱۴۲۷ء میں سربیا کے بادشاہ سٹیفان لزاروچ کی وفات کے بعد بلغراد پر ہنگرویوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور تقریباً سو سال تک ترکوں کے حملوں سے ہنگری کی جنوبی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اس شہر کو خاص اہمیت حاصل ہے

بلغراد پر مسلمانوں نے سب سے پہلا حملہ ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں کیا اور چھ ماہ تک اس شہر کا محاصرہ کیے رکھا۔ دوسرا حملہ ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء میں سلطان محمد ثانی نے ایک لشکر جرار، جنگی بیڑے اور ایک بھاری توپ خانے کے ساتھ کیا۔ بلغراد نے

بڑی استقامت سے اس شدید حملے کا مقابلہ کیا اور ترکوں کو ایک بار پھر محاصرہ اٹھانا پڑا۔ نیز بلغراد نے مسیحی دنیا کی بیرونی فصیل کے طور پر شہرت حاصل کر لی۔ بالآخر ۹۲۷ھ ۱۵۲۱ء میں ترکی فوج ایک لمبے محاصرے کے بعد بلغراد میں داخل ہو گئی۔ سرویا کے لوگوں کو قسطنطنیہ میں آباد کر دیا اور سروی جنگی جہازوں کے عملے کو ترکی جنگی جہاز راں بنا دیا۔ سمندریہ کے سنجاق کا صدر مقام بلغراد بنا کر بالی بے کو یہاں کا گورنر بنا دیا گیا۔ بلغراد فتح کرنے کے بعد ترکوں نے اسے اور مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ اسے توپ خانے سے آراستہ کیا گیا۔ اور ایک جنگی بیڑے سے بھی لیس کر دیا گیا۔

بخارسٹ (رومانیہ) کا قومی بنک
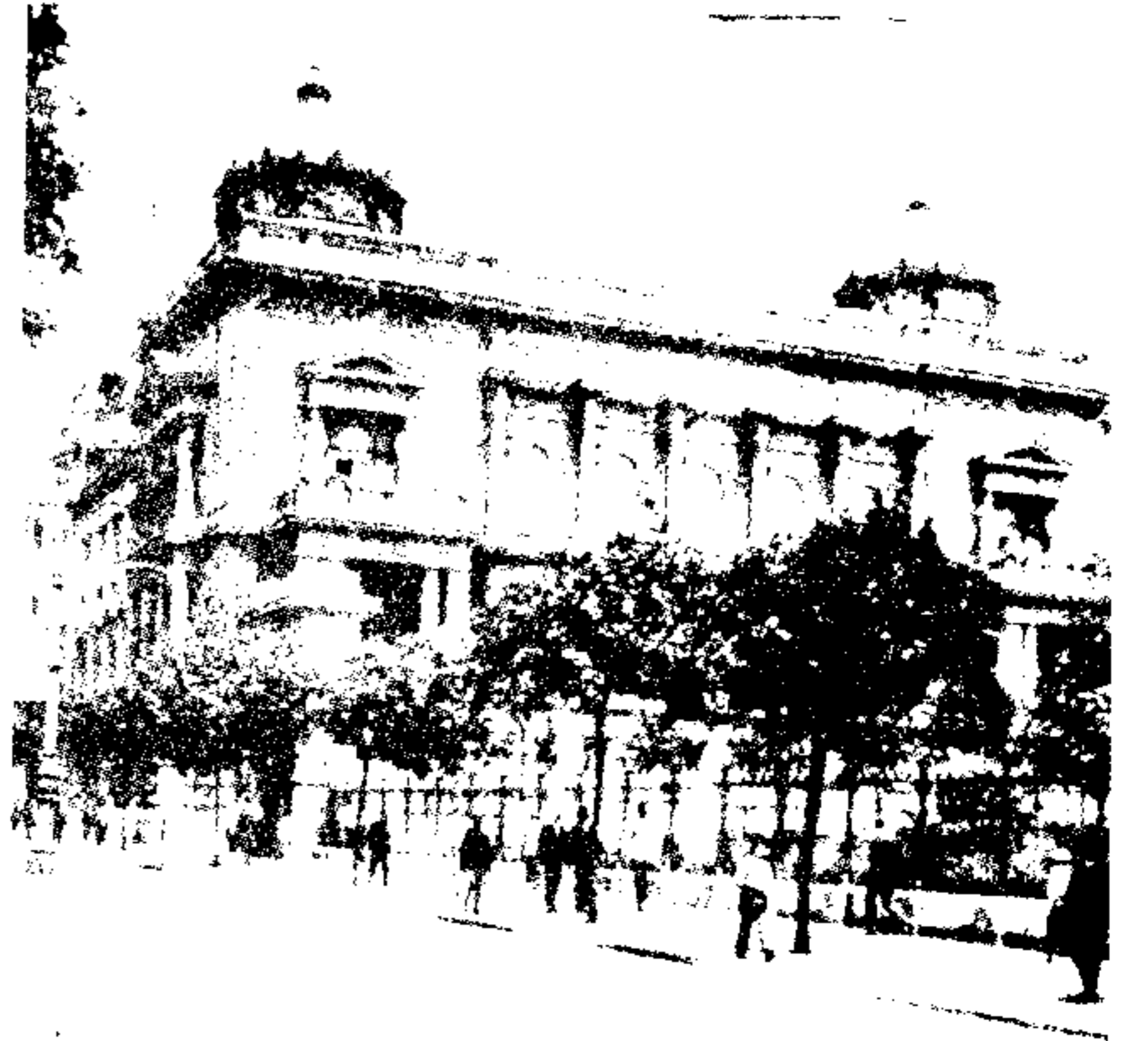
دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں بلغراد مشرقی وضع اختیار کر گیا۔ مسلم آبادی میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ اس کی وجوہات ایک تو انتظامی اور حفاظتی فوج کا وہاں قیام تھا۔ دوسرے ترکی کے کئی مقامات سے تاجر لوگوں کا وہاں آکر بس جانا تھا اور تیسرے مقامی آبادی کا اسلام قبول کر لینا تھا۔ ۹۵۹ھ / ۱۲۵۲ء میں بلغراد ایک تجارتی مرکز بن گیا۔ ۱۶۳۲ء میں ایک باپائی سیاح کے مطابق بلغراد میں آٹھ ہزار گھر تھے جن میں ساٹھ ہزار افراد بستے تھے۔ ۱۶۶۰ء میں یہاں کے باشندوں کی تعداد ۹۸ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ یہاں فوج کے غذائی سامان کے بڑے بڑے ذخائر، توپوں کی مرمت کے کارخانے اور ایک بارود سازی کا کارخانہ تھا۔ اولیا چلبی کے بیان کے مطابق قلعے کے اندر کی مسجد جو سلطان سلیمان نے بنوائی تھی اور شہر کے نچلے حصے میں محمد پاشا کی بنوائی ہوئی مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شہر میں آٹھ مدرسے اور نو حدیث کی درسگاہیں تھیں۔

۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۸ء میں بلغراد آسٹریا کے قبضے میں چلا گیا لیکن دو ہی سال بعد ترکوں نے اس شہر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ۱۱۲۹ھ / ۱۷۱۷ء میں ترکوں کو سیوائے کی یوجین کے زیر قیادت شاہی فوجوں نے شکست دی اور ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء میں جب بلغراد پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا تو یہ شہر شمالی سرویا کا دارالحکومت بن گیا۔

صلح نامہ بلغراد کی رو سے ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں جب دریائے ساوا اور دریائے ڈینیوب سرحد قرار دے دیئے گئے تو ایک بار پھر بلغراد ترکوں کے قبضہ میں تھا اور یہ ینی چریوں کا ایک سرحدی حفاظتی مقام ہو کر رہ گیا۔

۱۷۹۱ء کے صلح نامہ کی رو سے ینی چریوں کو بلغراد سے نکال دیا گیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد سلطان سلیم ثالث انھیں بلغراد واپس آنے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۸۰۴ء میں سرویوں نے ینی چریوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور ۱۸۰۶ء میں باغیوں نے بلغراد پر قبضہ کر لیا۔ اور ۱۸۱۳ء تک بلغراد پر حکمران رہے۔ ۱۸۱۵ء میں سرویوں نے ایک اور بغاوت کی تو ترکوں کو ان سے ایک معاہدہ کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ بلغراد سرویا کا شہر بنتا چلا گیا۔ بالآخر ۱۸۶۷ء میں بلغراد سرویا کے حوالے کر دیا گیا اور اس طرح وہ سرویا کا دارالسلطنت بن گیا۔ بلغراد میں ترکی عہد کی عمارات میں سے صرف چند ایک یادگار کے طور پر باقی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد ہے، ایک مقبرہ باقی رہ گئے ہیں۔ اس دور کی عمارات کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ جن کے نام وہاں کے باشندوں سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ بلغراد میں آج کل جو مسلمان آباد ہیں وہ ۱۹۱۸ء کے بعد بوسنہ، ہرسک، مقدونیہ اور یوگوسلاویہ کے دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

بلقان ریاستوں کا ایک مجموعہ، جو البانیا، بلغاریا، یونان، یوگوسلاویا، ترکی اور یورپ کے ترکی مقبوضات پر مشتمل تھا۔ بلقان ترکی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کی آب و ہوا وسطی یورپ کی سی ہے۔ یعنی سخت اور جنوبی علاقے معتدل آب و ہوا کے حامل ہیں۔

۶۸۰ء میں بلغار نامی ایک ترک قوم بحر اسود کے شمال سے آئی اور ڈینیوب کے زیریں علاقے میں آباد ہو گئی۔ نیز اس نے سلافیوں پر حکمران امرا کی حکومت قائم کر کے بلقان میں ایسی مملکت کی بنیاد رکھی جو بزنطینی سلطنت کی پہلی حریف بنی۔

بلقان میں اسلام غالباً ۶۶۲ھ / ۱۲۶۴ء میں ایک اناطولی بزرگ صاری صلتوق کے ذریعے پہنچا۔ چودھویں صدی عیسوی میں بلقان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن میں ہمیشہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد عثمانی سلطان ان تمام ریاستوں کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔ ۷۷۳ھ / ۱۳۷۱ء میں بایزید اول نے اپنے ماتحت علاقے پر براہ راست قبضہ کرنے کے بعد ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔ ... کی ... تھی کہ بلقان میں واحد سلطنت قائم کر دے۔ چنانچہ بایزید اول نے ۱۳۹۳ء اور ۱۳۹۶ء کے

ایتھنز (یونان) کی قومی اسمبلی

درمیان بلغاریا، مقدونیہ اور تھسلی کو تسخیر کر لیا اور قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش

کی۔ جب تیمور نے بایزید اول پر ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں فتح حاصل کر لی تو ترکوں کے ہاتھ سے اناطول میں اکثر مقبوضہ علاقے نکل جانے کے بعد صرف بلقان ہی ایسا مقام باقی رہ گیا تھا جسے وہ اپنا ٹھکانا بنا سکتے تھے چنانچہ آئندہ کے لیے ادرنہ عثمانی سلاطین کے اصل دارالحکومت کی شکل اختیار کر گیا۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب لاطینی بلقان سے نکال دیے گئے تو ان کی جگہ مقامی تاجروں نے لی جن میں مسلمان یونانی اور اہل راغوسہ شامل تھے۔ چنانچہ بلقان کی تجارت نے عثمانیوں کی سرپرستی میں بے پناہ ترقی حاصل کر لی۔ نیز عثمانی دور میں بلقان میں ایک بار پھر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو گئی۔ بلقان میں اسلام کی اشاعت عام طور پر کسی جبر یا سرکاری دباؤ کے تحت نہ تھی بلکہ

بلقان ۱۸۷۸ء اور ۱۹۱۳ء میں (اور ترکی کی حدود)

اسلام کے آفاقی اصولوں نے اہل بلقان کا دل موہ لیا تھا۔ اس بات کو مستشرقین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جب عثمانی ترکوں کا زمانہ زوال شروع ہوا تو بلقان یورپ کی بڑی طاقتوں

کی سازشوں کا مرکز بن گیا جن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ بلقان پر سے ترکوں کا تسلط ختم کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے سب سے اہم واقعہ جنگ بلقان ۱۳-۱۹۱۲ء کا ہے اور دوسرا اہم واقعہ پہلی جنگ عظیم کا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے ترکی کا اثر بلقان پر کم سے کم ہوتا چلا گیا اور یہ سارے علاقے جو ترکوں کی سلطنت میں شامل تھے خودمختار ہوتے چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اتحاد بلقان کی بنیاد پڑی یہ ایک سیاسی تنظیم تھی جس کی بنیاد ۱۹۳۴ء میں رکھی گئی اور اس میں چار بلقانی ممالک یوگوسلاویہ، رومانیہ، یونان اور ترکیہ شامل تھے۔ جس کا مقصد مشترکہ مفادات کی حفاظت اور باہمی دفاع تھا لیکن اتحاد بلقان کے ممالک کے ان بلند و بانگ دعووں کے باوجود جو اتحاد کے وقت کیے گئے تھے یہ ممالک کبھی بھی باہم مل کر مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے تمام ممالک جارحانہ حملوں کا شکار ہو گئے۔ اب ترکی

بلغراد کا شاہی محل

اور یونان کے سوا دیگر ریاستیں روس کے زیر اثر ہیں۔

۹ اگست ۱۹۵۴ء کو بلیڈ (یوگوسلاویہ) کے مقام پر ترکی، یونان، یوگوسلاویہ کے مابین باہمی اتحاد، سیاسی تعاون اور فوجی امداد کا ایک معاہدہ طے پایا جو بلقان

البانیہ کے دارالحکومت تیرانا کا ایک منظر

پیکٹ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ معاہدہ بیس سال کے لیے کیا گیا۔ لیکن عملاً اتحاد تعاون اور امداد کی صورت کبھی پیدا نہ ہو سکی۔

بلقیس ایک خوب صورت اور ذہین عورت کا نام، جو ملکہ سبا کے نام سے بھی مشہور ہے اس کے باپ کا نام شراحیل بن مالک تھا جو یمن کا بادشاہ تھا۔ بعض نے اس کے باپ کا نام الہدہاد بن شرجیل بھی لکھا ہے وہ اور اس کی قوم سورج کی پرستش کرتی تھی لیکن حضرت سلیمانؑ نے اسے ایک خط لکھ کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف مدعو کیا۔ بحث کے بعد یہ طے پایا کہ سلیمانؑ کا امتحان لیا جائے۔

بلقیس کا ذکر زلیخا کی طرح نام لیے بغیر قرآن مجید میں بڑے مختصر مگر جامع انداز میں آیا ہے۔ "کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ اس (ہُد ہُد) نے آکر کہا میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ (حضرت سلیمانؑ) کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں میں نے وہاں ایک عورت دیکھی ہے جو اس قوم کی حکمران ہے اسے ہر طرح کا سر و سامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے" (۲۷: ۲۲، ۲۳)

"سلیمانؑ نے کہا "ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں"۔

ملکہ بولی "اے اہل دربار میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے اور وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔" (خط سنا کر) ملکہ نے کہا "اے سرداران قوم میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو! میں کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی۔" انھوں نے جواب دیا ہم طاقتور اور لڑنے والے لوگ ہیں آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔"

ملکہ نے کہا "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔"

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمانؑ کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا گیا ہے تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کیساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔"

سلیمانؑ نے کہا "اے اہل دربار تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں!" جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں ایسی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔" جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں" جونہی سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے لیے ہی مفید ہے۔ ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"

سلیمانؑ نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اسکے سامنے رکھ دو دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے۔" ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ وہ کہنے لگی "یہ گویا وہی ہے۔ ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔" اسے (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لیے اس نے اپنے پائنچے اٹھا لئے۔ سلیمانؑ نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔" (۲۷: ۲۷ تا ۴۴)

ملکہ سبا کا یہ قصہ بائیبل کے عہد عتیق (جدید اور روایات [illegible] میں مختلف انداز) سے آیا ہے۔ "اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمانؑ کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے اور وہ بہت بڑے [illegible] ساتھ یروشلم میں آئی۔ جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس [illegible] باتوں کے بارے میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی [illegible] ان سب کا جواب دیا۔۔۔۔ اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمانؑ کی ساری حکمت [illegible] اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دستر خوان کی نعمتوں [illegible] ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک [illegible] ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر جاتا تھا دیکھا تو [illegible] ہوش اڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال اس شہرت سے جو میں نے سنی [illegible] ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا۔۔۔۔ اور [illegible] بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر [illegible] دیئے۔ اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیئے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے۔۔۔۔ اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔" (۱۔ سلاطین۔ ۱۰: ۱۔ ۱۳)

اس ملکہ کی تصویر جو ہمارے سامنے آتی ہے اس سے وہ ایک اعلیٰ درجے کی ذہین، مدبر اور دور اندیش حکمران خاتون کے ساتھ ساتھ تواضع اور خوش خوئی کی صفات سے بھی متصف نظر آتی ہے۔

بعض روایات کی رو سے حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس سے شادی کر لی اور اسے اس کے ملک پر بطور ایک حکمران برقرار رکھا۔ اس سے محبت کرتے تھے

اور ہر ماہ ایک بار اس کے پاس ملنے جاتے تھے۔ اس سے اولاد بھی ہوئی۔

بلقینی مصری علماء کا ایک خاندان۔ اس خاندان کا جد امجد صالح العزبیہ کے علاقے میں بلقینہ کے مقام پر آباد ہوا۔ اسی وجہ سے یہ خاندان جو نسلاً فلسطینی تھا بلقینی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کے مشہور ترین اشخاص یہ ہیں:

۱۔ **عمر بن رسلان بن ناصر:** ۱۲ شعبان ۷۲۴ھ/۴ اگست ۱۳۲۴ء۔ ۱۰ ذی قعدہ ۸۰۵ھ/یکم جون ۱۴۰۳ء) ابو حفص الکنانی۔ قاہرہ کے مشہور ترین علماء سے تعلیم پائی۔ ابن عقیل نے جو اس کا استاد تھا، اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور جب ابن عقیل ایک مختصر وقت کے لئے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوا تو وہ اس کے نائب کے فرائض سر انجام دیتا رہا۔ ۷۶۵ھ/۱۳۶۳ء میں وہ مصر کے دارالعدل میں قاضی مقرر ہوا اور اس نے اپنے زمانے کے ایک نامور فقیہ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ کچھ عرصے کے لئے قاضی القضاۃ کے عہدے پر بھی فائز رہا۔ اسے شیخ الاسلام کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ بعض لوگ اسے [illegible] صدی ہجری کا مجدد مانتے ہیں۔ [illegible] نے ہرات میں ایک مدرسے کی [illegible] عمر بن رسلان اپنی کوئی تصنیف مکمل نہ کر سکا۔

۲۔ **بدرالدین محمد بن عمر:** [illegible] ۷۵۶ھ/۱۳۵۶ء۔ [illegible] ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء) عمر بن رسلان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ [illegible]ھ/۱۳۸۰ء میں قاضی عسکر اور مفتی دارالعدل کے عہدے پر [illegible] باپ کا جانشین تھا۔

۳۔ **جلال الدین عبدالرحمان بن عمر:** ۱۲ [illegible] ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء۔ [illegible] ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) [illegible] ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں قاضی عسکر کے عہدے پر اپنے بڑے بھائی کا جانشین ہوا [illegible] تک زندگی بسر کرتا تھا۔ ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں جلال الدین شافعی قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوا اور [illegible] وفات تک کچھ وقفوں کے ساتھ اسی عہدے پر فائز رہا۔

۴۔ **صالح بن عمر:** (۱۱ [illegible] ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء۔ ۸۶۸ھ/۱۴۶۴ء) علم الدین [illegible] یہ عمر بن رسلان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء سے ۸۶۸ھ/۱۴۶۴ء تک [illegible] بار مختلف اوقات میں قاہرہ میں شافعی قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہا۔ یہ کئی مدارس میں معلم بھی رہا۔ سخاوی اور سیوطی فقہ میں اس کے شاگرد تھے۔ اس نے اپنے والد کی نامکمل تالیفات کی تکمیل کی اور اس کی سوانح عمری بھی لکھی۔ اس نے ایک کتاب تفسیر پر اور کئی احادیث پر لکھیں۔

۵۔ **ابوالسعادات بدرالدین بن محمد:** (۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء یا ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء۔ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) عمر رسلان کا پوتا تھا۔ ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں اپنے باپ کے انتقال پر قاضی العسکر بنا۔ ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں شافعی قاضی القضاۃ کے عہدے پر چار ماہ تک فائز کیا گیا۔

بلگرام ہندوستان کے ضلع ہردوئی کا ایک بہت پرانا قصبہ۔ اس شہر نے بڑی عظیم شخصیتوں کو جنم دیا۔ شروع میں اس مقام پر چھتھیرے آباد تھے جنہیں قنوج کے حملہ آور راجپوتوں نے یہاں سے نکال دیا۔

بلگرام کو ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے زمانے میں قاضی محمد یوسف نے فتح کیا۔ غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد ہندوؤں نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دیا۔ سلطان شمس الدین التتمش کے عہد حکومت میں ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں ایک مضبوط شاہی فوج کا دستہ لے کر سید محمد صغریٰ نے راجا سری کو شکست دی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ مغلیہ دور حکومت میں بلگرام قنوج کی سرکار کا ایک پرگنہ تھا۔ ۹۴۸ھ/۱۵۴۱ء میں یہاں پر ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان ایک زبردست جنگ لڑی گئی جس میں ہمایوں کی فوجیں بالکل تباہ و برباد ہو گئیں۔

بلگرام کی مشہور ترین شخصیات میں عبدالواحد بلگرامی، عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد، سید علی بلگرامی، عمادالملک، سید حسن بلگرامی، سید مرتضیٰ الزبیدی وغیرہ ہیں۔ سبحان رائے بٹالوی کے بقول اس قصبے کی آب و ہوا عمدہ ہے۔ باشندے

بلگرامی، سید علی (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء۔ ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء) شمس العلماء سید علی بلگرامی بن سید زین الدین حسن۔ پٹنہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیننگ کالج لکھنؤ میں دو سال گذارے۔ پھر ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج میں داخل ہو کر بی اے کیا۔ اور سنسکرت میں امتیاز حاصل کیا۔ ۱۸۷۶ء میں یورپ کا سفر کیا۔ جہاں انہوں نے جرمنی اور فرانسیسی زبان میں بھی تخصص حاصل کیا اور اس کے ساتھ ہی کیمیا، طبیعات اور معدنیات وغیرہ کے مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ واپسی میں اٹلی میں چند ماہ گذارے اور اطالوی زبان سیکھی۔ بنگالی زبان پہلے ہی جانتے تھے۔ حیدرآباد میں انہوں نے مرہٹی، تلنگی زبان بھی سیکھ لی۔ غرض وہ چودہ زبانیں جانتے تھے۔ اور ایسے لہجے میں بولتے تھے گویا یہ ان کی مادری زبانیں ہیں۔ یورپ سے واپسی پر انسپکٹر معدنیات مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری ملی۔ ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے۔ انہوں نے سنسکرت، فرانسیسی اور جرمنی زبان میں لکھی گئی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کی اپنی تصنیف کردہ کتابوں سے ان کے کئے ہوئے تراجم کہیں زیادہ ہیں۔ انگلستان سے واپس آکر وہ ہندوستان کے ضلع ہردوئی میں مقیم ہو گئے اور اپنی ساری توجہ علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف مبذول کر دی۔

"تمدن ہند" اور "تمدن عرب" ان کے دو بڑے شاہکار ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ انہوں نے ان کتابوں کا اردو میں ترجمہ اس انداز سے کیا ہے، گویا یہ ترجمہ نہیں بلکہ ان کی اپنی تصانیف معلوم ہوتی ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ بلگرامی رسالہ در تحقیق کلیلہ و دمنہ کے مصنف بھی ہیں۔

بلگین (وفات ۲۱ ذوالحجہ ۳۷۳ھ/۲۵ مئی ۹۸۴ء) بن زیری بن مناد افریقہ کا پہلا زیری فرمانروا۔ جس نے صنہاجہ کے امیر کی حیثیت میں فاطمی خلفاء کی بہت زیادہ خدمات انجام دیں اور ان خدمات کے صلے میں انہوں نے اسے افریقہ کا عامل نامزد کر دیا۔ بلگین ہمیشہ مغربی وسطیٰ کی مہمات میں مصروف رہتا تھا اس لئے اس نے قیروان اور مشرقی افریقہ کا نظم و نسق ایک نائب امیر کے سپرد کر دیا۔ ۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں اس نے الجزائر، ملیانہ اور میڈیا کے شہروں کی بنیاد رکھی۔

۳۵۸ھ/۹۶۸ء میں ابو خزر کے خلاف جنگ لڑی اور ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں زناتہ کو شکست دی۔ ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں مسلہ اور زاب کے باغی عامل جعفر بن علی بن حمدون الاندلسی نے اس کے باپ زیری کو قتل کر دیا۔

۲۰ ذوالحجہ ۳۶۱ھ/۲ اکتوبر ۹۷۲ء کو بلگین کو ابوالفتوح یوسف کے لقب

سے صقلیہ اور طرابلس کے علاوہ فاطمی سلطنت کے پورے مغربی علاقے کا حاکم بنا دیا گیا۔ اس نے المغرب میں بھی کئی مہمات سرانجام دیں ۳۶۴ھ تا ۳۶۵ھ/۹۷۴ء تا ۹۷۵ء اس نے کتامہ سے جنگ کی اور طرابلس، سرت اور اجدابیہ کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ ۳۶۸ھ تا ۳۷۳ھ/۹۷۹ء تا ۹۸۴ء میں اپنی آخری مہم میں بلگین نے فاس سجلماسہ اور بصرہ فتح کر لیے اور برغواطہ کو بھی شکست دی۔ واپسی پر اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا المنصور تخت نشین ہوا۔

بلند شہر ہندوستان کے صوبہ اترپردیش کا ایک شہر اور ضلع جو مشرق کی سمت آگرے اور علی گڑھ سے میرٹھ جانے والی بڑی سڑک پر واقع ہے شہر کالی ندی کے کنارے جو شہر کے پاس بہتی ہوئی گذرتی ہے ایک اونچی جگہ پر آباد ہے اور اسی اونچائی کے سبب اسے بلند شہر کہا جاتا ہے۔ اس شہر کا قدیم نام اس کے فرضی بانی اہی برن کے نام پر برن تھا۔

۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے اسے فتح کیا۔ یہاں کے ہندو راجہ نے سلطان کی اطاعت کر لی اور اپنے دس ہزار رعایا کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ بعد میں اس کی اولاد نے اسلام ترک کر دیا۔ ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک نے اس شہر کو فتح کر کے اپنے داماد اور جانشین التمش کو دے دیا۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں یہ شہر کسانوں کی بغاوت کا مرکز بن گیا۔ سلطان نے بغاوت فرو کرتے ہوئے اس علاقے کے اردگرد کا تمام علاقہ ویران کر دیا۔ مغلیہ دورِ حکومت میں اس شہر میں امن و امان رہا۔ اور اورنگ زیب کے عہد حکومت میں یہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی میں مرہٹے شہر کو تباہ و برباد کر کے خود اس پر قابض ہو گئے۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں یہ شہر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران میں اس شہر کی حالت بڑی ابتر اور خوفناک رہی۔ تاہم انگریزی محافظ فوج کو یہاں سے نکال دیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور ولی دادخان کے ہاتھ میں چلی گئی۔ یہاں کے عوام انگریزوں کے سخت دشمن ثابت ہوئے اور تقریباً پانچ ماہ کی مزاحمت کے بعد یہ شہر دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آیا۔

بلند شہر میں بعض قدیم مساجد اور مقبرے ہیں۔ ان میں سے ایک درگاہ خواجہ لال برنی کی ہے جو ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء کی اسلامی فتح کی یادگار میں تعمیر ہوئی۔

۱۹۷۱ء میں اس شہر کی آبادی پچاس ہزار تھی۔ اس میں ایک کالج ہے جو آگرہ یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ اب یہ اندرونی اور بیرونی تجارت کا ایک روبہ ترقی مرکز ہے۔ ضلع بلند شہر دوآب گنگ و جمن کے میدانوں میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۸۷ مربع میل اور آبادی پچیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر رقبہ مزروعہ ہے جہاں گندم، جو، گنا، مکئی اور کپاس پیدا ہوتی ہے۔ مغلیہ دور سے اب تک یہ علاقہ خوشحال رہا ہے۔

بلنسیہ ہسپانیہ کا ایک شہر جو آبادی کے لحاظ سے سپین کا تیسرا بڑا شہر ہے دریائے توریا وادی الابیض کے دونوں کناروں پر جزیرہ نما کے مشرقی حصے میں بحرہ روم کی بندرگاہ العزاد سے تین میل دور واقع ہے۔ ایک ریلوے لائن کے ذریعے میڈرڈ سے ملا ہوا ہے۔ یہ شہر اسی (بلنسیہ) نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے۔ شہر کے چاروں طرف سرسبز و شاداب ہورٹا ڈی ولنسیا کا میدان پھیلا ہوا ہے۔ بلنسیہ کو دریائے توریا سیراب کرتا ہے۔ اپنے محل وقوع کے دلکش ہونے کے سبب یہ شہر عہد اسلامی کے مشرقی ہسپانیہ کا دارالحکومت چلا آتا ہے۔

۱۳۸ ق م میں رومیوں نے بلنسیہ شہر کی بنیاد رکھی۔ روم کے ایک حاکم اعلیٰ جونیس بروٹس نے یہاں قدیم جنگ آزماؤں کی آبادی قائم کی جو حکومت روما کے وفادار تھے۔ بعد میں یہاں کے باشندوں نے سرٹوریوس اور پامپی کی لڑائی میں سرٹوریوس کا ساتھ دیا۔ ۷۵ ق م میں پامپی نے بلنسیہ کو جزوی طور پر تباہ کر دیا لیکن آگسٹس کے دور حکومت میں اس شہر نے اپنی خوشحالی دوبارہ حاصل کر لی۔ ۴۱۳ء میں بلنسیہ پر غربی قوطیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۹۲ھ/۷۱۱ء میں طارق بن زیاد نے جب اس شہر پر قبضہ کیا تو یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ عہد اسلامی میں اس شہر کا شمار عرب ثقافت کے اعلیٰ ترین مراکز میں ہوتا رہا۔ اس زمانے میں بلنسیہ ایک صوبے کا صدر مقام تھا اور قرطبہ کے خلیفہ کا مقرر کیا ہوا والی وہاں کا نظم و نسق چلاتا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ شہر ایک خود مختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت بن گیا۔

بلنسیہ کی ایک خود مختار اسلامی ریاست کی بنیاد ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں مبارک اور مظفر نے جو اس ضلع میں آبپاشی کے نگران تھے رکھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد مبارک کا انتقال ہو گیا تو مظفر کو بلنسیہ سے نکال دیا گیا اور وہاں کے باشندوں نے ایک [illegible] کو حکمران کے طور پر چن لیا۔ اس کا نام لبیب تھا۔ کچھ مدت کے بعد بلنسیہ کی ریاست عبدالعزیز بن عبدالرحمان کے قبضے میں آ گئی۔ اور وہ ۴۵۲ھ/۱۰۶۱ء تک بلنسیہ پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس دوران میں بلنسیہ ایک خوشحال ریاست رہی۔ [illegible] بلنسیہ نے جب سے ایک خود مختار اسلامی ریاست کا درجہ حاصل کیا تھا عیسائیوں کی نظریں اسے [illegible] فتح کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک تخت نشین ہوا تو فرڈیننڈ اول نے بلنسیہ پر حملہ کر دیا۔ عبدالملک نے [illegible] سے مدد طلب کی لیکن اس نے بلنسیہ آ کر عبدالملک کو تخت سے اتار کر [illegible] ریاست بلنسیہ کو سلطنت طلیطلہ میں شامل کر لیا۔ ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء میں جب [illegible] المامون نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا یحییٰ عبدالقادر تخت نشین ہوا جو [illegible] بلنسیہ نے اپنی خود مختاری دوبارہ حاصل کر لی۔ یحییٰ القادر نے [illegible] سے مدد مانگی لیکن ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء میں ریاست طلیطلہ پر [illegible] اس طرح بلنسیہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ بعد میں المرابطون نے [illegible] کو اسلامی حکومت کے تحت لانے کی کوشش کی لیکن رادریک دیاز [illegible] جو تاریخ میں السید کے نام سے مشہور ہے ناکام رہا۔ السید کی [illegible] بیوی المرابطون کے حملوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ اور آخر کار اس نے بلنسیہ کو [illegible] تاکہ مسلمان جب اس پر قبضہ کریں تو اس شہر کو بالکل تباہ و برباد [illegible] ۱۱۰۲ء میں مسلمان دوبارہ بلنسیہ میں داخل ہوئے المرابطون کی طرف سے [illegible] پر بارہویں صدی کے نصف تک حکومت کرتے رہے۔ بالآخر [illegible] کے بعد بلنسیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور ۲۸ ستمبر ۱۲۳۸ء میں [illegible] نے اسے فتح کر لیا۔ ۱۴۷۹ء میں بلنسیہ پر فرڈیننڈ دوم کا قبضہ ہو گیا۔ اور تب سے یہ [illegible] ہسپانیہ کا ایک اہم شہر رہا۔ ۱۹۷۱ء میں بلنسیہ کی آبادی ۶۵۳۰۰۰ تھی۔

بلوچ پاکستان کے علاقہ بلوچستان میں رہنے والے ایک قوم [illegible] جنہیں مختلف ادوار میں بلوص، بعلوث اور بلوش کے ناموں سے پکارا [illegible] انہیں عام طور پر براہوئی سے علیحدہ قبائل قرار دیا جاتا ہے اور بنیادی طور پر [illegible] اور سلیمانی گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

سکونت کے لحاظ سے بلوچ وادی بلوص کے جو شام میں حلب کے قریب ایران کی سرحد کے ساتھ واقع ہے رہنے والے ہیں اور نسبی لحاظ سے بلوص مزود کا لقب تھا جو بابلی سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا۔ وادی بلوص ایک اجاڑ وادی تھی عرب و شام کے کئی قبائل یہاں آباد تھے جو روم کی دراز دستیوں کی وجہ سے نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے ایک سردار حبیب بن مسلمہ کی سربراہی میں ایک لشکر اس وادی میں بھیجا۔ چنانچہ یہ فوج وادی بلوص کو ختم کرنے کے بعد وہیں پر آباد ہو گئی۔ بعد میں یہی لوگ بلوص اور پھر بلوچ کہلانے لگے۔

بعض محققین نے بلوچ قوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے بلوچ اور براہوئی اور یہ دونوں سامی الاصل ہیں۔ بلوچوں کے نسب میں بھی اختلاف ہے۔ کسی نے انہیں ترکمان نسل سے کہا ہے کسی نے ایرانی نسل سے اور بعض کے نزدیک یہ عرب ہیں۔ کچھ لوگ انہیں راجپوت بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن دور حاضر کی تحقیقات کے لحاظ سے بلوچ آریا ہیں۔ خود بلوچی اپنے آپ کو امیر حمزہ کی اولاد میں سے بتاتے ہیں اور یہ کہ وہ حلب سے آئے ہیں۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں بلوچوں کا ذکر کیا ہے اور کیخسرو کی افواج کے سپاہیوں کی حیثیت سے کیا ہے۔ اور بلوچوں کی انفرادی خصوصیات بھی بیان کی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قوم ایرانی بلوچستان اور مکران میں قدیم زمانہ سے اپنی انفرادی خصوصیت کے ساتھ چلی آرہی ہے۔

نور احمد خان فریدی نے اپنی تحقیقات میں یہ بات ثابت کی ہے کہ بلوچ قوم سامی النسل ہے اور ان کا اصل وطن بحیرہ خزر اور بحیرہ اسود کا درمیانی اور ساحلی علاقہ ہے۔ یہاں سے بلوچ دشت لوط اور کرمان میں منتقل ہوئے اور مختلف ادوار میں ان کے قافلے مکران کی طرف ہجرت کرتے رہے۔

بلوچوں میں رند، کورائی، لاشار، ہوت، جتوئی اور بلیدی وغیرہ قبائل خالص بلوچ نسل میں اب عربی اور عجمی قبائل کی تمیز کرنی بڑی مشکل ہے۔

مستند تحقیقات کے مطابق بلوچ گیارہویں صدی کے لگ بھگ سیستان اور کرمان کے علاقوں میں آکر آباد ہوئے۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں جب چنگیز خان کا حملہ ہوا تو بلوچ بھی مشرق میں مکران اور سندھ کی سرحد تک منتشر ہو گئے اور کچھ عرصے بعد ہی وہ شمال مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ کوہ سلیمان کے سلسلے پر قابض ہو گئے۔ پندرہویں صدی میں کچھ بلوچی قبائل پنجاب اور سندھ میں بھی مقیم ہو گئے۔ ان کی یہ ہجرت دشت لوط سے بابر کے حملے تک کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ مکران سے آگے کے علاقے کے لوگ آب و گیاہ پہاڑی ٹیلوں پر قابض ہو گئے۔ جن پر آج کل براہوئی آباد ہیں۔ بعض براہوئی قبیلوں نے قلات پر قبضہ کر کے بلوچوں کو سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں کی طرف دھکیل دیا۔ یہ واقعہ بلوچی قوم کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔ اس حادثے کے بعد سے یہ قوم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور اب مغربی اور مشرقی بلوچوں کے درمیان قلات کے براہوئی نظر آتے ہیں۔

جب شہنشاہ ہمایوں نے چونسہ کے مقام پر شیر شاہ سے شکست کھائی اور وہ دہشت زدگی کے عالم میں ادھر ادھر مارا پھر رہا تھا تو بلوچوں کے امیر نے اس کی مدد کی جس کا ذکر "ہمایوں نامہ" میں موجود ہے۔ جب ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان پر چڑھائی کی تو اس کی فوج میں چالیس ہزار بلوچ تھے۔

بلوچ عربوں کی طرح قبائلی نظام کے قائل ہیں۔ یہ شہری اور قصباتی بھی ہیں۔ اور خانہ بدوش بھی۔ ان کے اپنے قبیلے سے محبت اور شیفتگی بے مثل ہے۔ بلوچ قبیلے کے لیے تمن کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا ہے جس کا حاکم ماننا ہر فرد کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں خواہ جنگ ہو یا صلح یا کوئی اور معاملہ سردار کا حکم حرف آخر ہوتا ہے۔ جس قبیلے کا سردار نہیں ہوتا اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلوچوں میں خون کی پاکیزگی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ عربوں کی طرح بلوچوں میں بھی نسب ناموں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بلوچ قبیلے تین طبقوں میں تقسیم ہیں۔ ۱۔ سردار قبائل۔ ۲۔ متوسط قبائل۔ ۳۔ زیردست قبائل۔

ان کے ہاں عورت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جنگ اور لڑائی کے وقت بھی عورتوں پر ظلم اور ان کی بے حرمتی کرنا کمینگی اور بزدلی خیال کی جاتی ہے اگر دو قبیلے لڑ رہے ہوں تو عورت کے دخل دینے پر لڑائی بند ہو جاتی ہے۔ بلوچ عورتیں بلند کردار، بے حد دلیر اور جفاکش ہوتی ہیں۔ ان کا لباس شائستگی کا عمدہ نمونہ ہوتا ہے یہ کھلا اور ڈھیلا لباس پہنتی ہیں۔

بلوچ مرد بندوق، تلوار، خنجر، تیر کمان اور گھوڑوں کی سواری کے بڑے شیدائی ہوتے ہیں۔ تیر کمانوں کی جگہ اب پستول اور گھوڑے کی جگہ جیپ نے لے لی۔

ان کی غذا بہت سادہ ہوتی ہے۔ گوشت کو خاص طریقے سے پکاتے ہیں۔ اسے اپنی زبان میں سجی کہتے ہیں۔ بلوچ خون کا بدلہ خون کے قائل ہیں۔ جو بلوچ قتل کا بدلہ نہ لے سکے اسے بزدل اور نامرد سمجھا جاتا ہے اگر بلوچ کسی کو پناہ دے دیں تو اس کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ (نیز دیکھئے "براہوئی" "بلوچستان"، "بلوچی")

بلوچستان پاکستان کا ایک صوبہ۔ سطح مرتفع پر مشتمل یہ خطہ ۲۵ درجے سے ۳۲ درجے ۴ منٹ عرض بلد شمال اور ۶۱ درجے سے ۶۸ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس خطے کے شمال میں کوہ سلیمان کے مختلف سلسلے ہیں جو افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ حد فاصل کا کام دیتے ہیں۔ مشرق میں کیرتھر اور پب کی پہاڑیاں اسے صوبہ سندھ سے جدا کرتی ہیں۔ مغرب میں ایران اور جنوب میں بحیرہ عرب ہے۔ بلوچستان اور افغانستان کی سرحد سات سو بیس میل لمبی ہے۔ بحیرہ عرب کے ساتھ بلوچستان کی سرحد چار سو ستر میل ہے اور بلوچستان اور ایران کی مشترکہ سرحد پانچ سو بیس میل ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے یہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے یعنی یہ ایک لاکھ سینتیس ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا ہے جبکہ اس کی آبادی انتہائی کم یعنی ۱۹۷۲ء میں صرف ڈھائی لاکھ تھی۔ بلوچستان کی آب و ہوا گرمیوں میں گرم خشک اور سردیوں میں سرد خشک ہے۔

بلوچستان کا علاقہ ایران اور پاکستان کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ ایرانی بلوچستان کا صدر مقام ایرانشہر ہے جو پہلے فہرج کہلاتا تھا۔ پاکستان میں اس کا سب سے اہم مرکز قلات ہے۔ یہ ایک قدیم ترین علاقہ ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر ملا کا نام کے تحت ملتا ہے اسلامی عہد سے پہلے کے اس علاقے کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ غالباً بلوچی مغربی بلوچستان (مکران) میں اس وقت داخل ہوئے جس زمانے میں کرمان پر سلجوقیوں نے حملہ کیا۔ (نادر شاہ افشار وہ پہلا شخص تھا جس نے کوئٹہ اور قلات کے انتظامی ڈویژنوں کو بلوچستان کا نام دیا)۔

۳۲۵ ق م میں جب سکندر اعظم ہندوستان فتح کر کے ایران لوٹا تو وہ بلوچستان کے راستے ہی سے واپس آیا۔ سکندر اعظم کے بعد بلوچستان سلطنت باختر کا ایک حصہ بن گیا۔ ۴۰۴ء میں بلوچستان ساسانی خاندان کے ایک حکمران بہرام گور کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ جس کا دور حکومت ۴۰۴ء تا ۴۲۷ء رہا ہے۔ ۵۹۱ء سے ۶۲۸ء تک بلوچستان ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کی سلطنت میں شامل رہا۔ ۶۳۵ء میں بلوچستان پر سندھ کے برہمن راجہ چچ کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے بلوچستان کی حدود متعین کیں اور

بلوچستان کا دفاع مضبوط کرنے کے لئے قلعے بھی تعمیر کرائے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت ٢٣ھ/٦٤٤ء میں جب عربوں نے کرمان کا علاقہ فتح کیا تو کرمان کے قریبی پہاڑوں میں بلوچ نامی لوگ پائے جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حکیم بن جبلہ کو سندھ اور بلوچستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے ان علاقوں کی طرف بھیجا گیا تو انہوں نے اس علاقے کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کی جس سے اس علاقے کے بارے میں کئی معلومات باہم پہنچی ہیں۔

٣٩ھ/٦٥٩ء میں حضرت علیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت حارثؓ بن مرہ العبدی کو بلوچستان میں بھیجا اور انہوں نے یہاں کچھ علاقے فتح کئے۔ حضرت حارث، قلات میں لڑتے ہوئے اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت شہید ہوئے۔ بالآخر حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ٤٤ھ/٦٦٦ء میں مکران مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور عربوں نے اسے اپنا فوجی مستقر بنا لیا اور مکران کے قرب وجوار کے علاقوں

ایک بلوچی، اس کا اونٹ، ہل اور سنگلاخ زمین

کو فتح کرنا شروع کردیا۔ حضرت عبداللہؓ بن سوار نے جو مکران کی جنگ کے لئے آئے تھے قلات کے کچھ علاقے فتح کر لئے۔ لیکن جب وہ دمشق سے مکران واپس لوٹے تو یہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ یہاں انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان کے بعد حضرت سنان بن سلمہ سپہ سالار ہو کر آئے، اور انہوں نے دوبارہ مکران کو فتح کر کے شہر کو نئے سرے سے آباد کیا۔ بعد میں حضرت ابوالاشعث کو مکران کا حاکم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے قلات کے فتح کیا اور بولان کے درے تک سارا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ٨٩ھ/٧٠٨ء میں جب راجہ داہر کا مقابلہ کرنے کے لئے محمد بن قاسم ہندوستان آیا تو اس زمانے میں بلوچستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور راستے محفوظ تھے۔ مساجد آباد تھیں اور پہاڑی علاقوں میں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ بلوچ گیارہویں صدی عیسوی کے آخری دس برسوں میں اپنے سردار جلال خان کی سرکردگی میں مکران میں داخل ہوئے۔ اس وجہ سے مکران کو بلوچستان کا نام دیا گیا۔ ان کی آمد سے پہلے مکران پر منگولوں کی حکومت تھی۔ بلوچوں نے انہیں شکست دی۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی یہاں بلوچ آباد تھے۔

بلوچستان پر امیر جلال خان کی اولاد تقریباً ساڑھے تین سو سال حکمران رہی۔ پندرہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے دو قبیلے رند اور لاشاری وسطی بلوچستان کی طرف بڑھے۔ آخر امیر چاکر خان رند کے عہد میں سارا بلوچستان بلوچوں کے زیرنگیں آگیا۔ امیر چاکر خان رند نے خضدار، درہ مولا، کندھاوا، کچھی کے میدان، درہ بولان، ڈھاڈر اور سبی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بلوچستان براہویوں کے قبضے میں آگیا۔ کیونکہ امیر چاکر خان کے بعد بلوچستان افراتفری کا شکار رہا اور اس افراتفری کے دوران میں ایک براہوئی سردار میر احمد ثانی نے بلوچستان پر قبضہ کر لیا۔ براہوئی شاخ سے یکے بعد دیگرے پانچ سردار حکمران ہوئے۔ ١٧٣٠ء میں سندھ کے حکمران میاں نور محمد نے بلوچستان پر قبضہ کر لیا لیکن ١٧٣٢ء میں نادرشاہ نے بلوچستان عبداللہ خان کے وارثوں کو دلوا دیا۔

١٨٤٠ء میں انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت ہوئی کیونکہ انگریز بلوچستان کے معاملات میں دخل دینے لگ گئے تھے جو بلوچوں کو پسند نہ تھی۔ اس بغاوت میں انگریز فوجیوں کو قتل کیا گیا اور سپہ سالار کو گرفتار کر لیا۔ اس اثنا میں انگریزوں نے اپنی فوجی قوت اکٹھی کر کے بغاوت کو کچل دیا اور بلوچوں کو شکست دی۔ دسمبر ١٨٤٠ء میں انگریزوں اور نصیر خان ثانی کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا۔ اور انگریزوں نے نصیر خان کو قلات کا خان تسلیم کر لیا۔ اس دور میں بلوچستان کا سارا انتظام حکومت کے انگریز ایجنٹوں کے ہاتھ میں آگیا اور خان برائے نام حکمران رہ گئے۔

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو بلوچستان تین انتظامی یونٹوں میں تقسیم تھا۔ ١۔ برطانوی بلوچستان جو براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت تھا۔ ٢۔ ایجنسی مقبوضہ جو بالواسطہ حکومت برطانیہ کے ماتحت تھا اور ان مقبوضات میں انگریز ایجنٹ متعین تھے ٣۔ انتظامی حصے جن میں قلات، خاران، مکران اور لس بیلہ کی ریاستیں شامل تھیں اور ان پر خان اور نواب حکومت کرتے تھے۔

١٩٤٧ء میں یہاں سے ٨٤ ہزار ہندو اور سکھ ترک وطن کر کے بھارت چلے گئے اور ان کی جگہ ٣٠ ہزار مہاجرین بلوچستان میں آبسے۔ ١٤ اکتوبر ١٩٥٥ء کو بلوچستان کی صوبائی حیثیت ختم کر کے اسے وحدت مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا اور یہ [illegible] صوبہ مغربی پاکستان کے ماتحت رہا۔ اپریل ١٩٧٠ء میں وحدت مغربی پاکستان کو [illegible] گیا تو بلوچستان کو اس کی علیحدہ صوبائی حیثیت واپس ملی۔ کوئٹہ کو اس کا صوبائی [illegible] ٹھہرایا گیا۔

دسمبر ١٩٧١ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد سے پاکستان میں [illegible] کا نعرہ لگایا جانے لگا۔ جس میں بلوچستان کو بھی ایک قومیت ٹھہرایا گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہنما عبدالولی خان اس نعرہ کو اچھالنے میں مصروف تھے۔ صوبائی تعصب کو ہوا دی گئی اور اگرچہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت قائم تھی۔ مجبوراً وہاں وفاقی راج قائم کرنا پڑا۔ جس پر مینگل اور مری قبائل بغاوت پر اتر آئے۔ ان کے ساتھ دیگر کئی قبائل بھی شامل ہو گئے۔ حکومت نے فوج کے ذریعے اس بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں سینکڑوں باغی ہلاک ہو گئے۔

بڑے غور و فکر کے بعد وفاقی حکومت نے اندازہ لگایا کہ بلوچستان کا مسئلہ سیاسی سے کہیں زیادہ معیشی ہے۔ چنانچہ بلوچستان کی معیشی ترقی کے لیے اقدامات تیز تر کر دیئے گئے۔ جس سے وہاں کے سرداری اور شیڈنگ نظام پر چوٹ پڑی۔ چنانچہ قبائلی سردار ایک بار پھر بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اپریل ١٩٧٦ء میں وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بذات خود تفصیلی دورہ کیا اور وہاں سرداری نظام کا پورے طور پر خاتمہ کر دیا۔

نظام جرگہ:۔ بلوچستان کا ایک اہم نظام جرگہ ہے جو نصیر خاں اوّل کے عہد سے چلا آرہا ہے۔ اس میں قبائلی سردار مل کر انتظام حکومت چلاتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل جرگہ کو شاہی دربار کہا جاتا تھا۔ اس میں بلوچی اور براہوئی قبائل مساوی طور پر شریک ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے اس سرداری نظام کو ختم کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی گئی ہیں، تاہم قبائلی سردار ابھی تک اس امر کی مزاحمت کر رہے ہیں۔

اقتصادی اور دیگر معلومات:۔ بلوچستان میں درہ بولان اور درہ مولا دو مشہور درے ہیں۔ انہی سے حملہ آور یہاں داخل ہوتے رہتے۔ کوئٹہ بلوچستان کا صوبائی مرکز ہے، جو وادی شال کے وسط میں واقع ہے اس کے شمال میں پشین واقع ہے۔ جنوب مشرق میں لس بیلہ اور مغرب میں چاغی، خاران، بیکگر اور دوسری وادیاں ہیں۔ پہاڑوں میں کوہ سلیمان، کوہ سیاہان، کوہ مالک سیاہ، کوہ کیرتھر، کوہ چپ، کوہ چاغی، اور راس کوہ ہیں۔ مشہور شہروں میں کوئٹہ کے علاوہ مین قلات، سبی، لورالائی، پشین، خضدار، مستونگ، چمن اور زیارت ہیں۔

بلوچستان دو ڈویژنوں کوئٹہ اور قلات پر مشتمل ہے، جو مزید سات اضلاع پر مشتمل ہیں۔ آبادی اکثریت بلوچوں کی ہے جو ستر فیصد کے قریب ہیں۔

بلوچستان زیادہ تر صحراؤں اور خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ زرخیز علاقوں میں سیب، کھجور، خوبانی، ناشپاتی، انگور وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ معدنیات میں ... زیادہ تر کوئلہ اور قدرتی گیس پر ہے۔ کوئلہ سبی اور کوئٹہ کے قریب سے نکلتا ہے اور قدرتی گیس سوئی کے مقام سے نکلتی ہے، جو پورے پاکستان کو مہیا کی جاتی ہے۔ جدید تحقیقات کی رو سے بلوچستان میں پٹرول کے بڑے ذخائر موجود ہیں، جنہیں نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ (نیز دیکھئے "براہوئی"، "بلوچ"، "بلوچی")

بلوچی زبان، بلوچستان کے بلوچ قبائل کی زبان۔ یہ فارسی سے بھی قدیم تر زبان ہے۔ اگرچہ بعض کے نزدیک بلوچی فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے۔ بعض کتبات جو کھدائی کے دوران دستیاب ہوئے ہیں ان کا رسم الخط اردو سے ملتا ہے۔ انہی کتبات میں بلوچی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں گویا یہ ایک علیحدہ زبان ہے جو صوتی لحاظ سے قدیم پہلوی زبان کے بہت قریب ہے۔ بلوچستان میں بلوچی زبان کے مختلف لہجے ہیں لیکن ان میں دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک مشرقی بلوچوں کی زبان اور دوسری مغربی بلوچوں (مکران) کی زبان۔ ان میں تھوڑا سا صوتی اختلاف بھی ہے۔ مثلاً مشرقی زبان میں "درع" کھانا کہا جاتا ہے تو مغربی زبان میں "ورگ" کہا جاتا ہے۔ جب بلوچستان پر انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تو انہوں نے بلوچی پر بھی کچھ تحقیقی کام کیا۔ بلوچی کے قواعد ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ۱۹۰۷ء میں لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبان کے قدیم ادب پر مشتمل کتاب بلوچوں کی عوامی شاعری کے عنوان سے شائع کی۔ اس کتاب کو بلوچی کے کلاسیک میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

۱۹۱۰ء میں ایک انگریزی بلوچی لغات شائع کی گئی۔ بلوچی ادب پر اردو زبان میں سب سے پہلی "بلوچی ادب" کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں سلیم خان گمی نے لکھی۔ ۱۹۶۹ء میں عطا شاد کی کتاب "بلوچی نامہ" شائع ہوئی۔ جب ۱۸۴۵ء میں انگریز پورے بلوچستان پر قابض ہو گئے تو اس دور میں بلوچی شعراء کا میلان تصوف اور اخلاقیات کی طرف ہو گیا۔ اس وجہ سے اس دور کی شاعری زیادہ مذہبی ہے۔ اور اس دور کی شاعری میں نعتوں، معجزوں اور مدحوں کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ ملا ابراہیم اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا نعت گو شاعر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ابراہیم شعبانی نے مذہبی رہنماؤں کی توصیف میں نظمیں لکھیں اور لشکر خاں جسکانی نے خلفائے راشدین سے متعلق نظمیں اور حمد و نعت وغیرہ لکھیں۔ انگریزی دور میں رحم علی مری، ملا عمر مری، پنجو بنگلانی، غلام محمد بالاچانی اور ریکھا بزدار نے قومی اور مذہبی نظمیں لکھیں۔

نثری ادب میں آزادی سے پہلے درخانی علماء نے بلوچی میں مذہبی کتابیں شائع کیں۔ اس دور میں بائیبل کے ایک حصے کا بلوچی ترجمہ بھی کیا گیا اور بیسویں صدی کے اوائل میں حضور بخش جتوئی نے بلوچی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سے بلوچی ادب نظم و نثر کے میدانوں میں قابل ذکر ترقی کر رہا ہے۔

بلوغ المرام احادیث کا ایک انتخاب، جو فقہی ابواب کے طرز پر ایک شاندار انتخاب ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حدیث کی مشہور کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان وغیرہ سے انتخاب کیا ہے۔ یہ کتاب متوسط ضخامت کی ہے لیکن ترتیب و انتخاب کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ اس کتاب میں حافظ ابن حجر نے اسلامی تمدن، اقتصادیات، معاشیات کے اصولوں کے پیش نظر ان احادیث کو ترتیب دیا ہے۔ "بلوغ المرام" کو "باب الطہارۃ" سے شروع کیا گیا ہے، جو اسلامی تمدن کی کلید اور سب سے پہلی کڑی ہے۔ اس کتاب کی افادی حیثیت کے پیش نظر علماء نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں جن میں سے بعض شرحیں عربی زبان میں ہیں اور بعض فارسی زبان میں۔

"بلوغ المرام" کی نواب صدیق حسن خان نے دو شرحیں عربی اور فارسی میں کی ہیں۔ ان کی فارسی شرح کا نام "مسک الختام" ہے۔ جو درس نظامی کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ "بلوغ المرام" کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

بلھے شاہ سید محمد عبداللہ شاہ عرف بلّہ شاہ، بھلی شاہ، بلھے شاہ، پنجابی زبان کے مشہور صوفی شاعر اور بزرگ۔ والد کا نام سخی شاہ محمد درویش تھا۔ آبائی وطن بہاولپور کا مشہور گاؤں اُچ گیلانیاں تھا یہاں پیدا ہوئے۔ بلھے شاہ کے سن پیدائش اور وفات کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں ہے بعض کے نزدیک ۱۰۹۲ھ/۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔ بقول آسبورن ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔ "خزینۃ الاصفیاء" میں ان کی تاریخ وفات ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء ہے۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے ان کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو قلمی نسخے کی شکل میں ہے اور اس پر بلھا شاہ قادری کی مہر کے ساتھ ۱۱۸۱ھ کی مہر لگی ہوئی ہے اس صورت میں ان کی وفات ۱۱۷۱ھ نہیں مانی جا سکتی۔ بلھے شاہ کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ ان کے والد نامساعد حالات سے مجبور ہو کر پانڈو گاؤں میں آباد ہو گئے اور گاؤں کی ایک مسجد کی امامت اور درس کی ذمہ داری قبول کر لی اور بلھے شاہ کو تعلیم کے لیے قصور میں خواجہ غلام مرتضیٰ قصوری کے پاس بھیج دیا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بلھے شاہ مسجد کوٹ قصور کے طلباء میں سے تھے۔ خواجہ صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دو عجیب شاگرد ملے ہیں ایک بلھے شاہ جس نے علم حاصل کر کے سارنگی پکڑ لی اور دوسرا سید وارث شاہ جس نے عالم ہو کر ہیر رانجھا کے

گیت لکھنے اور گانے شروع کر دیے۔

بلھے شاہ بچپن ہی سے تصوف کی طرف مائل تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد پورے ہندوستان میں فتنہ و فساد برپا ہونے لگا اور مغلوں کی سلطنت پر زوال آگیا۔ یہ اثرات پنجاب میں دوسرے تمام علاقوں سے زیادہ محسوس ہوئے۔ بلھے شاہ کی حساس طبیعت میں ان حالات نے اور بھی زیادہ اضطراب پیدا کر دیا اور وہ مرشد کامل کی تلاش میں نکل پڑے۔ اسی تلاش مرشد میں بلھے شاہ لاہور پہنچے اور شاہ عنایت قادری لاہوری سے جو اونچی مسجد اندرون بھاٹی گیٹ میں مقیم تھے بیعت کی اور [illegible] اپنے مرشد کی وفات کے بعد بلھے شاہ قصور آ گئے۔ اور آخر تک قصور ہی میں رہے۔ ان کا مزار یہیں ہے جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔ ان کا عرس ہر سال [illegible] شعبان کو ہوتا ہے۔

بابا بلھے شاہ نے اپنی تمام زندگی زہد و تقشف میں گزاری۔ ساری عمر شادی نہ کی۔ صاحب "خزینۃ الاصفیاء" نے ان کے بارے میں لکھا ہے "وہ شاہ عنایت کے عظمائے خلفاء میں سے تھے۔ عابد و زاہد تھے۔ صاحب جذب و سکر و شوق و محبت و وجد و سماع تھے اور توحید میں بلند مرتبہ کلام پیش کرتے تھے۔ ان کے پنجابی اشعار معارف و توحید سے پر ہیں۔ خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ ان کی قوالیوں کو قوال صوفیا کی مجلسوں میں گاتے ہیں۔ ان کے خوارق اور کرامتیں زبان زد خلائق ہیں۔"

"دائرہ معارف اسلامیہ" میں بلھے شاہ کی صوفیانہ زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "پہلا دور وہ ہے جب وہ مرشد کی تلاش میں سرگرداں تھے اور تصوف کے مختلف مکاتب فکر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا دور 'فنا فی المرشد' ہونے کا ہے جب وہ مرشد کو وسیلہ نجات سمجھتے اور اس کی صورت میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں اس دور میں انہوں نے ہندو فلسفے سے آگاہی حاصل کی۔ تیسرا دور وہ ہے جب ان کا جذبہ بے پناہ اور عشق بیکراں ہو جاتا ہے۔ اور وہ رسمی مذہب اور سطحی عقائد کی دیواریں توڑتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں ان کی شاعری نقطہ عروج پر پہنچ گئی ہے"

جب بلھے شاہ نے شاعری شروع کی اور مرشد کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اسے پسند نہ کیا۔ بلکہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ مگر جب انھوں نے ان کے اشعار سنے تو ان کی ناراضگی دور ہو گئی۔ اور وہ بلھے شاہ کی عالی دماغی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ پیر و مرشد نے شاگرد کی کافیوں میں علم و معرفت اور حکمت کی باتیں دیکھیں تو انہیں شاعری کرنے کی اجازت دے دی۔ مرشد کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلھے شاہ نے سینکڑوں کافیاں کہہ ڈالیں۔ یہ کافیاں پنجاب کے مختلف علاقوں میں بڑی مشہور و مقبول ہیں ان کافیوں میں بلھے شاہ نے تصوف اور معرفت کے دریا بہا دیے ہیں۔ انہی کافیوں کے طفیل بلھے شاہ کو لافانی شہرت نصیب ہوئی۔

بلھے شاہ ایک مقبول عام صوفی شاعر تھے۔ ان کے سارے کلام میں صوفیانہ شاعری کی آزاد خیالی اور توکل و غنا کا رنگ ہے۔ توحید باری تعالیٰ اور عشق حقیقی ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ اور اس موضوع کو انہوں نے متنوع انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کا کلام کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کلام کے مطبوعہ نسخے ان ناموں سے چھپے ہیں۔

"قانون عشق" حصہ اول، دوم۔ "کافی ہائے حضرت بلھے شاہ قصوری" "کافیاں میاں بلھے شاہ"، "کافیاں بلھے شاہ لاہور" "کلیات بلھے شاہ"

نمونہ کلام کے طور پر دو کافیاں درج ذیل ہیں۔ ان میں علمائے سو کی طرف اشارہ ہے۔

پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر　　قرآن کتاباں چار چوفیر
گردے چانن وچ انھیر　　باجھوں رہبر خبر نہ سار
علموں بس کریں او یار
اکو الف ترے درکار

پڑھ پڑھ نفل نماز گزاریں　　اچیاں بانگاں چانگاں ماریں
منبر چڑھ کے وعظ پکاریں　　کیتا تینوں حرص خوار

بلیغ الدین شاہ ممتاز عالم دین، مصنف اور خطیب۔ آپ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور [illegible] سے ایم اے اور ایل ایل بی کیا۔ بقول نواب صدق علی خان [illegible] اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو صاحب تصنیف اور صاحب زبان بنایا ہے۔ [illegible] بلاغت یکساں ہے۔ ان کا اسلوب [illegible] [illegible]

بماکو جمہوریہ مالی کا دارالحکومت اور [illegible] افریقہ میں واقع ہے۔ بماکو دریائے نائیجر کے [illegible] [illegible] ملاپ ہوتا ہے۔ یہ شہر چونکہ ساحل اور افریقہ کے جنوبی [illegible] والی شاہراہوں پر واقع ہے۔ اس وجہ سے بماکو ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ [illegible] جہازوں کا ایک بڑا اڈا ہے۔

آج کل اس شہر کو افریقہ میں ایک اہم [illegible] مقام حاصل ہے [illegible] اضافہ ہوا ہے۔ جو ۱۸۸۳ء میں آٹھ سو تھی اور ۱۹۶۷ء میں [illegible] بماکو کو ایک شکاری نے بسایا تھا۔ بعد میں اس کے جانشینوں نے [illegible] اس شہر کا نام بماکو رکھا۔ بماکو کی آبادی اس وقت بڑھنا شروع ہوئی جب [illegible] چجہرے، بمبرا اور فولات کے لوگوں نے آکر سکونت اختیار کی [illegible] بھی رہنے لگے۔ یہ شہر چار حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ۱۔ نیارہ [illegible] ۲۔ [illegible] ۳۔ [illegible] ۴۔ درویلا۔ موجودہ شہر کی بنیاد انہی چار قصبوں [illegible]

اس شہر کی حیثیت دریائے نائیجر پر ایک [illegible] مستحکم قلعے کی تھی [illegible] کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ [illegible] انہوں نے [illegible] چنانچہ [illegible] سوڈان میں فرانسیسیوں کی جنگی کاروائیوں کا مرکز بن گیا۔ اور اس کی آبادی [illegible] اور سینیگالیوں کا برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح بماکو ایک عظیم فوجی [illegible] کی حیثیت اختیار کر گیا۔

بماکو ایک اسلامی شہر ہے لیکن اس کے اسلام پر افریقہ کا رنگ غالب ہے [illegible] میں اکثر اوہام پرستی کے قدیم عقائد بھی پائے جاتے ہیں۔ بماکو کبھی بھی اسلامی تبلیغ کا مرکز نہیں رہا۔ اس شہر میں قادریہ اور تیجانیہ سلسلے ایک مدت سے قائم ہیں [illegible] کی اکثریت ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک جماعت قائم ہوئی ہے جس کا مقصد [illegible] کو شعور و زوائد سے اور مختلف بدعتوں سے پاک کرانا ہے۔ اس تحریک کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہوتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں اس شہر کو ایک خاص اہمیت [illegible] [illegible] ۱۹۰۴ء میں فرانسیسیوں نے یہاں کے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر

بند رہا۔ ۱۹۰۴ء میں اسے فرانسیسی سوڈان کی نوآبادی کا صدر مقام قرار دیا گیا۔
تجارتی علاقے ریلوے سٹیشن کے گرد واقع ہیں۔ آبادی اور دریا کے درمیانی علاقے میں باغات کثرت سے ہیں۔ شہر کی اکثر عمارتوں میں کولوبہ کا سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی منڈی بماکو میں ہے۔ یہاں ایک چیمبر آف کامرس اور ایک بڑی جامع مسجد بھی ہے۔

[illegible] کا صدر مقام [illegible] تجارت کے [illegible] کی آبادی [illegible]

[illegible] جدید ترین بمبئی کا منصوبہ بنایا گیا۔ جس پر ۱۹۶۱ء تک عمل درآمد ہوتا رہا۔
بمبئی کا نام ممبا بائی یا ممبا دیوی سے اخذ کیا گیا ہے جو ہندوؤں کی ایک [illegible] عیسوی تک یہ شہر ہندو [illegible] ۱۳۴۸ء میں یہ سلطنت گجرات میں شامل کر لیا گیا اور ۱۵۳۴ء میں پرتگیزیوں کے قبضے میں جانے سے پہلے مسلمان حکمرانوں کے ماتحت رہا۔ ۱۵۳۴ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے یہ شہر پرتگیزیوں کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے ۱۶۶۱ء میں اسے انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کو ملکہ کیتھرائن کے جہیز میں دے دیا۔ ملکہ کیتھرائن پرتگالی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ جس کے ساتھ چارلس دوم نے ۱۶۶۱ء میں شادی کی۔ مزید دو برس تک یہ شہر انگریزوں کے حوالے نہ کیا جا سکا۔ ۱۶۶۴ء میں جمفرے کک اس پر بادشاہ انگلستان کے نام پر قابض ہوا۔ ۲۷ مارچ ۱۶۶۸ء کو شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دس پاؤنڈ سالانہ کرایہ پر دے دیا گیا۔ ۱۶۷۲ء میں سورت کے صدر جیرالڈ آنگر نے اپنے سرکاری دفاتر یہاں تعمیر کر لیے۔ اور یوں بمبئی کی اصل اور مرکزی حیثیت کا آغاز ہوا۔ اس وقت بمبئی چھوٹے چھوٹے سات جزائر پر مشتمل تھا جنہیں مشرق کے صحت افزا جزیرے کہا جاتا تھا۔ ۱۶۷۷ء میں اس شہر کی آبادی ساٹھ ہزار تھی جو ۱۸۹۱ء میں آٹھ لاکھ تک جا پہنچی۔

اس درمیانی عرصہ میں بمبئی نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ انگریزی عہد میں اسے باب ہندوستان سمجھا جاتا تھا اور یہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارت کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہاں ریلوے سٹیشن قائم کیا گیا۔ ۱۸۵۳ء میں بمبئی کو تھانہ اور ۱۸۶۴ء میں بڑودہ اور وسطی ہندوستان سے ملا دیا گیا۔ دو برس بعد وکٹوریہ ٹرمینس قائم ہوا۔ امریکی خانہ جنگی کے دور (۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک) میں بمبئی کو روئی کی تجارت میں اجارہ داری حاصل ہوئی اور یہ شہر ہندوستان بھر کے تاجروں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۸۵۴ء میں ایک پارسی رہنما کاؤس جی نانا بھائی نے یہاں روئی بیلنے کا پہلا کارخانہ قائم کیا۔ اگلے پانچ برسوں میں یہاں پچاس کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ اسی دوران جمشید جی ٹاٹا نے یہاں لوہے کے ذخائر دریافت کیے اور بلا شرکت غیرے فولاد کے کارخانوں کا مالک بن گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اس کے بیٹے سر دوراب جی ٹاٹا نے یہاں پن بجلی کا کارخانہ لگایا جس سے ان کے بڑے بڑے کارخانے حرکت میں آتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک بمبئی میں بڑی بڑی عمارات وجود میں آ چکی تھیں۔ بیسویں صدی کے وسط تک بمبئی میں تقریباً ہر صنعت کا کارخانہ قائم ہو چکا تھا۔ جس کی بنا پر ۱۹۷۱ء تک یہاں کی آبادی پچاس لاکھ سے متجاوز ہو گئی۔
بمبئی کی آبادی میں مذہبی تناسب ہندو ۶۰ فیصد، مسلمان ۲۵ فیصد، عیسائی ۶ فیصد، جینی ۴ فیصد، پارسی ۲ فیصد، یہودی ۱ فیصد، سکھ ۰.۵ فیصد اور باقی دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت خارجہ کا ایک تہائی کاروبار بمبئی میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر برآمدات تیل اور اس کی مصنوعات، کپاس، اون، میکانیز، موٹر وہیکل اور تعمیراتی ساز و سامان پر مشتمل ہیں۔
صوبہ بمبئی میں مہاراشٹر اور گجرات کے اکثر علاقے شامل تھے۔ برطانوی راج کے آخری ایام میں بمبئی ایک خود مختار صوبہ تھا۔ جسے ۱۹۶۰ء کے بعد دو صوبوں گجرات اور مہاراشٹر میں تقسیم کر دیا گیا۔ اب بمبئی شہر صوبہ مہاراشٹر کا دارالحکومت ہے۔

بنارس اترپردیش (بھارت) کا ایک شہر اور ڈویژن۔ قدیم ترین ہندو شہر۔ جو راجا کاشی کی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہ دریائے گنگا کے بائیں کنارے کلکتہ سے ۴۲۹ میل شمال مغرب میں اور دہلی سے ۵۰۸ میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی چھ لاکھ تئیس ہزار تھی۔
یہ شہر کوئی چار ہزار سال پرانی تاریخ کا حامل ہے۔ ۲۰۰۰ ق م میں آریا یہاں آئے اور یہ ان کا مذہبی اور سیاسی مرکز بنا۔ بدھ مت کے ظہور سے پہلے یہ شہر ململ، ریشمی کپڑے، عطریات اور ہاتھی دانت کے کام کی وجہ سے مشہور تھا۔ چندر گپت (۲۹۶ ق م) کے عہد میں یہ شہر مگدھ ریاست کے ماتحت آیا اور اشوک (۲۳۲ ق م) کے عہد میں یہ بدھ مت کا مرکزی شہر بن گیا۔ پہلی صدی عیسوی میں کابل کے حکمران کنشک نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اگلے ایک ہزار برس تک یہ بدھ مت اور ہندو تہذیب کا اہم مرکز رہا۔
۱۰۳۴ء میں بنارس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۱۹۳ء میں اسے محمد غوری نے دوبارہ فتح کیا۔ اکبر کے عہد میں یہاں دوبارہ ہندو تہذیب کا احیا ہوا۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی یہ شہر اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس دور میں یہاں مشہور فلسفی اور شاعر رامانند، بھگت کبیر اور تلسی داس وغیرہ نے جنم لیا۔ اسی دور میں مسلمان جولاہوں نے یہاں نفیس ترین ململ بننے کے فن کو عروج بخشا۔
مغلیہ دور کے زوال کے ساتھ ہی بنارس میں ہندو راج کا آغاز ہو گیا۔ منس رام پہلا حکمران تھا۔ جس نے نیم خود مختار حکومت قائم کی۔ اور ۱۷۲۵ء تک اسے مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بیٹے بلونت سنگھ نے بنارس کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت

دے ڈالی۔ اس عہد سے مرہٹوں، بدھوں، نیپالیوں اور ہندوؤں نے بنارس میں اپنی تعمیرات کا آغاز بڑے زور شور کے ساتھ کردیا۔ ۱۹۱۱ء میں بنارس کی علیحدہ حیثیت تسلیم کرلی گئی۔ اور پربھو نرائن سنگھ کو پورے اختیارات حاصل ہوگئے۔ مگر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں بنارس کی یہ حیثیت ختم کرکے اسے صوبہ اترپردیش میں شامل کردیا گیا۔

بنارس ڈویژن، بنارس، مرزاپور، جون پور، غازی پور اور بلیہ کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ ضلع بنارس میں ۱۹۲۱ گاؤں اور بارہ شہر شامل ہیں۔

بنانی

فاس کا ایک خاندان، جس میں بڑے نامور علما پیدا ہوئے۔ ابتدا میں یہ خاندان یہودی تھا۔ اس خاندان کے نامور مسلمان علما مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ **ابوعبداللہ محمد بن عبدالسلام**:۔ (وفات ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء) یہ مغرب اور مشرق ہر دو میں مروجہ مالکی مذہب اور اس کی روایات کا عالم تھا۔ اس کا حلقہ تلامذہ بے حد وسیع تھا۔

اس کی تصانیف میں زیادہ تر مشہور یہ ہیں۔ "الفہرسہ" اس زمانے کے فقہی اور قانونی مطالعے کا ایک اہم ماخذ ہے۔ ۲۔ الشاذلی کی کتاب "الحزب الکبیر" کی شرح۔ ۳۔ کلاعی کی کتاب "کتاب الاکتفاء" کی شرح۔

۲۔ **ابوعبداللہ محمد بن حسن بن مسعود**:۔ (وفات ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء) مالکی فقیہ، خطیب اور امام۔ اس کی تصانیف میں ۱۔ "الفتح الربانی"۔ ۲۔ زرقانی کی "مختصر خلیل بن اسحاق" پر تعلیقات۔ ۳۔ سنوسی کی شرح "مختصر المنطق" پر حاشیہ ۴۔ "مسلم کی شرح"۔ ۵۔ "کتاب الفہرستہ" اہم ہیں۔

۳۔ **مصطفیٰ بن محمد بن عبدالخالق**:۔ (وفات ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء) اس نے تفتازانی کی مختصر پر "التجرید" کے نام سے تعلیقات لکھیں جو کئی بار شائع ہوئیں۔

۴۔ **محمد بن محمد بن محمد العربی بن عبدالسلام**:۔ (وفات ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء) ابومحمد بن عبدالسلام کا پڑپوتا تھا۔ مکے میں مالکی مفتی رہا۔ اس کی تصانیف میں شرح صحیح البخاری ہے۔

۵۔ **محمد**:۔ (وفات ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء) فرعون کے نام سے مشہور تھا۔ کتاب الثوانی کا مصنف ہے۔ یہ کتاب کئی بار شائع ہوچکی ہے۔

بن بیلا

احمد بن بیلا الجزائر کے سابق صدر، دوسری جنگ عظیم میں الجزائر کی چھٹی رجمنٹ میں شریک ہوئے اور شاندار خدمات سرانجام دیں جس سے خوش ہوکر جنرل ڈیگال نے بن بیلا کو ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز دیا لیکن جب انہوں نے فوج میں کمیشن حاصل کرنے کی درخواست دی تو ان کے فرانسیسی جرنیل نے ان کی درخواست پر لکھا "بن بیلا ذہین ہے مگر خطرناک بھی ہے لہٰذا درخواست مسترد کی جاتی ہے۔"

بن بیلا دو مرتبہ فرانسیسیوں کی قید میں رہے۔ پہلی مرتبہ جیل سے بھاگ کر مصر چلے گئے یہیں پر ان کی ملاقات بومدین سے ہوئی اور انہوں نے بومدین کو سیاست میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔

دوسری مرتبہ مراکش جاتے ہوئے انہیں جہاز سے اتار کر گرفتار کیا گیا۔ جہاں سے ۱۸ مارچ ۱۹۶۲ء کو رہائی ملی۔

اگرچہ الجزائر میں جو انقلاب آیا اس کے لیے باقاعدہ اور منظم چھاپہ مار جنگ کا آغاز یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو ہوا لیکن جہاد آزادی دراصل ۱۴ جون ۱۸۳۰ء کو شروع ہوچکا تھا جب فرانس نے الجزائر میں تسلط کے ارادے سے قدم رکھا تھا

چھاپہ مار جنگ کی قیادت محاذ آزادی کے رہنما کر رہے تھے جن میں بن بیلا، یوسف بن خدہ، کرنل تیاتی، محمد خضر، آیت احمد وغیرہ شامل تھے۔ چار سال بعد بالآخر کامیابی نے مجاہدین کے قدم چومے اور فرانس کا صدر ڈیگال الجزائر کو ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو آزادی دینے پر مجبور ہوگیا۔ آزادی کے بعد الجزائر میں پہلی عبوری حکومت قائم کی گئی۔ اس کے وزیراعظم یوسف بن خدہ تھے۔ اگست ۱۹۶۲ء میں بن بیلا نے فوج کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اور اپنے تمام ساتھیوں کو جن میں یوسف بن خدہ، کرنل تیاتی، محمد خضر اور آیت احمد وغیرہ شامل تھے [illegible] راستے سے صاف کردیا۔ بن بیلا کے خلاف بغاوت بھی ہوئی لیکن باغی ناکام رہے اور بومدین نے جو فوج کے کمانڈر انچیف تھے بن بیلا کے اقتدار کی حفاظت کی اور باغی عناصر کو ختم کرکے رکھ دیا۔

۸ ستمبر ۱۹۶۳ء کو نیا آئین منظور ہوا اور وزیراعظم بن بیلا کو [illegible] صدر منتخب کیا گیا۔ مگر ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کی رات کو ساڑھے تین بجے کے قریب وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف بومدین نے جو نائب صدر بھی تھے [illegible] بن بیلا کا تختہ الٹ دیا اور بغیر کسی خون خرابے کے حکومت پر قبضہ کرلیا۔

نئے صدر بومدین نے بن بیلا کو گرفتار کرکے فوجی نگرانی میں دے دیا [illegible] کہا کہ بن بیلا کا وہی حشر ہوگا جو ایک آمر کا ہونا چاہیے۔ بن بیلا کے خلاف [illegible] چلایا گیا اور عمر قید دی گئی۔ ۱۹۸۰ء میں نئے صدر شاذلی نے ان کو رہا کردیا۔

بن بیلا نے اپنے مختصر دور حکومت میں ملک کی اقتصادی حالت کو [illegible] کی پوری پوری کوشش کی تھی انہوں نے تمام کارخانوں کو سرکاری تحویل [illegible] لے لیا تھا۔

بندر پہلوی

بحیرہ خزر پر ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ۔ جو انزلی [illegible] موسوم رہی۔ ۱۹۲۹ء میں رضا شاہ پہلوی نے تخت [illegible] بعد اسے بندر پہلوی کا نام دیا۔ یہ بندرگاہ بحیرہ خزر سے اور [illegible] درمیان ایک خلیج کے مغرب میں زمین کے آگے نکلے ہوئے ایک [illegible] ہے۔ خلیج کے مشرق میں غازیان نامی ایک پرانی بستی ہے۔ [illegible] پل پر سے ہوتی ہوئی غازیان تک جاتی ہے۔ اور وہاں سے رشت جو [illegible] کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے تک چلی گئی ہے۔ ۱۹۲۰ء [illegible] تھی۔ اکثر باشندے شیعہ ہیں۔ موجودہ صدی کے دوسرے ربع میں خلیج کو [illegible] بندرگاہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس بندرگاہ سے زیادہ تر تجارت [illegible] کی جاتی ہے۔ روس کے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہ بندرگاہ بین الاقوامی [illegible] مرکز رہی ہے۔ بحیرہ خزر پر دوسری بندرگاہ بندر شاہ کہلاتی ہے۔ [illegible]

بندر عباس

ایران کے ساحل پر جزیرہ ہرمز کے [illegible] واقع بندرگاہ۔ اس کا شہر چٹیل ریتلی زمین پر آباد ہے [illegible] فارس کے عین دہانے پر واقع ہے۔ اور یزد، کرمان، لار، شیراز اور [illegible] جانے والے تجارتی راستوں کا نقطۂ اختتام ہونے کی وجہ سے اس بندرگاہ کی تجارتی [illegible] جنگی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس بندرگاہ پر سمندر کے پایاب ہونے کی [illegible] سے بڑے بڑے جہازوں کو گودی سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہونا پڑتا تھا اور [illegible] کے ذریعے اتارا اور لادا جاتا رہا ہے۔ اب اسے کھود کر گہرا کردیا گیا ہے۔

یہ شہر ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں سے ترقی کر کے محل وقوع پر یا اس کے نزدیک

واقع ہے۔ آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی میں اس کے قریبی جزیرے جرون کو ہرمز کہا جانے لگا تو شہر والوں کو جرون کا نام دے دیا گیا۔ اور جب ہرمز ایک تجارتی مرکز بن گیا تو جرون کی اہمیت بھی سامان چڑھانے کے مرکز کی حیثیت سے بڑھ گئی۔ دسویں صدی ہجری، سولہویں صدی عیسوی میں جرون پر بھی پرتگیزیوں کا قبضہ ہو گیا ۱۶۱۵ء میں ایرانیوں نے اسے پرتگیزوں سے چھین لیا اور سات سال بعد برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بحری بیڑے کی مدد سے پرتگیزوں کو ہرمز سے بھی نکال باہر کیا۔ کمپنی کی ان خدمات کے صلے میں شاہ عباس اول نے جرون میں ایک کارخانہ لگانے کی اجازت دی۔ شاہ عباس یہ چاہتا تھا کہ یہ شہر اس کی سلطنت کی سب سے بڑی بندرگاہ بن جائے [illegible] اس کا نام بھی بندر عباس رکھا۔ چنانچہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی، ولندیزی [illegible] اور [illegible] کے آجانے سے یہ شہر واقعی ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ بن گیا ہے۔

[illegible] اس شہر کی آبادی [illegible] تک [illegible] تھے [illegible] ملک کی اندرونی شورشوں اور بغاوتوں کی وجہ [illegible] پالیز کے بقول اس شہر کی خوشحالی ختم ہو چلی [illegible] سے لوگ نقل مکانی کر گئے تھے اور ویران ہو چکے تھے اس کے بعد جب [illegible] نے بندر عباس کو چھوڑ دیا تو اس شہر کی آبادی اور کم ہو گئی۔ [illegible] یہ شہر سلطان عمان کو ٹھیکے پر دے دیا گیا اور [illegible] میں دوبارہ ایرانیوں کا اس [illegible]

[illegible] بندر عباس کی پہلی جیسی خوشحالی دوبارہ حاصل ہو گئی ۱۹۶۷ء میں اس [illegible] جن میں سے ایک شیعوں کے لیے ہے اور [illegible] مچھلی کو ڈبوں میں بند کرنے کا ایک کارخانہ بھی لگایا گیا ہے [illegible] جس کی وجہ سے شہر ترقی کی طرف گامزن [illegible] سال میں ایک [illegible] بھی بنایا گیا ہے۔

بندونگ

انڈونیشیا میں صوبہ مشرقی جاوا کا صدر مقام۔ یہ سطح سمندر سے دو ہزار [illegible] کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ شہر تعلیمی مرکز ہے [illegible] یہاں کی پیداوار میں کونین، کپڑا، ادویات [illegible] اشیا [illegible] مشہور [illegible] ہے۔

[illegible] ایشیائی کانفرنس جو ۱۹۵۵ء میں بلائی گئی تھی اسی شہر میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کانفرنس کا نام بندونگ کانفرنس ہے بندونگ کی کل آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۹ لاکھ ۷۳ ہزار اور ۱۹۷۴ء کے مطابق گیارہ لاکھ تھی۔

بندونگ کانفرنس

انڈونیشیا کے شہر بندونگ میں ہونے والی افریقی اور ایشیائی ممالک کی پہلی کانفرنس، جس میں ۲۹ ممالک کے وزرائے اعظم اور نمائندے شریک ہوئے۔ بندونگ کا شہر جاوا سے تھوڑی دور ایک پرفضا مقام ہے۔ ۱۹۵۵ء میں یہاں یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس انڈونیشیا نے بلائی تھی۔ اس میں شریک ہونے والے ممالک کا رقبہ ایک کروڑ ۳۶ لاکھ ۲۹ ہزار مربع میل اور آبادی ایک ارب چالیس کروڑ تھی۔ اس کانفرنس کے لیے حسب ذیل مقاصد کا اعلان کیا گیا۔

۱۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں اشتراک و تعاون کا جذبہ پیدا کرنا۔ ان کے مشترکہ مفادات کے لیے کام کرنا اور ان کے درمیان دوستی اور ہمسائیگی کی فضا قائم کرنا۔

۲۔ ان ممالک کے سماجی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل اور تعلقات پر غور کرنا۔

۳۔ ایشیائی اور افریقی عوام کی خودمختاری اور قومیت پر غور کرنا۔

۴۔ نئے حالات میں ایشیا اور افریقہ کے عوام کے حالات پر غور و خوض کرنا اور یہ دیکھنا کہ عالمی امن اور اشتراک و تعاون کو مستحکم کرنے کے لئے وہ کیا مدد کر سکتے ہیں۔

کانفرنس کے اختتام پر شریک ممالک نے الجزائر، مراکش، تیونس، مغربی ایرانی، فلسطین اور عدن کی آزادی کا مطالبہ کیا اور ہر قسم کی نوآبادیاتی نظام اور نسلی امتیاز کو انسانیت کے لیے لعنت قرار دیا۔ ایٹمی اسلحہ کو تہذیب اور انسانیت کی مکمل تباہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے ان کے خاتمے اور ان پر پابندی عائد کرنے پر زور دیا۔

آخری مشترکہ اعلان نامے میں کہا گیا کہ دنیا کے تمام ملک رواداری اور فراخدلی کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کریں اور ان دس اصولوں کی روشنی میں دوستانہ تعاون کی فضا پیدا کریں۔

۱۔ انسانی حقوق کے منشور کا احترام۔ ۲۔ تمام قوموں کی خودمختاری۔ ۳۔ نسلی امتیازات کا خاتمہ۔ ۴۔ عدم مداخلت۔ ۵۔ انفرادی یا اجتماعی معاہدے کرنے کا حق۔ ۶۔ ایسے دفاعی معاہدے جن سے بڑی طاقتیں فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ۷۔ حملے کی دھمکی سے گریز۔ ۸۔ تنازعات کا پرامن حل۔ ۹۔ باہمی تعاون اور مساوات۔ ۱۰۔ بین الاقوامی ذمہ داریوں کا احترام۔

بن غازی

لیبیا کا دوسرا دارالحکومت (طرابلس کے ساتھ مشترک) ہے۔ یہ شہر مغربی میدان میں ایک ساحلی پٹی پر واقع ہے اسے [illegible] ریتلے ٹیلوں نے خشکی سے جزوی طور پر منقطع کر دیا ہے۔ اس کی بندرگاہ شمالی اور مغربی ہواؤں کی زد میں ہے اور اس کے آس پاس کے علاقے خشک اور بنجر ہیں بن غازی کا قصبہ یوسپیریڈیس کے مقام پر آباد کیا گیا ہے جس کی بنیاد پانچویں صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے رکھی تھی۔ بعد میں بطلیموس ثالث شہنشاہ مصر کے دور حکومت میں یہ آبادی اس کی بیوی برینکہ کے نام پر برنیک مشہور ہو گئی۔ اس شہر کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی اور ازمنہ وسطیٰ میں اس پر ایسا زوال آیا کہ یہ بالکل ہی مٹ گیا۔

موجودہ شہر بن غازی کی تاریخ کا آغاز پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوتا ہے جب طرابلسی زلیتن اور مسراتہ کو خیرباد کہہ کر یہاں آباد ہو گئے۔ بن غازی کا نام سیدی غازی جو ایک ولی اللہ تھے کے نام پر ہے۔ بعد میں عثمانی سلطنت کے دیگر ممالک سے نقل مکانی کر کے آنے والوں کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان نقل مکانی کر کے آنے والوں میں اقریطشیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو یونانیوں کے ہاتھوں اپنا جزیرہ اقریطش کے فتح ہو جانے کے بعد ۱۸۹۷ء میں جوق در جوق یہاں پہنچے تھے۔ ان کے علاوہ طرابلس کے یہودی اور برقہ کے مختلف حصوں کے قبائلی اور نخلستانوں کے باشندے بھی تھے۔ اور قلیل سی تعداد یورپ کے لوگوں کی بھی تھی۔ ۱۹۰۰ء میں یہاں کی آبادی پندرہ ہزار کے قریب تھی۔

جب ۱۹۱۱ء میں اطالوی بن غازی اور طرابلس میں داخل ہوئے تو انہوں نے چند معمولی شہری آبادیوں کے علاوہ اس پورے علاقے کو مکمل طور پر بدویوں کا علاقہ پایا جہاں نخلستانوں سے باہر ایک گاؤں تک نہ تھا پوری آبادی نیم خانہ بدوش اور خانہ بدوش چرواہوں اور گلہ بانوں پر مشتمل تھی ۱۹۱۱ء میں یہاں کی آبادی ۱۴ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ابتدا میں یہ ایک ترکی ولایت کا مرکز تھا اور اب لیبیا کی نوآبادی کے حصے کا صدر مقام بنا۔ بن غازی ریل کے ذریعے جنوب میں

سلوک اور مشرق میں المرج سے ملا ہوا ہے۔ ملک کے اندر سے ادھر اُدھر جانے والی تمام سڑکیں یہاں آکر ختم ہوجاتی ہیں۔ یہاں پر ایک نئی بندرگاہ بنائی گئی ہے جسے پشتوں کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا ہے یورپ کے شہروں کی طرح اس قصبے کے لیے بلدیاتی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ پرانا قصبہ ۸۰۰ میٹر لمبے اور ۲۰۰ میٹر چوڑے ایک چوکور قطعہ زمین کے اندر آباد ہوا تھا۔ ایک جامع مسجد جو سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر کرائی گئی تھی پھر نئے سرے سے بنائی گئی ہے نیا مضافاتی قصبہ پرانے قصبے کے جنوب میں بسایا گیا ہے۔

۱۹۳۸ء میں بن غازی کی آبادی ۶۶۸۰۰ تھی اور اس میں اطالویوں کی تعداد ۲۲۰۰۰ تھی۔ اس کی بندرگاہ بڑی مصروف بندرگاہ تھی۔ ۱۹۴۲ء کے اواخر کی بمباری سے اور اطالویوں کے نکل جانے سے بن غازی کو بہت نقصان پہنچا۔ اطالویوں کے اخراج کے بعد بن غازی سرنیکا کا بڑا شہر اور وفاقی متحدہ لیبیا کے سلطان کا دارالحکومت اور قیام گاہ ہوگیا۔ اس کی اہمیت جو بندرگاہ کی حیثیت سے تھی ختم ہوگئی ہے اس کے ہوائی اڈے کی اہمیت زیادہ ترفوجی نقطۂ نظر سے ہے۔ ۱۹۵۴ء میں بن غازی کی آبادی ۶۳ ہزار تھی۔ جن میں یہودیوں اور یورپیوں کی ایک تھوڑی سی تعداد کے سوا سب مسلمان تھے۔ ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۸۰۰۰۰ تھی۔ شہر میں پانی کی سپلائی اور بجلی کی قلت ہے۔ جس پر حکومت خاص توجہ دے رہی ہے۔

بنگال بنگالہ یا بنگال، قدیم ہندوستان کا ایک صوبہ، جو ۱۹۴۷ء کے بعد دو حصوں مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال (بھارت میں) تقسیم ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کی حیثیت اختیار کرلی۔ بنگال لفظ بنگا سے نکلا ہے، جو اس علاقے میں آباد ایک غیر آریائی قوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ پال اور سین راجاؤں کے عہد میں دریائے گنگا کے ڈیلٹا کو بنگالہ کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہی جنوبی علاقہ بنگال کہلاتا تھا۔ البتہ مغلیہ دور میں موجودہ تمام علاقہ بنگالہ کہلاتا تھا۔ یہ سیلابوں، طوفانوں اور بارشوں کی سرزمین ہے۔ جہاں چاول، پٹ سن اور ایسی دوسری استوائی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔

آریاؤں کے دور میں بنگال (۱۲۰۰ق۔م سے ۴۰۰ ق۔م) کی تاریخ اندھیرے میں ہے۔ صرف سکندر اعظم کے حملے کے بعد یونانی ماخذوں سے کچھ پتا چلتا ہے کہ یہاں گنگیوں حکمران تھے۔ جو سکندر اعظم کے مقابلے کے لیے متحد ہوئے۔ اس دور میں بنگال کو ونگا کہا جاتا تھا۔ گپت خاندان کے تین راجا گوپ چندر، دھرم دت اور سما چار دیو ۵۲۵ء سے ۵۷۵ء تک یہاں حکمران رہے۔ ۶۰۶ء میں ایک باجگزار راجا مہاسامنت نے شمالی اور مغربی بنگال پر مشتمل ریاست گوڈا کی بنیاد رکھی۔ اس کی موت کے بعد بدھ راجا ہرش وردھن نے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا اور ۷۲۶ء کے بعد کشمیر کا راجا للتا دتیہ یہاں پر قابض ہوگیا۔

۷۴۴ء میں ایک بدھ خاندان پال نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے بانی گوپال کے بیٹے دھرم پال کے زمانہ ۷۷۰ء تا ۸۱۰ء میں یہ سلطنت ہمالیہ، مالوہ اور برار تک کے علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹے دیوپال کے عہد میں یہ ایک بہت بڑی سلطنت بن چکی تھی۔ جس کا ذکر المسعودی نے بھی کیا ہے۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں ہیمنت سین نے پال خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرنے کی کوشش شروع کردی اور رادھا میں ایک خودمختار حکومت قائم کرلی۔ اس کے بیٹے وجے سین (۱۰۹۵ء تا ۱۱۵۸ء) نے پورے بنگال کو اپنی ریاست میں شامل کرلیا۔ ۱۱۷۹ء میں اس کا بیٹا لکشمن سین تخت پر بیٹھا، جس نے عمر کے آخری حصے میں بڑی پریشانیاں اٹھائیں اور مسلمانوں سے شکست اٹھانے کے بعد ۱۲۰۶ء میں ڈھاکے کے قریب فوت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی بنگال پر سے سین خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۱۹۹ء میں قطب الدین ایبک کے ایک ترک سپہ سالار نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کو وسعت دینے کے لیے بنگالہ کی طرف کوچ کیا اور ۱۲۰۱ء میں سین راجا کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہوگیا اور بغیر جنگ کے ندیا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے فوراً ہی بعد وریندر یا اور گور پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور یہ چھوٹی ریاست بعد میں گور کی ایک بڑی خودمختار حکومت بن گئی۔ ۱۲۰۵ء میں اختیار الدین محمد سپہ سالار قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد علی بن مردان بنگال کا والی مقرر کیا گیا۔ ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد علی بن مردان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا اور اس طرح بنگال کا پہلا مسلمان بادشاہ بنا۔ ۱۲۱۱ء میں علی بن مردان کے قتل کے بعد حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بنگال کا بادشاہ بنا۔ اس کے زمانے میں بنگال نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اس نے حدودِ سلطنت کو وسیع کیا۔ ۱۲۱۹ء میں جہازوں کا ایک بیڑہ بنایا گیا۔ ۱۲۲۵ء میں جب سلطان التتمش نے بہار و بنگال پر حملہ کیا تو اس نے سلطان کی اطاعت قبول کرلی لیکن سلطان کی واپسی پر غیاث الدین نے بہار کے صوبیدار کو مار بھگایا۔ چنانچہ التتمش کے لڑکے ناصر الدین نے لکھنوتی پر چڑھائی کرکے غیاث الدین کو مار دیا اور اس طرح بنگال کی آزاد بادشاہت کو ختم کردیا۔

۱۲۲۷ء سے ۱۲۸۷ء تک بنگال سلطنت دہلی کا ایک حصہ رہا اور متعدد صوبیدار بنگال کا انتظام کرتے رہے۔

بلبن کے عہد میں بنگال کے صوبہ دار طغرل نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا لیکن بلبن اسے شکست دے کر اور اپنے بڑے لڑکے بغرا خاں کو بنگالہ کا حاکم بنا کر دہلی واپس آیا اور اس وقت سے بنگال کی صوبہ داری موروثی ہوگئی۔ یہ صوبیدار دہلی کی سیادت تسلیم تو کرتے تھے لیکن اپنے صوبے کے معاملات میں خودمختار ہوتے تھے۔

محمد تغلق کے آخری ایام میں حکومت میں والیان بنگال نے سیادت دہلی کا جوا اپنی گردن سے اتار ڈالا اور محمد تغلق ان کی خودمختاری اور آزادی مانتا رہا۔

آزاد مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں بنگال نے بڑی ترقی کی۔ بہت سی تعمیرات ہوئیں۔ مملکت بنگال کو وسعت دی گئی۔ مغربی آسام، کوچ بہار اور جاج نگر کے اقطاع اور شمالی و جنوبی بہار کا پٹنے تک کا علاقہ ان کے زیر اقتدار

۱۳۵۴ء تک مشرقی بنگال خودمختار رہا اور ۱۳۵۲ء میں مغربی بنگال کی الیاس شاہی سلطنت کا ایک جزو بن گیا۔ لیکن ۱۳۵۲ء ہی میں فیروز تغلق نے بنگال پر حملہ کرکے لکھنوتی کے مغرب کا سارا علاقہ دہلی سلطنت میں شامل کرلیا۔ تاہم الیاس شاہ نے اپنی سلطنت کا سروپ، ناگرا اور ورندر را راجشاہی اور دیناج پور تک بڑھالیا۔ الیاس شاہ کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ حکمران ہوا اور تینتیس سال حکومت کی۔ ۱۳۸۹ء میں سکندر شاہ اپنے بیٹے غیاث الدین کے ہاتھوں ایک جنگ میں مارا گیا۔ چنانچہ ۱۳۸۹ء میں غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ بنگال پر ۱۴۸۶ء تک سوائے چند برسوں کے الیاس شاہی سلطنت قائم رہی۔ یہ سلاطین بنگالی تھے لیکن ہر دلعزیز تھے۔

الیاس شاہی سلطانوں نے حبشیوں کی بے انتہا سرپرستی کی جس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ جن امیروں کی وجہ سے سلطنت چلتی تھی ان کا زور کم ہو گیا اور آخر کار حبشی سلطنت قائم ہو گئی۔ جو ۱۴۸۶ء سے ۱۴۹۳ء تک رہی۔ یہ دور بنگال کی تاریخ کا تاریک دور ہے۔ اس کے بعد ۱۴۹۳ء سے ۱۵۳۸ء تک بنگال پر حسینی شاہی خاندان کے لوگ حکومت کرتے رہے سید حسین علاء الدین حسین شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ ایک عرب تھا لیکن اس نے بنگالیوں کی زبان اور تہذیب کی سرپرستی کی اور بنگال میں نئے سرے سے فتوحات اور تعمیرات کے دور کا آغاز ہوا۔ حسین شاہ سے مسلمان اور ہندو دونوں خوش تھے۔ ۱۵۱۹ء میں حسین شاہ نے وفات پائی۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین نصرت شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ۱۵۳۲ء میں نصرت شاہ کو اس کے غلام نے قتل کر دیا اس کے بعد اس کے دو بیٹے حکمران ہوئے۔ انہی دنوں میں شیر خان سوری نے بنگال پر حملہ کیا۔ اس وقت ہمایوں مغربی ہند کی شورشیں فرو کرنے میں مصروف تھا۔ شیر خان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بہار کا حاکم بن بیٹھا۔

۱۵۳۹ء میں بنگال افغانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۵۳۰ء میں ہمایوں نے گوڑ پر قبضہ کر لیا۔ اور بنگال کو جنت آباد بنانے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ہمایوں کو یہاں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ۱۵۳۹ء میں چوسا کے مقام پر اس نے شیر شاہ سے شکست کھائی۔ اس کے بعد شیر شاہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے [illegible] اور گوڑ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۷۵ء میں بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہوا [illegible] [illegible] بنگال، بہار اور اڑیسہ میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت [illegible] کی کوششیں کرتے رہے۔ [illegible] شاہ جہان نے [illegible] [illegible] کو بنگال کا [illegible] کیا۔ اس کے عہد میں [illegible] میں بھی [illegible] ہوئی [illegible] بہار [illegible] ضلع [illegible] کا جنوب مشرقی حصہ، مدناپور، [illegible] جلیسور وغیرہ کا علاقہ مغل بنگال میں شامل کر دیا گیا [illegible] اورنگ زیب کے [illegible] اس سال تک مغل بنگال میں امن امان [illegible] بنگال کی [illegible]۔ اورنگ زیب کے [illegible] بنگال کا صوبیدار [illegible]۔ ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے مرشد قلی خان کو بنگال کا صوبیدار بنایا۔ ۱۷۲۷ء میں مرشد قلی خان کی وفات کے بعد [illegible] شجاع الدولہ بنگال کا صوبیدار بنایا گیا جس نے ۱۷۳۹ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا سرفراز علاؤ الدولہ کے لقب سے بنگال کی مسند پر بیٹھا ۱۷۴۰ء میں سرفراز علی وردی کے ہاتھوں میدان جنگ میں مارا گیا اور اس طرح علی وردی نے بنگال کی مسند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی نے وفات پائی اور اس کے [illegible] سراج الدولہ بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ سراج الدولہ کو پہلے ہی دن سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جن میں اس کے جاہ طلب رشتہ دار، امراء، وزراء اور انگریز شامل تھے۔ اس نے بڑی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا۔

سراج الدولہ نے اپنے خلاف اٹھنے والی تمام شورشوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ۱۷۵۶ء میں اس نے کلکتہ پر حملہ کر کے انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ لیکن انگریزوں نے اپنی ہزیمت اور شکست کا بدلہ لینے کے لیے بااثر ہندوؤں اور میر جعفر جیسے غدار مسلمانوں کو ساتھ ملا کر سراج الدولہ کا تختہ الٹنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ پلاسی کے مقام پر انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔ جس میں میر جعفر جیسے غداروں کی وجہ سے اسے شکست اٹھانا پڑی۔ اس کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا جو انگریزوں کی کٹھ پتلی کے طور پر حکومت کرنے لگا۔ اس نے ہر طرح سے کمپنی کا حرص پورا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ انگریزوں نے اسے سبکدوش کر دیا اور اس کی جگہ اس کے داماد میر قاسم کو بٹھا دیا۔ جو ایک قابل حکمران تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد انگریزوں نے اسے بھی معزول کر کے دوبارہ میر جعفر کو بحال کر دیا۔ میر جعفر کی موت کے بعد اس کے بیٹے کو گدی پر بٹھا دیا گیا، جو انگریزوں کا محض وظیفہ خوار تھا۔

میر جعفر کے مرنے کے بعد نوابی ختم ہو گئی اور لارڈ کلایو نے کمپنی کے لیے بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی۔ فوج کا اختیار کمپنی نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ لیکن کلایو اچھا منتظم ثابت نہ ہو سکا اس کی بدعملی کے باعث بنگال کی خوشحالی جاتی رہی ۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۰ء میں سخت قحط پڑا۔ اس قحط میں ایک تہائی آبادی ختم ہو گئی۔ ۱۷۷۴ء میں کلایو نے خودکشی کر لی۔ اور اس کی جگہ وارن ہیسٹنگز بنگال کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے دور میں مسلم قانون کی جگہ انگریزی قوانین نافذ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا مزید نقصان ہوا۔ کیونکہ دفتروں میں انگریزی زبان رائج کی گئی جبکہ مسلمان اس زبان سے ناآشنا تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے میں اس زبان کی تعلیم حاصل کر کے زیادہ ملازمتیں حاصل کر لی تھیں اس دور میں انگریزوں کے خلاف کئی تحریکیں اٹھیں جو پوری طاقت سے کچل دی گئیں۔ ان میں حاجی شریعت اللہ کی تحریک خاص طور پر مشہور ہے۔

تقسیم بنگال:۔ جب لارڈ کرزن وائسرائے بن کر آیا تو اس نے بنگال کے بڑے صوبے کو تقسیم کر کے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر ایک الگ صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جاتی تھی۔ اور مغربی بنگال میں بہار اور اڑیسہ کے رہنے والوں کی۔ مسلمان اس تقسیم کے حق میں تھے لیکن ہندو اس کے مخالف تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس تقسیم کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن ان تمام احتجاجات کے باوجود ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کر دی گئی۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے نام سے دو صوبے بن گئے۔ نئے صوبے مشرقی بنگال کا رقبہ ۱۰۶۵۰۰ مربع میل تھا اور اس میں آسام، مشرقی اور جنوبی بنگال چٹاگانگ، ڈھاکہ، راجشاہی اور مالدہ اضلاع شامل تھے۔ ڈھاکہ نئے صوبے کا دارالحکومت قرار پایا۔ دوسرے صوبے کا صدر مقام کلکتہ بنایا گیا۔ اس تقسیم پر ہندوؤں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور بالآخر دسمبر ۱۹۱۱ء میں خود شاہ انگلستان نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا۔

تحریک پاکستان:۔ ۱۹۰۶ء میں سر سلیم اللہ نے ڈھاکے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ جہاں ہند کے مسلمانوں کی ایک جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور یہی جماعت بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ سر سلیم اللہ کے بعد بنگال میں کوئی بڑا مسلمان لیڈر نہ رہا۔ تاہم بنگالی مسلمان اب بیدار ہو چکے تھے اور یہاں تک کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ایک قرارداد جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہے پاس کی گئی جس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا گیا۔

۱۹۴۱ء میں فضل الحق نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر کے مہاسبھا کے لیڈر شیاما پرشاد مکرجی کے ساتھ مل کر ایک مخلوط وزارت قائم کی۔ اس وزارت کے دور میں بنگال ایک قحط کا شکار ہوا جس میں لاکھوں بنگالی اس قحط سے مر گئے۔

آزادی ہندوستان:۔ ۱۹۴۷ء تک حکومت برطانیہ کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس نے ہندوستان چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا گیا۔ کانگرس نے ہندوستان کی تقسیم منظور کر لی لیکن پاکستان کو ہمیشہ کے لیے کمزور کرنے کے لیے اس نے پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم کر دیا ۱۴ اگست کو جب پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا تو اس روز متحدہ بنگال کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی نے مشرقی بنگال کو خواجہ ناظم الدین کے اور دوسرے روز مغربی بنگال پی۔ سی گھوش کے حوالے کر دیا اور اس طرح تقریباً دو سو سال کی غلامی کے بعد اس ملک پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

مشرقی پاکستان:۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مشرقی بنگال اور سلہٹ کا ضلع ملا

کر مشرقی پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان متحدہ پاکستان کا ایک صوبہ رہا۔ جسے باقی صوبوں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کی نسبت زیادہ حقوق حاصل رہے۔ (نیز دیکھیے "مشرقی پاکستان")

ستارہ مسجد، ڈھاکہ

بنگلہ دیش ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو پاکستانی فوجوں نے بھارت اور بنگلہ دیش تحریک کی متحدہ فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو مشرقی پاکستان ایک خودمختار ریاست بنگلہ دیش کے وجود میں ڈھل گیا۔ شیخ مجیب الرحمان اس کے پہلے وزیر اعظم بنے۔

بنگال میں اشاعت اسلام:۔ بنگال ہندومت اور بدھ مت کے زیر اثر تھا۔ نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک بدھ مذہب کے پیرو پال خاندان اور ہندومت کے پرستار سین راجاؤں کی حکومتیں رہیں۔ ۷۰۰ء سے بنگال کی سب سے قدیم اور بڑی بندرگاہ چاٹگام کے راستے دنیا کے برگزشتہ عرب، عجم، مصر، عراق، ترکی اور چین سے سیاحوں، مورخوں، مجاہدوں اور تاجروں کے علاوہ صوفیوں اور درویشوں کی آمد شروع ہوئی۔

بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی متعدد وجوہات ہیں۔ ۱۔ بیرونی ممالک سے مسلمانوں کی آمد۔ ۲۔ مسلمانوں کی نسل میں ترقی۔ ۳۔ مقامی باشندوں کا قبول اسلام۔ محمد بن بختیار خلجی کے حملے ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء سے قبل بھی چاٹگام کے نواح میں عرب تاجروں کی آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ پہاڑ پور اور مینامتی سے ملنے والے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان ہارون الرشید کے وقت سے آباد تھے۔ محمد بن بختیار خلجی کے زمانے میں بیرونی مسلمانوں کی آبادی پندرہ بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کی فتح بنگال سے بہت پہلے جن صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی ذات بابرکات کے علوم و فیوض اور کشف و کرامات سے بنگال کا چپہ چپہ متاثر ہوا ان میں احمد بن محمد معروف بہ شیخ المدار (م ۱۱ محرم ۳۴۲ھ) اور اسماعیل بن سید نیشاپوری (۱۶ شعبان ۳۶۶ھ) کا تذکرہ ملتا ہے۔

اشاعت اسلام میں سلاطین، علما اور صوفیا کا بڑا حصہ ہے۔ سلاطین نے حکومت قائم کر کے علما کی سرپرستی اور صوفیا کی اعانت کی۔ مدارس جاری کیے، مسجدیں تعمیر کرائیں خانقاہیں بنوائیں اور ایک خالص مسلم معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ احمد بن بختیار خلجی کے بعد

یہاں کا نقشہ حضرت سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک مکتوب (۸۰۰ھ/۱۴۰۰ء) بنام سلطان ابراہیم شاہ میں نظر آتا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"سرزمین بنگال کتنی اچھی سرزمین ہے۔ جہاں مختلف مقامات سے بے شمار مشائخ اور فقرا آتے۔ جنھوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا ہے۔ مثال کے طور پر دیوگاؤں کو لیجیے جہاں شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کے سترہ مشہور بزرگ آسودہ ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کے کئی اور بزرگ مہیسون میں مدفون ہیں۔ بیو حال زلونہ میں سلسلہ جلیلہ کے بزرگوں کا ہے۔ نارکوٹ کے مقام پر بھی شیخ المشائخ ارشیخ احمد دمشقی کے بعض ہمراہی رفقا کے مزاروں کا پتہ چلتا ہے۔ سلسلہ قادریہ کے بارہ بزرگوں میں سے ایک حضرت شرف الدین طولیہ کا مزار سنارگاؤں میں ہے۔ حضرت شرف الدین بہاری آپ کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ ان کے بعد حضرت پیر بدر الدین بدر عالم زاہدی اور متعدد دوسرے اولیائے کرام گذرے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال کے شہروں کا تو ذکر ہی کیا کوئی قصبہ اور کوئی قریہ ایسا نہ تھا جہاں بزرگان دین نہ پہنچے ہوں اور آباد نہ ہوئے ہوں۔

جن بزرگ اور صوفیا نے بنگال میں اسلام کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ان کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں حضرت سید سمنانی سارے ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے بنگال پہنچے ان ایام میں شیخ علاء الدین چشتی کا چرچا سارے بنگال میں پھیلا ہوا تھا۔ حضرت سمنانی آپ کی خدمت میں بارہ سال تک رہے۔ آپ سے بیعت کی اور منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ آپ سمنان (عراق) کے رہنے والے تھے۔

شیخ بابا آدم شہید:۔ ان بزرگان دین میں سے ہیں جو ابتدائی دور میں یعنی مسلمانوں کی فتح بنگال سے صدیوں پہلے سرزمین عرب سے بنگال میں وارد ہوئے اور دین حق کی تبلیغ اور اشاعت میں اپنی زندگی گذار دی۔ اس وقت وہاں برہمن خاندان کے راجہ بلال سین کی حکومت تھی۔ بابا آدم مکہ معظمہ یا طائف میں مشہور تھے۔ راجہ کے ظلم سے تنگ آکر ایک مسلمان نے آپ کی خدمت میں فریاد کی اور مدد کا طالب ہوا۔ آپ تقریباً چھ سو مریدین کے ساتھ رامپال تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی آمد سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی اور وہ گائے کی قربانی بھی کرنے لگ گئے۔ راجہ نے آپ کو شہید کرا دیا۔

شاہ سلطان رومیؒ:۔ گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ضلع میمن سنگھ کے ایک گاؤں مدن پور میں سکونت پذیر تھے۔ بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ کی کرامات کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ میمن سنگھ کے راجہ نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

شاہ سلطان بلخیؒ:۔ بلخ کے فرمانروا اصغر کے فرزند تھے۔ والد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے لیکن آپ نے تاج و تخت کے مقابلے پر فقیری کو ترجیح دی اور عازم سفر ہوئے۔ دمشق کے زمانہ قیام میں حضرت شیخ توفیق سے بیعت کی اور شیخ کی صحبت سے مستفیض ہو کر بحری راستے سے بنگال پہنچے۔ پہلے سندیپ پھر ہری رام نگر میں قیام فرمایا۔ یہاں کا راجہ کالی دیوی کی پوجا کرتا تھا راجہ نے آپ کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور اسی کے باعث وہ آپ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا وزیر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ مہاستھان گڑھ کے ایک گاؤں مہستان پہنچے وہاں کے راجہ اور اس کی بہن شیلا دیوی نے انھیں تبلیغ اسلام کے سبب قتل کروانا چاہا۔ آپ نے ان کا مقابلہ کیا اور نہ صرف راجہ اور اس کی بہن کو قتل کیا بلکہ ان کے راج پاٹ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ آپ نے یہیں سکونت اختیار کر لی اور مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔

شیخ جلال الدین تبریزی سہروردیؒ:۔ سرزمین بنگال کے ان اولیاء اللہ میں سے ہیں جو علوم باطنی اور ظاہری دونوں میں دسترس رکھتے تھے ولادت

تبریز میں ہوئی۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں شروع میں آپ صاحب ثروت ہی نہیں صاحب مملکت بھی تھے لیکن تجلیات الٰہی کے آگے دنیاوی بادشاہت ہیچ نظر آئی۔ تاج و تخت اپنے فرزند کے سپرد کر کے منزل سلوک کی طرف گامزن ہوئے۔ حضرت شہاب الدین کے مرید خاص تھے۔ سات سال تک شیخ کی صحبت میں رہے۔ دہلی کا بادشاہ سلطان التمش بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ اور آپ کی مجلس میں حاضری دیتا تھا۔ آپ نے حقیقت و معرفت کی جستجو میں دہلی، ملتان، بدایوں، اودھ، بہار اور بنگال کے سیر و سیاحت فرمائی اور ہر جگہ بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے بنگال کا ایک گاؤں پنڈوہ ہندوؤں کا مقدس مقام تھا۔ وہاں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی آپ کی آمد سے نہ صرف پنڈوہ اور اس کے قرب و جوار میں شمع ہدایت روشن ہوئی بلکہ بنگال کے اکثر ضلعوں میں بھی بت پرستی کا قلع قمع ہو گیا۔ بت خانوں کی جگہ مسجدوں اور خانقاہوں نے لے لی۔ آپ ہی کے طفیل بنگال میں سلسلہ سہروردیہ جاری ہوا پنڈوہ کا وہ علاقہ جو آپ کی آمد سے قبل بت پرستوں کا گڑھ تھی۔ آپ کی سکونت کے بعد خدا پرستوں کی سجدہ گاہ بن گئی۔

شاہ جلال دکنیؒ :۔ حضرت شاہ علی بغدادی سے تقریباً سو سال پہلے بنگال تشریف لائے تھے اصل وطن گجرات تھا۔

حضرت پیاراؒ :۔ حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز کے خلیفہ خاص تھے۔ مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ موتی جھیل ڈھاکہ میں ایک گنبد کے نیچے مدفون ہیں آپ ہی کی وجہ سے سلسلۂ قادریہ کا جال سارے بنگال میں پھیلا۔

[illegible] :۔ نویں صدی عیسوی کے آخر میں ایران سے [illegible] کے فاصلہ پر شمال جانب ایک چھوٹی سی [illegible] ریاضت و عبادت کے بعد کاملیت حاصل کی اور مخلوق خدا کی اصلاح [illegible] ہو گئے۔

سید بدر عالم زاہدیؒ :۔ بنگال کے اولیاء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اصل [illegible] تشریف لائے مدتوں قیام فرمانے کے [illegible] اور وہیں وفات پائی۔

آپ کی روحانی کرامات کے ساتھ ساتھ مادی کارنامے بھی قابل ذکر ہیں روایت ہے کہ [illegible] پور کے راجہ [illegible] نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو آپ نے [illegible] کے حاکم سلطان [illegible] کی مدد سے [illegible] راجہ پر چڑھائی کی اور اسے شکست دے کر اس کے علاقے کو اسلامی ریاست میں شامل کر لیا۔ آپ کا فیضان اراکان، اکیاب [illegible] کے [illegible] تک پہنچا ہوا ہے۔ چاٹگام، کومیلا اور نواکھلی کے ملاحوں کو آپ سے بے انتہا عقیدت ہے۔ جب ملاح عازم سفر ہوتے ہیں تو پیر بدر کا نام ان کے ورد زبان ہوتا ہے۔

[illegible] شاہ دولہ شہیدؒ :۔ قصبہ یمن کے رہنے والے تھے آپ کا سلسلہ نسب حضرت معاذ بن جبل سے جا ملتا ہے اپنے والد کے کہنے پر تبلیغ اسلام کے شوق میں بنگال کی طرف روانہ ہوئے۔ بہار کے راجہ نے جب آپ کی آمد کی خبر سنی تو بہت سیخ پا ہوا اس نے پہلے آپ کو [illegible] سے مریدوں سمیت نکل جانے کا حکم دیا لیکن آپ نے دین اسلام کا تبلیغی کام اور تیزی سے شروع کر دیا اس پر اس نے آپ کو اور آپ کے مریدین کو شہید کر دیا۔ آپ کا مزار شہداد پور میں ہے۔

شیخ سراج الدین المعروف شیخ اخی سراجؒ :۔ درویش کامل اور باکرامت تھے۔ علوم باطنی اور علوم ظاہری دونوں میں دسترس رکھتے تھے "انوار الاصفیا" میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ تمام ہندوستان میں آج تک دو بزرگوں شیخ نصیر الدین اودھی اور شیخ اخی سراج کے سلسلے جاری ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہیں گے۔

شیخ علاء الحق والدینؒ :۔ تلاش حق میں سرزمین پنجاب سے وادی بنگال میں وارد ہوئے۔ شیخ سراج الدین کے خاص مرید تھے اور ان کا شمار بنگال کے اولیاء کبار میں ہے۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی، طلباء کی تعلیم کا انتظام، مسافروں کے رہن سہن اور غرباء و مساکین کی امداد کے لیے آپ کی زندگی وقف تھی۔

سید العارفینؒ :۔ آپ اشاعت اسلام کے سلسلے میں شمالی ہند کے کسی علاقے سے بنگال تشریف لائے۔ اور باقر گنج میں مقیم ہو کر اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا ان کے علاوہ شاہ قمیص، شاہ عبدالرحیم، شاہ نعمت اللہ بت شکن، شاہ لوری، شاہ محمد دائم اللہ، شاہ علی بغدادی، شاہ اسماعیل غازی، بدیع الدین شاہ مدار ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔

بلاشبہ مسلم فاتحین نے اپنی فتوحات سے اسلام کی اشاعت کے لیے ایک فضا پیدا کی لیکن جن لوگوں نے یہاں کے عوام کے قلوب کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا اور [illegible] کی بدولت اس خطہ میں اسلام کی بہار آئی وہ اصل میں بنگال کے یہی صوفیائے کرام تھے۔ جن کی اخلاقی قوت کا لوہا عوام بادشاہوں سے زیادہ مانتے تھے اور جن کی تبلیغ کے خلوص کا اندازہ اس دور کی تاریخ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی حیات طیبہ سے عملی طور پر اسلام کو پیش کیا جس کا نتیجہ تھا کہ اسلام بنگال کے چپے چپے میں پھیل گیا اور آج صدیاں گذر جانے پر بھی جب کہ بنگال کے عوام اپنے ملوک و سلاطین کو بھول چکے ہیں۔ عوام کے قلوب پر جن لوگوں کی عظمت کے نقوش قائم ہیں وہ یہی صوفیائے کرام ہیں۔

علماء نے نہ صرف سلاطین کو وقتاً فوقتاً اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تلقین کی بلکہ اشاعت علم دین کیلئے متعدد مدرسے قائم کیے۔ لوگوں کو فارسی اور اور بنگلہ میں دینی و دنیوی تعلیم دی برہمنوں کے ساتھ مذہبی مناظرے کیے اور اکثر ایسا ہوا کہ علماء سے شکست کھانے کے بعد ان برہمنوں نے اہل خاندان اور عقیدت مندوں کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ ہندوؤں نے اپنے دھرم کو بچانے کے لیے اسلام کا سخت مقابلہ کیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات اور خوبیوں کو اپنے مذہب سے بہتر سمجھتے تھے۔ راجا کنس کے بیٹے جدو نے اسلام قبول کر لیا اور جلال الدین کے نام سے بنگال پر حکومت کرتا رہا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب ان بااثر لوگوں نے اسلام قبول کیا تو اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ مسلمان فرمانرواؤں کی رواداری اور رعیت پروری علماء اور صوفیاء کی دین داری اور پاکیزہ اخلاق و اطوار کے علاوہ اشاعت اسلام کا حلقہ وسیع ہونے کا سب سے بڑا سبب خود اسلام کی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی یہ خوبی تھی کہ اس میں شامل ہو کر سب برابر ہو جاتی تھی۔ جبکہ ہندوؤں میں ذات پات کی تمیز کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ قبول اسلام سے انہیں معاشرتی مساوات اور ترقی کے دروازے کھلے نظر آئے تو وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ مشرقی بنگال کے نانترک ہندو اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح بدھ مت کے پیرو سین راجاؤں کے عہد سے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں بھی اپنی نجات کی صورت اسلام قبول کرنے میں نظر آئی اور اس طرح بنگال میں اسلام کی اشاعت کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔

اسلام کا اثر بنگالی تمدن پر بھی پڑا کیونکہ بیرون ملک سے جو مسلمان بنگال میں آ کر آباد ہوتے انہوں نے یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے نومسلموں

کی کربلا میں شہادت تک کا واقعہ بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں قدامت پسند علما مذہبی تصانیف میں بنگلہ کو اظہار کا ذریعہ بنانے کے مخالف تھے۔ لہٰذا مصنفین پر یہ بات بھی ثابت کرنا لازم ہو گیا کہ تبلیغ دین بنگلہ زبان میں کامیابی اور مؤثر انداز سے کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ شاعروں نے خالص اخلاقی شاعری کے ذریعے براہ راست تبلیغ کا انداز اختیار کیا۔ عبدالحکیم کا "شہادت نامہ" بنگلہ میں خالص اخلاقی شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ عبدالحکیم نے بنگلہ میں اشاعت اسلام کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت کی ہے وہ کہتا ہے کہ بنگال میں عربی اور فارسی کے بعد اسلام کی زبان بنگلہ ہے جو لوگ عربی اور فارسی نہیں جانتے انہیں اسلامی ادب کا مطالعہ بنگلہ میں کرنا چاہیئے ورنہ وہ کبھی ایمان سے واقف نہیں ہو سکیں گے اور بدستور تاریکی میں رہیں گے۔" اس کے زمانے میں اشاعت اسلام کی روایت ایک مسلم حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کا زمانہ ۱۶۲۰ء سے ۱۶۹۰ء تک کا ہے۔

اٹھارویں صدی میں متعدد مصنفین اسلامی ادب کی مختلف اصناف کی تخلیق میں مصروف تھے۔ یہی وہ دور ہے جب اس ملک میں بنگلہ کے نام [illegible] اور مسلمان مصنفین [illegible] کے انداز میں لکھنے لگے۔ ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں، [illegible] نماز کی تعلیم کی گئی ہے۔ مثلاً انبیاء [illegible] قصص الانبیاء، نماز [illegible] [illegible] وغیرہ۔

[illegible] حکومت کے خاتمے کے بعد [illegible] دور کو ایک نیا معاشرتی و سیاسی [illegible] انہوں نے [illegible] حاصل کر کے ادب میں نئی نئی روایات قائم [illegible] قبول کیا۔ انہوں نے وقت [illegible] کے لیے بحور تیار کر لیا۔ ان میں اپنی اصلاح [illegible] کے مقابلے میں مسلمان [illegible] کی روایت پر عمل کرتے رہے۔ البتہ [illegible] مصنفین کے [illegible] مسلمانوں کو یہ روایات اختیار کرنا پڑیں [illegible] مسلمان مصنفین نے [illegible] دیکھا کہ اس دوران میں ایک [illegible] ترقی ہے جس کی زبان ان کی روزمرہ بول چال سے بالکل مختلف ہے [illegible] کی روایت روز افزوں مقبول ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہوں [illegible] ماضی بعید یعنی اسلامی زندگی کی شاندار عظمت و شان کے [illegible] موضوع بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا پیمانہ تلاش کیا جائے جو [illegible] کے لیے قابل قبول ہو اور دوسری طرف اس کی روشنی میں ان کے [illegible] نصب العین متعین ہو جائے جو ہندوؤں کے آدرش واد [illegible] کا مقابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں آنحضورؐ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی سوانح عمریاں بھی [illegible] اور شائع کی گئیں۔ یہ دور جذباتی انداز فکر اور انداز بیان کا تھا۔ چنانچہ اس دور کے تمام مسلمان مصنفین کے ہاں یہی مصلحانہ طرز ناصحانہ انداز اور جذباتی لہجہ نمایاں ہے۔

بنگلہ نثر میں مذہبی ادب پیدا کرنے کے رجحان کو اس رجحان کا ایک سلسلہ سمجھنا چاہیے جس کے تحت قبل ازیں مذہبی افکار و عقائد کو منظوم شکل میں پیش کیا جاتا رہا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی ادبی تخلیقات بطور مجموعی اگر ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو ان کے مساوی ضرور تھیں۔ مسلمان حکمران باہر سے آکر بنگال میں آباد ہوئے تھے اور ساری مہذب دنیا پر عربی اور فارسی کا سکہ رواں تھا ہر کیف مسلمانوں نے بنگلہ ادب کی سرپرستی کی اور کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد انہوں نے بنگلہ کو اپنی مادری زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ مذہبی خیالات رکھنے والے افراد نے بھی محسوس کیا کہ اگر بنگلہ کو موقع دیا جاتا تو وہ بھی مذہبی اقدار کی نشر و اشاعت میں فارسی اور اردو کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ بہرحال اب وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے بنگلہ میں بنیادی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اسلام اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ اسی سبب سے آج بنگلہ بھی مذہبی افکار کی نشر و اشاعت میں ویسی ہی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ جیسی کہ اردو البتہ ابھی اس میں اردو کے برابر سرمایہ پیدا نہیں ہو سکا۔

بنگلہ دیش سابق مشرقی پاکستان جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی جارحیت کی وجہ سے پاکستان سے کٹ کر ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ (بنگلہ سرکار کے طور پر قیام ریاست کی تاریخ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے۔) یہ ریاست مشرقی بنگال اور ضلع سلہٹ پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال مشرق اور مغرب میں بھارت جنوب مشرق میں برما اور جنوب میں خلیج بنگال ہے۔ اس کا رقبہ ۵۵،۱۲۶ مربع میل (۱۴۲،۷۷۶ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۴ء) ۷۱،۳۱۶،۵۱۷ ہے۔ صدر مقام ڈھاکہ ہے جس کی آبادی (۱۹۷۴ء) تیرہ لاکھ کے قریب ہے۔ دوسرے بڑے شہر چٹاگانگ، کپتائی، کھلنا، باریسال، کومیلا، نرائن گنج، راجشاہی، میمن سنگھ اور سید پور ہیں ۱۹۰۹ء میں بنگلہ دیش کے صدر الرسادات صام ہیں۔

تاریخ:- بنگلہ دیش، بھوک، قحط اور سیلابوں کی سرزمین ہے۔ پٹ سن چاول، نیل اور چائے کا مرکز ہونے کے باوجود وہاں کی معیشی حالت دگرگوں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہاں کی بے حساب اور روز افزوں آبادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اقتصادی حالات کی وجہ سے اہل بنگال کبھی بھی مرکز کے وفادار نہیں رہ سکے۔ بنگال اور مشرقی پاکستان کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ بنگلہ دیش کبھی بھی معیشی اور سیاسی مصائب کے چنگل سے نہیں نکل سکا۔

۱۹۰۶ء میں بنگال سے مسلم لیگ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ نواب سلیم اللہ اور فضل حق جیسے مشاہیر نے تحریک پاکستان میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ لیکن حالات گذرنے کے ساتھ ساتھ اہل بنگال کی مقامی عصبیت اپنا رنگ دکھاتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی پانے کے ساتھ ہی بنگلہ دیش پاکستان کے ایک صوبے "مشرقی پاکستان" کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ مگر حسین شہید سہروردی کی جماعت عوامی لیگ نے فوراً بنگالی زبان کو قومی بنانے کا نعرہ لگانا شروع کر دیا، جسے قائداعظم نے بامر مجبوری تسلیم کر لیا۔ یہیں سے علیحدگی کے عناصر نے جنم لینا شروع کیا۔ اسی جماعت کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو ۱۹۶۶ء میں صدر پاکستان محمد ایوب خاں نے علیحدگی کی ایک سازش کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس سازش کا نام "اگرتلہ سازش کیس" رکھا گیا۔ انہی دنوں ایوب خان کے خلاف ایک ملک گیر تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمن کو بھی رہا کرنا پڑا۔ انہوں نے آتے ہی علیحدگی کا چھ نکاتی پروگرام پیش کیا۔ جس میں مرکز کے پاس سوائے امور خارجہ کے کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔

انتخابی تحریک شروع ہوئی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ عوامی لیگ نے کل تین سو نشستوں میں سے ۱۶۷ نشستیں حاصل کیں۔ اب دو متضاد قوتیں برابر آ چکی تھیں۔ شیخ مجیب الرحمان نے اپنی اس اکثریت کے بل بوتے پر عوامی تحریک کا آغاز کر دیا۔ جس سے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی اور متوازی حکومت کا آغاز ہو گیا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو صدر پاکستان جنرل محمد یحییٰ خاں نے شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کر لیا۔ انہیں مغربی پاکستان لایا گیا اور فوج کو نظم و ضبط قائم کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ عوامی لیگ

کے نیم تربیت یافتہ رضاکاروں نے بھارت سے امداد کی خواہش کی اور "مکتی باہنی" کے نام سے ایک چھاپہ مار فوج تشکیل دے کر پورے صوبے میں پھیل گئی۔ اگست ۱۹۷۱ء کے قریب پاکستانی فوجوں نے حالات پر قابو پالیا۔ مگر مکتی باہنی اور دیگر باغی عناصر بھارت کی پناہ میں چلے گئے۔ جسے بہانہ بنا کر ۲۱ رنومبر ۱۹۷۱ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا۔ پاکستانی فوجوں کی کمک اور رسد بند ہوگئی۔ بیرونی اور اندرونی دشمنوں کی وجہ سے ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں پاکستانی فوجوں نے صلح کے لیے ہتھیار ڈال دیے۔ بھارتی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہوگئیں اور مشرقی پاکستان کا صوبہ پاکستان سے کٹ گیا۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے بنگلہ دیش حکومت کے قیام کا اعلان کردیا تھا۔ پاکستان میں نظام حکومت جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے خیر سگالی کے طور پر شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کردیا۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں شیخ مجیب الرحمٰن بنگلہ دیش کے پہلے صدر بنے۔ ۱۲ر جنوری سے ابوسعید چودھری کو بنگلہ دیش کا صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن

کو وزیر اعظم منتخب کرلیا گیا۔ بھارت کے ساتھ دوستی اور تعاون کے پچیس سالہ معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ شیخ مجیب کو "بنگ بندھو" (بنگال کے دوست) کا خطاب دیا گیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے بنگال کی تباہ حالی، اقتصادی بدحالی، قحط اور سیلابوں کے بے شمار مسائل کے علاوہ سیاسی اور انتظامی نوعیت کے مسائل بھی تھے۔ بنگلہ دیشی سکہ "ٹکہ" ایک ہی برس میں پچاس فیصد کم قیمت کا ہوگیا۔ قحط اور بدنظمی سے ہزاروں بنگالی موت کے گھاٹ اترنے لگے تو عوامی لیگ کی مخالف جماعتیں سرگرم ہوگئیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کے صدر عبدالحمید خاں بھاشانی نے نئے انتخابات کا مطالبہ کردیا۔ ۵ر نومبر ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی نے نئے آئین کی منظوری دے دی جو ۱۶ر دسمبر سے عمل میں آیا۔ نئے انتخابات کی تاریخ مارچ ۱۹۷۳ء رکھی گئی۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک روس تھا۔ جس نے جنوری ۱۹۷۲ء میں اسے تسلیم کرلیا۔ برطانیہ نے فروری میں اسے تسلیم کرلیا اور بنگلہ دیش اپریل ۱۹۷۲ء میں دولت مشترکہ کا رکن بن گیا۔ پاکستان نے اس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جب تک شیخ مجیب الرحمٰن نے بھارت پر یہ دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ پاکستان کے ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کو روکے رکھے۔

دسمبر ۱۹۷۳ء میں صدر ابوسعید چودھری کے مستعفی ہونے پر جنوری ۱۹۷۴ء میں [illegible] کو نیا صدر منتخب کیا گیا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کی پہلی مردم شماری ہوئی [illegible] رپورٹ جون ۱۹۷۴ء میں شائع کی گئی۔ جس کے مطابق بنگلہ دیش کی آبادی ۷،۱۴۹،۵۱۲ [illegible] جو ۱۹۶۱ء کے مقابلے میں ۴۰ء۲۰٪ زیادہ ہے۔

۲۲ر فروری ۱۹۷۴ء کو شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنے آئے۔ جس کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو ڈھاکہ گئے تاکہ بھارت اور [illegible] کی مشترکہ قید میں موجود ۱۹۵ محب وطن پاکستانیوں کو رہا کرایا جاسکے۔ [illegible]

جولائی ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کو سیلاب نے گھیر لیا [illegible] میل کا رقبہ زیر آب آگیا۔ کھڑی فصلیں تباہ ہوگئیں اور [illegible] تقریباً ایک تہائی آبادی اس مصیبت کا شکار ہوئی۔ [illegible] صرف سیلاب سے ۱۵ سو افراد ہلاک ہوئے۔ [illegible] مصیبت [illegible] بعد کھڑی ہوئی، خانہ جنگی تھی۔ بھوک کے عوام شیخ مجیب الرحمٰن [illegible] چھٹکارا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ مظاہرے [illegible] ہنگاموں میں کوئی [illegible] افراد مارے گئے۔ [illegible] دسمبر ۱۹۷۴ء کو ملک بھر میں ہنگامی حالت کا [illegible] مجیب حکومت کو سخت اقدامات کرنے پڑے۔

۱۵ر اگست ۱۹۷۵ء کی درمیانی شب [illegible] منایا جا رہا تھا بنگلہ دیش کے چند فوجی عناصر نے [illegible] تختہ الٹ دیا۔ ایک ہنگامے میں پہلی [illegible] مشتاق احمد خوندکر [illegible] حکومت کا تختہ الٹ دیا [illegible] قائم کردیا۔ [illegible] بنگلہ دیش کے [illegible] ایک [illegible] [illegible] منتخب ہوئے۔ لیکن چند ماہ کے بعد [illegible] اور خود صدر بن گئے۔

اقتصادی اور دیگر معلومات: [illegible] ۱۹۷۲ء میں چاولوں کی پیداوار ایک کروڑ لاکھ میٹرک ٹن [illegible] میٹرک ٹن، چائے [illegible] پیاز دو لاکھ میٹرک ٹن [illegible] برآمدات چائے اور پٹ سن پر مشتمل ہیں۔ [illegible]

بنگلہ دیش کے باشندے [illegible] کی ملکی پیداوار [illegible] کم ہے۔ چنانچہ ہر سال [illegible] وافر مقدار [illegible] ۱۹۷۲ء میں [illegible] بنانے والی [illegible] ہنر کے رکھنے والے تھے۔ اپنا سلسلہ نسب [illegible]

ں اور ... محیل ایک لاکھ ٹن تھی۔

بنگلہ دیش ... ۶۶۰ ... مربع میل کا رقبہ جنگلوں پر مشتمل ہے جن سے سالانہ ... عمارتی لکڑی برآمد ہوتی ہے۔ اس میں بانس اور بید شامل ہیں۔ ان جنگلوں سے ... خالص شہد بھی برآمد ہوتا ہے۔

بنگلہ دیش کی صنعت میں اس وقت کپڑے کے ۴۴ کارخانے، چینی کی سات فیکٹریاں ... سات فیکٹریاں ... کا ایک کارخانہ ... کارخانے موجود ہیں۔ ان [illegible]

[illegible]

... جیسے ڈھاکہ ... پٹ سن کے ... [illegible]

[illegible]

باپ کی طرف سے شاہ عباس ثانی اور ماں کی طرف سے شہنشاہ عالمگیر سے ملتا تھا۔ اس خاندان کا جد امجد میر طاہر علی ترک وطن کر کے ایران سے بیجاپور آیا جہاں ایک خاندانی جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کی بیوہ نے چار بیٹوں کے ساتھ ارکاٹ کے مغل فوجدار سے پناہ طلب کی۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک نے بنگن پلے کے جاگیردار کی بیٹی سے شادی کر لی۔

بنگن پلے پر مختلف فرمانرواؤں کی حکومت رہی۔ ۱۶۴۳ء میں بنگن پلے وجیانگر کی ریاست کے ایک بڑے حصے کے ساتھ بیجاپور کے زیر اقتدار آیا تو یہاں آصف جاہی حکومت قائم ہوئی۔ بعد میں یہ ریاست حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی ماتحتی میں رہی۔ ۱۷۹۰ء میں بنگن پلے کے خاندان کے کسی فرد نے سلطان ٹیپو کے فوجدار کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۰ء میں اس پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء تک یہ مدراس کے ماتحت رہی اور اس کے بعد سے اس کا انتظام برطانوی حکومت ہند نے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۲۶ء میں نواب ... کا خاندانی لقب دیا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ... کا خطاب دیا۔ ۱۹۴۰ء میں نواب میر فضل علی خان کے دور میں اس ریاست کو ریاست مدراس میں ضم کر دیا گیا۔

بنو: ... ان کی جمع بنون ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے ن حذف ہو گیا۔ اور بنو رہ جاتا ہے۔ عربی کے لیے کسی قبیلے کے جد امجد کا نام بطور مضاف الیہ آتا ہے۔ جیسے بنو امیہ، بنو عباس، بنو اسرائیل وغیرہ۔ اسی طرح بنو بکر، بنو شیبان، بنو تغلب، بنو عجل، بنو حنیفہ اور بنو تمیم کے لیے دیکھیے: بکر بن وائل۔

بنور: بھارت کے صوبہ مشرقی پنجاب کا ایک قدیم شہر جو انبالہ سے نو میل اور سرہند سے تیرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا قدیم نام ... پور تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بنی پور اور بالآخر بنور ہو گیا۔

بنور کا ذکر سب سے پہلے بابر نے کیا ہے۔ یہ علاقہ سفید مخمل کے پھولوں اور عطر کے لیے مشہور ہے اور آج بھی یہ چیز بنور کی شہرت کے لیے بالکل اسی طرح ہے

... میں بنگلہ دیش میں ... کا ایک سیلابی منظر

ایک روایت کے مطابق اس کا قدیم نام پشپا نگری یا پشپاوتی تھا جس کے لغوی معنی پھولوں کا شہر کے ہیں۔ بنور کو خاندان سادات کے دور میں خاص شہرت حاصل تھی۔ ۱۹۴۷ء تک یہاں پر زیادہ تر آبادی سادات ہی کی تھی یہ سادات ہلاکو کے ہاتھوں تباہی بغداد کے بعد ہجرت کر کے بھارت چلے آئے تھے۔ سید ذوالفقار خضر خان کے والد ملک سلیمان خان کا مزار ۱۹۴۷ء تک اس شہر میں موجود تھا۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی میں ایک سکھ حملہ آور بندہ بیراگی نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳ء میں بنور کو رئیس پٹیالہ الاسنگھ نے فتح کیا جو ۱۹۵۶ء تک اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہا اور جب ریاست پٹیالہ "مشرقی پنجاب" کے نئے صوبے میں مدغم کر دی گئی تو بنور بھی صوبہ مشرقی پنجاب کا ایک شہر شمار ہونے لگا۔

بنور میں مغلوں اور سکھوں نے اس کے استحکام کے لیے دو قلعے بھی تعمیر کرائے تھے۔ جن کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ بنور کے کھنڈر، جات تک جو بنور سے چار میل دور ایک قدیم اور ویران شہر ہے چلے گئے ہیں سید آدم بنوری اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ موجودہ شہر کی آبادی کوئی اڑھائی لاکھ کے قریب ہے۔

بنوری، ابو عبداللہ (وفات ۱۳ شوال ۱۰۵۳ھ / ۲۵ دسمبر ۱۶۴۳ء) معزالدین آدم بن سید اسماعیل۔ شیخ احمد سرہندی کے خلیفۂ خاص۔ ۱۶۴۲ء میں اپنے دس ہزار مریدین کو لے کر لاہور آئے تو شاہجہان نے وزیر اعظم علامہ سعد اللہ خاں اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو ان کی اتنی کثیر تعداد کے ساتھ لاہور میں آمد پر تحقیقات کرنے پر مامور کیا گیا۔ شاہجہان شیخ بنوری کے جواب سے مطمئن نہ ہوا اور انہیں لاہور سے بنور اور پھر بنور سے مکہ معظمہ کی طرف بغرض حج نکل جانے کو کہا۔

بنوری اپنی زندگی کے پہلے حصے میں کچھ عرصہ فوج میں صیغہ جزرسائی کے محکمے میں ملازمت کی لیکن ان کے زہد اور تقویٰ کے سبب ملازمت کا سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ پہلے حاجی خضر روغانی کے حلقۂ ارادت سے وابستگی اختیار کی اور پھر انہیں کے مشورے سے حضرت شیخ احمد سرہندی کی بیعت کی۔ انہوں نے صوفیا و فقراء کی تلاش میں ملتان، انبالہ، پانی پت، شاہ آباد، سرہند، لاہور اور سامانہ کا سفر کیا۔ ان کی تعلیم کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے انہیں امی عامی کہا ہے اور بعض کے نزدیک وہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ تھے۔

بنوری نے مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ کے قریب دفن ہوئے۔ ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ انتقال کے وقت ان کے عقیدت مندوں کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مذہبی تعلیم اتنی زیادہ نہ تھی۔ ان کا رویہ متشدد تھا حکام سلطنت سے نفرت تھی چنانچہ وہ ہر وقت تنقید و اعتراض کا ہدف بنتے رہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنے مسلک اور مقصد پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ ان کے خلفاء میں تقریباً ایک سو کے لگ بھگ افراد کا نام لیا جاتا ہے۔ جن میں حافظ عبداللہ اکبرآبادی جو شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے روحانی پیشوا اور سید علم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

بنوری کی تصانیف میں سے مشہور ترین ۱۔ نکات الاسرار جس میں تصوف کے دقیق مسائل پر بحث کی گئی ہے اور ان کی شرح تصوف کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ ۲۔ خلاصۃ المعارف (دو جلدیں) فارسی زبان میں ہے ۳۔ سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہے۔

بنوری، محمد یوسف، مولانا (پیدائش ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ / ۷ مئی ۱۹۰۸ء) سید محمد یوسف بن محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بنوری پاک و ہند کے ایک بہت بڑے عالم دین، شیخ الحدیث اور مصنف پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد، ماموں اور اپنے علاقے کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ کابل بھی گئے اور وہاں کے علماء سے فیض حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند کا سفر اختیار کیا اور دارالعلوم دیوبند میں تکمیل تعلیم کی۔

آپ کے اساتذہ میں حافظ عبداللہ بن خیر اللہ پشاوری۔ مولانا عبدالقدیر قاضی القضاۃ جلال آباد کابل۔ شیخ محمد صالح قیلنوی افغانی اور مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری وغیرہم ہیں۔ مولانا انور شاہ کاشمیری سے آپ نے دورہ حدیث کیا اور سند حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انور شاہ کاشمیری کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہیں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔

۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں ڈابھیل کی مجلس علمی کی طرف سے حجاز، مصر، یونان ترکی کا سفر کیا۔ دوران سفر میں آپ نے وہاں کی بڑی بڑی اور علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ کے ارباب حل و عقد کے شدید اصرار پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو چھوڑ کر دارالعلوم میں شیخ التفسیر اور شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور تین سال تک یہ خدمت سرانجام دینے کے بعد کراچی تشریف لے گئے۔ وہاں سے حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا۔ حج سے واپسی پر نیو ٹاؤن کراچی نمبرہ میں ایک علمی ادارہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔

علامہ بنوری عربی زبان کے صاحب طرز ادیب تھے۔ شاعرانہ ذوق رکھتے تھے اور بہترین نعتیں لکھی ہیں جو ایک علمی رسالے "الاسلام" میں چھپ چکی ہیں۔ آپ اردو، فارسی، پشتو اور عربی چاروں زبانوں کے ادیب اور شاعر تھے۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے آپ دمشق کی مجلس علمی کے ممبر تھے۔

تصوف میں آپ مولانا اشرف علی تھانوی کے مجاز صحبت [illegible] ۱۹۴۶ء میں جب آپ مکہ مکرمہ گئے تو وہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی [illegible] مولانا محمد شفیع الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے نوازے گئے۔ [illegible] ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوا۔

تصانیف میں آپ کی مشہور ترین کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عوارف المنن مقدمہ معارف السنن (عربی)
۲۔ معارف السنن شرح جامع ترمذی (عربی) چھ جلدیں
۳۔ بغیۃ الاریب فی احکام القبلۃ والمحاریب (عربی)
۴۔ نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ الانور (عربی) (مولانا انور شاہ کاشمیری کی سوانح)
۵۔ یتیمۃ البیان فی مشکلات القرآن (عربی)
۶۔ تسخیر کائنات اور اسلام (اردو)
۷۔ ختم نبوت۔

ان کے علاوہ جن کتابوں پر آپ نے مقدمے لکھے ہیں وہ بجائے خود ایک تصنیف ہیں۔ ان میں سے فیض الباری شرح بخاری۔ مقدمہ مشکلات القرآن۔ مقدمہ عبقات، مقدمہ عقیدۃ الاسلام بنزول عیسیٰؑ۔ مقدمہ نصب الرایہ لتخریج الهدایہ۔ مقدمہ مقالات الکوثری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بنوں پاکستان کا ایک شہر اور ضلع، جو صوبہ سرحد میں واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء میں شہر کی آبادی ۱۲،۵۱۶ اور ضلع کی آبادی ۳۰۷،۲۹۲ تھی، ۱۹۷۲ء میں شہر کی آبادی ۴۳ ہزار اور ضلع کی آبادی ساڑھے پانچ لاکھ کے قریب تھی۔

بنوں کا شہر انگریزوں نے آباد کیا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں ایک فوجی افسر لیفٹیننٹ ہربرٹ ایڈورڈز نے اسے آباد کیا اور اس کا نام ایڈورڈ آباد رکھا جو بعد میں اس وادی کے قدیم نام اور قبیلے بنوچیوں کے نام پر بنوں کہلایا۔ اس وادی پر زمانۂ قدیم سے مختلف حملہ آوروں کی یورشیں ہوتی رہیں۔ محمود غزنوی کے بعد دو صدیوں تک یہ علاقہ مغلوں کے پاس رہا۔ ۱۷۳۸ء میں اسے نادر شاہ افشار ایرانی نے فتح کیا اور پھر احمد شاہ درانی کی فوجوں نے اسے پامال کیا۔ ۱۸۲۳ء میں لاہور کے سکھ راجا رنجیت سنگھ نے اس وادی پر قبضہ کیا اور پہلی جنگ کے بعد ۱۸۴۹ء میں یہ علاقہ برطانیہ کے قبضے میں آگیا تو شہر بنوں کی بنا رکھی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس شہر نے کوئی حصہ نہیں لیا۔

بنوں شہر بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہاں گرم کپڑے کی ایک مل بھی ہے جس کی وجہ سے یہ ایک تجارتی مرکز بن گیا ہے۔ شہر کے قریب ہی اکرہ نام کا ایک ٹیلہ ہے جس کے پاس سے پرانے دور کے آثار قدیمہ ملے ہیں۔

بنی اسرائیل، سورۃ قرآن مجید کی ۱۷ویں سورت۔ اس میں ۱۲ رکوع اور ۱۱۱ آیات ہیں۔ مکی دور کی آخری سورتوں میں سے ہے۔

اس سورت کا نام اسرائیل ہے۔ اس کی پہلی ہی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ سورۃ معراج کے موقع پر نازل ہوئی جو ہجرت سے ایک سال قبل پیش آیا تھا۔ سورت کی ابتدا آنحضورؐ کے واقعہ معراج سے کی گئی ہے اور اس واقعہ میں مسجد اقصیٰ کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ وہ برکات جو بیت المقدس سے تعلق رکھتی تھیں اور جن کے ساتھ بنی اسرائیل کو مخصوص کیا گیا تھا اب وہ برکات آنحضورؐ اور امت محمدیہؐ کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہیں۔ معراج نبوی میں گویا عروج اسلام کا ذکر کر کے مضمون کا رخ بنی اسرائیل کی دو مرتبہ فساد عظیم برپا کرنے اور ان پر دو مرتبہ سزا آنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ذکر سے ایک طرف تو بنی اسرائیل کو سمجھانا مقصود ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے۔

دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اعلیٰ اغراض زندگی کو ترک کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی قومیں دنیا میں بھی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور اسی ضمن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا ہر ایک عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ نتائج یہاں انسان کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اور قیامت کے روز کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ دنیا میں بھی جب کوئی قوم حد سے تجاوز کرتی ہے تو یہ نتائج کھلا رنگ اختیار کر کے سامنے آجاتے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے رکوع میں عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور بار بار کرایا گیا ہے کہ یہی اعلیٰ اغراض زندگی ہیں جن کی طرف انسان کو متوجہ ہونا چاہیے۔ اسی تعلیم میں توریت کی بھی ساری تعلیم آگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تیسرے رکوع میں دوسروں سے نیکی کرنے کی تعلیم دی گئی ہے چوتھے رکوع میں دوسرے کے ساتھ برائی کرنے سے روکا ہے۔

پانچویں رکوع میں توحید کا مضمون شروع کر کے آخرت پر ایمان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر جب تک آخرت میں اعمال کی جزا و سزا پر پورا یقین نہ ہو اخلاق فاضلہ حاصل نہیں ہو سکتے۔

چھٹے رکوع میں اسی قانون جزا و سزا کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے عذاب خداوندی کے آنے کا قانون بتایا گیا ہے۔

ساتویں رکوع میں آنحضورؐ کے مخالفین پر عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

آٹھویں رکوع میں کفار کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو وہ آنحضورؐ کے خلاف کرتے تھے۔ دکھوں اور تکلیفوں کے بعد آنحضورؐ کو بادشاہت اور دولت کا لالچ دینا اور بالآخر آپؐ کے قتل کا منصوبہ۔

نویں میں حق کی کامیابی کی عظیم الشان بشارت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ باطل پرستی اب اس ملک سے ایسی دور ہوگی کہ پھر دوبارہ نہ آئے گی اور ضمناً یہ بھی سمجھا دیا کہ دنیا میں روز بروز توحید کا غلبہ ہوتا چلا جائے گا۔

دسویں رکوع میں قرآن پاک کے اعجاز عظیم کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ظاہر پرست مخالفین ظاہری کامیابی اور مال و دولت ہی کو معیار صداقت ٹھہرانے میں غلطی پر ہیں۔

گیارہویں رکوع میں انکار رسالت اور اس کی سزا کر کے

بارہویں رکوع میں پھر شریعت موسوی اور اس کی صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شریعت محمدیہ اور اس کی حقانیت کا ذکر کیا ہے اور آخری آیات میں سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری نبی عیسیٰؑ کے متعلق عقیدہ ابن اللہ کا رد کیا ہے۔

بقول مولانا مودودی اس سورت میں تنبیہ، تفہیم اور تعلیم تینوں ایک متناسب انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔

تنبیہ کفار مکہ کو کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے انجام سے سبق لو۔ خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر سنبھل جاؤ اور ضمناً بنی اسرائیل کو بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ پہلے جو سزائیں تمہیں مل چکی ہیں ان سے عبرت حاصل کرو۔

تفہیم کے پہلو میں بڑے دلنشیں طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ انسانی فلاح کا مدار دراصل کن چیزوں پر ہے۔ نیز توحید، معاد، نبوت اور قرآن کے برحق ہونے کی دلیلیں بڑے دل نشیں انداز میں دی گئی ہیں۔

تعلیم کے پہلو میں اخلاق اور تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر زندگی کے نظام کو قائم کرنا دعوت محمدی کے پیش نظر تھا اور یہ گویا اسلام کا منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہل عرب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔"

بنیامین حضرت یعقوبؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ بنیامین اور حضرت یوسفؑ ایک ہی ماں سے تھے اور حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

قرآن مجید میں ان کا ذکر بغیر نام دیئے کیا گیا ہے۔

"یوسفؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا دیکھتے نہیں کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں"۔ ...... یہ لوگ یوسفؑ کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھویا گیا تھا۔) اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ جب یوسف ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا۔ "بادشاہ کا پیمانہ ہمیں نہیں ملتا۔" (اور ان کے جمعدار نے کہا) جو شخص لا کر دے گا۔ اس کے لئے ایک بار شتر انعام ہے۔ اس کا میں

ذمہ لیتا ہوں۔" ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔" انہوں نے کہا "اچھا اگر تمہاری بات جھوٹ نکلی تو چور کی کیا سزا ہے"۔ انہوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔" تب یوسفؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کردی، پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کرلی۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی...... ان بھائیوں نے کہا "یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں۔ اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسفؑ) بھی چوری کرچکا ہے۔ یوسفؑ ان کی یہ بات سن کر پی گیا۔ (۱۲ : ۵۸تا۷۷)

بنیامین کے قبیلے کا شمار بنو اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں ہوتا تھا۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اسی طرح بنیامین کی اولاد میں اسرائیلی سردار بھی ہو گذرے ہیں جن میں طالوت بن قیس الدباغ اور یشبوشت بن طالوت قابل ذکر ہیں۔

بواط، غزوہ ایک مہم جو آنحضورؐ کو ۲ھ میں پیش آئی۔ مگر اس میں جنگ تک نوبت نہیں پہنچی۔ دراصل ہجرت کے بعد سے مشرکین نے نوزائیدہ اسلامی ریاست کے خلاف طاقت آزمائی کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ چنانچہ وصال نبویؐ تک دس برس کی مختصر مدت میں آنحضورؐ کو تقریباً مسلسل حالت جنگ میں رہنا پڑا۔ دشمن کے مقابلے میں چوکنا رہنے کی ہر وقت ضرورت تھی۔ آپ صحابہ کرامؓ کے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے مختلف اطراف میں روانہ فرماتے رہتے تھے۔ بعض مہمات میں آنحضورؐ بنفس نفیس شریک ہوتے۔ ربیع الاوّل ۲ھ میں آپ دو سو مہاجرین کو لے کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کو خائف کرنے کی غرض سے بواط تشریف لے گئے۔ سعدؓ بن معاذ مدینے میں نائب مقرر ہوئے لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور آپؐ چند روز بعد واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ تاہم مورخین نے اس مہم کو غزوہ ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔

بوٹی شاہ انیسویں صدی عیسوی کا ایک مورخ۔ غلام محی الدین لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ بطور تاریخ نویس شہرت پائی۔ اس کی مشہور ترین کتاب تاریخ پنجاب ہے جو اس نے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں لکھی یہ تاریخ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایک خاتمے کا باب ہے۔ اس کے مقدمے میں پنجاب کی وجہ تسمیہ اور وہاں کے جغرافیائی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں سدومن سے رائے پتھورا تک کے حالات درج کئے ہیں۔ تیسرے باب میں سکھوں کے گورونانک سے گرو گوبند سنگھ اور اس کی اولاد کا ذکر ہے۔ اور باب چہارم میں سکھ سرداروں اور مہاراجاؤں کے جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد برسر اقتدار آئے۔ حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اس کے پانچویں باب میں رنجیت سنگھ کے تسلط اور انگریزوں کی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے پنجاب کے حالات اس قدر تفصیل سے کسی دوسری کتاب میں درج نہیں ہیں۔

بوحمارہ (۱۱۷۹ھ/۱۸۶۵ء۔ یکم رمضان ۱۳۲۷ھ/۱۵ستمبر ۱۹۰۹ء) جلالی بن ادریس مراکش کا ایک باغی۔ کوہستان زرہون میں پیدا ہوا۔ انجنیئری کی تعلیم حاصل کی اور حکومت کے ایک معمولی شعبے میں ملازم ہوگیا۔ لیکن جلد ہی بعض الزامات کی بنا پر اسے ملازمت سے سبکدوش کرکے قید کردیا گیا۔ بعد میں وہ الجزائر چلا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں واپس آگیا اور اپنا نام تبدیل کرکے مولائی عبدالعزیز کا بھائی ہونے کا دعوے کردیا اسی بناء پر قبیلہ غیاطہ کی بہت سی شاخوں نے اسے اپنا سلطان تسلیم کرلیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد بعض دوسرے قبیلے بھی اس کے ہمنوا بن گئے۔ ۱۹۰۲ء میں تازا کے مقام پر تخت نشین ہوا۔ یہ اکثر گدھی پر سوار ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا لقب بوحمارہ پڑگیا۔

مولائی عبدالعزیز نے اس کے خلاف ۱۹۰۲ء میں بعض مہمات روانہ کیں لیکن انہیں شکست ہوئی۔ بالآخر ۱۹۰۳ء میں شریفی عساکر نے اسے فاس کے قریب شکست دی اور اس کے دارالحکومت پر بھی قبضہ کرلیا لیکن بوحمارہ نے دوبارہ اپنی شکست خوردہ فوج کو جمع کیا اور دو ادر سرغنوں کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اس کے ساتھ اس نے اہل ہسپانیہ سے بھی بات چیت شروع کردی اور یقین دلایا کہ اس علاقے میں انہیں کان کنی کے لئے مراعات مل سکتی ہیں۔

۱۹۰۸ء میں اس نے تازا پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اور فاس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ نئے سلطان مولائی عبدالحافظ نے کئی بار فوجیں بھیجیں۔ بالآخر ۱۹۰۹ء میں وہ بوحمارہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بوحمارہ کو گرفتار کرکے ایک پنجرے میں بند کرکے فاس کے بازاروں میں پھرایا گیا۔ اور بعد میں گولی مار کر ہلاک کردیا گیا اور نعش کو جلا دیا گیا۔

بودلہ بہار (وفات ربیع الثانی ۱۰۶۰ھ/اپریل ۱۶۵۰ء) ہندوستان کے ایک بزرگ صوفی بہبود علی نام تھا بودلہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ والد بہت [illegible] تھے جو اپنی وفات کے بعد بہت سا مال و دولت چھوڑ گئے تھے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے ساری دولت خدا کی راہ میں دے کر راہ فقر اختیار کی۔ [illegible] شاہ معین الدین علی کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کی۔ ریاضت [illegible] ہوگئے۔ سلطان عبداللہ شاہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد [illegible] دبیرپورہ میں سکونت اختیار کرکے خلق خدا کو فیض پہنچایا۔ [illegible] کے معجزات اکثر کتب میں درج ہیں۔ دبیرپورہ دروازہ میں آپ کا مزار ہے [illegible] میں آپ کا سالانہ عرس مبارک بڑے شاندار طریقے سے منایا جاتا ہے۔

بوران تاریخ کی دو مشہور عورتیں۔ ایک خلیفہ المامون کی زوجہ اور دوسری [illegible] بیٹی خلیفہ المامون کی بیوی کا نام خدیجہ اور بوران لقب تھا۔ اس کا باپ حسن بن سہیل تھا جو المامون کا ایرانی وزیر تھا۔ صفر ۱۹۲ھ/دسمبر ۸۰۰ء [illegible] کی عمر میں مامون سے نکاح ہوا۔ اور رخصتی کی رسوم رمضان ۲۱۰ھ/دسمبر ۸۲۵ء میں واسط کے قریب حسن بن سہیل کی اپنی جاگیر میں فم الصلح کے مقام پر ادا کی گئی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ جن دنوں شادی کی رسوم ادا کی گئیں۔ ان دنوں بوران کا باپ وزیر نہیں تھا۔ لیکن مامون کی خواہش تھی کہ اس خاندان سے اپنی وابستگی کا اظہار بڑے عمدہ طریق سے کرے۔ اسی موقعہ پر بوران نے ابراہیم بن المہدی کی سفارش بھی کی تھی۔ بوران نے تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بوران کی رہائش اس محل میں تھی جو جعفر برمکی کی ملکیت تھا اور بعد میں قصر الحسن کے نام سے مشہور ہوا۔ حسن نے یہ محل بوران کو جہیز میں دے دیا تھا۔ بوران کے انتقال کے بعد یہ محل خلیفہ کی ملکیت میں آگیا۔

بوران یا بوران دخت۔ خسرو پرویز کی بیٹی اور ساسانی ملکہ اس نے ۶۳۰ء

میں ایک مختصر مدت تک حکومت کی۔

بورنو نائیجیریا اور سوڈان کا ایک علاقہ، اس کا جغرافیائی لحاظ سے کبھی واضح تعین نہیں ہوسکا۔ اس کا رقبہ پنتالیس ہزار نو سو مربع میل ہے۔ ایک وسیع ریتلے میدان پر مشتمل ہے۔ اس کا پانی دو ندیوں میں بہتا ہے جو جھیل شاد کے دلدلی کنارں پر جاکر اس علاقے کے شمال مشرق کونے پر باہم مل جاتی ہیں۔ عہد قدیم میں دریائے شری کو بورنو کی مشرقی سرحد خیال کیا جاتا تھا اور بلاد بگرمی سے بورنو کو جدا کرتا تھا اس علاقے پر جرمن قابض تھا ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد عارضی طور پر یہ علاقہ برطانیہ عظمیٰ کی حفاظت میں دے دیا گیا تھا۔ بعد میں اسی صوبے میں بورنو اور دکوہ کے شیوخ کی ریاستیں اور کچھ دوسرے انتظامی حلقے بھی شامل کر دیئے گئے۔

بورنو کی قدیم تاریخ سلطنت کانم کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ بورنو کا سب سے پہلا بادشاہ شہنشاہ کانم سیف نامی ایک شخص تھا۔ عہد قدیم میں اس خطے کی حکمران جماعت کو معنی کہا جاتا تھا اور یہ حکمران جماعت سفید رنگ والی تھی۔ اس کی اصل کا تعلق طوارق سے ہے جنہوں نے اپنے شمال کی تبو قوم کو اپنے اندر ضم کر لیا اور سلطنت [illegible] کی بنیاد ڈالی۔ انہی حکمرانوں نے سلطان بری بری کو ریاں آباد ہونے کی اجازت دی۔ اس سلطنت نے گیارہویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یہ اسلامی سلطنت بہت طاقتور ہوگئی تھی۔ اور اس کا اثر شمال مشرق میں [illegible] اور جنوب میں دکوہ تک پہنچ گیا تھا۔ ابن خلدون نے شاہ کانم اور مالک بورنو کا ذکر کیا ہے [illegible] بورنو سے مراد بحیرہ شاد سے دکوہ تک کا علاقہ مراد ہے ۱۳۸۹ء میں خاندان سیف کو اس کے ایک اور قریبی قبیلے نے کانم سے مار بھگایا۔ نیز بعد میں قبائلی نقل و حرکت سے کنوری قوم بحیرہ شاد کے مغرب میں آگے تک بڑھ گئی اور [illegible] میں دریائے یوبے پر نگر گمو کی بنیاد رکھی اسے بورنو کی مملکت اور کنوری قوم کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ جو تین سو سال تک ان کا دارالحکومت رہا۔ ۱۵۰۷ء میں ان لوگوں نے کانم کو دوبارہ فتح کر لیا اور اپنے سابقہ ملک کانم کو بھی بورنو کا ایک حصہ بنا دیا۔

سولہویں صدی عیسوی میں بورنو کی سلطنت کافی دور تک پھیل گئی۔ جن حکمرانوں نے بورنو کی حدود سلطنت کو وسعت دی ان میں سب سے زیادہ اہم مے ادریس امہ تھے جس نے ٹانو جیسے دور دراز علاقے تک لشکر کشی کی اور تبو کے قبائل کو بھی اپنا مطیع بنا لیا۔ بورنو پر اس کے بعد دو سال تک سکوت کا زمانہ رہا۔ بعد میں چند ایک عوامل ایسے پیش آئے جس نے بورنو کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ ان عوامل میں ایک تو سات سالہ قحط ہے اور دوسرے اہل مراکش کی سنغی کی فتح ہے جو بڑی عام پھیل گئی تھی اس کے اثرات بھی بورنو تک پہنچے۔ نیز انیسویں صدی کے شروع میں جب فلانیوں نے مغرب میں آگے تک جہاد کیا تو بورنو ان اثرات سے بھی متاثر ہوا۔ ۱۸۰۸ء میں بورنو کے فلانی گجبہ میں اکٹھے ہوگئے احمد بن علی کو شکست دی اور اس کے دارالحکومت نگر گمو کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ مے احمد کانم کی طرف بھاگ نکلا جہاں اس نے وہاں کے ایک رئیس کانمی سے امداد طلب کی اس نے مے احمد کو دوبارہ بحال کر دیا اور فلانیوں کو باہر نکال دیا لیکن مے احمد کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کو شکست دینے کے لیے پھر آموجود ہوئے۔ یہاں سے بورنو کی جدید تاریخ کا آغاز شروع ہوتا ہے۔ الکانمی نے بنو فلانی اور بلغرمی پر پھر فتح پائی اور سیف کے قدیم خاندان کو رسمی بادشاہوں کے طور پر بحال کر دیا۔ لیکن خود کگوہ پر قابض ہوگیا۔ ۱۸۳۵ء میں اس کے انتقال پر اس کا بیٹا عمر اس کا جانشین بنا۔ اس نے بنو فلانی سے صلح کر لی۔ اسی گفت و شنید کے دوران میں عمر کی غیر حاضری میں سیف کے شاہی خاندان نے وادی کے حکمران کو بلا کر کانم کے خاندان کو باہر نکالنے کی سازش کی جو ناکام رہی اور سیف خاندان کا آخری وارث ابراہیم لڑائی میں مارا گیا۔ اب عمر بورنو کا قانونی حکمران بن گیا۔ اس نے مے کی بجائے شہو (شیخ) کا لقب اپنایا اور کانم بو کے نام سے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس نے کگوہ کو دوبارہ تعمیر کرایا جو وادی کے لوگوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگیا تھا وادی کے ساتھ مسلسل جنگ نے بورنو کو بہت کمزور کر دیا تھا اور زندر کا خطہ آزاد ہوگیا۔

۱۸۹۳ء میں رباح ایک بڑی فوج کے ساتھ بورنو میں داخل ہوا۔ اس نے کگوہ کو ختم کیا اور دکوہ میں فوجی حکومت قائم کی۔ ۱۹۰۰ء رباح نے فرانسیسی فوج کے ہاتھوں شکست کھائی اور مارا گیا۔ رباح کا بیٹا فضل اللہ جو مغرب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں نائیجیریا میں گجبہ کے مقام پر ایک معرکے میں کام آیا۔ بعد میں فرانسیسی حکام نے شہو بکر گربائی کو لا کر خاندان کانمی کو بحال کر دیا۔ ۱۹۰۷ء میں شہو بکر سیدگری کے قریب بردہ میں منتقل ہوگیا۔ جو اب تک بورنو کا دارالحکومت چلا آرہا ہے دکوہ جرمن کیمرون کا حصہ ہوگیا تھا۔ جو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمنی کے شکست کھا جانے کے بعد انجمن اقوام نے برطانیہ اور فرانس کی تحویل میں دے دیا اور دکوہ برطانیہ کے علاقے میں آیا۔

بورنو میں کنوری، فلانی، الحوصہ، شوہ عرب اور کچھ دوسرے قبائل کے لوگ رہتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں بورنو کی کل آبادی ۱۱۱۸۳۹۰ تھی۔ کنوری، فلانی، شوہ عرب اور الحوصہ قبائل کا مذہب اسلام ہے۔ فقہی مذہب مالکی ہے۔ طریقت میں قادریہ اور تجانیہ کے حامی سب سے زیادہ ہیں۔ صوبے کے جنوبی اور جنوب مشرقی پہاڑی علاقوں میں رہنے والے قبائل بیشتر لامذہب ہیں۔

میدوگری میں ایک مستقل ہوائی اڈا ہے۔ پہلے زمانے میں غلاموں اور ہاتھی دانت کی تجارت ہوتی تھی۔ اب مونگ پھلی، کھالوں، گوند، روئی وغیرہ کی تجارت ہوتی ہے۔

چونکہ یہ خطہ نہ ہی صنعتی ہے اور نہ اس میں شہر ہیں۔ اس کی آبادی کا زیادہ تر پیشہ زراعت ہے۔

بورنیو جزائر شرق الہند کا دوسرا اور دنیا کا تیسرا سب سے بڑا جزیرہ۔ سیاسی اعتبار سے بورنیو تین جداگانہ یونٹوں میں تقسیم ہے۔ جس میں سے پہلے دو برطانوی دولت مشترکہ کا حصہ ہیں اور ایک انڈونیشیا جمہوریہ کا حصہ ہے۔ اس جزیرے کے بڑے انڈونیشی حصے کو کلی من تن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو انڈونیشی جمہوریہ کا ایک صوبہ ہے اور برطانوی حصہ برطانوی کارنی بورنیو اور مشرقی ملایا پر مشتمل ہے کل رقبہ ۵۱ ہزار مربع میل ہے۔

انڈونیشی بورنیو کے مشہور دریا کاپیوس، بارلٹو اور مہاکام ہیں۔ بورنیو کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق پچاس لاکھ اور ۱۹۷۴ء کے مطابق ساٹھ لاکھ ہے۔ جس میں سے انڈونیشی بورنیو کی آبادی تقریباً چار لاکھ ہے۔

اسلامی مطالعات کے نقطہ نظر سے اس جزیرے کی اہمیت بہت کم ہے کیونکہ بورنیو کے اندرونی علاقے کی تقریباً کل آبادی بے دین ہے۔ ساحلی علاقوں میں اسلام اور عیسائیت کا کچھ نفوذ ہوگیا ہے۔ اور اب آہستہ آہستہ بورنیو کے اندرونی علاقوں کی طرف پھیل رہا ہے۔ ۱۹۴۲ء سے سیاسی حالات عیسائی مذاہب کی بجائے اسلامی تبلیغ کے لیے سازگار ہوگئے۔ مسلمانوں کی سرگرمیوں کا اہم مرکز

مغربی ساحل پر پون تیانک ہے۔ (نیز دیکھیے "انڈونیشیا")

بُوسعید عمان اور زنجبار کا حکمران خاندان۔ اس خاندان کا بانی احمد بن سعید تھا جو عمان کے یَعرُبی امام سیف بن سلطان ثانی کے تحت صحار کا والی ہوگیا تھا۔ اس نے نادر شاہ کے سپہ سالار محمد تقی خان شیرازی کے حملے کے وقت صحار کا بڑی کامیابی کے ساتھ بچاؤ کیا۔ بعد میں اپنی حکمت عملی اور جنگی قوت کی بدولت احمد بن سعید عمان کا مالک بن گیا۔ غالباً ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں اس نے امام کا لقب اختیار کیا۔ بعض کے نزدیک ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں یہ لقب اپنایا۔ احمد ترکوں کا طرفدار تھا اور اس وجہ سے ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں اس نے بصرے کو بچانے میں ترکوں کی مدد کی تھی۔ اس نے ہندوستان کے بحری قزاقوں کو دبانے میں بھی اقدامات کیے اور اپنے دور میں تجارت کو فروغ دیا۔

۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں احمد کا بیٹا سعید تخت نشین ہوا لیکن وہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چنانچہ حکومت سے کنارہ کش ہوگیا اور اختیارات اپنے لڑکے حامد کے سپرد کر کے الرستاق میں چلا گیا جہاں غالباً ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

حامد نے ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں وفات پائی۔ اور اس کے بعد اس کا چچا مسمی سلطان اس کا جانشین ہوا۔ جس نے چاہبار، ہرمز، کشم، بندر عباس اور بحرین فتح کیا۔ ایران نے چاہبار اور بندر عباس بوسعید کو پٹے پر دے دیے۔ اس نے برطانیہ [illegible] بندر عباس میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت دی۔ اس کو وہابیوں کی طرف سے بڑ[illegible] تھا

۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں سلطان لنگہ کے نزدیک ایک بحری لڑائی میں کام آگیا اور اس کے بعد تخت حاصل کرنے کے لیے جنگ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بالآخر بدر بن سیف نے وہابیوں کی مدد سے تخت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اسے سعید بن سلطان نے قتل کرا دیا اور اپنے بھائی سالم کے ساتھ مل کر حکومت کرنے لگا۔ جب ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں سالم کا انتقال ہوگیا تو سعید اکیلا حکمرانی کرنے لگا۔ سعید اپنے خاندان کا ممتاز ترین فرمانروا تھا۔ وہ برطانیہ کا پکا حلیف تھا۔ خاندانی نزاع کی وجہ سے قیس بن احمد نے صحار کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور اس علاقے نے خود مختاری حاصل کر لی۔ دوسری طرف وہابیوں سے اسے اکثر حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے بعض اوقات تو انہیں کچھ دے دلا کر اپنا پیچھا چھڑانا پڑتا تھا اور بعض اوقات برطانیہ کی مداخلت کی دھمکی دلا کر۔ اس نے لونڈی اور غلاموں کی تجارت پر پابندی عائد کر دی۔ نیز اس نے اپنے افریقی مقبوضات کو ترقی دے کر ایک تجارتی مملکت میں تبدیل کر دیا۔ سعید جب تخت پر بیٹھا تو اس کے زیر اقتدار صرف زنجبار کا ایک حصہ اور اسی طرح مافیا اور لامو کا کچھ حصہ تھا۔ اس نے اپنی حکومت عرب اور سواحلی نوآبادیوں میں مقدشو سے راس ڈلگاڈو تک پھیلا لی

سعید کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ثوینی مسقط پر دوسرا لڑکا ماجد زنجبار پر قابض ہوگیا۔ ان کا جھگڑا لارڈ کیننگ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے زنجبار پر ماجد کا قبضہ بحال رہنے دیا اور ایک خاص رقم جو خراج کی تعریف میں نہیں آتا تھا۔ ثوینی کو ہر سال ادا کرنے کو کہا۔ ماجد کے بعد برغش اس کا جانشین ہوا۔ مشرقی افریقہ میں جرمنوں کا نفوذ ہو جانے کی وجہ سے ایک انگریزی فرانسیسی جرمن جماعت کو بوسعیدی مملکت کی حدود متعین کرنے کے لیے تحقیقات پر مامور کیا گیا۔ اور بعد میں اس جماعت کے فیصلے کے مطابق برغش کو زنجبار، پیما اور چھوٹے چھوٹے جزیرے جو ان سے بارہ میل کے فاصلے کے اندر واقع ہوں۔ جزیرہ نمائے لامو، منکی سے کیپی تک کا ساحلی علاقہ دس میل اندر تک کسمیو، براوا، مرکہ، مقدشو اور ورشیخ کا حاکم تسلیم کر لیا گیا۔

۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں ایک اور انگریزی اور جرمنی سمجھوتے کے تحت دریائے امبا کے شمالی جانب کے مقبوضات جرمن نے خرید لیے اور باقی تقریباً سارے کا سارا علاقہ انگریزوں کی سیادت میں آگیا۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں انتظام نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ اور ایک انگریز وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔

۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء اور ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء میں برغش نے اقتدار چھیننے کی کوشش کی اور اسی دوسری کوشش کے دوران میں ایک انگریزی جہاز نے اس کے محل پر گولہ باری کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔

۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء تا ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں علی بن حمود چونکہ کم عمر تھا۔ اس لیے ایک

شجرۂ بوسعید

(۱) امام احمد بن سعید
۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء

(۲) سلطان — ۱۷۹۱ء – ۱۷۹۲ء
سیف — بدر
قیس — ۱۲۰۶ان
(۲) سعید امام — ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء
قیس — عزان
(۳) حامد — ۱۲۰۰ھ/۱۷۹۱ء

(۴) سعید — ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء – ۱۸۰۶ء
(۵) سالم — ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء – ۱۸۰۶ء
۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء – ۱۸۲۱ء

(ب) برغش — ۱۲۰۷ — ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۸ء – ۱۸۹۰ء
(د) علی
(الف) ماجد — ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء
(۱۲) ترکی — ۱۲۰۰ھ
(۱۱) ثوینی — ۱۲۷۳ھ
خالد

(۷) فیصل — ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء
(ج) خلیفہ — ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء
محمد
(۸) تیمور — ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء – ۱۹۱۳ء
(و) حمود
(۱۱) سعید — ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء – ۱۹۳۲ء
(ز) علی — ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء

دست برداری (ه) حامد — ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء — ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء – ۱۸۹۳ء
خوب — (ح) خلیفہ — ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء
(۱۰) سالم — ۱۲۴۲ھ/۱۹۹۹ء

انگریز وزیر اس کا نائب السلطنت رہا۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں زنجبار کی ذمہ داری برطانوی محکمۂ خارجہ سے محکمۂ مستعمرات کی طرف منتقل کر دی گئی۔

ثوینی جو عمان پر قابض تھا قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل کا شبہ اس کے بیٹے سالم

پر کیا گیا اور تھوڑے ہی دن حکومت کرنے کے بعد عزان بن قیس نے اسے وہاں سے نکال دیا لیکن عزان بھی خانہ جنگی میں کام آگیا۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں ترکی اور عزان کا بھائی ابراہیم ملک کرمان پر حکومت کرنے لگے۔ صحار ابراہیم کے حصہ میں آگیا لیکن دو سال بعد ترکی نے اس سے چھین لیا۔ اسی زمانے میں بندر عباس کو دوبارہ اجارے پر لے لیا اور چاہ بار پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں عیسے بن صالح کے زمانے میں ایک منافقانہ تحریک شروع ہوئی۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں سالم الخروصی کو امام منتخب کر لیا گیا۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء میں باغیوں نے مسقط پر حملہ کر دیا۔ جسے ایک [illegible] کی مدد سے بچا لیا گیا اور سالم کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے [illegible] جانشین نے [illegible] سے معاہدہ کر لیا اور اس معاہدے کی رو سے اندرون ملک کے قبائل کو خود مختاری مل گئی۔ عمان بعد میں تلفظ اور سلطان کشتہ اور راس الخیمہ کے شیخ کے علاقے اور [illegible] شامل ہیں۔ جزیرہ کے اردگرد ایک مضبوط قلعہ اور [illegible] ریاست [illegible] ایک معاہدے کی رو سے جنگ نہیں ہوتی۔

درج ذیل شجرہ نسب [illegible] سے عمان اور زنجبار دونوں کا حاکم رہا اور [illegible] سے فقط عمان کا حاکم [illegible] زنجبار کا حاکم [illegible] رہتے ہیں

بوسنہ [illegible] عوامی جمہوریہ بوسنیا اور ہرزگووینہ [illegible] جغرافیائی اور تاریخی علاقوں پر مشتمل ہے۔ بوسنیا اور ہرزگووینا [illegible] معنی اور [illegible] ہرزگووینا [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کثرت سے ملک کے زیادہ [illegible] اس [illegible] اہمیت [illegible] اضلاع پر مشتمل [illegible]

[illegible]

[illegible] کے آثار ملے ہیں جو بوسنہ کہلاتا تھا۔ پے در پے ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ تغیرات کے بعد یہ خطہ آخر کار ایک نئی مملکت کا مستقل جزو بن گیا اور یہ نئی مملکت بوسنہ نام سے موسوم ہوئی۔ ترکوں کے عہد حکومت میں بوسنیا عثمانی سلطنت کا ایک سنجاق تھا۔

۱۸۷۸ء سے ۱۹۱۸ء تک بوسنیا اور ہرزگووینا کا موجودہ علاقہ آسٹریا کی حکومت کے ماتحت رہا۔ ۱۹۲۹ء میں یوگوسلاویہ میں پارلیمانی حکومت کی بساط الٹ جانے کے بعد وہاں ایک آمرانہ حکومت قائم ہو گئی۔ اس حکومت کے دور میں پورے ملک کو تقسیم کر کے نو بڑی انتظامی وحدتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس تقسیم سے بوسنیا اور ہرزگووینا کے علاقے کے بعض حصے دوسری وحدتوں میں شامل کر دیئے گئے۔ موجودہ زمانے میں یوگوسلاویہ کے اندر ایک علیحدہ عوامی جمہوریہ بوسنیا و ہرزگووینا بنا دی گئی۔

عوامی جمہوریہ بوسنیا و ہرزگووینا کی یوگوسلاویہ کی دوسری جمہوریتوں کی طرح اپنی الگ ایک عوامی مجلس قانون ساز ہے جس کی مجلس عاملہ اور اعلیٰ سرکاری دفاتر سراجیوو میں ہیں اور یہی مقام اس جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ملک کو بارہ اضلاع اور ایک سو چونتیس پرگنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلام ترکی حکومت کے قیام اور مضبوط ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ترکوں نے بوسنیا پر پہلا حملہ ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں شاہ تورتکو کے عہد حکومت میں کیا۔ دوسرا حملہ ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء میں کیا گیا۔ لیکن ترکوں کو شکست اٹھانا پڑی۔ دوسرے ہی سال بوسنیا کی فوج نے سربیا کے والی لازار کی زیر قیادت جنگ قوسوہ میں حصہ لیا۔ جنگ کے دوران میں سلطان مراد کو بہت شدید زخم آیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ لیکن شہزادہ بایزید فتح پانے اور ڈیوک لازار کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد ڈیوک کے جانشینوں نے ترکوں کی سیادت قبول کر لی۔ سربیا کے باجگزار ہو جانے سے بوسنیا کی حیثیت اور بھی کمزور ہو گئی اور اس کے بیشتر حصے پر آزادانہ قبضہ ہو گیا۔ ۷۹۴ھ/۱۳۹۱ء میں جب ترکوں نے سکوپ کو فتح کیا تو ایک ایسا سرحدی علاقہ تشکیل میں آ گیا جس کے ڈانڈے بوسنیا اور سربیا سے ملتے تھے۔ ۱۴۲۰ء میں جب تورتکو ثانی نے اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد ترکوں کی سیادت تسلیم کر لی تو ترکوں نے بوسنیا کے بادشاہوں کو بھی خراج ادا کرنے کا پابند بنایا۔ ترکوں کا اس تمام علاقے پر آہستہ آہستہ اثر بڑھتا چلا گیا۔ ۸۶۷ھ/۱۴۶۳ء میں جب بوسنیا کے بادشاہ نے خراج دینے سے انکار کر دیا تو ترکی فوجوں نے سلطان کی قیادت میں بوسنیا پر حملہ کر کے بوسنیا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ہنگری کے بادشاہ نے بوسنیا پر چڑھائی کر کے بوسنیا کا ایک حصہ ہنگری میں شامل کر لیا۔ بوسنیا کا پہلا سنجاق بے محمد بے منت اوغلو تھا۔ ۸۷۷ھ/۱۴۷۱ء میں ہرزگووینا کی سنجاق کی بنیاد پڑی اور اس کا بقیہ حصہ ترکوں نے ۸۸۹ھ/۱۴۸۳ء میں فتح کیا۔ بوسنہ کی سنجاق کا صدر مقام سراجیوو میں تھا۔ جہاں دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں سنجاق بے غازی خسرو بے نے نہایت شاندار عمارات تعمیر کرائیں۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں خسرو وہاں حاکم سنجاق کی حیثیت سے آیا۔ اس زمانے میں سراجیوو کا شہر ایک وسیع اور اہم مقام کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

۹۹۸ھ/۱۵۸۰ء میں بوسنیا کی ایالت تشکیل دی گئی اور اس کا صدر مقام بانوقہ مقرر ہوا۔ جو سات سنجاقوں پر مشتمل تھا۔ بعد میں یہ ایالت آٹھ سنجاقوں پر مشتمل ہو گئی۔ ہرزگووینا کا نام پندرہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ جب ایک امیر نے اپنے دور کے شاہ بوسنیا کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ بعد میں یہ علاقہ ہرزگ کی سرزمین کہلانے لگا۔

بوسنیا کو جب ترکوں نے فتح کر لیا تو پھر انہوں نے اس میں اپنا معاشرتی نظام بھی رائج کیا جو سختی سے ایک مرکزی حکومت اور ان کے اپنے عسکری اور جاگیرداری آئین پر مشتمل تھا۔

اس زمانے میں بوسنیا میں اسلام کی خوب ترویج و اشاعت ہوئی اور دوسری طرف اشاعت اسلام کی وجہ حکمران مذہب کو تمام طبقوں یعنی کسانوں ،

جاگیرداروں اور شہری لوگوں میں اپنے پیرو اور طرفدار حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی اور چونکہ امرائے بوسنیا اور ہرزگووینا نے اکٹھے اسلام قبول کیا تھا اس لیے انھیں اپنی جاگیریں بدستور رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ترکی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد بوسنیا کا شہر ترقی کرنے اور بڑھنے لگے۔

ترکی کاریگری کی خصوصیات بوسنیا کے پہلے دور کی دستکاری کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ چنانچہ چرم سازی، زرگری اور ان صنعتوں میں جو عسکری ساز و سامان تیار کرنے اور شہری لوگوں کی ضروریات مہیا کرنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہت زیادہ ترقی ہوئی اور ان اسباب کی بنا پر بوسنیا اور ہرزگووینا کے شہروں نے بہت ترقی کی۔ اس کے علاوہ ان شہروں میں مساجد، تکیے اور دینی مدارس کثرت سے تعمیر ہوئے نیز کتب خانے بنے جو مساجد اور مدارس سے ملحق ہوتے تھے۔ الغرض بوسنیا کے شہر ترکی قوت کے حصار اور اسلامی ثقافت کے رکن رکین بن گئے۔

۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں اس سنجاق میں پچیس ہزار سے زائد عیسائیوں کے مکانات اور تیرہ سو سے زائد عیسائی بیواؤں کے مکانات تھے اور چار ہزار سے زائد غیر شادی شدہ مسیحی مرد تھے۔ جس کے مقابلے میں مسلمانوں کے تقریباً چار ہزار پانچ سو مکانات اور دو ہزار تین سو سے زائد غیر شادی شدہ مرد تھے۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں بوسنیا کے خاص خاص شہروں نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔

بوسنیا کی ایالت کے انتظامی ڈھانچے اور حدود نے گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جو متعین صورت اختیار کر لی تھی تقریباً اس صدی کے اواخر تک اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ لیکن بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں ترکی کی نئی اصلاحات نے بوسنیا کے مسلمانوں میں لازماً غصہ پیدا کیا۔ اور اس بنا پر شورشیں اور بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اُنہی شورشوں اور بغاوتوں سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں کسانوں کی شورشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۱۸۷۵ء میں ایک بڑی بغاوت کا آغاز ہوا۔ جس میں عیسائی کسانوں کے ساتھ ساتھ آغاؤں اور بیگوں نے بھی حصہ لیا۔ اس بغاوت کے موقع پر دول یورپ نے مداخلت کی اور سان شفانو کے معاہدے میں یہ بات واضح طور پر قرار پائی کہ ترکی بوسنیا اور ہرزگووینا کو خود مختاری دے دے۔

چنانچہ موتمر برلن کی شرائط کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کو آسٹریا ہنگری کی امانت میں دے دیا گیا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کی آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۴ لاکھ تھی۔ یہاں کے لوگ سربوکروٹ زبان بولتے ہیں۔ قومیت کے لحاظ سے یہ لوگ سرب، کروٹ اور تیسرے وہ جو اپنی قومیت واضح نہیں کرتے میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں ۳۲٫۳ فیصد مسلمان ہیں۔

۱۹۴۵ء سے ملک کی بڑھتی ہوئی صنعت کاری کی وجہ سے بوسنیا اور ہرزگووینا میں متعدد صنعتی کارخانے اور ادارے قائم کیے گئے ہیں صنعت کان کنی کو عہد جدید کے مطابق بنا کر وسعت دی گئی ہے۔

ذرائع مواصلات اور خصوصاً ریل کے معاملے میں یہ ابھی پیچھے ہے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں تہذیبی پسماندگی موجود ہے۔ آسٹریا ہنگری کی حکومت نے فرقہ وارانہ مدارس کا خاتمہ کیے بغیر سرکاری نگرانی میں ابتدائی مدارس قائم کیے۔ ۱۹۱۱ء سے لازمی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ لیکن جو مدارس اس مقصد کے لیے قائم کیے گئے ہیں ان میں صرف پڑھائی کے قابل عمر کے بچوں کی ۵۵٫۱۰ فیصد کو تعلیم دی جا سکتی تھی ۱۹۳۸ء - ۱۹۳۹ء میں ابتدائی تعلیم کے مدارس کی تعداد صرف ایک ہزار بانوے تھی۔ چنانچہ اس وقت بڑے پیمانے پر خواندگی پھیل رہی ہے اور مزید اس طرف توجہ دی جا رہی ہے

بوسنیا پر ترکی فتح کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں کی قومی اور نجی دونوں قسم کی طرز زندگی [illegible] حکومت کے عہد میں ویسی ہی ہوگئی جیسی کہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے شہروں میں تھی۔ اس لیے اس ثقافت کے خدوخال اپنی خصائص و حدود کے اعتبار سے زیادہ تر شہری تھے۔ اگرچہ ترکوں کے بعد اور بالخصوص یوگوسلاویہ کا ایک حصہ بن جانے کے بعد مشرقی ثقافت کے اثرات زائل ہونے لگے لیکن مشرقی طرز زندگی کے بہت سے خدوخال مثلاً رہن سہن، گھر کے ساز و سامان اور بعض پرانی رسوم میں اب تک پائے جاتے ہیں۔

اسلامی ثقافت کے دیرپا نقوش فن تعمیر اور شہری منصوبہ بندی کے میدان میں پائے جاتے ہیں۔ بوسنیا اور ہرزگووینا میں فن تعمیر کی اسلامی طرز کی [illegible] یادگاروں کا آغاز ترک عامد کے دور سے ہوتا ہے۔ ان یادگاروں میں [illegible] الدژہ مسجد [illegible] سردبے، سراجیوو کی مسجد علی پاشا، مدرسہ غازی خسرو بیگ سراجیوو کا برسہ بزستان نیز بہت سی اور یادگاریں ہیں۔

ترکی، عربی اور فارسی زبان کے الفاظ و محاورات کی بہت بڑی تعداد بوسنیا اور ہرزگووینا میں روزمرہ کے استعمال میں ہے اور خاص کر جہاں سربی کروٹ بولی جاتی ہے اس خطے میں زیادہ رائج ہیں۔

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلامی تعلیم و ثقافت کے گہوارے دوسرے ترکی علاقوں کی طرح مکتب، مدرسے اور مذہبی ادارے ہوا کرتے تھے [illegible] مذہبی تعلیم گاہوں کی حیثیت سے جاری رہے۔ ۱۹۰۹ء کے قانون [illegible] کے مسلمان بچوں کی مکتبوں میں [illegible] لازمی تھی اور کوئی مسلمان بچہ پہلے مکتب [illegible] پڑھے بغیر قانونی مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۸۸۷ء میں شرعی قانون اور شرعی عدالتوں کے [illegible] ایک درسگاہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

نئے یوگوسلاویہ میں اسلامی مذہبی فرقے کی حیثیت اور حقوق کا تحفظ [illegible] دفعات کے ذریعے کر دیا گیا ہے۔ مذہبی تنظیمات حکومت سے علیحدہ [illegible] مذہبی معتقدات کو ایک نجی معاملہ سمجھا گیا ہے۔ مذہبی فرقے اپنے مذہبی [illegible] کی تربیت کے لیے سکول چلا سکتے ہیں۔

بوشہر یا بوشیر: ایران کے صوبہ فارس کا ضلع اور شہر جو ایک [illegible] کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ ۱۱۴۹ھ تک بوشہر کی حیثیت ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھی یہاں تک کہ نادر شاہ نے اسے خلیج فارس میں اپنی بحریہ کا مستقر بنایا اور اسے بندر نادریہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے بعد [illegible] ایک بہت بڑا جنگی جہاز بنانے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ جہاز سازی نے [illegible] رہا لیکن نادر شاہ کے اس شہر کی طرف توجہ دینے سے یہ خوب پھولنے پھلنے لگا اور جس زمانے میں انگریزوں اور ولندیزیوں کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے بندر

عباس سے اپنے کارخانے اس شہر میں منتقل کر لیے تو اس شہر کو تجارتی اعتبار سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کریم خان زند کے عہد حکومت میں ایران کا دارالحکومت شیراز کو قرار دیا گیا۔ چونکہ بوشہر شیراز کے ساتھ ایک تجارتی شاہراہ کے ذریعے ملا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوشہر نے ملک کی مرکزی بندرگاہ کی حیثیت [illegible] کر لی اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ ۱۷۷۵ء میں ابراھام پارسنز کے قول کے مطابق اس شہر کی آبادی تقریباً بیس ہزار تھی۔ اور تقریباً دو تہائی آبادی بصرے کی مہم پر گئی ہوئی تھی۔

برطانیہ اور ایران کی مختصر سی جنگ کے دوران میں دسمبر ۱۸۵۶ء میں برطانوی فوج نے اس شہر پر قبضہ کر لیا جو مارچ تک قائم رہا۔ برطانیہ کا بوشہر سے تعلق تھا بعد میں یہ تعلق سیاسی بھی ہو گیا اور یہ شہر خلیج فارس میں پولیٹیکل ریذیڈنٹ کا صدر مقام بن گیا تھا۔ یہ تعلق وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہوتا چلا گیا اور شہر کی تجارت میں دوسرے ممالک بھی حصہ لینے لگے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی ربع میں بوشہر میں برابر خوشحالی قائم رہی یہاں تک کہ ۱۹۳۸ء میں ٹرانس ایرانین ریلوے کے مکمل ہو جانے اور بندر شاہپور اور خرم شہر کے ترقی پا جانے کی وجہ سے ملک کی بڑی بندرگاہ کی حیثیت حاصل نہ رہی اور ۱۹۴۶ء میں اس شہر کی آبادی پندرہ ہزار رہ گئی۔

بوصیر مصر میں کئی مقامات کا نام۔ جہاں یونانی دیوتا اوسیرس کو خاص طور پر مقدس کہا جاتا تھا۔ دریائے نیل کی شاخ دمیاط کے مغربی کنارے پر العزیزیہ کے [illegible] میں واقع ایک مقام بوصیر کہلاتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا [illegible] قریبی بستی [illegible] تھا۔ قدیم زمانے میں یہ خاصا مشہور تھا۔ یہاں ایک [illegible]۔

[illegible] وسطیٰ میں بوصیر کو بوصیر قوریدس کہا جاتا تھا کم از کم گیارہویں صدی [illegible] سترھویں صدی عیسوی میں بوصیر الملق کے نام سے مشہور ہے۔ اور دریائے نیل مغربی کنارے صوبہ فیوم کے [illegible] پر واقع ہے۔ اس قصبے کے اردگرد ایک صوبہ بوصیر [illegible] نام سے [illegible] آیا تھا جو چند ہی روز قائم رہ سکا۔ بہت سے مقامات کا نام بوصیر ہونے کی وجہ سے اس کا صحیح تعین کرنا بہت دشوار ہے۔ اموی خلیفہ مروان ثانی نے جہاں انتقال کیا تھا اس بوصیر کے بارے میں زیادہ تر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ وہ بوصیر [illegible] تھا۔

بوصیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرعون کے جادوگروں کا وطن تھا اور یہاں کے باشندے جادوگری میں مشہور تھے۔ اس وقت اس بوصیر کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اب ایک بوصیر دفنو صوبہ فیوم میں واقع ہے۔

بوصیری (یکم شوال ۶۰۸ھ یا ۶۱۰ھ / ۷ مارچ ۱۲۱۲ء یا ۱۲۱۴ء - ۶۹۶ھ / ۱۲۹۶ء) ابوعبداللہ شرف الدین محمد بن حماد عربی شاعر اور صوفی۔ بربری نسل کے قبیلہ صنہاجہ کی ایک شاخ بنو حبنون سے تھے۔ ان کا باپ بوصیر کا رہنے والا تھا۔ اس وجہ سے بوصیری کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں۔ تعلیم کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ بلبیس میں کاتب کے عہدے پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ کوئی خاص نمایاں شہرت حاصل نہ کی آخری عمر میں ٹانگ کی پنڈلی ٹوٹ گئی اور معذور ہو گئے۔ اس دوران میں قاہرہ میں قیام پذیر رہے اور بقول سیوطی اور حاجی خلیفہ ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء - ۱۲۹۶ء اور ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء اور ۱۲۹۵ء میں قاہرہ میں وفات پائی اور امام شافعی کے مقبرے کے قرب میں دفن کیے گئے۔

بوصیری کو سیرت سے خاص لگاؤ تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مناظرے کا بڑا شوق تھا اور اسی شوق کے سبب انہوں نے انجیل اور تورات کا براہ راست مطالعہ کیا۔ انہوں نے اپنے اشعار میں مخالفین کا رد انہیں کی مقدس کتابوں سے کیا ہے۔ خطاطی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اگرچہ تصوف اور شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ تھا لیکن جب سے زین الدین یعقوب بن زبیر کی قربت حاصل ہوئی تو آنحضور ﷺ کی مدح میں شاندار قصائد لکھنے شروع کیے۔ یہی نعتیہ قصائد بوصیری کی شہرت کا باعث بنے۔ صوفیا کے ہاں بوصیری کا بڑا درجہ ہے بوصیری نے طریقت میں ابوالحسن شاذلی کے خلیفہ ابوالعباس المرسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔

بوصیری کی شاعری کو دو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے دور کے دو قصیدے سفر حج سے قبل کا دور ہے۔ [illegible] الامیۃ فی الرد علی النصاریٰ والیہود [illegible] دونوں معارضۃ بانت سعاد ہیں اور حج سے واپسی کے بعد کے دور کا مشہور قصیدہ بردہ ہے۔

بوعلی قلندر (م ۶۰۵ھ / ۱۲۰۸ء - ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ / ۳ ستمبر ۱۳۲۴ء) شیخ ابوعلی شرف الدین بن سالار فخرالدین ہندوستان کے بزرگ اور مجذوب اولیاء میں سے ایک۔ آپ کا شجرہ نسب امام ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے۔ "انوار الاصفیاء" میں آپ کا شجرۂ نسب اس طرح درج کیا گیا ہے: شیخ شرف الدین بن سالار فخرالدین بن سالار حسن بن دانک بن امام اعظم ابوحنیفہ۔

آپ کے والد ماجد ۶۰۰ھ / ۱۲۰۴ء میں عراق سے ہندوستان آئے تھے جو بڑے متبحر اور جید عالم دین تھے۔ ان کی پہلی شادی حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کی وفات پا جانے کے بعد دوسری شادی مولانا سید نعمت اللہ ہمدانی کی ہمشیرہ بی بی حافظہ سے ہوئی۔ انہی کے بطن سے بوعلی قلندر نے جنم لیا۔

آپ نے کم سنی ہی میں تمام علوم پر دسترس حاصل کر لی اور تقریباً بیس سال تک دہلی میں قطب مینار کے پاس درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ دہلی کے بڑے بڑے علماء آپ کے متبحر علمی کے قائل تھے۔ لیکن جب آپ نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا تو اہل مدرسہ کو خیرباد کہہ دیا اور کتابیں دریا میں پھینک کر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ پر جذب و سکر کی حالت طاری ہو گئی۔ پانی پت کے مضافات باگھوتی اور بڈھا کھیڑا میں سکونت اختیار کر لی۔

"معارج الولایت" کے مؤلف نے بوعلی قلندر کو خواجہ بختیار کاکیؒ کا خلیفہ لکھا ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی حضرت نظام الدین اولیاء سے بھی ارادت و خلافت منسوب ہے۔

قیام پانی پت کے دوران میں حضرت خواجہ شمس الدین ترک اپنے خلیفہ کے حکم سے بوعلی قلندر کے ہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔

حضرت شیخ جلال الدین محمود پانی پتی بھی شیخ بوعلی قلندر ہی کے فیض نظر سے راہ طریقت پر گامزن ہوئے تھے۔ روایت ہے کہ کم سنی کے زمانے میں شیخ جلال الدین گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرے انہیں دیکھ کر بوعلی قلندر نے فرمایا: "زہے اسپ و زہے سوار" چنانچہ آپ کی یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی شیخ جلال الدین بے خود ہو گئے گھوڑے سے اتر پڑے۔ اور اسی وقت گریبان چاک کر کے

جنگل کی راہ لی۔ چالیس سال جنگل میں پھرتے رہے جب وطن واپس آئے تو شیخ بوعلی قلندرؒ سے بیعت کے لئے مصر ہوئے۔ لیکن آپ نے فرمایا اے فرزند عزیز تمہاری مشکل دوسرے شخص سے حل ہوگی۔ چنانچہ جب شمس الدین ترک پانی پتی کا وردِ پانی پت میں ہوا تو آپ نے شیخ جلال الدین کو ان کے پاس ارادت کے لئے بھیجا اور وہ آگے چل کر ان کے خلیفہ ہو گئے۔ وفات کے بعد آپ کرنال میں مدفون ہوئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اعزا و اقارب نے ایک رات پوشیدہ طور پر نعش مبارک کو پانی پت میں لے جا کر دفن کر دیا۔ چنانچہ کرنال، پانی پت، بڈھا کھیڑا اور باگھونی میں آج بھی آپ کے معتقدین کا ہجوم رہتا ہے۔

آپ کی زندگی کرامات اور وفات کے بارے میں بے شمار روایات ہیں۔ حتیٰ کہ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ پانی پت یا کرنال کا مزار فی الواقع انہیں کا ہے۔

آپ کی تصانیف میں عشق الٰہی کے موضوع پر آپ کے مکتوبات اور دو مثنویاں ہیں جو کلام قلندر کے نام سے مشہور ہیں۔

بوگرا بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کا ایک شہر اور ضلع۔ دریائے کراتویہ کے کنارے پر واقع ہے۔ غالباً یہاں کے باشندوں کی اکثریت ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو گئی ہوگی۔ کیونکہ اکثر دیہاتوں کے نام اب تک ہندوانہ ہیں حالانکہ وہاں کوئی ہندو آباد نہیں۔

تقسیم ہند سے قبل تمام بنگال میں اس شہر کے مسلمانوں کی تعداد تمام علاقوں سے زیادہ تھی اور ان میں اکثر وہ نومسلم ہیں جو پہلے کوچ یا راج بنسی کہلاتے تھے وہ شمالی علاقوں میں آباد تھے۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں راجہ مان سنگھ نے بوگرا ضلع کو دوبارہ فتح کیا۔ اس نے شیرپور میں مٹی کا ایک کچا قلعہ تعمیر کرایا اور اس کا نام سلیم نگر رکھا۔

بوگرا شہر اور ضلع میں اکثر سیلاب اور طوفان آتے رہتے ہیں جو بعض اوقات بڑے ہولناک ہوتے ہیں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء کے ایک طوفان نے اس ضلع میں بہت تباہی مچائی۔

۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں اس شہر میں ڈیڑھ گھنٹے میں اٹھارہ انچ بارش ہوئی تو سارا شہر غرقاب ہو گیا۔ بوگرا کو اکثر زلزلوں سے بھی واسطہ رہا۔ اور ۱۸۸۵ء ۱۸۸۸ء، ۱۸۹۷ء کے شدید زلزلوں سے جان و مال کو بہت نقصان پہنچا۔ خصوصاً ۱۸۹۷ء کے زلزلے میں تو پختہ اینٹوں کے بہت سے مکانات تباہ ہو گئے تھے ۱۹۵۱ء میں بوگرا شہر کی آبادی پچیس ہزار نو سو تھی اور بوگرا ضلع کی آبادی بارہ لاکھ پانچ سو اٹھاسی تھی۔

بوگرا شہر میں بوگرا محل اب چوہدری خاندان کی قیام گاہ ہے۔ یہ جگہ دلچسپ اور قدیم ہے۔ ضلع بوگرا اور مہاستھان میں آثار قدیمہ کثرت سے ہیں۔

بومدین (۲۴ صفر ۱۳۴۶ھ / ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۷۸ء) محمد بوخاروبا ابو محی الدین ہواری (بومدین) الجزائر کے موجودہ سربراہ گویلا مرسا کے مقام پر ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قسطنطین کے ایک اسلامی ادارے میں حاصل کی۔ پھر مصر میں قاہرہ کی جامعہ الازہر میں تعلیم پائی — قاہرہ میں ان کی ملاقات بن بیلا سے ہوئی اور انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی دسمبر ۱۹۵۴ء میں فرانس کے خلاف جنگ چھڑنے کے ایک ماہ بعد انہوں نے مذہبی تعلیم سے اپنا رخ فوجی تعلیم کی طرف موڑ لیا اور مراکو میں مزید فوجی ٹریننگ حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں مغربی گوریلا یونٹ میں شمولیت اختیار کی۔ تین سال بعد یہ مغربی محاذ کے انچارج ہو گئے۔ ترقی کرتے ہوئے ۱۹۵۸ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں تیونس میں فوج برائے قومی آزادی کے چیف آف جنرل سٹاف مقرر کئے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں احمد بن بیلا کی وزارت میں وزیر دفاع کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور گوریلا فوج کو جدید لڑائی کے طریقے سکھانے پر مامور کئے گئے۔ جلد ہی احمد بن بیلا سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس وقت بومدین ملک کے وزیر دفاع اور نائب صدر کے عہدے پر فائز تھے۔ اور وہ انقلابی کونسل کے سربراہ اور وزارتی کونسل کے چیئرمین مقرر ہوئے۔

۱۹ جون ۱۹۶۵ء میں ان کی قیادت میں ملک میں ایک انقلاب آیا۔ صدر احمد بن بیلا کو معزول کر کے کسی خون خرابے کے بغیر مسند اقتدار پر قبضہ کر لیا گیا۔ جولائی ۱۹۶۵ء کو بومدین نے صدارت کا عہدہ سنبھالا۔

صدر بومدین نے ستمبر ۱۹۷۳ء میں الجزائر میں غیر جانبدار ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کی صدارت کی۔ غیر جانبدار ملکوں کے سربراہوں کی چوتھی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر تیسری دنیا اور افریقی ممالک کی تنظیم میں بڑا اہم کردار انجام دیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب سربراہوں کی چھٹی کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا جو الجزائر میں ہوئی تھی۔

الجزائر فوج کی تنظیم میں جتنا حصہ بومدین کا ہے کوئی دوسرا رہنما اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بومدین نے ۱۹۶۲ء کے موسم گرما میں اس وقت کے وزیر اعظم یوسف بن خدہ کا تختہ الٹا تھا۔ اور پھر جب ستمبر ۱۹۶۲ء میں باغی فوج نے الجزائر

قائد انقلاب - محی [illegible]

پر قبضہ کر لیا تو بومدین ہی نے صدر احمد بن بیلا کے اقتدار کی حفاظت کی اور باغی عناصر کا قلع قمع کیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں اوراس کے پہاڑی علاقے میں حریت پسندوں نے جب فرانسیسیوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی تو بومدین چھاپہ مار دستوں کے کمانڈر کی حیثیت سے اس میں پیش پیش تھے۔ ۱۹۷۸ء میں انتقال کر گئے۔

بوہرہ نام۔ بیوپاری، اوقات عام میں مغربی ہندوستان کا ایک مسلم فرقہ یہ لوگ بیشتر

اسماعیلی فرقے کے شیعہ ہیں۔ بوہرہ کے معنی تاجر، بیوپاری کے ہیں۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ ہزار ۶ سو ۲۵ ہندووں اور ۱۵ جین مت کے پیرووں نے اپنے آپ کو بوہرہ شمار کرایا ہے اور کستان بوہروں کی تعداد ایک لاکھ چھیالیس ہزار دو سو چھپن تھی۔ موجودہ وقت میں غالباً ان کی تعداد پاک و ہند میں ڈیڑھ لاکھ اور تمام دنیا میں دو لاکھ کے قریب ہوگی۔

بوہرے دو بڑی جماعتوں میں تقسیم ہیں ایک بڑی جماعت جو سب سے اکثریت [illegible] شیعہ بوہروں کی جماعت ہے جو سب تاجر ہیں اور دوسری بڑی جماعت سنی [illegible] بوہروں کی ہے جن میں اکثریت کسانوں اور کاشت کاروں کی ہے۔ اسماعیلی بوہرے [illegible] کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے عرب اور مصر سے نقل کر [illegible] اختیار کی تھی۔ اگرچہ بوہروں کی اکثریت اپنے گروہ سے باہر شادی نہیں کرتی لیکن [illegible] ان سے اثنا عشری شیعوں، ہندووں اور یورپ [illegible] سے بھی باہمی شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوتے ہیں۔

[illegible] سے متعلق کہا گیا ہے ان کے آباؤ اجداد اسماعیلی [illegible] تھا۔ غالباً پہلا مبلغ عبداللہ نامی ایک شخص تھا جسے [illegible] ہندوستان میں ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء میں بھیجا تھا [illegible] میں رہتا تھا اور بوہرے اس کی زیارت [illegible] تھے اپنی آمدنی کا عشر ادا کرتے اور اپنے قضیوں کا فیصلہ [illegible] یوسف بن سلیمان یمن سے ہندوستان آگیا اور [illegible] ہوگیا۔

اس کے بعد ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں داعی داؤد بن عجب شاہ کا انتقال ہوگیا تو اس [illegible] تنازعات پیدا ہو گئے گجرات کے بوہروں نے جو اکثریت میں تھے داؤد بن قطب شاہ کو اس کا جانشین منتخب کیا۔ مگر دوسرے گروہ کے لوگوں نے سلیمان نامی ایک شخص کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیا۔ سلیمان کی وفات بھی احمد آباد میں ہوئی۔ دونوں حریفوں کی قبریں قریب قریب ہیں۔ اور دونوں کے پیرو اپنے اپنے طور پر دونوں کا احترام کرتے ہیں جن لوگوں نے سلیمان کی جانشینی کو قبول کیا وہ سلیمانیہ کہلاتے ہیں ان کا داعی یمن میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا ایک کارندہ رہتا ہے جسے منصوب کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان کا مرکز بڑودہ میں ہے۔ جو لوگ داؤد کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں ان کا پیشوا بمبئی میں رہتا ہے جس کا صدر مقام سورت ہے۔ سورت میں ایک عربی مدرسہ ہے جو درس سیفی کے نام سے مشہور ہے۔ آج کل اس گروہ کے داعی سیدنا طاہر سیف الدین کے بیٹے ہیں جو ملاجی صاحب یا سیدنا صاحب کے لقب سے پکارے جاتے ہیں ان کے مریدان کی بہت عزت و تکریم کرتے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد ایک خاص انداز میں اظہار عجز و نیاز کرتی ہے جیسے تقبیل الارض (زمین بوسی) کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ رسم فاطمیوں کے دور سے چلی آرہی ہے۔ اس زمین بوسی کی رسم میں اور نماز کے سجدے کی شکل میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ خاندانوں کے امور سے میں مقامی عہدیدار عوام کی رہنمائی کرتے ہیں انہیں "عامل" کہا جاتا ہے یہ عامل ملاجی صاحب مقرر کرتے ہیں۔ ان کے فرائض وہی ہیں جو سنیوں کے قاضیوں کے ہوتے ہیں۔

بوہرہ جماعت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ پیشوں کے لحاظ سے اپنے الگ الگ گروہ بنا لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعلقات بہت کم رکھتے ہیں نہ ہی دوسرے مسلمانوں میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ داؤدی فرقے سے الگ ہو کر دو اور چھوٹے فرقے بن گئے ہیں۔ ۱۔ علیہ بوہرے ۲۔ ناگوشیئے۔ علیہ بوہرے ۱۶۲۴ء میں بڑے ملا شیخ آدم کے پوتے علی کی گدی نشینی کے دعوے کے طرفدار تھے۔

دوسرا گروہ جو ناگوشیئے کے نام سے مشہور ہے ۱۷۸۹ء میں علیہ فرقے سے الگ ہو گئے یہ گھی اور گوشت کھانا گناہ سمجھتے ہیں۔

بوہرے اپنی مذہبی کتب کو چھپاتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بعض فقہ اور فلسفے کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی طور پر کوئی مفصل تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔

بویہ، بنو [illegible] بہترین حکمران خاندان جس نے ایران کی سطح مرتفع پھر عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے علاقے پر حکومت کی۔ اس خاندان کا نام بویہ سے ماخوذ ہے۔ جو ابن شجاع بن بویہ کے باپ کا نام تھا۔ یہ لوگ دیلمیوں کی آبادی میں شامل تھے جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ بویہی ابتداً میں اپنے ایک ہم وطن ماکان بن کاکی کے پیرو تھے۔ بعد میں مرداویج کے ساتھ مل گئے تاکہ دونوں باہم کر طبرستان کی زیدی ریاست سے مقابلہ کریں۔ لیکن جب علی کچھ دن کے لیے اصفہان کا مالک ہوا اور پھر مستقل طور پر فارس کا حکمران ہو گیا تو اس نے مرداویج سے نجات حاصل کرنے کے لیے سنی خلیفہ سے منظوری اس شرط پر حاصل کر لی کہ اس صوبے پر اس کی حکومت قائم رہے گی۔ بویہیوں کے سب سے بڑے بھائی علی نے فارس پر قبضہ جمائے رکھا اور اس کی دوسرے بھائی الحسن نے سائرہ الجبال پر اپنا قبضہ کر لیا۔ تیسرے بھائی احمد نے کرمان اور خوزستان کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ چنانچہ ان مستحکم قلعوں پر قبضہ کر لینے کے بعد بویہی دوسری جماعتوں کے ساتھ اقتدار کے حصول کی کشمکش میں شریک ہو گئے۔ بالآخر ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں احمد بغداد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے وہاں جو نظام حکومت قائم کیا وہ ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء تک قائم رہا۔ ان تینوں بویہیوں نے بعد میں اپنے لیے القاب حاصل کئے۔ ان میں احمد نے معز الدولہ، علی نے عماد الدولہ اور الحسن نے رکن الدولہ کا لقب اختیار کیا۔ ان کے وفات پا جانے پر عضد الدولہ کو جو رکن الدولہ کا بیٹا تھا اس خاندان بویہ کا سردار قرار دیا گیا۔ عضد الدولہ نے خاندان بویہ میں مکمل اتفاق اور اتحاد قائم کیا۔

عراق کی ولایت نے جو بویہیوں کے تحت تھی خلافت عباسیہ کی اس آخری مستحکم پناہ گاہ میں حکومت کا وہی طرز جاری رہنے دیا جو دیگر مقامات پر مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ عراق کی ولایت کو ایک خاص اہمیت بھی حاصل تھی اور وہ یہ کہ بغداد خلافت کا مرکز تھا۔ بویہیوں نے اس پر قبضہ کر کے انتظام حکومت میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی۔ کیونکہ وہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انہیں یہ معلوم تھا کہ شیعہ اقلیت ہی ہے اور اگر بغداد سے خلافت ختم بھی کر دیں تو وہ کسی اور جگہ سے نمودار ہو جائے گی۔ چنانچہ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ اسے اپنے اقتدار میں رکھا جائے اور اس میں جو سنی ہیں ان پر ان کے اقتدار کا جواز باقی رہے۔ اور دوسرے بیرونی دنیا سے ان کے سیاسی تعلقات مضبوط ہو جائیں اس لیے کہ سنی حکمرانوں کی اب عزت بھی کی جاتی تھی اور اخلاقی اعتبار سے ان کا اقتدار بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بویہیوں نے ہمیشہ اپنا ظاہری طرز عمل ایسا رکھا جیسے وہ سچے دل سے خلافت عباسیہ کے جواز کو تسلیم کرتے تھے۔ اگرچہ بویہیوں نے بلا امتیاز شیعوں اور معتزلیوں کو اپنے اندر قبول کیا لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اثنا عشری رہے چنانچہ بویہیوں نے کبھی

یہ منصوبہ نہ بنایا کہ شیعہ سنیوں پر ظلم و ستم کریں۔ یہ دونوں فرقے ان کی فوج میں شامل تھے۔ بویہیوں نے شیعیت کو ایک تنظیم کی صورت دی اور ایک حد تک ان کے عقائد کا ایک ڈھانچہ بھی تیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت سنی اپنے چار مسلکوں کو مسلم مسلک تسلیم کرانے پر زور دے رہے تھے تو اہل تشیع میں سے بعض علماء اور بغداد کے دو بھائیوں الرضیٰ اور المرتضیٰ جو بغداد کے شریف تسلیم کئے جاتے تھے شیعیت کو بھی ایک پانچویں مسلک کی حیثیت سے امت کے نظام میں داخل کرانے میں زور دے رہے تھے۔ انہی بویہیوں کے دور میں معزالدولہ نے عاشورا کے ماتم کی رسم کھلم کھلا جاری کی اور اسے ایک مذہبی فریضہ قرار دیا۔ غدیر خم کی بنیاد ڈالی۔ علوی مشہدوں کو مزین اور آراستہ کیا گیا۔ شیعی مدرسے بنائے گئے۔ مسجدوں میں شیعی طریقے سے عبادت کی جانے لگی اور اذان کا شیعی طریقہ جاری کیا گیا۔

اگرچہ آل بویہ کی حکومت ابتدا ہی سے قوی اور مضبوط نظر آتی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بعض کمزوریاں ایسی بھی تھیں اور بالآخر انہی کمزوریوں کی وجہ سے اس خاندان کو زوال آیا۔ ان کمزوریوں میں کچھ اندرونی پیداوار تھیں اور کچھ بیرونی تھیں جن میں ایک تو سمندری تجارت کا اضطراب انگیز انقلاب تھا کیونکہ..... آ رکے قریب بحر ہند کی طرف سے مغرب کے ساتھ جو تجارت کی جاتی تھی اس کا راستہ خلیج فارس کے راستے سے نہیں رہا بلکہ اس کا رخ بحر قلزم کی طرف بدل گیا۔ ان کے علاوہ فاطمیوں کا اقتصادی غلبہ اور ان سب کمزوریوں سے بڑھ کر وہ خانگی اور خلقی کمزوری تھی جو ان کے علاوہ اسی زمانے کی مشرق قریب کی بہت سی حکومتوں میں مشترک تھی۔ زوال کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ بویہیوں کی قوت منتشر تھی۔ ابتدا ہی سے ان کے تین گروہ الگ الگ ریاستوں پر متمکن تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی حکومت متحد نہ تھی۔ ان کی کمزوری اور بے بسی بیرونی حد تک خلافت کو فائدہ پہنچا کیونکہ خلیفہ کو ان کے خاندانی جھگڑوں میں حکم بننا پڑتا تھا اور اس طرح خلیفہ کا کھویا ہوا اقتدار اور اثر واپس مل گیا۔

۱۰۵۵ء میں طغرل بیگ کسی مزاحمت کے بغیر بغداد میں داخل ہو گیا اور اس نے بویہی الملک الرحیم کو گرفتار کر لیا۔ فارس نے بھی اطاعت کر لی اور اس طرح بویہی خاندان کی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

بہ آفرید بن فروردین۔ ایران کا ایک جھوٹا مدعی نبوت۔ عہد بنو امیہ کے تقریباً آخری دور میں ایران میں نیشاپور کے ضلع خواف کے مقام پر اس نے ایک مذہبی فتنہ کھڑا کیا اور نبوت کا جھوٹا دعوے کر کے اپنے اردگرد بہت سے مریدین کا جمگھٹا اکٹھا کر لیا۔ تقریباً سات سال تک چین میں جا کر رہا۔ بعد میں اپنے وطن واپس آ کر لوگوں سے اس بات کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندہ کر کے آسمانوں سے بھیجا ہے۔

اس کے بارے میں ایک روایت ہے کہ اس نے مرنے کا بہانہ کیا اور ایک قبر جو اس نے اپنے لئے بنوائی تھی، اس میں ایک سال تک دفن رہا اور بعد میں اپنے دوبارہ زندہ ہونے کو ایک معجزے کے طور پر پیش کیا۔

اس نے اپنے بارے میں زرتشتی ہونے کا دعوے کیا اور اپنے عقائد کی فارسی زبان میں ایک شرح لکھی بعد میں اس نے اسلامی تعلیمات سے کچھ شعائر اور محرمات کو اختیار کر لیا۔ اس کی تعلیمات میں شراب، غیر شرعی ذبیحہ اور محرمات سے نکاح کی ممانعت تھی۔ اس نے دن میں سورج کی طرف منہ کر کے سات نمازیں پڑھنے کا حکم دیا اور زکوٰۃ کو ضروری قرار دیا۔

ابومسلم نے دیکھا کہ یہ تحریک تو مسلموں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ تو اس نے بہ آفرید کو مجبور کیا کہ وہ اسلام کی طرف رجوع کرے اور عباسیوں کے مقصد کے حصول میں امداد دے لیکن وہ جب اپنے مذہب کی تبلیغ سے باز نہ آیا تو ۱۳۱ھ ۷۴۹ء میں ابومسلم کے حکم سے اسے اسکے مریدین کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے پیروجو باقی رہ گئے تھے وہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی تک پائے جاتے تھے وہ اس کے دوبارہ ظہور کا انتظار کرتے رہے ہیں۔

بہاء الدین (۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء — ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) ایک عرب دانشور۔ ابوالمحاسن یوسف ابن رافع ابن تمیم بہاؤالدین موصل میں پیدا ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بغداد میں ایک مدرسے میں مدرس رہا اور پھر موصل میں پروفیسر ہو گیا۔ ۱۱۸۸ء میں حج بیت اللہ کے بعد اس نے صلاح الدین کی ملازمت اختیار کر لی جو فلسطین میں عیسائیوں سے برسر پیکار تھا۔ اس نے جلد ہی سلطان کی خوشنودی حاصل کر لی۔ اور مستقل سلطان کے دربار کے ساتھ منسلک رہا۔ وہ مختلف سفارتخانوں اور حکومت کے مختلف عہدوں پر بھی خدمات سرانجام دیتا رہا۔

بہاؤالدین فوج کا قاضی بھی رہا اور بعد میں یروشلم کا قاضی بنا دیا گیا۔ صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد اس نے اس کے بیٹے ملک الظاہر ... بڑھایا جس نے اسے حلب کا جج مقرر کر دیا۔ ملک الظاہر کے بعد اس کا بیٹا ملک العزیز تخت نشین ہوا۔ ابھی وہ نابالغ تھا۔ اس لئے سارا انتظام بہاؤالدین کے ہاتھ میں آ گیا۔

بہاؤالدین نے سلطان صلاح الدین کی ایک سوانح عمری بھی لکھی ہے جو ۱۷۵۵ء میں لیڈن سے شائع ہوئی ہے۔

بہاءالدین، زکریاؒ ملتانی (۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء — ۷ صفر ۶۶۱ھ/۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء) سلسلہ سہروردیہ کے پاک و ہند کے ایک درویش اور ولی کامل۔ آپ کے والد کا نام وجیہ الدین محمد تھا۔ آپ کا تعلق قبیلہ ہباری اسدی (قریشی) سے ہے۔ پروفیسر مولوی محمد شفیع نے آپ کا خاندانی نسب نامہ یوں بیان کیا ہے۔ ”ابو محمد زکریا بن وجیہ الدین محمد بن کمال الدین شاہ علی قریشی بن سلطان حسام الدین بن سلطان علی قاضی بن شمس الدین محمد کردوی بن سلطان حسین بن سلطان عبداللہ بن الحسین بن سلطان مطرف بن سلطان خذیمہ بن امیر ہاشم بن امیر تاج الدین بن امیر عبدالرحیم بن عبدالرحمان بن ہبار بن اسد بن ہاشم بن عبد مناف۔“

آپ کی ولادت بمقام کوٹ کرور ضلع مظفر گڑھ میں ہوئی۔ سفینۃ الاولیا اور آئین اکبری میں ولادت کا سال ۵۶۵ھ لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں ۵۷۸ھ بتایا گیا ہے۔

آپ کی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید مع ہفت قرات کے حفظ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تاہم تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور آپ ایک عرصے تک علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل میں مصروف رہے۔ آپ نے تعلیم کی خاطر خراسان، بخارا، مدینہ منورہ اور فلسطین کے بڑے بڑے علمی مراکز کا سفر کیا۔ اپنے قیام مدینہ منورہ کے دوران میں ممتاز محدث شیخ کمال الدین یمنی سے حدیث کی تکمیل

کی اور کئی سال آنحضورؐ کے روضۂ اطہر پر ذکر و فکر میں گذارے پھر بیت المقدس الشریف لے گئے اور انبیا علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے بعد بغداد گئے اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ سترہ روز شیخ کی خدمت میں حاضر رہ کر اس تھوڑی سی مدت میں اس قدر نعمت حاصل کی جو دوسرے درویشوں کو برسوں کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔ شیخ نے خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا۔ خرقہ عطا کرنے کے بعد شیخ نے آپ کو رخصت کیا اور فرمایا کہ ملتان جا کر رہو اور اس ملک کے باشندوں کو فیض پہنچاؤ۔

"انوار غوثیہ" میں آپ کا سلسلۂ طریقت اس طرح درج ہے:۔

شیخ بہاؤالدین زکریا، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ضیاء الدین، ابوالنجیب سہروردی، شیخ وجیہ الدین سہروردی، شیخ ابوعبداللہ، شیخ اسود احمد دینوری، شیخ ممتاز علی دینوری، خواجہ جنید بغدادی، خواجہ سری سقطی، خواجہ معروف کرخی، خواجہ داؤد طائی، خواجہ حبیب عجمی، حضرت امام حسنؓ، حضرت علیؓ، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ ملتان میں تقریباً پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ تک خلق خدا کو فیض پہنچانے میں مصروف رہے۔ آپ کی خانقاہ جو ایک شاندار عمارت ہے۔ جس میں مقیمین اور زائرین کے رہنے کے لیے الگ الگ جگہیں ہیں۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں صوفیانہ تعلیمات کا ایک بہت بڑا مرکز بن گئی تھی۔ سلطان شمس الدین التمش نے آپ کو شیخ الاسلام کے عہدے پر مقرر کیا۔ اور یہ عہدہ ایک مدت تک آپ کے خاندان میں قائم رہا۔

شیخ بہاءالدین کے سلسلے کو زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں فروغ حاصل ہوا اگرچہ ان کے مریدین ہرات، ہمدان اور بخارا میں بھی تھے بطور صوفی ان کی شہرت ان کی وجدانی ذہانت کی بنا پر تھی۔ جس سے آپ اپنے مریدوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے تھے۔ آپ بہت سے معاملات میں اپنے ہم عصر چشتی صوفیا سے مختلف تھے مثلاً۔

آپ اپنے گرد ہر طرح کے لوگوں کو جمع نہیں ہونے دیتے تھے اور جوالقوں اور قلندروں کی شاذ ہی آپ تک کوئی رسائی ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ آپ کے اور شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے درمیان گہری محبت تھی۔ بابا فرید کہتے ہیں کہ ایک بار برادرم بہاءالدین نے فرمایا کہ زہد تین چیزوں کا نام ہے جس میں یہ نہیں ہیں، اسے زاہد کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ اوّل دنیا کو پہچاننا، اور اس سے مایوس ہونا۔ دوم اولاد کی خدمت کرنا اور اس کے حقوق کی نگہداشت کرنا، سوم آخرت کی طلب کرنا اور اس کے حصول میں لگاتار کوشاں رہنا۔

حضرت بہاءالدین زکریا کو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی خزانوں سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ آپ کے یہاں زراعت و تجارت بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھی۔ بہت سے ملازم اور کارندے تھے۔ اس کی آمدنی ایک لنگر خانے پر صرف ہوتی تھی، جہاں سینکڑوں بندگان خدا روزی حاصل کرتے تھے۔

آپ کی اپنی غذا محض قلیل ہوتی تھی اتنی کہ قوت بحال رہے۔ البتہ علمائے کرام اور مشائخ کے لیے دسترخوان پر اہتمام کرتے تھے۔ روزہ کم رکھتے تھے، لیکن طاعت و عبادت کثرت سے کرتے تھے۔ ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ بدن کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی ترک گناہ میں اور دین کی سلامتی کثرت درود میں ہے۔

ایک بار فرمایا کہ آدمی میں اصل چیز دل ہے۔ جب دل کی اصلاح ہو جاتی ہے تو آدمی کے بدن کی بھی اصلاح ہو جاتی ہے۔ دل کی بھی حیات اور ممات ہے، شغل دنیا کی کثرت سے دل میں اندیشے داخل ہو کر اسے سیاہ کر دیتے ہیں اور یوں دل مردہ ہو جاتا ہے۔

حضرت کی ایک مشہور کرامت زبان زد خلائق ہے کہ آپ نے اپنے روحانی تصرف سے دریائے چناب میں ڈوبتی ہوئی ایک کشتی کو بچا دیا۔ چنانچہ آج بھی اکثر ملاح کشتی کھیتے ہوئے "دم بہاءالحق" کا نعرہ لگاتے ہیں۔

آپ کسی کو اپنے سامنے جھکنے نہیں دیتے تھے اگرچہ سلسلہ چشتیہ میں زمین بوسی عام تھی۔

آپ فرمانرواؤں اور انکے عہدیداروں سے گہرے روابط رکھنے کے قائل تھے۔

آپ سماع کے قائل نہ تھے۔

آپ کا قرون وسطیٰ کی سیاسیات پر گہرا اثر تھا۔ چنانچہ ملتان پر اقتدار قائم رکھنے میں انہوں نے التمش کو بڑی مدد دی اور اس کا دیا ہوا اعزازی لقب "شیخ الاسلام" بھی قبول کیا۔ ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں جب منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ اور ہرات کا حکمران بھی ان کے ساتھ مل گیا تو شیخ نے اپنے پاس سے حملہ آوروں کو ایک لاکھ دینار کی رقم پیش کی اور انہیں محاصرہ اٹھا لینے پر رضامند کر لیا۔

بقول شیخ محمد نور بخش "حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی بلاد ہند میں رئیس الاولیاء تھے علوم ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے احوال و مقامات میں کامل تھے ان سے اکثر اولیاء اللہ کے سلسلے چلے، لوگوں کو رشد و ہدایت فرمائی اور ان کو کفر سے ایمان کی طرف معصیت سے طاعت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لائے اور وہ شان عظیم کے مالک تھے۔

آپ کے سال وفات کے بارے میں اختلاف ہے "راحت القلوب" میں ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء اور "اخبار سہروردیہ" اور "تذکرہ علمائے ہند" میں ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء ہے۔ "آئین اکبری" اور "اذکار ابرار" میں ۶۶۵ھ/۱۲۶۷ء اور "سفینۃ الاولیاء" "تاریخ فرشتہ" اور "نزہۃ الخواطر" وغیرہ میں ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء ہے۔

آپ ملتان میں ایک بڑے شاندار مقبرے میں مدفون ہیں اس پر نصف دائرے کی شکل کا گول گنبد ہے اور چینی کی خوبصورت کاشی سے مزین کیا گیا ہے۔ تواریخ ضلع ملتان اور ملتان گزیٹیر کے بیان کے مطابق آپ نے اپنا مقبرہ خود تعمیر کرایا تھا۔ آپ کا عرس، ۷ر صفر المظفر کو منعقد ہوتا ہے۔

آپ کی اولاد میں سات فرزندوں کے نام ملتے ہیں۔ شیخ صدرالدین (عارف) شیخ قطب الدین، شیخ شمس الدین، شیخ شہاب الدین، شیخ علاءالدین (یحییٰ) شیخ برہان الدین (احمد) شیخ ضیاءالدین (حامد)۔

آپ کے بے شمار مریدین تھے۔ آپ کے بڑے بڑے خلفاء میں سے شیخ صدرالدین (عارف)، سید جلال الدین بزرگ بخاری، حسن افغان، سید عثمان معروف بہ لعل شہباز سندھی، شیخ امیر حسینی، شیخ فخرالدین عراقی، خواجہ کمال الدین مسعود وغیرہ ہیں۔

بہاءالدین، شیخؒ (۹۰۷ھ/۱۳۸۸ء ـ ۱۴ر ذی قعدہ ۹۱۲ھ/۲۸ر مارچ ۱۵۰۶ء) دہلی کے ایک بزرگ۔ شاہ باجن چشتی برہان پوری کے نام سے مشہور ہیں۔ والد کا نام حاجی معزالدین تھا۔ آپ کا نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اور بعد میں مخدوم شیخ رحمت اللہ مانڈوی کے سلسلہ ارادت میں شامل ہوئے اور بیعت کی۔ شیخ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے اور برہان پور خاندیس میں سکونت اختیار کی جس کے بارے میں عالم رویا میں اشارہ ہوا تھا۔ ۱۲۱ سال کی عمر

میں وفات پائی اور برہان پور میں دفن ہوئے۔ آپ کی ذات علوم ظاہری اور باطنی کے فیوض کا مرکز تھی۔ بادشاہ نے آپ کے لئے ایک خانقاہ اور مسجد بنوا دی۔ ایک کتاب علم سلوک وحقائق فارسی زبان میں آپ کی علمی یادگار ہے۔

آپ نے ایک کتاب جوادرادکے متعلق ہے تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ یہ درا صل صوفیانہ رنگ کی ایک فقہی تصنیف ہے۔

بہاءُاللہ (۲ محرم ۱۲۳۳ھ/۱۲ نومبر ۱۸۱۷ء - ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ/ ۲۸ مئی ۱۸۹۲ء) مرزا حسین علی نوری بن مرزا عباس عرف مرزا بزرگ ایران کے بہائی مذہب کا بانی۔ ایران کے قصبہ نور میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کی نو بیویاں تھیں۔ جن کے ہاں تیرہ بچے تھے مرزا یحیٰ صبح ازل اور مرزا حسین علی بہاءاللہ مرزا عباس کے بچوں میں سے تھے جن سے بابی مذہب کے دو فرقے بنے۔

بعض نے اس کی پیدائش تہران میں بتائی ہے۔ باب کی وفات کے وقت بہاءاللہ کی عمر ۲۲ سال تھی۔ ۱۸۴۴ء میں علی محمد باب نے جونہی دعویٰ الہام اور باب ہونے کا دعوےٰ کیا تو بہاءُاللہ نے شروع ہی سے اسے تسلیم کر لیا۔ اگرچہ باب کے ماننے والوں نے بہاءُاللہ کا نام شامل نہیں کیا۔

بابیوں اور حکومت ایران کے فوجی دستوں کی جنگ میں جو جنگ قلعہ شیخ طبرسی کے نام سے مشہور ہے شرکت کے لئے بہاءُاللہ نے اپنے بھائی صبح ازل اور ساتھیوں کے ساتھ بغداد کا رخ کیا۔ بغداد پہنچنے کے کوئی ایک سال بعد ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں بہاءُاللہ اکیلا کردستان کے صحرا سلیمانیہ کے پہاڑ سرگلو پر چلا گیا اور اپنی زندگی کے دو سال نہایت تنگی اور عسرت میں بسر کئے اس عرصے میں وہ اپنے ساتھیوں سے خط وکتابت کرتا رہا۔ آخر کار صبح ازل نے اسے بغداد واپس بلوایا۔ یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی صبح ازل کی قیادت میں بابی تحریک تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے تو اس نے اپنے یظہرہ اللہ ہونے کا دعوےٰ کیا اور بابی تحریک کی زمام عملاً اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بابی تحریک میں نئے سرے سے جان ڈالی۔ چونکہ صبح ازل ایک صلح جو اور نرم طبیعت کا مالک تھا وہ حکومت سے ٹکر نہیں لینا چاہتا تھا۔ بہاءُاللہ نے تحریک کو اپنے ڈھنگ پر ڈالنا چاہا جو ایرانیوں کے لئے نقصان دہ تھا چنانچہ حکومت ایران نے ترکی کی حکومت کو لکھا کہ بہاءُاللہ کو بغداد سے جو ایرانی سرحدوں کے قریب ہے کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ کیونکہ وہ اپنے زمانہ قیام بغداد میں خفیہ طور پر جاہل اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور بعض دفعہ اس نے بغاوت بھی برپا کرنے کی کوشش کی ہے اور ملا آقا دربندی کے قتل میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ دونوں حکومت کے باہم مشورے سے ۱۸۶۳ء میں بہاءُاللہ کو اس کی دونوں بیویوں اور بچوں اور اس کے کچھ پیروکاروں سمیت بغداد سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا گیا۔ بقول بلیل جب بہاءُاللہ نے یظہرہ اللہ کا دعوےٰ کیا تو اس کی عمر سینتالیس سال تھی۔

بغداد سے قسطنطنیہ منتقل ہوتے وقت اس نے ایک باغ میں بارہ روز قیام کیا۔ اس باغ کو بہائی باغ رضوان کا نام دیتے ہیں اور ان دنوں کو ایام عید رضوان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگست ۱۸۶۳ء میں یہ قافلہ کرکوک، موصل اور دیار بکر سے گذرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا۔ وہاں چار ماہ قیام کیا پھر ادرنہ کی طرف کوچ کیا۔ ادرنہ کو بہائی ارض السر کہتے ہیں۔ کیونکہ اس جگہ قیام کے دوران ہی میں بہاءُاللہ نے اپنے مخفی ارادے وا شگاف کئے تھے جنہیں وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ یہاں پر اس نے اپنے دعوے کی راہ ہموار کر لینے کے بعد بابیوں کو دعوت دی کہ اسے یظہرہ اللہ تسلیم کریں۔ چنانچہ اس کے اس دعوے کو صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ صبح ازل قدامت پسند تھا۔ جبکہ بہاءُاللہ ترقی پسند۔ پس یہی وہ وقت تھا جب کہ بابی تحریک دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ بہائیوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ باب کا اصل قائم مقام تو بہاءُاللہ ہی تھا لیکن حکومت اور عوام کو دھوکا دینے کے لئے باب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ صبح ازل کو اپنا نائب نامزد کرے تاکہ لوگوں کی توجہ بہاءُاللہ سے ہٹ جائے اور وہ محفوظ رہے۔ ان اختلافات کی بنا پر بابیوں میں قتل وغارت کا سلسلہ بھی چل پڑا۔ اور ایک دوسرے کو زہر دینے کی کوششیں بھی کی گئیں جب حالات نے بڑی ناگفتہ بہ صورت اختیار کر لی تو حکومت ترکی نے صبح ازل کو قبرص اور بہاءُاللہ کو عکہ فلسطین میں منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۵ اگست ۱۸۶۸ء کو بہاءُاللہ اور اس کے دوسرے ۷۰ ساتھی عکہ پہنچے۔ جہاں انہیں قلعہ عکہ میں قید کر دیا گیا۔ بعد میں ان کے قیام کے لئے کئی مختلف جگہیں بدلی گئیں۔ اور ۱۸۷۷ء تک یہ لوگ قید وبند کے مصائب میں مبتلا رہے۔ [illegible] میں ان لوگوں کو ٹھکانہ مل گیا۔ جہاں ۱۰ مئی ۱۸۹۲ء میں بہاءاللہ بیمار ہو گیا اور ۲۸ مئی کو پچہتر سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

بہاءُاللہ کی دو بیویوں سے ہر ایک سے چھ چھ بچے تھے۔ بہاءُاللہ نے پہلی بیوی کے بڑے لڑکے کو غصن اعلیٰ کا لقب اور دوسری بیوی کے بڑے لڑکے کو غصن اکبر کا لقب دیا تھا۔ ان دونوں کے باہمی جھگڑوں نے بہائی مذہب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ (نیز دیکھیے "بابیت" "باب علی محمد" "بہائیت")

بھاٹیہ بھاٹیہ یا بھاٹیہ، پاکستان کا ایک قدیم شہر [illegible] شمال کی جانب واقع ہے۔ اس [illegible] برہمن راجا کی معرکہ آرائیوں کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس [illegible] ملتان کے درمیان بتایا گیا ہے۔ بھٹیوں کی قبائلی تاریخ [illegible] اس شہر کی بنیاد [illegible] کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اس شہر کی تاریخ بنیاد تقریباً دوسری صدی عیسوی [illegible]

۹۵ھ/۷۱۳ء میں جب محمد بن قاسم سندھ سے فتح کے [illegible] کی طرف جا رہا تھا تو اس نے الور کو چھوڑ دیا اور بھاٹیہ پر حملہ کیا۔ اس قلعے کی [illegible] معاہدہ اطاعت اور لگان کی شرائط پر ہتھیار ڈال دیئے

مسلمانوں کی اس فتح کے بعد بھاٹیہ پر امن وسلامتی اور خوشحالی کا دور [illegible] کا شہر اور قلعہ دونوں البیرونی کے عہد تک پُر رونق تھے [illegible] کا ذکر ملتان [illegible] اس وقت کے دریائے سندھ کی دو شاخوں کے وسط میں آباد [illegible] طور پر آتا ہے۔

العتبی بھاٹیہ کا مقام دریائے سندھ کے مشرق میں ملتان کے نزدیک بتاتا ہے اور سلطان محمود غزنوی کی مہم کا ذکر ۳۹۶ھ/۱۰۰۵ء کے سلسلے میں کرتا ہے کہ سلطان نے اس قلعے پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ راجہ چپکے سے بھاگ نکلا اور جب اسے گرفتار کیا جانے لگا تو اس نے خودکشی کر لی۔

وہ لکھتا ہے سلطان محمود جب سیستان کے معاملات کا تصفیہ کر چکا تو اس نے بھاٹیہ فتح کرنے کے منصوبے کی تکمیل کا فیصلہ کیا چنانچہ وہ دریائے سیہون اور [illegible] ملتان کو عبور کر کے بھاٹیہ کے سامنے لشکر لے آیا۔ شہر کی فصیل بہت اونچی تھی اس کے گرد خندق تھی جو بہت گہری اور چوڑی تھی اور اس کے چاروں طرف ایک

قصہ یہ ہے کہ پرتگیزوں نے چرسے کے برابر زمین مانگی۔ بعد میں چرسے کے باریک باریک ٹکڑے کر کے اس کے طول کے برابر زمین حاصل کی اور پھر اس علاقے میں ایک مضبوط سنگین حصار بنا کر توپیں نصب کر دیں اور یوں ملک پر قبضہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

بہادر نظام شاہ احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا آخری بادشاہ، والد کا نام ابراہیم نظام شاہ تھا جس کی وفات ذی الحج ۱۰۰۳ھ اگست ۱۵۹۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد احمد نگر میں بہت سے گروہ بن گئے۔ جنہوں نے اپنے اپنے برائے نام بادشاہ قرار دے لیے۔ اس وقت احمد نگر پر میاں منجو کا قبضہ تھا۔ اس نے بہادر نظام کو جو اس وقت ایک شیر خوار بچہ تھا، بادشاہ تسلیم کر لیا۔ شہزادے کے مخالفوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ میاں منجو نے گجرات کے حاکم سلطان مراد سے مدد طلب کی اور وعدہ کیا کہ اگر اس کی مدد سے کامیابی ہوئی تو وہ سلطنت مغلیہ کا باجگزار ہو جائے گا۔ سلطان مراد نے بھی اس شرط کو منظور کر لیا اور احمد نگر پر بڑی جمعیت کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ قبل اس کے کہ شاہی فوج مدد کو پہنچتی وہ اپنے مخالفین کو مغلوب کر چکا تھا۔ اب میاں منجو سلطان مراد سے مدد مانگنے پر بہت پچھتایا اس غرض سے کہ اسے سلطنت مغلیہ کا باجگزار نہ بننا پڑے۔ اس نے شہزادہ مراد کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ شہر کو چاند بی بی جو بہادر نظام کی پھوپھی تھی کی نگرانی میں دے کر انصیر خاں کے سپرد کیا اور خود لشکر فراہم کرانے اور قطب شاہ والی گولکنڈہ اور احمد شاہ والی بیجاپور سے کمک طلب کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۵ء میں سلطان مراد نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ چاند بی بی نے اس محاصرے کی بڑی ہمت سے مدافعت کی۔ اس نے خود چہرے پر نقاب ڈال کر سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے۔ آخر کار سلطان مراد نے ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء میں قلت رسد اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے متحدہ فوج کی آمد کی وجہ سے چاند بی بی سے خراج قبول کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔

۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمد نگر کو فتح کر لیا اور بہادر نظام شاہ کو اس کے خاندان سمیت گوالیار کے قلعے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید کر دیا گیا۔

بہادر یار جنگ (۲۸ ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ/ ۳ فروری ۱۹۰۵ء — ۴ رجب ۱۳۶۳ھ/ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء) حیدر آباد دکن کے نواب، مسلمانوں کے رہنما اور تحریک پاکستان کے پرجوش مبلغ اور خطیب، خطاب قائد ملت اور لسان الامت تھا والد کا نام نواب نصیب یار جنگ تھا۔ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ اصلاً ایک افغانی قبیلے سدوزئی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ جن کا نام بھی محمد بہادر خان تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں ہندوستان آئے اور قصبہ بارہ بستی ریاست جے پور میں سکونت اختیار کر لی۔ نواب سکندر جاہ کے عہد میں یہ لوگ حیدر آباد دکن پہنچے مرہٹوں کی شورشوں سے نجات حاصل کرنے میں حکومت وقت کا بڑی دلیری سے ساتھ دیا اور اس کے عوض تقریباً ۴ لاکھ کی جاگیر دو ہزار سوار اور بہت سے اعزازات سے نوازے گئے۔ آصفجاہی سلاطین سے اس خاندان کی وفاداری ہمیشہ غیر متزلزل رہی اور ہر دور میں ان کے اعزازات میں ترقی ہی ہوتی گئی۔

چنانچہ نواب بہادر یار جنگ نے ایک بڑے اونچے گھرانے میں آنکھیں کھولیں سات روز کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کے بعد نانی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور چودہ سال تک نواب کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہیں۔ مشرقی علوم کی تحصیل میں آپ نے بڑے جید علماء کی صحبت سے استفادہ کیا اور بہت جلد ان علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ مغربی علوم حاصل کرنے کے لیے شہر کی عوامی درسگاہوں میں داخلہ لیا جہاں امراء کے بچے بالعموم شریک ہوتے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ اس وقت میٹرک کے طالب علم تھے چنانچہ تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا اور اپنی آبائی جاگیر کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں۔ آپ نے کفایت شعاری اختیار کی اور سادہ سے سادہ زندگی کو اختیار کیا۔ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء میں بیت اللہ کا حج کیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد پورے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا اور حجاز فلسطین، شام، مصر، ترکی، ایران، وسط ایشیا اور افغانستان کے بارے میں بالتفصیل اپنے تاثرات بیان کیے۔ اسی بناء پر خواجہ حسن نظامی نے آپ کو ابن بطوطہ ہند کے لقب سے نوازا۔

نواب صاحب نے تبلیغ اسلام کو اپنا مشن بنایا۔ ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس تبلیغ اسلام کی بنا ڈالی اور مسلسل تین ماہ تک حیدر آباد کے گاؤں گاؤں میں دورے کیے مشقتیں برداشت کیں اور تقریباً بیس ہزار انسانوں تک اسلام کی روشنی پہنچانے کا باعث بنے۔ آپ نے دیہات میں اضلاع میں اور شہروں میں تبلیغ کے لیے تنخواہ یاب مبلغین مقرر کیے۔ نواب ان سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے اور ضروری ہدایات دیتے۔ آپ کو قرآن مجید سے خاص شغف تھا کہ برسوں فجر کی نماز کے بعد اپنی ڈیوڑھی کی مسجد میں تفسیر کا درس دیتے رہے۔ تفسیر کے ساتھ تاریخ اسلام سے مسلمانوں کی ناواقفیت کو دور کرنے کے لیے آپ نے اپنی بصیرت افروز تقاریر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

بقول محمد عبدالہادی صدیقی "کتنی موہ لینے والی شخصیت تھی۔ جلال و جمال کی رعنائیوں کا پیکر۔ جلال میں کوہ آتش فشاں اور جمال میں نرم و سبک رو چشمہ۔ جس کے سینے میں چیتے کا جگر تھا اور جس کی نظر شاہین کی نظر تھی۔ اقبال کے مرد مومن کا جیتا جاگتا پیکر ایسا میر کارواں تھا جس کی نگاہ بلند اور جس کا سخن دلنواز تھا جو خاکی تھا لیکن سیمابی صفت سے مزین تھا اور جس کی سرشت میں کوکبی و مہتابی تھی۔ نواب بہادر یار جنگ جب محو گفتگو ہوتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ کلام پاک کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ تو چہرے سے فرشتوں کا تقدس ٹپکتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اردو میں قرآن حکیم نازل ہو رہا ہے۔"

نواب صاحب کا خیال تھا کہ منجملہ اور کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ غفلت نظام عسکریت سے بے اعتنائی ہے۔ چنانچہ جب علامہ مشرقی نے مسلمانوں کی عسکری تنظیم و تربیت کے لیے خاکسار تحریک کا آغاز کیا نواب مرحوم اس تحریک سے وابستہ ہو گئے اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ لیکن جب علامہ مشرقی کے سیاسی رجحانات میں ضعف آگیا اور ان کی گاندھی سے مفاہمت ہوئی تو نواب صاحب نے خاکسار تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مجلس اتحاد المسلمین جو ۱۹۳۳ء سے پہلے ایک مذہبی جماعت تھی نواب صاحب کی کوششوں اور توجہات کی بدولت ریاست حیدر آباد کے مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت بن گئی۔ نواب پہلی بار ۱۹۳۹ء میں مجلس کے صدر منتخب کیے گئے اور پھر ہر سال ملت نے آپ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔

نواب بہادر یار جنگ کا شمار برعظیم پاک و ہند کے ان عظیم المرتبت مشاہیر میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی ہندی مسلمانوں کے مذہبی تہذیبی اور فکری اقدار کے تحفظ اور اتحاد المسلمین کے لیے وقف کر دی تھی۔ آپ ایک سچے مسلمان تھے اور عاشق رسول تھے اتحاد بین المسلمین اور تحریک پاکستان پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے۔ قرآن مجید کی تبلیغ ان کی زندگی کے اولین مقاصد میں سے ایک تھا۔

جابر و ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا نواب مرحوم کا جزو ایمان تھا۔ آپ سچے

معنوں میں" میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند" کی زندہ تعبیر تھے۔ آپ نے تحریک پاکستان کے سلسلہ میں بے انتہا قربانیاں دیں۔ آپ کا شمار قائد اعظم

قائد اعظم کے رفیق، نواب بہادر یار جنگ

محمد علی جناح کے قریب ترین ساتھیوں میں ہوتا ہے۔ آپ ہی کی تحریک پر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بہار ہندوستان کا ایک شہر اور اسی نام کا صوبہ۔ اس صوبے کے مغرب میں اتر پردیش اور مدھیا پردیش شمال میں نیپال، مشرق میں بنگال اور بنگلہ دیش اور جنوب میں اڑیسہ واقع ہے۔ بہار اشوک سلطنت کا مرکز تھا عام طور پر اسے گلشن ہند کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت پٹنہ ہے عہد قدیم میں بہار بدھ مت کا گہوارہ تھا۔

صوبے کا نام شہر بہار کے نام پر رکھا گیا ہے۔ بہار شہر آج کل کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس کے اردگرد بدھ مت کی خانقاہیں تھیں۔ یہ صوبہ انگریزوں کے زمانے میں ۱۷۶۵ء سے بنگال کے حاکم کے تحت رہا۔ ۱۹۱۲ء میں بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے جدا کر کے دو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور بہار کا انتظامی حیثیت سے اڑیسہ کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں بہار اور اڑیسہ کو دو علیحدہ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو صوبہ بہار بھی ایک الگ مستقل صوبہ بن گیا۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں صوبے کی حدود نئے سرے سے متعین کی گئیں۔ صوبہ بہار کا موجودہ کل رقبہ ۶۷۱۹۸ مربع میل ہے اور آبادی چھ کروڑ کے قریب ہے۔

۵۸۹ھ/۱۱۹۴ء میں اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے شہر بہار کو فتح کیا اور وہ قطب الدین ایبک کے زیر سیادت اسی کے قبضے میں رہا۔ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں محمد بن تغلق نے بہار کو دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں بہار کو جون پور سے ملحق کر دیا گیا۔ ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء میں سکندر لودھی کے حملے کے بعد بہار کو دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد دوبارہ شاہان بنگال کے قبضے میں چلا گیا۔ اور جب تک مغلوں کا بنگال پر قبضہ نہیں ہوا بہار ان کے قبضے میں رہا۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں اکبر نے عہد میں بہار کو ایک صوبہ بنا دیا گیا جس میں آٹھ سرکاریں تھیں اور بہار صوبہ بنگال کے تحت تھا اس صوبے کا صدر مقام شہر بہار تھا۔ جسے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی میں شیر شاہ نے بدل کر پٹنہ کو صدر مقام قرار دیا۔ اس کے دور میں یہ علاقہ اودھ اور بنگال کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا۔ اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں بہار پر ایک افغان سلیمان کرارانی نامی حکومت کرتا تھا۔ بہار [illegible] سے بنگال اور بہار دونوں اکبر کے زیر اقتدار آ گئے اور اسی وقت سے [illegible] تک بہار مغلوں کے قبضے میں رہا۔ ۱۷۶۵ء میں جب بنگال کے ساتھ [illegible] انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی اکثریت بہار سے مشرقی پاکستان [illegible] میں سے اکثر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد سابق مشرقی پاکستان [illegible] سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ موجودہ شہر بہار کی آبادی [illegible] میں ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔

صوبہ بہار کی یادگار عمارات میں مقبرہ شیر شاہ سوری [illegible]

یہ مقبرہ ایک عظیم مصنوعی جھیل کے بیچ درمیان [illegible] لودھیوں کے عہد حکومت میں سب سے بڑے نامور تعمیرات علی [illegible] اس کے علاوہ رہتاس کا قلعہ جو شیر شاہ نے [illegible] اور ایک جامع مسجد کی تعمیر بھی شیر شاہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ [illegible] ایک یادگار عمارت ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] کے قلعے اور [illegible] ناگپوری دروازے پر نازاں ہے۔ مخدوم شاہ دولت کا [illegible] درگاہ کے نام سے مشہور ہے لائق تحسین ہے۔

بہار کو اسلامی دور میں علمی اور ثقافتی لحاظ سے ایک مرکزی [illegible] حاصل رہی ہے۔

اس صوبے میں جو بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں ہندی [illegible] میتھلی اور ماگھی (بہاری) کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں [illegible] ہے۔ انتظامی کاروبار اور تعلیم کی زبان ہندی ہے۔

موجودہ دور میں بہار کی اقتصادی اہمیت بہت [illegible] کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئلے کی کانیں اور لوہے کے [illegible] کارخانے اور مراکز ہیں۔

اس صوبے میں گرمی شدت سے پڑتی ہے اور جاڑے [illegible] یہاں کی پیداوار میں خاص طور پر چاول بہت زیادہ [illegible] پٹ سن اور گنا یہاں کی خاص پیداوار ہے۔

بھارت ہندوستان، انڈیا، ایشیا کا ایک ملک، جو ہندوستان کے ایک بڑے رقبے پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں نیپال اور چین [illegible] برما اور بھوٹان، جنوب میں بحر ہند اور مغرب میں پاکستان واقع ہے۔ [illegible] اگست [illegible] کو وجود میں آیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک آزاد ریاست بنا۔ یہ مختلف صوبوں اور ریاستوں کا ایک مجموعہ ہے، جسے انڈین یونین کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ [illegible] کا کل رقبہ [illegible] مربع میل (۳۲۵۹۷۵ء۳ مربع کلومیٹر) اور آبادی کا تخمینہ ۱۹۷۶ء میں ۵۶ کروڑ لگایا گیا۔

(اس میں سکم اور مقبوضہ کشمیر شامل نہیں۔)

بھارت ایک جزیرہ نما ملک ہے، جو ایشیا کے انتہائی جنوب میں واقع ہے خط سرطان اس کے عین وسط سے گزرتا ہے۔ اس کے انتہائی شمال میں ہمالیہ کا سلسلہ ہے، جو چین اور بھارت کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ ہمالہ کے نیچے دو[illegible] گنگا و جمنا کی زرخیز وادی ہے۔ جس کے جنوب میں صحراؤں کا علاقہ ہے۔ انتہائی جنوب میں یہ ایک جزیرہ نما کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جہاں آب و ہوا استوائی ہے۔ جنوبی کونے پر بحر ہند میں لنکا واقع ہے، [illegible] کے [illegible] بھارت کے گہرے تعلقات ہیں۔

بھارت [illegible] صوبوں اور [illegible] ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے۔ دہلی بھارت [illegible] کا دارالحکومت ہے۔ [illegible] کی آبادی (۱۹۹۱ء) [illegible] لاکھ کے قریب [illegible] صوبوں اور بڑے شہروں کی آبادی [illegible] ملاحظہ کریں۔

بھارت [illegible] وفاقی جمہوری پارلیمانی نظام حکومت ہے۔ ہر صوبہ ایک گورنر [illegible] ہوتا ہے۔ صدر حکومت پارلیمان کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے۔ پارلیمان [illegible] دو ایوانوں پر مشتمل [illegible] ایوان بالا راجیہ سبھا کہلاتا ہے، جس میں ۲۲۸ منتخب [illegible] ارکان ہوتے ہیں۔ ہر صوبے اور علاقے کی مقننہ اپنے منتخب نمائندے [illegible] کبھی توڑا نہیں جا سکتا [illegible] سوجاتے ہیں۔ ایوان زیریں پانچسو منتخب اراکین پر [illegible] کہا جاتا ہے۔ یہ ارکان بالغ رائے دہی کے ذریعے [illegible] ہوتے ہیں [illegible] اراکین ملحقہ علاقوں سے بھی منتخب ہوتے [illegible] وزیر اعظم مقرر ہوتا ہے۔ بھارت کی موجودہ [illegible] سے دوبارہ فائز ہیں۔ بھارت کے [illegible] صدر منتخب ہوتے ہیں۔

[illegible] بھارت [illegible] عام طور پر ہندوستان کی تاریخ سمجھی جاتا [illegible] ہندوستان اور اس کی تاریخ کا وجود موجود [illegible] پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، لنکا، نیپال [illegible] تاریخ ہے۔ اس لیے مورخین اس بھارتی دعوے کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ سابقہ ہندوستان کی تاریخ بھارت کی تاریخ ہے۔

ہندوستان ایک جغرافیائی خطے کا نام ہے، جس میں بھارت کی طرح اور بھی کئی ممالک موجود ہیں۔ اہل فارس نے یہ خطاب دریائے سندھ کی وادی میں رہنے والوں کو دیا تھا۔ جسے بعدازاں پورے برصغیر کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ مسلمان کبھی بھی ہندوستان کو ایک ملک نہیں سمجھتے رہے۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سے انگریزوں نے اس لفظ کو بطور ملک استعمال کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان ایک واحد ملک قرار دیا جانے لگا۔ یہ اتنی بڑی تاریخی غلطی ہے، جسے آج بھی بھارتی حکمران دہرا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک بھارت دراصل ہندوستان ہی ہے اور پاکستان کا خدانخواستہ کوئی حقیقی وجود نہیں۔

تاریخی پس منظر کے طور پر ہم اس خطے کی تاریخ کا مختصراً ذکر کر سکتے ہیں، جو بھارتی حدود میں واقع ہے۔ یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب آریا قبائل یہاں حملہ آور ہوئے۔ اور یہاں موجود قدیم باشندوں "دراوڑیوں" کو محکوم بنا لیا۔ ایسا تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں ہوا۔ آریوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن سے لے کر زبان، ادب اور مذہب تک کو بدل ڈالا۔ ۵۰۰ ق۔م تک اس علاقے میں برہمن مت کا پرچار ہوتا رہا۔ ان کی مذہبی کتابیں وید کے نام سے سنسکرت زبان میں لکھی جانے لگیں۔ آریوں کا مرکزی مقام ہستن پور تھا جو دہلی کے قریب واقع ہے۔ یہیں سے انہوں نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ ۸۰۰ ق۔م سے ۵۵۰ ق۔م تک آریا مگدھ تک۔ یعنی موجودہ صوبہ بہار تک پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ویدوں کی شرحیں لکھی گئیں اور اپنشدوں کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں ذات پات کا نظام پیدا ہوا۔ اسی دور میں جین مت اور بدھ مت نے جنم لیا۔

۳۲۷ ق۔م میں سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن وہ پنجاب سے آگے نہ بڑھ سکا ۳۲۱ ق۔م میں موریا سلطنت کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بانی چندر گپت موریا نے پہلی بار شمالی ہندوستان کو متحد کر کے پاٹلی پتر (پٹنہ) کو مرکزی مقام بنایا اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ اشوک [illegible] ۲۷۳ ق۔م تا ۲۳۶ ق۔م تھا۔ ۱۸۴ ق۔م میں موریا حکومت ختم ہو گئی اور باختر کے یونانی حکمران پنجاب پر قابض ہو گئے۔ وادی گنگا میں پشیہ مترنے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ ۲۷ ق۔م میں ختم ہو گئی۔

دوسرا بڑا خاندان جس نے ہندوستان میں بہت بڑی سلطنت قائم کی، کنشک

آگرہ کی حسین و جمیل موتی مسجد

تھا۔ اس خاندان کے بانی کنشک نے ۷۸ء میں کابل سے لے کر بنارس تک ایک بہت بڑی سلطنت قائم کرلی۔ یہ خاندان ۱۷۶ء میں ختم ہوا۔ اس کے بعد مدت تک کوئی بڑی سلطنت نہیں ملتی۔ البتہ ۳۲۰ء سے ۵۳۵ء تک کے ایک لمبے عرصے کے لئے گپت خاندان برسر اقتدار آیا، جس نے پاٹلی پتر (پٹنہ) ہی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ شمالی ہند سے لے کر دکن تک اور مشرقی بنگال، آسام وغیرہ سے لے کر قندھار تک کے حکمران اس کے تابع تھے۔ اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران بکرماجیت (۳۷۵ء تا ۴۱۳ء) تھا اس نے مالوہ، گجرات اور سوراشٹر بھی فتح کرلیا۔ اس کے بعد یہ خاندان زوال پذیر ہوتا چلا گیا۔ اس خاندان کے عہد میں برہمن مت کو از سرنو فروغ حاصل ہوا۔

۴۷۰ء سے ۵۵۳ء تک وسط ایشیا پر سفید ہُن قابض رہے۔ ان کے بادشاہ مہرگل کا مرکز حکومت سیالکوٹ تھا۔ لیکن یہ وسطی ہندوستان پر بھی حکمران تھا۔ اس وقت نے مالوہ پر دوبارہ تسلط حاصل کیا اور اس کے بھتیجے علاءالدین نے کڑا کو فتح کیا۔ ۱۲۹۶ء میں علاءالدین تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بے حد وسیع کیا۔ یہاں تک کہ بنگال سے گجرات اور پنجاب سے دکن تک اسی کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس لحاظ سے وہ ہندوستان بھر کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔

غیاث الدین تغلق ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث ۱۳۲۰ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے پوری سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا اور اس کے حاکم مقرر کیے۔ اس کے بعد محمد تغلق، فیروز شاہ تغلق، محمد شاہ اور محمود شاہ حکمران ہوئے۔ ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۰ء تک حاکم پنجاب خضر خان اور اس کی اولاد سادات خاندان کے نام سے حکومت کرتے رہے اس خاندان نے دہلی کے سوا باقی علاقوں کی حکومت کھودی۔ ۱۴۵۱ء پر محمد شاہ کے سپاہی بہلول لودھی نے پنجاب اور پھر دہلی کی حکومت پر قبضہ کر

شہنشاہ اکبر کا تعمیر کردہ - قلعہ آگرہ

تھانیسر اور راجپوتانہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوچکی تھیں جو مسلمانوں کی آمد تک قائم رہیں۔

۷۱۱ء میں مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم نے دیبل (بندرگاہ) کو فتح کرلیا اور پھر تین ہی برس میں اس نے مالوہ، راجپوتانہ، مارواڑ اور ملتان تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ نویں صدی عیسوی کے آنے تک یہ اسلامی حکومتیں خودمختار ہوچکی تھیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمود غزنوی نے جو غزنہ کا حکمران تھا، ہندوستان پر حملے کیے۔ ۱۰۲۵ء میں اس نے سومنات (گجرات) پر مشہور حملہ کیا اور یہاں اسلامی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد محمد، مسعود، مودود، علی، عبدالرشید، فرخ زاد، ابراہیم، مسعود، بہرام شاہ، خسرو شاہ اور خسرو ملک غزنوی خاندان کے یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔

۱۱۷۵ء میں شہاب الدین محمد غوری نے ملتان پر حملہ کیا پھر اُچ پر قبضہ کرلیا۔ ۱۱۷۷ء میں گجرات پر چڑھائی کی۔ ۱۱۸۶ء میں لاہور فتح کیا اور ۱۱۹۲ء میں تھنیسرہ کو زیر نگیں کیا ۱۱۹۳ء میں اس نے رائے پتھورا کو شکست دے کر دہلی پر فتح حاصل کی۔ ۱۱۹۵ء میں قنوج کے راجہ جے چند کو شکست دے کر قنوج سے بنارس تک حکومت کی۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رضیہ بیگم، ناصرالدین محمود، غیاث الدین کیقباد خاندان غلاماں کے نام سے حکمران ہوا۔

معزالدین کے وزیر فیروز خلجی نے جلال الدین کے لقب سے حکومت سنبھالی اس اور لودھی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس نے جو [illegible] لودھی نے اپنی حکومت کو مالوہ سے بنگال [illegible] نے گوالیار کے قلعے پر قبضہ کیا۔ [illegible] ابراہیم لودھی کو شکست دی اور ہندوستان [illegible]

بابر نے راجپوتانہ کے راجہ سانگا کو زبردست شکست [illegible] جونپور سے بنگال تک وسیع کیا۔ اس کے بعد [illegible] نے مختلف صوبوں کی حکومتیں اپنے [illegible] گوشمالی کے لیے جونپور اور چنارگڑھ [illegible] آیا۔ ۱۵۳۲ء میں بہادر شاہ والیٔ گجرات [illegible] نے بغاوت کردی۔ ہمایوں شیر شاہ سے [illegible] جہاں امرکوٹ کے مقام پر اس کا بیٹا اکبر پیدا [illegible] خاندان کے نام پر بنگال، بہار، جونپور [illegible] حکومت کی۔ ۱۵۴۰ء میں وہ کالنجر کا قلعہ فتح کرتے [illegible] محمد شاہ عادل، ابراہیم سوری اور سکندر سوری حکمران ہوئے۔

۱۵۴۵ء میں ہمایوں ایران سے قندھار آیا اور افغانستان کے اکثر علاقوں کو فتح کرتا ہوا لاہور کی طرف آیا۔ ۱۵۵۵ء میں اس نے سرہند کے قریب سکندر سوری

کو شکست دی اور دہلی اور آگرہ کو فتح کر لیا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں فوت ہوا تو اس کا بیٹا اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کے سرپرست اور وزیر بیرم خاں نے ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں ہیمو بقال کو شکست دی۔ اس کے بعد اکبر نے گجرات، بہار، بنگال کشمیر، قندھار، برار، خاندیش اور احمد نگر کو دوبارہ فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کیا۔ ۱۶۰۵ء میں اس کا بیٹا سلیم، جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی سلطنت مغلیہ کو استحکام حاصل رہا۔ اس کے بیٹے شاہ جہان کے عہد (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) تک سلطنت کے استحکام کا یہی حال تھا۔ مگر شاہجہاں کے بیمار ہوتے ہی اس کے بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان حصول تخت کے لئے جنگیں چھڑ گئیں۔ اس سر پھٹول نے سلطنت مغلیہ کے استحکام کو نقصان پہنچایا اور اگرچہ اورنگ زیب نے ۱۷۰۷ء تک زبردست حکومت کی۔ مگر اس کے بعد مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور مغلوں کا اقتدار محض دہلی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اورنگ زیب کے بعد جہاں دار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، شاہ عالم دوم اور اکبر دوم یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ ۱۸۲۷ء میں اس کا بیٹا بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھا اور ۱۸۵۷ء تک دہلی پر حکمران رہا۔

اورنگ زیب کے عہد میں یورپی تاجر ہندوستان پہنچنے لگے اور انہوں نے ساحلی علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ ان میں ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز قابل ذکر ہیں۔ ولندیزی تو زیادہ تر مشرق بعید کی طرف متوجہ رہے لیکن فرانسیسیوں اور انگریزوں نے ملکی سیاست میں عمل دخل شروع کر دیا۔ خصوصاً جنوبی ہند کی ریاستیں دکن، میسور اور کرناٹک ان طاقتوں کی آویزشوں کا شکار رہیں۔ اس آویزش میں انگریز کامیاب رہے۔ انہوں نے بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد جنوبی ہند کی طرف توجہ دی۔

لارڈ ویلزلی ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل رہا۔ اس کے عہد حکومت میں میسور کے حکمران ٹیپو سلطانؒ شہید سے آخری جنگ ہوئی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطانؒ کی شہادت پر جنوبی ہند پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس وقت دکن میں نظام خاندان حکمران تھا جو اب انگریزوں کا باجگزار بن کر رہ گیا۔ سلطنت میسور انگریزوں نظام اور مرہٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ مرہٹے اس وقت شمالی ہندوستان پر قابض تھے۔ بعد ازاں مرہٹوں سے بھی جنگ ہوئی۔ پھر کارنوالس اور منٹو یکے بعد دیگرے گورنر جنرل بنے۔ اس دوران میں کچھ عرصہ سر جارج بارلو بھی حکومت کرتا رہا۔ منٹو نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے معاہدہ کر کے دریائے ستلج کو درمیانی سرحد بنا لیا (۱۸۰۹ء)۔ ہیسٹنگز نے انگریزی حکومت کی سرحدیں بڑھائیں۔ ۱۸۲۴ء میں برما سے پہلی جنگ ہوئی۔ جو دو سال جاری رہی۔ ۱۸۳۵ء میں شہنشاہ دہلی کا نام سکوں سے خارج کر دیا گیا۔

لارڈ آک لینڈ (۱۸۳۶ء - ۱۸۴۲ء) کے زمانے میں افغانستان سے جنگ ہوئی جس کا آخری فیصلہ لارڈ ایلن برا (۱۸۴۲ء - ۱۸۴۴ء) کے عہد میں ہوا۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ ہو گیا۔ بعد ازاں سکھوں سے جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں پورا پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ ادھر برما کا علاقہ بھی انگریزی قبضے میں آ گیا۔ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت بھی ختم کر دی گئی۔ لارڈ ڈلہوزی نے بہت سے راجاؤں اور رئیسوں کے علاقے انگریزی عملداری میں شامل کر لئے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے بعض فوجیوں اور رہنماؤں نے انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ شروع کی۔ جسے عام طور پر غدر کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے

بھارت (شہر اور ریلوے)

اس میں زبردست نقصان اٹھانے اور بڑی کش مکش کے بعد دہلی اور لکھنؤ پر قبضہ کیا آخری مغل شہنشاہ کو رنگون بھیج دیا گیا جہاں وہ نومبر ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔ بے شمار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت سے رہنماؤں کو قید کر کے جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور ہندوستان کا انتظام براہ راست حکومت برطانیہ نے سنبھال لیا۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی پہلی سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی۔ جسے زیادہ تر حمایت ہندوؤں کی حاصل تھی۔ ۱۸۹۲ء میں مقننہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے بنا۔ اسی زمانے میں انجمن ہائے امداد باہمی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس سے دیہی زندگی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ۱۹۰۵ء میں کرزن نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اس پر بنگالی ہندوؤں نے شورش برپا کی۔ ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم منسوخ کر دی گئی۔ اسی سال دہلی میں جارج پنجم کی تاج پوشی کی رسم ادا ہوئی۔ نیز دارالحکومت کلکتہ کی بجائے دہلی کو قرار دیا گیا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جسے پہلی اسلامی سیاسی جماعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اس کے ایک اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں قیام پاکستان کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور میں قیام پاکستان کی قرارداد پیش کی گئی۔ جس کی رو سے مسلم اکثریت والے علاقے ایک آزاد ریاست قرار پائے تھے۔

۱۹۰۹ء میں جو آئینی اصلاحات ہوئیں۔ انہیں منٹو مارلے اصلاحات کہا جاتا ہے ان میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔

آل انڈیا نیشنل کانگرس کے چند اہم رہنماؤں میں جے بی کرپلانی، مولانا ابوالکلام آزاد، قائد اعظم، سوبھاش چندر بوس، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، حکیم اجمل خاں، ویش بندھو داس، مسٹر سی آر داس، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر ایم اے انصاری، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا محمد علی اور مہاتما گاندھی ہیں۔ ان سب نے وقتاً فوقتاً کانگرس کے جلسوں کی صدارت کی۔

۱۹۳۷ء میں بہت سے صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ مگر جب ۱۹۳۹ء میں انگریزوں نے ہٹلر کے خلاف اعلان جنگ کیا تو کانگرسی وزرا مستعفی ہو گئے اور انہوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر کانگرسی لیڈروں نے مرکز میں وزارت بنانا منظور کر لیا۔ اس وزارت کے برسراقتدار آنے ہی ہندو اکثریت کے علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔

۱۹۴۲ء میں کرپس مشن ہندوستان آیا۔ تقسیم ہند کی تجویز ابتداً اسی نے پیش کی۔ کانگرس پورے ہندوستان کو ایک ملک قرار دیتی تھی اور مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ اگر کوئی صوبہ متحدہ ہندوستان میں نہ رہنا چاہے۔ تو اسے اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ ۱۹۴۵ء میں برما کو الگ نوآبادیاتی حیثیت دے دی گئی۔ اسی سال برطانیہ میں لیبر پارٹی برسراقتدار آئی جو شروع ہی سے کانگرس کی حامی تھی۔ مسلم لیگ نے کانگرس کو انتخاب لڑنے کا چیلنج دیا۔ ۱۹۴۶ء میں عام انتخابات ہوئے۔ جن میں کانگرس کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا، جس نے تقسیم ہند کا مسودہ پیش کیا۔ مسلم لیگ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن کانگرس نے اسے توڑ مروڑ کر۔۔۔ کانگرس نے آسام کو بنگال سے علیحدہ علاقہ قرار دیا۔

۲۴ اگست ۱۹۴۶ء کو برطانیہ نے ہندوستان میں عبوری حکومت بنانے کا اعلان

کیا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں یہ حکومت کانگریس کے سپرد کر دی گئی۔ اکتوبر میں نواب حمیداللہ خاں فرمانروائے بھوپال نے گاندھی سے اس مسودہ پر دستخط لے لئے۔ جس میں گاندھی جی نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نمائندہ ترین جماعت تسلیم کر لیا۔ ۱۶ راکتوبر کو لارڈ ویول نے کیبنٹ مشن پلان کی مسلم لیگی تعبیر و تشریح کے مطابق، عبوری حکومت میں مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کو وزارت سنبھالنے کے لئے مدعو کیا اور مسلم لیگی بلاک نے وزارتیں سنبھال لیں۔ کانگریس نے اہم وزارتوں پر خود قبضہ رکھا۔ وزارت خارجہ پر پنڈت جواہر لال نہرو، وزارت دفاع پر سردار بلدیو سنگھ اور وزارت داخلہ پر سردار پٹیل براجمان ہوئے۔ ادھر مسلم لیگ کے نوابزادہ لیاقت علی خاں کو وزارت خزانہ کا منصب ملا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن کانفرنس ہوئی، جس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم اور لیاقت علی خاں نے شرکت کی۔ اور کانگریس کی طرف سے جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی سیاسی تقسیم کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیراعظم نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک جغرافیائی خطہ ہے۔ ان کے تاریخی فیصلے کے مطابق:۔
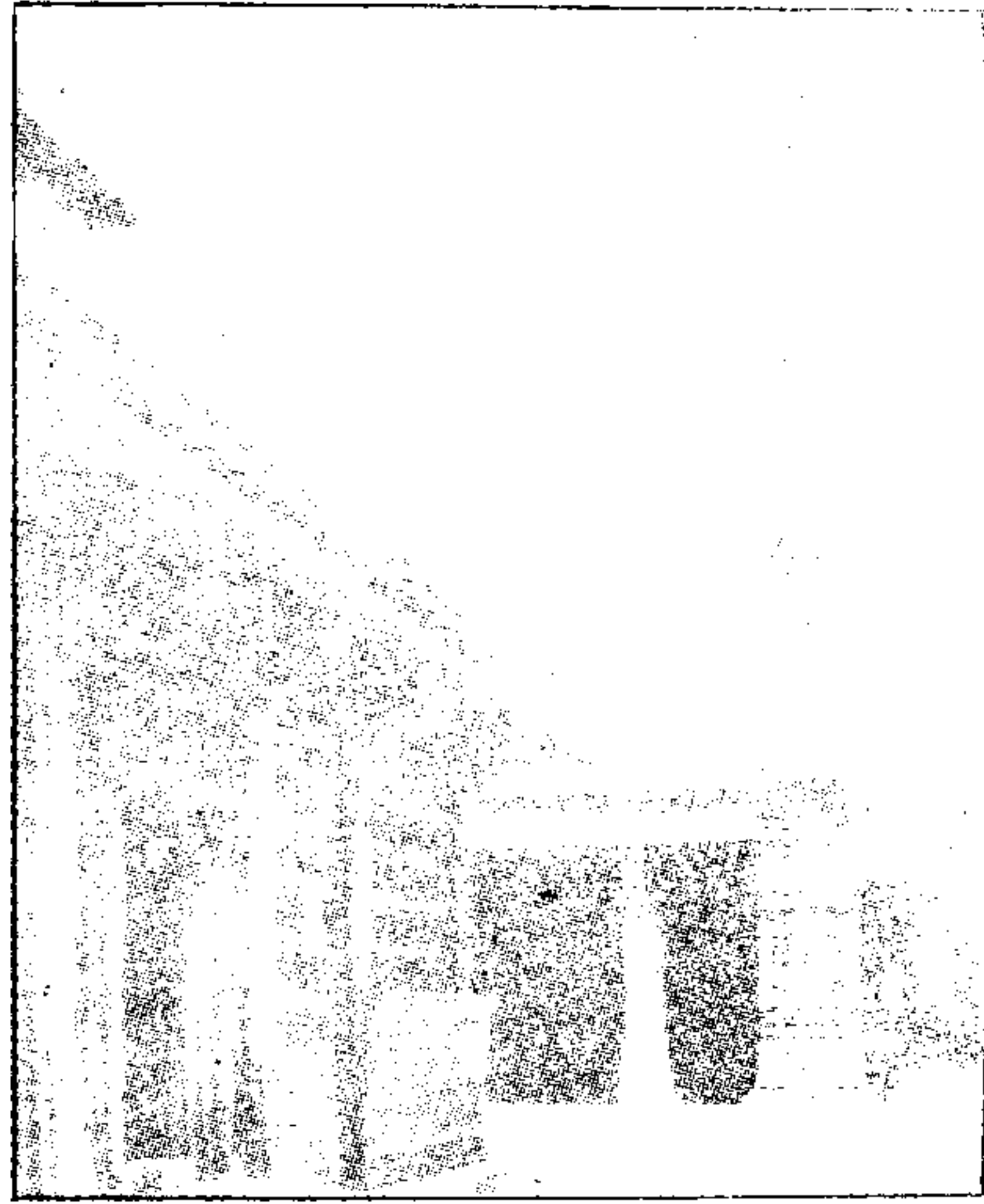
رانی مسجد، احمد آباد

۱۔ برطانوی حکومت اپنے قطعی ارادے کا اعلان کر چکی ہے کہ ممالک ہندوستان کا اقتدار ہیں کے ذمہ دار ہاتھوں میں منتقل ہو گا۔ اس کی تعمیل میں جون ۱۹۴۸ء سے زیادہ تاخیر نہیں کی جائے گی۔

۲۔ حکومت کو اعتراف ہے کہ اس بات کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا کہ کسی آئین پر یہاں کی تمام سیاسی جماعتیں متفق ہو جائیں۔

۳۔ برطانوی حکومت اعلان کرتی ہے کہ تاریخ موعود تک یا تو وہ ہندوستان کی کی ایک مرکزی حکومت کو اقتدار سونپ دے گی یا بعض صوبائی حکومتوں کو جس طرح بھی ممکن ہوا، اقتدار دے دیا جائے گا۔

کانگریس اس امر پر رضامند ہو چکی تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے نام سے علیحدہ حیثیت حاصل کر لیں لیکن پنجاب اور بنگال کے وہ اضلاع جہاں

بھارت کی سیاسی تقسیم ۔ رقبہ اور آبادی

علاقہ	صدر مقام	رقبہ (کلومیٹر)	آبادی (ہزاروں میں) ۱۹۷۱
ریاستیں (صوبے)			
آسام	دلیس پور	۷۸۵۲۳	۱۴۶۰۰
آندھرا پردیش	حیدرآباد	۲۷۵۲۸۱	۴۳۳۹۰
اتر پردیش	لکھنؤ	۲۹۴۳۶۶	۸۸۲۹۹
اڑیسہ	بھوبنیسوار	۱۵۵۸۲۵	۲۱۹۳۵
بنگال	کلکتہ	۸۸۵۶۳	۴۴۴۴۰
بہار	پٹنہ	۱۷۴۰۳۸	۵۶۳۵۲
پنجاب	چندی گڑھ	۵۰۳۷۶	۱۳۵۵۱
تامل ناڈو	مدراس	۱۳۰۳۵۷	۴۱۱۰۳
تری پورہ	اگرتلا	۱۰۴۵۳	۱۵۵۶
جموں کشمیر	سری نگر	متنازعہ علاقہ	
راجستھان	جے پور	۳۴۳۲۷۴	۲۵۷۲۴
کرناٹک	بنگلور	۱۹۱۷۵۷	۲۹۲۶۳
کیرالا	تری واندرم	۳۸۸۵۵	۲۱۳۴۷
گجرات	احمد آباد	۱۹۵۹۸۴	۲۶۶۹۸
منی پور	امپھال	۲۲۳۴۶	۱۰۷۰
مدھیا پردیش	بھوپال	۴۴۳۴۵۲	۴۱۴۵۰
میگھالیہ	شیلانگ	۲۲۴۴۵	۹۸۳
مہاراشٹر	ممبئی	۳۰۷۷۶۲	۵۰۴۱۲
ناگالینڈ	کوہیما	۱۶۵۲۷	۵۱۶
ہریانہ	چندی گڑھ	۴۴۰۵۶	۹۹۷۱
ہماچل پردیش	شملہ	۵۵۶۷۳	۳۴۶۰
ملحقہ علاقے			
آرونا چل پردیش	شیلانگ	۸۱۴۲۶	۴۴۵
انڈیمان، نکوبار	پورٹ بلیئر	۸۱۲۰	۱۱۵
پانڈیچری	پانڈیچری	۴۶۹	۴۷۱
چندی گڑھ	چندی گڑھ	۲۶	۸۹
دادر، نگرحویلی	سلواسا	۴۹۱	۷۴
دہلی	دہلی	۱۴۸۶	۴۰۶۶
گوآ، دمن، دیو	پنجم	۳۶۹۳	۸۵۷
لکشا دویپ	کوارتی	۳۲	۳۲
مزورم	ایزول	۲۱۲۳۰	۴۰۰

مسلمانوں کی اکثریت نہیں کانگریسی علاقوں کے ساتھ ملحق کر دیئے جائیں۔

تاریخ:۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آزادیٔ ہند کا مژدہ سنایا۔ جس کی رُو سے ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء ہندوستان دو آزاد مملکتوں پاکستان

اور بھارت میں تقسیم ہوگیا۔ کانگریس نے عملاً لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کو نیا گورنر جنرل بنائے رکھا
بھارت دولت مشترکہ برطانیہ کا رکن رہا اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء کو لندن میں ہونے
والی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں تسلیم کیا کہ بھارت خود کو برطانوی ملکہ کے زیر سایہ
سمجھتا ہے۔ ۱۰ مئی ۱۹۴۹ء کو بھارت کی قانون ساز اسمبلی نے اس امر کی توثیق کر دی
کہ بھارت برطانوی تاج کے زیر سایہ دولت مشترکہ کا ایک رکن ملک ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو بھارتی آئین منظور ہوا اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے نافذ ہو
گیا۔ اس آئین کی رو سے ۵۲۶ ریاستوں کے متحدہ ہندوستان کو جمہوریہ بھارت کا نام
دیا گیا۔ ریاستوں کی تعداد تیس کر دی گئی۔ گورنر جنرل کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ اور ملک میں
وزارتی نظام نافذ کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء تک اس آئین میں چالیس کے قریب ترامیم ہو چکی ہیں۔

اس آئین کی رو سے بھارت کی سرکاری زبان ہندی اور رسم الخط دیوناگری قرار
دیا۔ انگریزی کو ۱۹۶۵ء تک متبادل سرکاری زبان رہنے دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں لسانی ترمیم
کا ایک بل منظور کیا گیا، جس میں انگریزی اور ہندی دونوں کو سرکاری زبانیں قرار دیا گیا
دیگر زبانوں مثلاً آسامی، بنگالی، گجراتی، کناڈا، کشمیری، ملایالم، مرہٹی، اڑیا، پنجابی
سنسکرت، سندھی، تامل، تلگو اور اردو کو آئین کے آٹھویں گوشوارے میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں بھارت نے کشمیر اور پھر حیدرآباد اور جونا گڑھ جیسی ریاستوں پر فوج
کے زور پر قبضہ کر لیا۔ جو پاکستان کے ساتھ الحاق کر رہی تھیں یا کرنے والی تھیں۔
اس وقت سے ۱۹۶۹ء تک اگرچہ مرکزی حکومت پر کانگریس ہی برسر اقتدار رہی لیکن نہرو
کے فوراً ہی بعد اس جماعت کی مقبولیت میں کمی آنا شروع ہوگئی۔ اور دائیں اور بائیں بازو
کے عناصر زور پکڑتے چلے گئے۔ خصوصاً کمیونسٹ گروہ کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ ۳۰

تاج محل کا بڑا دروازہ

جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا۔ پنجاب میں سکھوں نے بمبئی میں مہاراشٹر صوبے
کے حامیوں اور شمال مشرقی علاقوں میں ناگا قبائل نے اپنے حقوق کے لئے فتنہ و فساد
برپا کرنا شروع کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم بنے۔ خوش قسمتی سے انھیں
زیادہ مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں بڑے بڑے رہنما یا تو
راہی ملک عدم ہوئے یا پھر وزارتوں سے مستعفی ہو گئے۔ مثلاً پٹیل اور ابوالکلام آزاد
فوت ہو گئے اور امبیدکر، دیش مکھ اور مکرجی جیسے وزرا مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں
پنڈت نہرو نے انتقال کیا تو لال بہادر شاستری وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ ان کے
دور اقتدار میں بھارت نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں بھارت کے بہت
سے علاقے پاکستان کے قبضے میں چلے گئے۔ بالآخر روس نے دونوں ملکوں میں صلح کرا دی
جنوری ۱۹۶۶ء میں تاشقند کے مقام پر معاہدہ ہوا۔ جس پر دستخط کرنے کے فوراً بعد
وزیر اعظم شاستری انتقال کر گئے۔ اب وزارت عظمیٰ پنڈت نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کے

پاس آئی۔ اس وقت سے لمحہ جاریہ ۱۹۷۶ء تک وہی اس عہدے پر براجمان ہیں [illegible]
نے بزعم خود اپنے عہدے میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یعنی ۱۹۷۱ء میں
پاکستان کے ساتھ جنگ چھیڑ کر اس کے ایک حصے مشرقی پاکستان کو اس سے کاٹ کر

[illegible]

ایک آزاد [illegible] حیثیت دے دی۔

اقتصادی اور دیگر معلومات: بھارت [illegible]
ملک کہلاتا ہے۔ لیکن یہاں [illegible]
[illegible] اقلیت اور [illegible]
[illegible] میں مسلمان [illegible]
اور دیگر مذاہب [illegible]

تعلیمی [illegible] بھارت [illegible]
[illegible] کا [illegible]
بنیادی [illegible]
[illegible] مرکزی حکومت کے [illegible]
میں پانچ [illegible] یونیورسٹیاں [illegible]
۱۹۷۴ء [illegible] پورے ملک میں ۹۰ یونیورسٹیاں [illegible]
اور [illegible] کے ڈگری تعلیمی [illegible]
پیشہ وارانہ تعلیمی [illegible] ۲۱۲۱۰۹ [illegible]
پرائمری اور ۴۲۰۲ [illegible] سکول ہیں۔

بھارتی سکہ روپیہ ہے۔ جو ۱۹۵۷ء سے اعشاری [illegible]
[illegible] پیسہ کہلاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں بھارت کی [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible] ۱۹۶۲ [illegible]
برطانیہ کے ۲۳۰ کروڑ روپے مغربی جرمنی کے [illegible]
روپے اور جاپان [illegible] کے ۵۴ کروڑ روپے بھارت کی [illegible]
بھارتی بجٹ کا زیادہ تر حصہ فوجی تیاریوں پر صرف [illegible]

اخراجات ۲۰۰۰ کروڑ روپے تھے۔ جب کہ کل اخراجات ۴۱۲۴ کروڑ روپے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں بھارتی فوج کی کل تعداد ۹۶۰۰۰۰ ہے۔ جو دو توپ خانے ۱۴ پیادہ اور دس پہاڑی ڈویژن ۵ آزاد آرمرڈ بریگیڈ، ۷ آزاد پیادہ اور ایک پیراشوٹ بریگیڈ پر مشتمل ہے بحریہ کے کل افسر ۳۰ ہزار ہیں، جو چار آبدوزوں، تین تباہ کن جہازوں، دو گموڈ بیڑوں، دو آبدوز شکن بیڑوں دو [illegible] آبدوز شکن بیڑوں، تین طیارہ شکن بیڑوں، چھ [illegible] بیڑوں، آٹھ روسی جہازوں چھ ساحلی محافظ جہازوں، آٹھ میزائل [illegible]، ۱۰ لانسی کشتیوں، ۵ طیارہ برداروں [illegible] جہازوں [illegible] پر مشتمل ہے۔ فضائیہ میں دو ہزار [illegible] جن پر اسی ہزار افسر کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے محفوظ آرمڈ [illegible] اور فضائی سکوارڈن ہیں جو سرکاری اعداد و شمار [illegible]

بھارت [illegible] ملک ہے جس پر ملک کی [illegible] کا دار و مدار ہے [illegible] کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ [illegible] باہر سے درآمد کرنا [illegible] ۱۹۷۳ء میں [illegible] ۱۲۹۲۲ ہزار میٹرک ٹن، مکئی ۱۰۲۸ ہزار

[illegible] قدیم مندر

[illegible] ۱۰۰۹۰ ہزار میٹرک ٹن اور جوار باجرہ ۱۰۲۲۸ ہزار میٹرک ٹن تھی۔ تقریباً [illegible] اور تقریباً [illegible] اور [illegible] زیر کاشت [illegible] معدنیات میں ابرک، [illegible] چینی، [illegible] کرومائیٹ، کوئلہ، لوہا، تانبا، سونا، چاندی [illegible] اہم ہیں۔ ۱۹۰۲ء [illegible] کوئلے کی صنعت کو قومیا لیا گیا۔ صنعتوں میں [illegible] پٹ سن، [illegible] اور دھاتوں کی صنعتیں اہم ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں لوہے اور فولاد کی صنعت کو قومیا لیا گیا۔ جو تقریباً ایک کروڑ ٹن سالانہ فولاد اور اس کی اشیاء تیار کرتی ہے۔ بھارت کی تجارت دنیا کے اکثر ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ برآمدات میں پہلے نمبر پر جاپان ہے۔ اس کے بعد امریکا پھر روس اور برطانیہ کا نمبر آتا ہے۔ درآمدات میں امریکا پہلے نمبر پر ہے۔ اس کے بعد ایران، پھر جاپان، روس اور برطانیہ کا نمبر آتا ہے۔ برآمدات میں کپڑا، پٹ سن، چمڑا، لوہا، چائے، مچھلی، پھل، تمباکو اور ان کی مصنوعات

بھارت کے چند مشہور شہروں کی آبادی۔ ہزاروں میں (۱۹۷۱ء)

آگرہ (۶۳۸)	بنگلور (۱۶۴۸)	چندی گڑھ (۲۳۳)	کلکتہ (۷۰۰۵)
اجمیر (۲۶۳)	بہار (۱۰۱)	حیدر آباد (۱۷۹۹)	کوچین (۴۳۹)
[illegible] (۱۰۹)	بھاگلپور (۱۷۳)	دربھنگہ (۱۳۲)	گنٹور (۲۷۰)
احمد آباد (۱۵۸۸)		ڈیرہ دون (۲۰۰)	
احمد نگر (۱۱۷)	بہرام پور (۱۱۸)	دہلی (۳۶۳۰)	گوالیار (۴۰۶)
اکولا (۱۶۹)	بھوپال (۳۹۲)	راجکوٹ (۳۰۰)	گورکھپور (۲۳۰)
الہ آباد (۵۱۴)	بھونیشور (۱۰۶)	رامپور (۱۶۲)	گوہاٹی ڈیس پور (۱۲۳)
[illegible] (۱۰۱)	[illegible] (۱۰۳)	رانچی (۲۵۶)	گیا (۱۸۰)
امرتسر (۴۳۳)	[illegible] (۱۸۹)	رائے پور (۲۰۶)	لدھیانہ (۴۰۱)
[illegible] (۱۰۶)	[illegible] (۶۰۰)	روہتک (۱۲۵)	لکھنؤ (۸۲۶)
انبالہ (۱۰۳)	پٹیالہ (۱۵۲)	سالم (۳۰۹)	متھرا (۱۴۱)
اندور (۵۶۳)	پونا (۸۵۳)	سورت (۴۷۲)	مدراس (۲۴۷۰)
اودے پور (۱۶۳)	تھانہ (۱۷۰)	سہارنپور (۲۲۶)	مدورائے (۵۴۹)
اورنگ آباد (۱۵۱)	جالندھر (۲۹۶)	شاہجہانپور (۱۴۴)	مراد آباد (۲۷۲)
بردوان [illegible]	جام نگر (۲۱۵)	علی گڑھ (۲۵۴)	مالیگاؤں (۱۹۲)
بڑودہ (۴۶۶)	جبل پور (۵۳۴)	غازی آباد (۱۲۸)	منگلور (۲۱۴)
برہان پور (۱۰۵)	جل گاؤں (۱۰۶)	فرخ آباد (۱۱۲)	میسور (۳۵۶)
بریلی (۳۲۶)	جمشید پور (۴۶۵)	فیروز آباد (۱۳۴)	ناگپور (۸۶۶)
بلگام (۲۱۴)	جودھ پور (۳۱۹)	فیض آباد (۱۱۰)	نظام آباد (۱۱۵)
بمبئی (۵۹۶۹)	جھانسی (۱۹۸)	کانپور (۱۲۷۳)	ویلور (۱۳۸)
بنارس (۵۸۳)	جے پور (۶۱۳)	کرنول (۱۳۶)	

امرتسر کا مشہور سنہری گوردوارہ

اہم ہیں۔ درآمدات میں پٹرولیم، مشینری، گندم، چاول، کھاد، فولاد، برقی اشیاء، کیمیاوی اشیاء اور ان کی مصنوعات اہم ہیں۔

بھارت میں ریلوے لائن کی کل لمبائی ساٹھ ہزار کلومیٹر ہے اور سڑکوں کی کل لمبائی

۱۲۸،۲۸۸ کلومیٹر ہے۔ ہوائی اڈوں کی کل تعداد ۸۴ ہے۔ جہاں بھارت کے ۴۲ طیارے اترتے چڑھتے ہیں۔ ان اڈوں میں سے چار بمبئی، کلکتہ، دہلی اور مدراس بین الاقوامی پروازوں کے اڈے ہیں۔

بہاری، غلام یحیٰ ایک عالم دین۔ باپ کا نام نجم الدین تھا۔ صوبہ بہار کے ایک گاؤں "باڑہ" میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ البتہ ان کی کتاب میں ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے مختلف مدارس میں حاصل کی۔ تکمیل علوم مدرسہ منصوریہ میں مولانا باب اللہ جونپوری سے کی۔ طریقت میں شیخ بدر العالم ساداموی سے فیض حاصل کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ لکھنؤ میں مدرس مقرر ہوئے اور برسوں تک تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعد میں دہلی میں مرزا مظہر جانجاناں سے طریق نقشبندی میں اجازت حاصل کی اور پانچ سال تک ان کی خدمت میں رہنے کے بعد خلافت سے نوازے گئے۔ بعد میں لکھنؤ آ گئے اور شیخ پیر محمد لکھنوی کے زاویے میں مسجد شیخ محمود قلندر کے قریب سکونت اختیار کی۔ اور ظاہری علوم کی تدریس ختم کر دی۔ نیز علوم عقلیہ کو بالکل بھلا دیا۔ اور باطنی علم کی تعلیم دینے میں مصروف ہو گئے۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں اور صاحب "نزہۃ الخواطر" کے بقول ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء ہے۔ یہیں پر مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں دو رسالے خاص طور پر مشہور ہیں اور درس نظامی کے نصاب میں داخل ہیں۔

۱۔ حاشیہ شرح "سلم العلوم"۔ ۲۔ لوامع الھدیٰ فی اللیل والدجیٰ۔ ۳۔ "کلمۃ الحق" (یہ کتاب تصوف کے بارے میں ہے۔)

بہاری، محب اللہ (وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) ایک عالم دین، والد کا نام عبدالشکور عثمانی تھا۔ صوبہ بہار میں محب علی پور کے قریب موضع کرا میں پیدائش ہوئی۔ ان کے آباؤ اجداد باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مولانا قطب الدین انصاری سے حاصل کی اور کچھ کتابیں قطب الدین شمس آبادی سے پڑھیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر دکن چلے گئے۔ اس زمانے میں اورنگ زیب دکن کے مقامی حکمرانوں سے معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔ اورنگ زیب نے مولانا محب اللہ بہاری کی علمی لیاقت اور خصوصاً فقہ کی مہارت سے متاثر ہو کر انہیں لکھنؤ کا قاضی مقرر کیا۔ ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں انہیں حیدرآباد کا قاضی بنایا اور اس کے بعد اورنگ زیب کے پوتے رفیع القدر کا استاد مقرر کیا گیا۔ جب شاہ عالم کو صوبہ کابل کا صوبے دار مقرر کیا گیا تو محب اللہ بھی کابل چلے گئے۔ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں جب شاہ عالم بہادر شاہ اول کے لقب سے تخت پر بیٹھا تو اس نے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا اور فاضل خان کے لقب سے نوازا۔ اس کے تھوڑی مدت بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی تصانیف ہیں ۱۔ سلم العلوم۔ ۲۔ مسلم الثبوت۔ ۳۔ الجوہر الفرد۔ ۴۔ رسالۃ المغالطۃ العامۃ الورود۔ ۵۔ رسالہ فی اثبات ان مذہب الحنفیۃ ابعد عن الرای من مذہب الشافعیۃ ہیں۔ پہلی تین تصانیف پاک و ہند میں دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔

بہاول پور پاکستان کا ایک شہر اور کمشنری۔ شہر دریائے ستلج کے بائیں کنارے پر پشاور کراچی کی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ پہلے یہ ریاست بہاولپور کا صدر مقام تھا۔ جو دریائے ستلج، پنجند اور سندھ کے بائیں کنارے پر تین سو میل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا عرض اوسطاً ۴۰ میل تک صحرا میں پھیلا ہوا تھا جس کی بنیاد سندھ کے داؤد پوتا خاندان کے دوسرے حکمران نے رکھی تھی جس کا نام محمد بہاول خان تھا۔ اس نے ۱۷۴۸ء میں بہاولپور شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنے نام سے موسوم کیا۔ یہ حکمران خاندان جو اپنے مورث اعلیٰ عباس کی نسبت سے عباسی بھی کہلاتا ہے اٹھارویں صدی کے اواخر میں افغان بادشاہوں کی سیادت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کو ... بغداد اور مصر کے عباسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۱۸۳۳ء میں اس خاندان نے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔

پاکستان بننے کے بعد ۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یہ ریاست پاکستان میں شامل ہو گئی ۱۹۵۵ء میں بہاولپور ریاست کا جداگانہ وجود ختم کر دیا گیا اور یہ ریاست صوبہ مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی۔ ۱۹۶۹ء میں اس شہر کی آبادی ۸۴،۰۰۰ تھی۔ بہاولپور شہر میں دو بڑے بازار ہیں۔ جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ایک بڑا محل ہے جو ۱۸۷۹ء میں نواب بہاولپور دوم نے بنوایا تھا۔ اب یہ محل سرکاری دفاتر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک نیا محل نواب صادق نے بنوایا ہے جو ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید عمارات میں لائبریری، سٹیڈیم، صادق ایجرٹن کالج، جامعہ اسلامیہ بہاولپور اور ایک بڑا ہسپتال ہے۔ ایک چڑیا گھر، عجائب گھر اور ایک اردو اکیڈمی بھی موجود ہے۔ یہاں صابن بنانے کی ایک بڑی فیکٹری ہے۔ یہ گیہوں، چاول، کپاس اور کھجور کی بڑی منڈی ہے۔

بہاولپور کمشنری میں ۱۹۵۱ء میں دو اضلاع بہاولپور اور رحیم یار خان تھے ۱۹۵۲ء میں بہاولنگر ضلع کو بھی شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں ضلع بہاولپور کی آبادی ۵۲۹،۸۴۳ تھی۔ ۱۹۵۵ء میں جب مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنایا گیا تو بہاولپور کو بہاولنگر اور رحیم یار خان کے ساتھ ایک ڈویژن (کمشنری) بنا دیا گیا اس کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۵،۷۴،۰۹۶ تھی۔

بہائیت بابی مذہب کا ایک فرقہ یہ اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک الگ مذہب ہے اور اس کے پیرو اپنے مذہب کو دنیا کے دوسرے تمام مذاہب سے بہتر مانتے ہیں۔ بہائیت کی تعلیمات اور اعتقادات کا بہت بڑا حصہ اسماعیلی عقائد و تعلیمات سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد مرزا حسین علی نوری ملقب بہ بہاء اللہ نے رکھی تھی۔ بہاء اللہ کا لقب اسے علی محمد باب نے دیا تھا کیونکہ یہ بابی مذہب کا پیروکار تھا۔

باب نے اپنے بعد مستقبل قریب میں ایک شخص کی بعثت کی خبر دی جسے اس نے یظہرہ اللہ کا نام دیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ایک شخص مرزا اسد اللہ خوئی نے یظہرہ اللہ کا دعویٰ کر دیا۔ بہاء اللہ اور صبح ازل نے اس کی مخالفت کر کے اسے قتل کرا دیا۔ بعد میں بہت سے بابیوں نے یظہرہ اللہ ہونے کا دعویٰ کیا لیکن کسی کو بھی خاص اہمیت حاصل نہ ہوئی۔

جب ۱۲۶۳ھ میں بہاء اللہ اپنے قافلے سمیت حج کو جا رہا تھا تو شیخ ... نے ...

لے گئے جارہا تھا گرفتار ہو گیا اور حکومت نے تحقیقات کے لیے پورے قافلے کو آمل کی طرف روانہ کیا تو بہاء اللہ نے راستے میں موقع پا کر تمام تحریریں دریا برد کرا دیں۔ اور آمل پہنچ کر اپنے مختلف ساتھیوں کو مختلف بہانوں سے رہا کرا دیا۔ تاہم خود قید میں رہا۔ یہ بہاء اللہ کی دوسری گرفتاری تھی۔ تیسری گرفتاری ۲۸ شوال ۱۲۶۸ھ/ ۱۵ اگست ۱۸۵۲ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۸۵۲ء میں اور بعض کے نزدیک ۱۸۶۱ء میں یا پھر بقول مرزا جواد جو ایک بابی مصنف ہے ۱۸۶۳ء میں بہاء اللہ نے من یظہرہ اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے اس دعوے کو صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے رد کر دیا۔ لیکن بابیوں کی اکثریت نے اس کا یہ دعوے تسلیم کر لیا۔

باپ کے دعوے کی طرح بہاء اللہ کا دعویٰ بھی بڑا پیچیدہ ہے اور اسے سمجھنا بہت دشوار ہے۔

بہائیوں کا بہاء اللہ کے بارے میں کچھ اس طرح کا تصور ملتا ہے کہ گویا بہاء اللہ ہی خدا تھا۔ جس نے انسانیت کا جامہ پہن لیا تھا۔ بہائیت کی مذہبی کتب میں پہلے انبیاء کو بھی ظہور الٰہی قرار دیا گیا ہے اور قرآن کریم کی آیت "وہ اپنے کاموں کے لئے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔" (۲۱ : ۲۳) کو صفات الٰہیہ میں سے قرار دیا گیا ہے۔ بہائیوں کے نزدیک یہی صفت بہاء اللہ کو حاصل تھی۔ نیز بہاء اللہ کا اپنے بارے میں یہ بھی دعوےٰ تھا کہ وہ "اپنے کاموں کے لئے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے اور سب جوابدہ ہیں۔" "وہ زندگی کا میدان ہے۔" "وہ اللہ ہے۔" "وہ تمام الٰہی اسماء وصفات کا منبع ہے۔" "وہ خود ہی ذاکر اور خود ہی مذکور تھا۔" "وہ وہی ہے جو موسیٰ سے کوہ طور پر ہمکلام ہوا تھا۔"

چنانچہ بہائیت کی تعلیمات کے مطابق بہائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسے خدا ہی مانتی ہے۔

بہائیت کا امریکہ میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا مبلغ ڈاکٹر ابراہیم جارج خیراللہ تھا جس نے بہاء اللہ کو بطور خدا ہی پیش کیا ہے۔ امریکا میں بہائی مذہب اختیار کرنے کے لیے جو بیعت فارم شائع کیا گیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں "اے عظیم عبدالبہاء، خدا کا نام لے کر میں بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے خالق و برتر و توانا خدا کی توحید کا اقرار کرتا ہوں اور خدا کے انسانی شکل میں ظاہر ہونے پر میرا ایمان ہے۔"

بہائیوں کے نزدیک بہاء اللہ کی آمد پر بعثت انبیاء کا دور ختم ہو چکا ہے اور یہ دور آدمؑ سے بہاء اللہ تک ہے۔ بہاء اللہ کے بعد پہلے انبیاء کی تمام شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں اور اب صرف بہائی شریعت پر ہی عمل کر کے نجات مل سکے گی۔

بہائیت میں اجتماعی عبادت کی کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ البتہ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء میں عبدالبہاء نے شکاگو کے قریب ایک "مشرق الاذکار" کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ اس عمارت کو بہائی مذہب کی عبادت گاہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک "مشرق الاذکار" ۱۹۰۲ء میں اشک آباد (روس) میں بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ بہائیوں کا قبلہ عکہ ہے۔ اور سال میں انیس روزے فرض ہیں جو ۲ مارچ سے شروع ہو کر ۲۱ مارچ تک ہیں۔ روزے کا وقت طلوع شمس سے غروب شمس تک ہے۔ ان کی کتاب الاقدس میں زکوٰۃ کے نصاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ لیکن نصاب کا ذکر نہیں کیا گیا۔

بہائیت میں معاشرتی مسائل کے بارے میں بھی تعلیمات دی گئی ہیں ان میں بلا مذہب و ملت حتیٰ کہ مشرکین سے بھی شادی کو جائز قرار دیا گیا ہے ایک وقت میں دو بیویاں رکھی جا سکتی ہیں لیکن عبدالبہاء نے اس تعداد ازدواج کو ختم کر دیا ہے بہائی شریعت میں مہر ۱۹ مثقال مقرر کیا گیا ہے۔ زنا کی سزا ۹ مثقال ہے اور دوسری مرتبہ زنا کی سزا ۱۸ مثقال ہے

بہائی سال میں پانچ عیدیں مناتے ہیں۔ ۱۔ بہاء اللہ کے ظہور پر عید رضوان ۲۔ عید بعثت باب۔ ۳۔ عید میلاد بہاء اللہ۔ ۴۔ عید میلاد باب۔ ۵۔ عید نوروز

بہائی تعلیمات میں اخفائے راز کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے اور بہائیوں کے ہاں اپنی دولت، اپنے سفر کی منزل مقصود اور اپنے مذہب کے چھپانے کی تلقین پائی جاتی ہے۔

بہائیوں میں ولی امر اللہ کا عہدہ موروثی ہے لیکن باپ کے بعد لازماً بڑا بیٹا اس کا جانشین نہیں ہوتا۔ بلکہ باپ اپنی زندگی میں اس عہدے کے لیے خاندان کے کسی فرد کو نامزد کر دیتا ہے۔ تاہم اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ بہائی مذہب کا رئیس اعلیٰ ہمیشہ بہاء اللہ کی اولاد میں سے ہو۔ (نیز دیکھیے۔ "بہاء اللہ")

بہائی، محمد آفندی (۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء ـ ۱۳ صفر ۱۰۶۴ھ/۳ جنوری ۱۶۵۴ء) عثمانی فقیہ اور ایک عالم دین۔ والد کا نام عسکر عبدالعزیز آفندی تھا جو روم ایلی کا قاضی تھا اور دادا کا نام سعدالدین تھا جو ایک مورخ کی حیثیت سے مشہور تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ مذہبی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرس ہو گیا۔ اس کے بعد سالونیکا کا قاضی بنا۔ اور پھر ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں حلب کا قاضی مقرر ہوا۔ اسے تمباکو پینے کا بے حد شوق تھا اور اس زمانے میں تمباکو نوشی کو ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں قاضی کے عہدے سے برطرف ہو کر قبرص میں جلاوطنی کے دن گذارنے لگا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء میں اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں شام کا ملا بنا دیا گیا۔ اور پھر ادرنہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں استنبول کا قاضی مقرر ہوا۔ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں اسے پہلی مرتبہ شیخ الاسلام کا عہدہ دیا گیا۔ اس نے درویشوں کے مولویہ اور خلوتیہ سلسلوں کو جو مراعات دیں نیز اس کے تمباکو اور قہوے کے استعمال پر اور درویشوں کے رقص و سماع کے بارے میں اس کی رواداری پر راسخ العقیدہ مسلمان اس کے مخالف ہو گئے۔ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں ازمیر کے قاضی اور وہاں کے برطانوی قونصل کے درمیان کچھ تنازعہ رونما ہوا تو اس نے برطانوی قونصل کو اس کے گھر پر نظر بند کر دیا۔ چنانچہ سفارتی مراعات کی اس خلاف ورزی پر اس کی موقوفی عمل میں آئی۔ ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۴ء میں اسے دوبارہ اس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ اور تادم وفات پھر وہ اسی عہدے پر قائم رہا۔

بہائی ایک عالم دین اور شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ اگر وہ تمباکو نوشی کی عادت میں مبتلا نہ ہوتا تو اس کا شمار ملک کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا۔

بہائی نے اپنی تصانیف میں نظمیں اور فتاوے چھوڑے ہیں۔ اس کا مشہور ترین فتوےٰ وہ ہے جس میں اس نے تمباکو نوشی کو جائز قرار دیا ہے۔

بُہتان تہمت، افتراء۔ ایسا جھوٹ جو سننے والے کو متحیر کر دے۔ وہ عیب جو آدمی میں نہ ہو۔ یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو وہ اس کی طرف منسوب کرنا۔ یہ فعل صرف اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو بلکہ ایک ایسا جرم بھی ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں

بھی اسے مستلزم سزا قرار دیا جاتے۔

قرآن مجید میں بہتان کا لفظ مختلف جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دے دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے۔" (۲۰:۴)

"پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔" (۱۱۲:۴)

سورۂ احزاب میں فرمایا گیا ہے۔

"اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انھوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔" (۳۳: ۵۸)

"کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔" (۲۴: ۱۶)

آنحضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ "غیبت کیا ہے" آپ نے فرمایا "تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔" عرض کیا گیا "اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو۔" آپ نے فرمایا "اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔" (ابو داؤد، ترمذی)

بھٹائی، عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء - ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) سندھ کے ایک معروف صوفی شاعر اور ولی اللہ، والد کا نام سید حبیب تھا۔ سندھ میں مٹیاری کے قریب بالا نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کا بچپن اپنے گاؤں ہالہ حویلی میں اور شباب کا زمانہ کوٹڑی میں گذرا لیکن اس کے بعد آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایک ریت کے ٹیلے (بھٹ) پر گذارا۔ اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ بچپن ہی سے آپ کا رجحان دین اور تصوف کی طرف تھا۔ بڑے ہوئے تو فقیروں اور صوفی منش بزرگوں میں بیٹھنا اور ذکر و فکر کرنا ان کا محبوب مشغلہ ٹھہرا۔ خدا رسیدہ ہستیوں سے ملاقات کی خاطر سفر کیا اور اس سلسلے میں ملتان، جیسلمیر، لس بیلا، مکران، کچھ اور کاٹھیا واڑ کے علاقوں کا سفر کیا اور مختلف بزرگان دین سے ملاقاتیں کیں اور فیض حاصل کیا۔

آپ ہر وقت دین اسلام کی تبلیغ میں سرگرم رہتے تھے۔ آپ کے زمانے میں سندھ کے علماء فرقہ پرستی کا شکار تھے۔ جب آپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو مصمم ارادہ کر لیا کہ اس تفرقہ بازی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کے سامنے اسلام کی اصل روح اور اسلامی تعلیم کا صحیح نقشہ پیش کیا اور اسلام کے صحیح اصولوں کی تبلیغ شروع کی۔ آپ کی ان تعلیمات کی وجہ سے عام لوگ اسلام کی صحیح اور سچی تعلیم سے واقف ہوئے اور انہوں نے ہندوانہ رسم و رواج ترک کر دیئے۔

آپ سندھی زبان کے ایک اچھے شاعر تھے۔ اپنی شاعری میں آپ نے صوفیانہ تعلیمات دی ہیں۔ آپ پر جلال الدین رومی کے صوفیانہ افکار کا بڑا گہرا اثر تھا۔ یہ رنگ آپ کی نظموں میں اکثر پایا جاتا ہے آپ نے اکثر لوک کہانیوں کو عارفانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس طرح سندھی ادب میں آپ کو ایک خاص مقام حاصل ہے بھٹائی کی نظمیں ان کے مریدوں نے اکٹھی کر کے ایک کتاب "رسالو" میں جمع کر دی ہیں۔

آپ کا عرس مبارک ہر سال ۱۴ صفر کو منایا جاتا ہے۔ آپ کا مزار سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑو نے تعمیر کرایا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد حکومت مغربی پاکستان نے مقبرے کے ساتھ ایک ثقافت مرکز قائم کیا ہے۔ جس کا مقصد شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے۔

آپ طبعاً سادگی پسند تھے۔ گفتگو سادہ مگر شیریں اور پرسوز ہوتی تھی عجز و انکساری ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اشعار سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ کے عرس کے موقع پر لوگ ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر ٹولی آپ کا کلام اپنی مخصوص طرز میں ترنم کے ساتھ پڑھتی ہے۔ آپ کے کلام کی مقبولیت اور شہرت کی تین خاص وجوہات ہیں ایک یہ کہ آپ کے کلام میں بے حد سوز و گداز ہے جو صوفیانہ رنگ سے مزین ہے۔ دوسرے اس میں شعریت و موسیقیت غایت درجہ موجود ہے۔ اور تیسرے آپ نے اپنے علاقے کی رومانی داستانوں پر مشتمل شاعری کی ہے جو نہایت دلچسپ، مشہور اور مقبول عام ہیں۔

بھٹنڈہ سابق ریاست پٹیالہ کا ایک شہر جو اب بھارت کے صوبہ پنجاب میں مدغم ہو گئی ہے یہ پرانا شہر تھا پٹیارا جپوتوں کا مرکز تھا۔ زمانہ قدیم میں یہ شہر گھگر ندی کے ایک معاون نالے پر واقع تھا اور اس کے گردو نواح کی زمین غیر آباد تھی۔ لیکن جنگی اہمیت کے وہ راستے جو ملتان سے راجپوتانہ اور وادی گنگ کی طرف جاتے تھے اس کی زد میں تھے۔ ان راستوں میں کئی تاریخی مقامات مثلاً پانی پت اور اندرا پت وغیرہ تھے۔ یہی وہ راستے تھے جن سے شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملے کیے۔

مسلمانوں کے دور سے پہلے یہ شہر وکرم گڑھ کے نام سے مشہور تھا بھٹنڈہ سے تیس میل دور سرہند کے راستے میں ایک جنگل کا ذکر ملفوظات تیموری میں ملتا ہے یہ جنگل اکبر بادشاہ کی شکار گاہ تھا۔ بھٹنڈہ اور اس کے گردو پیش میں بھیجیوں کی آبادی کثرت سے تھی۔

اسے ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں محمود غزنوی نے فتح کیا۔ بھٹنڈہ کا راجہ بجے راے محمود غزنوی کے محاصرے کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے قلعے سے بھاگ نکلا اور خودکشی کر لی۔

محمود غزنوی کی یہی فتح بالواسطہ ہندوستان کے سامانہ، انبالہ اور حصار کے خطے میں اسلام کے تعارف کا نشان آغاز ہے۔

۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں شہاب الدین غوری نے بھٹنڈہ فتح کیا۔ جب محمد غوری واپس غزنہ چلا گیا تو اس کے نائب حکمران پر جو بھٹنڈہ میں سلطان محمد غوری کی طرف سے مامور تھا، پرتھوی راج نے حملہ کر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ تیرہ مہینے کے محاصرے کے بعد قلعے پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں ایبک کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ نے بھٹنڈہ پر قبضہ کیا۔ اس وقت سے اس پر خاندان غلاماں کے بادشاہوں کا قبضہ رہا ہے۔ ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء میں بھٹنڈہ کے حاکم ملک اختیار الدین التونیہ نے بغاوت کر دی۔

۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں بھٹنڈہ پر ناصر الدین محمود کا قبضہ ہو گیا اس نے ملک شیر خان کو بھٹنڈہ کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے بعد سے بھٹنڈہ کا ذکر تاریخ میں شاذ ہی ملتا ہے۔

۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں بھٹنڈہ کا نام تاریخ میں ایک بار پھر آتا ہے جب کہ اسے پٹیالہ کے راجہ آلا سنگھ نے فتح کیا۔ اس کے بعد سے بھٹنڈہ اس کی اولاد کے قبضے میں رہا اور ۱۹۵۶ء میں یہ سارا علاقہ بھارت میں مدغم ہو گیا۔

یہ شہر ایک بارونق تجارتی منڈی ہے۔ اس کی مشہور پیداوار گندم، چنے، کپاس اور گنا ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اس ضلع کی کل آبادی بارہ لاکھ کے قریب تھی۔

بھٹنڈہ کے آثار قدیمہ میں شیر شاہ سوری کا بنوایا ہوا ایک قلعہ ہے جو ایک سو ٹھا فٹ بلند ہے۔ اس کے ۳۶ برج ہیں اب یہ قلعہ بڑی خستہ اور شکستہ حالت میں باقی رہ گیا ہے۔ دروازے کی محرابوں میں بڑی بڑی درزیں پڑ چکی ہیں۔

بھٹو، ذوالفقار علی (۵ جنوری ۱۹۲۸ء - ۴ اپریل ۱۹۷۹ء) وزیر اعظم پاکستان، والد کا نام سر شاہنواز بھٹو ہے، جو ریاست جوناگڑھ کے وزیر اعظم تھے۔ لاڑکانہ سندھ کے ایک گاؤں گڑھی بھٹو میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان ساڑھے تین سو سال سے آباد تھا۔ میٹرک تک تعلیم کیتھیڈرل ہائی سکول بمبئی میں پائی۔ بچپن ہی سے حافظہ بہت اچھا تھا۔ برکلے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ مزید تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی اور مڈل ٹمپل لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لی۔ ساؤتھمپٹن یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کے پروفیسر کے عہدے پر ان کی تقرری ہوئی۔ لیکن بھٹو اپنے والد کی بیماری کے سبب وہاں پروفیسر کے فرائض انجام نہ دے سکے اور پاکستان واپس آگئے۔ پاکستان آکر اپنی گھریلو جائداد کی دیکھ بھال اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اس کے ساتھ ہی وکالت کرنے کے لیے کراچی میں دفتر کھولا۔ ایک طرف تو جائداد کی ذمہ داریاں تھیں اور دوسری طرف وکالت کے کیسوں میں روز بروز اضافہ تھا۔ چنانچہ بھٹو نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا۔ اور سندھ مسلم کالج میں بین الاقوامی قانون کی تعلیم دینے لگے۔

اسکندر مرزا بھٹو گھرانے کا پرانا دوست تھا۔ اس دوران میں سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان سے ذوالفقار علی بھٹو کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں بھٹو کو پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے ساتھ بھیجا گیا اور مارچ ۱۹۵۸ء میں پاکستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے جنیوا میں اقوام متحدہ کے بحری قوانین کے متعلق ہونے والے اجلاس میں بھیجا گیا۔ جہاں انھوں نے بہت شاندار طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔

جب سکندر مرزا اور ایوب خاں نے جمہوری حکومت کا خاتمہ کیا تو حکومت چلانے کے لیے ایسے ذہین اور سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کی تلاش شروع ہوئی۔ جن کا فوج سے کوئی تعلق نہ ہو۔ چنانچہ صوبہ سندھ کی نمائندگی کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کو چنا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ وزیر تجارت مقرر کیے گئے۔ اور ۱۹۶۰ء میں امور اقلیت، قومی تعمیرات اور اطلاعات کے وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں وزیر ایندھن، بجلی، قدرتی وسائل اور امور کشمیر کی نئی وزارت کا کام سنبھالا۔

۱۹۶۳ء میں محمد علی بوگرا کے بعد بھٹو کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ اس دوران میں بھٹو نے چین کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوران میں بھٹو نے سلامتی کونسل میں جو تقریر کی تھی وہ ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو معاہدہ تاشقند کے موقع پر ایوب اور بھٹو کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس معاہدے سے پوری قوم کی طرح بھٹو کو بھی سخت مایوسی ہوئی تھی۔ چنانچہ بھٹو نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔

ملک کے طول و عرض میں ایوب آمریت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے تو ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد ازاں دیگر سیاسی دباؤ کے تحت انہیں رہا کیا گیا تو انہوں نے اپنی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جس نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں دوسری پارٹیوں سے کہیں زیادہ نشستیں حاصل کیں۔

مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا اقتدار پیپلز پارٹی کے حوالے کر دیا گیا اور ذوالفقار علی بھٹو نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سپریم کمانڈر افواج پاکستان اور صدر پاکستان کے عہدے سنبھال لیے۔

۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو نیا آئین نافذ ہو جانے کے بعد بھٹو وزیر اعظم پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے ان کے عہد حکومت میں بھارت سے نوے ہزار جنگی قیدیوں کی واپسی ہوئی۔ بھارت سے شملہ معاہدہ ہوا۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا۔ قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا۔ ملک میں جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل قرار دیا گیا۔ حج پر سے قرعہ اندازی کی شرائط ہٹادی گئیں۔ شراب، قمار بازی اور نائٹ کلبوں پر پابندی عائد کی گئی۔ بنکوں، بیمہ کمپنیوں اور تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لیا گیا۔ پاکستان کو دولت مشترکہ سے علیحدہ کیا گیا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں اسلامی سربراہ کانفرنس اہتمام بالشان طریقے سے لاہور میں منعقد ہوئی۔

لیکن ان کے ذاتی آمرانہ عزائم کے باعث ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزام میں متحدہ حزب اختلاف کی چلائی ہوئی مخالفانہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور ملک میں جنرل محمد ضیاء الحق کی سرکردگی میں چوتھا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

ایک سابقہ مقدمے کی بنیاد پر جس میں نواب محمد احمد قصوری کے قتل کا الزام بھٹو صاحب پر عائد ہوتا تھا۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا اور پنجاب ہائیکورٹ نے ان کو مجرم قرار دیتے ہوئے موت کی سزا سنائی جس کی توثیق سپریم کورٹ نے بھی کر دی۔ ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو انھیں کوٹ لکھپت جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

بہجت، مصطفیٰ افندی (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء - ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) عثمانی عہد کا ایک عالم اور طبیب۔ والد کا نام خواجہ محمد ابن شکوہی تھا جو وزیر اعظم خیر اللہ افندی کا بیٹا تھا۔ تعلیم دینی درسگاہوں میں حاصل کی اور فارغ ہونے کے بعد مدرس ہو گیا۔ اس نے علم طب میں خصوصی شہرت حاصل کی اور ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وہ سلطان کا طبیب اعلیٰ بن گیا۔ اپنی زندگی میں اس نے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ مثلاً ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں اسے سلطان کے اعلیٰ طبیب کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں دس سال بعد اس کا دوبارہ اسی عہدے پر تقرر ہوا ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں اسے جلا وطن کیا گیا۔ لیکن اسی سال دوبارہ اپنے پہلے عہدے پر فائز کر دیا گیا ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں اسے مجلس محلات سلطانی کا رکن بنایا گیا۔ اس کے علاوہ وہ اور بہت سے اہم مذہبی اور قانونی منصبوں پر فائز رہا۔ ان مناصب میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں ملائے ازمیر۔ ملائے مصر، قاضی عسکر اناطولی، قاضی عسکر روم ایلی وغیرہ۔

اس نے یورپی زبانیں بڑی محنت سے سیکھیں اور مغرب کی طبی اور سائنسی کتابوں کے متعدد اہم تراجم کیے۔ ان تراجم میں لبفون کی تاریخ طبعی اور ہیضہ، چیچک کا ٹیکہ لگانے پر جینر کا کتابچہ اور آتشک اور خارش کے موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ اس نے مصر پر فرانس کے قبضے کی تاریخ "مظہر التقدیس" کا ترکی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام تاریخ مصر رکھا

ایک طرف تو بہجت طب قدیم کے دبستان کے آخری اطباء میں سے تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ ترکی میں یورپی طرز کی طب جدید کے پیشروؤں میں سے بھی تھا۔ اس کی نگرانی میں ایک جدید ہسپتال بنایا گیا اور ایک نیا میڈیکل سکول کھولا گیا۔ اس سکول میں یورپی اساتذہ باہر سے بلائے گئے تھے۔ اس کام میں اس کا بھائی حکیم ہاشمی عبدالحق اس کا معاون تھا۔

بہرام ساسانی خاندان کے چوتھے، پانچویں، چھٹے، بارہویں اور چودہویں بادشاہ کا نام۔

بہرام اول:۔ ساسانی خاندان کا چوتھا فرمانروا۔ ہرمز کا بیٹا تھا۔ ۲۷۳ء میں

ایران کے تخت پر بیٹھا اور تین سال تین ماہ حکومت کر کے ۲۷۶ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کے بارے میں تاریخ میں بہت کم واقعات ملتے ہیں۔ اس کے دور کا سب سے اہم واقعہ مشہور مصور مانی کا قتل ہے۔ اس نے زرتشتی مذہب کے پیشواؤں کو مانی کے خلاف کل اختیارات دے دیئے تھے:

بہرام اوّل بڑا نرم دل اور فیاض شہزادہ تھا۔ رعایا اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

بہرام ثانی:- بہرام اوّل کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ۲۷۶ء میں ایران کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے دور حکومت میں روم اور ایران میں دوبارہ لڑائی ہوئی۔ اس نے آرمینیا اور عراق کا علاقہ رومیوں کے حوالے کر دیا تاکہ صلح ہو جائے اور وہ اپنے بھائی کشان شاہ گورنر خراسان کی بغاوت کو ختم کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے جو اپنے لیے ایک عظیم الشان ریاست کی بنیاد رکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ۲۹۳ء تک کل سترہ سال حکومت کی۔

بہرام ثالث:- اپنے باپ بہرام ثانی کی وفات کے بعد ۲۹۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا تایا اس کا مخالف تھا۔ اس نے بہرام ثالث کو شکست دی اور اس کے بھائی نرسی کو اس کی جگہ تخت پر بٹھایا۔ اس نے کل چار ماہ حکومت کی۔

بہرام رابع:- خاندان سامانیہ کا بارہواں حکمران۔ شاہ پور اعظم ثانی کا بیٹا تھا۔ ۳۸۸ء میں ایران کے تخت پر بیٹھا۔ یہ اپنے پیش رو حکمرانوں سے کمزور واقع ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دور حکومت میں امراء نے دوبارہ وہی اقتدار حاصل کر لیا جس سے شاہ پور ثانی نے انہیں محروم کر دیا تھا۔ اسی کے دور حکومت میں آرمینیا کو روم اور ایران کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح آرمینیا کا بڑا حصہ ایران کے قبضے میں آگیا۔ ۳۹۹ء میں اپنی فوج کی بغاوت فرو کرنے کی کوشش میں ایک تیر لگنے سے مر گیا۔ اس کے دور اقتدار کا زمانہ بعض تاریخ نویس ۱۱ سال اور بعض ۱۰ سال بیان کرتے ہیں اس کے بعد یزدجرد اس کا جانشین ہوا۔

بہرام خامس:- خاندان سامانیہ کا چودھواں ایرانی بادشاہ تھا۔ تاریخ ایران میں بہرام گور کے نام سے مشہور ہے۔ یزدجرد اوّل کا بیٹا تھا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ۴۲۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے حیرہ کے لخمی عرب بادشاہ المنذر اوّل کی زیر قیادت تربیت حاصل کی تھی اور اسی بادشاہ کی مدد سے اس نے ان امراء سے ایران کا تخت واپس لیا جنہوں نے اس کے بڑے بھائی کو قتل کر کے اس خاندان کے کسی دوسرے فرد کو تخت پر بٹھا دیا۔

بہرام گور کو اپنی فیاضی، شجاعت و مردانگی، محصولوں کی تخفیف، عشق و محبت کی زندگی اور سیر و شکار کے کارناموں کی وجہ سے عوام میں بہت زیادہ ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی۔

اس نے مرو کے علاقے کے وحشی لوگوں کے خلاف ایک مہم کی خود قیادت کی۔ اس کے دور حکومت میں ایران اور بزنطینی سلطنت کے درمیان ایک مختصر جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ایران کو شکست نصیب ہوئی۔ بعد میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ صلح نامہ ہوا جس کی رو سے ایران میں عیسائیوں کو مذہبی آزادی مل گئی۔ ۴۳۸ء میں ایک شکار کا تعاقب کرتے ہوئے مر گیا۔

بہرام سقا

بہرام بردوانی، فارسی زبان کے ایک صوفی شاعر، آپ کا سلسلہ نسب بخارا کے چغتائی ترکوں سے ملتا ہے۔ آپ کے بچپن اور تعلیم کے حالات تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں۔ آپ کی عادت تھی کہ مسافروں زائروں اور حاجیوں کو فی سبیل اللہ پانی پلاتے تھے اور مجذوبانہ زندگی بسر کرتے تھے آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ہمایوں نے ۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء میں اکبر کی رسم ختنہ پر قندھار میں جشن منایا، اسی زمانے میں آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی۔

بہرام بردوانی ہندوستان میں اس زمانے میں آئے جب ہمایوں اپنی جلاوطنی کے بعد دوبارہ بادشاہ ہوا تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں آگرہ میں مقیم تھے بقول عبدالقادر بدایونی "وہ اپنے چند مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ آگرہ بازار میں مفت پانی پلاتے پھرتے تھے اور ساتھ ساتھ شعر کہتے جاتے تھے۔" اکبر کے ابتدائی دور میں آپ پر رافضی ہونے کا الزام لگا۔ جس کی انہوں نے اپنے اشعار میں تردید کی ہے۔ اور اسی بات سے بددل ہو کر وہ آگرہ کو چھوڑ کر چلے گئے ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں بردوان چلے گئے اور تین روز بعد وفات پا گئے۔ بقول عبدالقادر بدایونی آپ نے اپنی شاعری کے بہت سے دیوان جمع کیے لیکن جب ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی تو انہیں دھو دیتے اس کے باوجود ان کے دیوان کے دو نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور ایک نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں موجود ہے۔

آپ کا مقبرہ بردوان میں ہے اس کے احاطے میں نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کی قبر ہے۔ آپ کی درگاہ پر جو کتبہ نصب ہے اس پر سن وفات ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء درج ہے۔

بہرام شاہ غزنوی

غزنی کا ایک سلطان۔ سلطان مسعود سوم کا بیٹا تھا اور اس کی ماں کا نام مہر عراق تھا۔ سلطان مسعود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا شیرزاد تخت نشین ہوا۔ لیکن بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شیرزاد طبرستان چلا گیا اور پھر وہاں سے حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ حج سے واپسی پر ملک ارسلان نے اسے قتل کرا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس زمانے میں بہرام شاہ تگین آباد میں مقیم تھا۔ ملک ارسلان کی تخت نشینی کے بعد وہ وہاں سے کرمان چلا گیا۔ جہاں اس کے چچا سنجر نے اسے خلعت بخشی اور لشکر جرار لے کر بہرام شاہ کے ہمراہ ملک ارسلان کی فوجوں سے مقابلے کے لیے نکلا۔ ۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء میں سنجر غزنہ میں داخل ہو گیا اور بہرام شاہ کو غزنہ کا تخت نشین کرا دیا۔ سنجر نے سلاطین غزنویہ کے تمام خزانے اپنے قبضہ میں لے لئے بہرام شاہ پر بھی ایک ہزار دینار یومیہ خراج مقرر کیا۔

جب سنجر غزنی سے واپس آگیا تو ملک ارسلان نے ہندوستان کی فوجوں کی مدد سے بہرام شاہ پر حملہ کیا۔ سنجر نے ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء میں بلخ سے بہرام شاہ کی مدد کے لیے دوبارہ فوج بھیجی اور ملک ارسلان کو قید کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد رہا کر دیا لیکن دوبارہ بغاوت کے آثار دیکھ کر اسے قتل کرا دیا۔

بہرام شاہ نے تخت نشینی کے وقت سنجر کو ایک ہزار دینار یومیہ خراج دینے کا وعدہ کیا تھا جو بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء سے اس نے یہ خراج بند کر دیا تو سنجر ایک فوج لے کر غزنی کی طرف آیا۔ بہرام شاہ نے معافی مانگ لی۔ اس کے بعد بہرام شاہ کی غوریوں سے جنگیں چھڑ گئیں۔ ان جنگوں کے دوران میں ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء میں غزنی پر غوریوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں بہرام شاہ نے دوبارہ غزنی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جب علاء الدین حسین غور کا حاکم بنا تو وہ ایک بہت بڑی فوج لے کر غزنی پر حملہ آور ہوا اور بہرام شاہ کو شکست فاش

دی۔ بہرام شاہ کو یہ شکست ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں ہوئی۔ لیکن ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں بہرام شاہ نے ایک مرتبہ پھر غزنہ پر قبضہ کر لیا۔
بہرام شاہ ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء کے بعد ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک زندہ رہا۔ بہرام شاہ کے دربار میں بڑے بڑے اہل قلم اور شعراء جمع رہتے تھے۔ اس کے دس بیٹے تھے۔ بہرام شاہ نے ۳۵ سال حکومت کی۔

بہرام شاہ معزالدین دہلی کا سلطان، شمس الدین التمش کا تیسرا بیٹا۔ التمش کا ولی عہد ناصرالدین محمود فوت ہو گیا۔ تو رضیہ سلطانہ کی گرفتاری کے بعد ترک امراء نے اس کے بھائی بہرام شاہ کو اس شرط پر کہ اتگین اس کا نائب مملکت ہوگا۔ دہلی کے تخت پر بٹھایا لیکن اتگین کو جسے بہرام شاہ نے تین ماہ بعد ہی قتل کرا دیا۔
اس کے بعد بہرام نے کوئی نائب مقرر نہیں کیا لیکن اس کے امیر حاجب بدرالدین سنقر نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ اور وزیر کسی کو بھی خیال میں نہ لاتا تھا۔ اس نے دہلی کے بعض علماء کو اپنے ساتھ ملا کر بہرام کو تخت سے اتارنے کی کوشش کی۔ جب بہرام کو اس سازش کا علم ہوا تو اس نے سنقر کو بدایوں جلا وطن کر دیا لیکن وہ بادشاہ کی بغیر اجازت دہلی واپس آیا تو بہرام نے اسے قتل کرا دیا۔ چنانچہ اتگین اور سنقر کے اوپر تلے بعد دیگرے قتل ہونے سے ترک امراء جنہوں نے بہرام کو تخت پر بٹھایا تھا بہرام کے مخالف ہو گئے۔ انہی دنوں منگولوں نے لاہور پر چڑھائی کر دی۔ بہرام کی طرف سے اختیارالدین جو لاہور کا گورنر تھا، منگولوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور اس طرح لاہور پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا۔
بہرام شاہ نے دہلی سے اپنے وزیر مہذب الدین کی سرکردگی میں کمک بھیجی۔ مہذب الدین نے راستے میں فوج کو بہرام کے خلاف ایسا ورغلایا کہ وہ لاہور جانے کے بجائے دہلی کو پلٹ پڑی۔ اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر شہر کے اندر بھی وزیر کے ساتھیوں نے افراتفری پھیلا دی یہاں تک کہ فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا اور بہرام کو گرفتار کر کے ۱۲۴۲ء میں قتل کر دیا۔ اس طرح بہرام صرف دو سال حکومت کر سکا۔

بہلول لودھی (دور حکومت ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء – ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء) دہلی کا ایک بادشاہ جس نے لودھی خاندان کی بنیاد رکھی۔ بہلول ملک کالا کا بیٹا تھا اور سرہند کے سلطان شاہ لودھی کا بھتیجا تھا۔ اس کے چچا اسلام خان نے اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے سرہند میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ بہلول جب سرہند کا گورنر ہوا تو اس نے اپنی پوزیشن اتنی مضبوط کر لی کہ محمد شاہ سید نے اس کے خلاف فوج بھیجی تو وہ شکست کھا کر واپس ہوئی۔ اس فتح کے بعد بہلول نے اپنی طاقت اور بڑھانا شروع کر دی۔ بہلول کی سرکردگی میں لودھیوں نے اتنا زور پکڑا کہ لاہور، دیپالپور، حصار اور سنام پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ بہلول نے سلطان کا لقب اس وقت اختیار کیا جب وہ دہلی پر اپنی ناکام مہم سے لوٹ کر گیا تھا۔
علاءالدین کے عہد میں لودھیوں کا اقتدار اور بھی بڑھ گیا۔ پانی پت، کیتھل، راپڑی اور بیانہ پٹھانوں کے ہاتھوں میں آ چکے تھے۔ علاءالدین کی کمزوری اور بے ہمتی کے باعث دہلی پر بھی بہت جلد بہلول کا قبضہ ہو گیا۔
۸۴۹-۸۵۰ھ/۱۴۴۵ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا تو امراء نے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو علاءالدین عالم شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ علاءالدین نے ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں جب عالم شاہ نے دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو اپنا پایہ تخت بنا لیا۔ چنانچہ بہلول نے دہلی پر قبضہ جما لیا۔ اس وقت دہلی پر عالم شاہ کا وزیر حمید خاں برسر اقتدار تھا اور بہلول جانتا تھا جب تک اسے راستے سے نہ ہٹایا جائے گا اس کی حکومت مکمل نہیں ہو سکتی۔
علاءالدین کے بعض امراء بہلول لودھی کی حکومت سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ وہ بعض عناصر کو اکساتے رہتے تھے۔ انہوں نے پہلے تو علاءالدین کو بہلول سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا لیکن جب وہ آگے نہ بڑھا تو انہوں نے سلطان محمود شرقی کو دہلی پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ ۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء میں محمود نے ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکا اور شکست کھائی۔ اس کے بعد بھی بہلول کا مقابلہ جونپور کے شرقی فرمانرواؤں سے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری فرمانروا سلطان حسین شرقی نے شکست کھائی۔ اور بنگال کی طرف بھاگ نکلا۔ اس طرح بہلول کی حکومت بہار تک قائم ہو گئی۔ بہلول نے اپنے لڑکے باربک شاہ کو جونپور کا حاکم مقرر کیا جب کالپی، دھول پور اور باری کے حکام نے بھی اطاعت قبول کر لی تو بہلول نے گوالیار کا رخ کیا۔ وہاں کے راجہ نے اسی لاکھ تنکہ پیش کر کے اطاعت قبول کر لی وہاں سے واپسی میں جلالی کے پاس ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء میں ملاولی کے مقام پر فوت ہو گیا۔ بہلول کے بعد اس کا بیٹا خان سکندر لودھی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔
بہلول لودھی اگرچہ سلطنت کے عہد زوال میں برسر اقتدار آیا۔ پھر بھی اس کا شمار بڑے سلاطین میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے سلطنت میں نئے سرے سے جان ڈال دی اور شمالی ہند میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پھر سے قائم کیا۔ اس کی تمام عمر جنگوں میں گذری۔ اور اسے کبھی انتظامی اصلاحات کا وقت نصیب نہ ہوا۔ ذاتی طور سے اس میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ غرور اور تکبر سے بالکل بے بہرہ تھا۔ وہ بہت فراخدل اور نیک طبع واقع ہوا تھا۔ ایک بار جنگ کے دوران میں شرقی سلطان کی ملکہ اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی۔ اس نے بڑی حفاظت اور احترام کے ساتھ جونپور بھجوا دیا۔ وہ علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔

بہلول مجنون کوفہ کے ایک مجذوب صوفی۔ بقول ابن جوزی بہلول ۱۸۸ھ/۸۰۴ء میں ہارون الرشید سے کوفے میں ملا تھا۔ اور شاید اس نے خلیفہ کو کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں۔
تقریباً چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں یہ نام ایک افسانوی روایت بن گیا اور دانشمند دیوانوں کو بہلول کہا جانے لگا۔ اس سے بعض اشعار جن میں نصیحتیں بھی کی گئی ہیں نیز طرح طرح کے محاضرات، سبق آموز اور مذہبی حکایات منسوب کر دیں۔
بہلول مجنون کا ذکر سب سے پہلے علامہ جاحظ کی کتاب "البیان" میں ملتا ہے جس میں ایک سادہ لوح شخص اور راستہ چلنے والوں کے سوقیانہ تمسخر کا ہدف بنتے دکھایا گیا ہے اور شیعہ فرقے کا ایک فرد بتایا گیا ہے۔
اس شخص سے الذہبی اور ابن تغری بردی نے احادیث کی چند روایات کو بھی منسوب کیا ہے لیکن غالب رائے یہ ہے کہ بہلول نامی چند محدثین کو یہاں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔
بہلول مجنون کو عام طور پر "بہلول دانا" (ہوشیار دیوانہ) بھی کہا جاتا ہے لوگ اسے ہارون الرشید کا مسخرہ بتاتے ہیں۔ قہوہ خانوں میں اس کی ظرافت اور نکتہ سنجی کی اکثر حکایات بھی مشہور ہیں۔
بہلول کی قبر بغداد میں بتائی جاتی ہے اور اس پر ۵۰۱ھ/۱۱۰۷ء کا کتبہ موجود

ہے۔ لی سٹرینج نے اسے مجذوبوں کا سلطان قرار دیا ہے۔ اور ایک "نفس مطمئنہ" بتایا ہے۔

بہمن جادویہ

ایک ایرانی ماہر جنگ اور سپہ سالار۔ ۱۳ھ/۶۳۴ء

میں حضرت عمرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابو عبیدہؓ کو سالار فوج بنا کر حضرت مثنیٰؓ کے ساتھ عراق کی مہم پر روانہ کیا۔ مثنیٰؓ کو حیرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے اہل عراق کو مسلمانوں کیخلاف بھڑکا دیا ہے۔ منظم اور مسلح ٹڈی دل ایرانی فوج خراسان کے حاکم اور نامور بہادر رستم کے زیر کمان میدان کارزار میں کود نے کے لیے پر تول رہی ہے۔ رستم کو مثنیٰؓ کے حیرہ پہنچنے کی خبر ملی تو اس نے ایک بھاری فوج حیرہ کی طرف دوسری زبردست جمعیت سپہ سالار نرسی کے زیر سرکردگی کسکر کی طرف اور تیسرا لشکر جرار نامور سردار جابان کے ماتحت نشیبی فرات کی سمت روانہ کیا۔

نمارق میں ابو عبیدہؓ اور جابان کے درمیان مڈبھیڑ ہوئی اور مسلمانوں نے ایرانیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ایرانی مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ادھر کسکر میں نرسی تیس ہزار فوجوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ جابان بھی شکست کھانے کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ ادھر سے رستم نے بھی بہادر جالینوس کے زیر قیادت سرفروش جنگ جوؤں کا ایک لشکر جرار نرسی کی مدد کے لیے بھیجا۔ مگر یہ لشکر ابھی راستے میں تھا کہ ابو عبیدہؓ سقاطیہ کے مقام پر نرسی کے مقابلے میں آ اترے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ نرسی حضرت ابو عبیدہؓ کے حملے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا اس کی فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔

جالینوس نرسی کی شکست کی خبر سن کر باقسیا میں ٹھہر گیا۔ ابو عبیدہؓ نے وہاں پہنچ کر اس پر حملہ کیا اور وہ بھی مات کھا کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔

جالینوس کی شکست کی خبر ایران کے دربار اور دارالحکومت میں برق غضب بن کر گری۔ رستم غصے سے سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ چنانچہ اس نے امرائے سلطنت کے مشورے سے ماہر جنگ اور نامور سپہ سالار بہمن جادویہ کو تین ہزار فوج تین سو جنگی ہاتھی اور ضروری ساز و سامان دے کر عربوں سے انتقام لینے کے لیے روانہ کیا اور ایرانیوں کا متبرک نشان فتح درفش کاویانی بھی ساتھ کر دیا۔ بہمن جادویہ نے دریائے فرات کے کنارے قس ناطف میں چھاؤنی ڈالی۔ اور ابو عبیدہؓ نے دوسرے کنارے پر مروحہ میں فوج اتار دی۔ ابو عبیدہؓ فوج لے کر دریائے فرات کے اس پار چلے گئے اور جنگ کا بازار گرم ہو گیا۔ اس جنگ میں چار ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا اور چھ ہزار ایرانی مارے گئے۔ بہمن جادویہ فتح کے پھریرے اڑاتا چلا گیا۔

بہمنی سلطنت

دکن (ہندوستان) کی ایک آزاد ریاست۔ محمد بن تغلق کے اواخر عہد میں دکن کے امیران صدہ نے بغاوت کر کے دکن کے اہم مقام دولت آباد (دیوگیر) پر قبضہ کر لیا۔ اور ایک آزاد ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اس ریاست کے سب سے پہلے حکمران اسماعیل مخ کو سلطان ناصر یعنی اسماعیل شاہ کے لقب سے ۱۳۴۵ء میں منتخب کر لیا گیا۔ لیکن وہ اس منصب سے عہدہ برا نہ ہو سکا چنانچہ ۵ ربیع الاول ۷۴۸ھ/۱۲ اگست ۱۳۴۷ء کو انہوں نے حسن گنگو کو اپنا سلطان چنا۔ حسن کا سلسلہ نسب چونکہ ایران قدیم کے بادشاہ بہمن شاہ بن اسفندیار سے ملتا تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو بہمنی کہتا تھا اسی مناسبت سے یہ نئی سلطنت بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔

حسن گنگوہ کو دولت آباد میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی تعمیر کردہ مسجد میں تاج خسروی پہنایا گیا اور وہ سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے تخت شاہی پر جلوہ گر ہوا۔

اس نے گلبرگہ کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اپنی سلطنت کو چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر کے اپنے وفادار ساتھیوں کو ان پر مقرر کیا۔ اندرونی حالات درست کر کے اس نے اپنی سلطنت کی توسیع شروع کی۔ قندھار، بیدر اور ملکھید فتح ہو کر بہمنی حدود میں شامل ہو گئے۔

محمد بن تغلق کی وفات کے بعد بہمنی سلطنت کی بنیاد مضبوط تر ہو گئی۔ اس کے جانشین فیروز شاہ نے دوبارہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن پورا نہ کر سکا۔ علاء الدین بہمنی نے اب یکسو ہو کر اپنے ہمسایہ علاقوں پر توسیعی حملے شروع کیے۔ گوا، ڈابھیل کولھاپور اور تلنگانہ کا کچھ حصہ فتح ہو کر بہمنی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر سلطان علاء الدین بہمنی کا انتقال کر گیا۔ سلطان نے مرنے سے پہلے اپنے بڑے لڑکے محمد شاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ علاء الدین کے انتقال کے وقت بہمنی سلطنت کی حدود شمال میں دریائے وین گنگا اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھیں۔ علاء الدین میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک سلطنت کے بانی اور اچھے بادشاہ میں ہونا لازمی ہیں۔ اس نے اپنی مسلسل کوششوں سے بہمنی سلطنت کو مستحکم اور وسیع کیا۔

بہمنی سلطنت کو ایک منظم کل کی شکل میں مربوط کرنے کا سہرا محمد شاہ اول کے سر ہے۔ ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء میں اس نے اپنی والدہ کے ذریعے خلیفہ مصر المعتضد باللہ سے اس امر کی رسمی سند حاصل کر لی کہ وہ اپنے نام کا سکہ جاری کرے اور خطبہ جمعہ میں اپنا نام [illegible] کرے۔ وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا۔ اور اپنے روزمرہ کے دربار کا [illegible] ایک عظیم الشان سلطنت کے حکمران کی حیثیت کے مطابق قائم رکھتا تھا۔

محمد شاہ بھی اپنے باپ کی طرح دلیر اور اولوالعزم تھا۔ [illegible] تلنگ اور وجیا نگر سے اس کی سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ تلنگ [illegible] دو سال لشکر کشی کی۔ بالآخر وہاں کے راجہ کنہیا نے صلح کی درخواست کی [illegible] قلعہ ۲۲ لاکھ روپیہ اور اپنا طلائی تخت محمد شاہ کے حوالے کیا۔ [illegible] لڑائی چھڑ گئی۔ راجہ ہری ہر نے اپنی طاقت کے نشے میں سلطان کے [illegible] اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ ملا کر کے محمد شاہ کی سلطنت کے [illegible] علاقے کو تاخت و تاراج کر دیا۔ محمد شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو [illegible] دریائے تنگ بھدرا کے کنارے جنگ ہوئی۔ جس میں ہندوؤں [illegible] اور محمد شاہ نے انتقاماً وجیا نگر قلعہ پر چڑھائی کر کے قرب [illegible] کر ڈالا۔ راجہ کو مغلوب ہو کر صلح کی درخواست کرنا پڑی۔ محمد شاہ [illegible] نے بہمنی سلطنت کو چار صوبہ جات میں تقسیم کیا اور ہر صوبے کا ایک گورنر مقرر کیا۔ [illegible] صوبوں کے مراکز دولت آباد، برار، احسن آباد، گلبرگہ اور محمد آباد بیدر تھے۔

بہمنی سلطنت کے سلطان محمد شاہ نے ۱۳۷۲ء میں تقریباً ساڑھے سترہ سال [illegible] کرنے کے بعد وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد تخت پر بیٹھا۔ اس نے [illegible] اور ترک امراء کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کیا۔ جس کے باعث دکنی امراء کو شکایت پیدا ہوئی۔ مجاہد نے وجیا نگر پر حملہ کیا لیکن بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے چچا داؤد نے اسے مروا دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا لیکن وہ بھی جلد ہی مارا گیا۔

اس کے بعد محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ وہ دوسرے بہمن بادشاہوں سے

مختلف تھا۔ وہ بڑا امن پسند اور سادہ مزاج تھا۔ بیت المال کو قوم کی امانت سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے شاہانہ شان و شوکت یا ذاتی عیش و آرام پر کوئی فضول خرچی نہ کرتا تھا اسے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا بہت خیال تھا۔ اس نے دکن کو علوم و فنون کا مرکز بنانے کی پوری کوشش کی۔ اس نے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں وہ علم و ادب کا بڑا قدردان تھا۔ اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر دور دور سے علماء اور فضلاء آکر اس کے دربار کی زینت بنے۔

محمد شاہ ثانی کے عہد میں نہ کوئی بیرونی حملہ ہوا اور نہ اندرونی بغاوت۔ آخری عہد میں اپنے لڑکوں کی سازش سے وہ بہت پریشان اور آزردہ خاطر ہوا۔ بالآخر اس نے ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء میں وفات پائی۔ وہ بہمنی خاندان کے قابل ترین سلاطین میں سے تھا۔ اس کے دور حکومت میں ماوراءالنہر کے وسطی ایشیا، ایران اور ملک عرب کے جری اور تنومند انسانوں کی ایک رو آئی جو بالآخر اس سرزمین کی آبادی کا ایک عنصر بن گئے۔ ان میں ادیب، علماء، دست کار، تاجر، سپاہی اور ماہرین فن تعمیر سب کے سب دکن کی طرف کھنچے چلے آئے تھے اس کے بعد اس کے دو لڑکے یکے بعد دیگرے قلیل سی مدت کے لئے حکمران ہوئے۔ بالآخر امراء نے علاءالدین حسن کے پوتے فیروز خان کو بلایا۔ اس نے گلبرگہ پہنچ کر تخت پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ فیروز شاہ بہمنی نے ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء میں تاج شاہی پہنا۔ ابھی ایک سال ہی گذرا تھا کہ راجہ ہری ہر دوم نے رائچور دوآب پر حملہ کر دیا۔ فیروز شاہ بھی فوج لے کر نکلا۔ دریائے کرشنا کے کنارے دونوں فوجیں جمع ہوئیں۔ بہمنی افواج نے دریا عبور کر کے راجہ کے لشکر پر زبردست حملہ کیا۔ راجہ اپنی فوج کے ساتھ فرار ہو گیا۔ سلطان نے وجیانگر تک ان کا تعاقب کیا۔ اس مہم میں بے شمار مال غنیمت فیروز کے ہاتھ لگا ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء میں وجیانگر کے راجہ سے دوبارہ لڑائی چھڑ گئی۔ اس مرتبہ فیروز شاہ نے بانکاپور پر قبضہ کر کے ساٹھ ہزار ہندوؤں کو گرفتار کر لیا۔ راجہ کو مجبور ہو کر صلح کرنا پڑی اور اس نے اپنی لڑکی سلطان کے حرم میں دی اس کے علاوہ تاوان جنگ بھی ادا کیا۔ ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں فیروز شاہ نے پنگل کا محاصرہ کیا۔ وجیانگر سے پھر لڑائی چھڑ گئی۔ دو سال کی بے سود کوشش کے بعد فوج میں وبا پھیل جانے کے باعث سلطان کو میدان سے ہٹنا پڑا۔ ہندوؤں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر بہمنی سرحد میں داخل ہو کر مسلمانوں کا بڑی بے دردی سے قتل عام کیا۔ سلطان کے دل پر اس بات کا بہت گہرا صدمہ ہوا اور اس کی صحت خراب ہو گئی۔ اور اسی بیماری کی حالت میں ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ جو فیروز کا بھائی تھا تخت نشین ہو گیا۔

اگرچہ فیروز کا پورا عہد حکومت وجیانگر کے راجے اور اس کے اتحادی سرداران راجمندری اور کھیڑلا سے نبرد آزمائی میں گذرا لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس عہد کی ایک خصوصیت مختلف ثقافتوں کا امتزاج تھی۔ وجیانگر کی آویزش کا نتیجہ دو دلچسپ واقعات تھے۔ جن کے اثرات لازماً دکن کی ثقافت پر مرتب ہوئے۔ ایک تو سلطان کی اپنی شادی وجیانگر کی شہزادی کے ساتھ ہوئی تھی جو نہایت دھوم دھام کے ساتھ رچائی گئی۔ اور دوسرے شہزادہ حسن خان کی شادی پرتھال کے ساتھ ہوئی جو مدگل کے ایک زرگر کی بیٹی تھی اور اپنی خوش گفتاری کے لئے شہرت رکھتی تھی۔

فیروز شاہ کی خواہش تھی کہ وہ مغربی اسلامی ممالک کے بہترین اشخاص کو اپنے ہاں بلائے۔ اس نے اس غرض کے لئے مصطفےٰ آباد، دابل اور چول کی بندرگاہوں سے بہمنی جہاز روانہ کئے تاکہ علماء کو ملک دکن میں لائیں، ان نئے ملکی آبادکاروں کے اثر کو خالص ہندوانہ اثر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا اور دکنی تہذیب کی شاندار عمارت انہی دو ثقافتوں کے امتزاج سے بنی۔ فیروز شاہ خود ایک اچھا خوشنویس تھا۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبیعیات اور اصطلاحات تصوف پر پورا عبور رکھتا تھا۔ اور تلنگو، کنڑی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور کئی دوسری زبانوں کا ماہر تھا۔

فیروز شاہ کے بعد اس کا بھائی احمد شاہ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا۔ احمد شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے تو اپنا دارالسلطنت بیدر میں منتقل کیا۔ بیدر کا قلعہ سلطان احمد شاہ اوّل کی غیر معمولی یادگار ہے۔ فیروز شاہ کے عہد حکومت کے اواخر میں بہمنی فوجوں کو وجیانگر کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ اب احمد شاہ نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے جنوب کی طرف فوج کشی کی۔ اور دریائے تنگ بھدرا کے کنارے ہندو افواج سے معرکہ ہوا۔ پہلے ہی حملے میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور راجہ نے فرار ہو کر وجیانگر کے قلعے میں پناہ لے لی احمد شاہ نے وجیانگر کو تباہ و برباد کر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مجبوراً راجہ نے ہتھیار ڈال دئے احمد شاہ نے ورنگل کے راجہ کو شکست دے کر اس کے راج کا بڑا حصہ بھی بہمنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس نے مالوہ کے مسلمان حکمرانوں کو بھی شکست دی۔ اور اس لڑائی میں بہت سا مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ احمد شاہ نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل حکومت کا تمام کاروبار اپنے لڑکے ظفر خان کے سپرد کر دیا وہ ۸۳۸ھ/۱۴۳۵ء میں انتقال کر گیا۔ یہ سلطان بھی اصحاب علم کی صحبت کا بڑا شوقین تھا۔ بیدر کو جو بعد میں بہمنی سلطنت کا پایہ تخت بنا اسی سلطان نے آباد کیا تھا۔

احمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا علاءالدین ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے بھائی محمد شاہ نے بغاوت کر دی جو بڑے کشت و خون کے بعد فرو ہوئی سلطان نے کونکن کے علاقے پر ایک مہم بھیجی جو کامیاب رہی لیکن اس لڑائی کے نتیجہ میں خاندیش اور گجرات سے لڑائی ٹھن گئی۔ اس لڑائی میں بھی بہمنی فوجیں کامیاب رہیں وجیانگر کے راجہ نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا اور انہیں جاگیریں عطا کیں۔ اس تیاری کے بعد بغیر کسی وجہ کے راجہ نے بہمنی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ لیکن ناکام رہا اور سلطان کو خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح ہوئی۔ امراء سلطنت میں ملکی اور غیر ملکی تفریق پہلے سے چلی آرہی تھی۔ دکنی امراء عموماً سنی تھے غیر ملکی امراء جن میں ترک اور ایرانی مغل شامل تھے عموماً شیعہ تھے۔ چنانچہ اختلافات پیدا ہوئے۔

علاءالدین بڑا سلجھا ہوا اور ذی فہم بادشاہ تھا۔ وہ طبعاً عیش پسند تھا لیکن اس نے کبھی اپنی عیش پسندی کو اپنے فرائض کی تکمیل میں حارج نہ ہونے دیا۔ وہ خود مذہبی شعائر کا پابند نہ تھا لیکن اس نے اپنی رعایا کے مذہبی اور اخلاقی حالات درست کرنے کی پوری کوشش کی۔ اپنی مملکت میں مکمل امن و امان قائم کیا۔ علاءالدین کے بعد چند روز کے لئے اس کا چھوٹا بیٹا حسن تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کا بڑا بھائی ہمایوں اسے ہٹا کر خود تخت نشین ہو گیا۔

ہمایوں بڑا سخت گیر، درشت مزاج اور مغلوب الغضب فرمانروا تھا۔ انسان کے خون کی اس کے آگے کوئی قیمت نہ تھی۔ وہ لوگوں کو معمولی معمولی باتوں پر مروا دیا کرتا تھا۔ جب اسے اپنے خلاف ایک سازش کا علم ہوا تو اس نے سازش کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر مروا دیا۔ اس کے ملازمین نے اسے نشہ کی حالت میں قتل کر کے رعایا کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلائی۔ اس کی موت ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء میں واقع ہوئی۔ ہمایوں نے مرنے سے پہلے اپنے جانشین کا انتخاب خواجہ جہاں،

محمود گاواں اور ملک شاہ کے سپرد کردیا تھا۔ ان تینوں نے سلطان مرحوم کے آٹھ سالہ بچے نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ حکومت کا اصل انتظام اس کی والدہ مخدومہ جہاں اور محمود گاواں کے سپرد تھا۔ ان دونوں نے بڑی مشکل سے ملک کے حالات درست کیے۔ اور مالوہ کی مردم آزادی کے اثرات کو دور کیا۔ ایک سال بعد نظام شاہ کی اچانک موت واقع ہوگئی۔ امراء نے اس کے بھائی محمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

چونکہ محمد شاہ ثالث بھی کم عمر تھا اس لیے حکومت کا انتظام کچھ عرصہ مخدومہ جہاں اور خواجہ جہاں نے سنبھالا۔ بعد میں محمد شاہ اور مخدومہ جہاں نے خواجہ جہاں کو مروا دیا اور وزارت کا منصب محمود گاواں کے سپرد کردیا۔ محمود گاواں نے جس دیانت، لیاقت اور بے لوثی سے اپنے فرائض کو انجام دیا اس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملیں گی۔ وہ بہت سادہ طبیعت کا انسان تھا۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ مصارف خیر میں خرچ کرتا تھا۔ رات کو بھیس بدل کر گشت کرتا اور لوگوں کے حالات معلوم کرتا۔ اس نے بیدر میں ایک بڑا مدرسہ بھی قائم کیا۔ اس نے بہمنی سلطنت کی حدود کو وسعت دی اور نظام حکومت کو سدھارا۔ بعض لوگوں میں محمود گاواں کی ہردلعزیزی اور اثر و اقتدار نے رشک و حسد کی آگ بھڑکا دی۔ انہوں نے بغاوت آمیز مضمون کے ایک جعلی خط پر اس کی مہر ثبت کرا کے سلطان کو نشہ کی حالت میں دکھایا۔ سلطان نے بغیر تحقیق و تفتیش کے محمود کو قتل کرا دیا۔ بعد میں جب سلطان کو محمود کی بے گناہی کا علم ہوا تو اسے بہت صدمہ ہوا اور ایک سال کے اندر ہی ۱۴۸۲ء میں سلطان کا بھی انتقال ہوگیا۔

محمود گاواں کے ساتھ ہی بہمنی سلطنت کا استحکام اور امن رخصت ہوگیا۔ محمد شاہ کے بعد محمود شاہ بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ لیکن بڑے ہو کر اس کی عادتیں خراب ہوگئیں۔ وہ اپنا اکثر وقت بھانڈوں اور نقالوں میں گذارتا تھا۔ اس کی ان عادتوں کا اثر حکومت کے نظم و نسق پر بھی بہت برا پڑا چنانچہ بیجاپور، احمد نگر، برار اور گولکنڈہ میں خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ محمود کے پاس صرف بیدر کا علاقہ رہ گیا اور وہاں بھی وہ برائے نام بادشاہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد چار اور بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ لیکن ان کی حیثیت بھی کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۵۲۶ء میں آخری سلطان کلیم اللہ نے بیدر سے بھاگ کر بیجاپور میں پناہ لی تو امیر برید نے بھی بیدر میں اپنی خودمختار سلطنت قائم کرلی۔ اس طرح بہمنی سلطنت رفتہ رفتہ ناپید ہوگئی اور اس کی جگہ پانچ سلطنتوں نے لے لی۔ یہ پانچ سلطنتیں مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ برار میں عماد شاہی سلطنت۔
۲۔ احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت۔
۳۔ بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت۔
۴۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت۔
۵۔ بیدر میں برید شاہی سلطنت۔

بھنبھور

سندھ اور بلوچستان کا وہ خطہ جو دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ سے عراق تک تجارتی شاہراہ ہونے کی بنا پر مشہور ہو چکا تھا اس شہر کا نام عشقیہ داستان سسی پنوں سے وابستہ ہے۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں جب سندھ میں عربوں کے اقتدار کا خاتمہ ہونے لگا تو یہ تجارتی شاہراہ اور اس کی یاد ایک افسانے کی حیثیت اختیار کرگئی اور داستان سسی پنوں اسی یاد کا شاخسانہ ہے۔

بھنبھور شہر کی شہرت سسی پنوں کی داستان سے ہوئی۔ اس شہر کا نام سب سے پہلے میر محمد معصوم بکری نے اپنی مثنوی حسن و ناز (جو داستان سسی پنوں کا فارسی ترجمہ ہے) میں کیا ہے۔

سندھی شاعری میں شاہ عبدالکریم کی صوفیانہ ابیات میں سے چند ایک میں اس شہر کا ذکر آتا ہے۔ ویسے تاریخی ماخذوں میں اس شہر کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر ان کھنڈروں کا کھوج لگایا جائے جن کو عوامی تخیل نے بھنبھور قرار دیا ہے تو یہ کھنڈر یقینی طور پر دیبل بندرگاہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ جسے ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ دیبل عربوں کے دور حکومت میں سندھ کی اہم بندرگاہ رہا۔ حال ہی میں محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے ان کھنڈروں کی کھدائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں وہ اس نظریہ کی [illegible] کرتے ہیں کہ عوام جن کھنڈروں کو بھنبھور سمجھتی ہے وہ اصل میں دیبل کی مشہور بندرگاہ کے کھنڈرات ہیں۔ اس شہر کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔

بھوپال

ہندوستان کے صوبہ مدھیہ پردیش کا صدر مقام اور سابقہ ریاست شہر بھوپال ایک ریتلے پتھر کی پہاڑی پر دو خوشنما جھیلوں کے کنارے سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

بھوپال کو ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء میں دوست محمد خان نے بسایا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ فتح گڑھ کے نام سے تعمیر کیا تھا۔ اس شہر کے دو حصے ہیں۔ [illegible] شہر خاص اس کے اردگرد ایک فصیل ہے۔ یہ فصیل دوست محمد نے بنوائی تھی۔ [illegible] آباد اور احمد آباد کے جدید محلے اور مضافات جو بعد میں جہانگیر محمد خان [illegible] کی یادگار قائم رکھنے کے لیے تعمیر کرائے گئے۔

بھوپال شہر کو ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء تا ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء میں نواب فیض محمد خان نے ریاست کا صدر مقام بنایا تھا۔

۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء تا ۱۸۱۳ء ناگپور اور گوالیار کی فوجوں نے بھوپال پر حملہ کر کے [illegible] شہر کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ جب نذر محمد خان ایک [illegible] کا فرمانروا بنا تو اس نے اس شہر کو [illegible] سے بچایا۔ [illegible] بہت سے کام شروع کر دیئے تھے۔ سلطان شاہجہان بیگم نے [illegible] کا اضافہ کیا جن میں قصر تاج محل اور تاج المساجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ [illegible] کی سرپرستی فرمائی۔ دونوں جھیلوں کے کنارے تقریباً اکثر [illegible] کردی تھی۔ جھیلوں کے اوپر شہر کے بے قاعدہ مکانات [illegible] کے ساتھ کہیں کہیں وسیع باغات ہیں۔ لیکن ان سب پر قدیم [illegible] رنگ چھائے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں شہر کی کل آبادی [illegible]

ریاست: حیدرآباد کے بعد سب سے اہم [illegible] دوست محمد خان نے رکھی تھی۔ دوست محمد خان ملازمت کی تلاش میں [illegible] شہنشاہ دہلی بہادر شاہ اول سے اپنی خدمات کے صلے میں اور کچھ [illegible] بیراسیہ کا پرگنہ پٹے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ [illegible] کی وجہ سے ایک بہت بڑے علاقے پر اپنے قدم جما لیے۔ شہر بھوپال اور قلعہ [illegible] کی بنیاد رکھنے کے بعد مغلوں کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی نوابی کا آغاز کردیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا [illegible] خان جانشین ہوا جسے یار محمد خان نے جلد ہی نکال باہر کیا۔ اس کے بعد فیض محمد خان جانشین بنا۔ اس کے زمانے میں بھوپال کی ریاست کا آدھا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مرہٹہ پیشوا باجی

راڈاول کے قبضے میں چلا گیا۔ فیض محمد خان کے بعد اس کا بھائی حیات محمد خان جانشین بنا۔ اس کے بعد وزیر محمد خان جو اپنے آپ کو حاکم بننے کا اہل ثابت کر چکا تھا ریاست کا حاکم بنا۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں وزیر محمد خان کا لڑکا نذر محمد اس کا جانشین ہوا اس نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے انگریزوں نے ذمہ لیا کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لئے محفوظ رہے گا۔ اس کے صلے میں ریاست کی فوج پنڈاریوں کے استیصال میں انگریزوں کی مدد کرے گی۔

نذر محمد کی شادی غوث محمد کی بیٹی قدسیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کے انتقال کے بعد ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں قدسیہ بیگم نے اپنی نابالغ بیٹی سکندر بیگم کے نگران کی حیثیت سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پچیس سال بعد سکندر بیگم باقاعدہ طور پر مسند نشین ہوئی اور اس سے ایک طویل اور نام آور سلسلہ بھوپال کی بیگموں کا چلا جو اس وقت ختم ہوا جب سلطان بیگم نے ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں برضا و رغبت ریاست سے دست بردار ہو کر اپنے بیٹے حمید اللہ خان کو اپنی جگہ مسند نشین کر دیا۔ یہی نواب حمید اللہ خان ریاست بھوپال کے آخری سربراہ تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھوپال ابتداء میں مرکزی حکومت کے زیر انتظام رہا۔ ۱۹۴۹ء میں بھارت میں مدغم کر دیا گیا۔ سابق نواب کو جو ایک عام شہری سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ پنشن دے دی گئی۔ ان کے جیب خرچ کے لیے گیارہ لاکھ سالانہ کی رقم منظور کی گئی۔ نواب حمید اللہ خان کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا تو ان کے بعد ان کی دوسری بیٹی ساجدہ سلطان بیگم کو ان کا جانشین تسلیم کیا گیا۔

بھوپال ریاست کا کل رقبہ [illegible] مربع میل تھا اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس ریاست کی کل آبادی [illegible] تھی۔

بہوتی (وفات ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) شیخ منصور بن یونس بہوتی ایک نامور حنبلی عالم دین جس کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری سترہویں صدی عیسوی کے نصف اول تک ہے۔ مدیریہ غربیہ میں بہوت نامی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس میں کئی ایک حنبلی علماء پیدا ہوئے۔

شیخ منصور بہوتی کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں وہ قاہرہ میں فقہ کی تعلیم دینے میں مشغول رہا اور وہیں انتقال کیا لوگ اس کے زہد و تقوے اور کریمانہ اخلاق کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب تعلیم بہت مقبول تھا۔ لوگ دور دور سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔

اس کے شاگردوں میں محمد بہوتی اور محمد ابن ابی سرور بہوتی ابوبکر بن ابراہیم الصالحی وغیرہ ہیں۔

بہوتی ایک صاحب تصنیف عالم تھا۔ اس کی کتاب ابھی تک مصر میں فقہ حنبلی کے نصاب درس میں شامل ہے۔

اس کی تصانیف میں ۱۔ "زاد" جو ابن قدامہ کی "المقنع" کا خلاصہ ہے۔ ۲۔ الاقناع ایک شرعی دستور العمل جو حنابلہ کے ہاں ایک مستند اور مسلم تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۳۔ الاقناع کی شرح جو کشاف کے نام سے تین جلدوں میں ہے ۴۔ محمد بن علی المقدسی کی المفردات کی شرح نظم میں لکھی مشہور ہیں۔

بھیروی، غلام قادر، مولانا (وفات ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ/۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء) ایک راسخ العقیدہ عالم دین۔ والد کا نام غلام حیدر تھا جو بڑے متبحر عالم تھے۔ بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر ہی میں حصول علم کی خاطر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور پاک و ہند کے مختلف مدارس دینیہ سے اکتساب علم کرتے رہے۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا غلام محی الدین بگوی، مولانا احمد دین بگوی، مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ اہم ہیں۔

حصول تعلیم کے بعد دہلی سے لاہور آئے اور بھاٹی دروازے کی "اونچی مسجد" میں وعظ فرمانے لگے۔ بعد ازاں بیگم شاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں انگریزوں کی خواہش کے مطابق ایک فتویٰ نہ دیا اور کالج کو خیرباد کہہ دیا۔ بعد ازاں مدرسہ نعمانیہ میں دین کی تعلیم دینے لگے اور اسی عالم مصروفیت میں انتقال کیا۔ مولانا سلسلہ چشتیہ میں خواجہ شمس الدین سیالوی سے بیعت تھے۔ قادری سلسلے اور فلسفہ وحدت الوجود کے زبردست حامی تھے سخت اور کڑے اعتقادات کے حامل تھے۔ وہابیوں، اہل تشیع اور احمدیوں (مرزائیوں) کے سخت مخالف تھے۔ مسلک حنفی کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔

مولانا بھیروی ایک بڑے مصنف بھی تھے انہوں نے گیارہ کتابیں لکھی ہیں جو نصابی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں چھوٹے چھوٹے جملوں اور آسان زبان میں اعتقاد کے اہم مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان تصانیف میں ۱۔ نماز حضوری ۲۔ نماز ضروری ۳۔ تحقیقات انوار محمدیہ ۴۔ شمس الحنفیہ بجواب نور الحنفیہ ۵۔ جوہر امانی ۶۔ عکازہ در صلوٰۃ جنازہ۔ وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ کے تلامذہ میں پیر جماعت علی شاہ، مفتی غلام احمد اور مولانا محمد عالم آسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی اولاد میں مولانا رفیع الدین، مولانا زین العابدین اور دو صاحبزادیاں تھیں۔

بھیرہ پاکستان کا ایک بہت پرانا شہر، ضلع سرگودھا میں دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر برارن کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ ابتداء میں اس کا نام راجا بھدر اسین کے نام پر بھدروتی نگر تھا۔ بعض نے اس شہر کا ذکر بھتیہ یا بھدیہ کے نام سے کیا ہے۔ جب سکندر اعظم ۳۲۶ قبل مسیح میں پنجاب پر حملہ کرنے کے لئے آیا تو بھیرہ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر تقریباً اسی جگہ آباد تھا جہاں ان دنوں احمد آباد کی بستی ہے۔ اس کے گیارہ سو سال بعد بابر کے زمانے میں بھی یہ شہر مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ محققین کی رائے کے مطابق سکندر نے پورس سے لڑائی کے وقت اپنا فوجی پڑاؤ قدیم بھیرہ کے نواح میں ڈالا تھا اور اصل جنگ دریا کے بائیں کنارے پر موجود بھیرہ کے نواح میں لڑی گئی۔

اس شہر کو شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں دریا کے بائیں کنارے پر ایک مسجد اور ایک بزرگ کے مزار کے گرد تعمیر کرایا تھا۔ عتبی کے بقول اس شہر کو سلطان محمود غزنوی نے انندپال کے ایک ماتحت راجا بجے رائے سے چھینا تھا۔ بھیرے کو ۱۲۲۱ء میں چنگیز خان کے ایک سپہ سالار تورتای نے جلال الدین خوارزم کا تعاقب کرتے ہوئے فتح کیا تھا۔ ۱۳۹۸ء میں جود پہاڑیوں کے راجاؤں کے ساتھ بھیرہ کا راجا بھی امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بابر نے ۱۵۱۹ء میں ہندوستان پر اپنے حملے کے دوران میں بھیرہ کے باشندوں پر چار لاکھ شاہرخی سکے کا تاوان عائد کیا تھا۔ اکبر کے عہد حکومت میں اس شہر میں تانبے کے سکوں کی ٹکسال قائم کی گئی تھی۔

شہر بھیرہ پاکستان کی ایک تحصیل کا صدر مقام اور علمی و ادبی مرکز ہے۔ بہت سے علماء اور صوفیاء اس شہر سے تعلق رکھتے تھے۔

بئرالسبع بیرشیبا، جنوبی فلسطین (اسرائیل) کا ایک شہر، جو یروشلم سے جنوب مغرب کی طرف بیاسی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر وہ چشمے تھے جن کے متعلق روایت ہے کہ انہیں حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے ہاتھوں سے کھدوایا تھا آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے یہ جگہ غیرآباد تھی۔ یہاں تک کہ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں ترکوں نے اسے دوبارہ آباد کیا اور اپنی جنوبی مملکت کے لئے اداری مرکز بنا کر دوبارہ آباد کیا۔ ترکوں کے یہ قدم اٹھانے کی وجہ مصری اور فلسطینی سرحد سے متعلق وہ اختلاف تھا جو ضمن حکومت برطانیہ سے پیدا ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بئرالسبع پر ترک اور برطانوی فوجوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جن دنوں یہ علاقہ برطانیہ کے زیرِ انتظام تھا۔ اس کی تحصیل فلسطین کے تقریباً نصف علاقے پر مشتمل تھی۔ اور اس میں تقریباً پچھتر ہزار سے ایک لاکھ بدوی آباد تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اس شہر کی آبادی تین ہزار ہو چکی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی ۷۵ ہزار سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء سے یہ شہر اسرائیل میں شامل ہے اور نجیب تحصیل کا صدر مقام ہے۔

بئرِ معونہ مدینہ منورہ کا ایک کنواں جو بنو سلیم کی ملکیت تھا۔ یہ علاقہ بنو عامر اور حرہ بنو سلیم کے درمیان واقع ہے اس کے آس پاس کا علاقہ بھی اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں بئرِ معونہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ کفار نے ایک سازش اور غداری کر کے بہت سے بلند مرتبہ اصحاب رسول کو جن میں حفاظ اور قرار شامل تھے شہید کر دیا تھا۔

یہ واقعہ ماہ صفر ۴ھ کا ہے کہ بنو عامر کا ایک معزز سردار ابو براء عامر بن مالک الکلابی آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی لیکن وہ اسلام نہ لایا اور نہ ہی اس کا انکار کیا۔ پھر اس نے عرض کی یا رسول اللہ اگر آپ اپنے کچھ صحابہ کو اہل نجد کی طرف بھیجیں جو انہیں اسلام کی دعوت دیں تو مجھے امید ہے وہ اسلام لے آئیں گے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد کی طرف سے ان لوگوں کے بارے میں خدشہ ہے۔ ابو براء نے کہا کہ میں ان کی ضمانت دیتا ہوں چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ ستر صحابہ کا ایک وفد بھیج دیا۔ جب یہ وفد بئرِ معونہ کے علاقہ میں قیام پذیر ہوا تو انہوں نے حضرت حرام بن ملحان کو آنحضورؐ کا خط مبارک دے کر بنو عامر کے سردار کے پاس بھیجا۔ عامر نے خط پڑھے بغیر قاصد کا سر قلم کر دیا اور اپنے قبیلے کو وفد پر حملہ کرنے کو کہا لیکن انہوں نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ ابو براء نے مسلمانوں کو اپنی حفاظت و حمایت میں لے رکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے بنو سلیم کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ تمام مسلمان لڑتے ہوئے شہید ہو گئے صرف حضرت کعب بن زید زخمی ہو کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ آنحضورؐ اور صحابہؓ کو شہدائے بئرِ معونہ کا بڑا دکھ ہوا اور آپؐ تقریباً ایک ماہ تک ہر نماز میں شہدائے بئرِ معونہ کے قاتلوں کے لئے بددعا کرتے رہے۔ یہ سانحہ ۲۰ صفر ۴ھ/ ۲۴ اگست ۶۲۵ء کو پیش آیا۔

بئرِ میمون مکہ مکرمہ کے قریب ایک کنواں۔ یہ کنواں اسلام کے ابتدائی دور میں مشہور و معروف تھا۔ آج کل اس کا نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ نہ ہی یہ بات کلی طور پر معلوم ہے کہ آیا بئرِ میمون برباد ہو گیا ہے یا کسی دوسرے نام سے آج بھی جاری ہے۔ اس کا محل وقوع مسجد حرام اور منیٰ کے درمیان منیٰ سے نسبتاً قریب ترقرار دیا جاتا ہے۔ طبری نے اس کنوئیں کے مقام پر ۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء میں خلیفہ المنصور کی وفات کے جو حالات لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنواں حدود حرم کے اندر تھا اور عراق سے آنے والے حاجیوں کی راہ پر واقع تھا ایک اور تاریخی شہادت کے مطابق یہ کنواں مکے کے شمال میں مرالظہران کے پاس تھا بقول ہمدانی یہ کنواں دنیا بھر کے دو قدیم کنوؤں میں سے ایک تھا اور البکری کے بقول یہ کنواں چاہ زمزم سے کہیں زیادہ قدیم تھا۔ عہد نبوی میں یہ میمون بن الحضرمی کی ملکیت تھا۔

بئرِ میمون مکے کے لئے آب رسانی کے اس نظام سے وابستہ تھا جو سب سے پہلے ملکہ زبیدہ نے تیار کرایا۔ ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں حاکم اربل مظفر نے مرمت کے بعد اس کنوئیں کو دوبارہ آباد کیا۔

بیان بن سمعان کوفے کا ایک شیعی رہنما۔ بقول النوبختی ابن کرب کے شاگرد حمزہ بن عمارہ کے ساتھ زانوئے تلمذ تہ کئے تھے۔ محمد بن حنفیہ کی امامت کے بارے میں وہ نہایت عجیب و غریب نظریات رکھتا تھا۔ اس نے محمد کے بیٹے ابو ہاشم کی امامت قبول کی اور امام محمد باقر کا معتقد ہو گیا۔ امام محمد باقر کی وفات کے بعد مغیرہ بن سعید بجلی ان کی جماعت کو چھوڑ کر بیان کے ساتھ آ ملا۔ کچھ عرصے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے یہ دونوں اپنے چند متبعین سمیت گرفتار کر لئے گئے اور ۱۱۹ھ/۷۳۷ء میں ہشام کے والی خالد القسری نے انہیں زندہ جلوا دیا۔

بیان کے معتقدوں نے بظاہر ایک جماعت بیانیہ نام سے بنا لی تھی [illegible] کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ لوگ اماموں کی نبوت کو نور ربانی کے ایک ذرہ باطنی سے منسوب کرتے تھے۔ اور موت کے بعد بہت سے مذہبی بزرگوں کی بازگشت کا اعتقاد بھی رکھتے تھے۔ بعض لوگ بیان کو بھی امام سمجھتے تھے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت ھذا بیان للناس سے سند لاتے تھے۔

بیان قرآن پاک کے لفظی تشبیہی معنی ساتھ لیا کرتا تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا [illegible] ذات ہے۔ چہرے کے سوا اس کے تمام اعضاء و جوارح [illegible] جائیں گے۔

بیبرس اوّل [illegible] ۶۲۰ھ/ ۱۲۲۳ء - ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء، [illegible] سلطان [illegible] کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ [illegible] کی جماعت میں تھا۔ جنہیں ایوبی سلطان الملک الصالح نے [illegible] ایدکین بندقدار تھا۔ اس کا ذکر تاریخ میں سب سے پہلے ۶۴۴ھ/ ۱۲۴۶ء میں [illegible] قیدی کی حیثیت سے آتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آقا کے ساتھ قید تھا۔ بعد میں [illegible] مصر کی طرف [illegible] شام میں [illegible] پکار نظر آتا ہے۔ جہاں اسے سخت فوجی تربیت [illegible] گذارنا پڑا۔ اس نے منصورہ کے میدان جنگ میں مصری فوج کی قیادت [illegible] اس کا پہلا جنگی کارنامہ تھا۔ اس کی یہ مہم فارس کور کی فیصلہ کن فتح اور فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی گرفتاری پر منتج ہوئی۔ اسی موقع پر بیبرس ہی کی [illegible] ۶۴۸ھ/ ۱۲۵۰ء میں توران شاہ کو قتل کیا گیا۔

۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں سلطان قطز کو اس کے خیمے میں قتل کر دیا گیا تو بیبرس الملک [illegible] کا لقب اختیار کر کے مصر کے تخت پر مسند نشین ہوا۔

بیبرس بڑا بہادر جرأت مند اور اولوالعزم حکمران تھا اور جنگوں میں بہ نفس نفیس شریک ہوتا تھا۔ اس نے ایک طرف تو عالم اسلام کو متحدہ قیادت عطا کی اور دوسری جانب فرنگیوں کے خلاف فاتحانہ جنگ لڑی۔ اس کے حملے بھرپور اور غیر متوقع ہوتے تھے۔ وہ ہر مفتوحہ علاقے کے ایک ایک بچے کو جلد ہی دفاع کے قابل بنا دیتا تھا۔

قاہرہ میں سلطان بیبرس اوّل کا مزار

بیبرس نے داخلی طور پر ملک کی از سر نو تنظیم میں غیر معمولی ہم آہنگی اور توازن پیدا کیا۔ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں سلطان نے اپنی آئندہ کی جارحانہ کارروائیوں کے اہم مقامات کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس نے حمص سے حوران تک ہر اس قلعے کو جسے منگولوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ مرمت کرا کے استعمال کے قابل بنایا۔

بیبرس ملکی حالات سے باخبر رہتا تھا۔ اسے ہفتے میں دو مرتبہ ملک کے ہر ایک حصے کی معلومات ملتی رہتی تھیں۔

جنگی اسلحہ خانوں کو نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے ایوبی شہزادوں کے مقبوضات کی قطع و برید کا آغاز کیا۔ سلطان خود حلب گیا اور دمشق میں اس مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء میں کرک کا رخ کیا اور ایوبی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء میں سلطان نے حمص کے علاقے کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں بندرگاہ قیساریہ فتح ہو گئی۔ اس کے بعد ارسوف کی بندرگاہ پر بھی سلطان کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء میں سلطان یافہ کے اس علاقے کی طرف متوجہ ہوا جو مملکت غیر سے گھرا ہوا تھا اور وہ ایک روز بھی سلطان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس طرح یافہ ایک ہی دن میں فتح ہو گیا۔ چند ہفتوں بعد مسلمانوں کا انتاکی اور بوفورٹ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اب مسلمان فوجیں اچانک لاطینی سلطنت کے شمالی سرے کے پاس نمودار ہو گئیں۔ اور انطاکیہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس فتح کے بعد اس کے قرب و جوار کے قلعے بھی مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ یہ فتح مسلمانوں کے لیے بڑی شہرت کا سبب بنی۔ ۶۶۹ھ/۱۲۷۱ء میں دو ماہ کے دوران ہی سفینہ کے مستحکم مقامات اور کرک، اور عکار کے قلعے بھی فتح ہو گئے۔

مورخین یہ بات کہتے ہیں کہ سلطان غیر متوقع طور پر پہنچ جاتا تھا اور اثنائے راہ میں اپنا رخ تبدیل کر لیتا تھا۔ تاکہ کسی کو پہلے سے یہ علم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء میں سلطان بیبرس نے وفات پائی۔

سلطان کے سترہ سالہ دور میں شام میں مجموعی طور پر اڑتیس دفعہ فوج کشی کی گئی۔ اس سلطان کے دور حکومت میں مستعدی ایک شاندار مثال نظر آتی ہے۔

بیبرس ثانی (وفات ۱۰ ذی قعدہ ۷۰۹ھ/۱۶ اپریل ۱۳۱۰ء) رکن الدین المنصوری۔ مصر کا مملوک سلطان جو چرکسی نسل سے تھا۔ یہ سلطان قلاوون کے مملوکوں میں سے تھا۔ سلطان محمد بن قلاوون کے پہلے عہد میں اس کا تقرر استاد دار کی حیثیت سے ہوا۔ سلطان کتغا نے ترقی دے کر اسے ایک بر سوار دل کا سپہ سالار بنا دیا۔ جب ۶۹۸ھ/۱۲۹۸ء میں سلطان قتل ہوا تو اس نے اور اس کے ایک اور حریف سالار نے محمد بن قلاوون کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ یہ دونوں آپس میں دشمن تھے۔ لیکن اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ بادشاہ کے نام پر جس کی عمر چودہ سال تھی حکومت کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جو بھی اہم اقدام ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے عرب مورخین ان دونوں امیروں کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

دس سال بعد محمد ان دونوں کی سرپرستی سے تنگ آ کر تخت سے دست بردار ہو گیا۔ بیبرس کے ساتھ سالار سے زیادہ مملوک تھے۔ چنانچہ وہ ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء میں ایوان سلطنت کا وارث بن بیٹھا۔ اور اسی موقع پر اس کی اصل کمزوری بھی ظاہر ہو گئی۔ چنانچہ ۷۰۹ھ/۱۳۱۰ء میں محمد تیسری مرتبہ تخت پر قابض ہو گیا۔ بیبرس بھاگ نکلا لیکن گرفتار ہو گیا۔ اور اسے قاہرہ میں ہلاک کر دیا۔

بیبرس منصوری (وفات ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) ایک مملوک سپہ سالار اور مورخ وہ قلاوون کا مملوک تھا اور اس نے قلاوون کی فوج کے ساتھ ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء میں شامی فرنگیوں کے خلاف ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں شام اور سلیشیا کی مہموں میں ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں انطاکیہ کے محاصرے میں اور ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء میں کیلیشیا کی ایک اور مہم میں حصہ لیا۔

۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء میں سلطان قلاوون نے بیبرس کو الکرک کے صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں سلطان کے جانشین نے اس کو اس عہدے سے علیحدہ کر دیا چنانچہ اس کے بعد وہ مصر لوٹ آیا۔ یہاں اس نے مغولوں کے خلاف مہموں میں حصہ لیا۔ ۶۹۳ھ/۱۲۹۳ء میں جب محمد سلطان منتخب ہوا تو اس نے بیبرس کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور رئیس عدالت کا اعلیٰ عہدہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد وہ کئی سال تک عسکری اور انتظامی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ بیبرس کی زندگی بھی محمد سلطان کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ محمد سلطان دوبار تخت سے معزول ہوا۔ اس کے ساتھ بیبرس بھی اپنے عہدے سے ہٹا دیا جاتا رہا۔ بیبرس محمد سلطان کا بڑا پرجوش حامی تھا۔ اس نے سلطان کو بحال کرانے میں بڑی جدوجہد کی۔ جب سلطان ۷۰۹ھ/۱۳۱۰ء میں پھر متمکن تخت ہوا تو اس نے بیبرس کو بہت سے اختیارات دے دیئے۔ ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں سلطان نے اسے اپنے بعد سب سے بڑے عہدے پر فائز کیا اور اسے مصر کا نائب السلطنت بنا دیا۔ ۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء میں بیبرس کو اس عہدے سے معزول کر کے اسکندریہ کے سرکاری قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

بیبرس نے اس قید خانے میں پانچ برس گذارے۔ یہیں اس نے اسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔

بیبرس ایک نہایت متقی مسلمان تھا۔ دینی کتب کے مطالعے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ اپنی مصروفیات میں سے تاریخی کتب لکھنے کا وقت بھی نکال لیتا تھا۔

اس کی تصانیف میں "زبدۃ الفکرۃ فی تاریخ الہجرۃ" اہم ہے۔ یہ ایک عام تاریخ اسلام ہے جو گیارہ جلدوں میں ہے اور ہر صدی کے لحاظ سے تالیف کی گئی ہے۔

بیت الحرام حرمت والا گھر۔ وہ جگہ جس کا حد سے زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔ مکہ میں جس جگہ خانہ کعبہ موجود ہے اسے بیت الحرام کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک اس کی عظمت اس لیے ہے کہ قرآن مجید کے مطابق اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے کی تھی۔ (نیز دیکھیے "کعبہ" اور "مسجد حرام")

بیت الخلاء بول و براز سے فراغت پانے کا کمرہ۔ بیت الخلا کا رخ اس طرح سے ہونا چاہیے کہ جب آدمی فراغت کے لیے بیٹھے تو وہ قبلہ رُخ نہ ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے حضرت ابوایوبؓ انصاری سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب تم بیت الخلا میں بیٹھو تو نہ قبلے کی طرف منہ کرو اور نہ پیٹھ"

آداب بیت الخلا میں سے یہ بھی ہے جب آدمی بیت الخلا میں داخل ہو تو وہ یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنَ الۡخُبُثِ وَالۡخَبَائِثِ (متفق علیہ) "اے اللہ میں تجھ سے جنوں اور جنیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔"

اسی طرح جب انسان فارغ ہو کر بیت الخلا سے نکلے تو کہے غُفۡرَانَکَ۔ اے اللہ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں۔ (ترمذی)

بیت العتیق پرانا گھر، قدیم گھر۔ خانہ کعبہ جو عبادت الٰہی کے لیے دنیا میں سب سے پہلا مقام اور مکان ہے جسے حضرت آدمؑ نے خدا کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ (نیز دیکھیے "کعبہ"، "مسجد حرام")

بیت اللہ اللہ کا گھر، جہاں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے۔ اصطلاحاً خانہ کعبہ مسلمان ہر سال بیت اللہ کی زیارت کے لیے یہاں آتے ہیں۔ اسلامی روایات کے مطابق دنیا میں یہ پہلا خدا کا گھر ہے۔ مسلمان دوسرے مناسک حج کے علاوہ کعبہ کے گرد سات چکر لگاتے ہیں اور حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ (نیز دیکھیے "کعبہ" اور "مسجد حرام")

خانہ کعبہ

بیت المال مال کا گھر، سرکاری خزانہ، شاہی خزانہ۔ شرعی اصطلاح میں اس کے معنی کسی مسلم ریاست کے خزانے کے ہیں۔ یعنی وہ مال جس کا کوئی خاص مالک نہ ہو۔ عام لوگوں کا حصہ ہو۔ اور جس سے ہر مستحق کو مدد دی جائے

بیت المال آنحضورؐ کے عہد مبارک سے کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے چونکہ عہد نبوی میں مال جمع کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی اس لیے اس مقصد کے واسطے کوئی الگ مکان نہیں بنایا گیا تھا۔ جو کچھ آتا وہ مسجد میں ڈھیر کر دیا جاتا اور مستحق لوگوں کو دے دیا جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی بیت المال کی [illegible] لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیت المال باضابطہ طور پر وجود میں آیا۔

پہلے پہل بیت المال کا لفظ [illegible] کے لیے بولا جاتا [illegible] یا اسباب کو حقداروں میں تقسیم کرنے سے پہلے عارضی طور پر رکھا جاتا [illegible] تحریک میں جب "دیوان" کا ادارہ بھی اس میں شامل کر دیا گیا [illegible] میں سرکاری خزانے کا تصور شامل ہو گیا۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک امام یا امیر [illegible] ہے، بیت المال کے یہ اختیارات بحیثیت [illegible] یا شخصی اقتدار و اختیار کا نتیجہ نہیں ہوتے۔

بیت المال آمدنی کے ذرائع حسب ذیل [illegible]

۱۔ مال زکوٰۃ۔ جو سرکاری طور پر [illegible]
۲۔ خمس یعنی جنگی لوٹ کے مال کا پانچواں حصہ
۳۔ معادن اور دفینے۔
۴۔ لاوارث مال۔
۵۔ جزیہ یعنی وہ ٹیکس جو غیر مسلم [illegible]

[illegible] دوران میں مرکز کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
مرکزی بیت المال [illegible]
ایک شاہی خزانہ [illegible]
[illegible]

بیت المعمور [illegible] کعبہ کے عین اوپر [illegible] تعداد میں فرشتے اور عبادت کرتے رہتے [illegible] جگہ کی زیارت کی تھی۔

بیت المقدس [illegible] کی بنیاد حضرت داؤدؑ نے رکھی [illegible] بیت المقدس کہا جاتا ہے [illegible] سے جنہیں نوع انسانی عظمت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ [illegible] کا ذرہ ذرہ

مقدس ہے۔ اکثر انبیاء اسی شہر میں مبعوث ہوئے۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یکساں متبرک ہے۔ آنحضور ؐ ہجرت کے بعد صحابہ کرام کو ساتھ لے کر سترہ ماہ تک اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ جب آپ ؐ معراج کے لیے گئے تو یہی مقام آپ ؐ کی پہلی منزل بنا۔ اسی مقام پر آنحضور ؐ نے سابق انبیاء ؑ کی امامت کرائی۔ یہاں حضرت داؤد، حضرت سلیمان ؑ اور کئی دوسرے انبیاء ؑ کے مقابر ہیں۔

حضرت داؤد ؑ نے شہر مقدس پر ۳۳ سال حکومت کی۔ اس تمام عرصے میں اسرائیلی فوجوں کو سکون بہت کم ملا۔ البتہ ان جنگوں کا نتیجہ بنی اسرائیل کے حق میں اس لیے بہت زیادہ مفید رہا کہ بنی اسرائیل جو قبائلی عصبیت کا شکار تھے۔ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک قوم بن گئے۔ حضرت داؤد ؑ کی دلی خواہش تھی کہ وہ ایک معبد بنائیں لیکن اسرائیلی روایات کے مطابق انہیں خواب میں بتایا گیا کہ اللہ کا مستقل گھر ان کے بیٹے کے عہد میں تعمیر ہوگا۔ چنانچہ حضرت سلیمان ؑ نے تخت نشین ہونے کے بعد ۱۰۱۲ ق۔م میں اس معبد کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ عمارت اسی جگہ تعمیر ہوئی جسے حضرت داؤد ؑ نے منتخب کیا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر سات سال تک مسلسل جاری رہی اور دو لاکھ افراد اس کی تعمیر میں مصروف رہے۔ بعد میں یہ عمارت ہیکل سلیمانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ بائیبل کی تصریح کے مطابق ہیکل سلیمانی فن تعمیر کا ایک شاہکار تھا۔ جس کی لمبائی ۹۰ فٹ چوڑائی ۳۰ فٹ اور اونچائی ۴۵ فٹ تھی۔ اس کے اندر پاک ترین جگہ بنائی گئی۔ جہاں تابوت سکینہ رکھا گیا۔

حضرت سلیمان ؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی ریاست دو حصوں میں بٹ گئی اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل فواحش، حرامکاری اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے ایک اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرنی شروع کر دی۔

رحبعام بن سلیمان ؑ کو تخت پر بیٹھے پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ شاہ مصر سی شاق نے یروشلم کی طرف پیشقدمی کی اور بغیر مزاحمت کے شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ ہیکل سلیمانی اور عبادت گاہ کی تمام قیمتی چیزیں شاہی خزانوں کے ساتھ لوٹ کر لے گیا۔

حزقیاہ نے (۷۴۰ ق م سے ۷۰۰ ق م) نے اپنے دور میں ہیکل سلیمانی کی عظمت کو بحال کیا۔

یہود کی پہلی قومی تباہی و بربادی بخت نصر کے ہاتھوں ۵۹۸ ق م میں ہوئی۔ اس تباہی میں نہ صرف ہیکل سلیمانی کا نام و نشان مٹ گیا بلکہ دیگر صحائف کے ساتھ ساتھ تورات بھی غائب ہو گئی۔ بخت نصر کے اس حملے کے بعد تابوت سکینہ ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔

۵۳۹ء میں ایران کے پہلے کسریٰ نے بابل کو فتح کیا تو اس نے یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ جب یہودی یروشلم واپس آئے تو انہوں نے یشوع بن یوصدق اور زروبابل بن سالتی ایل کی قیادت میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر دوبارہ شروع کی۔ ۵۱۶ ق۔م میں یہ تعمیر مکمل ہوئی۔

۶۳ ق۔م میں رومی جنرل پومپیائی نے شہر کا محاصرہ کر کے ہیکل کو دوبارہ تباہ کر دیا۔ لیکن ہیرود اعظم کے دور میں، جو رومی شہنشاہ کے باجگزار کی حیثیت سے یہاں کا بادشاہ بنا۔ بیت المقدس نے دوبارہ سلیمان ؑ کے عہد کی عظمت حاصل کر لی۔ اس بادشاہ نے ہیکل سلیمانی کو از سر نو عظمت بخشی بقول کیپٹن وارن ہیرود کے وسیع کردہ ہیکل کا رقبہ تقریباً ایک ہزار مربع فٹ تھا اور شان و شوکت میں سلیمان ؑ کے تعمیر کردہ ہیکل سے کسی طرح کم نہ تھا۔

۷۰ء میں جب رومی شہنشاہ، طیطس شہر میں داخل ہوا اور رومی سپاہی یہودیوں

احاطہ حرم کی زیارتیں

۱۔ قبۃ الصخرہ ۲۔ قبۃ السلسلہ ۳۔ قبۃ المعراج ۴۔ قبۃ النبی ۵۔ قبۃ الارواح ۶۔ قبۃ الخضر الیحاج ۷۔ قبۃ سلیمان ۸۔ کھلا منبر ۹۔ تخت سلیمان ۱۰۔ مہد عیسیٰ ۱۱۔ اصطبل سلیمان ۱۲۔ مسجد الاقصیٰ ۱۳۔ باب النبی ۱۴۔ باب المغاربہ ۱۵۔ باب السلسلہ ۱۶۔ باب المطارہ (بارش) ۱۷۔ باب القطانین ۱۸۔ باب الحدید ۱۹۔ باب الناظر ۲۰۔ باب الزوایا ۲۱۔ باب العزازہ ۲۲۔ باب السقر ۲۳۔ باب التوبہ ۲۴۔ باب الاسباط ۲۵۔ باب الذہب ۲۶۔ باب القدیم ۲۷۔ اکہرہ دروازہ ۲۸۔ تہرہ دروازہ ۲۹۔ دوہرہ دروازہ ۳۰۔ ۱۹۱۸ء سے قبل ترک افواج کا مستقر ۳۱۔ یہودیوں کا مقام گریہ۔

کا تعاقب کرتے ہوئے ہیکل کے اندرونی صحن میں داخل ہوئے تو ایک یہودی نے جلتی ہوئی مشعل ہیکل کے اندر پھینک دی جس سے ہیکل میں آگ بھڑک اٹھی اور یہ جل کر راکھ ہو گیا۔ اس مرتبہ ہیکل کی تباہی خود یہودیوں کے ہاتھوں ہوئی

۱۳۵ء میں جب دوبارہ معبد (ہیکل) تیار ہوا تو رومیوں نے اسے گرا کر اس کی جگہ ہل چلا دیئے۔ ۱۳۶ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ اور شہر کا نام پہلے ایلیا اور پھر کیپی ٹولینا قرار دیا۔ اس بات کو فرنگی مؤرخین اور ماہرین آثار قدیمہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہیرود کے تعمیر کردہ ہیکل تباہ ہو جانے کے بعد صدیوں تک اس جگہ پر ملبے اور غلاظت کے ڈھیر پڑے رہے۔ یہودیوں سے نفرت کی بنا پر تمام کوڑا کرکٹ اسی جگہ پھینکتے تھے۔

چنانچہ حضرت عمر ؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو

اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا۔ بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے حضرت عمرؓ کے حکم سے ان کھنڈرات پر ایک مسجد کی تعمیر ہوئی۔ ایک قدیم سیاح آرکلف نے بھی ایک سادہ سی مسجد کا ذکر کیا ہے جو ۶۷۰ء میں مقدس مقامات کی زیارت کے لیے بیت المقدس آیا تھا۔ تقریباً اس کے سادہ سی تعمیر کے پچاس سال بعد اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۷۲ھ/۶۹۰ء میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی بنیاد اٹھائی۔ یہ خلیفہ قبۃ الصخرہ کی تعمیر ہی مکمل کر سکا۔ مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا کام جو ادھورا رہ گیا تھا ولید بن عبدالملک نے مکمل کرایا۔

وہ مقدس مقامات جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدتوں کا مرکز ہے اکثر و بیشتر شہر کی مشرقی پہاڑی پر ایک احاطہ میں ہیں جس کو مسلمان حرم شریف اور یہودی بیت لحم کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔ ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف ۳۶ ایکڑ پر مشتمل ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ اسی حرم میں ہیں حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں۔ جنہیں مسلمان محراب کہتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔ حرم شریف میں چار حوض وضو کے لیے اور پانچ منبر واعظین کے لیے ہیں مستورات کے لیے تین مقصورے ہیں۔ اندرونی و بیرونی دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔ ۱۹۶۷ء میں مولانا شبیر علی نے حرم شریف کا طول ۱۲۰۰ گز عرض ۶۶۰ گز ہے اور دروازے چودہ بتائے ہیں۔ احاطہ حرم کے اندر جو زیارتیں ہیں ان میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے علاوہ مندرجہ ذیل عمارات ہیں۔

(۱) **مغارۃ الارواح**:۔ قبۃ الصخرہ کے نیچے چٹان کی جنوبی سمت گیارہ سیڑھیوں سے ایک غار میں اترتے ہیں۔ اسے مغارۃ الارواح کہتے ہیں۔ تہہ خانے کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ بقول ابن حوقل اور اصطخری چٹان کے نیچے کا کمرہ نہ مربع ہے نہ گول بلندی میں قد آدم جتنا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت زکریاؑ کی قبر اسی غار میں ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ غار ایک خلا تھا اور چٹان کے نیچے ایک کنواں تھا اسے بیر الارواح کہتے تھے۔ بعد ازاں اس کنویں پر دیوار بنا دی گئی۔ اس غار میں مختلف انبیاء کی جائے عبادت کو محرابوں سے مخصوص کیا گیا ہے شمالی حصے میں مقام خضرؑ اور جنوبی کونے میں مقام داؤدؑ ہے۔ ایک مقام کے بارے میں جسے مقام النبی کہا جاتا ہے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے یہاں نوافل ادا کیے تھے اس غار میں موئے مبارکؐ اور نقش پائے مبارکؐ بھی ہیں جو اس غار کے جنوب غربی کونے میں ایک الماری میں محفوظ ہیں۔ اس الماری کے سامنے ایک صندوق میں آنحضورؐ اور حضرت عمرؓ کے علم محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس غار میں ایک وقت میں پچاس ساٹھ آدمی سما سکتے ہیں۔

(۲) **قبۃ السلسلہ**:۔ بقول مقدسی حرم شریف کے وسط صحن میں ایک چبوترہ اٹھا ہوا ہے جس کے چاروں طرف کافی چوڑی سیڑھیاں ہیں چبوترے پر چار گنبد بنے ہوئے ہیں۔ ان میں قبۃ السلسلہ، قبۃ المعراج اور قبۃ النبیؐ کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں جو سنگ مرمر کے ستونوں پر بغیر دیواروں کے قائم ہیں۔ بقول ابن فقیہ قبۃ الصخرہ کے مشرق کی جانب قبۃ السلسلہ بیس ستونوں پر کھڑا ہے اس کے سامنے مشرق ہی کی طرف حضرت خضرؑ کا مقام عبادت ہے اس کے شمال رخ پر قبۃ النبیؐ اور مقام جبرائیلؑ ہیں اور چٹان کے برابر قبۃ المعراج ہے۔ یہ قبہ زیادہ پائیدار اور مستحکم نہ تھا اس لیے بار بار زلزلوں سے متاثر ہوتا رہا اور تعمیر ہوتا رہا۔ اس چبوترے کے دوسرے قبوں قبۃ النبیؐ، قبۃ المعراج اور قبۃ جبرائیل کے بارے میں ابن عبدربہ نے لکھا ہے۔

۱۔ وہ گنبد جہاں سے آنحضورؐ آسمان پر تشریف لے گئے۔
۲۔ اس مقام کے اوپر کا گنبد جہاں آنحضورؐ نے انبیاء سابقین کے ہمراہ نماز ادا فرمائی۔
۳۔ معبد جبرئیل۔

(۳) **مہد مسیحؑ**:۔ احاطہ حرم شریف کے جنوب مشرقی گوشے میں قدم آتا ہے پر ایک چھوٹی سی زمین دوز مسجد جس کا طول و عرض ۲۰ گز × ۵۴ گز ہے۔ مہد مسیح کے نام سے موسوم ہے۔ ابن عبدربہ نے اسے محراب مریم بنت عمران اور مقدسی نے محراب مریم و زکریا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مہد مسیح میں پرانے زمانے سے ایک پنگوڑا زمین میں گڑا ہوا ہے۔ جسے حضرت عیسیٰؑ کا پنگوڑا کہا جاتا ہے۔ اسی پنگوڑے کو مسجد کی محراب بنا دیا گیا ہے۔ محراب مریم اور محراب زکریا اس کے مشرقی پہلو میں ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ایک ستون پر انگلیوں کے نشانات ہیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت مریمؑ نے دردزہ کی شدت میں اس پتھر کو زور سے پکڑا تھا۔ اور یہ انہی کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ مہد عیسیٰ کے مغرب میں اصطبل سلیمان ہے اور دونوں کے درمیان ایک دروازہ ہے۔ محراب داؤد اب ختم ہو چکی ہے۔ البتہ اس کے قریب کرسی سلیمانؑ قد آدم بلند چٹان کی صورت موجود ہے۔

(۴) **سلیمانؑ کا مصلیٰ**:۔ باب حطہ میں دائیں سمت ایک دروازہ مسجد کے شمال میں واقع ہے۔ ان دونوں دروازوں کے درمیان چار ستونوں پر ایک قبہ اور محراب ہے جسے مصلیٰ سیدنا سلیمانؑ کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں روایت ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے دوران میں آپ اسی جگہ بیٹھ کر فیصلے فرماتے تھے۔

(۵) **روضۂ سلیمانؑ**:۔ حرم شریف میں گنبد صخرہ کے مشرق میں ... سو قدم کی دوری پر بیرونی دیوار کے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دو جانب جالی دار کھڑکیاں ہیں۔ جن سے قبر مبارک دیکھی جا سکتی ہے۔ کمرے کے ساتھ ہی حضرت سلیمانؑ کا وہ قید خانہ ہے جہاں پر شریر جنات کو قید رکھا جاتا تھا۔

(۶) **دیوار براق**:۔ اس کے بارے میں روایت ہے کہ معراج کی رات آنحضورؐ نے یہاں براق باندھا تھا۔ اس کے علاوہ حرم میں ایک چھوٹی سی ... ہوئی ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

(۷) **مزار مولانا محمد علی جوہر**:۔ مسجد صخرہ کے سامنے مغرب کی ... ایک بند کمرے میں واقع ہے۔ جس کے باہر عربی زبان میں لکھا ہے۔
"اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کی جان و مال کے بدلے جنت دے گا۔ یہ مجاہد ... مولانا محمد علی جوہر کی قبر ہے۔"

(۸) **دیوار گریہ**:۔ حرم شریف کی غربی دیوار میں ایک ... فٹ لمبا ہے دیوار گریہ کہلاتا ہے۔ یہودیوں کا اس کے بارے میں ... ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کی باقیات میں سے ہے اور وہ یہاں آ کر گریہ و زاری کرتے ہیں ... اسے البراق کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ معراج کی رات آپؐ اس جگہ براق سے اترے اور یہیں براق کو باندھا تھا۔

بیت لحم فلسطین کا ایک قصبہ جو بیت المقدس سے تقریباً دس کیلومیٹر دور جنوب سمندر سے آٹھ سو میٹر کی بلندی پر جودیہ کے چونے والے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔

یہ مقام چوتھی صدی عیسوی سے برابر مسیحیوں کی زیارت گاہ ہے۔ بعدازاں یہ مقام حضرت مسیحؑ کی ولادت گاہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی نظر میں بھی محترم ہو گیا۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کھجور کے درخت کی بھی نشان دہی کی ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ مریم کی آیت ۲۳ تا ۲۵ میں آیا ہے۔
نیز حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی قبور کا ذکر بھی کیا ہے جو یہاں موجود ہیں۔
ان جغرافیہ نویسوں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کی اس محراب کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس مقام پر آپؓ نے فلسطین فتح کرنے کے بعد اس طرف سے گذرتے وقت نماز ادا کی تھی۔

چونکہ یہ مقام بیت المقدس سے بہت قریب ہے اس وجہ سے اسے اتنی زیادہ شہرت حاصل نہ ہوسکی۔ پہلی صلیبی جنگوں میں جب جرمنوں کا اس سے الحاق ہوا تو انھوں نے ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں یہاں ایک قلعہ بنوایا۔ اس کے بعد ۱۱۱۰ء میں یہاں ایک مسیحی [illegible] کی اجازت حاصل کی گئی۔ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں صلاح الدین [illegible] نے [illegible] فلسطین کو نئے سرے سے فتح کیا تو یہ علاقہ بھی سلطان کے قبضے میں [illegible] الکامل اور فریڈرک دوم کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کے تحت [illegible] کو واپس دے دینا پڑا۔
[illegible] ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں مسلمانوں کی تھوڑی سی اقلیت [illegible] اور جدید طرز کے مکانات کثرت سے ہیں۔

[illegible] کا ایک مشہور شہر اور اسی نام کی سابق [illegible] سے تقریباً ۲۵۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے [illegible] ۹۶۴ھ [illegible] تک یادو راجاؤں کا ہمدرد نظام رہا۔ یہاں تک [illegible] علاء الدین [illegible] نے فتح کیا۔ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں یوسف [illegible] دکن کا بنیا رکھا جاتا ہے بیجاپور کی مستقل حکومت کی بنیاد [illegible] ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ یوسف نے کو، پر بھی قبضہ کر کے اس کو اپنی [illegible] کر دیا۔ اور عادل شاہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ لقب ان کا خاندانی لقب [illegible] یہ خاندان عادل شاہی خاندان کہلایا۔
[illegible] میں عادل شاہ تخت پر بیٹھا اس نے رفاہ عامہ کے بہت سے [illegible] بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے متحدہ فوجی دستوں نے [illegible] نگر کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کی وفات کے بعد ۹۸۸ھ/۱۵۷۹ء میں اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ تخت پر بیٹھا۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں ابراہیم کے انتقال کے بعد محمد عادل شاہ مسند نشین ہوا اس کے دور حکومت میں مرہٹوں نے شیواجی کی سرکردگی میں بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ اور بہت سے اہم قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب نے اپنے زمانہ شہزادگی میں بیجاپور پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کیا لیکن شاہجہان کی بیماری کی خبر سن کر اسے محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اور اس کے تیس سال بعد ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں سکندر عادل شاہ کے زمانے میں جو عادل شاہی خاندان کا آخری فرمانروا تھا اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر لیا۔ اورنگ زیب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں کام بخش کو بیجاپور کی حکومت پر متعین کیا جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں یہ علاقہ نظام حیدر آباد کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ جس نے ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں یہ علاقہ ساٹھ لاکھ روپے کے عوض مرہٹوں کے حوالے کر دیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں اس علاقے پر انگریزوں نے قبضہ کر کے راجا ستارہ کے حوالے کر دیا جو ریاست ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔

۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں بیجاپور ایک ضلع قرار دیا گیا۔ جس کا ایریا ۶۵۹۰ مربع میل تھا اور اس ضلع کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۶۵۸۴۵۳ تھی۔
۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء میں بیجاپور میں طاعون کی متعدی وبا کے علاوہ کئی ایک قحط بھی پڑے

بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کا مقبرہ - گول گنبد

ہیں۔ یہ قحط ان برسوں میں پڑے۔ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء - ۱۷۱۸ء، ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء - ۱۸۱۹ء، ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء - ۱۸۲۵ء، ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۱ء - ۱۸۲۳ء، ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء - ۱۸۵۴ء، ۱۲۹۰ھ/۱۸۶۳ء - ۱۸۶۴ء، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء - ۱۸۶۷ء۔
بار بار کے ان قحطوں نے اچھے خاصے بستے ہوئے شہر کی آبادی کم کر کے اسے چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹے سے قصبے میں بدل دیا۔ اس وقت سے آج تک یہ غیر آباد محلات اور تاریخی کھنڈروں کا ایک شہر ہے۔ ۱۹۷۱ء میں بیجاپور شہر کی کل آبادی ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔
بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین فن اور علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے انہوں نے فن تعمیر کو دکن کے دوسرے تمام حکمرانوں سے زیادہ ترقی دی۔ اسی وجہ سے دہلی کے سوا ہندوستان کے تمام دوسرے شہروں کے مقابلے میں بیجاپور کی عمارتیں نہایت عالیشان ہیں۔ بیجاپور کی ان عمارات میں مکہ مسجد، مسجد کریم الدین بہمنی وزیر خواجہ جہاں کی مسجد جامع مسجد یوسفی، مسجد اخلاص خان، گنبد والی مسجد، مسجد سید علی شہید پیر، گگن محل، شاہ درگ، دھارواڑ، شاہ نور اور بانکپور کے قلعے، مقبرہ علی اور جامع مسجد علی، ملکہ جہان کی مسجد، بخاری مسجد، روضہ ابراہیم جو عادل شاہیوں کی سب سے بڑی عمارت ہے آنند محل، آثار محل، انڈا مسجد، مسجد نو گنبد، مہتر محل، مسجد افضل خان، مزار گول گنبد مکہ مسجد وغیرہ ہیں۔

بیدر بھارت کی سابقہ ریاست میسور کا ایک شہر اور ضلع۔ شہر بیدر حیدر آباد سے شمال مغرب میں ۶۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگرچہ تاریخی آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بہت قدیم ہے۔ مسلمانوں کے قبضے سے پہلے بھی یہ شہر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔
اس شہر کے بارے میں تاریخ میں جو بات ملتی ہے یہ ہے کہ اس پر ۱۳۲۲ء میں الغ خان نے قبضہ کیا اور اسے دہلی کی قلمرو میں شامل کر دیا۔ جب محمد بن تغلق شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اسے دکن کی بغاوتوں سے واسطہ پڑا۔ آخر ۱۳۴۶ء میں دکنی سرداروں نے امیر اسماعیل مخ کو اپنا فرمانروا چن لیا۔ اور دولت آباد میں اسے تخت

پر بٹھا دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد امیر صدہ حسن گنگو کو جسے محمد تغلق نے ظفر خان کا خطاب دیا تھا۔ بہمن شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ اور بہمنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں شہاب الدین احمد شاہ اول نے سلطنت بہمنیہ کا پایہ تخت بیدر منتقل کر دیا۔ اور اس کا نام اپنے بیٹے محمد کے نام پر محمد آباد رکھا۔ اگرچہ بیدر صدیوں پرانا شہر تھا مگر بہمنی دور کے ابتدا میں بھی یہ کافی اہمیت رکھتا تھا۔ فوجی اعتبار سے بھی اس کا محل وقوع ہمیشہ اہم رہا ہے۔

اس شہر میں آٹھ بہمنی بادشاہوں نے حکومت کی۔ محمود گاواں نے اسے علماء اور فضلاء کا مرکز بنانے میں بہت زیادہ خدمات انجام دیں۔

۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں جب بہمنی سلطنت تقریباً نا پید ہوگئی تو بیدر میں محمد قاسم برید سلطان محمود شاہ بہمنی پر بہت حد تک حاوی ہو چکا تھا۔ لیکن کسی بھی صوبیدار کو خود مختار ہونے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بعد میں محمد قاسم کے پوتے علی برید نے آخری بہمنی فرمانروا کلیم اللہ کی وفات کے بعد اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور تقریباً ۱۶۱۹ء تک بیدر پر بریدی فرمانروا حکمرانی کرتے رہے۔ ان فرمانرواؤں میں قاسم برید الملک، امیر برید وزیر اعظم اور علی برید شاہ، ابراہیم برید شاہ، قاسم برید شاہ، امیر برید شاہ، مرزا علی برید شاہ، میرزا امیر برید شاہ تھے۔ ۱۶۱۹ء میں ابراہیم عادل شاہ نے بیدر پر قبضہ کر کے اس شہر کو عادل شاہی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح بیدر ۱۶۵۶ء تک سلطنت بیجاپور کا جزو رہا۔ اس کے بعد اس شہر کا سلطنت مغلیہ کے ساتھ الحاق ہوگیا۔ ۱۷۲۴ء میں بیدر آصف جاہی سلطنت کی عملداری میں آگیا۔

یہ شہر دکن کے مختلف تمدنوں کا گہوارہ رہا ہے اور اس میں بہمنیوں، بریدوں، مغلوں اور آصف جاہیوں کے ادوار کی عمارات ملتی ہیں۔

مختلف ادوار میں اس شہر کو مختلف نام دیئے گئے ہیں جو محمد آباد، ظفر آباد، محمد آباد میں بیدر میں آج کل اسے بیدر یا بیدر شریف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ بیدر ضلع ۲۰۰۲ مربع میل پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی آٹھ لاکھ کے قریب تھی۔

بیدل، عبدالقادر

(۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء — ۳ صفر ۱۱۳۳ھ/۵ دسمبر ۱۷۲۰ء) ایک عظیم مفکر، ہند کے نامور شاعر اور عارف کامل۔ اصل وطن توران تھا۔ بعض کے نزدیک ان کی پیدائش پٹنہ میں ہوئی۔ اور بعض نے بخارا میں بتائی ہے۔ والد کا نام میرزا عبدالخالق تھا اور چغتائی قبیلے سے تعلق تھا۔ ان کے والد نے نوعمری ہی سے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ وہ سلسلہ قادریہ کے ایک بزرگ شیخ کمال سے بیعت تھے۔ بیدل کی تعلیم و تربیت میں شیخ کمال کا بھی بڑا حصہ ہے۔ بیدل کے والدین کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا اور ان کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نے کی۔ انہوں نے اپنے ماموں میرزا ظریف سے تفسیر پڑھی۔ ماموں کی وفات کے بعد دہلی چلے آئے اور وہاں مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۰۶۹ھ/۱۶۶۹ء میں شہزادہ اعظم شاہ کی فوج میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن جلد ہی مستعفی ہو گئے۔ شاہ عالم بہادر شاہ اور بادشاہ فرخ سیر نے اپنے عہد میں ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ جب سادات بارہہ نے فرخ سیر کو قتل کرایا تو بیدل نے اس کی تاریخ وفات کہی۔ اس پر سادات آپ سے بھی انتقام لینے کی سوچنے لگے۔ چنانچہ آپ لاہور چلے آئے اور واپس اس وقت آئے، جب سادات بارہہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ دہلی میں وفات پائی۔

بیدل نے تقریباً ایک لاکھ اشعار کہے ہیں۔ انیس قصائد ہیں۔ جن کے اشعار کی تعداد دو ہزار ہے اور وہ تمام کے تمام آنحضورؐ اور حضرت علیؓ کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

میرزا بیدل کے مزاج میں استغنا تھا۔ وہ ایک بلند حوصلہ اور درویش منش انسان تھے۔ انہوں نے بے نیازی کی زندگی بسر کی۔ تصوف کو بہترین لائحہ عمل سمجھتے رہے۔ ان کے تمام فلسفیانہ نظریات کا مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کی عظمت کو ثابت کیا جائے۔ انہیں ذات الٰہی سے بے پناہ محبت تھی اور اس کے بغیر وہ ہر چیز کو بیکار سمجھتے تھے۔ میرزا بیدل کے نزدیک یہ جذبہ محبت ہی انسان کے ارتقائے ذات کا سبب تھا۔ انہوں نے صوفیوں کے احوال و مقامات اور ان کے اخلاق حسنہ کو خوبی کے ساتھ اپنے کلام میں بیان کیا ہے کہ یہ باتیں خود بخود دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ وہ تمام آئمہ تصوف سے متاثر تھے۔ لیکن ان کا علم تصوف زیادہ تر ابن عربی کا مرہون منت ہے۔

بیدو خان

ایران کا چھٹا ایلخانی حکمران، بیرطراغائی کا بیٹا اور ہلاکو خان کا پوتا تھا۔ بیدو خان صفر ۶۹۴ھ اپریل ۱۲۹۵ء میں ایران کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے پیشرو گیخاتو کو ۶۹۴ھ ۱۲۹۵ء میں کلا گھونٹ کر مار دیا گیا اس کے بعد باغیوں نے بیدو خان کو تخت نشینی کی دعوت دی مگر اس کا دوسرا چچیرا بھائی غازان جو ایلخان ارغون کا بیٹا اور گیخاتو کا بھتیجا تھا۔ اس کے مقابلے کیلئے خراسان سے لشکر لے کر اپنے چچا کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں نکل آیا لیکن دونوں میں ایک عارضی سی صلح ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد جب دوبارہ لڑائی شروع ہوئی تو اس کا فیصلہ غازان کے حق میں ہوگیا اور غازان نے نوروز کی تحریک سے جو غازان کا سپہ سالار تھا اسلام قبول کر لیا اور اس طرح اسے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوگئی۔ بیدو خان کے طرفداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور جب وہ بھاگنے کی فکر میں تھا تو اسے قتل کر دیا گیا۔

بیدو خان نے کل سات ماہ حکومت کی۔ بعض کے نزدیک اس نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

بیرامیہ

صوفیاء کا ایک سلسلہ، جس کی بنیاد حاجی بیرم ولی نے آٹھویں صدی ہجری (چودہویں صدی عیسوی) میں رکھی۔

صوفی روایت کے مطابق آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ذکر خفی اور حضرت علیؓ کو ذکر جلی کا حکم دیا تھا۔ بیرامیہ ذکر خفی کو ترجیح دیتے ہیں۔ حاجی بیرام کے انتقال کے بعد ان لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ آق شمس الدین کا پیرو ہے۔ وہ ذکر جلی کو ترجیح دیتا ہے۔ اسے بیرامیہ شمسیہ کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ عمر دوہ کو اپنا پیشوا مانتا ہے اس نے ذکر، ورد وغیرہ سب کچھ ترک کر دیا ہے اور اپنے آپ کو ملامیہ بیرامیہ کہلاتا ہے۔ بعد میں ایک اور گروہ پیدا ہوا جو جلوتیہ کہلاتا ہے۔

اس طریقے میں ابتدا ہی سے وحدت الوجود کے نظریے سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تمام افعال خدا کی طرف سے ہیں۔ نیز یہ افعال صفات کے مظہر ہیں اور صفات روح کے مظاہر ہیں۔ جبکہ وجود صرف ایک ہی ہے۔

یہ لوگ سفید نمدے کی چھ کونوں والی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ اس کا پہننے والا تمام اشیائے موجودہ کی حقیقت سے واقف ہے۔

۱۹۲۵ء میں جب ترکی میں ایسے تمام طریقے اور سلسلے ختم کیے گئے تو اس طریقے کے خاص خاص مراکز استنبول، انقرہ، ازمیدہ اور قسطمونی میں قائم تھے۔

بیرم خان (وفات ۱۴ جمادی الاوّل ۹۶۸ھ / ۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء) مغلیہ دربار کا ایک نہایت ممتاز سردار۔ خانخاناں لقب۔ والد کا نام سیف علی بیگ تھا جو غزنہ کا گورنر تھا۔ اور بابر کی وفات کے بعد اس نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ بیرم خان بدخشاں میں اور بعض کے نزدیک غزنہ میں پیدا ہوا۔ وہ بہارلو قوم کا ترکمان تھا اس کے آباؤاجداد نے خاندان تیموریہ کی بڑی خدمت کی۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد وہ بلخ چلاگیا اور بیرم خان نے بلخ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اور دربار کے آداب سے اچھی طرح واقف تھا۔ سولہ سال کی عمر میں ہمایوں کی ملازمت اختیار کی۔ جب کہ ہمایوں بدخشاں کا گورنر تھا۔ بعد میں وہ ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آیا اور چوسا و قنوج کی لڑائیوں میں شرکت کی۔ ان جنگوں میں ہمایوں نے بری طرح شکست کھائی۔ بیرم خان جان بچاکر میدان سے بھاگ نکلا۔ اس نے کچھ عرصہ گجرات کے بادشاہ سلطان محمود کے ہاں ملازمت کی لیکن ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں رہ جون کے مقام پر ہمایوں سے دوبارہ جاملا۔ اس وقت ہمایوں اپنے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوششیں کررہا تھا۔ بیرم خان نے ہندوستانی مہموں کے دوران میں شاہی افواج کے سپہ سالار کی حیثیت سے ہمایوں کے لیے کئی ایک فتوحات حاصل کیں۔ ان سب سے بڑی فتح ماچھی واڑے کے مقام پر سکندر شاہ سوری کی شکست تھی۔

۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں بیرم خان کو شہزادہ اکبر کا اتالیق مقرر کیا گیا اور خان بابا کا لقب دیا گیا۔ جب اکبر کو پنجاب کا حاکم بنایا گیا تو بیرم خان بھی پنجاب آگیا۔ جب ہمایوں کی اچانک وفات کی اطلاع پنجاب پہنچی تو بیرم خان نے اینٹوں کا عارضی تخت بناکر اکبر کی تاجپوشی کا اعلان کردیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب ہیموں بقال نے جو سوری کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ دہلی پر حملہ کیا تو ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس لڑائی میں بیرم خان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے ہیموں کو قتل کرادیا۔ ہیموں کی شکست کے بعد اکبر کا ہندوستان پر مکمل قبضہ ہوگیا۔ اس وقت بیرم خان اقتدار و اختیار کے انتہائی عروج پر تھا۔ چونکہ اکبر ابھی کم سن تھا اس لیے وہ اکبر کی طرف سے پوری سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔ اسی دوران میں بیرم خان نے سلیمہ سلطان بیگم سے جو اکبر کی پھوپھی زاد بہن تھی شادی کرلی اور اس طرح وہ شاہی خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ اس وجہ سے بیرم خان کی شخصی عظمت اور اقتدار میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

بیرم خان چونکہ اکبر کی تفریحات میں دخل دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ شاہانہ طور اطوار اختیار کرے۔ چنانچہ ان باتوں سے اکبر کی جانب سے اپنے اتالیق کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار ہونا شروع ہوگیا۔ اسی زمانے میں بیرم خان سے ایک غلطی یہ بھی ہوئی کہ اس نے دہلی کے رہنے والے ایک شخص شیخ گدائی کمبوہ کو صدرالصدور مقرر کردیا یہ بات تورانی سرداروں کو بہت ناگوار گذری اور وہ بیرم خان کے خلاف ہوگئے۔ ان تمام باتوں نے اکبر کے خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کردی۔ چنانچہ اکبر اور بیرم کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی اور یہ کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ جب بیرم خان نے اپنے خلاف ہوا کا یہ رُخ دیکھا تو اس نے لڑائی کے ذریعے اس قصے کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ حج کے بہانے سے جالندھر آیا اور جالندھر پر قبضہ جمانا چاہا چنانچہ شاہی فوجوں اور اس کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جس میں بیرم خان کو شکست ہوئی۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اکبر سے معافی چاہے۔ شہنشاہ اکبر نے اسے نہ صرف معافی دے دی بلکہ پچاس ہزار روپیہ سالانہ پنشن بھی مقرر کردی۔ اس کے بعد بیرم خان نے اکبر سے حج کے لیے جانے کی اجازت مانگی۔ اور حج کے ارادے سے گجرات گیا لیکن ایک شخص مبارک خان لوہانی نے جس کے باپ کو بیرم خان نے شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں لڑائی میں قتل کردیا تھا۔ بیرم خان کو قتل کردیا۔ اس کی تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہ کی جاسکی۔ بعد میں بیرم خان کی وصیت کے مطابق اس کی نعش کو مشہد منتقل کردیا گیا اور امام موسیٰ رضا کے روضے کے متصل ایک اونچے گنبد کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

بیرم خاں نے اپنے بعد ایک چار سالہ لڑکا عبدالرحیم خانخاناں چھوڑا۔

بیرم خان علماء کا بڑا قدردان تھا۔ وہ بڑا ذہین عالم، فاضل تھا ترکی اور فارسی زبانوں کا اچھا شاعر تھا۔ اس کے مخالفین بھی اس کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔

بیروت جمہوریہ لبنان کا دارالحکومت اور بڑی بندرگاہ۔ ابتداء میں بیروت راس کے شمالی کنارے پر آباد تھا۔ لیکن اب پوری سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ قدیم ترین شہر ہے۔ زمانہ تاریخ سے قبل بھی یہاں پر انسان آباد ہے۔

تاریخ میں بیروت کا ذکر سب سے پہلے پندرہویں صدی قبل مسیح میں ملتا ہے۔ جب یہاں فرعون مصر توتمس سوم (THUTMOSE III) حکمران تھا چودہویں صدی قبل مسیح میں تل العمارنہ میں جو تختیاں ملی ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا حکمران عمیونرا تھا اور اس شہر کا نام "بردنہ" تھا۔ اس زمانے میں یہاں تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس کے بعد یہ مقام مصر یا عراق سے آنے والی فوجوں کی گذرگاہ رہا۔ تیرہویں صدی قبل مسیح میں اسی راستے سے عمسیس دوم آیا اور ساتویں صدی قبل مسیح میں آشور کے بادشاہ آسارحدون کا بھی اسی راستے سے گذر ہوا۔

۱۴۰ قبل مسیح میں یہ شہر سوریہ کے غاصب ترلفون کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگیا۔ اس کے بعد رومیوں اور اطالویوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہوجانے کی وجہ سے اس بندرگاہ کو بڑی ترقی حاصل ہوئی اور بیروت کی اہمیت مشرق و مغرب کے درمیان ایک رابطے کی ہوگئی۔

۱۴ قبل مسیح میں رومی بادشاہ آگسٹس کے نام پر مارکس اگریپا نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اسے دوبارہ تعمیر کرایا اور ایک رومی نوآبادی کا درجہ دے گیا۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ شہر ایک علمی مرکز بن گیا۔ اور یہاں کی جامعہ قانون کی شہرت سارگی دنیا میں پھیل گئی اس شہر کو ایتھنز، اسکندریہ اور قیساریہ کا ہم پایہ سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ چوتھی صدی عیسوی میں فینیقیہ کے اہم ترین شہروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ جولائی ۵۵۱ء میں بیروت ایک زلزلے اور سیلاب سے تباہ و برباد ہوگیا۔ بعد میں جسٹینین نے اس کے کھنڈرات پر نئے سرے سے عمارات تعمیر کرائیں ۱۴ھ/۶۳۵ء میں جب مسلمان فوجیں حضرت ابوعبیدہؓ کی سرکردگی میں اس شہر میں داخل ہوئیں۔ تو یہ شہر رومی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ نے ایران سے لوگوں کو بلاکر بیروت کے گردونواح میں بسایا۔ ریشم کی صنعت نئے سرے سے ترقی کرگئی۔ اور دوسرے ممالک سے تجارتی رابطہ قائم ہوگیا۔ ۳۶۴ھ/۹۷۵ء میں بیروت کو جان زمسکز نے فتح کرلیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد فاطمیوں نے اس شہر کو واپس لے لیا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان شمالی سمت سے آنے والے صلیبی مجاہدین نے بیروت میں ٹھہر کر رسد فراہم کی۔ اور بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد یہاں سے واپس چلے گئے۔

۵۰۳ھ/۱۱۰۹ء میں بالڈون اوّل نے خشکی اور سمندر دو جانب سے بیروت کی ناکہ بندی کردی اور اسے فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیروت کو دوبارہ فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلی مرتبہ ناکام رہا۔ لیکن دوسری مرتبہ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں بیروت کو فتح کرلیا۔ ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء میں آئی بلیز نے اس کو دوبارہ فتح کرلیا۔ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں الوشجاعی نے دمشق سے آکر بیروت پر قبضہ جمالیا۔ مملوک حکمرانوں کے زمانے میں اس شہر کو صوبہ دمشق کی ایک اہم ولایت سمجھی جاتی تھی۔ مملوکوں نے بیروت کا دفاع مضبوط کیا اور یہاں ایک برج بھی تعمیر کرایا۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں بیروت ایک بار پھر مغربی تاجروں کی منڈی کی حیثیت اختیار کرگیا۔ سولہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں بیروت نے بہت زیادہ ترقی کی۔ ترکوں اور روسیوں کی جنگ کے دوران میں بیروت پر کئی بار بمباری ہوئی۔ کچھ عرصے کے لیے بیروت روسیوں کے قبضے میں رہا۔ اس شہر کی ترقی کا دور ۱۸۶۰ء سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اسے لبنان کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

بیروت کا ایک اور مرکزی چوک

بیروت میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان میں عربوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۹۷۱ء کے مطابق ۷۰۰،۰۰۰ تھی۔ یہاں پر امریکی، فرانسیسی اور لبنانی تین یونیورسٹیاں ہیں اور ہر قوم کے متعدد علمی ادارے ہیں۔ عرب ممالک میں یہ شہر ایک بڑا علمی اور فکری مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تجارتی لحاظ سے اس شہر کو مرکزیت حاصل ہے۔ بیروت کی بندرگاہ شام اور اردن سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں پر ایک بین الاقوامی ہوائی اڈا ہے۔ لیکن گزشتہ چند برسوں میں اسرائیل کی پے درپے مسلح جارحیت نے بیروت کا حسن تباہ کردیا ہے۔

بیستون بہستون، ایک پہاڑ جو بغداد سے ہمدان جانے والی شاہراہ پر کرمان شاہ سے تقریباً تیس کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ مسلمان اسے عجائب عالم میں سے ایک سمجھتے تھے۔ سڑک سے بہت بلندی پر ایک عمودی پہاڑی جس پر دارا اعظم کا مجسمہ اور مشہور کتبہ جس پر تین زبانوں قدیم فارسی اکدی اور عیلامی میں میخی خط کی تحریریں ہیں۔ ابو زید بلخی اور اس کا اتباع کرنے والے مصنفوں کے ہاں ان کتبوں کا ذکر ملتا ہے۔ مجسمے میں ایرانی شہنشاہ اپنے وزیر کے ہمراہ کھڑا ہے اس کا بایاں پاؤں باغی مُغ گومتا کی پیٹھ پر رکھا ہے سامنے نو باغی سردار رسی میں بندھے کھڑے ہیں اوپر خداوند اہورمزدا کی شبیہ کندہ ہے اور بادشاہ دائیں ہاتھ سے اسے سلام کر رہا ہے۔

ابن حوقل دارا اور اس کے قیدیوں کے مجسموں کی عجیب و غریب توجیہ کرتا ہے اور انہیں استاد اور شاگردوں کے مجسمے بتاتا ہے۔ اکثر مسلمان مصنفین کا خیال یہ ہے کہ یہ مجسمے شیریں اور خسرو ثانی کے ہیں۔

بیضاء سفید روشن، چمک دار، عام طور پر یہ لفظ اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے مختلف مقامات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی [illegible] کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

یاقوت نے بیضا نامی سولہ مختلف جگہوں کا ذکر کیا ہے۔ [illegible] میں سب سے اہم ترین مقام ایرانی شہر البیضاء ہے جو فارس کے صوبہ شیراز کے [illegible] اور اصطخر کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا اصلی نام [illegible] تھا۔ چوتھی صدی ہجری دسویں صدی عیسوی میں یہ اصطخر جتنا بڑا تھا۔ بہت سے اہل علم اس شہر کے باشندے [illegible] ہیں۔ ایک اور شہر لیبیا کا سابق دارالحکومت الزاویۃ البیضاء ہے [illegible]

بیضاء، الزاویہ لیبیا کا ایک شہر اور ڈویژن، محمد بن علی السنوسی ادریسی نے جو [illegible] کے سلسلہ سنوسیہ کے بانی ہیں۔ ۱۸۴۲ء میں درنہ کے [illegible] جبل اخضر میں الزاویۃ البیضاء کے نام سے ایک زاویہ قائم کیا جو بعد میں ایک [illegible] بستی بن گیا۔

یہ علاقہ قدیم سرینکا میں واقع ہے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء میں جب [illegible] العرب اور برقہ میں فرانس فزان میں اپنے اختیارات سے دستبردار ہو گئے تو [illegible] حکومت عمل میں آئی۔ ۱۹۶۲ء میں لیبیا کے آئین میں بعض تبدیلیاں کی گئیں [illegible] سے وفاقی حکومت کی جگہ ایک مرکزی حکومت نے لے لی۔ اور اس کا [illegible] قرار دیا گیا اور ڈویژن کی آبادی دو لاکھ کے قریب تھی۔ موجودہ شہر کو [illegible] حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۶۳ء میں شہر کی آبادی پچاس [illegible] تھی۔

بیضاوی (وفات ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء یا ۶۹۲ھ/۱۲۹۳ء) [illegible] بن عمر بن محمد ایک مشہور شافعی عالم دین اور مفسر [illegible] والد فارس کے قاضی القضاۃ تھے۔ آپ نے قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم [illegible] کی۔ شیراز ہی کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ ان کی شہرت ایک [illegible] کی حیثیت سے بھی ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام میں دسترس حاصل تھی۔ ان کی [illegible]

بیضاوی نے تفسیر، قانون، فقہ، علم الکلام اور [illegible] کے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف تفسیر قرآن ہے۔ جو انوار التنزیل و اسرار التاویل کے نام سے لکھی گئی ہے۔ عام طور پر اسے تفسیر بیضاوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تفسیر زمخشری کی "الکشاف" کی تلخیص اور ترمیم شدہ صورت ہے کیونکہ وہ معتزلی خیالات کے مطابق لکھی گئی تھی۔ اہل سنت کے نزدیک یہ بڑے

پائے کی تفسیر ہے اور درسِ نظامی میں شامل ہے۔ بیضاوی کی دوسری تصانیف میں "منہاج الوصول"، "غایۃ القصوٰی لب الالباب فی علم الاعراب"، "مصباح الارواح" اور "نظام التواریخ (فارسی)" اہم ہیں۔

بیع خرید و فروخت، یہ لفظ لغات اضداد میں سے ہے۔ یعنی وہ لفظ جو دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بیع شراء کی ضد ہے لیکن اس کے معنی خریدنا کے بھی ہیں اور فروخت کرنا کے بھی۔

قرآن کریم میں یہ لفظ تقریباً پندرہ جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

شرع کی اصطلاح میں بیع سے مراد یہ ہے کہ فریقین اپنی خوشی سے مال کا تبادلہ مال سے کریں۔

بیع کے دو رکن ہیں۔ ایک ایجاب دوسرا قبول۔ یعنی فریقین میں سے ایک کا یہ کہنا کہ میں یہ چیز اس قیمت میں دینا چاہتا ہوں اور دوسرے کا یہ کہنا کہ مجھے قبول ہے۔

بیع کی چند شرائط ہیں۔

۱۔ فریقین ذی عقل اور نفع و نقصان کو سمجھ سکتے ہوں یعنی ان میں سے کوئی مجنون یا بے شعور بچہ نہ ہو۔

۲۔ بائع و مشتری کم از کم دو ہوں۔ ایک ہی نہ ہو۔

۳۔ قبول ایجاب کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف ہو تو پھر از سر نو ایجاب ہونا چاہیے۔

۴۔ مبادلہ کی دونوں چیزوں میں مالیت ہو۔

۵۔ جس چیز کا سودا ہو رہا ہو وہ موجود ہو معدوم نہ ہو۔

۶۔ وہ چیز فی نفسہٖ مملوک نہ ہو۔

۷۔ بائع کی ملکیت میں ہو۔

۸۔ ایسا مال ہو جو شرعاً قابل قیمت اور سپردگی کے لائق ہو۔

۹۔ فریقین ایک دوسرے کی بات سنتے ہوں۔

۱۰۔ ایجاب و قبول دونوں ایک مجلس میں ہوں۔

۱۱۔ چیز اور اس کی قیمت معلوم ہو۔

۱۲۔ فائدہ متوقع ہو۔

بیع کی اقسام مختلف اعتبارات سے بہت سی ہیں۔ اگر سامان تجارت کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسی بیع کی چار اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ بیع مقایضہ۔ سامان کے بدلے سامان۔

۲۔ بیع صرف۔ نقد کا نقد سے تبادلہ۔

۳۔ بیع سلم۔ جس میں قیمت نقد وصول کر لی جاتی ہے اور جنس بعد میں ادا ہوتی ہے۔

۴۔ بیع مطلق۔ دست بدست قیمت اور مال تجارت کا تبادلہ۔

اس طرح اگر مال تجارت موجود ہو تو وہ بیع حاضر کہلاتی ہے ورنہ بیع غائب۔

قیمت کے لحاظ سے بھی بیع کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ بیع مساومہ۔ جس میں پہلی قیمت کا کوئی لحاظ نہ ہو۔

۲۔ بیع مرابحہ۔ جس میں پہلی قیمت کچھ منافع کے ساتھ ملحوظ ہو۔

۳۔ بیع تولیہ۔ جس میں پہلی قیمت پوری پوری بلا منافع ملحوظ ہو۔

۴۔ بیع وضیعہ۔ جس میں پہلی قیمت بقدرے تخفیف ملحوظ ہو۔

صحت اور عدم صحت کے لحاظ سے بیع کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بیع صحیح۔ ۲۔ بیع باطل۔ ۳۔ بیع مکروہ۔ ۴۔ بیع فاسد۔

بیع کی بہت سی اقسام ایسی ہیں جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں۔ شریعت نے ان میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔ ان بیوع میں سے بعض یہ ہیں۔

بیع الحبل۔ یعنی یہ سودا کرنا کہ فلاں مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے بیچ دیا جائے۔

بیع الحصاۃ۔ کنکری کی بیع مثلاً بائع کہے ان کپڑوں میں سے جس پر میری یہ کنکری جا گرے وہ فروخت کرتا ہوں۔

بیع الملامسہ۔ اندھیرے میں کسی لپٹے ہوئے کپڑے کو ٹٹول کر خرید لینا اس شرط پر کہ پھر واپس نہ کروں گا۔

بیع منابذہ۔ بیچنے والا کسی چیز کو خریدنے والے کی طرف پھینک دے اور سمجھے کہ بیع ہو گئی۔

بیع القاء الحجر۔ مشتری کسی چیز پر کنکر رکھ دے اور اسی سے بیع مکمل سمجھی جائے۔

بیع مزابنہ۔ ان کھجوروں کو جو ابھی درخت پر ہوں کٹی ہوئی کھجوروں کے عوض دینا۔

بیع المنابحۃ۔ کوئی مسودا اس شرط سے طے کرنا کہ اگر یہ سودا ہو جائے تو اس سے پہلے لیا ہوا فلاں قرضہ از خود ختم ہو جائے گا۔

بیع الوفا بیع کی ایک قسم کا نام۔ اسے بیع المعاملہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ قرضدار اپنے قرض خواہ کو کہے یہ چیزیں اپنے قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں بشرطیکہ جب میں قرض ادا کر دوں تو یہ چیز واپس لے لوں گا۔

یہ بیع فاسد ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بیع فی الحقیقت رہن ہے اور بعض اس بیع کو جائز کہتے ہیں۔ (نیز دیکھیے "رہن")

بیعت اطاعت کا عہد۔ مرید بننا۔ بیعت کی اصطلاح بیع سے نکلی ہے جس کے لغوی معنی بیچ دینا کے ہیں۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد کسی پیغمبر، ولی یا صاحب نسبت بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے گناہوں سے تائب ہونا اور اس بزرگ کی اطاعت کا اقرار کرنا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جسے انجام دے کر کوئی شخص یا جماعت کسی دوسرے شخص کے اقتدار کو تسلیم کر لے۔

بیعت کے دو بڑے مقاصد ہوتے ہیں ایک تو اصولاً کسی عقیدے سے وابستگی اور کسی شخص کی تعلیم کو قبول کرنا ہے۔ دوسرے معنی کسی کی حاکمیت کو تسلیم کرنا۔

بیعت کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی قائم شدہ حکومت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی جائے۔

قانونی لحاظ سے بیعت ایک قرارداد اور ایک معاہدہ ہے۔ اس میں ایجاب و قبول اور باہمی رضامندی ضروری ہے۔

بیعت کی اصل یہ ہے کہ آنحضورؐ ہر اس شخص سے جو داخل اسلام ہوتا بیعت لیا کرتے تھے اور اس سے برے اعمال کے ترک کرنے اور اچھے کام کرنے کا عہد لیتے تھے۔

طریقہ بیعت اپنی ظاہری صورت کے ساتھ ایک معنویت بھی رکھتا ہے۔ جسے تصوف کی زبان میں رابطہ یا نسبت کہتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور تک مسلمان خلیفۂ وقت کی بیعت کرتے تھے لیکن جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو بزرگوں نے لوگوں سے احکام خداوندی کی تعمیل کے لئے بیعت لینا شروع کر دی۔ بیعت لینے کا سلسلہ آج بھی صوفیاء میں جاری ہے۔

بیعتِ رضوان ایک ایسا اقرار نامہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ یہ اقرار نامہ صلح حدیبیہ سے کچھ دیر پہلے وقوع پذیر ہوا۔ آنحضورؐ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے ارادے سے آئے تھے اور مکہ سے چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ

کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو اپنا ایلچی بنا کر قریش مکہ کے پاس بھیجا کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کو طواف اور عمرے کی اجازت دی جائے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو کسی بات سے غرض نہ ہوگی۔ اہل قریش نے حضرت عثمانؓ کو کچھ دیر کے لئے روک لیا۔ اسی دوران میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اور ان کے واپس نہ آنے سے مسلمانوں کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا۔ اب چونکہ نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ چکی تھی اور مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا کہ وہ بد عہدوں کے ساتھ جنگ کریں اس لئے آنحضورؐ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اس امر پر بیعت لی۔ چودہ سو مسلمانوں کی تمام جمعیت نے آپؐ کے دست مبارک پر مر مٹنے کی قسم کھائی۔ اس بیعت کو بیعت رضوان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت محض افواہ تھی۔ تو مسلمان ارادہ جنگ سے باز آ گئے۔

قرآن مجید میں اس بیعت کا ذکر یوں آیا ہے۔

اے نبیؐ! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے۔ وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔" (۴۸ : ۱۰)

"اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا۔ جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں کا حال اسے معلوم تھا۔ اس لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی انہیں انعام میں قریبی فتح بخشی"۔ (۴۸ : ۱۸)

بیعت عُقبہ اولیٰ وہ اقرار جو ۱۲ نبوی میں یثرب کے بارہ آدمیوں نے آنحضورؐ کے دست مبارک پر کیا۔ جب مکہ اور طائف کے مشرکین نے آنحضورؐ کو دل برداشتہ کر دیا تو اللہ تعالےٰ نے اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک نیا باب کھول دیا۔ یثرب سے ہر سال لوگ حج کرنے مکہ مکرمہ آتے تھے۔ آنحضورؐ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام پیش کیا۔ مدینہ کے لوگ یہودیوں سے ایک نئے نبی کے آنے کی پیشگوئیاں سنتے رہتے تھے۔ جب آنحضورؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ وہی رسول ہے جس کا ذکر یہودی علماء اکثر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قبیلہ خزرج کے چھ افراد نے ۱۱ نبوی میں اسلام قبول کر لیا اور مدینہ جا کر اسلام کا پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ اگلے سال حج کے موقع پر یثرب کے بارہ افراد مکہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آنحضورؐ کے ہاتھ بیعت کی۔ یہ بیعت چونکہ عقبہ کے مقام پر لی گئی تھی اسلئے اسے بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جن باتوں پر آنحضورؐ سے بیعت کی تھی وہ یہ ہیں۔ ۱۔ ہم خدائے واحد کی عبادت کیا کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ۲۔ ہم چوری اور زنا کاری نہیں کریں گے۔ ۳۔ ہم اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔ ۴۔ ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کیا کریں گے۔ ۵۔ ہم نبی کی اطاعت ہر اچھی بات میں کیا کریں گے۔ ان بارہ افراد کے نام یہ ہیں۔ ابو امامہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، معاذ بن حرث، ذکوان بن عبد قیس، خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابو الہیثمؓ، عویم بن ساعدہ۔ اس کے بعد آنحضورؐ نے مصعب بن عمیر کو مسلمانوں کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے یثرب روانہ کیا۔

بیعت عقبہ ثانیہ وہ بیعت جو عقبہ کے مقام پر ۱۳ نبوی میں اہل یثرب نے آنحضورؐ کے ہاتھ پر کی۔ بیعت عقبہ اولیٰ کے اگلے سال حج کے موقعہ پر مدینہ منورہ سے ۷۵ افراد مکہ آئے اور انہوں نے عقبہ کے مقام پر آنحضورؐ کے ہاتھ بیعت کی۔ اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اسی موقع پر مدینہ کے لوگوں نے آپؐ کو دعوت دی کہ آپؐ اور آپؐ کے رفقاء مدینہ تشریف لے چلیں وہاں اسلام کی تبلیغ کے لئے زیادہ کام ہو سکے گا۔ آنحضورؐ نے آمادگی ظاہر کی۔ حضرت عباسؓ بھی وہاں موجود تھے مگر ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ لوگو تمہیں معلوم ہے کہ قریش مکہ محمدؐ کے جانی دشمن ہیں۔ اگر تم ان سے کوئی عہد باندھنے لگو تو پہلے سمجھ لینا کہ یہ نازک اور مشکل کام ہے محمدؐ سے عہد و پیمان کرنا سرخ اور سیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ ورنہ بہتر ہے کہ کچھ بھی نہ کرو۔"

ان لوگوں نے عباسؓ کو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں آنحضورؐ سے عرض کی کہ کچھ آپؐ ارشاد فرمائیں۔ آپؐ نے انہیں خدا کا کلام پڑھ کر سنایا پھر آپؐ نے فرمایا

۱۔ کیا تم دین حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے؟

۲۔ اور جب میں تمہارے شہر میں جا بسوں کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی مانند کرو گے۔؟"

ان لوگوں نے پوچھا "ایسا کرنے پر ہم کو کیا معاوضہ ملے گا؟"

آنحضورؐ نے فرمایا۔ "بہشت"

انھوں نے دوبارہ عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں یقین دلا دیجیے کہ حضورؐ ہمیں کبھی نہ چھوڑیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں میرا جینا، میرا مرنا تمہارے ساتھ ہو گا۔"

اس آخری فقرے کو سنتے ہی یہ لوگ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ براء بن معرور نے سب سے پہلے بیعت کی۔ یہ بیعت بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت کے بعد آنحضورؐ نے ان میں سے بارہ شخصوں کا انتخاب کیا اور ان کا نام نقیب رکھا اور انہیں اہل یثرب میں تبلیغ اسلام کا حکم دیا۔

بیمارستان ہسپتال۔ جدید محاورے میں اس کا اطلاق بالکل خالصۃً [illegible] عربوں کے قول کے مطابق سب سے پہلے ہسپتال [illegible] کے اساطیری بادشاہ منافیوش نے بالقراط سے رکھی تھی۔ جالینوس [illegible] کی ایجاد بقراط کی طرف منسوب کی ہے۔

ولید بن عبدالملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے عالم اسلام میں سب سے پہلے بیمارستان تعمیر کیا اور اس میں اطباء کو ملازم رکھا۔ [illegible] ہے کہ بیماروں کو باقی آبادی سے علیحدہ رکھنے سے متعلق [illegible] اس خیال کی [illegible] مسلم ہسپانیہ میں قرطبہ کے ایک محلے رَبَض [illegible] سے ہوئی ہے۔

اسلام میں ہسپتالوں کے قیام پر جندیشاپور کے مدرسہ طب اور ہسپتال کا [illegible] پڑا ہے۔ اس ادارے کی بنیاد ساسانیوں نے رکھی تھی۔ جندیشاپور [illegible] اثرات ہارون الرشید کے عہد حکومت میں ظاہر ہوئے جس نے [illegible] بن بختیشوع کے سپرد بغداد میں ایک بیمارستان بنانے کا کام کیا۔ اسی [illegible] ایک ماہر دواساز کو بھی بغداد بلایا گیا۔ بغداد کا ہسپتال [illegible] میں نہر کرخایا پر واقع تھا۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے شروع میں کثرت [illegible] بیمارستان بنائے جانے لگے۔ ان ہسپتالوں کی نگرانی کے لئے وزیر [illegible] نے ابو عثمان سعید بن یعقوب دمشقی کے سپرد کی گئی تھی۔ بعد میں سنان بن ثابت کو بغداد اور دیگر

مقامات کے ہسپتالوں کا منتظم عمومی مقرر کیا گیا۔

اس زمانے کے بیمارستانوں میں ایک بیمار المحرم کے علاقہ حربیہ میں ایک بیمارستان مقتدری باب الشام میں۔ ایک بیمارستان ابن الفرات کے نام سے درب المفضل میں اور اسی طرح مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی ایک بیمارستان السیدہ جو دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ اسی طرح الرّی کا بیمارستان اور بیمارستان عضدی شامل ہیں جس میں ۲۴۔ اطباء تھے۔

ان بیمارستانوں کی آمدنی کا ذریعہ وہ اوقاف تھے جنہیں ارباب اختیار و اہل ثروت اسی مقصد کے لئے قائم کر دیتے تھے۔

مسلمانوں کے دور میں بڑے بڑے بیمارستانوں میں ایک کی بنیاد نورالدین زنگی (۵۴۱ھ/ ۱۱۴۶ء تا ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۵ء) نے دمشق میں رکھی۔ ان ہسپتالوں میں مریضوں کے نام رجسٹروں میں درج کیے جاتے تھے اور وہ اخراجات بھی جو مریضوں کی ادویات اور غذا پر صرف کیے جاتے تھے روزانہ ان رجسٹروں میں درج ہوتے تھے

مصر میں سب سے پہلا بیمارستان احمد بن طولون نے ۲۵۹ھ/ ۸۷۲ء میں بنایا۔

شمالی افریقہ میں ایک پہلا اور بڑا بیمارستان سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے مراکش میں تعمیر کرایا۔ اس سلطان کا دور حکومت ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ ۱۱۹۵ء تھا۔ اس نے بڑے بڑے اطباء کا تقرر کیا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے پاگلوں، کوڑھیوں اور اندھوں کے لیے بھی اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں بیمارستان قائم کیے۔ بعد میں آنے والے مرینی سلطانوں نے بھی ان بیمارستانوں کو نہ صرف قائم رکھا۔ بلکہ ان میں مزید اضافے کئے۔ لیکن بعد میں آنے والے سلاطین نے جب بیمارستانوں پر صرف ہونے والے محاصل کو اپنے تصرف میں لے لیا تو ان کی حالت گرنے لگی۔

کوڑھیوں کو شہر سے باہر ادرہ نام کے خاص محلوں میں رکھا جاتا تھا۔ تونس میں سلطان ابو فارس نے ۸۲۳ھ/ ۱۴۲۰ء میں مفلس مسلمانوں کے لیے ایک ہسپتال کی بنیاد رکھی۔

ترکی میں سب سے پہلا ہسپتال اور مدرسہ ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۶ء میں قیصری کے مقام پر بنایا گیا۔ اس کے بعد سیواس، دیوریری، چانکیری، قسطمونی، قونیہ، توقاد، ارزروم ارزنجان، ماردین اور اماسیہ کے علاقوں میں قائم کیے گئے ان ہسپتالوں میں ہر قسم کے مریضوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ اناطولی میں پہلا ہسپتال ۷۲۶ھ/ ۱۴۰۶ء میں برسہ میں دارالشفائے یلدرم کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ادرنہ میں مراد دوم کے عہد میں ایک کوڑھی خانہ تعمیر ہوا۔ سولہویں صدی عیسوی میں استنبول میں تین بڑے ہسپتال قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ کئی اور بیمارستان مختلف مقامات پر تعمیر کیے گئے۔ جو عثمانی سلطنت کے اہم ترین بیمارستانوں میں سے تھے۔ ترکوں نے دوسرے مقامات کے علاوہ صرف استنبول میں تقریباً ستر بیمارستان قائم کیے تھے۔

بیوہل (۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء - ۱۳۵۱ھ/ ۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء) ایک مشہور مستشرق۔ کوپن ہیگن کے مقام پر پیدا ہوا اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ عربی، صرف و نحو اور تاریخ لغات سامیہ میں تخصص حاصل کیا۔ ۱۸۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اس کے اساتذہ میں پروفیسر فلائشر اور پروفیسر دلتیس جیسے اساتذہ شامل ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کوپن ہیگن کی یونیورسٹی میں عہدنامہ عتیق پڑھانے کے لیے بطور استاد اس کی تقرری ہوئی۔ ۱۸۸۹ء میں اس نے مصر، فلسطین، شام اور ترکی کا سفر اختیار کیا۔ ۱۸۹۰ء میں اسے جرمنی کی لائپزگ یونیورسٹی میں عہدنامہ عتیق کے پروفیسر کی حیثیت سے چنا گیا۔ یہاں کے عرصہ قیام کے دوران میں اس نے قاموس عبری پر استدراکات لکھے۔

۱۸۹۸ء میں اسے کوپن ہیگن یونیورسٹی میں السنۂ سامیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے واپس بلایا گیا۔ یہاں اس نے ڈنمارک کی زبان میں آنحضورؐ کی سیرت پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۹۱۱ء میں اسے کوپن ہیگن یونیورسٹی کے ریکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جہاں اس نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

اس کی اکثر تصانیف یروشلم اور قدیم فلسطین کے جغرافیے کے موضوع پر ہیں اس کے علاوہ مشاہیر اسلام اور اہم مقدس مقامات کے جغرافیائی حالات کے بارے میں کئی ایک مقالات لائڈن کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شائع ہوئے ہیں۔

بیّنہ واضح ثبوت۔ روشن دلیل۔ شہادت، قانونی اصطلاح میں گواہی جو شرعی عدالت مدعی سے طلب کرتی ہے۔ گویا گواہوں کی دلیل اور ان کی شہادت بیّنہ کہلاتی ہے۔ حدیث میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے۔ "مقدمے میں مدعی کا فرض ہے کہ وہ گواہ پیش کرے اور اگر وہ گواہ پیش نہ کرے تو مدعی علیہ سے حلف اٹھوایا جائے۔" (بخاری کتاب الرہن)

زبانی شہادت یا تمسکات وغیرہ سے جس ثبوت کی تحقیق ہو جائے اسے بھی بیّنہ کہا جاتا ہے۔

شریعت میں حجت کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ بیّنہ ۔ ۲۔ اقرار ۔ ۳۔ نکول یعنی جب مدعی بیّنہ پیش نہ کر رہا ہو تو مدعیٰ علیہ کا حلف اٹھانے سے انکار ہو۔ قاضی کا فرض ہوتا ہے کہ بیّنہ کی توثیق کی صورت میں جب کہ دوسری قانونی شرائط بھی پوری ہو رہی ہوں۔ بیّنہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ بعض لوگ اقرار کے مقابلے میں بیّنہ کو زیادہ قوی نہیں سمجھتے۔ لیکن علامہ ابن حزم اس کے مخالف ہیں۔

بیّنہ، سورۃ:۔ قرآن مجید کی ۹۸ ویں سورت (دیکھیے "البیّنہ، سورۃ")

بیوہ وہ عورت جس کا خاوند انتقال کر جائے۔ عورت کو خاوند کے مرجانے پر چار مہینے دس دن تک سوگ منانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس عرصے کو عدت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خاوند کے علاوہ کسی کا سوگ تین دن سے زیادہ نہیں۔ اگر بیوہ حاملہ ہو تو وہ وضع حمل تک عدت گذارے گی۔ اور اس کے بعد اسے حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔

اگر خاوند کی اولاد نہ ہو تو بیوہ کو اپنے خاوند کی جائداد کا چوتھا حصہ ملتا ہے اور اگر خاوند کے اولاد ہو خواہ کسی دوسری بیوی سے ہو تو بیوہ کو آٹھواں حصّہ ملتا ہے۔

بیوہ عورت سے زمانہ عدت میں نکاح کی درخواست بالصراحت کرنا منع ہے (نیز دیکھیے "عدت")

بیوی زوج، بیگم، رفیقۂ حیات، منکوحہ وہ عورت جو کسی مرد کے نکاح میں آجائے عربی میں زوج کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بیوی کو خاوند کے لیے اور خاوند کو بیوی کے لیے لباس کہا گیا ہے۔ (۲: ۱۸۷) یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا۔ بلکہ دونوں کا باہمی تعلق اور اتصال بالکل غیر منفک ہوتا ہے اسی طرح بیوی اور خاوند کا تعلق ہے۔ قرآن میں بہترین بیوی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں
مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں"
آنحضور نے فرمایا "بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔" (مشکوٰۃ کتاب النکاح)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا "جو عورت پانچوں وقت کی نماز پڑھے ماہ رمضان کے روزے رکھے۔ اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھے۔ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اسے اختیار ہے جنت کے جس دروازے سے جانا چاہے چلی جائے۔" (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

ایک حدیث میں عورت کے متعلق فرمایا گیا ہے۔
آنحضورؐ نے فرمایا "عورتوں کے ساتھ بھلائی کیا کرو اس لئے کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں جو ٹیڑھی چیز ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھی چیز اوپر کا حصہ ہے اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو پسلی کو توڑ دے گا اور اپنے حال پر چھوڑ دے گا تو اس کا ٹیڑھا پن دور نہ ہوگا۔ اس لئے عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہی مناسب ہے۔ (مشکوٰۃ : باب النکاح)

ایک اور حدیث میں فرمایا۔
"کامل مومن وہ ہے جس کا خلق اچھا ہو اور تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی سے اچھی طرح پیش آئے۔ (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

ایک مسلمان ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالےٰ ہے۔ "جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔ (۴ : ۳)

آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔
"جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل و انصاف نہ کرے قیامت کے دن وہ اس طرح آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گرا ہوا ہوگا۔" — (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

آنحضورؐ نے جس وقت وفات پائی، اس وقت آپؐ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں۔ اور ان میں سے آٹھ کی باری مقرر تھی (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ بیوہ عورت کے بعد جب کوئی شخص کنواری عورت سے نکاح کرے تو سات روز تک کنواری بیوی کے پاس رہے اور پھر باری مقرر کر دے اور جب کنواری کے بعد کسی بیوہ سے شادی کرے تو تین دن اس کے پاس رہے اور پھر باری مقرر کر دے۔ (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

ایک موقعہ پر آپؐ نے شوہر پر بیوی کے حقوق کے بارے میں فرمایا کہ "جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ۔ جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ اس کے منہ پر نہ مارا کرو اور برا نہ کہو۔ اور علیحدگی اختیار نہ کرو مگر گھر کے اندر" (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا "اپنی بیویوں کو نہ مارا کرو۔" چنانچہ حضرت عمرؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا عورتیں اپنے شوہروں پر غالب ہو گئی ہیں ان کی جرأت و دلیری بڑھ گئی ہے۔ آپؐ نے بیویوں کو مارنے کی اجازت عطا فرما دی۔ اس کے بعد بہت سی عورتیں آنحضورؐ کی بیویوں کے پاس جمع ہوئیں اور اپنے خاوندوں کی شکایتیں کیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا "میری بیویوں کے پاس بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کی شکایت کرنے آئی ہیں تم میں سے وہ شخص اچھا نہیں ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرے۔" (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

یہاں تک کہ خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ "عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔"

بیوی کے لئے خاوند کے انتقال کر جانے پر چار ماہ اور دس دن کا سوگ رکھا گیا ہے۔ اس عرصے میں نہ تو وہ رنگین کپڑا پہنے نہ سرمہ لگائے نہ خوشبو کو چھوئے اور نہ مہندی لگائے۔

آنحضورؐ بیویوں کے بارے میں نہایت عدل سے کام لیتے تھے۔ آپؐ اپنی بیویوں کی باری مقرر فرماتے اور عدل سے کام لیتے اور دعا کیا کرتے۔ "اے اللہ میں نے جو یہ باریاں مقرر کی ہیں یہ میری تقسیم ہے۔ اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں اور جس چیز کا تو مالک ہے میں مالک نہیں۔ اس چیز پر تو مجھ کو ملامت نہ کر۔" (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

بیہقی، ابو الفضل

(وفات صفر ۴۷۰ھ = اگست ۱۰۷۷ء) محمد بن الحسین ... ایرانی مورخ بیہق کی سرزمین کے گاؤں حارث آباد میں جو آج کل خراسان میں ہے، پیدا ہوا۔ نیشاپور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے کچھ عرصے بعد غزنویوں کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ اور زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گذارا۔ ابو الفضل محکمہ مراسلات کے صدر کے تحت کام کرنے والے دبیروں میں سے تھا۔ کبھی کبھار دربار کے اہم خطوط بھی تیار کرنا پڑتے تھے۔ عبدالرشید کے عہد میں وہ محکمہ مراسلات کا مہتمم اعلیٰ ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد معزول کر دیا گیا۔ بعد میں اس الزام میں کہ اس نے بیوی کو مہر ادا نہیں کیا قید کر دیا گیا۔ رہا ہوا تو عبدالرشید کے قتل کے بعد طغرل برار نے اسے بھی دوسرے درباریوں کے ساتھ دوبارہ قید کر دیا۔ اس قید سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس نے دوبارہ کسی سرکاری محکمے میں ملازمت نہیں کی۔ یہاں تک کہ وفات پا[illegible]

فارسی زبان کے مورخ ہونے کی حیثیت سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔ [illegible] نے اپنے دور کے واقعات کو جن کا وہ خود چشم دید گواہ ہے۔ نہایت [illegible] ساتھ لکھا ہے اس کی تحریر میں فصاحت و ادبیت ہے۔

اس کی سب سے اہم تصنیف "جامع التواریخ" ہے جو تیس جلدوں [illegible] ہے۔ اسے لوگوں نے اور کئی نام بھی دیئے ہیں۔ اس کی [illegible] اس کتاب کی ہر جلد کا علیحدہ نام تھا۔ جو کسی نہ کسی غزنوی بادشاہ کے نام کے ساتھ منسوب تھی۔ اس کتاب میں انیس سال کے واقعات قلم بند [illegible] زمانے میں اس کتاب کی پانچ جلدیں محفوظ ہیں اور وہ بھی ناقص [illegible] تک پہنچی ہیں۔ اس کی دوسری تصانیف میں "مقامات ابونصر [illegible]" "زینۃ الکتاب" ہے۔

بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین

(۳۸۴ھ = ۹۹۴ء – ۴۵۸ھ = ۱۰۶۶ء) [illegible] محدث اور شافعی فقیہہ۔ آپ بیہق میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تحصیل علم کی خاطر بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور ایک سو کے قریب شیوخ سے استفادہ کیا۔ حدیث ابوالحسن محمد بن الحسین، الحاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ اور دیگر اساتذہ سے پڑھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد غزنی کے دارالعلوم میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہے۔

عمر کے آخری حصہ میں نیشاپور میں سکونت اختیار کرلی۔ تدریس حدیث اور اپنی کتابوں کی نقل کرانے میں مصروف ہو گئے۔

آپ کے بارے میں ایک بات عام طور پر مشہور ہے کہ ممتاز محدث ہونے کے باوجود آپ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی تالیفات سے واقف نہیں تھے۔

آپ نے نیشاپور میں وفات پائی۔ بعد میں آپ کی میت کو بیہق لایا گیا اور خسروجرد میں دفن کیا گیا۔

آپ ایک زاہد کامل اور قانع بزرگ تھے، حدیث کے ضمنی فنون اور علم رجال سے خوب واقف ہونے کی وجہ سے آپ حدیث پر بحث کرنے میں خوب مہارت رکھتے تھے دوسری قابل قدر کتاب "المبسوط" ہے۔ جس میں آپ نے امام شافعیؒ کے اصول فقہ جمع کئے ہیں۔ اور جو اس قدر جامع ہے کہ بعد میں اس موضوع پر کسی کو قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

آپ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ جن میں کتاب السنن الکبریٰ دس جلدوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ تناسب ترکیب اور عمدگی کے لحاظ سے یہ بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں وہ اکثر احکام کے بارے میں ہیں۔ دوسری تصانیف میں مناقب الشافعی، کتاب الاسماء والصفات، کتاب معرفۃ السنن والآثار اور کتاب المدخل خاص طور پر مشہور ہیں۔

بیہقی، ظہیر الدین ابوالحسن علی بن زید (۴۹۹ھ/۱۱۰۶ء - ۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء) ایک ایرانی مصنف۔ سبزوار میں جو بیہق ضلعے کا انتظامی مرکز تھا پیدا ہوا۔ اس کا خاندان پہلے سے ممتاز اور معزز چلا آرہا تھا۔ جس کے افراد الحاکمی کا لقب اختیار کرتے تھے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم نیشاپور اور مرو میں حاصل کی۔ اور زندگی کا بیشتر حصہ خراسان میں گذارا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے بیہق کا قاضی بھی رہا۔ لیکن جلد ہی اس عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اس نے الجبرا اور علوم نجوم کا مطالعہ بھی کیا۔

وہ ایک کثیر التعداد کتب کا مصنف تھا بقول یاقوت اس نے ستر سے زائد کتب تصنیف کی تھیں۔ اس کی مشہور تصانیف میں تاریخ بیہق، صوان الحکمۃ کا تتمہ (عربی)، جوامع الاحکام (جو فقہی علم نجوم پر فارسی زبان میں ہے) ہیں۔

پ

پاپائیت پوپ کے زیرِ انتظام، پوپ کا طریق کار، پوپ کی حکومت۔ جب قسطنطین اعظم نے عیسائیت کو روما کا سرکاری مذہب قرار دیا تو رومی حکومت مقدس حکومت بن گئی۔ اور کلیسا کا انتظام پانچ پادریوں (پیٹری آرچ) کے ہاتھ میں آگیا۔ جنہیں پوپ کہا گیا۔ مغرب میں روم اور مشرق میں قسطنطنیہ (استنبول) کا پوپ اہم تھے۔ ان کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوگئی تو ۱۰۵۴ء میں دونوں کلیسا الگ ہوگئے۔ مغرب میں رومن کیتھولک اور مشرق میں یونانی کلیسا دو الگ اداروں کی حیثیت سے وجود میں آئے۔

پوپ گریگوری اوّل (۵۴۰ تا ۶۰۴ء) نے رومی کلیسا کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے بعد پاپائی نظام کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ پورا یورپ پوپ کے دائرہ کار میں آگیا اور اسے دینی و دنیاوی امور میں غیر محدود اختیارات حاصل ہوگئے۔ اس کی نافرمانی کو ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا۔ اس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈبلیو ڈی فادر انگھم لکھتا ہے کہ پاپائیت کلیسا پر بری طرح چھائی ہوئی تھی اور سیاست پر جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ دونوں آزادی اور حریت کے جانی دشمن تھے۔ بظاہر دونوں میں زبردست مشابہت تھی۔ عوام کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کے سروں پر مذہبی عہدیداروں کا ایک لمبا سلسلہ مسلط تھا، جو علاقائی اسقف سے لے کر پوپ تک جا پہنچتا تھا۔ پوپ خود کو پطرس کا جانشین اور حضرت عیسیٰ کا نائب کہتا تھا۔ اس کا اقتدار ربانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

پاپائیت کے مظالم کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے پوپ کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ کچھ نے تو مذہبی ٹیکس دینے سے انکار کیا اور تعلیم یافتہ طبقے نے ان کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جن کا مطالعہ پوپ نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ پوپ نے انہیں باغی قرار دے کر انہیں دردناک سزائیں دیں۔ اس سے کلیسا کے خلاف نفرت اور بھی بھڑک اٹھی۔

سب سے زیادہ مخالفت پوپ لوئی دہم کے جاری کردہ معافی ناموں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں ہوئی۔ لوئی سوم ایک عالیشان گرجا بنانا چاہتا تھا جس کے لئے زرِ خطیر کی ضرورت تھی۔ اس رقم کے جمع کرنے کے لئے اس نے معافی ناموں کی فروخت کا طریقہ رائج کیا۔ ان معافی ناموں کو نہ صرف پادری فروخت کرتے تھے بلکہ تاجروں نے باقاعدہ طور پر ان کی ایجنسیاں قائم کر رکھی تھیں۔ گناہوں کے نرخ نامے بھی مقرر تھے۔ مختلف گناہوں کی معافی کے لئے الگ الگ قیمتیں مقرر تھیں۔ مثلاً اسقاطِ حمل کے لئے ۲½ شلنگ، عدالت میں جھوٹی گواہی کے لئے ۵ شلنگ، چوری ۱۲ شلنگ، عصمت دری کرنے پر ۹ شلنگ، زنا اور قتل پر ۷½ شلنگ، لونڈی رکھنے پر ۱۰½ شلنگ۔

معافی نامے میں جو عبارت درج ہوتی تھی، وہ بڑی دلچسپ ہے۔ ان میں لکھا ہوتا تھا:۔

"تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ اپنے مقدس [illegible] آزاد کر دے۔ میں اس کی، اور اس کے بابرکت شاگرد پطرس پولوس [illegible] پوپ کی اس سند کی رو سے، جو انہوں نے مجھے عطا [illegible] ہوں اور سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی [illegible] تمہارے ہر ایک گناہ، عہد شکنی اور زیادتی سے [illegible] شدید کیوں نہ ہوں۔ میں تم سے وہ سزائیں لیتا ہوں [illegible] پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی۔ تاکہ تم جب مرو تو [illegible] اور جنت کی راہیں کشادہ ہوں۔ باپ بیٹے اور روح [illegible]

پاپائیت کی رو سے پادری تمام عمر [illegible] اجازت نہیں ہوتی۔ آج بھی رومن کیتھولک [illegible]

پاپائیت کا خاتمہ کرنے کے لئے جہاں سیاست [illegible] کوششیں کیں، وہاں خود اہلِ مذہب بھی مخالفت پر [illegible] ختم کرنے کے لئے کئی مصلحین میدان میں آئے۔ ان [illegible] چودھویں صدی کے جان ہس اور جان وکلف [illegible] قابلِ ذکر ہیں۔ مارٹن لوتھر ان سب میں نمایاں اور امتیازی حیثیت کا [illegible] ہیں وہ روم گیا اور اس نے پوپ کی زندگی کا مطالعہ قریب سے [illegible] نتیجے پر پہنچا کہ پوپ روحانی قوت کا مالک نہیں۔ چنانچہ [illegible] کی زبردست مخالفت شروع کر دی۔ ۱۵۱۷ء میں اس نے پوپ کے معافی نامے [illegible] کے انتہا پر شدید نکتہ چینی کی۔ ۱۵۲۰ء تک پورا یورپ لوتھر کے خیالات سے واقف ہو چکا تھا۔ اس سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ پاپائیت کے حامیوں نے لوتھر کو [illegible] کے بعد اس نے رہبانیت ترک کر کے شادی کر لی اور اس [illegible]

پروٹسٹنٹ وجود میں آگیا، جو پاپائیت اور رومن کیتھولک کا زبردست مخالف تھا۔

عوام تو پہلے ہی پاپائیت سے نالاں تھے۔ چنانچہ بہت جلد رومن کیتھولک کی جڑیں اکھڑنے لگیں۔ جیسے دیکھتے ہوئے اس فرقے میں بھی اصلاح کی کوششیں کی جانے لگیں۔ نتیجۃً پاپائیت کمزور پڑتی چلی گئی۔

لوتھر کے بعد دیگر مصلحین میں سوئٹزرلینڈ کے ہلڈرچ زونگلی اور فرانس کے جان کالون کا تذکرہ ضروری ہے۔ کالون کے عقائد نے تو انسانی اختیار کو بالکل ختم کر دیا اس کا کلیسا "اصلاح یافتہ" کہلاتا ہے۔ اسی طرح سکاٹ لینڈ اور انگلستان میں بھی اصلاح ترامیم کی بہت سی کوششیں ہوئیں۔ جس سے بہت سے کلیسا وجود میں آئے۔ جن کی وجہ سے عیسائیت میں قدیم پاپائی نظام تقریباً مفلوج ہو کر رہ گیا۔ (نیز دیکھئے پادری، پوپ)

پادری فادر، باپ، بڑا، بزرگ۔ عیسائیوں کا مذہبی پیشوا، کلیسائی نظام میں بشپ کا ماتحت ہوتا ہے۔ اس کے فرائض میں عبادات، انجیل مقدس کی تبلیغ اور مذہبی رسومات کی ادائیگی شامل ہوتی ہے وہ دیگر سماجی تقاریب میں کلیسا کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔ رومن کیتھولک کلیسا میں پادری عمر بھر کنوارا رہتا ہے اس لئے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جبکہ مشرقی کلیسا میں پادری پر شادی لازمی ہوتی ہے۔ لیکن آرتھوڈکس اور قدامت پسند کلیساؤں میں پادری رنڈوا ہونے پر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ (نیز دیکھئے "پاپائیت، پوپ"، "عیسائیت")

پارسی مذہب زرتشت کے قدیم ایرانی پیرو۔ آتش پرست۔ پارسیوں کا اصل مسکن ایران تھا۔ ان کی مذہبی کتاب ژند ہے۔ یہ لوگ ثنویت کے عقیدے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک نیکی اور بدی کے دو علیحدہ خالق ہیں۔ نیکی کے خالق کو وہ یزداں اور بدی کے خالق کو اہرمن کہتے ہیں۔ وہ آگ چاند، سورج اور ستاروں کو یزداں کے مختلف مظاہر قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے عبادتخانوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔

پارسی اپنے مردوں کو نہ تو زمین میں دفناتے ہیں نہ ہی آگ میں جلاتے ہیں بلکہ ایک اونچی عمارت پر رکھ دیتے ہیں۔ جہاں جانور انہیں اپنی خوراک بناتے ہیں دنیا بھر میں پارسیوں کی کل تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔

جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تو پارسیوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا مسلمانوں نے انھیں مجوس کا نام دیا۔

ان میں سے گذشتہ تیرہ صدیوں میں اکثریت نے اسلام کو قبول کر لیا ہے۔ کچھ ہندوستان بھاگ آئے۔ کچھ لوگ اب بھی فارس میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ کراچی، پونا، بمبئی، سورت میں آباد ہو گئے۔ ان کی سب سے زیادہ تعداد سورت میں مقیم ہے یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں آکر سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت ان کے گماشتے دو پارسی ہی تھے۔ اور جب انگریزوں نے ہانگ کانگ شنگھائی اور کینٹن کو اپنے زیر اقتدار کر لیا تو پارسیوں کی ایک بڑی تعداد ان علاقوں میں بحیثیت سوداگر پہنچی اور خوب دولت کمائی۔

پارسی رفاع عامہ کے کاموں پر بہت پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ پاک و ہند میں بھی یہ لوگ امیر کبیر ہیں اور بڑے بڑے کاروبار کے مالک ہیں۔ (نیز دیکھئے "آتش پرستی")

پاسبان اوغلو (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء۔ ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ/۲۷ جنوری ۱۸۰۷ء)

عثمان بن عمر آغا، ودین کا ایک باغی پاشا۔ آبائی وطن بوسنہ (طوزلہ) تھا۔ اس کے دادا پاسبان آغا کو ۱۷۳۹ء میں آسٹریا کے خلاف جنگی خدمات کے صلے میں بلغاریا میں ودین کے پاس دو گاؤں ملے تھے۔ عثمان کا باپ عمر آغا ان کا موروثی زمیندار ہونے کی وجہ سے سرکردہ لوگوں میں سے تھا لیکن اس کی سرکشی کی وجہ سے وہاں کے گورنر نے اسے قتل کرا دیا تھا۔ عثمان اپنی جان بچا کر البانیا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن ۱۷۸۸ء کی لڑائی میں اس نے ایک رضاکار کی حیثیت سے حصہ لیا اور وطن واپس آگیا۔ دوسری بار ودین کی طرف پلٹ آیا جہاں سے اس نے اپنے ساتھیوں کی معیت میں افلاق اور سربیا پر حملے شروع کر دیئے۔ جب سلطان نے اسے اس کی اس حرکت پر سزا دینا چاہی تو اس نے اطاعت کا جوا اپنے سر سے اتار کر پہاڑوں میں پناہ لے لی اور اپنی جماعت کی مدد سے ودین کو فتح کر لیا اور اس صوبے کا حاکم بن بیٹھا۔

۱۷۹۵ء میں اس نے بلغراد کے حاکم پر حملہ کیا۔ کیونکہ یہ سلیم ثالث کی اصلاحات کا حامی تھا۔ باب عالی نے پاسبان اوغلو کے مقابلے کے لئے کئی فوجیں بھیجیں جو ناکام رہیں۔ چنانچہ صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔

باب عالی نے چونکہ ودین کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا اس لئے اس نے ودین کے حاکم کو شہر سے نکال باہر کیا اور مشرق میں بلغاریا کے کئی شہروں پر اس کی فوجیں قابض ہو گئیں لیکن ورنا میں ان فوجوں نے شکست کھائی۔

۱۷۹۸ء میں باب عالی نے حسین پاشا کی زیر قیادت ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج پاسبان اوغلو کے مقابلے کے لئے بھیجی۔ جب یہ فوج شہر کو فتح نہ کر سکی اور اسے کافی نقصان اٹھا کر واپس ہونا پڑا تو باب عالی نے اس شکست اور نپولین کے حملہ مصر سے مجبور ہو کر پاسبان اوغلو سے برائے نام صلح کر لی۔

اگرچہ باب عالی نے پاسبان اوغلو کے تمام پچھلے قصور معاف کر دیئے تھے۔ لیکن اس نے ۱۸۰۳ء میں پھر باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸۰۴ء میں سربیا والوں کی بغاوت کی وجہ سے ترکوں کی توجہ اس کی جانب سے ہٹ گئی۔ ادھر پاسبان اوغلو کو خود اپنے مقبوضہ علاقے کے مغربی حصے میں جنٹزدی کی شورش کو فرو کرنے کے لئے لڑنا پڑا۔ ۱۸۰۶ء میں روسی فوجیں ڈینیوب کے بائیں کنارے پر نمودار ہوئیں تو پاسبان اوغلو نے اپنی خدمات باب عالی کو پیش کیں۔ لیکن جب باب عالی نے اس کی خدمات کو ٹھکرا دیا تو اس نے ارادہ کیا کہ اب وہ روس اور سربیا کے متحدہ حملوں کے خلاف صرف اپنے ملک کی حفاظت کرے گا۔ لیکن اس عرصے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

پاسبان اوغلو ایک قابل اور دور بین شخص تھا۔ چنانچہ ان چیزوں کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کی کمزور حالت نے بھی اس کی قسمت یاوری کی۔

پاسے آچے کے شمالی ساحل پر جو سماٹرا میں واقع ہے ایک ضلع۔ یہ علاقہ مشرق میں دریائے جمبو آچے سے شروع ہو کر مغرب میں دریائے پاسے کے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا ہے۔ پورا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہے ہر ریاست کا ایک سردار ہوتا ہے۔

آچے کا شہر قرون وسطی میں ایک بحری تجارتی راستے پر واقع تھا جو ہندوستان سے چین کو جاتا تھا۔ یہاں اسلام اسی راستے سے ہندوستان سے آیا اور اس نے اس ساحل پر اپنے مضبوط قدم جما لئے۔ یہ جزائر شرق الہند میں اسلام کا پہلا قدم تھا۔ پاسے کسی زمانے میں مشرقی ایشیا کی ایک مشہور مملکت تھی۔ الملک الصالح جس نے ۱۲۹۷ء میں وفات پائی۔

وہ اسلامی سلطنت کا بانی تھا اور اس نے اس ملک میں اسلام پھیلایا۔ اس کی قبر دریائے پاسے کے بائیں کنارے پر سمندر کے قریب ہے۔ اور تقریباً اسی جگہ سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ دوسرا پایۂ تخت سمدرا میں تھا۔ ابن بطوطہ دو مرتبہ ایک بار چین جاتے ہوئے اور پھر واپسی میں یہاں آیا۔ اس زمانے میں پاسے خوش حال ساحلی خطہ تھا۔ یہاں کے بادشاہوں کا طرز زندگی ہندوستان کے بادشاہوں کی طرح تھا۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ اس وقت کا بادشاہ بڑا پرجوش مسلمان تھا۔ اسے علوم کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ساحل کے عقبی علاقے میں کئی فتوحات حاصل کیں۔ پاسے میں لین دین کے لئے سیسے کے سکے اور چین کا خام سونا استعمال ہوتا تھا۔

۱۳۶۵ء سے قبل پاسے کو جاوا کی ہندو سلطنت مجاپائیت کی سیادت تسلیم کرنا پڑی۔ ۱۵۲۱ء میں پرتگالیوں نے پاسے پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اور اسے ایک قلعہ بند بستی بنا دیا۔ لیکن ۱۵۲۴ء میں آچے کے سلطان نے انہیں نکال باہر کیا۔ اس وقت سے یہ علاقہ سلطنت آچے کے تحت ایک صوبے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پاسے کے مسلمان علماء اور مبلغین نے جاوا اور ملایا کے جزائر پر کافی اثر ڈالا۔

یہاں کی پیداوار میں چاول، سیاہ مرچ اور ابریشم کے کیڑے قابل ذکر ہیں۔ پرتگالی سیاہ مرچ کے لئے ہی یہاں آئے تھے۔

پاشا ترکوں کا سب سے بڑا اعزازی لقب۔ یہ لقب صرف فوجیوں کے لئے ہی استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ بعض غیر عسکری اور دیوانی حکام کو بھی اس لقب سے نوازا جاتا تھا۔ یہ لقب سب سے پہلے تیرہویں صدی عیسوی میں استعمال ہوا۔ یہ لفظ عورتوں کے لئے بھی استعمال ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاشا کا لقب تیرہویں صدی کے آخر میں رئیسوں کے خاص خاص افراد کے ناموں کے ساتھ بڑھا دیا گیا۔ ان رئیسوں نے ایشیائے کوچک میں چھوٹی چھوٹی موروثی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔

عثمانیوں میں افراد پاشا کے لقب سے ملقب تھے۔ اس ضمن میں اتنی بات ضرور ہے کہ پاشا کا لقب ابتدا ہی سے ارباب سیاست کو دیا جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد پاشا کا لقب دو منصب داروں یعنی صوبے کے امیر الامراء اور پایۂ تخت کے وزراء کے لئے استعمال ہونے لگا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ پاشا کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ بڑے وزیر پر کیا جانے لگا۔

سلیم پاشا کی سلطنت میں یورپ ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں تھیں۔ یہ ولایتیں ایک سو تریسٹھ علاقوں پر منقسم تھیں۔ جنہیں لوا (صوبہ) کہتے تھے۔ ہر ولایت کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا۔ جسے "سہ اسپ دمہ" نشان عطا ہوتا تھا۔ ایسے پاشا کا منصب ایک وزیر کے منصب کے برابر ہوتا تھا۔ بالعموم پاشاؤں کا تقرر ہر سال ہوتا تھا۔ لیکن اگر کوئی پاشا اتنا طاقتور ہوتا کہ اسے برطرف کرنے میں باب عالی کو بغاوت کا اندیشہ ہوتا یا وہ دیوان عالی کے بعض وزراء کو اپنا طرفدار بنائے رکھتا تو ایک ہی شخص کئی کئی سال تک بلکہ کبھی عمر بھر تک اپنے عہدے پر مامور رہتا۔ انتظام کے سلسلے میں پاشا کی مدد کے لئے باب عالی کی طرف سے دو یا تین آدمی مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ اعیان کہلاتے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے پر مناصب کی یہ ترتیب ختم کر دی گئی اور جمہوریہ ترکیہ نے پاشا کا لقب صرف اہل فوج کے لئے رہنے دیا۔ لیکن ۱۹۳۴ء سے فوج میں بھی پاشا کی جگہ جنرل نے لے لی۔

پاکپتن پاکستان میں ضلع ساہی وال کا مشہور قصبہ اور تحصیل سابق نام اجودھن ہے۔ جو دریائے ستلج کے دائیں کنارے سے آٹھ میل دور واقع ہے۔ اس مقام کو بابا فرید گنج شکر کی نسبت سے خاص شہرت حاصل ہے۔ بابا فرید گنج شکر اپنی وفات تک اسی جگہ سکونت پذیر رہے اور یہیں ان کی تبلیغ کی وجہ سے پنجاب کے بڑے بڑے قبیلے جن میں سیال، راجپوت دلو وغیرہ شامل ہیں اسلام لائے ان کے مزار پر لوگ دور دراز سے زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اس قصبے کو زمانہ قدیم سے تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پہلے اس کا نام اجودھن تھا۔ اور چالوکیا خاندان کے راجاؤں کا دارالحکومت رہا۔ شہنشاہ اکبر نے بابا فرید گنج شکر کے مزار کی وجہ سے اسے پاک پتن کا نام دیا۔

۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ملتان فتح کیا تو پاک پتن پر بھی لشکر کشی کی۔ ایک زمانے میں پاک پتن کی حیثیت ایک تجارتی منڈی کی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں یہاں پر میونسپلٹی قائم کی گئی تھی۔ یہاں کی لاکھ بنانے کی صنعت بہت مشہور رہی ہے۔ عمدہ کپڑا بننے کا مرکز ہے۔ یہاں کی لنگیاں، کھیس وغیرہ مشہور ہیں۔ پاکپتن شہر کی آبادی بہشتی مزار کے قریب ہے۔

پاکدامن بیبیاں باکمال عابد و زاہد بیبیاں، جن کی تعداد چھ بتائی جاتی ہے لیکن ان میں سے دو خاص طور پر افسانوی حیثیت سے مشہور ہیں۔ "تحقیقات چشتی" میں ان بیبیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ چھ بیبیاں جن میں ایک بی بی حاج حضرت علیؓ کی بیٹی تھی اور پانچ بیبیاں حضرت علیؓ کے بھائی حضرت عقیل کی صاحبزادیاں تھیں۔ واقعہ کربلا کے بعد اپنی جان بچا کر لاہور آگئیں تھیں۔ لاہور میں اس زمانے میں ہندو راجگان کی حکومت تھی اس لئے وہ ان کے خوف سے دعا کر کے زمین میں سما گئیں۔ بعد میں اس کے بارے میں تفصیلی حالات سے ظاہر ہوا ہے کہ ان بیبیوں کے نام تاج، حاج، حور، نور، گوہر اور شہباز تھے اور ان میں نہ کوئی حضرت علی کی صاحبزادی تھی اور نہ حضرت عقیل کی۔

"تاریخ جلیلہ" میں تحقیقات چشتی کی اس تحقیق پر بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ جب لاہور میں کوئی مسلمان ہی نہ تھا تو ان بیبیوں کو اس کا رخ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسرے یہ عورتیں تنہائی اور بے کسی کے عالم میں اتنی دور سے یہاں کس طرح پہنچ گئیں۔ جبکہ لاہور کی نسبت کوفہ، شام یا حرمین الشریفین میں جا کر زیادہ محفوظ رہ سکتی تھیں اور وہاں کے لوگ ان کی زبان بھی سمجھتے تھے۔

ان بیبیوں کے بارے میں دوسری روایت یہ ہے جو صاحب حدیقۃ الاولیاء نے "تذکرہ حمیدیہ" کے حوالے سے بیان کی ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک عابد و زاہد بزرگ سید احمد توختہ لاہور میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ ان کی چھ بیٹیاں تھیں۔ بی بی حاج، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی حور، بی بی گوہر اور بی بی شہباز یہ سب بیبیاں بڑی عابد و زاہد تھیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد فصیل سے گھرے ہوئے لاہور کو چھوڑ کر اس علاقے میں قیام پذیر ہو گئیں جہاں اب یہ قبرستان واقع ہے۔

صاحب حدیقۃ الاولیاء اور صاحب تاریخ جلیلہ اس بات پر متفق ہیں کہ بی بی تاج اور حاج کا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ حضرت علی اور حضرت عقیل کی صاحبزادیاں ہیں۔ لیکن وہ لاہور کی اس عام روایت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ بیبیاں دشمنوں کے خوف سے اپنی عزت و عصمت کو بچانے

کے لیے زمین میں زندہ سما گئیں۔ عوام میں یہی روایت مشہور ہے۔
بابا خاکی کی اولاد ان خواتین کے مزاروں کی مجاور رہی ہے ان مزاروں کے ساتھ سلاطین وقت نے کچھ اراضی بھی وقف کر دی تھی۔ یہ مزار گڑھی شاہو لاہور میں ایک قدیم ترین قبرستان میں موجود ہیں۔ یہ قبرستان بی بی پاکدامناں کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس قبرستان کا آغاز کس زمانے سے ہوا۔

پاکستان دنیا کا واحد اسلامی ملک، جو اسلام کے نام پر سرزمین ہندوستان میں قائم ہوا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تحریک آزادی کی ایک طویل کش مکش کے بعد معرض وجود میں آیا۔ قیام کے وقت اس کے دو حصے مشرقی اور مغربی پاکستان تھے مشرقی پاکستان سابق مشرقی بنگال تھا، جس کے شمال مشرق اور مغرب میں بھارت، جنوب مشرق میں برما اور جنوب میں خلیج بنگال واقع ہے۔ مغربی پاکستان سابق صوبہ جات، پنجاب، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور کشمیر پر مشتمل تھا۔ اس کے شمال میں چین، مشرق میں بھارت، جنوب میں بحیرہ عرب، مغرب میں ایران اور شمال مغرب میں افغانستان اور روس آباد ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے ایک الگ ملک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اور مغربی پاکستان ہی موجودہ پاکستان ہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر واحد صوبہ مغربی پاکستان بنا دیا گیا۔ جسے یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو توڑ کر پھر سے چار صوبے بنا دیے گئے اب پنجاب میں سابقہ ریاست بہاولپور، سندھ میں کراچی اور لسبیلہ کے اضلاع اور سرحد میں تمام شمالی ریاستیں شامل کر دی گئی ہیں بلوچستان کو باقاعدہ صوبہ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ کشمیر ابھی تک بھارت کے قبضے میں ہے۔ صرف ایک "نہال" علاقہ آزاد ہے، جو آزاد کشمیر کے نام سے نیم خود مختار حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان ایک اسلامی وفاقی جمہوری پارلیمانی مملکت ہے۔ اس کا کل رقبہ [illegible] مربع میل ([illegible] مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۸۱ء میں [illegible] ہے۔ (اس میں جموں، کشمیر، گلگت، بلتستان، جوناگڑھ، مناودر اور سابق مشرقی پاکستان کی آبادی شامل نہیں) آبادی کا [illegible] فیصد مسلمان ہیں۔ [illegible] فیصد ہندو، [illegible] فیصد نچلی ذاتیں، [illegible] فیصد عیسائی اور [illegible] فیصد بدھ ہیں۔

اپنے محل وقوع کے لحاظ سے پاکستان تمام عالم اسلام کی امیدوں کا مرکز ہے۔ یہ بری، بحری اور فضائی راستوں کے ذریعے تمام اسلامی ممالک سے ملا ہوا ہے
سطح کے لحاظ سے پاکستان تین بڑے طبعی خطوں، پہاڑی، میدانی اور سطح مرتفع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑی علاقہ پاکستان کے شمال اور مغرب میں واقع ہے۔ شمال کی طرف ہمالیہ کے سلسلے واقع ہیں کشمیر، گلگت، چترال، ہنزہ، کاغان اور سوات کی خوبصورت وادیاں اسی خطے میں موجود ہیں۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے۔ ٹو اسی علاقے میں واقع ہے۔ بلند پہاڑ سارا سارا سال برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ جن سے نکلنے والے دریا کبھی خشک نہیں ہوتے۔ مغربی پہاڑی سلسلوں میں سرحد اور بلوچستان کے سلسلے کوہ سفید، کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر واقع ہیں۔ بارش کی کمی کے باعث یہ پہاڑ بنجر اور بے آب و گیاہ ہیں میدانی علاقہ پاکستان کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس میں صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ کے علاقے آتے ہیں۔ اس علاقے میں سندھ، جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس جیسے دریا بہتے ہیں۔ یہ انتہائی زرخیز علاقہ ہے۔ بندوں اور نہروں کا جال بچھا ہوا ہے، جو دنیا بھر میں آب پاشی کا بہترین نظام ہے۔ بہاولپور کے علاقے میں کہیں کہیں ریگستان واقع ہیں، جو سندھ کے زیریں علاقوں میں جا کر بڑی وسعت اختیار کر جاتے ہیں۔ تاہم نہروں کے ذریعے ان علاقوں کو زرخیز بنایا جا رہا ہے۔ سطح مرتفع کوہستان نمک کے شمال میں پوٹھوہار اور کوہ سلیمان کے مغرب میں بلوچستان میں واقع ہے۔ پوٹھوہار کا علاقہ راولپنڈی، جہلم اور کیمبلپور کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ بارانی ہے۔ یہاں مٹی کا تیل، کوئلہ اور دیگر ایسی معدنیات ملتی ہیں۔ بلوچستان کی سطح مرتفع سخت اور خشک پہاڑی ہے۔ اس کے عین وسط میں نمکین جھیل ہے۔ سارا علاقہ بنجر ہے
پشاور سے بنگال کے علاقے کو زیر نگیں کر لیا۔
اس کے بعد قطب الدین ایبک نے خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی، جو تقریباً اسی سال
چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں محمد غوری کی قیادت میں ترکوں اور افغانوں نے مغربی سرحدوں پر حملہ شروع کیا اور تیرہویں صدی کے آغاز میں تک قائم رہی۔

ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے شروع میں سلطان ایبک کے زمانے میں محمد بن بختیار خلجی نے بنگال کو فتح کیا خاندان غلاماں کے بعد خلجی آئے اور ان کے بعد تغلق برسر اقتدار آئے۔ اس خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق تھا۔ جس نے بنگال پر چڑھائی اور مشرقی صوبوں کو از سر نو سلطنت میں شامل کیا۔ سادات خاندان اور پھر ایک مستقل اور مضبوط حکومت مغلیہ خاندان نے قائم کی۔ بابر اس خاندان کا بانی تھا اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ لیکن وہ سارا عرصہ اپنے بھائیوں سے لڑتا اور ان کی بغاوتیں فرو کرتا رہا۔ اس عرصے میں شیر شاہ سوری نے جو افغان تھا، حکومت حاصل کر لی اور ہمایوں کو ہندوستان سے نکال دیا۔ یہ اچھا مسلمان بادشاہ تھا لیکن پانچ سال کی قلیل مدت حکومت کی اور اس مختصر عرصے میں سارا شمالی ہندوستان زیر نگیں کر لیا۔ اس کے بعد اس کے فرمانروا بہتر ثابت نہ ہوئے۔ اس دوران میں ہمایوں نے صفیوں کی مدد سے جو ایران پر حکمران تھے، حکومت حاصل کی۔ اس کے بعد اکبر کم سنی میں ملک کا فرمانروا بنا۔ اس نے ایک عجیب و غریب دین نکال کھڑا کیا۔ اور اسے دین الٰہی کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے اس الحاد کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی نے بڑی کوششیں کیں۔ جہانگیر کی پالیسیاں بدل گئیں۔ اس تحریک کا اثر شاہجہان پر بہت پڑا۔ اس نے اسلامی پالیسیاں بنائیں اس کا اثر اپنی پوری آب و تاب سے اورنگ زیب پر پڑا۔ جس نے اسلامی شریعت کے قوانین نافذ کیے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس تحریک کا آخری امین دکن کا حکمران ٹیپو سلطان تھا۔

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی آبادی ہزاروں میں (۱۹۷۲ء)

شہر	آبادی	شہر	آبادی
اسلام آباد	۷۷	قصور	۱۰۳
بہاولپور	۱۳۴	کراچی	۳۴۶۹
پشاور	۲۷۳	کوئٹہ	۱۵۶
جھنگ	۱۳۶	گجرات	۱۰۰
حیدرآباد	۶۲۴	گوجرانوالہ	۳۶۶
راولپنڈی	۶۱۵	لاہور	۲۱۴۸
ساہیوال	۱۱۵	لائلپور	۸۲۰
سرگودھا	۲۰۳	مردان	۱۰۹
سکھر	۱۵۹	ملتان	۵۴۴
سیالکوٹ	۲۱۲	واہ	۱۰۹

برصغیر - تقسیم سے پہلے

برطانوی ہندوستان کے صوبے
ہندوستانی ریاستیں

میلوں کا پیمانہ

برصغیر - تقسیم کے بعد

ہندوستان
پاکستان

حیدرآباد جموں و کشمیر ریاست

میلوں کا پیمانہ

اورنگ زیب نے پورے ہندوستان پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ لیکن اس کے آنکھیں بند کرنے کے بعد ہی اس کے جانشین اتنی بڑی سلطنت کو نہ سنبھال سکے۔ ایرانی حکمران نادر شاہ نے حملہ کر کے مغلوں کی صدیوں کی اکٹھی کی ہوئی دولت اور ان کے وقار کو نقصان پہنچایا اور اس تہذیب کو خاک میں ملا دیا۔ یہ تو ایک سیاسی کمزوری تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں اخلاقی اور معاشی کمزوری روز بروز آتی چلی گئی اور بالآخر یہ قوم غلامی کی پستی میں جا گری۔

ایک غیر قوم انگریز نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور ہندوستان کو اپنی تجارتی منڈی بنائے رکھا۔ یہاں سے ساری دولت سمیٹ سمیٹ کر انگلستان لے جانا شروع کر دیا اور ہندوستان جو سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور تھا۔ آن کی آن میں خاک میں مل گیا۔ اب یہاں پر مسلمانوں کی سیاسی اخلاقی مذہبی اور معاشرتی حالت رو بہ زوال ہو چکی تھی۔ اس زوال کو اور مسلمانوں کی اس کمزوری کو محسوس کرنے والے بزرگ اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کی اور مغلوں کی ختم ہونے والی حالت کو سنبھالا دینے کی پوری کوشش کی۔

[illegible] انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے وہ پورے ہندوستان [illegible] ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ کے بعد اس تحریک کو شاہ اسماعیل شہید [illegible] سنبھالا [illegible] میں انگریزوں کے خلاف آزادی [illegible] ایک [illegible] جس نے غیر ملکی تسلط کے خلاف آواز بلند کی [illegible] مسلمانوں کو [illegible] سمجھتے تھے کیونکہ انہوں [illegible] کے بعد انہوں نے مسلمانوں [illegible] اداروں کو بند کر دیا۔ [illegible] مسلمانوں سے چھین کر ہندوؤں کو دے دیئے گئے [illegible] اور معاشرے سے [illegible] پیدا ہو چکی تھی۔ ان [illegible] مسلمانوں کی حالت [illegible] سنبھالنے کی [illegible] سرسید کے ساتھ ساتھ دیگر علماء کی بھی کوششیں [illegible] انہوں نے مسلمانوں کے [illegible] کے بعد تحریک شروع کی۔ اگرچہ علیگڑھ کوئی سیاسی [illegible] اس نے سیاسی رنگ بھی اختیار کر لیا۔ سرسید کا خیال [illegible] نہیں [illegible] انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں [illegible] آراستہ کیا جائے تاکہ جدید و قدیم دونوں علوم سے [illegible] انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط کو اپنی گردن سے اتار پھینکنے کے [illegible] ایک فلسفہ ہے کہ جب کوئی قوم رو بہ تنزل ہو تو یا تو وہ قوم بالکل [illegible] سنبھلنے کی کوشش کرتی ہے اور اگر وہ وہی حربے استعمال [illegible] کی وجہ سے انہوں نے اپنے حریف سے شکست کھائی ہو تو وہ قوم [illegible] دشمن کے مقابل کھڑی ہو سکتی ہے اور دشمن کے تسلط سے چھٹکارا پا سکتی ہے۔

[illegible] انگریز [illegible] ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی ابتدا [illegible] مسلمان اور پارسی [illegible] بھی اس میں شامل تھے۔ لیکن مسلمانوں کے رہنما سرسید [illegible] کے ساتھیوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ دغا کریں گے اور سیاسی حقوق کے مطالبے میں یہ ہندو مسلم اشتراک مفید ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے جو بھی حقوق اور فوائد حاصل ہوں گے۔ ان پر ہندو اپنی کثرت تعداد، بہتر تعلیم اور قومی تنظیم کے باعث قابض ہو جائیں گے۔ ان وجوہات کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی ترجمانی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کرتی رہی۔

بنگال میں مسلمانوں پر ہندو قابض تھے اور ان کا معاشی طور پر پورا پورا قبضہ تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس پر ہندوؤں نے مظاہرہ کیا۔ تقسیم بنگال سے ہندوؤں کو نئے صوبے میں اپنی برتری اور اجارہ داری ہاتھ سے نکلتی نظر آئی تو انہوں نے اسے اپنے قومی اتحاد پر ضرب کاری قرار دیتے ہوئے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف ایک ہندوستان گیر تحریک چلا دی۔ کانگرس نے جگہ جگہ احتجاجی جلسے کئے اور بنگالی ہندو تشدد اور دہشت پسندی پر اتر آئے۔ انہوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا۔ ایک طرف تو وہ انگریز افسروں کو گولی کا نشانہ بنانے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں کے تعلقات بگڑنے لگے۔ مسلمانوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو قدرے نفع پہنچ رہا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سرسید کا خیال ٹھیک تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور اگر کچھ دور چلیں گے بھی تو عین وقت پر ہندو مسلمانوں کو دھوکہ دیں گے۔

چنانچہ ۱۹۰۶ء میں سر آغا خان کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد شملے میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا۔ اور اپنے سیاسی مطالبات پیش کئے۔ انہوں نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے طریق انتخاب جداگانہ ہونا چاہئیں۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا۔

اسی سال نواب وقار الملک نے نواب آف ڈھاکہ کے ساتھ مل کر ملک کے بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بلایا اور ڈھاکہ میں مسلمانان ہند کے حقوق کی حفاظت کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

اس طرح ۱۸۵۷ء میں مستقل اسلامی حکومت کی بحالی کا جو خواب پریشان ہوا تھا اس کی تعمیر نو کا واضح آغاز ہو گیا۔ اس وقت مسلم لیگ میں زیادہ تعداد اعتدال پسند مسلمانوں کی تھی۔ اور ان کی کوششیں اس امر پر مرکوز تھیں کہ برادران وطن سے ایسا سمجھوتا ہو جائے جو مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کے تحفظ پر مبنی ہو تاکہ سب متحد ہو کر آزادی ملک کے لیے جدوجہد کر سکیں۔

منٹو مارلے سکیم میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملنے کے باعث ہندو بہت برافروختہ تھے۔ ۱۹۱۰ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا تو باہمی کشیدگی دور کرنے کے لیے ہندو مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں قومیں ایک مطمع نظر پر متحد ہو جائیں۔ یہ کانفرنس ہندو لیڈروں کی ضد کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔

مسلمان اب حوصلہ مندی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس لکھنؤ میں بلایا گیا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی دعوت دی گئی۔ اس کے بعد محمد علی جناح جلد ہی مسلم لیگ کے صف اول کے رہنما بن گئے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے نام سے ایک معاہدہ عمل میں آیا اور کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک عدم تعاون ناکام ہو گئی۔ محمد علی جناح نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۲۰ء میں آئینی حقوق کی آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں مسلمانوں نے بڑی شاندار قربانیاں دیں۔ یہ سب قربانیاں دراصل ہندوستان کی آزادی، اسلامی سلطنتوں کی بقا اور اپنی قومی حیثیت کے تحفظ کے لئے تھیں۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں قائد اعظم

کی زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ جس میں مسلم لیگ کے رہنماؤں کا اختلاف دور ہو گیا۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے مستقبل کے ہندوستان میں مسلم انفرادیت کے تحفظ کے لیے وہ تجویز پیش کی جو چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئی۔

اور جسے آزادی کے حصول تک مسلمانوں کے قومی مطالبات کی حیثیت حاصل رہی۔ اس میں ملک کے لیے وفاقی دستور، صوبوں کی کامل خودمختاری، صوبائی مجالس قانون ساز میں اقلیتوں کی کافی اور مؤثر نیابت اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی جائز نیابت کے تحفظ، مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، ہر صوبے کی کابینہ وزارت میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات کے نفاذ، سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی، سرکاری ملازمتوں اور ذمے دار عہدوں پر تقرر کے وقت مسلمانوں کے مناسب حصے کا لحاظ تمام ملتوں کے لیے ضمیر و مذہب کی آزادی اور اسلامی تہذیب و تمدن اور تعلیم و زبان وغیرہ کی حفاظت و ترقی کا مطالبہ کیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ الٰہ آباد میں ہوا۔ علامہ اقبال نے خطبہ صدارت دیا۔ جس میں علامہ نے فرمایا "میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں مدغم دیکھ رہا ہوں۔ خواہ وہ حکومت برطانیہ کے اندر رہے یا آزاد" اس کے بعد ۱۹۳۱ء - ۱۹۳۲ء میں دو گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ جن میں قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر نے شرکت کی۔

۱۹۳۷ء میں کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تاہم دونوں جماعتیں نئے دستور کو غیر اطمینان بخش اور ناقابل قبول ٹھہراتی رہیں۔ مسلم لیگ نے اپنا نصب العین یہ متعین کیا کہ موجودہ صوبائی حق خود اختیاری اور وفاقی نظام کو بدل کر جمہوری حکومت خود اختیاری قائم کی جائے۔ اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعے وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسری طرف کانگرس نے یہ طے کیا کہ دستور جدید کے ماتحت انتخاب [illegible] بلکہ [illegible] پہنچ کر اس کے نفاذ کو بے اثر بنا دیا جائے۔

انتخابات میں ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں کانگرس کو [illegible] ان میں کسی دوسری جماعت کی مدد کے بغیر وزارتیں بن سکتی تھیں [illegible] کانگرسی رہنماؤں نے حکومت سے اس امر کی یقین دہانی [illegible]

پاکستان
انتظامی تقسیم

صوبائی حدود
حد ڈویژن
حد ضلع
وفاقی دار الحکومت
صدر مقام ڈویژن
صدر مقام ضلع
دریا

کے تحفظ کے لیے گورنروں کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ برتے نہیں جائیں گے شروع میں یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور ان صوبوں میں عارضی طور پر غیر کانگرسی حکومتیں قائم کر دی گئیں۔ لیکن جلد ہی اس اندیشے کے پیش نظر کہیں کانگرس کے عدم تعاون سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو جائے۔ بنگال اور پنجاب کے سوا تمام صوبوں کانگرسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں صوبائی نوعیت کی مضبوط اور منظم جماعتوں میں مسلم لیگ کے امیدوار بھاری تعداد میں کامیاب ہوئے اور دستور کے مطابق وزارتوں میں اہم اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنا لازم تھا لیکن کانگرس نے اس معاملے میں مسلم لیگ کو بالکل قطعاً نظر انداز کر دیا یا اس قسم کی ناقابل عمل شرائط پیش کیں جن سے اسمبلی میں مسلم لیگ کا وجود ہی ختم ہو جاتا تھا۔ لہذا مسلم لیگ نے اکثر صوبائی مجالس میں حزب اختلاف کی نشستیں سنبھال لیں۔ اس زمانے میں نہرو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ا۔ کانگرس۔ ۲۔ حکومت برطانیہ ہیں۔
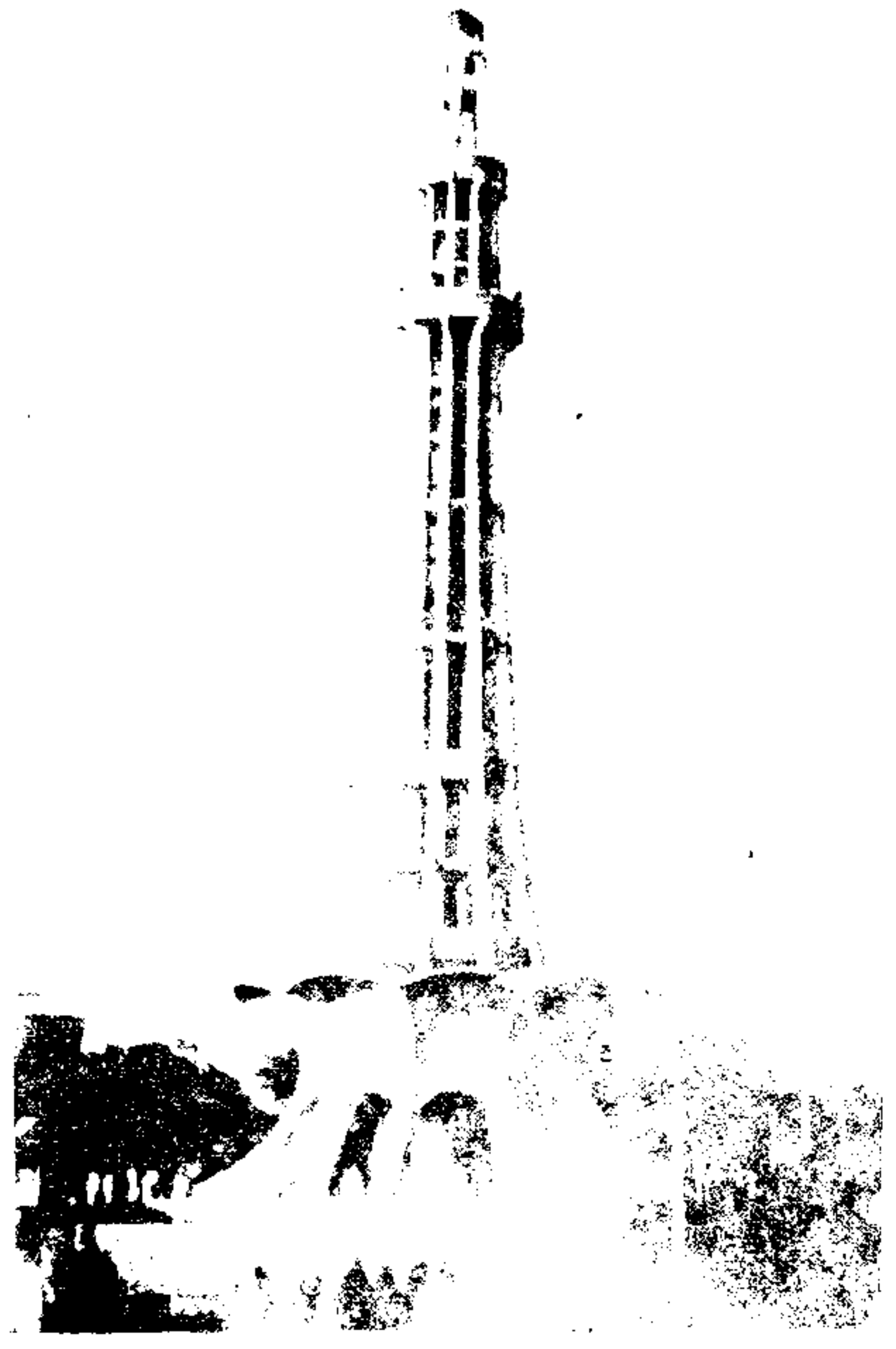
مینار پاکستان بیادگار ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

۔ اس طرح اس نے نہ صرف مسلم لیگ بلکہ مسلمانان ہند کے جداگانہ قومی وجود سے ہی انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے جواب دیا "کہ نہیں، تیسری پارٹی مسلمان اور مسلم لیگ ہے۔" اور کانگرس کو یوپی میں مسلمانوں کی پانچ نشستوں پر ہونے والے ضمنی انتخابات میں مقابلہ کرنے کا چیلنج دیا۔ کانگرسی وزارتیں قائم ہوتے ہی پھر تلخی شروع ہو گئی اور یہاں تک مسلمانوں کے خلاف کانگرسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگرس کے جھنڈے لہرائے۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا۔ تعلیم کے میدان میں واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم نافذ کرنے کی کوشش کی اردو کو ہر شعبے سے بے دخل کیا جانے لگا۔ الغرض ہمیں نے بڑے اہتمام سے مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور انہیں اس ملک میں

اکثریت کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ اس طرز عمل کا جواب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو نہایت تیزی اور سرگرمی سے منظم کیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے تنظیم کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا۔ ادھر علامہ اقبال نے قائداعظم پر یہ زور دیا کہ وہ مسلمانوں کو دین کی خاطر جمع کریں۔ مسلمان سیاست کی بناء پر جمع نہیں ہوں گے اس وقت سے قائداعظم نے دین کو سامنے رکھا۔ قائداعظم نے اپنے نظریات بدل دیئے اور انہوں نے دین کے نام سے کام شروع کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ کانگرس نے حکومت برطانیہ سے مقاصد جنگ کی وضاحت چاہی اور اس شرط پر اپنی حمایت کا یقین دلایا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ مسلم لیگ نے ایک طویل قرارداد میں اعلان کیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی شکایات کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرے مسلم لیگ اس وقت تک جنگ میں حکومت برطانیہ کی حمایت نہیں کر سکتی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا جس میں بتایا گیا کہ اختتام جنگ پر ملک معظم کی حکومت ہندوستانیوں کے مطالبے کی روشنی میں اور ہندوستانیوں کی مختلف پارٹیوں، فرقوں اور مفاد کے نمائندوں اور والیان ملک کے مشورے اور تعاون سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء میں کانگرس کی تمام صوبائی حکومتوں نے استعفے دے دیئے۔ تو مسلمانوں نے یوم نجات منایا۔ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں انگلستان کے اخبار میں قائداعظم کا ایک بیان شائع ہوا جس میں انھوں نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ ہندومت اور اسلام دو مختلف تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں اور اپنے بنیادی عقائد اور طرز زندگی میں دونوں اس قدر مختلف ہیں جتنی کہ یورپی اقوام۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا ۲۷ واں سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے دو قومی نظریے کی پوری طرح وضاحت کی اور اس کی روشنی میں ملک کے آئینی مسئلے کا حل تجویز کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی کہ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں۔ اور چاہیئے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو، ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست و دولت ہو۔"

چنانچہ ۲۳ مارچ کو ایک کھلے اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی۔ جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی کانگرس اور اس کی ہمنوا جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ مخالفین کہتے تھے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے اور ناقابل تقسیم ہے اکثر ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد ہندو تھے۔ اور تبدیل مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی۔ مسلم لیگ کی طرف سے ان اعتراضات کے بڑے مدلل جوابات دیئے گئے۔ قائداعظم نے جون ۱۹۴۰ء میں وائسرائے سے ملاقات کی اور اس پر زور دیا کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی آئینی تجاویز پیش نہیں کرے گی۔

اس زمانے میں اتحادیوں کو جرمنی کے مقابلے میں پے در پے پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور برطانوی حکومت ہندوستان سے ہر ممکن امداد کی خواہاں تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے منصفانہ اور مکمل حل کے لیے سرسٹیفورڈ کرپس کو خاص تجاویز دے کر بھیجا جو دو حصوں پر مشتمل تھیں۔ ان تجاویز کو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیا۔ کانگرس نے جنگ عظیم کی ~~صورت~~ ~~سے فائدہ اٹھاتے~~ ہوئے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ اس تحریک سے الگ تھلگ رہی کیونکہ اس تحریک نے متشددانہ شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی دوران میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریت

احیاء کے لیے آثار رہا جوان کی کوششوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔

۱۹۳۰ء میں اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے فرمایا: "اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔۔۔ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہند کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

اس خطبے میں علامہ اقبال نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کرنے کی تجویز پیش کی جسے بعد میں چوہدری رحمت الٰہی نے پاکستان کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

اسی دو قومی نظریے کی بنیاد پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔ تاریخ قیام پاکستان کا اعلان ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد حد بندی کی گئی۔ مسلمانوں کو اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ریڈکلف ایوارڈ کے بہت سے علاقے پاکستان سے کاٹ لیے گئے۔ مشرقی پنجاب اور دوسرے شورش زدہ علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں

مسجد وزیر خان لاہور کا دروازہ

مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ مسلمان مہاجرین کی آمد اور غیر مسلموں کے چلے جانے سے پاکستان میں کئی معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہو گئے۔

پاکستان کے سب سے پہلے گورنر جنرل قائد اعظم مقرر ہوئے۔ نئی مملکت کی تنظیم وفاقی آئین کے خطوط پر استوار ہوئی۔ پاکستان میں ناکافی ساز و سامان، مکانوں کی نایابی اور سب سے بڑھ کر کارکنوں کی کمی تھی۔ ادھر ہندوستانی لیڈر اس نئے ملک کو ختم کرنے کی فکر میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد بھیج دی جائے تاکہ اس کی نئی حکومت قائم ہی نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مشرقی پنجاب، دہلی اور شمالی یوپی کو مسلمانوں سے خالی کرانا شروع کر دیا۔

نیا ملک زیادہ تر ان حصوں پر مشتمل تھا، جو انگریزوں کے دور میں صنعتی طور پر پس ماندہ تھے۔ حد بندی کمیشن کے صدر ریڈکلف نے مسلم اکثریت کے بعض اہم علاقے بھارت کو دے دیے۔ بھارت کی کشمیر پر بالادستی قائم کرنے کے لیے اس سے ملحقہ ضلع گورداسپور اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اہم نہری ہیڈورکس جو فیروزپور اور مادھوپور میں تھے۔ جہاں سے پاکستانی علاقوں کو پانی فراہم ہوتا تھا بھارت کے حوالے کر دیئے تو پانی کا جھگڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

جب پاکستان بنا تو برطانوی ہند کی فوج بھی دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم ہوئی جو فوجیں پاکستان کے حصے میں آئیں اس وقت وہ یا تو بھارت میں تھیں یا بیرونی ملکوں میں متعین تھیں۔ پاکستان کی یہ مجبوری دیکھ کر بھارت نے کشمیر میں اپنی فوجیں اتار کر اس پر قبضہ کر لیا اور پاکستان منہ دیکھتا رہا۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی اسے گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر خوش قسمتی سے ابنائے وطن کو بابائے قوم کی قیادت میسر تھی سب سے اہم مسئلہ کشمیر پر بھارت کے حملے سے پیدا ہوا۔ آزادی کے بعد قائد اعظم کو زندہ رہنے کی بہت کم مہلت ملی تاہم انھوں نے اس قلیل مدت میں بھی وطن عزیز کے بہت سے مسائل اپنی دور اندیشی سے حل کر دیے۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین کو مرکزی وزارت نے نیا گورنر جنرل منتخب کیا۔ لیاقت علی خان اگرچہ قائد اعظم کے زمانے ہی سے وزیر اعظم تھے لیکن عملاً نظم و نسق قائد اعظم کی وفات کے بعد ہی لیاقت علی خان کے ہاتھ میں منتقل ہوا۔ وہ پارلیمانی حکومت کے عاملہ جلیلہ کے لیے طبعاً موزوں تھے۔ اس سے پہلے وہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے۔ قائد اعظم کی وفات کے دو ہی روز بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب سارے اسلامی ممالک میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ پنڈت نہرو کی ہدایات کے تحت بھارتی فوجوں نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا اور نظام حیدر آباد کی ملی جلی بھگت کے تحت مسلمانوں کی ایک قدیم سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

دستور ساز اسمبلی کی قرار داد مقاصد سے ہوئی۔ جس میں کہا گیا کہ پاکستان کی حکومت اسلامی ہوگی اور اس کے آئین و قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔

خواجہ صاحب کے دور میں بہت سے ممالک سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے اور ان تمام ممالک کے سفارت خانے پاکستان میں قائم ہوتے۔

جولائی ۱۹۵۱ء میں آناً فاناً بھارت کی فوجوں کا بیشتر حصہ پاکستان کی سرحد پر جمع ہو گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر پاکستان افواج نے بھی نقل و حرکت شروع کی اور اپنی سرحدوں کے قریب معمولی مقدار میں کیمپ لگا دیئے۔ جنگ سر پر منڈلاتی نظر آتی تھی۔ مگر حکومت کے پاکستان کے تدبر کے باعث جنگ رک گئی۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے اپنی کابینہ کے مشورے پر گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزارت عظمیٰ کے فرائض سنبھال لیے اور ان کی جگہ پاکستان کے وزیر خزانہ ملک غلام محمد گورنر جنرل مقرر کیے گئے۔ خواجہ ناظم الدین اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے بطور سربراہ حکومت زیادہ کامیاب نہ ہو سکے ان کے عہد میں غلے کی کمی پیدا ہو گئی۔ سرکاری ملازمین سیاست میں دخل دینے لگے اور

آئین سازی کی رفتار سست پڑ گئی۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کی ابتدا ہوئی۔ اس تحریک سے پنجاب میں نظم و نسق کی صورت حال بہت بگڑ گئی۔ چنانچہ مارشل لاء لگا کر پنجاب میں امن و امان بحال کیا گیا۔ تحریک ختم نبوت نے وزیر اعظم کی حیثیت کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے مداخلت کر کے خواجہ ناظم الدین کو وزارت سے برطرف کر دیا اور محمد علی بوگرا کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ محمد علی بوگرا نے مرکزی مقننہ میں دونوں صوبوں (مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان) کی نمائندگی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک سکیم تیار کی جو اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع کی گئی۔ انہی دنوں گورنر جنرل غلام محمد اور مرکزی حکومت کے بعض لیڈروں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تو غلام محمد نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ اور حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے نئے وزیر مقرر کر دیئے۔

۲۸ مئی ۱۹۵۵ء میں نئی آئین ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ جس کے ۸۰ ارکان تھے۔ اس مرتبہ جب مسلم لیگ نے محمد علی بوگرا کو اسمبلی میں پارٹی لیڈر نہ چنا تو وہ وزارت عظمیٰ سے الگ ہو گئے۔ اور چوہدری محمد علی نے متحدہ محاذ اور مسلم لیگ پر مشتمل ایک مخلوط وزارت بنائی۔

جامع مسجد - واہ کینٹ

چوہدری محمد علی نے جب وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا تو پاکستان کو بنے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کا آئین نہیں بن سکا تھا۔ چنانچہ حکومت نے مغربی پاکستان کو جو چار صوبوں اور کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا مشرقی پاکستان کی طرح واحد صوبہ قرار دیا۔ اس بات کا اعلان نومبر ۱۹۵۴ء میں وزیر اعظم کی طرف سے کیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۵۵ء میں آئین ساز اسمبلی نے وحدت مغربی پاکستان کا قانون منظور کیا جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو نافذ العمل ہوا۔

ملک غلام محمد کو اپنی مسلسل علالت کے باعث اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا اور ۷ اگست ۱۹۵۵ء کو ان کی جگہ پاکستان کے وزیر داخلہ میجر جنرل سکندر مرزا گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو آئین کا مسودہ قانون محمد علی نے آئین ساز اسمبلی میں پیش کیا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نیا آئین نافذ ہوا۔ جس کی رو سے پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار پایا اور سکندر مرزا گورنر جنرل کی جگہ پاکستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے لیکن بعض نامساعد حالات کی وجہ سے چوہدری محمد علی نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ حسین شہید سہروردی نے کابینہ کی تشکیل کی۔

اس کے بعد چندریگر اور ملک فیروز خان نون نے یکے بعد دیگرے قلمدان وزارت سنبھالا۔ بحیثیت مجموعی فیروز خان نون کا مختصر دور وزارت بے یقینی، جوڑ توڑ اور انتشار کا دور تھا۔ مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کا دور دورہ تھا۔ افراط زر، غلے کی کمی اور زر مبادلہ کے ضیاع جیسے مسائل نے خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو صدارتی فرمان کے ذریعے دستور کو معطل کر کے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ سکندر مرزا نے جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کو عملی طور پر ختم کر دیا گیا۔ چونکہ دو اشخاص کے برسر اقتدار رہنے سے ملکی نظم و نسق میں خلل پیدا ہونے لگا تھا اس لئے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا محمد ایوب خان کے حق میں صدارت سے دستبردار ہو گئے اور ایوب خان نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

ایوب خان کے اس دور کو تاریخ میں امن و سکون کے زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نئی کابینہ فوجی جرنیلوں اور شہری اکابر پر مشتمل تھی۔ وزیر اعظم کے عہدے کو ختم کر دیا گیا۔ اور ایوب خان کے وزراء نے صدارتی کابینہ کے ارکان کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔

یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا اعلان کیا گیا۔ جو ایک [illegible] ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا دستور تھا۔ اس دستور میں [illegible] مساوی نمائندگی حاصل تھی۔

۸ جون ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کا اجلاس [illegible] مارشل محمد ایوب خان نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا۔

جنوری ۱۹۶۵ء میں صدارتی انتخاب ہوا جس میں ایوب [illegible] منتخب ہو گئے۔

۱۹۶۵ء کے شروع میں بھارتی فوج نے رن کچھ [illegible] تو پاکستانی افواج بھی حرکت میں آگئیں [illegible] میں بھارت نے اعلان جنگ کئے بغیر مغربی پاکستان [illegible] تک جاری رہی۔ اس دوران میں پاکستانی افواج [illegible] کا اور عوام نے اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کا [illegible] کی فوجوں نے جو محاذ پر [illegible] اپنے قبضے میں [illegible] بڑھ سکیں۔ لیکن دوسری طرف پاکستانی افواج نے بھارت [illegible] قبضہ کر لیا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو یہ جنگ سلامتی کونسل کی ہدایت پر بند کر دی گئی۔ [illegible] ۱۹۶۶ء کو روسی وزیر اعظم کوسیجن کی وساطت سے دونوں ملکوں کے [illegible] معاہدہ تاشقند کے نام سے ایک معاہدہ طے کرایا جس کی رو سے دونوں [illegible] اپنی پرانی سرحدوں پر واپس چلی گئیں اور تنازعات کو باہمی بات چیت کے ذریعے [illegible] پر زور دیا گیا۔ جنگ کے دوران میں کشمیر کے بارے میں معاملہ [illegible] لیکن اعلان تاشقند کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس سے عوام [illegible] مایوسی کا شکار ہو گئے اور جا بجا اعلان تاشقند کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے جنہیں سختی سے دبا دیا گیا۔ اب عوام نے ایک بار پھر سیاست دانوں سے توقعات وابستہ کر لیں۔

۱۹۶۷ء میں پانچ جماعتوں پر مشتمل ایک جماعت تحریک جمہوریت پاکستان کے نام سے بنائی گئی۔ جس نے آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اس اتحاد میں پہلے جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، قومی جمہوری محاذ، نظام اسلام پارٹی اور عوامی

لیگ شامل تھیں۔ لیکن ۱۹۶۹ء کے شروع میں نیشنل عوامی پارٹی، جمعیت علماء اسلام اور چھ نکاتی عوامی لیگ بھی شامل ہوگئیں۔ ۱۰ جنوری کو ان تمام جماعتوں نے جمہوری مجلس عمل قائم کی اور اپنے آٹھ نکات کے پورا نہ ہونے تک انتخابات سے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب مظاہروں نے شدت اختیار کی تو ایوب خاں نے حزب اختلاف سے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے بارے میں گفتگو کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے لئے حزب اختلاف نے چند شرائط پیش کیں۔ ایوب خان نے ۲۱ فروری کو آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہ لینے کا اور سیاسی قیدیوں مجیب الرحمان بھٹو اور ولی خان کی رہائی کا اور ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ۲۶ فروری کو گول میز کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں ذوالفقار علی بھٹو اور بھاشانی نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور تمام ملک میں ایک افراتفری مچ گئی۔ خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہڑتالوں اور جلوسوں کی ایک رو چل نکلی۔

مہتہ پیلس ۔ کراچی

ان حالات میں پرامن انتقال اقتدار کی صورت باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ ہنگاموں اور جلوسوں کے پیش نظر پاکستان میں ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ صدر ایوب خان نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا اور جنرل یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔ ملکی آئین کو منسوخ کر دیا گیا اور مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا۔ نئی فوجی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ملک میں جمہوریت کو بحال کر دے گی۔ اس نے وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر دیا۔ اور ۲۹ مارچ ۱۹۷۰ء کو قانونی ڈھانچہ جاری کیا جس کے مطابق دسمبر ۱۹۷۰ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات شروع ہوئے۔ اس انتخاب میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے نمائندے کثرت سے کامیاب ہوئے۔ اقتدار کے مسئلے پر مغربی اور مشرقی پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے مابین اختلافات شروع ہوگئے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ جس کے نتیجے میں شرپسندوں اور غداروں کے خلاف فوجی کارروائی عمل میں لانا پڑی۔ اس پر نومبر ۱۹۷۱ء میں ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے بڑے نامساعد حالات میں ہتھیار ڈال دیئے اور پورے مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا قبضہ ہوگیا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار بھٹو پاکستان کی قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت میں صدر مملکت اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی ہدایت پر وفاقی وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے ۲ فروری ۱۹۷۳ء کو اسمبلی میں آئینی بل پیش کیا۔ جسے قومی اسمبلی نے ۱۲۵ ووٹوں سے منظور کر لیا کسی نے مخالفت میں ووٹ نہیں ڈالا۔ حزب اختلاف نے بھی آئین کی حمایت کی۔ پاکستان کی مختصر اور متنوع تاریخ میں متفقہ طور پر نئے آئین کی منظوری انوکھی بات ہے اس سے پہلے کبھی متفقہ طور سے کوئی آئین تیار نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کوئی آئین براہ راست عوامی نمائندوں نے مرتب کیا۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات ہوئے جس پر حزب اختلاف کی نو جماعتوں یعنی قومی متحدہ محاذ نے دھاندلی کے الزامات عائد کئے۔ وزیر اعظم بھٹو کے خلاف شدید تحریک چلی۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں چیف آف اسٹاف آرمی جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا جو اب تک جاری ہے۔

(نیز دیکھئے بھٹو اور محمد ضیاء الحق)

پانی ماء، آب، دنیا کا ایک اہم مرکب، جو تسلسل حیات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں پانی کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ ہماری اس خلاقی کو نہیں مانتے۔" (۲۱: ۳۰)

دوسری جگہ اس مطلب کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر، جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے" (۲۴: ۴۵)

علماء نے سات قسم کے پانی کو پینے اور طہارت حاصل کرنے کے لئے جائز قرار دیا ہے... بارش کا پانی۔ چشمے کا پانی، کنوئیں کا پانی، اولوں کا پانی، برف کا پانی، سمندر کا پانی، دریا کا پانی۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ آنحضورؐ سے جنگل کے گڑھوں کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جہاں جنگل کے جانور آ کر پانی پیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر پانی دو قلے ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔" (قلہ دو مشکوں کے برابر ہوتا ہے۔)

ایک اور حدیث میں جو ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے۔ آنحضورؐ سے راہ مکہ و مدینہ کے درمیان حوضوں کے پانی کے متعلق دریافت کیا گیا جن سے درندے اور کتے بھی پانی پیا کرتے تھے کہ ان کا پانی مطہر ہے تو آپؐ نے فرمایا۔ جانوروں کے پینے سے پانی پاک ہی رہتا ہے۔ (مشکوٰۃ، کتاب طہارۃ)

پانی پینے کے آداب کے ضمن میں مندرجہ ذیل احادیث ہیں:-

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی بائیں ہاتھ سے ہرگز کھانا نہ کھائے۔ اور نہ بائیں ہاتھ سے پانی پیے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضورؐ پانی پینے کے درمیان تین مرتبہ سانس لیتے۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے (مسلم)

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا ہے جو شخص چاندی کے برتن میں پینے کی کوئی چیز پیتا ہے تو اس کا یہ پینا اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھڑکائے گا۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے پانی کے برتن میں پانی پیتے وقت سانس لینے اور پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے (ابوداؤد)

پانی پت بھارت کے ضلع کرنال کا ایک قصبہ اور اسی نام کی تحصیل۔ دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہے۔ قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کی تاریخ مہا بھارت کے زمانے سے پہلے کی ہے۔ پانڈوں اور کوروں کی جنگ میں جو میدان مقابلے کے لیے منتخب کیا وہ پانی پت ہی تھا۔ بقول سر سید احمد خاں دہلی کے راجہ ڈنڈپال نے پانی پت بسایا اور اس نے ۱۰۰ قبل مسیح سے ۱۹۱ قبل مسیح تک یہاں راج کیا۔ یہ عین ممکن ہے کہ پانی پت کی قدیم آبادی ویران ہوگئی ہو اور عمارات تباہ و برباد ہوگئیں ہوں اور بعد میں راجہ ڈنڈپال نے اسے از سر نو بسایا ہو۔ بعد کے زمانے میں راجاؤں نے شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان قلعہ بنایا اور شہر کے چاروں طرف مضبوط فصیل تیار کرائی جس کے پندرہ دروازے تھے۔ آج کل قلعہ ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر گیا ہے جو کافی وسیع ہے۔

پانی پت ہمیشہ شمال مغربی دروں سے ہندوستان پر حملہ کرنے والوں کی جولانگاہ رہا ہے۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں یونانیوں نے اس پر حملے کیے اور لوٹ مار کرکے آگے چلے گئے۔ ان کے بعد وسط ایشیائی قومیں مختلف ادوار میں ۱۵۰ قبل مسیح سے ۴۰۰ء تک اس پر حملہ کرتی رہیں۔

۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء میں محمود غزنوی نے پانی پت اور تھانیسر پر حملہ کیا۔ محمود کی واپسی پر ہندو راجہ دوبارہ اس علاقے پر قابض ہوگیا۔ ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں محمود غزنوی کے لڑکے مسعود نے دوبارہ اس علاقے پر قبضہ کیا۔ ۴۳۴ھ/۱۰۴۳ء میں پانی پت پر دوبارہ ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا۔

جس زمانے میں عرب، شام، ایران اور عراق سے مسلمانوں کے مختلف خاندان ہندوستان کے مختلف شہروں میں آئے، تو پانی پت اپنی بہتر آب و ہوا کے لحاظ سے ان لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور آہستہ آہستہ یہ مقام اہل علم کا مرکز اور صوفیا و اولیاء کا مسکن بن گیا۔

پانی پت کی عظمت کا زمانہ خاص طور سے وہ تھا جب شاہ شرف بوعلی قلندر یہاں تصوف، سلوک اور روحانیت کا درس دے رہے تھے۔ چنانچہ اس وقت پانی پت ہندوستان کے منتخب بزرگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہاں سات سو علماء و فضلاء موجود تھے۔

پانی پت کی سیاسی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ یہاں پر ہمیشہ قوموں سلطنتوں اور حکومتوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ مثلاً ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں اکبر نے ہیموں کی فوجوں کا قلع قمع کیا اور آخری بار ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو احمد شاہ درانی نے شکست دی۔

اس شہر کی سیاسی اہمیت کی وجہ اس کا محل وقوع تھا کیونکہ شمال مغربی دروں سے جو بھی حملہ آور ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی پر حملہ کرتا تھا پانی پت اس کے راستے میں پڑتا۔

۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء میں پانی پت انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۸۲۴ء میں پانی پت کو ضلع بنا دیا گیا۔ کرنال اور سونی پت اس کی تحصیلیں قرار پائیں۔ بھارتی حکومت نے کرنال کو ضلع بنا کر پانی پت کو اس کی تحصیل قرار دیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں پانی پت کی آبادی اسی ہزار کے قریب تھی۔

پٹنہ بھارت میں ریاست بہار کا ایک شہر، ضلع اور ڈویژن کا صدر مقام دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر آباد ہے۔ پٹنہ شہر کی آبادی ۱۹۷۱ء میں [illegible] لاکھ ۹۰ ہزار تھی۔ ۱۹۱۲ء میں برطانوی ہند کا صوبہ بہار و اڑیسہ دو حصوں میں تقسیم ہوا تو پٹنہ بہار اور اڑیسہ کا صدر مقام بنایا گیا۔

یہ قدیم شہر ہے۔ یہ قدیم تاریخی مقام پاٹلی پتر کی جگہ آباد ہوا۔ اشوک کے عہد میں پاٹلی پتر اس سلطنت کا صدر مقام تھا جو ہندوکش سے خلیج بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۵۴۱ء میں پٹنہ کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ جبکہ شیر شاہ سوری نے اسے پہلی بار بہار کا دارالحکومت بنایا۔ مغلوں کے دور میں پٹنہ ایک تجارتی مرکز اور بہار کا دارالحکومت تھا۔ پٹنہ کے جنوب مغربی حصے میں پاٹلی پتر کے کھنڈر دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سو ستونوں والا ایک ایوان بھی ہے جو مہاراجہ اشوک نے بنوایا تھا۔

۱۹۱۴ء میں پٹنہ میں ایک ہائیکورٹ بنائی گئی اور ۱۹۱۷ء میں ایک یونیورسٹی قائم ہوئی۔

پٹنہ کا بڑا حصہ خاص شہر پر مشتمل ہے جو دریا کے کنارے نو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کی تجارت کا مدار زیادہ تر مقامی پیداوار پر ہے۔ یہاں کی بڑی بڑی عمارات میں گورنمنٹ ہاؤس، سیکرٹریٹ، کونسل چیمبر، عجائب گھر اور ہائیکورٹ ہیں۔ قدیم عمارات میں سے ایک مسجد جو عیدگاہ [illegible] جس کا ستون سنگ مرمر کا ہے [illegible] مسجد ۱۴۹۹ء میں بنگال کے حاکم حسین شاہ نے بنوائی تھی۔ اس کے علاوہ شیر شاہ سوری کی مسجد اور جہانگیر کے بیٹے شاہزادہ پرویز کی مسجد بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک عمارت جو گولا کے نام سے مشہور ہے خاص اہمیت کی حامل ہے جو ۱۷۸۶ء میں بنی تھی۔ یہ عمارت ۹۶ فٹ بلند ہے۔ یہاں ایک کتب خانہ خدا بخش کتب خانہ کے نام سے ہے جو دنیا کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتب خانے میں آنحضور کی پیدائش سے پہلے کے [illegible] کی اسلامی تصانیف محفوظ ہیں۔

ضلع پٹنہ کا رقبہ ۲,۰۶۰ مربع میل ہے اور قریب قریب سارا ضلع [illegible] ہموار میدان ہے۔

پٹنہ ڈویژن میں پٹنہ، گیا اور شاہ آباد کے اضلاع شامل [illegible] کا کل رقبہ ۱۱,۳۳۰ مربع میل ہے۔

یہ ڈویژن دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ [illegible] کے قریب ہے۔

پٹنی تھائی لینڈ کا ایک ضلع اور صدر مقام جو [illegible] پر تھائی لینڈ کے انتہائی جنوب میں واقع ہے۔

یہ علاقہ کوہستانی ہے۔ صرف ساحل پر ایک میدان [illegible] بڑی برآمد ربڑ، ٹین اور ناریل [illegible] کے قریب ہے۔

پٹنی کا نام [illegible] بارہویں صدی [illegible]

تجارت کی غرض سے یہاں [illegible]

۱۳۵۰ء میں پر [illegible]

[illegible] ۱۵۱۱ء میں جب پرتگیزوں نے [illegible]

[illegible] تجارت شروع کر دی۔

یہ بات کہ یہاں کے باشندوں نے [illegible]

کہی جا سکتی۔ البتہ ۱۴۰۰ء میں یہ ایک [illegible]

[illegible] روایت کے مطابق [illegible]

پہلے خود اسلام قبول کیا اور [illegible]

کے لوگوں کو مسلمان کیا۔ بعد [illegible]

مقامی باشندے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ [illegible]

یہاں خاندانی امور سے متعلق قوانین میں شریعت کا اتباع کیا جاتا ہے اور دوسرے معاملات میں سیاسی قوانین کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔

پیچوی، ابراہیم (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء - ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء) ایک ترک مورخ بلقان کے قصبہ پیچوی میں پیدا ہوا۔ بوسنہ اور ہنگری میں اس کے خاندان کی جاگیریں تھیں۔ تقریباً چودہ سال کی عمر میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا تو یہ اپنے چچا [illegible] کے ہاں رہنے لگا۔ بعد میں اپنے ایک اور رشتہ دار محمد پاشا کے ہاں رہنے [illegible] ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء [illegible] میں ملازمت کر لی اور سنان پاشا کے ہنگری کی معرکوں میں [illegible]

[illegible] ۱۰۱۰ء میں جب لالہ محمد پاشا وزیر اعظم بنا تو پیچوی مختلف عہدوں پر اپنی [illegible] محمد پاشا کے انتقال کے بعد اس کے جانشین نے پیچوی [illegible] کے لئے بھیجا لیکن بعد میں وہ [illegible] کے [illegible] پیچوی [illegible] ناخوشگوار اور تشویش کا [illegible] سرکاری ملازمت سے علیحدگی اختیار [illegible]

[illegible] سے جو کتب تالیف کی ہیں [illegible] اگرچہ [illegible] تصانیف ہیں [illegible] اس کی تصانیف سلیس سادہ [illegible] موجود ہیں۔ اس کی ایک تصنیف [illegible] پر مشتمل ہے۔ اس میں سلطان [illegible] کے زمانے کے [illegible]

پرتگال [illegible] اندلس [illegible] یورپ [illegible] اکیسٹرا ماڈورا [illegible] بحر اوقیانوس ہے۔ پرتگال کی سرحد کو پار [illegible]

اس کے چار دریا سپین سے جدا کرتے ہیں۔

بارہویں صدی عیسوی سے قبل پرتگال کی تاریخ سپین کی تاریخ کا ایک حصہ رہی ہے۔ اس لئے پرتگال کے بارے میں اس دور کی معلومات سپین کی تاریخ ہی میں مل سکتی ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں آزاد پرتگال کا قیام عمل میں آیا۔ غالباً مسلمانوں کی فتوحات کے وقت پرتگال کا تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو صرف جنوب میں مزاحمت پیش آئی۔ اودرہ، شنترین اور قلمریہ کو عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر نے ۹۴ھ/۷۱۳ء میں فتح کیا۔ اندلس کے سیاسی انتشار کے زمانہ میں اور خاص طور پر ۷۵۰ء میں جب قحط کی وجہ سے شمالی مغرب کے نوآباد اس علاقے سے کہیں اور چلے گئے تو اس علاقے کی بازیابی عیسائیوں کے لئے آسان ہوگئی۔ چنانچہ آسٹریا کے الفانسو اول نے اور بقول ابن حیان الفانسو کے بیٹے فرولا نے موجودہ پرتگال کے مغربی شمالی حصے پر قبضہ کر لیا لیکن یہ عارضی تھا بالآخر الفانسو سوم کے دور حکومت میں پرتگال پر عیسائیوں کا پوری طرح قبضہ ہوگیا لیکن وہ پورے علاقے کو اپنے قبضے میں رکھنے میں ناکام رہے۔ ۲۶۴ھ/۸۷۸ء میں قلمریہ پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ لیکن ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں منصور نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ لزبن ابھی تک خلافت کے ماتحت تھا اور ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء میں مہدی اس کا سربراہ بنا۔ بعد میں طوائف الملوکی کے دور میں یہ شہر افطسی حکمرانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ حکمران خاندان اندلس کا مغربی علاقہ حاصل کرنے کے لئے اشبیلیہ کے عبادی خاندان سے برسرپیکار تھا۔ جب ۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء میں قلمریہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو صرف اشبونہ ایک سرحدی علاقے کی حیثیت سے رہ گیا۔

۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں پرتگال کے پہلے بادشاہ الفانسو نے ان دونوں کو فتح کر لیا۔ ۵۸۰ھ سے قبل پرتگیزوں نے ہمت سے جنوبی علاقے پر قبضہ کر لیا۔

اس علاقے میں عربی زبان اور عرب تمدن کی جڑیں بہت گہری ہو چکی تھیں عہد خلافت میں کئی صوبوں کے اضلاع جن میں صدر مقام، عامل اور حفاظتی فوج متعین ہوتی تھی کلی یا جزوی طور پر پرتگال کے علاقے میں واقع تھے۔ انتہائی جنوبی ضلع اکشونبہ کے ماخذ میں شمال کی سمت میں موجودہ بیکیو، النیجو کی جگہ بیجہ کا ضلع (کورہ) تھا۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی یہی تھا۔ اس کے بھی شمال میں اشبونہ یا لزبن کا ضلع تھا۔ جس میں شنترین اور قیلہ شامل تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قلمریہ بھی کسی کورے کا صدر مقام ہو

پرتگال میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں آخری کش مکش ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں ہوئی یہ آخری کش مکش ابو یعقوب یوسف الموحد کی کوشش تھی۔ اس حملے میں مسلمانوں نے ڈٹ کر پرتگالیوں کا مقابلہ کیا۔ آخر کار الموحد کے عقب لشکر پر پرتگالیوں کے ایک حملے میں ابو یعقوب کے کاری زخم آیا اور وہ اشبیلیہ کو واپس جاتے ہوئے یابرہ کے قریب اپنے خالق حقیقی کو جا ملا۔ پرتگال میں یہ شکست عام توقعات کے خلاف تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں موحدین کی قوت و ناموری کا ستارہ بلندی پر تھا۔ چنانچہ ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء میں العقاب کے مقام پر عیسائیوں نے فتح حاصل کی جس میں پرتگالی فوجوں نے حصہ لیا تھا ۱۲۴۹ء میں شلب پر عیسائیوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ اور الغرب پر سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ موجودہ پرتگال میں الغرب مسلمانوں کا آخری مقبوضہ تھا۔ ایک اور جنگ کے دوران میں جو ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء میں رود سلادو کے کنارے لڑی گئی۔ اس میں بھی اگرچہ اندلسیوں نے پہلے حملے میں پرتگیزوں پر بڑا دباؤ ڈالا اور ان کی صفیں الٹ کر رکھ دیں لیکن بالآخر یہ میدان بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اس کے بعد اندلس کے مغرب میں اسلامی حکومت کا دوبارہ قیام ناممکن ہوگیا۔

موجودہ پرتگال میں مذہبی آزادی ہے۔ ۹۵ فیصد رومن کیتھولک عیسائی ہیں اس کے علاوہ پروٹسٹنٹ، یہودی اور دوسری اقلیتیں ہیں۔ اگرچہ ۱۹۱۰ء میں ایک جمہوریہ بن جانے کے بعد چرچ غیر آباد اور مذہبی امور کی مناہی اور سکولوں میں مذہبی تعلیم ختم کر

پہلے پہنچ جائے۔ (مشکوٰۃ: آداب حج)

یہی حکم خانہ بدوش لوگوں کا ہے جو گھاس، چارے وپانی پر ٹھہرتے پھرتے ہیں کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

دوسری قسم وہ زمین جس میں لوگ وطن بنانے کی غرض سے آکر ٹھہریں اس میں سلطان کا یہ فرض ہے کہ اگر ان کے یہاں رہنے سے مسافروں کے لئے تکلیف اور دقّت ہو تو ان لوگوں کو اترنے سے قبل اور بعد میں ہر حال میں روک دے اور اگر مسافروں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو تو پھر اسے اختیار ہے چاہے تو اجازت دے چاہے روک دے۔ جیسے حضرت عمرؓ نے بصرہ اور کوفہ کو آباد کرتے ہوئے یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ تیسری قسم کے بارے میں ایک حدیث ہے جسے کثیر بن عبداللہ کے دادا نے روایت کیا ہے۔ کہ ہم حضرت عمرؓ کے ساتھ ۱۷ھ کو عمرہ کرنے کے لئے چلے تو راستے میں تالاب والوں نے آپؓ سے مکہ اور مدینہ کے درمیان مکانات بنانے کی اجازت چاہی کیونکہ اس سے پہلے وہاں مکانات نہ بنے تھے آپؓ نے اجازت دے دی اور شرط یہ لگائی کہ مسافر پانی اور سایہ کے زیادہ مستحق ہوں گے۔

پلیمر جمہوریہ انڈونیشیا کے صوبہ کالی منتان کا ایک حصہ جو مشرقی بورنیو میں واقع دریائے پلیمر یا کندیو کی وادی پر مشتمل تھی۔

اس علاقے میں زیادہ تر تین قسم کے لوگ آباد ہیں۔ جن میں دَیاک، جزائر سلاویسی کے بَرک، لوحن بنجاری اور بگنی، ساحل پر ماہی گیروں کی ایک نسل جو باجو کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۵ مربع کلومیٹر تھا۔

۱۹۴۹ء سے پہلے قبیلہ دیاک کے نو ہزار افراد میں سے چار ہزار مسلمان ہو چکے تھے۔

روایات کے مطابق پلیمر کو ایک عرب نوان سید نامی نے اسلام سے روشناس کرایا۔ اس نے پلیمر کے حاکم کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس وجہ سے بھی یہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام کو قبول کیا۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ پلیمر میں صرف ایک مسجد ہے اور اس کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی عبادت گاہیں ہیں۔ مسلمان مولویوں کی تعداد بھی کم ہے۔ ان لوگوں میں حج کا شوق بھی بہت کم ہے۔

مذہبی پیشواؤں کی آمدنی کا ذریعہ زکوٰۃ اور فطرہ ہیں جو ماہ رمضان کے آخر میں ہر شخص حسب استطاعت دیتا ہے اس علاقے میں اسلامی تقویم رائج ہے۔ یہاں کے باشندوں کی عائلی زندگی اب کسی حد تک اسلامی رسوم کے مطابق مرتب ہو گئی ہے۔

پَسرُور پاکستان میں ضلع سیالکوٹ کا ایک پرانا شہر۔ سیالکوٹ سے ۱۹ میل دور جنوب میں نارووال سے امرتسر جانے والی شاہراہ پر واقع ہے بابر کے دور میں ایک باجوہ جاٹ پسرسندو نے آباد کیا تھا۔ ایک زمانے میں اس شہر کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ اس کی قدیم اور پُررونق آبادی کے آثار اس کے گرد و نواح میں آج بھی باقی ہیں۔ ایک تالاب جو شہنشاہ جہانگیر کے دور میں بنایا گیا تھا اب بھی موجود ہے۔ ایک نہ دارا شکوہ نے بنوائی تھی جس میں نالہ ڈیک کا پانی پڑتا تھا۔

یہاں ایک صوفی بزرگ میاں برخوردار کا مزار ہے جس کی زیارت کے لئے محرم کے مہینے میں اکثر لوگ آتے ہیں۔ ایک اور بزرگ مہ منگا کی قبر بھی ہے جو شمالی جانب

ٹیلے کے اوپر واقع ہے۔ چونکہ اکثر شہروں کو جانے والی سڑکیں یہاں سے گذرتی تھیں اس لئے اس شہر کو تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہاں میونسپل کمیٹی قائم ہوئی۔

پَسَنتْرَن پسنتری، جاوا اور مادورا کے جزائر میں دینیات کے طلبہ کی تربیت گاہ کو کہتے ہیں۔

جزائر شرق الہند میں تمام مسلمانوں کے لئے ابتدائی تعلیم (قرآن مجید اور ذالقص کی تعلیم) ضروری ہے جاوا اور مادورا کے بڑے دیہات اور شہروں میں بعض اساتذہ بچوں کو مساجد میں یا اپنے گھروں میں یا بعض عمارتوں میں جمع کر کے درس قرآن مجید دیتے ہیں اکثر اوقات دور دور کے طالب ان سے استفادے کی خاطر آکر ان کے پاس ٹھہرتے ہیں اور علم حاصل کرتے ہیں۔

لیکن پسنترن کا اطلاق ان اعلیٰ دینی تعلیم و تربیت کے اداروں پر ہوتا ہے جو ایسی عمارتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اگر یہ گاؤں سے باہر بنائے جاتے ہیں تو تقریباً گاؤں کا ایک محلے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ ان اداروں کے لئے بعض دین دار لوگوں نے اوقاف قائم کر دیئے ہیں۔ بعض اوقات حکومت بھی بعض دیہات کو لگان وغیرہ سے معافی کے حکم نامے جاری کرتی رہتی ہے جو بعد میں ان اداروں کا حق بن جاتا ہے۔ اس عمارت میں سب سے پہلے تو معلموں کے مکانات ہوتے ہیں پھر درس کے کمرے ایک مسجد، طلبہ کے حجرے اور چاول رکھنے کے کمرے ہوتے ہیں۔ طلبہ کے حجروں کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے طالب علم صرف بیٹھ سکتا ہے۔ کیونکہ طلبہ عموماً لیٹ کر مطالعہ کرتے ہیں ایک حجرے میں کئی طلبہ رہتے ہیں۔

ان اداروں میں طلبہ کی زندگی کا معمول یہ ہوتا ہے کہ فجر کی نماز معلم خود پڑھاتا ہے بعد میں سب شاگردوں کو ایک ایک کر کے سبق دیتا ہے سبق کے بعد طالب علم اپنی اقامت گاہوں میں واپس جا کر سبق یاد کرتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا کھانے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ کھانے کے بعد ظہر کی نماز کو جاتے ہیں۔ بعد ازاں نمازوں کے علاوہ جو بھی وقت ملتا ہے اس میں طلبہ اپنا سبق دہراتے رہتے ہیں۔ اونچے درجوں کے طلبہ کو معلم اکٹھا پڑھاتا ہے۔ عشاء کے بعد طلبہ سو جاتے ہیں۔

ولندیزیوں کے دورِ حکومت میں یورپی طرز کے جو مدارس قائم کئے گئے ہیں ان میں دینی تعلیم نہیں دی جاتی۔ آج کل ایسے نجی مدرسوں کا رواج بڑھ رہا ہے۔ جہاں دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

پشاور پاکستان کا سرحدی شہر جو تحصیل، ضلع، ڈویژن اور صوبے کا صدر مقام بھی ہے، دریائے باڑہ کے بائیں کنارے کے قریب جمرود سے گیارہ میل دور درہ خیبر کے داخلے پر واقع ہے۔ ابتداء میں ایک حفاظتی فصیل اس کے گرد تھی۔ جس کے سولہ دروازے تھے۔ شہر کے مغرب میں دو میل کے فاصلے پر چھاؤنی ہے۔ قدرتی طور پر چاروں اطراف سے مسلسل پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے صرف مشرقی جانب اٹک کے سامنے کچھ حصہ کھلا ہے۔ پشاور شہر اور چھاؤنی کا کل رقبہ ۹ مربع میل ہے۔ آبادی تین لاکھ سے زائد ہے۔ ضلع پشاور کا کل رقبہ ۱۶۶۴ مربع میل اور آبادی ۱۹۷۲ء میں ۱۷۱۲۰۰۰ تھی۔ تاریخ میں پشاور کا ذکر سب سے پہلے ریاست گندھارا کے ایک حصے کی صورت میں ملتا ہے جو ایک بدھ سلطنت تھی۔ سکندر اعظم کے حملے کے بعد پشاور کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ۳۲۶ ق م میں سکندر کی فوجیں جن دو علیحدہ راستوں سے دریائے سندھ

تک پہنچی تھیں ان میں ایک راستہ درّہ خیبر تھا۔ اگرچہ یونانیوں کے اس پہلے حملے نے پشاور پر کچھ بھی اثرات نہیں چھوڑے۔ سکندر کی واپسی کے بعد بدھ مت پشاور اور کابل تک پہنچ گیا۔ ساتویں صدی کے اواخر میں پشتون یہاں آئے جنہوں نے آتے ہی حاکمان لاہور سے دریائے سندھ تک کا میدانی علاقہ چھین لیا اس کے بعد دریائے سندھ کے مغرب اور دریائے کابل کے جنوب کے درمیانی پہاڑی علاقے پر بھی قابض ہو گئے۔

دسویں صدی عیسوی میں جب سبکتگین نے لاہور کے راجہ جے پال کو شکست دی تو پشاور غزنویوں کے قبضے میں آ گیا اور گیارہویں صدی کے پہلے ربع تک محمود غزنوی نے ہندوستان پر اپنے حملوں کے دوران میں پشاور کو چھاؤنی بنائے رکھا۔ اس کے بعد تقریباً سو سال بعد تک یہ علاقہ غزنہ کا صوبہ بنا رہا۔

غزنویوں کے بعد یہاں پر مختلف حکمران حکومت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۵۰۵ء میں درّہ خیبر کے راستے بابر حملہ آور ہوا۔ اس نے باجوڑ اور سوات کو بھی اپنا مطیع بنایا۔ لیکن مغل ان قبائل پر پوری طرح قابو نہ پا سکے۔ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں ان کی شورشوں پر قابو پانے کے لئے میدانی علاقوں میں جگہ جگہ فوجی قلعے تعمیر کئے۔ اسی زمانے میں یوسف زئی، مندڑ اور خٹکوں کی شورشیں رونما ہوئیں۔ ۱۶۷۸ء میں پشتونوں نے بھاری جمعیت کے ساتھ خیبر پر قبضہ جما کر دہلی اور افغانستان کا راستہ منقطع کر دیا اور ایک عرصے تک پورے میدانی علاقے پر اپنا قبضہ جمایا۔ اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو اس علاقے کو زیر کرنے کے لئے اپنی سرکردگی میں فوج لیکر آیا تقریباً دو سال تک اس کی یہ جدوجہد جاری رہی بعد میں اس کے جانشینوں نے اس علاقے کو فتح کر لیا۔ ۱۷۳۸ء میں پشاور پر نادر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد سدوزئی درانیوں نے احمد شاہ کے زیر تسلط قندھار میں اپنی حکومت قائم کی تو پشاور پر بھی ان کا مکمل قبضہ قائم ہوا۔ ۱۸۱۵ء میں یہ سارا علاقہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوا کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔
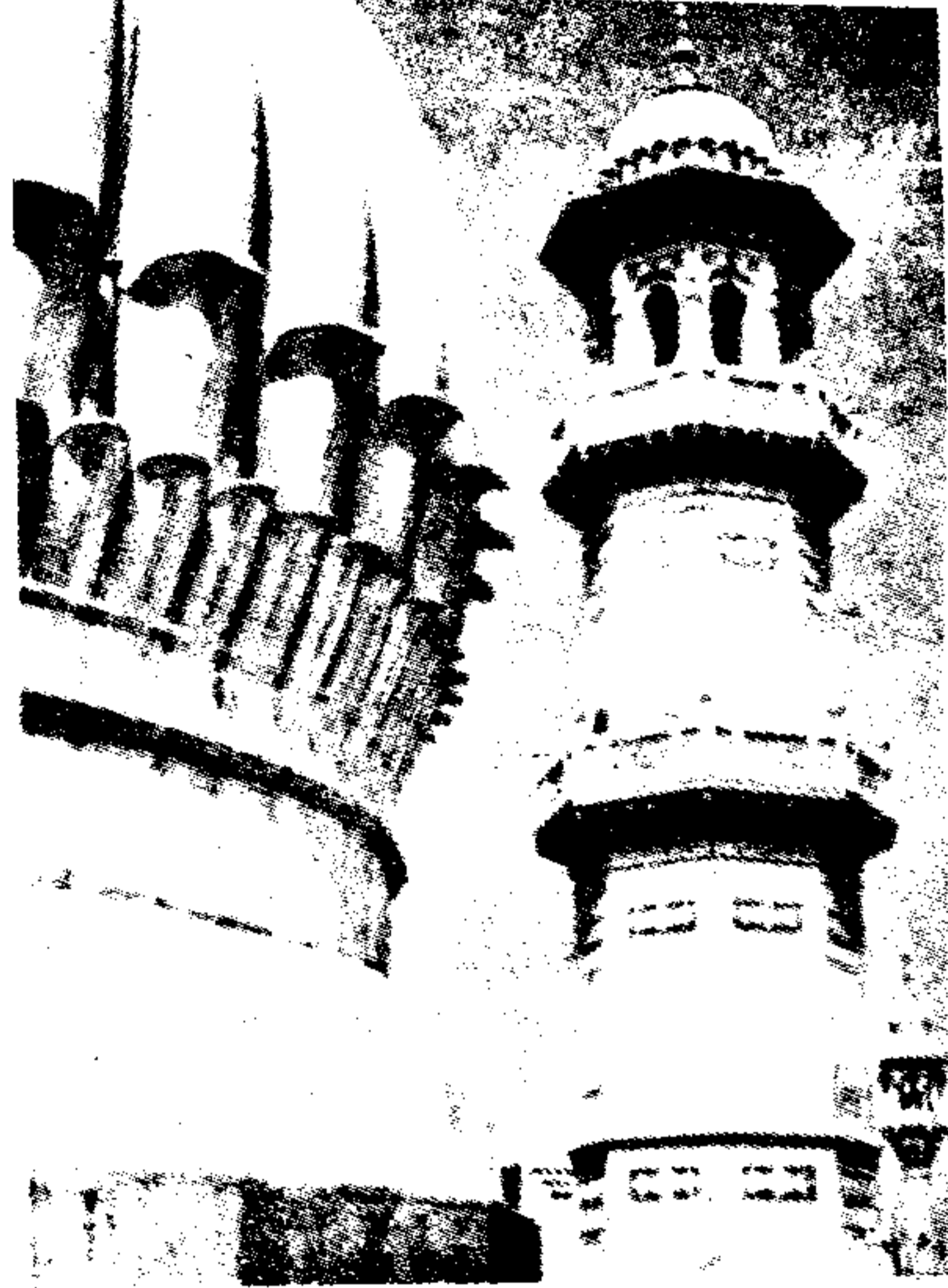
مسجد مہابت خان ۔ پشاور

۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۲ء تک یہاں کا نظم و نسق ایک انگریز جرنیل اوٹیبلا کے ہاتھ میں رہا۔ ۱۸۴۹ء میں یہ وادی انگریزوں کی مملکت میں شامل کر دی گئی اور اسے پنجاب حکومت کا انتظامی ضلع بنا دیا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے نام سے ایک علیٰحدہ صوبہ بنایا گیا۔ اور پشاور اس صوبے کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۹۵۵ء میں یہ صوبہ دوسرے صوبوں کے ساتھ وحدت مغربی پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں جب اس وحدت کو توڑ دیا گیا تو اسے دوبارہ صوبہ بنا دیا گیا۔ اب پشاور صوبہ سرحد کا دارالحکومت ہے۔

پشاور ڈویژن کی کل آبادی ۱۹۷۲ء میں ۴۷,۰۰۰ [illegible] تھی۔ اس علاقے کی پیداوار میں گیہوں، مکئی، گنا، چاول، دالیں، سرسوں کے بیج، تمباکو، وغیرہ اہم ہیں۔ یہاں خصوصاً دیہاتی آبادی کے نوے فی صد لوگوں کی بولی پشتو [illegible]

پشاور شہر میں ایک یونیورسٹی، لاء کالج، ایجوکیشن کالج، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، زرعی کالج، کامرس کالج اور آرٹس و سائنس کالج ہیں۔ ایک ہوائی اڈا ہے۔ پشاور شہر میں بہت سی مساجد ہیں جن میں شاہجہان کے عہد کی چند مساجد مسجد مہابت خان، جو سب سے بڑی اور شہر کے اندر واقع ہے، مسجد گنج علی خان، مسجد دلاور خان، مسجد خواجہ معروف اور مسجد [illegible] بہت مشہور ہیں۔

پشاور کے قابل دید مقامات میں قلعہ بالاحصار، شاہی باغ، وزیر باغ، کمپنی باغ (چھاؤنی)، عجائب گھر، اسمبلی ہال، میونسپل ہال، اسلامیہ کالج، وارسک پن بجلی گھر، درّہ خیبر، درّہ کوہاٹ اور آثار قدیمہ میں پنج تیرتھ، شاہ جی کی ڈھیری اور گور کھتری اہم ہیں۔

یہاں کے باشندے بیاہ شادی [illegible] صدقات [illegible] اسلام کے مطابق کرتے ہیں۔ پیروں، درویشوں، اولیاء اللہ کی بہت زیادہ [illegible] کرتے ہیں۔ اس علاقے کے لوگ انتہائی باغیرت، دلیر، جنگجو [illegible] ساتھ ساتھ بامروت اور مہمان نواز ہیں۔

پشتو پختو یا پشتو ایک زبان جو پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے [illegible] افغانستان، پاکستان اور بلوچستان کے ایک حصے [illegible]

یہ ایک قدیم زبان ہے جو آریوں کی آمد سے پہلے پشتون [illegible] وطن پشتون خوا میں بولتے تھے۔ پشتو بولی کے علاوہ پشتونوں کے [illegible] کا نام بھی ہے

پشتونوں میں کبھی نہ جانے کون کونسی قومیں آ کر آباد ہوتی رہیں [illegible] [illegible] چلی گئیں اور ایک وقت میں ان کے ساتھ مل کر سب پشتون [illegible] آمد و اتصال کا اثر قدرتاً زبان پر بہت زیادہ پڑتا چلا گیا [illegible] ساتھ بہت سے الفاظ دخیل ہوں گے۔ پشتو کی بنیاد بھی وہی زبان ہے جو [illegible] ہزار سال قبل مسیح میں باختر قدیم اور وسط ایشیا میں بولی جاتی ہوگی۔ کیونکہ [illegible] فارسی، سنسکرت، ہندی اور بکر طحہ علاقے کی پراکرتوں میں پشتو کے سینکڑوں [illegible] آج بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ تحریری شکل میں پشتو ادب [illegible] میں سامنے آیا جس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے [illegible] میں سلطان محمود غزنوی کے ایک وزیر احمد بن حسن میمندی نے کی تھی [illegible] میں یہ عربی اور ایرانی سے مختلف ہے۔

پشتو کے لئے عربی حروف تہجی کافی نہیں تھے اس لئے کچھ [illegible] بڑھا دیئے گئے لیکن یہ حروف وضع نہیں کئے گئے بلکہ عربی حروف پر چند [illegible]

کچھ علامتیں بڑھادی گئیں اور یوں اپنا مطلب پورا کرلیا گیا۔ پشتو ادب کی ابتداء دوسری صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوتی ہے۔ اور اس اعتبار سے اسے چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ وہ ادوار یہ ہیں۔

۱- ۲۰۰ھ تا ۱۰۰۰ھ ۲- ۱۰۰۰ھ تا ۱۲۰۰ھ ۳- ۱۲۰۰ھ تا ۱۳۰۰ھ ۴- ۱۳۰۰ھ تا دور حاضر۔

پشتو ادب دو صنفوں پر مشتمل ہے۔ ۱- عوامی - ۲- علمی۔ عوامی ادب میں قصے کہانیاں، کہاوتیں، پہیلیاں، معقولے، لوریاں، مرثیے اور ٹپے وغیرہ اہم ہیں۔

جدید معلومات کے مطابق پشتو کتابی ادب کی تاریخ ۱۳۹ھ/۷۵۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس پہلے دور میں جو دسویں صدی ہجری تک کا ہے نمایاں ادبی شخصیتیں امیر کرور سوری، ابو محمد ہاشم سروانی، بیٹ بابا، شیخ اسماعیل سڑبنی، شیخ رضی لودی، خوشبون، شیخ اسعد سوری، شیخ عیسے امشوانڑی، شکارندوے، شیخ تایمنی، سلیمان ماکو، بابو ھوتک، شیخ متی، حضرت شیخ بختیار کاکی، احمد بن سعید لودی، شیخ ملیار غرشین، شیخ ملی یوسف زئی، شیخ کٹہ مینتزی، اکبر زمینداوری، سلطان بہلول لودی، خلیل خان نیازی، شیخ محمد صالح، بی بی رابعہ قندھاری، پیر روشان (بایزید انصاری) خواجو ملیزی، بی بی زرغونہ خاتون، شیخ تیمن، شیخ بستان بڑیچ، زرغون خان دوست محمد کاکڑ، شیخ ارزانی، اخون جیالاک خٹک، مولانا عبدالوہاب (اخوند پنجو بابا) نعمت اللہ ہروی اور اللہ یار الکوزی ہیں۔

مندرجہ بالا افراد میں بایزید انصاری زیادہ اہم ہیں۔ انہوں نے تصوف اور طریقت میں کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم کتاب خیر البیان ہے جس کی پشتو عبارت بآسانی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے۔

دوسرا دور پہلے دور کے مقابلے میں پشتو ادب کے لیے زیادہ بہتر رہا اس دو سو سال کے عرصے میں پشتو ادب نے کافی ترقی کی۔ اس دور کے مشہور ادیب اخوند درویزہ ہیں جنہوں نے درسی طرز پر فارسی مسجع و مقفی قسم کی پشتو نثر میں کئی کتابیں تالیف کیں جن میں مخزن الاسلام، تذکرۃ الابرار والاشرار اور ارشاد طالبین ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں میں ملا الف ہو، ارزانی، علی محمد مخلص مرزا خان انصاری، دولت اللہ لوانڑی، واصل، امیر، اخون، قاسم پاپین خیل مصنف "فوائد شریعت"، بابو جان نعمانی، خوشحال خان خٹک (جس نے پشتو انشاء و املا دونوں میں بڑی اصلاح کی ہے اور پشتو نثر کو بہت سادہ رواں اور سلیس طرز میں ڈھالا۔) اشرف خان ہجری، عبدالقادر خٹک (جو ایک بلند پایہ عالم، ادیب اور شاعر تھے ان کی تصانیف میں گلدستہ (گلستان سعدی کا پشتو ترجمہ) یوسف زلیخا "چہل حدیث" کا پشتو ترجمہ اور "نصیحت نامہ" ہیں۔ صدر خان خٹک، سکندر خان گوہر خان، بہرام خان، بی بی حلیمہ، خواجہ محمد بنگش، رحمان بابا، عبدالحمید مہمند، محمد افضل خان خٹک، معز اللہ مہمند، کامگار خان خٹک، علی خان، کاظم خان شیدا شیخ محمد قاسم، ملا نور محمد، مولانا احمد شاہ وغیرہ ہیں۔

اس دور کے پشتو ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اس دور میں پشتو ادب عربی اور فارسی کا غلبہ زیادہ ہوگیا تھا۔ تیسرے دور میں جو ایک صدی کے قریب قریب کا زمانہ ہے۔ احمد شاہ ابدالی سے شروع ہوتا ہے اس دور میں پشتو نظم و نثر لکھنے والوں میں احمد شاہ درانی، سدوزئی، تیمور شاہ، میاں عمر (جو ایک بلند پایہ اہل قلم تھے۔) ملا عبدالرشید، اخون گدا، سعادت خان، قاسم علی آفریدی، نواب حافظ رحمت خان (مصنف گلستان رحمت) امیر محمد انصاری، حافظ امپوری، عبدالعظیم رانڑی زئی، حضرت عبید اللہ میاں گل، خوشحال شہید، نواز خٹک بیدل، مرزا خان، صدیق اخون زادہ، بابا سید گل، میاں نعیم، احمد کلاچوی، محمد رفیق، نجیب، مراد علی صاحبزادہ مصنف تفسیر یسیر، دوست محمد خٹک (جس نے واعظ کاشفی کی مشہور تفسیر حسینی کا تفسیر بدر منیر کے نام سے پشتو ترجمہ کیا اور نظم میں بحر العلوم اور اخلاق احمدی کے نام سے دو مثنویاں لکھیں۔) عبدالکریم کاکڑ، خواجہ رزاق اللہ، امام الدین، ملا حسن، معین الدین، مطیع اللہ، سپینہ خاتون، بی بی گکہ خاتون، سید حسین، معز الدین خٹک مصنف رلقۃ الاسلام، میاں محمد فہیم کاکاخیل فیض اللہ اخونزادہ مصنف ذخیرۃ القرار، خان زمان، دوستم وغیرہ ہیں۔

ان مصنفین و شعرا کے ہاتھوں پشتو ادب کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد کی لکھی ہوئی کتابوں میں بلحاظ موضوع اور نفس مضمون دینیات اور اخلاقیات کا اثر غالب ہے۔

چوتھے دور کے اہل قلم حضرات میں حبیبی، خادم، بینوا، مجروح، الفت، رشتین، پیرزادہ سید عبداللہ شاہ، مولوی میر احمد شاہ رضوانی، میاں محمد یوسف، میاں حسیب گل کاکاخیل، مولوی عبدالمجید افغانی، منشی احمد جان، قاضی رحیم اللہ سید راحت اللہ زاخیل، میاں آزاد گل کاکاخیل، حافظ محمد ادریس، میجر ایس اے رحمان، نصر اللہ خان نصر، مولانا عبدالقادر، امیر حمزہ شینواری، عبدالحلیم اثر، سمندر خان سمندر، میاں سید رسول رسا، دوست محمد خان کامل، فضل حق وغیرہم ہیں۔ اس دور میں پشتو ادب میں فکر و نظر کے زاویے بدلے ہوئے ہیں۔ علوم جدیدہ سے متصف ادیب نغمہ و بلبل اور کاکل پیچاں کے چکر سے نکل کر زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہیں اور اب ان میں نئے نئے افکار و خیالات جنم لے رہے ہیں۔ اس جدید دور میں پشتو ادب میں اب سیاست، صحافت، ناول، افسانہ، ڈرامہ، تنقید و تبصرہ، مقالہ نگاری فن لغت نویسی وغیرہ شامل ہوگئی ہیں۔

پشتو اکیڈمی کے تحت پشتونوں اور پشتو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر تحقیق کی جارہی ہے۔

پکتھال، محمد مارماڈیوک (۱۷/اپریل ۱۸۷۵ء — ۱۸/مئی ۱۹۳۶ء) ایک مستشرق، جنہوں نے بعد ازاں اسلام قبول کرلیا لندن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ مادری زبان کے علاوہ فرانسیسی اطالوی، جرمن، ہسپانوی اور عربی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ جغرافیے اور لسانیات سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ۱۸۹۴ء میں پکتھال کو شام اور مصر میں زندگی گذارنے کا موقع ملا تو انہوں نے یہاں پر اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ اسلامی طرز زندگی کے مشتاق ہوتے چلے گئے۔ بعد ازاں سوئٹزرلینڈ میں بہ امر مجبوری سکونت اختیار کرنا پڑی۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرومر کی دعوت پر دوبارہ مصر گئے اور ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ بیروت کے قیام کے دوران میں پکتھال نے عربی بولنا سیکھا۔ ۱۹۱۳ء میں ترکی گئے۔ جہاں انہوں نے ترکی کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ان دنوں ترکی کی حالت بہت گر چکی تھی۔ اور یورپ اسے تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اسلام نے پکتھال کے دل میں اپنی حقانیت کو تسلیم کرالیا تھا چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں کچھ عرصے لندن میں ادارہ معلومات اسلامی سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۰ء میں عمر سبحانی کی دعوت پر بمبئی چلے گئے۔ جہاں بمبئی کرانیکل کی ادارت شروع کی اور ۱۹۲۴ء تک اس کے مدیر رہے۔ بعد ازاں نظام دکن کے محکمہ تعلیم میں ملازمت

اختیار کرلی اور حیدرآباد گھاٹ ہائی سکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا مقصد غیر اسلامی دنیا کو اسلامی ثقافت اور علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا۔ تقریباً دس سال تک اس رسالے سے منسلک رہے اور بڑے خلوص اور لگن کے ساتھ یہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں وہ حیدرآباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو کر لندن چلے گئے۔ لیکن یہاں بھی رسالہ "اسلامک کلچر" کی ادارت جاری رہی۔ بالآخر لندن ہی میں ایک مختصر سی علالت کے بعد وفات پائی اور وہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ بقول پروفیسر کرنیکو حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ مغرب میں اسلام کی اشاعت کے لیے کام کرتے رہے اور اسی سلسلے میں انہوں نے ایک انجمن کی بنیاد بھی رکھی۔ وہ ایک قابل اعتماد دوست اور پکے مسلمان تھے۔

پکتھال کو تصنیف و تالیف کا شوق اپنے دادا اور نانا سے وراثت میں ملا تھا۔ ان کی تصانیف میں "SAID THE FISHERMAN"، "ORIENTAL ENCOUNTERS"، "THE CHILDREN OF THE NILE"، "VEILED-WOMEN" مشہور ہیں۔

ان میں انہوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں اپنے مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ اپنی کتاب "With The Turk in war time" میں ترکی کے حالات بیان کئے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی کو مرد بیمار سمجھ کر یورپ کی تمام طاقتیں ہڑپ کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔

جنگ عظیم کے دوران میں انہوں نے تین کتابیں Tales from five chimneys، The House of war، Knights of Araby شائع کیں۔

ایک کتاب "The cultural side of Islam" کے نام سے شائع کی جو ان خطبات کا مجموعہ تھی، جو پکتھال نے ۱۹۲۷ء میں مدراس میں سالانہ اسلامی خطبات کے سلسلے میں دیے تھے۔

پکتھال کی ایک سب سے اہم اور عظیم تصنیف قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے "The Glorious Quran." کے نام سے شائع ہوا۔ نظام دکن نے ۱۹۲۸ء میں انہیں دو سال کی رخصت اس مقصد کے لیے دی تاکہ وہ ترجمے کے کام کو مکمل کر سکیں۔ یہ ترجمہ صحت، سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے مقبول ترین ہے۔

پلونہ شمالی بلغاریہ کا ایک مشہور شہر جو توچینچہ ندی کی گہری وادی میں واقع ہے۔ یہ شہر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور ودین، نیقپہ، صوفیا اور کوہ بلقان کے دروں کو جانے والی شاہراہیں جہاں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں، کے مقام پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جنگی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

یہ شہر ترکوں کے عہد میں بسایا گیا۔ لیکن اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ اور جو معلومات ملتی ہیں وہ بھی باہم متضاد ہیں۔

اولیا چلپی اور حاجی خلیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ شہر نیقبیہ کی سنجاق میں ایک ضلع کا صدر مقام تھا۔

جب اولیا چلپی سترہویں صدی میں یہاں آیا تو پلونہ میں دو ہزار مکانات اور ایک ویران جنگی قلعہ، ایک دارالعلوم، سات مدرسے، تکیے اور چھ سرائیں تھیں۔

بقول سامی بک ترکی حکومت کے آخری زمانے میں پلونہ میں ستر ہزار باشندے اور اٹھارہ مساجد تھیں۔

اس شہر کو عالمگیر شہرت جنگ روس و ترکی کے دوران میں حاصل ہوئی جو ۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء تک جاری رہی۔ عثمان پاشا نے اس کے چاروں طرف مٹی کی مستحکم اور وسیع دیواریں بنوائیں۔ روسیوں نے تین بار پلونہ حاصل کرنے کی کوششیں کیں لیکن انہیں ہر بار بہت بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ان ناکامیوں کے بعد اتحادیوں نے باہم مل کر پلونہ کا باقاعدہ محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کی قیادت روسی سپہ سالار سباستوپول خود کر رہا تھا۔ عثمان پاشا اس مرتبہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے جان کی آخری بازی لگانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اس نے اپنے سے تین گنا فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن چند گھنٹوں بعد جب عثمان زخمی ہو گیا تو ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ عثمان پاشا نے ۴۰ ہزار فوج کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے۔

سقوط پلونہ کے ساتھ ہی روسیوں کے لیے ادرنہ اور آگے سان سٹیفانو تک کا راستہ کھل گیا۔

آج کل پلونہ تجارت کا مرکز ہے یہ ایک سرکل کا صدر مقام ہے۔ یہاں پر سب سے زیادہ تجارت مویشیوں اور شراب کی ہوتی ہے ایک عجائب گھر ہے جسے دیکھ کر روس ترکی جنگ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین۔ پاکستان کا ایک صوبہ۔ پاک و ہند کا وہ علاقہ جس میں دریائے ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم بہتے ہیں۔ یہ سب دریا مٹھن کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ میں آ کر گرتے ہیں، جو پنجاب کی مغربی حدود بناتا ہے۔ پنجاب کی حدود مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پنجاب کا مغربی حصہ پاکستان کے صوبہ پنجاب پر مشتمل ہے۔ اور مشرقی حصہ بھارت کے تین صوبوں ہماچل پردیش، پنجابی صوبہ اور ہریانہ صوبے پر مشتمل ہے۔ عہد مغلیہ سے قبل اور شہنشاہ اکبر سے پہلے تک اس علاقے کو صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ لیکن شہنشاہ اکبر کے دور سے پنجاب کا نام کثرت سے استعمال ہونے لگا۔

پنجاب کے مغرب میں تھل، جنوب میں چولستان کے صحرا ہیں۔ ہڑپہ اور ٹیکسلا کے کھنڈرات اس کی قدیم تہذیبوں کے امین ہیں۔ چار ہزار سال قبل مسیح میں یہاں دراوڑ قوم کی عظیم تہذیب موجود تھی۔ ہڑپہ کے کھنڈرات آج بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ [illegible] اڑھائی ہزار سال قبل مسیح میں آریہ پنجاب میں آئے اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم [illegible]۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات ان کی گواہی کے لیے موجود ہیں۔ ۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر اعظم [illegible] فتح کرنے کے بعد پنجاب کی طرف بڑھا۔ اور دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس کو شکست دے کر یونانیوں کا اقتدار قائم کیا۔ لیکن سکندر کی واپسی کے جلد ہی بعد چندر گپت [illegible] پنجاب سے نکال باہر کیا اور موریہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

پنجاب پر مسلمانوں نے پہلا حملہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں مہلب بن ابی صفرہ نے کیا اگرچہ اس حملے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا لیکن ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں محمد بن قاسم نے پنجاب کے جنوب مغربی حصے کو اسلامی قلمرو میں شامل کر لیا اور محمود غزنوی کے پنجاب پر حملے کے وقت تک ملتان پر عربوں کا قبضہ رہا۔ اگرچہ پنجاب میں مسلمانوں کا صحیح طور پر قبضہ محمود غزنوی کے دور میں ہوا۔ جب ۳۹۲ھ/۱۰۰۱ء میں محمود نے جے پال کو شکست دے کر دریائے جہلم کے کنارے ہند پر قبضہ کر لیا۔ لیکن پنجاب کے ہندو حکمرانوں کے آئے دن کے حملوں کا خاتمہ کرنے کے لئے محمود نے پنجاب کا الحاق ۴۰۳ھ/۱۰۲۲ء میں سلطنت غزنی سے کر دیا اور لاہور میں اپنے خادم خاص ایاز کو صوبیدار مقرر کیا۔

سلطان محمود غزنوی کے بعد اس کے جانشین پنجاب پر حکومت کرتے رہے۔ ۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا اور اس طرح پنجاب پر غوریوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ چنانچہ محمد غوری کی وفات کے بعد اس علاقے پر خاندان غلاماں حکومت کرنے لگا۔ قطب الدین ایبک اس خاندان کا پہلا خود مختار سلطان تھا۔ جس نے مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی۔

ایبک نے اپنا پایہ تخت دہلی کو بنا لیا۔ لیکن اسے اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے زیادہ تر پنجاب ہی میں رہنا پڑا۔ اس کی وفات بھی لاہور ہی میں ہوئی۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں بھی پنجاب کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی نے پنجاب پر لودھیوں کی عملداری قائم کی۔ ۱۵۲۴ء میں خاندان مغلیہ کے بانی بابر نے پنجاب آکر شاہی فوج کو شکست دی اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ سوری نے بھی پنجاب پر قبضہ کیا جسے ہمایوں نے ۱۵ سال جلاوطنی کے بعد دوبارہ اپنے تصرف میں لے لیا۔ اکبر کے دور حکومت میں پنجاب سیاسی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم تھا ایک حصہ براہ راست مغلوں کے کنٹرول میں تھا اور دوسرا حصہ جو

شاہ رکن عالم کا مزار ۔ ملتان

شمالی جانب تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں خود مختار راجاؤں اور سرداروں کے درمیان تقسیم تھا۔ لیکن اکبر کے عہد حکومت میں یہ تمام علاقہ سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا تھا۔ دور مغلیہ میں پنجاب میں سکھ ایک موثر اور مستحکم قوت بن گئے تھے۔

اورنگ زیب کے بعد سکھوں کا پنجاب میں بہت زور ہو گیا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں سکھوں نے رنجیت سنگھ کی قیادت میں پنجاب پر قبضہ کر لیا اور تقریباً ۴۰ سال تک پنجاب پر حکمرانی کرتے رہے۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا اور ۱۹۴۷ء تک پنجاب پر بھی انگریز کا اقتدار رہا۔ پنجاب سے جب سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کیونکہ سکھوں نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ رویہ اختیار کیے رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی نے مسلمانوں پر سے سکھوں کا ظلم ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے پنجاب مندرجہ ذیل قسمتوں اور اضلاع پر مشتمل تھا۔

۱۔ انبالہ جس میں انبالہ، شملہ، حصار، رہتک، کرنال، گوڑگانوں کے ضلعے شامل تھے۔

۲۔ جالندھر جس میں جالندھر، ہوشیار پور، کانگڑہ، فیروزپور، لدھیانہ کے اضلاع شامل تھے۔

۳۔ لاہور جس میں لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گورداسپور کے اضلاع شامل تھے۔

۴۔ ملتان جس میں ملتان، منٹگمری، لائلپور، جھنگ، مظفرگڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کے اضلاع تھے۔

۵۔ راولپنڈی جس میں راولپنڈی، جہلم، گجرات، سرگودھا، اٹک، میانوالی کے اضلاع شامل تھے۔

تحریک پاکستان میں پنجاب کے مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک پنجاب پر براہ راست سرکار برطانیہ کی حکومت رہی۔ لیکن مسلم لیگ کے ہلالی پرچم کو پنجاب کے مسلمانوں ہی نے سربلند رکھا۔ انگریزوں نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں مسلمانوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں خاکساروں پر سر عام گولی چلائی گئی۔ قرارداد پاکستان لاہور میں منظور ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں ایک بار پھر خاکساروں پر گولی چلی۔ پنجاب کے علماء، صوفیاء اور طلباء نے نظریہ پاکستان کی ترویج میں حتی المقدور حصہ لیا۔ اور جب ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا تو واہگہ اور گنڈا سنگھ والا کے راستوں سے پاکستان آنے والے لاکھوں مہاجرین کا خیر مقدم کیا۔

تقسیم کے وقت انبالہ اور جالندھر کے اضلاع کے علاوہ ضلع گورداسپور اور تحصیل چونیاں کا نصف حصہ بھارت کے علاقے میں چلا گیا، جسے مشرقی پنجاب کا نام دیا گیا۔ پاکستان میں موجود پنجاب کو ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو صوبہ پنجاب وحدت مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا اور یہ یکم جولائی ۱۹۷۰ء تک غیر صوبائی حیثیت کا حامل رہا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء اور نومبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ابتدائی اور اہم محاذ پنجاب ہی کی سرحد پر کھولے گئے تھے۔ ۱۹۷۰ء سے ایک بار پھر پنجاب کو اس کی صوبائی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ریاست بہاولپور اس صوبے میں ضم کر دی گئی اور لاہور اس کا صدر مقام ٹھہرا۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد بھی پنجاب میں راولپنڈی سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اسلامی کانفرنس بھی پنجاب (لاہور) میں منعقد ہوئی۔

پنجاب ہمیشہ اہل اللہ صوفیاء کرام کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ داتا گنج بخش، شاہ ابوالمعالی، پیر مکی، میاں میر، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، شاہ مقیم، بہاء الدین زکریا، شاہ شمس سبزواری، شاہ رکن عالم، بابا فرید، شاہ دولہ گجراتی، شاہ عنایت قادری، بلھے شاہ، سلطان باہو، شاہ جمال، مہر علی شاہ، شیخ قلندر شاہ سہروردی امام بری، سائیں شیر محمد، سید قطب علی شاہ اور سید محمد عبداللہ شاہ نے اسی سرزمین میں مشعل رشد و ہدایت روشن کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی سے اس خطہ کو منور کیا۔ آج بھی ان بزرگان دین کا فیض جاری ہے۔

اقتصادی اور دیگر معلومات: ۔ پنجاب ایک زرعی علاقہ ہے۔ ہند و پاکستان کے چھ مشہور دریا اس سرزمین کو سیراب کرتے ہیں۔ جن پر بند باندھ کر نہریں نکالی گئی ہیں، جو دنیا کا بہترین نظام آبپاشی کہلاتی ہیں۔ دنیا کے دو بڑے بند تربیلا اور منگلا ہیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں چھوٹے بڑے بند موجود ہیں، جو آبپاشی کے علاوہ برقی قوت بھی مہیا کرتے ہیں۔

پاکستان کے صوبہ پنجاب کی آبادی ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق تین کروڑ ساٹھ لاکھ اور بھارت کے صوبہ پنجاب کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے پاکستانی

پنجاب میں مسلمان پچانوے فیصد اور بھارتی پنجاب میں مسلمان صرف دس فیصد ہیں پاکستانی پنجاب کا صدر مقام لاہور اور بھارتی پنجاب کا چندی گڑھ ہے۔

مزار داتا گنج بخش، لاہور

پنجاب کی زرعی پیداوار میں گندم، مکئی، چاول، گنا اور کپاس سرفہرست ہیں مویشیوں میں گائے، بھینس، بیل، بکری، گدھا، گھوڑا، بھیڑیں، اونٹ اور خچر عام پائے جاتے ہیں۔ پنجاب کا تقریباً دس فیصد رقبہ صحرا، دس فیصد سطح مرتفع اور پانچ فیصد جنگلات پر مشتمل ہے۔ جہاں سے عمارتی اور پختہ قسم کی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ درختوں میں شیشم، کیکر، چیل، دیودار وغیرہ اہم ہیں۔ نیز دیکھیے "بھارت" "پاکستان"، "پنجابی")

پنجابی پنجاب کے باشندوں کی زبان، جو دہلی سے لے کر خیبر تک اور پشاور و ڈیرہ اسماعیل خان سے لے کر جموں و کشمیر تک کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اگرچہ اس زبان کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے جو دراصل اس کی مختلف بولیاں ہیں۔ مثلاً جھنگیالی، پوادھی، دوآبی، بالوی، پہاڑی، سرائیکی، ریاستی، ملتانی، چھاچھی پوٹھوہاری، شاہ پوری، ماجھی، ہندکو وغیرہ ہیں۔ تاہم ادبی اظہار کے لئے ایک ہی ٹکسالی زبان استعمال کی جاتی ہے جو لاہوری اور سرائیکی کے مابین ہے۔

اس زبان کے لئے پنجابی کا لفظ ۱۰۸۰ ھ ۱۶۵۰ء میں حافظ برخوردار نے اپنی مرتبہ "مفتاح الفقہ" میں استعمال کیا ہے۔ پنجابی کی ابتدا اور بناوٹ کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے بقول باوا بدھ سنگھ "پنجابی کا جسم سنسکرتی ہے لیکن اس کا لباس بدلتا رہتا ہے۔ جب سنسکرت بگڑی تو پراکرت بنی اور پراکرت سے اپ بھرنش اور اس سے پنجابی۔"

یہ چونکہ ایک وسیع خطے کی زبان ہے اور یہ بات ایک حقیقت ہے کہ جو زبان جتنی زیادہ جغرافیائی رقبہ رکھتی ہوگی تو اس کے لہجے اور محاورے میں اتنا ہی فرق ہوگا۔ اسی فرق کی وجہ سے موجودہ دور میں ان الگ الگ محاوروں کو الگ الگ زبانوں کا نام دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جنہیں دراصل بولیاں کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مسلمان صوفیاء اور علماء نے عوام میں اسلام کی تبلیغ کے لئے پنجابی کو اپنایا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ خالص دینی اور صوفیانہ تصانیف سے بڑھ کر ادبی کتابوں تک جا پہنچی۔ پنجابی زبان کو پانچ مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادوار مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ۱۵۲۶ء سے قبل کا دور۔
۲۔ باباگرونانک کا دور۔
۳۔ ۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء تک کا دور۔
۴۔ ۱۷۰۷ء تا ۱۸۴۹ء تک کا دور۔
۵۔ ۱۸۴۹ء کے بعد کا دور۔

موہن سنگھ نے پنجابی ادب کا آغاز ناتھ جوگیوں سے کیا ہے۔ موہن سنگھ کی [illegible] میں قدیم پنجابی وہی اپ بھرنش ہے جو پٹ چی کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور [illegible] پنجابی ادب میں جوگیوں اور مسلمانوں دونوں کا حصہ ہے۔ جوگی شعراء میں [illegible] گورکھ ناتھ، چرپٹ ناتھ، پورن بھگت [illegible] ناتھ اور [illegible] مسلمانوں میں مسعود سعد سلمان، بابا فرید شکر گنج [illegible]

دوسرا دور بابا گورونانک گلت [illegible]
۱۵۳۸ء تک کا ہے۔ بابا نانک [illegible]
مستند شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے [illegible]
تعلیمات کو پنجابی نظم میں ڈھالا [illegible]

تیسرے دور میں پنجابی [illegible]
مشہور ہیں۔ دمودر، پیلو، سلطان باہو [illegible]
سچل شاہ، عبداللہ لاہوری، درویش محمد [illegible]
بھٹو، عبدالرحمان منہاس، حکیم [illegible]

پنجابی ادب کا چوتھا دور [illegible]
ہے۔ اس دور میں پنجابی نثر کا آغاز ہوا [illegible]
اس دور میں علمائے دین نے [illegible]
زبان کے قواعد لکھے گئے [illegible]
کی ہے۔ اس [illegible]
مجھے شاہ، علی [illegible]
پنجابی [illegible]
عجائب القصص [illegible]
[illegible]

[illegible]

غلام رسول کی حسن القصص [illegible]
صاحبان، میر شہاب الدین، فیروز دین شرف، بابا [illegible] استاد کلام۔

سائیں مولا بخش، عشق لہر، سوختہ امرتسری، مولا بخش کشتہ، عبدالغنی وفا، لال دین قیصر، فیروز سائیں عارف، جوشوا فضل دین، استاد دامن کی شاعری اہم ہے دوسری جدید روایت جو انگریزی اور اردو ادب کے زیراثر ہے اور جس کی وجہ سے پنجابی شاعری میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عالمی ادب میں مختلف ادبی تحریکوں کی وجہ سے وجود میں آئی تھیں۔ ان جدید شعراء میں معمر لوگ بھی شامل ہیں اور نوجوان بھی۔

قدیم پنجابی ادب پر مذہبی خصوصاً اسلامی رنگ غالب ہے۔ لیکن دورِ جدید میں بھی اس میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ حافظ محمد لکھوی نے تفسیر محمدی کے نام سے قرآن مجید کا منظوم پنجابی ترجمہ مع تفسیر اور "انواع" مولوی بارک اللہ، "انواع محمدی"، "احوال الآخرت"، "زینت اسلام" اور "سیف السنۃ" لکھیں، مولوی حبیب اللہ فیروز دین نے "تفسیر قرآن" لکھی۔ میاں جان نے "تیسویں پارے"، مولوی نور محمد نے "سورۃ الملک" غلام کبریا اور ظہور الدین اکمل نے "سورۃ رحمٰن"، عبدالکریم قریشی نے "سورۃ الفاتحہ"، مولوی محمد عالم نے "سورۃ اخلاص، فیل، کہف، ضحیٰ، کوثر" کی حیات محمد واعظ نے "نویں پارے تک" اور محمد علی فائق نے نویں پارے سے تیسویں پارے تک "تفاسیر" لکھیں۔

پنجابی ادب کی دوسری دینی تصانیف میں ظہور الدین اکمل کی "شرح کافیہ" صوفی محبوب عالم کی "ستر المومنات"، "ترتیب الصلوٰۃ"، "شرح قصیدہ مالی" ... "ہدایت نامہ و عقد نامہ"، "آداب الفقرا"، نجم الدین فائز کی "کتاب المناقبات"، عبدالکریم قریشی کی "روح المیلاد فی ذکر المیلاد"، "صلح نامہ حدیبیہ" "تاریخ فتح مکہ" نور الحسن خام کی "ستر النساء"، مولوی دلپذیر بھیروی کی "قصص المحسنین"، "وعظ دلپذیر"، "گلزار چہار یار"، "انواع دلپذیر" میاں محی الدین مہدی کی "فقہ اکبر رد تقلید"، "شرح نجات المومنین"، امام الدین واعظ کی "حقوق الزوجین"، عبدالکریم مصیانوی کی تصنیف "نجات المومنین" جس کی شرح میر سید مخدوم نے لکھی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کے نثر میں بھی ترجمے ہوئے جن میں سے نبی بخش حلوائی، عبداللہ چکڑالوی، میاں محمد جیو کے ترجمے خاص طور پر مشہور ہیں۔

... دور میں معیاری پنجابی ادب کو ترقی دینے کے لیے باقاعدہ ادبی محفلیں اور تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں۔ ماہنامہ "پنج دریا" اور "پنجابی ادب" اس کی ترویج و اشاعت کے لیے میدان عمل میں ہیں۔ پنجابی کی مقامی بولیوں میں سرائیکی نے اپنی علیحدہ ادبی حیثیت حاصل کر لی ہے اور یوں رفتہ رفتہ پنجابی زبان صرف لاہور ہی تک محدود ہو رہی ہے۔

پنج پیر پاک و ہند میں پانچ پیروں کا عقیدہ، جسے پانچ پیر اور پنج کڑی بھی کہتے ہیں ان پڑھ مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ عام ہے۔ یہ ترکیب غالباً ہندی مسلمانوں ہی نے وضع کی ہے تاکہ پنجتن کے ساتھ پنجکڑی بھی مماثل ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے تن کو پیر سے بدل دیا۔

پنج پیر یا پانچ پیروں کا صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا کہ اس مجموعے میں کون کون سے بزرگ شامل ہیں۔ کیونکہ مختلف مقامات میں اس ترکیب میں مختلف بزرگ شامل ہیں۔ مثلاً پنجاب میں اس پنج کڑی میں خواجہ قطب الدینؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، نصیر الدین ابوالخیرؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ شامل ہیں۔ ایک دوسری ترکیب میں بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، شاہ رکن عالمؒ، شمس تبریزؒ، جلال مخدومؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ شامل ہیں۔

پنج پیر کے نام سے ایک پہاڑی پاکستان کے صوبہ سرحد میں یوسف زئی کے علاقے میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی سطح سمندر سے ۲۱۴۰ فٹ اونچی ہے۔ اس کی چوٹی ۴۹۰ فٹ ہے جہاں پر پنج پیر کی زیارت ہے۔ یہ مقام ہندوؤں اور عام مسلمانوں کی عقیدت گاہ ہے۔ ہندو اسے پانچ پانڈوؤں سے نسبت دیتے ہیں۔ اسی طرح ضلع ہزارہ میں ایبٹ آباد کے مقام پر ایک تکیہ پنج پیر کے نام سے موجود ہے۔

آج سے تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے بنگال میں ان پڑھ مسلمانوں اور نیچی ذات کے ہندوؤں میں پنج پیروں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں جگہ جگہ پنج پیروں کی درگاہیں ہیں۔ آج کل بھی لوگ ان درگاہوں کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس علاقے کے ملاح آج بھی کشتی پانی میں ڈالنے سے پہلے ایک نعرہ "اللہ، نبی، پنج پیر بدر بدر بدر" لگاتے ہیں وہ مشہور بزرگ بدر کو پنج پیروں میں سب سے بلند درجہ دیتے ہیں اور سمندر یا دریا کے راستے جب کبھی کوئی طویل یا خطرناک سفر درپیش ہوتا ہے تو یہ ملاح مندرجہ ذیل دعا مانگتے ہیں۔ جس میں پنج پیروں سے ارادت کا اظہار ہوتا ہے

"ہم تو بچے ہیں،
لیکن غازی (پیر) ہمارے نگہباں ہیں۔
ہمارے سامنے گنگا دریا ہے۔
پانچ پیرو ہم آپ کو پکارتے ہیں۔
بالخصوص آپ کے سردار بدر کو۔"

پنج پیر کے عقیدے کے حامل لوگوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ یہ پیر اگرچہ جسمانی طور پر انتقال کر گئے ہیں لیکن روحانی طور پر زندہ ہیں اور مافوق الفطرت قدرت رکھتے ہیں۔ اس قدرت کی وجہ سے وہ اپنے ماننے والوں کی مدد کرتے ہیں۔

بہار اور مغربی بنگال میں اس خیال کے لوگ اپنے گھروں میں ایک کمرہ مخصوص کر لیتے ہیں۔ کمرے کے شمال مغربی گوشے میں ایک چوکی پر چھوٹا سا چبوترہ ان کی نمائندگی کرتا ہے۔ چبوترے کے قریب چوکی پر ٹین کا ایک پنجہ جس پر پانچ انگلیوں کے نشان پنج پیروں کی نمائندگی کرتی ہیں رکھا ہوتا ہے۔ اس چبوترے پر چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔

اسلام میں اس طرح کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان شرفا اور اونچی ذات کے پڑھے لکھے ہندو پانچ پیروں کی پوجا نہیں کرتے جدید دور میں رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ختم ہو رہا ہے۔

پنج تن عام طور پر اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ ہیں۔ عام مسلمان خصوصاً اہل تشیع مختلف حاجات اور ضروریات میں انہیں وسیلہ خیال کرتے ہیں اور پنجتن پاک کے نعرے سے تقویت اور مدد حاصل کرتے ہیں۔

پنج دِہ سوویٹ روس کی جمہوریہ ترکمان میں ایک گاؤں، ایک سرسبز قطعہ جو رود کشک کے مشرق میں، کشک اور مرغاب کے سنگم پر واقع ہے۔ اس علاقے کے باشندے چند قبیلوں میں تقسیم تھے۔ اس علاقے کو ۱۸۰۵ء کے ایک دردناک حادثے سے جو پنج دہ حادثہ کے نام سے مشہور ہے شہرت حاصل ہوئی۔ اس معرکہ میں افغان فوج نے روسی فوج کے ہاتھوں بہت زیادہ نقصان اٹھایا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں جمشید اور ہزارہ قبائل آباد تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب مرو پر روس کا قبضہ ہو گیا تو روس اور برطانیہ میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ اس بات چیت کے نتیجے میں افغانستان کی شمالی حد کے تعین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ روسی اس بات پر مصر تھے کہ پنج دہ کے باشندے آزاد ہیں۔ جبکہ انگریزوں کا موقف یہ تھا کہ وہ افغانستان کی رعایا ہیں۔ ۱۸۵۷ء

میں ارساری قبیلے کے لوگ یہاں سے نقل مکانی کر گئے اور ان کی جگہ سرک ترکمانوں نے لے لی۔ اگرچہ یہ علاقہ کئی قبائل کے قبضے میں رہا لیکن تمام کے تمام قبائل اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ وہ افغانی علاقہ میں تھے اور حکومت افغانستان کو خراج دیتے تھے انگریزوں کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ بادغیس کا علاقہ ایک عرصے تک افغانوں کے پاس رہا تھا۔ چنانچہ جب امیر عبدالرحمان کی افغان محافظ فوج نے پنج دہ پر قبضہ کیا تو روسی حکومت نے فوراً احتجاج کیا۔ اسی عرصے میں افغانستان کی شمالی حد کے تعین کے لیے لندن میں گفت و شنید ہو رہی تھی، افغانستان کی سرحد پر کئی واقعات پیش آئے۔ ۲۹ مارچ ۱۸۸۵ء کو روسیوں نے افغان سرحد پر حملہ کر دیا۔ جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا لیکن یہ طے پایا کہ افغانستان پنج دہ کا علاقہ روس کو دے کر اس کے بدلے ذوالفقار کا علاقہ لے لے۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں حد بندی مکمل ہو گئی اور روس اور افغانستان کے درمیان ایک معین سرحد تسلیم کر لی گئی۔

پنگولو لغوی معنی سربراہ، مکھیا اور کارفرما کے ہیں سابق جزائر شرق الہند میں پنگولو دینی وغیرہ دینی امور کے ناظم اعلیٰ کو کہتے تھے۔ لیکن جزائر جاوا اور مادورا میں مسجد کے ایک عہدے دار کو یہ نام دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں مذہب کے سرکاری نمائندوں کی تنظیم مقامی انتظامیہ کے عملے کی طرح کی جاتی تھی۔ اور پنگولو اپنے علاقے کا حاکم ہوتا تھا۔ نائب حکومت جو سب سے اعلیٰ انتظامی حاکم ہوتا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو پنگولو ہوتا تھا۔ مسجد کے عمال کی بھی درجہ وار طبقہ بندی ہوتی تھی۔ ولایت کے صدر مقام کا پنگولو تمام علاقے کی مساجد کے تمام عملے کا صدر ہوتا تھا۔ دیہات میں نماز وغیرہ کا انتظام کرنے والا بھی گاؤں کی حکومت کا ایک رکن ہوتا تھا۔

اس عہدے پر تقرری قائم مقام حکمران کرتا تھا اور ریاستوں میں ان کا تقرر والیان ریاست کرتے تھے۔ لیکن ریاستوں میں بھی ان کے فرائض وہی تھے۔

پنگولو کے فرائض مختلف جگہوں پر مختلف تھے۔ اس کے ذمے نکاح کا انتظام بھی ہوتا تھا جو اس کی موجودگی میں ہوتا تھا۔ طلاق و رجوع کا فیصلہ کرنا بھی اسی کے ذمے تھا بعد ازاں ان تمام کاموں کی فیس مقرر کی گئی جو پنگولوں اور اس کے عملے کی آمدنی کا بڑا حصہ تھیں۔ زکوٰۃ بھی پنگولوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھی۔ صدر مقام کا پنگولو قاضی کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔ جزائر شرق الہند ولندیزی مقبوضات کی رو سے پنگولو کی حاضری کو عدالت میں اس وقت لازمی قرار دیا گیا تھا۔ جب مسلمان دیوانی اور فوجداری مقدمات میں بطور ملزم سرکاری عدالتوں میں حاضر ہوتے تھے۔ ان امدادی پنگولوں کی تعداد ہر عدالت کی ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی تھی۔

پوپ لاطینی لفظ ہے جس کے معنی باپ کے ہیں۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں پوپ کا خطاب کسی بھی پادری کے لیے استعمال کر لیا جاتا تھا۔ لیکن بعد ازاں یہ لقب روم کے بشپ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ اہل برطانیہ میں عیسائیت کی ترویج کے فرائض روم کے عیسائی پادریوں نے سرانجام دیے تھے چنانچہ جوں جوں برطانیہ میں عیسائیت کو غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ ایسے ہی ان پادریوں کو بھی عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی چلی گئی اور ان کا تقدس بڑھتا چلا گیا۔ پاپائے روم اہل برطانیہ کا سب سے بڑا روحانی پیشوا بن گیا۔ اور جب روم میں کلیسا نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا تو برطانیہ میں بھی پاپائے اعظم کی دھاک بیٹھ گئی۔

قرونِ وسطیٰ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہو گئی۔

ایک طرف تو سیاسی قوت تھی اور دوسری طرف مذہبی اثر اور دولت، ان چیزوں نے کلیسا کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا اور ہر شخص نہ صرف کلیسا کا محتاج اور اسی کے رحم و کرم پر تھا بلکہ شاہی دربار کے احکام و قوانین بھی کلیسا ہی کی وساطت سے طے پاتے تھے۔ نیز جب بہت سی وحشی اقوام مثلاً گوتھ، ہنس، گال، فرنگ وغیرہ نے رومی پوپ کے ذریعے عیسائیت قبول کی تو اس سے پوپ کی قوت میں خاصا اضافہ ہوا۔ پورا یورپ پوپ کے زیر اثر آ گیا۔ دینی اور دنیوی طاقت کا منبع پوپ ہی کی ذات تھی۔ اس لیے اسے غیر محدود اختیارات حاصل ہو گئے اس کی نافرمانی کو ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا۔ پوپ کی ہر بات قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور جو اس کی حکم عدولی کرتا تھا اسے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن پوپ نے اس قوت، دولت اور اثر کا زیادہ بہتر استعمال نہ کیا وہ حضرت مسیح کی سادہ اور بے تکلف زندگی چھوڑ کر عیش و عشرت میں کھو گئے۔ دولت حاصل کرنے کے [illegible] طرح کے ذرائع اختیار کیے۔ یہاں تک کہ پوپ نے جنت کے [illegible] شروع کر دیے۔

پوپ کی قوت کا استعمال صرف یہ رہ گیا کہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے [illegible] اور ان اختلافات میں اس درجہ بڑھ گئے کہ معمولی سا اختلاف رکھنے والوں کو موت کی سزا دے دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے خاص عدالتیں [illegible] احتسابی عدالت کہا جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق [illegible] ان عدالتوں نے تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار افراد کو مختلف [illegible] صرف ۳۲ ہزار وہ تھے جنہیں زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔ [illegible] ان میں گلیلو جیسے ماہر سائنسدان بھی شامل تھے۔

عوام پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے تو ان میں پوپ کے خلاف [illegible] نے جنم لیا۔ اور ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے پوپ کے [illegible] چلائیں۔ ان لوگوں میں پیٹر والڈو، جان ٹولر، مارٹن لوتھر جیسے [illegible] عوام کو پوپ کے اقتدار سے نجات دلائی۔ نیز دیکھیے [illegible]

پوپر سینٹ ولیم پوپر ایک بلند پایہ مستشرق [illegible] نیویارک میں جامعہ کولمبیا میں پروفیسر گوٹائل سے [illegible] میں پروفیسر نولڈکے جیسے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ مشرقی ممالک [illegible] کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب وطن [illegible] شروع کیا۔ ۱۹۲۲ء میں سامی زبانوں کے پروفیسر [illegible]

پروفیسر پوپر کو عربی زبان پر بہت [illegible] حاصل تھا۔ [illegible] کے عہد سے بہت زیادہ دلچسپی تھی [illegible] مؤرخ تھا کی دو کتابوں النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ [illegible] کو بڑی محنت اور کاوش کے بعد شائع کیا۔ اس نے [illegible] اسے اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے [illegible] ولندیزی مستشرق یون بول نے النجوم الزاھرۃ کی اشاعت شروع کی تھی [illegible] دو جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ پوپر نے اس کام کو پایہ تکمیل [illegible] ۱۹۲۰ء تک یہ کتاب متواتر برل کے مطبع خانے سے بالاقساط شائع ہوتی رہی دوسری کتاب حوادث الدھور مسلسل دس بارہ سال کے عرصے میں چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔

پوکاک (۱۶۰۴ء - ۱۶۹۱ء) ایڈورڈ پوکاک انگلستان کا ایک مشہور عربی دان مستشرق

اس کا باپ ایک پادری تھا۔ پوکاک نے اپنی ابتدائی عمر ہی سے عربی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ تکمیل تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی سے کی۔ اسے ولیم بیڈویل جیسے فاضل اساتذہ کی شاگردی نصیب ہوئی۔ ۱۶۳۰ء میں پوکاک نے مشرقی ممالک کا سفر کیا۔ پانچ سال حلب (شام) میں گذارے اور یہاں کئی ایک علماء سے دوستی قائم کی نیز شیخ فتح اللہ سے عربی کی تحصیل کی۔

۱۶۳۶ء میں وطن واپس آئے تو آکسفورڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے عربی کی ایک مسند قائم کی اور پوکاک کو [illegible] دی۔ چنانچہ پوکاک نے اپنے افتتاحی خطاب میں عربی زبان [illegible] کی اہمیت اور ان کے مطالعے کی ضرورت پر زور دیا۔

۱۶۳۷ء [illegible] پوکاک دوبارہ مشرقی ممالک کے دورے پر نکلا اور اس مرتبہ [illegible] حاصل کیں۔ ۱۶۴۱ء [illegible] دوبارہ آکسفورڈ واپس آیا اور [illegible] یونیورسٹی میں علمی کاموں میں صرف کر [illegible] علمی خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے [illegible] ان پر لسانی ادبی اور تاریخی حواشی لکھے [illegible] کا ترجمہ کیا اور اس پر تبصرہ لکھا۔ [illegible] "مختصر فی الدول" کی تاریخ کا متن ترجمے کے

[illegible] کارناموں کی شہرت سن کر دور دراز کے لوگ عربی علوم کی [illegible] آکسفورڈ آنے لگے۔

[illegible] اولاد کے چودہ بیٹے چھوڑے تھے۔ اس کے بڑے لڑکے نے [illegible] نقش قدم پر چل کر عربی علوم میں تخصص حاصل کیا۔ پوکاک کی وفات [illegible] سارا ذخیرہ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں منتقل ہو گیا۔

[illegible] مشرقی یورپ کا ایک جمہوری ملک جہاں کچھ عرصہ تک مسلمانوں کی عملداری [illegible] کے شمال میں بحیرہ بالٹک اور جنوب میں سوڈیٹن اور کارپاتھین [illegible] نکلنے والے دریا وسچولا، وارٹا اور اوڈر وغیرہ بحیرہ بالٹک میں گرتے [illegible] ہے اور زمین کے ستر فیصد رقبے پر کاشت ہوتی ہے۔ [illegible] سے اس ملک نے صنعت و حرفت اور جہاز رانی میں [illegible] کئی بندرگاہیں ہیں جن میں ڈنزگ مشہور ترین ہے۔

[illegible] میں پولینڈ اور لتوانیا متحد تھے یہی وجہ ہے مسلمانوں کی تاریخ میں لتوانیا [illegible] ذکر [illegible] کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی کے آخر میں اردوئے مطلا کے [illegible] مسلمانوں نے لتوانیا میں آکر سکونت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس دور میں مسلمانوں [illegible] یہاں کے لوگوں کا رویہ بھی خوانانہ تھا۔ مسلمانوں کو نہ صرف مکمل مذہبی آزادی [illegible] بھی [illegible] مراعات بھی دی گئی تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کی تاریخ شروع زمانے [illegible] پولینڈ کی تقسیم تک لتوانیا کے ساتھ وابستہ رہی اسی وجہ سے انہیں لتوانیا [illegible] تاتار کا نام دیا گیا ہے۔

۱۳۸۶ء میں پولینڈ اور لتوانیا کا آپس میں ادغام ہو گیا تو پولینڈ کو بہت زیادہ شہرت حاصل [illegible] یہ ایک جاگیردارانہ وفاق تھا اور یہاں کے باشندوں کو مکمل مذہبی آزادی [illegible] تھی اور یہی وجہ تھی کہ یہ روسی ریاستیں لتوانیا کی جانب خاص طور پر کشش رکھتی تھیں اور لتوانیا کو التون اردو پر ترجیح دیتی تھیں۔ اس زمانے میں لتوانیا ایک بڑی ریاست تھی جو گالیشیا کو چھوڑ کر سارے مغربی روس میں پھیل چکی تھی تاتاریوں کی لتوانیا میں موجودگی کا تذکرہ سب سے پہلے پولینڈ اور لتوانیا کے

ادغام کے وقت ملتا ہے۔ بقول ماکوفسکی جو ایک پولستانی مورخ تھا "لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک کے جلو میں اس کے ذاتی محافظ فوجی سپاہیوں میں ایک تاتاری دستہ بھی ہوتا تھا۔"

۱۳۹۵ء میں تقتیمس نے امیر تیمور سے آخری شکست کھائی تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت لتوانیا آکر پناہ گزیں ہوا۔ تاریخی اعتبار سے لتوانی تاتاریوں کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آلتون اردو کی یادگار ہیں۔ لتوانیا میں تاتاری سولھویں صدی کے آخر تک لتوانیوں کے [illegible] سے مستفید ہوتے رہے۔ انہیں مکمل مذہبی آزادی تھی مساجد کے لیے امام اسلامی ممالک سے بلائے جاتے تھے۔ حج پر جانے کی اجازت تھی۔ [illegible] معاملات میں انہیں قانون شریعت پر عمل کرنے کا حق تھا۔ ایسے مقدمات [illegible] تھے جو اکثر مساجد کے امام ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنی مرضی سے اسلامی عدالتوں کے بجائے ملک کی عام عدالتوں سے بھی رجوع کر سکتے تھے۔ جہاں لتوانی قانون رائج تھا۔ آلتون اردو سے ترک وطن کر کے لتوانیا میں آکر بسنے کے بعد انہیں ان جائدادوں کے برابر جاگیریں دی گئیں جو وہ اپنے وطن میں چھوڑ کر آئے تھے۔ سترہویں صدی میں جب یہ خاندان ختم ہوا تو تاتاریوں پر مظالم بھی شروع ہو گئے۔ مساجد کی تعمیر ممنوع ہو گئی۔ تاتاریوں پر ۱۶۵۵ء تا ۱۶۶۰ء کا دور بڑا مشکل دور تھا جبکہ ولنو پر ماسکو کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور پولینڈ پر سویڈن نے حملہ کر دیا۔ اس دوران میں بہت سے تاتاری بھاگ کر ترکی میں پناہ گزین ہو گئے۔ جب پولینڈ کی صورت حال بحال ہو گئی تو ان میں سے کچھ واپس بھی چلے گئے۔ البتہ اس دور میں تاتاریوں کی

ٹاؤن ہال پوزنان (پولینڈ)

تعداد کافی حد تک کم ہوگئی۔ ۱۷۰۳ء کی خانہ جنگی کے دوران میں بھی ترکی کی طرف انکی نقل مکانی کا پتہ چلتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں جب پولینڈ میں باقاعدہ فوج رکھی گئی تو تاتاریوں کی ایک بڑی تعداد اس فوج میں شامل تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جرنیل ایک تاتاری تھا۔ پولینڈ کے آخری بادشاہ سٹینسلاس آگسٹس نے تاتاریوں کے پرانے امتیازات بھی بحال کردیئے۔ ۱۷۹۴ء میں جب پولینڈ آخری بار تقسیم ہوا تو تاتاری روس کے ماتحت آگئے۔ یہاں کی ملکہ کیتھرائن دوم نے بھی وسیع مذہبی رواداری کا ثبوت دیا۔ اس نے انھیں پولینڈ کا ساتھ دینے کی ترغیب دی اور ۱۷۹۴ء میں ایک فرمان کے ذریعے اس نے اپنی سلطنت کی ملکی اور فوجی تمام ملازمتوں کے دروازے تاتاریوں کے لیے کھول دیئے۔ اس کے بیٹے پال اول نے ۱۷۹۷ء میں سواروں کا ایک دستہ قائم کیا۔ جس میں صرف تاتاری ہی شامل تھے چنانچہ اس دور میں تاتاریوں نے تعلیم کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہ دی اور فوجی ملازمت کو ترجیح دی۔ اس بات کا ثبوت پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں ملتا ہے جس میں روسی فوج میں بیس تاتاری جرنیل تھے۔ چھوٹے افسروں اور سپاہیوں کا تو شمار ہی مشکل ہے۔ ۱۸۶۳ء تک تاتاریوں پر پولستانی تہذیب غالب تھی جب وہ روس کے تحت آگئے تو روسی اثرات قبول کرنا شروع کردیئے۔ ان کی زبانیں بھی دو ہوگئیں ایک پولستانی اور دوسری روسی۔

سولھویں صدی میں تاتاریوں کی تہذیب خاصی بلند تھی جس کا پتہ مذہبی ادب سے چلتا ہے جو سفید روسی اور پولستانی زبان میں عربی رسم الخط میں تھا۔ اس ادب میں عربی زبان وخط سکھانے کی کتابیں قرآن مجید کے تراجم وتفاسیر، سیرۃ النبی، کتب تاریخ ودینیات پر کتابیں تھیں۔
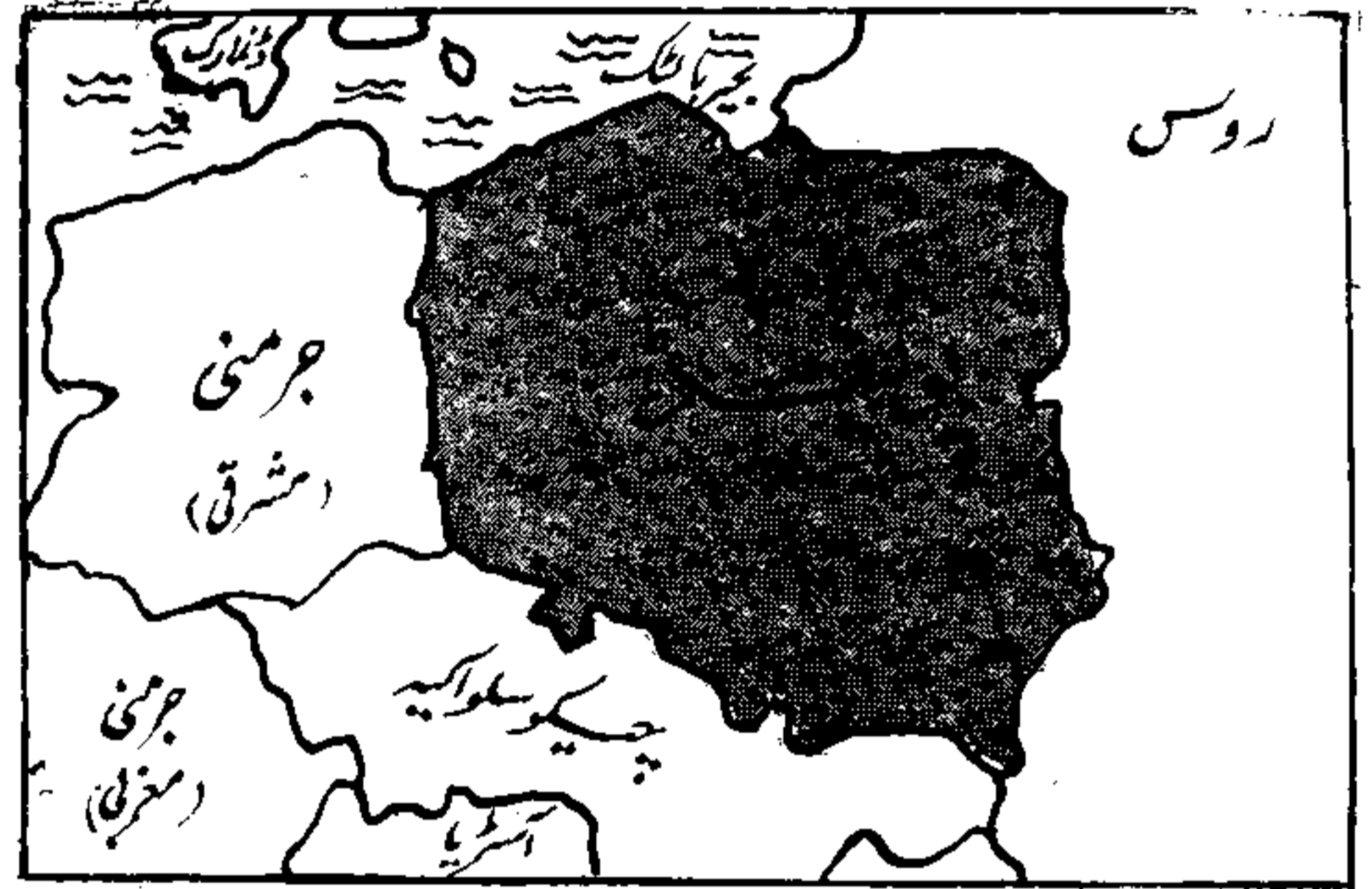
سترہویں صدی کے ہنگاموں کے بعد سے بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کا معیار تہذیب گرنا شروع ہوگیا۔ اب مسلمانوں کے امام بہت کم تعلیم یافتہ رہ گئے جو صرف نماز پڑھا سکتے تھے۔ چنانچہ نوجوان مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی۔ جب ۱۹۱۹ء میں پولینڈ کا دوبارہ احیاء شروع ہوا تو مسلمانوں کا معیار تہذیب بھی بلند ہونے لگا۔ حکومت نے قدیم رواداری پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کو مکمل آزادی دے دی۔ ۱۹۲۵ء میں یہاں کے مفتی یعقوب شنکیویچ کو مسلمانوں کا صدر مقرر کرکے مکمل طور پر اندرونی خودمختاری عطا کردی گئی۔ مسلمانوں کو انتظامی اور فوجی ہر محکمے میں پوری مساوات کے ساتھ قبول کیا جاتا تھا۔ وارسا کی جدید اشتراکی حکومت نے روس سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت ان تاتاری مسلمانوں کو پولینڈ کی رعایا بن جانے کا حق مل گیا۔

پولینڈ اور لتوانیا نے متحد ہو کر امیر تیمور کے خلاف قدم اٹھایا تو ان کے لیے عثمانی ترکوں کے دل میں ہمدردی پیدا ہوگئی اور یہ ہمدردی آگے چل کر مفادات کے اشتراک کی وجہ سے عثمانی ترکوں اور ان کے درمیان باہمی دوستی کا رنگ اختیار کرگئی۔ چنانچہ عثمانی ترکوں نے ہر مشکل اور آڑے وقت میں اس دوستی کو نبھایا اور ترکیہ پولینڈ کا واحد مددگار رہا۔ اگرچہ پولینڈ کا ترکیہ کے ساتھ ایک جیسا سلوک نہیں رہا۔ لیکن ترکیہ والوں پر اس چیز کا اثر بہت کم ہوا۔ یہاں تک کہ جب ۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۴ء روس

وارسا میں شاہی محل اور شاہی چوک

اور ترکی میں جنگ ہوئی تو پولینڈ اس میں عملاً شریک نہیں ہوا۔ ترکوں کو اس جنگ میں شکست ہوئی اور پولینڈ کے بھی ٹکڑے ہوگئے۔ لیکن ترکی دنیا کا واحد ملک ہے جس نے پولینڈ کی اس تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ۱۹۱۹ء میں پولینڈ کا احیاء ہوا تو ترکی کے اس سے دوستانہ تعلقات دوبارہ استوار ہوگئے۔

پولینڈ کا رقبہ ۱۲۰۶۲۴ مربع میل (۳۱۲۶۷۷ مربع کلومیٹر) ہے۔ یہ ۱۷ صوبوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۹۷۴ء میں ۳۳۵۰۰۰۰۰ ہے۔

پونا بھارت کے صوبہ مہاراشٹر کا ایک شہر اور ضلع جو سطح سمندر سے ... بلند ہے اور بمبئی سے ۱۱۹ میل جنوب مشرق میں ہے۔ یہ ... کے سنگم پر واقع ہے۔ تیسری صدی عیسوی تک پونا دکن کی ... حکومت ... علاؤالدین خلجی اور تغلق حکموں کے بعد یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اور ... بعد سے مسلمانوں کے مقبوضات میں شامل رہا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت ... مرہٹہ قوت کو جو نشوونما ہوئی وہ اسی علاقے میں ہوئی اور تقریباً سو سال تک ... مرہٹہ طاقت کا مرکز رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اس علاقے پر ... کا قبضہ ہوگیا۔ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس پونا ہی میں ہوا تھا۔ پونا کی ... آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۸۵۳۲۲۶ تھی۔

پونا ضلع کا کل رقبہ ۶۰۲۲ مربع میل اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۲۴۶۵۰۸۰ تھی۔

پونا میں ایک یونیورسٹی ہے۔ کاغذ کا ایک بڑا کارخانہ اور کپاس کا ایک کارخانہ ...

پونتیاک انڈونیشی بورنیو میں دریائے کپواس کے ڈیلٹے کی ایک ریاست اور اس کے صدر مقام کا نام جو خط استوا پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۵۴ مربع کیلومیٹر ہے۔ شریف عبدالرحمان نے ۱۷۷۲ء میں شہر کی بنیاد رکھی اس

کے باپ شریف حسین نے ۱۷۳۵ء میں متن میں سکونت اختیار کی۔ بعدازاں وہ یہاں وزیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ عبدالرحمان ایک ڈیاک عورت کے بطن سے تھا اور اپنی ابتدائی عمر ہی سے باعزم اور باہمت تھا۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ سلطان اس کا مربی تھا لیکن اس نے پہلے میاوا اور اس کے بعد پلیم بنگ اور بنجرماسین میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور اسی وجہ سے بعد میں اسے یہ مقام چھوڑنا پڑا۔ میاوا اور بنجرماسین کی شہزادی سے شادی کرنے کی وجہ سے عبدالرحمان بہت دولت مند ہوگیا تھا دوسرے اسے میاوا میں کوئی کامیابی بھی نصیب نہ ہوئی تھی چنانچہ اس نے لنڈک اور کپواس کے سنگم کے دہانے پر ایک غیرآباد علاقے میں ایک شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔

یہ علاقہ تجارت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ بہت جلد اس شہر نے بوگنی، ملادی اور چینی تاجروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور بہت تیزی سے ترقی کی۔

عبدالرحمان نے تجارت پر مناسب محصول عائد کر کے اسے باضابطہ بنایا۔ رعایا کے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کا ایک سردار مقرر کیا۔ بعد میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بٹاویا میں متن سے مغربی بورنیو کے علاقے پر تمام حقوق خرید لیے تو عبدالرحمٰن سے اس کمپنی کے نمائندے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس نے پونتیاک اور سنگاؤ کی ریاستیں اسے بطور جاگیر عطا کردیں۔ ۱۷۷۲ء میں بوگنیوں کے سلطان راجہ حاجی نے اسے سلطان کا خطاب دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شریف قاسم ان ریاستوں کا سلطان بنا تو اس نے دربار کے عربی رسوم اور آداب کو جدید طریقوں سے بدلا۔

پونتیاک مسلمانوں کا شہر ہے اور اسی نسبت سے یہاں سے حاجیوں کی کافی تعداد حج کے لیے خانہ کعبہ جاتی ہے

آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ دوسرا بڑا ذریعہ روزگار جنگلات ہیں یہاں کی اشیائے برآمد میں ناریل۔ سیاہ مرچ، سالودانہ، ربڑ اور روغن ہیں جو سنگاپور اور جاوا کو بھی بھیجی جاتی ہیں۔ چاول، کپڑا اور دوسری چیزیں درآمد کی جاتی ہیں۔ تجارت پیشہ لوگ زیادہ تر چینی ہیں۔

پونتیاک کی سلطانی ریاست ولندیزیوں کی سیادت میں خودمختار تھی۔ ۱۸۵۵ء میں شرق الہند کی ولندیزی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت سلطان کو ایک مقرر رقم ملتی تھی اور ریاست کی عدالت اور پولیس کا انتظام سلطان کے ذمے ہوتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ولندیزی حکومت کے ساتھ ایک طویل معاہدے میں باہمی روابط کا نئے سرے سے تعین کیا گیا۔ یہاں کی آبادی ملادی، ڈیاک، فرنگی، چینی اور دوسرے باشندوں پر مشتمل ہے۔ ملاوی اصطلاح: عربی النسل، جاوی، بوگنی اور ڈیاک تمام مقامی مسلمانوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اندرون ملک کے ڈیاک ابھی تک غیرمسلم ہیں۔

پونتیاک ایک تجارتی مرکز کے علاوہ صحت افزا مقام بھی ہے اور مزید ترقی کر رہا ہے

پھل ثمر، میوہ جات جنکا ذکر قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الرحمٰن میں ہے۔

"زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لیے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔" (۵۵: ۱۰، ۱۱)

"دونوں باغوں میں دو چشمے رواں ہیں۔ اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔" (۵۵: ۵۰ تا ۵۲)

"ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار ہیں۔" (۵۵: ۶۸)

قرآن میں ایک اور جگہ جنت کے پھلوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔

"ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔" (۲: ۲۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جو پھل کھانے کو دیئے جائیں گے وہ کوئی اجنبی پھل نہ ہوں گے جن سے جنتی لوگ نامانوس ہوں بلکہ شکل و صورت میں انہی پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے جن سے وہ دنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وہ ان سے بدرجہا بڑھے ہوں گے۔ دیکھنے میں آم اور انار ہی ہوں گے جنہیں اہل جنت دیکھتے ہی پہچان لیں گے مگر مزے میں دنیا کے آموں اور اناروں سے کہیں زیادہ ہونگے کرہ ارض پر پھل سینکڑوں قسم کے ہوتے ہیں۔ موسم کے لحاظ سے بھی پھل کے مختلف انواع و اقسام اور مدارج ہوتے ہیں۔ انہیں نعمت خداوندی کہا جاتا ہے۔ غذائی اعتبار سے پھل اپنے اندر اعلیٰ درجے کی خوبیاں رکھتا ہے۔ یہ ایسی غذا ہے جس سے کوئی مضرت نہیں پہنچتی۔ حکماء نے مختلف پھلوں سے مختلف بیماریوں کے علاج بتائے ہیں۔

پیالہ پاشا (۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء) ایک عثمانی امیر البحر ٹولنا (ہنگری) میں پیدا ہوا۔ کروٹ نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ باپ کا نام عبدالرحمان تھا۔ وہ لڑکپن میں استانبول کی سرائے میں ایک خدمت گار کی حیثیت سے قپوجی باشی تک ترقی کر گیا۔

۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں امیر البحر بنا اور سنجق بے کا خطاب ملا۔ ۹۶۵ھ/۱۵۵۹ء میں اسے بلیربای کا عہدہ دیا گیا اور وزیر اعظم رستم پاشا کے بھائی سنان پاشا کے عہدے پر اس کی تقرری کی گئی۔

اس نے جربہ کی تسخیر اور دوسری بڑی بحری فتوحات کیں۔ سلطان سلیمان نے اس کی شادی اپنی پوتی جوہر سلطان سے کی اور اس کے پانچ سال بعد اسے اوچ طوغ ویزلک کے عہدے کے نشان سے نوازا گیا۔ اس دوران میں اس نے سمندر میں بہت سے معرکے سرانجام دیئے اور وہ عثمانی سلطنت کا عظیم ترین امیر البحر شمار ہونے لگا۔

پیالہ پاشا نے نیپلز کے گرد ساحل پر فرانسیسی سفیر دارامون کی شہ پر چھاپے مارے رجیو کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں البہ کا محاصرہ کیا مگر ناکام رہا۔ اس کے بعد الجزائر کی مستحکم بندرگاہ وہران کو فتح کر لیا اور اگلے سال بزنا کی بندرگاہ پر بھی قبضہ جما لیا۔ اس سے اگلے سال ڈیڑھ سو بادبانی جہازوں کے ساتھ جزیرہ میورقہ پر حملہ کیا۔ اور نیپلز کے قریب سورنتو کو جلا کر تباہ کر دیا۔ ۱۵۶۰ء میں اس نے سب سے بڑا بحری کارنامہ تسخیر جربہ سرانجام دیا۔ ۱۵۶۴ء میں ایک چٹانی جزیرہ نما ہسپانویوں سے لے لیا تاکہ مالٹا کی تسخیر کی تیاری کر سکے اگرچہ اس معرکے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۵۶۶ء میں جب سلطان سلیمان نے ہنگری پر چڑھائی کی تو پیالہ پاشا استنبول کی بندرگاہ کا نگران تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے وہ جزیرہ خیوس اور ساحل اپولیا پر حملہ کر کے جزیرے اور بندرگاہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس جزیرے کی فتح کے بعد پیالہ پاشا کو اس کے خسر سلیم ثانی نے امیر البحر کے عہدے سے سبکدوش کر دیا۔ کیونکہ اس پر الزام تھا کہ جزیرہ خیوس کے مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ اس نے خود رکھ لیا ہے۔ ۱۵۷۰ء میں پیالہ پاشا نے شاہی دربار میں دوبارہ اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے جزیرہ تینہ کو فتح کر کے اسے قبرص کی فتح میں شامل کر لیا۔

اس نے استنبول میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کی وسیع املاک کا ایک

حصہ شاہی خزانے میں لے لیا گیا اور بقیہ اس کی بیوہ اور بچوں کو دیا گیا۔
اسے استنبول کے محلہ قاسم پاشا کی مسجد میں جو خود اس نے تعمیر کرائی تھی دفن کیا گیا۔

پیر بابا (وفات ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء) سید علی غواص پیر بابا ابن سید قنبر علی پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک بزرگ، صوفی۔ وطن خندس تھا۔ والد شاہان وقت سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دنیاوی منصب وجاہ کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ دادا سید احمد یوسف بہت اونچے پائے کے بزرگ تھے جو خندس اور بدخشاں میں عوام کی رشد وہدایت میں مصروف رہے۔ پیر بابا کو بچپن میں ان کے گھر والے دیوانہ کہتے تھے۔ ان کے دادا کو ان سے خاص انس تھا۔

"تذکرۃ الابرار والاشرار" میں ان کا نسب نامہ اس طرح درج ہے۔ علی بن قنبر علی سید احمد نور بن یوسف نور بن محمد نور بخش ترمذی بن احمد بعیم بن براق بن احمد مشتاق بن شاہ ابو تراب بن حامد بن محمود بن اسحاق بن عثمان بن جعفر بن عمر بن محمد بن حسام بن شاہ ناصر خسرو بن امیر علی بن عبدالرحیم بن محمود مکی بن مہدی بن حسن عسکری بن علی نقی بن محمد تقی بن امام موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین بن علیؓ۔

ابتدائی تعلیم اپنے دادا سے حاصل کی اور شرح ملا جامی تک انہی سے تحصیل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ تصوف سے آگاہی بھی انہی سے حاصل کی اور سلسلہ کبرویہ میں اجازت لی۔

پیر بابا کے والد چونکہ دنیا دار انسان تھے اور انہیں شاہی دربار میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اکثر اپنے بیٹے کو شاہی لباس پہنا کر دربار میں لے جاتے تھے۔ پیر بابا کی طبیعت کو قرار نہ تھا چنانچہ ایک مدت بعد حصول علم اور روحانیت کی طلب میں پانی پت آئے اور شیخ شرف الدین بو علی قلندر کے مزار پر حاضری دی۔ اس کے بعد ایک نامعلوم جگہ پر عبادت الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ بعد میں آپ کے والد بھی آپ کی تلاش میں اس مقام پر آ پہنچے تو آپ نے اپنے والد سے مزید سفر کی اجازت لی اور پرگنہ مانک پور میں شیخ سلونہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہیں پر شیخ موصوف سے علم کی مزید تحصیل کی اور ہدایہ تک تعلیم حاصل کی۔ بیعت ہونے کی بھی خواہش ظاہر کی لیکن شیخ موصوف نے بیعت کے سلسلے میں اجمیر والے شیخ سالار رومی کی طرف رہنمائی کی۔

شیخ سالار رومی نے پیر بابا کو تصوف اور سلوک کی منازل طے کرائیں۔ "خزینۃ الاصفیا" میں آپ کو نظام الدین تھانیسری کا مرید اور خلیفہ بتایا گیا ہے۔ لیکن "تذکرۃ الابرار والاشرار" میں سالار رومی سے بیعت ہونے کا ذکر ہے جو آپ کے ایک مرید اخوند درویزا نے لکھی ہے وہ لکھتے ہیں "میں ایک طویل مدت تک آپ (پیر بابا) کی خدمت میں رہا اور میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ آپ کے قدموں میں بسر کیا۔ چونکہ حضرت متقدمین مشائخ کی طرف سے پانچ خانوادوں میں مجاز تھے۔ ان میں سے ایک خانوادے میں آپ کو اپنے دادا کی طرف سے اجازت تھی اور چار میں شیخ سالار رومی کی طرف سے۔"

یہ سلسلے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سلسلہ کبرویہ، ۲۔ سلسلہ چشتیہ، ۳۔ سلسلہ سہروردیہ، ۴۔ سلسلہ شطاریہ
۵۔ سلسلہ ناجیہ حلاجیہ۔

پیر بابا کو اپنے شیخ سالار رومی نے خدمت دین کے لئے پہاڑی علاقے کی طرف جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے کشمیر کا ارادہ کیا اور راستے میں کچھ مدت گجرات میں قیام کیا جہاں بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔ پھر آپ اپنے شیخ کی زیارت کے لئے اجمیر گئے تو دیکھا کہ شیخ وفات پا چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں سے آپ پشاور آئے کچھ عرصہ دوآبہ میں سکونت اختیار کی پھر وہاں سے علاقہ یوسف زئی کے موضع سدم میں آ گئے اور یہاں پر لوگوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

یہیں پر انہوں نے شادی کی اور مستقل سکونت اختیار کی۔ پیر بابا نے لوگوں کو بایزید انصاری اور پیر جبال کی تحریک روشنائی کی گمراہیوں سے آگاہ کیا۔ انہی کی مخالفت کی وجہ سے بایزید انصاری جو پیر روشان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ پیر تاریک کے نام سے پکارے جانے لگے۔

پیر بابا اور ان کے خلیفہ اخوند درویزا نے تحریک روشنائی کی مخالفت کے جو دلائل دیتے ہیں وہ یہ تھے۔

۱۔ بایزید ہر موجودہ شے کو خدا کہتا تھا اور مخلوقات صوری کو ذات خدا جانتا تھا۔
۲۔ بایزید بعث کا منکر تھا اور اپنے مریدین کو اس کی تلقین کرتا تھا۔
۳۔ بایزید اور اس کے خلفاء پر تیسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ محرم عورتوں سے خلوت میں بیعت لیتے تھے اور انہیں اپنی خلافت دیتے تھے نہ صرف یہ بلکہ انہیں آراستہ کر کے شہر شہر اپنے ساتھ لے کر پھرا کرتے تھے۔
۴۔ پیر بابا کے نزدیک بایزید کی تصنیف "خیر البیان" کفر والحاد سے لبریز تھی۔
۵۔ بایزید پر ایک اعتراض یہ تھا کہ وہ عقیدہ تناسخ کا قائل تھا۔ چنانچہ پیر بابا نے اس قسم کے دوسرے اعتراضات کی بنا پر پیر بابا نے اس تحریک کی ڈٹ کر مخالفت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان الزامات اور اعتراضات میں بعض تو ایسے ہیں جن کا ثبوت سوائے پیر بابا اور ان کے خلیفہ کے اور کہیں نہیں ملتا اور بعض ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر بایزید انصاری کو کافر، ملعون اور ملحد کہنا انتہائی زیادتی ہے۔

پیر بابا اپنی عمر کے آخری حصے میں پاچا کلے (بنیر خانانہ) میں سکونت پذیر رہے اسی مقام پر پیر بابا کے نام سے مشہور ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ آپ کا مزار بھی اسی مقام پر ہے جو زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ آپ کا مزار [illegible] سے دس میل دور ایک ندی کے کنارے پر آباد ہے۔

آپ کی اولاد میں دو لڑکے سید عبداللہ اور سید [illegible] [illegible] کی جاتی ہیں۔

پیر پگارا پاکستان میں سندھ کے روحانی پیشوا [illegible] جن [illegible] جو گوٹھ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر [illegible] سندھ کے دیہاں گھرے ہوئے علاقے میں واقع ہے اور [illegible] جو صحرائے تھر کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

پیران پگارا کے سلسلے کا خاندانی سات پشت [illegible] گھرانہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ چنانچہ ایک بھائی کو آنحضور کا جھنڈا [illegible] بھائی کو آنحضور کی دستار مبارک ملی۔ چنانچہ پہلے بھائی کا سلسلہ [illegible] نام سے مشہور ہوا۔

دستار مبارک (پگڑی) کی وجہ سے دوسرا سلسلہ پگارا کہلایا۔

موجودہ گدی نشین شاہ مردان شاہ پیر صاحب پگارا ہفتم ۲۲ نومبر ۱۹۲۸ء کو پیر جو گوٹھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید صبغۃ اللہ تھا جو پیر صاحب پگارا ششم کے نام سے مشہور تھے۔ وہ اپنی زندگی میں انگریز سامراج سے برسر پیکار رہے۔ اس خاندان نے ہمیشہ اسلام کے لئے اعلیٰ خدمات [illegible] ہیں۔ ڈیڑھ سو برس قبل جب برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کی مشہور عوامی تحریک "تحریک مجاہدین" کا آغاز ہوا اور سید احمد شہید راجپوتانہ کے راستے سندھ [illegible]

ہوئے شمال مغربی کہساروں کی طرف نکلے تو سندھ میں اسی خاندان نے انہیں ہر ممکن مدد کا یقین دلایا اور سندھ میں یہی گھرانہ اس تحریک کا مرکز قرار پایا۔

جنگ عظیم دوم میں پیر صاحب پگاڑا ششم برطانوی استعمار پر ضرب کاری لگانے کے لیے مسلح جدوجہد کی جو خالص عوامی تحریک تھی اور جس کا رابطہ برعظیم کی آزادی کے رہنماؤں سے تھا۔ لیکن آزادی کے اس عظیم مجاہدانہ منصوبے کا علم قبل از وقت انگریزوں کو ہوگیا اور انہوں نے پیر صاحب پگاڑا کی اس تحریک کو نہایت بے دردی سے کچل ڈالا۔ آپ کو گرفتار کر لیا گیا اور آپ کے مرکز کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیا گیا۔ پیر صاحب پگاڑا ششم کو انگریز کی فوجی عدالت نے سزائے موت دی اور سزا کے بارے میں آپ کو چند گھنٹے پہلے مطلع کیا گیا جس کو آپ نے بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے، نوافل ادا کرتے ہوئے بخوشی قبول کیا۔ چنانچہ آپ کو پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا اور آپ کی حر تحریک کو کچل دیا گیا۔

پیر صاحب کے خلاف جب فوجی اقدام ہوا تھا تو انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان کے اہل خانہ کو کراچی لے جا کر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ بعد میں آپ کے دونوں صاحبزادوں شاہ مردان شاہ اور نادر شاہ کو جنکی عمر بالترتیب تیرہ اور گیارہ سال تھی، پہلے علی گڑھ اور پھر برطانیہ لے جایا گیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دوران تعلیم انہیں اپنے خاندانی پس منظر تاریخ اور روایات کو فراموش کرنے کی تعلیم دی جاتی رہی۔

پیر صاحب پگاڑا ہفتم نے ابتدائی تعلیم سندھی میں حاصل کی نیز اردو، سندھی، انگریزی، عربی، لاطینی میں بھی مہارت حاصل کی۔ ملک واپس آنے پر دینی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۲۳ سال کی عمر میں ۴ فروری ۱۹۵۲ء میں گدی نشین ہوئے کیونکہ پاکستان بن جانے کے بعد اس خاندان کی سابقہ خدمات کے صلے میں انہیں وطن واپس بلا لیا گیا اور گدی پیر صاحب پگاڑا کو بحال کر دیا گیا۔ پیر پگاڑا فی الوقت پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہیں۔

پیر مانکی (۔۔۔۔۔۔؟ ۱۹ شعبان ۱۳۲۲ھ/ اکتوبر ۱۹۰۴ء) پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک مشہور صوفی بزرگ۔ عبدالوہاب، والد کا نام مولانا ضیاء الدین تھا جو ضلع پشاور کے موضع اکوڑہ خٹک کے رہنے والے تھے۔ جب اس علاقے پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جانے لگے تو آپ کے والد بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ بدا ش میں سکونت اختیار کی۔ یہاں انہوں نے ایک مسجد کی امامت اختیار کر لی۔ اس ہجرت میں آپ بھی اپنے والد کے ساتھ شامل تھے۔

اس زمانے میں حضرت عبدالغفور اخوند صاحب کے عرفان و تصوف کا دور دورہ چرچا تھا۔ چنانچہ طلب حق اور معرفت الٰہی کا شوق آپ کو بھی ان کے قدموں میں کھینچ لایا۔ ان کی صحبت میں آپ نے تصوف کی منازل طے کیں اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء میں جب انگریزی فوج نے مالاکنڈ اور علاقہ سوات پر قبضہ کرنے کی نیت سے پیش قدمی کی تو آپ نے بھی جنگ امبیلہ میں اخوند صاحب، صاحب غازیان سوات اور بنیر کے ساتھ شامل ہو کر محاذ امبیلہ پر انگریزوں کے خلاف شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے حضرت اخوند سوات نے آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے خوش ہو کر آپ کو خلافت عطا فرمائی۔ خلافت ملنے کے بعد آپ اللہ کے دین کی تبلیغ اور سربلندی میں مشغول ہو گئے مریدین کی ایک جماعت ہر وقت آپ کے ساتھ رہتی اور آپ اس علاقے کے گاؤں اور قصبوں میں پہنچ کر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ موضع کمی رخیل میں پانی کی کمی تھی اس لیے آپ نے اپنے مرشد کے حکم بموجب مانکی شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔ جہاں آپ کا سالانہ عرس ۲۸ رجب المرجب کو ہوتا ہے۔

آپ نے عوام کو توحید پر قائم رہنے اور مختلف توہمات کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں بہت جدوجہد کی اور اس راہ میں آپ کو بہت سی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ نے کسی بھی بڑی سے بڑی مخالفت کی پرواہ نہ کی۔

آپ کی زندگی کا سب سے اہم پہلو آپ کا نظام اصلاح و تربیت تھا۔ آپ نے غلط اور فاسد نظریات کی اصلاح اور انسانیت کی اخلاقی سطح بلند کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا اور اس کی وجہ سے آپ کی شہرت اس علاقے میں دور دور تک پھیل گئی۔ چنانچہ دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

مانکی شریف میں سکونت کی وجہ سے آپ پیر مانکی شریف کے نام سے مشہور تھے۔ مغربی تہذیب سے انتہائی نفرت تھی۔ سادگی آپ کا شعار تھا آپ کھدر کا بنا ہوا لباس پہنتے تھے۔

آپ کی اولاد میں پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ آپ کے بہت سے خلفاء تھے۔ مشہور خلفاء میں عبدالحق ملانی، عبدالقیوم، صاحبزادہ صاحب خویشگی، کابل ملا صاحب، میاں صاحب کاکڑک، گنڈیری ملا صاحب رانی زئی، دکن ملا، یار حسین ملا صاحب، عبدالحنان، حاجی صاحب بنوں، مولانا تاج الدین، مولانا محمد اعظم وغیرہ ہیں۔ مریدین کی تعداد بے شمار تھی۔ آپ کی تصانیف میں احکام المذاہب اور ہدایت الابرار مشہور ہیں۔

پیر مکی (ف ۶۱۲ھ/ ۱۲۲۵ء) سید عزیز الدین پیر مکی۔ لاہور (پاکستان) کے ایک مشہور صوفی بزرگ وطن بغداد تھا۔ ۱۲ سال مکہ معظمہ میں رہے اسی نسبت سے پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مکہ معظمہ سے آپ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر اعتکاف کی نیت سے لاہور آئے۔ آپ کے سامنے ہی سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور پر یورش کی۔ اس وقت پنجاب پر خسرو ملک غزنوی کی حکومت تھی خسرو نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ابھی ایک سال تک کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ دوسرے برس شہاب الدین نے لاہور پر اور بعد ازاں رائے پتھورا راج کے دارالحکومت پر بھی قبضہ کر لیا۔

بقول صاحب "خزینۃ الاصفیاء" آپ ۳۶ سال تک لاہور میں مقیم رہے اور وفات کے بعد یہیں دفن ہوئے آپ نے زندگی بھر تدریس علوم کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزارہا لوگ آپ کے وعظ و نصیحت سے مستفیض ہوتے رہے۔

"تحقیقات چشتی" میں لکھا ہے کہ کوئی پیر مکی کو حضرت علی ہجویری کا استاد بتاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ محمود غزنوی کے ساتھ لاہور آئے۔ بعض آپ کو داتا صاحب کا مرشد کہتے ہیں۔

آپ کا مزار بقول صاحب "تحقیقات چشتی" شاہجہان کے حکم سے تعمیر ہوا جو ٹیکسالی اور بھاٹی دروازوں کے درمیان واقع ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ سالانہ عرس ۱۰، ۱۱ ربیع الاوّل کو ہوتا ہے۔

پیری، محی الدین (وفات ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۲ء) ایک عثمانی جہاز ران اور نقشہ کشی کا ماہر۔ یہ یونانی الاصل تھا۔ والد کا نام حاجی حقیری تھا۔ اس

نے اپنے چچا کمال رئیس کے ساتھ کئی ایک بحری سفر کئے اور بعد میں خیرالدین باربرؔ کے ماتحت خاص امتیاز حاصل کیا۔ پیری نے ان مہموں کے دوران میں بحرِ روم کے ملکوں کے متعلق بہت واقفیت حاصل کر لی تھی۔ کچھ عرصے بعد مصر کا بیڑہ دان بنا۔ اور اس حیثیت میں نہر سویز سے خلیج فارس اور بحیرہ عرب تک جہازی سفر کئے ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں اس نے عدن پر قبضہ کیا۔ بعدازاں مسقط کی بندرگاہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد ہرمز کا محاصرہ کیا لیکن واپس بصرے لوٹ گیا۔ ادھر والی بصرہ باب عالی کو مہم ناکام ہونے کی اطلاع دے چکا تھا۔ چنانچہ باب عالی سے پیری کو قتل کر دینے کا حکم آیا۔ جس کے تحت ۹۵۹ھ/۱۵۵۲ء میں یا ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

محی الدین پیری جہازرانی پر ایک کتاب کا مصنف ہے کتاب کا نام "بحریہ" ہے۔ اس کتاب میں ان تمام سواحل کا حال لکھا ہوا ہے جن کا اس نے سفر کیا تھا۔ اس نے پایاب سمندروں، لنگر ڈالنے کے مقامات، رودوں اور خلیجوں، آبناؤں اور بندرگاہوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

پیری ایک نقشہ نویس بھی تھا۔ اس نے اپنی ایک اٹلس سلطان سلیمان کو پیش کی تھی۔ اس کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک نقشہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں خلیل ادھم بے کو کتب خانہ سرای استنبول میں ملا ہے اس نقشے پر پیری محی الدین کے ۱۵۱۳ء کے دستخط موجود ہیں۔ یہ نقشہ ایک جھلی پر شوخ رنگوں سے بنا ہوا ہے اور ترکی زبان میں عبارت لکھی ہوئی ہے۔

پیشوا دکن کے سیواجی کا وزیر اعظم۔ مرہٹوں کے سرداروں کا لقب۔ سیواجی کو اورنگ زیب نے دہلی میں نظر بند کر رکھا تھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے بہادر شاہ نے اسے اپنے ملک (دکن) جانے کی اجازت دی۔ جہاں اس وقت اس کی چچی تارا بائی مرہٹوں پر حکمرانی کر رہی تھی۔ سیواجی نے تارا بائی کو شکست دی۔ تو مرہٹوں نے اسے اپنا راجہ تسلیم کر لیا۔ اس راجہ کی ایک مجلس تھی جو حکومت کے نظم و نسق کے چلانے میں راجہ کی مددگار ہوتی تھی۔ اسی جماعت میں ایک عہدہ پیشوا یا مکھیا پردھان کا ہوتا تھا۔ سیواجی نے سارا انتظام سلطنت بالاجی وشوا ناتھ کے سپرد کر دیا جو اس وقت پیشوا کے عہدے پر فائز تھا۔ رفتہ رفتہ بالاجی وشوا ناتھ تمام سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تو اس نے پیشوائی کے عہدے کو بھی موروثی بنا لیا۔ بالاجی وشوا ناتھ کو عموماً پہلا پیشوا شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ان مرہٹہ حکمرانوں کے سلسلے کا حقیقی بانی تھا۔ جو آہستہ آہستہ ستارا کے راجاؤں کی جگہ خود مرہٹہ جمعیت کے سردار بن گئے تھے۔ اس سے پہلے چھ اور پیشوا گزر چکے تھے۔ جن کے نام شام راج نیل کنٹھ ارکر، مورو ترمبک پنگلے نیل کنٹھ مرلشور پنگلے، پرس رام ترمبک پرتی ندھی، بہرو مرلشور پنگلے اور بال کرشنا واسدیو تھے۔

بالاجی پیشوا کا زمانہ ۱۷۱۴ء تا ۱۷۲۰ء ہے۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت پر بادشاہ گر سید چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے بالاجی وشوا ناتھ کو دہلی بلا کر اس کی خدمات کے عوض اسے دکن کے چھ صوبوں سے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کی اجازت دی یعنی دکن سے مال گذاری کا ۱/۴ حصہ محصول کی شکل میں اور ایک زائد محصول مالگذاری ۱/۱۰ لگانے کی اجازت دی۔ یہ گویا ایک قسم کا خراج تھا جو مسلمان اپنی کمزوری کے سبب مرہٹوں کو ادا کرتے تھے۔ اس سے مرہٹوں کا اقتدار بہت زیادہ بڑھ گیا اور انہیں مغلوں کے معاملات میں دخل دینے کا بہانہ مل گیا۔

بالاجی بڑا باتدبیر سردار تھا اس نے مرہٹوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ چوتھ کا دو تہائی حصہ مرہٹہ سرداروں میں تقسیم کر دیا کرتا اور صرف ایک تہائی سرکاری خزانے میں داخل ہوتا تھا۔

باجی راؤ پیشوا۔ (۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۰ء) بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا مقرر ہوا۔ وہ مرہٹوں کا سب سے بڑا پیشوا تھا۔ اس کے عہد میں مرہٹوں کی سلطنت بہت وسیع ہو گئی۔ کیونکہ اس نے مزید علاقے دبا لینے کی حکمت عملی اختیار کی تھی وہ چاہتا تھا کہ مرہٹوں کو منظم کر کے سب سے پہلے دکن پر تسلط جمایا جائے اس کے بعد شمالی ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ باجی راؤ فوراً مغلیہ سلطنت کو تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔ ۱۷۵۹ء میں باجی راؤ کے بیٹے بالاجی راؤ کے عہد میں مرہٹوں نے اٹک کے قلعے پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

ابتدا میں دکن کے صوبے دار نظام الملک سے اس کے معرکے ہوتے رہے نظام الملک نے مرہٹوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر اس نے باجی راؤ سے صلح کر لی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے مالوہ، گجرات اور بندھیل کھنڈ پر حملے کئے۔ اور وہاں سے چوتھ وصول کی۔ اس طرح مرہٹوں کا اقتدار دکن کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بھی قائم ہو گیا۔ باجی راؤ کے تدبر اور فتوحات کے باعث مرہٹوں کی سلطنت دور دور تک پھیل گئی۔

بالاجی باجی راؤ:- (۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۱ء) بالاجی نے مرہٹہ سلطنت کو اور بھی زیادہ ترقی دی۔ اس کی فوجیں ہندوستان کو کرنا ٹک سے لے کر پنجاب تک تاراج کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں عبرتناک شکست کھائی۔ اس شکست سے پیشوا کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ مرکزی حکومت [illegible] کمزور ہو گئی اور مرہٹوں کے تمام ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اتنے طاقتور نہیں ہوئے جتنے اس جنگ سے پہلے تھے انگریزوں نے مغلوں اور مرہٹوں کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا اور [illegible] ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

پیشوا کی موت کے بعد جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے [illegible] طاقت کو بہت کمزور کر دیا۔

مادھو راؤ پیشوا:- (۱۷۶۱ء تا ۱۷۷۲ء) اس کے دور حکومت [illegible] ۱۷۷۱ء میں ایک بار پھر شمالی ہندوستان پر [illegible] اثر قائم کر دیا [illegible] شاہ عالم [illegible] مرہٹوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا

نرائن راؤ پیشوا:- مادھو راؤ کے بعد اس کا بھائی نرائن راؤ [illegible] پیشوا بنا جو اپنے چچا کی شہ پر قتل کر دیا گیا۔ اس دور میں مرہٹے دو مخالف [illegible] گئے تھے ایک رگھوبا کے حامی تھے جو پیشوائی کا مدعی تھا اور دوسرا گروہ [illegible] نرائن کے حق وراثت کا حامی تھا۔

مادھو راؤ نرائن:- (۱۷۷۴ء تا ۱۷۹۵ء) نرائن راؤ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا یہ مرہٹوں کا چھٹا پیشوا تھا۔

باجی راؤ دوم:- (۱۷۹۶ء تا ۱۸۱۸ء) یہ ساتواں اور آخری پیشوا تھا جب نانا فرنویس ۱۸۰۰ء میں فوت ہوا تو ہلکر اور دولت راؤ سندھیا کے درمیان پونا کے اقتدار اعلیٰ کے لئے کشمکش شروع ہو گئی۔ اس کشمکش میں پیشوا بسین بھاگ گیا جہاں اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کی حفاظت میں دے دیا۔ بسین کے معاہدے کی رو سے ولزلی نے اپنے آپ کو پیشوا کا محافظ قرار دیا جو ایک امدادی فوج رکھنے اور انگریزوں کو اپنے دوسرے ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ تنازعات میں

ثالث بنانے پر راضی ہوگیا۔ اسی دوران میں بدقسمتی سے پیشوا ایک بے اصول انسان ترمبک جی کے زیر اثر آگیا۔ چنانچہ جب ریذیڈنٹ الفنسٹن نے اطلاع دی کہ پیشوا انگریزوں کے خلاف مرہٹہ قوت کو منظم کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے تو پیشوا سے صلحنامہ پونا پر زبردستی دستخط کرائے گئے۔ لیکن باجی راؤ اس مرتبہ بھی اس صلحنامہ پر پورا نہ اترا۔ جونہی لارڈ ہیسٹنگز نے مرہٹوں کے کچلنے کے لیے قدم بڑھایا۔ پیشوا نے بغاوت کردی۔ اور برطانوی ریذیڈنسی کو تاراج کرکے رکھ دیا۔ آخر کار پیشوا کی فوجوں نے شکست کھائی۔ انگریزوں نے اس کی پیشوائی ختم کردی اور اسے وظیفہ دے کر بٹھور میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔

پیلا (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء — ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء) شارل پیلا ایک مشہور معروف فرانسیسی عربی دان مستشرق۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پیرس کے مدرسہ السنہ شرقیہ میں عربی پڑھانے پر مامور ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں پیرس یونیورسٹی میں عربی زبان کا پروفیسر بنایا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر لیوی پروواں سال نے پیرس میں ایک رسالہ (ARABICA) نکالا تو شارل پیلا کو اس کی مجلس ادارت میں ایک رکن کی حیثیت سے جگہ دی۔ اس رسالے میں عربی ادب پر قابل قدر مضامین لکھے جاتے تھے اور بہت سی کتابوں پر تبصرے کیے جاتے تھے۔ پیلا پروفیسر لیوی کے انتقال کے بعد اس کی جگہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے فرانسیسی ایڈیشن کا ایڈیٹر بنایا گیا اور آخر دم تک یہ فرائض سرانجام دیتا رہا۔

پروفیسر پیلا نے علامہ جاحظ کی تصانیف اور اس دور کے علمی حالات کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا تھا۔ مرنے سے چند سال پیشتر وہ المسعودی کی کتاب "مروج الذھب" کا ایک جدید ایڈیشن تیار کرنے میں مشغول تھا لیکن بے وقت موت نے اس کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا۔

پروفیسر پیلا نے پچپن سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ جاحظ کی کتاب "تربیع والتدویر"

۲۔ "لینگویج اینڈ لٹریچر" جس کا موضوع عربی زبان اور اس کا ادب ہے

۳۔ جاحظ کی "کتاب التاج" کا فرانسیسی ترجمہ۔

پینانگ یا پولو پینانگ۔ ملائشیا وفاق کا ایک جزیرہ، جس کا رقبہ ۲۷۶ مربع کیلومیٹر ہے۔ ایک آبنائے اسے اندرون ملک سے جدا کرتی ہے یہ آبنائے تین سے سولہ کیلومیٹر چوڑی ہے۔ پینانگ شہر شمال مشرقی راس پر ملائشیا کے ساحل سے چار میل دور واقع ہے۔

۱۷۸۶ء میں یہ جزیرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے کپتان لائٹ نے کیدہ کے سلطان سے ایک سالانہ رقم کے عوض لے کر یہاں نوآبادی کی بنیاد رکھی۔ کپتان لائٹ کو یہ امید تھی کہ یہ جزیرہ مشرقی سمندروں کی منڈی بن جائے گا۔ لیکن اس کی یہ غرض پوری نہ ہو سکی اور تھوڑے عرصے بعد اسے ایک تعزیری بستی بنا دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء تک اسے ہندوستان کے کالے پانی کی حیثیت حاصل رہی۔ ۱۸۰۵ء میں اسے ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ ۱۸۲۶ء میں جب سنگاپور اور ملاکا کو ملایا گیا تو اس کا صدر مقام اسے بنایا گیا اور اسے یہ حیثیت ۱۸۳۷ء تک حاصل رہی ۱۸۶۷ء میں ایک نئی شاہی نوآبادی بنائی گئی تو یہ ایک ریذیڈنٹ کے زیر انتظام آگیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب ملائشیا آزاد ہوا تو اسے بھی وفاق میں شامل کر لیا گیا۔

پینانگ کی بندرگاہ جہازوں کی آمد و رفت کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ اس کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھی ہے۔ اب اس جزیرے میں ہر جگہ آمد و رفت کے راستے بن گئے ہیں۔ یہاں کی آبادی میں زیادہ تر چینی اور تامل ہیں جزیرہ نمائے ملایا اور سماٹرا سے آئے ہوئے ملائی لوگ خاصی تعداد میں ہیں۔ یہاں کے لوگ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔

ت

تابعین تابع یا تابعی کی جمع ۔ حدیث کی اصطلاح میں تابعین ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو آنحضور ؐ کے صحابہ کرام ؓ کے بعد ہوئے اور کسی نہ کسی صحابی سے ملاقات کی ۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو اگرچہ آنحضور ؐ کے زمانے میں موجود تو تھے لیکن آپ ؐ کو دیکھ نہیں سکے تھے ۔ بعض آپ ؐ کی حیات مبارک میں اتنے چھوٹے تھے کہ براہ راست آپ ؐ سے روایت یاد رکھنے کے قابل نہ تھے ۔

تابعین کے بعد میں آنے والوں کو علم حدیث میں تبع تابعین کا نام دیا گیا ہے لیکن تبع تابعی کے لیے بھی تابعی کا جاننا شرط ہے ۔

احادیث کے درجات قائم کرنے میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ حدیث کی روایت کرنے والا تابعی زیادہ صاحب اعتبار ہے یا کم نیز ان کی تعداد کو بھی اس ضمن میں ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔

حضرت حسن بصری کا شمار طبقۂ اولیٰ کے مشہور تابعین میں ہوتا ہے

تابوتِ سکینہ ایک صندوق جس میں یہودیوں کے تبرکات ہیں ۔ قرآن مجید میں اس صندوق کے بارے میں فرمایا گیا ہے ۔

"ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ" خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکون قلب کا سامان ہے ۔ جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جسے اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں ۔" (۲:۲۴۸)

بنی اسرائیل اس صندوق کو اصطلاحاً عہد کا صندوق کہتے تھے ۔ بائبل کے مطابق ایک لڑائی کے موقع پر فلسطی مشرکوں نے اس صندوق کو بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا ۔ لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں آخر کار انہوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا ۔

بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا متبرک اور اپنے لئے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے ۔ جب یہ صندوق ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت جواب دے گئی ۔ اور ہر ایک اسرائیلی یہ سوچنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے دور ہو گئی اور اب ہمارے برے دن آ گئے [illegible] بحوالہ سموئیل [illegible]

اس صندوق میں کیا تھا بائبل کے مطابق اس میں حضرت یوسف [illegible] مبارک اور بائبل ہی کی بعض روایات کی رو سے ہڈیاں اور کپڑے تھے [illegible] حضرت [illegible] اپنے ساتھ [illegible] تھے ۔

[illegible] الانبیاء میں ہے کہ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ حضرت موسیٰ و ہارون ؑ کے عصا و پیراہن [illegible] فلسطینیوں نے اسے اسرائیلیوں سے چھین کر اپنے مندر [illegible]

قرآن مجید میں اس کے بارے میں تصریح ہے کہ جب اسرائیلیوں [illegible] سے یہ صندوق نکل گیا تو فرشتے اس کی حفاظت پر مامور رہتے ۔ [illegible] اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات تھے [illegible] سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دی تھیں ۔ اس کے علاوہ تورات [illegible] اصل نسخہ جسے حضرت موسیٰ ؑ نے لکھوا کر بنی لاوی کی حفاظت [illegible] بوتل جس میں من بھر کر محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ آنے والی نسلیں اللہ تعالیٰ [illegible] اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں ان کے باپ دادا پر کیا گیا تھا [illegible] موسیٰ ؑ کا عصا بھی اسی صندوق کے اندر تھا ۔

جب طالوت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو یہ صندوق [illegible] واپس مل گیا ۔

حضرت داؤد ؑ کی زبردست خواہش تھی [illegible] گھر بنائیں تاکہ یہ محفوظ رہے لیکن [illegible] روایات کے مطابق انہیں [illegible] کے بیٹے حضرت سلیمان ؑ کے عہد میں تعمیر ہو گا ۔ [illegible] حضرت داؤد ؑ اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرتے رہے اور اپنے بیٹے کے [illegible] کی خاطر اس کام میں متواتر مصروف رہے بالآخر حضرت سلیمان ؑ نے اپنے [illegible] عہد میں یہ گھر تعمیر کیا جو ہیکل سلیمانی کے نام سے مشہور ہوا ۔ حضرت سلیمان [illegible] بیویوں اور خادموں کے لیے بھی [illegible] بنائی تھیں اس کے باوجود [illegible] بادشاہ نے اس ہیکل کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں [illegible] تابوت سکینہ کا کمرہ ان مختلف عمارتوں میں چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا ۔

۵۹۰ ق ۔ م میں جب بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو [illegible]

برباد کیا اور جلا کر راکھ کر دیا تو اس افراتفری میں تابوت سکینہ بھی غائب ہو گیا اور آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔

تاتار ایک قوم کا نام جنھیں تتار اور تتر بھی لکھتے ہیں۔ بقول تھامس یہ قوم بیکال کے جنوب میں آباد تھی اور کیریلین تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب منگولیا میں قتائیوں کی سلطنت تمام ہو گئی تو ترکوں کو منگولیا سے نکال دیا گیا اور مغول قبائل نے ان کی جگہ لے لی۔ علاقہ اُلوکان جو ترکوں کا مسکن تھا پانچویں صدی ہجری گیارہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے ملک میں شامل تھا۔ تاتاریوں کی زبان ترکوں سے مختلف تھی۔

بارٹولڈ نے انھیں تغزغز کا جزو بتایا ہے اور گردیزی نے قوم کیماک کا جو دریائے ارتش پر آباد تھے۔ ساتویں صدی ہجری تیرہویں صدی عیسوی کی مغول فتوحات کے زمانے میں تمام دنیا میں ہر جگہ ان فاتحین کو تتر کہتے تھے۔ یہی نام ابن اثیر نے چنگیز خان کے پیشروؤں کے لیے استعمال کیا ہے۔ بقول رشید الدین چنگیز خان کی فتوحات کے بعد بہت سے لوگ جنہوں نے اس کی اطاعت کو تسلیم کر لیا تھا اپنے آپ کو مغول کہنے لگے تھے۔ ان سے پہلے زمانے میں تاتاری بڑے طاقتور تھے اور یہی وجہ ہے کہ بلاد قفقاز، ہندوستان، چین، ماچین میں ترکوں کو آج تک تاتار کہا جاتا ہے

چنگیز خان کے عہد کے بعد منگولیا اور وسط ایشیا میں تاتار کا لفظ بالکل متروک ہو کر رہ گیا۔

تیمور کے حملے کے زمانے میں یہ لوگ اماسیہ اور قیصریہ کے درمیان خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی مجموعی تعداد تیس چالیس ہزار کنبوں پر مشتمل تھی۔ تیمور نے انھیں بایزید کے مشورے سے وسط ایشیا میں کاشغر کے جزیرہ ایسیک کول میں آباد کر دیا۔ تیمور کے مر جانے کے بعد یہ لوگ دوبارہ ایشیائے کوچک میں آ گئے ۱۴۱۹ء میں انھیں بلغاریہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

زمانہ حال میں روس اور مغربی یورپ میں اکثر تاتار کا لفظ عثمانیوں کے سوا تمام ترکی الاصل امم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعد میں تاتار کا لفظ دریائے والگا کے طاس میں ترکی بولنے والوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا جو قازان سے استرخان تک، کریمیا اور سائبیریا کے [illegible] حصے میں آباد تھے۔

چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں طمغاج (چین) کے پہاڑوں سے وحشی تاتاریوں کا ایک زبردست طوفان اٹھا جو سارے وسط ایشیا اور روس پر چھا گیا۔ اور اس نے چند ہی سال میں تمام اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ لاتعداد مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔ بڑے بڑے شہروں میں سناٹا چھا گیا اور وسط ایشیا کے طول و عرض میں جہاں تہذیب و تمدن کے پھول برستے تھے ویرانی و بربادی کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ غرض دنیائے اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک خاک اڑنے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں اشتراکی سوویٹ جمہوریہ کے قیام کے بعد اس کے صدر مقام قازان کی آبادی میں نصف سے کچھ کم تاتار ہیں۔

تاج الدین بن زکریا ہندوستان کے ایک بزرگ صوفی۔ شہر سنبھل میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے مرشد کامل کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ ناگور اور اجمیر بھی گئے۔ ایک مدت بعد شیخ اللہ بخش شطاری گڈھ مکتیسری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ لنگر خانے کے لیے لکڑیاں لانے اور پانی بھرنے کا کام آپ کے سپرد تھا۔ شیخ کی صحبت میں آپ نے سلوک کی منازل طے کیں اور عشقیہ، قادریہ، چشتیہ اور مداریہ طریقے کی اجازت حاصل کی۔ آپ دس سال تک شیخ کی خدمت میں رہے۔ بعد میں حضرت خواجہ محمد باقی سے بھی فیض حاصل کیا اور دس سال تک اُن کی خدمت میں رہے حضرت خواجہ نے آپ کو نقشبندی سلسلے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت خواجہ کی وفات کے بعد آپ نے ہندوستان کے شہروں، عراق اور عرب کا سفر کیا۔ اور آخر میں مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی۔ حجاز میں ایک بڑی تعداد آپ کی صحبت میں رہ کر نقشبندیہ سلسلے سے فیضیاب ہوئی۔

بقول صاحب اسراریہ آپ نے ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں وفات پائی اور حرم مکہ معظمہ میں اس رباط کے اندر جو آپ نے خود بنایا تھا دفن کیے گئے۔

آپ کی تصانیف میں نفحات الانس کا عربی ترجمہ، تعریب رشحات عین الحیات کا عربی ترجمہ۔ رسالہ طریقۂ نقشبندیہ، صراط مستقیم، نفحات الالٰہیہ، جامع الفوائد رسالہ در باب انواع طب، آداب المریدین مشہور ہیں

شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کا ذکر شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں ایک مکتوب آپ کے نام ہے۔

سید مرتضیٰ بلگرامی نے آپ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ آپ نے بصرے یمن، احساء، نجد اور حجاز میں سلسلہ نقشبندیہ کو پھیلایا اور آپ کے مرید بڑی تعداد میں تھے

آپ کی اولاد میں دو لڑکے محمد حارث اور محمد معاذ تھے۔ محمد حارث تو آپ کے انتقال سے پانچ سال پہلے مکہ ہی میں وفات پا گئے تھے۔ دوسرے صاحبزادے ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں ہندوستان آئے اور شاہجہان کی خدمت میں مکہ کے تبرکات بھی پیش کیے۔

آپ کے ہزارہا مریدین تھے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

استاد احمد الوالوفا، شیخ محمد مرزا بن محمد المعروف السروجی الدمشقی، امیر یحییٰ بن علی پاشا، شیخ عبدالباقی بن الزجاجی الزبیدی، شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرحمان، شیخ محمد علان، شیخ ابراہیم بن حسن، شیخ ابوبکر بن سعید بن ابی بکر الحضرمی، شیخ عبیداللہ بن محمد باقی، سید محمود بن اشرف الحسینی امروہی۔

تاج الدین حسین (۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء — ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء) ہندوستان کے ایک صوفی بزرگ والد کا نام سید عارف علی تھا جو خاندان سادات مودودیہ میں سے تھے۔ سہسوان ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ آپ کو علوم ظاہری پر بھی عبور تھا۔ اور علوم باطنی میں بھی کامل تھے۔ آپ ابتدا میں ریاست رامپور اور پھر دہلی میں شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالعزیز سے کسب کمالات کر کے اپنے وطن واپس آئے۔ اور تقریباً پچاس سال تک گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی۔

آپ نے ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار سہسوان میں مرجع خاص و عام ہے۔ تاج الدین حسین کا شمار اکابر اولیا میں ہوتا ہے۔ آپ علوم ریاضی تصوف اور فارسی زبان کے علامہ تھے۔ آپ کو امرا اور والیان ملک نے اکثر اپنے پاس آنے کی دعوت دی لیکن آپ کہیں نہیں گئے۔

تاجیک قدیم مسلمان ایرانیوں کا نام۔ یہ لقب ترک کے مقابلے میں استعمال ہونے لگا۔ شروع میں ایرانی لوگ مسلمان فاتحین کو تازیک کے نام سے پکارتے تھے۔ ایرانیوں کے نزدیک جو بھی ایرانی مسلمان ہو جاتا تھا تو

وہ بھی عرب بن جاتا۔ چنانچہ ترکوں کے یہاں جب تاجیک کا لفظ پہنچا تو اس کے معنی "مسلمان" یا "دارالاسلام سے آنے والا" کے تھے۔ چونکہ غیر ترک مسلمانوں میں ایرانیوں کی اکثریت تھی۔ اس لئے جب یہ لفظ وہاں پہنچا تو اس کے معنی ایرانی کے ہو گئے۔ اس دور میں ایرانی بھی خود کو تازیک کہنے لگ گئے تھے۔

ترک اور تاجیک کے درمیان جو فرق ہے اس پر اکثر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بات عام طور پر کہی گئی ہے کہ ترک اور تاجیک کے باہمی تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے اور کوئی تاجیک کسی ترک پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا۔

تاتاریوں کے ہاں جو دریائے والگا کے کنارے آباد تھے تاجیک کا لفظ سوداگر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

آج کل تاجیک کا لفظ کبھی کبھی خالص فارسیوں کو ممیز کرنے کے لئے یا مشرقی ایرانیوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور استرآباد اور یزد کے درمیانی علاقے کو ان کی مغربی حدود سمجھا جاتا ہے۔

ان لوگوں کو ترکستان میں ازبکوں کے دور میں بتدریج میدانوں سے بیدخل کر کے پہاڑوں کی طرف نکال دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل روس ترکستان کے تمام ایرانیوں کو تاجیکوں ہی میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب تاجکستان میں خود مختار جمہوریت قائم ہوئی تو اس میں تاجیکوں کی تعداد ۲۳۲۱۵۷۸ تھی

تادلا مراکش کا ایک ضلع جوام الربیع اور وادی العبید کی سطوح مرتفع پر مشتمل ہے۔ اس علاقے میں عربی النسل اور یفنہ، بنی جبران، بنی زمور، سماعلنہ، بنی موسیٰ نیم خانہ بدوش قبیلے آباد ہیں۔ ان قبیلوں کے مرکزی مقامات وادزم، بجداد، دارالدریذ درج ہیں۔

وادی ام الربیع کے وسط میں آیت ربوع قوم آباد ہے اور اس قوم کے تمام قبیلے مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عربوں اور بربروں کی مخلوط نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان قبائل میں گطایہ، سمگت، بنی مادان اور بنی ملال ہیں جن کے بڑے مراکز قصبہ تادلا اور قصبہ بنی ملال ہیں۔

وسطی اطلس کی مغربی ڈھلان پر شمال سے جنوب کی سمت میں آیت سری، آیت عطا، آیت لوزید، آیت عیاط اور آیت عتاب بربر قبیلے آباد ہیں۔

زمانہ قدیم میں تادلا میں آباد لوگوں کا مذہب عیسائی یا یہودی تھا۔ ۱۷۳ھ/۸۹ء میں جب ادریس ثانی نے یہ علاقہ فتح کر لیا تو بقول صاحب "روض القرطاس" انہیں یہاں پر مسلمان عیسائیوں اور یہودیوں کے مقابلے میں بہت کم ملے۔ یہاں بڑی بڑی یہودی آبادیاں تھیں۔ تادلا کو ادریس ثانی کے بیٹوں نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اور یہ شہر احمد کے حصے میں آیا تھا۔ کچھ عرصے بعد تادلا بنو یفرن کی سلطنت میں آ گیا۔ بعد میں یہ علاقہ مرابطین کے قبضے میں آ گیا۔ ۵۲۶ھ/۱۱۳۱ء میں عبدالمومن الموحدی کا تادلا پر قبضہ ہوا۔ جو اس وقت فاس اور مراکش کی درمیانی شاہراہ پر وسط میں واقع تھا۔ اس شہر میں عرب اور بربر قبائل اکثر فتنہ و فساد اٹھاتے رہتے تھے۔ ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں مرینی سلطان یعقوب نے تادلا پر حملہ کیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا۔ بنو سعد کی آمد کے موقع پر ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں تادلا میں ایک بار پھر جنگ ہوئی۔ بنی مرین کے اس جنگ میں پاؤں اکھڑ گئے۔ چنانچہ تادلا پر بنو سعد قابض ہو گئے لیکن اسی صدی میں تادلا زاویہ دلاء کے زناگہ بربروں کی مملکت کا ایک صوبہ بن گیا۔ علوی سلطان الرشید نے ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں دلائیوں کا زاویہ تباہ کر دیا ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں تادلا مراکش کے صوبوں کی تقسیم کے بعد مولائے اسماعیل کے بیٹے مولائے احمد کے حصے میں آیا

تاریخ علم تاریخ۔ اصطلاح میں اس علم کا نام ہے جس کے ذریعے [illegible] بادشاہوں، نامور اور مشہور شخصیتوں کے حالات اور گذرے ہوئے مختلف زمانوں کے عظیم الشان واقعات وغیرہ معلوم ہو سکیں۔

تاریخ دراصل انسانیت کا حافظہ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں کے بلکہ کل نوع انسانی کے پچھلے تجربات کا دفتر محفوظ رکھ کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے اور اپنے مستقبل کو آزمودہ بھلائیوں سے درست اور آزمودہ برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

تاریخ کے اس دفتر کا جائزہ لینے کے لئے تین نقطہ نظر ممکن ہیں۔ ایک نقطہ نظر محض معروضی مطالعے کا ہے یعنی واقعات اور حالات جیسے کچھ بھی گذرے ہیں انہیں جوں کا توں دیکھا جائے۔

دوسرا نقطہ نظر قوم پرستانہ مطالعے کا ہے یعنی اہم واقعات کو اس نسل یا اس قوم یا اس ملک کی حمایت کے جذبے سے دیکھیں جس سے ہمارا تعلق ہے۔ اسی لحاظ سے نتائج اخذ کریں اور اسی لحاظ سے اشخاص اور اشیاء کے متعلق رائے قائم کریں۔

تیسرا نقطہ نظر مقصدی اور اصولی ہے یعنی ہم نسلی اور قومی تعصبات سے بالاتر ہو کر مجرد انسانی فلاح و سعادت کو مقصود ٹھہرا کر اور نیک و بد کا ایک الگ معیار سامنے رکھ کر نسل انسانی اور اس کے مختلف اجزاء کے کارناموں کو جانچیں اور بے لاگ ہی رائے قائم کریں۔

پہلا نقطہ نظر خالص مؤرخانہ ہے اور اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس [illegible] کے مطالعے سے صحیح واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں مگر بجائے خود مفید نہیں۔

دوسرے نقطہ نظر میں بڑی جاذبیت ہے۔ بلا مبالغہ تاریخ کے ۹۰ فیصد طالب علموں کو اسی نقطہ نظر کی جاذبیت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ کیونکہ ہر [illegible] کسی نہ کسی نسل یا قوم یا ملک سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خود غرضی [illegible] اختیار کر کے بآسانی شخصی خود غرضی سے قومی خود غرضی [illegible] اس لئے وہ اپنے اور اپنی قوم ہی کے نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے [illegible] ہوتا ہے۔ لیکن دنیا میں اکثر جھوٹ اسی مطالعے کی بدولت پھیلے ہیں۔ اکثر [illegible] بے انصافیاں و خونریزیاں اور قومی و نسلی عداوتیں اسی کی بدولت برپا ہوئی [illegible] اکثر بروں کو اچھا۔ اکثر شیطانوں کو مرکز پرستش اسی مطالعے نے بنایا [illegible] کو برا اور اکثر نیکوکاروں کو لعن طعن کا ہدف اسی مطالعے کی بدولت ٹھہرایا گیا ہے۔ انسانیت کو مجروح کرنے اور زمین کو فساد سے بھرنے میں تاریخ کے اس طرز مطالعہ کا کچھ کم حصہ نہیں ہے۔ یہ مرض دنیا میں ترقی کر کے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ [illegible] ان اغراض کے لئے تاریخیں گھڑی جاتی ہیں۔ تاکہ نئی نسلوں میں دوسروں کے خلاف بغض پیدا کیا جا سکے۔

رہا تیسری قسم کا مطالعہ تو وہ یقیناً سب سے بہتر ہے مگر اس کے صحیح [illegible] ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ بجائے خود انسانی فلاح و سعادت کا نظریہ درست اور نیک و بد کا معیار صحیح ہو۔ دوسرے یہ کہ واقعات جن پر استدلال کی عمارت اٹھائی جاتی ہے معروضی مطالعے کے ذریعے اخذ کئے گئے ہوں نہ کہ اپنے نظریے کو سامنے رکھ کر ان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا گیا ہو۔

اسلام چونکہ کسی خاص قومیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مسلک ہے جو

مطلقاً انسان اور اس کی سعادت سے تعلق رکھتا ہے اور ان تعصبات سے اسے کسی قسم کی دل چسپی نہیں ہے جو انسانوں کی نسلی، قومی اور جغرافیائی نفسیات سے پیدا ہوتے ہیں لہذا تاریخ میں اس نے یہی آخری رویہ اختیار کیا ہے۔"

عربی اور فارسی تاریخ نگاری کے ارتقا کے سلسلے میں اسے چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ابتدائے تاریخ نگاری سے تیسری ہجری تک۔

۲۔ تیسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک

۳۔ چھٹی صدی ہجری کے آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے آغاز تک۔

۴۔ دسویں صدی ہجری سے تا حال۔

اسلام سے قبل کی آخری صدی کے واقعات کی یاد کو پہلی صدی ہجری میں داستانوں کی صورت میں بیان کیا جاتا تھا۔ یہی داستانیں قدیم تاریخ عرب سمجھی جاتی تھیں اس قسم کی داستانوں کو وھب بن منبہ اور عبید بن شریۃ کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ قدیم عربوں میں تاریخی حس اور نظری تناسب کے ادراک کا فقدان تھا۔ بعد کے مصنفین نے ان کے بیانات کو اپنی تصانیف میں شامل کر لیا۔ مثلاً ابن اسحاق عبید کے راویوں میں سے تھا اور عبد الملک بن ہشام نے وہب کی کتاب "التیجان" کو اس کی موجودہ صورت میں نشر کرنے کے لیے مرتب کیا۔

دوسری صدی ہجری میں قبائلی روایت کا میدان جو صرف راویوں اور نساب کے لیے ہی مخصوص تھا، ماہرین لسانیات کی جولانگاہ بن گیا۔ انھوں نے علم تاریخ کی شاندار خدمات سرانجام دیں اس قسم کی سرگرمیوں کا نمونہ ابو عبیدہ نے پیش کیا اس نے تقریباً دو سو موسوم رسائل تصنیف کیے۔ اگرچہ ان میں سے ایک بھی اس کے نام سے ہم تک نہیں پہنچا۔ لیکن ان میں سے اکثر مابعد کی تصانیف میں شامل کر لیے گئے۔

اس قسم کا کام ہشام بن محمد الکلبی نے بھی سرانجام دیا جو اس کے والد نے جمع کیا تھا۔ ہشام نے اسے ترتیب دیا اور اسے پھیلایا۔ اس نے تاریخی ماخذ سے وہ تاریخی معلومات جمع کیں جو شہر الحیرہ اور ملوک حیرہ سے متعلق تھیں۔ علمی تاریخ نویسی کی طرف یہ ایک نہایت اہم قدم تھا۔

عربی زبان میں علمی تاریخ نویسی کی ابتدا آنحضورؐ کی سیرت اور سرگرمیوں کے مطالعے سے وابستہ ہے۔ اس علم کے منبع کا پتا خاص طور پر ان احادیث سے لگتا ہے جو آنحضورؐ کے غزوات سے متعلق ہیں اور جنھیں اصطلاح میں مغازی کہا جانے لگا۔ یہ اصطلاح ابتدائی زمانے کی سیرت کی کتابوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔ ان کتابوں کے لکھنے والوں کا مرکز اولین مدینہ تھا۔ بعد میں دوسری جگہوں پر بھی مغازی لکھنے والے نظر آنے لگے۔ چونکہ یہ علم احادیث سے مربوط تھا اس وجہ سے تاریخی معلومات کے تخصص میں اور ان کی تنقیدی صحت میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ چنانچہ دوسری صدی کے مغازی نگاروں نے جو جامع مواد رکھتے ہیں۔ ابان بن عثمان اور عروہ بن الزبیر ہیں جو کتب مغازی کے مصنف ہیں۔ بعد کے زمانے میں کئی محدث ایسے گذرے جو احادیث مغازی کے جمع کرنے میں مشہور و معروف تھے۔ ان میں خاص طور پر محمد بن مسلم ابن شہاب الزہری ہیں۔ ان کے بعد تین اور مؤلفوں نے مغازی پر کتابیں ترتیب دیں جن میں مشہور ترین کتاب سیرۃ محمد ابن اسحاق بن یسار ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں وسیع تر تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں اس نے نہ صرف آنحضورؐ کی سیرت قلم بند کی بلکہ اس میں تاریخ نبوت لکھنے کا بھی اہتمام کیا۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں زمانہ جاہلیت کی تاریخ ابتدائے آفرینش سے لکھی گئی۔ دوسرے حصے میں آنحضورؐ کے پہلے سن ہجری تک کے حالات قلم بند ہیں۔ تیسرے حصے میں المغازی میں آپؐ کی وفات تک کے حالات ہیں۔ یہ کتاب زمانہ جاہلیت اور صدر اسلام کی تاریخ پر ایک مستند کتاب سمجھی جاتی رہی۔ لیکن اس کتاب کے تمام نسخے ضائع ہو گئے اور اس طرح سے تاریخی میدان ایک تلخیص کے لیے خالی رہ گیا جسے ایک مصری مؤلف عبد الملک ابن ہشام نے مرتب کیا۔ ابن اسحاق کے جانشینوں میں ایک محمد بن عمر واقدی ہے جس نے نہ صرف مغازی نبیؐ کے موضوع پر کتابیں لکھیں بلکہ اسلامی تاریخ کے کئی حوادث پر بھی قلم اٹھایا اور ایک بڑی تاریخ جو "کتاب التاریخ الکبیر" کے نام سے مشہور ہے تصنیف کی جو عہد ہارون تک کے حالات پر مبنی ہے واقدی کے مواد کا بہت بڑا حصہ اس کے اپنے کاتب محمد ابن سعد نے آنحضورؐ، صحابہ کرام اور تابعین کی سیرت نگاری میں استعمال کیا ہے۔ اس کی تصنیف کا نام طبقات ابن سعد ہے۔ اس تصنیف کا وہ حصہ جس کی آخری ترتیب و تدوین اس نے خود کی۔ "سیرت النبیؐ" تھا۔ اس میں بھی خاص طور پر وہ ابواب جو صفت اخلاق النبی اور اور علامات النبوۃ پر ہیں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی ابواب بعد میں آنے والی کتب شمائل و دلائل کا پیش خیمہ ہیں۔

دوسرا دور تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اس کے آغاز میں ادب کے بڑھتے ہوئے معیار اور کاغذ کی ایجاد نے ادب کے ہر شعبے میں ایک نئی جان ڈال دی۔ ۱۷۸ھ/۷۹۴ء میں بغداد میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔ چنانچہ قدیم ترین مخطوطات جو ہم تک پہنچے ہیں اسی زمانے سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد المدائنی کی طرف منسوب ہونے والے دو سو تیس رسالوں میں سے اکثر اس کی زندگی ہی میں کتابت میں آ گئے۔ ان رسالوں میں اہم ترین خلافت کی تاریخ سے متعلق بڑی تصانیف تھیں۔ اس زمانے سے تاریخ نویسی اسلامی تہذیب و تمدن کا جز و بن گئی وسیع معنی میں تاریخی تالیفات کی ابتدا جس میں سیرت کے مواد مذکورہ بالا مفرد رسائل اور دوسرے ماخذ کو ملا جلا کر ایک مربوط تاریخی بیان مرتب کیا گیا۔ تیسری صدی کے زمانہ وسط سے ہوئی۔ چنانچہ اس طرز کا سب سے پہلا مؤلف احمد بن یحییٰ بلاذری ہے۔ اس دور کی امتیازی تالیف تاریخ عالم ہے۔ جس میں ابتدائے آفرینش سے لیکر تمام دنیا کی تاریخ کا خلاصہ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر خالص اسلامی تاریخ کے مقدمے کے طور پر مذکور ہے۔ اس مطابعت میں ابو حنیفہ الدینوری اور ابن واضح الیعقوبی جیسے مؤلفین نے قلم اٹھایا۔ یعقوبی کی کتاب کو تو تاریخ عالم کی بجائے تاریخی انسائیکلوپیڈیا کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی صنف میں ابن قتیبہ کا کتابچہ "تعلیقات" المعروف بہ "کتاب المعارف" اور حمزۃ الاصفہانی اور المسعودی کی تالیفات بھی شامل ہیں۔ المسعودی کا شمار عربی میں لکھنے والے اکابر مورخین میں ہوتا ہے۔ اس کی بڑی تصانیف ضائع ہو گئی ہیں۔ اس طرز کی تصانیف سے ایک نئے فکری عنصر نے عربی تاریخ نویسی میں جنم لیا۔

۳۱۰ھ/۹۲۳ء میں محمد بن جریر طبری کی مشہور کتاب "تاریخ الرسل والملوک" میں قدیم تاریخی روایات نقطہ عروج پر نظر آتی ہیں۔ وہ اسلامی تاریخی روایات میں بھی اسی تفصیل اور تنقید کا حامل نظر آتا ہے جیسا کہ اپنی تفسیر میں۔

تیسری صدی ہجری میں عربی تاریخ نویسی کا قدیم دور ختم ہو گیا اور علم تاریخ کو بجائے خود ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ تیسری صدی سے چھٹی

صدی ہجری کے نصف تک تاریخ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور اس میدان میں کافی حد تک ترقی ہوئی۔ چوتھی صدی ہجری کے نصف اول کے بعد سیاسی تاریخ نویسی کا کام زیادہ تر سرکاری عمال اور درباریوں میں منتقل ہو گیا تو تاریخ نگاری کے ڈھانچے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ اب مفصل اسناد کی بجائے صرف مجملاً ماخذوں کا ذکر کیا جانے لگا۔ بعد کے مصنفین نے تو اسناد کا ذکر کرنا بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ قدیم دینی تصور کو جس کی وجہ سے علم تاریخ کو ایک خاص مقام حاصل ہوا تھا، متروک قرار دے دیا گیا۔ اسلوب کی اس تبدیلی سے ایک اور نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ ابتدائی زمانے میں تو علم تاریخ کے مطالعے کی ضرورت مذہبی اور دینی وجوہات کی بنا پر بتائی جاتی تھی اب اس کی جگہ تاریخ کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے بھی ضروری قرار دیا جانے لگا۔ اس دور میں اگرچہ سیاسی تاریخ نویسی کا میدان محدثین اور علمائے عمال حکومت کے لیے خالی کر دیا تھا لیکن سیرت نگاری کا وسیع میدان ابھی تک ان کے قبضے میں تھا۔ اس دور کی ایک ممتاز صنف علما و مشاہیر کے تراجم کے معجم ہیں اس قسم کی کتاب بہت ضخیم ہوا کرتی تھی جیسے الخطیب بغدادی کی تصنیف جو چودہ جلدوں میں ہے۔ اسی طرح ابن عساکر کی تصنیف "تاریخ" نہایت ہی جامع کتاب ہے۔

ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی کے احیاء کی کوشش تو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ایرانی خاندانوں کے عہد میں شروع ہوئی۔ اس دور میں جو تاریخی کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئیں ان میں سے بہت سی قدیم ترین کتابیں عربی تصانیف کے ترجموں اور خلاصوں پر مشتمل تھیں۔ لیکن اگلی صدیوں میں جوں جوں ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا توں توں وہ اپنے ساتھ فارسی زبان کو بھی لیتے گئے چنانچہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں ان ممالک میں بھی فارسی زبان میں تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ ہندوستان میں فخر الدین مبارک شاہ نے تاریخیں لکھیں۔

تاریخ نگاری کے اس تیسرے دور میں ایرانی ترکی ثقافت کے علاقے میں عربی کی جگہ فارسی نے لے لی اور چونکہ ہندوستان میں بھی توسیع اسلامی کی وجہ سے فارسی رواج پا گئی تو ان ممالک میں فارسی تاریخ نگاری کا رواج بڑی تیزی سے شروع ہوا۔ اگرچہ عربی میں بھی تاریخ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ابن الاثیر کی "الکامل" اسی دور کی ایک تصنیف ہے۔ اس دور میں عربی تاریخ نویسی کا مرکز شام میں منتقل ہو گیا تھا اس وقت کے تاریخ نویسوں میں عماد الدین الاصفہانی، ابو شامہ، بہاء الدین شداد ہیں تاریخ نویسی کی سرپرستی مملوک سلاطین کے عہد میں بھی ایوبیوں کے زمانے کی طرح جاری رہی اور مملوکوں کے دور حکومت کی آخری صدی میں تاریخ کے دبستان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہو گیا۔ اس خاص صنف کے ایجاد کرنے والوں میں تقی الدین المقریزی، العینی، ابوالمحاسن، ابن تغری بردی، علی بن داؤد الجوہری، شمس الدین سخاوی، جلال الدین سیوطی، ابن ایاس، احمد بن زنبل ہیں۔

ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں ابن الاثیر کی اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ابن الفوطی کی "مجمع آداب فی معجم الالقاب" جو پچاس جلدوں میں تھی ان کتابوں میں ہر زمانے کے مشاہیر کے حالات جمع کیے گئے تھے۔

دسویں صدی ہجری میں چونکہ تمام اسلامی دنیا مختلف حصوں میں تقسیم ہو گئی تھا۔ عربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں مراکو کی حد تک کا علاقہ عثمانی ترکوں کے زیر نگین تھا ایران میں صفویوں نے شیعی حکومت قائم کر لی تھی۔ وسط ایشیا میں ازبکی ریاستیں معرض وجود میں آ گئیں۔ ہندوستان خاندان مغلیہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ چنانچہ اس انقلاب کی وجہ سے نئی ثقافتی جماعت بندیاں عمل میں آئیں اور ان کا علم تاریخ پر بھی اثر پڑا خاص طور پر عربی زبان کی تاریخ نویسی پر تو بہت اثر ہوا۔ اور عربی زبان میں تاریخ نویسی دم توڑنے لگی۔ اگرچہ چند معمولی قسم کی تاریخیں مثلاً الدیار بالبکری، الجنابی وغیرہ ضبط تحریر میں آئیں۔ لیکن اس زمانے میں قدیم طرز کی عربی تاریخ نویسی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اس دور کے قابل ذکر مصنف عبدالرحمٰن الجبرتی اور حیدر احمد الشہابی، المقری التلمسانی ہیں۔

جب غزنویوں نے ہندوستان فتح کر کے دہلی کو اپنا پایہ تخت بنا یا تو اس زمانے سے یہاں ایرانی طرز کی تاریخ نویسی کی ابتدا ہوئی۔ اس زمانے کی تصانیف میں ضیاء الدین برنی کی تصنیف خاص اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ نگاری کے چوتھے دور میں ہندوستان میں تین مختلف ادبی اسلوبوں کا باہم اتصال ملتا ہے۔ ایک ہندی فارسی روایت کا اسلوب دوسرا [illegible] ہرات کا روایتی اسلوب اور تیسرا اسلوب [illegible] طرزوں کا دھارا ہے۔

چنانچہ جس روایت کا رواج غزنویوں کے عہد میں ہو چکا تھا وہ پہلی مرتبہ واضح طور پر شہنشاہ اکبر کے عہد میں نظر آتی ہے۔ اس کوشش میں نظام الدین اور عبدالقادر بدایونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں خاص طور پر بدایونی کی تاریخ جو ایک غیر سرکاری تصنیف ہے اور جس میں مشاہیر ہند کی تراجم نگاری اور سیاسی واقعات کا اندراج دونوں باہم شامل ہیں۔ بعد میں محمد قاسم فرشتہ نے اسلامی تاریخ کے میدان کو بہت زیادہ وسعت دی۔ تقریباً [illegible] صدی میں ہندوستان میں تاریخ نویسی نے اپنی منزل کو پا لیا۔ اس دور میں ہندو مصنفین نے بھی اس میدان میں کوششیں شروع کیں۔ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو [illegible] کی تاریخ میں پیوست کر دیا۔ اس دور میں مغل بادشاہوں کے لیے قدیم [illegible] ترجمہ فارسی زبان میں ہوا۔ اسی دور میں ان بادشاہوں کے عہد کی تواریخ بھی [illegible] طور پر قلم بند ہوئیں جن میں ابوالفضل علامی کی "آئین اکبری"، جہانگیر کی خود نوشت "تزک جہانگیری" اور اس سے قبل بابر کی "تزک بابری"۔ شاہجہان کے عہد [illegible] تاریخ جس کی دو جلدیں عبدالحمید اور تیسری جلد [illegible] کے [illegible] اورنگ زیب کے عہد کے حالات محمد کاظم، محمد ساقی مستعد خان نے تحریر کیے [illegible] خوانی کی تصنیف "تاریخ آل تیمور" اور [illegible] کی سوانح [illegible] کی تصنیف مغلیہ خاندان کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی تاریخ [illegible] رشیدی"، "ہمایوں نامہ"، شیخ محمد علی حزیں کا "تذکرۃ الاحوال" اور [illegible] خان کا "عبرت نامہ" ہیں۔ "نزھۃ الخواطر" جو تاریخ کے ایک [illegible] رکھتا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے عربی زبان میں [illegible] ہے۔ اسی دور کا ایک شاہکار ہے۔

جب برعظیم پاک و ہند میں فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تو مختلف تاریخ [illegible] اردو میں تراجم کیے گئے اور رفتہ رفتہ اردو زبان میں بھی تاریخ کے موضوع پر [illegible] بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اردو زبان میں تاریخ کی مشہور کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔ لیکن ان میں اکثریت کا موضوع سیرت ہے۔

۱۔ اصح السیر فی ہدی خیر البشر، دو جلدیں، مصنف ابو البرکات عبدالرؤف دانا پوری
۲۔ رحمۃ للعالمین، تین جلدیں، قاضی محمد سلیمان منصور پوری
۳۔ سیرۃ النبی، چھ جلدیں، مولانا شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
۴۔ "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۵۔ سیرۃ المصطفیٰ (تین جلدیں)، مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۶۔ عہد نبوی کے میدان جنگ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

۷۔ "نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب" مولانا اشرف علی تھانوی۔
۸۔ "محسنِ انسانیت"۔ نعیم صدیقی۔
۹۔ "تاریخ اسلام"۔ معین الدین ندوی
۱۰۔ "تاریخ اسلام"۔ اکبر شاہ نجیب آبادی
۱۱۔ "جذب القلوب" (تاریخ مدینہ) عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ محمد صادق
۱۲۔ "دربار رسول کے فیصلے" ۔عبداللہ المالکی ترجمہ حکیم عبدالرشید۔
۱۳۔ "رسالت خاتم النبیین" (دو جلدیں) سید عبدالحمید الخطیب ترجمہ محمد عادل قدوسی
۱۴۔ "زاد المعاد" (چار جلدیں) حافظ ابن قیم ترجمہ رئیس احمد جعفری۔
۱۵۔ "سید العرب"۔ عمر ابو النصر ترجمہ محمد احمد پانی پتی
۱۶۔ "سیرت ابن ہشام" (دو جلدیں) عبدالملک بن ہشام ترجمہ قطب الدین احمد محمودی
۱۷۔ "الشفاء"۔ قاضی عیاض ترجمہ حافظ احمد علی۔
۱۸۔ "عدالت النبوی کے فیصلے" عبداللہ المالکی مترجم غیر مذکور۔

تاریخِ اسلام اسلام کی تاریخ ۔اسلام کن ادوار میں کہاں کہاں پھیلا۔ عام طور پر مسلمانوں کی عام سیاسی تاریخ کو تاریخ اسلام کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے علمی غلطی ہے۔ اسے ہم صرف ملی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے مراد فقط دین اسلام کی تاریخ ہے۔ جس میں اگرچہ سیاسی تاریخ بھی شامل ہے لیکن اس سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

تاریخ اسلام کا مختصر ترین جائزہ لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام سرزمین عرب سے اٹھا اور بہت جلد عراق، شام، افریقہ کے علاوہ ایران کے راستے ہندوستان اور مشرق بعید تک پہنچ گیا۔ عام طور پر چونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا اس لئے زیادہ تر سیاسی تاریخ ہی اسلامی تاریخ کی جگہ لیتی رہی ۔حالانکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں جبر نہیں ۔سلاطین اسلام نے کبھی بھی عیسائیوں کی طرح خود کو کسی پوپ کے ماتحت محسوس نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے عیسائی مشنریوں کی طرح کبھی اشاعتی مشن قائم کئے۔

اسلام کا باقاعدہ اعلان و آغاز ۱۰ قبل ہجری/ ۶۱۲ عیسوی سے ہوا ہے ۔صرف دس برس میں پورا عرب حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اور تقریباً چالیس برس تک مسلمان سیدھے سادے انداز میں دین کی پیروی کرتے رہے۔ آنحضورؐ کے صحابہ میں تفسیر آیات، قرآنی و فقہی مسائل میں اختلافات ہوتے تھے لیکن یہ زیادہ تر فروعی قسم کے تھے ۔مگر خلفائے راشدین کے زمانے میں مختلف ممالک ایران، عراق، شام، افریقہ وغیرہ اسلام کے زیر نگیں آ گئے تو مختلف نسلوں اور مذاہب نے اسلام میں دخل اندازی شروع کر دی۔ جس سے اصولی اختلافات وجود میں آئے۔

اصولی اختلافات کی رو سے مسلمانوں میں سب سے پہلے ایک سیاسی گروہ شیعان علی کہلایا۔ بظاہر یہ لوگ حضرت علیؓ کے طرف دار تھے ۔لیکن دراصل یہ عراق و عجم کے ان تصورات کے حامل تھے، جو شخصی وراثت و حکومت کو جائز سمجھتے تھے عام مسلمانوں کا یہ خیال اور اس پر عمل تھا کہ امام یا خلیفہ کا انتخاب عوام کی کثرت رائے سے ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ امام کی تقرری منجانب اللہ کرنے پر مُصر تھے بعدازاں انہوں نے فروعی اور فقہی مسائل کے علاوہ اصولی مسائل میں بھی اختلافات کرنا شروع کر دیئے اور یہی یہ الگ فرقہ شیعہ کہلائے، جو آگے چل کر مزید کئی فرقوں میں بٹ گیا۔ اسی دور میں ایک اور فرقہ خوارج نے جنم لیا۔ ابتداء میں یہ لوگ بھی حامیانِ اہل بیت تھے لیکن جنگ صفین میں انہوں نے حضرت علیؓ پر جنگ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔

ایرانی اثرات کے ماتحت اسلامی تصوف میں بھی کئی رنگ آئے۔ ان صوفیاء نے دنیا سے بے رغبتی پر زور دیا۔ دولت اور تعیش سے کنارہ اور دنیاداری کو حرام سمجھنا ان کی تعلیم تھی۔ دوسری طرف یونانی تصورات بھی اسلام پر اثر انداز ہوئے اور اس کے زیر اثر مامون الرشید کے عہد میں ایک اور فرقہ معتزلہ پیدا ہوا۔ اس فرقے نے عقل ہی کو سب سے بڑی کسوٹی قرار دیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر فرقہ اشعریہ نے جنم لیا۔ یہ لوگ بھی فلسفے کے سہارے چلتے تھے۔ بعدازاں یہی لوگ اہل سنت والجماعت کہلائے۔ ان میں بڑے بڑے علماء اور امام گذرے ہیں۔

اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے جداگانہ کام کئے۔ انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے اسلامی فقہ کو ایک حد تک مکمل کر دیا اور ایسے تمام مسائل جو پیش آ چکے تھے یا آنے والے تھے ان سب کا حل پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ان چاروں میں سے کسی ایک کے پیروکار ہو گئے اور یوں اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ آج بھی اہل سنت کے ہاں یہی چار فقہی مذاہب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی رائج ہیں۔ اس تقلید کا نتیجہ فرقہ پرستی کی صورت میں نکلا۔ مناظرات کا بازار گرم ہو گیا۔ فروعی مسائل پر سر پھٹول ہونے لگے۔ جس سے عوام میں مذہب اور اس کے پیشوا سے بیزاری اور بے توجہی عام ہو گئی۔

فلسفہ کو مختلف فرقوں نے استعمال کرنا شروع کیا تو اسے غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی اور بے شمار مسلمان فلسفی اور سائنس دان پیدا ہوئے۔ جنہوں نے مشرق و مغرب میں شہرت پائی۔ یہ لوگ عقلیت پسند کہلائے۔ جبکہ اشاعرہ اور دیگر فرقوں کے اکثر علماء متکلمین کہلاتے تھے۔ جو فلسفہ کی چوکھٹ میں اسلام کو فٹ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں ملحد قسم کے فلسفی اور جذبہ ایمانی سے خالی علماء پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ عام مسلمانوں کے جذبات دینی بھی سرد پڑ گئے اور وہ میدان جہاد میں شمشیر بکف ہونے کی بجائے مناظروں اور محفلوں میں ایک دوسرے سے سر بگریباں ہونے لگے۔

فلسفہ کے ردعمل کے طور پر تصوف کو عروج حاصل ہوا۔ جس میں قلبی واردات اور احساسات کو علم کا منبع ٹھہرایا گیا۔ فلسفی عقل کے ذریعے خدا کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے تو صوفیاء نے دل کو اس کام کے لیے مقرر کر دیا۔ ایرانی اور پھر ہندی اثرات کے تحت تصوف میں بہت تبدیلیاں آئیں۔ پہلی دو صدیوں کے بعد سے تصوف میں زیادہ تر زرتشتی اثرات، نوافلاطونی وحدت الوجود، بدھی نروان اور ویدانت کے فقر و فاقہ کو بنیادی عناصر قرار دے دیا گیا۔ تصوف میں بھی چار مشہور سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ ہیں۔ تصوف کے زیر اثر بیعت شیخ، رہبانیت، چلہ کشی، قبر پرستی، کشف و کرامات اور بعدازاں بہت سی بدعات اسلام میں در آئیں۔ چونکہ صوفیاء عوام کے زیادہ قریب تھے۔ اس لیے عوام میں ان باتوں نے بڑی راہ پائی ان امور کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ایسے لوگ بھی آتے رہے۔ جنہوں نے اصلاح و تزئین کی کوشش کی۔ عمر بن عبدالعزیز، امام غزالی، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، محمد بن عبدالوہاب، سید احمد بریلوی، جمال الدین افغانی، سرسید اور علامہ اقبال جیسے لوگوں نے مسلمانوں کو پھر سے صراط مستقیم پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس امر میں بعض مصلحین نے سختی، درشتی اور تنگ نظری سے بھی کام لیا۔ جس کی وجہ سے وہ مطعون ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کو دیگر عناصر کے اثرات سے پاک کرنے اور اس کی تشکیل و تدوین نو کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ آج کے دور

میں یہ ضرورت جتنی بڑھ گئی ہے۔ اس سے پہلے شاید اس میں اتنی شدت کبھی نہیں تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولا جائے اور بقول علامہ اقبال اسلامی فکر کی روایت پھر سے تازہ کی جائے اور مذہبی علوم کو سائنس کی زبان میں یعنی سائنٹیفک انداز سے سمجھا جائے۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک الگ مادی دنیا کا کوئی ایسا وجود نہیں، جس کی جڑیں روحانی دنیا میں نہ ہوں اور جو ناپاک اور ناقابل التفات ہو۔ یہ دنیاوی مظاہر ہی ہیں، جن میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے ان مظاہر سے کنارہ کشی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ان مظاہر کو بنیاد مانا جا سکتا ہے کہ یہ بذات خود غیر اہم ہیں۔

اسلام کی سیاسی، دینی اور علمی تاریخ کا ایک سنین وار جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے اس میں دیے گئے سنین کے لیے حتی الامکان استناد کی کوشش کی گئی ہے تاہم دیگر جگہوں پر درج سنین کا ان سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ واقعات کے اندراج کے ضمن میں محض زیادہ سے زیادہ اہم واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام کب، کہاں اور کس طرح پھیلا تو اس کی تاریخ مختلف ملکوں، شہروں اور شخصیات کے ساتھ اجمالاً دے دی گئی ہے۔ وہاں سے استفادہ کیا جائے۔ نیز تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف، اسلامی فرقوں وغیرہ پر الگ الگ مضامین کے علاوہ "علم" کے عنوان کے تحت بھی کسی قدر معلومات دی گئی ہیں۔ مضمون میں مسلم تاریخ کا ایک تقابلی خاکہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ جس سے مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں برسرِ اقتدار خانوادوں کا علم ہوتا ہے۔

اسلامی سیاسی و دینی واقعات کا ایک مختصر جائزہ

(سنین وار)

ہجری سن	عیسوی سن	واقعات
۵۴ ق ھ قبل ہجری	۵۶۹ء یا	ولادت آنحضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔
یا ۵۳ ق ھ	۵۷۰ء	
۵۰ ق ھ	۵۷۳ء	واقعہ شقِ صدر
۴۸ ق ھ	۵۷۵ء	وفات بی بی آمنہؓ
۴۶ ق ھ	۵۷۶ء	وفات عبدالمطلب
۲۰ ق ھ	۶۰۳ء	ولادت علیؓ
۱۹ ق ھ	۶۰۴ء	کعبہ کی تعمیرِ نو۔ حجرِ اسود آنحضورؐ کے فیصلے کے مطابق رکھا گیا۔
۱۴ ق ھ	۶۰۹ء	ابتدائے نزولِ وحی۔ ولادت عائشہؓ
۱۰ ق ھ	۶۱۳ء	اعلانِ دعوتِ اسلام۔
۹ ق ھ	۶۱۴ء	ہجرتِ حبشہ۔
۸ ق ھ	۶۱۵ء	عمرؓ و حمزہؓ کا قبولِ اسلام
۴ ق ھ	۶۱۹ء	وفات خدیجہؓ
۲ ق ھ	۶۲۱ء	معراج۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ
۱ ق ھ	۶۲۱ء	بیعتِ عقبہ ثانیہ
یکم ہجری	۶۲۲ء	ہجرتِ مدینہ، مسجدِ قبا کی بنیاد، اذان کی ابتدا۔
۲ ہجری	۲۳-۶۲۴ء	فرضِ جہاد، فرضِ صومِ رمضان۔ غزوۂ بدر
۳ھ	۶۲۵ء	غزوۂ احد۔
۴ھ	۶۲۵ء	غزوات ذات الرقاع، بئر معونہ، بنی نضیر، ذات الرجیع، واقعہ افک، احکامِ تیمم
۵ھ	۶۲۶ء	غزوات دومۃ الجندل، بنی مصطلق، خندق
۶ھ	۶۲۷ء	غزوات خیبر، بنی لحیان، ذی قرد، صلح و عمرۂ حدیبیہ
۷ھ	۶۲۸ء	مکاتیبِ رسولؐ بنام مقوقس و دیگر امراء
۸ھ	۳۰-۶۲۹ء	فتح مکہ، غزوۂ حنین۔
۹ھ	۳۱-۶۳۰ء	آیتِ ربوٰ۔ ابوبکر امیر الحج
۱۰ھ	۶۳۱ء	غزوۂ تبوک، حجۃ الوداع۔
۱۱ھ	۶۳۲ء	وصالِ نبویؐ، آغازِ خلافت ابوبکر صدیقؓ
۱۳ھ	۶۳۴ء	وفات ابوبکر صدیقؓ و خلافت عمر فاروقؓ۔
۱۴ھ	۶۳۵ء	فتح دمشق، بعلبک، حمص و انطاکیہ
۱۵ھ	۶۳۶ء	واقعہ یرموک، جنگ قادسیہ۔
۱۶ھ	۶۳۷ء	تعمیر بصرہ و کوفہ، فتح بیت المقدس
۲۱ھ	۶۴۲ء	فتح نہاوند، وفات خالدؓ بن ولید
۲۲ھ	۶۴۳ء	فتح طرابلس۔
۲۳ھ	۶۴۴ء	شہادت عمر فاروقؓ۔ آغاز خلافت حضرت عثمان غنیؓ
۲۸ھ	۶۴۸ء	فتوحات افریقہ، قبرص، آذربائیجان وغیرہ۔
۳۲ھ	۶۵۳ء	ایران میں اسلامی سلطنت کا قیام، وفات ابودرداءؓ و عبدالرحمٰنؓ بن عوف و عباسؓ و عبداللہ بن مسعودؓ و ابوذر غفاریؓ۔
۳۵ھ	۵۶-۶۵۵ء	وفیات ابوطلحہ انصاریؓ و عامرؓ، شہادت عثمانؓ۔ خلافت علیؓ
۳۶ھ	۶۵۶ء	وفیات سلمان فارسیؓ، طلحہؓ و زبیرؓ۔ واقعہ جمل۔
۳۷ھ	۶۵۷ء	واقعہ صفین، عہد نامہ تحکیم
۴۰ھ	۶۶۰ء	شہادت علیؓ۔ خلافت حسنؓ۔ اعلان خلافت [illegible]
۴۴ھ	۶۶۴ء	فتح کابل۔
۴۹ھ	۶۶۹ء	وفات امام حسنؓ
۵۴ھ	۶۷۴ء	وفات اسامہؓ بن زید، فتوحات بخارا و ترمذ
۶۰ھ	۶۸۰ء	وفات معاویہؓ و خلافت یزید۔
۶۱ھ	۶۸۰ء	واقعہ کربلا، شہادت حسینؓ
۶۲ھ	۶۸۱ء	فتح خوارزم و سمرقند۔
۶۴ھ	۶۸۳ء	وفات یزید بن معاویہ، تعمیر کعبہ، خلافت [illegible]
۶۵ھ	۶۸۵ء	خلافت عبدالملک بن مروان۔
۷۳ھ	۶۹۲ء	شہادت عبداللہؓ بن زبیرؓ، وفات [illegible]
۸۰ھ	۶۹۹ء	پیدائش امام جعفر صادقؒ و امام ابوحنیفہؒ [illegible] بن جعفر طیارؓ۔
۸۶ھ	۷۰۵ء	خلافت ولید بن عبدالملک [illegible]
۹۲ھ	۷۱۱ء	محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ [illegible] طارق بن زیاد [illegible] فتح اندلس۔
۹۶ھ	۷۱۵ء	وفات خلیفہ ولید، خلافت سلیمان [illegible]
۹۹ھ	۷۱۷ء	عمرؒ بن عبدالعزیز کی خلافت
۱۰۱ھ	۷۲۰ء	شہادت عمر بن عبدالعزیز، خلافت یزید ثانی۔
۱۰۵ھ	۷۲۴ء	خلافت ہشام
۱۰۸ھ	۷۲۶ء	فتح قیساریہ
۱۱۰ھ	۷۲۹ء	جنگ ارض روم [illegible]

۱۲۵ھ / ۷۴۳ء — وفات خلیفہ ہشام، خلافت ولید ثانی۔
۱۲۶ھ / ۷۴۴ء — خلافت یزید ناقص، خلافت ابراہیم، خلافت مروان ثانی
۱۲۹ھ / ۷۴۷ء — ابومسلم خراسانی کا اعلان بغاوت
۱۳۰ھ / ۷۴۷ء — فتنہ اباضیہ
۱۳۲ھ / ۷۴۹ء — خلافت عباسیہ (ابوالعباس السفاح) کا آغاز، خلیفہ مروان ثانی کا قتل۔
۱۳۵ھ / ۷۵۲ء — وفات رابعہ بصریؒ
۱۳۶ھ / ۷۵۴ء — خلافت منصور عباسی، جنگ نصیبین، عبدالرحمان الداخل سپین پہنچا اور اموی حکومت کی بنیاد رکھی۔
۱۴۸ھ / ۷۶۵ء — وفیات جعفر صادق و ابن ابی لیلیٰ
۱۵۰ھ / ۷۶۷ء — استاد سیس کا دعوٰے۔ وفات امام ابوحنیفہؒ
۱۵۳ھ / ۷۷۰ء — افریقہ میں اباضیوں کے خلاف زبردست مہم۔
۱۵۷ھ / ۷۷۳ء — وفات امام اوزاعی۔
۱۵۹ھ / ۷۷۵ء — خلافت مہدی حکیم مقنع نے دعوائے خدائی کیا۔ مصنوعی چاند نکالا اور خودکشی کرلی۔
۱۶۱ھ / ۷۷۷ء — مسجد نبوی میں توسیع وفات سفیان ثوریؒ
۱۶۲ھ / ۷۷۹ء — وفات ابراہیم بن ادھم و قاضی ابوبکر بن ابی سبرہ
۱۶۶ھ / ۷۸۲ء — تعمیر مسجد الحرام مکہ
۱۶۹ھ / ۷۸۵ء — خلافت الہادی
۱۷۰ھ / ۷۸۶ء — خلافت ہارون الرشید
۱۷۲ھ / ۷۸۸ء — سپین میں وفات عبدالرحمان وخلافت ہشام اوّل
۱۷۴ھ / ۷۹۱ء — فتح ارض روم۔
۱۷۸ھ / ۷۹۴ء — عباسی خلافت میں یحییٰ برمکی کی وزارت اور کل اختیارات
۱۷۹ھ / ۷۹۵ء — وفات امام مالک و حماد البصری۔
۱۸۰ھ / ۷۹۶ء — وفات ہشام اوّل
۱۸۳ھ / ۷۹۹ء — وفات موسیٰ کاظم
۱۸۷ھ / ۸۰۳ء — جعفر برمکی کے قتل سے برامکہ کا زوال۔
۱۹۰ھ / ۸۰۵ء — ہارون کی فتوحات روم، وفات یحییٰ برمکی۔
۱۹۳ھ / ۸۰۹ء — وفات ہارون، خلافت امین الرشید
۱۹۸ھ / ۸۱۳ء — قتل امین و خلافت مامون الرشید
۲۰۰ھ / ۸۱۵ء — عباسیوں کی مردم شماری۔
۲۰۱ھ / ۸۱۶ء — ظہور بابک خرمی
۲۰۴ھ / ۸۱۵ء — ابتدائے دولت عثمانیہ۔ وفات امام شافعیؒ
۲۰۵ھ / ۸۲۱ء — بنیاد دولت طاہریہ
۲۱۲ھ / ۸۲۷ء — فتنہ خلق القرآن۔
۲۱۸ھ / ۸۳۳ء — وفات عبدالملک بن ہشام، وفات المامون، خلافت المعتصم
۲۲۳ھ / ۸۳۷ء — بابک خرمی کا قتل۔
۲۲۹ھ / ۸۴۲ء — واثق کی تخت نشینی۔
۲۳۲ھ / ۸۴۷ء — وفات واثق، خلافت المتوکل۔
۲۳۸ھ / ۸۵۲ء — سپین میں وفات عبدالرحمان ثانی، حکومت محمد اوّل۔
۲۴۰ھ / ۸۵۴ء — سندھ میں حکومت ہباری

۲۴۱ھ / ۸۵۵ء — وفات امام احمد بن حنبلؒ
۲۴۵ھ / ۸۶۰ء — وفات ذوالنون مصری۔
۲۴۷ھ / ۸۶۱ء — قتل متوکل۔ خلافت المنتصر
۲۴۸ھ / ۸۶۲ء — وفات المنتصر وخلافت المستعین
۲۵۲ھ / ۸۶۶ء — قتل المستعین وخلافت المعتز
۲۵۴ھ / ۸۶۸ء — دولت طولونیہ۔ دولت صفاریہ ایران کی ابتدا
۲۵۵ھ / ۸۶۹ء — قتل المعتز، خلافت المہتدی، وفات علی نقی امام
۲۵۶ھ / ۸۷۰ء — قتل المہتدی، خلافت المعتمد، وفات امام بخاری۔
۲۵۹ھ / ۸۷۳ء — پہلے مسلمان سائنسدان الکندی کی وفات۔
۲۶۰ھ / ۸۷۳ء — وفات حسن عسکری، امام
۲۶۱ھ / ۸۷۵ء — وفات امام مسلم و بایزید بسطامی
۲۶۸ھ / ۸۸۲ء — وفات احمد بن طولون۔
۲۷۳ھ / ۸۸۹ء — وفات محمد اندلسی، حکومت منذر اموی، وفات ابن ماجہ
۲۷۵ھ / ۸۸۸ء — وفات المنذر وحکومت عبداللہ بن محمد اموی، وفات ابوداؤد
۲۷۸ھ / ۸۹۱ء — قرامطہ کی بغاوت، وفات موفق عباسی۔
۲۷۹ھ / ۸۹۲ء — وفات المعتمد، خلافت المعتضد، وفات ابوعیسیٰ ترمذی
۲۸۰ھ / ۸۹۳ء — وفات دارمی۔
۲۸۹ھ / ۹۰۲ء — وفات المعتضد، خلافت المکتفی
۲۹۵ھ / ۹۰۸ء — وفات المکتفی وخلافت المقتدر
۲۹۷ھ / ۹۰۹ء — ابتدائے دولت فاطمیہ
۲۹۸ھ / ۹۱۱ء — وفات جنید بغدادی۔
۳۰۰ھ / ۹۱۲ء — خلافت عبدالرحمان ناصر اندلسی۔
۳۰۱ھ / ۹۱۴ء — منصور حلاج کا دعوٰے "انا الحق" اور گرفتاری
۳۰۳ھ / ۹۱۵ء — وفات نسائیؒ
۳۰۹ھ / ۲۲-۹۲۱ء — مصر پر عباسیوں کا قبضہ، حلاج کا قتل۔
۳۱۰ھ / ۹۲۲ء — وفات طبری مورخ
۳۱۱ھ / ۹۲۳ء — وفات محمد بن زکریا الرازی، قرامطہ نے حاجیوں کا قتل عام کیا
۳۱۷ھ / ۹۲۹ء — وفات ابوالقاسم البغوی، قرامطیوں نے مکہ میں قتل عام کیا اور حجر اسود نکال کر لے گئے۔ قرطبہ علمی مرکز بنا۔
۳۲۰ھ / ۹۳۲ء — قتل المقتدر، خلافت القاہر البغدادی
۳۲۲ھ / ۹۳۴ء — معزولی القاہر وخلافت الراضی۔
۳۲۴ھ / ۹۳۵ء — وفات ابوالحسن اشعری۔
۳۲۹ھ / ۹۴۰ء — وفات الراضی وخلافت ابراہیم المتقی
۳۳۳ھ / ۹۴۴ء — معزولی المتقی وخلافت المستکفی
۳۳۴ھ / ۹۴۵ء — قتل المستکفی وخلافت المطیع
۳۳۸ھ / ۹۴۹ء — بغداد میں شیعہ سنی فسادات
۳۳۹ھ / ۹۵۰ء — وفات ابونصر فارابی، حجر اسود واپس لایا گیا۔
۳۴۷ھ / ۹۵۸ء — عراق وشام پر رومیوں کا حملہ۔
۳۴۹ھ / ۹۶۰ء — کثیر تعداد ترکوں کا قبول اسلام۔ معزالدولہ نے بغداد کی بہت سی مساجد بند کرادیں۔
۳۵۰ھ / ۹۶۱ء — وفات عبدالرحمان ناصر وخلافت مستنصر الاموی

۳۵۲ھ / ۹۶۳ء — نوحہ، ماتم اور مراسم محرم کی ابتداء۔ عید غدیر کی ابتداء، غزنہ پر الپتگین کا قبضہ

۳۵۶ھ / ۹۶۶ء — سرکاری طور پر جبری ماتم، قتل ابوالفرج اصفہانی۔

۳۵۷ھ / ۹۶۸ء — المتقی کی وفات۔ عراق و شام میں بدامنی۔

۳۶۱ھ / ۹۷۲ء — مصر میں جامعہ ازہر کی بنیاد رکھی گئی۔

۳۶۶ھ / ۹۷۶ء — وفات المستنصر و خلافت ہشام ثانی الاموی۔

۳۷۸ھ / ۹۸۸ء — بغداد میں دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ تعمیر ہوئی۔ وفات ابونصر سراج صوفی۔

۳۸۰ھ / ۹۹۰ء — ہندوستان میں راجہ جے پال اور سبکتگین کی پہلی جنگ۔

۳۸۵ھ / ۹۹۵ء — وفات امام دارقطنی

۳۸۹ھ / ۹۹۹ء — محمود غزنوی کی تخت نشینی

۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء — محمود غزنوی کا ملتان پر حملہ۔

۳۹۸ھ / ۱۰۰۷ء — بغداد میں فسادات۔ وفات ابونصر کلاباذی، سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے۔

۳۹۹ھ / ۱۰۰۸ء — محمود غزنوی کا انندپال پر حملہ۔ معزولی ہشام ثانی و خلافت محمد مہدی الاموی۔

۴۰۰ھ / ۱۰-۱۰۰۹ء — محمود غزنوی کا نگرکوٹ پر حملہ۔ خلافت المستعین دوبارہ خلافت محمد مہدی دوبارہ، خلافت ہشام دوبارہ۔

۴۰۱ھ / ۱۰۱۱ء — سندھ میں سومرہ حکومت۔ محمود غزنوی کا ملتان پر قبضہ

۴۰۵ھ / ۱۰۱۴ء — الحاکم فاطمی نے بے پردہ عورتوں کو قتل کروا کے دریا میں پھینکوا دیا۔

۴۰۸ھ / ۱۰۱۸ء — خلافت عبدالرحمان الرابع اندلس۔

۴۱۱ھ / ۱۰۲۱ء — حکومت الظاہر فاطمی۔

۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء — ایک مصری باطنی نے حجر اسود کو ہتھوڑا مار کر توڑ دیا۔

۴۱۴ھ / ۱۰۲۳ء — خلافت عبدالرحمان الخامس و خلافت محمد المستکفی (اندلس)

۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء — محمود غزنوی نے سومنات توڑا۔

۴۱۸ھ / ۱۰۲۷ء — خلافت ہشام ثالث (اندلس)

۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء — وفات محمود غزنوی، تخت نشینی مسعود غزنوی۔ اندلس میں طوائف الملوکی کا آغاز۔

۴۲۸ھ / ۱۰۳۶ء — وفات ابوبکر اصفہانی و ابن سینا۔

۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء — آل سلجوق کی ابتداء (رکن الدین)

۴۳۳ھ / ۱۰۴۱ء — تخت نشینی مودود غزنوی۔

۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء — مراکش و الجیریا میں دوبارہ عباسی خطبہ

۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء — فتنہ و قتل بساسیری۔

۴۵۹ھ / ۱۰۶۶ء — مدرسہ نظامیہ بغداد کی ابتداء۔ الپ ارسلان کی حکومت

۴۶۱ھ / ۱۰۶۹ء — جامعہ دمشق میں آتشزدگی۔

۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء — وفات خطیب البغدادی۔

۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء — الپ ارسلان کا انتقال اور حکومت ملک شاہ سلجوق۔

۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء — طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ، وفات امام الحرمین الجوینی۔

۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء — حرمین میں عباسیوں کا خطبہ، عیسائیوں پر یوسف بن تاشفین کی فتح۔

۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء — شہادت نظام الملک الوزیر، وفات ملک شاہ سلجوقی۔

۴۹۱ھ / ۱۰۹۸ء — انطاکیہ اور حمص پر صلیبی قبضہ، وفات ابوالحسن کرخی صلیبی جنگیں۔

۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء — عیسائیوں نے شام اور حمص میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

۴۹۴ھ / ۱۱۰۰ء — حسن بن صباح کی قیادت میں فدائیوں کا عروج۔

۴۹۷ھ / ۱۱۰۳ء — فرنگیوں کا عکہ پر قبضہ

۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء — وفات یوسف بن تاشفین۔

۵۰۲ھ / ۱۱۰۹ء — طرابلس پر فرنگیوں کا قبضہ۔

۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء — وفات امام غزالی۔

۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء — وفات ابن رشد

۵۲۴ھ / ۱۱۲۹ء — وفات محمد بن تومرت المہدی، و خلیفہ آمر باحکام اللہ فاطمی۔

۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء — سلطان سنجر اور تاتاریوں کے درمیان جنگ۔

۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء — نورالدین محمود زنگی نے فرنگیوں سے زمین تکلے واپس لیے۔

۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء — دمشق پر نورالدین زنگی کا قبضہ

۵۵۸ھ / ۱۱۶۳ء — نورالدین زنگی کی فرنگیوں پر فتح۔ وفات عبدالمومن والی المغرب

۵۶۱ھ / ۱۱۶۵ء — بغداد میں رافضیوں کی بے اعتدالیاں۔

۵۶۲ھ / ۱۱۶۶ء — وفات شیخ عبدالقادر جیلانی

۵۶۴ھ / ۱۱۶۹ء — حکومت صلاح الدین ایوبی۔

۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء — آخری فاطمی امام العاضد کی معزولی اور عباسی خطبہ کا اجراء

۵۷۰ھ / ۱۱۷۴ء — شام پر صلاح الدین کا قبضہ

۵۷۱ھ / ۱۱۷۶ء — شہاب الدین غوری کا ملتان پر قبضہ

۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء — پرنس آرنات کی مدینہ کی طرف فوج کشی اور عزالدین فرخ شاہ کی کامیاب مدافعت۔

۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء — وفات ایلغازی

۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء — شہاب الدین غوری کا لاہور پر قبضہ

۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء — صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا۔

۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء — شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج میں جنگ اور اگلے برس شہاب الدین کو فتح

۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء — صلاح الدین ایوبی کی وفات۔

۵۹۴ھ / ۱۱۹۷ء — علاؤالدین خوارزم شاہ کا بخارا پر قبضہ۔ بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا۔

۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء — دہلی پر شہاب الدین غوری کا قبضہ

۶۰۱ھ / ۱۲۰۴ء — ملک العادل ایوبی اور فرنگیوں میں صلح۔

۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء — قطب الدین ایبک کی حکومت

۶۰۶ھ / ۱۲۰۹ء — وفات فخرالدین رازی

۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء — قتل غیاث الدین محمود، وفات قطب الدین ایبک، تخت نشینی آرام شاہ۔

۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء — شہادت فریدالدین عطار

۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء — وفات بختیار کاکی۔

۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء — وفات خواجہ معین الدین اجمیری۔ تخت نشینی رکن الدین فیروز شاہ دہلی۔

۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء — حکومت رضیہ سلطانہ (دہلی)
۶۳۷ھ / ۱۲۴۰ء — حکومت معز الدین بہرام شاہ۔
۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء — وفات ابن عربی و بدیع الدین شاہ مدار
۶۳۹ھ / ۱۲۴۲ء — حکومت علاؤ الدین مسعود دہلی۔
۶۴۲ھ / ۱۲۴۵ء — شہادت شمس تبریزی۔
۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء — ہلاکو خاں نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا اور خلیفہ المستعصم کو شہید کر دیا۔
۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء — وفات بابا فرید گنج شکر۔ حکومت غیاث الدین بلبن وفات داتا گنج بخش (۴۶۵ھ)
۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء — وفات مولانا روم و خواجہ نصیر الدین طوسی
۶۷۷ھ / ۱۲۷۸ء — وفات حمید الدین ناگوری
۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء — وفات ابن خلکان
۶۸۶ھ / ۱۲۸۶ء — وفات غیاث الدین بلبن، حکومت کیقباد (دہلی)
۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء — حکومت جلال الدین خلجی
۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء — وفات علاء الدین صابر کلیری۔
۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء — وفات سعدی شیرازی
۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء — حکومت علاء الدین خلجی
۶۹۹ھ / ۱۳۰۰ء — تخت نشینی عثمان بانی دولت عثمانیہ ترکیہ۔
۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء — حکومت قطب الدین مبارک خلجی، قتل کافور ملک
۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء — حکومت غیاث الدین تغلق
۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء — وفات بو علی قلندر
۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء — حکومت محمد تغلق۔ وفات نظام الدین اولیاء و امیر خسرو دہلوی
۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء — وفات امام ابن تیمیہ
۷۳۵ھ / ۱۳۳۴ء — وفات برہان الدین غریب
۷۴۷ھ / ۱۳۴۶ء — حسن گنگو بہمنی بانی دولت بہمنیہ ہوا۔
۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء — حکومت فیروز تغلق
۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء — وفات نصیر الدین چراغ دہلی
[illegible] — تخت نشینی مراد اول (عثمانی)
۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء — وفات فیروز تغلق و حکومت محمد تغلق
۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء — ابوبکر شاہ دہلی۔ حکومت متوکل (سہ بارہ) وفات حافظ شیرازی
۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء — تخت نشینی، بایزید یلدرم عثمانی۔
۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء — حکومت مظفر شاہ گجراتی
۷۹۸ھ / ۱۳۹۶ء — نکوپلس کی جنگ میں بایزید یلدرم نے متحدہ یورپی فوجوں کو شکست دی۔
۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء — تیمور لنگ کا حملہ دہلی، وفات ظاہر برقوق
۸۰۵ھ / [illegible] — تخت نشینی محمد اول (عثمانی)
۸۰۶ھ / ۱۴۰۴ء — وفات شیخ زاہد قتال
۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء — وفات ابن خلدون۔
۸۱۳ھ / ۱۴۱۰ء — وفات غیاث الدین سلطان بنگال و مظفر شاہ گجراتی
۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء — تخت نشینی مراد ثانی عثمانی، حکومت مبارک شاہ ثانی (دہلی)
۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء — وفات خواجہ گیسو دراز و ابن بیطار
۸۲۶ھ / ۱۴۲۲ء — وفات نعمت اللہ ولی۔
۸۴۲ھ / ۱۴۳۸ء — وفات سلطان ابراہیم شرقی۔
۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء — وفات احمد بن ارسلان
۸۵۲ھ / ۱۴۴۹ء — وفات امام ابن حجر عسقلانی
۸۵۴ھ / ۱۴۵۱ء — دہلی پر بہلول لودھی کا قبضہ
۸۵۷ھ / ۱۴۵۳ء — وفات بہاء الدین نقشبند۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا۔
۸۶۳ھ / ۱۴۵۹ء — وفات قطب شاہ گجراتی۔
۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء — تخت نشینی بایزید ثانی عثمانی
۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء — غرناطہ پر عیسائیوں کا قبضہ۔
۹۰۷ھ / ۱۵۰۲ء — ایران میں صفوی حکومت کی ابتداء (اسماعیل صفوی)
۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء — وفات جلال الدین سیوطی
۹۱۵ھ / ۱۵۱۰ء — حکومت ابراہیم لودی
۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء — وفات یوسف عادل شاہ بانی دولت بیجاپور، وفات احمد شاہ گجراتی۔
۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء — تخت نشینی سلیم اول عثمانی و آغاز خلافت عثمانیہ
۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء — سماٹرا میں مسلم حکومت (علی شاہ) کی ابتداء
۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء — خلافت سلیمان قانونی عثمانی
۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء — جنگ پانی پت اور ہندوستان میں بابر کی حکومت کا آغاز
۹۳۳ھ / ۱۵۲۷ء — بہمنی سلطنت کا خاتمہ
۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء — وفات بابر و حکومت ہمایوں
۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء — وفات شیخ عبدالقدوس گنگوہی
۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء — ہمایوں کا فرار اور ہندوستان پر شیر شاہ سوری کی حکومت
۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء — وفات شیر شاہ سوری و حکومت اسلام شاہ
۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء — تعمیر مسجد حرم۔ حکومت محمد عادل شاہ سوری
۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء — حکومت ابراہیم شاہ سوری
۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء — ہمایوں کی مراجعت
۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء — وفات ہمایوں، حکومت اکبر، خاتمہ سوری حکومت
۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء — قتل ہیموں بقال۔
۹۶۸ھ / ۱۵۶۱ء — قتل بیرم خان
۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء — وفات محمد غوث گوالیاری
۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء — خلافت سلیم ثانی عثمانی
۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء — خلافت مراد ثالث عثمانی۔
۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء — وفات طہماسپ صفوی اول، وفات بحر العلوم بدرالدین غزی۔
۹۹۵ھ / ۱۵۸۶ء — اکبر نے کشمیر فتح کیا۔
۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء — احمد نگر کی حکومت کا خاتمہ
۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۳ء — وفات شیخ مبارک ناگوری۔
۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء — خلافت محمد ثالث عثمانی۔ وفات علامہ فیضی۔

۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء — وفات عبدالقادر بدایونی

۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء — قتل شیخ ابوالفضل علامی

۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء — وفات خواجہ باقی باللہ دہلی، خلافت احمد اوّل عثمانی

۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء — وفات محمد قاسم فرشتہ (مورخ)

۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء — خلافت مصطفیٰ اوّل عثمانی

۱۰۲۷ھ / ۱۶۱۸ء — خلافت عثمان ثانی۔

۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء — دوبارہ خلافت مصطفیٰ اوّل عثمانی

۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ء — خلافت مراد الرابع

۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء — وفات شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی

۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۷ء — وفات عبدالرحیم خانخاناں

۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء — وفات جہانگیر حکومت شاہجہان

۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء — وفات میاں میر لاہوری

۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء — خلافت ابراہیم عثمانی

۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء — وفات شیخ عبدالحق محدث دہلوی

۱۰۵۵ھ / ۱۶۴۵ء — وفات ملکہ نورجہاں و منیر لاہوری

۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء — خلافت محمد رابع عثمانی

۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء — وفات حاجی خلیفہ مصنف "کشف الظنون"

۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء — معزولی شاہجہان و حکومت اورنگ زیب عالمگیر

۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۱ء — قتل سرمد۔ پرتگالی تاجروں کی ہندوستان میں آمد

۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء — وفات شاہ ولی اللہ

۱۱۰۲ھ / ۱۶۹۰ء — خلافت احمد ثانی۔

۱۱۰۶ھ / ۱۶۹۴ء — خلافت مصطفیٰ ثانی۔ وفات شائستہ خان امیر الامراء

۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء — خلافت احمد ثالث

۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء — وفات اورنگ زیب عالمگیر۔ حکومت بہادر شاہ اوّل
ہندوستان میں ولندیزیوں کی آمد۔

۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء — حکومت جہاندار شاہ (دہلی)، و حکومت فرخ سیر (دہلی)
ہندوستان میں یورپی تاجروں کی ہر طرح کی آزادی۔

۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء — انقلابات کا سال۔ دہلی میں یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات
رفیع الدولہ اور روشن اختر محمد شاہ کی حکومتیں۔

۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء — وفات میرزا بیدل۔ ولایت برہان الملک اوّل نواب اودھ

۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء — وفات سردار دوست محمد خان بانی ریاست بھوپال

۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء — خلافت محمود اوّل عثمانی۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء — ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ اور دہلی میں قتل عام

۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء — ایران میں نادر شاہ افشار کا قتل۔ احمد شاہ ابدالی کا عروج۔

۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء — ایران میں احمد شاہ ابدالی، درانی کے لقب سے تخت پر
بیٹھا۔ دکن میں وفات آصف جاہ اوّل

۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲ء — کریم خان زند نے ایران میں صفوی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء — ہندوستان میں حکومت عزالدین عالمگیر دوم۔

۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء — ترکی میں خلافت عثمان ثالث

۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۷ء — بنگال میں جنگ پلاسی اور شہادت نواب سراج الدولہ

۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۸ء — خلافت مصطفیٰ ثالث۔

۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء — دہلی میں حکومت شاہجہان سوم و شاہ عالم دوم، پنجاب میں
مرہٹوں کا عروج۔

۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء — پانی پت کی تیسری لڑائی، احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں
مرہٹوں کی تباہی۔

۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء — وفات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء — خلافت عبدالحمید اول عثمانی

۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء — وفات حیدر علی و تخت نشینی ٹیپو سلطان (ریاست میسور)

۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء — خلافت سلیم ثالث

۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء — وفات فیض اللہ بانی ریاست رامپور

۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۶ء — ایران میں قاچاری حکومت کی ابتدا (آقا محمد)

۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء — مصر میں نپولین نے مملوکوں کو شکست دی۔ قاہرہ پر
قبضہ کر لیا اور جامع مسجد میں نماز ادا کی۔

۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء — شہادت ٹیپو سلطان۔ ہندوستان میں انگریزی راج۔

۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء — مصر میں محمد علی پاشا گورنر بنا

۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء — دہلی میں حکومت اکبر دوم

۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء — خلافت مصطفیٰ رابع عثمانی

۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء — خلافت محمود ثانی

۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء — وفات عبدالعلی بحر العلوم

۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء — مصر نے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔

۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء — وفات عبدالعزیز محدث دہلوی

۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء — روس نے ترکی پر حملہ کر دیا۔

۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء — بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی و مولانا سید اسماعیل
سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۷ء — دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی حکومت۔ انگریزوں نے بادشاہ
دہلی کے اختیارات میں کمی کر دی۔

۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء — خلافت سلطان عبدالمجید اوّل

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء — افغانستان کے امیر شجاع الملک کا قتل

۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء — انگریزوں نے دوست محمد خان کو بادشاہ افغانستان تسلیم کر لیا۔

۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء — الجزائر پر فرانس کا قبضہ

۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء — وفات محمد علی پاشا (خدیو مصر)

۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء — معزولی واجد شاہ (اودھ) کشمیر میں ڈوگرہ راج کا آغاز

۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء — میرٹھ سے ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز

۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء — دہلی پر انگریزی قبضہ، بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور ہندوستان
پر براہ راست تاج برطانیہ کی حکومت۔

۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء — وفات بہادر شاہ ظفر (رنگون میں قید)

۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء — وفات مفتی صدرالدین دہلی۔

۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء — خلافت مراد خامس عثمانی۔ خلافت عبدالحمید ثانی۔

۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء — روس اور ترکی کے درمیان جنگ۔ سرسید کی تحریک علیگڑھ

۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء — وفات محمد قاسم نانوتوی۔

۱۲۹۰ھ / ۱۸۸۱ء — وفات آغا خان اوّل۔ حکومت عبدالرحمان (افغانستان)،
تیونس پر فرانس کا قبضہ

۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء - شہادت مدحت پاشا - روسی بیڑہ قسطنطنیہ پہنچا۔ مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ

۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء - وفات مہدی سوڈانی۔

۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء - وفات عبدالحی فرنگی محل و نواب کلب علی خاں

۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء - وفات واجد علی شاہ (کلکتہ)

۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء - وفات نواب صدیق حسن بھوپال۔

۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء - وفات فیض الحسن سہارنپوری

۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء - وفات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ ام درمان میں انگریزوں اور درویشوں کی جنگ

۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء - مڈغاسکر پر فرانس کا قبضہ، قتل ناصر الدین قاچار - وفات سید جمال الدین افغانی - ترکی میں نوجوان ترک تحریک کا آغاز

۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء - وفات سر سید احمد خاں - سرحدی قبائل میں ہنگامہ آرائی

۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء - وفات امیر عبدالرحمان خاں - حکومت حبیب اللہ خاں (کابل) ایران کے بحری ساحل پر روس کا قبضہ۔

۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء - وفات رشید احمد گنگوہی - تقسیم بنگال - ہندوستان میں مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) شاہ افغانستان اور انگریزوں میں دوستی کا معاہدہ

۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء - ایران کی آزادی روس اور برطانیہ کے ہاتھوں ختم۔

۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء - احمدیت (قادیانیت) کے مبلغ مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات - ترکی میں دستوری حکومت کا قیام۔

۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء - معزولی عبدالحمید ثانی، خلافت محمد خامس عثمانی - ایران میں اینگلو پرشین آئل کمپنی کا قیام

۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء - اٹلی نے لیبیا پر قبضہ کر لیا - جنگ طرابلس بلقان کا آغاز، فرانس اور بلجیم میں کانگو کا بٹوارا (۱۹۱۰ء)

۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء - وفات حاجی عابد حسین بانی دارالعلوم دیوبند و ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء - وفات شبلی نعمانی - جنگ عظیم اول کا آغاز

۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء - وفات الطاف حسین حالی

۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء - وفات وقار الملک - شریف مکہ نے برطانیہ کی شہ پر ترکوں سے بغاوت کر دی - مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین میثاق لکھنؤ

۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء - برطانیہ کا یروشلم پر قبضہ - خلافت محمد سادس عثمانی۔

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء - حکومت امان اللہ خان (کابل)، ہندوستان میں رولٹ ایکٹ - جلیانوالہ باغ، امرتسر میں جنرل ڈائر نے گولی چلوائی۔

۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء - شام کی آزادی، شہادت انور پاشا - وفات شیخ الہند محمود الحسن قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء - وفات احمد رضا خاں بریلوی - مراکش میں محمد بن عبدالکریم "مجاہد ریف" کا جہاد آزادی، ہندوستان میں قومی تحریکات کا آغاز - مولانا محمد علی جوہر وفد کے ساتھ انگلستان گئے - شاہ سعود نے ملک حجاز اور نجد کے سلطان ہونے کا دعوے کیا۔ جنگ سقاریہ میں ترکوں نے یونانیوں کو شکست۔

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء - خلافت عبدالمجید ثانی - سعودی عرب میں شاہ فیصل ابن سعود کا اقتدار۔

۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء - ترکوں اور اتحادیوں کے مابین معاہدہ لوزان - معزولی خلافت عبدالمجید ثانی - ایران میں قاچاری حکومت کا خاتمہ - سعودی سلطان کا حجاز پر مکمل قبضہ - مصطفیٰ کمال اتاترک ترکی کے صدر منتخب ہوئے - سعد زاغلول مصر کے وزیر اعظم مقرر کئے گئے وفات نواب وقار الملک۔

۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء - ایران میں رضا شاہ پہلوی برسر اقتدار آئے۔

۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء - برطانیہ نے نجد و حجاز کی آزادی تسلیم کر لی - وفات حکیم اجمل خاں

۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء - قائداعظمؒ نے چودہ نکات پیش کیے - بچہ سقہ کا افغانستان میں عروج - امان اللہ خان کا فرار اور نادر شاہ کی حکومت (افغانستان)

۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء - وفات مولانا محمد علی جوہر - علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے جلسہ الہ آباد میں تصور پاکستان پیش کیا۔

۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء - آزادی عراق۔

۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء - نادر شاہ (افغانستان) کا قتل اور محمد ظاہر شاہ کا اقتدار

۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء - قائد اعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی۔

۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء - آزادی مصر - وفات ڈاکٹر مختار انصاری

۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء - تقسیم فلسطین کی تجویز برطانیہ کے پیل کمیشن نے شائع کی۔

۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء - وفات علامہ اقبال و اتاترک و مولانا شوکت علی - دوسری جنگ عظیم کا آغاز (۱۹۳۹ء)

۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء - مسلم لیگ نے لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی - تاسیس جماعت اسلامی (۱۹۴۱ء)

۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۳ء - وفات اشرف علی تھانوی و مولانا محمد الیاس، فلسطین، شرق اردن پر برطانیہ اور فرانس کا قبضہ - سنگاپور پر جاپانی فوجوں کا قبضہ (۱۹۴۲ء)

۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء - وفات بہادر یار جنگ - عرب لیگ قائم ہوئی۔

۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۵ء - دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی - فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ ایران سے روسی اور امریکی فوجوں کا انخلاء - مصر کے وزیر اعظم احمد ماہر پاشا کا قتل - ہندوستان میں کرپس مشن کی آمد - انڈونیشیا آزاد ہوا۔

۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء - آزادی لبنان و شام و اردن - ہندوستان میں عبوری حکومت کا قیام۔

۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء - قیام پاکستان - کشمیر پر بھارت کا حملہ، دکن اور جوناگڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق۔

۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء - وفات قائد اعظم، حیدر آباد دکن پر بھارت کا حملہ اور قبضہ کشمیر میں جنگ بندی - فلسطین میں اسرائیل کا قیام - عرب اسرائیل جنگ - خواجہ ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل بنے۔

۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء - مصر میں اخوان المسلمون کے بانی حسن البنا کی شہادت - شام میں پہلا فوجی انقلاب - وفات شبیر احمد عثمانی۔

۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء - وفات حسرت موہانی - الجزائر میں جنگ آزادی کا آغاز، لیبیا آزاد ہوا - سوڈان آزاد ہوا - اردن میں شاہ عبداللہ کا قتل اور شاہ حسین کا اقتدار - ڈاکٹر مصدق نے ایران تیل کمپنی کو قومیا لیا - شہادت نوابزادہ لیاقت علی خاں (پاکستان ۱۹۵۱ء)

۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۲ء - شاہ فاروق (مصر) کی جلا وطنی اور جنرل نجیب برسر اقتدار آئے

نقشہ تاریخ اسلام
سقوطِ بغداد سے پہلے

نقشہ تاریخ اسلام

سقوط بغداد کے بعد

۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء ۔ عراق میں فیصل دوم کی تخت نشینی۔

۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء ۔ وفات سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء) جمال ناصر مصر کے صدر بنے جنرل نجیب کی علیحدگی۔

۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء ۔ میثاق بغداد (سینٹو) میں پاکستان، ترکی، ایران اور عراق شامل ہوئے۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات بگڑ گئے۔ سکندر مرزا پاکستان کے گورنر جنرل بنے۔

۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء ۔ سوڈان، مراکش اور تیونس کی آزادی۔ اسرائیل کا مصر پر حملہ پاکستان کے پہلے صدر سکندر مرزا بنے۔ مصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء ۔ اردن کی کامل آزادی۔ وفات آغا خان سوم، ملائشیا آزاد ہوا۔

۱۳۷۷ھ/۵۸-۱۹۵۷ء ۔ ملایا کی آزادی۔ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر و شام) کا قیام۔ سوڈان پر فوجی حکومت کا قبضہ۔ عراق پر عبدالکریم قاسم کا قبضہ اور فیصل شاہ عراق کا قتل، لبنان میں ہنگامے۔

۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء ۔ دوبئی کی آزادی۔ پاکستان میں مارشل لاء۔ جنرل ایوب خان برسر اقتدار آئے۔ وفات ابوالکلام آزاد۔ موریطانیہ کی آزادی

۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء ۔ آزادی کیمرون۔

۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء ۔ آزادی صومالیہ سینیگال، وسطی افریقہ، نائیجیریا اور کویت۔

۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء ۔ شام اور مصر کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ بحرین آزاد ہوا۔ ترکی میں عدنان مندریس کو پھانسی دے دی گئی۔

۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء ۔ پاکستان میں نئے آئین کا نفاذ۔ وفات علامہ مشرقی۔ یمن میں امامت ختم ہو گئی۔ الجزائر آزاد ہوا۔ یمن میں عبداللہ سلال کا فوجی انقلاب

۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء ۔ یمن میں جمہوریت۔ آزادی زنجبار۔ عراق میں صدر قاسم کا قتل

۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء ۔ بومدین (بومدین) نے بن بلا کی حکومت (الجزائر) الٹ دی۔ پاکستان اور بھارت میں جنگ۔

۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء ۔ اعلان تاشقند۔ شام میں بعث پارٹی کا اقتدار (نورالدین عطاسی صدر بنے)

۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء ۔ اسرائیل کا مصر پر حملہ۔ صحرائے سینا پر قبضہ

۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء ۔ پاکستان میں مارشل لاء، ایوب خان مستعفی ہو گئے۔ جنرل یحییٰ خان نے صدارت سنبھالی۔ سوڈان میں جعفر نمیری کا فوجی انقلاب۔ لیبیا میں فوجی انقلاب۔ مسجد اقصیٰ میں یہودیوں نے آگ لگا دی

۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء ۔ مصر میں صدر ناصر کا انتقال۔ پاکستان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پہلے عام انتخابات

۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء ۔ مشرقی پاکستان پر روس اور امریکہ کی ملی بھگت سے بھارت کا حملہ اور قبضہ۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت۔

۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء ۔ شیخ مجیب الرحمان کی رہائی، پاکستان دولت مشترکہ سے الگ ہو گیا۔ شملہ میں پاک بھارت مذاکرات۔

۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء ۔ پاکستان میں نئے آئین کا نفاذ۔ مصر اور دیگر عرب ممالک پر اسرائیل کا حملہ۔ عربوں کا تیل کو بطور معاشی ہتھیار بنانا۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی۔ افغانستان میں سردار داؤد نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔
پاکستان میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے متحدہ جمہوری محاذ کا قیام

۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء ۔ لاہور میں تمام اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس۔ پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ شمالی یمن میں کرنل ابراہیم حمیدی کا انقلاب۔ وفات مفتی اعظم امین الحسینی۔ قادیانیوں کو پاکستان حکومت نے غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔

۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء ۔ بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) میں فوجی انقلابات۔ شیخ مجیب الرحمان کے قتل پر پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات۔ شہادت شاہ فیصل ابن سعود۔ نائیجیریا میں فوجی انقلاب۔

۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء ۔ قبرص کے ترکوں نے رؤف ڈنکاش کو نمائندہ منتخب کیا۔ مصر کی پارلیمنٹ نے روس کے ساتھ "معاہدہ دوستی" منسوخ کر دیا۔ انور السادات کو دوسری مرتبہ صدر منتخب کیا گیا۔ پاکستان نے بھارت کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کئے۔ ملائشیا کے وزیر اعظم تنکو عبدالرزاق کی وفات نائیجیریا کے صدر مرتضیٰ محمد کا قتل۔ پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس۔

۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء ۔ مصر اور لیبیا کی سرحدی جھڑپ۔ انور السادات اور [illegible] کے مذاکرات۔ قطر میں تیل کو مکمل طور پر قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔

۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء ۔ افغانستان میں سردار داؤد خان کا قتل۔ نور محمد ترہ کئی صدر اور وزیر اعظم بنا۔ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ الجزائر کے صدر بومدین کا انتقال۔ بنگلہ دیش میں جنرل ضیاء الرحمن صدر منتخب ہو گئے۔ [illegible] میں لیفٹیننٹ جنرل فرید اکفو فوجی بغاوت کر کے خود صدر بن [illegible] انڈونیشیا کے عام انتخابات میں جنرل سہارتو تیسری مرتبہ صدر منتخب کیا گیا۔

۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء ۔ افغانستان میں حفیظ اللہ امین وزیر اعظم [illegible] قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ببرک کارمل [illegible] صدر مقرر ہوئے۔ مصر اور اسرائیل کے درمیان [illegible] پر عرب ممالک نے مصر کا بائیکاٹ کر دیا [illegible] نے [illegible] کو صدر منتخب کیا۔ [illegible] اسلامی جمہوریہ کا قیام [illegible] مراکش کا قبضہ [illegible] پاکستان کے سابق وزیر اعظم [illegible] میں نیا آئین نافذ ہوا [illegible]

۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء ۔ افغانستان پر روس کی مسلح [illegible] سخت مزاحمت [illegible] کی پندرہ سال کے بعد بحالی [illegible] فوج کی [illegible] کنٹرول۔ مصر کے صدر [illegible] میں ابوالحسن بنی صدر کا انتخاب [illegible] عراق کی ایران جنگ کا آغاز [illegible] انتقال [illegible] میں سب سے [illegible] کے بعد جنرل کنعان ایورن نے مارشل لاء [illegible]

۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء ۔ بنگلہ دیش کے صدر جنرل ضیاء الرحمن کا قتل۔ [illegible] کا اعلان کیا۔ ایران میں بنی صدر کو معزول کر کے وزیر اعظم رجائی کو صدر مقرر کیا گیا لیکن ایک ماہ بعد [illegible] میں ایک بم کے دھماکے میں وہ ہلاک ہوئے۔ اسرائیل نے بغداد پر فضائی حملہ کر کے [illegible]

ریکٹر تباہ کر دیا۔ کویت کی نیشنل اسمبلی کا اجلاس (پانچ سال کے بعد) عالمِ اسلام اور بالخصوص پاکستان میں چودہ صدیوں کی تکمیل پر ہجری تقریبات کا آغاز۔

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء ۔ گھانا میں فوج نے سویلین حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ بیروت میں فلسطینی حُرّیت پسندوں اور مہاجر کیمپوں پر اسرائیل کے وحشیانہ حملے اور لبنان سے فلسطینی حُرّیت پسندوں کا انخلا۔ اواکس ریڈار طیاروں کے بارے میں سعودی عرب اور امریکہ میں سمجھوتہ۔ دنیا بھر میں یوم افغانستان منایا گیا۔ بنگلہ دیش میں صدر عبدالستار کی حکومت کا خاتمہ کر کے جنرل ارشاد نے مارشل لاء لگا دیا۔ ایران کے سابق وزیر خارجہ صادق قطب زادہ کو موت کی سزا دی گئی۔ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ خالد انتقال کر گئے۔ شہزادہ فہد نئے فرمانروا بن گئے اور شہزادہ عبداللہ کو ولی عہد مقرر کیا گیا۔ صدر انورالسادات کے قاتلوں کو سزائے موت دی گئی۔ عراق کے صدر صدام حسین نے جنگ بندی کے لیے ایران کی شرائط منظور کر لیں۔ لبنان کے نئے صدر بشیر جمائل بم کے دھماکے میں ہلاک ہوئے۔ ترکی میں بھاری اکثریت سے نیا آئین منظور اور جنرل کنعان ایورن سات سال کے لیے صدر ہو گئے۔ پاکستان میں پہلی مجلس شوریٰ کا قیام۔

تازا شرقی مراکش کا ایک شہر۔ جو فاس کے شمال مشرق میں ساٹھ میل کے فاصلے پر نشیب میں واقع ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس علاقہ کو مغرب اقصیٰ اور مغرب وسطیٰ کے درمیان حدِ فاصل کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

تازا میں تاریخ سے قبل زمانہ کی آبادیاں دریافت کی گئی ہیں۔ آٹھویں تا دسویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ نیم بدوی مکناسہ بربروں کے ایک گروہ کے قبضے میں تھا۔ اس زمانے میں تازا کی آبادی کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی ابن خلدون کے نزدیک انہی لوگوں نے رباط "تازا کی بنیاد رکھی۔ لیکن تاریخی طور پر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ تازا میں ایک مستحکم شہر اور رباط کی بنیاد موحدین نے رکھی۔ ۵۲۸ھ/۱۱۳۳ء میں عبدالمومن بالائی اطلس پر قبضہ کر لینے کے بعد نشیب تازا میں پہنچا۔ چنانچہ اس کی تعمیر کرائی ہوئی فصیل کا ایک حصہ اب بھی باقی ہے۔

۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں تازا پر مرینیوں نے قبضہ کر لیا۔ مرینیوں نے بھی تازا کے دفاعی استحکام کی طرف زیادہ توجہ دی انہوں نے دوبارہ یہاں کی بڑی مسجد کی مرمت کرائی اور مدارس قائم کیے۔ چنانچہ ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء میں جب سلطان تلمسان ابو حمو ثانی نے تازا پر حملہ کیا اور اس کا ایک ہفتے تک محاصرہ کیا تو اہل تازہ نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اسے پسپا ہونا پڑا۔

بقول حسن بن محمد الوزان زیاتی" سولھویں صدی میں تازا سلطنت کا تیسرا بڑا شہر تھا۔ اس کا انتظام سلطان فاس کے دوسرے بیٹے کے سپرد تھا اور اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار خاندانوں پر مشتمل تھی۔ اس شہر کو جو چشمے پانی مہیا کرتے تھے ان کی حفاظت کی خاطر بنی سعد کے ایک شریف نے ایک برج تعمیر کرایا تھا جو آج بھی فصیل کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔

تاشقند روس کا ایک بڑا شہر اور ریاست ازبکستان کا صوبہ جو تخلستان چرچک میں واقع ہے۔ اور سیر دریا کے داہنی طرف کی معاون ندیوں میں سے ایک ندی کے کنارے آباد ہے۔ اگرچہ ازبکستان کا دارالحکومت سمرقند ہے لیکن وسط ایشیا میں سب سے بڑا شہر ہونے کی وجہ سے تجارت و تعلیم میں تاشقند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کل وسط ایشیا کی اقتصادی موتمر کے اجلاس یہیں پر ہوتے ہیں

یونانی اور رومی ماخذ کے مطابق دریائے سیحون کے کنارے پر خانہ بدوش لوگ آباد تھے۔ قدیم چینی ماخذ میں یو۔ نی کی سرزمین کا ذکر موجود ہے جسے بعد میں تاشقند ہی کا علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس سرزمین کو چیچی کا نام دیا گیا۔ چاچ میں جو حکمران ہوتے تھے ان کی حکومت دوسرے ملکوں کی طرح پورے ملک پر نہیں ہوتی تھی دورِ عہد قبل ہجری / آٹھویں صدی عیسوی میں جب عرب اس علاقے پر حملہ آور ہوئے تو یہاں ملک شاش حکمرانی کرتا تھا۔ اور اس کا دارالحکومت طاربند تھا۔ ۷۵۱ء میں چینی گورنر کاؤسی این جی نے شاش کو قتل کر دیا تو اس کے بیٹے نے عربوں سے مدد مانگی۔ ابومسلم نے زیاد بن صالح کو مدد کے لیے بھیجا۔ اس نے چینیوں کو ۱۳۳ھ/۷۵۱ء میں دریائے طالاس کے کنارے شکست دی اس لڑائی کی وجہ سے مسلمانوں کی وسط ایشیا میں ایک دھاک سی بیٹھ گئی۔ عہدِ خلافت میں ترکوں اور اسلام کے درمیان شاش کا علاقہ بطور سرحد سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۱ھ/۸۰۶ء میں اس علاقے پر ترک قابض ہو گئے۔ البتہ مامون کے عہد میں شاش کا علاقہ دوبارہ اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں ایک شخص ابوالعباس یحییٰ ابن اسد شاش کا حاکم بنا ۲۲۵ھ/۸۴۰ء میں نوح بن اسد نے اسفیجاب کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس زمانے میں شاش میں ایک نہر جاری کی گئی۔

اس علاقے کے لیے "تاشقند کا لفظ سب سے پہلے البیرونی نے اپنی تاریخ الہند میں استعمال کیا ہے۔ یہ نام سکوں پر سب سے پہلے مغل عہد میں کندہ کیا گیا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد تاشقند تیمور اور آل تیمور کی مملکت میں آ گیا۔ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں یہ شہر خان مغول یونس کے قبضے میں آیا۔ خان یونس کے بعد اس کا بیٹا محمود خان اس علاقے کا حاکم بنا۔ ۱۵۰۳ء کے بعد تاشقند پر ازبکوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور یہ ازبکوں کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کے بعد چند صدیوں تک یہ علاقہ کبھی ازبکوں اور کبھی قازاق کے ماتحت رہا۔ ۱۷۲۳ء میں تاشقند کو قلماقوں نے فتح کر لیا تو اس پر قلماقوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ بسا اوقات حکومت پر فوجوں کا قبضہ بھی رہا۔

ان صدیوں میں تاشقند بڑی خونریز لڑائیوں کا مرکز بنا رہا۔ ۱۸۶۵ء میں اس پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ چنانچہ اس علاقے کو سیر دریا کے پورے علاقے کا دارالحکومت اور ترکستان کے گورنر جنرل کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے اس کی رونق دو چند ہو گئی۔ پرانے شہر کے ساتھ ساتھ ایک نیا شہر آباد کیا گیا۔ جس میں سرکاری حکام رہتے تھے۔

۱۸۷۷ء میں دونوں شہروں کو باہم ملا کر ایک شہر بنا دیا گیا اور دونوں کی بلدیہ مشترک کر دی گئی۔ ۱۸۹۷ء میں اس شہر کی کل آبادی ۱۵۶۴۲۳ تھی۔ تاشقند کو پاک و ہند میں جنوری ۱۹۶۶ء میں اس بنا پر بڑی شہرت حاصل ہوئی کہ اس شہر میں پاک و ہند کے درمیان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد صدر پاکستان ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم شاستری کے درمیان ملاقات ہوئی اور روس کے وزیر اعظم کوسیجن کی مساعی سے ایک معاہدہ طے پایا۔ جو معاہدہ تاشقند کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے میں طے پایا کہ دونوں ملک اپنے مسائل آپس کی بات چیت سے طے کریں گے۔ اسی رات وزیر اعظم شاستری کا اسی شہر میں انتقال ہو گیا

۱۹۶۶ء کے وسط میں اس علاقے میں خوفناک زلزلے آئے۔ اور ایک مدت تک ان کا سلسلہ جاری رہا جن کی وجہ سے شہر کو کافی نقصان پہنچا۔

۱۹۲۰ء میں یہاں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی۔ یہاں وسط ایشیائی زرعیت کا ایک

بڑا کتب خانہ اور ایک بڑا عجائب خانہ ہے۔

تاشقند شہر کی کل آبادی ۱۹۵۹ کی مردم شماری کے مطابق ۹۱۱۰۰۰ تھی پورے صوبے کی آبادی ۲۲٦۳۰۰۰ تھی۔

تالمود یہودیوں کی ایک مقدس کتاب۔ اس کتاب میں حضرت ہارون اور ان کی اولاد کے اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ اقوال کے ساتھ راویوں کے نام بھی درج ہیں۔ ان اقوال کو یہودا ربی نے جمع کیا۔ اس کا نام مشناہ رکھا۔ بعد میں اس کی تشریح اور توضیح میں جمارا نامی حصہ کا اضافہ کیا گیا۔ ان دونوں حصوں کے مجموعے کو تالمود کہتے ہیں۔

مشناہ کے بارے میں یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ اقوال بطور وحی حضرت موسیٰ پر نازل ہوئے تھے۔

تالمود دو ہیں ایک فلسطینی اور دوسری بابلی تالمود۔ فلسطینی تالمود بابلی کی نسبت آسان اور مختصر ہے جس میں تاریخ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں بابلی تالمود بہت طویل اور دقیق ہے۔ نیز معلومات کے لحاظ سے بھی اسے خاص اہمیت حاصل نہیں۔

تالمود جمہور یہود کے لیے عہد نامہ عتیق کے بعد سب سے زیادہ اہم کتاب ہے۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی یہودیوں میں ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس فرقے کو کریم کا نام دیا گیا۔ جس کے لفظی معنی پڑھنے والے کے ہیں۔ یہ لوگ ان زبانی روایات کے منکر ہیں، جن پر تالمود کا انحصار ہے۔ یہ فرقہ یہود مذہب اور قوانین کا ماخذ صرف عہد نامہ عتیق ہی کو قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک توراۃ کی تعلیم کے منافی تمام احکام ناقابل التفات ہیں۔

تاؤمت چین کا ایک مذہب جس کا بانی لاؤزے تھا۔ لاؤزے نے اپنی کتاب "تاؤتہ کنگ" میں لکھا ہے کہ خوشحال زندگی گذارنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تاؤ کی پیروی کی جائے۔ لیکن اس نے اس کتاب میں تاؤ کی تشریح کسی جگہ بھی نہیں کی۔ اسی وجہ سے تاؤ کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں اور انہوں نے اس کے کئی ایک معنی بتائے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی امن کے راستے اور طریقے کے بتائے ہیں اور بعض کے نزدیک تاؤ کے معنی بولنے اور گفتگو کرنے کے ہیں۔ اہل یورپ کے نزدیک اس کے معنی عقل کے ہیں۔

تاؤ کے بارے میں جو صفات بتائی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس کی ایک اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ چنگ زی کے بقول (جو اس مذہب کا مستند مصنف بتایا جاتا ہے) کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب تاؤ موجود نہ ہو۔ لاؤزے کے نزدیک تو تاؤ کا تصور خدا سے پہلے بھی موجود تھا۔

۲۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کوئی جگہ بھی ایسی نہیں جہاں وہ موجود نہ ہو۔

۳۔ کائنات کی عظمت اور شان و شوکت اسی کے دم سے ہے اور وہ [illegible] باریک سے باریک چیز میں بھی موجود ہے

۴۔ ننھے ننھے کیڑوں کو بھی اسی نے زندگی بخشی ہے اور چاند سورج اپنے اپنے مدار پر اسی کی وجہ سے گھومتے ہیں۔

۵۔ تاؤ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ اس کی اپنی کوئی آواز ہے وہ غیر مرئی ہے لیکن تمام اجسام کا وہی خالق ہے اور تمام آوازیں اس نے بنائی ہیں اور اس سے کوئی چیز خالی نہیں۔

٦۔ وہی تمام مخلوقات کا روزی رساں ہے لیکن وہ غیر متحرک ہے۔

۷۔ وہ متشخص نہیں ہے اور ناقابل تقسیم ہے۔ ہر ایک پر مہربان ہے۔

ہوائی نان زو جو تاؤ فلسفے کا ماہر ہے تاؤ کی صفات کے بارے میں لکھتا ہے "تاؤ ہی آسمان کو سہارا دینے والا اور زمین کا بچھانے والا ہے جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ جس کی بلندی ناپی نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تمام کائنات اس کے قبضہ قدرت میں وہ بے حد لطیف اور باریک ہے۔ ہر شئے میں اسی طرح موجود ہے۔ جس طرح پانی دلدل میں ہوتا ہے پہاڑوں کی بلندی اور غاروں کی پستی تاؤ ہی کے دم سے قائم ہے جانوروں کا چلنا پرندوں کا اڑنا، چاند اور سورج کی روشنی، ستاروں کی گردش سب اسی کے [illegible] کے کرشمے ہیں۔ بہار کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہی چلاتا ہے اور برسات کی بارش وہی برساتا ہے۔ پرندوں کے انڈے وہی دلاتا ہے اور ان انڈوں سے بچے وہی نکالتا ہے۔ جب درختوں سے پتیاں نکلتی ہیں، انڈوں سے بچے اور عورتوں کے رحم سے بچے پیدا ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب کام اپنے آپ ہو رہے ہیں کیونکہ کرنے والے کا ہاتھ ہمیں نظر نہیں آتا۔ تاؤ [illegible] سے سایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے جسم نہیں اس کے ذرائع غیر [illegible] اور پوشیدہ ہیں لیکن تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے اس سے کبھی کوئی بے کار اور غیر مفید کام نہیں ہوا۔"

لاؤزے کا نظریہ تاؤ بہت مبہم اور غیر [illegible] ہے وہ خود کہتا ہے کہ تاؤ کے متعلق معلومات حاصل کرنا یا اس تک پہنچنا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ جو لوگ تاؤ کے متعلق کچھ بتاتے ہیں وہ اس کی بابت کچھ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ اس کے متعلق گفتگو نہیں کرتے۔

تعلیمات:۔ تاؤ مذہب کی تعلیمات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ ہستی اعلیٰ کا تصور:۔ تاؤ کے ہستی اعلیٰ ہونے میں [illegible] کی مختلف آراء ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک تاؤ ہی ہستی اعلیٰ ہے [illegible] کے مطابق لاؤزے جس ہستی اعلیٰ کا عقیدہ رکھتا ہے اس کا [illegible] اصل میں یہ غلط فہمی تاؤ ادب کے ایک لفظ [illegible] سے پیدا ہوئی ہے [illegible] پیدا کرنے یا بدلنے کے ہیں لیکن اس کے معنی غلط طور پر خالق کے لیے جاتے [illegible] چنانچہ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ اس سے مراد وہ ہستی ہے جو [illegible] کرتی ہے۔ ایسی ہستی کو اعلیٰ ہستی کہنا درست نہیں چنانچہ تاؤ ادب [illegible] کو خدا کا حریف قرار دیا گیا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی ہستی اعلیٰ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ب۔ اخلاق:۔ تاؤ مذہب میں انسان کو کائنات کا ایک جزو [illegible] دیا گیا ہے اس لیے تمام شعبہ حیات میں انسان بھی دوسری چیزوں کی طرح [illegible] تاؤ کا مظہر ہے اس کا نظریہ انسان صرف علمی ہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد اخلاقیات پر قائم ہے۔ اور انھی اخلاقیات کے باعث انسان خود کو فطرت کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح فطرت کے یہ قوانین جن کے سامنے وہ سر جھکا دیتا ہے اس کے [illegible] عزت و احترام کا باعث بن جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ فطرت کے کسی کام میں قصداً [illegible] کو دخل نہیں ہے۔ اس لیے انسان کے تمام اعمال بھی ارادے کے بغیر [illegible] چاہئیں اور چونکہ فطرت میں انفعال ہے اس لیے منصوبہ بندی [illegible] دوا دوش، خواہش اور تمنا وغیرہ سب کی سب انسانی فطرت کے منافی ہیں۔

تاؤ مذہب میں وہ کام جو کسی سعی و ارادہ سے کیے جاتے ہیں۔ زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ اس لیے سخاوت، راست بازی اور حسن اطوار کے مقابلے میں رحم، میانہ روی اور پاک بازی کا شمار اخلاقیات میں ہوتا ہے۔

نیز زندگی چونکہ مسلسل جدوجہد کا نام ہے اس لیے اس سے بچنے کے لیے تاؤ مذہب کے پیروترک دنیا کر کے پہاڑوں میں پناہ لینے کو مستحسن خیال کرتے ہیں۔

"تاؤ مذہب کے اخلاق میں خواہشات اور جذبات پر قابو پانے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بقول لاؤزے جو دوسرے پر غالب آتا ہے وہ قوی ہے اور جو خود اپنے آپ پر غالب آجائے وہ قوی تر ہے۔

دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہ جائے۔ لالچ سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں اور حرص سے بڑھ کر کوئی وبال نہیں ہے۔

تاؤ مذہب میں انسانوں کا قتل کرنا اور جنگ میں فتح پانا کوئی قابل فخر بات نہیں۔ وہ قیدیوں کو سزا کے طور پر قتل کرنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتا۔

ج۔ نظریہ حیات بعد الموت:۔ تاؤ مت میں موت ایک اچھی اور خوشگوار چیز ہے یہ ایک لازمی امر ہے اور اس سے ڈرنا بیکار ہے۔ موت ایک خوشگوار تبدیلی کا نام ہے۔ موت سرمایہ دارانہ زندگی کا انجام ہے۔

موت اور زندگی میں وہی تعلق ہے جو آنے اور جانے میں ہے۔ چنانچہ اس دنیا سے چلے جانے کے معنی دوسری دنیا میں پیدا ہونے کے ہیں۔ انسان زندگی سے محبت کر کے ایک فریب میں مبتلا ہے۔ انسان موت کی ہولناکیوں سے واقف ہے لیکن موت کے بعد کی راحتوں سے ناواقف۔ انسان کی زندگی کا تابناک پہلو یہی ہے کہ موت ازل ہی سے تمام انسانوں کا نوشتہ تقدیر بنی ہوئی ہے۔

موت نیکوں کے لیے سکون اور بروں کے لیے پردہ ہے۔ مردے وہ ہیں جو اپنے ٹھروں کو پہنچ چکے ہیں اور زندہ جیسے پھرتے ہیں۔

مرنے کے بعد کی زندگی میں نیک لوگ نہایت ہی آرام کی زندگی بسر کریں گے اور بروں کو مزید برائی کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔

تاؤ مت کی مقبولیت:۔ اگرچہ تاؤ مت کی تعلیمات لوگوں کی فہم سے بالاتر تھیں لیکن اس کے بانی کے بعد چینیوں نے سحر و فسوں کو بھی مذہب میں داخل کر دیا تھا جس کے چینی عوام قدیم زمانہ سے دلدادہ تھے۔ دوسرے فطرت پرستی نے عوام کو اس مذہب کی طرف راغب کیا نیز ارواح خبیثہ کے عقیدے کی وجہ سے اس مذہب نے چینیوں میں خاص مقبولیت حاصل کر لی۔

اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب شہنشاہ سین نے کنفیوشس کے پیروؤں پر مظالم ڈھائے اور ان کی مذہبی کتابوں کو جلا ڈالا تو تاؤ مت کو اس کی حمایت حاصل تھی کیونکہ وہ بھی ابدی زندگی کا خواہاں تھا۔ تاکہ چین پر ہمیشہ حکومت کر سکے۔ اس لیے شہنشاہ نے تاؤ مت کو باقی رہنے دیا چنانچہ کنفیوشش مذہب کے عارضی طور ختم ہو جانے کے بعد اس مذہب کو ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔

تاؤ مت اپنے بانی کے بعد:۔ تاؤ مت ایک فلسفیانہ مذہب تھا عوام اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ لاؤزے کے بعد اس کے پیروؤں نے اس کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ تاؤ مت کا مقابلہ چونکہ کنفیوشش مذہب سے تھا جو اس کے مقابلے میں عام فہم تعلیمات رکھتا تھا۔ اس لیے فلسفیانہ خیالات کی جگہ ادنیٰ قسم کے نظریات کو دے دی گئی۔ لاؤزے کے خیالات کی تشریح عجیب و غریب طریقوں سے کی جانے لگی۔ لاؤزے کی تعلیم تھی کہ انسان فطرت کے منفعلانہ اتحاد کے ذریعہ غیر فانی بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس عقیدے نے عملی صورت اختیار کر لی اور تمام کوشش اب اس بات پر صرف ہونے لگی کہ کسی طرح حیات جاودانی کا نسخہ ہاتھ لگ جائے۔ چنانچہ لاؤزے کے انتقال سے تقریباً پانچ سو سال بعد چنگ تاؤ لنگ نامی ایک شخص نے ایک ایسا شربت تیار کیا جس کے پیتے ہی انسان ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جاتا تھا۔ اس شخص نے عوام میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ لوگ اسے معبود کے طور پر پوجنے لگے۔

اس مذہب کی فلسفیانہ تعلیمات کی وجہ سے سحر و فسوں نے اس مذہب میں راہ پائی اور اس کا ایک اہم جزو بن گیا۔ لوگ ٹونوں اور ٹوٹکوں کے قائل ہو گئے۔ لوگوں کے عقائد اس قسم کے ہو گئے کہ اگر کوئی شخص خاص راکھ یا کوئی مقدس تحریر اپنے پاس رکھے تو اس پر کسی طرح کوئی آفت اثر نہیں کرتی۔ ان میں بہت سے دیوتا پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے چوہے سانپ اور نیولے کو بھی اپنا معبود بنا لیا۔ ارواح خبیثہ کا عقیدہ ان لوگوں میں عام ہو گیا یعنی یہ کہ ارواح خبیثہ انسان کے درپے آزار ہیں۔

لاؤزے کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تعلیمات کے خلاف کام کرنے کو عین اتباع قرار دیا گیا۔ دنیا میں یہ واحد مذہب ہے جس میں اس کے پیروؤں نے اپنے بانی مذہب کی تعلیمات کو اس قدر متضاد معنی پہنائے جو کسی اور مذہب میں نہیں۔

بانئ مذہب:۔ لاؤزے اس مذہب کا بانی تھا۔ اس کا اصل نام لی پہ یانگ تھا۔ وہ کنفیوشس کا ہم عصر تھا۔ وہ ریاست سو میں ۶۰۴ ق م میں ایک غریب چینی گھرانے میں پیدا ہوا۔ کم سنی ہی میں اس نے شاہی کتب خانے کے محافظ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ یہاں اسے مطالعہ کتب کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ اس نے جب اپنی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا شروع کیا اور ان کی تبلیغ شروع کی تو لوگ اسے لاؤزے کے نام سے پکارنے لگے جس کے معنی بوڑھے فلسفی کے تھے۔

سیاسی حالات کی وجہ سے وہ ملازمت ترک کر دینے پر مجبور ہو گیا بلکہ نوے سال کی عمر میں اسے وطن کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔

لاؤزے نے ایک کتاب جو پچیس صفحوں پر مشتمل تھی "تاؤ تہ کنگ" کے نام سے لکھی تھی جو چین کی سرحد عبور کراتے ہوئے سرحد کے محافظ نے اس سے لے لی۔

سرحد عبور کرنے کے بعد وہ نامعلوم مقام پر چلا گیا اور اس کے بعد کے حالات کہ اس نے کہاں اور کس تاریخ کو وفات پائی کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکے۔

لاؤزے کے نزدیک نیک شخص وہ ہے جو سب سے محبت کرے اور کسی سے بھی نفرت نہ کرے اسی وجہ سے اسے اپنے ہم عصر مفکر کنفیوشس سے اس بات میں اختلاف تھا کہ وہ بروں سے نفرت کرتا تھا۔ اور اس حق میں تھا کہ بروں کے ساتھ برا سلوک کرنا چاہیے۔ جبکہ لاؤزے کا خیال تھا

"جو لوگ میرے ساتھ نیکی کرتے ہیں میں ان کے ساتھ نیک رہتا ہوں جو لوگ میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتا ہوں اس طرح برے سے برا آدمی بھی درست ہو جاتا ہے اور جو لوگ میرے ساتھ خلوص سے پیش آتے ہیں میں ان کے ساتھ خلوص سے پیش آتا ہوں اور جو لوگ خلوص نہیں برتتے ہیں ان کے ساتھ بھی مخلصانہ رویہ رکھتا ہوں۔ اس طرح پوری دنیا مخلص بن جاتی ہے۔"

مذہبی کتاب:۔ جب لاؤزے نوے سال کی عمر میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر چینی سرحد پر پہنچا تو اس کے ایک قدردان افسر نے اسے اس وقت تک سرحد

پارکرنے نہیں دی جب تک اس نے اپنی تعلیمات کا خلاصہ ایک کتاب کی شکل میں لکھ کر اس کے حوالے نہ کر دیا۔ لاؤ سے نے اس کتاب کا نام "تاؤ تہ کنگ" رکھا جس کے معنی عقل سکھانے والی کتاب کے تھے۔ یہ کتاب صرف پچیس صفحات پر مشتمل تھی اس کتاب کا بڑا حصہ مختصر ہونے کی وجہ سے ناقابل فہم ہے صرف تھوڑا حصہ آسان اور عام فہم ہے۔

اس کتاب میں اس نے زیادہ تر اس بات پر زور دیا ہے کہ خوشحال زندگی بسر کرنے کا طریقہ تاؤ کی پیروی کرنے میں ہے۔

تاویل اصل کی طرف لوٹنا۔ اصطلاحاً حقیقی معانی کی طرف رجوع کرنا، توضیح کرنا یا تفسیر کرنا۔ گویا تفسیر اور تاویل ایک دوسرے کے مترادف ہیں ابتدائی زمانے میں اور تقریباً چوتھی صدی عیسوی تک تاویل کا لفظ تفسیر کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تفسیری ادب میں ہمیں ابن قتیبہ کی تفسیر تاویل مشکلات القرآن اور ماتریدی کی تفسیر تاویلات القرآن ملتی ہیں۔ ان کتابوں کے ناموں میں تاویل کا لفظ تفسیر کے معانی ہی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ایک جگہ آیات قرآنی کے حقیقی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے —

"جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (۳ : ۷)

ایک دوسری آیت تاویل کا لفظ کسی واقعے کی اصل حقیقت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"اس نے کہا بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ (۱۸ : ۷۸)

ایک اور مقام پر یہ لفظ تعبیر رویا کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

"لوگوں نے کہا یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔ ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تعبیر بتاتا ہوں مجھے ذرا (قید خانے تک) بھیج دیجیے" (۱۲ : ۴۴، ۴۵)

علما تاویل اور تفسیر میں تھوڑا سا یہ فرق کرتے رہے کہ لفظ تفسیر کا استعمال مشکل الفاظ اور مفردات کے لیے اور تاویل کا لفظ جملوں اور معانی کی توضیح کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ فرق تمام علماء کے نزدیک نہیں تھا۔

بعد میں آنے والے فقہا نے تاویل کے معنی کسی آیت یا حدیث کے ایسے معنی استنباط کرنا جو الفاظ کے ظاہری معنی سے مختلف ہوں کر دیئے۔ چنانچہ علماء کی عبارات میں اس قسم کی عبارت تصریح کے طور پر اکثر ملتی ہے۔ جیسے "یہ آیت یا حدیث اتنی صریح ہے کہ اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔"

چنانچہ کسی آیت یا حدیث کے ظاہری معنی اور اس کے تاویلی معنوں میں یہ فرق ہوا کہ تاویل کے لیے کسی دلیل یا قرینے کی ضرورت نہیں۔

بعد میں مسلمانوں میں ایسے فرقوں نے جنم لیا جنہوں نے تاویل کو اپنے ذاتی رجحانات و میلانات کے جواز کے لیے ایک آلہ کار بنا لیا یہاں تک کہ وہ قرآن مجید کی محض مجازی اور تمثیلی تفسیر تک کرنے لگے۔ اور انھوں نے ظاہری معنی اور روایتی تفاسیر کو اپنے لیے ناقابل قبول قرار دیا۔ یہ لوگ تاویل کے مفہوم اور استعمال میں حد سے تجاوز کر گئے اور آیات کی طرح طرح سے تاویلیں کرنے لگے۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن مجید کے ایک معنی ظاہری ہیں اور ایک باطنی معنی ہیں اور پھر اپنی آراء کو جو اسلام کے سراسر منافی تھیں اسلام پر چسپاں کرنے لگے

تاہرت الجزائر کا ایک قدیم شہر جو وہران کے موجودہ مرکز کی مشرقی سرحد پر واقع تھا ادریسی نے اس نام کے دو بڑے شہروں کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہرت قدیم تاہرت جدید۔ تاہرت قدیم یہ شہر رومیوں کے دور کا ایک قدیم شہر تھا جو کسی مقامی خاندان کا صدر مقام تھا اور بزنطینی سلطنت کا باجگزار تھا۔ آج کل یہ مقام تیارت کا صدر مقام ہے۔ جو اپنے پرانے کھنڈرات پر تعمیر کیا گیا ہے۔

تاہرت جدید تیارت کے جنوب مغرب میں چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آج کل اس کی گذشتہ شان و شوکت کے چند آثار ملتے ہیں۔ یہ شہر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اباضی اماموں کا مرکز رہا۔ عبدالرحمان بن رستم نے قیروان سے فرار ہو کر اسی مقام پر پناہ لی تھی۔ اس نے ۱۴۴ھ/۷۶۱ء میں اس شہر کی بنیاد ڈالی۔ یہ شہر چونکہ ایسے مقام پر آباد تھا جہاں بدوی اور شہری آبادی کا اتصال تھا۔ چنانچہ یہ بہت جلد ایک تجارتی منڈی بن گیا۔ لوگ دور دور سے یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ انہوں نے مکانات اور بہترین بازار بنوائے۔ یہاں تک کہ لوگ اس شہر کو "العراق الصغیر" کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ نیز یہ شہر خوارج کی سلطنت کا پایۂ تخت تھا جس کی بنیاد مذہب پر تھی اور یہاں کے لوگوں کی زندگی سخت مجاہدانہ تھی۔

البکری نے اس شہر کے چار دروازوں اور قلعے کا ذکر کیا ہے۔ ۲۹۶ھ/۹۰۸ء میں ایک شیعہ داعی ابوعبیداللہ نے تاہرت کو فتح کر کے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا اس وقت سے بربروں کے عہد تک اس کی اہمیت کم رہی۔ موجودہ دور میں یہ ایک بار پھر تجارت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

تَبالہ ایک قصبہ جو شمالی یمن کے مغرب میں مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں عسیر کے اندرونی علاقے میں واقع ہے۔ ادریسی کے قول کے مطابق یہ قصبہ مکہ معظمہ سے چار روز کی مسافت پر اور عکاظ کی منڈی سے تین دن کی مسافت پر اور ایک وادی کے نشیب میں آباد ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں پانی کی کثرت ہے۔ اس قصبے کی وجہ تسمیہ روایتوں میں یہ ہے کہ عمالقہ کی ایک عورت کے نام سے یہ نام ماخوذ ہے۔ یہ قصبہ بہت قدیم ہے۔ اس جگہ کے لوگ زمانہ جاہلیت میں ایک پتھر کے بت کی پوجا کرتے تھے۔ آنحضورؐ نے جریر بن عبداللہ البجلیؓ کو وہاں بھیجا اور انہوں نے اس بتکدے کو مسمار کر کے باب مسجد تبالہ کی دہلیز بنا دیا۔

سرسبز و شاداب ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ اخضر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا زوبیر کے مطابق تبالہ مقام حصین ہے جو مکہ معظمہ کے زیر نگیں تھا۔ اور اس میں مستقل وسائل آب پاشی ہونے کی وجہ سے اناج کے کھیتوں اور کھجور کے درختوں کی بہتات تھی۔ اس کی زرخیزی کو بدویوں کے ہاتھوں کافی نقصان پہنچا۔ خلیفہ عبدالملک کی فوجوں نے جب اس علاقے پر قبضہ کیا تو اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی حجاج کو اس علاقے کا والی مقرر کیا گیا لیکن اس نے اس کی حقارت کے سبب اس میں داخل ہونا بھی مناسب نہ سمجھا اور باہر سے واپس لوٹ گیا۔

تبالہ ایک تجارتی مرکز تھا۔ تاریخ اسلام میں اس قصبے کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ یہ ان شہروں میں ہے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا

تبت چین کا ایک صوبہ اور سابق ملک اس کے جنوب میں آسام، بھوٹان، سکم اور نیپال مغرب میں کشمیر اور ہندوستان کے پنجاب کی ریاستیں ہماچل پردیش، اتر پردیش۔ شمال میں سنکیانگ اور مشرق میں چین کے صوبے کانسیو اور سچوان ہیں۔ لہاسا اس کا دارالحکومت ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۲۱۰۰۰ مربع کیلومیٹر اور ۱۹۵۳ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۱۲۷۳۰۰۰ تھی۔ اس کے بعد سے حکومت چین نے اپنے ملک کی آبادی کو کبھی سامنے نہیں آنے دیا۔

بقول یعقوبی ۹۹ھ/۷۱۷ء میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں الجراح بن عبداللہ الحکمی تبت کے وفد کی یہ درخواست والی خراسان کے پاس لے کر گیا کہ تبت میں ایک اسلامی مبلغ بھیجا جائے۔ چنانچہ سلیط بن عبداللہ کو مبلغ کی حیثیت سے تبت بھیجا گیا۔ بعد میں تبت کے بادشاہ نے خلیفہ المہدی کی اطاعت قبول کرلی۔ المامون کے عہد میں تبت کے بادشاہ نے اسلام قبول کرلیا۔ اور سونے کا ایک بت جس کی وہ پرستش کرتا تھا ثبوت کے طور پر خلیفہ کی خدمت میں بھیجا۔ مامون نے اس

تبت کے دارالحکومت لاسہ میں دلائی لاما کا محل

بت کو مکہ میں لوگوں کو دکھانے کے لئے بھیجا کہ تبت کے بادشاہ نے اسلام قبول کرلیا ہے۔
شمالی ہند اور وسط ایشیا پر نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں جب اسلام کو قطعی کامیابی حاصل ہوچکی تو اس کے بعد مسلمان بادشاہوں نے تبت پر حملہ کیا۔ اور نویں صدی ہجری کے اواخر میں بلور اور تبت کے وہ علاقے جو بدخشاں اور کشمیر کے درمیان ہیں کاشغر کے والی ابوبکر کے جرنیل میر ولی نے مطیع کرلیے۔ اور جب ۱۵۱۴ء میں سعید خاں نے ابوبکر کو شکست دے کر باہر کیا تو تبت (لداخ) کے قلعوں پر تبتیوں کا قبضہ ہوگیا۔ سعید خاں کے عہد حکومت (۱۵۱۴ء تا ۱۵۳۳ء) میں تبت، لداخ اور ملحقہ علاقوں پر ۱۵۱۷ء میں میر مزید نے حملہ کیا اور ۱۵۳۲ء میں خود خان نے حیدر مرزا کی معیت میں حملہ کیا۔ ۱۵۴۸ء میں حیدر مرزا نے شاہ کشمیر کی حیثیت سے لداخ اور بلتستان پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت بلتستان تبت میں شامل تھا۔ لیکن اس ملک میں اسلام کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ سولہویں صدی کے نصف تک تبت خود میں اسلام ایک سیاسی طاقت بن گیا تھا۔ خپلو کے حاکم علی میر بشیر خان نے سارے بلتستان کو زیر کرکے وہاں سے بدھ مت کے آثار ختم کردیئے۔ بعد میں اس نے لداخ کو بھی فتح کیا۔ اس نے اسکردو شہر بھی آباد کیا جو بلتستان کا دارالحکومت ہے۔

۱۶۸۲ء کے قریب وسطی تبت پر قلماق حکمران تھے۔ مشہور و معروف خواجہ آپاق اپنے خان اسمٰعیل سے ناراض ہوکر لہاسا چلے گئے۔ ان کی درخواست پر دلائی لامہ نے انہیں خان قلماق کے نام پروانہ راہداری دیا۔ لوشوکتو نے خوجہ کو ساتھ لیکر ایک فوج کے ساتھ کاشغر پر حملہ کردیا اور اسماعیل خان کو قید کرکے خوجہ کو بادشاہ بنادیا۔

آخری چند صدیوں میں تبت کا اسلامی ممالک کے ساتھ تعلق بہت کم رہا۔
۱۹۱۳ء میں جمہوریہ چین نے تبت کے چین کا ایک صوبہ ہوجانے کا اعلان کردیا۔
۱۹۵۱ء میں حکومت تبت کے نمائندوں اور چین کی کمیونسٹ پارٹی کے درمیان پیکنگ میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق کمیونسٹ حکام نے تبت میں پرانے نظام کو نہ بدلنے اور دلائی لامہ کے اختیارات اور اس کے امور کی حسب سابق عزت کرنے کا یقین دلایا۔ ۱۹۵۹ء میں دلائی لامہ کے ہندوستان میں جان بچا کر بھاگ آنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں یہ ایک خودمختار علاقہ بن گیا۔

تبریز ایران کی ولایت آذربائیجان کا ایک بڑا شہر جو اس کے رسوبی میدان کے مشرقی کونے میں واقع ہے۔

بقول ارمنی مورخ وردان اسکالی ارمنی خسرو (۲۱۷ء تا ۲۳۳ء) نے ساسانی بادشاہ اردشیر اول کے خلاف انتقامی جذبے کے ماتحت ایرانی علاقے میں اس شہر کی بنیاد رکھی ایک روایت کے مطابق ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے تبریز کو ۱۷۵ھ/۷۹۱ء میں بسایا۔ لیکن بلاذری اور ابن فقیہ کے نزدیک تبریز کی تعمیر حدید الرواد الازدی نے کرائی تھی اور اس کے بیٹوں اور بھائیوں نے شہر کے گرد دیوار بنوائی تھی۔

تبریز میں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں اور جن زلزلوں سے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچا وہ ۲۴۴ھ/۸۵۸ء، ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء میں آئے۔ ۲۴۴ھ/۸۵۸ء کے زلزلے سے یہ شہر بالکل تباہ و برباد ہوگیا۔ چنانچہ المتوکل کے دور میں ۲۴۷ھ/۸۶۱ء تک یہ شہر نئے سرے سے تعمیر ہوا۔ اس کے بعد یہ شہر مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتا رہا ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء میں تبریز ایک مرتبہ پھر زلزلے کے باعث تباہ و برباد ہوگیا۔ ۴۳۸ھ ۱۰۴۶ء میں ناصر خسرو نے تبریز میں سیف الدولہ ابو منصور وھسودان کو بادشاہ پایا۔ ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں ابو منصور وھسودان نے طغرل کی اطاعت قبول کرلی۔

المقدسی نے تبریز کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کا معاصر ابن حوقل ۳۶۷ھ/۹۷۷ء میں تبریز کو آذربائیجان کا سب سے زیادہ آباد شہر بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "خرید و فروخت بکثرت ہوتی تھی اور یہاں ارمنی پارچات بنانے کے کارخانے ہیں۔

ابن مسکویہ نے بھی تبریز پر قلم اٹھایا ہے وہ لکھتا ہے۔ "تبریز ایک شاندار شہر ہے۔ اس کے گرد مضبوط فصیل ہے اور یہ باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے باشندے شجاع جنگجو اور امیر ہیں۔"

ناصر خسرو نے ۴۳۸ھ میں شہر کا کل رقبہ ۱۴۰۰×۱۴۰۰ قدم لکھا ہے۔ عہد سلاجقہ میں تبریز کا ذکر بہت کم سننے میں آیا ہے۔ سلطان برکیارق اور اس کے بھائی محمد کے مابین تنازعہ ہوا تو برکیارق تبریز کے جنوبی پہاڑی علاقے میں چلا گیا بعد میں صلح ہونے پر یہ شہر محمد کے حصے میں آیا۔ ۵۱۴ھ میں سلطان محمود نے تبریز میں خاصا وقت گذارا اس کی وفات

کے بعد اس کے بھائی مسعود نے اس شہر پر قبضہ کر لیا لیکن داؤد بن محمد نے مسعود سے یہ شہر چھین لیا اور تبریز میں رہ کر ایک وسیع سلطنت پر حکمرانی کرتا رہا۔ ۶۱۰ھ میں مغلوں نے تبریز کا محاصرہ کر لیا۔ اور ایک کثیر رقم بطور فدیہ لے کر واپس جانے پر رضامند ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہر سال یہ روش اختیار کر لی۔ ۶۲۲ھ میں جلال الدین خوارزم شاہ تبریز میں داخل ہوا۔ اور چھ سال تک حکمرانی کرتا رہا۔

۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں ہلاکو خان بغداد کی فتح کے بعد آذربائیجان آیا اور مراغہ میں سکونت اختیار کی۔ ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء میں ہلاکو شمالی قفقاز میں برکائی کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد تبریز واپس آیا۔ ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء میں ہلاکو نے تبریز کو ملک صدرالدین کی مستقل نظامت میں دے دیا۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں اباق کے دور حکومت میں تبریز کو پایۂ تخت قرار دیا گیا۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء میں جلائر (ایلخانی) خاندان تبریز پر عروج پذیر ہوا۔ ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں جب تیمور نے ایران پر پہلی مرتبہ حملہ کیا تو سلطانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ سمرقند واپس چلا گیا۔ اس کے سب سے بڑے دشمن توقتمش خان نے ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء میں ایک مہم آذربائیجان کے خلاف بھیجی تو حملہ آوروں نے تبریز پر قبضہ کر لیا لیکن سلطان احمد جلائر تبریز پر قابض ہو رہی تھا کہ اسے تیمور نے ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں پھر نکال دیا اور تبریز کے باشندوں پر ایک تاوان لگایا۔ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں الوس ہلاگو کی ایالت کا پایۂ تخت تبریز کو قرار دیا گیا اور میران شاہ کو یہ ایالت تفویض کی گئی۔ میران شاہ کے بعد اس کے لڑکے مرزا عمر کو تخت ہلاگو کی ایالت تفویض ہوئی۔ ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء میں اوزون حسن نے تبریز کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے دور میں تبریز ایک بہترین شہر تھا یہاں خوب رونق تھی۔ تمام ملکوں کے سفراء یہاں آتے تھے۔ اوزون حسن کے بعد اس کا بیٹا یعقوب تبریز کا حاکم ہوا۔

۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں اسماعیل اوّل نے تبریز پر قبضہ کیا۔ یہ صفوی خاندان سے تھا۔ ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں جنگ چالدران کی وجہ سے عثمانیوں کے لیے تبریز کا راستہ کھل گیا چنانچہ لوذن کی لڑائی کے بعد سلطان سلیم کا تبریز پر قبضہ ہو گیا۔ ترکوں نے بڑی نرم پالیسی اختیار کی انہوں نے صرف ان خزانوں پر قبضہ کیا جو ایرانی بادشاہوں نے جمع کر رکھے تھے۔ سلطان سلیم نے صرف ایک ہفتہ تبریز میں قیام کیا۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں مراد ثالث کا وزیر اعظم اور عثمان پاشا چالیس ہزار فوج لے کر تبریز پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے بڑھا چنانچہ ستمبر کے مہینے میں ترکوں کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ عثمان پاشا نے تبریز کی حفاظت کے لیے مربع شکل کا ایک قلعہ بنوایا۔ یہ قلعہ چھتیس روز میں تیار ہوا تھا عباس اوّل کے مرنے کے بعد ترکوں اور ایرانیوں میں باہمی کش مکش از سر نو شروع ہوئی یہاں تک کہ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں سلطان مراد رابع نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور تبریز پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ مراد رابع کے ہاتھوں سارا شہر تباہ و برباد ہو گیا تھا لیکن اس سلطان کے دور میں تبریز نے پہلے سے کہیں زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس زمانے میں تبریز کی آبادی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ تھی۔

بقول شاردان ۱۶۷۳ء میں جب شاہ سلیمان اوّل کا زمانہ تھا تبریز کی آبادی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ تھی۔ پندرہ ہزار مکان تھے اور تقریباً اتنی ہی دکانیں۔ یہ واقعی ایک بہت بڑا اور اہم شہر ہے۔" اگرچہ ان معلومات میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس شہر کے بارے میں یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ اس وقت ایک خاص اہمیت کا حامل تھا

۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں نادر شاہ تبریز میں داخل ہوا۔ نادر شاہ نے آذربائیجان کا صوبہ امیر ارسلان کے سپرد کر دیا تھا۔ نادر کی وفات کے بعد ابراہیم خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا لیکن جلد ہی نادر شاہ کے پوتے شاہرخ کے ہاتھوں مارا گیا۔

۱۷۸۰ء میں زلزلے کی وجہ سے تبریز کو ایک بار پھر نقصان پہنچا۔ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں قاچار خاندان کے بانی آقا محمد نے آذربائیجان پر قبضہ کیا تو اس نے تبریز کو حسین خان دنبلی کی جاگیر میں شامل کر دیا۔

۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں عباس مرزا تبریز کا حاکم بنا اس کے وقت سے تبریز ولی عہد سلطنت ایران کی رسمی قیام گاہ کے طور پر رہا۔ انیسویں صدی کے آخر تک تبریز کے اندر کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۹ء تک اس شہر کی تاریخ بہت پرآشوب رہی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب رضا خاں بطور ایک نئے گورنر جنرل کے تبریز میں آیا تو اس نے یہاں پھیلی ہوئی بدنظمی کو ختم کیا اور یہی گورنر جنرل بعد میں ایران کا بادشاہ بنا

تبریز کے قدیم ترین آثار قدیمہ مغل دور کی یادگاروں میں سے ہیں۔ یہ آثار ویران ہو چکے ہیں صرف نیلی مسجد کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں

تبریز کی آبادی ۱۹۷۴ء میں پانچ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب یہ شہر قالین خشک پھلوں روئی اور چمڑے کی تجارت کی وجہ سے مشہور ہے۔

تبریزی، جلال الدین

بنگال کے ایک صوفی بزرگ ابوالقاسم کنیت تھی۔ ایرانی النسل تھے۔ تبریز میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ آپ نے پہلے شیخ ابوسعید تبریزی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ پھر ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیوض باطنی حاصل کیے۔

جلال الدین تبریزی ابتداء میں بڑے پرشکوہ بادشاہ تھے۔ اچانک عشق الٰہی سے آپ کا دل روشن ہوا اور بادشاہت اپنے بیٹے کے سپرد کر کے شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ شیخ کی عزت اس قدر کیا کرتے تھے کہ مکہ معظمہ کے سفر کے دوران میں شیخ کی سواری کے ساتھ سخت گرمی اور دھوپ میں پیدل چلے جاتے تھے اور پاس ادب کی خاطر اونٹ پر سوار نہ ہوتے تھے

ایک اور روایت میں ہے کہ سفر کے دوران میں آپ شیخ کے لیے انگیٹھی اور دیگچی لے کر چلتے تھے تاکہ جب شیخ کھانا طلب کریں تو گرم کھانا دے سکیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضری کے دوران ہی میں آپ کی ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہوئی۔ دونوں میں بہت زیادہ محبت تھی۔ جب بہاء الدین ملتان چلے گئے تو آپ ان سے جدا ہو کر دلی تشریف لے آئے جہاں پر سلطان شمس الدین التمش نے آپ کا استقبال کیا اور آپ کی بڑی خاطر مدارت کی۔

اس کے بعد آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات کے لیے گئے بعد ازاں ایک واقعہ کے بعد آپ نے دلی کو چھوڑ دیا اور بدایوں میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور ایک لمبے عرصے تک مقیم رہے آپ کے بہت سے فیوض و برکات سے اہل بدایوں مستفیض ہوئے۔ بدایوں میں آپ نے علی کو اپنا خلیفہ بنا کر ادھر کا رخ کیا۔ اور بہار سے ہوتے ہوئے بنگال پہنچے یہاں آپ نے پنڈوہ میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کی اس وقت گوڑ کے تخت پر لکشمن داس قابض تھا۔ آپ نے پنڈوہ میں ایک مسجد بنوائی۔ باغ لگوایا اور ایک خانقاہ قائم کی جس میں ہزاروں مسافروں اور درویشوں کو کھانا ملتا تھا۔ بنگال میں بہت سے مقامی یوگیوں نے آپ سے مناظرے کیے بعد میں یہ تمام یوگی اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے اور اسلام قبول کر لیا۔

بنگال میں طالبانِ حق جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ جس وقت آپ پنڈوہ میں داخل ہوئے اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ کسی مسلمان کو وہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن آپ تن تنہا وہاں رہ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے صدیوں کا کفر کدہ ایک انقلاب سے دوچار ہو گیا۔ لوگ آپ کی تعلیمات اور قوتِ روحانی سے متاثر ہو کر جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے پجاریوں کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ یہاں کا عظیم الشان بت خانہ آہستہ آہستہ اپنی شان کھو بیٹھا اور بالآخر مسمار کر دیا گیا۔ اس شہر میں جہاں پہلے مندر ہی مندر تھے اب ان کی جگہ مساجد نظر آنے لگیں۔ بنگال میں آج مسلمان کی جو کثرت نظر آتی ہے وہ سب آپ کی برکات اور فیوض کا نتیجہ ہے۔

آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے خزینۃ الاصفیاء کے مطابق آپ نے ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں وفات پائی۔ لیکن تذکرہ اولیائے ہند میں آپ کا سن وفات ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء ہے۔

آپ کی جائے وفات کے بارے میں "سید العارفین" میں لکھا ہے کہ آپ کے جائے قیام کو دیولالا کہتے ہیں وہاں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ آپ نے اس بت خانے کو توڑ کر وہاں تکیہ بنا دیا۔ آپ کا مقبرہ بھی یہیں ہے۔ آپ کی روحانیت اور شخصیت کا بنگال کے معاشرے پر بہت گہرا اثر پڑا۔ پنڈوہ میں بہت سی عمارتیں خانقاہیں جلال تبریزی کے نام سے ہی مشہور ہوئیں۔ ماہ رجب میں ہر سال یکم سے بائیس تک آپ کا عرس ہوتا ہے۔

تبسہ الجزائر کا ایک شہر۔ یہ جبال مجمعۃ اسمر اور جبل دکان کے گنجان پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ پہاڑی ندیوں سے آب پاشی کی وجہ سے یہ غلے کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہے۔ شہر کے اردگرد باغوں کی بہتات ہے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے یہ شہر ایک تجارتی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ شہر کے قرب و جوار میں نمک کی کانوں کی وجہ سے اس کی رونق اور بھی دوبالا ہو گئی ہے۔

۲۵ قبل مسیح میں آگسٹس نے اسے اپنی تیسری فوج کا صدر مقام بنایا تھا۔ اس زمانے میں رومی افریقہ میں قرطاجنہ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل تھی۔ بعض مصنفوں نے اس کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ بتائی ہے۔ اس کے بعد اس شہر کی حالت دن بہ دن گرنے لگی۔ بالآخر یہ بالکل زوال پذیر ہو گیا۔ چوتھی صدی عیسوی تک اس کی یہی حالت رہی۔ یہاں تک کہ پانچویں صدی میں بزنطینیوں کا اس پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ سلیمان کے عہد میں اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ ۵۹۷ء میں بربروں نے تبسہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶۸۲ء میں یہ عربوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس شہر پر اغلبی، فاطمی، زیری اور موحدین مختلف ادوار میں حکمرانی کرتے رہے۔ بعد میں بنو حفص کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ اور صدیوں تک وہی اس پر حکمرانی کرتے رہے۔ سولہویں صدی میں ترکوں نے تبسہ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ترکوں نے یہاں بلاد تونس کی سرحدوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک فوج تعینات کی۔ تبسہ میں مختلف قومیں آباد ہیں ان میں روکس اور بیکاریہ کے باشندوں کے کنبے بلاد تونس اور بلاد الجرید کے مہاجر اور قلعہ کے محافظ فوج کے سپاہیوں کی اولاد ہیں۔ جنہوں نے مقامی عورتوں سے جنم لیا ہے۔ آخری عنصر دوسروں پر غالب آ گیا ہے۔ انہوں نے آبادی کی اکثریت کو حنفی مسلک کا پیروکار بنا دیا ہے۔

جب فرانسیسیوں نے ۱۸۳۷ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو ترکی قلعہ گیر فوج نے تونس کی طرف راہ فرار اختیار کی اور شہر بالکل غیر محفوظ رہ گیا۔ اس صورت حال کے خاتمے کے لئے عمائدین شہر نے فرانسیسیوں سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں یہاں ایک مستقل فوج رہنے لگی اور اس طرح چھاؤنی کے قرب میں ایک یورپی نوآبادی معرض وجود میں آ گئی۔ یہاں کی آبادی کی اکثریت کاشت کاری کرتی ہے جس میں مقامی اور یورپی دونوں قومیں شامل ہیں۔

تبع تابعین تابعین کے بعد آنے والے علم حدیث کی اصطلاح میں تبع تابعین سے مراد وہ بزرگ ہیں جنہیں تابعین کا شرف زیارت نصیب ہوا ہو اور وہ خود بھی مومن ہوں اور اسلام ہی پر وفات پائی ہو اور ان کی صحبت سے متمتع ہوئے ہوں۔ بالفاظ دیگر تبع تابعین صحابہؓ کی تیسری کڑی ہیں۔ آنحضورؐ نے صحابہ تابعین اور تبع تابعین کو امت کے بہترین افراد قرار دیا ہے

تبلیغ لغوی معنی انتہا یا آخری ٹھکانے تک پہنچانا ہیں۔ دینی اصطلاح میں اس کے معنی اللہ تعالےٰ کا پیغام دوسرے بندوں تک پہنچانا ہیں۔ قرآن مجید میں تبلیغ کے لئے ابلاغ کا لفظ بھی ہے۔ بقول پروفیسر مُلر "اسلام دراصل ایک تبلیغی مذہب ہے۔ جس نے اپنے آپ کو تبلیغ کی بنیادوں پر قائم کیا اسی کی قوت سے ترقی کی اور اسی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔" تبلیغ غیر مسلم اور مسلم دونوں کو ہو سکتی ہے۔

چونکہ اسلام روحانی ہی نہیں بلکہ مادی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس لئے ہر عہد میں اسلام کی تبلیغ کی ضرورت رہی ہے اور آج کے زمانے میں تو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

تبلیغ اسلام کی ضرورت صرف اس لئے نہیں ہے کہ اس میں دنیا والوں کا فائدہ ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہر مسلمان کی بہتری اور فلاح ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"قسم ہے زمانے کی، یقیناً انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے نیک کام کئے۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔" (سورۃ العصر)

چنانچہ اگر نیکی کی تبلیغ رک جائے تو قوم گھاٹے میں رہتی ہے۔ نیکی محض ٹھہراؤ کا نہیں حرکت کا نام ہے۔ اگر اس میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا نہ کی جائے تو یہ سکڑتی ہے۔ اور جلد یا بدیر ختم ہو جاتی ہے۔

تبلیغ کے دو اجزا ہیں (۱) نیکی کی اشاعت (۲) برائی کا روکنا۔ تبلیغ کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے کچھ احکامات دیئے ہیں۔

"تم میں ایک جماعت تو ایسی ہونی ہی چاہیئے جو نیکی کی دعوت دے۔ بھلائی کا حکم دے۔ اور برائی سے روکے اور وہی لوگ فلاح یاب ہیں۔ (۳:۱۰۴)

آنحضورؐ نے تبلیغ کی بہت تاکید فرمائی۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

"مجھ سے پیغام سن کر آگے پہنچا دو چاہے یہ ایک آیت ہی ہو۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تمہیں اچھائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالےٰ تم پر عذاب بھیج دے۔ پھر تم اسے پکارو گے اور تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔" (ترمذی)

قرآن مجید میں ایک مقام پر آتا ہے۔

"تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم اچھے

کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔" (۳: ۱۱۰)

آنحضورؐ کو ہر چیز سے زیادہ تبلیغ عزیز ہوتی تھی اور اس کی خاطر آپؐ نے بڑے بڑے دکھ اٹھائے۔

تبلیغ کے دو طریقے ہیں۔ ۱۔ زبانی ہدایت۔ ۲۔ اخلاقی کشش۔

زبانی تبلیغ نہایت صبر و تحمل اور حسن کلام سے ہونی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلا اور ان کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔" (۱۶: ۱۲۵)

یعنی انسان کسی کو تبلیغ کرے تو اسے نرم خوئی، دل سوزی، اخلاص، ہمدردی، شفقت اور حسن اخلاق سے کام لینا چاہیے۔

۲۔ اخلاقی کشش۔ اسی انسان کا کلام دوسرے کے دل پر اثر کرتا ہے جو اپنے کہنے پر عمل پیرا بھی ہو۔ مبلغ کا کلام ہزار شیریں ہو لیکن اس کا اخلاق دلآویز نہ ہو تو وہ اثر نہیں کرتا۔

جب ہم اشاعت اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند، ایران، عرب، مصر، افریقہ، چین، جزائر ملایا، ممالک تاتار اور ترکستان میں اسلام صرف تبلیغ ہی کی وجہ سے پھیلا۔ آج اسلام کی وہ فتوحات جنہیں شمشیری کہا جا سکتا ہے۔ دنیا سے مٹ گئی ہیں اسپین ختم ہو چکا۔ صقلیہ مٹ گیا یونان تباہ ہو گیا۔ مگر وسط افریقہ، جاوا، سماٹرا اور جزائر ملایا اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی زندگی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے۔ یہ تبلیغ ہی کی وجہ تھی کہ جب ایک طرف بغداد میں قتل عام جاری تھا۔ تو دوسری طرف سماٹرا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ سے اسلام مٹایا جا رہا تھا لیکن دوسری طرف جاوا میں اس کا علم بلند ہو رہا تھا۔ ایک طرف تاتاری اس کو مٹانے پہ تلے تھے لیکن دوسری طرف خود ان کے دلوں کو اسلام فتح کر رہا تھا۔

تبنی گود لینا، متبنیٰ بنانا۔ لے پالک بنانا، کسی لڑکے یا لڑکی کو اپنی فرزندی میں لینا متبنیٰ بنانے کا رواج اکثر قوموں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے باوجود مسلمانوں میں کمال درجہ کی اخوت پیدا کرنے کے تعلقات نسبی میں اس کو حائل نہ ہونے دیا۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ جس بچے کو متبنیٰ بنا لیتے۔ وہ بالکل ان کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا اور لوگ اسے اسکے حقیقی باپ کے نام سے بھی نہیں پکارتے تھے۔ اسے وراثت میں بھی حقدار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جیسے حقیقی بہن کے ساتھ اس کے مر جانے کے بعد یا اپنی بیوی کو طلاق دے دینے کے بعد منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ رسم اسلامی قوانین وراثت اور نکاح و طلاق سے ٹکراتی تھی۔

قرآن مجید میں تبنی کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"اور نہ اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے ...... منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک منصفانہ بات ہے۔" (۳۳: ۴، ۵)

"اور پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا۔ تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے۔ جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔" (۳۳: ۳۷)

"(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔" (۳۳: ۴۰)

اسلام تبنی کے بارے میں جو ہدایات دیتا ہے وہ یہ ہیں ایک تو منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے منہ بولے باپ کی وراثت میں سے حقیقی اولاد کے طور پر حصہ نہیں پا سکتے زیادہ سے زیادہ انہیں حق وصیت میں سے حصہ مل سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر منہ بولا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا اس کے مر جانے کے بعد وہ بیوہ ہو جائے تو منہ بولا باپ اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اور اس طرح منہ بولے باپ کی حقیقی بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسے بیٹے کا نکاح ہو سکتا ہے۔

اسلام میں کسی کو متبنیٰ بنانا منع نہیں ہے۔ حضرت زیدؓ آنحضورؐ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ اسلام نے صرف متبنیٰ کے حقوق کے بارے میں چند حدود متعین کر دی ہیں تاکہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو سکے۔

تبو ایک قوم جو صحرائے اعظم کے مشرقی حصے میں آباد ہے۔ یہ لوگ بہت وسیع علاقے میں آباد ہیں، جس کے مشرق میں صحرائے لیبیا، مغرب میں ہجر [illegible] دونوں کے درمیان یہ علاقہ واقع ہے۔ شمال میں فزان کا علاقہ اور جنوب میں چاڈ ہے۔ تبو کی بہت بڑی تعداد فزان کے علاوہ قطرون اور الکفرہ میں پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ تبیستی، بورکو، انیدی اور واڈائی کے شمالی حصے اور بحر الغزال میں بھی یہ لوگ آباد ہیں۔ کانم اور کوار کے نخلستانوں میں ان لوگوں کی اکثریت ملتی ہے۔ یہ [illegible] تبو کہتے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے ان کے دو گروہ بالکل پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر پست قد اور سانولے رنگ کے ہیں۔ ان میں کچھ بدوی ہیں اور کچھ [illegible] اکثر غریب اور بدحال ہیں۔ ان کی آمدنی کے ذرائع کھجور اور غلے کی کاشت ہے۔ جوانوں کی [illegible] ہوتی جاتی ہے لیکن ان کا خاص پیشہ لوٹ مار ہے۔ [illegible] نہیں ہوتی تاہم یہ غارت گری سے نہیں چوکتے۔ یہ لوگ [illegible] کے عادی ہو گئے ہیں۔

یہ لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہیں اشراف اور عوام۔ [illegible] حاکم ہیں یا پھر محکوم۔ حاکم قبائل مثلاً [illegible] کے درمیان سوڈانیوں کی طرح حداد بالکل الگ طبقہ ہے۔ انہیں [illegible] تصور کیا جاتا ہے اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

مذہب کے اعتبار سے یہ لوگ مسلمان ہیں لیکن [illegible] انہیں مسلمان ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کیونکہ ان کی رسوم [illegible] برکو اور بحر الغزال کے لوگ کٹر عقیدے والے ہیں۔ انہوں نے یورپی لوگوں کے داخلے اور اثر و نفوذ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔

ان لوگوں کو ایک زمانے تک [illegible] خیال کیا جانے لگا۔ موجودہ زمانے میں انہیں سوڈان کے باشندے تسلیم کیا گیا ہے جنہوں نے صحرا میں دھکیل دیا گیا ہے۔ [illegible] نے کانم کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

[illegible] صدی کے نصف میں انہیں اولاد سلیمان اور طوارق کے [illegible] سے اپنا بچاؤ کرنا پڑا۔ ان کے بارے میں [illegible] یقینی معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

تبوک ایک شہر جو درب الحج پر واقع ہے اور مدینہ کا [illegible]

کے قول کے مطابق یہ مدینہ منورہ سے بارہ دن کی مسافت پر ہے۔ یہ بیضوی میدان کی معمولی سی اونچائی پر واقع ہے۔ یہاں کی اہم ترین عمارت حاجیوں کا قلعہ ہے جو ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کی تعمیر کردہ ایک مسجد ہے۔

اس مسجد میں خوب صورت تراشے ہوئے پتھر لگائے گئے ہیں۔ آنحضورؐ کے زمانہ مبارک میں یہ علاقہ بلاد عرب کی شمالی سرحد کے خط پر واقع تھا اور اس کے دوسری طرف بزنطینی سلطنت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ ۹ھ میں جب آنحضورؐ نے شمالی علاقوں کے خلاف غزوہ شروع کیا تو یہ علاقہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہو گیا۔ آنحضورؐ جب مسلمانوں کا لشکر لے کر یہاں پہنچے تو رومی منتشر ہو گئے۔ تو آپؐ نے اس مہم کو ترک کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ آنحضورؐ نے اس علاقے میں تقریباً دس راتیں اور بقول ابن سعد بیس راتیں بسر کیں۔ اس عرصے میں یہاں کے لوگوں سے آپ کی بات چیت ہوئی۔ آپؐ نے انہیں دعوت اسلام دی اور وہ لوگ مطیع ہو گئے۔

تبوک، غزوہ ایک غزوہ جس کی تیاری رجب ۹ھ/نومبر ۶۳۰ء میں کی گئی۔ اگرچہ سلطنت روم کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش کی ابتدا فتح مکہ سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ لیکن ۸ھ/۶۲۹ء میں جب موتہ کے مقام پر مسلمانوں کے تین ہزار مجاہدین شرحبیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرائے اور رومیوں کو شکست فاش دی تو دوسرے ہی سال قیصر روم نے غزوہ موتہ کی شکست کا داغ دھونے کے لئے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار بھی فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ آنحضورؐ نے دشمنان اسلام کی ان تیاریوں کو دیکھتے ہوئے بلا تامل قیصر روم کی عظیم الشان طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔

جن حالات میں اس غزوے کی تیاری کی گئی وہ بڑے دگرگوں تھے۔ ملک میں قحط سالی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ فصلیں پکنے کے قریب تھیں۔ سواریوں اور جنگی ساز و سامان کا بندوبست نہایت دشوار تھا۔ سرمائے کی بے حد کمی تھی۔ ان حالات میں جب کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک کے ساتھ مقابلہ درپیش تھا آنحضورؐ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ گھڑی دعوت حق کے لیے زندگی یا موت کے فیصلے کی گھڑی ہے، جنگ کی تیاری کا اعلان عام کر دیا۔ مسلمانوں کو پورا پورا احساس تھا کہ وہ جس تحریک کے لیے ۲۲ سال سے جدوجہد کر رہے ہیں اس کے لئے فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ چنانچہ اس احساس کے ساتھ مسلمانوں نے انتہائی جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سر و سامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ الغرض ۹ھ کو تیس ہزار مجاہدین کا ایک لشکر تیار ہو گیا۔ بہت سے مسلمان سواری کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ کیونکہ سواریوں کی کل تعداد دس ہزار تھی اور ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرمی کی شدت ایک علیحدہ مسئلہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے جس عزم اور ہمت کا ثبوت اس موقع پر دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب مسلمان تبوک کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ قیصر روم اور اس کے مددگاروں نے حملہ کرنے کے بجائے اپنی فوجوں کو سرحدوں سے ہٹا لیا چنانچہ لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی۔ مسلمانوں کو اس موقع پر بڑی اخلاقی فتح حاصل ہوئی۔ آنحضورؐ نے اسے اس مرحلے پر کافی سمجھا اور سرحد شام میں داخل ہونے کے بجائے آپ نے ۲۰ دن تبوک ہی میں قیام کر کے ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنت روم اور مسلمانوں کے علاقے کے درمیان واقع تھیں انہیں سلطنت اسلامی کا باجگزار اور تابع کر لیا اور اس طرح مملکت اسلامی کی حدود رومی سلطنت کی سرحد تک وسیع ہو گئیں اور جن عرب قبائل کو شہنشاہان روم عرب کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے۔ اب ان کا بیشتر حصہ مسلمانوں کا معاون بن گیا۔

تتش، تاج الدولہ (۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء – ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء) ملک شام کا ایک سلجوقی حکمران۔ الپ ارسلان کا بیٹا۔ جب اس کے بھائی ملک شاہ نے ۴۷۱ھ/۱۰۷۹ء میں اسے شام کی حکومت دے دی تو اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ حلب کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا محاصرہ کر لیا لیکن ناکام رہا حلب سے واپسی کے بعد بزاعہ اور البیرہ وغیرہ کو جو اس کے اردگرد کے ممالک تھے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ تتش کی غیر موجودگی میں حلبیوں نے مسلم بن قریش سے مدد مانگی جس نے مرداسیوں کے حکمران خاندان کو وہاں سے نکال کر ملک شاہ سے اپنی حکومت تسلیم کرا لی۔ لیکن تتش کو یہ بات ناگوار گذری۔ تتش کو اس دشمن سے اس وقت چھٹکارا حاصل ہوا جب وہ سلیمان کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اب تتش کا ایک اور حریف سلیمان رہ گیا تھا لیکن سلیمان ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں تتش کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ لیکن پھر بھی حلب اس کے قبضے میں نہ آ سکا۔ کیونکہ ملک شاہ نے اپنے دوست آقسنقر کو دے دیا۔ چنانچہ تتش نے ان کے خلاف ہونے کی بجائے دوستی ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور انہوں نے متحد ہو کر ملک شام میں نمایاں کامیابیاں حاصل بھی کیں۔ ملک شاہ کی وفات کے بعد دونوں ترکی امیر تخت کے دعوے دار تتش کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں جب برکیارق اپنے باپ کے جانشین کے طور پر آگے آیا تو دونوں ترکی امیر اس کے ساتھ مل گئے۔ اور تتش کو اکیلا چھوڑ دیا۔ تتش نے امیروں سے اس بات کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ ادھر ان امیروں نے بھی اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ دونوں فوجوں میں تل السلطان کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ جس میں تتش ان پر غالب آ گیا۔ اس نے دونوں امیروں کو قتل کروا دیا۔ برکیارق کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی۔ اس لیے وہ اصفہان کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں اسے سمجھایا گیا کہ اب دونوں دعویداران تخت کے درمیان صرف تلوار ہی فیصلہ کر سکتی ہے چنانچہ برکیارق کے تحت اردگرد کے علاقوں سے فوجیں اکٹھی ہونا شروع ہو گئیں اور دشلیو کے مقام پر دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ تتش کے سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ آخر اس لڑائی میں تتش داد شجاعت دیتا ہوا آقسنقر کے ایک سپاہی کے ہاتھوں مارا گیا۔

تثلیث عیسائیوں کا ایک عقیدہ۔ جس کے تحت روح القدس جبرائیل، خدا اور حضرت عیسیٰؑ یہ تینوں خدا ہیں لیکن انہیں نہ ایک خدا کہا جا سکتا ہے نہ تین خدا۔ یہ ایک میں تین ہیں اور تینوں میں ایک ہے۔

بقول ریورنڈ جارج ولیم ناکس "عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک عجیب قسم کا مرکب ہے جس میں مذہبی خیالات تو بائیبل کے ہیں لیکن ایک آریائی فلسفے کی صورتوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ اس عقیدے کا مواد یہودی ہے اور مسئلہ خالص یونانی اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ سراسر فلسفیانہ تھا یعنی ان تینوں اقانیم (باپ بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کس نوعیت کا ہے۔ چنانچہ ۳۲۵ء میں جب نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا تو بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے

کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح حقیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔

قرآن مجید میں اس عقیدے کا بطلان کیا گیا ہے۔

"اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچے کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔ باز آجاؤ یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے وہ بالاتر ہے۔ اس بات سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہے۔ (۴ : ۱۷۱)

عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ عیسائیوں کے لئے یہ مسئلہ کہ عقیدہ توحید کے باوجود عقیدہ تثلیث کو اور عقیدہ تثلیث کے باوجود عقیدہ توحید کو کس طرح نباہیں، ایک ناقابلِ حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اس عقدے کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اس عقیدے کی مختلف تعبیرات پر بنے اور ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی تکفیر کی۔ اللہ تعالےٰ نے اس مسئلے کا حل یہ بتایا ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں مسیح اور روح القدس کے بارے میں انہوں نے جو غلو اختیار کیا ہے ان کی الوہیت کا تخیل چھوڑ دیں اور صرف اللہ کو واحد الٰہ تسلیم کر لیں۔

قرآن میں ایک اور جگہ اس عقیدے کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے۔ حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اسے دردناک سزا دی جائے گی (۵ : ۷۳)

تجارت سوداگری، بیوپار۔ اسلام میں ایک معزز ذریعہ حصولِ رزق ہے۔ آنحضرتؐ نے بذاتِ خود تجارت کی ہے۔ عرب کی خوشحالی کا سارا دارومدار بھی تجارت ہی پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں ایک سورت میں عرب معاشرے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

"قریش کی حفاظت کی وجہ سے، ان کے جاڑے اور گرمی کے سفروں کی وجہ سے پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا۔ اور خوف سے امن دیا۔ (۱۰۶ : ۱ تا ۴)

اس سورت میں قریش کے ان تجارتی سفروں کا ذکر ہے جو وہ گرمی اور سردی میں کیا کرتے تھے۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ تجارت پوری ایمانداری سے کی جائے اور اس میں کسی فریق کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ چنانچہ احادیث میں بھی آنحضورؐ نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"آنحضورؐ نے فرمایا نہایت سچا اور دیانت دار تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔" (مشکوٰۃ)

اس کے مقابلے میں بددیانت تاجر کے بارے میں ارشاد ہے۔

"تاجر لوگوں کا حشر فاجروں کے ساتھ ہو گا۔ مگر جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی اور نیکی کی اور سچ بولا۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا

"سودا کرنا جر ہیں۔" اس پر کسی نے کہا یا رسول اللہ کیا اللہ تعالےٰ نے خرید و فروخت کو حلال نہیں کر دیا۔" آپ نے جواب دیا یقیناً۔ وہ بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں اور گناہ کرتے ہیں۔ (احمد)

اگر کوئی شخص ناقص مال نقص ظاہر کئے بغیر فروخت کرے گا تو اللہ تعالےٰ اس سے ہمیشہ بیزار رہے گا۔ اور فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت بھیجیں گے۔" (ابن ماجہ)

تجارت میں اس بات کو بہت زیادہ مستحسن خیال کیا گیا ہے کہ تاجر کشادہ دل اور دل جوئی کرنے والا ہو۔ ناپ اور تول میں پورا اور تولنے میں ذرا کم کر دیتے ہوئے جھکتا تولے۔ (ابن ماجہ)

"کسب حلال جہاد ہے۔ اور اگر تم اسے بچے یا بچوں اور قرابت داروں پر خرچ کرنے ہو تو یہ صدقہ ہے اور بے شک جائز تجارت سے کمایا ہوا ایک درہم ان دس درہموں سے افضل ہے جو دوسرے طریقوں سے کمائے گئے ہوں۔" (ابن ماجہ)

تجارت میں باہمی رضامندی ضروری ہے اور لینے والے یا بیچنے والے پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہونا چاہیے۔

اسلام اس چیز کو بھی غلط کہتا ہے کہ تاجر اپنے مال تجارت کی عمدگی ظاہر کرنے کے لیے قسمیں کھائے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔

"قسموں کے ذریعے مال فروخت تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی برکت اٹھ جاتی ہے (بخاری باب ۲۶)

بعض چیزیں جن کا استعمال ... جو مجلس میں ... ہے ان کی تجارت ممنوع قرار دی گئی ہے۔ مثلاً شراب، سود ... وغیرہ کی تجارت۔

اسلام کے نزدیک کاروبار تجارت مذہب کے ... کے قوانین کے مطابق تجارت کی جائے تو وہ عبادت ... [illegible] انبیاء تجارت کرتے تھے۔

تجانیہ صوفیہ کا ایک سلسلہ جس کا بانی ... [illegible] سلسلے کا بانی احمد بن ... [illegible] بیماری سے وفات پا گئے۔ ابتدائی تعلیمات ... [illegible] ابیض کا سفر بھی اسی مقصد کے لئے ... [illegible] میں تلمسان ... حج ... اور مدینہ منورہ اور ... کا سفر بھی کیا ... [illegible] طیبیہ اور ... سلسلوں میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں اس نے ... [illegible] ایک نیا سلسلہ قائم کیا ... [illegible] یہاں اس کے قول کے مطابق خواب میں آنحضور ... [illegible] حکم دیا۔ یہاں سے احمد ... [illegible] ۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔

تجانیہ کے پیروکاروں کو ... [illegible] منع ہو گئے۔ اس سلسلے کے پیروکاروں کا سب سے بڑا ... [illegible] اطاعت کی جائے۔ ذکر کے ضمن میں ... [illegible] بار بار دہراتے ہیں۔

احمد کی وفات کے بعد اس کے ... [illegible] کا شیخ علی بن ... جسے احمد نے خود خلیفہ نامزد کیا تھا اس کے ... [illegible] اور محمد الکبیر کو ... آپ ... [illegible] امیر ... [illegible] سیدی علی ... احمد کے بیٹوں ... [illegible]

میں چھوڑ کر خود تماسین چلا گیا۔ جب محمد کبیر ایک حملے میں مارا گیا تو اس نے محمد صغیر کو تجانیہ سلسلے کی اشاعت و تبلیغ کی ہدایت کی۔ اس کی تبلیغ اور اشاعت کے سلسلے میں یہ سلسلہ بہت پھیل گیا۔ اور اس کی دولت و طاقت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ لیکن اب انہوں نے فوجی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرانسیسیوں نے الجزائر پر حملہ کیا تو انہوں نے ان کے خلاف مقابلے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

۱۸۳۶ء میں امیر عبدالقادر نے جو فرانسیسیوں کو ملک سے باہر نکالنا چاہتا تھا تجانیہ سلسلے کے پیروکاروں کی امداد چاہی تو ان کے امیر نے جواب دے دیا کہ میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اور ذکر و فکر کی خاموش زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں

علی بن عیسےٰ نے جب ۱۸۴۴ء میں تماسین میں انتقال کیا تو اس کے بعد اس کا بیٹا باقی شیخ چنا گیا۔ اور اس کے انتقال پر علی کا پوتا محمد العابد اس سلسلے کا شیخ بنا اس کے بعد اس کے دو بیٹے احمد اور البشر اس سلسلے کے شیخ بنے۔

اگرچہ اس سلسلے کی اشاعت مصر، عرب اور ایشیا کے دوسرے شہروں میں بھی ہوئی لیکن جو ترقی اسے فرانسیسی افریقہ میں نصیب ہوئی اور کسی جگہ پر نہیں ہوئی ایک مبلغ محمد الحافظ بن مختار نے اس سلسلے کی نشر و اشاعت نہایت کامیابی سے کی اس نے مراکش کے انتہائی جنوب کے اہل صحرا میں اس سلسلے کو روشناس کرایا اور ایک بڑی تعداد اس سلسلے میں داخل ہوئی۔ ایک اور مبلغ الحاج عمر نے فرانسیسی گنی میں اس سلسلے کی اشاعت کی۔ جہاں جہاں یہ سلسلہ موجود ہے وہاں وہاں اس نے قادریہ سلسلے کی جگہ لے لی ہے۔

تجانیہ سلسلے کے اعمال و اشغال کے سب سے اہم مجموعے کا نام "جواہر المعانی و بلوغ الامانی فی فیض الشیخ التجانی" ہے۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب مشہور بزرگوں کے تراجم کی معجم ہے۔ اس کا نام "کشف الحجاب" ہے۔

تجرد تنہائی، علیحدگی۔ اصطلاح میں غیر ازدواجی زندگی بسر کرنا۔ ایسے شخص کو مجرد کہا جاتا ہے۔ جو شخص اہل و عیال کے حقوق ادا کر سکے اس کا نکاح نہ کرنا خلاف سنت ہے۔ تجرد کی زندگی گذارنا شہوانیات کو اپنے دل میں پالنا ہے جس سے بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

صوفیا کے نزدیک جو شخص مخلوق میں رہنا چاہے اس کے لئے نکاح کرنا لازمی ہے کیونکہ یہ جزو معاشرہ ہے اور جو شخص مخلوق سے علیحدہ رہنا چاہے اس کے لئے تجرد کی زندگی گذارنا بہتر ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا "چلو چلو اعبادت میں تیز گام ہو جاؤ۔ کیونکہ مجرد لوگ تم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ (کشف المحجوب)

حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے۔ "ہلکے بوجھ والوں نے نجات پائی اور بھاری بوجھ والے ہلاک و برباد ہوئے۔"

آنحضورؐ کے اس فرمان کے تحت "آخر زمانہ میں سب لوگوں سے بہتر وہ شخص ہوگا جو کم حال ہوگا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسولؐ اللہ کم حال کون ہوتا ہے آپؐ نے فرمایا جس کے اہل و عیال نہ ہوں۔ (کشف المحجوب)

چنانچہ مشائخ طریقت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مجرد درویش سب پر فضیلت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نفس کی آفات سے محفوظ رہیں۔ اور شہوانیات کے مرتکب نہ ہوں۔ جب عورتیں اس کے نزدیک بہت ہی محبوب ہوں اور جنس لطیف کا حسن و جمال اس کی طبیعت پر گہرا اثر کرے تو اس کے لئے تجرد کی زندگی گذارنے کی بجائے نکاح کر لینا اچھا ہے۔

بقول حضرت علی ہجویریؒ "طریقت کی بنیاد مجرد رہنے پر رکھی گئی ہے نیز مجرد آدمی کے لئے یہ شرائط ہیں کہ آنکھ کو ناشائستہ امور کے دیکھنے سے روکے اور نہ سننے کے لائق باتوں کو نہ سنے اور نہ سوچنے کے قابل باتوں کو نہ سوچے اور شہوت کی آگ کو بھوک کے ذریعے سے بجھائے اور دل کو دنیا سے اور اس کے حوادث میں مشغول ہونے سے محفوظ رکھے اور اپنی خواہش نفس کو علم اور الہام نہ کہے اور شیطان کے شعبدہ کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت میں مقبول ہو۔

تجلی تصوف کی اصطلاح۔ حق تعالےٰ کے انوار کا ذات حق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے والے لوگوں کے دل میں ایسے طور سے اثر انداز ہونا کہ اس وجہ سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ دل سے حق تعالےٰ کو دیکھ سکیں۔ "کشف المحجوب" میں حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں۔ "اس دلی رویت حق اور عینی رویت حق کے درمیان یہ فرق ہے کہ دل میں جلوہ حق پانے والا اگر چاہے تو حق کو دیکھ لیتا ہے۔ اگر نہ چاہے تو نہیں دیکھتا یا کبھی دیکھتا ہے اور کبھی نہیں دیکھتا۔ لیکن عینی رویت والے بہشت میں اگر حق کو نہ دیکھنا چاہیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ تجلی پر پردہ کا آنا جائز ہے لیکن رویت پر حجاب روا نہیں۔"

"اس دنیا میں حق تعالےٰ کی عینی رویت ناممکن ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے" "اور جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جب تک کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں۔ پس تم کو ہولناک آواز نے آ لیا اور تم دیکھ رہے تھے۔" (۲:۵۵)

چنانچہ جونہی اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے ان ستر آدمیوں کو جنہیں حضرت موسےٰؑ منتخب کر کے اپنے ساتھ اللہ کی تجلی دکھانے لے گئے تھے اپنی تجلی دکھائی تو پہاڑ میں زلزلہ آ گیا اور وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

تجوید تحسین یعنی آراستہ کرنا، درست کرنا۔ اصطلاح میں اس سے مراد فن قرأۃ ہے جس کے تحت حروف قرآن کو ان کے صحیح مخرج کے مطابق پڑھا جاتا ہے اور حروف کے ادا کرنے میں آواز نہ زیادہ زوردار ہوتی ہے نہ کمزور اور نہ کوئی لغزش و غلطی ہوتی ہے۔

تجوید کی تین قسمیں ہیں۔ ترتیل، حدر اور تدویر۔ ترتیل سے مراد الفاظ کو آہستگی کے ساتھ ان کے مطالب پر غور و خوض کرتے ہوئے پڑھنا ہے۔

حدر سے مراد جلد اور تیز تیز پڑھنا ہے۔

تدویر سے مراد اعتدال کے ساتھ پڑھنا ہے۔

تجوید سے سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے زبان لحن یعنی لغزش اور غلطی سے محفوظ رہے۔ فن تجوید کے تحت سب سے پہلے تو حروف ہجا کے مخارج بتائے جاتے ہیں یعنی کسی حرف کا صحیح مخرج کیا ہے۔ پھر حروف کو ان کے صحیح مخارج سے نکالنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اصول و قواعد یعنی ترقیق امالہ اور ادغام کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔

تجہیز و تکفین میت کی آخری رسوم۔ مختلف مذاہب میں کفن دفن کے مختلف طریقے ہیں۔ اسلامی روایات کے مطابق جب آدمی مر جائے تو اس کی آنکھیں بند کر کے عموماً ایک پٹی اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے سر کے اوپر باندھ دی جاتی ہے۔ تاکہ اس کا منہ کھلا نہ رہے اور مکھی وغیرہ اندر داخل نہ ہو۔ مرنے والے کے پیٹ پر بھی کچھ وزن رکھ دینا چاہیے تاکہ پیٹ پھول نہ جائے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں

جلدی کرنا مستحب ہے۔ جامع ابو داؤد میں ہے جب حضرت طلحہؓ بیمار ہوئے تو آنحضورؐ عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا میرا خیال ہے طلحہؓ کی وفات کا وقت آگیا ہے لہذا مجھے خبر کر دینا۔ ان کی تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا کیونکہ مسلمان میت کو اس کے گھر والوں میں رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ (مشکوٰۃ) جب تک میت کو غسل نہ دیا جائے اس کے نزدیک قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔

میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے۔ جب میت کو غسل دینے کے لیے تخت پر لٹایا جاتا ہے تو اس سے پہلے تخت کو تین سے سات بار تک صندل یا لوبان کی دھونی دی جاتی ہے۔ میت کو اس طریقے سے تخت پر لٹایا جاتا ہے کہ اس کا رُخ قبلے کی طرف ہو۔ نیز غسل با پردہ جگہ پر دیا جاتا ہے تاکہ غسل دینے والے اور اس کام میں مدد دینے والوں کے علاوہ اور کوئی نہ دیکھے۔ غسل کا پانی اگر میسر ہو تو بیری کے پتے یا صابن یا سجّی ڈال کر گرم کیا جاتا ہے۔ حضرت عطیہؓ سے روایت ہے۔ ہم آنحضورؐ کی بیٹی کو غسل دے رہے تھے کہ آنحضورؐ تشریف لائے اور فرمایا اس کو تین یا پانچ بار اور اگر مناسب سمجھو تو اس سے زیادہ بار غسل دینا اور بیری کے پتوں کے پانی سے غسل دینا۔ آخری بار پانی میں کافور ڈال دینا۔" (مشکوٰۃ) غسل دینے والے کو چاہیے کہ پہلے میت کے استنجے کی جگہ سے مٹی کی چھوٹی ڈلیوں سے نجاست صاف کرے۔ پھر کپڑے کی تھیلی ہاتھ میں پہن کر میت کا پانی سے استنجا کرے۔ اس تھیلی کو اتار پھینکے۔ پھر ہاتھ دھو کر اپنی انگلی پر کپڑا لپیٹ کر میت کے دانتوں اور ہونٹوں پر پھیرے پھر ناک کے نتھنوں میں پھیرے میت کے منہ اور ناک میں پانی نہ ڈالے۔ پھر باقی وضو کرا دے اور وضو سے پہلے میت کے پہنچوں تک ہاتھ نہ دھوئے۔ اگر سر اور ڈاڑھی کے بال ہوں تو صابن وغیرہ سے دھوئے۔ اس کے بعد میت کو بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں طرف تین مرتبہ پانی سر سے پاؤں تک ڈالے اور میت کا سارا جسم ہاتھ سے مل کر دھوئے صرف ستر کی جگہ کپڑے کی تھیلی پہن کر دھوئے۔ پھر میت کو دائیں کروٹ پر لٹا کر بائیں طرف سے تین مرتبہ پانی بہائے اور پہلے کی طرح اس کا بدن ہاتھ سے مل کر دھوئے۔ اس کے بعد میت کی پشت کو غسل دینے والا اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں یا سینے سے تکیہ لگا کر میت کو بٹھائے۔ اور میت کا آہستہ آہستہ پیٹ نیچے کو ملے اگر اس کے پیٹ میں سے کوئی گندگی نکلے تو اسے دھو ڈالے۔ دوبارہ وضو اور غسل کا اعادہ نہ کرے۔ پھر میت کو بائیں کروٹ لٹا کر داہنے طرف سے سر سے پاؤں تک تین مرتبہ پانی بہائے۔ یہ تیسرا غسل کہلاتا ہے۔ اس کے بعد میت کے بدن کو کپڑے سے پونچھ ڈالے اور اس کی ہتھیلیوں، تلووں، پیشانی، ناک اور دونوں گھٹنوں پر کافور لگائے۔ نیز ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں خوشبو عطر وغیرہ لگائے۔

میت کو کفن دینا فرض کفایہ ہے۔ سنت کے مطابق مردوں کے لیے کفن تین کپڑے ہیں۔ تہ بند، چادر اور قمیص۔ کفن کفایت دو کپڑے ہیں تہ بند اور چادر۔ کفن ضرورت ایک کپڑے پر اکتفا جائز ہے جو میت کے تمام جسم کو ڈھانک لے۔ عورت کے لیے پانچ کپڑے مستحب ہیں۔

کفن سفید اور سوتی کپڑے سے بنانا مستحب ہے۔

شہید کے لیے غسل اور کفن کی ضرورت نہیں ہوتی اور خون آلود کپڑوں ہی میں نماز جنازہ پڑھ کر تدفین کر دی جاتی ہے۔ اگر کپڑے جو اس کے بدن پر ہوتے ہیں کفن مسنون سے زیادہ ہوں۔ (یعنی مرد کے تین اور عورت کے پانچ)، تو اتار لیے جاتے ہیں۔ اور اگر کم ہوں تو انھیں سنت کے مطابق کر دیا جاتا ہے۔ (نیز دیکھیے "تدفین"، "جنازہ"، "کفن")

تجیب، بنو

ایک خاندان جو فتح اندلس کے وقت ارغون میں آباد ہوا تھا۔ اس خاندان کے کئی افراد اندلس کے عہد اسلامی میں بہت مشہور ہوئے۔ اور انھوں نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ یہ خاندان دو شاخوں میں بٹ گیا۔ بنو ہاشم جن کا مرکز سرقسطہ میں تھا اور بنو صمادح جو المریہ میں سکونت رکھتے تھے۔ اس خاندان کا سردار عبدالرحمان بن عبدالعزیز تجیبی جو امیر محمد اول کے عہد (۲۳۸ھ/۸۵۲ء تا ۲۷۳ھ/۸۸۶ء) میں تھا، بنو تجیب پر پورا پورا اقتدار رکھتا تھا۔ عبدالرحمان نے ارغون کے ایک خاندان بنو قسی کے اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں بنو تجیب پہلے تو قرطبہ کے باجگزار بنے پھر سرقسطہ کے خود مختار حکمران بنو ہاشم کی اطاعت قبول کر لی۔ اور جب تک بنو ہاشم حکمران رہے بنو تجیب ان کے مطیع رہے۔

تجیب کی دوسری شاخ بنو صمادح کو عبدالرحمٰن نے پہلے ہی ارغون سے نکال دیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں ابوالاصبغ معن بنو صمادح کے سردار نے المریہ کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو یحییٰ محمد حکمران بنا اور ۴۳۲ھ/۱۰۴۱ء تک تقریباً پچاس سال حکمرانی کرتا رہا۔ اس کا دور حکومت نہایت شاندار تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا احمد معز الدولہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ لیکن وہ جلد ہی مرابطین سے شکست کھا گیا۔ بعد میں مرابطین نے اشبیلیہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ تو وہ بجایہ چلا گیا اور وہیں حالت گمنامی میں انتقال کر گیا۔

تحریف

حروف بدلنا۔ تغیر و تبدل کرنا۔ اصطلاح میں تحریف سے مراد یہود و نصاریٰ کا اپنی الہامی کتابوں میں تغیر و تبدل کرنا ہے۔

تحریف دو قسم کی ہے۔ ۱۔ تحریف لفظی۔ ۲۔ تحریف معنوی۔

تحریف لفظی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو عبارت میں کی جائے اور تحریف معنوی یہ ہے کہ عبارت کے صحیح معنی تو کچھ اور ہوں لیکن ان کی جگہ اپنے مطلب کے معنی مراد لیے جائیں۔

یہود و نصاریٰ نے اپنی الہامی کتابوں میں دونوں قسم کی تحریف کی ہے۔

قرآن مجید میں ان کی اس خرابی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

"پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خود سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف [illegible]

یہاں تحریف سے مراد تحریف لفظی ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت سے [illegible] کی وضاحت ہوتی ہے۔

"پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت لے لیں۔ پس ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں۔ (۲: ۷۹)

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تورات و انجیل میں اہل کتاب نے اپنی طرف سے تحریف کی ہے۔ علمائے اسلام نے اس بارے میں بہت سے دلائل دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ اہل کتاب کی موجودہ کتب تحریف شدہ ہیں۔ اس بات کا اعتراف خود ان لوگوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایک مفسر پادری ڈملو نے جس نے بائبل کی انگریزی میں ایک تفسیر لکھی ہے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسیٰ کی کتابیں حضرت موسیٰؑ کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کر کے بنا لی گئی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس پرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسیٰؑ کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں۔" اپنے اس دعوے کی تائید میں اس مفسر بائبل نے کئی ایک مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ "موسیٰؑ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں۔"

یہی مفسر اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں اس احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہد نامہ قدیم کے پہنچانے میں پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض اوقات وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہونے تھے بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونا چاہئیں تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض اوقات اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالہ جات کے علاوہ قریباً چار ہزار نسخے عہد نامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہے۔"

تحکیم، معاہدہ ایک معاہدہ جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ہوا۔ جنگ صفین میں شامی لشکر کو جب اپنی شکست یقینی دکھائی دینے لگی تو حضرت امیر معاویہؓ پریشان ہوئے۔ عمروؓ بن العاص نے آپ سے کہا کہ لوگوں کو فوراً حکم دو کہ وہ نیزوں پر قرآن مجید بلند کریں اور بلند آواز سے نعرہ لگائیں کہ یہ کتاب ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے۔

چنانچہ جب شامی لشکر نے اس فرمان پر عمل کیا اور حضرت علیؓ کے لشکر نے قرآن کو نیزوں پر بلند دیکھا تو لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت علیؓ نے لوگوں کو سمجھایا کہ یہ صرف ایک چال ہے لیکن لشکر علیؓ کی اکثریت نے جس میں خوارج کی ایک بڑی تعداد شامل تھی تلواریں میان میں رکھ لیں اور مجبوراً حضرت علیؓ کو لڑائی بند کرنا پڑی۔ اشعثؓ بن قیس کو حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا گیا تاکہ قرآن کو نیزوں پر اٹھانے کی غرض معلوم ہو سکے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے انہیں بتایا کہ "ہم اور تم دونوں خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کریں ایک شخص کو تم اپنی طرف سے منتخب کر دو اور ایک کو ہم اپنی طرف سے منتخب کرتے ہیں۔ ان دونوں سے حلف لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کریں گے اس کے بعد جو فیصلہ وہ دیں گے اس پر ہم اور تم دونوں راضی ہو جائیں۔"

چنانچہ حضرت علیؓ کے لشکر نے ابوموسےٰ اشعریؓ کو اور حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر نے عمروؓ بن العاص کو حکم تجویز کیا۔

عمروؓ بن العاص نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اقرار نامہ تحریر کرنے کے لئے کہا جو اسی وقت تحریر میں آیا۔ اس معاہدے کی رو سے (۱) دونوں ثالث کتاب و سنت کے مطابق جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کو منظور ہوگا۔ (۲) جب تک فیصلہ نہ ہو جنگ بند رہے گی۔ (۳) ثالث چھ ماہ کے اندر اندر فیصلہ سنا دیں گے۔ (۴) فیصلہ کسی ایسی جگہ پر سنایا جائے گا جو عراق اور شام کے درمیان ہو۔ اس معاہدے کو معاہدہ تحکیم کا نام دیا گیا۔

تحلی کسی اچھی قوم کے ساتھ صرف قول میں مشابہت پیدا کرنا لیکن عمل نہ کرنا۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔ "ایمان اچھی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے اور ان جیسے بننے کی آرزو کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ دل میں اللہ تعالےٰ کے بارے میں جو یقین جم جائے اس یقین کی عمل کے ساتھ تصدیق کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔" گویا اپنے آپ کو کسی جماعت کے ساتھ اس کے حقیقی عمل کے بغیر اس کے مانند بنانا تحلی ہے (کشف المحجوب)

تختہ جی ایک فرقے کا نام جس کا رجحان زیادہ تر شیعہ مذہب کی طرف ہے۔ اس فرقے کا مرکز اناطولیہ ہے۔ مگر اس کے پیرو زیادہ تر ایشیائے کوچک کے مغربی حصے میں ملتے ہیں۔ ان کا پیشہ مویشی پالنا۔ زراعت کرنا، اور لکڑی کاٹنا ہے۔ تختہ جی کے لفظی معنی لکڑہارا کے ہیں۔ اور غالباً ان کا نام اسی پیشے کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے۔ اس فرقے کی ابتدا کب ہوئی اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے بارے میں جو کچھ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایرانی آبادکار ہیں۔ اور سولہویں صدی کے آخر میں ایران سے مغربی اناطولیہ میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے عقائد صفوی تھے۔

یہ لوگ شاہ اسماعیل کے زمانہ عروج سے پہلے ایشیائے کوچک میں کافی تعداد میں پھیل گئے تھے۔ اس زمانے میں صفویہ اور تختہ جی کے رسم و رواج اور عادات میں بہت حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔

ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ یہ لوگ شراب پیتے اور سؤر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کی بعض رسوم اصطباغ جیسی رسوم کی یاد دلاتی ہیں۔ ایرانی اور عیسائی مہمانوں کی بہت زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ مگر ترکوں کے لئے اچھے جذبات نہیں رکھتے۔ ان کے نام عام طور پر علی اور اسماعیل کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سردیاں ساحل پر گذارتے ہیں اور گرمیوں میں اپنے مویشیوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔

یہ لوگ ترکی سلطنت کی حدود سے باہر ہیں۔ اور کچھ عرصہ پہلے تک انہیں پرانے دستور کے مطابق ایرانی سمجھا جاتا تھا۔

تخلی تصوف کی اصطلاح ان اعمال و اشغال سے اجتناب کرنا جو بندے کو اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ بقول حضرت داتا گنج بخشؒ "ان مانعین قرب اللہ میں ایک دنیا ہے۔ دوسری مانع چیز عقبیٰ کی محبت تیسری چیز خواہش نفس کی پیروی اور چوتھی چیز خلقت کی صحبت ہے۔

تخلیق پیدا کرنا۔ تکوین عالم یعنی آسمان اور زمین اور مخلوقات کو پیدا کرنا۔ تخلیق کے بارے میں آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

سب سے پہلے اللہ تھا۔ اس سے پہلے کوئی شے نہ تھی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور لوح محفوظ پر سب چیز لکھی (بخاری)

انسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے۔ "اور ہم نے انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سے۔ سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکی تھی۔ پیدا کیا۔ اور جنوں کو ہم نے تیز آگ سے پیدا کیا۔ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی، سیاہ متغیر کیچڑ سے پیدا کرنے والا ہوں اور جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اسے سجدہ کرنا (۱۵: ۲۶ تا ۲۹)

قرآن مجید میں ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے۔

"انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ایک ست سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔ (۳۲: ۷، ۸)

ایک اور جگہ انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے۔

"ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔" (۲۲: ۵)

سورہ مومنوں میں ارشاد ہے۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ (۲۳: ۱۲، ۱۴)

تخلیق کائنات کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔

"خدا ہی تو ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں، سب کو چھ ایام میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا اور اس کے سوا تمہارا نہ کوئی دوست ہے، نہ سفارش کرنے والا، کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ وہی آسمان سے زمین تک ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ پھر وہ ایک روز جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار برس ہوگی، اس کی طرف صعود کرے گا۔ (السجدہ: ۴، ۵)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے۔

"کہو! تم اس سے انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اس کا مد مقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہاں کا مالک ہے اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی۔ اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا چار دن میں۔ طلب گاروں کے لئے مساوی پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ، خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کا حکم بھیجا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے مزین کیا اور محفوظ رکھا۔ یہ زبردست علیم کے اندازے ہیں (حٰم السجدہ ۹ تا ۱۲)

بقول سرسید یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تخلیق کائنات یونہی بس اچانک ہو گئی ہو اور اس میں کوئی قانون، ضابطہ، تنظیم یا اصول مقرر نہ ہو۔ جب کہ قرآن مجید میں بھی یہی ارشاد ہوا ہے:۔

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، ان کو کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (الدخان: ۳۸، ۳۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

"ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے، مبنی برحکمت اور ایک وقت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے، اس سے منہ موڑ لیتے ہیں" (الاحقاف: ۳)

یہود و نصاریٰ کے نزدیک تخلیق کائنات بس اچانک صرف سات دنوں میں ہو گئی ان کے نزدیک یہ زمینی دن تھے۔ عہد نامہ عتیق میں کتاب پیدائش میں ان ساتوں دنوں کے احوال کچھ یوں بیان کئے گئے ہیں۔

"خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو پہلا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے درمیان فضا ہو تاکہ پانی پانی سے جدا ہو جائے۔ پس خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے جدا کیا اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے فضا کو آسمان کہا اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو دوسرا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں اور پھلدار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی میں بیج رکھیں اور پھل دار درختوں کو جن کے بیج ان کی جنس کے موافق ان میں ہیں، اگایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو تیسرا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں، زمانوں، دنوں اور برسوں کے امتیاز کے لئے ہوں اور وہ فلک پر انوار کے لئے ہوں کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور ایسا ہی ہوا۔ سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو فلک پر رکھا کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور دن پر اور رات پر حکم کریں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چوتھا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں کو کثرت سے پیدا کرے اور پرندے زمین کے اوپر فضا میں اڑیں اور خدا نے بڑے بڑے دریائی جانوروں کو اور ہر قسم کے جاندار کو جو پانی سے بکثرت پیدا ہوئے تھے۔ ان کی جنس کے مطابق اور ہر قسم کے پرندوں کو ان کی جنس کے موافق پیدا کیا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے ان کو یہ کہہ کر برکت دی کہ پھلو اور بڑھو اور ان سمندروں کے پانی کو بھر دو اور پرندے زمین پر بہت بڑھ جائیں اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو پانچواں دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ زمین جانداروں کو ان کی جنس کے موافق چوپائے اور رینگنے والے جاندار اور جنگلی جانور ان کی جنس کے موافق پیدا کرے اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے جنگلی جانوروں اور چوپایوں کو ان کی جنس کے موافق اور زمین کے رینگنے والے جانوروں کو ان کی جنس کے موافق بنایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں، اختیار رکھیں۔

اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری ان کو پیدا کیا اور خدا نے ان کو برکت دی اور کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو۔ اور سمندر کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں، اختیار رکھو۔ اور خدا نے کہا کہ دیکھو میں تمام روئے زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت، جس میں اس کا بیج دار پھل ہو، تم کو دیتا ہوں یہ تمہارے کھانے کو ہوں اور زمین کے کل جانوروں کے لئے اور ہوا کے کل پرندوں کے لئے اور ان سب کے لئے جو زمین پر رینگنے والے ہیں جن میں زندگی کا دم ہے کل ہری بوٹیاں کھانے کو دیتا ہوں۔ اور ایسا ہی ہوا اور

خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چھٹا دن ہوا۔

سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا۔ ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا، ساتویں دن فارغ ہوا اور خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا۔ کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے، جسے اس نے پیدا کیا اور بنایا، فارغ ہوا۔

یہ ہے آسمان اور زمین کی پیدائش، جب وہ خلق ہوئے۔ جس دن خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا اور زمین پر اب تک کھیت کا کوئی پودا نہ تھا اور نہ میدان کی کوئی سبزی اب تک اگی تھی۔ کیونکہ خداوند خدا نے زمین پر پانی نہیں برسایا تھا اور نہ زمین جوتنے کو کوئی انسان تھا۔ بلکہ زمین سے کہر اٹھتی تھی اور تمام روئے زمین سیراب کرتی تھی اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ تو انسان جیتی جان ہوا۔ (باب اول، دوم)

عہد نامۂ عتیق کے اس بیان کو متضاد اور متناقض خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں بیان شدہ امور کو بعینہٖ تسلیم کر لینے میں تامل ہوتا ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید میں بھی اگرچہ تخلیق کائنات کی مدت چھ ایام قرار دی گئی ہے۔ لیکن ہر یوم کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ زمین کے ہزاروں سال کے برابر ہے۔ تاہم یہ ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں آتا کہ تخلیق کائنات کا عمل تفصیلی طور پر کیونکر ہوا۔ ابتدائے آفرینش اور ارتقائے نسل کے سائنسی نکات کیا تھے؟ ان کے بارے میں یہاں بحث نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ امر انسان کے فکر و تعقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ وہ خود غور کرے۔ البتہ تخلیق کی چند معروف نشانیاں بتا کر مقصد تخلیق کی وضاحت کی گئی ہے اور وہ ہے خدا کی طرف پلٹنا، اس کا شکر ادا کرنا اور عبادت کرنا۔ تمام کائنات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ انسان وجود میں آسکے اور زندہ رہ سکے اور انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ رازہائے قدرت کا کھوج لگائے۔ کائنات پر تصرف کرے اور شانِ ربوبیت کی معرفت حاصل کر کے نیابت الٰہی کا فرض ادا کرے۔ یہی اس کی آزمائش ہے۔ اسلام نے اس کے حصول کے طریقے کا نام تقویٰ رکھا ہے۔ (نیز دیکھیے "آدم"، "ارتقاء"، "انسان"، "تقویٰ")

تدفین مُردوں کو دفن کرنا۔ مختلف مذاہب میں اس کے لئے مختلف طریق رائج ہیں۔ دنیا کے اکثر علاقوں کے لوگ اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں۔ قدیم مذاہب کے پیروکاروں میں سے اکثر اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کرنے کے ساتھ ان کی دل پسند چیزیں بھی رکھ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مُردوں کو ان اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائل آج بھی ان رسوم کو اپنائے ہوئے ہیں۔ قدیم مصر میں تدفین کے طریقے مختلف ادوار میں مختلف رہے ہیں۔ قدیم ترین رسم کے مطابق مُردے کو بائیں کروٹ لٹا کر اس کا منہ شمال یا جنوب کی طرف کر دیا جاتا تھا۔ بعض جگہوں پر نعشوں کو گلا سڑا کر ان کی ہڈیاں الگ دفن کرنے کا رواج تھا۔ عام طور پر مصری قبرستان ریگستانوں کے سروں پر ہوتے تھے۔ بادشاہوں کی قبروں پر اہرام تعمیر کئے جاتے تھے۔ جن کے اندر منقش کمرے ہوتے تھے۔ عام طور پر انہیں تابوتوں میں بند کر کے دفن کیا جاتا تھا۔ یہی حال قدیم چینیوں کا تھا۔ وہ بھی اپنے مردوں کو دفن کرنے کے ساتھ استعمال کی چیزیں بھی رکھ دیتے تھے۔ دیگر اقوام کی طرح وادیٔ سندھ کی دراوڑی قوم بھی اپنے مُردوں کے ساتھ برتن، زیورات، آرائش کی چیزیں رکھ دیتی تھی۔

یہودیوں کے ہاں مُردے کے پاس لوگ دعائیں پڑھتے ہیں۔ پھر انہیں معمولی کپڑوں میں لپیٹ کر تابوت میں بند کر دیا جاتا ہے۔ تدفین کے بعد سات روز تک سوگ منایا جاتا ہے۔ عیسائی بھی کم و بیش تدفین کے یہی طریقے استعمال کرتے ہیں۔

اسلام میں میت کا دفن کرنا فرض کفایہ ہے۔ بغلی قبر بنانا سنت ہے۔ اگر کہیں پر زمین نرم نہ ہو تو صندوقی قبر بنانا بھی درست ہے۔

"حضرت عروہؓ بن زبیرؓ سے روایت ہے مدینہ منورہ میں دو گورکن تھے ان میں ایک تو بغلی قبر کھودا کرتا تھا اور دوسرا صندوقی۔ چنانچہ صحابہ نے فیصلہ کیا کہ جو شخص پہلے آجائے وہ اپنے مطابق قبر کھودے تو پہلے بغلی قبر کھودنے والا آیا اور اس نے آنحضورؐ کی قبر کھودی۔" (مشکوٰۃ) ایک اور حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص مرض الموت میں کہنے لگے۔ میرے دفن کے لئے بغلی قبر کھودنا اور اس پر کچی اینٹیں رکھ دینا جو آنحضورؐ کے لئے کیا گیا۔ (مشکوٰۃ)

قبر اتنی لمبی اور چوڑی ہونی چاہیے کہ میت کو اس میں سمانے کی تنگی نہ ہو۔ میت کو قبر میں جتنے بھی لوگ بخوبی اتار سکتے ہیں اتارتے ہیں۔ اس بارے میں کوئی خاص تعداد متعین نہیں ہے۔

آنحضورؐ کو چار اشخاص حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور ان کے دونوں بیٹوں فضیلؓ اور صہیبؓ نے قبر مبارک میں اتارا تھا۔

قبر میں اتارنے والے نیک، صالح اور قوی ہونے چاہئیں۔

عورتوں کو دفناتے وقت قبر پر پردہ کرنا مستحب ہے۔

میت کو قبر میں رکھتے ہوئے بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پڑھتے ہیں۔

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد کفن کے بندھن (گرہیں) کھول دی جاتی ہیں۔ میت کو قبر میں داہنی کروٹ پر قبلہ رخ لٹا کر مٹی یا ڈھیلے کا تکیہ لگانا فتاویٰ عالمگیری اور کشف الغطا میں درج ہے۔

میت کو قبلے کی طرف سے قبر میں داخل کرنا مستحب ہے۔ اگر زمین بہت زیادہ نرم ہو یا ریتلی ہو اور قبر نہ بن سکے تو میت کو لوہے، لکڑی یا پتھر کے تابوت میں رکھ کر گاڑنا درست ہے۔ لیکن اس میں مٹی کا فرش بنانا اور اس کے اندر بھی مٹی لگا دینا سنت ہے۔ جب قبر کا منہ اینٹوں یا تختوں وغیرہ سے بند کر دیتے ہیں تو پھر قبر کے سرہانے تین لپ مٹی ڈالنا سنت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے ایک جنازے میں نماز پڑھی پھر اس کی قبر کے سرہانے آکر تین لپ مٹی ڈالی۔ (مشکوٰۃ) جب پہلی بار مٹی ڈالتے ہیں تو مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ پڑھتے ہیں دوسری مٹی ڈالتے ہوئے وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ اور تیسری بار وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی پڑھتے ہیں۔

دفن کرنے کے بعد قبر پر پانی چھڑکتے ہیں۔ اس کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے سرہانے سے پاؤں تک قبلے کی جانب تین بار چھڑکتے ہیں اور پھر اسی طریقے سے دوسری جانب۔ حدیث شریف حضرت جابرؓ سے روایت ہے آنحضورؐ کی قبر پہ پانی چھڑکا گیا پانی چھڑکنے والے بلالؓ تھے۔ انہوں نے سر کی طرف سے چھڑکنا شروع کیا۔ اور پاؤں تک لے گئے۔ (مشکوٰۃ) قبر سے نکلی ہوئی مٹی قبر پہ ڈال جاتی ہے۔

قبر کو اونٹ کے کوہان کی شکل میں بنانا چاہیے۔ حضرت سفیان تمارؓ سے روایت ہے کہ "میں نے آنحضورؐ کی قبر مبارک اونٹ کے کوہان کی مانند دیکھی (مشکوٰۃ المصابیح) (نیز دیکھیے "تجہیز و تکفین"، "جنازہ"، "کفن")

تدلس (TEDELLES) ایک شہر جو الجزائر کے ساحل پر دریائے سباؤ و کے دھانے سے مشرق میں چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

شہر دو حصوں میں منقسم ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ ایک حصہ دیسی محلے پر مشتمل ہے۔ اس محلے کے بازار تنگ ہیں۔ دوسرا محلہ یورپی محلے کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۱۰۵ فٹ کی بلندی پر ہے۔ بہتر انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس محلے کے نیچے بندرگاہ ہے جہاں جہاز بحفاظت لنگرانداز ہو سکتے ہیں۔ ارد گرد کا علاقہ باغات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور اس علاقے میں زراعت خوب ہوتی ہے۔

رومیوں کے دور میں اس جگہ پر شہر روسکود آباد تھا۔ جس کے آثار حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ عرب فتوحات کے دوران میں یہ شہر تباہ ہوا۔ یہ ایک عرصے تک ویران و غیر آباد پڑا رہا۔

بنو حماد نے بجایہ کو پایہ تخت بنایا تو اس شہر نے اپنے محل وقوع کے لحاظ سے تجارتی اور فوجی اہمیت حاصل کر لی۔ بنو حماد کی طرف سے اس شہر میں ایک حاکم رہتا تھا اور شہر کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ ۴۹۶ھ/۱۱۰۲ء سلطان منصور نے المریہ کے ایک شہزادے کو جس نے افریقہ میں آکر پناہ لی تھی۔ اس شہر کا حاکم مقرر کیا۔

ادریسی نے شہر کے ایک بلند مقام پر واقع ہونے اور اس کے ارد گرد ایک مضبوط فصیل کا ذکر کیا ہے۔

بنو حماد کے بعد اس شہر پر ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں موحدین کا قبضہ ہو گیا بعد میں موحدین، بنی زیان، بنی حفص اور بنی مرین اس شہر کے لئے جھگڑتے رہے اور آخر کار بنی مرین اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے۔ بعد میں جب الجزائر کے باشندوں نے ہسپانیہ کی اطاعت قبول کر لی تو تدلیس کے باشندوں نے بھی ہسپانیہ کا اقتدار قبول کر لیا۔ ۱۵۱۷ء میں (بابا) عروج نے اسے دوبارہ فتح کیا اور ترکوں نے یہاں ایک قلعہ بند فوج مقرر کی۔ اور اسے فوجی مرکز کی حیثیت دی اگرچہ سمندری راستوں کے ذریعے رسل و رسائل کا الجزائر سے سلسلہ برابر قائم رہا۔ ۱۸۴۴ء کو فرانسیسیوں کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ اس وقت یہ شہر ایک بے رونق قصبے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں یہاں پر ایک یورپی نو آبادی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۷۱ء کی شورش میں بربری قبائل نے خشکی کے راستے سے اس شہر کی ناکہ بندی کر دی۔ لیکن سمندر کے راستے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہنے کی وجہ سے شورش پسندوں کا شہر پر قبضہ نہ ہو سکا۔ یہ شہر بہت دور افتادہ مقام پر آباد ہے۔ رسل و رسائل کے ذرائع کی مشکلات کی وجہ سے یہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔

یہاں کی مجموعی آبادی چالیس ہزار ہے جس میں اکثریت دیسی باشندوں کی ہے۔ زبان عربی بولی جاتی ہے۔

تدلیس عیب کا چھپانا۔ اصطلاح حدیث میں حدیث کے کسی عیب کو چھپانا۔ اس کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ تدلیس فی الاسناد۔
۲۔ تدلیس فی المتن۔
۳۔ تدلیس فی الشیوخ۔

تدلیس فی الاسناد کی سات صورتیں ہیں۔

اوّل محدث اپنے شیخ کی سند سے ایک حدیث روایت کرے جس سے اس نے اور احادیث بھی روایت کی ہیں لیکن ایک مدلس حدیث اس نے براہ راست اپنے شیخ سے روایت نہیں کی بلکہ ایک ایسے شخص سے روایت کی ہے جس نے اس شیخ سے سنی تھی۔

دوم۔ راوی ان تمام رواۃ کے نام سلسلہ وار بیان کرتا ہے جس میں وہ حدیث اس تک پہنچی ہو لیکن اس سلسلہ رواۃ میں ان راویوں کا نام حذف کر دے جن کے بارے میں ضعیف راوی ہونے کا امکان ہے۔

سوم۔ راوی ایک نام یا کئی نام اس شیخ کے نام کے ساتھ بیان کرے لیکن دراصل اس نے اس سے یا ان سے یہ حدیث نہیں سنی۔

چہارم۔ راوی حدثنا کہہ کر کچھ دیر کے لئے وقفہ کرے اور اس کے بعد اس شخص کا نام بیان کرے جس سے اس نے وہ حدیث نہیں سنی۔

پنجم۔ ایک شخص کسی دوسرے کو روایت حدیث کی اجازت دے دیتا ہے گو یہ شخص اس شیخ کے زیر درس نہ رہا ہو۔

ششم۔ راوی حدثنا یا اخبرنا کہے بغیر اسناد بیان کر کے اس حدیث کو اپنے شیخ کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔ گو اس نے اپنے شیخ سے وہ حدیث نہیں سنی ہوتی۔

ہفتم۔ راوی کسی مشہور و معروف مقام کا ذکر کرے لیکن اس کی اس سے وہ مراد نہ ہو بلکہ اسی نام کے کسی دوسرے مقام سے اس کی مراد ہو۔

۲۔ تدلیس فی المتن۔ راوی حدیث بیان کرتے ہوئے اس میں اپنی یا کسی دوسرے شخص کی عبارت شامل کر دیتا ہے جس سے لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ وہ متن بھی اصل حدیث کا جزو ہے۔

۳۔ تدلیس فی الشیوخ یہ ہے کہ محدث روایت کرے کہ اس نے یہ حدیث فلاں شیخ سے سنی ہے لیکن شیخ کا عام مشہور نام نہ بتائے۔ اور اس کا غیر معروف لقب یا کنیت عرف بیان کر دے اور یہ اس وجہ سے کرتا ہے کہ شاید اس کا شیخ ضعیف حدیث ہو اور اس طرح وہ اس عیب کو چھپانا چاہتا ہے۔

سبط ابن العجمی نے لکھا ہے کہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء کے بعد تدلیس کا رواج شاذ ہی ہوا ہو۔

سب سے پہلے تدلیس کے موضوع پر ابو علی الحسن کرابیسی نے قلم اٹھایا تھا۔

تدمر پالمائرا یا پالمیرا۔ عراق کا ایک شہر جو دمشق سے شمال مشرقی جانب ایک نخلستان میں واقع ہے۔ یہاں گرمی ناقابل برداشت حد تک پڑتی ہے۔ سردیوں میں بعض اوقات برف پڑتی ہے۔ یہ شہر بہت قدیم ہے۔ بارہویں صدی قبل مسیح کے کتبات سے اس کی قدامت کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعد میں اس کا نام سن عیسوی کے آغاز سے کچھ پہلے سامنے آتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ یہ شہر حضرت سلیمانؑ نے آباد کیا عرب میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس شہر کے بنانے میں جنوں نے حضرت سلیمانؑ کی مدد کی اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ملکہ بلقیس نے حضرت سلیمانؑ سے تدمر میں ملاقات کی تھی اور یہیں دفن ہوئی۔

سلطنت روم میں شامل ہونے کے بعد یہ شہر ایک خاص اہمیت حاصل کر گیا اور تجارتی مرکز بن گیا۔

تیسری صدی عیسوی میں اہل تدمر ایک اور سلطنت کے بارے میں سوچنے لگے جس کا دارالحکومت تدمیر ہو۔ چنانچہ یہاں کے حاکم نے اہل ایران کو اپنی خدمات پیش کیں جب انہوں نے اس کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تو وہ روم کے ساتھ مل گیا اور ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ قیصر روم نے خوش ہو کر اسے روم کے تمام مشرقی مقبوضات عطا کر دیئے۔ ۲۶۶ء میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا وبلاتوس اس کا جانشین ہوا لیکن پورے اختیارات اس کی بیوہ زینوبیا کے ہاتھ میں تھے۔ کچھ عرصے بعد تدمر نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چنانچہ ۲۷۰ء میں ایک جنگ ہوئی اس میں زنوبیا نے شکست کھائی۔ لیکن جب اہل تدمر نے دوسری بغاوت کی تو اوریلیان نے اس شہر کو پوری طرح مسمار کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس شہر کی ساری عظمت ختم ہو گئی۔ بعد میں اس کی شہر پناہ کو دوبارہ تعمیر کرایا گیا۔ اسی زمانے میں یہاں پر عیسائیت پھیلنے لگی۔

اس شہر کو مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں فتح کیا۔ پہلے تو یہاں کے باشندوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بعد میں انہوں نے اس شرط پر کہ انہیں ذمیوں کے حقوق دیئے جائیں ہتھیار ڈال دیئے۔ بعد میں یزید کے زمانے میں ان لوگوں نے بغاوت کر دی۔ تو یزید نے دمشق فتح کرنے کے بعد وجہ کو انکے مقابلے کے لیے بھیجا۔ اور اس نے اس علاقے کو قطعی طور پر مطیع کر لیا۔ جب مروان ثانی خلیفہ بنا تو یہاں کے باشندے اس کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ چنانچہ مروان نے اس شہر پر فوج کشی کی اور فصیل کا ایک حصہ گرا دیا۔ یہاں تک کہ یہاں کے باشندوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ۱۰۸۹ء میں اس شہر میں ایک زلزلہ آیا جس نے اسے سخت نقصان پہنچایا الدمشقی نے اس شہر کے بے شمار کھنڈرات کے ساتھ ایک جامع مسجد کا بھی ذکر کیا ہے جس کی چھت پندرہ پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ جب ممالک مشرق میں ایک عظیم زوال آیا تو یہ شہر بھی اس زوال کا شکار ہو گیا۔ یہاں کے باشندے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے لگے۔ ۱۶۷۰ء میں حلب کے انگریزی کارخانے کے ارکان نے اس شہر کا دوبارہ پتہ لگایا۔ اب شہر پھر سے آباد ہو چکا ہے۔

تدمیر (TODMIR) اندلس کا ایک صوبہ جس کا مرکز بنی امیہ کے دور کے خاتمے تک مرسیہ تھا۔ جب عربوں نے ہسپانیہ فتح کیا تو گورنر تھیوڈومیر مرسیہ میں شاہ طلیطلہ کا نمائندہ تھا۔ عرب مصنفین کے نزدیک تدمیر اسی گورنر کے نام کا معرب ہے۔ تھیوڈومیر اور موسیٰ بن امیر کے مابین معاہدہ ہوا تھا۔ عرب جغرافیہ دانوں نے تدمیر کو جیان اور البیرہ کے صوبوں کے ساتھ واقع بتایا ہے۔ اور اس صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں لورقہ، یولہ، لقنت قرطاجنہ اور مرسیہ بتائے ہیں۔ تدمیر کی اسلامی تاریخ مرسیہ کے ساتھ ملحق ہے (نیز دیکھئے "مرسیہ")

تراویح وہ نماز جو رمضان کی راتوں میں عشاء کے بعد پڑھتے ہیں۔ آنحضورؐ تراویح کی رغبت دلایا کرتے تھے مسلم شریف کی ایک حدیث کے مطابق آپؐ نے فرمایا جو ایک پختہ ایمان و اعتقاد کیساتھ رمضان میں قیام کریگا اسکے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور اسی کی ترغیب دلاتے ہوئے آپؐ کا وصال ہو گیا۔ (مسلم)

آنحضورؐ نماز تراویح کا بہت ثواب بیان فرماتے تھے لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ تراویح فرض نہیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے۔

"آپؐ نے مسجد میں بورے کا ایک حجرہ بنایا۔ وہاں کئی رات نماز پڑھی۔ حتیٰ کہ لوگ جمع ہو گئے اور ایک رات آواز نہ آئی تو خیال ہوا کہ آپؐ سو گئے۔ بعض نے کھانسنا شروع کیا تاکہ آپ تشریف لے آئیں۔ تب آپؐ نے فرمایا۔ تمہارا شوق تراویح کے متعلق یہی رہنا چاہیئے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ نماز فرض نہ ہو جائے اور اگر فرض کر دی جاتی تو تم نہ پڑھ سکتے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

حدیث میں ہے کہ لوگ مدینے کی مسجد میں فرداً فرداً یا گروہوں میں نماز تراویح ادا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے ایک قاری کی امامت میں باجماعت نماز تراویح کی ابتدا کی۔ (بخاری)

امام مالکؒ کے نزدیک تراویح کی چھتیس ۳۶ رکعتیں ہیں اور یہ نماز سنت نمازوں میں سے ہے۔

اہل حدیث نماز تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھتے ہیں جبکہ حنفی بیس رکعتیں پڑھتے ہیں

اہل تشیع کے نزدیک رمضان کے مہینے میں ایک ہزار نفل رکعتیں پڑھنا مستحب ہیں۔ نماز تراویح بدعت نہیں ہے کیونکہ نماز تراویح کی اصل تہجد کی شکل میں شریعت میں موجود ہے اور آنحضورؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ رمضان میں نماز تہجد کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی اہمیت کی خاطر اسے اوّل شب میں کر دیا۔ تاکہ جو لوگ پچھلے وقت نماز کے لیے نہیں اٹھ سکتے وہ بالکل محروم نہ رہ جائیں۔ نیز اس کی ایک نظیر وتر نماز میں موجود ہے جو دراصل نماز تہجد ہی کا حصہ ہے مگر تمام لوگوں کی خاطر اسے اوّل شب میں رکھ دیا گیا۔ اس کا اوّل شب میں رکھنا خود آنحضورؐ کا عمل ہے۔

تراویح کی نماز میں لوگ رمضان کی راتوں میں ایک یا اس سے زیادہ بار قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہیں۔

زیادہ مصروف آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ نماز تراویح تھوڑے وقت میں ادا کرے۔

تراویح کا لفظ ترویحہ سے نکلا ہے جسکے معنی ایک دفعہ آرام لینا کے ہیں نماز تراویح میں چونکہ چار رکعتوں کے بعد کچھ دیر کے لیے ٹھہرتے ہیں اور آرام لیتے ہیں اسی وجہ سے اسے تراویح کہا جاتا ہے۔

تربت جام ایران کے شمال مشرق میں ایک مقام جو خراسان کی ولایت میں ہے اور افغانستان کی سرحد کے قریب ہے۔ مشہد سے ۹۶

میل کے فاصلے پر ہری رودکی ایک معاون ندی کے کنارے واقع ہے۔
یہاں کے باشندے جامی کہلاتے ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں یہاں تقریباً چار ہزار کنبے آباد تھے۔ زراعت ان کا پیشہ تھا۔ بیٹ کے بقول یہ لوگ حاکم ضلع کے ماتحت تھے۔ یہاں ایک پرانے زمانے کا قلعہ بھی ہے۔ گاؤں کے مشرق میں شیخ الاسلام احمد جامی کا مقبرہ ہے۔ انہیں کے نام پر یہ مقام موسوم ہے اس مقبرے پر تیمور اور اس کے جانشینوں نے کئی مرتبہ حاضری دی۔
زمانہ وسطیٰ میں اس مقام کا نام بوزجان تھا۔ تاریخ میں اکثر علماء کی نسبت بوزجانی عام ہے۔ موجودہ دور میں تربت جام بخش تربت جام کا مرکز ہے اور بخش شہرستان مشہد میں شامل ہے۔
بقول اصطخری اس شہر سے ۱۸۰ مواضعات متعلق تھے۔ اور یہ ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں آباد تھا۔

ترتیل قرآنی اصطلاح۔ جس کے معنی قراء کے نزدیک قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے ہیں۔ اصطلاحات جرجانی میں ترتیل کے معنی مخارج حروف کی رعایت رکھنا اور وقوف واوصال اور آیات و مد کی حفاظت کرنا ہیں۔ بعض کے نزدیک ترتیل آواز کو پست کر کے غم آلود لہجے میں خوش آوازی سے قرآن کا پڑھنا ہے۔
قرآن مجید میں اس کا ذکر اس طرح سے آیا ہے۔
"اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔" (۷۳ : ۴)

ترجمان ترک صوفیا کی ایک اصطلاح۔ ان صوفیاء کے ہاں ترجمان کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ کسی سلسلے کا کوئی رکن جو نئے مرید کو اپنے سلسلے میں داخل کرتے ہوئے اور اس کے اصولوں کی تلقین کے وقت روحانی ترجمان کے طور پر اس کے ہمراہ رہتا ہے۔
بکتاشیہ سلسلے میں جب کوئی نیا مرید داخل ہوتا ہے تو اسے دو ترجمان شیخ کی خدمت میں لے جاتے ہیں ان کے ساتھ گیارہ افراد اور بھی ہوتے ہیں جو اماموں کے نمائندے کہلاتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر دونوں ترجمان نئے آنے والے کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کی طرف سے وہ کلمات جو مرید کو اس موقع پر پڑھنا پڑتے ہیں۔ پڑھتے ہیں ان ترجمانوں اور بعض عمّال کے فرائض تقریباً ملتے جلتے ہیں جنہیں یا ترجمان القدم کہا جاتا ہے۔
ترجمان کا دوسرا مفہوم ان صوفیاء کے نزدیک وہ خاص دعائیں ہیں جو خاص موقعوں پر پڑھی جاتی ہیں۔ نیز بکتاشیوں کے خفیہ لفظ یا جملے کا نام بھی ترجمان ہے۔

ترک ایک قوم۔ جس کا ذکر سب سے پہلے چھٹی صدی عیسوی میں ایک خانہ بدوش کی حیثیت سے آتا ہے۔
اس قوم نے چھٹی صدی میلادی میں منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے بحیرۂ اسود تک ایک بدوی سلطنت قائم کی۔ اس کا بانی یا تومن تھا۔ اس کے بھائی استیمی نے مغرب میں فتوحات حاصل کیں۔ چینی ان دونوں سلطنتوں کو شمالی ترکوں اور مغربی ترکوں کی سلطنتوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۵۸۱ء میں جب چینی خاندان سوئی بر سر اقتدار آیا تو ان دونوں سلطنتوں میں اس خاندان کے زیر اثر تعدید پیدا ہو گیا۔ ۶۳۰ء میں شمالی ترک سلطنت اور ۶۵۹ء میں مغربی ترک سلطنت کو ایک بار پھر آزادی نصیب ہو گئی۔ اور ترکوں نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیا۔

چینی ترکوں کا تعلق سیونگ نو کی اولاد کے ساتھ جوڑتے ہیں جو ہن نژاد تھا
بقول ٹامسن ترک کے معنی قوت و باس کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نام پہلے ایک قبیلے کا تھا۔ بلکہ ایک حکمران خاندان کا نام کہنا بہتر ہوگا۔ کتبوں میں تیسرے ترک میرے لوگ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ترکوں کے ساتھ ساتھ اوغوز یا توغوز کا ذکر بھی اکثر ملتا ہے کبھی تو ان کی حیثیت ترکوں اور ان کے حکمرانوں کے دشمنوں کی ہوتی ہے اور کبھی ان کی حیثیت خوانین کی ہوتی ہے۔
۷۴۵ء میں منگولیا کی حکومت اوغوز کے ہاتھوں سے نکل گئی اور اس پر اویغور کا قبضہ ہو گیا۔ ان کے قبیلوں کی تعداد نو تھی۔ چنانچہ کچھ اوغوز تو منگولیا ہی میں اویغور حکومت کے ماتحت رہ گئے۔ اور بعض مغرب اور جنوب کی سمت جا کر آباد ہو گئے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں ایک قبیلہ شاتو بھی شامل تھا جو ابتداً مغربی ترکوں میں سے تھا۔ یہ لوگ ساتویں صدی عیسوی میں برکول جھیل کے کنارے آباد تھے۔ ۸۰۸ء کے بعد جب تبتیوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا تو یہ لوگ چین میں چلے گئے۔ جہاں پر انہیں ہوانگ چاؤ کی بغاوت کو فرو کرنے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دسویں صدی میں ہونان کے صوبے میں ان ترکوں نے تین حکمران خاندانوں کی بنیاد ڈالی۔ جو تھوڑے عرصے تک قائم رہی۔ سغدیوں نے چینیوں اور ترکوں کے درمیان مذہب مانویت کی اشاعت کی۔
۸۴۰ء میں ان اویغوروں نے جو منگولیا سے نکال دیئے گئے تھے دو نئی سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ ایک کانچو میں اور دوسری بیش بلق میں اس علاقے کو، جو اب چینی ترکستان کہلاتا ہے، ترکی تہذیب میں ڈھالنے والے سب سے پہلے اویغور ہی ہیں۔ عرب کاشغر اور ان سب ممالک کو جو اس کے مشرق میں واقع ہیں شروع سے خالص ترکی علاقے سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان دو ترکی سلطنتوں میں سے ۱۰۲۸ء میں کانچو پر قبیلہ تنگ کا قبضہ ہو گیا اور دوسری مغلوں کے عہد تک قائم رہی۔ اس سے پہلے قتائی خاندان کے حکمران اباؤکی نے قرغیزوں کو منگولیا سے نکال دیا تھا۔ قرغیز ترکی النسل قوموں میں سے آخری تھے اور ان پر فتح پانا حقیقت میں منگولیا میں ترکی حکومت کے خاتمے کی علامت تھی۔
بزنطینی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۷۶ء میں ترکوں نے خاکنائے کریمیا کو فتح کر لیا تھا لیکن یہاں ان کی حکومت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور ۵۹۰ء کے قریب اس علاقے پر بزنطینی دوبارہ قابض ہو گئے۔
اس کے چند سال بعد ترکوں کی بزنطینیوں اور ایرانیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ جب ترکوں نے قوم الان کو فتح کر لیا تو ترکی سلطنت کی سرحدیں ساسانی سلطنت کی نہ صرف وسطی ایشیا میں بلکہ بحر خزر کے مغرب میں بھی آملیں۔ ترکوں نے ساتویں صدی میں بہت زیادہ قوت حاصل کر لی۔ چنانچہ ساسانیوں نے ترکوں کے خلاف دربند کی دیواریں تعمیر کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ترک ہمسایوں کے خلاف بحر خزر کے مشرقی علاقوں میں بھی مدافعتی قلعے تعمیر کئے۔ صوبہ جرجان کی حفاظت کے واسطے سدِ ترکی بنائی۔ لیکن ان سے یہ اقدامات ترکوں کی پیش قدمی کو نہ روک سکے
۵۹۸ء میں عربوں اور ترکوں کے درمیان جنگ میں جرجان کے ترکوں کی قیادت دہستان کے صول نامی ایک دہقان نے کی تھی۔ ایک کتاب الاغانی کی رو سے رود گرگان کے ترکوں نے ایرانیوں کی زبان اور مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے غالباً چھٹی صدی عیسوی میں ساسانیوں ہی کے زمانے میں وہ اس علاقے کو فتح کر چکے ہوں گے۔ اس ماخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔ آمو دریا کے جنوب میں جو جنگیں ہوئیں ان میں ترک ہی غالب رہے

لیکن کچھ عرصے بعد آخری ساسانی بادشاہ ایران کے سرپرست ترکوں کو عربوں کے خلاف محاذ آرائی میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ عربوں کی طرف سے امن و آشتی کی سفارشیں ترکوں کے پاس بھیجی گئیں۔ خلیفہ ہشام نے ترکوں کے بادشاہ کو دعوت اسلام بھی دی تھی۔

اگرچہ ابتدائی ہجری صدیوں میں ترکی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی لڑائی کے علاوہ ان کے علاقے پر فوج کشی بھی کی گئی۔ لیکن مسلمانوں کی جنگی کامیابیوں کا ترکوں کے قبول اسلام پر بہت کم اثر پڑا۔ چنانچہ آنحضورؐ نے حبشیوں کے بارے اپنی علیحدہ زبان تھی۔ لیکن وہ ترکی زبان بھی اچھی طرح سے بولتے تھے۔ جنوبی قبائل میں سے سوائے جمل کے دوسرے قبیلے ترکی زبان نہیں بول سکتے تھے۔

ایلک خانون یا آل افراسیاب کے زمانہ عروج میں ایک کثیر التعداد ترکی قوم نے اسلام قبول کیا۔

بعد کے زمانے میں وہ ترک جو زیادہ تر مغرب میں آباد تھے اسلام لائے ایک ترکی قبیلے نے جو قشلاق اور بلغار کے علاقے سے متصل تھا۔ ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء میں اسلام قبول کیا۔ ابن اثیر کے بقول ان کے دس ہزار خیمے تھے۔

وسطی ایشیا میں کامیابی سے اسلام کی تبلیغ کی گئی۔ اور قرہ ختائی کی سلطنت قائم ہو جانے سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ تاہم مشرقی یورپ کے ترکوں میں منگول دور سے قبل اسلام کی تبلیغ تو کی گئی لیکن بہت کم لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ قرہ ختائی حکومت کے قیام کے وقت خان بلاساغون کی ریاست ان علاقوں میں انتہائی شمالی اسلامی علاقہ تھا اور جب اس سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو اس وقت بھی دریائے ایلی کے شمال میں مسلمانوں کی حکومتیں موجود تھیں۔ ایشیائے کوچک اور آذر بائیجان میں ترکی تہذیب و تمدن سا[illegible]یوں کے ذریعے پہنچا۔ غالباً یہاں ترکوں کو پہلے اس لئے آباد کیا گیا تھا کہ وہ سرحد کی حفاظت اور بزنطی اور گرجستانی سلطنت کی بڑھتی ہوئی قوت کے خلاف جنگ کریں۔

نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں سلطان صلاح الدین ترکوں کے مصر میں متعدد دستے لایا۔ اور ان میں سے بعض وہاں سے شمالی افریقہ اور سپین میں بھی پہنچے۔ منگول سلطنت کا قیام منگولوں کی نسبت ترکوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوا۔ بیشتر منگول ترکوں میں ضم ہو گئے۔ اور اس طرح انہوں نے نہ صرف ترکوں کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ خصوصیت کے ساتھ سیاسی حیثیت سے ان کے لئے باعث تقویت بھی بنے۔

میں جو حکم دیا تھا "کہ جب تک وہ تم سے تعرض نہ کریں تو تم بھی ان سے تعرض نہ کرو" کا اطلاق ترکوں پر بھی کیا گیا۔

بالآخر چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ترکوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ ۳۸۲ھ/۹۹۲ء میں مسلمان ترک پہلی بار بخارا میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے اور اس سے بڑھ کر ایشیائے کوچک کی فتح تھی جو سلجوقی ترکوں کے ہاتھوں پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں انجام پائی۔

ترکوں کے علیحدہ علیحدہ قبائل کے نام اور ان کی عادات و اطوار کے بارے میں تفصیلی معلومات چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ملتی ہیں جو عرب جغرافیہ نویسوں کی کوششوں کی مرہون ہیں۔

ابوزید بلخی نے پانچ قبائل کا ذکر کیا ہے جو ایک ہی زبان بولتے تھے۔ تغزغز، خرخیز، کیماک، غزیعنی اوغوز اور خرلخ تھے۔ ان میں سے خرخیز دوسرے ترک قبائل کے مقابلے میں انتہائی شمال مشرق میں آباد تھے۔ اور اوغوز اور خرلخ (قرلق) وسطی ایشیا میں بلاد اسلام کے نزدیکی ہمسائے تھے۔

محمود کاشغری نے کل قبیلوں کی تعداد بیس بتائی ہے، جو دس دس قبیلوں میں جنوبی اور شمالی دو حصوں میں تقسیم تھے۔ مشرق سے مغرب کو آتے ہوئے دس قبیلے یہ تھے۔ بجنک، قفچاق، اغز، یماک، بشغرت، بسمیل، قای، یباقو، تتار، قرقز اور جنوبی گروہ کے دس قبیلے۔ چگل، تخسی، یغما، اغراق، جرق، جمل، ایغر، تنکت، ختای، توغاچ تھے۔ شمالی قبائل میں قای، یباقو، تتار اور بسمیل کی اپنی

چودہویں صدی میں ترکوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد التون اردو کی سلطنت کی تاسیس کو ترکوں کی سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس صدی کے آخر تک اس سلطنت نے پوری طرح ترکی رنگ و روپ اختیار کر لیا۔ اس سلطنت کے بعد تین نئی تاتاری سلطنتیں قائم ہو گئیں۔

لفظ تاتار جو پہلے منگولوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اب ایک ترکی قوم کا نام ہو گیا اور کریمیا میں خود ترک بھی اسے استعمال کرنے لگے۔ روس میں لفظ تاتار کو زیادہ وسیع مفہوم دے دیا گیا۔ سب غیر عثمانی ترکوں کو روسی علماء اور ان کے تتبع میں عام طور پر اروپی تاتار کہا جانے لگا۔ اور اس طرح ایک ترکی تاتاری اصطلاح بن گئی۔

مغرب میں عثمانی ترکوں کے علاوہ ترکمان سیاسی تاریخ میں بڑے نمایاں رہے ہیں۔ قرہ قوئیونلو اور آق قوئیونلو کی سلطنتوں کو پندرہویں صدی میں خاصا اقتدار حاصل تھا۔ ممالیک کی سلطنت میں بھی دیار بکر سے غزہ تک بہت سے ترکمان قبائل موجود تھے۔ وسطی ایشیا میں ترک اپنی کوئی علیحدہ مملکت کبھی قائم نہ کر سکے لیکن ان کی آزادی ہمیشہ برقرار رہی۔ اور جو ۱۸۸۴ء میں شمال سے روسیوں کی پیش قدمی اور جنوب سے افغانوں کی یلغار کی بدولت ختم ہو گئی۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں ترکمانوں کو وسطی ایشیا کی اور قازاق و قرغیز کی ترکی قوموں کی طرح قلماقوں کے حملوں سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ترکمانوں میں سے اب بھی کچھ لوگ سٹاروپول میں رہتے ہیں۔ ینیسے کے کنارے کرغز، جو وہاں اٹھارویں صدی کے شروع تک آباد رہے۔ اسلام سے بالکل غیر متاثر رہے اور یہی حال ان ترکی قبائل کا ہے جو آج کل ینیسے میں رہتے ہیں اور جنہوں نے روسی انقلاب کے بعد خکس کا نام اختیار کر لیا۔

جزیرہ نمائے بلقان اور بحر اسود کے شمالی ساحل سے لے کر چینی سرحد تک کے تمام ممالک سولہویں صدی کے نصف اول میں مسلم ترکوں کے زیر حکومت تھے۔ سترھویں صدی میں روس نے یہ تجویز بنائی تھی کہ شمالی ایشیا کے سب ممالک روس اور چین کے درمیان تقسیم ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ترکی نے ایک زبان کی حیثیت سے روسی حکومت کے تحت ترقی کی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے اور خاص طور پر ۱۹۲۴ء سے جبکہ قومیت کے اصول پر عمل شروع ہوا ہے، اشتراکی روس میں قومیت ہی کی بنا پر خود اپنی اپنی حکومت کے ماتحت اور اپنی اپنی روش ارتقاء کے خطوط پر ترکی اقوام کی جمہوریتیں قائم ہو گئیں۔ اوزبک اور ترکمان جمہوریتیں جمہوریات اشتراکیہ کے اتحاد کے جداگانہ حصے ہیں۔ اور آذربائیجان کی جمہوریت وفاق میں شامل ہے۔ سات خود مختار جمہوریتیں قدیم تاتار، چواس بشکز، تاتار، قازاق، قرغیز اور یاقوت متحدہ جمہوریہ روسیہ اشتراکیہ کی ارکان ہیں۔ چار خود مختار علاقوں قراچای، بلکر، کبرون، قرہ قلپاق اور خطہ اویرات میں بھی ترکوں کی اکثریت ہے۔

موجودہ دور میں ترک ان مختلف علاقوں میں تقسیم ہیں۔

۱۔ جمہوریہ ترکی میں زیادہ تر آبادی ترکوں کی ہے۔ ۱۹۵۴ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد دو کروڑ سے زائد تھی ان کی زبان ترکی تھی۔

۲۔ ایران میں آذربائیجان کے صوبے میں ترکوں کی اکثریت ہے۔ اس کے علاوہ خراسان، جنوبی ایران میں قبیلہ کاشا کی اینالوا اور بہارلو ترک قبائل آباد ہیں ان کی صحیح تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اندازاً بیس لاکھ ہے۔

۳۔ چین میں سوویٹ تخمینے کے مطابق چالیس لاکھ پچاس ہزار ہے جن میں سے چالیس لاکھ ترک صوبہ سنکیانگ میں رہتے ہیں۔

۴۔ افغانستان میں بھی چند ہزار ازبک اور کچھ تعداد ترکمانوں کی مشرقی افغانستان میں آباد ہے۔

۵۔ جمہوریہ اشتراکیہ روس میں ترکوں کی تعداد ۱۹۳۹ء کے مطابق ایک کروڑ نوے لاکھ سے کم نہیں تھی۔ ۱۹۳۹ء کے بعد بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کی تفصیلات ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکیں۔

(نیز دیکھئے "ترکستان"، "ترکی"، "ترکیہ")

ترکالہ ایک یونانی شہر۔ جو مغربی تھسلی میں وولوس اور کلبکہ ریلوے لائن پر واقع ہے۔ یہ شہر ترکالموس کی سیراب وادی میں سطح سمندر سے ۴۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔

ترکالہ پر یونانیوں کا قبضہ ۱۸۸۱ء میں ہوا۔ ان سے پہلے سلطنت عثمانیہ کی مقبوضات میں تھا۔ اور ۷۹۸ھ/۱۳۹۵ء میں سلطان بایزید اوّل نے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم کے دور حکومت میں جب یہودیوں کو بوڈاپسٹ سے نکالا گیا تو انہیں اسی شہر میں بسایا گیا۔ بعد میں یہ شہر طرخان اوغلو کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ یہ خاندان عثمانی امرا میں سے تھا ابن طرخان نے یہاں ایک مدرسہ اور مسجد بنوائی۔ یہاں ایک سرکاری قاضی بھی مامور تھا۔ شہر میں چار بڑی جامع مساجد تھیں جو غازی طرخان، عثمان شاہ بیگ، حاجی مصطفیٰ اور حسین آغا کی جامع کے نام مشہور تھیں۔ عثمان شاہ بیگ کی مسجد مشہور معمار سینان نے بنائی تھی۔ یہ مسجد آج کل کھنڈرات کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ شہر میں بزنطی حکومت کا بلند قلعہ اور اس کے اطراف میں باغوں کی کثرت ایک خوشنما منظر پیش کرتے ہیں۔

اس شہر میں مشہور و معروف لوگوں کے مقابر میں سے جلال الدین بابا، سنان بابا رمضان افندی، جعفر افندی اور آتل قالقان ہیں۔ مسلمان اب اس شہر کو چھوڑ گئے ہیں۔ اب یہاں یونانی اور یہودی آباد ہیں۔

قدیم ترکالہ موجودہ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ شہر میں اسقلپیوس کا مشہور ہیکل ہے۔

ترکستان ترکوں کے رہنے کی جگہ۔ چھٹی صدی میں جب ترک پہلے پہل نکلے تو آمو دریا تک آ پہنچے۔ چنانچہ ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں ترکستان کی سرحد آمو دریا کے ساتھ ہی شمال سے شروع ہو جاتی تھی اہل ایران کے لئے ترکستان کی جنوبی سرحد جو ایران کی سرحد کے سامنے تھی خاص توجہ کا مرکز تھی۔

ایران اور ترکستان کے درمیان سرحد کا تعین طبری کی ایک حکایت کے مطابق ایرش نے ایک تیر پھینک کر کر دیا تھا اور اس کے مطابق آمو دریا کو سرحد قرار دیا گیا تھا۔

بقول سبیوس ارمنی آمو دریا کا دہروٹ ترکستان میں تھا۔

عربوں نے ترکوں کو شمال کی سمت میں کافی دور تک دھکیل دیا تھا چنانچہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے جغرافیہ دانوں نے ترکستان کی سرحد کا تعین ماوراء النہر سے کیا ہے اور ترکستان میں ان علاقوں کو شمار کیا جو ماوراء النہر کے شمال و مشرق میں تھے۔ یاقوت نے جند اور کند کے علاقوں کو ترکستان میں شمار کیا ہے۔ جو سیر دریا کے زیریں حصے میں آباد تھے۔ اس نے ترکستان کی سرحد کی ابتدا فرغانہ کے شہر کاسان سے بتائی ہے۔ اور شہر ختن کو بھی ترکستان کا ایک شہر شمار کیا ہے۔

ازبکوں کی فتوحات نے سولھویں صدی میں آمو دریا کے جنوب میں ایک اور ترکستان پیدا کیا۔ بعض سیاحوں نے درہ آق رباط کو اس ترکستان کی جنوبی سرحد قرار دیا ہے۔ جبکہ دوسرے سیاح درہ حاجی گک کو اس کی سرحد شمار کرتے ہیں۔

سفرناموں اور ادبی کتب میں روسی، چینی اور افغانی ترکستان کو عام طور پر علیحدہ علیحدہ شمار کیا گیا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں روسی ترکستان میں گورنر جنرل کا عہدہ قائم کیا گیا اور اس کا صدر مقام تاشقند قرار دیا گیا۔

پروفیسر مشکتوف ۱۸۸۶ء میں ترکستان کو جغرافیائی حدود دینے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس نے طاس ترکستان کے تحت وسط ایشیا کے وسطی پہاڑوں اور طاس بحیرہ خزار اور سطح مرتفع ایران کو شامل کیا ہے۔

انقلاب روس کے بعد جمہوریہ ترکستان چند سال قائم رہی۔ ۱۹۲۴ء میں جب قومیت کا اصول حتمی طور پر نافذ ہو گیا تو ملک کا مشہور نام "ترکستان" ترک کر دیا گیا اور ازبکستان، ترکمنستان اور تاجکستان جیسی اصطلاحوں نیز ترکستان کی جگہ وسط ایشیا کی اصطلاح نے لے لی۔

ایک شہر بھی ترکستان کے نام سے ازبکوں کے عہد حکومت میں سیر دریا کے وسطی حصے میں آباد تھا لیکن آج کل اس شہر کے آثار نہیں ملتے۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس شہر کو یسی کا نام دیا جاتا تھا۔ بزرگ صوفی یسوی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ جن سے سلسلہ یسویہ کا آغاز ہوا۔ جب تیمور نے اس شہر میں آپ کا عالیشان مقبرہ بنوایا تو اس شہر کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس بزرگ کو حضرت ترکستانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ روسی فتوحات کے زمانے میں اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ ہزار تھی۔ ۱۹۰۸ء میں آبادی پندرہ ہزار تھی جو آج کل پچاس ہزار کے قریب ہے۔

ترکمان وسط ایشیا میں رہنے والے ترک۔ ان کے لئے یہ نام پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی سے استعمال ہونا شروع ہوا۔ ابو الفضل بیہقی کے نزدیک ترکمان ترکی لفظ اوغوز کے مترادف ہے۔ عربی کتب جغرافیہ میں ترکمانوں کا ذکر المقدسی کے ہاں ملتا ہے۔ اس نے ان کا ذکر اسبیجاب کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے متعدد شہروں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

کاشغری کے بعد کے زمانے سے ترک اور ترکمان کی اصطلاحیں دو مختلف گروہوں کے لئے استعمال ہونے لگیں۔ کیونکہ مغرب کی طرف ہجرت کرنے سے ترکمانوں کی زبان اور ان کے خد و خال اس حد تک تبدیل ہو گئے کہ دوسرے ترکوں کے ساتھ ان کی مماثلت بالکل معدوم ہو گئی۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے سیاسی حادثات نے ترکمانوں کو بھی مغربی ایشیا میں بڑے

بیمانے پر منتشر ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ منگولوں کے عہد تک اوغوز نام کی بجائے ترکمان نام کا رواج نہیں ہوا تھا۔ بقول رشید الدین ان اوغوز قبائل کی تعداد چوبیس تھی ۔ محمود کاشغری کے ہاں اکیس نام رشید الدین کے ناموں سے مشترک ہیں۔ لیکن کاشغری بھی ان قبائل کی تعداد چوبیس ہی مانتا ہے۔

جب ان ترکمانوں نے مغربی ایشیا کی طرف ہجرت کی ان میں اپنے نسلی نام استعمال کرنے کا رواج آہستہ آہستہ موقوف ہوتا چلا گیا اور وہ خود کو ترکمان کے نام سے موسوم کرنے لگے۔

ابن بطوطہ نے عثمانیوں کو بھی ترکمان ہی کہا ہے ۔ خلیل الظاہری نے نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے ان ترکمانی قبائل کی فہرست دی ہے جو غزہ سے دیار بکر تک کے علاقے میں آباد تھے ۔ مغربی ایشیا میں جن ترکمانی ریاستوں کو خاص اہمیت حاصل تھی ان میں قرہ قویلونلو اور آق قویونلو خاندانوں کی تھی۔

ترکمانوں نے منگولوں کے عہد کے بعد بھی اپنا قدیم نسلی نام برقرار رکھا اگرچہ موجودہ دور میں ان کے قدیم قبائلی ناموں میں سے بہت کم نام باقی رہ گئے ہیں موجودہ دور کے اہم ترکمان قبائل تکہ، گوکلن، یوموت، ارساری، سرِلق وغیرہ ہیں۔

ترکمان کبھی بھی اپنی علیحدہ حکومت قائم نہیں کر سکے۔ اس لیے انہوں نے مختلف حکومتوں مثلاً ایران، خوارزم، بخارا، افغانستان کے علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن ان تمام حکومتوں میں انہوں نے اپنی آزادی قائم رکھی۔ بسا اوقات ان کے خلاف فوجیں روانہ کی گئیں۔ جنہیں ترکمانوں نے شکست دی۔ ترکمانوں کا ایک قومی شاعر مخدوم قلی تھا جو قبیلہ گوکلن سے تعلق رکھتا تھا۔ جس نے اپنی شاعری میں ترکمانوں کو ان کی قومی وحدت کا احساس دلایا ہے۔

سترہویں صدی کے آخر میں ان کی ایک جماعت منگیشلاک سے ہجرت کر کے بحر خزر کے شمال میں روسی علاقے میں جا کر آباد ہو گئی جہاں وہ اب تک دریائے مینچ کے طاس اور دریائے کورنہ کے علاقے میں آباد ہیں۔

۱۸۸۵ء میں روسیوں نے انہیں زیر کر لیا۔ بعد کے برسوں میں جب سرحدوں کے تعین کے لیے جو معاہدے ہوئے ان کے ذریعے روس، ایران اور افغانستان کے مابین ترکمان علاقوں کی موجودہ تقسیم عمل میں آئی۔ ابتدا میں روسی ترکمانی علاقے کا انتظام ایک علیحدہ ضلع کی حیثیت سے تھا لیکن انقلاب کے بعد جب مختلف قومیتوں کے مسئلے کا فیصلہ ہوا تو اس علاقہ کو ایک سوویتی اشتراکی جمہوریت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۱۹۲۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس علاقے کی آبادی دس لاکھ تھی۔ جس میں ترکمان سات لاکھ تھے۔ ایران اور افغانستان میں ترکمانوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ ارسطوف کے اندازے کے مطابق ۱۸۹۶ء میں ان کی تعداد اسی ہزار تھی جن میں سے پچاس ہزار افغانستان میں اور تیس ہزار ایران میں تھے۔

موجودہ دور میں ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں ترکمانوں کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ ہے جن میں اکثریت قازقستان اور ازبکستان میں آباد ہے ایران اور افغانستان میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ کچھ تعداد عراق اور شام میں بھی آباد ہے لیکن اناطولیا (ترکی) میں کثیر تعداد آباد ہے۔ ترکمانوں کی زبان ترکی سے بہت زیادہ قریب ہے۔

ترکمان سنی العقیدہ مسلمان ہیں لیکن اکثریت اسلام سے زیادہ متاثر نہیں ہے۔ ان ترکمانوں نے ہمیشہ بدوی زندگی گذاری۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی اپنی سلطنت قائم نہ کر سکے۔

ترکی ترکوں کی زبان۔ اس میں قدیم ترین تحریر آٹھویں صدی کی ہے۔ جب وسطی ایشیا کے ترکوں نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے اویغور الفبا کی جگہ عربی ابجد اختیار کر لی۔ ایلک خانوں یا قرہ خانیوں کے ممالک میں بھی جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے وسط ایشیا کی ترکی ادبی زبان جو دور اسلامی کے ساتھ مخصوص ہے پروان چڑھی۔ اس زبان کی قدیم ترین دستاویز کُدات غُو۔ بلگ (علم سعادت بخشی)، ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کی ایک ادب آموز نظم ہے۔ جسے یوسف خاص حاجب نے تصنیف کیا تھا۔ عتبۃ الحقائق کو جسے ہم بارہویں صدی کی تصنیف کہہ سکتے ہیں رباعیات پر مبنی ہے۔ یہ ادیب احمد کی ادب آموز تصنیف ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ترکی تصوف کے بانی احمد یسوی کی تصنیف "حکمت" ملتی ہے۔

اس دور کے ادبی مواد میں قرہ خانی عہد کی ادبی زبان کے عناصر مقامی بولیوں سے وجود پذیر ہوئے جو اب تک زندہ ہیں۔

چودہویں صدی میں ایک منظوم رومان "خسرو شیریں" ہے۔ جو نظامی کی اسی نام کی مثنوی کی مطابقت میں لکھا گیا ہے۔

چودہویں صدی عیسوی کی ایک مشہور تصنیف "قصص الانبیاء" ہے جس میں نظم کے ٹکڑے بھی ہیں اور جو قرہ خانی زبان سے بہت زیادہ قریب ہے۔

چودہویں اور پندرہویں صدی کے ترکی ادب میں سب سے زیادہ ترقی عثمانی اور چغتائی ادبی زبانوں نے کی۔ چغتائی زبان کی نشو و نما تیموریوں کے ممالک میں ہوئی۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی کے شروع میں خانان خوقند اور خیوہ کی ریاستوں کے ادب میں چغتائی نثر اور نظم کے اثرات نظر آتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں چغتائی زبان ازبکستان میں ازبکی ادبی زبان سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔

آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی کے چند ترک شعراء کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ تیمور کے زمانے میں امیر سیف الدین سیفی کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ ترکی اور فارسی میں نہایت عمدہ اشعار کہتا تھا۔ نویں صدی ہجری پندرہویں صدی عیسوی میں ایک اور شاعر میر حیدر مجذوب تھا جس نے نظامی کی "مخزن الاسرار" کا جواب لکھا تھا۔ اسی دور کی ایک اور تصنیف "معراج نامہ" مع ترکی ترجمہ "تذکرۃ الاولیا" ہے جس کے مصنف خیر الدین عطار ہیں۔ ازبکوں کے عہد میں صوفی اللہ یار مقبول ترین شعراء میں سے ہے۔ اس کا عہد اٹھارویں صدی کے اوائل تک کا ہے۔ بعد میں وہی ادبی زبان جو ازبکوں کے دور میں لکھی جاتی تھی موجودہ زمانے تک چینی ترکستان کاشغریہ میں لکھی جاتی ہے۔ یہاں کی اہم تصنیف حیدر مرزا کی "تاریخ رشیدی" ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے اور اس کے دو ترکی ترجمے موجود ہیں۔ یہاں پر تصنیف ہونے والی ایک اور تاریخ جو ملا موسیٰ سیرامی نے لکھی ہے تاریخ امانیہ کے متعلق ہے۔

بیسویں صدی میں یورپی اثرات کے باعث ازبکوں میں ایک نئے ترکی ادب کی بنیاد پڑی جسے جدید چغتائی ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

عثمانی ترکی :- عثمانی ترکی، ترکی زبانوں کے جنوب مغرب یا ترکمان گروہ کی ایک شاخ ہے۔ پندرہویں صدی کے آخر سے عثمانی ترکی ایک ایسے ادب اور ثقافت کی زبان رہی ہے جس کی مختلف صورتیں اس زبان کی چار سو سالہ زندگی

میں نہایت مستحکم ہوگئی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا شمار اسلامی دنیا کی اہم زبانوں میں ہونے لگا اور اس کا مقام عربی فارسی سے دوسرے درجے پر ہوگیا۔

قدیم ادبی زبان میں عربی اور فارسی سے مستعار الفاظ کی بھرمار ہے۔ دوسری ترکی زبانوں کی طرح عثمانی ترکی میں بھی شروع ہی سے مذہب اور ثقافت سے متعلق متعدد ایسے غیر ملکی الفاظ نظر آتے ہیں جو فارسی اور عربی سے اخذ کیے گئے ہیں لیکن ادبی زبان میں عربی فارسی کے مستعار الفاظ کے استعمال کے خلاف ردّ عمل کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا جب ترکی ادب پر یورپی اثر نے زور پکڑا۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے سادہ تر زبان استعمال کرنے پر زور دیا ان میں ایک سلیمان پاشا تھا۔ دوسری شخصیت احمد وفیق پاشا کی تھی۔ اس زمانے میں جدید تر اسلوبوں سے کام لیا گیا چنانچہ جس تناسب سے عثمانی سلطنت اس صدی کے آخر میں اپنے سیاسی بحران سے قریب آتی گئی اسی تناسب سے اس زبان میں لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔

۱۹۲۸ء میں ترکیہ میں سرکاری طور پر عربی ابجد کی بجائے لاطینی ابجد جاری کر دی گئی۔ عثمانی ادب دراصل اوغوز ترکوں کا ادب ہے جو سلجوقی عہد میں ایشیائے کوچک میں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس ادب نے سلجوقیوں کے عہد سے آج تک ارتقا کی بہت سی منازل طے کی ہیں۔ سولہویں صدی سے یہ ادب ترکی میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔

عثمانی ادب کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اسلامی ادب۔

۲۔ یورپی ادب۔

۳۔ قومی ادب۔

اسلامی ترکی ادب: بارہویں صدی میں اسلامی ثقافت نے بڑے بڑے شہروں میں ایک خاص مقام حاصل کرلیا تھا۔ ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء میں جب قرہ مان اوغلو محمد بک نے قونیہ پر قبضہ کرلیا تو اس نے حکم دیا کہ دیوانی کاروبار میں صرف ترکی استعمال کی جائے۔ پھر اس نے ترکی کے سوا کسی اور زبان کا استعمال نہ صرف دیوانی کاروبار میں بلکہ نجی کاروبار میں بھی ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ انہی سب اسباب کا نتیجہ تھا کہ ہم ترکی ادبی تصانیف کو تیرہویں صدی کے دوران میں ظہور پذیر ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس صدی کی تصانیف میں جو ہم تک تاریخی حوالوں سے پہنچی ہیں "قصہ شیخ صنعان" منظوم شکل میں ہے۔ یہ ایک نامعلوم شخصیت کی تصنیف ہے دوسری اور تصنیف "صلصال نامہ" نظم و نثر میں ہے جس کا مصنف شیاد عیسیٰ ہے۔ اس میں صلصال دیو سے حضرت علیؓ کے معرکوں کا ذکر ہے۔ تیسری تصنیف "دانشمند نامہ" جو ابن علا کی تصنیف ہے۔ یہ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں لکھی گئی۔

عربی اور ایرانی تصوف کے زیر اثر ترکی صوفیا نے بھی ترکی زبان کی طرف توجہ دی تاکہ اسلام کی دعوت زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ ان لوگوں میں مولانا جلال الدین رومی، سلطان ولد، احمد فقیہ اور ان کے شاگرد شیاد حمزہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ حمزہ جو احمد فقیہ کا شاگرد ہے خاص طور پر مشہور ہے۔

یہ ادبی اسلوب چودہویں صدی میں بھی انہی راہوں پر گامزن تھا جن پر تیرہویں صدی میں جاری تھا۔ اس صدی میں اناطولیا کا ایک بڑا حصہ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں آگیا تھا اور ایشیائے کوچک کے متعدد حاکم نہ تو عربی تہذیب سے آشنا تھے نہ ہی ایرانی تہذیب سے چنانچہ اس دور میں عوام کی زبان کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ترکی زبان میں کتابیں لکھی گئیں اور کئی عربی اور فارسی کتابوں کے ترکی میں تراجم کیے گئے

اس صدی کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ "تفسیر برسورۃ فاتحہ" "سورۃ اخلاص" یہ ایک نامعلوم شخصیت کی تفاسیر ہیں جو ابن ایناج کی فرمائش پر لکھی گئی۔

۲۔ "قصہ امام حسنؓ و حسینؓ" جسے تقیب اوغلی نے نظم میں لکھا ہے۔

۳۔ "قصص اولیاء"۔ مصنف کا نام معلوم نہیں ایک اور کتاب "کلیلہ و دمنہ" کا مصنف مسعود نامی ایک شخص ہے جس نے محمد بک کے بیٹے امور بک کے لیے اس کتاب کو ترکی زبان میں ڈھالا تھا۔ "باز نامہ" جسے محمد بن محمد برجینی نے فارسی سے ترجمہ کیا تھا۔ ایک اور کتاب "البا سیہ" محمد بن محمود شیروانی نے پہلے عربی میں لکھی۔ بعد میں اس نے ترکی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں "قابوس نامہ" اور "مرزبان نامہ" کا بھی ترکی زبان میں ترجمہ ہوا۔

"تفسیر سورۃ الملک" جس پر مصنف کا نام درج نہیں ایک اناطولی امیر خضر بن گرل بکی کے حکم سے لکھی گئی تھی۔

الفترہ کے ایک مصنف مصطفیٰ بن محمد نے اورخان کے سب سے بڑے بیٹے سلیمان پاشا کے لیے سورۃ الملک کی تفسیر لکھی گئی۔ اسی دور کی تصانیف میں داستان مقتل حسین از شیاد، مثنوی مہر و وفا، مناجات از خواجہ اوغلی، فتح قلعہ سلاسل از معاذ اوغلی، مناقب الاحرار فی مقالات الاخیار از احمد بن درویش۔ مثنوی بعنوان حکایت کنعان و شمعون از علی، منتخب الشفاء از اسحاق بن مراد، کشف المعانی جو شاطبی کا منظوم ترجمہ ہے محمد بن عاشق سلیمان ترجمہ منطق الطیر از گلشہری ہیں۔

پندرہویں صدی کی مشہور تصانیف میں محمد بن عمر الحلبی کے تراجم الفرج بعد الشدۃ، مناقب امام اعظم، ترجمہ مرصاد العباد از قاسم بن محمود، ہدایہ اور وقایہ کے تراجم از دولت اوغلی یوسف، ترجمہ گلشن راز از شیخ الوان شیرازی، ترجمہ مثنوی مولانا روم، ترجمہ تاریخ ابن کثیر، سلجوق نامہ از یازیجی زادہ علی، مناہج الانشاء از یحییٰ بن محمد، ترجمہ تفسیر النفس الجواہر از ابوالفضل موسیٰ، ابواللیث کی تفسیر، ترجمہ جامع الحکایات از ابن عرب شاہ ہیں۔

تصوف میں نئے نئے صوفی طریقوں کے وجود میں آنے سے صوفیانہ ادب کی اہمیت بڑھتی گئی۔ چنانچہ تصوف کی بڑی بڑی تصانیف گلشن راز، مرصاد العباد، فصل الخطاب، تذکرۃ الاولیاء کے ترجموں کے ساتھ ساتھ مثنوی ہائے مناجات، فتوت نامہ، عبرت نامہ، الست نامہ، حیرت نامہ ایسی تصانیف ملتی ہیں۔ اس دور میں سلیمان چلبی کی "مولد سیرت" کی مشہور نظم ہے جسے لوگ صدیوں تک پڑھتے رہے اس نظم میں ترکی ادب کے ایک شاہکار کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔

اس صدی میں ترکی نظم و نثر میں ایرانی اسلوب کا بہت اثر پڑا۔ اور معاملہ یہاں تک بڑھا کہ فارسی نظم و نثر کی تقلید ترکی ادب میں ایک فیشن بن گیا۔

سولہویں صدی میں سروری، سودی، ابن کمال اور ریاضی جیسے علماء کی کوششوں سے فقہ اللغۃ پر مشتمل شرحیں، معاجم اور نحوی کتابیں لکھی گئیں اس دور میں بھی ترکی زبان و ادب بدستور عربی اور فارسی سے الفاظ و تراکیب مستعار لیتی رہی۔ بے شمار کتابیں عربی اور فارسی سے ترکی میں ترجمہ ہوئیں۔ اس دور کی نثر ثقیل تر اور مصنوع تر ہوگئی۔ فارسی کی پیروی میں سادہ ترین خیالات کو تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگیوں میں الجھا دیا گیا۔ یہ اسلوب نگارش اس دور کے بڑے بڑے انشاء پردازوں میں پایا جاتا ہے۔ سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو تعلیم یافتہ طبقہ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن جہاں تک اس طرز نگارش کا تعلق ہے اسے صرف ضخیم کتابوں کے دیباچوں میں روا رکھا گیا

چنانچہ اس دور میں بہت سی ادبی، تاریخی، مذہبی یا اخلاقی تصانیف نہایت سادہ زبان میں لکھی گئیں۔ عوام الناس کے لئے لکھی جانے والی مذہبی کتب میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ان میں نہایت سادہ زبان استعمال کی جائے باقی اور فضولی کی نثر سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

اس صدی میں صنف تاریخ کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ ان تصانیف میں ادریس بدلیسی کی تاریخ آل عثمان، سعدالدین کی تاج التواریخ، لطفی پاشا کی تاریخ اور آصف نامہ، عالی کی کنہ الاخبار، نصیحۃ السلاطین، قواعدالمجالس اور مناقب هنروران خاص طور پر مشہور ہیں۔

اس دور کے مشہور شعراء میں قل محمد، اوکسوز دده، خیالی، کوراد علی، چرپانلی آرمودلو، قل چولخہ، گدا مصلو۔ صوفی شعراء میں یونس امرہ، احمد ساربان، ادریسی مختفی، سید سیف اللہ خلوتی ہیں۔

سترہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے سیاسی زوال کے باوجود ذہنی اور ادبی زندگی کی رفتار بدستور جاری رہی۔ البتہ ارباب سیاست میں بہت کم لوگ ادب کے سرپرست رہ گئے تھے۔ اس صدی میں مدارس کے انحطاط اور اس ناقدری کے باوجود کچھ قابل علماء ابھی تک ضرور باقی رہ گئے تھے۔ ان علماء میں صاری عبداللہ، اسماعیل انقروی، اسحاق خواجہ سی اور احمد افندی شامل ہیں اس صدی میں دینی اور صوفیانہ کتابوں اور مختلف سلسلوں سے متعلق اخبار اولیاء اور سبق آموز تصانیف بڑی تعداد میں لکھی گئیں جو اکثر نظم میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ آنحضورؐ کی مدح میں نعتیں، حدیث اربعین اور مولدوں کے منظوم تراجم اکثر ملتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں بھی ادب وثقافت کی وہی روش رہی جو گذشتہ صدیوں میں تھی۔ نظم ونثر میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اس دور میں نثری ادب کا رجحان آہستہ آہستہ سادگی کی طرف مائل ہو گیا۔ عثمان زادہ تائب نے نثر میں مبالغہ آمیز تصنع کے خلاف علانیہ طور پر آواز بلند کی۔ اس دور میں تاریخی کتابیں صفِ اوّل میں آتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی سیرت اور تاریخ کی کتابوں کی تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔

انیسویں صدی کی ابتداء میں عثمانی ادب کا معیار بہت زیادہ گر گیا اور یہ حالت دورِ تنظیمات تک قائم رہی۔ زبان کو سادہ اور سلیس بنانے کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ اس دور کے عوامی ادب کے نمائندوں میں ہیچ ایمن، قیز احمد حاجی موذن، کور حافظ وغیرہ تھے۔

ترکی ادب کے دوسرے دور میں جسے یورپی دور کا نام دیا جاتا ہے ترکی صحافت نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ اس دور میں یورپی زبانوں خاص طور پر فرانسیسی سے ادب اور سائنس کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ اور یوں ترکی زبان میں سادگی وسلاست کا آغاز ہوا۔ جدید ادب کی مشہور ترین شخصیتیں شناسی اور وہ اس کے دو شاگرد نامق کمال اور ضیا پاشا تھے اس دور میں اخبار نویسی، سیاسی اور ادبی تنقید، ناٹک، مغربی ادبی تصانیف، ترجموں، ناولوں اور فلسفیانہ مقالوں کا آغاز ہوا۔ اس دور میں کئی ایک مصنفین اور مفکرین نے ملک کی ثقافتی نشوونما میں حصہ لیا۔ جن میں مشہور شخصیات احمد جودت پاشا، احمد وفیق پاشا، سلیمان پاشا، احمد مدحت افندی، شمس الدین سامی بک کی ہیں نامق کمال کے شاگرد عبدالحق حامد نے شعر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے ترکی شاعری میں گیت اور تمثیل کو داخل کیا۔

ترکی ادب کا تیسرا دور قومی ادب کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں ترکی زبان کو سادہ بنانے کی مہم دوبارہ شروع کی گئی۔ اور ضیا گوک آلپ نے ایک انجمن اتحاد وترقی کے نام سے اس تحریک کا آغاز کیا۔ چنانچہ بیسویں صدی میں زبان کو اور زیادہ سادگی میں ڈھالا گیا۔ فن برائے فن کی جگہ فن برائے زندگی نے لے لی۔ اس دور کا ادب معاشرے کے سب طبقوں کی زندگی اور خصوصیات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس دور کے شعراء میں فاروق نافذ، اورخان سیفی، انیس بہیج، یوسف ضیاء، خالد فخری، نجیب فاضل وغیرہ مشہور ہیں۔

ترکیہ ایک مسلمان ملک جو یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں واقع ہے مشرق قریب کی ایک جمہوریہ جس کا کل رقبہ ۲۹۶۱۸۵ مربع میل ہے۔ جس میں سے ۹۰۶۸ مربع میل یورپ میں اور باقی ایشیا میں واقع ہے اس کے مشرق میں جمہوریہ اشتراکیہ روس اور ایران ہے جن کی سرحدیں بالترتیب ۳۶۷ میل اور ۲۹۲ میل لمبی ہیں۔ جنوب میں عراق اور شام کی ۲۳۵ میل اور ۴۹۰ میل تک متصل سرحدیں چلی گئی ہیں۔ مغرب میں یونان اور بلغاریہ کی سرحدیں ۱۲۷ میل اور ۱۴۲ میل تک چلی گئی ہیں۔ شمال میں بحر اسود ہے۔

ترکی یورپ اور ایشیا کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انقرہ جدید ترکی کا دارالحکومت ہے۔

ترک جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی۔ تین سو سال بعد یہ سلطنت وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی۔

چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں ترکوں نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی۔ جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لیکر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا بانی تومن تھا۔ اس کے بھائی استمی نے مغرب میں فتوحات حاصل کیں۔ دونوں بھائی الگ الگ حکمران تھے۔ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں ان دونوں حکومتوں کو سلطنت چین کی اطاعت قبول کرنا پڑی لیکن ۶۳ھ/۶۸۲ء میں شمالی ترکوں نے چین سے گلوخلاصی کرالی اور انہیں ایک بار پھر خود مختاری حاصل ہو گئی یہ خود مختاری ۱۲۶ھ/۷۴۴ء تک حاصل رہی۔ تاآنکہ ۱۲۱ھ/۷۳۵ء میں عربوں نے نصر بن سیار کی قیادت میں اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اوّل کے عہد خلافت سے شروع ہوئے۔ اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے بخارا، سمرقند، خوارزم، فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کے ترکی علاقے فتح کرکے وہاں اسلامی حکومتیں قائم کیں۔

آل سلجوق کا مورثِ اعلیٰ کاشغر کے ترک قبائل کا ایک رئیس تھا۔ جس کا نام وقاق تھا۔ سلجوق اس کا لڑکا تھا جو اپنے غیر مسلم ترک فرمانروا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا۔ اور یہاں وہ اور اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر بخارا کے قریب ایک مقام جند میں سکونت پذیر ہوا۔ اس نے غیر مسلم ترکوں پر فتوحات حاصل کرکے اپنی قوت بہت بڑھالی۔ اس نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے ارسلان، میکائیل اور موسیٰ چھوڑے۔ سلطنت سلجوقیہ کے وارث میکائیل کے تین لڑکے بیغو، طغرل اور جغر بیگ قرار پائے۔ لیکن سلطنت کی فرمانروائی طغرل

بیگ کو ملی جس نے اپنی قوت اور زور بازو کا لوہا گرد و پیش کے تمام ممالک سے منوایا۔ اس نے خراسان، جرجان، طبرستان اور خوارزم کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ طغرل ہی نے خلیفہ قائم بامر اللہ کے حکم پر بغداد میں آل بویہ کا خاتمہ کیا تو بغداد میں بھی آل سلجوق کا اثر قائم ہو گیا۔ خلیفہ نے اسے سلطان شرق و غرب کا خطاب دیا۔ اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیار بکر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد الپ ارسلان کے عہد میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہو گئے۔ ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں عدن اور یمن بھی ملک شاہ نے فتح کر کے سلطنت سلجوق میں شامل کر لیے۔ اس طرح پانچویں سے ساتویں صدی ہجری تک خلیفہ بغداد کے ایشیائی مقبوضات کا بیشتر حصہ آل سلجوق ہی کے زیر نگیں رہا۔

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں شاہان خوارزم کی قوت عروج پر تھی وہ ایران، خراسان اور شام و عراق میں آل سلجوق کے بیشتر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے۔ اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے۔ لیکن اسی دوران میں چنگیز خان نے سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا۔ اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگ گئے۔ انھی ترک قبائل میں جو اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے۔ ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا جو اوغوز ترک قبیلے کا

شہر بلسک کی مسجد اور ھان (۱۳۵۰ء)

ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں شام کی طرف جا رہا تھا دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ یہ قبیلہ بھی منتشر ہو گیا۔ جو لوگ باقی رہ گئے وہ ارطغرل کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور سلطان علاء الدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے۔ سلطان علاء الدین نے ارطغرل کی بہادری کے کارناموں کے صلے میں دریائے سقاریہ کے بائیں جانب سغوت کا زرخیز علاقہ جاگیر میں عطا کیا۔ ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں اپنی فتوحات سے اپنی شجاعت کا سکہ بزنطینی حکمرانوں کے دلوں میں بٹھا دیا اس سے پہلے بزنطینی قلعہ داروں سے سلجوقیوں کو اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی۔ سلطان علاء الدین کے لیے ایک جاگیردار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا تشویش کا باعث بننے کی بجائے اطمینان کا سبب بنا۔ اس نے ارطغرل کو مزید

انعامات دیے اور اپنا نائب مقرر کیا۔ ارطغرل نے اپنے زور قوت اور دولت سلجوقیہ کے تفرق و انتشار کے باوجود کبھی خود مختاری کا دعوٰی نہیں کیا۔ ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں ارطغرل نے وفات پائی تو اس کا بڑا لڑکا عثمان خان اوّل اس کا جانشین ہوا۔ یہی سلطنت عثمانیہ کا بانی اور پہلا تاجدار ہے۔ اس نے اپنے اڑتیس سالہ دور حکومت میں عثمانی سلطنت کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کیا۔ اس وقت سلطنت عثمانی کا طول ۱۲۰ میل اور عرض ۶۰ میل کے قریب تھا۔ اس کے ابتدائی دور حکومت میں ایک مسجد شہر میں تعمیر ہوئی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے۔ عثمان نے ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں وفات پائی۔

عثمان اوّل نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھوٹے بیٹے اورخان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ چنانچہ اورخان ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں ۴۲ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اورخان نے اپنے پینتیس سالہ دور حکومت میں عثمانی مقبوضات کو بہت زیادہ وسعت دی۔ اس نے نہ صرف ایشیائے کوچک کے بقیہ بزنطینی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور بعض ترک ریاستیں مملکت عثمانی میں شامل کر لیں۔ بلکہ یورپ میں داخل ہو کر تھریس کا ایک حصہ بھی فتح کر لیا جو براعظم یورپ میں عثمانی فتوحات کا [illegible] مقدمہ تھا۔ اس نے ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں وفات پائی۔

اورخان کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا مراد چالیس سال کی عمر میں عثمانی سلطنت کا فرمانروا بنا۔ اس میں ملک گیری کی وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو [illegible] فرمانرواؤں میں تھیں۔ اس کی غیر معمولی فوجی قابلیت نے ایک [illegible] کی متعدد مملکتوں کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا اور [illegible] فتوحات کو سلطنت کا ایک مستقل جزو بنا دیا۔ [illegible] سرویا اور بوسنیا پر دولت عثمانیہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ [illegible] دریائے ڈینیوب تک جا پہنچا۔ مراد اوّل [illegible]

مراد کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا بایزید اوّل [illegible] کا دور حکومت ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء سے ۸۰۵ھ [illegible] میں سرویا نے سلطنت عثمانیہ کی باجگزاری [illegible] ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں۔ [illegible] جن میں ایدین، منتشا اور صاروخان [illegible] سلطنت [illegible] اب ترک بحیرہ ایجیئن کے ساحل تک پہنچ گئے۔

بلغاریا کا شمالی حصہ ابھی تک ترکوں کے قبضے میں [illegible] دور میں پورے ملک پر سلطنت عثمانیہ کا تسلط ہو گیا [illegible] میں سے کوئی بھی آل عثمان کا مقابل نہ رہا۔ اس کے علاوہ عثمانی [illegible] اسٹا کر یا اور ہنگری پر حملے شروع کیے۔

بایزید کے عہد حکومت ہی میں تھسلی، فوسیس، ڈورلیس اور [illegible] عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

بایزید کے دور حکومت کے آخری دو سالوں میں اسے اتنی زبردست شکست اٹھانا پڑی کہ اس کی تمام فتوحات پر پانی پھر گیا۔ اور کچھ دنوں کے لیے سلطنت عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی۔ اس تباہی و بربادی کا سبب وہ آویزش بنی جو بایزید اور تیمور کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس آویزش کے تحت نہ صرف بایزید کا خاتمہ ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ بھی نیست و نابود ہو گئی۔ تیمور نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں تھیں دوبارہ انہیں واپس کر دیں۔ اور ایشیائے کوچک کا کوئی علاقہ آل عثمان کے ہاتھ میں باقی

نہ رہا۔

بایزید کا عہد حکومت ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء میں انقرہ کی لڑائی کے دوران میں گرفتاری کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کے بعد گیارہ سال کے عرصے میں اس کے لڑکے عیسےٰ، محمد، سلیمان اور موسیٰ سلطنت کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور اس دور کا خاتمہ ہوگیا۔

دوسرا دور محمد اوّل کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے جو بایزید اوّل کا بیٹا تھا۔ اس کا دور حکومت ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء کا ہے۔ اگرچہ سلطنت عثمانیہ پر یہ وقت بڑا کٹھن تھا لیکن اس نے اپنی غیر معمولی قوتِ بقا کا ثبوت دیا اور دس بارہ سال کے قلیل عرصے میں نہ صرف اپنے تمام قدیم مقبوضات واپس لے لیے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ رونما ہوئی۔ اگرچہ اس کے عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ میں کوئی توسیع نہیں ہوئی۔ تاہم جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کی تباہی جس حد تک جا پہنچی تھی اور مسلسل گیارہ سال کی خانہ جنگیوں سے جو مزید خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ ان کے پیش نظر محمد اوّل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سلطنت کے کسی صوبے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اگرچہ ایشیائے کوچک کی [illegible] طرح قبضہ اس کے مختصر دور میں نہیں ہو سکا لیکن اس نے [illegible] دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک بار پھر وابستہ کر دیا۔ انہی وجوہات [illegible] عثمانیہ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

[illegible] کا بیٹا مراد ثانی ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں تخت نشین [illegible] تیموری حملے کے تمام اثرات مٹا دیے اور [illegible] مستقل و مستحکم کیا۔ مراد ثانی نے ایشیائے [illegible] توجہ دی۔ جو تیموری حملے کے بعد سلطنت [illegible] ان تمام ریاستوں کو سلطنت عثمانیہ [illegible] میں آل عثمان کا دوبارہ وہی اقتدار [illegible] تھا۔ اس [illegible] سالونیکا اور سرویا [illegible] میں مراد نے [illegible] تخت نشین ہوا۔ اس کا دور حکومت [illegible] ہے۔ اس کے دور حکومت میں قسطنطنیہ [illegible] میں شامل ہوا۔ اس فتح کے بعد محمد فاتح نے یونان کا رخ کیا [illegible] پہنچنے سے پہلے ہی باجگزاری اور فرمانبرداری کا عہد کیا۔ اسی فاتح

کے عہد میں ترکوں کا سرویا پر مکمل قبضہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ بوسنیا، موریا، کرمانیہ طرابزون اور سنیوپ، یونانی مجمع الجزائر، کریمیا، ولاچیا، البانیا، ہرزیگوونیا، وینس اور اٹرانٹو کے علاقوں پر عثمانی سلطنت کا تسلط قائم ہوگیا۔

محمد فاتح کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا بایزید ثانی ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء تک حکومت کی۔ اس نے ہرزیگووینا کو جو اب تک ایک باجگزار حکومت تھی اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ اسی کے عہد حکومت میں بحری فتوحات کے ضمن میں موریا میں وینس کے تین قلعے لوار، موڈن اور کورن بھی فتح ہو گئے۔

۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں بایزید ثانی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سلیم کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا اور ۴۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ سلیم اوّل نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں اس نے سلطنت عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کر دیا۔ اس کے دورِ حکومت میں اگرچہ یورپین مقبوضات میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن ایشیا میں دیار بکر، کردستان، شام، مصر اور عرب کا ایک بڑا حصہ جس میں حرمین شریفین بھی تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے تسلط میں آگئے سلیم کا دور محض سلطنت مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کی قوت آزمائی کا دور نہیں تھا بلکہ حقیقتاً اس کا تعلق دنیائے اسلام کے عام انتشار اور پراگندگی سے تھا۔ جب سے خلافت عباسیہ مصر میں منتقل ہوئی تھی اس وقت سے اسلام کی متحدہ سیاسی قوت پارہ پارہ ہوگئی تھی۔ خلیفہ کا اقتدار محض رسمی رہ گیا تھا۔

دنیائے اسلام کی یہ حالت سلیم سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ضعف و انتشار کا سب سے بڑا سبب خلافت اور سلطنت کا دو علیحدہ علیحدہ شخصیتوں میں تقسیم ہو جانا ہے۔ اور اسلام کے اس اقتدار کو قائم کرنے کے لیے اس کے نزدیک ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہستی میں جمع کر دینا نہایت ضروری تھا۔ اور چونکہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقتور اس وقت تک کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہ تھی۔ اور دفاع و جہاد کا فرض جو منصب خلافت کا پہلا مقصد ہے ڈیڑھ سو سال سے وہی ادا کر رہی تھی۔ اس لئے دنیائے اسلام کی امامت کا حقدار بھی اس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ چنانچہ جب سلیم کا مصر کی فتح کے بعد حجاز پر بھی اقتدار قائم ہوگیا تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مگر حقیقتاً بغیر کسی اختیار و اقتدار کے زندگی بسر کر رہا تھا خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی سلیم کو تفویض کر

بلغاریہ
یونان
بحیرہ مرمرا
روسی ترکستان
روس
انقرہ
طرابزون
کوہ ارارات
ازمیر
قونیہ
دیار بکر
بحیرہ کیسپین
تبریز
موصل
بحیرہ روم
شام
عراق
ایران

دیے اور مقامات مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں اور بعض آثار نبویہ بھی اس کے سپرد کر دیے۔ اس تاریخ سے سلاطین عثمانیہ خلیفہ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے۔ منصب خلافت پر فائز ہو جانے کے بعد سلطان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا۔

سلیم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیمان اوّل قانونی ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں خلافت کے منصب پر فائز ہوا۔ اس کا دور حکومت ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء تک جاری رہا۔ اس کا دور حکومت نہ صرف سلطنت عثمانیہ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت قوت اور خوشحالی کے لحاظ سے حدِ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد جزائر قبرص پر اور کریٹ کے علاوہ اس میں کوئی اہم اضافہ نہ ہوا۔ یہ سلطنت بودا سے بصرہ تک اور بحر کاسپین سے بحر روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور یورپ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک

استنبول کی نیلی مسجد (سلطان احمد اوّل)

[illegible]ں میں شامل تھے۔ شمال میں ازف کی دیواریں روس کے مقابل سلطنت عثمانیہ کی سرحد کی حفاظت کرتی تھیں۔ جنوب میں عدن کی پہاڑی نے سلاطین کی حکومت عرب کے جنوبی ساحل پر مستحکم کر دی تھی۔ انہیں بحر ہند میں با اثر بنا دیا تھا اور بحر احمر پر کامل اختیار دے رکھا تھا...... سلطان کا یہ فخر کوئی بے جا نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرمانروا تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے۔ الغرض سلیمان نے اپنے طویل عہدِ حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو حدِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ جس کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

سلیمان اعظم کے بعد سلیم ثانی ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء میں سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔ وہ سلطنت جو تین سو سال پہلے اناطولیا کی چند جاگیروں پر مشتمل تھی اور سلیمان کے عہد میں مکہ معظمہ سے بودا تک اور بغداد سے الجزائر تک پھیل گئی تھی۔ سلیم ثانی کی نااہلی کی وجہ سے زوال پذیر ہونے لگی۔ اس زوال کے اسباب داخلی اور خارجی دونوں تھے۔ روس کی سلطنت جو اس سے پہلے اپنے دور وحشت کی منزلیں طے کر رہی تھی سولہویں صدی سے مہذب اور طاقتور سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی اور دولت عثمانیہ کی ہمسایہ سلطنت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا تصادم ناگزیر ہو گیا یورپ کی جن حکومتوں نے سولہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ پر حملے شروع کر دیے ان میں روس سب سے آگے تھا۔ لیکن اگر نظام سلطنت میں اندرونی طور پر فساد پیدا نہ ہوتا تو سے یورپ کی سلطنتوں کا اتحاد کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔

سلیم ثانی وہ پہلا فرمانروا تھا جو میدان جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ اس نے اپنے مختصر دور کو بادہ نوشی اور عیش پرستی میں ضائع کر دیا۔

سلیم ثانی کے بعد اس کا بڑا لڑکا مراد ثالث تخت نشین ہوا [illegible] سالہ دور محمد صوقولی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے اس [illegible] نے اہم فتوحات حاصل کیں۔ بقول لارڈ ایورسلے سلطنت عثمانیہ [illegible] کو سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے آخری سال [illegible] عہد وزارت کے آخری سال ہی پہنچی۔ کیونکہ [illegible] میں جب صوقولی نے سلطنت کا [illegible] جن میں جزیرہ قبرص، صوبہ تونس [illegible] حصے شامل تھے۔ [illegible] سلطنت عثمانیہ [illegible] کریٹ ۱۰۹۹ھ/۱۶۹۹ء میں فتح [illegible] اور رفتہ رفتہ ہمسایہ سلطنتوں کا [illegible]

[illegible]

عثمانیہ اپنے عروج [illegible]

[illegible]

بعد تک [illegible]

حکومت میں [illegible]

اس کی [illegible]

[illegible]

[illegible] ایشیا [illegible]

سلطنت کے خلاف تھی۔ اس بغاوت [illegible]

وہ اب بعد [illegible]

اس بغاوت کے دوران میں شاہ عباس [illegible]

عثمانیہ پر ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں حملہ کر دیا [illegible]

نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے [illegible]

محمد ثالث کے انتقال کے بعد احمد اوّل کا بڑا بیٹا تخت نشین ہوا [illegible]

تک فرمانروائی کرتا رہا۔ اس کے دور حکومت میں ایران سے جنگ کا سلسلہ [illegible]

جاری رہا۔ جس میں ترکوں کا ہی زیادہ نقصان ہوا۔ صلح نامہ سیتوا تورک [illegible]

اس کے عہد حکومت کے تیسرے سال ہوا تھا، یہ بات واضح ہو گئی کہ اب دولت

عثمانیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب وہ زوال و انحطاط کی طرف مائل ہو گئی

احمد اوّل کے بعد ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء میں اس کا بھائی مصطفیٰ تخت پر بیٹھا اور اپنی نااہلی کی وجہ سے تین ماہ سے زیادہ عرصہ مسندِ حکومت پر فائز نہ رہ سکا۔ چنانچہ اراکینِ سلطنت نے اسے معزول کر کے احمد اوّل کے بڑے بیٹے عثمان ثانی کو چودہ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا۔ اسے اپنے دورِ حکومت میں ترکوں کی مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنا پڑی۔ مختصر عرصے میں فوج اس کی مخالف ہو گئی۔ چنانچہ ۱۶۲۲ء میں اسے برطرف کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ بعد ازاں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اور دوبارہ مصطفیٰ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن اسے ایک سال سے زائد حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ یہ قلیل مدت بھی سلطنت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اسی دوران میں ایران سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ بغداد اور بصرہ بھی سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔

مصطفیٰ کے بعد سلطنت عثمانیہ کی باگ ڈور مراد رابع کے ہاتھ میں آئی جو ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ء میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ابتدائی نو سال تک حکومت کی باگ ڈور اس کی والدہ کے ہاتھ میں رہی جو ایک بڑی قابل اور زیرک عورت تھی۔ اس نے اپنے آٹھ سالہ دورِ حکومت میں عمائدینِ سلطنت میں پیدا شدہ انتظامی خرابیوں نیز فوج کی بغاوت کو ختم کر دیا۔ اس کے دورِ حکومت میں ایران اور سلطنت عثمانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ایران ایرانیوں کو واپس کر دیا گیا۔

۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء میں مراد رابع کا بھائی ابراہیم سلطنت عثمانیہ کا وارث بنا جس نے تھوڑے سے ہی عرصے میں مراد کے کارناموں پر پانی پھیر دیا۔ اگرچہ اس کا عہدِ حکومت اندرونی انتشار کے باوجود بیرونی فتوحات کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں دو معرکے پیش آئے۔ اور دونوں میں سلطنت عثمانیہ کو فتح حاصل ہوئی۔ ان میں ایک بحر ازف کی مہم تھی اور دوسری کریٹ کی۔

ابراہیم کے بعد ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء میں اس کا بیٹا محمد رابع جب تخت نشین ہوا تو اس کی عمر سات سال تھی۔ اس کا دورِ حکومت ۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۷ء تک پھیلا ہوا ہے اس کے ابتدائی دورِ حکومت سے ۱۶۷۶ء تک عنانِ حکومت ایسے وزیروں کے ہاتھ میں رہی جنہوں نے دولت عثمانیہ کی عظیم خدمات انجام دیں لیکن بعد میں جب سلطان نے اس عہدے پر قرہ مصطفیٰ کا تقرر کیا تو یہ سود مند ثابت نہ ہوا۔ چنانچہ اس کی نااہلیت کی وجہ سے ویانا میں ترکوں کو زبردست شکست ہوئی۔ اس شکست نے تمام یورپ کو بیک وقت سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اس شکست سے تمام معرکوں میں ترکوں کے قدم اکھڑتے گئے۔ اسی سلطان کے عہد میں الجزائر اور تونس کی حکومتوں نے بھی دولت عثمانیہ سے گلو خلاصی کرالی اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۷ء میں محمد رابع کے بعد اس کا بھائی سلیمان ثانی تخت نشین ہوا۔ جس نے کُل چار سال حکومت کی۔ اس کے دورِ حکومت میں آسٹریا کی فوجیں مقدونیہ تک آ پہنچیں اور وہاں کے عیسائی باشندے اپنے بطریق کی قیادت میں انہیں مدد پہنچا رہے تھے۔ اب گویا سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات کے قلب پر حملہ شروع ہو گیا تھا۔ ترکی اور تاتاری فوجوں نے جرمنی آسٹریا اور البانیا کی متحدہ فوجوں کو دو معرکوں میں شکست دے کر مقدونیہ اور اس کے گرد و نواح کے ان تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا جو آسٹریا کی فوجوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی احمد ثانی ۱۱۰۲ھ / ۱۶۹۱ء میں سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔ اس کے عہد میں جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جمہوریہ وینس سے لڑائی کے دوران میں جزیرہ ساخز سلطنت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گیا۔ ۱۱۰۶ھ / ۱۶۹۵ء میں احمد ثانی کی وفات پر محمد رابع کا بیٹا مصطفیٰ ثانی تخت پر بیٹھا۔

یہ ایک دانشمند اور بیدار مغز سلطان تھا۔ اس نے ابتدائے عہد میں بڑی ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا اور متعدد اہم فتوحات حاصل کیں لیکن زنتا کی شکست کے بعد سلطنت کی فوجی قوت اتنی کمزور ہو گئی کہ آسٹریا سے مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔

مصطفیٰ ثانی کی معزولی کے بعد احمد ثالث ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء میں سلطنتِ عثمانیہ کا فرمانروا بنا اور ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس کے ۲۷ سالہ دور میں سلطنت عثمانیہ کو آسٹریا، روس، وینس اور ایران سے متعدد معرکے پیش آئے لیکن معاہدہ پسارووچ کی رُو سے مقبوضات کا وہ حصہ جو ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا ازف اور موریا کی واپسی اور ایرانی فتوحات نے نہ صرف اس کی تلافی کر دی بلکہ بحیثیت مجموعی سلطنت کے رقبہ میں اضافہ کر دیا۔

۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء میں احمد ثالث کی سبکدوشی کے بعد سلطان مصطفیٰ ثانی کا بیٹا محمود اوّل سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں جہاں تک یورپ کی سلطنتوں کا تعلق ہے دولت عثمانیہ سے ان کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۷۴۳ء میں ایران سے پھر جنگ چھڑ گئی جو تین سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۷۴۶ء میں تقریباً انہی شرائط پر ختم ہوئی جو سلطان مراد رابع کے عہد میں دونوں فریقوں کے درمیان طے پائی تھیں۔ حکومت کو بعض اوقات ان مطلق العنان والیوں کی سرکشی کو بھی دبانا پڑا۔ بغاوت کا سب سے زیادہ اثر صوبہ مصر میں تھا جو بتدریج دولت عثمانیہ کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔

محمود اوّل کی وفات کے بعد اس کا بھائی عثمان ثالث ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں تخت نشین ہوا۔ اور تین سال کی مختصر مدت تک حکومت کی۔ اس کے دورِ حکومت میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا اور سلطنت کا نظم و نسق بالکل محمود اوّل کی پالیسی کے مطابق چلتا رہا۔

۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں سلطان احمد ثالث کا بیٹا مصطفیٰ ثالث تخت نشین ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں روس سے مقابلہ پیش آیا۔ اس لڑائی میں عثمانی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور دریائے ڈینیوب کے شمال میں جتنے عثمانی قلعے تھے ان پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ انگلستان کی سیاست دولت عثمانیہ کے لئے دو رُخی تھی۔ ایک طرف تو وہ روس کو جنگ میں پوری پوری امداد پہنچا رہا تھا۔ دوسری طرف دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھر رہا تھا۔

مصطفیٰ ثالث کے بعد اس کا بھائی عبدالحمید اوّل ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۷۸۲ء میں کیتھرائن نے جوزف کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی۔ اس اسکیم کی بنیاد یہ تھی کہ روس اور آسٹریا متحد ہو۔ ترکوں کو ان کے تمام یورپی مقبوضات سے نکال دیں۔ ان کے نکل جانے کے پھر ان علاقوں کی تقسیم میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ اگرچہ اس اسکیم پر عملدرآمد کرنے کا ان میں کبھی حوصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن ۱۷۸۳ء میں روس کا کریمیا پر قبضہ ہو گیا اور یہ علاقہ سلطنتِ روس میں شامل کر لیا گیا۔ سلطان عبدالحمید اوّل کے بعد مصطفیٰ ثالث کا بیٹا سلیم ثالث ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء میں فرمانروا بنایا گیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں بھی روس سے جنگ بدستور جاری رہی۔ اس نے تازہ دم فوجیں روس کے مقابلے میں روانہ کیں لیکن وہ بھی ناکام رہیں۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ مثلاً ہنگری، ٹرانسلوینیا اور کریمیا میں عثمانی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ بحر اسود اور بحر ازف کے شمالی ساحلی علاقوں سے بھی ترک دستبردار ہو گئے تھے۔ سلطنت کے بہت سے صوبوں پر سلطان کی حکومت

برائے نام رہ گئی تھی۔ شام میں دروزیوں اور لبنان اور فلسطین کے پہاڑی باشندوں نے تقریباً خودمختاری حاصل کر لی تھی۔ سلیم کے زمانۂ اقتدار میں وہابیوں نے شام پر از سر نو حملہ شروع کر دیا۔ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کر کے تمام عرب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سردیا نے بھی عثمانی سلطنت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور خودمختاری حاصل کر لی۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں سلطنت عثمانیہ بحیثیت مجموعی اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات کی شدت کے ساتھ مخالفت ہوئی اور فوج نے علانیہ بغاوت کر دی۔ لیکن ان اصلاحات سے جو نئی روح پیدا ہو گئی تھی وہ پھر کبھی فنا نہ ہوئی۔ دولت عثمانیہ کے آئندہ فرمانرواؤں نے سلیم ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالحمید اول کے اصلاحی کارناموں کا سنگ بنیاد سلیم ہی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔

۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں سلطان عبدالحمید اول کا بیٹا مصطفےٰ رابع سلطنت عثمانیہ کا وارث بنا۔ اس نے صرف تیرہ ماہ حکومت کی۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں مصطفےٰ کا بھائی محمود ثانی تخت نشین ہوا۔

محمود ثانی نے اپنے دورِ حکومت میں ایک تو ینی چری فوج کا بالکل خاتمہ کر دیا دوسرے اس نے یورپی نظام کے مطابق اپنی جدید فوج کی تعداد بڑھا کر پینتالیس ہزار کر لی۔ وہ اس فوج کو اڑھائی لاکھ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن روس نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اور سلطان کی ان فوجی اصلاحات کو شروع ہی میں ختم کروا دیا۔

۱۸۲۶ء میں روس نے پرزور مطالبہ کیا کہ ایشیا کے بعض قلعے جو اس کے دعوے کے مطابق صلح نامہ بخارسٹ میں اسے دیئے جا چکے تھے فوراً دے دیئے جائیں۔ مولداویا اور ولاچیا کے باشندوں کو قبل بغاوت کے تمام حقوق دیئے جائیں۔ سربیا والوں کے سیاسی حقوق بلا تاخیر منظور کئے جائیں۔ چنانچہ محمود کو مجبوراً ان مطالبات کو ماننا پڑا اور ۱۸۲۶ء میں اس نے معاہدہ آق کرمان پر دستخط کر دیئے

یورپ کی عیسائی طاقتوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دولت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں لندن، انگلستان، فرانس اور روس کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ جسے سلطان محمود نے ٹھکرا دیا۔ موریا میں یونانی باغیوں کے خلاف ابراہیم پاشا کی عظیم الشان کامیابی، روس، فرانس اور انگلستان کی نظروں میں خار بن کر کھٹکنے لگی۔ انہوں نے یونان کی امداد کے لئے اپنے جنگی بیڑے روانہ کئے اور ابراہیم پاشا کو پیغام بھجوایا کہ اب باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ اور فوج لے کر واپس لوٹ جائے۔ ابراہیم پاشا نے انکار کر دیا۔ تو ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو اتحادی بیڑوں کے کمانداروں نے ابراہیم پاشا کی غیر موجودگی میں سارے ترکی بیڑے کو تباہ کر دیا۔

سلطان محمود ثانی کے بعد اس کا بڑا بیٹا عبدالمجید خان اول ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کی تخت نشینی کے چند روز بعد خبر آئی کہ محمد علی پاشا نے ترکی بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلطان نے اس سے صلح کی بات چیت شروع کی۔ محمد علی نے شرط پیش کی کہ مصر، شام، طرابلس، کریٹ اور اطنہ کی پاشائیاں اسے وراثتاً دے دی جائیں۔ فرانس، روس، آسٹریا اور پرشیا کے سفیروں نے سلطان کو دول عظمیٰ کی وساطت سے یہ معاملہ حل کرانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ۱۵ جولائی ۱۸۴۰ء کو لندن میں سلطنت عثمانیہ، انگلستان، روس، آسٹریا اور پرشیا میں ایک معاہدہ طے ہوا۔ جس میں سلطان اور محمد علی کے درمیان صلح کی شرائط طے کی گئیں۔ اتحادیوں نے محمد علی کو الٹی میٹم دیا کہ دس روز کے اندر اندر سلطان سے اظہار اطاعت کر کے شام سے فوجیں واپس بلا لے اور اس کے بدلے مصر کی حکومت اس کی نسل کے لئے اور شام کی حکمرانی اس کے لئے تاحیات مستقل ہو جائے گی۔ ورنہ شام کی پاشائی اس سے چھین لینے کے علاوہ مصر کی پاشائی بھی صرف اس کی زندگی تک محدود کر دی جائے گی۔ محمد علی نے فرانس کی امداد کے بھروسے پر اس تجویز کو ٹھکرا دیا

بحیرۂ باسفورس کے کنارے واقع محل ذوالبہاچ ۔ یہ استنبول میں صدر ترکیہ کی سرکاری رہائش گاہ ہے

تو عثمانی فوجوں نے اتحادیوں کی زبردست امداد سے قلعے پر قلعہ فتح کرتے ہوئے شام کو زیرنگیں کر لیا۔ جب محمد علی نے یہ دیکھا تو اس نے اس شرط پر صلح کر لی کہ مصر کی حکومت اس کے اور اس کی اولاد کے لئے مستقل کر دی جائے۔ نیز مصر کی سالانہ آمدنی کا چوتھائی حصہ خراج کے طور پر دینا قبول کیا۔

اس کے بعد اتحادیوں اور دولت عثمانیہ کے درمیان ایک جداگانہ معاہدے کی رُو سے قرار پایا کہ ترکی جہازوں کے سوا کسی دوسری حکومت کے جنگی جہازوں کو دردانیال اور آبنائے باسفورس میں داخل ہونے کا اختیار نہیں۔

اسی زمانے میں روس نے انگلستان کو ساتھ ملا کر دولت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس کے سامنے ایک سکیم پیش کی جسے انگلستان نے مسترد کر دیا۔ پھر روس نے دولت عثمانیہ سے چند مطالبات کی تکمیل کے لئے کہا لیکن سلطان عبدالمجید نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر روس نے جنگ چھیڑ دی لیکن روس کو شکست کھانا پڑی۔ ۲۸ مارچ ۱۸۵۴ء کو انگلستان اور فرانس نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بالآخر فروری ۱۸۵۶ء کو پیرس میں سلطنت عثمانیہ، انگلستان، فرانس، روس، آسٹریا، سارڈینیا اور پرشیا کے درمیان ایک صلح نامہ قرار پایا جس کی خاص دفعات یہ تھیں۔

۱۔ ان حکومتوں نے باب عالی کو باقاعدہ مجلس دول یورپ کا رکن بنا لیا۔

۲۔ سلطنت کی آزادی اور مقبوضات کی سالمیت کے لئے بالاتفاق ذمہ داری لی۔

۳۔ دول یورپ نے واضح اعلان کیا کہ انہیں دولت عثمانیہ کے داخلی امور میں مداخلت کا مجموعی یا انفرادی طور پر کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔

۴۔ بحیرۂ اسود و تمام اقوام کے تجارتی جہازوں کے لئے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ روس اور سلطنت عثمانیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی۔ فریقین کے تمام مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے گئے۔ چنانچہ قارص سلطنت عثمانیہ کو لوٹا دیا گیا اور کریمیا روس کو واپس ملا۔ جنوبی بسرابیا کا علاقہ جو روس نے لے لیا تھا مولداویا کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ مولداویا اور ولاچیا پر دولت عثمانیہ کی حکومت بدستور قائم رکھی گئی۔ روس کا ان ریاستوں کی حمایت کے حق سے دستبردار ہو گیا۔ ان ریاستوں کو خود اختیاری کے حقوق عطا کیے گئے۔

سلطان عبدالمجید کے بعد ۱۸۶۱ء میں اس کے بھائی سلطان عبدالعزیز نے تخت حکومت کو زینت دی۔ اس کا دور حکومت ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔ اس کے دور حکومت میں ۱۸۶۷ء میں مولداویا اور ولاچیا نے مل کر رومانیہ کی ریاست قائم کر لی اور ۱۸۶۸ء میں جرمن شہزادہ چارلس کو اس کا حکمران مقرر کیا۔ حالانکہ یہ صلح نامہ پیرس کے صریحاً خلاف ورزی تھی۔ سربیا نے بڑی طاقتوں کی شہ پر سلطنت عثمانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ بلغراد اور دوسرے سرحدی قلعوں سے اپنی فوجیں نکال لے۔ سلطان نے معاہدہ پیرس کی رُو سے اسے مسترد کر دیا لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث ان قلعوں سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں اور یوں سربیا آزاد ہو گیا۔

یونانی فسادیوں نے کریٹ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے لئے وہاں بغاوت کے شعلے بھڑکا دیئے۔ سلطان نے اس بغاوت پر قابو پا ہی لیا تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں خیراندیشی کا پروانہ لے کر میدان میں آ دھمکیں۔ اور پیرس میں کئے گئے ایک فیصلے کے مطابق کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق عطا کر دیئے۔

۱۸۷۰ء میں روس نے فرانس اور جرمنی کی جنگ سے فائدہ اٹھا کر معاہدہ پیرس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحیرۂ اسود پر پھر سے قبضہ کر لیا۔

روس نے دولت عثمانیہ کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جمعیت سلافیہ کی بنیاد ڈالی جس نے سلافی قوموں میں روسی ادبیات کی اشاعت کا آغاز کیا تھوڑے ہی عرصے میں اس جمعیت نے یہاں تک ترقی کی کہ ریاست بلقان کے تمام عیسائی جمعیت سلافیہ کے زیر علم جمع ہو گئے۔ اور بغاوت کا پرچم لہرانے کے لئے اس کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ یہ جمعیت روس کے اعیان حکومت پر مشتمل تھی۔ اس سے پہلے بلقان کی سلافی قومیں بلغاری، بوسین وغیرہ یونانی کلیسا کے ماتحت ہونے کی بنا پر یونانی ہی خیال کی جاتی تھیں لیکن اس تحریک سے ان میں قومی بیداری پیدا ہوئی اور انہوں نے یونانیوں کے مقابلے میں ایک علیحدہ قومی ہستی قائم کرنے کی کوشش کی۔ روس کے سفیر نے سلطنت عثمانیہ سے زبردست سفارش کر کے ۱۸۷۰ء میں سلطان سے ایک فرمان کے ذریعے بلغاریا میں کلیسائے یونان سے آزاد ایک قومی کلیسا قائم کرنے کی اجازت دلا دی۔ اس طرح بلقان میں ایک جدید قومیت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔

۱۸۷۲ء میں فواد پاشا اور عالی پاشا کی وفات سے انتظام سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور بدنظمی و شورش کا بازار گرم ہو گیا۔ ان پاشاؤں کی زندگی میں تو روسی سفیر کی دال نہ گل سکتی تھی اب اسے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور اس نے گہری چالوں سے کام لے کر جدید صدر اعظم محمود ندیم پاشا کو اپنے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا لیا اور سلطنت عثمانیہ گویا روس کی حکومت بن گئی۔

روس برابر مخالفانہ سرگرمیوں کو ہوا دے رہا تھا۔ آسٹریا چاہتا تھا کہ بوسنیا اور ہرزیگوینا پر خود قبضہ کرے۔ چنانچہ دونوں سلطنتوں نے مؤثر تدبیروں سے کام لے کر دونوں صوبوں میں بغاوت برپا کرا دی۔

چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۵ء کو سلطان نے باغیوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا تو روس، جرمنی اور آسٹریا کے حکمرانوں نے ایک جگہ جمع ہو کر چند فیصلے کئے جو اندراسی نوٹ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

اس نوٹ میں بتایا گیا کہ بوسنیا اور ہرزیگوینا کے باشندوں کو کامل مذہبی آزادی عطا کی جائے مسلم اور غیر مسلم رعایا سے یکساں سلوک کیا جائے۔ ان صوبوں سے جو ٹیکس لئے جائیں وہ انہیں صوبوں کی مقامی ضروریات پر صرف کئے جائیں وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا نے بھی بغاوت کے ضمن میں ہرزیگوینا کی ہاں میں ہاں ملا دی اور سربیا، مونٹی نگرو اور بلغاریا پر بھی بغاوت کے پرچم لہرانے لگے۔

بلغاریا میں جب بغاوت برپا ہوئی تو وہاں کے حکام نے سلطان سے قیام امن کے لئے فوجی دستے بھیجنے کی درخواست کی لیکن روسی سفیر راستے میں حائل ہو گیا۔ اور وہاں فوج نہ بھیجی جا سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے عیسائی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا بے تحاشا قتل عام کیا۔

۱۸۷۶ء میں اراکین سلطنت نے سلطان عبدالعزیز کو برطرف کر کے اس کے بیٹے سلطان مراد خامس کو سلطنت عثمانیہ کا وارث بنایا۔ لیکن وہ چونکہ پہلے ہی اعصابی مریض تھا اس لئے تین ماہ بعد تخت سے برطرف کر دیا گیا۔

ستمبر ۱۸۷۶ء میں مراد خامس کا بھائی عبدالحمید ثانی سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو دستور اساسی کے اعلان کے روز قسطنطنیہ میں بڑی طاقتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ بوسنیا، ہرزیگوینا اور بلغاریا کے حکمران دولت عثمانیہ پہلے پانچ سال تک بڑی طاقتوں کی منظوری

سے مقرر کرے۔ لیکن ترکوں نے اسے منظور نہ کیا تو انہوں نے دولت عثمانیہ کو لکھا کہ اگر یہ تجویز ایک ہفتے کے اندر اندر منظور نہ کی تو وہ قسطنطنیہ سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۷۷ء میں وہ قسطنطنیہ سے چل دیئے۔

۱۸۷۷ء میں روس نے پھر جنگ چھیڑ دی جس میں ترکوں کو پسپا ہونا پڑا ۳۱ جنوری کو ایک صلحنامے پر فریقین کے دستخط ہوئے۔ ۳ مارچ کو دونوں مملکتوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا، جو معاہدہ سان سٹیفانو کے نام سے موسوم ہوا۔

۱۳ جون کو معاہدہ برلن کے نام سے بڑی طاقتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو دولت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات کے لیے ایک تباہ کن معاہدہ
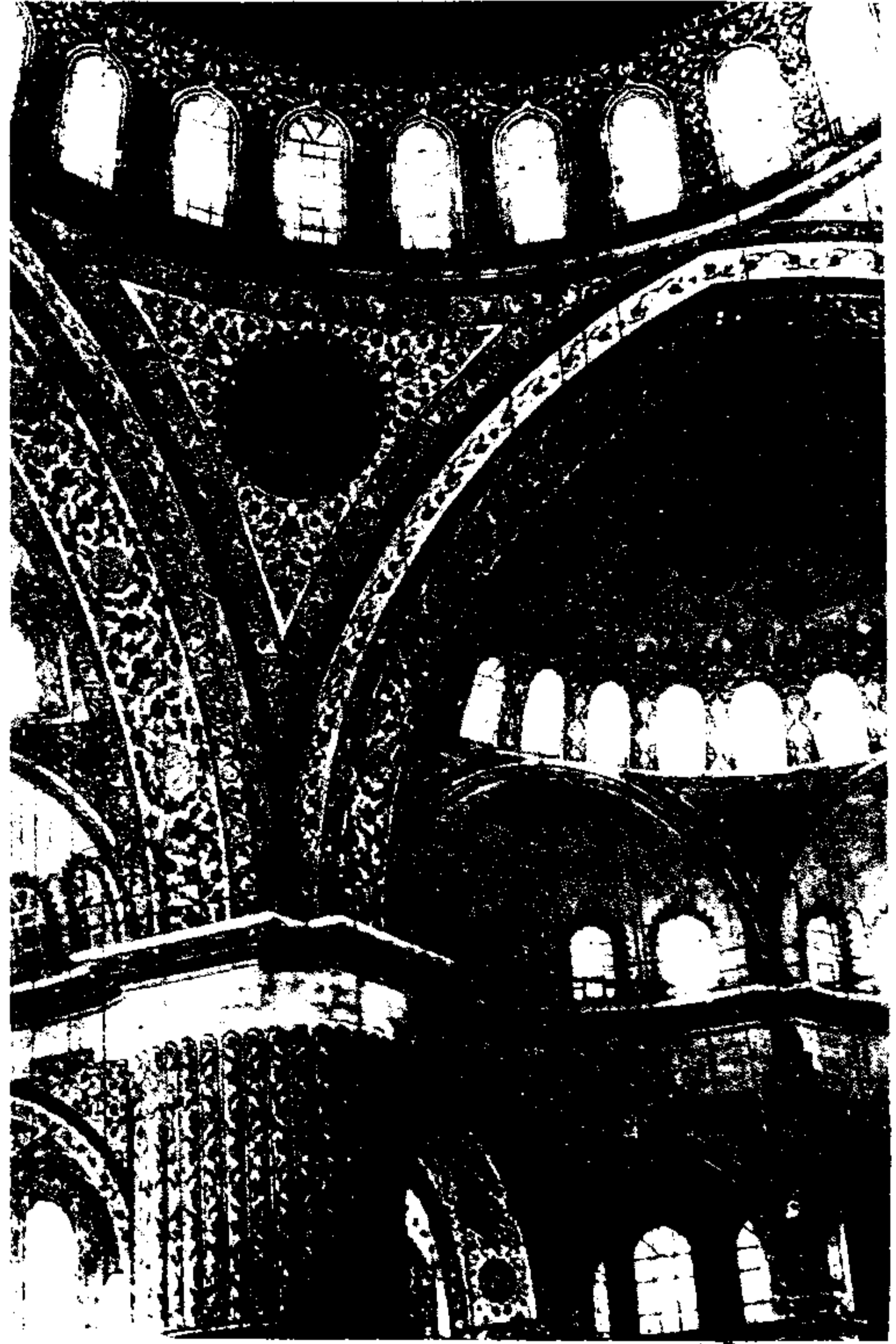
نیلی مسجد (استنبول) کا اندرونی دالان

ثابت ہوا۔ عثمانی صوبوں کی جگہ یونان، سربیا، بلغاریا، رومانیہ اور مونٹی نگرو کی مطلق العنان حکومتیں معرض وجود میں آگئیں اور باقیماندہ صوبوں میں بھی آزادی حاصل کرنے کی تحریک چل نکلی۔

افریقہ کی ساحلی حکومتیں سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر علم خوداختیاری بلند کرتی چلی گئیں اور دول مغرب ان پر بری طرح جھپٹ پڑیں۔ چنانچہ مصر پر انگلستان نے قبضہ جما لیا۔ تونس اور الجزائر فرانس کے قبضے میں آئے اور طرابلس اٹلی کے حصے میں آیا۔

۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی کے بعد اس کا بھائی محمد خامس سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔

۱۹۱۰ء تک حکومت اٹلی یہی اعلان کرتی رہی تھی کہ وہ دولت عثمانیہ کے کسی حصے پر نظر ہوس نہیں ڈالے گی۔ لیکن اس اعلان کے تقریباً دس ماہ بعد ہی اس نے سلطنت عثمانیہ سے جنگ چھیڑ دی اور پچاس ہزار کا ایک لشکر لے کر طرابلس پر چڑھائی کر دی۔ تاہم اس جنگ میں اٹلی کو منہ کی کھانا پڑی اطالویوں نے اس شکست کے بعد ترکوں پر انتہائی وحشیانہ مظالم توڑنا شروع کر دیئے جب یہ تیر بھی نشانے پر نہ بیٹھا تو بحری جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بحیرہ آژ کے بعض جزیروں پر قابض ہو گئے۔ اسی دوران میں بلقان میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور سلطان کو ان حالات سے مجبور ہو کر اٹلی سے صلح کرنا پڑی دونوں ممالک کے درمیان ایک صلحنامہ ہوا جو لوزان کے نام سے موسوم ہے۔

اس کی رو سے طرابلس اٹلی کے قبضے میں چلا گیا۔ اٹلی نے وعدہ کیا کہ وہ بحیرہ آژ (ایجین) کے مفتوحہ جزائر سلطنت عثمانیہ کو واپس کرے گا [illegible] اٹلی کا یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوا۔

۱۹۱۲ء میں ایک طرف تو بلقانی ریاستیں متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف [illegible] کھڑی ہوئیں۔ دوسری طرف ترکوں کی اندرونی حالت [illegible] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ بلقان میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ [illegible] عثمانیہ سربیا اور بلغاریا کے درمیان ایک عارضی [illegible] سے لڑائی جاری رہی۔ اس وقت تقریباً [illegible] علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے [illegible] اور یانینا ان کے پاس رہ گئے تھے۔ ان کا [illegible] جنوری ۱۹۱۳ء میں لندن کی صلح کانفرنس [illegible] کے حوالے کر دیا جائے [illegible] صدر اعظم کامل پاشا دول عظمیٰ کے [illegible] نے اس یادداشت کو [illegible] تھی۔ اس کے ساتھ ہی [illegible] میں نئے سرے سے جنگ چھیڑ دی [illegible] لیکن ۲۰ جولائی کو [illegible] بلغاریا کے درمیان ایک معاہدہ [illegible] ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا باقی رہ گئے اور باقی [illegible] قبضے میں چلا گیا۔ [illegible] جنگ [illegible] بنا پر اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔

۱۔ سلطنت عثمانیہ ان پابندیوں سے جو یورپی طاقتوں نے [illegible] نام سے ان پر عائد کر رکھی تھیں آزاد ہونا چاہتی تھی۔ ترک [illegible] چاہتے تھے لیکن اتحادی روس کی وجہ سے انہیں اپنے ساتھ ملا [illegible] نہ تھے۔ چنانچہ ترکوں کو ان کے مخالف کا ساتھ دینا پڑا۔

۲۔ روس عرصہ دراز سے ایسے وقت کی تلاش میں تھا کہ جونہی [illegible] ملے وہ قسطنطنیہ کو ہڑپ کر جائے۔ چنانچہ ترکوں کے لیے روس کی مخالف [illegible] کا ساتھ دینا لازمی تھا۔

۳۔ اتحادیوں نے ہمیشہ دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کے لیے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی اور اقتصادی برتری قائم و استوار کر دیں

اس وجہ سے بھی ترکوں کو ان کے مخالف فریق کا ساتھ دینا پڑا۔

۴۔ ترکوں کا ایک با اقتدار فریق جرمن کا ساتھ دینا چاہتا تھا کیونکہ جرمن روس کا دشمن اور روس دولت عثمانیہ کا دشمن تھا۔ انور پاشا جرمن سے اتحاد کرنے میں پیش پیش تھا۔ اگست ۱۹۱۴ء کے معاہدے میں جو قسطنطنیہ میں جرمنی اور دولت عثمانیہ کے درمیان طے پایا ترکوں نے انگلستان اور فرانس کے متعلق غیر جانبدار رہنے کا اظہار کیا۔ وہ صرف روس کے مقابلے میں جرمنی کی حمایت کے طلبگار تھے

۵۔ ترکی ابھی تک فرانس اور انگلستان کے بارے میں غیر جانبدار تھا لیکن برطانیہ نے انگلستان میں جو تعمیر ہونے والے ترکی جہاز، جن کی رقم بھی ادا کر دی گئی تھی جرمن کے اعلان جنگ کے ہوتے ہی ضبط کر لیے حالانکہ ترکی ابھی تک برطانیہ کے مقابلے میں نہ آیا تھا۔ چنانچہ ترکوں کو جرمنی کا ساتھ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ جنگ کے شروع میں دولت عثمانیہ نے دس لاکھ سے زیادہ فوج میدان جنگ میں روانہ کی تھی جس میں چار لاکھ ستائیس ہزار مقتول اور چار لاکھ مجروح ہوئے۔ ایک لاکھ تیرہ ہزار قیدی لاپتا ہوئے۔ مالی نقصان بھی بے انتہا ہوا۔ اب جنگ کے اختتام پر ترکی کے حلیف بلغاریا نے اتحادیوں سے غیر مشروط اظہار اطاعت کر دیا تھا۔ جرمنی خود جنگ سے دست کش ہو رہا تھا۔ ان حالات میں ترکی کے لیے اتحادیوں سے صلح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

۱۸۱۸ء میں محمد خامس کا بھائی محمد سادس تخت نشین ہوا۔ اس دوران میں جو لوگ مثلاً انور پاشا، جمال پاشا اور انجمن اتحاد و ترقی کے بہت سے رکن جو اتحادیوں کی شرائط پر متفق نہیں ہو سکتے تھے وطن عزیز کو خیر باد کہہ گئے۔

ترکوں کی فوجی طاقت کی شکست و ریخت اور عام بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر اتحادی ان خفیہ معاہدوں کی تکمیل کرنے لگے جو دوران جنگ میں کیے گئے تھے چنانچہ معاہدہ قسطنطنیہ، معاہدہ لندن اور معاہدہ سائیکس پیکو کی شرائط کے مطابق دولت عثمانیہ کے مقبوضات پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں نے یونانیوں کو سمرنا پر بھی قابض ہونے کا حکم دے دیا۔ سمرنا پر یونانی قبضے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دولت عثمانیہ کے پورے طول و عرض میں پھیل گئی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے منعقد ہوئے اور یکایک مملکت کے گوشے گوشے میں قومی تحریک کی لہر دوڑ گئی۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ترکی اور فرانس میں ایک معاہدے کے تحت فرانس نے سلیشیا کا علاقہ ترکی کے حوالے کر دیا۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء میں معاہدہ لوزان کی رو سے مشرقی تھریس، ادرنہ اور قسطنطنیہ بھی ترکی سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔ اس تحریک کی روح رواں مصطفےٰ کمال پاشا تھے۔ چنانچہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء سے مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوئی۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کر دی گئی۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۲۴ء کے بعد سے ترکی ایک جمہوری سلطنت قرار دی گئی۔ آئین میں جمہوریت کا سربراہ صدر مقرر کیا گیا جس کی مدت صدارت چار سال قرار پائی اور مصطفےٰ کمال پاشا پہلے صدر جمہوریہ قرار پائے اور ۱۹۳۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۲۵ء میں روس کے ساتھ غیر جانب داری، عدم جارحیت اور بین الاقوامی تعاون کا معاہدہ ہوا۔

۱۹۳۰ء میں یونان سے معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں ترکی لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) کا رکن بنا۔

۱۹۳۷ء میں عراق، ایران اور افغانستان کے ساتھ باہمی دوستی کا معاہدہ ہوا۔ اسی سال عصمت انونو پندرہ سالہ وزیر اعظم رہنے کے بعد وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے اور جلال بایار وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء میں عصمت انونو ترکی کے دوسرے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۹ء میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ طے پایا جس کی رو سے فرانس نے اسکندرونہ کا علاقہ ترکی کو واپس کر دیا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو ترکی عرصہ دراز تک غیر جانبدار رہا۔

۱۹۴۳ء میں عصمت انونو دوسری مرتبہ صدر منتخب ہوئے اور سراج اوغلی وزیر اعظم بنائے گئے۔

۱۹۴۴ء میں ترکی جرمنی سے تعلقات ختم کر کے جنگ میں شریک ہو گیا جنگ کے اختتام پر ترکی اقوام متحدہ کا رکن بنا۔

۲۲ر مئی ۱۹۵۰ء میں جلال بایار صدر ترکیہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں ترکی نیٹو کا رکن بنا۔

۱۹۵۵ء میں معاہدۂ "بغداد" ہوا جو عراق سے تعاون اور دفاع کا معاہدہ تھا۔ بعد ازاں جس میں برطانیہ، ایران اور پاکستان بھی شامل ہو گئے۔ اور جیسے انقلاب عراق کے بعد ۱۹۵۸ء میں سینٹو کا نام دیا گیا۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر انقرہ میں ہے۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۱ء جمال گرسل ترکی کے صدر بنے ان کے عہد میں ۲۱ر جولائی ۱۹۶۴ء کو عالم اسلام کے تین بڑے ممالک پاکستان، ایران اور ترکی کے درمیان اس دائمی رشتہ اخوت کی تجدید ہوئی جسے نامساعد حالات نے کمزور کر دیا تھا یا اتحاد عالم اسلام کی طرف ٹھوس قدم تھا۔ جس سے عالم اسلام میں ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ آر۔سی۔ڈی (علاقائی تعاون برائے ترقی) کے نام سے ایک معاہدہ طے پایا۔

۲۹ر مارچ ۱۹۶۶ء کو جودت سنائے ترکی کے نئے صدر منتخب ہوئے۔

۶ر اپریل ۱۹۷۳ء سے فہری کوروتورک ترکی کے صدر ہیں۔ اور سلیمان دیمرل وزیر اعظم ہیں۔

اقتصادی و دیگر معلومات:۔ ترکی ایشیا اور یورپ کے وسط میں ایک انتہائی اہم ملک ہے۔ صدر مقام انقرہ ہے۔ ترکی کی آبادی ۱۹۷۶ء میں ۴ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ جس میں تین کروڑ ترک، پچیس لاکھ کرد، چار لاکھ عرب، اور باقی دیگر اقوام یونانی، آرمینی اور یہودی وغیرہ آباد ہیں۔ قانونی طور پر مذہبی آزادی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی مردم شماری کی رو سے ترکی میں مسلمان تین کروڑ چودہ لاکھ تھے۔ باقی عیسائی، یہودی اور دیگر مذاہب سے ت[illegible] تھے۔ تعلیمی لحاظ سے ترکی ایشیا بھر میں سب سے آگے ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ تین یونیورسٹیاں استنبول میں۔ تین انقرہ۔ ایک ایک یونیورسٹی ازمیر، ارض روم، ترابزون اور سیواس میں قائم ہیں۔ خواندگی کا تناسب ۱۹۲۷ء میں ۱۰٪، ۱۹۳۵ء میں ۲۰٪، ۱۹۴۵ء میں ۳۰٪، ۱۹۶۵ء میں ۴۸٪ اور ۱۹۷۰ء میں ۴۹٪ تھا۔ سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم ترکی ہے۔ جسے یکم نومبر ۱۹۲۸ء سے لاطینی و رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ عربی رسم الخط اور عربی زبان کی تدریس و اشاعت ممنوع ہے۔ مساجد میں بھی سرکاری طور پر عربی زبان کی جگہ ترکی کو اختیار کیا گیا ہے۔

ترکی کا سکہ لیرا کہلاتا ہے۔ جو سو قروص میں تقسیم ہوتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ۲۲ ارب لیرا کی درآمدات اور ۱۲ ارب لیرا کی برآمدات کی گئیں۔ اس سے ترکی کی درآمدی اور برآمدی توازن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ درآمدات میں مشینیں، لوہا، فولاد، تیل، کپڑا اور دیگر ریشے، ادویہ اور رنگ و روغن اہم ہیں۔ برآمدات میں تمباکو

پھل، کپاس، معدنیات اور جو، جوار، باجرہ وغیرہ شامل ہیں۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

قدیم ترکی شہر (اصحاب کہف کا شہر) افسوس کے آثار

ترکی کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار زراعت پر ہے۔ ۱۹۷۰ء میں زرعی پیشہ افراد کی تعداد ایک کروڑ تھی۔ اور تقریباً سولہ لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ زیر کاشت تھا۔ اہم پیداوار تمباکو، گندم، جو، جوار، باجرہ، مکئی، کپاس، پھل، خشک پھل، انجیر، بادام، ناریل وغیرہ ہیں۔ معدنیات میں کوئلہ، گندھک، خام لوہا، تانبا اور پٹرولیم اہم ہیں۔ دیگر صنعتوں میں کھال، اون، سیمنٹ، کاغذ، بجلی اور فوجی سامان کی صنعتیں اہم ہیں۔ دریاؤں سے پیدا کردہ پن بجلی کی مقدار ۵۶ ارب کلوواٹ ہے ملک بھر میں ریل اور سڑکوں کا جال بچھا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ترکی کی ریل کی کل پٹڑی ۸۱۳۳ کلومیٹر اور سڑکوں کی کل لمبائی ۶۰ ہزار کلومیٹر تھی۔ مجموعی طور پر ترکی ایک ترقی پذیر ملک ہے۔

ترمذ روسی ترکستان کا ایک شہر، جو آمو دریا کے شمالی کنارے پر دریائے سرخان کے دہانے کے قریب واقع ہے۔ اس شہر کی بنیاد بقول حافظ ابرا سکندر اعظم نے رکھی تھی۔ اگرچہ قدماء کے ہاں اس بات کا ذکر موجود نہیں۔

جب مسلمان وہاں پہنچے تو ترمذ میں بدھ مت عروج پر تھا اور وہاں ایک ہزار کے قریب بھکشو موجود تھے۔ اس زمانے میں ترمذ ایک بہت بڑے حکمران کے ماتحت تھا جو شاہ ترمذ کے لقب سے مشہور تھا۔ اس زمانے میں دریا کے کنارے ایک مستحکم قلعہ تھا۔ ترمذ کو ۷۰ھ/ ۶۸۹ء میں موسےٰ بن عبداللہ بن خازم نے فتح کیا اور تقریباً پندرہ سال تک اسلامی حکومت سے بغاوت کر کے اس پر قابض رہا۔ یہاں تک کہ ۸۵ھ/ ۷۰۴ء کے آخر میں عثمان بن مسعود نے مفضل بن مہلب کے حکم سے اسے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔

مقدسی کے بقول ترمذ آمو دریا پر ایک اہم بندرگاہ تھی۔ یہاں کشتیاں بنا کر باہر بھیجی جاتی تھیں۔ یہاں کا صابن مشہور تھا۔

سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں یہ شہر دوسرے شہروں کی طرح جو دریائے جیحون کے شمال میں تھے۔ بلخ کے تابع رہا اور غزنی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ ۵۳۶ھ/ ۱۱۴۱ء میں جب ماوراالنہر کی حکومت قرہ ختائیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو بھی ترمذ پر سلجوقیوں ہی کا قبضہ رہا۔ ۵۵۱ھ/ ۱۱۵۶ء میں سلطان سنجر نے ترمذ ہی میں پناہ لی۔ اس کے بعد قرہ ختائیوں کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ ۶۰۱ھ/ ۱۲۰۵ء میں عماد الدین عمر جو غوریوں کی طرف سے بلخ کا حاکم تھا، ترمذ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بہرام شاہ یہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ لیکن ایک سال بعد ہی خوارزم شاہ محمد نے ترمذ فتح کر کے قرہ ختائیوں کو لوٹا دیا۔ جب سلطنت قرہ ختائی کو زوال آ گیا تو یہ شہر خوارزم شاہ کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ ۶۱۷ھ/ ۱۲۲۱ء میں منگولوں کے ہاتھوں یہ شہر بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔

ابن بطوطہ جب بلخ پہنچا تو ترمذ کی حالت بہتر ہو چکی تھی۔ جبکہ بلخ ابھی کھنڈر ہی کی شکل میں تھا۔ ترمذ اپنے پہلے مقام سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر دوبارہ آباد ہوا۔ اور اس کی حیثیت ایک اہم اور بڑے شہر کی تھی۔ باشندے [illegible] کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ منگول حملے کے بعد ترمذ کو مدینۃ الرجال [illegible] شہر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ۸۱۰ھ/ ۱۴۰۷ء میں [illegible] کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی سے [illegible] ازبکوں کی حکومت میں شامل رہا۔

بلخ کی لڑائی میں جو ازبکوں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان [illegible] ہوئی ترمذ پر ہندوستانی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے [illegible] کے قبضے میں آ گیا۔ بعد کے زمانے میں فسادات کی وجہ سے یہ شہر ایک [illegible] برباد ہوا۔ ۱۰۷۲ھ/ ۱۶۵۸ء میں محمد رحیم خان نے اس شہر کو دوبارہ تعمیر [illegible] شہر کی قسمت میں ایک بار پھر بربادی لکھی جا چکی تھی۔

تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی کے [illegible] کے کھنڈرات کے قریب حصار اور صالح آباد جیسے گاؤں کے سوا اور کچھ [illegible] ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء میں ترمذ کے کھنڈرات سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ایک [illegible] قلعہ تعمیر ہوا جو آہستہ آہستہ شہر بن گیا۔ اس وقت ترمذ میں زیادہ آبادی [illegible] ۱۹۱۶ء میں ترمذ ریلوے کا افتتاح ہوا۔ لیکن انقلاب کے دوران [illegible] تباہ کر دی گئی۔ جسے اب دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔

ترمذ کے آثار قدیمہ میں ابو عبداللہ محمد بن علی کا مقبرہ جو [illegible] صدی ہجری [illegible] صدی عیسوی میں تعمیر ہوا تھا، ایک نفیس ترین عمارت ہے اس کا شمار وسط ایشیا کی خوبصورت ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ ترمذ نے کئی ایک مشہور ہستیوں کو جنم دیا جنھوں نے اسلامی دنیا میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔ ایسی ہی مشہور شخصیتوں میں سے ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی ہیں جو محدث اور عالم دین تھے ان کی تصانیف کو صحاح ستہ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

دوسری شخصیت ابوعبداللہ محمد بن علی ترمذی ہیں جو امام بخاری کے ہم سبق تھے۔

ترمذی، ابوعبداللہ (وفات ۲۸۵ھ/۸۹۸ء) محمد بن علی بن حسین الحکیم خراسان کے عالم دین، محدث، فقیہ اور صوفی۔
آپ کے حالات کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ آپ کے مزار پر جو کتبے ہیں ان سے "تذکرۃ الاولیاء" اور "نفحات الانس" میں درج معلومات کی تصدیق ہوتی ہے۔
علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ بھی بعض انہی شیوخ کے شاگرد تھے جن سے امام بخاری نے تلمذ کیا تھا۔
آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے اوپر بنتی ہے۔ ان تصانیف میں "نوادر الاصول" "ختم الولایہ" [illegible] جن میں آپ نے بعض مسائل کی تفسیر اور وضاحت تصوف کے رنگ میں کی ہے۔ مثلاً نور محمدی کا ازل سے موجود ہونا، حقیقت آدمیت، علم ملائکہ، ولایت [illegible] "علل العبودیہ"، "شرح الصلوٰۃ"، "الحج واسرارہ"، "کتاب الفروق" [illegible] مشہور ہیں۔
[illegible] آپ سب سے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طبقات صوفیہ پر [illegible] ان کی تصانیف کو تین سو سال بعد بڑی قدر کی نظر سے دیکھا [illegible] پہنچے ہیں۔

ترمذی، ابوعیسیٰ [illegible] ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن [illegible] سلمی مشہور محدث اور عالم دین۔ آپ کی نسبت [illegible] کسی وجہ سے ترمذ آکر آباد ہوگئے تھے
[illegible] حالات زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں [illegible] بعض روایات میں ہے کہ آخر عمر میں نابینا ہو [illegible] احادیث جمع کرنے کے لیے خراسان، عراق اور حجاز کے [illegible]
آپ کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، قتیبہ بن سعید، علی بن حجر، محمد بن بشار وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔
[illegible] کا حافظہ بلا کا تھا۔ حاکم نے عمرو بن ملک کا ایک قول بیان کیا ہے کہ امام بخاری کے بعد ابوعیسیٰ علم، حافظے اور زہد و ورع میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے حافظے کے بارے میں ایک روایت ہے۔
آپ فرماتے تھے کہ میں نے شیخ کی روایات کے دو اجزاء ان سے نقل کیے۔ لیکن اب تک انہیں پڑھ کر سنانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے راستے میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوگئی تو میں نے شیخ سے ان اجزاء کی قرأت کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمالیا اور کہا کہ ان اجزاء کو ہاتھ میں رکھیں میں پڑھتا جاتا ہوں اور تم مقابلہ کرتے جاؤ۔ میں نے جب ان اجزاء کو تلاش کیا تو وہ اتفاقاً میرے پاس نہیں تھے چنانچہ میں نے دو سادے کاغذ ہاتھ میں پکڑ لیے اور سننے میں مشغول ہوگیا۔ اسی دوران میں شیخ کی نظر ان کاغذوں پر پڑی تو وہ ناراض ہوکر فرمانے لگے "کیا تو مجھ سے مذاق کرتا ہے۔" پس میں نے انہیں تمام قصہ کہہ سنایا اور عرض کی کہ اگرچہ وہ اجزاء میرے پاس نہیں ہیں تاہم لکھے ہوئے اجزاء سے مجھے زیادہ یاد اور محفوظ ہیں۔ شیخ نے فرمایا اچھا سناؤ تو میں نے وہ سب احادیث سنادیں۔ شیخ نے تعجب کیا تو میں نے عرض کی اب کی بار پھر امتحان لے

لیں تو انہوں نے چالیس احادیث اور پڑھیں جنہیں میں نے صحیح صحیح سنا دیا تو شیخ نے فرمایا میں نے تجھ جیسا محنتی نہیں دیکھا۔
امام ترمذی نے جابجا اپنے آپ کو اہل حدیث میں شمار کیا ہے اور جامع ترمذی میں اپنی مستقل رائے پیش کی ہے۔ اکثر علماء نے انہیں شافعی اور حنبلی کہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ مقلد نہ تھے بلکہ خود امام اور مجتہد تھے۔
آپ سے بے شمار تلامذہ نے استفادہ کیا ہے۔ ان تلامذہ میں سے احمد بن عبداللہ المروزی، ہیثم بن کلیب الشاشی، محمد بن احمد بن محبوب، احمد بن یوسف النسفی، اسعد بن حمدویہ، داؤد بن نصر ابزدوی، محمد بن منذر الهروی، ابوذر محمد بن ابراہیم، ابومحمد حسن بن ابراہیم، ابوالحسن وازری، محمد بن سفیان خاص طور پر مشہور ہیں۔
آپ اگرچہ امام بخاری کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن امام بخاری نے بھی آپ سے دو احادیث کا سماع کیا ہے۔ آپ کی تصانیف میں۔
"الجامع الترمذی (ترمذی شریف)" "کتاب العلل الصغیر"، "علل الکبیر" "کتاب التاریخ"، "کتاب الزہد"، "کتاب الاسماء والکنیٰ"، "کتاب الشمائل النبویۃ" شامل ہیں۔ "جامع ترمذی" آپ کی مشہور ترین کتاب ہے۔
آپ کا انتقال ترمذ میں ہوا۔ لیکن بقول سمعانی اور یاقوت آپ نے ۲۷۵ھ/۸۸۹ء میں قریہ بوغ میں جو ترمذ سے چھ فرسخ کے فاصلے پر تھا انتقال کیا۔
(نیز دیکھیے "ترمذی شریف")

ترمذی، برہان الدین ایک بزرگ صوفی جو سید حسین ترمذی، سید سردان اور برہان الدین محقق کے ناموں سے مشہور ہیں۔ مولانا بہاؤالدین ولد کے مرید تھے۔ کچھ مدت مولانا سے علم ظاہری کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مجاہدے اور ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ یہاں تک کہ ترمذ ہی میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کے بہت سے عقیدت مند بھی یہاں آپ کے پاس سکونت پذیر ہوگئے۔ جب مولانا بہاؤالدین ولد کا قونیہ میں انتقال ہوگیا تو آپ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں قونیہ چلے گئے۔ یہاں پر جلال الدین رومی کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہوئے۔ جو ابھی نوعمر تھے اور فقہ و ادب کے طالب علم تھے۔ نو سال بعد آپ قیصریہ میں جاکر معتکف ہوگئے۔ منگولوں کے قتل عام کے دوران میں آپ اسی جگہ پر موجود تھے۔ جو سلجوقوں کی طرف سے اس علاقے کے والی اور آپ کے مرید خاص شمس الدین اصفہانی نے آپ کی وفات کے بعد تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور اسی نے آپ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔
آپ کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بقول اولیاء چلبی آپ کا انتقال ۴۷۴ھ/۱۰۸۱ء میں ہوا۔
آپ کو فرقہ مولویہ کی روایات میں جو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہی آپ کی شہرت کا خاص باعث ہے۔

"ترمذی شریف" کتب احادیث کے مجموعہ "صحاح ستہ" کی ایک اہم کتاب اس کے مصنف ابوعیسیٰ محمد بن سورہ ترمذی ہیں۔ خطیب بغدادی اور امام حاکم نے جامع ترمذی کو الصحیح کے نام سے یاد کیا ہے۔ کیونکہ جامع میں ضعیف احادیث بھی ہوتی ہیں۔ حافظ ابن اثیر نے جامع الاصول کے مقدمے میں جامع ترمذی کے بارے میں لکھا ہے۔ "اس کا شمار الصحیح میں ہے۔ اس کی

ترتیب اچھی ہے اور تکرار کی قلت ہے۔

ترمذی کے بارے میں علمائے اندلس نے ایک بہترین قصیدہ کہا ہے۔

بقول شاہ عبدالعزیز صاحب "بستان المحدثین" فن حدیث میں امام ترمذی کی جامع بعض وجوہ سے جملہ کتب احادیث سے احسن ہے۔ اولاً حسن ترتیب عدم تکرار دوم مذاہب کا بیان اور ان کے ادلہ کا ذکر سوم انواع حدیث میں صحیح و ضعیف، غریب اور معلل وغیرہ کا بیان چہارم راویوں کے نام کنیت و القاب اور علم رجال کے متعلق دیگر فوائد بیان کرنے کی وجہ سے۔

صحت و شہرت کے اعتبار سے اہل علم نے کتب احادیث کو پانچ طبقوں میں شمار کیا جاتا ہے جامع ترمذی ان میں سے دوسرے طبقے کی کتاب ہے۔ صحاح ستہ میں صحیح مسلم کے بعد اسے دوسرا مقام دیا جاتا ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حدیث کے مختلف علوم کی نشاندہی ملتی ہے جس سے اس کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً

۱۔ اصناف فوائد پر کتاب کی تالیف و ترتیب کے ساتھ بیان سند۔ ۲۔ تصحیح حدیث ۳۔ سقم روایت کا بیان ۴۔ تعدد طرق کا رکا ایراد۔ ۵۔ جرح رداۃ۔ ۶۔ تعدیل رواۃ، ۷۔ راویوں کے نام کا تعین۔ ۸۔ راویوں کی کنیت کا ذکر۔ ۹۔ بیان وصل۔ ۱۰۔ بیان قطع۔ ۱۱۔ معمول بہ کا اظہار۔ ۱۲۔ متروک کا ایضاح۔ ۱۳۔ رد و قبول آثار کے متعلق علماء کا اختلاف۔ ۱۴۔ تاویل حدیث میں اختلاف۔ ترمذی شریف میں بخاری اور مسلم کے مقابلے میں احادیث بہت کم ہیں اور تکرار بھی ان سے کم ہے۔

جامع ترمذی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کے سلسلے میں امام ترمذی نے چار شرطوں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

۱۔ وہ روایات لائی جائیں جو صحیح ہوں نیز صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موافق اور ان کی شرائط کے مطابق ہوں۔

۲۔ جو امام ابوداؤد اور نسائی کی شرط کے موافق ہوں اور یہ کہ امام ابوداؤد اور امام نسائی کے ہر اس راوی سے جس کے ترک پر اجماع نہ ہو روایت لیں گے۔

۳۔ صرف اس ضعیف روایت کو لیا جائے جو حسن لغیرہ کے قبیل سے ہو کیونکہ اس کے ساتھ سلف کی ایک جماعت کے مسلک کی مطابقت ہوتی ہے۔

۴۔ طبقہ اولی کے رواۃ کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ طبقہ اولیٰ اور ثانیہ سے زیادہ روایات لی ہیں۔ طبقہ ثالثہ اور رابعہ سے نسبتاً کم اور طبقہ خامسہ سے استشہاداً یا شاذ و نادر اعتبار کے طور پر روایت لی ہے۔

ترمذی شریف ہر زمانے کے علماء میں متداول رہی ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن کی تعداد پچیس کے قریب ہے۔ ان میں سے مشہور مشہور شروح یہ ہیں۔

۱۔ عارضۃ الاحوذی:۔ حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ الاشبیلی کی۔

۲۔ المنقح الشذی:۔ حافظ ابوالفتح محمد بن محمد کی جو سید الناس الشافعی کے نام سے مشہور ہیں اور ائمہ حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔

۳۔ شرح الزوائد:۔ حافظ عمر بن علی بن احمد کی ہے۔ جنہوں نے بکثرت شروح اور علوم حدیث پر کتابیں لکھی ہیں۔

۴۔ قوت المغتذی:۔ حافظ جلال الدین سیوطی کی ہے جو فن حدیث کے بہت ماہر تھے

۵۔ مختصر الجامع:۔ نجم الدین محمد بن عقیل البالسی نے لکھی۔

۶۔ ایک شرح ابوالحسن بن عبدالہادی کی ہے جو چالیس اجزاء پر مشتمل ہے۔

۷۔ معارف السنن:۔ علامہ محمد یوسف بنوری نے لکھی ہے چھ جلدوں میں ہے۔

۸۔ التعلیقات علی الترمذی:۔ جو شیخ احمد بن شاکر نے لکھی ہے۔ اس شرح کے ساتھ جامع ترمذی کے متن کی تصحیح کا التزام بھی کیا گیا ہے۔

۹۔ هدیۃ الالمعی علی برکات الترمذی:۔ علامہ ابوالطیب محمد شمس الحق نے لکھی ہے

۱۰۔ تحفۃ الاحوذی:۔ یہ شرح علامہ محمد عبدالرحمان محدث مبارک پوری کی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

جامع ترمذی حدیث کی وہ کتاب ہے جو ہر زمانے میں درس نظامی کا ایک حصہ رہی ہے اور اسی وجہ سے مقبول عام ہے۔

ترنم، مولانا غلام محمد (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء ۔ ۔ ۔ ۱۳۶۹ھ ۔ ۔ ۔) ایک عالم دین، خطیب، ادیب، شاعر و نعت گو ان کا نام عبدالعزیز تھا۔ امرتسر کے ایک ... گھر سے پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ... ازاں مفتی عبدالصمد ... سے حاصل کی ... تالیف ... اور ... ہائی سکول ... معاش بنا لی ... چند سال بعد ... تعلیم حاصل کرنے کی ... ترجمہ ... اور ... منشی فاضل، ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا ...

علامہ محمد عالم آسی سے عربی ادب ...

کے بعد حکیم حاجی محمد علی ... حکیم ... اور خاص دسترس حاصل کی۔

آپ ... کے خطیب تھے تو ... ہوتے۔ بہت سی خستہ حال مساجد آپ کی ... تبدیل ہو گئیں۔ کیونکہ آپ شہر کے ... کر دیتے تھے اور لوگ وہیں پہنچ ...

آپ ایک ایسے خطیب تھے کہ ذرا سی دیر میں ... اور ذرا سی دیر میں رونے پر مجبور کر دیتے تھے۔

آپ ... ہائی سکول شریف پورہ ... رہے۔ فارغ وقت میں مطب کرتے تھے ... کی حیثیت رکھتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ اہل سنت ... مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے مختلف سیاسی ... تحریک پاکستان میں آپ نے بہت کام کئے ... پذیر ہوئے۔ اور سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطابت کے فرائض ... مسجد کو جو بہت تنگ تھی اور جس میں نزد ... کی ترغیب دلانے پر ایک بہترین جدید مسجد کی تشکیل دی گئی

آپ ایک عرصے تک جمعیۃ العلمائے پاکستان پنجاب کے صدر رہے۔ تحریک ختم نبوت کے دوران میں آپ چھ ماہ سے زائد عرصہ تک قید میں رہے۔

وفات سے تین سال قبل ذیابیطس کا مرض لاحق ہوا ... آخری دو ماہ میں مرض نے شدت اختیار کر لی۔ آخر کار اسی مرض نے انہیں موت تک پہنچا دیا۔

مولانا ترنم کا مزار قبرستان میانی صاحب میں ہے جہاں ہر سال جولائی کے

آخری اتوار کو عرس ہوتا ہے۔ آپ کی مصروفیات نے آپ کو تصنیف و تالیف کا موقع نہ دیا۔ اس لیے کوئی قابلِ ذکر تصنیف نہیں چھوڑی۔ البتہ آپ کے کلام کو مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔

تَرویہ لغوی معنی سیراب کرنا، پانی فراہم کرنا، اصطلاح میں ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو یوم ترویہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس روز حاجی مکہ معظمہ میں نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد احرام باندھے منیٰ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ چونکہ منیٰ اور عرفات میں پانی نہیں ملتا اس لیے وہ اپنے ساتھ پانی لے لیتے ہیں۔

اس دن کو یوم النقلہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس روز حاجی لوگ منیٰ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے ترویہ کو رویۃ سے مشتق مانا ہے ان کے نزدیک اس کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ حضرت جبریل نے اس روز حضرت ابراہیمؑ کو مناسک حج دکھائے تھے یا یہ کہ اس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب سے ہے جس میں آپ نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرتے دیکھا تھا۔

تزکیہ نفس نفس کو پاک صاف اور منزہ کرنا۔ اصطلاح میں نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خدا ترسی کے راستے پر ڈال دینا اور اس کو درجہ کمال پر پہنچنے کے لائق بنانا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور پرہیزگاری اس پر الہام کر دی یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے دبا دیا۔" (۹۱ : ۷ تا ۱۰)

بقول مولانا امین احسن اصلاحی صحیح شعور کے ساتھ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو مغلوب کرنے کا یہ جہاد قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔

جب تزکیہ نفس کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی اور مفہوم یہ ہے کہ نفس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں۔ ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں جاہلی عادات و اخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں، انہیں درست اور ہموار کیا جائے۔ دنیائی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے اس کا علاج کیا جائے۔

اسلام نے تزکیہ نفس کی اہمیت اور ضرورت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کی غرض و غایت انسانی نفوس کا تزکیہ ہی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:۔

"اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔" (۲ : ۱۲۹)

ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کی بعثت اور اس کا مقصد بیان فرمایا ہے

"چنانچہ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تمہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔" (۲ : ۱۵۱)

سورۃ جمعہ میں بھی آپؐ کی بعثت کی غرض یہی بتائی گئی ہے۔

وہی خدا ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ (۶۲ : ۲)

ان آیات میں آنحضورؐ کی بعثت کا مقصد تزکیہ ہی قرار دیا گیا ہے اور جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرمایا۔

"اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمہیں کیا خبر! شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو۔" (۸۰ : ۱ تا ۳)

حضرت موسیٰؑ کی بعثت کا بھی اہم مقصد تزکیہ ہی قرار دیا گیا۔

"فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہو کہ ہے تیرے اندر کچھ رغبت کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔" (۷۹ : ۱۷، ۱۸)

تزکیہ نفس ہر شخص کی فلاح و نجات اخروی کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ چنانچہ اسی چیز کے پیش نظر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کی گندگیوں پر پردہ ڈالا (۹۱ : ۹، ۱۰)

مندرجہ بالا آیات سے دین اسلام میں تزکیہ نفس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ گویا تزکیہ نفس کی حیثیت غایت و مقصد کی ہے جبکہ دوسری تمام چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تزکیہ نفس کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور اسی کے وہ اسرار و حقائق ہیں جو نبی کے ذریعے سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں تزکیہ کی حیثیت دین اسلام میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کے طور پر ہے۔ گویا یہ نجات اور فلاح آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے جسے پورا کیے بغیر انسان آخرت میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

علم تزکیہ صرف نفس کے ہر پہلو ہی سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ نفس کی ہر پہلو سے ایسی تربیت کرے جس سے نفس "نفس مطمئنہ" بن جاتا ہے۔ یہی نفس مطمئنہ تزکیہ نفس کا اصل مقصود ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے

"اے نفس مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔" (۸۹ : ۲۷، ۲۸)

تزکیہ کا مطمح نظر صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ انسانی نفس کسی نہ کسی شکل میں راہ پر لگ جائے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر نفس کو خوب سے خوب تر بنانے کی بھی جد و جہد میں لگا رہتا ہے۔ تزکیہ صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ انسان کو خدا اور اس کی شریعت کا کچھ علم حاصل ہو جائے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کے صفات کی سچی اور پختہ معرفت حاصل ہو جائے۔ اس کے پیش نظر صرف یہی نہیں کہ انسانی عادات کسی حد تک سنور جائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان مکارم اخلاق کے پیکر مجسم بن جائیں وہ انسانوں کے اندر رقت و لطافت اور سوز و گداز کی گھلاوٹ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ تزکیہ چاہتا ہے کہ انسان نفس خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کو اس طرح بجا لائے جس طرح اس کا حق ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم خدا کو ان تمام صفات کے ساتھ مانیں اور زندگی کے ہر گوشہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات کی پیروی کریں۔

ایک حدیث میں آنحضورؐ کی ایک دعا کا ذکر آتا ہے۔

"اے اللہ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا کر اور پاکیزہ کر تو ہی وہ بہترین ہستی ہے جو اسے پاکیزہ کرے، تو ہی اس کا سرپرست اور مولا ہے۔ (مسلم)

احمد، نسائی۔)

تسبیح کا لفظ ذو معنی ہے۔ اس کے ایک معنی پاکی بیان کرنا ہیں اور دوسرے معنی سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ کوشش کرنا ہیں اللہ کی تسبیح کرنے سے مراد ان تمام عیوب اور نقائص اور کمزوریوں سے جو مشرکین اپنے شرک اور انکار آخرت کی وجہ سے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس ذاتِ بے ہمتا کے پاک اور منزہ ہونے کا اعلان و اظہار کرنا ہے۔

تسبیح زبان سے بھی ہوتی ہے اور دل سے بھی۔ اس کے کئی مراتب ہیں ادنیٰ مرتبہ تو زبان سے تسبیح کرنا ہے اور اعلیٰ درجہ زبان اور دل دونوں سے تسبیح کرنا ہے۔

قرآن مجید میں تسبیح کے بارے میں کئی مقامات پر ذکر آیا ہے۔ مثلاً فرشتوں کا بارگاہ الٰہی میں عرض کرنا "آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" (۲: ۳۰)

پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو۔ مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔" (۱۷: ۴۳، ۴۴)

ایک دوسری آیت میں بتایا کہ بے جان مخلوق خدا کی تسبیح کس طرح کرتی ہے۔ بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں۔" (۱۳: ۱۳)

"اے محمدؐ! اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں، اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔" (۲۵: ۵۸)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔" (۳۳: ۴۲)

ایک دوسری جگہ حکم دیا گیا۔

"اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو۔ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں بھی اس کی تسبیح کرتے رہو۔" (۷۶: ۲۵، ۲۶)

غرض اسی طرح بہت سی آیات میں خدا کی تسبیح و تقدیس کرنے کا ارشاد ہوا ہے۔ تسبیح کے بارے میں احادیث میں بھی آیا ہے۔

حضرت سمرہ بن جندب سے روایت ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب سے بہتر وہ کلام ہے جس میں خدا کی تسبیح کی گئی ہو۔" (مشکوٰۃ)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک دن میں سو مرتبہ خدا کی تسبیح کرے اس کے سب گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت جابر سے روایت ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ تسبیح کہنے والے کے لئے جنت میں کھجور کا درخت لگایا جاتا ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

قرآن مجید میں جس جگہ حمد و تسبیح کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد نماز ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک حدیث میں تسبیح کے کلمات کے بارے میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرین نے حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ مالدار لوگ تو بڑے درجے لوٹ لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا "کیا ہوا" انہوں نے عرض کی کہ وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ آنحضورؐ نے فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے بازی لے جاؤ گے؟ وہ عمل یہ کہ تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا کرو۔"

ایک روایت میں سبحان اللہ اور الحمد للہ ۳۳۔ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ آیا ہے۔

نماز میں بھی رکوع اور سجدے میں کم سے کم تین مرتبہ تسبیح کرنا سنت ہے [illegible] میں سبحان ربی العظیم اور سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے ہیں۔

تسنیم لغوی معنی بلند کرنا ہیں۔ اصطلاح [illegible] جو بلندی سے [illegible] آتا ہے۔ قرآن مجید [illegible]

"بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے [illegible] کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر خوشحالی کی رونق [illegible] ترین سربند شراب پلائی جائے گی [illegible] بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ [illegible] کریں گے [illegible] اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی [illegible] ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے [illegible]

قبر کا ذیشان کے کوہان کی طرح [illegible] مسنون ہے۔ آنحضورؐ کی قبر بانسہ [illegible]

تشبیہ تمثیل، انگریزی [illegible] ایک شے کا [illegible] کے نزدیک تشبیہ [illegible]

۱۔ تمثیل [illegible]

۲۔ تجسیم [illegible]

تشبیہ کے ان دو واضح [illegible] رہی ہے۔ خدا کی ذات [illegible] فلسفیوں نے اپنے [illegible] میں لفظ تشبیہ کا استعمال [illegible] جگہ تشبیہ کی بجائے تمثیل کا لفظ [illegible]

کائنات کی کوئی چیز اس کے مثل [illegible]

اکثر علماء تنزیہ باری تعالیٰ سے یعنی مراد [illegible] ہیں اور تشبیہ کے حامی نہیں [illegible] تثبیت مثبت یعنی تعینات صفاتی [illegible]

تشبیہ سے اللہ تعالیٰ کی تخصیص لازم آتی ہے [illegible] ہے کہ وہ بت پرستی اور کفر کی طرف لے جاتی ہے [illegible] الحاد و مشرک کا پیش خیمہ ہے۔

تشہد شہادت کا طور پڑھنا [illegible] اصطلاح میں اس [illegible] نماز قعدہ میں پڑھی جاتی ہے [illegible]

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِيْنَ ط اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

سب بندگیاں زبان کی اللہ کو ہیں اور سب بندگیاں بدن کی اور سب بندگیاں مال کی۔ سلامتی ہو تم پر اے نبی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے بندوں پر جو نیک ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود (عبادت کے لائق) مگر اللہ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے ہیں اس کے رسول ہیں۔

تشہد کی اس صورت کو ابن مسعودؓ نے بیان فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی اسی تشہد کو اختیار کیا ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت شدہ تشہد اختیار کیا ہے جو یہ ہے۔

اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوٰاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ ... الخ

[illegible] روایت کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔ "آنحضورؐ ہمیں تشہد اس طرح سکھاتے [illegible] قرآن کی کوئی سورت پڑھایا کرتے تھے۔" (مسلم)

[illegible] تشہد ابن عمرؓ [illegible] ہے اور اسے امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے۔

[illegible] اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰہِ الزَّاكِيَاتُ لِلّٰہِ الطَّيِّبَاتُ الصَّلَوٰاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ ... الخ

[illegible] دو رکعت والی نماز کے علاوہ ہر نماز میں تشہد [illegible] دوسری رکعت میں اور ایک مرتبہ آخری رکعت میں۔

[illegible] مسلمان فلسفیوں کے نزدیک علم منطق کی دو اقسام ہیں۔ ان [illegible] تصور [illegible] ایک تصور کا [illegible] ہے اور دوسری قسم تصدیق کا علم ہے۔ [illegible] منطق کی یہ تقسیم صرف یونانی فلسفیوں کے نزدیک نہیں ہے اور پہلی بار مسلمانوں [illegible]

کسی شے کی ماہیت کا ادراک بغیر اس کے کہ اس ماہیت پر حکم لگایا جائے، تصور ہے۔ [illegible] تصوری علم کا ذریعہ حد یا تعریف ہے اور جب دو یا دو سے زیادہ تصورات پر انہیں موضوع اور محمول کی حیثیت سے طرفین قرار دے کر نفی یا اثبات کا حکم لگایا جائے تو اسے تصدیق کہتے ہیں۔

اس نظریے کے مطابق تصور تصدیق پر زمانی اعتبار سے سبقت رکھتا ہے کیونکہ انسان کے ذہن میں خیالی تصور پہلے آتے ہیں اور بعد میں انہیں نفی یا اثبات کے حکم سے جوڑا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ جس رشتے سے تصورات ذہن میں جوڑے جاتے ہیں وہ بھی خارج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

اس نظریے پر ایک بہت بڑا اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ تصورات کے مابین جو حکمی نسبت قائم ہوتی ہے وہ کبھی یقینی ہوتی ہے اور کبھی ظنی اور جس کا جواب مطابقتی نظریہ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے بعد کے دبستانِ رواقیہ میں ایک نئے نظریے نے جنم لیا۔ جس کے مطابق ایک قضیے کے تصورات باہر تو خارج سے آتے ہیں لیکن ان کے مابین حکمی نسبت قائم کر کے تصدیق بنانا ذہن کا کام ہے۔ اس ذہنی فعل کو فلاسفہ رواقی تیقن اور تصدیق کا نام دیتے ہیں۔ اسلام میں متکلمین متاخرین میں ان دونوں نظریوں کا ملاپ ہوا اور نہایت ہی دل چسپ بحثیں پیدا ہوئیں۔

تصدیق کے معنی ذہنی نقطہ نظر سے علم دینیات میں نبی کی دعوت تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ ان معنوں میں تصدیق ایک قلبی فعل ہے۔ عام علماء اور متکلمین کے نزدیک یہ ایک اختیاری فعل ہے جس کا کرنا یا نہ کرنا انسان کے بس میں ہے۔ لیکن معتزلہ اور فلاسفہ کے نزدیک معتبر دینی تصدیق اور اعتقاد کی بنیاد عقلی معرفت پر ہے۔

تصوّف مسلم فکر کا ایک اہم مکتب۔ لغوی طور پر یہ لفظ بعض کے نزدیک صُوف سے نکلا ہے، جس کے معنی اُون کے ہیں۔ یعنی اون پہننے والے یا گدڑی پوش صوفی کہلائے اور ان کا فکر تصوّف ٹھہرا۔ بعض نے اسے صُفّہ سے مشتق ٹھہرایا ہے کیونکہ اصحاب صُفّہ نے اپنی زندگیاں خدمت دین کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ بعض اسے صفا (پاک) سے مشتق قرار دیتے ہیں اور بعض کے خیال میں یہ یونانی لفظ سوف سے نکلا ہے، جس کے معنی حکمت وغیرہ ہیں۔

تصوف کی ماہیت:۔ تصوف کی تعریف جامع و مانع نہیں ہے۔ ہر صوفی کے نزدیک اس کا مفہوم ذاتی ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں: "تصوف ایک صفت ہے، جس میں بندہ قائم ہے۔" کسی نے پوچھا۔ "بندہ کی صفت ہے یا خدا کی؟" آپ نے فرمایا: "وہ حقیقت میں خدا کی صفت ہے اور ظاہر میں بندے کی۔ یعنی درحقیقت تصوّف بندہ کی بشری صفت کے فنا ہونے کا تقاضا کرتا ہے تاکہ وہ خدا کی صفت کے ساتھ باقی رہے۔"

بقول ابوالحسن نوریؒ "تصوف نفس کی ہر لذّت کو چھوڑ دینا ہے۔" حصریؒ کے نزدیک "تصوّف مخالف کی کدورت (آلودگی) سے باطن کو پاک کرنا ہے۔"

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ یعنی سخاوت رضا، صبر، اشارہ، غربت، صوف پہننا، سیر، فقر۔ سخاوت حضرت ابراہیمؑ کی اقتدا ہے۔ رضا حضرت اسماعیلؑ کی اقتدا ہے۔ صبر حضرت ایوبؑ کا اتباع ہے۔ اشارہ حضرت زکریاؑ کا اتباع، غربت یحیٰؑ کی پیروی، سیاحت حضرت عیسٰیؑ کا، صوف پہننا حضرت موسیٰؑ کی پیروی اور فقر آنحضورؐ کی سنت ہے۔"

تصوف کیا ہے؟:۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوّف عملی طور پر وہ طریقۂ حیات ہے۔ جس کا مقصود ذات خداوندی سے بلا واسطہ رابطہ پیدا کرنا ہے۔ اس رابطے کے حصول کے لیے ہر شخص کو چند روحانی تجربات میں سے گذرنا پڑتا ہے، جنہیں وارداتِ قلب کہتے ہیں۔ صوفیا کا علم ان کے نفس کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے جسے مشاہدے یا کشف کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ علم مشاہدات اور واردات تک توصحیح رہتا ہے۔ لیکن اسے الفاظ کا جامہ پہنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ تجربات اور مشاہدات الفاظ و بیان کا جامہ پہن کر آتے ہیں تو نہ صرف صوفیاء بلکہ حکماء کے لیے بھی ایک الجھن کا باعث بن جاتے ہیں۔ تضادات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں، مختلف سوالات مثلاً خدا اور انسانوں کے مابین کس قسم کا تعلق ہے؟ وحدت اور کثرت کے ڈانڈے کس جگہ اور کس طرح ملتے ہیں؟ انسان لافانی اور ماورائے عقل ہستی کا مشاہدہ کس طرح کر سکتا ہے؟ محسوسات اور مشاہدات کی حد تک تو شاید انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ ہستی مطلق کا ادراک کامل کرے، لیکن جب بھی اس حقیقتِ مطلقہ کو الفاظ کا لباس پہنایا جائے گا۔ تو اس کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر سے اوجھل اور تفہیم سے ماورا ہو جائے گا۔ یوں صداقت میں کذب کی آمیزش ہو کر اختلافات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ان مشکلات سے بچنے کے لیے صوفیاء نے اصطلاحات کا سہارا لیا لیکن ان کی تشریح میں بھی اختلافات پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب اور مکتبِ فکر کے لوگوں نے ان وارداتِ تصوّف کو اپنے رنگ میں بیان کیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی، یہودی

یونانی، ہندی، چینی اور اسلامی تصوف ایک دوسرے سے بآسانی تمیز کیے جاسکتے ہیں۔

تصوف اور مذہب:- اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصوف نے مذہب کے ساتھ تعلق کیوں قائم کیا ہے؟ اور کن حالات میں صرف توحیدی مذاہب میں نمودار ہوا ہے۔؟ اس کا جواب اکثر یوں دیا جاتا ہے کہ ہر مذہب حقیقی معنوں میں تصوف ہے یا اس پر مبنی ہے۔ اگر تصوف سے مراد یا د خدا سے بلا واسطہ تعلق کا احساس ہے تو ہر مذہب کی بنیاد اسی اساس پر قائم ہے۔ اگر انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد اور محبت کو اہمیت نہ دی جائے تو مذہب محض چند بے جان رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم تصوف اور مذہب کے مابین تمیز کرسکتے ہیں مذہب انسان کے تمام داعیات و ضروریات کی تسکین چاہتا ہے۔ گویا داخلیت و خارجیت دونوں پہلوؤں سے مذہب زندگی پر حاوی ہوتا ہے، جبکہ تصوف سراسر داخلیت کا نمائندہ ہے اور داخلی وجذباتی زندگی ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوّف مذہب کے داخلی پہلو پر توجہ مرکوز کرنے اور اسے اس حد تک ابھارنے کا نام ہے کہ یہ مذہب سے جدا ایک مکتب کی صورت اختیار کرجاتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ تصوف مذہب سے بہت دیر میں جاکر پیدا ہوا اور وہ بھی توحیدی مذہب میں۔ کثرت پرستی میں انسان اور خدا ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ تھے۔ انسان کے دیوتا اس کی شکل وصورت میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ایسے اسطوری دور میں داخلیت یا تصوّف کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی پھر ایک دور آیا جس میں خدا کو علیم وبصیر ہونے کے ساتھ ساتھ لافانی، ماورا اور لامحدود اور انسان کو فانی، کمتر اور محدود قرار دیا گیا۔ یہ فرق اتنی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا کہ تصوّف ابھر ہی نہ سکا۔ تاہم اسی دور میں ہمارے سامنے وحی آتی ہے جو خدا اور انسان کے مابین اس دوئی کی خلیج کو پاٹ دیتی ہے۔ وحی انسان کو نصب العین بتاتی ہے۔ اس کے بتائے راستے پر چلنے سے یہ دوری ختم ہوجاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب نیک اعمال انفرادی سے سماجی صورت اختیار کرجاتے ہیں اور انسان ان احکام وحی کی پیروی محض ایک میکانکی طریقے سے کرنا شروع کردیتا ہے تو قلب میں ایک روحانی خلا باقی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ وہ دور ہوتا ہے جب تصوّف کا آغاز ہوتا ہے اور انسان اس کوشش میں مصروف ہوجاتا ہے کہ وہ دوئی اور کثرت کو ختم کرکے حقیقی وحدت تک جاپہنچے۔ گویا ایک طرح سے یہ اسطوری دور کی طرف مراجعت کا نام ہے جب دوئی ناپید تھی اور انسان کے ہر طرف، آمنے سامنے وحدت کار فرما تھی۔ لیکن وحی نے انسان اور خدا کے درمیان تمیز پیدا کردی اور من و تو کی تمیز پیدا ہوگئی، جسے ختم کرنے کے لئے تصوّف سامنے آیا۔ اگرچہ صوفیا وحی سے منکر نہیں ہوتے، لیکن وہ اپنے الہامات اور مشاہدات قلبی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وحی کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوتا اور انسان اور خدا کا تعلق کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوسکتا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تصوف کی صحیح اور اصل صورت اسلام اور داعیٔ اسلام کے بعد ہمارے سامنے آتی ہے۔ گویا تصوف کا آغاز بجا طور پر ختمِ نبوت کے بعد ہوتا ہے اور یوں انسان اور خدا کے تعلق کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

متصوفانہ واردات:- تصوّف کا بہترین مظہر وہ تجربہ ہے۔ جہاں صوفی ایک جذب وانہماک کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بالکل غافل ہوجاتا ہے۔ عام طور پر صوفیا نے اس تجربے کو بیان کرتے ہوئے اسے نور سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی جب وہ اس واردات کا تجربہ حاصل کرتے ہیں تو انہیں یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہر طرف سے ایک ملکوتی نور میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اسی نور کے باعث وہ حقیقت کا علم حاصل کرتے ہیں۔ یہ علم استدلالی نہیں بلکہ عینی ہوتا ہے۔ اس منزل میں آکر قرب خداوندی کا وہ احساس پیدا ہوتا ہے، جس کے لیے صوفیا نے حلول، اتحاد اور وصول کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس حالت میں خودی اور انفرادیت کا احساس کلی طور پر محو ہوجاتا ہے۔ اور انسان ہر شے کو فراموش کرکے صرف ذات خداوندی اور اس کے انوار کے مشاہدات میں منہمک ہوجاتا ہے۔ لیکن اس انہماک اور استغراق کے باعث صوفی ایک غیر معمولی قوت کا حامل ہوجاتا ہے۔ اس دیدار ذات کے بعد اس کی خودی میں کمال وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ پرانے تصورات اور محرکات تقریباً ختم ہوجاتے ہیں اور زندگی کا ایک عظیم تر دور شروع ہوجاتا ہے جس کے ملتے جلتے [illegible] مقاصد ہوتے ہیں۔

خودی اور نفی خودی:- عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تصوف نفی خودی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ تصوف [illegible] خود فراموشی پر [illegible] یہ نفسیاتی طور پر احساس خودی کے ایک بلند تر نصب العین کا نتیجہ ہے۔ [illegible] انسان اپنے سارے وجود کو خدا کے خلق کے حضور پیش کرتا اور اس [illegible] خواہاں ہوتا ہے تا کہ اس تمام سپردگی کے عمل [illegible] انسان کی [illegible] ہے اور یہ انفرادیت اور خودی کا اظہار ہے [illegible] کے خیال میں [illegible] خودی اور انفرادیت [illegible] وہ دنیا کی ہر پابندی سے بے نیاز اور ماورا ہوجاتا ہے [illegible] دوسرے واحد سے دوچار ہوتا ہے۔"

تصوف اور سائنس:- [illegible] سب سے زیادہ تجربیت پسند انسان [illegible] صوفی [illegible] کو ہر قسم کے تجربی معیار پر پرکھتا اور [illegible] ہے کہ وہ خالص معروضی حقیقت [illegible] اور یہی طریق کار سائنس کا ہے۔ اب سائنس کا [illegible] لگاتے اور ان تمام مشاہدات معروضات کی صورت [illegible] اور ذاتی رہتی ہیں [illegible]

ذاتی واردات اور [illegible]:- [illegible] اور تجربہ ناقابل بیان ہوتا ہے۔ [illegible] جو تو محسوس کرتا ہے اور الفاظ میں بیان [illegible] کا مواد محسوسات کی دنیا سے متعلق [illegible] ہوتا ہے۔ اس پر غور کرنے سے پتا چلے گا [illegible] جذباتی تجربہ بھی ذاتی ہوتا ہے [illegible] بعینہٖ دوسرے تک منتقل نہیں ہوسکتا [illegible] دوسرے کو سمجھانا محال ہے۔ عشق [illegible] وہ ایک ذاتی اور انفرادی کیفیت ہے [illegible] مثال بھی [illegible] مثلاً گلاب کے پھول کی خوشبو [illegible] کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ [illegible] محسوس نہ کرتا ہو [illegible] اور تشبیہات کا محتاج ہے۔ جبکہ تشبیہ کا [illegible] ایک انفرادی [illegible] اور یوں ہم پھولوں کی خوشبو کے متعلق اپنے احساسات اور خیالات [illegible] سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ [illegible] تجربہ ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے بیان میں اصطلاحات کا [illegible] ہوجاتا ہے۔ گویا جس حقیقت کا ادراک صوفی کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کے مادی لباس الفاظ

تشبیہات سے ماوراء ہوتا ہے۔

محبت اور فنا:۔ صوفی کا تعلق اس ذات باری کے ساتھ ایک گہرے جذبے پر قائم ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ اتنا جامع اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ اس میں کوئی اور جذبہ نہیں سما سکتا۔ اسے محبت اور عشق کا نام دیا گیا۔ ایسی محبت کی مثالیں اکثر صوفیاء کے ہاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اس محبت کی خاطر تمام دنیاوی تعلقات سے منہ موڑ لیا حتیٰ کہ بعض نے اولاد کی محبت کو بھی اس کے منافی جانا۔ تاہم بعض صوفیاء کے نزدیک اس محبت میں مخلوق سے محبت شامل ہے۔ صوفی جب محبت خداوندی سے سرشار ہوتا ہے تو اس کا ایک مظہر مخلوق خداوندی سے محبت بھی ہوتا ہے۔ جس کے باعث وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے۔

محبت ایک انفعالی جذبہ ہے۔ اسی بناء پر محققین کے نزدیک صوفی اپنے آپ کو کسی دوسری قوت کے ہاتھ میں ایک آلہ کار سمجھتا ہے۔ اس کے اعمال اور اقوال گویا اس کے اپنے نہیں بلکہ دوسری شخصیت کے ہیں۔ لیکن یہ انفعالیت [illegible] ہوتی ہے، جو بہت جلد ایک اعلیٰ فعالیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ [illegible] کیفیتوں کے مجموعے کا نام بن جاتی ہے۔ وادی حالت میں [illegible] جسے صوفیاء فنا کا نام دیتے ہیں۔ اس میں من و تو کی تمیز ختم [illegible] اور وحدت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اسی بناء [illegible] وحدت الوجود کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس احساس کے [illegible] کم نہیں کر دیا بلکہ اس میں ایک عمیق ترین تخلیقی [illegible] جسے وہ معرفت پیش کرتا ہے اور لوگوں کو نئی [illegible] کے نزدیک صوفی یوں محسوس کرتا ہے گویا اس ذات [illegible] تمام وجود میں سرایت کر رہی ہے اور اس کے سارے [illegible] بلکہ اس محبت سے وہ تمام انسانوں سے [illegible] کا عکس اس کی ذات میں منعکس ہو کر اسے [illegible] جس کے [illegible] انسانیت سے محبت، [illegible] وہ [illegible] جو برگساں کی نظر میں مذہب کو جمود، سکون اور [illegible] زندگی اور حرکت بخشتے ہیں۔

تصوف قبل از اسلام:۔ تصوف کی ابتداء کے بارے میں واضح طور پر [illegible] مشکل ہے۔ شاید اس نے سب سے پہلے فارس میں اپنا مقام بنایا۔ [illegible] عقائد رفتہ رفتہ دنیا بھر میں پھیلتے چلے گئے اور پھر ایک طرف تو شام اور مصر کی راہ سے یونان میں اور دوسری طرف چین اور ہندوستان میں داخل ہوئے۔ تاہم وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تصوف کا بنیادی ماخذ کہاں ہے۔ مختصراً یونانی، چینی عیسائی، یہودی اور پھر اسلامی تصوف کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یونانی تصوف:۔ یونان میں صوفیانہ تصورات کا آغاز ایک نیم دیومالائی شخص آرفیئس سے ہوتا ہے اس وقت مغربی ایشیا میں سامی افکار اور زرتشتی عقائد پھیلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے رفتہ رفتہ عمومی رسوم کی صورت اختیار کر لی۔ فلسفیانہ افکار نے عقلیت پسند ذہنوں کو ان رسوم سے بدگمان کر دیا۔ انہوں نے ایک طرف تو خیر و شر کی پائدار اقدار کی تلاش شروع کر دی تو دوسری طرف شر سے محفوظ رہنے کے طریقوں کو تلاش کیا۔ اسی ماحول میں آرفیئس کی باطنی رسوم نے جنم لیا۔ اس نے زہد و اتقاد کو بنیاد قرار دے کر ذاتی تجربے اور اس کی فکری توجیہات کی اشاعت شروع کی اس نے تاریخ میں پہلی بار خانقاہیں قائم کیں۔ اس سے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ اگر روح جسم کی بندشوں اور مادی حدود سے آزاد ہو جائے تو اس کی قوتوں میں بے حد اضافہ ہوگا۔ اسی چیز نے تصوف اور رہبانیت کا آغاز کیا۔ ان کے ہاں آواگون کا فلسفہ بھی کارفرما تھا، جو ہو سکتا ہے کہ ہندی اثرات کے تحت وہاں پہنچا ہو۔ آرفیئس کے بعد یونانی شاعر پنڈار ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس نے جنت کا تصور بھی پیش کیا۔ اس سے فیثاغورث، سقراط اور افلاطون بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ فیثاغورث نے ان رسوم میں نیت اور روح کو بے حد اہمیت دی۔ آرفیئس کے نزدیک نجات کے لئے مجاہدہ اور ریاضت کافی ہے۔ جس میں فنا یا قرب الٰہی کا مقام بھی آتا ہے۔ فیثاغورث نے اس مقصد کے لئے جذبات کی برانگیختی کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ تاہم وہ بھی آواگون کا قائل رہا۔ آرفیئس کے نزدیک روح جسم میں مقید ہے اور یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی فطری نورانیت سے محروم ہو گیا ہے۔ جبکہ فیثاغورث نے اسے انسان کی بھلائی اور عروج وارتقاء کا ایک ذریعہ سمجھا، اور اسے بلندترین روحانی قوتوں کے حصول کا ایک ذریعہ جانا لیکن یہ بھی کہا کہ افزائش نسل کا سلسلہ ختم کرنا چاہیے تاکہ انسان مادی دنیا کی قید سے نجات حاصل کر سکے یونان کے بعد اسکندریہ میں نوفیثاغورثی فلسفہ قائم ہوا۔ جس کی رو سے خدا روح اور جسم میں مختلف چیزیں ہیں۔ خدا نے روح کو جو خیر مطلق تھی، جسم میں مقید کر دیا ہے، جو شر ہے چنانچہ جسمانی جذبات اور خواہشات پر قابو پانا ہی روح کی معراج ہے۔ چنانچہ اس کے حصول کے لئے زہد، عبادت اور صوفیانہ رسوم کو رواج دیا گیا۔

فیثاغورث کے بعد یونان کا بڑا فلسفی فلاطینوس تھا۔ اس کے نزدیک خدا ہر شئے سے بالا اور ماوراء ہے۔ اس کے نزدیک دو عالم ہیں۔ ایک محسوسات اور دوسرے معقولات کا۔ روح محسوسات کے عالم سے تعلق رکھتی ہے اور انسان کی بلندترین حیثیت کا انحصار صرف روح پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تصویر کشی کا مخالف تھا۔ اس فلسفی صوفی کا اثر ہمیں عیسائی، یہودی اور اسلامی تصوف پر بے حد ملتا ہے۔

یہودی تصوف:۔ یہودیوں کے ہاں ظاہری رسوم کی پابندی کو زور دیا گیا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہاں تصوف پنپ نہ سکا۔ یونانی اثرات کے تحت یہودیوں کے ہاں بھی تصوف نے جنم لیا۔ جس کا بہترین نمائندہ حکیم فیلو ہے۔ اس نے مذہب اور فلسفہ دونوں کا مطالعہ کیا اور ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گویا وہ ایک طرح سے متکلمین میں سے تھا۔ اس کے بعد یہودی تصوف زیادہ تر اسلامی تصوف کے زیر اثر پیدا ہوا، جسے قبالہ کا نام دیا گیا ہے۔ عام طور پر یہودی تصوف میں خدائے خالق اور خدائے مطلق کے دو جداگانہ وجود ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک تورات کا خدا خدائے خالق ہے لیکن حقیقی خدا اس سے ایک علیحدہ ہستی ہے۔ جو انسانوں کی عقل سے ماوراء ہے۔ لسے خدائے خالق کو انہوں نے حقیقی خدا کا مشاہدہ مرکبہ قرار دیا۔ چنانچہ ان کا تصوف مشاہدۂ عرش تک محدود رہا۔

عیسائی تصوف:۔ عیسائی تصوف کی بنیادیں بابلی اور مصری باطنیت میں گھڑی ہوئی ہیں۔ بابلی صوفیاء کے نزدیک کائنات کے تمام واقعات نہ تو قوانین فطرت اور نہ انسانی ارادے سے ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ دیوتاؤں کے فیصلے کا نتیجہ ہیں۔ یہ دیومالائی فیصلے باطنی اسرار ہیں، جو انسان ایک خاص قسم کے عمل سے پا سکتا ہے۔ اسی بناء پر بابل میں صوفیانہ حلقے قائم ہوئے۔ یہی چیز یونان میں دیومالا کی صورت اختیار کر گئی۔ ادھر بابل اور مصر میں اس چیز نے نجوم اور دیگر خرافات کی صورت اختیار کر لی ایران سے اہرمن اور یزدان کی کشمکش کا فلسفہ بھی بابل میں آن وارد ہوا۔ ان تمام فلسفوں کے معجون مرکب نے مصر کے باطنی نظام پر اثر ڈالا۔ اور یوں وہاں تصوف

کا رواج ہوا۔ ہرمیس کے نوشتے قدیم صوفیانہ تحریک میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہرمیس فیلو کا ہمعصر تھا۔ اس کے نزدیک انسان فطری طور پر لافانی اور ابدی وجود ہے۔ چونکہ وہ مادی دنیا میں ملوث ہو چکا ہے، اس لئے اس کی ابدیت ختم ہو گئی اور وہ موت کا شکار ہو گیا۔ جنسی عمل اور توالد و تناسل ہی ہبوطِ آدم کا باعث ہے۔ اس لعنت سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے کہ انسان مادی اور جسمانی تقاضے پوری طرح دبا دے۔ ہرمیس کے نزدیک وہ انسان جو علم رکھتا ہے وہ خدا کی مانند ہے اور موت اسے کبھی نہیں چھوئے گی۔ یہ علم خیر و شر کی تمیز کا علم نہیں۔ بلکہ اپنے نفس کا عرفان ہے اور یہ عرفان تقوے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات خدا اور انسان کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ کائنات خدا کی شبیہ کا عکس ہے۔ اور انسان اس کائنات کی پیدائش ہے۔ انسان اس وسیلے کے بغیر خدا کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہی تصورات بعد میں عیسائیت نے اپنائے۔ اور انہوں نے کائنات کی بجائے مسیح کو وسیلۂ نجات قرار دے دیا۔

عیسائیت میں مذہب کا تصور بالکل داخلی اور ذاتی ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ حواریٔ مسیح کے لقب سے بہت سے صوفیا حضرت عیسیٰؑ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے اس فقرے "آسمانی بادشاہت تمہارے اندر ہے جو کوئی اپنے نفس کو پہچان لے گا۔ وہ اسے پا لے گا" سے عیسائی تصوف کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تصوف کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان بلا واسطہ خدا کے ساتھ تعلق قائم نہیں کر سکتا اور یہ واسطہ صرف مسیحؑ ہے، جبکہ اسلام نے خدا اور بندے کے درمیان کسی کو واسطہ نہیں ٹھہرایا۔

عیسائی تصوف کا بانی پولوس ہے۔ اس نے اپنے مکاشفے کے بعد سے اپنی تعلیمات کی تبلیغ کی۔ حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے متعلق اس نے جو تصور پیش کیا، وہ یونانی فکر، یہودی اور مروجہ مشرکانہ مذاہب کے تصورات کی آمیزش تھی۔ اس کے نزدیک عیسیٰؑ ایک روحانی وجود ہے، نورانی، مختارِ کل، سب دلوں کے خفیہ راز سے واقف ہے۔ وہ سب انسانوں کے لئے قابلِ پرستش ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ خدا کی طرح لوگوں پر فضل کی بارش کرے۔

پولوس کے بعد دوسری اہم شخصیت کلیمنٹ ہے۔ وہ یونانی فلسفے اور تمام قدیم و جدید مذاہب سے پوری طرح آشنا تھا۔ اس کے نزدیک خدا کا تصور بالکل سلبی ہے۔ جس میں فلاطینوس کا اثر نمایاں ہے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے وہ تین منزلیں بتاتا ہے۔ پہلی منزل طہارت ہے جس میں انسان خود کو نفسانی خواہشات سے آزاد کر لیتا ہے۔ دوسری منزل منطقی تجزیہ ہے۔ یہ ایک عقلی علم ہے، جس میں انسان مادی اشیاء کو ان کی صفات سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ تیسری منزل میں مسیح کی وسیع ذات میں داخل ہوتا ہے اس سے بھی ہمیں یہ علم نہیں ہو گا کہ خدا کیا ہے۔ البتہ ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ وہ کیا نہیں ہے۔ یہ علم سلبی ہو گا۔ اثباتی نہیں۔

عیسائی تصوف کی دوسری اہم شخصیت آگسٹائن ہے۔ اس نے عیسائیت، مانویت، فلسفہ اور سائنس غرضیکہ ہر علم اور مکتبِ فکر کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ انسان فطرتاً گناہگار ہے اور نیکی و بدی اختیار کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات شر انگیز نہیں اور اگر کوئی شخص انہیں پورا کرتا ہے تو وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ عیسائیت میں قنوطیت اور رہبانیت نے جنم لیا۔ آگسٹائن کے نزدیک جذب و مشاہدے کا راستہ انسانی زندگی کا بہترین اور بلند ترین مقصد ہے اور یہ مشاہدہ اسی دنیا میں ممکن ہے۔

اسلامی تصوف

آغاز:۔ اسلام میں تصوف کی اصطلاح غالباً تیسری صدی ہجری میں اہلِ بغداد نے رائج کی تھی۔ امام قشیری کے بقول یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں جاری ہوا۔ اس کا سرچشمہ آنحضورؐ کی ذات مبارک ہے۔ اور آپ ہی سے یہ علم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کو ملا۔ ان سے حضرت سلمان فارسیؓ اور حسن بصریؒ نے استفادہ کیا۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلا شخص جسے صوفی کے لقب سے نوازا گیا، کون تھا۔ بقول صاحب "کشف الظنون" سب سے پہلا صوفی ابوہاشم تھا۔ جنہوں نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی بقول مولانا جامی وہ شخص جس نے سب سے پہلے تصوف کی تعلیم دی۔ ذوالنون مصری تھے، جس کا انتقال ۲۴۵ھ میں ہوا۔

صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگی کی بنیاد خوفِ خدا اور رسولؐ کی محبت پر رکھی تھی۔ سادگی میں تمام صحابہ اعلیٰ رتبے کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں شریعت اور طریقت یعنی دین اور تصوف دو جداگانہ چیزیں نہ تھیں۔ رفتہ رفتہ جب سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا تو علوم و علماء ظاہری اور باطنی اصطلاحات [illegible] تمیز کی جانے لگی۔ اور تصوف کو شریعت سے ہٹ کر ایک جداگانہ حیثیت حاصل ہو گئی۔

صوفیا کے نزدیک اسلامی علوم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ظاہری علوم سے مراد شریعت ہے اور باطنی علوم سے مراد علمِ تصوف ہے۔ رفتہ رفتہ عام مسلمانوں اور صوفیوں کے نظریات میں نمایاں فرق ہوتا چلا گیا۔ علماء کی تمام تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ ظاہری یا خارجی عنصر کی اصلاح کی جائے۔ لیکن صوفیوں کے نزدیک نفس و روح کی تطہیر ہی قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

[illegible]:۔ اسلامی تصوف شروع ہی میں دو گروہوں میں تقسیم [illegible] ہمہ الٰہی (ہمہ اوستی) صوفیا اولین صوفیا پر نو فلاطونیت [illegible] کے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ الٰہی صوفیا تھے۔ بعد ازاں جب زرتشتی [illegible] ہندی اور بدھی اثرات اسلام میں شامل ہوئے تو ہمہ الٰہی صوفیا [illegible] بسطامیؒ کے زمانے سے اسلامی تصوف کے دھارے نے ہمہ اوستیت کی طرف [illegible] شروع کر دیا۔ حضرت بایزیدؒ، حلاج، قشیری، شہاب الدین سہروردی [illegible] عبدالکریم جیلی ہمہ الٰہی تھے۔

مشہور صوفیا:۔ اسلامی تصوف کے ہزاروں بے شمار مسلم صوفیا [illegible] مندرجہ ذیل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حضرت علیؓ (وفات ۶۶۱ء)، حضرت رابعہ بصری [illegible] بایزید بسطامیؒ (۸۷۴ء)، ابراہیم بن ادھمؒ (۸۰۰ء)، جنید بغدادی [illegible] حلاج (۹۲۱ء)، ابوبکر شبلیؒ (۹۴۴ء)، قشیریؒ (۱۰۷۲ء)، عبدالقادر جیلانی [illegible] سہروردیؒ (۱۱۹۱ء)، فرید الدین عطارؒ (۱۲۲۹ء)، ابن عربی (۱۲۴۰ء)، رومی [illegible] (۱۴۳۲ء)، بہاء الدینؒ (۱۳۸۹ء)، عبدالکریم جیلی (۱۴۰۶ء)، جامی (۱۴۹۲ء) [illegible] میں علی ہجویری داتا گنج بخشؒ (۱۰۷۲ء)، خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۲۳۰ء)، بختیار کاکی (۱۲۳۶ء)، فرید الدین گنج شکرؒ (۱۲۶۵ء)، نظام الدین اولیاءؒ (۱۳۲۵ء) [illegible] (۱۶۲۴ء) وغیرہ اہم ہیں۔

تصانیف:۔ مسلمان صوفیا بڑے عالم فاضل ہستیاں ہوتے تھے۔ ہر وقت ان کے گرد طالبانِ علم کا ہجوم رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مختلف کتابیں لکھیں۔ ان کی اہم ترین تصانیف یہ ہیں۔

"اللمع فی التصوف" از ابونصر سراج (وفات ۹۸۸ء)، "کشف المحجوب" از داتا گنج بخشؒ، "رسالہ قشیریہ" از قشیری، "احیاء العلوم" از غزالی، "عوارف المعارف" از شہاب الدین سہروردی، "منطق الطیر" از فرید الدین عطار، "فتوحاتِ مکیہ" از

"فصوص الحکم" از ابن عربی۔ "حدیقہ" از حکیم سنائی۔ "مثنوی" از رومیؒ۔ "گلشن راز" از شبستریؒ۔ "انسان کامل" از عبدالکریم جیلی "لمعات" اور "لوامع لوائح" از جامی۔ "کتاب التعرف" از امام کلا باذی۔ "مکتوبات امام ربانی" از احمد سرہندیؒ وغیرہ۔

تعلیمات :- صوفیوں کا نقطۂ نظر مختصراً یہ ہے کہ ہستی باری تعالےٰ ایک لامعرف، غیر تعین پذیر، غیر انقسام پذیر اور ماورائے ادراک وحدت۔ اکثر صوفیاء یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا عین حسن ہے۔ جسے اصطلاحاً کمال کہتے ہیں۔ اور بعض ارادے کو، بعض نور کو اور بعض علم کو اللہ تعالےٰ کا عین قرار دیتے ہیں۔ پہلے مکتب خیال کے پیرو شفیق بلخی، ابراہیم بن ادھم اور رابعہ بصری ہیں۔ دوسرے مکتب فکر کے پیرودں میں ممتاز ترین شخصیت ابن منصور حلاج کی تھی۔ تیسرا مکتب شہاب الدین سہروردی کا اور چوتھا مکتب فکر ابن عربی کا ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ کی صفات اس کے عین سے الگ ہیں۔ یہ اس کی وحدت انعکاسات یا جلوہ ہائے ذات ہیں۔

جہاں تک دنیائے حقیقت کا تعلق ہے یہ ایک عکس اور باری تعالیٰ کی صفات ہمہ تن عین العین پہ مشتمل ہے۔ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ اس کی برعکس تمام اشیاء چونکہ ہستی باری تعالےٰ کے انعکاسات، صدورات یا حسب مراتب صفا اس کے کمال یا حسن کی تجلیات ہیں، وہ فی نفسہا اپنی اصل سے قرب و بعد کے اعتبار سے حسین [illegible] ہیں۔

روح انسانی بھی اللہ تعالےٰ کا ایک صدور ہے، جیسے شعاع آفتاب کی صدور ہے جیسے شعاع عمل اشعاع سے پہلے آفتاب کے ساتھ ایک تھی۔ اس طرح روح انسانی بھی روح بننے سے پہلے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک تھی۔ مادّے کے ساتھ ملنے سے جس طرح اتصال نے ذرات گرد و غبار کے ساتھ شعاع نور کے اتصال کی طرح اسے ایک ممیز شکل دے دی ہے۔ انسان ایک کائنات اصغر ہے۔ جس میں باری تعالےٰ کی تمام صفات ناتمام صورت میں جلوہ گر ہیں۔ اسی لئے کائنات میں انسان کا مقام کیا اور بے عدیل ہے۔

بھٹکے کی طرح انسان بھی اپنی اصل میں دوبارہ آ جانے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ یہ اضطراب و بے قراری، در جہ اشکال سے گذر جانے کے بعد یہ تڑپ، اور حسن کامل کے ساتھ مل کر ایک ہو جانے کی یہ تمنا ہی دراصل عشق ہے۔ عشق ہی تمام مذاہب کی روح رواں ہے۔ لہذا اللہ تعالےٰ کا مقام نہ مندر ہے، نہ مسجد اور نہ کلیسا بلکہ وہ تو قلب انسانی ہے۔

عشق کا مقصود حقیقی جمال الٰہی ہے۔ لیکن اس حد تک پہنچنے کے لئے صوفی پر لازم ہے کہ وہ پہلے حسانِ عالم سے عشق کرے اور ان کے مراقبے میں رہے اور ایسے عمل کرے جو محبوب کے پسند خاطر ہوں۔ سلوک کی راہ میں صوفی متعدد منازل و احوال سے گذرتا ہوا جب محبوب کے حسن کامل کے حضور میں پہنچا دیتا ہے تو اس وقت تمام صفات زائل ہو جاتی ہیں اور صوفی کی ہستی اپنے محبوب حقیقی کی ہستی میں مل کر ایک ہو جاتی ہیں

جنت وصل یا تقرب کا سرور ہے اور جہنم درد کا نام ہے۔ صوفی اس راہ کے تمام شدائد و مصائب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ کیونکہ اس کا نزول اس کے محبوب کی طرف سے ہوتا ہے۔ صوفی پر لازم ہے کہ محبوب میں فنا ہو جانے کے لئے، محبوب کی تقلید کرے۔

طریقہ تصوّف :- چونکہ انسانی زندگی کا مقصد تلاشِ حق ہے اور حق روشنی اور تاریکی کے ستر ہزار پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس لئے حق کے متلاشی کے لئے ضروری ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے نہایت ریاضت اور محنت سے کام لے۔ حق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے صوفیاء نے سات منزلوں کے نام بتائے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں :-

(۱) عبودیت (۲) عشق (۳) ایذاء (۴) معرفت (۵) وجد (۶) حقیقت اور (۷) وصل۔

اس روحانی سفر میں طالب حق جسے اصطلاح میں سالک کہا جاتا ہے۔ یہ سات منازل طے کرتا ہے۔ بعض صوفیاء نے چار منازل گنوائی ہیں۔

(۱) شریعت (۲) طریقت (۳) معرفت اور (۴) حقیقت یہاں شریعت سے مراد اطاعت خدا اور اطاعت رسولؐ ہے۔ عبادت کے ذریعے انسانی ذہن کی جلا ہوتی ہے۔ اس کے بعد سالک دوسرے مرحلے یعنی طریقت میں داخل ہوتا ہے جس میں شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ ایسے ایک مرشد کی تلاش کرنا چاہیئے جو اسے ضبط نفس کی تلقین کر سکے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر طالبِ حق تیسری منزل یعنی معرفت میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کا قلب اس قابل ہو جاتا ہے کہ حق کا علم حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی چوتھی اور آخری منزل حاصل ہو جاتی ہے، جو حقیقت ہے۔

اس سفر میں سالک کو ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی اطاعت اسی طرح کرنا ہوتی ہے، جس طرح محبوبِ حقیقی کی۔ راہِ عشق میں کوئی منطق نہیں چلتی یہاں بلا چون و چرا تعمیل حکم کرنا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک رہبر ناقص اسے راستے سے بھٹکا دے۔ اس لئے اس پر لازم ہے کہ ایک سچے راہبر کی تلاش کرنے میں اپنی پوری سمجھ بوجھ سے کام لے اور اس کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط ملحوظ رکھے۔

الٰہی صوفیا فنا فی اللہ کی باتیں نہیں کرتے بلکہ وہ تجلی رب یا تقرب الٰہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مرشد کی تعلیم کا پہلا زینہ ریاضت اور مجاہدہ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں اصولی اور تفصیلی مجاہدہ۔ اصولی کے اصول چار ہیں۔ قلت کلام۔ قلت طعام، قلت منام قلت اختلاط مع الانام۔ مجاہدہ تفصیلی کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اخلاقِ حمیدہ حاصل کرنا۔ دوسری قسم اخلاقِ ذمیمہ سے بچنا۔ اخلاقِ حمیدہ یہ ہیں۔

۱۔ توبہ :- گناہ کو یاد کرکے افسوس کرنا اور نادم ہونا اور ترک کر دینے کا عہد کرنا۔

۲۔ صبر :- ہوائے نفسانی پر غالب آنا۔

۳۔ شکر :- نعمت کو منعمِ حقیقی کی طرف سے سمجھنا اور پھر خوش ہو کر اس کی اطاعت کرنا۔

۴۔ رجا :- فضل اور مغفرت اور جنت و نعمت کے انتظار میں قلب کو راحت ہونا اور ان کے حصول کی کوشش کرنا۔

۵۔ خوف :- عتاب و عذاب کے خیال سے دل کو دردمند کرنا۔

۶۔ زہد :- فانی چیزوں کی خواہشات کو ترک کرکے آخرت کی طرف مائل ہونا۔

۷۔ توحید :- یہ یقین رکھنا کہ بدون ارادہ خدا کے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

۸۔ توکل :- صرف وکیل یا کارساز پر قلب کا اعتماد رکھنا۔

۹۔ محبت :- طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس سے حقیقی لذت حاصل ہو

۱۰۔ شوق :- محبوب کو اس کے کمال کے ساتھ دیکھنے کی خواہش کرنا۔

۱۱۔ انس :- محبوب کی معلومہ وجوہ پر نظر کرکے قلب کو سرور حاصل ہونا۔

۱۲۔ رضا :- حکم قضاء پر اعتراض نہ کرنا۔

۱۳۔ نیّت :۔ دل کا ایسی چیز کی طرف ابھرنا جسے اپنے نفع کے موافق سمجھنا۔
۱۴۔ اخلاص :۔ اطاعت میں صرف اللہ کے تقرب ورضا کا قصد رکھنا۔
۱۵۔ صدق :۔ جس مقام کو حاصل کریں، اسے کمال تک پہنچائیں۔
۱۶۔ مراقبہ :۔ ذات پاک کا دل سے دھیان رکھنا۔
۱۷۔ فکر :۔ معلومات سابقہ کو ملا کر غیر معلوم باتوں تک پہنچنا۔

اخلاق ذمیمہ جن سے بچنا لازم ہے :

۱۔ آفاتِ لسان :۔ فضول تکرار، گالی گلوچ، بدگوئی، لعنت، خوشامد جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنا۔
۲۔ شہوت :۔ بطن وفرج کی لذات۔
۳۔ غضب :۔ انتقام لینے کے لئے دل کا جوش میں آنا۔
۴۔ حقد :۔ دل کی گرانی جو انتقام نہ لے سکنے کی صورت میں قائم رہتی ہے۔
۵۔ حسد :۔ کسی کی اچھی حالت دیکھ کر جلنا اور اس کے زوال کا خواہاں ہونا۔
۶۔ حُبِّ دنیا :۔ ان دنیوی اشیاء کی خواہش، جن سے آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو۔
۷۔ بخل :۔ شرعاً لازم مصارف میں تنگی کرنا۔
۸۔ حرص :۔ مال وغیرہ کے ساتھ دل کو لگانا۔
۹۔ حب جاہ :۔ لوگوں کے نزدیک قابل تعظیم بننے کی خواہش کرنا۔
۱۰۔ ریا :۔ شہرت اور نیک نامی کی غرض سے لوگوں کو دکھا کر طاعت کرنا۔
۱۱۔ تکبر :۔ خود کو صفات کمال میں دوسروں سے بڑا سمجھنا۔
۱۲۔ عجب :۔ اپنے کمال کو اپنی طرف منسوب کرنا اور زوال کا خوف نہ کرنا۔
۱۳۔ غرور :۔ کسی نفسانی خیال پر طبیعت کا مائل اور قلب کا مطمئن ہونا۔

تصوّف کے مختلف سلسلے

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں صوفیاء نے تزکیہ نفس کے مختلف طریقے وضع کئے جو سلسلہ یا خانوادہ کہلاتے ہیں۔ ان سلسلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن کی آگے چل کر کئی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر شاخ کا ایک بانی ہے۔ ہر سلسلے کا منبع حضرت علیؓ کی ذات ہے۔ صرف ایک سلسلہ نقشبندیہ ایسا ہے جس کی ابتداء حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتی ہے۔

زیادہ مشہور سلسلے یہ ہیں :۔

سلسلۂ قادریہ :۔ اس سلسلے کے بانی عبدالقادر جیلانیؒ ہیں انہوں نے اس سلسلے کی بنیاد مشہور صوفی حضرت جنیدؒ کی تعلیمات پر رکھی۔ اس سلسلے میں درود شریف پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ سماع کے خلاف ہیں۔ ذکر جلی اور ذکر خفی دونوں کو جائز سمجھتے ہیں۔

سلسلۂ نقشبندیہ :۔ اس کے بانی خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندی ہیں۔ اس کی بنیاد بایزید بسطامیؒ کی تعلیمات پر رکھی گئی۔ پاک و ہند کے مسلمان اس سلسلے سے خواجہ باقی باللہؒ کے ذریعے متعارف ہوئے۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے اس سلسلے کو مزید ترقی دی۔ یہ لوگ مراقبے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سماع کے مخالف ہیں اور اذکار میں بھی ذکر خفی کو جائز سمجھتے ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ :۔ اس سلسلے کی بنیاد خواجہ علو دیناوری ہیں۔ لیکن اس سلسلے کو اصل شہرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وجہ سے نصیب ہوئی پاک و ہند میں یہ سلسلہ خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کی وجہ سے مقبول ہوا۔ اس سلسلے میں کلمہ شہادت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اور خاص طور پر لفظ اللہ کے ورد کی بڑی تاکید کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک سماع جائز ہے۔

سلسلۂ سہروردیہ :۔ اس سلسلے کے بانی ابوالنجیب سہروردی ہیں ہیں۔ اس سلسلے میں سانس بند کرکے اللہ ہو کہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ یہ لوگ سماع کی جگہ تلاوت کلام پاک پر زور دیتے ہیں۔ ذکر جلی اور خفی دونوں طریقوں سے کرتے ہیں۔

اسلام تصوّف اور دیگر مذاہب

اسلامی فرقے اور تصوّف :۔ اسلامی فرقوں میں سب سے پہلے خارجیوں نے تصوّف سے عداوت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد امامیہ فرقوں یعنی زیدی، اثنا عشری اور غلاۃ نے تیسری صدی ہجری میں تصوّف کے مسلمان کی مذمت کی۔ اہل سنت والجماعت نے صوفیا کے خلاف اپنا طرز عمل ظاہر کرنے میں مفاہمت [illegible] سے کام لیا۔ اور نہ ہی وہ کبھی تصوف کو مطعون کرنے کے سلسلے میں متفق [illegible] ہوئے۔ ان میں صرف دو گروہوں نے تصوّف کو ہدف ملامت بنایا۔ ایک تو حشویہ نے دوسرے معتزلہ اور اہل ظاہر نے۔ لیکن بہ حقیقت ہے کہ اہل سنت [illegible] نے معتدل تصوّف کو کبھی اسلام سے خارج [illegible] ہمیشہ [illegible] اور عبادات کے معاملے میں ابن ابی الدنیا کے تصوف [illegible] ابوطالب مکی کی قوت القلوب، امام غزالی کی احیاء العلوم اور علی ہجویری [illegible] سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کی ہے۔

دیگر مذاہب پر اثر :۔ جہاں اسلامی تصوّف نے دیگر مذاہب [illegible] مکاتب فکر سے اثر قبول کیا، وہیں اپنے مخصوص طرز فکر سے دیگر مذاہب [illegible] کیا۔ گولڈزیہر کے خیال میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمان صوفیوں [illegible] ہندو فلسفیوں اور جوگیوں میں اسلام کے بنیادی تصورات [illegible] اور اخوت انسانی) اثر پذیر ہوئے۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں [illegible] کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اسلام ہندومت سے متاثر ہوا ہو لیکن [illegible] اسلام ہی کی طرف سے داخل ہوئی رکھتی۔ شنکر، رامانج، مہادیو [illegible] دادو، بیرچھان، لال داس، بابا لال، نامدیو اور چیتنیہ جیسے ہندو فلسفی [illegible] کے زیر اثر آگے بڑھے۔

یورپی تصوف پر بھی اسلامی تصوّف نے دور رس اثرات چھوڑے [illegible] کتاب "ڈیوائن کامیڈی" ابن عربی کی فتوحات مکیہ کے زیر اثر [illegible] صلیبی کی نظمیں مسلمان صوفیوں سے حاصل کردہ فکر و تخیل [illegible] صدی میں ریمانڈ لل کی متصوفانہ تحریریں بقول آربری مسلم صوفیانہ فکر [illegible] فارسی کی صوفیانہ شاعری نے گوئٹے پر جو اثرات مرتب کئے وہ عیاں [illegible] چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمی تصوف کی ارتقائی صورت [illegible] اور اس نے عالمی تصوّف کی راہ موڑنے اور متعین کرنے میں [illegible]

تصویر شکل، صورت، شبیہ۔ اسلام میں تصاویر کی حرمت آنحضورؐ کے [illegible] ارشادات، صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہا نے اسلام کے [illegible] کی رو سے مسلّم قانون ہے۔

ابو محمد ہذلیؒ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ ایک جنازے میں شریک تھے۔ آپؐ نے فرمایا تم لوگوں میں سے کون ہے جو جا کر مدینہ میں کوئی بت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جسے زمین کے برابر نہ کرے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا میں اس کے

لیے حاضر ہوں چنانچہ وہ گیا مگر اہل مدینہ کے خوف سے یہ کام کیے بغیر پلٹ آیا پھر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں جاتا ہوں آنحضورؐ نے فرمایا اچھا تم جاؤ حضرت علیؓ گئے اور واپس آکر انہوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو، کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کر دیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ (مسلم و مسند احمد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ رحمت کے فرشتے کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔" (مسلم، ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا پھر آپؐ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا (مسلم، بخاری)

اسی مضمون کی کئی اور احادیث ہیں جن سے تصویر کی حرمت ثابت ہے۔ تصاویر کے بارے میں آنحضورؐ نے آخر کار امت کے لیے جو ورثہ چھوڑا اس کا پتا صحابہ کرامؓ کے اس عمل سے چلتا ہے جو انہوں نے اس معاملے میں اختیار کیا۔ کیونکہ اسلام کے مسلمہ اصولوں میں معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد آنحضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو اور آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ کا کسی طریقے پر عمل کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ نے امت کو اسی طریقے پر چھوڑا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں (بخاری: کتاب الصلوٰۃ)

حنش الکنانی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی پولیس کے کوتوال سے کہا تم جانتے ہو کہ میں کس مہم پر بھیج رہا ہوں؟ اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا، یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور قبر کو زمین کے برابر کر دوں۔" (مسند احمد)

ابن عربیؒ نے لکھا ہے کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر اجماع ہے قطع نظر اس کے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف بچیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔

امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیے پر اگر تصویر ہو تو اسکے استعمال کی اجازت ہے مگر دیوار یا چھت پر جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا اعزاز ہوگا۔ بخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے رہے گی۔

حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ زمانہ تابعین کے علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ فرش اور تکیے میں تصویر کا ہونا اس (تصویر) کے لیے باعث ذلت ہے نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اونچی جگہ پر لگائی گئی تصویر حرام اور قدموں میں جسے پامال کیا جائے، جائز ہے۔ (فتح الباری)

تعز : جنوبی عرب کا ایک شہر۔ جو سطح سمندر سے ۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور جبل صبر کی شمالی ڈھلان پر تعمیر کیا گیا ہے۔ ترکی عہد حکومت میں یہ شہر تعزیہ کے سنجاق یعنی ضلع کا صدر مقام تھا۔

مقامی روایات کی رو سے یہ شہر زمانہ جاہلیت میں آباد کیا گیا تھا۔ بقول ابن مجاور اصحاب کہف کے طویل خواب کا مقام جبل صبر ہی کا ایک غار ہے۔

حاجی خلیفہ صاحب "جہان نما" کے نزدیک تعز کا بانی ایوبی خاندان کا بادشاہ ظہیر الدین ابو الفوارس تغتکین تھا۔ جو ۵۷۸ھ/۱۱۸۳ء میں یمن آیا۔

ایک روایت میں تعز کی بنیاد ایک ولی سے منسوب ہے۔ اس روایت کے مطابق یہ مقام پہلے بادشاہوں کا مسکن تھا۔ بعد میں ایک مشہور و معروف سنی ولی اور تعز کے صاحب کرامت بزرگ اسماعیل ملک نے الثعبات ماہرہ کے ٹیلے پر اپنی مسجد اور قبر تیار کرائی۔ بعد ازاں اسی مقام پر ایک قلعہ تعمیر ہوا اور شہر بھی آباد ہو گیا۔

یاقوت کے زمانے ۱۲۲۹ء میں تعز یمن کا ایک بڑا اور مشہور قلعہ تھا اور عدینہ اس کے مضافات میں تھا۔

رسولی خاندان کے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اس شہر کو بہت زیادہ شہرت اور خوشحالی حاصل ہوئی۔ انہوں نے یہاں پر پانچ مدرسے بنوائے۔ ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں ایک لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ یہ کتب خانہ ایک مدرسے میں تھا جسے المؤید داؤد ۱۲۹۶ء تا ۱۳۲۱ء نے قائم کیا تھا۔

۱۵۱۶ء میں حسین الکردی نے تعز کو فتح کیا یہ مملوک سلطان قانصوہ الغوری کا سپہ سالار اور امیر البحر تھا۔ ۱۵۴۵ء میں تعز پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵۶۷ء میں ترکوں سے صنعاء کے اماموں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ان صدموں کے اٹھانے کے بعد تعز کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی تھی بقول فرانسیسی طبیب ولاگریو ویژر" یہ ایک پرانا شہر ہے۔ جس کی خوبصورت دیواریں ترکوں نے تعمیر کی ہیں۔ قلعہ میں تیس توپیں ہیں۔ اب یہ قلعہ سرکاری قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔"

۱۶۲۵ء میں جب صنعا کے امام ترکوں کے جانشین ہوئے تو ان کے عہد میں اس شہر کے سابقہ تمام نقصانات کی تلافی ہو گئی۔ بعد میں تعز پر ذو محمد کا قبضہ ہو گیا جو ایک زبردست قبیلہ تھا۔ ایک عرصے تک یہ شہر انہی کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک ابراہیم پاشا کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۳۵ء میں مصریوں نے اس شہر پر اپنا تسلط قائم کیا جو ۱۸۴۰ء تک قائم رہا۔ ۱۸۷۱ء میں جب ترکوں نے یمن کو دوبارہ فتح کیا تو تعز بھی ترکوں کے زیر نگیں آگیا۔ ۱۸۹۲ء میں یہ شہر زیدیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن اگلے سال ہی اس پر ترکوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء کی صلح کے بعد ترکوں کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ اور امام صنعا کے دائرہ حکومت میں آگیا۔

شہر کے گرداگرد ایک فصیل ۹ سے ۱۲ فٹ اونچی ہے اور ۲۵ سے ۳۰ فٹ تک چوڑی ہے۔ یہ فصیل ایک غیر مساوی الاضلاع مستطیل کو گھیرے ہوئے ہے جو مشرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے۔

اس مستطیل کے جنوب مشرقی پہلو میں ایک ڈھلوان چٹان ہے جس کی بلندی ۴۵۰ فٹ ہے۔ چوٹی پر قلعہ القاہرہ ہے جو اب کھنڈر ہو چکا ہے شہر کی فصیل کے پانچ دروازے ہیں۔

یہاں ایک بہت بڑی منڈی ہے یہاں پر پتھر کے ایک منزلہ مکانات تھے جو اب کھنڈر بن چکے ہیں اور ان کی جگہ اب جھونپڑیوں نے لے لی ہے۔ چند خوبصورت مساجد ہیں جن میں ایک مسجد اشرفیہ ہے۔ جس کا بانی رسولی خاندان کا بادشاہ اسماعیل بن العباس تھا۔ یہ مسجد خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ شہر کی جامع مسجد المظفریہ ہے جو جبل صبر کی ڈھلان پر واقع جو ایک وسیع اور شاندار مسجد ہے۔ ان کے علاوہ دوسری مساجد میں عبدالہادی کی مسجد، مسجد شیخ موسیٰ، مسجد شیخ افضل جو شاندار مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ مسجد محمدیہ، مسجد شرف الدین خاص طور پر قابل دید ہیں۔

تعز میں پانی کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ چنانچہ یہاں پر بہت سے باغات، کھیت اور مرغزار ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور باغ سلیمان پاشا کا ہے اس باغ کا نام برکہ حسینیہ ہے۔

تعز کے اردگرد کے میدانی علاقے میں خوب کاشت کاری ہوتی ہے۔ جبل صبر بھی ایک باغ نباتات ہے۔ جس کی نیچی ڈھلانوں پر ہر قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں تعز کی آبادی پچیس ہزار کے قریب تھی۔

تعزیت کسی کے مرنے پر صبر کی تلقین اور اظہار ہمدردی کرنا۔ حضرت معاذؓ کے ایک فرزند کا انتقال ہوا تو آنحضورؐ نے انہیں ایک تعزیت نامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

"شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ یہ تعزیت نامہ محمد رسول اللہ کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام ہے۔ تم پر سلامتی ہو۔ میں اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اللہ تمہارے اجر کو اور زیادہ کرے اور صبر عطا فرمائے اور ہمیں اور تمہیں شکر کی توفیق دے۔ ہماری جانیں ہمارے اموال اور ہمارے اہل و عیال سب کچھ اللہ کی خوش آئند بخششیں ہیں اور اس کی ودیعت کردہ عاریتیں ہیں۔ تمہیں رشک و مسرت کے ساتھ اس سے سرفراز کرتا رہا اور بڑے اجر کے عوض تم سے اسے واپس لے لیا یہ واپسی اجر ہے۔ صلوٰۃ، رحمت، اور ہدیٰ ہے لہٰذا اگر تم اسے کار ثواب سمجھتے ہو تو صبر سے کام لو تمہاری بے صبری تمہارے اجر و ثواب کو ضائع کر کے تمہیں نادم نہ کرنے پائے یہ سمجھ لو کہ بے صبری کا ماتم نہ مرے ہوئے کو واپس لا سکتا ہے نہ غم کو دور کر سکتا ہے اور ہونے والا حادثہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ والسلام"

ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ تعزیت مستحب ہے۔ لیکن اس کے وقت میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دفن کرنے سے پہلے تعزیت سنت ہے۔ امام شافعی اور امام احمدؒ کے نزدیک دفن کے پہلے اور دفن کے بعد تین دن تک سنت ہے نیز امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک تعزیت کے لئے بیٹھنا مکروہ ہے۔

تعزیر باز رکھنا۔ منع کرنا۔ تنبیہ و تادیب کر کے کسی کو احکام پر قائم کرنا۔ اصطلاح میں تعزیر سے مراد وہ سزائیں ہیں جنہیں کتاب و سنت نے متعین نہیں کیا بلکہ حاکم وقت اس کے ایما پر قاضی موقع کے اعتبار سے یا ضرورت کے مطابق متعین کر سکتا ہے۔ یہ سزائیں تعزیر کے ضمن میں آتی ہیں۔

تعزیر اور حد میں یہ فرق ہے کہ تعزیر میں بندوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس میں بندہ تصرف کر سکتا ہے۔ اس کی سزا کم و بیش کی جا سکتی ہے اور اسے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دُرّوں کی سزا کو قید میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن حد اللہ تعالےٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ اس میں بندہ اپنے تصرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ حد کا شمار حقوق اللہ میں ہوتا ہے۔ جبکہ تعزیر کا شمار حقوق العباد میں ہوتا ہے۔ قصاص بھی اس لحاظ سے حقوق العباد کے ضمن میں آتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی بندے کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو مجرم کو معاف کر دے

تعزیر ایسے گناہ کے لئے مشروع ہے جس میں حد اور کفارہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے گناہ کے باعث جس میں تعزیر دی جاتی ہے، تعزیر کا مستحق ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک اسے تعزیر دینا واجب ہی نہیں بلکہ جائز ہے اور حاکم اس امر میں مختار ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر حاکم تعزیر دینے میں مصلحت سمجھتا ہو تو اس کے لیے تعزیر دینا واجب ہے۔ ورنہ نہیں۔ امام احمد کے نزدیک ہر صورت میں واجب ہے۔

اگر حاکم کسی کو تعزیر دے اور وہ اس سے مر جائے تو امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک حاکم پر خون بہا دینا لازم نہیں آئے گا۔ امام شافعی کے نزدیک واجب ہے۔

تعزیر کی سزا حد کی سزا سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے اور یہ مسلک امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ تعزیر حاکم کی رائے پر موقوف ہے اور اگر وہ حد کی سزا سے بھی زیادہ سزا دینا چاہے تو اس کے لئے جائز ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تعزیر کی سزا زیادہ سے زیادہ ۳۹ کوڑے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بیس کوڑے ہیں۔

تعزیر اور حد کی طرح تعزیر اور تادیب میں بھی فرق ہے۔

تعزیر ایک اصطلاح بن چکی ہے جس کے متعلق امیر المؤمنین یا حاکم وقت کی طرف سے قاضی یا کوئی اور عہدیدار نوعیت جرم متعین کرنے کے بعد اس کی مناسب سزا نافذ کرتا ہے۔ اس کے برعکس تادیب قانونی سزا نہیں ہے مثلاً استاد کا شاگرد کو سزا دینا اور باپ کا بیٹے کو سزا دینا تادیب کہتے ہیں۔

تعزیہ اردو میں حضرت امام حسینؓ کے روضے کی شبیہ کو تعزیہ کہا جاتا ہے [illegible] سونے چاندی، لکڑی، بانس، کپڑے اور کاغذ وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اہل تشیع تعزیہ کو غم اور سوگ کی علامت کے طور پر جلوس کی [illegible] میں اور کربلا تک لے جاتے ہیں اور بعض امام باڑوں میں [illegible] پر رکھے جاتے ہیں۔

عراق میں تعزیہ کو شبیہ کہتے ہیں۔ مرحلے کے تعزیہ [illegible] صنعت و کاریگری کے بڑے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

بناوٹ کے لحاظ سے ان کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً

ضریح :۔ وہ تعزیہ جو بالکل حضرت امام حسینؓ کے روضے کی [illegible] ضریح کہلاتا ہے۔ نظام دکن، والی رامپور [illegible] ۱۰۶ خانوں میں یہ ضریحیں موجود ہیں۔

بنگلہ :۔ اس کی شکل و صورت محل نما [illegible] اس قسم کے تعزیے لکھنؤ اور اس کے مضافات میں [illegible]

مومی :۔ بانس کی تیلیوں پر مندرجہ بالا دونوں شکلوں [illegible] ڈھانچہ بنا کر اس پر موم چڑھایا جاتا ہے۔

جَو کے تعزیے :۔ تعزیے کے ڈھانچے پر [illegible] دانے ایک خاص انداز سے چپکائے جاتے ہیں۔ [illegible] چھوٹے چھوٹے پودے نکل آتے ہیں [illegible] کے دوران میں ان پر پانی چھڑکتے رہتے ہیں [illegible] حصے کو تخت، اوپر والے کو [illegible] اور اوپر والے حصے کو علم کہتے ہیں۔

تعزیہ ۲۹ ذی الحج سے ۹ محرم تک آراستہ [illegible] رکھے جاتے ہیں۔ یہ مقامات مختلف ناموں سے موسوم [illegible] تعزیہ خانہ، امام باڑہ، عاشورہ خانہ، امام خانہ [illegible]

تعزیہ اگرچہ اہل تشیع کے نقطۂ نظر سے ان کے نزدیک [illegible] مرتبہ رکھتا ہے لیکن بعض سنیوں اور ہندوؤں میں بھی اسے [illegible] دیکھا جاتا ہے۔

تعزیے رکھنے والی جگہوں پر مجالس ماتم، سوز خوانی، مرثیہ خوانی [illegible] بیت، مصائب و واقعات کربلا پر تقاریر وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تعزیہ کا رواج سولہویں صدی [illegible] شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں تعزیہ اور جلوس تعزیہ کا رواج تھا۔ عالمگیر ہی نے تعزیہ کے جلوس [illegible]

شمشیر زنی کو ممنوع قرار دیا تھا۔

دکنی ریاستوں میں عزاداری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ مجلس، ماتم جلوس، تعزیہ، امام باڑے قائم ہوئے۔ الغرض تیرہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی تک پورے ہندوستان میں تعزیہ داری عام ہو گئی تھی۔

برعظیم پاک و ہند میں تعزیے کا عام رواج ہے۔ لکھنؤ، رام پور، جے پور وغیرہ میں تعزیے کا جلوس یوں نکلتا ہے گویا گھر سے کسی معزز آدمی کا جنازہ نکل رہا ہو اس جلوس میں ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، فوجی باجے، ماتمی جھنڈیاں، باوردی سپاہی، ماتم دار اور تعزیہ دار برہنہ سر، ماتمی لباس پہنے، سروں پہ خاک ڈالے آنسو بہاتے سینہ کوبی کرتے چلتے ہیں۔

ایران میں تعزیے کا رواج نہیں شبیہ یا تمثیل رائج ہے۔ عراق میں علم اور ذوالجناح نکالے جاتے ہیں۔ کشمیر، نیپال اور افریقہ میں تعزیہ داری میں وہی انداز اختیار کیا جاتا ہے جو پاکستان میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

دسویں محرم تعزیوں کو تعزیہ دار سروں یا کاندھوں پر اٹھا کر جلوس کے ساتھ کربلا کی طرف جاتے ہیں۔ کربلا پہنچ کر قابل دفن تعزیوں کو کربلا میں دفن کر دیتے ہیں۔ ورنہ [illegible] باقی تبرکات کے ساتھ محفوظ کر کے واپس لے آتے ہیں۔

تعصب [illegible] بلا وجہ کسی کے خلاف ہونا یا کسی مذہبی خیال یا عقیدے سے محض بربنائے [illegible] روگردانی کرنا۔ تعصب انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔ تعصب عقل و استدلال کا دشمن ہوتا ہے۔ اسلام نے تعصب کے بارے میں [illegible] احکامات دیئے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا "اپنی قوم کی ناحق بات پر مدد کرنا تعصب [illegible] ہے۔" (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا: "جو شخص قوم کی (بیجا) حمایت کی طرف لوگوں کو بلاتے (یعنی اس بات کی تحریک پیدا کرے کہ لوگ مبتلائے تعصب ہو جائیں) وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو شخص قوم کی حمایت (بیجا) کے لیے لڑے وہ ہم میں سے نہیں اور جو حالت تعصب میں مر جائے وہ ہم میں سے نہیں (ابوداؤد)

ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص اپنی قوم کی ناحق ورناروا بات پر مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ جیسا ہے جو اونچی جگہ سے (کنوئیں میں) گر کر ہلاک ہو جاتا ہے (اور) پھر دُم پکڑ کر کھینچا جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

تعصب ایک ایسی بیماری ہے کہ اگر قومیں تعصب میں مبتلا ہو جائیں تو ان کی ترقی رک جاتی ہے۔ مذہب میں تعصب کا رویہ تمدن کے فساد کا باعث ہوتا ہے

تعلیم کسی کو کچھ بتانا، پڑھانا، سکھانا۔ تعلیم کے وسیع مفہوم میں وہ تمام معلومات و تجربات شامل ہیں جو گود سے لیکر قبر تک ہر فرد باضابطہ یا بے ضابطہ خود حاصل کرتا ہے یا اسے حاصل کرائے جاتے ہیں۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک اپنے تجربے کو دوسرے تک بعینہٖ منتقل کرنا تعلیم کہلاتا ہے۔

مہذب انسان کے لئے تعلیم ہمیشہ سے ایک اہم ترین ضرورت رہی ہے افلاطون کے نزدیک تعلیم کا مقصد افراد کی قدرتی صلاحیتوں کو دریافت کرکے ان کو نشوونما دینا ہے تاکہ ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جا سکے۔

ارسطو کہتا ہے کہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ روح دو طرح کی ہوتی ہے یعنی روح فعالی اور انفعالی۔ تعلیم وہ ہے جو روح فعالی اور روح انفعالی کی تربیت کر سکے۔ روح فعالی کی تربیت کے لیے سائنس اور فلسفہ اور روح انفعالی کے لیے موسیقی ادب اور اخلاق کی تعلیم دی جائے۔" وہ مملکت کی اصلاح اور استحکام کے لئے تعلیم کو ضروری سمجھتا ہے۔

بقول ملٹن "تعلیم وہ عمل ہے جو کسی فرد کو زمانہ امن و جنگ میں انفرادی اور اجتماعی فرائض کو منصفانہ طور پر اور ہنرمندی سے انجام دینے کے قابل بنائے"

جان ڈیوی نے تعلیم کی تعریف اس طرح سے کی ہے۔

"یہ تجربے کی مسلسل تعمیر نو کا نام ہے۔ جس سے تجربے کے معنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جس کے طفیل بعد میں پیش آنے والے تجربات کا رُخ معین کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔"

جان سٹوارٹ کے نزدیک۔

"تعلیم وہ معاشرتی عمل ہے جس کے ذریعے کوئی نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو موجودہ ثقافت منتقل کرتی ہے۔ تاکہ وہ نہ صرف حاصل کردہ ترقی کا معیار برقرار رکھ سکے بلکہ ممکن ہو تو اسے بلند بھی کرے۔"

افلاطون کے نزدیک "تعلیم اس عمل کا نام ہے جو معاشرے کو متوازن تنظیم عطا کرتا ہے۔"

اسلام نے تعلیم کا مقصد اللہ کا صالح بندہ بنانا بیان کیا ہے۔ یعنی انسانوں کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رُخ پہ ڈالنا اور انہیں ذہنی جسمانی، عملی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گذار بندے بنکر رہیں۔ کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں نیز انفرادی عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ان کے خالق و مالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کما حقہٗ عہدہ برا ہو سکیں۔

اسلام نے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے کی جتنی پرزور ہدایت کی ہے اس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"ہم نے اسے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے اب چاہے تو وہ شکر گذار بن جائے اور چاہے تو ناشکرا" (۷۶: ۳)

"خدا سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جنہیں علم سے نوازا گیا ہے" (۳۵: ۲۸)

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

"اللہ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو تمہارے درمیان ایمان اور علم رکھتے ہیں۔ (۵۸: ۱۱)

احادیث میں تعلیم کی اہمیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔" (ابن ماجہ)

"علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ" (البیہقی)

"جو علم حاصل کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔ جب تک واپس نہ آجائے۔" (ترمذی)

"مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔" (مشکوٰۃ)

"میری تعلیم لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت ہو۔" (بخاری)

"جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔" (ترمذی اور ابوداؤد) ایک اور جگہ پر لوگوں کو حکم دیا گیا ہے

"لوگ اپنے پڑوسیوں کو لازماً تعلیم دیں انہیں وعظ و نصیحت کریں اچھی باتوں

کی تلقین کریں بری باتوں سے روکیں اسی طرح لوگوں کو اپنے پڑوسیوں سے علم حاصل کرنا ہوگا۔ اور اپنے اندر سمجھ پیدا کرنا ہوگی ورنہ میں ان لوگوں کو بہت جلد دنیا میں سزا دوں گا۔" (طبرانی)

"تمہارے پاس اطراف زمین سے لوگ علم دین سمجھنے آئیں گے تم ان کو بھلائی کی تلقین کرنا" (ترمذی)

اسلام کے نزدیک تعلیم کا مقصد انسان کو خلافت ارضی کا اہل بنانا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو افراد کو علم و بصیرت کی دولت عطا کرے یعنی انہیں زندگی کے ابدی روحانی حقائق اور سائنسی اور معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کے قابل بنائے۔ اور افراد کو عمل پر آمادہ کرے۔ روحانی حقائق کو سمجھ کر وہ عبادت کی لذت سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ سائنسی حقائق کا علم انہیں فنی اور تکنیکی مہارتوں پر قدرت عطا کر سکتا ہے اور معاشرتی حقائق کو سمجھ کر وہ قوم کی خدمت پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ افراد کو رضائے الٰہی کا اس حد تک دلدادہ بنا دے کہ وہ اس کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام سائنس کی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ سراسر غلط ہے اسلام تو خود مشاہدات و تجربات کے ذریعے تسخیر کائنات کا سبق دیتا ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے وہ انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ ان سے فائدہ اٹھائے۔ تسخیر کائنات کے لیے مظاہر قدرت کا مشاہدہ کرنا اور فطرت کے قوانین کا علم ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں بار بار تحقیق و تفتیش پر زور دیا گیا ہے اور انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ مظاہر قدرت مثلاً چاند، تارے، موسموں کے تغیر و تبدل زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کریں۔ چنانچہ مسلمانوں کی روایات یہ ہیں کہ علم و حکمت دنیا کے جس گوشے میں ملے اسے ہر قیمت پر حاصل کیا جائے۔ (نیز دیکھیے "درس گاہ"، "درس نظامی"، "علم")

تغا تیمور

تغا تیمور جرجان کا مغل حکمران۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں برسر اقتدار آیا۔ وہ جوچی خان کی نسل سے تھا۔ اس کا باپ سودا [illegible] مرکونخت پر بیٹھا۔ باپ کا نام سری تھا۔ اس کا دادا بابا بہادر ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں دس ہزار کنبوں کے ساتھ خراسان آیا۔ اور اس نے الجایتو خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں اس نے خوارزم پر چڑھائی کی۔ لعبد میں مشرقی قپچاق کے خان اوزبک کی شکایت پر الجایتو نے بابا اور اس کے بیٹے کو قتل کرا دیا۔ لیکن اس کا قبیلہ مازندران میں سکونت پذیر رہا۔

جب ابو سعید ایلخانی نے وفات پائی تو حسن بزرگ جلائری نے محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ جلد ہی حسن بزرگ کے امیروں کی آپس میں نا اتفاقی ہو گئی اور ان میں سے کئی ایک خراسانی امیروں کی مدد سے تغا تیمور کے پاس پہنچے اور ۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء میں اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہت سنبھالنے کے بعد تغا تیمور اپنے امراء کے ساتھ آذربائیجان کی طرف بڑھا جہاں موسیٰ اس کے ساتھ آملا۔ چنانچہ دونوں نے ایران کو آپس میں تقسیم کر لینے کی تجویز طے کی لیکن حسن بزرگ نے انہیں شکست دی۔ اب تغا تیمور بسطام کی طرف ہٹ گیا یہاں وہ مازندران اور خراسان کے علاقوں پر حکمرانی کرنے لگا۔

۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء میں تغا تیمور نے عراق پر ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ اسے الجایتو خان کی اولاد کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن اس بار بھی اسے [illegible] کے مقام پر اس نے

شکست اٹھائی۔ سربداروں نے خراسان پر قبضہ کر لیا اور ارغون شاہ والی نیشاپور کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ [illegible] مسعود سربدار نے تغا تیمور کی فوجوں کو دریائے اترک پر شکست دی۔ علی کاؤن کو قتل کیا اور کچھ عرصے تک جرجان پر قابض رہا۔ اب تغا تیمور کی بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ اگرچہ سربدار سالانہ ایک مرتبہ ملازمت و تجدید عہد کے لئے تغا تیمور کے دربار میں حاضر ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ اس قسم کی حاضری کے موقع پر ۷۵۴ھ/۱۳۵۳ء میں سربدار یحییٰ کرابی نے تغا تیمور کو سلطان دودین کے مقام پر قتل کر دیا۔

تغا تیمور کو عمارات بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے مشہد میں خوبصورت عمارات بنوائیں۔ اس کے عہد کے جو سکے دستیاب ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکے نہ صرف آمل، مشہد، قزوین وغیرہ میں مضروب ہوئے تھے بلکہ بغداد میں بھی مضروب ہوتے تھے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تغا تیمور کو ایک وسیع علاقے پر اقتدار حاصل تھا۔

تغلب، بنو

تغلب، بنو عربوں کے ایک قبیلے کا نام۔ قدیم عرب [illegible] ربیعہ سے [illegible] قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کے مورث اعلیٰ کا اصل نام [illegible] تھا۔ روز [illegible] کے باپ نے اس کی کامیابی کے بارے میں کہا [illegible] اسی روز سے اس کا نام تغلب پڑ گیا۔ اور [illegible] قبیلے کا نام [illegible] بعض کے نزدیک اس قبیلے کا نام اس کے مورث [illegible] قدیم ہے۔ [illegible] شعراء کے نزدیک [illegible] کا نام تھا۔

جب [illegible] حجاز اور تہامہ کی [illegible] پر قابض ہو گئے [illegible] ہوتے رہے یہاں تک کہ عہد اسلام کے شروع تک [illegible] کو بعد میں دیار ربیعہ کا نام دیا گیا۔ [illegible] میں آباد تھے۔ بنو تغلب کے علاقے [illegible] جا سکتی ہے کہ یہ علاقہ [illegible] حصوں میں آباد تھے۔ [illegible] وہ بتدریج دریائے فرات کے [illegible]

زمانہ جاہلیت میں [illegible]

تھی۔ [illegible] ان کا [illegible] رہنما [illegible] کے مقامات پر خیموں میں [illegible] کا ایک گروہ [illegible] میں جا کر [illegible]

بنو تغلب کا [illegible] تغلب کے علاقے پر [illegible] ایران [illegible] نے ان میں سے بعض کو اپنے [illegible] کے علاقوں میں آباد کیا [illegible] نے زیریں جناب [illegible] اور تغلب کا [illegible] عیسائیوں کا [illegible] ہو میں [illegible] شکست کھانے کے بعد بنو تغلب [illegible]

بنو تغلب کی چند شاخوں کا حال ہی تاریخ میں ملتا ہے۔ [illegible] تغلب نے اپنے [illegible] النعمان بن [illegible] میں [illegible]

نے اپنے دیوان میں تحریر کیا ہے کہ بکر بن وائل نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی تھی اور یہ بات بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب بن وائل دونوں کے لیے باعث افتخار تھی۔

اسلام کے ظہور سے قبل نصرانیوں سے ملاپ کی وجہ سے بنو تغلب میں عیسائیت نے بھی قدم جما لیے تھے۔ اس سے قبل وہ ایک دیوتا اوال کی پرستش کرتے تھے جب ان میں تبلیغ اسلام کی کوششیں کی گئیں تو ان کے ایک چھوٹے سے فریق نے جوش سے [illegible] ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ ۹ھ میں بنو تغلب کا ایک وفد مدینے میں آیا۔ ان میں سے بعض مسلمان تھے اور بعض عیسائی رہے۔ عیسائیوں نے آنحضورؐ سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب ہی پر قائم رہیں گے لیکن اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائیں گے۔

[illegible] کے دوران میں سجاح (جھوٹی نبوت کی دعویدار) جس نے بنو تغلب [illegible] مسیحی ماحول میں پرورش اور تربیت پائی تھی تغلب اور [illegible] تعداد [illegible] روانہ ہوئی۔ اور انہیں کے ساتھ [illegible] عراق [illegible] ان تغلبیوں نے ۱۲ھ میں عین التمر کے [illegible] مسلمانوں سے مقابلہ کیا۔ چنانچہ اس معرکے میں حضرت خالد بن ولید نے انہیں شکست [illegible] اور ان کے سردار عقہ کو بھی قتل کر دیا۔ تغلبیوں نے [illegible] کا بدلہ لینے کے لیے ایک اور رزم میں حصہ لیا۔ اس مہم میں ایرانیوں نے [illegible] تیاری کی تھی۔ تغلبیوں کا سردار ہذیل بن عمران مقام المصیخ میں [illegible] حضرت خالد بن ولید ان پر فوج کے تین دستوں سمیت ٹوٹ پڑے [illegible] کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ پھر الثنی میں آپ نے [illegible] کی فوج کو مار بھگایا اور ربیعہ کی [illegible] حضرت علیؓ [illegible] جو اسیر ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ حضرت خالد بن ولید نے زمیل کے ایک اور [illegible] ہلال بن عقہ [illegible] سے بچ نکلا اور رضاب کی طرف چلا آیا

حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے جب حضرت خالد بن ولید نے ملک شام کی طرف یلغار کی تو [illegible] الحصید کے مقام پر مرتد تغلبیوں کو موجود پایا جو ربیعہ بن بجیر کے تحت تھے [illegible] نے انہیں شکست دی۔ مندرجہ بالا واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تغلبیوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔

بنو تغلب کا ایک وفد حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں عبداللہ کے [illegible] وفد کے ساتھ مدینے آیا تھا۔ جس نے حضرت عمرؓ سے علیحدہ ایک معاہدہ کیا

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں پہلے تو بنو تغلب محبان علیؓ میں سے تھے۔ لیکن [illegible] بعد وہ بنو امیہ کے ہمنوا بن گئے اور جنگ صفین میں امیر معاویہ کی طرف سے لڑے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے انہیں کوفے میں آباد کر دیا۔ [illegible] کی جنگ میں تغلبیوں نے یزید کا ساتھ دیا۔ اور مرج راہط میں مروان کے طرفدار رہے۔

[illegible] میں جب عمیر بن الحباب اپنے سلیمیوں سمیت دریائے خابور کے کنارے آ بسا اور وہاں تغلبیوں سے برسر پیکار ہوا جو اس علاقے میں خیمہ زن تھے تو چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد ایک زبردست جنگ جو ماکسین کے مقام پر ہوئی اس میں تغلبیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ یہ جدال و قتال تغلب کے آخری اہم واقعات میں سے تھا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی چند واقعات پیش آتے رہے مثلاً جب روح بن صالح ہارون الرشید کی طرف سے بنو تغلب کے صدقات کا محصل بنا تو [illegible] میں تغلبیوں نے اسے قتل کر دیا، جس کا بدلہ اس کے بھائی حاتم نے [illegible] بنو تغلب سے بڑی بے رحمی سے لیا۔ اس واقعے کے سات سال بعد بنو تغلب نے ایک بغاوت کی۔

بنو تغلب ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء میں تاتاریوں کے خلاف کامیابی سے جنگ کرتے ہوئے اور فتح یاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ نویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے اس قبیلے کا ذکر تاریخ کے اوراق سے غائب ہو جاتا ہے۔

بنو تغلب زراعت پیشہ تھے جنہوں نے بدوؤں کے طور طریقے اپنا لیے تھے۔ الجزیرہ میں وہ گھوڑوں کو تربیت دینے اور پرورش کرنے میں مشہور تھے۔ وہ ملاح بھی تھے اور کشتیوں کی تجارت سے انہوں نے خوب دولت اور شہرت کمائی تھی۔

بقول تبریزی "اگر اسلام کا ظہور کچھ عرصہ بعد ہوتا تو بنو تغلب سب لوگوں کو نگل لیے ہوتا۔"

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس طاقتور اور اونچی ناک والے قبیلے کے ساتھ بردباری اور حلم سے کام لیتے رہے۔

شراب نوشی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے مخالفین انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے۔

اس قبیلے میں کئی مشہور شاعر گذرے جن میں کلیب مہلہل، فرزل، السفاح الخنس بن شہاب، الفوان، عمرو بن کلثوم، جابر بن حنی، عمیرہ بن جعیل، کعب بن جعیل الاخطل، العتابی وغیرہ بہت بلند پایہ شاعر تھے۔

بنو تغلب کی زبان رومیوں کے قریب ہونے کی وجہ سے خالص نہ تھی۔

تغلق، بنو ایک خاندان جس نے سلطنت دہلی پر تقریباً ۹۴ سال حکومت کی بقول مورخ فرشتہ "تغلق اصل میں تُلغ تھا جو ترکی لفظ ہے اور جس کے معنی بزرگ یا بڑے کے ہیں۔ اہل ہند نے اسے الٹ کر تغلق کر دیا۔"

اس خاندان کا نام اس کے بانی غیاث الدین تغلق کے نام سے ماخوذ ہے جو قرونیہ ترکوں میں سے تھا۔ اس کا باپ ترک اور ماں ہندی النسل تھی۔ اس خاندان کے فرمانرواؤں کا شجرہ مندرجہ ذیل ہے۔

خاندانِ تغلق

- غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۵ء)
  - محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء)
- ملک رجب
  - فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء)
    - ظفر خان
      - ابوبکر (۱۳۸۹ء تا ۱۳۹۰ء)
    - ناصر الدین محمد شاہ
      - محمود تغلق (۱۳۹۴ء تا ۱۴۱۲ء)
      - سکندر شاہ
    - فتح خان
      - نصرت شاہ
      - تغلق ثانی (۱۳۸۸ء تا ۱۳۸۹ء)
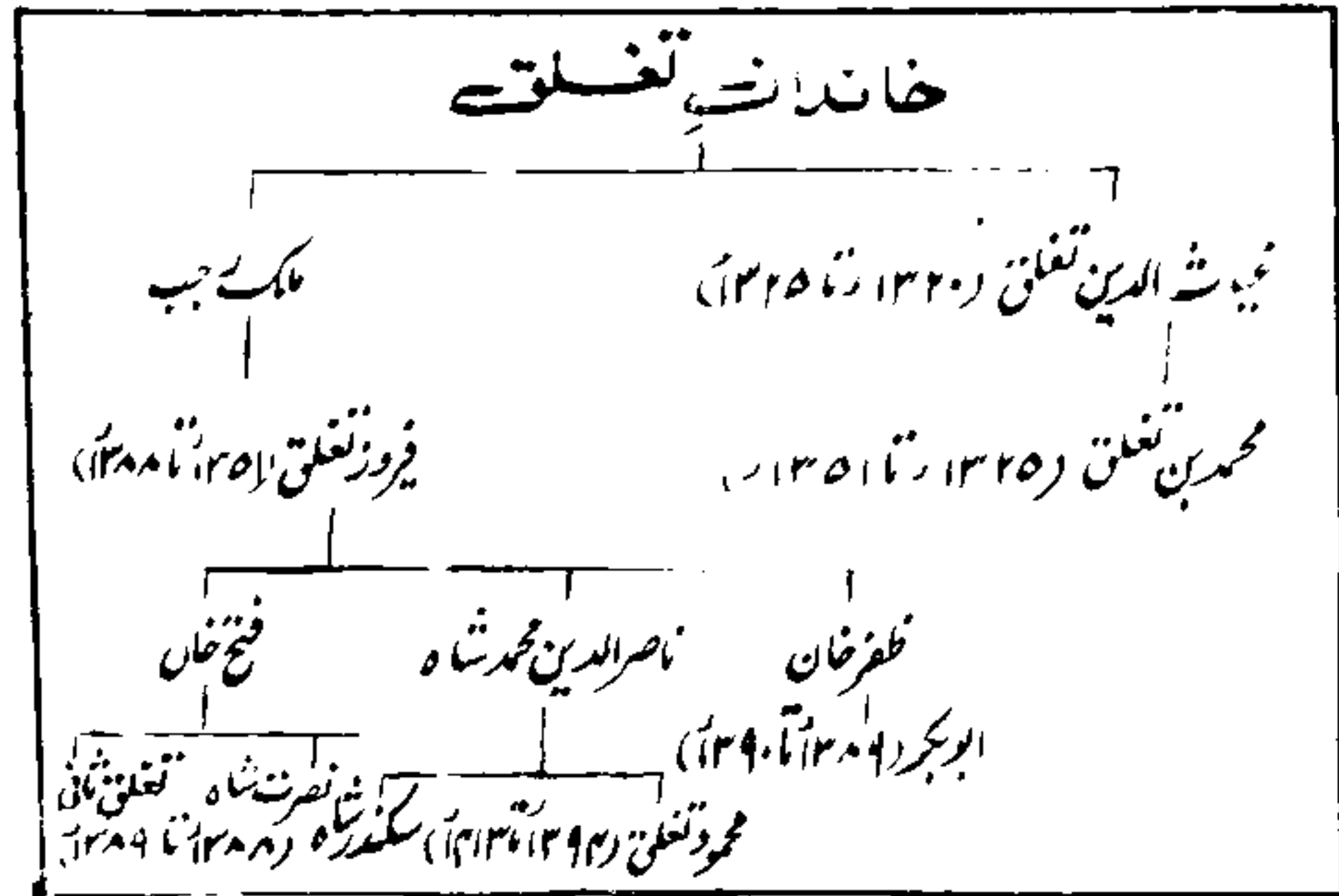
غیاث الدین تغلق (دور حکومت ۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۵ء) دہلی میں تغلق سلطنت کا بانی۔ فخر الدین نام غازی ملک لقب تھا۔ ترکوں کے قبیلہ قرونیہ سے تھا۔ اس کی ماں ہندی النسل تھی۔ شروع میں یہ ایک سوداگر کے اصطبل میں ملازم تھا۔ بعد میں سلطان علاء الدین خلجی کے بھائی الغ خان کے پیادوں میں شامل ہو گیا۔ وہاں سے ترقی کرتے ہوئے سوار فوج کا افسر اعلیٰ بن گیا۔ منگولوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے لڑائیاں لڑیں اور تقریباً ۲۹ معرکوں میں حصہ لیا۔ اسی بنا پر اسے غازی

ملک کا خطاب ملا۔ سلطان علاءالدین کے عہد حکومت میں دیپالپور کے اہم سرحدی صوبے کا گورنر اور کمانڈر تھا۔ خسرو کو شکست دینے کے بعد غیاث الدین کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ جب اس نے عنان حکومت سنبھالی تو ملکی اور معاشرتی نظام درہم برہم تھا۔ اس نے بڑی سمجھداری اور تدبر سے کام لیا۔ اور ہر چیز میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔

سلطنت کے انتظامی اور مالیاتی امور کو درست کر کے تغلق نے سلطنت کی توسیع کی طرف توجہ کی۔

تلنگانہ کے راجہ پرتاپ اور دیوتائی نے دہلی کے ابتر حالات سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۳۲۱ء میں تغلق نے الغ خاں ولی عہد سلطنت کو تلنگانہ کی فتح کے لئے روانہ کیا۔ یہاں کے راجہ نے صلح کی درخواست کی۔

۱۳۲۲ء میں سلطان نے الغ خاں کو دوبارہ ورنگل کی مہم پر بھیجا۔ ہندوؤں نے مقابلہ کیا لیکن بہت جلد مغلوب ہو گئے۔ راجہ اپنے خاندان سمیت گرفتار ہوا اور اس طرح تلنگانہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔ ورنگل سلطان پور کے نام سے اس صوبے کا صدر مقام بنا۔

۲۵-۱۳۲۴ء میں بنگال میں بغرا خاں کے لڑکوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ تغلق نے موقع غنیمت جانا اور بنگال پر فوج کشی کی۔ ناصرالدین نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ لکھنوتی کا علاقہ ناصرالدین کے حوالے کر دیا گیا۔ سنارگاؤں اور ست گاؤں کے علاقے سلطنت میں شامل کر لیے۔ واپسی میں سلطان نے ترہت کا قلعہ فتح کیا۔ ترہت سے سلطان غیاث الدین دہلی روانہ ہوا۔ اس نے اپنی آمد کی پیشگی اطلاع اپنے بیٹے الغ خان کو بھیج دی۔ الغ خان نے سلطان کے استقبال کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ اور دہلی سے کچھ دور افغان پور کے مقام پر سلطان کے قیام کے لئے عارضی طور پر ایک محل تعمیر کرایا۔ کہ رات کو سلطان اس محل میں آرام کرے اور صبح جلوس کی شکل میں شہر میں داخل ہو۔ بدقسمتی سے اچانک محل کی چھت گر گئی اور سلطان اس کا بیٹا اور چار دوسرے آدمیوں کے ساتھ چھت کے نیچے دب کر فوت ہو گئے

غیاث الدین تغلق نے کل پانچ سال حکومت کی۔ لیکن اس نے اس تھوڑے سے عرصے میں ایک وسیع، خوشحال اور پُرامن سلطنت قائم کر لی تھی۔

وہ ایک قابل منتظم اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ شریعت کا پابند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ساری ہندو مسلم رعایا برسر روزگار ہو۔ اس کے عہد میں چوروں اور ڈاکوؤں نے چوری اور نقب زنی چھوڑ کر کاشت کاری اختیار کر لی تھی۔ اس کے دور میں راستے اور شاہراہیں محفوظ تھیں لیکن اسے کچھ زیادہ مہلت نہ مل سکی۔

محمد بن تغلق:- (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا الغ خان محمد بن تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اسے ایک وسیع سلطنت اور مال و دولت سے پُر خزانے ورثہ میں ملے تھے۔ وہ خود ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ تعلیمی اعتبار سے وہ تمام سلاطین دہلی پر فوقیت رکھتا تھا۔ وہ ادیب، خطیب، حافظ قرآن اور عالم باعمل تھا۔ طب، ریاضی اور نجوم سے بخوبی واقف تھا۔ اسے منطق میں بھی ایک خاص مقام حاصل تھا۔

محمد بن تغلق کی طبیعت میں ندرت اور اختراع کا مادہ بہت تھا۔ اور اسے نت نئے منصوبے اور ضابطے بنانے کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے منصوبوں نے بہت سے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور ابتدائی دس سالہ حکومت کے بعد اس کی بقیہ زندگی ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں گذری۔ ۱۳۵۱ء میں جب وہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سندھ پہنچا تو اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور چند روز بعد انتقال کر گیا۔ سندھ اور بنگال کے صوبے محمد بن تغلق کے عہد ہی میں مرکز سے الگ ہو چکے تھے۔

اس کے مزاج میں بلا کی انتہا پسندی تھی۔ جب اس پر فلسفے کا غلبہ ہوا تو وہ الحاد کے قریب پہنچ گیا اور دین سے منکر ہو گیا۔ جب اس پر مذہبی جذبہ غالب ہوا تو اس نے اتنا غلو کیا جو نمازیں نہیں پڑھتے تھے انہیں قتل کرا دیتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق: (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) یہ سالار رجب کا فرزند تھا جو سلطان غیاث الدین کا چھوٹا بھائی تھا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو غیاث تغلق ہی نے اس کی پرورش اور تربیت کی۔ جہانبانی اور کشورکشائی کے اصول اس نے غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے عہد میں سیکھے۔

سولہ سال کی عمر میں محمد بن تغلق نے اسے نائب امیر مقرر کر کے نائب باربک کا عہدہ دیا۔ سلطان ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ سلطان نے بوقت رحلت وصیت کی کہ اس کی وفات کے بعد فیروز شاہ اس کا جانشین ہو گا۔

فیروز شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی ان تمام علاقوں کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا جو سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت میں سلطنت دہلی کے حلقہ اثر سے آزاد ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے سندھ کے صوبے کو مسخر کر لیا۔ لیکن بنگال کی تسخیر میں ناکام رہا۔

اس کا دور حکومت رفاہی کاموں کے لئے مشہور ہے۔ اس نے ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سلطان فیروز تغلق ایک نیک دل، متبع شریعت اور رعایا پرور حکمران تھا۔ اس نے رعایا کو آسائش پہنچانے کے لئے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کئے۔ ملک میں کنوؤں اور نہروں کا جال بچھا کر رعایا کی خوشحالی میں اضافہ کیا۔

بقول صاحب تاریخ فرشتہ فیروز شاہ نے زراعت کو ترقی دینے کے لئے پچاس بند بنوائے۔ چالیس مساجد، تیس مدارس، بیس محلات، دو سو کے قریب شہر بسائے، سو شفاخانے، پانچ مقبرے اور دس مینار ستون یادگار تعمیر کئے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے بعد اس کا پوتا تغلق بن فتح خان ۱۳۸۸ء میں سلطان غیاث الدین تغلق ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ وہ ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ نوجوان تھا۔ جلد ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی ابوبکر ظفر خان کو قید کرا دیا۔ اس پر بعض امراء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے [illegible] بغاوت کی وجہ سے تغلق ثانی کو تخت و تاج کے علاوہ زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

۱۳۸۹ء ابوبکر تغلق مسند نشین ہوا تو اس کے چچا محمد بن فیروز نے تاج و تخت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ شہر میں لڑائی ہوئی جس میں محمد کو شکست ہوئی اور وہ دوآب کی طرف بھاگ نکلا۔ اگرچہ ابوبکر نے محمد کو شکست دے دی تھی لیکن دہلی میں اس کی حیثیت مخدوش تھی اس نے اپنے ایک ساتھی بہادر ناہر کے پاس پناہ لی۔ اس کی عدم موجودگی میں محمد چند امراء کی دعوت پر دہلی میں داخل ہوا ۱۳۹۰ء میں ناصرالدین محمد شاہ تغلق کے لقب سے تخت پر بیٹھا [illegible] کو سنبھال نہ سکا یعنی جنوری ۱۳۹۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات کے چند ماہ بعد امراء نے محمد شاہ کے دوسرے لڑکے محمود کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے ناصرالدین محمود تغلق کا لقب اختیار کیا۔

دوآب کے حالات مخدوش تھے سلطان نے ملک سرور خواجہ جہاں کو ملک الشرق کا خطاب دے کر دوآب اور مشرقی اضلاع کا حاکم مقرر کیا۔ خواجہ جہاں نے جونپور میں اپنا علیحدہ دارالحکومت بنا لیا اور ارد گرد کے علاقوں پر تسلط جما کر شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اسی اثناء میں گجرات، مالوہ اور خاندیش بھی دہلی کی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چند امراء نے سلطان فیروز شاہ کے پوتے نصرت خان کو بادشاہ بنا دیا۔ اب دہلی میں دو بادشاہ تھے۔ ایک ایوان دہلی کا در

درمیہ فیروز آباد کا۔ ان دونوں بادشاہوں کی حیثیت شطرنج کے مہروں کی سی تھی اصل اقتدار امراء کے ہاتھ میں تھا، جو باہم دست وگریباں رہتے تھے۔

چنانچہ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے دہلی پہنچتے ہی نصرت خان کو وہاں سے بھگا دیا گیا تھا۔ محمود تغلق اور ملو نے تیمور کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ محمود گجرات کی طرف نکل گیا۔ تیمور کے واپس چلے جانے کے بعد محمود دوبارہ بادشاہ بن گیا۔ لیکن اب اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں تھی۔ مکمل اقتدار ملو کے ہاتھ میں تھا۔ محمود نے ۱۴۱۳ء میں کیتھل کے مقام پر وفات پائی۔ اس کے انتقال کے بعد تغلق خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

تفتازانی (صفر ۷۲۲ھ / مارچ ۱۳۲۲ء۔ ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء) سعد الدین بن مسعود بن عمر، بلاغت، منطق، کلام، فقہ، تفسیر، ماوراء الطبیعۃ کے ماہر عالم اور مصنف تفتازان میں خراسان میں نسا کے قریب پیدا ہوئے۔ آپ نے عضد الدین ایجی اور قطب الدین رازی سے تعلیم حاصل کی۔ بقول ابن عرب شاہ، تفتازانی، قطب الدین رازی کی طرح ان علماء میں سے تھے جو خوانین قبچاق کے مغل بادشاہوں کے درباروں میں چلے آتے تھے۔ چنانچہ آپ خوارزم میں آ بسے تھے ۱۳۸۰ء میں علامہ تفتازانی سمرقند چلے گئے۔ سمرقند ہی میں وفات پائی اور سرخس میں دفن ہوئے۔ آپ کے سن وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۷۹۲ھ / ۱۳۹۰ء بعض ۷۹۳ھ / ۱۳۹۰ء اور حبیب السیر ۷۹۷ھ ۱۳۹۵ء بتایا ہے۔

آپ کی اولاد میں ایک لڑکے کا ذکر ملتا ہے جو شیخ الاسلام شمس الدین محمد کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سے حسام الدین حسن بن علی بیوردی اور برہان الدین حیدر کے نام ملتے ہیں۔

تفتازانی نے شافعی اور حنفی فقہ پر کتابیں لکھیں۔ اسی وجہ سے بعض انہیں شافعی مسلک اور بعض حنفی مسلک کے حامل سمجھتے ہیں۔

تفتازانی نے کئی ایک اصناف علم پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ کی تصنیف حسب ذیل ہیں۔

شرح التصریف العزی اور ارشاد الہادی صرف و نحو میں۔
المطول، مختصر المعانی اور شرح القسم الثالث من المفتاح بلاغت پر
شرح الرسالۃ الشمسیہ، تہذیب المنطق والکلام منطق پر
المقاصد، شرح العقائد النسفیہ، ماوراء الطبیعات اور علم کلام پر
التلویح الی کشف حقائق التنقیح، شرح الشرح، اصول فقہ پر۔
المفتاح، اختصار شرح تلخیص الجامع الکبیر فقہ پر۔
کشف الاسرار وعدۃ الابرار (تفسیر قرآن مجید بزبان فارسی) تفسیر پر
شرح الکشاف، یا حاشیہ علی الکشاف ہیں۔

تفسیر کھولنا، بیان کرنا، کسی تحریر و قول کے مطالب کو سامعین کے ذہن کے قریب کرنا۔ اصطلاح میں اس سے مراد قرآن مجید کے معانی اور مفہوم کو واضح کرنا۔ بالفاظ دیگر تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت ادا اور الفاظ کے معنی، ان کے انفرادی و ترکیبی حالات اور ان کے تتمات کا بیان ہو۔

بقول امام ماتریدی "تفسیر اس یقین کا نام ہے کہ لفظ سے یہی مراد ہے اور اس قدر یقین ہو کہ خدا کو شاہد ٹھہرا کر کہا جائے۔ خدا نے یہی معنی مراد لئے ہیں"

امام ابو النصر قشیری کے نزدیک "تفسیر موقوف ہے۔ سماع اور اتباع رہبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، پر کتاب اللہ کا جو مفہوم سنت رسول اللہ اور احادیث صحیحہ و صریحہ کے ذریعہ متعین ہوگا وہ تفسیر ہوگا۔"

زرکشی نے کہا کہ "تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب سمجھی جاتی ہے جسے اس نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔"

بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ تفسیر اصطلاح میں نزول آیات ان کے شان نزول اور ان کے اسباب نزول کے علم کو کہا جاتا ہے اور اس بات کے جاننے کو بھی تفسیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہ آیات قرآن کے مکی اور مدنی محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، خاص و عام، مطلق و مقید، حلال و حرام وعدہ و وعید، امر و نہی اور عبرت و امثال ہونے کی ترتیب معلوم ہو۔

ضرورت تفسیر:۔ یہ ایک امر واقعی ہے کہ تمام انسان یکساں عقل و قابلیت نہیں رکھتے۔ ان کی استعداد اور صلاحیتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کوئی کج فہم ہوتا ہے تو کوئی زود فہم کوئی ذکی ہوتا ہے تو کوئی بالکل غبی۔ اس لئے کسی کلام کو سمجھنے میں ہر شخص یکساں نہیں۔ پھر عام لوگوں کا کلام تو الگ رہا لیکن جہاں معاملہ اللہ تعالےٰ کے کلام کا ہو۔ جس کی جامعیت، ہمہ گیری، بسط اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں جس میں بے شمار مطالب فصاحت و بلاغت، اوصاف کلام اور معنی و بدیع کی ایک دنیا آباد ہو۔

قرآن کی تفسیر و تشریح آنحضورؐ کی ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

"اور وہ قرآن کی تعلیم دیتے اور سکھاتے ہیں۔" (۳ : ۱۶۴)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے تفسیر کے سیکھنے کا حکم بھی دیا تھا۔

چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "سورۃ حدید" کی تفسیر سیکھو"۔
ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "تو قرآن کا اچھا ترجمان ہے۔"

آپ کے بعد صحابہؓ کے دور میں بھی تفسیر و تشریح کلام خداوندی کا فریضہ صحابہ کرامؓ انجام دیتے رہے۔ ان کے باقاعدہ مختلف مقامات پر حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور اس کے بعد پھر ہر دور میں تفسیر قرآن کا رواج برابر قائم رہا۔ بقول خواجہ عبدالحی فاروقی آج تک عربی میں جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان کی تعداد کئی ہزار ہے۔

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ تفسیر کا علم ایک مقدس اور متبرک علم ہے جو ہر شخص سے تمام احتیاطوں اور ذمہ داریوں کا مطالبہ کرتا ہے اور جس کا موضوع اللہ تعالےٰ کی کتاب قرآن مجید ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کے احکام کا پورا علم حاصل کر سکے۔

تفسیر کا ارتقاء:۔ آنحضورؐ کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے
"بلاشبہ یہ اللہ تعالےٰ کا مومنین پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ان کے پاس خود انہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" (۳ : ۱۶۴)

مندرجہ بالا ارشاد الٰہی سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کی ذمہ داری محض یہ نہ تھی کہ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی بھیجی ہوئی کتاب پر ایمان لے آئیں آپ صرف ان

تک قرآنی آیات پہنچا دیں بلکہ ان کا تزکیہ اور انہیں اس کتاب کی تعلیم دینا بھی آپ کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ نیز تعلیم دینا سے مراد صرف الفاظ کا دہرانا نہیں تھا۔ بلکہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے مطابق "ہم نے (اے رسولؐ) تم پر قرآن نازل کیا تاکہ لوگوں کے سامنے اس چیز کی وضاحت کرو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے" (۱۶ : ۴۴) اس کی تشریح و توضیح تھی۔

چنانچہ یہی تعلیم کتاب و حکمت ہے جو قرآن مجید کی تفسیر نبوی ہے۔ آپؐ کا ہر ارشاد اور آپؐ کا ہر عمل قرآن مجید کی تفسیر و تشریح تھا۔

عہد نبوی میں تفسیر کی نوعیت یہ تھی کہ اگر کسی آیت کے متعلق آنحضورؐ نے ضرورت محسوس کی تو خدا کی منشا و مراد بتا دی۔ یا کسی کو کوئی مشکل پیش آئی تو اس نے آنحضورؐ سے پوچھ کر اپنی تشفی کر لی اور وہ آیات جن کا تعلق عمل سے ہے۔ آنحضورؐ نے عملاً ان کی تفسیر کر دی۔

آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ قرآن کی تفسیر اور تشریح میں بڑی شدت سے احتیاط برتتے رہے۔ احادیث میں تفسیر بالرائے کے متعلق جو وعید آئی ہے اس کی وجہ سے انہیںؓ دھڑکا لگا رہتا لیکن احساس فرض اور تمدنی ضروریات کی بناء پر صحابہ کرامؓ کی ایک تعداد ایسی تھی جو قرآن کی تشریح و تفسیر کرتی تھی۔ ان کی تفسیروں کا تعلق صرف ان آیات سے تھا جو امر و نہی پر مشتمل ہیں۔ ان مفسر صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابن کعبؓ، ابن ثابتؓ، ابن زبیرؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ خاص طور پر مشہور ہیں۔ صحابہ کرامؓ سے قرآن کی جو تفاسیر منقول ہیں ان میں سے دو قلم بند کی گئی تھیں۔ ایک تفسیر ابن عباسؓ ہے دوسری تفسیر ابن کعبؓ ہے۔ ان کا بیشتر حصہ قرآن کے مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ آیات احکام سے متعلق اگر کوئی حدیث انہیں معلوم ہوتی تو ان آیات کی تفسیر میں وہ احادیث بیان کر دیتے تھے اور اگر کوئی حدیث انہیں معلوم نہ ہوتی تو پھر خود ہی فقہی نقطۂ نظر سے اس آیت کی تشریح و توضیح کرتے لیکن ایسا موقع بہت کم آیا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین کا دور آتا ہے اس دور میں مختلف فرقے اپنے باطل نظریات کی اشاعت کے لیے قرآن کو آلۂ کار بنانے میں زیادہ سرگرم ہو گئے تھے دوسرے جب رومیوں اور ایرانیوں سے میل ملاپ بڑھا تو کچھ ایسے عجمی افکار کو دخل اندازی کے مواقع ملے جن سے ذہنی انتشار پیدا ہونا لازمی تھا۔ تیسرے یونانی فلسفہ کی وجہ سے معاشرتی معاشی اور سیاسی نوعیت کے بہت سے پیچیدہ مسائل ابھر رہے تھے چنانچہ تابعین کو ان گوناگوں مشکلات سے واسطہ تھا۔ اس لیے انہوں نے تفسیر کے معاملے میں صحابہ کرامؓ کا ہی طریقہ اختیار کیا۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ انہیں جو کچھ صحابہ کرامؓ سے پہنچا ہے اسے بیان کرنے ہی پر اکتفا کریں لیکن اس کے ساتھ وہ پیش آمدہ مسائل سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ایسے مسائل میں وہ خود اپنی علمی بصیرت سے کام لے کر قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح کرتے۔ تابعین کے درمیان تفسیر میں اختلاف کم ہے احکام میں زیادہ اختلاف ہے کیونکہ زمانے کے تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات کی بنا پر ابھرنے والے نئے مسائل میں اجتہاد کیا جائے گا۔ تو لازمی طور پر آراء کے درمیان اختلاف ہو گا۔ لیکن یہ اختلاف تنوع کا ہے تضاد کا نہیں ہے۔

اس دور کے مشہور مفسرین میں علقمہ، عمرو بن شرحبیل، مسروق، اسود بن یزید، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، شعبی، مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ اور اعمشؒ ہیں۔ تبع تابعین کے دور میں علوم اسلامی کی فنی تقسیم عمل میں آئی۔ جب کہ اس کی حیثیت پہلے ایک جامع علم کی تھی جو تفسیر بھی تھا حدیث بھی فقہ بھی تھا اور اصول فقہ بھی تھا۔ لیکن اب ہر شعبہ بجائے خود ایک مستقل فن کی نوعیت اختیار کر گیا۔ نیز اس دور میں سارے غلط اور باطل نظریات کھل کر سامنے آ گئے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ایسی تفسیریں تالیف کی گئیں جن میں آنحضورؐ سے مروی تفاسیر اور صحابہ و تابعین کے اقوال کو جمع کیا گیا۔ لیکن فاسد اور باطل نظریات و افکار سے پوری طرح متاثر اور مرعوب ہو جانے والے اذہان کے لیے یہ کوشش کارآمد نہ ہو سکی۔ تاہم ان باطل نظریات کے رد کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ اسی دور میں روشن خیالی اور ذہنی ترقی اس بات کا نام قرار پائی کہ یونانی فلسفہ اور عجمی افکار کی بساط پر قرآنی آیات کے مہرے جمائے جائیں اور قرآن کی زبان سے وہی کچھ کہلوایا جائے جو اس فلسفہ اور ان افکار کو مطلوب ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیت اور نصرانیت کی اسلام کے خلاف ملی بھگت نے مسلمانوں پر سے ایمانیات و عقائد کی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے نئی چالیں چلیں جن میں ایک خلق قرآن کا فتنہ بھی تھا۔ لیکن ان تمام فتنوں کا جواب دیا جاتا رہا۔

لسانی علوم (ادب و بلاغت) میں رسوخ رکھنے والے اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے قرآن کو استعمال کر رہے تھے۔ انہی علوم میں دستگاہ رکھنے والے اہل حق بھی تھے جو انہی علوم سے ان نظریات کا رد بھی پیش کر رہے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تفسیری ادب میں تفسیری تالیفات کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ اور یوں کتب تفسیر کا ایک عظیم الشان ذخیرہ امت مسلمہ کے پاس جمع ہو گیا۔ چونکہ علوم کی شعبہ وار تقسیم ہو چکی تھی۔ اس لیے ہر شعبے کے شاہسواروں نے میدان میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ اور یوں مختلف علوم و فنون کے زاویۂ نگاہ سے مرتب کی ہوئی تفسیروں کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو گیا جو اپنی تعداد کے لحاظ سے شمار میں نہیں آ سکتا اور اپنی مقدار کے لحاظ سے اس قدر حیرت انگیز ہے کہ انسان [illegible] عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

موجودہ دور تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں بنیادی طور پر [illegible] جہات میں سے انہی کو اختیار کیا گیا ہے جو سابقہ تفاسیر کی [illegible] قدیم علوم و فنون اور افکار و نظریات کی کارفرمائیاں نظر آتی [illegible] پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ لیکن جب جدید علوم و فنون [illegible] طرز استدلال کا غلغلہ بلند ہوا تو جدید ترین تفاسیر میں جدید علوم و فنون کی [illegible] جدید طرز بیان کے ساتھ تصنیف کی گئیں۔

ا۔ چند مشہور تفاسیر

ا۔ تفسیر ابن عباسؓ:۔ اس تفسیر کا نام [illegible] ہے۔ ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے اسے جمع کیا ہے۔ یہ تفسیر نہایت [illegible] لیکن مفہوم کے اعتبار سے مکمل ہے۔ [illegible] تفسیری مباحث [illegible] اور اعتقادی مباحث میں مدار تحقیق ہے کیونکہ [illegible] ابن عباسؓ [illegible] میں سے علوم قرآن کے موضوع پر بحث [illegible] القرآن کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ تفسیر بڑی تقطیع کے [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ تفسیر طبری:۔ اس کا نام جامع البیان عن تاویل آی القرآن ہے۔ ابوجعفر بن جریر طبری (۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ موجودہ تفسیری سرمایہ کا ماخذ اول ہے۔ علماء نے تسلیم کیا ہے کہ اس تفسیر کی کوئی نظیر آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر میں تمام قراءتوں صحابہ کرام اور تابعین کے تمام تفسیری اقوال

کو منضبط کیا ہے۔ آیات کی تفسیر میں جتنی احادیث ملی ہیں انھیں نقل کر دیا گیا ہے اگرچہ اس میں کچھ ضعیف احادیث بھی آگئی ہیں تاہم مصنف نے تمام اقوال روایات نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

۳۔ تفسیر ابن کثیر:۔ "تفسیر قرآن العظیم" حافظ عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن الخطیب (۷۰۵ھ تا ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے۔ تفسیر ماثور ہے۔ صحابہ کرام و تابعین کی تمام صحیح روایات اور آثار اس میں نقل کیے گئے ہیں۔ احادیث کی نقل میں صحت اور سند کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ فقہی اختلاف کے موقع پر مختلف مذاہب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ عبارت سادہ اور بیان دل نشین ہے۔ اہل سنت والجماعت کے ہاں یہ تفسیر متداول ہے۔ کئی بار چھپ چکی ہے نو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ تفسیر الکبیر:۔ "مفاتیح الغیب" ابوعبداللہ محمد بن عمر بن حسین الملقب فخر الرازی (م۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے۔ تیس جلدوں میں ہے علامہ فخر الدین رازی ایک زبردست متکلم اور علوم عقلیہ اور علوم ریاضی کے بڑے ماہر تھے اس تفسیر میں کلامی بحثوں، معتزلہ کی تردید، مضامین فلسفہ، مباحث ریاضی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے۔ یہ تفسیر درایت میں اعلیٰ درجے کی اور روایت میں کم پایہ کی تفسیر ہے۔

اس میں سوال و جواب اور مسائل کی شکل میں مباحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے معتزلہ اور ملحدین کے اعتراضات کو تو زوردار طریقے سے بیان کیا ہے لیکن اس کے جواب میں وہ زور نہیں جو ہونا چاہیے تھا امام رازی اس تفسیر کو اپنی زندگی میں پوری نہیں کر سکے تھے۔ چنانچہ شیخ احمد بن محمد قمولی نے اسے مکمل کیا۔

۵ تفسیر کشاف:۔ "الکشاف عن الحقائق تنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل" ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری (م۵۳۸ھ) کی تصنیف اور ایک جامع تفسیر ہے جو معتزلہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ لغت، نحو اور بلاغت کے نقطۂ نظر سے اس میں نہایت عمدہ باتیں اور عجیب و غریب نقاط اور لطائف ہیں۔ یہ صرف قرآن کی تفسیر ہی نہیں بلکہ عربی زبان سیکھنے کے لیے بڑی مفید و ممد ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کا معیار بے حد بلند ہے۔

یہ تفسیر طوالت، اسرائیلیات اور ضعیف روایات سے پاک اور سہل ہے۔ اور اکثر مقامات پر سوال و جواب کی صورت میں مطالب کو پیش کیا گیا ہے۔

اسلوب بیان کے لیے جا بجا اسالیب عرب سے استدلال کیا گیا ہے اس تفسیر کے کئی حاشیے لکھے گئے ہیں۔ کمال باشا زادہ پہلوان، شیخ حیدر اور رہاوی کے حاشیے خاص طور پر مشہور ہیں۔

اہلسنت اور معتزلہ کے مشہور کلامی اختلافات میں بڑے پرزور انداز میں معتزلہ کی وکالت کی گئی ہے۔ بقول صاحب "کشف الظنون" کسی کتاب تفسیر کی ایسی خدمت نہیں کی گئی جیسی کہ اس کتاب کی گئی ہے۔

صاحب مناہل العرفان کے بقول تفسیر کشاف مندرجہ ذیل امور میں دوسری تفاسیر سے ممتاز ہے۔

۱۔ حشو و زوائد اور طوالت سے خالی ہے۔

۲۔ قصص اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔

۳۔ لغات عرب کے مطابق معانی کے بیان پر اور اس کے اسالیب پر اس میں اعتماد کیا گیا ہے۔

۴۔ معانی و بیان کے علوم پر خاص توجہ دی گئی ہے اور وجوہ اعجاز کی تفہیم کے لیے نکات بلاغت کی تحقیق کی گئی ہے۔

یہ تفسیر کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ صاحب کشف الظنون کے بقول چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ جو نسخہ ۱۳۶۷ء میں شائع ہوا وہ تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

۶۔ تفسیر طبرسی:۔ "مجموعہ البیان فی التفسیر القرآن" ابو علی الفضل ابن الحسن الطبرسی (م۵۴۸ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ شیعہ اثنا عشری فرقے کی بلند پایہ تفسیر ہے۔ ابتدائی دور کی بڑی تفسیروں میں اس کا شمار ہوتا ہے اہل تشیع کی نظر میں اس تفسیر کا مقام وہی ہے جو اہل سنت کے ہاں تفسیر طبری کا۔ اگرچہ یہ ایک شیعی تفسیر ہے لیکن بہت معتدل نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی روایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اور امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے فقہی احکام بھی درج کیے گئے ہیں۔ بلاغت و فصاحت کے لحاظ سے بھی ایک اچھی تفسیر ہے

۷۔ تفسیر احکام القرآن:۔ احمد بن علی رازی المشہور ابو بکر جصاص کی تصنیف ہے جو اپنے وقت کے امام تھے حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر علماء آپ کو مجتہد تسلیم کرتے ہیں۔

یہ تفسیر فقہی آیات کی تفسیر ہے جو سورتوں کی ترتیب ہی سے لکھی گئی ہے علمی اور فقہی اختلافات پر مجتہدانہ بحث اور حنفی مسلک کی وضاحت و وکالت کی گئی ہے۔ یہ تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ جو ۱۸۵۰ صفحات پر مبنی ہے۔ ہر جلد کے آخر میں مضامین کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ اس کے حد درجہ اختصار کی وجہ سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

۸۔ تفسیر قرطبی:۔ "جامع احکام القرآن" ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی (م۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں تمام تفسیری مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ البتہ تاریخی واقعات کی تفصیلات کا ذکر کرنے کے بجائے انھوں نے احکام القرآن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہ مالکی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس قرأت، اعراب اور ناسخ و منسوخ کی بحثوں کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر کے درمیان آنے والی احادیث اور اقوال کا مکمل حوالہ دینے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ تفسیر بیس جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

۹۔ تفسیر بیضاوی:۔ "انوار التنزیل واسرار التاویل" قاضی امام ناصر الدین ابوسعید عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی (م۶۸۵ھ) اور بقول بعض ۶۸۲ھ کی تصنیف ہے۔ یہ چار اہم تفاسیر طبری، رازی، کشاف، بیضاوی وغیرہ میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم الشان تفسیر ہے جو تعریف و توصیف سے ماورا ہے مختلف امتیازات رکھنے والی تفاسیر کا نچوڑ ہے۔ یعنی اس میں اعراب اور معانی و بیان سے متعلق مباحث دراصل کشاف کے مندرجات کا مغز ہیں حکمت و کلام سے متعلق مواد تفسیر کبیر (الرازی) سے ماخوذ ہیں۔ اشتقاق اور دقیق حقائق اور لطیف اشارات و نکات تفسیر راغب اصفہانی سے ماخوذ ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ قاضی بیضاوی نے اس میں معقول دلائل اور مقبول تصرفات رکھنے والے ایسے امور بھی ثبت کیے ہیں جو ان کی فکر و بصیرت کے ثمرات و نتائج ہیں۔

تفسیر

درس نظامی میں عرصہ دراز سے متداول ہے۔ تفسیر کشاف کے بعد سب سے زیادہ حواشی اسی تفسیر کے لکھے گئے ہیں جو کم و بیش چالیس ہیں۔

مصنف نے لغوی تحقیق اور قرأت کے بیان کے بعد ان شبہات کا ازالہ کیا ہے جو اہل سنت کے خلاف معتزلہ اور دوسرے عقلیت پرستوں نے کئے تھے اس تفسیر کے بے شمار حاشیے لکھے گئے۔ مصنف نے ہر سورت کے آخر میں فضائل سورت کے بارے میں احادیث بیان کی ہیں۔ اگرچہ اس میں ضعیف اور قوی کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔

١٠۔ تفسیر جلالین:۔ اس تفسیر کے دو مؤلف ہیں دونوں کے ناموں کے ساتھ جلال الدین آتا ہے اس لئے اس تفسیر کا نام جلالین ہے۔ جلال الدین محلی (م ٨٦٤ھ) نے اس تفسیر کے پندرہ سولہ پارے لکھے تھے کہ وفات پا گئے۔ بعد میں علامہ جلال الدین سیوطی (د۔ ٩١١ھ) نے مولانا جلال الدین کے نقش قدم پر چل کر اسے مکمل کیا۔ اس میں گرامر، نحو اور لغت کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت آسان ہے۔ اس کے مختلف حاشیے اور خلاصے لکھے گئے۔ پرانی تفاسیر میں سب سے زیادہ چھپنے والی یہی تفسیر ہے۔ درس نظامی کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ تفسیر تمام عالم اسلام میں مشہور اور متداول ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔

١١۔ تفسیر روح المعانی:۔ "روح المعانی فی التفسیر القرآن العظیم و سبع المثانی" علامہ شہاب الدین محمود آلوسی البغدادی (د۔ ١٢٧٠ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ نو بڑی جلدوں پر مشتمل ہے، تیرہ صدیوں میں علم تفسیر پر جتنا کام ہوا ہے۔ اس کا احاطہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس تفسیر میں ہر قسم کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف صرف کتابوں کا حوالہ دیتا ہے۔ علم قرآن کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہ گیا جس پر بحث نہ کی گئی ہو۔ علم الکلام، فقہ، تصوف، گرامر، لغت یہ تمام کچھ اس میں ہے۔ یہ موجودہ زمانے کی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ مصنف اہل سنت گروہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن فضیلت اہل بیت اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس سے اس کا میلان شیعت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

١٢۔ تفسیر الجواھر: "الجواہر فی تفسیر القرآن الحکیم" علامہ طنطاوی جوہری (بعض جگہوں پر طنطاوی بن جوہری درج ہے) کی تصنیف ہے۔

یہ عجیب و غریب تفسیر ہے علماء اسے ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں سب کچھ ہے لیکن تفسیر نہیں۔ عرب میں ایک مرتبہ اسے ضبط بھی کر لیا گیا۔ علامہ طنطاوی موجودہ علوم کا ماہر تھا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد سائنسی علوم کی طرف توجہ مبذول کرانا تھا۔ یہ تفسیر ٢ جلدوں میں ہے۔ جس میں قرآن کی تفسیر صرف چھ جلدوں میں آتی ہے۔ علامہ طنطاوی اپنے نیک جذبے کے تحت ہر معاملے میں اسلام کی برتری ثابت کرتا ہے۔

١٣۔ تفسیر المنار:۔ "المنار فی تفسیر القرآن الحکیم" علامہ رشید رضا (م ١٣٥٤ھ) مشہور مصری عالم شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد کی تفسیر ہے۔ جو ١٢ جلدوں میں ہے اور صرف ١٢ پاروں کی تفسیر ہے۔ مصنف کے انتقال کی وجہ سے یہ تفسیر نامکمل رہ گئی۔ یہ تفسیر زیادہ تر ان کے استاد شیخ عبدہٗ کے اقوال پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس تفسیر میں صحیح روایات، عقلی دلائل، حکمت تشریع اور کائنات میں قانون قدرت جیسے موضوعات کو لیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن مجید ہر دور کے لئے ذریعہ رشد و ہدایت ہے۔ نیز مصنف نے بڑی دلسوزی کے ساتھ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا قرآنی تعلیمات کے ساتھ تقابل کیا ہے۔

یہ تفسیر تحریک احیائے اسلام کی طویل کڑیوں میں سے اہم کڑی ہے کہیں کہیں شرح و بسط سے بھی کام لیا گیا ہے۔ روایات کو کتابوں میں سے چھان بین کر کے لکھتے ہیں۔ گرامر کی مفید باتیں بھی ہیں دورِ حاضر کی بہت عمدہ اور جامع تفاسیر میں سے ہے۔ ہمارے زمانے تک اسلام کے ضمن میں جو پیچیدگیاں اور دو سری الجھنیں پیدا کی گئی ہیں وہ اس تفسیر میں بیان کی گئی ہیں اور احسن طریقے ان کے جوابات دیئے ہیں۔

١٤۔ تفسیر فی ظلال القرآن:۔ یہ سید قطب شہید (د۔ ١٣٨٦ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں تفسیر کا علمی مواد کم ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم کوئی بلند پایہ عالم دین نہیں تھے وہ پہلے صرف ایک سکول میں مدرس تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر جیل میں لکھی جہاں کوئی کتاب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ اس تفسیر میں علم کم ہے لیکن جذبہ ایمان بے انتہا ہے۔ ادبی لحاظ سے بہترین تفسیر ہے مصنف کا ولولہ اسلام کو دوبارہ غالب دیکھنا ہے پوری کتاب تین حصوں اور آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ سراسر دعوت عمل ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ اور جملے سے اسلام اور ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ پوری تفسیر میں تجدد پسندی، سقیم تاویلات اور معذرت خواہانہ انداز بیان کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مغرب کے مادی تصورِ حیات کے سخت دشمن ہیں اور دل نشین انداز میں دنیا کی بے ثباتی بیان فرماتے ہیں۔ اسلوب بیان اور طرز ترتیب بالکل نیا ہے۔

یہ مصر کی جدید ترین تفاسیر میں سے ہے۔

١٥۔ تفسیر حقانی:۔ "فتح المنان" مولانا عبدالحق حقانی دہلوی (د۔ ١٩٠٠ء) نے تصنیف کی ہے۔ یہ پہلی جامع اردو تفسیر ہے جو اپنے زمانے تالیف تک بالکل جدید تفسیر ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کا ایک اہم مقام ہے جس دور کی یہ تصنیف ہے وہ زمانہ چونکہ مناظروں کا تھا اس لئے اس میں مناظرانہ رنگ بھی ہے۔ مصنف نے اس تفسیر میں عیسائیوں کے اس پروپیگنڈے کا رد کیا ہے جو وہ اسلام اور قرآن کے بارے میں کرتے رہتے ہیں نیز مغرب زدہ طبقے کے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ اسلام [illegible] ہے۔ مصنف نے ابتداء میں ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں [illegible] کے بنیادی افکار کی وضاحت کی ہے اور تجدد پسندوں کے خیالات کو رد کیا ہے۔ اس تفسیر میں تحقیق لغوی ترکیب نحوی، اسباب نزول، فقہی احکامات کی تشریحات وغیرہ تمام باتیں موجود ہیں جو عام تفاسیر میں پائی جاتی ہیں۔

یہ تفسیر متوسط درجے کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

١٦۔ بیان القرآن:۔ یہ تفسیر مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھی ہے مولانا نے خود لکھا ہے کہ آج کل اردو میں ناشروں نے محض تجارت کی غرض سے بے شمار ترجمے اور تفسیریں شائع کرنا شروع کر دی ہیں جن میں رطب و یابس صحیح و سقیم سب کچھ درج ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آسان زبان میں مختصر تفسیر لکھی جائے جس میں صحیح مطالب بیان کئے گئے ہوں۔

یہ تفسیر ایک جلد میں ہے جس میں مندرجہ بالا مقصد کے ساتھ ساتھ تشریح لغات، فصاحت و بلاغت کے نکات اور تصوف و سلوک کے اسرار و رموز بھی [illegible] گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ تصنیف اور بھی مفید ہو گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا انداز مشکل پسندانہ ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے

خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

۱۸۔ "ترجمان القرآن"۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صرف اٹھارہ پارہ کی تفسیر کی ہے۔ اس کی عبارت نہایت عمدہ اور مختصر ہے اس تفسیر کے چند حصوں پر علماء نے اعتراض کیا ہے ان حصوں کا تعلق متحدہ قومیت اور وحدت ادیان سے ہے

۱۸۔ "تفسیر ماجدی"۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تصنیف ہے۔ قرآن مجید کی آیات پر مختصر حواشی ہیں۔ تقریباً ہر آیت پر مستند ترین کتب تفسیر سے تفسیر کو اختصار و سلیقے سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ گویا آیات کے بارے میں مختلف مفسرین کی بصیرت افروز آراء ان حاشیوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔ دو جلدوں میں ہے مغربی تہذیب اور مستشرقین کے معاندانہ اعتراضات کا نہایت عمدگی سے رد کیا ہے۔

۱۹۔ "تفہیم القرآن"۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف ہے۔ جو ۱۹۷۲ء میں چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔

اگرچہ یہ عالمانہ تفسیر نہیں ہے جس کا خود مصنف نے بھی مقدمہ میں اظہار کیا ہے "کہ یہ تفسیر میں عوام کے لئے لکھ رہا ہوں" لیکن جدید دور میں جدید مسائل کے متعلق اس کا حل پیش کرنے میں تمام تفاسیر پر فوقیت حاصل کر چکی ہے۔

بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق "تفہیم القرآن بے پناہ محنت، تحقیق اور تلاش و طلب کا ایک حسین شاہکار ہے۔ آیات کے اردو ترجمے میں بلا کی سلاست و فصاحت ہے۔ ہر واقعہ کا تاریخی پس منظر دیا گیا ہے۔ غزوات کی ضرورت و اہمیت پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ آیات کی شان نزول پر احادیث کی روشنی ڈالی گئی ہے اور آیات سے فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔"

اس تفسیر کی ہر سورت کے شروع میں ایک دیباچہ کی شکل میں اس سورت کے مضامین کا خلاصہ اور ساتھ ہی تاریخی پس منظر اور زمانہ نزول بھی بیان کر دیا گیا ہے جس سے پڑھنے والے کے سامنے پوری سورت کے مضامین کا ایک مرتب اور مربوط مجموعہ آ جاتا ہے اور پوری سورت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی۔

"تفہیم القرآن" میں تفسیر بالرائے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ مغربی افکار اور جدید تہذیب نے اسلام کے بارے میں جس قدر شکوک و شبہات پھیلائے ہیں "تفہیم القرآن" میں ان کے نہایت اطمینان بخش جوابات موجود ہیں۔

ب۔ عربی اور فارسی کی دیگر اہم تفاسیر

۱۔ "مجمع البحرین"۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے اتقان اس کا مقدمہ ہے

۲۔ "تفسیر ابی اللیث" (د، ۳۸۳ھ) روایت و درایت کے لحاظ سے عمدہ تفسیر ہے

۳۔ "تفسیر اسحاق بن راہویہ نیشاپوری" (د، ۲۳۸ھ) اس میں منقولات کو نہایت احتیاط سے نقل کیا ہے۔

۴۔ "تفسیر الخوارزمی" (د، ۵۳۹ھ) اہل حدیث کی تفاسیر کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

۵۔ "تفسیر الجوینی" (د، ۴۳۸ھ) اس میں ہر ایک آیت کی دس وجوہ پر تفسیر کی ہے۔

۶۔ "مدارک التنزیل"۔ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی (د، ۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ حنفی مذہب کی نہایت عمدہ تفسیر ہے۔

۷۔ "معالم التنزیل"۔ ابو محمد حسین رکن الدین بن مسعود بغوی (د، ۵۱۶ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں کسی قدر غیر معتبر قصے بھی درج ہیں۔

۸۔ "تفسیر مظہری" قاضی ثناء اللہ پانی پتی (د، ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے۔ تصوف اور فقہ سے متعلق مضامین ہیں۔ منقولات کو نہایت تحقیق سے لاتے ہیں۔ بہت عمدہ تفسیر ہے۔

۹۔ "تفسیر در منثور"۔ جلال الدین سیوطی کی تفسیر ہے منقولات کی کثرت ہے۔

۱۰۔ "سواطع الالہام"۔ ابوالفیض فیضی (د، ۱۰۰۴ھ) کی بے نقط تفسیر ہے عبارت آرائی ہے۔ غیر معمولی تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ مقصد تفسیر سے بے بہرہ ہے۔

۱۱۔ "سراج المنیر"۔ شیخ خطیب شربینی کی تصنیف ہے۔ تفسیر رازی اس کا ماخذ ہے

۱۲۔ "فتح الرحمان" شاہ ولی اللہ کا ترجمہ اور حواشی بزبان فارسی۔

۱۳۔ "عرائس البیان" از ابو محمد بقلی شیرازی کی تصنیف ہے۔ تصوف کے نقطہ نظر سے تفسیر کی گئی ہے۔

۱۴۔ "فتح البیان"۔ نواب صدیق حسین خان کی تصنیف ہے جو قاضی شوکانی کی تفسیر کا ملخص ہے۔

۱۵۔ "لباب التاویل فی معانی التنزیل" المشہور تفسیر خازن از علاء الدین علی بن محمد بغدادی المعروف صوفی خازن (م ۷۲۵ھ) اس میں قصوں پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اکثر غلط روایات اور اسرائیلیات کی بھرمار ہے سب سے زیادہ غلط روایات اس تفسیر میں ہیں۔

۱۶۔ "تفسیر تنزیہ القرآن عن المطاعن" از قاضی عبدالجبار معتزلی (د، ۴۱۵ھ) معتزلہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے پوری تفسیر نہیں ہے

۱۷۔ "احکام القرآن" از ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن عربی (د، ۴۶۸ھ) اس میں ان تمام اختلافات کو لیا گیا ہے جو احکام کے بارے میں ائمہ کے مسالک کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ چار جلدوں میں ۲۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۸۔ "احکام القرآن"۔ ابوالحسن علی بن محمد الکیا الہراسی (د ۵۰۴ھ) کی تصنیف ہے شافعی مسلک کے نقطہ نظر سے فقہی مسائل قلم بند کئے گئے ہیں۔

۱۹۔ "کنز العرفان فی فقہ القرآن"، مقداد ابن عبداللہ کی تصنیف ہے جنہوں نے آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی ہجری کے شروع میں وفات پائی ہے اثنا عشری فرقے کی تفسیر ہے۔

۲۰۔ "تفسیر حسینی" ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ تصوف کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ فارسی زبان میں ہے۔

۲۱۔ "اتقان فی علوم القرآن" از شیخ جلال الدین سیوطی۔

۲۲۔ "ارشاد العقل السلیم" از ابوالمسعود

۲۳۔ "ارشاد ابن برجان" از شیخ ابن برجان۔

۲۴۔ "بسیط واحدی" از شیخ واحدی۔

۲۵۔ "تاویلات ماتریدی"۔ از شیخ ماتریدی۔

۲۶۔ "تفسیر ابراہیم" از ابراہیم بن معقل حنفی (د، ۲۹۲)

۲۷۔ "تفسیر ابن ابی حاتم" از ابو حاتم عبدالرحمان بن محمد رازی (م، ۳۲۸ھ) علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کا خلاصہ لکھا۔

۲۸۔ "تفسیر ابن ابی جمرہ" از حافظ عبداللہ بن سعد اندلسی (د ۵۲۵)

۲۹۔ "تفسیر ابن ابی شیبہ"۔ حافظ ابوبکر عبداللہ بن محمد کوفی (د، ۲۳۵ھ) کی تصنیف ہے

۳۰۔ "تفسیر ابن اثیر" از علامہ ابن اثیر۔

۳۱۔ "تفسیر ابن جماعہ" قاضی ابراہیم بن محمد کنانی کی تصنیف ہے آٹھ جلدوں میں ہے

۳۲۔ "زاد المسیر المشہور تفسیر ابن جوزی" ابوالمظفر یوسف بن قزاعی حنفی (د،

۴۵۶ھ) کی تصنیف ہے ۲۷ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۳۳۔ "تفسیر ابن حبان" از حافظ محمد شبطی (د، ۳۵۴ھ)

۳۴۔ "تفسیر ابن حکیم" از ابوالمظفر محمد بن اسعد (د، ۵۶۷ھ)

۳۵۔ "تفسیر ابن دہان" سعید بن مبارک نحوی کی تصنیف ہے جو چار جلدوں میں ہے

۳۶۔ "تفسیر ابن رزین" از تقی الدین محمد بن حسین شافعی (د، ۶۸۰ھ) شافعی مسلک کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔

۳۷۔ "تفسیر ابن العربی" از شیخ محی الدین محمد بن علی الطائی الاندلسی (د، ۶۳۸ھ) تصوف کے رنگ میں ہے اور ایک مختصر تفسیر ہے۔

۳۸۔ "تفسیر ابن عرفہ" امام ابو عبداللہ محمد بن عرفہ مالکی (د، ۸۰۳ھ) کی تصنیف ہے

۳۹۔ "تفسیر المحرر الوجیز" از ابو محمد عبدالحق۔ ابوحیان نے اس کی بڑی تعریف کی ہے

۴۰۔ "تفسیر ابن ماجہ" حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی (د، ۲۷۳ھ) کی تصنیف ہے

۴۱۔ "تفسیر ابن مردویہ" از حافظ ابوبکر احمد بن موسیٰ اصفہانی (د، ۴۱۰ھ)

۴۲۔ "تفسیر ابن المنذر" از امام ابوبکر محمد بن ابراہیم (د، ۳۱۸ھ) دس جلدوں میں ہے

۴۳۔ "تفسیر ابن النقاش" شمس الدین محمد بن علی (د، ۷۶۳ھ) کی تصنیف ہے کافی ضخیم ہے۔ اس تفسیر میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ کسی دوسری تفسیر سے ایک حرف تک نقل نہیں کیا گیا۔

۴۴۔ "التحریر والتحبیر" از شیخ ابن النقیب۔ یہ تفسیر پچاس سے زائد جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۵۔ "تفسیر ابن وہب" از عبداللہ بن وہب قرشی کی تصنیف ہے۔

۴۶۔ "تفسیر ابوالحسن" از ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (د، ۳۲۴ھ)

۴۷۔ "تفسیر ابوالعباس" از ابوالعباس سمعان۔ یہ تفسیر دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۸۔ "تفسیر ابواللیث"۔ ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی حنفی (د، ۳۷۵ھ) کی تصنیف ہے۔ نہایت عمدہ تفسیر ہے اس کا ترکی میں ترجمہ شہاب احمد بن محمد نے کیا ہے۔

۴۹۔ "تفسیر ابوالقاسم" از ابوالقاسم عبداللہ بن احمد بلخی (د، ۳۱۹ھ) ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوئی۔

۵۰۔ "الاستغنا فی علوم القرآن" از محمد بن علی مغربی (د، ۳۸۸ھ) ۱۲۰ جلدوں میں ۱۲ سال میں ختم ہوئی۔

۵۱۔ "تفسیر الاسکندری" حسین بن ابوبکر نحوی (د، ۷۴۱ھ) کی تصنیف ہے۔ دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۵۲۔ "تفسیر اصفہانی" از شیخ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد تیمی (د، ۵۳۵ھ) اس مصنف کی دوسری تفاسیر میں تفسیر جامع تیس جلدوں میں تفسیر معتمد دس جلدوں میں تفسیر ایضاً چار جلدوں میں تفسیر توضیح تین جلدوں میں ہے۔

۵۳۔ "تفسیر اصفہانی" علامہ شمس الدین شافعی (د، ۷۴۹ھ) کی تصنیف ہے کئی جلدوں میں ہے۔

۵۴۔ "تفسیر بدرالدین" شیخ محمود بن اسرائیل (د، ۸۲۳ھ) کی تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۵۵۔ "تفسیر امام الحرمین" ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی (د، ۴۷۸ھ) کی تصنیف ہے۔

۵۶۔ "تفسیر البخاری" ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری کی وہ تفسیر ہے جو آپ نے صحیح بخاری میں ذکر کی ہے اس کے علاوہ ایک اور بہت بڑی تفسیر بھی آپ نے لکھی ہے۔

۵۷۔ "تفسیر البیہقی" از ابوالمحاسن مسعود بن علی بیہقی (د، ۵۴۴ھ) کی تصنیف ہے

۵۸۔ "تفسیر جامی" از شیخ نورالدین عبدالرحمان بن احمد جامی "کشف التنزیل فی تحقیق التاویل" ابوبکر بن علی مصری۔ (د، ۸۰۰ھ) کی تصنیف ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔

۵۹۔ "تفسیر الخطیب التبریزی" ابوزکریا یحییٰ بن علی (د، ۵۰۲ھ) کی تصنیف ہے۔

۶۰۔ "تفسیر الزرکشی" از شیخ بدرالدین محمد بن عبداللہ مصلی (د، ۷۹۴ھ)

۶۱۔ "تفسیر سبط ابن الجوزی" از ابوالمظفر یوسف بن قزاوغلی (د، ۶۵۴ھ) دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۶۲۔ "تفسیر السخاوی" از ابوالحسن علی بن محمد مصری (د، ۶۴۳ھ)

۶۳۔ "تفسیر الشیرازی" شیخ عبدالوہاب بن محمد فامی کی تصنیف ہے جس میں شواہد کے طور پر ایک لاکھ اشعار درج ہیں۔

۶۴۔ "تفسیر الصالحی" از صالح بن محمد ترمذی۔ اس میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایات ہیں اور ان کے علاوہ چار ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔

۶۵۔ مجمع البیان لعلوم القرآن۔ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (د، ۴۶۰ھ) علامہ زمخشری نے اسے مختصر کیا ہے اور اس کا نام "جوامع الجامع" رکھا۔

۶۶۔ "تفسیر عبدالصمد" از عبدالصمد بن قاضی محمود۔ تین جلدوں میں ہے۔

۶۷۔ "تفسیر عطا" از عطا بن ابومسلم خراسانی۔

۶۸۔ "تفسیر عکرمہ" از حضرت عکرمہ۔ اس تفسیر کے مطالب عبداللہ بن عباس سے روایت کیے گئے ہیں۔

۶۹۔ "تفسیر القاری" ملا علی قاری کی تصنیف ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

۷۰۔ "تفسیر القزوینی" شیخ ابویوسف قزوینی کی تصنیف ہے تین سو جلدوں [illegible]

۷۱۔ "تفسیر قطب الدین" از قطب الدین محمد بن محمد [illegible] (د، [illegible]) کی تصنیف ہے۔ جو کئی جلدوں میں ہے

۷۲۔ "تفسیر الماوردی" از امام ابوالحسن علی بن حبیب (د، ۴۵۰ھ)

۷۳۔ "تفسیر مجاہد" ابوالحجاج مجاہد بن جبیر (د، [illegible]) کی تصنیف ہے۔

۷۴۔ "تفسیر المرسی" ابوالفضل محمد بن عبداللہ (د، ۶۵۵ھ) کی تصنیف ہے بیس جلدوں میں ہے۔ اس تفسیر میں [illegible] عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۷۵۔ "تفسیر المحمدیہ" اسے تفسیر مصنفک بھی کہتے ہیں۔ علی بن محمد شاہرودی (د، ۸۷۵ھ) کی تصنیف ہے۔ زبان فارسی کئی جلدوں [illegible]

۷۶۔ "تفسیر ناصر بن منصور" از ناصر بن منصور آٹھ جلدوں میں ہے۔

۷۷۔ "تفسیر نجم الدین" از احمد بن عمر خیوطی (د، ۶۱۸ھ) بارہ جلدوں میں ہے

۷۸۔ "الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن" ابوزید عبدالرحمان بن محمد الجزائری (د، [illegible]) کی تصنیف ہے۔ تصوف کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔

۷۹۔ "غرائب القرآن و رغائب الفرقان" [illegible] بن محمد [illegible] نیشاپوری (د، ۹۰۰ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں قرأت، لغت اور تصوف پر باقاعدہ عنوانات کے تحت بحث کی

گئی ہے ۔ یہ جامع قسم کی تفسیر ہے ۔

۸۰ ۔ "الجامع بین فنی الروایہ والدرایہ فی التفسیر المشہور فتح القدیر" قاضی محمد بن علی الشوکانی (د ۱۲۵۰ ھ) کی تصنیف ہے یمن کے رہنے والے تھے اور زیدی شیعہ تھے ۔ یہ چار جلدوں میں ہے

ج ۔ اردو تفاسیر

۱ ۔ "تفسیر الحسنات بآیات بینات خلاصہ تفسیر الآیات باقوال الحسنات" از ابوالحسنات قادری علامہ سید محمد احمد (م ۱۳۸۰ ھ) مفسر مرحوم نے اپنی وفات سے ایک روز پہلے ۲۸ ویں پارے کی تفسیر مکمل کر لی تھی ۔

۲ ۔ "تفسیر خلیل" ۔ ابو ابراہیم بن الحکیم الحاج عبدالعلی آروی کی تفسیر ہے ۔ دو جلدوں میں ہے

۳ ۔ "تفسیر اکسیر اعظم" احتشام الدین محمد مرادآبادی کی تصنیف ہے نو جلدوں پر مشتمل ہے ۔

۴ ۔ "تفسیر نعیمی" مفتی احمد یار خان نے سات جلدوں میں لکھی ۔

۵ ۔ "تفسیر نعیمی" مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی نے دو جلدوں میں مکمل کی ۔

۶ ۔ "تفسیر قادری" مولانا فخر الدین قادری دو حصوں میں مکمل ہے ۔

۷ ۔ "تفسیر منصوص القرآن" ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے تین حصوں لکھی ہے

۸ ۔ "تفسیر بیان للناس" خواجہ احمد الدین امرتسری کی تصنیف ہے سات جلدوں میں ہے

۹ ۔ "تفسیر عثمانی" از مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمود حسین ۔

۱۰ ۔ "احسن التفاسیر" از احمد حسن محدث دہلوی (د ۱۳۳۸ ھ) کی تصنیف ہے اہل حدیث نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے ۔ یہ چار جلدوں میں ہے

۱۱ ۔ "تنویر القرآن علی کنز الایمان" از مفتی اعجاز ولی خان ۔

۱۲ ۔ "تفسیر مواہب الرحمان" سید امیر علی ملیح آبادی کی تصنیف ہے جو ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے ۔

۱۳ ۔ "خلاصہ التفاسیر" از فتح محمد تائب (م ۱۳۲۴ ھ) چار جلدوں پر مشتمل ہے بقول مولانا عبدالماجد دریابادی اگرچہ ضخامت میں یہ تفسیر چھوٹی ہے ۔ لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے افضل ہے ۔

۱۴ ۔ "تشریح القرآن" محمد عثمان سلیم الدین تسلیم (د ۱۳۰۱ ھ) کی تصنیف ہے ۔ چار جلدوں میں ہے ۔

۱۵ ۔ "تفسیر ثنائی" از ثناء اللہ امرتسری (د ۱۳۶۷ ھ) سات جلدوں پر مشتمل ہے ۔ ایک تفسیر عربی زبان میں بھی لکھی ہے جو "تفسیر القرآن بکلام الرحمان" ہے ۔

۱۶ ۔ "تفسیر صدیقی" از عبدالقدیر حسرت صدیقی ۔

۱۷ ۔ "تفسیر مجددی" اس تفسیر کو تفسیر فاروقی بھی کہتے ہیں ۔ رؤف احمد رافت کی تصنیف ہے ۔ تین جلدوں میں ہے ۔

۱۸ ۔ "ترجمان القرآن بلطائف البیان" از نواب صدیق حسن خان (د ۱۳۰۷ ھ) ۱۶ جلدوں پر مشتمل ہے امام شوکانی کی عربی تفسیر فتح القدیر کا خلاصہ ہے ۔

۱۹ ۔ "الطاف الرحمان بتفسیر القرآن" از عبدالباری محمد فرنگی محلی (د ۱۳۰۳ ھ)

۲۰ ۔ "تفسیر حقانی" مولانا عبدالحق حقانی دہلوی نے چار جلدوں میں تفسیر کی ہے ۔

۲۱ ۔ "مطالب القرآن" از سید علی حسن بہاری ۔ تین جلدوں میں ہے ۔

۲۲ ۔ "تفسیر قادری" از فخر الدین احمد فرنگی محلی ۔ دو جلدوں میں ہے

۲۳ ۔ "تفسیر جلالین" ابوذر سنبھلی نے عربی کی تفسیر جلالین کا اردو ترجمہ کیا ہے ۔

۲۴ ۔ "تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف" از مولانا حسین بخش جاڑا گیارہ حصوں میں ہے ۔

۲۵ ۔ "تفسیر بیان القرآن" از محمد علی لاہوری احمدی ۔ تین جلدوں میں ہے ۔

۲۶ ۔ "تدبر قرآن" مولانا امین احسن اصلاحی ، چار جلدیں چھپ چکی ہیں ۔

۲۷ ۔ "معارف قرآن" مفتی محمد شفیع کی تصنیف ہے آٹھ جلدوں میں ہے

۲۸ ۔ "برہان" "تفسیر الفرقان فی المعارف القرآن" خواجہ محمد عبدالحیٔ فاروقی کی تصنیف ہے

۲۹ ۔ "معارف القرآن" از مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۔

۳۰ ۔ "تفسیر سراج البیان" ۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے یہ تفسیر لکھی ہے ۔

د ۔ قرآن مجید کی نامکمل اور مختلف پاروں کی اردو تفاسیر

۱ ۔ "القول المتین فی تفسیر سورۂ والتین" ۔ ابوالکلام آزاد کی تصنیف ہے ۔

۲ ۔ "تفسیر سورۃ فاتحہ" از محمد عالم آسی امرتسری

۳ ۔ "تفسیر سورۃ الفیل ، اخلاص و فضائل بسملہ" از ابراہیم رضا ۔

۴ ۔ "آسان تفسیر" از مولانا محمد عبدالحی یہ تیسویں پارے کی تفسیر ہے ۔

۵ ۔ "تفسیر بیان القرآن" از احمد حسن ۔ دو پاروں کی تفسیر ہے ۔

۶ ۔ "تفسیر فاتحہ الکتاب" از احمد سعید خان ۔ قرآن پاک کی وہ آیات جن میں سورہ فاتحہ کے الفاظ آئے ہیں جمع کر کے تفسیر کی گئی ہے ۔

۷ ۔ "اسرار القرآن" از احمد علی خان پارہ اوّل کی تفسیر ہے ۔

۸ ۔ "تفسیر سورۃ بقرہ" از ارشد خان بھٹی ۔

۹ ۔ "الازھار النافعہ فی تفسیر سورۃ فاتحہ" از مولانا اشرف شمسی

۱۰ ۔ "تفسیر سورۃ آل عمران" از ڈاکٹر اشفاق علی ۔

۱۱ ۔ "توضیح القرآن" از شیخ محمد اقبال ۔ سورہ بقرہ ، آل عمران ، نساء ، انفعال ، محمد فتح ، الحجرات کی تفسیر ہے ۔

۱۲ ۔ "تفسیر فراہی" ۔ از حمید الدین فراہی اسے اردو قالب میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ڈھالا ہے ۔

۱۳ ۔ "تفسیر ابر رحمت" امیر الدین محمد پٹیالوی کی تصنیف ہے ۔ سورۃ یوسف کی تفسیر ہے ۔

۱۴ ۔ "الناموس المفصل فی تفسیر سورۂ مزمل" از انوار الحق علوی

۱۵ ۔ "نور الحق فی تفسیر الفلق" از انوار الحق علوی ۔

۱۶ ۔ "تفسیر سورۃ کوثر" از انیس احمد

۱۷ ۔ "تفسیر سورۂ والتین والعصر" از مولانا محمد ایوب ۔

۱۸ ۔ "تفسیر سورۃ فاتحہ" از مولانا تمنا عمادی ۔

۱۹ ۔ "تفسیر سورۃ یوسف" مولانا ثناء اللہ امرتسری

۲۰ ۔ "میزان الادیان بتفسیر القرآن" از دیدار علی شاہ الوری ۔

۲۱ ۔ "تفسیر القرآن" از ذوالفقار حیدر ۔ یہ سورۃ بقرہ کی تفسیر ہے ۔

۲۲ ۔ "تفسیر رفیعی" از رفیع الدین محدث دہلوی ۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر ہے ۔

۲۳ ۔ "معارف القرآن" از زاہد القادری ، سورۃ العصر کی تفسیر ہے ۔

۲۴ ۔ "لوامع البیان" از سعادت اللہ خان ۔ یہ سورۃ النبا اور النازعات کی

تفسیر ہے۔

۲۵۔ "رفیق المسلمین" تفسیر سورۂ یٰس۔ از نواب نذر آور الدین ولنواب وقار الدین

۲۶۔ "سلطان التفاسیر" از سلطان محمد خان پادری تفسیر سورہ فاتحہ۔

۲۷۔ "الجمال والکمال" از محمد سلیمان سلمان منصورپوری۔

۲۸۔ "تفسیر سورۂ فاتحہ" از سید احمد شہید بریلوی۔

۲۹۔ "تفسیر قرآن" از شائق احمد عثمانی۔ یہ پارہ ۲۹ اور ۳۰ کی تفسیر ہے۔

۳۰۔ "نظم البیان فی مطالب القرآن" از شمس الدین

۳۱۔ "تفسیر القرآن" از قاضی شمس الدین۔ پہلی جلد سورۂ مائدہ تک چھپ چکی ہے

۳۲۔ تفسیر الجوہر الفرید فی سورۃ التوحید" از شمس اللہ قادری

۳۳۔ "تذکیر الکل بتفسیر الفاتحہ واربع قل" از نواب صدیق حسن خان۔

۳۴۔ "سراج المبین" از ظہور احمد وفق یہ سورۂ یٰسٓ کی تفسیر ہے۔

۳۵۔ "تفسیر سورۂ والعصر" از عبدالباری

۳۶۔ "اسرار التنزیل فی تفسیر سورہ فیل" از عبدالبصیر سیوہاروی

۳۷۔ "الفوز العظیم" از عبدالجلیل نعمانی۔

۳۸۔ "جواہر التفسیر فی السیر والتذکیر" از عبدالحی قادری۔

۳۹۔ "الخلافۃ الکبریٰ" از خواجہ محمد عبدالحی فاروقی سورۂ بقرہ کی تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بیان (تفسیر آل عمران) الصراط المستقیم (انفعال و توبہ) عبرت (سورۂ یوسف) بصائر (بنی اسرائیل سے متعلق آیات کی تفسیر) برہان (سورۂ نور) سبیل الرشاد (سورت حجرات) سبیل السلام (سورۂ مجادلہ تا التحریم) ذکریٰ (پارہ عم کی تفسیر) بھی ان کی تصانیف ہیں۔

۴۰۔ "تفسیر پارہ عم" از محمد عبدالرحیم

۴۱۔ "الدر المکنون فی تفسیر الماعون" از عبدالصمد صارم

۴۲۔ "تفسیر سورۂ فاتحہ" از عبدالصمد فاروقی۔

۴۳۔ "تفسیر کلام علام الغیوب فی احوال یوسف ابن یعقوب" از عبدالعزیز ابی محمد ابن حاجی محمود۔

۴۴۔ "مشکوۃ الموحدین" از عبدالغفور سجاری

۴۵۔ "تفسیر پارہ عم و آلم" از عبدالقادر

۴۶۔ "ذخیرۂ عقبیٰ معروف تفسیر سورۂ الانشراح" از عبدالقادر محمد سجادہ نشین محمد قطب الدین۔

۴۷۔ "تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن" از عبدالقادر ہزاروی۔

۴۸۔ "دستور الارتقا تفسیر سورۃ الاسریٰ" از عبداللطیف افغانی اکبرآبادی۔

۴۹۔ "تفسیر القرآن بآیات القرآن (ابتدائی پارے) از عبداللہ چکڑالوی

۵۰۔ "تفسیر مقبول" از عبداللہ سید۔ یہ سورۂ یٰس۔ الرحمٰن، الواقعہ، تبارک الذی، نوح، الجن، المزمل کی تفسیر ہے۔

۵۱۔ "جنگ انقلاب" از عبیداللہ سندھی

۵۲۔ "دستور انقلاب" " "

۵۳۔ "عنوان انقلاب" " "

۵۴۔ "نور مبین تفسیر سورۃ یٰسٓ" از محمد عسکری

۵۵۔ "نعم البیان" از غلام معین الدین

۵۶۔ "تفسیر سورہ یٰس و پارہ تبارک الذی" از غلام غوث حنفی اس کے علاوہ مطلع البدر فی تفسیر سورۃ العصر، نثر المرجان، تفسیر سورۃ نساء، ام القرآن۔ نثر المرجان۔ تفسیر سورۂ مائدہ تا سورہ توبہ بھی ان کی تفاسیر ہیں۔

۵۷۔ "تفسیر سورہ الرحمان" از فیض الرحمان۔

۵۸۔ "تفسیر معوذتین" از محمد قاسم نانوتوی

۵۹ "مظہر العجائب" از لطف اللہ لکھنوی۔

۶۰۔ "نکات القرآن" محمد علی ایم اے (احمدی) ابتدائی پانچ پاروں کی تفسیر ہے۔

۶۱۔ "نجم الہدیٰ فی تفسیر سورہ والنجم" از حافظ محمد ابراہیم سیالکوٹی

۶۲۔ "عرائس البیان تفسیر سورہ رحمٰن" از " "

۶۳۔ "انوار الساطعہ تفسیر سورہ واقعہ" از " "

۶۴۔ "واضح البیان تفسیر سورہ فاتحہ" از " "

۶۵۔ " سورہ کہف" از " "

۶۶۔ "تبصرۃ الرحمٰن فی تفسیر القرآن" از " "

۶۷۔ "تفسیر سورہ کوثر فی فضائل خیر البشر" از نادر حسین خالص الدولہ

۶۸۔ "ناصر التفاسیر" از ناصر علی ۶۹۔ دستور حیات تفسیر سورۂ نساء" از حافظ احمد یار

ان کے علاوہ سینکڑوں ایسی بہت سی تفاسیر ہیں۔ جو یا مکمل یا کسی پارے یا واقعے پر مبنی ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث انہیں درج نہیں کیا جا سکا۔

تفلس گرجستان اور کارتیل کا صدر مقام۔ جس کا محل وقوع باب کے شمال مشرق یعنی داغستان میں ہے۔

گرجی وقائع نامہ کے مطابق شاہ گرجستان کے خلاف جو آل ساسان کی شاخ میں سے تھا۔ ایک مہم بھیجی گئی جس کی سرکردگی ایرانی سپہ سالار کے ہاتھ میں تھی اس نے ابواب کوہ قاف کے درمیان تفلس کا شہر تعمیر کرایا تاکہ وہ گرجستان کے پایۂ تخت متسخیتا کے خلاف ایک دیوار کا کام دے سکے۔

شاہ وختنگ گرگسال کی جنگوں میں جو ایرانیوں کے خلاف لڑی گئی تھیں تفلس کا قلعہ اور گاؤں تباہ ہو گئے تھے۔ بعد میں وختنگ نے تفلس میں ایک شہر کی بنیاد ڈالی جس کی فصیلیں اس کے بیٹے ڈچی نے مکمل کرائیں۔ ۵۲۳ء میں ایرانیوں نے گرجستان کے حکمران خاندان کو ختم کر کے تفلس میں ایرانی قبضہ قائم کر لیا۔

مسلمانوں نے خلفائے راشدین کے عہد حکومت میں یہاں اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ زیر نگیں کر لیا تھا۔ بقول طبری ۲۲ھ/۶۴۳ء میں سراقہ نے حبیب بن مسلمہ کو تفلس فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جس کی آخری سال وہاں کے باشندوں سے صلح ہو گئی۔ بقول الیعقوبی یہ صلح ۲۵ھ/۶۴۵ء میں حضرت عثمان کے عہد خلافت میں ہوئی۔ حبیب بن مسلمہ آرمینیا فتح کرنے کے بعد جب گرجستان کی طرف متوجہ ہوا تو ایک گرجستانی سفیر امان حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ حبیب نے لوگوں کو امان دے دی اور ایک عالم عبدالرحمان بن جزء السلمی کو تفلس کے لوگوں کو شریعت کے مسائل سمجھانے کے لئے بھیج دیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد اہل تفلس نے اسلام قبول کر لیا۔ تفلس فتح کر لینے کے بعد حبیب نے دوسرے علاقے فتح کرنے یا ان علاقوں سے صلح نامے کرنے شروع کئے۔ حبیب کی مدت المتوکل کے عہد حکومت تک جرزان اور ابخاز تفلس کے فوجی کمانڈر کو خراج ادا کرتے رہے تفلس میں عہد بنو امیہ میں ایک ٹکسال بھی قائم کی گئی۔ ۷۴۷ء میں استرخان خوارزمی کے حملے کے دوران میں تفلس میں داخل ہو گئے۔ خزروں کا ایک حملہ ۱۸۳ھ/۷۹۹ء میں ہوا جس میں تفلس تباہ ہو گیا۔ المامون کے عہد

ہیں ایک شخص محمد بن عتاب آرمینیا کا بادشاہ بن بیٹھا ۲۱۴ھ/۸۲۹ء میں اس نے گرجستان کا علاقہ فتح کر لیا محمد بن عتاب کے بعد خالد نے تفلس اسحاق بن اسماعیل بن شعیب کو دے دیا جو مروان کا حوالی تھا، ۹۲۲ء تک تفلس میں عباسی ٹیکسال موجود تھی جس میں درہم ڈھلتے تھے۔

۹۱۲ء میں تفلس جعفر بن علی کے قبضے میں تھا۔ جعفر کی وفات کے بعد تفلس کے امراء نے شہر کی چابیاں شاہ بگرات کے حوالے کر دیں۔ ۱۰۵۴ء میں سلجوقیوں نے گنجہ کے خلاف ایک مہم بھیجی لیکن بگرات رابع کے حلیف بزنطینیوں کی ایک جوابی کارروائی سے شہر بچ گیا۔ ۱۰۶۸ء میں الپ ارسلان نے شاہ آرمینیا، شاہ کاخیتھیا اور امیر تفلس کو ہمرکاب لے کر بگرات کے خلاف چڑھائی کی اور پورے خارتھلیا پر قبضہ کر لیا۔

اس نے تفلس فضلون گنجوی کو عطا کر دیا۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں تفلس کے مسلمانوں کی شکایت پر محمود بن سلجوق نے گرجستان میں ایک مہم بھیجی۔ ان دنوں داؤد ثانی تفلس کا حاکم تھا جو مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم کرتا تھا۔ محمود بن سلجوق کے لشکر کو داؤد ثانی نے شکست دی اور اس نے مسلمانوں پر ظلم و ستم روا رکھا۔

۱۴۰۲ء میں تیمور تفلس سے گذرا تو اس نے تمام مسیحی دیروں اور کلیساؤں کو ویران کر دیا۔ تیمور کی لائی ہوئی تباہی کے بعد جو عام بدنظمی پھیلی اس کا ذکر وقائع نامہ گرجستان میں محفوظ ہے۔ ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء میں جہان شاہ قرہ قویونلو نے تفلس پر قبضہ کر لیا۔ اس دور میں گرجستان تین بڑی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جو یہ تھیں خارتھلیہ، کاختیا جس کا صدر مقام تفلس تھا اور امیرتھیا۔

۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء میں اوزون حسن گرجستان میں آیا تو قسطنطین نے تفلس اوزون کے حوالے کر دیا۔ ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں طہماسپ نے تفلس پر قبضہ کیا۔ حاکم شہر نے ایرانیوں کی اطاعت قبول کر لی اور اسلام بھی لے آیا۔

[illegible]ء میں عثمانی ترک سمتسخہ کے راستے سے گرجستان میں گھس گئے اور تفلس پر قابض ہو گئے۔ ترکوں نے دو سو سپاہی اور ایک سو توپیں تفلس میں چھوڑ دیں اور تفلس کی سنجق محمد بن فرہاد پاشا کے حوالے کر دی۔ دو گرجوں کو مساجد میں تبدیل کیا۔

۱۶۰۳ء میں ایران کے شاہ عباس اوّل نے تفلس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۱۷۲۳ء میں عثمانیوں نے دوبارہ گرجستان کا علاقہ حاصل کر لیا۔ ۱۷۳۴ء تک یہ علاقہ ان کے قبضے میں رہا۔

۱۷۹۵ء میں آغا محمد قاچار نے تفلس کو فتح کیا اور نہایت بے دردی سے لوٹا۔ ایرانی حملے کے بعد داغستانیوں نے حملہ کیا۔ ۱۷۹۹ء میں تفلس کا روس سے الحاق ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء تک تفلس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انقلاب روس کے بعد تفلس جمہوریات متحدہ روسیہ میں سے ماورائے قفقاز کی جمہوریہ کا پایۂ تخت قرار پایا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ترکوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے سے انکار کر دیا تو ماورائے قفقاز کو تین جمہوری سلطنتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ تفلس دوبارہ گرجستان کا پایۂ تخت قرار پایا۔

تفلس کا حال عرب جغرافیہ دانوں نے بہت کم بیان کیا ہے۔ بقول اصطخری یہ شہر بہت بڑا تھا۔ اس کے گرد مٹی کی فصیلیں تھیں۔ یہ عالم اسلام کا ایک سرحدی مقام تھا۔ جس کے پرے کوئی مسلم آبادی نہ تھی۔

۱۸۰۳ء میں تفلس میں چار ہزار مکان تھے اور کل آبادی ۲۰ ہزار تھی۔ ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۲۹۱۸۲۸ تھی۔ جن میں ارمنی، گرجستانی روسی، یہودی، ایرانی، جرمن، آذربائیجانی اور ترک شامل تھے۔

تقتمیش ترکی حکومت آلتون اردو کا خان۔ باپ کا نام تولی خوجہ تھا جو منگیشلاق کا حاکم تھا۔ اسے کو خان ارس کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ تقتمیش کو باپ کے قتل کے بعد نابالغ ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔ ۷۷۷ھ/۱۳۷۶ء میں تقتمیش تیمور کے پاس چلا گیا۔ جس نے سمرقند میں اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اترار، صبران اور سیغناق کے علاقے عطا کیے۔ ارس خان کے بیٹے قتلغ بوغا نے اس پر حملہ کیا۔ اگرچہ قتلغ بوغا اس لڑائی میں قتل ہو گیا لیکن تقتمیش کو شکست نصیب ہوئی۔ وہ دوبارہ تیمور کے پاس گیا اور وہاں سے امداد حاصل کرنے کے بعد ارس خان کے دوسرے بیٹے کے ساتھ نبرد آزما ہوا لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست اٹھانا پڑی۔ اب تیمور کو بذات خود تقتمیش کے ساتھ ارس خان کے خلاف میدان جنگ میں آنا پڑا۔ چنانچہ تیمور نے ارس خان کے لشکر کو شکست فاش دی۔ اس جنگ میں ارس خان بھی مارا گیا۔ خان کے بعد اس کے بیٹے توختہ قیا اور تیمور ملک یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ تیمور ملک نے تقتمیش کو تیمور کے واپس لوٹتے ہی پھر شکست دی۔ لیکن بعد میں تیمور کی خواہش کے مطابق اسے سیغناق کا علاقہ دے دیا۔ تیمور ملک کو تخت نشین ہونے کے بعد شراب خوری کی عادت ہو گئی اور وہ سلطنت کے کاروبار سے غافل ہو گیا۔ چنانچہ تقتمیش نے تیمور کے کہنے پر اس کے علاقے پر یلغار کی اور اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد تقتمیش نے آلتون اردو کی سلطنت کے مغربی حصے پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا اور اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔ ۱۳۸۱ء میں اس نے روسیوں سے اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب روسیوں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے ۱۳۸۲ء میں ملک روس کو بری طرح پامال کیا۔ روس کے دار الحکومت ماسکو کو خود لوٹا اور اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح روس میں تاتاریوں نے اپنی حکومت ایک سو سال کے لیے دوبارہ قائم کر لی۔

تقتمیش اپنی ریاست قائم کرتے ہی تیمور کا دشمن ہو گیا۔ اور اس طرح سے اس نے تیمور کے احسانات کا بدلہ دیا۔ ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں تقتمیش نے تیمور کے خلاف دربند کے راستے آذربائیجان پر حملہ کیا۔ تبریز کو بڑی بے دردی سے تباہ کر دیا۔ آٹھ روز تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ اس سارے عرصے میں تیمور نے بڑے تحمل اور صبر سے کام لیا۔ اس نے ایک لشکر اپنے بیٹے میران شاہ کی کمان میں بھیجا جس نے تقتمیش کو شکست دی۔ لیکن فتح حاصل کرنے کے بعد تیمور نے قیدیوں کو رہا کر دیا اور تقتمیش کو صرف ملامت و تنبیہ کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ لیکن تقتمیش نے اسی سال تیمور کے قلب سلطنت پر حملہ کر دیا۔ تیمور کو ایران سے جلد ہی واپس لوٹنا پڑا اور اس نے ۱۳۹۱ء میں آلتون اردو کے ممالک کے خلاف انتقامی مہم شروع کی۔ چنانچہ تقتمیش کو قندوزچہ کے میدان میں شکست فاش ہوئی۔ تیمور آلتون اردو کی سلطنت کو مطیع کیے بغیر واپس چلا گیا۔

اب تقتمیش اور تیمور کے درمیان کھلی عداوت پیدا ہو گئی۔ تقتمیش نے مصر کو آلتون اردو کی حکومت کو ساتھ ملا کر تیمور کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں تیمور مغرب کے خلاف اپنی پنج سالہ یورش میں مصروف تھا۔ ۱۳۹۴ء میں تیمور کو کوشکی کے مقام پر اطلاع ملی کہ آلتون اردو کے لشکروں نے ملک پر حملہ کر دیا۔ تیمور نے نہایت آسانی سے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ ۱۳۹۵ء میں تیمور نے تقتمیش کے خلاف اپنی مہم شروع کی۔ دریائے ترک کے کنارے فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں تقتمیش کچھ عرصے کے لیے غائب ہو گیا۔ تیمور نے اس کا تعاقب

کیا تورا تور پہنچ کر اس نے قویری چاق اغلی ارُس خان کے بیٹے کوارس جوجی کی خانی عطا کی۔ ۱۳۹۶ء میں تیمور دربند کے راستے آذربائیجان واپس آگیا تو تقتمیش کو ایک بار پھر تاج و تخت واپس لینے کا موقعہ ملا۔ ۱۳۹۶ء میں اس نے جنوہ کے فرنگیوں کے خلاف جنگ کی تقتمیش بھاگ کر ویٹوٹ ہیں امیر لتھونیا کے پاس چلا گیا۔ امیر لتھونیا نے اس کی مدد کی لیکن تاتاریوں نے ۱۳۹۹ء میں اسے شکست دی۔ ۱۴۰۵ء میں تقتمیش نے اپنا ایک ایلچی تیمور کے پاس بھیجا جس کے ذریعے اس نے تیمور سے معافی مانگی۔ تیمور نے وعدہ کیا چین کی مہم کے بعد آلتون اردو کی مملکت میں آکر وہ تقتمیش کو اس کا تخت واپس کرا دے گا۔ ۱۴۰۶ء میں تقتمیش تومن کی ایک فوج کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

تقدیر اندازہ ٹھہرانا۔ مقرر کرنا۔ یہ لفظ قدر سے نکلا ہے جس کے معنی اندازے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے "ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" (۵۴: ۴۹)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے ضمن میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہوا لیکن قرآن مجید میں اس کے بار بار اعادے سے اس کی اہمیت واضح ہو گئی ہے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اسے بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ بعض احادیث میں تقدیر کو ایمانیات کی آخری کڑی قرار دیا گیا ہے۔ (صحیح مسلم)

تقدیر کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اندازے اور فیصلہ ازلی کے مطابق بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کے تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی نقشہ تیار کر لیتا ہے اور اسی مجوزہ نقشے کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں۔ چنانچہ خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلے کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں۔ موت و حیات، فقر و غنا، کامیابی و ناکامی تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنی میں کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

"اور سورج چلتا ہے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے منزلیں مقدر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوٹتا ہے نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ وہ چاند کو پا سکے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔" (۳۶: ۳۸ تا ۴۰)

"اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ بنایا ہے (۶۵: ۳)

"ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا۔" (۵۶: ۶۰)

چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لئے مقدرات کو نوشتہ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عقیدہ تقدیر کا منشا یہ ہے کہ ہمیں جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بے جا ہے اسی طرح ہمیں جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے۔ اس لئے ہمیں دل شکستہ اور مایوس نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ہمیں اسی جذبے اور جوش و خروش سے از سر نو جدوجہد میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "جبر و قدر"، "قضا و قدر")

تُقرّت تگرت، الجزائری صحرا کا ایک قصبہ۔ یہ بسکرہ سے ۱۳۵ میل جنوب میں واقع ہے اور سطح سمندر سے ۲۰۰ فٹ اونچا ہے۔

تقرت کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات نہایت قلیل ہیں۔ ابن خلدون کے مطابق بربر قبیلے ریرزہ کی ایک بڑی جماعت نے زاب اور وارقلہ کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں زناتہ کے دیگر قبائل کے ساتھ گھل مل گئے اور خود مختارانہ طور پر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے لگے۔ ان قصبات میں تقرت سب سے بڑا قصبہ تھا۔ ان لوگوں میں یہودیوں کی خاصی تعداد تھی جن میں سے اکثریت نے خوارج کا مذہب اختیار کر لیا۔ اور ایک مدت دراز تک اس مذہب پر قائم رہے۔

تقرت عربوں کے پہلے حملے سے تو بچا رہا لیکن آخر کار مغرب کے حکام کی برتری انہیں تسلیم کرنا پڑی۔ الموحدون کے عہد حکومت میں ایک والی، جو بسکرہ میں رہتا تھا، اہل تقرت کا حاکم ہوتا تھا۔ اس کے بعد تونس کے حفصیوں کے ماتحت رہا۔ بعد ازاں بنو مزل کے زیر اقتدار آ گیا۔ تقرت پر دو خاندان بنو معبد [illegible] اور تیماسین کے بنو ابراہیم اپنا اپنا حق ملکیت جتاتے تھے جس کی وجہ سے ان دونوں میں فسادات ہوئے۔ ان فسادات کو دبانے کے لئے سلطان [illegible] الحفصی نے تقرت پر حملہ کیا اور ۱۳۵۲ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ [illegible] عرصے بعد دوبارہ خانہ جنگی شروع ہوئی جو اس وقت تک جاری [illegible] سیدی محمد بن یحییٰ نے تقرت پر قبضہ نہیں کر لیا۔ وہ تقریباً چالیس برس [illegible] حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے بعد فسادات پھر اٹھ کھڑے ہوئے [illegible] شہزادہ سلیمان بن جلاب یہاں پر اقامت پذیر ہوا [illegible] مسجد بنوائی اور اپنے آپ کو بادشاہ تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گیا [illegible] بنی جلاب کا بانی ہے جو انیسویں صدی تک تقرت میں حکمرانی کرتے رہے [illegible] صدی میں بیلربک صالح رئیس نے بنی جلاب کے خلاف [illegible] کی اور تقرت کو لوٹنے کے بعد خراج کے معاہدے پر [illegible] صدی میں بنی جلاب نے قسطنطنیہ کے بیگ کی [illegible] ٹیکس ادا نہ کئے چنانچہ بیگوں نے [illegible] بیٹھانا چاہا۔ ۱۸۲۱ء میں جب احمد [illegible] کچھ دے دلا کر اس سے اپنی گلو خلاصی کرائی۔ لیکن بنو جلاب کی [illegible] اور زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۸۴۱ء میں جب فرانسیسیوں نے [illegible] نے تو عبدالکریم کے جانشین عبدالرحمان نے فرانس کی [illegible] لیکن ۱۸۵۲ء میں فرانسیسی فوج کے ایک دستے نے تقرت پر قبضہ [illegible] ایک محافظ فوج متعین کر دی ۱۸۷۱ء میں پھر شورش [illegible] نامی ایک شخص نے تقرت پر قبضہ کر لیا۔ محافظ فوج کو تہ تیغ کر دیا [illegible] پر امن قائم ہو گیا۔

تقرت وادی ریغ کا سب سے اہم مقام ہے۔ وادی ریغ ۱۳۰ میل [illegible] لمبی تنگ وادی ہے جس میں صحرا سے دو دریا گزرتے ہیں۔ تھوڑی [illegible] پر زیر زمین پانی موجود ہے۔ چنانچہ یہاں کھجور کے درخت خوب پھلتے پھولتے ہیں تقرت کے جھنڈ میں دو لاکھ کے قریب درخت ہیں [illegible] قسم کی کھجوریں لگتی ہیں تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ یہاں کا موسم [illegible]

کے لحاظ سے مضر ہے کیونکہ سطح زمین پر جمع ہو جانے والے پانی کے نکاس کا کوئی راستہ نہیں۔ موسم گرما میں یہاں ایک خاص بخار کا دور دورہ ہوتا ہے۔ تقرت دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ سواد قصبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس حصے میں متعدد محلے ہیں۔ دوسرا حصہ نواح قصبہ کے نام سے ہے جس میں قصبے کے گرداگرد دو یا تین میل کے دائرے کے اندر متعدد گاؤں آباد ہیں۔ اس حصے میں مکان کچی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں۔

تقرت کی قابل ذکر عمارت صرف ایک جامع مسجد ہے جسے تیونس کے کاریگروں نے تعمیر کیا تھا۔ تقرت کی آبادی زیادہ تر زرداہ پر مشتمل ہے جو وادریغ کے اصلی باشندے ہیں اور بربر نسل سے ہیں۔ وہ یہودی جنہوں سترہویں صدی کے اختتام اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں اسلام قبول کیا۔ انہوں نے یہاں آکر ایک الگ محلہ بسالیا ہے۔

آج کل تقرت ایک خطے کا صدر مقام ہے۔ جس کی آبادی اڑھائی لاکھ کے قریب ہے۔

تقلید

کسی ایسے قول کی پیروی کرنا جس کی دلیل وحجت سے مقلد کو واقفیت نہ ہو۔ گویا تقلید یہ ہے کہ انسان کسی غیر کے قول یا فعل کو صحیح مان کر اس کی دلیل پر غور وتامل کئے بغیر اس کا اتباع کرے۔ تقلید اجتہاد کی ضد ہے۔ اتباع اور تقلید میں ایک باریک سا فرق ہے کیونکہ اتباع میں کسی کی پیروی سوچ سمجھ کر اور مقاصد واغراض سے کماحقہ واقفیت حاصل کر کے کی جاتی ہے جبکہ تقلید کی روح محض حسن ظن ہے۔

تقلید کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جس زمانے میں مذاہب فقہ کی تدوین ہوئی۔ تقلید کے اسباب میں اہم ترین سبب علما ومتاخرین میں مجتہدانہ صلاحیتوں کا فقدان ہے۔ تیسری صدی کے بعد جب اجتہاد مطلق ختم ہو گیا تو فقہائے متاخرین یا عوام کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اکابر متقدمین کی تقلید کے قائل ہو جائیں۔

شاہ ولی اللہ نے تقلید کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک تقلید واجب ہے۔ ایک تقلید حرام۔

چنانچہ جو شخص کتاب وسنت سے ناواقف ہو اور تتبع واستنباط کے ناقابل ہو وہ کسی متقی عالم سے پوچھے کہ فلاں مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے۔ اور جب اسے بتایا جائے تو اس پر عمل کرے۔ یہ تقلید جائز اور واجب ہے نیز لکھتے ہیں کہ اس قسم کی تقاید کی علامت یہ ہے کہ کسی مجتہد کے قول پر گویا اس شرط پر عمل کیا جائے کہ وہ قول سنت کے مطابق ہو اور پھر تاحد امکان سنت کی تلاش کرتا رہے۔ جب اسے یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کے مجتہد کا قول کسی قطعی حدیث سے مطابقت نہیں رکھتا تو اس قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے جیسا کہ اس بات کی طرف ائمہ کرام کا اشارہ بھی ہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کا قول کہ اگر میری بات کسی حدیث سے ٹکرائی ہو تو اسے پتھر پر دے مارو۔

اگر قطعی حجت کے مل جانے کے باوجود بھی مقلد محض تقلیداً کسی امام کے خلاف شریعت قول کو نہیں چھوڑتا۔ تو ایسی تقلید ممنوعہ ہے۔ اس کی شرع میں کوئی اصل نہیں اور نہ قرون سابقہ میں سے کسی نے اس پر عمل کیا۔

تقلید کی مخالفت کرنے والوں میں داؤد بن علی ابن حزم اور دیگر اصحاب ظاہریہ کا نام آتا ہے۔ ان کے نزدیک متاخر فقہا کے لئے بھی ضروری ہے کہ اجتہاد کریں۔

وجوب تقلید کی تائید میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فقط قرون اولیٰ کے فقہا میں وہ حقیقی نظر اور تیزی فہم وہ وسعت علم اور درایت پائی جاتی تھی جو اصل ماخوذ سے مسائل فقہ کے استنباط کے لئے ضروری ہے اور وہی لوگ ان مسائل کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے قائم کر سکتے تھے۔ یہ بات متاخرین کے حصے میں نہیں آئی۔

تقلید نے مختلف مذاہب میں اختلاف قائم رکھنے میں مدد دی۔ لیکن اس پر یہ الزام دینا مناسب نہیں ہے کہ زمانہ مابعد میں فقہ کی ترقی کے محرکات کو ٹھنڈا کرنے کی ذمہ داری بھی تقلید ہی پر ہے۔ (نیز دیکھئے "اجتہاد")

تقویٰ

محفوظ کرنا، مصیبت سے بچانا۔ اصطلاح میں تقوےٰ سے مراد ممنوع چیزوں سے بچ کر رہنا۔ پاکیزہ زندگی بسر کرنا۔ گویا اپنے آپ کو گناہ میں پڑنے سے بچانا تقوےٰ ہے۔

حضرت عمرؓ نے کعب الاحبارؓ سے تقویٰ کی تعریف پوچھی تو انہوں نے پوچھا آپ کبھی خاردار راستہ پر چلے ہیں۔؟ حضرت عمرؓ نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا کہ آپ نے کیا طریقہ اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے بچاؤ کیا اور کپڑے سمیٹ کر چلا۔ حضرت کعب نے کہا یہی تقوےٰ ہے (معالم التنزیل)

امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں تقویٰ کے مندرجہ ذیل تین مراتب بیان کئے ہیں

۱۔ جہنم سے ڈر کر اپنا دامن شرک سے پاک رکھنا۔ یہ توحید خالص ہے جسے قرآن مجید میں کلمۃ التقویٰ کہا ہے۔

۲۔ ہر اس فعل یا ترک فعل سے اجتناب کرنا جس میں گناہ ہو حتی کہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچنا۔ شرع میں اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے۔"

۳۔ ہر اس چیز سے جو حق سے غافل کرتا ہے قطعاً لاتعلق رہنا اور حق کیساتھ ظاہر وباطن میں دل بستگی رکھنا۔

یہ اعلیٰ ترین تقوےٰ ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے

"اللہ سے تقوےٰ رکھو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے۔"

تقوےٰ انسانی شخصیت کی تشکیل اور تعمیر میں بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ کا مقام دل ہے۔ سب نیک ارادوں اور نیتوں کا دارومدار تقوےٰ ہی پر ہے۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

"اللہ تعالےٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے جسموں سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ (کیونکہ دل ہی مخزن تقویٰ ہیں۔) (مسلم)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

"آگاہ رہو کہ سینے میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب یہ تندرست ہو تو تمام بدن تندرست رہتا ہے۔ اور اگر یہ بیمار ہو جائے تو سارا بدن بیمار پڑ جاتا ہے۔ جان لو یہ دل ہے۔" (بخاری)

اسلام میں عبادات کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے مگر اس بنیاد کی قرارگاہ بھی تقویٰ ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ تقوے کے بغیر عبادات کی

کوئی قدر و قیمت نہیں ہے
چنانچہ حج کے بارے میں یہ حکم دیا کہ
"سفر کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے" (۲: ۱۹۷)
قربانیوں کے بارے میں فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ تک، تمہارے ذبیحوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے جس کا مقام دل ہے۔" (۲۲: ۳۷)
روزوں کے بارے میں ارشاد ہے۔
"تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔" (۲: ۱۸۲)
لباس، ستر اور عفتِ نگاہ کے لیے بہت ہی اہم اور ضروری چیز ہے۔ لیکن یہاں پر بھی اصل الاصول تقویٰ ہی بتایا گیا ہے۔
"بہترین پوشاک لباس تقویٰ ہے۔" (۷: ۲۶)
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو جلوا دیا اس لئے کہ آپؐ کو وحی کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر نہیں تھی۔
آنحضورؐ نے جمعہ کا پہلا خطبہ جو قبا کے مقام پر ارشاد فرمایا اس خطبے میں آپؐ نے فرمایا:
"میں تمہیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمانوں کو جو بہترین تلقین کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسے آخرت کے لئے آمادہ کرے اور تقویٰ کا حکم دے۔" (طبری)
حدیث قدسی ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ سے تقویٰ رکھا جائے جس نے مجھ سے تقویٰ کیا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا۔ اس کے لیے میرے پاس مغفرت ہے۔" (شرح اربعین ابن حجر)
تقویٰ کے تقاضے مندرجہ ذیل ہیں۔
۱۔ اللہ تعالیٰ کا خوف۔ ۲۔ حدود شناسی۔ ۳۔ صغیرہ گناہوں کو معمولی نہ سمجھنا۔ ۴۔ مشکوک چیزوں سے بچنا۔ ۵۔ دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرنا۔ ۶۔ عدل و انصاف۔ ۷۔ ایفائے عہد
تقویٰ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ آنحضورؐ نے خطبۂ قبا میں فرمایا کہ تقویٰ آبرو دلاتا ہے۔ اللہ کی خوشنودی دلاتا ہے۔ درجات بلند کرتا ہے۔ (طبری)
ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:
"اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہ ہے جو تقویٰ میں تم سب سے بڑھ کر ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

تقویم جنتری، کیلنڈر۔ وقت کو گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں مرتب کرنا۔ گویا تقویم تاریخ اور ہفتے کے دنوں کی تعین کے جدول کا نام ہے۔
یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ہفتہ کے سات دن، تیس دنوں کے مہینے اور بارہ مہینوں کا سال کب سے مقرر کیا گیا اور کس قوم کا یہ کارنامہ ہے لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ ابتداً لوگ چاند ہی کے مہینے جانتے تھے۔ اور بارہ مہینوں کا ایک سال شمار کرتے تھے۔ دن رات جو ہم روز دیکھتے ہیں اس میں شمار کرنے کی کوئی امتیازی بات حقیقتاً ایسی نظر نہیں آتی جس سے شمار کیا جا سکے۔ صرف ایک بات ہمارے دیکھنے میں آتی ہے کہ تیس یا انتیس دن کے بعد چاند بہت باریک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد ہر روز بڑھتا رہتا ہے اور پورا چاند ہو جاتا ہے اسی طرح روز بروز گھٹتا رہتا ہے اور نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر دو تین راتوں کے بعد باریک سا نمودار ہوتا ہے۔
جب بارہ مرتبہ اسی طرح چاند کا عروج و زوال ہو جاتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً وہی پچھلا موسم آ جاتا ہے اس طرح مہینے کے تیس یا انتیس دن ہوئے اور سال کے بارہ مہینے۔ دنیا اسی قاعدے پر عمل کرتی رہی اور سال کے کسی بڑے واقعے کو ابتداء قرار دے کر حساب ہوتا رہا۔ کہیں پر کسی بڑے بیٹے کو ابتداء قرار دے دیا گیا اور کہیں کسی جنگ یا بادشاہ کی تخت نشینی کو۔
شمسی سال اس عرصے کے برابر ہوتا ہے جس میں زمین اپنے مدار کو پورا طے کرتی ہے۔ یعنی پوری طرح سورج کے گرد چکر کاٹ لیتی ہے۔ یہ عرصہ [illegible] دن ۵ گھنٹے، ۴۸ منٹ، ۴۶ سیکنڈ ہے۔
قمری سال شمسی سال سے ۱۱ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو قمری مہینوں کے ساتھ ہی کچھ زائد دن لگا کر ایک مخلوط طریقِ حساب رائج ہوا۔ جس کے ذریعے بارہ قمری مہینوں کو شمسی سال کے برابر کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہندوستان، چین اور [illegible] کے قدیم کیلنڈروں میں نظر آتا ہے۔ بعد میں شمسی سال اور مہینوں کا حساب [illegible] الگ ہونے لگا۔ لیکن مذہبی امور کے لیے قمری حساب کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔
آج کی دنیا میں قمری اور شمسی دونوں قسم کے سال کا شمار موجود ہے قمری [illegible] حقیقی ہے۔ اس میں موسم کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ کبھی یہ سال سردیوں میں [illegible] ہوتا ہے اور کبھی گرمیوں میں، کبھی بہار میں اور کبھی خزاں میں۔ [illegible] کے بارہ چکروں کی مجموعی مدت ۳۵۴ دن ۸ منٹ، ۴۸ سیکنڈ [illegible] قمری سال اتنی ہی مدت کا ہوتا ہے۔ یہی قمری سال [illegible] میں شمار ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے قمری سال ہی کیوں [illegible] مجید کی یہ آیات ہیں۔
"وہ خدا ہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو [illegible] کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ تم سالوں کی گنتی [illegible]
"اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہی ہے [illegible] ہے۔" (۹: ۳۶)
نصاریٰ کا ایسٹر، ہندوؤں کی دیوالی اور [illegible] قمری سال کے حساب ہی سے ہوتے ہیں۔ باقی کاروبار [illegible] شمسی سال رائج ہے۔
[illegible] عرب میں قدیم زمانہ سے قمری [illegible] مہینوں کے نام بھی یہی ہوا کرتے تھے۔ سال کے آخری مہینے [illegible] ہوا کرتا تھا اور یہ طریقہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے [illegible] سے رائج تھا۔
قمری مہینے چونکہ موسموں کا ساتھ نہیں دیتے عربوں نے جب دیکھا کہ [illegible] کبھی گرمی اور کبھی سردی میں آ جاتا ہے اس وقت نہ ان کی فصلیں تیار [illegible] اور نہ جانوروں کے بچے خرید و فروخت کے لیے مہیا ہوتے ہیں تو [illegible] غالباً یہودیوں سے سیکھ کر کبیسہ کا طریقہ رائج کیا۔ یعنی دو یا تین سال کے بعد سال میں ایک ماہ کا اضافہ کرنے لگے۔ اس عمل حساب کو ہندوستان میں لوند

کہتے ہیں - یہ طریقہ قبیلہ کنانہ کے ایک شخص قلمس نے رائج کیا تھا - اس کے بعد یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ قبیلہ کنانہ کا سردار حج کے اجتماع میں اعلان کر دیتا تھا کہ آئندہ حج کس ماہ میں ہو گا اور اضافی تیرہواں مہینہ اس نے کس مہینے کے ساتھ بڑھایا ہے - لیکن عربوں نے اس عمل کو ہر کام کے لیے قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ وہ قمری مہینوں کو بھی یاد رکھتے تھے اور بغیر کبیسہ کے سال اور مہینہ شمار کرتے تھے -

چنانچہ عربوں میں دو قسم کے کیلنڈر رائج ہو گئے - آنحضورؐ کے زمانے میں بھی یہ دونوں قسم کے کیلنڈر موجود تھے - یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں تاریخوں اور مہینوں کے بعض اختلافات ملتے ہیں - یہ طریقہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع تک جاری رہا - اس سال آنحضورؐ نے حج کے موقع پر خدا کے حکم کے مطابق اعلان فرما دیا کہ اب زمانہ پھر صحیح وقت پر آ گیا ہے آئندہ سے نہ کبیسہ ہو گا اور نہ نسئی ہوا کرے گی - اس کے بعد سے ایک ہی قسم کا قمری سال شمار ہونے لگا -

دنیا میں ہر قوم میں کسی مشہور اور اہم واقعہ سے سال کا شمار ہوتا ہے - مسلمانوں کا ہجری سال آنحضورؐ کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے - یعنی جس سال آپؐ نے ہجرت فرمائی تھی اس سال کی پہلی محرم سے ۱ھ شمار کیا جاتا ہے - جس روز آپ مقام قبا پر پہنچے تاریخ ۸ ربیع الاول ۱ھ تھی -

سنہ عیسوی :- ہم آج کل جس شمسی کیلنڈر کو عیسوی سنہ کہتے ہیں - وہ گریگوری کیلنڈر بھی کہلاتا ہے - یہ درحقیقت پرانا رومی کیلنڈر ہے - جسے آگسٹس نے ترمیم کر کے تیار کیا تھا - پھر جولین نے اس میں ترمیم کی اس کے بعد بھی کئی بار اس میں ترمیم ہوئی - آخری بار ۱۵۸۲ء میں پاپائے گریگوری کے حکم سے اس میں ترمیم کی گئی -

جولین کے چھ سو سال بعد ایک عیسائی راہب ڈینس اگزیگوس نے اسے حضرت عیسیٰؑ کی طرف غلط حساب کر کے منسوب کر دیا - اس وقت سے اسے مسیحی کیلنڈر کہنے لگے - ورنہ اس کا حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حقیقت میں کوئی تعلق نہیں ہے -

تقیہ حذر، خوف، بچاؤ - فقہ اہل تشیع کی اصطلاح میں نقصان کے خوف سے عقائد کو پوشیدہ رکھنا - شیعہ علماء کہتے ہیں کہ تقیہ ایک پردہ ہے مومنین کے لیے اور اس کے جواز میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہیں -

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے - اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے -" (۱۶ : ۱۰۶)

"مومن، مومن کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ کریں - اور جو شخص ایسا کرے گا - اسے اللہ سے کوئی تعلق نہیں مگر اس صورت میں کہ ان کافروں سے بچاؤ مقصود ہو اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے -" (۳ : ۲۸)

اس آیت میں "تُقٰتَۃً" کو "تَقِیَّۃً" بھی پڑھا گیا ہے -

"آل فرعون کے ایک مومن نے کہا جو اپنا ایمان چھپاتا تھا -" (۴۰ : ۲۸)

اس آیت میں واضح طور پر ایمان کے چھپانے کا ذکر تعریف کے انداز میں کیا گیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحت اعتقاد و خوف خدا کے ساتھ خلاف ایمان کچھ کہہ دینا یا کرنا جائز ہے - اس سلسلے میں حضرت عمارؓ بن یاسر کی مثال دی جاتی ہے کہ جب کفار قریش نے انہیں بہت مجبور کیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اور پھر آنحضورؐ کے سامنے اپنی مجبوری کو بیان کر کے اسلام کا اقرار کیا -

تقیے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ خوف ضرر و دفع مضرت مقصود ہو خواہ وہ مال و جان کا نقصان ہو یا آبرو کا لیکن کسی قسم کا نفع اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے قول و فعل کو تقیہ نہیں کہا جائے گا -

دوسری شرط یہ ہے کہ ان اعمال و اقوال کا تعلق حقوق اللہ اور فرائض دین سے ہو - حقوق العباد میں تقیہ خونریزی سے بچنے کے لیے جائز ہے لیکن خون کرنے تک نوبت پہنچ جائے تو جائز نہیں ہے - تقیے کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ اس سے اصل دین کو نقصان نہ پہنچے -

تاریخی رنگ میں تقیہ کی ضرورت اس واسطے پیش آئی کہ بعض غیر شیعی حکومتوں میں انہیں بعض صورتوں میں برا سمجھا جاتا رہا - چنانچہ اپنے مخالفین کے طعن و تشنیع اور سلاطین کے خوف سے بچنے کے لیے انہوں نے تقیہ کو اختیار کیا اور تعلیمات اہل تشیع میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہو گیا -

اہل سنت حضرات کے ہاں تقیہ کوئی اصطلاح نہیں ہے -

امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رخصت ہے جس پر عمل نہ کرنا بہتر اور افضل ہے -

امام احمدؒ بن حنبل سے کسی نے پوچھا اگر آپ کے سر پر کوئی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو آپ اس کی بات مان لیں گے تو انہوں نے کہا "نہیں" اس کے بعد فرمایا اگر عالم نے تقیہ کر کے مان لیا اور جاہل تو جاہل ہے ہی تو پھر حق کے ظاہر ہونے کی کیا صورت رہ جاتی ہے -

امام رازیؒ کے نزدیک "تقیہ انھی صورتوں میں جائز ہے جن میں اظہار حق اور دین کا سوال ہو -"

تکبّر دوسرے کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھنا - آنحضورؐ نے تکبر کی تعریف ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرمائی ہے -

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا

"جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا - ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں - اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے - آپ نے فرمایا کہ اللہ جو کہ صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے - تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے -" (مشکوٰۃ المصابیح)

تکبر کا ظہور سب سے پہلے شیطان سے ہوا - اس نے آدم کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہتر اور بالاتر سمجھا اور پکارا -

"میں اس (آدم) سے بہتر ہوں وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں -" (۷ : ۱۲)

چنانچہ شیطان کو اسی تکبر کی بنا پر مردود قرار دیا گیا اور فرمایا "یہاں سے اتر جا - تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے - نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں -" (۷ : ۱۳)

تکبر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے - یعنی محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے - ان کو عزت و نعمت حاصل ہوتی ہے اسے وہ اللہ کا فضل سمجھنے اور اس پر اس کے شکر گزار

ہونے کے بجائے اسے یا تو اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں — یا اپنی کوشش اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے اور فخر کرتے ہیں۔ اس چیز کو بعض احادیث میں آدمی کی خودفریبی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کے لئے تین مہلک چیزوں میں سے سب سے زیادہ مہلک شمار کیا گیا ہے آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

"رہیں تین مہلک چیزیں تو ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے دوسرے بخل کی اطاعت اور تیسرے آدمی کا خود اپنے اوپر فریفتہ ہونا اور یہ چیز ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ (مسلم)

قرآن وحدیث میں تکبر کرنے والے شخص کے بارے میں کئی جگہوں پر وعید سنائی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

"اللہ کسی خودپسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔" (۳۱ : ۱۸)

"اللہ یقیناً ان سب کے کرتوت جانتا ہے چھپے ہوئے بھی اور کھلے بھی وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو تکبر کرتے ہیں۔" (۱۶ : ۲۳)

آنحضورؐ نے فرمایا۔

"دوزخی بدگو، حرام خور اور متکبر کو کہتے ہیں۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں فرمایا۔

"وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو۔" (مسلم)

تکبر وغرور کے بہت سے اسباب ہیں لیکن عام طور پر دنیادار لوگ جن چیزوں پر تکبر کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔ حسب ونسب، حسن وجمال، مال و دولت قوت اور اعوان و انصار کی کثرت اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں کوئی چیز فخر وغرور کا ذریعہ نہیں بلکہ تم میں سے اللہ کے نزدیک بڑا اور عزت والا وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔" (۴۹ : ۱۳)

تکبیر خدا کی بڑائی بیان کرنا۔ اللہ اکبر کہنا۔ قرآن میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر" (۷۴ : ۳)

"اور اس کی بڑائی بیان کرو۔ کمال درجے کی بڑائی۔" (۱۷ : ۱۱۱)

اللہ اکبر کا نعرہ مسلمانوں کا مذہبی نعرہ ہے۔ اس کا استعمال نماز اور اذان میں ہوتا ہے نماز اسی کلمے سے شروع کی جاتی ہے اور نماز کا ہر نیا رکن ادا کرتے وقت تکبیر کہی جاتی ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر کہتے ہیں تکبیر سے مسلمانوں میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلمان عیدین کی نماز پڑھنے کے لئے نکلتے ہیں تو راستے میں عید الفطر کے موقع پر آہستہ آواز سے اور عیدالاضحٰی کے موقع پر بلند آواز سے تکبیریں پڑھی جاتی ہیں۔ جانور ذبح کرتے وقت بھی بسم اللہ کے ساتھ اللہ اکبر ضرور کہا جاتا ہے۔

عیدین کی نماز میں چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں۔

نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہی جاتی ہیں جبکہ اہل تشیع کے ہاں پانچ تکبیریں ہیں۔

اذان چار تکبیروں سے شروع ہوتی ہے اور دو تکبیروں پر ختم ہوتی ہے حج کے دوران میں کئی بار تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ مثلاً طواف کے شروع میں طواف کے درمیان طواف کے اختتام پر کعبہ نظر آنے پر۔ حجر اسود کے پاس، منیٰ اور عرفات کے درمیان اور صفا ومروہ پر۔

گویا تکبیر وہ کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لیے مختصر ترین کلمہ ہے اور اسلامی زندگی کے مختلف حالات میں جہاں اللہ اس کی عظمت، رحمت اور اس کی عنایت کا تصور مسلمانوں کے ذہن میں جلوہ گر ہوا استعمال کیا جاتا ہے۔

تکبیر تحریمہ نماز کی نیت کے بعد قیام کرتے وقت اللہ اکبر کہہ کر نماز کی ابتدا کرتے ہیں۔ اسی کو تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد نمازی ہمہ تن نماز میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اکثر ائمہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کہنا فرض ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کا اٹھانا سنت ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز ہر اس لفظ سے جو تعظیم والا ہو منعقد ہو جاتی ہے جیسے اَللہُ اَعْظَم اور اَللہُ اَعْظَم اور صرف اللہ بھی کہہ دیا جائے تو کافی ہے۔

تکریت دریائے دجلہ کے کنارے ایک قصبہ جو سامرا کے شمال میں سلسلہ جبل حمرین کے دامن میں واقع ہے۔ تکریت کا پرانا قصبہ چند پہاڑیوں پر تعمیر ہوا تھا موجودہ قصبہ ان پہاڑیوں میں سے ایک پر واقع ہے اس کے دامن میں دریا بہتا ہے۔ شمال کی طرف سنگ ریگی کی چٹان ہے جس پر اب تک پرانے قلعے کے آثار موجود ہیں۔ یہ دریا کی سطح سے دو سو فٹ بلند ہے۔ پرانے شہر کے آثار ایک بڑے دائرے کی شکل میں ان دونوں پہاڑیوں کے مغرب میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرانا تکریت کسی زمانے میں ایک بہت بڑا رقبہ گھیرے ہوئے تھا۔

اس شہر کا ذکر سب سے پہلے بطلیموس نے برتہ کے نام سے کیا ہے۔ [illegible] اور مارکلینوس نے اسے ورتہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قلعے کی چوٹی کو اب تک برتہ کہا جاتا ہے۔ سریانی کتب میں اس کا نام تغریت آیا ہے۔ [illegible] الموصل میں شامل کر دیا گیا۔

بقول عرب مصنفین اس کی بنیاد ساسانی بادشاہ سابور بن اردشیر نے رکھی تھی اس کے نام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نام ایک عیسائی عورت تکریت بنت [illegible] کے نام پر رکھا گیا تھا۔

تکریت کو ۱۶ھ میں عبداللہ بن معتمؓ نے جنہیں سعد بن ابی وقاصؓ نے بھیجا تھا فتح کیا دوسری مرتبہ ۲۰ھ میں ایک صلح نامے کے تحت اس نے دوبارہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ مسعود بن حریث نے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور وہ یہاں کا پہلا فرمانروا تھا [illegible] نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی۔

ساتویں صدی کے آخر میں اس شہر کے نواح میں قیس اور بنو تغلب میں جنگ ہوئی گیارھویں صدی میں یہاں پر خودمختار سرداروں کی حکومت تھی۔ بعد میں طغرل بیگ سلجوق نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۴۹ء سے تکریت بیگ تگین خاندان کے علاقے میں شامل کر دیا گیا اور ۱۱۹۰ء میں یہ شہر عباسی خاندان کے قبضے میں آ گیا۔

تکریت صلاح الدین ایوبی کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے بھی مشہور ہے عہد سلاجقہ میں صلاح الدین کا والد نجم الدین ایوب تکریت کا والی تھا۔

بعد کی صدیوں میں اس شہر کی رونق ختم ہو گئی اور یہ ایک معمولی سا مقام رہ گیا۔ بغداد کی مہم کے دوران میں ہلاکو نے دریائے دجلہ اسی مقام سے پار کیا تھا۔

خلافت عثمانیہ میں تکریت ایالت رقہ کی ایک سنجق تھا۔ انیسویں صدی کی اصلاحات کے بعد اس کی اس حیثیت کو کم کر کے ولایت بغداد کی قضا سامرا کا ایک ناحیہ بنا دیا گیا۔ [illegible]

وقت اس کی آبادی چار پانچ ہزار سے زائد نہیں تھی۔ جواب پچیس ہزار کے قریب ہو چکی ہے یہاں کی اکثریت حنفی العقیدہ مسلمانوں کی ہے اور یہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے۔

تکش (دورِ حکومت ۵۶۷ھ/۱۱۷۲ء تا ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء) ابن ایل ارسلان خوارزم شاہ مرو اور خورستان کا حکمران تخت نشینی سے پہلے جند کا والی تھا جو سیر دریا کے زیریں حصے پر واقع ہے۔ تخت کے لیے اسے اپنے چھوٹے بھائی سلطان شاہ سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ اس کش مکش میں شاہ قرہ ختائی نے اسے مدد دی۔ جب لڑائی کا فیصلہ تکش کے حق میں ہو گیا تو اس نے شاہ قرہ ختائی کی مدد سے مرو، سرخس اور طوس میں ایک خود مختار حکومت قائم کی اور اپنی وفات تک ان علاقوں پر حکومت کرتا رہا۔

تکش نے ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں خراسان کے پایۂ تخت نیشاپور پر قبضہ کر لیا اور اپنے بڑے بیٹے ملک شاہ کو وہاں کا والی مقرر کیا۔ بعد میں اسے مرو کا والی بنا دیا اور چھوٹے بیٹے کو اس کی جگہ مقرر کیا۔

۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں سلطان طغرل ثانی کے شکست کھا جانے کے بعد عراق سے سلاجقہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اس فتح کے بعد تکش کا مرتبہ ایک مقامی امیر سے بڑھ کر ایک بڑی سلطنت کے بادشاہ کا ہو گیا۔ اس نے اپنے سکوں پر سلطان ابن خوارزم شاہ کندہ کرنا شروع کر دیا۔ اب عراق ہمدان سمیت تکش کے قبضے میں آ گیا۔ ۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء میں خلیفہ ناصر کے لشکر کو ہمدان میں شکست دی۔ خلیفہ کا مطالبہ تھا کہ وہ مفتوحہ علاقے خالی کر دے لیکن تکش نہ صرف اس مفتوحہ علاقے پر قابض رہنا چاہتا تھا بلکہ خلیفہ سے ولایت خورستان بھی ہتھیانا چاہتا تھا۔ تکش اور شاہ قرہ ختائی کے درمیان بھی باہمی جنگ و جدال کا ذکر ملتا ہے۔ ان لڑائیوں کا سب سے بڑا واقعہ تکش کا بخارا کو تسخیر کرنا تھا۔

اگرچہ تکش ایک بڑا صاحبِ اقتدار بادشاہ تھا لیکن آخر تک قرہ ختائی کا باجگزار رہا۔

تکلیف کسی کی طاقت سے زیادہ کام۔ اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ، مصیبت، مشکل۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر مختلف مقامات پر اس طرح کیا گیا ہے۔

"کسی جان پر اس سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالا جائے۔" (۲: ۲۳۳)

"اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔" (۲: ۲۸۶)

"ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بوجھ رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے" (۶: ۱۵۲)

"پس اے نبیؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو۔ تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے مکلف نہیں ہو" (۴: ۸۴)

"بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور اچھے کام کیے۔ اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ جنت والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (۷: ۴۲)

"اور ہم کسی شخص پر کچھ بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی طاقت کے مطابق" (۲۳: ۶۲)

"اللہ کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر اس کے مطابق جو اسے دیا ہے" (۶۵: ۷)

گویا تکلیف کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس بات کا حکم نہیں دیتا جو اس کی استطاعت سے بڑھ کر ہو۔ گویا مخلوق خدا پر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے پہنچایا ہے اس پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل واجب ہونا تکلیف ہے۔

مکلف کون شخص ہے۔ اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر عاقل اور بالغ انسان مکلف ہے۔ لیکن چونکہ آنحضورؐ جنات کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے اس لیے جنات بھی مکلف ہیں اس شریعت کے جو آپ لائے تھے۔ رہے فرشتے تو وہ بھی مکلف ہیں کیونکہ آنحضورؐ ان فرشتوں کی طرف بھی مرسل ہیں لیکن فرشتوں پر تکلیف کا اطلاق عملی طاعات میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں ایمان تو پہلے ہی موجود ہے۔ بعض کی رائے کے مطابق عملی طاعت تو ان میں فطری طور پر موجود ہے۔ اور ان کی طرف آنحضورؐ کی بعثت محض ان کی شان بڑھانے کے لیے تھی۔

چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان کی ذمہ داری اس کی مقدرت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے بازپرس کرے کہ تو نے فلاں کام کیوں نہ کیا، یا ایک چیز جو بحیثیت الحقیقت اس کی قدرت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مواخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن ان تمام معاملات میں اپنی مقدرت کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا ہے اور کیا چیز اس کی استطاعت سے باہر ہے؟

تکہ ایک ترکمانی قبیلہ۔ جس کا تعلق نسل سالور سے بتایا جاتا ہے۔ ابوالغازی نے اس قبیلے کو دو اور قبیلوں سرلق اور یموت کے ساتھ بیرونی سالور کے ذیل میں شمار کیا ہے۔ اسی کی تصنیف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ قبیلہ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں کوہستان بلخان و کورین پر خانہ بدوشی کی حالت میں رہا کرتا تھا۔ اس قبیلے کے بعض لوگ تجارت کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں اس قبیلے نے مشرق کی جانب بڑھنا شروع کر دیا اور یہاں پر انہوں نے آہستہ آہستہ ایرلی قبیلے اور قزدش لی قبیلے کی جگہ لے لی۔ اسی طرح سرلق کو سرخس اور مرو سے نکال کر ان کی جگہ بھی خود آباد ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے قریب قریب تکہ کا مرو پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس وقت تکہ قبیلے کا سردار قوشت خان تھا۔ جب بلخان میں روسیوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے تکہ کو مغلوب کرنا ضروری سمجھا چنانچہ ۱۸۷۷ء میں لڑائی شروع ہو گئی جو ۱۸۸۴ء میں ختم ہوئی جبکہ مرو پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ روسی اعداد و شمار کے مطابق اس وقت تکہ قبیلے کی تعداد تین لاکھ تھی اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم تھے۔ ہر گروہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو خان کے لقب سے مشہور تھا۔

روسی حکومت کے قائم ہونے کے بعد اور خاص کر انقلاب روس کے بعد تکہ بھی دوسرے قبیلوں کی طرح اپنے خاص خاص قبائلی نام کھو چکے ہیں اور اب مجموعی طور پر ترکمان کے نام سے مشہور ہیں۔

تکہ اوغلی اناطولیہ کا ایک خاندان جو تکہ ایلی پر حکمران رہا۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ تکہ بک یا تکہ پاشا تھا جو سلجوقیوں کی طرف سے انطالیہ کا حکمران تھا اس کے بعد اس کا بیٹا یونس بیگ اس کا جانشین ہوا۔ لیکن اسکے دورِ حکومت کا حال تاریکی میں ہے۔ ۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء میں بقول ابن بطوطہ یہاں خضر بیگ جو یونس بیگ کا بیٹا حکمرانی کرتا تھا۔ جس کے بعد اس کا بھائی محمود بیگ تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کے دورِ حکومت کے حالات بھی کچھ واضح طور پر سامنے نہیں آ سکے۔ ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء میں محمود بیگ کا بیٹا محمد بیگ یہاں کا حکمران بنا۔ ۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء میں سلطان بایزید اول یلدرم نے تکہ ایلی کی ریاست کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت عثمانی میں شامل کر لیا۔ ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تک عثمانی خاندان حکمران رہا۔ اسی سنہ میں محمد بیگ کے

بیٹے عثمان چلپی نے بادشاہت سنبھال لی۔ عثمان نے دوسرے حکمرانوں سے مل کر اپنی حکومت کو اور زیادہ مضبوط کر لیا۔
۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں قرہ حصار کے والی حمزہ بن فیروز بیگ نے انطالیہ کا محاصرہ کیا۔ عثمان چلپی نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس کی وفات کے بعد یہ خاندان بھی ختم ہو گیا۔

تکہ ایلی ایشیائے کوچک (ترکیہ) کا ایک ضلع جو جنوبی اناطولیہ میں واقع ہے۔ اس کی شمالی سرحد قرہ مان اور حمید ایلی کے اضلاع ہیں۔ مشرقی سرحد ایچ ایلی اور مغربی منتشا ایلی ہے جنوب میں سمندر جو قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے۔

ابتدا میں تکہ اوغلی کی سرزمین تھی لیکن جس طرح تکہ اوغلی کے حالات تاریکی میں ہیں اسی طرح تکہ ایلی کے حالات کے بارے میں بھی بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں تکہ ایلی کے ایران سے تعلقات تھے۔ ایران کے ایک بزرگ شیخ صدر الدین نے یہاں ایک جماعت بھی تیار کی تھی۔ اس وقت سے تکہ ایلی اور اس کے ملحقہ علاقے حمید ایلی کے لوگ ایرانی شیوخ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علویوں کی کئی بغاوتیں تکہ ایلی میں ظہور پذیر ہوئیں جن میں سے ایک باباشاہ قلی کی بغاوت تھی۔ جس کا تعلق ایران کے صفویہ سے تھا۔

تکہ ایلی میں اہل تشیع آباد ہیں۔ اس علاقے کی دو بندرگاہیں انطالیہ اور علائیہ ایک اہم خصوصیت کی حامل ہیں۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے دوران میں ان کے ذریعے ایشیائے کوچک کی پیداوار اسکندریہ اور دمیاط بھیجی جاتی تھی۔ انطالیہ اپنی خود مختاری ۱۴۵۰ء تک قائم رکھ سکا جب کہ علائیہ پر ۱۴۷۲ء میں عثمانیوں کا قبضہ ہوا۔

تکیہ دارا، دائرہ، سہارا، ٹیک۔ اصطلاح میں آرام کرنے کی جگہ۔ فقیر کے رہنے کی جگہ۔ زمانہ قدیم میں تکیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی دستور تھا کہ شام کے بعد شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ رات کے وقت آنے والے مسافر شہر کے اندر داخل نہ ہو سکتے تھے اور انہی تکیوں میں رات گذارتے۔ تکیہ کا فقیر ان مسافروں کی ہر طرح سے خدمت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ نو وارد شخص بھی جس کا شہر میں کوئی رشتہ دار نہ ہوتا تھا، انہی تکیوں میں رہتا تھا۔ گویا پرانے زمانے میں یہ تکیے ایک طرح کے ریسٹ ہاؤس تھے۔

دن کے وقت ملحقہ علاقوں کے بوڑھے اور جوان اپنی فرصت کے اوقات بھی انہی تکیوں میں گذارتے۔

ہر تکیہ میں ایک کنواں اور اس کے ساتھ غسل خانے موجود تھے۔ یہیں لوگ نہا دھو کر چٹائیوں پر بیٹھ کر چوسر، شطرنج اور تاش کھیل کر اپنا دل بہلاتے۔ شادی اور غمی کی تقریبات بھی انہی تکیوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ برادریوں کے جھگڑے حل کرنے کے لیے پنچایتیں بھی یہیں لگتیں۔ تکیہ کے اندر ہی ورزش کرنے کے لئے ایک اکھاڑہ ہوتا تھا۔

زمانے کے ساتھ ساتھ ان تکیوں کا نقشہ بھی بدل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تکیے بھنگیوں چرسیوں اور چنڈو بازوں کے قبضے میں آ گئے۔ اور پھر یہ محض ملنگوں اور نشہ بازوں کے تکیے بن کر رہ گئے۔ پاکستان میں اکثر بڑے شہروں کے باہر یہ تکیے موجود ہوتے تھے۔ لاہور کے مشہور تکیے مندرجہ ذیل ہیں۔

تکیہ صابر شاہ، تکیہ بھورے سائیں، تکیہ شیر علی، تکیہ بالمیکیاں، تکیہ پیر مکی، تکیہ ذیلداراں، تکیہ سیدے شاہ، تکیہ گوندی پیر، تکیہ کھڑکی پیر، تکیہ قطب شاہ، تکیہ سردار شاہ، تکیہ پیر ازغائب، تکیہ گھڈو شاہ، تکیہ مسکین سائیں، تکیہ املی والا، تکیہ تاجے شاہ، تکیہ میراثیاں، تکیہ کھوتیاں والا، تکیہ لالو سائیں، تکیہ کبوتر شاہ، تکیہ گڈی سائیں، تکیہ شیر شاہ ولی، تکیہ جھنگی، تکیہ نتھے شاہ، تکیہ کھائی والا، تکیہ سرمہ سائیں، تکیہ سبز پیر، تکیہ چیت رام، تکیہ سادھواں۔

تلاوت قرآن مجید پڑھنا۔ قرآن مجید کے پڑھنے کے بارے میں قرآن و حدیث میں بہت فضیلت بتائی گئی ہے۔ "اور جب قرآن کی تلاوت کی جا رہی ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"
آنحضور نے فرمایا کہ "جو آدمی قرآن پڑھتا اور پڑھاتا ہے وہ سب سے افضل شخص ہے۔" (بخاری)
ایک حدیث میں فرمایا "سوائے دو آدمیوں کے اور کسی سے حسد کرنا جائز نہیں ایک اس سے جو قرآن کا علم رکھتا ہے اور اس کو پڑھتا پڑھاتا ہے دوسرے اس سے جو مالدار ہے اور اپنا مال راہ خدا میں شب و روز لٹاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)
ایک جگہ فرمایا "خداوند عالم قرآن پڑھنے والے کو عزت بخشتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو ذلیل کرتا ہے۔" (مسلم)
ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔
"اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ (یعنی تلاوت کلام پاک کرتے رہا کرو)۔ [illegible] جہاں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔" (مسلم)
حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف بھی تلاوت کرے گا اسے ایک ایک حرف کے بدلے میں ایک نیکی عطا ہوتی ہے اور ہر نیکی کا دس گنا ثواب ملتا ہے۔" (مشکوۃ) (نیز دیکھیے: تجوید، ترتیل، قرأت)

تل ابیض شام کا ایک شہر اس شہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت [illegible] سرزمین کنعان کی طرف کوچ کرنے سے قبل یہاں اقامت گزیں [illegible] تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خادم [illegible] کو حضرت [illegible] کے رشتے کے لیے یہاں بھیجا تھا۔

تل باشر خوشجزیوں کی پہاڑی۔ شمالی شام کا ایک قلعہ جو عینتاب کے قریب ساجور پر حلب کے شمال میں دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔
اس شہر کا ذکر قدیم آشوریوں کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ [illegible] تل بسرے کہتے تھے۔
عرب مصنفین نے صلیبی جنگوں سے پہلے تل باشر کا ذکر نہیں [illegible] ہالی تل باشر ورا وندان گوڈفرے کے بھائی کاؤنٹ بالڈون اولورگ نے فتح کر [illegible] الرہا کی ریاست میں شامل کر لئے۔ ۱۱۰۲ء میں تل باشر جوسلین کو جاگیر دے [illegible] ۱۱۰۴ء میں فرنگیوں نے تل باشر سے حلب کی طرف کوچ کیا اور بسرفوث پر قبضہ کر لیا۔ حران کی شکست کے بعد جب جوسلین کو اس کے دشمنوں نے گرفتار کر لیا اور زر فدیہ کی رقم مقرر ہو گئی اور اسے یہ رقم ادا کرنے کے لئے رہائی دی گئی تو اس کے ساتھیوں کو جو تل باشر میں موجود تھے یرغمال کے طور پر قید کر لیا گیا۔
ذیلی مصادر کے مطابق ۵۰۲ھ/۱۱۰۹ء میں جوسلین اپنے چچا بغدوین [illegible] کے ساتھ تل باشر کو اپنا فوجی مرکز بنا کر انطاکیہ کے تنکری کے ساتھ برسر پیکار رہا۔
سلطان محمد نے ترکوں کا ایک لشکر امیر مودود والی موصل کی کمان میں بھیجا جو تل با[illegible]

کے سامنے آموجود ہوا۔ اور ڈیڑھ ماہ تک اس لشکر نے تل باشر کا محاصرہ کئے رکھا لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۱۲۰ء میں ایل غازی، جوسلین سے شکست کھا کر تل باشر کی طرف بڑھا اس نے کئی روز محاصرہ جاری رکھا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں اہل حلب نے تل باشر پر کئی مرتبہ حملہ کیا لیکن نقصان اٹھاتے رہے۔ یہاں تک کہ جب جوسلین ۱۱۳۱ء میں مر گیا تو اس کا بیٹا جوسلین ثانی تخت نشین ہوا جو بہت زیادہ عیاش اور شراب نوشی کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس کے زمانہ میں تل باشر حلب کے حکمران سیف الدین سوار کے بار بار حملوں کی جولانگاہ بن گیا۔ ان حملوں کی وجہ سے نیز سلطان مسعود سلجوقی کی تاخت و تاراج اور نورالدین کے حملوں سے جوسلین کو اور بھی زیادہ ضعف پہنچا۔ ۱۱۵۰ء میں جوسلین کو گرفتار کر کے حلب میں قید کر دیا گیا اور مسعود نے کیسوم بہسنی اور رعبان کے قلعے فتح کر لئے لیکن تل باشر وہ اب بھی فتح نہ کر سکا۔ اس کے واپس ہو جانے کے بعد شاہ یروشلم نے تل باشر میں بزنطینی سپاہیوں کی فوجیں متعین کیں لیکن دوبارہ فرنگیوں کی حکومت قائم نہ کر سکا۔ دلوک کا قلعہ مسخر ہو جانے کے بعد ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں تل باشر کی قلعہ گیر فوج نے مجبوراً قلعے کی چابیاں نورالدین کے حوالے کر دیں۔

نورالدین نے تل باشر کا قلعہ حسان کے حوالے کر دیا جس نے اس کے دفاعی مورچوں کو مضبوط کر کے اس میں کئی برسوں تک کا سامان رسد جمع کیا۔ ۱۱۷۶ء میں یہاں کے امراء نے صلاح الدین ایوبی کی اطاعت قبول کر لی۔ ۵۷۹ھ/۱۱۸۲ء میں صلاح الدین ایوبی نے تل باشر کے قلعے کا دفاع عمادالدین زنگی کے مقابلے میں نہایت کامیابی سے کیا۔ ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء میں الملک الظاہر نے تل باشر کو فتح کیا۔ ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں شاہ روم کیکاؤس نے یہ قلعہ فتح کیا۔ اسی سال الملک اشرف نے اس قلعے کو سلطان سلجوق سے دوبارہ چھین لیا اور حلب کے نوجوان شہزادے شہاب الدین طغرل کے حوالے کر دیا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں العزیز والی حلب نے تل باشر کا قلعہ فتح کیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کیا۔

۶۳۸ھ/۱۲۴۱ء میں خوارزمیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ۶۴۶ھ/۱۲۴۹ء میں حلب کے والی الملک الناصر نے حمص کے خلاف ایک فوج بھیجی الملک اشرف نے مجبوراً حمص شہر کے بدلے تل باشر اسے دے دیا۔

اس شہر میں کئی تجارتی منڈیاں تھیں اور ایک بستی ربض تھی آج کل غالباً تل باشر مزرعہ سہا، یہی قدیم ربض ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کے اردگرد سرسبز و شاداب باغات بھی تھے

تلبیس کسی چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے کو تلبیس کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔ "اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ" (۲:۴۲) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "اور البتہ ہم ان پر مشتبہ کر دیں گے جو کچھ وہ حق کو باطل سے ملاتے ہیں۔" بقول علی ہجویری "یہ صفت اللہ تعالے کے سوا کسی اور کے لئے محال ہے کیونکہ وہ کافر کو مومن کی صفت میں ظاہر کرتا ہے اور مومن کو کافر کی صفت میں۔" جب ایک گروہ میں سے کوئی آدمی اچھی خصلتوں کو بری صفات سے پوشیدہ کرتا ہے تو اس کے اس عمل کو تلبیس کہتے ہیں۔"

تلبیہ لبیک کا کلمہ ادا کرنا جس کے معنی ہیں "میں تیری اطاعت پر مقیم ہوں۔" میں حاضر ہوں۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ کلمات ہیں جو احرام باندھنے کے بعد رمی جمار تک بآواز بلند بار بار کہنا ہوتے ہیں۔ یہ کلمات مندرجہ ذیل ہیں۔

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ

"حاضر ہوں میں اے اللہ، حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ ہر قسم کی تعریف اور نعمت تیرے ہی لئے ہے اور بادشاہی بھی۔ تیرا کوئی شریک نہیں"

تلبیہ کی اس سے مختصر صورتیں بھی ہیں۔ مثلاً

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وغیرہ۔

تلمسان "چشموں کا شہر" الجزائر کا ایک شہر جو معمولی سی ڈھلوانی سطح مرتفع پر واقع ہے جو اس میدان سے یک دم بلند ہو جاتی ہے۔

قدیم شہر موجودہ شہر سے چند سو گز کے فاصلے پر اس کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ یہ قدیم شہر تلمسن اور آغادیر (اگادیر) دو ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔

تلمسان کو الجدار یا مدینۃ الجدار کا نام بھی دیا گیا ہے۔ عربوں کی روایت کی رو سے قرآن مجید کے مطابق حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات کا مقام یہیں پر تھا۔ تلمسان کے اور نام بھی ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ پومار یا (باغہائے میوہ) یہ اس چھوٹے سے شہر کا نام تھا جس کا ذکر بعض لاطینی کتبوں میں ملتا ہے۔

۲۔ تغرات یا تاگرارت۔ یہ نام اسے گیارہویں صدی میلادی میں فاتح مرابطین نے دیا تھا۔ جنہوں نے موجودہ تلمسان اور اس کی شاندار جامع مسجد کی بنیاد ڈالی تھی۔ انہوں نے اس کی بنیاد اس وقت ڈالی تھی جب وہ پرانے تلمسان کا محاصرہ کر رہے تھے۔

۳۔ منصورہ یا المحلۃ المنصورہ۔ (فتح مند یا فتح مندی والی لشکرگاہ) اس شہر کا رقبہ ۲۵۰ ایکڑ تھا۔ اسے فاس کے سلاطین نے تیرہویں صدی میں تلمسان کے محاصرے کے وقت ایک میل مغرب کی سمت بنایا تھا۔ انہوں نے ایک جامع مسجد ایک محل اور ایک فصیل دار قلعہ اس شہر میں بنوایا تھا۔ تلمسان ان تین شہروں سے جو یکے بعد دیگرے تعمیر ہوئے بنا۔ اگادیر مشرق میں تاگرارت وسط میں اور منصورہ مغرب میں تھا۔ موجودہ تلمسان شہر وسطی شہر ہے۔ دوسرے دونوں شہروں کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔

تلمسان میں اسلام کب پھیلا تاریخی طور پر یہ بات واضح طور پر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ آٹھویں صدی عیسوی کی بربری ریاست کے سردار ابوقرہ کے بارے میں بھی زیادہ مفصل حالات نہیں ملتے۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس امیر نے متعدد بار خوارج زمانہ کے سردار کی حیثیت سے مشرق کی جانب یلغاریں کیں اور افریقہ تک جا پہنچا تھا

تلمسان میں اہل سنت والجماعت کا مذہب آٹھویں صدی میں اچھی طرح رائج ہو چکا تھا۔ ۷۹۰ھ میں ادریس اول نے یہاں ایک عالیشان مسجد بنوائی تھی۔ اس وقت سے تلمسان اگادیر صوبائی حکومت کا مرکز بن گیا۔

موجودہ تلمسان نے جس کی بنیاد گیارہویں صدی عیسوی میں یوسف بن تاشفین نے رکھی تھی، بڑی ترقی کی۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں الموحدین نے اس کے گرد ایک فصیل بنوائی۔ مرابطین کے زمانے میں یہ شہر علم کلام اور فقہ کے درس و تدریس کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس دور میں اس نے بڑے بڑے علماء اور فقہاء پیدا کئے۔ شہر پر قبضہ کرنے کے تیس سال بعد الموحدین نے جامع مسجد کے ایک حصے کی زیب و زینت کو مکمل کیا۔ ساتویں صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں جب الموحدین کی سلطنت کمزور ہو گئی تو بنو عبدالواد نے مغرب وسطیٰ میں اپنی خود مختار ریاست قائم کی۔ اور تلمسان کو اپنا پایہ تخت بنا لیا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں تلمسان کے ہمسایہ حکمرانوں نے تلمسان پر متواتر حملے کئے اگرچہ یہ حملے بعض اوقات کامیاب بھی رہے لیکن شاہی خاندان نے اتنا وقت نکال ہی لیا تھا کہ انہوں نے چند یادگار عمارتیں تعمیر کر سکیں۔ بنو عبدالواد نے علوم و فنون کو خوب ترقی دی۔ اور طلباء کے لئے

مدرسے قائم کیے۔ ان بادشاہوں کو تلمسان کی تجارتی اہمیت کا پورا احساس تھا چنانچہ انہوں نے اپنی بندرگاہ حنین کے ذریعے ہسپانیہ کے ساتھ بھی ہمیشہ تعلق قائم رکھا۔

اس دور میں تلمسان نہ صرف ایک بڑا تجارتی مرکز اور گردو نواح کے علاقے کی پیداوار کے لیے بڑی بھاری منڈی تھا بلکہ صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا۔ یہاں کی بنی ہوئی اشیاء کی مانگ عام تھی۔

نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی میں جب عربوں نے سپین سے ہجرت کی تو ان کی اکثریت تلمسان ہی میں آ کر آباد ہوئی۔ ان کی وجہ سے زندگی کے مختلف شعبوں میں نئی سرگرمی پیدا ہو گئی۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بنو عبدالواد کے آخری بادشاہوں نے وہران میں ہسپانیوں کی بادشاہی تسلیم کر لی۔ لیکن ۱۵۵۵ء میں الجزائر کے پاشا صالح رئیس نے ترکوں کے نام پر تلمسان پر قبضہ کر لیا۔

ترکوں کے قبضے کے بعد تلمسان کی تجارت اور خوشحالی آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ اب اسکے عروج و زوال کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ترک تین سو سال تک اس شہر پر قابض رہے لیکن اس سارے عرصے میں یہاں کوئی نئی عمارت تعمیر نہ ہوئی بلکہ متعدد عمارتیں اور محل گر کر کھنڈر بن گئے۔ ۱۸۳۰ء میں تلمسان نے ترکوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ترک اپنے پیچھے ایک اہم نسلی ورثہ قول اوغلی چھوڑ گئے۔ یعنی ترکوں کی اولاد جو مقامی عورتوں سے ہوئی۔ قول اوغلی ابھی تک موجود ہیں اور تلمسان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں۔

۱۸۳۰ء میں اہل تلمسان نے ترکوں سے چھٹکارہ پا کر سلطان مراکش کی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۸۳۶ء میں فرانسیسی پہلے پہل تلمسان میں داخل ہوئے لیکن ۱۸۳۷ء میں ایک عہد نامے کی رو سے وہ یہاں کا قبضہ امیر عبدالقادر کے نائب کے حوالے کر کے یہاں سے چلے گئے۔ ۳۱ جنوری ۱۸۴۲ء کو عہد نامے کی خلاف ورزی ہونے پر بوگو تلمسان آیا اور شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے آج تک تلمسان میں خوشحالی کا دور دورہ ہے جسے مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی نے تباہ کر رکھا تھا۔

۱۸۵۴ء میں تلمسان کو ایک خود مختار بلدیہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۵۸ء میں اسے ایک اقلیم عام کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ ایک قضا اور فوجی چھاؤنی کا صدر مقام تھا۔ یہاں ایک پیادہ پلٹن اور ایک رسالہ تعینات تھا۔ یہاں کئی مدرسے، بینک اور زمینداروں کو قرض دینے کے دفاتر موجود ہیں۔

اسلامی فن کی یادگار زمانہ عمارتیں جن کی وجہ سے تلمسان زینت کاری کے بہترین اندلسی المغربی دور کا عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دل فریبی اور زیبائش میں اہم درجہ رکھتی ہیں۔

اس کے آثار قدیمہ میں تاگرارت اور منصورہ کی فصیلیں، اولیاء اللہ کے مقابر، جامع مسجد اور اس کا مینار، مسجد اولاد الامام، خاندان عبدالواد کے پہلے حکمران کا بنوایا ہوا محل، مسجد و خانقاہ سیدی ابراہیم، مساجد سیدی سنوسی اور سیدی النباء، مسجد سیدی بومدین جو ابوالحسن مرینی نے تعمیر کرائی تھی قابل دید ہیں۔

اہل تلمسان فنون صغریٰ مثلاً بافندگی، چمڑے پر سنہری اور روپہلی گل دوزی، تانبے، اون، لکڑی اور دھاتوں کی چیزوں کی آرائش میں اب بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ساز اور زین پوشوں کی زیبائش میں جو سرکاری تقاریب میں استعمال ہوتی ہیں، خاص طور پر بڑا کمال دکھاتے ہیں۔

تلمسان کے باشندوں نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ عربی زبان غالباً اندلسی عہد میں اختیار کی تھی۔ یہ لوگ شروع سے اولیاء پرستی اور ٹونے ٹوٹکے کے معتقد ہیں۔ یہاں کی آبادی میں یہودی بھی ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں جو رسم و رواج میں مسلمانوں کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ ان یہودیوں کی زبان بھی ایک قسم کی عربی ہی ہے۔ جس پر مراکشی بولی کا بہت زیادہ اثر ہے۔

تلمسان کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بربروں کا ایک قدیم شہر تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ تیسری صدی ہجری میں یہاں پر عربی زبان بولی جانے لگی۔ یہاں کے باشندے مالکی المذہب کے پیروکار ہیں۔ قرون وسطیٰ میں اس کی حیثیت صوبائی صدر مقام کی تھی۔ بعد میں ایک مسلمان بربری شاہی خاندان کا پایہ تخت رہا۔ ترکوں کی آمد سے ثقافتی لحاظ سے تو اس پر کوئی خاص اثر نہ پڑا اگرچہ نسلی اعتبار سے ایک خاص نسل قول اوغلی نے جنم لیا۔ مسلمان آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں دوسرے نمبر پر یہودی اور تیسرے نمبر پر فرانسیسی اور دوسرے یورپی باشندے آتے ہیں۔

تلمسانی، عفیف الدین سلیمان

(۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء – ۵ رجب ۶۹۰ھ/۴ جولائی ۱۲۹۱ء) ابن علی بن عبداللہ ابن علی ایک صوفی اور عالم جو کوفی الاصل خاندان سے تھا۔ بقول ذھبی کومی الاصل۔ تلمسان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر ہی میں شام آ گئے تھے۔ جہاں وہ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بعد ازاں روم چلے گئے اور صدر الدین القونوی کی شاگردی اختیار کی۔ یہیں پر چالیس چالیس دن کی چالیس صوفیانہ خلوتیں مکمل کیں۔ عفیف الدین ایک خوش اخلاق اور باوقار انسان تھے لیکن ان کی ذات ہمیشہ مشتبہ رہی۔ بقول ذہبی کوئی شیخ صحیح طور پر ان کے اعتقادات معلوم نہ کر سکا کہ ان کے اعتقادات کی حقیقت کیا تھی۔ ان پر نصیری العقیدہ ہونے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ ابن الفوطی نے اپنی کتاب "مجمع الآداب" میں انہیں علماء عارفین میں شمار کیا ہے۔ عفیف الدین ایک خوش صحبت انسان تھے۔ ان کا دعوٰی تھا کہ انہیں عرفان حاصل ہے اور اس امر کا اظہار انہوں نے بستر مرگ پر کیا تھا۔ انہوں نے موت کے وقت یہ الفاظ کہے تھے "جسے معرفت الٰہی حاصل ہے وہ اللہ سے کیونکر خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ مجھے یہ معرفت حاصل ہے اس لیے مجھے اس سے خوف نہیں بلکہ خوشی ہے کہ اس کی خدمت میں شرف حضوری حاصل ہو گا۔"

ان کا انتقال دمشق میں ہوا اور شہر کے صوفیوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

انہوں نے مختلف علوم پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں رسالہ فی علم العروض، دیوان، مقامات، شرح المواقف للنفری، کتاب المواقف، شرح قصیدہ النفسیہ لابن سینا، شرح اسماء الحسنیٰ، شرح فصوص الحکم مشہور ہیں۔

تلمسانی ابواسحٰق

ابراہیم رحمہ رجب ۶۰۹ھ/نومبر ۱۲۱۲ء – ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) ابراہیم بن ابی بکر بن عبداللہ انصاری ایک عالم دین اور مالکی فقیہ۔ تلمسان میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ غرناطہ چلے گئے۔ تین سال بعد غرناطہ سے مالقہ چلے گئے۔ یہیں پر انہوں نے اکثر علوم کی تحصیل کی۔ بعد میں مالقہ سے سبتہ چلے گئے۔ یہاں پر انہوں نے شادی کی اور اسی شہر میں وفات پائی۔

وہ عالم، فاضل شخصیت کے مالک تھے۔ فقہ میں خاص درک رکھتے تھے۔ امام مالک کے مقلد تھے۔ اور مالکی فقہاء میں خاص مقام حاصل تھا۔ اکیس سال کی عمر میں انہوں نے احکام وراثت پر ایک رسالہ لکھا تھا جس کی کئی ایک شرحیں کی گئیں۔ ان کی دوسری تصانیف میں تنبیہ الخیر و ... الغیر فی نظم المغازی السیر

(آنحضورؐ کی منظوم سیرت)، مقالہ فی العروض، منظومہ المویدالکریم، العشرات وغیرہ ہیں۔

تمجید بزرگی بیان کرنا۔ خدا کی بزرگی کی تعریف کرنا۔ کلمہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ پڑھنا۔

احادیث میں اس کلمے کی بہت فضیلت آئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "کیا میں تمہیں وہ کلمہ جو زیر عرش جنت کے خزانے سے نازل فرمایا گیا ہے بتا دوں؟ وہ یہ ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ جب آدمی یہ پڑھتا ہے تو خداوند عالم فرماتا ہے۔ میرا یہ بندہ میرا مطیع ہوگیا۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہنے سے ننانوے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ ترین بیماری سخ وغم ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد زیادہ سے زیادہ رکھا کرو۔ اس لیے کہ یہ جنت کے خزانوں کی ایک کنجی ہے۔ بقول مکحولؒ جو شخص یہ پڑھے گا اس کے واسطے نقصان کے ستر دروازے بند کر دیئے جائیں گے جن میں سب سے کم درجہ رکھنے والا دروازہ مفلسی ہے۔

تمکین تصوف کی اصطلاح میں تمکین سے مراد محققین کا محل کمال اور درجہ اعلیٰ میں اقامت کرنا ہے۔ پس اہل مقامات کا مقامات سے گذرنا ممکن ہے لیکن تمکین کے درجے سے گذرنا محال ہے۔ کیونکہ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے۔ اور تمکین منتہی لوگوں کی جائے قرار ہے۔ گویا مقامات رستے کی منزلیں ہیں اور تمکین درگاہ حق میں قرار پانا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں شاعر لوگ اپنے ممدوح کی مدح عمل سے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی شاعر کسی ممدوح کی درگاہ میں پہنچ جاتا تو تلوار سونت لیتا اور گھوڑے کے پاؤں اڑا دیتا اور تلوار توڑ دیتا۔ اس کی مراد اس فعل سے یہ ہوتی تھی کہ مجھے سواری کے جانور کی اس لئے ضرورت تھی کہ اپنے حاسدوں کو جو مجھے آپ کی خدمت سے منع کرتے تھے اپنے سے ہٹا رکھوں۔ اب میں جناب کی خدمت میں پہنچ گیا ہوں اور سارے مقامات طے کر لئے ہیں تو اب سامان سفر کی ضرورت ہے۔ اس شاعر کا یہ عمل مقامات سے گذر کر تمکین اختیار کر لینا ہوتا تھا۔

اللہ تعالےٰ نے موسیٰؑ کو بھی یہی حکم دیا تھا جب آپ منزلوں کو طے کر کے اور مقامات سے گذر کر تمکین کے محل میں پہنچے تو حق تعالےٰ نے ان سے فرمایا اپنے دونوں جوتے اتار دو اور اپنی لاٹھی پھینک دو کیونکہ وہ مسافت طے کرنے کا آلہ ہے اور وصل کی درگاہ میں مسافت طے کرنے کے سامان کی پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس محبت کی ابتدا حق کو طلب کرنا اور انتہا حق کے ساتھ آرام پانا ہے۔ بقول حضرت علی ہجویریؒ صاحب تمکین یا متمکن وہ شخص ہے جو منزدد نہ ہو اور اپنا سارا سامان درگاہ الٰہی میں لے گیا ہو اور غیر کا خیال دل سے نکال دیا ہو۔ نہ کوئی ایسا معاملہ گذرے کہ اس کے ظاہر کو بدل دے اور نہ کوئی ایسا حال ہو کہ اس کے باطن کو تبدیل کر دے جیسا کہ حضرت عیسیٰ متغیر تھے۔ حق تعالےٰ نے ایک نظر سے طور پر جلوہ ڈالا تو آپ کے ہوش اڑ گئے اور ہمارے نبی کریمؐ متمکن تھے کہ مکہ معظمہ سے قاب قوسین تک عین تجلی الٰہی میں گئے لیکن آپؐ کا حال متغیر نہ ہوا۔ یہ درجہ نہایت اونچا تھا۔

تمگروت وادی درعہ کا سب سے بڑا شہر جو مراکش کے جنوب میں واقع ہے اس شہر کے مکان لال مٹی سے بنے ہوئے ہیں جن کے گرد کھجور اور دوسرے پھلدار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں۔ وادی درعہ کے بائیں کنارے آباد ہے۔ شہر کے گرد ایک فصیل ہے جو زیادہ بلند نہیں ہے۔ اس فصیل میں چار دروازے ہیں جو چاروں سمتوں میں واقع ہیں۔

اس شہر کی اہمیت شیخ محمد ابن ناصر کی شخصیت کی وجہ سے ہے۔ اس کی بنیاد ۹۸۳ھ/ ۶، ۱۵۷۵ء میں مرابطون خاندان کے ایک فرد ابوحفص عمر بن احمد انصاری نے ڈالی تھی۔ جس کا تعلق زاویہ سیدالناس سے تھا۔ یہاں پر دو اشخاص سیدی عبداللہ بن حسین اور سیدی احمد بن ابراہیم کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی تھی کہ صوفی ارادت مند محمد ابن ناصر بھی یہیں ان کے قدموں میں آکر آباد ہو گئے اور سیدی احمد بن ابراہیم کی وفات کے بعد شیخ الزاویہ بنے۔ آپ نے اپنا سلسلہ طریقت جاری کیا۔ ۱۰۸۵ھ/ ۱۶۷۴ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا اور اس کے بعد اس کا بیٹا موروثی طور پر تمگروت کے شیخ ہوتے چلے آئے۔ ان سب شیوخ کے مزار ایک مقبرے میں ہیں جو ۱۸۶۹ء کی آتشزدگی کے بعد دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

تمیم بن معز (رجب ۴۲۲ھ/ جولائی ۱۰۳۱ء – ۵۰۱ھ/ ۱۱۰۸ء) بنوزیری کے صنہاجہ خانوادے کا پانچواں بادشاہ۔ قیروان کے قریب صبرہ (المنصورہ) میں پیدا ہوا۔ ۴۴۵ھ/ ۱۰۵۴ء میں ۲۳ سال کی عمر میں المھدیہ کا والی بنا۔ ۴۴۹ھ/ ۱۰۵۷ء میں اس کے والد المعز نے دارالسلطنت قیروان کو اس کی حفاظت نہ کر سکنے کی وجہ سے خیرباد کہہ دیا اور تمیم کے پاس پناہ گزین ہوا۔ المعز کی وفات کے بعد ۴۵۴ھ/ ۱۰۶۲ء میں تمیم کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے افریقہ کے ان تمام شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جنہیں سابقہ والیوں اور امراء نے خودمختار ریاستوں میں تبدیل کر لیا تھا۔ تمیم کو بنوحماد سے بھی لڑنا پڑا جو اس کے رشتہ دار ہی تھے لیکن تمیم نے المھدیہ کے خلاف بنوحماد کے حکمران الناصر بن حماد کی کوششوں کو بھی ناکام بنا دیا لیکن اس کی توجہ زیادہ تر ساحلی شہروں کی طرف رہی اور اس نے کچھ عارضی نوعیت کی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ سوسہ پر اس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

۱۰۸۴ء میں عربوں نے المھدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ تمیم کے بری مقبوضات اس کے قبضے سے نکلے جا رہے تھے اس نے اپنے والد کے نقش قدم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہ کوشش کی کہ نارمن صقلیہ پر قبضہ نہ کر سکیں، لیکن جب وہ اس میں ناکام ہوا تو بحری غارتگری کو زیادہ تیز کر دیا۔ اس کا ردعمل عیسائیوں میں یہ ہوا کہ اہل جنوہ اور اہل پیزا نے اتحاد کر کے ۶ اگست ۱۰۸۷ء کو المھدیہ پر قبضہ کر لیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا۔ ۴۹۸ھ/ ۱۱۰۴ء میں زیری نے اس پر ایک اور حملہ کیا، جو ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کے چار سال بعد تمیم نے وفات پائی۔

تمیم، بنو ایک عرب قبیلہ۔ اس کا نسب نامہ کچھ اس طرح ہے۔ تمیم بن مُرّ بن اُدّ بن طابخۃ بن الیاس بن مُضر۔ اس لحاظ سے اس قبیلے کا شمار مضری قبائل میں ہوتا ہے۔

اس خاندان کے بارے میں ابتدائی معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ بنوتمیم کا ذکر تاریخ میں پہلی بار چھٹی صدی میں آتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عظیم قبیلہ تھا جو عرب کے مشرقی ساحل پر ایک بڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ نجد کے تمام علاقے، بحرین کے ایک حصے اور یمامہ کے ایک حصے میں یہ لوگ آباد تھے۔

بنو تمیم چونکہ بدوی تھے، اس لئے انہوں نے کبھی شہر نہیں بسائے۔ ہجر، الاحساء اور الجرعا جیسے شہروں میں یہ لوگ میلوں اور منڈیوں کے موقعوں پر اکثر جایا کرتے تھے بعض روایات کے مطابق انہوں نے ان مقامات کو فتح بھی کیا تھا لیکن زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ یہ لوگ ان شہروں کی آبادی کو تنگ کرتے رہتے کبھی ان سے صلح کر لیتے اور کبھی جنگ چھیڑ دیتے۔ اور کبھی شہریوں کو فدیہ وصول کرنے کے لئے پکڑ کر لے جاتے بنو تمیم لات، منات اور عزیٰ کی پرستش کرتے تھے۔ علاقے کی وسعت کے لحاظ سے یہ لوگ زمانہ قدیم ہی سے بہت سے گروہوں اور شاخوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان میں ہر گروہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قبیلے کے مختلف گروہوں میں کبھی اتحاد قائم نہ ہو سکا۔

اس قبیلے کے بڑے بڑے گروہ اور بطون مندرجہ ذیل ہیں۔

زید مناۃ، عمرو، سعد، مالک، منقر، عطارد، حنظلہ، دارم، یربوع، ریاح، کلیب، نہشل، مجاشع وغیرہ۔

بنو تمیم میں بڑے بڑے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے تمیم اور ان کے ہمسایوں بکر بن وائل کی مسلسل رقابت رہی اور دوسری طرف شاہان ایران سے ان کے تعلقات۔ شاہان ایران نے بنو بکر اور بنو تغلب کو اپنے زیر اثر لانے کے بعد بنو تمیم پر بھی اپنا سکہ جمانا چاہا۔ کیونکہ تمیم کی موجودگی سے عرب کے مشرقی ساحل اور یمن کے ساتھ ایرانیوں کے بری راستے ہمیشہ خطرے میں رہتے تھے۔

آنحضورؐ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے آس پاس کے قبیلوں پر غلبہ حاصل کر لیا اور وسطی عرب پر بھی مدینے کی اسلامی حکومت کا رعب اور دبدبہ بیٹھ گیا تو بنو تمیم نے بھی مسلمانوں کے ساتھ اتحاد قائم رکھنے میں فائدہ سمجھا۔ چنانچہ ۸ھ میں انہوں نے ایک وفد آنحضورؐ کی خدمت میں بھیجا اور باہمی دوستی کا معاہدہ طے کیا۔ لیکن اس وقت اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ کے انتقال کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے والوں میں انہوں نے سب سے پہلے سبقت کی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے شدید حملوں کے باعث انہوں نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں اسلامی فتوحات کے دوران میں انہوں نے اپنے سپاہیانہ جوہر خوب دکھائے۔ اس کے بعد تمیمی مجاہدین کا ایک بڑا حصہ ایران کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ پہلے کوفے اور بصرے کے دو بڑے فوجی مقامات میں آباد ہوئے۔ اور بعد ازاں خراسان کا رُخ کیا۔ یہاں پر عباسیوں کے دور حکومت میں عربی آبادی میں اکثریت انہی کی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ بدستور اپنی جنگجویانہ روح کی نمائش کرتے رہے۔ انہوں نے بنو امیہ کے دور کی تمام باغیانہ تحریکوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

بنو تمیم نے خوارج کی حیثیت سے کافی مستعدی دکھائی۔ اس تحریک کے آغاز کے غالی خارجی یہی لوگ تھے۔ ازارقہ کا سردار قطری بن الفجاءہ اور اس کے اکثر سردار تمیمی ہی تھے۔ عباسیوں کی تحریک میں بھی یہ لوگ پیش پیش رہے اور آخر میں افریقہ میں خاندان بنو اغلب کی بنیاد ڈالنے والا ابراہیم بن اغلب بنو تمیم ہی سے تھا

تمیم داری رضؓ ابو رقیہ تمیم الداریؓ ایک صحابی۔ قبیلہ لخم بن عدی کی شاخ الدار بن ھانی بن حبیب بن نمارۃ بن لخم سے تھے۔ آپ کا قبیلہ یمن سے نکل فلسطین میں آباد ہو گیا تھا۔ آپ کی ایک نسبت الدیری بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ ۹ ہجری میں اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک دیر میں راہب تھے۔

آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔

"تمیم بن اوس بن خارجہ بن سود بن جزیمہ بن ذراع بن عدی بن الدار"۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی آپ مذہبی زندگی بسر کرتے تھے۔ فلسطین میں آپ راہب اور عابد کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ بعض نے آپ کو یہود اور نصاریٰ کے علماء میں شمار کیا ہے۔

۹ ہجری میں غزوہ تبوک سے پہلے آپ شام سے مدینے آئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے قبیلے کے اور بھی کئی افراد تھے۔ سب نے اکٹھے اسلام قبول کیا اور عہد نبوت میں مدینے ہی میں مقیم رہے۔ بقول ابن ہشام اس وفد کی آمد دلو تھی ان کے متعلق آنحضورؐ نے خیبر کی زمین کی وصیت فرمائی تھی۔ بقول ابن اسحاق آپ نے آنحضورؐ کے ساتھ غزوہ تبوک میں شرکت کی تھی کیونکہ قبول اسلام کے بعد یہی ایک غزوہ تھا جو رجب ۹ ہجری کو پیش آیا تھا۔

آپ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک مدینے ہی میں سکونت پذیر رہے ۳۵ھ کے بعد شام چلے آئے۔ بقول صاحب تہذیب آپ بیت المقدس میں قیام پذیر ہوئے۔ اور صاحب [illegible] کے نزدیک بیت المقدس کے قریب عینون نامی گاؤں میں آکر آباد ہو گئے۔ جو آنحضورؐ نے آپ کو جاگیر میں عطا کیا تھا

آپ کی زندگی مدینے اور شام میں زاہدانہ اور عابدانہ طریق سے گذری۔ مدینے میں آنحضورؐ کی وصیت کے مطابق خیبر سے گذر بسر کے لئے کچھ مل جاتا تھا۔ شام پہنچ جانے کے بعد قریہ عینون کی آمدنی سے گذر بسر کرتے رہے۔ سارا وقت عبادت میں صرف کرتے۔ کبھی کبھی وعظ بھی کہتے تھے۔ آپ تہجد [illegible] پڑھتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی رکعت میں سارا قرآن ختم کر دیتے۔

آپ اسلام میں پہلے قاص (واعظ) تھے۔ اس کے لئے آپ نے حضرت عمرؓ سے اجازت لے لی تھی۔

آپ نے مسجد نبوی میں قندیل لٹکا کر زیتون کے تیل کا چراغ [illegible] اس کے بعد قندیلوں کا عام رواج ہو گیا۔ جو آگے چل کر [illegible] صورت اختیار کر گیا۔

[illegible] عالم ہونے اور اپنے ذوق علمی کے سبب [illegible] کئے جاتے ہیں۔ آپ سے بہت سی روایات مروی ہیں۔ [illegible] کرنے والے صحابہ میں ابن عمرؓ، ابن عباسؓ [illegible] زرارۃ بن اوفیٰ، تابعین میں سے عبداللہ بن موہب [illegible] قبیصہ بن ذویب، عطاء بن یزید لیثی، روح بن زنباع [illegible] بن غنم وغیرہ اہم ہیں۔

ان مرویات میں ایک روایت [illegible] ایک ایسا شرف ہے جس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں [illegible] بارے میں اس روایت سے علمائے حدیث نے چند [illegible]

آپ کی شہرت اور علم کی وسعت پر [illegible] جب آپ آنحضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے آنحضورؐ [illegible] کی کہ حبرون اور الخلیل کو [illegible] اور ان کی اولاد کو بطور جاگیر عطا فرما دیا [illegible] نے آپ کی درخواست منظور کر لی اور اس قطعے کی دستاویز لکھ دی [illegible] اس وقت تک بزنطینیوں کے قبضے میں تھا۔

آپ کی تاریخ وفات بعض کے اقوال کے مطابق ۴۰ھ ہے جو قبر پر [illegible] ہوئی ملی ہے۔

آپ کی وفات بیت جبرین میں ہوئی جو فلسطین کا ایک شہر ہے۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام رقیہ تھا۔ اسی لئے آپ کی کنیت ابو رقیہ

تھی۔ آپ کا شمار ان صحابہ میں تھا جو زہد و تقوےٰ عبادت و ریاضت میں ضرب المثل تھے۔ آپ کی نماز تہجد مشکل ہی سے قضا ہوتی، تہجد میں بسا اوقات ایک آیت اتنی بار دہراتے کہ پوری رات ختم ہو جاتی۔

ریاکاری سے حد درجہ پرہیز رکھتے تھے۔ اپنی عبادت لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ آپ رات میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں آپ اس سوال پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ایک رکعت نماز جسے میں رات کی تنہائی میں پڑھوں، مجھے اس بات سے زیادہ محبوب ہے کہ میں رات بھر نماز پڑھوں اور صبح کو سب سے بتاتا پھروں۔

تمیم داری خوش پوش، خوش وضع اور خوش صورت آدمی تھے۔ حضرت عمر فاروق رض آپ کو خیر اہل المدینہ (مدینہ کے سب سے اچھے اور نیک آدمی) فرمایا کرتے تھے۔

تمیمی، عبدالواحد

(و، ۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) بغداد کے ایک صوفی بزرگ۔ کنیت ابوالفضل تھی والد کا نام عبدالعزیز بن حرث بن اسد تھا۔ عرب کے مشہور و معروف قبیلے بنو تمیم سے تھے۔

پہلے شیخ خراسان شیخ ابوالقاسم سے اکتساب فیض کیا۔ بعدازاں شیخ ابوبکر شبلی سے منسلک ہو گئے۔ اور سرفراز خلافت ہو کر شبلی کی مسند ارشاد کی زینت بنے۔

آپ کا سلسلہ جنیدیہ تھا۔ آپ نے شریعت و طریقت کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بے شمار خلقت نے آپ کی وجہ سے راہ ہدایت پائی۔ آپ نے حرمین الشریفین کے کئی سفر کیے اور بیشتر بلاد عرب و عجم کی سیاحت کی۔ عمر کا زیادہ حصہ بغداد میں بسر کیا۔ عہد عباسی میں وفات پائی۔ قبر امام احمد بن حنبل کے مقبرہ میں واقع ہے۔

تناسخ

اواگون۔ جون بدلنا۔ بقول مولانا اشرف علی تھانوی ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف نفس ناطقہ کا انتقال۔

ہندوستان میں اس اعتقاد کے لوگ عام ہیں۔ بقول البیرونی "جس طرح شہادت بہ کلمۂ اخلاص مسلمانوں کے ایمان کا شعار ہے۔ تثلیث علامت نصرانیت ہے اور سبت منانا علامت یہودیت اسی طرح تناسخ ہندو مذہب کی نمایاں علامت ہے۔"

البیرونی تناسخ کے بارے میں حکمائے ہند کی یہ رائے بھی لکھتا ہے۔

"ایک ہی زندگی کی مدت نفس کے لیے اتنی کم ہے کہ وہ اس میں ان کثیر چیزوں کا جن پر دنیا مشتمل ہے احاطہ نہیں کر سکتا۔"

بقول شہرستانی۔ "تناسخ سے مراد وہ عقیدہ ہے جس کی رُو سے دنیا کے پے در پے ادوار حیات اور یکے بعد دیگرے نئے وجود اختیار کرنا مانا جاتا ہے۔"

ہندومت تناسخ کا قائل ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان جس قسم کے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے اسی کے مطابق اگلا جنم لے گا۔ موجودہ زندگی کی مصیبتیں اور راحتیں سب کی سب گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ان ہی اعمال کے نتیجے کے طور پر انسان ادنیٰ یا اعلیٰ ذات میں حیوانات اور نباتات کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ عمدہ اعمال کی وجہ سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اگر اعمال انتہائی خراب ہوں تو پھر اسے جہنم میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اس دنیا میں بار بار پیدا ہوتا رہتا ہے اس چکر کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کو کرم کے چکر سے آزاد کرے۔ اور یہ چیز برہما کے ساتھ اتحاد کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

عقیدہ تناسخ روح کے ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہونے کے معنی میں متعدد شیعی فرقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

نصیریوں کا عقیدہ ہے کہ ان کی ملت کا گنہگار آدمی یہودی، سنی مسلمان یا عیسائی کی شکل میں اس دنیا میں واپس آئے گا اور وہ منکر جو حضرت علی رض کو نہیں مانتے، گدھے، خچر، اونٹ، کتے اور اسی قسم کے دوسرے جانور بن جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تناسخ کے سات درجے ہیں۔

اسماعیلی یہ بات نہیں مانتے تھے کہ روح جانوروں کے اجسام میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ عقیدہ ضرور رکھتے ہیں کہ عالم حیات و ممات میں زندگی متعاقب اور پے بہ پے ہوتی ہے جن میں روحیں محو عمل رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں معرفت امام حاصل ہوا اس کے بعد یہ روحیں عالم نور میں پہنچ جاتی ہیں۔

بقول شہرستانی معتزلہ میں سے احمد بن حائط کے مریدوں کی تعلیم یہ تھی کہ اوّل اوّل خدا نے ہر قسم کی مخلوق پیدا کر کے ایک قسم کو اس دنیا سے الگ کسی اور دنیا میں رکھا اس کے بعد جس کسی نے کچھ نافرمانی کی اسے اس کے گناہوں کے مطابق انسان یا جانوروں کی شکل میں اس دنیا میں بھیجا۔ اس کے بعد وہ ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کے گناہوں کے اثرات زائل ہو جائیں۔

تناسخ کا عقیدہ ہندومت اور مسلمانوں کے علاوہ بدھ مت، قدیم یونانیوں اور دنیا کے دیگر مذاہب و اقوام کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اسلام کی صحیح تعلیمات اس عقیدے کی مخالف ہیں اور واضح طور پر اس کی تردید کرتی ہیں۔ (نیز دیکھئے "روح" و مضامین متعلقہ مذاہب)

تنادقی

اباضی فرقے کے بہت سے روحانی شیوخ کا اسم نسبتی۔ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں ان شیوخ میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے۔

۱۔ ابولیعقوب یوسف بن محمد تنادقی ان کا بعد کی روایات میں بھی اکثر ذکر ملتا ہے۔ آپ کے بیٹے اسماعیل اور پوتے ابولیعقوب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ نہایت متقی و پرہیزگار اور صاحب کرامات تھے۔

۲۔ ابوعمار عبدالکافی تنادقی۔ آپ ایک امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے تیونس میں تعلیم حاصل کی۔ حصول علم خاص طور پر فقہ اللغت عربی کی تحصیل کا بے حد شوق تھا۔ تعلیم میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ والدین روپے کے ساتھ جو خطوط بھیجتے تھے آپ انہیں بھی پڑھنے کی فرصت نہ پاتے تھے۔ جب تعلیم سے فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو ان خطوط کو کھولا جن میں سے ایک میں والد کے انتقال کی خبر تھی اور دوسرے میں والدہ کے انتقال کی۔

علم دین میں آپ کے استاد ابوزکریا یحییٰ بن ابی بکر تھے۔

آپ کی تصانیف میں "الموجز فی تحصیل السؤال"۔ "شرح الجہالات" — "سیر" وغیرہ ہیں۔

۳۔ عدون بن اللؤلؤ تنادقی۔ کچھ عرصہ جزیرہ جربہ میں مقیم رہے۔ یہ پہلے شخص تھے جن کو عرب حملہ آوروں نے وارجلہ میں قتل کیا۔ یہ بھی مذکورہ بالا حضرات کی طرح اصحاب تقوےٰ میں سے تھے۔

تنزانیہ مشرقی افریقہ کا ایک ملک جو ٹانگا نیکا اور زنجبار کے باہمی ادغام سے ۱۹۶۴ء میں متحدہ جمہوریہ تنزانیہ کے نام سے عمل میں آیا اس کا کل رقبہ ۳۶۲۸۲۰ مربع میل اور آبادی ۱۴۰۰۰۰۰۰ ہے ڈوڈوما تنزانیہ کا دارالحکومت ہے۔ ۷۰۰ ق م میں تنزانیہ کے ساتھ ہندوستان اور عرب ممالک کی ساحلی تجارت زوروں پر تھی۔ پہلی صدی عیسوی میں یونانی تاجروں نے بھی اس کے ساتھ تجارت شروع کی۔

۱۴۹۸ء میں دنیا کا مشہور سیاح واسکوڈے گاما کی سیاحت کے بعد پرتگالیوں نے عربوں کو اس ملک سے نکال باہر کیا۔ اور خود قابض ہو گئے لیکن تعداد کی کمی کے باعث وہ سلطنت کا انتظام چلانے میں ناکام رہے۔ چنانچہ جلد ہی عربوں کی حکومت دوبارہ بحال ہو گئی۔ ۱۸۵۶ء میں سید سعید والی تنزانیہ کے انتقال کے بعد تنزانیہ کو تقسیم کر دیا گیا اور زنجبار ایک علیحدہ سلطنت کی حیثیت سے تنزانیہ سے علیحدہ ہو گیا۔

تقسیم کے بعد تنزانیہ میں جرمنوں کا اثر و نفوذ اس قدر تیزی سے بڑھا کہ ۱۸۸۴ء میں ڈاکٹر کارل پیٹرز نے یہاں کے سرداروں سے تھوڑے ہی عرصے میں بہت سے معاہدے کر لیے۔ ۱۸۸۵ء میں حاصل کردہ علاقے کو جرمنی کا زیر تحفظ علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں سلطان نے زنجبار اور پمبہ کا علاقہ برطانیہ کے حوالے کر دیا۔

جنگ عظیم اوّل کے دوران میں برطانوی اور بلجیمی فوجوں نے جرمنوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ اور ۱۹۱۹ء میں معاہدہ ورسیلز عمل میں آیا جس کی رُو سے ٹانگا نیکا برطانیہ کا انتدابی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ٹانگا نیکا میں پہلی لیجسلیٹو کونسل قائم کی گئی ۱۳ دسمبر ۱۹۴۶ء میں اس علاقے کو اقوام متحدہ کے تولیتی علاقے میں تبدیل کر دیا گیا۔ پہلے انتخابات کے بعد یہاں پر وزارتی نظام قائم کیا گیا۔ اگست ۱۹۶۰ء میں دوسرے عام انتخابات میں جولیس نایریرے یہاں کا وزیر اعلیٰ منتخب ہوا۔ یکم مئی ۱۹۶۱ء کو نایریرے کو یہاں کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو اسے مکمل خود اختیاری حاصل ہو گئی اور اسی تاریخ کو ٹانگا نیکا بھی آزاد ہو گیا۔ ۱۸ جنوری ۱۹۶۱ء کو زنجبار میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اسے شدید آئینی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اسے خود مختار سلطنت قرار دیا گیا۔ لیکن ایک ماہ کے اندر ہی نئی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور ملک کو عوامی جمہوریہ زنجبار قرار دے دیا گیا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۴ء کو زنجبار اور ٹانگا نیکا کو باہم مدغم کر کے ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو نئی حکومت کا نام تنزانیہ رکھ دیا گیا۔ اور ۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو یہاں ایک پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہاں کی زرعی پیداوار میں لونگ، کپاس، کافی، گنا اور لکڑی ہے۔ معدنیات میں ہیرے، سونا، ٹین وغیرہ ہیں۔ کوہ کلمنجارو کی چوٹی یہاں کا بلند ترین مقام ہے۔ ۱۹۳۴۰ فٹ بلند ہے۔ آبادی کا مذہب اسلام ہے۔ یہاں کی بولیوں میں سواحلی اور انگریزی ملک کی سرکاری زبانیں ہیں۔ زنجبار میں سواحلی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی، انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

تنزانیہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کا رکن ہے۔

تنس (TENES) الجزائر کے ساحل پر ایک شہر جو وادی شلف میں الجزائر سے ۱۲۵ میل دور واقع ہے۔ یہ شہر ایک پتھریلی سطح مرتفع پر تعمیر ہوا ہے موجودہ شہر اسی جگہ پر آباد ہے جہاں کارتنا کا قدیم شہر اور فنیقیہ اور قرطاجنہ والوں کی بستی کو ٹھی واقع تھی جو رومیوں کے زمانے میں رومی نو آبادی بنا دی گئی۔ پہلے ونڈالوں نے اسے تباہ کیا بعد عربوں نے تاخت و تاراج کیا۔ اور نتیجۃً کارتنا بالکل تباہ و برباد ہو گیا تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں سپین کے مہم جو افراد نے یہاں آکر سمندر سے دو میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر بسایا۔ یہی شہر موجودہ تنس ہے۔

بقول البکری یہ شہر ہسپانوی ملاحوں نے ۲۶۲ھ / ۸۷۵ء میں بسایا تھا۔ جو سردیوں کے موسم میں اس بندرگاہ سے گذارتے تھے۔ بعد میں بنو ابراہیم کے بربر بھی یہاں آکر آباد ہو گئے۔ اور ان مہاجروں کی سادہ سی بستی نے ایک شہر کی صورت اختیار کر لی۔ اس شہر کے گرد دیواریں تھیں اور اس کے اندر ایک مسجد بھی تھی۔ اس کے آثار اب تک تنس قدیم میں موجود ہیں۔ فصیل کا ایک حصہ ابھی تک باقی ہے۔ مسجد بھی موجود ہے۔

بقول ادریسی یہاں پر ایک علوی الاصل خاندان حکمران تھا۔ جس نے اندلس کے امویوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اموی حکمران ایسے آدمیوں کو جن کے متعلق انہیں شکایت ہوتی تھی، جلا وطن کر کے یہاں بھیج دیا کرتے تھے۔

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے بعد کئی خاندان یکے بعد دیگرے یہاں پر حکمران رہے۔ ان خاندانوں میں فاطمیہ، صنہاجہ، مغراوہ، [illegible] اور [illegible] مشہور ہیں۔ الموحدون کی سلطنت کے خاتمے کے بعد یہ علاقہ تلمسان کے [illegible] کے قبضے میں آگیا۔ پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ علاقہ ایک خود مختار ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ جس پر پہلے تو شاہی خاندان کے افراد اور [illegible] شیوخ حکمرانی کرتے رہے۔ آخری شیخ ہسپانیہ کا باجگزار بن گیا۔ [illegible] میں ترکی امیر البحر عروج بار بروسا نے [illegible] فتح کیا اور چند سال بعد خیر الدین باربروسا نے یہاں ترکی اقتدار قائم کر دیا۔ اور [illegible] قائد اور کچھ قلعہ گیر فوج متعین کر دی۔ اس وقت سے اس شہر کی خوشحالی کو زوال [illegible] ہوا۔ اٹھارویں صدی میں غلے کی تجارت جو یورپ کے ساتھ سولہویں اور سترہویں صدی میں جاری تھی بالکل بند ہو گئی۔ مقامی لوگوں نے شہر کو کئی بار ترکوں [illegible] سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔

۱۸۳۰ء کے بعد تنس کچھ مدت کے لیے خود مختار رہا۔ بعد میں عبد القادر نے اس شہر کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ اور یہاں کی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کی [illegible] کامیاب رہا۔ ۱۸۴۳ء میں یہاں کے لوگوں نے فرانسیسیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ [illegible] نے یہاں فوراً مکانات بنوانے شروع کر دیے۔ ان تعمیرات سے موجودہ شہر کی [illegible] ۱۹۲۹ء سے پہلے ایک ریلوے لائن بنائی گئی جو شہر کو وادی شلف سے ملاتی ہے۔ [illegible] سے بندرگاہ کی تجارت پر اچھا اثر پڑا ہے۔ یورپی آبادی جنوب [illegible] پر مقامی باشندوں کا ایک گاؤں ہے جس کی آبادی بارہ سو کے قریب ہے [illegible] کہتے ہیں۔ یہ بھی سطح مرتفع پر واقع ہے۔

شہر تنس اپنے اندرونی انتظامی معاملات میں بالکل خود مختار ہے۔ [illegible] دس ہزار کے قریب ہے۔ یہ ایک مخلوط ناحیے کا صدر مقام بھی ہے [illegible] ایک لاکھ کے قریب ہے۔

تنظیمات وہ اصلاحات جو ممالک عثمانیہ کی حکومت اور جمہوری ادارے [illegible] میں سلطان عبدالمجید کے عہد حکومت میں جاری ہوئیں۔ تنظیمات [illegible] کی ترکیب پہلے پہل سلطان محمود ثانی کے دور حکومت کے آخری برسوں میں [illegible] تنظیمات کا خاتمہ ۱۸۸۰ء میں سمجھا جاتا ہے۔ جب عبد الحمید ثانی کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔

تنظیمات نے ان اصلاحات کو جاری رکھا جنہیں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے اس غرض سے شروع کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کو جو اندرونی اور بیرونی [illegible] سے کمزور ہو چکی تھی بچایا جا سکے۔ محمود ثانی اندرون ملک میں نظام جاگیرداری کو ختم کرنے اور دینی چری فوج کے رجعت پسند [illegible] کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس [illegible]

داخلی معاملات میں اس نے اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا۔ لیکن وہ مصر اور یونان کے چھن جانے کو نہ روک سکا۔ تنظیمات کا کارنامہ اس کے جانشینوں اور سرکاری عہدیداروں کے حصے میں آیا۔

۱۸۳۹ء سے لے کر کریمیا کی جنگ کے خاتمے تک اصلاحات کی روح رواں مصطفیٰ پاشا تھا، جو چھ مرتبہ وزیر اعظم بنا۔ اصلاحات کے دوسرے دور میں جس کا آغاز فروری ۱۸۵۶ء میں ہوا، مصلحین کی سرگرمیوں کی رہبری علی پاشا اور فواد پاشا نے کی تیسرے دور کی شخصیت مدحت پاشا تھی۔

سلطان عبدالمجید نے اپنے والد سلطان محمود ثانی کی تیار کردہ سکیم کے مطابق نفاذ اصلاحات سے متعلق ان کے تیار کردہ فرمان کا اعلان کیا۔ جسے "خط شریعت گلخانہ" کا نام دیا گیا۔ یہ فرمان اپنی نوعیت کے اعتبار سے دولت عثمانیہ کا اہم دستور خیال کیا جاتا ہے۔ اس فرمان میں سلطان نے اس بات کا اعلان کیا۔

"یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں قرآن عزیز کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت عظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثناء اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوشحالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

ڈیڑھ سو سال سے پیہم حادثوں اور مختلف وجوہ کی بناء پر شریعت نبویؐ اور قوانین سلطنت کی عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ طاقت اور فارغ البالی کمزوری اور افلاس سے بدل گئی ہے۔ کیونکہ جو حکومت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی کافور ہو جاتا ہے۔"

"ہم شروع ہی سے ان معاملات پر غور کر رہے ہیں اور سریر آرائی کے دن سے آج تک بہبود عامہ، صوبوں کی اصلاح اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے۔ اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافیائی حالات، زمین کی زرخیزی، باشندوں کی موزونی طبع اور ذکاوت فہم کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں یقین آ جائے گا کہ مؤثر طریقوں کی دریافت اور استعمال پر امید ہے۔ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سال میں حاصل ہو جائے گا۔ لہذا اللہ تعالےٰ کی نصرت اور آنحضورؐ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعے سے دولت عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم و نسق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ قوانین بالخصوص مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے:۔

۱۔ رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

۲۔ محاصل کے وصول کرنے کا ایک باقاعدہ نظام۔

۳۔ فوج کی بھرتی اور اس کی مدت ملازمت کے تعین کے لئے بھی ایسا ہی باقاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت ضروری ہے کیونکہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لئے رقم کی ضرورت رہتی ہے جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے لگائے جائیں۔ لہذا ضروری ہے کہ آئندہ ملت عثمانیہ کے ہر فرد پر اس کے حسب حیثیت محصول لگایا جائے۔ اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔ اور چونکہ پہلے نظام کے تحت صوبے کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص کی مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا تھا کیونکہ حاکم اگر نیک نہ ہو تو اپنے فائدے کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ اب وہ نظام ختم کیا جاتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بری اور بحری فوجوں کے مصارف کا تعین خاص قوانین کے ذریعے کر دیا جائے۔ اگرچہ ملک کی حفاظت کا خیال ہم سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے لئے سپاہی فراہم کریں پھر بھی ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لئے قوانین مقرر کر دیئے جائیں۔ نیز فوجی سپاہیوں کی مدت ملازمت کم کر کے چار یا پانچ سال کر دی جائے کیونکہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کئے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا بے انصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت و حرفت کو بھی ایک مہلک صدمہ پہنچاتا ہے۔ اسی طرح سپاہیوں کو عمر بھر فوجی خدمت میں رکھنے کے لئے ان کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

غرض ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت نہ خوشحالی نہ امن بخلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

• ۔ آئندہ ہر ملزم کے مقدمے کی سماعت علانیہ شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا علانیہ زہر دے کر یا کسی اور طریقے سے مار ڈالے۔

• ۔ کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

• ۔ ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال و متاع پر قابض رہے گا اور پوری آزادی سے اسے فروخت یا منتقل کر سکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہوگا مثلاً کسی مجرم کے بیگناہ وارث اپنے قانونی حقوق سے محروم نہیں کئے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال و متاع ضبط کیا جائے گا۔

• ۔ یہ مراعات ساری رعایا کے لئے بلا لحاظ مذہب و فرقہ پوری قوم کے لئے یکساں طور پر جاری ہوں گی۔

• ۔ جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کا تقاضا ہے، سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔"

ان تنظیمات سے چونکہ قدیم دساتیر کی مکمل تجدید ہوتی تھی اور وہ بالکل بدل جاتے تھے اس لئے ان تنظیمات کا نفاذ بڑی پر آشوب فضا میں ہوا۔ کوئی وزیر اعظم شاذ و نادر ہی کسی منصوبے کو مکمل طور پر امن کے ساتھ نباہ سکتا تھا۔ وزارت اچانک معزول ہو جاتی تھی۔ پھر اچانک ہی بحال بھی ہو جاتی تھی۔ باوجودیکہ سلطان عبدالمجید ان اصلاحات کی طرف نسبتاً زیادہ مائل تھا۔ رشید پاشا ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۸ء تک کے درمیانی عرصے میں کم از کم چھ مرتبہ وزیر اعظم بنا۔ ایسے وقت بھی آئے جب غیر ملکی دخل اندازی کی وجہ سے اچانک نئی جدوجہد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ صورت حال بالخصوص پیرس کی صلح کانفرنس سے پہلے کے مذاکرات کے وقت پیدا ہوئی۔ ترکیہ کے حلیف اس وقت سلطان کو بین الاقوامی قرارداد کے ذریعے پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان اصلاحات کا فوری نفاذ کرے جو ابھی تک معرض التوا میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ "خط ہمایوں" (۱۸۵۶ء) کی شکل میں نکلا۔

۲۱ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطان عبدالمجید نے باب عالی کے دوسرے اہم دستور (تنظیمات) کا اعلان کیا جو مندرجہ ذیل ہے۔

"تمام رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت" "خط شریعت گلخانہ" میں دی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا۔

ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دیئے گئے ہیں، از سر نو توثیق کی جاتی ہے۔ ان حقوق و مراعات پر بے توقف نظر ثانی کر کے زمانے اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انہیں ترقی دی جائے گی۔ اور اس غرض

سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی۔ جو مندرجہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی۔ سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کیے تھے، ان میں اس جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب عمر بھر کے لیے ہوا کرے گا۔

نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔

وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں۔ مقررہ تنخواہیں بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی۔ پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی متعرض نہیں کیا جائیگا۔

موجودہ کلیساؤں۔ مدرسوں ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقے کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا۔ اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ ملاحظہ کر کے تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقے کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القابات وامتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں، ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا۔ اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائیگا ملکی اور فوجی عہدے ساری رعایا کے لیے یکساں طور پر ہوں گے۔ تقرر صرف قواعد و ضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بناء پر ہوگا۔

ہر فرقے کو علوم و فنون کے مدارس قائم کرنے کی اجازت ہے۔ البتہ نصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی۔

وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے ہوں گے مخلوط عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور ان کا اجلاس بر سر عام ہوا کرے گا۔

قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی اور معمولی جرائم کے مجرموں کے لیے نئے ضابطے مرتب کیے جائیں گے۔

چونکہ محصولوں کے عائد کرنے میں مساوات برتی جائے گی اس لیے انصاف تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقے کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں، انھیں فوجی خدمات کے معاوضے میں نقد رقم پیش کرنے کی اجازت بھی حاصل رہے گی۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کر کے جلد شائع کر دیے جائیں گے۔

صوبوں کی مجلس میں اصلاح کی جائے گی تاکہ انتخابات بہتر طریق پر ہو سکیں اور باشندوں کی آزاد و صحیح رائے معلوم ہو سکے۔

باب عالی مالی ساکھ قائم کرنے میں حتی الوسع پوری کوشش کرے گا اور جن چیزوں سے اس ساکھ کو تقویت ہوتی ہے مثلاً بنک وغیرہ انہیں فروغ دے گا اور ان کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا۔

ان کے علاوہ سلطان عبدالمجید نے تعلیم کے شعبے میں بھی اصلاحات نافذ کیں۔

فوجی اصلاحات کے سلسلے میں فوج کے دو حصے کر دیے گئے۔ ۱۔ نظام ۲۔ ردیف۔ پہلی فوج میدان کارزار میں رہتی تھی اور دوسری حرب گاہ کی مقررہ میعاد ختم کرنے کے بعد آئندہ ضروریات کے لیے تیار رکھی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا تنظیمات کے جاری کردہ اہم قوانین سن وار ذیل میں دیے جاتے ہیں

۱۸۳۹ء کے فوراً بعد رشید پاشا نے فرانسیسی طرز پر صوبوں کے نظم و نسق کا ایک نیا طریق جاری کیا۔

۴۔ نومبر ۱۸۳۹ء خط شریعت گلخانہ۔

۸۔ مارچ ۱۸۴۰ء مجلس احکام عدلیہ کی ترتیب جدید۔

۱۸۴۰ء اجرائے مجموعہ قوانین تعزیرات

۱۸۴۰ء تخلیق عدالت تجارت (تجارت مجلسی)

۶۔ ستمبر ۱۸۴۳ء مختلف مقامات سے فوج بھرتی کرنے کا قانون۔

۱۸۴۵ء دارالخلافہ میں مجمع مندوبین ولایات۔

۱۸۴۵ء قیام یونیورسٹی و دیگر معاہد برائے تعلیم ثانوی۔

۱۸۴۶ء۔ نشر ضابطہ اداری۔

۱۸۴۷ء دیوانی اور فوجداری مخلوط عدالتوں کا قیام۔

۱۸۴۷ء نظارت معارف عمومیہ۔

۲۴۔ مئی ۱۸۵۰ء فرمان بحق مسلمانان۔

۲۸۔ جولائی ۱۸۵۰ء ضابطہ تجارت کا نفاذ۔

۲۸۔ نومبر ۱۸۵۲ء فرمان ادارۂ ولایات۔

۱۸۵۴ء مجلس کبیر کی دو حصوں میں تقسیم۔

۱۔ مجلس اصلاحات ۔ ۲۔ مجلس عالی احکام عدلیہ۔

۷۔ مئی ۱۸۵۵ء غیر مسلم رعایا سے وصولی خراج کی موقوفی اور انہیں فوج میں بھرتی [illegible]

۱۸۔ فروری ۱۸۵۶ء خط ہمایوں کا اجراء۔

۳۰۔ مارچ ۱۸۵۶ء عہد نامہ صلح پیرس۔

۱۸۵۶ء عثمانی بنک کی تاسیس۔

۲۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء قانون اراضی کا نفاذ۔

۹۔ اگست ۱۸۵۸ء ضابطہ تعزیرات کا نفاذ۔

۳۰۔ اپریل ۱۸۶۰ء ملحق قانون تجارت ان عدالت ہائے تجارتی کی [illegible] غیر مخلوط عدالتوں میں ضم کر دیا گیا۔

۲۴۔ مئی ۱۸۶۰ء قواعد و ضوابط متعلقہ جماعت ارمنیان گریگوری۔

۱۸۶۱ء دونوں مجالس عالیہ کو ایک کر کے اس کے تین شعبے اداری [illegible] اور مالی قائم کیے گئے۔

یکم مئی ۱۸۶۱ء جدید ضوابط برائے لبنان۔

۱۴۔ نومبر ۱۸۶۱ء آئین دادرسی تجارتی۔

۱۸۶۲ء۔ ضوابط اساسی برائے بطریکیہ عمومی۔

۴۔ فروری ۱۸۶۳ء امتیاز تاسیس امپیریل۔

۲۰۔ اگست ۱۸۶۳ء۔ ضابطہ قانون تجارت بحریہ۔

یکم اپریل ۱۸۶۴ء ضوابط خصوصی برائے جماعت یہود۔

۶ر ستمبر ۱۸۶۴ء۔ قواعد اساسی برائے لبنان۔

۸ر نومبر ۱۸۶۴ء۔ قانون ولایات۔

۱۶ر جون ۱۸۶۷ء۔ قانون جس کی رُو سے غیر ملکیوں کو حصول ملکیت کا حق حاصل ہوا۔

۱۲ر اپریل ۱۸۶۸ء۔ قیام شورای دولت و دیوان احکام عدلیہ۔

۱۸۶۸ء۔ افتتاح مدرسہ ثانوی غلطہ سرای۔

یکم ستمبر ۱۸۶۸ء۔ عثمانی قومیت کا قانون۔

۱۹ر جنوری ۱۸۶۹ء۔ قانون اختیارات عدالت ہائے نظامیہ۔

۴ر اپریل ۱۸۶۹ء۔ مجلہ۔ احکام عدلیہ یعنی ضابطہ دیوانی کی تنقیح اس قانون کے سولہ حصے جو ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۶ء میں نافذ ہوئے۔

۱۸۶۹ء۔ فرمان تخلیق اسقفیہ بلغاریا۔

۲۲ر جنوری ۱۸۷۱ء۔ ادارہ ولایات کا قانون۔

۲۱ر جنوری ۱۸۷۴ء۔ اوقاف دینیہ کے غیر دینی کاموں میں استعمال کرنے کا قانون (اس پر کبھی عملدرآمد نہیں ہوا۔)

۱۸۷۵ء۔ فرمان برائے اصلاح محکمہ عدالت۔ عدالت ہائے تجارتی وزارت عدل کو منتقل ہوئیں۔

۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء۔ سلطنت عثمانیہ کے قانون اساسی کا نفاذ۔

۲۰ر مئی ۱۸۷۹ء۔ وزارت عدل و عبادات کا نظام اساسی۔

۱۸ر جون ۱۸۷۹ء۔ نظام عدالت ہائے نظامیہ۔

۱۸ر جون ۱۸۷۹ء۔ قانون اجرائے فیصلہ جات۔

۲۲ر جون ۱۸۷۹ء۔ ضابطہ دادرسی دیوانی۔

تنوخ قدیم مختلف قبائل کا مجموعہ جن کے شجرۂ نسب کے مشترک ہونے کی وجہ سے عموماً انہیں ایک ہی قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ قبائل عربوں کے خلاف باہم متحد تھے۔ ان میں وہ قبیلے شامل تھے جو تہامہ سے بحرین کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یعنی مینی قبائل ان میں بنو اشعر اور بنو ازد وغیرہ اہم ہیں۔

ایک اور فہرست میں مصریوں کا بھی ذکر ہے اور مالک بن زہیر کے ساتھ ساتھ مالک اور عمرو (ابنا) فہم بن تیم اللہ اور ان کے رھط اور الحیقار بن قنص اور ایاد بن نزار ابن معد کے تین بطون کا ذکر بھی آتا ہے۔ ان قبائل کا ذکر طبری اور ابن خلدون نے کیا ہے۔

بحرین میں یہ سب قبیلے جمع ہوئے اور دفاع اور حملہ کرنے میں باہم شریک ہونے کی شرط پر حلیف بنے۔ یہیں انہوں نے اپنا نام تنوخ رکھا۔ بقول طبری نمارہ بن لخم کے قبائل بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ بعدازاں ازدی بھی اسی اتحاد میں شریک کر لئے گئے۔

یہاں سے تنوخ عراق میں طوائف الملوکی کے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ عراق میں داخل ہونے لگے۔ سب سے پہلے الحیقار، قنص اور کچھ دیگر قبیلے اکٹھے ہو کر وہاں پہنچے۔ ان کا ارمانیوں سے مقابلہ ہوا جن کی زمینوں پر ان قبائل نے جنگ کر کے قبضہ کر لیا اور اس کے بعد عرب الانبار اور عرب الحیرہ کا جزو بن گئے ان کے بعد تیم اللہ اور ایاد اپنے حلیفوں کے ساتھ الانبار پہنچے پھر نمارہ بن قیس بن نمارہ قبائل کندہ اور دوسرے قبیلے الحیرہ میں آ گئے۔

بقول یاقوت تنوخ کی کثیر تعداد الانبار اور الحیرہ کے درمیان ایک ایسے علاقے پر آباد ہوئی جس کے مشرق میں دریائے دجلہ اور مغرب میں صحرا ہے انہیں عرب الضاحیہ کہا جاتا تھا اور یہ لوگ جھونپڑیوں اور بکریوں کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔

ان کا سب سے پہلا بادشاہ مالک بن فہم تھا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمرو اور اس کے بعد جذیمۃ الابرش اس کے جانشین ہوئے۔ جذیمہ کی سلطنت حیرہ انبار، بقہ، ہیت، عین التمر، غمیر اور قطقطانہ تک کا علاقہ شامل تھا۔

جذیمہ کے بعد عمرو بن عدی اس سلطنت کا مالک بنا اور اس طرح بادشاہت بنی لخم میں منتقل ہو گئی۔

ابوالفداء نے تنوخ کی ان جنگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو لخمیوں سے ہوئیں تنوخ میں عیسائیت کی تبلیغ کب کی گئی اس بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بقول پاٹرول اور رینٹ ۵۵۹ء اور ۵۷۰ء کے درمیان احوذمہ نے ان میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔

اسلام کے ابتدائی فتوحات کے دوران میں تنوخ عام طور پر سرحد کے قبیلوں بہرا، کلب، سلیح اور غسان وغیرہ کے حلیف دکھائی دیتے ہیں جن کے کچھ افراد عیسائی تھے۔

خالدؓ بن ولید ۱۲ھ میں عین التمر کی فتح کے بعد دومۃ الجندل کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں تنوخ کی کثیر تعداد اپنے سرداروں کی سربراہی میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے عیاض بن غنم پر پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ عربوں نے قلعے سے نکل کر مسلمانوں کی دو فوجوں پر حملہ کیا۔ لیکن ناکام رہے اور صرف چند افراد ہی واپس قلعے میں جا سکے۔ تھوڑے عرصے میں قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور بچوں اور عورتوں کے سوا تمام مردوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔

دریائے یرموک کی لڑائی کے بعد ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے حمص اور قنسرین کا رُخ کیا اور انہیں فتح کر لینے کے بعد گرد و نواح کی مستقل آبادی کو جسے حاضر قنسرین کا نام دیا جاتا تھا اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ تنوخی یہاں پر مستقل طور پر آباد تھے ان میں سے بعض تو مسلمان ہو گئے اور اکثر عیسائی ہی رہے۔ ابوعبیدہؓ نے تنوخ اور دوسرے قبائل سے معاہدہ کیا اور ان لوگوں پر جزیہ عائد کیا جو اسلام نہ لائے۔

۱۷ھ میں جب ہرقل نے شام کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے ایک بڑی مہم تیار کی تو اہل قنسرین و حلب بشمول تنوخ و سلیح بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ چونکہ اہل جزیرہ کے تنوخ نے رومیوں کو اہل حمص کے خلاف برانگیختہ کیا تھا حضرت عمرؓ نے ان کی تنبیہہ کے لئے جند عراق کو الجزیرہ پر چڑھائی کے لئے بھیجا اور تنوخ اور ربیعہ کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ یہ کارروائی عیسائی عربوں کو پسپا کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس کے فوراً بعد بزنطینیوں کو جو تنوخ اور سلیح کو مشکل میں پھنسا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے زبردست شکست ہوئی بزنطینیوں کے بقیہ السیف کو جن کے ساتھ غسان، ایاد اور تنوخ کے افراد بھی شامل تھے اور ہرقل سے جا ملنے کی کوشش کر رہے تھے میسرہ بن مسروق نے آ لیا اور ان سب کا کام تمام کر دیا۔

اس دور میں تنوخ الحضر سے روانہ ہو کر بہت دور مغرب کی طرف جا آباد ہوئے تھے۔ بقول ہمدانی ان کے بائیں طرف اس علاقے میں جو بحیرہ روم تک پھیلتا چلا گیا ہے تنوخ آباد تھے۔ القصیص تنوخ کا فوجی گروہ ہے۔ ساحل سمندر پر لاذقیہ کا شہر انہی کا شہر ہے۔

دوسرے عیسائی قبیلوں مثلاً تغلب کی طرح جنگ صفین کے موقع پر تنوخ بھی امیر معاویہؓ کے اور مرج راھط میں مروان کے طرفدار ہو کر لڑے تھے۔

خلیفہ المہدی نے ان تنوخیوں کو جو حلب کے گرد و نواح میں خیمہ زن تھے مسلمان ہونے پر مجبور کیا اور ان کے نو تعمیر گرجے مسمار کرا دیئے۔

ہارون الرشید کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے فتنوں کے دوران میں باغیوں نے حلب کے قریب تنوخ کی آبادی پر حملہ کر دیا۔ دس روز تک لڑائی جاری رہی اور آخر کار تنوخی رات کے وقت خفیہ طور پر قنسرین کی طرف روانہ ہو گئے لیکن قنسرین پر بھی قبضہ نہ کر سکے۔ اور منتشر ہو کر تکریت، آرمینیا اور دوسرے مقامات کی طرف چلے گئے۔ بقول فواد حمزہ ملک شام میں تنوخ کی اولاد اب بھی باقی ہے۔

تَوّاب گنہ گاروں کی توبہ قبول کرنے والا۔ اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام۔ تواب تائب کا مبالغہ ہے اور تائب توبہ سے ماخوذ ہے توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے تو گناہ سے رجوع کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو رحمت کے ساتھ رجوع کرنا۔ یعنی بندہ توبہ کرے تو خدا اپنی عادت کے مطابق پھر مہربانی کرنے لگتا ہے۔

قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ "اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲: ۳۷)

"یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ" لوگو تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔" اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲: ۵۴)

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲: ۱۲۸)

"البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں۔ ان کو میں معاف کر دوں گا۔ اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔" (۲: ۱۶۰)

"اور وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" (۹: ۱۰۴)

"اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا۔ تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں یقیناً وہ توبہ کرنیوالا اور رحیم ہے۔" (۹: ۱۱۷ تا ۱۱۸)

"تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا) (۲۴: ۱۰) (نیز دیکھئے "اسمار الحسنیٰ"، "توبہ")

توبہ رجوع کرنا۔ پلٹنا۔ لوٹنا۔ گناہوں سے پچھتا کر صدق دل سے خدا کی طرف مائل ہونا۔ بندے کی طرف سے توبہ کے یہ معانی ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آگیا۔ طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا۔ پھر سے نظر عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

قرآن مجید میں توبہ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔" (۹: ۱۰۴)

"اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی خرابی نہ ہوگی سو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان پر رجوع برحمت کیا۔" (۵: ۷۱)

"اور اے مومنوں، سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔" (۲۴: ۳۱)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو اللہ کے آگے خالص توبہ کرو امید ہے کہ تمہارا رب تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے اور تمہیں باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔" (۶۶: ۸)

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں توبہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

توبہ مومنین کے لئے اپنے رب سے تقرب کا ذریعہ بنتی ہے اور ان کا شمار شہدا اور صدیقین میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جو بندہ جتنا اللہ کے زیادہ قریب ہو گا اسے اتنا ہی اپنی بے بضاعتی اور اللہ کے جلال و کمال کا احساس ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیا اور اولیا توبہ و استغفار کثرت سے کرتے تھے۔ [illegible] کہ توبہ و استغفار کسی گناہ کی بنا پر ہو بلکہ وہ اس کے ذریعے گناہ کے تصور سے اللہ کی طرف بھاگتے تھے اور اس طرح اپنے رب کے قریب تر ہو جاتے تھے۔

توبہ گناہ کو اس طرح سے زائل کر دیتی ہے کہ گویا وہ سرزد ہوا ہی نہیں۔ احادیث میں آتا ہے۔

"لوگو، اللہ کی درگاہ میں توبہ کرو۔ میں دن میں سو بار حضرت کی درگاہ میں توبہ کرتا ہوں (مشکوٰۃ)۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا:

"جب کوئی بندہ اللہ سے توبہ کرتا ہے تو وہ اپنے بندے کی توبہ سے اتنا خوش ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنی سواری پر ایک چٹیل میدان میں جا رہا ہو۔ [illegible] گم ہو جائے اور اس پر اس کا کھانا پینا بھی ہو اور وہ نا امید ہو کر ایک درخت کے پاس آئے اور اس کے سائے میں لیٹ گیا ہو پس وہ اسی مایوسی کی حالت میں خاموش پڑا ہو کہ اچانک اس کی سواری اس کے پاس آکھڑی ہو۔ اس نے اس کی رسی پکڑ لی اور خوشی کی زیادتی کے سبب اس کے منہ سے یہ غلط الفاظ نکل گئے ہوں۔ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا پروردگار ہوں" (مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

"اللہ تعالےٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا رہتا ہے جب تک کہ (موت) اس کا غرغرہ نہ بولنے لگے۔" (مشکوٰۃ)

توبہ اس ندامت اور پشیمانی کا نام ہے جو گناہ پر اس کے گناہ ہونے کے لحاظ سے حاصل ہو اور ساتھ اس بات کا بھی پختہ ارادہ ہو کہ آئندہ وہ کام نہ کیا جائے۔

توبہ کی ایک قسم توبۃ النصوح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

"توبۃ النصوح یہ ہے کہ انسان دل سے نادم ہو۔ زبان سے استغفار کرے پھر گناہ سے قطعاً رک جائے اور نیت کرے کہ آئندہ پھر اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے گا۔ بعض

کہتے ہیں کہ توبہ کے معنی ہیں گناہ سے باز رہنا۔"

معتزلہ نے توبہ کے قبول ہونے کو تین شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ایک بندوں کے حقوق کو ادا کرنا۔ دوسرے پھر وہ کام کبھی نہ کرنا۔ تیسرے ہمیشہ اور ہر وقت پشیمان رہنا۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک ان میں سے کوئی بات توبہ کے قبول ہونے کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک توبہ کی یہ تین شرائط ہیں۔ اوّل فی الفور گناہ کو چھوڑ دینا دوسرے آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا۔ تیسرے اس کے مرتکب ہونے پر پچھتانا۔

بقول سری سقطیؒ "توبہ نام ہے گناہ کو یاد رکھنے کا۔"

امام ثوری فرماتے ہیں "توبہ کے معنی ہیں خدا کے سوا سب چیزوں سے قطع تعلق کر لینا۔"

بقول امام غزالیؒ توبہ ہر مومن پر "علی الفور" تادم مرگ واجب ہے۔ کیونکہ کوئی بشر معصیت سے خالی نہیں اور معاصی نفس ایمان کے لئے مہلکات ہیں۔

کیا توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالٰی پر لازم و واجب ہے؟

معتزلہ کے نزدیک توبہ قبول کرنا اللہ تعالٰی پر واجب ہے۔ لیکن اہل سنت کا مسلک اس سے مختلف ہے۔ امام غزالی معتزلہ سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے خود توبہ کو گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنایا ہے لہٰذا جو شخص توبہ کی شرائط کو پورا کرے گا اس سے اللہ تعالٰی کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ یہ وجوب اللہ تعالٰی پر خارج سے عائد کیا گیا ہے۔

بعض نے توبہ کی یہ تین قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ توبہ عوام۔ گناہوں سے رجوع کرنا اور دل میں پچھتانا۔

۲۔ توبہ خواص۔ اپنی نیکیوں کو حقیر سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ میری کوئی نیکی خدا کی بارگاہ میں پیش ہونے کے لائق نہیں۔ یہ خیال کر کے اپنی نیکیوں سے اس طرح عذر خواہی کرے جیسے گنہگار اپنے گناہوں سے عذر خواہی کرتا ہے۔

۳۔ توبہ خاص الخاص۔ مخلوقات سے قطع تعلق کر کے خدا کی طرف جھک جانا اور اس سے نفع و نقصان کی امید نہ رکھنا۔

امام غزالیؒ نے تائبین کو چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ بندہ توبہ کرے اور اس پر آخر عمر تک قائم رہے۔ جو تقصیر ہو گئی اس کی تلافی کرے۔ اور بعد میں اس کے دل میں ارتکاب معاصی کا خیال تک نہ آئے (سوائے ان معمولی لغزشوں کے جو تقاضائے بشریت ہیں۔) ایسا بندہ سابق بالخیرات ہے۔ اور ایسی توبہ "توبۃ النصوح" کہلاتی ہے۔

۲۔ تائب اوامر پر عمل کرے اور کبائر سے اجتناب کرے لیکن کیفیت یہ ہو کہ وہ ایسے گناہوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکتا ہو جو اس کے ماحول کے سبب سے اس پر بلا قصد وارد ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اسے احساس ہو اور اپنے نفس کو ملامت کرے اور نادم ہو۔ پھر تجدید عزم کرے کہ وہ ان اسباب سے جن کی وجہ سے اس سے یہ گناہ سرزد ہوا، اپنے آپ کو بچائے گا۔ عام تائبین اسی زمرے میں آتے ہیں اور تائب کا یہ بھی اعلیٰ مرتبہ ہے۔

۳۔ تائب توبہ کرے اور خاصی مدت تک اس پر قائم بھی رہے پھر بعض معاصی اسے مغلوب کر لیں لیکن اس کے باوجود وہ اعمال صالحہ پر قائم رہے اور ہر وقت امید کرتا رہے کہ وہ ان معاصی سے اجتناب کرے گا۔ وہ بار بار توبہ کرتا ہے اور نادم ہوتا ہے۔

۴۔ یہ کہ مرتکب معاصی توبہ کرے لیکن بعد میں پھر معاصی میں منہمک ہو جائے حتیٰ کہ اسے پھر توبہ کا خیال تک نہ آئے اور نہ اس کے دل میں افسوس اور ندامت پیدا ہو بلکہ وہ شہوات نفسانی کا بندہ بن جائے۔ اگر ایسے بندے کا انجام نیکی پر ہو تو وہ عذاب دوزخ سے آخر کار نجات پا سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی کی مغفرت بہت وسیع ہے۔

بقول قشیری توبہ سالکین طریقت کی پہلی منزل اور طالبان حقیقت کا پہلا مقام ہے ان کے نزدیک توبہ کے تین مدارج یہ ہیں۔

جو بندہ عذاب سے ڈر کر توبہ کرے وہ صاحب توبہ ہے۔

جو حصول ثواب کے لئے توبہ کرے وہ صاحب انابت ہے۔

جو اللہ کی اطاعت اور پابندیٔ احکام کی خاطر توبہ کرے وہ اوّاب ہے۔ نیز وہ توبہ کو عام مومنین کی صفت قرار دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔

"عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور خاص لوگوں کی توبہ غفلت سے ہوتی ہے۔"

ابوالحسن بوشنجہؒ فرماتے ہیں "جب تو گناہ کو یاد کرے اور اس کے یاد کرنے سے لذت نہ پائے، پس یہی توبہ ہے۔"

بقول ذوالنون مصریؒ توبہ دو قسم کی ہوتی ہے۔

ایک توبہ انابت یعنی رجوع کرنے کی وجہ سے اور دوسری توبہ استحیا یعنی شرم کی وجہ سے۔ پس خدا کی طرف رجوع کرنے کی توبہ یہ ہے کہ بندہ عذاب کے خوف سے خدا کی طرف رجوع کرے اور حیا کی وجہ سے توبہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالٰی کے کرم سے حیا کر کے گناہ سے خدا کی طرف رجوع کرے۔

توحید

توحید یکتائی، وحدت واحد ہونا۔ علم الکلام کی اصطلاح میں خدا تعالٰی کی ذات کا ہر طرح کے شرک اور دوئی سے پاک ہونا۔ اسلام کے بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ یعنی اللہ تعالٰی ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرقہ معتزلہ کے نزدیک محض توحید ہی بنیادی عقیدہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا کے واحد ہونے کا بیان کئی مقامات پر آیا ہے۔ لیکن لفظ توحید کہیں نہیں آیا مثلاً۔

"اور لوگو! تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس بڑے مہربان، رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔" (۲ : ۱۶۴)

علمائے دین اس امر پر متفق ہیں کہ توحید کے معنی اللہ کو ایک ماننا اور اس پر ایمان لانا کے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ابن خلدون کے نزدیک توحید کے بارے میں فقط ایمان یا تصدیق کافی نہیں بلکہ دل میں ایک ایسی کیفیت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ جس سے انسان بے اختیار اللہ کو ذات، صفات اور افعال میں یکتا مان لے۔

توحید کے دلائل

مختلف اسلامی فرقوں نے علم توحید کی طرح طرح کے دلائل سے توضیح کی ہے۔

پہلی دلیل تو یہ ہے کہ کسی بھی نظام کار کے لئے حاکمیت اعلیٰ کا واحد اور غیر منقسم ہونا ضروری ہے۔ کسی ایسی تنظیم کا تصور بھی محال ہے۔ جہاں دو یا دو سے زیادہ صاحب اقتدار ہوں۔ اگرچہ جمہوریت حکومت کا حق بہت سے لوگوں کو تفویض کر دیتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ عامل بھی بہت سے ہوں۔ یقیناً انہیں ایک نہ ایک عامل منتخب کرنا پڑتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں "ایک اور اہم پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اور باہمی سازگاری ہے۔ اسی طرح کی موافقت جیسی کہ زوجین

میں نظر آتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلف کا ہے زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔"

"توافق کا یہ پہلو صرف صنوین ہی میں نہیں بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لئے سرگرم رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں۔ زمین اس کے لئے گہوارہ مہیا کرے۔ ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے۔ سورج اس کو گرم رکھے۔ شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے۔ ہوائیں اس کو لوریاں دیں اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہولے تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ یہی حال دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔"

جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لئے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے۔ پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لئے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں۔ وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں۔ بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی لاتا ہے۔ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے، جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لئے تصرف میں لائے

قرآن مجید میں اسی توافق اور ہمہ گیری کے اصول کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے ان تمام مناظر قدرت کو جو بھی دیکھے گا وہ یہ کیسے باور کرے گا کہ یہ تمام یونہی اتفاقی طور پر وجود میں آگئے یا مختلف دیوتاؤں نے باہمی صلاح مشورے کے ساتھ انہیں پیدا کیا۔؟

قدیم مذاہب میں توحید

ابتدائی تصورات:۔ خدا کے متعلق انسان کا قدیم ترین تصور توحید ہی کا ہے یعنی صرف ایک ان دیکھی قوت نے انسان اور ان تمام اشیاء کو پیدا کیا۔ جنہیں وہ چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اکثر مغربی علماء کا یہ خیال ہے کہ انسان کے دینی عقائد کی ابتدا شرک اور کثرت پرستی سے ہوئی۔ یہ تصورات قانون ارتقاء کی مختلف کڑیوں سے گذرتے رہے۔ اور بالآخر انہوں نے اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک ہستی اور خالق واحد کی نوعیت پیدا کر لی۔ عام خیال یہی ہے کہ شروع میں فطرت پرستی نے جنم لیا۔ اور پھر ہر فطری مذہب کے لئے علیحدہ علیحدہ دیوتا مقرر ہو گیا۔ اسی صدی میں اجداد پرستی کے نظریہ نے جنم لیا۔ جس سے انسان کے ابتدائی تصورات مذہب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی اور تقریباً تمام تر علماء اسی ارتقائے مذہب کے نظریے کے حامی رہے۔ وائنا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو شمٹ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اثری شواہد کی رو سے سب سے پہلا مذہبی تصور جو ذہن انسانی کے افق پر طلوع ہوا توحیدی اعتقاد ہی تھا۔

قدیم تہذیبیں:۔ قدیم ترین تہذیبوں اور ثقافتوں میں ہمیں ہستی الٰہی کے واحد ہونے کا تصور ملتا ہے مثلاً قدیم آسٹریلیا کے باشندے "بادلوں کے باپ" کی پوجا کرتے تھے۔ جس نے اس ساری دنیا کو بنایا تھا۔ چند قبائل اسے ایک بڑا

اژدہا قرار دیتے ہیں۔ نیوزی لینڈ کے موری قبائل اس مادرائی ہستی کو "اتوا" کا نام دیتے ہیں۔ نیوگنی اور جزائر سلیمان کے قدیم لوگ اسے "ماٹا" اور پولینیشیا کے لوگ اسے "تاروا" کہتے تھے۔ افریقہ کے جن قبائل کے ہاں ہستی اعلیٰ کا تصور ملتا ہے۔ وہ اسے "انکالی" یا "ادماکورو" کہتے تھے۔ تاہم اس کے اختیارات محدود تھے۔ قدیم امریکا کے قبائل کے ہاں بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ ان کے خدائے واحد کا نام "نوزکا" تھا۔

لنکا کے ویدہ قبائل کے یہاں ہستی اعلیٰ ایک مخالف روح ہے، جس سے انسان ڈرتا رہتا ہے۔ قدیم موہنجو ڈارو میں بھی ہمیں دیوتائے واحد "ادن" کی جھلک ملتی ہے۔

گونڈ قبیلہ کے ہاں "بھگوان" سب سے بڑا دیوتا ہے۔ یہی دیوتا ہندوؤں کے ہاں سب پر حاوی ہے۔ قدیم سامیوں کے ہاں بھی ہستی مطلق کا نام "ایل" یا "آل اللاہ" تھا۔ یہی نام آگے چل کر الوہ، الٰہی اور اللہ کی صورت اختیار کر گیا۔ ہندوستان میں یہ [illegible] برہما کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ فلسفہ اپنشد نے برہما کو خالق مطلق قرار دیا ہے یہ اور بات ہے کہ عملاً ہندو مت میں سینکڑوں ہزاروں دیوتا پیدا ہو گئے۔ بدھ مت میں اگرچہ خدا کی ہستی کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ مگر مہاتما بدھ کے پیروؤں نے خود اسی کو الوہیت کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ قدیم ایرانیوں کے ہاں بھی آہورمزدا ہی کو خالق کل قرار دیا گیا۔

یہودیوں کا تصور:۔ ابتدا میں یہودیوں کا خدا محض نسلی خدا کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی "یہوا" صرف اسرائیل کا خدا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تصور وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ [illegible] دوم کے صحیفہ میں "تمام قوموں کا خدا" اور "تمام قوموں کا ہیکل" نمایاں ہوئے۔ [illegible] اسلام کے ظہور تک عملی طور پر توحید کا یہ تصور نسل اسرائیل ہی تک محدود رہا۔

مسیحی تصور:۔ عیسائیوں کے ہاں خدا واحد تو تھا لیکن اس کی تعلیم [illegible] بھی شریک تھیں۔ روح القدس اور بیٹا۔ چنانچہ یہ تصور بھی ناقص ہی رہا۔

مصر اور یونان کا تصور:۔ قدیم مصر کے فرعونوں کے ہاں خدا [illegible] اگرچہ مصری ان فرعونوں کے آگے سر جھکاتے رہتے لیکن عام طور پر توحید [illegible] ان کے تمام دیوی دیوتا ایک خالق مطلق کے ماتحت تھے، جیسے [illegible] دیا گیا ہے۔ البتہ ان کے ہاں توحید خالص نہیں تھی۔ [illegible] جس نے مصر میں توحید پرستی کو رواج دیا۔

قدیم یونانیوں کے ہاں تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح [illegible] لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیت سقراط کی حکمت [illegible] افلاطون نے آخری شکل دی۔ سقراط نے قدیم [illegible] کی اور توحید خالص کا علم بلند کیا۔ اسے اپنی اس حق گوئی کی سزا [illegible] میں وصول کرنا پڑی۔

افلاطون نے اپنے استاد کے اس کام کو آگے بڑھایا اور باقاعدہ حیثیت [illegible] اس کے تصور کے مطابق خدا مادے سے الگ اور واحد حیثیت رکھتا ہے۔ [illegible] اسے عقل اول اور عقل فعال کا نام دیا۔ جو ایک ابدی اور بسیط ہستی ہے [illegible] نو فلاطونی مکتب فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا واحد ہے لیکن وہ کیا ہے [illegible] کہا جا سکتا۔

قرآنی تصور توحید:۔ اسلام میں توحید خالص کا ذکر اس طرح سے کیا گیا ہے

"کہ اللہ کی ذات واحد ہے۔ اللہ بے نیاز ہے اسے کسی کی احتیاج نہیں [illegible] تو اس سے کوئی پیدا ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجہ [illegible] برابر کی ہے۔" (۱۱۲: ۱تا۴)

قرآن کہتا ہے کہ خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آ سکتی ہیں

متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے۔ رحمت والا ہے۔ دیکھنے والا، سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ لیکن یہ بھی صاف صاف بتا دیا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آسکتی ہو۔ وہ عدیم المثال ہے۔ تمہاری نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں۔ اسکے لیے تخیل سے بھی مثالیں نہیں گھڑی جاسکتیں۔ یہی توحید خالص ہے یعنی ہر تشبیہ تنزیہہ سے پاک ہے۔

بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ "قرآن کے تصور الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کرے گا۔ اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کر سکے گا۔ یہاں ایک طرف بام حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں۔ دوسری طرف ہماری فطرت کا آغاز اضطراب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام آشنا بلند نہ نگاہ تصور تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید ناسمجھ کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔

توحید اور شرک :۔ جہاں تک توحید اور شرک کا تعلق ہے۔ قرآن کا تصور اس حد تک کامل اور بے جھجک ہے کہ اس کی کوئی مثال دیگر تصورات میں نہیں مل سکتی۔ اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو بقول ابوالکلام آزاد اسے اپنی صفات میں بھی یگانہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اگر کوئی دوسری ہستی اس میں شریک نہ ہو۔ پہلی بات کو توحید فی الذات اور دوسری کو توحید فی الصفات قرار دیا گیا ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی۔ اس لیے دیگر مذاہب نے زیادہ تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا اور کسی نہ کسی صورت میں شخصیت اور اصنام پرستی کی راہیں کھلی رہی ہیں لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ جیسی آیت کی تفسیر قرآن مجید میں جابجا ملتی ہے۔

علم توحید اور اس کا ارتقاء

اہل اسلام کے نزدیک توحید کا تصور بھی درجاتی ہے۔ انہی میں سے ایک درجہ علمی ہے جو دلیل اور برہان پر موقوف ہے اور ایک عینی درجہ ہے، جو وجدان سے پیدا ہوتا ہے۔ بطور علم توحید عقائد دینیہ یعنی علم الکلام کی بنیاد ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک علم توحید کی یہ تعریف ہے کہ اس میں ایمان کے صحیح عقیدوں کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جاتا ہے۔

علم توحید کی حدود :۔ مختلف علماء کی تعریفوں کے ملخص کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علم توحید وہ علم ہے، جس میں اللہ اور اس کی صفات سے بحث کی جاتی ہے۔ رسولوں کا اور ان کی ضروری خصوصیات کا پتا چلایا جاتا ہے۔ آخرت اور اس کے احوال کی تفتیش کی جاتی ہے اور اس میں ان امور سے بحث کی جاتی ہے جو ان مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بقول الخوارزمی اس علم کا تقاضا ہے کہ بہت سے مسائل میں اختلاف رائے پیدا ہو۔ ان تمام مسائل کو بارہ مبادیات کے تحت درج کیا گیا ہے مثلاً ۱۔ اجسام حادث ہیں۔ ۲۔ عالم کا موجد ہے اور وہ اللہ ہے (۳) اللہ ایک ہے ۴۔ اللہ کی مثل نہیں۔ ۵۔ اللہ کا دیدار۔ ۶۔ صفات الٰہی کی بحث۔ ۷۔ انسانی افعال کی بحث۔ ۸۔ برائی مشیت ایزدی ہے یا نہیں۔ ۹۔ کبیرہ گناہ۔ ۱۰۔ نبوت کے ثبوت۔ ۱۱۔ آنحضور صلعم کی نبوت اور ختم نبوت۔ ۱۲۔ مسئلہ امامت

ان مسائل پر بحث مباحثے کی بنا پر مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا ہو گئے۔ مثلاً اہل سنت، معتزلہ، خوارج، شیعہ وغیرہ۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے اکثر علماء نے علم توحید کو سرے ہی سے رد کر دیا اور کہہ دیا کہ توحید یا علم کلام پڑھنے والا زندیق ہے چونکہ علم توحید کو علم کلام، فقہ اکبر، اصول دین وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے ائمہ کرام نے عوام کو علم کلام اور اس کے شغل سے روکا۔ امام شافعی کا ایک قول ہے کہ "شرک کے سوا، اگر آدمی ان تمام باتوں میں جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔ مبتلا ہو جائے۔ تب بھی وہ اس سے بہتر ہے کہ علم کلام کو اپنا شغل بنائے۔" اسی طرح امام احمد بن حنبل کی رائے ہے۔ "علم کلام میں مشغول رہنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔"

ابتدائی نشو و نما :۔ علم توحید کا آغاز بنیادی طور پر تفسیر قرآن سے ہوتا ہے۔ پہلی صدی کے ابتدا میں اہل اسلام قرآن کو سمجھنے کے لیے اپنی عقل اور رائے سے کام لیتے اور اسی طرح سنت کو پرکھتے۔ آنحضور صلعم کے فوراً بعد مسئلہ امامت پیدا ہوا جس نے علم کلام کی بنیادیں بہم پہنچائیں۔ شیعان علی اہل بیت کو امامت کا حق دار ٹھہراتے تھے اور خارجی معتزلہ سب سے زیادہ اہل شخص کی امامت کے قائل تھے۔ اعتدال پسند مسلمان قریش میں سے بہترین کے طرف دار تھے۔ یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ عائشہؓ و علیؓ، معاویہؓ و علیؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے طرفداروں نے آپس میں سر پھٹول اور جنگ و جدال سے کام لیا۔ ہر دو گروہ نے ایک دوسرے کو کافر ٹھہرایا۔ چنانچہ ایمان کے معنی تشریح اور توضیح کی تلاش شروع ہو گئی۔ اسی اختلاف کی بنا پر خوارج، مرجیہ اور بعد ازاں معتزلہ جیسے فرقے پیدا ہوئے اور یوں یہ سیاسی اختلاف دینی اختلاف بن کر رہ گیا۔ ادھر امامت کا مسئلہ بھی علم کلام کا ایک جزو ہو گیا۔ جبکہ بقول شہرستانی مسئلہ امامت کی بحث کے لیے علم فقہ زیادہ موزوں تھا نہ کہ علم کلام۔ کیونکہ اس کا تعلق عمل سے زیادہ ہے، اعتقاد سے نہیں۔ مگر امامیوں، رافضیوں اور خارجیوں کے عقائد میں غلو کرنے کی وجہ سے متکلمین نے اسے بھی علم کلام میں شامل کر لیا تاکہ دین کے عقائد مجروح نہ ہو سکیں۔

بیرونی اثرات :۔ جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکلتے ہی اسلام پر دنیا بھر کے افکار و مذاہب کے فکری و نظری حملے ہونے لگے اور مختلف ادیان اور نظریات کے حامل لوگ جب حلقہ اسلام میں آتے ہیں اپنے مخصوص زاویہ نظر کی بنا پر عقائد اسلامی کی مختلف توجیہیں کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے علمائے دین سے باقاعدہ مناظرے اور مجادلے کرنا شروع کر دیے۔ اسی موقع پر مفکرین نے قرآن کی آیات متشابہات کا سوال اٹھایا اور اس کے حل میں لگ گئے۔ بعض نے ان کے معنی ظاہری لیے اور بعض نے تشبیہی۔ بعض نے سرے سے ان پر بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ان اختلافات کی بنا پر فرقہ بندی ہوئی اور مشبہہ، مجسمہ، معتزلہ، معطلہ اور صفاتیہ وغیرہ فرقے پیدا ہوئے۔

اشعریہ یا اشاعرہ :۔ ان تمام فرقوں اور ملحدوں کے رد عمل کے طور پر ابوالحسن اشعری میدان میں آئے اور انہوں نے علم توحید میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انہوں نے ہر فرقے کی افراط و تفریط سے دامن بچانے کی کوشش کی اور یوں ایک درمیانی راہ نکالی۔ ان کے پیروکار اشعریہ یا اشاعرہ کہلائے اور ان کے مذہب کو اہل حق یا اہل سنت والجماعت کا مذہب قرار دیا گیا۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے فلسفہ کی تحصیل کی تاکہ ملحدوں کا مقابلہ فلسفے ہی کے ہتھیاروں سے کیا جائے۔ اس بات سے علم کلام پر گہرا اثر پڑا اور بہت سے فلسفیانہ نکات سامنے آنے کی بنا پر اس علم کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ اشعری مذہب کو جس عالم نے سب سے پہلے فلسفیانہ دلائل پر منظم کیا اور اس کی خوب اشاعت کی وہ قاضی ابوبکر الباقلانی ہیں۔ ان کے بعد امام الحرمین جوینی اور پھر ان کے شاگرد امام غزالی پیدا ہوئے۔ جنہوں نے علم کلام میں اپنی مسلّم حیثیت پیدا کی۔ ان کا طریقہ اس بنیاد پر قائم ہوا تھا کہ اگر دلیل باطل ہے تو عقیدہ بھی باطل ٹھہرتا ہے۔ بعد ازاں امام غزالی نے

استدلال کی تمام پابندیاں ہٹا دیں اور آج تک یہی قاعدہ رائج ہے۔

مختلف فرقوں کی آراء

قرآن مجید میں اللہ کا چہرہ اور ہاتھ کے الفاظ آئے ہیں۔ عرش اور دیگر تشبیہی باتیں نیز خدا کا علم، قدرت اور کلام وغیرہ ثابت ہے۔ مشبہہ مجسمہ گروہ نے ان آیات کے وہی معنی لئے جو ظاہری تھے یعنی اللہ کا ہاتھ، پاؤں چہرہ وغیرہ ہے۔ وہ کلام کرتا ہے، نیز وہ نظر بھی ہو سکتا ہے۔ ابن جوزی کے نزدیک ان میں سے غالی حنبلیوں نے افراط سے کام لیا اور صفات کو محسوسات میں شامل کر دیا۔ انہوں نے اللہ کے لئے انسان کا سا جسم ٹھہرایا۔ دوسری طرف معتزلہ نے اتنی مخالفت کی کہ صفات کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ معتزلہ کے افراطی گروہ کا نام واصلیہ بھی ہے۔ معتزلہ کے بہت سے فرقے ہوئے۔ تاہم وہ پانچ اصولوں پر متفق ہیں۔ ۱۔ توحید۔ ۲۔ عدل۔ ۳۔ وعد و وعید۔ ۴۔ ایمان و کفر کی درمیانی منزل۔ ۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ توحید میں انہوں نے اللہ کو مخلوق کی صفات سے منزہ ٹھہرایا اور اس میں اتنے غلو سے کام لیا کہ سرے سے صفات ہی کے منکر ہو گئے۔ اس لئے ان کا نام معطلہ بھی پڑ گیا۔ ان کے برعکس جو صفات کے قائل رہے۔ صفاتیہ کہلائے معتزلہ کے نزدیک توحید یہ ہے کہ "اللہ ایک ہے، اس کا کوئی مثل نہیں چنانچہ وہ نہ جسم ہے۔ نہ صورت نہ جوہر ہے نہ عرض۔ اس کا نہ کوئی رنگ ہے، نہ بو، نہ موضع، لمس، اس کا طول، عرض اور عمق بھی نہیں۔ وہ نہ متحرک ہے نہ ساکن۔ اس کے اعضاء و جوارح کچھ نہیں۔ اس کے لئے جہتیں ہیں نہ کوئی مکان اسے محیط کئے ہوئے ہے۔ اسے چھونا ممکن نہیں۔ حواس اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسے انسانوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وہ کسی مخلوق کے مشابہ ہے۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔"

تیسری صدی ہجری میں اشاعرہ کا ظہور ہوا۔ انہوں نے اس افراط و تفریط کے بین بین راہ نکالی اور عقل کو کسوٹی قرار دیا۔ انہوں نے تشبیہ کو باطل ٹھہرایا اور صفات معنوی ثابت کیں۔ نیز اس بارے میں تمام بدعتوں کا رد کیا۔ اور بعض اقوال بھی تیار کئے۔ اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے لئے ایک خاص جہت اور مکان ہے۔ اور وہ صفات علم قدرت وغیرہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے لئے جسم یا اس سے تشبیہ لازم نہیں۔ نیز خدا تعالےٰ کا دیدار اگرچہ دنیا میں ممکن ہے۔ لیکن یہ آخرت میں وقوع ہوگا۔ ان کے نزدیک کلام دو طرح کا ہے، کلام لفظی جو ہم پڑھتے ہیں اور کلام نفسی جو اللہ تعالےٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ کلام لفظی حادث ہے اور کلام نفسی قدیم۔ اس طرح وہ قرآن کو مخلوق کہنے سے بچ گئے

خوارج کے ہاں بیس فرقے ہوئے۔ یہ سب دو باتوں پر متفق تھے۔ ۱۔ علیؓ، عثمانؓ اصحاب جمل دو نوں حکم (عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری) اور ان کے متفقین سب کافر ہیں۔ ۲۔ گناہ کا مرتکب مسلمان، کافر ہے۔

شیعہ کے ہاں بھی بہت سے فرقے ہوئے مثلاً ۱۔ غالیہ، جو حضرت علیؓ کی شان میں غلو کرتے ہیں۔ ۲۔ کیسانیہ۔ ۳۔ زیدیہ۔ ۴۔ امامیہ۔ یہ تمام فرقے امامت کو ارکان دین میں سے ایک مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک آنحضورؐ پر یہ فرض تھا کہ وہ امت کے لئے امام مقرر کر کے جاتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا ہے۔ اس کے لئے وہ نص غدیر قائم کرتے ہیں یعنی "جس کا میں مولا اس کا علی"۔

عقیدہ توحید کے اثرات

توحید محض ایک مجرد علمی حقیقت نہیں، بلکہ یہ عملی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے اس عقیدے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بہت سے نمایاں اثرات پڑتے ہیں انہیں ہم آسانی فکری اور عملی اثرات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

فکری اثرات :۔ مولانا محمد حنیف ندوی اپنی تصنیف "اساسیات اسلام" [illegible] لکھتے ہیں کہ توحید کا پہلا اور عظیم اثر فکر و ذہن پر مرتب ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی [illegible] آسی میں اپنی یکتائی کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ بہتر اور احسن ہی نہیں اللہ کا بندہ بھی ہے یا کائنات میں اس کی عظمت صرف حیاتیاتی [illegible] کی نہیں بلکہ اس سے سوا اور اس سے زیادہ یہ کسی [illegible] حقیقت سے بھی تعبیر ہے۔

توحید کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے اس [illegible] کائنات، معاشرہ اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں جو ایک طرح کی دوری، اجنبیت یا غیریت ہے۔ وہ دور ہو جاتی ہے اور انسان اپنے گردوپیش اور حالات و ظروف کو اپنا مخالف سمجھنے کی بجائے اپنا دوست سمجھنے لگتا ہے۔ کیونکہ جس خدا نے اس کائنات کو بنایا ہے، وہی خدا تو ہے جس [illegible] نے انسانی فکر و تعقل کی پرورش کی ہے۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ان دونوں میں [illegible] حقیقی اختلاف رونما ہو۔

توحید کا تیسرا اثر یہ پڑتا ہے کہ انسان خدا کو [illegible] ہے [illegible] ہے ناکامی کی صورت میں توکل کا عنصر انسان کو مایوس ہونے سے بچا لیتا ہے۔ [illegible] اس نیت کے ساتھ کام کرتا ہے کہ اگر کار صحیح ہے اور مقصد نیک ہے تو [illegible] میرے ساتھ ہے۔ اس کی کارسازی درفوزی [illegible]

علاوہ ازیں توحید کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ انسان فکر و تدبر [illegible] اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور ذہن توہمات اور بت پرستی کے تمام [illegible] روشنی کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات [illegible] علل و اسباب کی ہم آہنگی اور استواری ہے اور ایک [illegible]

عملی اثرات :۔ عملی طور پر عقیدہ توحید انسان پر کس طرح سے [illegible] کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی [illegible] میں دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک :۔

انسانی زندگی پر اس کا سب سے نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ [illegible] کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق [illegible] انسان میں حد درجہ خودداری اور عزت نفس پیدا کر دیتا ہے [illegible] سوا کسی کو طاقتور اور صاحب اختیار و اقتدار نہیں سمجھتا۔

یہ عقیدہ انسان میں تواضع اور انکسار بھی پیدا کر دیتا ہے [illegible] نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے [illegible] اسے واپس بھی لے سکتا ہے۔ چنانچہ کسی [illegible]

یہ عقیدہ رکھنے والا وسعت نظری کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ایسے خدا [illegible] زمین و آسمان اور کائنات کی ہر شے کا مالک ہے۔ چنانچہ وہ کسی طرح [illegible]

اسی طرح عقیدہ توحید پر ایمان [illegible] سمجھتا ہے کہ نفس [illegible] سوا اس کے لئے نجات اور فلاح کا کوئی ذریعہ نہیں۔ کیونکہ وہ ایک ایسے [illegible] جو بے نیاز ہے اور بے لاگ عدل کرنے والا ہے۔

اس عقیدے کا حامل ہمیشہ پرامید رہتا ہے۔ وہ ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو زمین اور آسمان کے تمام خزانوں کا مالک ہے جس کا فضل و کرم بے حد و حساب ہے۔ جس کی قوتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایمان اس کے دل کو تسکین بخشتا ہے۔ اس کو اطمینان سے [illegible] ہے اور [illegible] امیدوں سے لبریز رکھتا ہے۔ چاہے وہ دنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرایا جائے

یہی چیز انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ حرص و ہوس اور رشک و حسد کے رکیک جذبات اس کے دل سے نکل جاتے ہیں [illegible] ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ عزت اور طاقت کا مالک ہے، جس کو جب چاہتا ہے

جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔
یہ عقیدہ انسان میں صبر و توکل کی زبردست طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی انسان اپنی سعی کا نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتا ہے اور ناکامی کی صورت میں مایوس نہیں ہوتا۔

اسی چیز سے انسان میں سعی و محنت کا حوصلہ، ارادہ اور عزم بیدار ہوتا ہے، جو انسان کو بہادر اور جری بنا دیتا ہے۔ اس عقیدے کا قائل اپنی جان و مال اور ہر چیز کا مالک خدا ہی کو سمجھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

توحید کا عقیدہ انسان کو خدا کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کا ماننے والا جانتا ہے کہ خدا ہر چھپی ہوئی اور کھلی چیز سے باخبر ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اگر ہم رات کے اندھیرے اور تنہائی کے گوشے میں بھی کوئی گناہ کریں تو خدا کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ یہ عقیدہ جتنا مضبوط ہوگا۔ اتنا ہی انسان خود کو خدا کے احکام کا مطیع پائیگا

اجتماعی طور پر انسان ہر قسم کے تعصبات رنگ، نسل، قوم، وطن، علاقہ، زبان وغیرہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور پوری بنی نوع انسان کو ایک وحدت سمجھنے لگتا ہے جس سے عالمی ریاست کے تصور کو جلا ملتی ہے۔ (مزید دیکھیے "اسلام"، "ایمان"، "اسمائے حسنیٰ الله"، "کلام")۔

توختہ، سید احمد ترمذی [illegible] بزرگ۔ والد کا نام سید احمد تختہ شال رسولا تھا جو شہاب الدین غوری کے زمانے میں لاہور [illegible] تھے۔ توختہ ترمذ میں پیدا ہوئے۔ توختہ ترکی زبان میں کھڑے ہونے کو کہتے ہیں آپ کے نام توختہ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ ایک دن آپ کے مرشد نے آپ کو یاد فرمایا۔ آپ جب حاضر ہوئے تو شام کا وقت تھا حجرے کا دروازہ بند تھا۔ [illegible] آنے کی اطلاع یا دستک دینے کو ادب کے منافی سمجھا اور ساری رات حجرہ کی دہلیز کے پاس کھڑے کھڑے گذار دی کہ شاید شیخ یاد فرمائیں۔ جب صبح ہوئی اور مرشد نے دروازہ کھولا اور آپ کو باہر کھڑے ہوئے پایا تو توختہ کہہ کر مخاطب کیا اس روز سے لوگ آپ کو سید احمد توختہ کے نام سے مخاطب کرنے لگے۔

ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شہاب الدین غوری کے عہد میں لاہور آئے تھے۔ یہ خیال صاحب "تاریخ جلیلہ" کا ہے۔ اکثر نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ ان مصنفین کے نزدیک سید احمد توختہ خود لاہور تشریف لائے۔ قدیم مصنفین نے ان کی ولادت کے بارے میں بھی کچھ نہیں لکھا۔ البتہ غلام دستگیر نامی نے تاریخ جلیلہ میں سردار شاہ مکران کے خط کو درج کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ سید احمد توختہ جب ترمذ سے کیچ، مکران پہنچے تو ان کے ہمراہ ان کی دو صاحبزادیاں بی بی حاج اور بی بی تاج تھیں۔ بی بی حاج کا نکاح آپ نے شہزادہ مکران سلطان بہاء الدین بن سلطان قطب الدین سے کر دیا اور اس کام سے فارغ ہو کر آپ لاہور روانہ ہو گئے۔

آپ کی لاہور میں آمد کا سن کسی تاریخ نگار اور مصنف نے نہیں لکھا ہے اور نہ ہی کسی نے آپ کی عمر لکھی ہے صرف صاحب "حدیقۃ اولیاء" نے آپ کا سن وفات ۶۰۲ھ لکھا ہے۔ بقول منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور سید احمد توختہ خسرو شاہ غزنوی کے عہد حکومت میں غالباً ۵۶۰ھ کے قریب لاہور تشریف لائے تھے۔

سید احمد توختہ نے لاہور ہی میں انتقال کیا۔ اور آپ کا مزار اکبری دروازے کے اندر محلہ جلیبیاں میں واقع ہے۔ جس جگہ آپ دفن ہیں وہاں یا تو آپ ہی کے زمانہ میں قبرستان تھا یا آپ کے دفن کیے جانے کے بعد وہاں قبرستان بن گیا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل سید احمد توختہ کا مزار نہایت خستہ حالت میں تھا اندرونی اور بیرونی فرش مٹ چکے تھے۔ دیواروں کا پلستر بھی ختم ہو چکا تھا۔ پیر غلام دستگیر نامی نے اس کی مرمت کرائی۔ مزار کے حجرہ اور برآمدہ کو اچھی طرح مسقف کرایا اور ایک منزل بنا کر وہاں کتب خانہ رکھا۔ اور نیچے مہمانوں اور زائرین کے لیے آرام گاہ بنائی گئی۔

تورات یہودیوں کی الہامی کتاب جو عبرانی زبان میں حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی عام طور پر تورات سے مراد بائیبل کے عہد نامہ قدیم کی ابتدائی پانچ کتابیں لی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں تورات بائیبل کی پانچ کتابوں کا نام نہیں بلکہ وہ ان پانچ کتابوں میں شامل ہے۔

بقول مولانا مودودی تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالےٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیے تھے۔ باقیماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دی تھیں اور ایک نقل بنی لاوی کے سپرد کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک نقل جو بنی لاوی کے سپرد کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی اور بنی اسرائیل اس کو "تورات" ہی کے نام سے جانتے تھے۔"

تورات جن پانچ صحیفوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں صحائف موسےٰؑ کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

۱۔ کتاب تکوین۔ اس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک کے حالات سے مجملاً بحث کی گئی ہے۔ اس میں آل یعقوب کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے اور مذہب میں اخلاق کو جو مقام حاصل ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے

۲۔ کتاب خروج۔ اس کی ابتدا ولادت موسیٰؑ سے ہوتی ہے نیز یہ کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر طور سینا تک لے گئے، اس کا احوال ہے۔

۳۔ کتاب احبار۔ اس میں بنی اسرائیل کے لیے وہ قوانین جن کا تعلق خاص طور پر عبادات سے ہے مثلاً قربانی، قصاص، جانوروں کی حلت و حرمت وغیرہ کے احکام درج ہیں۔

۴۔ کتاب گنتی۔ اس میں خروج کے بعد کا تاریخی تبصرہ ہے کہ کس طرح علاقہ فتح کیا۔ نیز جستہ جستہ احکام و قوانین درج ہیں۔

۵۔ کتاب استثناء۔ اس میں ملک فلسطین کی تقسیم وغیرہ کے امور مذکور ہیں یہ صحیفہ حضرت موسیٰ کی وفات کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔

تورات کے بارے میں قرآن شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمایا تھا۔ چنانچہ تورات وحی کے اس سلسلے کی ایک عظیم المرتبت کڑی ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے انبیا پر نازل کرتا رہا۔ اس کی بڑی اہمیت یہ کہ یہ ایک مکمل شریعت یا دستور حیات ہے جو حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے لیے دیا گیا تھا۔ اگرچہ تورات کے بعد داود صحیفے زبور اور انجیل نازل ہوئے لیکن شریعت موسوی برقرار رہی اور حضرت عیسیٰؑ نے بھی اسے قائم رکھا۔ جیسا کہ آپؑ نے فرمایا۔ "یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں" (متی ۵: ۱۷)

قرآن مجید میں تورات کا کئی جگہوں پر ذکر آیا ہے اور کہیں اس کو

"الفرقان وضیاء" اور کہیں "بصائر" کے القابات سے نوازا گیا ہے۔

"اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان اور روشنی اور متقیوں کے لئے نصیحت دی۔" (۲۱: ۴۸)

"پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی۔ لوگوں کے لئے بصیرتوں کا سامان بنا کر ہدایت اور رحمت بنا کر تاکہ شاید لوگ سبق حاصل کریں۔" (۲۸: ۴۳)

قرآن کریم کی رُو سے وہ تورات جو موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی اسی طرح منزل من اللہ تھی۔ جیسے قرآن مجید لہٰذا من جملہ اور صحائف انبیاء کے اس پر بھی کتاب اللہ کی حیثیت سے اعتقاد رکھنا اور ایمان لانا لازمی ہو جاتا ہے۔

موجودہ تورات کی تدوین و تالیف کا زمانہ متعین کرنا آج ممکن نہیں ہے۔ جو تورات عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی۔ یہودیوں کی اس سے غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ تورات رکھی ہوئی مل گئی۔ اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا۔ اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا تو یہ کتابیں تلف ہو گئیں۔ ان کتابوں کے احکامات معناً یہودی ربانیوں کے حافظے میں موجود تھے۔ کیونکہ وہ مذہبی مجالس میں ان کتابوں کے مفہوم کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہتے تھے۔ زمانہ اسیری میں ان کتابوں کو دوبارہ جمع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ بابل کی اسیری کے بعد جب عزرا کاہن کے زمانے میں بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا۔ تو چند بزرگوں کے دل میں تورات کو جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ عزرا اور دوسرے چند بزرگوں نے اس اہم کام کی تکمیل کی۔ یہ کام ۴۵۴ ق۔م میں انجام پایا۔ لیکن ۱۶۸ ق۔م میں یونانی بادشاہ انٹیوکس نے ایک بار پھر بخت نصر کے تاخت و تاراج کی یاد تازہ کر دی۔ اس نے عزرا کی جمع کردہ تورات بھی جلوا دی۔ اس کے بعد یہودہ نے تورات کی از سر نو تدوین کی۔ اور اس میں تیسرے سلسلے کا اضافہ کیا۔ جب رومی حملہ آور ہوئے تو یہ ایک بار پھر حملہ آوروں کی دست برد کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد یہ کئی بار ضائع ہوئی اور اس کو بار بار جمع کیا گیا۔

ہر بار جب تورات تدوین کی جاتی تھی تو اس کی زبان بھی بدل جاتی تھی۔ پہلے تورات عبرانی زبان میں تھی عزرا نے غالباً اسے جب دوبارہ جمع کیا تو آرامی زبان استعمال کی۔ کیونکہ نینوا میں اسیری کے دوران میں یہودی اپنی زبان بھلا بیٹھے تھے اور انہوں نے مقامی زبان آرامی کو اپنا لیا تھا۔ پھر جب یونانیوں نے انہیں گرفتار کر کے اسکندریہ میں قید کر دیا تو انہیں یونانی زبان اپنانے میں کسی قسم کا تردد نہ ہوا۔ اس کے بعد تورات یونانی زبان ہی میں جمع کی گئی۔ جیسے شاہ مصر بطلیموس نے اسکندریہ کے کتب خانے کے لئے تیار کرایا تھا۔ یونانی نسخے سے ایک مرتبہ تورات کو عبرانی زبان میں منتقل کیا گیا۔ جب یہودی رومیوں کے غلام بنے تو پھر وہ رومی زبان اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور تورات کا ترجمہ رومی زبان میں ہوا۔

مذکورہ بالا تاریخی شہادتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہودیوں کی اصل کتاب حوادث زمانہ کی نذر ہو گئی۔ اور موجودہ تورات بعد میں مرتب ہوئی۔ چنانچہ ان حادثات سے گذرنے کی وجہ سے تورات اپنی اصلی حیثیت کھو بیٹھی۔ اور اس میں اکثر جگہوں پر تحریف ہو گئی اور اس میں بہت سی وہ باتیں بھی شامل کر لی گئیں جو من جانب اللہ نہیں تھیں بلکہ ان ترتیب دینے والوں کے ذہن کی اپنی اختراع تھیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ تورات کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

"اے مسلمانو! اب کیا تم ان لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔" (۲: ۷۵)

"اس سے پہلے ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔" (۴۱: ۴۵)

"ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہو گا۔ انہیں پوشیدہ نہیں رکھنا ہو گا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ دیا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔" (۳: ۱۸۷)

تورات کے بارے میں یہ بات کہ وہ تحریف کا شکار ہوئی صرف قرآن ہی نہیں کہتا بلکہ خود علمائے یہود و نصاریٰ بھی اس بات کو مانتے ہیں۔

عہد قدیم کے دیگر صحائف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحریف کا آغاز بہت ابتدائی زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔ بعض انبیائے بنی اسرائیل نے خود بھی اس فعل کو مذموم قرار دیا ہے۔

"سرزمین [illegible] ان کے نیچے جو اس پر بستے [illegible] نجس ہوئی کہ انہوں نے شریعتوں کو عدول کیا۔ قانونوں کو بدلا۔ عہد ابدی کو توڑا [illegible]"

"تم نے زندہ خدا رب الافواج [illegible] ہمارے خدا کی باتوں کو [illegible]"

ہسپانوی یہودی عالم ابن عزرا نے تحقیق کی کہ صحائف خمسہ [illegible] تورات [illegible] موسیٰؑ کے بعد کی تالیف ہیں۔

فرانسیسی عالم کاپیلو نے ثابت کیا ہے کہ تورات کا [illegible] اعراب کے اور حرفوں پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ [illegible] حقیقی طور پر صحیح نہیں ہے۔

ایک فاضل جرمن عالم [illegible] نے [illegible] کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کیا ہے۔

تورات کے بارے میں ان نظریات کے حامل کوئی [illegible] فضلا کی اکثریت کا یہی نظریہ تھا۔ جدید تنقید و تحقیق نے بالآخر یہ ثابت [illegible] اور دیگر صحائف عہد قدیم اللہ کا کلام یا وحی منزل من اللہ نہیں ہیں [illegible] اور [illegible] اشخاص نے تصنیف و تالیف کیا ہے۔

جب جدید تنقید و تحقیق نے یہ بات تسلیم [illegible] موجودہ تورات [illegible] نہیں ہے تو مختلف صحائف اور ان کے حقیقی [illegible] کا پتا لگا [illegible] ان محققین کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ عہد قدیم کی تالیف [illegible] اس کی تدوین [illegible] ادوار میں ہوئی۔ سب سے پہلے تورات مدون ہوئی اس کے بعد [illegible] پھر صحائف مقدسہ۔

اگرچہ اس بارے میں کہ موجودہ تورات کس سن میں مرتب کی گئی کوئی [illegible] نہیں ہے۔ اندرونی شہادت کی بنا پر اس کی تدوین کی تاریخ ۴۴۴ ق۔م ہو سکتی ہے صحائف انبیاء کے ترتیب دیے جانے کا زمانہ ۲۰۰ ق۔م اور ۲۵۰ ق۔م کے درمیان کا ہے

جبکہ صحائف مقدسہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ ۴۰۰ ق م اور ۱۵۰ ق م کے درمیانی عرصے میں مرتب و مدون کیے گئے۔

قرآن تورات کے بارے میں جو مؤقف اختیار کرتا ہے، وہ ابتدائے مضمون میں درج ہو چکا ہے۔ قرآن نے جہاں مجملاً تورات کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی ہے آج سے چودہ سو سال پیشتر یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ اس میں یہود نے تحریف کر دی ہے اور اس کے بعض حصے خود بھی تصنیف کر لیے ہیں موجودہ دور میں محققین یہود و نصاریٰ قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں بلکہ وہ اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھے ہیں کہ اکثر نے اس کے وحی ہونے ہی سے انکار کر دیا۔

لیکن ان محققین کا یہ نظریہ بھی درست نہیں ان کی نظریں یہ دیکھنے سے قاصر رہی ہیں کہ جہاں تورات میں انسانی ہاتھوں کی لکھی تحریریں موجود ہیں، وہاں اس میں اب بھی وحی الٰہی کے جواہر ریزے موجود ہیں۔ اگرچہ ایک عام آدمی کے لیے تو یہ تمیز کرنا بڑا مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر۔ تاہم جو لوگ کتب آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں۔ وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزاء میں کہاں کہاں اضافے ملحق کر دیے گئے ہیں۔

قرآن انہی منتشر اجزاء کو تورات کہتا ہے اور انہی کی وہ تصدیق کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزاء کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو پھر ان کے بعض بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے۔ اصول تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان سرمو فرق نہیں پایا جاتا۔

توران ایرانی اصطلاح میں اس سے مراد وہ ملک ہے جو ایران کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

اس علاقے کو توران کیوں کہا جاتا ہے نیز اس کا مفہوم بعد کے زمانے میں کیا تھا جس کی وجہ سے لفظ توران "ترکوں کی سرزمین" کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کا جواب کچھ یوں ہے۔

اوستا کے ان اجزاء میں، جو اب تک محفوظ ہیں "تورہ" کا لفظ ملتا ہے۔ جو دو نیک آدمیوں کے باپ کا نام تھا۔ اوستا میں جو لوگ مذکور ہیں کہ جنہیں تورہ کہا جاتا تھا، غالباً خانہ بدوش تھے۔ ان لوگوں کو سچے مذہب کا دشمن بتایا گیا ہے۔ لیکن متعدد عبارات میں اس بات کا بھی ذکر موجود ہے کہ تورہ میں نیک اور متقی لوگ بھی تھے۔

تورہ کی نسلی خصوصیات کے متعلق جو نظریات پیش کیے گئے ان کے مطابق اس نام کے تحت میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو بحیرۂ خزر اور دریائے سیحون کے درمیانی میدانوں میں رہتے تھے۔

تورہ کے متعلق زیادہ مفصل معلومات مشہور مستشرق مارکوارٹ نے بہم پہنچائی ہیں اس کے نزدیک ایرانیوں کا قدیم وطن ایریانم وایجو خوارزم میں تھا۔ ایران اور توران کی جنگ جس کا ذکر اساطیر میں آیا ہے۔ اس کش مکش کا مظہر ہیں جو شہری (حضری) ایرانیوں اور خانہ بدوش ماہی خوروں کے درمیان ہوئیں۔

تورہ کی اصطلاح بعد میں ایرانیوں کے نئے دشمنوں (سکروکائے، طخاریوں، یوئے۔ چی کوشانیوں، حیاودیوں، ھیاطلہ اور ترکوں) کے لیے استعمال ہونے لگی۔

توران کا ذکر شاہنامے میں فریدون کے ذکر کے ساتھ جو آخری شہریار تھا مذکور تھا قدیم اساطیری روایات کے مطابق فریدون کے بیٹوں کے درمیان دنیا کا تین حصوں میں تقسیم ہونا ایک تمثیل ہے۔ لیکن فردوسی کے دور تک یہ افسانوی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی۔ فردوسی نے شاہنامے میں لکھا ہے کہ فریدون کے تین بیٹے سلم، تور اور ایرج تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کو ان تینوں میں ایسے تقسیم کیا کہ بڑے بیٹے سلم کو مغرب کے علاقے (روم و خاور) دیئے۔ دوسرے بیٹے تور کو توران عطا کیا۔ اسی وجہ سے اس کا لقب توران شاہ پڑا۔ تیسرے بیٹے کو "دشت گردان و ایران زمین" کا علاقہ دیا۔

توران ایک جغرافیائی اصطلاح کی حیثیت سے :۔ یہ اصطلاح قبائل تورہ کے نام سے ماخوذ ہے بالآخر اس کا اطلاق ترکوں کے ملک پر ہونے لگا۔

بقول فردوسی یعنی چینیوں اور ترکوں کے علاقے کو دریائے جیحون ایران سے جدا کرتا ہے۔ عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک ترکوں کا علاقہ صرف سیر دریا کے مشرق میں شروع ہوتا تھا۔ اور ماوراءالنہر کا علاقہ اس میں شامل نہیں اس لیے عام تاثر یہی ہے کہ توران اور ماوراءالنہر کو ایک ہی ملک سمجھا جائے یعنی وہ علاقہ جو آمو دریا (جیحون) اور سیر دریا (سیحون) کے درمیان ہے۔

خوارزمی کے بقول ایرانی جانب جیحون کے علاقے کو "مرز توران" کہتے ہیں۔ یاقوت نے بھی ماوراءالنہر کے ملک کو توران کہا ہے۔ دمشقی کے نزدیک فریدون کے ہاتھوں دنیا کے تین حصوں میں بٹ جانے کے بعد جو حصہ تور کو ملا ترکوں نے اس علاقے کا نام اپنے بادشاہ کے نام پر توران رکھا۔

ہربیٹ کے نزدیک توران کی اصطلاح افراسیاب جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے ترک لیکن نسل کے اعتبار سے فریدون کے بیٹے تور کی اولاد سے تھا، ماخوذ ہے۔ وہ اس تمام علاقے کا بادشاہ تھا۔ جو دریائے جیحون کے پار مشرق اور شمال میں واقع ہے۔ اس ملک کو توران کہتے تھے۔ اس کے بعد اسے ترکستان کہنے لگے ہیں۔

یورپ میں توران کی اصطلاح نے انیسویں صدی میں رواج پایا۔ جس زمانے میں ترکی قومیت کی مہم شروع ہوئی اور اس کو خوب ہوا دی گئی اس زمانے میں اس تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ضیا گوک الپ تھا۔ اس نے اپنے قومی گیتوں میں کہا ہے "اوغوز خان کی اولاد اس ملک کو کبھی نہیں بھولے گی جس کا نام توران ہے۔"

ترکوں کا آبائی وطن نہ ترکیہ ہے اور نہ ترکستان، ان کا اصل وطن تو توران کی عظیم الشان ازلی ابدی سرزمین ہے۔ ضیا گوک الپ کی تعلیمات کا خلاصہ اس کی کتاب "ترکیت کے بنیادی اصول" میں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں توران کے تخیل کو نسبتاً زیادہ عملی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نے قوم کا اطلاق افراد کی اس جماعت پر کیا ہے جو زبان مذہب اخلاقیات اور جمالیات کے واحد رشتے میں منسلک ہوں گویا توران ترکوں، منگولوں، تونغوزدن فنوں اور مجاروں سے مرکب نہیں بلکہ توران ایک نام ہے جس میں صرف ترکی قبائل شامل ہیں۔

توران شاہ (دور حکومت ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء - ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء) بن ایوب یمن کے خاندان ایوبی کا بانی۔ اس سے دو سال پہلے فاطمی بادشاہ عاضد کی موت نے صلاح الدین ایوبیؒ کو آئین کے مطابق مصر کا حاکم بنا دیا تھا۔ حاکم بننے کے بعد صلاح الدین کے دل میں یمن کو فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

صلاح الدین ایوبیؒ نے اپنے بڑے بھائی توران شاہ کو نوبہ کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ لیکن توران شاہ نے نوبہ کو اس اہمیت کا حامل نہ سمجھا کہ اس کے لیے اتنی مشقت اور خرچ برداشت کیا جائے۔ اسی اثناء میں صلاح الدین کی توجہ جزیرہ نمائے عرب کی طرف مبذول ہو گئی جس کی شمالی سرحد پر بندرگاہ ایلہ واقع تھی۔ اس لیے اس نے توران شاہ کو یمن بھیج دیا۔ چنانچہ توران شاہ نے ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۴ء میں زبید کو فتح کر لیا اور اسی سال عدن پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

توران شاہ نے اس سے اگلے ہی سال صنعاء سے علی بن حاتم ہمدانی کو نکال باہر کیا۔ لیکن توران شاہ کی اس جگہ طبیعت نہ لگی۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی صلاح الدین کو کہہ سن کر ملک شام میں اپنی تبدیلی کرالی۔ توران شاہ نے ملک شام کے والی کی حیثیت سے تین سال دمشق میں گذارے۔ یہاں سے اس کی تبدیلی اسکندریہ میں ہوگئی جہاں پر اس نے انتقال کیا۔ توران شاہ کو شام سے جو محبت و رغبت تھی اسی بنا پر اس کی بہن اس کی لاش کو مصر سے شام لے آئی تھی اور دمشق کے باہر اپنے تعمیر کردہ مدرسے میں اس کی تدفین کرائی۔

توران شاہ کی فتح یمن ایوبیوں کے لئے بہت اہم ثابت ہوئی۔ انہوں نے وہاں کی تین تین چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے سلطنت ایوبی سے ملحق کر دیا۔ اور اس ملک پر پورا پورا تسلط جمالیا۔

توران شاہ زندگی میں لطف اٹھانے والوں میں سے تھا۔ اس نے مصر کے زمانۂ قیام میں ہی کافی دولت اکٹھی کر لی تھی۔ قیام یمن کے دوران میں بھی صلاح الدین ایوبی نے اسے بیش قیمت جاگیریں عطا کیں۔ لیکن باوجود اتنی جاگیروں کا مالک ہوتے ہوئے جب اس کا انتقال ہوا تو وہ دو لاکھ دینار کا قرض دار تھا۔ جو اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی نے ادا کیا۔

توفیق پاشا —— خدیو مصر (۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۲ء) یہ خدیو اسمٰعیل پاشا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ مصر میں تعلیم پائی۔ انیس سال کی عمر میں مجلس خصوصی کے صدر کی حیثیت سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۰ر مارچ ۱۸۷۹ء میں جب نوبار پاشا مستعفی ہوگیا تو اس کے والد نے اسے وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن جلد ہی اس نئی وزارت کو ختم کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ شریف پاشا وزیر اعظم بنا۔ جب ۲۶ر جون ۱۸۷۹ء میں سلطان نے اسماعیل کو معزول کر دیا۔ تو قانون وراثت کے مطابق باپ کی جگہ توفیق پاشا تخت نشین ہوا۔

آغاز حکومت ہی میں توفیق پاشا کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شریف پاشا نے نئے خدیو کی خدمت میں آئین کا مسودہ پیش کیا۔ جسے خدیو توفیق پاشا نے مسترد کر دیا۔ چنانچہ ۱۸ر اگست کو شریف پاشا مستعفی ہوگیا اور کچھ عرصے تک مجلس وزراء کی صدارت توفیق پاشا خود ہی کرتا رہا۔ تھوڑے عرصے بعد ریاض پاشا کو اس عہدے پر فائز کیا گیا جس کی وزارت دو سال تک رہی۔ یہاں تک کہ عرابی پاشا کی قیادت میں فوج نے بغاوت کر دی۔ چنانچہ اس دوران میں ملک کے مالیات پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کی نگرانی دوبارہ قائم ہوگئی۔ ان حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کی خوشحالی کا جدید دور شروع ہوگیا ہے۔ لیکن جنوری ۱۸۸۰ء میں فوج میں بدامنی پیدا ہوگئی اور اس بدامنی کے نتیجے میں شریف پاشا کو دوبارہ اقتدار حاصل ہوگیا جس کی بنا پر عام قومی شورش رونما ہوگئی۔ خدیو توفیق پاشا کے ساتھ کوئی ایسی طاقت و جماعت نہ تھی جس کی طاقت کے بل پر وہ اپنا اختیار و اقتدار برقرار رکھ سکتا۔ اس کا حامی و محافظ سلطان روم جو مصر کا اختیار دار تھا۔ بھی کمزور ہی تھا اس لئے وہ بے بس اور ناچار دیکھتا ہی رہا اور قوم پرستوں نے جو اقدامات مناسب سمجھے کر ڈالے۔ قوم پرستوں نے ایک قدم یہ بھی اٹھایا کہ عمائدین کی ایک مجلس ملی کا اجلاس بلایا۔ اگرچہ پہلے پہل تو قومی رہنماؤں نے نہایت ہی اعتدال پسندی کا ثبوت دیا لیکن بین الاقوامی مالی مشکلات کی وجہ سے غیر ملکیوں کے خلاف عام نفرت اور مخالفت کا زبردست جذبہ پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ جون ۱۸۸۲ء میں اسکندریہ میں قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۱ر جولائی کو انگریزی بیڑے نے شہر پر گولہ باری کی۔ خدیو توفیق پہلے ہی ارکان حکومت کے ساتھ دار الخلافہ سے بھاگ کر اسکندریہ کے قریب آ گیا تھا۔ اعرابی پاشا جو اب خدیو کا مخالف تھا اور کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا تھا۔ خدیو کی قیام گاہ سے چند میل کے فاصلے پر مقیم ہوگیا۔ اب خدیو کے لئے دو راستے تھے یا تو قوم پرستوں کا ساتھ دے یا پھر غیر ملکی مداخلت قبول کرے۔ آخر کار قوم پرستوں کی بغاوت کو انگریزی فوجوں نے کچل ڈالا۔ خدیو قاہرہ میں واپس آ گیا اب اس کے لئے اپنا اقتدار بچانے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی تھی۔ کہ وہ غیر ملکیوں (انگریزوں) کی خواہش کے مطابق عمل پیرا ہو۔

خدیو توفیق پاشا کے زمانے ہی میں سوڈان کا صوبہ مصر سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے جلد ہی بعد توفیق پاشا کا حلوان کے خدیوی محل میں اچانک انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا عباس حلمی تخت نشین ہوا۔

توفیق پاشا کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ اتنی پریشانیوں اور سیاسی مشکلات کا، جو اسے پیش آئیں، مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ توفیق پاشا نرم مزاج آدمی تھا۔ جن لوگوں کو شخصی طور پر اس سے واسطہ پڑا، وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں یورپی سیاست دان بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے اس کے بارے میں بہت سی اچھی باتیں بیان کی ہیں۔

توکل توکل خدا پر بھروسہ رکھنا، اعتماد کرنا۔ توکل قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ عام طور پر لوگوں کے نزدیک توکل یہ ہے کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے اور بے کار بیٹھے ہوئے یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس کے لئے اسباب اور تدبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ صحیح معنوں میں توکل یہ ہے کہ کسی کام کو پورے ارادے اور عزم کے ساتھ انجام دے اور یہ یقین رکھے کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو خدا تعالیٰ اس میں ضرور کامیاب کرے گا۔ پس تدبیر اور جدوجہد و کوشش کو ترک کرنا توکل نہیں ہے۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا ایک اہم راز ہے قرآن و حدیث میں توکل کے بارے میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ ذیل میں درج ہے۔

ان آیات و احادیث میں توکل کا صحیح مفہوم بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے

"اور معاملات میں ان سے مشورہ لے لو۔ پھر جب پکا ارادہ کر لو تو خدا پر بھروسہ رکھو۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور مومنوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔" (۳: ۱۵۹، ۱۶۰)

"اے پیغمبر! پیروی کرو۔ اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی گئی ہے۔ بے شک اللہ خبردار ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی کارساز ہے۔" (۳۳: ۲، ۳)

"اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور میرا اللہ کی آیات سے نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔" (۱۰: ۷۱)

"اے نبی! تو ان منافقوں سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ سے کام بنانے والا۔" (۴: ۸۱)

"اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا اور اپنے بازو کو اس کے لئے جھکا جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔ سو اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے جب تو اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔"

(۲۶: ۲۱۴ تا ۲۱۹)

"اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی اس کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو کچھ پروا نہ کر تجھے اللہ کافی ہے وہی ہے جس نے اپنی نصرت کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تجھے قوت دی۔" (۸: ۶۱، ۶۲)

"یہ قرآن بنی اسرائیل پر بہت سی وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور بے شک وہ مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے تیرا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ غالب علم والا ہے۔ سو اللہ پر بھروسہ رکھ۔ تو کھلے حق پر ہے۔" (۲۷: ۷۶ تا ۷۹)

"اور ہم نے تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دیجئے میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا (سوائے اس کے) کہ جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے اور اس زندہ رہنے والے (خدا) پر بھروسہ کر جسے موت نہیں" (۲۵: ۵۶، ۵۷)

"اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ کافی ہے۔ نہیں کوئی معبود لیکن وہی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔" (۹: ۱۲۹)

"میں نے تو جہاں تک ممکن ہے اصلاح کا ارادہ کیا ہے اور مجھے توفیق اللہ ہی سے ملی ہے۔ اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (۱۱: ۸۸)

"اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے۔ وہی اللہ ہے میرا پروردگار۔ اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (۴۲: ۱۰)

ان آیات اور اسی قسم کی اور بہت سی آیات میں کہیں عزم کے بعد، کہیں عمل کے، کہیں دشمنوں کے مقابلے میں استقلال کے بعد، کہیں بقدر وسعت و طاقت اصلاح قوم کے بعد، کہیں ضعف قلب کو زائل کر کے جرأت ظاہر کرنے کے لیے توکل کا اعلان کیا گیا ہے یا توکل کی تعلیم دی گئی ہے۔

ایک حدیث میں صحیح توکل کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

کہ ایک شخص آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ کیا میں اپنی اونٹنی کو اللہ پر توکل کرتے ہوئے کھلا چھوڑ دوں؟ آپؐ نے فرمایا اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔" (ترمذی)

بعض روایات میں آیا ہے کہ کچھ لوگ زاد راہ لیے بغیر حج کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے "نحن المتوکلون" ہم متوکل ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے اس طرز عمل کو غلط بتاتے ہوئے ان کی اصلاح کی ہے اور فرمایا "زاد راہ لے کر چلو"۔

اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسباب سے کام نہ لینا اور اسے توکل قرار دینا بہت بڑی غلط فہمی ہے اور دین کو نا سمجھنے کی بات ہے اور ایسے توکل کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بقول امام قشیریؒ "توکل کا محل (مقام) قلب ہے اور ظاہری ہاتھ پاؤں ہلانا قلبی توکل کے منافی نہیں۔ آنحضورؐ متوکلانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ لیکن کسب بھی آپؐ ہی کی سنت تھی۔

توکل کا طبعی نتیجہ صبر ہوتا ہے یا شکر۔ اگر متوکل آدمی کی منشا کے مطابق معاملات وقوع پذیر ہوتے ہیں تو اس سے تشکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اگر معاملات اس کے برخلاف وقوع پذیر ہوتے ہیں تو صبر کی قلبی عبادت ظاہر ہوتی ہے۔

ابوعلی دقاق کے نزدیک متوکلانہ زندگی کے تین درجات ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ توکل ہے جو مومنین کی صفت ہے۔

پس کسی کام کو سرانجام دے کر اس کا نتیجہ خدا پر چھوڑ دینا توکل ہے۔ ایسے ہی توکل کے بارے میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

"میری امت کے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں جائیں گے۔ اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں نہ تو منتر جنتر کراتے تھے نہ شگون لیتے تھے بلکہ ہر حال میں خدا پر بھروسہ کرتے تھے۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"اگر تم لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے جیسا کہ اس پر بھروسہ رکھنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اسی طرح روزی دیتا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے اور شام کو شکم سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔" (ابن ماجہ)

توکلی، نور بخش مولانا

(۱۸۷۰ء — ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء) ایک عالم دین اور مصنف موضع چک قاضیاں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بزرگان دین سے ارادت مندی اور عقیدت آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ اپنی ذہانت، محنت اور شریف النفسی کے باعث اساتذہ اور ہم عمر ساتھیوں میں مقبول تھے۔ مقامی مدرسین سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے عربی کی امتیازی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸۹۳ء میں محمڈن سکول چھاؤنی انبالہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ انبالہ ہی میں حضرت توکل شاہ سے بیعت ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں میونسپل بورڈ کالج امرتسر میں پروفیسر مقرر ہوئے علم دین کے حصول شوق نے اس دور میں بھی آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ مولانا غلام رسول قاسمی سے آپ نے فقہ، حدیث، تفسیر اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ سائیں توکل شاہ کی وفات کے بعد مولوی مشتاق احمد محدث انبیٹھوی سے بیعت ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد لاہور تشریف لے آئے اور ایک مدت تک انجمن عثمانیہ کے دارالعلوم کے اعزازی ناظم تعلیم رہے۔ اور ماہوار رسالہ انجمن نعمانیہ کے ایڈیٹر بھی۔ اسی دوران میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ ایک عرصے تک انجمن نعمانیہ کی دینی درسگاہ کے ناظم امور تعلیمات رہے۔ آپ کی یہ ساری خدمت اعزازی تھی۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے چک قاضیاں میں ایک مدرسہ اسلامیہ توکلیہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے سے بہت سے طلبہ فیضیاب ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ نے لائلپور میں سکونت اختیار کر لی آپ نے آخری وقت تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

ایک روز مکان کی سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا۔ جس سے کافی زخم آئے آپ ان زخموں کی تاب نہ لا سکے اور اسی روز آپ کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق نور شاہ ولی کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں سیرت رسول عربی، عید میلاد النبی، معجزات النبی اعجاز القرآن، شرح قصیدہ بردہ (عربی و اردو) غزوات النبی، حلیۃ النبی، شرح ہدایہ، کتاب البرزخ، مقدمہ تفسیر القرآن، امام بخاری و شافعی، تفسیر سورۃ فاتحہ سورۃ البقرہ، تذکرہ غوث الاعظم وغیرہ ہیں۔

تونس

ایک اسلامی ملک اور ایک شہر جو تونس ملک کا صدر مقام ہے۔

تونس ملک جو قرونِ وسطیٰ میں افریقیہ کہلاتا تھا۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۵۱۸۰ مربع کلومیٹر ہے اور ۶۳۳۷۹ مربع میل ہے۔ اس کے مغرب میں الجزائر۔ جنوب میں صحرائے اعظم جنوب مشرق میں دور جا کر لیبیا شمال مشرق میں بحیرہ روم کے ساحل ہیں۔ شمال مغرب میں خمیر اور مگود کے پہاڑ ہیں جو ساحل کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں مشرق میں یہ پہاڑ گھٹتے گھٹتے ان پہاڑیوں سے آ ملتے ہیں جو بنزرت اور ماطر کے رسوبی میدانوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

تونس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس علاقے پر لو سو سال تک بربر حکومت کرتے رہے۔ اسے فتح کرنے کے لیے عرب حملہ آور جو جنوب مغرب سے آئے تھے۔ تقریباً نصف صدی تک یہاں کے بربر باشندوں اور بزنطی عمال کے خلاف شدید جنگیں لڑتے رہے۔

عربوں سے پہلے دو حملے جن کے درمیان اٹھارہ سال کا وقفہ تھا ان کی صورت صرف قتل و غارت کی تھی لیکن ان کی وجہ سے زیادہ منظم مہمات کے ذریعے ملک کو باقاعدہ فتح کرنے کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ ان دنوں بزنطی

تلمسان کی جامع مسجد، تونس، ۱۰۸۲ء

افریقیہ سیاسی بحران میں مبتلا تھا ۶۶۷ء تک المغرب کی ولایت کا الحاق مصر کے ساتھ ہو چکا تھا۔ یہ قبضہ ۶۶۹ء اور ۶۷۵ء کے درمیانی عرصے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں عقبہ بن نافع نے فتوحات سرانجام دیں اور قیروان کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں بڑا سین پر عربوں کا مکمل طور پر قبضہ ہوا اور بربری قبیلوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ لیکن اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ایک نئے اسلامی شہر کی بنیاد پڑی۔ ۶۸۱ء میں عقبہ واپس آ گیا۔ لیکن دو سال بعد ہی وہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں تنگتا نیا تک جا نکلا اور واپسی پر علاقہ زاب میں باغیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ یہ بغاوت اہل ملک نے کی تھی جس کا سرغنہ کسیلہ تھا اور اس کی امداد رومی کر رہے تھے۔ وہ کئی سال تک ایک وسیع بربری ریاست پر حکمران رہا اور عربوں کے نئے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ ۶۸۸ء میں سیبہ کے علاقے میں ایک حملے کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ ۶۹۲ء ۶۹۳ء میں بنو امیہ اپنے داخلی حالات درست کر کے اس قابل ہو سکے کہ توسیع سلطنت کی پالیسی پر دوبارہ عمل پیرا ہو سکیں۔ چنانچہ حسان بن نعمان چالیس ہزار فوج لے کر بزاسین پر حملہ کرنے کے لیے آیا۔ ۶۹۵ء میں اس نے قرطاجنہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن دو سال بعد یہ علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن اگلے ہی سال اس نے دوبارہ قرطاجنہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اور خوب مضبوطی سے یہاں اپنے قدم جما لیے۔ ۶۹۸ء میں عرب وہ تمام علاقہ جو اب مملکتِ تونس میں شامل ہے۔ بربروں اور بزنطیوں سے چھین چکے تھے۔ حسان نے تونس کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشین موسیٰ بن نصیر نے زغوان فتح کیا۔ اور پھر افریقہ کے بربروں کو ساتھ لے کر فتح المغرب کی جانب بڑھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں شمالی افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح اس حصے میں بھی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ یہاں کے بربروں نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح فساد عقیدہ کی آڑ لے کر دوبارہ خود مختار ہو جائیں۔ آخری اموی خلفا اس دور دراز صوبے کو جوان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا اپنے ماتحت رکھنے میں ناکام رہے۔ ادھر عباسی یہ چاہتے تھے کہ افریقہ والے ان کی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکنا ہے تو کم سے کم [illegible] اباضی سے چھین کر واپس لے لیں۔ چنانچہ عباسی جرنیل محمد بن الاشعث نے [illegible] قیروان کو فتح کیا لیکن اس کی حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی [illegible] میں دوبارہ واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا جانشین الاغلب [illegible] باغیوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ اور ۷۶۰ء کی بغاوت میں [illegible] سال تک ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم رہا۔ ۷۷۲ء تا ۷۹۵ء [illegible] آلِ مہلب حکمران رہے یہ خاندان ایک مدت تک امن و امان [illegible] کامیاب رہا۔ بنو مہلب کے آخری حکمران الفضل کی وفات کے بعد [illegible] فساد کا بازار گرم ہو گیا ۷۹۱ء میں ابراہیم بن اغلب عباسیوں کی [illegible] سے اپنے صوبے زاب میں جہاں اس کا باپ والی رہ چکا تھا [illegible] ہوا اور ابن مقاتل کو بھی قیروان میں واپس لے آیا جس کو تونس کی [illegible] نے وہاں سے بھگا دیا تھا۔ ہارون الرشید نے ابراہیم کا ایک باجگزار [illegible] سے تقرر کر دیا۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے لے کر ۹۰۹ء تک بنو اغلب تونس پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس خاندان نے تونس میں بڑے گہرے نقوش [illegible] یہ امیر اگرچہ ظاہراً خلیفہ بغداد کے ماتحت تھے لیکن عملاً خود مختار تھے [illegible] کے خاندان میں موروثی تھی وہ ہمیشہ توسیع مملکت کی حکمت عملی پر کاربند رہے اگرچہ ابراہیم خود تمیمی تھا لیکن اس خاندان کو ہمیشہ بنو تمیم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا مسکن تونس تھا۔ چنانچہ بنو تمیم اکثر بغاوتیں اور شورشیں برپا کرتے رہے۔ ۸۰۲ء میں ملک تونس میں ایک بغاوت برپا ہوئی جسے ابراہیم

نے دبا دیا - ۸۰۵ء میں اسے طرابلس کی بغاوت سے واسطہ پڑا - ۸۱۰ء میں اس کے جرنیل عمران بن مخلد نے بغاوت کر دی -

ابراہیم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا زیادۃ اللہ (۸۱۷ء تا ۸۳۸ء) تخت نشین ہوا - اسے بھی ایک طاقتور حریف منصور الطنبذی سے واسطہ پڑا - کئی سال تک ملک تونس کا تمام شمالی علاقہ امیر کی دسترس سے باہر رہا - لیکن زیادۃ اللہ نے اپنی عقلمندی اور ذہانت سے اس علاقے کو دوبارہ واپس لینے میں کامیاب ہوگیا - اس نے فسادی فوج کی توجہ سسلی کے جہاد کی طرف مبذول کر دی اور اس طرح یہ فوج کی طرف سے مطمئن ہو کر تعمیرات کی طرف متوجہ ہوا - ۸۲۱ء میں اس نے رباط سوسہ تعمیر کرایا - قیروان میں ایک جامع مسجد بنوائی اور اسی طرح کی کئی اور تعمیرات کرائیں ۸۳۱ء میں پلرمو فتح ہوگیا اور اس کے ۱۲ سال بعد مسینہ کی بھی تسخیر ہوگئی -

تعمیرات کا کام زیادۃ اللہ کے جانشینوں نے بھی وسیع پیمانے پر جاری رکھا - ۸۵۰ء میں سوسہ اور سفاقس کی جامع مساجد تعمیر ہوئیں - امیر احمد اس معاملے میں ان سے بڑھا ہوا تھا - اس نے ۸۶۰ء کے لگ بھگ ان دونوں شہروں کے گرد فصیلیں بنوائیں اور مشہور تالاب جو اغلبیوں کے تالاب کے نام سے مشہور ہے بنوایا - اس تالاب سے قیروان کو پانی مہیا کیا جاتا تھا - امیر ابراہیم ثانی جو اپنے بھائی محمد کے بعد ۸۷۴ء میں تخت نشین ہوا - اس نے قصر القدیم کو خیر باد کہہ کر ایک جدید مسکونی قصبہ رقادہ بسایا جو قیروان سے پانچ میل جنوب میں واقع تھا -

سسلی کی فتح ۸۷۸ء میں سیراقوسہ اور ۹۰۲ء میں طبرمین کے فتح ہونے سے پایۂ تکمیل کو پہنچی - ۹۰۲ء میں ابراہیم ثانی اپنے بیٹے عبداللہ کے حق میں دستبردار ہوگیا اسی سال بنو اغلب نے کتامہ کے خلاف ایک مہم بھیجی جو بڑی مشکلات کے بعد کامیاب ہو سکی - ۹۰۳ء میں زیادۃ اللہ ثالث کے عہد میں جو اپنے باپ عبداللہ کو قتل کرنے کے بعد امیر بنا تھا شیعی خطرے کا دباؤ کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگا - اس کے زمانے میں ۹۰۷ء میں باغایہ اغلبیوں کے ہاتھ سے نکل گیا - ۹۰۹ء میں الاربس کی فتح کے بعد امیر زیادۃ اللہ ثالث نے بغداد کی طرف راہ فرار اختیار کی اور شیعی داعی مہدی ملک رقادہ میں داخل ہوگیا اور اس طرح تونس ملک میں فاطمی خلافت قائم ہوگئی -

اغلبی دور فقہی مباحث کے لحاظ سے ایک سنہری زمانہ تھا - اس دور میں مختلف مذاہب فقہ ہوئے - اور احادیث کی امہات کتب تالیف ہوئیں - خوارج کو ملک تونس میں یہ طاقت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ مذہب اہلسنت کے مقابلے میں ملک کے اکثر حصے میں غلبہ حاصل کر سکیں - اس دوران میں ملک تونس میں کئی بڑی شخصیات نے جنم لیا - ان میں قاضی عبدالرحمان بن زیاد جو ابن الاشعث کے رفیق کار تھے - اسد بن الفرات جو خراسانی تھے - اور مصر کے مالکی فقیہ امام عبدالرحمان کے شاگرد تھے - امام سحنون جو اسد بن الفرات کے شاگرد تھے اور قیروان کے قاضی تھے اور انہوں نے مالکی مذہب کو خوب ترقی دی - اس وقت سے تونس کا غالب مذہب مالکی ہی ہے -

فاطمی خلفاء کی نظریں اول روز سے ہی مصر پر لگی ہوئی تھیں اور جب تک اسے زیر نہ کر لیا گیا وہ وہاں فوجی مہمات بھیجتے رہے - ۹۱۱ء میں عبیداللہ (مہدی) نے جو پہلا فرمانروا تھا - اپنے داعی ابوعبداللہ کو قتل کرا دیا جس کی کوششوں کی وجہ سے اسے تاج و تخت ملا تھا - ۹۱۴ء میں اس نے اپنے بڑے بیٹے کی سرکردگی میں الفیوم پر حملے کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی ایک دوسری فوج نے اسکندریہ پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا - عبیداللہ (مہدی) کو مغرب میں بہت زیادہ کامیابیاں حاصل ہوئیں اور اس نے ایک وسیع علاقے پر فاطمیوں کا اقتدار قائم کر دیا اس کے بعد ابوالقاسم نزار المتلقب القائم بامر اللہ اس وسیع سلطنت کو جو اسے ورثہ میں ملی بڑی مشکل سے ہی اس پر اپنا اقتدار قائم رکھ سکا - ابویزید بن کیداد جو "صاحب الحمار" کے نام سے مشہور تھا نے افریقہ کے شہروں پر حملہ کرنے کی ٹھانی - اس نے مشرقی اور اس کے ہوارہ قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر ایک زبردست بغاوت برپا کر دی - دوسری طرف خارجی بربروں نے باجہ اربس، قیروان اور سوسہ کو تاخت و تاراج کر ڈالا اور تونس پر قبضہ کر لیا - اور خلیفہ کو اس کے پایۂ تخت مہدیہ میں محصور کر دیا جہاں اس نے ۹۴۶ء میں انتقال کیا - اس کے بعد اس کے بیٹے اسماعیل (المنصور) نے ان لوگوں کی مدد سے جو ان حملہ آوروں سے تنگ آ چکے تھے - صورت حالات پر قابو پا لیا - اور اس طرح ایک پرآشوب دور کا خاتمہ ہونے کے بعد تونس میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا - منصور نے امن و امان کے فوراً بعد صبرۃ (المنصوریہ) نامی ایک شاندار اور بارونق شہر کی بنیاد ڈالی - ۹۵۳ء میں المعز تخت نشین ہوا اس کے دور حکومت میں ۹۶۹ء میں فسطاط فتح ہوا - اور اگلے سال ہی دمشق پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا - ۹۷۳ء میں خلیفہ المعز نے قاہرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا - اور افریقہ کو اپنے ایک قابل معاون بربری امیر لولگین بن زیری کے سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا -

چنانچہ ۹۷۳ء سے تونس پر بنو زیری حکومت کرنے لگے - ان کے عہد حکومت میں جن کا تقرر ہمیشہ قاہرہ سے فاطمی خلفاء کرتے تھے - افریقہ نے ترقی و خوشحالی کا دور دیکھا - اگرچہ کئی ایک واقعات ایسے ضرور وقوع پذیر ہوتے رہے جن کا اثر اس ترقی و خوشحالی پر بھی پڑا - لیکن ان تمام واقعات کے باوجود گیارہویں صدی کے نصف تک المعز بن بادیس کے عہد حکومت میں افریقہ کی خوشحالی اوج کمال پر پہنچ

گئی ۔ المعز بن بادیس جس کی مصر کے فاطمی خلفا بڑی عزت کرتے تھے اور سارے مغرب میں جس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی ۱۰۵۰ء تک فاطمیوں کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا اور فاطمی اطاعت سے منحرف ہو کر عباسیوں کی بیعت کر لی ۔ فاطمیوں نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے اس باغی حکمران کے خلاف خانہ بدوش ہلالی عربوں کے غارت گر دستے بھیجے ۔ چنانچہ ۱۰۵۱ء جس میں بنو ریاح بنو ہلال میں سے سب سے پہلے افریقیہ پہنچے تونس کی تاریخ میں ایک نقطۂ انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے حملہ آوروں نے جو لاکھوں کی تعداد میں آ گئے تھے شمالی افریقیہ کا حلیہ بگاڑ دیا ۔ المعز مہدیہ چلا گیا ۔ بربروں کو شمالی افریقیہ میں اور پرے تک دھکیل دیا ۔ مرکزی حکومت کا زور بالکل ٹوٹ گیا ۔ بڑے بڑے شہر عربوں کے قبضے میں آ گئے یا خود مختار بن بیٹھے ۔ مقامی سرداروں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں

بنو زیری ان تمام مشکلات کے باوجود مہدیہ میں جمے رہے اور وہاں سے سوسہ اور قابس کے درمیانی ساحل پر حکمرانی کرتے رہے ۔

یحیٰی بن تمیم (م ۱۱۱۶ء) اور اس کے بعد اس کے بیٹے علی (م ۱۱۲۱ء) نے فاطمی خلفاء کی دوبارہ اطاعت قبول کر لی اور عربی قبیلوں کی مدد سے خشکی اور تری کے علاقوں پر کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں لیکن اچانک ایک متوقع دشمن نے انہیں مغلوب کر لیا یہ دشمن نارمن تھے جو سسلی اور مالٹا فتح کر چکے تھے ۔ اور اب افریقیہ کے معاملات میں بھی دخل انداز ہونے لگے تھے ۔ اور بالآخر حسن بن علی کو ۱۱۴۸ء میں مہدیہ سے نکال دیا اور سوسہ سے طرابلس تک کے تمام ساحلی شہروں پر ان کا قبضہ ہو گیا ۔ یہاں تک کہ ۱۱۵۹ء - ۱۱۶۰ء میں عبدالمومن الموحدی نے انہیں کفار سے نجات دلائی ۔ عبدالمومن نے تمام مخالفین کا قلع قمع کر دیا ۔ شمالی افریقہ کی سیاسی وحدت ایک بار پھر بحال کر دی جو تقریباً پچاس سال تک قائم رہی ۔ ۱۲۰۰ء میں بنو مرابطین کے یحیٰی بن اسحاق بن محمد ابن غانیہ نے ملک تونس کے تمام حصے پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ۱۲۰۵ء - ۱۲۰۶ء میں خلیفہ الناصر نے ایک مہم بھیجی جس نے المرابطین کے دور کو ختم کر دیا ۔ اور زبردست صوبائی حکومت قائم کی اور اس کا انتظام شیخ عبدالواحد بن ابی حفص کے حوالے کیا ۔ اور اس طرح بنو حفص کی افریقیہ پر حکمرانی قائم ہو گئی ۔ ابو زکریا (یحیٰی) اپنے بھائی عبداللہ کو اپنے راستے سے ہٹا کر رفتہ رفتہ خود مختار ہو رہا تھا ۔ اس عظیم الشان خاندان بنو حفص کا اصل بانی ہے جو تقریباً ساڑھے تین سو سال حکومت کرتے رہے انہوں نے دوبارہ مالکی مذہب اختیار کیا ۔ ۱۲۵۰ء میں ابو عبداللہ محمد بن ابو زکریا جو اس خاندان کا دوسرا خود مختار امیر تھا کی خلافت کا مکہ مکرمہ سے اعلان کیا گیا اور اس نے خلیفہ المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا ۔ اس کے دور میں سلطنت کی وسعت طرابلس سے لے کر الجزائر کے اندر تک تھی اور بڑے بڑے شہروں یعنی تونس (شہر) قسطنطنیہ اور بجایہ میں مضبوطی سے قائم تھی ۔ اس سلطنت کا رعب داب شمالی افریقیہ کی حدود سے باہر بھی قائم تھا ۔ اسی وجہ سے ہسپانیہ اور مسیحی یورپ کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگی تھیں ۔ اس دور میں علم فقہ اور فن تعمیر کو ملک تونس میں خوب فروغ حاصل ہوا ۔ حفصیوں کے عظیم الشان بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ابو عمر عثمان کا نام جس نے ۱۴۳۵ء سے ۱۴۸۸ء تک حکومت کی اس صدی کے سارے حکمرانوں کے ناموں پر چھایا ہوا ہے ۔ عثمان کی وفات کے بعد حالات بہت خراب ہوتے چلے گئے ۔ چند سالوں کے اندر تین خلیفہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور اس طرح یہ عظیم الشان سلطنت آہستہ آہستہ ہسپانیوں کے حملے کے سامنے دم توڑنے لگی ۔ جو ترک بحری قزاقوں کے تعاقب میں ان علاقوں میں آ نکلے تھے اور رفتہ رفتہ مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے لگے تھے ۔ بالآخر ستمبر ۱۵۷۴ء میں عثمانی فوجوں نے جو قسطنطنیہ سے سنان پاشا کے بیڑے میں بھیجی گئی تھیں حلق الوادی اور تونس کو فتح کر لیا اور اس طرح ہسپانوی قبضے کا خاتمہ کر دیا ۔ اور اس کے ساتھ ہی حفصی خاندان کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ سنان پاشا نے ملک تونس کو مستقل ترکی صوبہ قرار دیا اور اس کا ایک حاکم از ایک پاشا مقرر کیا ۔ ۱۵۸۷ء میں اس صوبے کو براہ راست باب عالی کے تحت لے لیا گیا ۔ ۱۶۱۰ء تا ۱۶۳۷ء جبکہ تونس کی نیابت یوسف کے ہاتھ میں تھی تو تونس کی نیابت نے طرابلس کے پاشا سے جربہ واپس لے لیا ۔ اس طرز عمل سے تونس اور الجزائر کی سرحد متعین ہو گئی ۔

انیسویں صدی میں نیابت تونس کی سیاسی حیثیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں ۔ جب ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہو گیا تو اس کے اثرات تونس پر بھی پڑے ۔ تونس نے نصف صدی تک اپنے اندرونی نظام کی ترمیم و تجدید سے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے کی بے سود کوشش کی ۔ اس کے لیے ایک طرف تو ڈھیلی ڈھالی عثمانی اختیارداری تھی اور دوسری طرف اس کے معاملات میں عیسائی حکومتوں کی دخل اندازی جو وہ اپنے قنصلوں کے ذریعے کرتی رہتی تھیں ۔ تونس کی حکومت کو ان کے بین بین چلنا پڑتا تھا ۔

خلافت عثمانی کا حق اختیارداری جس کی برطانیہ کی طرف سے تائید ہوتی تھی اور فرانس کی جانب سے مخالفت صرف چند شاہی فرمانوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا تھا جو بای کے تقرر کے وقت جاری ہوتے تھے ۔

۱۸۷۸ء میں برلن کانگرس کے بعد سے برطانیہ اور جرمنی فرانس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے ۔ اس وقت فرانس نے تونس میں دخل اندازی کی ۔ جب اہل [illegible] نے [illegible] پر حملے کیے تو فرانس کے وزیر ژول فیری نے اپریل ۱۸۸۱ء میں تونس پر حملہ کرنے کے لیے تیس ہزار فوج بھیج دی ۔ فرانسیسی جرنیل بریار نے ۱۲ مئی کو ترکی احتجاج کے باوجود محمد الصادق بای تونس سے معاہدہ باردو پر دستخط کرا لیے جس کی رو سے نیابت تونس کے کل فوجی خارجی اور مالی معاملات پر فرانس کا عملاً تصرف ہو گیا ۔ اور وہاں پر ایک فرانسیسی وزیر مقیم مقرر کیا گیا ۔ اس طرح یہ نیابت تونس فرانس کے زیر حمایت [illegible] اس وقت تو زیر حمایت کا لفظ استعمال نہ کیا گیا لیکن اسے کچھ عرصہ بعد [illegible] تونس اور جنوب میں علی بن خلیفہ کے زیر حمایت ایک شورش برپا ہوئی تو اسے ایک دوسری مہم کے ذریعے دبا دیا ۔ تو یہ ملک قطعی طور پر فرانس کی [illegible]

فرانس کے زیر حمایت آ جانے سے تونس کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز [illegible] اب بای برائے نام اس نیابت کا اختیار دار امیر اور صاحب مملکت تھا ۔ وزیر مفوض برائے نیابت تونس کہلاتا تھا عملی طور پر یہاں کا حقیقی حکمران تھا ۔ یہ [illegible] ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں دس ہزار تونسیوں نے فرانس کی خاطر جان دی ۔ اس دور میں تونس میں دوہری حکومت قائم رہی یعنی ایک طرف تو بای کی حکومت جو روایتی تھی اور دوسری طرف فرانس کی حکومت تھی ۔ فرانس نے تونس کے قرضے کی [illegible] کی ضمانت بھی دی تھی اس لیے برطانیہ اور اطالیہ دونوں اس بات پر راضی ہو گئے کہ [illegible] مالی کمیشن توڑ دیا جائے چنانچہ ۱۸۸۴ء میں اسے توڑ دیا گیا ۔

فرانس کے عہد حمایت کے آغاز میں اور ۴ فروری ۱۸۸۳ء کے موجب [illegible] بالفصل معارف و سیر عام حکومت تونس تھا جو [illegible] تھا ۔ اور وزیر اعظم کے باب میں اس کا وہی مقام تھا جو بای کے باب میں [illegible] عام کا تھا ۔ ۴ جولائی ۱۹۲۲ء سے یہ عہدہ اڑا دیا گیا ۔ اور اس کی جگہ نائب [illegible] عام نے لی ۔ [illegible] فروری ۱۹۲۳ء کو ایک صدارتی فرمان کی رو سے اس کے اختیارات کی تحدید کی گئی ۔ ملک کا جنوبی حصہ فوجی علاقہ سمجھا جاتا تھا ۔ اس حصے کو چھوڑ کر باقی ملک پانچ کور دوں

میں منقسم کر دیا گیا۔ ہر کورہ متعدد داخلی نظارتوں میں منقسم تھا۔ جنکی تعداد ۱۹ تھی۔ ۲۷ مارچ ۱۹۲۸ء کے فرمان کے مطابق اقلیتی بلدیات کا قیام عمل میں آیا۔ ان کے ارکان کا انتخاب ہر چھ سال بعد ہوتا تھا۔

۱۹۳۰ء میں حزب "نو دستور" وجود میں آیا۔ اگرچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی آزادی کے حصول کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس جنگ کے بعد اس تحریک نے بہت زور پکڑا۔ لیکن فرانس کب چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے یہ علاقہ نکلے۔ چنانچہ حزب "نو دستور" جن کا سب سے بڑا مقصد عوام تک پہنچنا اور انہیں منظم کرنا تھا، وجود میں آیا تو حکومت فرانس نے ان پر سختی کی اور بہت سی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ دستور و نو دستور دونوں کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے خطرے کے پیش نظر بعض صلح جویانہ اقدامات بھی کئے گئے۔ جونہی دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی تونس اور متصلہ علاقے جنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ ۱۹۴۳ء میں قوم پرستوں نے دوبارہ سر اٹھایا تو انہیں جبر طاقت کے زور سے دبا دیا گیا۔ لیکن اس مرتبہ قوم پرستوں نے بڑے عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد کے برسوں میں کچھ اصلاحات کی گئیں۔ مگر فرانسیسی حکومت کا رد عمل چونکہ بہت سست تھا اور قوم پرستوں کے مزاج کے مطابق نہ تھا اس لئے ان کا جوش آزادی بڑھتا گیا۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں فرانس تونس کو داخلی آزادی دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو تونس آزاد ہو گیا اور حبیب بورقیبہ نئی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ انہوں نے تونس کو آزاد کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو تونس میں عام انتخابات منعقد ہوئے اور ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء میں تونس کو جمہوریہ قرار دیا گیا اور حبیب بورقیبہ ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں ملک کو نیا دستور دیا گیا۔ ۸ نومبر کو قومی اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے اب ملک ۱۳ ولایتوں میں تقسیم ہے۔ اور ہر ولایت کا حاکم والی کہلاتا ہے۔ اس کا معاون معتمد کہلاتا ہے۔

۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء کو لیبیا اور تونس کے انضمام کا اعلان کیا گیا اور اس مشترکہ ریاست کا نام "اسلامی عرب جمہوریہ" رکھا گیا۔ مگر اس اعلان پر عملدرآمد نہ ہو سکا

اقتصادی و دیگر معلومات :- آئین کی رو سے ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ کل رقبہ ۱۶۴۱۵۰ کلو میٹر ہے (۶۳۳۶۲ مربع میل) ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ایک اندازے کے مطابق تونس کی آبادی ساٹھ لاکھ تھی۔ جس میں ۹۷ فیصد مسلمان ہیں۔ عربی سرکاری زبان ہے۔ البتہ فرانسیسی بھی بولی سمجھی جاتی ہے۔

تونس میں تعلیم پر سرکاری کنٹرول ہے۔ ۱۹۷۴ء میں وہاں ۹ لاکھ ۴۰ ہزار طلبا پرائمری میں، ایک لاکھ اسی ہزار طلبا ثانوی اور پیشہ ورانہ سکولوں میں اور ۱۵ ہزار طلباء اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے۔ تونس میں ایک یونیورسٹی ہے۔

تونس بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ جہاں مکئی، گندم، جو، جوار، باجرہ زیتون، کھجور، نارنگیاں، لیموں اور دیگر پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ایک خاص قسم گھاس بھی پیدا ہوتی ہے، جس سے کاغذ بنتا ہے۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ سے ہوتی ہے ملک بھر میں ریل، سڑک، ہوائی راستوں، ٹیلیفون، تار، ڈاک وغیرہ کا جال بچھا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر تونس ایک ترقی پذیر ملک ہے۔

تونس جمہوریہ تونس کا دارالحکومت۔ آج کل تونس دو شہروں پر مشتمل ہے جو اگرچہ ایک دوسرے سے متصل ہیں لیکن تمدنی زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے بالکل مختلف ہیں۔ ایک شہر جس میں ملکی باشندوں کی آبادی ہے عہد قدیم کی یادگار ہے۔ جبکہ دوسرا شہر یورپی طرز کا ہے۔ جس کی بنیاد زمانہ قریب ہی میں ڈالی گئی اور مزید ترقی کر رہا ہے۔ پرانا شہر تونس جھیل کے کنارے سے تقریباً پون میل کے فاصلے پر ہے۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی تونس پردۂ تاریکی سے نکل کر ایک اسلامی شہر کی حیثیت میں ابھرا۔ اس نے جلد ہی قرطاجنہ کا مقام حاصل کر لیا۔ ۶۹۸ء میں جب حسان بن النعمان نے قرطاجنہ کو فتح کر کے برباد کر دیا تو اسے سب سے پہلے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جھیل کے کنارے چھوٹے قصبے کو بحری مرکز میں تبدیل کر دے جہاں سے بحری بیڑے دور دراز مہموں پر روانہ ہو سکیں۔ اور وہ قصبہ بزنطی بڑے کے اچانک حملے سے بھی محفوظ رہ سکے۔ اس نے تونس میں ایک دارالصناعۃ بھی قائم کیا اور جہاز سازی کے اس دارالصناعۃ میں کام کرنے کے لئے مصر سے ایک ہزار قبطی خاندان یہاں لا کر آباد کئے۔ پہلے پہل یہاں عیسائی سوداگر اور عامل آئے لیکن جلد ہی نومسلم باشندے کثیر تعداد میں یہاں آنے لگے جہاں عرب سپاہی بھی ان کے ساتھ آملے۔ ۱۱۴ھ/۷۳۲ء میں اموی والی ابن الحجاب نے یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔ بقول یعقوبی شہر کے ارد گرد گارے اور کچی اینٹوں سے فصیل تعمیر کی گئی تھی۔ —— —— یہ فصیل کس نے تعمیر کرائی، اس بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ شہر اچانک ظہور میں آیا۔ قیروان کی طرح وہ کسی خاص منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آیا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں تونس نے خاص اہمیت حاصل کر لی اس کی شہرت فقہی اور مذہبی تعلیم کے لحاظ سے تھی۔ یہاں پر روزگار زمانہ علما معلمین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی، جنہوں نے اپنی تعلیمات سے پورے ملک میں اسلام کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا۔

تونس سیاسی لحاظ سے قیروان کی مرکزی حکومت کی مخالفت و مزاحمت کا مرکز و مرجع رہا۔ بنو تمیم کی فوج جو یہاں مقیم تھی، وہ شورشوں کا اہم عنصر تھی۔ اسی وجہ سے اس شہر نے اکثر بغاوتوں اور شورشوں میں حصہ لیا، جنہیں بنو امیہ، بنو عباس کے والی اور اغلبی امیر برابر دباتے رہے۔ جب زیادۃ اللہ اول کے دور میں منصور الطنبذی نے زبردست شورش برپا کی تو یہ شہر بھی اس شورش میں ملوث تھا۔ زیادۃ اللہ کی فوجوں نے اس شہر کو فتح کر لیا۔ اور ۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں اس کی فصیلوں کو مسمار کرا دیا ۲۸۱ھ/۸۹۴ء میں بھی ابراہیم ثانی نے ایک بغاوت میں ملوث ہونے کی وجہ سے تونس پر چڑھائی کی اور اپنا صدر مقام بھی اسی میں تبدیل کر لیا تاکہ اس شہر پر اپنا نظم و ضبط قائم رکھ سکے۔ ابراہیم ثانی نے یہاں پر کئی عمارات تعمیر کرائیں۔ عبداللہ ثانی نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا اگرچہ وہ ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں اسی محل میں مارا گیا۔

فاطمیوں نے اس شہر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ۳۳۲ھ/۹۴۴ء میں ابو یزید کا تونس پر عارضی سا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ اس کا حملہ تونس کے لئے بہت سخت تھا ابن حوقل نے دسویں صدی عیسوی کے تونس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس وقت وہ ایک خوشحال شہر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تونس کی پیداوار کی کثرت، اس کے محل وقوع کی موزونیت اور اس کے باشندوں کی دولت مندی کی تعریف ہے شہر کی فصیلوں اور خندق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق شہر کے پانچ دروازے تھے۔

تونس تقریباً سو سال تک خوشحالی اور امن و امان کے دور سے فیضیاب رہا۔ حتیٰ کہ گیارہویں صدی عیسوی میں اسے ایک خوفناک حادثے کا شکار ہونا پڑا۔ جس سے اس کی اقتصادی اور سیاسی حالت نہایت دگرگوں ہو گئی، جبکہ ہلالی عربوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں بنی ریاح کے سردار عابد بن ابی الغیث کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ ۴۵۱ھ/۱۰۶۰ء میں اس نے وہاں پر عبدالحق ابن خراسان کو اپنا والی مقرر کیا۔ جس نے جلد ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے صنہاجی خاندان کی بنیاد ڈالی جو ایک

سو سال تک برابر حکومت کرتا رہا۔ سوائے بیس سال کے ایک وقفے کے۔ عبدالمومن کے دورِ حکومت ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء میں تونس افریقیہ کا صدر مقام بنا اور جمہوریہ تونس بننے تک یہ شہر افریقیہ ہی کا صدر مقام رہا۔ ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء میں عبدالکریم الرغاغی نے اس پر ناکام حملے کیے۔ لیکن اس کے بعد یعنی تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں بنوحفص اس شہر پر قابض ہو گئے۔ بنوحفص کے پہلے خودمختار بادشاہ ابوزکریا کے دور سے تونس میں بھی خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس نے کئی عمارت تعمیر کرائیں۔ مدارس قائم کیے گئے اور مساجد تعمیر ہوئیں۔ چودھویں صدی عیسوی کو علمی لحاظ سے تونس کا سنہری دور قرار دینا چاہیے۔ لیکن سیاسی لحاظ سے اس صدی میں فتنہ و فساد اور بدامنی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ بنی مرین نے دو مرتبہ تونس پر قبضہ کیا۔ پندرہویں صدی میں اگرچہ سیاسی حالات پر سکون ہو گئے۔ لیکن تونس پر ایک طرح کا جمود طاری رہا۔ اس صدی میں بھی مدارس اور مساجد کی تعمیر کے علاوہ دوسری عمارات کی تعمیر بھی جاری رہی۔ یہاں تک کہ سولھویں صدی میں تونس ترکوں اور ہسپانیوں کی طویل جنگوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ۱۵۳۴ء میں خیرالدین کی فوجوں نے تونس کو تاخت و تاراج کیا اور اگلے ہی سال چارلس پنجم کی فاتح فوجوں نے اس میں لوٹ مار مچادی۔ ۱۵۷۳ء میں اگرچہ بنوحفص کے دوبارہ اقتدار بحال ہو جانے سے شہر کے استحکامات کی طرف پھر توجہ دی گئی لیکن یہ سب باتیں بے کار ثابت ہوئیں کیونکہ تونس کو ایک بار پھر غارت گری کے لیے ہسپانوی فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

۱۵۷۴ء میں ترکوں نے اس قلعے کو جو جھیل کے کنارے ستارے کی شکل میں بنایا گیا تھا بالکل تباہ کر دیا گیا۔ لعدمیں سنان پاشا نے یہاں پر ایک مستحکم حکومت قائم کی اور تونس کی تعمیرات کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہوا۔ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع کے سیاسی ہنگاموں کے دوران میں اہل الجزائر نے تونس پر دو دفعہ ۱۶۸۶ء اور ۱۶۹۴ء میں قبضہ کر لیا۔ اس بدامنی کے دور میں کافی اہل تونس کو کشت و خون کے دریا سے گذرنا پڑا۔ اس زمانے میں تونس اہل الجزائر کے رحم و کرم پر تھا۔ یہاں تک کہ حسینیوں کے زمانے میں بھی یہی حالت قائم رہی اگرچہ جنگوں کے درمیانی پر امن وقفوں میں اس خاندان نے بہت سی نئی عمارات تعمیر کرائیں جن سے شہر کی رونق بڑھتی گئی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں فرانسیسی قبضے کی وجہ سے تونس میں بڑے وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی۔ یہ ترقی ابھی تک جاری ہے۔

۱۹۷۶ء میں تونس کی کل آبادی دس لاکھ تھی۔ جس میں ایک چوتھائی یورپین اور کوئی پچاس ہزار یہودی تھے۔

تونسوی، محمد سلیمان

(۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء - ۱۲۶۰ھ/۱۸۵۱ء) برِ عظیم کے ایک بزرگ صوبہ گڑگوجی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام زکریا بن عبدالوہاب تھا۔ آپ کا خاندان افغان قوم کے جعفر یہ قبیلہ سے متعلق تھا چونکہ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا، اس لیے تعلیم و تربیت کا انتظام والدہ نے کیا۔ چار سال کی عمر میں آپ کی والدہ نے ملا یوسف جعفر کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لیے بھیجا بعد میں میاں حسن علی سے قرآن پاک پورا کیا اور ابتدائی دینی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں مولوی ولی محمد، قاضی محمد عاقل سے تکمیل تعلیم کی۔ نوعمری کے زمانے ہی میں خواجہ نور محمد مہاروی سے بیعت کی پیر کی عقیدت اور احکام کی بجاآوری میں دوسرے پیر بھائیوں سے سبقت لے گئے۔ پیر کے حکم پر دہلی کا سفر کیا۔ یہ سفر شاہ فخر کی ملاقات کے لیے کیا تھا جو آپ کے پیر کے مرشد تھے لیکن جب دہلی پہنچے تو شاہ فخر کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہاں سے واپس لوٹے۔ چھ سال مرشد کی خدمت میں رہے۔ خلافت ملنے پر مرشد کے حکم کے مطابق تونسہ میں قیام فرمایا۔ جہاں لوگ دور دور سے آپ کی بیعت کے لیے حاضر ہوتے۔ آپ نے تونسہ کو دارالعلوم بنا دیا تھا۔ آپ نے تونسہ میں کئی مدرسے قائم کیے جن میں پچاس مدرسین تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کے اس درس و تدریس کے شوق نے تونسہ کو تعلیمی مرکز بنا دیا جہاں پر دور دور سے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے۔ آپ کو خود درس دینے کا بہت شوق تھا اپنے خاص شاگردوں اور مریدوں کو سلوک و احسان کی کتابوں کا درس خود دیتے تھے۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا [illegible] حدیث اور فقہ پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ تصوف کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی تھا آپ نے نہایت عسرت میں عمر بسر کی اور ساری زندگی فقر و فاقہ میں گذاری۔

آپ نے ایک طرف تو صوفیا کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ دوسری طرف علماء کو بھی ان کا صحیح مقام بتایا۔ آپ صوفیا کو دنیاداری سے دین داری کی طرف بلاتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ کل تم کیا تھے اور آج کیا ہو گئے ہو۔ تمہاری [illegible] عبادتوں کے مرکز کیوں تبدیل ہو گئے۔ تم نے دین کی بجائے دنیا سے کیوں [illegible] لیا۔ تم نے اپنے اعتقادات میں کیوں فساد پیدا کر لیا۔ [illegible] وہی سعادت دارین کا باعث ہے۔ دوسری طرف وہ علماء کی [illegible] گمراہی کے مترادف سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ علماء کی [illegible] نہیں رہتی عوام بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ ایک صوفی کی [illegible] رہتی ہے لیکن عالم کی بے راہ روی سے عوام بھی متاثر ہو [illegible] جنت میں جاتے ہیں اور نہ دوزخ میں دونوں جگہ [illegible]

آپ شریعت کے معاملے میں نہایت سخت گیر تھے وہ [illegible] چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا محبوب ہو جائے تو اسے چاہیے کہ [illegible] کی متابعت کرے۔ آپ کا خیال تھا کہ انسانیت کا [illegible]

آپ فرماتے تھے۔ ایک غیر شرعی فعل بندے کو [illegible] دیتا ہے۔ آپ تصوف و سلوک کی مستند کتابوں کے حوالے [illegible] تھے کہ صراطِ مستقیم سے مراد راہِ شریعت ہے۔ شیخ [illegible] ہیں اور شیخ سہروردی نے عوارف المعارف میں [illegible] کے بغیر روحانیت کی دشوار گذار راہیں طے نہیں کی جا سکتیں [illegible] وفات پائی۔ نواب بہاولپور نے [illegible] روپے سے سنگ مرمر کا [illegible]

آپ کی اولاد میں دو فرزند خواجہ گل محمد اور خواجہ درویش محمد تھے لیکن دونوں آپ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے پوتے خواجہ اللہ بخش آپ کے خلیفہ ہوئے۔

آپ کے ستر سے زائد خلفاء تھے جنہیں آپ نے خرقۂ خلافت عطا [illegible] ان میں مولوی محمد باراں کلاچوی، مولوی محمد علی مکھڈی، مولوی محمد علی [illegible] احمد تونسوی، مولوی نور جہانیاں صاحب بہاول پوری، شمس الدین سیالوی وغیرہ [illegible]

پنجاب میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کا نام شاہ نور محمد مہاروی کے ذریعے پہنچا اور شاہ محمد سلیمان تونسوی کے ذریعے اس سلسلے کی تکمیل ہوئی۔ آپ [illegible] کے آخری عظیم بزرگ تھے۔ آپ کا تبحر، تقدس، اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد اپنی نظیر آپ تھی۔

تھانوی، احتشام الحق

[illegible] ہوئے۔ حضرت مولانا [illegible] تھانوی [illegible]

کی بدولت تھانوی کہلاتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی سے وابستہ رہنے کے سبب سیاسی طور پر قائداعظم اور مسلم لیگ کی حمایت کرتے رہے اور تحریک پاکستان کے زمانے میں شاندار خدمات انجام دیں۔ وعظ و تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کی زبردست خدمت کرتے رہے۔ ان کا درس قرآن ریڈیو پاکستان سے عرصے تک نشر ہوتا رہا۔ ان کی تفسیر روزنامہ "جنگ" میں باقاعدگی سے مدتوں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ ٹنڈوالہ یار کا دینی

مولانا احتشام الحق تھانوی

مدرسہ انھوں نے ہی قائم کیا تھا۔ مرکزی جمیعت العلمائے اسلام کے سربراہ بھی رہے۔ صدر ایوب خان کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ رویت ہلال کے مسئلے پر چند ماہ کی نظر بندی کی صعوبت برداشت کی۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۷۷ء میں مستعفی ہو گئے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۸۰ء کو انتقال ہوا۔

تہامہ ایک عرب صوبہ ساحل عرب کے متصل ایک نشیب اور تنگ قطعہ زمین جو جزیرہ نمائے سینا سے شروع ہو کر عرب کی مغربی اور جنوبی سمت کے ساتھ چلا گیا ہے۔

تہامہ کا مفصل حال ادریسی نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس میں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ گذرتا ہے جو خلیج قلزم سے شروع ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پشتہ کوہ مشرق کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کی مغربی سرحد پر خلیج قلزم مشرقی سرحد پر پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شمالاً جنوباً چلا گیا اور یہ صوبہ سرجہ سے عدن تک پھیلا ہوا ہے تہامہ کا وسیع ترین حصہ جدہ کا عقبی علاقہ ہے اور اکثر تہامہ کو بھی مکے ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے اور مکہ کے مندرجہ ذیل حصے تہامہ ہی میں شامل تصور کئے جاتے ہیں جو عشم، بیش، عک ہیں۔ اگرچہ عرب مصنفین اس مخصوص سمت میں تہامہ کی وسعت کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ ان تمام آراء کو یاقوت نے معجم میں بیان کیا ہے۔

تہامہ کی چوڑائی مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ بعض مقامات پر تو وہ ساحل کا ایک تنگ سا ٹکڑا ہی ہے۔ جیسا کہ الطور اور سویز کے درمیان یا قنفذہ اور لحیہ کے مقامات پر ہے یمن کے علاقہ میں تہامہ سطح سمندر سے ۴۰۰۰ فٹ بلند ہو جاتا ہے۔

عرب جغرافیہ نویسوں نے تہامہ کو نہ صرف ساحل البحر، غور اور سافلہ کا مرادف بلکہ اسے یمن، الیمامہ اور العروض کے ساتھ ساتھ ایک مستقل جغرافیائی وحدت قرار دیا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یمن کی تاریخ کے مختلف ادوار میں تہامہ اداری لحاظ سے ایک علیحدہ کورہ یا صوبہ ہوتا رہا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب ایرانیوں نے یمن کو فتح کیا تو اس کی یہی صورت تھی۔ ۸۱۹ء تا ۱۰۱۸ء بنو زیادی کے دور حکومت میں بھی اس کی یہی حیثیت تھی۔ اس کے بعد تھوڑے عرصے کے لیے تہامہ نے خود مختاری بھی حاصل کی اور زبید اس کا پائے تخت تھا۔ بعد میں صنعا کے امراء کے تحت یہ دوبارہ علیحدہ صوبہ بن گیا۔

یمنی کے حصے میں اس کی چوڑائی تیس میل سے لے کر پچاس میل تک ہے۔ تہامہ کی زمین گرم و خشک ہونے کی وجہ سے میدانی نباتات پیدا کرنے کی قدرتی اہلیت رکھتی ہے۔ باجرہ، جو، مکئی، گندم، گنا، کھجور، تل، نیل اور کپاس یہاں کی مشہور پیداوار ہیں۔

تہامہ کی آبادی کا اندازہ پچاس لاکھ کے قریب ہے۔ ساحل پر لوگ تجارت، جہاز رانی، ماہی گیری اور کشتیاں بنانے کا کام کرتے ہیں اور ملک کے اندرونی حصوں میں اکثر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کی زبان فصیح عربی سے بہت مختلف ہے۔

تھانیسری، مولانا احمد (وفات ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) ایک عالم دین اور صوفی والد کا نام محمد تھا، دہلی میں پیدا ہوئے اور تعلیم بھی دہلی ہی میں حاصل کی۔ قاضی رکن الدین عبدالمقتدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ طریقت میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید ہوئے اور تصوف میں کمال حاصل کیا۔

آپ علم و فضل اور زہد و تقوے کے باعث بہت مشہور تھے۔ جب تیمور نے دہلی پر حملہ کرنے کا قصد کیا تو دہلی سے اکثر علماء نکل کھڑے ہوئے لیکن آپ دہلی ہی میں مقیم رہے۔ بعد میں تیمور نے آپ کے مریدوں سمیت آپ کو گرفتار کر لیا لیکن جب تیمور کو آپ کے علم و فضل کا علم ہوا تو اس نے آپ کو قید سے رہا کر کے اپنے دربار میں جگہ دی۔ جب تیمور ہندوستان سے واپس چلا گیا اور تیموری حملہ کی وجہ سے دہلی کی رونق ماند پڑ گئی تو مولانا احمد تھانیسری نے بھی دہلی کو خیرباد کہہ کر کالپی میں سکونت اختیار کر لی اور وفات تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ وفات کے بعد کالپی ہی میں دفن ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں سے "قصیدۂ دالیہ" جو نعت ہے۔ بہت زیادہ مشہور ہے

تہجد کچھ دیر سونے کے بعد جاگنا بقول مولانا مودودی تہجد کے معنی نیند توڑ کر اٹھنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں قیام شب اور خصوصاً نصف رات اور فجر کے درمیان نماز (نوافل) پڑھنا تہجد ہے۔

قرآن مجید میں تہجد کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے نفل ہے۔ بعید نہیں کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر فائز کر دے۔" (۱۷: ۷۹)

جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے نماز تہجد آنحضورؐ کے لیے فرض نمازوں سے بھی ماسوا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں صحابہ کرام کا قیام شب کا دستور عام تھا۔

"اے کملی لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔" (۷۳: ۲تا۴)

ایک اور آیت میں قیام شب یا قیام لیل کے بارے میں فرمایا گیا۔

"رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز رہو اور رات کا طویل حصہ اس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔" (۷۶: ۲۶)

یہی وجہ ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپ نے اور صحابہ کرام نے قیام لیل کو فرض سمجھا اور وہ آپ کے ساتھ اتنا قیام فرماتے کہ ان کے پاؤں ورم کر جاتے (ابوداؤد)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جب آنحضورؐ رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہوتے تو اور لوگ بھی شرکت کی غرض سے آجاتے تھے لیکن آپ اتنے شفیق و رحیم تھے کہ آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر وہ اس پر اس طرح کاربند رہے تو کہیں قیام لیل امت پر ہمیشہ کے لیے فرض نہ ہو جائے۔ پس آپ نے فرمایا کہ لوگ اپنے گھروں میں تہجد پڑھیں (ابوداؤد)

مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ سورۂ مزمل کی آخری آیات کے نزول کے بعد قیام لیل اگرچہ عام مسلمانوں کے لیے تطوع ہو گیا لیکن نبی کریم کے لیے خصوصیت کے ساتھ فرض رہا۔ احادیث میں قیام لیل کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اسے تمام اعمال سے افضل کہا گیا ہے۔

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ "طول القیام" (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔ "فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

آنحضورؐ جب کبھی بیمار یا تھکے ہوتے تو بیٹھ کر نماز تہجد ادا کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ نے آنحضورؐ کی نماز تہجد کی تفصیل اس طرح بتائی ہے۔

"آنحضورؐ نماز شب عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد سے قبل فجر تک گیارہ رکعتیں پڑھتے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے ایک رکعت وتر کی نماز پڑھتے۔ سجدہ اتنا طویل کرتے کہ آدمی پچاس آیتیں پڑھ سکتا۔ سر اٹھانے سے پہلے فجر کی اذان کے بعد پھر کھڑے ہو کر دو مختصر رکعتیں پڑھ کر داہنی کروٹ سے لیٹ جاتے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ کی ایک اور روایت کہ آپ نے تیرہ رکعتیں پڑھیں ان میں وتر اور فجر کی دو سنتیں شامل ہیں۔" آپ نے تہجد کی بعض دفعہ آٹھ اور بعض دفعہ دس رکعتیں پڑھیں

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ وتر کو صلوٰۃ لیل کا آخری جزء بناؤ۔

احناف کے نزدیک وتروں کے علاوہ تہجد کے نوافل آٹھ یا چار رکعت میں دو رکعت بھی پڑھتے ہیں۔

ایک حدیث میں نماز تہجد کی ترغیب آپ نے اس طرح دلائی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آپ نے فرمایا "خداوند ہر رات کو تہائی حصہ رہ جانے پر آسمان دنیا پر آتا ہے اور آواز دیتا ہے کون ہے جو مجھ کو پکارے اور میں اس کی دعا سنوں۔ کون ہے جو مجھ سے کچھ مانگے اور میں عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے اور میں اسے بخش دوں۔" (بخاری و مسلم)

تہران ایران کا صدر مقام۔ پہلے پہل "ط" سے طہران لکھا جاتا رہا۔ بعد میں "ط" کی جگہ "ت" نے لے لی۔ تہران کا ذکر سب سے پہلے "فارس نامہ" (۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء) میں آتا ہے۔ اس کے مصنف نے تہران کے انار کی بہت تعریف کی ہے۔ تہران کے گاؤں اصطخری کا ذکر ۳۴۰ھ کے زمانے سے پہلے بھی موجود ہے۔ سمعانی نے اپنے ایک بزرگ ابوعبداللہ محمد بن حماد الطہرانی الرازی کا ذکر کیا ہے۔ جس نے عسقلان میں ۲۶۱ھ ۸۷۵ء میں انتقال کیا تھا۔

سلطان ارسلان بن طغرل نے کبھی کبھی دولاب کے قریب، جو تہران کے جنوب مشرق میں ایک جگہ کا نام ہے، قیام کیا ہے۔

ابن اسفندیار نے تاریخ طبرستان میں ایران کے حماسی دور کی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ افراسیاب اس جگہ خیمہ زن ہوا تھا جہاں اب دولاب اور تہران آباد ہیں۔

یاقوت نے تہران کے بارے میں ایک مختصر سی یادداشت لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ ایک بڑا قریہ تھا جس کے بارہ محلے تھے۔ تہران میں مکان زیر زمین بنائے گئے تھے اور اطراف قریہ کے باغات بہت گھنے تھے۔ یہ مقام اچھی طرح سے محفوظ تھا۔

۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں رے زوال پذیر ہونا شروع ہوا۔ جب مغلوں نے اس کو تباہ و برباد کر دیا تو تہران کو اہمیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ تہران کی آب و ہوا [illegible] تھی اور یہاں آبادی بھی زیادہ تھی۔

۸۰۶ھ/۱۴۰۴ء میں تیموری دور میں تہران کا ذکر آیا ہے کہ اس جگہ [illegible] نے تقریباً بیس روز تک قیام کیا تھا۔

تہران میں آنے والے پہلے یورپی سیاح کلاویخو نے تہران کے بارے میں لکھا ہے کہ اس وقت تیمور کا داماد امیر سلیمان شاہ رے میں حکومت کرتا تھا وہ [illegible] شہر سے بے آباد تھا۔ برج تہران میں اس کا ایک [illegible] (گورنر) رہا کرتا تھا۔ یہ ایک خاص عمارت تھی جس میں بادشاہ اپنے قیام کے دوران میں ٹھہرا کرتا تھا۔ [illegible] اس کے گرد اس وقت کوئی فصیل نہ تھی۔

صفویوں کے عہد میں رے کی کچھ زیادہ اہمیت نہ رہی تھی۔ [illegible] قابل ذکر رہ گئے تھے۔ ایک تہران اور دوسرا ورامین۔ تہران کی خوشحالی شاہ طہماسپ [illegible] دور ہی سے شروع ہوئی ہے۔ چنانچہ صفویوں کے دور میں تہران [illegible] شہر کی حیثیت سے ترقی کر گیا۔ شاہ طہماسپ اول نے ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں [illegible] بنوائے اور شہر کے اردگرد ایک فصیل بنوائی جس میں چار دروازے [illegible] تھے۔ [illegible] کی لمبائی تقریباً ایک فرسخ تھی۔ ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء میں [illegible] گیا۔ ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں نادر شاہ نے تہران کا علاقہ اپنے بڑے [illegible] جاگیر میں دے دیا۔ خاندان نادری کے زوال کے بعد [illegible] ۱۷۵۹ء میں کریم خان زند نے قاچاریوں کو شکست دی اور تہران پر قبضہ کر لیا۔ [illegible] تہران کو اپنا پایۂ تخت بنانا چاہتا تھا۔ لیکن [illegible] کو اس مقصد کے لیے چنا۔ جب آقا محمد قاچار کریم خان کے سامنے [illegible] مہربانی سے پیش آیا اور معاف کر دیا۔

۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں کریم خان کے انتقال کے بعد آقا محمد خان [illegible] میں قبضہ کر لیا۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں آقا محمد کی فوجوں نے تہران کا محاصرہ کر [illegible] تہران پر آقا محمد قاچار کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے تہران کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ [illegible] ایران مکمل طور پر فتح کر لیا تو تہران کو ایران کا دارالحکومت قرار دے دیا [illegible] کی یہ حیثیت قائم ہے۔

۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء میں آقا محمد قاچار کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد فتح علی [illegible] ہوا۔ فتح علی شاہ کے بعد [illegible] تخت پر بیٹھا۔ اس نے [illegible] حکومت کی۔ [illegible] کے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے۔ ان بادشاہوں کے دور حکومت میں [illegible] چین میں وبائی امراض خلل انداز ہوتے رہے۔ [illegible] سے نقل مکان کرتے رہے۔

قاچاریوں کے عہد میں تہران نے بہت ترقی کی۔ کئی عمارت تعمیر ہوئیں [illegible] گلستان اور مسجد شاہ جیسی قابل دید عمارات ہیں۔ ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۴ء [illegible] عمل میں آئیں۔ شہر کو ہر سمت میں وسعت دی گئی۔ پرانی خندق اور فصیل [illegible] ہو گیا۔ ۱۸۷۴ء میں شہر میں بارہ دروازے بنائے گئے۔ [illegible]

تعمیرات وغیرہ۔
انقلاب ایران کے بعد سے تمدن جو اس سے قبل بائیں صدیوں سے کچھ الگ تھلگ تھا یورپ کے ساتھ آملا۔ یہ سیاسی اور علمی کاوشوں کا مرکز بن گیا۔ موجودہ زمانے میں کئی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مثلاً بانک شہنشاہی، دانش گاہ، ریلوے سٹیشن، مسجد سپہ سالار جو شہر کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار ہے۔ وغیرہ تہران ایران کے نظام رسل و رسائل میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ ایک بین الاقوامی ہوائی اڈا ہے۔ یورپ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، افغانستان اور پاکستان جیسے ممالک سے اس کا اتصال ہے۔

تہران کی جامع مسجد

تہران میں برابر توسیع ہو رہی ہے۔ آج کل شمال کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اب یہ ایران کا سب سے بڑا شہر خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں تہران کا نقشہ بدل دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں تہران کی آبادی تخمیناً چار لاکھ تھی۔

جدید تہران کے تاریخی مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔
شہر کے درمیان میں میدان سپاہ (فوجی میدان)، شہرداری (ٹاؤن ہال) اور اس کے نزدیک بہت سی وزارتی عمارات ہیں۔ پولیس ہیڈکوارٹرز ایک جدید عمارت ہے۔ آثار قدیمہ کا ایک عجائب گھر ہے میدان سپاہ کے جنوب میں قصر گلستان ہے جو انیسویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جو اب ایک عجائب گھر بنا دیا گیا ہے اور جس میں بہت سے تاریخی نوادرات مثلاً تخت طاؤس جیسی چیزیں ہیں اس کے نزدیک ہی بازار میں مسجد شاہ ہے جو قاچار دور کی یادگار ہے۔ میدان سپاہ کے مشرق میں شمال مشرق کی طرف قصر بہارستان ہے جہاں قومی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس عمارت میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے۔ قصر بہارستان کے بالکل نزدیک جنوب میں مسجد سپاہ سالار ہے۔ جس میں آج کل تھیالوجیکل کالج اور لائبریری قائم ہے شہر کے مغرب میں خاک مرمر (قصر ماربل) ہے جو شاہ کی اقامت گاہوں میں سے ایک ہے۔ شہر کے شمال مغرب میں تہران یونیورسٹی ہے شہر کے جنوبی حصے میں خیابان پہلوی کے ساتھ ہی ریلوے سٹیشن ہے جو کہ ایک بڑی اور باا ثر عمارت ہے۔ اس کے علاوہ دو باغ "باغ ملی" اور "باغ شاہ" ہیں تہران سے پانچ میل دور مہرآباد میں ہوائی اڈا ہے۔ اس کے علاوہ کپڑے، سیمنٹ، سگریٹ، چینی، چمڑا اور اسلحہ بنانے کے کارخانے ہیں۔

تہلیل کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہنا۔ یعنی اس بات کا اقرار کرنا: "نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے"۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ تہلیل کا لفظ لا الٰہ الا اللہ سے اسی طرح ماخوذ ہے جیسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے کو بسملہ اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہنے کو تحولق (تحوقل) کہتے ہیں۔
احادیث میں اس کلمے کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں اور ذکر الٰہی میں یہ کلمہ بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔
حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا: "ایمان کے ستر سے اوپر دروازے ہیں۔ ان میں سب سے ارفع اور اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے" (مسند احمد)
ایک اور جگہ لا الٰہ الا اللہ بکثرت کہنے کو تجدید ایمان کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ (مسند احمد)
ایک اور حدیث میں اس کلمے کو ان چار کلموں میں شمار کیا گیا ہے جو اللہ تعالےٰ کو بہت زیادہ پسند ہیں۔ (مسند احمد)
ایک حدیث میں آیا ہے کہ
آپؐ نے فرمایا "بے شک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر انسان مرتے دم اسے ادا کرے تو اس کی روح کو جسم سے جدا ہوتے وقت ایک نئی تازگی مل جائے اور قیامت کے دن وہ اس کے لیے نور کا کام دے گی۔" (مسند احمد)
آنحضورؐ نے ایک حدیث میں حکم دیا ہے۔
"تیمارداروں کو چاہیے کہ مرنے والے کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کریں۔" (مسند احمد)
جب آپؐ کو نبوت ملی تو آپ اکثر اجتماع کے مقامات پر تشریف لے جاتے اور اس کلمے کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے:
"لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو تمہاری فلاح و بہبود اسی کلمے سے وابستہ ہے۔" (مسند احمد)
حضرت عمرؓ نے اس کلمے کو کلمۂ اخلاص اور کلمۂ تقوےٰ قرار دیا ہے۔
اس کلمے کے پہلے حصے لا الٰہ میں تمام مطلوبوں اور الٰہوں کی نفی ہے اور دوسرے حصے الا اللہ میں خدائے واحد کی وحدانیت کا اثبات ہے۔ اور یہی تہلیل کا مفہوم بھی ہے۔

تیرانا مملکت البانیا کا صدر مقام، جو سطح سمندر سے ۴۰۰ فٹ بلندی پر کوہ ملبی واجتت کے ۵۳۰۰ فٹ لمبے چوڑے دامن میں واقع ہے۔ مشرق، جنوب اور مغرب میں پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔
تیرانا کی بنیاد ۱۶۰۰ء کے قریب بازفین زادہ سلیمان پاشا نے رکھی تھی۔ اور اس نے اپنی ایرانی فتوحات کی یادگاروں کے طور پر ان کا نام تہران رکھا تھا جو بگڑ کر تیران یا تیرانہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جدید تحقیق کی رو سے تیرانا کا ذکر ۲ دسمبر ۱۴۷۰ء میں بھی ملتا ہے جب تیرانا کے میدان میں وینس کا کمانڈر فرانسسکو کونٹارینی اڑھائی ہزار سواروں اور البانوی پیادہ فوج کے ساتھ ترکوں سے لڑا تھا اور بری طرح شکست سے دوچار ہوا تھا۔ تقریباً

...۱۸ء کے بعد اس شہر پر کردیہ کے خاندان توپتان کا قبضہ ہوگیا۔ اس خاندان کے ایک رکن قپلان احمد پاشا کو جس نے ایک لڑائی میں جو والیٔ اشقودرہ البانیہ کے خلاف لڑی گئی تھی، کارہائے نمایاں انجام دینے پر سلطان نے تیرانا کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ ۱۸۲۰ء کی خانہ جنگی کے زمانے میں تیرانا کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۳۹ء تک احمد بیگ شاہ زوگ حکمران رہا۔ ۱۹۳۹ء میں اس شہر پر اٹلی کا قبضہ ہوگیا۔ اٹلی اور جرمنی کی فوجوں نے اس شہر کو خوب تاخت وتاراج کیا۔ ۱۹۴۴ء میں اہل البانیہ نے جرمنوں سے یہ ملک واپس لے لیا اور ۱۹۴۶ء میں ایک خودمختار عوامی جمہوریت قائم کی گئی۔ اس زمانے سے یہ شہر [illegible] ترقی کر رہا ہے۔ نئے محلے آباد کیے گئے۔ کئی نئے کارخانے قائم ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کئی ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم ہیں۔ پانچ کالجوں میں زراعت طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شہر میں پرانی یادگاریں بہت کم ہیں۔ ان یادگاروں میں زیادہ مشہور مسجد حاجی ادھم بے اور جامع مسجد احصاف ہیں۔ جامع مسجد سلیمان پاشا نے ۱۶۰۵ء میں تعمیر کرائی تھی۔ تیرانا کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ البانیا کے مفتی اعظم کی جائے قرار ہے۔ بے شمار مسلمان امراء کا وطن ہونے کی وجہ سے اسے البانیہ میں مسلمانوں کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ تجارتی لحاظ سے بھی تیرانا کو بہت اہم مقام حاصل ہے کیونکہ یہ شہر البانیا کے زرعی پیداوار کی تجارتی منڈی ہے۔

تیط مراکش میں بحر اسکاہل کے ساحل پر ایک مقام ــــــ ۔ مقامی روایت کے مطابق تیط کے بانی ولی اسماعیل امغار (شیخ) تھے جو آسمانی روشنی کی رہنمائی میں مدینے سے یہاں آئے اور ایک چشمہ کے سامنے جو سمندر میں تھا۔ آپ جنگل میں قیام پذیر ہوئے۔ جب کبھی آپ کو روزہ افطار کرنا ہوتا تو آپ سمندر کی لہروں پر چل کر اس چشمے پر جایا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کا نام تیط۔ ان۔ فطر مشہور ہوگیا۔

اسماعیل شیخ نے اس علاقے کے سردار کی لڑکی سے شادی کی اور امغاریوں کے خاندان شرفا کے مورث اعلیٰ بن گئے۔ اسی خاندان کے ایک رکن مولائے عبداللہ نے تیط کا اہم رباط بارہویں صدی عیسوی میں قائم کیا۔

اس علاقے کے بارے زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں العمری نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔ "تیط مراکش کے ۲۴ بڑے شہروں میں سے ہے۔ ۱۵۱۲ء میں جب پرتگیزوں کا ازمور پر قبضہ ہوگیا تو تیط نے بھی ان کی اطاعت قبول کرلی اور خراج ادا کرنے لگا۔ جلد ہی ۱۵۱۴ء سے میں وطاسی خاندان کے حکمران محمد ان صر نے اس خوف سے کہ کہیں رباط عیسائیوں کا فوجی مرکز نہ بن جائے۔ اس کی فصیلیں مسمار کرادیں اور یہاں کے باشندوں کو فاس کے علاقے میں بھجوا دیا۔ اس سے تیط کی اہمیت بالکل ختم ہوگئی۔ موجودہ دور میں تیط ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کے اردگرد قدیم تیط کے برجوں اور دروازوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ لوگ اب اس کو مولائی عبداللہ کے نام سے جانتے ہیں۔

تیمم قصد کرنا۔ ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک مٹی یا اس کی قائم مقام کسی چیز سے خاص طریقے کے ساتھ پاکیزگی حاصل کرنا۔

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کی اجازت غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ھ میں ہوا تھا۔ جب حضرت عائشہؓ کا ہار تلاش کرنے میں لوگوں کو اتنی دیر لگ گئی کہ پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو یہ اجازت نازل ہوئی تھی۔

قرآن مجید میں تیمم کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے۔

"اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کرکے آئے یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔ بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا ہے اور بخشش فرمانے والا ہے۔" (۴: ۴۳)

"اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کرکے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو۔ بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اللہ تم پر تنگی نہیں چاہتا مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردے تاکہ تم شکرگذار بنو۔" (۵: ۶)

حضرت عمرانؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں آنحضورؐ کے ساتھ تھے آپؐ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب نماز پوری ہوگئی تو دیکھا کہ ایک شخص سب سے الگ بیٹھا ہے۔ اس نے سب کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تو فرمایا اے فلاں تو نے [illegible] کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی۔ اس نے کہا میں ناپاک تھا اور پانی نہیں [illegible] فرمایا تمہیں تو تیمم کرلینا ہی کافی تھا۔ (بخاری ومسلم)

حضرت عمارؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ بن الخطاب کے پاس آیا اور کہا کہ میں جنبی ہوں اور پانی نہیں۔ حضرت عمارؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا۔ آپ کو وہ واقعہ یاد نہیں کہ میں اور آپ ایک سفر میں جنبی ہوگئے تھے تو آپ نے نماز نہیں پڑھی اور میں نے خاک میں لوٹ کر تیمم کرلیا اور نماز پڑھ لی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ خاک پر لوٹنے کی بجائے [illegible] تیمم کرلینا کافی تھا۔ اور آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور پھونک مار کر [illegible] اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔ (بخاری) مسلم سے بھی [illegible] کی مانند روایت [illegible] وہ کہتے ہیں کہ زمین پر ہاتھ مار کر پھر پھونک کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرلینا [illegible] کافی ہے۔ (مسلم)

تیمم وضو کا کام بھی دے سکتا ہے اور غسل کی بجائے بھی کافی ہوسکتا ہے [illegible] کا طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر اور یہ نیت کرکے کہ میں پاک ہونے کے [illegible] غسل کی بجائے تیمم کرتا ہوں۔ پاک مٹی پر یا گرد آلود چیز پر دونوں ہاتھ [illegible] کہنیوں تک ملے جائیں۔ انگوٹھی، ہاتھ کے زیور وغیرہ کو ہلا لینا چاہیے۔ [illegible] کا یہی مسلک ہے۔

اہل حدیث حضرات اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک صرف [illegible] مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر پھیر لیا جائے اور [illegible] کو کلائی تک [illegible] پھیر لیا جائے کہنیوں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ وضو [illegible] کے لیے تیمم کافی ہے مگر دونوں کے لیے جدا جدا نیت فرض ہے۔ [illegible] تیمم میں بھی یہ شرط ہے کہ ہاتھ اور منہ کی کوئی ایسی جگہ نہ رہے جس پر ہاتھ نہ [illegible]

فقہی نقطۂ نظر سے تیمم کی اجازت ان صورتوں میں ہے:

۱۔ سفر میں یا شہر سے باہر ہو اور ایک کوس تک قریب پانی نہ ملے۔
۲۔ غسل کی حاجت ہو اور پانی صرف وضو کے لیے مل سکتا ہو۔
۳۔ پانی صرف پینے کے لیے اور اس کو وضو میں برتنے سے یہ اندیشہ ہو کہ اسے یا اس کے ساتھی یا ساتھ کے جانوروں کو پیاس سے تکلیف ہوگی۔
۴۔ پانی تک جانے میں دشمن یا درندے کا خوف ہو یا آگ لگ جانے یا مال چوری ہوجانے کا اندیشہ ہو۔
۵۔ کنواں موجود ہو مگر پانی نکالنے کے لیے ڈول وغیرہ نہ ہو۔
۶۔ ساتھی کے پاس پانی ہو مگر وہ قیمت پر دیتا ہو اور قیمت موجود نہ ہو یا وہ [illegible]

وہ بہت گراں دیتا ہو۔
۷۔ بیماری کے باعث پانی استعمال کرنے سے معذور ہو۔
۸۔ پانی استعمال کرنے سے بیمار ہونے یا بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔
۹۔ عید کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو یا عید کی نماز میں وضو ٹوٹ جائے اور وضو کرتے کرتے نماز کے جاتے رہنے کا احتمال ہو۔
۱۰۔ نماز جنازہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔ لیکن جنازہ کے ولی کو تیمم کرنا جائز نہیں پانی ملنے کی امید میں نماز کے آخر وقت تک توقف کرنا مستحب ہے۔ لیکن اگر اوّل وقت میں ہی تیمم کر کے نماز پڑھ لی جائے اور پھر وقت کے اندر اندر پانی مل جائے تو نماز دوہرانا واجب نہیں۔ جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تیمم بھی ان چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیمم پانی مل جانے پر اور عذر رفع ہو جانے پر بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تیمور ۲۰ شعبان ۷۳۶ھ/۹ اپریل ۱۳۳۶ء - ۱۷ شعبان ۸۰۷ھ/۱۸ فروری ۱۴۰۵ء فاتح ایشیا۔ امیر ترغائی کا بیٹا۔ تکینہ خاتون کے بطن سے تھا اس کا باپ حاجی برلاس سے پہلے کش اور اس کے ملحقہ علاقے کا حاکم تھا۔ اس کے خاندان کا دعوے تھا کہ وہ چنگیز خان کی اولاد سے ہیں۔ خواجہ ایلغار نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ آج کل مولود خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ لنگ کا لقب تیمور کو ایک زخم کی وجہ سے ملا تھا۔

تیمور ابتدائے عمر ہی میں نہایت ذہین اور شجاع تھا۔ پہلے اس نے امیر قازغان کی ملازمت کر لی جو ایک مقامی حکمران تھا۔ جب توغلوق تیمور خان نے ماوراء النہر پر حملہ کیا تو تیمور حاجی برلاس کے ہمراہ فرار ہو گیا۔ لیکن جلدی ہی واپس آ کر اپنے ہموطنوں کی مظلومیت کا حال بیان کرنے کے لیے فاتحین کے سامنے پیش ہوا اور توغلوق تیمور خان کے پاس جا کر اپنے قبیلے کی طرف سے اطاعت کی قسم کھائی۔ اس اقدام کی بنا پر اور اس کی بہادری سے متاثر ہو کر توغلوق تیمور خان نے اسے اپنے بیٹے الیاس کا، جسے اس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کا انتظام کرنے کے لیے سمرقند کا والی بنایا تھا، وزیر مقرر کیا اور اس طرح تیمور پچیس سال کی عمر ہی میں سیاست کے میدان میں داخل ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اپنے سالے امیر حسین سے جا ملا۔ جس نے چغتائی شہنشاہ توغلوق تیمور خان کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ امیر حسین نے ماوراء النہر کے علاقے سے جو اب الیاس کے قبضے میں تھا، چغتائی فوجوں کو اس علاقے سے نکالنے کے لیے اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ اگرچہ اس معاملے میں پہلے پہلے تو انہیں (امیر حسین اور تیمور) کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بالکل آخر توغلوق تیمور خان اور اس کا بیٹا الیاس ایک جنگ میں مارے گئے لیکن امیر حسین انتہا درجے کا حاسد تھا۔ چنانچہ تیمور اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس پر حملہ کر کے اس کو قتل کرا دیا۔ اس طرح تیمور ۷۷۱ھ/۱۳۷۰ء میں جانشین چنگیز اور تیمور کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس وقت سے اسے ترکوں کے ہاں "الغ بیگ" یا "بک" اور جن علاقوں میں فارسی بولی جاتی تھی وہاں پر "امیر" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

تیمور نے ۷۷۱ھ تا ۷۸۲ھ/۱۳۷۰ء سے ۱۳۸۰ء کے درمیان اس نے چغتائی قوم کے مشرقی حصوں پر جو جتہ کے نام سے مشہور تھے اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی اس مقصد کے لیے وہ دس سال سے زیادہ لڑتا بھڑتا رہا۔ اس نے نو بار لشکر کشی کی پانچ بار بلاد جتہ پر اور چار مرتبہ بلاد خوارزم کے خلاف۔

اس نے ۷۷۲ھ/۱۳۷۲ء میں کاث وخیوہ پر چڑھائی کی اور علاقہ کاث کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۷۷۳ھ/۱۳۷۳ء میں تیمور نے ایک بار پھر خوارزم کا رخ کیا۔ اور اپنے تمام سابقہ علاقے واپس لے لیے۔ ۷۷۷ھ/۱۳۷۶ء میں تیمور نے قپچاق کی تقسیم کے وقت تقتمش خان کی حمایت کی تھی جو کریمیا کا خان تھا ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء ۱۳۸۱ء میں تیمور نے تقتمش کو روسیوں کے خلاف بھیجا۔ چنانچہ اس نے ماسکو فتح کر کے شہر کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن اس کے چار سال بعد ہی تقتمش تیمور کے خلاف ہو گیا جو اس کا محسن تھا۔ پہلے تو اس نے فتح پائی۔ لیکن بعد میں ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں تیمور نے اسے شکست دی۔

۱۳۸۰ء سے ۱۳۸۱ء میں تیمور نے ایران کی فتح کا عزم کیا۔ اور اس کی ابتدا خراسان کے حملے سے کی۔ خراسان فتح کرنے کے بعد ۷۸۴ھ/۱۳۸۳ء میں کفار مغول کے خلاف ایک مہم سے واپس آ کر اس نے گرگان، مازندران اور سیستان کو فتح کیا ۷۸۶ھ ۱۳۸۴ء میں ہرات کی بغاوت کے خاتمے پر اس علاقے پر بھی اس کا مکمل قبضہ ہو گیا ۷۸۸ھ تا ۷۹۰ھ/۱۳۸۶ء تا ۱۳۸۷ء تک تیمور فارس، عراق، لرستان اور آذربائیجان کی فتح میں مشغول ہو گیا اور جلد ہی ان علاقوں پر قابض ہو گیا۔ جب اصفہان کے لوگوں نے تیمور کے خلاف ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء میں بغاوت کی تو اس بغاوت کو جسے آذربائیجان اور عراق کے سابق فرمانروا کی حمایت حاصل تھی کچلتے وقت تیمور نے ستر ہزار باشندوں کو قتل کرا کر ان کی کھوپڑیوں سے مینار بنوا لیے۔

چونکہ تقتمش ابھی تک برابر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور جس وقت تیمور ایران کی مہم میں مصروف تھا تو تقتمش نے سمرقند اور کش تک کے علاقے پر حملہ کر کے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ خوارزم تقتمش کا فوجی مستقر تھا۔ چنانچہ تیمور نے ایران کی مہم سے واپس لوٹ کر مصمم ارادہ کر لیا۔ ۱۳۸۸ء میں وہ خوارزم کی طرف بڑھا۔ اور ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں سیر دریا کے طاس میں داخل ہوا۔

۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء میں تیمور اپنی پنجسالہ مہم پر روانہ ہوا۔ آذربائیجان سے روانہ ہو کر وہ پورے قفقاز کو طے کر کے گرجستان اور آرمینیا پہنچا اور ان پر قابض ہو گیا ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں آل مظفر کا خاتمہ کر کے علاقہ فارس کو مکمل طور پر تسخیر کر لیا۔ اور اپنے بیٹے عمر شیخ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ بغداد پر فوج کشی کر کے اس نے بغداد کو بھی فتح کر لیا۔

سلطان احمد جلائر بغداد سے بھاگ کر شام پہنچا جہاں وہ سلطان مصر الملک الظاہر برقوق کا باجگزار بن گیا۔ جب ملک الظاہر نے اسے تیمور کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر تیمور نے ایشیائے کوچک پر حملہ کر کے الرہا فتح کر لیا اور اسے تاخت و تاراج کر ڈالا۔ تکریت ماردین اور آمد بھی تسخیر کر لیے۔ اس جنگ میں شیخ مارا گیا۔ ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں دربند کے مقام پر تقتمش کو شکست دی اور اس علاقے کے ان تمام فوجی استحکامات کو جو تقتمش کے لیے فوجی مستقر کی حیثیت رکھتے تھے، تباہ و برباد کر ڈالے۔ تیمور کی فوجیں بڑھتے بڑھتے علاقہ قازان میں دریائے والگا اور دریائے کاما کے سنگم تک پہنچ گئیں۔ یہاں سے وہ کیف سے ہوتا ہوا روس کے اندرونی علاقے سے گذرتا ماسکو تک پہنچا۔ اس نے روس کے متعدد شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ ماسکو پر تیمور ایک سال تک قابض رہا۔

۷۹۸ھ/۱۳۹۶ء میں تیمور نے آذربائیجان کا رخ کیا۔ رمضان کے مہینے میں نہاوند پہنچا۔ نہاوند سے ہمدان پہنچا اور یہاں عید منانے کے بعد ایران کے مختلف حصوں پر حکومت کرنے کیلئے والی مقرر کیے۔ اس دوران میں یزد میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو اس نے اس بغاوت کو دبا دیا۔ اس دوران میں تقریباً فارس کے تیس ہزار باشندے قتل کیے گئے۔

تسخیر ایران کے بعد تیمور کا ارادہ تھا کہ وہ چین جائے اور ان چینی شہزادوں کو ان کا حق دوبارہ واپس دلائے جو اس کی کفالت میں تھے۔ اس کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان شہزادوں کو ان کا حق دلانے کے ضمن میں وہ مشرقی ترکستان اور منگولیا پر قابض ہو کر اس تمام علاقے کو مسلمان بنا سکتا ہے۔ لیکن اس مہم کا آغاز کرنے سے پہلے ہندوستان پر فوج کشی ضروری تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تیمور کی مملکت کی جو سرحد ملتان اور کابل کے مقامات پر ہندوستان سے ملتی تھی وہ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔

چنانچہ مارچ ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں تیمور ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ۲۴ ستمبر کو اس نے دریائے سندھ پار کر کے ۱۸ دسمبر کو دہلی کو فتح کر لیا۔ اسّی ہزار باشندوں کا قتل عام کیا اور شہر کو ویران کر دیا۔ چند روز دہلی میں گذارنے کے بعد تیمور ۸۰۲ھ/۸ جنوری ۱۳۹۹ء میں میرٹھ پہنچا اور قلعہ میرٹھ کی تسخیر کے بعد اس نے کوہ ہمالیہ کے دامن کے راجاؤں کو مغلوب کیا۔ کشمیر کی سرحد جھان پر پہنچنے کے بعد تیمور نے واپس سمرقند لوٹنے کی تیاری کی۔ دہلی اور ملتان میں اس نے سالہ تغلق حکام کا تقرر کیا۔ جنہوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اگرچہ دہلی میں اس کے بہت سے کام ناتمام رہ گئے تھے۔ لیکن ان کاموں کو ادھورا چھوڑ کر عجلت میں سمرقند لوٹنے کے بعض اسباب تھے۔ اناطولیہ کوچک میں اس وقت جو ناساز گار حالات پیدا ہو گئے تھے، ان حالات سے مجبور ہو کر تیمور کو ایک بار پھر اس طرف کوچ کرنا پڑا۔ چنانچہ ۸۰۲ھ/۱۰ ستمبر ۱۳۹۹ء میں وہ دوبارہ اس طرف روانہ ہوا۔ آذربائیجان پہنچتے ہی فوراً اپنے بیٹے میران شاہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے خلاف ضروری کارروائی کر کے تیمور نے گرجستان کو تباہ و برباد کیا۔ ۸۰۳ھ/اگست ۱۴۰۰ء میں ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور سیواس میں آ دھمکا یہاں اس نے اپنے مخالف تقریباً ۴ ہزار سواروں کو کنوؤں میں زندہ دفن کرا دیا۔ سیواس سے وہ ملطیہ، حلب، حماۃ، حمص اور بعلبک ہوتا ہوا شام پہنچا اور دمشق پر قابض ہو گیا۔ ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں دوبارہ بغداد پر قبضہ کر کے ان بیس ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا جنہوں نے سلطان احمد جلائر کی حمایت کی تھی۔ ابن عرب شاہ نے ان کی تعداد چالیس ہزار بیان کی ہے۔

جب تیمور گرجستان کی تازہ مہم سے واپس آیا تو بایزید اول جس نے مصر کے عباسیوں سے سند حکومت طلب کی تھی اور تیمور کے دوست بزنطی بادشاہ پر حملہ کیا تھا اور تیمور کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ انقرہ کے میدان میں ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء کو ایک بڑا معرکہ کارزار گرم ہوا جس میں بایزید کو شکست ہوئی۔ اور وہ قید کر لیا گیا بالآخر ۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تیمور نے ازمیر کو فتح کیا اور ۸۰۶ھ/۱۴۰۴ء میں سمرقند واپس آ گیا۔ جہاں سے اس نے چین کے خلاف نئی مہم کا آغاز کیا۔ ۸۰۷ھ/۱۴۰۴ء میں اس نے یہ مہم شروع کر دی۔ اور جیحون دریا کو جس پر برف جمی ہوئی تھی عبور کر لیا۔ اترار کے مقام پر تقتمش کی درخواست پر اس کو معاف کر دیا۔ اس مہم کے دوران میں اس نے بہت سے علما کو اپنے ساتھ لیا تاکہ ان کی مدد سے بدھ مذہب کے پیروؤں اور چین کی راہ میں ملنے والے شامنی مذہب والوں کو مسلمان کیا جا سکے۔ تیمور نے فیصلہ کیا تھا کہ چین اور منگولیا کے علاقوں کو فتح کر کے اپنے پوتے محمد سلطان کے سپرد کر دے گا لیکن اس کا آق شہر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے یہاں کے عمل داری دوسرے پوتے الغ بیگ کے حوالے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ۱۰ شعبان ۸۰۷ھ/۱۱ فروری ۱۴۰۵ء کو وہ بیمار پڑ گیا۔ بالآخر ۱۷ شعبان یعنی ۱۸ فروری کو ۷۱ سال کی عمر میں ۳۶ سال حکومت کرنے کے بعد تیمور کا انتقال ہو گیا۔ یہاں سے اس کی میت سمرقند لائی گئی اور گور میر کی شاندار عمارت میں اسے دفن کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ رخ اس کا جانشین بنا۔

تیمور کے دائیں ہاتھ میں عیب تھا اور دائیں ٹانگ میں لنگ تھا۔ ۱۹۴۱ء میں پروفیسر گریمی یازوف اور پروفیسر اوشانن نے تیمور کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیوں کا معائنہ کر کے ثابت کیا کہ اس کے دائیں ہاتھ اور ٹانگ میں نقص خرابی تھی۔

تیمور سنجیدہ طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کے مزاج میں جدت تھی۔ منافقت کا دشمن تھا۔ صاف گوئی کو پسند کرتا تھا۔ بعض لوگوں نے اس کے انصاف کی بہت تعریف کی ہے۔ نہایت سخت مزاج تھا۔ مجرموں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرتا تھا۔ حافظہ خداداد تھا۔ ان پڑھ تھا۔ فارسی ترکی اور معمولی جانتا تھا عربی سے قطعاً ناآشنا تھا۔ فن تعمیر سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ اس نے کئی مساجد، محل تعمیر کیے کئی باغات لگوائے جو بہت مشہور تھے۔

تیمور ایک طویل قامت انسان تھا اس کا سر بہت بڑا تھا۔ اس کی چار بیویاں تھیں ان میں سے پہلی بیوی اولجائی ترکان ماوراءالنہر کے حکمران قازغان کی پوتی تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ اور ایک بیٹی تھی ۱۔ غیاث الدین جہانگیر ۲۔ معزالدین عمر شیخ ۳۔ جلال الدین گورگان عرف میران شاہ ۴۔ شاہ رخ۔ بیٹی کا نام سلطان بخت تھا۔ جس کی شادی سلیمان شاہ سے ہوئی تھی۔

تاریخ میں تیمور کو خاندان تیموریہ (مغلیہ خاندان) کے بانی کے علاوہ فنون لطیفہ اور ثقافت کے مربی کی حیثیت سے بھی یاد کیا جاتا ہے ایران میں تیموری عہد کے فن آرٹ کی سرپرستی تیمور ہی نے کی تھی۔ اسے محلات اور باغات تعمیر کرانے کا بے حد شوق تھا۔ سمرقند کے محلات اور باغات اسی کے ذوق کی شہادت دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں نکلوانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

تیمور کو علم تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ تاریخی شخصیتوں میں وہ محمود کو سب سے زیادہ محبوب و محترم جانتا تھا۔ تصور حکومت میں وہ چنگیز خان اور محمود غزنوی سے بے حد متاثر تھا۔ سادات اور علما کا بے حد احترام کرتا تھا۔ شیخ زین الدین ... کو روحانی پیشوا مانتا تھا۔ اسے منافقت سے سخت نفرت تھی اور حق و راست گوئی کو پسند کرتا تھا۔ خود شراب کا رسیا تھا اور ... اس معاملے میں وہ شریعت کی بجائے چنگیزی یاسا کا پابند تھا۔ ... کے باوجود وہ معارف دینی کی تحقیق میں لگا رہتا تھا۔

تیموری عہد اس سے مراد یوں تو تیمور کے تمام خاندان ہیں لیکن خاص طور پر ... تیموری خاندان کے دو شہزادے ... ... حکمران رہے۔ اس خاندان کی تاریخ دو ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ دور اول میں تیمور کی سلطنت اس کے بیٹوں اور پوتوں میں تقسیم ہو گئی تھی لیکن جلد اس کے دو حصے ہو گئے۔ مغرب میں میران شاہ اور اس کے بیٹوں ابو بکر اور محمد قلی ... ہو گئی اور مشرق میں شاہ رخ کی جو پہلے پہل خراسان تک محدود تھی لیکن تھوڑے عرصے ہی میں ماوراءالنہر کا علاقہ بھی اس کی سلطنت میں شامل ہو گیا اور ... علاقے جو امیر تیمور کی حکمرانی میں تھے۔ شاہ رخ کے زیر اقتدار آ گئے۔

دوسرا دور شاہ رخ کے انتقال سے جنگ ... تک ہے۔ ... تیموری سلطنت کو آخر ... لگی۔ اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

امیر تیمور کی وفات پر امرا کا یہ خیال تھا کہ جب تک چین کی تسخیر مکمل نہیں ہو جاتی اس وقت امیر تیمور کی وفات کو چھپائے رکھنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس مہم کے دوران میں شہزادہ خلیل کو حاکم بنانے اور دارالسلطنت کے جانے کے ... کرنے اور نیز مہم کے انتظام پر خلیل ... تیمور کی خواہش کے مطابق حکومت ...

حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں دعویداران حکومت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ چنانچہ دو مرتبہ شکست کھانے کے بعد پیر محمد نے خلیل کی اطاعت قبول کر لی خلیل نے اس کا علاقہ اسی کے پاس رہنے دیا لیکن اس کے چھ ماہ بعد پیر علی تاز وزیر نے اس کو قتل کرا دیا اور خود اس کے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اسی کوشش میں اسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ادھر امراء نے خلیل کا بھی ساتھ چھوڑ دیا اور اسے معزول کر دیا لیکن ۸۰۹ھ/۱۴۰۷ء میں اس کی اتابک شولؒ کے لیے عراق کی حکومت اس کے حوالے کر دی گئی۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے باقی دن گذارے۔

میران شاہ اپنے بیٹے ابوبکر کے ساتھ امیر تیمور کی نصیحت کے مطابق اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمد عمر کی نگرانی میں اپنی سلطنت پر جو صوبہ جات عراق، آذربائیجان موغان، شیروان اور گرجستان پر مشتمل تھی حکومت کرتا رہا۔ ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء میں اس نے بھی شاہرخ کی اطاعت قبول کر لی۔ وہ ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں قرا یوسف کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ تقریباً اسی زمانے میں اس کے بیٹے بھی ہلاک ہو گئے۔

جب امیر تیمور نے وفات پائی تو شاہرخ خراسان کا حاکم تھا۔ اس نے ۸۰۹ھ/۱۴۰۷ء میں مازندران فتح کیا۔ ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں ماوراء النہر پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ شاہرخ نے ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں فارس ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں کرمان اور آذربائیجان کے علاقوں کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ آخر کار شام اور عربستان کے سوا وہ علاقے جو امیر تیمور کی سلطنت میں شامل تھے شاہرخ کے قبضے میں آ گئے۔ اس کے عہد حکومت میں کئی بغاوتیں بھی ہوئیں جو دبا دی گئیں۔

۸۱۹ھ/۱۴۱۷ء میں اس نے اپنے بیٹے بایسنغر کو دیوان اعلیٰ کی مسند پر بٹھایا اور خود لوگوں کے فیصلے اور انصاف کرنے لگا۔ شاہرخ کے الغ بیگ کے سوا باقی تمام بیٹے اس کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ شاہرخ کا انتقال رے کے مقام پر ۸۵۰ھ/۱۴۴۷ء میں ہو گیا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی سخاوت اور شجاعت کی وجہ سے بہت عزت تھی۔ اسے رفاہ عامہ کے کاموں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے ہرات میں ایک بڑا کتب خانہ بنوایا تھا۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

الغ بیگ جو شاہرخ کا بیٹا تھا، عالم، دانشمند اور ادیب شخص تھا۔ اسے حکومت کے کاروبار کے بجائے علمی تحقیقات سے بہت زیادہ دلچسپی اس نے صرف دو سال حکومت کی۔ اپنے بھتیجے علاء الدولہ سے شکست کھا کر اس نے اس کے ہر مطالبے کو منظور کر لیا تاکہ اپنے لڑکے عبداللطیف کو اس کے نیچے سے نکال لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

اس کے لڑکے نے بغاوت کر کے اسے کئی مرتبہ شکست دی بالآخر ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء میں اپنے بیٹے عبداللطیف کے ہاتھوں ہی قتل ہوا۔ اگرچہ وہ خود بھی چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہرخ کا پوتا سلطان عبداللہ میرزا، ابوسعید کی مخالفت کے باوجود تخت نشین ہوا۔ لیکن جلد ابوسعید کے ہاتھوں جس نے ازبکوں سے مدد لی تھی شکست کھا کر قتل ہوا۔ ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں عبداللہ کے بعد بابر میرزا تخت نشین ہوا جو نہایت عیاش اور شراب کا رسیا تھا۔ اس کے زمانے میں عراق اور کرمان کا علاقہ تیموریوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے علاء الدولہ کی آنکھیں نکلوا دیں مرزا ابوسعید سے شکست کھائی اور اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء میں مر گیا

بابر میرزا کے بعد ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء میں ابوسعید تخت پر بیٹھا۔ اس کا عہد حکومت بالکل مختلف تھا وہ اپنے دور کا سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔ سلطان عبداللہ کے بعد اس نے سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا۔ بعد میں اس نے ماوراء النہر، بدخشاں، کابل، قندھار اور

ثغور ہند کے اضلاع عراق اور خراسان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مغلوں سے لڑنے کے بعد اس نے ان سے اتحاد کر لیا۔ ازون حسن کی صلح کی درخواست کو ٹھکرا کر ابوسعید نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور قراباغ جا پہنچا جہاں اس کی فوجیں بھوک سے مرنے لگیں اور وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئیں اور خود دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اوزون حسن نے ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء میں اسے قتل کرا دیا۔

ابوسعید میں بہت سی عمدہ صفات تھیں۔ اس میں وقار، دوراندیشی، صاف گوئی سرگرمی اور حیرت انگیز سیاسی قابلیت تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان احمد اس کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس کا دور حکومت سوائے چار لڑائیوں کے جن میں سے ایک اس کے چھوٹے بھائی عمر شیخ سے ہوئی تھی۔ سارا عہد امن و امان سے گزرا۔ اس سارے دور حکومت میں سارا اقتدار امراء اور علماء کے پاس تھا اور وہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ اس کا دور حکومت ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء تا ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء تک کا ہے۔

سلطان احمد کے بعد سلطان محمود اپنے پیشروؤں کے چار بیٹوں کو قتل کرا کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس نے صرف چھ ماہ حکومت کی۔ اس کا یہ مختصر دور ظلم و استبداد کا دور تھا۔ وہ اس مختصر سے دور میں قابل نفرت و ملامت سمجھا جاتا رہا۔ یہ اپنے بعد کئی بیٹے چھوڑ کر مرا اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان مسعود ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے بھائیوں بایسنغر اور علی سے لڑنا پڑا۔ سلطان مسعود نے ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء تک چار حکومت کی۔

عمر شیخ بن ابوسعید نے فرغانہ میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ اس نے کئی بار سمرقند پر حملے کیے اور اسے فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس کی سخاوت، شیریں مزاجی اور انصاف پسندی کی بہت سی تعریف کی جاتی ہے۔ اگر اسے شراب نوشی اور جوئے کی لت نہ ہوتی تو وہ ایک دیندار آدمی تھا۔ وہ چغتائی فرمانروا یونس خان کا داماد تھا۔

۳۹ سال کی عمر میں ایک حادثے کی وجہ سے ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا جانشین ظہیر الدین بابر ہوا۔ اس نے کئی مرتبہ سمرقند پر کامیابی سے حملے کیے۔ ایک بار سمرقند پر قابض بھی ہو گیا لیکن ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں شیبانی نے اسے بے دخل کر دیا۔ یہاں سے وہ ہندوستان چلا آیا۔ اور ایک عظیم الشان مغلیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔

ہرات میں سلطان حسین بائیقرا نے ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء تا ۹۱۱ھ/۱۵۰۶ء ۳۷ سال حکومت کی۔ اس نے خراسان، طخارستان، قندھار، سیستان اور مازندران کے علاقوں کو اپنے زیر اقتدار کر لیا اور اپنے سب حریفوں پر فتح حاصل کی۔ اس کی سلطنت کو ایک طرف تو ازبکوں سے خطرہ رہتا تھا۔ دوسری طرف اس کے بیٹوں نے اس کے خلاف بغاوتیں کیں جنہیں اسے فرو کرنا پڑا۔ ایک بار وہ شیبانی کے خلاف جنگ کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بدیع الزماں جانشین ہوا جو ایران کے تیموری خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ شیبانی سے شکست کھا کر شاہ اسماعیل کا مہمان بنا اور آخر کار سلطان سلیم نے اسے قید کر ڈالا اسی قید میں اس نے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں قسطنطنیہ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد زمان قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان چلا آیا جہاں اس نے گجرات کا بادشاہ بننے کی ناکام کوشش کی ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء میں فوت ہوا

ط

ٹمبکٹو مغربی افریقہ میں جمہوریہ مالی کا ایک شہر جو دریائے نائیجر کے قریب صحرائے اعظم افریقہ کی سرحد پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۸۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔

بقول صاحب "تاریخ بلاد سوڈان" اس شہر کی بنیاد خانہ بدوش قبیلہ توارگ مغشرن نے پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں رکھی۔ یہ لوگ ان علاقوں میں اپنے گلے چراتے پھرتے تھے۔ بالآخر مستقل طور پر اسی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اس طرح ٹمبکٹو ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ تاجروں کے ساتھ ساتھ علما و فضلا بھی مصر، توات، غدامس، تافیلات، فاس اور سوس وغیرہ سے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ شہر کے اندر خوب صورت عمارات تعمیر ہوئیں اور اس کے ارد گرد ایک فصیل بھی بنائی گئی۔ ایک جامع مسجد وسط شہر میں تعمیر ہوئی۔ اور ایک مسجد شمال کی جانب بنائی گئی۔ ۷۳۲ھ/۱۳۳۶ء میں مالی سے پہلا حکمران خاندان یہاں آیا جو ۸۴۳ھ/۱۴۳۳ء تک حکرانی کرتا رہا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی اسی زمانے میں یہاں آیا۔ اس نے شہر کے متعلق بڑی دل چسپ باتیں تحریر کی ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ شہر ایک خوشحال تجارتی مرکز تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں کی عورتیں برہنہ رہتی تھیں۔ قبیلہ مسوفہ کے لوگ ایک ایسی نقاب پہنتے تھے جو چہرے کے نیچے کے نصف حصے کو چھپا لیتی تھی۔

ٹمبکٹو پر دوسرا حکمران قبیلہ مغشرن کے توارگ کا تھا جو تقریباً چالیس سال تک اس علاقے پر قابض رہا۔ اس خاندان کے بعد یہ شہر سنی علی کے قبضے میں چلا گیا اور ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء سے ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء تک اس کے زیر اقتدار رہا۔ شہر فتح کرنے کے بعد اس نے اسے خوب تاخت و تاراج کیا۔ انتہائی ظالم حکمران تھا۔ اس کے بعد ٹمبکٹو نے سنغائی خاندان کے عہد میں بہت ترقی کی۔ اس خاندان کے مشہور بادشاہ اسکیا الحاج محمد کے عہد میں یہ شہر ترقی کی اعلیٰ منازل پر تھا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ اسکیا داؤد تھا جس کا انتقال ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس شہر پر حکومت مراکش کا تسلط قائم ہو گیا۔ ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں مراکش کے پاشا محمود نے مراکش کے سلطان مولائی احمد سے چھین لیا۔ چنانچہ ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء سے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء تک اس علاقے پر مراکش کی حکومت کا قبضہ رہا اور یہ شہر پاشاؤں کی جبر ستانی اور توارگ کے حملوں سے دوچار رہا۔ ۱۱۰۴ھ/۱۶۹۲ء میں توارگ اس علاقے پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں ٹپا قوم کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ جن سے پھر تکروروں نے چھین لیا۔

ٹمبکٹو کا یورپ سے اتصال نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ اس کی تجارت اٹلی، فلورنس کے ساتھ تونس اور طرابلس کے راستے ہوتی تھی۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے بعد یورپ سے اس شہر کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اس شہر کی وضع دیکھنے میں اب بھی معمولی [illegible] ہے۔ اگرچہ مقامی فن عمارت سے یہاں والوں کی خوش ذوقی کا پتا چلتا ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں یہ شہر فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس شہر کو الجزائر کے ساتھ پہلے پہل موٹر کاروں کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ اب یہ شہر اتنا وسیع نہیں ہے۔ جتنا کہ سنغائی حکمرانوں کے دور میں تھا۔ قدیم شہر کے کھنڈر دریائے نائیجر سے دس میل جنوب کی طرف اور موجودہ شہر کے شمال اور [illegible] میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۸ء تک یہ علاقہ فرانسیسی سوڈان [illegible] شامل تھا۔ آج کل مالی میں شامل ہے۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت سنغائی لوگوں [illegible] جو حبشی ہیں۔ اس شہر کی پرانی رونق اگرچہ بحال نہیں ہو سکی۔ تاہم فرانسیسی اثر سے کئی نئے کوچے اور مدارس تعمیر ہو گئے ہیں۔

یہ شہر نہ صرف اس لیے دلچسپ ہے کہ یہ جنوب کی طرف اسلام کی عظیم [illegible] شاہد ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ مسلمانوں کی سرگرم زندگی کا یہ خود ایک پر رونق [illegible] ہے۔ یہاں ایک مشہور و معروف دانش گاہ تھی جس نے بہت سے علما [illegible] کیے۔ ٹمبکٹو میں انتہائی علم و ادب کا دور آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی [illegible] سے گیارہویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی تک رہا ہے۔

موجودہ زمانے تک اس شہر کا باہر کی دنیا سے اتصال اونٹ کی سواری [illegible] راستے یا سڑک ہی سے ہے یہاں نہ ریلوے لائن ہے اور نہ ہوائی اڈا موجود ہے۔

ٹمبکٹو کی کل آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے۔ یہاں پر نمک کا ذخیرہ ہے [illegible] نمک کے دو قافلے سال میں دو مرتبہ یہاں آتے ہیں۔ ہر قافلے میں اونٹوں کی تعداد [illegible] چار ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ یہاں نمک کی تجارت عروج پر ہے۔

ٹونک ہندوستان کی ایک قدیم ریاست اور شہر جو اب صوبہ راجستھان کے ایک ضلع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست ٹونک راجپوتانے اور وسط ہند کے درمیان واقع تھی۔ جس کا کل رقبہ ۲۵۵۳ مربع میل تھا یہ ریاست چھ اضلاع پر مشتمل تھی۔ راجپوتانے کے تین اضلاع ٹونک، علی گڑھ اور نمبا ہیڑہ اور وسط ہند کے تین اضلاع چھبڑہ، پڑاوہ اور سرونج اس میں شامل تھے۔ ریاست کا نام دارالحکومت ٹونک پر

رکھا گیا تھا۔

ٹونک شہر کی بنیاد ١٠٥٣ھ/١٦٤٣ء میں رکھی گئی۔ جس کے گرد فصیل ہے۔ اس کے جنوب میں نیا شہر ہے جس کے محلوں کے نام مختلف نوابوں کے ناموں پر ہیں۔

ٹونک ہندی میں نوکدار پہاڑی کو کہتے ہیں۔ اس شہر کی ابتدائی آبادی ایک نوکدار پہاڑی کے دامن میں ہوئی تھی جسے ٹونکوار کہتے تھے جو رفتہ رفتہ ٹونک کے نام سے بدل گئی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس شہر کا نام محمد آباد رکھا گیا تھا۔ اس شہر پر مختلف راجپوت قبیلے اور رئیس قابض رہے۔ نواب امیر خان کے دور (انیسویں صدی) سے اس کی تاریخی حیثیت کا آغاز ہوا۔ ١٨١٧ء میں نواب نے انگریزوں سے سمجھوتہ کر کے ریاست ٹونک کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے میں ٹونک شہر میں مختلف محل، حویلیاں، تالاب، باغ اور گنج تعمیر ہوئے۔ جن کی وجہ سے وہ ایک قابل ذکر شہر بن گیا۔

١٢٥٠ھ/١٨٣٤ء میں نواب امیر خان کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا محمد وزیر خان مسند حکومت پر بیٹھا۔ جو بڑا علم دوست اور دین دار حکمران تھا۔ اس کو ملک کی ترقی اور خوشحالی کا بہت زیادہ خیال تھا۔ وہ سید احمد شہید بریلوی کا مرید تھا۔

١٢٨١ھ/١٨٦٤ء میں وزیر خان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا یمین الدولہ نواب محمد علی خان ریاست ٹونک کا والی بنا یہ فرمانروا بھی بہت بڑا عالم اور دیندار تھا اور اپنے والد کی طرح سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین سے دلچسپی رکھتا تھا جو انگریزوں کو کھٹکتی تھی

١٢٨٤ھ/١٨٦٧ء میں انگریزوں نے اسے معزول کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حافظ محمد ابراہیم علی مسند نشین ہوا۔ اور نواب محمد علی خان نے حکومت برطانیہ کی خواہش کے مطابق بنارس میں بقیہ زندگی بسر کی جہاں اس نے ١٣١٣ھ/١٨٩٥ء میں وفات پائی۔

تقسیم ہند کے بعد دوسری ریاستوں کی طرح ریاست ٹونک بھی ہندوستان میں ضم ہوگئی اور آج کل بائیس ریاستوں کی یونین میں جو "راجستھان یونین" کے نام سے مشہور ہے شامل ہے۔

موجودہ ٹونک شہر کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے اور یہ ایک اہم صنعتی و زرعی مرکز ہے۔

ٹھٹہ پاکستان کا ایک قدیم شہر جو کوہ مکلی کے دامن میں قدیم شہر کے کھنڈروں پر آباد ہے۔ یہ کراچی سے ٦٠ میل دور واقع ہے۔ سومروں کے زوال کے بعد جب سندھ کی حکومت پر سمّوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے کوہ مکلی کے دامن میں ایک شہر بسایا جس کا نام "ساموئی" رکھا۔ ساموئی ان کا پہلا دارالحکومت تھا پھر اس سے چھ میل جنوب کی جانب انہوں نے کوہ مکلی کے ایک پشتے پر قلعہ تغلق آباد تعمیر کیا اور اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ آج کل اسے کلاکوٹ کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ساموئی اور قلعہ تغلق آباد کے درمیان ٹھٹہ آباد کیا اور اس میں اپنا پایہ تخت منتقل کیا۔

ٹھٹہ کا ذکر سب سے پہلے ٧٤٨ھ/١٣٤٧ء میں ملتا ہے۔ آثاریات سندھ کے مشہور محقق ہیگ کے خیال کے مطابق "یہ غالباً ١٣٤٨ء میں آباد ہوا ہوگا۔" مدت دراز تک یہ ایک اہم تجارتی مرکز رہا۔ مشہور مورخ وڈنگٹن کے بقول "مغلیہ دور میں تجارت میں ٹھٹے کی برابری ہندوستان کا کوئی شہر نہ کرسکتا تھا۔" اس زمانے میں ملتان بھکر سے سامان تجارت دریا کے راستے کشتیوں پر ٹھٹہ میں لایا جاتا تھا۔ ٩٩٩ھ/٩١-١٥٩٠ء میں جب خانخانان نے ٹھٹے پر لشکر کشی کی تو لشکر کے لئے غلہ کشتیوں کے ذریعے لاہور سے وہاں تک پہنچایا گیا تھا

١٦١٤ء کی حدود میں پرتگیز لاہور سے کشتیوں کے ذریعے مال تجارت یہاں لاتے تھے اور پھر یہاں سے ایران بھیجتے تھے۔ وڈنگٹن نے لاہور سے ٹھٹہ کی مسافت تیس دن لکھی ہے جبکہ فنچ نے یہ مسافت چالیس دن بتائی ہے۔

تاریخ میں ٹھٹے کا ذکر بار بار آیا ہے۔ عرب فاتحین پہلی بار اموی خلیفہ عبدالملک کے دور میں وارد ہوئے اور محمد بن قاسم نے الور کی مہم کے لیے ٹھٹے ہی کے قریب سے دریائے سندھ کو پار کیا۔ یہ علاقہ پہلے اموی خلفاء اور بعد میں عباسی خلفاء کے عاملوں کے ماتحت رہا۔

٤١٦ھ/١٠٢٥ء میں محمود غزنوی نے قادر باللہ عباسی کے عاملوں کو اُچ اور ملتان سے نکال دیا۔ ٤١٧ھ/١٠٢٦ء میں محمود غزنوی کے وزیر عبدالرزاق نے سندھ پر حملہ کیا اور ٹھٹے اور سیوستان کے لوگوں کو زیر کر کے عربوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ٹھٹہ پر غزنویوں کا ٥٨٣ھ/١١٨٣ء تک قبضہ رہا۔ اس کے بعد یہاں بدامنی اور بے چینی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ خاندان تغلق کے زمانہ میں سندھ کی ہندو رعایا نے اپنے حقوق کا مطالبہ کر دیا۔ ٧٢٠ھ/١٣٢٠ء میں جب سلطان غیاث الدین تغلق ملتان سے دہلی گیا تو یہاں کی سومرہ قوم نے بغاوت کر دی اور ٹھٹے پر قبضہ کر لیا۔ ٧٥١ھ میں سلطان محمد شاہ تغلق کی وفات پر جو ٹھٹے کے قریب ہی ہوئی تھی ٹھٹے نے بغاوت کر دی۔ قوم سومرہ اور جاریجہ سے ساز باز کر کے فیروز شاہ تغلق سے ٹھٹے کے قریب جنگ لڑی۔ ٧٧٢ھ/١٣٧٠ء میں ٹھٹے کے حاکم جام خیر الدین نے بھی بغاوت
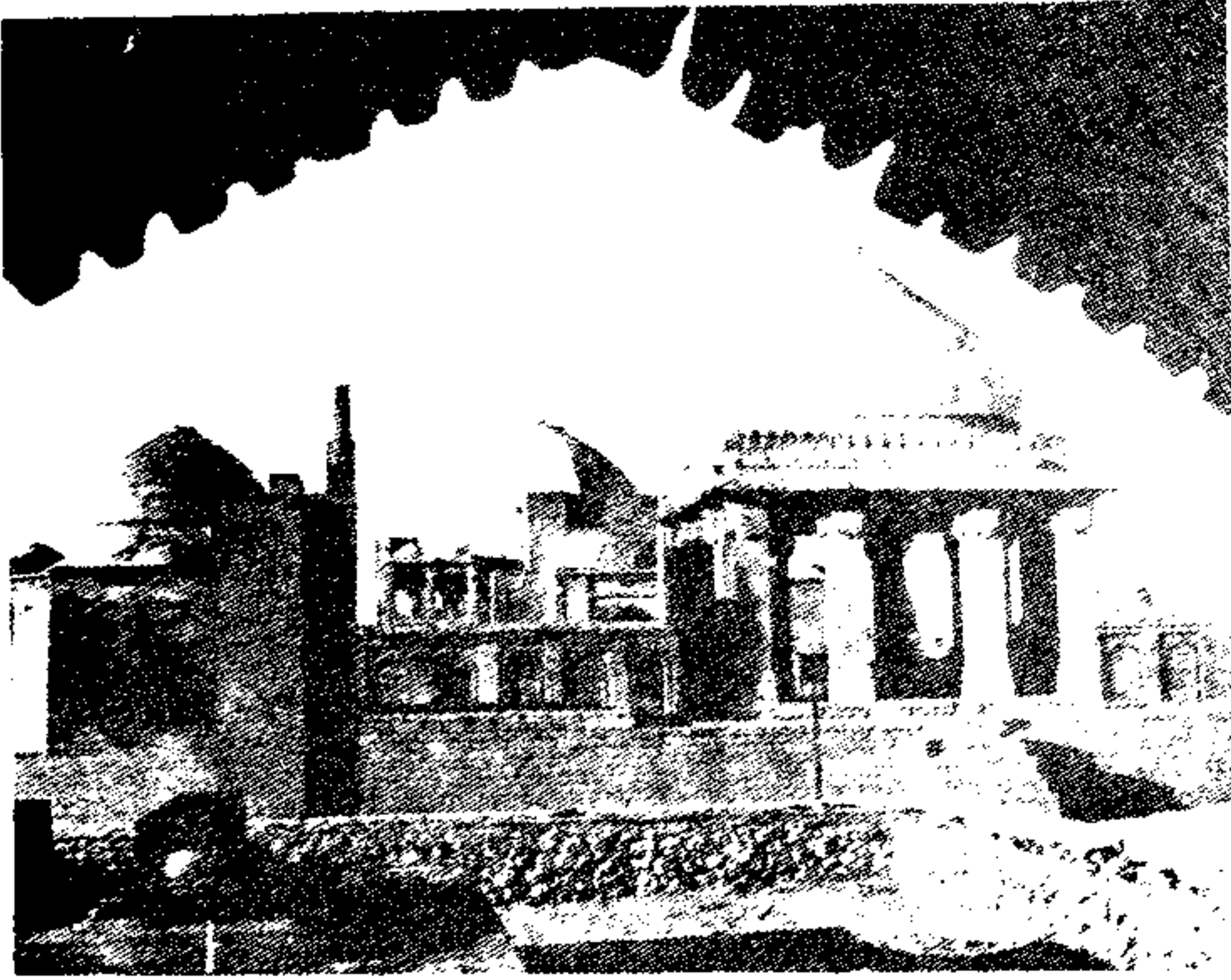
ٹھٹہ کی شاہجہانی مسجد

کردی۔ جس کی وجہ سے فیروز شاہ تغلق کو ایک بار پھر ٹھٹے کا رُخ کرنا پڑا۔ خیر الدین قلعہ بند ہوگیا۔ بعد میں اس نے سلطان سے معافی مانگ لی۔ چنانچہ سلطان نے اس کے بعد اس کے بیٹے جام جونہ کو ٧٧٧ھ/١٣٧٥ء میں ٹھٹے کا حاکم بنایا جو ٩١-٧٩٠ھ/١٣٨٨ء تک یہاں کا حاکم رہا۔ اس کے بعد جام علی شیر کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا لیکن اسے اس کے بھائیوں نے قتل کر دیا۔ جام علی شیر ٨٠٩ھ/١٤٠٦ء سے ٨١٥ھ/١٤١٢ء تک یہاں کا حاکم رہا۔ اس کے بعد سلطان علی شاہ میران خان نے ٹھٹہ فتح کر کے ٨١٦ھ میں جام کرن کو یہاں کا حاکم بنایا لیکن عوام نے دوسرے روز ہی اسے قتل کر دیا۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں صلاح الدین نے سلطان مظفر کی مدد سے ٹھٹے پر قبضہ کر لیا۔

سلاطین تغلق کے بعد سے ٹھٹے کے خود مختار حکمرانوں کا دور شروع ہو جاتا ہے

ان خود مختار حکمرانوں میں جو جام ہی کہلاتے تھے جام نندو یعنی جام نظام الدین ٹھٹے کا پہلا حکمران تھا۔ اس کا دور حکومت ۸۶۶ھ/۱۴۶۱ء سے ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء تک ہے اس کا عہد حکومت نہایت زرین عہد ہے۔ وہ بڑا نیک، علم دوست اور دیندار انسان تھا۔ اس نے چوروں اور ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا۔ قاضی عبداللہ کی نماز جنازہ قاضی صاحب کی وصیت کے مطابق اسی جام نندو نے پڑھائی تھی۔ کیونکہ نیکی عفت کے

ٹھٹہ میں جام نظام الدین کا مقبرہ
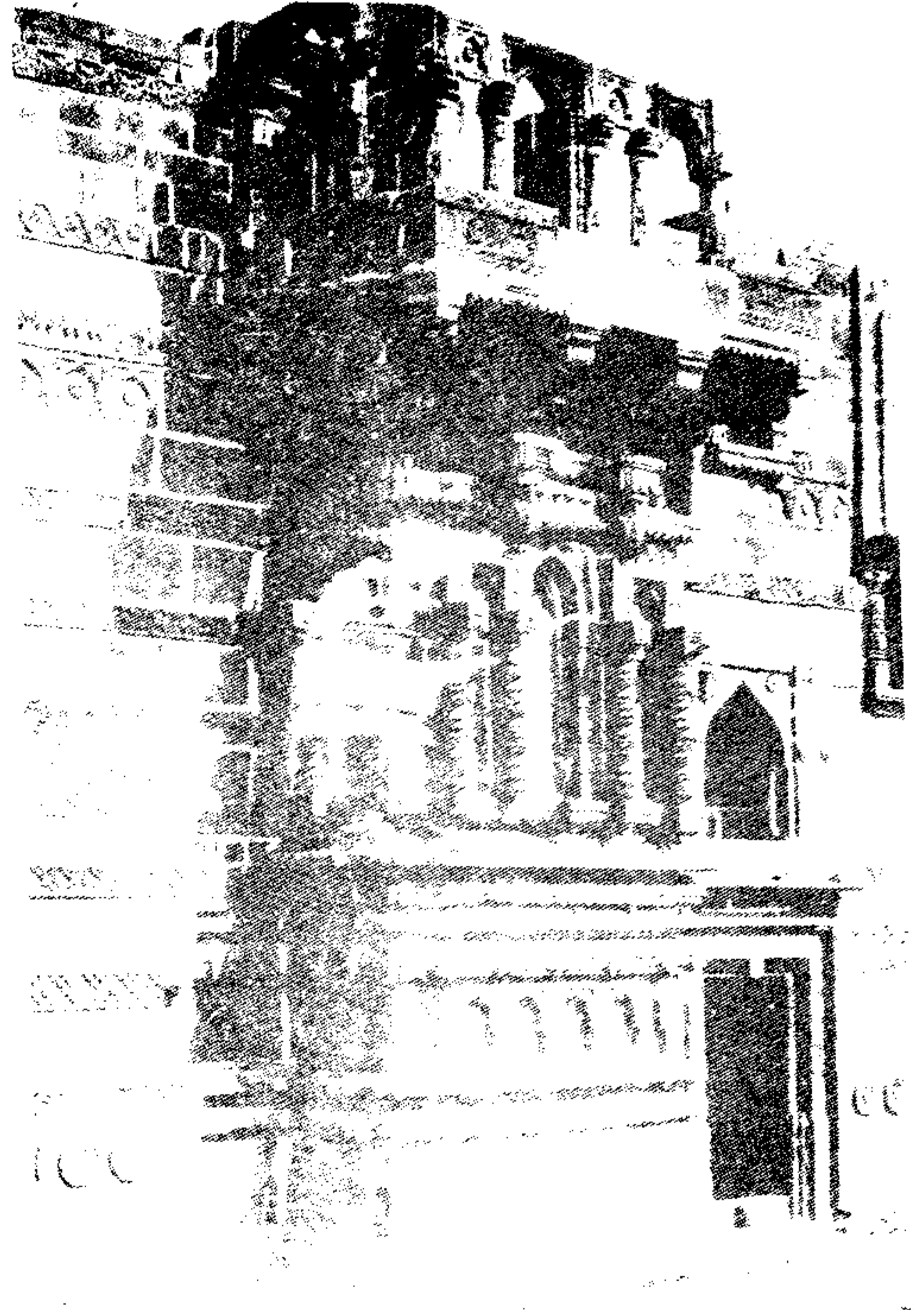
لحاظ سے جام نندو ضرب المثل تھا۔

۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں شاہ بیگ ارغون بھکر کے حکمران نے جام نندو کی وفات کے بعد ٹھٹہ پر پہلا حملہ کیا۔ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں ایک اور حملے کے بعد اس نے ٹھٹے پر قبضہ کر کے سموں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں شاہ بیگ ارغون کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسین مسند نشین ہوا جو بڑا باتدبیر اور صاحب استقلال انسان تھا۔ اس نے مغلوں کے سندھ میں پاؤں کا جمنے دیئے۔ اس کے بعد ٹھٹہ پر ترخانوں کی ۳۸ سال حکومت رہی۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں میرزا عیسی ترخان کے عہد حکومت میں پرتگیزوں نے ٹھٹے پر دھاوا بول دیا۔ لوگ نماز جمعہ ادا کر رہے تھے کہ فرنگیوں نے شہر میں لوٹ مچائی کر کے گھروں کو آگ لگا دی۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو عیسیٰ خاں بھکر میں تھا۔ چنانچہ وہ یہ خبر سن کر ٹھٹہ آیا۔ اس نے دریا کے ساتھ ساتھ شہر کے گرد ایک فصیل بنوائی۔ ایک نہر شہر تک کھدوائی۔ ایک نیا قلعہ "شاہ بندر" تعمیر کرایا۔

جب شیر شاہ سوری سے ہمایوں نے شکست کھائی تو وہ لاہور سے ہوتا ہوا بھکر پہنچا اور وہاں سے مایوس ہو کر ٹھٹہ آیا۔ شاہ حسین میرزا ارغون نے ہمایوں سے جنگ کی اور لشکر بادشاہی میں غلے کا پہنچنا بند کرا دیا جہاں سے وہ ناچار جودھپور کی طرف چلا گیا۔

۹۹۹ھ/۹۱-۱۵۹۰ء میں جب خانخاناں نے شہنشاہ اکبر کے عہد میں سندھ پر حملہ کیا تو ٹھٹہ ترخانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور یہاں پر خاندان مغلیہ کے مقرر کردہ نواب حکومت کرنے لگے۔

جب ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۴ء میں سندھ کا ایک الگ صوبہ بنایا گیا تو ٹھٹہ اس کا صدر مقام بنا۔

ٹھٹے میں عہد مغلیہ کی دو مساجد بہت زیادہ خوب صورت اور دل کش ہیں ان میں سے ایک تو عہد جہانگیر میں نواب مظفر خان کے دور ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں مکمل ہوئی اور دوسری شاہجہان کی جامع مسجد ہے جو ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں تعمیر کی گئی تھی نواب سردار خان اس آفت ناگہانی سے تقریباً نصف شہر غیر آباد ہو گیا۔ نواب حفیظ اللہ خان نے یہاں ایک قلعہ کی تعمیر شروع کرائی جو نامکمل ہی رہ گئی ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے دارا شکوہ کے تعاقب میں فوجیں بھیجیں تو وہ ٹھٹہ میں آ گیا۔ جہاں سے بعد میں وہ گجرات کی طرف بھاگ گیا۔

میاں نور محمد کلہوڑہ نے شاہان مغلیہ سے لے لیا۔ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء میں ہملٹن ٹھٹے سے گذرا اس نے لکھا ہے "یہ شہر تین میل لمبا اور نصف میل چوڑا تھا اور اس کی آبادی ۸۰ ہزار تھی۔"

بارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی میں ٹھٹہ ایک مرد خیز شہر تصور ہوتا تھا۔ یہ بہت سے اولیاء، علماء و فضلاء اور دوسرے نامور ہستیوں کا مرکز

۱۷۵۸ء میں یہاں پر ایک برطانوی فیکٹری (تجارتی کوٹھی) قائم کی گئی۔ ۱۷۷۵ء میں ایک برطانوی فوج کا دستہ اس کوٹھی میں متعین کیا گیا۔

عہد حاضر میں دریائے سندھ ٹھٹہ سے تقریباً چھ میل مشرق میں بہتا ہے اور چار پانچ میل نیچے جا کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء تک یہ دریا ٹھٹے کے جنوب میں بہتا تھا۔ اس کی ایک شاخ اس شہر کے مغرب میں بہتی تھی۔ ٹھٹہ ایک بارونق شہر ہے۔ ببول اور کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ میں سے دیکھا جائے تو درختوں کے جھنڈ سے شہر کی اچھی ہوئی عمارات کا منظر [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ ٹھٹہ کی آبادی پچیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ آثار قدیمہ میں [illegible] اللہ کے مزار مساجد وغیرہ ہیں۔ مساجد میں خصوصاً شاہجہان اور اورنگ زیب کی بنائی ہوئی اور مقابر میں حاکم سندھ عیسیٰ ترخان، جام نظام الدین اور مرزا جانی بیگ کے مزار قابل دید ہیں۔

ٹیپو سلطان (ح ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ/۲۰ نومبر ۱۷۵۰ء - ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ/۴ مئی ۱۷۹۹ء) ہندوستان کی سلطنت میسور کا آخری فرمانروا شیر میسور نواب حیدر علی کا بیٹا۔ تحریک آزادی ہندوستان کا پہلا شہید۔ دیون ہلی کے مقام پر پیدا ہوا۔ والدہ کا نام فاطمہ فخر النساء تھا۔ حیدر علی نے نرینہ اولاد کی آرزو میں آرکاٹ کے مشہور بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر دعا مانگی تھی۔ اس لئے بیٹے کا نام اس بزرگ کے نام پر رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو کا اصل نام فتح علی تھا، لیکن تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس کا نام فتح علی تھا یا اس کی کنیت ابوالفتح تھی۔ البتہ اس کے ایک بیٹے کا نام فتح حیدر ضرور تھا۔ "تاریخ حمیدیہ خانی" کے مصنف نجب الحسن خان کی روایت کے مطابق ۱۷۶۷ء میں نظام دکن نے ٹیپو کو "فتح علی خاں بہادر" کا خطاب

دیا تھا۔ "نشانِ حیدری" کے مولف حسین کرمانی کے بقول حیدر علی نے ایک وفد ٹیپو کی سرکردگی میں دکن روانہ کیا تھا۔ جہاں ٹیپو کو "نصیب الدولہ" کا خطاب ملا۔

بچپن ہی سے ٹیپو جری، محنت کش اور صاحب لیاقت تھا۔ اسلامی علوم کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، تامل، کنٹری جیسی زبانوں پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔ نیز اس زمانے کے فنون سپہ گری شمشیر زنی، تیر افگنی، نیزہ بازی، تفنگ اندازی، تیراکی وغیرہ میں بھی کما حقہٗ مہارت حاصل کر لی تھی اور سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے ٹیپو سلطان حرب و ضرب کے آداب اور رزم و پیکار کے انگریزی طریقوں سے بھی واقف ہو چکا تھا۔

۱۷۶۵ء میں ٹیپو سلطان فوجی زندگی میں پہلی بار ہمارے سامنے آتا ہے، جب وہ حیدر علی خاں کے ساتھ مالا بار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہاں اس نے صرف دو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے ایک بڑے لشکر کو حراست میں لے لیا جس پر حیدر علی نے خوش ہو کر اسے اپنی محافظ فوج میں شامل کر لیا اور جاگیر عطا کی۔

۱۹ رجون ۱۷۶۷ء کو ٹیپو سلطان مدراس اور اس کے مضافات پر چھاپے مار رہا تھا۔ اس وقت انگریز پہلی بار میسور میں حیدر علی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہاں سے وہ واپس لوٹتے ہوئے ترنا پور اور دام باڑی کی تسخیر میں والد کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ نیز آمبور کے محاصرے میں بھی شریک رہا۔

جب انگریزوں نے منگلور (بندر کوڑیال) پر قبضہ کر لیا۔ تو ٹیپو سلطان کو ان کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے حیدر علی بھی وہاں پہنچا۔ یہاں انہوں نے عجب چال چلی۔ بیگار میں پکڑے ہوئے بیس ہزار افراد کو لکڑی کی بندوقیں دے کر ہزار ہزار کی ٹکڑی میں انگریزی توپ خانے کے سامنے کھڑا کر دیا اور خود ٹیپو سلطان مورچوں پر حملہ آور ہوا۔ اس محاذ پر فتح یابی کے بعد حیدر علی مدراس کی طرف روانہ ہو گیا اور ۴ راپریل ۱۷۶۹ء کو حکومت مدراس کو صلح نامہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے دیسی ریاستوں میں کمپنی کا وقار گر گیا اور انہوں نے خود کو مضبوط اور مستحکم محسوس کیا۔

حیدر علی انگریزوں سے نمٹ کر واپس آیا تو مرہٹہ فوجیں ترمبک راؤ کی قیادت میں میسور کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ ساونور اور کڑپہ کے سردار بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس مرحلے پر ٹیپو سلطان کو حکم ملا کہ وہ مرہٹوں کی رسد کو تباہ کرے۔ چنانچہ اس نے مرہٹوں کے عقب میں موجود تمام کنوؤں اور تالابوں میں زہر ڈلوا دیا اور کھیت روند ڈالے۔ اب حیدر علی نے بھی مرہٹوں کے عقب پر چھاپہ مارنا چاہا۔ مرہٹوں کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے پلٹ کر جنگ شروع کر دی۔ مشیروں کی رائے کے خلاف حیدر علی سرنگا پٹم کی طرف فرار ہو گیا۔ اس افراتفری میں ٹیپو اپنے باپ سے جدا ہو گیا۔ جس سے مرہٹوں نے فائدہ اٹھایا اور ٹیپو کی گرفتاری کا اعلان کر دیا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی ٹیپو دو دن جانثاروں کے ساتھ بھیس بدل کر سرنگا پٹم پہنچ گیا اور دونوں باپ بیٹا ایک ماہ تک وہاں محصور رہے۔ ترمبک راؤ تینتیس دن محاصرے سے تنگ آ گیا اور وہاں سے اٹھ کر تنجاور کی طرف چلا گیا۔

۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کی وفات کے بعد دربار پونا کی اندرونی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر علی نے دریائے تنگ بھدرا اور کرشنا کے درمیانی علاقے مرہٹوں سے چھین لئے۔ ان میں اکثر مہمات میں ٹیپو بھی شریک رہا۔

۱۷۸۰ء میں انگریزوں سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو نوے ہزار فوج کے ساتھ کرناٹک جا پہنچے۔ انگریز سپہ سالار سکپڑ منرو کانجی ورم پہنچ کر کرنل بیلی کا انتظار کر رہا تھا، جو سامان رسد و اسلحہ کے ساتھ گنٹور سے آ رہا تھا

ٹیپو سلطان کو بیلی پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ سلطان نے بیلی کو کانجی ورم سے پندرہ میل پرے بری طرح شکست دے کر قید کر لیا۔ بیلی کی شکست کے بعد اعتراف کیا گیا کہ یہ شدید ترین ضرب تھی، جو ہندوستان میں انگریزی قوت پر لگی۔

ادھر حیدر علی نے منرو پر حملہ کرنے کی بجائے آرکاٹ کا محاصرہ کر لیا۔ ٹیپو سلطان بھی مدد کو پہنچا اور شہر فتح ہو گیا۔ پھر ٹیپو سلطان آمبور اور بعض دوسرے قلعے مسخر کر کے اگست ۱۷۸۱ء میں واپس آرکاٹ پہنچا۔ جہاں سے ۱۷۸۲ء میں اسے تنجاور بھیج دیا گیا۔ یہاں اس نے کرنل بریتھویٹ کو شکست فاش دی۔

عقب سے خبر ملی کہ انگریزی فوجیں ساحل مالا بار پہنچ رہی ہیں۔ چنانچہ سلطان فوراً پلٹا اور پال گھاٹ کا محاصرہ کر لیا۔ انگریز اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پال گھاٹ خالی کر کے پونانی پہنچ گئے۔ ٹیپو سلطان نے پونانی کا بھی محاصرہ کر لیا۔ مگر ابھی وہ حملہ نہ کر پایا تھا کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر ملی۔

حیدر علی نے ۷ ردسمبر ۱۷۸۲ء کو وفات پائی۔ سرداروں نے فوراً مہا مرزا خاں کو ٹیپو سلطان کی طرف بھیج دیا اور میت کو غسل دے کر تابوت میں رکھا اور مناسب پہرے کے ساتھ کولار کی طرف بھیج دیا۔ نیز چھوٹے بیٹے عبدالکریم کو عارضی طور پر مسند نشین کر دیا۔

۱۱ ردسمبر ۱۷۸۲ء کو ٹیپو سلطان کو خبر ملی اور وہ اسی وقت روانہ ہو گیا۔ ۲۵ ردسمبر ۱۷۸۲ء کو وہ چکور پہنچ گیا، جہاں اس کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے تمام ماتمی رسوم کی ممانعت کر دی اور ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ/ ۲۶ ردسمبر ۱۷۸۲ء کو خاموشی کے ساتھ مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

تخت نشینی کے وقت ٹیپو سلطان کی سلطنت دکن میں شمالی طرف دریائے کرشنا، جنوبی سمت ریاست ٹراونکور، مشرق میں مشرقی گھاٹ اور مغرب میں ساحل سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ آبادی، زرخیزی اور حسن انتظام کی بدولت یہ ایک شاندار سلطنت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے علاوہ مقامی ہمسائے مرہٹے اور نظام حیدر آباد اس علاقے کو ہتھیا لینے کی فکر میں تھے۔ مگر دوسری طرف اس علاقے کا فرمانروا ایک ایسا سلطان تھا۔ جو نہ صرف موروثی طور پر جری اور مجاہد تھا بلکہ دورِ شہزادگی میں بھی عزم و حوصلے اور تدبر کی داد لے چکا تھا۔

حکومت سنبھالتے ہی ٹیپو سلطان نے سب سے پہلا کام اپنی فوج کو منظم کرنے کا کیا۔ اس نے باقاعدہ رجمنٹیں مقرر کیں اور ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں ماہوار تنخواہ کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس نے فرانسیسی افسروں کی خدمات حاصل کیں تاکہ فوج کو یورپی نمونے پر منظم کیا جا سکے۔ عام روایت کے مطابق ٹیپو سلطان کی باقاعدہ فوج ایک لاکھ کے قریب تھی۔

انگریزوں نے جنرل میتھیوز کی سرکردگی میں از سر نو مالا بار پر حملہ کر دیا اور بدنور کے حاکم ایاز خاں نے نہ صرف شہر و قلعہ بلکہ پورا صوبہ بدنور اس شرط پر انگریزوں کے حوالے کر دیا کہ اس کی حکومت بدستور اسی کی تحویل میں رکھی جائے۔ سلطان کو خبر ہوئی تو اس نے لطف علی بیگ کو دفاع کی غرض سے بھیجا۔ اس وقت تک انگریز ایاز خاں سے سمجھوتے کے مطابق بڑے علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ لطف علی بیگ نے باقی علاقے کو بچانے کی کوشش کی لیکن انگریزوں کی قوت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ فتح کے بعد انگریزوں نے وہاں انتہائی دردناک مظالم روا رکھے۔

یہ خبریں سلطان تک پہنچیں تو وہ بگولے کی طرح اٹھا اور انگریزوں پر چھا گیا اس نے ایک ہی حملے میں بدنور پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ بنگلور پہنچا اور اس کا محاصرہ

کر دیا۔ انگریز جنرل کیمبل نے ۲ راگست ۱۷۸۳ء کو صلح نامہ پر دستخط کر دیئے۔ ہر طرف سے شکست و ہزیمت اٹھا کر انگریزوں نے میسور میں سازشوں

ٹیپو سلطان شہید۔ ایک مصور کی نظر میں

کا آغاز کر دیا۔ سرنگا پٹم میں ہندو راجا کو گدی پر بٹھانے کی سازش کرائی گئی۔ لیکن ٹیپو سلطان کی تدبیروں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور نتیجتہً ۱۱ر مارچ ۱۷۸۴ء کو انگریزوں اور سلطان کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ جس کی رو سے فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے۔ اور اسیران جنگ چھوڑ دیئے۔

انگریزوں سے فارغ ہو کر سلطان نے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ اتحاد کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ادھر نظام اور مرہٹوں کے درمیان اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ میسور کی سابقہ ریاست چھوڑ کر باقی تمام سلطانی مقبوضات کو چھین کر باہم تقسیم کر لیا جائے۔ ایک جھڑپ کے بعد دونوں فروری ۱۷۸۷ء میں سلطان کے ساتھ صلح کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ طے پایا کہ دونوں طاقتیں انگریزوں کے خلاف سلطان کو مدد دیں گی۔

اسی زمانے میں سلطان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا، جسے دونوں ہمسایہ ممالک نے تسلیم کیا۔ خطبے میں مغل حکمران کی جگہ اپنا نام شامل کرایا۔ نیا روپیہ جاری کیا۔ انتظامی معاملات درست کئے۔ نیا آئین حکومت نافذ کیا۔ سرنگا پٹم میں مسجد اعلیٰ کی تعمیر اختتام کو پہنچی۔ سن ہجری کی جگہ سن محمدی جاری کیا جو آغاز نبوت سے شروع ہوتا تھا۔ مہینوں کے نئے نام رکھے اور ملک بھر میں مختلف صنعتیں جاری کروائیں سلطان نے فرانس کے دستور جمہوریت سے متاثر ہو کر اس کا عملی نفاذ اپنے ہاں بھی کرنا چاہا اور دفاعی اور خارجی امور کے علاوہ دیگر تمام تر اختیارات مجلس وزراء

کو سونپ دیئے۔ جس کا میر (وزیر اعلیٰ) یعنی صدر الصدور میر صادق کو بنایا۔

۱۷۸۴ء میں سلطان نے عثمان خاں کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا تھا۔ وہاں سے حوصلہ افزا جواب آیا تو غلام علی خان لنگڑے، شاہ نور اللہ، لطف علی بیگ اور محمد حنیف کو ایک سفارت پر روانہ کیا۔ جسے قسطنطنیہ کے بعد فرانس اور پھر انگلستان بھی جانا تھا، مگر یہ سفارت صرف ترکی ہی سے واپس لوٹ آئی۔ سلطان ترکی نے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے لئے پروانۂ سلطان بھجوایا۔ اسی طرح سلطان نے کریم خاں زند، حاکم ایران، زمان شاہ درانی حاکم افغانستان اور شاہ فرانس کے پاس بھی الگ الگ سفارتیں بھجوائیں

اس وقت لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بنکر ہندوستان آیا۔ اس نے آتے ہی تمام معاہدوں سے انحراف کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ ٹیپو سلطان کو شکست دیئے بغیر انگریزی حکومت قائم کرنے کے خواب کی تعبیر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مگر فوجی و عددی برتری کے باوجود ابھی تک وہ سلطان کو شکست سے آشنا نہ کر سکے تھے۔ یہ دیکھ کر کارنواس نے سازشوں کا ایک جال بچھانا شروع کر دیا۔

مرہٹوں اور نظام کے ساتھ انگریزوں کی گفت و شنید جاری تھی کہ ٹراونکور کے راجہ نے انگریزوں کی شہ پر سلطانی علاقے کوچین پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران میں ٹراونکور نے ولندیزیوں سے دو قلعے جیاکوٹہ اور کرنگانور خرید لیے جو دفاعی لحاظ سے میسور کی سرحد پر اہم حیثیت رکھتے تھے۔ کارنوالس نے اس سودے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اور ولندیزی گورنر نے بھی اس میں اپنی عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ ان حالات میں ۲۴ر دسمبر ۱۷۸۹ء کو جب سلطان نے اپنی سرحدوں کا جائزہ لیا۔ تو اس نے ایک خط راجہ کو لکھا کہ دونوں قلعے اسے واپس دے دیئے جائیں۔ نیز کوچین کا علاقہ بھی واپس کر دیا جائے۔ راجہ کے غیر ذمہ دارانہ جواب پر سلطان نے اس کی گوشمالی کرنے کے لئے تھوڑی فوج بھیجی، جس کے ساتھ راجہ کی فوجوں کی چھوٹی سی جھڑپ ہوئی۔

جولائی ۱۷۹۰ء میں مدراس کے گورنر نے کارنوالس کی ہدایت کے مطابق سلطان کو لکھا کہ جھگڑے کے تصفیے کے لیے کمشنر مقرر کیے جائیں۔ سلطان نے تسلیم کیا اور کہا کہ بہتر ہے کمشنر اس کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ جب میڈوز مدراس نے کمشنر سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اپنے سفیر بھیجنا چاہے تو اس نے کہا اگر صلح چاہتے ہو تو تاوان ادا کرو۔

بعد کے واقعات کچھ بھی ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ٹراونکور کے واقعہ کو بہانہ بنا کر تیسری بار میسور پر حملہ کر دیا۔ ابتدا میں جنرل میڈوز نے کمان سنبھالی۔ اس نے جنوبی سمت سے میسور پر حملہ کر دیا۔ مئی سے دسمبر ۱۷۹۰ء تک انگریز ناکام رہے۔ فروری ۱۷۹۱ء میں کارنوالس نے کمان سنبھالی اور سیدھا بنگلور کی طرف بڑھا۔ سلطانی فوج مدافعت میں ناکام رہی اور کارنوالس نے بنگلور کو فتح کرنے کے بعد مئی ۱۷۹۱ء میں سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ مگر چیچک پھوٹ پڑنے کی وجہ سے ناکام رہا۔ ابھی کارنوالس محاصرہ اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ مرہٹے اس کی مدد کو آگئے۔ فروری ۱۷۹۲ء میں اس نے دوبارہ سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ سامان رسد کی موجودگی میں محاصرے کی طوالت کا کوئی خوف نہ تھا۔ ادھر سلطانی فوج ہر قسم کی کمک سے محروم تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریز چاہتے تو سلطنت میسور کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر ٹیپو سلطان کا دبدبہ ان پر اس قدر طاری ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو مصالحت کا پابند بنانے ہی میں عافیت سمجھی۔

اس مصالحت میں طے پایا کہ:۔

۱۔ سلطان نصف سلطنت اتحادیوں (انگریز، مرہٹے اور نظام) کے حوالے کر دے

۲۔ تین کروڑ تیس لاکھ پگوڈے کی رقم تاوان دے۔ اس میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ کی رقم فوراً ادا کی جائے اور باقی رقم فی الفور ادا کر دی جائے۔

۳۔ تمام اسیران جنگ رہا کر دیئے جائیں۔

۴۔ معاہدے کی شرطیں پوری ہونے تک سلطان کے دو بیٹے بطور یرغمال اتحادیوں کے پاس رہیں۔

اس معاہدے سے سلطان پر سیاسی، معاشی اور انتظامی طور پر سخت ضرب لگی۔ اندازہ لگانے کی بات ہے کہ جس ملک کا مالیہ اڑھائی کروڑ ہو، وہ نصف ملک بھی ہاتھ دے اور تین کروڑ سے زیادہ تاوان بھی دے۔ اس کی معاشی حالت کیسی ہو جائے گی۔ اس کے باوجود سلطان نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی اولالعزمی میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ جفاکشی کے ساتھ انتظام سلطنت میں لگ گیا سرکشوں کو سزا دی۔ وفاداروں سے حلف لیا۔ زراعت کی حوصلہ افزائی کی اور فوج کو ازسرنو مستحکم کیا اور صرف پانچ ہی برس کی انتھک محنت سے ملکی معیشت کو سنبھالا دے دیا۔

اس دوران میں سلطان کی سیاسی اور فوجی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ تجارت اور صنعت کے علاوہ اس نے فرانس کے ساتھ کئی فوجی معاہدے بھی کئے اس وقت نپولین مصر فتح کر چکا تھا۔ اس نے جو خط ٹیپو سلطان کو لکھے، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایران کے راستے ہندوستان آنا چاہتا تھا تاکہ یہاں انگریزوں سے نمٹ سکے۔ اس خط سے انگریز بھی آگاہ تھے۔ ابتدا میں تو وہ خاموش رہے مگر جب مرہٹوں اور نظام کی طرف سے انہیں مکمل معاونت کا یقین ہو گیا تو انگریز گورنر ولزلی نے سلطان کو تہدید آمیز خطوط لکھنے شروع کئے۔

سلطان کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے۔ مسلمان آپس کی سر پھٹول کے باعث کمزور ہو چکے تھے اور سات سمندر پار کی ایک قوم اپنے پنجے اس سرزمین میں گاڑ رہی ہے۔ اگر اس قوم کا مقابلہ نہ کیا گیا تو بہت جلد ہندوستان جیسا زرخیز علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا جائے گا جو یہاں سے دولت کو ہر روپ میں انگلستان پہنچا دیں گے۔

مگر افسوس کہ سلطان اپنے محل اور دربار میں ہونے والی سازشوں کو نہ سمجھ سکا۔ بزعم خود اس نے فرانسیسی طرز کی جمہوریت نیو ڈال دی۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ یہ زمین بھی موزوں ہے یا نہیں۔ میر صادق، پورنیا اور قمر الدین خاں جیسے وزرا اختیارات کو ناجائز طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہ فوری فوائد کے لالچ میں درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور حکومت کو مناصب کے بڑے بڑے عہدوں کی امید میں سلطان کا ہر راز ان تک پہنچا دیتے تھے۔

جب سلطان کے دل میں ان سازشوں کے متعلق شکوک کی جگہ گھری تو اس نے تمام عہدیداروں کو مسجد اعلیٰ سرنگاپٹم میں بلا کر وفاداری اور ایمانداری کا حلف لیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ انگریزوں کی سازشیں عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ اور ولزلی سلطان کو جنگ کی دھمکی دے چکا تھا

جولائی ۱۷۹۸ء میں ولزلی نے جنرل ہیرس کو حکم دیا کہ سلطان سے گفت و شنید ختم کر دی جائے اور سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا جائے۔ سلطان کو علم ہوا تو اس نے سفیر کے ذریعے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی مگر اس کا جواب یہ ملا کہ اب جنرل ہیرس ہی سے بات چیت ہو سکتی ہے۔

فروری ۱۷۹۹ء میں جنرل ہارس نے پیشقدمی شروع کر دی۔ ۲۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو اس نے سرنگاپٹم پر گولہ باری سے پیشتر مصالحت کا ایک مسودہ سلطان کی خدمت میں دستخط کرنے کے لیے بھیج دیا۔ جس میں انتہائی ذلت آمیز شرائط درج تھیں۔ یعنی نصف سلطنت چھوڑ دی جائے۔ دو کروڑ تاوان دیا جائے۔ جن میں سے ایک کروڑ فوراً ادا کیا جائے۔ چار بیٹے اور چار جرنیل بطور یرغمال دیئے جائیں۔ یہ جواب چوبیس گھنٹے کے اندر مانگا گیا تھا۔

سلطان ایسی ذلت آمیز شرائط پر صلح نہ کر سکتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" امید افزا جواب نہ ملنے پر جنرل ہیرس نے قلعہ پر گولہ باری شروع کرا دی۔ سلطانی افواج نے اس گولہ باری کا پوری مستعدی سے جواب دیا۔ مگر سلطانی وزرا غداری کی قسم کھائے بیٹھے تھے انہوں نے گولہ بارود میں مٹی اور سن ملوا دیا۔

۴ مئی کی صبح انگریزی افواج سرنگاپٹم کے گرد موجود دریائے کاویری کا دو سو گز پاٹ پار کر کے فصیل کے ایک شگاف پر حملہ کیا۔ سلطان نے خود وہاں دفاعی فوج متعین کی تھی۔ مگر عین اس وقت پورنیا نے محافظ فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے بلا لیا۔ یوں انگریزی فوج بلا تکلف اندر داخل ہو گئی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ٹیپو سلطان مورچوں پر سے چکر لگا کر سائبان تلے آکر بیٹھا تھا کھانا سامنے دھرا تھا۔ ابھی لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک جاں نثار سید غفار کے شہید ہونے کی اطلاع ملی۔ پتا چلا کہ انگریزی فوج قلعہ میں آ گئی ہے۔ سلطان نے یہ کہہ کر کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ "ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں۔"

اس وقت انگریزی فوج اندر آ چکی تھی۔ سلطان ڈوڈی دروازے کی طرف بڑھا چند جاں نثار ساتھ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ قلعہ سے باہر نکل کر کسی اور مقام پر پناہ لی جائے۔ لیکن میر صادق نے باہر نکل کر دروازہ بند کرا دیا اور خود شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک جاں نثار اس کی غداری کو بھانپ لیا اور پیچھے دوڑ کر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا دی

اب سلطان ہر طرف سے انگریزی فوج میں گھر چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی تلوار اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ سلطان کے دو زخم لگ چکے تھے۔ تیسرے زخم نے نڈھال کر دیا۔ وفاداروں نے اٹھا کر پالکی میں ڈالنا چاہا۔ لیکن ایک ہجوم نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ سلطان زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑا ایک انگریز سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کی بیش قیمت پیٹی اتارنا چاہی۔ ابھی سلطان میں زندگی کی رمق اور غیرت کا جوش باقی تھا۔ فوراً تلوار کا وار کیا۔ اور سپاہی کو کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ ایک اور سپاہی یا شاید اسی سپاہی نے پستول کے وار سے سلطان کو شہید کر دیا۔

۵ مئی کو انگریزوں نے سلطان کی میت کو حیدر علی کے پہلو میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا۔ اس کی دو بیویاں تھیں اور بارہ بیٹے تھے، جو اس کے بعد حراست میں لے گئے۔

۶ مئی تک سرنگاپٹم میں لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ محل کے علاوہ عوام کے گھروں سے کروڑوں اربوں پونڈ مالیت کی اشیا اٹھائی گئیں۔ ہزاروں لاکھوں افراد شہید ہوئے اور اس لوٹ مار کو روکنے کے لئے خود انگریز جرنیلوں نے اپنے کئی سپاہیوں کو پھانسی پر چڑھایا۔

اس وقت بڑا شہزادہ فتح حیدر سرنگاپٹم سے باہر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا، مگر انگریزوں کے ساتھ ساتھ پورنیا نے تخت دلانے کا یقین دلایا۔ چنانچہ اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ بعد میں لارڈ ولزلی اپنے عہد سے پھر گیا اور سلطان شہید کے شہزادوں کو دو لاکھ چالیس ہزار پگوڈا کا وظیفہ دے کر میسور کی گدی پر قدیم راجا کے پانچ بیٹے کو بٹھا دیا۔ شہزادوں کو پہلے ویلور میں نظر بند کیا

کیا گیا اور بعد ازاں کلکتے منتقل کر دیا۔

ٹیپو سلطان ایک بہت بڑا مجاہد اور پکا مسلمان تھا۔ نماز صبح کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور سارا دن باوضو رہتا۔ خود عالم تھا اور اہل علم کی قدردانی کرتا تھا۔ اس کا کتب خانہ ہندوستان کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔

اس کے اوضاع اور اطوار پسندیدہ اور مثالی تھے۔ حیاداری کا یہ عالم تھا کہ حمام میں بھی کپڑا باندھ کر نہاتا۔ اس نے کبھی ایسا کپڑا نہ باندھا جس سے جسم شرعی حدود میں ننگا ہوتا یا جس میں نماز نا جائز ہوتی۔ آخری دور میں سبز رنگ کی دستار پہنتا تھا۔ مکروہات اور منہیات سے اس نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ تمام فرامین پر اپنے ہاتھ سے بسم اللہ لکھتا اور نیچے دستخط کرتا۔

شجاعت اور بہادری میں اس کا کوئی ہم سر نہ تھا۔ شیر اس کا پسندیدہ جانور تھا۔ شاید اسی لیے انگریزوں نے اسے شیر میسور ہی کا لقب دیا تھا۔ اسلامی حمیت اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تعصب سے بھی پاک تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ پورنیا جیسے ہندو اس کے وزرا میں شامل تھے۔

ٹیپو سلطان بے حد اختراع پسند تھا۔ سن محمدی، نئے سکّوں، نئی وضع کے اسلحے، قواعد ضوابط، آئین وغیرہ کا اجرا اُس کی اختراع پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اسے اپنی ریاست اور عوام سے بے حد محبت تھی اور ہمیشہ ان کی فلاح و بہبود میں لگا رہتا۔ اگرچہ اس کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں گذرا، اس کے باوجود اسے جتنا بھی وقت ملا، اسے اس نے عوام کی فلاح کے لئے صرف کیا۔ کسانوں کو مالیہ معاف کیا سرکاری زمین پٹے اور ملکیت پر کاشت کے لئے دی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے بہتر اقدامات کئے۔ اس سے پہلے ہندو عورتیں عام طور پر سر و سینہ کھولے پھرتی تھیں۔ اس نے حکم دیا کہ کوئی عورت کرتے اور اوڑھنی کے بغیر باہر نہ نکلے۔

وہ مذہبی شعائر کا سختی سے پابند تھا۔ رمضان میں پورا ملک روزوں کا احترام کرتا اس نے گدی نشینوں اور مجاوروں کو نذر و نیاز لینے سے منع کر دیا۔ نیز لوگوں کو اپنے سامنے احتراماً جھکنے سے بھی منع کر دیا۔

حکومت کے لئے اس نے مختلف محکمے قائم کئے۔ جو تعداد میں ننانوے تھے۔ ہر محکمے کا ایک میر مقرر کیا۔ توشے خانے کو دو حصوں جنس اور نقد میں تقسیم کیا۔ بحریہ کا مستقل محکمہ قائم کیا۔ فوجی قواعد کے لئے کتاب لکھوائی۔ فن جہاز سازی پر توجہ دی۔ مقناطیسی پہاڑوں سے جہازوں کو بچانے کے لئے لوہے کی جگہ تانبے کے پیندے کا استعمال ٹیپو سلطان ہی کی ایجاد ہے۔

تجارتی و صنعتی ترقی کے لئے ہندوستان میں پہلا قدم ٹیپو سلطان ہی نے اٹھایا ریشم کی صنعت اسی کی مرہون منت ہے۔ لائے گئے۔ گندم، جوار، دھان کی کاشت سے خصوصی دلچسپی تھی۔ درختوں میں چیڑ، سال، ساگوان، سپاری، صندل اور ناریل لگانے پر زور دیتا۔ شہتوت کے درختوں پر ریشم کے کیڑے پالنے کے لئے بڑے بڑے باغات لگوائے۔

ان تمام امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان ایک ایسا مسلمان، غیور مجاہد باہمت جری، قابل، منتظم اور حکمران تھا۔ جس کی مثال تاریخ بہت کم پیش کر سکے گی مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد وہ جنگ آزادی کا پہلا ہیرو اور پہلا شہید تھا۔ زندگی بھر انگریزوں کا دشمن رہا اور اس نے ان کے غلبے سے ملک کو بچانے کے مقصد کی خاطر جان دے دی۔ دشمن پر اس کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ عرصہ دراز تک انگریز مائیں اپنے بچوں کو ٹیپو کا نام لے کر ڈراتی رہیں۔

ث

ثابتؓ بن ضحاک صحابی ابوزید کنیت تھی اور قبیلہ اشہل سے تھے۔ آپ بعثت نبوی کے تیسرے سال پیدا ہوئے۔ غزوہ حمراء الاسد اور خندق میں حصہ لیا۔ آپ سے چودہ احادیث کی روایت ہے۔ آنحضورؐ کے وصال کے بعد آپ نے شام میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر شام سے بصرہ منتقل ہو گئے اور وہیں پر مستقل سکونت پذیر ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں وفات پائی۔

ثابتؓ بن دحداح صحابی۔ ابوالدحداح کنیت قبیلہ بلی کے خاندان انیف سے تھے ہجرت کے بعد مشرف باسلام ہوئے اور بہت سے غزوات میں حصہ لیا۔ غزوہ اُحد میں جب مسلمان بددل ہو کر لڑائی سے کترانے لگے تو آپ نے انتہائی ثابت قدمی اور عزم و استقلال کا ثبوت دیا۔ قریش مکہ کے چند جانبازوں نے آپ کی شجاعت دیکھ کر آپ پر حملہ کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں کی ہمت افزائی کرنے والا کوئی شخص باقی نہ رہے خالدؓ بن ولید (جو ابھی تک اسلام نہیں لاتے تھے) کے نیزے سے زخمی ہو کر گر پڑے علاج کی بدولت عارضی طور پر تندرست ہو گئے۔ لیکن غزوہ حدیبیہ کے بعد زخم پھر سے ابھر آئے جو جان لیوا ثابت ہوئے۔

آپ صدقہ و سخاوت میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ کئی مرتبہ آپ نے مالی قربانی دی اور بے شمار دولت خرچ کی۔

ثابت بن قیس رضؓ صحابی۔ ابومحمد کنیت اور خطیب رسول اللہ لقب تھا۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ کئی غزوات میں آنحضورؐ کی معیت میں لڑے۔ حضرت جویریہؓ غزوہ مریسیع میں اسیر ہو کر ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں۔ جنہیں آنحضورؐ نے رقم دے کر ثابت بن قیسؓ سے آزاد کرا لیا اور اپنے عقد میں لے لیا۔ ۹ھ میں بنو تمیم کے وفد کے سامنے آپ نے آنحضورؐ کے حکم سے جوابی خطبہ دیا اسے سن کر بنو تمیم دنگ رہ گئے اور آپ کی فصاحت کے معترف ہوئے۔ ۱۱ھ میں جب طلیحہ پر فوج کشی کی گئی تو انصار آپ ہی کی قیادت میں تھے۔ جب وہ آیت جس میں مسلمانوں کو رسول اللہؐ کے سامنے اونچی آواز میں بولنے سے منع کیا گیا نازل ہوئی تو حضرت ثابتؓ بن قیس کو فکر دامنگیر ہوئی اور اپنے گھر میں سر جھکا بیٹھے رہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا تو کہنے لگے۔ میں اکثر آنحضورؐ کے سامنے اونچی آواز سے بولتا رہا اس باعث مجھے ضرور جہنم میں جانا پڑے گا۔ جب آنحضورؐ کو اس بات کا علم ہوا تو فرمایا "خدا کی قسم ثابتؓ جہنمی نہیں۔ بلکہ میں اسے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔"

۱۲ھ میں مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کے دوران شہید ہوئے۔

ثابت بن قرہ (۲۱۹ھ/۸۳۴ء - ۲۶ صفر ۲۸۸ھ/۱۸ فروری ۹۰۱ء) ماہر ریاضیات طبیب اور فلسفی۔ حران میں پیدا ہوا۔ وہ ایک اونچے خاندان کا فرد تھا۔ ابتدائی عمر میں صراف تھا۔ قیام بغداد کے دوران میں اس نے فلسفہ اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی۔ محمد بن موسیٰ اسے اپنے ہمراہ بغداد لے گیا اور خلیفہ معتضد کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ نے اپنے درباری منجموں میں شامل کر لیا۔ بغداد میں ثابت کا بیشتر وقت یونانی علماء کی تصانیف کے ترجمے اور شرح نویسی میں گذرا۔ اس کے علاوہ اس نے خود بھی ریاضی میں کتابیں لکھیں۔ فلسفے کا مطالعہ اور مطب کا شغل بھی جاری رکھا۔ اور بغداد ہی میں انتقال کیا۔

خلیفہ کے دربار میں ثابت کی بارسوخ شخصیت سے صابیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ثابت کی سریانی تصانیف جو اس نے غالباً حران ہی میں اپنے ہم مذہبوں کے عقائد اور طریق عبادت کے متعلق لکھیں تھیں۔ آج کل یہ کتابیں ناپید ہیں۔ ابن العبری کو جس نے تیرہویں صدی میں انتقال کیا۔ ان کتب کے متعلق ایک حد تک معلومات تھیں

ثابت کی عربی تصانیف کی فہرستیں خودل زون، زوٹر، شٹائن، شتائنڈر براکلمان اور ویڈیمان نے اپنی کتب میں دی ہیں۔ بہت سا قیمتی اور قابل اشاعت مواد اب بھی مخطوطات کی صورت میں موجود ہے۔

ثانی شرقپوری رحؒ (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء - ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء) میاں غلام اللہ نام حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے بھائی اور خلیفہ۔ شرقپور میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ تربیت میاں شیر محمدؒ نے کی۔ میٹرک تک تعلیم پائی اور طبیہ کالج سے حکیم حاذق کا امتحان پاس کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی تو طبابت چھوڑ کر میونسپل کمیٹی شرقپور میں سیکرٹری ہو گئے میاں صاحب نے اپنی زمین واقع جھوک گنڈو والی ان کے نام کر دی تو نمبرداری بھی مل

گئی۔ ایک روز میاں صاحبؒ نے نظر توجہ کی تو تصوف کی راہ پر آ گئے اور ان کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں انہوں نے جامعہ حضرت میاں صاحبؒ کی بنیاد رکھی اور تبلیغ اسلام کے لیے ایک انجمن "حزب الرسول" قائم کی۔ تین حج کیے اور تقریباً تیس برس تک منصب خلافت ادا کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ پسماندگان میں دو صاحبزادے چھوڑے۔

حضرت ثانیؒ صحیح معنوں میں میاں صاحب کے ثانی تھے۔ انھی کی مانند وعظ فرمایا کرتے۔ خلافت شریعت کسی کو بات نہ کرنے دیتے۔ طبیعت میں انتہائی سادگی اور سخاوت تھی۔ سائل کو کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹایا کرتے۔ دین اسلام کی اشاعت کا شوق بے حد، جس کا مظہر تبلیغی انجمن ہے۔ ان کا عرس ۲۹ر سے ۳۱ر جولائی تک ہوتا ہے۔

ثعالبی تین مشہور عرب مصنفین جنکا اسم نسبتی ثعالب سے ماخوذ ہے یعنی لومڑیوں کی کھالیں سینے اور ان کا کاروبار کرنے والے

(۱) ۔ ثعالبی ابو منصور:۔ (۳۵۰ھ/۹۶۱ء ۔ ۴۳۰ھ/۱۰۳۹ء) عبدالملک بن محمد اسماعیل پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کا ایک کاتب، شاعر اور مصنف جس کی پچاس سے زائد تالیفات ہیں۔ نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کے حالات زندگی جو اس کی تصانیف سے اخذ کیے گئے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

بقول ابن خلکان "ثعالبی فرا تھا یعنی لومڑی کی کھال کی پوستینیں سیا اور بنایا کرتا تھا۔ لیکن بقول ذکی مبارک "یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کا ادبی کمال ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور اس کی شہرت ابھی دور دور تک نہیں پہنچی تھی" جب اس نے کاتب، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے کمال حاصل کر لیا تو ملوک و امرائے وقت کے ہاں اسے تقرب حاصل ہو گیا۔ جن امراء کے پاس اسے رسائی اور تقرب حاصل تھا ان میں امیر صاحب الجیش ابوالمظفر نصر بن ناصرالدین سلطان مسعود ابن محمود، ابوالعباس مامون بن مامون خوارزم شاہ خلف بن احمد سنجری الشیخ ابوالحسن محمد بن عیسے الکرجی، امیر ابوالفضل عبیداللہ بن احمد المیکالی، ابوالحسن مسافر بن الحسن، الوزیر ابونصر احمد بن محمد، امیر ابونصر سہل ابن المرزبان تھے۔

۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء میں ثعالبی نیشاپور چھوڑ کر جرجان پہنچا۔ وہ ایک طویل مدت تک غزنہ میں مقیم رہا۔ ۳۸۲ھ/۹۹۲ء میں وہ بخارا میں تھا۔ ۴۰۳ھ میں جرجان سے جرجانیہ گیا۔ تقریباً ایک سال بغداد میں بھی مقیم رہا۔

ثعالبی کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور تصنیف "یتیمۃ الدھر فی محاسن ابن العصر" ہے۔ یہ کتاب اس نے ہارون بن المنجم کی کتاب البارع کے ذیل کے طور پر لکھی۔ یہ کتاب ۳۸۴ھ میں لکھنا شروع کی اور تقریباً ۴۰۳ھ میں اسے جرجان میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں ثعالبی کے معاصر اور اس سے پہلی نسل کے شعراء کا تذکرہ ہے جس کی ترتیب شعراء کے اوطان کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تذکرہ میں زیادہ تر منتخب اشعار مجموعہ ہے۔ جس میں شعراء کے سوانح حیات عام طور پر نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تعریفی کلمات مبالغہ آمیز بیان کیے ہیں اور ان کلمات کا استعمال مختلف شعراء اور ادبا کے لیے اس طرح کیا ہے کہ کسی کے بارے میں بھی تشخیص اور تمیز میں مدد نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اس کی ایک کتاب "احاسن کلم النبیؐ والصحابہ والتابعین وملوک الجاہلیہ وملوک الاسلام والوزراء والکتاب والبلغاء والحکماء" بھی بے حد اہم ہے۔

(۲) ثعالبی، ابو منصور:۔ (وفات ۔ ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) حسن بن محمد المرغنی۔ ایک عرب مورخ۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ اس نے ایک کتاب "الغرر فی سیر الملوک واخبارھم" لکھی اور اسے امیر نصر محمود غزنوی کے بھائی کے نام معنون کیا۔ اس کتاب میں نوع انسانی کی تاریخ حضرت آدمؑ سے لے کر محمود سبکتگین کے زمانے تک درج ہے۔ اس کتاب میں عرب تاریخ نویسی کی پرانی رسم یعنی واقعات کو خالصتاً سال وار لکھنے کی قیود سے آزاد ہو کر تاریخ کو نفسیاتی اصولوں کے مطابق قلم بند کرنے کی ایک قابل تعریف کوشش ہے۔ اس نے طبری، [illegible] اور دوسرے عرب مورخین کی کتب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مگر کسی تنقید کے بغیر ان کا مواد شامل تصنیف کر دیا۔

(۳) ثعالبی، عبدالرحمٰن:۔ (۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء ۔ ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء) ابن محمد بن مخلوف الجزائری۔ شمالی افریقہ کے ایک عالم دین الجزائر میں پیدا ہوئے۔ بجایہ، تونس اور قاہرہ میں تعلیم پائی۔ قاہرہ سے بغرض حج بیت اللہ حجاز کا قصد کیا۔ زیارت خانہ کعبہ کے بعد تونس واپس آئے اور یہیں وفات پائی۔

آپ کی تصانیف میں سب سے اہم قرآن مجید کی تفسیر ہے جو آپ نے ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء میں مکمل کی۔ تفسیر کا نام "الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن" ہے۔ اس کے علاوہ "العلوم الفاخرہ فی النظر فی امور الآخرہ" جو مسائل معاد پر ہے۔ "جامع الامہات فی احکام العبادات" اور "رسالہ الانوار المضیئہ الجامعہ بین الشریعۃ والحقیقۃ" بھی آپ کی بہترین تصانیف میں سے ہیں۔

ثعلبہ بنو ایک عام اور قدیم اسم جس کا اطلاق قدیم عرب کے متعدد قبائل کی بڑی شاخوں کے ناموں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ثعلبہ بن عکابہ جو بکر بن وائل کے بڑے قبیلے کی اہم شاخ ہے اور یمامہ سے بحرین تک کے علاقے میں آباد ہے۔ "ثعلبہ بن ذبیان" جو غطفان کی شاخ ہے اور علاوہ [illegible] "ثعلبہ بن یربوع" تمیم کا ایک قبیلہ ہے۔

ثعلبہ نام کے دو اور قبائل بھی قابل ذکر ہیں ان میں یثرب بن اوس کا ایک قبیلہ ثعلبہ اور دوسرا ثعلبہ بن الفطیون جو یہودی بنی قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک رکن مخیرق بہت بڑا عالم تھا۔ [illegible] اس نے اسلام قبول کر لیا اور جنگ احد میں شہید [illegible]۔

ایک اور شخص ثعلبہ بن عمرو بن [illegible] تھا جو خاندان غسان کا پہلا رئیس بتایا جاتا ہے۔

ثعلبی (وفات ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) احمد بن محمد بن ابراہیم، ابو اسحاق [illegible] ایک مشہور امام اور مفسر۔ آپ کی مشہور تصنیف تفسیر "الکشف والبیان عن تفسیر القرآن" ہے۔ اس تفسیر میں آپ نے طبری کے علاوہ [illegible] ماخذوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تفسیر [illegible] کے لحاظ سے [illegible] ہے۔ دوسری مشہور تصنیف "قصص انبیاء" جو [illegible] ہے۔ اس میں انبیاء کے بارے میں تمام واقعات تفصیل سے [illegible] درج کیے گئے ہیں۔

ثقافت تہذیب، تمدن، اخلاقیات، تربیت، ذہنی ترقی، [illegible] اختیار، آداب، رکھ رکھاؤ۔ یہ ایک مجموعی لفظ ہے، جو [illegible] اور تمدن کے لیے [illegible]۔ اصطلاحی طور پر [illegible] تہذیب اور تمدن، [illegible]

کے معنوں میں فرق ہے۔

ثقافت کے اصطلاحی معنی انسانوں کے طریق زندگی کے ہیں۔ یعنی انسان کیونکر رہتے سہتے چلتے، کھاتے پیتے، بولتے گاتے اور سلیقے سکھاتے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر طرز معاشرت کو ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے کلچر (CULTURE) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی "ہل چلانا" یا "کھیتی باڑی کرنا" کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کے مفہوم میں ذہنی ترقی، اخلاق و آداب، تہذیب و

جامعہ ازہر (قاہرہ) کا دالان

تمدن اور قومی خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام کام اکتسابی ہوتے ہیں۔ یعنی انسان خود سیکھ کر کرتا ہے۔ ان میں جبلی اور فطری طور پر انجام پانے والے کام شامل نہیں۔ مثلاً بھوک جبلی شے ہے اس لئے یہ ثقافت میں شامل نہیں۔ مگر اسے مٹانے کے لئے جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ انہیں ثقافت میں شامل کیا جاتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ثقافت ماحول اور ضرورت کے تحت جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے۔ ثقافت ہر شخص کی ضرورت ہے اور ہر شخص ثقافت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

تہذیب ثقافت کی ایک شاخ ہے، جس میں تحریر کا استعمال، شہروں کا وجود سیاسی ردّ و بدل اور پیشہ وارانہ تخصص شامل ہے۔ جدید دور کے محققین نے ثقافت کی حدود میں مذہب، فلسفہ، آرٹ اور معاشرت کو شامل کیا ہے اور تہذیب میں ہر طرح کے تکنیکی علوم کو شامل کیا ہے۔ ثقافت کی طرح ہر شخص تہذیب میں اپنا کردار ادا نہیں کرتا اور یہ اس کے لئے ضروری بھی نہیں۔ ثقافت کی ترقی میں تہذیب ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ثقافت تہذیب یافتہ بھی ہو سکتی اور غیر تہذیب یافتہ بھی۔ مثلاً ہجری دور کی ثقافت ۲۰۰۰ ق م میں تہذیب یافتہ ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس وقت تحریر اور شہر وجود میں آ چکے تھے۔

تمدن بھی تہذیب کی طرح ثقافت کی ایک شاخ ہے۔ یہ لفظ مدینہ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی شہر کے ہیں۔ تمدن کو شہر کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تمدن شہروں کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ گویا تمدن شہری طرز معاشرت و معیشت کا نام ہے۔ غلطی سے تمدن کے لفظ کو تہذیب کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ہم ہڑپا یا قدیم روما کی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل ہم اس کے تمدن کی بات کرتے ہیں۔ تمدن عارضی اور مقامی ہوتا ہے۔ ہر قوم اور علاقے کے ساتھ اس کا تمدن نشوونما پاتا اور بالآخر اس کے ساتھ ہی مٹ جاتا ہے۔

ثقافت، تہذیب اور تمدن کی ان تعریفوں میں سے بھی ثقافت کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں آتا۔ اس سلسلہ میں اے ایل کروب اور اس کے ایک دوست نے اہم علمی کوشش سر انجام دی ہے۔ ان کے نزدیک ثقافت:

۱۔ کا حقیقی تعلق معیار سے ہے۔

۲۔ اس میں شعور و ادراک بھی ایک اہم فعل ہے۔

۳۔ ضروری ہے کہ یہ معیار کسی نوع یا معاشرہ کی عملی زندگی میں جاری و ساری ہو۔

۴۔ اس طرز زندگی کو اس نہج کا ہونا چاہیئے کہ اس پر صحت مند مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

اسلامی ثقافت

کیا مسلمانوں کی جداگانہ ثقافت، تہذیب یا تمدن ہے یا کبھی رہا! کیا اسلام نے کسی قسم کی ثقافت کا آغاز کیا؟۔ اس کا جواب صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ خود مفکرین یورپ نے بھی دیا ہے۔ "تشکیل انسانیت" میں رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

"یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد و گوناگوں اثرات ہیں۔ جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔ پھر اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہلو نہیں جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتا نہ چلے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے ظہور سے ملتا ہے۔ جو عصر حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کار فرمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ ہمارا مطلب ہے علوم طبعی اور روح علم کے ظہور سے ...."

بریفالٹ کی طرح دیگر مستشرقین کو بھی اس امر کا بخوبی یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب یا ثقافت مغربی تہذیب و تمدن کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی تہذیب ہے۔ جو علم و اخلاق سے آراستہ اور عشق جیسی توانائی سے مسلح ہے۔ مصر و بابل کا تمدن ختم ہو گیا، ان کی تہذیب و تمدن اجڑ گئی اور ثقافت برباد ہو گئی۔ چین کی ثقافت عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی ہندو تہذیب و تمدن اوہام اور خرافات کا مجموعہ ہے اور یورپی تہذیب میکیاولی کی ابلیسی سیاست پر مبنی ہے۔

مولانا مودودی نے اسلامی تہذیب اور اس کے مبادیات پر بہ احسن طریق قلم فرسائی کی ہے۔ انہوں نے ثقافت اور تہذیب کو ہم معنی الفاظ قرار دیتے ہوئے تہذیب ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع بدائع، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست (جسے ہم نے ثقافت کا نام دیا ہے) تہذیب

کے نتائج ومظاہر ہیں۔ جبکہ تہذیب کے عناصر ترکیبی ۱۔ تصور زندگی ۲۔ زندگی کا نصب العین ۳۔ بنیادی افکار وعقائد، ۴۔ اخلاقی تربیت، ۵۔ نظام اجتماعی ہیں۔ دنیا کی ہر تہذیب انہی عناصر سے بنی ہوئی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اسلامی ثقافت کو ان عناصر کی بنیاد پر دیکھیں، لازم ہے کہ ثقافت کے وسیع مفہوم کا جائزہ لیتے ہوئے اسلامی ثقافت کا کھوج لگائیں اس کا آغاز داعیٔ اسلام کی بعثت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ "لاالٰہ الا اللہ" وہ بنیادی کلمہ ہے، جس پر اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن کی عمارت استوار ہوتی ہے، جس کا سب سے پہلا اخلاقی مظہر "السلام علیکم" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ وحشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا اور ایشیا وافریقہ کی ثقافت وتمدن میں تہذیب کا شائبہ تک نہ تھا۔ یورپ کا تمدن بھی غیر مہذب اور ثقافت بھی غیر مہذب تھی۔ اس وقت اسلام کی روشنی عرب سے نکلی جس کی تہذیب نے پوری دنیا کو راہِ ہدایت دکھائی۔ اسلام وہ پہلا دین ہے، جس نے مذہب کی صحیح حدود متعین کیں۔ اسے ذاتی ذوق سے نکال کر اجتماعی مقام عطا کیا فلسفے کو ایک نیا موڑ بخشا، تمام علوم وفنون کو یکجا کیا اور انسانی تہذیب ومعاشرت کو یک لخت بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ تکنیکی علوم میں مسلمانوں نے جدید یورپ کی سی ترقی نہیں کی لیکن بغداد اور اندلس کے مراکز علوم وفنون کی بیشتر مثالیں، تکنیکی علوم میں مسلمانوں کے ذوق وشوق کا اظہار کرتی ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے طریق زندگی میں اس حد تک تبدیلی پیدا کر دی کہ آج بھی مختلف مقامی ثقافتوں کے باوجود مجموعی طور پر اسلامی ثقافت ایک ہی ہے جس کا آغاز کلمہ طیبہ سے ہوتا ہے تو انجام صفائی (باطنی وجسمانی) پر۔

اسلامی ثقافت کی بنیادیں

اسلامی ثقافت کیونکر ایک جداگانہ حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور اس سے مسلمانوں کی مختلف تہذیبوں اور تمدنوں نے کیوں کر جنم لیا؟ اس کا جواب مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر دیا ہے۔ ان کی تشریحات کا لب لباب یہ ہے۔

اسلام کا تصورِ زندگی:۱۔ اسلام کا تصور زندگی دیگر تمام اقوام ومذاہب سے جدا اور افراط وتفریط میں میانہ رو ہے۔ اسلام نے نہ تو انسان کو غیر ذمہ دار اور متکبر ہونے کی اجازت دی ہے اور نہ مجبور وبے کس مخلوق ٹھہرایا ہے۔ انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ نطفہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ بے بس بچہ ہوتا ہے۔ قدرت اس کی پرورش کا سامان کرتی ہے۔ وہ جوان ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو کر مر جاتا ہے۔ اس مختصر عرصۂ حیات میں وہ ایک لمحہ بھی اپنی زندگی پر قادر نہیں ہوتا۔ یقیناً اس سے بالاتر ایک قوت موجود ہے جس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف کائنات کی تمام چیزیں انسان کے لیے کارآمد ہیں۔ وہ ان پر فضیلت رکھتا ہے اور انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور نائب ہے کائنات اور اس کی تمام اشیاء کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ انسان کو اس کا تصرف حاصل ہے مگر اس تصرف کے سلسلے میں وہ اللہ کے آگے جوابدہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے انسان کائنات اور اس کی اشیاء کا استعمال اللہ کی بتائی ہوئی حدود میں رہتے ہوئے کرے۔ اس ذمہ داری میں ہر شخص فرداً فرداً اللہ کے آگے جوابدہ ہے۔ یہ دنیا صرف برتنے کے لیے ہے۔ حلال چیزیں خود حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے والے خدا کے باغی ہیں۔ جن کا حساب آخرت میں ہوگا۔ ایماندار اچھا اجر پائیں گے اور بے ایمان اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ ضرورت ہے کہ دنیا اور اس کے اموال کا استعمال اس طرح سے کیا جائے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ کیونکہ ایک وقت آنے والا ہے کہ جب ہر نفس کو اس کی سعی کے مطابق بدلہ ملے گا۔ پس جو شخص ذرہ برابر بھی نیک عمل کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برا عمل کرے گا وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ ہر نفس جو کچھ کماتا ہے۔ اس کا بوجھ اسی پر ہے اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ایک گروہ انسان کو مجبور وبے کس ٹھہراتا ہے دوسرے گروہ کے نزدیک کائنات کی بنیاد تکلیف اور دکھ پر ہے۔ تیسرا گروہ اس زندگی کو حقیقی سمجھ کر [illegible] راہ پر گامزن ہے اور چوتھا گروہ اس ساری دنیاوی زندگی کو سراسر گناہ سمجھ کر [illegible] کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن اسلام ان سب کے بین بین راستہ اختیار کرتا ہے [illegible]

برصہ میں عثمانی تعمیرات (۱۳۰۱ء)

مسجد قرطبہ کا [illegible]

کو طبعی قوانین قدرت کا پابند ٹھہرا کر نیابت الٰہی کا مکلف ٹھہراتا ہے۔

یہی چیز اسلامی ثقافت کی پہلی بنیاد ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھک سکتا۔

۲۔ **زندگی کا نصب العین:**۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر فرد، قوم اور تہذیب میں اس کا جواب مختلف طور سے ملے گا۔ تاہم ایک شے ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے خوشی اور مسرت کا حصول۔ روحانی تہذیبوں میں اسے نجات کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام میں زندگی کا نصب العین صرف اللہ کی خوشنودی کو قرار دیا گیا ہے۔ انسان کا ہر خیال، ارادہ اور عمل صرف اللہ کے لیے ہونا فرض ہے یعنی جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، وہ دراصل اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ اخلاق و طبعی قوانین کے تحت کیا جاتا ہے۔ جب تمام کائنات ایک خدا کی مطیع و فرمانبردار ہے تو اخلاق و عقلی طور پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان کے ہر ارادے اور فعل کا مقصد رضائے الٰہی قرار دیا جائے تاکہ فرض نیابت بہ احسن طور ادا ہو سکے۔

جب زندگی کا مقصد اللہ کی خوشنودی ٹھہرے تو یقیناً انسان کا ہر ثقافتی فعل، خیال، ارادہ، زندگی، موت، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، معاملات معاشرت، دوستی دشمنی، معیشت و معاشرت وغیرہ محض اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ گویا اسلامی ثقافت کی دوسری بنیاد "خالص اللہ کے لیے ہونا" ہے۔ یہ چیز اسلامی ثقافت کو دنیا کی دیگر ثقافتوں اور تہذیبوں کو جدا کر دیتی ہے۔

۳۔ **بنیادی افکار و عقائد:**۔ ہر انسانی تہذیب اور ثقافت کسی نہ کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایمان کی اصطلاح قائم کی گئی ہے اسلام کے علاوہ دیگر تہذیبوں میں اوہام باطلہ کی ایک کثیر تعداد ایمان میں شامل ہے۔ ایسے ایمان میں قوم پرستی، شخصیت پرستی، قانون پرستی، علم پرستی، نفس پرستی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اسلام میں ایمان صرف پانچ بنیادوں پر قائم ہے۔ اس میں کسی قسم کے وہم، تعصب یا نفس پرستی کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پانچ باتوں پر ایمان کو توشۂ آخرت قرار دیا گیا۔

۱۔ **اللہ پر ایمان** کہ وہ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ چنانچہ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ تنگ نظر نہیں ہو سکتا، خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ اس کے سامنے خشوع خضوع اور انکسار کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ صبر و توکل سے کام لیتا اور کبھی بھی اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا۔ اس سے اس کے اندر بزدلی نہیں آتی اور وہ ہمت و شجاعت کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے دل سے حرص و ہوس اور رشک و حسد کے جذبات بھی دور ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے اعمال کی تہذیب کرنے پر مجبور رہتا ہے۔

(ii) **فرشتوں کے وجود پر ایمان:**۔ یعنی ایسی قدرتی قوتیں موجود ہیں جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کوئی انہیں عقول کہتا ہے تو کوئی طبعی قوانین اور کوئی خدا کے بیٹے۔ مگر اسلام کے نزدیک فرشتے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ مخلوق خدا ہیں۔ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے احکام کے پابند ہیں انھی میں سے کچھ پیغام رسانی پر لگے ہوئے ہیں۔ جو اللہ کی وحی اس کے برگزیدہ بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ ان پر ایمان کا مطلب ہے کہ انسان یقین کرے کہ یہ ساری کائنات ایک نظام کی طرح مربوط ہے، جسے خدا کے مقرر کردہ فرشتے چلا رہے ہیں۔

(iii) **رسولوں پر ایمان:**۔ اس بات پر ایمان لانا کہ خدا اپنے بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اور ان کی رہبری کرتا ہے۔ وہ اس پیغامبری کے لیے چند لوگوں کو چن لیتا ہے۔ انہیں رسول کہتے ہیں۔ جنہیں وحی کے ذریعے فرشتے خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ایسے لوگ غیر معمولی علم اور بصیرت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا علم یا خبر یقینی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا دیا ہوا پیغام صحیح اور سچا ہے۔ تمام پیغمبر ایک ہی پیغام لے کر آئے تھے۔ ان کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور حضرت محمدؐ پر ختم ہوا ہے۔ آنحضور صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ گویا آخری ہدایت ہے، جس میں کوئی ردوبدل نہیں۔ یہاں آکر تمام رسولوں کے پیغام کی تکمیل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب لازم ہو گیا ہے کہ اتباع و اطاعت رسول کی جائے۔

ایمان بالرسول کی بنیاد پر جو تہذیب قائم ہوتی ہے، وہ تمام خرابیوں سے پاک ہوتی ہے۔ کیونکہ اولاً اس میں طرق فکر ایک ہی شخص مقرر کرتا ہے۔ وہی اصول اخلاق بھی متعین کرتا ہے اور وہی قوانین وضع کرتا ہے۔ اس طرح سے وہ تہذیب و تمدن کا منبع مصدر بن جاتا ہے۔ خدا کے رسولؐ کے مقرر کردہ اصول قومی یا زمانی نہیں بلکہ آفاقی اور مبنی بر صداقت ہوتے ہیں۔ جس چیز کو محمدؐ نے کفر اور باطل قرار دے دیا ہے، وہ ہمیشہ کے

کتاب "مجالس حریری" کا ایک ورق (عہد عباسی)
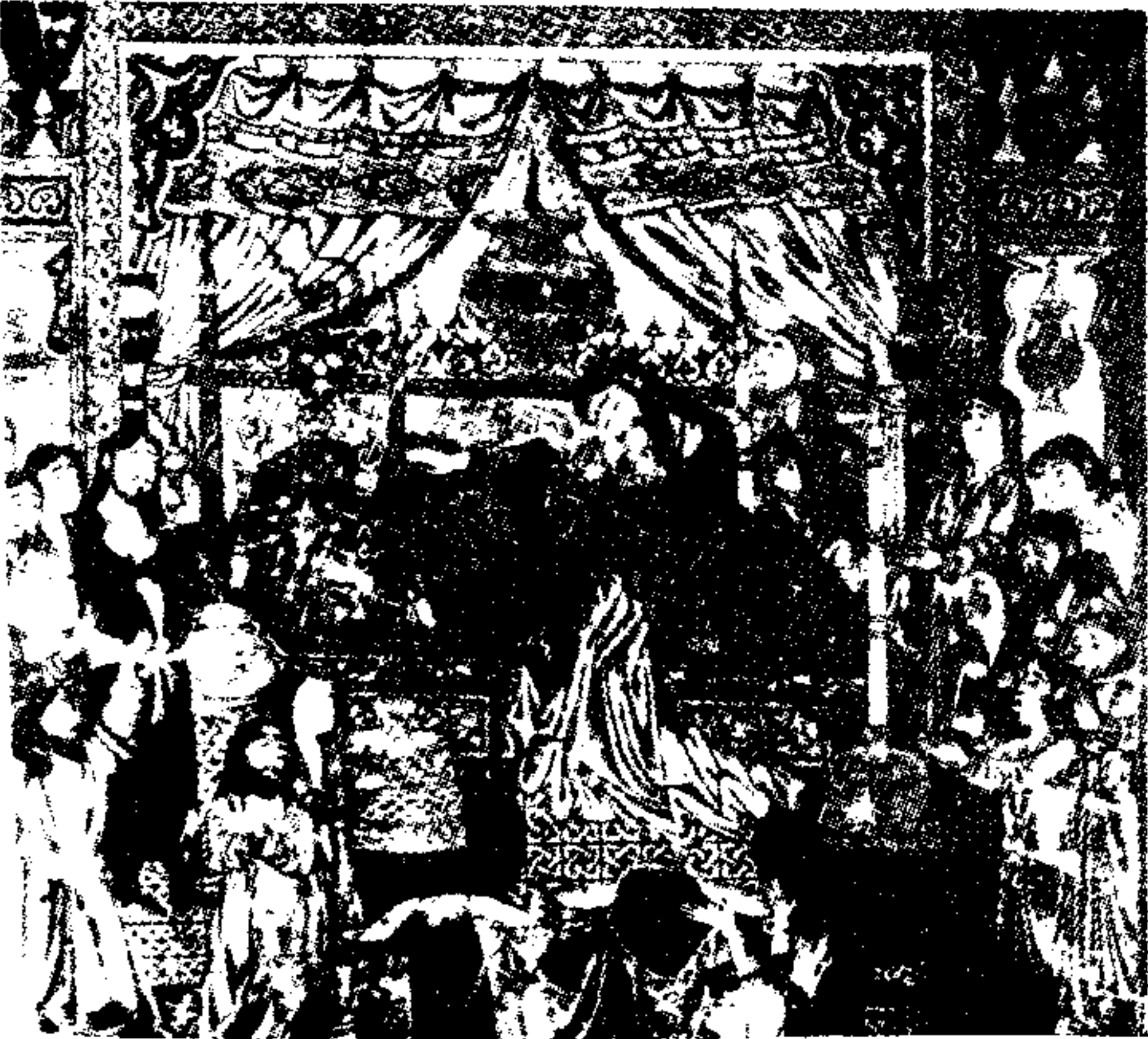
شاہنامہ فردوسی کا ایک ورق۔ سکندر اعظم کی محفل

لیے کفر اور باطل ہے اور جسے اسلام اور حق کہہ دیا وہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور حق ہے یہی وہ ٹھوس بنیاد ہے جس پر اسلامی تہذیب کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

(۲) الہامی کتابوں پر ایمان :- اس امر پر ایمان لانا کہ اللہ تعالٰی نے اپنے رسولوں پر کتابیں نازل کیں۔ کتابوں سے مراد اللہ کا کلام ہے، جو اس کے رسولوں پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے کی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ اگرچہ تمام الہامی کتابوں کے وجود پر ایمان ضروری ہے لیکن اتباع صرف قرآن مجید کا ضروری ہے۔ کیونکہ دیگر الہامی کتب میں تحریف کی گئی ہے اور یوں اس میں کلام انسانی شامل کر دیا گیا ہے۔ جبکہ قرآن مجید اس خامی سے پاک ہے۔ یوں یہ شریعت اسلامی کا منبع و مصدر ٹھہرتا ہے۔ جس پر اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے۔

(۳) یوم آخرت پر ایمان :- اس امر پر ایمان کہ موت کے بعد ایک زندگی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کی ہے۔ یہ زندگی صرف اس دائمی زندگی کو حاصل کرنے کی تیاری کرنے کے لیے عطا کی گئی ہے۔ ایک دن آئے گا جب ساری مخلوق دوبارہ زندہ کی جائے گی اور ان کے اعمال کے مطابق جزا و سزا قائم کی جائے گی۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل برا ملنا لازم ہوگا۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی بس یہی کچھ ہے، جو ہمارے سامنے ہے۔ دوسروں کے نزدیک زندگی شعور اور احساس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تیسرے کے نزدیک روح انسانی بار بار اس دنیا میں مختلف روپ میں آتی جاتی رہتی ہے اور یوں یہ کارخانۂ حیات مسلسل چلتا رہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ کائنات ایک روز پیدا ہوئی تھی تو ایک روز ختم بھی ہو جائے گی۔ موت فنائے محض نہیں بلکہ انسان کو ایک زندگی سے دوسری کی طرف لے جانے والا ایک دروازہ ہے۔ جہاں رائی کے برابر عمل بھی سامنے آ جائے گا۔ وہاں افعال کے وہ حقیقی نتائج مرتب ہوں گے، جو عقل، حکمت اور عدل و انصاف کے مطابق ہیں موجودہ دنیا کے وہ مادی وسائل اور قوانین جو انصاف و عقل کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ وہاں بے اثر ہوں گے۔ مثلاً دولت، سفارش، حمایت، چالاکی، طاقت وغیرہ۔

اس عقیدے کے ماننے سے لازم ہو جاتا ہے کہ انسان خود کو ایک ذمہ دار ہستی سمجھے اور اپنی ہر حرکت اور فعل کے لیے ذمہ دار بنے۔ چنانچہ وہ اپنی دنیاوی زندگی اس طرح سے مرتب کرے گا کہ اسے آگے چل کر جواب دہ ہونا ہے۔ نیز حیات دنیا ایک دھوکا ہے اور آخرت بہتر جگہ ہے۔

۴۔ تربیت افراد :- اسلام میں تربیت افراد کا طریقہ خارجی سے زیادہ داخلی ہے تہذیب و تزکیۂ نفس کے بعد ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ بہتر معاشرتی زندگی گزار سکے۔ اسلام نے اعمال کا دارومدار نیت کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ نیت درست ہونے ہی سے کردار و عمل کی درستگی ہو سکتی ہے اور جب ایسا ہو تو یقیناً ایک ناجی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جس کی ثقافت دنیا کی بہترین ثقافت بن جاتی ہے۔ وضو، غسل اور دیگر ایسے کئی طریقوں سے جسمانی پاکیزگی اور طہارت کی عادت پڑ جاتی ہے، جو یقیناً ایک صاف ستھری ثقافت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

۵۔ اجتماعی نظام :- اگرچہ اسلام نے انفرادیت پر زور دیا ہے لیکن ہر فرد کو ذاتی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ملت یا معاشرے کا پابند بھی ٹھہرایا ہے۔ اطاعت امیر اور پابندی شریعت فرد میں ایسی خصوصیات پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ ملت کے ساتھ وابستہ رہ کر اس کی [illegible] اور قوت کا باعث بنتا ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام خاندان سے شروع ہو کر مسجد، محلہ، گاؤں، شہر [illegible] پھر درجہ بدرجہ ملت اسلامیہ کی طرف جاتا ہے۔ لیکن مسلمان کی وفاداری ترجیحی طور پر [illegible] ملت کے ساتھ ہے اور پھر درجہ بدرجہ ہوتی ہوئی خاندان اور ذات تک آتی ہے [illegible] نسبتاً ایک مضبوط معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔

اسلامی ثقافت کی روح :- وہ کونسی واحد بنیاد ہے [illegible] تہذیب و ثقافت کی عمارت تعمیر ہوئی یعنی [illegible] کا جواب علامہ اقبال نے اپنے [illegible] میں یوں دیا ہے [illegible] اسلام کی وہ توجہ جو اس نے علم و حکمت کی [illegible] جائے کہ یہ یونانی فلسفہ تھا [illegible] ثقافت کی [illegible] افکار اسلامی نے جس سمت میں حرکت کی [illegible] کے بقول یونانیوں کی نظر ہمیشہ تناسب پر رہی۔ لامتناہیت [illegible] کا ذہن ہمیشہ وجود متناہی کی قدر [illegible] رہا۔ اسلامی ثقافت کے نزدیک فکر محض [illegible] رہا ہے کہ لامتناہی سے لطف [illegible]

مسجد ابن طولون قاہرہ [illegible] (عہد عباسی)

اسلامی تہذیب و ثقافت، ابتدائی عہد میں

تہذیب و تمدن ثقافت کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ اسلامی ثقافت میں بھی ان شاخوں نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے کہ ان تہذیب و ثقافت کو جدا جدا [illegible] میں دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ابتدائی [illegible] کی اسلامی ثقافت یقیناً عرب ثقافت سے ایک حد تک جداگانہ تھی۔

[illegible] بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عرب بت پرست تھے۔ حضرت محمد صلعم کی برکت نبوت سے وہ چند برس میں توحید پرست ہو گئے اور خانہ کعبہ بتوں سے پاک ہو گیا۔ جگہ جگہ مساجد قائم ہو گئیں۔

۲۔ اسلام [illegible] تہذیب کا ایک اہم اور بنیادی جزو بن گیا۔

[illegible] اخوت اور بھائی چارے نے لے لی۔

[illegible] سمجھنے کی جگہ انہیں بھی معاشرے میں [illegible]

[illegible] کی جگہ سادگی اور خلوص نے لے لی۔

[illegible] کا حق سمجھا جانے لگا۔

[illegible] مظلوموں اور بیواؤں کی دادرسی ہونے لگی

[illegible]

[illegible] کی بن گئیں۔

[illegible] مسلمانوں کا [illegible] بن گیا۔

[illegible] زندگی اختیار کرنے لگے۔

۱۲۔ روایتی بہادری کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی حدود سے نکال کر اشاعت اسلام کے لیے صرف کیا جانے لگا۔

۱۳۔ حاکمیت اعلیٰ کا حق دار صرف خدا تعالےٰ کو سمجھا گیا۔ جس کی نیابت خلفاء، شریعت کی حدود میں رہ کر کرتے تھے۔

۱۴۔ خلفاء کا چناؤ اور عوام کے سامنے جوابدہی جمہوری اصولوں سے بھی کہیں بہتر جمہوری ہو گئی۔ ابوبکر صدیقؓ کا خطبہ اس امر کی گواہی دیتا ہے۔

۱۵۔ علم، ادب، فن کے ہر شعبے پر اسلام کی ایک مخصوص چھاپ لگتی چلی گئی۔

۱۶۔ دنیا میں پہلی بار باقاعدہ تعلیمی نظام اور درس گاہوں کا اجراء ہوا۔ اس سے پہلے مقامی اساتذہ اور ان کی درسگاہیں محدود تعداد میں ہوا کرتی تھیں۔

۱۷۔ مسلمان اپنا کام عموماً خدا کی خوشنودی کے لیے، خدا واسطے سے کرتے تھے۔

۱۸۔ عوام کی خبر گیری اور انتظام سلطنت کے لیے بیت المال کا قیام عمل میں آیا۔ نظام حصول زکوٰۃ جاری ہوا۔ اور لاوارثوں اور مستحق لوگوں کے روزینے مقرر ہوئے۔ خلفائے راشدین کے دور میں عموماً ان امور پر عمل ہوتا رہا۔

۱۹۔ شرم و حیا اسلامی تہذیب و ثقافت کا اہم جزو بن گئی۔ خصوصاً عورت کے لیے پردہ لازم ہو گیا۔

۲۰۔ عدل و انصاف کا دور دورہ ہوا اور دنیا میں پہلی بار عدالت کے کٹہرے میں حکمران اور رعیت مساوی حیثیت سے کھڑے ہونے لگے۔ عدل فاروقی آج بھی دنیا میں ضرب المثل ہے۔ یوں مساوات کا آغاز ہوا۔

۲۱۔ اطاعت امیر (جب تک امیر شریعت کا پابند رہے) عام مسلمانوں کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ خالد بن ولید کی معزولی ایک اہم مثال ہے۔ ان تمام امور کی ہزاروں مثالیں تاریخ

دمشق کی جامع مسجد (۷۰۵ء)

[illegible] ۱۳۵۴ء

مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لئے استعمال کیا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے کہ کاغذ پر پہلی تحریر عربوں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے افریقہ کے سردار یعقوب نے ۱۲۰۵ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابل ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔ مسلمانوں نے عجیب و غریب قسم کی گھڑیاں بنائیں۔ جن کے تذکروں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ دل ڈیوران لکھتا ہے کہ سپین کے ایک مسلمان ابن فرناس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اوّل عینک کا شیشہ، دوم وقت بتانے والی گھڑی اور سوم

سلطان سلیمان عثمانی کے مقبرے میں منقش ٹائیل

سمرقند اور نیشاپور کے ظروف (عہد عباسی)

ہوا میں اڑنے والی مشین۔ اسی طرح پہلا چھاپہ خانہ بھی سپین میں لگا۔ جس پر عبدالرحمان اوّل (۷۸۸ء) کے احکام چھپتے تھے۔ تاریخ میں ماہ نخشب کا ذکر عموماً آتا ہے۔ یہ وہ مصنوعی چاند ہے، جسے ترکستان کے ایک عالم حکم بن ہاشم نے بنایا تھا۔ یہ چاند نخشب کے ایک کنوئیں سے نکلتا، اندازاً سو مربع میل کے رقبے کو منور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے۔ موصل کی ململ، دمشق اور طلیطلہ کی تلواریں، عدن کے اونی کپڑے، حلب کے شیشے، رے کے رنگین برتن۔ رقہ کے صابن، ایران کے قالین اور نیشاپور کا عطر مشہور تھے۔

مسلمان وہ پہلے لوگ تھے، جنہوں نے سائنس پر کما حقہ، توجہ دی۔ بقول رابرٹ بریفالٹ "سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے، پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔ جن سے یونانی بے خبر تھے۔ یورپ میں اس روح اور اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔" یوں تو مسلمانوں کے طبعی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق مختصراً یہ کہ انہوں نے روشنی، نظر، کسوف خسوف، باد و باراں، حیوانیات، نباتات، خواص اشیاء وغیرہ پر لاتعداد کتب لکھیں گندھک اور شورے کا تیزاب بنایا۔ الکحل سے کام لیا۔ جر ثقیل کے قوانین پر روشنی ڈالی مائعات معادن اور سیماب وغیرہ کا وزن معلوم کیا۔ نیز پہاڑوں اور سمندروں کے ذخائر پر بحث کی۔

طب میں اسلام نے ہزارہا علماء پیدا کئے۔ جبرئیل بن بختیشوع یوحنا بن ماسویہ، الکندی رازی، ابن سینا، ابوالقاسم، ابن زہر، ابن خطیب اور ابن رشد جیسے سینکڑوں طبیبوں نے علم طب کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے کہ چیچک کا ٹیکہ اور آپریشن کے کئی طریقے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔

فلسفہ اور دیگر علوم مابعد الطبیعیات مسلمانوں نے بیش قیمت اضافے کئے یورپ میں صدیوں تک الکندی، ابن رشد، جاحظ، ابن طفیل، امام غزالی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا۔ ریاضی میں عمر خیام، الخوارزمی، ابوالوفا، ابن الہیثم اور موسیٰ بن شاکر جیسے علماء کا کوئی جواب نہ تھا۔ الجبرا، مثلثات اور دیگر کئی علوم ریاضی مسلمانوں ہی نے ایجاد کئے۔ علم ہیئت میں مسلمانوں کی اہم ایجاد اصطرلاب تھی، جس سے ستاروں کا فاصلہ ناپا جاتا تھا۔

علم تاریخ پہلی بار مسلمانوں ہی نے صحیح اور سائنسی بنیادوں پر مدوّن کیا۔ واقدی ابن سعد، بلاذری، ابن اثیر، طبری، ابن خلکان، ابن حجر، ابن عساکر اور ابن خلدون جیسے سینکڑوں مؤرخین نے وہ کام کئے جو آج بھی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم لغت، ادب، شاعری، تصوف، موسیقی، حدیث، فقہ، علم الکلام اور ایسے سینکڑوں علوم میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔

قرون وسطیٰ کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیل علم کو فرض اوّلین اور کسب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔ خصوصاً علم دین اور تصوّف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب بست و کشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

مسلمانوں کی چند اہم تہذیبیں اور تمدن

اس امر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا پورا نمونہ، جس کا خاکہ جناب مولانا مودودی نے پیش کیا ہے۔ کبھی سامنے آیا۔ کیونکہ ایسا تبھی ممکن ہے جب پورا معاشرہ اسلامی ہو اور اس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمو ہو

سکے۔ لیکن اس کی چند جھلکیاں مسلمانوں کی چند تہذیبوں میں ضرور ملتی ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب کا ایک مجموعی تاثر تو سابق میں دیا جا چکا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے چند اہم شہروں کی تہذیبوں کی ایک جھلک دینا ضروری ہے۔

بغداد، عہد عباسیہ میں:۔ عباسی خلفاء نے عراق کے شہر بغداد کو اپنا پایہ تخت بنایا تو دنیا بھر سے اہل علم و ہنر یہاں اکٹھے ہو گئے۔ سلطنت عباسیہ کے عہد میں شہر بغداد آبادی، خوبصورتی، علوم و فنون، تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے دنیا میں اوّل درجے کا شہر تھا۔ شہر ایک خندق اور پختہ فصیل کی حدود میں تھا۔ فصیل کے دروازوں پر خوبصورت گنبد بنے ہوئے تھے، جن پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ شہر میں ہر طرف بے شمار صاف، سیدھی سڑکیں تھیں۔ جن پر دونوں طرف بازار ہوتے تھے، جہاں دنیا بھر کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں، ایک بڑی اور کئی چھوٹی چھوٹی نہریں شہر میں پہنچائی گئی تھیں۔ امرائے سلطنت کے محل سنگ مرمر کے بنے ہوئے منقش اور خوبصورت ہوتے تھے۔ رات کے وقت وہاں قندیلوں سے روشنی ہوتی تھی۔ دریائے دجلہ شہر کے درمیان سے گذرتا تھا، جس میں کئی جہاز ہر وقت لنگر انداز رہتے تھے۔ لوگوں کو پینے کے لئے صاف اور میٹھا پانی مہیا ہوتا تھا۔

بیبرس ثانی کے لئے بنایا گیا بلوریں فانوس (شام - ۱۳۱۵ء)

بغداد میں بے شمار مساجد، مدارس اور جامعات تھیں۔ طلباء کو وظائف دیئے جاتے۔ تعلیمی اخراجات حکومت کی زیرنگرانی اوقاف سے پورے ہوتے۔ علمی و انصاف کا چرچا دور دور تک ہوتا تھا۔ علم و ادب کا دور دورہ تھا۔ الف لیلیٰ کی مشہور داستان یہیں لکھی گئی۔

۲۔ قرطبہ، اموی دور میں:۔ یہ سپین کا ایک شہر ہے۔ قرون وسطیٰ میں سپین کو اندلس کہا جاتا تھا۔ قرطبہ اندلس کا پایہ تخت تھا۔ اموی خلفاء یہاں حکمران تھے یہاں کے شاہی محلات، باغات، مکانات، عمارتیں، مساجد، پل، حمام وغیرہ اتنے خوبصورت تھے کہ آج تک ان کا ذکر قابل فرحت ہے۔ شہر کے ۲۱ بڑے محلے تھے۔ ہر محلہ بجائے خود ایک شہر تھا۔ ان سب کو ایک فصیل نے احاطہ کیا ہوا تھا۔ شہر میں کشادہ

کاشی کا ڈول [illegible] محمد بن عبداللہ [illegible]

سڑکیں اور کشادہ [illegible] کوچے تھے۔ [illegible] وادی الکبیر کا پل انجینئرنگ کا بے مثال نمونہ تھا۔ [illegible] جاتی تھی۔ کتب خانے بے شمار تھے۔ [illegible] تہذیب اور تمدن کی نشان دہی کرتی ہے

ان دونوں بڑی تہذیبوں کے علاوہ بے شمار چھوٹی [illegible] جو مختلف علاقوں مثلاً [illegible] ترکستان، [illegible] میں معرض وجود میں آئیں اگرچہ [illegible] باوجود ان پر اسلامی ثقافت کی چھاپ ضرور رہی [illegible] سمرقند، بخارا، لاہور، ملتان، دہلی، لکھنؤ [illegible] کی تہذیب و ثقافت آج بھی قابل ذکر ہے۔

ثقیف، بنو عرب کا مشہور قبیلہ جو بہت جنگجو تھا اور [illegible] میں آباد تھا۔ آخر تک کفر کا ساتھ دیتا رہا۔ قبائل عدنان کی [illegible] جس کا نسب نامہ عرب مؤرخین نے اس طرح بیان کیا ہے۔ "ثقیف بن منبہ بن [illegible] بن ہوازن۔"

ثقیف کا زمانہ ظہور اسلام سے تقریباً تین سو سال پہلے کا ہے۔ کیونکہ [illegible] اواخر میں عروہ ابن مسعود بن معتب بن مالک بن کعب بن عمرو ابن سعد بن عوف بن ثقیف نے اپنے بڑھاپے میں اسلام قبول کیا تھا۔

عربی روایات کی رُو سے ثقیف نے اپنے حقیقی بھائی یا چچازاد بھائی کو کسی بات پر قتل کر کے فرار اختیار کیا تھا اور طائف پہنچا تھا۔ جہاں سردار علاقہ عامر بن الظّرب عدوانی نے اسے پناہ دے کر اپنی لڑکی بھی اس سے بیاہ دی تھی۔ اس مشہور عرب حکم کے نسب سے بھی ثقیف کا زمانہ اسی مذکورہ مدت پر متعین ہوتا ہے۔

ثقیف کے بارے میں کہ آیا اس کا تعلق قبیلہ ایاد سے تھا یا ہوازن سے یا خود ثمود سے، پرانے زمانے ہی سے اختلاف چلا آتا ہے۔ اس اختلاف کا پس منظر یہ ہے کہ ثقیف ایک مفرور پناہ گزیں تھا۔ جس نے مصلحتاً اپنا صحیح نسب پوشیدہ رکھا ہوگا بعد میں جب اس سوال نے علمی اہمیت اختیار کی تو ثقفیوں کے موافقوں اور مخالفوں دونوں نے خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ ابرہہ حبشی کے حملۂ مکہ میں ثقیف نے حبشیوں سے تعاون کیا تھا اور ابو رغال نے حملہ آور فوج کی رہبری کی تھی۔

بنو ثقیف کا علاقہ طائف تھا۔ وہ اسلام سے قبل ہی اچھی خاصی حضریت اختیار کر چکے تھے۔ وہ وادی وج میں لیۃ اور وھط وغیرہ میں باغبانی وغیرہ کو کافی ترقی دے چکے تھے اور آب رسانی میں بھی کافی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے شہر کی حفاظت کے لئے اس کے اردگرد ایک فصیل بھی بنالی تھی۔ اہل مکہ کے ساتھ بیاہ شادی کے تعلقات تھے۔ دیگر عربوں کی طرح بنو ثقیف بھی بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ عکاظ میں جہار نامی بُت ان کا خاص بت تھا۔ جس کی نگرانی وغیرہ انہیں کے سپرد تھی۔ طائف میں تو انہوں نے لات نامی بت کے لیے کعبۂ ثانی بھی تیار کر لیا تھا اور طائف شہر کو ایک حرم قرار دے دیا تھا۔ جہاں پر جانوروں کا شکار اور جنگلی درختوں کا کاٹنا حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ طائف کی زرخیزی اور تجارتی اہمیت کے باعث یہاں بہت سے یہودی بھی آکر آباد ہو گئے تھے۔ جو عہد اسلام کے آغاز تک موجود تھے بنو ثقیف ابتداء ہی کچھ زیادہ تعداد میں نہیں تھے کہ قابل کاشت زمین سے تنہا استفادہ کر سکتے۔ اس لیے انہوں نے دوست قبائل کو وہاں پر آباد ہو جانے دیا پہلے پہل تو ان کے تعلقات بہتر رہے لیکن جلد ہی ان قبائل میں باہمی رقابت پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ یہ قبائل جو بعد میں یہاں آکر آباد ہوئے احلاف کہلاتے۔ معاہدہ اسلام طائف میں اس بات کی خاص طور پر صراحت موجود ہے کہ بنی مالک (ثقیف) کا شرار الگ ہوگا اور احلاف کا الگ۔

ظہور اسلام سے کچھ عرصہ بعد آنحضورؐ تبلیغ کی خاطر طائف گئے لیکن وہاں پر کسی ایک شخص نے بھی آپؐ کی بات نہ سنی۔ ۵ ہجری میں جنگ خندق کے موقع پر جب کہ سارا عرب مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر چڑھ آیا تھا تو ان حملہ آوروں میں بلاذری کے بقول بنو ثقیف کا بھی ایک دستہ تھا۔

فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں جب مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ ہوازن مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا تدارک کرنے کے سلسلے میں اولاً حنین کا معرکہ پیش آیا اور بقیۃ السیف کا طائف میں محاصرہ کیا گیا اور چند دن ٹھہر کر بعض مؤثر سیاسی انتظامات کرنے کے بعد آنحضورؐ واپس مدینہ تشریف لے آئے لیکن ایک سال کی مدت کے اندر ہی بنو ثقیف وغیرہ اہل طائف کا ایک وفد مدینے آیا اور اسلام قبول کیا۔ آنحضورؐ نے ان کی دلداری کے لئے انھیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور بعض رعایتوں سے نوازا لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد خلافت میں مرتدین سے مقابلے کے لئے بنو ثقیف نے بخوشی فوجی رضا کار مدینے بھیجے تھے۔ حضرت عمر فاروق کے دور میں بنو ثقیف گورنری اور دیگر ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا گیا۔ عمان کا گورنر جس نے مغربی ہند کے ساحلوں پر پہلی اسلامی مہم بھیجی تھی، وہ ثقفی ہی تھا۔ حجاج بن یوسف بھی بنو ثقیف ہی سے تھا جس کے بھتیجے نے سندھ و پنجاب تک اسلامی مقبوضات کو بڑھا دیا۔

تیسری صدی ہجری میں ثقفی مزارعین یمن وغیرہ کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ زیدیوں کے یمن پر قبضہ کرنے میں بنو ثقیف کا بھی ہاتھ تھا۔

مشہور سیاح برکھارٹ کے بقول "طائف کے نواح کا زرخیز علاقہ اور حجاز کی مشرقی گھاٹیوں کے عمدہ مقامات اسی قبیلے کی ملکیت ہیں۔ طائف کی حضری آبادی کا نصف حصہ اب بھی بنو ثقیف ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ خانہ بدوش بھی ہیں۔ ان کے پاس گھوڑے اور اونٹ تو بہت کم ہیں لیکن بھیڑ بکریاں خاصی تعداد میں ہیں۔ ضرورت پڑے تو وہ آتشیں اسلحہ سے مسلح دو ہزار افراد میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۳ء میں طائف کے دفاع میں وہابی نجدیوں کا مقابلہ کیا تھا۔

ثمامہ بن آثالؓ صحابی۔ ابو امامہ کنیت تھی۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: "ثمامہ بن آثال بن نعمان بن سلمہ بن عتبہ ابن ثعلبہ بن یربوع بن ثعلبہ بن دؤل بن حنیفہ حنفی یمامی۔"

آپ یمامہ کے سردار تھے۔ فتح مکہ کے چند روز بعد آنحضورؐ نے یمامہ کی طرف ایک مختصر سریہ بھیجا جو چند سواروں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے لوٹتے ہوئے ثمامہ کو گرفتار کر لیا اور مدینہ لاکر مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا۔ آنحضورؐ نے انکے پاس آکر پوچھا: کیوں ثمامہ کیا ہوا۔ تو آپ نے جواب دیا "محمدؐ بہت اچھا ہوا۔ اگر تم مجھ کو قتل کرو گے تو ایک جاندار کو قتل کرو گے اور اگر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو ایک احسان شناس پر احسان کرو گے۔ آنحضورؐ نے دوسرے دن پھر یہی سوال کیا اور تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ تیسری مرتبہ سوال کے جواب پر آنحضورؐ نے انہیں رہا کر دیا۔ آپ پر آنحضورؐ کے اس رحم و کرم کا اثر یہ ہوا کہ رہائی پاتے ہی اسلام قبول کر لیا اور عرض کی کہ میں عمرہ کا قصد کر رہا تھا کہ آپ کے سواروں نے مجھے پکڑ لیا۔ اب کیا حکم ہے۔ آنحضورؐ نے بشارت دی اور عمرہ پورا کرنے کا حکم فرمایا جب عمرہ کے لیے مکہ گئے تو کسی نے پوچھا کیا تم بے دین ہو گئے تو جواب میں کہا کہ نہیں بلکہ رسول اللہ کے ساتھ اسلام لایا ہوں۔ یاد رکھو اب بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے گیہوں کا ایک دانہ بھی یمامہ سے مکہ نہیں آسکتا۔

چنانچہ واپس یمامہ جا کر غلہ رکوا دیا۔ جس سے مکہ میں قحط پڑ گیا۔ بعد میں اہل مکہ کی درخواست پر آنحضورؐ نے ثمامہ کو لکھا کہ غلہ نہ روکا جائے۔ اس طرح غلہ دوبارہ یمامہ سے مکہ آنے لگا۔

مسیلمہ کذاب مشہور مدعی نبوت آپ کا ہم وطن تھا۔ آنحضورؐ کی حیات مبارک میں تو آفتاب حقیقت پر اس کی تاریکی غالب نہ آسکی۔ لیکن وصال نبویؐ کے بعد مسیلمہ بڑے زور شور سے اٹھا۔ اہل یمن اس کے جال میں پھنس کر مرتد ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کی سرکوبی کے لئے جب اسلامی لشکر بھیجا تو حضرت ثمامہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت ان میں شامل ہو گئے اور مرتدین کی سرکوبی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔

مرتدین کے استیصال کے بعد بنی قیس کے مرتد سردار حطیم کا حلہ (کرتا) اس کے قاتل سے خریدا اور اسے پہن کر نکلے بنو قیس نے آپ کے بدن پر حطیم کا حلہ دیکھ کر سمجھا کہ آپ ہی نے اسے قتل کیا ہے۔ چنانچہ اس شبہہ میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔ آپ ایک اچھے عربی شاعر تھے۔

ثمامہ بن اشرس ایک متکلم جو معتزلہ شیوخ میں سے تھا اور مامون معتصم اور واثق کے عہد میں دربار سے وابستہ رہا۔

نہایت عالم و فاضل شخصیت کا مالک تھا۔ ہارون اور اس کے بعد مامون نے اس کی ذہنی قابلیت اور تبحر علمی کے باعث دربار میں حاضری کی دعوت دی۔ یہ قدامت پسندانہ نظریات پر کڑی تنقید کرتا تھا۔ اس سے قدامت پسندانہ نظریات کا حامل طبقہ اس کا دشمن تھا۔ جب متوکل کے دور حکومت میں ان لوگوں کا دربار میں دوبارہ اثر و رسوخ ہوگیا تو انہوں نے اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں۔

ثمامہ نے اپنے زمانے کے اہم حل طلب مسائل پر نہایت مدلل طریق سے آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ اس کی یہ رائے بسا اوقات منفرد ہوتی ہے۔ ثمامہ کی رائے میں "علم انسانی وہ چیز ہے جس کی ابتدا وقت میں ہوتی ہے لیکن جس کی کوئی علت اولیٰ نہیں ہے جو وقت میں کام کر رہی ہو۔ نفس انسانی خود اسے پیدا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ گویا ایک ایسا فعل سرانجام دے گا جو خدا کا فعل ہے۔"

ہمارے پاس جو کچھ ہے اور ہمیں جس چیز پر اختیار حاصل ہے وہ صرف ہماری قوت ارادی کا باطنی فعل ہے۔ اس فعل کے نتائج اس میں شامل نہیں۔" ہماری فطری عقل ہمارے افعال کی اخلاقی اقدار طے کرتی ہے۔ اور ان اقدار کی تعیین اللہ کی طرف سے آمرانہ رنگ میں نہیں ہوتی۔"

"ہمارے تمام معارف (عقلی مدرکات) ضروری ہیں، اتفاقی نہیں۔ جس شخص کو خدا کی وہ معرفت حاصل نہیں۔ جس پر منطق اسے مجبور کرتی ہے تو وہ احکام الٰہی کی تعمیل پر مامور نہیں۔ لیکن عدم تعمیل کی صورت میں وہ شرف انسانی سے محروم ہوکر حیوانوں کی سطح پر آجائے گا۔"

ثمامہ کا مذہب یہ ہے کہ ہماری ساری معلومات ضروری ہیں ان میں اتفاق کا دخل نہیں نیز یہ کہ جس شخص نے اطمینان کے ساتھ منطق (استدلال) کے زور سے اللہ کو نہیں مانا۔ وہ اللہ کو پہچاننے کا مکلف نہیں ہے۔ نیز اس کے نزدیک "جس نے ضروری طور پر اللہ کو نہیں پہچانا، اس کے لئے نہ کوئی امر ہے نہ کوئی نہی۔ یعنی اس پر تعمیل احکام کا حکم عائد نہیں ہوتا۔ وہ صرف خدمت اور دوسروں کی عبرت کے لیے پیدا ہوا ہے اور وہ اپنی جہالت کے بارے میں معذور ہے۔ اس کے لئے نہ ثواب ہے نہ عذاب

ثمامہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہود اور نصاریٰ اور ان جیسے اور لوگ مثلاً کفار اور کمسن بچے جنہیں معرفت اشیا کی طاقت نہیں ہوتی یہ سب عنقریب مٹی ہوجائیں گے اور انہیں آگ کا عذاب نہ ہوگا لیکن خیاط معتزلی نے ان لوگوں کو جنہوں نے مندرجہ بالا رائے ثمامہ سے منسوب کی ہے۔ جھوٹا قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ثمامہ مانتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور تمام کفار کو آگ کا عذاب ہوگا۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ انہیں کیا کرنے کا حکم ملا ہے اور کس چیز سے روکا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ قصداً اللہ کا انکار کرتے ہیں البتہ جسے معرفت کا کوئی راستہ ہی نہیں مل سکا تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ وہ نہ یہودی ہے نہ نصرانی اور نہ کافر۔

ثمامہ بن عدی رضی اللہ عنہ صحابی۔ خاندان قریش سے تھے۔ ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہوگئے تھے۔ آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ غزوہ بدر اور بعد میں پیش آنے والے غزوات میں وقتاً فوقتاً شریک ہوتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں صنعا (یمن) کے حاکم مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر سن کر بے اختیار رو پڑے اور ایک نہایت ہی رقت انگیز اور دردناک خطبہ دیا۔ جس میں فرمایا آج خلافت سلطنت سے بدل گئی۔ جو شخص جس چیز پر قابض ہوگا اسی کو کھا جائے گا۔

اس سے زیادہ حالات زندگی معلوم نہیں ہیں۔

ثمود حضرت صالحؑ کی قوم کا نام۔ یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ اس قوم کے قصے نزول قرآن کے وقت زبان زد عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بھی اس قوم کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نگاروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

بقول مولانا مودودی "مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔"

رومی مورخین کے مطابق "یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے جو ان کے دشمن تھے۔"

قوم ثمود کا وطن شمالی مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم

ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جو مدائن صالح کے نام سے موسوم ہے۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں الحجر کہلاتا تھا۔ اب بھی وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں۔ جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس علاقے کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ آنحضورؐ کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ آنحضورؐ جب غزوہ تبوک کے موقع پر اس علاقے سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشاندہی کی اور فرمایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے

مدائن صالح کی ثمودی عمارات

[illegible] دوسرے کنوؤں کا پانی نہ پیا۔ ایک پہاڑی درے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ [illegible] درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ آج کل یہ مقام "فج الناقہ" کے نام سے [illegible] جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے آپؐ نے انہیں جمع [illegible] قوم کا علاقہ ہے جن پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔ لہذا یہاں سے [illegible] سیر کا نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

جب حضرت صالحؑ نے قوم ثمود کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی تو آپ کے مخالفین نے [illegible] جندع بن عمرو تھا۔ آپؐ سے معجزے کے لئے سوال کیا اور جب اللہ تعالیٰ نے [illegible] کے طور پر اونٹنی بھیجدی تو اس قوم نے اس کو قتل کر دیا۔ اس بنا پر اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے ایک عذاب کے ذریعے انہیں ہلاک کر دیا۔

قرآن مجید میں قوم ثمود کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے:

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے، لہذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آلے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا۔ اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقے کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انہوں نے جواب دیا "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔" ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

"پھر انہوں نے اسی اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے اور صالحؑ سے کہہ دیا کہ لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔ آخر کار ایک ہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے اور صالحؑ یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ اے میری قوم، میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں

مدائن صالح میں وہ کنواں جس پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی

نے تیری بہت خیرخواہی کی، مگر کیا کروں کہ تجھے اپنے خیرخواہ پسند ہی نہیں ہیں۔" (۷: ۷۳ تا ۷۹)

قرآن میں ایک اور مقام پر قوم ثمود کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

"ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یونہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور ان بے لگام لوگوں کی عبادت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔" انہوں نے جواب دیا "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے۔" صالحؑ نے کہا "یہ اونٹنی ہے ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔ اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا۔" مگر انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے۔ عذاب نے انہیں آلیا۔"

(۲۶: ۱۴۱ تا ۱۵۸)

ایک اور سورت میں اس قوم کی بدکرداری اور اس عذاب کا نقشہ جو انہیں دیا گیا، اس طرح کھینچا ہے:

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔ صالحؑ نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیوں نہیں اللہ سے

مغفرت طلب کرتے ؛ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے۔" انہوں نے کہا "ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے" صالح نے جواب دیا "تمہارے نیک و بدشگون کا سررشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔"

اس شہر میں نو جتھہ دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔" یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔" (۲۷ : ۴۵ تا ۵۲)

قوم ثمود جس طریق سے ہلاک ہوئی، اس کی تفصیل جیسا کہ سورۃ ۷ : ۷۶ میں بتائی گئی ہے کہ رجفۃ یعنی بھونچال نے انہیں آلیا اور سورہ ۴۱ : ۱۲، ۱۶ آیت میں صاعقہ یعنی بجلی گرنے کا ذکر ہے۔

ان دونوں اقوال کو اس طرح سے جمع کیا جا سکتا ہے کہ زلزلے نے انہیں نیچے سے آلیا اور آواز بلند اوپر سے۔

قرآن میں قوم ثمود کا ذکر بعض ایسی ہی دوسری اقوام کے ساتھ انسانوں کو عبرت دلانے کے لئے کیا گیا ہے۔

ثناءاللہ امرتسری، مولانا

(۱۲۸۷ھ/۱۸۶۸ء - ۱۳۶۸ھ/ ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء) مفسر، مناظر اور عالم دین۔ ابوالوفا کنیت۔ والد کا نام خضر تھا۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب کشمیر کے نومسلم خاندان منٹو سے ملتا تھا۔ آپ نے مولانا غلام رسول قاسمی، مولانا احمد اللہ امرتسری، مولانا احمد حسن کانپوری، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث تھے چنانچہ اپنے مسلک کی ترویج کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اخبار اہل حدیث جاری کیا۔ فن مناظرہ میں مشاق تھے۔ زندگی بھر آریہ سماج اور قادیانیوں سے معرکتہ الآرا مباحثے کئے اور دین اسلام اور ختم نبوت کی حقانیت ثابت کرتے رہے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد سرگودھا میں مقیم ہو گئے۔ آخر عمر میں فالج ہو گیا۔ اور اسی عارضہ سے وفات پائی۔

آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن کی تفسیر کا نام "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے۔ اردو تفسیر کا نام "تفسیر ثنائی" ہے۔

ثناءاللہ پانی پتی، قاضی

(۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰-۳۱ء - یکم رجب ۱۲۲۵ھ/ ۲ اگست ۱۸۱۰ء) مفسر اور جید عالم دین۔ شیخ جلال الدین پانی پتی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت عثمانؓ سے جا ملتا ہے۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور بعد میں دوسرے علوم کی تحصیل میں مشغول رہے۔ تحصیل علم کی خاطر دلی گئے جہاں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے حدیث سنی۔ کم عمری ہی میں شاہ محمد عابد لاہوری سے نقشبندی سلسلے میں بیعت کی۔ ان کی وفات پر مرشد کے حکم کے مطابق مرزا مظہر جانجاناں دہلوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بھی طریقت اخذ کیا۔ علم کی تحصیل کے بعد وطن واپس آئے اور بقیہ عمر افتاء، تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت میں گزار دی۔ آپ نے پانی پت میں منصب قضا بھی اختیار کیا۔ اور اس بلند عہدے کا آپ نے نہایت احسن طریق سے حق ادا کیا۔ آپ نے پانی پت ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ایک بلند پایہ شخصیت تھے۔ آپ کے مرشد مرزا مظہر جانجاناں نے ایک مرتبہ آپ کے بارے میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے بروز حشر پوچھا کہ ہماری درگاہ میں کیا تحفہ لائے ہو تو عرض کروں گا ثناء اللہ پانی پتی لایا ہوں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے آپ کو بیہقی وقت کا خطاب دیا۔ فقہ و حدیث میں آپ مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔ تفسیر، کلام و تصوف میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ [illegible] ذہن، جودت طبع، قوت فکر اور سلامت عقل کے [illegible] مشہور تھے۔

آپ کی [illegible] تصانیف و تالیفات [illegible] مشہور [illegible] مندرجہ ذیل ہیں:

تفسیر مظہری: یہ عربی زبان میں سات جلدوں میں [illegible] کی معروف ترین تصنیف ہے۔ اس کو آپ نے اپنے مرشد مرزا مظہر جانجاناں کے نام سے منسوب کیا۔ دوسری مرتبہ حیدرآباد دکن سے دس جلدوں میں شائع [illegible] کا رنگ محدثانہ ہے اور حنفی مذہب کے مطابق لکھی گئی ہے۔ یہ تفسیر [illegible] کے اقوال اور روایات صحیحہ کی جامع ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] ارشاد الطالبین، جواہر القرآن، حقوق الاسلام (فارسی)، [illegible] والقبور (فارسی)، تذکرۃ المعاد (فارسی)، رسالہ [illegible] (فارسی)، رد مذہب شیعہ، رسالہ حرمت متعہ وغیرہ ہیں۔

ثناءاللہ قادری

(۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء - [illegible]) دین خانقاہ [illegible] پیدا ہوئے [illegible] کے زیر سایہ تربیت پائی۔ اوائل عمر [illegible] ہی میں ایران، کابل اور ہندوستان کے دور دراز مقامات [illegible] سفر کئے [illegible] سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد شاہ محمد صادق کے دست مبارک پر بیعت کی [illegible] سال تک مرشد کی خدمت میں رہے پھر لاہور آئے اور حضرت میاں میر [illegible] حاصل کیا۔ کلکتہ میں حضرت عبدالوہاب کے [illegible] سے فیض حاصل کیا۔ بعد میں کابل جا کر شاہ قلندر کی صحبت سے [illegible] کے بعد حضرت غلام الدین خراسانی سے بھی کسب فیض کیا۔ الغرض آپ نے [illegible] کے پچاس سال سیر و سیاحت اور بزرگان دین سے فیض و برکات حاصل [illegible] گزارے۔ آخر عمر میں جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں سکونت اختیار کر لی [illegible] مزار مبارک کلا جو متصل جلالپور جٹاں کے کنوؤں کے پاس ہے۔ آپ [illegible] کے عارف باللہ، متبحر عالم اور پرگو شاعر تھے۔

آپ نے تقریباً ایک سو سے زائد کتب تصنیف کیں۔ جو نثر اور نظم دونوں میں ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ دیوان خراباتی، شمع العارفین، [illegible] نوز نامہ، مجمع البرکات، تذکرہ الواصلین، سراج الطالبین، [illegible] العارفین، [illegible] صراط مستقیم، حقیقت اولیاء، تذکرۃ الکاملین وغیرہ ہے

ثنویت

دو خداؤں کی پوجا کرنا۔ ایک عقیدہ جس کی تعلیم یہ ہے کہ نور و ظلمت دو مستقل اور دوامی لاصل خلق کنندہ ہیں۔ [illegible] کی اصطلاح [illegible] سب سے پہلے [illegible]

ہاپکنز نے اپنی کتاب تاریخ مذہب میں استعمال کی، جس سے اس نے مذہب کی خیر و شر کی ثنویت مراد لی تھی۔

زرتشت کی تعلیم میں ثنویت سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کا خالق ایک نہیں بلکہ دو ہیں، ایک وہ جس نے دنیا کی تمام مفید اور کارآمد چیزیں پیدا کیں جسے وہ اہورا مازدا یعنی بہت جاننے والا آقا کے نام سے یاد کرتے ہیں، دوسرا خالق جس نے تمام مضر اور تکلیف دہ اشیاء کی تخلیق کی اس کا نام اینگرو مینو بتایا گیا ہے

زرتشتی تعلیمات کے ماخذ اوستا میں اہورامازدا کی جو صفات بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں اہورا خود کہتا ہے۔ "میں ہی محافظ، میں ہی خالق، میں ہی رازق اور میں ہی باری ہوں، سب سے زیادہ رحم کرنے والا میں ہی ہوں۔ میرا نام صحت عطا کرنے والا ہے۔ اہور یعنی آقا، مازدا یعنی بہت جاننے والا، مقدس، عظیم، دوراندیش، محافظ، خیرخواہ، خالق، خوشحالی دینے والا، مطلق العنان اور خود مختار میں ہی ہوں۔"

خالق خیر کی چھ صفات بہت اہمیت رکھتی ہیں (۱) یعنی وہ عقل کل ہے (۲) غیر فانی ہے (۳) صحت مند اور قوی ہے (۴) حقیقت اعلیٰ ہے (۵) دیندار اور متقی ہے (۶) یعنی نعمتوں کا مالک ہے۔

بعد میں یہودیت میں اور اسلام میں اسکو ان تمام صفتوں کا حامل قرار دیا جانے لگا جو شیطان کے سلسلہ میں انجیل اور قرآن میں موجود ہیں۔

ان دونوں خالقوں کے دائرہ اختیار واضح طور پر الگ الگ متعین ہیں اوپر خدائے خیر کی عملداری ہے اور نیچے پاتال میں اس کے طاقتور حریف کا عمل دخل ہے۔ ان دونوں خداؤں کی سلطنت کے درمیان یہ دنیا واقع ہے جو دونوں کا اکھاڑا ہے۔ یہ دونوں دنیا میں قوت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے عمل کی حمایت حاصل ہوتی ہے

چنانچہ پارسیوں کا عقیدہ ہے کہ اینگرومینو نے نہ صرف مضر اشیاء پیدا کی ہیں بلکہ وہ مازدا کی پیدا کردہ اچھائیوں کو ختم کرنے کے درپے بھی رہتا ہے۔ موت کا بازار بھی اسی نے گرم کر رکھا ہے۔ انسانوں کے پہلے جوڑے کو اینگرو ہی نے ورغلایا۔ اس لیے ہر پارسی کا فرض ہے کہ وہ شر کا مقابلہ کرے اور خیر کی سربلندی کے لیے کوشاں رہے اور خود کو گناہ اور معصیت میں ملوث نہ ہونے دے۔

اسلام میں کسی ایسے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی اسلام میں کوئی ثنوی فرقہ یا ثنوی عنصر ہے۔ اسلام نے چونکہ توحید پر زور دیا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک ثنویت کا مطلب خدا کے تصور کی نفی ہے۔ اس طرح سے لفظ ثنویت الحاد و خواری کا کلمہ بنکر رہ گیا۔

ثواب

بدلہ، صلہ، نتیجہ عمل۔ بقول امام راغب اصفہانی "انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے۔

لغوی اعتبار سے ثواب کا لفظ خیر و شر دونوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے۔

قرآن مجید یہ لفظ انھی معانی میں استعمال ہوا ہے۔

"(یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے" (۳ : ۱۹۵)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

"تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ (دیگا)" (۳ : ۱۴۸)

"جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا۔" (۳ : ۱۴۵)

یہاں ثواب دنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجے میں آخرت کی پائیدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔

قرآن ہی میں ایک جگہ آتا ہے۔

"جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اس کو اس کی نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا۔ اور جو شخص بدی لے کر آئے گا تو بس اتنی ہی سزا بھگتے گا اور لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (۶ :)

ثوبانؓ

(وفات ۵۴ھ/۶۷۳ء) صحابی۔ ابوعبداللہ کنیت۔ آپ یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ثوبان غلام تھے آنحضورؐ نے خرید کر آزاد کر دیا اور فرمایا "دل چاہے اپنے خاندان والوں میں چلے جاؤ اور دل چاہے میرے ساتھ رہو، میرے ساتھ رہو گے تو میرے اہل بیت میں تمہارا شمار ہو گا۔" حضرت ثوبانؓ نے اس شرف کو خاندان پر ترجیح دی اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد مدینہ میں طبیعت نہ لگی اور یہاں سے شام چلے گئے اور رملہ میں سکونت اختیار کر لی۔ حضرت عمر فاروق کے عہد حکومت میں مصر کی فتوحات میں شریک ہوئے بعد میں رملہ سے حمص منتقل ہو گئے اور یہیں وفات پائی۔

ثوبان آنحضورؐ کے خادم خاص تھے اور مسلسل آپؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہیں آنحضورؐ سے استفادہ کرنے کا زیادہ وقت ملا تھا۔ انہیں ۱۲۷ حدیثیں ازبر تھیں۔ بقول حافظ ابن عبدالبر "ثوبان ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے حدیثیں محفوظ کیں اور ان کی اشاعت بھی کی۔"

ثوبانؓ کے تلامذہ میں معدان بن طلحہ، راشد بن سعد، جبیر بن نفیر، عبدالرحمان ابن غنم، ابو ادریس خولانی قابل ذکر ہیں۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جو جماعت صاحب علم دانتا تھی ثوبان اس کے ایک رکن تھے۔ لوگ ان سے احادیث سنتے تھے۔ ان کے معاصرین دوسروں سے سنی ہوئی حدیثوں کی تصدیق ان سے کراتے تھے۔

آنحضورؐ کی حیات مبارکہ میں اور وفات کے بعد بھی دونوں زمانوں میں آپؐ کا فرمان مبارک ثوبانؓ کے پیش نظر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ زبان نبویؐ سے جو کچھ سن لیا وہ ہمیشہ جان کے ساتھ رہا۔ جس چیز میں بھی آنحضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی کا ذرا سا بھی پہلو نکلتا ہوتا وہ ہمیشہ اس سے محترز رہتے۔

ثویبہؓ

صحابیہؓ۔ ابولہب کی لونڈی تھیں۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ آنحضورؐ نے اپنی والدہ کے دودھ کے بعد پہلا دودھ جو پیا، وہ انھی کا تھا۔ حضرت ثویبہؓ نے حمزہ بن عبدالمطلب، جعفر بن ابی طالب اور ابو سلمہ بن عبدالاسد المخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔

ثور، غار

ایک غار جس میں مدینہ کو ہجرت کرتے ہوئے آنحضورؐ اور ابوبکر صدیقؓ نے پناہ لی تھی۔

بقول زرقانی "یہ غار مکہ سے تین میل دائیں سمت واقع ہے۔ پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے۔ سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔"

یہ غار جو جبل ثور میں واقع ہے آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔ اس غار سے

چند معجزات وابستہ ہیں۔ مشہور ہے کہ جب کفار آپ کو تلاش کرتے ہوئے غار کے قریب آئے تو خدا نے حکم دیا تو دفعتہً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر غار کے منہ کو ڈھانک لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے اور مکڑی نے غار کے منہ پر جالا تن دیا۔ جب قریش کے نوجوانوں نے دیکھا کہ غار کے منہ پر ایک درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اتنی گھنی ہیں کہ انہیں کاٹے اور صاف کئے بغیر کوئی شخص بھی غار میں داخل نہیں ہو سکتا نیز مکڑی کا تنا ہوا جالا کہ اگر کوئی شخص غار میں داخل ہوتا تو وہ صحیح و سالم نہ رہتا اور کبوتروں کے گھونسلے اور انڈوں سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ مدت سے یہاں کوئی شخص نہیں آیا۔ چنانچہ وہ یہ سب کچھ دیکھ واپس لوٹ گئے۔

آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں اس غار میں تین دن اور تین راتیں قیام فرمایا۔ بقول ابن ہشام اس عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔" اور آپؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ شب کو غار میں ساتھ سوتے صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتا لگاتے کہ قریش کیا مشورہ کر رہے ہیں جو خبر ملتی شام کو آنحضورؐ سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور ابوبکرؓ صدیق انکا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی جو کھاتے رہے آپؐ اس غار سے نکلے اور مدینے کی راہ لی اور وہ راستہ اختیار کیا جہاں سے کم لوگ آتے جاتے تھے

ج

جابر بن افلح ابو محمد، ایک مشہور ہیئت دان۔ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ قرون وسطیٰ میں تو اسے اکثر غلطی سے کیمیا دان جابر بن حیان سے خلط ملط کر دیا جاتا تھا۔ اس کا بیٹا یہودی فلسفی ابن میمون کو (وفات ۱۲۰۴ء) ذاتی طور پر جانتا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جابر بن افلح نے بارہویں صدی عیسوی کے نصف کے قریب قرطبہ میں وفات پائی ہوگی۔

جابر نے فلکیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو آج بھی دو مختلف ناموں "کتاب الھیئۃ" اور "اصلاح المجسطی" سے محفوظ ہے۔ اس کتاب میں جابر نے بطلیموس کے بعض نظریوں پر سخت تنقید کی ہے۔ خاص طور پر بطلیموس کے اس دعوے پر نکتہ چینی کی ہے کہ سیارگان اسفل یعنی عطارد اور زہرہ کا کوئی مرئی اختلاف منظر موجود نہیں۔ یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے فلکی حصے سے پہلے مثلثیات پر بھی ایک باب موجود ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں بھی کیا گیا ہے جو پطرس اپیانوس نے نورمبرگ سے ۱۵۳۴ء میں شائع کیا تھا۔

جابر بن حیان (۱۲۰ھ/۷۳۷ء - ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) بن عبداللہ عرب کیمیاگر جو طوس میں اور بعض کے نزدیک خراسان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفہ کا مشہور دوا ساز تھا۔ جابر نے بھی ابتداً یہی پیشہ اختیار کیا اور کچھ عرصہ طبابت بھی کی۔ لیکن جلد ہی اپنی زندگی کیمیاوی تحقیقات کے لئے وقف کر دی۔ اپنے مصری اور یونانی پیشروؤں کی طرح جابر بھی اس نظریے کا حامی تھا کہ بنیادی دھاتیں مثلاً ٹین، سکہ، لوہا، تانبا وغیرہ ایک پوشیدہ عنصر کے ذریعے سونے چاندی میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ اس عنصر کی تلاش میں اس نے بہت سے کیمیاوی تجربے کئے۔ وہ اس عنصر کو تو دریافت نہ کر سکا البتہ دوسرے کئی ایک مفید مرکب معلوم کر لئے۔ اس کا اہم کارنامہ تین تیزابوں شورے کا تیزاب، گندھک کا تیزاب اور ایکوا ریجیا کی دریافت ہے۔ جن کو اس نے اپنے ایجاد کردہ ایک آلہ کیمیا، قرع انبیق کی مدد سے تیار کیا تھا۔

مذہبی عقائد کے لحاظ سے جابر کا قرامطہ سے بڑا گہرا تعلق نظر آتا ہے اس کے ہاں وہی اصطلاحات ملتی ہیں جو قرامطیوں اور فاطمی اسماعیلیوں کے ہاں رائج تھیں۔ بعض عقائد کے لحاظ سے جابر کی تعلیم فرقہ نصیریہ سے ملتی ہے۔ کیونکہ اس کے یہاں بھی اقانیم ثلاثہ کا تصور موجود ہے۔

جابر کے اپنے قول کے مطابق اسے جملہ علوم اپنے استاد امام جعفر صادقؑ سے ملے تھے اور اس کی اپنی حیثیت محض ایک مرتب اور مؤلف کی ہے۔ اس کا ایک استاد حربی الحمیری تھا اور ایک راہب سے بھی اس نے بعض علوم حاصل کئے تھے لیکن شیعی تصنیفات سے امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں میں کسی جابر بن حیان کا نام نہیں ملتا۔

محمد محسن شیخ آغا بزرگ طہرانی نے ابوالربیع بن سلیمان کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب جابر نے ۲۰۰ ہجری میں مقام طوس وفات پائی تو اس کی تصنیف "کتاب الرحمۃ" اس کے سر کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔

جابر کی تصانیف کی تعداد بائیس تا ستائیس تک بتائی جاتی ہے۔ جن میں کتاب الرحمہ، کتاب التجمیع اور الزیبق الشرقی خاص طور پر مشہور ہیں۔ اس کی تصانیف کو متعدد مجموعوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں اہم ترین کتب المائۃ والاثنا عشر، کتاب السبعین، کتب الموازین، کتب الخمسمائۃ ہیں۔ اس کی تصانیف میں سے تقریباً سب کی سب لاطینی کے علاوہ یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ کیمیا کے متعلق جابر کے بہت سے نظریات اٹھارویں صدی میں مروجہ کیمسٹری کے آغاز تک درست اور مستند سمجھے جاتے رہے ہیں۔

جابر نے اپنی کیمیا کی کتابوں میں دھات کا کشتہ بنانے، فولاد بنانے، چمڑا رنگنے، لوہے پر وارنش کرنے، خضاب بنانے وغیرہ کی بیسیوں ترکیبیں لکھی ہیں۔

جعفر برمکی جابر کا بہت مداح تھا۔ چنانچہ جابر نے اپنی کئی تصانیف خالد برمکی، یحیٰ برمکی اور جعفر برمکی کے نام معنون کی ہیں۔

بعد میں آنے والے عرب کیمیاگروں نے جابر کی تحریروں سے خاصا اثر قبول کیا۔ متاخرین سب کے سب ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک نے اس کی تصانیف کی شرحیں بھی لکھیں۔

جابر بن زید (۲۱ھ/۶۴۲ء - ۹۳ھ/۷۱۱ء) ابوالشعثاء البصری فرقہ اباضیہ کا مشہور محدث اور فقیہ۔ عمان میں نزوی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ قبیلہ ازد سے تعلق تھا۔ تابعین میں سے تھے۔ حدیث اور فقہ میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ بیشمار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ان سے بہت سی روایات

مروی ہیں۔ اگرچہ آپ سرکاری طور پر قاضی نہ تھے۔ لیکن بصرے میں آپ ہی کو قاضی سمجھا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق انہیں عبداللہ بن اباض کی وفات پر بصرے کی اباضی جماعت کا (دیکھئے اباضیہ) سربراہ تسلیم کیا گیا۔

جابر کے امویوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ الحجاج سے بھی بہت اچھے مراسم تھے جب حجاج نے ازارقہ کو دبانے کے لئے انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا تو انھیں بھی پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب کئی دوسرے اباضی سرداروں کے ساتھ جزیرۃ العرب کے جنوبی علاقے میں جلاوطن کردیا گیا کیونکہ عامل بصرہ سے انہیں بعض سیاسی معاملات میں اختلاف تھا۔

آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۹۶ھ/۷۱۴ء بتائی ہے اور بعض کے نزدیک ۱۰۳ھ/۷۲۱ء ہے۔

بصرے میں آپ کے علم و فضل کی بہت زیادہ شہرت تھی۔ قرآن مجید کی تفسیر کے بارے میں بھی آپ کا قول سند مانا جاتا تھا۔ چنانچہ امام حسن بصری کی غیر حاضری میں جابر ہی سے فتوے طلب کیا جاتا تھا۔ جابر حضرت ابن عباسؓ کے گہرے دوست اور ان کے متبعین میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔

بعض کے نزدیک جابر اباضیوں میں سے نہیں تھے مثلاً ابونعیم نے "حلیہ" میں جہاں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے، لکھا ہے کہ ان پر اباضیت کا "الزام" لگایا جاتا ہے۔

جابر بن سلیم المعروف فراج بن سلیم۔ سسلی کا ایک مشہور و معروف محقق اور عالم اس نے ۱۲۷۹ء میں امام رازی کی تصنیف "الحاوی" کا ترجمہ کیا اور ۱۲۸۱ء میں ابن جزلہ کی کتاب "تقویم الابدان" کا ترجمہ اور حواشی لکھے۔ اس کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔

جابرؓ بن عبداللہ رضؓ (وفات ۷۴ھ/۶۹۴ء) صحابی، ابوعبداللہ کنیت۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر والد سمیت مسلمان ہوئے آپ کا شمار آنحضورؐ کے مشہور صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ خندق میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ خندق کھودنے میں شامل ہوئے۔ غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک میں بھی شرکت کی۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں بھی شامل تھے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں اختلاف ہوا تو حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور ۳۷ھ میں جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے۔

حضرت جابر کی زندگی کا مقصد اشاعت حدیث رہا۔ آپ نے بڑی محنت سے احادیث جمع کیں۔ آپ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ آنحضورؐ کو جب بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی تو آپ ہی سے قرض لیتے تھے۔ ایک بار ادائیگی کے وقت خوشنودی کے طور پر اصل رقم سے کچھ زیادہ دیا۔ آنحضورؐ کو آپ سے بہت محبت تھی۔ باوجود آسودہ حال اور فراخی کے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سادہ خوراک کھاتے جب کوئی مہمان آتا تو کوئی تکلف نہ کرتے اور جو کچھ اس وقت موجود ہوتا سامنے رکھ دیتے تھے۔

جب حجاج مدینہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے آپ کے ساتھ بھی سختی کی۔ آخر عمر میں بہت کمزور اور نابینا ہو گئے تھے۔ ۹۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ حجاج نہ پڑھائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے فرزند نے پڑھائی۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپ کا مکان مسجد نبوی سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ جس کے قریب آپ نے ایک مسجد بنوا رکھی تھی۔

جابرؓ بن مسلم صحابی۔ آپ کی کنیت ابوجری تھی۔ بنو تمیم سے تھے۔ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص کی رائے کو قبول کررہے ہیں۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہے۔"؟ معلوم ہوا کہ رسولؐ اللہ ہیں۔ میں نے آپ کے پاس جاکر کہا "علیکم السلام یا رسول اللہ"۔ یہ سلام سنکر آنحضورؐ نے فرمایا کہ علیک السلام مُردوں کا سلام ہے۔ السلام علیک یا رسول اللہ کہا کرو۔ اس تعلیم کے بعد میں نے کہا "السلام علیک یا رسول اللہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں!" فرمایا "ہاں میں اللہ کا رسول ہوں، میری دعا قبول ہوتی ہے۔ اگر میں تمہارے لئے دعا قبول کردوں تو قبول ہوگی۔ اگر تمہارے قحط سالی ہو تو میری دعا سے تم سیراب ہوگے اور تمہارے لئے روئیدگی ہوگی۔ اگر تم بے آب و گیاہ میدان میں ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے تو میری دعا سے تمہارے پاس واپس آجائے گی۔" یہ سنکر میں نے کہا "یا رسول اللہ خدا نے آپ کو جو کچھ سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھائیے" فرمایا "نیکی کو حقیر نہ سمجھو، اگرچہ وہ اسی قدر ہو کہ اپنے بھائی سے خندہ روئی سے گفتگو کرو یا اپنے ڈول سے پیاسے کے برتن میں پانی ڈال دو۔ اگر کوئی شخص تمہارے راز سے واقف ہو اور وہ تم کو کسی بات پر شرم دلائے تو تم اس کے راز کا حوالہ دے کر اس کو شرم نہ دلاؤ۔ تاکہ اس کا وبال تمہارے اوپر نہ ہو۔ لٹکتے ہوئے ازار (تہمد) سے پرہیز کرو کیونکہ یہ غرور کی نشانی ہے اور غرور خدا کو ناپسند ہے۔ کسی کو گالی نہ دو۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کے بعد سے میں نے کسی انسان بلکہ اونٹ اور بکری تک کو گالی نہیں دی۔ آپ کے حالات زندگی کچھ زیادہ نہیں ملتے۔

جابہ ایک قدیم پہاڑی ریاست جس کا صدر مقام برھم پترہ تھا۔ جابہ کو کئی مختلف ناموں سے لکھا جاتا رہا ہے۔ مثلاً یعقوبی نے اسے نابہ، کنبایہ ادریسی نے جافہ اور جابہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اسے غابہ، خابہ اور [illegible] وغیرہ بھی لکھا گیا ہے۔ بقول ہیوان سانگ "یہ ریاست ۶۶۰ میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔" غالباً الکنندہ اور کرنالی دریاؤں کے درمیان کا پہاڑی علاقہ اس میں شامل تھا۔ بعد میں شہر چمبہ کو اس کا صدر مقام بنایا گیا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو اس ریاست کو ہماچل پردیش کے صوبے میں مدغم کردیا گیا اور اس طرح اس ریاست کا نظم و نسق براہ راست مرکزی حکومت ہندوستان کے ہاتھ میں آگیا۔

عرب مصنفین نے عام طور پر جابہ کو چمبہ کے حکمرانوں کا لقب قرار دیا ہے۔ یہ حکمران غالباً سورج بنسی راجپوت تھے۔ بن رستہ کے بقول یہاں کا فرمانروا ہندوستان کے راجاؤں میں بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ اس کا تعلق سلوقی نسل سے تھا اور سلوقین کی اصطلاح چمبہ کے شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھی۔ خاندان چمبہ کی بنیاد دسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں رکھی گئی۔ یہاں کے راجا اپنے ہی خاندان میں بیاہ شادی کرتے تھے۔ البتہ بلہرا کے راجہ راشٹر کوٹ ان عورتوں سے شادی کرلیتے تھے۔ جابہ کی الجرز (گوجروں) سے ہمیشہ جنگ رہتی تھی راشٹر کوٹوں اور راجگان چمبہ کا آپس میں اتحاد تھا۔ ابن رستہ کے مطابق سرخ صندل کی لکڑی چمبہ سے درساور بھیجی جاتی تھی۔

جابیہ غسانی حکمرانوں کی مرکزی قیام گاہ جو جولان میں دمشق سے تقریباً ۸۰ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ یہ قیام گاہ بہت سی پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی تھی جابیہ عرب بدووں کے حیرتا کا مکمل ترین نمونہ تھا۔ حیرتا اس وسیع میدان کو کہتے ہیں جہاں بدوی پڑاؤ ڈالتے تھے۔ اور جہاں مکان اور خیمے آپس میں خلط نظر آتے تھے۔

موجودہ دور میں یہ مقام ایک بہت بڑے چشمے اور چراگاہوں پر مشتمل ہے۔ عربوں نے جب اس شہر کو فتح کر لیا تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ ابتدا ہی سے یہاں ایک بڑی چھاؤنی قائم تھی جو پورے شام میں سب سے بڑی تھی۔ جابیہ عرصہ دراز تک جند دمشق کا صدر مقام رہا۔ جنگ یرموک سے بھی اس مقام کو وابستگی ہے۔ یہیں پر بزنطیوں سے ایک جھڑپ ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ ۱۷ھ / ۶۳۸ء میں حضرت عمرؓ نئی فتوحات سے پیدا شدہ صورت حال کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے حجاز کے اکابر صحابہ کے ساتھ جابیہ تشریف لائے۔ فوج کے سالاروں اور اعلیٰ عہدے داروں کا جو وہاں اجتماع ہوا وہ آج بھی یوم جابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی مقام پر وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۃ الجابیہ کہلاتا ہے اور حدیث کی کتب میں اکثر اس خطبے کا ذکر آتا ہے۔ ابتدائے عہد اسلام میں ہی یہاں ایک وسیع مسجد تیار کی گئی۔ جس میں منبر بھی نصب تھا۔ چنانچہ جابیہ نے جلد ہی ایک بڑے شہر اور چھاؤنی کا درجہ حاصل کر لیا۔

تمام اموی خلفاء امیر معاویہؓ کے زمانے ہی سے اس مقام پر کچھ دن ضرور قیام کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب اپنی خلافت کا اعلان کیا اور حجاز سے بنو امیہ نکال دیئے گئے تو اہل شام معاویہ ثانی کا جانشین مقرر کرنے کے لیے جابیہ ہی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ مروان بن الحکم کی خلافت کا اعلان یہیں کیا گیا تھا۔ عبدالملک کے دو بڑے بیٹوں کو اس کا جانشین اسی جگہ چنا گیا۔ سلیمان کے عہد میں جابیہ کے عظیم فوجی چھاؤنی یہاں سے حلب کے شمال میں دابق میں منتقل کر دی گئی۔ لیکن یہ شہر ایک صوبے کا صدر مقام ضرور رہا۔ عباسی عہد میں اس شہر کی اہمیت فروتر ہونے لگی اور آہستہ آہستہ جابیہ تباہی سے دوچار ہوتا چلا گیا۔ آج کل اگرچہ یہ شہر کالعدم ہو چکا ہے لیکن دمشق کے جنوب مغربی دروازے باب الجابیہ سے اس کی پرانی یاد اب بھی تازہ ہو جاتی ہے۔

جٹ

برعظیم پاک و ہند کا ایک قبیلہ جو پنجاب، سندھ، راجستھان اور مغربی اتر پردیش میں آباد ہے۔ غیر منقسم پنجاب میں راوی کے مغربی جانب کے اضلاع میں بہت سے جاٹ مسلمان تھے۔ لیکن وسطی پنجاب میں اکثر جاٹ سکھ اور جنوب مشرقی علاقے میں ان کی اکثریت ہندو تھی۔ تقسیم کے بعد تمام غیر مسلم جاٹ پاکستانی علاقوں سے ہندوستان چلے گئے۔ اور آج کل اتر پردیش کے شمالی اور مغربی اضلاع میں ان کی آبادی کثرت سے ہے انہوں نے سلطنت مغلیہ پر زوال لانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اپنے آخری ایام میں یہ سلطنت اس قابل بھی نہ رہی کہ صدر مقام پر بھی جاٹوں کی لوٹ مار کا مقابلہ کر سکتی۔

جب محمد بن قاسم سے قبل عرب سپہ سالار بدیل بن طہفۃ البجلی نے دیبل کی بندرگاہ پر حملہ کیا تھا تو جاٹوں نے اس کا مقابلہ کر کے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ بعد میں ان کی مڈبھیڑ محمد بن قاسم سے ۹۴ھ / ۷۱۲ء میں حملہ دیبل کے موقع پر ہوئی۔ مسلمانوں نے ان کو کثیر تعداد میں گرفتار کر کے حجاج بن یوسف کے پاس بھجوا دیا۔ اس کے بعد سے یہ لوگ سندھ اور بیرون سندھ میں مستقل طور پر پُرامن زندگی بسر کرتے رہے۔ جب محمود غزنوی کا دور حکومت آیا تو اس سے ان کی دریائے سندھ پر ایک بحری لڑائی ہوئی۔ کیونکہ ان لوگوں نے سلطان کی فوج پر عقب سے چھاپے مارے تھے۔ اور کئی مرتبہ لشکر کا ساز و سامان لوٹ لیا تھا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد یہ لوگ پھر شاہجہان کے عہد حکومت میں سامنے آتے ہیں۔ ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں انہوں نے شہنشاہ کے خلاف بغاوت کی اور متھرا کے فوجدار مرشد علی خان کو قتل کر دیا۔ اورنگ زیب کو دکن کی مہم میں مصروف پا کر شمالی ہند کے جاٹوں نے اپنے سرداروں راجا رام اور رام چہرا کی سرکردگی میں عوام میں پھر بغاوت کی۔ انہوں نے اکبر کے مقبرے کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ میر ابوالفضل نے جو یہاں کا فوجدار تھا ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی کے لیے سردار خان جہان کوکلتاش کو بھیجا لیکن اس نے کئی معرکوں میں جاٹوں سے شکست کھائی۔ بعد میں شہنشاہ نے اپنے پوتے بیدار بخت کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھرت پور اور اس کے گرد و نواح کے جاٹوں نے اپنے سردار سورج مل کی قیادت میں آگرے اور دہلی کے درمیانی علاقے میں خوب لوٹ مار مچائی اور باشندوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھائے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو اس نے ان مظالم جاٹوں کا قلع قمع کرنے کا اپنی فوج کو خاص طور پر حکم دیا۔ ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں اپنے چوتھے حملے کے دوران میں اس نے ایک بار پھر جاٹوں پر چڑھائی کی۔ اگرچہ وہ ان پر مکمل طور پر قابو نہ پا سکا۔ ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء میں جب مرہٹوں کو ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کی تیسری لڑائی میں ایک فیصلہ کن شکست ہوئی تو اس شکست سے جاٹوں کی بھی کمر ٹوٹ گئی۔

جب احمد شاہ واپس لوٹا تو اس نے پنجاب کے جاٹوں کے ایک معمولی سردار آلا سنگھ کو اس کی فوجی خدمات کے صلے میں کئی ایک گاؤں عطا کیے جو بعد میں ریاست پٹیالہ کی بنیاد بنے۔

تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں رنجیت سنگھ جو ایک جاٹ تھا پنجاب میں ایک طاقتور سکھ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران جاٹوں نے دہلی میں عام بدنظمی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے تو انہیں بھی مطیع ہونا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے الور، بھرت پور اور گرد و نواح کے علاقے میں دوبارہ سر اٹھایا اور تقسیم ہند کے بعد ہونے والی لوٹ مار اور قتل و غارت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ موجودہ دور میں وہ مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

ہندوستان میں کچھ جاٹوں نے مسلمانوں کی فتح سندھ کے تھوڑے عرصے بعد ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ پنجاب میں ان کے بہت سے قبیلوں نے جلال الدین حسین بخاری اور بابا فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بھی ان کی ایک بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔

جاٹ کی معرب شکل زُط ہے۔ جٹ اور جَتّا کے الفاظ بھی ان ہی کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔

جاحظ، ابو عثمان

(۱۶۰ھ / ۷۷۶ء — محرم ۲۵۵ھ / دسمبر ۸۶۸ء یا جنوری ۸۶۹ء)

جاحظ، ابو عثمان عمرو بن بحر الفقیمی۔ عربی نثر نگار اور کتب ادب کا مصنف بصرہ میں پیدا ہوا۔ حبشی الاصل تھا۔ آنکھوں کے ڈھیلے پیدائش ہی سے باہر کو نکلے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس کا لقب جاحظ پڑ گیا تھا۔ بچپن بصرہ ہی میں گذرا تعلیم کا بچپن ہی سے بے حد شوق تھا۔ متجسس طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا۔ مسجد میں ان لوگوں میں جا بیٹھتا تھا جو مختلف مسائل پر بحث کرنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ لسانی تحقیق کی جو مجالس مربد میں منعقد ہوتی تھیں ان میں بھی شریک ہوتا تھا۔ اس نے الاصمعی، ابو عبیدہ، ابو زید جیسے علمائے لسانیات اور شعر العرب کے فاضل ترین لوگوں کے حلقۂ درس میں زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔ ذہانت اور شوق نے اسے بچپن ہی میں معتزلہ اور امراء کے حلقوں سے روشناس کرا دیا تھا۔ اس طرح سے اس نے رفتہ رفتہ عربی زبان میں حقیقی مہارت پیدا کر لی اور ساتھ ہی مروجہ روایتی ثقافت میں بھی ماہر ہو گیا۔ اپنے ذوق مطالعہ سے وہ بیرونی دنیا کے حالات اور معاملات سے

بھی روشناس ہوگیا۔ بصرے کے علاوہ بغداد نے بھی جو تہذیب و تمدن کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھا۔ جاحظ کے ذہن کی نشوونما میں فیصلہ کن اثر ڈالا۔ اعتزال اور حقیقت پسندی کی واضح چھاپ تو اگرچہ بصرے ہی نے اس کے ذہن پر ثبت کر دی تھی اور وہ اپنے وطن کا صرف عالم ہی نہیں بلکہ ایک کامل نمائندے کی حیثیت حاصل کر گیا تھا۔

جاحظ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ تو اگرچہ پہلے ہی شروع کر دیا تھا لیکن اندازاً ۲۰۰ھ/ ۸۱۵، ۸۱۶ء میں تو واضح طور پر اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اس زمانے میں اس نے "امامت" کے موضوع پر چند تصانیف لکھ کر مامون سے خراج تحسین حاصل کیا اور اسے خلیفہ کے دربار میں ایک اہم مقام حاصل ہوگیا۔ وہ چند دن ابراہیم بن صولی کا دفتر وزارت میں مددگار بھی رہا اور کچھ روز کاتب (منشی) کے فرائض بھی انجام دیے لیکن سیرت نگاروں کی تحریروں کی روشنی میں جاحظ کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی بھی کسی سرکاری عہدے پر فائز نہ ہوا اور نہ ہی اس نے کسی کی باقاعدہ نوکری کی۔ وہ اپنی تصانیف بڑے لوگوں کے ناموں سے منسوب کر کے معقول رقمیں وصول کرتا تھا۔ غالباً وہ ایک مدرس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متوکل اسے اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کرنے کا خواہشمند تھا لیکن وہ اس کی بدصورتی کی بنا پر یہ خدمت اس کے سپرد نہ کر سکا۔ جاحظ کو کچھ عرصہ حکومت سے وظیفہ بھی ملتا رہا۔ ان تمام بحثوں کو سمیٹتے ہوئے جو ہمیں اس کے بارے میں مختلف سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں کے ہاں ملتی ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ جاحظ کو ایک درباری کی حیثیت تو حاصل نہیں تھی لیکن وہ ایک غیر رسمی مشیر کی خدمت ضرور انجام دیتا رہا۔ جن تصانیف کی بنا پر اسے دربار میں شہرت حاصل ہوئی ان تصانیف میں مسئلہ خلافت سے بحث کی گئی تھی اور عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ خلفاء کے ساتھ تو اس کے بے تکلفانہ مراسم قائم نہ ہو سکے لیکن امراء اور دوسری سربرآوردہ شخصیتوں کے ساتھ اس کا برابر ربط ضبط رہا۔

جاحظ نے مختلف سیاحتیں بھی کیں۔ جن میں شام کی سیاحت بھی شامل ہے۔ قیام بغداد کے دوران میں اسے علم کے ایک بیش بہا خزینے سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور وہ یونانی کتب کے بہت سے تراجم تھے جو مامون کے عہد میں عربی میں کیے گئے۔ اسے قدیم فلاسفہ کو مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

زندگی کے آخری حصے میں فالج سے اس کا آدھا حصہ مفلوج ہوگیا تھا اور وہ بغداد سے بصرہ واپس لوٹ آیا تھا جہاں اس نے وفات پائی۔

جاحظ ایک کثیر التصنیف مصنف ہے۔ اس کی تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ اس کی تصانیف کو دو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ادب کے تحت آتی ہے۔ ان کتب میں جاحظ کا کام صرف اتنا ہے کہ اس نے مضامین کا انتخاب کر کے انہیں پیش کیا اور تحریری روایات پر رائے زنی کی دوسری قسم میں اس کے اپنے طبع زاد تصانیف اور مقالات ہیں جن سے وہ بحیثیت ایک انشا نگار اور مفکر کے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کی مشہور تصانیف۔

"کتاب الحیوان"، "کتاب البغال"، "کتاب البیان والتبیین"، "کتاب البخلاء"، "کتاب مفاخرۃ الجواری والغلمان"، "المعاد والمعاش"، "السر وحفظ اللسان"، "کتاب العثمانیہ"، "کتاب تصویب علی فی تحکیم الحکمین" "رسالہ فی بنی امیہ"، "رسالہ فی نفی التشبیہ"، "کتاب الرد علی النصاریٰ"، "رسالہ فی مناقب الترک" اور "کتاب التربیع والتدویر" ہیں۔

جاحظ معتزلی نظریات و افکار کا مالک تھا۔ سیاسیات کی طرح الٰہیات [illegible] بھی وہ معتزلی

ہی تھا۔ بقول ابوحیان توحیدی وہ "فصاحت و بلاغت کا بڑا ماہر اور معتزلہ کے ایک دبستان کا بانی تھا۔"

جبادو ایک بڑا نخلستان [illegible] ۲۰ درجے تک طول بلد شمال اور ۱۲ سے ۱۳ درجے عرض بلد مشرق کے درمیان واقع ہے [illegible] عمارتوں کے کھنڈروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنہیں پہاڑی [illegible] الگ کر دیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صحرائی ہے۔ یہاں کا موسم انتہائی [illegible] اور دن رات کے درجہ حرارت میں بے حد فرق ہے۔

اس کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے مختلف راستے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مثلاً مرزوق اور [illegible] تجارتی راستے [illegible] اسی مقام پر وہ راستہ بھی آ ملتا ہے جو [illegible] ہے یہ راستہ یہاں سے جنوب کی طرف علیحدہ ہو جاتا ہے اور [illegible] جانب بانا تیجریا کے گیا [illegible] نکل جاتا ہے۔

نخلستان کے کنارے پر چند باغات کے آثار [illegible] موجود تھے۔ اور ارد گرد صحرا میں [illegible] قوم کے حسنی گروہوں نے بسا رکھے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں یہاں کے باشندوں کی معاشی حالت [illegible] ہوگئی تھی اس دور میں صحرا پار کی تجارت [illegible] کی تجارت کو قطعاً بند کر دیا تو انہیں بے پناہ نقصان [illegible] سبب اجر ہوا رقی اور [illegible] قوم کے لوگ [illegible] جمع ہوگئے [illegible] پھر [illegible] باشندے اپنی ملک کی کانیں اور کھجوروں کے [illegible] باشندوں نے لے لی۔ جب یہ علاقہ فرانس کی عملداری میں آیا تو [illegible] نخلستانوں کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ [illegible] کاروانوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا اور کھجوروں کے [illegible] دینے لگی۔ چنانچہ جبادو کے نخلستان میں اس کے سات ہزار [illegible] حاصل ہوتی تھی۔

۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے [illegible] کے موقع پر یہاں کی آبادی چند [illegible] کسب معاش کے [illegible] کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور فصل [illegible] آتے ہیں۔ یہاں کی موجودہ آبادی سات ہزار کے لگ بھگ ہے۔

جبادو طرابلس الغرب میں جبل نفوسہ [illegible] ضلع [illegible] میں ایک قصبہ [illegible] ہے۔ جس کا ایک قدیم شہر کا تعلق ہے [illegible] کے بارے کوئی زیادہ تفصیل سے معلومات نہیں ملتی۔ تاریخ کے حوالوں سے جو معلومات [illegible] کہ جادو شہر کی بنیاد مسلمانوں کی فتح شمالی افریقہ سے [illegible] پہلے پڑ چکی تھی [illegible] اس قدیم شاہراہ پر واقع تھی جو طرابلس شہر کو [illegible] یہی بات اس شہر کی خوشحالی اور ترقی کا سبب بنی۔

جادو کے بارے میں معلومات صحیح طور پر پہلی بار [illegible]

عیسوی کے اواخر میں ملتی ہیں۔ یہ معلومات الدرجینی نے جو ایک اباضی سوانح نگار ہے شیخ ابوعثمان المزاتی کے متعلق ایک قصے میں ایک تجارتی قافلے کا ذکر کیا ہے جو اہل جادو پر مشتمل تھا۔

اباضی مورخین کے بقول "جادو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں پورے جبل نفوسہ کا سیاسی اور انتظامی مرکز تھا۔" ابومنصور الیاس بھی یہیں اقامت گزیں تھا جسے تاہرت کے رستمیہ امام نے یہاں کا والی مقرر کیا ہوا تھا۔ بعد میں ابویحییٰ زکریا ارجانی نے بھی جادو ہی کو اپنا صدر مقام بنایا جو ایک خودمختار امام کی حیثیت سے جبل نفوسہ پر حکمرانی کرتا رہا۔

ان دنوں جادو نے ایک تجارتی شہر کی حیثیت سے بہت ترقی کی۔ بقول ابن حوقل (۲۷۴ھ / ۹۰۰ء) "یہاں ایک مسجد تھی اور ایک منبر"۔ ابوعبید البکری (۴۶۱ھ / ۱۰۶۸ء) نے لکھا ہے کہ جادو ایک بڑا شہر تھا۔ جس میں بازار تھے اور یہودیوں کی کافی آبادی تھی۔ طرابلس المغرب سے غدامس کے شہر زویلہ کو جانے والے قافلے جادو ہی سے گزرتے تھے۔ جبل نفوسہ اور خاص طور پر جادو کے کام کے ساتھ بڑے گہرے روابط قائم تھے۔ جبل نفوسہ کے دوسرے مقامات کے باشندے جادو میں جو تجارتی مرکز تھا آیا کرتے تھے۔ ان دنوں جادو ملک کے سارے مشرقی حصے کا معاشی مرکز تھا۔

جادو اپنی مخلوط آبادی کے باوجود اباضیوں کا ایک اہم مذہبی مرکز تھا۔ جہاں پر ملک بھر کے باضی علما و فضلا کا اجتماع رہتا تھا۔

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کا زمانہ جادو کے لیے نہایت خوشحالی کا زمانہ تھا۔ جبل نفوسہ کے حاکموں کے علاوہ خود اس شہر کے حاکم بھی مقامی اباضی شیوخ ہوا کرتے تھے۔ اہل جادو میں سب سے پہلا حاکم ابومحمد الدرفی تھا۔ اس کی رہائش دار بنی عبداللہ میں تھی جو جادو کے بازار میں واقع تھا۔ بعد میں یہی مکان شیوخ شہر کی آماجگاہ بن گیا۔ ابومحمد کے بعد اس کا بیٹا ابویحییٰ یوسف جانشین ہوا جو ۳۹۰ھ / ۱۰۰۰ء تک حکمران کرتا رہا۔

بیسویں صدی کے آخر میں یہاں پانچسو مکانات تھے اور آبادی زیادہ تر نفوسہ کے بربروں پر مشتمل تھی۔ موجودہ زمانے میں جادو کی آبادی چند ہزار ہے قدیم شہر کے آثار محض ٹوٹے پھوٹے پتھروں کے ایک ڈھیر اور غاروں کی صورت میں موجود ہیں۔ جن کے وسط میں ایک مسجد ہے۔ مسجد کے قریب ہی زمانہ قدیم میں کاروباری منڈی اور بازار تھا۔ اس بارے میں کہ یہ قدیم شہر کس زمانے میں ویران ہوا۔ تاریخ سے ہمیں کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ جادو شہر کا آخری بار ذکر اباضیوں کے تذکرے میں چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں آیا ہے۔

جادو واقعات کے غیر فطری طور پر ظہور میں لانے کا فن۔ یہ علم ہر زمانے میں ہر قوم کے افراد کے عقیدے میں داخل رہا ہے اور مختلف اشخاص ہر جگہ اس کا دعوے کرتے چلے آئے ہیں۔ قدیم مصر کے پجاری اس دعوے پر اپنی عبادت اور مذہب کی بنیاد رکھتے تھے۔ قدیم مصری، بابلی، ویدک اور دیگر روایتوں میں دیوتاؤں کی طاقت کا ذریعہ بھی جادو ہی کو خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ میں باوجود عیسائیت کی اشاعت کے جادو کا رواج برابر جاری رہا اور افریقہ میں اب تک ایسے ڈاکٹر موجود ہیں جو جادو کے علاج کا صرف دعوے ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے دعوؤں کو حبشی لوگ عملاً تسلیم کرتے اور ان سے خائف رہتے ہیں۔ جادو کئی شکلیں اختیار کرتا ہے۔

جادو کے متعلق یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر برا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواح خبیثہ یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے۔ اس لیے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے۔

"سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔" (۲ : ۱۰۲)

لیکن اس میں کوئی کلمہ کفر یا کوئی فعل شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے۔ اور آنحضورؐ نے اسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سات غارتگر چیزوں سے پرہیز کرو۔" لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ "فرمایا" خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا اور بھولی بھالی عفیف مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ (بخاری و مسلم)

جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گذر کر جسم کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گذر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً خوف ایک نفسیاتی چیز ہے۔ مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور بدن میں کپکپاہٹ سی ہو جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی طرف جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں۔ وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی تھیں لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انہیں سانپ ہی محسوس کیا۔ اور حضرت موسیٰؑ تک کے حواس جادو کی اس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اسی طرح قرآن میں سورۃ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "بابل میں ہاروت و ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈالدے۔ (۲ : ۱۰۲)" یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا اور ظاہر ہے اگر تجربے سے لوگوں کو اس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ یہ بات بلاشبہ اپنی جگہ درست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا اثر انداز ہونا بھی اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے

جارچوی، ابن حسن (۱۹۰۵ء - ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء) ممتاز شیعہ عالم دین۔ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے اور بی ٹی کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں سکھر میں جو شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی اس میں انھوں نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کی صدارت شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ نے کی تھی۔ علامہ جارچوی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء تک جامعہ ملیہ دہلی میں استاد رہے۔ ۱۹۳۸ء میں انھیں راجہ محمود آباد کو دینی تعلیم دینے کا فریضہ سونپا گیا۔ بعد ازاں وہ شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۵ء کرپس مشن کے سامنے پیش ہوئے تاکہ برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے نظریے کی وضاحت کر سکیں۔ ۱۹۵۱ء میں بھارت سے پاکستان چلے آئے۔ ان کی کوششوں سے کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ ریسرچ بھی قائم ہوا۔ ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

جارودؓ بن عمرو صحابیؓ، نام بشر، ابومنذر کنیت اور جارود لقب تھا۔ قبیلہ عبدقیس کے سردار تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں انہوں نے قبیلہ بکر بن وائل کو لوٹ کر بالکل صاف کر دیا تھا۔ عربی میں جرد کے معنی برگ و بار کے ہیں۔ یہی واقعہ ان کے لقب کا سبب بنا۔ مذہباً عیسائی تھے۔ ۱۰ھ میں قبیلہ عبدقیس کے ساتھ مدینہ آئے۔ آنحضورؐ

نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے کہا اے محمدؐ میں ایک مذہب پر تھا۔ اب تمہارے مذہب کے لئے اپنا مذہب چھوڑ رہا ہوں۔ میرے تبدیل مذہب کے بعد تم میرے ضامن ہو گے؟ آنحضورؐ نے فرمایا ہاں میں تمہارا ضامن ہوں۔ خدا نے تم کو تمہارے مذہب سے بہتر مذہب کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ اس مختصر سی گفتگو کے بعد جارودؓ اپنے ساتھیوں سمیت حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ آنحضورؐ کو ان کے اسلام لانے کی بہت خوشی ہوئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے۔

فتنۂ ارتداد کے زمانے میں ان کے قبیلے کے بہت سے آدمی مرتد ہو گئے لیکن آپ استقامت کے ساتھ دین حق پر قائم رہے۔ چونکہ آپ سردار قبیلہ تھے اس لئے اپنے اسلام کا اعلان کر کے دوسروں کو ارتداد سے روک رکھے تھے۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں آپ نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایران پر فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے اور فارس یا نہاوند کے معرکے میں شہید ہوئے۔

حضرت جارود سے عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابو مسلم الجذامی، زید بن علی اور محمد بن سیرین نے روایت کی ہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ میں بہت زیادہ جرأت تھی اظہار حق میں بے باکی حد درجہ پہنچی ہوئی تھی۔ جس بات کو حق سمجھ لیتے تھے اس کے اظہار میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ بحرین کے گورنر قدامہ بن مظعون کو بعض رومیوں نے شراب پیتے دیکھا۔ آپ کو اس کا علم ہوا تو حضرت عمرؓ کے پاس آ کر کہا کہ امیرالمومنین قدامہ نے شراب پی ہے ان پر شرعی حد جاری کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے شہادت طلب کی تو آپ نے حضرت ابوہریرہ کو پیش کیا۔ انہوں نے شہادت دی کہ میں نے نشہ کی حالت میں قے کرتے ہوئے دیکھا ہے حضرت عمرؓ نے قدامہ کو طلب کیا، وہ آئے۔ ان کے آنے کے بعد حضرت جارودؓ نے پھر کہا۔ امیرالمومنین کتاب اللہ کی رو سے حد جاری کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم گواہ ہو مدعی نہیں ہو۔ تمہارا کام شہادت دینا تھا جسے تم پورا کر چکے۔ اس وقت آپ خاموش ہو گئے لیکن دوسرے روز پھر اصرار کیا۔ شہادت ناکافی ہونے کے سبب حضرت عمرؓ کو آپ کا اتنا اصرار ناگوار گذرا اور فرمایا "تم تو مدعی بنے جاتے ہو شہادت صرف ایک ہے۔ اس اعتراض پر حضرت جارودؓ نے کہا عمرؓ میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ حد میں تاخیر نہ کرو۔ آخر کار ان کی بے جا ضد پر حضرت عمرؓ کو تنبیہہ کرنا پڑی اور فرمایا جارودؓ خاموش رہو ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔ اس تنبیہہ پر جارود نے غصے سے کہا "عمرؓ حق اس کا نام نہیں ہے کہ تمہارا ابن عم شراب پئے اور تم الٹے مجھے برے سلوک کی دھمکی دو آخر میں جب قدامہ کی بیوی نے شہادت دی تو حضرت عمرؓ نے حد جاری کرائی۔

جارودؓ چونکہ آنحضورؐ کے آخری زمانہ میں سلام لائے تھے اس لئے آپ کی روایتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادے تھے جن کا نام منذر تھا۔

جارودیہ ابتدائی دور کے اہل تشیع کی ایک جماعت۔ ان کا ذکر اکثر زیدیہ کے ضمن میں آتا ہے۔ یہ لوگ ہر علوی کو جو حضرت فاطمہ کی اولاد میں سے ہو امام تسلیم کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو اور بزور شمشیر امامت کا دعویٰ کرے۔

اس گروہ کا بانی ابوالجارود زیاد بن المنذر تھا جو نابینا تھا۔ اس نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے جنہوں نے اس کا نام سرحوب رکھا تھا۔ اسی وجہ سے یہ گروہ سرحوبیہ بھی کہلاتا ہے۔

یہ گروہ ابوبکرؓ صدیق اور عمر فاروقؓ کی خلافت کو اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ علویوں کی موجودگی میں غیر علویوں کی امامت تسلیم نہیں کی جا سکتی وہ کسی غیر علوی امام کی تائید کرنے والوں کو کافر سمجھتے تھے۔ ان کا امامت کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ ہر فاطمی امامت کا یکساں حقدار ہے۔ نیز ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ امام کو جس علم کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے فطرت ہی سے ودیعت ہوتا ہے۔ سیکھنے سے نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ کوئی نہ کوئی علوی خروج کرتے ہوئے بطور مہدی واپس آئے گا بعض کے نزدیک یہ مہدی محمد بن عبداللہ بن حسینؓ بن علیؓ المعروف نفس الزکیہ اور بعض کی رائے میں محمد بن قاسم بن علی بن حسین یا یحییٰ بن عمر الکوفی ہوں گے۔

بعض شیعیوں کے لئے یہ نام تقریباً ڈیڑھ سو سال تک استعمال ہوتا رہا۔

جاریہؓ بن قدامہ صحابیؓ، ابو ایوب کنیت اور المحرق لقب تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ جاریہ بن قدامہ بن زہیر [illegible] بن مالک بن زہیر ابن الحصین بن رزاح بن ربیعہ۔

حضرت علیؓ کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور یہی ان کی شہرت کا سبب ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو شہید ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب حضرت [illegible] حضرت زبیر کے لشکر بصرے میں داخل ہوئے تو جاریہ ان دنوں یہیں موجود تھے جنگ جمل میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ جنگ صفین میں بصرے [illegible] اور رباب کی سرداری انہیں کو سونپی گئی تھی۔ انہوں نے اس معرکے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

بقول المبرد وہ تحکیم کی موافقت میں تھے اور سرداران تمیم کے [illegible] تھے جس نے الاشعث اور ابو ازد کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی۔

واقعۂ تحکیم کے بعد بھی حضرت علیؓ کے وفادار رہے اور خوارج کے ساتھ [illegible] میں حضرت علی کے مددگار رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے جس لشکر کو [illegible] سے جنگ کے لئے بصرہ بھیجا تھا۔ جاریہؓ اس لشکر کے سردار تھے۔ جب [illegible] علی کے دوستوں تک نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو پھر بھی ان کی وفاداری [illegible] نہ آیا۔ پھر جب حضرت امیر معاویہؓ نے مصر فتح کر لیا تو [illegible] کے پیش نظر کہ وہاں حضرت علیؓ کے حامی قلیل تعداد میں تھے [illegible] شہر کو اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی۔

حضرت امیر معاویہ نے عبداللہ بن عامر الحضرمی کو [illegible] تمیم کی تالیف قلب کرے چنانچہ اسے ایک حد تک ان کی حمایت [illegible] زیاد بن ابیہ نے جو بصرے کا نائب عامل تھا۔ حضرت علی کو [illegible] بھیجیں کیونکہ ان کی اپنے قبیلے میں [illegible] زیادہ عزت [illegible] لے کر بصرے پہنچے۔ بنی تمیم کی تالیف قلب کر [illegible] کے لشکر پر حملہ کیا۔ ابن الحضرمی کو شکست کھا کر اپنے ستر رفقا کے ساتھ [illegible] سا سانی قلعے میں بند ہو گیا۔ جاریہؓ نے اس قلعہ کا محاصرہ کر کے [illegible] گرا دیں اور آگ لگوا دی اس طرح ابن الحضرمی اور اس کے رفقا جل [illegible] میں حضرت علیؓ کی حکومت [illegible] ہو گئی

جاریہؓ ہی نے حضرت علیؓ سے ۳۹ھ میں زیاد کو [illegible] کی سفارش کی تھی تاکہ وہ ان ایرانیوں کی بغاوت [illegible] جنہوں نے [illegible] بند کر دیا تھا۔

جاریہؓ نے حضرت علیؓ کے عہد حکومت میں [illegible] ۴۰ھ میں لڑی تھی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد [illegible] لئے مدینہ [illegible] میں لوگوں سے زبردستی بیعت لی۔

حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں جاریہؓ کی ان سے صلح ہوگئی۔ ایک روایت کے مطابق امیر معاویہؓ نے انھیں ۹۰۰ جریب پر مشتمل ایک جائداد بھی عطا کی تھی۔ انہوں نے بصرے میں وفات پائی۔

جاسوس خفیہ خبر رساں۔ ٹوہ لگانا۔ جاسوس خاص طور پر اس مخبر کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے سن گن لینے کے لئے دشمنوں میں بھیجا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ایمان والوں کو ایک دوسرے کی ٹوہ لگانے سے منع کیا گیا ہے (۴۹:۱۲) الماوردی کے نزدیک محتسب کے لئے جاسوس سے کام لینا جائز ہے۔ جبکہ کسی ممنوعہ بات کا ارتکاب کیا گیا ہو۔ مگر امام غزالی کے نزدیک ناجائز ہے۔

جاسوسی کے دو پہلو ہیں ایک تو دوسروں کے راز ٹٹولنا، لوگوں کے حالات و معاملات کی ٹوہ لگاتے پھرنا۔ گویا اندرون ملک ایسے وجوہ کی بنا پر جن کا تعلق حکومت اور نظم و نسق سے ہو دوسرے بیرون ملک سیاسی اور جنگی اغراض کے تحت جاسوسی کرنا۔

جہاں تک پہلی قسم کی جاسوسی کا تعلق ہے بقول مولانا مودودی وہ ہر حال میں شرعاً ممنوع ہے۔ ایک مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسروں کے جن حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے ان کی کھوج کریدکرے اور پردے کے پیچھے جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کس میں کیا عیب ہے۔ اور کس میں کون کونسی کمزوریاں چھپی ہوئی ہیں۔ لوگوں کے نجی خطوط پڑھنا، دو آدمیوں کی باتیں کان لگاکر سننا، ہمسایوں کے گھروں میں جھانکنا اور مختلف طریقوں سے دوسروں کی خانگی زندگی یا ان کے ذاتی معاملات کی ٹٹول کرنا ایک بڑی بداخلاقی ہے جس سے طرح طرح کے فساد رونما ہوتے ہیں۔ اسی لئے آنحضورؐ نے تجسس کرنے والوں کے بارے میں فرمایا۔ اے لوگو! جو زبان سے ایمان لائے ہو مگر ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اترا ہے مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی کھوج نہ لگایا کرو۔ کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب ڈھونڈنے کے درپے ہوگا اللہ اس کے عیوب کے درپے ہوجائے گا اور اللہ جس کے درپے ہوجائے اسے اس کے گھر میں رسوا کرکے چھوڑتا ہے۔ (ابوداؤد)

تجسس کی ممانعت کا یہ حکم صرف افراد کے لئے ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی حکومت کے لئے بھی شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سپرد کیا ہے۔ اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ جاسوسی کا ایک نظام قائم کرے۔ لوگوں کی چھپی ہوئی برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا دے بلکہ اسے صرف ان برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہیئے جو ظاہر ہوجائیں۔ رہی مخفی خرابیاں تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں ہے بلکہ تعلیم، وعظ و تلقین، عوام کی اجتماعی تربیت اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہے اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا آپ کو شک گذرا اور دیوار پر چڑھ گئے دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی آپ نے پکار کر کہا "اے دشمنِ خدا، کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا۔ اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟" اس نے جواب دیا "امیر المومنین جلدی نہ کیجئے اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کئے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت لئے بغیر داخل نہ ہو اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔"

یہ جواب سنکر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے۔ اور اس کے خلاف انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی۔ البتہ اس سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ افراد کے لئے ہی نہیں خود اسلامی حکومت کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کے راز ٹٹول ٹٹول کر ان کے گناہوں کا پتہ چلائے اور پھر انہیں پکڑے۔

اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ مخصوص حالات ہیں جن میں تجسس کی فی الحقیقت ضرورت ہو مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رویے میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آرہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہوجائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کرسکتی ہے۔

جہاں تک جاسوسی کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے عہدِ نبوی میں بھی سیاسی اور جنگی مقاصد کے تحت خفیہ اطلاعات فراہم کرنے کے لئے جاسوس سے کام لیا جاتا تھا چنانچہ مشرکین اور ابوسفیان وغیرہ کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے آپؐ نے خاص آدمی مقرر کر رکھے تھے۔ زمانہ جنگ میں اور خاص طور پر خانہ جنگی اور بغاوت کے دوران میں خفیہ خبر رسانوں سے کام لینے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

جسطرح عسکری قائدین کو یہ صلاح دی گئی ہے کہ وہ اپنے جاسوس دشمنوں میں بھیجیں اسی طرح انہیں یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ اپنے لشکر سے ایسے سب افراد کو نکال دیں جو دشمنوں کے لئے جاسوسی کرسکتے ہیں۔ غیر مسلموں کو کاتب مقرر نہ کرنے کا مشورہ بھی اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ دشمنوں کے جاسوسوں کا کام دے سکتے ہیں فقہائے دشمن کے لئے کام کرنے والے جاسوسوں کے سلوک کے بارے میں اپنی اپنی آراء بیان کی ہیں۔

امام اوزاعی نے کہا ہے کہ اگر یہ جاسوس ذمی ہے تو اس نے وہ عہد توڑ دیا جس کی بنا پر اس نے مسلمانوں کے ساتھ رہنا اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ امام ابویوسف کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اسے فقط عبرت آموز سزا ملنی چاہیئے کیونکہ وہ نقضِ عہد کا مرتکب نہیں ہوا۔ امام ابوحنیفہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے نزدیک وہ صرف جسمانی سزا اور قید کا مستوجب ہے۔ امام مالک کے نزدیک وہ نقضِ عہد کا مرتکب ہوا ہے اور اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک "اگر جاسوس غیر ملکی باشندہ ہو اور اسلامی علاقے میں پروانۂ سلامتی حاصل کئے بغیر گھس آیا ہو تو اسے قتل کردیا جائے گا اور اگر پروانۂ سلامتی اس کے پاس ہے اور وہ کاروباری سلسلے میں نہیں آیا تو اسے محض حدود ملک سے خارج کردیا جائے گا اور اگر وہ تجارت کی غرض سے سفر کررہا ہے تو اسے جسمانی سزا دے کر نکالا جاسکتا ہے۔" امام مالک کی رائے کے مطابق دشمن کے جاسوس کا قتل کردینا جائز ہے خواہ وہ پروانۂ سلامتی لے کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ امام یوسف بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

جاف جنوبی کردستان اور ایران کے ایک ضلع سنہ کا ایک بڑا اور مشہور کرد قبیلہ۔ اس قبیلہ نے ایران کے صوبہ اردلان کے علاقہ جوان رود میں گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بود و باش اختیار کی۔ مویشی پال کر گذر بسر کرتے ہیں۔ بعض موسموں میں یہ خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس قبیلے کا تاریخ میں ذکر پہلی بار سلطان مراد چہارم کی مہمات اور معاہدہ ترکی و ایران کے ضمن میں آتا ہے۔ ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں اس قبیلے کی بڑی تعداد ترکی کے علاقے میں نقل مکانی کرگئی۔ یہ تعداد دس ہزار خیموں پر مشتمل تھی۔ ترکی کے علاقے میں آباد ہو جانے والے گروہ کا قیام موسم گرما میں پنجوین کے گرد و نواح کے کوہستانی علاقے میں ہر دو

خزاں کے موسم میں شہر زور کے میدانی علاقے میں اور موسم سرما میں دریائے سیروان کے دائیں کنارے پر واقع ان اراضی پر جن کا انحصار کفری پر تھا ہوا کرتا تھا۔

زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس قبیلے کے کچھ عناصر گوران کچھ سنجابی کچھ شرف بیانی اور بعض باجلان کے ساتھ خلط ملط ہو گئے۔ اور اصل قبیلے سے کٹ گئے۔ یہ قبیلہ اپنی خانہ بدوش زندگی اور نظم و ضبط سے بے اعتنائی کے باعث اپنے پڑوسیوں اور حضری آبادی سے تنازعات برقرار رکھے رہا۔ بعض موسموں میں یہ لوگ ایران کے علاقوں میں داخل ہو جاتے تھے جہاں کے باشندوں سے ان کے گہرے روابط قائم ہو گئے تھے چونکہ ان کے دونوں ممالک (ایران، ترکی) سے تعلقات تھے اس لئے تقریباً ایک صدی تک دونوں ملکوں کی سرحدی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل رہا۔ یہ ایک عنصر تھا جسے قابو میں رکھنا بڑا مشکل تھا۔ ایک توان کی تعداد زیادہ تھی دوسرے اقتدار کے حصول کے لئے ان میں آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔ ان میں سے ہر فریق کبھی ایران سے اور کبھی ترکی سے امداد کا طالب رہتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء سے ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء تک متعدد وقفوں کے ساتھ ان کا شمار سلطنت بابان کے باجگزاروں میں ہوتا رہا۔ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں اگرچہ یہ لوگ برائے نام ترکی حکومت کے نظم و نسق کے ماتحت ہو گئے تھے لیکن پھر بھی جنگ عظیم اوّل تک انہیں قوانین حکومت کا مؤثر طور پر پابند بنایا جا سکا۔ وہ جس علاقے میں ڈیرہ ڈالتے وہاں مویشی چراتے اور اپنا تسلط برقرار رکھتے۔

۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں سرحدوں کی واضح حد بندی کے بعد اور ایک مؤثر و مستحکم حکومت قائم ہو جانے کے بعد سے اس قبیلے کی اہمیت کافی حد تک ختم ہو چکی ہے

جاگیر زمین، اقطاع۔ وہ اراضی جو حکومت کی طرف سے افراد کو بطور انعام تفویض کی جائے۔ جاگیردار اس اراضی پر مالیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ سلطان لوگوں کو انہیں علاقوں کی جاگیریں دے سکتا ہے۔ جن کا اس کا تصرف اور احکام نافذ ہوں۔ جن جاگیروں کے مالک معین اور مستحقین معلوم ہوں وہ کسی کو بطور جاگیر نہیں دے سکتا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ اقطاع تملیک (مملوکہ جاگیرات) ۲۔ اقطاع استغلال (وظائف)

اقطاع تملیک کی تین قسمیں ہیں۔ غیر آباد زمین، آباد زمین اور معادن (کانیں)، غیر آباد زمین کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ہمیشہ سے بے آباد پڑی ہوں دوسرے وہ جو کسی وجہ سے بے آباد ہو گئی ہوں۔ وہ زمین جو ہمیشہ سے غیر آباد ہو۔ اور کسی کی ملک نہ ہو سلطان کو حق ہے کہ کسی کو آباد کرنے کے لئے دے دے اس بارے میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ سلطان نے جاگیر دی ہو کیونکہ ان کے خیال کے مطابق بلا اجازت سلطان آباد کرنا جائز نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک جاگیر ملنے سے آباد کرنے کا حق زیادہ ہو جاتا ہے۔

غیر آباد زمین کی دوسری قسم یہ ہے کہ پہلے آباد تھی پھر غیر آباد ہو گئی۔ اس کی بھی دو اقسام ہیں۔

۱۔ عہد جاہلیت کی یعنی عاد و ثمود کی زمینوں کی طرح ہو یہ قدیمی غیر آباد زمین کے حکم میں آتی ہے۔ اس میں سے جاگیر دینا جائز ہے۔ آنحضورؐ کا فرمان مبارک ہے کہ عاد کی زمینیں اللہ اور رسول کی ہیں پھر میری طرف سے تمہاری ہیں۔

۲۔ اسلامی۔ جو زمینیں مسلمانوں کی ملک رہ کر پھر بیکار اور برباد ہو گئی ہوں اس بارے میں فقہا کی تین آراء ہیں۔ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ آباد کرنے سے ملکیت حاصل نہ ہو گی۔ خواہ اصل مالک ہوں یا نہ ہوں۔ امام مالک کے نزدیک ہر دو صورت میں آباد کرنے سے آباد کرنے والے کو ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو آباد کرنے سے بھی وہ زمین آباد کار کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر مالک غیر معلوم ہیں تو آباد کرنے سے اس کی ملکیت ہو گی۔ نیز ان کے نزدیک جاگیروں کے علاوہ اور زمین آباد کرنے سے کسی کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ مالکوں کے معلوم ہونے کی صورت میں سلطان کے لئے ایسی زمینوں کو جاگیر میں دینا جائز نہیں ہے۔ اس کے اصلی مالک ہی اس زمین کو بیچ کرنے یا آباد کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔

جب سلطان کسی کو جاگیر دے تو دوسروں کی نسبت اس کا زیادہ حق ہو جائے گا۔ مگر اس کی ملکیت آباد کرنے سے پہلے قائم نہ ہو گی وہ شخص مکمل آباد کرنے کے بعد مالک ہو گا۔ اگر آباد کرنے میں توقف کیا تو مالک نہ ہو گا۔ توقف کو دیکھا جائے گا۔ اگر ظاہری عذر کی وجہ سے ہو تو قابل اعتراض نہیں اور جاگیر عذر کے ختم ہونے تک اس کے قبضے میں رہنے دی جائے گی۔ اور اگر عذر نہ ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک تین سال سے پہلے کچھ تعرض نہ کیا جائے گا اگر اس عرصے کے اندر اندر آباد کرے تو خیر ورنہ جاگیر واپس لے لی جائے گی۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے جاگیروں کی مدت تین سال مقرر کی تھی۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ مدت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں صرف آباد کرنے کی قدرت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر اتنا عرصہ گذر گیا جس میں آسانی سے وہ زمین آباد ہو سکتی تھی تو اب اس سے کہا جائے گا کہ یا تو اسے آباد کرو تو یہ تمہارے قبضے میں رہے گی ورنہ تمہارے سے لے لی جائے گی۔

نیز اس قسم کی جاگیر اگر کوئی دوسرا متغلب آباد کرے تو اس کے بارے میں امام شافعی کی رائے کے مطابق اگر تین سال کے اندر آباد کرے تو جاگیردار کی ملک ہے [illegible] بعد آباد کرے تو آباد کرنے والے کی ملک ہے۔ امام مالک کے نزدیک اگر جاگیر ہونے کا علم ہوتے ہوئے آباد کرے تو جاگیردار کی ملک ہے۔ اور اگر یہ علم نہ ہو تو جاگیردار کو اختیار دیا جائے کہ یا تو اپنی جاگیر لے کر آباد کرنے کا خرچ آباد کرنے والے کو دے یا زمین اسے دے کر غیر آباد ہونے کے وقت کی قیمت اس سے وصول کر لے۔

اقطاع تملیک کی دوسری قسم آباد زمین ہے اس کی بھی دو اقسام ہیں۔ [illegible] یہ کہ اس کا مالک معلوم ہو اس میں سلطان کو تصرف کرنے کا حق نہیں۔ [illegible] جاگیر دار الاسلام میں واقع ہو تو خواہ مسلم کی ملک ہو یا ذمی کی بیت المال [illegible] وصول کر سکتا ہے اور مسلمانوں کے ہاتھ [illegible] دارالحرب میں [illegible] سکتا ہے۔ جس طرح حضرت تمیم داریؓ نے آنحضورؐ سے شام کی فتح سے پہلے [illegible] کی تھی کہ شام کے چشمے مجھے عنایت فرما دیجئے تو آپؐ نے انہیں ان کی ملکیت [illegible] طور پر دے دیا تھا۔ اسی طرح ابو ثعلبہ خشنیؓ نے ایک جاگیر رومی سلطنت میں [illegible] تعجب ہوا صحابہ سے فرمایا سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے [illegible] اس نے کی [illegible] کی جس نے آپؐ کو مبعوث فرمایا ہے۔ یہ علاقے حضور آپ کے لئے فتح ہوں گے [illegible] آپؐ نے اس کو تحریری اجازت دے دیا۔

دوسرے یہ کہ اس کے مالک مخصوص متعین نہ ہوں۔ اس کی بھی تین اقسام ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد اس کو امام بیت المال کے لئے انتخاب کرے یا تو اہل خمس کے استحقاق میں یا غانمین کی رضامندی سے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے سواد کی زمین سے کسریٰ اور اس کے خاندان کا مال اور جس کے مالک بھاگ گئے یا ہلاک ہو گئے تھے انتخاب کر لیا تھا۔ آپ نے اس میں سے کسی کو جاگیر نہیں دی۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے اس مصلحت سے کہ جاگیروں میں دینے سے اس کی آمدنی بڑھ جائے گی۔ اس کو جاگیروں میں دے دیا۔ اور شرط یہ رکھی کہ اس کا حق فے ادا کریں گویا یہ جاگیریں آپ نے اجارہ پر

کے دی تھیں جس کی آمدنی رفاہِ عامہ میں صرف کی تھی اور حضرت عثمانؓ اس سے انعامات عطیات دیتے تھے اس کے انتظام میں سلطان کو اختیار ہے خواہ وہ اس کی آمدنی براہِ راست بیت المال کے لیے رکھے۔ جیساکہ حضرت عمرؓ نے کیا خواہ زمین کو ہوشیار زمینداروں کے حوالے کر کے ان سے کم و بیش پیداوار کے لحاظ سے معین خراج وصول کرے جیساکہ حضرت عثمانؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ یہ خراج زمین کی اجرت ہوگا۔ جو مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے۔ البتہ اگر اہل خمس کا حق ہو تو ان پر خرچ کیا جائے گا۔

دوسری قسم خراجی زمین ہے۔ اس میں سے جاگیر دینا جائز نہیں کیونکہ اس کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں اوّل یہ کہ اصل زمین وقف ہو اور اس کا خراج اجرت ہو اس میں سے مملوکہ جاگیرات صحیح نہیں نہ اس کی بیع و ہبہ جائز ہے اور دوسری قسم یہ ہے کہ زمین ملک ہو اور اس کا خراج جزیہ ہو تو جس زمین کے مالک معین ہوں اس کو بھی جاگیر میں دینا صحیح نہیں اور اس کے خراج میں سے وظائف مقرر ہونے کے متعلق اقطاع استغلال میں ذکر آ رہا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ اس کے مالک مرگئے ہوں اور نہ ہی کوئی اس کا وارث موجود ہو اس کو بیت المال کی ملکیت میں داخل کر کے عام مسلمانوں کی میراث بنا دینا چاہیے اور آمدنی کو ان کی مصالح میں صرف کرنا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کی میراث صرف فقراء میں میت کی طرف سے بطور صدقہ کے خرچ کرنی چاہیے اور امام شافعی کے نزدیک اس کا مصرف عامۃ المسلمین کے مصالح ہیں۔ چنانچہ ایک رائے تو اس بارے میں یہ ہے کہ وہ وقف ہو جاتے ہیں اس لیے اس کا مصرف کسی طرح خاص نہیں عام ہے اور ان کی بیع ہبہ اور جاگیر کے طور پر دینا جائز نہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ جب تک امام وقف نہ کرے وقف نہیں ہوتے اس رائے کے مطابق ان کی بیع اگر بیت المال کے لیے مفید ہو تو درست ہے۔ ان کی قیمت مصالح عامہ، حاجت مندوں پر صرف کیا جائے گا اور جاگیر میں دینے کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک میں جواز کا پہلو ہے کہ جب بیع کرنا اور قیمت حاجت مندوں میں صرف کرنا جائز ہے تو جاگیر میں دینا بھی جائز ہے۔ دوسرے قول میں عدم جواز کا کیونکہ بیع میں معاوضہ ہوتا ہے اور جاگیر عطیہ ہوتی ہے۔

اقطاع معادن یعنی کانوں کی جاگیر سے مراد زمین کے وہ ٹکڑے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دھاتیں جواہر اور دوسری اقسام کی اشیاء پیدا کی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہرہ اور دوسری باطنہ۔

ظاہرہ سے مراد وہ معادن ہیں جن کی چیز ظاہر اور کھلی ہوئی ہوں جیسے سرمہ، نمک وغیرہ ان کا حکم پانی کے مثل ہے جو کسی کو بطور جاگیر دینا درست نہیں۔

ثابت بن سعید اپنے دادا کی روایت بیان کرتے ہیں کہ ابیض بن حمال نے مارب کے نمک کو آنحضورؐ سے بطور جاگیر مانگا۔ آپؐ نے دے دیا۔ اقرع بن حابس تمیمی نے عرض کیا "یا رسول اللہ میں نے اس نمک کو جاہلیت میں دیکھا ہے کہ وہاں اور کچھ نہیں ہے۔ لوگ آتے ہیں اور پانی کی طرح لے جاتے ہیں۔" آپ نے اس کو ابیض سے واپس کرنے کو فرمایا تو اس نے عرض کیا "یا رسولؐ اللہ میں اس شرط پر واپس کرتا ہوں کہ آپؐ اس کو میری طرف سے صدقہ فرمادیں۔" آپؐ نے فرمایا "یہ تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور مائے عد کی طرح ہر شخص کے لیے عام ہے۔" مائے عد سے مراد وہ پانی ہے جس میں انقطاع نہ ہو۔ جیسے کنویں، چشمے وغیرہ۔

چنانچہ اس قسم کی چیزوں کو جاگیر میں دینا جائز نہیں۔

معادن باطنہ سے مراد وہ کانیں ہیں۔ جن کی اشیاء پوشیدہ ہیں۔ جیسے سونے چاندی پیتل اور لوہے وغیرہ کی کانیں جاگیر کے طور پر دینے کے بارے میں دو قول ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ انھیں جاگیر کے طور پر دینا ناجائز ہے اور معادن ظاہر کی طرح یہ بھی سب کے لیے عام ہیں۔

دوسرے قول کے مطابق جائز ہے۔ دلیل اس کی یہ دی جاتی ہے کہ ابن عوف اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو معادن قبلیہ کی جلسی اور غوری قدس کی ناقابل زراعت زمینیں جواب تک کسی مسلمان کو نہیں دی گئی تھیں مرحمت فرمائیں۔

اس قول پر جاگیر دار کو حق جاگیر حاصل ہے اور دوسرے کو منع کرنا صحیح ہوگا اس کے بارے میں دو رائے ہیں ایک یہ کہ جاگیر داران معادن کا اپنے دوسرے اموال کی طرح مالک ہوتا ہے اور اپنی زندگی میں بیع کرسکتا ہے اور مرنے کے بعد وراثت جاری ہوگی۔

دوسری رائے یہ ہے جاگیر داران معادن کا مالک نہیں ہوتا وہ جب تک قابض رہے مستفید ہوتا رہے گا۔ اور کوئی شخص تعرض نہیں کرسکتا۔ اور جب وہ جاگیر سے دستبردار ہو جائے تو وہ معادن جاگیر کے حکم سے خارج ہو کر حسب سابق سب کے لیے مباح ہو جائے گی۔

یہ تو تھیں اقطاع تملیک (مملوکہ جاگیرات) کی اقسام اب ہم اقطاع استغلال (وظائف) کے بارے میں بحث چھیڑتے ہیں۔

اقطاع استغلال (وظائف) کی دو اقسام ہیں۔ ۱۔ عشر۔ ۲۔ خراج۔ عشر میں سے وظائف مقرر کرنا ناجائز ہیں۔ کیونکہ وہ زکوٰۃ ہے۔ اور اس کے مستحقین بھی خاص لوگ ہیں خراج کے وظائف کا حکم وظیفہ خوار کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی تین حالتیں ہوسکتی ہیں۔

ایک یہ کہ وظیفہ خوار اہل صدقات سے ہو۔ اسے خراج سے دینا جائز نہیں۔ کیونکہ خراج مال فے ہے۔ جس کے اہل صدقات مستحق نہیں ہوتے جس طرح فوجی صدقہ کے مستحق نہیں ہوتے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک خراج سے وظیفہ دینا جائز ہے کیونکہ وہ فے کو اہل صدقہ کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ دوسرے اگر وظیفہ خوار اہل مصالح میں سے ہو کہ جنگی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی ان کے لیے بھی علی الاعلان وظیفہ مقرر کرنا جائز نہیں بطور انعام دینا جائز ہے۔

تیسرے یہ کہ تنخواہ دار یعنی فوجی ہو۔ فوجیوں کو اقطاع دینا خصوصیت سے جائز ہے۔ ان کی معین تنخواہیں اس استحقاق پر دی جاتی ہیں کہ وہ قوم و مذہب کی حمایت میں اپنی جانیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے یہ وظیفہ دائمی اور برقرار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی مدت ایک سال تک ہے۔ چونکہ اقطاع خراج کو زیادہ تر اہل فوج ہی کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا اور اس طرح ہی فوجی جاگیرداری کی ابتدا ہوئی۔ یہاں تک کہ جاگیرداروں کی ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی۔ اقطاع خراج سے یا تو فوج کی تنخواہوں کا ایک حصہ ادا کرنا مقصود تھا یا اسے تنخواہوں کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اگر محاصل کی وصول میں بے قاعدگی ہوتی تو جاگیریں اہل فوج ہی کو دے دی جاتی تھیں۔

جالوت فلسطیوں کا ایک گراں ڈیل پہلوان، جس نے بنی اسرائیل کی فوج کو دعوت مبارزت دی اور جسے حضرت داؤدؑ نے قتل کیا تھا۔ یہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل پر عمالقہ کا غلبہ ہوگیا تھا اور انہوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ بنی اسرائیل پر اس وقت سموئیل نبی حکومت کرتے تھے جو بہت بوڑھے ہوچکے تھے۔ سرداران بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا بادشاہ ہونا چاہیے جس کی قیادت میں وہ جنگ کرسکیں۔ چنانچہ سموئیل نبی نے حکم ربی کے مطابق طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ جب طالوت بنی اسرائیل کا لشکر لے کر دریا پار کر کے آگے بڑھا تو انہوں نے طالوت سے کہا کہ ہم جالوت کا مقابلہ

کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

قرآن مجید میں جالوت کا ذکر اس طرح سے آیا ہے:۔

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کرکے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے۔ انہوں کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی "اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا۔" (۲: ۲۴۸ تا ۲۵۱)

جالوت سے جنگ کا مقام "غور" بتایا جاتا ہے۔ جو اردن کی زیریں وادی میں ہے بعض نے جالوت کو امیر العمالقہ اور بقیۃ الجبارین کے القاب دیئے ہیں۔

جالوت کے بارے میں مختلف قصے اور کہانیاں گھڑی گئی ہیں۔ اور مختلف قصوں میں اسے ملوث کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت داؤد سے پہلے جن لوگوں نے بنی اسرائیل پر مظالم کئے تھے ان سب کو جالوت کا نام دے دیا گیا۔

جالور

ہندوستان کی ریاست راجستھان کا ایک قصبہ، جو جودھ پور سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر جنوب کی سمت میں واقع ہے۔

مسلمانوں کا یہاں سے گذر سب سے پہلے ۶۹۶ھ/ ۱۲۹۷ء میں ہوا جب علاء الدین کی فوجیں جالور سے گذری تھیں لیکن انہوں نے اس علاقے پر قبضہ نہیں کیا۔

جمادی الاول ۷۵۰ھ/ دسمبر ۱۳۵۰ء میں بادشاہ نے ملتان کے والی عین الملک کو جالور اجین اور چندیری پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ جب وہ مالوے میں داخل ہوا تو ڈیڑھ لاکھ ہندو فوج نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ جالور کا چوہان راجہ مسلمانوں کی اس فتح سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ والی ملتان کے ساتھ سلطان علاء الدین کی اطاعت کا حلف اٹھانے کے لئے دہلی آیا۔ دو سال بعد جب اس راجہ نے سرکشی اختیار کی تو علاء الدین نے جالور پر حملہ کر دیا۔ جسے کمال الدین گرگ نے فتح کر کے دہلی کے زیر نگیں کر دیا۔ بعد میں جب سلطان کی وفات کے بعد دہلی کی سلطنت کمزور پڑ گئی تو چوہان راجہ کا دوبارہ جالور پر قبضہ ہو گیا۔

۷۹۴ھ/ ۱۳۹۲ء میں چوہان راجہ کے مرجانے کے بعد افغانوں کا سردار ملک خرم اس کی بیوہ کا امور حکومت میں ہاتھ بٹانے لگا۔ یہ افغان گروہ آٹھویں صدی ہجری چودہویں صدی عیسوی کے زمانے میں صوبہ بہار سے مارواڑ آ گیا تھا جہاں انہوں نے جالور کے راجہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جب افغانوں اور راجپوتوں میں اختلافات رونما ہوئے تو ملک خرم نے شہر اور اس کے قلعہ سونگیر پر قبضہ کر لیا اور دہلی کی سلطنت سے اپنی حکومت کی توثیق کا پروانہ حاصل کر لیا۔ ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۹ء میں جب تیمور نے دہلی پر قبضہ کیا اور اسے تاخت و تاراج کیا تو جالور کے حاکم کچھ عرصے کے لئے خود مختار حاکم ہو گئے لیکن بعد میں وہ گجرات کی سلطنت کے باجگزار ہو گئے۔

دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی میں جب پالن پور بھی جالور کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ تو حاکم جالور جو اب نواب کہلانے لگے تھے ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء میں جالور سے اپنا پایہ تخت پالن پور میں تبدیل کر لیا۔ یہ ریاست ۱۹۵۶ء تک ایک خود مختار مسلم ریاست رہی جو بعد میں حکومت ہندوستان میں مدغم کر دی گئی۔

جالور کی یادگار عمارات میں قلعہ پرمار راجپوتوں نے تعمیر کرایا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں اس قلعے کے احاطے کی دیواروں میں توپیں نصب کرنے کے لئے کچھ تغیر و تبدل کیا تھا۔ قدیم ترین عمارت اندرون شہر کی ایک مسجد ہے جو سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ مسجد توپ خانہ مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اور مدتوں اسلحہ خانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔

ایک مسجد قلعے کے اندر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے علاء الدین کی فوج نے بنایا تھا۔

موجودہ دور میں جالور ایک قصبہ ہے۔

جالینوس

(۱۳۰ء – ۲۰۰ء) ایک مشہور و معروف طبیب، جراح، دوا ساز اور علم طب کی کتابوں کا مصنف۔ ایشیائے کوچک کے شہر پرگاموں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک معمار کا بیٹا تھا۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں طب کا مطالعہ شروع کیا۔ علم کی تحصیل کے لئے سمرنا، کورنتھ اور سکندریہ گیا۔ اسکندریہ سے واپس آکر پرگیمم کے بادشاہ کا شاہی طبیب مقرر ہوا۔ بعد میں روم چلا گیا اور شہنشاہ مارکس آریلیس کا شاہی طبیب بن گیا۔ لیکن چار سال بعد پھر واپس پرگیمم آ گیا۔

اس نے تشریح عضویات، امراضیات، معالجات اور صیدلیات میں نئے نئے تجربے کر کے نئے حقائق کا انکشاف کیا۔ جالینوس بڑا پرنویس، واضح اور زوردار مصنف تھا۔ اس کا شمار دنیا کے مشہور طبی فلاسفہ میں کیا جاتا ہے اس نے تقریباً ۱۲۰ کے قریب کتب تصنیف کیں جو طب، منطق، صرف و نحو، اخلاقیات فلسفہ اور ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ اس کے غیر معمولی فضل و تبحر، ذہانت، سہل بیانی اور ادعا و تحکم کا نتیجہ ہے کہ اس کے اقتدار میں سولہویں صدی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے یونان کی تشریحی و طبی معلومات اور ان کے عملی پہلو کو ایک واحد اور منظم شکل میں پیش کیا۔ اس کی شہرت ایک طبیب کی حیثیت سے برسوں تک بڑھتی چلی گئی۔ اور اسے آخر کار بقراط کے بعد طب کا معلم اعظم تسلیم کر لیا گیا۔

جالینوس نے یونانی اطباء کے عظیم الشان کارناموں کو جس طرح مرتب کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچایا وہ اسی کا کارنامہ ہے۔

طب و فلسفہ میں جالینوس کی بہت سی تصانیف جن کے بارے میں خیال تھا کہ نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ عربی ترجموں کی شکل میں منظر عام پر آ ئیں۔ ۵۰۰ء میں جب فلسفے اور طب کو مسیحی نصاب تعلیم میں قطعی طور پر شامل کر لیا گیا تو نہ صرف جالینوس کی اکثر تصانیف کے محفوظ رہنے کی ضمانت مل گئی بلکہ آئندہ زمانے تک کے لئے اس کا تفوق بھی قائم ہو گیا۔

ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں جالینوس کی جو تصانیف یونانی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان سب تصانیف کے ترجمے آخر کار عربوں کے ہاتھوں میں آ گئے۔ اور اس طرح عربوں کو اس کی متعدد ایسی تصانیف کا سراغ مل گیا جو متاخر بزنطی دور میں ضائع ہو چکی تھیں۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ متاخر عرب اطباء نہ صرف جالینوس کی جملہ تصانیف بلکہ اس کے طریق کار اور قائم کردہ نتائج پر پوری طرح حاوی تھے اور ان کے ہاں طب کی تعلیم و تدریس میں ان سب کتابوں کا متن ان کی شرحیں اور خلاصے اور ان پر مبنی تالیفات نصاب کے لازمی جزو کے طور پر شامل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ وسطی اور دور نشاۃ ثانیہ میں جالینوس پر جو کچھ علمی کام ہوا ہے وہ ایک حد

تک عربوں کی تالیفات اور اس کی کتابوں کے عربی تراجم ہی کا مرہونِ منت ہے

جام

افغانستان کا ایک گاؤں جو علاقۂ غور میں چشت کے شمال میں واقع ہے اور خاص طور پر خوبانیوں کے باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں پر اسطوانی شکل کا متناسب منزلوں والا ایک مینار بھی واقع ہے۔ جس کی کرسی ہشت پہلو ہے۔ اس پر مخروطی شکل کی تین منزلیں اوپر نیچے بنی ہوئی ہیں۔ جن کے اندر ۱۸۰ سیڑھیوں والا ایک زینہ بنا ہوا ہے۔ مینار کی بلندی کی وجہ سے اسے قطب مینار دہلی اور مینار سنجارا کے ساتھ شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مینار غوری خاندان کے پانچویں بادشاہ، ابوالفتح محمد بن سام (۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء۔ ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء) نے بنوایا تھا۔

بقول لے ماریکیو "یہ مینار، مینارِ فتح بھی تھا اور قطب مینار کی طرح ایک ایسا مینار بھی جو سلطنت غوریہ کے علاقوں کے مرکزی نقطے کی نشاندہی کرتا تھا۔ چنانچہ اس مینار کو جام میں غوریوں کے دارالسلطنت شہر فیروزکوہ کا راجہ باقی ماندہ نشان قرار دیا جا سکتا ہے۔"

جامع اموی

دمشق کی ایک مسجد جسے اسلام میں چوتھی مقدس ترین مسجد کا درجہ حاصل ہے۔ ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے مسجد اقصےٰ کے بعد دوسرا درجہ جامع اموی کا ہے۔ ۸۹ھ/۷۰۵ء میں ولید بن عبدالملک نے اس مسجد کو بنوایا تھا۔ یہ مسجد دنیا کی جمیل ترین عبادت گاہوں میں سے ہے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے حرموں کے بعد اسی جامع کا درجہ ہے۔ اس کا طول ساڑھے پانچ سو قدم ہے

جامع اموی

اور عرض ڈیڑھ سو قدم ہے۔ ولید بن عبدالملک نے سات سال تک اس مسجد کی تعمیر کے لیے شام کا پورا مالیہ وقف رکھا۔ مقامی کاریگر باعثِ تسلی ثابت نہ ہوئے تو ایران اور ہندوستان سے فنکار بلائے گئے اور ایک ... فنکار روم کے لیے بزنطی شہنشاہ کو لکھا گیا۔ رنگ رنگ کے ... نہایت کم یاب سنگ مرمر سے اس مسجد کی دیواریں اور چھتیں آراستہ کی گئیں۔ دیواروں پر سنہری بیل بوٹے بنوائے گئے تھے اور جابجا جواہرات جڑے گئے تھے۔ اس کے ستون بہت بڑے بڑے تھے جو سنگ سماق اور سنگ رخام کے مختلف رنگوں کے ہیں۔ اس کے قبہ میں بارہ ہزار قندیلیں سونے اور چاندی کی زنجیروں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ماہ رمضان میں ان بارہ ہزار قندیلوں کو روشن کیا جاتا۔ چار مصلوں یعنی حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کے لیے چار محراب علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے ہیں۔ اس مسجد میں ۵۰ مؤذن مقرر ہیں جو اس کے تین میناروں پر چڑھ کر اذان کہتے ہیں۔ بقول مولوی محبوب عالم "میں نے ظہر کے وقت اس کے مشرقی مینار پر پندرہ بیس آدمی ایک وقت میں اذان دیتے ہوئے دیکھے جو بلند آواز سے ہم آہنگ ہو کر اذان کہتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی آواز دور دور تک پہنچتی ہے۔"

مسجد کی شمالی سمت میں ولید نے ایک مینارہ تعمیر کرایا تھا۔ جس پر رات کے وقت روشنی ہوتی تھی۔ بعد میں تعمیر کے اس نمونے کی پیروی شام، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں ہوئی۔ یہ سب سے پرانا اور خالص اسلامی مینارہ ہے۔ جنوبی سمت کے دو مینار پہلے گرجے کے برج تھے۔ بقول امام غزالی وہ شمالی مینار میں عبادت اور مراقبے کے لیے معتکف رہے۔

اس مسجد کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ نماز کے لیے محراب سب سے پہلے اسی میں بنی۔ اسی مسجد میں نعل نما محرابیں بنائی گئیں۔

ایک اندازے کے مطابق اس کی تعمیر پر تین کروڑ اشرفیاں صرف کی گئیں۔ اس جامع کی تعمیر کے وقت علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے کاریگروں کے جو اس تعمیر کے لیے دستیاب ہو سکتے تھے۔ بارہ ہزار کاریگر اور معمار و سنگتراش بلاد روم سے بلائے گئے تھے۔ ابن عساکر نے "العیون" میں اس جامع کو تعمیر کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔

جامع اموی کی جگہ پہلے پہل یہاں دمشق کے جوپیٹر کے لیے ایک مندر بنا ہوا تھا۔ بعد میں رومی شہنشاہ آرکاڈیس نے پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کی جگہ ایک کلیسا تعمیر کیا۔ ولید نے اس گرجے پر قبضہ کر کے یہاں مسجد کی تعمیر کرائی۔ جس مقام پر حضرت یحییٰ کا سر مبارک کٹ جانے کے بعد رکھا گیا تھا وہ مقام اب بھی مسجد کے اندر محفوظ ہے اور اس پر ایک قبہ بنا دیا گیا ہے۔ ایک اور مسیحی اثر بھی مسجد میں محفوظ ہے۔ یعنی جنوبی سمت کے رواق کا کتبہ جس کی عبارت یہ ہے۔ "اے مسیح! تیری بادشاہت دائمی ہے اور تیری حکومت نسلاً بعد نسل قائم رہے گی۔"

۱۰۶۹ء میں یہ عظیم الشان مسجد پہلی مرتبہ آتشزدگی سے برباد ہو گئی۔ جب اسے تعمیر کیا گیا تو تیمور لنگ نے فتح دمشق کے وقت اسے آگ لگوا دی۔ اس مرتبہ پھر اس کو اسی شان و شوکت سے تیار کیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں اسے تیسری بار پھر آتشزدگی کا حادثہ پیش آیا۔ اس مرتبہ کی آتشزدگی سے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس مرتبہ اس میں وہ قرآن مجید بھی جل گیا جس پر حضرت عثمانؓ کا خون گرا ہوا تھا جسے وہ اپنی شہادت کے وقت پڑھ رہے تھے۔ لیکن اہل دمشق نے چندہ کر کے دوبارہ اس کی تعمیر اور مرمت شروع کر دی۔ بقول منشی محبوب عالم "۱۹۰۰ء میں جب میں نے اسے دیکھا تو آدھی سے زیادہ تیار ہو چکی تھی۔ اور اس وقت تک پچاس ساٹھ ہزار پونڈ خرچ ہو چکے تھے۔" اب یہ مسجد مکمل طور پر تیار ہو چکی ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر مبارک بھی اسی مسجد کے سامنے واقع ہے۔

جامع قرطبہ

قرطبہ کی ایک بڑی جامع مسجد۔ قرطبہ کی جامع مسجد اس شہر کے لیے مایۂ ناز تھی۔ اس کا شمار وسیع ترین ... میں ہوتا تھا اور وہ مسجد مغربی دنیائے اسلام کی مقدس ترین عبادت گاہ تھی۔ دور دراز اور قریب

جوار کے مسلم زائرین اس شاہراہ پہ ہوتے ہوئے جو اندلسیہ (عرب حکمرانوں کی زبان میں الاندلس) کے سرسبز شاداب دیہات سے گذرتی تھی، قرطبہ پہنچتے تھے۔ ان تھکے ماندے زائرین کو جو دریا کے طویل رومی پل پہ سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آتے تھے مسجد کا بلند مینار دراصل روشنی کا مینار معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹی سی ڈھلوان سڑک پل پہ سے مسجد کی مغربی دیوار کے قریب تک جاتی تھی۔ زائرین ایک محرابی دیوار سے گذر کر جب ایوانِ عبادت کے صحن میں جاتے تھے تو سفر کی تمام تھکن بھول جاتے۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ ایک نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔ ہر طرف خاموشی اور سکون کا سماں ہوتا تھا۔ ایک شخص عمارت کے شمالی کنارے پہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنی ہوئی کشادہ محرابوں میں سے ایوان عبادت کے اندر دور تک نظر ڈال سکتے تھے۔ نارنگی کے درختوں کی قطاریں صحن میں ٹھنڈا سایہ پھیلاتی تھیں اور درختوں کے پتلے تنوں کا سلسلہ ان مرمریں ستونوں سے جا کر مل جاتا ہے۔ جو عمارت کے اندر دور تک چلے گئے تھے اور محراب کے قریب پہنچ کر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے تھے۔

یہ عظیم مسجد اب ایک بڑا گرجا ہے۔ مگر آج بھی اس کے متعلق یہ خیال کرنا دشوار ہے کہ یہ عمارت کوئی مسیحی کلیسا ہے۔ قدیم ایوان عبادت اتنا وسیع ہے کہ سولھویں صدی میں گرجا کا جو سماع خانہ اور مقدس عبادت گاہ تعمیر کی گئی تھی وہ دھندلے ستونوں کے جنگل میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ عمارت اس زمانے کے مقابلے میں جب مسلم زائرین اس میں نماز پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے اب دھندلی ہو گئی ہے۔ صحن کے سامنے کشادہ محرابی دروازے اب بند کر دیے گئے ہیں اور بہت سے جھاڑ فانوس جو چھت میں لٹکے ہوئے تھے غائب ہیں۔

دروازوں کے اندر داخل ہوتے ہی ان ستونوں کے درمیانی راستوں سے گذرنا پڑتا ہے جو آٹھویں صدی میں عبدالرحمان اول نے اس وقت بنوائے تھے جب مسجد کی تعمیر شروع کی تھی۔ عرب معماروں نے اونچائی میں اضافے کے لیے دوہری محرابوں کا ایک نیا طریقہ اخذ کیا۔ اور اپنے ذوق رنگ آمیزی کی مدد سے سرخ اینٹ اور ہلکے بادامی رنگ کے پتھر کی متبادل دھاریاں ڈال کر محرابیں تعمیر کیں۔ جنوب کی طرف جانے کے لیے ان درمیانی راستوں سے گذرنا پڑتا ہے جو عبدالرحمان ثانی نے نمازیوں کی بڑھتی ہوئی جماعتوں کے لیے گنجائش نکالنے کی غرض سے تعمیر کرائے تھے۔ اس کے بعد محرابوں کی تزئین زیادہ پر رونق ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان سے محراب نظر آنے لگتی ہے جو جنوبی دیوار کے اندر ایک گہرے طاق کی شکل میں ہے اور جس کے چاروں طرف طلائی پچیکاری کے نقوش تاباں و درخشاں ہیں۔ محراب مصلیٰ کے سامنے قوسی محرابیں کچھ عجیب طرح آپس میں گتھی ہوئی ہیں اور اوپر قوسی چھتوں نے جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ جانے والے راستے پر تین نہایت خوشنما چھوٹے چھوٹے برج بنا دیے ہیں۔

عمارت کا یہ خوبصورت جنوبی حصہ ان کاریگروں کا مرہون منت تھا جن کی خدمات الحکم ثانی نے حاصل کی تھیں۔ ان فنکاروں نے محراب مصلیٰ، قوسی چھتیں اور محرابوں کی آرائش اس طرح کی تھی کہ پلاستر اور سفید رنگ مرمر کے چوکوں پر کندہ کاری کے ابھرے ہوئے نقوش ہیں۔ ایک دوسرے پر لپٹی ہوئی ڈنڈیوں، پھولوں اور پتیوں کے نمونے سجائے گئے تھے۔ محراب مصلیٰ کی قوس کے اردگرد پچیکاری میں نقوش عربیہ کے حسین دلربا پھول بوٹے اس کاریگر کا کارنامہ تھے جسے الحکم کی مخصوص درخواست پر بزنطی شہنشاہ نے قسطنطنیہ سے بھیجا تھا۔

محراب کے [illegible] دائیں جانب کی قوسی محراب بھی پچیکاری سے آراستہ تھی یہیں وہ نجی دروازہ تھا جس سے خلیفہ مسجد میں آتا تھا۔ اس کا محل [illegible] دریا کے کنارے تھا۔

یہیں سے ایک مسقف راستہ نجی دروازے تک آتا تھا۔ بائیں جانب کی محراب سے ان کمروں میں داخل ہوتے تھے۔ جہاں بیش بہا چیزیں محفوظ تھیں۔ مسجد کی سب سے بیش بہا چیز وہ بڑی تقطیع کا قرآن مجید تھا جس کے چار صفحات آنحضورؐ کے صحابی اور خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمانؓ کے قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ نیز جب آپؓ کو شہید کیا گیا تھا تو آپ اسی نسخے کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کا خون اس کے صفحات پر گرا تھا۔ یہ قرآن صرف جمعہ کے وقت نکالا جاتا تھا اور قرطبہ پہنچنے والا ہر زائر اسے اپنی زیارت کے لیے طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

جامع مسجد دہلی

دلی کی مشہور و معروف مسجد جسے شاہجہان نے بنوایا تھا شاہجہان کی خواہش تھی کہ اس کا نیا دارالحکومت جو شاہجہان آباد کہلاتا تھا۔ دنیا کے اعلیٰ ترین شہروں میں سے ایک ہو۔ اپنے محل کے قریب ہی اس نے جامع مسجد تیار کرائی۔ جس کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ [illegible] مسجد کا نمونہ شاہجہان نے خواب میں دیکھا تھا اور اسی قسم کی مسجد جو [illegible] آسمان پر [illegible] مسجد جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ یہ مسجد ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء سے ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء کے درمیان عرصے میں بن کر تیار ہوئی۔ اس مسجد کے بارے میں ایک روایت [illegible] مشہور ہے۔ جس کا کتب تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا کہ جب جامع مسجد بن کر تیار ہو گئی تو بادشاہ نے [illegible] معائنہ کیا۔ قطب نما رکھ کر جب قبلہ جانچا تو معلوم ہوا کہ کچھ فرق رہ گیا ہے۔ بادشاہ [illegible] مایوس اور رنجیدہ ہوا۔ مگر ایک درویش ظاہر ہوتے اور انھوں نے پلنے [illegible] جو مسجد کا کونہ ہے اس سے پشت لگا کر مسجد کو سیدھا کر دیا اور [illegible] کے بعد فوراً [illegible] انتقال کر گئے۔ بادشاہ نے اس بزرگ کی قبر اسی مقام پر بنوا دی۔ [illegible] آج بھی وہاں موجود ہیں۔ لہٰذا اس روایت میں اور بھی جان پڑ گئی۔

مسجد کو دیکھتے ہی پہلا اثر اس کی بلند کرسی کا ہوتا ہے۔ اصل [illegible] کے نیچے ایک پوری پہاڑی دبا دی گئی ہے۔ وہ چبوترہ جس پر مسجد [illegible] گئی ہے تیس فٹ اونچا ہے اور چودہ سو مربع گز اس کا رقبہ ہے۔ مسجد کے [illegible] اور شمال سمت بڑی بڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں جن پر [illegible] جہاں سیڑھیاں اوپر جا کر ختم ہوتی ہیں وہاں خاص بڑے [illegible] سیڑھیاں تین طرف سے آ کر ختم ہوتی ہیں۔ [illegible] دروازے کی [illegible]

قبلہ کی جانب مغربی سمت [illegible] [illegible] جن کی شان اس سبب سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی [illegible] وہاں تک پہنچنے کے نہایت وسیع اور کشادہ سیڑھیاں ہیں [illegible] کے سامنے والا دروازہ جو مشرقی دروازہ کہلاتا ہے۔ بادشاہوں کے [illegible] لیے کھولا جاتا تھا۔ اور شمال و جنوب کی سمت [illegible] دروازے [illegible] کا صحن ۳۲۵ فٹ مربع ہے۔ اس کے عین وسط میں ایک بڑا حوض [illegible] میں مسقف دالان ہیں۔ اصل عمارت عرض میں دو [illegible] فٹ اور گہرائی [illegible] سامنے دیوار میں گیارہ محرابی در ہیں جن پر سفید اور سیاہ پتھر کا کام ہے۔ [illegible] دیوار میں نہایت خوشنما محرابیں بنائی گئی ہیں۔ پیش امام کے سامنے جہاں [illegible] تھے ایک سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ اس دودھیا پتھر میں یہ خوبی ہے کہ [illegible] سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو یہ پتھر گلابی ہو جاتا ہے۔ [illegible] سنا ہے کہ یہ پتھر [illegible] لیا گیا ہے۔ مسجد کی چھت پر تین بڑے گنبد ہیں جن پر سنگ موسیٰ [illegible] سنگ سرخ کی پٹیاں ہیں۔ عمارت کے دونوں کناروں پر سنگ سرخ کے ایک سو [illegible] فٹ بلند [illegible] ہیں ان کے اندر چکر دار زینے ہیں۔ جن سے اوپر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ [illegible]

دیدہ زیبی غرض ہر نقطہ نظر سے یہ عمارت لاجواب کہی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہوا تو جذبۂ انتقام کی آگ نے ان کو آپے سے باہر کر دیا تھا۔ ان کے بعض حکام چاہتے تھے کہ مسجد کو بارود سے اڑا دیا جائے تاکہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائے۔ بعض کی خواہش تھی کہ اس کو گرجا میں منتقل کر دیا جائے۔ بہر حال آخر میں طے یہ پایا کہ اس کو مسلمانوں سے لے کر اپنے قبضے میں رکھا جائے۔ لیکن آخر کار ۱۸۶۲ء میں اس کو واگذاشت کر دیا گیا اور اس وقت سے مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں۔

جامعہ

یونیورسٹی۔ اصطلاح میں اس کا اطلاق اعلیٰ مذہبی تعلیم کے قدیم اداروں مثلاً جامعہ الازہر وغیرہ پر ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں سرکاری طور پر اس لفظ کا اطلاق جدید طرز کی ایسی یونیورسٹی تک محدود ہے جسے مغربی نمونے پر چلایا جا رہا ہو جامعہ کی اصطلاح پہلی بار انیسویں صدی کے وسط میں استعمال کی گئی۔ یونیورسٹی کے معنوں میں جامعہ کا لفظ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں استعمال ہوا جب جامعہ المصریہ کے قیام کے لئے مصر کے چند دانشوروں اور مصلحین نے ایک تحریک کی ابتدا کی۔ اسی زمانے سے اسلامی ملکوں میں جامعہ یونیورسٹی کا ہم معنی قرار پایا۔ بعض اسلامی ممالک میں جامعہ کے علاوہ چند اور اصطلاحات بھی استعمال کی جانے لگیں۔ اور یہ اصطلاحات یا تو قومی زبانوں سے ماخوذ تھیں یا پھر یورپ سے مستعار لی گئی تھیں۔ مثلاً ترکی میں (UNIVERSITE) برعظیم پاک و ہند میں "یونیورسٹی" ایران میں "دانش گاہ" اور انڈونیشیا میں "UNIVERSITAS"

موجودہ زمانے تک یونیورسٹی تعلیم نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ بہت سی یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔ ذیل میں ہم صرف چند بڑی اور مشہور یونیورسٹیوں کا ذکر کریں گے۔

برعظیم پاک و ہند میں سر چارلسووڈ کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور تقریباً پچیس سال تک پورے ہندوستان میں انہیں یونیورسٹیوں سے کام چلایا جاتا رہا۔

۱۸۸۲ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی ۱۸۸۷ء میں الہ آباد میں ایک اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سے پہلی جنگ عظیم تک کوئی اور یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن دو مختلف ادوار میں یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان اور دوسرے تقسیم پاک و ہند کے بعد یونیورسٹی اداروں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی تعداد ۶۲ تھی اور ان میں سے ۸ یونیورسٹیاں وہ تھیں جو تقسیم ملک کے بعد قائم ہوئی تھیں۔

ہندوستان میں دو یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔ ان میں ایک تو علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ سر سید احمد خان ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جسے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ جس کا مقصد مسلمان نوجوانوں کو جدید سائنسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا۔

دوسری یونیورسٹی حیدر آباد دکن کی "جامعہ عثمانیہ" تھی جو ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی

جامع مسجد دہلی (تعمیر ۱۶۴۴ تا ۱۶۵۸)

اس یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی طرف خاص توجہ دی تھی۔

پاکستان میں سب سے قدیم یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی ہے۔ جو ۱۸۸۲ء میں لاہور میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ حیدرآباد میں سندھ یونیورسٹی ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی۔ پشاور یونیورسٹی ۱۹۵۰ء اور کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئیں۔ لاہور میں ایک انجنیئرنگ یونیورسٹی اور لائلپور میں زرعی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ حال ہی میں چند اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ جن میں ملتان یونیورسٹی۔ سکردو یونیورسٹی۔ اسلام آباد میں قائد اعظم یونیورسٹی، گومل یونیورسٹی، ہزارہ یونیورسٹی، کوئٹہ یونیورسٹی شامل ہیں۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو بھی اب باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ان تمام یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم کے شعبے موجود ہیں۔

ایران کی یونیورسٹیوں میں قدیم ترین یونیورسٹی تہران یونیورسٹی (دانشگاہ تہران) بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کی ابتدا ۱۸۵۱ء میں دارالفنون کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۳۴ء

پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس)

میں ایک سرکاری یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء میں دانشگاہ تبریز کی بنیاد رکھی گئی۔ بعدازاں دانشگاہ مشہد، دانشگاہ شیراز، دانشگاہ اصفہان، دانشگاہ اہواز، دانشگاہ رضائیہ۔ ایران کی تمام یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم فارسی ہے۔

افغانستان میں یونیورسٹی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ایک شعبہ طب کے اجرا سے ہوا۔ بعد میں دوسرے شعبے بھی قائم ہو گئے۔ اور ان تمام شعبوں کا الحاق ۱۹۴۶ء میں کابل یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ کابل یونیورسٹی ۱۹۳۳ء میں قائم کی گئی تھی۔

ملایا اور سنگاپور:۔ ملایا میں یونیورسٹی کا قیام ۱۹۴۹ء میں وفاق ملایا اور نوآبادی سنگاپور کی حکومتوں کے مشترکہ احکام سے عمل میں آیا۔ کوالالمپور میں یونیورسٹی کی مکمل تعلیم کا آغاز ۱۹۵۰ء سے اور سنگاپور میں ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں یہ یونیورسٹی دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے جو درجے کے اعتبار سے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ملایا یونیورسٹی سنگاپور میں اور دوسری ملایا یونیورسٹی کوالالمپور میں دو مساوی حصوں پر مشتمل ہے۔

انڈونیشیا میں یونیورسٹیوں کے قیام کی تحریک ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی ۱۹۴۹ء میں جوگ جکارتا میں گاجا مادہ یونیورسٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں جکارتا میں انڈونیشیا یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ ایرلنگا یونیورسٹی ۱۹۵۴ء میں، اندلاس یونیورسٹی ۱۹۵۶ء میں۔ بوگی نگی اور حسن دین یونیورسٹی ۱۹۵۶ء میں قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ مرکاسر، مدونگ، گاجہ میڈا، سورابایا، حالانگ بالی، پاجا کمبوہ، پادانگ اور توند الو میں کئی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔

مصر میں ۱۹۰۶ء میں ایک قومی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک اٹھائی گئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کو سرکاری یونیورسٹی سے ممتاز کرنے کے لئے الجامعۃ الاهلیۃ کہا جاتا ہے۔ ایک سرکاری یونیورسٹی مارچ ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں اسکندریہ میں ایک مکمل یونیورسٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں قاہرہ میں ایک اور یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ انقلاب کے بعد ان تینوں یونیورسٹیوں کو جامعۃ القاہرہ، جامعۃ الاسکندریۃ اور جامعۃ عین شمس کے نام دیے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں ایک یونیورسٹی اسیوط میں قائم کی گئی لیکن مصر کی تمام یونیورسٹیوں میں قاہرہ یونیورسٹی سب سے قدیم ہے

شام میں الجمہوریۃ العربیۃ المتحدہ کی تشکیل کے موقع پر جامعۃ السوریۃ کا نام جامعۃ الدمشق رکھ دیا گیا۔ اس کے علاوہ حلب میں ۱۹۶۰ء میں ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

لبنان میں سب سے پہلے بیروت میں امریکن یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں اس کا نام شامی پروٹسٹنٹ کالج تھا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۰ء میں اسے امریکن یونیورسٹی آف بیروت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک یونیورسٹی سینٹ جوزف ہے جو ۱۸۷۵ء میں قائم کی گئی تھی۔ ۱۸۸۱ء میں پوپ لیو سیزدہم نے اسے یونیورسٹی کا نام دیا۔ ۱۹۵۱ء میں الجامعۃ اللبنانیہ کا قیام عمل میں آیا۔

عراق میں پہلی جنگ عظیم سے قبل اعلیٰ تعلیم کا صرف ایک ادارہ تھا۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت نے جامعۃ آل بیت کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ۱۹۳۰ء میں یہ منصوبہ ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ کئی ایک کالج قائم کیے گئے۔ ۱۹۵۸ء میں جامعہ بغداد کا قیام عمل میں آیا۔

سعودی عرب میں ۱۹۵۷ء میں ریاض میں جامعہ شاہ سعود قائم کی گئی [illegible] ایک یونیورسٹی مدینہ میں قائم ہے۔

سوڈان میں ۱۹۵۶ء میں جامعہ خرطوم کا قیام عمل میں آیا۔ آج کل خرطوم یونیورسٹی میں زراعت، فنون، معاشی و عمرانی علوم، انجینیئرنگ، قانون، طب [illegible] اور سائنس کے شعبے قائم ہیں۔

لیبیا میں جامعہ لیبیا کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں رکھی گئی۔ اس یونیورسٹی کی ابتدا بن غازی میں ادب اور تعلیمات کے ایک شعبے سے ہوئی تھی۔ آج تک اس میں کئی اور شعبوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔

تونس میں الجامعۃ الاعظم ایک اعلیٰ مذہبی تعلیم کا قدیم مرکز ہے۔ آج کل اسے الجامعۃ الزیتونیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ایک اور تونس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔

الجزائر میں جامعۃ الجزائر کی حیثیت ۱۹۶۲ء تک ایک فرانسیسی یونیورسٹی کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں مدارس قانون، سائنس اور ادب کو ترقی دے کر باقاعدہ یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی تھی۔ ذریعہ تعلیم فرانسیسی تھا۔

مراکش میں حصول آزادی کے بعد ایک قومی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک اٹھی اور ۱۹۵۷ء میں جامعۃ الرباط کا قیام عمل میں آیا۔ جو شعبہ ہائے شریعت، قانون، معاشی

عمرانی علوم، ادب اور طبیعیات پر مشتمل ہے۔ طب اور دوا سازی کا بھی ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔

ترکی میں جدید طرز کی فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوا۔ اس سلسلے میں کئی ایک مدارس قائم کیے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں ایک مجلس نے سرکاری یونیورسٹی
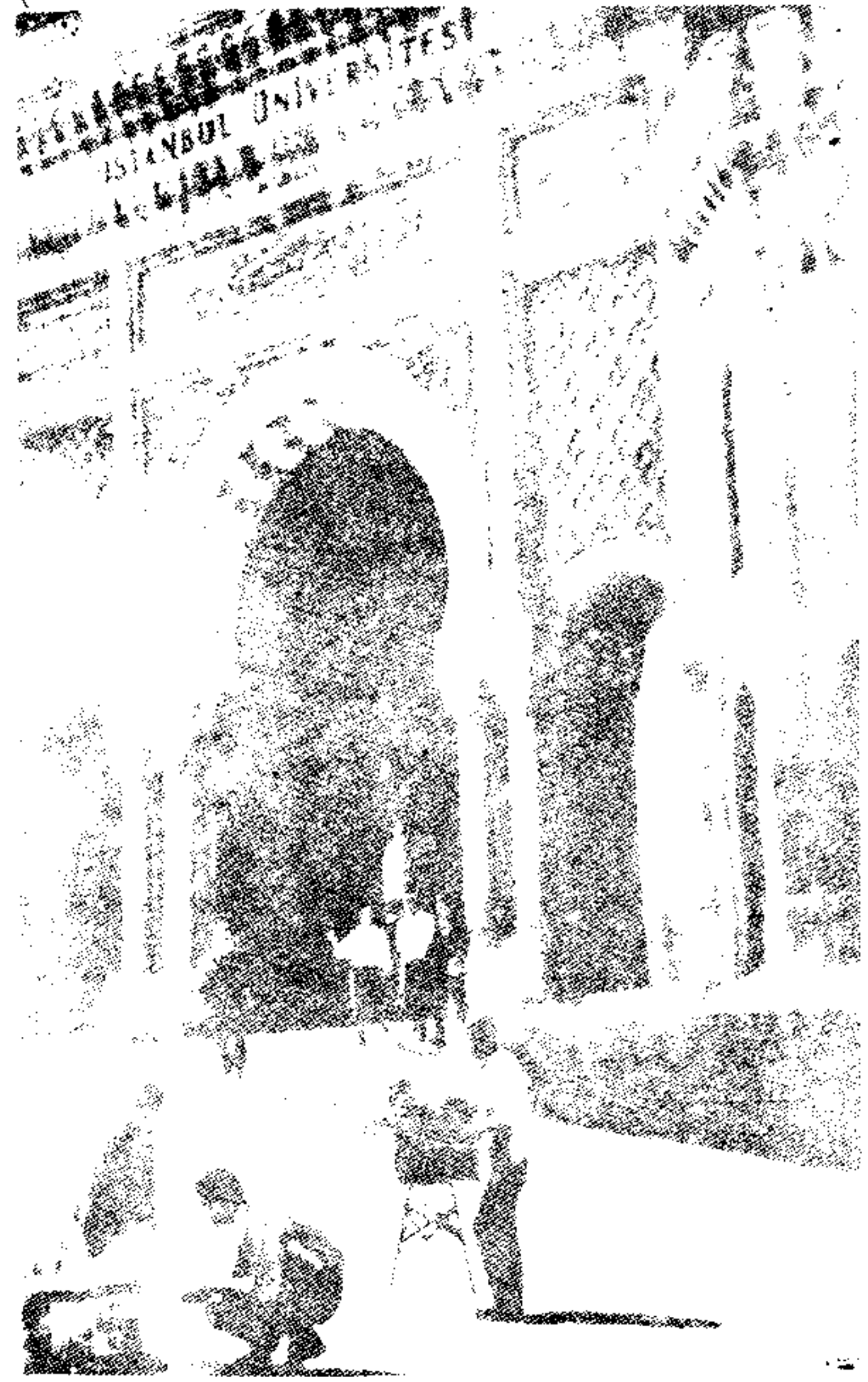
جامعہ استنبول

کے قیام کی سفارش کی۔ اگرچہ اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہو سکا آخر کار ۱۹۰۰ء میں جامعہ استنبول قائم ہوئی۔ پہلے اس کا نام دار الفنون تھا۔ ۱۹۰۹ء میں مدرسہ طب اور مدرسہ قانون کا اس سے الحاق کر دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ایک استنبول تکنیکی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۴۶ء میں انقرہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں ایجین یونیورسٹی ازمیر میں قائم کی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں مشرقی ترکیہ میں اتاترک۔ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

پچھلے چند برسوں میں یونیورسٹی تعلیم نے اسلامی ممالک میں نہایت تیزی کیسا تھ ترقی کی ہے۔ قائم شدہ یونیورسٹیوں میں مختلف شعبوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور نئی نئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مسلمانوں کی ایک عظیم درسگاہ۔ جس کی بنیاد مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۲۰ء میں رکھی تھی۔ جس زمانے میں اس درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی ان دنوں انگریز حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ جس کے تحت ہر اس چیز، ہر اس ادارے اور ہر اس شخص سے تعلقات توڑ دیے گئے۔ جس کا تعلق انگریزوں سے تھا۔ انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انگریزوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے سماجی و معاشرتی تعلقات منقطع کر لیے گئے، حتیٰ کہ ایسے لوگوں کو مرنے پر قبرستانوں میں دفن کرنے سے منع کر دیا گیا، تعلیمی اداروں کے لیے حکومت کی گرانٹ (امداد) لینے سے انکار کر دیا گیا۔ بہت سے طالب علموں نے ایسے تعلیمی اداروں سے اپنے نام خارج کروا لیے۔ جنہیں حکومت چلاتی تھی یا جو حکومت کی امداد سے چلتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت کے قائد اعلیٰ تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ علیگڑھ کالج بھی تحریکِ خلافت کے پروگرام پر عمل کرے۔

چنانچہ مولانا محمد علی جوہر علی گڑھ گئے اور بہت سے طلبا کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ کالج کے منتظمین کا خیال تھا کہ جب تک کالج کے طلبا سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں حکومت سے عدم تعاون حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگرچہ مولانا کالج کو انگریزی اثر سے آزاد کرانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علیحدہ بنیاد ڈال دی۔ جو ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ یہاں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری نے انہیں بہت مدد دی اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کے حسن تدبر اور انتظامی قابلیت سے جامعہ نے بہت زیادہ ترقی کی۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی کچھ عرصہ اس سے منسلک رہے ہیں۔ آج بھی یہ ادارہ اپنی مخصوص عمارت میں اوکھلا (قرول باغ) کے مقام پر بدستور قائم ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ادب و اشاعت علم کا ایک مرکز ہے۔ یہاں فنون اور عمرانی علوم کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا امتحان حکومت کی نظر میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی بی اے کی سند سے کم تصور نہیں کیا جاتا۔

جامی، مولانا (۲۳ شعبان ۸۱۷ھ / ۷ نومبر ۱۴۱۴ء - ۱۸ محرم ۸۹۸ھ / ۹ نومبر ۱۴۹۲ء) نور الدین عبد الرحمان۔ ایک بہت بڑے عالم دین، صوفی اور بلند پایہ فارسی شاعر۔ خراسان کے ضلع جام کے قصبہ خرجرد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نظام الدین احمد دشتی تھا۔ ان کا خاندان پہلے دشت میں سکونت پذیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود مولانا جامی بھی پہلے دشتی تخلص کرتے تھے۔ بعد میں ان کے والد نے دشت کو چھوڑ کر علاقہ جام میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ہرات اور سمرقند گئے جو اسلامی علوم کے بہت بڑے مراکز تھے۔ جہاں پر آپ نے علوم اسلامی اور تاریخ و ادب کی تعلیم حاصل کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ ظاہری علوم حاصل کرنے کے بعد باطنی علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور سعد الدین محمد کاشغری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور بیعت کی۔ یہ بزرگ سلسلہ نقشبند کے بانی حضرت بہاء الدین نقشبندی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ان کی بدولت تصوف میں کمال حاصل کیا۔ مرشد کی وفات کے بعد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے اور واپسی میں ہمدان کردستان، بغداد، کربلا، نجف شریف، دمشق، حلب اور تبریز کے علاقوں کا سفر کرتے ہوئے واپس وطن لوٹے۔ بقیہ زندگی ہرات ہی میں بسر کی جہاں آپ کا سارا وقت مطالعے، شعر و شاعری اور روحانی مجاہدات میں صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ بہت بلند مرتبہ شاعر تھے۔ لیکن تمام زندگی کسی دربار کا رُخ نہیں کیا اور نہ ہی کسی بادشاہ کی خوشامد کی۔ آپ کے زمانے کے بادشاہ آپ کی بہت عزت کرتے تھے بقول شہنشاہ ظہیر الدین بابر "علوم عقلی و نقلی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔" نیز یہ کہ جامی کو کسی مدح و ستائش کی ضرورت نہیں یہاں ان کا ذکر محض برکت و سعادت حاصل کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔"

نویں صدی ہجری میں جب آپ کی شہرت ترکی میں پہنچی تو محمد ثانی نے آپ کو استنبول آنے کی رغبت دلائی۔ بایزید ثانی نے بھی انہیں دو مکتوب ارسال کیے۔ بقول دولت شاہ جامی آخر عمر میں ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ لیکن علی شیر نوائی

نے اس بات کی تردید کی ہے جو آخر عمر تک آپ کے پاس تھا۔ آپ نے ہرات میں وفات پائی اور حاکم ہرات نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کا مقبرہ ہرات میں آپ کے مرشد سعدالدین کے مقبرے کے قرب میں واقع ہے۔

مولانا جامی کی متعدد تصانیف ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کتنے مختلف علوم پر حاوی تھے۔ آپ کو زبان واسلوب پر پوری دسترس حاصل تھی آپ کی زیادہ تصانیف نثر میں ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ کو شہرت شعری تخلیقات کی بنا پر ہوئی۔ نظم میں آپ کی تخلیقات ایک تو وہ سات مثنویاں ہیں جو مثنوی ہفت اورنگ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے علاوہ غزل میں آپ کے تین مجموعے ہیں اس دیوان میں جوانی سے لے کر آخر عمر تک کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ تینوں مجموعے ان ناموں سے مشہور ہیں۔ ۱۔ فاتحۃ الشباب (۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء) ۲۔ واسطۃ العقد (۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء) ۳۔ خاتمۃ الحیات (۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء) اور مثنویوں میں جو ہفت اورنگ کے نام سے مشہور ہے یہ شامل ہیں۔ ۱۔ مثنوی سلسلۃ الذھب (۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء) ۲۔ مثنوی سلامان وابسال (۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء) ۳۔ مثنوی تحفۃ الاحرار (۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء) ۴۔ مثنوی سبحۃ الابرار (۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء) ۵۔ مثنوی یوسف وزلیخا (۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء) ۶۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں (۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء) ۷۔ مثنوی خردنامہ سکندری (۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) نثر میں آپ کی تصانیف ۱۔ تفسیر ۲۔ شرح فصوص الحکم ۳۔ رسالہ فی الوجود ۔ ۴۔ رسالہ لاالٰہ الا اللہ ۔ ۵۔ شواہد النبوۃ ۔ ۶۔ اشعۃ اللمعات ۔ ۷۔ شرح رباعیات ۔ ۸۔ رسالہ تحقیق مذہب صوفی ومتکلم وحکیم ۹۔ رسالہ مناسک حج ۔ ۱۰۔ مناقب ۔ ۱۱۔ نفحات الانس، خواجہ عبداللہ انصاری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

جانبلاط

جانبلاط امرا کا ایک خاندان جو نسل کے اعتبار سے کرد تھے اور ان کا مذہب دروزی تھا۔ یہ خاندان لبنان میں آکر آباد ہو گیا تھا لبنان میں ان لوگوں نے ایک جانبلاطی جماعت قائم کی۔ یہ لوگ دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں علاقہ کلیس میں نمودار ہوئے۔ اس خاندان کے جو افراد خاص طور پر مشہور ہوئے وہ یہ ہیں۔

جانبلاط بن قاسم الکردی :۔ (م ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) ابن عربی کے نام سے مشہور تھا۔ عثمانی ترکوں نے اسے اپنی طرف سے کلیس کی سنجاق کا حاکم مقرر کیا اس نے وہاں پر قزاقی کا سدباب کیا اور قبرص جزیرے کی فتح میں حصہ لیا۔ اس کے بیٹے حسین (م ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء) نے حلب سے وہاں کے والی نصوح پاشا کو نکال باہر کیا۔ چونکہ حسین نے ایران کے خلاف مہم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس لیے اسے وان کے مقام پر پھانسی دے دی گئی۔ اس کا بیٹا علی عثمانی مورخین کا جانبلاط اوغلو تھا۔

علی بن حسین :۔ (م ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء) حسین کے بعد اس کا بیٹا علی کلیس کا حاکم بنا جس نے حلب میں بغاوت برپا کر دی۔ اور شام میں اپنی حکومت کی توسیع کا کام کیا۔ اس نے حماسے اونہ تک ایک "آزاد" امارت قائم کر لی اور سلطان کو خراج دینا بند کر دیا اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کر دیا۔ اس نے تیس ہزار سے زائد فوج بھرتی کی۔ لیکن ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں ارج کے مقام پر سلطان کی فوجوں نے اس پر غلبہ پالیا تو اس کے چچا کی سفارش پر سلطان نے اسے معاف کر دیا۔ اور تمسوار کی فوجی قیادت اس کے سپرد کی۔ تو وہ ینی چریوں کے ساتھ لڑائی میں شریک ہو گیا اور بعد میں بلغراد بھاگ گیا اور آخرکار ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن کلیس پر حکمرانی جانبلاطی کی رہی۔ علی بن حسین کے بعد جانبلاط خود بھی سلطان کے وفادار رہے۔ علی کا ایک بھتیجا مصطفےٰ ولایت روم ایلی کا "بے" مقرر کیا گیا۔

جانبلاط بن سعید :۔ (م ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) یہ غالباً علی کا پوتا تھا اپنے دو بیٹوں سعید اور رباح کے ساتھ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں لبنان میں آکر شوف میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء کو یہ امیر فخرالدین کی مہمات میں شریک ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رباح اس کا جانشین بنا۔ اس کے پوتے علی نے دروزیوں کے طاقتور رئیس قبلان القاضی التنوخی کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد اس کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس نے امیر حیدر شہاب کو یمنی جماعت کے خلاف جنگ عین وارہ میں کافی مدد بہم پہنچائی تھی بعد میں اس کے داماد علی نے مختارہ کا قلعہ تعمیر کرایا اور آخرکار مقامی طور پر وہاں اپنے خاندان کی حکومت قائم کر لی۔ اس نے جانبلاطی جماعت سے مل کر امیر لبنان کی حکومت کے خلاف ایک تحریک کو ترقی دی۔ اس نے خاندان شہاب کے تنازعات میں بھی مداخلت کی۔ ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء میں اس نے امیر منصور کو اس کے شریک نائب السلطنت احمد کے مقابلے میں حکومت دلانے کا یقین دلایا۔ لیکن اس سے فریب کھانے کے بعد امیر یوسف کو حکومت دلائی۔ بعد میں امیر یوسف کے بھی خلاف ہو گیا۔ اس نے [illegible] سال کی عمر میں وفات پائی۔

جانبلاط بشیر نے جو غالباً علی کا پوتا تھا۔ عکا کی مسجد کے نمونے کی مختارہ میں مسجد تعمیر کرائی۔ اس نے امیر بشیر ثانی شہاب کی تخت نشینی میں [illegible] مدد دی اور ایک عرصے تک اس کا مددگار رہا۔ جب امیر بشیر مصر گیا تو اس نے امیر کی غیر حاضری میں اس کے نائب عباس کو امیر کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ امیر بشیر نے واپسی پر مختارہ کے مقام پر اسے شکست دی۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ ۱۸۴۱ء میں خاندان شہاب کے سقوط کے بعد عثمانی ترکوں نے شوف کی حکومت کے لئے جانبلاط خاندان کی جگہ خاندان ارسلان کو ترجیح دی۔ سعید جانبلاط جس کو اس طرح سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۶۰ء کے خونچکاں واقعات میں سرگرمی سے حصہ لیا اسے موت کی سزا سنائی گئی۔ بالآخر اس نے ۱۸۶۱ء میں قیدخانے میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نسیب نے ارسلان کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی اور انیسویں صدی میں ارسلان کو شوف کی حکومت سے نکال دیا۔

جانکنی

جانکنی عالم نزاع۔ جب انسان پر عالم نزاع کا وقت ہوتا ہے تو اس پر موت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً ناک کا ٹیڑھا ہو جانا، پاؤں کا ست جانا کہ پھیل نہ سکیں یا اسی قسم کی اور چیزیں جو جانکنی کے وقت ظاہر ہوتی ہیں تو جو لوگ اس وقت ایسے شخص کے پاس موجود ہوں ان کے لیے مستحب ہے کہ اس کا منہ قبلے کی طرف پھیر دیں اور سیدھی کروٹ لٹانا سنت ہے۔ جیسے زندگی میں سونا سنت ہے۔ اگر چت لٹانا مقصود ہو تو اس کے پاؤں قبلے کی طرف کر دیں اور سر کے نیچے ایک پاک تکیہ رکھ کر ذرا اوپر اٹھا دیں تاکہ اس کا منہ قبلے کی طرف ہو جائے۔ اس طرح لٹانا بھی جائز ہے اور اگر مرنے والے کو کچھ زیادہ تکلیف ہو تو اس کو اسی وضع پر چھوڑ دیں جس وضع پہ وہ پڑا ہو۔ اس کے اقربا پر اور اگر اقربا موجود نہ ہوں تو جو کوئی مسلمان وہاں پر موجود ہو شہادتین کی تلقین کرنا نزع کے وقت سے قبل یعنی اس سے پہلے کہ دم اس کے گلے میں آکر اٹکے واجب ہے کیونکہ یہ حالت سننے اور سمجھنے کی نہیں رہتی۔ بعض علما کے نزدیک تلقین کرنا مستحب ہے اور اس سے مراد اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ ہے اور بعض کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللہ ہے۔ —

لیکن تلقین اس طور سے کی جائے کہ حاضر خود پڑھ پڑھ کر سنائیں اور مرنے والا شخص سنے اور سمجھے۔ مرنے والے کو نہ کہیں کہ تو بھی کہہ اس لئے کہ یہ وقت اس پر کمال تکلیف کا ہوتا ہے۔ مبادا ان کا کہنا اس کو برا معلوم ہو یا وہ بسبب تکلیف کی زیادتی انکار کردے جو اس کے حق میں بہتر نہیں۔ حاضرین اس وقت تک تلقین کرتے رہیں کہ مرنے والا ایک بار شہادتین صراحتاً یا اشارۃً کہہ ڈالے پھر اس کو تلقین کرنا موقوف کردیں اگر اس کے بعد کوئی دنیاوی بات اس کے منہ سے نکلے تو پھر اسی طور پر تلقین کریں یہاں تک کہ اس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو جائے۔ اگر کسی مسلمان سے کفر کا کلمہ جانکنی کی حالت میں منہ سے نکل جائے تو اس کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت مانگنی چاہیئے۔ اور اس کی تجہیز و تکفین بھی مسلمانوں ہی کی طرح کریں کیونکہ اس وقت کفر و اسلام کا اعتبار نہیں۔ مرنے والے کے پاس سورۃ یاسین اور سورۃ رعد پڑھنا مستحب ہے۔

جان محمد، مولانا

(وفات ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء) ایک عالم دین والد کا نام غوث محمد تھا۔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ سکھ دور حکومت میں تعلیم حاصل کی۔ اور علم دین میں خاص دسترس حاصل کی۔ آپ سے ہزاروں طلبہ نے علم دین کی تکمیل کی۔

مولانا جان محمد ایک قابل مدرس، خوش بیان واعظ اور مشہور فقیہہ تھے۔ بقول مولوی فقیر محمد جہلمی صاحب "حدائق الحنفیہ" آپ علوم مروجہ کی ہر شاخ پر بڑی دسترس رکھتے تھے درس میں تشنگان علوم دینیہ کے جمگھٹے رہتے۔ پنجاب کے دور افتادہ اضلاع سے لوگ آتے اور علم و فضل سے دامن بھر کرلے جاتے جو آپ کا وعظ سنتا گناہ سے تائب ہوجاتا۔ آپ کے شاگرد علم و عمل کے پیکر بنکر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ پنجاب کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو جہاں آپ کا شاگرد علم دین کا نور نہ بکھیر رہا ہو۔

آپ کی تصانیف میں "زبدۃ التفاسیر"، "شرح قصیدہ بردہ"، "شرح قصیدہ امالی"، "رسالہ اثبات خلافت امیر معاویہؓ" وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی محمد عالم کھوڑی، مولوی کرامت اللہ، مولانا غلام محمد اور مولانا فخر الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جانیکلی، علی پاشا

(۱۱۳۴ھ/۲۱-۱۷۲۰ - ۱۱۹۹ھ/جولائی ۱۷۸۵ء) ایک صاحب سیف اور خاندان درہ بے کا بانی۔ والد کا نام احمد آغا تھا جو قصر شاہی کا قپوجی باشی تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ عہد جوانی میں اپنے بھائی سلیمان پاشا کے ہمراہ جانیک گیا۔ بعد میں اپنے بھائی کی جگہ وہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ اور محصل کے خطاب سے نوازا گیا۔ روس اور ترکی کی جنگ کے دوران میں اسے متعدد بار لشکر کی قیادت سونپی گئی۔ پہلے اس نے جارجیا میں خدمات سرانجام دیں بعد میں مولدویا میں اس کا تقرر کیا گیا جہاں اس نے روسیوں کے خلاف لڑائی میں خوب شہرت حاصل کی اور اسے انعام کے طور پر وزارت کا منصب سونپا گیا۔ ۱۱۸۸ھ/۷۴-۱۷۷۴ء میں اس نے کریمیا کی مہم کی قیادت کی۔ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں قارص کا سپہ سالار بنایا گیا۔ اسی دوران میں اس نے جانیک میں اپنی حکومت کو خوب مضبوط کرلیا۔ اور مشرق کی جانب اپنی سلطنت میں توسیع بھی کی۔ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں اسے طرابزون کا والی تسلیم کرلیا گیا۔ اس کے چند سالوں بعد ہی اس نے سیواس اور ارزروم کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا۔

اسے ایک بار پھر ۱۱۹۱ھ/جنوری ۱۷۷۸ء میں کریمیا کا سر عسکر اور ایک مہم کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے بعد اسے اپنے اناطولوی حریف چوپان اوغلی کے مقابلے پر آنا پڑا۔ جس نے استنبول میں اس کے دشمنوں کے اکسانے پر اس پر فوج کشی کردی تھی۔ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں علی پاشا کریمیا کی طرف فرار ہوگیا۔ اور وہاں کے خان شاہین گرای سے پناہ کا طالب ہوا۔ جس کے توسط سے اسے معافی مل گئی۔ اور دوبارہ بحال کردیا گیا اسے وزیر کا منصب اور سابقہ مقبوضات بھی دوبارہ مل گئے۔ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں علی پاشا نے حکومت کو ایک یادداشت پیش کی۔ جس میں روس میں ترکوں کی شکست کے اسباب بیان کئے گئے تھے۔ اور ان اصلاحات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جنہیں اس وقت سلطنت میں نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

جاوا

انڈونیشیا کا معاشی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے ایک اہم مرکزی جزیرہ دنیا کا گنجان آباد جزیرہ جس کے مغرب اور شمال مغرب میں سماٹرا ہے شمال میں بحیرہ جاوا اسے کالیمنتان سے جدا کرتا ہے۔ مشرق میں جزائر سونڈا صغیر ہیں۔ اور جنوب میں بحر ہند واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۸۵۰۴ مربع میل ہے۔

جاوا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس نے اس جزیرے کو اپنی زبان میں جاباد یو لکھا تھا اور جاوا اسی سے ماخوذ ہے قدیم ہندوؤں نے سنسکرت میں اس کا نام "یاوا دیپا" (سونے کا جزیرہ) لکھا ہے۔ چنانچہ جاوا "یاوہ" سے نکلا ہے۔ سب سے قدیم ماخوذ جس میں جاوا کا لفظ پہلی بار ملتا ہے وہ یاقوت کی معجم البلدان ہے۔

جاوا انسانی آبادی کے قدیم ترین اماکن میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ کا آغاز ہندوؤں کی آمد سے ہوتا ہے جو تجارت کے لئے اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں ان ہندو تاجروں نے یہاں پر اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں جو بعد میں باقاعدہ ریاستوں کی شکل اختیار کرگئیں۔ چنانچہ جاوا میں ہندوؤں اور بدھوں کی بعض بڑی بڑی سلطنتیں بھی قائم ہوئیں۔

ایک روایت کے مطابق یہاں کی پہلی ہند و ریاست تروما تھی۔ جس کا پہلا ہندو راجہ آجی ساکا تھا۔ آٹھویں یا نویں صدی میں جاوا کے نصف جزیرے پر سماٹرا کی بدھ سلطنت سری وجایا کا قبضہ ہوگیا۔ جس کا خاتمہ خاندان سلیندرا کے ہاتھوں ہوا اس خاندان کے بعد یہاں خاندان ماترم کی حکومت رہی جس کے بعد سلطنت کیدی قائم ہوئی۔ ۱۲۹۴ء میں جاوا کی ممتاز ترین ہندو سلطنت مجاپاہت کا آغاز ہوا جس کا ۱۴۷۸ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔

جاوا میں اسلام کی اشاعت کا کام چودہویں صدی کے اواخر اور پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ملاکا کے مسلمان تاجروں کے ذریعے ہوا۔ احمد آباد کے ایک تاجر اور صوفی بزرگ ملک ابراہیم (مولانا مغربی) جاوا میں پہلے مبلغ اسلام تھے۔ انہیں طب میں بھی حد درجہ کمال حاصل تھا۔ انہوں نے گریسک کے راجہ کا علاج کیا جو صحت یاب ہونے کے بعد مسلمان ہوگیا۔ اس کا نام رادن رحمت رکھا گیا۔ اس طرح جاوا میں پہلی مسلمان حکومت قائم ہوئی۔ رادن رحمت کا شمار بھی مولانا مغربی کی طرح جاوا کے ان ولیوں میں ہوتا ہے جن کی کوششوں سے یہاں پر اشاعت اسلام ہوئی مبلغین اسلام عام طور پر اپنے معتقد مسلمان تاجروں کے ہمراہ یہاں آتے تھے اور علاقائی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد تبلیغ اسلام کا آغاز کردیتے۔ یہ مبلغین نہایت اونچے اخلاق کے حامل تھے۔ انہوں نے بے انتہا ہمدرد، بے لوث، سچے اور اچھے کردار کا جو نمونہ پیش کیا اس سے لوگ خود بخود ان کے پیغام کی طرف کھینچنے لگے اور بڑی کثیر تعداد میں اسلام قبول کرتے چلے گئے۔ اور اسلامی سلطنتیں قائم ہونے لگیں۔

دیمپاک کی سلطنت :۔ اگرچہ جاوا میں پہلی اسلامی سلطنت گریک میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن صحیح معنوں میں پہلی اسلامی سلطنت دیماک میں قائم ہوئی جو مجاپاہت کی آخری ہندو ریاست تھی۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی اشاعت سے برافروختہ ہوکر ہندو راجاؤں نے مسلمانوں پر سختی کرنی شروع کی تو مسلمان سوداگروں نے نومسلموں کی مدد سے ایک فوج تیار کی اور اس کا سپہ سالار ایک مقامی جرنیل رادن پاتح (فاتح) کو مقرر کیا۔ جس نے ہندو فوج کو شکست دی۔ بعد میں اس کو وہاں کا حکمران تسلیم کرلیا گیا۔ ۱۵۲۰ء میں رادن پاتح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رادن یونس تخت نشین ہوا جس نے اپنے عہد حکومت میں نہ صرف جاپارا سے گریسک تک کا علاقہ بلکہ مادورا سے پالمبانگ کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس نے پرتگیزوں کو مشرق سے نکالنے کے لئے ان پر چڑھائی کی لیکن ناکام رہا اور جاپارا بھی اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ۱۵۲۳ء میں یونس کے انتقال کے بعد اس کا چچا رادن ترنگانو جو ایک بلند حوصلہ حکمران تھا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے سوپت یورنگ اور اس کے نواحی علاقے اپنی مملکت میں شامل کیے۔ اس کے چھوٹے بیٹے تیمور نے ماترم فتح کیا۔ ۱۵۴۶ء میں ترنگانو نے پسوروان کی ہندو سلطنت پر حملہ کیا لیکن اسے دشمنوں نے ایک غلام کے ذریعے قتل کرادیا۔ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا مومن تخت پر بیٹھا وہ بڑا عالم دین تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف کررکھی تھی۔ اس کے دور حکومت میں اسلامی علوم اور اسلامی طرز زندگی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس مرد درویش کو اس کے بھتیجے آریو پنان سانگ نے قتل کردیا اور اس کے نوعمر بیٹے آریو پنگری کو برطرف کرکے حکومت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

بانتن کی سلطنت :۔ ۱۵۲۲ء میں مشہور عالم اور صوفی پاتح صلا (فتح اللہ) نے جاوا کے مغربی حصے میں ایک ریاست قائم کی۔ بانتن اس کا صدر مقام تھا۔ ۱۵۵۲ء میں سلطنت اپنے بیٹے مولانا حسن الدین کے حوالے کرنے کے بعد پاتح صلا تبلیغ اسلام کی خاطر چری لون چلے گئے۔ جہاں اٹھارہ سال تبلیغ کرنے کے بعد ۱۵۷۰ء میں وفات پائی۔

سلطان حسن الدین جس نے ۱۵۵۲ء تا ۱۵۷۰ء تک حکمرانی کی۔ ایک دیندار عالم اور عادل حکمران تھا۔ اس نے لمپونگ کا علاقہ اپنی مملکت میں شامل کیا۔ اس کے دور حکومت میں تجارت کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ اس نے کثرت سے مساجد، مدرسے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ اس سلطان کی دینداری کی طرف رغبت کے باعث مکہ مکرمہ اور دوسرے بلاد اسلامیہ کی طرف بہت سے علماء اور صوفیا بانتن پہنچے۔ ۱۵۷۰ء میں سلطان حسن الدین کی حکومت اپنے بیٹے یوسف کے سپرد کرکے تبلیغ اسلام میں مشغول ہوگیا۔ جو ۱۵۸۰ء تک حکمران رہا۔ اس سلطان نے بھی اپنے باپ دادا کی اسلامی روایات پر عمل کرتے ہوئے سلطنت کا نظم ونسق بڑی عمدگی کے ساتھ چلایا اور علم وحکمت وتجارت وحرفت کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بھائی شہزادہ جاپارا فوج لے کر چڑھ آیا اور حکومت کا دعوےدار بنا۔ لیکن امراء نے اس کو حکمران تسلیم نہ کیا اور سلطان یوسف کے ایک کمسن لڑکے مولانا محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ سلطان محمد کے دور حکومت میں بانتن کا بحری بیڑا بہت مضبوط تھا۔ جس کی مدد سے ۱۵۹۵ء میں سلطان نے ولندیزیوں کو شکست دے کر جاوا سے نکال باہر کیا تھا۔ ۱۶۰۵ء میں سلطان نے سماٹرا پر چڑھائی کی تاکہ علاقہ اہل یورپ کو ان کے اڈوں سے آسانی باہر نکالا جاسکے پالمبانگ کے مقام پر بڑی خونریز لڑائی ہوئی لیکن عین فتح کے موقع پر دشمن نے دھوکے سے سلطان کو قتل کرادیا۔ اس طرح سلطان کی فوج کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ سلطان محمد کے بعد یہ ریاست خانہ جنگی کا شکار ہوگئی۔ ۱۶۱۰ء میں ولندیزی دوبارہ آ پہنچے اور انہوں نے بتاویہ میں اپنا تجارتی مرکز اور قلعہ تعمیر کرکے بانتن پر اپنی بالادستی قائم کرلی۔

۳۔ پاجانگ کی سلطنت :۔ ترنگانو کے پوتے آریو پنگری کو اس کے پھوپھا دیا بوجو پاجانگ کا گورنر تھا اپنے ساتھ پاجانگ لے گیا تھا۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کردی۔ اور پاجانگ کو اس کا مرکز حکومت قرار دیا۔ اس طرح ترنگانو کی سلطنت کا مرکز دیماک سے منتقل ہوکر پاجانگ ہوگیا۔ چونکہ دیماک دارالحکومت سے کافی فاصلے پر تھا یہ دیکھتے ہوئے ترنگانو کا ایک داماد وہاں کا حاکم بن بیٹھا۔ لیکن وہاں کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی اور سلطان پاجانگ سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان نے اس مہم پر آدی ویانیو کے ایک متبنیٰ سوتا دیا ویورو کو بھیجا۔ سوتا دیا ویورو اس میں کامیاب رہا اور اسے سنوپاتی (جرنیل) کا اعزاز دیا گیا۔ سلطان کا جانشین شہزادہ پونو تھا لیکن وہ اتنا سر دلعزیز نہ تھا۔ سنوپاتی کو عوام اور فوج کی حمایت حاصل تھی۔ جب سے ایک خاندانی نزاع کی بنا پر جلاوطن کردیا گیا تو ملک میں بغاوت ہوگئی۔ اس بغاوت میں آدی ویانیو مارا گیا۔ نیز شہزادہ پونو نے ۱۵۷۸ء میں تخت سنوپاتی کے حوالے کردیا۔

ماترم کی سلطنت :۔ سنوپاتی نے اپنا صدر مقام پاجانگ سے ماترم منتقل کرکے جاوا کی سب سے مشہور اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کا دور حکومت ۱۶۰۱ء تک رہا۔ اس نے تمام مشرقی اضلاع فتح کیے۔ کیدیری، پسوروان، مادورا اور دیگر پر اس کا تسلط قائم ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا جو لانگ تخت پر بیٹھا۔

جاوا میں انسانی ہاتھوں کا کمال

کو اس کے بڑے بھائی سرنگ سنگ نے معزول کر کے خود سلطان اگنگ کا لقب اختیار کیا۔

سلطان اگنگ کا دورِ حکومت ۱۶۱۳ء تا ۱۶۴۵ء تک ہے۔ وہ جاوا کا سب سے بڑا مسلمان فرمانروا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت اسلامی اقتدار کا عہد عروج تھا۔ اس کے تخت نشین ہونے پر تمام ہندو ریاستوں نے متحد ہو کر ہندو مجاپاہیت کا اقتدار بحال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سلطان اگنگ نے ان تمام ریاستوں کو زیرنگیں کر لیا۔ اس کے عہدِ حکومت ہی یورپ کے تاجروں کی آمد الجزائر شرق الہند میں شروع ہو چکی تھی۔ ۱۵۹۵ء میں سلطان بانتن کی اجازت سے انہوں نے جاپارا میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ لیکن بڑھتے بڑھتے انہوں نے ۱۶۱۹ء میں جکارتا پر قبضہ کر لیا۔ اور ایک نیا شہر بٹاویا کے نام سے بسایا۔ اب یہ لوگ ماترم کی سلطنت کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ جب سلطان اگنگ نے ان کا یہ رخ دیکھا تو ان پر حملہ کر کے شکست فاش دی۔ اور انہیں اس جزیرے سے نکال باہر کیا۔ تقریباً پچیس سال تک یہ جزیرہ ان کے وجود سے پاک رہا۔

سلطان اگنگ ایک نڈر جرنیل اور مدبر حکمران تھا۔ علماء کا سرپرست تھا اور خود بھی ایک بڑا عالم دین تھا۔ اس نے جگہ جگہ مدارس قائم کیے۔ طلبہ کو غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجنے کا بندوبست کیا۔ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کیے وہ چاہتا تھا کہ سارے انڈونیشیا کو متحد کر کے ایک ملک اور ایک قوم کی شکل دی جائے۔ جس کی بنیاد اسلام پر ہو۔ اس نے فلسفہ و حکمت پر ایک ضخیم کتاب "سرت گندنگ" بھی تصنیف کی۔

سلطان اگنگ کے بعد اس کا بیٹا ہمنگ کورت اول تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۶۴۵ء تا ۱۶۷۷ء تک ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک نااہل حکمران ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف ولندیزیوں کو واپس آنے کی اجازت دی بلکہ ہر قسم کی تجارتی اور تبلیغی مراعات سے بھی نوازا۔ اس طرح ولندیزی جاوا میں اپنے پنجے جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمنگ کورت کے وطن دشمن اور غیر اسلامی کردار سے کبیدہ خاطر ہو کر عوام نے ایک بہادر نوجوان تورونا جایا کے زیرِ قیادت ولندیزیوں اور سلطان کے خلاف ایک طویل جنگ کا آغاز کیا۔ اور بالآخر ماترم پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمنگ کورت نے ولندیزوں کے پاس جانے کے لیے راہ فرار اختیار کی لیکن راستے ہی میں مر گیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا ہمنگ کورت دوم ۱۶۷۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۰۳ء تک ہے۔ ولندیزوں نے اسے اپنے باپ کا تخت واپس دلوانے کے لیے عہد نامہ سیمارانگ طے کیا۔ اور ۱۶۷۸ء میں تورونا جایا پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ جب وہ ہمنگ کورت دوم کے سامنے لایا گیا تو اس نے اسے فوراً قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ ۲ جنوری ۱۶۸۰ء کا ہے۔ اب ولندیزوں کے لیے جاوا پر پوری طرح سے قابض ہونے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ اس کے آخری ایام میں ولندیزی سلطان کے خلاف ہو گئے۔ تو اس نے سراپاتی سے مدد چاہی جو وسطی جاوا میں ان کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ ۱۶۸۵ء میں جب ولندیزوں نے ایک فوج ماترم پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجی تو اس نے شب خون مار کر اس فوج کو ختم کر دیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا سونان ماس ہمنگ کورت سوم کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ یہ صرف ایک سال تخت پر بیٹھ سکا کہ اس کے چچا پاکوبوانو نے ولندیزوں کی مدد سے اسے معزول کر دیا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۰۳ء تا ۱۷۰۴ء رہے۔

ہمنگ کورت سوم کی معزولی کے بعد پاکوبوانو ۱۷۰۴ء تا ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا اس کے دورِ اقتدار میں جاوا پر ولندیزوں کا پورا پورا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا پاکوبوانو دوم کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۱۹ء تا ۱۷۲۷ء تک ہے۔ اس کو ولندیزوں نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہمنگ کورت چہارم (۱۷۲۷ء تا ۱۷۴۹ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد کا مشہور واقعہ جنگ مادورا ہے جس میں اہل جاوا پہلی مرتبہ کھلم کھلا خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے۔ ۱۷۴۶ء کے عہد نامہ سوراکارتا کی رو سے ولندیزوں کو مکمل اجارہ داری مل گئی۔ اس کے بعد پاکوبوانو سوم تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۴۹ء تا ۱۷۸۸ء تک ہے۔ اس کے ہی عہدِ حکومت میں وہ مشہور عہد نامہ ہوا جس کی رو سے آئندہ سے ماترم کے تمام حکمرانوں کو ولندیزوں کی نگرانی میں حکومت کرنا تھا۔ جب سلطان نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو جنگ چھڑ گئی جس کے نتیجے میں ولندیزوں کو چند روز کے لیے مشرقی جاوا خالی کرنا پڑا لیکن ۱۷۵۵ء میں انہوں نے بالآخر پاکوبوانو کے حلیف منگ کالوجی کو اپنے ساتھ ملا کر سلطنت ماترم کو دو ریاستوں یوگ یکارتا اور سوراکارتا میں تقسیم کر دیا۔ ایک ریاست کا سربراہ پاکوبوانو کو قرار دیا گیا اور دوسری کا منگ کالوجی کو اور اس کی ریاست کا صدر مقام جوگ جکارتا مقرر ہوا۔ اس طرح سلطنت ماترم ولندیزوں کے ماتحت آ گئی اور مجمع الجزائر پر ان کے تین سو سالہ دور کا آغاز ہو گیا۔ (اس دور کی تفصیل کے لیے دیکھیے "انڈونیشیا")

۱۹۴۹ء میں آزادی کے بعد آزاد جمہوریہ متحدہ انڈونیشیا کا وجود عمل میں آیا۔ جس کے تحت جاوا نظم و نسق کے اعتبار سے تین حصوں مغربی جاوا (بندونگ)، وسطی جاوا (سیمارانگ)، مشرقی جاوا (سورابایا) میں تقسیم کر دیا گیا۔ انڈونیشیا کا دارالحکومت جکارتا بھی جاوا ہی میں واقع ہے۔

جاوا میں ۱۰۹ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ جن کا سلسلہ اس جزیرے کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک پھیلا ہوا ہے۔ جن میں سے تیرہ پہاڑ ابھی متحرک ہیں اور بعض اوقات بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا گرم ہے اور بارش خوب ہوتی ہے گرم آب و ہوا اور بارش کی کثرت کے سبب زمین زرخیز ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں پر پانچ ہزار سے زیادہ خودرو بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔

پیداوار کے لحاظ سے جاوا انڈونیشیا کا سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب جزیرہ ہے۔ تقریباً تیس لاکھ ایکڑ زمین پر چاول اور ساڑھے چار لاکھ ایکڑ پر چائے کی کاشت ہوتی ہے۔ چاول اور چائے کے علاوہ یہاں کی پیداوار میں گنا، تمباکو، ربڑ، سنکونا، قہوہ اور گرم مصالحہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں کی آبادی ۱۹۷۳ء کی مردم شماری کے مطابق ۷۸۶۶۰۰۰۰ ہے۔

جاوید (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء - ۱۳۴۱ھ/۱۶ اپریل ۱۹۲۳ء) ایک ترک معیشت دان اور سیاست دان۔ سالونیکا میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کا باپ ایک سوداگر تھا۔ سالونیکا اور استنبول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۱۸۹۶ء میں مدرسہ ملکیہ سے فارغ التحصیل ہوا۔ پہلے چند دن زرعی بنک میں ملازمت کی بعد میں وزارت تعلیم میں ملازم ہو گیا۔ ۱۹۰۲ء میں اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر سالونیکا واپس چلا گیا۔ جہاں وہ ایک نجی ابتدائی سکول کا مدیر ہو گیا۔ یہیں پر اس نے عثمانی انجمن اتحاد و ترقی میں شرکت کی۔ جو سلطان عبدالحمید ثانی کے ظلم و استبداد کے خلاف نوجوان ترکوں کی ایک تحریک تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جاوید مدرسہ ملکیہ میں معاشیات کا لیکچرر مقرر ہوا۔ یہیں پر اس نے چند کتب اقتصادیات پر تصنیف کیں۔ اور ایک رسالہ "علوم اقتصادیہ و اجتماعیہ مجموعہ سی" احمد شعیب اور رضا توفیق بولوق باشی کے ساتھ مل کر نکالا۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک پارلیمنٹ کا رکن رہا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک وزیر

مالیات مقرر کیا گیا۔ وہ ایک بہترین مقرر اور اعلےٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت پر جاوید کابینہ سے مستعفی ہو گیا۔ جب انجمن اتحاد و ترقی کے قائدین کی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو جاوید روپوش ہو کر ملک سے باہر نکل گیا۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں استنبول کی عدالت نے اسے اس کی عدم موجودگی میں پندرہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے عبدالحمید ثانی کے لڑکے برھان الدین کی مطلقہ بیوی علیہ سے شادی کی۔ ۱۹۲۲ء میں جاوید واپس استنبول آگیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے لوازن صلح کانفرنس کے وفد کے مشیر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ۱۹۲۶ء میں مصطفےٰ کمال اتاترک پر قاتلانہ حملے کے بعد جاوید کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور بغاوت کے الزام میں اسے انجمن اتحاد و ترقی کے دوسرے تین اور رہنماؤں کے ساتھ ۲۶ راگست ۱۹۲۶ء کو انقرہ میں پھانسی دے دی گئی۔

جاہلیت اصطلاح میں اس سے مراد زمانہ قبل اسلام کے عربوں کی حالت۔ دعوت اسلام سے پہلے اور بالخصوص قبل از ہجرت نبوی کا زمانہ مراد ہے کیونکہ اس زمانے میں عرب میں مشرکین عرب کا اجتماعی اور سیاسی قانون جاری و ساری تھا جو کسی وحی الٰہی کے تابع نہ تھا۔

قرآن مجید میں یہ لفظ چار مختلف جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

"اور ایک دوسرا گروہ جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے (۳ : ۱۵۴)

"تو کیا پھر یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" (۵ : ۵۰)

"اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔" (۳۳ : ۳۳)

"جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی۔" (۴۸ : ۲۶)

جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

آنحضورؐ نے فرمایا۔ "تین کام جاہلیت کے ہیں۔ دوسروں کے نسب پر طعن کرنا ستاروں کی گردش سے فال لینا اور مردوں پر نوحہ کرنا۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

بقول مولانا مودودیؒ جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرز عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔" جاہلیت اولیٰ کا مطلب وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

مفسرین میں سے بعض کے نزدیک دور جاہلیت اس زمانے کا نام ہے جو آنحضورؐ کی بعثت سے پہلے تھا اور بعض کے نزدیک ہجرت نبویؐ تک کا زمانہ ہے۔ بعض نے آنحضورؐ سے ڈیڑھ سو سال پہلے تک کے زمانے کو عہد جاہلیت قرار دیا ہے۔

جائز اصطلاح فقہ میں اس سے مراد وہ افعال ہیں جن کے کرنے کی اجازت ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ افعال جو اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو جائز کی اصطلاح واجب اور مندوب (جس کے کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے) سے اس طرح ممیز اور مختلف ہے جس طرح حرام اور مکروہ سے۔

جائز وہ ہے جسے قانون شرع نے جاری و نافذ کیا ہے اور اس پر عمل بلا دغدغہ قلب صحیح ہے۔

فقہائے اسلام نے جائز کی اصطلاح خاص معنوں میں استعمال کی ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مراد ہر وہ قانونی فعل جو باطل یا فاسد نہیں۔ علمائے احناف کے نزدیک ایسے فعل کو (جو باطل یا فاسد نہ ہو) صحیح کہا جاتا ہے۔ یہ فعل قانون شریعت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ بایں ہمہ حنفی علماء اس امر کو ترجیح دیتے ہیں کہ لفظ جائز کو ہر درست کام کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اس فعل کے لیے استعمال کیا جائے جو از روئے شریعت درست و روا ہو۔ درحقیقت جائز کام کے صحیح معنی شرعی نقطہ نظر سے مشروع فعل ہے۔

بقول مولانا اشرف علی تھانوی جائز کا اطلاق بہت سے معانی پر ہوتا ہے۔ ۱۔ مباح۔ ۲۔ جو شرعاً ممتنع و ناممکن نہ ہو خواہ مباح ہو یا واجب یا مندوب یا مکروہ۔ ۳۔ جو عقلاً ممتنع و ناممکن نہ ہو۔ خواہ واجب ہو یا راجح۔ ۴۔ جس میں دونوں باتیں برابر ہوں۔ خواہ یہ مساوات و برابری شرعی نقطہ نظر سے ہو۔ جیسے مباح یا عقلی نقطہ نظر سے جیسے بچے کا فعل۔ ۵۔ جو مشکوک ہے اور جسے محتمل بھی کہتے ہیں اور یہ ایسا فعل ہے کہ جس کے بارے میں انسان کی عقل یہ کہے کہ اس میں دونوں باتیں برابر ہیں یا جو نفس الامر اور شریعت کے اعتبار سے ممتنع نہ ہو۔

جبارؓ بن صخر (ـــــ ۳۰ھ / ۶۵۰ء) صحابیؓ۔ ابوعبداللہ کنیت۔ قبیلہ خزرج کے خاندان سلمہ سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے۔ غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ آپ حساب میں بہت زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے محاسب اور خازن کا عہدہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ فتح خیبر کے بعد عبداللہ بن رواحہ کی جگہ آپ ہی کو خازن مقرر کیا گیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں آپ اسی عہدے پر فائز رہے۔ آپ سے چند احادیث مروی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ۶۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

جُبّائی (۲۳۵ھ / ۸۴۹ء - ۳۰۳ھ / ۹۱۶ء) ابوعلی محمد بن عبدالوہاب۔ معتزلی عالم۔ خوزستان کے شہر جبا میں پیدا ہوا۔ تعلیم بصرہ میں ابو یعقوب الشحام کے مدرسے میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر ان کا جانشین بنا۔ اس نے اپنے اساتذہ کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ترقی بھی دی۔

جبائی کا شمار معتزلہ کے مشہور ترین افراد میں ہوتا ہے۔ عقیدے کے لحاظ سے اسے بغدادی معتزلہ سے اختلاف تھا۔ وہ بصرے میں بھی نظام وغیرہ سے اختلاف رکھتا تھا۔ نہ ہی اصم اور عباد کے نظریات سے اسے اتفاق تھا۔ ... مقام معتزلہ بصرہ میں ہے۔ جنہیں خاص طور پر افعال انسانی کے مسئلے میں بغداد کے معتزلہ سے اختلاف ہے۔

جبائی کے دو شاگرد ایسے تھے جنہوں نے اس کے بعد کافی شہرت حاصل کی۔ ایک نواسا کا بیٹا ابوہاشم تھا اور دوسرے ابوالحسن اشعری تھے جو ایک مسئلے کے بارے میں جبائی کے جوابات سے مطمئن نہ ہو کر ایک الگ جماعت کے بانی بنے اور معتزلی عقائد کے رد میں مشغول ہو گئے۔

ایک روایت کے مطابق جس مکالمے کی بنا پر امام اشعری اور ان کے استاد

جبائیؒ کے درمیان اختلاف ہوا۔ وہ مکالمہ تین بھائیوں کے انجام سے متعلق تھا۔ جن میں سے ایک متقی تھا، دوسرا غیر متقی اور تیسرا ایسا تھا جو بچپن ہی میں انتقال کر گیا تھا اس مسئلے میں قضائے الٰہی کی عقلی تصدیق و تصویب کا معاملہ درپیش تھا۔ اور جب جبائیؒ سے اشعری کے سوالات کا کوئی شافی جواب نہ بن پڑا تو اشعری اپنے استاد سے علیحدہ ہو گئے۔

جبائیؒ کی تصانیف میں سے آج کوئی تصنیف بھی باقی نہیں ہے۔ اس کی ایک تصنیف "کتاب الاصول" کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔ جس کے رد میں امام اشعری نے کئی رسائل لکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی کئی اور تصانیف بھی تھیں۔

جبائیؒ ان معتزلہ میں سے تھا جن کی تردید کی اشعری نے بہت زیادہ کوشش کی اس نے بعض اشعری دلائل کو خود پیش کیا۔ اس کے بعض رجحانات معتزلی دبستان کی بہترین روایتوں سے مربوط ہیں لیکن بعض میں اشعریہ کے مسائلِ علم کلام کے حل پیش کرتا نظر آتا ہے۔

جبائیؒ نے حقیقت صفات کی "تعطیل" پر اس حد تک زور دیا کہ ان کی حیثیت محض اسماء کی رہ گئی۔

جبائی کا بیٹا ابوہاشم جو اس کا شاگرد بھی تھا۔ اشعری کا ہم عصر تھا۔ اور ان متاخر معتزلہ میں سے تھا۔ جنہوں نے سنی فکر کو براہ راست متاثر کیا۔ وہ ایک [illegible] کا بانی تھا۔ اس کے پیرو بہشمیہ کہلاتے تھے۔

جبت بے حقیقت، بے فائدہ اور بے اصل چیز۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا یہ حال ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔" (۴: ۵۱)

اسلام کی زبان میں جادو، کہانت، جوتش، فال گیری ٹونے ٹوٹکے، شگون اور دوسری تمام وہمی و خیالی باتوں کو جبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آنحضورؐ کا ارشاد مبارک ہے:۔

"جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے نشاناتِ قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب "جبت" کے قبیل سے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الحکمت)

پس جبت کا مفہوم وہی ہے جسے اردو میں اوہام کہا جاتا ہے۔ (نیز دیکھئے اوہام جاہلیہ)

جُبّ الحزن غم کا کنواں۔ غم والا گڑھا۔ جہنم کا ایک گڑھا۔ جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب الحزن سے اللہ کی پناہ مانگا کرو۔" صحابہ نے عرض کی۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب الحزن کیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا۔ جہنم میں ایک نالہ ہے جس سے جہنم بھی دن میں چار سو بار پناہ مانگتی ہے۔" صحابہ نے عرض کی" اس میں کون داخل ہوگا۔" آپؐ نے فرمایا" جو محض دکھلاوے کے لئے قرآن شریف پڑھتے ہیں۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

جبرائیلؑ ایک مقرب فرشتہ جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیغمبروں پر وحی لاتا رہا ہے۔ جبرائیل کے معنی عبرانی زبان میں عبداللہ کے ہیں۔ یعنی اللہ کا بندہ۔ اس فرشتے کے دوسرے نام روح الامین، روح الاعظم، روح القدس صفاتی نام ہیں۔

آنحضورؐ کی جبرائیلؑ سے سب سے پہلی ملاقات غار حرا میں ہوئی۔ جب آپؐ تفکر و عبادت میں تنہا مشغول تھے۔ تو جبرائیلؑ تشریف لائے اور اپنا تعارف کرا کے آپؐ کو رسول ہونے کی خوشخبری دی اور پھر سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات پڑھنے کی تلقین کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نہیں پڑھ سکتا۔ تو جبرائیلؑ نے آپؐ کو اپنے سینے سے چمٹایا اور کہا لو اب پڑھو۔ آپؐ نے پھر وہی عذر کیا چنانچہ پھر اپنے سینے سے چمٹایا اور تین بار یہی عمل دہرایا۔ اور تیسری بار بڑی طاقت سے بھینچا اور کہا پڑھو۔ یہ پہلی وحی تھی۔

روایت کے مطابق اس وحی کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہو گیا۔ آنحضورؐ مضطربانہ اس کے منتظر رہے۔ چنانچہ ایک روز آپؐ غار حرا سے اعتکاف کے بعد واپس تشریف لا رہے تھے کہ اوپر سے ایک آواز آئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو عظیم الشان فرشتہ جس سے پہلے حرا میں ملاقات ہو چکی تھی۔ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ ایک تخت پر متمکن اور زمین و آسمان کے مابین سارے افق پر چھایا ہوا تھا۔ آپؐ گھر آ کر چادر لپیٹ کر پڑ گئے۔ اسی اثنا میں سورۃ المدثر نازل ہوئی۔

بخاری کی ایک روایت کی رو سے اس وقت جبرائیلؑ اپنی طبعی صورت میں تھے آنحضورؐ نے انہیں اس صورت میں دو بار دیکھا تھا۔ ورنہ عموماً وہ انسانی شکل و صورت میں آپؐ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احزاب کے بعد جبرائیلؑ آدمی کی شکل میں غبار آلود ظاہر ہوئے اور یہ کہہ گئے کہ آپؐ تو جنگ سے فارغ ہو گئے لیکن ہم نہیں ہوئے چلئے بنی قریظہ کا محاصرہ کیجئے یہ حدیث صحاح ستہ کی کتب میں روایت ہے۔ اور کبھی اجنبی شکل میں اس طرح ظاہر ہوتے تھے کہ شریک مجلس بھی دیکھ لیتے تھے۔ چنانچہ مشہور حدیث جو حدیث جبرائیلؑ کے نام سے موسوم ہے۔ ایک اجنبی صورت میں نہایت سفید لباس میں ظاہر ہوئے اور آپؐ کے زانوئے مبارک سے زانو ملا کر بیٹھ گئے اور آنحضورؐ سے سوال کرنے لگے لیکن آنحضورؐ کے جواب کی تصدیق بھی کرتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس شخص کے اس طرح سوالات کرنے اور خود ہی ان کے جوابات کی تصدیق کرنے پر بڑا تعجب ہوا۔ اس شخص کے چلے جانے کے بعد آنحضورؐ نے فرمایا کہ یہ جبرائیلؑ تھے اور تمہیں اسلام کے معنی سکھانے آئے تھے۔

اسی طرح جبرائیلؑ آنحضورؐ اور صحابہؓ کے ساتھ ایک روز اول وقت میں نماز پڑھ کر اور دوسرے روز آخر وقت میں نماز پڑھ کر نمازوں کے اوقات بتا کر گئے

یہود جبرائیلؑ سے خوش نہیں تھے۔ اور انہیں اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔ اور عذاب کا فرشتہ کہتے تھے۔

قرآن میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"ان سے کہہ دو کہ جو کوئی جبرائیلؑ سے عداوت رکھتا ہو، اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ جبرائیلؑ نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیلؑ اور میکائیل کے دشمن ہیں۔ اللہ ان کافروں کا دشمن ہے" (۲: ۹۷-۹۸)

قرآن میں تین مختلف جگہوں پر جبرائیل کا نام آیا ہے۔ دو مرتبہ سورۃ بقرہ کی آیت ۹۷ اور ۹۸ میں اور تیسری مرتبہ سورۃ التحریم کی آیت ۴ میں۔ "اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں"

اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے باہم جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولیٰ ہے۔ اور اس کے بعد جبرائیل اور تمام صالح اہلِ ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔ (۶۶ : ۴)

قرآن میں باقی جگہوں پر جہاں بھی جبرائیل کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے صفاتی ناموں کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً

"اور عیسیٰؑ ابن مریم کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔" (۲ : ۸۷)

"جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی۔ میں نے روح پاک سے تیری مدد کی۔" (۵ : ۱۱۰)

"یہ تیرے رب کی نازل کردہ چیز ہے اسے لیکر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے۔" (۲۶ : ۱۹۲، ۱۹۳)

ان آیات میں روح القدس، روح الامین سے مراد جبرائیلؑ ہی ہیں۔

جبرتی، عبدالرحمٰن (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء - ۱۲۴۱ھ/۲۶-۱۸۲۵ء) بن حسن ایک بلند پایہ مورخ۔ جبرت میں ایک حنفی المذہب خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ خاندان زہد و تقشف میں نہایت اونچا مقام رکھتا تھا جبرتی کے کردار اور تصور حیات کے بنانے، سنوارنے میں سب سے زیادہ حصہ اس کے والد کا ہے۔ اپنے والد کے علاوہ جبرتی جن دوسرے لوگوں سے متاثر ہوا ان میں مرتضیٰ الزبیدی، حسن العطار اور اسماعیل الخشاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں مملوک کے عہد میں گوناگوں تفصیلی اور صحیح تاریخی ماخذ کی وہ فراوانی ہے کہ عالم اسلام کا کوئی دوسرا خطہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے برعکس مصر کے عثمانی دورِ حکومت میں اس قسم کے ہم عصر ماخذ کی بڑی کمی ہے جو خود اہلِ مصر نے تصنیف و تالیف میں کئے ہیں۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں تاریخ نگاری کا مصر میں کچھ احیاء ہوا۔

جبرتی نے اپنی وقائع نگاری کی ابتداء ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء سے کی ہے۔ اگرچہ اس عہد تک اس کی اسلامی اور مصری تاریخ میں معلومات بہت کم تھیں لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس نے ایک ایسے صوبے کی مقامی تاریخ تصنیف کی جو وسیع و عریض سلطنت کا حصہ تھا۔

"عجائب الآثار فی التراجم والاخبار" جبرتی کی سب سے بڑی تاریخی تصنیف ہے اس میں اس نے ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء سے ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء تک کی معلومات درج کی ہیں۔ اس کتاب کی پہلی تین جلدوں کو جبرتی نے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء سے لے کر ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تک آخری شکل دی۔ چوتھی اور آخری جلد اسی زمانے میں لکھی گئی۔ جس زمانے کا حال اس میں قلمبند ہے۔ یعنی ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تا ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں۔ جبرتی نے چونکہ محمد علی اور اس کی حکومت پر تنقید کی تھی۔ اس وجہ سے اس کتاب کی اشاعت ایک عرصے تک ممنوع رہی۔ اور کہیں ۱۸۷۰ء میں اس سے پابندی اٹھائی گئی۔ ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء میں یہ کتاب مکمل طور پر شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس پورے عہد کے لیے بے حد اہم ہے جس کا حال اس میں قلم بند کیا گیا ہے۔ جبرتی نے اس کے ابتدائی حصے میں جو عام تصویر پیش کی ہے۔ اس سے اس زمانے کی مصر کی نہایت واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ جس کا تعلق فرانسیسی قبضے اور محمد علی کی حکومت کے ابتدائی عہد سے ہے اس سے بہتر کوئی اور ماخذ نہیں ہے۔

جبرتی کی دوسری تصنیف "مظہر التقدیس بذھاب دولۃ الفرنسیس" کے نام سے ہے۔ اس میں اس دور کے حالات قلمبند ہیں۔ جب فرانسیسیوں کا مصر پر قبضہ تھا۔ یہ کتاب دو چھوٹی جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا دوبار ترکی زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ جبرتی کا تاریخ اسلام کے بارے میں علم اگرچہ بہت محدود تھا۔ نہ ہی اس کے کسی مسلم مورخ سے ذاتی روابط تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مصر اور خاص طور پر قاہرہ میں جو واقعات رونما ہوتے رہے ان کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کرنے میں اسے بہت سہولت حاصل تھی اس کے خاندان اور بالخصوص اس کے والد کے ممالیک اور آلِ عثمان کے حکمران طبقے اور علماء سے مختلف نوعیتوں کے نہایت گہرے تعلقات قائم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر اور قاہرہ میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح معلومات جبرتی کی تصانیف میں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے جبرتی کو ایک بہت بڑا مورخ مانا جاتا ہے۔ جسے اسلامی تاریخ نگاری میں ایک یکتا حیثیت حاصل ہے۔

جبر مسیحی حضرمت کے ایک عیسائی خاندان کا غلام۔ آنحضورؐ مروہ کے قریب جبر کے مکان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی حلاوت اور اس کے علوم کی نورانیت جب قلوب کی تسخیر کرنے لگی اور کفار نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرویدہ ہوتے جارہے ہیں اور کوئی تدبیر اسلام کی مخالفت میں کامیاب نہیں ہوتی تو انہوں نے طرح طرح کے افترا اٹھانے شروع کیے۔ کبھی آپ کو سحر بتایا۔ کبھی کاہن کے قصے اور کہانیاں کہا۔ کبھی یہ کہا کہ آنحضورؐ نے یہ خود گھڑ لیا ہے اور یہ طعن کوشش کی کہ کسی طرح لوگ اس کتاب مقدس کی طرف سے بدگمان ہوں۔ انہیں فتنہ انگیزیوں اور مکاریوں میں سے ایک مکر یہ بھی تھا کہ انہوں نے جبر مسیحی جو ایک عجمی غلام تھا کے بارے میں کہا کہ وہ آنحضورؐ کو قرآن سکھاتا ہے۔ اور آپ اس غلام کی باتیں سنکر اپنے الفاظ میں دہرا دیتے ہیں۔ نیز وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہمیں اپنا مذہب تبدیل کرنا پڑا تو ہم بھی دین اختیار کرلیں گے

جب قریش نے اس بات کو عام کرنا شروع کیا تو اللہ تعالے نے سورۃ نحل کی آیت ۱۰۳ میں ان کے اس الزام اور گمراہی کی تردید کی۔

"اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص آپ کو آیات سکھاتا ہے لیکن جس شخص کی جانب یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ واضح عربی زبان میں ہے۔" (۱۶ : ۱۰۳)

اللہ تعالے کی قدرت ہے کہ جس غلام کی طرف کفار مکہ یہ نسبت کرتے تھے اس کے دل کو بھی اس کلام کے اعجاز نے تسخیر کرلیا اور وہ بھی مشرف باسلام ہوگیا اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگا۔

جبر و قدر ابتدائے آفرینش سے جن مسائل نے عقلِ انسانی کو ورطۂ حیرت میں رکھا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ جبر و قدر بھی ہے۔ یعنی یہ کہ انسان اپنے ارادے اور فعل میں مجبور ہے یا مختار اور اگر مختار ہے تو کس حد تک۔ اگر اسے مطلق مختار تصور کریں تو یہ بات اللہ کی قدرت حاکمیت ارادیت اور ایمان والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالے کے منافی ہوگی۔ اور اگر انسان کو بالکل مجبور محض مانیں تو انبیاء کی بعثت اور جزا وسزا کا خیال اور ان کا جوابدہ ہونا باطل قرار پائے گا۔ اور مشرکین و کفار اپنے مذہب باطل کفر و شرک کی تائید میں تقدیر ازلی کو بطور حجت پیش کرکے اپنی معذوری ثابت کریں گے جیسا کہ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات میں اس کا اشارہ ملتا ہے۔

یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے

باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" (۶ : ۱۴۸)

یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" (۱۶ : ۳۵)

وہ بولا "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا۔" (۱۵ : ۳۹)

جبر و قدر کا مسئلہ ہمیشہ سے اہل مذہب اور اہل فلسفہ کے نزدیک معرکۃ الآراء رہا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف اقوام اور افراد نے اس بارے میں مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ عام طور پر انہوں نے اس مسئلے کی حل کی دو ہی صورتیں نکالی گئیں۔ یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی۔ اور دبے پاؤں اس راستے سے گذر گئے۔ یا اگر بحث چھیڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا۔ چنانچہ یہی جبر ہندو مذہب میں تناسخ، اواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ اور خدا کی مرضی کے پیرایہ میں ہے۔ یہودیوں کے مجموعہ تورات میں حضرت ایوبؑ کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے ــــ

دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا۔ خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔

قرآن حکیم میں اس مسئلہ کے متعلق اس قدر اہتمام ہے کہ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں اس کے متعلق پہلوؤں میں سے کسی نہ کسی پر روشنی ڈالی گئی ہو اور غالباً قرآن حکیم میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کو مشکل ترین تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ واقعات عالم کی شہادت اور قانونِ قدرت کے مطالعے سے جس قدر اس مسئلے کی صحت معلوم ہوتی ہے۔ شاید ہی کسی اور مسئلہ کی ہو۔

مسلمانوں میں جو لوگ انسان کے لیے اصلاً کسی اختیار کے قائل نہ ہوئے یا اسے مجبور محض سمجھتے تھے جبریہ کہلائے۔ اس کے برعکس جو انسان کو مختار کل اور اپنے افعال کا خالق سمجھتے تھے جیسے معتزلہ، امامیہ، زیدیہ وغیرہ قدریہ کہلائے۔

اہل جبر کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان بالکل مجبور ہے اور کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اس کی مثال بعینہٖ پتھر اور لکڑی کی سی ہے۔ اس خیال کے لوگوں کو اگر صحیح مان لیا جائے تو نتیجۃً شریعت کے تمام اوامر و نواہی کو باطل قرار دیا جائے اور ضرورت نبوت کو عبث تسلیم کیا جائے گا۔ اور افعال ذات باری کو حکمت و مصلحت سے عاری سمجھا جائے گا۔

اہل قدر کا مسلک یہ ہے کہ جس قدر افعال انسان سے سرزد ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ذات باری کو کسی قسم کا تعلق نہیں بلکہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے گویا اہل قدر نے قدر و ارادت ذاتِ باری کا انکار کر دیا اور اسے معطل قرار دیا۔

تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جبر و قدر کے ہر دو مذہب باطل ہیں اور صحیح مذہب جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے افراط و تفریط کے عین وسط میں واقع ہے۔ یعنی نہ تو مجبور محض ہے نہ قادر مطلق بلکہ انسان مشیت ازلی کے تابع ہو کر اپنی آزاد مرضی کا استعمال کرتا ہے اور اسی لیے وہ جوابدہ بھی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر ایک فعل کی جو انسان سے صادر ہوتا ہے دو جہت ہوا کرتی ہے۔ جہت اول کو تو ذات باری کی مشیت و قدرت سے تعلق دے سکتے ہیں۔ جس سے کمال صفاتِ باری تعالیٰ کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ یعنی آیت وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

اور ہر ذرہ کائنات میں مشیت ازلی مؤثر دکھائی دیتی ہے اور اسی مقام پر یہ راز کھلتا ہے کہ کوئی امر اللہ کے دائرہ علم و ارادت، حکمت و قدرت سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اس اعتقاد سے انسان کو اپنے عجز و ضعف کا علم ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے توفیق و عصمت کی استدعا کرتا ہے۔ جہت ثانی کے اعتبار سے فعل کو ارادہ انسانی کے ساتھ تعلق دیا جاتا ہے۔ جس سے انسان کی اس حالت اختیاری کا پتہ چلتا ہے جس کی رو سے وہ جوابدہ قرار پاتا ہے یعنی انسان کسبِ فعل میں خیر کو شر پر ترجیح دینے میں مختار من اللہ ہے۔ اس مقام پر آیت قرآنی لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اس عقیدے سے وہ اپنے مالک کی بارگاہ میں اپنے تئیں مجرم قرار دیتا ہے۔ اور اللہ کی طرف شر کی نسبت کرنے سے باز رہتا ہے

مذکورہ بالا ہر دو جہتوں کے ربط سے جو صحیح عقیدہ مسئلہ اختیار کے بارے میں حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خالق افعال ذاتِ باری ہے اور اکتساب فعل انسان سے صادر ہوتا ہے۔ یہی وہ درست عقیدہ ہے جس سے توحید، شریعت، عدل و حکمت کا ابطال لازم نہیں آتا قرآن حکیم کی آیات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح آیاتِ جبر کے ساتھ آیات قدر کو ربط دیا گیا ہے۔ اور ہر دو کے باہم ملانے سے مذکورہ بالا صحیح عقیدہ کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ وگرنہ اہل جبر نے آیاتِ جبر کو اپنے دعوے میں پیش کر کے آیات قدر میں تاویل کر لی اور اہل قدر نے آیات قدر کو اثبات دعوے میں پیش کر کے آیات جبر میں تاویل کر لی اور بجائے خود ہر دو مشِّ حق بن بیٹھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اختیار اور عدم اختیار کے ضمن میں ہم ربوبیت اور عبودیت کے اس ضروری ربط اور تعلق کے بغیر نہ تو قادر مطلق کی توحید کا مسئلہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی انسانی ہستی کی عظمت اور اس کی غایت کا مفہوم ہمارے ذہن میں آ سکتا ہے۔ اس مسلک اعتدال کی حقانیت قرآن حکیم کی آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے پناہ مانگتے ہیں) سے ثابت ہوتی ہے جس میں نہایت وضاحت کے ساتھ ہر دو مذہب باطل یعنی جبریہ و قدریہ کا رد ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایاک نعبد میں انسان نسبت فعل اپنی ذات کی طرف کرتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی ہستی کو چند فرائض کی بجا آوری کے معرض میں لاتا ہے۔ گویا اس نسبتِ فعل سے وہ اپنے تئیں جواب دہ قرار دیتا ہے لیکن وہ مکلف ہونے کی قابلیت رکھتا ہے اور یہی ایک امر اس کو دیگر جمادی اشیاء کی ہستی سے امتیاز بخشتا ہے۔ پس ایاک نعبد میں خالص جبر کا رد نہایت شدت سے ثابت ہوتا ہے۔ ایاک نستعین کی حقیقت میں فرقہ قدریہ کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ استعانت کی حقیقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسباب ضروریہ خارجیہ کا مہیا ہونا اللہ کی طرف سے ہے اور اسی کا نام توفیق الٰہی ہے چونکہ انسان اپنے فرائض کے انصرام کو توفیق الٰہی پر موقوف رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کی خود مختاری کا مسئلہ باطل ہوا۔ پس ہر دو جملے کے ملانے سے جو صریح مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے اور نہ ہی علی الاطلاق مختار کل۔ قرآن حکیم میں اس قسم کے سینکڑوں نظائر موجود ہیں جن سے مذکورہ بالا خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بنیادی حقائق درج ذیل ہیں۔

۱۔ سب کچھ مشیت ربانی سے ہوتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور کتب منزلہ اور فطرت انسانی اور عقول سلیم اور انسان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اس امر پر دال ہے کہ عالم کائنات میں کسی امر کے وجود اور عدم وجود کی حقیقی علت مشیت یا ارادہ الٰہی ہے تمام اہل اسلام اس اصل عظیم کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی کو اس میں انکار نہیں۔ نیز جب تک ارادہ الٰہی کو ہر امر کی علت نہ مانا جائے کسی شخص کو حقیقی توحید کی طرف راستہ نہیں مل سکتا۔ سورۃ التکویر کی آیت۔

"اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے (۸۱ : ۲۹) سے ظاہر ہے۔ اسی نقطہ نظر کی طرف حضورؐ کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے۔

لا تقولوا ما شاء اللہ و شاء محمدٌ و لکن قولوا ما شاء اللہ وحدہٗ

۲۔ اللہ تعالیٰ نے نیک اور بد دونوں راستے سمجھائے ہیں۔ چنانچہ نیک راہ پر چلنے والا نیک نتائج تک پہنچتا ہے اور برائی اختیار کرنے والا بد انجام حاصل کرتا ہے۔

"اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی ۔" (۹۱ : ۷، ۸)

"اور دونوں نمایاں راستے انہیں دکھا دیئے ۔" (۹۰ : ۱۰)

۳ ۔ حکمت کاملہ کے اسی طرح کے انتظام ہیں مثلاً اگر دنیا میں بالکل بدی نہ ہوتی تو نیک مخلوق انعام و صلہ کی مستحق نہ ہوتی ۔ اسی طرح اگر نیکی اور بدی دونوں ہوتیں مگر بدی کا نتیجہ برا نہ ہوتا تو پھر بھی نیکی اور بدی میں تفاوت نہ ہوتا اور کامل عدل کے بالکل منافی ہوتا کہ نیک اور بد کو یکساں صلہ دیا جائے ۔

۴ ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کیفیت میں ترقی کی قابلیت ودیعت کی ہے نیک اور بد دونوں کیفیتوں میں توفیق من جانب اللہ ہے ۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی ۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی ، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے ۔" (۱۳ : ۱۱)

"پھر جب انہوں نے ٹیڑھا اختیار کی تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے ۔ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا ۔" (۶۱ : ۵)

۵ ۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کا حکم دیا اور بدی سے منع فرمایا اور اسی مقصد کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے ۔

"اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو ۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی ۔" (۱۶ : ۳۶)

۶ ۔ اللہ تعالیٰ کامل العلم ہے ۔ اسے کائنات اور موجودات کے ہر ذریعے کے متعلق مکمل علم ہے اور جو واقعہ پیش آنے والا ہے سب اس کی لوح علم پر منقوش ہے ۔

"یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا اور کون سیدھے راستے پر ہے ۔" (۵۳ : ۳۰)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو ۔" (۵۷ : ۲۲)

۷ ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت فیصلہ عطا کی ہے ۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات کے افعال ان کی فطرت میں داخل ہیں لیکن انسان کی فطرت میں بجائے افعال کے قوت فیصلہ کو داخل کیا گیا ہے ۔

جس کو کام میں لا کر وہ جداگانہ راستے انتخاب کرتا ہے ۔ یہی وہ قوت فیصلہ خدا کی امانت ہے جو آسمان و زمین کی کسی مخلوق کو نہیں دی گئی اور اسی کے سبب وہ اپنے افعال کا فاعل سمجھا جاتا ہے ۔

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے ۔ مگر انسان نے اسے اٹھا لیا ، بیشک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے ۔" (۳۳ : ۷۲)

نتیجتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ہر چیز اللہ کی قدرت مشیت اور علم و حکمت سے ہے لیکن ان تمام مجبوریوں کے باوجود انسان میں چونکہ قوت فیصلہ ودیعت کی گئی ہے اس لیے اس کو پتھر یا حیوان کی طرح مجبور ماننا بھی ناانصافی ہوگی ۔ اور جو حکم اس کو نیکی کی طرف جانے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ اس کو تکلیف مالایطاق کہنا بھی غلط ہوگا ۔ اور دوسری طرف انسان کو ہر امر میں مطلق العنان اور کامل آزاد قرار دینا بھی ان تمام قوانین قدرت سے چشم پوشی کرنا ہے ۔ جو اسے چاروں طرف سے محیط ہیں ۔ غرضیکہ جبر و اختیار کے بین بین حالت ہی وہ صداقت ہے جو واقعات عالم کی شہادت اور فطری مذہب کی تعلیم سے قابل یقین ثابت ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

"ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو ہر ایک کا حال ٹھیک ٹھیک بتا دینے والی ہے ۔ اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۔" (۲۳ : ۶۲)

"اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے ۔" (۱۸ : ۲۹)

لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا ، اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے ۔" (۳۹ : ۷)

"یہ تو ایک نصیحت ہے ، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرے اور یہ کوئی سبق حاصل نہیں کریں گے ۔ الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے ۔ وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے ۔ اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ) کرنے والوں کو بخش دے ۔" (۷۴ : ۵۵، ۵۶)

جیسا کہ قرون وسطیٰ اور عہد عتیق کے فلسفیوں کو اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ جدید مفکرین کو بھی اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا ۔ (نیز دیکھئے "تقدیر" ، "جبریہ")

جبریہ

وہ فرقہ جو انسان کو مجبور محض مانتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے ۔ انسان بذات خود کچھ نہیں کر سکتا ۔ ان کے عقیدے کے مطابق چونکہ ہر شے امر الٰہی کے تابع ہے اس لیے کوئی شے انسانی ارادے سے بدل نہیں سکتی ۔ چنانچہ اس مذہب کی رو سے بندوں کے افعال ان کے اپنے ارادوں کے تابع نہیں بلکہ وہ طوعاً و کرہاً ارادہ الٰہی سے وابستہ ہیں ۔ گویا بندوں سے سرزد ہونے والے افعال درحقیقت افعال الٰہی ہیں ۔ جبریہ مذہب قدریہ مذہب کی عین ضد ہے ۔

اس فرقے کی بنیاد جہم بن صفوان (م ۱۲۸ھ / ۷۴۵ء) نے رکھی ۔ اس کے مخالف فرقے قدریہ یعنی معتزلہ انسان کو مختار مطلق مانتے ہیں ۔ اشعریوں کے نزدیک انسان کچھ مختار ہے اور کچھ مجبور ۔ معتزلہ اشاعرہ کو بھی جبریہ ہی کہتے ہیں ۔

اہل سنت اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں کے اختیاری اور غیر اختیاری سارے افعال اللہ کی طرف سے معرض وجود میں آتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے بخشے ہوئے ارادہ جزئیہ کو ہر کام میں صرف کر سکتے ہیں ۔ یہ بات جبریہ کے عقیدے کے خلاف ہے ۔

جبریہ کا ایک فرقہ جو جبریہ خالصہ کے نام سے موسوم ہے ۔ تمام جبر کا قائل ہے ۔ ان کے نزدیک انسان اور جمادات کے مابین کوئی فرق نہیں ۔ دوسرا فرقہ جبریہ متوسطہ کہلاتا ہے ۔ جو اس بات کے تو قائل ہیں کہ بندے میں قدرت ہے مگر یہ نہیں مانتے کہ یہ قدرت فعل پر کوئی تصرف کر سکتی ہے ۔

بخاریہ ، فراریہ اور کلابیہ بھی اسی فرقے میں شمار ہوتے ہیں ۔ مغربی فلاسفہ کا ایک گروہ بھی جبر کا قائل ہے ۔ چنانچہ یونانی مفکر کے خیال کے مطابق کائنات کی ہر چیز قدرت کے ماتحت ہے اور اس سے انحراف نہیں کر سکتی ۔ برطانوی فلسفی ہابس کا نظریہ ہے کہ کائنات اور انسان کی ہر حرکت قانون اسباب کے ماتحت ہے ۔ نفسیات کے علماء کا خیال بھی یہی ہے کہ انسان اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے بلکہ ذہنی اور جسمانی حالات اس کے ارادے اور عمل کو جس رخ چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں ۔ (نیز دیکھئے "تقدیر" ، "جبر و قدر" ، "قدریہ")

جبل الطارق

جبرالٹر ۔ ہسپانیہ کے صوبہ قادس کے جنوب مغرب میں ہسپانیہ کی انتہائی جنوبی حد پر ایک برطانوی نوآبادی جو سطح سمندر پر ابھرتی ہوئی ایک پہاڑی پر واقع ہے ۔ اس کا کل رقبہ ۲/۱ ۲ مربع میل ہے ۔ ہسپانیہ کے قطعہ زمین سے ایک

ایک ریگستانی ٹکڑے کے ذریعے منسلک ہے۔

جبل الطارق کو ہر دور میں بحیرہ روم کی کلید کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس وجہ سے ہر دور میں اس کے استحکام پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔

زمانہ قدیم میں اسے قادس ہرکیولیم (HERCULEUM) کہا جاتا تھا۔ عرب اسے خلیج الزقاق کہتے ہیں۔

اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ۹۲ھ/۷۱۱ء میں طارق بن زیاد اس کے ساحل پر اترا تھا۔ اور اس کو فتح کیا۔ اس کا دوسرا نام جبل الفتح ہے۔ جبرالٹر جبل الطارق ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

عربوں کے عہد حکومت میں جبل الطارق کی بندرگاہ شہر اور قلعہ جو موروں نے بنایا تھا۔ جہازوں کے لئے ایک محفوظ مستقر کا کام دیتا رہا۔

جب خلیفہ عبدالمومن الموحد اپنی افریقی مہم (۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء تا ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) سے واپس آیا تو اس نے اپنے بیٹے یوسف عامل اشبیلیہ کو جبل الطارق میں ایک نیا شہر بسانے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ شہر قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ پر ہونے والے حملوں کا مقابلہ کر سکے اور زبردست لشکر کشی کے لئے ایک مستقر اور محل اجتماع کا کام دے تاکہ وہاں فوجیں ٹھہرائی جا سکیں۔ چنانچہ ایک خوبصورت شہر جس میں ایک جامع مسجد اور خلیفہ کے لئے ایک محل تعمیر کیا گیا۔ المومن نے ۵۵۵ھ/نومبر ۱۱۶۰ء میں نئے شہر کا معائنہ کیا اور اس کا نام مدینۃ الفتح رکھا۔ ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں فرڈیننڈ چہارم نے شاہ قشتلہ کے لئے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء میں مراکش کے بنو مرین نے اسے فتح کر لیا۔ بعد میں غرناطہ کے ناصری سلطان یوسف ثالث نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کا قبضہ ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء سے ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء تک رہا۔ بالآخر ۲۰ اگست ۱۴۶۲ء کو مدینہ شدونہ کے ڈیوک قزمان نے ہنری چہارم شاہ قشتلہ کے لئے اسے فتح کیا۔ ۱۴۶۲ء سے ۱۵۰۲ء تک جبل الطارق قزمانوں کی موروثی جاگیر رہا۔ اور بعد میں دوبارہ بادشاہ کی ملکیت میں آگیا۔ ۱۷۰۴ء میں ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی کے موقعہ پر امیر البحر سر جارج روک نے اس پر قبضہ کر کے اسے برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ بعد میں اسے کئی محاصروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں ۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۳ء کا محاصرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس میں جبل الطارق نے جنرل ایلیٹ کے ماتحت ہسپانیہ اور فرانس کے محاصرے کا مقابلہ کیا۔

۱۰ ستمبر ۱۹۶۷ء میں جبل الطارق کے باشندوں کو موقعہ دیا گیا کہ آیا وہ برطانیہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا سپین کے اقتدار کے تحت آنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے برطانیہ کے ساتھ الحاق کو ترجیح دی۔

جبل الطارق ایک اہم بحری اڈہ ہے۔ ۱۹۷۳ء میں اس کی کل آبادی ۲۹۹۲۷ تھی جو برطانوی، یہودی اور مراکشی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اس تعداد میں برطانوی حکومت کا حفاظتی دستہ بھی شامل ہے۔

جبلہ شام کے ساحل پر ایک بندرگاہ جو جزیرہ رواد کے مقابل واقع ہے فنیقیوں کے زمانے میں یہ شہر ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈوریوں کی نوآبادی کا قیام عمل میں آیا۔ رومیوں کے عہد حکومت میں یہ شہر بہت خوشحال تھا۔ زرعی پیداوار کی کثرت تھی۔ ۱۷ھ/۶۳۸ء میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے اس شہر کو فتح کر کے اس کی قلعہ بندیاں مسمار کر دیں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کے دفاع کا نئے سرے سے انتظام کیا۔ اور ایک فصیل بھی تعمیر کرائی۔

جب چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں بزنطیوں کو دوبارہ طاقت حاصل ہوئی تو انہوں نے اس شہر پر دو مرتبہ قبضہ کیا۔ پہلی بار ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں دوسری بار ۳۶۴ھ/۹۷۵ء میں۔ ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں یہ شہر پھر سے جند حمص کا حصہ بن گیا۔ ۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء میں ابن صُلَیحَہ نے بزنطیوں کو اس علاقے سے نکال باہر کیا اور یہ شہر ایک بار پھر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ ۴۹۴ھ/۱۱۰۱ء میں قاضی ابن صلیحہ نے اسے طغتگین کے جو دمشق کا اتابک تھا حوالے کر دیا لیکن تھوڑے سے دنوں بعد دمشقی دستے کو شہر سے نکلنا پڑا۔ اور اس مرتبہ اس پر طرابلس کے بنو عمار کا قبضہ ہوگیا۔

جبلہ ۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء میں صلیبیوں کے ہاتھ آگیا۔ جنہوں نے یہاں پر ایک رومی اسقفیت قائم کی اور یہاں کی تجارت اہل جنیوا کے سپرد کر دی۔ ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں اہل جبلہ کی دعوت پر صلاح الدین نے اس شہر کا رخ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح جبلہ الظاہر کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۲۸۵ء تک یہ شہر صلیبی جنگجوؤں اور فوجی طرز کے پادریوں کی جماعت کے درمیان وجہ نزاع بنا رہا۔ ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاؤن نے اسے فتح کر کے نیابت حماۃ میں شامل کر لیا۔ مملوک عہد میں یہ شہر خوشحال تھا۔ اور صوفی ابراہیم بن ادھم کی زیارت کے لئے آنے والوں کی وجہ سے اسے بہت رونق حاصل تھی۔ ۱۵۱۶ء سے چار سو سال تک جبلہ پر عثمانیوں کی حکمرانی رہی۔

موجودہ دور میں جبلہ کی حیثیت ایک قصبے کی ہے۔ یہاں کے آثار قدیمہ اس کی سابقہ شان و شوکت کی داستان بیان کرتے ہیں۔

جبلہ بن ایہم بنو غسان کا آخری بادشاہ۔ سلطنت غسان عرب اور شام کے درمیان عربوں کی ایک ریاست تھی جو قیصر روم کی باجگزار تھی۔ اس نے مسلمانوں سے بزنطی لشکر کے ساتھ مل کر دو لڑائیاں لڑیں۔ ایک دومۃ الجندل اور دوسری یرموک لیکن دونوں میں شکست کھائی۔ جنگ یرموک ۱۵ھ/۶۳۶ء میں جبلہ بزنطی لشکر کے ساتھ مسلمان عربوں کے خلاف لڑا۔ شکست کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ بڑے شاہانہ کر و فر کے ساتھ اسلامی دار الخلافہ میں آیا۔ جہاں اس کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ ایک روز کعبہ کا طواف کرتے ہوئے جبلہ کے شاہی چوغے پر ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا۔ جبلہ نے اس بدو کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ جس سے اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ بدو حضرت عمرؓ کی عدالت میں حاضر ہو کر انصاف کا طالب ہوا۔ حضرت عمرؓ نے جبلہ کو بلا کر پوچھا "تم نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو کیوں مارا۔؟" جبلہ نے جواب دیا۔ "اس نے میری توہین کی۔ اگر وہ متبرک جگہ پر نہ ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔" حضرت عمرؓ نے کہا۔ "یہ الفاظ تمہارے جرم کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا یا تم بدو سے معافی مانگو یا مقررہ سزا بھگتو۔" جبلہ نے کہا "لیکن میں بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی آدمی" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "شاہ ہو یا گدا تم دونوں مسلمان ہو اور اسلام کی نظر میں سب برابر ہیں۔" جبلہ نے درخواست کی کہ سزا کل تک کے لئے موقوف رکھی جائے۔ بدو کی رضامندی سے یہ درخواست منظور ہوئی۔ مگر جبلہ نے رات کی تاریکی میں راہ فرار اختیار کی اور قسطنطنیہ پہنچ کر دوبارہ عیسائی ہوگیا۔

جبوتی ایک شہر اور بندرگاہ جو خلیج عدن کے افریقی ساحل پر خلیج تجرہ کے دہانے پر واقع ہے۔ یہ علاقہ فرانس کو مارچ ۱۸۸۵ء میں عیسے کے مقامی مشاہیر نے دیا تھا جو صومالی بولنے والا ایک قبیلہ تھا۔ یہ شہر اور بندرگاہ فرانس ہی کی تعمیر شدہ ہے۔ شہر کی بنیاد گورنر لے گارڈ نے ۷ مارچ ۱۸۸۸ء میں رکھی۔ ۱۸۹۶ء میں اس نے فرانس کی خلیج عدن کی بستی کے بڑے شہر اُبک کی جگہ لے لی۔ اور ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ تھوڑے سے عرصے بعد ہی اس بندرگاہ کے سامنے زیلع اور تجرہ کی بندرگاہیں ماند پڑ گئیں اور یہ جنوبی حبشہ کے مال کے برآمد کرنے کا مقام بن گیا۔ چونکہ اس میں گہرے

پانی کی چند گودیاں موجود ہیں۔ اس لیے یہ افریقہ کے مشرقی ساحل کی اول درجے بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ جبوتی جمہوریہ فرانس کے زیر اقتدار ہے ۲۳ جون ۱۹۵۶ء کے قانون کی رو سے ۱۹۵۷ء سے یہ ایک گورنر کی نگرانی میں ہے۔ جو حکومتِ فرانس کا ایک نمائندہ ہوتا ہے لیکن ۱۹۷۷ء میں جبوتی کو باقاعدہ آزاد مملکت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور وہاں کا باشندہ سربراہ مملکت ہے۔ ۱۸۹۷ء میں فرانسیسی، حبشہ ریلوے کا کام شروع کیا گیا جو ۱۹۱۷ء میں مکمل ہوگیا۔ یہ ریلوے جبوتی کو حبشہ کے دارالحکومت ادیس ابابا سے ملاتی ہے۔

۱۹۶۶ء میں اس شہر کی آبادی ستر ہزار کے قریب تھی۔ جن میں صومالی، گدبورسی ہبراول، الیساق اور دارود تھے۔ ایک چوتھائی غیر ملکی ہیں۔ عربوں کی بھی ایک خاص تعداد موجود ہے۔ بیشتر تجارت عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ اکثریت کی زبان عربی ہے

جبوتی کا قاضی عربی الاصل ہوتا ہے جو اس علاقے کا مذہبی سربراہ ہے۔ یہاں کی آبادی کی اکثریت شافعی المذہب ہے۔ تصوف میں جبوتی اور قادریہ سلسلے مقبول ہیں عبدالقادر جیلانیؒ کے علاوہ بہت سے مقامی اور غیر مقامی اولیا کی تقریباً ہر جگہ تقدیس و تکریم کی جاتی ہے۔

جبوتی میں آٹھ جامع مساجد ہیں جو پختہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں اور یہ مساجد چھوٹے چھوٹے قبیلوں نے اپنے تاریخی بزرگوں کے نام سے موسوم کر رکھی ہیں۔

جبیرؓ بن مطعم (؟ — ۵۷ھ/۶۷۶ء) صحابیؓ۔ کنیت ابومحمد قریش سے تھے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل بن عبدمناف قرشی نوفلی۔

جبیر کے والد مطعم قریش کے نرم دل اور خدا ترس لوگوں میں سے تھے۔ آنحضورؐ کو ان کی وجہ سے ابتدائی زندگی میں بہت زیادہ مدد ملی۔ جب کہ آپ چاروں طرف سے مصائب و آلام سے گھرے ہوئے تھے۔ جب قریش مکہ کو آنحضورؐ کو تبلیغ سے روکنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو آپس میں معاہدہ کر کے بنو ہاشم کا مقاطعہ کر دیا اور اس عہد نامے کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے قریش کی دوسری شاخوں کا میل جول بنی ہاشم کے ساتھ ممنوع ہو گیا تھا۔ اس لیے بنی ہاشم شعب ابی طالب میں چلے گئے اور تین سال تک اس قید میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اس پوری مدت میں شعب ابی طالب پر باہر قریش کا پہرہ رہا۔ اور کھانے پینے کی کوئی چیز شعب ابی طالب تک نہ جانے پاتی تھی۔ لیکن ایسی شقی القلب لوگوں میں کچھ نرم دل بھی تھے جو کھانے پینے کی چیزیں چوری چھپے اندر بھیج دیا کرتے تھے۔ بعد میں کچھ منصف مزاج لوگوں نے اس ظالمانہ معاہدے کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اس کو چاک کر ڈالا۔ ان صدائے احتجاج بلند کرنے والوں میں ایک مطعم بھی تھے۔

جبیر اسی منصف مزاج اور نرم دل باپ کے بیٹے تھے۔ لیکن قومی عصبیت قبول حق کے مانع آئی تھی۔ مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جب بدر کے مقام پر پہلا معرکہ ہوا تو جبیر اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ البتہ اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لئے آئے۔ جب جبیر مسجد میں داخل ہوئے تو آنحضورؐ نماز میں مصروف تھے اور سورۃ طور کی آیات تلاوت فرما رہے تھے۔ جبیر نے جب کلام اللہ کی آیات سنیں تو خود کہتے ہیں کہ میں اس قدر متاثر ہوا کہ معلوم ہوتا تھا میرا قلب پھٹ جائے گا۔

جب آنحضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں گفتگو کی۔ آپؐ نے جبیر کے والد کے احسانات کو یاد کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا اور وہ سفارش کرتا تو میں چھوڑ دیتا۔

غزوہ بدر کے مقتولین کا انتقام غزوہ احد کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں تمام مشرکین نے بقدر استطاعت حصہ لیا۔ جبیر نے بھی اپنی طرف سے اپنے غلام وحشی کو بھیجا اور کہا کہ اگر تم حمزہ کو قتل کر دو گے تو تم آزاد ہو جاؤ گے۔ چنانچہ حضرت حمزہ اسی وحشی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جبیر نے صحیح روایت کے مطابق صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی زمانے میں اسلام قبول کیا۔

قبول اسلام کے بعد غزوہ حنین میں شرکت کی۔ حنین کی واپسی کے وقت آپ آنحضورؐ کے ساتھ تھے۔

آنحضورؐ کی وفات کے بعد ایک عرصے تک زندہ رہے لیکن بہت کم نظر آتے تھے۔ اولاد میں دو لڑکے محمد اور نافع چھوڑے۔

اگرچہ حضرت جبیرؓ کو آنحضورؐ کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع بہت کم نصیب ہوا لیکن کافی احادیث آپ کے حافظہ میں محفوظ تھیں۔ آپ سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد ساٹھ ہے جن میں سے چھ متفق علیہ ہیں۔

علم الانساب کے بہترین حافظ تھے اور اس کو اس فن کے سب سے بڑے ماہر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حاصل کیا تھا۔ اس لیے ان کا شمار قریش کے ممتاز نسابوں میں تھا۔ حضرت عمرؓ کو جب نسب کی تحقیقات کی ضرورت پیش آتی تھی تو جبیرؓ ہی سے تحقیقات کرتے تھے

حضرت جبیرؓ میں حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اگرچہ قریش کی ایک ممتاز شاخ کے رکن اور سردار قریش میں سے تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کبر و نخوت نام کو نہ تھی۔ اور ان کا قریش کے حلیم ترین اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔

جُبَیل خلیج فارس کے کنارے سعودی عرب کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ جو [illegible] سے مشہور ہے۔ جبیل درب الکنجدی کے شروع میں واقع ہے جو ریاض کو جانے والی ایک کاروانی گذرگاہ اور موٹر کا راستہ ہے۔

قبیلہ آل بوعینین کے افراد دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مقام پر ان کے جد [illegible] بن دارم آباد ہوئے تھے اور اس کا عینین نام وہاں کے دو چشموں کے [illegible] تھا۔ ایک روایت کے مطابق کسی وقت یہاں پر قبیلہ عبدالقیس بھی سکونت پذیر تھا۔

اوائل اسلامی عہد میں یہ علاقہ اپنے کھجور کے درختوں کی وجہ سے خوب مشہور تھا [illegible] شہر ۱۳۲۲ھ/۱۹۱۱ء کے قریب آل بوعینین کے افراد سے آباد تھا۔ جو ایک مقامی جھگڑے کی بنا پر ترک حکام کی اجازت سے قطر سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ یہ لوگ [illegible] تھے اور صدف گیری یا دوسرے پیشوں سے گذر بسر کرتے تھے۔ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء [illegible] سلطان عبدالعزیز السعود نے الحسا فتح کیا تو جبیل سعودی حکومت میں شامل ہو گیا [illegible] ۱۹۱۵ء کے صلح نامے کی رو سے جب برطانیہ نے سلطان عبدالعزیز کا قبضہ تسلیم کر لیا [illegible] طور پر سعودی عرب کا علاقہ سمجھا جانے لگا۔ [illegible] جبیل [illegible] جانے والے سامان کے لئے ایک درآمدی بندرگاہ بن گئی۔

دمام میں بندرگاہ، ریل اور سڑکوں کا مرکز بن جانے سے [illegible] تو اس کی اہمیت کم ہو گئی۔

یہاں کی آبادی اندازاً آٹھ، نو ہزار کے قریب ہے۔

جُبَیلہ وادی حنیفہ کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں جو عیینہ اور درعیہ کے درمیان نجد میں واقع ہے۔

وادی حنیفہ کے دائیں کنارے جو ٹیلے موجود ہیں وہ مقامی روایات کے مطابق قبور [illegible] بتلاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضورؐ کے ان صحابہ کی قبریں ہیں جو [illegible]

زوال میں شہید ہوئے تھے۔

ابن بشر کے بقول "جبیلہ ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں آل یزید کے قبضے میں تھا۔ جس پر موسیٰ بن ربیعہ بن مانع مریدی نے جو السعود کا ایک جد امجد تھا حملہ کر دیا اور جلد ہی اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ جبیلہ اور عقربا کا ذکر بطور میدان کارزار بار بار کرتا ہے جہاں آل سعود کی ترقی پذیر طاقت اور العنسا کے بنو خالد کے بارسوخ امراء کے درمیان ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء اور ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں معرکے ہوتے رہے۔

یہ علاقہ ریاض سے حجاز جانے والی دو شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہے۔ ان میں سے ایک سڑک اس پتھریلے ملک میں سے چکر کاٹتی ہوئی گزرتی ہے جو وادی حنفیہ کے مشرقی کنارے اور ریاض کے درمیان واقع ہے اور دوسری سڑک وادی حنفیہ کے ساتھ ساتھ جبیلہ تک چلی گئی ہے۔ انھی سڑکوں کے ذریعے اس قصبے کو ریاض تک عقربا کے باغ کی پیداوار فروخت کرنے کے لیے رسائی ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ایک نئی سڑک تعمیر کی گئی ہے جو ریاض سے جنوب مشرق کو شعب لحا پر واقع بازو سے توئیق کو جاتی ہے۔

جدہ بحر احمر پر سعودی عرب کا ایک شہر اور حجاز کی سب سے بڑی بندرگاہ اور مکہ آنے والے حجاج کے لیے سب سے بڑی اترنے کی جگہ جو مکہ سے تقریباً ۴۶ میل دور ۲۱ درجے ۲۹ دقیقہ شمال میں اور ۳۹ درجے ۱۶ دقیقے مشرق میں واقع ہے اور پختہ سڑک کے ذریعے ۷۳ کلو میٹر اور مدینہ منورہ سے ۴۱۰ کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔

اس شہر کو حقیقی شہرت اور اہمیت اس وقت نصیب ہوئی جب ۲۶ھ/۶۴۶ء میں حضرت عثمان نے پرانی بندرگاہ شعیبہ کی جگہ جدے کو مکے کی بندرگاہ قرار دیا۔ اسلامی دنیا کا مرکز اور قبلہ ہونے کی وجہ سے مکہ ایک بڑا تجارتی شہر بن گیا اور سامان تجارت دور دراز کے راستے مصر اور ہندوستان سے آنے لگا۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں یہ ایک خوشحال شہر تھا اور یہاں سے حاصل ہونے والا محصول حجاز کے حکمرانوں کی آمدنی کا اہم ذریعہ تھا۔ بقول ناصر خسرو پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں اس کی فصیل نہیں تھی۔ مردوں کی آبادی پانچ ہزار تھی اور شریف مکہ کا ایک غلام یہاں پر حکمران تھا۔ جس کا سب سے بڑا کام محاصل کی وصولی تھا۔ ابن جبیر نے چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے جدے کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ اس میں گھاس پھونس کے جھونپڑے ہیں، پتھر کی بنی ہوئی سرائیں اور مسجدیں ہیں وہ صلاح الدین کی تعریف کرتا ہے کہ اس نے وہ محاصل ختم کر دیئے تھے جو شریف مکہ وصول کرتے تھے۔

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد تجارت کا رخ بصرے سے جدے کی طرف مڑ گیا۔ مصر سے بحری جہاز سونا، معدنیات اور یورپ سے اونی کپڑا لے کر جدے میں ان جہازوں سے ملتے تھے جو ہندوستان سے چاول، شکر، چائے، غلہ، قیمتی پتھر اور عطریات وغیرہ لے کر آتے تھے۔ جدے کو اس سامان تجارت پر دس فیصد محصول حاصل ہوتا تھا ۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء کے بعد مصر کے مملوک سلاطین نے محاصل کی وصولی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح جدہ مصر کا ایک طرح سے دست نگر ہو گیا۔

۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں جب پرتگیزوں کی مشرقی سمندروں میں آمد شروع ہوئی اور مسلمان جہاز رانوں پر انھوں نے جو حملے کیے اس سے جدہ کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ جس کا مقابلہ مملوک سلاطین نے اور پھر عثمانی خلفاء نے بڑی ہمت سے کیا۔ حسین الکردی نے جو مملوک سلطان قانصوہ الغوری کی طرف سے جدے کا گورنر تھا۔ ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تیار کرائی۔

۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں لوپو سوارس مملوک بحری بیڑے کا تعاقب کرتا ہوا جدے کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا لیکن مضبوط دفاعی انتظامات کی وجہ سے شدید حملہ نہ کر سکا۔

۹۴۸ھ/۱۵۴۱ء میں پرتگیزوں نے جدے پر قبضہ کرنے کی آخری ناکام کوشش کی جس کا شریف البرکات نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سلطان سلیمان نے اس کامیاب دفاع کے صلے میں اسے جدے سے وصول شدہ رقم کا نصف دیا۔

جدے کی تاریخ میں گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی تک کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں جدہ کئی انقلابات سے گزرا۔ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں وہابیوں نے شریف غالب کو جدے میں محصور کر دیا۔ لیکن وہ شہر پر قابض نہ ہو سکے بالآخر شریف غالب نے ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء تک جدہ پر وہابیوں کا قبضہ رہا۔ یہاں تک کہ محمد علی پاشا نے جدہ پر عثمانیوں کی سیادت قائم کر دی۔ بقول برکہارٹ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۵ء میں جدے کی آبادی ۱۲ ہزار تا ۱۵ ہزار تھی۔ جس میں اصل باشندے بہت کم تھے جبکہ یمن و حضرموت کے غیر ملکی لوگ زیادہ نظر آتے تھے۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں جدہ براہ راست باب عالی کے تحت آ گیا۔ ۳ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ/۱۵ جون ۱۸۵۸ء میں جدے میں ایک خونریز ہنگامہ ہوا۔ جس میں بہت سے آدمی مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں غیر ملکی بھی تھے۔ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں جب شریف حسین نے عربوں کی خود مختاری کا اعلان کیا تو جدہ پہلا شہر تھا جس پر اس کا قبضہ ہوا۔ عربوں کی بغاوت کے دوران میں شریف کی فوجوں کے لیے جو ترک افواج سے برسر پیکار تھیں جدہ سب سے بڑا رسدگاہ تھا۔ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ/اکتوبر ۱۹۲۴ء میں سعودیوں کا مکے پر قبضے کے بعد جدہ علی بن الحسین کا دارالحکومت بن گیا۔ اس دوران میں جدہ شریفوں اور وہابیوں کے مابین اقتدار کے لیے رسہ کشی کا مرکز بنا رہا۔ جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ/جنوری ۱۹۲۵ء سے مسلسل ایک سال کے لیے وہابی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کیے رکھا۔ آخر کار جمادی الآخر ۱۳۴۴ھ/دسمبر ۱۹۲۵ء میں شہر پر وہابیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء میں عبدالعزیز بن سعود اور گلبرٹ کلیٹن نے جدے میں باہمی ملاقات کی جس کے مطابق برطانیہ نے سلطنت آل سعود کی مطلق اور مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا۔

انتظامی طور پر یہاں ایک قائم مقام حکومت کرتا ہے جو گورنر مکہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ شہر کی ایک منتخبہ میونسپل کمیٹی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جدے کی تجارت بڑے زوروں پر ہے۔ ۱۹۴۶ء - ۱۹۴۷ء میں شہر کی فصیل گرا دی گئی اور شہر کو زمین ہموار میں پھیلا دیا گیا۔ مشرق میں مکے کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ شمال میں مدینے کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ اور جنوب میں بندر والی سڑک کے ساتھ ساتھ شہر کے پرانے حصے میں قدیم عمارات کو گرا کر سرکاری دفاتر کے لیے عمارات تعمیر کرائی گئی ہیں۔

جدہ اپنی بین الاقوامی نوعیت کی آبادی کے لیے مشہور ہے۔ جدے کی بڑی بڑی عمارات میں کسٹم ہاؤس، میونسپلٹی کے دفاتر، حکومت کے دفاتر وغیرہ ہیں شہر کے جنوبی کنارے پر ایک جدید طرز کی بندرگاہ ہے۔ جس میں دو نشست والا ایک ہزار تین سو فٹ لمبا پشتہ ہے۔ اس بندرگاہ میں آٹھ لاکھ ٹن سالانہ کے حساب سے سامان تجارت اتارا اور چڑھایا جاتا ہے۔ شہر میں ایک مرکز صحت ایک ہسپتال ایک طبی امتحان گاہ اور دو دارالحجاج موجود ہیں۔ جن میں ایک پشتے سے ملحق ہے اور دوسرا ہوائی اڈے جدہ حاجیوں کے لیے سرکاری ہوائی اور بحری اڈا ہے۔ جہاں وہ مکہ جاتے ہوئے اترتے ہیں۔

یہاں پر کئی ایک ہلکی صنعتیں قائم ہیں۔ جن میں سیمنٹ کے کارخانے اور سنگ مرمر کاٹنے کے کئی ایک کارخانے قائم ہیں۔

جدیدہ مراکش کا ساحلی شہر جو بحر اوقیانوس پر وادی ام الربیع کے دہانے سے ۱۱ کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔

آج کل مازگان کی پرانی بستی کو اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ محض ایک بندرگاہ تھی جہاں جہاز اکثر آتے جاتے تھے۔ تمام قرون وسطیٰ میں بھی بظاہر یہی صورت رہی۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے البکری نے مازگان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی توثیق چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں کی ہے۔ اس جگہ کا یہی نام دوبارہ ایک مخطوطے میں وارد ہوا ہے جو مقام ازمور کے ایک نامور ولی مولائی ابوشعیب سے متعلق سبق آموز محاضرات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں مازیغان مچھلی والوں کی ایک بستی کا نام بتایا گیا ہے جو ازمور اور رباط تیط کے درمیان واقع تھی۔

اس بندرگاہ سے نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی سے دکالہ کا غلہ بھر کر مازگان کی بندرگاہ سے اپنے صدر مقام کی رسد رسانی کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء میں جارج ڈی میلو نے پرتگال واپس آکر مازگان میں اپنے خرچ سے ایک قلعہ بنانے کی شاہی اجازت حاصل کی۔ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں جارج ڈی میلو کو اس قلعے کی سرداری عطا کی گئی۔ لیکن ۱۵۱۲ء میں یہ قلعہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ ۱۵۱۴ء میں دو معماروں کی زیر ہدایت ایک چوکور قلعہ وہاں پر تعمیر کیا گیا۔ اس کے بازوؤں پر چہار گوشہ برج بنائے گئے۔ ان میں سے ایک برج وہی قدیم تھا جو بریجہ کے نام سے مشہور تھا۔ موجودہ باشندے پرتگیزی قصبے کا ذکر اسی نام سے کرتے ہیں۔ ۱۵۴۱ء میں اسے مال خانہ بنا دیا گیا۔ ۱۲ مارچ ۱۵۴۱ء کو شاہ پرتگال سوم نے ناچار تہیہ کر لیا کہ سعی اور ازمور کو خالی کر کے مازگان میں اپنی ساری طاقت جمع کرے کیونکہ یہ مقام زیادہ کام کا اور زیادہ آسانی سے قابل دفاع اور جنوبی مراکش میں وہ جتنی پرتگیزی فوج رکھنا چاہتا تھا اس کے لیے موزوں تھا۔

مازگان کو اپنے قبضے میں رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پرتگیزی ساحل پر اپنا جہازی اڈا قائم رکھیں۔ تاکہ شرق الہند سے آمد و رفت کا راستہ محفوظ رہے۔ نیز انہیں یہ بھی امید تھی کہ سازگار حالات میں یہ قلعہ مراکش کو فتح کرنے کے لیے ایک نہایت اچھا اڈا ثابت ہو گا۔

مازگان کے قلعے کو چند موقعوں پر سخت حملے برداشت کرنے پڑے۔ اپریل ۱۵۶۲ء میں سعدی سلطان محمد بن عبداللہ الغالب باللہ نے اس کا فوجی محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ وہ اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۶۳۹ء میں سیدی محمد عیاشی مجاہد نے پرتگیزوں پر حملہ کر کے ان کو کسی قدر نقصانات پہنچائے۔

مولائی اسماعیل کے پوتے سیدی محمد بن عبداللہ نے جنوری ۱۷۶۹ء کے آواخر میں اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پانچ ہفتے کے محاصرے کے بعد پرتگیزوں نے اس قلعے کو خالی کر دیا۔ پرتگیزوں نے جاتے ہوئے سرنگیں لگی چھوڑ دی تھیں۔ ان کے پھٹ جانے سے بڑا نقصان ہوا۔ سلطان کا ایک تباہ شدہ شہر پر قبضہ ہوا تھا۔ اس نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا۔ لیکن اس شہر کی حالت خراب و خستہ ہی رہی۔ اسی وجہ سے اس کا نام مہدومہ شکستہ حال پڑ گیا۔ ۱۲۰۰ھ / ۱۸۲۴ء میں سیدی محمد بن ہشام کے عہد حکومت میں سیدی محمد بن طیب نے جو دکالہ اور تامسنا کا قائد تھا اس کی حالت درست کی اور اس کا نام "جدیدہ" رکھا۔ اس شہر کی موجودہ آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

جذام، بنو ایک عرب قبیلہ۔ جس کا نسب نامہ یہ ہے۔ عمرو بن عدی بن حارث بن مرہ بن اود بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا۔

بنو جذام ان بدویوں میں شامل تھے جو زمانہ قبل از اسلام میں بزنطی شام اور فلسطین کی سرحدوں پر آباد ہو گئے تھے اور مدین، عمان، معان، اذرح جیسے مقامات پر قابض تھے۔ جنوب میں تبوک اور وادی القریٰ تک ان کے اثرات نمایاں تھے۔ مدینے کے یہودی قبیلے بنو نضیر کو بھی بنو جذام کی ایک شاخ ہی سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ بنو جذام کے بزنطیوں سے روابط قائم تھے اسی وجہ سے سطحی طور پر عیسائی بن گئے تھے۔ اگرچہ ابن الکلبی کے نزدیک انکا شمار بھی اہل شام میں ہوتا ہے جو الاقیصر نامی بت کو پوجتے تھے۔

جب اسلام شمال کی جانب پھیلنے لگا تو بنو جذام نے [illegible] کے مقام پر اس کی راہ روکنے کے لیے کوشش کی۔ اگرچہ اس کی ایک شاخ بنو ضبیب مسلمان ہو چکی تھی لیکن ان کے خلاف حضرت زید بن حارثہ اور عمرو بن العاص کی مہمات کو ضروری خیال کیا گیا۔ یہ قبیلہ شہنشاہ ہرقل کے عرب اتحادیوں میں سے تھا اور [illegible] ۶۲۹ء میں جنگ موتہ میں انہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ بعد میں جب یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے شام کی فتح میں حصہ لیا۔

اموی دور میں جند فلسطین کا ایک بڑا حصہ بنو جذام پر مشتمل تھا۔ جب معاویہ بن یزید کی وفات پر مروان کا نام بحیثیت خلیفہ کے پیش کیا گیا تو یہ نام پیش کرنے والا شخص بنو جذام کا رئیس روح بن زنباع تھا۔ اور اموی دور کے زوال تک ان کے تعلقات بنو مروان سے بہت زیادہ قریبی رہے۔

بنو جذام نے [illegible] دور میں بغاوت کی [illegible] [illegible] سے یمنی اور لخم اور [illegible] تھی [illegible] لیکن شمالی عرب کے [illegible] کا دعوے [illegible] جذام، قضاعہ اور لخم کی [illegible] اختیار کر لی تھی۔

جراجمہ جرجومہ شہر کے باشندے، جو علویوں اور [illegible] کے [illegible] میں آباد تھے۔ انہوں نے اسلام کے ابتدائی دور [illegible] میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ [illegible] اگرچہ یہ لوگ مذہباً عیسائی تھے [illegible] مذہب کے معاملے میں [illegible]

عربوں نے جب انطاکیہ فتح کیا تو [illegible] جراجمہ [illegible] ایک دستہ زیر قیادت حبیب بن مسلمہ الفہری روانہ کیا [illegible] جراجمہ عربوں کے لیے [illegible] اور [illegible] خدمات [illegible] کے لیے [illegible] یہ کوہ جبل اللکام سے [illegible] اور عربوں کے [illegible] چھوٹے قلعوں کی محافظ فوجوں [illegible] کے [illegible] باہر جانے والے راستوں کے محافظ تھے چنانچہ ان لوگوں [illegible] اور انہیں یہ بھی حق دیا گیا کہ اگر وہ جنگی معرکوں میں حصہ لیں [illegible] بھی حصہ دیا جائے گا۔ لیکن ان لوگوں کی [illegible] کبھی بھی نہیں پہنچتے تھے۔

بقول [illegible] قسطنطین نے جراجمہ کو شام [illegible] جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے فوجی دستوں نے بزنطی فوجوں کی مدد سے یونانی افسروں کی زیر قیادت [illegible] علاقے پر قبضہ جما لیا۔ نیز لبنان کے خطے کے سارے پہاڑوں [illegible] یونانی الاصل غلام بھی جراجمہ کے ساتھ آ ملے اور کچھ [illegible] کے باشندے بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ چنانچہ اس خطرناک صورت حال [illegible] کے لیے امیر معاویہ نے قیصر سے گفت و شنید کی اور دونوں کے درمیان [illegible]

طے پایا جس کے مطابق انہوں نے سالانہ خراج ۳۰۰۰ سونے کے سکے، ۸۰۰۰ قیدیوں کی رہائی اور ۵۰ اصیل گھوڑے دینے کی شرط قبول کر لی۔ قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ جراجمہ کا ساتھ چھوڑ دے گا اور انہیں آدمی، ہتھیار اور مال غرض کسی شکل میں مدد نہ پہنچائے گا۔ بعد میں اس گروہ کو امیر معاویہؓ کے ہاتھوں کچھ نقصان بھی پہنچا۔ اور ۴۹ھ/۶۶۹ء یا ۵۰ھ/۶۷۰ء میں انطاکیہ اور آگے شمال کی طرف خاص جراجمہ کے علاقے میں زط (جاٹ) بسا دیئے گئے۔

جب خلیفہ عبدالملک ۶۹-۷۰ھ/۶۸۸-۶۸۹ء میں عبداللہ ابن زبیرؓ سے برسرِ پیکار تھا نیز اس کے ساتھ ہی عمرو بن سعید اشدق کی بغاوت فرو کرنے میں بھی منہمک تھا۔ جس کو خود اس نے دمشق کا عامل بنایا تھا۔ قیصر جسٹینین دوم نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے جراجمہ کو شام پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس لشکر کے ساتھ جراجمہ کے علاوہ مقامی کسانوں اور بھاگے غلاموں کی بھی ایک بڑی تعداد آملی۔ چنانچہ اس [illegible] قوم کے حملے ختم کرنے کے لیے خلیفہ کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑے اور اس کا ذمہ لیا کہ انہیں ہر ہفتے ایک ہزار دینار ادا کیے جائیں گے۔ اس کے بعد خلیفہ نے قیصر سے انہی شرائط پر صلح کی جن پر امیر معاویہؓ نے قیصر سے اس وقت کی تھی جب وہ اہل عراق کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے۔ لیکن بعد میں قیصر نے اپنے مطالبوں میں اضافہ کر دیا اور خلیفہ نے بامر مجبوری قبرص، ارمینیا اور آئبیریا کا آدھا خراج قیصر کو دینا منظور کیا۔ چنانچہ قیصر نے ۱۲ ہزار جراجمہ کو واپس بلا لیا جو بزنطی علاقے میں آباد ہو گئے۔

بقول البلاذری صلح نامہ پر دستخط کرنے کے بعد خلیفہ کو جراجمہ سے پیچھا چھڑانے کی چال چلنی پڑی۔ اس نے اپنے ایک معتمد علیہ شخص سحیم بن المہاجر کو روانہ کیا کہ ان کے یونانی سردار سے ملاقات کرے۔ سحیم اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اس نے ظاہری طور پر خلیفہ کی مذمت کر کے یقین دلایا کہ وہ یونانی سردار کا ساتھی ہے۔ اس کے بعد اپنے سپاہیوں کو لیکر جو کمین گاہ میں چھپے ہوئے تھے، اچانک اس پر حملہ کر دیا اور اسے اور اس کے یونانی سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ سحیم نے جراجمہ کو امان دیدی ان میں سے کچھ تو حمص و دمشق کے قرب وجوار میں آباد ہو گئے، اور کچھ آمانوس کو چلے گئے۔ مقامی کسان جو جراجمہ کے ساتھ جا ملے تھے اپنے اپنے گاؤں واپس چلے گئے اور بھاگے ہوئے غلام اپنے آقاؤں کے پاس واپس پلٹ کر آگئے۔ کچھ نے خلیفہ کی ملازمت اختیار کر لی اس طرح خلیفہ نے اس عنصر پر قابو پایا۔

بہرحال جراجمہ اپنے آمانوس کے پہاڑی ٹھکانوں میں بیزان یونانیوں کی مدد سے جو کندروں کے قرب وجوار سے آئے ہوئے تھے۔ پریشانی کا باعث بنے رہے۔ ۹۹ھ/۷۰۸ء میں مسلمہ نے قلعہ جرجومہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک مہم تیار کی اور اسے مسخر کر کے مسمار کر ڈالا۔ لیکن جراجمہ کے ساتھ ہر حال میں خاص سلوک روا رکھا گیا۔ انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ مسلمانوں کا لباس پہنتے ہوئے بھی اپنا عیسائی مذہب قائم رکھیں۔ انھیں جزیے سے معافی دے دی گئی۔ ان کے گھر والوں کے لیے تنخواہیں اور سامان رسد مقرر ہوا۔ وہ مسلمانوں کی مہمات میں حصہ لیتے تھے۔ اور انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ جنگ میں جس کو وہ قتل کریں اس کا مال وہ خود لے لیں۔ ان تمام روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکومت نے ان کے ساتھ بڑا فیاضانہ سلوک کیا اور بلا امتیاز مذہب انہیں بڑی بڑی رعایتیں دیں۔

ان کی کچھ تعداد شمالی شام میں تیزین اور ریلیون کے علاقے میں اور کچھ حمص اور انطاکیہ میں آباد کی گئی تھی لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود بہت سے جراجمہ سرحد پار چلے گئے اور پمفلیا میں جا کر آباد ہو گئے۔ اور مارد یہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ تصانیف میں ان مارد یہ کے حوالے بھی ملتے ہیں جو اسلامی مملکت میں مقیم رہے۔ یزید ثانی کے عہد میں عراق کی فوج میں شامل تھے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں آمانوس کی محافظ قلعہ فوج میں شامل تھے۔ عہد عباسی میں واثق باللہ نے بھی ان کے خصوصی حقوق کو بحال رکھا۔ لیکن المتوکل نے اپنے دور حکومت میں ان پر جزیہ لگا دیا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں جراجمہ کا آمانوس میں موجود ہونے کا ذکر ملتا ہے جہاں جبل اللکام میں حضرت مریمؑ کی ایک خانقاہ کا حال تحریر ہے۔ جو "دیرالجراجمہ" کے نام سے موسوم تھی۔

جَربہ المغرب کا سب سے بڑا جزیرہ جو تونس کے جنوب میں خلیج قابس میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۵۱۴ مربع کلومیٹر ہے۔ یہ جزیرہ برِاعظم سے کٹا ہوا ہے کیونکہ اس کے مغرب میں بحیرہ بوغرارہ اور رابنا یہ قنطرہ اور مشرق میں آبنائے اجم ہے۔

جربہ کو مصنفین نے کئی نام دیئے ہیں۔ بعض نے اسے پایاب پانی کا جزیرہ اور بعض نے آرام طلبوں کا ملک لکھا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے وسط سے یہاں پر خوب کاشت کاری ہونے لگی۔ اس زمانے سے یہ علاقہ حکومت قرطاجنہ کے ماتحت تھا اور اس کی معیشت کا انحصار زیتون کے تیل پر تھا۔ رومیوں کے عہد میں اس جزیرے کی بحری سرگرمیوں کا کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہے۔ لیکن قدیم بستیوں کے کھنڈروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اس کی معاشی اہمیت کچھ زیادہ ہو گی

جربہ شہر جس سے اس جزیرے کا نام مشتق ہے۔ حرت سوق کے قریب واقع تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں جب یروشلم کو لوٹا گیا تو بہت سے یہودی وہاں سے بھاگ کر جربہ میں آبسے آج کل جو یہودی یہاں آباد ہیں وہ انھی کی اولاد میں سے ہیں۔ جربہ پہلے ایک رومن نائب قنصل کے صوبے کا حصہ تھا۔ اس کے بعد حکومت طرابلس الغرب کے زیر اقتدار آگیا۔ بعد میں اس پر وندال قوم کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد بزنطی حکومت کا تسلط اس پر قائم ہو گیا۔ بزنطی عہد میں جربے کے اسقف کا تقرر طرابلس سے ہوتا تھا۔ ۴۵ھ/۶۶۵ء میں جب معاویہ بن حدیج نے (BYZACENE) میں لڑائیاں لڑیں تو جربہ کو رویفع بن ثابت نے فتح کر کے وہاں قبضہ جما لیا۔ بعد کی چند صدیوں کے جزیرے کے حالات کا پتہ نہیں کیا ہے۔ جب یہ قیروان اور مہدیہ کے زیر تسلط آیا تو یہاں کے باشندے خارجی عقائد کے دل سے حامی ہو گئے۔ بقول البکری یہاں کے باشندے بدمزاج اور بدکار تھے۔ خشکی اور تری دونوں میں ڈاکے مارتے تھے۔"

ادریسی نے ان کے بارے میں لکھا ہے "یہ سب بربر تھے۔ اور کوئی زبان نہیں بول سکتے تھے"

پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں اس جزیرے کی بابت بیان کیا گیا ہے کہ یہاں پر پھلوں اور زیتون کے گنجان باغ تھے اور جربہ کا شمار وہاں کے چھوٹے شہروں میں کیا گیا ہے۔ اس دور میں بنو ہلال کی یورشوں اور زیری خاندان کے زوال کے باعث اہل جربہ کے جذبہ حریت میں اضافہ ہوا۔ ان کے تونس کے ساحل پر اور عیسائی بیڑوں پر قزاقانہ حملے پہلے سے زیادہ ہو گئے۔

۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء تک علی بن یحییٰ زیری ان کا رئیس تھا۔ ۵۳۰ھ/۱۱۳۵ء میں جورج الانطاکی نے جو صقلیہ کا امیر البحر تھا اس جزیرے کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء میں مہدیہ کی فتح سے نارمن اقتدار کو مزید تقویت ملی۔ یہ قبضہ ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد عبدالمومن الموحدون نے نارمنوں کو تونس کے ساحل اور جزائر سے نکال باہر کیا۔ لیکن ۶۸۲ھ/۱۲۸۴ء میں ابوحفص عمر کے دور حکومت کے آغاز میں عیسائیوں نے حملہ کر کے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں عیسائیوں نے آبنائے قنطرہ اور رومی سنگ بستہ راستے کی حفاظت کے لیے وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جس کے چاروں طرف ایک خندق تھی۔ چند بغاوتوں کے برپا ہونے اور ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں تونس والوں کے چھاپہ مارنے کے بعد شاہ صقلیہ نے رامون مونتانیر کو روانہ کیا کہ جربہ پر دوبارہ قبضہ کر لے۔ اس نے ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء سے ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء تک بڑی جابرانہ حکومت کی۔ بعد میں یہ جزیرہ براہ راست حکومت صقلیہ

کے تحت آ گیا۔ کچھ عرصہ بعد اہل جربہ نے پھر بغاوت کی۔ اس مرتبہ انہیں بنوحفصہ کے فرمانروا ابوبکر کی حمایت حاصل تھی تو بالآخر ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں جربہ چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہو گئے لیکن بعد میں انہیں ایک بار پھر ۸۵ ۶ھ/ ۱۳۸۲ء تا ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۲ء حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بعد کی صدی میں ارغون کے الفانسو پنجم کی اس جزیرہ کو فتح کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ جب ۸۳۵ھ/ ۱۴۳۲ء میں اس نے دوسرا حملہ کیا تو سلطان ابوالفارس جربہ والوں کی مدد کے لیے بنفس نفیس آیا۔ عربوں نے اس جزیرہ میں ایک اور قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ "ابرج الکبیر" کے نام سے جربہ کے کھنڈروں کے قریب شمال کی جانب بنایا گیا ہے۔ کچھ وقت گذرنے کے ساتھ اس فصیل کے چاروں طرف ایک نئی بستی بھی آباد ہو گئی۔ اس بستی کا نام حومت سوق رکھا گیا۔

اہل جربہ کی آزاد اور سرکش طبیعت کی وجہ سے ان کی حفصیوں اور عیسائیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۳ء میں ابو عمر عثمان نے اپنا تعلق اچانک ان لوگوں سے منقطع کر لیا اور جربہ کو برِ اعظم سے ملانے والی واحد سڑک یعنی رومی سنگ بستہ راستے کو ارادۃً توڑ ڈالا۔

دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں جربہ ہسپانیوں اور ترکوں کے درمیان باہمی کش مکش کا مرکز بن گیا۔ حفصیوں نے جربہ ترکوں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے جنگی مرکز بنائیں۔ عیسائی انہیں یہاں سے ہٹانے میں ناکام رہے۔ ۹۱۷ھ/ ۱۵۱۱ء میں انہوں نے پیڈرو نوارو کے زیر قیادت ایک زبردست حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء میں یہ جزیرہ طور غود کے جنگی اقدامات کا مرکز بنا۔ آخر کار جربہ ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس کا نظم و نسق یکے بعد دیگرے الجزائر، طرابلس اور تونس سے متعلق رہا۔

۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء تا ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء حمودہ بے کے دورِ اقتدار میں جربہ مستقل طور پر تونس کے زیرِ اقتدار آ گیا۔ ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء میں اس جزیرے کو حکومت طرابلس کے مطالبات نہ ماننے پر ابراہیم پاشا نے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔

۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء تک ترکی تونس کے حکمران دے اور بے آتے رہے۔ ان کے بعد حسینی خاندان کے حکمران آئے۔ انہوں نے جربہ کے دور دراز علاقوں میں اپنے نائب پہلے "شیخ" اور "قائد" مقرر کیے۔ یہ اعلیٰ عہدے دار بعض خاص گھرانوں سے موروثی طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔

بارہویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں ہی مالکی مذہب نے فرقہ اباضیہ کی جگہ لے لی اور عربی سب سے زیادہ مشترکہ زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اٹھارویں صدی ہی میں خانہ بدوش ارغامہ اور اکارہ قبائل نے جزیرہ کے میدان سے متعدد بار چھاپے مارے۔ ۱۷۹۴ء میں طرابلس کے ایک علی بوغل کے نامی شخص نے ۵۸ روز تک جزیرے پر قبضہ جمائے رکھا اور خوب لوٹ مار کی۔ ۱۸۶۴ء میں علاقہ زرزیس کے قبائل نے جزیرے پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۰۵ء - ۱۷۰۶ء ، ۱۸۰۹ء اور ۱۸۶۴ء میں جزیرے میں طاعون کی وبا پھیلی۔ ۱۸۴۶ء میں جب احمد بای نے غلاموں کی تجارت کی بندش کر دی۔ تو جزیرے کی معاشی حالت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ کیونکہ اس وقت جربہ اور قابس بردہ فروشی کی بڑی منڈیاں تھیں۔ انیسویں صدی میں جربہ ایک پر رونق اور خوشحال جزیرہ تھا۔

اس جزیرے کی آبادی ہمیشہ نسبتہً زیادہ ہی رہی۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی ۶۳۲۰۰ تھی۔ پچھلے چند سالوں میں برِ اعظم افریقہ اور خاص طور پر جنوبی تونس کے بہت سے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں آبادی میں یہاں کے اصلی باشندوں کی تعداد ۵۰ فیصد ہے۔ یہاں کے لوگ عربی بولتے ہیں۔

آدھی آبادی نے وہابیت کی مقامی صورت میں اپنے اباضی عقائد برقرار رکھے ہیں۔ سکان کی بڑی اکثریت جو مشرقی اور وسطی حصوں میں قیام پذیر ہے۔ اہلسنت یا ہے۔ یہاں پانچ لاکھ ستر ہزار کھجور کے درخت ہیں۔ قدیم دستکاریاں اب کسی نہ کسی طور موجود ہیں۔ یہاں کی صنعت میں شوخ رنگ کا دھاری دار اونی کپڑا اور دوسرا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ یہاں کے باشندے اپنے مختلف پیشوں میں بڑی محنت سے کام کرتے ہیں اگرچہ وہ مدتوں باہر رہتے تھے پھر بھی اپنے جزیرے، اپنے معاشرتی اور خاندانی تعلقات کے ساتھ دل و جان سے وابستہ رہتے ہیں۔

زراعت خاص طور پر مرکزی اور مشرقی حصوں میں ہوتی ہے جہاں میووں اور ترکاریوں کی فصلوں کی آبپاشی کے لیے پانی ٹانکوں کے ذریعے زمین سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ماہی گیری یہاں کی گیارہ فیصد آبادی کا پیشہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں کی آبادی ۶۵۵۳۳ تھی۔

جُرجان

جُرجان ایک قدیم صوبہ جس کی حدود وہی تھیں جو موجودہ ایرانی صوبے استرآباد کی ہیں۔ اس صوبے کی زرخیزی اور خوشحالی کا دارومدار اترک اور جرجان کے دریاؤں پر تھا۔

ساسانی عہد میں جرجان کو بہت اہمیت حاصل تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ شمال کی جانب سے دباؤ ڈالنے والے خانہ بدوشوں کے مقابلے میں اسے ایک سرحدی مورچہ کی حیثیت حاصل تھی۔ شہرستان یزدگرد اور شہر پیروز کے قلعے بیابان دہستان کے خانہ بدوشوں کے حملوں کا دفاع کرنے کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں حفاظت کے لیے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک لمبی فصیل بنا کر دی گئی تھی۔

اگرچہ ۳۰ھ/ ۶۵۱ - ۶۵۰ء میں سعید بن العاص نے [illegible] لیکن جرجان پر مسلمانوں کا قبضہ حقیقی معنوں میں ۹۸ھ/ [illegible] کے ہاتھوں ہوا۔ اس وقت اس علاقے پر ایک مرزبان کی حکومت تھی لیکن [illegible] ایک ترک سردار صول کے ہاتھوں میں تھے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ جب سوید بن مقرن نے [illegible] کر لیا تو روزبان صول نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں کی ماتحتی قبول کر لی۔

دریائے اندر باز (موجودہ دریائے جرجان) کے کنارے [illegible] بعد یزید بن مہلب نے شہر جرجان کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے [illegible] صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ [illegible] صدی ہجری [illegible] صدی [illegible] ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر خوشحال تھا۔ [illegible] کی آبیاری دریا سے کی جاتی تھی۔ اس شہر کی صنعت میں ریشم سازی [illegible] اہم تھی۔ یہ شہر روس جانے والی کاروانی شاہراہ کی [illegible] حصوں کو ملانے کے لیے ایک کشتیوں کا پل تھا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر [illegible] تھا جو شہرستان کے نام سے مشہور تھا۔ بقول المقدسی [illegible] مغربی کنارے پر ایک مضافاتی شہر بکرآباد کے نام سے مشہور تھا۔

بحر خزر کے ساتھ کا علاقہ علوی دعوت کے لیے بہت [illegible] ہے کہ طبرستان کے علویوں نے جرجان کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔ [illegible] میں حضرت محمد بن جعفر صادقؑ کی قبر ہے۔

۳۱۶ھ/ ۹۲۸ء میں مرداویج بن زیاد دیلمیوں کی [illegible] جرجان میں [illegible] قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو تقریباً ایک سو سال تک قائم رہی۔ [illegible] ۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء تا ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۲ء) کی قبر کا قبہ گنبد قابوس کے نام سے آج بھی اس عہد کی یادگار ہے۔

جب مغول یلغار ہوئی تو جرجان کی آبادی کا نہ صرف قتل عام کیا گیا۔ بقول المستوفی [illegible]

نے آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب نزھتہ القلوب تحریر کی، رقم کیا ہے کہ جرجان شہر کھنڈروں کا ڈھیر تھا۔

ایک روایت کے مطابق تیمور نے ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں یہاں پر دریا کے کنارے ایک محل تعمیر کرایا تھا لیکن جرجان کی پہلی سی خوشحالی دوبارہ واپس نہ آسکی۔

حاجی خلیفہ نے جہاں نما میں جو ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۲ء کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ عہد مغول کے بعد جب جرجان دوبارہ آباد ہوا تو اس وقت سے یہاں کی اکثریت غالی شیعوں پر مشتمل رہی ہے۔ دریائے جرجان اور خرم رود کے سنگم سے جو زاویہ بنتا ہے۔ وہاں کھنڈروں کے بڑے بڑے ڈھیر دں سے قدیم جرجان کی جائے وقوع کا پتہ چلتا ہے۔

جرجانی، اسمٰعیل بن الحسین

زین الدین، ابوالفضائل حسینی ایک طبیب و مصنف جو اسماعیل کے نام سے مشہور تھا۔ ۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء میں وہ خوارزم چلا گیا۔ اور قطب الدین محمد خوارزم شاہ کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اس نے عربی اور فارسی زبان میں تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب ذخیرۂ خوارزمشاہی قطب الدین محمد خوارزم شاہ ہی کے نام سے معنون [illegible] ہے۔

[illegible] ابن محمد کے دربار سے وابستگی اختیار کر لی۔ جس کے [illegible] کی تصنیف کا کام شروع کیا۔ اس کے بعد میں [illegible] خوارزم شاہ کا دار الحکومت تھا، کے [illegible]۔

اسماعیل کی تصانیف میں ذخیرۂ خوارزم شاہی سب سے عمدہ تصنیف ہے اسے فارسی زبان کا [illegible] دائرۃ المعارف کہنا بجا ہوگا۔ اس میں ساڑھے چار [illegible] الفاظ ہیں۔ اس کتاب کا [illegible] اور ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے [illegible] اس تصنیف کے علاوہ اس کی تقریباً [illegible] اور تصانیف ہیں۔ عربی زبان میں دنیا کی بے ثباتی پر اس کا ایک رسالہ [illegible] ہے۔

جرجانی، علی بن محمد

(۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء - ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) کنیت ابوالحسن المعروف سید شریف۔ ایک عالم دین و مصنف استرآباد کے قریبہ تاجو میں پیدا ہوئے۔ ۷۶۶ھ/۱۳۶۵ء میں وہ قطب الدین محمد الرازی التحتانی سے علم حاصل کرنے کی غرض ہرات گئے۔ لیکن انہوں نے اپنے [illegible] مبارک شاہ سے جو مصر میں مقیم تھے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ ۷۷۰ھ/۱۳۶۸ء [illegible] وہ ہرات ہی میں ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد قرمان گئے اور محمد الفناری کی شاگردی اختیار کی بعد میں ان کے ہمراہ مصر گئے اور مبارک شاہ اور اکمل الدین کے درس سے مستفیض ہوئے۔ ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا اور پھر وہاں سے شیراز پہنچے جہاں پر ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء میں شاہ شجاع نے انہیں معلم مقرر کیا۔

جب تیمور نے شیراز فتح کیا تو سید شریف کو اپنے ساتھ ہی سمرقند لے گیا۔ یہاں پران کی سعد الدین تفتازانی سے بحثیں ہوئیں۔ تیمور کی وفات کے بعد سید شریف شیراز واپس آگئے۔

سید شریف نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی زبان میں منطق اور صرف ونحو کی کتابیں لکھیں۔ متکلم کی حیثیت سے انہوں نے فلسفے کو بہت بڑا مقام دیا۔ وہ زمانہ جس سے سید شریف کا تعلق ہے متقدمین کی کتب پر شرحیں لکھنے کا زمانہ تھا۔ انہوں نے ایجی کی "المواقف" پر شرح لکھی۔ فقہ میں سجاوندی کی تصنیف "الفرائض السراجیہ" کی شرح لکھی۔ تفتازانی کی شرح "المطول" پر تعلیقات و حواشی لکھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف "تعریفات" میں نہایت ہی سہل وسادہ زبان اختیار کی ہے۔

بقول بدر الدین العینی "سید جرجانی عالم الشرق اور علامہ دھر تھے۔ فصاحت و بلاغت اور حسن عبارت کے ساتھ ساتھ فن مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی علمی اور تدریسی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے متبعین اور تلامذہ کی ایک کثیر تعداد تھی۔

جرّاح، بنو

قبیلۂ طے کی ایک شاخ۔ بقول صاحب "تاج العروس" یہ شاخ حوط بن خالد بن معبد بن عدی افلت طائی کی نسل سے ہے جو فلسطین اور بلقاء کے علاقے میں آباد ہوئی۔ اس علاقے میں الشراۃ کے پہاڑ اور شمالی عرب کے صحرا جہاں اجا اور سلمیٰ کی دو پہاڑیاں واقع ہیں، ان کے علاقے میں شامل تھے۔

اس خاندان نے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی اور پانچویں صدی ہجری گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس دوران میں بھی وہ اپنے لیے نہ کوئی ریاست ہی حاصل کر سکے اور نہ ہی کوئی علاقہ اپنا مرکز بنا سکے۔ بزنطیوں اور فاطمیوں کے درمیان ان کے تعلقات عجیب ہی رہے کبھی تو وہ فاطمیوں کے طرفدار ہوتے اور کبھی بزنطیوں کے۔ جب بھی انہیں کسی جانب سے خطرہ محسوس ہوتا تو وہ خوشامد سے کام لینے میں ہرگز ہرگز نہ ہچکچاتے تھے۔ وہ اپنی چال بازیوں سے صرف اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے کہ وہ حج کو جانے والے قافلوں کو لوٹتے رہیں۔

تاریخ کے اوراق میں اس خاندان کے جس فرد کا نام سب سے پہلے آتا ہے وہ دغفل بن الجراح ہے جو قرامطہ کا حلیف تھا۔ دغفل کے بعد اس کے بیٹے مفرج نے ۴۰۴ھ/۱۰۱۴ء تک خوب شہرت حاصل کی۔

خلیفہ عبدالعزیز کے زمانے میں جب ایک ترک الپتگین کے خلاف فوج کشی کی گئی اور محرم ۳۶۷ھ/ستمبر ۹۷۷ء میں رملہ کے باہر ایک لڑائی ہوئی۔ الپتگین بھاگ کھڑا ہوا لیکن اپنے دوست مفرج کے قابو آ گیا۔ جس نے اسے خلیفہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے دو سال بعد وہ عارضی طور پر رملہ پر قابض ہو گیا۔ اس کی یہ حیثیت مصری لشکر کے سردار الفضل نے بھی تسلیم کر لی۔ فضل اور مفرج کے باہمی تعلقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے۔ لیکن مفرج نے خلیفہ العزیز کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے سپہ سالار کو یہ حکم دے کہ مفرج کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اس طرح مفرج کو فلسطین کا مختار کل ہونے کا ایک بار پھر موقع مل گیا۔ اس نے فلسطین میں اپنی تاخت وتاراج کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگلے سال خلیفہ نے اس کی بیخ کنی کے لیے ایک لشکر بھیجا۔ مفرج وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس دوران میں اس نے حاجیوں کے ایک قافلے کو، جو مکہ معظمہ سے حج کے بعد واپس لوٹ رہا تھا لوٹ لیا۔ ۳۶۹ھ ۹۷۹ء میں مفرج نے شمالی عرب میں حجاج کے ایک قافلے کو لوٹا۔ اگرچہ کلیس جو وزیر مصر تھا، مفرج کو بہت خطرناک خیال کرتا تھا۔ اس نے بستر مرگ پر خلیفہ سے درخواست کی تھی کہ اگر مفرج اس کے ہاتھ لگ جائے تو اسے ہرگز معاف نہ کیا جائے۔ لیکن خلیفہ نے درگزر سے کام لیا اور حلب کے خلاف مہم میں حصہ لینے کے لیے بلا بھیجا۔

مفرج نے ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں رملہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس علاقے کو تاخت وتاراج کیا۔ دمشق کے نئے عامل جیش بن صمصامہ نے صور میں علاقہ کی

بناوت فرو کرنے کے بعد مفرج پر حملہ کر کے اسے مار بھگایا۔ مفرج نے بنو طے کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ ۳۹۶ھ/۱۰۰۶ء میں مفرج نے اپنے تینوں بیٹوں علی، حسن اور محمود کو بدویوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ابو رکوہ باغی کے خلاف الحاکم کی مدد کے لیے بھیجا۔

۴۰۲ھ/۱۰۱۲ء میں فاطمی وزیر ابو القاسم المغربی نے بھاگ کر فلسطین میں مفرج کے بیٹے حسان کی لشکرگاہ میں پناہ لی۔ جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بعد میں بنو جراح نے المغربی کے اکسانے پر رملہ پر قبضہ کر لیا۔ فلسطین پر بنو جراح کا قبضہ صرف دو سال پانچ ماہ رہا۔ ۴۰۴ھ/۱۰۱۳ء کے آغاز میں الحاکم نے فیصلہ کیا کہ بنو جراح کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ان کے خلاف ایک فوج روانہ کی علی اور محمود نے اطاعت قبول کر لی مفرج کا عین اس موقع پر انتقال ہو گیا۔ حسان نے راہ فرار اختیار کی اور اپنی ماں کے ذریعے معافی کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ ۴۰۶ھ/۱۰۱۶ء میں اس نے حلب کی مہم میں شرکت بھی کی۔ حسان کے ولی عہد عبدالرحیم سے جو الحاکم کا بھائی اور دمشق کا عامل تھا نہایت خوشگوار تعلقات تھے جو اور بھی زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ حسان کی خواہش فلسطین پر حکومت کرنے کی تھی اس نے اپنے باپ کی طرح بزنطی سلطنت سے برابر رابطہ قائم رکھا۔ جب قیصر ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں حلب کے صالح بن مرداس کے بیٹوں کے خلاف لشکر کشی کی تیاری کر رہا تھا تو حسان نے اس سلسلے میں اپنے قبیلے کی طرف سے اسے مدد کی پیش کش کی۔ قیصر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ حسان کے اقتدار کو اس ملک میں پھر بحال کر دے گا۔ لیکن قیصر کی یہ مہم ناکام رہی۔ حسان نے پھر رافع بن ابی الیل کے بنو کلب کی مدد سے حوران کے علاقے میں فاطمی لشکر کے خلاف مہم شروع کی۔ لیکن اسے صحرا کی طرف پسپا ہونا پڑا یہاں تدمر کے نواح میں وہ قیصر کے ایک ایلچی سے ملا۔ جس نے اسے بزنطی علاقے کے قریب آباد ہونے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ بیس ہزار سے زائد افراد اپنے گلوں اور خیموں کے ساتھ انطاکیہ کے نواحی علاقے کی طرف ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں منتقل ہو گئے۔ حسان کو قیصر نے بہت سے تحفے تحائف عطا کیے۔ اور اس کے بیٹے علاف کو دربار میں شرف باریابی بخشا۔ بنو طے نے انطاکیہ کے جنوب مشرقی جانب اپنے خیمے اوج کے قریب نصب کیے۔ حسان نے بزنطیوں کی بڑی شد و مد سے مدد کی۔ اس نے قلعہ افامیہ پر کامیاب حملہ کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس کے علاوہ حاکم کی جبل الرادیت میں قلعہ منیقہ کو سر کرنے میں بھی ان کی مدد کی۔

۵۰۱ھ/۱۱۰۰ء میں ایک شخص ابو عمران فضل بن ربیعہ بن حازم بن الجراح کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے، جو بغداد سے سلجوقی تاجدار کی ملازمت اختیار کرنے آیا تھا۔ شام میں وہ کبھی تو مصریوں کا ساتھ دیتا اور کبھی فرنگیوں کا۔ اس کا یہ طرز عمل دیکھتے ہوئے دمشق کے اتابک طغتگین نے اسے شام سے نکال دیا۔ بغداد میں اس نے حلہ کے صدقہ زیدی کے خلاف کرنے اور اس صحرا کا راستہ بند کر دینے کی پیش کش کی۔ بعد میں وہ انبار چلا گیا۔

اس شورش پسند قبیلے کے متعلق تاریخ میں یہی کچھ واقعات محفوظ ہیں۔ بہرحال چوتھی پانچویں صدی ہجری / دسویں، گیارہویں صدی عیسوی میں شام کی سیاسیات میں اس قبیلے کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ان پر فاطمی کبھی حملہ کرتے اور کبھی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے۔ بزنطیوں نے بھی انھیں ہمیشہ اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے ہمیشہ منافقانہ طرز عمل، غداری اور لوٹ مار کو اپنا طرز عمل بنائے رکھا۔

جرح و تعدیل علم حدیث و فقہ کی ایک اصطلاح۔ جرح کے معنی ہیں تنقید کرنا عیب نکالنا اور تعدیل کے معنی ہیں صادق اور قابل اعتبار ثابت کرنا۔

علم حدیث کی اصطلاح میں اس کے معنی راویان حدیث کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی تحقیق کرنا فقہ کی اصطلاح میں اس کے معنی گواہوں کے قابل اعتبار یا ناقابل اعتبار ہونے کی چھان بین کرنا ہے۔

حدیث کے راویوں کی یہ چھان بین آنحضورؐ کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکی تھی لیکن فن کی صورت بعد میں ملی۔

حدیث میں اس فن میں خدمات سرانجام دینے والوں میں حضرت ابن عباسؓ، انس بن مالکؓ، شعبی، ابن سیرین، الاعمش، شعبہ، امام مالک، ابن المبارک، ابن عیینہ عبدالرحمان بن المہدی اور یحیٰ بن معین۔

امام احمد بن حنبل کے عہد میں جرح و تعدیل کا فن پورے کمال پر پہنچ چکا تھا۔

جب دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے دوران میں بہت سی احادیث گھڑی جانے لگیں تو راویوں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کی طرف خاص طور پر توجہ دی جانے لگی۔ ان کے اوصاف کے بارے میں لکھا جانے لگا۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں تو اس فن پر کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ ان تصانیف میں عام طور پر راویوں کے اسماء کی فہرست دی جاتی تھی اور ہر ایک کے نام اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کا ثقہ و غیر ثقہ ہونا بھی درج کیا جاتا تھا۔ سنن، مسانید، حدیث کی کتابوں میں احکام کی احادیث میں راویوں کے حالات پر حواشی ملتے ہیں۔ جیسے کہ سنن [illegible] وغیرہ میں ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں راویوں کی ثقاہت کی چھان بین [illegible] اور درست قرار دیا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ راویان حدیث پر جانچ کرنے کا [illegible] خیال نہیں کرتے تھے۔ بعد میں جب علم حدیث پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں تو جرح و تعدیل اس علم کا ایک مستقل شعبہ قرار پایا۔

چونکہ آنحضورؐ کے تمام صحابہ معتبر تھے اس لئے ان کے متعلق [illegible] پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زمانہ مابعد کے راویوں کے بارے میں [illegible] ثقہ راویوں کی چند صفات مقرر کی گئیں۔

صبحی صالح نے اپنی کتاب "علوم الحدیث" میں یہ صفات درج کی ہیں۔

۱۔ وہ مسلمان ہو۔ ۲۔ حافظہ [illegible] رکھتا ہو [illegible] (صادق القول) ہو۔ ۴۔ اپنی روایت کے نقص و عیب [illegible] ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہو۔

ابن ابی حاتم الرازی نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل کے مقدمے میں [illegible] کے مختلف طبقات سے بحث کی ہے۔ اس کے مقرر کئے ہوئے طبقات [illegible] موضوع پر بعد میں لکھنے والے کے لئے معیار کا کام دیتے رہے ہیں۔

ابن ابی حاتم الرازی نے راویوں کی چند اقسام بتائی ہیں۔ ان کے نزدیک جن راویوں کی احادیث قبول کی جا سکتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ ثقہ یا متقن یعنی بالکل صحیح ضبط کرنے والا۔ ۲۔ صدوق یعنی راست گو۔ ۳۔ شیخ۔ ۴۔ صالح الحدیث یعنی حدیث میں کھرا۔

استناد کے لحاظ سے کمتر درجے کے راویوں کی چار اقسام ہیں۔

۱۔ لین الحدیث (حدیث میں نرم اور کمزور) ۲۔ لیس بالقوی (روایت میں قوی نہ ہو) ۳۔ ضعیف الحدیث (حدیث میں ضعیف) ۴۔ متروک الحدیث جس کی احادیث ترک کر دی گئی ہیں، اور ذاہب الحدیث (جس کی حدیث رد کر دی گئی ہو) یا کذاب جھوٹا

علمائے حدیث کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں جرح اور تعدیل دونوں موجود ہوں تو جرح کو قوی تر مانا جائے گا۔ کیونکہ جنہوں نے جرح (نکتہ چینی) کی ہے ان کے پاس اس راوی کے بارے میں ایسی اطلاعات ضرور ہوں گی جو دوسروں کو میسر نہ تھیں۔ لیکن جہاں تعدیل کرنے والوں پر لازم نہیں کہ اپنی رائے کی تائید میں دلیل پیش کریں وہاں جرح کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنی رائے کی معقول وجہ پیش کریں۔ کیونکہ ضعف کی وجوہ کے بارے میں علمائے حدیث میں اختلاف ہے اس لئے جراح کا فیصلہ اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب اس کے وجوہ بیان کئے جائیں۔

اس بارے میں بھی اختلاف رائے ہے کہ ایک عالم کی جرح و تعدیل کافی بھی ہے یا نہیں کیونکہ گواہوں کو قابل اعتماد قرار دینے کے لیے دو اشخاص کی تصدیق ضروری ہے لیکن بقول ابن صلاح "راوی حدیث کو قابل اعتماد یا ناقابل اعتماد قرار دینے کے لیے ایک شخص کی رائے بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی عدالت، امانت اور ثقاہت مشہور ہو۔

جُرم عربی میں اس کے ایک معنی ذنب (گناہ) کے ہیں قرآن مجید میں مجرمین اور مجرمون کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اسلامی شریعت میں جرم کی سزا کی دو اقسام ہیں۔ ۱۔ حد۔ ۲۔ تعزیر۔

حد کا پیمانہ اور اس کے قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ جبکہ تعزیر میں حاکم وقت یا قاضی کی صوابدید کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اسے اختیار ہوتا ہے کہ مختلف جرائم کے لیے کس قسم کی سزا دی جائے۔ جرمانہ بھی تعزیر کے ضمن آتا ہے۔ (نیز دیکھئے "تعزیر"، "حد")

فارسی میں جرم بمعنی جرمانہ (تاوان) بھی آتا ہے۔

جُرُندَہ ایک شہر۔ ہسپانیہ کے اسی نام کے صوبے کا صدر مقام۔ ولایت قطلونیہ کے چار صدر مقامات میں سے ایک۔

ابتدا میں یہ ایبریا کا ایک گاؤں تھا جسے بعد میں رومیوں نے ترقی دے کر ایک شہر کی حیثیت دی۔

یہ شہر سمندر سے ۲۵ کلومیٹر دور جبل البرانس کے بیرونی دامن میں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع ہے۔ جو تیر اور اونا کی ندیوں سے گھرا ہوا ہے۔

یہ شہر چونکہ فرانس اور سپین کے مشرقی راستے پر واقع ہے۔ اس لئے اس کی جائے وقوع دفاعی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کو مختلف ادوار میں مسلسل حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام محاصروں کا شہر بن گیا۔ اس شہر پر باری باری قرطلوں، عربوں، ہسپانیہ کے سرحدی فرانکوں اور قطلونی ارغونیوں کا قبضہ ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بڑے جنگی قلعے کی شکل اختیار کر لی۔

جب عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں مسلمانوں نے حملے شروع کئے تو انہوں نے جبل البرانس کے دامن کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جرندہ بھی ان مقبوضات میں شامل تھا۔

دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی میں اس مقام پر جو بعد میں ہسپانوی سرحدی علاقے کے نام سے موسوم ہوا کوئی معین سرحد نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جرندہ کے باشندوں نے قرطبہ کے امیر عبدالرحمان اول کی شکست کے بعد ۱۶۹ھ / ۷۸۵ء میں اپنا شہر فرنگیوں کے حوالے کر دیا تھا جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اب فرنگی برشلونہ کے وسیع علاقے پر قبضہ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو ۱۷۷ھ / ۷۹۳ء میں خلیفہ ہشام اول کے سپہ سالار عبدالملک بن مغیث نے جرندہ کا محاصرہ کر لیا اور وہاں کی محافظ فوج کا صفایا کر دیا۔ اگرچہ وہ جرندہ شہر کو فتح نہ کر سکا۔ ۱۸۱ھ / ۷۹۷ء میں فرنگیوں نے جرندہ اور تعزکی بالائی وادی کے درمیانی کوہستانی علاقے پر قبضہ جما لیا اور ایک طویل محاصرے کے بعد برشلونہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۱۲ھ / ۸۲۸ء میں برشلونہ اور جرندہ پر مسلمانوں نے حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ہسپانیہ کا یہ سرحدی علاقہ اتنا مضبوط کر دیا گیا تھا کہ حاجب المنصور کے برشلونہ پر قبضے کے باوجود مسلمان جرندہ تک نہ پہنچ سکے۔

۴۰۰ھ / ۱۰۱۰ء میں یہاں کے قطلونیوں کا ایک گروہ خلیفہ محمد المہدی کی معیت میں بربروں سے وادی آرد میں لڑا تھا۔ اس لڑائی میں قطلونیوں کو بری طرح ناکامی اٹھانی پڑی اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ مقتولین میں جرندہ کا اسقف بھی تھا۔

۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء میں فرانس کے فلپ اگسٹس نے جرندہ پر قبضہ کر لیا۔

بعد میں اس شہر کو امیر وی آنا کی بھڑکائی ہوئی خانہ جنگیوں اور فرانس کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کی بنا پر بہت سے محاصروں اور حملوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی کے دوران میں اہل جرندہ نے آرچ ڈیوک کی حمایت کا اعلان کیا تو اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی گئی۔ اس کے مصائب و آلام اس وقت انتہا کو پہنچے ہوئے تھے جب جنرل الرز کاسٹرو نے دلیرانہ مقاومت پر کمر باندھی اور یہ شہر پورے سات ماہ تک نپولین کے سپہ سالاروں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔

جرندہ کی آبادی تقریباً ۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

جُرھُم، بنو عرب کا ایک قبیلہ۔ اس کو جُرھَم پڑھنا بھی درست ہے۔ قدیم عرب مستند روایات کے مطابق یہ قحطان کی اولاد سے تھے۔ اس قبیلے نے یمن سے مکہ مکرمہ ہجرت کی۔ پہلے تو یہ لوگ قبیلہ قطورا (عمالیق) سے جنگ میں برسر پیکار رہے پھر اپنے سردار مضاض بن عمرو کے ماتحت بیت اللہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ بنو خزاعہ کے بکر بن عبد مناۃ نے انہیں بیت اللہ سے نکال باہر کیا۔

یہ روایت بھی بنو جرہم کے بارے میں روشنی ڈالتی ہے کہ حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کو بنو جرہم نے اپنی حمایت میں لیا اور حضرت اسماعیل نے اسی قبیلے کی ایک خاتون سے شادی کر لی۔ مختلف روایات سے اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے کہ جرہم ماضی بعید میں ایک خوشحال قبیلہ تھا جو آغاز اسلام سے پہلے معدوم ہو چکا تھا۔

بقول ابن خلدون "جرہم کے نام سے دو قومیں گذری ہیں ایک بنو جرہم تو عاد کے زمانے میں تھے۔ اور یہ قحطان سے بہت پہلے ہوئے ہیں۔

دوسرے بنو جرہم قحطانی نسل سے تھے۔ جنہوں نے حجاز میں حکومت قائم کی۔ جرہم کے بعد اس کا بیٹا یالیل مسند حکومت پر بیٹھا اور اس کے بعد یہ سلسلہ نفیلہ بن عبدالمدان، عبدالسیح، مضاض تک پہنچا۔ اسی قوم میں حضرت اسماعیل مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی شادی بھی اسی قبیلے میں ہوئی تھی۔

بقول ابن حزم اور القلقشندی "جرھم بالکل نیست و نابود ہو گئے تھے اور ان میں سے کوئی باقی نہیں بچا تھا۔"

جُریج ایک صالح اور عابد شخص جو بنو اسرائیل میں سے تھا۔ اس شخص کا قصہ خود آنحضورؐ نے بیان فرمایا ہے اسی وجہ سے اسے حدیث میں جگہ ملی۔

اس قصے کی روایات میں مختلف تفصیلات ملتی ہیں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ جریج ایک نیک آدمی تھا جس پر ایک عورت نے تہمت زنا لگائی اور ثبوت کے طور پر اپنے بچے کو پیش کیا کہ یہ اس کے نطفے سے ہے۔ حالانکہ اس بچے کا باپ کوئی اور تھا۔

جب اس بچے سے خود اس مرد صالح نے پوچھا کہ تیرا باپ کون ہے۔ تو اس نے اپنے اصلی باپ کا نام بتا دیا اور اس طرح وہ شخص تہمت سے بری ہو گیا۔

روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جریح کا زمانہ حضرت عیسےٰؑ اور آنحضورؐ کے درمیان کا زمانہ تھا۔

جریدہ

نخلستانوں کا علاقہ، صحرائے اعظم کا ایک علاقہ جو جنوب مغربی تونس میں واقع ہے۔ اس میں نفطہ، توزر، الوادان اور الحمہ کے نخلستان شامل ہیں وسطی زمانہ میں اس کو بالعموم قسطیلیہ کہا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں جریدہ میں قفصہ نفزاوہ کو ہی نہیں بلکہ علاقہ قابس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

توزر، نفطہ اور الحمہ تینوں اس سڑک پر واقع تھے جو رومی اور بزنطی سرحد کی طرف جا نکلتی تھی۔

جریدہ کو عربوں نے دو مرتبہ فتح کیا۔ ۲۹ھ/ ۶۴۹ء میں اسے ابن زبیر نے فتح کیا اور ۴۹ھ/ ۶۶۹ء میں عقبہ بن نافع نے۔ جریدہ ہمیشہ علیحدگی پسند تحریکوں اور باغیوں کا مرکز رہا ہے۔ نویں صدی عیسوی میں جب قسطیلیہ اغالبہ کا ایک صوبہ تھا اور یہاں ان کی طرف سے ایک عامل حکومت کرتا تھا۔ باوجودیکہ اس کی زیادہ تر آبادی اباضی خارجیوں کی تھی۔ یہاں صرف ایک مرتبہ بغاوت ہوئی۔ عربوں کی آبادی اس وقت علاقے میں بہت تھوڑی سی تھی۔

پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ بڑا خوشحال تھا۔ اس وقت توزر کی حیثیت فی الواقع ایک شہر کی تھی اس کی فصیلوں کے چار دروازے تھے مسجد بہت بڑی تھی۔ اور ملحقہ بستیاں گنجان آباد تھیں۔ بلاد الحضر کی جامع مسجد ۱۰۲۷ء سے ۱۰۳۰ء کے درمیان قیروان کے روایتی طرز پر تعمیر ہوئی تھی۔

نفطہ شہر کی حفاظت کے لئے بھی ایک فصیل تھی۔ اس کی آبادی بہت کثیر تھی توزر کے چار شہروں پر مشتمل تھا جن کے گرد اگرد بھی فصیلیں تھیں۔ نفطہ کی آبادی ۶۰۰۰ ہے مگر فضا بالکل دیہاتی ہے۔ یہ شہر اتنے قریب قریب تھے کہ ایک شہر میں رہنے والے دوسرے شہر والوں سے گفتگو کر سکتے تھے۔

جریدہ کے قدرتی وسائل بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں کھجور اول نمبر پر تھی یہاں کے سنگترے اور نیشکر کی بہت زیادہ شہرت تھی بقول البکری "توزر سے ہر روز کھجوریں سے لدے ہوئے ایک ہزار سے زائد اونٹ باہر جاتے تھے۔

۵۴۴ھ/ ۱۰۵۳ء میں بنو ہلال کے مقدمۃ الجیش نے عابد بن ابی الریث کی سرکردگی میں قسطیلیہ کو لوٹا لیکن تھوڑے ہی عرصے اسے اس ریاست میں شامل کر لیا جو قفصہ کے عامل عبداللہ بن الرند نے جنوبی تونس میں قائم کی تھی اور جو اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک ۶۰-۱۱۵۹ء میں الموحدین نے اسے فتح نہ کر لیا۔ کچھ عرصے بعد جریدان کوششوں کا مرکز بن گیا جو علی اور اس کے بعد یحییٰ بن غانیہ نے دولت المرابطین کو پھر سے بحال کرنے کے لئے کیں۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری/ تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں حفص کے ماتحت جریدہ کی حکمرانی ان خاندانوں کے ہاتھ میں تھی جو یہاں پر اپنی موروثی حکومت قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ترکوں نے اور ۱۰۰۵ء سے حسینی سلاطین نے بار بار لشکر کشی کی تاکہ جریدہ کو اپنے زیر نگیں رکھ سکیں۔ ۱۸۸۱ء میں یہاں فرانسیسی حکومت قائم ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد کئی ایک مقامات پر چاہ کنی سے نخلستانوں کے رقبے میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

جریدہ میں گیارہ لاکھ سے زائد کھجوروں کے پیڑ موجود ہیں۔ کھجوروں کے سب سے زیادہ باغ توزر میں ہیں۔ یہاں کی آبادی بارہ ہزار افراد پر مشتمل ہے جو جریدہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور تونسی صحرا کی سب سے بڑی منڈی ہے۔

جریرؓ بن عبداللہ

(؟ — ۵۴ھ/ ۶۷۳ء) صحابی، یمن کے شاہی خاندان کے رکن اور قبیلہ بجیلہ کے سردار ابو عمر کنیت تھی نسب نامہ اس طرح ہے

جریر بن عبداللہ بن جابر بن مالک بن نضر بن ثعلبہ بن جشم بن عوف بن خزیمہ بن حرب بن علی بن مالک بن سعد بن نذیر بن قسر بن عبقر بن انمار بن اراش بن عمرو بن غوث بجلی۔

بعض روایات کے مطابق آنحضورؐ کے وصال سے ۴۰ روز پیشتر ایمان لائے لیکن صحیح ترایات یہ ہے کہ آپ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ ظاہر ہے آپ آنحضورؐ کے وصال سے چار پانچ ماہ پیشتر ایمان لائے ہوں گے۔ بقول واقدی آپ رمضان میں مشرف باسلام ہوئے تھے۔

جب آپ آنحضورؐ کی خدمت میں قبول اسلام کے لئے حاضر ہوئے تو آنحضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کیسے آنا ہوا۔ عرض کیا اسلام قبول کرنے آیا ہوں۔ آنحضورؐ نے آپ کے لئے اپنی چادر بچھا دی اور فرمایا مسلمانو جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کی عزت کیا کرو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر مجمع کو خاموش کرانے کی خدمت آپ ہی کے سپرد تھی۔

فتح مکہ کے بعد اگرچہ عرب کے تمام قبیلے تقریباً اسلام کے حلقہ اثر میں آ چکے تھے لیکن صدیوں کے اعتقاد کی وجہ سے توہم پرستی باقی تھی۔ چنانچہ وہ صنم کدوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے اس وہم کو دور کرنے کے لیے آنحضورؐ نے کئی صنم کدے گرا دیئے۔ یمن کے صنم کدہ ذی الخلیفہ کو جو کعبہ یمانی کے نام سے مشہور تھا ڈھانے کی خدمت جریرؓ کی سپرد ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ایک سو پچاس سواروں کے دستہ کے ساتھ یمن پہنچ کر ذی الخلیفہ کے صنم کدہ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ابھی آپ یمن ہی میں تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن آپ کو اس [illegible] ہو سکا۔ ایک روز یمن کے دو آدمیوں کو حدیث نبوی سنا رہے تھے کہ انہوں نے کہا [illegible] کا حال سنا رہے ہو وہ تین روز ہوئے ختم ہو گیا۔ یہ دردناک خبر سن کر آپ مدینہ کو روانہ ہو گئے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں غالباً آپ نے خاموشی کی زندگی بسر کی [illegible] عہد خلافت میں آپ نے عراق کی فوج کشی میں شرکت کی۔ اگرچہ عراق پر حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت ہی میں فوج کشی ہو چکی تھی۔ [illegible] اس سلسلے کی مشہور جنگ [illegible] عہد خلافت میں ہوئی۔ مسلمانوں کو نہایت سخت شکست ہوئی [illegible] اس لئے حضرت عمرؓ نے [illegible] کی امداد کے لئے تمام عرب [illegible] قبیلے کے سردار کو اس قبیلے کا افسر بنا کر [illegible] جریرؓ بجیلہ کے [illegible] ساتھ عراق پہنچے اور مقام [illegible] میں حارثہ سے جو [illegible] کے مقابلہ [illegible] میں مسلمانوں اور ایرانیوں کا مقابلہ ہوا۔ جریرؓ اپنے قبیلے کو [illegible] مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

جنگ یرموک میں جس [illegible] بڑے [illegible] اور بہادری [illegible] کے بعد کسریٰ کا پایہ تخت فتح ہوا۔ بعد میں عمرو بن مالک نے جلولاء کی مہم [illegible] مسلح فوج کے ساتھ جلولاء کی حفاظت کے لئے متعین کیا۔

جلولاء کے قریب [illegible] جو ایرانیوں کا اہم مرکز تھا [illegible] کر لیا۔ اس کے بعد [illegible] کی باری آئی۔ تو [illegible] جریرؓ [illegible] میں ناکام ہو گئے۔ بعد میں [illegible] مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جریرؓ ہمدان کے گورنر تھے۔ [illegible] کے بعد حضرت علیؓ کی بیعت کر لی اور اپنے [illegible] حضرت علیؓ کی بیعت [illegible] کوفہ چلے آئے۔ جنگ جمل کے بعد جب حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو [illegible] بیعت کے خط لکھا تو اس خط کو حضرت امیر معاویہؓ کے پاس لے جانے [illegible] جریرؓ ہی تھے [illegible]

اہل شام نے حضرت علیؓ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تو واپس آکر مطلع کیا اور حضرت امیر معاویہؓ کے انتظامات سے بھی مطلع کیا۔ اس پر کچھ دوسرے لوگ آپ سے ناراض ہو گئے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں رکھنے لگے۔ چنانچہ ان باتوں سے بددل ہو کر آپ نے قرقیسیا میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔ پھر آپ نے کسی جنگ میں حصہ نہ لیا۔ نہ ہی آپ جنگ صفین میں شریک ہوئے بلکہ قرقیسیا میں خاموشی کی زندگی بسر کرنے لگے اور یہیں پر وفات پائی۔

آپ کی اولاد میں پانچ لڑکے عمر، منذر، عبیداللہ، ایوب اور ابراہیم تھے۔

اگرچہ آپ آخری زمانہ میں مشرف با سلام ہوئے اور اس وجہ سے آپ کو فیضان نبوی سے استفادے کا موقع بھی کم ملا۔ لیکن جتنا وقت آپ کو ملا اس سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ آپؓ سے ایک سو کے قریب احادیث مروی ہیں۔ جن میں سے آٹھ متفق علیہ ہیں۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں آپ کے لڑکوں میں منذر عبیداللہ، ایوب ابراہیم اور ان کے علاوہ ابوذرعہ بن عمر، انس، ابووائل، زید بن وہب زیاد بن علاقہ شعبی، قیس بن ابی حازم، ہمام بن حارث وغیرہ ہیں

آپ اتنے حسین تھے کہ حضرت عمرؓ آپ کو امت مسلمہ کا یوسف کہا کرتے تھے۔

آنحضورؐ آپ کی بہت عزت و توقیر فرماتے تھے۔ جب آپ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے تو آنحضورؐ آپ کے بیٹھنے کے لیے چادر مبارک بچھا دیتے تھے۔ آپ کو دیکھ کر مسکرا دیتے تھے اور غائبانہ ذکر خیر فرماتے۔

جریرؓ کی خوبیوں اور آنحضورؐ کے ان کی توقیر کرنے کی وجہ سے خلفاء اربعہ بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے۔ "خدا تم پر رحمت نازل فرمائے، تم جاہلیت میں بھی اچھے سردار تھے اور اسلام میں بھی اچھے سردار ہو۔"

جزا: بدلہ، صلہ، مکافات۔ یہ لفظ اچھے اور برے اجر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ثواب کے لیے بھی اور سزا کے لیے بھی۔

جزا کا ایک عظیم الشان وقت وہ ہے جو قیامت یا محشر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے جزا اس عالم میں بھی ہے۔ لیکن اخروی زندگی کے لیے خاص طور پر مستعمل ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی جزا و سزا ایک کھلا کھلا رنگ ان نتائج کا ہے جو فی الحقیقت ہر فعل کے ساتھ ساتھ ہر آن یہاں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر وہ نظر انسانی سے بسا اوقات مخفی رہتے ہیں۔ بعض وقت بطور نمونہ ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔

آخرت کی زندگی جسے سورۂ بقرہ میں پانچواں اصول مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اس زندگی پر یقین رکھنا یہی ہے کہ انسان جزا و سزا پر کامل یقین رکھے۔ جب ایک انسان ایک فعل کے نتیجے کو برا جانتا ہے تو وہ عموماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اچھا جانتا ہے تو اسے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جزا و سزا پر یقین انسان کو گناہ سے بچاتا ہے اور جب تک اعمال کی جزا و سزا پر یقین کامل نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا مودودی رقمطراز ہیں کہ اس کے معنی ہیں "روز جزا کا مالک" یعنی اس دن کا مالک جب کہ تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے ان کے کارنامۂ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا صلہ یا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ کی تعریف میں رحمان اور رحیم کہنے کے بعد مالک روز جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ نرا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ منصف بھی ہے اور منصف بھی ایسا با اختیار منصف کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہو گا نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔"

جزا و سزا کا ذکر قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے۔

"جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔" (۷: ۱۸۰)

"کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے وہ ان کے چہروں اور ان کے کولھوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو، یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا" (۸: ۵۰، ۵۱)

"پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزا چکھو، جو تم کماتے رہے ہو اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے۔"! (۱۰: ۵۲)

"اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے گا۔" (۱۴: ۵۱)

"اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا۔" (۱۱: ۱۱۱)

"جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید فضل ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی۔ وہ جنت کے مستحق ہیں۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے۔" (۱۰: ۲۶، ۲۷)

"اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو۔ تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔" (۶۶: ۷)

"بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے .... درحقیقت جہنم ایک گھات ہے، سرکشوں کا ٹھکانا، جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کے دھوون (ان کے کرتوتوں) کا بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے۔ اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لئے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔

یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے، باغ اور انگور اور نوخیز ہم سن لڑکیاں اور چھلکتے ہوئے جام، وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے۔ جزا اور کافی انعام تمہارے رب کی طرف سے۔" (۷۸: ۱۷ تا ۳۶)

پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی۔ وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔" (۹۹: ۷، ۸)

قرآن و حدیث میں وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومن صالح، مومن خطاکار مومن ظالم و فاسق، محض کافر اور کافر مفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔

اول یہ کہ کافر و مشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے۔) ضائع کر دیے گئے۔ آخرت میں وہ ان کا وہاں کوئی اجر نہیں پا سکیں گے۔ ان کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں ان کو مل جائے گا۔

دوم یہ کہ بدی کی سزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہے۔ مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی۔ بلکہ کہیں تصریح ہے کہ ہر نیکی کا اجر اس سے دس گنا ہے اور کہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کر دے۔

سوم یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں تو ان کے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

چہارم یہ کہ مومن صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ اس کی برائیوں سے درگذر کیا جائے گا اور اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالےٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ دنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے وہ رزق دیتا ہے اور آخرت میں ان کی جزا دے گا۔ رہا کافر تو دنیا میں اس کی بھلائیوں

کا بدلہ چکا دیا جاتا ہے پھر جب قیامت ہوگی تو اس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی" (ابن ماجہ)
آیت "جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا" انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے۔ یوں ہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں۔

جزا کی حقیقت، اس کی مدت اور اس کے مستحقین کے بارے میں جو مسائل ہیں ان میں بکثرت اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ معتزلہ کے عقیدے کے مطابق خدا کی طرف سے خیر کا اجر اور برائی کی سزا لازمی ہے۔ عقل ہمیں یہی سمجھاتی ہے۔

معتزلہ بصرہ کی رائے یہ تھی کہ خدا نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ لیکن چاہے تو سارے گنہگاروں کو بخش دے۔

عام عقیدہ یہ ہے کہ مومن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ میں نہیں رہے گا۔ بالآخر خدا اسے نجات دے دے گا۔ جبکہ معتزلہ اور خوارج کی اکثریت اس خیال کی حامی تھی کہ کبیرگناہ انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ میں پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن جاحظ کے نزدیک یہ صرف ضد کی منکری کا مقدر تھا۔

جزُولی، ابوعبداللہ

(۔۔۔۔۸۷۰ھ/۱۴۶۵ء) محمد بن سلیمان بن ابی بکر۔ ایک صوفی اور فقیہہ۔ مراکشی سوس میں بربر قبیلہ جزولہ میں پیدا ہوئے اور انہیں میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی بعد میں فاس چلے گئے اور وہاں مدرسہ صفارین میں داخل ہو کر مزید تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسہ میں ان کا سکونتی حجرہ آج تک محفوظ ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے قبیلے میں واپس گئے ہی تھے کہ انہیں مجبوراً شمالی مراکش کی طرف چلے جانا پڑا کیونکہ انہوں نے لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لئے ایک ایسے جرم کا اعتراف کر لیا تھا جس کا ارتکاب انہوں نے نہیں کیا تھا وہاں سے سمندر کے راستے بلاد مشرق کی طرف چلے گئے۔ اور چالیس سال وہیں پر گذارے۔ اس عرصے میں وہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کچھ عرصہ بیت المقدس میں رہے۔ اس کے بعد فاس میں واپس لوٹ آئے۔ اپنے اس قیام فاس کے دوران میں انہوں نے اپنی کتاب دلائل الخیرات تالیف کی۔ اس کے بعد سلسلہ شاذلیہ میں بیعت کی اور چودہ سال تک دنیا سے کنارہ کش رہے اور عبادت الٰہی میں مشغول رہے۔ چودہ سال بعد خلوت خانہ سے نکل کر اسفی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں ان کے مریدین کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی حتیٰ کہ شہر کا حاکم انہیں وہاں سے نکال دینے پر مجبور ہو گیا۔

ایک روایت ہے کہ جزولی نے اس شہر کے لئے اللہ تعالیٰ سے بددعا کی جس کے نتیجے میں وہ چالیس سال تک پرتگیزوں کے قبضہ میں رہا۔

ایک اور روایت کے مطابق شہر کے حاکم نے ان کے بارے میں یہ خیال کر کے کہ یہ مہدی ہی ہیں جن کا انتظار ہے۔ انہیں زہر دلا دیا۔ انہوں نے نماز کی حالت میں وفات پائی۔ جس مقام پر ان کی وفات ہوئی وہ آفوغال تھا۔ ان کے ایک مرید عمر بن سلیمان السیاف نے اس واقعے سے متاثر ہو کر خود نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اپنے مرشد کا انتقام لینے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے جزولی کی نعش ایک تابوت میں رکھی اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسلسل بیس سال تک وہ اپنے مرشد کی نعش کو ساتھ لئے ضلع سوس کو تاخت و تاراج کرتا پھرا۔ جب شام ہوتی تو وہ اسے ایک جگہ رکھ دیتا۔ اس جگہ کا نام اس نے رباط رکھا ہوا تھا۔ اس کے گرد پہرا لگوا دیتا اور ایک قد آدم دیا جلتی جو تیل سے بھرے ہوئے پیپے میں کھڑی رہتی۔ جب ۸۹۰ھ/۱۴۸۶ء میں عمر السیاف قتل کر دیا گیا تو جزولی کی نعش کو حاحۃ کے علاقہ میں دفن کر دیا گیا۔ ستر سال بعد جب سلطان ابوالعباس احمد اعرج مراکش میں داخل ہوا تو اس نے شیخ کی نعش کو قبر کھود کر نکلوایا اس کے ساتھ ہی سلطان کے والد کی نعش بھی نکالی گئی۔ جنہیں مراکش لے جایا گیا اور ریاض العروس کے مقبرے میں پہلو بہ پہلو دفن کیا گیا۔

عوام میں جزولی سیدی بن سلیمان کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا شمار مراکش کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔

جزولی تصوف کے [illegible] عالم ہونے کے علاوہ فقیہہ بھی تھے۔ ابن الحاجب کی "مدونہ" اور "المختصر الفرعی" از بر تھیں۔

اگرچہ تصوف میں انہوں نے کئی ایک کتب تصنیف کی تھیں لیکن آج ۴ مندرجہ ذیل کتابیں دستیاب ہیں۔

۱۔ "دلائل الخیرات وشوارق الانوار فی ذکر الصلوٰۃ علی النبی المختار"

۲۔ حزب الفلاح۔ ۳۔ حزب الجزولی موجودہ دور میں حزب [illegible] کے نام سے مشہور ہے۔

جزولی، ابوموسیٰ

(۔۔۔۔؟۔۔۔۔ ۶۰۷ھ/۱۲۰۸ء) عیسیٰ بن عبدالعزیز بن یللبخت بن عیسیٰ بن یوم [illegible] بربر قبیلے کا ایک فرد تھا جو جزولہ مراکش کے البربر [illegible] میں شامل ہے۔ ابتدائی تعلیم مراکش میں حاصل کی۔ [illegible] کا رخ کیا اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے شرف یاب ہوا۔ [illegible] ابومحمد بن عبداللہ بن بری کے درسوں میں شریک ہوا۔ [illegible] محمد بن عبیداللہ سے پڑھی۔ اپنے قیام [illegible] سی [illegible] پڑا اور فقر و فاقہ کی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔

واپسی میں وہ بجایہ میں کچھ دن کے لئے ٹھہر گیا۔ [illegible] قواعد عربیہ کے پڑھانے میں صرف کیا۔

۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں اپنے الجزائر کے قیام کے دوران [illegible] نحوی ابوعبداللہ بن محمد بن [illegible] کی کتاب [illegible] بعد سمندر پار کر کے وہ اندلس پہنچا اور کچھ عرصہ [illegible] نحو کی تعلیم [illegible] ابوالعباس المعزب نے الموحدین کے سلطان سے سفارش کر کے [illegible] مسجد میں خطیب کا عہدہ دلایا۔

ابوموسیٰ جزولی نے ازمور میں انتقال کیا۔ بقول ابن قنفذ [illegible] میں وفات پائی۔

اس کے شاگردوں میں ابن مطیع بن عبدالرحمان [illegible] الازدی الشلوبینی تھے۔

اس کی تصانیف میں [illegible] جو [illegible] نام سے مشہور ہے۔ ۳۔ القانون کی شرح [illegible] لابن السراج۔ ۶۔ شرح دیوان المتنبی و اختصار [illegible]۔

جزیرۃ الخضرا

ایک شہر جو [illegible] پورپ کے درمیان واقع ہے۔ [illegible] جو اس عورت کے نام پر ہے [illegible] موسیٰ بن نصیر [illegible] اپنے ساتھ لے کر اس جزیرے میں داخل ہوا اور بعد میں یہ علاقہ [illegible] دیا تھا۔ شامی سرداروں نے ان پر [illegible] جنہیں [illegible]

۷۴۰ء میں اس وقت ان کے سپرد کیا تھا جب وہ لبستہ سے بربروں کی ایک بغاوت کو فرد کرنے کے لئے جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں وارد ہوا تھا۔

اس شہر کو جولیا جوزا کا نام بھی دیا جاتا رہا ہے۔ رومی عہد میں اس کا نام ایڈپورٹم ایلیم تھا۔

یہ جزیرہ ایک پہاڑی پر آباد ہے جو سمندر پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کی دیواریں ساحل بحر تک چلی گئی ہیں۔

اس علاقے کو مسلمانوں نے رمضان ۹۱ھ/ستمبر، اکتوبر ۷۱۰ء میں فتح کیا تھا اور یہ وہ پہلا مقام تھا جو مسلمانوں نے اندلس میں فتح کیا تھا۔ مسلمانوں نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی جو جزیرۃ الخضراء کے جنوب مشرق سمت سمندر کے کنارے بنائی گئی تھی۔ اس مسجد کو مسجد الرایات (جھنڈوں والی مسجد) کہتے تھے کیونکہ یہاں ان جھنڈوں کے نیچے عرب اور بربر قبائل جو طارق کے زیر فرمان تھے، مشورے کرتے تھے۔ ۲۴۵ھ/۸۶۰ء میں نارمنوں (مجوسیوں) نے اسی مسجد کے بالمقابل صف آرائی کی اور بعد میں اس پر قابض ہو کر اسے جلا دیا تھا۔

عبدالرحمان ثالث نے یہاں پر اپنے فوجی دستوں کے لئے ایک اسلحہ خانہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے سپہ سالاروں نے یہیں سے مراکش کے ادریسیوں کے خلاف فوج کشی کی۔ خلافت اندلس کے موقعہ پر بربروں نے پہلے ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں اور پھر ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء سے ۴۴۹ھ/۱۰۵۶ء تک اس کو تاخت و تاراج کیا۔ یہیں اس کے اشبیلیہ سے الحاق سے قبل حمودی خاندان کے محمد اور قاسم نے اپنی خلافت قائم کی۔ ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں جزیرۃ الخضراء کو معتمد نے یوسف بن تاشفین کے حوالے کر دیا۔ جس نے یہیں پر فوج کشی زلاقہ کے مقام پر الفانسو ششم کو شکست فاش دی۔ یوسف نے فوراً شہر کی حصار بندی کی اور شہر کے گرداگرد ایک خندق کھدوائی اسلحہ اور خوراک ذخیرے فراہم کئے اور سپاہیوں کا ایک منتخب دستہ تعینات کیا۔ جب دوسری بار اس نے سمندر پار کیا تو پھر یہیں پر اترا اور الیت کے محاصرے کے لئے یہیں سے روانہ ہوا۔ ۵۴۰ھ/۱۱۴۶ء میں الموحدون کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء اور ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں اہل قشتالیہ نے اس شہر کو اور رندہ کے علاقوں کو خوب لوٹا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں یہ شہر ابن ہود کے زیر سیادت آ گیا۔ ۶۶۷ھ/۱۲۶۸ء میں الفانسو (فاضل) نے سمندر کے راستے اس شہر کی ناکہ بندی کر دی۔ ۱۲۷۹ء میں مسیحی فوجوں نے یہاں پر ڈیرے ڈال دیئے ۱۲ جولائی ۱۲۷۹ء کو قشتالوی لشکر نے بنو مرین کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ انہوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کر کے اسے سر کر لیا۔ اندلس کی جارحیتوں کے دوران میں ابو یوسف نے اسی شہر کو اپنی کارروائیوں کا مستقر بنایا۔ اس کے قریب ہی فاس میں قصر البنیہ تعمیر کرایا۔ ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء میں ابوالحسن علی نے جزیرۃ الخضرا کی خلیج میں امیر البحر تینوریو کے لشکر کو شکست دی اور شہر میں داخل ہوا لیکن دو سال بعد الفانسو یازدھم نے اس شہر کو فتح کیا۔ ۷۷۰ھ/۱۳۶۹ء میں غرناطہ کے سلطان نے اسے دوبارہ تسخیر کیا اور اس کے استحکامات کو تباہ و برباد کر دیا لیکن اس کا یہ قبضہ زیادہ دیر نہ رہا۔ کیونکہ چند سال بعد عیسائیوں نے مستقل طور پر اپنی حکومت قائم کر لی انہوں نے مسلمانوں کا بنایا ہوا شہر گرا دیا۔ اس شہر کا الحاق جبل الطارق سے ہو گیا۔ اور ۱۷۵۵ء تک اسے انتظامی طور پر سان روکیو سے علیحدہ نہیں کیا گیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اس شہر نے بہت سرعت سے ترقی کی۔ ۱۹۰۵ء میں یہاں پر ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ جو مراکش کے مسئلے پر غور و خوض کے لیے تھی۔

جزیہ جزیہ جزا سے مشتق ہے۔ بقول امام راغب اصفہانی اس کا نام جزیہ اس لیے ہے کہ یہ ذمیوں کی جانوں کی حفاظت کا بدل ہے۔

بقول "صاحب روح المعانی" کیونکہ اہل ذمہ کو قتل و قتال سے بری الذمہ کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کام کی جزا اور بدلے کے طور پر ان سے جزیہ لیا جاتا ہے۔" پھر آخر میں خوارزمی کا قول نقل کیا ہے یہ "گزیت" کا معرب ہے جس کے معنی فارسی میں خراج کے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک حتیٰ یعطوا الجزیۃ سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ عقد معاہدہ پر قائم رہیں۔ جسطرح تمام حکومتوں کے قوانین میں ٹیکس دیتے رہنا وفاداری و پابندی قانون کی دلیل ہے۔ اور نہ ادا کرنا بے وفائی و غداری کی۔ اسی طرح جزیہ دیتے رہنا بھی پابندی عہد کی دلیل ہے۔ اور اس کا ادا نہ کرنا نقض عہد کا ہم معنیٰ۔

ابن اثیر نے جزیے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"جزیہ عبارت ہے اس مال سے جس پر اہل کتاب سے حفاظت جان کی ذمہ داری کا معاہدہ طے کیا جائے گویا یہ ذمی کی جان کا بدل ہے۔

بقول ابن منظور "ذمی کا جزیہ وہ مال ہے جس پر وہ حفاظت اور ذمے داری میں آنے کا معاہدہ طے کرے۔"

مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک "جزیہ وہ مال ہے جو ذمی پر عائد کیا جاتا ہے جسے خراج یا خراج الراس بھی کہتے ہیں۔

اسلام کے عہد اولین میں خراج اور جزیہ ایک دوسرے کے مترادف رہے ہیں۔

جزیہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب غیر مسلم دشمن ہتھیار ڈال دے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا معاہدہ مذکورہ اسلامی اصولوں کے مطابق طے پا جائے اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی حفاظت و ذمے داری میں آنا قبول کرے۔ جزیے کی وصولی پورا سال گذرنے کے بعد ہو گی۔ اس سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ نیز اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جائے تو اس کا جزیہ معاف ہو جاتا ہے۔

ابن اثیر نے ایک حدیث نقل کی ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا "مسلمانوں پر کوئی جزیہ نہیں" اس کی تشریح میں اس نے لکھا ہے کہ جب کوئی ذمی مسلمان ہو جائے اور سال کا کچھ حصہ گذر چکا ہو تو قبول اسلام سے سال کے اس حصے کا جزیہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح ذمی کے فوت ہو جانے پر بھی جزیہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

جزیے کی حکمت یہ ہے کہ ایک طرف تو ذمی لوگ کفر پر مصر ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی جان و مال کی حفاظت بھی چاہتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر دارالاسلام کے دفاع میں اور دارالحرب کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس لئے ان کے سامنے ایک آسان متبادل صورت رکھی گئی ہے اور وہ یہ کہ شہری حقوق کے بدلے ذمی لوگ مالی ذمے داری قبول کریں۔ چنانچہ ایک شہری کے طور پر جزیے کی مناسب مقدار انہیں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی ہے کہ چونکہ دارالسلام کے باشندے اس کی حفاظت و دفاع کے لیے اپنی رغبت سے جان و مال کی قربانی دیتے ہیں اور ایک غیر مسلم سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دارالاسلام سے اسے قلبی وابستگی یا دلی لگاؤ ہو گا اور ظاہر ہے کہ قدرۃً اس کا اندرونی میلان دارالحرب ہی کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس سے سچی قربانی اور کامل امداد کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

جزیہ کی رقم ایسی قلیل مقرر کی گئی ہے کہ اس کا ادا کرنا ان لوگوں پر بار نہ ہو۔ اس کے وصول کرنے کے طریقوں میں بھی نرمی و رفق کی تاکید کی گئی ہے۔ قید اور سزا وغیرہ سے انہیں تکلیف دینا اور ان پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا جائز نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے متعلق کئی ایک تاکیدی احکام اور روایات موجود ہیں۔

حضرت عمرؓ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ کی ایک بڑی رقم لائی گئی۔ آپ نے اسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہوتا ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا۔" محصلین نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی سے وصول کیا ہے۔" آپ نے پھر پوچھا بغیر مارے باندھے؟

انہوں نے عرض کیا "بغیر مارے باندھے"۔ تب آپ نے کہیں جاکر اس مال کو بیت المال میں داخل کرنے کی اجازت دی۔

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو عکبری پر عامل مقرر کرتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ خراج کی تحصیل میں ان پر ایسی سختی نہ کی جائے کہ وہ اپنے گدھے یا اپنی گائیں یا اپنے کپڑے یا دوسری چیزیں فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرنا۔"

حضرت حکیمؓ بن حزام نے فلسطین کے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ تحصیل جزیہ میں سختی کرتے ہیں۔ تو انہوں نے اس سے منع کیا اور کہا کہ میں نے آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو لوگ دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں انہیں اللہ تعالےٰ قیامت کے دن تکلیف دے گا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اسلامی فوجیں حمص (شام) سے ہٹ آئیں تو حضرت ابوعبیدہؓ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر کئی لاکھ کی رقم جزیہ یہ کہہ کر لوٹا دی کہ چونکہ ہم اب تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے یہ جزیے کی رقم بھی نہیں رکھ سکتے۔

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ ان شہری حقوق کے جواب میں ایک ٹیکس ہے جو جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری کی شکل میں انہیں حاصل ہوتے ہیں۔

مسلم آبادی حقوق کے لئے دوسری طرح کے فرائض بجالاتی ہے۔ یعنی فوجی خدمات مگر غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہو کر صرف جزیے کے مکلف ہوتے ہیں۔ نیز ان باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں پر جو جزیہ عائد کیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ امن و آئین کے پابند ہوں۔ رضا و رغبت کے ساتھ قانون عدل کی اطاعت کریں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے مصارف ادا کریں جو انہیں پرامن زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے۔ ظلم و تعدی سے محفوظ رکھتی ہے انصاف کے ساتھ حقوق تقسیم کرتی ہے۔ قوت والوں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکتی ہے کمزوروں کو قوت والوں کا غلام بننے سے بچاتی ہے اور تمام سرکش عناصر کو اخلاق و انسانیت کا پابند بناتی ہے۔

قرآن مجید کی آیت جزیہ "ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں۔ اور نہ وہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اور محکوم و مطیع ہونا قبول کریں۔" کی رو سے وجوب جزیہ کی تین شرائط نکلتی ہیں۔ اور اگر ان تینوں میں سے کسی ایک کا فقدان ہوگا تو جزیہ لینا جائز نہ ہوگا

۱۔ یہ کہ مسلمان جنگ کے ذریعے انہیں قوت سے مغلوب کرلیں۔ اس لئے جنہیں قوت سے مغلوب نہ کیا گیا یا وہ قتال کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں جیسے بچے، بوڑھے اور عورتیں، تو ان پر جزیہ عائد نہ ہوگا۔

۲۔ وہ اسلامی حکومت کے مطیع و محکوم ہونے پر راضی ہو کر معاہدہ طے کرلیں۔

۳۔ ذمی کو حفاظت کی نعمت حاصل ہو لہٰذا اگر جان و مال کی حفاظت نہ ہو تو جزیے کی وصولی کا حق نہیں ہوگا۔

جزیہ عائد کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کافر مسلمانوں کی قوت سے ٹکرانے کی جرأت نہ پائیں اور برضا و رغبت غلبہ اہل اسلام قبول کرلیں۔ اس صورت میں جزیے کی مقدار وہی رہے گی جو طرفین باہمی گفت و شنید سے طے کرلیں گے۔ جیسا کہ آنحضورؐ نے بنی نجران سے ایک ہزار دو سو حلہ ادا کرنے پر معاہدہ کیا تھا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھا کر غلبہ اہل اسلام قبول کرلیں۔ اور امام وقت انہیں اپنے مذہب اور اپنی املاک پر برقرار رہنے کی اجازت دے دے اور ان پر جزیہ عائد کردے۔

امام احمد کے نزدیک جزیے کی کوئی مقدار متعین نہیں بلکہ وہ امام وقت کی صواب دید پر ہے جب کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دولت مند پر ۴۸ درہم اور متوسط الحال پر ۲۴ درہم سالانہ ہے۔

امام مالک کے نزدیک یہ مقدار چار دینار یا چالیس درہم سالانہ ہے۔ جبکہ امام شافعی کے نزدیک ہر بالغ ذمی پر جزیہ ضروری ہے اور ہر امیر غریب، مرد، عورت، بوڑھے، پاگل اندھے اور راہب پر ایک دینار ہے۔

اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ مذہب کے لحاظ سے جزیہ ادا کر کے حفاظت میں آنے کے مستحق کون لوگ ہیں۔

اہل کتاب اور مجوس سے جزیہ لینے پر تو سب لوگ متفق ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مشرکین عرب کے سوا ہر کافر و مشرک سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ مجوسی ہوں یا صابی یا بت پرست، امام شافعی کہتے ہیں جزیہ اہل کتاب و مجوس سے خاص ہے۔ امام مالک نزدیک مرتد کے سوا ہر کافر سے جزیہ لیا جا سکتا ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک جزیہ اہل عجم کے ساتھ خاص ہے خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک۔ اہل عرب خواہ اہل کتاب ہو یا مشرک ان سے صرف اسلام یا تلوار قبول ہے

آنحضورؐ نے یہود و نصاریٰ اور مجوس سے جزیہ قبول فرمایا۔ اور انہیں مذہبی آزادی عطا کی۔ البتہ بت پرست اور مشرک عربوں سے صرف اسلام ہی قابل قبول تھا۔ جزیے سے ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری کبھی قبول نہیں کی۔

حضرت معاذؓ کو جو آنحضورؐ کے عہد مبارک میں یمن کے گورنر تھے آپؐ نے انہیں ہدایت فرمائی۔ "یہود و نصاریٰ کو اپنا دین چھوڑنے کی آزمائش میں نہ ڈالا جائے اور ان پر جزیہ عائد کیا جائے۔ ہر بالغ مرد، عورت، غلام اور لونڈی پر ایک دینار یا اس کا مساوی (یعنی کپڑا) واجب ہے۔ جو یہ رقم میرے کارندوں کو ادا کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت و ذمہ داری میں آگیا۔ اور جو نہ دے گا وہ اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ (نیز دیکھئے "اہل ذمہ")

جسم بدن۔ اصطلاح فلسفہ میں جسم اور لاجسم، اللہ، روح اور نفس کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے افکار کے نوفلاطونیت سے متاثر ہونے کا تعلق ہے ان کے ہاں دو خصوصیات پر زور دیا گیا ہے ۱۔ لاجسم کلی طور پر بسیط اور غیر منقسم ہے۔ ۲۔ لاجسم اپنی سلبی صفت کے باوجود ایک حقیقی معلول مسبب ہے۔ جبکہ جسم لاجسم کا ایک حاصل ہے۔

بقول امام اشعری ایک شیعی متکلم ہشام بن الحکم [illegible] عیسوی اس نظریے کا بہت بڑا علمبردار تھا کہ اللہ ایک جسم ہے۔ [illegible] دنیوی اجسام سے نہیں کرتا تھا۔ بلکہ مجازی مفہوم میں ایک ہستی موجود قرار دیتا تھا جو بسبب خود اپنی ذات کے موجود ہے۔

علم الکلام کے دبستانوں کے درمیان طویل مباحث کے بعد مسلمانوں نے [illegible] لاجسمیت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن نفس انسانی کی روحانیت کے عقیدے کو [illegible] بالخصوص امام غزالی کی تائید حاصل تھی۔ قبول عام نصیب ہوا۔ ابن حزم نے اپنی کتاب "الفصل" میں نفس ذویہ کو جسم قرار دیا۔ اس لئے کہ یہ دیگر افراد کے نفوس سے [illegible] اور اس لئے بھی کہ اسے متعدد ایسی باتوں کا علم ہے جن سے کوئی اور واقف نہیں۔

فلسفیانہ اعتبار سے دیکھا جائے تو جوہریت پسندوں اور ان کے مخالفین میں [illegible] ایک مفروضہ مشترک ہے اور وہ یہ کہ جسم مرکب لاجسم سے۔ لیکن [illegible] جوہریت [illegible] متکلمین کے نزدیک جسم نے ایسے چھوٹے چھوٹے ذروں اجزاء سے ترکیب پائی ہے جن کی مزید تقسیم ممکن نہیں اور جو بجائے خود لاجسم اور ناقابل ادراک ہیں۔ اس کے برعکس

ارسطو اور اس کے ہمنوا فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ جسم مرکب ہے ۔ ہیولیٰ (مادہ) اور صورت سے اور یہ دونوں بذات خود لاجسم اور ناقابل تقسیم اور ناقابل ادراک ہیں لیکن جسم قابل تقسیم ہے ارسطو کے نزدیک "جسم وہ ہے جس کے تین ابعاد ہوں ۔ اور جو متصل اور بجز طور غیر منقسم کمیت ہو ۔

اس سوال کا کہ جسم کس طرح معرض وجود میں آتا ہے ، جواب یوں دیا گیا ہے کہ جسم نے جسمیت کے ذریعے مادی وجود اختیار کیا ہے ۔ جب جسم مطلق یا مادہ ثانیہ اس طرح معرض وجود میں آتا ہے تو محسوس اجسام کے ابعاد اور اس کی دیگر صفات بھی معرض وجود میں آجاتی ہیں ۔ اس طرح لاجسم اور جسم کے درمیان خلیج کو پاٹ دیا گیا ہے ۔

بدن ، جسد کو جسم کے مترادفات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ بدن اور جسد کا اطلاق عموماً انسانی جسم پر ہوتا ہے ۔ بدن کا اطلاق عموماً دھڑ پر ہوتا ہے ۔

انسان کے اعضاء قدرت نے مقصداً پیدا کئے ہیں ۔ ان کے صحیح استعمال اور حفاظت کا نام آداب ہے ، جسم کی پاکیزگی اور صفائی کا موجب ہے اس سے صحت قائم اور طبیعت خوش رہتی ہے ۔ روزانہ غسل کرنا تمام دن تر و تازہ رکھتا ہے ۔ اس سے صحت قائم اور طبیعت خوش رہتی ہے ۔ چہرہ چونکہ انسان کا آئینہ دل ہوتا ہے اس لئے چہرے پر وقار و سکون کی علامت موجود رہنی چاہیئے ۔ سر ہمیشہ سیدھا رکھنا چاہیئے ۔ سر کے بال یا تو تمام رکھنے چاہئیں یا پھر تمام منڈوا دینے چاہئیں ۔ سفید بالوں کا اکھاڑنا مکروہ فعل ہے آنکھوں کو مدھم اور تیز روشنی سے بچانا اور ہمیشہ صاف رکھنا چاہیئے ۔ ہلکی روشنی میں مطالعہ نہیں کرنا چاہیئے ۔ مطالعہ کرتے ہوئے روشنی بائیں طرف سے آنی چاہیئے ۔ آنکھوں کو سورج کی طرف دیکھنے سے روکنا چاہیئے ۔ سبز اور نیلا رنگ آنکھوں کے لئے مفید ہے کانوں میں کوئی چیز پھیرنے سے پردے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ کان اچھی بات سننے کے لئے ہوتے ہیں ناک میں انگلی ڈالنا خلاف ادب ہے اس لئے رومال استعمال کرنا چاہیئے ۔ دانتوں کی حفاظت کے لئے مسواک کرنا لازم ہے ۔ دانتوں سے ناخن کترنا ، ہونٹوں میں دبانا اور زبان کو ہونٹوں پر پھیرنا بری بات ہے ۔ زبان سے گندی بات کہنے سے غیبت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے اور اسے نیک کلمات میں استعمال کرنا چاہیئے ہاتھوں سے کھیلنا ، منہ پر رکھنا اور بالوں میں پھیرنا خلاف تہذیب ہے ۔ انگلیاں چٹخانا اور لوگوں کے سامنے ناخن کاٹنا درست نہیں ۔ ہاتھوں سے دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہیئے ۔ ہر کام دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیئے ۔ پاؤں دھو کر صاف رکھنے چاہئیں اور انہیں برے کاموں کی طرف لے جانے سے پرہیز کرنا چاہیئے ۔ یہ آداب جسم انسان میں کمال حقیقی پیدا کرتے ہیں ۔

جصاص (۳۰۵ھ/۹۱۷ء ۔ ۷ ذوالحجہ ۳۷۰ھ/۲۸ اگست ۹۸۱ء) احمد بن علی ابوبکر الرازی ، ایک مشہور حنفی فقیہہ ۔

۳۲۴ھ/۹۳۵ء میں بغداد پہنچا ۔ جہاں پر علی بن الحسن کرخی کے حلقہ درس میں فقہ کا مطالعہ کیا ۔ اپنے قیام بغداد کے دوران میں قرآن و حدیث پر بھی کام کیا اور عاصم ، عبدالباقی قانع ، عبداللہ بن جعفر الاصفہانی گجرانی اور دیگر اساتذہ سے احادیث کی روایت کی ۔ بعد میں اپنے استاد کرخی کی ہدایت پر نیشاپور گئے اور وہاں پر حاکم نیشاپوری کی زیر نگرانی اصول حدیث کا مطالعہ کیا ۔ کچھ عرصے بعد جب ان کے استاد کرخی وفات پا گئے تو وہ واپس بغداد چلے آئے اور یہ واقعہ تقریباً ۳۴۴ھ/۹۵۵ء کا ہے ۔

بغداد واپس آکر جصاص حنفیوں کے سرگروہ بن گئے ۔ انہیں دو مرتبہ قاضی کے عہدے پر نامزد کیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا ۔

جصاص نے محدثین اور فقہاء کے درمیان ثالثی کے فرائض سر انجام دیئے ۔ اس کے شاگردوں میں قدوری ابوبکر احمد بن موسیٰ خوارزمی اور کئی ایک علماء ہیں ۔ انہوں نے نیشاپور میں انتقال کیا ۔

ان کی تصانیف میں "کتاب الاصول" جو شیبانی کی جامع الکبیر کی شرح ہے ۔ "شرح المختصر فی الفقہ" جو امام طحاوی کی المختصر فی الفقہ کی شرح ہے ۔ "احکام القرآن" دستیاب ہیں ۔

جعدہ (عامر) جنوبی عرب کا ایک قبیلہ ۔ ابتدائے عہد اسلام میں جعدہ کے پاس یمن کے پہاڑی حصے یعنی سرو حمیر کے انتہائی جنوب کی وہ زمینیں تھیں جن کے شمال میں الضالع اور قعطبہ کے موجودہ شہر اور جنوب میں وادی ابین واقع ہے ۔ عدن سے صنعا جانے والی سڑک جعدہ کے علاقے سے گذرتی تھی ۔ ان کے ہمسائے بنو مذحج اور بنو یافع تھے ۔ جنوبی عرب کے جعدہ کو ہمدانی نے عین الاکبر کا ایک قبیلہ لکھا ہے ان میں اور شمالی عرب کے قبیلہ جعدہ بن کعب بن ربیعہ میں فرق ہے ۔ ہمدانی نے مزید لکھا ہے کہ اس زمانے میں جنوبی عرب کے جعدہ دعوے کرتے تھے کہ وہ جعدہ بن کعب کے حوالہ سے زیادہ طاقتور قبیلہ تھا ، رشتہ دار ہیں

البکری کے بقول جعدہ بن کعب جنوب کی جانب نجران کے علاقے تک پائے جاتے ہیں ۔ اور غالباً اس قبیلے کے مہاجر مغربی نجد سے یہاں آئے اور جعدہ سرو حمیر ان کی انتہائی جنوبی آبادی کے نمائندے ہیں جو مقامی لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے ہیں ۔

ہمدانی نے جعدہ کے علاقے کے جغرافیائی حالات بھی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں ۔

قبیلہ عامر جعدہ کی ایک شاخ ہے آج کل ان کا علاقہ تقریباً وہی ہے جو قدیم دور کے جعدہ کا تھا ۔ یہ اس سطح مرتفع پر مشتمل ہے جو عدن سے ایک سو میل شمال میں واقع ہے اور جس کا مرکزی مقام الضالع ہے جو عامری امارت کا صدر مقام ہے ۔ قبیلہ جعدہ کے لوگ وادی عمد کے علاقے کے اندر بھی رہتے ہیں ۔ ان لوگوں کا پیشہ زراعت ہے ۔ جعدہ اپنی اصل بنو ہلال سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ زیادہ دور کے شمالی علاقے سے نقل مکانی کر کے آئے تھے ۔

جعفر بن ابی طالب (ر ۔ ۱ ۔ جمادی الاول ۸ھ/۶۲۹ء) ابو عبداللہ کنیت والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ تھا ۔ والد کی طرف سے سلسلہ نسب یہ تھا ۔ جعفر بن ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی اور والدہ کی طرف آنحضورؐ کے چچیرے بھائی اور حضرت علیؓ کے سگے بھائی تھے اور ان سے دس سال بڑے تھے ۔ حضرت عباسؓ نے اپنے بھائی ابوطالب کی عیال داری کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ۔ اور انہیں اپنے گھر لے گئے ۔ تھوڑے دن بعد ہی حضرت جعفرؓ نے اسلام قبول کر لیا ۔ وہ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں چوبیسویں ، اکتیسویں یا بتیسویں فرد تھے ۔

حضرت جعفرؓ مشرکین قریش کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر گئے ۔ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس بھی ان کے بعد حبشہ ہجرت کر گئیں ۔ جب مشرکین مکہ نے دیکھا اور سنا کہ مسلمان حبشہ میں آرام اور امن و سکون سے زندگی گذار رہے ہیں تو انہوں نے عمرو بن العاص ، ابوربیعہ اور ابن المغیرہ مخزومی کو تحفے تحائف دے کر نجاشی کے دربار میں بھیجا تاکہ نجاشی سے کہہ سن کر مہاجرین کو حبشہ سے نکلوا باہر کریں ۔

چنانچہ شاہ نجاشی کے طلب کرنے پر مسلمانوں نے حضرت جعفرؓ ہی کو اپنا امیر بنایا ۔ اور انہوں نے عربوں کی جہالت اور آنحضورؐ کی تعلیمات کے بارے میں ایک

بہترین تقریر کی۔ وہ تقریر یہ تھی۔

"بادشاہ ہم پر ایک تاریک دور گذرا ہے اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا۔ مردار خوری، زناکاری، قتل و غارت، قطع رحمی ہمارے آئے دن کا مشغلہ تھا۔ ہمسایوں کے حقوق سے ہم بے گانہ تھے۔ رحم و انصاف سے ہم ناآشنا تھے اور حق و باطل کے امتیاز پر ہماری نظر نہ تھی۔ غرض ہماری زندگی سرتاسر درندوں کی سی زندگی تھی۔ قوی، ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتوانوں کو ہضم کر لینے کو اپنے لیے باعث فخر و طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہم میں ایک عظیم الشان پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف ہیں جس کی صداقت، امانت، عصمت پر دوست و دشمن، دونوں گواہ ہیں، جس کی قوم نے اسے "محمد الامین" کا لقب دیا۔ وہ آیا۔ اس نے ہمیں خدا کی وحدانیت کا درس دیا۔ خدائے واحد کی جانب بلایا۔ اس نے بتایا کہ خدا کا کوئی سہیم و عدیل نہیں ہے۔ وہ شرک سے پاک ہے۔ بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لیے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد کی عبادت، حق عبدیت ہے۔ اس نے ہمیں حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا۔ ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی۔ قتل و غارت کی رسم بد کا خاتمہ کیا۔ زناکاری کو حرام اور فاحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہمیں نجات دلائی۔ نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا۔ جھوٹ بولنے اور ناحق مال یتیم کھانے کو حرام قرار دیا۔ نماز اور خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہمیں حیوانیت کے قعر مذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مقام پر پہنچایا۔

بادشاہ ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے۔ یہ ہے ہمارا قصور، جس کی بدولت مشرکین کا یہ وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہمیں ان کے حوالے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم توحید سے منہ موڑ کر بت پرستی اختیار کر لیں اور برے کاموں کو اچھا جانیں مکہ میں جب ان لوگوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو ہم نے اے بادشاہ تیرے ملک کا رخ کیا اور یہاں پناہ لی۔"

نجاشی نے حضرت جعفرؓ کی تقریر سنکر فرمائش کی کہ تمہارے پیغمبر پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس میں سے مجھے بھی سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی آیات تلاوت کیں۔

"پس مریمؑ نے عیسےٰ کی طرف اشارہ کیا، لوگوں نے کہا کہ ہم اس بچے سے جو ابھی گہوارے میں ہے۔ کسطرح بات کریں؟ حضرت عیسیٰؑ نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں خدا نے مجھ پر کتاب نازل کی اور مجھے پیغمبری سے نوازا ہے۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے مبارک کیا ہے اور جب تک میں زندہ رہوں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ مجھے ظالم اور شقی نہیں ٹھہرایا۔ سلامتی ہے میرے لئے اس روز جب میں پیدا ہوا۔ اور اس روز جب میں مروں گا اور اس روز جب مجھے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔" (۱۹ : ۲۹ تا ۳۳)

نجاشی حضرت جعفرؓ کی تقریر سے اس قدر متأثر ہوا کہ ان سفیران قریش کو کہا تم لوگ واپس جاؤ، خدا کی قسم میں ان مسلمانوں کو تمہارے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔

حضرت جعفرؓ ہجرت کے چھٹے سال کے بعد تک حبشہ ہی میں رہے اور ۷ھ/۶۲۸ء کو عین فتح خیبر کے روز مدینہ منورہ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضورؐ نے انہیں گلے سے لگایا اور پیشانی چوم کر فرمایا کہ میں نہیں جانتا مجھے جعفرؓ کے آنے سے زیادہ خوشی ہوئی یا خیبر کی فتح سے۔

آنحضورؐ نے جب قیصر روم، خسرو ایران، عزیز مصر اور دوسرے فرمانرواؤں اور رؤسا کے نام دعوت اسلام کے خطوط بھیجے ایک خط شرجیل بن عمرو کے نام بھی بھیجا لیکن شرجیل نے آپؐ کے قاصد حارثؓ ابن عمیر کو شہید کر دیا چنانچہ ان کے قصاص کے لیے آپ نے تین ہزار افواج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ اس کا سپہ سالار زیدؓ بن حارثہ کو مقرر کیا۔ اور فرمایا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ ان کے جانشین ہوں اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ ان کی جگہ لیں۔ موتہ کے مقام پر پہنچ کر مسلمانوں کا مقابلہ شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے ہوا۔ یہ غزوہ، غزوۂ موتہ کے نام سے مشہور ہے جو جمادی الاوّل ۸ھ/۶۲۹ء میں پیش آیا۔ اس لشکر حضرت زیدؓ شہید ہو گئے تو حضرت جعفرؓ نے علم سنبھالا اور دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دشمن کا ہر طرف سے دباؤ تھا۔ چنانچہ ان کا بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ دونوں ہاتھ کٹ گئے۔ لیکن انہوں نے علم مبارک سرنگوں نہ ہونے دیا اور اسے کٹے ہوئے بازوؤں میں لے کر سینے سے چمٹائے رکھا۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی۔ حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ تینوں ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے۔

حضرت جعفرؓ انتہائی دلیر اور نڈر انسان تھے۔ ایک روایت کیمطابق لڑائی شروع ہونے سے قبل انہوں نے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں تاکہ لڑائی سے بھاگنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جو اس غزوہ میں شریک تھے، کہتے ہیں کہ میں نے جعفرؓ کی لاش کو تلاش کر کے دیکھا تو صرف سامنے کی طرف پچاس زخم تھے۔ تمام بدن کے زخموں کا شمار نوے سے زیادہ تھا۔ لیکن کوئی زخم پشت پر نہیں تھا۔

آنحضورؐ کی آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا پورا نقشہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت جعفرؓ کی خبر آنے سے پہلے ہی صحابہ کے سامنے ان کی شہادت کا حال بیان فرما دیا۔ آپؐ کو عرصے تک شدید غم رہا۔ حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو بشارت دی کہ خدا نے جعفرؓ کو دو کٹے ہوئے بازوؤں کے بدلے دو نئے بازو عنایت فرمائے ہیں وہ ان بازوؤں سے ملائکہ جنت کے ساتھ مصروف پرواز رہتے ہیں۔ اسی لیے انہیں جعفر طیار اور ذوالجناحین کہا جانے لگا۔

آنحضورؐ نے حضرت جعفرؓ کے بارے میں فرمایا کہ جعفرؓ تم میری صورت اور سیرت دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو۔ چونکہ بہت فیاض اور راہ خدا میں زیادہ خیرات کرنے والے تھے اس وجہ سے انہیں ابوالمساکین کا لقب بھی دیا گیا تھا۔

جعفرؓ نے دو بار ہجرت کی تھی اس وجہ سے انہیں ذوالہجرتین بھی کہا جاتا ہے ایک ہجرت حبشہ کی طرف اور دوسری مدینہ منورہ کو۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ کے بعد کوئی شخص جس نے جوتے پہنے، سواریوں پر سوار ہوا اور عمامہ باندھا وہ جعفرؓ سے افضل نہ تھا۔

جعفر بن حرب

(— ۲۳۶ھ / ۸۵۰ء) کنیت ابوالفضل۔ ایک معتزلی عالم جس کا تعلق دبستان بغداد سے تھا پہلے بصرے میں ابوالہذیل علاف کا شاگرد ہوا۔ بعد میں بغداد جا کر مزدار کی شاگردی اختیار کی۔ اس نے زہد و تقویٰ اور تقشف میں اپنے استاد مزدار کا اتباع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہوئی کثیر مال و دولت غریبوں میں تقسیم کر دی۔

جعفر معتزلہ کے اس عقیدے کا حامی تھا کہ قدیم ہی سے باری تعالیٰ اپنی ذات کی وساطت سے ہر شے کا عالم ہے۔ اس کا علم اس کے وجود کا عین ہے اور جو چیز اس کے علم میں ہے وہ بھی قدیم ہی ہوگی۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی ہے کہ

اس بات کی ضمانت موجود ہے کہ اس سے ظلم و کذب کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ درحقیقت ہم ایسے "اللہ" کا معقول طور پر تصور ہی نہیں کر سکتے جو واقعتہً ظلم کا مرتکب ہوتا ہو۔ جو منکر اپنی سعی اور تحقیق سے اللہ کا اقرار کرے وہ اس سے افضل ہے جو عنایت الٰہی سے ایمان لائے

جعفر قرآن مجید کو بھی مخلوق مانتا تھا اور اس کے نزدیک قرآن حادث ہے اور اس کا محل و قوع آنحضورؐ ہیں۔

اس کی رائے میں روح اصلاً جسم سے مختلف ہے اور اس کے ساتھ اتفاقاً جمع کر لی گئی ہے۔ اس کی رائے میں ہم اپنے آخری فیصلے یا ارادے کے مطابق عمل کرتے ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی اور فیصلہ مانع نہ ہو جائے۔

امامت کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ امامت اسے ملتی ہے جو سب سے بڑھ کر اس کا اہل ہو نہ کہ اسے جو نسب کی وجہ سے یہ حق رکھتا ہو۔ اس کے خیال میں آنحضورؐ کے بعد امامت کے زیادہ اہل حضرت علیؓ تھے

جعفر بن مُبَشِّر (؟ — ۲۳۴ھ/۸۴۸ - ۸۴۹ء) الثقفی، القصبی۔ دبستان بغداد کا ایک مشہور و معروف معتزلی عالم ابو موسیٰ المردار کا شاگرد رشید تھا کسی قدر النظام (البصرہ) سے متاثر تھا۔ اس کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ اس کے بارے میں صرف یا تو ترک دنیا کے متعلق چند ایک حکایات ملتی ہیں یا یہ بات کہ اس نے عامہ کو معتزلی عقائد سے روشناس کرایا اور بشر بن غیاث المریسی سے مناظرے کیے۔

جعفر کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ بعد کے زمانے میں ملاحدہ کے سیرت نگاروں نے اس کے شاگردوں اور جعفر بن حرب کے شاگردوں کو جعفریہ کے نام سے معتزلہ بغداد کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

بقول الخیاط فقہ میں اس کا مسلک یہ تھا کہ قرآن کے ظاہری مفہوم سنت اور اجماع کی پیروی کی جائے اور رائے و قیاس سے اجتناب کیا جائے۔

جعفر فقہ اور کلام کی بہت سی کتابوں کا مصنف تھا۔ اگرچہ اس کی تصانیف گردش زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو چکی ہیں۔ صرف قرآن مجید سے متعلق مختلف آراء پر اس کا ایک طویل اقتباس ملتا ہے۔ اس کی نگارشات میں ایسی تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ جن میں اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث کی مخالفت موجود ہے۔ الٰہیات کے بارے میں اس کی آراء مختلف معتزلی عقائد تک محدود ہیں۔ اس کی بعض آراء اس کے زاہدانہ نقطہ نظر کی آئینہ دار ہیں۔ مسئلہ خلافت میں اس کی رائے میں آنحضورؐ کے بعد سب سے افضل حضرت علیؓ تھے۔ لیکن ان سے کم فضیلت والے پیشرووں کا تقرر بھی جائز تھا۔ اسی نظریے کی بنا پر اسے اور دبستان بغداد کے دیگر معتزلہ کو "زیدیہ" کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے۔

جعفر چلبی (۸۶۴ھ/۱۴۵۹ء — ۸ رجب ۹۲۱ھ/ ۱۸ اگست ۱۵۱۵ء) ترک سیاست دان اور ادیب، والد کا نام تاجی بیگ تھا۔ اماسیہ میں پیدا ہوا۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرس مقرر ہوا۔ بعد میں سلطان بایزید ثانی نے اسے نشانچی مقرر کر دیا۔

۹۰۳ھ/ ۹۸ - ۱۴۹۷ء میں تخت نشینی کی کش مکش میں جعفر کو شہزادہ احمد کی حمایت کرنے کے شبے میں اس کے دوسرے ساتھیوں سمیت ینی چریوں کے کہنے پر اسے اس کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن ۹۱۷ھ/ ۱۵۱۱ء میں بایزید ثانی کے جانشین سلیم نے جعفر کی قابلیت کی قدر کرتے ہوئے اسے دوبارہ اسی منصب پر بحال کر دیا گیا۔ چالدران کی جنگ کے بعد اس کا نکاح شاہ اسماعیل کی بیوی تاجلی خانم سے ہوا۔ نیز اسے اناطولی کا قاضی عسکر بنا دیا گیا۔ لیکن جب جعفر استنبول واپس آیا تو مذکورہ بالا مہم کے دوران میں ینی چریوں کی شورش کی حوصلہ افزائی کے الزام میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

جعفر کی تصانیف میں نظم میں ایک دیوان، ہوس نامہ، ایک ترکی مثنوی ہے۔ نثر میں اس نے ایک فارسی کتاب انیس العارفین کا ترکی میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ ایک مشہور خطاط اور شعراء کا قدردان تھا۔

جعفر حسین، مفتی (۱۹۱۴ — ۱۹۸۳ء) ممتاز شیعہ عالم دین اور محقق۔ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم چراغ دین ایک ممتاز طبیب اور علاقے کی ایک مقبول شخصیت تھے۔ چودہ برس کی عمر میں مفتی صاحب نے ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا، جہاں وہ بارہ برس تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے فاضل حدیث اور فاضل ادب سمیت متعدد اسناد حاصل کیں۔ بعد ازاں وہ عراق چلے گئے۔ جہاں انھوں نے پانچ برس تک مشہور درس گاہ حوزہ علمیہ میں تعلیم حاصل کی اور "مفتی" اور "مجتہد" کی اسناد حاصل کیں۔

بعد ازاں وہ لوٹ کر سادات مراد آباد کی ایک دینی درس گاہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں مختلف مکاتیب فکر کے ۳۱ علماء کی کانفرنس میں شرکت کی۔ جس میں متفقہ طور پر اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں ۲۲ نکات مرتب کیے گئے تھے۔ مفتی جعفر حسین نے حافظ کفایت حسین سمیت فقہ جعفریہ کی نمائندگی کی تھی۔ مفتی صاحب شروع ہی سے اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن چلے آ رہے تھے کہ پیپلز پارٹی کے عہد میں کونسل کے کام پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس سے مستعفی ہو گئے تھے۔ موجودہ دور حکومت میں وہ دوبارہ نظریاتی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ لیکن ۱۹۷۸ء میں پھر مستعفی ہو گئے۔ ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء کو بہ عمر ستر سال لاہور میں وفات پائی۔

جعفر شاہ پھلواری (۲۹ شعبان ۱۳۲۰ھ/ ۲۸ نومبر ۱۹۰۲ء – ۱۹۸۰ء) ایک عالم دین۔ والد کا نام شاہ محمد سلیمان پھلواروی، ان کے دادا حکیم محمد داؤد لکھنؤ اور گورکھپور میں شاہی طبیب تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک تھے۔ جب ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو وہ فرار ہو کر پھلواری کے ایک قریبی گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے۔

جعفر شاہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ (صوبہ بہار، بھارت) میں پیدا ہوئے جو تقریباً آٹھ صدیوں سے علم اور تصوف دونوں کا یکساں مرکز رہا ہے۔ والدہ کا انتقال زمانہ شیر خوارگی ہی میں ہو گیا۔ چونکہ ان کا گھرانہ علم و ادب کا گہوارہ تھا اور ان کے خاندان میں بڑے جید قسم کے علماء تھے اس لیے ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں ایک سکول میں دسویں جماعت میں انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ترک موالات کے سلسلے میں سکول میں سٹرائک ہو گئی تو ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے اور ۱۹۲۴ء میں وہاں سے سند فراغت لی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا حیدر حسن خان اور مولانا حفیظ اللہ جیسے جید علماء تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پھلواری شریف کی سپلاونی جامع مسجد میں خطیب مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کپورتھلہ کی "مراکش مسجد" کی خطابت سنبھالی۔ ۱۹۴۶ء میں خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین بنائے گئے۔

۱۹۴۷ء میں جب قیام پاکستان وجود میں آیا تو لاہور آ گئے،

اور چند ماہ کے لیے پولیس کی اصلاح کے لیے مولوی سب انسپکٹر پولیس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں اسلامک دی کنسٹرکشن میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے علامہ لیوپولڈ اسد نے بلا لیا۔ لیکن جلد ہی یہ محکمہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور نے ہفتہ وار درس قرآن کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ سلسلہ تقریباً آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اس نے علاوہ ریڈیو پاکستان سے اسلامی موضوعات پر تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہا اور کم و بیش سات سو کے قریب تقاریر ریڈیو پاکستان کراچی اور لاہور سے نشر ہوئیں۔ ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی کی ادارت ان کے سپرد کی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۷۳ء تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ اس اثناء میں انہوں نے اکیس کتابیں تصنیف کیں جو ادارے نے شائع کی ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے بورڈ آف گورنرز کا رکن بنایا گیا۔

۱۹۷۶ء میں لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے اور سابق سفیر عراق سید عبدالقادر گیلانی مرحوم کے قائم کردہ مرکز قادری کا "شیخ المرکز" یعنی ڈین بنا دیا گیا۔

مولانا جعفر شاہ کی تصانیف میں مقام سنت، انتخاب حدیث، گلستان حدیث، اسلام، اسلام اور فطرت، اجتہادی مسائل، مسئلہ تعدد ازدواج، اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی، رویت ہلال، اسلام اور موسیقی، مجمع البحرین، پیغمبر انسانیت، مقالات از جعفر شاہ، الفخری جو شیعہ مورخ ابن طقطقی کا مشہور تاریخ "الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ" کا اردو ترجمہ ہے۔ خاص طور پر مشہور ہیں۔

جعفر شریف بن علی شریف قریشی، ناگوری۔ عالم دین، مصنف اور طبیب اس کے حالات زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ مدراس کے ضلع کسٹنہ میں ہلور میں پیدا ہوا۔ اس نے بطور منشی حکومت مدراس کی ملازمت اختیار کی۔ اس نے ۱۸۳۲ء سے کچھ قبل اس نے ڈاکٹر ہرکلوٹس کی فرمائش پر ایک کتاب قانون اسلام لکھی تھی۔

جعفر شریف عقیدے کے لحاظ سے سُنی تھا۔ لیکن اہل تشیع کے ساتھ رواداری سے پیش آتا تھا۔ جنکا جنوبی ہند میں بڑا اثر تھا۔ وہ علم سحر بھی جانتا تھا لیکن اس موضوع پر لکھتے ہوئے اس کی تحریر میں ناپسندیدگی کا اظہار نمایاں ہے۔ جعفر شریف طب یونانی کا بھی ماہر تھا۔ ہرکلوٹس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی ایسی کتاب ضرور ہونی چاہیے جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں پوری وضاحت سے معلومات درج ہوں۔ چنانچہ اس نے جعفر شریف کو اس کام کے لیے تیار کیا۔ اس نے یہ کتاب دکنی اردو میں لکھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی اعانت سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں اس نے ایام حمل سے لے کر مرنے کے بعد کی رسوم تک جو جنوبی ہند کے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کا تذکرہ کیا ہے اور پورے سال کے دوران میں ہونے والی خانگی رسوم، تقریبات اور تہواروں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ہندوستان اور خاص طور پر دکن کے عوام میں جو رسوم و رواج تھے ان کے بارے میں ایک بڑی قیمتی دستاویز ہے۔

جعفر صادق، امام اہل تشیع کے بارہ اماموں میں سے چھٹے امام۔ جلیل القدر تبع تابعی کنیت ابوعبداللہ و ابواسماعیل۔ سلسلہ نسب والد کی طرف سے جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن الحسینؓ بن علیؓ بن ابو طالب اور والدہ کی طرف سے ام فروہ فاطمہ بنت قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ صدیق۔

آپ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ امام بخاری اور علامہ محسن الامین کے نزدیک آپ کا یوم ولادت ۸ ربیع الاول ۸۰ھ/۲۴ مئی ۶۹۹ء ہے لیکن کلینی اور شیخ مفید نے جس قول کو ترجیح دی ہے۔ وہ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ/۲۰ اپریل ۷۰۲ء ہے۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔

آپ چودہ سال تک اپنے دادا امام زین العابدینؒ اور چونتیس سال تک اپنے والد امام محمد باقرؒ اور ستائیس سال تک اپنے نانا قاسمؒ کے زیر سایہ تربیت حاصل کرتے رہے۔

آپ جب پیدا ہوئے اس وقت مدینہ منورہ علم و عرفان کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور تمام بلاد اسلامیہ کے علما و فضلا اس مرکز میں جمع تھے۔ چنانچہ اس علمی ماحول میں آپ نے آنکھ کھولی۔

امام جعفر صادق نے طریقت میں اپنے والد کے توسط سے حضرت علیؓ سے اور والدہ کی طرف سے بتوسط حضرت قاسم بن محمد ابوبکرؓ سے فیض حاصل کیا تھا۔

چنانچہ آپ علم و فضل سے آراستہ ہو کر مسند ارشاد و نصیحت پر فائز ہوئے۔ بلاد اسلامیہ کے علما و فضلا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیض حاصل کرتے رہتے۔

حضرت امام جعفر صادق نے اپنی تمام صلاحیتوں کو علم پھیلانے اور نیکی و تقویٰ کو عام کرنے میں صرف کیا۔ آپ ساری عمر سیاست سے کنارہ کش رہے اور اپنا سارا وقت عبادت اور خدمت خلق میں صرف کیا۔ آپ حکام وقت سے بھی تعلق پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کو آپ کے بارے میں بدگمان تھا کہ آپ عباسیوں کی حکومت سے ناخوش ہیں لیکن آپ نے کبھی کسی بھی امر خلافت میں کوئی تنازعہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی مذہب کے اعتبار سے اثنا عشری شیعہ اپنے آپ کو جعفریہ کہتے ہیں جس طرح حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

آپ اہل مدینہ اور اہل عراق دونوں سے کسب علم کے قائل تھے اور یہی ان کا شیوہ تھا۔

امام جعفر صادق کو علم کلام میں بھی ایک بلند مقام حاصل تھا۔ آپ نے [illegible] بھی مناظرے کیے۔ علم کیمیا، طب، فال اور جفر وغیرہ کے علوم بھی آپ سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ آپ کو خلیفہ وقت منصور عباسی نے [illegible] بلوایا جب آپ خلیفہ کے سامنے آئے تو منصور تخت سے نیچے اترا اور نہایت عجز و انکساری سے آپ کا استقبال کیا۔ تخت پر بٹھایا اور خود مؤدبانہ طریق سے آپ کی خدمت عالیہ میں بیٹھا اور پوچھا جناب کیا حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا یہی کہ تو دوبارہ مجھے نہ بلائے تاکہ میں عبادت الٰہی میں مشغول رہوں۔ چنانچہ خلیفہ نے آپ کو نہایت عزت و احترام سے خلعت فاخرہ دے کر رخصت کیا۔

آپ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ مدینہ منورہ میں بسر کیا۔ اگرچہ آپ کو کئی مرتبہ عباسیوں کے طلب کرنے پر عراق بھی جانا پڑا اور بعض اوقات یہاں پر آپ کا قیام طویل بھی رہا لیکن عراق آپ کا وطن نہ بن سکا۔

آپ نے بعمر ۶۵ سال یا ۶۸ سال مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی اور جنت البقیع میں اس قبے میں دفن ہوئے جس میں حضرت حسن، امام زین العابدین اور امام باقر دفن تھے۔

آپ کی اولاد میں صاحبزادوں میں اسماعیل، عبداللہ، موسیٰ کاظم، اسحٰق، محمد اور عباس تھے اور لڑکیوں میں ام فروہ، اسماء اور فاطمہ الصغریٰ تھیں۔

آپ کا علم و عمل نوع انسانی کی ہدایت کا باعث تھا۔ آپ صبر و شکر، تسلیم و رضا، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کا نمونہ تھے۔ ہر زمانے کے علماء نے آپ کی شخصیت اور پاکیزہ کردار کے بارے میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے

بقول امام نووی "لوگ آپ کی امامت و جلالت اور عظمت و سیادت تسلیم کرتے ہیں"

ابن حجر مکی کے بقول تمام بلاد اسلامیہ میں آپ کے علم و حکمت کا شہرہ تھا۔

شہرستانی کے نزدیک امام جعفر صادق علم دین و ادب کا سرچشمہ، حکمت کا بحر ذخار، زہد و تقویٰ میں کامل تھے اور عبادت و ریاضت میں بلند مقام رکھتے تھے دنیا سے نفور، حب دنیا اور شہرت سے بے تعلق تھے۔ اپنے زہد و تقشف کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

بقول عمر بن ابی المقدام آپ شجر نبوت کا ثمر شیریں ہیں۔

روایت حدیث اور علم حدیث اگرچہ آپ کے خاندان کا طرہ امتیاز تھا لیکن خود امام جعفر سے بکثرت احادیث مروی ہیں۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے سوال کیا گیا کہ جو احادیث آپ روایت کرتے ہیں ان کی سند کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد سے سنی ہیں اور بعض ان کی تحریرات سے مجھے ملی ہیں۔

امام مالک نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے آنحضور کی کوئی حدیث بیان کی ہو اور آپ باوضو نہ ہوں۔

خود آپ کے قول کے مطابق "ابان بن تغلب نے مجھ سے ۳۰ ہزار احادیث نقل کی ہیں،"

النجاشی نے "رجال" میں لکھا ہے کہ میں نے کوفے کی مسجد میں نو سو شیوخ کو حضرت امام جعفرؓ سے روایت کرتے سنا ہے۔

آئمہ حدیث و سنن کی ایک جماعت نے امام جعفر سے روایت کی ہے اور ان میں مسلم، مالک، ابو داؤد سجستانی، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی وغیرہ شامل ہیں

اہل تشیع کے یہاں اصول مذہب میں جو چار کتابیں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں ان سب جامعین نے امام جعفر سے حدیث روایت کی ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک ان کے رواۃ کی تعداد ۴ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روایات کی تعداد کتنی ہو گی جب کہ رواۃ کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔

فقہ میں بھی اہل تشیع کے نزدیک امام جعفر کا مقام بہت بلند ہے

آپ سے بہت سے اقوال مشہور ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا۔ "پانچ قسم کے لوگوں سے پرہیز کرو۔

ایک جھوٹے آدمی سے کیونکہ ہمیشہ اس کے ساتھ غرور میں رہو گے۔

دوسرے بے وقوف سے کہ وہ ہر چند تیرا فائدہ چاہے گا لیکن تیرا نقصان کرے گا۔

تیسرے بخیل سے کیونکہ وہ تیرا نہایت قیمتی وقت ضائع کرے گا۔

چوتھے بزدل آدمی سے کہ وہ بوقت ضرورت تجھ سے علیحدہ ہو جائے گا۔

پانچویں فاسق سے کہ وہ تجھ کو ایک لقمہ کے عوض فروخت کرے گا اور لقمہ سے کم کا لالچ کرے گا۔

جعفر، میر نواب سراج الدولہ کی افواج کا سپہ سالار جو نواب سے غداری کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء تا ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء اور ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء تا ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء تک نواب آف بنگالہ رہا۔ وہ سید احمد النجفی کا بیٹا تھا۔ اس کی شادی بنگال کے صوبیدار علی وردی خان کی سوتیلی بہن شاہ خانمؒ سے ہوئی تھی۔

علی وردی خان کی ملازمت میں وہ کٹک کا نائب ناظم اور مدناپور و ہگلی کا فوجدار تھا۔ جب علی وردی نے مسند سنبھالی تو اس نے جعفر کو بخشی افواج مقرر کیا۔ اس نے کئی ایک لڑائیوں میں کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں بھاگیرتی کے کنارے اس نے مرہٹہ سردار بھاسکر پنڈت کو شکست دی۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں ہگلی کے جرمن تاجروں کی شوریدہ سری کو اس بہتر انداز سے کچلا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس علاقے سے چلے گئے۔

۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں جب اس کو مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کا حکم ملا تو اس نے اس حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بردوان پر حملہ کر دیا۔ اس حکم عدولی کی بنا پر اس کو تمام مناصب سے الگ کر دیا گیا لیکن اگلے ہی سال ان تمام مناصب پر دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء میں اس نے میر حبیب اور اس کے مرہٹہ حلیفوں کے خلاف ایک معرکے میں کامیابی حاصل کی۔

میر جعفر ایک بے اصول اور جاہ طلب شخص تھا۔ اس کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ اس نے ایک بار اپنے محسن اور سرپرست علی وردی خان کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ علی وردی خان کی وفات کے بعد جب اس کا نواسہ سراج الدولہ تخت پر بیٹھا تو اس نے ایک بار پھر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اس نے سراج الدولہ کے خالو زاد بھائی شوکت جنگ سے جو مدعی حکومت تھا خفیہ طور پر خط و کتابت کے ذریعے اسکو حکومت کے لیے اکساتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شوکت جنگ جیسے نااہل اور کمزور انسان کے برسر اقتدار آ جانے کی وجہ سے حکومت کا سارا نظم و نسق خود اس کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ لیکن میر جعفر کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور شوکت جنگ سراج الدولہ کے ہاتھوں جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد میر جعفر نے انگریزوں سے جوڑ توڑ شروع کی جو سراج الدولہ سے شکست کھانے کے بعد ہندو سیٹھوں اور غدار مسلمان امراء کو ساتھ ملا کر ایک ایسے شخص کو نواب آف بنگال بنانا چاہتے تھے جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کا کام دے سکے۔ چنانچہ ۴ جون ۱۷۵۷ء کو اس کے اور انگریزوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا جس کے مطابق یہ بات طے پائی کہ انگریزی افواج کی مدد سے سراج الدولہ کو معزول کر کے میر جعفر کو مسند حکومت پر بٹھایا جائے۔ اور اس کے معاوضے میں میر جعفر انگریزوں کے تمام فوجی اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ دو کروڑ روپے بطور ہرجانہ کلکتے کے سوداگران کو ادا کرے گا۔ نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کو مزید مراعات دے گا۔ جب سراج الدولہ کو اس معاہدے کا علم ہوا تو اس نے میر جعفر کو معزول کر دیا۔ لیکن جب جگت سیٹھ جیسے غداروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ جعفر کے بغیر انگریزوں سے مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے تو سراج الدولہ نے اسے دوبارہ بحال کر دیا۔ نیز میر جعفر اور اس کے ساتھیوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ انگریزوں سے مقابلے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور دل و جان سے ان کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ ۲۲ جون ۱۷۵۷ء میں جب پلاسی کے میدان میں کلائیو کے زیر قیادت انگریزی فوج سے سراج الدولہ کا مقابلہ ہوا تو عین اس موقع پر جب کہ میدان جنگ سراج الدولہ کے ہاتھ میں تھا میر جعفر کی غداری کے سبب انگریزوں کا پلہ بھاری ہو گیا اور اس طرح میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ سراج الدولہ مرشد آباد لوٹ گیا وہاں سے عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں میر جعفر کے داماد میر قاسم کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مرشد آباد لایا گیا جہاں پر میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور میر جعفر کو نواب بنا

دیاگیا۔

میر جعفر نہ تو ذہین تھا اور نہ مستعد حکمران۔ اس میں اصول جہانبانی کا فقدان تھا اپنے دور حکومت میں تمام عرصہ وہ برائے نام نواب رہا۔ اور اصل اقتدار کلائیو کے ہاتھوں میں تھا۔ اسے ابتدا ہی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خزانہ تقریباً خالی تھا۔ تخت نشینی کے وقت جعفر مالی لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ انگریزوں سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرسکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس سلسلے میں اسے یہ آسانی دینے میں رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ نصف رقم ۳۱ اکتوبر ۱۷۵۷ء تک اور بقیہ رقم تین سال کے عرصے میں ہر چھ ماہ بعد مساوی اقساط میں ادا کردے۔ چنانچہ مسند نشینی کے فوراً بعد اس نے روپوں اور اشرفیوں سے پوری کشتی بھر کر کلکتے کی طرف روانہ کی جس میں ۲۵ لاکھ روپیہ ثابت جنگ کرنل کلائیو کا حصہ تھا۔ اس نے کمپنی اور کمپنی کے اہلکاروں کی طمع پوری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں میں کلائیو کا گدھا کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس نے شروع شروع میں کمپنی کو ۶۶۰، ۲۰، ۱۷ روپے دیئے۔ ۹ اگست ۱۷۵۷ء کو مزید ۳۵۸، ۵۵، ۱۶ روپے دیئے۔ ۳۰ اگست ۱۷۵۷ء کو جو سونا اور جواہرات دیئے اس کی مالیت ۲۳۷، ۹۹، ۱۵ روپے تھی۔ کلکتہ کونسل کے ارکان نے ان نذرانوں کے علاوہ میر جعفر سے کثیر رقوم حاصل کیں۔ ان معاملات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر جعفر اپنے مالی مسائل سے سخت پریشان ہو گیا۔ اس کے پاس سپاہیوں کی تنخواہ دینے کے لیے خزانے میں کچھ نہ تھا۔ اس پر اکثر سپاہیوں نے بغاوت کردی۔ دوسری طرف انگریزوں کو مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی اور شجاع الدولہ والی اودھ کے مقابلے کے لئے مزید رقم کی ضرورت محسوس ہوئی تو کمپنی نے بقیہ اقساط کی وصولی کے لئے میر جعفر پر زور ڈالا۔ اور جب وہ انگریزوں کی توقعات پوری نہ کرسکا تو انہوں نے اس کو معزول کردیا۔ اور اس کی جگہ اس کے داماد میر قاسم کو بٹھا دیا۔ لیکن ۱۱۷۷ھ / ۶۴-۱۷۶۳ء میں میر قاسم کو معزول کرکے دوبارہ میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن اس کے آخری ایام اطمینان و سکون سے نہ گذر سکے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی آخری عمر میں افیون و حشیش کا عادی ہو گیا تھا اور آخر کار جذام کے مرض میں مر گیا۔

اس نے اپنی قوم سے جو زبردست غداری کی تھی اس کی سزا اسے اس طرح بھگتنی پڑی کہ اس گناہ عظیم کے لیے تاریخ اور دنیائے انسانیت اسے غدار کے نام سے یاد کرتی ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اسی کے بارے میں یہ شعر کہا ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ دنیا ننگ دین ننگ وطن

جَعَلیوَن قبائل کا ایک گروہ۔ جس کا تعلق جمہوریہ سوڈان سے ہے۔ اس گروہ کے بڑے بڑے قبیلے زیادہ تر حضری ہیں اور دریائے نیل کے کناروں پر علاقہ دنقلہ سے جنوب کی جانب سبلوقہ تک آباد ہیں۔ ان کے نسب نامے کے بارے میں یہ روایت کی جاتی ہے کہ ان کے اس نام کا بانی ایک شخص ابراہیم تھا جو جعل کے لقب سے مشہور تھا۔ اگرچہ کردفان اور دوسرے مقامات کے دیگر قبیلے اور برادریاں بھی اپنے آپ کو اسی گروہ سے وابستہ کرتی ہیں۔ اس گروہ کے شمالی قبیلے ابھی تک ایک نوبی بولی بولتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر اس گروہ میں مشترک عنصر غالباً نوبی خون کی آمیزش ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ان لوگوں نے وادی نیل سے بار بار نقل مکانی کی اور غالباً اسی وجہ سے سوڈان کے دیگر حصوں میں بھی متعدد قبائل نے جعلی نسل ہونے کا دعوے کیا ہے۔ بعض روایات میں ابراہیم جعل کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس روایت کا معاملہ صرف اس حد تک ہے جس طرح زمانہ مابعد کے افراد خودنمائی کی خاطر اکثر ایسی روایات وضع کرلیا کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں جعلیوں کا لقب عموماً ایک مخصوص قبیلے کو دیا جاتا ہے جو دریا کے قریب انتہائی جنوبی جانب رہنے والے قبائلی گروہ میں سے ہے اور جس کا علاقہ اتبرہ اور نیل کے سنگم اور آبشار سبلوقہ کے درمیان واقع ہے۔

فنج کے دور میں جعلیون اپنے جنوبی پڑوسیوں عبد اللاب کے تابع تھے [illegible] سردار و دعجیب سلطان سنار کے تحت عرب قبائل کا رئیس اعلیٰ تھا۔ دسویں صدی ہجری سولہویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر ترکی و مصری فتح کے زمانے تک یہ قبیلہ نمائندہ سعداب کے سرداروں کے ماتحت رہا۔ جن کا صدر مقام شندی نیل کے دائیں کنارے پر واقع تھا۔

۱۷۷۲ء میں جب بروس یہاں پر آیا تھا تو اقتدار کی اصلی مالک عبداللہ بیہ شہزادی تھی۔ ان سرداروں کو مک کہا جاتا تھا۔ آخری مک نمر محمد کی حکومت جعلی قبیلے کے عبدلاب کی حکومت سے کہیں زیادہ باوقار تھی۔

بقول برکہارٹ جو یہاں پر ۱۸۱۴ء میں آیا تھا۔ مشرقی جغرافیائی سوڈان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز شندی تھا۔ اور یہاں پر اندرون مصر اور بحر احمر سے آنے والے [illegible] کرلیتی تھیں۔ ترکی اور مصری حملے کے وقت مک نمر محمد نے اسماعیل کامل پاشا کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ لیکن اگلے سال ہی ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۱ء میں جب اسماعیل سنار سے [illegible] آیا تو غلاموں کے بارے میں دونوں میں جھگڑا [illegible] ہوا اور اسماعیل [illegible] مارا گیا۔ اس کے نتیجے میں جعلیون اور ان کے جنوب کے قبائل میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ اس بغاوت کو کردفان [illegible] خونریزی کے بعد فرو کیا۔

جعلیون نے جو تیز فہم اور تجارت میں اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتے تھے ترکی اور مصری حکومت کے تحت خوب دولت کمائی [illegible] سے جعلیون کردفان اور دارفور میں آبسے۔ خاص طور پر جنوبی [illegible] میں جہاں چھوٹے چھوٹے سوداگروں کے لئے حالات [illegible] چونکہ ان سوداگروں کا غلاموں کی تجارت [illegible] گورنر جنرل گورڈن پاشا نے ۱۸۷۹ء میں ان کے خلاف سخت [illegible] وجہ ہے کہ مہدی کے مددگار زیادہ تر [illegible] جعلیون [illegible] حکومت کے ابتدائی برسوں میں جعلیون [illegible] دریا کے قریب [illegible] پیش [illegible]۔ لیکن خلیفہ عبداللہ نے سیاسی اقتدار [illegible] کردیا۔ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں [illegible] قیام میں جعلیون نے تعلیم و تجارت کے [illegible] آج کل یہ قبائل موجودہ جمہوریہ سوڈان کے علاقوں میں [illegible]۔

جغرافیہ یونانی لفظ جیوگرافی کا معرب [illegible] زمین کی [illegible] بیان کا علم۔ وہ علم جس کے پڑھنے سے دنیا کی [illegible] قدرتی [illegible] مصنوعی کا حال معلوم ہو۔

جغرافیہ کی اصطلاح سب سے پہلے رسائل اخوان الصفا میں نقشہ کے معنی میں استعمال ہوئی تھی۔

علم جغرافیہ میں کرہ ارض کے خط و خال، زمین، پانی، آب و ہوا، نباتات، حیوانات اور انسان کے آپس کے تعلقات سے بحث ہوتی ہے اس علم کی خاص خاص شاخیں یہ ہیں طبعی، نباتاتی، حیواناتی، اقتصادی، تاریخی، ریاضیاتی، طبقاتی اور سیاسی یا ملکی۔

المقدسی نے "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" جغرافیے کے بیشتر پہلوؤں سے بحث کی ہے اور وہ اس کی جامعیت کے تصور کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔

اسلام سے قبل عربوں کی جغرافیائی معلومات بعض روایتی اور قدیم جغرافیائی تصورات یا جزیرۂ عرب کے مقامات اور آس پاس کے علاقوں کے مقامات کے ناموں تک محدود تھیں۔ یہ معلومات جن تین بنیادی ماخذوں میں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں ۱۔ قرآن مجید۔ ۲۔ احادیث نبوی۔ ۳۔ قدیم عربی شاعری۔ قدیم عربی شاعری میں جو جغرافیائی تصورات و معلومات موجود ہیں۔ ان سے اسلام سے قبل کے عربوں کے ہاں جغرافیائی نظام کے مفہوم اور ان کے علم کی حدود کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں جغرافیہ اور کائنات کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں۔ ان کے لیے صحابہ کرام سے منسوب ایسی روایات بھی موجود ہیں جنکا تعلق کائنات، جغرافیے اور دیگر متعلقہ مسائل سے ہے۔ یہ روایات بعض جغرافیہ والوں نے اپنی کتابوں میں قابل اعتنا و علمی ذخیرے کے طور پر پیش کیں۔ جب اسلام افریقہ اور ایشیا میں پھیلا تو عربوں کو معلومات جمع کرنے اور ان مختلف ممالک کے بارے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے اور اس طرح مسلمانوں کے علم جغرافیہ نے ترقی کی۔ اس ترقی میں قرآن مجید، فن حدیث و رجال اور عام تحقیقی و مشاہداتی ذوق نے بڑا حصہ لیا۔

مسلمانوں کے علم جغرافیہ میں زیادہ وسعت عباسی عہد کے آغاز اور بغداد کے دارالخلافہ بن جانے کے بعد ہی پیدا ہوئی۔ ایران، مصر اور سندھ کی فتوحات نے ایک طرف تو عربوں کو قدیم تہذیب کے ان وارثوں کے علمی و ثقافتی سرمائے سے براہ راست مستفید ہونے کا موقع دیا اور دوسری طرف ان علاقوں کے علمی مراکز تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں ان کے قبضے میں آ گئیں۔

اس دور میں مسلمانوں نے غیر ملکی زبانوں کے علمی ذخائر کو حاصل کر کے انہیں عربی زبان میں منتقل کیا چنانچہ ہند کی جغرافیائی و فلکیاتی معلومات سنسکرت کی کتاب سوریہ سدھانت کے عربی میں ترجمہ ہونے کی وجہ سے عربوں تک پہنچیں۔

ان ہندی تصورات میں جن سے عرب علما متعارف ہوئے آریا بھٹ کا یہ نظریہ بھی شامل تھا۔

عربوں کے جغرافیائی ادب سے اس امر کی کافی شہادت ملتی ہے کہ عربی جغرافیہ و نقشہ نویسی پر ایران کے اثرات بھی ہیں۔ ایران کے بہت سے جغرافیائی تصورات و روایات کو عربوں نے اپنایا۔ ایرانی روایات نے عربوں کی جہازرانی اور اس سے متعلقہ ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ عرب نقشہ سازی پر بھی فارسی اثرات ظاہر ہیں۔

یونانیوں کا علم جغرافیہ اور علم ہیئت کس طرح عربوں میں منتقل ہوا۔ اس کے متعلق ہمیں مقابلتہً زیادہ مواد دستیاب ہے۔ اس عہد میں جغرافیہ بطلیموس کا ترجمہ کئی بار ہوا۔

اگرچہ علاقائی اور بیانی جغرافیے نیز نقشہ سازی میں فارسی اثرات واضح تھے لیکن یونانی اثرات عملی طور پر عرب جغرافیے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو گئے۔ عرب جغرافیے کی یونانی بنیاد سب سے زیادہ ریاضیات، طبیعیات اور انسانی و حیاتی جغرافیے کے میدان میں نمایاں رہی۔

دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی تک عرب ماہرین فلکیات و فلسفہ نے اپنے تجربات اور نظریاتی مباحث کے ذریعے ریاضیاتی و طبعی جغرافیے میں بھی نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ عرب جغرافیہ نگاروں نے جن ممتاز عرب فلاسفہ اور ماہرین فلکیات کی کتابوں سے استفادہ کیا یا ان کے نظریات سے بحث کی ان میں یعقوب بن اسحاق الکندی خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ جغرافیے کی دو کتابوں کا مصنف ہے۔ ۱۔ "رسم المعمور من الارض"۔ ۲۔ "رسالۃ فی البحار والمیاہ والجبال" ہے۔

ابن خرداذبہ نے جس کو بابائے جغرافیہ کہنا بجا ہے۔ عربی زبان میں جغرافیہ نگاری کے اسلوب اور نمونے کی بنیاد ڈالی۔ دبستان عراق کے ضمن میں ابن خرداذبہ، یعقوبی، اور مسعودی کی کتابیں اس دبستان کے دوسرے مصنفین سے بعض باتوں میں ممتاز ہیں

قدامہ بن جعفر الکاتب نے "کتاب الخراج وصنعۃ الکتابۃ" کا بارہواں باب عہد بنو عباس میں ڈاک کی منزلوں اور راستوں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اس کے نزدیک اس تصنیف کا اصل مقصد مملکت اسلام اور اس کی سرحدوں کا بیان تھا۔ اس کے جغرافیے میں اسلامی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی رجحان بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً سرحدوں کا دفاع۔ وہ عمومی اور طبعی جغرافیے سے بحث کرتا ہے۔

"الاعلاق النفیسہ" جو ابن رستہ کی تصنیف ہے اس لحاظ سے ابن قدامہ کی کتاب کے مشابہ ہے کہ اس کے علاقائی جغرافیے کے آغاز ہی میں مکہ و مدینہ کا بیان ملتا ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ممالک کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جو عالم اسلام کی حدود سے باہر واقع تھے۔ اس نے ریاضیاتی جغرافیے سے باقاعدہ اور مفصل طور پر بحث کی ہے۔ بالکل اسی کے تتبع میں ابن الفقیہ نے بھی اپنی کتاب "البلدان" میں جغرافیائی مواد کو علاقائی بنیادوں پر پیش کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی ایک مشہور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار سیاح اور ممتاز جغرافیہ نگار بھی تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا لکھا ہوا سفرنامہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ لیکن اس کی دوسری تصانیف سے اس کی سیاحت کے بارے میں ایک سرسری سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے جغرافیے کو تاریخ کا ایک جزو قرار دیا ہے۔

عمومی جغرافیے پر لکھنے والوں کے دوسرے بڑے گروہ میں الاصطخری، ابن حوقل، المقدسی اور ابوزید احمد بن سہل البلخی شامل ہیں۔

دبستان بلخ کے جغرافیہ نویسوں نے عربی جغرافیے کو صحیح معنوں میں اسلامی رنگ دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بلاد اسلامیہ تک محدود رکھا۔ انہوں نے جزیرہ عرب کو وسط عالم قرار دیا۔ الاصطخری، ابن حوقل اور المقدسی نے پہلی بار جغرافیائی اصطلاح میں ملک کا تصور پیش کیا ہے اور دنیا کی چار عظیم سلطنتوں کی سرحدیں متعین کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ملک کی حد بندی کی ہے۔ چنانچہ دبستان بلخ کے تصورات کی اشاعت کا سب سے زیادہ ذمہ دار الاصطخری ہی تھا۔ اس نے طویل سیاحتیں کیں اور اپنے تجربات سفر کو بھی "المسالک والممالک" میں قلم بند کیا ہے۔ یہی کتاب بعد میں فارسی کتب جغرافیہ کی بنیاد بنی۔

ابن حوقل کو بچپن ہی سے جغرافیے میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس نے طویل سیاحت کی۔ اس نے اپنی کتاب "صورۃ الارض" ۳۶۶ھ/۹۷۷ء میں مکمل کی۔ اس نے نئی معلومات کا اضافہ کیا جو کہ کئی صدیوں تک جغرافیہ نگاروں کے لیے ایک مستند ماخذ بنی رہیں۔

صاحب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" المقدسی اپنے زمانے کا صحیح جغرافیہ دان تھا۔ اس نے عربی جغرافیہ کو ایک نئی بنیاد پر استوار کیا اور اسے ایک نیا مفہوم اور وسعت دی۔ اس نے اپنے سے پہلے جغرافیہ نگاروں سے نہایت ضروری باتیں اخذ و مستعار لیں۔

اسی دور کے جغرافیائی ادب اور سفرنامے وجود میں آئے۔ جن سے علاقائی و بیانی جغرافیے سے متعلق عربوں کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ عربوں نے دو

خطے دریافت کیے۔ جن کے بارے میں انہیں علم ہی نہیں تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے ان علاقوں کے اکتشاف کی بھی کوشش کی۔ جن کے بارے میں وہ نظریاتی معلومات رکھتے تھے۔

اس دور کی ایک امتیازی خاصیت یہ ہے کہ اس دور میں عربوں میں تحقیق و تجسس اور انکشافات کی روح بیدار تھی۔ لیکن ملاحی ادب، جس کا اکثر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ یونانی اور دیگر ماخذ سے حاصل شدہ نظریاتی معلومات کی تردید کے طور پر وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریے اور عملی تجربے میں بعض اوقات تضاد پیدا ہو جاتا تھا۔ اور اسی مسئلہ کا سامنا عرب جغرافیہ والوں اور سیاحوں کو کرنا پڑا۔ نظریے اور تجربے کے مابین یہی تصادم تھا۔ جس کے باعث بعد کے دور میں عرب جغرافیے کے ارتقا کی راہ متعین ہوئی۔ جب عملی تجربہ کرنے والوں نے نظریاتی اصول رکھنے کے لئے میدان خالی کر دیا تو عرب جغرافیہ نویسی کا زوال یقینی ہو گیا۔

پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کا زمانہ عرب جغرافیے کی انتہائی ترقی کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں عربی ادب میں جغرافیائی ادب کو خاص مقام حاصل ہوا۔ جغرافیائی مواد کو پیش کرنے کے لئے اسالیب اور طریقے اختیار کیے گئے۔ اس دور میں البیرونی نے عرب جغرافیے میں جو اضافہ کیا اس کی اہمیت دو طرح سے ہے۔ ایک تو اس نے اپنے زمانے کے تمام جغرافیائی ادب کا تنقیدی خلاصہ پیش کیا۔ چونکہ وہ یونانیوں، ہندیوں اور ایرانیوں کی تحقیقات سے بخوبی واقف تھا۔ اور سے عربوں کی مساعی کا بھی جو انہوں نے اس میدان میں کی تھیں علم تھا اس لئے اس نے اس موضوع کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا۔ جہاں تک عمومی، طبعی اور انسانی جغرافیے کے اصول و نظریات کا تعلق ہے اس نے قابل قدر اضافے کئے۔

البیرونی کے معاصر جغرافیہ والوں میں ابن یونس، ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن ناصر خسرو، ابوعبیداللہ بن عبدالعزیز البکری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک عرب جغرافیہ مسلسل تنزل کا شکار رہا۔ اس دور کی تصانیف کا معیار عام طور پر پست ہے۔ موضوع کے بارے میں علمی و تنقیدی رویہ اختیار کرنے اور معلومات کی صحت پر توجہ دینے کی بجائے اب پچھلے مصنفین کی تصانیف کے ملخصات پر ساری توجہ مبذول کر دی گئی۔ اس دور کو ہم جغرافیائی معلومات کی جمع و تدوین کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے جغرافیائی ادب کو آٹھ اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ جغرافیہ عالم:۔ اس دور کی جغرافیہ عالم پر اہم تصانیف میں "منتہی الادراک فی تقسیم الافلاک"، تصنیف محمد بن احمد الخرقی۔

"کتاب الجغرافیہ" از محمد بن ابوبکر زہری غرناطی۔

"نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" از شریف ادریسی۔

"کتاب الجغرافیہ فی الاقالیم السبعہ" از ابن سعید۔

"تقویم البلدان" از ابوالفداء ہیں۔

۲۔ کائناتی جغرافیہ:۔ اس صنف پر بھی کئی ایک تصانیف ہیں۔ جو اس دور میں تصنیف ہوئیں۔ ان میں سے مشہور ترین ابوحامد غرناطی کی "تحفۃ الالباب و نخبۃ العجائب" القزوینی کی "عجائب البلدان اور آثار البلاد"

الدمشقی کی "نخبۃ الدھر فی عجائب البر والبحر" اور

ابن الوردی کی "خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب" ہیں۔

۳۔ زیارتی ادب:۔ تیسری صنف زیارتی ادب کی ہے اور اس موضوع پر قابل ذکر کتب میں الہروی کی "اشارات الی معرفۃ الزیارات" عبدالقادر محمد نعیمی کی "الدارس فی تاریخ المدارس" ہیں۔

۴۔ جغرافیائی لغات:۔ اس موضوع پر یاقوت الحموی نے ایک بہت ہی مفید کتاب معجم البلدان کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء کی تصنیف ہے اس میں اسمائے امکنہ کی ایک جغرافیائی لغت ہے۔ اس کی دوسری اہم تصانیف "کتاب المشترک وضعاً والمختلف صقعاً" ہے۔

۵۔ سیاحت نامے:۔ اس دور کے مشہور سیاحت ناموں میں "الرحلہ" تصنیف ابن جبیر، "تاریخ المستنصر" تصنیف ابن مجاور، نیز البنانی، العبدری الطیبی اور التیجانی وغیرہ کی الرحلات ہیں۔ لیکن قرون وسطیٰ میں عربی میں سب سے اہم سفرنامہ "تحفۃ النظار" ہے جو سفرنامہ ابن بطوطہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

۶۔ ملاحی ادب:۔ اس صنف پر مشہور تصانیف ابن ماجد کی "کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد"، سلیمان بن احمد المہری کی "العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ" اور "شرح تحفۃ الفحول فی تمہید الاصول" ہیں۔

۷۔ فلکیاتی ادب:۔ اس دور میں فلکیات پر بھی کچھ اہم کتابیں تصنیف ہوئیں الغ بیگ اس دور کے ماہرین فلکیات میں سے تھا۔ اس کی موت سے عربی ادب فلکیات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے مشاہدات کے نتائج "زیج جدید سلطانی" میں شامل ہیں۔

۸۔ علاقائی جغرافیائی ادب:۔ اس دور میں عربی اور فارسی میں علاقائی اور قومی اساس پر جغرافیائی ادب پر تصانیف کی ایک کثیر تعداد منظر عام پر آئی۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں ابراہیم ابن واصف شاہ، النویری، المقریزی، ابن فضل اللہ العمری القلقشندی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شمالی افریقہ میں الحسن بن علی المراکشی نے "جامع المبادی والغایات" تحریر کی۔ ایران، وسط ایشیا اور ہندوستان میں فارسی کی بعض تصانیف میں بھی کسی حد تک علاقائی اور ریاضیاتی جغرافیے سے بحث کی گئی ہے۔

جہاں تک ترک جغرافیہ نگاروں کا معاملہ ہے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عثمانی ترکوں نے نویں صدی ہجری پندرھویں صدی عیسوی تک جغرافیے پر کتابیں لکھنی شروع نہیں کی تھیں۔ شروع شروع میں انہوں نے کتب عجائب کے نمونہ پر احوال عالم کے بارے میں کتابچے لکھنے شروع کئے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور تصنیف "در مکنون" ہے۔ جو یازیجی اوغلی احمد بیجان کی تصنیف ہے۔

کچھ عرصے بعد سپاہی زادہ محمد بن علی نے "اوضح المسالک الی معرفۃ البلدان والممالک" کے نام سے ابوالفداء کی تصنیف تقویم البلدان کا ترجمہ کیا۔ دسویں صدی ہجری میں جغرافیائی ادب میں ہم علی قوشجی کی تصنیف رسالہ ریاضیات و فلکیات کا نام لے سکتے ہیں جو فارسی میں تھا۔

ترکوں کی طبع زاد تصانیف جغرافیہ بحری و جہاز رانی میں ملتی ہیں۔ اس موضوع پر پیری محی الدین رئیس نے ایک کتابچہ لکھا جو ۱۲۹ ابواب پر مشتمل تھا اور ہر باب کے ساتھ ایک نقشہ تھا۔ اسی موضوع پر سیدی علی رئیس بن حسین نے ایک کتاب "المحیط" کے نام سے تصنیف کی۔ سید نوح کی تصنیف "کتاب بحر الاسود والابیض" بھی اس موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔

"جہان نما" تصنیف مصطفیٰ ابن عبداللہ المشہور کاتب چلپی ایک اہم ترین اور جامع جغرافیائی تصنیف ہے۔ اس کتاب کو اس نے ایک نئے انداز سے یورپی نمونے کے مطابق لکھا ہے۔

عثمانی ادب میں سیاحت ناموں میں علی اکبر کا "سفرنامہ چین" اور سیدی علی رئیس

کا سفرنامہ ہند قابلِ ذکر ہے۔ لیکن ان سب میں اہم ترین تصنیف اولیا بن درویش محمد ظلی المعروف اولیاء چلبی کی "تاریخ السیاح" یا "سیاحت نامہ" ہے۔ یہ کتاب مسلم اقوام کے پورے ادب میں منفرد حیثیت کی مالک ہے۔

جفر ایک عددی علم، اس میں احوالِ غیب کا علم معلوم کرنے کا دعوےٰ کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں اس علم میں مخفی معانی کی مدد سے واقعات، خصوصاً آنے والے واقعات کی تعبیر یا ان کی اطلاع حاصل کی جاتی ہے۔ اس علم کی بنیاد نیومرلوجی یعنی یونانیوں کے قدیم علم الاعداد پر ہے۔ سب سے پہلے عبرانیوں نے اپنی ابجد کے بائیس حروف کو اعداد میں منتقل کرکے ان سے طرح طرح کی تاویلات اخذ کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ عربوں نے اس ابجد میں چھ حروف کا اضافہ کیا۔ اس طرح عربی ابجد کے کل اٹھائیس حروف وضع ہوئے جن کے مساوی اعداد مقرر کرکے عربوں نے ان اعداد کی گنتی کو ہزار تک پورا کر لیا۔ عربی ابجد کے حروف اور ان کے مساوی اعداد حسبِ ذیل ہیں۔

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰

ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ان اٹھائیس حروف ابجد کو چاند کی اٹھائیس منازل پر منطبق کرکے ہر منزل کا ایک الگ حرف مقرر ہوا اور ہر حرف کی ایک خاص تاثیر متعین کی گئی۔
انہی تاثیرات کے علم پر جفر کی مشہور و معروف شاخ علم الآثار کو استوار کیا گیا۔
اوراد و نقوش علم الآثار کے اصول و قواعد کے مطابق ہی ترتیب پاتے ہیں۔
اوراد میں وہ وظائف بھی شامل ہیں جو کلام پاک کی آیات سے لے کر علم الآثار کے مطابق مختلف تاثیرات پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بعض آیات قرآن کے حروف کی ابجدی قدریں مجمل کرکے نقوش ترتیب دیئے جاتے ہیں اور مختلف مطالب کے حصول اور اخذ کرنے کے کام آتے ہیں۔
علم الاخبار علم جفر کی دوسری بڑی اور مشہور شاخ ہے۔ اس علم کے اصول و قواعد کے مطابق حروف سوال سے حروف جواب پیدا کر لئے جاتے ہیں اور اس طرح ماضی حال مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔
علم جفر کے بارے میں جو تحقیق کی گئی ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی ابتداء عبرانیوں سے ہوئی ہے۔ وہی اس علم کے موجد تھے۔ لیکن جس نوعیت میں یہ موجودہ دور میں رائج ہے اس کے بانی عرب ہیں۔

بعض حضرات اسے آنحضورؐ، حضرت علیؓ اور حضرت جعفر صادقؓ جیسی شخصیات سے منسوب کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ علم عرب کاہنوں میں موجود تھا۔

اہلِ تشیع میں بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے دو رسائل "جفر" اور "جامع" نام سے تصنیف کئے تھے۔ جن میں ماضی حال اور مستقبل کے حالات مندرج تھے۔ یہ رسائل نسلاً بعد نسلاً آپؓ کی اولاد میں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ امام مہدی ان کو ساتھ لے کر سردابہ سُرّ من رائے میں گم ہو گئے اور جب آپ دوبارہ ظاہر ہوں گے تو یہ رسائل بھی آپ کے پاس ہوں گے۔

جکارتا انڈونیشیا کا سب سے بڑا شہر اور صدر مقام جو جاوا کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ اس شہر کا قدیم نام سنڈا کلاپا تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں یہ بندرگاہ جب سلطان بانتن کے زیرِ اقتدار میں آئی تو اس نے اس بندرگاہ کو جکارتا (شاندار قلعہ) کا نام دیا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک اور روایت یہ کی جاتی ہے کہ اس کا نام جکارتا بمعنی فاتح خوشحال تھا۔ جو ولندیزی ابتدا میں سیاحت کے لئے یہاں آئے۔ انہوں نے اس کو جکاترا کر دیا۔
دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب ولندیزی جاوا پہنچے تو انہوں نے وہاں کے مقامی سلاطین سے جاپارا، بانتن اور جکارتا وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ لیکن جب انہوں نے مشورہ سری اختیار کی تو سلطان بانتن نے ان پر سختی کی اور وہ ان سختیوں کی وجہ سے جکارتا منتقل ہو گئے۔
اس دور میں جکارتا ایک قصبہ تھا۔ انہوں نے امیر جکارتا کی مرضی کے خلاف ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ امیر نے سلطان بانتن سے مدد چاہی۔ چنانچہ دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی جو جنگ جکارتا کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں ولندیزی شکست کھا کر جزیرہ امبون میں پسپا ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی

جکارتا کی سنہری مسجد

سے مال غنیمت کی تقسیم پر بانتن اور جکارتا کی فوجوں میں آپس میں لڑائی چھڑ گئی اور دونوں فوجیں آپس میں کٹ مریں۔ جب ولندیزیوں نے میدان صاف دیکھا تو دوبارہ جکارتا پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے تین روز تک قتل عام جاری رکھا۔ شکست تباہ [illegible] دیئے گئے اور مساجد کو مسمار کر دیا۔ جب یہ قصبہ اہل ملک سے خالی ہو گیا تو ولندیزیوں نے اپنے اہل قوم کے لئے ایک جدید طرز کی بستی بسائی اور اس کا نام بٹاویا رکھا۔ ابھی اس شہر کو آباد ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ماترم کے سلطان اگنگ کی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تین چار ماہ سخت مقابلہ رہا اور بالآخر سلطان کی فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا بٹاویا کا قلعہ تباہ کر دیا گیا۔ اگرچہ سلطان کی زندگی میں ولندیزی یہاں اپنے قدم نہ جما سکے لیکن اس کی وفات کے بعد انہوں نے دوبارہ بٹاویا کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور یہاں پر یورپ کے شہری نمونوں پر عمارات تعمیر کرائیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ شہر یورپی ڈھانچے میں ڈھل گیا۔
۱۹۱۹ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا اولین ہیڈکوارٹر یہیں بنایا تھا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک ایک مختصر عرصے کے لئے یہاں پر برطانیہ کا قبضہ رہا لیکن ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک اس شہر پر دوبارہ ولندیزی قابض رہے۔ اور جکارتہ ولندیزی گورنر جنرل کا مستقر رہا۔ اس دور میں اس شہر نے خوب ترقی کی اور بین الاقوامی تجارت کا مرکز اور انڈونیشی مجمع الجزائر میں انتظامیہ کا صدر مقام رہا۔ انڈونیشیا کے دوسرے حصوں اور

[illegible] ایک جنگل

دارالحکومت بن گیا۔

اس نقطۂ نظر سے یہ بات قابل بیان ہے کہ ولندیزی دورِ حکومت میں یہاں کے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکوں کے مراکز زیادہ تر یہیں رہے۔ تاہم بٹاویا کو بھی اسلامی زندگی کے مطالعے اور علمی تحقیقات کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل رہی۔ بٹاوی شعبۂ قانون جو ۱۹۲۴ء میں قائم ہوا میں ابتدا ہی سے اسلامی قانون و اسلامیات کے پروفیسر کی آسامی مخصوص رکھی گئی۔

۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے انڈونیشیا فتح کرنے کے بعد بٹاویا کا نام ایک بار پھر جکارتا رکھ دیا گیا۔

جکارتا سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام بوگور ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب بٹاویا (جکارتا) میں ایک خطرناک وبا پھیلی تو لوگ یہ شہر چھوڑ گئے اور بوگور میں جا بسے اس طرح ایک نئی بستی وجود میں آئی جس میں سرکاری دفاتر بھی منتقل کر دیئے گئے۔ سرکاری آبادی اب بھی یہیں پر آباد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جکارتا شہر دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس جدید حصے میں باغات، کشادہ سڑکیں اور نئی وضع کی خوبصورت عمارات ہیں۔ پرانا شہر انڈونیشی تہذیب و تمدن کا منظر ہے۔ اس حصے میں سے کئی نہریں گذرتی ہیں جو بڑا حسین منظر پیش کرتی ہیں۔ ان پر آمد و رفت کے لئے متعدد پل ہیں۔ جکارتا سے سورابایا اور دوسرے شہروں کو ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔

موجودہ شہر نہایت خوبصورت ہے، سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ہیں، خوبصورت عمارات ہیں۔ شہر سے متصل ایک جدید بندرگاہ ہے۔ جو پچاس لاکھ مربع فٹ کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ بندرگاہ اور شہر کے مابین کیموران کے مقام پر انڈونیشیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈا ہے۔

جکارتا میں متعدد کارخانے ہیں جن میں سے ریلوے ورکشاپ، لوہے کی ڈھلائی، چمڑہ رنگنے اور ادویہ سازی کے کارخانے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ چونکہ یہ شہر انڈونیشیا کا سب سے بڑا اور اہم ترین شہر ہے۔ اس لحاظ سے تعلیمی مرکز بھی ہے۔ تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ جمہوریہ انڈونیشیا یونیورسٹی یہیں قائم کی گئی ہے۔ یہاں کی قابل [illegible] گرجا گھر، مسجدیں اور عجائب گھر ہیں۔ شہر سے تھوڑے [illegible] ریڈیو سٹیشن ہے۔ ملک کا مرکزی شفاخانہ بھی یہیں پر ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی [illegible]

جلال الدولہ

(۳۸۳ھ / ۹۹۳ء - ۴۳۵ھ / [illegible])

جلال الدولہ بہاء الدولہ بویہی سلطنت کا [illegible] بیٹے سلطان الدولہ کو امیر الامراء چنا گیا تو اس نے [illegible] مقرر کیا [illegible] دہ کئی سال تک اس عہدے پر [illegible] کی وفات کے بعد [illegible] اگلے [illegible] کی وفات کے بعد [illegible] بنایا گیا۔ لیکن وہ اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے بغداد [illegible] بن سلطان الدولہ کو یہ عہدہ پیش کیا گیا [illegible]

جب جلال الدولہ نے یہ [illegible] بغداد میں اس [illegible] تو اس نے بغداد پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست کھانی پڑی [illegible] گیا۔ ۴۱۸ھ / ۱۰۲۷ء میں ترکوں کی درخواست پر وہ دار [illegible] برس ہی بغداد میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی [illegible] جلال الدولہ نے [illegible] بحال کیا۔ اس دوران میں اس کے بھتیجے نے بصرے پر قبضہ کر لیا [illegible] میں اس نے واسط پر بھی قبضہ جما لیا۔

۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں ابوکالیجار نے جلال الدولہ کے خلاف [illegible] دن جنگ [illegible] لڑنے کے بعد اس نے فرار کی راہ اختیار کی۔ جلال الدولہ نے واسط پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر بغداد میں داخل ہوا۔ [illegible] فتح ہو گیا لیکن ابوکالیجار کی [illegible] پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ اس زمانے میں دار الخلافہ میں ترک سپاہیوں کی [illegible] روز بروز

بڑھتی چلی گئی۔ اس لئے امیر الامراء کو اپنے مزید اختیارات سے دستبردار ہونا پڑا۔

۴۲۳ھ/۱۰۳۲ء میں امیر الامراء کا محل لوٹ مار کا نشانہ بنا چنانچہ جلال الدولہ نے عکبرا کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ ترکوں نے ابو کالیجار کو امیر الامراء بنانے کا اعلان کر دیا لیکن چونکہ اسے امارت میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جلال الدولہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد دوبارہ اپنے دار الخلافہ میں آ گیا۔ اگلے سال اس کے محل پر دوبارہ حملہ ہوا۔ اب یہ امیر جو قوت و اختیار سے بالکل محروم ہو چکا تھا۔ دوسری مرتبہ پھر راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اس نے کرخ میں شیعیوں کے ہاں پناہ لی۔ بعد میں باغیوں نے اسے بغداد واپس بلا لیا۔

اسی سال ابوالقاسم والی بصرہ نے ابو کالیجار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کیونکہ وہ اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔ ابوالقاسم نے جلال الدولہ کے لڑکے عبدالعزیز کو بصرے بلایا لیکن ۴۲۵ھ/۱۰۳۴ء میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا اور شہر کے لوگوں نے دوبارہ ابو کالیجار کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔

۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں جلال الدولہ کو ایک بار پھر بغداد سے نکال دیا گیا۔ لیکن قرواش بن المقلد الموصلی و دبیس بن علی الحلی کی حمایت حاصل ہو جانے پر وہ ایک بار پھر دار الخلافہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ابو کالیجار نے آخر کار جلال الدولہ سے صلح کر لی اور جب اس کے لڑکے ابو منصور کی شادی جلال الدولہ کی لڑکی سے ہو گئی تو اس صلح پر آخری مہر ثبت ہو گئی۔ اس موقع پر جلال الدولہ نے "شاہ شاہان" کا لقب اختیار کیا جو قدیم ایرانی لقب تھا۔

۴۳۱ھ/۱۰۴۰ء میں اسے ایک بار پھر دار الخلافہ میں ترکوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار بویہی سلطنت کو انتہائی زبوں حالی میں چھوڑ کر جلال الدولہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

جلال الدین احسن (م ۷۴۰ھ/۱۳۳۹-۴۰ء) مدورا کا پہلا سلطان۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ پنجاب کے قصبہ کیتھل کا رہنے والا تھا۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء میں صوبہ معبر میں نائب اقطاع کے عہدے پر فائز تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے اسے صوبیدار مقرر کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے ۷۳۴ھ/۱۳۳۳-۳۴ء میں جلال الدین احسن شاہ کا لقب اختیار کر کے مدورا میں جو معبر یا مدیا سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا چنانچہ سلطان محمد تغلق نے اسے اس کی غداری کی سزا دینے کے لیے جنوب کی طرف چڑھائی کی جو ہیضہ پھوٹ پڑنے کی وجہ سے رک گیا۔ اس وبا سے سلطان محمد تغلق کی فوج کا دسواں حصہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان دہلی کو ہاتھ سے نکلے ہوئے صوبے پر دوبارہ قبضہ نہ ہو سکا۔

تقریباً پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اس کے ایک عامل نے اسے قتل کر دیا۔ اگرچہ جلال الدین احسن مدورا کا پہلا خود مختار سلطان تھا۔ لیکن اس نے کسی حکمران خاندان کی بنیاد نہ رکھی۔

جلال الدین کی اولاد میں دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کی سلطان غیاث الدین سے اور دوسری کی شادی ابن بطوطہ سے ہوئی تھی۔

جلال الدین مجرد سلہٹی (۔۔۔ ؟ ۔۔۔ ۲۰ ذیقعدہ ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء) بنگال کے بزرگ صوفی۔ والد کا نام محمد ابراہیم تھا جو بخارا کے قریب قونیا نامی گاؤں میں اقامت پذیر تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد یمن کے رہنے والے تھے۔ جو قونیہ میں آ بسے تھے۔ دادھیال کی طرف سے آپ قریشی الاصل تھے۔ اور ننھیال کی طرف سے آپ کا سلسلہ سادات سے جا ملتا ہے۔ ابھی آپ کا بچپن ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ آپ کے ماموں سید احمد کبیر نے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ وہ آپ کو مکہ معظمہ لے گئے اور وہاں پہ مذہبی اور روحانی تعلیم دی۔ آپ نے انھی کے حلقہ طریقت میں رہ کر حقائق و معارف کے درس حاصل کئے۔ جب پوری طرح واقف اسرار و رموز ہو گئے تو آپ کے ماموں نے کہا کہ اب سرزمین ہند میں جا کر لوگوں کی اصلاح کرو اور دین حق کی تبلیغ کرو۔

آپ کی سلہٹ میں آمد کس سن میں ہوئی۔ اس بارے میں مورخین کی رائے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۱۳۴۰ء بتایا ہے اور بعض نے ۱۳۰۳ء۔ موخر الذکر تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

آپ کی سلہٹ میں آمد کے بارے میں بڑی دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے کہتے ہیں کہ جب آپ سلہٹ تشریف لائے۔ تو یہاں پہ اسلام کا نام لینے والا صرف ایک شخص تھا۔ جس کا نام برہان الدین تھا جب اس کے گھر بچہ پیدا ہوا تو اس نے اس بچے کی خوشی میں ایک گائے ذبح کی۔ اس راجہ نے برہم ہو کر اسے بچے کو ذبح کرا دیا اور برہان الدین کا دایاں ہاتھ بھی کٹوا دیا۔ جب راجہ کے تشدد کی یہ خبر دہلی کے فرمانروا علاؤ الدین خلجی تک پہنچی تو اس نے اپنے بھانجے سکندر خان غازی کو اس راجہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ سکندر نے دو مرتبہ حملہ کیا لیکن دونوں بار ناکام رہا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فتح حضرت جلال الدین کے ہاتھ میں رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت جلال الدین مکہ معظمہ سے دریائے برہم پتر پہنچے۔ ان کے ساتھ ۳۶۰ اولیائے کرام تھے۔ آپ نے اللہ کا نام لے کر اپنے مصلے دریا میں ڈال دیئے۔ چنانچہ دریا کو عبور کر کے سلہٹ کی وادیوں میں پہنچے جہاں پر ان کا مقابلہ راجہ گوڑ گوبند سے ہوا۔ راجہ جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے حکومت کی باگ ڈور سکندر غازی کو سونپ دی اور خود یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح آپ کے دم قدم سے نہ صرف سلہٹ بلکہ سارے بنگال میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک مشہور شعر ہے۔

کافرستان تھا سلہٹ در و دیوار سے پوچھ
کون آیا تھا یہاں کس کی اذانیں گونجیں

آپ نے سلہٹ میں ابتدائی دو سال سلطنت کے نظم و نسق میں صرف کیے اور باقی پینتیس سال خدمت خلق اور ریاضت و عبادت میں گذارے۔ آپ مجرد تھے۔ اسی سبب آپ کو مجرد سلہٹی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ جب بنگال کی سیر و سیاحت کے لئے آیا تھا تو اس نے آپ سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس نے اپنے سفر نامے میں آپ کے بارے میں لکھا ہے۔

"متواتر چالیس سال سے آپ صائم الروز رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ صرف دسویں دن روزہ افطار کرتے تھے۔ آپ کے پاس ایک گائے تھی جس کے دودھ سے روزہ افطار کرتے۔ آپ قائم اللیل بھی تھے اس وقت آپ کا قد بلند و بالا تھا اور رخساروں پر بہت کم بال تھے۔ ان پہاڑوں کے باشندے آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے آپ انہی لوگوں کے درمیان رہنے سہنے لگے تھے۔"

آپ نہایت سادہ زندگی گذارتے تھے۔ شجاعت بہت زیادہ تھی۔ آپ کا مزار مبارک سلہٹ کی قابل دید عمارتوں میں سے ایک ہے، آپ کی درگاہ کو روحانیت اور مادیت دونوں اعتبار سے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس محلہ کا نام جہاں آپ کی درگاہ ہے اس کی نسبت سے محلہ درگاہ پڑ گیا ہے۔ درگاہ مبارک پہ مسلمان، ہندو سکھ، عیسائی۔ سب زیارت کے لئے آتے ہیں۔ یہ عمارت پہاڑوں پر واقع ہے

درگاہ کا خوب صورت قبہ آپ کے جاہ و جلال کا پتہ دیتا ہے۔ اس کے مشرقی جانب خوبصورت مسجد ہے۔ آپ کے مزار کے آس پاس ان شیدائیان اسلام کے مقبرے ہیں جو آپ کے ہمراہ سلہٹ تشریف لائے۔

جلال زادہ صالح چلبی ایک عثمانی عالم، مورخ اور شاعر۔ جلال زادہ مصطفیٰ چلبی کا چھوٹا بھائی تھا۔ وچترن میں پیدا ہوا۔ جہاں پر اس کا والد جلال الدین قاضی تھا۔ اس نے کمال پاشا زادہ اور سلطان سلیمان کے اتالیق خیرالدین آفندی سے علم حاصل کرنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء میں صحن اور ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں ادرنہ بایزیدیہ میں پہنچا۔ اس نے حلب، دمشق، اور قاہرہ میں عدالتی خدمات بھی انجام دیں۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء میں اسے اس عہدے سے علیحدہ کردیا گیا۔ تو اس نے ایوب میں سکونت اختیار کرلی۔ اور یہیں پر ایک مقامی مدرسے میں معلمی اختیار کرلی۔ آخر عمر میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے اس نے معلمی کو خیرباد کہہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگیا۔ اور مرتے دم تک اسی کام میں مشغول رہا۔ اس نے ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے بھائی کی بنائی ہوئی مسجد کے صحن میں دفن ہوا۔

صالح چلبی نے تقریباً سترہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں مشہور ترین کتاب "تاریخ مصر جدید" ہے۔

جلال زادہ مصطفےٰ چلبی (۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء — ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء) عہد عثمانیہ کا مورخ۔ باپ کا نام قاضی جلال الدین تھا۔ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں دیوان ہمایوں میں محرر ہوگیا۔ بڑا باصلاحیت آدمی تھا۔ پیری پاشا نے اس کی صلاحیتیں دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مصطفیٰ چلبی پیری پاشا اور اس کے جانشین ابراہیم پاشا کا کاتب رہا۔ احمد پاشا کی بغاوت کے بعد مصر کے معاملات کو معمول پر لانے میں اس نے بڑی مدد دی۔ ان خدمات کے صلے میں اسے رئیس الکتاب کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ ۹۴۱ھ/۱۵۳۵ء میں اسے نشانجی بنایا گیا۔ اس عہدے پر اس نے تیئیس سال خدمات انجام دیں۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سرکاری دستاویزات اور اس کے رائج کردہ القابات کئی سال تک نمونے کا کام دیتے رہے۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۷ء میں رستم پاشا نے اسے متفرقہ باشی کا عہدہ دے کر اس منصب سے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء میں سکولو نے اسے دوبارہ اس کے عہدے پر بحال کردیا۔ لیکن اگلے ہی سال مصطفیٰ کا انتقال ہوگیا۔

اس نے سلطنت کے نظم و نسق کے حالات تیس جلدوں میں لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور اپنی اس تصنیف کا نام "طبقات الممالک و درجات المسالک" رکھا گیا تھا۔ اس کتاب کی صرف آخری جلد جو سلیمان کے عہد حکومت تک ہے۔ ہم تک پہنچی ہے۔ اس کتاب کے چند ایک قلمی نسخے جو علیحدہ علیحدہ اجزاء پر مشتمل ہیں۔ آج بھی موجود ہیں۔ جو "فتح نامہ رودس" اور "مہاج نامہ" کے نام سے موسوم ہیں۔

اس کی دوسری تصانیف میں "مواہب الخلاق مراتب الاخلاق"، "دلائل نبوت محمدی"، "معارج النبوہ"، "ہدیۃ المومنین"، "جواہر الاخبار فی خصائل الاخیار"، "قانون نامہ" وغیرہ ہیں۔ یہ تمام تصانیف ترکی میں محفوظ ہیں۔

جلایریہ (جلائر) ایک مغل قبیلے کا نام۔ یہ قبیلہ ان خانوادوں میں سے ہے۔ جنہوں نے ایلخانیہ کے بعد ان کی معدوم سلطنت کے حصے بخرے کرلئے تھے۔ ان کے شجرہ نسب کا آغاز ایلخانیوں سے ہوتا ہے۔ جو ہولاگو کے متعلقین میں سے تھا۔ یہ شجرہ "حسن بزرگ" تک پہنچتا ہے۔ جو اس خاندان کا موسس ہے اور ابوسعید کے دور حکومت میں روم کا والی تھا۔ جب ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں ابوسعید کا انتقال ہوا تو ہولاگو خاندان کے تین افراد یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے ان میں سے محمد حسن بزرگ کا متوسل تھا۔ جب محمد کو حسن کوچک نے قتل کیا اور خود ساتی بیگ کے نام پر حکومت کرنے لگا۔ اس کے بعد سلیمان پوری ایلخانی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکے۔ اور حسن بزرگ اور اس کے پیروکاروں نے بغداد میں اپنے قدم جمالئے اور اراتا اور خراسان کے حکمران طغا تیمور کی طرح چوبانیوں کی حکومت کا مقابلہ کرتے رہے جلایریہ کو حسن کوچک نے اپنا مطیع کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ جو ناکام رہیں۔ ۷۴۳-۷۴۴ھ/۱۳۴۳-۱۳۴۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی ملک اشرف نے حکومت پر قابض ہو کر سلیمان اور ساتی بیگ کو حسن بزرگ کے ہاں فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ لیکن اشرف بھی جلایریہ سے بغداد خالی نہ کرا سکا۔ البتہ اصفہان، کرمان یزد اور شیراز کے صوبے جو حسن کوچک کے مطیع تھے۔ وہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔

یہ بات واضح ہے کہ سلطنت ایلخانیہ کو کمزور کرنے میں حسن بزرگ کا ہاتھ تھا لیکن وہ اس کے خاتمے کا خواہاں نہ تھا۔ ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء میں حسن بزرگ کا انتقال ہوگیا اور جلایریہ کی قیادت اس کے بیٹے اویس کو ملی۔

جب التون اردو کے سلطان جانی بیگ نے ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء میں اشرف کی حکومت کا تختہ الٹا تو بغداد کے جلایریہ نے جانی بیگ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا جانی بیگ کے بعد اس کا بیٹا بیردی بیگ نے آذربائیجان سے اشرف کے سابقہ مقبوضات کے حق میں دستبردار ہوگیا تو اویس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اور آذربائیجان کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اور آخر کار ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں دوسرے حملے میں اسے کامیابی حاصل ہوگئی۔

جلایریہ نے ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء سے ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء تک جلایریہ کو بڑی کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ فارس میں خاندان مظفریہ کے شہزادے شاہ محمود نے جلایریہ کی سیادت تسلیم کرلی۔ لیکن ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء میں ان کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ان کے نئے مزید قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ ۷۷۵-۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں اویس نے انتقال کیا تو امراء نے اس کے بڑے لڑکے حسن کو قتل کردیا۔ چنانچہ اس کا چھوٹا بیٹا حسین تخت نشین ہوا۔ جس کے دور میں سلطنت کے انحطاط کے آثار ظاہر ہوئے۔ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء میں شیخ علی نے بغاوت کردی اور بغداد پر قبضہ کرلیا عادل جس پر حسین کامل اعتماد رکھتا تھا۔ جب ۷۸۲ھ/۱۳۸۰-۱۳۸۱ء میں سے ... حملہ آور ہوا تو حسین کے بھائی احمد نے اپنے بھائی کو بے یار و مددگار پاکر قتل کردیا۔ اور خود حکمران بن بیٹھا ابھی وہ اپنی حکومت بھی اچھی طرح سے مستحکم نہ کرنے پایا تھا کہ التون اردو اور اس کے بعد تیمور کے حملے نے اسے یہاں سے باہر نکال دیا۔ احمد بغداد واپس چلا آیا اور بعد میں عثمانی ترکوں کے پاس اور پھر وہاں سے مصر چلا گیا۔ تیمور کی وفات پر احمد ایک بار پھر بغداد پر قابض ہوگیا۔ لیکن ۸۱۲-۸۱۳ھ/۱۴۰۹-۱۴۱۰ء میں اس نے دوبارہ تبریز کو فتح کرنے کی کوشش کی تو وہ قرہ قویونلو کے ہاتھوں گرفتار کرکے مار دیا گیا۔

ویسے تو بغداد پر ۸۱۴-۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں قرہ قویونلو کا قبضہ ہوگیا تھا لیکن عراق کے زیریں حصے میں جلایری چند سال تک حکومت کرتے رہے۔ اس خاندان کا آخری فرمانروا حسین ثانی ۸۳۵-۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں محاصرہ حلہ کے دوران میں جو قرہ قویونلو

نے کیا تھا، مارا گیا۔

اس قبیلے کے بادشاہوں کے زیر سرپرستی جو یادگاریں تعمیر کی گئیں ان میں مرجان کی سرائے اور مسجد ہیں۔

جُلُف ایک سابقہ ریاست کا نام۔ یہ ریاست اس علاقے میں تیرہویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک قائم جو اب سنیگال کا حصہ ہے۔ اس میں والو، کایور، باؤل، سین، سلوم، دمار اور مبوک کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔

موجودہ دور میں یہ علاقہ جمہوریہ سنیگال کے ایک خطے کا نام ہے اس کے شمال میں والو، دمار اور فوٹہ تورو، مشرق میں فوتہ دمغا اور فرلو، جنوب میں نیانی ولی اور باؤل مغرب میں کایور اور نیانی ومبور واقع ہیں۔

ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ کے خاندان کے ایک نیک اور متقی انسان جن کا نام ابوبکر بن عمر تھا جو ابو دردای کے نام سے بھی مشہور تھے۔ مکہ معظمہ سے سینیگال میں جاکر آباد ہوئے اور اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کی۔

اسی طرح کی ایک اور روایت کے مطابق ایک اور شخص نے جو آنحضورؐ کی آل میں سے تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جُلُف کو تکرور کے تسلط سے آزاد کرایا اور مختلف علاقوں مثلاً والو، باؤل، سین اور سلوم کا باری باری الحاق کر لیا۔ ان حکمرانوں نے بوربہ جلف کا لقب اختیار کیا۔

یہ حکمران سولھویں صدی عیسوی تک حکمرانی کرتے رہے۔ اور غالباً یہ ان لوگوں کی حد درجہ جمہوریت پسندی ہی کی وجہ ہے کہ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی ایسا حکمران نہیں ہے جس کا نام ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔

چونکہ یہ علاقہ اندرون ملک واقع ہے۔ اس لئے یورپی استعماریت کا اس پر نسبتاً کچھ دیر سے ہی اثر ہوا۔ ویسے ہی سولھویں صدی میں اس علاقے میں اسلام کا اثر بھی کچھ زیادہ گہرا نہ تھا۔ الفوں میں مشرکانہ رسوم پائی جاتی تھیں جو متقی مسلمانوں کے لئے خاص طور پر پریشانی کا موجب تھیں۔ لیکن بقول کادموستو ۵۰۸ھ/۱۴۴۵ء میں اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کی رفتار بہت زیادہ ترقی پر تھی۔

فرانسیسیوں نے ۱۶۸۲ء میں الفو کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے تین سال بعد جلف کے حاکم سے معاہدہ کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے ۱۷۴۹ء میں ایک فرانسیسی عالم طبیعات نے جلف کی سیاحت کی۔ اور تقریباً ایک صدی بعد کایور کے دامل لات دیور کے خلاف فوجی کارروائیوں کے دوران میں یہ باغیوں کی جائے پناہ بن گیا۔ ۱۸۷۰ء میں تیجانی سردار احمد شیخو نے جلف اور کایور کا محاصرہ کیا لیکن ناکام رہا اور شکست کھائی۔

اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں کرنل دودز نے جلف کے حاکم کو بھگا دیا۔ بالآخر حاکم جلف کے بھائی نے ۳ رمئی ۱۸۹۰ء میں فرانسیسی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ اس وقت ہی سے جلف سینیگال کی ترقی سے بہرہ ور ہونے لگا۔ ۱۹۳۱ء میں ڈکر۔ سینٹ لوئی ریلوے کی ایک لائن جلف کے اندر تک بچھائی گئی۔ موجودہ زمانے میں یہ پورے کا پورا علاقہ اسلام قبول کر چکا ہے۔ ہر ایک گاؤں میں جامع مسجد اور ایک یا اس سے زائد مرابطی بزرگوں اور درویشوں کی خانقاہیں موجود ہیں۔ یہ لوگ صوم وصلوٰۃ کے بہت پابند ہیں یہاں کے باشندے تصوف میں سلسلہ قادریہ کے متبعین میں سے ہیں۔

ان لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں گاؤں ان زمینوں پر بسائے گئے تھے جو حاکم جلف نے مختلف مہمات میں نمایاں کارنامے انجام دینے والے لشکریوں کو دی تھیں۔ یہاں کا معاشرہ بھی درون زواجی گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور ان گروہوں میں سے کوئی دوسرا شخص داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کو چھوڑ سکتا ہے۔ آزاد لوگ مرابطیا بانی موضع کی اولاد ہیں۔ یہاں مختلف گھرانے علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔

جلف سینیگال کے سب سے بنجر علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندے عارضی طور پر شہروں میں نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ یہاں صرف مونگپھلی کی کاشت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے جلف کی معیشت کو واضح طور پر ترقی حاصل ہوئی ہے ——

جلوآنوی حضرت مولانا غلام محمدؒ (پیدائش ۱۹۵۰ بکرمی - ۱۸۹۳ء — تاریخ وصال ۴ رشوال المکرم ۱۳۷۵ھ ۱۵ رمئی ۱۹۵۶ء) سلسلہ قطبیہ قادریہ کے مشہور ترین ولی کامل، عالم باعمل، فارسی، عربی، اردو اور پنجابی کے قادر الکلام شاعر۔

ضلع لائلپور کے قصبہ کمالیہ کے قریب ایک گاؤں مخدوماں شریف میں حضرت میاں محمد فاضل مرحوم کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابھی بارہ تیرہ برس ہی کے تھے کہ سید شیر محمد گیلانیؒ فتح پور شریف گوگیرہ ضلع ساہیوال کے بیعت ہو گئے۔ اور پھر انہیں کی خدمت میں اٹھارہ سال کے طویل عرصہ میں علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور ہوئے۔ مرشد کامل کی نگاہ خاص کے صدقے تصوف اور وحدت الوجود کے علم میں آفتاب درخشاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دقیق سے دقیق مسائل چند اشاروں میں حل کر دیا کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وحدت الوجود اور تصوف کے منکرین بھی سلسلہ غلامی میں شمولیت فرما کر جاتے۔

آپ شریعت غرا کے سخت متبع، سراپا عشق ومحبت، مسئلہ رضا بالقضاء توکل، عشق و توحید و شریعت مطہرہ کے عین مطابق قرآن و احادیث اور عارفین و کاملین کے اقوال کی روشنی میں ایسی پُرتاثیر تقریر فرماتے کہ جاہل اور ان پڑھ بھی قلب و ذہن میں محسوس کر لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تمام مریدین صاحب حال ہیں۔

آپ تمام زندگی دن ہو یا رات ہر وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں سرشار و مستغرق رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور پُرنور، تاجدار عرب و عجم کی ذات والا صفات کے کمال حقی و خلقی اور شمائل و فضائل عام فہم زبان میں بیان کرنے کا خاص کمال حاصل تھا آپ وفات کے بعد نانڈیانوالہ، سمندری روڈ پر واقع موضع جلوانہ شریف میں ہی دفن کیے گئے۔

۱۰ رجولائی ۱۹۷۰ء سے آپ کا جسد مبارک آپ کی وصیت کے مطابق لاہور جڑانوالہ روڈ پر ڈھڈلیوالہ شریف (فیصل آباد) منتقل ہو چکا ہے اور وہاں آپ کا عالیشان روضہ زیر تعمیر ہے امام جلویؒ کا سالانہ عُرس ۲۰-۲۱ اسوج ڈھڈلیوالہ میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔

آپ کو نہ صرف علم لدنی اور علم تصوف میں امتیاز حاصل ہے بلکہ اپنے زمانے کے عربی، فارسی اردو اور پنجابی میں مایۂ ناز اور یکتائے زمانہ شاعر ہونے کا شرف بھی ہے نادر الوجود، نایاب عجائب روزگار اور عشق افروز کلام کہنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کی شاعری میں غزلیات، قصائد، کافیاں، ڈھولے، سی حرفیاں، رباعیات اور منظوم خطوط شامل ہیں۔

مولانا غلام محمد جلویؒ نے اپنی زندگی میں شاعری کے علاوہ متعدد کتب تصوف نثر میں لکھی ہیں جن کی تعداد سترہ کے لگ بھگ ہے۔

جَلوتیہ ترکی کے ایک سلسلہ تصوف کا نام۔ اس سلسلے کی بنیاد استنبول کے نزدیک سقوطری کے شیخ عزیز محمود ہدائیؒ نے رکھی۔ یہ جلوہ سے مشتق ہے اس

کا مفہوم اصطلاحِ تصوف میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان صفاتِ خداوندی پر غور و فکر یعنی مراقبے کے ذریعے خلوت سے نکل کر ہستی باری تعالیٰ میں فنا ہو جائے۔ جلوتیہ ایک خاص سنی طریقہ ہے اور اس کی بنیاد سات اسماءِ الٰہی کے ذکر پر ہے جو اصول اسماء کہلاتے ہیں ان اسماء میں پانچ اور فروعی اسماء الفتاح، الاحد، اللہ الصمد کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ شیخ اپنے ہر مرید کو یہ اسماء بتاتا ہے اور ان اسماء کا ورد ان پر لازم ہوتا ہے۔ اور وہ بعد میں ان خوابوں کی بنا پر جو وہ شیخ کے سامنے بیان کرتے ہیں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے کی دیگر عبادات میں مختلف نفل نمازیں اور روزے بھی شامل تھے۔ جلوتی سبز عمامہ باندھتے تھے۔ جن میں کپڑے کی تیرہ پٹیاں ہوتی تھیں۔

اس سلسلے کا مرکز سقوطری کے تکیے میں تھا۔ جہاں محمود ہدائی مدفون تھے۔ دوسرا مشہور مرکز بروسہ میں اسماعیل حقی کا تکیہ تھا۔ بقول اسماعیل حقی مصنف تفسیر روح البیان و دیگر تصانیف "سات اسماء کے ذکر کی ابتداء شیخ ابراہیم زاہد گیلانی سے شروع ہوئی اور ان کے شاگرد شیخ ابو اسحاق صفی اردبیلی کے توسط سے آگے پہنچا۔"

جلوتیہ سلسلہ بیرامیہ کی ہی ایک شاخ ہے۔ اگرچہ حاجی بیرام محمود ہدائی کا روحانی رشتہ بعض مقامات پر یقینی نہیں۔ ہدائی سفری حصار میں پیدا ہوئے اور بعض کے نزدیک سیوری حصار ان کا مولد بتاتے ہیں۔ سلطان سلیم نے ادرنہ کے مدرسہ میں مدرسی اختیار کرنے سے قبل انھوں نے استنبول میں تعلیم پائی۔ مصر میں جہاں وہ نائب قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ کریم الدین خلوتی سے وابستہ ہو کر خود بھی خلوتی ہو گئے۔

ہدائی بڑے خوش بیان اور نرم گفتار تھے۔ وہ سر پر لمبے بال رکھتے تھے ان کی تقلید میں ان کے مقلدین نے بھی اپنے سروں پر لمبے بال رکھنے شروع کر دیئے۔

جلوتیہ کی ایک اور شاخ تھی۔ جس کے بانی ہاشم بابا تھے۔ انھوں نے ۱۷۷۳ء میں وفات پائی۔ وہ جلوتیہ شیخ اور ملامتی بھی تھے اور قطب ہونے کے مدعی تھے۔

جَلیلی موصل کا ایک شاہی خاندان۔ اس خاندان کے سترہ افراد اس ولایت میں والی کے منصب پر فائز ہوئے۔

روایت کی رو سے ان کا وطن مشرقی اناطولیہ بتایا گیا ہے۔ اس خاندان کا مؤسس عبدالجلیل ہے۔ جس نے گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں عمری خاندان کے عیسائی غلام کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔

اس کے بیٹے اسماعیل نے جو مسلمان تھا، اپنی غیر معمولی قابلیت کی بناء موصل کی پاشالیق حاصل کر لی، اور ۱۱۳۹ھ/ ۱۷۲۶ء سے چند سال تک حکمرانی کرتا رہا۔

اسماعیل کے بعد اس کا بیٹا حسین پاشا ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء میں اس منصب پر فائز ہوا۔ وہ ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء تک آٹھ بار مختلف وقفوں کے بعد اس منصب پر فائز ہوا۔ حسین نے ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء میں نادر شاہ کے مقابلے میں موصل کے دفاع میں شریک ہو کر بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ وہ مختلف اوقات میں دوسری ولایتوں کا والی اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔

اس کی وفات کے بعد پچاس سال تک اس کے بیٹے اور دوسرے اقربا کا بھی یہی حال رہا۔ اس کے اخلاف میں سے جلیلی پاشا جو موصل کا والی تھا۔ موصل میں قبائلیوں اور دیہاتیوں کو شورشوں اور اپنے خاندان کی حاسدانہ تفرقہ پردازیوں کے برخلاف برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔

اس خاندان کو عراق کے اگلے اور پچھلے تمام خاندانوں میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

جب اس خاندان کے آخری والی یحییٰ پاشا کو معزول کر کے ایک جدید قسم کی مرکزی حکومت قائم کی گئی تو ان والیوں میں اس خاندان کے ممتاز افراد میں امین پاشا بن حسین، محمد پاشا بن امین پاشا اور احمد پاشا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جلیلی خاندان کے افراد تقریباً سو سال تک حکمرانی کرتے رہے۔ اور اتنی طویل مدت تک اس خاندان کا اپنے آپ کو بے بدل ثابت کرنا اور اس کا مردانہ وار استقلال اس کو تاریخ میں ایک خاص مقام دیتا ہے۔

موجودہ دور میں اس خاندان کی اولاد موصل میں بڑی کثیر تعداد میں آباد ہے اگرچہ انہیں اب حکومت میں کوئی اثر و رسوخ حاصل نہیں رہا۔

جم (۲۷ صفر ۸۶۴ھ/ ۲۲ دسمبر ۱۴۵۹ء — ۲۹ جمادی الاول ۹۰۰ھ/ ۲۵ فروری ۱۴۹۵ء) بن سلطان محمد ثانی۔ سلطنت عثمانیہ کا ایک سلطان۔ ماں کا نام چیچک خاتون تھا۔ جو سلطان محمد ثانی کی ایک کنیز تھی جس کو سلطان نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔

جم کا تعلق غالباً سربیا کے شاہی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ ۸۷۳ھ/ ۱۴۶۹ء میں جم کو دو اتالیقوں کے ساتھ قسطمونی کے سنجاق کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ ۸۷۹ھ/ ۱۴۷۴ء میں وہ اپنے متوفی بھائی مصطفیٰ کی جگہ قرہ مان قونیہ کا گورنر بنا۔

سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد قرہ مانی کے دشمنوں نے ینی چری کی مدد سے ۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء میں جم کی جگہ اس کے بھائی بایزید کو تخت نشین کر دیا [illegible] استنبول ہی میں تھا کہ جم نے آ کر بروسا پر قبضہ کر لیا۔ یہاں اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ بھی جاری کیا۔

بایزید نے اس کی تجویز کہ ممالک کو آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔ رد کر دیا اور [illegible] ۱۴۸۱ء میں ینی شہر کے مقام پر بایزید نے جم کو شکست دی۔ شکست کے بعد جم قونیہ کی طرف نکل گیا اور طرسوس میں پناہ گزین ہوا۔ یہ علاقہ [illegible] کے زیر حکومت تھا۔ جب مملوکوں کے دار السلطنت میں پہنچا تو سلطان [illegible] اس کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا۔

۸۸۷ھ/ ۱۴۸۲ء میں قرہ مانی مدعی حکومت قاسم بیگ [illegible] محمد نے اسے اناطولیہ واپس جانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ [illegible] اناطولیہ جانے کی اجازت دے دی۔ قاسم اور محمد [illegible] سے آملے اور قونیہ کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھے تو [illegible] بڑھ گیا تھا۔ شکست ہوئی اور اسے [illegible] کر دیا [illegible]

قاسم اور محمد [illegible] کا خیال چھوڑ کر انقرہ پر قبضہ [illegible] لیکن جب انھوں نے یہ خبر سنی کہ بایزید ثانی کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج آ رہی ہے۔ تو وہ دونوں واپس لوٹ گئے۔ جم نے [illegible] پہنچ کر جم نے بایزید سے صلح کی بات چیت کی۔ لیکن وہ [illegible] نے جو علاقہ دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جم کو سمندر کے راستے [illegible] کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے [illegible] کر لیا۔ جم کے اس سے پہلے [illegible] سے تعلقات تھے [illegible] زمانہ میں قرہ مان کا گورنر تھا۔ اس معاہدہ کی رو [illegible] کرنے کی اجازت مل گئی۔ [illegible] نے پوپ [illegible] تباہ کرنے سے [illegible] استعمال کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] بایزید ثانی کو اس بات پر راضی کرنے کا کہ ممالک عثمانیہ آپس میں تقسیم [illegible]

جائے۔ لیکن بایزید نے ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں نائٹوں سے معاہدہ صلح کرلیا۔ جس کے تحت یہ طے پایا کہ نائٹ جم کو پوری طرح قابو میں رکھیں گے اور وہ بایزید کو تنگ نہ کرسکے گا اور بایزید اس کام کے عوض انہیں پینتالیس ہزار سالانہ وینس کے طلائی سکے دیتا رہے گا۔ جب پی ڈی ابیوسن نے جم سے یہ وعدہ کرکے کہ اسے براہ فرانس ہنگری پہنچا دیا جائے گا تو جم کو فرانس میں سات سال نظر بند رکھا۔ جم چونکہ ایک اہم سیاسی قیدی تھا۔ وہ جس کے پاس بھی رہتا تھا ایک تو اس کا سیاسی بھرم بڑھتا تھا۔ دوسرے اسے روپیہ بھی ملتا تھا۔ اس لیے ہر ایک اسے اپنے پاس رکھنے کا خواہش مند تھا۔ جب جم فرانس میں نظربند تھا تو بایزید نے اس کے تین سالہ بچے اوغوز خان اور اپنی سلطنت کے سب سے طاقتور فرد کدک احمد پاشا کو قتل کرا دیا۔

نائٹوں اور پوپ ہشتم نے عیسائی دنیا کی عام بہتری کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ جم کو روما بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں جب جم پوپ سے ملا تو اس نے پوپ سے نائٹوں کی شکایت کی کہ انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور انہوں نے اسے روم ایلی پہنچانے کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ نیز انہوں نے مجھ سے قیدیوں کا سا سلوک کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ ہنگریوں کے ساتھ مل کر اپنے ہم مذہبوں سے نہیں لڑے گا۔ چنانچہ اسے واپس مصر بھیج دیا جائے۔ لیکن پوپ نے اس کی ایک نہ سنی۔ جم کے یورپ پہنچنے سے پوپ کی وقعت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ ترکوں کے خلاف صلیبی لڑائی لڑی جائے۔ چنانچہ اس نے عیسائی بادشاہوں کے نام خطوط لکھے۔

بایزید جم کے روما بھیج دیے جانے سے بڑا پریشان تھا۔ اس نے قپوجی باشی مصطفٰے بیگ کو ایک خط دے کر روما بھیجا جس میں پوپ کو اپنی دوستی کا یقین دلایا گیا تھا نیز اس نے اپنے سفیر کو ایک لاکھ بیس ہزار ڈوکٹ بھی دے کر بھیجا تھا جو جم کی تین سال کی پنشن تھی۔ جو اس وقت ادا کرنی تھی جب کہ مصطفٰے بیگ جم کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔

۹۰۰ھ ۱۴۹۵ء میں شاہ فرانس جم کو بادشاہ نیپلز پر حملہ کرنے کے وقت اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن جم راستے میں بیمار ہوگیا اور نیپلز پہنچ کر اس کا انتقال ہوگیا۔

جم نے مرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھا تھا کہ اس کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔ تاکہ صلیبی جنگ کے منصوبوں کے سلسلے میں کفار اس کا نام استعمال نہ کرسکیں۔

بایزید اس کی لاش کو سرزمین ترکی میں لے جائے۔ اس کے تمام قرضے ادا کر دیے جائیں اور اس کی ماں، بیٹی اور دوسرے لواحقین اور خدام کی کفالت کا بایزید مناسب انتظام کرے۔

جم کے انتقال کی خبر بایزید کو ۲۴۔ رجب ۹۰۰ھ/۱۲ اپریل ۱۴۹۵ء میں ملی۔ اس نے پوری مملکت عثمانیہ میں اس کی وفات کا اعلان کرا دیا اور اس کے لیے عام دعائے مغفرت کی گئی۔ ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں اس کی میت کو ترکی لایا گیا۔ اور بروسا میں اس کے بڑے بھائی مصطفٰے کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

بایزید ثانی نے اس کی وصیت کے مطابق تمام باتیں پوری کیں مگر اس کا لڑکا مراد جس نے رودس میں پناہ لے رکھی تھی۔ جزیرے کی فتح کے موقع پر پکڑا گیا اسے اس کے بیٹے سمیت قتل کرا دیا گیا۔

جم ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس کے دو دیوان ایک فارسی اور ایک ترکی

زبان میں موجود ہے۔

جماعت پارٹی، گروہ، حدیث میں جماعت کا لفظ بہت سی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً بنیادی طور پر جماعت کا لفظ باجماعت نماز میں شریک ہونے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آنحضورؐ نے فرمایا۔

"باجماعت نماز دو یا دو سے زیادہ افراد کے شریک ہونے سے ہوتی ہے (مسند)

"باجماعت نماز کا ثواب اکیلے پڑھنے سے زیادہ ہے۔ (بخاری)

جماعت کا لفظ احادیث میں اس جماعت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو کسی امام کی اطاعت پر جمع ہوں۔

آنحضورؐ نے فرمایا۔

"ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کی نہ جماعت ہو اور نہ ان کا کوئی امام۔ کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیے۔" (بخاری و مسلم)

جماعت کا لفظ آنحضورؐ نے ان سیاسی وثیقوں میں بھی استعمال کیا ہے جو ابن سعد نے نقل کیے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا:۔

"تو ہماری جماعت میں داخل ہو جا۔ یہ تیرے لیے بہتر ہے۔ (الوثائق ص ۹)

"جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔" (ترمذی)

"جس نے سنت ترک کی وہ جماعت سے نکل گیا۔ (مسند احمد)

احادیث میں جماعت کا لفظ عامۃ المسلمین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جنہیں قوم، نسل، رنگ، زبان اور ملک کے اختلاف سے قطع نظر محض دینی اور اسلامی رشتے نے مسلمانوں کی ایک قوم بنا دیا۔

فقہا جماعت کا لفظ باجماعت نماز ادا کرنے والوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک جماعت کا اصولی مفہوم وہ جماعت صحابہ ہے جو نماز میں آنحضورؐ کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ بعد میں نماز سے قطع نظر صحابہ کی پوری جماعت مراد لیا جانے لگا۔

حنبلی عقائد میں یہ خیال برابر کام کرتا رہا کہ حقیقی مسلمان بننے کے لیے ضروری ہے کہ آنحضورؐ کے اسوہ کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور جماعت صحابہ کے تعامل پر نظر رکھی جائے۔

جماعت کے تصور کے بارے میں مختلف مکاتب فکر میں اختلاف ہے۔ مثلاً طبری کے خیال میں جماعت کا مفہوم صرف صحابہ تک محدود نہ رکھا جائے۔ شاہ ولی نے جماعت المسلمین کا لفظ جماعت کفار کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ علامہ رشید رضا کے نزدیک بھی جماعت کے مفہوم میں وسعت ہے اور حنبلیوں کی طرح محدود نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جماعت سے مراد ہر عہد کے "ارباب حل وعقد" مراد ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو برملا کہتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں جماعت سے مسلمانوں کا سواد اعظم مراد لی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیات جاہلی سے تعبیر کیا ہے۔ ...... افراد تباہ ہو سکتے ہیں لیکن ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہوسکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"

ان کے نزدیک "جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، اختلاف، امتزاج اور نظم ہو..... اجتماع کے یہ خواص و اوصاف

نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ قائم رہ سکتے ہیں۔ جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد اور مؤتلف و ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔"

اسلام مسلمانوں کی جماعت کی بنیاد باہمی مواخات و مساوات پر رکھتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کی تشکیل کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کی بہتری اور فلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے (۳ : ۱۱۰)

جماعتِ اسلامی

پاکستان کی ایک مشہور و معروف جماعت۔ یہ ۲ شعبان ۱۳۶۰ھ / ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں مولانا مودودی کی دعوت پر قائم ہوئی۔ اس کی بنیاد ۷۵ ارکان نے رکھی تھی۔ برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے بعد جماعتِ اسلامی بھی تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۱۔ جماعتِ اسلامی پاکستان ۲۔ جماعتِ اسلامی ہند۔ ۳۔ جماعتِ اسلامی جموں و کشمیر۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ یہ جماعت جزائر انڈیا اور سری لنکا میں بھی سرگرمِ عمل ہے۔

جماعتِ اسلامی محض ایک "سیاسی" یا "مذہبی" یا "اصلاحی" جماعت نہیں ہے بلکہ یہ وسیع معنی میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے اسلام کے جامع اور عالمگیر نظریۂ حیات پر یقین رکھتی ہے۔ اور اس کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک دنیا کے بگاڑ کا حقیقی سبب خدا اور آخرت سے بے نیازی اور رسالت کی رہنمائی سے روگردانی ہے۔ دنیا میں جہاں اور جس شعبہ زندگی میں بھی خرابی پیدا ہوئی ہے اس کی تہہ میں یہی بنیادی سبب کارفرما رہا ہے اور کوئی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ خدا کی اطاعت، آخرت کی جوابدہی کے احساس اور رسالت کی رہنمائی کو نظامِ زندگی کی بنیاد بنایا جائے۔

عقیدہ جماعتِ اسلامی کا بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہوگا۔ یعنی یہ کہ صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس کی تشریح دستورِ جماعت میں اس طرح کی گئی ہے۔

اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ کے واحد الٰہ ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ ہے۔ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہے، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں۔ خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ نہ تسلیم کرے۔ کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے۔ کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ جو ایک اللہ کی اطاعت کے تحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ

۶۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دستبردار ہو جائے، اپنی خواہشِ نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے بلکہ ہر چیز، حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضا، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔

۱۱۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں معاشرت اور تمدن میں معیشت اور سیاست میں غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے، اور ہر اس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس عقیدے کے دوسرے جز یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعے سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطۂ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطے کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امرِ واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے۔

۱۔ انسان ہر اس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول اللہ سے ثابت ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔

۳۔ رسولِ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے تحت ہونی چاہیے۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے۔ خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت و عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آ جائے یا اس

کی مدمقابل بن جائے۔

٦۔ رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔

٧۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی دوسرے انسان کا یہ منصب تسلیم نہ کرے کہ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ ہو۔

جماعت اسلامی کا مقصد جس کے لئے وہ قائم ہوئی ہے یہ ہے۔

"انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر و نظر، عقیدہ و خیال مذہب و اخلاق، سیرت و کردار، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت معیشت و سیاست، قانون و عدالت، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر قائم کیا جائے۔

جماعت اسلامی کے سربراہ کو "امیر" کہتے ہیں۔ اس جماعت کے پہلے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ موجودہ امیر میاں طفیل محمد ہیں۔ امیر کا انتخاب پانچ سال کے لئے ارکان جماعت براہ راست خفیہ رائے دہی کے ذریعے کرتے ہیں امیر جماعت جماعتی پالیسی اور پروگرام اور تمام اہم امور پچاس ارکان پر مشتمل مجلس شوریٰ کے مشورے سے طے کرتا ہے اور اس مجلس شوریٰ کے ارکان کا تقرر بھی ارکان جماعت کے براہ راست خفیہ ووٹوں سے کیا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی اپنے ممبروں کی تنظیم کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے،

١۔ متفق - ٢۔ رکن۔

احیائے اسلام کی تحریک اور عوام پاکستان کی بہبود کے لئے جماعت اسلامی کے تاریخی پارٹ کا جائزہ لینے کے لئے حسب ذیل شواہد قابل توجہ ہیں۔

١۔ جماعت اسلامی کا لٹریچر اور اس کی دعوت کے اثرات گذشتہ ٢٢ سالوں میں کرہ ارض کے ہر گوشے میں جہاں مسلمان پائے جاتے ہیں پہنچ گئے ہیں۔ اس کا لٹریچر اردو سے عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، سواحلی، تامل، بنگلہ گجراتی وغیرہ ستائیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل رہا ہے اور یہ جماعت کا اہم ترین کام ہے کہ اس نے ایک وسیع لٹریچر فراہم کیا ہے جو ہر پہلو میں اسلام کی صداقت اور اس کے قابل عمل ہونے کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کو مطمئن کرسکتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات پر پوری طرح مطمئن ہے اور ہوتی جارہی ہے کہ ایک جدید ترین ریاست کو اسلام کے اصولوں پر چلایا جاسکتا ہے۔

٢۔ جماعت کا دوسرا کام یہ ہے کہ اس نے مخلص اور بھروسے کے قابل سیرت و کردار رکھنے والے کارکنوں کی ایک ایسی منظم ٹیم تیار کی ہے۔ جس نے انتھک محنت سے لاکھوں آدمیوں کو اپنا ہم خیال بنایا ہے۔ قوم میں اپنی دیانت و امانت کا اعتماد قائم کیا ہے۔

٣۔ پاکستان بننے کے بعد سے سیلابوں اور طوفانوں کے متاثرہ افراد، ١٩٦٥ء کی جنگ کے مصیبت زدگان، جہاد کشمیر، دفاع پاکستان، جہاد فلسطین و اریٹیریا کے مجاہدین کی امداد کے سلسلے میں پاکستان کے عوام نے مجموعی طور پر ٧٠ لاکھ روپے نقد و سامان کی صورت میں جماعت کو دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں جماعت کے شعبہ خدمت خلق کے تحت ملک میں مفت اور سستے علاج اور غریب طبقوں اور طلبہ کی امداد کا کام وسیع پیمانے پر جاری ہے۔

٤۔ اس ملک میں جو تحریکیں لادینی اور ملحدانہ نظام لانا چاہتی ہیں یا جو تحریکیں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں جماعت اسلامی نے ہر میدان میں ان تحریکوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور کررہی ہے۔ خواتین میں بھی اس جماعت کا کام جاری ہے۔

٥۔ دستور میں پہلے قرارداد مقاصد کا پاس کرانا اور اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرانے میں جماعت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

جماعت اسلامی کو ١٩٥٣ء میں بھاری ابتلاء سے گذرنا پڑا جو قادیانیت کی تحریک کی مخالفت کرنے کی وجہ سے تھا۔ جماعت کے امیر مولانا مودودی کو پھانسی تک کی سزا بھی سنائی گئی جو اس تحریک کے خلاف ایک پمفلٹ لکھنے کے جرم میں سنائی گئی تھی۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ١٩٧٧ء میں قومی متحدہ محاذ کی تحریک میں جماعت اسلامی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ستمبر ١٩٧٩ء میں بانی جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات کے بعد میاں طفیل جماعت کے امیر مقرر ہوئے۔

جماعت، تبلیغی

ایک خالص مذہبی جماعت۔ جس کا مرکز رائے ونڈ ہے۔ تبلیغی جماعت کے بانی اور داعی مولانا محمد الیاس ہیں۔ آپ نے ١٣ ربیع الثانی ١٣٤٥ھ/ اکتوبر ١٩٢٦ء کو مدینہ منورہ سے کاندھلہ واپس آنے کے بعد اس جماعت کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ آپ نے تبلیغی گشت شروع کرکے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ بھی عوام میں نکل کر دین کے اولین ارکان و اصول (کلمہ توحید و نماز) کی تبلیغ کریں۔ دین کی تبلیغ کے لئے عام آدمیوں کا زبان کھولنا بڑا پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ چند آدمیوں نے بڑی شرم و حیا اور رکاوٹ کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔ چنانچہ عرصے تک میوات میں اسی طرز پر کام ہوتا رہا اور دینی و علمی مرکزوں کے لوگوں کو میوات کے جلسوں میں تبلیغی جماعت کے اجتماع کے موقع پر دعوت دی جاتی رہی اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا نے اپنے طویل تجربے اور بالغ نظری سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اپنے ماحول اور مشاغل میں گھرے رہ کر ان غریب میواتی کاشت کاروں کا دین سیکھنے کے لئے وقت نکالنا اور اس تھوڑے سے وقت میں جس میں ان کو کامل یکسوئی حاصل نہیں ہوسکتی۔ دین کے ایسے اثرات کو قبول کرلینا جن سے ان کی زندگی میں انقلابی اصلاح اور تغیر پیدا ہوجائے ممکن نہیں۔ ان سے یہ مطالبہ کرنا بھی صحیح نہیں کہ سب کے سب اس عمر میں مکاتب اور مدارس کے طالب علم بن جائیں اور یہ توقع بھی غلط ہے کہ وعظ و پند ہی سے ان کی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔ اور وہ اس جاہلی زندگی سے نکل کر اسلامی زندگی میں قدم رکھیں گے، ان کے عادات و اخلاق مزاج و طبائع شوق و رغبت اور جذبات بدل جائیں گے۔

مولانا کے نزدیک اس کی تدبیر صرف یہ تھی کہ ان کو کچھ مدت کے لئے جماعتوں کی شکل میں دین اور علم کے مرکزوں کی طرف نکلنے پر آمادہ کیا جائے۔ وہ وہاں کے عوام اور جہلا میں کلمہ اور نماز کی تبلیغ کریں اور اس طرح اپنا پڑھا ہوا سبق پختہ کریں اور وہاں کے اہل علم و دین کی مجلسوں میں بیٹھ کر ان کی باتوں کو غور سے سنیں اور ان کی زندگی نشست و برخاست اور عمل کو بغور دیکھیں اور اس طرح بالکل فطری طریقہ پر جس طرح بچہ زبان سیکھتا ہے اور آدمی تہذیب و شائستگی حاصل کرتا ہے وہ دین اور علم دین حاصل کریں۔

جب تبلیغی جماعت کے افراد تبلیغ کے لئے نکلتے ہیں تو ان کو حسب ذیل ہدایات ہیں۔ جن کو ہم تبلیغی جماعت کے اصول کہہ سکتے ہیں۔

١۔ ہر کلمہ گو اور علم والے کا دل سے احترام و اکرام کریں اور اس کی مشق کریں۔

۲۔ دوسرے کے عیوب سے اپنی آنکھیں بند کریں۔ اور اپنے عیوب تلاش کرتے رہیں
۳۔ بیان اور تعلیمی حلقوں اور مجلسوں میں کسی طبقہ یا جماعت یا فرد پر نکیر یا طنز نہ کرنا۔ جو لوگ جماعت میں وقت نہ لگا سکیں ان کی بھی تنقیص نہ کرنا۔

۴۔ ہر علاقہ کے بزرگانِ دین علماء اور مشائخ سے استفادہ کی اور دعا کی نیت سے ملیں اور ہر ایک کے تعلق والوں سے اکرام و محبت کے ساتھ مل کر کام کریں۔ کسی پر تنقید نہ کریں۔

۵۔ تبلیغ اور جماعت میں نکلنے کو دنیوی فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اپنے حاصل کیے ہوئے مفادوں کو قربان کرنے کی مشق کی جائے۔

۶۔ بیان میں اپنے کارنامے نہ بیان کیے جائیں۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام صحابہ کرامؓ اور اسلاف کے واقعات کے ذریعہ ترغیب دی جائے اور ان ہی کی مددوں کا تذکرہ کیا جائے۔

۷۔ کرنے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ دن میں اس کے دین کی انتھک کوشش کرکے راتوں کو تضرع و زاری و الحاح کے ساتھ خدا ہی سے اس کی نصرت اور مدد مانگی جائے اور جو کچھ وجود میں آئے اس کا کرم سمجھا جائے۔

تبلیغی جماعت کے نظام کار کے بارے میں کہ جب جماعتیں وجود میں آجائیں تو ان کے کام کا نظام کیا ہوگا اور ترکیب کیا ہوگی۔ کس چیز کی اور کتنی چیزوں کی دعوت دی جائے گی۔ مولانا الیاسؒ کے الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ نکلنے کے وقت حضورؐ کی لائی ہوئی چیزوں میں جو چیز جتنی اہم ہے اس میں کی حیثیت سے کوشش کرنا، اس وقت ہم بدقسمتی سے کلمہ تک سے ناآشنا ہو رہے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کلمہ طیبہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدا کی خدائی کا اقرار نامہ ہے یعنی اللہ کے حکم پر جان دینے کے علاوہ درحقیقت ہمارا کوئی بھی مشغلہ نہ ہوگا۔

۲۔ کلمہ کے لفظوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے اور نمازوں کو حضورؐ کی نماز جیسی بنانے کی کوشش میں لگے رہنا۔

۳۔ تین وقتوں کو (صبح و شام اور کچھ حصہ شب کا) اپنی حیثیت کے مناسب تحصیل علم و ذکر میں مشغول رکھنا۔

۴۔ ان چیزوں کو پھیلانے کے لیے اصل فریضہ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بہ ملک رواج دینا۔

۵۔ اس پھرنے میں خُلق کی مشق کرنے کی نیت رکھنا۔ اپنے فرائض (خواہ خالق کے ساتھ متعلق ہو یا خلق کے ساتھ) کی ادائیگی کی سرگرمی، کیونکہ ہر شخص سے اپنے ہی متعلق سوال ہوگا۔

۶۔ (تصحیح نیت) یعنی ہر عمل کے بارے میں اللہ نے جو وعدے وعید فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعے اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا۔

یہ جماعت ہند و پاکستان کے علاوہ حجاز، عراق، لندن، امریکہ، افریقہ، برما وغیرہ تقریباً سارے ہی ملکوں میں موجود ہے۔

پاکستان میں اس جماعت کا مرکز رائے ونڈ میں ہے جو لاہور کا ضلع ہے۔ اسی مرکز میں اس کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے اور اس اجتماع میں ہزاروں کی تعداد میں ساری دنیا کے مسلمان جو جماعت سے وابستگی رکھتے ہیں شریک ہوتے ہیں۔ یہیں سے مختلف جماعتیں بن کر پورے ملک میں اور بیرون ملک تبلیغ کے لیے نکلتی ہیں۔

جماعت علی شاہ، پیر

(۱۲۵۶ھ یا ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۰ء یا ۱۸۴۵ء – ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ/۳۱ اگست ۱۹۵۱ء) ایک عالم دین اور محدث۔ والد کا نام سید کریم شاہ تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سے سید محمد حنیف نامی ایک بزرگ شہنشاہ اکبر کے عہد میں شیراز سے ہندوستان تشریف لائے اور علی پور سیداں میں سکونت پذیر ہو گئے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں عبدالرشید سے پڑھیں اور مولانا عبدالوہاب امرتسری سے تکمیل کی پھر لاہور آکر مولانا غلام قادر بھیروی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے مولوی عالم اور مولوی فاضل کا کورس پڑھا۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی سے جو اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر تھے مزید استفادہ کیا۔ بعد میں مولانا احمد مظہر سہارنپوری، مولوی محمد علی اور مولانا احمد حسن کانپوری، شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔

روحانی تربیت کے لیے آپ بابا فقیر محمد چوراہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند روز ان کی صحبت میں رہے۔ حضرت بابا نے آپ کو خلافت اور اجازت عطا فرمائی۔ اور دعاؤں کے ساتھ آپ کو رخصت کیا۔ یہ اسی بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ پشاور سے راس کماری اور کشمیر سے مدراس تک آپ کے عقیدت مندوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے برعظیم پاک و ہند ہی میں نہیں بلکہ کابل، برما، سعودی عرب اور دیگر ممالک میں بھی آپ کے عقیدت مند موجود ہیں۔

خلافت ملنے کے بعد آپ نے علی پور سیداں کی مسجد کو وعظ و تبلیغ کا مرکز بنایا اور ملک کے دور دراز علاقوں میں تبلیغی دورے کیے۔ آپ کے ہاتھ پر سینکڑوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ آپ نے کئی جگہ مدارس و مساجد اور کنوئیں بنوائے۔ آپ ساری عمر تبلیغ اسلام میں پوری تندہی کرتے رہے۔

۱۹۲۳ء میں جب شدھی کی تحریک اٹھی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا تو آپ نے اس تحریک کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اس فتنے کی روک تھام کے لیے مہم شروع کی۔

آپ نے ہر قومی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب عثمانی سلطان عبدالحمید نے حجاز ریلوے لائن کی تعمیر کے سلسلے میں مسلمانان عالم سے چندہ مانگا تو آپ نے خطیر رقم اپنی اور اپنے متوسلین کی جانب سے بھجوائی۔ سلطان نے آپ کو عمدۃ الامائل والافاضل کے خطاب سے نوازا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی گئی تو آپ نے تین لاکھ روپے کی رقم اس فنڈ میں جمع کرائی۔ اور بعد میں بھی تعاون فرماتے رہے۔

تحریک خلافت میں بھی آپ نے ہر طرح کی خدمات انجام دیں۔ خلافت فنڈ میں لاکھوں روپیہ چندہ دیا۔

تحریک پاکستان میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کی حمایت کی۔ قائد اعظم کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے کوشش کرتے رہے۔ آپ جگہ جگہ جلسوں اور یادداشتوں کے ذریعے حکومت کو اسلامی آئین کے نفاذ کا وعدہ یاد دلاتے رہے۔

علی پور سیداں میں آپ نے چھ لاکھ روپے کے صرف کثیر سے ایک خوبصورت مسجد بنوائی جو قابل دید ہے۔

پیر جماعت علی شاہ کا انتقال ایک سو سال سے زائد کی عمر میں ہوا۔ آپ کا عرس علی پور سیداں میں ہر سال ۲۸، ۲۹ ذیقعدہ کو نہایت عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے

آپ سچے عاشق رسولؐ تھے اور عشق نبی آپ کے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ آنحضورؐ کا نام مبارک سنتے ہی آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ آپ ہر سال حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جاتے اور زیادہ وقت مدینہ طیبہ ہی میں گذارتے آپ کو وہاں کی ہر چیز سے عقیدت تھی۔ وہاں کے چرند پرند اور حیوان اور جانوروں تک سے پیار تھا۔ مولانا داؤد غزنوی نے آپ کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے جو انہوں نے بچشم خود دیکھا تھا۔

"ایک مرتبہ مدینہ شریف میں باب السلام کے نزدیک چند کتے لیٹے ہوئے تھے ایک ناسمجھ نے جاتے جاتے ایک کتے کو لاٹھی ماری۔ کتا لنگڑاتا اور چیختا چلاتا جا رہا تھا کہ اچانک آپ وہاں تشریف لے آئے۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو کتے کو پاس بٹھایا اور اس شخص سے کہا ظالم تو نے یہ نہ دیکھا کہ مدینہ منورہ شریف کا کتا ہے۔ پھر اپنا عمامہ پھاڑ کر کتے کی زخمی ٹانگ پر پٹی باندھی اور بازار سے کھانا منگوا کر اسے کھلایا۔

آپ کی مجلس میں اکثر و بیشتر نعت خوانی ہوتی رہتی تھی۔ آپ امیر ملت اور محدث علی پور کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

جمال الدین آق سرای (۔۔۔؟ ۔۔۔ ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء) ایک ترکی فلسفہ دان اور متکلم۔ آق سرای کے مقام پر پیدا ہوا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امام فخرالدین رازی کا پڑپوتا تھا اور جمالی کے نام سے مشہور تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آق سرای کے مدرسہ زنجرل میں مدرس مقرر ہوا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو جو ایک کثیر تعداد میں تھے۔ تین گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی جماعت اور گروہ کو "مشائیون" کہا جاتا تھا۔ یہ شاگرد اس کے گھر کے دروازے پر جمع ہو جاتے اور اس کے ساتھ مدرسے تک جاتے اور جمال الدین انہیں چلتے چلتے درس دیتا تھا۔ دوسری جماعت "رواقون" کی تھی جو مدرسے کے ستونوں کے نیچے اس کا انتظار کرتے تھے۔ جہاں ان کا استاد انہیں کھڑے کھڑے سبق دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیسرے گروہ کے پاس جاتا تھا جو مدرسے کے بڑے کمرے میں موجود ہوتے تھے۔

حسام الدین نے اپنی کتاب "اماسیہ تاریخی" میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حاجی شادگلدی کے ہاں قاضی عسکرے کے عہدے پر فائز تھا۔ جب موخرالذکر کو میواس کے امیر قاضی برہان الدین کے ہاتھوں شکست ہوئی تو ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں جمال الدین آق سرای چلا گیا۔

جمال الدین کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ براکلمان نے ۷۷۸ھ/۱۳۷۷ء طاہر بروسلی نے ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء اور عدنان ادوار نے ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء بیان کی ہے۔

اس کے شاگردوں میں علامہ ملاں فناری جیسے صاحب علم لوگ تھے۔

جمال الدین کی تصانیف اخلاق جمالی، شرح الغایۃ القصویٰ، شرح الایضاح شرح مشکلات القرآن الکریم، حال، الموجز، حاشیہ، الملتقی، شرح اللباب المسمیٰ بکشف الاعراب وغیرہ ہیں۔

جمال الدین محمود، استادار (۔۔۔؟ ۔۔۔ ۷۹۹ھ/۱۳۹۵ء) مصر میں عہد مملوک میں شاہی محل اور شاہی مطبخ کا نگران استادار کے فرائض میں شاہی محل اور شاہی مطبخ کی دیکھ بھال، محل کے غلام، لونڈیاں اور ملازمین کی تنخواہ کی تقسیم ان کے لئے غذا، پوشاک اور دوسری ضروریات کی فراہمی کا کام تھا۔ یہ ایک نہایت اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا اور ایک وقت میں کئی کئی افراد استادار ہوتے تھے۔

اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مصری عمائدین میں ہوتا ہے اس کے ابتدائی حالات زندگی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ نہایت ہی غریب شخص تھا، خوش قسمتی سے اس کی رسائی ایک مشہور ترکی غلام سودون باق السیفی المزیامی الظاہری تک ہو گئی اور اس کی حالت بہتر ہو گئی چونکہ جمال الدین سودون کا پروردہ تھا اسی نسبت سے اسے السودونی بھی کہا جانے لگا۔ وہ الملک الظاہر سیف الدین ابوسعید کے عہد حکومت میں حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز ہوا۔ وہ قاہرہ کا "شادالدواوین" بھی مقرر کیا گیا جو ایک فوجی عہدہ تھا۔ محمود نے اس عہدے کو نہایت ہی احسن طریقے سے نبھایا۔ اس کی خوش سلیقگی سے متاثر ہو کر الملک نے اسے جلد ہی "استاداریہ" جیسے نہایت ہی اہم منصب پر تقرر کر دیا۔ کچھ عرصے بعد ہی اسے سلطان کا مشیر خاص ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

جب یلبغا الناصری نے خروج کیا تو اسے بھی دوسرے ظاہری امراء کے ساتھ قید میں ڈال دیا گیا۔ جب الملک الظاہر دوبارہ مصر آکر تخت نشین ہوا تو جمال الدین محمود کو اس کے سابقہ عہدے پر دوبارہ فائز کر دیا گیا۔

آخر عمر میں محمود کو بہت زیادہ تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا سارا مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور اسے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ وہ سلطان کے زیر عتاب آگیا۔ اس سے پانچ لاکھ دینار طلب کئے گئے اور حکم دیا گیا کہ انکار کی صورت میں اس کی جاگیر فروخت کر کے یہ رقم حاصل کی جائے۔ بالآخر یہ معاملہ ڈیڑھ لاکھ دینار پر طے ہو گیا۔ اس کے بیٹے امیر ناصرالدین محمد نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر دس گھوڑے اسکندریہ کے بنے ہوئے سوتی کپڑوں کے دو سو تھان اور دس ہزار دینار پیش کئے۔ لیکن سلطان کا غصہ محمود دوآا، محمود کے بارے میں پھر بھی ٹھنڈا نہ ہو سکا ابن بطلاری والی قاہرہ نے ان کے ملازمین اور اقرباء کو ایسی سخت سخت سزائیں دیں کہ وہ لوگ خزانوں اور دفن شدہ مال و دولت کو زیادہ دیر راز میں نہ رکھ سکے۔ ان لوگوں کی اطلاعات پر جب تفتیش شروع ہوئی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے چاندی اور سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ محمود کی جو دولت سلطان کو حاصل ہوئی بقول ابن تغری بردی چودہ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم بتائی ہے۔ لیکن پھر بھی محمود نے جو دولت لوگوں کے پاس چھپا رکھی تھی وہ ان ہی کے پاس رہ گئی۔

جب محمود نے قید خانے میں انتقال کیا تو اس کی حالت نہایت ہی کس مپرسی کی تھی اور اس کے کفن کے لئے دام تک میسر نہ تھے۔ آخر اس کے ایک غلام نے اپنی جیب خاص سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا۔

جمال پاشا، احمد (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء ۔۔۔ ۱۳۴۰ھ/۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء) ایک ترک سپاہی اور سیاستدان۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں "مکتب حربیہ مکتبی" میں تعلیم مکمل کی۔ اور بحیثیت کپتان عام اراکین حربیہ میں ملازم ہوا۔ اس کا تقرر سالونیکا کی تیسری فوج میں کیا گیا۔ یہاں پر وہ مقدونیہ کی نوجوان ترک سازش کے بنیادی اراکین میں شامل ہو گیا۔ اس کو مجلس اتحاد و ترقی کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں انقلاب کے بعد وہ مجلس اتحاد و ترقی کی مجلس عاملہ کا رکن بنا۔ اس

۱۹۰۹ء کی تحریک مخالف انقلاب" کے دبانے میں بڑی ہمت سے کام کیا اور سقوطری کا فوجی عامل بنایا گیا۔ اسی سال اسے اڈنہ کا اور ۱۹۱۱ء میں بغداد کا والی بنایا۔ ۱۹۱۲ء میں اس نے قونیہ کی فوج محافظ کی قیادت سنبھالی۔ بلقان کی پہلی جنگ میں اس نے ویزہ کی لڑائی میں شرکت کی۔ اور پنا احصار پر شکست کھائی۔

اتحاد و ترقی کے انقلاب کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء میں وہ استنبول کا فوجی قائد اور والی مقرر کیا گیا۔ بلقان کے حملے کے وقت اس نے اتحادیوں کی ادرنہ پر دوبارہ قبضے کی تجویز کی پرزور تائید کی۔ اور اپنی تدابیر سے دارالسلطنت کی حزب مخالف کے سرغنوں کو گھیر کر اور ملک بدر کر کے جدید نظام کو قطعی اور مضبوط تر کر دیا۔

جون ۱۹۱۳ء سے جب صدر اعظم محمود پاشا کو قتل کیا گیا۔ جنگ عالمگیر کے اختتام تک سلطنت عثمانیہ کی باگ ڈور عملی طور پر جمال پاشا، انور پاشا اور طلعت پاشا ہی کے ہاتھ میں رہی۔ جمال پاشا کو لیفٹیننٹ جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں وزیر تعمیرات عامہ مقرر کیا گیا۔ فروری ۱۹۱۴ء میں وزارت بحریہ اس کے سپرد کی گئی جولائی ۱۹۱۴ء میں وہ فرانس کے دورے پر گیا تاکہ حکومت عثمانیہ اور فرانس میں باہمی تعاون قائم ہو سکے۔ اگست ۱۹۱۴ء میں اسے دوسری فوج کی قیادت سونپی گئی۔ نومبر ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک جمال پاشا چوتھی فوج کے سپہ سالار رہے۔ نیز صوبہ شام کا جس میں فلسطین اور حجاز شامل تھے۔ فوجی عامل بھی رہا۔ اس ساری مدت میں ۱۹۱۸ء تک اس کے پاس وزارت بحریہ کا عہدہ رہا۔ وہ بیک وقت انور پاشا کا ہم پلہ بھی تھا۔ اس کا ماتحت بھی۔

جب طلعت پاشا کی مجلس وزراء سے مستعفی ہوئے تو جمال پاشا نے بھی بحریہ کی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو طلعت اور انور کے ساتھ فرار ہو کر برلن چلا گیا۔ جہاں سے بعد میں سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ اس کی غیر حاضری میں عدالت نے اسے موت کی سزا کا فیصلہ سنایا۔ اس نے قیام یورپ کے دوران میں افغانستان کے امیر امان اللہ خان کی ملازمت قبول کر لی۔ یہاں سے اس نے روس کا سفر کیا اور وہاں سوویٹ حکومت کے مہتمم امور خارجہ شسٹرن کو اس بات پر راضی کر لیا کہ افغانستان کی فوج جدید طرق پر تیار کرے۔ اپنے قیام ماسکو کے دوران میں اس نے کمال اتاترک کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۹۲۰ء میں تاشقند میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ جہاں پر اس نے نظر بند ترکی افسران میں سے چند افراد کو بھرتی کر کے اپنے منصوبے کے لیے ایک جماعت تیار کی۔ اور پھر اپنا "فوجی ناظر عام" کا عہدہ سنبھالنے کے لیے افغانستان روانہ ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ایک بار پھر ماسکو گیا۔ تاکہ بالشویک حکومت، مصطفیٰ کمال اور انور پاشا کے ساتھ مزید بات چیت کرے۔ اس کے بعد جب وہ افغانستان آ رہا تھا تو تفلس کے مقام پر دو ارمنوں سرگود تیان اور کرکن لالیان نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسے پہلے تفلس میں اور پھر کچھ عرصہ بعد ارزروم میں دفن کیا گیا۔

جمال تلوی، ملا ایک عالم دین۔ آپ نے اوچ شریف میں مولانا اسماعیل سے علم دین حاصل کیا۔ لاہور کے محلہ تلہ میں فروکش تھے۔ آپ کی درسگاہ میں بہت سے طالب علم علم تفسیر و حدیث اور دوسرے اسلامی علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ آپ کو علی ہجویری" المعروف داتا گنج بخش سے حد درجہ عقیدت تھی۔ پورے بارہ سال تک آپ مزار مبارک پر حاضری دیتے رہے۔

آپ میں صبر و تحمل اور برداشت حد درجہ موجود تھی۔ ایک مرتبہ آپ کو کھانے کے لیے کئی روز تک کچھ نہ مل سکا۔ لیکن آپ نے اس فاقہ کشی کا کسی دوسرے کے سامنے ذکر نہ کیا۔

ملا بدایونی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ اس وقت کے اعلم العلماء میں سے ہیں۔ آپ کا درس بے مثال ہے بڑے خوش بیان اور زور خطابت کے مالک تھے۔ معقولات اور منقولات کے نہایت دقیق مسائل شاگردوں کو اس انداز میں سمجھاتے تھے۔ جیسا کہ یہ چیز ان کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ فیضی اپنی بے نقط تفسیر میں آپ سے ہی اصلاح لیتا تھا۔

جمال حسینی (۔۔۔؟ ۔ غالباً ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) ایک عالم دین اور مورخ امیر جمال الدین عطاء اللہ حسینی الدشتکی الشیرازی ان کا اعزازی لقب تھا۔ انہوں نے ہرات میں سلطان حسین تیموری کے عہد حکومت میں شہرت پائی۔

ان کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں "روضۃ الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب" جو آنحضورؐ اور آپؐ کے خاندان اور صحابہؓ کی تاریخ ہے یہ کتاب انہوں نے میر علی شیر نوائی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں ہوا۔

دوسری تصنیف "تحفۃ الاحبار فی مناقب آل الاخیار" جو آنحضورؐ، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کے فضائل پر مشتمل ہے۔

تیسری کتاب کا نام "ریاض السیر" ہے۔

جمال، عبدالناصر (۱۳۳۶ھ/۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء ۔ ۱۳۹۰ھ/۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء) مصر کے سابق صدر۔ شمالی مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں بنی مور میں پیدا ہوئے۔ جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہ ایک متوسط الحال مصری گھرانہ تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں انہیں تعلیم کے لیے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ نہضۃ المصر ثانوی سکول میں داخل ہوئے۔ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹ سال کی عمر میں ۱۹۳۷ء میں ملٹری اکیڈمی میں داخل ہوئے ایک سال تکمیل علم سے فارغ ہونے کے بعد جولائی ۱۹۳۸ء میں انفنٹری میں انہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے کمیشن مل گیا۔ اس کے بعد تھرڈ کیوارن بٹالین کے ساتھ منسلک ہو گئے اور ان کا ملک آباد میں تقرر کیا گیا۔ یہیں پر ان کی زکریا محی الدین اور احمد انور سے ملاقات ہوئی۔

جمال عبدالناصر اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے ملک و ملت کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ خود ان کے قول کے مطابق "میری زندگی میں ۱۹۳۵ء کے اس پر آشوب دور سے بھی پہلے آ چکا تھا۔ جب میں طالب علم تھا اور میرے شب و روز فلک شگاف نعروں اور جلوسوں میں بسر ہو رہے تھے ۱۹۲۳ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا جو بالآخر بحال کر دیا گیا۔ میں ان دنوں طلباء کے وفود کے ساتھ قوم کے زعماء کے پاس جایا کرتا تھا کہ خدا کے لیے مصر کی خاطر متحد ہو جائیے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں جو نیشنل فرنٹ کا قیام عمل میں آیا وہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔"

جمال عبدالناصر ایک انقلابی جذبہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھی ان میں یہ جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لکھا ہوا خط جو انہوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ ان کے اس انقلابی ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"آج صورت حال بڑی نازک ہے اور مصر نازک ترین پوزیشن میں ہے ...... شاید ہمیں زندگی کو خیرباد کہنا پڑے، موت سے ہمکنار ہونا پڑے، یا

اس کی دیواریں بڑی مستحکم ہیں، کون ان کو ڈھائے گا۔ کون ان کو گرائے گا۔
۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر انہیں سکندریہ بھیجا گیا۔ یہاں ان

مصر کے صدر جمال عبد الناصر

کی ملاقات عبدالحکیم عامر سے ہوئی۔ بعد میں انہیں العالمین اور سکندریہ کے درمیان ایک فوجی کیمپ میں متعین کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ دو برس کے لیے سوڈان بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں انہیں ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر مقرر کیا گیا اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے جنرل سٹاف کالج میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد لیکچرر کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین شروع ہوئی تو ناصر نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تاکہ وہ رضاکار کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو سکیں۔ لیکن ان کا استعفیٰ منظور نہ ہوا۔ جب مصر نے جنگ فلسطین میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو جمال عبدالناصر کو محاذ پر بھیجا گیا۔ دوران جنگ وہ شدید زخمی ہوئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک غزہ کے ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ اس جنگ میں انہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں انہیں دو مرتبہ فوجی اعزاز "فواد شار" ملا۔ وہیں انہوں نے آزاد خیال افسروں کی تنظیم کا خاکہ تیار کیا۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ فاروق کے نامزد امیدوار کے خلاف جنرل نجیب کو آفیسرز کلب کا صدر منتخب ہونے میں مدد دی۔ آزاد خیال افسروں کی تنظیم نے جس کی قیادت جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء میں مصر میں انقلاب برپا کیا۔ اور نائب صدر منتخب ہوئے۔ جب جون ۱۹۵۳ء میں جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو نجیب صدر اور وزیر اعظم ہوئے اور جمال عبدالناصر نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ بنے۔ جب خارجہ پالیسی اور ملکی اصلاحات کے سلسلے میں نجیب اور ناصر کے درمیان اختلافات رونما ہوئے تو فوجی کونسل کی اکثریت نے ناصر کا ساتھ دیا۔ ایک سال تک جنرل نجیب کو سیاست سے الگ ہونا پڑا۔ اس پر امریکہ نے اسوان بند کے لیے مالی امداد کا وعدہ واپس لے لیا۔ اور بین الاقوامی بینک نے بھی قرض دینے سے انکار کر دیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۴ء کو زرعی اصلاحات کا قانون پاس ہوا۔ جس کے تحت حد ملکیت دو سو ایکڑ تک مقرر کی گئی۔ اس طرح مصر میں پہلی مرتبہ فلاحین (مزارعوں) کو جو صدیوں سے جاگیرداری نظام کے تحت پستے چلے آ رہے تھے۔ اس عرصے میں نئی حکومت نے معاشرتی اصلاحات اور قومی ترقی کے مسائل پر بھی توجہ دی اور ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کیا۔ ۱۹ اکتوبر کو مصر سے برطانوی افواج کے انخلا سے غیر ملکی تسلط سے نجات مل گئی۔

۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو ناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے اور قرار پایا کہ بیس ماہ کے اندر تمام برطانوی افواج مصر کے علاقے سے نکل جائیں۔ اس طرح مصر کو تین ربع صدی بعد ۲۹ اکتوبر کو برطانیہ، فرانس اور اسرائیلی افواج نے مصر پر حملہ کر دیا۔ مگر اقوام متحدہ کے دباؤ پر برطانیہ فرانس اور اسرائیل کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔

جون ۱۹۵۶ء میں مصر میں نیا آئین نافذ کیا گیا اور جنرل ناصر پہلے صدر منتخب ہوئے فروری ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کا اتحاد ہوا اور متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئی۔ صدر ناصر کا دور اقتدار مسلسل آزمائش میں گذرا۔ نہر سویز ۱۹۵۶ء میں اینگلو فرانسیسی اور اسرائیلی حملے نے مصر کو نہایت ہی نازک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ لیکن صدر ناصر کے پائے استقلال میں ذرا لغزش نہ آئی۔ انہوں نے کمال جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔

دوسری بار ایک اور بڑی آزمائش کا سامنا جون ۱۹۶۷ء میں اس وقت کرنا پڑا۔ جب اسرائیل نے عربوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اور صحرائے سینائی سمیت کئی عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ نہر سویز بند ہو گئی۔ جس سے مصر کے لیے چند در چند مشکلات پیدا ہو گئیں۔ صدر ناصر نے اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور صدارت کے منصب سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ جو بعد میں عوام اور دوست عرب ممالک کے اصرار پر واپس لے لیا۔

انہوں نے اسرائیل کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مصر کی طاقت میں نمایاں اضافہ کیا۔ اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ آئندہ اسرائیل کی جارحیت کا مؤثر انداز میں سدباب کر سکے۔ وہ تادم مرگ مقبوضہ عرب علاقوں کو اسرائیل سے واگذار کرانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ شبانہ روز محنت نامساعد حالات اسرائیلی جارحیت اور اردن میں فدائین اور حکومت کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کے باعث ان کی صحت بری طرح متاثر ہوئی اور جلد ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

جمال عبدالناصر کے کارہائے نمایاں میں مصر کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانا۔ زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیرداری نظام کا خاتمہ۔ اقتصادی استحکام کے لیے دور رس اقدامات ہیں۔

فروری ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کا اتحاد ہوا اور متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آیا۔ ۱۹۶۰ء میں روس سے اسوان ڈیم بنانے کا معاہدہ ہوا۔ اسوان ڈیم کی تعمیر ان کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ ان کے ان تمام کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کا ایک ایسا کام بھی ہے جو ان کے خلاف جا پڑتا ہے اور وہ ہے اخوان المسلمون پر ان کی زیادتیاں اور مظالم۔

جمالی، حامد بن فضل اللہ دہلوی (م ؟ — ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء) ایک صوفی شاعر اور صوفیاء کا تذکرہ نگار۔ اس نے وسط ایشیا سے المغرب تک اور اناطولی سے یمن تک پورے دارالاسلام میں سیاحت کی اور بہت سے صوفیاء کرام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان صوفیاء میں مولانا جامی بھی ہیں۔ اس کی سیاحت کو ہندی سلسلہ ہائے تصوف اور بقیہ دنیائے

اسلام کے صوفیاء کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت حاصل ہے۔

جمالی اگرچہ صوفی تھا۔ اور اس کے زہد و تقوے کی شہرت اگرچہ عام تھی۔ لیکن وہ بھی پچھلے سہروردی صوفیاء کی طرح سلاطین دہلی کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس کے سکندر لودھی سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ جب مغل لودھیوں کا تختہ الٹ کر خود حکمران ہوئے تو اس نے بابر اور ہمایوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے۔

اکبر کے عہد حکومت میں اس کا بیٹا عبدالرحمان گدائی صدر کے عہدے پر فائز تھا

جمالی نے ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ لیکن اس کی شہرت کا دار و مدار "سیر العارفین" پر ہے۔ یہ ہندوستان کے سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ کے حالات زندگی پر مبنی ہے۔

جمالی، مولانا علاؤالدین علی مولانا

(ر۔ ؟ — ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء)

علی بن احمد بن محمد جمالی سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام صرف علی چلپی اور زنبلی علی افندی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

جمالی کرمان کے شیوخ اور علماء کے اس خاندان سے ہیں جس نے اماسیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اماسیہ میں پیدا ہوئے۔ استنبول اور برسہ میں ملا خسرو اور حسام زادہ مصلح الدین جیسے علماء سے علم کی تحصیل کرنے کے بعد ادرنہ میں مدرس مقرر ہوئے۔

۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء میں انہیں مدرسی سے سبکدوش کر دیا گیا۔ لیکن ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں بطور مدرس آپ کا دوبارہ تقرر ہوا۔ ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں اماسیہ کے مفتی بنے ۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء میں استنبول کے مدرسہ ثمانیہ میں انکا بطور مدرس ان کا تقرر کیا گیا اور اس طرح آپ پیشہ تدریس کے بلند ترین منصب پر پہنچ گئے۔ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء میں ان کا تقرر بطور شیخ الاسلام کیا گیا۔ چنانچہ جمالی اس عہدے پر بایزید ثانی، سلیم اول اور سلیمان اول کے ادوار حکومت میں تقریباً ۲۴ سال تک فائز رہے۔ حکومت کے بعض اہم مسائل میں بیباکانہ مداخلت اور ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر شیخ الاسلام کا عہدہ سلطنت عثمانیہ میں ایک اہم ترین منصب بن گیا۔ چنانچہ جب سلیم اول نے یہ سوال اٹھایا کہ امور حکومت میں شیخ الاسلام کی مداخلت سلطان کے انتظامی اختیارات پر دست اندازی کے مترادف ہے۔ تو انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ بحیثیت شیخ الاسلام اس پر اگلی دنیا میں سلطان کی نجات کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔

سلیم اول ان کا بہت زیادہ مداح تھا۔ وہ انہیں روم ایلی اور اناطولی کا قاضی عسکر مقرر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جمالی نے اس کی اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جمالی کو تصوف سے بھی دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا ذکر صوفی علی جمالی کے نام سے بھی کیا جاتا ہے۔ انہوں نے تصوف میں ایک رسالہ فی حق الدوران بھی تصنیف کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد انہیں ایک ولی کامل کا درجہ دیا گیا استنبول میں کوچہ زیرک کی ایک چھوٹی سی مسجد جو انہوں نے خود بنوائی تھی ہیں دفن ہیں۔

جمالی کی تصانیف میں "مختصر الہدایہ" اور "مختار الفتاوی" بھی ہیں۔

جمائی

آنحضورؐ نے فرمایا" جمائی لینا شیطانی فعل ہے۔ لہٰذا جمائی کو روکنے کی کوشش کرو۔ اس لیے کہ شیطان اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔" (بخاری)

ایک اور حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

" جب کوئی شخص جمائی لیتے ہوئے "ہا" کرتا ہے۔ تو شیطان ہنستا ہے۔" (مسلم)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا" جب جمائی آئے تو ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لو۔ کیونکہ شیطان منہ میں داخل ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

جمرہ

کنکر۔ اصطلاح میں جمرہ سے مراد دوران حج میں کنکریاں پھینکنا ہے۔ نیز جمرہ کا نام منیٰ کی وادی میں ان تین مقامات کو دیا گیا ہے۔ جس جگہ پر حاجی لوگ عرفات سے واپس لوٹتے ہوئے ٹھہرتے ہیں اور حکم شرعی کے مطابق کنکریاں پھینکتے ہیں۔ ان تینوں مقامات کو جمرہ اولیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ عقبہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس جگہ کا نام جمرہ یا تو اس بنا پر پڑا کہ وہاں کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔ اور یا پھر کنکریوں کے ڈھیر کی وجہ جو حاجیوں کی کثیر تعداد میں پھینکی جانے کی وجہ سے بن جاتا ہے۔

یہ تینوں مقامات مکہ سے چند میل کے فاصلے پر منیٰ کے میدان میں ہیں عرفات سے چل کر حاجی لوگ جمرہ اولیٰ پر پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں سے ۱۵۰ میٹر کے فاصلے پر جمرہ وسطیٰ ہے۔ یہ دونوں مقام منیٰ کے بڑے بازار کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں سے ۱۱۵ میٹر آگے کی طرف دائیں ہاتھ کو جہاں سڑک منیٰ سے نکل کر پہاڑوں پر چڑھتی ہوئی مکہ کی طرف جاتی ہے۔ جمرہ عقبہ واقع ہے۔ اس میں ایک دیوار واقع ہے اور ایک حوض زمین میں کھدا ہوا ہے۔ پہلے دو ستونوں اور تیسری دیوار کو حاجی لوگ شیطان کہتے ہیں۔

ذوالحجہ کی دس تاریخ کو قربانی سے پہلے ہر حاجی کو سات کنکریاں جمرۃ العقبہ پر پھینکنی ضروری ہیں۔ ۱۱ تاریخ کو زوال اور غروب شمس کے درمیانی وقت میں ہر حاجی ہر جمرہ پر باری باری جاتا اور جمرہ اولیٰ سے شروع کر کے تینوں پر سات سات کنکریاں پھینکتا ہے۔ ۱۲ تاریخ کو بھی یہی عمل دہرانا پڑتا ہے۔ نیز اگر کوئی گروہ منیٰ میں ٹھہرا رہے تو تیرہ تاریخ کو بھی یہی عمل کرتا ہے۔ یہ کنکریاں حاجی لوگ مزدلفہ سے لے کر آتے ہیں۔

کنکری پھینکتے بسم اللہ۔ اللہ اکبر کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ بعض فقہا نے کہا ہے کہ اس رسم کا اصل ماحصل یہی ہے۔ اس سارے عمل کو اصطلاح میں رمی جمار کہتے ہیں۔ چاروں فقہا کے نزدیک یہ عمل واجب ہے۔

ہر ایک مذہب فقہ میں حج کے طریقے کی جو ہدایات دی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کوتاہی کرنے پر کفارہ دینا واجب ہوتا ہے۔ جو ایک مسکین کو کھانا کھلانے سے لے کر ایک جانور کی قربانی تک ہے۔

یہ سنت ابراہیمی ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو اپنی عزیز ترین چیز کی قربانی دینے کے لیے خواب میں کہا گیا تو آپ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کے لیے لے کر چلے تو راستے میں شیطان کا سامنا ہوا۔ یہ تین مقام جن پر کنکریاں پھینکی جاتی ہیں وہ مقام ہیں کہ جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کو شیطان دکھائی دیا اور اس نے آپ کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن آپ نے اس کی بات پر کچھ توجہ نہ دی۔ بلکہ اس کی طرف ناراضگی سے کنکریاں پھینکیں۔ شیطان ان تینوں مقامات پر مختلف بھیس میں حضرت ابراہیمؑ کے سامنے آیا تھا۔ چنانچہ حاجی لوگ اسی سنت ابراہیمیؑ کا اتباع کرتے ہیں۔ جس سے شیطان کی ذلت ہوتی ہے۔

جمشید (جم)

کئی تاریخی شخصیتوں کا نام۔ قدیم ایرانی نوشتوں میں [illegible] کا دیوا ہونت کا بیٹا تھا۔ کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شخصیت [illegible]

سالہ عہد کی شخصیت ہے۔ جس میں انسانوں نے مذہب اور اخلاق کی بدولت دیوں کے اثر و نفوذ سے نجات حاصل کی۔ اس نے ہزاروں شہر اور قریے آباد کئے ذات پات کی تنظیم کی۔ جب سردی کے ایک خوفناک موسم کے بعد سیلاب آنے لگے جو کسی جادوگر یا دیو نے شروع کئے تھے تو اس نے بنی نوع انسان کو تباہی سے بچانے کے لئے ایک وسیع زمین دوز پناہ گاہ تیار کی۔ زرتشتوں ہی کی رو سے اس نے ان لوگوں کو جو صرف سبزی ہی کھاتے تھے جانوروں کا گوشت کھانا سکھایا اوستا میں جو خونی قربانیوں سے روکتی ہے اس کی مذمت کی ہے۔ نیز اس کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کسی دیو کے زیر اثر یہ بھی سمجھنے لگا تھا کہ وہ خود ہی خدا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کی پاکیزگی جاتی رہی۔ نیز نوع انسانی کو اس سے بجز آلام و مصائب کے اور کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ ایک صدی تک گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بعد میں دیوتوں نے اپنے سردار اژی دھاکہ کے حکم پر اسے تلاش کرنے کے بعد ایک کھوکھلے درخت میں جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی آرے سے چیر دیا گیا۔

اس روایتی کہانی کی تین بڑی خصوصیات ہیں جو ایرانی ابطال کی کہانیوں میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شدید گناہ کی پاداش میں رحمت خداوندی سے محروم ہو جانا دوسری کسی شاندار محل کی تعمیر، تیسری حیات ابدی سے محرومی۔

جادو کا پیالہ جس میں جمشید کو تمام جہان نظر آتا تھا یہ بھی بہت قدیم قصوں کا موضوع ہے۔

اکثر مصنفین نے جمشید اور حضرت سلیمانؑ کو ایک ہی شخصیت قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عرب مصنفین نے اس نظریے کے رد میں کافی کچھ لکھا ہے۔

جمشید یا جم کئی تاریخی شخصیات کا بھی نام ہے۔ ان میں ایک ساسانی بادشاہ قباذ کا بیٹا ہے۔ ایک عثمانی سلطان محمد ثانی کا بیٹا ہے۔ (دیکھئے "جم") اسی نام سے ایک شخصیت غیاث الدین جمشید کی ہے۔ جس نے الغ بیگ کا اس کی فلکی زیجات میں ہاتھ بٹایا تھا۔

فارسی اور ہندی ادب میں بہت سے قصے اور کہانیاں لکھی گئیں جن کا موضوع جمشید ہے۔ ان بعض شاعروں نے دختر جمشید کی ترکیب استعمال کی ہے۔ کیونکہ شراب جمشید کی ایجاد ہے۔ اس لئے اسے دختر جمشید کہا گیا ہے۔ جام جم اور تخت جم کی تراکیب اکثر ملتی ہیں۔

جمع بین الصلاتین دو وقتوں کی نماز ملا کر ایک وقت میں پڑھنا۔ مثلاً ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت ہی میں پڑھ لی جائے۔ حج کے دوران میں حاجی لوگ عرفات میں ۹ ذوالحجہ کے وقت ہی میں ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء کے وقت میں مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک جمع بین الصلاتین حج کے علاوہ ہر سفر میں جائز ہے اس کی ایک شکل جمع صوری بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کو موخر کرکے اس وقت پڑھا جائے۔ جب اس کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو اور دوسرے وقت کی نماز کو وقت شروع ہوتے ہی پڑھ لیا جائے۔ اس طرح بظاہر تو یہ معلوم ہو گا کہ دونوں نمازیں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھی گئی ہیں لیکن حقیقت میں دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئیں۔ فقہائے احناف کے نزدیک سفر حج کے علاوہ دوسرے سفروں میں صرف صوری ہی جائز ہے۔ جمع بین الصلاتین یا جمع حقیقی جائز نہیں۔

جمعہ یوم، دن، مسلمانوں کا ایک خاص یوم۔ اسلامی تقویم کے لحاظ سے ہفتے کا ساتواں اور آخری دن۔ عہد اسلام سے قبل اس کو "یوم عروبہ" کہا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کا نام یوم جمعہ رکھا۔ کیونکہ اس روز مسلمان مسجد میں جمع ہوتے اور نماز پڑھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس کی وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ اس روز اللہ تعالے نے آدمؑ کی تخلیق کی یا اس لیے کہ اس دن حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کا ملاپ اور اجتماع ہوا۔

بقول محمد بن سیرین کہ ہجرت نبوی اور سورہ جمعہ میں نماز جمعہ کی فرضیت کے نزول سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے انصار کے بعض لوگوں کو جمع کیا اور وہ یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے اور دو رکعت نماز باجماعت پڑھی۔ پھر ایک بکری ذبح کی اور مسلمانوں کی دعوت کی۔ یہ یوم العروبہ تھا۔ جس کو بعد میں یوم الجمعہ کا نام دیا گیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ کعب بن لوی یا قصی بن کلاب نے بھی اس دن کے لئے یہی نام استعمال کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس روز قریش کے لوگوں کا اجتماع کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے اس فعل سے اس دن کا نام تبدیل نہیں ہوا تھا اور عام اہل عرب اس کو یوم عروبہ ہی کہتے تھے۔

کیونکہ اسلام سے قبل ہفتہ کا ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کر لینے اور اس کو اپنی ملت کا شعار بنانے کا طریقہ اہل کتاب میں موجود تھا۔ اور یہودیوں کے ہاں اس مقصد کے لئے سبت (ہفتہ) کا دن خاص تھا۔ کیونکہ اس روز اللہ تعالے نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی تھی۔ عیسائیوں نے اپنے لئے اتوار کا دن شعار ملت قرار دے رکھا تھا۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو یہودیوں سے مخصوص کرتے تھے۔ کیونکہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ صلیب پر جان دینے کے بعد حضرت عیسےٰ اتوار کے روز قبر سے نکل کر آسمان کی طرف گئے تھے۔

چنانچہ ان دونوں ملتوں سے اپنی ملت کو مخصوص اور ممیز کرنے کے لئے اسلام نے ان دونوں ایام کو چھوڑ کر جمعہ کا روز اپنی اجتماعی عبادات کے لئے اختیار کیا۔

جمعہ کی فضیلت کے بارے میں کثرت سے احادیث مروی ہیں۔

آنحضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا۔ "سب سے افضل دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اس دن اللہ تعالے نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اسی دن وہ جنت سے اتارے گئے۔ اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اور اسی دن قیامت آئے گی۔ اور اسی دن میں ایک وقت ایسا ہے جسے بندہ مومن پالے تو وہ اللہ سے جو دعا مانگے گا قبول ہو گی۔ (مسلم)

ایک اور حدیث میں جمعہ کے روز کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"اللہ کے نزدیک جمعہ سید الایام ہے۔ جس کا مرتبہ یوم الفطر اور یوم النحر سے بھی بڑا ہے اور اس میں پانچ باتیں ہیں۔ اسی دن آدمؑ پیدا کئے گئے۔ اسی دن وہ جنت سے اتارے گئے اسی دن وہ فوت ہوئے اسی دن میں ایک لمحہ ایسا بھی ہے جس میں بندہ مومن اللہ سے جو مانگتا ہے پاتا ہے بشرطیکہ وہ کوئی حرام چیز طلب نہ کرے اور اسی دن قیامت آئے گی۔ (الدر المنثور ۶ : ۲۱۸)

ایک اور موقع پر آپ کا ارشاد ہے۔

"میرے پاس جبرائیل آئے ان کے پاس سفید آئینہ تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ جمعہ ہے

جو اللہ تعالےٰ نے آپ کے اور آپ کے بعد آپ کی امت کے لئے عید بنا کر پیش کیا ہے یہ دن ہمارے نزدیک سید الایام ہے اور اسے ہم آخرت کے دن تک "یوم المزید" یعنی اضافے والا دن کہیں گے۔ (الکشاف ۴ : ۵۲۲)

ماہ رمضان کا آخری جمعہ، رمضان کا مہینہ اہل اسلام کے نزدیک

جمعۃ الوداع چونکہ بہت خیر و برکت کا مہینہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے مسلمان اس مہینے کو اس اہتمام سے رخصت کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے عزیز مہمان کو الوداع کہتا ہے۔ ماہ رمضان کے اس آخری جمعہ کو زیادہ سے زیادہ افراد نماز جمعہ ادا کرتے ہیں اور اس روز عید کا سا سماں ہوتا ہے۔

جمعہ، نماز ایک فرض نماز۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو مسعودؓ انصاری کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی فرضیت کا حکم ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ مکہ میں کوئی اجتماعی عبادت کرنا ممکن نہ تھا اس وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ لیکن آپ نے ان لوگوں سے جو مکہ سے ہجرت کر چکے تھے یہ حکم بھجوا دیا کہ وہاں جمعہ قائم کریں۔ چنانچہ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے بارہ آدمیوں کے ساتھ مدینے میں پہلا جمعہ پڑھا۔

بقول حضرت کعب بن مالک اور ابن سیرینؒ "اس سے بھی پہلے مدینے کے انصار نے بطور خود قبل اس کے کہ آنحضورؐ کا حکم انہیں پہنچتا آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ہفتہ میں ایک دن مل کر اجتماعی عبادات کریں گے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے یہودیوں کے سبت اور عیسائیوں کے اتوار کو چھوڑ کر جمعہ کا دن منتخب کیا اور پہلا جمعہ حضرت اسعد بن زرارہ نے بنی بیاضہ کے علاقہ میں ۴۰ افراد کے ساتھ پڑھا۔ (مسند احمد)

بقول مولانا مودودیؒ "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ذوق خود اس وقت یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ایسا ایک دن ہونا چاہئے جس میں زیادہ سے زیادہ مسلمان جمع ہو کر اجتماعی عبادت کریں اور یہ بھی اسلامی ذوق ہی کا تقاضا تھا کہ وہ دن ہفتے اور اتوار سے الگ ہو تاکہ مسلمانوں کا شعار ملت یہود و نصاریٰ کے شعار ملت سے الگ رہے۔ یہ صحابہؓ کی اسلامی ذہنیت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ بسا اوقات ایک حکم کے آنے سے پہلے ہی ان کا ذوق کہہ دیتا تھا کہ اسلام کی روح فلاں چیز کا تقاضا کر رہی ہے"۔

آنحضورؐ نے ہجرت کے بعد جو کام کئے ان اولین کاموں میں سے ایک جمعہ کی اقامت بھی ہے۔

بقول ابن ہشام۔ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آپ پیر کے روز قبا پہنچے چار دن وہاں قیام فرمایا پانچویں روز جمعہ کے دن وہاں سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں بنی سالم بن عوف کے مقام پر تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آ گیا۔ اسی جگہ آپ نے پہلا جمعہ ادا فرمایا۔

جمعہ کی نماز کے لئے آپ نے وہی وقت مقرر فرمایا جو ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ آپ نے ہجرت سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو جو حکم بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ جب جمعہ کے روز سورج نصف النہار سے ڈھل جائے تو دو رکعت نماز کے ذریعے سے اللہ کے حضور تقرب حاصل کرو۔ (مسند احمد)

یہ بات بھی آپ کے عمل سے ثابت ہے کہ اس روز آپ ظہر کی نماز کے بجائے جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے۔ اس نماز کی صرف دو رکعتیں ہوتی تھیں۔

نماز جمعہ کے بارے میں حدیث میں بہت تاکید فرمائی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔" (۶۲ : ۱۰)

اس آیت میں پکارنے سے مراد وہ اذان ہے جو خطبہ سے پہلے کہی جاتی ہے نہ کہ وہ اذان جو خطبہ شروع ہونے سے بہت پہلے جو لوگوں کو یہ اطلاع دینے کے لئے دی جاتی ہے کہ جمعہ کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں صرف ایک ہی اذان کہی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی ایک ہی اذان کہی جاتی رہی۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں جب آبادی بڑھ گئی تو انہوں نے پہلے ایک اور اذان دلوانی شروع کر دی جو مدینے کے بازار میں ان کے مکان زوراء پر دی جاتی تھی۔ (بخاری)

مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

"یہ حکم واضح طور پر نماز جمعہ کے فرض ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اول تو اذان سنتے ہی اس کے لئے دوڑنے کی تاکید بجائے خود اس کی دلیل ہے۔ پھر بیع جیسی حلال چیز کا اس کی خاطر حرام ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فرض ہے۔ مزید براں ظہر کی فرض نماز کا جمعہ کے روز ساقط ہو جانا اور نماز جمعہ کا اس کی جگہ لے لینا بھی اس کی فرضیت کا صریح ثبوت ہے کیونکہ ایک فرض اسی وقت ساقط ہوتا ہے جب کہ اس کی جگہ لینے والا فرض اس سے زیادہ اہم ہو۔" اسی کی تائید کثرت احادیث کرتی ہیں۔ جن میں آنحضورؐ نے جمعہ کی سخت ترین تاکید کی ہے اور اسے صاف الفاظ میں فرض قرار دیا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں آتے۔" (بخاری)

ایک جگہ فرمایا۔

"لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ چھوڑنے سے باز آ جائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے گا اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں جمعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

آپ نے فرمایا "آج سے لے کر قیامت تک جمعہ تم لوگوں پر فرض ہے۔ جو شخص [illegible] ایک معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اسے چھوڑ دے۔ خدا اس کا [illegible] کرے، نہ اسے برکت دے۔ خوب سن رکھو اس کی نماز نہیں [illegible] نہیں، اس کا حج نہیں۔ اس کا روزہ روزہ نہیں اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں [illegible] کہ وہ توبہ نہ کرے۔ پھر جو توبہ کرے اللہ اسے معاف فرمانے والا ہے۔ [illegible]

ایک جگہ آپ نے فرمایا۔

"جمعہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو اس کی اذان سنے۔" [illegible]

امام بیہقی نے بھی اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث روایت کی ہے [illegible] میں فرمایا۔ "جان لو کہ اللہ نے تم پر نماز جمعہ فرض کی ہے۔"

بعض علماء اہل حدیث کے نزدیک جمعہ کے لئے دو اذانیں درست [illegible] امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ آنحضورؐ اور ابوبکر صدیقؓ و عمرؓ کے زمانے [illegible] اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر حضرت عثمانؓ [illegible] آبادی کی کثرت کے باعث ایک اذان کا اضافہ کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ [illegible] سنت رسول اور سنت شیخین پر عمل ہوا۔

بقول ابن العربی "اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ نماز جمعہ کی [illegible] خرید و فروخت بالکل حرام ہے۔

حنفیوں کے نزدیک جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا وقت ہے [illegible] میں جمعہ ہو سکتا ہے اور نہ بعد میں۔ بیع کی حرمت پہلی اذان کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے [illegible]

دوسری اذان سے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی ہے لیکن بیع فاسد نہیں ہو جاتی جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ مصر جامع میں ہو سکتا ہے اور مصر جامع کی تعریف یہ ہے کہ وہ شہر جس میں بازار ہوں قیام امن کا انتظام موجود ہو اور آبادی اتنی ہو کہ اگر اس کی بڑی مسجد سے بڑی مسجد میں بھی نماز جمعہ کے مکلف سب جمع ہو جائیں اس میں سما نہ سکیں جو لوگ شہر سے باہر رہتے ہوں ان پر جمعہ اس صورت میں شہر آکر پڑھنا فرض ہے۔ جب کہ ان تک اذان کی آواز پہنچتی ہو یا وہ زیادہ سے زیادہ شہر سے چھ میل دور کے فاصلے پر ہوں نماز جمعہ کھلے میدان میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ نیز یہ کہ اس جگہ جہاں ہر شخص کو شریک ہونے کا اذن عام ہو نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں دوسرے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو خواہ وہاں کتنے ہی افراد جمع ہوں نماز جمعہ نہیں ہوتی۔

جمعہ کی نماز میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک۔ کم از کم امام کے سوا تین آدمی یا بقول امام یوسف و محمد امام سمیت دو آدمی ایسے موجود ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ مسافر، بیمار، ٹانگوں سے معذور اور قیدی پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ نیز اندھے یا کسی ظالم سے اس کو جان و آبرو کا یا ناقابل برداشت مالی نقصان کا خطرہ ہو یا سخت بارش اور کیچڑ وغیرہ ہو تو بھی جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن جن لوگوں سے جمعہ چھوٹ گیا ہو یا قیدیوں اور معذوروں کے لیے نماز ظہر با جماعت پڑھنا مکروہ ہے۔

خطبہ بھی نماز جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط ہے۔ خطبہ لازماً نماز سے پہلے ہونا چاہیے اور دو خطبے ہونے چاہئیں خطبے کے لیے جب امام منبر کی طرف جائے اس وقت سے اختتام خطبہ تک ہر قسم کی بات چیت ممنوع ہے۔

شوافع کے نزدیک بھی جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔ بیع کی حرمت اور سعی کا وجوب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب دوسری اذان ہو جائے لیکن بیع فسخ نہیں ہوتی۔ جمعہ ہر اس بستی میں ہو سکتا ہے۔ جس کے مستقل باشندوں میں چالیس ایسے آدمی موجود ہوں جن پر نماز جمعہ فرض ہے۔ بستی سے باہر کے ان لوگوں پر جمعہ کے لیے حاضر ہونا لازم ہے۔ جن تک اذان کی آواز پہنچ سکتی ہو۔ جمعہ لازماً بستی کے حدود میں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں پڑھا جائے۔ صحت جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں امام سمیت کم از کم ۴۰ آدمی ایسے شریک ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ شوافع کے نزدیک جن عذرات سے کسی شخص سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ سفر کی حالت میں ہو یا کسی مقام پر چار روز یا اس سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو بشرطیکہ سفر جائز نوعیت کا ہو ایسا بوڑھا یا مریض ہو کہ سواری پر بھی جمعہ کے لیے نہ جا سکتا ہو۔ اندھا اور کوئی آدمی ایسا نہ پاتا ہو جو اسے نماز کے لیے لے جائے۔ جان یا مال اور آبرو کا خوف لاحق ہو۔ قید کی حالت میں بشرطیکہ قید اس کے اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہ ہو۔ نماز سے پہلے دو خطبے ضروری ہیں۔ خطبے کے دوران میں خاموش رہنا مسنون ہے مگر بات کرنا حرام نہیں۔ مکروہ ہے سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے اور آنحضورؐ کا نام سن کر باآواز بلند درود پڑھ سکتا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک جمعہ کا وقت زوال سے شروع ہو کر مغرب سے اتنے پہلے تک ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے خطبہ اور نماز ختم ہو جائے۔ بیع کی حرمت اور سعی کا وجوب دوسری اذان سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی بیع فاسد ہے اور فسخ ہو جائے گی۔

جمعہ ان بستیوں میں ہو سکتا ہے جن کے باشندے وہاں مستقل طور پر گھر بنا کر رہتے ہوں اور جاڑے و گرمی میں منتقل نہ ہوتے ہوں۔ ان کی ضروریات اسی بستی میں فراہم ہوتی ہوں اور اپنی تعداد کی بنا پر وہ اپنی حفاظت کر سکتے ہوں۔ عارضی قیام گاہوں میں خواہ کتنے ہی لوگ ہوں اور خواہ وہ کتنی ہی مدت ٹھہریں جمعہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جس بستی میں جمعہ قائم کیا جاتا ہو۔ اس سے تین میل کے فاصلے تک رہنے والے لوگوں پر جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔ نماز جمعہ صرف ایسی مسجد میں ہو سکتی ہے جو بستی کے اندر یا اس سے متصل ہو اور جس کی عمارت بستی کے عام باشندوں کے گھروں سے کم تر درجے کی نہ ہو۔ بعض مالکیوں نے ایک شرط یہ بھی لگائی کہ مسجد مسقف ہو اور اس میں پانچ وقت کی نماز کا اہتمام بھی کیا جاتا ہو۔ لیکن مالکیہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ ایسی مسجد میں بھی جمعہ ہو سکتا ہے جو صرف نماز جمعہ کے لیے بنائی گئی ہو اور پانچ وقت کی نماز کا اس میں اہتمام نہ ہو۔ نیز مسجد کا مسقف ہونا بھی شرط نہیں۔

نماز جمعہ کی صحت کے لیے جماعت میں امام کے سوا کم سے کم ۱۲۔ آدمی موجود ہونے ضروری ہیں جن پر نماز جمعہ فرض ہے۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ تقریباً وہی ہیں جو دوسروں کے نزدیک ہیں۔

خطیب لازماً وہی شخص ہونا چاہیے جو نماز پڑھائے اگر خطیب کے سوا کسی اور نے پڑھائی ہو تو وہ باطل اور فاسد ہوگی۔

حنبلیوں کے نزدیک نماز جمعہ کا وقت صبح کو سورج کے بقدر یک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے عصر کا وقت شروع ہونے تک ہے۔ لیکن زوال سے پہلے جمعہ صرف جائز ہے۔ اور زوال کے بعد واجب اور افضل ہے۔ بیع کی حرمت اور سعی کے وجوب کا وقت دوسری اذان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو بیع ہو وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتی۔ جمعہ صرف اس جگہ ہو سکتا ہے۔ جہاں سے ۴۰ ایسے آدمی ہوں جن پر جمعہ فرض ہو۔ مستقل طور پر گھروں میں آباد ہوں۔ اگر متفرق گھر اور محلے ہوں اور جو ساتھ ساتھ نہ ہوں لیکن ان سب کے مجموعے کا نام ایک ہو تو وہ ایک ہی بستی ہے خواہ اس کے ٹکڑوں کے درمیان کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو بستی سے باہر جو لوگ تین میل کے اندر رہتے ہوں ان پر جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔ جماعت میں امام سمیت ۴۰ آدمیوں کا شریک ہونا لازمی ہے۔ نماز جمعہ مسجد کے علاوہ کھلے میدان میں بھی ہو سکتی ہے۔ جن صورتوں میں جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ تقریباً دوسرے آئمہ والی ہی ہیں۔ نماز سے پہلے دو خطبوں کا ہونا ضروری ہے۔ جو شخص خطیب کے اتنے قریب بیٹھا ہو کہ اس کی آواز سن سکتا ہو اس شخص کے لیے بولنا حرام ہے۔

اگر جمعہ کے روز عید ہو جائے تو جو لوگ عید پڑھ چکے ہوں ان پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہے۔ لیکن مسلک آئمہ ثلاثہ کے نزدیک عید سے جمعہ کی نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔

وہ شخص جس پر جمعہ فرض نہیں ہے اگر وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اس کے لیے پھر ظہر پڑھنا فرض نہیں رہتا۔

نماز جمعہ کی فرضیت کے لیے شرائط سات ہیں۔

۱۔ عقل ۔ ۲۔ مرد ہونا ۔ ۳۔ حریت (آزاد ہو) ۴۔ بلوغ ۔ ۵۔ قدرت ۶۔ اقامت ۔ ۷۔ قریہ۔

جب یہ شرائط پوری ہو جائیں گی تو نماز جمعہ فرض ہو جائے گی۔

اہل حدیث حضرات کے نزدیک جمعہ کے لیے کوئی شرط نہیں۔ ان کے نزدیک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی نماز جمعہ درست ہے۔ ان کے نزدیک جب نمازی مسجد میں آئے خواہ اذان ہو یا خطبہ ہو رہا ہو تو اس کو دو رکعت نماز پڑھ کر بیٹھنا چاہیے۔

اہل تشیع حضرات کے نزدیک امام یا اس کے نائب کی موجودگی اور جماعت اور وقت اور خطبہ مشروط ہے اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر جمعہ کی نماز ایک وقت میں ایک سے زائد مقامات پر پڑھی جائے تو ان میں کم از کم ایک فرسنگ کا فاصلہ ہونا

لازمی ہے ورنہ نماز باطل ہو جائے گی۔

جمل، جنگ ایک لڑائی جو جمادی الآخر ۳۶ھ / دسمبر ۶۵۶ء میں بصرے کے قریب ہوئی۔

اس جنگ کے فریقین میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ تھے۔ اس جنگ کو جنگ جمل کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں حضرت عائشہؓ میدان جنگ میں ایک اونٹ پر سوار تھیں۔ جس کا نام عسکر تھا۔ بعد میں یہی اونٹ لڑائی کا مرکز بن گیا۔

حضرت عائشہؓ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ معظمہ گئی ہوئی تھیں لیکن محرم میں عمرہ کرنے کے لیے وہیں قیام پذیر تھیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ملی جب عمرہ کی ادائیگی کے بعد مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں تو راستے میں مقام سرف پر عبید بن ابی سلمہ نے اطلاع دی کہ حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اور مدینہ منورہ میں ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ چنانچہ آپ راستے ہی سے مکہ واپس ہو گئیں اور لوگوں کو حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے اور اصلاح فتنہ وفساد کی دعوت دی۔ چنانچہ مکہ میں حضرت عثمانؓ کا مقرر کردہ عامل عبداللہ بن عامر حضرمی اور بنو امیہ کے تمام افراد نے جو ابھی مکہ پہنچے تھے آپؓ کی آواز پر لبیک کہی۔ عامل بصرہ عبداللہ بن عامر اور عامل یمن یعلیٰ بن منبہ نے لشکر کے سامان سفر کی تیاری اور فراہمی میں حصہ لیا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چار ماہ بعد مکے پہنچ گئے۔

اس مہم کے جواز کے سلسلہ میں ان لوگوں نے جو دلائل دیے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اصلاح احوال کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک طرف تو شہادت عثمان کا واقعہ تھا اور لوگ قاتلین قصاص لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات بھی کہی گئی کہ حضرت علیؓ قاتلوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں اور وہ انہیں سزا نہیں دیں گے۔ اس سے ایک خلفشار پیدا ہو گیا۔ بعض جگہوں مثلاً مصر میں محمد بن ابی حذیفہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس تمام صورت حال کو ختم کرنے کے لیے حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ تاکہ اصلاح احوال کے لیے کوئی قدم اٹھایا جا سکے۔ نیز قاتلین عثمانؓ سے قصاص لیا جا سکے۔ اگر ایسا نہ کیا جا سکا تو ہر آنے والے قائد کو قتل کرنے کی رسم چل نکلے گی۔

چنانچہ بعض مورخین کے نزدیک ایک ہزار اور بعض کے خیال کے مطابق تین ہزار افراد پر مشتمل یہ قافلہ بصرے کی طرف روانہ ہوا جب حضرت علیؓ کو اس بارے میں معلوم ہوا تو آپؓ نے حالات کے تدارک کے لیے ربیع الاول کی آخری تاریخوں میں بصرے کا رخ کیا۔ آپؓ پہلے شام کی طرف چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مکے سے آنے والوں کو راستہ ہی میں روک لینا چاہتے تھے۔ لیکن الزبدہ کے مقام پر پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ وہ تینوں حضرات اپنے ساتھیوں سمیت آگے نکل چکے ہیں بصرے پہنچ کر حضرت عائشہؓ کے لشکر نے اہل شہر کو اپنے مقصد میں شرکت کے لیے دعوت دی چنانچہ اہل شہر دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جماعت نے حضرت علیؓ کے عامل بصرہ عثمان بن حنیف کے ہاتھ پر بیعت کی اس دوران میں دونوں جماعتوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئیں۔

آخر کار جمادی الآخر کے وسط میں حضرت علیؓ بصرہ کے مضافات میں پہنچ گئے اور فریقین میں گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سب کے سب یہ چاہتے تھے کہ صلح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اور ہر شخص کو یقین تھا کہ اب سمجھوتا ہوا ہی چاہتا ہے کہ منافقین اور قاتلین عثمانؓ کی شرارت سے جنگ شروع ہو گئی۔

حضرت عائشہؓ کی فوج میں تیس ہزار اور حضرت علیؓ کی فوج میں بیس ہزار سپاہی تھے۔ لڑائی صبح سے شام تک جاری رہی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں گروہوں میں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے ایک ہی قبیلے کے اور بعض اوقات ایک ہی خاندان کے لوگ باہم لڑ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ محمل میں اونٹ پر سوار تھیں۔ جس کے سرپوش کو لوہے کی چادروں اور دوسرے سامان سے مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ اونٹ کی حفاظت ایک قسم کے زرہ بکتر سے کی گئی تھی۔ لڑائی کے اختتام پر محمل میں اس قدر تیر لگ چکے تھے کہ وہ خارپشت دکھائی دیتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کو کوئی تیر نہ لگا۔ صرف بازو پر ایک خراش آئی۔ لڑائی اونٹ کے ارد گرد خاص طور پر بہت زیادہ شدید تھی۔ محمل کے محافظین آیات قرآنی پڑھتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا آتا رہا جو زخمی ہو کر گر جاتا وہ اونٹ کی مہار دوسرے محافظین کے ہاتھ میں دے دیتا۔ ناقہ کی مہار پکڑنا گویا دار و رسن سے کھیلنا تھا۔ چنانچہ جانثار یکے بعد دیگرے اونٹ کی مہار پکڑتے جاتے اور شہید ہوتے جاتے تھے۔ ان محافظین کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ان کی تعداد چالیس سے دو ہزار سات سو تک بتائی جاتی ہے۔

بالآخر حضرت علیؓ نے جنگجوؤں کو حکم دیا کہ اس ناقے کو کسی نہ کسی طرح مار گراؤ کیونکہ جنگ کا خاتمہ اس کے گرنے پر منحصر ہے اس پر اعین بن ضبیعہ نے اونٹ کے پاؤں میں تلوار ماری اور وہ بلبلا کر بیٹھ گیا۔ بس پھر کیا تھا اہل جمل منتشر ہو گئے اور حضرت علیؓ کی فوج نے اونٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے اعلان کر دیا کہ ہتھیار ڈالنے یا گھر کا دروازہ بند کرنے والا امن و امان میں ہے۔ کسی کا تعاقب نہ کیا جائے۔ کسی کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر اس پر دست درازی نہ کی جائے۔ حضرت علیؓ کی فوج نے اس حکم کی تعمیل کی۔

حضرت علیؓ نے محمد بن ابوبکر کو حکم دیا کہ جا کر اپنی بہن کی حفاظت کرو۔ [illegible] کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ پھر وہ خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مزاج پرسی کے بعد کہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر غلطی پر خط عفو کھینچ دے۔ [illegible] حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا عفو الرحیم تمہاری بھی [illegible]

اس جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کے تیس ہزار لشکریوں میں سے [illegible] اور حضرت علیؓ کے بیس ہزار کی فوج میں سے ایک ہزار ستر [illegible] لڑائی مصالحت اور صاف دلی کی گفتگو پر ختم ہوئی۔

یکم رجب ۳۶ھ / ۶۵۶ء کو حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو محمد بن ابوبکر اور امرائے بصرہ کی چالیس خواتین کے ہمراہ بصرے سے روانہ کیا۔ اور چند کوس تک خود بھی رخصت کرنے آئے۔ پھر دونوں صاحبزادوں حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ کو بھیجا اور حضرت عائشہ مکہ معظمہ تشریف لے گئیں۔ اور وہاں سے فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد محرم ۳۷ھ / ۶۵۷ء میں عازم مدینہ ہوئیں۔

اس جنگ میں حضرت علیؓ کے مخالف فریق کی شکست کی چند وجوہات یہ تھیں۔

بقول حضرت علیؓ جو انہوں نے ایک سائل کے جواب میں کہا تھا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کی رضا کے لیے خروج کیا ہے۔ تو ان کے پاس اس موقف کی تائید میں دلیل موجود ہے اور ہمارے پاس کی اپنے موقف کی تائید [illegible]

ہی دلیل موجود ہے۔ اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو دونوں طرف کے مقتولین جنت میں ہوں گے۔

جنگ سے پہلے ایک ایسا موقع پیدا ہوگیا تھا کہ فریقین میں صلح ہوجائے حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ کی بالمشافہ گفتگو ہوچکی تھی اور جنگ نہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوچکا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ کا بھی یہی خیال تھا۔ جس کی وجہ سے طرفین کے سرداروں نے جنگ و پیکار کے خیالات اور ارادے بتدریج اپنے دلوں سے نکال دیئے۔

حضرت طلحہؓ کو تیر لگا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک مکان میں چلے گئے اور جہاں پر جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

ایک موقع پر حضرت زبیرؓ کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے ان سے کہا "اے ابوعبداللہؓ کیا تمہیں یاد ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے فرمایا تھا۔ "تم علیؓ سے ناحق لڑو گے"۔ چنانچہ یہ گفتگو کرنے کے بعد زبیرؓ میدان جنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ بنو تمیم کے ایک فرد نے ان کا تعاقب کیا اور ایک سنسان جگہ پر انہیں شہید کردیا۔

لڑائی کے دوران میں حضرت علیؓ نے اس بات کو تاڑ لیا تھا کہ جب تک لوگوں کو حضرت عائشہؓ کا ہودج میدان جنگ میں نظر آتا رہے گا یہ جنگ کسی طرح نہ تھمے گی۔ چنانچہ آپؓ کے کہنے پر ایک شخص نے اونٹ کے پاؤں پر تلوار ماری اور اونٹ بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ جنگ ختم ہوگئی۔

جمعیت جدید عربی زبان میں یہ اصطلاح جماعت یا انجمن کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال موجودہ دور ہی میں شروع ہوا اور پہلی بار یہ اصطلاح غالباً ان منظم خانقاہی فرقوں یا اجتماعات کے لئے جو سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں شام اور لبنان کے مشرقی یونانی کلیساؤں میں منظر عام پر آئے۔ مثلاً جمعیت المخلص یعنی ایک یونانی کیتھولک فرقہ جس کی بنیاد ۱۷۰۰ء کے قریب رکھی گئی۔

وسط انیسویں صدی میں لبنان اور ازاں بعد عربی بولنے والے دوسرے ممالک میں بھی اس اصطلاح کا استعمال عام ہوگیا اور علمی، ادبی، فلاحی اور سیاسی مقاصد کے لئے رضاکارانہ طور پر قائم ہونے والی جماعتوں پر بھی اس نام کا اطلاق ہونے لگا۔

سب سے پہلی جماعت جو الجمعیۃ السوریہ کے نام سے ۱۸۴۷ء میں قائم ہوئی اس کی بنیاد ان امریکی پروٹسٹنٹ مبلغین نے جو علمی مذاق رکھتے اور تہذیب و ثقافت کے معیار کو بلند کرنا چاہتے تھے بیروت میں قائم کی۔ ۱۸۵۷ء میں اس کی جگہ الجمعیۃ العلمیہ السوریہ نے لی جو ایک بڑی جماعت تھی۔ ۱۸۶۸ء میں عثمانی حکومت نے اس کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کرلیا۔ اسی قسم کی ایک تنظیم ۱۸۵۰ء میں الجمعیۃ الشرقیہ قائم کی گئی۔

پہلی انجمن خواتین جو بیروت میں ۱۸۸۱ء میں جمعیت باکورۃ سوریہ تھی۔ اس کے علاوہ فلاح عامہ کی متعدد انجمنیں جن میں جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ غالباً سب سے پہلی تھی اس کی بنیاد ۱۸۷۸ء میں سکندریہ میں رکھی گئی۔ اس کے اغراض و مقاصد میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے قومی مدارس کا قیام تھا لیکن اعرابی تحریک اور برطانوی قبضے کی وجہ سے اس کا خاتمہ ہوگیا۔ بعد میں ۱۸۹۲ء میں ایک اور جماعت الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ مصر کے مشہور عالم شیخ محمد عبدہ اس جمعیت کے سرگرم رکن تھے۔ اس جمعیت کے ماتحت کئی مدارس قائم کئے گئے۔

بیروت میں جمعیۃ المقاصد الخیریہ ۱۸۸۰ء میں قائم کی گئی۔ جس کے تحت لبنان کے سنی مسلمانوں کے لئے کئی ایک مدرسے کھولے گئے۔ ان جمعیتوں میں ایک اور مشہور اور ذی اثر جماعت جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ تھی جو مسلمانوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی اور جس کے ارکان نے ایک حقیقی اسلامی حکومت قائم کرنے کا حلف اٹھا رکھا تھا۔ اس جماعت کے روح رواں مشہور و معروف شخصیت جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہٗ تھے۔ یہ اس زمانے میں قائم ہوئی جب مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہوچکا تھا۔ اس کی جمعیت کی شاخیں مختلف ممالک میں قائم تھیں۔

جمعیت کی اصطلاح بطور ایک سیاسی انجمن کے اور کچھ عرصہ تک مستعمل ہوتی رہی۔ مثلاً جمعیۃ العربیۃ الفتات جو ۱۹۱۱ء میں سلطنت عثمانیہ کے آخری ایام میں جو سات عرب طالب علموں نے قائم کی تھی۔ عرب قوم پرستوں کی مشہور انجمن تھی۔ پیرس میں قائم کی گئی بعد میں دمشق اس کا مرکز بنا اس نے خفیہ بات چیت میں بڑا حصہ لیا۔ جو مصر میں شریف حسین اور برطانوی حکام کے درمیان ہوئی۔ جس کا نتیجہ ترکی حکومت کے خلاف عرب بغاوت کی صورت میں نکلا۔ اس بغاوت کا رہنما فیصل بن حسین اسی جمعیت کا ایک رکن تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مصر میں ایک اور جمعیت اخوان المسلمین کے نام سے قائم ہوئی۔ جس کا آغاز ۱۹۲۸ء میں حسن البنا شہید کے ہاتھوں ہوا۔ اس نے سیاست میں بڑا اہم کردار سرانجام دیا۔

اب عام طور پر سیاسی تحریکوں کے لئے جمعیۃ کی اصطلاح کی بجائے حزب کی اصطلاح استعمال ہونے لگی اور جمعیۃ صرف فلاحی اور ثقافتی اور ایسی ہی دوسری رضاکارانہ تنظیموں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

جمعیت اتحاد العلماء پاکستان میں علماء کی ایک تنظیم جس میں تقریباً تمام مسلکوں کے علما شامل ہیں۔ یہ ۱۹۶۳ء کے آخری ایام تھے موسم سرما اپنے جوبن پر تھا۔ جب ملک کے ۲۷ منتخب علمار کرام سٹلائیٹ ٹاؤن، سرگودھا کے ایک مکان میں جمع ہوئے۔ ان سب حضرات کو مولانا گلزار احمد مظاہری نے اپنے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ دور تھا۔ جب سابق صدر پاکستان محمد ایوب خان مرحوم نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ عوام ان کی حکومت سے مطمئن نہیں اور اپنے اقتدار کو مضبوط اور طویل بنانے کے لئے انہیں کچھ دوسرے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جو ذرائع اختیار کئے ان میں سے ایک ذریعہ یہ تھا کہ قوم کو آپس میں مذہبی بنیادوں پر لڑا دیا جائے اور ملکی نظم و نسق اور سیاسی مسائل پر ان کی توجہ کم سے کم ہوجائے۔ اس سلسلے میں وہ کچھ مذہبی راہنماؤں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور کچھ مخلص علماء جو حقائق کے اس پس منظر سے ناواقف تھے۔ میدان میں اس لئے کود پڑے تھے کہ اگر مخالف گروہ کے سرکردہ لوگ ہمارے مسلک کے خلاف اس طرح کھل کر پراپیگنڈہ کرتے ہیں تو ہمیں بھی اپنا مؤقف اسی آن بان اور اسی انداز میں عوام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ صورت حال جب یہ ہوگئی اور مختلف اطراف سے ایک دوسرے پر الزام تراشی کے طومار باندھے جانے لگے تو دردِ دل رکھنے والے علمار کرام سے قوم کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اور کڑکڑاتی سردی کے دنوں میں وہ سرگودھا شہر میں جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ امت کے اس انتشار کو ختم کرنے کے لئے باقاعدہ تنظیم کے تحت کام کیا جائے۔ انفرادی کوششیں کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہوسکتیں۔ اس تنظیم کا نام جمعیت اتحاد العلماء رکھا گیا۔ اور یہ نام اپنے مقاصد کی پوری پوری نشاندہی کر رہا تھا۔ امام المحدثین مولانا سید انور شاہ صاحب کاشمیری کے شاگرد رشید اور جامعہ عربیہ گوجرانوالہ

کے بانی مولانا محمد چراغ صاحب اس تنظیم کے صدر، اشاعت العلوم لائلپور کے شیخ الحدیث مولانا مفتی سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل نائب صدر اور مولانا گلزار احمد مظاہری اس تنظیم کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ کارکنوں کے اعتماد کی بنا پر تنظیم کا یہ ڈھانچہ آج تک جوں کا توں کام کر رہا ہے۔ تنظیم کی سرپرستی کے لیے برصغیر کی عظیم اور اسم بامسمیٰ علمی شخصیت حضرت مولانا ولی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں درخواست کی گئی جو انہوں نے بخوشی قبول فرمائی۔

اپنی زندگی کے اس تقریباً تیرہ سالہ دور میں اس تنظیم کی سرگرمیاں ملکی حالات کے ساتھ ساتھ تیز اور سست ہوتی رہی ہیں۔ تنظیم کے ناظم اعلیٰ مولانا گلزار احمد صاحب مظاہری آج کل مشرق وسطیٰ کے دورے پر ہیں اور اتحاد امت کی خاطر سعودی کی نمایاں شخصیتوں کے ساتھ ملاقاتیں کر رہے ہیں۔

پاکستان میں تحریک ختم نبوت جب اپنے عروج پر تھی تو مولانا گلزار احمد مظاہری اس وقت بھی بیرون ملک تھے۔ اس دوران میں وہ جہاں جہاں گئے۔ انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کو اس مسئلہ سے اچھی طرح روشناس کرایا اور پاکستانی عوام کے اس ضمن میں مطالبات کے لیے زبردست تائید حاصل کی۔

۱۹۷۵ء میں جمعیۃ اتحاد العلماء نے نفاذ شریعت کیلئے ایک ملک گیر مہم کا آغاز کیا۔

جمعیت اتحاد العلماء کے قابل ذکر کاموں میں سے ایک کام جو بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ علماء اکیڈمی کا قیام ہے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے اس لحاظ سے فریضۂ اقامت دین کو بنیادی ذمہ داری ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے طبقۂ علماء کی اکثریت اس فریضے کی اہمیت اور اس کے عملی تقاضوں سے بے تعلق ہے۔ اس وجہ سے آج ہمارے ہاں دینی رہنمائی کے سرچشمے خشک ہو چکے ہیں۔ اور طبقۂ علماء اپنے اندرونی اختلافات اور فروعی مسائل میں الجھ رہا ہے اور امت کی رہنمائی کے منصب سے یکسر بے خبر ہے۔ جمعہ کے اجتماعات ایک رسم بن گئے ہیں۔ اور لوگ وہاں سے فکر، پیش آمدہ حالات پر تبصرہ اور کوئی رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے پرانے قصے اور دور دراز کار داستانیں سن کے اٹھ آتے ہیں۔ ان حالات میں ضرورت ہے کہ علماء و آئمہ کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے جو دین کی حقیقی روح سے آشنا ہو۔ اپنی ذمہ داریاں سمجھتا ہو۔ امت کے حالات و معاملات پر اس کی نظر ہو اور وہ اپنے سامعین اور مقتدی حضرات کو کوئی فکر اور جذبہ دے سکے۔ ایسے گروہ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ آج دنیا بھر میں مساجد کی تعداد لاکھوں ہے، لیکن ان میں سے بہت کم ایسی مساجد ہیں جن کو مرکز اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ حال ہی میں مکہ کی "پیغام مسجد کانفرنس" میں بھی اس ضرورت کا احساس کیا گیا اور مساجد کو مراکز اسلام میں تبدیل کرنے کی عملی تدابیر طے کی گئی ہیں۔ انہی مقاصد کے حصول کے لئے ایک عرصے اہل فکر و نظر کے حلقہ میں تجاویز و مشورے ہو رہے تھے۔ چنانچہ جمعیت اتحاد العلماء کے اصحاب علم و فضل نے اسے عملی شکل دے دی ہے اور علماء اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس میں باقاعدہ کلاسز کا آغاز ہو چکا ہے۔

علماء اکیڈمی نہ صرف علماء حق کا گروہ تیار کرے گی بلکہ مساجد کے ذریعے اسلامی انقلاب لانے کی ایک تجربہ گاہ بھی ثابت ہو گی۔

علماء اکیڈمی ان مقاصد کو بروئے کار لائے گی جو درج ذیل ہیں:

- ایسے علماء اور ائمہ حضرات تیار کرنا جو فریضۂ اقامت دین کا مکمل شعور رکھتے ہوں۔
- معاشرے میں حکیمانہ انداز میں اصلاح کا کام کر سکیں۔
- دور حاضر کے مسائل میں اسلام کو بحیثیت ایک رہنما قوت کے پیش کر سکیں۔
- اتنا علم رکھتے ہوں کہ عالمی تحریکات (عیسائیت، یہودیت، سرمایہ داری سوشلزم، قادیانیت) کا مقابلہ علمی استدلال سے کر سکیں۔
- قیام پاکستان کے محرکات سے بخوبی آگاہ ہوں۔
- اختلافی مسائل میں امت کو الجھانے کی بجائے اسے قرآن و سنت کی روشنی فراہم کریں۔
- اپنی مساجد یا دینی مراکز میں تحریک اسلامی کے بھرپور کارکن ہوں۔
- قرأت و تجوید کے اعلیٰ معیار پر پورا اتر سکیں۔

چنانچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اکیڈمی میں تین شعبے قائم کئے گئے ہیں:

۱۔ شعبہ تربیت آئمہ و خطباء
۲۔ شعبہ حفظ و قرأت
۳۔ شعبہ تحقیق

یہ علماء اکیڈمی لاہور سے تقریباً چھ میل دور ملتان روڈ پر مرکزی جماعت اسلامی "منصورہ" کے سامنے ایک قطعہ اراضی اور ایک عمارت خرید کر اس میں قائم کی گئی ہے۔

جمعیت علماء اسلام

پاکستان کی ایک دینی اور سیاسی تنظیم۔ جمعیۃ علماء اسلام سب سے پہلے قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے علماء نے قائم کی اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی [illegible] سرہ العزیز کی راہنمائی میں جمعیۃ علماء اسلام نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

قیام پاکستان کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی زندگی نے زیادہ دیر وفا نہ [illegible] کے بعد جمعیۃ کو فعال اور سرگرم قیادت میسر نہ آسکی۔ تاہم حضرت مولانا مفتی محمد [illegible] بانی جامعہ اشرفیہ لاہور اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی راہنمائی میں تھوڑا [illegible] کام جاری رہا اسی دوران جمعیۃ علماء اسلام کی مساعی سے علامہ سلیمان ندویؒ کی صدارت میں تمام مکاتب فکر کے ۳۱ جید علماء نے اسلامی دستور کے ۲۲ نکات کا اعلان کیا۔

۵۶ء میں پہلے آئین کے نفاذ کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ [illegible] مولانا مفتی محمود صاحب کی تحریک پر ملتان میں مغربی پاکستان کے علماء کرام کا [illegible] اجتماع منعقد ہوا جس میں جمعیۃ علماء اسلام کو از سر نو گرم اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت مولانا احمد علیؒ نئی جمعیۃ کے امیر منتخب ہوئے۔ جمعیۃ نے عام [illegible] میں حصہ لینے کا اعلان کیا اور انتخابی منشور بھی جاری کیا۔ نیز جمعیۃ کی طرف سے [illegible] دستور کے خلاف اسلام دفعات کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے [illegible] میں ترامیم کا مطالبہ کیا اور مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد جمعیۃ کا نصب العین قرار پائے۔

۱۔ علمائے دین کی راہنمائی میں مسلمانوں کی منتشر قوتوں کو جمع کرنا اور عالم اسلام سے دین کی خاطر برادرانہ تعلقات قائم کرنا۔

۲۔ قرآن و سنت کی روشنی میں سیاسی، مذہبی اور ملکی معاملات میں مسلمانوں کی راہنمائی اور اس کے موافق عملی جدوجہد کرنا۔

۳۔ پاکستان میں صحیح جمہوریت اسلامیہ برپا کرنے اور اسلامی عادلانہ نظام کے نفاذ کے لیے ایسی کوشش کرنا جس سے باشندگان پاکستان ایک طرف انسانیت

کش سرمایہ داری اور دوسری طرف الحاد آفریں اشتراکیت کے مضر اثرات سے محفوظ رہ کر فطری معاشرتی نظام کی برکتوں سے مستفید ہو سکیں۔

۴۔ پاکستان میں ایسے جامع نظام تعلیم کی ترویج و ترقی کے لئے سعی کرنا جس سے مسلمانوں میں خشیت الٰہی، خوف آخرت اور پابندیٔ ارکان اسلام کے علاوہ فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

۵۔ مسلمانان پاکستان کے دلوں میں جذبہ جہاد فی سبیل اللہ، ملکی دفاع، استحکام اور سالمیت کے لئے جذبۂ ایثار و قربانی پیدا کرنا۔

۶۔ مسلمانوں میں وحدت فکر اور اخوت اسلامیہ کو اسی طرح ترقی دینا کہ ان سے صوبائی لسانی اور نسلی تعصبات دور ہوں۔

۷۔ تمام محکوم مسلم ممالک کی حریت و استقلال اور غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیتوں کی باعزت اسلامی زندگی کے مواقع پیدا کرنے کے لئے کوشش کرنا۔

۸۔ مختلف اسلامی اداروں مثلاً مساجد، مدارس، کتب خانوں اور دارالیتامیٰ کی اصلاح و ترقی اور ان کی آزادی و خود مختاری کے تحفظ کی کوشش کرنا۔

۹۔ تمام آئینی ذرائع سے باطل فرقوں کی فتنہ انگیز نیز مخرب اخلاق اور خلاف اسلام کارروائیوں کی روک تھام کرنا۔

نوٹ: جمعیۃ علماء اسلام میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے اور جمعیۃ کے اغراض مقاصد سے اتفاق رکھنے والے ہر مسلمان (مرد اور عورت) جمعیۃ کا رکن بن سکتا ہے

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء میں دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ جمعیۃ علماء اسلام بھی خلاف قانون قرار دے دی گئی تو جمعیۃ سے وابستہ علماء نے مذہبی امور میں ملت اسلامیہ کی راہنمائی کے لئے غیر سیاسی تنظیم "نظام العلماء" قائم کر لی۔ جس کے سربراہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ منتخب ہوئے۔ مارشل لاء کے دوران فوجی حکومت نے عائلی قوانین نافذ کیے تو نظام العلماء نے اس کی پرجوش مخالفت کی اور دہلی گیٹ کے باہر ایک بہت بڑے جلسۂ عام میں مولانا احمد علیؒ نے عائلی قوانین کو سراسر خلاف اسلام قرار دے کر انہیں منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح ایوب خاں مرحوم نے دستور کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں آراء و سفارشات طلب کیں تو نظام العلماء نے اسلامی دستور کا خاکہ اور ضروری تجاویز پیش کیں۔

کالعدم جمعیۃ علماء اسلام کے سربراہ مولانا احمد علیؒ مارشل لاء کے دوران ہی وفات پا گئے اس لیے مارشل لاء اٹھنے کے بعد جمعیۃ کے نائب امیر مولانا مفتی محمود نے قائم مقام امیر کی حیثیت سے جمعیۃ علماء اسلام کی بحالی کا اعلان کیا۔ اور بعد ازاں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی کو جمعیۃ علماء اسلام کا مرکزی امیر منتخب کر لیا گیا جو اب تک امارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

جب ایوب حکومت نے ملک میں اسمبلیوں کے پہلے انتخابات کرائے تو مولانا مفتی محمود قومی اسمبلی کے اور مولانا غلام غوث ہزاروی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور دونوں راہنماؤں جمعیۃ علماء اسلام کے اغراض و مقاصد کی روشنی میں اسلامی اقدار اور قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔

۱۹۶۲ء میں مشرقی پاکستان میں جمعیۃ علماء اسلام کے باقاعدہ قیام کے بعد مرکزی سطح پر جمعیۃ کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ مولانا محمد عبداللہ درخواستی امیر اور مولانا مفتی محمود جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ اس دوران لاہور میں جمعیۃ کی آل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں ہزاروں علماء نے شرکت کی اور ایوب آمریت کے خلاف علماء نے لاہور کی سڑکوں پر تاریخی مظاہرہ کیا۔ جس پر ملک بھر کے اخبارات نے جمعیۃ کو خراج تحسین پیش کیا۔

اسی دوران حزب اختلاف کی جماعتوں نے "جمہوری مجلس عمل" قائم کی اور جمعیۃ علماء اسلام اس میں شامل ہو گئی۔ ایوب خان مرحوم کی گول میز کانفرنس میں جمعیۃ کے جنرل سیکرٹری مولانا مفتی محمود اور مشرقی پاکستان شاخ کے امیر پیر محسن الدین ایم اے شریک ہوئے اور کانفرنس میں مولانا مفتی محمود نے تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کے مرتب کردہ ۲۲ دستوری نکات کو شامل کرنے اور مسلمانوں کی تعریف متعین کرنے کا مطالبہ کیا۔

ایوب خان کی آمریت کے خلاف اپوزیشن کی جدوجہد میں جمعیۃ علماء اسلام نے بھرپور حصہ لیا۔ جمعیۃ کے صوبائی امیر مولانا عبیداللہ انور کی قیادت میں جمعیۃ نے لاہور میں احتجاجی مظاہرہ کیا اور پولیس کے وحشیانہ تشدد کی وجہ سے مولانا انور شدید زخمی ہو کر کافی عرصہ تک میو ہسپتال میں زیر علاج رہے مولانا عبیداللہ انور اور ان کے رفقاء کی اس قربانی سے ملک بھر میں تحریک جمہوریت کو تقویت ملی۔

۱۹۷۰ء میں یحییٰ خان نے ملک میں عام انتخابات کرائے اور تمام صوبوں میں جمعیۃ علماء اسلام نے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں اسے قومی اسمبلی میں سات سرحد اسمبلی میں چار بلوچستان اسمبلی میں تین اور پنجاب اسمبلی میں دو نشستیں حاصل ہوئیں انتخابات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام نے دستور سازی میں اپنا کردار انجام دینے کی طرف توجہ دی اور یحییٰ خان، مجیب الرحمان اور بھٹو کے درمیان اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اور جب بھٹو صاحب اور ان کی تحریک پر مغربی پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹیوں نے دستور ساز اسمبلی کے ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تو جمعیۃ علماء اسلام نے اسے ملکی سالمیت کے لئے تباہ کن قرار دیتے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت کرنے کا تاریخی اعلان کیا اور مولانا مفتی محمود نے اقلیتی سیاسی جماعتوں کا لاہور میں اجلاس طلب کر کے حکومت سے معقول اور متوازن رویہ اختیار کرنے کا مطالبہ کیا اور دستور سازی کے سلسلہ میں تجاویز پیش کیں اور اس کے بعد بھی دوسرے سیاسی لیڈروں کے ساتھ مل کر یحییٰ خان، مجیب الرحمان اور بھٹو کے درمیان اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کی مسلسل سعی کی۔

سقوط ڈھاکہ کے المناک سانحہ کے بعد بھٹو صاحب نے مغربی پاکستان میں عنان اقتدار سنبھالی تو جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مارشل لاء کے خاتمہ کی بھرپور جدوجہد کی۔ جس کے نتیجے میں بھٹو صاحب کو مارشل لاء ہٹا کر عبوری آئین کے تحت صوبائی حکومتیں بحال کرنا پڑیں۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مشترکہ حکومتیں قائم کیں۔ سرحد میں جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود نے وزارت اعلیٰ کا قلمدان سنبھالا اور بلوچستان میں نیپ کے راہنما سردار عطاء اللہ خان مینگل وزیر اعلیٰ بنے۔

مولانا مفتی محمود نے وزارت سنبھالتے ہی صوبہ بھر میں شراب پر مکمل پابندی لگانے کا اعلان کیا۔ جس کا ملک میں اور بیرون ملک پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے اردو کو صوبہ کی سرکاری زبان قرار دیا۔ احترام رمضان کا آرڈیننس نافذ کیا۔ جہیز پر پابندی لگائی۔ سرکاری لباس شلوار قمیض قرار دے دیا۔ خواتین کے لیے پردہ لازمی قرار دیا۔ جوئے پر مکمل پابندی لگائی، تقاوی قرضوں پر سود معاف کر دیا۔ تمام قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے علماء اور وکلاء پر مشتمل کمیشن قائم کیا اور ان جیسی دیگر اسلامی اصلاحات مرکزی حکومت کی مسلسل مداخلت کے باوجود کیں۔

صوبائی حکومتوں کے قیام کے ساڑھے نو ماہ بعد جب مرکزی حکومت نے بلوچستان کی آئینی واکثریتی حکومت کو جسے ۲۱ کے ایوان میں سے ۱۴ ارکان کی حمایت

حاصل تھی برطرف کر دیا تو مولانا مفتی محمود کی کابینہ بھی احتجاجاً مستعفی ہو گئی اور مرکزی حکومت کے مسلسل اصرار کے باوجود انہوں نے استعفیٰ واپس نہ لیا۔

اس کے بعد اپوزیشن پارٹیوں نے متحدہ جمہوری محاذ قائم کیا تو جمعیۃ علماء اسلام اس میں شامل ہو گئی۔ اور مولانا مفتی محمود اس کے اول نائب صدر منتخب ہوئے۔ متحدہ محاذ کے ساتھ ملک کے دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی اور جمہوری بنانے کے لیے مولانا مفتی محمود نے فیصلہ کن کردار ادا کیا اور بالآخر مسلسل جدوجہد کے بعد دستور میں بہت سی اسلامی اور جمہوری دفعات شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

بھٹو حکومت کی طرف سے دفعہ ۱۴۴ کے مسلسل نفاذ کے خلاف لاہور اور ملتان میں متحدہ جمہوری محاذ نے ۷۴ء میں تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا تو جمعیۃ کے متعدد کارکنوں نے جبر و تشدد کے باوجود دوسری جماعتوں کے شانہ بشانہ گرفتاریاں پیش کیں اور جمعیۃ کے صوبائی سربراہ مولانا عبید اللہ انور بھی اس موقع پر گرفتار ہوئے۔

تحریک ختم نبوت میں بھی جمعیۃ علماء اسلام نے بھرپور کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی میں ملت اسلامیہ کے جذبات کی ترجمانی کرنے والے ارکان اسمبلی کی مولانا مفتی محمود نے قیادت کی اور ملک بھر میں جمعیۃ کے کارکنوں نے تحریک میں پرخلوص اور بھرپور حصہ لیا۔

جمعیۃ علماء اسلام نے لوگوں کے ایسے تنازعات و مقدمات کے تصفیہ کے لیے جن میں سرکار فریق نہیں ہوتی۔ "عدالت شرعیہ" کے نام سے ایک پرائیویٹ عدالتی نظام بھی قائم کر رکھا ہے۔ جس کے قاضی القضاۃ مولانا مفتی محمود تھے اور ان کے معاون قاضی مولانا محمد سرفراز خان گوجرانوالہ اور مولانا عبدالکریم لاڑکانہ ہیں۔ مرکزی عدالت کے تحت صوبوں میں باقاعدہ شرعی عدالتیں قائم ہیں اور اپنے تنازعات کے شرعی تصفیہ کے خواہشمند حضرات ان عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں۔

جمعیت علمائے اہل حدیث

اہل حدیث حضرات کی تنظیم۔ برعظیم پاک و ہند میں اہلحدیث حضرات آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس، مؤتمر اہلحدیث ہند، جماعت غرباء اہل حدیث سابقہ پنجاب، اور بنگال میں جمعیۃ تبلیغ اہلحدیث نام کی تنظیموں کی صورت میں منظم تھی۔ اہلحدیث کے دینی مدارس اور دینی ادارے بھی کثرت سے مشرقی پنجاب اور وسطی ہند میں تھے۔ ۱۹۴۷ء قیام پاکستان کے ہنگامہ دار و گیر میں بہت سے اکابر علماء اہل حدیث جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کی مساجد و مدارس اجڑ گئے۔ ان کے قیمتی اور نادر و نایاب کتب خانے ہندوستان میں رہ گئے یا تباہ ہو گئے الغرض پاکستان کے سلسلہ میں جماعت اہلحدیث کو شدید صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔

ڈیڑھ دو سال اسی افراتفری میں گذر گئے۔ پھر جماعت اہل حدیث کے اصحاب رشد نے جن میں سرفہرست مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ) مولانا عبدالواحد، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف وغیرہ تھے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی کی زیر قیادت جمعیت کی تنظیم کی طرح ڈالنے کے لیے غور و فکر کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کو جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے لاہور مدرسہ تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں جمعیت قائم کی گئی اور مولانا داؤد غزنوی کو صدر اور پروفیسر عبدالقیوم کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

پہلی اہلحدیث کانفرنس مئی ۱۹۴۹ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس کے صدر حافظ محمد ابراہیم میر محدث سیالکوٹی اور صدر استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی قرار پائے۔

جمعیت اہل حدیث کا ابتدائی قافلہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، حاجی محمد اسحاق حنیف ارشدی، پروفیسر عبدالقیوم، مولانا محمد علی قصوری مرحوم، مولانا محی الدین قصوری، مولانا محمد حنیف ندوی، میاں عبدالمجید پر مشتمل تھا۔

"الاعتصام" کا اجراء۔ اسلام کی تبلیغ کتاب و سنت کی اشاعت مسلک اہل حدیث کے فروغ۔ جمعیت اہل حدیث کے استحکام اور جماعت کے علمی و تبلیغی ذوق کو مزید پختہ کرنے کی غرض سے گوجرانوالہ سے "الاعتصام" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا گیا۔ یہ ہفت روزہ جماعت اہل حدیث گوجرانوالہ کی سرپرستی میں جاری ہوا جو بعد میں مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی تحویل میں دے دیا گیا۔

جمعیت اہلحدیث کو منظم کرنے کے لیے مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف اور مولانا حافظ محمد اسماعیل ذبیحی نے اس سلسلے میں پورے مغربی پاکستان کے دورے کیے اسی اثناء میں ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی مجلس عمل جس میں تمام دینی جماعتیں شامل تھیں۔ جمعیت اہلحدیث کی طرف سے اس میں تین اکابر نامزد کئے گئے ان اکابرین میں مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور محمد عطاء اللہ حنیف تھے اس تحریک میں دوسرے علماء کے ساتھ جمعیت اہلحدیث کے بھی بہت سے علماء گرفتار ہوئے۔

جمعیت اہلحدیث کی دوسری اہلحدیث کانفرنس اپریل ۱۹۵۴ء میں ملتان میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی قصوری اور صدر استقبالیہ مولانا محمد اسحاق تھے اس کانفرنس میں تبلیغ دین کے لیے جامع منصوبہ تیار کرنے، جمعیت کی تنظیم کو مزید مستحکم کرنے اور اہلحدیث افراد کو جو دوسری جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں ان کو دوبارہ جماعت میں واپس لانے کے بارے میں فیصلے کئے گئے۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں تیسری اہلحدیث کانفرنس بلائی گئی جو دھوبی گھاٹ [illegible] میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر مولانا سید محمد اسماعیل غزنوی اور صدر استقبالیہ مولانا محمد صدیق لائلپوری تھے۔ اس کانفرنس کے موقع پر مجلس شوریٰ جمعیت اہلحدیث نے انتہائی دور رس فیصلے کئے۔

اولاً جماعتی دستور پاس کیا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا ثانیاً مرکزی معیاری درسگاہ کا قیام عمل میں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ثالثاً ادارہ اشاعت [illegible] نام سے اشاعتی ادارے کا قیام کے متعلق تھا۔

رابعاً دینی و سیاسی جماعتوں کو پانچ نکاتی قرارداد [illegible] کی طرح ڈالی۔

جامعہ سلفیہ کا قیام۔ جماعت کی علمی، دینی اور تحقیقی [illegible] کرنے کی غرض سے لائلپور میں ایک معیاری دینی و علمی درسگاہ بنام جامعہ سلفیہ [illegible] کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ کانفرنس کے موقع پر [illegible] محمد اسماعیل سلفی مرحوم [illegible] حضرت میاں صوفی محمد باقر [illegible] کے ہاتھوں ایک [illegible] تقریب میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی اور بہت سے دیگر علماء و اعیان جماعت [illegible] تھے۔ جامعہ سلفیہ کی بنیاد رکھی گئی ایک [illegible] میں مولانا عبداللہ [illegible] کئے گئے۔ جنہوں نے شب و روز ایک کر کے دو تین سال میں [illegible] شاندار عمارت تعمیر کر دی۔ مئی ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم تقویۃ [illegible] ایک منتخب اور سپیشل جماعت کا انتخاب کر کے جامعہ سلفیہ کا اجراء کر دیا گیا۔ مولانا [illegible] قصوری مرحوم اس کے ناظم تعلیمات منتخب ہوئے تھے۔ اس سپیشل کلاس کے [illegible] میں مولانا سید احمد داؤد غزنوی مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔

چوتھی اہلحدیث کانفرنس۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کے آخر میں گوجرانوالہ شیرانوالہ باغ میں چوتھی اہلحدیث کانفرنس پوری شان و شوکت سے منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر علامہ خلیل عرب مرحوم، صدر استقبالیہ مولانا محمد اسماعیل سلفی

مرحوم تھے۔ کانفرنس کے موقعہ پر مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاس ہوئے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی صدارت میں مجلس شوریٰ نے آئندہ کے لیے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو صدر، مولانا حافظ محمد گوندلوی کو نائب صدر، مولانا محمد اسماعیل سلفی کو ناظم اعلیٰ، حاجی محمد اسحاق حنیف کو ناظم نشر و اشاعت، مولانا محی الدین احمد قصوری کو ناظم تعلیمات میاں عبدالمجید کو ناظم مالیات منتخب کیا۔

ادارہ اشاعت السنہ کا قیام: مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے بموجب جمعیۃ اہلحدیث اشاعت السنہ کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کر لیا۔ جس نے تھوڑے سے وقت میں نہایت قیمتی کتابیں مثلاً بنیات ۲۔ تقویۃ الایمان ۳۔ عدالت نبوی کے فیصلے ۴۔ اسلامی دستور کا مختصر خاکہ ۵۔ تحفۃ المواحدین ۶۔ مکالمات نبوی وغیرہ شائع کر کے ملک بھر کے اہل علم سے داد و تحسین وصول کیا۔

۱۹۵۷ء کے نصف اول میں جامعہ سلفیہ لاہور سے لائلپور منتقل ہو گیا۔ اس کے صدر المدرسین و رئیس الجامعہ استاذ العلماء حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ مقرر ہوئے۔ "الاعتصام" کی ادارت مستقلاً مولانا محمد اسحاق بھٹی نے سنبھالی۔

جمعیۃ اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس اپنے ہر عواقب و نتائج کے اعتبار سے ملک گیر شہرت اور اثرات کی حامل رہی تھیں۔ چنانچہ پانچویں کانفرنس ۱۹۵۷ء کو سرگودھا میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدر استقبالیہ مولانا محمد اسحاق رحمانی تھے ۵۸، ۵۹، ۱۹۶۰ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہونے کی وجہ سے کانفرنس کی اجازت نہ مل سکی۔ ۱۹۶۱ء اکتوبر کو لائلپور میں جامعہ سلفیہ کی حدود کانفرنس منعقد ہوئی البتہ ۱۹۶۲ء نومبر کو ساتویں اہلحدیث کانفرنس مولانا عبداللہ کی صدارت میں باغ موچی دروازہ میں اپنے تزک و احتشام سے منعقد ہوئی۔ اس کے صدر استقبالیہ حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم تھے۔ اس کانفرنس میں مشرقی پاکستان کے اجلہ علماء کرام نے بھی شمولیت فرمائی تھی۔ علماء اہلحدیث کے علاوہ اس میں آغا عبدالکریم شورش کاشمیری مرحوم، شیخ خورشید احمد مرحوم (اس وقت وزیر قانون تھے)، علامہ علاء الدین صدیقی، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری نے بھی خطاب فرمایا تھا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو مولانا محمد داؤد غزنوی وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مجلس شوریٰ نے مولانا محمد اسمٰعیل سلفی کو ان کی جگہ امیر، مولانا غزنوی کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر غزنوی کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا۔ آج کل جمعیت اہل حدیث پاکستان امیر مولانا معین الدین لکھنوی آف اوکاڑہ، ناظم اعلیٰ الحاج مولوی فضل الحق ہیں اور جامعہ سلفیہ نہایت خوش اسلوبی سے لائل پور میں اپنے سفر کو رواں دواں کیے ہوئے ہے۔ ہفت روزہ الاعتصام کے مدیر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف ہیں۔ ہفت روزہ "اہلحدیث" لاہور حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری کی ادارت میں نکلتا ہے۔ جمعیت اہلحدیث کا دوسرا مجلہ ہفت روزہ الاسلام گوجرانوالہ سے جناب بشیر احمد انصاری ایم اے کی ادارت میں نکلتا ہے

جمعیت اہل حدیث کا دائرہ کار:- جمعیت اہلحدیث پاکستان اپنے دائرہ کار اور وسعت کے اعتبار سے ایک ممتاز اور دینی جماعت ہے۔ پاکستان کے تمام صوبہ جات صوبہ سرحد آزاد کشمیر پنجاب بلوچستان اور سندھ میں پانچ صد سے زائد ابتدائی شہری اور ضلعی جمعیتیں اس سے ملحق ہیں۔ مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کا مرکزی دفتر ایبک روڈ انارکلی میں واقع ہے۔

جمعیت اہل حدیث کا نظام:- مرکزی جمعیت اہلحدیث کا نظام جمہوری شورائی ہے۔ پاکستان بھر کے مختلف صوبہ جات بلکہ ضلع جات کے الگ الگ بنیادی اعتبار سے مجلس شوریٰ کے لیے کوٹے مقرر ہیں۔ ابتدائی جمعیتوں کے انتخابات ہوتے ہیں۔ ضلعی یا شہری جمعیتوں کے نمائندگان مجلس شوریٰ مجلس شوریٰ ایک جگہ اکٹھے ہو کر مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کا انتخاب کرتے ہیں اور یہی جمعیت اہلحدیث کا سب سے بڑا اور مؤثر و طاقتور ایوان ہوتا ہے۔ اسے مرکزی مجلس شوریٰ کہا جاتا ہے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کا امیر منتخب ہونے کے بعد چالیس ایام کے اندر اندر عہدیداران کے علاوہ مزید پچیس ارکان پر مشتمل مجلس عاملہ نامزد کرتا ہے جو صرف ارکان مجلس شوریٰ سے ہی لی جا سکتی ہے اور یہی جمعیت اہلحدیث کی پالیسی ساز اور نگران مجلس ہوتی ہے اور مجلس عاملہ بھی مجلس شوریٰ کے ہاں جواب دہ ہوتی ہے۔

(مولانا محمد اسلم سیف فیروزپوری)

جمعیت علمائے پاکستان

پاکستان میں اہل سنت جماعت (بریلوی مکتبہ فکر) کی سب سے بڑی تنظیم جس کا قیام ۱۹۴۸ء میں ملتان میں عمل میں آیا اور سب سے پہلے امیر علامہ سید احمد قادری ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔

اس جمعیت کا مقصد اور نصب العین اس مملکت پاکستان میں اس کے نظریہ کے مطابق مکمل اسلامی آئین کا نفاذ۔ نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری قوت سے نافذ کرنا اور مقام و ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور تحفظ ہے۔

- صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی عزت و تکریم۔
- اولیاء کرام، صوفیائے عظام کا احترام اور ان کی تعلیمات کا فروغ۔
- آئمہ مجتہدین، خاص طور پر امام اعظم ابوحنیفہ کا احترام اور علماء کی کتاب و سنت کی روشنی میں پیروی۔
- اس نظام حکومت کا قیام، جس میں کتاب و سنت کی عملداری ہو جس میں پارلیمنٹ حدود اللہ سے باہر جا کر کوئی اختیار استعمال نہیں کر سکتی۔
- اسلام کے مکمل اقتصادی اور معاشی نظام کو بروئے کار لانا۔
- کسانوں، مزدوروں اور محنت کش طبقہ کے حقوق کا تحفظ اور وسائل مہیا کرنا اس کے پروگرام میں شامل ہے۔

جمعیت علمائے پاکستان کا واحد مقصد جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔
پاکستان میں نظام اسلام کا نفاذ۔
اسلامی اقدار کی حفاظت۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا ابقاء
خلفائے راشدین کے دور سعید سے راہنمائی حاصل کرنا، عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کے قیام کی کوشش کرنا اور حقوق اہل سنت کا تحفظ ہے۔

جمعیت کی جدوجہد:- جمعیت العلماء پاکستان ملکی و ملی معاملات میں دلچسپی لیتی رہی۔ بحالی مہاجرین اور تحریک آزادی کشمیر میں بھرپور حصہ لیا مگر اس کی اصل جدوجہد آئین اسلامی کی تدوین تھی۔ اسلامی فقہ کی رو سے اصولی فقہ سے مراد آئین اور احکام فقہ سے مراد "قانون" ہے۔ پھر بھی عہد حاضر کی زبان میں مستقل آئین ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ اس لیے جمعیت کی تمام سرگرمیاں اسی جانب مرکوز رہیں چنانچہ ہم نے ۱۹۴۹ء کی قرارداد مقاصد ۱۹۵۲ء کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (بی پی سی رپورٹ) ۱۹۵۴ء کے عبوری مسودہ آئین ۱۹۵۶ء کے آئین ۱۹۶۲ء کے ایوبی آئین سب کو نامکمل قرار دیتے ہوئے مثالی آئین کے لیے کوشش جاری رکھی۔ مذکورہ تمام مسودات آئین میں کوتاہی کی وجہ یہ تھی کہ قرآن و سنت کو پاکستان میں اساس حجت تسلیم کر لینے کے باوجود فقہ کو اساس حجت میں شامل نہ کیا گیا اور اس طرح نص کو تفسیر بالرائے سے مسخ کرنے اور تحریف و مطالبہ کے راستے کھلے رکھے گئے۔

۱۹۶۹ء میں جب یحییٰ خان نے مستقل آئین سازی کے لیے مجلس آئین ساز منتخب

کرانے کے لیے عمومی انتخابات کا اعلان کیا تو سوادِ اعظم اہلسنت نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جون ۱۹۷۰ء میں اہلسنت کا ایک آل پاکستان کنونشن دارالسلام ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقد کیا۔ اس کنونشن میں تقریباً دس ہزار علماء، مشائخ، خطباء، وفقہاء اور آئمہ و قانون دان حضرات جمع ہوئے جہاں آئین اسلامی کی خاطر عمومی انتخابات میں حصہ لینے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔ تقریباً اڑھائی لاکھ سنی عوام کے اجتماع میں اس قرارداد کی توثیق ہوئی خواجہ حافظ محمد قمرالدین صاحب سجادہ نشین آستانہ سیال شریف کو آل پاکستان جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔

پانچ چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں خواجہ صاحب نے ملک بھر میں جمعیت کے پبلک جلسوں سے خطاب کیا۔ اگست میں عمومی انتخابات کے سرکاری اعلان کے بعد خواجہ صاحب نے بے سروسامانی کی حالت میں آئین اسلامی کی تدوین کی خاطر الیکشن کی تیاری شروع کی۔ تین چار ماہ کی جدوجہد میں جمعیت العلمائے پاکستان نے آئین ساز اسمبلی کی سات نشستیں حاصل کرلیں۔

۱۹۷۱ء کے پرآشوب دور میں جمعیت ملکی دفاع کے لئے سرگرم عمل رہی۔

مئی ۱۹۷۳ء میں بمقام خانیوال جمعیت کا کل پاکستان کنونشن منعقد ہوا جس میں صوبائی مجالس شوریٰ، صوبائی مجالس منتظمہ مرکزی مجلس شوریٰ اور مرکزی مجلس عاملہ کے علاوہ خصوصی دعوت پر مندوبین شامل ہوئے جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے متجاوز تھی۔ اس کنونشن میں جمعیت کا نیا آئین منظور ہوا۔ جس سے پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے مرکزی عہدیداروں نے خطاب کیا۔ اسی خانیوال کنونشن میں مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کو صدر اور مولانا عبدالستار خان نیازی کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

پاکستان کے مستقل آئین کی تدوین کے سلسلہ میں جمعیت نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مولانا نورانی صاحب کی خدمات زبان زد خاص وعام ہیں۔ اسمبلی کے اندر اور باہر آئین کی تدوین کے علاوہ بنگلہ دیش کے فتنہ سے قوم کو نجات دلانے کے لئے اکابرین جمعیت نے ملک میں سینکڑوں جلسے کیے صرف مولانا نیازی صاحب نے اس سلسلہ میں بنگلہ دیش کے خلاف اسی جلسوں سے خطاب کیا۔ مولانا کے خلاف مقدمات کھڑے کیے گئے اور جیل میں ڈال دیا گیا۔ مولانا کے علاوہ جمعیت کے دیگر اکابرین صوبائی ناظم اعلیٰ، نائب ناظم، ناظم اطلاعات اور صوبہ سندھ کے اکابرین پر مقدمات چلائے گئے۔

۱۹۷۳ء میں مہنگائی، گرانی اور حکومت کی ناقص خارجہ پالیسی کے خلاف متحدہ جمہوری محاذ کے فیصلے کے مطابق بطور احتجاج تحریک جمہوریت شروع کی گئی تو جمعیت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۷۴ء میں جب قادیانیت کے خلاف مہم شروع کی گئی تو جمعیت بھی ملک کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں پر مشتمل مجلس عمل تحفظ ختم نبوت میں شریک رہی جمعیت کے رہنما علامہ سید محمود احمد رضوی مجلس عمل کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء میں بھی جب ملک میں تحریک ختم نبوت چلی تو تمام مکاتب فکر کے علماء نے اپنے اجلاس میں جمعیت کے سربراہ مولانا سید ابوالحسنات قادری کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا۔ اس زمانے میں جو تمام مذہبی جماعتوں کے لئے ابتلا کا دور تھا۔ جمعیت کے موجودہ سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خاں نیازی کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا تھا۔

جمعیت علمائے پاکستان کی تنظیم کے ممبروں کے دو درجے ہیں۔ ۱۔ رکن ۲۔ خادم

جمعیۃ علمائے ہند غیر منقسم ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ و تجدید و احیائے دین کا کام شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانیؒ کی ذات گرامی سے شروع ہوتا ہے۔ آپ وہ خرابیاں دور کرنے میں کامیاب ہوئے جو اس وقت اکبری الحاد سے پیدا ہو چکی تھیں آپ کی اصلاحی خدمات کا سلسلہ ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء تک رہا۔ یعنی جہانگیر کی وفات سے تین سال تک اس کے بعد شاہجہان کے دور سلطنت میں آپ کی اصلاحات کا نمایاں اثر سامنے آیا۔ اورنگ زیب عالمگیر جو سلطنت مغلیہ کے آخری مضبوط اور دیندار بادشاہ تھے۔ وہ خواجہ محمد معصوم صاحب ابن حضرت مجدد سے بیعت بھی تھے اور خواجہ سیف الدین ابن خواجہ محمد معصوم سے روحانی تربیت حاصل کی تھی۔ عالمگیر کے دور حکومت ہی میں پہلی بار ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا تھا کہ کابل اور قندھار سے آسام تک، تبت اور نیپال سے بندرگاہ سورت کھمبات اور بالا بار تک سیاسی اور اسلامی مرکز ایک ہوگیا۔ یہ انھی بزرگوں کی طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

جمعیۃ علماء کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں فقط علماء ہوں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی وہ جماعت جنہوں نے علماء کی قیادت کو منظور کیا اور ان کی زیر سرکردگی خدمات انجام دیں۔ اس لئے جمعیۃ کے لئے عام ممبرسازی اور عہدہ داران میں غیر علماء کو ہمیشہ لیا جاتا رہا۔

اس طبقہ جماعت علمائے ہند کو طبقہ اول سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ زوال سلطنت مغلیہ کا دور وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ بھی اسی گروہ علماء سے تعلق رکھتے تھے آپ نے ہر ممکن سعی کی کہ سلطنت اسلامی صحیح راہ پر گامزن ہو جائے۔ جس کی دلیل آپ کی گرانقدر تصانیف ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول، انسان کے بنیادی حقوق، بین الاقوامی تعلقات اور مذہبیات جیسے سب ہی عنوانات دے کر مسائل حل فرمائے ہیں۔

یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد سے حضرات کا یہ مسلک رہا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی اصلاح کی پوری قوت سے کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں چاہے کوئی ملامت اور چاہے مصائب و آلام سے بھی دوچار ہونا پڑے۔ کیونکہ خیرخواہی جس کی آنحضورؐ نے تعلیم فرمائی "النصیحۃ لائمۃ المسلمین وعامتھم" دراصل یہی ہے۔

ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے بعد یہاں کی حکومت کو گھن لگنا شروع ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے نہ صرف یہ کہ اس کو محسوس کیا بلکہ اس کے اسباب علل پر بڑی دیدہ وری سے اور جامعیت کے ساتھ بحث کی اور ان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اس کی طرف حکومت کو، امراء اور وزراء کو اور سوسائٹی کے دوسرے طبقات کو درجہ بدرجہ نہایت پرزور و پرشکوہ الفاظ میں توجہ دلائی۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی حیات میں دہلی کے حالات اور زیادہ بگڑے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے دہلی کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ نیز جب آپ نے یہ حالات دیکھے تو اپنے حلقہ اثر کو لیا اور اپنے بعد جانشین ہونے والوں کا تعارف کرایا۔ اپنی حیات ہی میں ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۸ء میں سید احمد شہید کی سرکردگی میں ان کی ایک باقاعدہ ترتیب دے دی۔ پہلے پہل یو۔ پی اور اودھ میں اسلامی حکومت کے غلبہ کی لگن کی وجہ سے انگریزی تسلط کے باوجود انجام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان حضرات نے دورہ کر کے رضاکارانہ تربیت کا آغاز کیا۔ روح جہاد پھونکی اور سرفروش مجاہدین تیار کرنے شروع کر دیئے۔ ہر دور کا آخری مقام سہارنپور تھا جو یوپی کی آخری سرحد ہے جو پنجاب سے ملتی ہے آپ کی اس تحریک کے اثرات پورے بنگال آسام اور برما تک پہنچ گئے۔

۲ رشوال ۱۲۳۹ھ/ ۲ مئی ۱۸۲۴ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے نواسے

حضرت شاہ اسحاق صاحب آپ کی جگہ مسند نشین ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ان کو تمام کام سونپ دیئے تھے۔ جب سید احمد شہید کا قافلہ دہلی پہنچا، تو انہوں نے بھی شاہ اسحاق کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس زمانے میں اگر جمعیۃ کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحاق اس کی صدارت کرتے اور جب اجلاس مدرسہ سے باہر ہوتا تو سید احمد شہید اس اجلاس کی صدارت کرتے۔

شاہ عبدالعزیز کے معروف ترین تربیت یافتہ علمار حضرات یہ تھے۔

مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا شاہ عبدالغنی، مولانا محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب، مولانا شاہ عبدالحی، شاہ محمد اسماعیل، حضرت سید احمد شہید، مولانا رشید الدین، مولانا مفتی صدرالدین، مولانا الہٰی بخش، شاہ غلام علی، مولانا مخصوص اللہ مولانا کریم اللہ، مولانا میر محبوب علی، مولانا عبدالخالق، مولانا میر محبوب علی، مولانا حسن علی مولانا حسین احمد وغیرہ۔ یہ حضرات وہ عظیم المرتبت شخصیات تھیں جنہوں نے دین اسلام کی بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ انہی افراد میں سے وہ طبقہ بھی تھا جس نے بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔ تاریخ حریت کا دہشتناک حادثہ ہم ۲ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ/ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا۔

علمار کا یہ طبقہ جماعت علمار کا پہلا طبقہ تھا۔ اس طبقے میں اور اس کے بعد تمام طبقات میں قیادت علمار ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ ورنہ مجاہدین میں عوام ہی تھے

دوسرا طبقہ :۔ اس کے بعد، ۱۸۵۷ء کا وحشت و بربریت کا دور آیا۔ اس میں بھی سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ان کے پیر بھائی حافظ محمد ضامن شہید مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ معرکہ شاملی میں جہاد بالسیف بھی کیا یہ جماعت علمار کا دوسرا طبقہ تھا۔

انگریزی غلبہ کے بعد ان حضرات میں سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا رحمت اللہ مکہ معظمہ ہجرت فرما گئے۔ دوسرے حضرات نے دینی درسگاہ پر زور دیا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ غرض ان آفتابہائے رشد و ہدایت نے اسلامی نظریات وعلوم اور عمل کی حفاظت میں پوری توجہ دی اور بدیشی حکومت کا تسلط ختم کرنے میں پوری قوت صرف کرتے رہے۔ ان اکابرین کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ "علمار ہند کا شاندار ماضی" میں درج ہیں۔

تیسرا طبقہ :۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے بعد صحیح طور پر اس مسند پر متمکن ہونے والی عظیم ترین مفکر شخصیت حضرت مولانا محمود الحسنؒ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف تو ایسے رفقائے کار عطا فرمائے جو آسمان رشد و ہدایت کے آفتاب تھے۔ مثلاً شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا سید تاج محمود امروٹی، مولانا غلام محمد دینوری وغیرہم اور دوسری طرف مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا انور شاہ کاشمیری۔ مولانا حسین احمد مدنی مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم جیسے اہم حضرات کہ جنہیں آسمان علم کے روشن ستارے کہا جائے بجا ہوگا۔ یہ حضرات   قدرت نے آپکے حلقہ تلامذہ میں داخل فرمائے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے دو طریقے اختیار فرمائے۔ ایک طرف گوریلا جنگ کا انتظام کیا اور دوسری طرف حکومت ترکیہ اور دیگر اسلامی حکومتوں سے انگریز کے پنجہ استبداد سے استخلاص کے لئے امداد چاہی۔ انگریز کی حکومت میں رہتے ہوئے اس طرح کا نظام چلانا بہت ہی مشکل تھا۔ آپ نے ہر علاقہ کے اولیار کرام کو اس علاقہ کی گوریلا تحریک کا انچارج بنا کر پورے ہندوستان کو مختلف یونٹوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس لئے انگریز سی آئی ڈی تحریک کے تمام شرکار کو دریافت نہ کر سکی۔

مولانا محمود الحسن کی روش ہمیشہ سب کو یکجا کرنے کی رہی۔ انگریزی دور میں کارکن حضرات اشاروں سے کام لیتے تھے۔ ریکارڈ کے بارے میں ہدایت ہوتی تھی کہ ہرگز نہ رکھا جائے۔ ۱۹۴۶ء تک یہی حالت رہی۔ اس لئے حضرت شیخ الہند کے کارکنوں کی تصویر کشی ناممکن ہے۔

چوتھا طبقہ :۔ جمعیۃ علمار کا چوتھا طبقہ ان حضرات کا ہے جو حضرت شیخ الہند کے رنگ میں رنگے گئے۔ کچھ عرصہ اس طبقہ کے سرگروہ حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رہے۔ آپ کے بعد ۳۲ سال مولانا حسین احمد مدنی اس طبقہ کے سرگروہ رہے۔ ۱۹۴۲ء تک اس طبقہ (جمعیۃ علمار) کی ایک ہی رائے ہوتی تھی لیکن اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی بعض اختلافات کی بنار پر دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے اور پھر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار فرمالی۔ اور مسلم لیگ کی مناسبت سے جمعیۃ علمار اسلام کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے لئے قانون اسلام پر عمل کرنے کے لئے ایک جدا وطن چاہتے تھے جو مسلم لیگ لے کر اٹھی تھی۔ ان کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے تاکید کی تھی کہ اگر ان کا پاکستان بننے سے پہلے انتقال ہو جائے تو انہیں اس جگہ دفن کیا جائے جہاں پاکستان بننا یقینی ہو۔

انہوں نے اور ان کے سب عظیم ساتھیوں نے اس ملک کے لئے پوری جدوجہد سے کام لیا۔ آپ شارح مسلم شریف مفسر قرآن اور جامع العلوم شخصیت رکھتے تھے اس پر مستزاد یہ کہ حسن تقریر و تحریر انتہا درجہ کا تھا۔ جب پاکستان بنا تو کراچی تشریف لے آئے۔ آپ میں دنیا طلبی قطعاً نہ تھی۔ بے حس قوم نے ان کے مرتبہ کو پہچانا اسلامی حکومت کے لئے قرارداد مقاصد پاس کرائی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کی وفات ہو گئی۔ اور کراچی میں مدفون ہوئے۔

دوسری طرف مولانا حسین احمد مدنی اور باقی سب علمار تھے۔ ان کا اس وقت یہ نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے نقل آبادی اور جدا وطن مناسب نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے قرارداد پاس کر کے یہ فارمولا پیش کیا کہ

"۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لئے کر دی گئی ہو باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵ - مسلمان ۴۵ - دوسری اقلیتیں ۱۰ ـــ

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہوں گے۔

اس فارمولے کے فائدے یہ ہوں گے کہ (و) اہم پورٹ فولیو (قلمدان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوگی۔ (ب) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جائے تو صوبہ کشمیر، پورا صوبہ پنجاب، کیمبلپور سے سہارنپور کی سرحد تک۔ پورا صوبہ بنگال، مسلم اکثریت کے زیر اقتدار ہوں گے۔ ہر طرح ہندوستان کے کل چودہ صوبوں میں سے پانچ صوبے ایسے ہوں گے۔ جہاں مسلم اکثریت کا اقتدار ہوگا۔ اور کشمیر سمیت پندرہ میں سے چھ صوبے ایسے ہوں گے (ج) صوبہ دہلی اور صوبہ آسام میں مسلمان ۴۴ فیصد ہیں۔ حکومت میں مسلمانوں کا حصہ مساوی کے قریب ہوگا۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ ۳۰ یا ۳۳ فیصد ہوگا۔ وزارتوں

جمعیۃ علمائے ہند کے اکابر اپنی جگہ کامل اخلاص کے حامل تھے۔ انہوں نے اپنے اسلاف کے طرز پر زندگی گذاری تھی۔ استبداد انگریز کے مقابلہ میں ساری عمر قید و بند کی

صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ مولانا آزاد ذہین ترین انسان تھے۔ تاحیات جمعیۃ سے تعلق رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پروردہ تھے۔ ان پر ان کی نظر شفقت رہی تھی انہوں نے اپنے نظریہ کے ناکام ہونے کے بعد نواب محمد وٹ کے ذریعے قائد اعظم سے کہلایا کہ وہ بنگال چھوڑ دیں اور پنجاب پورا لے لیں لیکن قائد اعظم نے فرمایا وہ کیا جانیں اور وہ کانگریس کو اس پر کیسے راضی کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر لیاقت علی خان کی زبانی کہلایا کہ میں کانگریس سے منوا لوں گا۔ کیونکہ اس علاقہ میں سکھوں کی اکثریت ہے اسے پاکستان میں داخل کر دیں۔ لیکن انہوں نے آکر جواب دیا کہ قائد اعظم منظوری کے دستخط کرا آئے ہیں۔ اس کے بعد قائد اعظم جو آہنی عزائم والے انسان تھے کتنے پریشان ہوئے اور مولانا آزاد نے ان سے ایک بار کہا تھا کہ آپ جلدی نہ کریں دس سال مل کر کوشش کریں گے تو نقشہ ہی بدل جائے گا۔ جس پر قائد اعظم نے فرمایا کہ دس سال بہت ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد نے کہا کہ قوموں کی قسمت کے فیصلوں کے لئے دس سال کا عرصہ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کے بارے میں کچھ روشنی راجہ صاحب محمود آباد کے انٹرویو سے پڑتی ہے۔ جو جناب مختار مسعود کے مجموعہ مضامین میں جس کا نام "آواز دوست" ہے۔ غالباً جولائی ۸۵ء میں چھپا ہے۔

فارمولے کی مذکورہ دستاویز سے اور اس کے ماسبق و مابعد عبارتوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان حضرات کا۔ یعنی جمعیۃ علما ہند اور مسلم لیگ مع جمعیت علما، اسلام کا اختلاف دراصل اس بارے میں تھا کہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے کونسی صورت زیادہ نفع بخش ہے۔ صوبائی خود مختاریاں دلائی جائیں تو بہتر رہے گا جس میں کلکتہ جیسا بڑا شہر مع قرب و جوار کے فولادی کارخانوں کے مسلم اکثریت کے تحت آجاتا ہے یا مسلمانوں کے لئے جدا حدود اور جدا وطن کا مطالبہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے زیادہ مفید ہے۔ لیکن جمعیۃ علما ہند انتخابات میں ناکام ہو گئی۔ اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت قرار پائی اور مملکت پاکستان معرض وجود میں آئی۔

لیکن جیسے کہ ایک مثال مولانا آزاد کے اخلاص کی دی گئی ہے اسی طرح جمعیۃ کے سب اکابر کا حال رہا۔ انہوں نے کبھی پاکستان کی مخالفت تو کیا کمزوری بھی نہیں چاہی۔ پاکستان کی مضبوطی سے ہندوستان کے مسلمانوں کی کمر مضبوط ہوتی ہے اور اس کی کمزوری سے وہاں کا مسلمان نڈھال ہو جاتا ہے کیونکہ اسلام کا رشتہ سب رشتوں پر غالب ہے۔

چنانچہ شیخ العرب والعجم صدر جمعیۃ علما ہند و صدر مدرس و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ "جب کسی نے ایک مجلس میں پوچھا کہ حضرت پاکستان کے لئے اب آپ کا کیا خیال ہے؟۔ تو حسب معمول سنجیدگی و بشاشت سے فرمایا کہ "مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے" (شیخ الاسلام نمبر روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء صدا کالم ۱ سطر ۶)

جمعیۃ علماء کے اس طبقہ نے طبقہ اول کی طرح اسلامی اقتصادیات کبھی تحریر کیں۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمان صاحبؒ سیکرٹری جمعیۃ علماء ہند نے اس عنوان پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کی مختصر فہرست ابواب یہ ہے (۱) اقتصاد و علم الاقتصاد (۲) معاشیات کے جدید نظریے (۳) اصول معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں (۴) انفرادی معیشت (۵) اجتماعی نظام معیشت (۶) بیت المال اور اس کے مصارف (۷) زراعت تجارت اور صنعت و حرفت (۸) مالگزاری خراج اور (۹) زمینداری (۱۰) ربا اور اس کے اقسام و احکام (۱۱) بینک کوآپریٹو سوسائٹیاں اور مضاربت (۱۲) کارنیں اجارہ داری کی کمپنیاں ملیں اور کارخانے (۱۳) زکوٰۃ صدقات وراثت اور اوقاف (۱۴) اسلامی نظام کا دیگر اقتصادی نظاموں سے موازنہ۔ (۱۵) ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء سے طبع ہوتی آ رہی ہے۔

اس کے بعد ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی جو دسمبر ۱۹۷۰ء میں دہلی سے طبع ہوئی۔ اس کا نام ہے "دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" یہ کتاب ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

سید صاحب کے مکاتیب میں جو انہوں نے سلاطین کے نام تحریر فرمائے یہ مضمون ملتا ہے کہ میں امام جہاد ہوں اور منصب امامت اور منصب سلطنت میں بہت فرق ہے۔ امام کا تقرر جہاد و بغاوت و فساد فرو کرنے کے لئے ہوتا ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ممالک پر قابض ہو جائے۔ مکاتیب سید احمد شہید مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لاہور ص۸۱ اس سے آگے دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

لہٰذا اس وقت کہ بلاد ہندوستان اہل کفر و طغیان کے تسلط سے بھر گئے ہیں میں نے اپنے وطن مالوف سے چل کر بہ نیت ہجرت و جہاد خراسان کی طرف رخ کیا ہے اس سے آگے ص۹۱ کی پشت پر ایک مکتوب میں ہے۔

میرا مقصود اصلی یہ ہے کہ ہندوستان میں جہاد کروں نہ یہ کہ دیار خراسان کو وطن بنا لوں۔

ص۱۹۹ پر قاضی مقرر کر کے اس کے فرائض بتاتے ہیں وہ یہ ہیں جھگڑے ختم کرنا۔ ان کے بارے میں فیصلے دینا۔ حدود شرعیہ اور تعزیرات کا نفاذ اقامت جمعہ و عیدین۔

بہرحال آپ نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے لئے کیا اور اپنے آپ کو امیر المؤمنین لکھا جو خاص اسلامی لقب ہے۔ اور خود کو اسی درجہ میں رکھا کہ دراصل آپ امام جہاد ہیں۔ اس صفحہ کی دوسری طرف متعدد قاضیوں کا اسلامی طریقہ پر تقرر کے فرامین دیئے گئے ہیں۔

سید صاحب کا مکتوب امامت کے متعلق سیرت سید احمد شہید میں [illegible] مطبوعہ خواجہ بک ڈپو لاہور پر دیا گیا ہے جو قابل دید ہے۔

اب تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سے بقیہ مسلمانوں کو نمایاں کیا [illegible] مکاتب قائم کئے گئے۔ ہندی رائج ہونے پر ہندی [illegible] ہندی [illegible] اس دور میں جمعیۃ کی خدمات کا تذکرہ مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علما ہند شیخ الحدیث و صدر مفتی مدرسہ [illegible] دہلی و رئیس [illegible] جامعہ قاسمیہ مراد آباد و ممبر عاملہ شوریٰ دار العلوم دیوبند نے جمعیۃ علما [illegible] [illegible] خدمات جمعیۃ علماء ہند کے نام سے چار حصے تحریر فرمائے ہیں۔ ان کی فہرست بھی اس انسائیکلو پیڈیا کے مختصر مضمون میں [illegible] ممکن نہیں [illegible] اللہ اجمعین۔

جمہوریت ایک طرز حکومت۔ یہ اصطلاح ترکی میں [illegible] عربی لفظ جمہور سے وضع کی گئی ہے [illegible] کے معنی [illegible] مجموعہ۔ مجمع عام یا عام طور پر سارے لوگ مراد لئے جاتے ہیں۔

جمہوریت کی اصطلاح پہلی مرتبہ فرانسیسی جمہوریہ کے بارے میں [illegible] جمہور کے مفہوم میں لوگوں کی اکثریت [illegible] فقہ میں یہ لفظ [illegible] معنی [illegible] ہوا ہے۔ یعنی جمہور علماء سے مراد علما کی اکثریت ہے۔

الماوردی کے قول کے مطابق اسلامی ریاست کے رئیس کے لئے [illegible]

کا اتفاق ضروری ہے مگر اسلامی ریاست کو قدیم ادب میں جمہوریت کسی نے نہیں کہا۔

جمہوریت کی اصطلاح مغربی افکار و علوم کی اشاعت کے بعد عام ہوئی۔ اور مسلمانوں کے ادب میں جمہوریت کا جدید مغربی تصور اس سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں اسلامی ریاست کے جمہوری اور غیر جمہوری ہونے کی بحث بھی پیدا ہوئی۔

چنانچہ یہ بحثیں بھی پیدا ہوئیں کہ اسلامی ریاست کو مغربی طرز کی جمہوریت کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ نیز خلفائے راشدین کی حکومت جمہوریت کے جدید مفہوم کے مطابق کس حد تک جمہوری تھی یا نہیں۔

بہت سے علماء نے اسے جمہوریت کہنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں مغربی جمہوریت کے وہ اصول بھی شامل ہو سکتے ہیں جنہیں اسلامی تصورات سے مطابقت نہیں ——

تحقیق کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی تصور ریاست بعض امور میں جدید جمہوری نظریے سے مماثلت رکھتا ہے اور بعض میں اس سے مختلف ہے۔

اسلام کو جمہوریت کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلا سے کچھ زیادہ ہی شدومد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہیئے اور قانون کی حکمرانی کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جاننے اور اس کو مؤثر بنانے کے لئے جو نظام اور ڈھانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں۔ اسلام تو مغربی جمہوریت کی مندرجہ ذیل باتوں سے اختلاف کرتا ہے۔

اسلام حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے۔ اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے۔ بنیادی قانون قرآن و سنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر سو فیصد افراد بھی قانون خداوندی کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اس کا اختیار نہیں۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے۔ یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے ان میں عوام اور ان کے نمائندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی و عمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے۔ ان میں تفصیلات طے کریں۔ اس طرح جمہور کی قانون سازی کے اختیار مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے حدود اختیار کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے۔ جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں جب کہ اسلام کے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور مسلمان اپنے معاملات اس کے مطابق طے کرتے ہیں۔

جمہوریت میں ہر لحظ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا برقرار رہتی ہے۔ اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے۔

"نیکی اور تقوے کے معاملات میں تعاون کرو اور برائی اور گناہ کے امور میں ہرگز تعاون نہ کرو۔" (۲:۵)

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

اسلام اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیئے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں آنحضور کا ارشاد مبارک ہے۔

"بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔" (بخاری و مسلم)

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود حکومت کے کسی عہدہ منصب کا طالب ہو۔" (ابوداؤد)

اسی طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب اختیار کے لیے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی۔

جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ جبکہ اسلامی ریاست ایک اصولی نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالمگیر ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ہمارے سامنے اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یعنی اس کا شورائی کردار اور جمہوری کردار آ جاتا ہے اور یہیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست اور مغربی طرز کی جمہوریت سے کن باتوں میں مختلف ہے۔

دراصل مغربی جمہوریت صرف شورائیت ہی نہیں اس کے جدید تصورات ایک سے زیادہ اور پیچ در پیچ ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار کے مطابق ڈیموکریسی جس کا جدید اردو، عربی اور ترکی ادب میں ترجمہ "جمہوریت" کیا گیا ہے "ایک ایسی طرز حکومت ہے جسے اپنے ہی لوگ چلا رہے ہوں اور جدید تر عمل کی رو سے آزاد انتخابی اور نمائندہ اداروں کے انتظام میں ہو اور اس کی ہیئت حاکمہ قوم کے سامنے جواب دہ ہو۔" مقالہ نگار مزید لکھتا ہے۔ "یہ ایک اسلوب حیات بھی ہے۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام افراد برابر ہیں اور ہر فرد کو زندہ رہنے کا برابر حق حاصل ہے اسی طرح ہر فرد کی آزادی مسلم ہو۔ اپنی زندگی خوشگوار بنانے میں ہر شخص آزاد ہو لیکن ان عقیدوں کے پس منظر میں اور ان کے نتیجے میں صدہا تصورات ایسے بھی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف پائے جاتے ہیں۔

اسلامی ریاست جہاں مغربی جمہوریت کے بعض پہلوؤں سے مماثلت رکھتی ہے وہاں وہ جمہوریت سے کئی لحاظ سے مختلف بھی ہے۔ اور اپنا مخصوص مزاج اور اپنی مخصوص شعوریات کی حامل ہے جس میں اسلام کے باقی احکامات کی طرح اعتدال و وسط پسندی اور امتزاج عناصر کی صفات موجود ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تمدنی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ تصور افراط و تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے بنی نوع انسانی کے مصالح کی بہتر کفالت کر سکتا ہے۔

جو علماء اسلامی ریاست کو جمہوریت کہنا مناسب خیال نہیں کرتے وہ اپنے نظریے کے حق میں مندرجہ ذیل دلائل دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی ریاست نیابت الٰہی ہے وہ ایک طرف زمین پر خدا کی نیابت کرتی ہے تو دوسری طرف خدا کے بندوں کی۔

۲۔ اسلامی ریاست کا دستور اساسی وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ چنانچہ بنیادی قوانین قرآن و سنت نے مہیا کر دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے بنیادی قوانین کی حد تک یہ حکومت قانون سازی نہیں کر سکتی۔ البتہ جن معاملات میں قرآن و سنت خاموش ہیں اور معاملہ محض کاروباری اور تمدنی ہے۔ بہیئت حاکمہ (امیر یا امام) یا شوریٰ قیاس و اجماع

کے ذریعے قانون بنا سکتی ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست میں شوریٰ کے طریقے حالات کے تحت مختلف ہو سکتے ہیں جیسا کہ خلافت راشدہ کے تجربوں سے معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ اسلامی ریاست میں امیر یا امام مستقل ہوتا ہے لیکن اصولاً مستقل اس لئے نہیں کہ اسے شرعی اسباب کی بنا پر عدم اعتماد کی وجہ سے معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اسلامی ریاست میں امام اھل العقد والحل کی رائے پر عمل کرتا ہے۔ لیکن امام ان کی رائے کو مسترد کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔

۶۔ امام اکثریت کے فیصلے کا پابند نہیں لیکن اکثریت کے فیصلے کو شرعی جواز کے بغیر مسترد نہیں کر سکتا اسے اپنے مؤقف کے بارے میں دلائل دینا پڑتے ہیں۔

۷۔ اسلامی ریاست مساوات کے سلسلے کا کامل نمونہ ہے۔ مغربی تصور مساوات کے مقابلے میں ارفع، اکمل اور معقول تر ہے۔

۸۔ اسلامی ریاست میں شریعت کے تابع آزادی رائے اور آزادی عمل کا اصول موجود ہے۔ لیکن یہ آزادی بنیادی عقائد اسلامی کے خلاف استعمال نہیں کی جا سکتی۔

۹۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلامی ریاست کے بنیادی تقاضوں سے متفق ہو کر شہری حد تک ان کی تکمیل میں متفق و متحد ہوں۔

جمیل بن نخلۃ المدور (۱۲۶۹ھ/۱۸۶۲ء - ۱۳۲۵ھ/۲۶ جنوری ۱۹۰۷ء) ایک عرب صحافی اور ادیب۔ المدور تخلص تھا۔ بیروت میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک علمی گھرانے میں پرورش پائی۔ یہی وجہ اس کے ادیبانہ رجحانات کو ترقی دینے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی۔

اس نے نہ صرف عربی علوم کی تحصیل کی بلکہ بیروت یونیورسٹی میں فرانسیسی زبان و ادب کی تعلیم بھی پائی۔ لیکن جلد ہی اس کا میلان تاریخ میں مشرق قدیم کی اقوام کے مطالعے کی طرف ہو گیا۔ وہ بہت سے رسالوں کا مدیر رہا۔ ان رسائل میں "الجنان" اور "المقتطف" اور ایک بین الاقوامی اخبار "المؤید" شامل ہیں۔

اس کا انتقال قاہرہ میں ہوا۔ اس کی تصانیف میں "حضارۃ الاسلام فی دار السلام" بہت مشہور و معروف ہے۔ اس کتاب کا شمار جدید عربی فکر کی ایک دستاویز کی حیثیت سے موجودہ دور کی اہم ترین تصانیف میں کیا جا سکتا ہے "حضارۃ الاسلام" میں بنو عباس کے خلیفہ المنصور سے لے کر ہارون الرشید تک کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں قدیم اسلامی تاریخ اور ثقافت کے حوالے بھی آ گئے ہیں۔

اس کی ایک اور تصنیف "تاریخ بابل و اشور" ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور تصنیف "کتاب التاریخ القدیم" ہے۔

جن چھپے ہوئے۔ پوشیدہ۔ جس لفظ میں جیم اور نون کا مادہ ہو گا اس میں پوشیدگی و استتار ملحوظ ہو گا۔ مثلاً جنت (کیونکہ وہ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے) اس لئے جنت کہلاتی ہے۔ جنون کیونکہ عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

جنین پیٹ والے بچے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ماں کی رحم میں پوشیدہ ہوتا ہے جنان کا اطلاق دل پر اس لئے کرتے ہیں کہ وہ پوشیدہ اور اس کے خیالات چھپے ہوتے ہیں۔ جُنّہ، ڈھال کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی آڑ میں چھپا لیتی ہے چنانچہ جن الله کی اس مخلوق پر بولا جاتا ہے جو لطافت مادہ کے سبب حس بصر (دیکھنے کی قوت) سے پوشیدہ رہتی ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں جن ایک غیر مرئی مخلوق ہے۔ بعض کے نزدیک ملائکہ بھی جنوں میں شامل ہیں۔ بعض کے نزدیک تمام ملائکہ جن ہیں۔ لیکن تمام جن ملائکہ نہیں ہیں جنوں کی تخلیق کس طرح ہوئی یا ان کی کیا حقیقت ہے۔ اس بارے میں مفسرین نے قرآن مجید کی ان آیات کی بنا پر جن میں یہ لفظ آیا ہے۔ اس مخلوق کے بارے میں بہت سے تصورات قائم کئے ہیں۔

امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ "یہ بخار یا آگ سے بنے ہوئے ذوی العقول ہمارے حواس سے غیر محسوس، مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے والے اور عظیم و دشوار کاموں کے انجام دینے کے قابل اجسام ہیں۔" اور ان کے ساتھ کی دوسری ذوی العقول ہستیوں کو نور اور مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ جن نجات [illegible] حاصل کر سکتے ہیں، وہ مزید لکھتے ہیں۔ "آنحضور ان کی طرف بھی اسی طرح مبعوث ہوئے ہیں جیسے بنی نوع انسان کے لیے ان میں سے کچھ جنت میں داخل ہوں گے اور کچھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔"

اسلامی عقائد میں جن کا وجود متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ [illegible] قائم ہے۔ حتیٰ کہ معتزلہ میں سے بھی صرف چند ہی نے ان کے وجود میں شک کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے بھی ان کے متعلق مختلف نظریات [illegible] ہیں۔

مولانا مودودی اپنی تفسیر میں "خلق الجان من مارج من نار" کے ضمن میں رقمطراز ہیں۔

"نار سے مراد ایک خاص نوعیت کی آگ ہے نہ کہ وہ آگ جو [illegible] پیدا ہوتی ہے اور مارج کے معنی ہیں خالص شعلہ جس میں دھواں [illegible] انسان مٹی سے بنایا گیا پھر تخلیق کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے [illegible] گوشت کے زندہ بشر کی شکل اختیار کی اور آگے اس کی نسل نطفہ سے چلی [illegible] جن خاص آگ کے شعلے یا آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا گیا اور بعد میں [illegible] جنوں کی نسل پیدا ہوئی۔ ان کا وجود بھی [illegible] ہم محض تودہ خاک نہیں ہیں اسی طرح وہ بھی محض شعلۂ آتش نہیں ہیں۔"

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ جن [illegible] خاص نوعیت کے مادی جسم رکھتے ہیں [illegible] شیطان اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے جہاں [illegible] (۲۷) اسی طرح جنوں کا سریع الحرکت ہونا ان کا [illegible] ان مقامات پر پہنچ [illegible] نفوذ [illegible] نفوذ نہیں کر سکتے تو ان کا نفوذ [illegible] اور ناقابل فہم ہیں کہ وہ فی الاصل [illegible] مخلوق [illegible]

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ [illegible] آگ نوعیت کی مخلوق ہیں بلکہ ان کا مادہ تخلیق [illegible] انسان [illegible] سے قطعی مختلف ہے۔

جن بھی انسانوں کی طرح ایک فنا ہو جانے والی مخلوق ہیں۔ [illegible] جنات بھی ایک ذی اختیار مخلوق ہیں یعنی انہیں بھی انسانوں کی طرح [illegible] انتخاب کی آزادی ہے۔ اور جزا و سزا کے مکلف ہیں۔

جن اگرچہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے [illegible] سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاء اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو نہیں سن سکتے [illegible]

ہے۔ جو ری چھپے سن گن لیں تو شہاب ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔

مشرکین عرب کا خیال تھا کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں یا خدائی اسرار تک انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ انہیں خدا کا شریک ٹھہراتے تھے۔ ان کی عبادت کرتے تھے اور ان کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے ان عقائد کی تردید کی ہے۔

"پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔" (۱۴ : ۳۴)

عربوں میں جنات کے لئے ان کے اوصاف کی بنا پر چند نام دیئے جاتے تھے

۱۔ عامر (ہمزاد) جو جن آدمیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

۲۔ ارواح :۔ جو لڑکے بالوں کو ستاتے ہیں۔ (اہل ہند انہیں بھوت یا آسیب کہتے ہیں۔)

۳۔ شیطان :۔ جو خبیث اور سخت تکلیف دینے والے ہوتے ہیں۔

۴۔ مارد :۔ جو شیطانوں سے بھی زیادہ سرکش ہوتے ہیں۔

۵۔ عفریت :۔ یہ مارد سے زیادہ قوی ہوتے تھے۔

۶۔ ہاتف :۔ جنگلوں میں چیخنے چلانے اور آواز دینے والوں کو کہتے ہیں۔

۷۔ رجال الغیب :۔ یہ مسافروں کو راہ بھلا دیتے ہیں۔

۸۔ شہابہ :۔ یہ بیابانوں میں کبھی ایک لشکر اور مشعل وغیرہ سے چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔

۹۔ چھلاوہ :۔ رات میں اور بعض اوقات دن میں اجاڑ جنگلوں میں کبھی چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی صورت میں دکھلائی دیتے ہیں اور پھر دفعتاً کسی اور شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ جنوں کا ایک گروہ آنحضورؐ سے قرآن سن کر ایمان لایا تھا اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرتا تھا۔

"اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے۔) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے انہوں نے جا کر کہا "اے ہماری قوم کے لوگو ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی۔ رہنمائی کرتی ہے حق ہے اور راہ راست کی طرف اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو۔ اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تمہارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا۔ اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا۔" (۴۶ : ۲۹ تا ۳۱)

معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کم از کم چھ وفود آئے تھے۔

جن مسلم اور کافر دونوں قسم کے ہیں۔ کافر جن زیادہ شریر اور مشکل سے قابو میں آنے والے سمجھے جاتے ہیں۔

جنات میں نر اور مادہ دونوں صفتیں موجود ہیں اور یہ اکٹھے مل کر رہتے ہیں۔ جیسا کہ امام مالک... کے فتوے سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اہل یمن نے ان سے ایک فتویٰ معلوم کیا تھا کہ ایک جن مرد ایک انسان عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

امام مالک نے اس کے جواب میں کہا کہ اس میں کوئی برائی تو نہیں لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ ایک عورت حاملہ پائی جائے تو وہ کہہ دے کہ یہ حمل جن کی طرف سے ہے۔ اور اسلام میں فتنہ بڑھے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جنات کی سرگرمیاں رات کے وقت ہوتی ہیں اور صبح جیسے ہی مرغ پہلی بار بانگ دیتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

کیا جن جنت میں جائیں گے اور کیا جنوں کو ثواب ملے گا۔ اس سوال کے جواب میں امام ابوحنیفہ سے تین قول ثابت ہیں۔

پہلا قول تو یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی ثواب نہیں سوائے اس کے کہ وہ آگ سے نجات پائیں گے اور پھر انہیں حکم ہوگا کہ دوسرے حیوانات کی طرح مٹی ہو جائیں اور وہ نیست ہو جائیں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جن بھی اہل جنت میں سے ہوں گے۔ مگر دخول جنت سے بڑھ کر انہیں کوئی ثواب نہ ملے گا۔

تیسرا قول توقف کا ہے کہ گو جنوں کے عذاب اور آگ میں جانے کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مگر ان کے بہشت میں جانے کا کوئی ذکر نہیں نہ ان نعمائے حاصل کرنے میں ان کا ذکر ہے جو اہل جنت کے لئے ہیں۔

امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے کہ جنوں کو طاعت پر ثواب ملے گا اور وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

جنابت

جنابت حدث کبیر دوری بے گانگی، شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ نجاست ہے جو قضاء شہوت سے یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو جنب کہتے ہیں۔ ایسا شخص صرف غسل سے یا بامر مجبوری تیمم ہی کے ذریعے پاک ہو سکتا ہے۔

جنبی شخص کے لئے نہ تو نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور نہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر سکتا ہے۔ نہ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے۔ (مگر مجبوری کی حالت میں جائز ہے) اور نہ قرآن پاک کو چھو سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

"اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک کہ غسل نہ کر لو۔ الا یہ کہ راستہ سے گذرتے ہو۔" (۴ : ۴۳)

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے فقہا اور مفسرین میں سے ایک گروہ نے یہ مراد لی ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیئے۔ الا یہ کہ کسی کام کے لئے مسجد میں سے گذرنا ہو۔

بعض دوسرے حضرات نے اس سے مراد سفر لیا ہے یعنی اگر آدمی حالت سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے تو تیمم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک جنبی وضو کر کے مسجد میں بیٹھ سکتا ہے۔ اس رائے کو حضرت علیؓ، ابن عباس، سعید بن جبیر نے اختیار کیا ہے۔ اس بارے میں تقریباً تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالت سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔

جنابت سے متعلق قرآن میں ایک اور مقام پر آیا ہے۔

"اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔ . . . . . اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو۔" (۶ : ۷)

جنابی، ابوسعید (ر ـــ ؟ ـــ ۳۰۱ھ/۹۱۳ء) مشرقی عرب میں قرامطہ کے اقتدار کا بانی۔ حسن بن بہرام۔ جنابہ میں پیدا ہوا جو فارس کا ساحلی قصبہ تھا۔ بائیں پاؤں سے لنگڑا تھا۔ بصرے میں آٹے کی سوداگری کرتا تھا۔ اس نے قرامطی ہونے کی وجہ سے جنوبی ایران میں داعی کے فرائض انجام دیئے۔ یہاں پر اسے حکومت کے خوف سے چھپ کر رہنا پڑتا تھا۔ بعد میں اسے بحرین خاص میں بھیجا گیا۔ جہاں اس نے ایک بڑے گھرانے میں شادی کر لی۔ یہاں پر اس کے مریدین میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

اس نے ۲۸۶ھ/۸۹۹ء میں بحرین کے ایک بڑے حصے کو اپنے زیر تسلط کر لیا۔ قطیف پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

۲۸۷ھ/۹۰۰ء اس کے مددگار بحرین کے صدر مقام ہجر کے قریب بڑی تعداد میں جمع ہو کر بصرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خلیفہ المعتضد نے اس کے مقابلے کے لیے دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بھیجا۔ ابوسعید کے لوگوں نے اس لشکر کو بری طرح شکست دی اور تقریباً ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں ابوسعید نے طویل محاصرے اور شہر کا پانی بند کر دینے کے بعد ہجر پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں یمامہ پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے عمان پر حملہ کر دیا۔ ۳۰۰ھ/۹۱۳ء میں اس کی فوجوں نے ایک بار پھر بصرے کے ضلع پر حملہ کر دیا۔ لیکن ایک غلام نے اسے کئی دوسرے سرداروں سمیت قتل کر دیا۔

اس کے مرنے کے بعد اس کے سات بیٹوں میں سے سعید تخت نشین ہوا۔ پھر چند سال بعد ابوطاہر جو اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا تخت پر بیٹھا۔

ابوسعید کے مرنے کے بعد اس کی عزت و تکریم بہت زیادہ کی جانے لگی۔ اس کے بارے میں اس کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آئے گا۔ اور اسی خیال کے سبب اس کے مقبرے کے دروازے پر ایک گھوڑا جس پر زین کسا ہوتا تھا ہر وقت تیار کھڑا رہتا تھا۔

بحرین کے قرامطہ نے اسی کے نام پر اپنا نام ابوسعیدی رکھا۔ اور بعد میں یہاں کی جمہوریہ کا جو دستور بنا اس کو بھی ابوسعید کے نام ہی سے موسوم کیا گیا۔

جنابی، ابوطاہر (رمضان ۲۹۴ھ/جون ۹۰۷ء) بحرین کا حکمران۔ سلیمان ابن ابوسعید۔ بحرین کی ریاست کے مشہور ترین حکمرانوں میں سے تھا۔ یہ کچھ عرصے تک حجاج اور زیریں عراق کے باشندگان کے لیے خطرہ بنا رہا۔ ابوطاہر ان قرامطہ کا جو ۳۱۱ھ/۹۲۳ء شبخون مار کر بصرے میں گھس گئے تھے سردار تھا۔

۳۰۵ھ/۹۱۷ء میں اس کے بڑے بھائی سعید کو معزول کر کے بقول ابن خلدون عبیداللہ فاطمی کے فرمان کے مطابق اسے حاکم بنا دیا گیا تھا۔

۳۱۱ھ/۹۲۳ء میں بصرے پر حملہ ہوا اسی سال کے آخر میں ابوطاہر نے حجاج کے قافلے پر جو مکہ معظمہ سے الہبیر واپس آ رہا تھا حملہ کر دیا۔ امیر قافلہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اسے اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا۔

اسی موقع پر ابوطاہر نے اپنے ایک قاصد کو بغداد بھیج کر اس کے ذریعے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ بصرہ، اھواز اور کچھ اور علاقے قرامطہ کو دیئے جائیں۔ جب اس کا یہ مطالبہ رد کر دیا گیا تو اس نے ۱۲-۳۱۳ھ/۹۲۵-۹۲۷ء میں حجاج پر دوبارہ حملہ کر دیا اور کوفے کو لوٹا۔ خلیفہ نے اس کے خلاف یوسف ابی الساج کو ایک بڑی فوج دے کر بھیجا لیکن یوسف گرفتار ہو گیا۔ ابوطاہر دریائے فرات کے کنارے بڑھتے ہوئے انبار جا پہنچا اور وہاں سے دریا پار کر کے بغداد پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ یہاں سے ناکام ہو کر ابوطاہر نے شمال کی طرف رُخ کیا اور راحبہ، قرقیسیا اور رقہ پہنچ کر وہاں کے باشندوں سے زرفدیہ وصول کیا۔ ۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں واپس بحرین پہنچا اور یہاں پر الاحساء کے قریب جو اس کا دارالحکومت تھا ایک "المومنیہ" نام سے ایک دارالہجرۃ تعمیر کرایا۔

۷ ذوالحجہ ۳۱۷ھ/۱۱ جنوری ۹۳۰ء کو ابوطاہر نے اس وقت جب حجاج جمع تھے۔ مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ اس نے مسجد حرام میں حجاج کا قتل عام کرایا اور خانہ کعبہ کی تمام قیمتی اشیاء لوٹ لیں۔ اور مسلسل سات روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ واپسی میں حجر اسود نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔

۳۱۸ھ/۹۳۰ء میں اس کا عمان پر قبضہ ہو گیا۔ ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں اس نے عراق کو فتح کرنے کی دوبارہ کوشش کی لیکن کوفے سے آگے اس کی رسائی نہ ہو سکی اور قرامطہ تقریباً پچیس روز تک کوفے میں لوٹ مچاتی کرتے رہے۔

ان حالات میں حج کرنا چونکہ ناممکن ہو گیا تھا۔ اس لیے خلیفہ الراضی کے رئیس الحجاب محمد بن یاقوت نے ۳۲۲ھ/۹۳۴ء میں ابوطاہر سے گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ خلیفہ کا اقتدار تسلیم کرے اور حجاج سے تعرض کرنا چھوڑ دے نیز حجر اسود کو اس کے مقام پر واپس کر دے۔ اور اس کے بدلے میں ان علاقوں کی حکومت جو اس نے فتح کر لئے ہیں باضابطہ طور پر سند دے دی جائے گی۔ اگرچہ ابوطاہر نے سوائے حجر اسود کی واپسی کے تمام باتیں منظور کر لیں لیکن ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں اس نے دوبارہ حجاج پر حملہ کیا خلیفہ نے فوجی دستوں کو کوفے اور قادسیہ کے درمیان شکست دی۔ بحرین واپس آنے سے پہلے کچھ عرصے کے لئے کوفے پر قابض رہا۔

۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں بالآخر کوفے کے ایک علوی کے ذریعے ابوطاہر اور خلیفہ کے درمیان یہ بات طے پائی کہ حج دوبارہ جاری ہو سکتا ہے بشرطیکہ ۲۵ ہزار یا ایک لاکھ بیس ہزار دینار بطور خراج اور راستے کی حفاظت کے لیے محصول ادا ہوتا رہے چنانچہ یہ رقم قرامطہ حجاج سے باقاعدہ وصول کرتے رہے لیکن عراق کے جنوبی حصے میں ان کے حملے ختم نہیں ہوئے۔

ابوطاہر نے اڑتیس سال کی عمر میں چیچک کے عارضہ سے انتقال کیا۔

جنابی، ابومحمد ایک مورخ مصطفیٰ ابن حسن بن سنان الحسینی الہاشمی امیہ الامامیہ کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا کئی ایک شہروں میں تعلیم حاصل کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کئی ایک شہروں میں علمی کے دائرے انجام دیتا رہا۔ کچھ عرصے کے لیے حلب میں قاضی کے عہدے پر بھی فائز رہا۔

اس کی شہرت ایک تاریخی کتاب کے لکھنے سے ہوئی۔ جو اس نے دسویں صدی ہجری سولھویں صدی عیسوی میں عربی زبان میں تاریخ کے موضوع پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا نام العلیم الزاخر فی احوال الاوائل والاواخر۔ یہ کتاب عام طور پر تاریخ [illegible]

کے نام سے مشہور ہے۔

اس کتاب کے بیاسی باب ہیں اور ہر باب میں ایک مسلمان حکمران خاندان کا بیان ہے۔

جنابی نے خود ہی اس کا عربی سے ترکی زبان میں ترجمہ اور خلاصہ تیار کیا تھا۔

جناحیہ ایک گروہ جنہیں الطیاریہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت جعفر بن ابو طالب کے پرپوتے عبداللہ بن معاویہ کے خاص طرفدار تھے۔ اگرچہ یہ خاندان اہل تشیع حضرات کی نظروں میں حضرت جعفر ان کے بیٹے اور ان کے پوتے بہت محترم اور قابل عزت ہیں۔ لیکن اس خاندان سے کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت وابستہ نہیں ہوئی تھی۔ ۱۲۷ھ/۷۴۴ء میں عبداللہ بن معاویہ بنوامیہ کے خلاف شیعوں کی ایک عام بغاوت میں ان کی قیادت سنبھالی۔

اگرچہ عبداللہ بن معاویہ کی وسیع جماعت میں کچھ عرصہ تک شیعہ حضرات بھی شریک رہے۔ اور وہ سیاسی طور پر بڑے سرگرم عمل تھے۔ اور کچھ خوارج بھی تھے لیکن جناحیہ اور الطیاریہ کے لفظ کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے۔ جن کی امامت کے واحد حقدار عبداللہ بن معاویہ تھے۔ اس جماعت کے لوگوں کے دعوے کے مطابق ابوہاشم بن محمد بن الحنفیہ نے امامت بنوعباس کی بجائے عبداللہ بن معاویہ کے حوالے کی تھی جو اس موقع پر نہایت کم سن تھے۔ اور ان کی دیکھ بھال صالح بن مدرک کے سپرد تھی۔

ان لوگوں کے نزدیک امام علم غیب رکھتا ہے۔ نیز جو امام کو پہچانتا ہے وہ باقی فرائض سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن معاویہ کے انتقال کے بعد بعض جناحیہ کا یہ دعوے تھا کہ وہ اصفہان کے پہاڑوں میں چلے گئے ہیں اور کسی علوی کو حکومت دلانے کے لئے واپس آئیں گے۔ بعض جناحیہ نے اسحاق بن الحارث کو اپنا امام مان لیا تھا

جنازہ جنز کے معنی چھپایا، ڈھانپا۔ چارپائی پر ڈالی ہوئی نعش، میت تابوت یا میت مع تابوت۔

مردے کو کفنانے کے بعد چارپائی پر یا جو چیز چارپائی کے مثل ہو اس پر ڈال کر اس طرح لے کر چلنا کہ اس کے چاروں کونے چار مرد کاندھوں پر رکھ کر لے چلیں سنت ہے لیکن اگر اٹھانے والوں کی تعداد کم ہو تو جتنے بھی جنازہ اٹھا کر چلیں جائز ہے

جس وقت جنازہ لے کر چلیں تو مستحب ہے کہ پہلے دس دس قدم چاروں طرف سے لیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب جنازہ اٹھالیں تو ایک شخص اٹھانے والوں میں سے اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلے پھر اسی سمت سرہانے سے پاؤں کی طرف دائیں کندھے پر ہی رکھ کر دس قدم چلے۔ اس کے بعد بائیں کندھے پر جنازے کی دوسری طرف سرہانے کی طرف دس قدم لے کر چلے۔ اور پھر اسی طرف میت کے پاؤں والی سمت بائیں کندھے پر دس قدم لے کر چلے۔ یہ کل چالیس قدم بنتے ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان چالیس قدموں کے عوض چالیس گناہ کبیرہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ جنازے کو باری باری ایک دوسرا اپنے کندھے پر لیتا ہوا چلے جنازہ لے کر چلتے ہوئے جلد چلنا چاہیئے لیکن اس قدر تیز نہیں چلنا چاہیئے کہ دوڑنے کا گمان ہو اور جنازے کو حرکت اور تکلیف پہنچے۔

جنازے کے پیچھے چلنا بہتر ہے آگے چلنا بھی جائز ہے۔ بہت آگے پیچھے نہیں چلنا چاہیئے بلکہ قریب چلنا چاہیئے۔ جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے والے اپنے دلوں میں خدا کا خوف کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں اور موت کو یاد کرتے غمناک صورتیں بنا کر دل میں گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے چلیں اور دنیا کی باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے نہ چلیں

جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کلمہ، درود یا قرآن مجید یا کوئی اور ذکر الٰہی اونچی آواز سے پکار کر پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

جنازے کے ساتھ چلتے وقت سواری پر سوار ہو کر چلنا خلاف حرمت ہے۔ اگر کوئی شخص بمجبوری امر سوار ہو کر چلے تو اسے جنازے کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ آنحضورؐ ایک جنازے کی مشایعت میں نکلے آپؐ نے کچھ لوگوں کو سوار دیکھ کر فرمایا "کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ خدا کے فرشتے تو پاپیادہ چلتے جاتے ہیں اور تم چوپاؤں کی پیٹھ پر چڑھے جا رہے ہو۔ (ترمذی)

جنازہ، نماز میت کی نماز، اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ جنازے کی نماز فرض کفایہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے انکار کرے تو کافر ہو جائے گا۔ اور ایک مسلمان نے بھی نماز پڑھ لی تو سب چھوٹ جائیں گے

ابن مسعود سے روایت ہے کہ نماز جنازہ کا نہ کوئی وقت معین ہے نہ اس کی تکبیرات کی خاص تعداد مقرر ہے۔ "اوسط" میں ہے کہ آپ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات تکبیریں بھی کہی ہیں اور پانچ بھی اور چار بھی۔ لہٰذا جب تم کسی کو امام جنازہ بناؤ تو جتنی تکبیریں وہ کہے تم بھی کہو۔ (انتخاب حدیث از جعفر شاہ)

نماز جنازہ کی صحت کی نو شرطیں ہیں۔

۱۔ مسلمان ہونا میت کا اور نماز پڑھنے والے کا۔ ۲۔ میت اور مصلی (نمازی) کا پاک ہونا جنابت اور بے وضو ہونے سے اور تمام ناپاک چیزوں سے اگر جنازہ کی نماز با جماعت پڑھیں تو فقط امام اور میت کی طہارت شرط ہے۔

۳۔ میت اور مصلی کا لباس پاک ہونا چاہیئے۔ ۴۔ میت اور نمازی کا پاک ہونا۔ ۵۔ میت اور مصلی کا ستر عورت چھپانا۔ ۶۔ میت کا زمین یا اس چیز پر رکھنا جو شرع میں زمین کے مثل ہو۔ نمازی کے روبرو۔ ۷۔ امام کا بالغ ہونا۔ ۸۔ کھڑا ہونا نماز پڑھنے والے کا قبلہ کے رُخ۔ ۹۔ نیت کرنا مصلی کی نماز کے خاص واسطے اللہ تعالےٰ کے دعا واسطے اس میت کے۔

مصلی اس طرح کہے نیت کرتا ہوں چار تکبیر نماز جنازہ واسطے اللہ کے درود واسطے رسول اللہ ہے۔ دعا واسطے اس میت کے منہ طرف قبلہ شریف کے اور اگر مقتدی ہو تو یہ بھی کہے پیچھے اس امام کے اللہ اکبر۔ جنازے کی نماز کے دو ارکان ہیں ۱۔ چار تکبیریں کہنا۔ ۲۔ نماز میں کھڑا ہونا ترکیب نماز یہ ہے۔

نیت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ثنا پڑھے۔

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ ط

پاک ہے تو اے اللہ اور ساتھ تعریف اپنی کے اور برکت والا ہے تیرا نام اور بلند ہے۔ شان تیری اور تیری تعریف بڑی ہے اور نہیں ہے معبود سوائے تیرے۔

پھر دوسری تکبیر پڑھے اور آنحضورؐ پر درود شریف پڑھے جو درود بھی یاد ہو پڑھ لے مثلاً اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ وَسَلَّمْتَ وَبَارَكْتَ وَرَحِمْتَ وَتَرَحَّمْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ط

الٰہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آل پر رحمت بھیج۔ جس طرح تو نے رحمت بھیجی اور سلام بھیجا اور برکت دی اور مہربانی کی اور رحم کیا، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی آل پر، بے شک تو تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔

پھر تیسری تکبیر کہے اور دعا پڑھے اس نماز میں کوئی دعا مقرر نہیں۔ جو دعا یاد ہو پڑھ لے لیکن جو دعا حدیث شریف میں آئی ہے اس کا پڑھنا افضل ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَكَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَاُنْثَانَا، اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ۔

اے اللہ بخش ہمارے زندہ کو اور ہمارے مردہ کو اور ہمارے حاضر کو، اور ہمارے غائب کو اور ہمارے چھوٹے کو اور ہمارے بڑے کو اور ہمارے مرد کو اور عورت کو۔ اے اللہ جس کو زندہ رکھے تو ہم میں سے پس زندہ رکھ اس کو اوپر اسلام کے، اور جس کو فوت کرے تو ہم میں سے پس فوت کر اس کو اوپر ایمان کے۔

اگر میت نابالغ اور مجنون کی ہو جو عبادت کے مکلف نہیں تو نابالغ لڑکے کے لئے اور مجنون مرد کے لئے یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا وَّاجْعَلْهُ لَنَا اَجْرًا وَّذُخْرًا وَّاجْعَلْهُ لَنَا شَافِعًا وَّمُشَفَّعًا ط۔

اے اللہ بنا اس کو واسطے ہمارے پیش رو اور بنا اس کو واسطے ہمارے اجر اور ذخیرہ اور اس کو واسطے ہمارے سفارش کرنے والا اور اس کی سفارش قبول فرما۔

نابالغ لڑکی اور مجنون عورت کے لئے یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا لَنَا فَرَطًا وَّاجْعَلْهَا لَنَا اَجْرًا وَّذُخْرًا وَّاجْعَلْهَا لَنَا شَافِعَةً وَّمُشَفَّعَةً ط

اے اللہ بنا اس کو واسطے ہمارے پیش رو اور بنا اس کو واسطے ہمارے اجر اور ذخیرہ اور بنا اس کو واسطے ہمارے سفارش کرنے والی اور اس کی سفارش قبول فرما۔

پھر دعا پڑھنے کے بعد چوتھی تکبیر کہہ کر دائیں طرف منہ پھیر کر السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہے اور پھر بائیں طرف منہ پھیر کر یہی کلمہ کہے۔

پہلی تکبیر میں کانوں تک ہاتھ اٹھانا ضروری ہے باقی تکبیروں کے دوران میں ہاتھ اٹھانا موافق مذہب مختار کے درست نہیں۔

نماز میں میت کے سینے کے برابر امام کا کھڑا ہونا مستحب ہے۔ نیز نماز میں تین صفیں بنانا مستحب ہیں اگر سات آدمی ہوں تب بھی تین صفیں بنانی چاہئیں۔ کیونکہ آنحضور کا فرمان ہے۔ "جس شخص پر تین صف آدمیوں نے نماز پڑھی تو اللہ تعالٰے اس کو بخش دے گا۔"

نماز جنازہ میں برخلاف دوسری نمازوں کے سب سے پچھلی صف میں کھڑا ہونے کا ثواب بہت زیادہ ہے۔

اگر بہت سے جنازے اکٹھے ہوں تو ہر جنازے کی علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ اگر اکٹھی نماز پڑھ لیں تو بھی جائز ہے۔

اگر جنازوں میں مرد عورتیں اور نابالغ سب جمع ہوں تو مردوں کو سب سے پہلے رکھیں خواہ آزاد ہوں یا غلام۔ اس کے بعد نابالغوں کو رکھیں اور انکے بعد عورتوں کو رکھیں۔

جناونی، ابو عبیدہ جبل نفوسہ کا حکمران۔ عبد الحمید، جو تاہرت کے اباضی اماموں کی طرف سے جبل نفوسہ کا والی تھا۔ اجناون کے گاؤں کا باشندہ تھا۔ یہ علاقہ شہر جادو کے جنوب میں واقع تھا۔ جناونی کو ۱۹۶ھ / ۸۱۱ء میں امام عبد الوہاب بن عبد الرحمان بن رستم کے جبل نفوسہ کے قیام کے دوران تو میں بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اسی شہرت کے سبب ابوالحسن ایوب کے انتقال کے بعد یہاں کے باشندوں نے جناونی کو اپنا والی اور حکمران چن لیا۔ عبد الوہاب کی وفات (۲۰۸ھ / ۸۲۳ء) سے ذرا پہلے اسے باقاعدہ تقرری بھی حاصل ہو گئی تھی۔

اس کے زمانہ ولایت میں مسلسل جنگ کی وجہ سے بڑا خلل پیدا ہوا۔ جناونی کو یہ جنگ شمالی افریقہ کے ایک سابق اباضی امام ابوالخطاب عبد الاعلیٰ کے پوتے خلف بن السمح کے خلاف لڑنا پڑی۔ بالآخر جناونی اس جنگ میں کامیاب ہوا۔

جناونی ایک عالم و فاضل شخص تھا وہ بربری زبان کے علاوہ عربی اور کاؤ کی زبان سے بھی واقف تھا۔ اس کا شمار ان بارہ شخصیات میں ہوتا ہے جن کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ان شخصیات کو "مستجاب الدعواۃ" کہا جاتا ہے۔ یہ شخصیات دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر اور تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اوائل میں جبل نفوسہ میں آباد تھیں۔ ان شخصیات کا مستقر اجناون ہی تھا جو جبل نفوسہ کا کچھ عرصے کے لئے سیاسی اور مذہبی مرکز بن گیا تھا۔

جَنْبٌ پہلو جمع جنوبٌ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے۔ (۳ : ۱۹۱)

جنب سے فعل دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک سمت مخالف کو جانا۔ دوسرے سمت موافق کو آنا۔ صاحب بالجنب کے معنی قریبی دوست کے ہیں۔

جارِ الجُنُب اس پڑوسی کو کہتے ہیں جو اجنبی شخص پڑوس میں رہتا ہو۔ قرآن میں یہ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (نیز دیکھئے "پڑوسی")

وہ شخص جس پر غسل واجب ہو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا

"جب تم حالت جنابت میں ہو تو غسل کر لو۔" (۵ : ۶) (نیز دیکھئے "جنابت")

جَنَبَہ عمان کے سرکردہ قبائل میں سے ایک قبیلہ [illegible] جنبہ کو عمان کے بدوی قبائل میں سب سے زیادہ [illegible] موجودہ دور میں بھی اس قبیلے کی تعداد [illegible] دروع اور آل وھیبہ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

اس قبیلے کے بڑے بڑے حصے [illegible]

مجاعلہ، فوارس، آل وحیان، آل ابو غالب [illegible] پر برتری حاصل ہے۔ اس گروہ کا سردار [illegible] حمود ہے۔

جنبہ ایک وسیع و عریض علاقے پر آباد [illegible] جاتے ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔

مشرق میں یہ لوگ خلیج عمان میں صور کے مقام پر ساحلوں [illegible] چلے گئے ہیں۔ یہاں بو علی ان کے شریک ہیں۔ ساحل [illegible] جازر کی حد تک [illegible] کی آبادی بحری امور سے خاص دلچسپی رکھتی ہے [illegible] بعض باشندوں نے تاجروں کی حیثیت سے [illegible] حاصل کی ہیں۔

[illegible] گروہ کے خانہ بدوش اونٹوں اور بکریوں کے بڑے بڑے گلوں کے [illegible] سردیوں میں یہ لوگ ساحلوں پر ڈیرے جما لیتے ہیں اور گرمیوں میں [illegible] گیری بھی بہت سے افراد کا پیشہ ہے۔ جو [illegible]

جنبہ کا دوسرا گروہ جو [illegible] سے بنیادی طور پر مشتمل ہے۔ [illegible] سے بعض لوگوں کی کچھ نہ کچھ املاک بھی ہیں۔ قبیلے کا سردار [illegible]

دارالحکومت سمجھا جاتا ہے۔ کچھ اراضی کا مالک ہے۔
اس گروہ کا دل پسند سلسلۂ کوہ، اور شہر ادم کی نواحی وادیاں کوہستان دردع کے مشرق میں واقع ہیں۔
جنبہ کا تعلق غافری فریق سے ہے یہ لوگ دہیبہ کے خلاف ہیں۔ دردع کے حلیف ہیں اگرچہ اب ان قبائل کی باہمی عداوت پہلے جیسی شدید نہیں رہی۔
جعلان جنبہ بنی بوعلی کے حلیف ہیں۔ جنبہ عقیدے کے لحاظ سے سنی ہیں اباضی عقائد ان کے ہاں فروغ نہ پا سکے۔ اگرچہ اباضی امام کی یہ لوگ عزت وتکریم ضرور کرتے ہیں

جنت باغ۔ نیک انسانوں کا مرنے کے بعد دائمی گھر۔ جنت ہر اس باغ کو کہتے ہیں جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ بعض کے نزدیک ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوتے ہوں اور بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے اور یا اس لئے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کے اس ارشاد سے ظاہر ہے۔
"کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے" (۳۲ : ۱۷)
جنت کی جمع جنات ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنات لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہے۔
۱۔ جنت الفردوس۔ ۲۔ جنت عدن۔ ۳۔ جنت النعیم۔ ۴۔ دارالخلد ۵۔ جنت الماوٰی۔ ۶۔ دارالسلام۔ ۷۔ علیین۔
بعض اہل تحقیق نے بہشت کے آٹھ درجات قائم کئے ہیں۔ جو یہ ہیں
۱۔ عدن۔ ۲۔ جنت الماوٰی۔ ۳۔ فردوس۔ ۴۔ نعیم۔ ۵۔ دارالقرار ۶۔ دارالخلد۔ ۷۔ دارالسلام۔ ۸۔ دارالجلال۔
محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہ کے لئے ہیں لیکن آٹھواں دیدار حق تعالیٰ کے لئے لیکن دیدار حق کے لئے کونسا درجہ ہے اس بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس کے نزدیک یہ مقام علیین ہے جب کہ بعض کے نزدیک مقعد صدق ہے۔
علامہ زمخشری صاحب "کشاف" نے جنت کے نام اس ترتیب سے بیان کئے ہیں۔
"دارالخلد، دارالمقام، دارالسلام، جنت عدن، دارالقرار، جنت نعیم جنت الماوٰی، جنت فردوس۔"
علامہ موصوف نے سورۃ الذاریات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عدن کو زمرد سبز سے بنایا گیا ہے۔ اس میں سخی وعادل ونمازی وزاہد اور آئمہ مساجد رہیں گے۔
جنت الماوٰی کو نور سے تیار کیا گیا ہے اور یہ مقام ہے شہید حقیقی، حیزات کرنے والوں، غصہ کھانے والوں اور تقصیروں کے معاف کرنے والوں کا۔
فردوس کو جلال کبریائی کے نور سے بنایا ہے۔ اس میں انبیاء علیہم السلام رہیں گے۔ اس کے درمیان ایک غرفہ نور رضا کا بنایا ہے۔ اسے مقام محمود کہتے ہیں۔ آنحضورؐ اس میں تشریف رکھیں گے۔
نعیم کو زبرجد سبز سے بنایا ہے۔ اس میں شہید حکمی اور موذن رہیں گے۔
دارالقرار کو مروارید روشن سے بنایا ہے۔ اس میں عام مومنین رہیں گے۔
دارالسلام کو یاقوت سرخ سے بنایا ہے۔ اس میں فقیر، صابر اس امت کے رہیں گے۔

دارالجلال زر سرخ سے بنا ہے۔ اس کو دارالمقام بھی کہتے ہیں۔ اس میں اس امت کے اغنیاء شاکر رہیں گے۔
قرآن مجید میں صیغہ واحد وتثنیہ وجمع میں یہ لفظ ایک سو انچاس مرتبہ آیا ہے۔ بعض جگہوں پر اضافتوں کے ساتھ بھی آیا ہے۔ مثلاً جنۃ النعیم، جنۃ الخلد جنت عدن، جنۃ الماوٰی۔
قرآن مجید میں اس لفظ کے لئے اور دوسرے الفاظ جو استعمال کئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں۔
فردوس، روضہ، دارالخلد، دارالمقامہ، دارالسلام
قرآن پاک میں آنے والی زندگی کے اس دائمی اور غیر فانی گھر کو جو ہر قسم کے آزار اور پریشانی سے پاک ہوگا، باغ (جنت) کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ان لوازم کا بھی ذکر موجود ہے جن سے ہم اس مادی زندگی میں مانوس ہیں۔ مثلاً باغ، مرغزار، آب رواں، گل وثمر، عمدہ مشروبات وملبوسات وغیرہ۔
مفسرین کے ایک گروہ نے ان کی لفظی تعبیر کی ہے لیکن ایک اور گروہ اسے مجاز، استعارہ سمجھتا ہے۔
بقول مولانا سید سلیمان ندوی "ان کی حقیقت بالکل وہی نہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں۔ بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند واتم ہوں گی۔
بعض حضرات کے نزدیک قرآنی آیات سے جنت کے بارے میں جو تصور قائم ہوتا ہے، وہ مثالی ہے۔ یعنی جنت نکوکاروں کے اس گھر سے عبارت ہے جس میں انسانوں کی اعلیٰ تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہوں گی۔ جنت کی ایک صفت خلود بھی ہے یعنی اس گھر میں پہنچ کر لوگ ایسی مسرتوں سے بہرہ مند ہوں گے جنہیں زوال نہیں آئے گا۔ یہاں کی مسرتیں غم وحزن کی آلائشوں سے پاک ہوں گی یہ ایسی پاکیزہ جگہ ہوگی جس میں کینہ، بغض، حسد، رشک اور لغویات کا گذر تک نہ ہوگا۔ وہ امن وسلامتی کا گھر ہوگا۔ مقام رحمت ہوگا۔ مقام نور اور مقام رضوان مقام طیب وطاہر، مقام تسبیح وتہلیل، مقام قرب خداوندی اور مقام نعمت دیدار ایزدی۔
قرآن مجید میں جنت کے بارے میں جو آیات ہیں ہم ذیل میں ان کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جن سے جنت کے تصور کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔
"مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنستر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے۔ جسے پی کر نہ ان کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں۔ اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ہوگی ...... وہ بے خار بیریوں اور تہ بہ تہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے

اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن ۔" (۵۶ : ۱۵ تا ۳۷)

"اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا ۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ۔ نہ انھیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر ۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی ۔ اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں) ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے ۔ شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہوگا ۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی ۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے ۔ ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں بکھیر دیئے گئے ہیں ۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سر و سامان نظر آئے گا ۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے ۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے ۔ اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا ۔" (۷۶ : ۱۲ تا ۲۱)

قرآن مجید کی طرح احادیث میں بھی جنت کا بکثرت ذکر آیا ہے ۔ ذیل میں احادیث اور مفسرین کے بعض نکات جو جنت کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں درج کئے جاتے ہیں ۔ کیونکہ پوری تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہو سکتا ۔ یہ نکات زیادہ تر طبرانی اور شعرانی نے بیان کئے ہیں

جنت عام طور پر بلند ترین آسمان کے اوپر اور عرش الٰہی کے نیچے بتائی جاتی ہے جنت کے مختلف طبقات یا مقامات تک پہنچنے کے لئے آٹھ بڑے دروازے ہیں ہر طبقہ اپنی جگہ عموماً درجوں میں منقسم ہے ۔ بلند ترین درجے کو جو ساتویں آسمان پر یا اس سے بھی ماوراء ہے عدن اور فردوس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔

ان دروازوں کے کھولنے کی چابی کے تین دندانے ہیں ۔ جو ایک حدیث میں بیان ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں ۱ ۔ توحید کا اقرار ۲ ۔ اطاعت خداوندی ۔ ۳ ۔ تمام غیر شرعی کاموں سے احتراز ۔

آنحضورؐ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے ۔ فرشتے نہایت عمدہ اور سریلے نغموں کے ساتھ ان نیک بندوں کا استقبال کریں گے ۔ عربی یہاں کی زبان ہو گی ۔ پھر یہاں پر ان لوگوں کی ضیافت ہوگی ۔ نیز احادیث میں ایک ایک کھانے کا حال بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔ بعد میں انہیں مکانوں کی طرف لے جایا جائے گا جو ان سے پہلے ہی تیار کئے گئے ہیں ۔ جنت پہلے ہی سے موجود ہے ۔ جنت میں مومنین کو رویت باری تعالیٰ نصیب ہوگی ۔

ایک حدیث میں جو عبادہؓ بن صامت سے مروی ہے ۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ بہشت کے سو درجے ہیں اور ہر درجے کی مسافت مقدار مسافت ارض و سما ہے اور اعلیٰ درجہ فردوس ہے اور اسی پر عرش ہے اور وہ بہشت میں درمیان کی چیز ہے اور اسی سے چار نہریں جاری ہیں ۔ سو تم جب اللہ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو ۔ اس لئے کہ بہشت اعلیٰ درجہ ہے ۔

معتزلہ ان افعال خداوندی کو جنہیں شرعی اصطلاحوں میں پیش کیا گیا ہے استعارہ سمجھتے ہیں لیکن جنت کی حسی لذات کا مفہوم لفظی لے کر اس میں تمثیل کے انداز پیدا کرتے ہیں ۔ مثلاً ان کے نزدیک جنت کے پھل اس دنیا کے پھلوں کی طرح ہیں ۔ نیز معتزلہ لقاء ۔ رویت الٰہی کا انکار کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں جنت اس وقت موجود نہیں ہے ۔ بلکہ وہ قیامت کے وقت تخلیق کی جائے گی ۔

ان کے مقابلے میں دوسرے متکلمین یعنی اشاعرہ کے نزدیک جنت ابدی ہے ۔ ان کے نزدیک جنت کی لذتوں کا دنیوی خوشیوں کے ساتھ کوئی مشترک معیار نہیں بلکہ وہ ان کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں اور وہ ایک مختلف نوعیت کی ہیں ۔

جنت البقیع

جنت البقیع مدینہ منورہ کا قبرستان ۔ یہ قبرستان مسجد نبوی سے مشرق کی سمت واقع ہے ۔ معمولی رفتار سے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا راستہ ہے ۔ پہلے زمانے میں یہاں تک پہنچنے کے لئے بہت سے ٹیلوں سے گذرنا پڑتا تھا لیکن اب حکومت نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی کھلی پختہ سڑک بنا دی ہے ۔ اس راستے کی وجہ سے بقیع میں آنا جانا بہت زیادہ آسان ہو گیا ہے

جنت البقیع کا قبرستان زمانہ جاہلیت سے اہل مدینہ کا قبرستان چلا آ رہا ہے عثمانیوں کے دور میں یہاں بھی بہت سی پختہ قبریں اور ان پر خوبصورت قبے بنے ہوئے تھے لیکن نجدی حضرات نے شریف حسین کو شکست دے کر جب مدینہ منورہ پر قبضہ کیا تو یہاں کے اکثر قبے گرا دیئے اور قبریں توڑ دیں لیکن پھر بھی پختہ قبروں کی کچھ تعداد اب بھی موجود ہے ۔

اس قبرستان کی فضیلت میں کئی ایک احادیث مروی ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص مدینہ میں مرے اور بقیع میں دفن کیا جائے ۔ وہ میری شفاعت سے ممتاز ہوگا ۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے آنحضورؐ زمین سے اٹھیں گے پھر آپ کے بعد ابوبکر صدیقؓ ۔ ان کے بعد عمر فاروقؓ اور ان کے بعد اہل بقیع اور پھر اہل مکہ اٹھیں گے ۔

حدیث میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ دو مقبرے ایسے ہیں جن کی روشنی آسمان پر ایسی ہے جیسی کہ زمین پر چاند سورج کی ۔ ایک تو مقبرہ بقیع ہے اور دوسرا مقبرہ عقلان ۔

اس قبرستان میں بے شمار صحابی مدفون ہیں ۔ مسلمانوں میں سے جنت البقیع میں سب سے پہلے دفن ہونے والوں میں حضرت عثمان بن مظعون ہیں ان کے بعد سیدنا ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی قبرستان میں دفن کئے گئے ۔

جب جنت البقیع میں زیارت کے لئے جائے تو سنت یہ ہے کہ بقیع کے دروازے پر پہنچ کر السلام علیکم یا اہل القبور کہے اور یہ دعا پڑھے ۔

اللهم اغفر لاهل بقيع الغرقد اللهم [illegible] بعدهم واغفرلنا ولهم نیز اس دعا سے پہلے یا اس کے بعد کئی مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب اہل مقبرہ کی ارواح کو ہدیہ کرے ۔ سلام کی نیت اور مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ جمیع آل و اصحاب اور مومنین جو اس قبرستان میں آرام فرما ہیں انہیں ثواب پہنچے ۔

پھر اپنا منہ آنحضورؐ کی پھوپھی کی جانب کرے جو بقیع کے دروازے کے متصل بائیں جانب مدفون ہیں اور زیارت ختم بھی انہیں پر کر لی جائے ۔ اس بارے میں بعض علماء کا اختلاف ہے کہ کس قبر سے زیارت کی ابتدا کرے ۔ اہل گروہ کے نزدیک حضرت عباسؓ اور ائمہ اہل بیت سے جو لوگ آپ کے قبہ میں مدفون ہیں ان سے ابتدا کرے کیونکہ یہ قبہ قریب ہے اور یہاں سے گذر کر دوسروں کی زیارت کی طرف متوجہ ہونا ایک قسم کی بے ادبی ہے ۔ نیز وہ گروہ اپنی دلیل میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اہل مدینہ کا یہی عمل تھا ۔

دوسرا گروہ کے نزدیک زیارت کی ابتدا حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سے کرے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی بہنیں مدفون ہیں اور چونکہ یہ آپؐ کے جزو شریف اور آپ کے ٹکڑے ہیں اس لیے دوسری کو ان پر مقدم کرنا مناسب نہیں۔
بعض علمار کے نزدیک حضرت عثمانؓ بن عفان سے زیارت کی ابتدا کرے اس لیے کہ آپ اہل بقیع میں افضل ہیں۔
اسی طرح بعض علمار نے اس سے مختلف آرار کا اظہار بھی کیا ہے۔

جندرلی عثمانی ترکوں میں علما اور سیاست دانوں کا ایک خاندان۔ یہ خاندان ۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء تا ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء تک ممتاز و نمایاں رہا۔ اس خاندان سے پانچ افراد وزیر اعظم بنے۔ پرانے ماخذوں میں اس خاندان کا نام چندرلی اور جندرلی ہے۔ اس خاندان کے مشہور افراد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خیر الدین خلیل بن علی:- جو قرہ خلیل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ یکے بعد دیگرے ازنک اور برسہ کا قاضی رہا۔ مراد اول نے مسند نشینی کے بعد جلد ہی اسے قاضی عسکر کے عہدے پر مقرر کیا۔ غالباً ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں اسے وزیر بنا دیا گیا۔ وہ پہلا وزیر تھا جسے ملکی نظم و نسق کی نگرانی کے ساتھ فوج کی قیادت بھی دی گئی تھی وہ سرزمین تھریس، مقدونیہ اور تھسلی کی فتوحات میں بھی برابر شریک رہا۔ کرمان کی جنگ کے دوران میں اسے سلطان مراد نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے روم ایلی میں متعین رکھا۔ جہاں ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں وفات پاگیا۔ اس کا بیٹا الیاس "بیگلربیگی" ہوا۔ جس نے بایزید اوّل کے عہد میں انتقال ہوا۔

۲۔ علی پاشا:- اس نے بھی وزیر اعظم کے طور پر مراد اوّل، بایزید اوّل اور امیر سلیمان کی خدمات انجام دیں۔ اس نے ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں انتقال کیا۔

۳۔ ابراہیم پاشا:- ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں برسہ کا قاضی تھا۔ ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں قاضی عسکر بنا۔ ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء کی ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں وہ وزیر دوم تھا۔ مراد ثانی جب خلیفہ بنا تو بایزید پاشا (وزیر اعظم) تخت کے مدعی مصطفی کے ہاتھوں مارا گیا۔ تو ابراہیم اس کی جگہ وزیر اعظم بنا اور مرتے دم تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس نے بعارضہ طاعون ۲۴ ذیلقعدہ ۸۳۲ھ/۲۵ اگست ۱۴۲۹ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنے دور میں ایک محتاط اور دانشمندانہ خارجی حکمت عملی اختیار کی۔

۴۔ خلیل پاشا:- ابراہیم پاشا کا بڑا لڑکا تھا۔ ۸۴۷ھ/۱۴۴۳ء تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں اس نے مراد کو دوبارہ تخت نشین کرانے میں جو کردار ادا کیا نیز بزنطی شہنشاہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کے نتیجے میں محمد ثانی نے ناراض ہو کر فتح قسطنطنیہ کے بعد ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں اسے قتل کرا دیا۔

۵۔ ابراہیم پاشا:- خلیل پاشا کا لڑکا تھا۔ ۸۳۳ھ/۱۴۳۰ء میں پیدا ہوا جب خلیل سلطان کی نظروں میں معتوب ہوا تو اس وقت ابراہیم ادرنہ کا قاضی تھا۔ اور ۸۶۹ھ/۱۴۶۵ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ بعد میں قاضی عسکر بنایا گیا ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء تک وہ سلطان بایزید کا للہ (وزیر کے منصب کے ساتھ) تھا۔ بایزید ثانی نے اپنی تخت نشینی کے بعد ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں روم ایلی کا قاضی عسکر بنایا۔ لیکن اگلے سال ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء میں وزیر اعظم بنا۔ لیکن اس کے دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔
ابراہیم پاشا کے بعد جندرلی خاندان میں پھر کوئی اس منصب پر فائز نہ ہو سکا اور یہ خاندان معرض گمنامی میں پڑ گیا۔

جندی، ابوعبداللہ (۔۔۔؟ ۔۔۔ ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء) یمن کے شافعی فقیہہ اور مورخ۔ بہاؤ الدین محمد بن یعقوب بن یوسف اس کا تعلق یمن کے شہر ظفار سے تھا۔ ابوعبداللہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ زبید میں گذارا اور یہیں پر اس کا انتقال ہو گیا۔
اس کی تصانیف میں سے جو محفوظ رہ گئی ہیں ان میں "کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک" ہے۔ یہ کتاب یمن کے علماء اور خصوصاً فقہا کی سوانحی قاموس ہے اس میں شہروں کے لحاظ سے شخصیات کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مقدمے میں جو بڑا طویل ہے آنحضورؐ سے لے کر ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء تک ملک کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس مقدمے کو یمن کے مورخین نے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بلکہ کئی ایک مورخین نے تو اسے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔
ابوعبداللہ کی دوسری تصنیف "سلوک" ابھی تک مکمل طور پر طبع نہیں ہو سکی اس کے تاریخی مقدمے کے ایک حصے کی جس کا تعلق یمن میں فاطمی داعیوں سے ہے۔ ایچ۔ سی۔ کای نے اپنی کتاب Yaman its early Mediaeval History میں ترتیب دی ہے اور ترجمہ کیا ہے۔

جندیشاپور خوزستان کا ایک شہر۔ جندیشاپور کی بنیاد ساسانی بادشاہ شاپور اول نے رکھی تھی۔ اس شہنشاہ نے اس شہر میں یونانی قیدیوں کو بسایا تھا۔ اس شہر کو یونانی زبان میں Beth Lapat کا نام دیا گیا ہے جو بگڑ کر بیل آباد ہو گیا ہے۔
اس شہر کے محل وقوع کی نشاندہی شاہ آباد کے کھنڈرات کرتے ہیں
مسلمانوں نے اس شہر پر ۱۷ھ/۶۳۸ء بلکہ زیادہ ترصحیح ۶۳۸ء میں تستر پر فتح حاصل کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس شہر کی فتح کا سہرا ابوموسیٰ اشعریؓ کے سر ہے۔ یہاں کے باشندوں نے شرائط طے کرنے کے بعد بغیر لڑے ہتھیار ڈالے تھے۔
یہ شہر یعقوب بن لیث الصفار (۲۶۲ھ/۸۷۵ء تا ۲۶۳ھ/۸۷۷ء) کا دار الحکومت تھا۔ یعقوب کے دور کے چند آثار اس شہر کی نشاندہی کرتے ہیں۔
اس شہر کی شہرت زیادہ تر اس کے ثقافتی مرکز بنے رہنے کی وجہ سے ہے جس نے اسلام میں علمی و عقلی سرگرمیوں کو متاثر کیا۔ اس کی شہرت میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ اضافہ ہوا کہ اس سے طب کا گہرا تعلق تھا اور یہ شہر طب یونانی کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔
جندیشاپور میں ایک ہسپتال تھا جس میں یونانی طریق علاج اور بزنطی ہسپتالی طریق علاج کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاج کی بنیاد تنہا علمی طب پر رکھی ہوئی تھی ہارون الرشید نے جس چوتھے ہسپتال کی بنیاد رکھی تھی اسے جندیشاپور کے اطبار نے تعمیر کیا تھا اور وہی اس کو چلاتے تھے
اس شہر میں ایک طبی مدرسہ بھی تھا۔ مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی طب پر جندیشاپور کا اثر ہارون الرشید کے عہد حکومت میں اس وقت باقاعدہ طور پر پڑنا شروع ہو گیا تھا جب جندیشاپوری اطباء نے بغداد میں سکونت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔
روایات میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ عرب کے طبیب حارث بن کلدہ نے جو آنحضورؐ کے زمانہ مبارک میں تھا۔ اس نے اسی شہر میں طب پڑھی تھی۔
جندیشاپور کو بلاشبہ نسطوریوں نے ایک اہم طبی مرکز کی شکل میں بدل دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جندیشاپور کی طبی تعلیم کو اسکندریہ اور انطاکیہ کی طبی تعلیم کے نمونے پر

ڈھالا گیا ہو۔
اس شہر کا مطالعہ اس نظر سے بھی کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا مقام ہے جس کے ذریعے الرھا اور نسی بس کے یونانی علم کی میراث بغداد میں پہنچی۔

جنگی اصول

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ "ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرنے آمادہ ہوں۔"
اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مدافعانہ جنگ کی ہدایت دیتا ہے۔ لیکن سورۃ نساء میں ارشاد ہے۔
"تم کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جن بستیوں کے لوگ ظالم ہیں۔"
اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام صرف مدافعانہ جنگ کی تعلیم ہی نہیں دیتا بلکہ مظلوم کی حمایت میں لڑنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ وہ دنیا میں صلح و امن کا خواہشمند ہے۔ جنگ و جدل کا نہیں لیکن جہاں انسانوں پر ظلم و ستم ہو ان کو نجات دلا کر امن و سکون کی زندگی سے بہرہ ور کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے وہ صرف اس صورت میں جارحیت کی اجازت دیتا ہے۔ جب کہ ظلم کا ازالہ پر امن طریقوں سے نہ ہو سکے۔
بلاشبہ جنگ ایک فتنہ ہے لیکن ظالموں کو ان کے مظالم سے نہ روکنا بہت بڑا فتنہ ہے۔ ان حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔
زمانہ جاہلیت میں جنگ کی حیثیت ایک قومی پیشہ کی سی تھی۔ ذرائع معاش کی قلت، ضروریات زندگی کی کمیابی اور اجتماعی نظم و ضبط کے فقدان سے عربوں میں جنگجوئی کی عادت اس قدر پختہ اور راسخ ہو گئی تھی کہ وہ قتل و خون ریزی اور لوٹ مار کو اپنی خصوصیات، بلکہ مفاخر میں شمار کرنے لگے تھے۔
جب اسلام کا جھنڈا اس دنیا میں بلند ہوا تو اس نے اور دوسرے معاملات کی طرح جنگ کے معاملے میں بھی اصلاح کا علم بلند کیا۔ اس نے حقیقت جنگ کو بدل کر بالکل ایک نیا نظریہ پیش کیا جس سے اس وقت کی دنیا نا آشنا تھی۔
اس نے اپنی تعلیمات کے ذریعے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرائی کہ جنگ و قتال فی الاصل ایک معصیت ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہیے لیکن جب دنیا میں اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم و فساد پھیل جائے اور سرکش و گمراہ لوگ اللہ کی مخلوق کے امن و سکون کو خطرے میں ڈال دیں تو محض دفع شر کے لیے جنگ کرنا ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتا ہے۔
لیکن چونکہ اس کے نزدیک جنگ کا اصل مقصد اپنے حریف کو ہلاک کرنا یا نقصان پہنچانا نہیں بلکہ محض فساد اور فتنے کو دفع کرنا ہے اس لیے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جنگ میں صرف اتنی ہی طاقت استعمال کرنی چاہیئے جتنی دفع شر کے لئے ناگزیر ہو۔ نیز اس کا استعمال صرف انھی افراد کے خلاف ہونا چاہیئے جو عملاً برسرپیکار ہوں یا زیادہ سے زیادہ جن سے شر کا اندیشہ ہو۔
چنانچہ اسلام نے اپنے اس پاکیزہ تصور کے تحت جنگ کے بارے میں ایک مکمل ضابطہ اور لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ جنہیں ہم اسلامی اصول جنگ یا اسلامی قوانین جنگ کا نام دے سکتے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

قتال اور غیر اہل قتال کی تقسیم:- اسلام اس سلسلے میں سب سے پہلے جو اصول پیش کرتا ہے وہ مسلمانوں سے برسرپیکار گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک طبقے کو وہ اہل قتال کا نام دیتا ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔
دوسرا طبقہ جسے اسلام غیر اہل قتال کا نام دیتا ہے۔ اس میں وہ انسان شامل ہیں جو عقلاً و عرفاً اور عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی اندھے، لنگڑے لولے مجنون، خانقاہ نشین اور معبدوں کے مجاور وغیرہ اسلام نے پہلے طبقے کو تو جنگ میں قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن دوسرے طبقے کو قتل کرنے اور ان سے تعرض کرنے سے منع کیا ہے۔
آنحضورؐ نے فرمایا۔
"نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو۔ اموال غنیمت میں چوری نہ کرو۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو۔ نیکی و احسان کرو۔ کیونکہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"
حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آنحضورؐ جب کہیں فوج بھیجتے تھے تو ہدایت کر دیتے تھے کہ معابد کے بے ضرر خادموں اور خانقاہ نشین افراد کو قتل نہ کرنا۔
فقہاء نے اس حکم سے یہ استنباط کیا ہے کہ وہ تمام لوگ جو رشتہ سے معذور ہیں یا عادتاً معذور کے حکم میں آتے ہیں قتال سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن یہ استثناء اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ عملاً جنگ میں حصہ نہ لیں۔ اگر ان میں سے کوئی عملاً جنگ میں شرکت کرے۔ مثلاً بیمار، پلنگ پر بیٹھے بیٹھے فوجوں کو جنگی چالیں بتا رہا ہو یا عورت غنیم کی جاسوسی کا کام کر رہی ہو یا بچہ خفیہ خبریں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا مذہبی طبقہ کا کوئی فرد دشمن کو جنگ کا جوش دلا رہا ہو تو اس کا قتل جائز ہے
اس کے ساتھ ہی اسلام اہل قتال کے بارے میں بھی چند ایک اصول بتاتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔
بے خبری اور غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز یعنی رات کے آخری حصے میں جب لوگ بے خبر سو رہے ہوں۔ آنحضورؐ نے اس فعل قبیح کی ممانعت فرمائی۔ دیتا عدہ نو کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔
حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ آنحضورؐ جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے۔
آگ میں جلانے سے ممانعت:- اکثر جنگوں میں فریقین غصے اور شدت انتقام سے پاگل ہو کر اپنے دشمنوں کو زندہ جلا دیتے تھے۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ "آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے اور کسی کو سزاوار نہیں۔"
باندھ کر قتل کرنے کی ممانعت:- اسلام نے دشمنوں کو باندھ کر قتل کرنے اور تکالیف پہنچا پہنچا کر جان لینے سے منع فرمایا ہے۔
حضرت ابوایوب انصاری سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے قتل صبر (باندھ کر مارنے) سے منع فرمایا۔
لوٹ مار کی ممانعت:- اسلام اس بات سے بھی منع کرتا ہے۔
فتح خیبر کے موقع پر آپ فرمایا۔ "خدا کی قسم میں جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہوں اور جو امر و نہی کے احکام دیتا ہوں وہ بھی قرآن کی طرح یا اس سے زیادہ ہیں۔ اللہ نے تمہارے لیے یہ جائز نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھس جاؤ ان کی عورتوں کو مارو پیٹو اور ان کے پھل کھا جاؤ۔ حالانکہ ان پر جو کچھ واجب تھا وہ تمہیں دے چکے۔"
اسی طرح ایک مرتبہ جہاد میں اہل لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ جب آنحضورؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے ہنڈیاں الٹ دیں

اور فرمایا لوٹ کھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔

دشمن کے علاقے کی بربادی و تباہ کاری کی ممانعت :۔ اگرچہ افواج کی پیشقدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی جنگ کے معمولات میں سے ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں یہ پسندیدہ بات نہیں۔ اسلام اس چیز کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ اس بات کی ممانعت کرتا ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ نے شام اور عراق کی طرف فوجیں بھیجتے ہوئے انہیں جو ہدایات جاری کیں ان میں سے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا اور فصلوں کو خراب نہ کرنا۔

مثلہ اور نعشوں کی بے حرمتی کی ممانعت :۔ اسلام نے جنگ کے اصولوں میں یہ بھی ایک اصول قرار دیا ہے کہ دشمن کی نعشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ نہ ان کے اعضاء کو کاٹا جائے۔

حضرت عبداللہ بن یزید انصاری سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ کے مال اور مثلہ سے منع فرمایا۔

قیدیوں کے قتل کی ممانعت :۔ جیسا کہ آنحضورؐ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا تھا۔ "کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے۔ کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ امان میں ہے۔"

لیکن اسلام کا یہ اصول اسیران جنگ کے بارے میں عام طور پر ہے۔ اسلامی حکومت کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ اگر کوئی جو اسلام کا شدید دشمن ہو یا جس نے مسلمانوں پر انتہائی مظالم ڈھائے ہوں یا وہ ائمہ شر و فساد ہوں کبھی جنگ میں ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان کے قتل کا حکم دے سکتی ہے جیسا کہ غزوہ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی محیط کو قتل کیا گیا تھا۔

قاصد اور سفیر کے قتل کی ممانعت :۔ اسلام قاصدوں اور سفیروں کے قتل سے بھی منع کرتا ہے۔ جب آنحضورؐ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کا قاصد اس کا گستاخانہ پیغام لے کر آیا تو آپ نے فرمایا۔ "اگر قاصدوں کا قتل کرنا ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔"

ایفائے عہد کا حکم :۔ نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی ممانعت میں بے شمار احادیث ہیں۔ اسلام نے اس فعل کو بدترین فعل قرار دیا ہے۔

آنحضورؐ نے فرمایا "ہر غدار و عہد شکن کی بے ایمانی کا اعلان کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا۔ جو اس کے غدر کا ہم قدر ہوگا۔" ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا "جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت گذر نہ جائے۔ یا پھر اگر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختم معاہدہ کی اطلاع دے دے۔"

اس کے علاوہ اسلام نے بدنظمی اور انتشار سے بھی منع کیا ہے جو کہ جاہلیت کے دور کی روش تھی کہ جب عرب جنگ کے لئے نکلتے تو راستے میں جو کوئی ملتا اس کو تنگ کرتے اور جب کسی منزل پر اترتے تو سارا راستہ روک لیتے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر آپ نے منادی کرائی۔

"جو کوئی منزل کو تنگ کرے گا یا راہ کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں ہوگا۔"

اسی طرح آپ نے شور و ہنگامے سے بھی باز رہنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ

ایک موقع پر ہم آنحضورؐ کی معیت میں تھے اور جب کسی وادی پر پہنچتے تھے تو زور شور سے تکبیر و تہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے۔

اس پر آنحضورؐ نے فرمایا "لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے۔"

چنانچہ اسلام نے یہ جنگی اصول بیان کر کے جنگ کو ان تمام وحشیانہ افعال سے پاک کر دیا جو اس عہد میں جنگ کا ایک غیر منفک جزو بنے ہوئے تھے اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جس میں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم ممکن نقصان پہنچا کر اس کے سر کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔

جنگلی ایران کی ایک قومی اور اصلاحی تحریک۔ یہ تحریک میرزا کوچک خان، احسان اللہ خان اور کئی دوسرے آزاد خیال اور آئین پرست افراد کی زیر قیادت ۱۹۱۵ء میں گیلان کے جنگلوں میں وجود میں آئی۔ جن لوگوں نے اس تحریک میں حصہ لیا انہیں جنگلی کہتے ہیں۔

ان کا نعرہ خارجی اثر و نفوذ سے آزادی اور اسلام کے جھنڈے تلے ایران کی آزادی تھا۔ ان لوگوں نے "اتحاد اسلام" کے نام سے ایک خاص انقلابی جماعت قائم کی۔

انہوں نے "جنگل" نام کا ایک اخبار بھی جاری کیا تھا اور فوجی تربیت کے لیے جرمنی، آسٹریا اور ترکی کے متعدد افسروں کو فوجی استادوں کے طور پر بلایا۔ اس تحریک کے اخراجات گیلان کے زمینداروں سے جبراً وصول کئے ہوئے روپے سے پورے کئے جاتے تھے۔ اس تحریک کو ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب سے بہت زیادہ تقویت حاصل ہوئی۔ اور یہ ۱۹۱۸ء میں بحر خزر کے دوسرے علاقوں تک پہنچ گئی۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں انہیں قزوین پر قبضہ کرنے سے بمشکل ہی باز رکھا گیا۔ جرمنوں اور ترکوں کو کاکیشیا میں داخل ہونے اور باکو میں تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لئے جو برطانوی فوج بھیجی گئی تھی جنگلیوں کا علاقہ اس فوج کے راستے کے آرپار پڑتا تھا ان کے اور برطانوی فوجوں کے درمیان منجیل اور رشت والی سڑک پر معمولی سی لڑائی بھی ہوئی لیکن ۱۲ اگست ۱۹۱۸ء میں برطانیہ اور میرزا کوچک خان نے انگریزوں کے خلاف جنگ جدال ترک کرنا پڑی۔ لیکن اس معاہدے کے بعد جنگلیوں میں اعتدال پسند عناصر اور انتہا پسندوں کے خلاف تفریق پڑ گئی۔ اس باہمی تفرقہ بازی نے ایرانی حکومت کی قازق فوجوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ جنگلی فوجوں کو منتشر کر دیں خواہ عارضی طور پر ہی سہی۔

اس تحریک کے دوسرے مرحلے کی خصوصیت بالشویکی مدد ہے۔ ۱۸ مئی ۱۹۲۰ء کو روس بالشویکی بیڑے نے انزلی پر بمباری کی اور سوویٹ فوجوں نے گیلان کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ کو تو ایک نئی جماعت تشکیل کی گئی اور میرزا کوچک خان نے اپنے آپ کو ایرانی اشتراکی جمہوریہ کا نمائندہ ظاہر کر کے گیلان کی سوویٹ جمہوریہ قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ گیلان کی اس اشتراکی جمہوریہ نے جو ۱۹۲۱ء تک برسر اقتدار رہی بڑے بڑے زمینداروں کی جاگیروں کو ضبط کر کے کسانوں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ ایرانی کسانوں کو آزاد مقامی اشتراکی گروہوں میں منظم کرنے میں ناکام رہی۔

جب ۲۶ فروری ۱۹۲۱ء سوویٹ ایرانی معاہدہ طے پایا تو اس کی رو سے ۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو سوویٹ فوجیں ایران سے واپس چلی گئیں۔ چنانچہ سوویٹ امداد سے محروم ہونے کے بعد جب ان کا مقابلہ رضا شاہ کے زیر قیادت بڑی ایرانی فوجوں سے ہوا تو اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء تک ان کی بغاوت فرد ہو گئی۔ میرزا کوچک خان کو قید کر لیا گیا۔ جسے بعد میں پھانسی دے دی گئی۔ اور اس طرح یہ تحریک اپنے خاتمے تک پہنچی۔

جنید آیدین اوغلو خاندان کے امراء میں سے آخری امیر عثمانی ماخذ میں اس کا لقب ازمیر اوغلو لکھا ہے۔ بدمیہ کے امیر ابراہیم بہادر کا بیٹا اور محمد بیگ کا پوتا تھا۔ جس نے ایدین میر، اس خاندان کی امارت کی بنیاد ڈالی تھی۔

تاریخ میں جنید سب سے پہلے ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں ظاہر ہوتا ہے جب کہ تیمور نے امارت آیدین کو جسے بایزید اول نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا، دوبارہ آزاد کیا تو جنید اور اس کے بھائی حسن آغا نے جو حکومت عثمانیہ کے زمانے میں ازمیر کے بالائی حصار کے قرہ باشی رہ چکے تھے سلطان بایزید اول کے بیٹوں کی خاندانی جنگوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ازمیر کو جنید نے اور آیا سولوک کو حسن آغا نے اپنے قبضے میں لے لیا ۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء میں موسیٰ کی وفات کے بعد اس کے بھائی امور ثانی نے آیا سولوک کو دوبارہ فتح کر لیا۔ اور حسن آغا کو قید کر دیا۔ جنید اپنے بھائی حسن آغا کو رہا کرانے میں کامیاب رہا اور اسے ازمیر لے آیا۔ اس نے صوبہ آیدین کے سابق والی سلیمان چلپی کے ذریعے آیا سولوک دوبارہ حاصل کر لیا۔ نیز امور ثانی سے صلح کر کے اس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ امور ثانی کی وفات کے بعد، ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وہ تنہا امارت کا حاکم بن بیٹھا۔ اس نے آیدین کی امارت میں آلاشہر، صالح لی اور نیف بھی شامل کر لیے۔ اسی سال عیسیٰ چلپی ازمیر آیا تاکہ اپنے بھائی محمد کے خلاف جنید کی مدد حاصل کر سکے۔ لیکن محمد نے انہیں شکست دی جنید نے معافی مانگ لی اور فاتح کی اطاعت کا اقرار کر کے اپنی حکومت بچا لی۔

۸۰۹ھ/۱۴۰۷ء میں سلیمان جنید کو رومیلی لے گیا۔ اور اوچریدہ کا حاکم بنا دیا۔ ۸۱۳ھ/۱۴۱۱ء میں جب سلیمان اپنے بھائی موسیٰ سے لڑتا ہوا مارا گیا تو جنید ازمیر واپس آ گیا اور آیا سولوک کے حاکم کو نکال کر اپنی پہلی ریاست واپس لے لی۔ محمد اول نے موسیٰ پر فتح پانے کے بعد ازمیر کے علاقے پر قبضہ کر لیا لیکن جنید کے معافی مانگنے پر ازمیر اسے بخش دیا۔ ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں جنید کو رومیلی بھیجا گیا اور نیقوپولیس کا حاکم مقرر کیا گیا۔ صوبہ آیدین الگزانڈر ولد شمن کو دے دیا گیا لیکن وہ مصطفیٰ کی بغاوت کے دوران ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں مارا گیا۔

مصطفیٰ نے جنید کو اپنا وزیر بنا لیا۔ لیکن سلطان محمد اول نے وینس سے صلح کا معاہدہ کر لیا جس کے بل پر مصطفیٰ نے تخت کے حقدار ہونے کا دعوے کیا تھا۔ بعد میں سلطان محمد اول کے حکم سے مصطفیٰ جزیرہ لیمنوس اور جنید کو قسطنطنیہ کی خانقاہ میں نظر بند کر دیا گیا کیونکہ بزنطی حاکم کو محمد اول نے قید کے مصارف ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں محمد اول کی وفات کے بعد قیصر نے دونوں قیدیوں کو رہا کر دیا مراد ثانی نے جنید سے وعدہ کیا کہ اگر وہ مدعی تخت مصطفیٰ کا ساتھ چھوڑ دے تو اسے ازمیر کا علاقہ دوبارہ واپس مل سکتا ہے۔ چنانچہ جنید راتوں رات ازمیر پہنچ گیا۔ جہاں کے باشندوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے امور ثانی کے بیٹے مصطفیٰ کو آیا سولوک سے نکال دیا۔ تو مراد ثانی نے ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں جنید کے خلاف قدم اٹھایا تاکہ اسے ازمیر کے علاقے تک محدود کر دے لیکن جنید ترکی علاقوں پر چھاپے مارنے سے باز نہ رہ سکا۔

چنانچہ مراد ثانی نے ایک نئی فوج قرطاش کے بیٹے کی زیر قیادت بھیج کر ازمیر کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور جنید کو قلعہ اپسیلی میں پناہ لینی پڑی اور اس نے بخشی کی بہن کو مار ڈالا جو اس کے پاس تھی۔ چونکہ مراد ثانی نے آیدین صوبہ کی حکومت ایک نو مسلم خلیل بخشی کو دی تھی جس کی بہن کو جنید نے گرفتار کر لیا تھا۔ جب جنید نے ۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء میں اپسیلی میں ہتھیار ڈال دیئے تو بخشی نے اپنی بہن کا قصاص لینے کے لئے اس کو مار ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بیٹے قرت حسن اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کو مار ڈالا۔

جنید، ابوالقاسم بن محمد بن جنید خزاز۔ (م ۲۹۸ھ/۹۱۰ء) ایک بہت بڑے صوفی آپ سری سقطی کے بھتیجے (بھانجے) اور انہی کے مرید تھے۔ آپ کی سکونت بغداد میں تھی۔ آپ نے فقہ ابوثور سے پڑھی تصوف کی تعلیم حارث محاسبی سے حاصل کی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اپنے استاد محاسبی کے ساتھ چلتے پھرتے تصوف کے مسائل پر بحث کرتے رہتے تھے اور وہ آپ کے سوالات کے برجستہ جوابات دیتے رہتے تھے۔ ان جوابات کو بعد میں آپ نے کتابوں میں قلمبند کر دیا۔

محاسبی کے ساتھ آپ کو بھی راسخ العقیدہ صوفیا کا سب سے بڑا امام تسلیم کیا گیا ہے اور آپ "سید الطائفہ" (صوفیوں کے [illegible]) "طاؤس الفقراء" "شیخ المشائخ" کے القابات سے نوازا گیا ہے۔ لوگ آپ کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔

ابن ندیم نے اپنی "الفہرست" میں آپ کے رسائل کا ذکر کیا ہے جو خاص اشخاص کے نام مرسلہ خطوط اور تصوف کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔

حلاج پر آپ کا اثر بہت نمایاں تھا۔ جنید نے اپنے عقیدے کو [illegible] دلائل عقلیہ سے واضح کیا تھا۔ اس طرح بیان کیا ہے۔ "چونکہ سب چیزوں کا [illegible] ذات خدا ہے۔ اس لئے علیحدگی (افتراق) کے بعد آخر کار وہ پھر اسی ذات کی طرف عود کریں گے تاکہ پھر اس سے مل جائیں۔ نیز صوفی [illegible] حاصل کرتا ہے۔

حالت وصل کے بارے میں آپ نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"چونکہ اس وقت تجھ سے خطاب کیا جائے گا اور [illegible] تجھ سے تیرے حالات دریافت کئے جائیں گے۔ اور دریافت کرنے [illegible] ہوگا۔ برکات کا کثرت سے فیضان ہوگا اور دونوں جانب سے [illegible] ہوں گے ایمان کی قوت پیہم بڑھتی چلی جائے گی اور [illegible]

آپ زبان کی ان [illegible] سے بچتے [illegible] شکر کی زبان پر جاری ہو کر راسخ الاعتقاد مومنوں کو [illegible]

الغرض جنید نے اپنے واضح تصورات اور مکمل ضبط نفس [illegible] قائم کر دی۔ جس کے اوپر بعد کے سلسلہ ہائے صوفیہ کی [illegible]

جنید ہمہ تن درد و عشق تھے۔ تصوف کے بارے [illegible]

ایک ہاتھ سے قرآن اور دوسرے سے سنت [illegible] پر نہ چلو تاکہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرو اور نہ بدعت [illegible] ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قیل و قال اور جنگ و پیکار سے یہ درجہ ہم کو نہیں ملا [illegible] نیند اور ترک دنیا سے ملا۔"

آپ کا قول ہے۔

"جو آنکھ حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کو نہ دیکھے اس کا اندھا ہونا [illegible] جو زبان ذکر حق میں مصروف نہ ہو اس کا گونگا ہونا اچھا ہے۔ اور جو کان حق بات سے اس کا بہرہ ہونا اچھا ہے اور جو بدن اس کی خدمت نہ کرے اس کا مر [illegible] بہتر ہے۔"

آپ نے فرمایا، عبودیت کی دو خصلتیں ہیں۔

۱۔ ظاہر و باطن میں ہر طرح خدا کی رضا پر راضی رہنا۔ ۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری محبت کے ساتھ اقتدا کرنا۔

آپ کا قول ہے کہ خلق چار چیزوں کا نام ہے۔ ۱۔ سخاوت۔ ۲۔ الفت۔ ۳۔ نصیحت۔ ۴۔ شفقت

جنید بن عبد الرحمان (م۔ ؟ ۔ ۱۱۶ھ/۷۳۴ء) اموی خلیفہ ہشام کے دور میں ایک نامور سپہ سالار اور والی۔ جنید کو ہشام نے ۱۰۵ھ/۷۲۴ء میں برعظیم پاک و ہند کے ان مسلم مقبوضات کا جنہیں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ والی مقرر کیا۔ یہ مقبوضات ۹۲ھ/۷۱۱ء سے ۹۴ھ/۷۱۳ء میں فتح کیے گئے تھے۔ جنید ۱۱۰ھ/۷۲۹ء تک سندھ کا گورنر رہا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی مرتبہ فوج کشی کی۔ جنید نے کیرج کے راجہ کے خلاف فوج کشی کی جو مجبور ہو کر فرار ہو گیا اور اس طرح کیرج شہر جنید کے ہاتھ آ گیا۔ ۱۱۰ھ/۷۲۹ء میں جنید کو گورنری کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ اس وقت میں جنوبی ہند کی سمت مسلمان گجرات کے اندر تک اور مشرق کی جانب مالوہ کی سرزمین تک یعنی وسطی ہند تک پہنچ چکے تھے۔ جنید شمال میں ہنود کے علاقے تک پہنچا۔ نیز چین کی ایک باجگزار ریاست کا ایک شہر اور اس کا قلعہ بھی قابض ہو گیا۔ ۱۱۱ھ/۷۳۰ء میں جنید خراسان کا والی مقرر کیا گیا۔ بعد میں اسے ماوراء النہر کی طرف بھیجا گیا تاکہ اس کی حالت کو درست کر سکے۔ جو ترکوں کے حملوں کی وجہ سے ناقابل اطمینان ہو گئی تھی۔ نیز اشرس بن عبداللہ سلمی سابق والی خراسان بھی ماوراء النہر میں تھا جو ترکوں سے برسرپیکار تھا۔ چنانچہ جنید ایک فوج کے ساتھ بخارا میں اشرس کی فوج سے جا ملا اور ترکوں سے برسرپیکار تھا۔ چنانچہ جنید ایک فوج کے ساتھ بخارا میں اشرس کی فوج سے جا ملا اور ترکوں سے کئی لڑائیاں لڑیں اور زرمان کے مقام پر انہیں شکست دی۔

خراسان واپس آ کر جنید نے طخارستان پر حملہ کیا لیکن اسے جلد ہی وہاں سے ماوراء النہر کے لیے واپس آنا پڑا جہاں اسے سمرقند کے حاکم سورۃ بن حر التمیمی کی مدد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جنید نے دریائے جیحون عبور کر کے کش سے سمرقند جانے کے لیے پہاڑی راستہ منتخب کیا۔ لیکن جب وہ الشعب نامی گھاٹی میں پہنچا تو صغد، شاش اور فرغانہ کے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ماری گئی۔ جنید نے یہاں سے سورۃ کو پیغام بھیجا کہ وہ سمرقند چھوڑ کر اس کی مدد کے لیے آ جائے۔ چنانچہ سورۃ جنید کی مدد کے لیے روانہ ہو گیا لیکن جیسا کہ وہ اس بات کا نتیجہ جانتا تھا۔ ترکوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ سورۃ خود اس لڑائی میں مارا گیا۔ اور اس کی فوج بھی اس لڑائی میں ختم ہو گئی۔ جنید الشعب سے نکل کر سمرقند پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چار ماہ تک صغد میں قیام کیا اور یہیں سے اس نے بخارا کو جس کا ترکوں نے محاصرہ کر رکھا تھا، بچانے کے لیے قطن بن قبیصہ کی مدد کے لیے ایک فوج تیار کی اور بالآخر طوابیس کے قریب ترکوں کو شکست دے کر بخارا میں داخل ہوا۔ ۱۱۶ھ/۷۳۴ء کے آغاز میں خلیفہ نے اسے واپس بلا لیا۔ کیونکہ وہ جنید سے اس بنا پر ناراض ہو گیا تھا کہ اس نے خلیفہ کے باغی یزید بن مہلب کی بیٹی فاضلہ سے شادی کر لی تھی۔ خلیفہ نے اس کی جگہ عاصم بن عبداللہ کو خراسان کا والی مقرر کیا۔ لیکن ابھی عاصم راستے ہی میں تھا کہ جنید مرو میں ایک بیماری سے انتقال کر گیا۔

جنید میں ایک بہترین سپہ سالار کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ماوراء النہر میں ترکوں کی سخت مخالفانہ تحریک کے باوجود اپنا اقتدار قائم رکھ سکا سپہ سالاری کے علاوہ اس میں انتظامی صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جب اسے سندھ سے واپس بلایا گیا تو اس نے بیت المال میں ایک کروڑ اسی لاکھ طاطری درہم چھوڑے تھے۔

جنید کے بارے میں جو عام روایات مشہور ہیں ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنید نے سندھ کی حکومت سے برطرف کیے جانے کے بعد بنو امیہ کی مخالفت میں بکیر بن ہامان کی برپا کردہ باغیانہ تحریک میں اس کا ساتھ دیا تھا لیکن یہ روایت بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جنید کو سندھ کی گورنری سے معزول کیے جانے کے فوراً بعد خراسان کا حاکم بنا دیا گیا تھا جہاں جنید نے اس باغیانہ تحریک کے سرکردہ آدمیوں کو گرفتار بھی کیا تھا۔ اس ضمن میں الدینوری کی فراہم کردہ اطلاع بھی صحیح نہیں ہے۔ نیز اسد بن عبداللہ کی معزولی کی خبر بھی جو الدینوری نے بیان کی ہے صحیح نہیں ہے۔

جنیدیہ صوفیا کا ایک گروہ اور فرقہ۔ یہ لوگ حضرت ابو القاسم جنید بن محمد سے محبت کرتے ہیں۔ جو صوفیا کے ایک گروہ کے سردار اور ان کے اماموں کے امام تھے۔ آپ کا طریقہ طیفوریوں کے برعکس صحو پر مبنی ہے۔ جن کا اختلاف پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔ صوفیا کے تمام مذاہب میں مشہور و معروف آپ ہی کا مذہب ہے۔

بقول حضرت علی ہجویری جتنے مشائخ بھی ہوئے ہیں سب جنیدی مذہب کے ہوئے ہیں۔

جواد اصفہانی زنگی حکمرانوں کا وزیر۔ ابو جعفر محمد بن علی۔ اس کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اس کے والد نے بہت کچھ اہتمام کیا تھا۔ ابھی اس کی عمر بہت کم تھی کہ سلطان محمود سلجوقی کے دیوان العرض میں اسے ملازمت مل گئی بعد میں وہ زنگی کے مصاحبین و مقربین میں شامل ہو گیا۔ جواد نصیبین اور الرقہ کا والی بھی رہا۔ تمام زنگی ریاست کی نگرانی بھی اس کے سپرد تھی۔ جب زنگی کو قتل کیا گیا تو جواد کی جان بھی مشکل ہی سے بچی۔ اور وہ اپنی فوج موصل لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

جواد سیف الدین غازی کے عہد میں بھی اپنے عہدے پر قائم رہا۔ اس دور میں وہ اپنی داد و دہش کی شہرت کی بنا پر الجواد یعنی صاحب کرم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ مسلمان اس بنا پر بھی اس کے احسان مند ہیں کہ اس نے ذاتی خرچ سے مکے اور مدینے کے مقدس شہروں میں بہت سی مفید اصلاحات کیں۔ ۵۵۹ھ/۱۱۶۳ء میں قطب الدین مودود نے جو اپنے بھائی کا جانشین ہو چکا تھا۔ جواد کو موصل میں قید کر دیا۔ ایک سال بعد وہ اسی قید خانے میں انتقال کر گیا۔

جواد کی میت کو پہلے مکہ معظمہ لے گئے جہاں مقدس مقامات پر اسے پھرایا گیا پھر وہاں سے مدینہ منورہ لے جا کر اسے دفن کیا گیا۔

جواد پاشا (۱۲۶۹ھ/۱۸۵۱ء ——— ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ/ ۱۱ اگست ۱۹۰۰ء) ترکی کا وزیر اعظم۔

احمد جواد پاشا میر آلای مصطفیٰ عاصم کا بیٹا تھا۔ شام میں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت فوجی کالج میں پائی۔ ۱۸۷۱ء میں اس نے سٹاف کالج کے نصاب کی تکمیل کر لینے کے بعد روسی۔ ترکی جنگ میں سپہ سالار اعظم سلیمان پاشا کے ایڈ ڈی کانگ اور نجیب پاشا کے لشکر میں سٹاف افسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

جواد پاشا نے تھوڑے سے عرصہ میں بڑی ترقی کی۔ اور وہ مختلف عہدوں پر فائز ہوا مثلاً ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں وہ میرلوا کے ساتھ ساتھ مانٹی نیگرو کا سفیر مقرر کیا گیا ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں فریق کے منصب کے ساتھ اقریطش کا فوجی سالار مقرر ہوا لیکن اس کے جلد ہی بعد اقریطش کا نائب والی اور خصوصی متصرف (کمشنر)

نے عہدے پر نامزد کیا گیا۔

سلطان عبدالحمید نے اس کی خدمات اقریطش سے خوش ہو کر ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں جواد پاشا کو وزیر اعظم کے منصب سے سرفراز کیا۔ وہ اس منصب پر تین سال سے کچھ زائد عرصے تک فائز رہا۔ بعد میں جواد پاشا سلطان کی نظروں سے گر گیا۔ کیونکہ اس نے متفرق بغاوتوں اور شورشوں کے بارے میں جو عرض داشتیں سلطان کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ ان میں ان تمام شورشوں کا سبب نظام حکومت کی خامی کو قرار دیا تھا۔ نیز اس نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ حکومت میں شاہی محل کی مداخلت کو کم کر کے باب عالی کے اختیارات بڑھائے جائیں۔ چنانچہ جواد پاشا کو ان عرض داشتوں اور تجاویز کا صلا یہ ملا کہ اسے ۹ر جون ۱۸۹۵ء کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی اسے دوبارہ اقریطش کا سالار عسکر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں جواد پاشا کو شام کی پانچویں فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ لیکن عرصے میں جب اس کی صحت بہت خراب ہونے لگی تو اسے استانبول واپس بلا لیا گیا جہاں یہ کچھ عرصہ بعد اس نے وفات پائی۔

وہ ایک صاحب علم آدمی تھا۔ اسے بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ وہ ترکی، فارسی، اطالوی، فرانسیسی اور یونانی زبانوں کا عالم تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کئی ایک کتب کا مصنف بھی تھا جن میں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

"معلومات کافیہ فی ممالک عثمانیہ"، "تاریخ عسکری عثمانی" اس کے علاوہ ترکی زبان میں "ریاضی ثانت مباحث ذہنیہ سی" "کیمیا کنک صنائعہ تطبیق" "سماوی علوم" ہیں۔ جواد پاشا کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا وہ ایک بہت قیمتی کتب خانے کا مالک تھا۔

جوتا اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر شعبے اور معاملات کے بارے میں انسانوں کو تعلیم دی ہے۔ جوتا پہننے سے آدمی پاؤں پر ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رہتا ہے نیز ہر قسم کی گندگی وغیرہ سے بھی بچا رہتا ہے اسی لیے کتب احادیث میں جوتے کا ایک علیحدہ باب باندھا گیا ہے۔

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے کسی غزوے میں آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا، بہت سی جوتیاں لے لو اس لیے کہ مرد جب تک جوتیاں پہنے رہتا ہے سوار کی مانند رہتا ہے۔" (مسلم)

احادیث میں جوتا پہننے کے چند آداب بھی بتائے گئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا جب کوئی شخص پہنے تو پہلے سیدھے پاؤں پر پہنے اور جب جوتا اتارے تو الٹا جوتا اتارے یعنی پہننے میں پہلا جوتا داہنے پاؤں کا ہونا چاہیے اور اتارنے میں پہلا جوتا بائیں پاؤں کا۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور جگہ پر آپ نے فرمایا۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو ایک پاؤں میں جوتی پہن کر نہ چلے جب تک اس کی دوسری جوتی کا تسمہ درست نہ ہو جائے اور نہ ایک پاؤں میں موزہ پہن کر چلے۔" (مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر جوتا پہنے (ترمذی و ابو داؤد)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے "یہ طریقہ سنت ہے کہ جب آدمی کہیں بیٹھے تو اپنی جوتیاں اتار لے اور اپنے پہلو میں یعنی اپنے پاس رکھ لے۔" (ابو داؤد)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضورؐ اپنے صحابہ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ اچانک آپؐ نے اپنے جوتے پاؤں سے اتار کر اپنی بائیں طرف رکھ دیئے۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے۔ جب نماز ختم ہو گئی تو آنحضورؐ نے پوچھا کہ تم نے اپنے جوتے کیوں اتارے؟ صحابہ نے عرض کی ہم نے آپ کی تقلید میں ایسا کیا۔ پھر آنحضورؐ نے فرمایا میرے پاس جبرئیلؑ آئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے جوتے پر تھوڑی سی غلاظت لگی ہوئی تھی۔ پس تم سے جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو جوتے کو اچھی طرح دیکھ لیا کرے اور اگر تم ان پر غلاظت لگی ہوئی پاؤ تو اسے صاف کر لو اور پھر ان کے ساتھ نماز پڑھ لو۔"

حضرت عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ میں نے آنحضورؐ کو جوتوں سمیت اور بغیر جوتوں کے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

ہدایہ میں جو فقہ حنفی کی کتاب ہے درج ہے کہ جب جوتوں پر کوئی غلاظت لگی ہو مثلاً خون یا گوبر تو اس زمین پر رگڑ کر دور صاف کر لیا جائے۔

جُوچی (... ھ/۱۱۸۴ء — ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء) چنگیز خان کا سب سے بڑا لڑکا اور دشت قپچاق اور خیوہ کے فرمانروا خاندان کا جد امجد۔

اس کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں اور یہ بات بھی [illegible] یہ شخص جو اس قدر بہت سے شاہی خاندانوں کا بانی تھا [illegible] اشتہ کردہ تھا یہی کہ اس کی ولدیت تک مشتبہ ہے۔

جوچی کا ذکر سب سے پہلے ۱۲۰۷ء میں ملتا ہے جب وہ [illegible] سائبیریا کے مغربی ساحل پر جنگلوں میں رہنے والے [illegible] کے ساتھ [illegible] لوگوں پر [illegible] حاصل کرنے کے لیے [illegible] گرما میں یہاں پر چنگیز خان نے جو یادگار بھی [illegible] قبول کر لی تھی۔ ۱۲۱۰ء ۱۲۱۱ء میں [illegible] وہ اپنے باپ کے ساتھ ان معرکوں میں بھی [illegible] تھے اس نے اپنے بھائیوں چغتائی اور اوگتائی کے ساتھ [illegible] ان اور جوکی [illegible] میں بھی حصہ لیا۔

جوچی نے ۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ میں مرکیتوں کے [illegible] کشتی میں بھی حصہ لیا اور انہیں شکست دے کر [illegible] کی اقوام [illegible] دار [illegible] جب چنگیز خان کی فوجیں اتر [illegible] میں [illegible] اور گرگانج [illegible] یا بنا تھا لیکن جب اسے یہاں کی حکومت [illegible] کر لیا جو ۱۲۲۰ء میں فتح ہوا [illegible] پیش قدمی [illegible] یہاں سے چنگیز خان نے [illegible] کے ساتھ ہو کر ایک ہونے کا حکم دیا۔ آخر کار یہ مہم بھی ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء [illegible] جوچی کے مفتوحہ علاقے میں شامل ہو گئے ۱۲۲۳ء [illegible] اپنے باپ اور بھائیوں سے جا ملا۔ بعد [illegible] مفتوحہ علاقے میں آیا اور باقی زندگی [illegible] باپ چنگیز خان سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔

جوچی نے قدان باشی میں چنگیز خان سے [illegible] وفات پائی [illegible]

اس کے دو بیٹوں اوردہ اور باتو نے آپس میں تقسیم کرلی۔ اور یہ دونوں علی الترتیب اردوے مطلا کے بانی ہوئے۔

جود وسخا بخشش، سخاوت۔ بعض لوگوں نے جود وسخا کے درمیان فرق کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ سخی وہ ہے جو سخاوت میں اپنے پرائے کی تمیز کرے اور جو کچھ وہ کرے کسی دنیاوی غرض اور سبب سے وابستہ ہو۔ اور سخاوت میں پہلا بتدار کا مقام ہے۔

جواد وہ ہوتا ہے جو بخشش کرتے وقت اپنے اور بیگانے کی تمیز نہ کرے اور اس کی سخاوت بے غرض اور بلا سبب ہو۔

علی ہجویریؒ نے جواد اور سخی کی دو مثالیں بیان کی ہیں جس سے جود وسخا کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں آجاتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب تک کوئی مہمان نہ آجائے کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ تین روز تک کوئی شخص نہ آیا۔ آخر ایک آتش پرست آپؑ کے گھر کے دروازے پر آگیا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا تو کون ہے اس نے کہا میں آتش پرست ہوں آپؑ نے فرمایا چلا جا تو مہمانی اور مہربانی کے لائق نہیں۔ اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ جس شخص کی ستر سال تک میں نے پرورش کی ہے تجھے تنا بھی گوارا نہ ہوا کہ اسے ایک روٹی دے دے۔

پس حضرت ابراہیمؑ نے بخشش میں اپنے پرائے کی تمیز کی اور ایک روٹی تک غیر مذہب والے کو دینی گوارا نہ کی۔

لیکن اس کے برعکس جب حاتم کا بیٹا آنحضورؐ کی خدمت میں آیا تو آپؐ نے اپنی چادر مبارک اس کے نیچے بچھا دی اور فرمایا۔ "جب تمہارے پاس کسی بھی قوم کا کوئی شریف آدمی آئے تو اس کی تکریم کرو۔"

آنحضورؐ نے اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہ کی۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ کا مقام سخاوت تھا اور آنحضورؐ کا مقام جود تھا۔

آنحضورؐ نے فرمایا سخی آدمی بہشت سے قریب اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل آدمی دوزخ کے نزدیک اور بہشت سے دور ہے۔ نیز فرمایا کافر سخی اللہ کے نزدیک بخیل مومن سے اچھا ہے۔ (کشف المحجوب)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ کل کے لیے کوئی چیز نہیں رکھتے تھے (ترمذی)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ آنحضورؐ سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ نے دیتے ہوئے فرمایا ہو میں نہیں دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ سب لوگوں سے زیادہ حسین زیادہ سخی اور زیادہ بہادر تھے۔ (بخاری) .... ایک اور حدیث میں جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضورؐ کے پاس آیا۔ اور آپؐ سے اس قدر بکریاں مانگیں کہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی جو بھیڑ بکریوں سے پُر تھی بخش دی۔ جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ کر گیا تو کہنے لگا اے قوم! مسلمان ہوجاؤ۔ خدا کی قسم محمد وہ بخشش کرتے ہیں کہ اپنی مفلسی سے کبھی نہیں ڈرتے۔" (بخاری)

نیز حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ آنحضورؐ کے پاس ایک مرتبہ اسی ہزار درہم آئے آپؐ نے ان کو ایک گدڑی پر ڈال دیا۔ اور جب تک ان سب کو راہ خدا میں نہ دے دیا۔ آپؐ اس جگہ سے نہ اُٹھے۔ (مشکوٰۃ)

جواز حلت۔ کسی چیز کا جائز، حلال، مجاز ہونا۔ شریعت کی اصطلاح میں نص قرآنی اور احکام شریعت کے ماتحت کسی عمل اور استعمال کی اجازت۔ اسلامی فقہ کے دائرے میں جواز کا مفہوم وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی ضد حرمت یا عدم جواز وغیرہ ہیں۔

جوالیقی، ابومنصور (٤٦٦ھ/١٠٧٣ء - ١٥ محرم ٥٣٩ھ/١٩ جولائی ١١٤٤ء) - ایک ادیب اور معلم۔ موھوب بن احمد بن محمد بن خضر۔ بغداد میں پیدا ہوا۔ بقول براکلمان وہ ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

اس کی "جوالیقی" نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ادنےٰ خاندان کا فرد تھا۔ کیونکہ جوالیق کے معنی بوریاں بنانے والا یا بیچنے والا کے ہیں۔

جوالیقی مدرسہ نظامیہ میں اپنے استاد تبریزی صدر شعبہ علم الالسنہ کا دوسرا جانشین ہوا۔ مسلک کے اعتبار سے وہ پکا سنی تھا۔ اسے علی بن زید کی جگہ جو کٹر شیعہ تھا زبردستی استعفیٰ دلوا کر مقرر کیا گیا تھا۔

وہ ایک فرض شناس معلم تھا۔ اور سوالات کے جواب نہایت احتیاط سے دیا کرتا تھا۔ وہ بہترین خوش نویس بھی تھا۔ اس کی خوش نویسی کی بہت تعریف کی جاتی ہے جوالیقی کی تصانیف کو تبریزی کی تصانیف کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے عربی زبان کا ثقافتی درجہ اس پستی سے جس میں وہ سلجوقیوں کے زمانے میں جا پڑی تھی۔ نکال کر بلند کیا۔

اس نے اپنی کتاب "المعرب من الکلام العجمی علی حروف المعجم" میں فصیح عربی کی حفاظت اس طرح کی کہ بیرونی اصل کے سارے الفاظ ایک جگہ اکٹھے کر کے ان کی حقیقت کی صراحت کردی گئی ہے۔ یہ شرح لغت کی کتاب جو اس کی زندگی میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اور بہت مفید ثابت ہوئی۔ جوالیقی نے بغداد میں وفات پائی۔

اس کی شہرت بڑی حد تک مندرجہ بالا تصنیف کی مرہون منت ہے۔ جیسا کہ اس کے ایک شاگرد ابوالبرکات ابن الانباری نے کہا ہے "شیخ نحو سے بڑھ کر لغت نویسی کا ماہر تھا۔"

یہ کتاب اس کے پیشروؤں کی تحقیقات کی ایک قابل قدر تطبیق ہے۔

اس کی دوسری کتاب "التکملہ فی مایلحن فیہ العامہ" ہے۔ اس کتاب کا واضح مقصد غلط الفاظ کی تصحیح کرنا ہے۔

جوالیقی کی تیسری تصنیف ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" کی شرح" ہے۔ جو ایک اوسط درجے کی کتاب ہے۔

ابن الانباری اس کی طرف ایک اور تصنیف "کتاب العروض" بھی منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح براکلمان نے اس کی تصانیف کی فہرست میں "شرح مقصورہ ابن درید" کو بھی شامل کیا ہے۔ تنوخی نے ایک اور تصنیف "کتاب غلط الضعفا من الفقہاء" اسی کی تصنیف بتاتا ہے۔

جوانی، ابوعلی (٥٢٥ھ/١١٣١ء - ٥٨٨ھ/١١٩٢ء) ایک عرب نسّاب ادیب مورخ۔ محمد بن اسعد۔ جوانی خاندان کا دعوےٰ تھا کہ وہ عبیداللہ بن حسینؓ کے ایک بیٹے کے واسطے سے حضرت علیؑ کی اولاد سے ہیں۔ مصر میں پیدا ہوا اور وہیں پر تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مصر، دمشق اور حلب میں حدیث پڑھائی۔ ایک بار وہ مصر میں علوی سردار بھی مقرر ہوا اس کا شوق و مشغلہ انساب اور تاریخ کا مطالعہ کرنا تھا۔

ابوعلی جوانی ہمیشہ ایوبیوں کا منظور نظر رہا۔ ان کے ناموں سے اس اپنی کئی

تصانیف بھی معنون کی ہیں ۔ صلاح الدین نے اسے مدینہ منورہ کے قریب موضع جوانیہ جاگیر کے طور پر عطا کیا تھا ۔ اور اسی نام کی نسبت کی وجہ سے اس کا خاندان موسوم ہوا ۔

مقریزی نے المقفیٰ میں جوانی کی اٹھارہ تصانیف کا ذکر کیا ہے ۔ ان میں بعض کتابیں ضخیم تھیں ۔ ان کتابوں میں حضرت علیؓ کے شجرہ نسب سے بحث کی گئی ہے اور جوانی خاندان کی تاریخ بھی شامل ہے ۔ اس کے علاوہ اپنے والد کے شجرہ نسب کی تحقیق اور بنوطالب کی سوانح عمریوں، طالبی ماہرین الانساب، بنوالارقط اور بنوادریس پر بھی کتابیں لکھی ہیں ۔ اس نے زیادہ عام نوعیت کی تاریخی اور نسابی تصانیف بھی مرتب کی ہیں ۔

اس کی تصانیف ہیں " الجواہر المکنون فی ذکر القبائل والبطون " ، " النقط علی الخطط " " التحفۃ الشریفیۃ " ، " التحفۃ الظریفیۃ یا " اصول الحساب وفصول الانساب " ہیں ۔

ایک سابق ریاست اور شہر ۔

جودھپور انڈیا میں مارواڑ راجپوتانہ ایجنسی کی تمام قدیم ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست ۔ اس ریاست کا رقبہ ۳۶۱۰۰ مربع میل تھا اور ۱۹۴۱ء میں اس کی کل آبادی ۲۵۵۵۹۰۴ تھی ۔

اس ریاست کی بنیاد قدیم روایات کے مطابق جنکا تاریخی طور پر کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ قنوج کے راجپوتوں نے محمد غوری کے ہاتھوں ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء میں شکست کھانے کے بعد رکھی تھی ۔

جودھپور شہر کی تاریخ کا آغاز ۸۶۴ھ / ۱۴۵۹ء سے ہوتا ہے ۔ یہاں کے راجا راو مالدیو نے جس نے ہمایوں کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا ، شیر شاہ اور اکبر کے ہاتھوں شکست کھائی ۔ اور ان کا باجگزار بن گیا ۔ اس وقت سے حاکمان جودھپور کے دہلی کے شاہان مغل سے گہرے تعلقات قائم رہے ۔ یہاں کے حکمران اپنی بیٹیوں کی شادیاں مغلیہ خاندان میں کرتے تھے ۔ اور مغل افواج میں بھرتی ہوتے تھے ۔ مہاراجہ جسونت سنگھ جوان راجپوتوں میں سے مشہور ترین مہاراجہ تھا ۔ مغل شہنشاہوں کے ملازموں میں مشہور تھا ۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں جب ان کی مغلیہ سلطنت سے جنگ چھڑی تو جودھپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ۔ اگرچہ گوریلا اور چھاپہ مار لڑائی کئی سال تک جاری رہی ۔

سادات بارھہ نے جودھپور کے حکمران کو مجبور کیا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر سے کرے ۔ جونہی مغلیہ سلطنت کمزور پڑی تو مرہٹوں اور امیر خاں کی فوجوں نے جودھپور کو بری طرح روندا ۔ ۱۸۱۸ء میں جودھپور انگریزوں کے زیر تسلط آگیا اور یہاں ان کی عملداری قائم ہو گئی ۔ مہاراجہ تخت سنگھ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا طرفدار اور حمایتی تھا ۱۸۶۲ء میں متبنیٰ بنانے کے حق کی ضمانت دی گئی ۔ اس تمام عرصے میں جب تک یہ ریاست انگریزوں کی عملداری میں رہی کوئی خاص واقعہ یا اہم بات قابل ذکر نہیں ۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں جودھپور کو راجستھان کے نئے صوبے میں ملا دیا گیا ۔ اور اس طرح یہ قدیم ریاست ختم ہو گئی ۔

ایک پہاڑ کردستان کے علاقے ضلع بہتان میں جزیرہ ابن عمر کے شمال

جودی، کوہ مشرق میں تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر ایک بلند کوہ جو ۳۷ درجے ۳۰ دقیقہ شمال میں واقع ہے ۔ اس کا دوسرا نام کوہ آرارات اور جبل الحارث بھی کہتے ہیں ۔

اس کا قدیم نام اعزی ناغ تھا ۔ جودی پہاڑ کی شہرت کا منبع عراق و عرب کی وہ روایت ہے جس کے مطابق اس پہاڑ پر کشتی نوحؑ جا کر ٹھہری تھی ۔

یہ پہاڑ اس مقام پر واقع ہے جہاں ترکی ، ایران ، روس اور ارمینیا کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ اس کی شمالی اور مشرقی ڈھلان کی طرف آرس بہتا ہے جو سطح سمندر سے تین ہزار فٹ بلند ہے ۔ اس کے جنوب مغرب میں بایزید کا میدان واقع ہے جو سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے ۔ مغرب کی طرف چھوٹی چھوٹی آتش فشاں پہاڑیوں کا سلسلہ ہے ۔ ان میں سے ۵½ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹا سا درہ گذرتا ہے ۔ یہ پہاڑ دو چوٹیوں پر مشتمل ہے ان کا درمیانی پالان ۸۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے ۔ دونوں چوٹیوں کے درمیان سات میل کا فاصلہ ہے ۔ بڑی چوٹی کی انتہائی بلندی ۱۶۹۲۰ فٹ ہے ان دونوں چوٹیوں کے قریب دور دور تک کوئی اور چوٹی اتنی بلند نہیں ۔ دونوں چوٹیاں لاوے اور آتشی چٹانوں سے بنی ہیں ۔ آج کل اس پر ہمہ وقت برف جمی رہتی ہے ۔ اس کے ارد گرد میدانوں میں عمدہ گھاس کے وسیع قطعات ہیں یہاں کرد قبائل اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اس کے دامن میں کہیں کہیں درخت بھی ملتے ہیں ۔ لیکن پہاڑ سبزے سے خالی ہے ۔ کسی زمانے میں یہاں آبادی تھی بقول المقدسی " اس پہاڑ پر ایک ہزار گاؤں آباد تھے ۔ "

اس پہاڑ کا ذکر سب سے پہلے بائیبل میں آرارات کے نام سے ملتا ہے ۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نوحؑ کی کشتی " آرک " اسی پہاڑ کی بڑی چوٹی پر آ کر ٹھہری تھی ۔ نیز یہ کشتی ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کو آرارات کی پہاڑیوں پر ٹک گئی (پیدائش ۸ : ۴)

قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر موجود ہے ۔

" حکم ہوا " اے زمین ، اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا ۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا ، فیصلہ چکا دیا گیا ، کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم ۔ " (۱۱ : ۴۴)

قدیم ارمنی روایات اس بارے میں بالکل خاموش ہیں کہ کشتی نوحؑ کہاں [illegible] ارمنی ادب میں جو کچھ روایات اس بارے میں ملتی ہیں وہ تورات کے [illegible] کا نتیجہ ہے ۔ ابن قتیبہ نے آرارات کو کوہ جودی قرار دیا ہے [illegible] پروسس لکھتا ہے کہ اسے کوہ جودی کی چوٹی پر سے کشتی کے [illegible] نے ۲۰۵ء میں اس پہاڑ کی زیارت کی تھی ۔

موجودہ دور میں بھی اکثر لوگوں کو یقین ہے کہ آرارات کی چوٹی پر [illegible] برس پرانی برف کے نیچے نوحؑ کی کشتی موجود ہے ۔

آرمینیہ کے لوگ اس روایت پر یقین رکھتے ہیں [illegible] بسنے والی پہلی قوم آرمینیہ کے لوگ تھے ۔

قدیم تفسیروں میں اس پہاڑ کو حضرت نوحؑ کے خشکی پر اترنے کی جگہ بتایا گیا [illegible] نوحؑ کے ٹھہرنے کی جگہ کی اس تعیین کی جس کا پتا عہد نامہ قدیم کی ارمنی زبان [illegible] تراجم میں بھی چلتا ہے ۔ اس کی بنیاد آرمینیائی روایت ہے ۔ اس کا [illegible] کے علاوہ کوہ [illegible] جس کا ذکر داستان طوفان نوحؑ کے سلسلے میں قدیم [illegible] خط میں لکھے ہوئے کتبات میں ملتا ہے ۔ ممکن ہے وہ کوہ [illegible] مانند کی [illegible] کے پہاڑوں کو حضرت نوحؑ کی خشکی پر اترنے کی جگہ بتایا جاتا ہے یہ قدیم یہودی ، بابلی روایت عیسائیوں نے اختیار کی بعد میں جب [illegible] نے بہتان فتح کر لیا تو انھوں نے اسے کوہ جودی کا نام دے دیا قرآن حکیم میں جودی سے وہ پہاڑ ہی مراد لی جاتی ہے جو عرب میں واقع ہے ۔ چنانچہ بائیبل میں [illegible]

آراراط بتائی گئی ہے وہ آرمینہ کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلہ کوہستان کا نام بھی۔ اور یہ سلسلہ کوہستان آرمینہ کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل جودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیراسس نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتی نوحؑ کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے زمانے کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔

کوہ آرارط اور اس کے دامن میں آرمینی شہر جیروان

آراراط کے آس پاس کے تمام علاقوں کی طرح جبل جودی کا گردوپیش آج تک ایسی یادگاروں اور داستانوں سے پُر ہے جن کا تعلق طوفان نوحؑ اور کشتی کے نکلنے کے بعد حضرت نوحؑ کے حالات زندگی سے ہے۔

مثال کے طور پر پہاڑی کے دامن میں اب تک ایک گاؤں ہے جسے قریۃ ثمانین کہتے ہیں۔ کیونکہ داستان کی رو سے کشتی میں بچ نکلنے والے ۸۰ آدمی پہلے یہیں آباد ہوئے تھے۔

اسی طرح عرب جغرافیہ نویس اپنے زمانے میں ایک خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو جودی پر موجود تھی اور جسے دیرالجودی کہتے تھے۔

ایک برباد شدہ درگاہ کا مسلمان عیسائی اور یہودی سب احترام کرتے ہیں آج کل اس کو "سفینہ نبی نوحؑ" کہا جاتا ہے۔

جوزجان (گوزگان) ایک قدیم ضلع جو افغانستان ترکستان میں مرغاب اور آمو دریا کے درمیان واقع ہے۔ اس ضلع کی حدود واضح طور پر متعین نہیں کی گئی تھیں۔ خاص طور پر مغرب میں تو کوئی واضح حد بندی نہیں تھی۔ اس ضلع میں وہ خطہ جس میں آج کل میمنہ، اندخوی، شبرگان اور سرپل واقع ہیں، ضرور شامل تھا۔ یہ علاقہ ہمیشہ خانہ بدوش قبائل کی جائے سکونت رہا کیونکہ یہ علاقہ ایرانی سطوح مرتفع کے دامنوں اور شمالی بے برگ و گیاہ میدانوں میں واقع تھا۔

موجودہ زمانے میں بھی یہاں پر خانہ بدوش قبائل سکونت پذیر ہیں اگرچہ یہاں کی بعض زرخیز وادیوں میں مستقل آبادیاں بھی موجود ہیں۔ یہاں کی اصل دولت مویشیوں کے ریوڑ ہیں۔ جن پر لوگوں کی گذر بسر ہے۔

ایرانی سطوح مرتفع سے ماوراءالنہر کا راستہ اس ضلع کے اندر سے ہو کر گذرتا تھا لیکن اسے زیادہ تر جنگی راستے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

جوزجان کا ضلع پہلی صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں طخارستان سے ملحق تھا۔ ۳۲ھ/۶۵۳ء میں جب احنف بن قیس نے فوج کشی کی تو اس کے نائب الاقرع نامی شخص نے جوزجان کو فتح کیا۔ اس علاقے کو صرف ترکوں ہی کی جنگ سے نقصان نہیں پہنچا بلکہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے بھی جوزجان کو بہت کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۱۹ھ/۷۳۷ء میں جوزجان کے صدر مقام کے قریب اسد بن عبداللہ قسری نے خاقان کو شکست دی۔ ۱۲۵ھ/۷۴۳ء میں یحییٰ بن زید علوی نے جن کے مزار کا بعد ازاں ایک مدت دراز تک احترام کیا جاتا رہا۔ امویوں سے جنگ کرتے ہوئے اسی جگہ شکست کھائی۔ عہد عباسی میں یہاں کا حاکم انبار میں سکونت رکھتا تھا۔ تاہم گوزگان۔ خدا کا مقامی حکمران گھرانہ یعنی خاندان افریغون باقی رہا۔ اس خاندان نے کندرم کو اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا۔ اگرچہ کبھی کبھی جوزجان کا سیاسی مرکز شبورقان نظر آتا ہے۔ المقدسی اور الیعقوبی نے یہودیہ (میمنہ) کو دارالسلطنت بتایا ہے۔

کا شکار رہی ہیں۔ دوست محمد خان کے عہد میں ان تمام ریاستوں کو رفتہ رفتہ باہم ملا دیا گیا ہے اور ایک افغان ترکستان بنا دیا گیا ہے۔ صرف میمنہ میں خود مختاری کا کچھ شائبہ باقی ہے۔

اس ضلع کا "جوزجان" جو قدیم نام تھا۔ آہستہ آہستہ متروک ہو گیا۔ اس کے متعدد شہروں کا ذکر اس ضمن میں آتا ہے کہ وہ مخالفانہ حملوں کا شکار ہوتے رہے اور یہ بات اس ضلع کی اہمیت کے لئے سب سے بڑھ کر ہے کہ اس کے متعدد شہر اگرچہ بہت سے حوادث کے شکار ہوتے رہے لیکن ان تمام حوادث کے باوجود آج تک باقی ہیں۔

موجودہ دور میں ازبک خانوں کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستیں (آقچہ، اندخوی، شبرگان، سرپل، میمنہ) قدیم جوزجان میں قائم ہو گئی ہیں لیکن اپنے طاقتور ہمسایوں کی یورشوں

جوزجانی، مولانا (۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء۔ غالباً ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء، ۱۲۶۰ء) ایک عالم دین، مصنف اور مورخ۔

ابوعمر منہاج الدین عثمان المعروف "مولانا منہاج سراج" والد کا نام سراج الدین محمد تھا۔ جنہیں افصح العجم اور اعجوبۃ الزمان کہا جاتا تھا۔ ان کے بزرگوں میں امام عبدالخالق (۴۵۱ھ/۴۹۲ھ) جوزجان میں وارد ہوئے۔ انہوں نے سلطان ابراہیم غزنوی کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ امام عبدالخالق کے یہاں ابراہیم ہوئے۔ ابراہیم کے یہاں منہاج الدین عثمان پیدا ہوئے۔ جن کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا نصف اول ہے۔ منہاج الدین عثمان کے فرزند سراج الدین محمد تھے۔ یہ خاندان دربار غزنی میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

بقول محمد عوفی ان کی ولادت لاہور میں ہوئی۔ منہاج الدین عثمان کی والدہ ہرات کے مشہور علمی خاندان کی خاتون تھی۔ جس کا نام تولک تھا۔ وہ سلطان غیاث الدین غوری کی شہزادی کی رضاعی بہن تھی۔ سن بلوغ کے پہنچنے تک منہاج الدین عثمان کی تربیت فیروزکوہ ملوک غور کے دربار میں ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے قرآن پاک حفظ کیا۔ اور ۶۱۱ھ/۱۲۱۴ء تک اسی دربار میں زندگی گذاری۔

۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں سلاطین غور کی طرف سے دربار سیستان میں پہلی بار سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں جب چنگیزی افواج نے ہرات پر حملہ کیا تو منہاج عثمان وہیں پر

موجود تھا۔ ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں اس نے گزیو اور ترآن کا سفر کیا اور وہیں پر شادی کے بعد سکونت اختیار کر لی۔

بعد میں اس کی درباری اور سیاسی شہرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اس نے سلاطین غور کے قاصد اور سفیر کی حیثیت سے ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء تک متعدد بار فراہ و سیستان اور قہستان ملاحدہ کی طرف سفر کیا۔ اسی سال اس نے ہندوستان کا قصد کیا۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء کے آغاز میں وہ غزنہ اور درہ گومل سے ہوتے ہوئے بنوں (بنیان) پہنچا۔ یہاں سے اُچ میں وارد ہوا۔ جہاں سلطان ناصر الدین قباچہ کی طرف سے اسے مدرسہ فیروزی کا اہتمام اور لشکر میں عہدہ قضا تفویض کیا گیا۔

۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں جب سلطان شمس الدین التمش نے اُچ فتح کر لیا تو منہاج الدین اس کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ دہلی پہنچا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء میں سلطان نے اسے خطیب دربار مقرر کیا۔ اگلے سال صفر ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء میں منہاج الدین کا تقرر حصار گالیور میں قاضی و خطیب و امام و محتسب جمیع امور شرعیہ کی حیثیت سے حاصل ہوا۔ اس عہدے پر وہ چھ سال تک رہا۔

۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء میں رضیہ سلطانہ کے عہد حکومت میں منہاج الدین دہلی واپس ہوا جہاں اسے گالیور (گوالیار) کے عہدہ قضا کے علاوہ مدرسہ ناصریہ کا صدر مدرس اور مہتمم بھی بنا دیا گیا۔

بہرام شاہ کے عہد حکومت میں ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں منہاج الدین کو قاضی پایۂ تخت و قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ بہرام شاہ کے قتل ہو جانے کے بعد اس نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس دور میں اس پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔ جس میں وہ بال بال بچا۔ اس کے بعد وہ دو سال تک یعنی ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء تک لکھنوتی (مشرقی بنگال) میں گوشہ نشین رہا۔ سلطان علاء الدین مسعود نے اسے دوبارہ دہلی طلب کیا اور مدرسہ ناصریہ کا انتظام اوقاف دہلی کی تولیت، گالیور کی قضا اور خطیب جامع مسجد دہلی کی حیثیت سے اس کا تقرر کیا گیا۔

جب سلطان ناصر الدین ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں دہلی میں تخت نشین ہوا تو اس نے منہاج الدین پر گوناگوں نوازشات کیں۔ ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء میں اسے کل ہند کا قاضی القضاۃ اور حاکم حضرت دہلی مقرر کیا گیا۔ اور ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۲۰ ربیع الاول ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں اسے "صدر جہاں" کا خطاب دیا گیا۔ ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء میں تیسری مرتبہ ہندوستان کا قاضی القضاۃ اور قاضی حضرت دہلی بنا دیا گیا۔

بلبن جو بعد میں غیاث الدین بلبن کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا منہاج الدین کا مربی خاص تھا۔

اس کے بعد کے حالات زندگی، اس کی وفات اور اس کے مدفن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً اس نے ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء، ۱۲۶۰ء میں وفات پائی ہو گی۔ کیونکہ اس کی آخری تصنیف جو "طبقات ناصری" کے نام سے ہے۔ ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء کے اواخر میں مکمل ہوئی تھی۔

منہاج الدین ایک ہمہ گیر شخصیت کا حامل تھا۔ وہ ایک عالم، درباردار، فقیہ، شاعر، ادیب اور مورخ تھا۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے اسے اہل تصوف اور صاحب وجد و سماع لکھا ہے۔

سلطان ناصر الدین کی اس پر گوناگوں نوازشات تھیں۔ چنانچہ اس نے اس سلطان کے نام پر پہلے "ناصری نامہ" اور پھر "طبقات ناصری" تصنیف کیں۔

منہاج الدین کی تصانیف میں "طبقات ناصری" بہت زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں اس نے قدیم تاریخی کتب کے حوالے سے نیز اپنے مشاہدات اور ان روایات کی بنیاد پر جو اس تک پہنچیں فارس و یمن اور عرب کے قدیم بادشاہوں کے حالات نیز انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور پھر ظہور اسلام سے اپنے عہد تک کے احوال رقم کیے ہیں۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

جولان

جنوبی شام کا ایک ضلع۔ اس کے مغرب میں اردن شمال میں جبل الشیخ کی شاخیں مشرق میں دریائے رقاد اور دریائے علان اور جنوب میں دریائے علان اور جنوب میں دریائے یرموک واقع ہے۔ جولان کا شمالی حصہ قدرے بلندی پر واقع ہے جو ایک غیر آباد کوہستانی علاقے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ کانی چٹانوں والی زمین پر بلوط کے جنگلات موجود ہیں۔ جولان کا جنوبی حصہ خاصا نشیب میں ہے۔ اس حصے کی زمین میں برکانی کنکر پائے جاتے ہیں یہ نسبتاً ہموار ہے۔

موجودہ جولان کا یہ علاقہ سیلیکی عہد کے قدیم جولانیتس سے ملتا جلتا ہے جو کہ باشان جولان کے نام پر جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں آتا ہے۔ موسوم ہوا لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ علاقہ وقت کے ساتھ ساتھ سکڑتا رہا۔

ایک وقت تھا کہ اس صوبے میں دریائے علان کے مشرق کا علاقہ بھی اس صوبے میں شامل تھا۔ چنانچہ سرحد کے اس پار جابیۃ الجولان اور تسیم الجولان جیسے مقامات [illegible] اس کا واضح ثبوت ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور تک یہ علاقہ جولان کے صوبے میں شامل تھا بزنطی عہد میں جولان ولایت فلسطین ثانیہ میں شامل تھا۔ اور اس [illegible] بنو غسان کی ریاست کا ایک مرکز تھا۔ مرثد جیل نے جب اردن کو فتح کیا تو اس [illegible] اس نے اس علاقے پر بھی قبضہ کیا۔ بعد میں اسے دمشق کے صوبے سے ملا دیا گیا تھا۔ [illegible] المقدسی جولان دمشق کے چھ اضلاع میں سے ایک تھا۔ اس کا صدر مقام [illegible] اور مملیک کے عہد تک اس کی یہی حیثیت برقرار رہی۔ جدید عہد میں بہ حیثیت قصبہ [illegible] ہے لی۔ جو دمشق اور طبریہ کے درمیان ایک اہم سڑک پر آباد ہے۔ اس کی آبادی [illegible] حصہ بنو مرہ پر مشتمل تھا۔ لیکن اب یہاں مختلف النسل اور مختلف زبانیں بولنے والے آباد ہیں۔ ان لوگوں میں دروز اور متاولہ شیعہ بھی شامل ہیں۔ جو کہ حرمون کے [illegible] چرکسوں اور ترکمانوں کی آبادیوں اور دوسرے بدوی قبائل کے ساتھ ساتھ [illegible] زندگی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ آباد ہو گئے ہیں۔

اس شہر کی شہرت خاص طور پر یہاں کی زرعی پیداوار کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ دمشق کو یہیں سے غلہ فراہم کیا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں بھی اس پورے علاقے میں غلہ [illegible] کرنے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

جوناگڑھ

پاک و ہند کا ایک متنازعہ شہر اور عہد برطانوی میں ہندوستان کی ایک ریاست جو ۲۲ درجے ۴۴ دقیقے اور ۲۱ درجے ۵۳ دقیقے عرض بلد شمالی اور [illegible] درجے اور ۷۰ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳۳۳۷ مربع میل ہے تقسیم پاک و ہند کے وقت یہاں کی آبادی تقریباً ساڑھے سات لاکھ تھی اور سالانہ آمدنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ تھی۔ یہ شہر مغرب اور جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب سے گھرا ہوا ہے اس کی ایک بارونق بندرگاہ جو ویراول (ملبادل) کے نام سے مشہور ہے کراچی پاکستان سے تین سو بحری میل کے فاصلے پر ہے۔

ریاست میں گرنار کی پہاڑیوں پر کئی ایک جینیوں اور ہندوؤں کے مندر ہوتے ہیں ہندوان پہاڑیوں کو بہت مقدس خیال کرتے ہیں۔ یہ مندر جو ان پہاڑیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے کے ہیں۔ جوناگڑھ اور گرنار پہاڑیوں کے درمیان ایک کھنڈ کی چٹان پر مہاراج اشوک کے فرمان کھدے ہوئے ملے ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانہ

قدیم میں یہ علاقہ بدھ مت کا ایک خوشحال مرکز اور سلطنت موریا کا ایک حصہ تھا خاندان موریا کے بعد اس علاقے میں باختریوں اور یونانیوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ ان سلطنتوں کا صدر مقام جوناگڑھ تھا۔ جب ان بیرونی حکمرانوں کا زوال شروع ہوا تو یہاں کے مقامی راجپوت سرداروں نے انہیں مغلوب کر کے ملک بدر کر دیا۔ جب محمود غزنوی نے ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں حملہ کر کے یہ سارا علاقہ فتح کیا تو یہ علاقہ انہی راجپوتوں کے قبضے میں تھا۔ سومناتھ کا مندر بھی جسے محمود غزنوی نے مسمار کیا تھا جس میں وہ مشہور بت جس کو محمود غزنوی نے توڑا تھا اسی علاقے میں تھا۔

محمود غزنوی اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد ایک مسلم فوجدار کے ہاتھ میں دے کر غزنہ واپس چلا گیا۔ جسے بعد میں یہاں کے راجپوتوں نے اس علاقے سے نکال باہر کیا۔ ۵۹۳ھ/۱۱۹۶ء-۱۱۹۷ء میں قطب الدین ایبک نے انہلواڑہ کی فتح کے بعد سورٹھ (کاٹھیاواڑ بشمول جوناگڑھ) پر چڑھائی کی لیکن خراج وصول کر کے واپس چلا گیا۔

اس کے بعد تقریباً سو سال تک کسی مسلمان حملہ آور نے اس علاقے پر حملہ نہیں کیا۔ اگرچہ شمال کی طرف سے مسلمان سیاحت کے لئے برابر یہاں آتے رہے۔ بعض مسلمانوں نے یہاں سکونت بھی اختیار کر لی۔

۶۹۷ھ/۱۲۹۷ء میں علاء الدین خلجی کے بھائی الماس بیگ الغ خاں نے سورٹھ پر حملہ کیا اور سومناتھ کو راجپوتوں سے چھین کر اس مندر کو زمین بوس کر دیا۔ لیکن اس نے چوڑاسما راجپوتوں سے جو جوناگڑھ پر قابض تھے کوئی تعرض نہ کیا۔ ۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء میں سلطان محمد بن تغلق نے اس علاقے پر حملہ کر کے جوناگڑھ کا قلعہ فتح کر لیا۔ چنانچہ اسی وقت سے جوناگڑھ صوبہ گجرات کی عملداری میں آگیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں ناظم گجرات نے جوناگڑھ میں ایک تھانہ قائم کیا۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے اس تبدیلی حالات سے پورے طور پر مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ ناظم گجرات ظفر خان نے ۷۹۷ھ/۱۳۹۴ء اور ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں سومناتھ پر سرکش راجپوتوں کو سزا دینے کے لئے حملہ کیا تھا۔ یہ راجپوت ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء تک اس بیرونی حکومت کے خلاف کوششیں کرتے رہے۔ چنانچہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں محمود بیگڑا نے راجپوتوں کے آخری فرمانروا کو شکست دے کر جوناگڑھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

محمود کو اس معزول کردہ راجہ کے خلاف جس نے اپنا کافی علاقہ دوبارہ واپس لے لیا تھا ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء اور ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں مزید دو حملے کرنے پڑے۔ ایک سال تک بڑی [illegible] کے بعد آخر کار سلطان محمود جوناگڑھ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی کے بعد ہندوؤں کی حکومت جوناگڑھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور شہر کا نام مصطفےٰ آباد رکھا گیا۔ سادات، علماء و قضاۃ اور دیگر مشاہیر کو احمد آباد سے اس شہر میں آ کر بس جانے کی دعوت دی گئی۔ قدیم قلعے کی مرمت کی گئی۔ نیز دولت مند لوگوں کو بڑے بڑے مکانات، مسجدیں اور رفاہ عامہ کی عمارات بنانے کی ترغیب دلائی گئی۔ چنانچہ تھوڑے سے ہی عرصے میں شہر کی عظمت و شان کو چار چاند لگ گئے۔ قلعہ اوپرکوٹ کی بستی جوناگڑھ ہی کہلاتی رہی لیکن نیچے کے نئے شہر کا نام مصطفےٰ آباد کہلانے لگا۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء تک جوناگڑھ سلاطین گجرات کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد میں اس کو عبدالرحیم خانخاناں نے فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔

صوبہ گجرات کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے جوناگڑھ کا انتظام فوجداروں کے سپرد تھا۔ جنہیں ناظم مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک فوجدار شیر خان بابی نے جو نسلاً افغان تھا، ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء-۱۷۳۸ء میں اپنے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایک دانشمند فوجی سردار تھا۔ اس نے اپنے بیس سالہ دور حکومت اپنی حکومت استحکام اور مضبوطی سے قائم کر لی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں محمد مہابت خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بارہ سال حکومت کی ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا کمسن بیٹا محمد حامد خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ستائیس سال تک حکومت کر کے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں وفات پائی۔

جوناگڑھ کے اسی فرمانروا سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلی مرتبہ معاہدہ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں ہوا۔ اس سے قبل جوناگڑھ اور اس کی باجگزار ریاستوں مانا ودر، مانگرول اور دیگر تعلقوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا تھا۔ جس کی رو سے انہوں نے جوناگڑھ کی سیادت اور ان سے خراج وصول کرنے کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ یہ معاہدہ تسلیم کروانے میں انگریز ریذیڈنٹ مقیم بڑودہ کا بھی عمل دخل تھا۔ چنانچہ انگریزوں کا ملک کے اندرونی معاملات میں عمل دخل بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۱ء میں جوناگڑھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا تفوق پوری طرح تسلیم کر لیا۔ اور کمپنی نے خراج کی وصولی کا کام ریاست کی طرف سے اپنے ذمے لے لیا جوناگڑھ کا یہ فرمانروا ۱۸۴۰ء میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا کم سن لڑکا اس کا جانشین ہوا۔

بعد کے فرمانرواؤں میں محمد رسول خان جو ۱۸۹۲ء تا ۱۹۱۱ء تک برسر اقتدار رہا۔ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے دور حکومت میں جوناگڑھ میں ایک کالج، ایک کتب خانہ، عجائب گھر اور ایک جدید طرز کا ہسپتال، آب رسانی کا کارخانہ اور ایک یتیم خانہ قائم کیا۔ سومناتھ کے مندر کی مرمت کے لئے ایک معقول رقم مختص کی۔ اس کی وفات کے بعد ۱۹۱۱ء میں اس کا لڑکا محمد مہابت خاں چونکہ کم سن تھا۔ اس لئے ریاست کا نظم و نسق حکومت ہند نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب مہابت خان سن بلوغ کو پہنچا تو اس نواب گدی نشین کو ۱۹۲۰ء میں پورے اختیارات سونپ دیئے گئے۔ ۱۹۴۳ء سے ریاست جوناگڑھ کے ساتھ سردار گڑھ اور بانٹوہ کی باجگزار ریاستیں اور بہت سے دیگر تعلقے جوناگڑھ سے ملحق ہو گئے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب برطانوی اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہو گیا تو اس ریاست نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا۔ ہندوستانی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی چنانچہ جب ریاست نے اپنا فیصلہ واپس لینے سے انکار کر دیا تو اسی سال نومبر میں ہندوستانی فوجوں نے ریاست پر ناجائز طور پر جبراً قبضہ کر لیا۔ نواب نے مع اہل و عیال پاکستان (کراچی) میں پناہ لی۔ اور اس نے ۱۹۶۰ء میں یہیں پر وفات پائی۔ جوناگڑھ کے الحاق اور قبضے کا جھگڑا ہندوستان اور پاکستان میں اب تک چل رہا ہے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں چلا آتا ہے۔

ریاست جوناگڑھ کا سب سے بڑا شہر جوناگڑھ ہندوستان کے سب سے خوشنما اور خوبصورت شہروں میں سے ہے۔ اس کا قدیم قلعہ، اوپرکوٹ برعظیم ہند و پاک کے مضبوط ترین پہاڑی قلعوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس شہر میں متعدد شاندار اور اعلیٰ درجے کی عمارات پائی جاتی ہیں۔ ان عمارات میں پہلے حکمرانوں کے اور ان کی بیگمات اور وزیر شیخ بہار الدین کے مقبرے شامل ہیں۔ جو دکنی طرز تعمیر پر بنائے گئے تھے۔ ان مقبروں کی خصوصیت ان کے ان کے پہلوؤں کے دو دو مینار ہیں جن پر چڑھنے کیلئے گھومتے ہوئے زینے باہر کی طرف بنے ہوئے ہیں۔ پورے برعظیم پاک و ہند میں اس طرح کے زینوں کا نمونہ اور کہیں نہیں ملتا۔

جوناگڑھ شہر میں دو بڑی لمبی چوڑی توپیں موجود ہیں۔ جنہیں بیرونی ترک جو یہاں کے حکمران کے ملازم تھے جوناگڑھ لائے تھے۔ یہاں پر ایک وسیع جنگل ہے جو بہت گھنا ہے اور گر جنگل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ امراء اور مقامی رئیسوں کی پسندیدہ شکارگاہ ہے۔ اسی ریاست کی حدود کے اندر سومناتھ کا مندر بھی ہے۔

جونپور

ہندوستان کے صوبہ اترپردیش (شمالی ہندوستان) میں دریائے گمتی کے کنارے

ایک شہر جو ۲۵ درجے ۴۴ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸۲ درجے ۴۲ دقیقے طول بلد مشرقی میں واقع ہے۔

جونپور کی بنیاد ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں فیروز شاہ تغلق نے منیاچ کے قریب رکھی تھی۔ ہیکل کے مشابہ ہے۔ اس مسجد کا سب سے بڑا دروازہ ۲۲ء۹ میٹر اونچا ہے۔ ہر باب مسجد کے اندر ایک وسیع محراب دار حجرہ ہے جس میں روایتی طور پر بنی ہوئی بیزدوں کی انوں جیسی جھالریں ہیں۔ اس مسجد میں مینار نہیں ہیں۔ ایک اور مسجد خالص مخلص، جو ابراہیم کے درو الیوں نے تعمیر کی تھی۔ اسی عہد کی ہے۔ اس مسجد کے صرف مرکزی باب مسجد ہیرج اور مغربی لیوان باقی رہ گئے ہیں۔ جو تمام دلیو ہیکل اور بغیر کسی تزئین کے ہیں۔

اسی عہد کی ایک اور مسجد جو مسجد جھنجھری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے وسطی دروازے میں سے صرف اس کی منقش دلیوار باقی بچی ہے۔ جو جونپور کی سنگ تراشی کے نہایت نفیس کام سے بھری پڑی ہے۔

مسجد لال دروازہ جو شہر کے شمال جنوب میں واقع ہے۔ جونپور کی سب سے چھوٹی مسجد ہے۔ یہ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں تعمیر کی گئی تھی۔

جسے ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے برباد کیا تھا۔ مسلم مورخین کے نزدیک جونپور کا نام جونہ شاہ سے مشتق ہے جو تخت نشینی سے پہلے محمد بن تغلق کا لقب تھا۔

ناصر الدین محمود تغلق کے دور حکومت میں جب ملک پر آشوب حالات سے دوچار تھا تو مشرقی اضلاع کے ہندوؤں نے سلطنت دہلی کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔

۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں خواجہ سرا ملک سرور خواجہ جہاں نے محمود کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے اسے بھیجے۔ چنانچہ خواجہ جہاں نے کویل (علی گڑھ) اناوہ اور قنوج کو مطیع کر لینے کے بعد جونپور پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں وہ اودھ کی سلطنت کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔

۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں دہلی کے سلطان بہلول لودھی نے آخری شرقی سلطان حسین کو شکست دی اور اپنے لڑکے باربک کو جونپور کا حکمران بنایا نیز اسے شاہی لقب اور سکہ ضرب کرنے کی اجازت بھی دی۔ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں سکندر لودھی جب دہلی کا سلطان بنا تو جونپور کو بھی اس نے دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء، ۱۵۲۷ء میں ہمایوں نے اپنے باپ بابر کے لئے جونپور کو فتح کیا اور وہاں پر گورنر کا تقرر کیا گیا لیکن شیر شاہ سوری کی قوت بڑھ جانے اور گورنر جنید برلاس کی وفات کے بعد جونپور افغان گروہ کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ چنانچہ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں ہمایوں نے ایک بار پھر مجبوراً جونپور پر چڑھائی کی اور اس پر قبضہ کیا۔

ہمایوں کی دہلی سے طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد مشرقی صوبوں پر سے اس کا قبضہ ختم ہو گیا تو ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کی فتح عظیم کے بعد اسے اور اس کے بیٹے عادل خان کو جونپور کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔

جب چنار نے ترقی کی تو جونپور کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ علی قلی خان کی جو ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء میں وہاں کا گورنر تھا، بغاوت (۹۷۴ھ/۱۵۶۷ء) کے پہلے اسے اہمیت حاصل

جامع مسجد، جون پور

نہ ہوئی - جب ۹۷۴ھ/ ۱۵۶۷ء میں علی قلی خاں نے شکست کھائی - تو اکبر نے عارضی طور پر وہاں سکونت اختیار کر لی - اور خانخانان محمد منعم خان کو وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا -

الہ آباد کی تاسیس کے بعد جونپور کی ساری اہمیت ختم ہو کر رہ گئی اور بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جونپور نوابان اودھ کے اور ۱۷۷۵ء میں انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا -

جونپور اپنی تاسیس کے زمانے سے لے کر شیر شاہ کے عہد تک اپنے علم و فضل کی وجہ سے "شیراز ہند" کہلاتا تھا - یہاں کے بعض حکمران روایتی انداز کے عالم و فاضل سے بڑھ کر شائستہ، نکتہ سنج اور صاحب ذوق تھے - اس کی مساجد میں آج بھی دینی مدارس موجود ہیں

جونپور کی یادگار عمارات میں فیروز شاہ کا قلعہ ہے - جو دریائے گومتی کے شمالی کنارے پر واقع ہے - اس کی دیواریں پتھر کی ہیں جو کافی بلند ہیں - اس کی حفاظت کے لئے مخروطی در کروی برج تعمیر کئے گئے ہیں - ان برجوں کو ۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے مسمار کر دیا تھا - انہی مسمار شدہ عمارات میں فیروز شاہ کے گورنر کا تعمیر کرایا ہوا محل چہل ستون بھی تھا - اسی گورنر کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد ابھی تک موجود ہے - جو اس نے اپنے قلعے میں تعمیر کرائی تھی مسجد کے صحن میں ایک منفصل مینار ہے جو تقریباً بارہ میٹر اونچا ہے -

ان ہی قابل دید عمارات میں اٹلہ مسجد بھی ہے - جس کی بنیادیں فیروز شاہ تغلق نے ہندوؤں کے مندر اٹلہ دیوی کی جگہ رکھی تھی - اسے ابراہیم شرقی نے ۸۱۰ھ/ ۱۴۰۸ء میں تعمیر کرایا - یہ مسجد سب سے بڑی (۲۰۸۰ مربع میٹر) اور سب سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے - اس کے ایوان کا مرکزی کھانچا جو ایک بہت بڑے برج سے ڈھکا ہوا ہے اور سے صحن کی طرف سے ایک بلند مخروطی پھاٹک نے ڈھانپ رکھا ہے

جونپوری، سید محمد (جمادی الاول ۸۴۷ھ/ ۱۰ ستمبر ۱۴۴۳ء - ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۵ء) مہدی ہونے کا مدعی - والد کا نام سید خان تھا - وہ بڈھ اویسی اور لی بن آقا ملک کے نام سے بھی مشہور تھا - جونپور میں پیدا ہوا -

سید محمد بچپن ہی میں بہت زیادہ ذہین اور غیر معمولی قوت حافظہ کا مالک تھا - اس نے سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا - بارہ سال کی عمر میں اس کے استاد شیخ دانیال چشتی نے اسے اسد العلماء کے خطاب سے نوازا - چالیس سال کی عمر میں وہ جونپور سے مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوا - قیام مکہ معظمہ کے دوران میں طواف کرتے ہوئے اس نے اچانک اعلان کر دیا کہ وہی مہدی موعود ہے - مکہ کے علماء نے اس کے دعوے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی - اگلے سال وہ گجرات واپس آیا - احمد آباد میں اس کا ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۷ء میں پہلی بار راسخ العقیدہ علماء کے ساتھ تصادم ہوا - جنہوں نے اس کے اس دعوے کو چیلنج کیا کہ خدا ان طبعی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے - چنانچہ ماحول کو اپنے خلاف پا کر وہ احمد آباد چلا گیا - لیکن ۹۰۵ھ/ ۱۴۹۹ء میں اس نے پٹن کے قریب ایک چھوٹی سی جگہ بڑھلی میں ایک بار پھر اپنے مہدی ہونے کے دعوے کو دہرایا اور بعض خود مختار حکمرانوں کو جن میں غیاث الدین خلجی (مالوہ) محمود بیگڑا (گجرات) احمد نظام شاہ (احمد نگر) شاہ بیگ (قندھار) اور میر ذوالنون (فراہ) کے حکمرانوں کو اس نے تبلیغی خط لکھے اور لکھا کہ یا تو اسے مہدی مان لیں یا اگر وہ جھوٹا ہو تو اسے مروا دیں - چنانچہ ان حکمرانوں نے اس کے دعوے مہدویت کو تسلیم کر لیا - لیکن یہ بات بھی علماء کو متاثر نہ کر سکی - جب علماء نے دیکھا کہ عوام میں اس کا اثر بڑھتا جا رہا ہے تو اس کی جلا وطنی کا مطالبہ کیا - وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا پھرا - جب یہاں اسے اپنے دعوے میں ناکامی ہوئی تو وہ خراسان میں فراہ کے مقام پر آیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا -

اس کے پیرو زیادہ تر جنوبی ہند کے بعض علاقوں میں آباد ہیں جو ابھی اس کے مقبرے کی زیارت کرنے کے لئے فراہ میں جاتے ہیں -

اس کے مرنے کے بعد اس کے پیروکاروں میں متعدد روحانی جانشین اور خلفاء ہوئے سب سے پہلا خلیفہ اس کا لڑکا سید محمود تھا - اس عرصے میں اس کے پیروکاروں نے اپنے کئی ایک مرکز قائم کئے - جنہیں وہ اپنی اصطلاح میں "دائرے" کہتے ہیں یہ دائرے زیادہ تر گجرات میں تھے - جہاں وہ مل کر مشترک زندگی بسر کرتے تھے - وہ صرف آپس میں ہی لین دین کرتے تھے - ان کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت کو حکومت نے اپنے لئے خطرہ سمجھا تو حکومت نے ان پر سختی کرنی شروع کی - انہیں مرتد قرار دیا گیا اور ان کے خلیفہ کو قید میں ڈال دیا گیا - جہاں وہ قید کی مشقتوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء میں انتقال کر گیا - نیز جب گجرات کے علماء نے ان کے قتل کا فتوےٰ دیا تو انہیں اور زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا - ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء میں سدراسن کے مقام پر گجرات کی فوج اور مہدویوں کے درمیان بڑے زور کا رن پڑا - جس میں ان کا خلیفہ خوندمیر اپنے بہت سے پیروکاروں کے ساتھ مارا گیا - اگرچہ علماء کی مخالفت اور حکومت کی مزاحمت کے باوجود یہ تحریک بالکل ختم نہ ہو سکی -

سید محمد جونپوری بہت نیک سیرت انسان تھا - عبدالقادر بدایونی جیسا انسان بھی جو اس کا سخت معترض تھا، اس کے تقوے، علم و فضل اور اخلاص کا قائل تھا اور اسے عظیم علماء میں شمار کرتا تھا -

دوسرے صوفیاء کی طرح سید محمد نے بھی اپنے پیروکاروں کو دنیا سے کنارہ کش رہنے اور ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنے کا حکم دیا - وہ توکل، صحبت صالحین پر اور دنیا سے کنارہ کشی پر زور دیتا ہے -

اس کے پیروکار ہجرت کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے - اگرچہ یہ لوگ سیاست سے کنارہ کش رہتے تھے - تاہم ان کی سرگرمیوں نے حکومت کو کارروائی کرنے پر مجبور کیا -

سید محمد سرمایہ پرستی، ذخیرہ اندوزی اور جمع مال کو بھی ایک غیر اسلامی اور لائق مذمت فعل قرار دیتا ہے -

اس کی تحریک کی ناکامی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں -

۱ - اس کے پیروکاروں کی ملت کے سواد اعظم سے علیحدگی -
۲ - بانی تحریک سید محمد کو مہدی موعود تسلیم کرلنے پر ان لوگوں کا اصرار
۳ - علماء اور حکومت کی مخالفت
۴ - شمالی ہند میں قابل قیادت کی کمی -
۵ - دکن میں ان لوگوں کا سیاست میں الجھ کر رہ جانا -

سید محمد کے پیروؤں کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں موجودہ دور میں سابق ریاست حیدر آباد (دکن)، میسور، جے پور اور گجرات میں موجود ہیں - جو لوگ پاکستان ہجرت کر کے آگئے ہیں انہوں نے شہدادپور کے مقام پر ایک "دائرہ" قائم کیا ہے -

جوہر لفظ فلسفہ ارسطالیس کی ایک بنیادی اصطلاح ہے - مادہ، اصل ہر شے، فارسی اور عربی زبانوں میں اس کے معنی قیمتی پتھر کے بھی ہیں - یہ مادے کو اس کے عام مفہوم کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقی معنی میں آتا ہے یعنی وہ چیز جو حقیقت میں موجود ہو - افلاطون کے نظریے کے مطابق جزئی اور چند روزہ اشیاء جو عالم محسوسات میں نظر آتی ہیں - محض نمود ہیں - اس کی حقیقت اس عالم میں ہے جو ماوراء ہے اور وہ غیر متغیر اور قدیم تصورات کا عالم ہے -

ارسطالیس اور اس کے مسلمان متبعین کا نظریہ افلاطون کے نظریے کے خلاف ہے

ان کے نزدیک عالم محسوسات حقیقت رکھتا ہے اور افراد پر مشتمل ہے ۔ اسی لئے مادہ (جوہر) اپنے سب سے وسیع اور گہرے مفہوم کے لحاظ سے ارسطاطالیس کی فہرست مقولات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم مقولہ ہے جس سے مراد ایک محسوس اور ٹھوس جسم ہوتا ہے ۔ اس مفہوم کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ عالم محسوس کی تمام اشیاء ، تمام اجسام ، اجزائے اجسام نباتات اور حیوان سب جوہر ہیں ۔ منفرد جوہر بعض اوقات اول کہلاتے ہیں تاکہ انہیں دوسرے جواہر یعنی انواع و اجناس سے ممتاز کیا جائے ۔ لیکن ارسطاطالیس اور اس کے مکتبہ فکر کے مطابق ہر ایک ٹھوس اور معین جسم دو چیزوں مادہ اور صورت سے مرکب ہے ۔ اور اگرچہ مادہ بغیر صورت کے موجود بذاتہ نہیں ہو سکتا اور نہ صورت ہی ، کم سے کم عالم تحت القمر یعنی عالم ارضی میں تاہم دونوں کی حقیقت خارجی ہے ۔ مادہ اپنے معنوی مفہوم کے لحاظ سے مادہ اور اور صور کی تہ میں پنہاں شے ہے اور بذاتہ کوئی معین صورت نہیں رکھتا ۔ تاہم چونکہ یہ صورتوں کا حامل ہے جو کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی حقیقتیں ہیں ۔ اسلئے اسے جوہر یا شے کا نام دینا ہوگا ۔

علاوہ ازیں جوہر محض ایک استعداد یا قوت ہے لیکن سارے وجود کی اصل بھی ہے اس لیے خود اپنے وجود کی اصل نہیں ہو سکتا ، بلکہ قدیم اور ازلی ہے ۔ صورت ، ذات ، ماہیت اور حقیقت ہے اور وہ ہر فرد جزئی کی ایک عمومی خصوصیت ہے ۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہر فرد انسان ایک انسان ہے ۔ اور انسان ہونا اس کی ماہیت ہے جو اسے دیگر حیوانات سے جدا کرتی ہے اور یہی اس کے انسان ہونے کی ایک علت ہے ۔ اسی کو ارسطاطالیس اور اس کے دبستان کے لوگ "علت صوری" کہتے ہیں ۔ اگرچہ یہ ذوات ارسطاطالیس کے نظریے کے مطابق بذاتہ موجود نہیں کیونکہ وجود تو فقط جزئیات یا افراد کا ہوتا ہے ۔ پھر بھی وہ انہیں ایسی حقیقتیں مانتا ہے جو حادث چیزوں کی حقیقت سے اعلیٰ ہیں ۔ کیونکہ وہ علتیں ہیں اور علت اس کے نزدیک اپنے معلول سے زیادہ بلند مرتبہ ہوتی ہے پھر یہ قدیم ہیں اور اس لحاظ سے بھی یہ افراد کہلانے کی بہ نسبت جوہر کہلانے کی زیادہ مستحق ہیں ۔ لیکن ان ذوات کو جو خود موجود نہیں مگر قدیم ہیں حادث موجودات کی علت صوری کیسے مانا جا سکتا ہے ۔ یہ ایک اہم سوال ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے نو افلاطونی فلسفے کے نقیب مسلم فلاسفہ ارسطاطالیس کو چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان ذوات کا حقیقی اور قدیم سرچشمہ اللہ تعالےٰ کے علم میں یا اس کے خیال کرنے میں قائم ہے یہ اللہ ہی کا "خیال" ہے جو تمام اشیاء کی علت صوری اور علت العلل ہے ۔ تاہم اللہ تعالےٰ کی وحدت کاملہ اس کے اپنے خیال سے متاثر نہیں ہوتی ۔ اللہ کا شعور ذاتی ان ذوات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اللہ جو عالم ہے اس کی ذات میں علم اور معلوم سب ایک ہیں ۔

نیز یہ کہ اس عالم میں وہ خفیہ جوہر ہے جسے العقل الفعال کہتے ہیں ۔ یہ غیر مولود اور غیر فانی ہیں ۔ یہ ایک غیر مادی صورت ہے جو عقل انفعال سے مل کر انسانی ہستیوں میں انکا رو حرکت میں لاتی ہے ۔ اس عالم سے اوپر اور بھی عقول ہیں جو جواہر ہیں اور یہی کرہ ہائے افلاک کو متحرک کرنے والی ہیں ۔ پھر سب سے اوپر چوٹی پر اللہ تعالےٰ جو الحق اور صحیح ترین معنی میں جوہر ہے ۔ تاہم ارسطاطالیس کے نزدیک اللہ تعالےٰ تو ایک قدیم کائنات کا قدیم حرکت دینے والا ہے ۔ مگر وہ اس کا پیدا کرنے والا نہیں ۔ نہ کرہ ہائے افلاک حرکت میں لانے والے عقول اپنی ذات یا وجود میں اس کے محتاج اور تابع ہیں لیکن مسلم فلاسفہ کے نزدیک نو افلاطونی نظریہ [illegible] کے زیر اثر ، واجب الوجود ایک قدیم اور متعقل خالق عالم ہے اور عالم اس کے ساتھ موجود ہے ۔ اور قدیم ہے ۔ ان کے نزدیک وحدت الٰہی سے کثرت عالم پیدا ہوتی ہے اور اس کا ذریعہ ہے وسائط ، عقول اور نفوس کے سلسلہ تنزلات کا قدیم و لا زمانی ظہور ۔ یہی مجرد ہستیاں رہ [illegible] ہائے افلاک کو حرکت میں لاتی ہیں اور اس سلسلہ عقول کی آخری کڑی عقل فعال یعنی واھب الصور ہے ۔

امام غزالی نے اس کی بنیادی کمزوریوں پر نظر ڈالی ہے ۔ اگر عالم کثرت وسائط سے حاصل ہوا ہے تو اللہ کے علاوہ علل العلل اور بھی ثابت ہوتی ہیں اور اگر خود اللہ سے حاصل ہوا ہے تو درمیانی وسائط بے کار ہیں ۔ اگر اللہ سب سے برتر قدیم اور وجود عالم کی علت اولین ہے تو عالم کے تمام تغیرات اسی سے صادر ہوں گے ۔ ان کا ماخذ مادہ نہیں ہو سکتا جو پہلے سے موجود ہو ۔ کیونکہ اللہ سے پہلے کوئی ایسی ہستی ہے ہی نہیں ۔ اس کے علاوہ مادہ بلا صورت موجود ہو ہی نہیں سکتا ۔ نیز یہ کہ قدیم فلاسفہ کی ساری الجھنیں مادے کو قدیم ماننے کا نتیجہ ہیں ۔ حالانکہ وہ حادث ہے ۔

اشاعرہ کے نزدیک جوہر محض چند اعراض کی اساس مضمرہ ہے ۔ جس کا نام دیا ہے اسے مادہ کہہ لے مگر یہ وہ مادہ نہیں جسے ارسطاطالیسی فلسفہ ایک صاحب استعداد و قوت ذات مانتا ہے ، بلکہ فقط ایک ایسی شے جو اعراض بردار یا حامل اعراض ہے اسے جسم بھی کہہ سکتے ہیں ۔ کیونکہ یہ اساس مضمرہ جواہر سے مرکب ہے جو باہم اکٹھے ہو کر جسم بن جاتے ۔ پھر بھی یہ اصطلاح کسی قدر مبہم بن رہتی ہے ۔ کیونکہ وہ جوہر کا اطلاق جزء لایتجزیٰ پر کرتا ہے ۔ جب کہ اجزاء لایتجزیٰ جن سے مل کر عالم بنا ہے ۔ ان کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے ان کا دار و مدار صرف اللہ تعالےٰ کی قدرت پر ہے ۔ جو کہ ہر وقتی جوہر میں اپنی جوہر دنیا کی دم بدم تخلیق کرتا رہتا ہے ۔ نیز چونکہ علم کلام میں جوہر کے معنی خالص مادی شے ہے [illegible] اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالےٰ پر نہیں کیا جا سکتا ۔

مسلمان فلاسفہ اس بات میں بھی ارسطاطالیس سے اختلاف کرتے ہیں ۔ ارسطاطالیس روح یا نفس کو بھی جوہر کہتا ہے کیونکہ وہ ہر زندہ شے کی علت صوری ہے تاہم وہ اسے بدن سے الگ کوئی علیحدہ شے تسلیم نہیں کرتا ۔ یعنی ایسی شے جو بدن سے [illegible] کی فنا کے بعد باقی رہے ۔ اس کے مقابلے میں مسلم فلاسفہ روح یا نفس کو جوہر [illegible] تسلیم کرتے ہیں ۔ یعنی ایسا جوہر جو اپنا وجود رکھتا ہے اور اس کا [illegible]

جوہر صقلی [illegible] ذوالقعدہ [illegible] اور منتظم جو شمالی افریقہ اور مصر میں فاطمی سلطنت کے بانیوں [illegible]

جوہر کے والد کا نام عبداللہ تھا ۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۔ [illegible] خاندان کا ایک آزاد شدہ غلام تھا اور سلافی نسل سے تھا ۔ [illegible] باپ عبد [illegible]

٣٤٧ھ / ٩٥٨ء میں جب المعز نے فیصلہ کیا کہ اپنی پوری طاقت [illegible] لگا دے جس سے سارا شمالی افریقہ اس کے زیر نگیں آ جائے تو اس نے [illegible] اپنے کاتب جوہر کو دی تاکہ وہ جوہر کو دوسرے لوگوں کی نظر میں بڑا ثابت کر سکے [illegible] سپاہیوں میں ماہر ترین اور قابل شخصیت ہے ۔

جوہر نے اس مہم میں جو مغرب اوسط و مغرب اقصیٰ میں عقبہ بن نافع [illegible] تقریباً ٢٨٩ سال بعد عمل میں آئی تھی [illegible] کی کامیاب مہموں [illegible] کامیاب تھی ۔ اگرچہ جوہر نے جو فتوحات حاصل کیں ان کے اثرات دیرپا نہ تھے [illegible] کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں ۔

ایک تو اس علاقے کی نوعیت بڑی دشوار گذار تھی اور دوسرے دشمن کی طاقت [illegible] زیادہ تھی ۔

تاہرت کے قریب اس کا زناطیوں کی ایک بڑی فوج سے مقابلہ ہوا ۔ جوہر نے اس لڑائی میں کامیابی حاصل کی اور زناطیوں کا قائد یعلیٰ بن محمد جو افکن کا گورنر تھا اور [illegible] کا طرفدار تھا اس لڑائی میں مارا گیا ۔

اس لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد جوہر نے فاس پر چڑھائی کرنے کے بجائے یا اس علاقے میں بنو امیہ کے دوسرے قلعوں کو فتح کرنے کے بجائے [illegible] چنانچہ اس نے اپنا رخ جنوب مشرق کی طرف کیا اور سجلماسہ کی چھوٹی سی ریاست پر [illegible] کر دیا ۔ اور وہاں کے حاکم محمد بن الفتح بن میمون بن [illegible] کو مار بھگایا اور بعد میں [illegible] قتل

کردیا۔ جوہر نے اس علاقے میں سال بھر سے زیادہ قیام کیا۔

۳۴۹ھ/اکتوبر ۹۶۰ء میں اس نے فاس کا رُخ اختیار کیا۔ اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ ایک ماہ بعد ایک زبردست حملہ کرکے اس شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس فتح سے سارا مغرب اقصیٰ کچھ دنوں کے لیے فاطمیوں کے زیر اقتدار آگیا۔ جوہر چند ماہ کے بعد قیروان سے ایک فاتح کی حیثیت سے لوٹا۔ اور اپنے ساتھ کچھ قیدی اور بیش قیمت مال غنیمت لایا۔

المعز، جوہر کی ان فتوحات سے بہت خوش ہوا۔ اسے یقین ہوگیا کہ جوہر کی مدد سے وہ مصر فتح کرسکتا ہے۔ جس کی فتح کا خواب فاطمی شروع دن سے دیکھ رہے تھے۔

۳۵۰ھ/۹۶۱ء سے ۳۵۸ھ/۹۶۹ء تک جوہر کے بارے میں تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ ۳۵۸ھ/۹۶۹ء میں وہ ایک بار پھر میدان جنگ میں نظر آتا ہے۔ اس مرتبہ المعز نے مصر پر فوج چڑھائی کے لیے قائد عسکر منتخب کیا۔ بقول اس کے "واللہ اگر یہ جوہر اکیلا ہی اٹھ کھڑا ہو تو مصر فتح کرے گا۔ اور ہم اپنے معمولی سادہ لباس ہی میں اس سرزمین کے اندر بغیر لڑے بھڑے داخل ہو جائیں گے۔ اور اس قابل ہو جائیں گے کہ ابن طولون کی ویران شدہ قیام گاہوں میں جا بسیں اور ایک ایسا شہر تعمیر کریں جو ساری دنیا پر غالب آجائے۔"

چنانچہ چار ماہ کے اندر جوہر مصر کو فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ شعبان ۳۵۸ھ/جولائی ۹۶۹ء میں فسطاط کا حاکم بن گیا۔ اسے ذنقطہ جیزہ پر معمولی سی لڑائی لڑنا پڑی۔ جوہر اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ مصری عوام کی ہمدردیاں کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس نے عوام کو بڑے شاندار اعلانات پڑھ کر سنائے نیز جعفر بن الفرات کو وزیر بنالیا۔ دوسرے دن اس نے نئے دارالسلطنت قاہرہ کی بنیاد رکھی جو بغداد کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا شہر بنا۔ اس کے ایک سال بعد جوہر نے جامع ازہر کی بنیاد ڈالی۔

جوہر مصر میں فاطمی سلطنت قائم کرنے کے بعد چار سال سے زائد مصر کا تنہا گورنر رہا۔ چار سالہ گورنری کے دوران میں جوہر نے بحیثیت ایک منتظم اپنی قابلیت اور پیش بینی کا ثبوت دیا۔ اس کو مصر کے عوام کی مکمل طور پر ہمدردیاں حاصل تھیں۔ اس نے مصر کی مالی حالت کو جو اخشیدیوں کے آخری عہد میں بری طرح ابتر ہوچکی تھی درست کیا۔ جوہر کو اس نئے صوبے کے انتظامی کام کے علاوہ قرامطہ کے خطرے کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔

قرامطہ اور ان کے مددگاروں سے جنگ کے دوران میں جوہر کو حجاز بھی فاطمی حکومت میں شامل کرنے کا موقع مل گیا۔

۳۶۳ھ/۹۷۶ء میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں فاطمیوں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ چار سالہ گورنری کے بعد جب المعز ۷ محرم ۳۶۲ھ/۷ اکتوبر ۹۷۲ء میں قاہرہ میں داخل ہوا تو کچھ عرصے بعد اس نے جوہر کو برطرف کردیا۔

۳۶۰ھ/۹۷۸ء کے بعد سے جوہر کا نام سننے میں نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ برطرفی سے اپنی موت تک کا زمانہ اس نے عبادت الٰہی میں بسر کیا۔ اس کا ایک لڑکا حسین خلیفہ الحاکم کا سپہ سالار رہا تھا جو بعد میں خلیفہ کے خلاف سازشوں کے نتیجے میں مارا گیا

جوہر، مولانا محمد علی (۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء - ۱۳۵۰ھ/۴ جنوری ۱۹۳۱ء) ایک عالم دین۔ مسلمانوں کے لیڈر۔ جرنلسٹ۔ مولانا کے والد کا نام

ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔

محمد علی دو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ پہلے بریلی کے اسکول میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ وہاں سے انگلستان گئے اور آکسفورڈ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

ولایت سے آنے کے بعد کچھ دن تک رام پور کے محکمہ تعلیم میں ملازم رہے۔ وہاں سے بڑودہ چلے گئے اور پھر نوساری میں کمشنر مقرر ہوگئے۔ بڑودہ میں تقریباً چھ سات سال ملازمت کی۔ مضامین لکھنے کا شوق یہیں سے پیدا ہوا۔

بعض باتوں کی وجہ سے وہ بڑودہ کی ملازمت سے دل برداشتہ ہوگئے تھے اس لیے انہوں نے دو سال کی چھٹی لے لی اور کلکتہ چلے گئے۔ اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" کے نام سے جاری کیا۔ چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء میں "کامریڈ" کا پہلا پرچہ نکلا۔ اگر دیکھا جائے تو مولانا محمد علی جوہر کی پبلک لائف صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ ۲۰ سال تک ان کی ہنگامہ پرور شخصیت دنیا کے سامنے رہی۔ بالآخر لندن میں جہاں وہ برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبہ آزادی پیش کرنے کے لیے گئے تھے کہ وہیں انتقال کرگئے۔ تدفین کی غرض سے آپ کی میت بیت المقدس لے جائی گئی اور وہیں آپ دفن ہوئے۔

ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے بے انتہا مظالم سہے۔ جیلیں کاٹیں۔ تحریک عدم تعاون کی پاداش میں کئی سال جیل میں رہے۔ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت کے بانی مولانا محمد علی جوہر ہی تھے۔ ترک موالات کی تحریک میں بھی وہ مسٹر گاندھی کے برابر کے شریک تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی جس نے قابل تعریف قومی خدمات انجام دیں مولانا ہی کی تخلیق ہے۔ مولانا انڈین نیشنل کانگرس میں بھی رہے۔

اس کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا۔ پھر ولولہ اور آخر میں جنون یہی جنون تھا جو کامریڈ کے مضمون پر اور جامع مسجد کے ممبر پر قلم اور زبان سے اہل احتساب کو دعوت گیر و دار دیتا تھا۔

مولانا جوہر شروع شروع میں یعنی کامریڈ کی ابتدائی زندگی میں انگریزوں کے بالکل مخالف نہ تھے۔ ان کے بہت سے دوست جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان سب سے مولانا کے تعلقات دوستانہ رہے۔ مگر نظر بندی کے زمانہ میں ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا۔ اور انھیں انگریزوں سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہوگئی۔ اور انہوں نے طے کرلیا کہ اب اپنے مادر وطن کو انگریزوں سے آزاد کراکر ہی دم لیں گے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ میرے خیال میں وہ سب سے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے کانفرنس میں بیٹھ کر انگریزوں سے للکار کر کہا کہ یہ مقدر ہوچکا ہے کہ ہندوستان سے برطانوی تسلط نابود ہوکر رہے۔

یہ ان کی اسلام اور اپنے وطن سے محبت ہی تھی کہ گول میز کانفرنس میں انگریز دشمنی کے باوجود شرکت کی۔ ان کی شرکت ان کی حب الوطنی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ وہ اسوقت سخت بیمار تھے اور جہاز میں اسٹریچر پر لٹاکر لے جائے گئے تھے۔ روانگی سے پیشتر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ مرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ لیکن ایک بیان میں انہوں نے کہا تھا کہ حکومت نے صلح و آشتی کا جو دروازہ کھولا ہے میں اسے بند کرنا نہیں چاہتا۔

مولانا کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان کا ہر کام (دوستی و دشمنی) اللہ کے لیے تھا۔ نظر بندی کے زمانے میں جب سپرنٹنڈنٹ پولیس، سی آئی ڈی کے افسر اعلیٰ کے ایماء پر آپ سے ایک عہدنامے پر دستخط کرانے کے لیے آیا جس میں یہ وعدہ درج ہو کہ مولانا غیر آئینی طریقوں اور تشدد سے ہمیشہ محترز رہیں گے۔ تو مولانا جوہر نے اس عبارت میں یہ اضافہ کیا کہ سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں

گے تو اس صورت میں میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا۔ حکومت وقت نے اس عہدنامے کو قبول نہیں کیا اور دونوں بھائیوں کو مزید دو سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ بیک وقت لیڈر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، مقرر، مورخ اور زبردست انشا پرداز تھے۔

مولانا محمد علی جوہر

انشا پردازی کے میدان میں انھوں نے انگریزوں تک کو شکست دے دی۔ ان کے اردو کے مضامین بھی بڑے رُوح پرور تھے۔ بقول سید محفوظ علی بدایونی "مولانا محمد علی خوش نصیب شخص تھے جنہیں جینا بھی خوب آتا تھا اور مرنا بھی خوب آیا۔ جو عملاً دکھلا گئے کہ زندگی چاہے شروع اپنے ذاتی عیش کے خیال سے کی جائے مگر ختم دوسروں کے آرام کی خاطر ہونی چاہیے۔ چونکہ قسمت میں اس کے خدا پرست مسلمان کی زندگی لکھی تھی اور ایک مجاہد کی موت وہ اللہ کے عاشق تھے۔ اللہ کے رسول کے عاشق تھے رسول کی امت کے عاشق تھے۔"

جوہری، ابو نصر

(۔۔۔؟ — ۳۹۸ھ/۱۰۰۸ء یا ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء) اسماعیل بن حماد، ایک مشہور لغت نویس۔ فاراب کے صوبے میں پیدا ہوئے جو سیحوں دریا کے مشرق میں واقع تھا۔ ترکی الاصل تھا۔ اپنے ماموں ابو ابراہیم اسحاق فارابی سے گھر میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بغداد چلے گئے۔ جہاں پر ابوسعید حسن بن عبداللہ سیرافی اور ابو علی حسن بن احمد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ انھوں نے عربی زبان پر تبحر پیدا کرنے کے لیے عراق و شام کی سیاحت کی اور حجاز تک گئے۔ اس تمام سفر میں ان کی تمام توجہ ربیعہ اور مضر قبائل کے مخصوص محاورے کی جستجو میں مرکوز تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مشرق کا رخ کیا اور کچھ عرصہ دامغان میں جو الرے سے نیشاپور کو جانے والی سڑک کے کنارے ایک قصبہ ہے ابو علی حسن بن علی کے پاس گزارا۔ خراسان کے دارالحکومت میں جاکر انھوں نے عربی زبان، نحو اور خطاطی کی تعلیم دی۔ انھوں نے خطاطی میں بہت شہرت حاصل کی۔ یہاں تک کہ ان کے خط اور مشہور ابن مقلہ کے خط میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ انھوں نے نیشاپور میں وفات پائی۔ انھوں نے جنونی حالت میں اپنے مکان کی چھت سے گر کر وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔

جوہری کے شاگردوں میں اسماعیل بن محمد بن عبدوس الدہان نیشاپوری، ابو سہل محمد بن علی بن محمد ہروی کے نام شامل ہیں۔

جوہری کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ ثعالبی اور یاقوت نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

جوہری کی تصانیف یہ ہیں: المقدمہ فی النحو، عروض الورقہ، تاج اللغہ و صحاح العربیہ، دیوان الادب فی اللغۃ، لغت، عروض [illegible]

جویریہ

(رضی اللہ عنہا) (۔۔۔ — ۵۶ھ/۶۷۵ء) ام المومنین ان کے والد کا نام حارث بن ابی ضرار الخزاعی تھا جو قبیلہ بنو مصطلق کے سردار تھے۔ غزوہ بنو مصطلق میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے پاس آئیں۔ یہ غزوہ ۵ھ/۶۲۶ء میں واقع ہوا تھا۔

مسلمانوں نے یک دم حملہ کیا تو بنو مصطلق کے دس آدمی مارے گئے۔ باقی مرد اور عورتیں جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ انھی جنگی قیدیوں میں حضرت جویریہ بھی تھیں جو حصے میں ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں۔ لیکن آنحضور نے حضرت جویریہ کی درخواست پر ان کی ثابت بن ثابت سے غرض کر آزاد کر دیا۔ پھر آپ نے بنو مصطلق کی بیٹی کو [illegible] اپنی زوجیت کے شرف سے نوازا۔ [illegible] قیدیوں کو رہا کر دیا۔ آنحضور آپ کا نکاح آپ کی [illegible] باعث ثابت ہوا۔

آپ کا اصل نام برہ تھا۔ آنحضور نے [illegible] سے پہلے خاوند کا نام مسافع بن صفوان تھا [illegible] پہلے خاوند کا [illegible]

آپ آنحضور کے [illegible]

حضرت جویریہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

حضرت جویریہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

مقرر کی تھی۔

جوین

[illegible] ایک [illegible] پتھر [illegible] سڑک پر [illegible] جانے والی سڑک پر [illegible] موجود [illegible] نہیں [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] دو [illegible] کہتے ہیں۔

۲۔ نیشاپور کے علاقے کا ایک ضلع [illegible] یہ علاقہ [illegible] سے جانے والی ایک کارروانی شاہراہ پر [illegible] کے درمیان [illegible]

ہے۔ اس ضلع کا صدر مقام آزاذوار تھا۔ بعد میں فری یومد اس کا صدر مقام بنا۔ یہ سب گاؤں تھے جو تمام کے تمام شمالی نصف حصے میں تھے۔ جنوبی نصف حصہ بالکل غیر آباد تھا۔

جوین کا میدان شمال اور جنوب میں پہاڑیوں کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے جو آج بھی سبزوار کے ضلع کا ایک حصہ ہے۔ اس میں تقریباً ۶۵ چھوٹے چھوٹے شہر ہیں یہ شہر دریائے جوین کے کنارے دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اس وادی کے درمیان آزاذوار کے گاؤں کے قریب قدیم دارالسلطنت کے کھنڈر ملتے ہیں۔ آج کل مرکزی شہر جگتے ہے جو اس کے جنوب مشرق میں جنوبی پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے

(۲) جوین یا گوین سجستان میں ایک قلعہ بند مقام

یہ لاش سے تین سے پانچ کلومیٹر شمال کی جانب فراہ رود کے کنارے واقع ہے۔ یہ مقام اپنے موجودہ نام سے قدیم اور قرون وسطیٰ کے سیاحت ناموں میں ملتا ہے۔

لاش اور جوین کی اہمیت کا دارومدار اب بھی اس بات پر ہے کہ افغانستان کی جانب سے قندھار اور ہرات کی سڑکیں ایران کی طرف سے مشہد، یزد اور ناصر آباد کی سڑکیں یہاں آکر ملتی ہیں۔

بقول عرب جغرافیہ نویس ہرات سے زرنج جانے والے سڑک پر جوین خارجیوں کا ایک نہایت مضبوط و مستحکم قلعہ تھا۔

یہ ایک اونچے مقام پر ایک زرخیز میدان کے بیچ میں جو کھنڈروں سے ڈھکا پڑا ہے واقع ہے۔ جس کے اردگرد مٹی کی ایک چوکور دیوار کھینچی ہوئی ہے۔ جوین لاش کے مستحکم مقام سے جو ایک چٹان پر واقع ہے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی میں جوین کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ اور روبہ تنزل دکھائی دیتا تھا۔ موجودہ دور میں بھی اس علاقے میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔

جوینی، ابوالمعالی

(۱۸ محرم ۴۱۹ھ / ۱۷ فروری ۱۰۲۸ء — ۲۵ ربیع الآخر ۴۷۸ھ / ۲۰ اگست ۱۰۸۵ء) ایک مشہور عالم دین جن کا تعلق اشاعرہ سے تھا۔

عبدالملک نام اور امام الحرمین لقب تھا۔ مشہور شافعی عالم دین۔ ابومحمد عبداللہ جوینی کے فرزند تھے۔ بشتنکان نامی گاؤں میں نیشاپور کے نواح میں پیدا ہوئے بیس سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات کے بعد ان کا سلسلہ درس و تدریس سنبھالا۔ جب طغرل بیگ سلجوق کے وزیر عمید الملک کندری نے اشاعرہ کی مخالفت کی اور منبروں سے بھی ان کی مخالفت شروع ہوئی تو ابوالقاسم قشیری کی طرح جوینی بھی ترک وطن کر کے بغداد چلے گئے۔ اس کے بعد ۴۵۰ھ / ۱۰۵۹ء میں وہ حجاز چلے گئے اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں چار سال تک درس دیتے رہے۔ اسی وجہ سے انہیں امام الحرمین کہا جانے لگا۔ پھر جب سلجوقیوں کے ہاں وزیر نظام الملک کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ اشاعرہ کا طرفدار تھا۔ اس نے تمام تارکین وطن کو واپس بلایا چنانچہ جوینی بھی نیشاپور واپس آ گئے۔ نظام الملک نے ان کے لیے نیشاپور میں ایک خاص مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسہ نظامیہ رکھا۔

امام غزالی اپنی عمر کے آخری حصے میں کچھ مدت کے لیے اس مدرسے میں معلم رہے۔

جوینی آخر عمر میں بیمار ہو کر اپنے پیدائشی گاؤں میں چلے گئے۔ چنانچہ وہیں پر ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے شاگردوں میں امام غزالی جیسے عالم ہیں۔

جوینی نے اس دور میں قلم اٹھایا جو قدیم اشعری دبستان اور اس دبستان کے درمیان کا زمانہ تھا۔ جس کو ابن خلدون نے دبستان جدید قرار دیا ہے۔ جوینی کی تحقیقات اصول فقہ اور علم الکلام کے درمیان بٹی ہوئی تھیں۔ ان کی تصانیف میں "کتاب الورقات فی اصول الفقہ" جس کی شرحیں گیارہ صدی ہجری / سترہ صدی عیسوی تک برابر لکھی جاتی رہیں۔ "کتاب البرھان فی اصول الفقہ" علم کلام پر "الشامل" جو عظیم تصنیف ہے۔ "کتاب الارشاد الی قواطع الادلۃ فی اصول الاعتقاد" ہیں۔

جوینی، ابومحمد

(؟ — ۴۳۸ھ / ۱۰۴۷ء) ایک شافعی عالم عبداللہ بن یوسف بن محمد امام الحرمین آپ کا لقب تھا۔ اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ نیشاپور میں گذارا اور نیشاپور ہی میں وفات پائی۔

آپ تفسیر، فقہ اور لغت کے جید عالم تھے۔ ابوالمعالی عبدالملک مشہور عالم آپ کا بیٹا تھا۔ آپ کو فروق المسائل سے زیادہ دلچسپی تھی۔ آپ کی تصانیف "الرسائل فی فروق المسائل" اور "الجمع والفروق" شافعی فقہ کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

جوینی، شمس الدین محمد

(؟ — ۴ شعبان ۶۸۳ھ / ۱۶ اکتوبر ۱۲۸۴ء) محمد بن محمد، ایک ایرانی ماہر سیاست اور علاء الدین جوینی کا بھائی اس کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہیں۔ ۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء، ۱۲۶۳ء میں ایلخان ہلاکو نے اسے وزیر اعظم بنایا۔ وہ صاحب دیوان ہو گیا اور بعد میں اباقا کے عہد حکومت میں بھی وہ اسی منصب پر فائز رہا۔ اس نے اپنا اثر اپنے ماتحت وفادار عمال کی مدد سے ساری ایلخانی مملکت پر پھیلا دیا۔ اس کی شہرت بھی بہت زیادہ ہو گئی وہ خاص کر اپنے ان مسلم ساتھیوں میں جنہیں اس نے ان کے دشمن حاکموں کے بہت سے جابرانہ اقدامات سے بچایا تھا، بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

شہرت کے ساتھ ساتھ اس کی ثروت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی آمدنی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک تومان روزانہ تھی۔

جوینی ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء میں اناطولی میں مغلوں کی کمزور حالت کو مضبوط کرنے کے لیے ایک مستعد شخصیت ثابت ہوا۔ وہ قرامان اوغللری سے بھی عمدہ تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے شرف الدین ہارون کو وہاں کا حاکم بنایا جو بعد میں ۶۸۲ھ / ۱۲۸۳ء میں بغداد کا حاکم ہو گیا۔ اس کے بعد جوینی ایران واپس آ گیا۔ اس دوران میں اس کا ایک مخالف مجدالملک یزدی ترقی کر کے مملکت کا مہتمم بن گیا۔ چنانچہ اباقا نے اپنی نظریں جوینی سے ہٹا کر یزدی کی طرف پھیر لیں۔ اباقا کی موت کے بعد جوینی ایک بار پھر واحد سرکردہ وزیر رہ گیا۔ سلطان احمد جو ایلخانیوں میں پہلا مسلمان فرمانروا تھا جوینی کی طرف بہت زیادہ مائل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جوینی نے اس کی جعلی مدعی سلطنت ارغون کے خلاف مدد بھی کی تھی۔

۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء میں جب ارغون تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جوینی نے پہلے تو ہندوستان کی طرف فرار ہونے کا فیصلہ کیا لیکن پھر اس نے ایلخان سے معافی مانگنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اور اپنے گھرانے کے بچاؤ کے لیے اس نے فدیہ پیش کیا۔ اگرچہ وہ مطالبے کے دو ہزار تومان میں سے صرف چار لاکھ درہم فراہم کر سکا۔

جوینی اہر نامی گاؤں کے قریب جو قزوین اور زنجان کے درمیان تھا بے رحمی کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ اس کے کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی اسی طرح مار دیے گئے۔

جوینی اپنے بھائی کی طرح ایک علم دوست شخص تھا۔ اس نے علم کلام اور دیگر علوم و فنون کی حتی الامکان سرپرستی کی۔ اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس غرض کے لیے صرف کیا۔ خود وہ عربی فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا۔

جوینی، علاء الدین (۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء — ۶۸۱ھ/۱۲۸۳ء) بن محمد (بہاء الدین) ایک ایرانی حاکم اور مورخ اس کا خاندان جوین کے ایک خاص شہر آزادوار سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان اپنا رشتہ ہارون الرشید کے وزیر فضل بن ربیع کی اولاد سے جوڑتا ہے۔

علاء الدین نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف "دیوان" میں ملازمت اختیار کر لی۔ جوینی دو مرتبہ ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء تا ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء اور ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء تا ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء منگولیا میں اپنے آقا ارغون کے ہمرکاب رہا۔ جب ہولاگو خراسان پہنچا تو علاء الدین اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ چنانچہ جب اس نے الموت کے اسماعیلیوں پر اور بعد میں بغداد پر حملہ کیا تو علاء الدین اس کے ساتھ تھا۔ اسی نے اسماعیلیوں کے سردار رکن الدین خورشاہ کے ہتھیار ڈالنے کی شرائط تحریر کیں اور اسی کی کوشش سے الموت کا مشہور کتب خانہ تباہی سے بچ گیا۔

۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء میں علاء الدین عراق عرب اور خوزستان کا حاکم مقرر ہوا جہاں وہ بیس سال تک اسی منصب پر فائز رہا۔ اس نے اپنے دور میں مزارعوں کی حالت سدھارنے کے لیے بہت زیادہ کام کیا۔ اس نے ان صوبوں کی خوشحالی میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔ اس نے انبار سے کوفے اور نجف تک دس ہزار طلائی دینار خرچ کر کے ایک نہر کھدوائی۔ اور اس نہر کے کناروں پر تقریباً ڈیڑھ سو گاؤں آباد کیے۔

ہولاگو کے بیٹے اباقا کا دور حکومت علاء الدین اور اس کے بھائی شمس الدین جو صاحب دیوان تھا کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ جوینی اس دور میں مصائب کا خاص نشانہ بنا رہا۔

۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء میں علاء الدین کو اس الزام کے تحت کہ اس نے سرکاری خزانے سے ۲۵ لاکھ دینار غبن کر لیے۔ قید میں ڈالا گیا لیکن چند ماہ بعد ایلخانی گھرانے کے بعض افراد کی سفارش پر اسے قید سے رہا کر دیا گیا۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد اس الزام پر کہ اس کی مصر کے مملوک بادشاہ سے خط و کتابت ہے۔ دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اس الزام کی جوابدہی کے لیے ہمدان پہنچا لیکن اس وقت ایلخانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ قید ہی میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ تگودار جس نے اسلام قبول کر لیا اور اب سلطان احمد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اباقا کا جانشین ہوتے ہی علاء الدین کو رہا کر کے اس کے سابق عہدے پر بحال کر دیا۔ چنانچہ علاء الدین دوبارہ اپنے پرانے علاقوں کا گورنر بن گیا۔ لیکن وہ اس کے بعد کچھ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ سلطان احمد کا بھتیجا جو بعد میں ایلخان ارغون کے نام سے ۶۸۲ھ/۱۲۸۴ء میں تخت نشین ہوا۔

۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء، ۱۲۸۳ء میں بغداد پہنچا اور اس نے علاء الدین کے نائبوں پر دوبارہ غبن کا الزام عائد کر کے انہیں تکالیف دینی شروع کیں۔ علاء الدین نے جو اس وقت اران میں تھا، جب یہ خبر سنی تو اس پر سکتے کا دورہ پڑا اور وفات پا گیا۔

علاء الدین جوینی بڑا عالم و فاضل شخص تھا۔ وہ شعرا اور علماء کا بہت زیادہ قدردان تھا۔ اس کی تاریخ کی تصنیف کو اسلوب کے لحاظ سے انشاء کا بے مثال نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کی کتاب "تاریخ جہانگشائی" صرف واحد ایسی تصنیف ہے جس سے ہمیں اس کی زندگی کے تفصیلی حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں پہلے حصے میں مغول کی تاریخ اور ان کی فتوحات کا بیان ہے۔ اس حصے میں جوچی اور چغتائی کے اخلاف کی تاریخ بھی شامل ہے۔ یہ حصہ اس زمانے کے واقعات تک محدود ہے جو گیوک قاآن کی وفات کے بعد رونما ہوئے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں خوارزم شاہوں کے خاندان کی تاریخ ہے۔ جس کی بنیاد سابقہ تصانیف پر رکھی گئی ہے۔

تیسرا حصہ مغول کی تاریخ کا تتمہ ہے جو اسماعیلیوں کے مغلوب ہونے تک ہے۔ اس کتاب کا مشرق کی تاریخی روایات پر بڑا اثر پڑا۔ اور درجہ اوّل کی مستند تواریخ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ علاء الدین وہ تنہا فارسی مورخ ہے جس نے منگولیا تک سفر کیا اور مشرقی ایشیا کے ممالک کا بیان خود اپنے ذاتی علم سے کیا ہے۔ چنگیز خاں کی فتوحات کے بارے میں جتنی تفصیلات اور کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔ بہت سے اہم واقعات بھی فقط اسی کتاب میں ملتے ہیں۔

جوینی نے یہ تاریخ اس وقت لکھنی شروع کی تھی جب وہ ۶۵۰ھ [illegible] میں منگولیا میں تھا۔

اس نے اپنی آخری عمر میں دو اور رسالے تصنیف کیے جن میں سے ایک کا نام "تسلیۃ الاخوان" ہے۔

جہاد کوشش، مشقت۔ وہ کوشش اور محنت جو کسی نیک مقصد کے لیے کی جائے اصطلاح میں اس کے معنی ہیں نہایت اور کوشش [illegible] اللہ کے لیے، اللہ کی راہ میں، اسلام کے لیے، امت مسلمہ کے لیے [illegible] کی جائے۔ خواہ وہ مال سے ہو، جان سے ہو یا کسی اور طریقے سے [illegible] اپنے نفس سے جہاد کرنے کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

جہاد مسلمانوں کا ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے [illegible] محنت جو عبادت شامل ہے جو ملت کے [illegible] سے کرلت کے معین [illegible] حملہ آوروں کا مقابلہ [illegible] سلسلہ رسل و رسائل اور ان کی مرکزی قوت [illegible] جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا بھی جہاد ہے۔

قتال جہاد میں شامل ہے [illegible] وہاں قوام کے لیے ضروری ہوتی ہے [illegible] نقطۂ نظر [illegible] کو تیار رکھنا لازمی ہے۔

اسلام چونکہ رہبانیت میں اعتقاد نہیں رکھتا اور زندگی کے [illegible] اس لیے قتال کی مجبوری سے غفلت نہیں برتتا [illegible] تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

اگرچہ جہاد میں قتال بھی شامل ہے لیکن ہر قتال جہاد نہیں ہوتا۔ جہاد اپنے مقصد [illegible] نصب العین کے اعتبار سے محض اعلائے کلمۃ الحق اور تحفظ [illegible] کے لیے ہوتا ہے۔ یہ [illegible] جنگ و جدال نہیں بلکہ مقاصد ملت کی خاطر ایک [illegible] جو

معین اصولوں، پابندیوں اور احتیاطوں کے ساتھ لڑی جاتی ہے۔ اور ان احتیاطوں کا ذکر قرآن مجید میں بصراحت کیا گیا ہے۔

اسلام میں جہاد کا حکم اس وقت نازل ہوا جب آنحضورؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور چونکہ اس وقت کفار قریش نے جنگی یورشوں کے ساتھ مسلمانوں کو ستانا شروع کیا۔ چنانچہ ان لوگوں کے مقابلے اور ان کے شر کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے جہاد کا حکم دیا۔

قرآن مجید میں اور احادیث میں جہاد کا کئی مقامات پر حکم دیا گیا ہے۔

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔" (حج: ۷۸)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا۔

"اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے۔ اگر تم جان لو۔" (۶۱: ۱۱)

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے۔ جو کہتے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفاکار ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔" (۴: ۷۵)

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی برا ہے۔" (۲: ۱۹۰ - ۱۹۱)

"تم ان سے لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔" (۲: ۱۹۲)

"کیا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی راہ میں جہاد کیا۔" (۹: ۱۶)

"مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔" (۴: ۹۵)

جہاد کا حکم چونکہ مدینہ منورہ کے زمانے میں دیا گیا ہے۔ اس لئے جہاد کے بارے میں مدنی سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات کے علاوہ اور بہت سی آیات میں جہاد کے بارے میں حکم دیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی جہاد کے بارے میں کئی مقامات پر ترغیب دلائی گئی ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو اللہ کو رب ماننے پر اسلام کو دین اور محمدؐ کو رسول ماننے پر راضی ہو گیا اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ میں یہ سن کر متعجب ہوا۔ عرض کیا یا رسول اللہ! ان کلمات کا اعادہ فرمائیں۔ آپؐ نے ان کا اعادہ فرمایا اور پھر ساتھ ہی یہ فرمایا اور ایک اور کام ہے جس کی بدولت اللہ تعالےٰ ایک بندے کو جنت کے اندر کے سو درجے زیادہ بلندی عطا فرمائے گا۔ ایک درجے سے دوسرے درجے تک کا فاصلہ اتنا ہوگا جتنا آسمان و زمین کا۔ عرض کیا وہ کونسا کام ہے یا رسول اللہ۔ ارشاد ہوا "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔" تین مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا۔ (مسلم، نسائی)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے اللہ کی راہ میں اتنا عرصہ تک بھی قتال کیا جتنا ایک اونٹنی کے دودھ دوہنے پر لگتا ہے، اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔ بشرطیکہ یہ قتال اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی نیت سے کیا ہو۔ (ترمذی)

ایک اور حدیث میں جہاد کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل ایسا عمل ہے جو راہ خدا میں جہاد کے ہم پلہ ہو۔؟ آپؐ نے فرمایا۔ اس عمل کی تمہارے اندر استطاعت نہیں ہے دریافت کرنے والوں نے یہی سوال پھر دو یا تین بار دوہرایا۔ آپؐ ہر مرتبہ یہی فرماتے رہے کہ اس عمل کی تمہارے اندر استطاعت نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ "مجاہد فی سبیل اللہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص برابر روزے رکھ رہا ہو، برابر نماز پڑھ رہا ہو۔ برابر آیات الٰہی کی تلاوت کر رہا۔ اپنے روزوں اور نمازوں میں کوئی توقف نہ کر رہا ہو یہاں تک کہ مجاہد گھر لوٹ آئے۔" (بخاری، مسلم)

جہاد ناگوار ہونے کے باوجود فرض ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"تم پر قتال فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔" (۲: ۲۱۹)

"نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔" (۹: ۴۱)

"اے ایمان والو! مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہو پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" (۴: ۷۱)

چنانچہ تمام محدثین اور آئمہ فقہ نے جہاد کی فرضیت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک فرض عین اور دوسری فرض کفایہ۔ اگر دشمن دارالاسلام کے کسی علاقہ پر، خواہ وہ آباد ہو یا غیر آباد، صحرا ہو یا پہاڑ حملہ کر دے تو اس علاقے کے مسلمانوں پر دشمن کے خلاف جہاد کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔ اگر وہ دشمن کے دفاع کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو متصل کے علاقوں کے مسلمانوں پر اس کی مدافعت فرض عین ہے اور اگر وہ بھی ناکافی ثابت ہو رہے ہوں تو مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں پر دارالسلام کے اس حصے کا دفاع لازم ہے اور دشمن کے تسلط سے اس کا آزاد کرنا فرض عین ہے۔

جو شخص بلا عذر اس فرض کے قیام سے جی چرائے گا وہ سخت گنہگار ہوگا۔ اور اس کے تمام اچھے اعمال غارت ہو جائیں گے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں جن لوگوں نے جہاد کی نفیر عام کے بعد شرکت میں پس و پیش کیا یا عدم شرکت کے مرتکب ہوئے وہ منافقین کہلائے۔ ان کے لئے اللہ تعالےٰ نے سخت وعید بھیجی اور آنحضورؐ کی دعائے مغفرت سے محروم ہوئے۔

فرض کفایہ کی شکل یہ ہے کہ اگر کوئی گروہ دشمن کی مؤثر مدافعت کر رہا ہو۔ تو دوسروں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس ذمہ داری کو سب نے ترک کر رکھا ہو تو سب تارک فرض ہوں گے اور گنہگار رہوں گے۔ فرض کفایہ کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت و فضیلت کا موجب ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مجاہدین کو قاعدین (جہاد کے لئے نہ نکلنے والوں) پر فضل و انعام اور رحمت و مغفرت کے لحاظ سے کئی درجے فائق تر رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

فرض عین کی شکل میں تمام قوم کو اپنی خدمات حکومت اسلامی کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ حکومت کا یہ کام ہے کہ وہ جن لوگوں کو چاہے قتال کے لئے منتخب کرے اور جن لوگوں کو چاہے کوئی اور ذمہ داری سونپ دے۔ اور جن لوگوں کو حکومت کی طرف سے کوئی معین ذمہ داری نہ سونپی گئی ہو تو وہ بجائے خود جس شکل میں بھی جہاد میں حصہ لے سکتے ہوں لیتے رہیں۔

جہاد کی یہ شکل دائمی اور ابدی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے

حضرت انس بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تین چیزیں ایمان کی جڑ ہیں۔ پہلی چیز اس آدمی سے ہاتھ اٹھا لینا جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے اور کسی گناہ کی وجہ سے اس کی تکفیر نہ کی جائے اور کسی عمل پر اسے دائرہ اسلام سے خارج نہ کیا جائے

دوسری چیز جہاد ہے۔ یہ جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اور جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑے گا۔ اس جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل منسوخ نہیں کر سکتا۔ تیسری چیز تقدیروں پر ایمان لانا ہے (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس نے نہ جہاد کیا اور نہ جہاد کا ارادہ دل میں رکھا۔ وہ نفاق کی ایک حالت میں مرا (مسلم، مسند احمد)

عمران بن حصین سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت کا ایک گروہ برابر حق پر لڑتا رہے گا۔ اور حق کے دشمنوں پر غلبہ پائے گا۔ حتیٰ کہ میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑے گا۔ (ابوداؤد)

جہاد سے جی چرانے اور جہاد نہ کرنے والوں کے لئے بڑی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

"اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اٹھائے گا۔ اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ (۹:۳۹) —

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جب لوگ درہم و دینار کے حریص ہو جائیں اور جنس بازار میں آنے سے پہلے ہی اس پر بیع کرنے لگیں اور بیلوں کی دُمیں پکڑ لیں۔ (کھیتی باڑی میں منہمک ہو جائیں) اور جہاد چھوڑ دیں تو اللہ ان پر سخت آزمائش مسلط کرے گا۔ اور وہ اس سے وقت تک نہ نکل سکیں گے جب تک اپنے دین کی طرف نہ لوٹ کر آ جائیں گے۔ (اور جہاد کو قائم نہ کریں گے) (مسند احمد)

ایک حدیث میں جہاد کی اقسام کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا۔ مشرکین سے جہاد کرو اپنے مالوں سے، اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے (مسند احمد، نسائی)

اس حدیث میں جہاد کی تین قسموں پر زور دیا گیا ہے۔ مالی جہاد، جسمانی جہاد، اور لسانی جہاد۔ ان تینوں قسموں کی فضیلت قرآن و حدیث میں بتائی گئی ہے۔ (نیز دیکھئے "جنگی اصول")

جہاں آرا بیگم (۲۱ر صفر ۱۰۲۳ھ/۲۳ر مارچ ۱۶۱۴ء - ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء) ایک مغل شہزادی جو شاہجہاں اور ممتاز محل کی پہلوٹھی کی لڑکی تھی اعزازی لقب "فاطمۃ الزمان" تھا۔ بیگم صاحب یا بادشاہ بیگم درباری خطاب تھا۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء میں اپنی والدہ ممتاز محل کے انتقال کے بعد اسے سلطنت کی خاتون اول کا اعزاز ملا۔

جہاں آرا بیگم اپنے والد کی فرمانبردار اور خدمت گذار تھی۔ جب شاہجہاں کو اورنگ زیب نے معزول کرنے کے بعد قید میں ڈال دیا تو بھی اس نے اپنے والد کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسے دارا شکوہ سے خاص انس تھا۔

جہاں آرا بیگم کئی ایک اچھی صفات کی مالک تھی وہ ایک باکمال خاتون تھی شاہجہاں کے عہد حکومت میں وہ بڑی بااثر تھی۔ بادشاہ نے سورت کی بندرگاہ کی آمدنی جو تقریباً چھ لاکھ روپے سالانہ بنتی تھی اپنی اس بیٹی کے نام کی ہوئی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے عہد میں اس رقم کو دوگنا کر دیا تھا۔ جن دنوں شاہجہان نظربند تھا۔ تو جہاں آرا کی حیثیت باپ اور بھائی اورنگ زیب بادشاہ وقت کے درمیان ایک واسطے کی تھی۔ اور ساری اہم سیاسی خط و کتابت اسی کے ذریعے ہوتی تھی۔

تمام عمر اس نے شادی نہیں کرائی۔ اس کو تصوف سے بھی خاص لگاؤ تھا اور سلسلہ چشتیہ میں بیعت تھی۔

جہاں آرا بیگم دو کتابوں کی مصنف بھی تھی۔ اس کی یہ تصانیف "مونس الارواح" اور "صاحبیہ" کے عنوان سے ہیں۔ "مونس الارواح" حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح حیات ہے۔ جبکہ دوسری کتاب میں اس نے اپنے پیر و مرشد ملا شاہ قادری کی سوانح حیات قلم بند کی ہے جو نامکمل ہے۔

وفات کے بعد اسے دہلی میں حضرت نظام الدین درگاہ کے صحن میں ایک سادے سے مقبرے میں جو خود اس نے بنوایا تھا۔ دفن کیا گیا۔

شاہجہاں کی طرح فن تعمیر سے اسے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ آگرے کی جامع مسجد جس سے ملحق ایک مدرسہ بھی تھا۔ اسی کی یادگار ہے جو اکبر کی تعمیر کرائی ہوئی فتح پور سیکری کی مسجد کے بعد مغل دور کی سب سے پہلی اور وسیع ترین مسجد ہے۔ یہ مسجد جہاں آرا نے اپنے ذاتی خرچ سے بنوائی تھی۔

جہاندار شاہ (۱۰ر رمضان ۱۰۷۱ھ/۱۰ر مئی ۱۶۶۱ء - ۱۶ر محرم ۱۱۲۵ھ/[illegible] فروری ۱۷۱۳ء) ایک مغل شہنشاہ جس کا دور حکومت ۲۱ر صفر ۱۱۲۴ھ/۲۹ر مارچ ۱۷۱۲ء تا ۱۶ر محرم ۱۱۲۵ھ/۱۱ر فروری ۱۷۱۳ء ہے۔

معز الدین اپنے والد بہادر شاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ جو بہادر شاہ کی [illegible] وقت ملتان کا صوبیدار تھا۔ جہاندار شاہ عیش پسند اور آرام طلب انسان تھا [illegible] شاہ کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ چھڑی تو جہاندار شاہ نے دکن کے صوبیدار [illegible] میر بخشی ذوالفقار خان کے بل بوتے پر اس جنگ میں عملی حصہ لیا۔ کیونکہ میر بخشی [illegible] کو تخت سے محروم کر کے وزارت خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ مغلوں کے دستور کے مطابق بہادر شاہ کے [illegible] جنگ شروع ہو گئی لاہور کے قریب تین روز کی جنگ کے بعد [illegible] اور وہ ہلاک ہو گیا۔ جہاندار شاہ نے ذوالفقار کی مدد سے اپنے [illegible] جہان شاہ اور رفیع الشان کو بھی قتل کرا دیا۔ اور وہ [illegible] تخت [illegible]

جہاندار شاہ اپنے باپ بہادر شاہ سے بھی [illegible] خوب صورت کنجڑن سے شادی کر لی۔ جو [illegible] وہ اور کنجڑن ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں نکلتے تھے۔ اور کنجڑن [illegible] تھے۔ کنجڑے اس داد و دہش سے بہت [illegible]

ایک دفعہ جہاندار شاہ قطب صاحب کی سیر سے [illegible] میں شاہی رتھ میں مدہوش پڑا تھا۔ رتھ بان بھی بے خبر تھا [illegible] میں کھڑی کی اور پھاٹک کو قفل لگا کر چلا گیا۔ بادشاہ [illegible] ہوئی۔ ساری رات تلاش کی لیکن پتہ نہ چلا۔ صبح ہوئی تو رتھ بان اپنی [illegible] خانے کا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت ابھی رتھ میں پڑے [illegible] وہ ساری رات رتھ خانے میں پڑے سوتے رہے۔

ایسے حالات میں ملکی معاملات کیا ترقی کر سکتے تھے۔ اس کے [illegible] اس کے انجام کا باعث اس کے ذوق [illegible] پرستی اور رقاصہ [illegible] شیفتگی کو ٹھہرایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مرکزی حکومت کی [illegible] کی کوئی کوشش نہ کی اور اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار خان وزیر کے خلاف [illegible] مصاحبین کی سازشوں سے نظم و نسق سلطنت میں کوئی مضبوطی یا استحکام پیدا نہ ہو سکی۔ اس نے خاندانی آدمیوں کی بجائے بازاری لوگوں کو اعلیٰ عہدے دیے [illegible]

کئے اور انہیں اپنا مشیر بنایا۔ یہ بادشاہ سلطنت کے کاموں سے بالکل بے خبر رہا۔
چنانچہ تقریباً ایک سال بعد اورنگ زیب کا پوتا اور عظیم الشان کا دوسرا بیٹا فرخ سیر سادات بارھہ یعنی عبداللہ خان اور حسین علی خان کی مدد سے جن کو ساتھ ملانے میں جہاندار شاہ ناکام رہا تھا۔ پٹنے سے آگرے کی طرف بڑھا اس نے راستے میں کھجوا (خواجہ) کے مقام پر جہاندار شاہ کے بیٹے عزالدین کو شکست دی، جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں نے عجلت میں لشکر جمع کیا اور آگرے کی طرف روانہ ہوئے لیکن ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء میں شکست کھائی۔ اس کے بعد جہاندار شاہ ذوالفقار خاں کے والد معلق اسد خان کے پاس پناہ لینے کے لئے دلی کی طرف بھاگ نکلا۔ جہاں باپ اور بیٹے نے اس توقع پر کہ شاید فرخ سیر کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے جہاندار شاہ کو دلی کے قلعے میں بند کر دیا۔ فرخ سیر نے دلی پر چڑھائی کی اور اس کے دلی میں فاتحانہ داخل ہونے سے ایک روز پیشتر جہاندار شاہ اور اس کے وزیر ذوالفقار خان کو اس کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ فرخ سیر نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان دونوں کی بے سر لاشوں کو ہاتھی کے ہودے سے الٹا لٹکا کر شہر میں پھرایا۔

جہاں سوز (... ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء) علاء الدین حسین بن الحسین غوری خاندان کا ایک شاعر فرمانروا۔ جو اس واقعے کی بنا پر جہاں سوز کے نام سے ... اس نے ۵۴۶ھ/۱۵۱ا۱ء میں غزنہ کو نذر آتش کر دیا تھا۔

غوریوں اور بہرام شاہ غزنوی کے درمیان چپقلش کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ قطب الدین محمد علاء الدین کے بڑے بھائی نے غزنہ کے بعض باشندوں سے ساز باز کر کے خود غزنہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو بہرام شاہ نے اسے زہر دلوا دیا۔ علاء الدین کے ایک دوسرے بھائی سیف الدین نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ غزنہ پر غوری افواج کا عارضی طور قبضہ ہو جانے کے بعد سیف الدین کو بہرام شاہ کے ہاتھوں بڑے بہیمانہ طریقے سے موت کا شکار ہونا پڑا۔ علاء الدین کے ایک اور بھائی بہاء الدین سام کو اس کی موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے بھائیوں کا بدلہ لے سکے۔ چنانچہ علاء الدین نے بہرام شاہ پر چڑھائی کر دی۔ اور تین لڑائیوں میں بہرام شاہ کو پے در پے شکست دے کر غزنہ پر قبضہ کرنے کے بعد شہر کو نذر آتش کر دیا۔

اگلے سال ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں جب کہ بہرام شاہ پنجاب میں پناہ گزین ہو چکا تھا علاء الدین نے مقطع ہرات سے اتحاد کر کے سلطان سنجر کی طرف پیش قدمی کی لیکن ہرات کے قریب اوبہ کے مقام پر شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں رہائی پائی۔ اور اپنی وفات تک فیروزکوہ میں خاموشی سے حکومت کرتا رہا۔

جہانگیر (۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ/۳۱ اگست ۱۵۶۹ء - ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ/۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء) خاندان مغلیہ کا چوتھا بادشاہ، نورالدین اور جہانگیر لقب تھا۔

شہنشاہ اکبر کا زندہ رہنے والوں میں سب سے پہلا بچہ کیونکہ اس سے پہلے سب بچے زمانہ شیر خوارگی ہی میں وفات پا جاتے تھے۔

جہانگیر کی والدہ مشہور و معروف راجپوت مہارانی مریم الزمانی تھی۔ اس کی پیدائش ہندوستان کے مشہور و معروف بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ہوئی۔ یہ خانقاہ آگرے کے قریب فتح پور سیکری میں واقع تھی۔ اس بزرگ ہستی کے نام پر شہزادے کا نام بھی سلیم ہی رکھا گیا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ شہزادہ سلیم اسی بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ نیز اکبر شہزادے کو ہمیشہ شیخو بابا کے نام سے پکارتا تھا۔ کیونکہ وہ احتراماً بزرگ شیخ کا نام اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

اگرچہ شہزادے کی تعلیم و تربیت ایک خاص ماحول میں کی گئی تھی لیکن سلیم اس وقت کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور محلاتی سازشیں اس پر بھی اثر انداز ہو کر رہیں یہاں تک کہ باپ اور بیٹے کے تعلقات میں حد درجہ کشیدگی پیدا ہو گئی اور یہی کشیدگی ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں بغاوت کا سبب بنی۔ سلیم نے علم بغاوت بلند کر کے الٰہ آباد، اودھ اور بہار پر قبضہ کر لیا اور اپنے باپ کی اطاعت سے منحرف ہو کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں جہانگیر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھا لیکن اکبر کی دفاعی کارروائیوں کی وجہ سے الٰہ آباد کی طرف واپس لوٹ آیا۔ یہیں پر اس نے شاہی لقب اختیار کیا۔ اور باقاعدہ دربار بھی قائم کر لیا۔ اس دوران میں جہانگیر کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اس کے اور اکبر کے درمیان تعلقات کشیدہ کرانے والی شخصیت اکبر کا وزیر ابوالفضل ہے۔ جو اس کے خلاف شہنشاہ اکبر کے کان بھرتا رہتا ہے چنانچہ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں جب ابوالفضل دکن سے واپس آ رہا تھا تو جہانگیر کے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق بندیلا سردار بیر سنگھ دیو کے ملازمین نے اس پر حملہ کیا اس کا سر قلم کر کے جہانگیر کے دربار میں الٰہ آباد بھیج دیا۔ ان چند صدمات نے اکبر کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اس کی صحت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ آخر کار ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا

اکبر کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق جہانگیر ابوالمظفر نورالدین محمد بادشاہ غازی کے لقب سے خاندان مغلیہ کا چوتھا شہنشاہ بنا۔

ابھی جہانگیر کو تخت پر بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ اسے اپنے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ خسرو راجہ مان سنگھ کا بھانجہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس بغاوت میں راجپوت اس کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ وہ فوج جمع کرنے کے ارادے سے آگرے سے بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد جہانگیر بھی اس کے تعاقب میں لاہور پہنچ گیا۔ دریائے راوی کے کنارے باپ بیٹے میں ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں خسرو کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ لیکن شاہدرہ کے قریب پکڑا گیا۔

اگرچہ آپس میں مصالحت ہو گئی لیکن شہنشاہ جہانگیر نے اپنے بیٹے کی اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ بالآخر اس نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں برہان پور کے مقام پر انتقال کیا اس کے انتقال سے جہانگیر کی ایک بڑی پریشانی دور ہو گئی۔

۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں احمد نگر کے ایک حبشی سردار ملک عنبر نے بہت سی فوج جمع کر کے شاہی فوج پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ اس پر جہانگیر نے بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم خانخاناں کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ لیکن عبدالرحیم کو اس مہم میں کامیابی نہ ہوئی۔ بعد میں یہ مہم خان لودھی اور شہزادہ خرم (شاہجہاں) کے سپرد ہوئی ان دونوں نے احمد نگر والوں سے کئی معرکے ہوئے آخر شہزادہ خرم نے ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء کو احمد نگر کو دوبارہ سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ملک عنبر کا انتقال ہو گیا اور احمد نگر کی شورش ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کر لی جو مرزا غیاث کی بیٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فرمانروا کی حیثیت سے جہانگیر کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ نورجہاں نے آہستہ آہستہ تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ امور سلطنت پر دن بدن اثر انداز ہونے لگی۔ اس کا نام شہنشاہ جہانگیر کے نام کے ساتھ طلائی سکوں پر کندہ ہونے لگا۔ آخر کار وہ عملی طور پر پوری پوری فرمانروا بن گئی۔

۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں جہانگیر کے دوسرے بیٹے شہزادہ خرم (شاہجہان) نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں شہزادہ خرم اور نورجہاں کی باہمی رنجش کا بڑا دخل تھا۔ شہزادہ خرم کی شادی نورجہاں کے بھائی آصف خاں کی لڑکی سے ہوئی

اور شہریار جو جہانگیر کا چھوٹا بیٹا تھا نور جہاں کی بیٹی سے بیاہا گیا تھا جو اس کے پہلے خاوند شیر افگن سے تھی۔ اس لئے نور جہاں یہ چاہتی تھی کہ جہانگیر کے بعد اس کا داماد شہریار دہلی کے تخت پر بیٹھے لیکن آصف خان خفیہ طور پر اپنے داماد خرم کی مدد کرتا تھا۔ دربار میں نور جہاں کا زور تھا۔ اس لئے مغل شہزادوں کے عام دستور کے مطابق اس نے بھی تخت پر قبضہ کرنے کے لئے دکن میں اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر نور جہاں نے مہابت خان کو جو ایک افغان سردار تھا، شہزادہ خرم کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ مہابت خان نے شکست دے کر خرم کا ناک میں دم کر دیا۔ وہ جان بچانے کے لئے کبھی دکن سے بنگال کی طرف بھاگتا تھا اور کبھی بنگال سے دکن کی طرف آخر تنگ آکر اس نے ۱۰۳۵ھ/ مارچ ۱۶۲۶ء میں مہابت خان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور باپ سے معافی مانگ لی۔ اس طرح خرم کی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس فتح سے مہابت خان کا اقتدار بہت بڑھ گیا نور جہاں اسے اپنے ساتھ ملانا چاہتی تھی تاکہ شہریار جہانگیر کی وفات کے بعد آسانی سے تخت پر بیٹھ سکے۔ لیکن مہابت خان نے انکار کر دیا۔ اس لئے نور جہاں نے اس پر خیانت کا الزام لگا کر دربار میں طلب کیا۔ جہانگیر اس وقت کابل جا رہا تھا اور دریائے جہلم کے اس طرف ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ نور جہاں اور شاہی فوج دریا کے پار پہنچ چکی تھی کہ مہابت خان پانچ ہزار سپاہیوں کو لے کر جہانگیر کے خیمے کے سامنے پہنچ گیا اور جہانگیر کو اکیلے میں پکڑ اپنی حراست میں لے لیا۔ یہ واقعہ ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کا ہے جب نور جہاں کو بادشاہ کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو بادشاہ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر وہ بھی جہانگیر کے پاس چلی آئی اور مہابت خان نے اسے بھی نظر بند کر لیا۔ یہاں سے یہ قافلہ کابل پہنچا آصف خان پہلے تو فرار ہوگیا مگر پھر نور جہاں کے اشارے پر کابل میں مہابت خان سے جا ملا اور شاہی افواج میں پھوٹ ڈلوا دی۔ وہاں نور جہاں نے خفیہ طور پر بہت سی فوج جمع کرلی اور بادشاہ کو مہابت خان کی قید سے نکال لے گئی۔ مہابت خان بھاگ کر دکن میں شہزادہ خرم سے جا ملا۔ جو تخت پر قبضہ کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ نور جہاں نے اس کے بعد خان جہاں لودھی کو شاہی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور حکم دیا کہ باغیوں کو کچل دیا جائے۔ لیکن مہابت خان کے خلاف کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے ہی جہانگیر راجوڑی سے کشمیر آتے ہوئے راستے ہی میں انتقال کر گیا۔

جہانگیر جہانگیر کا مقبرہ

جہانگیر نے ۵۸ سال (شمسی) کی عمر میں ۲۲ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ اس کی میت لاہور میں لائی گئی۔ جہانگیر کی میت کو نامساعد حالات کی بنا پر موزوں رسوم تعزیت کے بغیر ہی دفن کر دیا گیا۔ جہانگیر کو جس مقبرہ میں دفن کیا گیا اس کا انتخاب نور جہاں نے کیا تھا اور اپنے خرچ سے ایک شاندار مقبرہ بھی اسی نے تعمیر کرایا تھا۔

جہانگیر کے دور حکومت کے دو مشہور واقعات قاضی نور اللہ شوشتری کا قتل اور حضرت مجدد الف ثانی رح کی اسیری ہے۔ جنہیں جہانگیر کے حکم سے گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا تھا۔ لیکن کم و بیش ایک سال بعد بادشاہ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے انہیں رہا کر دیا۔ ان دو واقعات پر معاصر اور بعد میں آنے والے مورخین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اس کے عہد حکومت کا ایک اور مشہور واقعہ سر طامس رو کا ہندوستان میں بطور سفیر آنا ہے جس کو انگلستان کے بادشاہ جیمز اول نے بھیجا تھا۔ وہ کئی سال تک جہانگیر کے دربار میں رہا۔ اس نے سورت، کھمبایت، گوا اور احمد آباد میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس طرح انگریزوں کو محصول ادا کئے بغیر ہندوستان میں تجارت کرنے کا موقع مل گیا اور اسی تجارت کی بدولت انہوں نے اس ملک میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

جہانگیر ایک عالم فاضل شخص تھا۔ وہ انسان شناس اور مسائل میں گہری نظر رکھنے والا تھا۔ تخت پر بیٹھنے سے پہلے اس کی طبیعت میں لاپرواہی زیادہ تھی اور وہ چنداں مستقل مزاج معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن تخت پر قدم رکھتے ہی اس کے طور طریقے بدل گئے۔ وہ نہایت متانت اور دانشمندی سے امور سلطنت سر انجام دینے لگا۔ جنگ کے محصول میں کئی نقائص تھے اس نے وہ سب نقائص دور کئے بہت سے محصول بالکل ختم کر دیئے۔

اس سے پہلے بعض جرموں میں مجرموں کے کان ناک وغیرہ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اس نے اس وحشیانہ سزا کو منسوخ کر دیا۔ اگرچہ وہ خود شراب پیتا تھا لیکن اس نے شراب، تمباکو اور ایسی دوسری نشہ آور اشیاء کی امتناعی کا حکم دے رکھا تھا۔ وہ بڑا نہایت ہی زیرک حکمران تھا۔ فارسی کے علاوہ ترکی زبان بھی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ بابر کی طرح اس نے بھی اپنی سوانح حیات خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کی اس کا نام تزک جہانگیری رکھا۔ اس نے اس کتاب میں اپنی سلطنت کے حالات بالکل صحیح صحیح لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شراب نوشی کی عادت پر بھی پردہ نہیں ڈالتا جو اس کی صحت کو گھن کی طرح کھا گئی تھی۔

جہانگیر نرم دل اور کریم النفس بھی تھا۔ وہ بڑا انصاف پسند اور عادل بادشاہ تھا۔ وہ ملک کی خوش حالی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ عدل و انصاف میں اس قدر مشہور تھا کہ اس کے عدل کے سبب اردو ادب میں عدل جہانگیری کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ اس نے اپنے محل کی دیوار کے ساتھ سونے کی ایک زنجیر لٹکا رکھی تھی اور حکم دے رکھا تھا کہ جس شخص کو کوئی شکایت ہو اور وہ ہم سے ملنا چاہتا ہو وہ رات کے وقت بھی اس زنجیر کو ہلا کر ہمارے کانوں تک اپنی فریاد پہنچا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل وانصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔

اسے تشدد سے نفرت تھی اگرچہ بعض اوقات وہ تشدد پہ اتر آتا تھا لیکن ایسے واقعات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

اس کا دور حکومت رعایا کے لیے امن وخوشحالی کا دور تھا۔ اس دور میں صنعت اور تجارت کو بھی بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کے دور میں سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال واستحکام پیدا ہوا۔ جس کو صرف میواڑ اور دکن کی چند لڑائیوں اور بنگال کی معمولی شورشوں نے متاثر کیا۔

نورالدین جہانگیر

اسے مناظر قدرت سے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ جس کا ثبوت اس کی تصنیف تزک جہانگیری میں ملتا ہے۔ جس میں اس نے مناظر قدرت سے کشمیر اور دوسرے مقامات کے حسن کی تعریف خوب مزے لے لے کر کی ہے۔ اس نے بہت سے شفاخانے، سرائیں مکتب اور مدرسے تعمیر کرائے۔ ان سب کے اخراجات حکومت خود ادا کرتی تھی۔ اس کے دربار میں کئی ایک مشہور مصور موجود رہتے تھے۔ اسے شاعری کا بھی ذوق تھا۔

جہانگیر جوگیوں اور سنیاسیوں کی بھی بہت سرپرستی کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو پہلے سے بھی زیادہ ترقی کے میدان میں گامزن ہو کر تمام سلطنت پر چھا گئے۔

جہانگیر لاہور میں شاہدرہ کے مقام پر جس مقبرے میں دفن ہے وہ مغلوں کے فن تعمیر کا ایک نہایت اعلیٰ اور عمدہ نمونہ ہے۔

جہشیاری، ابوعبداللہ (م ۔ ۱ ۔ ۳۳۱ھ/۹۴۲ء ۔ ۹۴۳ء)، محمد بن عبدوس۔ ایک ادیب اور سیاست دان۔ کوفے میں پیدا ہوا چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کی ابتدا ہی سے سیاست میں حصہ لیتا کیونکہ اس کے وزیروں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کا باپ وزیر علی بن عیسےٰ کا حاجب تھا۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد جہشیاری اس عہدے پر فائز ہوا۔

۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں وہ علی بن عیسےٰ کی فوج رکاب کا سردار تھا۔ کچھ عرصے بعد جہشیاری ابن مقلہ کے حامیوں میں شامل ہو گیا۔ جس کی وزارت کے اعلان میں اس نے مدد کی تھی نیز جب وہ معزول ومعتوب ہوا تو جہشیاری ہی نے اسے چھپایا۔ خود اسے کئی بار وزیروں اور امیروں نے قید اور جرمانے کی سزائیں دیں۔

جہشیاری کی تصنیف "کتاب الوزراء والکتاب" بہت زیادہ مشہور ہے بلکہ خود اس کی شہرت اسی تصنیف کے سر ہے۔ اس کتاب میں اس نے حکومت کے ان وزیروں اور دبیروں کا ذکر کیا ہے جو ۲۹۶ھ/۹۰۸ء تک برسر اقتدار آئے۔ اس میں اس نے لوگوں کے کردار اور فکری وذہنی صلاحیتوں پر بھی اسی قدر توجہ دی ہے جتنی کہ ان کی انتظامی اور سیاسی سرگرمیوں پر۔

جہشیاری نے المقتدر کی خلافت کے حالات وواقعات پر بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کی ایک اور تصنیف جو حکایات کا مجموعہ تھی بعض لوگ "الحکایات العجیبہ" کو جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے جہشیاری ہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

جھنگ پاکستان میں صوبہ پنجاب کا ایک شہر اور ضلع۔ جو ۳۰ درجے طول بلد اور ۲۵ درجے عرض بلد پر واقع ہے قدیم مورخین نے جھنگ نام کے کسی شہر کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم اس علاقے کو وسیع اور گھنے جنگل کی وجہ سے جھنگی، جھانگ، جہانگ، جھنگڑ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں اس قصبہ کا نام برہمن گڑھ اور علاقے کا نام جھنگی تھا۔

جھنگ کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے۔ وہ گذشتہ ہزاروں برس سے مختلف حملہ آوروں کی دست برد کا نشانہ بنتا رہا۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ قدرتی بات ہے۔ کول، دراوڑ، تامل، آریا، یونانی، ایرانی، بدھ اور مسلم تہذیبوں نے یہاں اپنے اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔

جب اشوک ۲۷۲ قبل مسیح میں تخت پر بیٹھا تو اس نے بدھ مذہب کو فروغ دینے کے لیے جگہ جگہ مندر تعمیر کرائے۔ چنانچہ اس علاقے میں بھی ان مندروں کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ ان کے ملبے سے اب بھی بدھ کی مورتیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ شورکوٹ میں (بدھ کے) مندر سے بدھ کی مٹی کی مورتیاں تانبے کے سکے جن پر ایک طرف مہاتما بدھ اور دوسری طرف اشوک کی شبیہیں کندہ ہیں اب بھی بعض لوگوں کے پاس موجود ہیں۔

چچ نامہ میں لکھا ہے کہ چچ کے بعد ساہسی ثانی حکمران بنا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے ہرلس نے حکومت سنبھالی تو اس نے اپنی سلطنت کو انتظامی اعتبار سے چار مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبوں میں ایک صوبہ برہمن گڑھ تھا۔ اس نام کا ایک قلعہ اور شہر موجودہ جھنگ صدر کے قریب موجود تھا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ جھنگ کو ایک صوبہ کا درجہ دیا گیا۔ اس صوبے میں پنڈی بھٹیاں، تکوارہ، چاچ، چنیوٹ، شورکوٹ، لیہ، اعوانی اور دیپالپور کے علاقے شامل تھے۔ جب محمد بن قاسم نے ۹۲ھ/۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا اور اس کے بعد ملتان فتح کر لیا۔ تو مسلمان فوجیں شورکوٹ کا قلعہ فتح کرنے میں بھی کامیاب ہو گئیں۔ ان دنوں جھنگ کا حاکم بیجے راؤ کا نواسہ تھا۔ محمد بن قاسم کے حملے کے دوران اسے سخت نقصان پہنچا۔ اور مسلمانوں کی فتح کے بعد یہ علاقہ ہندوؤں کی سلطنت کا حصہ نہ بن سکا۔

نظام حکومت سنبھالنے کے بعد محمد بن قاسم نے سندھ سے چنیوٹ تک ریاست کو پانچ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ ان صوبوں میں ایک صوبہ شورکوٹ اور ایک صوبہ چنیوٹ بھی تھا۔ چنیوٹ کے گورنر حریم بن عبدالملک تمیمی اور شورکوٹ کے گورنر جلال الدین محمود غازی بنے۔

خلافت عباسیہ کے دور میں جھنگ کے جن گورنروں کے نام ملتے ہیں ان میں موسےٰ بن کعب، تمیمی، عیینہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں مشہور عمر بن حفص ہے۔ جو در پردہ فاطمی تحریک کا ہمنوا تھا۔

جب محمود غزنوی نے ملک ایاز کو اپنا نائب بنا کر لاہور میں متعین کیا تو شورکوٹ جھنگ، چنیوٹ، بھیرہ وغیرہ کے علاقے ملک ایاز کی نگرانی میں رہے۔

محمود غزنوی کے بعد کھوکھروں نے بھیرہ سے شورکوٹ تک کا علاقہ سنبھال لیا۔ پھر جب التمش حکمران ہوا جسے خلافت عباسیہ بغداد نے باقاعدہ طور پر ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کیا تو اس نے اپنی حدودِ سلطنت دہلی تک وسیع کرلیں اور جو علاقے ناصرالدین قباچہ نے ایبک کے زمانے میں اپنی ریاست میں شامل کر لئے تھے وہ بھی اس سے واپس لے لئے۔ اس طرح شورکوٹ تا بھیرہ اور علاقہ کوہستان بھی التمش کی حکومت میں چلا گیا۔ اس نے جھنگ کے لئے سردار لودر کو باقاعدہ مقامی اختیارات سونپے۔

جس جگہ آج کل جھنگ شہر آباد ہے۔ یہاں گھنا اور وسیع جنگل تھا۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہاں سے دو میل جنوب مشرق کی طرف برہمن گڑھ کا قلعہ اور شہر تھا۔ اس برباد شدہ قلعہ پر ہیر سیال کا مزار موجود ہے۔ کیونکہ رائے سیال اور اس کی اولاد حضرت شیر شاہ جلال بخاری سے بیعت ہو چکے تھے اور وہ عموماً بھیرہ، خوشاب، چنیوٹ، ساہیوال، شاہ پور کے علاقوں میں عموماً جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس وسیع جنگل میں شہر بسانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جھنگی یا جھانگ کے نام سے یہ علاقہ پہلے ہی مشہور تھا۔ حضرت شاہ جلال نے رائے سیال کو بشارت دی کہ آئندہ اس علاقے پر تمہاری حکومت ہوگی چنانچہ ۱۲۸۸ء میں اس بشارت کے تحت نئے شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اس کا نام جھنگ سیالاں رکھا۔

۱۴۶۰ء میں جھنگ پر لنگاہوں کا حملہ ہوا اس جنگ میں جھنگ تباہ و برباد ہوگیا لیکن ۱۴۶۲ء میں جھنگ شہر جو اس لڑائی میں تباہ ہوگیا تھا مل خاں نے دوبارہ بسایا۔

اکبر کے عہد میں جھنگ صوبہ ملتان سے منسلک ہوگیا۔ ۱۸۱۶ء میں سردار کھڑک سنگھ کی قیادت میں سکھوں کی فوج نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ ۱۸۱۸ء میں ملتان شہر پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا تو جھنگ اور اس کی ذیلی و ملحقہ ریاستوں پر سکھ افسران متعین ہو گئے تھے اور اس طرح جھنگ سکھوں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۴۸ء میں ضلع جھنگ پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور سکھ حکومت کے تمام کارندوں کو فارغ کر کے جملہ اختیارات خود سنبھال لیے۔

۱۸۹۰ء میں ضلع جھنگ کی از سر نو حد بندی کی گئی۔ لیہ کا علاقہ جھنگ سے نکال کر ضلع مظفر گڑھ میں شامل کر دیا۔ حیدر آباد کو ضلع میانوالی میں پنڈی بھٹیاں کو ضلع گوجرانوالہ میں کمالیہ اور ساہی وال کو علیحدہ کر کے ضلع ساہی وال بنایا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ساندل بار کا علاقہ جو سب تحصیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ کاٹ کر لائل پور کے نام سے نیا ضلع بنا دیا گیا۔ باقیماندہ ضلع کو بھی انتظامی اعتبار سے تحصیلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جھنگ تحصیل کا صدر مقام جھنگ صدر (مگھیانہ) مقرر ہوا۔

۱۴ اگست کو پاکستان کے قیام کے بعد سے جھنگ پاکستان کا ایک شہر ہے۔

انگریزوں کی عملداری کے ابتدائی دنوں میں یعنی ۱۸۸۱ء جھنگ کا مجموعی رقبہ ۶۰۰۷ میل پر مشتمل تھا۔ اور اس کی آبادی ۳۹۵۲۹۶ تھی ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع جھنگ کا کل رقبہ ۳۴۰۱ مربع میل رہ گیا ہے۔ اس کی کل آبادی ۶۵۵۳۶۵۷ تک پہنچ گئی ہے۔ جھنگ شہر کی آبادی ۱۹۷۲ء میں چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس وقت زنانہ مردانہ دو ہائی سکول اور تیرہ پرائمری سکول جاری ہیں۔ سات مذہبی مدارس ہیں۔

جھنگ صدر: - موجودہ شہر ان دنوں ضلع جھنگ کا صدر مقام ہے۔ جو جھنگ صدر کے نام سے موسوم ہے۔ تمام ضلعی دفاتر اسی جگہ واقع ہیں۔ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ پندرہ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ موجودہ شہر سے ڈیڑھ میل مشرق کی جانب جہاں مائی ہیر کا مزار ہے۔ قدیم شہر اور قلعہ اس جگہ پر تھے۔ ۱۹۴۴ء میں محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ کے مطابق یہ شہر سکندر اور چندر گپت کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔

تاریخ میں دوسری مرتبہ یہ شہر مغل تاجدار جہانگیر کے عہد میں ایک چھوٹی سی بستی کی شکل میں میگھا نامی ایک سیال نے آباد کیا تھا۔ یہ جگہ نسبتاً بلند تھی کیونکہ قدیم زمانے میں یہاں ایک قلعہ تھا۔ جو تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ اسی قلعے کے کھنڈروں پر مگھیانہ شہر آباد ہوا۔ شہر کے گرد پختہ فصیل تعمیر کی گئی۔ اس کے چاروں طرف پختہ دروازے بنائے گئے۔ قدیم شہر ان چار دروازوں کے اندر تھا۔ دونوں شہروں کا انتظام چلانے کے لئے ایک میونسپل کمیٹی جس میں جھنگ شہر اور جھنگ صدر (مگھیانہ) ۱۸۸۰ء سے آج تک شامل ہیں۔

۱۹۵۰ء میں سیلاب سے شہر کو سخت نقصان پہنچا۔ حکومت نے تین میل مشرق کی جانب سیٹلائٹ ٹاؤن بسایا۔

جھنگ صدر میں دو مردانہ ایک زنانہ ڈگری کالج۔ ایک زنانہ انٹر کالج ایک کمرشل انسٹی ٹیوٹ، دو ٹیکنیکل سکول، پانچ مردانہ اور ایک زنانہ ہائی سکول چار مڈل سکول اور چالیس پرائمری سکول ہیں۔ اس وقت ۵۳ جامع مساجد ۹۶ دیگر مساجد اور دو عیدگاہیں ہیں۔ پانچ فلور ملیں اور ایک شوگر مل ہے۔

جھوٹ کذب، دروغ، خلاف واقعہ، غلط، انسان کے سارے اخلاق ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت خواہ وہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے۔

جھوٹ تمام قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے۔ انسان کے دل کے اندر کی بات سوائے اللہ تعالے کے اور کوئی نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا شخص کسی فرد کے بارے میں اگر کچھ جان سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اگر وہ اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کرتا ہے۔ تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے۔ ایسے انسان نے دنیا کی جو برائیاں بھی ہیں وہ اس سے کم ہیں۔

شریعت میں جھوٹ کی بہت زیادہ مذمت آئی ہے۔ جھوٹ کبیرہ گناہوں میں داخل ہے۔

نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹا شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر نبی سچا نہیں تو اس کے دعوے اور پیام پر کسی کو بھروسا نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے صدق نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہو سکتا۔

اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور آہی جائیں گے اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گذرنے والا کذاب ہو۔ (۴۰ : ۲۹)

اس آیت سے واضح ہے کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ارشاد باری تعالے ہے۔

اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو۔ (۳۹ : ۳)

آنحضورؐ نے فرمایا کہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔ (بخاری)

ایک اور حدیث آپ نے فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضورؐ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے۔" آپ نے فرمایا "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔" اس شخص نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "جھوٹ بولنا۔ جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا۔ اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔" (مسند احمد)

اس حدیث سے واضح ہے کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں۔ اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

ایک اور جگہ پر آپ نے فرمایا۔

"جھوٹ رزق کو گھٹاتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

اسلام کی لعنت کا سب سے سخت ترین لفظ لعنت ہے۔ جس کے معنی اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا مستحق شیطان کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہودیوں کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالےٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے۔ مباہلہ کے موقع پر فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدا تعالےٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

"پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں" (۶۱:۳)

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

"اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔" (۷:۲۴)

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر انجان بن جائے۔ حق کا علم رکھتے ہوئے بھی اس کے اظہار سے باز رہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ یہ گویا ایک طرح نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ جو دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

"اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی طور پر جھوٹے ہیں۔" (۱:۶۳)

اسی بنا پر آنحضورؐ نے جھوٹ کو نفاق کی ایک علامت بتایا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ منافق کی پہچان تین باتیں ہیں۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔" (بخاری)

جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جس کی وجہ سے بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہوجاتی ہیں۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو۔ لیکن یہ قولی ہے یعنی زبان کا جھوٹ۔ کذب عملی یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

اسلام اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ بچوں کو بہلانے کے لئے ان سے جھوٹے وعدے کر لئے جائیں جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔

ایک صحابی عبداللہ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا جب کہ آنحضورؐ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ "یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی۔ آنحضورؐ نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو۔ میری ماں نے کہا اس کو کھجور دے دوں گی۔ آپ نے فرمایا۔ "ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ بھی تمہارا جھوٹ لکھا جاتا۔ (ابوداؤد)

اس تعلیم کا منشا ایک طرف تو یہ ہے کہ مسلمان کی زبان کسی حالت میں بھی جھوٹ سے آلودہ نہ ہونی چاہیئے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید کرنا اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویے سے بچے کی تعلیم و تربیت پر اثر پڑے گا۔

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی موجود ہوتی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید نے آنحضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی لکھا جاتا ہے۔ (مسند احمد)

اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی جو خوش گپی کے موقع پر محض لطف صحبت کے لئے بولا جاتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس، اس پر افسوس" (ابوداؤد) کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے۔ اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ کے برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابل اعتماد سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کرتا ہے۔ اسلام نے اس کو خیانت قرار دیا ہے۔

آنحضورؐ نے فرمایا کہ یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآں حالانکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو۔" (ادب المفرد)

اس سے زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زور اور افک وغیرہ کے ناموں سے تعبیر کیا ہے۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالےٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے۔ "بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔" (۳۰:۲۲)

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ایک انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے۔ ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں سمّٰعون للکذب (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے۔ (۴۲:۵)

جہلم پاکستان کا ایک شہر اور ضلع، جو لاہور سے ۱۰۳ میل کے فاصلے پر دریائے جہلم کے

مسجد افغاناں جو دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے

کنارے واقع ہے۔ یہ ضلع ۳۲ درجے ۲۶ دقیقے اور ۳۳ درجے ۱۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۱ درجے ۱۵ دقیقے اور ۷۳ درجے ۵۰ دقیقے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔

تاریخی لحاظ سے جہلم نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ جہلم کا ذکر اس زمانے سے چلا آتا ہے جب آریا وسط ایشیا سے اس ملک میں آئے تھے اور قافلوں کی شکل میں اس جگہ مقیم ہوئے تھے۔ جہاں آج کل دریا کے کنارے شہر جہلم واقع ہے۔

جہلم کا ذکر تاریخ میں اس وقت نمایاں طور پر آتا ہے جب سکندر اعظم نے اس ضلع کی تحصیل پنڈدادن خان میں دریائے جہلم کے دائیں کنارے پورس سے جنگ کے موقع پر اپنا فوجی کیمپ لگایا تھا جو کئی میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت راجہ پورس جہلم پر حکمرانی کرتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ راجا بکرا جیت کا بھائی جوجوگی ہوگیا تھا۔ ٹلہ کی خانقاہ پر پہنچا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں بال ناتھ جوگی کی اس خانقاہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ خانقاہ گورکھ ناتھ کے نام سے منسوب تھی۔ مہا بھارت کی جنگ کے بعد پانچ پانڈو بھائی جلاوطنی کے بعد اس جگہ آئے تھے۔

۲۷۲-۲۳۱ قبل مسیح میں جہلم کا علاقہ اشوک کی سلطنت میں شامل تھا اور اس کا ایک حصہ تھا۔

تاریخ میں جہلم کا دوبارہ ذکر اس وقت آتا ہے۔ جب یہ حکومت کشمیر کے زیر اثر رہا۔ چینی سیاح ہیون سانگ جب ۶۳۱ء میں یہاں پہنچا تو اس وقت سے لے کر نویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ کشمیر کے ہندو راجاؤں کے زیرنگین رہا۔ بعد میں یہ علاقہ یکے بعد دیگرے کابل کے برہمنی راجاؤں، محمود غزنوی، محمد غوری، بلبن، فیروز شاہ خلجی اور تیمور کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا ۱۵۱۹ء میں بابر کے قبضے میں آیا۔ اس زمانے میں کئی عمارات اور مندر بنے جو جہلم کے نزدیک کے علاقہ میں کھنڈرات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس علاقے نے محمود غزنوی جیسے فاتح اور شہاب الدین محمد غوری جیسے عظیم شہنشاہوں کو بھی یہاں سے گذرتے دیکھا جب کہ ان کی منزل مقصود دہلی تھی۔ اس علاقے کی مغل شہنشاہوں نے بھی تعریف کی ہے۔ جب یہ علاقہ شیر شاہ سوری کے زیرنگیں آیا تو اس نے ہمایوں کے مقابلے کے لئے رہتاس کا مشہور قلعہ تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ رہتاس ۲۶۰ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے جو ۱۵۴۰ء میں تیار کرایا تھا۔

بابر نے وادیٔ جہلم کی حسین ترین جھیل کلر کہار کا ذکر نہایت دلچسپ پیرائے میں کیا ہے

ضلع جہلم ہی میں مہابت خان نے جو شاہجہان کا جرنیل تھا جہانگیر اور نورجہاں کو گرفتار کیا تھا۔ دریائے کے اس پار قصبہ سرائے عالمگیر مغلوں ہی کی یادگار ہے۔

۱۷۹۳ء میں زمان شاہ کابل کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد جب دہلی پر حملے کے لئے بڑھا تو اس کی توپوں میں سے بارہ توپیں دریائے جہلم میں ڈوب گئیں۔

۱۸۱۰ء میں اس علاقے پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا۔ پنڈدادن خان میں سکھوں نے اپنا دارالحکومت بھی قائم کیا تھا۔ بعد میں یہ علاقہ انگریزوں کے تحت آگیا۔ انگریزوں نے ۲۳ مارچ ۱۸۴۹ء پنڈدادن خان، چکوال، تلہ گنگ اور جہلم کی چار تحصیلیں [illegible] میں شامل کیں اور پنڈدادن خان کو اس ضلع کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں جب تحصیل کو تلہ گنگ کی تحصیل میں شامل کر دیا گیا [illegible] ہوئی۔ بعد میں پنڈدادن خان کی جگہ جہلم شہر کو ضلع جہلم کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

موجودہ دور میں جہلم تین تحصیلوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ تحصیل جہلم۔ اس کا رقبہ ۹۴۰ مربع میل اور آبادی [illegible]

۲۔ تحصیل چکوال۔ اس تحصیل کا رقبہ ۱۰۰۱ مربع میل اور آبادی [illegible]

۳۔ تحصیل پنڈدادن خان۔ اس کا کل رقبہ ۸۸۴ مربع میل اور آبادی [illegible]

دریائے جہلم اس ضلع کو شمال میں کشمیر سے اور جنوب میں گجرات [illegible] سے جدا کرتا ہے۔ یہ دریا ضلع کی حدود کے ساتھ ساتھ ایک سو [illegible] میل تک [illegible] میں تلہ اور نیلی کے سلسلہ ہائے کوہ پائے جاتے ہیں۔ اس علاقے کو [illegible] اس علاقے کی معدنیات میں سے نمک کی پیداوار سب سے زیادہ ہے کھیوڑہ [illegible] کان جو دنیا کی بڑی بڑی کانوں میں سے دوسرے درجے پر ہے۔

جہلم کے قابل دید مقامات میں قلعہ رہتاس ہے جو جہلم سے شمال مغرب کی جانب دس میل کے فاصلے پر ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر [illegible] میں ...۵۰۰،۰۰۰ روپیہ صرف ہوا تھا۔ قلعے کے لئے [illegible] نے کیا تھا۔ قلعے کا محیط ڈھائی میل ہے۔

کھیوڑہ:۔ یہ دنیا کی نمک کی بڑی بڑی کانوں میں سے دوسرے نمبر پر ہے۔ دنیا کا بہترین نمک یہاں سے نکالا جاتا ہے کان کا اندرونی حصہ قابل دید ہے۔ [illegible] سو ٹن نمک نکالا جاتا ہے۔

کلوکہار کی جھیل۔ اس کی بابر نے اپنی "تزک" میں بڑی تعریف کی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں پر بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ منگلا ڈیم جہلم سے ۱۹ میل کے فاصلے پر بنایا گیا ہے۔ یہ ڈیم بن جانے سے پاکستان بجلی کے معاملے میں خودکفیل ہوگیا ہے۔

پہاڑوں میں گھری ہوئی ۲۰ میل لمبی جھیل اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان کی ہمت کے سامنے دریا، پہاڑ کوئی رکاوٹ نہیں۔ دریا کے کنارے مسجد افغاناں ہے جو جہلم میں داخل ہوتے ہوئے ایک حسین منظر پیش کرتی ہے۔

جہلم ضلع اور اس کے صدر مقام کا نام ہی نہیں بلکہ اس دریا کا نام بھی جہلم ہے جس کے دائیں کنارے پر اس نام کا شہر آباد ہے۔

جہم بن صفوان ابومحرز۔ الٰہیات کا ایک عالم۔ جہم کو بعض اوقات ترمذی اور سمرقندی بھی کہا گیا ہے۔ یہ خوارزم کے ایک قبیلہ راسب کے مولیٰ تھے۔

ان کا ذکر حارث بن سریج کے کاتب کی حیثیت سے آتا ہے۔ جو تاریخ میں "صاحب الرایۃ السوداء" (کالے جھنڈے والے) کے نام سے مشہور ہے۔ جس نے بنوامیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔

جہم ۱۱۶ھ/۷۳۴ء سے ۱۲۸ھ/۷۴۶ء تک مشرقی خراسان کے ایک حصے کا فرمانروا بھی رہے۔ ۱۲۸ھ/۷۴۶ء میں انہیں گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا۔ اس تحریک بغاوت کا جس کی ذہنی قیادت جہم نے کی تھی۔ بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ حکومت اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق ہونی چاہیے۔ اسی وجہ سے اس تحریک کو مرجئہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

جہم نے ایک ہندی فرقہ سمنیہ کے رد میں اللہ کی ہستی پر دلائل عقلیہ پیش کیے تھے۔

دیگر آرا جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ فرقہ جہمیہ کی ہیں۔ جن کا ذکر ان کی وفات کے ستر سال بعد سننے میں آیا۔ ان آرا کا تعلق جہم کے ساتھ واضح نہیں ہے۔

جہمیہ قدیم زمانے کا ایک فرقہ۔ اس فرقے کے بارے میں سب سے دلچسپ یہ ہے کہ اس کے افراد میں سے کسی کا نام معلوم نہیں۔ سوائے جہم بن صفوان کے جس کو اس فرقے کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں جب یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوچکا تو بشر بن غیاث المریسی اور اس دور کے بعض دوسرے لوگوں نے فرقہ جہمیہ کے عقیدے کی اشاعت کی۔

بشر جو ابو یوسف کا شاگرد تھا ابراہیم بن المہدی کے زمانے (۲۰۲ھ/۸۱۷ء) میں اس کے ان عجیب خیالات کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔

جہمیہ کے بارے میں ابتدائی حوالے اس کے مخالفوں کی تحریروں میں ملتے ہیں (خاص طور پر امام احمد بن حنبل کی تصنیف "الرد علی الزنادقۃ والجہمیہ" اور ان کے ہم خیال لوگوں مثلاً ابن قتیبہ کی تصنیف "الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجہمیہ والمشبہہ" الاشعری کی "الابانہ" خشیش کی "تنبیہ"، ابن خزیمہ کی "کتاب التوحید" اور ابن رجب البغدادی کی "ذیل طبقات الحنابلہ" میں موجود ہیں۔

جہمیوں کے نزدیک جو قرآن کے الفاظ کو مخلوق یا جو اللہ کی صفت علم کا انکار کرتا تھا، کافر تھا۔

نعیم بن حماد نے جو غالباً ۲۲۱ھ/۸۴۶ء میں قید خانے میں فوت ہوا اور جب اس نے قرآن کے مخلوق ہونے کا انکار کیا تو بتایا کہ وہ پہلے جہمی تھا۔

جہمیہ نے عقیدہ "جبر" کی انتہائی شکل کو اختیار کیا تھا۔ جس کی رو سے انسانوں کی طرف فعل کی نسبت محض مجازی ہے۔ جیسے کہ غروب ہونے میں سورج کا فعل مجازی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق قرآن مخلوق تھا۔ نیز وہ اس بات کا انکار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مستقل ازلی صفت علم ثابت ہے۔ ان عقیدے کے لحاظ سے حوادث دنیوی کا علم اللہ تعالیٰ کو ان کے ظہور کے بعد ہوتا ہے بالعموم وہ تمام صفات الٰہیہ کے علیحدہ وجود کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی لئے ان پر تعطیل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ (یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو محض ایک مجرد ہستی ٹھہراتے ہیں)

قرآن میں جو صفات جیسے ید، وجہہ وغیرہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ جہمیہ ان کی عقلی تاویل کرتے تھے۔ ایمان کے بارے میں ان کے عقائد مرجئہ کے عقائد سے مماثلت رکھتے تھے۔

نعیم بن حماد اور ابن عساکر نے اس فرقے کی نشوونما کا باعث متبعین ابوحنیفہ کو اور بصرے میں عمرو بن عبید کو قرار دیا ہے۔ جب کہ حنابلہ کے خیال میں وہ لوگ تھے جو عام طور پر معتزلہ شمار ہوتے تھے۔ حقیقت میں جہمیہ کے خیالات اور ابوالہذیل جیسے معتزلہ کے عقائد میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ بعد میں معتزلہ نے اپنے حلقے سے ان لوگوں کو خارج کر دیا جو ان سے مسئلہ قدر یا اختیار کے باب میں اختلاف کرتے تھے۔ اگرچہ وہ بہت سے دیگر مسائل میں ان سے متفق تھے۔ متبعین ابوحنیفہ کی طرف سے بھی جہمیہ پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔

جہنم دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام۔ جہنام کے معنی بہت زیادہ گہرائی کے ہیں۔ جہنم کا لفظ اسی سے نکلا ہے۔

لوگوں کے مرنے کے بعد ان کی روحوں کے محشر میں جمع ہونے کا عقیدہ بہت پرانا ہے۔ یہ عقیدہ تقریباً بیسویں قبل مسیح کے بعد سے اکاریوں، سومیریوں، قدیم مصریوں، یونانیوں، اشوریوں اور حطیوں میں راسخ ہوچکا تھا۔ نیز ہندومت، بدھ مت اور زرتشتیت میں بھی اس عقیدے کے بارے میں کچھ نہ کچھ ملتا تھا۔ لیکن موجودہ اہم مقدس کتابوں میں اس عقیدے کے بارے میں جو تعلیمات ملتی ہیں وہ مبہم اور مختصر ہیں۔

اسلام واحد مذہب ہے جس نے نہایت واضح الفاظ میں آخرت اور آخرت میں مکافات وعقوبت کے عقیدے کو بیان کیا ہے۔

قرآن مجید میں آنحضورؐ کے بارے میں بشیر (خوشخبری دینے والا) اور نذیر (ڈرانے والا) بنا کر بھیجنے کا ذکر بار بار آیا ہے۔

قرآن مجید میں جہنم کا ذکر بھی واضح طور پر موجود ہے۔

قرآن کے مطابق جہنم بے ایمان مرنے والوں اور ایسے گناہ گاروں کا ٹھکانہ ہے جن کے جرم ناقابل معافی ہیں۔ اس کا سب سے نمایاں وصف آگ ہے۔ قرآن میں بعض جگہوں پر آگ کے معنی میں آنے والا کلمہ "نار" ہی جہنم کے لفظ کی جگہ پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۃ ۸۷: ۱۲، ۱۰۱: ۱۱، ۱۱۱: ۳، ۴: ۱۴۵۔

بعض مفسرین نے بعض روایتوں کی بنا پر بیان کیا ہے کہ جہنم سات طبقوں یا درجوں میں تقسیم ہے۔

۱۔ جہنم۔ جو اس امت مرحومہ کے عذاب وعتاب کا مکان ہے۔

۲۔ سعیر۔ جو نصاریٰ کا مقام ہے۔

۳۔ حطمہ۔ جو یہودیوں کا مقام ہے۔

۴ - لظیٰ - جس میں دیوؤں اور ابلیس کا ٹھکانا ہے ۔
۵ - سقر - جو جباروں اور متکبروں کی سزا کی جگہ ہے ۔
۶ - جحیم - جو مشرکوں اور بت پرستوں کی جگہ ہے ۔
۷ - ھاویہ - جو سب سے نیچے ہے - اور یہ فرعونوں اور منافقوں کا ٹھکانا ہے

قرآن مجید میں جہنم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے ۔

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے - سرکشوں کا ٹھکانا - جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے - اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ چکھیں گے کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون - ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ (۷۸: ۲۱تا۲۶)

قرآن مجید میں جہنم کے ایک درخت کا ذکر بھی آیا ہے - جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

"بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لئے فتنہ بنا دیا ہے وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے - اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر - جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے - اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لئے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا - اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہو گی -" (۳۷: ۶۲ تا ۶۸)

جہنم کا کئی ایک احادیث میں بھی ذکر آیا ہے ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ دوزخ میں ہزار برس تک آگ پھونکی گئی - یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گیا پھر ہزار برس زیادہ تیزی کی گئی یہاں تک کہ وہ سفید ہو گیا - پھر ہزار برس زیادہ تیزی کی گئی حتیٰ کہ سیاہ ہو گیا - سو دوزخ کی آگ سیاہ تاریک ہے اس میں روشنی ہرگز نہیں ہے - (مشکوٰۃ)

جہنم کی گہرائی کے بارے میں ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اگر اس میں کنکر پھینکا جائے تو ستر برس میں بھی اس کی تھاہ کو نہیں پہنچے گا - (مسلم)

معتزلہ کے نزدیک جہنم میں داخل ہونے والے پھر باہر نہیں نکلیں گے - مگر ان کے علاوہ اشاعرہ اور دیگر فرقوں اور مذاہب (مسلکوں) اور اکابرین سلف کے نزدیک صاحب ایمان لوگ جہنم میں تا ابد ہرگز نہیں رہیں گے بلکہ یہ بھی کہ جنہیں اللہ چاہے وہ وہاں رہے بغیر ہی نجات پا جائیں گے

جہنم کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ وہ قید خانہ نہیں بلکہ شفا خانہ ہے اور بقول سید سلیمان ندوی اس کا منشا یہ ہے کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کو نتائج بد کو دور کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہو گی - اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہو گی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہو گی ۔

اس خیال کی تصدیق بخاری شریف کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہاں تک کہ جب دوزخیوں کو گناہوں سے خالص کر لیا جائے گا - اور وہ پاک و صاف ہو جائیں گے تب انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی ۔"

نیز عبداللہؓ بن عمرو اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہو گا اور اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے - (مسلم و مسند احمد)

جمہوریہ جب ہسپانیہ میں سقوط خلافت بنو امیہ پر جو ہولناک تصادم رونما ہوا - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل قرطبہ نے باسوخ اور معزز وزیر ابوحزم ابن جہور [illegible] بن جہور کے مشورے سے اول تو شاہی خاندان کے جملہ افراد کو نالائق قرار دیا اور پھر انہیں شہر بدر کر دیا - اور ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں ایک جمہوریہ کا اعلان کر کے اس کی صدارت وزیر ابوحزم کے سپرد کر دی - ابوحزم اس سے پہلے بھی ہشام ثانی کے دور میں اپنی عظیم سیاسی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کر چکا تھا - اس نے صدر منتخب ہونے کے بعد تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے ایک جمہوری طرز کی حکومت قائم کر دی - اور معاملات کے انتظام و انصرام کے لیے ایک مجلس قائم کی - وہ مجلس جو فیصلے کرتی تھی ابوحزم ان کی طرف سے ان فیصلوں کو نافذ کر دیتا تھا ۔

اس طرح قرطبہ میں پھر امن و امان بحال ہو گیا - تجارت میں بھی از سر نو زندگی کی لہر دوڑ گئی ابوحزم کی یہ حکومت ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تک تقریباً بارہ سال تک قائم رہی ۔

ابوحزم کے بعد اس کا بیٹا ابوالولید محمد اس کا جانشین ہوا اور الرشید کا لقب اختیار کیا - اس نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر حکومت کا انتظام چلانا چاہا - لیکن اس میں ابوحزم جیسی قوت نہ تھی کہ حکومت کر سکتا - لہٰذا اس نے اپنی چھوٹی سی ریاست کا انتظام اپنے وزیر ابن السقا کے حوالے کر دیا - چنانچہ قرطبہ پر اصل حکومت ابن السقا کی تھی - اور الرشید برائے نام تھا - ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں اس کے بیٹے عبدالملک نے المعتضد کے کہنے میں آکر ابن السقا کو دھوکے سے قتل کر دیا تو الرشید نے اپنا ولی عہد بنا دیا اور اجازت دے دی کہ [illegible] سیاست امور سلطنت انجام دے - لیکن قرطبہ کے باشندے اس کی خلاف قانون کارروائیوں کے باعث بہت جلد اس سے نفرت کرنے لگے - ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں جب المعتضد حاکم اشبیلیہ [illegible] ابن الافطس نے قرطبہ پر قبضہ کرنے کی ٹھانی - عبدالملک نے المعتمد [illegible] اس نے تیرہ سو سواروں کا ایک دستہ اس کی مدد کے لئے بھیجا - [illegible] الافطس کو محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا - المعتمد کے قائدین عسکر نے [illegible] باپ الرشید کو جو گذشتہ پچیس سال سے حکمران تھے گرفتار کر لیا تو اہل قرطبہ نے [illegible] کی - چنانچہ ان دونوں کو جزیرہ سالتیز میں جلا وطن کر دیا گیا ۔

جہیر بنو • ایک خاندان جس نے سلاجقہ اور ترک کے دور [illegible] مکمل اجارہ داری سنبھال رکھی تھی ۔

اس خاندان کو جو سیاسی اقتدار حاصل تھا [illegible] فخر الدولہ [illegible] تھا جو ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء میں موصل میں دولت مند تاجروں کے ایک خاندان [illegible] اس نے اس شہر کے عقیلی فرمانرواؤں کی ملازمت اختیار کر لی - [illegible] ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء میں فخر الدولہ حلب چلا گیا جہاں پر اس نے خاندان مرداسیہ [illegible] عز الدولہ ثمال کا وزیر مقرر ہو گیا - ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں اس نے [illegible] نصر الدولہ کے ہاں سکونت اختیار کر لی اور جلد ہی اس کا وزیر بن گیا تھا - جب نصر الدولہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹوں میں جھگڑے [illegible] نے خلیفہ القائم کی ان دشواریوں سے فائدہ اٹھایا جو اسے ایک [illegible] سلسلے میں پیش آ رہی تھیں جو ایک طرف تو طغرل کا تقرب ہوا [illegible] حقوق کا تحفظ بھی کر سکے - چنانچہ ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء میں فخر الدولہ کو [illegible] کی گئی - بنو عباس کی وزارت پر یہ خاندان تقریباً نصف صدی تک فائز رہا [illegible] ۴۶۰ھ/۱۰۶۸ء سے صرف چار ماہ کی مدت کے سوا ۴۷۱ھ/۱۰۷۸ء تک وزیر رہا جب [illegible] پر عتاب نازل ہوا تو اس کے چند ماہ بعد ہی اس کے بیٹے عمید الدولہ نے [illegible] ۴۶۰ھ/۱۰۶۸ء [illegible] ۱۰۶۹ء میں نظام الملک کی ایک بیٹی کے ساتھ عمید الدولہ کی شادی کے واقعے کے بعد نظام الملک اور ابن جہیر کے درمیان [illegible]

مضبوط ہو گئے۔ کیونکہ ابن جہیر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کی حیثیت اس صورت میں مستحکم رہ سکتی ہے کہ وہ ایک طرف تو حقوق خلافت کا دفاع کرے اور بہ ظاہر نہ ہونے دے کہ اسے خلیفہ کے احکام کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی خواہش ہے اور دوسری طرف سلطنت اور اس کے مختار اور مقتدر وزیر نظام الملک کے ساتھ گہرے ذاتی تعلقات قائم رکھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا قدم اس کی اسی سوچ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ جب نظام الملک کی بیٹی وفات پا گئی تو اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی ابن جہیر کی معزولی بھی عمل میں آئی۔ بعد میں عمید الدولہ کی شادی متوفیہ کی بھتیجی یا بھانجی سے ہو گئی۔

ملک شاہ کے دور حکومت (۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء تا ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کے نصف آخر میں بغداد پر ملاحدہ کی گرفت کے باوصف جو روز بروز کڑی ہوتی جا رہی تھی خلیفہ المقتدی نے ابن جہیر کی جگہ مسکویہ کے جانشین ابوشجاع روذراوری کو مقرر کر دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ابن جہیر نے ایک اور خطرناک مہم کا بیڑا اٹھایا۔ فخر الدولہ نے کچھ ایسے منصوبے بنائے [illegible] ملک شاہ جس نے اسے لشکر مہیا کیا تھا اسے اس ریاست کی فتح کا کام تفویض کر دے جہاں [illegible] نے [illegible] اپنے مفادات محفوظ اور روابط استوار کر رکھے تھے۔ لیکن اس نے [illegible] اپنے پیش روؤں کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا تھا۔ چنانچہ یہ جنگ ۴۷۸ھ/[illegible] کے [illegible] میں [illegible] ختم ہو گئی۔ فخر الدولہ نے آل مروان کا خزانہ ڈھونڈ نکالا اور بظاہر اسراف کی نذر کر دیا۔ اسی سال کے آخر میں اس کی [illegible] بدلعزیزی کے باعث ملک شاہ نے [illegible] صوبے کا حاکم اپنے کسی اور نمائندے کو مقرر کرنا چاہا لیکن عمید الدولہ نے اس صوبے کے محاصل کا اجارہ لے لیا اور تین سال میں ایک کروڑ دینار ادا کیے۔ دوسری طرف اس کے باپ فخر الدولہ کو موصل کی نظامت مل گئی۔ یہاں اس نے محاصل معاف کر کے ہر شخص [illegible] کر لیا تھا۔ فخر الدولہ کی وفات سے قبل جو موصل میں ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں واقع ہوئی [illegible] لکھوایا ہوا [illegible] بحال ہو گیا۔

اگلے سال نظام الملک نے خلیفہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ عمید الدولہ کو وزارت واپس دے۔ چنانچہ وہ ۴۹۲ھ/۱۱۰۰ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔

دیار بکر کی حکومت عمید الدولہ نے اپنے بھائی الکافی کو اپنا نمائندہ بنا کر سپرد کر دی تھی [illegible] وفات پر اس کا بیٹا جانشین ہوا۔

بنو جہیر پر ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں پہلے سے بھی زیادہ سخت وقت آیا۔ ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء میں ملک شاہ کے مرنے کے بعد دیار بکر پر اس کے بھائی تتش نے قبضہ کر لیا۔ غالباً ایک مختصر عرصے کے لیے الکافی کو وزارت کے منصب پر بدستور فائز رکھنے کے بعد واپس بلا لیا گیا۔

بغداد میں نئے سلطان برکیارق کے زمانے میں جب ان جنگوں کے دوران میں کئی مواقع پر اسے اپنے بھائیوں سے لڑنا پڑی تھیں۔ تو اس نے غالباً اس بنا پر کہ اسے اپنی حکومت کے ساتھ عمید الدولہ کی وفاداری پر شبہہ تھا اسے گرفتار کر لیا۔ اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے دیار بکر اور موصل سے ملنے والے خزائن کو غصب کیا ہے۔ چنانچہ عمید الدولہ پر اس الزام میں ایک کثیر رقم کا جرمانہ بھی کیا گیا۔ تھوڑے عرصے بعد عمید الدولہ قید خانے ہی میں انتقال کر گیا۔

عمید الدولہ کے بعد اس کا بھائی الکافی ۴۹۶ھ/۱۱۰۳ء سے ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء تک نئے خلیفہ المستظہر کا وزیر رہا اور پھر نئے سلطان محمد کی سفارش پر ۵۰۲ھ/۱۱۰۹ء سے ۵۰۷ھ/۱۱۱۴ء تک اسی عہدے پر فائز رہا۔

اس کے بعد بنو جہیر کے ایک اور فرد نظام الدین ابوالنصر المظفر بن محمد بن جہیر کا نام ملتا ہے جو استاد دار اور پھر ۵۳۵ھ/۱۱۴۱ء تا ۵۴۱ھ/۱۱۴۷ء تک خلیفہ کا وزیر رہا۔

جہیز

اسباب، سامان۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ سر و سامان ہے جو لڑکی کو نکاح میں اس کے ماں باپ کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ جہیز دینے کی رسم بہت قدیم ہے۔ ہر ملک اور علاقے میں اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام طور پر جہیز زیورات، کپڑوں، نقدی اور روزانہ استعمال کی اشیا پر مشتمل ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں جہیز کی رسم بہت عجیب و غریب صورت اختیار کر گئی ہے بہت سے غریب والدین کی بیٹیاں اس بنا پر رشتوں سے محروم رہ جاتی ہیں کہ ان کے والدین اپنی بیٹی کو جہیز میں بہت سا ساز و سامان نہیں دے سکتے۔

اسلام میں اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے

جے پور

بھارت کی ایک سابق ریاست جو ۲۵ درجے ۴۱ ثانیے اور ۲۸ درجے ۴ ثانیے عرض بلد شمالی اور ۷۴ درجے ۴۱ ثانیے طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ کل رقبہ ۱۵۵۷۹ مربع میل ہے۔

اس علاقے کا پہلا حکمران جسے اس وقت ڈھنڈھار کہتے تھے۔ گوالیار کے کچھواہہ رئیس کی اولاد میں سے ہے جسے ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء کے قریب دوسہ کا ضلع اپنے خسر سے تحفے میں ملا تھا۔ چنانچہ دوسہ اس علاقے کا پہلا دارالحکومت بن گیا۔

موجودہ شہر جے پور کی بنیاد جس کے نام پر تمام ریاست موسوم ہے راجہ جے سنگھ دوم نے ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء میں رکھی تھی۔ یہ راجہ جے سنگھ سوائی کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے امبر کو چھوڑ کر جو سابق دارالحکومت تھا نئے شہر کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ جے پور کو احمد آباد کے نقشے کے مطابق تیار کیا گیا جس میں سایہ دار چوڑی سڑکیں اور کشادہ بازار تھے۔ اس نے احمد آباد ہی سے مختلف پیشوں کے ماہر دستکاروں کو بھی بلوایا تھا۔

جے پور کو مولانا عبدالحی لکھنوی نے اپنی کتاب یاد ایام میں جین نگر لکھا ہے۔ اس راجہ کو مغل شہنشاہ نے جے سنگھ سوائی کا خطاب دیا تھا۔ یہ حکمران ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں امبر کی گدی پر بیٹھا اور ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں وفات پائی۔ اس نے جے پور، دہلی، بنارس، متھرا اور اجین میں رصدگاہیں بنوانے میں اپنے سائنسی علوم و ہنر سے خوب کام لیا وہ دھوپ گھڑی جو دہلی کی رصدگاہ کے مثلث برج کے اوپر نصب ہے آج تک درست وقت دیتی ہے۔

۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں جے سنگھ کے انتقال کے فوراً بعد ہی بھرت پور کے جاٹوں نے کئی شدید حملوں کے بعد جے پور ریاست کا ایک حصہ چھین لیا ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کے قریب ماچیری (الور) کے سردار کا ساتھ چھوڑ دینے سے ریاست کا رقبہ مزید کم ہو گیا۔ اس صدی کے اواخر میں جے پور کی ریاست انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور کئی ایک ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔

۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک معاہدہ ہوا۔ لیکن وہ دو سال بعد ہی ختم ہو گیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں ایک اور معاہدہ کیا گیا جس سے مرہٹوں کے حملوں کا سدباب ہو گیا۔

۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں جے سنگھ سوم کے بچپن ہی میں جب ایک شورش برپا ہوئی تو ریاست میں ایک انگریز عہدے دار کا تقرر کیا گیا۔

۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں ایک اور بغاوت ہوئی جس میں ایک گورنر جنرل کا ایجنٹ زخمی اور ایک برطانوی پولیٹیکل افسر مارا گیا۔

چنانچہ انگریزوں نے جبر و تشدد سے کام لیا اور ریاستی افواج میں بھی کمی کر دی گئی

اگست ١٩٤٧ء کی تقسیم کے بعد یہ ریاست حکومت متحدہ بھارت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

جیجل

الجزائر کا ایک ساحلی شہر جو بجایہ کے مغرب میں ستر کلومیٹر اور کولو (COLLO) کے مشرق میں پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جیجل کا قدیم شہر ایک بلند جگہ پر واقع تھا جہاں آج بھی اس کا قلعہ موجود ہے۔ یہ دو خلیجوں کے درمیان واقع ہے۔ موجودہ شہر ١٨٥٦ء میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے ترکوں کے قدیم شہر کے تباہ و برباد ہو جانے کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ یہ شہر سمندر کے کنارے بڑی مشرقی خلیج کے نزدیک واقع ہے۔

جیجل ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ فینقیوں نے اپنے عہد میں یہاں ادگل نامی ایک تجارتی منڈی بھی قائم کی تھی۔ فینقیوں کے بعد یہ اہل قرطاجنہ کے ہاتھوں میں آیا رومیوں کے زمانے میں ادگل گلی کی نوآبادی MAURETANIA CAESARIENSIS ۔ میں شامل تھی۔ یہاں ایک اسقف رہتا تھا۔ بعد میں یہ نوآبادی ونڈلوں کے قبضے میں آگئی اور پھر ونڈلوں کے بزنطیوں کا اس پر قبضہ ہو گیا۔

جب المغرب پر عربوں نے قبضہ کیا تو جیجل آزاد رہا۔ اور بقول ابن خلدون ابتدائی ہجری صدیوں میں اس شہر پر بربری قبیلہ کتامہ کا قبضہ تھا۔ جو قریبی پہاڑیوں میں آباد تھے۔ اس کے بعد یہ شہر تاراج کیا گیا اور ویران ہو گیا۔ بعد میں البکری کے دور میں یہ شہر پھر آباد ہو گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ یہاں اس وقت پرانی عمارتوں کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔

بعد میں اس شہر کو بنو حماد نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور انہوں نے یہاں پر ایک قلعہ کی بھی تعمیر کی۔

چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں عیسائیوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور عیسائی اس وقت تک اس شہر پر قابض رہے جب تک عبدالمومن نے بنو حماد کا خاتمہ کر کے ان کا علاقہ اپنی حکومت میں شامل نہ کر لیا۔ چنانچہ عبدالمومن نے عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس شہر کو خالی کر دیں۔

الموحدون کے اقتدار کے خاتمے پر اس شہر پر بنو حفص نے غلبہ پالیا۔ یہ شہر کئی ایک مواقع پر بجایہ اور تونس کے حکمرانوں کے درمیان باعث نزاع بنا۔ ان دونوں حکومتوں کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے باشندے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں جیجل کی تجارتی اہمیت کم ہو گئی جس کا سبب بحری ڈاکہ زنی میں اضافے کا ہو جانا تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں اس شہر پر اہل جنوا کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن اس قبضے کے ایک سال بعد ہی اہل جیجل نے عروج کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ جس نے احمد بن القاضی کی مدد سے جو ایک قبائل سردار تھا اہل جنوا کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ٩١٨ھ/١٥١٢ء میں اس نے بجایہ کا محاصرہ کیا۔ ٩٢٢ھ/١٥١٦ء میں عروج نے الجزائر کو فتح کیا۔

خیرالدین باربروسہ نے قبائلیوں سے شکست کھا کر اس شہر میں پناہ لی۔ اور ٩٢٦ھ/١٥٢٠ء سے ٩٣٤ھ/١٥٢٧ء تک اس شہر میں سکونت پذیر رہا۔ خیرالدین نے جیجل کو اپنے بیڑے کا مرکز بنایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس شہر کو اپنا صدر مقام بنائے لیکن بعد میں اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے اس شہر کے لوگوں کو وفاداری کے صلے میں ان کو اور ان کے بعد آنے والوں کو ہمیشہ کے لیے تمام لگانوں سے مستثنیٰ کر دیا۔ ١٠٢٠ھ/١٦١١ء میں عیسائی طاقتوں نے مشتعل ہو کر (SANTA CRUZ) کے مارکوئیس کی سالاری میں ہسپانوی بیڑے نے اس شہر کو نذر آتش کر دیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ پوری سولہویں صدی اور سترہویں صدی کے نصف اول تک جیجل کے جہاز ران بحری یلغاریں کرتے رہے تھے۔

١٠٧٤ھ/١٦٦٣ء میں حکومت فرانس نے جیجل میں اس فوجی بیڑے کے لیے جو بربری حملہ آوروں کا سدباب کرنے میں مشغول تھا۔ ایک مستقل بندرگاہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اگلے سال تقریباً آٹھ ہزار حملہ آور فوج جیجل میں اتار دی گئی اور ٢٣ جولائی ١٦٦٤ء میں فرانسیسیوں کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ دوسری طرف الجزائری اپنی فوج لے آئے انہوں نے زبردست توپیں نصب کر لیں۔ چنانچہ الجزائری توپوں سے مار کھا کر فرانسیسی ٣١ اکتوبر ١٦٦٤ء کو اپنے دو ہزار آدمیوں کا نقصان اٹھا کر یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔

آئندہ کے حملوں کا سدباب کرنے کے لیے ترکوں نے اس شہر میں مستقل قلعہ نشین فوج مقرر کر دی۔ لیکن یہ فوج تعداد میں کم تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ قلعے میں بند اور مسلسل محاصرے کی حالت میں رہتی تھی۔

١١٦٨ھ/١٧٥٥ء میں جیجل کی تجارت کو پھر فروغ حاصل ہوا اور خوشحالی کی کیفیت ١٨٠٣ء تک قائم رہی یہاں تک کہ قبائلی بغاوت نے اسے خطرے میں ڈال دیا۔ الحاج محمد بن الحرش نے شہر پر حملہ کیا۔ اور ترکی محافظ فوج فرار ہو گئی۔ الحاج محمد نے اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا۔ جیجل کی حکومت آغا کا خطاب دے کر حامی کے سپرد کر دی ١٨٠٥ء میں رئیس حمیدو کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے جہازوں کے ایک دستے کے ساتھ بھیجا گیا۔ اس نے شہر پر گولہ باری کی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد قبائلیوں کی بدسلوکی سے تنگ آ کر جیجل کے باشندوں نے والی کی اطاعت قبول کر لی اور اس نے شہر ... محافظ فوج ... ١٨٣٠ء میں ترکی حکومت کے خاتمے پر اس شہر کے باشندے آزاد ہو گئے۔ ان کی یہ آزادی و خودمختاری ١٨٣٩ء تک قائم رہی۔ ١٣ مئی ١٨٣٩ء کو الجزائر کے گورنر جنرل نے اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ١٨٥١ء میں جنرل سینٹ ارنو کی سرکردگی میں ایک مہم نے قبائلیہ صغیر کے قبائل کو اپنا مطیع فرمان کر لیا اور اس طرح اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس بندرگاہ کو کارک کی برآمد کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو زیادہ تر ... کے جنگلات میں پیدا ہوتا ہے۔

جیحان

ایک قدیم ندی۔ ان دو ندیوں میں سے ایک ہے جو سلیشیا میں سے گزر کر ... ہے اور بحیرہ روم جا پڑتی ہے۔ دوسری جو زیادہ مغرب میں ہے ... جیحان سے مراد قدیم ندی پیرمیس لیتے ہیں۔ مندرجہ بالا دونوں ندیوں کو عربوں نے جیحون اور سیحون کے ناموں پر جیحان اور سیحان کے نام دیئے ہیں یہ دونوں ندیاں عربوں اور بزنطینیوں کے علاقوں میں حد فاصل تھیں۔

یہ دریا البستان کے ذرا شمال مشرق میں ان پہاڑوں سے نکلتا ہے جو ... کی وادی سے جدا کرتے ہیں۔ اور زمزمہ دریائے فرات کا ایک معاون ہے۔ البستان کے نزدیک چھوٹی چھوٹی بہت سی ندیوں کے ملنے سے جیحان کے پانی میں اضافہ ہو جاتا ہے زمان صوبو ان تمام ندیوں میں ممتاز ہے۔ جو جیحان میں آ کر ملتی ہیں ... کے نیچے ... جائی اس میں آ ملتی ہے تو یہ جنوب کی سمت ... کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس شہر کے مضافات میں آق صو جو ... کی نہر جو ریش کے نام سے ... ہے۔ آ ملتا ہے جو شمال مشرق سے آتا ہے۔

جیحان یہاں سے جبل لبنان کے مغرب لوہاتے ہوئے جنوب مغرب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اور سیس کے خطے سے گزرتا ہے۔ جہاں سے یہ اپنے معاونوں کو ساتھ لیتا ہوا کلیکیا کے میدان کے کنارے پہنچتا ہے۔ یہ اپنا راستہ ... کی جانب

بنالیتا ہے اور یہاں آطنہ کی شاہراہ اسے ایک قدیم پتھر کے پل کے ذریعے سے عبور کرتی ہے۔

دریائے جیحان کا دہانہ بحرہ روم میں ہے اور سیلابی مٹی سے بنے ہوئے ڈیلٹا کے باعث چند بار سرکتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ مشرق کی سمت مڑکر فوراً سمندر کی ایک خلیج میں جاگرتا ہے۔ جو قدیم آیاس کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا زیریں اور وسطی حصہ علاقہ ثغور (سرحدی اضلاع) میں تھا۔ اس دریا کا ذکر حمدانی عہد کے شاعروں کے ہاں ایک سے زائد بار آیا ہے۔

مملوکوں کے عہد میں ملک ناصر محمد نے اس علاقے کو فتح کیا۔ اور وہ جیحان کی بگڑی ہوئی شکل جہان کی مطابقت سے "الفتوحات الجہانیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

جیحان کا لفظ کبھی کبھی دریا کے علاوہ اس خطے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یحییٰ بن سعید الانطاکی نے یہ لفظ انھی معنی میں استعمال کیا ہے۔

جیرفت کرمان کا ایک زرخیز ضلع اور ایک شہر۔ یہ شہر بام کے جنوب مغرب میں واقع ہے جسے بارجان کے پہاڑ بام سے جدا کرتے ہیں۔

اس شہر کا ذکر سب سے پہلے اس وقت آتا ہے۔ جب ۳۵ھ/۶۵۵ء میں مجاشع بن مسعود نے اسے فتح کیا۔ اس کے بارے میں اس سے پہلے کے حالات معلوم نہیں ۳۵ھ/۶۵۵ء کے بعد سے اس کا نام عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں کثرت سے ملتا ہے اس شہر میں خوارج بھی سرگرم عمل رہے۔ المقدسی مشہور جغرافیہ نویس نے اس شہر کی وسعت، زرخیزی اور اس کی خوب صورتی کے بیان میں اس کی بہت تعریف کی ہے یعقوب صفاری اور اس کے بھائی عمرو نے اس شہر کو عمارتوں سے مزین کیا لیکن اسے منگول اور ایلخانی دور کے بعد کی طوائف الملوکی سے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔

جیرفت کا ذکر تیموری عہد تک بدستور ملنے میں آتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس شہر کا ذکر ماخذوں میں نہیں ملتا۔

اگرچہ ضلع کا نام موجودہ دور میں بھی یہی ہے پرانے شہر کی جائے وقوع اگرچہ معلوم نہیں لیکن اس کے بارے میں قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور سبزاداراں کے موجودہ قصبے کے قریب ہوگی۔ کیونکہ وہاں پر بعض پرانے کھنڈرات بھی ملتے ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ضرور اس قدیم شہر کے ہوں گے۔

جیزان بحیرہ قلزم کے ساحل پر جنوب مغربی سعودی عرب میں ایک وادی، ایک بندرگاہ اور ضلع یا صوبہ اس نام سے موسوم ہیں۔ اس کا قدیم نام جازان اب بھی اس صوبے کے رہنے والے اپنی نگارشات میں استعمال کرتے ہیں۔

ابتدا میں یہ ایک ندی کا نام تھا جو جبل رازح اور یمن کے علاقہ خولان سے نکلتی ہے۔ جبل العر کے جنوب میں بہتی اور پھر جنوب مغرب کی طرف مڑکر جدید بندرگاہ کے قریب بحیرۂ قلزم میں جاگرتی ہے۔ اس کے باعث ندی کے سب سے نشیبی علاقے عرب کے زرخیز ترین زراعتی قطعے بن گئے ہیں۔ یہاں کی خاص فصلوں میں جوار، باجرا اور تل ہیں۔ بعض دوسرے اناج، کپاس اور نیل بھی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں کی زمین بہت زیادہ زرخیز ہے۔

سعودی عرب کی حکومت نے اس ندی پر ایک بہت بڑا بند باندھا ہے۔

دو نہریں جن میں ایک PEARLY GATES کے نام سے مشہور ہے۔ کھلے سمندر سے نکل کر فرسان کے ساحل سے گذرتی ہوئی بندرگاہ جیزان تک جاتی ہے، بندرگاہ کے قریب سمندر زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس وجہ سے جہاز اس سے تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ چھوٹی کشتیوں کے لیے پتھریلے ساحلی پہاڑوں کے درمیان ایک بندرگاہ بنادی گئی ہے۔ شہر پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں کی سب سے اونچی پہاڑی ساٹھ میٹر بلند ہے۔ بستی کا خشکی کی طرف کا رخ ایک شور میدان سے گھرا ہوا ہے۔ آج کل یہاں پر نئی طرز کے پختہ مکان، ہسپتال، ایک ہوٹل اور سکول بھی موجود ہے۔ قصبے کے باہر ایک نمک کی کان ہے جس سے تجارتی پیمانے پر نمک نکالا جاتا ہے۔ جیزان کے لوگوں کا خاص پیشہ ایک زمانے میں موتی نکالنا تھا۔

جیزان کا صوبہ جو تہامہ عسیر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ نشیبی علاقوں کے علاوہ ان پہاڑیوں پر بھی مشتمل ہے جو براعظم کی حد فاصل کے مغرب میں واقع ہیں اور ان کی چوٹی پر ابہا واقع ہے۔ یہ پہاڑ جو جیزان کی اندرونی حدود میں واقع ہیں۔ القہر، حروب الریث، بنو مالک اور فیفا شامل ہیں۔ جو ساحل سمندر سے کم و بیش پچاس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہیں۔

القحمہ کی بندرگاہ کو لاوے کا ایک میدان باقی صوبے سے جدا کرتا ہے۔ سارے صوبے میں الشقیق اور جزائر فراسان صرف ایسے مقام ہیں جہاں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔ مواشی کی کثرت ہے۔

ابتدائے عہد اسلامی میں اس علاقے کا سب سے اہم قبیلہ حکم بن سعد العشیرہ تھا جو جنوبی عرب کے قبیلے کہلان کی ایک شاخ تھی۔ اس قبیلے کا صدر مقام شہر الخصوف تھا اور بندرگاہ الشرجہ تھی۔ نشیبی علاقے میں کئی ایک اور قبائل سکونت پذیر تھے عقیلی کے بقول بارہ قبائل وادی کے نشیبی حصوں میں آباد ہیں۔ جن کا صدر مقام جیزان کی بندرگاہ ہے اور سترہ قبائل بالائی حصوں میں آباد ہیں۔ جن کا مرکز ابو عریش ہے۔

جیزان کا لفظ ایک حدیث میں بھی آیا ہے جہاں اسے ضمد کے ساتھ ملا کر لایا گیا ہے جو شمال کی ایک متصلہ وادی کا نام ہے۔ قدیم جغرافیہ نویسوں کے ہاں جیزان سے مراد یہی وادی ہوتی ہے۔

۳۷۳ھ/۹۸۳ء تا ۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء تک یہاں پر عثر کا رئیس سلیمان بن طرف یہاں پر حکمرانی کرتا تھا۔ یہ خیال عقیلی کے مطابق ہے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ حسین بن سلامہ (م ۴۰۲ھ/۱۰۱۲ء) نے جو خانوادہ زیادیہ کا وزیر تھا۔ سلیمان کے اقتدار کا خاتمہ کیا ہو اور مخلاف السلیمانی کا علاقہ واپس زیادی حکومت کے ماتحت دے دیا ہو۔

سلیمانی شریفوں کے مخلاف میں متمکن ہونے کا زمانہ متعین نہیں ہو سکا۔ ایک روایت کے مطابق داؤد بن سلیمان جو اس خاندان کا پہلا شخص تھا حجاز سے ہجرت کرکے مخلاف میں وارد ہوا۔ اور یہ واقعہ ۲۹۸ھ/۹۱۰ء کا ہے۔ تاہم سلیمانیوں کی قوت کا مرکز تخمیناً ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء تک مخلاف میں منتقل نہیں ہوا تھا۔

۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء تا ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں مخلاف کو سرور نے جو وزیر کی حیثیت سے نجاحدہ کے اقتدار کا اصلی مالک تھا، اپنے لیے بطور جاگیر حاصل کر لیا تھا۔ زیدی امام بھی جو جیزان کے قریب قریب ٹھیک مشرق میں صعدہ کے پہاڑی اقطاع میں اکثر حکمران رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً مخلاف کے معاملات میں دخل اندازی کرتے رہے ہیں۔

مخلاف کے حکام کو ایوبیوں کے عہد میں شطوط کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا۔ قاسم بن غانم کے دو بیٹوں نے یکے بعد دیگرے ایوبیوں کے خلاف بغاوتیں بھی کیں، جو ناکام رہیں الملک الاشرف عمر بن یوسف کے بقول ہاشم بن وہاس کو جو غانم بن یحییٰ کا پرپوتا تھا اس کے زمانے میں جیزان کا حاکم تھا۔ غانمی خاندان کے دوسرے افراد بیش اور باغتہ میں حکمران تھے۔ اور اس قبیلے کی دوسری شاخوں کے افراد ضمد، صبیا اور لؤلؤ میں حکمران تھے

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں غوانم کی ایک اور شاخ قطبی نے درب النجا کو اپنا صدر مقام مقرر کیا۔ اس شہر کے کھنڈر آج بھی ابو عریش کے نزدیک

پائے جاتے ہیں۔

۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء یا ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء/۱۵۰۹ء میں شریف مکہ محمد بن برکات اول نے مخلاف پر حملہ کیا اور بہت سا مال غنیمت جس میں قیمتی کتابیں بھی تھیں لوٹ کر لے گیا۔

جب ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء میں ورتھیما نے جیزان کی سیاحت کی تو اس نے بندرگاہ پر مختلف ملکوں کے ۴۵ جہاز کھڑے دیکھے تھے۔ اس نے مخلاف اور الشرجہ کی بندرگاہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

قیس بن محمد الجرامی نے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جیزان پر نیز مختلف مواقع پر حملہ کیا۔ ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء میں ایک ترکی امیر مخلاف کا حاکم بناکر بھیجا گیا اور اس کا صدر مقام ابوعریش بنایا۔ انھی دنوں میں ایک قلیل عرصے کے لیے شریف محمد البونمی نے اس ضلع پر قبضہ کر لیا۔

۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء میں صنعاء کے زیدی امام نے احمد بن غالب کو مخلاف کا حاکم مقرر کیا۔ زیدیوں ہی کی طرف سے مخلاف کے خیراتیہ خاندان کے پہلے حاکم احمد بن محمد نے بھی ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء میں یہاں پر اپنی حکومت کا آغاز ایک زیدی حاکم کی حیثیت سے کیا۔ احمد کا دادا خیرات جب مکے سے ابوعریش میں آیا تو اس کے لیے بندرگاہ جیزان کی آمدنی سے زیدی امام المتوکل اسماعیل بن القاسم نے وظیفہ مقرر کیا۔

بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں نجران کے جنگجو قبیلہ یام نے اپنے نئے سرداروں کے ماتحت مخلاف پر پیشقدمی کی۔

۱۱۶۹ھ/۱۷۶۳ء میں خیراتیہ خاندان کا دوسرا حاکم محمد ابن احمد ابوعریش کے وسیع ضلع پر جس میں جیزان کی بندرگاہ بھی شامل تھی خودمختار حاکم تھا۔

۱۸۰۹ء میں وہابیوں کے جہاز جیزان کی بندرگاہ میں داخل ہوئے اور قہوہ کی دوسری اشیاء پر قبضہ کر لیا۔

۱۸۳۵ء میں جیزان کی بندرگاہ کی تجارت محمد علی پاشا کی اجارہ داری کے طول کے باعث بہت مدھم پڑ چکی تھی۔

خیراتیہ رئیسوں میں سب سے زبردست حکمران الحسین بن علی جس نے ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۹ء تک حکومت کی تہامہ پر جنوب میں مخفہ تک اور کچھ عرصے کے لیے تعز اور الیمن الاسفل کے دوسرے پہاڑی مقامات پر بھی قابض ہو گیا تھا۔ زیدی المتوکل محمد بن یحیی سے شکست کھانے کے بعد حکومت سے دستبردار ہو گیا۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں اس کے دو بیٹے ابوعریش میں قائم مقام رہے۔

۱۹۰۹ء میں مخلاف میں ترکوں کی جگہ لینے کے بعد علی الادریسی نے دو سال بعد جیزان کی بندرگاہ کے قریب الحفائر کے مقام پر شکست دی۔

آج کل سعودی عرب کی حکومت نے بندرگاہ جیزان کو اس ضلع کا صدر مقام قرار دیا ہے۔ نیز اس کی خوشحالی کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں۔

جیزی، ابومحمد (... ۲۵۶ھ/۸۷۰ء یا ۲۵۰ھ/۸۶۴ء) الربیع بن سلیمان بن داؤد الازدی الاعرج، ایک عالم دین۔ جیزی امام شافعی کے پیرو تھے۔ اور غالباً ان کے بلاواسطہ شاگرد تھے۔ وہ بہت سے قدیم شوافع کی طرح مالکی اور عبداللہ بن عبدالحکم کے شاگرد تھے۔ شافعی مسلک اختیار کرنے کے بعد جیزی "کتاب الام" کو کامل صحت سے جمع و تالیف کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جو شافعی مسلک کا ایک شاہکار ہے۔ نیز شافعی مسلک کی یہ کتاب جو جیزی کی تالیف ہے۔ اور البویطی کا تالیف شدہ نسخہ بہت معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔

جیزی کا تالیف شدہ نسخہ شافعی فقہ کے اس دوسرے دور کا ترجمان خیال کرنا چاہیے جسے مصری دور کہتے ہیں۔

جیزی نے مصر میں وفات پائی۔ اس کے شاگردوں میں ابوداؤد اور النسائی ہیں۔

بقول ابن خلکان جیزی نہایت صالح اور منکسرالمزاج شخصیت کے مالک تھے

جیسور بنگلہ دیش کا ایک بڑا شہر۔ اس کے نام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ سنسکرت کے لفظ "یاشوہرہ" سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی معتوب کے ہیں۔ اس کا تعلق راجا پرتاب آدتیہ کی کہانی سے ہے جو ایک زمیندار تھا اور مغل بادشاہ جہانگیر نے اس کے باغیانہ رویے کی بنا پر اس کی سرکوبی کی تھی۔

یہ علاقہ مسلمانوں کی حکومت میں خلیفہ آباد کی سرکار کا ایک حصہ تھا۔ آج کل خلیفہ آباد کی جگہ کھلنا کے ضلع کا باگرہاٹ ہے۔

جہاں خان جہان (م ۸۶۳ھ/۱۴۵۹ء) مدفون ہے جس نے اس علاقے کو سلطان ناصر الدین محمود ثانی کے عہد حکومت میں فتح کیا تھا۔ اس زمانے کی بہت سی عمارت آج بھی باگرہاٹ یا اس کے قرب وجوار میں موجود ہیں۔

ان عمارات میں زیادہ اہم خان جہان کا مقبرہ، سات گنبد مسجد، [illegible] مسجد، قصبہ اور مسجد سیل گیا ہیں۔ یہ مساجد مسلمانوں کے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں اور بنگال کے مسلمانوں کے فن تعمیر کا ایک نیا اسلوب پیش کرتی ہیں۔

خان جہان نے جسے عوام خانجا علی کہتے ہیں۔ محمد [illegible] مل کر اس علاقے میں اشاعت اسلام کا کام سرانجام دیا۔ آج کل یہاں کے [illegible] خان جہان کو ایک بہت بڑا ولی اللہ مانتے ہیں۔

جیش فوج کے لیے ایک عربی اصطلاح۔ جند، لشکر۔ زمانہ جاہلیت [illegible] اگرچہ عربوں میں باہمی جنگیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ ان [illegible] لڑائیوں تمام صحت مند اور توانا افراد کو حصہ لینا پڑتا تھا لیکن [illegible] عسکری تنظیم نہ تھی۔ ان لڑائیوں کا فیصلہ افراد کی قوت [illegible]

فوج کا تخیل اسلام کے ظہور کے ساتھ [illegible] قیادت آنحضورؐ نے فرمائی تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں [illegible] تمام مسلمان افراد کو جہاد کے لیے بلایا جا سکتا تھا۔ لیکن عملاً قبائل [illegible] سے ایک مقررہ حساب سے آدمی جہاد کے لیے دیا کرتے تھے۔ [illegible] رضاکاروں سے پوری کی جاتی تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں متعین ہو جانے [illegible] وہ لوگ اپنے اہل وعیال سے منقطع نہیں ہوتے تھے وہ صحیح معنوں میں فوجی [illegible] مرتب نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑائیوں کے درمیانی وقفوں میں [illegible] تو دیگر مشاغل بھی اختیار کر سکتے تھے۔ دوسرے بجز چند مستثنیات کے [illegible] الگ چھاؤنیوں میں رہنے کے پابند نہیں تھے۔ لیکن وہ قوم کا ایک [illegible] جو مستقل طور پر جہاد کے حکم پر لبیک کہنے پر تیار اور مجبور رہتے تھے۔ ان فوجی [illegible] تعداد کا صحیح اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ غالباً حضرت عمرؓ کے ماتحت ان کی تعداد [illegible] پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اور بنوامیہ کی انتہائی وسیع و عریض مملکت کے وقت یہ تعداد اس سے دوگنا ہو گئی تھی۔

شام کے سوا دیگر ولایات میں عرب افواج کو ملکی باشندوں کی بستیوں کی بجائے چھاؤنیوں میں رکھا جاتا تھا جو بعد میں نئے شہر بن گئے۔ تمام فوج مختلف قبائل سے

افراد سے مرکب ہوتی تھی۔ لیکن فوج کے زیریں درجوں میں ایک ہی قبائلی اصل کے سپاہی ہوتے تھے۔ ان کی آمدنی غنیمت سے متعلق قوانین کے ذریعے معین کی جاتی تھی۔ جنگی فتوحات سے اموال غنیمت میں وسیع علاقوں کا اضافہ ہوگیا تو فوج کا ایک گروہ یہ بات منوانے میں کامیاب ہوگیا کہ مفتوحہ علاقے اجتماعی طور پر موجودہ اور آئندہ امت اسلامیہ کی مشترکہ ملکیت رہیں گے۔ اور پھر انہیں محاصل سے باقاعدہ فوج کے لیے روپیہ فراہم ہونے لگا۔ بعد ازاں شام میں اور پھر المغرب میں ایک مربوط عسکری تنظیم صوبوں کے حساب سے قائم کر دی گئی۔ جس کی نظیر اس سے پہلے ایران و عراق میں کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

یہ بات کہ پہلی ابتدائی نوعیت کی فوج کلیۃً مسلمان عربوں پر مشتمل تھی۔ تاریخ میں واضح ہے تاہم جلد ہی عرب سردار اپنے موالی اپنے ہمراہ لانے لگے تھے۔ اس کے برعکس بعض جنگجو سرحدی قوموں کو اسلام قبول کیے بغیر ہی مسلمانوں کی فوجی مہمات میں محصولات سے مستثنیٰ کر کے امدادی سپاہیوں کی حیثیت سے ملازمت میں لے لیا گیا تھا۔ ان میں وسطی ایشیا، شمالی ایران اور آرمینیا نیز شامی امالوس کے سپاہیوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد بربر جو ابھی سطحی طور پر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اس لشکر کا ایک بڑا جزو بن گئے۔ جو ہسپانیہ کی فتح کے لیے روانہ ہوا تھا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک فوجی دستہ تشکیل دیا گیا جس کا نام شرطہ تھا۔ یہ فوجی دستہ خلیفہ یا والی کے بہت ہی قریب ہوتا تھا۔ لیکن یہ بنیادی طور پر جنگ سے کم اور داخلی امن و امان کے قیام سے زیادہ متعلق تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے پولیس کی ایک جمعیت کی شکل اختیار کر لی۔

اموی دور کے بعد فوجی تنظیم کی صورتوں میں کافی تبدیلی ہوئی۔ ایک طرف تو بڑھتی ہوئی مزاحمت اور ذرائع رسل و رسائل کے طویل ہوتے چلے جانے کے وجہ سے فتوحات کی آمد کم ہوگئی تو تنخواہ ہی جو کہ بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی ان فوجی سپاہیوں کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ رہ گئی۔ اب ان کے مطالبات بڑھ گئے ہیں دوسری طرف بصرے اور کوفے جیسے شہروں میں متعین محفوظ افواج روز بروز شہری زندگی کے زیادہ رنگ، ڈھنگ اختیار کرتی چلی گئی۔ چنانچہ اس کے سرحدی جیش کے درمیان ایک نئی تفریق پیدا ہوگئی۔ کیونکہ سرحدوں کے یہ فوجی بدستور جنگی زندگی گذارتے تھے۔ وہ لوٹ کر وطن نہیں آتے تھے۔ اگرچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جنگی تدابیر میں اصلاح کا سہرا اموی خاندان کے آخری خلیفہ مروان ثانی کے سر ہے جو ایک تجربہ کار شخصیت ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اموی دور کے اختتام تک فوج میں کوئی نئی تنظیم قائم نہیں ہوئی۔

عباسیوں کے دور میں ایک نئی فوج جسے ابومسلم خراسانی نے مرتب کیا تھا جو خراسان کے لوگوں پر مشتمل تھی اور عباسی اپنی فتح کے لئے اسی نئی فوج کے مرہون منت تھے۔ تقریباً ایک سو سال تک اسی نئی حکومت کی پشت پناہی کرتی رہی۔ ابتداء میں یہی خراسانی لشکر خلیفہ قریب اور بڑے بڑے ملکی مرکزوں میں مقیم رہتے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصے تک دو فوجیں پہلو بہ پہلو رہیں۔ خراسانی فوج جو فوجی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھی اس فوج کو تیر اندازی میں، محاصرے کی لڑائی میں اور نفطہ (آتش یونانی) کے استعمال میں اتنی زیادہ مہارت حاصل تھی کہ اموی فوج اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس فوجی عنصر سے عباسیوں کو فنی مہارت کا ایک ایسا عنصر مل گیا تھا جس سے اموی فوج محروم تھی۔

اب عربوں کی دو جداگانہ حیثیتیں ہوگئیں ایک وہ عرب جو فوجی کارروائیوں کے منقطع سے بہت دور رہتے تھے۔ پھر دوسری قسم کے عرب وہ سرحدی لوگ تھے جنہیں اس طریقے سے غیر عسکری نہیں بنایا جا سکا۔ لیکن انہوں نے غازیوں اور مرالطون کی نئی خود مختارانہ طرز کے مطابق اپنے آپ کو منظم کر کے سرکاری فوج سے باقاعدہ طور پر اپنے آپ کو منقطع کر لیا۔

عباسیوں کے دور میں باقاعدہ سرکاری فوج کے سپاہی خواہ کوئی بھی ہوں دوسری جنگی جماعتوں سے جن کی تنظیم مقابلۃً محض ہنگامی ہوتی تھی۔ بہرحال امتیاز رکھتے تھے دوسرے رضاکاروں کے فوجی دستوں کو نہ صرف تنخواہ کم ملتی تھی بلکہ انہیں یہ تنخواہ دوران جنگ ملتی تھی۔ وہ پیشہ ور سپاہی شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں تک غازیوں کا تعلق ہے۔ توان کا گذارا لڑائیوں کے درمیانی وقفے میں اپنے غیر فوجی کاروبار کے منافع پر دوران جنگ میں مال غنیمت پر اور ان مذہبی اوقاف پر ہوتا تھا جو اندرون ملک کے مسلمان جہاد کے بدل کے طور پر اپنی طرف سے ایک کثیر تعداد میں قائم کر رہے تھے۔ ان غازیوں کے نام بھی جیش کے عام دفاتر میں درج نہیں ہوتے تھے۔

المعتصم نے جس نے کہ مصر میں عربوں کی باقاعدہ فوج کو مغلوب کیا تھا خراسانیوں کی جگہ ترکوں کو دینے میں پیش قدمی کی۔ چنانچہ شروع میں ترک سے مراد زیادہ تر وہ لوگ تھے جو اسلامی حدود میں مقیم تھے۔ خاص کر فرغانہ کے لوگ جن کے معاشرتی حالات خراسانیوں سے ملتے جلتے تھے لیکن اس کے کچھ عرصے بعد ہی وہ نوجوان جو مسلم سلطنت سے باہر پیدا ہوئے تھے اور جنہیں مجاہدین یا سوداگر وسطی ایشیا سے یا ان علاقوں سے جواب روسی نیم صحرائی علاقے میں لائے تھے۔ انہیں بھی ترکوں کے طور پر فوج میں بھرتی کیا جانے لگا۔ یہ ترک دیگر سپاہیانہ اوصاف کے علاوہ خصوصیت سے اعلیٰ درجے کے شہسوار ہوتے تھے۔ یہ اتنی چھوٹی عمر میں غلام بنائے جاتے تھے کہ اپنے آقا کی ذات سے وابستگی ان کی سرشت کا جزو بن جاتی تھی۔ مشرقی مسلم ریاستوں کے لیے ترکی فوج کے بغیر گذارہ کرنا گویا ناممکن ہوگیا تھا اور جس ملک کے بعد دیگرے ترکوں کی ایسی فوج رکھتے رہے۔ پھر بعد میں مشرق میں یہ بھی کیا گیا کہ ان ترکوں کے توڑ کے لیے ایسے لوگ بھی فوج میں بھرتی کیے گئے جو اکھڑ دیہاتی اور کوہستانی تھے اور پہاڑی پیادہ جنگ لڑنے میں ماہر تھے۔ مثال کے طور پر دیلمی، یا شہسوار جیسے کرد یا مقامی حبشی اور غزنویوں کی فوج میں ہندو وغیرہ۔

ولایت افریقیہ میں جہاں زنگیوں، سلاویوں اور رومیوں سے جیش کی تعداد بڑھائی گئی تھی ترکوں کو لاکر ان کا توازن درست کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں ترکوں کی جگہ ارمنوں کو لانے کی کوشش کی۔

بعد میں جب سلجوقیوں نے جو خود ترک تھے۔ سابق اسلامی ممالک پر قبضہ کیا تو اس وقت بھی فوج کی ساخت مستقل طور پر متاثر نہیں ہوئی۔ ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں نے اپنے طریقے پر اپنی فوج کے شعبوں میں بزنطی ارمنی اجیر سپاہیوں، فرنگیوں وغیرہ کا اضافہ کیا جب کہ مغل فاتحین اپنی فوج میں گرجستانیوں کو لے آئے۔ چنانچہ سابق رومی سلطنت کا اتباع کرتے ہوئے خصوصاً بزنطی سلطنت کے حدود میں اسلامی عہد میں بھی جنگیں لڑنے کا کام روز افزوں طور پر اجیر سپاہیوں کے حوالے ہوتا رہا۔ ان میں زیادہ تعداد ترکوں کی تھی اجیر سپاہیوں کے لیے اپنے آبائی وطن کو لوٹنا خلاف معمول بات تھی۔ کسی سلطان کی فوج کے مملوک بھی ذاتی یا خانگی غلاموں کی طرح نہ ہوتے تھے۔ بلکہ وہ دراصل شاہی اقتدار کے سرگرم کارکن ہوتے تھے۔ انہیں بھی تنخواہ دار سپاہیوں کی طرح تنخواہ ملتی تھی۔ انہیں اپنے فوجی فرائض کی ادائیگی کے بعد خاص آزادی حاصل ہوتی تھی۔

ان نوجوان سپاہیوں (غلاموں) کے بارے میں جو عباسی فوج میں ہوتے تھے کی تربیت کا کیسا انتظام تھا واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آتا۔ ان معاملات کے بارے میں صحیح معلومات ہمیں مملوکوں کے دور میں ملتی ہیں۔ ان کے قیام کا انتظام کبھی کبھی لوگوں کے گھروں

میں بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ سپاہی زیادہ تر بارکوں میں رہتے تھے۔ ایک گروہ "حجریہ" کہلاتا تھا جو حاکم وقت کے محل کے نزدیک رہتا تھا۔ ان کے اور آبادی کے درمیان بار بار لڑائی جھگڑے رہتے تھے۔ المعتصم کے دور میں سامرہ کو دارالخلافہ بنانے کا باعث بھی یہی ہوا تھا۔ لیکن سلجوقی فتح کے بدولت یک جہتی پیدا ہوگئی۔ اس دور میں فوج عسکری تربیت شہروں کے مضافات میں کھلی جگہوں میں حاصل کرتی تھی۔ بڑی ریاست کی فوج کئی جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس گروہ بندی میں عام طور پر نسل اور فنی ضروریات کا خیال رکھا جاتا تھا اس زمانے میں فوج کی کوئی خاص وردی نہ ہوتی تھی۔ لیکن ہر دستے کا اپنا باضابطہ لباس ضرور تھا۔ اس کے علاوہ مختلف لشکروں کے اپنے اپنے جھنڈے (رایتہ) اور سپہ سالار یا حکمران کا اپنا "لوار" ہوتا تھا۔ جو اس کے خیمے کے نزدیک ہوا میں لہراتا رہتا تھا جہاں سے لڑائی کی قیادت کرتا اور جو پوری فوج کے مرجع اور مقام اجتماع کا کام دیتا تھا

الجزائر اور مراکش میں جیش کے معنی ایک مسلح دستے فوج کے ہیں جو کسی کاروان یا فوجی جمعیت کے خلاف "غزو" کے لیے جائے اور جب جیش کئی سو آدمیوں پر مشتمل ہو تو "حرکہ" کہتے ہیں۔ یہ جیوش شمالی سوڈان یا وادی نائجر سے لے کر صحرا میں سے گذرتے ہوئے الجزائر اور مراکش کے جنوب تک ترکتاز کیا کرتے تھے۔ یہ جیوش کبھی کبھی قبیلہ طوارق کے افراد پر مشتمل ہوتے تھے لیکن اکثر اوقات بلند جبال اطلس کی جنوبی ڈھلانوں کے بربروں پر مشتمل ہوتے۔

مراکشی فوج میں جیش سے مراد ایک قسم کی جاگیرداری تنظیم مراد ہے۔ یہاں جیش کے وجود میں آنے کی تاریخ مراکش کے موجودہ حکمران خاندان کے آغاز سے وابستہ ہے یہاں کے سلاطین کو اس اندیشے سے کہ وہ بربروں کے دست نگر نہ بن جائیں اور جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، غیر ملکی اجیر سپاہیوں کو اپنے گرد رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ پہلے زمانے میں شمالی افریقہ کے بادشاہ عیسائیوں، کردوں، ایرانیوں اور حبشیوں کو فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ بنو وطاس کے دور میں کرد، عیسائی اور حبشی فوج رکاب کے سپاہیوں کو برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ عربوں کے محافظوں نے لے لی۔

بنو سعد تخت نشین ہوئے تو انہوں نے اپنے جیش کے عربوں کو اہل سوس کا نام دے کر ان کی محافظ فوج کے ساتھ متعین کیا۔ اس طرح بنو سعد کی فوج بھی جیش معرض وجود میں آئی۔ جیسا کہ بنو وطاس کے عہد میں ہوتا تھا کہ جیش "مخزن" کے ارکان کے لشکروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور ارکان مخزن عمر بھر اپنے سلطان کے بلادے کے منتظر رہتے تھے۔ ان کی گذر اوقات اراضی پر ہوتی تھی جو ایک قسم کی جاگیری شکل تھی نیز انھیں مال گذاری معاف ہوتی تھی۔

پھر جب ترکوں کا ہمسایہ ملکوں پر قبضہ ہوا تو بنو سعد کے دربار میں بھی ان کا اثر بڑھا اور جیش کے علاوہ یہاں کے شریفوں نے بھی ایک ایسا لشکر رکھنا چاہا جو ترکوں کے تربیت یافتہ تھے۔ جب بنو سعد کا شیرازہ بکھرا تو سلطان عبداللہ بن شیخ نے وفادار فوجیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہی جس پر وہ کامل اعتماد کر سکتا ہو چنانچہ اس نے سراقہ کو ان بیشتر اراضی کی ملکیت عطا کر دی جو ان کے پاس پہلے فقط عارضی جاگیر کی شکل میں تھی۔

۱۶۶۵ء میں جب مولای الرشید نے تخت پر قبضہ کیا تو اس کے جانشین مولای اسماعیل نے جیش کو اس کی امتیازی صورت عطا کی۔ اس جیش میں شراقہ کے گروہ نیز شرادہ قبیلے، اودایہ اور بواخر بھی شامل تھے۔ فرانسیسیوں کے زیر حمایت حکومت میں جیش انھی چار مخزن قبائل پر مشتمل تھا۔ جیش میں عہدے اکثر باپ سے بیٹے کو ملتے تھے۔

دور جدید میں اسلامی افواج کی تاریخ کا سب سے نمایاں پہلو ان کی اصلاح اور مغربی طرز اختیار کرنے کی تاریخ ہے۔ ۱۶۴۴ء تا ۱۶۶۹ء جنگ اقریطش میں عثمانی خلافت نے اپنے سرنگ انداز سپاہیوں کی تربیت کے لیے انگریز اور ولندیزی معلموں کی خدمات حاصل کیں۔ سترہویں صدی کے اختتام پر توپ بنانے کے کارخانوں کی نگرانی وینس کے توپ خانے کا ایک سابق فوجی سردار کیا کرتا تھا۔ جس نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا کے ذمے گولہ اندازوں کے فوجی دستے کی تربیت کا کام سپرد ہوا۔ ۱۷۸۳ء میں جب روسیوں نے کریمیا کا الحاق کر لیا تو ترکی فوج کی مغربی طرز پر تنظیم نے زور پکڑا۔

سلیم سوم کے عہد حکومت (۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء تا ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) میں پرانی طرز کی فوج کی ہیئت کو بالکل بدل کر جدید حالات کے مطابق و مناسب بنا دینے کی کوشش کی۔ اس نے توپ خانے میں اصلاحات نافذ کیں۔ نظم و ضبط کو کسا اور لشکریوں کی تنخواہ میں بیس سے چالیس اسپر روزانہ کا اضافہ کیا۔ ۱۷۹۶ء میں جمہوریہ فرانس سے ایک سفیر آبر دوبایے اپنے ساتھ استنبول میں متعدد افسر لایا جنہیں "نظام جدید" کی تربیت کا کام تفویض کیا گیا۔ یہ نیا جیش جو رضاکاروں سے بنا تھا توپچیوں، سپاہیوں اور پیادوں پر مشتمل تھا۔ سلطان اس نئی فوج کا ینی چریوں سے بلا ضرورت میل ملاپ ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے "نظام" کو استنبول کے باہر فوجی بارکوں میں مقیم کرایا۔ جب ۱۷۹۸ء میں فرانسیسی فوج نے فلسطین پر فوج کشی کی تو اس "نظام" کو جس کی تعداد اس وقت تین چار ہزار پر مشتمل تھی، شہر عکہ کی مدافعت پر لگایا گیا۔ اور اس نے اپنے جوہر دکھائے۔ چنانچہ سلطان نے اب "نظام" کے سپاہی ینی چریوں اور عام آبادی دونوں میں سے جبریہ بھرتی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن ینی چریوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا اور اس نے "نظام" کی تنسیخ سے اپنے تخت کو بچانے کی کوشش کی۔ ینی چریوں نے "نظام" کی بارکوں کو ایرانی فوج کی یورپی طرز پر تنظیم کرنے کے قابل ہو سکے۔

۱۹۲۵ء میں جبری بھرتی کا قانون منظور ہوا۔ اس میں دو برس کے لیے فوجی ملازمت کو تمام افراد کیلئے لازمی قرار دیا گیا۔ تہران میں ایک فوجی کالج بھی قائم کیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد جو عرب حکومتیں قائم ہوئیں ان کے پاس یورپی حکم بردار حکومتوں کے ماتحت مختصر رضاکار افواج تھیں جن کی تربیت اور تنظیم انہیں حکم بردار حکومتوں نے کی تھی۔ ان عرب حکومتوں نے مکمل آزادی حاصل کرنے کے بعد تیزی کے ساتھ عام جبری بھرتی کا آغاز کیا۔

جَیطالی، ابوطاہر

(ــ ؟ ــ ۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء یا ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء) اسماعیل بن موسیٰ، ایک ممتاز اباضی عالم۔

وہ اجیطال یا جیطال کا باشندہ تھا۔ یہ گاؤں جبل نفوسہ کا ایک قدیم گاؤں ہے جو اب تک موجود ہے۔ اور اجیطل یا جیطل کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے بارے میں تاریخ سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ شیخ عیسیٰ بن موسیٰ الطرمیسی کا شاگرد تھا جو ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہو گذرا ہے۔ جیطالی نے کچھ عرصہ مغورہ میں تعلیم پائی۔ نیز اس نے اپنی زندگی کے نو سال فرسطہ کے گاؤں میں گذارے جو جبل نفوسہ کے مغربی حصے میں واقع ہے۔

جیطالی کے بارے میں ایک روایت یہ بھی کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کچھ غلاموں کو فروخت کرنے کیلئے طرابلس لے گیا اس شہر کے امیر نے اسے قید کر لیا۔ لیکن ابن مکی والی قابس کی مداخلت کی وجہ سے اسے وہاں سے رہائی حاصل ہوئی۔ جس کے بعد وہ جربہ چلا گیا۔ یہ علاقہ اس وقت والی قابس کے زیر حکومت تھا۔ اس نے جربہ میں ہی وفات پائی۔ اور اسے جزیرے کی اباضی

وھاں جامع مسجد کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اس نے کئی رسائل تصنیف کئے۔ جن کا موضوع خاص طور پر عقائد اور شریعت سے ہے اور بقول بعض متاخر اباضی علماء ان رسائل سے اس (اباضی) فرقے کا احیاء ہوا۔

ان رسائل میں "قواعد الاسلام"، "القناطر" جو کئی جلدوں میں ہے۔ "شرح النونیہ" "کتاب الفرائض"، "اجوبۃ الائمۃ"، "کتاب الحج والمناسک"، "قصائد"، "کتاب المرضا" خاص طور پر مشہور ہیں۔

جیفر عمان کے بادشاہ کا نام۔ جیفر اور اس کے بھائی عبد کے نام آنحضورؐ نے حضرتؓ عمرو بن العاصؓ کے ہاتھ خط بھیجا تھا۔

اس خط کا مضمون یہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خدا کے رسول محمدؐ بن عبداللہ کی جانب سے جیفر اور عبد بیسران جلندر کے نام۔

اس شخص کو سلامتی ہو جو راہ راست پر چلے۔

امابعد۔ میں تمہیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لے آؤ۔ تاکہ سلامت رہو۔ میں تمام لوگوں کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ ان لوگوں کو نصیحت کروں جو باطنی زندگی سے زندہ ہیں۔

میں نے کافروں پر حجت پوری کر دی ہے۔ اگر تم اسلام لائے تو میں تمہیں تمہارے ملک پر بحال رکھوں گا۔ اگر اسلام سے اعراض کروگے تو تم سے تمہارا ملک چھین لیا جائے گا۔ میرے گھوڑے تمہارے ملک میں گشت لگائیں گے۔ میری نبوت تمہارے ملک پر غالب ہو جائے گی۔

آنحضورؐ کے اس خط کی کتابت ابی بن کعبؓ نے کی تھی۔

جین مت ایک قدیم مذہب جو اپنشد کے نظریات کے ردعمل کی بناء پر وجود میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنشد کی تعلیمات اس قدر فلسفیانہ تھیں کہ عوام ان کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ دوسرے آتما اور برہمن کا اتحاد جس کی بنیاد اپنشد نے رکھی تھی اس کو لوگوں نے کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ اس نظریہ کی بڑی مخالفت کی گئی۔ اسی لئے ایک نیا مذہب وجود میں آیا۔

اس مذہب کا نام ان صوفیوں (جینا) پر رکھا گیا جنہوں نے اپنی تمام خواہشات پر قابو پالیا تھا۔ جین کے لفظی معنی فاتح کے ہیں۔

جینی اپنے مذہب کو قدیم ترین بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جین مت کروڑہا برس سے موجود ہے۔ ان کے نزدیک چوبیس سرتھنکر (پیغمبر) گذرے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے پہلا انسان ناتھ تھا۔ اور سب سے آخری مہابیر ہے جس کا زمانہ ۵۴۰ ق م تا ۴۶۸ ق م ہے ناتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سو کھرب پلیے پہلے پیدا ہوا تھا۔ پلیہ سے مراد ان کے نزدیک اتنی مدت ہے جتنا کہ کوئی پرندہ ایک مربع میل کنوئیں کو باریک بالوں سے فی بال سو سال کے حساب سے ڈال کر بھر دے۔

بانی مذھب: ۔ جین مت کا بانی مہابیر ہے جو گوتم بدھ کا ہمعصر تھا۔ مہابیر مگدھ کے راجہ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا اصل نام وردھمان تھا۔ وہ بچپن ہی میں اپنی شجاعت اور معمولی بہادری کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا تھا۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی اور دس سال تک نہایت خوشگوار زندگی بسر کرتا رہا۔ اس زمانے میں لوگ روحانی زندگی کے حصول کے لئے فقر و فاقہ کرتے حتیٰ کہ اس میں مر جاتے تھے۔ مہابیر کے والدین نے بھی اسی طریقے سے وفات پائی۔ ان کی موت نے مہابیر پر بہت زیادہ اثر کیا اور اس نے تارک الدنیا ہو جانے کا تہیہ کیا۔ وہ فقیروں کا لباس پہن کر محل سے نکل کھڑا ہوا اور بارہ سال تک خاموش رہنے کا عہد کیا۔ وہ اس عرصے میں جنگلوں میں گھومتا پھرا اس مدت کے گذر جانے کے بعد وہ اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے دور دراز ملکوں میں گیا۔ مہابیر نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

تعلیمات: ۔ جینیوں کے نزدیک تمام مصائب کا سرچشمہ انسانی خواہشات کو قرار دیا گیا ہے۔ جو لامتناہی اور غیر محدود ہیں۔ چنانچہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ان خواہشات سے دور رکھے اپنے دل سے ہر قسم کی تمنا اور خواہش کو نکال پھینکے اور جب خواہشات نکل جائیں تو روح مسرت اور شادمانی سے ہم آغوش ہو جائے گی۔ یہی مسرت نروان کہلاتا ہے یہ نروان حاصل کرنے کا سلبی ذریعہ تھا۔ مہابیر نے نروان حاصل کرنے کے ایجابی ذرائع کی بھی نشاندہی کی ہے۔

پانچ ورت (عہد) پر عمل پیرا ہونے سے نروان حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۔ کسی ذی روح کو قتل نہ کیا جائے۔ کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

۲۔ چوری سے پرہیز کیا جائے۔

۳۔ جھوٹ بولنے سے باز رہا جائے۔

۴۔ پاک دامنی کی زندگی بسر کی جائے۔ اور نشہ آور اشیاء کے استعمال سے باز رہنا چاہیے۔

۵۔ کسی چیز کا لالچ یا تمنا نہ کی جائے۔

جینی خدا کے قائل نہیں نہ ذات پات کی تفریق اور دیدوں کو مانتے ہیں۔ نروان حاصل کرنا ان کا ارشی ہے۔

جین مت میں عبادت میں صرف تپیا پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس تپیا میں فقر و فاقہ کو بہت اہمیت دی گئی۔ تعذیب نفس، ترک خواہشات اور ترک دنیا ہی ان کے نزدیک بہتر عبادت ہے۔ اور اس کے لئے کسی مندر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں جین مت میں معابد کے نشانات نہیں ملتے۔ بعد میں عبادت خانے تعمیر ہوئے۔

اس مذہب میں آہنسا پر بھی بہت زور دیا گیا ہے اور قربانی کی مخالفت کی گئی ہے جینیوں نے آہنسا کے معاملے میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ وہ اپنے منہ اور ناک کے نتھنوں پر کپڑا باندھ رکھتے ہیں تاکہ کوئی جاندار چیز اندر نہ جا کر مر جائے۔ نہ گوشت کھاتے ہیں۔ پانی چھان کر پیتے ہیں۔ نیز چلتے وقت کپڑے کی دھجیوں کی ایک جھاڑو سے راستہ صاف کرتے جاتے ہیں کہ کہیں جیو ہتیا نہ ہو جائے۔

جین مت میں واضح طور پر جنت اور دوزخ کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوزخ زیر زمین ہے اور اس کی تعداد سات ہے۔ جنت کو چھبیس بتاتے ہیں جو اوپر تلے ہیں۔ ان کے خیال میں روح میں وزن ہوتا ہے۔ جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو روح بھاری ہو جاتی ہے اور جہنم میں جا گرتی ہے۔

آج کل جینیوں کی تعداد سولہ لاکھ کے قریب ہے ان کے بعض مندر ہندوستان کے فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ ہندوستان کے صوبہ گجرات میں کوہ ابو میں ایک عظیم الشان مندر ہے جس کا شمار ہندوستان کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ان مندروں کی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہے۔

آج بھی جینی خدمت خلق کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایسے اداروں کا قیام جن کے ذریعے انسان و حیوان کی خدمت ہو سکے ان کا محبوب مشغلہ ہے

اس مذہب کے حقیقی عروج کا زمانہ موریا خاندان کا عہد ہے۔ چندرگپت موریا نے جین مت قبول کر لیا تھا۔ اس کے عہد ہی میں جین مت کے پیروکاروں کے دو فرقے ہو گئے تھے ایک فرقہ سوتیامبر کے نام سے موسوم ہوا جو سفید کپڑے پہنتا تھا۔ دوسرا فرقہ دگمبر یعنی آسمانی لباس والا مشہور ہوا جو بالکل برہنہ رہتے تھے۔ جینیوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ مذہب دنیا

کا قدیم ترین مذہب ہے اور یہ صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ کائنات کی تمام چیزوں کا مذہب ہے لیکن اس کے باوجود یہ مذہب عالمگیر نہ بن سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اصول بہت سخت تھے۔ اس کے پانچ اصولوں میں سے پہلے اصول پر بہت زور دیا گیا تھا۔ یعنی کسی جاندار کا قتل نہ کیا جائے۔ اس کے باعث اس کے پیروکار دنیا کا کوئی پیشہ اختیار کرنے کے قابل نہیں رہے وہ زراعت سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ زمین پر ہل چلانے سے حشرات الارض کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بھٹی کے کام سے اس لئے دور رہتے تھے کہ اس سے بھی غیر مرئی جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں وہ اسی خیال سے پانی تک نہیں ابالتے تھے۔ شکار کے قریب نہیں بھٹکتے تھے۔ چنانچہ اگر ان تعلیمات پر عمل کیا جائے تو تمام کاروبار حیات معطل ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ اسی خامی کی وجہ سے یہ مذہب دوسرے ملکوں میں مقبول نہیں ہوا۔ البتہ اس کے ماننے والے ہندوستان میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں آہنسا پر اتنی سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔

جیون، ملا احمد (۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء — ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء - ۱۷۱۸ء) بن ابی سعید بن عبید اللہ بن عبد الرزاق بن مخدوم۔ ایک عالم دین و مفسر قرآن لکھنؤ کے قریب امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سات برس کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں عقلی اور نقلی علوم کی تکمیل کر لی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں محمد صادق السرکھی اور لطف اللہ کوڑا جہاں آبادی ہیں۔

آپ نے اکیس برس کی عمر میں اپنی تفسیر مکمل کر لی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کو اپنے "اساتذہ" میں شامل کر لیا تھا اور آپ کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول بھی اپنے باپ اورنگ زیب کی طرح آپ کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ آپ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فقہ میں خاص مہارت حاصل تھی۔ یہ ایسے احکام شرعیہ سے بحث کرتی ہے جنہیں فقط قرآن حکیم ہی سے مستخرج کیا گیا ہے۔

علم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے آبائی شہر میں پڑھانا شروع کیا۔ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں آپ اجمیر اور دہلی کو روانہ ہوئے۔ اور یہاں پر آپ نے کافی عرصہ قیام کیا۔ اس قیام کے دوران میں آپ وعظ و نصیحت اور تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء میں پہلی مرتبہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور پانچ سال تک وہاں پر قیام کیا۔ ۱۱۰۷ھ ۱۶۹۵ء میں ہندوستان واپس آنے پر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ آپ تقریباً چھ سال تک اورنگ زیب کے افسروں کے ساتھ رہے۔ جو اس زمانے میں دکن کی ریاستوں سے برسرپیکار تھا۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دوبارہ حج بیت اللہ تشریف لے گئے۔ اور ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء میں واپس امیٹھی پہنچے۔ یہاں پر دو سال قیام کیا اس قیام کے دوران میں آپ کو اپنے شیخ یاسین بن عبد الرزاق قادری سے خرقہ تصوف عطا ہوا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے بہت سے شاگردوں کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ اجمیر میں شاہ عالم اول سے ملاقات ہوئی جو آپ کو اپنے ہمراہ لاہور لے آیا۔ شاہ عالم کی وفات کے بعد آپ دوبارہ دہلی لوٹے اور پھر تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے اپنے آبائی شہر امیٹھی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔

آپ کا انتقال دہلی کی جامع مسجد میں اپنے زاویے میں ہوا لیکن ان کی لاش کو بعد میں نکال کر امیٹھی میں دفن کیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں "التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیہ"، "نور الانوار" شرح "منار الانوار"، "السوانح"، "مناقب الاولیاء" خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک اور کتاب آداب احمدی جو تصوف اور صوفیہ کے مقامات پر ہے۔ آپ کی اوائل عمر کی تصنیف ہے۔

چ

چار قُل قرآن مجید کی آخری سورتوں میں سے چار سورتیں جو "قل" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی "قل یا ایہا الکافرون"، "قل ھو اللہ احد" "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس"
فاتحہ اور ایصال ثواب کے لیے انہیں پڑھا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد دوسرے تیسرے دن فاتحہ کی تقریب کو بھی قل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چار یار (ف) چار دوست۔ اس ترکیب کے لغوی معنی چار دوستوں کے ہیں۔ یہ لفظ آنحضورؐ کے چار اصحاب خلفائے راشدین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جن کے اسمائے گرامی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ۔ یہ چاروں یار عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

چاشت، نماز وہ نفل نماز جو سورج کے بہت بلند ہونے پر پڑھی جاتی ہے یہ نماز مستحب ہے دو یا چار یا بارہ رکعت پڑھی جاتی ہیں۔
اس نفل نماز کا احادیث میں بہت درجہ بتایا گیا ہے۔
حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ صبح ہوتے ہی لازم ہوتا ہے تمہاری ہر ہڈی پر صدقہ۔ پھر تمہاری ہر تسبیح۔ یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے اور لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے اور اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔ نیک کام کا حکم کرنا صدقہ ہے اور بری بات سے روکنا صدقہ ہے۔ اور ان سب کے مقابلے میں دو رکعت چاشت کی کافی ہوتی ہیں۔" (مسلم)
حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک قوم کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا تو کہا کہ یہ لوگ جانتے نہیں کہ اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں نماز اس سے بہتر ہے (یعنی چاشت کی نماز جو یہ لوگ اول وقت میں پڑھ رہے ہیں اس سے وہ چاشت کی نماز بہتر ہے جو گرم وقت میں پڑھی جائے) چنانچہ آنحضورؐ نے فرمایا ہے کہ خدا کی طرف کامل توجہ رکھنے والوں کی نماز کا وقت وہ ہے جب کہ اونٹوں کے بچے گرم ہو جائیں یعنی آفتاب خوب بلند ہو جائے۔" (مسلم)
حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص چاشت کے وقت بارہ رکعتیں پڑھے خداوند تعالیٰ اس کے لیے جنت میں سونے کا محل بناتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)
حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص چاشت کی دو رکعتوں کی حفاظت کرے تو اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں اگرچہ وہ دریا کے جھاگ کے برابر ہوں۔ (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

چاند ہلال، چاند دیکھنے کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ جب چاند دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل دعا پڑھنی چاہیے۔
آنحضورؐ جب چاند دیکھتے تھے تو مندرجہ ذیل دعائیں پڑھتے تھے۔
حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ چاند دیکھ کر یہ دعا پڑھتے تھے
اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْیُمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَ رَبُّکَ اللّٰہُ۔
اے خدا اس (چاند) کو ہم پر یمن و برکت و سلامتی اور اسلام کے ساتھ نکال میرا پروردگار اور تیرا پروردگار خدا ہے۔"
حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ آنحضور جب نیا چاند دیکھتے تو اول تین مرتبہ فرماتے ھِلَالُ خَیْرٍ وَّ رُشْدٍ۔ "یہ خیر و بھلائی کا چاند ہے۔" پھر تین مرتبہ فرماتے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَکَ میں اس خدا پر ایمان لایا جس نے تجھے پیدا کیا اور بعد میں فرماتے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ذَھَبَ بِشَھْرِ کَذَا وَ جَآءَ بِشَھْرِ کَذَا۔
سب تعریف خدا کے لیے ہے جو فلاں مہینہ لے گیا اور فلاں مہینہ لایا۔"

چاند بی بی (۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء - ۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۰ء) احمد نگر کے بادشاہ حسین نظام شاہ (۱۵۵۳ء تا ۱۵۶۵ء) اور ملکہ خونزہ سلطان کی بیٹی تھی۔ ۱۵۶۴ء میں چودہ سال کی عمر میں اس کی شادی سلطان بیجاپور علی عادل شاہ سے ہوئی۔ اس شادی سے ان دو ہمسایہ ریاستوں کی باہمی چپقلش ختم ہو گئی۔ اور دکن کی پانچوں سلطنتوں میں باہمی اتحاد کی صورت نکل آئی۔ کیونکہ علی عادل شاہ کی بہن کی شادی چاند بی بی کے بھائی مرتضیٰ نظام سے ہوئی تھی۔
جب چاند بی بی اپنے خاوند کے گھر آئی تو اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے خاوند کا تخت کانٹوں کی سیج ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے خاوند کی ہر معاملے میں مدد کرنے کو

اپنا شعار بنا لیا۔

چاند بی بی کئی ایک مہموں میں اپنے خاوند کے ہمراہ رہی۔ اس نے میدان جنگ کی سختیاں اور مصائب جھیلے۔ وہ اس کے ساتھ شکار کھیلتی اس کو بوقت ضرورت بہت قیمتی مشورے دیتی۔ اور اس کی ہمت بندھاتی۔

جب اس کے خاوند علی عادل شاہ نے (۱۵۸۰ء) میں وفات پائی تو اس کی عمر اٹھائیس برس کی تھی لیکن وہ رزم و بزم کے تمام قواعد سے واقف تھی۔

علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ چنانچہ اس کے بعد اس کا نو سالہ بھتیجا ابراہیم تخت پر بیٹھا اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کا لقب اختیار کیا۔ لیکن حکومت کا نظم و نسق چاند بی بی کے ہاتھ میں ہی تھا۔ کیونکہ بادشاہ کی عمر ابھی بہت کم تھی۔

چاند بی بی کی شجاعت و بہادری ایک بار اس موقع پر دیکھنے میں آئی جب برار بیدر اور گولکنڈہ کی متحدہ فوجوں نے بیجاپور کے دارالحکومت پر حملہ کیا۔ چاند بی بی دشمنوں کی اس صف آرائی سے ذرہ برابر خوفزدہ نہ ہوئی۔ اور جتنے دن تک محاصرہ رہا۔ برابر ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک جاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب کہ بارش بہت تیزی سے ہو رہی تھی اور ایک جگہ فصیل میں شگاف بھی پڑ گیا تھا لیکن چاند بی بی وہاں اس کی حفاظت کے لیے خود کھڑی رہی۔ اور اپنے سامنے اس شگاف کو بند کروایا۔ یہ محاصرہ پورا ایک سال تک رہا بالآخر دشمن کو ناچار پسپا ہونا پڑا۔

جب ابراہیم عادل شاہ کی ہمشیرہ کا نکاح احمد نگر کے شاہزادے میراں حسین سے ہوا تو اس وقت ہی چاند بی بی کو اپنے وطن میکے میں آنا نصیب ہوا۔ کیونکہ رخصتی کے بعد سے سلطنت کے حالات اور انتظامات نے اس کو اتنی فرصت ہی نہ دی تھی کہ وہ کہیں باہر قدم رکھتی۔ ان دنوں احمد نگر کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ اب احمد نگر اور بیجاپور کے مابین اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے احمد نگر کے اندرونی حالات بھی بہت حد تک دگرگوں تھے۔ چنانچہ چاند بی بی بیجاپور واپس آ گئی۔ بعد میں دوبارہ جب وہ احمد نگر گئی تو حالات پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئے تھے۔

ابراہیم نظام شاہ کے انتقال کے بعد احمد نگر کے تخت کے دو دعویدار تھے۔ ایک ابراہیم کا لڑکا بہادر تھا۔ دوسرا احمد تھا جو نظام شاہ کے ایک بھائی کا پوتا تھا۔

چاند بی بی بہادر کی طرفدار تھی۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ اس کی حمایت کی۔ لیکن میاں منجو جو احمد کا طرفدار تھا۔ اس نے ایک غیر معمولی نقصان دہ قدم اٹھایا۔ اس نے شہنشاہ اکبر کے لڑکے مراد کو جو اس وقت گجرات کا حاکم تھا احمد نگر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

مراد نے فوراً دارالحکومت پر چڑھائی کر دی۔ ادھر چاند بی بی نے بہادر کے جائز وارث تاج و تخت ہونے کا اعلان کر دیا اور گولکنڈہ اور بیجاپور والوں سے مدد طلب کی۔ مغلوں نے احمد نگر کا دو مرتبہ محاصرہ کیا جو دکن کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ ہیجان انگیز واقعات میں سے ہے۔

مراد کو ان تمام باتوں کے باوجود کہ اسے ذرائع رسل و رسائل کی فراوانی حاصل تھی اور احمد نگر کے حکمران طبقے میں انتشار تھا۔ کامیابی نہ ہو سکی۔ چاند بی بی نے اس محاصرے کے دوران میں وہ وہ بہادرانہ کام سرانجام دیئے کہ کوئی مرد بھی مشکل سے ایسے نازک وقت میں ان حالات سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مراد نے چاند بی بی کی بہادری کو دیکھتے ہوئے اسے سلطان تسلیم کر لیا۔ دکن کی پانچ سلطنتوں میں صرف اسی حکمران کے شاہی لقب کو مغلوں نے تسلیم کیا چنانچہ ایک عہدنامے کے مطابق برار کا علاقہ مغلوں کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اور احمد نگر کی مکمل آزادی خودمختاری تسلیم کر لی گئی۔

اس معاہدے کے بعد کچھ عرصے کے لئے حالات پرسکون رہے لیکن داخلی امن کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ جو لوگ چاند بی بی کے مخالف تھے انہوں نے اب مغل شہزادے دانیال کو مدد کے لیے بلایا۔ چاند بی بی سلطان نے بھی دوبارہ گولکنڈہ اور بیجاپور سے مدد طلب کی۔ لیکن اس دفعہ یہ اتحاد کامیاب نہ ہو سکا اور ۱۵۹۲ء میں سونی پت کے میدان میں چاند بی بی اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ چاند بی بی کو اس کے مخالف گروہ نے جس کی قیادت حمید خان کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے شہر کے اوباشوں کو ساتھ لے کر محل کے اس حصے پر حملہ کر دیا جہاں قیام گاہ تھی اور ملکہ کو نہایت سفاکی کے ساتھ قتل کر دیا گیا

ایک انگریز مصنف میڈوز ٹیلر نے چاند بی بی کے بارے میں لکھا ہے۔

"ملکہ الزبتھ کی ہمعصر . . . . ایک ملکہ، قابلیت میں اس کی ہم پلہ سیاسی فہم و ذکا میں اس کے برابر اور اس کی طرح تعلیم یافتہ اور کمالات سے آراستہ تھی گو اس کی تعلیم کی نوعیت یک گونہ مختلف تھی، وہ اتنے ہی بڑے اور زرخیز خطے پر حکمران تھی جتنا انگلستان ہے۔ حاسدوں اور دشمنوں میں گھری ہوئی ایک خاتون جس نے محض اپنی شجاعت و عزیمت سے اپنی مملکت کو تباہ اور ٹکڑے ہو جانے سے بچا لیا . . . . . . وہ سادہ مزاج، فیاض، راست باز اور رحم دل، پاکباز، متقی اور مخیر، ہندوستان کی تمام خواتین میں وہ اس طرح ممتاز تھی جس طرح ایک گوہر بے داغ و بے بہا۔"

چاہ بابل بغداد سے جنوب کی طرف تقریباً ۵۵ میل کے فاصلے پر ایک چوکور کنواں جس کا قطر تین فٹ کے قریب ہے۔ کنکر پھینکنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں پانی موجود ہے۔ اس کنوئیں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ہاروت و ماروت الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور قیامت تک الٹے لٹکے رہیں گے۔ (نیز دیکھئے "ہاروت و ماروت")

چاہ نخشب ایک کنواں جس کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ اس کنوئیں میں سے حکیم عطا ابن مقنع نے شعبدے کے طور پر سیمابی اجزا کی ترکیب سے ایک چاند نکالا تھا۔ نخشب ترکستان کے ایک شہر کا نام ہے۔ اسی شہر کی نسبت سے ماہ نو کو ماہ نخشب کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ مذکورہ شہر کے باہر ایک کنواں [illegible] سے اندھیری راتوں میں ایک چاند نکل کر فضا میں معلق ہو جاتا اور چاروں [illegible] سے ہر چیز منور ہو جاتی۔

چاہ یوسف فرات شام میں طبریہ کے نزدیک ایک کنواں۔ وہ کنواں جس میں حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے [illegible] حضرت یوسفؑ چونکہ حضرت یعقوبؑ کے بہت زیادہ چہیتے بیٹے تھے [illegible] آپ سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے سوتیلے بھائی آپ سے حسد کرنے لگے۔ وہ آپ کو سیر کے بہانے سے جنگل میں لے گئے۔ اور [illegible] آپ کو ایک ایسے کنوئیں میں ڈال دیا جو عرصے سے خشک پڑا تھا۔ حجازی [illegible] کا سامان تجارت لے کر شام سے مصر کی طرف جا رہا تھا۔ کنواں دیکھ کر [illegible] پانی کے لئے اس میں ڈول ڈالا جسے پکڑ کر حضرت یوسفؑ کنوئیں سے باہر آ گئے۔ [illegible] انہیں غلام کے طور پر اپنے ساتھ لے لیا اور مصر لے گئے۔

اس کنوئیں پر آج کل ایک گنبد بنا ہوا ہے۔

چترال عہد برطانوی کی ہندوستان کی ایک ریاست جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں شامل ہوئی ۱۹۶۹ء میں پاکستان کی حکومت کے ایک حکم کے تحت ریاست دیر، سوات اور چترال کو ختم کر کے ان علاقوں پر مشتمل مالاکنڈ ڈویژن کی تشکیل کی گئی جو صوبہ سرحد کا ایک

حصہ ہے۔

سابق ریاست چترال کا علاقہ ۳۵ درجے ۱۵ دقیقے اور ۳۶ درجے ۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۱ درجے ۲۲ دقیقے اور ۷۴ درجے ۶ دقیقے طول بلد مشرق میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۵۰۰ مربع میل ہے۔ یہ علاقہ سوویت روس، افغانستان اور عوامی جمہوریہ چین سے ملا ہوا ہے۔ اس ریاست کا نام اس کے دارالحکومت کے نام پر چترال ہے۔

چینیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد چترکے نام سے موسوم کیا۔ جس کے معنی سبزہ باغ بیان کئے گئے ہیں۔ بابر نے اپنی تزک بابری میں یہی لفظ چھت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس ریاست کی سالانہ آمدنی تقریباً ۱۲،۰۰۰ روپے تھی۔

وادیٔ چترال میں برف باری

چترال کا علاقہ ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ جس کی برفانی چوٹیاں اور برفانی تودے کوہ ہندوکش کی سرسبز و شاداب وادیوں کے لیے آب پاشی کا ایک دائمی منبع ہیں۔ کوہ ہندوکش کی شاخیں چترال کو کئی کوہستانی علاقوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ چترال میں جو دیر اور سوات کے بے نام کوہستانوں ہمالیہ اور سلسلہ قراقرم سے چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے بہت سے مشہور درے اور چوٹیاں ہیں۔

درہ دوارہ سے جو ۱۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے بدخشاں کو راستہ جاتا ہے جو سال میں صرف تین مہینے کھلا رہتا ہے زمانہ قدیم سے یہ درہ چترال اور وسطی ایشیا کے درمیان کاروانوں کا اہم راستہ رہا ہے۔ درہ باروغل جو وادی یارخون کے اس پار ہے چین اور سوویٹ روس کو چترال سے ملاتا ہے اور یہاں کاشغر اور ختن سے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔ دیگر اہم دروں میں درہ شندور اور درہ لورائی ہیں۔ جن سے بالترتیب، گلگت اور دیر کو راستہ جاتا ہے جبکہ درہ لورائی چترال اور باقی پاکستان کے درمیان آمدورفت کا واحد ذریعہ یہاں کے لوگوں کا ذریعہ گذر بسر زراعت و پرورش حیوانات ہے۔ اگرچہ اس علاقے میں معدنیات اور جنگلات بکثرت ہیں۔ جن سے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ یہاں پر سرمہ، کچے لوہے گندھک، ابرق بلور اور ہڑتال کے اچھے خاصے ذخیرے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد چترال نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔

چترال کی قدیم تاریخ کی بابت بہت کم معلومات ہیں۔ قدیم باشندے "پشاچ" کہلاتے ہیں۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مردم خور ہیں انہیں پہلی صدی قبل مسیح میں مغلوب کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے چترال کے بارے میں معلومات تاریکی میں ہیں۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں جاکر ہمیں آثار قدیمہ کی یہ شہادت ملتی ہے کہ چترال ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں کابل کے راجہ جے پال کے زیر فرمان تھا۔ اور یہاں کے باشندے بدھ مت کے پیرو تھے۔ چنگیز خان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی چترال پر حملے کئے۔ اگرچہ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔

چترال کے آخری حکمران خاندان کا بانی ایوب بابا نامی ایک شخص تھا۔ اسے بابر کا پوتا [illegible] ہے جو اپنے باپ میرزا کامران کے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہونے کے بعد چترال آ نکلا تھا اور اس نے یہاں کے فرمانروا کے ہاں ملازمت کر لی تھی۔ جو خاندان رئیسہ کا شہزادہ تھا بعد میں ایوب کا پوتا سنگین علی اول حکمران کا منظور نظر بن گیا۔ جس نے اسے امیرالامراء مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے بڑی قوت حاصل کر لی۔ ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء میں جب اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے دو بیٹوں محمد رضا اور محمد بیگ نے اس کی جگہ سنبھالی۔ بعد میں رئیسہ شہزادے کے انتقال کے بعد محمد رضا فاتح حکمران بن گیا۔ لیکن جلد ہی اس کے بھتیجوں نے اس کو قتل کر دیا کیونکہ اس نے ان کے والد محمد بیگ کے ساتھ زیادتیاں کی تھیں۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں محمد بیگ کے بیٹے محترم شاہ اول نے چترال کے آخری رئیسہ حکمران کو پرامن طور پر تخت سے اتار کر بدخشاں بھیج دیا اور خود حکمران بن بیٹھا۔ ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں محمود بن ناصر رئیسہ نے ایک بہت بڑی بدخشانی فوج کے ساتھ چترال پر چڑھائی کر دی۔ اس نے محترم شاہ اول کو شکست دی اور چترال سے جلاوطن کر دیا۔ ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں محترم شاہ اول محمود رئیسہ کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ چترال واپس آگیا۔ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۴ء میں اس پر دوبارہ حملہ کیا گیا۔ بعد میں محترم شاہ اول کو اپنی فوج کی غداری کے سبب ملک چھوڑنا پڑا۔ اس کے بیٹے سنگین علی دوم نے اپنی کھوئی ہوئی ریاست دوبارہ حاصل کرنے سے مایوس ہوکر افغانستان چلا گیا۔ جو اس وقت ہندوستان کی مغل حکومت کا ایک حصہ تھا۔

بہادر شاہ اول (شاہ عالم) کے دور حکومت میں سنگین علی دوم دہلی آگیا۔ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں شاہ عالم کی ملازمت میں آگیا۔ بادشاہ کی مالی امداد سے وہ اس قابل ہوگیا کہ وہ سوات کے رنگروٹوں کو فوج میں بھرتی کر سکے۔ اور اس طرح اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کے قابل ہوگیا۔ ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اس کو خاندان رئیسہ کے چند افراد نے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد متعدد کمزور اور ناکارہ حکمران آتے رہے۔ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں فرامرز جو محترم شاہ اول کا بھتیجا تھا تخت نشین ہوا۔ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں اسے اس کے چچا شاہ افضل نے قتل کر ڈالا اور تخت پر قبضہ جما لیا۔ ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بھائی شاہ فاضل تخت پر بیٹھا۔ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں شاہ نواز خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں خیر اللہ خان بن عصمت اللہ خان کے چترال پر حملے کو بھاری نقصانات اٹھا کر پسپا کیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں وہ تیسری بار تخت پر بیٹھا۔ اس وقت چترال چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک وحدت ایک مقامی سردار کے ماتحت تھی۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں شاہ نواز کا بھائی محترم شاہ ثانی کٹور کا خطاب اختیار کر کے حکمران بن بیٹھا اور ملک امان کے کمسن بیٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا کر بادشاہت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں اس کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا شاہ افضل ثانی تخت نشین ہوا۔ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں مہتر چترال نے مہاراجہ کشمیر سے سمجھوتہ کر لیا جس کی رو سے مہاراجہ نے بارہ ہزار روپے سالانہ خراج کے عوض مہتر چترال کی سرداری کو تسلیم کر لیا

۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں بالائی چترال کے حکمران بہادر پہلوان کی شکست کے ساتھ کا سارا علاقہ پہلی دفعہ ایک سردار مہتر امان ملک کے تحت متحد ہوگیا۔ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں لاک ہارٹ مشن چترال آیا۔ اس کے بعد ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں ایک اور مشن کیپٹن ڈیورنڈر کی سرکردگی میں وہاں آیا۔ جس کے توسل سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں سالانہ خراج کی رقم جو کشمیر دربار ادا کرتا تھا بڑھا کر بارہ ہزار روپے کر دی گئی۔ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں افضل الملک اپنے باپ امان الملک کا جانشین ہوا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی اس کے چچا شیر افضل نے اسے قتل کرا دیا۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں نظام الملک کو اس کے

سوتیلے بھائی امیر الملک نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد امرا خان نے جو جندول کا والی اور اس وقت دیر کا مالک تھا چترال پر حملہ کیا۔ شیر افضل جو افغانستان میں ایک جلاوطن تھا، اس کے ساتھ مل گیا۔ امرا خان اور شیر افضل دونوں برطانوی ہندوستانی مختصر سی فوج کے خلاف متحد ہو گئے جو ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء کے معاہدے کی رو سے چترال میں متعین تھی۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ امیر الملک امرا خان اس کے حلیف سے خفیہ ساز باز کر رہا ہے تو برطانوی ایجنٹ نے اسے حراست میں لے لیا اور شجاع الملک کو عارضی طور پر مہتر تسلیم کر لیا۔

برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ شاہ شجاع کو تخت پر بٹھانے سے پہلے ملکی اور برطانوی چار سو ملے جلے فوجی سپاہیوں کے ساتھ قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس حفاظتی فوج نے امرا خان اور شیر افضل کی فوجوں پر حملہ کیا۔ لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

اب امرا خان اور اس کے حلیفوں کا تاریخی محاصرہ چترال شروع ہوا۔ جو ۳ مارچ ۱۸۹۵ء سے ۱۹ اپریل ۱۸۹۵ء تک رہا۔ لیکن بعد میں شیر افضل ۲۶ اپریل ۱۸۹۵ء کو بھیجی جانے والی انگریزی فوج کے ہاتھوں قید ہو گیا۔ تو محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اور امرا خان بچ کر افغانستان چلا گیا۔ شجاع الملک کو بحیثیت مہتر کے مستقل کر دیا گیا۔ اور اس وقت سے چترال میں امن و امان کا مسلسل دور دورہ رہا۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء کی جنگ افغانستان کے دوران میں چترال سکاؤٹوں نے پورے طور پر انگریزوں سے تعاون کیا۔ مصارف جنگ کے لئے مہتر نے جو چندہ دیا تھا اس کے عوض میں اسے ایک لاکھ روپے کی رقم دی گئی اور اسی سال سے اسے گیارہ توپوں کی سلامی کے ساتھ ہز ہائی نس کا خطاب بھی دیا گیا۔

شجاع الملک نے جو ایک روشن دماغ حکمران تھا، چترال میں بجلی، مواصلات لاسلکی اور موٹروں جیسی جدید سہولتوں کو ریاست میں مروج کیا۔ اور سڑکیں، قلعے، اناج کے گودام، آب پاشی کی نہریں اور سکول تعمیر کرائے۔ ایک جامع مسجد بھی بنوائی۔ اس کو جدید چترال کا معمار کہا جاتا ہے۔

شجاع الملک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ناصر الملک ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں اس کا چھوٹا بھائی مظفر الملک اس کا جانشین ہوا۔ یہ وہی حکمران تھا۔ جس نے ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء میں پاکستان سے چترال کے الحاق کی پیش کش کی۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں سیف الرحمان اس کا جانشین ہوا جو ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کا تین سالہ لڑکا سیف الملک ناصر تخت نشین ہوا۔

۱۹۶۹ء میں حکومت پاکستان کے عوام کے پر زور مطالبے کے پیش نظر چترال دیر، سوات کی ریاستوں کو ختم کر کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مدغم کر دیا۔

چٹاگانگ بنگلہ دیش کی ایک اہم بندرگاہ، ضلع اور ڈویژن۔ چٹاگانگ صدیوں پرانی بندرگاہ ہے۔ جہاں عیسائی جہاز ران اپنے جہاز اور مال لے کر آتے تھے۔ مسلمان پہلی بار دسویں صدی عیسوی میں اس بندرگاہ سے متعارف ہوئے ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء میں چٹاگانگ بنگال کا ایک خوشحال علاقہ تھا۔ مسلمانوں نے آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی میں چٹاگانگ پر قبضہ کیا۔ ۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء میں بنگال کے نواب شائستہ خاں نے چٹاگانگ کو فتح کر کے اپنے علاقے میں شامل کر لیا اور اس کا نام اسلام آباد، غداری سے میر قاسم نے ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیا۔ چٹاگانگ دریائے کرنافلی کے کنارے واقع ہے۔ دریا کے دہانے سے بندرگاہ کا فاصلہ تک بھگ بارہ میل ہے۔ سرسبز پہاڑیوں، دریا، سمندر اور ہرے بھرے میدانوں نے اس علاقے کو بے پناہ حسن و دلکشی عطا کر رکھی ہے۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر سینکڑوں مکانات تعمیر کیے گئے ہیں۔ چٹاگانگ کی آب و ہوا صحت افزا ہے۔ فروری اور جون کے درمیان درجۂ حرارت عموماً ۸۵ فارن ہیٹ سے کم ہی رہتا ہے۔ سردی کا موسم گرما چار ماہ کا ہوتا ہے۔ سال کے باقی حصے میں برسات رہتی ہے سلہٹ کے بعد اس علاقے میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ ہوائی راستے اسے ڈھاکہ، کاکس بازار، رنگون اور کلکتہ کے ساتھ ملائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عمدہ بندرگاہ ہے۔ جس کے آس پاس کے علاقوں میں پٹ سن کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں چائے کے باغات بھی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کلکتہ سے کافی مسلمان تاجر یہاں آباد ہوئے۔ جس سے یہاں کی بندرگاہ کو ترقی ملی اور نئے نئے کارخانے قائم ہونے لگے۔ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء کے بعد چٹاگانگ بندرگاہ میں جہازوں کی مرمت اور مال رکھنے کی سہولت میں چار گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

۹ھ/۶۳۰ء میں ایک چینی سیاح ہیون سانگ یہاں آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ "چاٹگام کا وہ علاقہ جو خوب صورت جھیلوں اور حسین پہاڑوں کی دنیا ہے، دو سو مربع میل پر محیط ہے۔ یہ انسان کی سچی خوشیوں اور روحانی لذتوں کی آماجگاہ ہے۔" عرب کے نامور سیاح ادریسی نے اپنی ڈائری میں کرنافلی کے عنوان سے لکھا ہے کہ اس علاقے کی سیر و سیاحت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہاں ایک بڑا شہر ہے جو خوب صورت پہاڑیوں، دریاؤں اور جزیروں کی آغوش میں ہر ذی روح کو پیغام حیات دیتا ہے۔ دنیا کے سیاحوں کے لئے یہاں قدرت کی طرف سے دلچسپی کے کافی سامان مہیا ہیں۔ ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء میں مشہور سیاح مارکوپولو نے چٹاگانگ بندرگاہ کی خوب صورتی اور ترقی کی تعریف کی۔ ابن بطوطہ نے سن ۷۴۶ - ۷۴۷ھ/۱۳۴۵ - ۱۳۴۶ء میں جاوا کے راستے چٹاگانگ سے چین تک سفر کیا۔ وہ بنگال کے قدرتی حسن سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے "چیزیں یہاں دنیا بھر سے سستی ہیں۔ لوگ خوش حال اور حکمران مسلمان ہیں۔ ہندو مذہب کا بھی اثر ہے۔ دیہاتی زندگی ملاحوں اور کشتیوں کے گرد گھومتی ہے۔ ملاح بڑے شریف اور دیندار ہیں۔" دسویں صدی عیسوی میں عرب یہاں آئے تو اس علاقے کی دلفریبی سے متاثر ہو کر ان میں سے کچھ لوگ یہیں آباد ہو گئے۔ یہ بنگال سے مختلف چیزیں اپنے ملکوں کو بھیجتے تھے۔ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں پرتگالی یہاں آئے۔ انہوں نے یہاں تجارتی کوٹھیاں بنائیں اور چٹاگانگ کی موجودہ بندرگاہ کا نام بڑی بندرگاہ رکھا۔ عربوں کی آمد سے پیشتر چٹاگانگ ایک معمولی بندرگاہ تھا جسے تام لوگ کہتے تھے۔ عرب اس علاقے کو رہم کہتے تھے۔

چٹاگانگ کی بڑی بڑی عمارتیں سرکاری دفاتر اور کچھ اونچی پہاڑیوں پر واقع ہیں۔ اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان رینگتی ہوئی سڑکیں اور سرسبز درخت بڑا پرکیف منظر پیش کرتے ہیں۔ شہر سے کچھ فاصلے پر حضرت بایزید بسطامی کی زیارت، حضرت شیخ فرید شکر گنج کا چشمہ اور حضرت بدر الدین شاہ اور حضرت امانت شاہ کے مزارات ہیں۔ شہر کی پہاڑیوں پر ریلوے ہیڈ کوارٹر، جنرل ہسپتال، پہاڑی میں واقع ریلوے ورکشاپ اور فوجی تربیت گاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چٹاگانگ بنگلہ دیش کا اہم تجارتی مرکز ہے۔ یہاں پٹ سن سے مختلف چیزیں تیار کرنے کے کئی کارخانوں کے علاوہ ٹیکسٹائل ملز، آئل ملز، ماچس اور چمڑا رنگنے کے کئی کارخانے ہیں۔ دریائے کرنافلی پر بند باندھ کر بجلی پیدا کی گئی ہے جو گھریلو استعمال اور کارخانے چلانے میں

مدد دیتی ہے ۔ چٹاگانگ میں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کئی مسلمان بزرگوں نے قیام کیا اور لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی ۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں پر اسلامی طرز معاشرت اور اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر ہے ۔

چٹاگانگ ڈویژن بنگلہ دیش کے پانچ مشرقی ضلعوں پر مشتمل ہے ۔ ان اضلاع کے نام چٹاگانگ، چٹاگانگ ہل ٹریکٹ، نواکھلی، کومِلا اور سلہٹ ہیں ۔ پورے ڈویژن میں چودہ سب ڈویژن اور تقریباً سترہ سو دیہات ہیں ۔ پٹ سن، چائے اور چاول اس علاقے کی مشہور فصلیں ہیں ۔ کچھ علاقے میں تیل کے بیج اور کپاس بھی
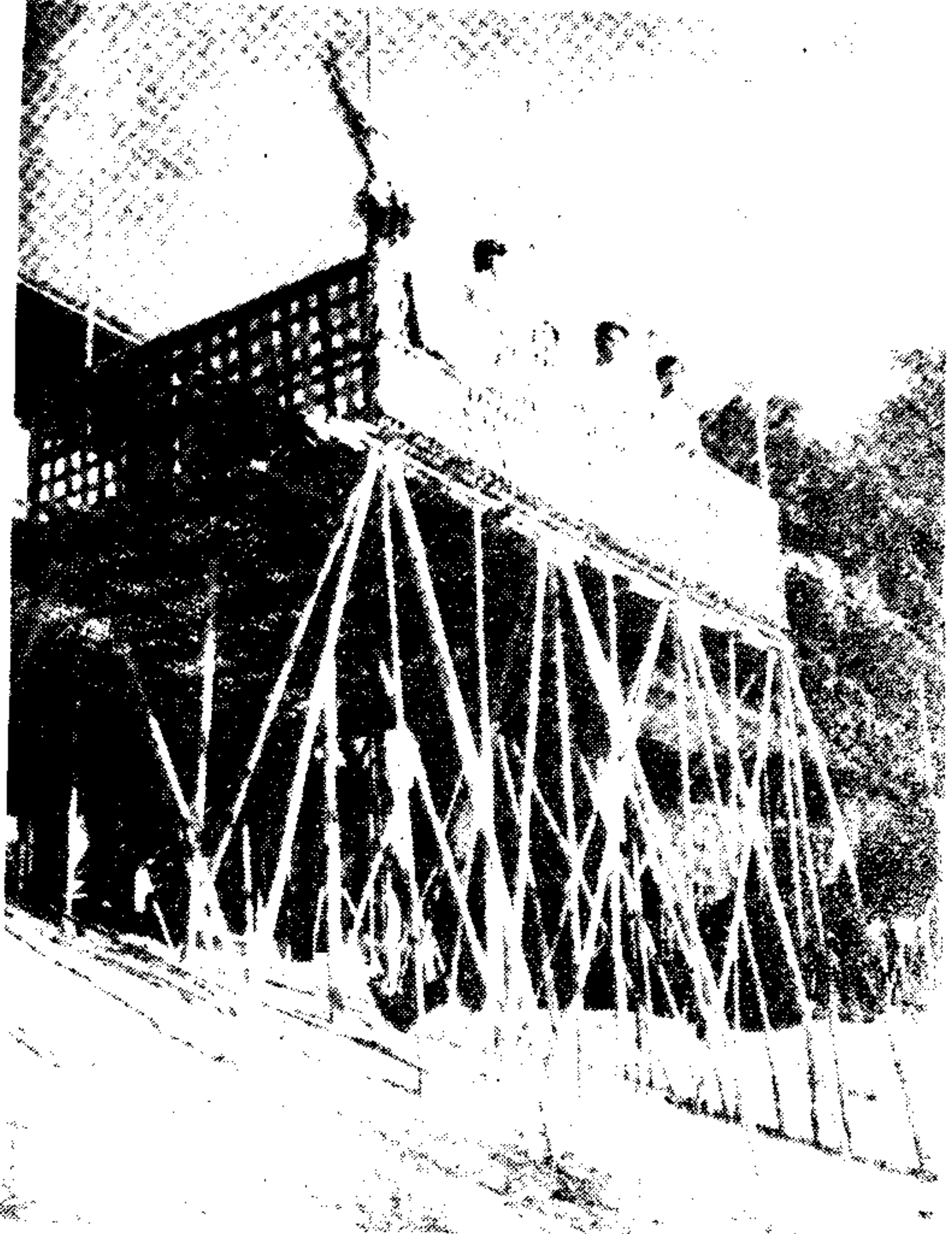
چین کا قومی عجائب گھر

پیدا ہوتی ہے ۔ زیادہ تر آمدورفت دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے ہوتی ہے چٹاگانگ کے جنگلات میں کئی طرح کی قیمتی لکڑی ہوتی ہے ۔ جس میں بید اور بانس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ کپڑا بننا ۔ بانس اور پٹ سن سے مختلف چیزیں تیار کرنا اس علاقے کی گھریلو صنعتیں ہیں ۔ چٹاگانگ ڈویژن میں مسلمان، ہندو، بدھ اور قبائلی لوگ آباد ہیں ضلع چٹاگانگ کی آبادی میں غیر ملکی کثرت سے ملے ہوئے ہیں ۔ ان میں عربی النسل لوگوں کی اچھی خاصی تعداد ہے ۔ چٹاگانگ کی بولی میں عربی کا اثر بھی زیادہ ہے

چراغاں ایک محل کا نام جو خلیج باسفورس کی یورپی جانب اشکطاش اور اورتہ کوی کے درمیان واقع ہے ۔ یہ محل سلطان مراد رابع نے اپنی بیٹی کیا سلطان کے لئے تعمیر کرایا تھا ۔ بعد میں سلطان احمد کے وزیر اعظم اور ابراہیم پاشا کے داماد نے اپنی بیوی فاطمہ سلطان کے لئے اسے دوبارہ تعمیر کرایا بعد میں سلطان احمد کے وزیر اعظم اور ابراہیم پاشا کے داماد نے اپنی بیوی فاطمہ سلطان کے لئے اسے دوبارہ تعمیر کرایا ۔ سلطان اکثر یہاں آتا تھا اور اس موقع پر اس محل میں چراغاں کیا جاتا تھا ۔

یہ محل تیسری بار سلطان مصطفیٰ ثالث نے اپنی دختر بیہمن سلطان کے لئے تیار کرایا ۔ اس مرتبہ یہ تمام کا تمام لکڑی سے تیار کرایا گیا تھا ۔ اس میں ۱۸۰ قدم لمبا ایک شاندار ایوان تھا ۔ اس کے علاوہ مختلف تقاریب کے لئے اور بھی ایوان تھے ۱۸۶۳ء میں سلطان عبدالمجید نے اس محل کو گروا دیا ۔ لیکن سلطان عبدالعزیز کے عہد میں اس کی تعمیر پھر نئے سرے سے شروع کی گئی ۔ جو ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی ۔ اس بار یہ پتھروں سے بنایا گیا ۔

۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالعزیز کی معزولی کے بعد سے خودکشی کے زمانے تک اسی محل میں نظربند رہا ۔ معزول سلطان مراد خامس کو اس محل میں ستائیس سال تک رکھا گیا ۔ بعد میں یہ محل کچھ تبدیلی کے بعد مجلس ملی کی عمارت کے طور پر بھی استعمال ہوتا رہا ۔ جہاں پر سینٹ اور مجلس نمائندگان کے اجلاس ہوتے تھے ۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۱۰ء میں آگ لگ جانے کی وجہ سے یہ محل ضائع ہو گیا ۔ آج کل اس کی دیواریں اور شاہی دروازے باقی ہیں ۔

چراغ دہلی (؟ ـــ ۷۲۸ھ/۱۳۶۷ء) ایک بہت بڑے بزرگ، صوفی اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کبار خلفاء میں سے تھے ۔ شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ ۔ آپ کے والد لاہور میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں اودھ میں جا کر سکونت اختیار کر لی ۔ چنانچہ آپ کی پیدائش اودھ ہی میں ہوئی ۔ آپ صحیح النسب سادات میں سے تھے ۔ نو سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا ۔ آپ کی پرورش آپ کی والدہ نے کی ۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالکریم شیروانی، مولانا افتخار الدین محمد گیلانی ہیں ۔

آپ کے بچپن ہی میں آثار ترک و تجرید نفس کشی آپ کی پیشانی سے ظاہر تھے پچیس سال کی عمر ہوئی تو ترک و تجرید کا طریقہ اختیار کیا ۔ اور محاسبہ نفس اور مجاہدہ اور ریاضت عبادت میں سات سال تک مشغول رہے ۔ پورے سات سال تک ایک درویش کامل کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی ۔ چالیس یا تینتالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور شیخ المشائخ نظام الدین محمد بدایونی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ۔ آپ کا دستور تھا کہ شب و روز کمربستہ خدمت پیر و مرشد میں حاضر رہتے تھے ۔ اس وقت حضرت نظام الدین کیلوکھڑی میں تشریف فرما تھے ۔ جو جمنا کے کنارے ایک بالاخانہ تھا ۔ چنانچہ آپ بھی پیر کی خدمت میں وہاں رہنے لگے ۔ اس کے بعد وطن جانے کا کچھ زیادہ اتفاق نہیں ہوا ۔ سوائے ایک مرتبہ والدہ محترمہ کی زیارت کے لئے گئے اور ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے یا پھر بہن کی دلجوئی کی خاطر گاہے گاہے شیخ کی اجازت سے وہاں گئے ۔

آپ کا دہلی میں قیام اپنے دوست شیخ برہان الدین غریب کے مکان پر تھا ۔ شیخ المشائخ حضرت نظام الدین نے ۲۰ر ذوالحجہ ۷۲۴ھ/۹ر نومبر ۱۳۲۴ء کو اپنے چند خلفا مقرر کئے اور اس واقعے کے تقریباً ۴ ماہ بعد وفات پا گئے ۔

آپ کو آپ کے مرشد نے اپنے پیر شیخ فریدالدین کا عطا کردہ خرقہ، مصلیٰ، تسبیح اور کاسہ چوبیں عنایت فرما کر دہلی میں اپنا جانشین مقرر کیا اور وصیت کی کہ اغیار کے آزار اور سرزنش پر صبر کیا کریں ۔

آپ اپنے مرشد کے بعد تقریباً بتیس سال تک زندہ رہے ۔ اس ساری مدت میں آپ اپنے پیر کا پورے طور پر اتباع کرتے رہے ۔

ایک بار کوئی آپ کی پوشاک چوری کر کے لے گیا ۔ آپ نے دم نہ مارا ۔ اور یہ وصیت

مرشد پابند رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن بعد نماز ظہر آپ حجرہ میں عبادت میں مشغول تھے۔ اور مراقبہ میں سر جھکائے ہوئے تھے کہ تراب نامی ایک قلندر بے باک کہ برسوں سے آپ کا دشمن تھا خالی موقع پا کر حجرہ میں گھس آیا۔ اور گیارہ زخم چھرے سے آپ کے جسم پر لگائے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مریدوں نے دیکھ کر اسے گرفتار کر لیا اور حضرت کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا اس سے کوئی مزاحمت نہ کرے نیز اس قلندر کو نزدیک بلا کر بہت کچھ دے کر رخصت کیا اور دوستوں سے کہا کہ اگر اس کو ایذا دی جاتی تو خلاف وصیت شیخ ہوتا۔ اس واقعے کے بعد آپ تین سال تک زندہ رہے۔ اور بعد میں مختصر سی علالت کے بعد انتقال فرمایا اور اپنے ہی گھر میں دفن ہوئے۔ آپ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ اور اپنے پیر سے خرقہ و قدح وغیرہ جو کچھ ملا تھا آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ آپ کا مزار سلطان فیروز شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔

آپ نے ساری عمر فقر، صبر اور تسلیم و رضا کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔ آپ سماع میں مزامیر سے اجتناب کرتے رہے۔ ایک واقعہ آپ کے بارے میں نقل ہے کہ ایک روز آپ کے کسی پیر بھائی کے گھر میں مجلس تھی۔ آپ بھی اسی مجلس میں موجود تھے کہ باجے کے ساتھ سماع شروع ہوا۔ آپ وہاں سے اٹھ کر چلے۔ دوستوں نے کہا بیٹھو۔ آپ نے فرمایا میں نہ ٹھہروں گا۔ یہ امر خلاف سنت ہے۔ لوگوں نے کہا کیا سماع سے منکر ہو۔ اور مشرب پیر سے پھر گئے ہو۔ آپ نے فرمایا یہ کوئی حجت نہیں۔ دلیل تو کتاب و سنت سے چاہیے جب اس بات کا ذکر آپ کے مرشد سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کا اتقا بڑھا ہوا ہے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی اور ان کے اکثر خلفاء کا طریق یہ تھا کہ شریعت کا اتباع پوری طرح کیا جائے اور علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول رہا جائے۔

آپ بڑے عابد و زاہد تھے حالات عالیہ اور مکاشفات جلیلہ رکھتے تھے۔ طریقہ آپ کا صبر و شکر، فقر و رضا و تسلیم تھا۔

آپ نے کوئی اپنی تصنیف نہیں چھوڑی البتہ حمید شاعر قلندر نے جو آپ کے خدمتگاروں میں سے تھا آپ کے ملفوظات جمع کئے۔ اور اس کتاب کا نام خیر المجالس رکھا۔

آپ کے مریدین میں سید محمد جعفر، قاضی عبدالمقتدر، سید محمد بن یوسف المعروف بہ گیسو دراز، سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں، مولانا احمد تھانیسری، اخی سراج پروانہ مولانا حسام الدین ہنروالی اور محمد وجیہ الدین ادیب وغیرہ ہیں

آپ کے چند ایک ارشادات درج ذیل ہیں۔

جو شخص ذکر الٰہی کرتا ہے خدا اس کا جلیس ہوتا ہے۔

راتوں کو بیدار رہو، اس لئے کہ نزول انوار اکثر راتوں ہی میں ہوا کرتا ہے۔

جو اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے اسے طاعت میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

سالک کو عبادت میں ذوق و شوق حاصل ہو تو یہی اس کی غذا بن جاتا ہے اگر یہ حاصل نہ ہو تو پھر عبادت اس کے لئے اشتہا کا باعث ہوتی ہے۔

اگر طلب دنیا میں خیر کی نیت ہو تو وہ فی الحقیقت طلب آخرت ہے

چراگاہ زمین کے وہ قطعات جو اس غرض سے آباد نہ کرنے دیئے جائیں کہ ان میں گھاس اور چارہ اُگے اور جانوروں کے چرنے کے لئے مباح ہو

آنحضورؐ نے اپنی حیات طیبہ میں مدینہ منورہ میں ایسا کیا تھا۔ آپ بقیع میں ایک پہاڑی پر چڑھے۔ آپؐ نے میدان کی طرف جس کی مقدار ۶×۱ میل تھی اشارہ کر کے فرمایا یہ میری حمیٰ (چراگاہ) ہے۔ اس چراگاہ کو آپؐ نے مہاجرین و انصار کے گھوڑوں کے چرنے کے لئے روک دیا تھا۔

آپؐ کے بعد آپ کے خلفاء کے بارے میں یہ بات ہے کہ اگر وہ تمام بنجر یا اکثر کو خاص لوگوں یا مالداروں کے لئے چراگاہ بنائیں تو جائز نہیں۔ اور اگر عام مسلمان یا فقراء و مساکین کے لئے بنائیں تو اس بارے میں دو قول ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے کیونکہ چراگاہ بنانے کا حق آنحضورؐ کو تھا۔ صعب بن جثامہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے بقیع کو چراگاہ بناتے وقت یہ فرمایا تھا کہ چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آپؐ کے بعد آئمہ (خلفاء) کا چراگاہ بنانا جائز ہے کیونکہ آپؐ کو مسلمانوں کی مصلحت مدنظر تھی نہ کہ ذاتی منفعت یہی آپؐ کے خلفاء نے کیا۔ مثلاً ابوبکر صدیقؓ نے ربذہ میں اہل صدقہ کے لئے چراگاہ تجویز کی اور اس پر اپنے مولیٰ ابوسلامہ کو عامل مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ نے سرف میں چراگاہ مقرر کر کے اس پر اپنے مولیٰ ہنی نامی کو عامل بنایا تھا اور نصیحت کی تھی کہ اے ہنی لوگوں پر دست درازی نہ کر۔ مظلوم کی بددعا سے ڈر اس کی بددعا قبول ہوتی ہے اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے چرواہوں کو داخل ہونے دے۔ ابن عفان اور ابن عوف کے چوپایوں کو نہ چھیڑ اگر ان کے جانور ہلاک ہونے لگے تو کھجوروں اور کھیتوں کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور اونٹ اور بھیڑ بکری کے چرواہے میرے پاس آکر یہ شکایت کریں گے اے امیر المومنین! آپ نے یہ کیا کیا۔ کیا میں ان کو یونہی برباد ہونے چھوڑ دوں گا۔ مجھے درہم و دینار سے گھاس دینا سہل ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں جان ہے کہ اگر میں ان سے فی سبیل اللہ مال نہ لیتا تو ان کی بالشت بھر زمین بھی چراگاہ نہ بناتا اور آپ کے ارشاد کا کہ حمیٰ (چراگاہ) صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔ یہ مطلب ہے کہ چراگاہ صرف اسی طرح ہے جس طرح اللہ اور رسول نے فقراء اور مساکین اور عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے بنائی۔ نہ زمانہ جاہلیت کی طرح جب کہ لوگ زور قوت سے اپنے لئے مخصوص کر لیتے تھے۔ جیسے کلیب بن وائل کا طریقہ تھا کہ کسی جگہ کتے کو باندھ دیتا اور جہاں تک اس کے بھونکنے کی آواز جاتی اس کو چاروں طرف سے اپنی چراگاہ مخصوص قرار دیتا اور دوسری چراگاہوں میں لوگوں کا شریک رہتا۔

جب زمین کو چراگاہ بنا دیا جائے اور اسے آباد کرنے کی ممانعت کر دی جائے تو پھر اس پر چراگاہ کا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ اگر سب کے لئے ہو تو امیر و غریب مسلمان اور ذمی کو اپنے جانور چرانے کا حق ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے لئے خاص ہو تو ذمیوں کو امیر و غریب کو حق ہے ذمیوں کو ممانعت ہے۔

کسی قطعہ زمین کو حمیٰ قرار دینے کے بعد اگر کوئی شخص اس زمین کو آباد کر لے جس سے چراگاہ کا رقبہ کم ہو جائے تو اگر وہ آنحضورؐ کی تجویز کردہ ہو تو وہ چراگاہ ہی رہے گی اور آباد کرنا باطل ہے آباد کنندہ کو سزا دی جائے۔ اور اگر آپ کے بعد والوں میں سے کسی کی تجویز کردہ ہو تو کھیتی باقی رکھنے کے متعلق دو قول ہیں۔

ایک تو یہ کہ آباد نہ رکھی جائے آنحضورؐ کی چراگاہ کے مثل اس کا حکم ہے کیونکہ صحیح نافذ شدہ حکم سے چراگاہ قرار دی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ آباد رہنے دی جائے۔ کیونکہ آپ کا ارشاد صحیح ہے کہ جو شخص بیکار زمین کو آباد کرے وہ اس کی مالک ہے۔

کسی حاکم کو یہ جائز نہیں کہ چراگاہ یا بے کار زمینوں میں جانور چرانے پر لوگوں سے معاوضہ لے۔ آنحضورؐ کا فرمان ہے کہ تین چیزوں میں سب مسلمان شریک ہیں پانی، آگ، چارا۔

چــــرکس اس لفظ کا اطلاق چند گروہوں پر ہوتا ہے جو نواح انجاز، نواح بزہ اور بحر اسود سے مل کر آئبیر (قفقازی) قوم کی شمال مغربی یا ابسکو اور

شاخ بن گئے ہیں۔

چرکس قوم کے آباؤ اجداد بحر ازوف اور بحر اسود کے ساحلوں پر اور دریائے قوبان کے جنوب اور شمال کے میدانوں میں رہتے تھے۔ اور شاید دریائے ڈان تک پھیلے ہوئے تھے۔

دسویں صدی عیسوی میں روسی لوگ جزیرہ نمائے تمان ریاست تمترکن میں آباد ہوئے تو ان کا رابطہ چرکس سے شروع ہوا۔ جنہیں روسی وقائع نگار "کسگ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک شمال مغربی کاکیشیا التون اردو کے زیر نگین تھا جب مؤخر الذکر کو زوال آ گیا تو مشرقی چرکس قبائل نے تاریخ قفقاز میں حصہ لینا شروع کیا۔

سولہویں صدی عیسوی میں ملوک قباردای نے ماسکو کے حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے ایوان چہارم کی دوسری بیوی چرکس شہزادی تھی۔ سترہویں صدی میں قباردای قبائل نے اہل قفقاز کے متحدہ گروہ کی قیادت کی۔ اس عہد سے چرکس کو یہاں بالادستی حاصل ہو گئی۔

انیسویں صدی کے وسط میں روسی فتح سے پہلے چرکس قبائل جو تعداد میں دس لاکھ سے زائد تھے۔ شمال مغربی کاکیشیا اور بحیرہ اسود کے مشرقی ساحل کے ایک حصے اور جزیرہ نمائے تمان میں انجازیہ کے نواح تک میں آباد تھے۔ ان کے بڑے بڑے قبائل یہ تھے۔

مغربی قبائل: ناتخواج، شاپشگ، ادغہ، موخوش، قرکوے، بجدخ، حاتوقای، بسلنی۔

مشرقی قبائل: یا قبارد جو دو گروہوں قباردای الکبریٰ اور قباردای الصغریٰ میں منقسم تھے۔ تزواج اور آبازہ کو بھی ان قبائل میں شمار کر لینا چاہیے۔

اس ملک پر جب روسیوں نے فتح پالی تو مغربی چرکسوں کا بیشتر حصہ ۱۸۶۴ء ۱۸۶۵ء میں ترکی میں نقل مکانی کر گیا اور بہت قلیل تعداد روس میں رہ گئی۔

۱۸۶۵ء کی نقل مکانی کے بعد قبائلی اختلافات تیزی سے کم ہوتے گئے اور روس میں رہ جانے والے قبائل منتشر عناصر نے ادغہ قوم کی چھوٹی سی وحدت کی صورت میں اپنے آپ کو متحد کر لیا۔ موجودہ دور میں صرف مندرجہ ذیل قبائل اپنی بولی اور رسم رواج کی بعض خصوصیات اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

ابادزخ، ابزاخ، بجدوخ، شاپسگ۔

چرکسی حنفی المذہب سنی مسلمان ہیں اسلام سولہویں صدی میں پہلے قباردوں پھر سترہویں صدی میں ادغہ میں کریمیا کے تاتاریوں کے ذریعے پھیلا۔ لیکن اس کے نفوذ کی رفتار سست تھی اور پہلے وہ جاگیردار طبقہ امراء میں پھیلا۔ اٹھارہویں صدی میں کہیں جا کر کریمیا کے خانوں اور آنا پہ کے ترکی پاشاؤں کی بدولت تمام قوم نے اسلام قبول کر لیا اور اس نے عیسائیت اور قدیم بت پرستی کی جگہ لے لی۔ اسلام قبول کرنے سے قبل چرکس زرعی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔

روس میں خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد ہی یہ نوبت آئی کہ روسی حکومت چرکس سے آباد علاقوں میں قائم ہوئی۔ چرکس تین علاقائی وحدتوں میں تقسیم کیے گئے۔

۱۔ ادغہ کا خود اختیار خطہ:۔ دریائے قوبان اور اس کے معاونوں کے طاس میں جو کہ سفوور کے خطے سے متعلق ہیں ۲۷ جولائی ۱۹۲۲ء کو اسے ادغہ چرکس کے خود اختیار خطے کا نام دیا گیا۔ اس خطے کا رقبہ ۴۴۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ اس خطے کا دارالحکومت میکوف ایک روسی شہر ہے

۲۔ قرہ چای چرکس کا خود اختیار خطہ:۔ زلن چک کلاں اور خزدکی مرتفع وادیوں کا علاقہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو معرض وجود میں آیا۔ اس کا رقبہ ۱۴۲۰۰ مربع کلومیٹر ہے

۳۔ قبارد وبلکر خود اختیار سوویت اشتراکی جمہوریہ۔ وسطی قفقاز کے کوہستانی حصے میں ہے یکم ستمبر ۱۹۲۱ء میں اس کی تشکیل دی گئی۔ اور خود اختیار خطہ قبارد کا نام دیا گیا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو بلکر کے قومی شہری ضلع کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا رقبہ ۱۲۴۰۰ کلومیٹر ہے۔ دارالحکومت نلچک ہے۔

چرکس مختلف زمانوں میں۔

چرکس عہد ممالیک میں: آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی کے آخری عشروں سے لے کر ملوک سلطنت کے خاتمے تک ممالیک کے عسکری معاشرے میں چرکس ایک غالب عنصر تھے۔ وہ اس سلطنت کے ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں قیام ہی کے وقت سے بخوبی نمایاں تھے۔ وہ برجیہ کی فوجی جمعیت میں جس کی بنیاد سلطان قلاوون نے رکھی تھی۔ ایک بہت ہی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ قپچاق ترک جو ایک سو تیس سال تک حکمران رہے چرکسوں سے ان کی جاہ طلبی خود سری اور انتشار و فساد پھیلانے کے رجحان کے سبب سخت خوفزدہ رہتے تھے۔

سلطان برقوق نے جو بذات خود چرکس اور برجیہ سپاہ کا رکن تھا، چرکس ملوکوں کو روز افزوں تعداد میں باقاعدہ طریقے سے خرید کر اور اس کے ساتھ ہر دوسری قوموں کے مملوکوں کی خرید کو سختی سے کم کر کے اپنی قوم کو حتمی فتح دلائی۔ اسے بجا طور پر چرکس حکومت کا بانی کہا جاتا ہے بقول قلقشندی (جو ایک قدیم مصنف ہے) "ہمارے زمانے میں بیشتر امیر اور فوجی چرکس ہیں۔ مصر کے ترکی مملوک تعداد میں اتنے کم ہو گئے ہیں کہ ان کے صرف چند باقی ماندہ لوگ اور ان کے بچے رہ گئے ہیں۔"

ملوک ماخذ قپچاق ترکوں کے انحطاط کی بنا پر چرکسوں کے عروج کا ذمہ دار زیادہ تر ان عوامل کو ٹھہراتے ہیں جو خود مملوک سلطنت کے اندر موجود تھے۔ اگرچہ وہ عوامل بھی جو (مصر کے باہر) مملوکوں کے اصل وطنوں میں کارفرما تھے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ہو سکتا ہے کہ چرکسوں نے اس سلطنت کے زوال کا عمل تیز کر دیا ہو۔

بعد کے عہد مملوکی میں چرکس نسل کا غلبہ ابتدائی دور کے قپچاق۔ ترکی غلبے سے زیادہ قوی اور ہمہ گیر تھا۔ قپچاق ترکوں کے برعکس چرکس دوسرے مملوک گروہوں کے سخت دشمن تھے جن کی سیاسی اہمیت کو انہوں نے ختم کر دیا۔ مملوکوں کی کوئی دوسری جماعت نسلی وحدت اور نسلی فوقیت کے جذبات سے ان سے زیادہ سرشار نہ تھی۔ ان کے عہد میں القوم کا اطلاق صرف چرکسوں پر ہوتا تھا جو ساری کی ساری مملوک اقوام میں سے چرکسی ہی ایک ایسی قوم تھی جسے یہ دعوے تھا کہ ان کا سلسلہ نسب عرب قبیلے بنو غسان سے ملتا ہے۔ یہ قبیلہ ہرقل کے شام سے پسپائی کے وقت جبلۃ بن الایہم کے ساتھ بلاد الروم میں داخل ہوا تھا۔

چرکس عثمانی عہد میں: عثمانی ترکوں نے بحرہ اسود کے ساحلوں کا اہل جنیوا کو ہٹا کر آنا پہ اور کبہ پر ۸۸۴ھ / ۱۴۷۹ء میں قبضہ کر لیا۔ لیکن اندرونی علاقوں میں چرکس قبائل بدستور کریمیا کے خانوں کے ماتحت رہے۔ جو اپنے بیٹوں کو چرکسوں کے ہاں تربیت دلانے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ اس رسم اور سلاطین کریمیا کی چرکسی امیرزادیوں کے ساتھ شادیوں کی وجہ سے ان کے چرکسوں کے ساتھ تعلقات استوار ہو گئے۔ کریمیا کے خوانین اپنے آپ کو فرمانروائے "طائع آرا چرکس" یا چرکاچ کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔

چرکسوں کا ملک "دشت" سے آنے والے تاتاری نوغائی قبیلوں کی پناہ گاہ کا کام بھی دیتا تھا۔ جو ان سے گھل مل جانے کی غرض سے عموماً یہاں خصوصاً دریائے قوبان کے طاس اور جزیرہ نمائے تامان میں آتے رہتے تھے۔ تاتاری چرکسی تعلقات کی استواری کے نتیجے میں اسلام چرکسوں میں پھیل گیا۔ لیکن بقول اولیا چلبی ۱۰۶۷ھ / ۱۶۶۵ء میں بھی بہت سے قبائل ہنوز غیر مسلم تھے۔

عثمانی سلاطین چرکسوں پر کریمیا کی بادشاہی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن وہ چرکسی سرداروں

کو اپنے متوسل بیگ سمجھ کر انہیں احکام بھیجتے اور خطابات دیتے رہتے تھے۔ ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۰ء میں سلیم ثانی نے زار روس کو لکھا کہ وہ چرکسوں کے معاملے میں جو اس کی رعایا ہیں کوئی مداخلت نہ کرے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل سے چرکستان کو روسی سلطنت کی روزافزوں توسیع کی وجہ سے سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ تو چرکس عثمانی ترکوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے لگے۔

۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء میں چرکسوں نے دریائے قوبان کے دوسرے کنارے پر روسی فوجوں کو پسپا کر دیا لیکن ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء کے عہد نامہ قینچ - قینرجہ کی رو سے عثمانی ترکوں نے کریمیا کی تاتاری ریاست کی آزادی کو اس کے مقبوضات سمیت جو دریائے قوبان کے شمال میں تھے اور جنہیں ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء میں روس نے اپنے ساتھ ملحق کر لیا تھا تسلیم کر لیا۔ قبارطای ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں پہلے ہی سے روسیوں کے تحت آ چکے تھے۔

فرح علی پاشا نے ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء تا ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء جو غیر معمولی قابلیت کا ناظم تھا۔ عثمانی سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اس غرض سے کی کہ وہ چرکسوں سے ازدواجی رشتے قائم کریں جس سے عثمانی اثر و نفوذ بڑھے اور چرکسوں میں اشاعت اسلام کو تقویت حاصل ہو۔ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء کے ادرنہ کے صلح نامہ کی رو سے عثمانی ترکوں کو روس کے حق میں چرکستان پر اپنے حقوق سے دستبردار ہونا پڑا۔ پھر بھی چرکسوں نے حملہ آوروں کے خلاف ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء تک شدید جدوجہد جاری رکھی۔ اور عثمانی اطلاع کے مطابق ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء اور ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء کے درمیان ۵۹۵۰۰۰ چرکسی اپنے ملک سے ہجرت کر کے ترکی چلے گئے۔ انہیں اناطولی اور روم ایلی میں بسا یا گیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے بعد تک چرکسی غلام عثمانی نظام "قول" میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور بہت سے چرکسی حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

چشتی، ابو یوسف، خواجہ

(۳۷۵ھ/ ۹۸۵ء - ۴۵۹ھ/ ۱۰۶۶ء) ایک صوفی بزرگ۔ آپ کا لقب ناصر الدین تھا۔ والد بزرگوار کا نام محمد سمعان تھا اور والدہ کا نام عصمت خاتون تھا۔ جو خواجہ ابو محمد کی ہمشیرہ تھیں اور بڑی نیک اور زاہدہ تھی۔ خواجہ ابو محمد کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے خواجہ ابو یوسف کی پرورش اور تربیت آپ نے کی اور اپنے بعد انہیں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔

خواجہ ابو یوسف علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہو کر تھوڑے ہی عرصہ میں علم و فضل اور معرفت و حقیقت کے بلند درجہ کو پہنچ گئے۔ علم کی تحصیل سے فراغت پا کر آپ نے حضرت خواجہ ابو محمد ہی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ خواجہ نے فرمایا اے فرزند سات بار میرا نام لے کر آسمان کی طرف دیکھ۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو تحت الثریٰ تک نظر آ گیا۔ حضرت خواجہ کی نظر فیض کے اثر سے آپ پر علوم ربانی منکشف ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا کر کے جانشین مقرر کیا۔ مرشد کی وفات کے بعد آپ نے رشد و ہدایت کا فرض سنبھالا اور بہت سے لوگوں کو مقصود حقیقی تک پہنچایا۔

آپ ہمیشہ فقر و فاقہ میں رہتے تھے۔ لباس پھٹا پرانا ہوتا تھا۔ ہمیشہ فقراء کے ساتھ رہتے اور انہیں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اگر کوئی اہل دنیا آپ کی مجلس میں آ جاتا تو چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ اس لیے کہ اہل دنیا سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ آپ روتے تھے اور فرمایا کرتے تھے اے اللہ میں فقیر اور مسکین ہوں پچاس سال کی عمر میں ایک تہہ خانے میں جو خود تیار کرایا تھا گوشہ نشین ہو گئے اور بارہ سال تک ریاضت کرتے رہے۔ یہ عبادت گاہ اب بھی موجود ہے اور لوگ اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

آپ کا مزار چشت میں ہے۔ قطب اقطاب مودود چشتی آپ ہی کے صاحبزادے تھے اور آپ ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔

چشتی، خواجہ معین الدین حسن

(۵۳۶ھ/ ۱۱۴۱ء - ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء) نامور اور اکابر اولیاء میں سے ایک۔ ہندوستان میں سلسلہ چشت کے بانی۔ سیستان کے قصبہ سنجر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ غیاث الدین حسن بہت دولت مند تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے عابد و زاہد تھے نسب کے لحاظ سے آپ نجیب الطرفین سید تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

"خواجہ معین الدین بن غیاث الدین بن سید کمال الدین بن سید احمد حسین بن سید طاہر بن سید عبدالعزیز بن سید ابراہیم بن امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی بن امام زین العابدین بن امام حسینؓ بن علیؓ۔

بیس سال کی عمر میں ان کے والد سید غیاث الدین انتقال کر گئے۔ غز ترکوں کے ہاتھوں سیستان کی تاخت و تاراج کے بعد وہ احوال باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلک صوفیہ کی جانب بہت قوی رجحان پیدا ہو گیا۔

والد نے ترکے میں ایک باغ اور ایک چکی چھوڑی۔ چنانچہ آپ نے باغبانی کو ذریعہ معیشت بنایا۔ آپ سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ درختوں کو پانی دیتے، زمین ہموار کرتے۔ پودوں کی کانٹ چھانٹ عمل میں لاتے اور خود ہی پھلوں کو فروخت کرتے۔ ایک روز آپ اپنے باغ میں آرام فرما رہے تھے کہ ابراہیم قندوزی ایک مشہور بزرگ جو مجذوب بھی تھے باغ میں تشریف لائے۔ اور تھوڑی دیر میں خواجہ صاحب کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اب آپ احوال باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلک صوفیہ کی جانب بہت قوی رجحان پیدا ہو گیا۔ سارا مال و اسباب راہ خدا میں دے دیا اور خدا پر توکل کر کے تن تنہا نکل کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے سمرقند و بخارا پہنچے جو ان دنوں اسلامی علوم و فنون کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ وہاں کی درسگاہوں میں اس زمانے کے ممتاز علماء سے مذہبی علوم کی تحصیل کی۔ عراق جاتے ہوئے قصبہ ہارون سے گذر ہوا جو ضلع نیشاپور میں واقع ہے۔ یہاں پر خواجہ عثمان سے ملاقات ہوئی اور ان کے مریدوں کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ تعلیم و تربیت کی غرض سے بیس سال تک اپنے مرشد کے ہمراہ سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اس کے بعد خود سیاحت کے لیے نکلے۔ دوران سفر مشاہیر مشائخ و علماء سے ملاقات کی۔ ان بزرگوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ نجیب الدین، عبدالقاہر سہروردی، شیخ ابو سعید تبریزی، شیخ عبدالواحد غزنوی جیسی مشہور و معروف شخصیات تھیں۔ آپ نے مملکت اسلامیہ کے تقریباً تمام بڑے مرکزوں کی جو اس عہد میں موجود تھے۔ سیاحت کی اور وہاں کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے تقریباً تمام رجحانات سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ کچھ عرصہ لاہور میں رہے اور کچھ وقت حضرت علی ہجویری کے مزار پر مراقبے میں صرف کیا۔ یہاں سے اجمیر پہنچے۔ آپ نے اجمیر ہی میں شادی کی۔ بقول عبدالحق دہلوی آپ نے دو شادیاں کیں ان میں سے ایک زوجہ ہندو راجہ کی لڑکی تھی۔ آپ نے اجمیر میں وفات پائی۔ اور یہیں پر آپ کا مزار ہے۔ جس کا ہندو مسلمان احترام کرتے ہیں۔ عرس کے موقع پر پاک و ہند سے لاکھوں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں تین لڑکے ابو سعید فخر الدین، ابوالخیر ضیاء الدین، شیخ حسام اور ایک بیٹی

بی بی جمال تھیں۔

آپ کی درگاہ کے احاطے میں بہت سی عمارتیں شامل ہیں۔ دروازے، مسجدیں، مسافر خانے، لنگر وغیرہ مالوے کے فرمانرواؤں، مغل شہنشاہوں، رئیسوں، سوداگروں اور صوفیوں نے گذشتہ صدیوں میں وہاں پر تعمیر کرائے۔

محمد بن تغلق جو دہلی کا پہلا فرمانروا تھا جس نے خواجہ صاحب کے مزار پر حاضری دی۔ مالوے کے خلجی سلاطین نے اسی ولی اللہ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ان کا مزار ملک کی سب سے بڑی زیارت گاہ کے طور پر شہرت پا چکا تھا۔

خواجہ صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے جو کام انجام دیا وہ معمولی نوعیت کا نہیں اور نہ ہی کسی معمولی انسان کا کام ہے۔

آپ ہی نے ہندوستان میں سلسلہ چشت کی بنیاد رکھی۔ آپ دو مرتبہ دہلی آئے۔ لیکن آپ نے سیاسی قوت کے اس مرکز سے اپنے آپ کو دور ہی رکھا اور خاموشی سے اس ملک میں ایک فکری انقلاب کی بنیاد رکھی۔

آپ کی تصانیف کے ضمن میں کئی ایک کتابوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن ایک کتاب کے بارے میں تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ "انیس الارواح" آپ ہی کی تصنیف ہے۔ دوسری کتابوں کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

آپ کے خلفاء میں خواجہ برہان الدین، شیخ حمید الدین ناگوری، بی بی حافظ
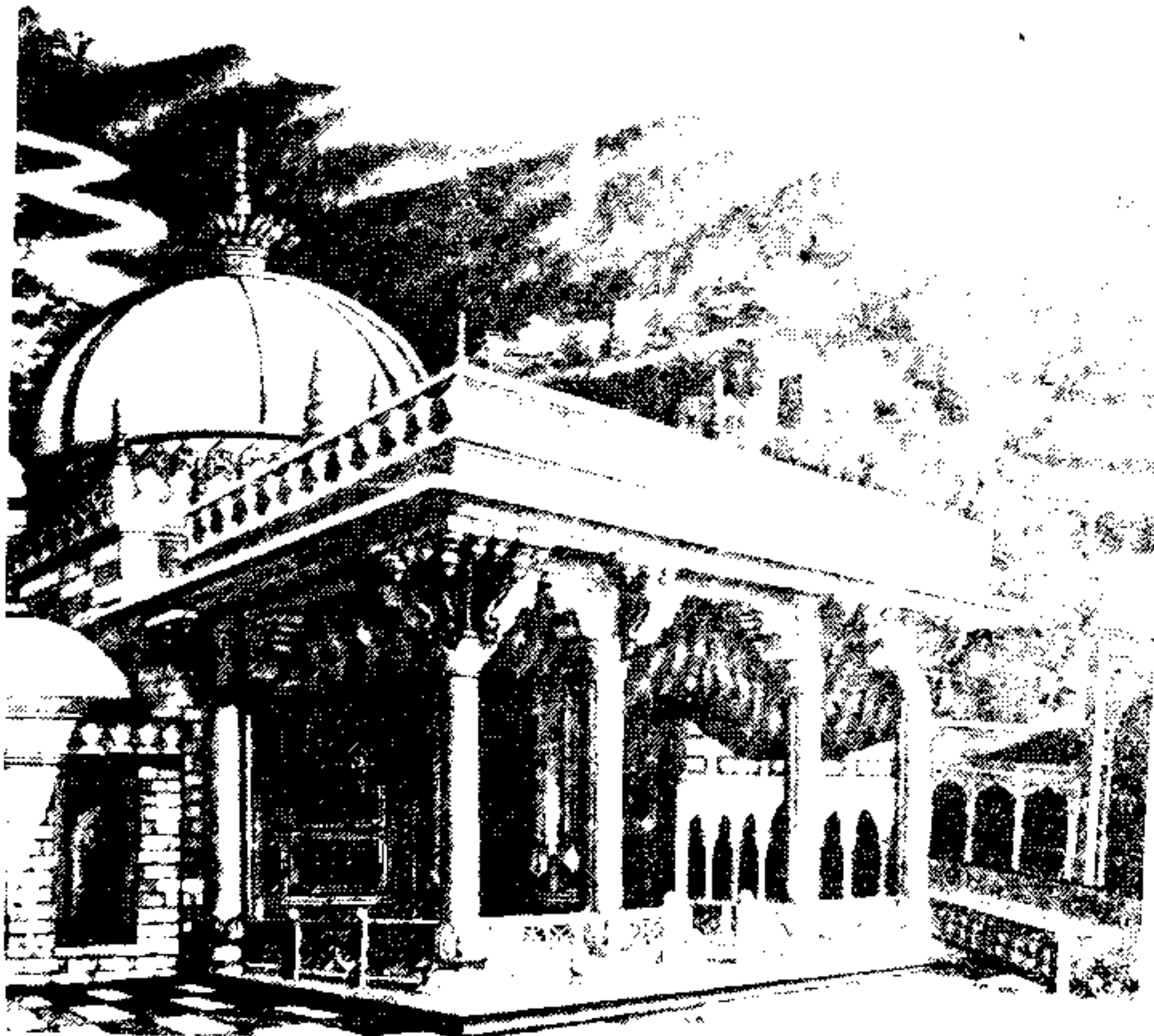
مزار خواجہ معین الدین چشتیؒ

جمال، شیخ وجیہہ الدین، سلطان مسعود غازی، شیخ وحید الدین خرسانی وغیرہ ہیں

آپ کے بعض ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بڑے صاحب دل، وسیع المشرب اور نہایت دردمند انسان تھے۔ آپ عمیق جذبہ انسانیت کے علمبردار تھے۔ آپ کے نزدیک مذہب کے معنی خدمت خلق کے تھے۔ اپنے مریدین کو تعلیم دیتے تھے کہ وہ اپنے اندر دریا کی سی فیاضی، سورج جیسی گرم جوشی، زمین جیسی مہمان نوازی پیدا کریں۔"

تصوف کے چار بڑے سلسلوں میں سے ایک۔

چشتیہ اس سلسلے کے نام کی نسبت چشت سے ہے جو ہرات کے قریب ایک گاؤں (چشت) ہے۔ جہاں پر اس سلسلے کے حقیقی بانی خواجہ ابواسحاق شامی اپنے مرشد خواجہ ممشاد علو دینوری کے حکم کے مطابق آکر آباد ہوئے۔ اس سلسلے کا شجرہ اس طرح ہے۔

ابواسحاق ممشاد علو دینوری، امین الدین ابی ھبیرہ البصری، سدید الدین حذیفتہ المرعشی، ابراہیم ادھم بلخی، ابوالفیض فضیل بن عیاض، ابوالفضل عبدالواحد بن زید، حسن البصری، علی بن ابی طالب، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

خواجہ معین الدین چشتی اس سلسلے کو چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں لائے۔ اور اجمیر میں چشتی صوفیہ کا مرکز قائم کیا۔ یہاں سے یہ سلسلہ ہندوستان کے اطراف و اکناف میں پھیلا۔

خواجہ معین الدین اس سلسلے کے بانی تک مندرجہ ذیل روحانی پیشواؤں کے سلسلے سے پہنچتے ہیں۔

معین الدین حسن، عثمان ہارونی، حاجی شریف زندانی، مودود چشتی، ابی یوسف ابی محمد، ابن احمد، ابی احمد بن فرسنفہ، ابواسحاق شامی۔

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کی سرگرمیوں کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ مشائخ کا ادوار جو تقریباً ۵۹۵ھ / ۱۲۰۰ء سے ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء تک ہے۔

۲۔ صوبائی خانقاہیں۔ آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی سے نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی تک ہے۔

۳۔ سلسلہ صابریہ کا عروج۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی سے آگے تک۔

۴۔ سلسلہ نظامیہ کا احیاء۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی سے آگے تک۔

پہلے دور کے صوفیا نے اپنی خانقاہیں زیادہ تر راجپوتانہ، یوپی اور پنجاب میں قائم کیں۔ اس عہد میں یہ سلسلہ ایک بہت ہی زیادہ مربوط مرکزی نظام پر قائم رہا۔ محمد بن تغلق نے جب صوفیا کو ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہونے پر مجبور کیا تو اس کی اس حکمت عملی نے چشتیوں کے مرکزی نظام کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اور اس سلسلہ چشتیہ کی مرکزی تنظیم کا شیرازہ بکھر گیا اور صوبائی خانقاہیں جو کسی مرکزی نظام کے تحت نہ ہوتی تھیں معرض وجود میں آگئیں۔

اس دوسرے دور میں پہلے صوفیا کی روایات ترک کر دی گئیں۔ اور یہ آسان نظریہ اپنا لیا گیا کہ صوفیاء کو بادشاہوں اور اعلیٰ منصب داروں کا ہم نشین ہونا چاہیے۔ تاکہ ان پر اچھا اثر ڈال سکیں۔ جب کہ پہلے دور کے صوفیاء بادشاہوں سے دور رہتے تھے۔

اس دور میں شیخ سراج الدین المعروف بہ اخی سراج نے بنگال میں اس سلسلے کی بنیاد رکھی۔ جب کہ شیخ برہان الدین غریب نے اس سلسلہ کو دکن میں روشناس کرایا۔ گجرات میں اس سلسلے کی نیو ڈالنے والے خواجہ قطب الدین کے دو مرید شیخ محمود اور شیخ حمید الدین ہیں۔ مالوے میں شیخ نظام الدین اولیا کے مریدین شیخ وجیہ الدین یوسف شیخ کمال الدین اور مولانا مغیث الدین نے اس سلسلے کو منظم کیا۔

اس سلسلے کی صابریہ شاخ کے بانی کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ اس شاخ کے اہم مراکز کلیر، پانی پت، ردولی، گنگوہ، تھانیسر، جھنجھانہ، الہ آباد، امروہہ، دیوبند، تھانہ بھون اور نانوتہ تھے۔ شیخ عبدالقدوس اس شاخ کے مشہور و معروف فرد تھے۔

۱۔ مشائخ عظام کا عہد

معین الدین حسن
(م ۱۲۳۶ء)
اجمیر

قطب الدین بختیار
(م ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) دہلی

حمید الدین صوفی
(م ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء) مہلی

فرید الدین گنج شکر
(م ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء) پاک پٹن

بدر الدین غزنوی دہلی
امام الدین ابدال
شہاب الدین عاشق دہلی

نظام الدین اولیا
(م ۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء)
دہلی

جمال الدین
(م قبل از ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء)
ہانسی

نجیب الدین متوکل
(م ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء)
دہلی

علاء الدین
علی بن احمد صابر
کلیر

نصیر الدین چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء)
مولانا مؤید الدین (م تقریباً ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء)
شمس الدین یحییٰ
علاء الدین نیلی

قاضی محی الدین کاشانی
(م تقریباً ۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء)
فخر الدین زرادی
شہاب الدین امام
رکن الدین
مسعود بک
(م ۸۳۹ھ/۱۴۳۲ء)

چشتیہ سلسلے کی نظامیہ شاخ کا احیاء شاہ کلیم اللہ جہان آبادی نے کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی تصوف کے لئے وقف کردی اور سلسلۂ چشتیہ کو جو تقریباً مردہ ہو چکا تھا، نئے سرے سے زندہ کیا۔

نظریات:۔ قدیم چشتی صوفیائے ہند شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب "عوارف المعارف" کو سب سے اہم تصنیف سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے کا بنیادی تصور "وحدت الوجود" تھا۔ ذاتی جائداد پر قبضہ رکھنے کو چشتیہ توکل علی اللہ کے منافی سمجھتے ہوئے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ تمام دنیاوی

۳۔ سلسلۂ صابریہ کا عروج

شیخ علاء الدین علی بن احمد صابر
(م ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء) (کلیر)
شمس الدین ترک (پانی پت)
جلال الدین محمود (پانی پت)
احمد عبد الحق
(م ۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء) (ردولی)
شیخ عارف (ردولی)
شیخ محمد

عبد القدوس
(م ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) (گنگوہ)

شیخ بدھ

عبد الاحد
(والد شیخ احمد سرہندی)

جلال الدین فاروقی
(تھانیسر)
(م ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء)
نظام الدین فاروقی (بلخ)
(م تقریباً ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء)
ابو سعید (گنگوہ)

شیخ پیر
قطب الدین
شیخ حامد
(م ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء)
عبد الرحمان
(مصنف مرآۃ الاسرار)

شیخ منصور
شیخ عالم

محمد صادق
محمد داؤد

شاہ ابو المعالی
(م ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء)
محمد سعید
سید محمد سالم
(م ۱۱۶۵ھ/۱۷۹۱ء)
سید محمد اعظم
(م ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء)
حافظ موسیٰ مانک پوری
(م ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء)
سید امانت علی (م ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء)
حافظ محمد حسین (مصنف انوار العارفین)

شیخ سوندھا
(م ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء)
محمد اکرام
(مصنف اقتباس الانوار)

محب اللہ صدر پوری
(م ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) (الہ آباد)
شاہ محمدی فیاض
(م ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء) (آگرہ)
شاہ عضد الدین
(م ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء)
شاہ عبد الہادی
(م ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) (امروہہ)
شاہ عبد الباری
(م ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء)
سید عبد الرحیم فاطمی
(م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) (بالاکوٹ)
میاں جی نور محمد
(م ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) (جھنجھانہ)

حاجی امداد اللہ (تھانہ بھون) (م ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) مکۂ معظمہ

- محمد قاسم نانوتوی (بانی مدرسہ دیوبند) (م ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء)
- اشرف علی (تھانہ بھون)
  - سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) کراچی
- رشید احمد (م ۱۹۰۵ء) (گنگوہ)
  - محمود حسن شیخ الہند (م ۱۹۲۰ء) (دیوبند)
  - حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) دیوبند
  - خلیل احمد انبیٹھوی (م ۱۹۲۷ء) (مدینہ منورہ)
  - عبد الرحمن محدث (امروہہ)
  - محمد الیاس کاندھلوی (م ۱۹۴۴ء) (دہلی)
- احمد حسین محدث (م ۱۹۱۱ء) (امروہہ)

۲ - صوبائی خانقاہوں کا دور

- سراج الدین اخی سراج (م ۷۵۹ھ/۱۳۵۷ء) (گوڑ، بنگال)
  - علاء الدین بن اسعد لاہوری بنگال (م ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء) (پانڈوہ)
    - نور قطب عالم (۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء) (پانڈوہ)
      - حسام الدین (م ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء) (مانک پور)
        - راجی حامد شاہ (م ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء) (مانک پور)
          - حسن طاہر جونپوری (۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء) (دہلی)
      - سید شمس الدین طاہر (رنتھمبور)
    - سید اشرف جہانگیر سمنانی (م ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء) (کچھوچھہ)
- قطب الدین منور (م تقریباً ۷۶۰ھ/۱۳۵۸ء) (ہانسی)
  - نور الدین
  - تاج الدین شیر سوار (تقریباً ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء) (نارنول)
- نصیر الدین چراغ (م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) (دہلی)
  - سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۶ھ/۱۴۲۲ء) (گلبرگہ)
    - میر سید یداللہ (م ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء)
      - شیخ پیارا (م ۸۶۵ھ/۱۴۶۰ء)
        - شاہ جلال گجراتی (۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء)
          - شیخ محمد (م ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء) (مالوہ نزد قنوج)
            - شیخ سعد اللہ (شیخ عبد الحق دہلوی کے دادا)
  - قاضی عبد المقتدر (دہلی)
    - شیخ عبد الفتح (جونپور)
  - کمال الدین علامہ (گجرات)
    - سراج الدین (م ۸۱۴ھ/۱۴۱۱ء) (احمد آباد)
      - عالم الحق
        - محمود المعروف بہ شیخ راجن
          - حسن محمد
            - یحییٰ مدنی
              - شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (دہلی)
  - مولانا خواجگی (کالپی)
- برہان الدین غریب (م تقریباً ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء) (دولت آباد)
  - زین الدین
- سید حسین (نہروالہ)
- حسام الدین ملتانی (م تقریباً ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء) (نہروالہ)
- شاہ بارک اللہ (گجرات)
- وجیہ الدین یوسف (م تقریباً ۷۲۹ھ/۱۳۲۸ء) (چندیری)
- کمال الدین (مالوہ)
- مغیث الدین (اجین)

۴ ـ سلسلۂ نظامیہ کا احیاء

شاہ کلیم اللہ جہان آبادی
(م ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء) (دہلی)
|
شاہ نظام الدین
(م ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء) (اورنگ آباد)
|
شاہ فخر الدین
(م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) (دہلی)

- نور محمد (م ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء) (مہاران در بہاولپور)
  - محمد عاقل (م ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء) (چاچڑاں، پنجاب)
    - گل احمد پوری (م ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء) (مصنف تکملۂ سیر الاولیا)
  - حافظ جمال (م ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء) (ملتان)
    - خدا بخش (ملتان)
      - اللہ بخش (م ۱۹۰۱ء)
        - حافظ موسیٰ (م ۱۹۰۶ء) (تونسہ)
      - شمس الدین (م ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء) (سیال، پنجاب)
        - مہر علی شاہ (گولڑہ پنجاب)
        - غلام حیدر علی شاہ (م ۱۹۰۸ء) (جلال پور، پنجاب)
      - محمد علی (م ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء) (خیر آباد، یوپی)
      - حاجی نجم الدین (م ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء) (فتحپور، نزد جھنجھنو، راجپوتانہ)
        - حکیم محمد حسن (م ۱۹۰۴ء) (امروہہ)
  - شاہ محمد سلیمان (م ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء) (تونسہ، نزد ڈیرہ غازی خان)
- شاہ نیاز احمد (م ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) (دہلی)
  - سید نظام الدین (بریلی)
    - شاہ محی الدین (بریلی)

(نیز دیکھیے "تصوف")

ساز و سامان اور مادی شہوات کو ترک کرتے تھے۔ امن و صلح اور عدم تشدد پر اعتقاد رکھتے تھے اور انتقام اور بدلے کو حیوانی دنیا کا طریقہ خیال کرتے تھے۔ حکومت سے راہ و رسم رکھنے کی کسی صورت میں بھی اجازت نہ تھی۔ ان کے نزدیک صوفیانہ زندگی کو غایت فقط اللہ تعالیٰ کے لیے جینا ہے۔ صوفی کو نہ تو جنت کی تمنا کرنی چاہیے اور نہ دوزخ سے ڈرنا چاہیے۔ چشتی صوفیانہ ریاضت کی ابتدا کرنے کے لیے رسمی طور پر اسلام قبول کرنے کا مطالبہ ضروری شرط کے طور پر نہیں کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ رسمی طور پر اسلام قبول کرنے سے پہلے جذباتی زندگی میں انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔

چغتائی خان چغتائی سلطنت کا بانی۔ چنگیز خان اور اس کی دوسری بیگم بورتہ فجن کا دوسرا بیٹا۔ اپنے بھائیوں کی طرح اس نے چین کے خلاف باپ کی مہموں میں حصہ لیا۔ تین شہزادوں جوجی، چغتائی اور اوکتائی نے خوارزم شاہ کی سلطنت اور گانج کا محاصرہ کر لیا۔ اور اسے صفر ۶۱۸ھ/۲۴ اپریل ۱۲۲۱ء میں فتح کر لیا۔ اسی سال چغتائی کا سب سے بڑا لڑکا موآتوکان، بامیان کے سامنے قتل ہوا دریائے سندھ کی لڑائی کے بعد غالباً، شوال ۶۱۸ھ/۲۴ نومبر ۱۲۲۱ء چغتائی کو جلال الدین خوارزم شاہ کے خلاف جنگ کا انتظام سونپا گیا۔ اس نے اس سال موسم سرما ہندوستان میں گذارا۔ تنگت پر چنگیز خان کی آخری مہم کے دوران میں وہ منگولیا میں ان افواج کا امیر لشکر رہا۔ جو وہاں پیچھے چھوڑ دی گئی تھیں۔

چنگیز خان کے انتقال کے بعد چغتائی نے پھر کسی بھی مہم میں عملاً حصہ نہیں لیا۔ اس کی چنگیز خان کا سب سے بڑا زندہ بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ اس کو مشرق میں اویغور کے علاقے سے لے کر مغرب میں بخارا و سمرقند تک سارا ملک اپنے باپ سے ملا تھا۔

چغتائی اسلام کی طرف میلان نہیں رکھتا تھا۔ مغول قانون کی جن خلاف ورزیوں کی وہ سخت سزا دیتا تھا، ان میں بعض اسلامی احکام بھی تھے۔ ان ظالمانہ سزاؤں کی وجہ سے جو وہ ایسی خلاف ورزیوں پر صادر کرتا تھا مسلمانوں کو اس کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔

جوینی کے قول کے مطابق، چغتائی اپنے بھائی اوکتائی کے کچھ عرصہ بعد تک زندہ رہا۔

چغتائی خانیہ وسطی ایشیا کی ایک ریاست جسے چغتائی نے اپنے نام سے موسوم کیا۔ اگرچہ یہ اس مغول شہزادے کی وفات کے بعد قائم ہوئی۔ چغتائی کے بعد اس کا پوتا قرا ہولاکو اس کا جانشین بنا۔ اس کو چنگیز خان اور اوکتائی نے چغتائی کا وارث نامزد کیا تھا۔ ۱۲۴۱ء خان اعظم گویوک نے اسے چغتائی کے پانچویں بیٹے کے حق میں تخت سے معزول کر دیا۔ لیکن ۱۲۵۱ء میں گویوک دوبارہ قرا ہولاکو کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ وطن واپس آتے ہوئے راستے ہی میں انتقال کر گیا اس کے بعد اس کی بیوی اس کی جگہ حکومت کرنے لگی۔ جس کا حلقۂ اقتدار وادی ایلی سے آگے پھیلا ہوا دکھائی نہ دیتا۔

۱۲۵۹ء میں خان اعظم مونگکا کے انتقال کے ساتھ ہی معاملات نے ایک بالکل ہی مختلف صورت اختیار کر لی۔ جب خان کے بھائیوں قوبیلائی اور اریغ بوکا میں غلبہ حاصل کرنے کی کشمکش ہوئی۔ تو الغو جو چغتائی کا ایک پوتا تھا اریغ بوکا کے لیے وسطی ایشیا پر قبضہ رکھنے اور اس کے دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کرنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ سارے وسطی ایشیا بشمول خوارزم اپنے زیر نگیں کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ تمام علاقہ کبھی خانوادہ چغتائی کے تسلط میں نہیں آیا تھا۔

الغو وسط ایشیا کی ایک آزاد مغول ریاست کا بانی شمار کیا جا سکتا ہے تھوڑے ہی عرصے بعد ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ - ۱۲۶۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مبارک شاہ نے ۶۶۴ھ/ مارچ ۱۲۶۶ء میں جو قرا ہولاکو اور شہزادی اورقینہ کا بیٹا

تھا اور جس نے اس خانوادے میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ تھوڑے ہی دن بعد اس کے چچا زاد بھائی براق خان نے اسے تخت سے اتار دیا۔ ۱۲۷۰ء میں جب براق کا انتقال ہو گیا تو قیدو نے چغتائی کے پوتے نیک پای کو اس کا جانشین بنا دیا۔ نیک پای کا جانشین چغتائی کا ایک اور پوتا بوقا تیمور بنا۔ قیدو نے ۱۲۸۲ء میں براق کے بیٹے دوا کو منتخب کر لیا۔ خان اعظم کے خلاف قیدو کی تمام جنگوں میں دوا اس کا حلیف اور وفادار رہا۔ اس نے ۱۳۰۶ء میں اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے اپنے بیٹے چیر کو شکست دی اور اسے معزول کر دیا۔ اس وقت سے چغتائی حکومت دوا ہی کے خاندان میں رہی اور دوا کے چھ بیٹے یکے بعد دیگرے حکمرانی کرتے رہے۔

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیوی مونکسا کی مختصر سی حکومت بھی ان لوگوں سے اچھا سلوک کرتی تھی۔ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

چغتائی کی ملکہ اور قیمہ اپنے شوہر کے برعکس مسلمانوں پر بہت زیادہ مہربان تھی بقول وصاف وہ مسلمانوں کی محافظ و مددگار رہی۔ جمال قرشی کے بقول تو اس نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ اس کے بیٹے مبارک شاہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور مبارک شاہ کا حریف براق خان بھی کچھ عرصے بعد مسلمان ہو گیا تھا۔ الغو کی حکومت مسلمانوں سے کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ قیدو، چیر اور دوا نیز دوسرے مغول بادشاہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ اور ان کی سکونت مشرقی صوبوں میں رہی۔ ایسن بوکا کے عہد حکومت میں خان اعظم کی فوجیں مشرقی وسطی ایشیا میں دور تک اندر گھس گئیں اور انہوں نے بوکا کی سرمائی اور گرمائی اقامت گاہوں کو تہس نہس کر دیا۔

کبک جو اسن بوکا کا جانشین تھا اگرچہ مسلمان تو نہیں ہوا تھا لیکن مسلمان اسے عادل سلطان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس نے کئی شہر بسائے۔ اس نے نقرئی سکے بھی چلائے جو بعد میں کبکی سکوں کے نام سے موسوم ہوئے۔ یہ سکے چغتائی مملکت کا پہلا سکہ تھا۔ اس نے کئی شہر بھی بسائے نیز اس نے نخشب کے نواح میں اپنے لئے ایک محل بنوایا۔ کبک کے کچھ عرصہ بعد اس کا بھائی ترماشرین تخت پر بیٹھا۔ اس نے اسلام قبول کیا۔ اور اپنا نام علاءالدین رکھا اس نے مشرقی صوبوں کی طرف تغافل برتا۔ کچھ عرصے بعد اس کے بھتیجے بزن نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ لیکن اس نے بھی چند ماہ ہی حکومت کی کہ ترماشرین کا ایک اور بھتیجا جنگشی اس سے تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دور میں چغتائی سلطنت کا مرکز پھر کچھ عرصے کے لئے وادی ایلی میں منتقل ہو گیا۔ اور عیسائی کسی مداخلت کے بغیر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے۔ بعد میں خان قازان جو اوپری نسل سے تھا۔ اور موائوکان کا دوسرا بیٹا تھا۔ حکمران ہوا اس نے ترک امراء کے خلاف جدوجہد کے دوران میں ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء، ۱۳۴۷ء میں ایک لڑائی میں انتقال کیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ماوراءالنہر میں اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اگرچہ ترک امیر ۱۳۷۰ء تک چغتائی کی اولاد کو برائے نام حکمرانوں کے طور پر تخت پر بٹھاتے رہے

چغری بیگ (غالباً ۳۸۰ھ۔ ۳۸۵ھ/۹۹۰ء۔ ۹۹۵ء ۔ ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء) داؤد بن میکائیل بن سلجوق طغرل بیگ کا بھائی اور خاندان سلجوق کی بنیاد رکھنے میں طغرل بیگ کا شریک۔

اس کے خاندان کے بارے میں اس بارے میں کوئی واضح شہادت نہیں ملتی کہ ان کا خاندان پہلے ہی مسلمان ہو گیا تھا یا بعد میں مسلمان ہوا۔

ان دونوں بھائیوں کے ابتدائی معاملات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ابھی یہ دونوں بھائی چھوٹی عمر ہی میں تھے ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش ان کے دادا سلجوق نے خطہ جند میں کی۔ اس دوران میں ان کے چچا ارسلان اسرائیل ساماینوں کی ملازمت میں تھا۔ اور جنگی مہمات میں خدمات انجام دیتا تھا۔ دادا کی وفات کے بعد انہیں بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر انہیں اپنے قبیلے کے ایک حصے کے ساتھ اس علاقے میں منتقل ہونا پڑا۔ جو ایک قرہ خان کی ملکیت تھا یہ حاکم کچھ عرصہ تک بغراخان کے لقب سے معروف رہا۔ بعد میں ان دونوں بھائیوں کا اس سے جھگڑا ہو گیا تو یہ دونوں اپنے چچا سے جا ملے جو اس وقت بغرا کے حریف اور بخارا کے قراخانی حاکم علی تگین کی ملازمت اختیار کئے ہوئے تھا۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی بھی علی تگین ہی کی ملازمت میں آ گئے۔ بعد میں جب ان کی قبیلہ کی سرداری کے سوال پر اس سے ناچاقی ہو گئی تو یہ دونوں بھائی خوارزم میں منتقل ہو گئے۔ قوم اغز کا امیر شاہ ملک جو ان کے خاندان کا دیرینہ دشمن تھا اور اس وقت رفتہ رفتہ جند کا مالک بن بیٹھا تھا، کی دھمکیوں نے انہیں ایک بار پھر ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ یہاں سے نقل مکانی کر کے انہوں نے خطہ غزنہ میں محمود غزنوی کے جانشین مسعود سے زبردستی اپنی سکونت کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ انہیں مغربی خراسان میں شمال کے سرحدی میدانوں میں انہیں سرکاری مراعات حاصل ہو گئیں لیکن وہ اپنے آپ کو نیک سیرت مہمان ثابت نہ کر سکے۔ ۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء میں اہل مرو نے چغری بیگ کے لئے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اور اس نے وہاں ایک خودمختار امیر کی حیثیت سے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس کے بھائی طغرل نے نیشاپور میں بالکل یہی رویہ اختیار کیا۔ مرو سے چغری نے ہرات کا رخ کیا اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنی برادری والوں کو خطہ سیستان کی طرف بھیجا۔ ۴۳۱ھ/۱۰۴۰ء میں سلجوقی لشکر نے مسعود کو دندانقان پر ایسی شکست دی کہ اس کے بعد وہ سنبھل نہ سکا۔ بعد میں ان فاتحین نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ طغرل نے ایک طرف ایران میں نئی فتوحات کے لئے قسمت آزمائی شروع کی لیکن چغری نے نوخیز سلجوقی قوت کا مرکز خراسان ہی میں قائم رکھا۔ چغری نے ایک طرف بلخ اور پھر ترمذ کو اور دوسری طرف خوارزم کو اپنی سلطنت میں ملحق کر کے خراسان کی تسخیر مکمل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی چغری کے ایک بیٹے کورت نے ایک حد تک خودمختار حاکم کی حیثیت سے کرمان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد سے چغری کی افواج کا سب سے بڑا عسکری کام غزنویوں کے خلاف ایک دشوار جدوجہد رہ گیا۔ جنہوں نے اپنے ایک کوہستانی حصار میں اور ان وسائل سے قوی ہو کر جو انہیں وادی سندھ کے صوبوں سے دستیاب ہوئے پھر جنگ چھیڑ دی اور گاہے گاہے انہیں کامیابی بھی ہوتی رہی۔ سلجوقی غزنین کے اندرونی جھگڑوں میں مداخلت کرتے رہے۔ سلطان مودود نے چغری کی ایک لڑکی سے شادی بھی کی تھی مگر مودود کے ایک جانشین کے خلاف سلجوقیوں نے غاصب فرخ زاد کو شہ دی لیکن جلد ہی ان کی اس سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ بلخ اور سیستان کے ضلعوں میں برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چغری اب بوڑھا ہو چکا تھا اور جنگ کی باگ ڈور فی الحقیقت اس کے بیٹے الپ ارسلان کے ہاتھوں میں آ گئی۔

۴۵۱ھ/۱۰۶۰ء میں چغری اور سلطان ابراہیم غزنوی نے صلح کر لی۔ اگلے ہی سال چغری کا انتقال ہو گیا۔

چغری اور طغرل دونوں بھائیوں کے تعلقات کے درست رہنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ طغرل کے کوئی اولاد نہ تھی یہی وجہ ہے کہ جب ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء۔ ۱۰۵۹ء میں ابراہیم اینال کی بغاوت سے طغرل کی سلطنت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا تو اس وقت طغرل ایک حد تک اپنی سلامتی کے لئے اس مدد کا مرہون منت ہوا۔ جو اسے الپ ارسلان اور یاقوتی نے بہم پہنچائی۔

چغری نے خوارزم کی ایک شہزادی سے شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا الپ ارسلان اپنے باپ اور چچا دونوں کا وارث بنا۔

چقمق الملک الظاہر سیف الدین - مصر کا سلطان -
جوانی میں سلطان برقوق کا مملوک تھا۔ آہستہ آہستہ ترقی کر کے سلطان برسبای کے تحت صدر "حاجب"، میر آخور اور آخر میں اتابک (سپہ سالار اعلیٰ) بن گیا۔

۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں جب سلطان برسبای بستر مرگ پر تھا تو اس نے چقمق کو اپنے شیرخوار بچے الملک العزیز یوسف کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ مملوکوں کے کئی لشکر جو ابتدا سلطان برقوق، ناصر فرج، موید شیخ اور برسبای کی فوج رکاب کے طور پر بنائے گئے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے تھے۔ ہر ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ جس قدر ممکن ہو دولت اور اثر و رسوخ حاصل کر لیں۔ اس حالت سے جو انتشار پھیلا اس انتشار میں چقمق کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا جو یہ تھا کہ وہ خود فوج پر قبضہ کرے۔ چنانچہ سلطان یوسف کو معزول کر کے ایک حصار میں قید کر دیا گیا۔ بعد میں اسے اسکندریہ میں حراست میں رکھا گیا۔ چنانچہ ان اقدامات سے دمشق اور حلب کے والیوں کی مزاحمت بھی ختم ہو گئی۔ شامی باغیوں نے بھی شکست کھائی۔ ان کے قائدین کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ آخر کار ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں چقمق کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا۔ وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح عیسائیوں کے حملوں کو روکنے اور ان بحری قزاقی کے انسداد کے لئے شمالی ساحل کی مدافعت اور استحکام کا خواہشمند تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے قبرص کے راستے رودس کو جہاز بھیجے لیکن مصریوں کو ناکام واپس آنا پڑا۔ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء اور ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء میں مصریوں نے پھر رودس کو فتح کرنے کی کوشش کرلی پڑی۔

چقمق کی خارجہ حکمت عملی کامیاب تھی۔ اس کے تمام مسلمان حکمرانوں سے خوشگوار تعلقات تھے۔ اس کے عثمانی سلطان اور ملوک ایشیائے کوچک کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات رکھے۔ چقمق اپنی داخلی حکمت عملی میں مصر میں سرکاری اجارہ داریوں کی بدنظمی کے سدباب میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ بذات خود کفایت شعار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ علماء کا قدردان تھا۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں چقمق نے اپنے بیٹے عثمان کے ہاتھ پر لوگوں سے بیعت لی۔ اور اسی اثنا میں وفات پائی۔

اس کی رعایا کو اس کی وفات کا بہت زیادہ رنج ہوا۔ ارکانِ دربار اور لوگوں کے ہجوم کثیر نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔

چکڑالوی، عبداللہ فرقہ اہلِ قرآن کا بانی
غلام نبی المعروف عبداللہ چکڑالوی۔ موضع چکڑالہ ضلع کیمبلپور کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں علم حدیث کی تکمیل کی۔ اور فارغ ہو جانے کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور اعتقادی کش مکش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انگریز کے پھیلائے ہوئے فکری اور نظریاتی فرقے آزادی سے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عبداللہ چکڑالوی نے بھی اس شہر کی فضا کو اپنے مشن کے موافق پاکر عوام الناس کو معمولی کوتاہیوں پر کافر قرار دینا شروع کر دیا۔ جس سے ان کے خلاف مخالفت کی زبانیں وا ہونے لگیں۔ لاہور میں مسجد چینیاں میں جب مولوی رحیم بخش نے وفات پائی تو ان کے بعد اس کی امامت انہیں مل گئی۔ کچھ عرصہ درس حدیث دیتے رہے۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی اپنے درس میں صحیح بخاری کے لئے اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری کی دلیل دے کر بخاری شریف کے علاوہ حدیث کی دوسری تمام کتابوں کو مشکوک قرار دے دیا۔ ایک عرصے تک بخاری شریف کا درس جاری رکھا مگر طبعی اضطراب نے بخاری اور قرآن کا توازن شروع کر دیا۔ بعض احادیث خلافِ آیات اللہ قرار دے کر اعلان کر دیا کہ جب قرآن ایک مکمل ہدایت ہے تو حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ چینیاں والی مسجد کے مقتدی کچھ عرصے تک تو برداشت کرتے رہے۔ پھر ایک روز مسجد سے نکال دیا۔ اسی عرصے میں ایک تفسیر بھی لکھی۔ جب مسجد سے نکال دیا گیا تو ان کا ایک متشدد مقتدی محمد بخش عرف چٹو پٹولی آپ کو سر بالزوالے بازار اپنے مکان میں لے گئے جہاں ایک احاطے میں اپنی مسجد بنا کر "اہلِ قرآن" کے مسائل کی تشہیر شروع کر دی۔ کچھ عرصے بعد چٹو پٹولی بھی چکڑالوی کا ساتھ چھوڑ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ملتان میں ایک نواب صاحب کے ہاں رہنا شروع کر دیا۔ ایک موقع پر لوگوں نے کسی خاص واقعہ پر عبداللہ چکڑالوی کو سنگسار کر دیا اور وہ نیم مردہ اپنے آبائی وطن چکڑالہ چلے گئے۔ جہاں ایک طویل عرصے کے بعد انتقال کیا۔

"اہلِ قرآن" نے مختلف عنوانات سے صوبے بھر میں اپنے مراکز قائم کئے گوجرانوالہ میں اچھی خاصی تعداد اہلِ قرآن بن گئی۔ گجرات میں "دتے شاہی" فرقہ صرف تین نمازیں ادا کرتا اور دو نمازوں کو حدیثی نمازیں کہہ کر چھوڑ دیتا۔ امرتسر میں بھی ایک جماعت اہلِ قرآن کے مسلک اور عقائد کی اشاعت کرتی رہی۔ موجودہ دور میں غلام احمد پرویز اس مکتب فکر کے ترجمان ہیں۔

چلبی زادہ (غالباً ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء - ۲۸ جمادی الآخرہ ۱۱۷۳ھ/۱۹ فروری ۱۷۶۰ء) اسماعیل عاصم افندی - اٹھارویں صدی کا ایک عثمانی مورخ، شاعر اور شیخ الاسلام استنبول میں پیدا ہوا۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ بقول سالم افندی اسے ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں اسے فیض افندی نے ملازم کا درجہ دیا تھا۔ اس کی معلمانہ زندگی کا آغاز جو تمام تر استنبول میں بسر ہوئی ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں کنعان پاشا کے مدرسے سے ہوا۔ جہاں سے وہ ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں درزداریہ چلا گیا اور پھر باری ۔ ری دم قبی میں ۱۷۱۸ء میں مدرسہ احمد پاشا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں مدرسہ عارفیہ اور ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں ملا گورانی میں اپنے خسر قاضی عمر افندی کے قائم کردہ مدرسے میں رہے۔ ۲۸ رمضان ۱۱۳۵ھ/۱۵ اپریل ۱۷۲۳ء میں اس کا تقرر رشید افندی کے بعد وقائع نویس کے طور پر ہوا۔ اور وہ اس عہدے پر تقریباً ۱۱۴۳ھ تک متمکن رہا۔ جب اس کے سرپرست صدر اعظم ابراہیم پاشا کو باغیوں نے قتل کر دیا تو اس کے مقربوں کو بھی عہدوں سے معزول کر دیا۔

اس کو ۱۱۴۵ھ - ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۲ء - ۱۷۳۳ء میں وہ ینی شہر کا ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء - ۱۷۳۹ء میں بر سر ۱۱۵۷ - ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۴ - ۱۷۴۵ء میں استنبول کا قاضی رہا۔ اس کے بعد وہ ایک عرصے تک بے کار رہا۔ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء میں ایک سال کے لئے اسے اناطولی کا قاضی عسکر بنا دیا گیا۔ ۵ ذوالقعدہ ۱۱۷۲ھ/۳۰ جون ۱۷۵۹ء میں اس کو شیخ الاسلام کا منصب ملا۔ اور آٹھ ماہ تک اس منصب پر فائز رہنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی تاریخ جو تاریخ راشد کے تکملے کے طور پر دو بار طبع ہوئی ہے استنبول کے ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء تا ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء کے عہد تک محیط ہے۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے جو حسن بیان اور لطافت و نزاکت خیال کے لحاظ سے ہمیشہ اس عہد کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

چم ملائی - پولی نیشی نسل کے لوگ وہ حضرت مسیح کی پیدائش سے پہلے جزیرہ نمائے ہند چینی کے جنوبی ساحلوں پر آباد ہو گئے تھے۔ تاریخ میں ان کا ذکر اس وقت

آتا ہے جب ۱۹۲ء میں چمپا کی شاہی ریاست کی بنیاد رکھی ۔ یہ ریاست موجودہ ویت نام کے ساحلی صوبوں پر مشتمل تھی اور شمال میں کوانگ بند سے جنوب میں بند تھوان تک پھیلی ہوئی تھی ۔

دسویں صدی تک چمپا کی ریاست ترقی کی اعلیٰ منازل پر تھی ۔ اس عرصے میں چم خاندانوں نے اپنی حدود سلطنت میں کسی قدر توسیع کی ۔ لیکن بعد کی صدیوں میں اس ریاست کا ویت نام اور خمر کے ہمسایہ ممالک سے کھلم کھلا تصادم ہوا بعد میں اسے مغلوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ نیز اندرونی شورشوں اور بیرونی حملوں نے اس سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا ۔ بادشاہ چی بونگ نگا کے دور حکومت (۱۳۶۰ء تا ۱۳۹۰ء) میں فاتحانہ جنگ کے ایک مختصر وقفے اور حکمران کی حمایت میں چینی مداخلت کے باوجود یہ ریاست زوال پذیر ہو چکی تھی ۔ ۱۴۷۱ء میں ویت نام کے شہنشاہ لی تھانہ تون نے ریاست چمپا کو مکمل طور پر زیر کر لیا ۔ اور یہ ریاست ویت نام کے مقبوضات میں شامل ہو گئی ۔ اس کے کچھ باشندوں نے سرزمین کمبوڈیا میں پناہ لے لی ۔ آہستہ آہستہ اس ریاست کا نام مشرق بعید کی تاریخ سے غائب ہو گیا ۔

چم قوم ہندوستان کی تہذیب سے بہت زیادہ متاثر تھی ۔ اور اس قوم نے دوسری صدی عیسوی میں ہندو مذہب اور ادب کو مکمل طور پر اپنا لیا تھا ۔ پندرہویں صدی عیسوی تک یہ لوگ ہندومت کے پیرو رہے ۔

اگرچہ مسلمان چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں اس علاقے میں سکونت اختیار کر چکے تھے لیکن ان لوگوں نے اپنی سلطنت کے خاتمے تک اسلام کو سنجیدگی سے قبول نہیں کیا ۔

آج بھی ویت نام میں رہنے والے چم لوگوں کا دو تہائی حصہ برہمنی مذہب اختیار کئے ہوئے ہے ۔ اور باقی ایک تہائی حصہ جو کمبوڈیا ہجرت کر کے گئے ہیں مسلمان ہیں ۔ ایک اندازے کے مطابق ویت نام کے جنوب میں ان کی تعداد ۱۵۰۰ اور کمبوڈیا میں ۲۰۰۰ ہے ۔

چم ابتدا میں مادر شاہی اور مختلف کنبوں میں منقسم تھے لیکن بعد میں انہوں نے ہندوستان کے زیر اثر ذات پات اور ہندوانہ طور طریقے اختیار کر لئے ۔ یہ لوگ بحری قزاقوں کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ ہمسایہ صوبوں پر چھاپے مارتے اور غلاموں کی تجارت کرتے تھے ۔ موجودہ دور میں چم نسلی اعتبار سے ایسی اقلیتیں ہیں جو اکثریت میں جذب ہوتی جا رہی ہیں ۔

چمپانیر

(محمود آباد) مغربی ہندوستان میں گجرات کا ایک شہر ۔ یہ شہر احمد آباد کے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۹۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ گجرات کے سلطان محمود شاہ اول بیگڑہ نے ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء میں اس کے قریبی قلعے پاواگڑھ کو فتح کر لینے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا ۔ پاوہ گڑھ پر اس سے پہلے ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں احمد شاہ اول نے حملہ کیا تھا لیکن فتح کرنے میں ناکام رہا تھا ۔ محمود شاہ بیگڑہ قلعے کو فتح کرتے ہی شہر میں داخل ہوا ۔ اور اس نے شہر کے اردگرد ایک فصیل بنوائی جس میں برج اور پھاٹک تھے ۔ اس نے ایک قلعہ (بہادر) بھی تعمیر کرایا ۔ نیز اس کا نام چمپانیر کی بجائے محمود آباد رکھا اور ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں اس کی وفات تک یہ اس کی محبوب سکونت گاہ رہا ۔ ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء تک جب بہادر شاہ کا انتقال ہوا یہ شہر گجرات کا سیاسی مرکز رہا ۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں جب گجرات مغلوں کے قبضے میں آیا تو چمپانیر اس وقت نو محلات کی ایک سرکار کا صدر مقام تھا ۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ شہر مرہٹوں کے قبضے میں آگیا ۔ ۱۸۵۳ء میں اس کو انگریزوں نے فتح کر لیا ۔ لیکن اس وقت یہ شہر چونکہ ویران ہو چکا تھا اس لئے اسے دوبارہ آباد نہیں کیا گیا ۔

اس شہر کی یادگاروں عمارتوں میں سات منزلہ محل جس کی اب صرف نچلی منزل باقی رہ گئی ہے ۔ اس محل کو محمود نے پاواگڑھ کے بالمقابل چٹان کے سرے تعمیر کرایا تھا ۔ شہر پناہ کے علاوہ باقی سب مسجدیں اور مقبرے ہیں ۔ جن کا طرز تعمیر مقامی ہے جامع مسجد جو ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء کی تعمیر ہے کا خاکہ اس سے سو سال پہلے کی بنی ہوئی احمد آباد کی جامع مسجد سے لیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ دس اور مسجدیں جن میں نگینہ مسجد اور سدی سید کی مساجد بھی ہیں اور کئی ایک گمنام مقبرے ہیں ۔

آج کل یہ شہر بالکل کھنڈر بن چکا ہے ۔

چمکنی، میاں عمر صاحب

(۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء ۔ ۱۹ / شعبان ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء) صوبہ سرحد کے ایک علمی اور روحانی بزرگ جو اپنی کرامات اور ہدایت خلق کے باعث بہت مشہور ہیں ۔

والد کا نام محمد ابراہیم تھا ۔ آپ کی پیدائش فرید آباد کے گاؤں میں ہوئی جو شاہجہان نے آپ کے دادا کو بطور جاگیر دیا تھا ۔ آپ نے یوسف زئی کے علاقے خدوخیل میں تربیت پائی ۔ آپ کے استاد دریا بابا حاجی تھے ۔ جو شیخ عبدالوہاب اخوند پنجو کے مریدین میں سے تھے ۔ تصوف اور سلوک میں آپ نے قلعہ اٹک کے شیخ یحییٰ سے فیض حاصل کیا ۔ اس کے بعد آپ نے پشاور سے چھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں چمکنی میں سکونت اختیار کی ۔ ان کے علم و عرفان کے کمالات اور ان کی کرامات کی شہرت صوبہ سرحد، افغانستان اور پنجاب میں دور دور تک پھیل گئی ۔ آپ کی خدمت میں کیا خاص اور کیا خاص سب کے سب حاضری دینا اپنے لئے باعث برکت سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی جب بھی اپنی جنگی مہمات کے سلسلے میں ہندوستان کی طرف آتا تو چمکنی میاں عمر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا ۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ احمد شاہ ابدالی کو عدل و انصاف خدمت خلق اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہدایت کرتے تھے ۔

احمد شاہ ابدالی نے چمکنی کی خانقاہ اور لنگر کے لئے ہزاروں جریب زمین وقف کر دی تھی ۔

آپ نے جابجا مسجدیں تعمیر کرائیں اور دینی مدارس قائم کئے ۔ مسافروں کے آرام کے لئے کنوئیں کھدوائے ۔ آپ کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ جو چمکنی میں آپ کی خانقاہ سے ملحق تھا ۔ اب سے چالیس سال پہلے تک بہت زیادہ شہرت رکھتا اور سرحد افغانستان سے طلباء علم دین حاصل کرنے کے لئے یہاں آتے تھے ۔

آپ کی تصانیف میں "معالی" شرح قصیدہ امالی ۔ ۲ ۔ "توضیح المعانی" ۔ ۳ ۔ "شجرہ نسب افغاناں" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں ۔

آپ نے تقریباً سو سال کی عمر میں وفات پائی ۔ آپ کا مزار پشاور میں ہے ۔ جو بہت زیادہ مشہور اور مرجع خاص و عام ہے ۔

آپ کی اولاد میں ایک لڑکے کا ذکر ملتا ہے جس کا نام صاحبزادہ محمدی تھا اور جو پشتو زبان کا بہترین شاعر تھا ۔

چندیری

شمالی وسطی ہندوستان کا ایک شہر اور پرانا قلعہ ۔ اس کے مشرق کے رخ سامنے دریائے بیتوا کی وادی نظر آتی ہے

یہاں ہندو اور جین آثار قدیمہ کے درمیان مسلمانوں کے قلعوں کے کھنڈر موجود ہیں جو غالباً آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کے ہیں کیونکہ غیاث الدین بلبن نے اگرچہ ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء میں اس شہر کو فتح کر لیا تھا لیکن اس وقت اس کے پیش نظر اس پر مستقل قبضہ رکھنا مقصود نہ تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کا اس پر باقاعدہ قبضہ اس وقت ہوا جب ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں عین الملک نے راجہ ہر آنند کو شکست دی۔

نیا چندیری غالباً مالوہ کے غوری بادشاہوں نے نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں بسایا۔ مالوا کی جنگوں کے دوران میں سلطان علاء الدین خلجی نے ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں اسے غوریوں سے چھین لیا۔ اس کے بعد یہ مقام خلجی صوبے داروں کے ماتحت رہا۔

چندیری چونکہ بندیل کھنڈ اور مالوا کی سرحد پر واقع تھا اس لیے اس پر یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں کا قبضہ رہا۔ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء تک اس پر سکندر لودھی کی فوجوں کا قبضہ رہا۔ جب وہ یہاں سے ہٹیں تو چتوڑ کے رانا کا اس پر قبضہ ہو گیا اس نے محمود ثانی کے معزول کردہ وزیر مدنی رائے کو یہاں کا صوبے دار مقرر کیا۔ ۹۳۴ھ/۱۵۲۸ء بابر نے چندیری اس سے چھین لی۔ اور صاحب خان کے بیٹے احمد خان کو واپس دے دیا۔ بعد میں اس پر پوربیا راجپوت پورن مل کا قبضہ ہو گیا۔ اور ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء کے قریب شیر شاہ نے اسے فتح کر لیا۔ لیکن پورن مل اس پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ اس نے چندیر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ شیر شاہ نے ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں اس سے مسلمانوں کا انتقام لیا۔ جب اکبر نے مالوے کا صوبہ فتح کیا تو چندیری اس کی ایک سرکار کا صدر مقام ہوا۔ اس دور میں یہ ایک بڑا شہر تھا۔ جس میں چودہ ہزار پتھر کے مکان تھے۔ اور ۱۲ سو مساجد تھیں۔ اس کے بعد یہ کئی مرتبہ بندیلیوں کے قبضے میں آیا۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے اس پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔

یہاں کی یادگار عمارتوں میں جامع مسجد، مدرسہ، شہزادی کا روضہ ہیں۔ شہر فصیل سے گھرا ہوا ہے۔ جس میں پانچ دروازے ہیں۔ ایک دروازہ کاٹی گھاٹی ہے جو سطح زمین پر ابھری ہوئی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

چنگانہ ایک نام جو خانہ بدوش قوموں کے لیے مشرق میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ چنگر یا زنگر سے نکلا ہے۔ یہ نام اس قوم کا تھا جو زمانہ قدیم میں دریائے سندھ کے کناروں پر آباد تھی۔ غالباً بہرام پنجم (۴۲۰ء تا ۴۳۸ء) انہیں سب سے پہلے ہندوستان سے ایران لایا۔ اس کے بعد یہ لوگ ساری دنیا میں پھیل گئے۔

ان میں سے کچھ ایک جگہ آباد ہو گئے ہیں اور باقی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پرانے طور طریقوں پر چلنے والے خانہ بدوش ایک جگہ بس جانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایران اور ترکی میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کا اپنا علیحدہ مذہب اور سیاسی نظام ہے۔

چنگیز خان (۵۶۲ھ/۱۱۶۷ء – ۶۲۵ھ/۲۵ اگست ۱۲۲۷ء)۔ مغول سلطنت کا بانی۔

اس کے باپ کا نام یسوکائی تھا۔ قبلہ کا بھتیجا تھا جو اصلی مغولوں کا آخری خان یا حاکم تھا۔ چنگیز خان کا اصل نام تموجین تھا وہ دریائے انان کے دائیں کنارے دلیون بولدا کے مقام پر پیدا ہوا جو مشرقی سائبیریا کے موجودہ علاقے چیتہ میں واقع ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تفصیلی حالات دو مغول کتابوں میں درج ہیں۔ چنگیز خان کا سلسلہ نسب کئی پشتوں سے ہوتا ہوا بھورے بھیڑیے اور سفید ہرن کے باہمی اختلاط تک پہنچتا ہے۔

مغول بارہویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے میں مشرقی منگولیا میں غالب رہے لیکن بعد میں انہیں علاقہ بوئر نور کے تاتار نامی ایک قبیلے کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس قبیلے نے شمالی چین کے حکمرانوں کے ساتھ مل کر ۱۱۶۱ء میں مغولوں کو شکست دی۔ اگرچہ اب مغولوں کا کوئی سردار نہیں رہا تھا اور وہ غیر منظم ہو چکے تھے تاہم انہوں نے تاتاریوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ تاریخ میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ چنگیز کی پیدائش کے وقت اس کا باپ دو تاتار سرداروں کو جنگی قیدی بنا کر لایا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام تموجین۔ اوکہ تھا اسی سے چنگیز خان کو اس کا اصل نام تموجین ملا تھا۔

مغولوں میں اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ اپنے قبیلے سے باہر شادی کرتے تھے چنانچہ جب تموجین کی عمر نو سال ہوئی تو اس کا باپ اسے لے کر منگولیا کے انتہائی مشرقی حصے میں گیا تاکہ اس کی ماں کے قبیلے قنقرات میں اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کرے مغولوں کے رواج کے مطابق یسوکائی اپنے بیٹے کو وہیں پر چھوڑ آیا تاکہ وہ اپنے ہونے والے سسر کے خیمے ہی میں پرورش پائے۔ جس کی دس سالہ بیٹی بورتہ سے اس کی شادی ہونا طے پائی تھی۔ اور جس کی قسمت میں شہنشاہوں کی ماں اور دادی بننا لکھا تھا۔ جب یسوکائی وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ تو اس کے دیرینہ دشمنوں نے اس کو پہچان کر ایک دعوت میں زہر دے دیا۔ اس کی بیوی نے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کی کوشش کی جس میں شروع شروع میں تو اسے کامیابی ہوئی لیکن انہوں نے بعد میں اسے اور اس کے کم سن بچوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا تاکہ وہ فاقہ کشی سے خود بخود ہلاک ہو جائیں۔ انہوں نے درختوں کی جڑیں، بیر اور وہ مچھلیاں جو تموجین اور اس کے بھائی دریائے انان سے پکڑ کر لاتے تھے اور چھوٹا موٹا شکار کر کے گذر بسر کرتے تھے۔

تموجین تقریباً جوان ہو چکا تھا۔ اس کے قبیلے کی ایک شاخ تائیجوت کو جب یہ پتا چلا کہ وہ زندہ ہے انہوں نے اس مقصد سے ان کے چھوٹے سے خیمے پر حملہ کر دیا تاکہ وہ اپنے باپ کی جگہ نہ لے سکے۔ اگرچہ تموجین بچ کر جنگلوں میں نکل بھاگا مگر چند دن بعد ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے دشمنوں نے اسے مارا نہیں لیکن انہوں نے اسے مستقل طور پر قیدی بنا لیا۔ اس کے گلے میں لکڑی کا ایک طوق ڈال دیا وہ جہاں کہیں بھی جاتے اس کو برابر اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک موقع پر جب کہ وہ لوگ جشن منا رہے تھے تو تموجین کو بھاگ نکلنے کا موقع ملا اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور اس طرح وہ ان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ان لوگوں سے رہائی پانے کے بعد تموجین نے اپنی ہونے والی بیوی بورتہ کے لیے مشرقی منگولیا کا سفر کیا۔ بورتہ اپنے جہیز میں صرف ایک سیاہ سمور کی کھال لائی۔ یہ کھال اس کے لیے آگے چل کر ترقی کا ذریعہ بنی۔ تموجین نے کھال طغرل کو تحفتہً پیش کی۔ جس کی سلطنت دریائے تلا کے کنارے موجودہ الن بتور کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ طغرل تاریخ میں اونگ خان کے نام سے معروف ہے جو تموجین کے باپ کا اندہ یا حلیف بھائی رہ چکا تھا۔ وہ اس تحفے سے بہت خوش ہوا اور اس نے تموجین کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ اس بات کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایک جنگی قبیلے مرکیت کے لوگوں نے تموجین کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور اس کی نو بیاہتا بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ تموجین نے طغرل اور اپنے دوست جاموقہ کی مدد سے مرکیت کو شکست دے کر اپنی بیوی کو واپس لے لیا۔ جا

اور تموجین بہت زیادہ گہرے دوست تھے۔ وہ ساتھ ساتھ ہی اپنے خیمے لگاتے تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد دونوں میں رنجش پیدا ہوگئی جاموقہ سے کنارہ کش ہوجانے کے فوراً بعد مغول حکمرانوں نے تموجین کو اپنا خان تسلیم کرلیا اور اسے چنگیز خاں کا لقب دیا۔ بعد میں وہ اسی لقب سے تاریخ میں مشہور ہوا۔

قبیلے کا سردار بننے کے بعد چنگیز خاں مغولوں کی خانہ جنگیوں میں ایک اہم قوت بن گیا ۱۱۹۶ء میں جب لوگوں نے اس کے سرپرست طغرل کو تخت سے اتار دیا تو اسے کچھ وقت قرہ ختائی کے دربار میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی بالآخر ۱۱۹۸ء میں چنگیز خاں کی مداخلت سے اسے دوبارہ اپنا تاج و تخت واپس مل گیا۔ اسی سال ان دونوں نے تاتار کے خلاف ایک مہم میں چین کے حلیف کے طور پر حصہ لیا۔ ۱۱۹۹ء میں چنگیز خاں اور طغرل جسے اب اونگ خان کا لقب مل چکا تھا۔ دونوں نے مل کر مغربی منگولیا میں نایمان قبیلے پر حملہ کیا یہ قبیلہ بظاہر ترکی النسل تھا اور اس کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ۱۲۰۱ء اور ۱۲۰۲ء میں ان دونوں نے کئی موقعوں پر چنگیز خاں کے سابق دوست جاموقہ کے وفاقی قبیلوں کو شکست دی۔ ۱۲۰۲ء میں چنگیز خاں نے ایک اور لڑائی میں اپنے قدیم دشمنوں تاتاریوں سے آخری انتقام لیا۔ اور بحیثیت قوم کے تاتاری نیست و نابود ہوگئے۔ اس اثنا میں طغرل اور اس کے درمیان بھی تعلقات خراب ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ ایک روز ان دونوں کے درمیان کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی۔ پہلی جنگ میں چنگیز خاں کو شکست ہوئی لیکن دوسری لڑائی میں چنگیز خان نے طغرل کو شکست فاش دی۔ اور وہ مغرب کی جانب بھاگ نکلا جہاں ایک نایمانی سرحدی سنتری نے اس کا کام تمام کر دیا اور اس طرح مشرقی اور وسطی منگولیا مکمل طور پر چنگیز خان کے زیر اقتدار آ گئے۔ صرف مغرب کی طرف جہاں نایمان کے ساتھ جاموقہ اور مرکیت سردار اور ان کے ساتھ توقتائی بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس علاقے میں چنگیز خاں کا اقتدار تمام نہیں ہو سکا لیکن قبل اس کے کہ اس کے دشمن اس پر حملہ کرتے چنگیز خان نے پیش قدمی کر کے ایک معرکے میں انہیں شکست دی۔ اس موقعہ پر نایمان حکمران مارا گیا اس کا بیٹا کوچلوگ مرکیت کے توقتائی کے ساتھ مغرب کی طرف بھاگ گیا تاکہ دریائے ارتش کے بالائی حصوں میں جا کر آخری مرتبہ دشمن کے مقابلے کی تیاری کرے اچانک ایک تیر لگنے سے توقتائی مر گیا اور کوچلوگ کو آگے مغرب کی طرف بھاگنا پڑا۔ جہاں قراختائی کے علاقے میں اس کو پناہ مل گئی لیکن اس اثنا میں جاموقہ کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور دھوکے سے اسے چنگیز خان کے حوالے کر دیا جس نے اسے مروا دیا اور اس طرح چنگیز خاں بلا شرکت غیرے منگولیا کا مالک بن بیٹھا۔ ۱۲۰۶ء میں مغول حکمرانوں کے ایک اجتماع میں چنگیز خان کے حاکم اعلیٰ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

۱۲۰۵ء میں چنگیز خان نے تنگوت پر حملہ کیا۔ یہاں کے باشندے تبتی نسل کے تھے اور اس علاقے میں آباد تھے جہاں دریائے زرد کا بڑا موڑ واقع ہے۔ آجکل یہ علاقہ صوبہ کانسو اور علاقہ اوردوس پر مشتمل ہے۔ مزید دو مہموں کے بعد تنگوت کی حیثیت باجگزاروں کی ہوگئی اور اس طرح شمالی چین پر حملے کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ ۱۲۱۱ء میں چنگیز خان نے دیوار چین کے سارے علاقے پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ لیکن دیوار کی وجہ سے ان کی پیشقدمی رک گئی۔ ۱۲۱۳ء میں وہ دیوار چین کو سر کر کے دوسری طرف پہنچ گیا اور مغول شمالی چین کے میدان میں پھیل گئے۔ ۱۲۱۵ء تک دریائے زرد کے شمال کا سارا علاقہ مغولوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب وہ تین اطراف سے پیکن (موجودہ بیجنگ) کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چینی شہنشاہ نے شرائط صلح منظور کر لیں اور خراج ادا کر کے مغول فوجوں کو اپنے علاقے پر حملہ کرنے سے باز رکھا۔ یہ خراج وہ بیش بہا جہیز تھا جو چینی شہزادی کو دیا گیا جس کی شادی چنگیز خاں سے کر دی گئی لیکن حالات نے مغول کو فوراً بعد ہی چین واپس آنے پر مجبور کر دیا پیکن پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے اسے بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ شہنشاہ دریائے زرد کے جنوبی کنارے پر واقع کائی فنگ کی طرف بھاگ نکلا۔ لیکن لڑائی اس کے بعد بھی جاری رہی اور بالآخر چنگیز خان کی وفات کے سات سال بعد یعنی ۱۲۳۴ء میں جا کر چین کی تسخیر مکمل ہوئی۔ جو چنگیز خاں نے اپنے ایک جرنیل مقلی کے سپرد کی تھی۔

سمرچائی اور سنکیانگ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کے بعد چنگیز خان کی سلطنت کی سرحدیں، سلطان محمد خوارزم شاہ کی مملکت سے جا ملیں۔ ۱۲۱۶ء میں اور مزید احتیاط کے ساتھ ۱۲۱۹ء میں بحیرہ ارال کے شمال اور مشرق میں سلطان محمد کے زیر کمان فوج اور چنگیز خان کے سب سے بڑے بیٹے جوچی کے زیر کمان مغول فوج کے درمیان لڑائی ہوئی مغول فوج اس وقت مرکیت کے باقی ماندہ لوگوں کو مغلوب کر کے واپس آ رہی تھی۔ یہ لڑائی فیصلہ کن ثابت نہیں ہوئی اور آخر میں پیدا ہونے والی آویزشوں پر بظاہر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ یہ آویزش دراصل اس وقت شروع ہوئی۔ جب اترار کے حاکم نے چنگیز خان کے ایک سفیر اور اس کے ساتھ جانے والے مسلمان تاجروں کے کارواں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنگیز خاں نے خون بہا کی خاطر دوسرا سفیر بھیجا اسے بھی قتل کر دیا گیا اب جنگ ناگزیر ہوگئی۔ ۱۲۱۹ء کے موسم بہار میں چنگیز خان نے دریائے ارتش کے کنارے اپنی فوجیں اکٹھی کیں اور موسم خزاں تک وہ اترار کی دیواروں کے سامنے جا پہنچا اور اس نے شہر کا محاصرہ کرنے کے لیے اپنے بیٹوں چغتائی اور اوکتائی کے ماتحت ایک دستہ یہاں چھوڑا اور ساتھ ہی جوچی کو سیر دریا کے نشیبی جانب ایک مہم پر روانہ کیا۔ اور فوج کا بڑا حصہ ساتھ لے کر خود بخارا کی طرف بڑھا۔ شہر کا محاصرہ ہوا تو محافظ فوجیں آگے چھوڑ کر بھاگ گئیں اور شہر صرف تین دن کے محاصرے کے بعد فروری ۱۲۲۰ء میں تسخیر ہو گیا۔ سمرقند نے بھی بخارا کی طرح بہت کم مزاحمت کی اور مارچ میں اپنی شکست تسلیم کر لی اترار پہلے ہی فتح ہو چکا تھا۔ اور اس کے محاصرین بھی سمرقند کی فتح میں شامل ہو گئے۔ سمرقند سے چنگیز خان نے اپنے دو بہترین جرنیلوں یعنی جبہ اور سبتائی کو سلطان محمد کے تعاقب میں بھیجا۔ سلطان محمد مغول کی تیز پیش قدمی کی خبر سن کر پریشانی کے عالم میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مغربی جرنیلوں نے مغرب کی جانب اپنی پیشقدمی جاری رکھی اور آذربائیجان سے گذرنے اور کوہ قاف عبور کرنے کے بعد وہ موجودہ جنوبی روس کے جنگل میدانوں میں اترے۔ جہاں انہوں نے روسیوں اور قپچاق کی ایک فوج کو کریمیا میں دریائے کلکہ کے کنارے شکست دی۔ اس کے بعد وہ بحیرہ خزر کے شمالی ساحل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وسطی ایشیا میں چنگیز خاں سے جا ملے۔

۱۲۲۰ء میں چنگیز خان نے اپنے آدمیوں اور مویشیوں کو آرام دینے کے لیے موسم گرما نخشب کے علاقے میں گذارا۔ موسم خزاں میں اس نے ترمذ پر قبضہ کیا اور پھر دریائے جیحون کے بالائی حصے کا رخ کیا اور ۱۲۲۰ء-۱۲۲۱ء کے موسم سرما میں موجودہ سٹالن آباد کے علاقے میں فوجی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اور کچھ دن بدخشاں میں بسر کیے۔ سمرقند فتح کرنے کے بعد وہ چغتائی اور اوکتائی کو سلطان محمد کے صدر مقام گرگنج کا محاصرہ کرنے کے لیے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔ اب اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو خراسان کی تسخیر مکمل کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ کام اس نے اس خوبی سے سرانجام دیا کہ وہ صوبہ پھر کبھی اپنی سابقہ حالت پر نہ آ سکا۔

بقول ابن الاثیر مرو کے مقام پر سات لاکھ مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ جبکہ الجوینی نے قتل ہونے والوں کی تعداد ۱۳ لاکھ بتائی ہے جو قابل اعتبار نہیں ہے۔ نیشاپور کے متعلق بھی جوینی نے لکھا ہے کہ "یہ حکم دیا گیا تھا کہ شہر کو اس طرح برباد کیا جائے کہ اس کی زمین پر ہل چل سکے اور (ایک مغول حکمران کی موت کا) انتقام اس طرح لیا جائے کہ بلی اور کتے تک زندہ نہ چھوڑے جائیں۔" ہرات فتح کرنے کے بعد تولی اپنے باپ سے جا ملا۔

جس نے شہر طالقان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ جو بلخ اور مرو الرود کے درمیان واقع تھا۔ ۱۲۲۱ء کا موسم گرما چنگیز خان نے بلخ کے جنوب کے پہاڑوں میں گزارا۔ اس اثنا میں سلطان محمد کا بیٹا جلال الدین غزنہ تک آ پہنچا اور چاری کار کے شمال مشرق میں پروان کے مقام پر ایک مغول فوج کو، جو اس کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی تھی شکست فاش دے چکا تھا۔ پوری مہم میں یہ واحد موقع تھا کہ مغولوں کو شکست ہوئی۔

چنگیز خان کو جونہی یہ المناک خبر پہنچی تو وہ بڑی تیزی سے جلال الدین کے تعاقب میں جنوب کی طرف بڑھا اور آخر کار اسے دریائے سندھ کے کنارے آ لیا۔ جلال الدین کو مغول فوجوں نے تین طرف سے گھیر رکھا تھا اور چوتھی طرف یعنی اس کے پیچھے دریا تھا۔ اس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور بعد میں دریا میں کود پڑا۔ اور دوسرے کنارے پر جا پہنچا اور چنگیز کے مرنے کے تین سال بعد تک مغول سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتا رہا۔

بقول نسوی سندھ کی جنگ جو شوال ۶۱۸ھ/ ۲۴ نومبر ۱۲۲۱ء میں ہوئی چنگیز خان کی مغرب کی مہم کی آخری جنگ تھی۔ اس نے واپسی کی تیاریاں شروع کیں۔ اور آسام اور تبت سے ہوتا ہوا ہندوستان کے راستے واپسی کے امکانات کا جائزہ لینے کے بعد بالآخر اسی راستے واپس چلا گیا۔ جس راستے سے آیا تھا۔ یہ سفر اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑاؤ ڈال کر طے کیا۔ ۱۲۲۲ء کی گرمیاں اس نے ہندوکش کی پہاڑی چراگاہوں میں اور سردیاں سمرقند کے قرب و جوار میں بسر کیں۔ ۱۲۲۳ء میں موسم بہار اور موسم گرما موجودہ تاشکنت (تاشقند) میں بسر کیا۔ ۱۲۲۴ء کی گرمیاں اس نے دریائے ارتش کے بالائی حصے میں بسر کیں اور ۱۲۲۵ء میں موسم بہار میں وہ منگولیا میں جو اس کا صدر مقام تھا پہنچا۔

۱۲۲۶ء میں وہ پھر ایک بار تنگوت سے برسرپیکار ہوا لیکن اس مہم کی کامیابی دیکھنے کے لیے موت نے اسے مہلت نہ دی۔ ۱۲۲۷ء میں جب وہ کانسو میں دریائے حسی پر واقع ضلع جنگ شوئی میں اپنے گرمائی مقام میں آرام کر رہا تھا اس کا انتقال ہو گیا۔

جوزجانی کے بقول جب چنگیز خان نے خراسان پر چڑھائی کی تو اس وقت وہ ایک بلند قامت قوی الجثہ اور تنومند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھدرے بال تھے جو سفید ہو چکے تھے۔

چنگیز خاں کی زندگی کے اپنے والد کی وفات کے بعد کے ستائیس سال جب کہ وہ چالیس سال کا ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا دور قسمت آزمائی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس نے اسے ایک حکمران بننے کی تربیت دی۔ چنگیز خان کی فوج کے اعداد و شمار کے متعلق ماخذوں سے جو معلوم ہو سکا ہے وہ اس کی فوج کی تعداد چھ یا سات لاکھ بتاتے ہیں۔

چنگیز کی کامیابی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مغربی اور مشرقی ترکستان کے مسلمان باشندے بادشاہ نایمان کوچلک خان اور خود خوارزم شاہ کے ہاتھوں بہت مظالم برداشت کر چکے تھے۔ اور وہاں کے بہت سے شہر چنگیز خان کا انتظار بطور ایک نجات دہندہ کر رہے تھے۔ چنگیز خان ان مسلمان حکمرانوں کے ساتھ جو دل سے اس کے ساتھ تھے برابر حسن سلوک سے پیش آتا اور ان پر اعتماد کا اظہار کرتا رہا اور اس طرح ان کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

چنگیز خان جب بخارا پر قبضہ کر چکا تو وہ اپنے بیٹے تولی خان کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کی جامع مسجد میں جو قراخانیوں کے زمانے میں جامع کبیر کہلاتی تھی داخل ہوا اور اس کے ایک حصے میں گھوڑوں کے لیے اصطبل بنوا دیا اور وہاں کے علماء اور مشائخ کو ان گھوڑوں کو دانہ کھلانے پر مامور کیا اور خود اپنے امراء کے ساتھ مسجد کے ایک دوسرے حصے میں اپنی فتح و کامیابی کا جشن منانے اور عیش و عشرت کی محفل منعقد کرنے میں مشغول ہو گیا۔ تیسرے روز شہر کے باہر مصلیٰ میں شہر کے اشراف اور دولتمند لوگوں کو جمع کر کے منبر پر کھڑا ہوا اور ان سے اس طرح مخاطب ہوا: "تمہارا گناہ بڑا ہے اور میں اس کے محاسبے کے لیے مامور کیا گیا ہوں۔ میں عذاب الٰہی ہوں، اگر تم نے کوئی بڑا گناہ نہ کیا ہوتا تو خدا مجھے عذاب بنا کر نہ بھیجتا۔"

مسلمان علماء میں جس عالم کا ذکر تاریخی مصادر میں چنگیز کے مصاحب کے طور پر آیا ہے وہ قاضی وحید الدین فشنگی ہے۔ اس سے چنگیز خان نے متعدد بار پیغمبروں اور سابقہ مسلمان حکمرانوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ آنحضورؐ کو "محمد یلواچ" (محمد رسول) کہا کرتا تھا۔ ایک بار فشنگی سے دریافت کیا کہ محمد یلواچؐ نے اس کے بارے میں دنیا میں آنے اور دنیا کو فتح کرنے کے بارے میں کوئی خبر دی تھی یا نہیں۔ اس پر قاضی فشنگی نے اسے وہ احادیث سنائیں جو ترکوں کے خروج کے متعلق ہیں۔ انہیں غور سے سننے کے بعد چنگیز نے کہا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تو سچ کہہ رہا ہے۔"

چنگیز خانوادہ

چنگیز کے چار بیٹوں سے جو بورتہ کے بطن سے پیدا ہوئے ان سے جو اولاد ہوئی خانوادہ چنگیز کے نام سے موسوم ہوئی۔

چنگیز کی وصیت کے مطابق اس کی سلطنت اس کے مندرجہ ذیل چار بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔ ۱۔ جوچی ۲۔ چغتائی ۳۔ اوکتائی ۴۔ تولوی۔

۱۔ جوچی چونکہ اپنے والد کی وفات سے پہلے ہی مر گیا تھا اس کا ورثہ جو میدان قبچاق اور مغربی سائبیریا بشمول خوارزم پر مشتمل تھا۔ اس کی اولاد کے حصے میں آیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تیرہویں صدی ہی میں اور یقینی طور پر چودہویں صدی کے اوائل تک اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ عقیدے کے اعتبار سے سنی تھے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

جوچی کے دوسرے بیٹے باتو (م ۱۲۵۵ء) کے حصے میں قبچاق کا میدان آیا۔ اس نے التون اردو کی سلطنت کی بنیاد رکھی اس کے جانشینوں نے ۱۳۶۰ء تک یہاں حکومت کی۔

سولہ برس بعد ۱۳۷۶ء میں التون اردو کی سلطنت باتو کے بڑے بھائی کے جانشینوں کے ہاتھ آئی۔ ۸۴۲ھ/ ۱۴۳۸ء کے بعد التون اردو کا علاقہ کئی ریاستوں میں منقسم ہو گیا جن پر چنگیز خان کی اولاد کی حکومت تھی۔ اور وہ ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۲ء تک اس پر قابض رہے۔

۲۔ قلمرو استراخان جہاں کوچک محمد کے جانشین ۹۶۵ھ/ ۱۵۵۰ء تک حکومت کرتے رہے۔ اس دوران میں باتو اور اردہ کے بھائی توقا تیمور (توقا تیمور) کے جانشین قبچاق کی تقسیم میں اپنا حصہ لینے میں کامیاب ہو گئے ان کا تعلق اس خاندان کی تیسری شاخ سے تھا۔ ان میں حکمرانی کے سلسلے کی تفصیل یہ ہے۔

۳۔ الغ محمد اور بورک اردو سے نکالے جانے کے بعد قازان کا خان بنا۔ یہ ریاست اس کے جانشینوں سے روسیوں نے ۹۶۰ھ/ ۱۵۵۲ء میں چھین لی۔

۴۔ الغ محمد کا بھتیجا حاجی گرائی کریمیا کا حکمران بنا۔ اس کے جانشینوں نے خاندان گرائی کے نام سے یورپ میں چنگیز خان کے آخری جانشینوں کی حیثیت سے اس علاقے میں حکومت کی۔ یہاں تک کہ روسیوں نے ۱۷۸۳ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔

۵۔ قاسموف۔ علاقہ ایازان کی چھوٹی سی تاتاری ریاست میں الغ محمد، کوچک محمد گرائی، اور شیبانیوں کی شاخوں کے کئی حکمرانوں نے حکومت کی۔ ان میں سے بعض نے عیسائیت قبول کر لی۔ یہ لوگ روسی امراء کے خاندانوں کے مورث اعلیٰ ہے۔

۶۔ استراخان (دیکھیے ۲) میں حکمران شاخ کے جانشین روسی قبضے کے بعد جاگیر شیبانیوں کے پاس بخارا میں چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک شہزادے جان محمد بن یار محمد نے شیبانی خان اسکندر کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء میں خاندان بخارا کی

چنگیز (خانوادہ)

چنگیز خان، م ۱۲۲۷ء

۱۔ جوچی (جوجی، توشی) م ۱۲۲۷ء

۲۔ چغتائی م حدود ۱۲۴۲ء

۳۔ اوکتائی (اوقتائی، در جامع) قاآن (۱۲۲۹ تا ۱۲۴۱ء)

۴۔ تولوی (تولی) م حدود ۱۲۴۰ء

جوچی کی اولاد:

ب۔ اوردہ — آق اردو — چھ پشتیں

ا۔ باتو م ۱۲۵۵ء — آلتون اردو (۱۳۶۰ء تک) (دیکھیے شجرۂ نسب سادہ باتو (خانوادہ))

برکہ — آلتون اردو تیمور (۱۲۵۶ء تا ۱۲۶۶ء)

ج۔ توغہ — (توقاتیمور) ایک پشت — ساتِ پشتیں

د۔ مغول — نوغائی م ۱۲۹۹ء — دو پشتیں

ہ۔ شیبان (شیبان) — شیبانی ہای قازقستان از ۱۴۴۷ء

چغتائی کی اولاد:

دو پشتیں — بُرَق (بُراق) م ۱۲۷۱ - ۱۲۷۲ء

ا۔ خوانینِ ماوراء النہر ۱۴۰۲ء تک (دورِ اقتدارِ تیمور ۱۳۶۳ء تک)

ب۔ خوانینِ مغولستان — خوانینِ ماوراء النہر (تناسخِ خرد ۱۵۰۹ء تک)؛ خوانینِ مغولستان اور کاشغر ۱۶۷۸ء تک

اوکتائی کی اولاد:

کیوک خان (۱۲۴۶ تا ۱۲۴۸ء)

کشی — قیدو (قایدو، م ۱۳۰۱ء) — چپر ۱۳۰۹ء میں بھاگ گیا

شیبانیوں کی شاخیں:

(ا) بخارا ۱۵۰۰ء تا ۱۵۹۸ء

(ب) خوارزم ۱۵۱۲ء تا ۱۶۹۴-۱۶۹۵ء

(ج) خوقند ۱۷۱۰ء تا ۱۸۷۶ء

(د) سائبیریا ۱۵۶۵ء، تا حدود ۱۶۲۵

(ہ) قاسموف نیز دوسری شاخوں کے حکمران تا ۱۶۸۱ء

اوردہ کی اولاد:

اُرس خان آلتون اُردو ۱۳۷۴ء تا ۱۳۷۶ء — تین پشتیں — کوچوک محمد حدود ۱۴۳۵ء تا حدود ۱۴۶۵ء

(تولی) خوجہ — نقتمیش ۱۴۰۶ء تا ۱۴۰۷ء — آلتون اردو ۱۳۷۷ء تا ۱۳۹۵ء — چار بیٹے اور آلتون اردو ۱۴۱۲ء تا ۱۴۱۹ء

تولوی کی اولاد:

منکو (منگکو) (مونککا در جامع) قاآن ۱۲۵۱ء تا ۱۲۵۹ء

(ا) قبلای قاآن ۱۲۵۹ تا ۱۲۹۴ء — خاندان یوآن چین میں ۱۳۳۸ء تک — خوانینِ منگولیا بدھ مذہب — متعدد قبائل

(ب) ہولاگو م ۱۲۶۵ ایلخان ۱۳۵۳ء تک — تفصیل کے لئے (دیکھیے ایلخانیہ)

ارک بوغا — دو پشتیں — اریا ایل خان ۱۳۳۵ تا ۱۳۳۶ء

مزید شاخیں:

ا۔ بویوک اردو ۱۵۰۲ء تک

ب۔ استراخان ۱۵۵۷ء تک — و جانی ہای بخارا ۱۵۹۸ء تا ۱۷۸۵ء تک

ج۔ الغ محمد م ۱۴۴۷ء قازان ۱۵۵۲ء تک

غیاث الدین (خاندان گرای) د۔ کریمیا ۱۷۸۳ء تک

اولاد ذریت کے ختم ہو جانے کے بعد جان محمد کے بیٹے باقی محمد نے ملک کا انتظام سنبھال لیا اور اس نئے خاندان کا نام استرخانی یا جانیہ پڑ گیا۔ یہ خاندان ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء تک بخارا میں حکمران رہا۔

جوچی کے ایک اور بیٹے منغول کے جانشینوں میں اس کے پوتے نوغائی نے التون اردو کے کئی حکمرانوں کے دور میں ایک مقتدر شخص کی حیثیت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء میں وہ ایک خانہ جنگی کے دوران میں مارا گیا۔ اس کے بعد دو پشتوں تک اس کے جانشینوں کا پتہ چلتا ہے۔

جوچی کے سب سے چھوٹے بیٹے شیبان کے جانشین ابتدائی دور میں کوہ یورال کے جنوب مشرقی علاقے میں دریائے ترکول کے منبع اور مشرق میں بالائی ارتش کے درمیان کہیں رہتے تھے جہاں انہوں نے اپنی خانہ بدوشی کی زندگی کو قائم رکھا۔ جب وہ نقل مکانی کر کے اور وہ کے آق اردو کے باشندے تقتیمش کی ماتحتی میں قپچاق کے میدان میں چلے گئے تو شیبانیوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ شیبانیوں کی حکومت ماوراءالنہر کے مندرجہ ذیل علاقوں میں قائم رہی۔

بخارا پر یہ لوگ ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک قابض رہے ان کا آخری حکمران عبداللہ ثانی تھا

خوارزم۔ اس پران کا اقتدار ۹۱۱ھ۔ ۹۱۲ھ/۱۵۰۵۔ ۱۵۰۶ء میں قائم ہوا۔ اور یہاں پران کا اقتدار ۱۱۰۶ھ۔ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۴۔ ۱۶۹۵ء تک قائم رہا۔

فرغانہ۔ جس پر شیبانیوں کی ایک شاخ نے ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں قبضہ کیا اور ۱۸۷۶ء تک یہاں پران کا اقتدار قائم رہا۔ یہاں تک کہ روس نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

تومن۔ اس کے نواحی علاقے کو شیبانی حکمران ابک نے ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں ایک غیر چنگیزی سے چھین لیا۔ اور تقریباً ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء تک اس علاقے پر قابض رہے

چنگیز خان کے دوسرے بیٹے چغتائی کے جانشینوں نے بھی تقریباً اتنے ہی عرصے تک حکومت کی۔ انہوں نے اوکتائی کے جانشینوں کا تیرہویں صدی عیسوی میں نہایت جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء کے بعد اندرونی ایشیا ان کے قبضے میں آ گیا۔

چغتائی کا پرپوتا برق اور اس کا بیٹا دوا (۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء تا ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء) چینیوں کی مدد سے قایدو سے جنگ کرتے رہے اور بالآخر اس کی سلطنت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بھائی ترمہ شیرین نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے ساتھ اپنے خاندان کو اور رفتہ رفتہ سارے علاقے کو حلقۂ اسلام میں داخل کر لیا۔ اس کی موت کے بعد اس خاندان کی عارضی طور پر دو شاخیں ہو گئیں

۱۔ خاندان کی وہ شاخ جو ماوراءالنہر میں حکمران تھی مسلمان ہو گئی۔

۲۔ اولوس کا مشرقی حصہ جو اس وقت مغولستان کہلایا۔ خاندان کی دوسری شاخ کے ہاتھ آیا۔ اس کے دور حکومت میں اسلام بہت آہستہ آہستہ پھیلا۔ ماوراءالنہر کے شیبانیوں نے چغتائیوں کو ۹۱۴۔ ۹۱۵ھ/۱۵۰۸۔ ۱۵۰۹ء میں قطعی طور پر ختم کر دیا۔ صرف تمن شن کے مشرق کا مغولستان اس خاندان کے قبضے میں رہا لیکن اسے قبیلہ دوغلات کو بھی اپنے اقتدار میں ایک حصہ دار بنانا پڑا۔ جن کا مرکز کاشغر تھا۔ سولہویں صدی تک چغتائی قوت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی بالآخر ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں جب خان اسماعیل کاشغری نے خوجہ کے اقتدار سے نکلنے کی کوشش کی تو چغتائی قوت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔

چنگیز خان کا تیسرا بیٹا قاآن کی حیثیت سے اپنے باپ کا جانشین بنا اور ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء تا ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء تک حکمران رہا۔ اس کے بیٹے کیوک کو بھی ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء تا ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء تک یہ شرف حاصل رہا۔ ان کی وفات کے بعد ان دونوں کی بیواؤں نے اتالیق کی حیثیت سے سلطنت کا کاروبار چلایا لیکن باتو کے اثر و رسوخ کے تحت خانیت عظمیٰ اس شاخ میں نہ رہ سکی۔ اور تولوی کی شاخ میں منتقل ہو گئی۔

چنگیز خان کے سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو خاص منگولیا کا علاقہ بطور اولوس ملا تھا۔ چونکہ اس کے بیٹوں منگکو قاآن اور قبلائی کی حیثیت خاقان بزرگ کی تھی۔ ۱۲۸۰ء تک وہ تمام چین پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس لئے منگولیا اور اس کے صدر مقام قراقرم اور وسطی سلطنت کے درمیان خاندانی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ ایک تیسرے بھائی ارق بوگ نے منگولیا میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا لیکن ۱۲۶۴ء میں اسے مغلوب ہونا پڑا۔ ۱۲۹۴ء میں قبلائی کی موت کے بعد پوری مغول سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اس خاندان کی دوسری شاخوں نے آہستہ آہستہ اسلام قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ ایران کے ایلخان بھی جن کے تعلقات خاص طور پر خان باتو کے ساتھ بہت زیادہ مسلمان ہو گئے۔

سولہویں صدی کے آغاز میں مغول قوم میں بدھ مت اپنے کلیسائے زردکی رہبانیت والی تبتی شکل میں قدم جما چکا تھا۔ ۱۹۴۹ء کے بعد اور روس کے علاقے میں مغول چینی تسلط میں آ گئے۔

قبلائی کے چوتھے بھائی ہولاگو نے ایران، عراق اور عارضی طور پر شام فتح کیا۔ اس نے عباسی خلافت ختم کر کے ایلخانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی وہ اور اس کے جانشین شروع میں بدھ مت کی طرف مائل تھے لیکن ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء میں وہ خاندان کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء کے بعد خانہ جنگیوں کی وجہ سے ایلخانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس شاخ کا آخری فرمانروا انوشیروان تھا۔

چنیوٹ

چنیوٹ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ایک شہر جس کا ضلع جھنگ ہے دریائے چناب کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور شہر سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بہتا ہے۔ غالباً یہ شہر از منہ قدیم میں چینیوں کی ایک بستی تھی شہر کے بارے میں [illegible] روایات ہیں مثلاً یہ کہ قدیم زمانے میں کسی حکمران کی بیٹی جس کا نام چندن تھا وہ شکار کی بڑی شوقین تھی۔ اسے شکار کے لئے یہ جگہ بہت زیادہ پسند آئی اور اس نے یہاں ایک شہر بسانے کا حکم دیا اس شہر کا نام اس کے نام کی رعایت سے چندنیوٹ رکھا گیا قدیم تحریروں میں اس کا یہی نام ملتا ہے۔

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے چنیوٹ اور سفید ہنوں کی سلطنت کے صدر مقام ساکلہ کو ایک ہی شہر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

[illegible] ھ/۱۳۹۸ء کی ہندوستانی مہم کے دوران میں تیمور نے [illegible] بعد اس شہر پر اسی خاندان کا قبضہ رہا۔ ۸۴۶ھ/۱۴۴۱ء میں ملتان [illegible] بن قطب الدین لنگاہ نے بہلول لودھی کے صوبے دار سید علی خان ملک [illegible] چنیوٹ کی حکومت سے بے دخل کر دیا اسی اثنا میں بہلول لودھی کے [illegible] باربک شاہ کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا سلطان حسین لو [illegible] نے ملتان کے قریب گھمسان کی ایک لڑائی میں باربک شاہ کو شکست دی [illegible] باربک کی توجہ چنیوٹ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

بابر اس ارادے سے کہ چنیوٹ پر بھی تیموری خاندان کا قبضہ تھا اس شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء میں چنیوٹ فتح کر لیا۔ [illegible] مغلوں کے زیر حکومت آ گیا۔ اکبر کے دور حکومت میں یہاں پر ایک [illegible] قلعہ میں پانچ ہزار فوجی رہتے تھے۔

بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں درانیوں کے حملوں اور سکھوں کی لوٹ مار نے اس شہر کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں چنیوٹ کو ایک بار پھر سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ جب ایک سکھ سپالار نرائن سنگھ نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن اگلے ہی سال انگریزوں نے پنجاب کو اپنے علاقے میں شامل کیا تو اس شہر پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

موجودہ چنیوٹ میں اب خاص شہر اور دو نواحی بستیاں شامل ہیں۔ شہر بڑا گنجان آباد ہے۔ شاہ جہانی عہدِ حکومت کے وزیرِ اعلیٰ سعد اللہ خاں علامی نے یہاں ایک خوب صورت جامع مسجد بنوائی تھی۔ اس مسجد میں قرب و جوار کی پہاڑیوں کا پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ چنیوٹ کی موجودہ آبادی اندازاً ۵۰ ہزار ہے۔

چوبان (خانوادہ)

مغل امراء کا ایک خاندان۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ قبیلہ سلادز کے ایک شخص بیدر خان شیرہ کی نسل سے ہیں جس نے ایک موقع پر چنگیز خان کی جان بچائی تھی۔ اس خاندان کے ممتاز ترین افراد مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ امیر چوبان : ایک قابل اور آزمودہ کار فوجی سپہ سالار تھا۔ اس نے اپنی پہلی لڑائی ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں لڑی۔ اس کے بعد اس نے ایلخانی، ارغون، گیخاتو، غازان اور الجایتو کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

۷۱۷ھ / ۱۳۱۷ء میں ابو سعید نے اسے امیر الامراء کے منصب سے نوازا اور اپنی بہن دولندی سے اس کی شادی ہوئی۔ ابو سعید کے عہدِ حکومت میں جو الجایتو کا جانشین بنا امیر چوبان کو ملکی امور میں بہت اثر و رسوخ حاصل ہوگیا۔ علاوہ ازیں ایلخانی سلطنت کے سب صوبوں پر اس کے بیٹوں کی حکومت تھی۔ ۷۱۹ھ / ستمبر ۱۳۱۹ء میں امراء کی ایک جماعت نے امیر چوبان کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن امیر چوبان نے ابو سعید کی اعانت سے اس بغاوت کو کچل ڈالا۔ دولندی کی وفات کے بعد امیر چوبان نے ابو سعید کی دوسری بہن ساتی بیگ سے شادی کر لی۔ یہ واقعہ ۷۱۹ھ / ۱۳۱۹ء کا ہے۔ ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں اس نے اپنی بیٹی بغداد خاتون سے جو شیخ حسن جلایری کی بیوی تھی سے ابو سعید کو شادی کرنے سے روک دیا۔ دو سال بعد جب امیر چوبان پایۂ تخت سے دور خراسان میں تھا تو اس نے امیر چوبان کو اور پوری ایلخانی سلطنت میں اس کے خاندان والوں کو قتل کرنے کے احکام جاری کئے۔ امیر چوبان کو ان احکامات کی پہلے ہی خبر مل گئی تھی۔ چنانچہ وہ رے تک آیا اور ابو سعید سے گفت و شنید کی لیکن ناکام رہا۔ یہاں سے وہ ہرات کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اور کرت قبیلے کے رئیس ملک غیاث سے پاس پناہ گزین ہوگیا۔ جس نے چند ماہ بعد انعام کے لالچ میں ۷۲۸ھ / ۱۳۲۷ء میں امیر چوبان اور اس کے بیٹے جلاوخان کو قتل کر دیا۔ ان کی لاشیں دفن کے لئے مدینہ منورہ لے جائی گئیں۔

۲۔ دمشق خواجہ : امیر چوبان کا تیسرا بیٹا۔

جب امیر چوبان ۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء میں چغتائی خاندان کے مغلوں کے خلاف خراسان کی حفاظت کے لیے روانہ ہوا تھا تو دمشق خواجہ شاہی دربار میں رہا اور عملاً ایلخانی سلطنت کا حکمران بن گیا۔ اس کی آوارہ مزاجی نے ابو سعید کو جو چوبانیوں کا قلع قمع کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا ایک عذر مہیا کر دیا۔ دمشق خواجہ پر حرم شاہی کی ایک عورت سے ناجائز تعلق کا جرم ثابت ہوا اور اسے ۵ شوال ۷۲۷ھ / ۲۴ اگست ۱۳۲۷ء میں موت کی سزا دے دی گئی۔ اس کی بیٹی دلشاد خاتون کی اس کے باپ کی موت کے بعد پہلے ابو سعید سے شادی ہوئی اور بعد میں جلایری شیخ حسن بزرگ سے

۳۔ تیمور تاش : امیر چوبان کا دوسرا بیٹا جو الجایتو کا وزیر رہا تھا۔

۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء میں ولایت روم کا حاکم بنا۔ وہ پہلی مرتبہ مغول فوجوں کو بحیرہ روم کے ساحلوں تک لے گیا۔ ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ - ۱۳۲۲ء میں اس نے بغاوت کی۔ اس نے مہدی کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کے سکے ڈھلے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ امیر چوبان اپنے اس بیٹے کو گرفتار کر کے ابو سعید کے پاس لایا جس نے اس کے باپ کی خاطر اسے معاف کر دیا۔ اپنے بھائی خواجہ دمشق کے قتل کے بعد تیمور تاش بھاگ کر مصر چلا گیا۔ جہاں پر سلطان الناصر نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ لیکن بعد میں ابو سعید کے تیمور تاش کے لئے مطالبات سے گھبرا کر اسے قتل کرا دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۳ شوال ۷۲۸ھ / ۲۱ اگست ۱۳۲۸ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

۴۔ حسن بن تیمور تاش :

اس کو حسن کوچک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ۷۳۶ھ / ۱۳۳۵ء میں ابو سعید کی وفات کے بعد ایک حیلے سے روم میں اپنے والد کے امیر ڈول کی مدد حاصل کر لی۔ اس نے ذوالحجہ ۷۳۸ھ / جولائی ۱۳۳۸ء میں حسن بزرگ کو نخچوان کے قریب شکست دی۔ پھر اس نے امیر چوبان کی بیوہ ساتی بیگ اور اریہ خان کی تبریز میں اطاعت قبول کر لی۔ ۷۳۹ھ / ۱۳۳۸ - ۱۳۳۹ء میں حسن بزرگ سے شرائط صلح طے کر لیں۔ اگلے سال اس نے اپنی اطاعت ہولاگو خان کی اولاد میں سے سلیمان خان کی طرف منتقل کر کے اس سے ساتی بیگ کی شادی کر دی۔ ۲۷ رجب ۷۴۴ھ / ۱۵ دسمبر ۱۳۴۳ء میں اس کی بیوی عزت ملک نے تبریز میں قتل کرا دیا۔

چورم

وسطی اناطولیہ کے شمالی حصے کا ایک شہر جو دریائے مجی توزو کے معاون چوردم چای سے تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔

چورم ایک وسیع زرخیز وادی میں واقع ہے اور چورم نام کی ولایت کا صدر مقام ہے۔ یہ ولایت انقرہ میں شامل تھی۔ آخری مردم شماری کے مطابق جو ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ اس شہر کی آبادی ۲۲۸۳۵ تھی۔

جدید چورم میں اگرچہ تاریخی دلچسپی کی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس کی بڑی مسجد "اولو جامع" موجودہ دور کی بنی ہوئی ہے جو ۱۹۰۹ء میں تعمیر کی گئی تھی لیکن اس کی بنیاد غالباً اٹھارھویں صدی کی عمارت پر رکھی گئی ہے۔ اس مسجد میں سلجوقیوں کے آخری عہد کی ایک خوب صورت اور بڑا سا منبر رکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ منبر قرہ حصار سے یہاں لایا گیا تھا۔

چورم کی ولایت کی بعض فضاؤں میں حتی کی مشہور کھدائیاں ہوئی ہیں

چوش

وسطی والگا کی ایک ترکی بولنے والی قوم۔

چوش کی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ اسی قوم کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ آس پاس کے علاقوں میں بھی آباد ہیں یعنی تاتارستان اور باشقرت کی خود مختار جمہوریتوں اولیا نووسک، کوئی بیشو اور سراٹوف کے خطے اور مغربی سائبیریا میں بھی یہ لوگ آباد ہیں۔

ایک خیال کے مطابق چوش قبائل خزر کے اخلاف تھے۔ اگرچہ یہ خیال آج کل ترک کر دیا گیا ہے اور زیادہ قرین قیاس خیال یہ ہے کہ چوش بلغاری الاصل ہیں۔ اس دعوے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ آج کل کی چوش زبان اور بلغار شہر کے شکستہ آثار اور دریائے ڈینیوب کے کنارے پر مقابر کے کتبوں کی زبان میں موجود ہے۔ چنانچہ

موجودہ دور میں حسین فیض خانوف اور کئی ایک دوسرے محققین چوش کو بلغاری قبیلہ سوک یا سوز کی نسل سے بتاتے ہیں جنہوں نے دیگر بلغاریوں کے برخلاف اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور مظاہر پرستی پر قائم رہے۔

چوش کے بارے میں ایک نیا نظریہ یہ ہے کہ چوش کے اجداد ایسے فن اگری قبائل سے تھے جو ترکی کی تمدن سے مختلف ترکی قبائل کے ذریعے متاثر ہوتے۔ یہ ترکی قبائل جنوب یا جنوب مشرق سے آکر ساتویں صدی عیسوی میں بلغاریوں کے وسطی والگا تک پہنچنے سے پہلے ہی وہاں وارد ہو گئے تھے۔ ترکی تمدن کا اثر و نفوذ فن اگری لوگوں میں بلغاری عہد میں تیرھویں صدی تک یا اس کے بعد تک جاری رہا۔

ان کی اصل و نسل جو کچھ بھی ہو، چوش ترکی بولتے تھے لیکن مظاہر پرست تھے۔ اٹھارھویں یا انیسویں صدی میں اُنہیں عیسائی بنا لیا گیا لیکن مسلمانوں یعنی بلغاریوں اور بعد میں تاتاریوں کے رابطے کی وجہ سے اسلامی اثرات سے متاثر ہوتے رہے۔ بعض چوش جو قازان کے تاتاریوں سے بہت زیادہ قریب تھے مسلمان ہو گئے یہ عمل قازان کی خانی حکومت کے دور سے شروع ہوا اور موجودہ زمانے تک جاری ہے۔

ان میں سے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے انہوں نے تاتاریوں کی زبان اور مذہب دونوں بیک وقت اختیار کر لئے اور وہ تاتاری نما بن گئے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں قازان کی حکومت میں چوش تاتاریوں سے تین گنا تھے۔

وہ چوش جو مظاہر پرست یا عیسائی ہیں ان میں بیسویں صدی کے آغاز تک بھی ایسے گروہ موجود تھے جو راسخ العقیدہ مسلمان نہ تھے جیسے تاتارستان کی خود مختار سوویٹ جمہوریت کے ضلع KAYBITZK کے کرش چینی کے باشی جو مظاہر پرست ہیں یا اولیانووسک کے علاقے کے چوش جنہیں ۱۹۱۷ء سے پہلے کلیسائے قدیم کا عیسائی تصور کیا جاتا تھا۔

۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد تیرہ لاکھ اٹھتر ہزار کے لگ بھگ تھی جبکہ ۱۹۵۶ء میں چوش کی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ میں ان کی تعداد دس لاکھ پچانوے ہزار تھی۔

چوری

سرقہ، خفیہ طور پر اس چیز کو لے لینا جس کو لینے کا حق نہ ہو۔

شرعی اصطلاح میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں۔ کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لینے کی حرکت حد درجہ کمینی حرکت ہے اسی لئے اس کی سزا بھی بہت سخت رکھی گئی ہے۔

قرآن مجید میں چوری کی سزا یہ بیان ہوئی ہے

"اور چور خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی۔
(۵ : ۳۸، ۳۹)

بقول مولانا شبلی نعمانی "چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اور اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی اور برائیاں شامل ہیں۔"

اہلِ عرب میں غالباً عام افلاس کی وجہ سے یہ بیماری اس حد تک تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس بات کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی۔

حضرت عبادہ بن صامت رضؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضورؐ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔" پھر یہ آیت پڑھی۔ "جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ تعالےٰ کے ذمے ہے۔ اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہو اور اس کو اس کی سزا دے دی گئی تو اس کے گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اُس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے، چاہے سزا دے۔" (بخاری، کتاب الحدود)

ایک اور حدیث میں آنحضورؐ نے چور پر لعنت بھیجی۔ "فرمایا اللہ تعالےٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔" آنحضور نے یہ بھی فرمایا کہ جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔" (بخاری)

نبی کریمؐ نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اور ایک ڈھال کی قیمت آنحضورؐ کے زمانہ میں بروایت عبداللہ بن عباسؓ دس درہم، بروایت ابن عمرؓ تین درھم اور بروایت انس بن مالکؓ پانچ درہم اور بروایت حضرت عائشہؓ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔

اس اختلاف کی بنا پر فقہا کے درمیان کم سے کم نصاب سرقہ میں اختلاف ہو گیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سرقہ کا نصاب دس درہم ہے اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک چوتھائی دینار۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ مثلاً آنحضورؐ نے ہدایت فرمائی ہے کہ پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ کاٹا نہ جائے گا۔ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ کے زمانہ میں حقیر چیزوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔ نیز حضرت عمرؓ نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کٹوایا۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیان نہ بنا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کے قائل نہیں۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی امام اعظمؒ قطع ید کے قائل نہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

اگر چور خود ایک بار اقرار کرے یا دو مردوں کی گواہی سے چوری ثابت ہو جائے تو اس کا ہاتھ کاٹنا ضروری ہے۔ اگر ایک جماعت چوری کرے تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اگر جماعت میں سے ایک شخص نے چوری کی اور باقی جدا ہو کر ... اس مال کو آپس میں تقسیم کیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر ہر ایک کے حصے میں نصاب کی مقدار یعنی دس درہم مال آیا ہے تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے پہلی بار چوری کی تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر وہ دوسری بار پھر چوری کرے تو بالاتفاق اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ تیسری بار چوری کرنے کے جرم میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک اسے قید کیا جائے گا لیکن امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک تیسری مرتبہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور چوتھی بار چوری کرنے پر اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ (نورالہدایہ)

چھینک جب بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں تو دماغ متاذی ہو کر اضطراراً ان کو دفع کرتا ہے اس طرح جو حرکت عمل میں آتی ہے چھینک کہلاتی ہے۔

چھینک سے ایک طرح کی راحت پہنچتی ہے اس لئے چھینک لینے والے کو الحمد للہ کہنے کا حکم ملا ہے۔ یہ کلمہ شکر ہے۔

حضرت عامر بن ربیعہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضورؐ کے پیچھے نماز میں چھینک لی تو کہا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا حَتّٰی یَرْضٰی رَبُّنَا وَبَعْدَ مَا یَرْضٰی مِنْ اَمْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۞

"سب تعریف خدا کے لئے ہے۔ بہت تعریف، پاک تعریف۔ یہاں تک کہ ہمارا پروردگار راضی ہو جاتے اور اس کے بعد ہمارے دنیاوی اور اخروی امور سے راضی ہو۔"

آنحضورؐ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ کلمات کس نے کہے ہیں۔ وہ شخص خاموش ہو گیا۔ آنحضورؐ نے پھر فرمایا کہ یہ کلمات کس نے کہے ہیں اس مرتبہ بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے تیسری بار فرمایا کہ یہ کلمے جس نے کہے ہیں اُسے فوراً بول اُٹھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس نے کوئی بُری بات نہیں کہی ہے وہ شخص بول اُٹھا کہ حضورؐ میں نے کہے ہیں اور میں نے بجز بھلائی کے ان سے اور کچھ ارادہ نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ کلمات سیدھے عرش تک پہنچ گئے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ (ہر حال میں خدا کا شکر ہے) کہے اور سننے والا یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہے اور جب سننے والا یَرْحَمُکَ اللّٰہُ (خدا تجھ پر رحم کرے) کہے تو یہ اس کے جواب میں یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ (خدا تمہیں ہدایت دے اور تمہارے دل سنوارے) کہے (مشکوٰۃ)

ایک حدیث میں جو حضرت انسؓ سے مروی ہے "ایک بار دو آدمیوں کو آنحضورؐ کے سامنے چھینک آئی۔ پس ایک کا تو آپؐ نے جواب دیا اور دوسرے کا جواب نہ دیا۔ اس نے عرض کی یا حضرتؐ آپؐ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا تو آپؐ نے فرمایا اس نے الحمد للہ کہا تھا اور تم نے نہیں کہا تھا" (مشکوٰۃ)

آنحضورؐ کا فرمان مبارک ہے "جب کسی کو چھینک آئی اور اس نے الحمد للہ کہا تو تم جواب دو اور جو نہ کہے تو تم بھی جواب نہ دو" (مسلم)

ایک اور حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آپؓ نے فرمایا کہ جب آنحضورؐ کو چھینک آتی تو آپؐ روئے مبارک ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور آواز مدھم کر لیا کرتے" (ترمذی، ابوداؤد)

حضرت مسلم بن اکوعؓ سے مروی ہے ایک بار آنحضورؐ کے سامنے ایک شخص کو چھینک آئی تو آپ نے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ فرمایا۔ مگر دوسری مرتبہ فرمایا اس کو زکام ہے۔ (مسلم)

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے تیسری بار یہ فرمایا تھا۔

چیچن روسیوں کا دیا ہوا ان مسلمانوں کا نام جو وسطی قفقاز میں دریائے سنجہ اور دریائے تیرک کے جنوبی معاون دریاؤں کی وادیوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ "آبیرو۔ قفقازی" اقوام کے لسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان انگش، بتسربی اور کستن زبانوں کے ساتھ مل کر ایک خاص گروہ کی تشکیل کرتی ہے جو داغستانی زبانوں سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔

چیچن قدیم "آبیرو قفقازی" قبائل کی اولاد ہیں جنہیں الائن نے درہ دریال اور اور وادی تیرو ارغون کے درمیان بلند پہاڑیوں کی طرف بھگا دیا تھا۔ اٹھارھویں صدی تک ان کی تاریخ کا قطعی پتہ نہیں چلتا۔ ان کے بارے میں صرف اس حد تک معلومات ملتی ہیں کہ سولہویں صدی میں ان کے غلہ بان قبیلوں نے اس علاقے میں آنا شروع کیا جو آج کل چیچنوں کے ملک کا شمالی حصہ ہے۔ شروع میں وہ کبرد حکمرانوں کے محکوم تھے لیکن اٹھارھویں صدی میں وہ روسیوں کے آنے سے ذرا پہلے انہوں نے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا تھا۔

یہ لوگ حنفی مسلک تھے جو سترھویں صدی سے داغستان اور کبربیا کی راہ سے اس ملک میں داخل ہونا شروع ہوا۔

جب روسی فوج کے دستے اس علاقے میں داخل ہوئے تو چیچن خیلوں میں منقسم تھے۔ ان میں سے بعض قبیلوں کی صورت میں متحد تھے روسیوں نے چیچن کا نام اٹھارھویں صدی کے وسط میں روسیوں کی جنوب کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی تو اس پیش قدمی میں قلعے تعمیر ہوئے۔ قازقوں کی نو آبادیاں قائم کی گئیں اور مقامی باشندوں کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر کے انہیں بلند کوہساروں کی طرف بھگا دیا گیا۔

چیچنوں نے روسی پیش قدمی کا جم کر مقابلہ کیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں بلادِ چیچن شمیل کی امامت کا سب سے بڑا گڑھ بن گئے۔ اور روسی ۱۸۵۹ء تک بمشکل اُن پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ۱۸۶۵ء میں چیچنوں کا ایک گروہ جو چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا ترکیہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب سے ذرا پہلے بلادِ چیچن میں امن و امان قائم ہو گیا تھا۔

انقلاب سے پہلے چیچنی معاشرے میں قدیم اور اصلی جاگیردارانہ نظام قائم رہا۔ ہر جگہ چالیس سے پچاس افراد تک کا ایک بڑا سا قبیلی خاندان نظر آتا تھا۔ بعد ازاں چیچنی معاشرے نے معاشرتی طبقات میں کسی قسم کی تفریق کو تسلیم کرنا چھوڑ دیا۔ اور تمام چیچن اپنے آپ کو ازدن (اشراف) سمجھنے لگے۔

اکتوبر کے انقلاب کے بعد ملک چیچن جو روسی حکومت کے خلاف مقامی مدافعت کا آخری گڑھ رہ گیا تھا، ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء میں اسے جمہوریہ کوہسار میں شامل کر لیا گیا اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو بالائی چیچنیا کو خود مختار خطہ چیچن بنا دیا گیا، جولائی ۱۹۲۴ء کو بلاد انگش کو خود مختار خطہ انگش کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ۴ نومبر ۱۹۲۹ء کو گروزنی سے ملحقہ نشیبی علاقے کو چیچن کے خود مختار خطے میں شامل کر دیا گیا۔ لیکن جنوری ۱۹۳۴ء میں ان دو مختار علاقوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ اور اسے چیچن۔ انگش خود مختار علاقے کا نام دے کر ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو چیچن انگش آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریہ کی صورت دے دی گئی۔ ۲۵ جون ۱۹۴۶ء کو یو ایس ایس آر کی سپریم کورٹ کے حکم سے اس جمہوریہ کو ختم کر دیا گیا اور چیچن اور انگش اقوام کو ملک بدر کر کے وسطی ایشیا میں بھیج دیا گیا۔ ۹ جنوری ۱۹۵۷ء میں سپریم سوویٹ کے ایک نئے حکم نے مہاجرین کو بحال کر دیا۔ اور چیچن انگش آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریہ پھر قائم ہو گئی۔

موجودہ زمانے میں چیچن۔ انگش کی آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریہ کا کل رقبہ انیس ہزار تین سو مربع کلومیٹر ہے اور ۱۹۵۸ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی سات لاکھ تھی۔ جس میں چیچنوں کی حیثیت اقلیت کی ہے۔

چین آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک جو براعظم ایشیا کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے اس کا نمبر روس اور کینیڈا کے بعد آتا ہے۔

چین کے مغرب میں روس، پاکستان اور ہندوستان کا علاقہ ہے شمال میں روس اور منگولیا، شمال مشرق میں شمالی کوریا اور روس اور جنوب مشرق میں بحرالکاہل سے ملحقہ سمندر، بحیرہ مشرقی چین، جنوبی بحیرہ چین واقع ہیں۔ جنوب میں ہندوستان نیپال بھوٹان، برما، لاؤس اور شمالی ویت نام جیسے ممالک ہیں۔ تائیوان (فارموسا) مشرقی اور جنوبی بحیرہ چین کے درمیان واقع ہے۔ چین کی مشرقی سمت میں ہانگ کانگ ہے۔

چین کی آبادی پچاسی کروڑ اور رقبہ ۳۶،۹۱،۵۰۱ مربع میل ۹۵،۶۰،۹۸۸ مربع کلومیٹر ہے۔ پیکنگ دارالحکومت ہے۔ چین کے اکیس صوبے اور وفاقی لحاظ سے پانچ خود مختار یونٹ ہیں جغرافیائی اعتبار سے یہ ملک کئی صوبوں میں بٹا ہوا ہے۔

چین کی سرزمین کی طرح یہاں کے باشندے بھی کئی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہن، جنہیں چین کے اصل باشندے سمجھا جاتا ہے اصل چین اور منچوریا میں آباد ہیں یہ لوگ ملک کی آبادی کا نوے فی صد ہیں۔ چین کے باقی باشندوں کی تعداد ملک کے مغربی اور شمالی حصوں میں آباد ہیں ان کی اکثریت منگول، تبتی اور یوگرز لوگوں پر مشتمل ہے یہ مختلف زبانیں بولتے ہیں، ترکی، منگولی اور تبتی زیادہ بولی جانے والی زبانیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ بدھ اور کنفوشزم کے پیرو ہیں مسلمان بھی تھوڑی تعداد میں آباد ہیں۔

چین کے اسی فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں ۱۹۶۵ء تک زراعت سے کل قومی آمدنی کا پچاس فی صد حاصل ہوتا تھا۔ چین میں صنعتی ترقی کا آغاز ۱۹۴۹ء میں ہوا ۱۹۶۵ء میں چینی کارخانوں نے قومی پیداوار کا ۲۶ فی صد حصہ فراہم کیا۔ چین کی قدیم ترین صنعت پارچہ بافی نے صنعتی ترقی اور قومی آمدنی بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

چین کی تاریخ بڑی پرانی اور متنوع ہے۔ یہاں سے ایسے انسانی ڈھانچے ملے ہیں جو دس لاکھ سے بھی زیادہ پرانے ہیں جس سے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کرہ ارض کے ابتدائی عہد کے انسان چین میں آباد تھے شمالی چین کے میدانوں میں دریائے زرد کی وادی قدیم انسانی تہذیب کا گہوارہ تھی جس نے اپنے انوکھے منفرد اور عالیشان تہذیبی اثرات چھوڑے۔

ولادت مسیح سے تین ہزار سال پہلے چین دنیا کا متمدن ترین ملک سمجھا جاتا تھا۔ تاریخ میں چین کے جس پہلے بادشاہ کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے اس کا نام فوہی تھا جو ۲۸۵۲ ق۔م سے ۲۷۳۸ ق م تک حکمرانی کرتا رہا۔ چینیوں نے اسے دیوتا کا درجہ دے دیا تھا اس کے بعد تین شہنشاہوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کی حکومت ۲۴ ویں صدی قبل مسیح تک رہی ان کے بعد یاؤ اور رس آتے ہیں جن کو چینیوں نے پہلے صحیح حکمران قرار دیا ہے۔

۲۲۰۵ ق۔م میں ہسیا خاندان کی حکمرانی تھی اگرچہ اس بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ واقعی یہ خاندان کبھی چین پر حکمران رہا ہے۔ البتہ اس بات پر تمام تاریخ دان متفق ہیں کہ چین میں سب سے پہلے شنگ یا ین خاندان نے حکومت کا آغاز کیا۔ اس خاندان نے ۱۷۶۶ تا ۱۱۲۲ قبل مسیح تک حکمرانی کی ۱۱۲۲ قبل مسیح میں ریاست "چو" کے حکمران وو نے اس خاندان کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ پہلا حکمران خاندان ہے جس کے بارے میں تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ یہ خاندان تین سو سال تک حکمران رہا۔

۶۰۰ سے ۲۰۰ قبل مسیح کے عرصے میں چین میں تین مشہور فلاسفر پیدا ہوئے جنہوں

چین کا قومی عجائب گھر

نے چینی زندگی کو بے حد متاثر کیا یہ لاوزو، کنفوشس اور مسانز دتھے۔ ان میں سے کنفوشس کے فلسفے کے چینیوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا اس کی تعلیمات میں سے اہم یہ ہے کہ لیڈر صرف اچھی مثالیں قائم کر کے تعلیم کی مدد سے نرم روی اور انصاف اختیار کر کے لوگوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے اس خیال کو دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی کہ آدمی سکونِ قلب صرف دنیا کے لوگوں کے لیئے برادرانہ محبت کے جذبے اور ذاتی ڈسپلن کے ذریعے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ مثالی ڈھانچے، منظم تعلیم یافتہ اور باہمی اتحاد کی بنیاد پر قائم ہونے والی جس سوسائٹی کا خواب کنفیوشس نے دیکھا وہ کئی سو برس تک چین کے لوگوں کا ائیڈیل بنی رہی۔

۲۵۶ ق۔م میں چاؤ خاندان ختم ہوا اور ۲۴۹ ق۔م میں چی ان خاندان اقتدار پر براجمان ہوا۔ اہم افیل میح ہیر. ودنی حکمران کے عہد میں چین اس قدر مضبوط تھا کہ اس کی قدیم سرحدیں وسیع کرنے کا کام آسانی سے ہونے لگا۔

ہن حکمرانوں کے عہد میں چین معاشی لحاظ سے خوشحال ہو گیا۔ ۸ء میں حکومت کے ایک عہدے دار وانگ ہینگ نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ہن خاندان نے حکومت واپس لے لی۔ ۲۲۰ء میں آخری ہن حکمران کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ہونے چار سو سال تک چھ مختلف خاندان چین پر حکومت کرتے رہے۔ ۵۵۰ء میں سوئی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ لیکن سوئی خاندان ہی کے ایک افسر اعلیٰ نے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد تین سو سال تک تیانگ خاندان حکومت کرتا رہا۔

۸۰۰ء میں اندرونی انتشار کے باعث ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ۹۰۰ء میں ذلیغوں نے چین سے منگولیا، منچوریا اور کوریا کے علاقے چھین لیئے اس کے بعد سنگ خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ خاندان ۹۶۰ء سے ۱۲۷۹ء تک حکمران رہا۔ ۱۲۶۰ء میں قبلائی خان نے یوان خاندان کی بنیاد رکھی اور یہ خاندان ۱۳۶۸ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ ۱۳۸۲ء میں منگ خاندان نے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ انھوں نے اصل چین یا چلین کے باشندوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۴۰۰ء میں منگولوں کے پاس اس ملک کا صرف مغربی اور کچھ شمالی علاقہ رہ گیا۔ ۱۴۲۱ء میں منگ خاندان کے بادشاہ نیگ دہم نے پیکنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ آخری خاندان جس نے چین پر بادشاہت کی مانچو خاندان تھا۔ اس خاندان کا دورِ حکومت ۱۶۴۲ء سے ۱۹۱۲ء تک ہے۔ ۱۹۱۴ء کو چین میں پہلی مرتبہ جمہوری تحریک کو کامیابی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر سن یات سن جمہوریہ چین کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے انتقال کے بعد چیانگ کائی شیک برسرِ اقتدار آئے۔ انھوں نے ملک کی انقلابی تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی ۱۹۳۵ء میں انقلابی تحریک کی قیادت ماؤزے تنگ کے ہاتھ میں آ گئی چیانگ کائی شیک اقتدار سے محروم ہو کر فارموسا بھاگ گیا یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عوامی جمہوریہ چین کا پرچم سارے ملک پر لہرانے لگا۔

اس ملک کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے جس میں آنحضور نے فرمایا۔
"علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے" بقول علماء کرام یہاں چین سے مراد دور دراز کا علاقہ ہے۔

ح

حاتم بن ہرثمہ ایک شخص جو خلفائے عباس کی ملازمت میں متعدد عہدوں پر فائز رہا۔

اس کے لئے الامین کی طرف سے صالح کی طرف ایک خط شوال ۱۹۲ھ/اگست ۸۰۸ء میں لکھا گیا تھا۔ جس میں ولی عہد نے اپنے بھائی کو ہدایت کی تھی کہ حاتم بن ہرثمہ کی اس کے عہد میں توثیق کر دے۔ نیز خلیفہ کے محلات کی حفاظت کا کام اس کے سپرد کر دے۔ بعد میں الامین نے حاتم کو مذہبی اور مالی اختیارات کے ساتھ مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس سے قبل وہ ۱۷۸ھ/۷۹۶ء میں اپنے باپ کی گورنری کے دوران میں مصر میں پولیس کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکا تھا ۱۹۴ھ/۸۱۰ء میں مصر میں ایک ہزار خراسانی ابناء کی فوج کے ساتھ گورنر کی حیثیت سے پہنچا۔ اس نے پہلے بلبیس میں قیام کیا۔ اس دوران میں اس نے حوف بامشرقی ڈیلٹا کے سرکش عربوں کو خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ بعد میں اس نے ان میں سے ایک سو کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ ۴ شوال ۱۹۴ھ/۱۱ جولائی ۸۱۰ء کو وہ فسطاط پہنچا۔ جب الامین اور المامون کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی چونکہ حاتم کو المامون کا طرفدار خیال کیا جاتا تھا اس لئے الامین نے اس کو برطرف کر دیا۔ حاتم نے جمادی الآخرہ ۱۹۵ھ/ مارچ ۸۱۱ء میں مصر کو خیرباد کہا ۲۰۰ھ/۸۱۶ء میں جب اس کے والد نے وفات پائی تو وہ آرمینیہ کا گورنر تھا۔ اس کے بعد کے حالات بہت کم دستیاب ہیں۔

حاتم طائی بن عبداللہ بن سعد۔ دورِ جاہلیت کا ایک شہسوار اور شاعر، زمانہ زیست چھٹی صدی عیسوی کے نصف ثانی سے لیکر ساتویں صدی کے اوائل تک ہے۔ وہ بشر بن ابی خازم اور عبید بن الابرص جیسے شعراء کا ہم عصر تھا۔

حاتم میں ایک صاحب مروت شخص کے اوصاف خاص طور پر مہمان نوازی اور سخاوت بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس نے مہمان نوازی اور سخاوت کرنے میں اپنی ضروریات کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس کے اندر جود و سخا کا یہ میلان اس کے بچپن ہی میں ظاہر ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دادا نے اس کے بچپن ہی میں [illegible] چھوڑ دیا تھا جس کی سرپرستی میں اس نے پرورش پائی تھی۔ کیونکہ اس کا والد عین جوانی میں وفات پا گیا تھا۔

عام روایت کے مطابق جو اس کے بارے میں کی جاتی تھی وہ قبل از اسلام کے عربوں کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس کی فیاضی ضرب المثل تھی۔ اسی وجہ سے اسے جواد یا اجود کہتے تھے۔

اس کا مزار غالباً بلاد طئی کے ایک پہاڑ کے اوپر تھا جو تنغر میں وادی حائل کے کنارے واقع تھا۔ اس کے مزار کے دائیں اور بائیں جانب پتھر کی چار مورتیاں تھیں جن کی شکل لڑکیوں کی سی تھی اور جو بال بکھیرے ہوئے اس کے مدفن پر نوحہ کر رہی تھیں اس کے مزار کے قریب اس بڑی دیگ کے باقی ماندہ ٹکڑوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی جس میں سے وہ اپنے مہمانوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔

بقول پال گربو" حاتم کا مزار اس علاقے میں اب تک مشہور و معروف ہے۔ حاتم کے اشعار زیادہ تر سخاوت اور ایثار کی تعریف میں ہیں عربی ادب میں حاتم کی شخصیت بہت ہر دلعزیز ہے۔

حاجب اصطلاح میں حاجب کا لفظ مسلم ممالک میں ایسے شخص کے لئے ہوتا تھا جو بادشاہ تک رسائی دلانے یا اس کی حفاظت پر مامور ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح بہت جلد دربار میں ایک حیثیت اور عہدے کا نام بن گئی۔ اس عہدے کی نوعیت مختلف حلقوں اور مختلف ادوار میں خاصی بدلتی رہتی تھی۔

اموی دور کی ابتداء ہی میں حاجب کا عہدہ نظر آتا ہے حاجب نہ صرف حکمران کے حضور میں احباب اور ملاقات کرنے والوں کو پیش کرتا بلکہ دربار [illegible] سامعین کی تنظیم کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس دور میں حاجب لقب سیکرٹری کی حیثیت میں خلیفہ کے مصاحبوں میں شامل تھا۔

عباسی دور میں دربار کے دو عہدے سب سے زیادہ اہم تھے [illegible] کا تھا اور دوسرا عہدہ حاجب کا۔ یہ دونوں عہدے موالی کو عطا کئے جاتے تھے حاجب کا مرتبہ وزیر کے مرتبے سے کم تھا۔ حاجب تو محل کے خدام میں سے مقرر ہوتا تھا محل کے خدام و حشم کا سربراہ بھی ہوتا اور رسوم کا نگران بھی۔ بعض اوقات یہ حکم بھی ملتا تھا کہ ایسے اشخاص کو تشدد آمیز طریقوں سے برطرف کرے جنہوں نے خلیفہ کو ناخوش کیا ہے۔

عباسی دورِ حکومت کی پہلی دو صدیوں میں وزیر اور حاجب کے درمیان مسلسل رقابت چلتی رہتی۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ رقابت برقرار تھی لیکن اس صدی کے آخر میں حاجب کی حیثیت وزیر کی حیثیت کے مقابلے میں کسی قدر کم ہو گئی۔ حاجب کی امیر کے ساتھ بھی رقابت تھی جو اس دور میں فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ ۳۱۷ھ/۹۲۹ء سے حاجب کا عہدہ زیادہ تر فوجی نوعیت کا ہو... حاجب فوجی سپہ سالاروں (امراء) کے رقیب بن گئے تھے۔ ... اس دور میں حاجب کے سرکاری فرائض اب بھی خلیفہ کی خدمت یا حفاظت سے متعلق تمام اشخاص کی نگرانی کرنا، محل کے اندر کے تمام امور کا نظم و نسق اور مختلف معززین اور درباریوں کے مراتب کی صحیح تعین کرتے ہوئے درباریوں کا انتظام کرنا تھا۔

اندلس میں حاجب کی حیثیت مشرق کے حاجب سے مختلف تھی۔ یہاں حاجب کا لقب وزیر کے لقب سے ہمیشہ اعلیٰ تر ہوتا تھا اور وزراء کی حیثیت مختلف النسل کے مشیروں سے زیادہ نہ تھی۔ حاجب انتظامی اور سرکاری امور میں حکمران کی اعانت کرتا اور بطور وزیر اعلیٰ کام کرتا تھا۔ وہ شہری انتظامیہ کے تین محکموں یعنی قصر شاہی، دیوان وزارت اور شعبۂ مالیات کا نظم و نسق اس کے ہاتھ میں تھا۔

جب اندلس میں اموی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ملوک الطوائف نے ملک کے بجائے اپنے لئے حاجب کا لقب اختیار کر لیا۔

سامانیوں کے دور میں محلاتی نظام اور دفتری نظام عباسی خلفاء کے طرز پر تھا۔ چنانچہ سامانی حاجب امیر کے اپنے نجی عملے سے ابھرتا تھا۔ اگرچہ چوتھی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں اور غالباً اس سے بھی کچھ پہلے سے حاجب محل کا ایک خالص نجی عہدے دار نہ رہا تھا بلکہ وہ بنیادی طور پر ایک اعلیٰ فوجی سالار ہو گیا تھا۔ چونکہ سامانی فوج مرکزی اور اہم حصہ ترکی غلاموں کا محافظ دستہ تھا۔ اس لئے حاجب اعلیٰ محل کے عملے کا سربراہ بھی ہوتا تھا اور فوج کا سپہ سالار اعلیٰ بھی۔

یہ عہدہ سامانیوں سے خراسان میں ان کے جانشین غزنویوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ سلطان کے ماتحت فوج کے سالار اعلیٰ کا لقب حاجب بزرگ ہوتا تھا اور حاجب اور جرنیل براہِ راست اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ غزنوی حاجب بزرگ سامانی حاجب بزرگ کے مقابلے میں محل کے انصرام پر بلاواسطہ اختیار رکھنے میں ایک قدم پیچھے ہوتا تھا۔

سلجوقی عہد میں غزنوی دور کے مقابلے میں امیر حاجب کے عہدے کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ اس وقت حاجب خاص طور پر سپہ سالار فوج نہیں رہا۔ بلکہ ایک درباری عہدیدار بن گیا۔ تمام امیروں کی طرح امیر حاجب بھی فطری طور پر فوجی مہموں میں حصہ لیتا تھا اور بسا اوقات ملک کی فوج کے ایک حصے کی قیادت بھی کرتا تھا۔ اس دور میں حاجب کے فرائض بقول نظام الملک درباری عہدیدار کے تھے۔ نیز امیر حاجب عملی طور پر بالعموم ایک ترک امیر ہوتا تھا۔ اور اس کے ماتحت عموماً غلام ہوتے تھے۔ اس کا تعلق فوجی نظم و ضبط اور درباری اداب سے ہوتا تھا وہ دربار کا اہم ترین عہدیدار ہوتا تھا جس کا منصب امیر حرس سے بلند سمجھا جاتا تھا۔

بقول ابن الاثیر "بڑے بڑے امیروں اور صوبائی گورنروں کے اپنے دربار ہوتے تھے اور ان کے بھی حاجب ہوتے تھے۔"

ایلخانیوں کے دورِ حکومت میں حاجب قصر شاہی کا منصرم ہوتا تھا وہ شاہی دربار یا صوبائی درباروں میں اکثر فوجی طبقے کا رکن ہوتا تھا

تیموریوں کے عہد میں حجاب دربار کے عہدیداروں میں سے ہوتا تھا اور اس کا رتبہ نواب حضرت سے کچھ کم ہوتا تھا۔

صفویوں کے دور میں حاجب کی اصطلاح میں تبدیلی ہو گئی۔ اب حاجب اعلیٰ کو ایشک آقاشی باشی کہا جانے لگا۔ اس کے فرائض بھی بالکل وہی ہوتے تھے جو حاجب دربار کے ہوتے تھے۔

فاطمیوں کے دربار کا حاجب ایک بلند درجے کا اہل کار ہوتا تھا جو صاحب الباب کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ لیکن اس کے ماتحت حاجب کہلاتے تھے۔ نیز بسا اوقات اسے بھی اس کے معروف لقب صاحب الباب کی بجائے حاجب الباب کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ابن الصیرفی نے حاجب الدیوان کے فرائض کا ذکر کیا ہے "اس کا فرض یہ تھا کہ سرکاری رازوں کو محفوظ رکھنے کی غرض سے وہ غیر مجاز ملاقاتیوں کو دور رکھے۔

شام کے سلجوقی حکمرانوں نے پہلی بار حاجب کا عہدہ قائم کیا جو مشرق میں معروف تھا۔ اس دور میں اس عہدے پر ایک فوجی عہدیدار کا تقرر ہونے لگا جس کے فرائض فوجی نوعیت کے تھے۔ مثلاً وہ قلعے کی کمان کرتا اور شحنہ کی حیثیت سے کام کرتا۔ یا بعض اوقات سفیر کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا۔

الغرض مصر میں ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں حاجب کی اصطلاح کا استعمال بھی قصر شاہی کے منصرم کے معنی میں ہوتا تھا۔

مملوک عہد میں بھی حاجب منصرم محلات کے کچھ فرائض انجام دیتا تھا۔ بڑا حاجب یعنی حاجب الحجاب سلطان کے دربار میں سفیروں، مہمانوں، فریادیوں اور دوسرے زائرین کو پیش کرتا تھا۔ تاہم مملوکوں کے عہد میں حاجب کے بنیادی فرائض تشریفات کے بجائے عدلیہ سے متعلق تھے وقت کے ساتھ ساتھ حاجب الحجاب کا عدالتی دائرہ کار خاصا وسیع ہوتا چلا گیا۔ پہلے پہل وہ مصر میں نائب السلطنت کے ماتحت تھا لیکن یہ عہدہ خالی چھوڑ دیا جاتا یا بعد میں جب اسے ختم کر دیا گیا تو حاجب نے بہت زیادہ قوت حاصل کر لی سلطان شعبان نے عدالتی اختیارات، جنہیں نائب السلطنت استعمال کرتا تھا۔ حاجب الحجاب کو منتقل کر دیئے جو ایک خود مختار اور آزاد عدالت کا سربراہ بن گیا۔ پہلے پہل مرکز میں تین اعلیٰ افسر ہوتے تھے:

۱۔ حاجب الحجاب۔

۲۔ حاجب اور

۳۔ حاجب ثانی۔

بعد میں برقوق نے اس تعداد کو پانچ کر دیا تھا۔

حاجب کا عہدہ شمالی افریقہ میں فاطمی عہد میں موجود تھا۔ لیکن اس کے بعد قوماً ختم ہو گیا۔ لیکن حفصیوں کے عہد میں اس نے دوبارہ اہمیت حاصل کر لی۔ غالباً یہ عہدہ افریقہ میں اندلس سے آیا تھا۔ پہلے پہل حاجب محض ایک قسم کا منتظم محلات تھا اور ساتھ ہی حکمران اور ہر طبقے کے لوگوں کے درمیان واسطے کا کام دیتا تھا۔ ابو حفص کے عہد کے بعد حاجب نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ اس سے وزیر اعلیٰ کا کام لیا جانے لگا۔ قسطنطنیہ اور بجایا کے امراء کی اس رسم کو تونس میں بھی شروع کیا گیا کہ سفامی حاجب کو اپنا دستِ راست بنایا جائے۔

آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں حفصیوں کی بحالی کے بعد حاجب کا لقب تو برقرار رہا لیکن اس کے اختیارات کم ہو گئے اور وہ ایک بار پھر ایک قسم کا رئیس محکمہ استقبالیہ بن کر رہ گیا

حاجت کی نماز: وہ نماز جو حاجت براری کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ جب بندے کو کوئی مشکل کام آپڑے تو حاجت کی نماز پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا جس آدمی کو اللہ یا کسی آدمی سے کوئی حاجت ہو تو چاہیئے کہ باقاعدہ وضو کرکے دو رکعتیں پڑھے اور اللہ تعالےٰ کی حمد وثنا کرے۔ درود بھیجے اور پھر یہ دعا پڑھے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًى اِلَّا قَضَيْتَهَا بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

ترجمہ: "نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ بُردبار اور بخشش کرنے والا۔ پاک ہے پروردگار بڑے عرش کا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پرورش کرنے والا ہے تمام جہانوں کا۔ میں تجھ سے ان اعمال کی توفیق مانگتا ہوں جو تیری رحمت نازل ہونے کا سبب ہوں اور ایسے عمل جن کے سبب تیری بخشش ضروری ہو جائے۔ ہر گناہ سے محفوظ رکھ اور معاف کر دے میری ہر فکر کو دور کر دے، تمام حاجات کو بر لا، پورا کر اس کو اے تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے۔"

حاج عمر دورِ حکومت (۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۴ء) سوڈان کا ایک جوشیلا مذہبی رہنما، فاتح اور مملکت تکرور کا بانی سینیگال کے ضلع فوتا میں الور کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام عمر سید تل تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی اور زبتہ میں تعلیم کی تکمیل کی۔

۱۸۲۰ء میں حج کے لئے سفر کیا اور مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران میں اس نے اپنے آپ کو شیخ محمد الغالی سے وابستہ کر لیا اور اس طرح تجانیہ سلسلے میں داخل ہو گیا افریقہ میں واپس آ کر اس نے کچھ عرصہ بورنو اور سکوتو میں گزارا۔ یہیں پر اپنے دوران قیام اس نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے خاص طور پر قادری سلسلہ کی مخالفت کی اور ان پر تساہل پسندی کا الزام لگایا۔ بورنو اور سکوتو سلطنتوں کے حکمران اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ لیکن یہاں سے اپنے سفر کے دوران میں جب وہ ہما بگو پہنچا تو بمبارہ کے سلطان نے اسے قید کر لیا۔ اور کافی عرصے تک اسے قید میں رکھا۔ بعد میں رہائی حاصل کرنے کے بعد وہ فوتا جالون چلا گیا۔ جہاں اس نے الماتون کی ہمدردیاں حاصل کرلیں۔ اس نے دیگنکو میں ایک زاویہ قائم کیا جو جلد ہی مرجع خلائق بن گیا۔ اسے جلد ہی ملک بھر میں اس علاقے کا مذہبی پیشوا تسلیم کر لیا گیا ۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۸ء تک اس نے فوتا کے قریبی علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لئے سفر جاری کیا۔ بہت سے قبائل اس کے مقلد بن گئے۔ اس کے روزافزوں رسوخ سے خائف ہو کر المامی الفایا نے اسے فوتا کے علاقے میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تو اس نے دنگرای میں قیام کر لیا جہاں پر اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اور ہتھیار اور گولہ بارود جمع کرکے اپنے پیروکاروں کو کفار کے خلاف جہاد کا حکم دیا۔ چنانچہ پندرہ سال کی مدت میں حاج عمر کا ایک وسیع علاقے پر قبضہ ہو گیا اور وہ وہاں کا حکمران بن گیا۔ ۱۸۴۹ء میں اس نے بورہ، بمبوک اور بلودوگو کے اضلاع فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلئے۔ بعد میں اس نے کارتہ کو بھی اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ وہ اس کے لئے بائیس سال تک برسرپیکار رہا۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں اس کے دارالحکومت پر قبضہ کرکے اس نے اس علاقے کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے پر مائل کیا۔

حاج عمر کو کئی ایک بغاوتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اسے المغاربہ کے علاوہ سیکو کے سلطان احمدو کے حملوں سے بھی اپنا بچاؤ کرنا پڑا۔ اس عرصے میں بالائی سینیگال کے فرانسیسیوں سے تصادم شروع ہو گیا۔ جب وہ کارتہ کا مکمل طور پر مالک بن گیا تو اس نے سیگو کے بمبارہ اور مسینا کے قبیلہ کے خلاف کارروائی شروع کی۔ اس نے سانسندنگ پر قبضہ کر لیا اور دشمن کی فوجوں کو تبو کے مقام پر شکست دی وہ ۱۸۶۱ء میں سیگو کے شہر میں داخل ہوا اور اپنے بیٹے احمد شیخو کو سیگو کا حاکم بنایا۔

سیگو فتح کرنے کے بعد اس نے ٹمبکٹو کے خلاف فوج کشی کی اور اس علاقے کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ اس شہر پر اس کا دوسرا حملہ ناکام رہا۔ کیونکہ مسینا میں ایک علم بغاوت بلند ہو گیا جو قبلہ کے کئی سرداروں کی انگیخت سے جنہیں کونتہ کے سرداروں کی حمایت حاصل تھی، عمل میں آئی تھی۔ باغیوں نے حاج عمر کو حمداللہ میں محصور کر لیا۔ لیکن وہ آٹھ ماہ کے محاصرے کے بعد شہر کو آگ لگا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس کے دشمنوں نے اس کا تعاقب کیا تو اس نے ایک غار میں چھپ کر پناہ لی۔ جہاں اس نے خودکشی کر لی تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ زندہ نہ آسکے۔

حاج عمر کی موت کے بارے میں ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس کا تعاقب کرنے والوں نے غار میں دھواں کرکے اس کا دم گھونٹ دیا۔

حاج عمر نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اس کے انتقال کے بعد کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے لڑکے نے بعد میں اپنے والد کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ اس کوشش میں نیورو اور مسینا پر قابض ہو سکا۔

حاجی حج کرنے والا۔

حاجی کا لفظ اصل میں حج کی عبادت بجا لانے کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جیسے کسی کو نماز پڑھنے کے لحاظ سے نمازی کہا جاتا ہے یا روزہ رکھنے کے لحاظ سے روزہ دار کہیں۔ لیکن حج نماز اور روزہ کی طرح ایک ایسی عبادت نہیں جو ہر شخص بجا لا سکے بلکہ وہ اپنی شرائط کی سختی کے باعث بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ اس لئے حاجی کا لفظ دوسرے لوگوں کے درمیان ایک امتیاز خاص پیدا کر دیتا ہے۔ اور ناموں کے ساتھ بطور خطاب استعمال ہوتا ہے

(نیز دیکھئے "حج")

حاجی بہادر (۱۲ رجب ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء) پاکستان میں صوبہ سرحد کے ایک بزرگ صوفی۔ آپ کا نام عبداللہ والد کا نام سید سلطان محمد شاہ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے :-

"سید عبداللہ بن سید سلطان محمد میر سرورؒ بن سید سلطان میر اکبر بن سید سلطان میر انشاہ بن سید سلطان سجان شاہ بن سید سلطان محمد میر بن سید میر کمال بن سید سلطان میر جمال بن سید سلطان ابی فضل بن سید سلطان سراج الدین بن سید سلطان بہاؤالدین بن سید سلطان عبدالرحمان بن سید سلطان محمد عمران بن سید سلطان شعبان بن سید سلطان محمد زاہد بن سید سلطان امیر احمد بن عبدالعزیز بن سید محمد ابراہیم بن سید امام ... بن سید

بن سید امام علی نقی بن سید امام علی موسیٰ رضا بن سید امام موسیٰ کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید امام باقر بن سید محمد زین العابدین بن سید امام حسینؓ بن علیؓ۔

آپ ہندوستان کے مشہور شہر آگرہ میں پیدا ہوئے علوم رسمیہ کی تکمیل کے بعد سترہ سال کی عمر میں سید آدم بنوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہوں نے آپ کو بہادر کے لقب سے نوازا۔ آپ نے سید آدم بنوری کے دست حق پرست پر بیعت کی اور پورے گیارہ سال تک آپ اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ مرشد نے آپ کی تربیت باطنی پر خصوصی توجہ دی۔ یہاں تک کہ آپ منزل کمال پر پہنچ کر مظہر تجلیات ذوالجلال ہوئے اور خلافت سے نوازے گئے۔

اسی زمانے میں آپ نے مرشد کے ہمراہ فریضہ حج و زیارت روضہ نبویؐ کی سعادت حاصل کی۔ پھر آپ نے کوہاٹ آکر رشد و ہدایت کی شمع روشن کی تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی شہرت کا چرچا دُور دُور تک پھیل گیا۔

آپ کو خدا بینی کا دعویٰ تھا۔ اس بنا پر لوگ آپ کو خدا بین کہنے لگے۔ جب آپ کے اس دعوے کا چرچا عام ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچا تو اس نے آپ کو حسن ابدال میں طلب کیا جہاں وہ خوشحال خان خٹک کی بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھا۔

چنانچہ آپ حسن ابدال کے دربار میں پہنچے جہاں پر علمائے ہندوستان جمع تھے تو فرمایا "میں اس زمانے کا قطب و غوث ہوں، حق سبحانہٗ تعالےٰ جو بے چون و بے جہت ہے اس ظاہری آنکھ سے دیکھتا ہوں نہ باطنی آنکھ سے"۔

چنانچہ اس موضوع پر پانچ چھ روز مناظرہ ہوتا رہا۔ علماء کی طرف سے اس مناظرے میں جنہوں نے حصہ لیا ان میں اخوند شاہ مراد دہلوی اور مولانا نور محمد مدحق لاہوری تھے لیکن آپ نے اپنے دعوے کی حقیقت کو علماء پر واضح کر دیا۔

اورنگ زیب عالمگیر نے خواہش ظاہر کی کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کوہاٹ چھوڑ کر دارالسلطنت لاہور میں آ بسیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ کوہاٹ میرے آباؤ اجداد کا وطن ہے اور میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

آپ کی وفات حالت سفر میں بڈا خیل میں ہوئی۔ آپ کا جنازہ کوہاٹ لایا گیا۔ اور شہر کی جنوبی سمت میں آپ کو دفن کیا ہے۔ آج بھی آپ کا مزار کوہاٹ میں مرجع خلائق ہے۔

آپ کے مریدین کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب ہے جبکہ مولوی شاہ مراد دہلوی نے آپ کے مریدین کی تعداد دو لاکھ ساٹھ ہزار نو سو کے قریب بتائی ہے۔

حاجی بیرام ولی

(۷۵۳ھ/۱۳۲۵ء - ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء-۱۴۳۰ء) انقرہ کے مشہور ولی اور سلسلہ بیرامیہ کے بانی۔

نعمان نام والد کا نام قوئیون لوجہ احمد تھا انقرہ کے گاؤں ضول فسل میں پیدا ہوئے۔ بروسہ اور انقرہ میں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے مدرسہ قرہ انقرہ میں پڑھایا۔ بعد میں شیخ حامد نے انہیں قیصریہ میں آنے کی دعوت دی۔ تو انہوں نے معلمی کی زندگی ترک کر دی۔ شیخ حامد کے مرید کی حیثیت میں ان کے ساتھ اور پھر وہاں سے حج کے لیے گئے جہاں سے وہ آق سرای میں آ گئے۔ ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء میں اپنے مرشد شیخ حامد کی وفات کے بعد بقول منتقیم زادہ اپنے وطن انقرہ واپس لوٹ آئے انقرہ میں بہت سے افراد ان کے مرید ہو گئے۔

حاجی بیرام ولی کے مریدین میں آق شمس الدین، دودہ عمر سکینی، یازیجی اوغلو محمد اور احمد بیجان نیز حاجی بیرام کے داماد وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے بعض مریدین کے انتہا پسند رجحانات کے باوجود ان کی اپنی تعلیمات ان حدود سے آگے نہیں بڑھیں جن کی اجازت شریعت نے دی ہے۔ وہ سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کرتے اور محنت مزدوری کر کے روزی کماتے اور راہِ خدا میں صرف کرتے وہ ہمیشہ دوسروں کو جود و سخا کی تلقین کرتے۔ اولیا چلبی کے بقول حاجی بیرام ولی اس کی جامع میں تبلیغ کرتے تھے۔ وہ اسی مسجد سے ملحق مزار میں دفن کیے گئے اس مسجد کی بنیاد بھی خود انہوں نے رکھی تھی۔ حاجی بیرام ولی سے پانچ نظمیں منسوب ہیں۔

حاجی بیرام ولی کے حالات زندگی پر کوئی مفصل تصنیف نہیں ہے اس وجہ سے ان کے حالات زندگی اتنی وضاحت سے معلوم نہیں۔

حاجی پاشا

(؟ — ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) نام خضر بن علی بن خطاب۔ ایک عثمانی دور کا فقیہہ اور طبیب۔

وہ سلطان بایزید یلدرم کا ہم عصر تھا۔ تعلیم قاہرہ میں حاصل کی۔ اس نے شیخ مبارک شاہ سے دینیات اور فقہہ کا نصاب مکمل کیا۔ شیخ اکمل الدین اور شیخ بدر الدین بہادی اس کے ہم سبق تھے۔ ایک بار جب وہ بیمار ہوا تو اس نے طب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور جلد ہی اس نے علم میں بہت شہرت حاصل کر لی۔ آخر کار وہ قاہرہ کے شفا خانے مارستان مصر کا رئیس الاطباء مقرر ہو گیا۔ آیدین واپس آنے پر اس نے آیدین اوغلو محمد بے کی دعوت پر برگی میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں پر وفات پائی۔

حاجی پاشا نے اپنی خدمات تیمور کے سامنے بھی پیش کی تھیں اور اس نے تیمور کے طبیبوں کو تعلیم دی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ شہزادہ سلیمان کی ملازمت میں اس کے دربار میں گزارا۔

اس نے اپنی اوائل عمر میں دینیات اور فقہہ پر کتابیں لکھی تھیں جن میں تفسیر مجمع الانوار فی جمع الاسرار (دو جلدوں میں) ۲۔ شرح بیضاوی شریف طب میں ایک کتاب "الشفاء" ہے۔

حاجی خلیفہ

(ذوالقعدہ ۱۰۱۷ھ/فروری مارچ ۱۶۰۸ء - ۲۷ ذوالحجہ ۱۰۶۷ھ/۲۶ ستمبر ۱۶۵۷ء) مصطفیٰ بن عبداللہ المعروف بہ کاتب چلبی، ایک مشہور ترکی مصنف۔

قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ سلحداروں کے رجمنٹ فوجی دستے میں بھرتی ہو گیا۔ تقریباً اسی دور میں اسے اناطولی کے دفتر محاسبہ میں ایک ادنیٰ منشی کی جگہ مل گئی۔

وہ برابر عساکر سلطانی کے ہمراہ ایشیائے کوچک کی مشرقی سرحد پر ۱۰۲۳ھ سے ۱۰۴۵ھ تک سوائے دو مختصر وقفوں کے مقیم رہا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ سوار فوج کے انتظامی دفتر میں منشی مقرر ہوا۔ لیکن شوال ۱۰۳۸ھ/ مئی ۱۶۲۹ء کے آخر میں اسے پھر اس مہم میں شریک ہونا پڑا۔ جو وزیر اعظم خسرو پاشا کی قیادت میں ایران کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس نے ایران کے خلاف ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۳ء تا ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء کی اس بڑی مہم میں حصہ لیا۔ جو خود سلطان مراد رابع کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی ۲۲ صفر ۱۰۴۵ھ/ ۷ اگست ۱۶۳۵ء میں جن دنوں فوج حلب میں موسم سرما بسر کر رہی تھی۔ حاجی خلیفہ نے حج بیت اللہ کیا۔ رجب

۱۰۴۵ھ/ دسمبر ۱۶۳۵ء میں قسطنطنیہ واپس آنے پر ایک خاص بڑی جائداد ورثے میں ملی۔ ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۴۵ء میں اس نے "سواری باش مقابلہ قلمی" کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا لیکن ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں اس کے دوستوں نے اسے اسی دفتر میں خلیفہ ثانی کی جگہ دلوا دی۔ چنانچہ اسی وقت سے لوگ اسے حاجی خلیفہ کے نام سے پکارنے لگے۔

ابھی وہ ۵۰ سال ہی کا تھا کہ قسطنطنیہ میں اسے اجل کا پیغام آ پہنچا۔

اس کی تصانیف میں "فذلکہ" جو تقریباً ڈیڑھ سو فرمانروا خاندانوں کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے اور عربی زبان میں ہے۔ فقہ سے متعلق علی توشجی کے رسالہ "المحمدیہ" کی شرح، "تقویم التواریخ"، "سلم الوصول الی طبقات الفحول" جو مشاہیر کے سوانح کی قاموس ہے اور عربی زبان میں ہے۔ "تحفۃ الاخیار فی الحکم والامثال والاشعار"۔ "کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون" جو عربی زبان میں ایک مشہور و معروف دائرۃ المعارف اور مصنف کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ "رونق السلطنۃ" جو تاریخ قسطنطنیہ ہے۔ "تحفۃ الکبار فی اسفار البحار" جو عثمانی بحریہ کی تاریخ ہے۔ "میزان الحق فی اختیار الاحق" جو مصنف کی آخری تصنیف ہے خاص طور پر مشہور ہیں۔

حاجی گرای (— ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۶ء)

خوانین کریمیا کے خاندان گرای کا بانی۔

اس نے سکوں پر اپنا نام السلطان حاجی کری بن غیاث الدین خان کندہ کرایا تھا۔ وہ ۸۳۲ھ/ اگست ۱۴۲۹ء میں اس کی قریم پر بطور خان حکومت کر رہا تھا۔ پولینڈ کے ماخذ کی رو سے وہ لتھوانیا میں ٹروکی کے نزدیک پیدا ہوا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لتھوانیا کے گرینڈ ڈیوکوں نے تقتمش اور حاجی گرای کے آباؤ اجداد کو پناہ دی۔ اور سرای کے خوانین سے انہیں بچایا۔ جن کی حمایت طاقتور ایمرا دیغو کرتا تھا۔

حاجی گرای کے تحت قریم میں ایک خود مختار خانیہ کی تشکیل میں جو عوامل کار فرما رہے۔ ان میں اہم ترین بات یہ تھی کہ شیرین، نوغورت اور برین جیسے بڑے بڑے قبائل نے مغرب کی جانب بحیرۂ اسود کے شمالی سواحل اور جزیرہ نمائے قریم میں نقل مکانی کی۔

۸۳۶ھ/ ۱۴۳۳ء اور ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۴ء میں حاجی گرای بحیثیت خان، کفہ کے جنویوں سے جنگ کر رہا تھا تاکہ کفہ اور قریم کی دوسری بندرگاہوں سے وصول ہونے والے اہم محاصل پر متصرف ہو سکے۔ وہ بھی اپنے پیش رو خوانین آلتون اردو کی طرح ہمیشہ ان بندرگاہوں کو اپنے زیر اقتدار سمجھتا رہا۔

۸۳۶ھ/ ۱۴۳۶ء کے موسم گرما میں جب اس کے باجگذار منکوب کے والی آلکیس نے بلقلاوہ پر قبضہ کر لیا۔ تو اس نے کفہ کے جنویوں کے خلاف خود ہی عداوت کا راستہ کھول دیا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے جنوا سے کارلو لیمیلینو کو چھ ہزار سپاہ دے کر بھیجا گیا۔ اس نے بلقلاوہ کو واپس لے لیا۔ جب وہ حاجی گرای کے مستقر اسکی قریم کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو اچانک حملہ ہوا جس میں اسے شکست ہو گئی اور حاجی گرای کی فوجوں نے کفہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن چونکہ ان کے پاس نہ جہاز تھے اور نہ توپ خانہ لہذا وہ آتشیں ہتھیاروں سے مسلح شہر کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ کفہ کی تسخیر میں ناکامی کے بعد حاجی گرای نے کوشش کی کہ تجارت کا رخ اس کی قریم کرچ اور اکرمن بندرگاہوں کی طرف پھیر دیا جائے جو اس کے زیر اقتدار تھیں۔

۸۳۷ھ/ ۱۴۳۴ء میں سرای کے خان سید احمد نے قریم پر قبضہ کر لیا۔ اور حاجی گرای کہیں رجب ۸۵۳ھ/ اگست ۱۴۴۹ء میں جا کر کاسی میر چہارم کی مدد سے یہاں پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء میں اس نے پولینڈ کے کاسی میر چہارم کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ لتھوانیا اور پولینڈ کے ساتھ گہرا تعاون ہمیشہ اس کی حکمت عملی کا حصہ رہا۔ ۸۵۶ھ/ ۱۴۵۲ء میں جب سید احمد نے کاسی میر کے علاقوں پر چڑھائی کی تو حاجی گرای نے عقب سے حملہ کر کے اسے شکست دی۔

۸۵۸ھ/ جون ۱۴۵۴ء میں اس نے عثمانی سلطان محمد ثانی سے ایک معاہدہ کیا جس کا مقصد یہ تھا جنویوں سے کفہ چھین لیا جائے لیکن یہ فتح نہ ہو سکا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد جنوی قریم کے قبائلی سرداروں کو حاجی گرای کے خلاف صف آرا کرانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اسے معزول کر کے اس کے بیٹے حیدر خان کو اس کی جگہ خان بنا دیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی حیدر خان کو بھاگنا پڑا۔ اور حاجی گرای کو دوبارہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد سے جنویوں سے اس کے تعلقات خوشگوار رہے۔

حاجی گرای نے لتھوانیا اور پولینڈ سے قدیم اتحاد برقرار رکھا۔ اس نے التون اردو کا شیرازہ منتشر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ بوپ نے روم [illegible] سلاطین عثمانیہ کے خلاف استعمال کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے [illegible] ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں اس کا شمار مشرقی یورپ کی نہایت طاقتور [illegible] ہوتا تھا۔ وفات کے بعد وہ بغچہ سرای کے نزدیک سلجیق میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوا۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے۔

حاحا

یہ بربر قبائل کا مراکشی وفاق۔ یہ لوگ مسمودہ [illegible] حصہ ہی ہیں اور مغربی اطلس اعلیٰ کی سطح مرتفع [illegible] آباد ہیں۔

۱۹۳۹ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد [illegible] میں سے بیس یہودی تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم دستور [illegible] علاقے میں کسی یہودی کو سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ [illegible] شاہراہ پر واقع ہے جو شمالی اور جنوبی علاقوں یعنی مراکش کے [illegible] وادی کے درمیان پہاڑی دوروں میں سے ہوتی ہوئی ساحل کے ساتھ [illegible] چلی جاتی ہے۔

حاحا نے غالباً عقبہ بن نافع کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ یہ [illegible] بولی بولتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر متنی سو پر بولی جانے [illegible] سمجھتے ہیں۔ ان کا پیشہ کاشت کاری اور بھیڑ بکریاں پالنا ہے۔ [illegible] ان کے مکانات ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے [illegible] ہیں ان کا ہر گروہ دوسرے گروہ سے علیحدہ رہتا ہے۔

تاریخ میں اس وفاق کا ذکر سب سے پہلے پانچویں/ گیارہویں صدی [illegible] مرابطی تحریک کے حامیوں کی حیثیت سے آتا ہے۔ بعد میں ان کا ذکر سلطنت الموحدون کے معاونین کے طور پر آتا ہے۔

ابن خلدون نے ان کی دانشوری کی تعریف کی ہے اور انہیں جنگجو اور دلیر بتایا ہے۔ اس کے ایک صدی بعد الحسن بن محمد الوزان الزیاتی اور بعد ازاں

مارمون نے قانون وفقہ میں ان لوگوں کے امتیاز کی توثیق کی ہے۔ جو علاقہ ان سے منسوب کیا جاتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے جو آج کل کے تصرف میں ہے۔

جب مراکش میں پرتگیزوں نے پیش قدمی کی تو ان میں ایک مذہبی اور اجنبی دشمن کے طور پر پرتگیزوں کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور انہوں نے فوراً ان کے خلاف جہاد کی قیادت سنبھال لی اور مرابطون بنو سعد سے مدد کی درخواست کی۔ ان کی عیسائیوں کے خلاف ایک طویل عرصے تک جدوجہد جاری رہی۔

۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں سلطان احمد المنصور نے حاحا کے چھ سو آدمیوں کو بھرتی کرکے اس وعدے پر ٹمبکٹو بھیجا کہ وہ تمام محاصل اور ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء میں جب الصویرہ کا شہر بسایا گیا تو شمالی حاحا مزید خوشحال زندگی گذارنے لگے۔

جنوب کے حاحا جن کا مرکز تمنر ہے مراکشی مخزن کے لئے مستقل پریشانی کا باعث بنے رہے اور ان کے علاقے میں پوری طرح عمل دخل فرانسیسی انتداب کے زمانے میں ہوسکا۔

حارثؓ بن ابی ہالہ صحابی۔

آپ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے فرزند تھے جو پہلے شوہر سے تھے۔ جب مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی اور آنحضورؐ نے حرم کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کیا تھا تو کفار آنحضورؐ پر ٹوٹ پڑے۔ حارث یہ خبر سن کر دوڑے آئے کافروں نے اُن کو شہید کردیا اسلام کی راہ میں وہ پہلے شہید ہیں۔

حارثؓ بن اوس (؟ — شوال ۲ھ/ ۶۶۲۳ء)

ایک صحابی۔

ابن معاذ بن نعمان بن امرئ القیس بن زید بن عبدالاشہل۔ ابوالاوس کنیت تھی۔ والدہ ہند بنت عتیک بن امرئ القیس بن زید بن عبدالاشہل تھیں۔

آنحضورؐ نے حارث بن اوس اور عامر بن ضمیرہ کے درمیان عقد مواخاۃ کیا۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے کعب بن الاشرف (یہودی) کو قتل کیا۔

حارث غزوہ اُحد میں بھی شریک ہوئے اور اسی روز شہید ہوگئے۔ اپنی شہادت کے دن ان کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ اُن کی کوئی اولاد نہ تھی

حارث بن سریج (؟ — ۱۲۸ھ/۶۷۴۶ء)

ابوحاتم، خراسان میں اموی انتظامیہ کے خلاف ایک باغیانہ تحریک کا قائد۔

حارث کا ذکر ۱۱۱ھ/۷۲۹ء میں پیکند کے مقام پر خاقان کی فوجوں کے خلاف لڑائی میں جراءت مند جنگجوؤں کے ضمن میں آتا ہے۔ اسے والی خراسان جنید بن عبدالرحمان المری کے حکم پر کوڑے لگوائے گئے۔ کیونکہ حارث نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

حارث نے ۱۱۶ھ/۷۳۴ء میں بغاوت کی۔ اور جوزجان، فاریاب اور طالقان کی مقامی فوجوں کی مدد سے حارث نے بلخ پر قبضہ کرلیا اور ایک فوج کی قیادت کرتے ہوئے مرو پر چڑھائی کردی لیکن اس مقام پر اس کی شکست سے اس کے پیروؤں کی تعداد گھٹ کر تین ہزار رہ گئی۔

جب خلیفہ ہاشم نے عاصم کو گورنری سے برطرف کردیا اور اس کی جگہ اسد بن عبداللہ قسری نیا گورنر مقرر ہوا تو اسد نے بلخ پر دوبارہ قبضہ کرکے حارث کو دریائے جیحون عبور کرنے پر مجبور کردیا۔ حارث نے مقامی قائدین کی فوجوں کی مدد سے ترمذ کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن وہ اس شہر کو فتح کرنے میں ناکام رہا اور اسے طخارستان میں واقع تبوشکان کے قلعے میں پسپا ہونا پڑا اور جب اسد کی بھیجی ہوئی ایک فوج نے اس قلعے کا محاصرہ کرلیا تو حارث کے پیروؤں نے قلعہ چھوڑ دینے پر اصرار کیا اور مخالف فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جن میں سے بعض کو قتل کردیا گیا اور عورتوں کو لونڈیاں بناکر فروخت کردیا گیا۔ حارث اپنی فوج سمیت ترغش کے خاقان کے ساتھ شامل ہوگیا وہ خریستان کی لڑائی میں خاقان کی طرف سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑا۔ جب اس کی فوج نے شکست کھائی تو ایک اور نئی مہم کی تیاریوں میں حارث نے خاقان کی معاونت کی اور خاقان سے ۵ ہزار گھوڑے وصول کئے۔

اسد کی وفات کے بعد نصر بن سیار نے ۱۲۲ھ/۷۴۰ء میں ایک فوج کے ساتھ شاش پر چڑھائی کردی۔ نصر اور حارث کے دستوں کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی لیکن بعد میں شاش اور نصر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت یہ طے ہوا کہ شاش کا حکمران حارث کو فاراب میں جلاوطن کردے گا۔ لیکن بعض حالات کی بناء پر نصر کو خلیفہ یزید بن الولید سے حارث کو معاف کردینے کی درخواست کرنی پڑی۔

جب حارث ۱۲۷ھ/۷۴۵ء میں مرو آیا تو اس نے اس مطالبے پر زور دیا کہ کتاب و سنت کے احکام کے مطابق عمل کیا جائے۔ نصر اور مرو کے لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ نیز اس کا بیٹا محمد اور بیٹی الالوف کو بھی رہا کردیا گیا اور نصر نے اسے ایک ضلعے کا حاکم مقرر کرنے کی پیش کش کی تو اس نے انکار کردیا۔ نصر نے اسے جو تحائف دیئے وہ اس نے اپنے پیروکاروں میں تقسیم کردیئے۔ حارث نے نصر سے مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرے جو شریف الطبع اور حق پرست ہوں۔

حارث کی مرو میں آمد کے تھوڑے عرصے بعد تین ہزار تمیمی اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ انہوں نے اس سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ حارث نے مرو کے باہر پڑاؤ ڈالا اور نصر کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے جہم بن صفوان کو اپنی سیرت پڑھنے کی ہدایت کی۔ تھوڑے عرصے کے لئے جدیع الکرمانی بھی حارث کے ساتھ شامل ہوگیا لیکن ان کی فوجوں میں تصادم ہوگیا اور حارث اس اثناء میں قتل کردیا گیا۔

حارث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مرجئی تھا اس کا معتمد جہم بن صفوان تھا۔ اس نے سیاسی سرگرمیوں میں ابوالصیدار کی پیروی کی جو موالی کے حقوق کے لئے لڑا۔ حارث اور اس کے پیرو اسلام کے ابتدائی دور میں صرف ایک ہی ایسا گروہ ہے جس نے قوم سے علیحدگی اختیار کی اور اپنے بھائیوں کے خلاف غیر مسلموں کی حمایت اس مقصد کے لئے کی کہ ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو قرآن وسنت کے احکام کے مطابق عمل کرے۔

حارث میں تبلیغ کا ایک احساس تھا اس نے بظاہر زہد کی زندگی بسر کی۔ وہ چاہتا تھا کہ آنحضورؐ اور خلفائے راشدین کی حکومت جیسی ایک صحیح حکومت قائم کی جائے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ شوریٰ کے انتخاب کے اصول کو اختیار کیا جائے۔

حارثؓ بن عمیر ازدی :

(صحابی) آپ قبیلہ ازد سے تھے۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔

آنحضورؐ نے جب سلاطین اور امراء کے پاس دعوتِ اسلام کے خط بھیجے تو ایک خط شرجیل بن عمر فرمانروائے بصریٰ کے نام بھی لکھا۔ حضرت حارثؓ کو اس کے پہنچانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ یہ خط لے کر آپ موتہ کے مقام تک ہی پہنچے تھے کہ شرجیل سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟۔ حارثؓ نے کہا شام، شرجیل نے کہا، تم کسی کے قاصد معلوم ہوتے ہو؟۔ آپؓ نے کہا ہاں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں۔ یہ سن کر اس نے حارثؓ کی مشکیں کسوا کے قتل کر دیا۔

حارثؓ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے قاصد ہیں جس نے خدا کی راہ میں جام شہادت پیا۔ آنحضورؐ کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپؐ کو بہت زیادہ رنج ہوا۔ اور حارثؓ کے خون کے لئے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک سریہ موتہ روانہ کیا۔ اسی سریہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفر طیارؓ وغیرہم شہید ہوئے۔

حارث بن کعب (بنو)

یمن کا ایک عرب قبیلہ بنو حارث کا نسب یہ ہے :۔

"حارث بن کعب بن عمرو بن علۃ بن جلد بن مذحج (مالک)"

بنو حارث نجران کے علاقے میں رہتے تھے اور بنو ہمدان کے پڑوسی تھے نجران کے علاقے کے علاوہ اور مقامات پر یہ علاقے ان کے قبضے میں تھے۔ العرش، العاذ، بطن الذہاب، ذوالمروت، الفرط، عدورہ، عبانہ، الخصاصہ، قری تجل، صمصر، سوحان، میبان، اشطزباد۔ وادیوں میں العوصل الاعلیٰ اور العوصل الاسفل، النضارات۔ تجر

چشموں میں عیناذنب، البثرار، الجفر، الہرار، الحمیٰ، الکوکب، خطمہ خلیقی، الملحات، ماوہ شمسیٰ، الشلیلہ، بدمات اور پہاڑیوں میں نخم کی پہاڑیاں ان کے قبضے میں تھیں۔

اس قبیلے کے کچھ خاندان حضرموت کے مقام ریدۃ العبیر اور شہر رداع میں صمع اور حدقان کی بستیوں میں اور دمشق کے قریب الغلجہ میں رہتے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ یغوث نام بت کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سے بعض عیسائی تھے۔ عبدالمدان بن دیان نے جو بنو حارث کا ایک ممتاز خاندان تھا۔ ایک بڑا گرجا "دیر نجران" بنایا تھا جو کعبہ نجران بھی کہلاتا تھا۔

یہ بات تاریخی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ یغوث نامی بت کی وجہ سے بنو حارث اور بنو مراد کے مابین جو اس بت کی ملکیت کے دعویدار تھے الرزم کے مقام پر عین اسی روز ایک معرکہ ہوا جس دن جنگ بدر ہوئی۔ بنو حارث نے بنو ہمدان سے اتحاد کر کے بنو مراد کو شکست دی اور یغوث انہی کے قبضے میں رہا۔

کلاب کی دوسری لڑائی میں جو دھنا میں لڑی گئی، بنو حارث جو بلحارث کے نام سے معروف تھے تمیمی قبیلوں رباب اور سعد ابن زید مناۃ کے خلاف لڑے جن کا قائد قیس بن عاصم تھا بلحارث کے ساتھ ہمدان، کندہ، قضاعہ اور دوسرے قبیلے تھے اور فوج کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ اس جنگ میں بلحارث کو شکست ہوئی۔

ایک اور جنگ میں جو صدرہ کے نام سے معروف ہے اور نہامہ کے مقام پر دس کے خلاف لڑی گئی تھی، بلحارث کو دوبارہ شکست ہوئی۔

جب آنحضورؐ کی دعوت تمام دیار عرب میں پہنچی تو بنو حارث میں سے جو لوگ عیسائی تھے انہوں نے آنحضورؐ کی خدمت میں غالباً ۸ ھ/۶۲۹ - ۶۳۰ ء میں ایک وفد بھیجا جو زیادہ تر مذہبی پیشواؤں پر مشتمل تھا۔ یہ وہی وفد ہے جس کا تفاسیر میں وفد نجران کے نام سے ذکر آتا ہے۔

اس وفد نے مدینے کے قریب ایک مقام پر آنحضورؐ سے ملاقات کا انتظام کیا اور طے کیا کہ اس مقام پر آپؐ کے ساتھ مباہلہ کریں گے لیکن جب ان کو آپؐ کی صداقت کا یقین ہو گیا اور اپنی شکست کا خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے آنحضورؐ سے مباہلہ منسوخ کرنے کی درخواست کی جسے آپؐ نے اس شرط پر منظور کر لیا کہ وہ پہلے سے زیادہ جزیہ دیں۔

ربیع الاوّل ۱۰ ھ/۶۳۱ ء میں آنحضورؐ نے خالد بن ولیدؓ کو چار سو اسی افراد کے ساتھ بلحارث کے پاس انہیں اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا ان میں سے بعض مشرکوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت خالدؓ نے وہاں قیام فرما کر انہیں قرآن حکیم اور ارکان اسلام کی تعلیم دی۔

کچھ عرصہ بعد وہ ایک وفد کے ہمراہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے وفد کے ہر رکن کو چار سو درہم دیئے۔ ان میں سے قیس بن الحصین کو بلحارث کا امیر مقرر کیا۔ جب ۱۱ ھ/۶۳۲ ء میں اسود عنسی نے پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کیا تو بلحارث نے اس کی پیروی اختیار کر لی اور انہوں نے نجران کے عامل عمرو بن حزم کو نکال دیا اور اسود عنسی ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں بلحارث کے مسلمان اسلام پر قائم رہے۔ اور عیسائیوں نے معاہدے کی تجدید کی۔

حارثؓ بن نوفلؓ :

(صحابی) آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے "حارث بن نوفل بن حارث ابن عبد بن ہاشم قرشی ہاشمی۔ آپ کے والد آنحضورؐ کے چچیرے بھتیجے تھے۔ اس رشتہ سے حارثؓ آنحضورؐ کے پوتے ہوئے۔

حارثؓ کے والد نے غزوۂ خندق سے قبل اسلام قبول کیا تھا اور آپؓ بھی اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ اگرچہ آپؓ کے والد شرف ہجرت سے بھی سرفراز ہوئے لیکن حارثؓ اس شرف سے محروم رہے۔

آنحضورؐ نے حارثؓ کو جدّہ کی امارت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس لئے آپ جنگ حنین میں شریک نہ ہو سکے۔ بقول واقدی حضرت ابوبکرؓ نے آپؓ کو مکہ کی امارت پر فائز کیا تھا لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق مکہ کی امارت پر عتاب بن اسید مامور تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد خلافت میں حارثؓ کو جدّہ کی امارت سے معزول کر دیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں آپؓ کو اسی سابقہ عہدے پر دوبارہ بحال کر دیا تھا۔

حارثؓ نے بصرہ میں گھر بنا لیا تھا اور یہیں پر وفات پائی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ستر برس تھی۔

ایک اور روایت کے مطابق آپؓ نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے آخر میں وفات پائی۔ لیکن ابن سعدؓ نے "طبقات" میں آپؓ کی وفات حضرت عثمانؓ کے عہد میں بتائی ہے۔

آپؓ کی چار بیویاں تھیں جن کے نام یہ ہیں :۔ رملہ، ام زبیر، ربیعہ اور اُم حارث اور لڑکوں میں سعید، محمد الاکبر، ربیعہ، عبدالرحمٰن، عتبہ، محمد الاصغر، حارث ابن حارث تھے۔

حارثؓ بن ہشام

صحابی اور مشہور دشمن اسلام ابوجہل کے بھائی۔ کنیت ابو عبدالرحمٰن، نسب نامہ یہ ہے:۔

حارثؓ بن ہشام ابن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم، قرشی، مخزومی۔

حارثؓ مکہ کے رئیس اور بڑے مخیر اور فیاض آدمی تھے۔ سینکڑوں غریبوں کے کھانے کا بندوبست ان کے دسترخوان پر ہوتا تھا۔ آنحضورؐ کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح حارثؓ اسلام قبول کرلے۔ ایک مرتبہ آپؐ کی مجلس میں ان کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کیوں نہ ہو ان کے باپ بھی سردار تھے کاش خدا انہیں اسلام کی ہدایت دیتا۔

غزوۂ بدر میں ابوجہل کے ساتھ تھے لیکن میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے اور ابوجہل مارا گیا۔ چنانچہ ان کی اس بزدلی پر حسانؓ بن ثابت نے اشعار میں انہیں غیرت دلائی۔ انہوں نے اشعار ہی میں اس کی توجیہ آمیز د   کی۔ اُحد میں بھی مشرکین کے ہمراہ تھے۔

حارثؓ فتح مکہ میں دوسرے سردارانِ قریش کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلام کے بعد سب سے پہلے غزوہ حنین میں شریک ہوئے۔ آنحضورؐ نے مالِ غنیمت میں سے سو اونٹ مرحمت فرمائے۔

حنین کے بعد مکہ لوٹ گئے۔ لیکن آنحضورؐ کی وفات کے وقت مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے۔ چنانچہ جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار میں خلافت کے بارے میں اختلاف ہوا تو حارثؓ نے یہ صائب رائے ظاہر کی کہ خدا کی قسم اگر رسول اللہ نے "الائمۃ من قریش" نہ فرمایا ہوتا تو ہم انصار کو بے تعلق نہ کرتے۔ کیونکہ وہ اس کے اہل ہیں لیکن رسول اللہ کے فرمان میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اگر قریش میں صرف ایک شخص بھی باقی ہوتا تو بھی خدا اس کو خلیفہ بناتا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب شام پر فوج کشی کا عزم کیا اور تمام بڑے بڑے رؤسا کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو حارثؓ کو بھی ایک خط لکھا۔ حارث حصول سعادت کے بہت سے مواقع کھو چکے تھے اس لئے تلافی مافات کے لئے فوراً آمادہ ہو گئے۔ لیکن ان کی ذات تنہا نہ تھی۔ وہ صدہا غریبوں کا سہارا تھے۔ اس لئے مکہ ماتم کدہ بن گیا سب با دیدۂ پرنم الوداع کہنے کو نکلے۔ جب بطحا کے بلند حصے پر پہنچے تو رونے والوں کی یہ زاری دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور ان الفاظ میں ان کو تشفی دینے کی کوشش کی۔

"لوگو! خدا کی قسم میں اس لئے تم لوگوں سے جدا نہیں ہو رہا ہوں کہ مجھے تمہارے مقابلے میں کوئی ذاتی منفعت مقصود ہے یا تمہارے مقابلے میں دوسرا شہر پسند ہے بلکہ ایک اہم معاملہ پیش آگیا ہے۔ اس میں قریش کے بہت سے اشخاص شریک ہو چکے ہیں جو تجربہ اور خاندانی اعزاز کے لقب سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے اس زریں موقع کو چھوڑ دیا تو اگر مکہ کے تمام پہاڑ سونے کے ہو جائیں اور ان سب کو ہم خدا کی راہ میں نثار بھی کردیں تب بھی اس کے ایک دن کے برابر اجر نہیں پاسکتے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں اگر ہم کو دنیا نہ ملی تو کم از کم آخرت کے اجر میں شریک ہو جائیں ہمارا یہ نقل مکانی خدا کے لئے اور شام کی طرف ہے۔"

چنانچہ اہل و عیال اور قریش کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلے اور فحل اور اجنادین کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔ اس سلسلہ کی مشہور جنگ یرموک میں ابتداء میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے تو بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ حارثؓ بھی سخت زخمی ہوئے دم واپسیں پیاس کا غلبہ ہوا۔ پانی مانگا فوراً لایا گیا۔ پاس ہی ایک دوسرے زخمی مجاہد نے بھی پانی مانگا۔ فطری فیاضی نے گوارا نہ کیا کہ ان کو پیاسا چھوڑ کر خود سیراب ہوں۔ چنانچہ پانی ان کی طرف بڑھا دیا۔ اس زخمی مجاہد کے پاس ایک تیسرا زخمی اسی حالت میں تھا چنانچہ اس نے ان کی طرف بڑھا دیا۔ ان کے پاس پانی پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ دم توڑ دیا۔ غرض تینوں تشنہ کامانِ حق تشنہ حوضِ کوثر پر پہنچ گئے۔

شہادت کے وقت ایک لڑکا عبدالرحمٰن چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسل میں بڑی ترقی دی اور خوب پھلی پھولی۔

حضرت حارثؓ کی فیاضی، سیر چشمی اور غربا پروری کے مناظر کی ایک جھلک تو مندرجہ بالا سطور میں سامنے آچکی۔ ان کے دوسرے فضائل بقول ابن عبدالبر یہ تھے حارثؓ فضلاً اور خیار صحابہ میں تھے۔ عموماً مؤلفۃ القلوب مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اتنا زیادہ راسخ نہ ہوا تھا لیکن حضرت حارثؓ اس سے مستثنیٰ تھے۔ وہ ان مؤلفۃ القلوب میں تھے جو سچے مسلمان تھے اور قبول اسلام کے بعد ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہ دیکھی گئی۔

حارث کذاب :

(— ۶ — ۶۹ھ/۶۸۸ء) ایک جھوٹا نبی حارث بن عبدالرحمٰن بن سعید متنبی دمشقی۔ پہلے ابوجلاس عبدی قریشی کا مملوک تھا۔ آزاد ہونے کے بعد اس کے دل میں یادِ الٰہی کا شوق پیدا ہوا۔ اہل اللہ کی دیکھا دیکھی دن رات عبادتِ الٰہی میں مصروف رہنے لگا۔ سدِّ رمق سے زیادہ غذا نہ کھاتا۔ کم سوتا، کم بولتا اور اس قدر کپڑا پہنتا جو ستر عورت کے لئے ضروری ہے۔ یہ زہد و ورع، ریاضتیں اور مجاہدے کسی مرشد کامل کے ارشاد و افادہ کے ماتحت عمل میں لائے جاتے تو اسے قال سے حال تک پہنچا دیتے اور معرفتِ الٰہی کا نور اس کے کشورِ دل کو جگمگا دیتا۔ لیکن اس غریب کو معلوم نہ تھا کہ جو لوگ کسی رہبرِ کامل کی صحبت میں رہ کر منازل سلوک طے کرنے کے بجائے از خود ریاضت و اتزوا کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، شیطان ان کا رہنما بن جاتا ہے اور اس وقت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک انہیں ضلالت و ہلاکتِ ابدی میں نہیں ڈال دیتا۔

چنانچہ جب جنودِ ابلیس نے حارث کو اپنی نگاہِ التفات سے مخصوص کرکے اس پر القاء و الہام کے دروازے کھولے تو اس کو عجیب قسم کی چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ جو پہلے کبھی مشاہدے سے نہیں گزری تھیں۔ لیکن اس کے سر پر کسی شیخ طریقت کا سایہ نہیں تھا جس کی طرف یہ رجوع کرتا کہ وہ اسے شیطانی اغوا کوشیوں سے متنبہ کرکے ضلالت سے بچاتا۔ اس نے اپنے باپ کو جو موضع حولہ میں رہتا تھا لکھ بھیجا کہ جلد میری خبر لو۔ مجھے بعض ایسی چیزیں دکھائی دے رہی ہیں جن کے متعلق خوف ہے کہ مبادا شیطان کی طرف سے ہوں۔ یہ پڑھ کر گم کردہ راہ باپ نے اس کو ورطۂ ہلاکت سے نکالنے کی بجائے الٹا گمراہی کے جال میں پھنسا دیا اور لکھ بھیجا "بیٹا! تو اس کام کو بے خطر کر گزر جس کے لئے تجھے حکم ہوا ہے۔"

چونکہ حارث نے سخت زاہدانہ اور متقشفانہ زندگی اختیار کر رکھی تھی، اور دائم العبادات، معمور الاوقات تھا۔ اس سے بھی ماورا عقل افعال صادر ہوتے تھے۔ چنانچہ مسجد میں ایک پتھر پر انگلی مارتا تو وہ تسبیح پڑھنے لگتا۔ موسم گرما میں لوگوں کو سرما کے پھل اور میوہ جات کھلاتا۔ جب حارث کے استدراجی کمالات نے دور رس شہرت اختیار کی تو ایک دمشقی رئیس قاسم بن بخیرہ اس کے پاس آیا اور دریافت کیا کہ تم کس بات کے مدعی ہو؟ حارث نے کہا "میں نبی اللہ ہوں۔" قاسم کہنے لگا اے عدو اللہ تو جھوٹا ہے۔ آنحضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ بالکل بند ہو چکا ہے۔ قاسم نے جا کر خلیفہ عبدالملک بن مروان سے ملاقات کی اور حارث کی فتنہ انگیزیوں کا حال بتایا۔ عبدالملک نے حکم دیا کہ حارث کو گرفتار کرکے میرے سامنے لایا جائے۔

جب پولیس گرفتاری کے لئے مکان پر پہنچی تو اس کا وہاں کوئی کھوج نہ مل سکا۔ حارث دمشق سے بھاگ کر بیت المقدس پہنچا اور نہایت رازداری کے ساتھ اپنی نشۂ انگیزیوں میں مصروف رہا۔ اس کے مرید ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو خدا سے ملاقات کے شائق ہوں۔ انہیں جہاں کہیں اس ذہنیت کا آدمی نظر آتا اس کو ساتھ لے جاتے اور حارث سے ملاقات کرا کے اپنی جماعت میں داخل کرانے کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ ایک بصری کو اپنے ساتھ لے گئے جو بیت المقدس میں نووارد تھا اس نے توحید الٰہی کے متعلق حارث کی نکتہ آفرینیاں سنیں تو اس کے حقائق و معارف پر عش عش کر اٹھا لیکن جب حارث نے بتایا کہ میں نبی مبعوث ہوا ہوں تو کہنے لگا تمہاری ہر بات پسندیدہ ہے۔ لیکن دعوائے نبوت کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔ حارث نے کہا نہیں نہیں تم سوچو اور غور کرو اس وقت تو بصری بلا تسلیم دعوائے نبوت مجلس سے اٹھ کر چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر آیا اور ظاہری طور پر حارث کے دین پر ایمان لا کر اس کی جماعت میں داخل ہو گیا اور شب و روز وہیں رہنا شروع کر دیا یہاں تک کہ حارث کے مخصوص مریدین میں شمار کیا جانے لگا۔

جب بصری نے حارث کے تمام جزی اور کلی حالات معلوم کر لئے تو ایک دن کہنے لگا۔ یا نبی اللہ میں بصرہ کا رہنے والا ہوں، اب میں اپنے وطن جا کر لوگوں کو آپ کی نبوت کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ حارث نے اجازت دے کر رخصت کیا۔ بصری سیدھا خلیفہ عبد الملک کے پاس گیا اور اس سے حارث کے بارے میں ذکر کیا۔ عبد الملک نے کہا کہ وہ اس وقت کہاں ہے بصری نے بتایا کہ بیت المقدس میں فلاں جگہ چھپا بیٹھا ہے اس نے مزید کہا کہ اگر میرے ساتھ کچھ آدمی کر دیئے جائیں تو میں اسے گرفتار کر کے آپ کی بارگاہ میں پیش کر سکتا ہوں۔ خلیفہ نے چالیس فرغانی سپاہی بصری کی تحویل میں دے دیئے اور ان کو حکم دیا کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔

بصری ان پیادوں کو لے کر بیت المقدس آیا اور رات کے وقت حارث کی قیام گاہ پر پہنچا۔ یہ شخص سپاہیوں کو ایک آڑ میں کھڑا کر کے پہلے خود گیا لیکن دربان نے دروازہ کھولنے سے انکار کیا اور بولا کو تم حضرت کے خدام میں داخل ہو تاہم اتنی رات گئے کسی کے لئے داخلہ کی اجازت نہیں۔ بالآخر بصری نے دربان کو دروازہ کھولنے پر رضامند کر لیا۔ دروازہ کھلا تو بصری نے سپاہیوں کو بھی بلا لیا۔ یہ دیکھ کر دربان اور دوسرے پیروانِ حارث کے ہوش اڑ گئے۔ بصری نے اپنے رفقاء کی مدد سے حارث کو زنجیروں میں جکڑا اور عبد الملک کے دربار میں لے کر چلے۔ جب وہ بیت المقدس میں پہنچے تو حارث نے ایک قرآنی آیت (۳۴ : ۵۰) پڑھی، جس کے پڑھتے ہی گلے اور ہاتھ کی زنجیر ٹوٹ کر زمین پر جا پڑی۔ پیادوں نے زنجیر اٹھا کر پھر ہاتھ گلے سے باندھی اور لے کر چلے۔ جب دوسرے درے پر پہنچے تو حارث نے پھر وہی آیت "اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں راہ راست کو چھوڑ دوں تو یہ حق فراموشی مجھی پر وبال ہو گی اور اگر راہ راست پر ہوں تو یہ اس کلام کی بدولت ہے جس کو میرا رب مجھ پر نازل فرما رہا ہے۔" چنانچہ پیادے پھر سلاسل کو اٹھا اور حارث کو سہ بارہ اس میں جکڑ کر چلے۔ آخر دمشق پہنچے اور حارث کو عبد الملک کے دربار میں پیش کیا۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ واقعی تم مدعی نبوت ہو؟ حارث نے کہا ہاں، خلیفہ نے ایک قوی ہیکل محافظ کو حکم دیا کہ اس کو نیزہ مار کر ہلاک کر دو۔ نیزہ مارا گیا لیکن حارث پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر حارث کے مریدوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ انبیاء اللہ کے جسم پر ہتھیار اثر نہیں کرتے۔ خلیفہ نے محافظ سے کہا کہ شاید تم نے بسم اللہ پڑھ کر نیزہ نہیں مارا۔ اس مرتبہ محافظ نے بسم اللہ پڑھ کر وار کیا تو حارث بری طرح زخم کھا کر گرا اور جان دے دی۔

علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان" میں لکھا ہے کہ حارث کی ہتھکڑیاں اتارنے والا اس کا کوئی شیطان دوست تھا۔

حارثہ: ابن بدر بن تمیم۔ قبیلہ تمیم کی ایک شاخ غدانہ کا ایک فرد جو زیاد بن ابیہ کا سپہ سالار اور دوست تھا

ہجرت نبوی سے کچھ عرصہ قبل پیدا ہوا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ [illegible] عمر میں وہ سجاح کے پیروؤں میں شریک رہا جس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا [illegible] جمل میں حضرت علیؓ کے مخالفین میں سے تھا۔ لیکن بعد ازاں اس نے حضرت علیؓ سے وابستگی اختیار کر لی۔

اواخر عمر میں وہ زیاد سے جو بعد میں عراق کا گورنر ہوا وابستہ ہو گیا وہ خطیب ہونے کے علاوہ شعر بھی کہتا تھا اور عربوں کی قدیم تاریخ میں اسے خاص طور پر دسترس حاصل تھی اور اس کی شجاعت بھی مسلّمہ اور آزمودہ تھی۔

اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت کی بنا پر وہ معاشرے کا ایک نمایاں فرد تھا اور [illegible] تو طبیعتوں کے جمع ہونے سے اس نے واعظیہ کا لقب پایا۔ اگرچہ وہ تمیمی تھا لیکن زیاد کی دوستی کی بدولت اس کا نام قریش کی فہرست میں درج کر لیا گیا تھا۔

زیاد کے جانشین اور بیٹے عبید اللہ نے حارثہ سے دوستی رکھنے میں اتنی زیادہ گرمجوشی نہیں دکھائی۔ یزید اول کے انتقال پر جو سیاسی بحران پیدا ہوا اس دوران [illegible] بار کہ وہ بیش کامیابی کے ساتھ خارجیوں سے برسرِ پیکار رہا۔

حارثہ کی ناکامی کی وجہ اکثر اوقات بصرے کے سپاہیوں کی کمزوری تھی۔ [illegible] ہی مہم کے دوران میں وہ ۶۶ھ میں بیمار ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہ ولید اول کے عہدِ حکومت تک زندہ رہا۔ اگرچہ یہ روایت زیادہ صحیح نہیں ہے۔

حارثہؓ بن سراقہ: (صحابی) (—— ؟ —— ۲ھ [illegible])

آپ قبیلہ خزرج کے نجار خاندان سے تھے والد ہجرت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ ہجرت سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سلسلہ نسب یہ ہے حارثہ بن سراقہ بن حارث بن عدی بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن [illegible] والدہ اُم حارثہ تھیں نام ربیع بنت النضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار تھا۔ آنحضورؐ کے خادم انس بن مالک کی پھوپھی تھیں [illegible] نے حارثہ بن سراقہ اور سائب بن عثمان ابن مظعون کے درمیان عقد مواخات [illegible] کیا۔ غزوہ بدر کے روز سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ [illegible] ایک حوض پر پانی پینے گئے حبان بن العرقہ نے تیر مارا۔ آپؓ وہیں شہید [illegible] حارثہؓ کو انصار میں سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی۔ والدہ سے بہت زیادہ محبت اور اطاعت کرتے تھے والدہ بھی آپ سے بہت محبت رکھتی تھیں۔ جب آپ شہید ہوئے تو آپؓ کی والدہ نے آنحضورؐ سے عرض کی یا رسول اللہ صلعم آپ کو حارثہ سے میرا تعلق معلوم ہے اگر وہ جنت میں ہو تو صبر کروں ورنہ آپؐ دیکھ لیں گے [illegible] آپ نے فرمایا اے والدۂ حارثہ جنت ایک نہیں ہے بلکہ بہت سی جنتیں ہیں اور حارثہ [illegible] افضل یا اعلیٰ درجے فردوس میں ہیں۔ حارثہ بن سراقہ عبادت اور ریاضت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔

حارثہؓ بن نعمان: (صحابی) ابن نفع زید بن ثعلبہ بن غنم۔ ان کی والدہ جعدہ بنت عبید بن ثعلبہ بن عبید بن ثعلبہ بن غنم تھیں۔ ابو عبداللہ کنیت تھی۔

حضرت حارثہ بدر واحد وخندق تمام غزوات میں حضور کے ہمرکاب رہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے زندگی بھر میں دو مرتبہ جبرئیلؑ کو دیکھا۔ ایک دفعہ تو یوم الصورین میں، جس وقت آنحضورؐ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہوئے اور جبرئیل دحیہ بن خلیفۃ الکلبی کی شکل میں ہمارے پاس سے گزرے اور انہوں نے ہمیں مسلح ہونے کا حکم دیا۔

دوسرے موضع الجنائز کے دن، جس وقت ہم لوگ حنین سے واپس آئے میں اُس حالت میں گزرا کہ وہ آنحضورؐ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سلام نہیں کیا۔ جبرئیل نے پوچھا کہ اے محمدؐ یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "حارثہ بن نعمانؓ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا یہ یوم حنین میں ان سو صابروں میں سے نہیں ہیں جن کے جنت میں رزق کا اللہ کفیل ہے؟ اگر یہ سلام کرتے تو ہم انہیں ضرور جواب دیتے۔

آخر عمر میں حارثہ بن نعمان کی نظر جاتی رہی تھی۔ انہوں نے اپنی جائے نماز سے حجرے کے دروازے تک ایک ڈوری باندھ رکھی تھی۔ پاس ہی ایک ٹوکری رکھ لی تھی جس میں کھجوریں وغیرہ تھیں۔ جب کوئی مسکین سلام کرتا تو وہ ان کا سلام کھجوریں سے بینتے۔ ڈوری پکڑ کر دروازے تک آتے اور مسکین کو دیتے۔ گھر والے کہتے کہ ہم آپ کے لیے کافی ہیں۔ جواب دیتے کہ میں نے آنحضورؐ کو فرماتے سُنا ہے کہ مسکین کو دینا بُری موت سے بچاتا ہے۔

حضرت حارثہ بن نعمان کے مکانات مدینے میں آنحضورؐ کے مکانات کے قریب تھے انہوں نے حضرت امیر معاویہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

حازم: (۶۰۰ھ/۱۲۱۱ء — ۲۴ رمضان ۶۸۴ھ/نومبر ۱۲۸۵ء) حازم بن محمد بن خلف بن حازم انصاری مشہور نحوی۔ شاعر اور ماہر بلاغت۔

قرطاجنہ میں قبیلہ اوس کے ایک خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ قرطاجنہ کا قاضی تھا۔ حازم نے اپنے والد ہی سے نحو، عربی زبان، حدیث اور مالکی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اُس نے مرسیہ میں اور پھر اشبیلیہ اور غرناطہ میں اپنی تعلیم جاری رکھی الشلوبینی نے اس کو عربی زبان میں فلسفہ اور سب سے بڑھ کر ابن سینا کی تصانیف سے یونانی فلسفے کا مطالعہ کرنے پر اُکسایا۔

والد کی وفات کے بعد وہ مراکش چلا گیا جہاں پر اس نے الموحد خلیفہ الراشد کے عہد میں ادبی مشاغل میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ المغرب چلا گیا اور وہاں پر ابو زکریا اول حفصی کے دیوان میں سکریٹری ہو گیا۔ نحو اور بلاغت میں اپنی اعلیٰ درجے کی علمیت اور اپنی روایت کی بدولت اسے اپنے معاصرین میں بلند مقام حاصل ہو گیا۔

حازم نے تونس میں وفات پائی۔ اس کی تصانیف تین بڑے شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی منظوم تصانیف جو مخطوطات اور معاصر یا متاخر تصانیف میں محفوظ ہیں متنبی کے اثر کو ظاہر کرتی ہیں۔

نحو کے میدان میں حازم ناصحانہ انداز میں لکھی گئی ایک نامکمل نظم اور ابن عصفور کی "المقرب" پر تنقید کا ایک مصنف بھی ہے۔ جس کا نام "شد الزنار علی جحفلۃ الحمار" تھا۔ ایک ماہر بلاغت کے طور پر اس کی تصانیف "کتاب المتخبس" عروض پر ایک رسالہ "کتاب القوافی" اور ایک اہم تصنیف "منہاج البلغاء وسراج الادباء" ہیں۔

حازمیہ: خارجیوں کا ایک فرقہ جو حازم بن عاصم کا متبع ہے۔ ان کا مذہب اہل تشیع کے موافق ہے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں وہ توقف کرتے ہیں اور انہیں بُری نہیں جانتے اور نہ اُن کے سوا کسی اور کو بری سمجھتے ہیں۔

حاشد وبکیل: جنوبی عرب کے قبائل کا ایک بڑا مجموعہ جن کے مابین ایک وفاق قائم تھا۔

موجودہ زمانے میں جنوبی عرب کے باشندے حاشد کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کرتے ہیں۔ حاشد الاصغر بن جشم بن نوف بن حاشد الاکبر بن جشم بن ہمدان بکیل کو وہ حاشد الاکبر کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔

ان کا علاقہ صنعا کے قریب واقع ہے اور مغرب کی سمت میں مارب اور نجران تک پھیلا ہوا ہے اور مشرق میں صحرا کے عین کنارے تک پہنچ جاتا ہے۔ نی لوزنے اسی علاقے کو "بلد القبائل" یعنی قبائلیوں کا علاقہ کہا ہے۔ بنو حاشد تین بڑے گروہوں میں منقسم ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ الحارف۔
۲۔ بنو صریم۔
۳۔ العصیات۔

بنو حاشد میں مسلح آدمیوں کی تعداد بائیس ہزار ہے۔ حاشد کے علاقوں میں مندرجہ ذیل مقامات شامل ہیں:۔

قاعتہ شمس، قاعتہ جیس، قاعتہ الیون، جبل ذی بین اور عیس کے ساتھ اسی نام کی ایک وادی ہے جو وادی شرابہ کی معاون ہے۔ حوت اور رقت کے گاؤں، خمر، نفار کے کھنڈرات، جبل تنلن۔

بنو حاشد تمام عرب قبائل میں بدنام ہیں۔ لیکن گلازر نے مہربان خصلت اور بالطبع صاف دل لکھا ہے۔

بنو بکیل بنو حاشد کے علاقوں سے مشرق کی جانب رہتے ہیں اور مندرجہ ذیل قبائل پر مشتمل ہیں:۔

بلحارث، بلاد البستان، خولان، جبر، ارحب، نہم، عیال صریح، نوف ذو محمد، ذو حسین، سفیان، مرہبہ، مرھبہ، وادعہ، ہمدان عیال، سالم، وائلہ، عمامسہ اور اہل امار نیز خود صنعا کا شہر بھی ایک وقت میں بنو بکیل کے علاقے میں شمار ہوتا رہا۔ بکیل کے مسلح آدمیوں کی تعداد اسی ہزار بتائی جاتی ہے۔

حاشد اور بکیل زیدی ہیں اور سیاسی حیثیت سے زیادہ تر آزاد ہیں۔ زمینوں کی پیداوار روز بروز کم ہونے جانے کی وجہ سے حاشد اور بکیل کے بہت سے افراد اپنے علاقے کو ترک کر دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حاشد اپنے علاقے سے باہر جبل برع کے علاقے میں اور تعز کے علاقے ذو محمد میں بس گئے ہیں وہ اکثر اپنے ہمسایہ حکمرانوں مثلاً امام صنعا اور شریف مکہ کی فوجوں میں بھرتی ہو جاتے تھے۔

۱۸۸۵ء میں بکیل اور حاشد کے درمیان ایک شدید جنگ ہو رہی تھی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ بکیل حاشد کی دو عورتوں کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ چنانچہ بنو حاشد نے سفیان کے دیہات واقع خیوان میں قتل عام شروع کر دیا۔ حاکم صنعا عزت پاشا نے اپنی کوششوں سے جھگڑے کو ختم کرایا اور اس طرح یہ دونوں قبیلے اس کے زیر حکومت آ گئے۔

الہمدانی نے اپنی تصنیف صفۃ جزیرۃ العرب میں ان دونوں قبیلوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

بکیل کے علاقوں میں یہ مقامات شامل تھے۔ الصمع، حذفان، مطرۃ عذر، متعدد ندیاں جو خارد میں آکر مل جاتی ہیں، جبل زیبان، حریب لرضاض، وادی محصم، بالائی جوزف، صدلان، جبل درفو، السیع، خیوان اور صعدہ کے درمیانی گاؤں بلد اشاکر بن بکیل، حیدرہ اور طلاح ہیں۔ بکیل کی منڈیوں میں درود، عرق اور ریدہ تھیں۔

حاطبؓ بن ابی بلتعہ : (— ؟ — ۳۰ھ/ ۶۵۰ء) صحابی اور ایام جاہلیت کے مشہور شاعر۔ ابو محمد اور ابو عبداللہ کنیت۔ سکونت یمن میں تھی شہسواری میں کمال شہرت رکھتے تھے۔ ہجرت سے پہلے مسلمان ہوئے اور تمام جنگوں میں نمایاں حصّہ لیا۔

آپ ۶ ھ میں مقوقس شاہ مصر کے پاس آنحضورؐ کا خط لے کر گئے تھے شاہ مصر نے خط پڑھ کر اسے بڑی تکریم کے ساتھ ہاتھی دانت کے ایک ڈبے میں بحفاظت رکھ دیا اور حاطب کو بیش قیمت تحائف اور ماریہ اور سیرین دو لونڈیاں دلدل نامی ایک خچر اور بہت سے قیمتی ملبوسات دیکر روانہ کیا۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ خود فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس شاہ اسکندریہ کے پاس نامۂ گرامی دے کر بھیجا۔ مقوقس نے مجھے اپنے محل میں اپنے پاس ٹھہرایا۔ اس نے اپنے تمام پادریوں کو جمع کیا اور مجھے بلا کر کہا "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا تم ذرا سمجھ کر جواب دینا" میں نے کہا "پوچھئے" اس نے کہا "تم اپنے حضرت سے مجھے مطلع کرو کیا وہ نبی نہیں ہیں؟" —— میں نے کہا "وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں" اس نے کہا جب وہ اس اونچے پایہ کے تھے تو انہیں یہ کیسے سوجھی کہ جب قوم نے انہیں وطن سے نکال باہر کیا، قوم کے لئے بد دعا کیوں نہ کی؟ میں نے کہا "کیا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تم لوگ اللہ کے رسول ہونے کی شہادت نہیں دیتے ہو؟" اس نے کہا "بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں" میں نے کہا "جب قوم نے ان کو پکڑا اور ان کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو انہیں کیا سوجھی کہ قوم پر بد دعا کیوں نہیں کی؟ کہ اللہ ان سب کو تباہ و برباد کر دیتا اور ان کو اللہ نے آسمان دنیا پر اٹھا لیا" یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا تم نہایت ہی دانا اور عقلمند ہو اور دانا و عقلمند کے پاس آئے ہو۔ یہ ہدیئے میں تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں آنحضورؐ کے لئے اور تمہارے ساتھ پہرے دار بھیج دوں گا۔ چنانچہ اس نے بہت سی نایاب چیزیں اور تین باندیاں آنحضورؐ کی خدمت میں بھیجیں جن میں سے ایک ابراہیم بن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ مبارکہ ہوئیں جن کا نام حضرت ماریہؓ تھا۔ ایک باندی آپ نے حسان بن ثابت کو اور تیسری محمد بن قیس عبدی کو ہبہ کر دی تھی۔

جب آنحضورؐ نے مکے پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا تو آپؓ نے مکہ والوں کو اس سے خبردار کرنے کے لئے ایک خط لکھا۔ آنحضورؐ کو اس خط کی اطلاع ہو گئی۔ آپؐ نے حاطبؓ سے پوچھا تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور عرض کی کہ میں نے مرتد ہو کر خط نہیں لکھا بلکہ صرف اس لئے کہ ایام جاہلیت میں قریش سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے اور میرے بہت سے قرابت دار مکے میں مقیم ہیں چنانچہ آنحضورؐ نے معمولی سرزنش کے بعد ان کا قصور معاف کر دیا۔

حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں آپؓ کو دوبارہ سفیر بنا کر مصر بھیجا گیا۔ آپؓ نے ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ بڑے سخت مزاج اوصاف کے تھے۔ تجارت آپؓ کا ذریعہ معاش تھا۔

حافظ : جب اس کلمے کا اطلاق انسان پر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے قرآن مجید زبانی یاد ہو یعنی جس نے قرآن مجید کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رکھا ہو۔

حافظ : (۴۶۷ھ/ ۱۰۷۴ء —— جمادی الآخرہ ۵۴۴ھ/ اکتوبر ۱۱۴۹ء) گیارھواں فاطمی خلیفہ۔ عبدالمجید نام اور ابو المیمون کنیت تھی عسقلان میں پیدا ہوا جہاں اس کا والد ابوالقاسم محمد مصر میں قحط سالی کی وجہ سے چلا گیا تھا۔ حافظ نے خاصی لمبی عمر میں سیاسیات میں عملی طور پر حصّہ لینا شروع کیا ۵۲۴ھ/ ۱۱۳۰ء میں جب خلیفہ الامر بغیر اولاد نرینہ چھوڑے قتل ہوا تو اس وقت حافظ کافی معمر ہو چکا تھا۔ چونکہ شہزادوں میں وہ قریب ترین وارث تھا۔ اسی وجہ سے اسے الحافظ لدین اللہ کا لقب دے کر نائب السلطنت چنا گیا۔ اسے خلیفہ اس لئے نہیں بنایا گیا کہ اس زمانے کے عام شیعہ عقیدے کے مطابق امامت صرف باپ سے بیٹے کو منتقل ہو سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ الامر کی بیوہ کے ہاں جلد ہی ولادت کی توقع تھی۔ حافظ نے ابھی عنانِ حکومت سنبھالی ہی تھی کہ ابو علی احمد بن افضل معروف بہ الخلیفہ نے فوج کی مدد سے اس کے خلاف بغاوت اور حافظ کے مقرر کردہ وزیر کو برطرف کر کے خود وزارت کے عہدے پر قابض ہو گیا۔ حافظ کو قصر شاہی میں قید کر دیا اور فاطمی خاندان کے جائز حقوق پامال کر کے امام منتظر کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اسی کے نام کا سکہ جاری کر دیا ایک سال تک وہ پورے اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ بالآخر حافظ تخت پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور بلا شرکتِ غیرے حکومت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے بیٹوں حسن اور حیدرہ کے باہمی جھگڑوں نے اس کے اقتدار کی بنیاد متزلزل کر دی۔ ایک سخت معرکہ کے بعد جس میں حیدرہ نے شکست کھائی اور حسن سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ حسن نے اپنے والد حافظ کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا۔ حافظ نے مجبور ہو کر اس کے عیسائی طبیب سے زہر دلا کر اسے ہلاک کروا دیا۔ فوج نے بہرام نامی ایک ارمنی وزیر کا تقرر کروایا جو عیسائی تھا۔ دو سال بعد حافظ نے اسے معزول کر دیا اس کے بعد رضوان وزیر مقرر کیا گیا لیکن اس کا بھی حافظ سے تعلق بگاڑ پیدا ہو گیا انہی نامساعد حالات میں بوڑھے خلیفہ حافظ کا درد قولنج سے ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

حافظ الاسد (۱۹۳۰ء) ملک شام کے موجودہ صدر۔ صوبہ لتاکیہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں فضائی فوج کی اکیڈمی میں داخلہ لینے سے قبل حمص ملٹری اکیڈمی سے بحیثیت پائلٹ گریجویشن مکمل کی۔ ۱۹۵۸ء میں مزید تعلیم کے لئے روس گئے۔ وہاں سے واپسی پر سکواڈرن لیڈر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۵۹ء میں قاہرہ میں تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں انہیں اس بنا پر فوجی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا کہ انہوں نے مصر کے ساتھ شام کے اتحاد کی مخالفت کی تھی۔ اس کے بعد وہ میدان سیاست میں داخل ہوئے اور خود کو بعث پارٹی کے لئے وقف کر دیا۔ دو سال کے بعد انہیں فضائیہ کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ فروری ۱۹۶۶ء میں شام کے وزیر دفاع بنے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۷۰ء کو انہوں نے شام کے وزیر اعظم نورالدین الاتاسی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے تین روز بعد وہ شام کے صدر مملکت بنے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں شام کے صدارتی انتخابات منعقد

ہوئے جس میں انھوں نے ۹۹ فی صد ووٹ حاصل کئے۔ وہ اپنے ملک کے عوام میں بہت

حافظ الاسد، صدر شام

مقبول ہیں۔ لبنان کی پیچیدہ صورت حال میں اسرائیل کا مقابلہ پامردی سے کر رہے ہیں۔

حافظ ابراہیم : مصری شاعر اور مصنف۔ اصل نام محمد حافظ اور والد کا نام ابراہیم تھا۔ حافظ ابراہیم کے نام سے معروف ہوئے۔ ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۲ء کے درمیان رہائشی کشتی میں پیدا ہوا جو دیروط کے نزدیک نیل کے ساحل پر لنگر انداز تھی۔ ابھی چار سال کا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ اس کی پرورش ماموں نے کی۔ یہ کچھ عرصہ قاہرہ میں رہا۔ بعد میں طنطا چلا گیا جہاں اس کے ماموں نے ایک مکان دے دیا تھا۔ اسی جگہ وہ عربی شاعری سے مانوس ہوا۔ پھر بیروزگاری سے تنگ آکر اس نے قاہرہ فوجی کالج میں داخلہ لے لیا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر وہ وزارت جنگ میں اور پھر وزارت داخلہ میں ملازم رہا۔ اس نے ایک عہدیدار کی حیثیت سے مشرقی سوڈان میں لارڈ کچنز کی مہم کے زمانے میں کافی عرصہ ملازمت کی۔ ۱۹۰۶ء میں قاہرہ واپس آگیا اور استاد مفتی عبدہ سے وابستہ ہوگیا۔ یہاں پر اس نے خود کو شاعری کے لئے وقف کر دیا۔ اس دور میں اس نے سعد زغلول، مصطفےٰ کامل اور قاسم امین جیسے سیاسی قائدین سے رابطہ قائم رکھا۔ ۱۹۱۱ء میں وہ سول سروس کا رکن بنا اور اسے قاہرہ میں کتاب خانہ خدیو کے ادبی حصے کا صدر بنا دیا گیا۔ اپنی وفات تک (۲۱ جولائی ۱۹۳۲ء) اس نے یہ عہدہ سنبھالے رکھا۔

حافظ ابراہیم عربی شاعری کے جدید مکتب فکر کے نمائندوں میں سے ہے جن کا قائد سامی البارودی تھا۔ اس کے دیوان کے قطعات میں بہت سی تفصیلات اور براہ راست مشاہدات ملتے ہیں جو اس زمانے کے مصر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کی شاعری الازہر کے علمی حلقوں میں بہت جلد معروف ہوگئی اور اس نے مصر کے اعلیٰ مہذب طبقے اور سیاسی قائدین سے بڑی داد حاصل کی۔ اس نے وکٹر ہیوگو کی MISERABLES میں سے کئی ضمنی قصوں کا ترجمہ کیا۔ اس نے خلیل مطران سے مل کر PAUL-LEROY-BEAULIEU کی ایک تصنیف کا ترجمہ بھی کیا جو "الموجز فی علم الاقتصاد" کے نام سے شائع ہوا۔

حافظ ابرو : (— ء — ۳ شوال ۸۳۳ھ/۱۵ جون ۱۴۳۰ء) ایک ایرانی جغرافیہ نویس اور مؤرخ

شہاب الدین عبداللہ بن الرشید الخوافی، المعروف حافظ ابرو۔ ہرات میں پیدا ہوا۔ ہمدان میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی تصانیف سے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیمور کے دربار سے وابستہ تھا اور بادشاہ کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے وہ شطرنج کا ماہر تھا۔ تیمور کے بعد وہ اس کے جانشین شاہرخ اور شاہزادہ بایسنغر کے دربار سے منسلک ہوگیا۔

حافظ ابرو نے تیمور کی آخری مہمات، موت اور شاہرخ کی مہمات کے حالات ایک عینی شاہد کی حیثیت سے لکھے ہیں۔ ۸۱۷ھ/۱۴۱۵ء میں شاہرخ نے اس سے جغرافیہ پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ حافظ ابرو کی یہ تصنیف جس کا نام کہیں بھی درج نہیں دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں المغرب سے کرمان تک مختلف ملکوں کا بیان ہے۔ آخری ابواب میں جو فارس اور کرمان سے متعلق ہیں، جغرافیائی حالات اور مختلف اضلاع کی سیاسی تاریخ مصنف کے زمانے تک مندرج ہے۔ دوسری جلد میں خراسان اور ماوراءالنہر کا جغرافیہ اور تاریخ زیادہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

پہلی جلد ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء میں لکھی گئی اور دوسری جلد اس سے ایک سال بعد۔ شاہرخ کے فرمان کے مطابق حافظ ابرو نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں تاریخ عالم کی اہم ترین کتابوں کو ایک تالیف "مجموعہ حافظ ابرو" میں جمع کیا۔ اس کتاب کے لئے حافظ ابرو نے جامع التواریخ کا ذیل ۷۰۳ھ/۱۳۰۴ء سے لے کر تیمور کی تخت نشینی تک لکھا۔

۸۲۶ھ/۱۴۲۳ء میں حافظ ابرو نے شہزادہ بایسنغر کے لئے چار جلدوں میں "زبدۃ التواریخ" کے نام سے تاریخ عالم لکھی جو ۸۳۰ھ/۱۴۲۶ء میں مکمل ہوئی۔ یہ تاریخ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد میں زمانہ قبل اسلام کے پیغمبروں اور ایران کے شاہان قدیم کے بارے میں حالات درج ہیں۔ دوسری جلد میں آنحضور ﷺ سے المستعصم تک، تیسری جلد میں بعد از خلافت بغداد سلجوقیوں اور مغلوں کے حالات ابوسعید ایلخانی کی وفات تک اور چوتھی جلد میں سوانح تیمور اور شاہرخ کے گیارہ سالہ حالات قلم بند ہیں۔

حافظ ابرو نے اپنی کتابوں میں بہت سی معلومات ایسی تحریروں سے اخذ کی ہیں جو اب معدوم ہیں۔ جہاں تک اس کے اپنے عہد کے واقعات اور حالات کا تعلق ہے اس کی کتاب کے متعلقہ حصے بہت مستند سمجھے جاتے ہیں۔

حافظ احمد پاشا : (— ء — ۱۹ رجب ۱۰۴۱ھ/۱۰ فروری ۱۶۳۲ء) سلطنت عثمانیہ کا صدر اعظم۔

اس کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن ایک روداد کے مطابق جو اس نے وینس کی حکومت کو بھیجی تھی ۱۶۱۲ء میں اس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ اس نے اندرون ہمایوں (محل سلطانی) میں مصاحب (بادشاہ کا خاص ندیم) کے منصب تک ترقی کی۔ وہ طوغانجی باشی (میر شکار) بھی رہا۔ بعد میں وہ وزیر اور قپودان پاشا یعنی عثمانی بحریہ کا امیرالبحر اعظم بن گیا۔ اور اس عہدے پر ۲۲ شوال ۱۰۱۶ھ/۹ فروری ۱۶۰۸ء تا ۱۶ فروری ۱۶۰۹ء فائز رہا۔ اس عہدیدار کی حیثیت سے اس نے کوئی ناموری حاصل نہ کی۔ ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں وہ ان جہازوں کی حفاظت نہ کر سکا جو مصر کا خراج لے کر اسکندریہ سے قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کو قپودان پاشا کے عہدے سے معزول کر کے شام کا بیگلر

بیگی بنا دیا گیا۔ اپریل ۱۶۰۹ء تا جنوری ۱۶۱۵ء وہ لبنان کے دروزی سردار فخر الدین ثانی کے خلاف فوجی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ بعد میں جب وہ دیار بکر کا بیگر بیگی تھا اسے بغداد پر ترک حکومت بحال کرنے کا حکم ملا۔ جہاں سو باشی بکر نے بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ اس مہم میں وہ ناکام رہا۔ ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳-۱۶۲۴ء میں شاہ عباس اوّل صفوی کی فوجوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ ربیع الآخر ۱۰۳۴ھ/ فروری ۱۶۲۵ء میں حافظ احمد پاشا صدرِ اعظم مقرر ہوا۔ اس کے عہد کا سب سے اہم واقعہ بغداد کا ناکام محاصرہ ہے جو صفر ۱۰۳۵ھ/ نومبر ۱۶۲۵ء تا شوال ۱۰۳۶ھ/ دسمبر ۱۶۲۶ء جاری رہا۔

حافظ احمد پاشا کو ربیع الاول ۱۰۳۶ھ/ دسمبر ۱۶۲۶ء میں صدرِ اعظم کے عہدے سے معزول کر کے وزیر ثانی بنا یا گیا۔ سلطان مراد رابع کی ایک بہن سے اس کی شادی ہو گئی۔ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۰۴۱ھ/ ۲۵ اکتوبر ۱۶۳۱ء کو دوسری بار صدرِ اعظم بنا۔ لیکن ایشیائے کوچک کے فوجی دستوں (ینی چریوں) کی ایک بغاوت میں مارا گیا۔

حافظ احمد پاشا ترکی زبان کا ایک اچھا شاعر تھا۔ بغداد کا محاصرہ کر کے اس نے سلطان سے کمک بھیجنے کی درخواست ایک منظوم خط میں کی تھی۔ سلطان مراد رابع نے جو خود بھی شاعر تھا اس خط کا جواب منظوم خط میں ہی دیا تھا

حافظ برخوردار: (غالباً ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۰ء — ؟)

پنجابی زبان کا ایک ممتاز شاعر اور مصنّف۔

تخت ہزارے کے نواحی گاؤں شُلمانی ضلع سرگودھا میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے لئے لاہور آیا۔ بعد میں سیالکوٹ چلا گیا بقیہ عمر وہیں گزاری۔ وہ قرآن مجید کا حافظ تھا ساری عمر وعظ و نصیحت کرنے اور شعر و شاعری میں گزاری۔

حافظ برخوردار کی تصانیف کی تعداد چالیس کے قریب ہے جو تمام کی تمام پنجابی میں ہیں۔ اس کی تصانیف کو موضوع کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مذہبی اور شرعی مسائل سے متعلق کتب ہیں "نہر العلوم، بحر العلوم، شمس العلوم، مفتاح العلوم، فقہ اجمال، نجات المسلمین، تنبیہ المفسدین، فرائض ہندوی، یوسف زلیخا، اور انواع برخوردار" ہیں۔ رومانی داستانوں میں "مرزا صاحباں" اور "ہیر رانجھا" قابلِ ذکر ہیں۔

حافظ برخوردار نے ان تصانیف میں مقامی بولی کی بجائے ٹکسالی اور معیاری پنجابی زبان استعمال کی ہے۔ مذہبی تصانیف میں عربی اور فارسی کی بڑی پیاری آمیزش ہے۔ رومانی داستانوں کی زبان بہت دل آویز اور خوب صورت ہے وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنی زبان کے لئے "پنجابی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

پنجابی ادب کے بعض نقادوں نے یہ بات لکھی ہے کہ حافظ برخوردار کے نام کا ایک نہیں بلکہ دو شخص تھے۔ بقول میاں محمد بخش، احمد یار، مولوی دل پذیر، "ایک حافظ برخوردار تو وہ ہے جس نے فرائض ہندوی میں اپنا مسکن جھبہ چٹھہ پرگنہ صوبہ لاہور بتایا ہے اور دوسرا وہ ہے جس نے "تنبیہ المفسدین"۔ "مفتاح السعادت" وغیرہ میں اپنا وطن تخت ہزارہ بتایا ہے"۔

اس بات کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ "بحر العلوم" کے مصنف حافظ برخوردار نے رومانی داستانیں لکھنے والوں کو سخت الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور انہیں بدعت کا مرتکب قرار دیا ہے۔

حافظ جمال اللہ سیّد: (۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء — ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۳۰ء) ایک صوفی بزرگ۔

آپ حافظ محمد برخوردار کے صاحبزادے تھے۔ پیدائش ساہن پال شریف ضلع گجرات میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر مولانا مفتی محمد صدیق اور حافظ مفتی شکر اللہ سے علوم عقلی و نقلی حاصل کئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر درگاہ نوشاہیہ میں مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کو حدیث و فقہ میں بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ علم تصوّف و اشارات فقر میں استاد کامل تھے۔ مجاہدہ و ریاضت سے کبھی فارغ نہ ہوتے۔ اکثر لاہور تشریف لے جایا کرتے اور اکابر مشائخ لاہور سے ملاقاتیں کیا کرتے۔ مولانا سید نسیم الحق لکھنوی نے آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"الشیخ الفاضل جمال اللہ بن برخوردار بن محمد بن العلا لاہوری"۔

آپ نے چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار ساہن پال شریف ضلع گجرات میں ہے۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے تھے جن کے نام سیّد ابو سعید مرتاض، سیّد حافظ محمد حیات ربانی ہیں۔ "حقائق الآثار" آپ کی تصنیف ہے۔

حافظ دراز (۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۷ء — غالباً ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء)

ایک عالم دین۔

نام محمد احسن واعظ ابن حافظ محمد صادق واعظ۔ پشاور میں پیدا ہوئے۔ اکثر علوم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کئے۔ آپ فقہ و حدیث اور اصول میں یگانۂ روزگار تھے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تمام عمر تدریس و تالیف میں صرف کی۔ آپ نے ۶۱ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے "فتح الباری شرح صحیح بخاری (فارسی)"، "تفسیر سورۂ یوسف"، "تفسیر سورۃ والضحیٰ"، "معراج نامہ"، "حاشیہ سُلّم"، "شرح قاضی مبارک" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

حافظ رحمت خان: (۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء — ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء)

روہیل کھنڈ کے ایک اہم حکمران خاندان کا سردار۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:-

"رحمت خان بن شاہ عالم خان بن محمود خان بن شہاب الدین بن دولت خان بن بدل خان بن داؤد خان بن حُبّ شیخ خان بن قیس عبدالرشید"

وہ تہامت پور میں پیدا ہوا جو روہ کا ایک چھوٹا سا قصبہ معروف گاؤں ہے۔ اس کی پیدائش اس کے والد کی ہندوستان سے پہلی بار واپسی کے بعد ہوئی۔ جہاں ان دنوں علاقہ کٹھیر میں ایک غلام داؤد خان نے جو مقامی راجاؤں اور زمینداروں کے ہاں فوجی خدمات انجام دیتا رہا تھا بہت اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ داؤد خان نے اپنی ریاست علیحدہ قائم کر لی۔ اس کے عروج کی خبر سن کر اس کے بہت سے ہم وطنوں نے بھی ہندوستان کا رُخ کیا۔ انہیں میں رحمت خان کا والد عالم خان بھی تھا۔ داؤد خان نے ایک آقا کی حیثیت میں ان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ لیکن جلد ہی دونوں میں رنجش پیدا ہو گئی۔ اور داؤد خان نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد داؤد خان خود بھی مارا گیا اور متبنّیٰ علی محمد خان اس کا جانشین ہوا۔ جو سخت جان اور دلیر سپاہی تھا۔ اس کے دور میں روہیلے نڈر ہو گئے کہ انہوں نے علی محمد خان کی سرکردگی میں پرگنہ بریلی اور اس کے گردو نواح میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع موصول ہوئی تو اس نے

مزید علاقے فتح کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔ اودھ کے نواب وزیر صفدر جنگ نے بادشاہ کو علی محمد خاں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ چنانچہ خود بادشاہ کی قیادت میں روہیلہ سردار کے خلاف ایک مہم روانہ ہوئی۔ علی محمد خاں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگرچہ وزیر المالک قمر الدین خان کی سفارش سے اسے معافی مل گئی۔ لیکن بادشاہ اسے قیدی کی حیثیت سے دہلی لے گیا۔ مگر علی محمد خان کے دست راست حافظ رحمت خان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ رحمت خاں نے اپنی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑی فوج تیار کر لی۔ اور دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا، تاکہ بادشاہ پر دباؤ ڈال کے اپنے سرپرست علی محمد خان کو رہا کرا سکے۔ چنانچہ حافظ رحمت خان وزیر المالک اور دوسرے امراسے اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ یوں علی محمد خاں کو رہا کر کے اسے سرہند کی صوبیداری دے دی گئی۔ جہاں ان دنوں سکھوں اور جاٹوں کے جتھوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ رحمت خان نے ایک بار پھر سرکش زمینداروں کی قوت کو توڑ کر حملہ آور لٹیروں کو بھگا کر امتیاز حاصل کیا۔

محمد شاہ اور وزیر المالک قمر الدین خان کے انتقال پر ۱۱۶۸ھ/۱۷۴۸ء میں وزارت کے اہم منصب کے لئے کش مکش شروع ہوئی تو رحمت خان ایک ہزار چیدہ سپاہیوں کو لے کر دہلی روانہ ہوا اور کامیاب حملہ کر کے بادشاہ احمد شاہ کو وزارت کا عہدہ صفدر جنگ کے سپرد کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۳ شوال ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں علی محمد خان کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنی وفات سے دو دن پہلے حافظ رحمت خان کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ لیکن رحمت خان اس کے ایک کمسن لڑکے سعد اللہ خان کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو گیا اور اس کی خورد سالی کے زمانے میں رحمت خان عملاً نائب حکومت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے نواب صفدر جنگ کے دل میں روہیلوں کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اس نے پہلے تو قطب الدین خاں سابق گورنر مراد آباد کے نام روہیل کھنڈ کی حکومت کی سند دربار شاہی سے جاری کرا دی لیکن وہ حافظ رحمت خان سے لڑتا ہوا مارا گیا تو فرخ آباد کے بنگش نواب قائم خان کو روہیلوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ بدایوں سے تین میل کے فاصلے پر زبردست جنگ ہوئی جس میں قائم خاں مارا گیا اور اس کے ساتھ ہزار فوج تتر بتر ہو گئی۔ رحمت خان نے نواب بنگش نواب کے پرگنوں کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ ادھر صفدر جنگ نے اپنے آلۂ کار کی شکست سے فائدہ اٹھا کر فرخ آباد پر قبضہ کر لیا۔ لیکن قائم خان کے چھوٹے بھائی احمد خان نے جلد ہی صفدر جنگ کے نائب نول رائے کو شکست دے کر قتل کر دیا اور اپنا غصب شدہ علاقہ واپس لے لیا۔ اس پر صفدر جنگ برافروختہ ہوا اور اس نے ایک بڑی فوج جمع کر کے افغانوں کے خلاف چڑھائی کر دی۔ رحمت خان نے احمد خان کی درخواست پر اس کا ساتھ دیا۔ اور اس طرح دونوں کی فوجوں نے مل کر اودھ کی افواج کو بھاری شکست دی۔ چنانچہ اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے صفدر جنگ نے ملہار راؤ ہلکر اور آپاجی سندھیا کی سرکردگی میں مرہٹوں کو بلا لیا اور فرخ آباد کی طرف کوچ کر دیا۔

ابھی رحمت خان الوملے میں افغان سرداروں سے بات چیت ہی کر رہا تھا کہ سعد اللہ خاں اس سے مشورہ کئے بغیر یلغار کرتا ہوا میدان جنگ میں آ گیا۔ ۲۸ اپریل ۱۷۵۱ء کو فتح گڑھ کے نزدیک ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں نے سعد اللہ خاں کی بارہ ہزار فوج کو مکمل شکست دی۔ اس فتح سے سرشار ہو کر مرہٹوں اور ان کے حلیف صفدر جنگ کو اب کٹھیر (روہیل کھنڈ) پر حملہ کرنے اور قبضہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے ارادوں کو بھانپ کر رحمت خان اور دوسرے روہیلہ سردار ترائی کے دشوار گزار علاقے میں ہٹ گئے۔ صفدر جنگ اور اس کے مرہٹہ حلیفوں نے ان کی خیمہ گاہ کا محاصرہ کر لیا لیکن اس علاقے کی دشوار گزاری اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے باعث ان کی ہمت پست ہو گئی اور انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ واپس چلے جائیں بعد میں وہ احمد شاہ کے اشارے پر روہیلوں سے صلح کی گفت و شنید کرنے پر راضی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں ۱۷۵۲ء میں لکھنؤ میں ایک صلح نامے پر دستخط ہو گئے اس طرح حافظ رحمت خان اور صفدر جنگ کے درمیان تجدید تعلقات ہو گئی۔ مرہٹوں کی تاخت سے روہیل کھنڈ میں بڑی تباہی پھیلی تھی۔ لہٰذا حکومت کا خرچ چلانے کے لئے حافظ رحمت خان نے بڑے بڑے سرداروں میں علاقہ تقسیم کر دیا تاکہ ہر سردار اس کی آمدنی سے اپنی سپاہ کا خرچ پورا کر سکے۔

۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے علی محمد خان کے دو بیٹوں کو جنہیں یرغمال کے طور پر قندھار میں رکھا گیا تھا، رہا کر دیا۔ سعد اللہ اور رحمت خان نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد تینوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ عبد اللہ کو آنولہ، سونہ، بدایوں اور کوٹ وغیرہ کا علاقہ ملا فیض اللہ خان کو بریلی اور امرات کا علاقہ اور سعد اللہ خان کو مراد آباد کا علاقہ ملا۔ ریاست کی تقسیم ہو جانے کے باوجود جلد ہی نواب عبد اللہ خان کی سخت طبیعت کی وجہ سے فساد ہونے لگے۔

معاملہ یہاں تک بڑھا کہ ایک روز اس نے اپنے بھائی فیض اللہ خان کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ جب فیض اللہ نے حافظ رحمت خان کے ہاں پناہ لی تو عبد اللہ خان نے رحمت خان کو زہر دلوانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ رحمت خان نے اسے وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ لیکن پانچ ماہ تک مارا مارا پھرنے کے بعد نواب احمد خان بنگش کی سفارش پر وہ دوبارہ حافظ رحمت خاں کے پاس آیا اور ریاست کی نئے سرے سے تقسیم ہوئی۔ لیکن اس تقسیم سے سلطنت کی آمدنی بہت کم ہو گئی اور رحمت خاں اپنی سلطنت کی حدود بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی حکومت پیلی بھیت تک بڑھا لی۔ اس کا نام اس نے حافظ آباد رکھا اور اسے اپنی عملداری کا صدر مقام بنا لیا۔ اس سے پہلے بریلی اس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا اس نے بریلی میں ایک بڑا محل، ایک دیوان خاص اور ایک دیوان عام تعمیر کرایا تھا۔ اسی دوران احمد شاہ نے صفدر جنگ کی جگہ غازی الدین عماد الملک کو وزارت دے دی۔ اس بات سے برہم ہو کر صفدر جنگ لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔

اس نے حافظ رحمت خان کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا۔ رحمت خان چالیس ہزار سپاہی لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا لیکن راستے ہی سے واپس لوٹ آیا۔ حافظ رحمت خاں کا ایک رفیق نجیب خان بادشاہ کے ساتھ جا ملا اور اس نے صفدر جنگ کے مقابلے میں کئی مورچے سر کئے۔ بعد میں صفدر جنگ نے بادشاہ سے معافی مانگ لی۔ ۱۷۵۶ء میں صفدر جنگ کا انتقال ہوا۔ اس سال غازی الدین نے احمد شاہ بادشاہ کو نابینا کر کے قید میں ڈال دیا اور اس کی جگہ بہادر شاہ اول کے پوتے عزیز الدین کو عالمگیر کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر تیسری بار حملہ کیا۔ اس نے میر منو کی بیوی کی سفارش پر غازی الدین کو معاف کر دیا۔ اور رحمت خان کو حکم دیا کہ غازی الدین کو شجاع الدولہ سے، جو صفدر جنگ کا جانشین ہوا۔ زر پیشکش وصول کرنے میں مدد دے۔ حافظ رحمت خاں کی کوشش سے دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا اور جنگ کی نوبت نہ آئی۔ احمد شاہ ابدالی عماد الملک کی جگہ نواب نجیب الدولہ کا تقرر کر کے قندھار واپس چلا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد غازی الدین نے مرہٹوں

حافظ رحمت خان

اور جاٹوں کی مدد سے نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال دیا۔ جس نے حافظ رحمت خان اور شجاع الدولہ کی مدد سے ان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اسی اثنا میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کی خبر پھر مشہور ہوئی تو غازی ملک نے عالمگیر ثانی کو قتل کرا کے اورنگ زیب عالمگیر کے ایک پوتے کو شاہجہان ثانی کے خطاب سے بادشاہ بنا دیا۔ ١١٧٥ھ/١٧٦١ء میں مرہٹوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ رحمت خان، اس کے بیٹے عنایت خاں اور چچا زاد بھائی دوندے خان نے جو نجیب الدولہ کا خسر بھی تھا، عملی حصہ لیا اور اپنی فوجوں سے احمد شاہ ابدالی کی مدد کی۔ جس کے صلے میں ابدالی نے اسے اٹاوہ کا پرگنہ دے دیا۔ احمد خان نے وہاں سے مرہٹوں کو جو ابھی تک اس پر قابض تھے نکال باہر کیا۔ کچھ عرصے بعد شجاع الدولہ کو فرخ آباد کے بنگش نواب سے پرانی عداوتیں ختم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اپنے سابق دشمن نجیب الدولہ سے اتحاد کر کے جو اب وزیر اور وزیر الامراء ہو گیا تھا اس نے فرخ آباد کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ حافظ رحمت خان نے کمزور فریق کا ساتھ دیا اور فرخ آباد کی اس چھوٹی سی ریاست کو تباہی سے بچا لیا۔

١٧٦٣ء میں نواب سعد اللہ خاں کا انتقال ہوا تو روہیل کھنڈ کے سردار نواب علی محمد خان کے کسی لڑکے کو اپنا حکمران ماننے پر رضامند نہ ہوتے بلکہ حافظ رحمت خان کی سرداری میں رہنا قبول کیا۔

١٧٦٨ء تک روہیل کھنڈ میں امن و امان رہا۔ اس کے بعد رحمت خان نے جس بڑے واقعہ میں حصہ لیا وہ پٹنے پر حملہ تھا، جو اس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ١١٧٨ھ/١٧٦٤ء میں بکسر کی جنگ میں جو انگریزوں اور بنگال کے معزول ناظم میر قاسم اور رحمت خان کے حلیف شجاع الدولہ کے درمیان لڑی گئی شجاع الدولہ کو شکست ہوئی۔ اس نے رحمت خان کے پاس پناہ لی جو ان دنوں حسن پور میں خیمہ زن تھا۔ جب شجاع الدولہ نے دیکھا کہ رحمت خان کوئی عملی مدد دینے کے لئے تیار نہیں تو اس نے مرہٹوں سے رجوع کیا۔ اور دونوں کی فوجوں نے مل کر ١١٧٩ھ/١٧٦٥ء میں کورۃ جہان آباد کے مقام پر انگریزوں پر دھاوا بول دیا تاہم ان کے سپاہی انگریزی توپوں کی گولہ باری کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور انہیں مکمل شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شجاع الدولہ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن اس کے دل میں حافظ رحمت خان کی طرف سے برابر یہ خلش رہی کہ وہ ایک نازک وقت میں اس کے کام نہیں آیا۔ چونکہ انگریزوں کو حافظ رحمت خان کی جانبداری کا یقین تھا لہٰذا اسے چند سال اور اطمینان اور راحت میں بسر کرنے کا موقع مل گیا۔

انگریزوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ ہندوستان کے افق پر نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور یہ بات حافظ رحمت خان جیسے ہوشیار اور باصلاحیت شخص سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی۔ ١١٨٤ھ/١٧٧٠ء میں نجیب الدولہ اور ١١٨٥ھ/١٧٧١ء میں رحمت خان کا چچا زاد بھائی دوندے خاں انتقال کر گیا جس سے ہندوستان میں افغان حکومت کو بہت نقصان پہنچا۔ نجیب الدولہ کا بیٹا اور جانشین مرہٹوں کا حلیف بن گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنے مقبوضات کی شجاع الدولہ سے حفاظت کر سکتا تھا۔ حافظ رحمت خاں نے نواب اودھ کا ساتھ دیا۔ جسے انگریز اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے اور جس کا علاقہ ان کے اور مرہٹوں کے مابین ایک درمیانی ریاست کا کام دے سکتا تھا۔

مرہٹوں کے خلاف محافظت کی قیمت میں اپنے حصے کے طور پر رحمت خان نے شجاع الدولہ کو روہیلوں کی جانب سے چالیس لاکھ روپے دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ دس لاکھ روپے تو فوراً ادا کر دیئے جائیں گے اور باقی رقم تین سال کے عرصے میں تین قسطوں میں پوری کر دی جائے گی۔ کچھ مدت بعد حافظ رحمت خان کو محسوس ہوا کہ وہ شرائط پوری نہیں کی گئیں جن کی رو سے وہ چالیس لاکھ روپے دینے کا پابند ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے اس رقم کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔

شجاع الدولہ نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی تصور کیا۔ اس نے وارن ہیسٹنگز کو بیس لاکھ روپے نقد اور ہیٹھ لاکھ روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ جس کے بدلے کمپنی کی طرف سے مدد کا یقین دلایا گیا۔ اس نے اٹاوہ اور فرخ آباد پر قبضہ کر کے نہ صرف نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خان سے امداد کا وعدہ لے لیا۔ بلکہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کو بھی یہ لالچ دے کر کہ فتح کے بعد آدھا روہیل کھنڈ بادشاہ کی ملکیت میں دے دیا جائے گا، روہیل کھنڈ کے فتح کرنے کی اجازت لے لی۔ بعض روہیلہ سرداروں نے اس جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ انگریزوں نے اس جنگ میں عملی طور پر اودھ کی فوجوں کی مدد کی۔ ان سرداروں میں علی محمد خان کا دوسرا بیٹا فیض اللہ خان بھی شامل تھا۔ جو بعد میں ریاست رامپور کا بانی ہوا۔ حافظ رحمت نے مصالحت کی خاطر وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن اس نے حافظ رحمت سے ملنے کی بجائے شجاع الدولہ کی اعانت کے لئے انگریزی فوج روانہ کر دی جس کے سپہ سالار کرنل چیمپئن نے حافظ رحمت خان کو لکھا کہ شجاع الدولہ کو دو کروڑ روپے ادا کئے جائیں ورنہ جنگ ہو گی۔ اس نامعقول مطالبے کے بعد صلح کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور ١١٨٨ھ/١٧٧٤ء میں فریقین کا کٹرہ میراں پور میں تصادم ہوا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی یا دھر نجیب خان کی قیادت میں روہیلوں کی فوج کی ایک بڑی تعداد نے حافظ محمد خان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حافظ رحمت خان کو ایک گولہ آ کر لگا اور وہ فوراً ہلاک ہو گیا۔ اس کے ایک سابق ملازم نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور اسے لے کر شجاع الدولہ کے پاس گیا جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ بعد میں اس کی نعش بھی میدان جنگ میں مل گئی اس طرح ہندوستان میں روہیلوں کی قلیل المدت لیکن شاندار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

١١٨٩ھ/١٧٧٥ء میں راؤ پہاڑ سنگھ نے جس کو رحمت خان نے کئی جاگیریں دی تھیں اس کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کر دیا جسے ١١٩٤ھ/١٧٨٠ء میں رحمت خان کے ایک بیٹے ذوالفقار خاں نے مکمل کیا۔ حافظ رحمت خان کی موت کے بعد مفتوح فوجوں نے بے یار و مددگار آبادی کو خوب لوٹا۔ ہزاروں لوگ جنہوں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا، تہ تیغ کر دیئے گئے اور باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ سینکڑوں عمارتیں جو روہیلہ سرداروں نے بنوائی تھیں پیوند زمین کر دی گئیں۔ حافظ رحمت کے رشتہ داروں اور کنبے والوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے ان کی حالت انتہائی خراب و خستہ کر دی گئی اور ان کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پیدل چلنے پر مجبور کیا گیا

حافظ رحمت خاں ایک نیک، عادل اور رحم دل حکمران تھا۔ اس کے عہد حکومت میں چاروں طرف امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ وہ علم و ادب کا سرپرست تھا۔ تقریباً پانچ ہزار علماء کو خزانۂ عامرہ سے وظائف دے کر کفالت کرتا تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ فارسی زبان کا شاعر بھی تھا۔ اس نے خلاصۃ الانساب جیسی کتاب لکھی جس میں افغانوں کے نسب کا حال بیان کیا گیا ہے۔ [illegible] باب میں شیعہ مذہب کی تردید کی گئی ہے۔ اس کے عہد میں کسانوں کی حفاظت کی جاتی تھی کاریگروں اور صناعوں کو اپنے اپنے کام میں بلا روک ٹوک مشغول رہنے

کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کے دور میں کاروبار ترقی پر تھا۔

حافظ روح اللہ (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء — ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء)

ایک عالم دین۔ آپ نے لاہور میں زندگی بسر کی۔ صرف و نحو، منطق، فلسفہ اور علومِ دینیہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد سلیم لاہوری بھی تھے جن سے آپ کو حد درجہ عقیدت تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر معلمی کا پیشہ اپنایا اور ساری عمر درس و تدریس میں گزاری۔ یہ زمانہ پنجاب پر بڑا پر آشوب تھا۔ سکھوں کی حکومت نے علمی مراکز کو تہس نہس کر دیا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں سکھوں کی چیرہ دستیوں نے زندگی اجیرن کر دی تھی۔ مگر حافظ روح اللہ حالات سے بے نیاز اہلِ ذوق کو علمِ دین کی دولت سے مالامال کرتے رہے۔ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں امن و امان قائم ہوا تو اس نے آپ کے استقلال اور علمی خدمات کی شہرت سُن کر طلب کیا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء کو حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ جہاز میں رمضان کی راتوں میں تراویح پڑھانے کے لیے لوگ آپ کو امام بناتے۔ آپ حافظِ قرآن نہ تھے مگر سارا دن ایک پارہ زبانی یاد کر کے تراویح میں سناتے اس طرح آپ نے دورانِ سفر قرآن حفظ کیا۔ مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد یمن تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔

حافظ شیرازی: (غالباً ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء — ۷۹۱-۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء) فارسی غزل گو شاعر۔

نام اور لقب شمس الدین محمد ہے۔ شیراز میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور علمِ دین و دیگر متعلقہ علوم کی تحصیل میں مشغول رہے۔ اسی دور میں عربی زبان و ادب سے خوب واقفیت پیدا کر لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد معلمی کا پیشہ اپنایا۔ وہ ایک مدرسے میں تفسیر قرآن کے معلم تھے ان کا مدرسے میں تقرر یا تو قوام الدین حسن نے یا خواجہ قوام الدین وزیر نے کیا تھا۔

حافظ کو غزل گوئی میں حد درجہ کمال حاصل تھا۔ آخر میں انہوں نے اپنی غزلیات کو دیوان کی صورت میں مرتب کیا اور اس میں قصائد اور دوسری چھوٹی نظموں کا اضافہ کر کے ۷۷۰ھ/۱۳۶۸-۱۳۶۹ء میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس دیوان کے ساتھ ہی حافظ کا نام شیراز سے باہر بھی مشہور ہو گیا۔ چنانچہ ہرمز کے والی توران شاہ نے بہت فیاضی کے ساتھ حافظ کی قدر دانی کی۔ اگرچہ یزد کے مظفری خاندان کے فرمانروا نصرت الدین یحییٰ نے جو اپنی زندگی ہی میں اپنے بخل کے لیے بدنام تھا۔ حافظ کی طرف نظرِ التفات نہ کی۔ دکن کے بہمنی خاندان کے حکمران محمود شاہ اوّل کے عہد میں حافظ کو بادشاہ کے وزیرِ عدالت کی طرف سے دعوت پہنچی تھی۔ ایلخان احمد جو خود بھی شاعر تھا حافظ کو بغداد آنے کی دعوت دی تھی۔ ان کی دعوت کو حافظ نے قبول نہ کیا۔

حافظ کی شاعرانہ سرگرمیاں شاہ شجاع کے عہد میں اپنے عروج پر تھیں۔ شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ/۱۳۹۴ء میں وفات پائی۔ حافظ نے اکثر قصائد میں اس کی مدح سرائی کی ہے۔ ان کی باہمی دوستی کے متعلق بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ آخری عمر میں حافظ کو دوبارہ مظفری خاندان کا ایک مربی منصور مل گیا جس نے تیمور کے جانے کے بعد فارس کے صوبے پر قبضہ کر لیا تھا۔

حافظ کو اپنے وطن شیراز سے ایسی دلی محبت تھی جو آج بھی دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کبھی شیراز سے باہر جانا گوارا نہ کیا۔

حافظ، ایران کے غزل گو شعراء میں بلند ترین مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ وارداتِ عشق کے بیان میں بہت محتاط ہیں۔ عریانی سے پرہیز کرتے ہیں۔ سرورِ بادہ اور نشاط و طرب کی نغمہ سرائی میں مشرق میں ان کی نظیر کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دنیا کے عظیم ترین شعراء میں شمار کیا جاتا ہے جس کا ثبوت ان کے دیوان کی شرحوں سے ملتا ہے جو کافی تعداد میں موجود ہیں۔

حافظ کو پرانے زمانے میں پر اسرار مقبولیت حاصل ہوئی کہ لوگ ان کے کلام سے فال نکال کر معاملات میں رہنمائی حاصل کرتے تھے اور انہیں لسان الغیب کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

حافظ نور اللہ شاہ: (جمادی الآخر ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء — ۶ صفر ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)

ایک عالمِ دین اور بزرگ صوفی۔

آپ کا لقب فرشتہ صفات اور قاضی القضاۃ تھا۔ والد کا نام حافظ محمد حیات ربانی تھا۔ ساہنپال ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والدِ محترم سے حاصل کی آپ علمِ تفسیر، حدیث و فقہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ نے بیعت اپنے والد بزرگوار سے کی اور مقاماتِ سلوک طے کرنے کے بعد خلافت و اجازت حاصل کی نیز اپنے عم بزرگ سید ابو سعید مرتاض سے خرقۂ تبرک حاصل کیا۔ ۱۷۸۸ء میں رئیسِ اعظم منچر چٹھہ ضلع گوجرانوالہ نے جو زمانۂ طوائف الملوکی میں حدودِ ملتان تک کا خود مختار حاکم تھا، اپنے علاقے کے سنز علماء میں سے آپ کو منتخب کر کے قاضی القضاۃ کا منصب دیا تھا۔

آپ نے بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کا مقبرہ نوشاہیہ میں ہے۔ آپ کی تصانیف میں "نور الہدیٰ المعروف فتاویٰ نوشاہیہ"، "مصطلحات الصوفیہ"، "انشائے نور اللہ"، "رقعات نور اللہ" اور "مکتوبات نور اللہ" ہیں۔

حافظ ولی اللہ (— ؟ — جمادی الاول ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء)

برِعظیم پاک و ہند کے ایک نابینا عالم دین اور مناظر۔

جموں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے تھے کہ والدین مہاراجہ کے مظالم سے تنگ آ کر لاہور چلے آئے۔ چیچک کی بیماری میں بینائی جاتی رہی۔ آپ حافظِ قرآن و انجیل تھے۔ میدانِ مناظرہ میں اپنے مدِّمقابل اور حریف کو اسی کی کتابوں کے حوالے سے لاجواب کر دیتے۔

ایک وقت تھا کہ انگریز بہادر کی مضبوط حکومت کے زیرِ سایہ سینکڑوں عیسائی پادری یورپ سے نکل کر برِعظیم کے ہر شہر میں علمائے اسلام کو مناظرہ کے لیے کہا کرتے اور عیسائیت کے محاسن و کمالات سے عوام کو متاثر کرتے۔ اگرچہ اُس وقت کے علمائے کرام نے ان فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے مسکت جواب دیئے۔ مگر حافظ ولی اللہ ان کی جو درگت بناتے وہ انھی کے حصے کی بات تھی۔

پنجاب کے تمام شہروں میں جہاں کوئی عیسائی پادری سر اٹھاتا حافظ ولی اللہ بنفسِ نفیس وہاں پہنچتے اور اسے للکار کر میدانِ مناظرہ میں لے آتے۔ بھرے مجمع میں اس کو لاجواب کر کے تائب کرا دیتے یا بھاگ جانے پر مجبور کر دیتے۔ ان کی آمد کی خبر سُن کر عیسائی مبلغ شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

قدرت نے آپ کو بے پناہ حافظہ بخشا تھا۔ جس کتاب کو ایک بار سن لیتے وہ ان کے ذہن پر نقش ہو جاتی تھی۔ کسی شخص کا ہاتھ ایک بار ہاتھ میں لیتے تو پندرہ بیس

سال بعد اگر ملاقات ہوتی تو پہچان لیتے کہ یہ فلاں شخص کا ہاتھ ہے۔

۱۸۴۹ء میں جب پنجاب میں بھی انگریزوں کا عمل دخل ہو گیا تو لارڈ ڈلہوزی نے ایک منصوبے کے تحت یورپ کے عیسائی پادریوں کو دعوتِ عام دی کہ وہ برِّعظیم میں پہنچ کر مشنری مراکز قائم کریں یوں حکومت کی سرپرستی میں یہ لوگ دوسرے علاقوں کے علاوہ پنجاب میں بھی پہنچے پادری فورمین، بانی ایف سی کالج لاہور، بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ یہ لوگ نہ صرف عیسائیت کے محاسن پیش کرتے بلکہ اسلام پر بھی کُھلّم کُھلّا قسم کے اعتراضات کرتے چنانچہ اس زمانے میں حافظ ولی اللہ گوجرانوالہ سے لاہور پہنچے اور شاہی مسجد کے نائب خطیب مقرر ہوئے آپ مولانا غلام قادر بھیروی، مولوی غلام محمد بگوی، مولوی محمد الدین وغیرہ کے ہم عصر تھے یہ تمام علماء آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ فنِ مناظرہ کے علاوہ آپ عربی زبان پر اس قدر حاذق تھے کہ عرب سیاح لاہور آتے تو آپ سے بلا تکلف عربی میں گفتگو کرتے یہاں کے حالات پر تبصرہ کرتے اور علمی مسائل پر بحث کرتے۔ مولوی فقیر محمد جہلمی آپ کے معاونِ تحریر تھے۔

حافظ ولی اللہ کے ایک مناظرے کا ذکر درج کیا جاتا ہے۔ لاہور میں پادری فونڈر نے چیلنج کیا کہ وہ مسلمانوں کے علماء سے مناظرہ کرنا چاہتا ہے۔ سرائے سلطان لاہور میں عظیم اجتماع ہوا۔ تین روز تک مناظرہ ہوتا رہا۔ حافظ ولی اللہ ان دنوں لاہور سے باہر تھے۔ واپس آئے تو آتے ہی کہنے لگے کہ مجھے مناظرے کے میدان میں لے چلو۔ آپ وہاں پہنچے تو مجمع میں ایک شور برپا ہو گیا۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ آپ نے سارے علماء کرام سے اجازت لی اور پادری کے مقابلہ میں تن تنہا کھڑے ہوئے۔ آپ نے کہا کہ میں نابینا ہوں اپنے مدِمقابل کو پاس جا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ آپ کو پادری فونڈر کے قریب لے جایا گیا۔ وہ ایک پُر رعب شخصیت کا مالک تھا۔ حافظ صاحب نے اس کے چہرے کو ٹٹولا اور پھر منہ پر ایک ایسا زوردار تھپڑ مارا کہ پادری کے دانتوں سے خون بہہ نکلا۔ بس پھر کیا تھا مجمع میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مناظرہ درہم برہم ہو گیا حافظ ولی اللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کو ڈر تھا کہ یہ معاملہ کوئی تحریک نہ بن جائے اگلے ہی روز لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو جو انگریز تھا مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کیا گیا عدالت کے اردگرد بڑا ہجوم تھا۔ حافظ ولی اللہ کو بیان دینے کے لئے بلایا گیا۔ آپ نے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے بتایا کہ استغاثہ کا مجھ پر یہ الزام کہ میں نے ارادہ قتل سے تھپڑ مارا ہے۔ بالکل غلط ہے میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پادری صاحب انجیل مقدس پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں۔ میں نے تھپڑ مارا۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر تمہیں ایک تھپڑ مارا جائے تو دوسرا گال پیش کر دو مگر پادری صاحب نے انجیل پر عمل کرنے کی بجائے مقدمہ کر دیا۔ یہ بیان دیتے ہی حافظ ولی اللہ نے انجیل کے ایڈیشن کا حوالہ دے دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ فلاں ایڈیشن فلاں لائبریری میں ہے۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پادری فونڈر کو جواب دینے کے لئے کہا تو اس نے اٹھ کر اعتراف کیا کہ واقعی انجیل مقدس میں یونہی لکھا ہے۔ میں مقدمہ واپس لیتا ہوں۔

آپ ایک عرصہ تک شاہی مسجد کے خطیب رہے پھر مسجد وزیر خاں میں خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ آپ نے جو کتابیں املا کرائیں ان میں "ردِّ لفٹ رتی" "مباحثہ دینی"، "صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان" اور "ابحاث ضروری" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حاکم

وہ شخص جو فیصلہ کرے۔ اور حکومت کرنے والا۔

مسلمانوں کا حاکم خلیفہ ہوتا ہے جو زمین پر رسول اللہ کا نائب ہوتا ہے۔ صوبوں کا انتظام چلانے کے لئے جو خلیفہ کے ماتحت ہوتے ہیں وہ امراء کہلاتے ہیں۔ اسلام میں خطابات سلطان اور بادشاہ وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ قرآن میں بادشاہ کے لئے ملک کا لفظ آیا ہے "اور ان کے نبی نے انہیں کہا کہ اس کی بادشاہی کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس تابوت آئے جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون اور اس کا بقیہ ہے" (۲: ۲۴۸)

قرآن مجید اور احادیث میں حاکم کی اطاعت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ بس بشرطیکہ اس کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو" (۴: ۵۹) حضرت ام حصینؓ سے مروی ہے آنحضورؐ نے فرمایا اگر کسی نکٹے غلام کو حاکم بنا دیا جائے اور وہ تم پر کتاب اللہ کے موافق حکمرانی کرے تو تم اس کی اطاعت کرو اور اس کا حکم مانو (مشکوٰۃ)

حاکم کو اپنی رعیت کی خبرگیری کرنی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس بات خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ حضرت معقل بن یسار سے مروی ہے کہ میں نے آنحضورؐ کو فرماتے سنا کہ جس بندے کو خدا اپنے بندوں کا حافظ و نگہبان ٹھہرائے اور وہ رعیت کی خیرخواہی اور خیراندیشی کے ساتھ حفاظت و نگرانی نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھنے پائے گا (مسلم شریف [illegible])

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ سنو! تم سب اپنی رعیت کے محافظ ہو اور تم سب سے رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ امام تو لوگوں کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ رعیت کا نگہبان ہے اور وہ اپنی رعیت کے [illegible] سے پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے اہل خانہ کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت [illegible] خانہ کی بابت پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی محافظ ہے اور اس سے ان کی بابت سوال ہوگا۔ آدمی کا غلام اپنے مالک کے مال کا نگران ہے اور اس سے اس کی بابت دریافت کیا جائے گا۔ سنو تم سب نگران ہو اور سب اپنی رعیت کی بابت جوابدہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

حاکم کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ عدل و انصاف [illegible]

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز [illegible] بندگان خدا میں بزرگ ترین بندہ منصف اور نرم [illegible] کے دن بھی [illegible] (بیہقی) ایک اور حدیث [illegible] جو شخص مسلمان رعیت کا حاکم ہو اور [illegible] تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم) [illegible] (مشکوٰۃ [illegible])

ایک اور مقام پر آنحضورؐ نے فرمایا عادل و منصف حاکم [illegible] پروردگار کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور خدا کے دونوں ہاتھ [illegible] عادل حاکم جو اپنے احکام میں اپنے اہل میں اور [illegible]

حاکم بامر اللہ

(۲۳ ربیع الاول ۳۷۵ھ / ۱۳ اگست ۹۸۵ء — [illegible])

ابو علی منصور بن عبدالعزیز باللہ نزار۔ [illegible] اپنے جور و ستم اور ظلم و تشدد کی وجہ سے اور اپنے دعوئ الوہیت کی وجہ سے [illegible] ہے۔ قاہرہ میں پیدا ہوا۔ جب اس کے باپ نے انتقال کیا تو اس کی عمر [illegible]

۳۸۳ھ/۹۹۳ء میں اس کے ولی عہد ہونے کا سرکاری اعلان ہو چکا تھا۔ اس کے والد نے بسترِ مرگ پر قاضی القضاۃ محمد بن نعمان اور بنوکتامہ کے سردار الحسن بن عمار کو ہدایت کی کہ اس کے بیٹے کی خلافت کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ باپ کی وفات کے بعد اس کی بیعت کی گئی اور امام کے خطاب اور حاکم بامراللہ کے لقب سے خلیفہ بنایا گیا۔ اور برجوان اس کا ولی مقرر ہوا۔

کتامی بربروں نے اس کے عہدِ حکومت کے آغاز ہی میں اس بات پر اصرار کیا کہ حکومت کی قیادت ان کے سردار الحسن بن عمار کے ہاتھ میں دے دی جائے چنانچہ اس نے اپنی فوج میں شامل دیگر عناصر کو نظر انداز کر کے بربروں کو نوازنا شروع کر دیا۔ اس نے برجوان سے بھی جھگڑا کیا جس کو ابن عمار کے حامیوں کے اس منصوبے سے خاصی تشویش ہوئی تھی کہ حاکم کو دبا دیا جائے۔ نہایت طاقتور بربروں میں سے ایک بربر جیش بن طمصامہ جسے طرابلس کی گورنری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا تھا برجوان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ابن عمار کے خلاف ایک بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے شکست ہوئی۔ چنانچہ برجوان دوبارہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں نوجوان خلیفہ حاکم کے حق میں دوبارہ بیعت کرائی اور ابن عمار کو قتل کر دیا گیا۔ ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء کے بعد برجوان کے پاس اقتدار نہ رہا۔ حاکم جس کی شخصیت اب ظاہر ہونے لگی تھی برجوان کی اتالیقی کو بوجھ محسوس کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے اپنے غلام ریدان کے ہاتھوں اسے اس وقت قتل کرا دیا جب وہ اس کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہنگامے شروع ہوئے کیونکہ ترکوں نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ یہ بربر جماعت کا لایا ہوا انقلاب تھا۔ نوجوان خلیفہ حاکم کو محل کے دروازے پر ان اسباب کی وضاحت کرنے کے لیے آنا پڑا جن کی وجہ سے وہ برجوان کو قتل کرانے اور جملہ رعایا سے اطاعت و معاونت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

برجوان کو قتل کرا دینے کے بعد مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ وہ صرف اپنے نفس اور میلان کی اطاعت کرتا تھا۔ نہایت غیر معمولی اور غیر مقبول اقدامات کے احکام صادر کرتا۔ پھر ان میں تخفیف کر دیتا یا انھیں منسوخ کر دیتا۔

اس کے عہدِ حکومت کی بعض خصوصیات یہ تھیں۔

۱۔ مذہبی اقدامات اور اخلاقی و معاشی نوعیت کے فرامین۔

۲۔ پھانسی کے بہت سے واقعات اور مظالم۔

۳۔ غیر مطمئن لوگوں کی بغاوتیں۔

۴۔ حاکم کی عجیب و غریب عادات جو جنون کے قریب تھیں اور اس کا دعویٰ الوہیت۔

دوسری جانب ایسے مواقع بھی تھے جہاں حاکم نے نہایت سادگی انکسار، انصاف اور زاہدانہ رواداری کا اظہار کیا۔ حاکم نے جو اقدامات کیے ان کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ ۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں شراب کی ممانعت کر دی اور شراب کے مٹکے توڑنے کے احکام صادر کیے۔ مصر کے غالب اکثریت رکھنے والی سنی آبادی نے سنیوں کے خلاف اقدامات کی شدید مخالفت کی۔ چنانچہ یہ اقدامات بعض اوقات منسوخ بھی کیے گئے۔ ۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں تیرہ اشخاص کو گرفتار کر کے ان کی عام نمائش کی گئی کیونکہ انھوں نے ضحیٰ کی نماز ادا کی تھی۔

حاکم نے حکمتِ عملی میں متلون مزاجی کے باعث چند ایسے اقدامات بھی کیے جن کی وجہ سے اکثر ہنگامے ہوتے رہتے تھے اور فرقہ وارانہ رجحانات کو ہوا ملتی تھی۔ انجام کار شیعہ سنی کشیدگی نے فسادات کی شکل اختیار کر لی۔

اس نے سنیت کی مخالفت کرنے اور اسماعیلی پروپیگنڈہ کو فروغ دینے کے لیے کئی اقدامات کیے۔

اخلاقی اور معاشرتی نوعیت کے فرامین حاکم کے نہایت عجیب و غریب فیصلوں میں سے ہیں۔ اگر وہ اس کی متلون مزاجی اور ترنگ کا نتیجہ نہیں تھے تو انھیں عمدہ اخلاق کو فروغ دینے اور فحاشی کو ختم کرنے کی شدید خواہش سے نسبت دی جا سکتی ہے۔

انتہا پسند اسمٰعیلیوں نے اس کے ان نظریات کو قبول کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جن کی رو سے وہ خدائی شخص تھا۔ اس سلسلے میں اسمٰعیلی مبلغوں حسن بن حیدرہ الفرغانی الاخرم، حمزہ بن علی احمد الزوزنی اور محمد بن اسمٰعیل النشتکین الدرزی نے انفرادی طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ سن ۴۰۸ھ/۱۰۱۸ء میں خلیفہ کی منظوری سے اس نظریے کا پرچار شروع ہوا۔

حاکم کا انجام بھی اس کی زندگی کی طرح غیر معمولی ہوا۔ ۲۷ شوال ۴۱۱ھ/۱۲ فروری ۱۰۲۱ء کو مقطم پہاڑی کی اس سطح مرتفع پر جو اس علاقے سے حلوان کو جاتی ہے رات کو سیر کرتے ہوئے غائب ہو گیا۔ وہ سیر کرتا ہوا اپنے درباریوں سے دُور نکل گیا جو اس کے ساتھ تھے اور جنہیں اس نے انتظار کرنے کا حکم دیا تھا۔ انھوں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا وہ اگلی صبح محل واپس چلے گئے۔ تلاش کی گئی اور پانچ روز بعد اس کے کپڑے پائے گئے جو خنجر کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ حاکم کے بارے میں ایک روایت جسے اکثر مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے یہ ہے کہ اسے اس کی بہن ست الملک نے قتل کرا دیا تھا جس کے ساتھ اس کی چپقلش تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مجموعی طور پر حاکم کا عہدِ حکومت مصر کے لیے خاص طور پر برا تھا۔ اگرچہ اس کے عہدِ حکومت کے کچھ اچھے پہلو بھی تھے۔ حاکم کے عہدِ حکومت میں وسیع فاطمی سلطنت کا کوئی علاقہ ضائع نہیں ہوا۔ حلب کے منصور بن لولو نے اس کے عہد میں فاطمی خلافت کی اطاعت قبول کی اور اس کے غائب ہونے کے بعد حلب میں کئی فاطمی گورنر آئے۔

جامع الراشدہ اور جامع المقس کی تعمیر اور جامع الحاکم کی تکمیل بھی حاکم کے کارناموں میں شامل ہے۔ حاکم علوم و ادبیات کی سرپرستی کرتا تھا۔ اپنے عہدِ حکومت کے آغاز میں اس کا ارادہ تھا کہ وہ قاہرہ کے اہم اشخاص کے باقاعدہ مشورے سے حکومت کرے گا لیکن جلد ہی وہ اس سے اکتا گیا۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ فیاض تھا اور اس نے عطیات دے کر اور اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں استحکام پیدا کر کے قحط کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ حاکم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ابوہاشم علی کی خلافت کا اعلان کیا گیا اور ابن دواس کو اس کمسن خلیفہ کا ولی مقرر کیا۔ عوام نے اسے الظاہر لاعزاز دین اللہ کا لقب دے کر اس کی بیعت کی۔

حاکم نیشاپوری (۳ ربیع الاول ۳۲۱ھ/۹۳۳ء — ۳ صفر ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) محمد بن عبداللہ بن محمد۔ کنیت ابوعبداللہ۔ ایک ممتاز محدث ابن البیع کے نام سے مشہور تھے۔ علم حدیث کی تحصیل کے لیے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ آپ نے تقریباً دو ہزار شیوخ سے احادیث سنیں۔ آپ چونکہ کچھ عرصہ قاضی رہے تھے اس لیے حاکم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد ذہبی نے ایک ہزار بیان کی ہے۔ ان تصانیف میں "معرفۃ علوم الحدیث" علم حدیث پر ایک اہم کتاب ہے۔ جس نے اس موضوع کا ایک معیار قائم کیا ہے۔ اگرچہ حاکم نیشاپوری کی علمیت کی بڑی قدر کی جاتی تھی اور بہت سے علماء آپ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے۔ تاہم آپ کی تصانیف بھی تنقید سے نہ بچ سکیں۔ بعض نے آپ کو شیعہ لکھا ہے۔ جس کی سبکی نے پُرزور تردید کی ہے۔ ذہبی نے اپنی تصنیف تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو "محدثین کا امام" اور "اعلیٰ پائے کا حافظ بتایا ہے۔ ابن حجر نے 'لسان المیزان' میں آپ کے بارے میں لکھا ہے۔" ان کا شمار ضعیف محدثین میں نہیں کیا

جاسکتا۔" آپ کی تصانیف میں "المستدرک علی الصحیحین" "المدخل فی اصول الحدیث" "معرفۃ علوم الحدیث" "تاریخ نیشاپور" اور کتاب مزکی الاخبار" خاص طور پر مشہور ہیں۔

حال زمانے کی موجودہ گھڑی جو وقت کو ماضی اور مستقبل سے جدا کرتی ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں "حال وہ کیفیت ہے جو دل میں بغیر تصنع و اجتناب و اکتساب پیدا ہوتی ہے، کبھی طرب کبھی حزن یا قبض یا بسط اور کبھی ہیبت و خوف کی صورت میں اور نفس کی دوسری صفات زائل ہوکر یہ کیفیت چھا جاتی ہے لیکن عارضی ہوتی ہے۔ یہی کیفیت اگر دائمی ہو جائے اور ہر وقت رہے تو اسے مقام کی کیفیت کا نام دیا جاتا ہے۔

بقول علی ہجویری رحؒ "حال وہ کیفیت ہے کہ بندہ اس کی وجہ سے زمانۂ ماضی و مستقبل سے فارغ ہو جائے اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل میں جلوۂ الٰہی یا الہام کی قسم کا کوئی فیضان ہو جو اس کے باطن کو ہمہ تن اس میں اس طرح مجتمع کر دے کہ حال کے مکاشفہ میں نہ اس کو وقت گذشتہ یاد ہو نہ آئندہ۔ پس جن لوگوں کو یہ کیفیت حاصل ہے وہ کہتے ہیں ہمارا علم انجام اور تقدیر سابقہ کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے حال یعنی حالتِ مشاہدہ بہت اچھی چیز ہے کیونکہ اگر ہم آئندہ کل میں مشغول ہوں یا گذشتہ کل کا اندیشہ دل میں لائیں تو موجودہ وقتِ مشاہدہ سے ہم حجاب میں چلے جائیں گے۔ چنانچہ ابوسعید خرازؒ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو سب سے عزیز ترین چیز کے سوا کسی اور چیز میں مشغول نہ کر اور بندہ کی عزیز ترین چیز ماضی اور مستقبل کے دوران موجودہ وقت میں حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ہے۔ حال کی یہ تعریف بھی کی گئی ہے کہ یہ ایک روحانی کیفیت کا نام ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ الوہی کیفیت جس سے رُوحانی توازن پیدا ہو کر ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ ذوالنون مصریؒ نے سب سے پہلے حال اور مقام کا فرق بیان کیا ہے بعض مشائخ حال کو تغیر پذیر صفت نہیں مانتے ان کا خیال ہے کہ اس صفت میں بقا و دوام ہوتا ہے۔ لیکن بعض دوسرے مشائخ کا خیال یہ ہے کہ حال کا حصول یا تو اعمالِ صالحہ اور تزکیہ نفس پر منحصر ہے یا ذاتِ حق سے محض بطورِ امتحان یا انعام حاصل ہوتا ہے۔ حال اور وقت میں فرق یہ ہے کہ حال وہ فیضانِ الٰہی ہے جو مشاہدۂ حق کے وقت دل پر وارد ہو کر اسے ایسا آراستہ کر دیتا ہے جیسا کہ رُوح جسم کو آراستہ کر دیتی ہے۔ لہذا وقت حال کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ وقت کی صفائی اور آرائشگی حال کے سبب سے ہوتی ہے اور کا قیام اس پر موقوف ہوتا ہے۔ پس جب صاحبِ وقت صاحبِ حال ہو جاتا ہے تو تغیر اس سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے حال میں وہ مستقیم ہو جاتا ہے کیونکہ حال کے بغیر وقت پر زوال روا ہے اور جوں ہی اس کے ساتھ حال پیوستہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا زمانہ وقت ہی ہو جاتا ہے اور پھر اس پر زوال روا نہیں۔ مشائخ نے بیان کیا ہے کہ حال یہ ہے کہ زبان کسی اندازِ بیان میں بھی اس کو بیان نہ کر سکے بلکہ عمل اس کے حال کی حقیقت کو بیان کرے۔

ابو علی وقاق کا قول ہے کہ دنیا اور عقبیٰ میں خوشی اور ہلاکت میں تیرا وقت وہی ہے جس میں تو موجود ہے اور حال ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر فیضان ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ صاحبِ وقت تھے کہ ایک وقت فراق سے اُن کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں اور دوسرے وقتِ وصال سے بینا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ چونکہ صاحبِ حال تھے وہ نہ فراق کا کچھ خیال کرتے کہ اس سے غمگین ہوں اور نہ وصال کا خیال کرتے کہ اس سے مسرور ہوں ستارہ چاند اور سُورج سب ان کے حال کی مدد کرتے تھے لیکن آپ مشاہدۂ حق کی وجہ سے سب سے فارغ تھے حتیٰ کہ جس چیز کو دیکھتے اس میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے اور فرماتے" میں زوال پانے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ پس صاحبِ وقت کے لیے عالم کبھی تو دوزخ بن جاتا ہے کیونکہ وہ غیبت کے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور حبیب کے گم ہو جانے سے اس کا دل وحشت کا محل بن جاتا ہے اور کبھی اس کا دل مشاہدہ حق کی دولت پاکر جو ہر آن اس کو تحفہ کے طور پر ملتی رہتی ہے بہشت کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن صاحبِ حال خواہ بلائے حجاب میں ہو یا نعمت کے مشاہدہ میں سب حالتیں اس پر یکساں ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ مشاہدہ کے محل میں ہوتا ہے۔ اس مثال سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ حال ایسے شخص کی صفت ہے جو خدا تعالیٰ کو مطلوب ہوتا ہے اور وقت اس شخص کا درجہ ہے جو طالبِ حق ہو ایک تو وقت کی راحت میں اپنے ساتھ باہوش ہوتا ہے اور دوسرا حال کی خوشی میں حق تعالیٰ کے ساتھ مجذوب اور مدہوش ہوتا ہے۔ پس ان دونوں مقاموں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حالت افندی (۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء ــــــ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) محمد سعید، سلطان محمود ثانی کے عہد کا ایک ترک مدبر۔ والد کا نام قاضی حسین افندی تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ شیخ الاسلام شریف افندی کے ہاں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ شیخ الاسلام کی وفات کے بعد رئیس تشریفات راشد افندی کے مہردار کا یاماق پھر یہنی شہر فنار کے نائب کا کتخدا مقرر ہوا۔ استانبول واپس لوٹنے پر اس کو تعلیم مکمل کرنے کا موقع مل گیا۔ اسے زُودفہمی اور ذہانت کی بنا پر مختلف عمائد کے ہاں کاتب کی حیثیت سے ملازمت ملتی رہی۔ اسی دوران میں اس کا تقرر رئیس دفتر محاسبہ کے عہدے پر ہوگیا۔ فرانس سے شرائط صلح طے ہوتے ہی اسے پیرس میں سفیر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۰۶ء کے اواخر میں اسے دیوان ہمایونی میں مہردار کی حیثیت سے اس کا تقرر ہو گیا۔ لیکن مئی ۱۸۰۷ء میں اسے رئیس الکتاب بنادیا گیا۔ ۵ مارچ ۱۸۰۸ء کو اُسے برطانیہ سے ساز باز کرنے کے الزام میں برطرف کر کے جلاوطن کر کے کوتاہیہ بھیج دیا گیا لیکن اگلے ہی سال ۱۸۰۹ء میں اسے استانبول واپس آنے کی اجازت مل گئی سلطان محمود ثانی نے اسے بغداد بھیجا تاکہ وہاں کے خود مختار والی کوچک سلیمان پاشا کو واجب الادا رقم کی ادائیگی پر آمادہ کر سکے۔ چنانچہ اس نے اس سرکش والی کے خلاف ایک فوجی مہم تیار کی اور اس مہم میں کامیاب رہا۔ ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں حالت افندی کا تقرر کتخدائی ہمایوں کے عہدے پر ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں وہ نشانجی ہو گیا۔ حالت افندی سلطان محمود ثانی کا معتمد تھا اور سلطان اکثر امور سلطنت میں اس سے مشورہ لیتا تھا۔ ایک دور میں اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ صدر اعظم اور شیخ الاسلام کے عہدوں پر نامزدگیاں بھی اس کے اختیار میں تھیں۔

حالت افندی کے زوال کا سبب اس کی وہ سرگرمیاں تھیں جو ۱۸۲۰ء میں یانینہ کے تپہ دلنلی علی پاشا کی برطرفی پر منتج ہوئیں۔ علی پاشا کے خلاف مہم سے یونانیوں کو شہ ملی اور موره میں یونانیوں نے بغاوت کر دی۔ یہ واقعہ مارچ ۱۸۲۱ء کا ہے۔ چنانچہ اسے ذمے دار حالت افندی کو ٹھہراتے ہوئے ۱۲۳۸ھ/نومبر ۱۸۲۲ء میں قونیہ جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں چند روز بعد اُسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا اس کی لاش وہیں دفن کر دی گئی لیکن سر قسطنطنیہ میں لایا گیا جسے اس کی بنائی ہوئی سبیل اور کتب خانے کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

حالتی (۵ شعبان ۹۷۷ھ/۲۳ جنوری ۱۵۷۰ء ــــــ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۱ء) مصطفےٰ افندی، عثمانی دور کا مشہور عالم اور شاعر۔ وہ عزمی زادہ کے نام سے بھی معروف تھا۔ قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد پیر محمد عزمی شہزادہ محمد جو بعد میں سلطان محمد ثالث بنده کا اتالیق تھا۔ اس نے سعد الدین جیسے نامور مؤرخ اور اساتذہ سے تعلیم

حاصل کی۔ تعلیم کے بعد مدرس ہوگیا۔ فن تدریس میں اُس نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی اور ایوب وسلطان سلیم کے مدارس میں اور سلیمانیہ اور وفا میں مدرس رہا۔ حالتی کو ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں دمشق کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء میں وہ قاہرہ چلا گیا جہاں کچھ عرصہ کے لیئے وہ بیگلر بیگی کے عہدے پر فائز رہا۔ کچھ عرصے کے لیئے معتوب رہنے کے بعد اُسے بروسہ کا قاضی بنادیا گیا۔ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں ادرنہ کا قاضی مقرر ہوا۔ اسی سال وہ دمشق آگیا اور ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء تک دمشق ہی میں مقیم رہا۔ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء میں عثمان ثانی تخت نشین ہوا تو حالتی کو پھر قاہرہ کا قاضی مقرر کیا گیا۔ بعد میں سلطان مراد رابع نے اسے اناطولیہ اور پھر روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدے پر فائز کیا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے اسے سلیمانیہ کے دار الحدیث کا مدرس مقرر کیا گیا۔

وفات کے بعد اسے قسطنطنیہ میں صوفلر چارشی سی کے صحن میں دفن کیا گیا۔ حالتی اپنی زندگی میں بڑے نشیب وفراز سے گزرا۔ وہ بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ اُس کے تذکرہ نویس اِس بات پر متفق ہیں کہ حالتی اپنے زمانے کے فاضل ترین علماء میں سے تھا اس نے فقہ کی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس کا کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے بیشتر کتابوں پر اس کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے حواشی تھے۔

نثر میں اس کی تصانیف میں "شرح المنار" اور "در روغرر" پر حواشی "مغنی اللبیب کی شرح" "شرح ہدایۃ" وغیرہ اور نظم میں ایک دیوان ہے جو اکیس قصائد، سات سو اکیس غزلیات، تین سو رباعیات اور ساقی نامہ پر مشتمل ہے۔

حالیؔ الطاف حسین (۱۲۳۵ھ/۱۸۳۷ء — /۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء) برِّعظیم پاک وہند کے ایک نامور شاعر اور ادیب۔ والد کا نام ایزد بخش تھا۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ نسب کے اعتبار سے انصار قوم کی

مولانا الطاف حسین حالی

اس شاخ سے تھے جو غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت سے پانی پت میں آباد تھی۔ نو سال کی عمر میں والد وفات پاگئے اور ان کی پرورش بڑے بھائی نے کی۔ مولانا حالی کو مسلسل تعلیم کا موقع نہ مل سکا لیکن انھوں نے فارسی اور عربی کی بعض متداول کتابیں پڑھیں۔ فلسفہ، منطق اور حدیث وتفسیر کا بھی مطالعہ کیا۔

مولانا حالی کو قیام دہلی کے دوران میں مرزا غالب کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا اور ان سے شعر وسخن میں اصلاح لینے لگے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مولانا حالی کو نواب مصطفٰے خان شیفتہ سے تعلق پیدا ہوگیا اور وہ ۱۸۶۹ء تک ان کی خدمت میں رہے۔ شیفتہ اُردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجے کا تھا۔

۱۸۷۲ء میں مولانا حالی نے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کرلی۔ جہاں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ عبارتوں کی تصحیح کا کام ان کے سپرد ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں جب کرنل ہالرائڈ کے ایما پر مولانا محمد حسین آزاد نے ایک ایسے مشاعرے کی طرح ڈالی جس میں مصرع طرح کی بجائے موضوع دیا جاتا تھا چنانچہ مولانا حالی نے چار مثنویاں 'حُبِّ وطن'، 'برکھا رُت'، 'نشاطِ امید' اور 'مناظرہ رحم وانصاف' انھی مشاعروں کے لیئے لکھیں۔

بعد میں لاہور کی ملازمت سے قطع تعلق کرلیا اور اینگلو عربک سکول میں مدرسی اختیار کرلی۔ ۱۸۷۹ء میں سر سیّد کے ترغیب دلانے پر "مسدس مدو جزر اسلام" لکھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے متعلق سر سیّد احمد خان نے کہا تھا کہ جب روزِ قیامت خدا مجھ سے پوچھے گا تو کیا لایا، تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔

آپ نے پانی پت میں وفات پائی۔

مولانا حالی کی تصانیف میں "مجالس النساء"، حیاتِ سعدی، مقدمہ شعر وشاعری، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، تریاق، شواہد الالہام وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا حالی میں شیخی، تعلّی اور تکبر نام کو نہ تھا۔ ان کی خاموشی، متین سنجیدہ طبیعت اور گفتگو سے ایک ناواقف شخص اس بات کا پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ مصنف، شاعر یا عالم ہیں۔

جدید اُردو نثر میں حالی کا بڑا مقام ہے۔ حالی نے سب سے پہلے متین اور حقیقت کی ترجمان نثر کی بنیاد ڈالی جو ہر قسم کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین ادا کرنے کیلئے موزوں ہے۔ اُن کی نثر میں سادگی اور مدعا نگاری کا اجتماع ہے۔ بقول نواب عماد الملک "سر سیّد کی جماعت میں بہ حیثیت انسان حالی کا درجہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سر سیّد بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے" حقیقت یہ ہے کہ وہ ہماری تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے مزاج میں ضبط، اعتدال، رواداری اور بلند نظری تھی۔ اور یہی خوبیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

بقول خواجہ غلام الثقلین مرحوم "مولانا حالی یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیا خیالات کی رُو سے ایک صاحبِ باطن ولی تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے صحیح اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہبًا نہایت بے تعصب تھے۔ ان کے والدین شیعہ تھے بچپن میں اہل سُنّت والجماعت میں تعلیم پائی۔ مولانا مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریق نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔

حام حضرت نوحؑ کا بیٹا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں آیا۔ طوفان کے وقت اپنے بھائیوں سام اور یافث کے ساتھ کشتیِ نوح میں موجود تھا۔ اس کے بارے میں ایک

روایت موجود ہے جس کی رو سے حضرت عیسیٰؑ نے اس کی قبر پر قم باذن اللہ پکار کر اسے کچھ عرصہ کے لیے زندہ کیا اور اس سے طوفان نوحؑ کا حال سُنا۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حام عالم شباب ہی میں فوت ہو گیا تھا (الطبری ۱: ۱۸۷)

مسلم مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بددعا سے اولاد حام کا رنگ سیاہ اور بال گھنگھریالے ہو گئے۔ نیز حضرت نوحؑ نے یہ دُعا بھی کی تھی کہ سب پیغمبر سام کی اولاد سے اور سب بادشاہ یافث کی اولاد سے ہوں اور حام کی اولاد ان دونوں کی خدمت گزار ہوں۔

یہ بات بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ نے ساری زمین اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔ حام کو دریائے نیل سے مغرب کا علاقہ (افریقہ) دیا گیا اور وہ ابوالحبش کہلایا۔

تورات کی رو سے حام کے چار بیٹے تھے کوش، مصرایم، فوط اور کنعان۔ کوش کا بیٹا نمرود بابل کا بادشاہ ہوا اور اس کی باقی اولاد مشرق و مغرب کے ساحلی علاقے نوبہ، حبشہ اور فزان وغیرہ میں آباد ہو گئی۔

حام زمانہ جاہلیت میں اہل عرب مختلف طریقوں سے جانوروں کو بتوں وغیرہ کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اور ان سے کام لینا یا ذبح کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس طریق پر چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔ چنانچہ حام اس بوڑھے اونٹ کو کہتے تھے جس کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا۔ تب اس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفے سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزاد کر دیا جاتا تھا۔

نیز وہ زبانیں جن کا رشتہ السنہ سامیہ سے ہے ان کے لئے حامی۔ سامی گروہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ گروہ حامی زبانوں پر مشتمل ہے۔

حامد رضا خان قادری : (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۷ء–۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) ایک عالم دین۔ حامد رضا خانؒ مولانا احمد رضا خان بریلوی کے بڑے فرزند تھے۔ تعلیم و تربیت آپ کے والد نے فرمائی۔ انیس برس کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ مولانا حامد رضا خان عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ علوم ادبیہ کے علاوہ دیگر علوم و فنون تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ میں یکتائے روزگار تھے۔ نہایت فصاحت و بلاغت سے عربی میں برجستہ اشعار و مضامین و خطبات تحریر فرماتے۔ آپ نے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا اور اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی کے جوار میں دفن ہوئے۔ آپ کی اولاد میں دو صاحبزادے اور چار لڑکیاں تھیں۔

مولانا حامد رضا خان نہایت متواضع، حلیم المزاج اور عمدہ اخلاق کے مالک تھے۔ علم دین حاصل کرنے والے طلبا، حاجت مندوں، درویشوں اور فقرا پر بہت شفقت فرماتے۔ آپ نے سالہا سال دارالعلوم منظر الاسلام میں درس حدیث دیا۔ آپ کے خلفا میں شیخ الحدیث مولانا سردار احمد قادری، مولانا ابراہیم رضا خان، مفتی اعجاز ولی خان اور ابوالحسنات محمد احمد قادری جیسی شخصیات ہیں۔

حامد علی خان (۱۹۰۷ء–۱۹۸۰ء) عالم دین۔ والد کا اسم گرامی مولوی شیدا علی خان۔ رامپور میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ رام پور کے اساتذہ مولانا معز اللہ خان، مولانا نذیر الدین، مولانا وجیہ الدین اور مولانا حمایت اللہ سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں۔ حصول تعلیم کے بعد کچھ عرصہ اپنے ہاں تدریس کی اور پھر ۱۹۳۲ء مدرسہ اسلامیہ خیر المصادر ٹونک کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اسی دوران جب تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو آپ نے مسلم لیگ سے بھرپور تعاون کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۶ء میں پاکستان آئے اور ملتان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جہاں خیر المعاد کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی اور آخری دم تک اس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے پاکستان میں اٹھنے والی ہر اسلامی تحریک کا ساتھ دیا۔ ۱۹۷۰ء میں ملتان سے قومی انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کا مقابلہ کیا لیکن صرف چند ووٹوں سے رہ گئے۔ اور ۱۹۷۴ء میں جب تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا تو مولانا حامد علی خان اس میں بھی پیش پیش تھے۔ ۱۹۷۷ء میں آپ نے دوبارہ انتخابات میں حصہ لیا اور قومی اسمبلی کی نشست پر کامیاب ہوئے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف عوامی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا حامد علی خان عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ پیر طریقت بھی تھے۔ مولانا عنایت اللہ رام پوری نے آپ کو سلسلہ نقشبندی مجددیہ میں خلافت سے نوازا تھا۔ جنوری ۱۹۸۰ء کو انتقال فرمایا۔ لاکھوں افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ مولانا سید احمد سعید کاظمی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور حضرت شاہ رکن عالم کے مزار کے سامنے قلعہ کے اندر دفن ہوئے۔ جہاں آپ کی درگاہ کے سامنے ایک عالیشان دینی درس گاہ قائم ہے۔

حامد میاں مولانا : (۱۳۴۵ھ/دسمبر ۱۹۲۶ء تا حال) پاکستان کے ایک جید عالم دین۔ تاریخی نام سعید اختر۔ والد کا نام محمد میاں۔ خاندان سادات سے ہیں۔ [illegible] طرف سے سلسلہ نسب عثمانی ہے جس کا تذکرہ سید محبوب رضوی نے تاریخ دیوبند میں کیا ہے۔ اور اس خاندان کے افراد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

والد کی طرف سے سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

سید حامد میاں بن سید محمد میاں بن سید منظور محمد بن سید یوسف علی بن سید محمد علی بن سید ظہور ولی بن سید محمد فردوس بن سید شاہ شبلی بن سید بندگی محمد اسماعیل بن سید محمد علاؤ الدین بن سید محمد کبیر بن شہاب الدین بن حسین علی بن سید الیاس بن [illegible] بن اسحاق عندلیب الملکی بن قدرتی حسین علی بادی بن سعد اللہ بن [illegible] احمد بن حسین بن علاء الدین بن ابی طالب بن ناصر الدین محمد بن نظام [illegible] موسیٰ بن محمد الاعرج بن ابی عبداللہ احمد بن موسیٰ المبرقع بن امام محمد تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام ابی عبداللہ الحسین بن سیدہ فاطمہ زہرہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان کے آباؤ اجداد ساتویں صدی ہجری میں سید محمد ابراہیم کے اجداد [illegible] حسین حمص سے ترک وطن کر کے ادش میں وارد ہوئے اور وہاں سے ہندوستان تشریف لائے اور شیخ بہاء الدین زکریا سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

مولانا حامد میاں دیوبند میں پیدا ہوئے اور تعلیم کا آغاز دیوبند ہی سے ہوا۔ قاری اصغر علی استاد اول تھے۔ چونکہ ان کے والد جامعہ قاسمیہ المعروف مدرسہ شاہی مراد آباد میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بقیہ تعلیم اس مدرسہ میں حاصل کی اور اپنے والد محترم مولانا عبدالحق مدنی مولانا عبدالاحد، مولانا عجیب نور بتوی، مولانا اسماعیل سنبھلی وغیرہم سے تحصیل علم

کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر دیو بند میں داخلہ لیا۔ اور حدیث و تفسیر اور فقہ کا علم یہاں سے حاصل کیا۔ دیو بند میں مولانا اعزاز علی، مولانا ابراہیم بلیاوی اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہم سے تعلیم پائی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگرچہ مولانا حسین احمد مدنی سے طبعی مناسبت اور عقیدت پہلے کبھی نہیں رہی تھی لیکن ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر بیعت کی یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا ہے۔ چنانچہ حضرت مدنی کی معیت میں سلوک کی منازل طے کیں اور حج کے لئے بیت اللہ شریف گئے۔ اور زیارت بیت اللہ اور روضہ اطہر سے مشرف ہوئے۔

ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کے بعد مراد آباد میں مدرسہ شاہی میں جس کی بنیاد مولانا نانوتوی نے رکھی تھی، میں معلمی کے فرائض کے ساتھ ساتھ افتار کے فرائض بھی زیر سرپرستی مولانا سید فخر الدین صاحب جو بعد میں دیو بند کے شیخ الحدیث بنے، انجام دینے لگے۔

۱۹۵۲ء میں پاکستان تشریف لائے۔ چند ماہ جامعہ اشرفیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ بعد میں احمدیہ بلڈنگ کے قریب مدرسہ احیاء العلوم کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۵ء میں مسلم مسجد لوہاری میں جامعہ مدنیہ شروع کیا جو بعد میں کریم پارک میں مستقل جگہ مل جانے کے بعد ایک بڑی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ آج کل مولانا امیر انجمن جامعہ مدنیہ کے عہدے پر فائز ہیں اور تدریسی فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ آج کل بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ایک ماہوار رسالہ "انوار مدینہ" کے نام سے نکال رہے ہیں جو ۱۹۷۰ء سے مسلسل نکل رہا ہے۔

آپ کی تصانیف میں تصوف پر "ذکر جمیل"۔ نحو پر "تسہیل الصرف" اور "تسہیل النحو" ہیں۔ کچھ کتابیں ابھی مسودات کی شکل میں موجود ہیں۔ جو جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔

حامدیؒ ابراہیم

(--- ؟ --- شعبان ۵۵۷ھ / جولائی ۱۱۶۲ء) بن حسین بن ابی السعود ہمدانی۔ یمن میں طیبی اسمٰعیلیوں کا دوسرا داعی مطلق۔ ایک روایت کے مطابق اسے صلیحی ملکہ السیدہ نے ۵۲۶ھ/۱۱۳۲ء میں داعی اعظم مقرر کر دیا لیکن بعد میں یہ عہدہ عدن کے امیر سبا بن ابی السعود بن زریع کو منتقل کر دیا۔ ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء میں داعی خطاب بن الحسن کی وفات کے بعد پہلے طیبی داعی مطلق ذؤیب بن موسیٰ نے اسے اپنا نائب بنا لیا۔ ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں اس کی وفات کے بعد حامدی اس کا جانشین ہوا اور اس طرح امام کی عدم موجودگی وہ بلند ترین منصب تک پہنچ گیا۔ حامدی ابراہیم صنعا میں رہتا تھا۔ جس کے یمنی حکمران جماعت کو چھوڑ چکے تھے لیکن وہ تبلیغی کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے حامدی بظاہر مخصوص طیبی نظام حقائق کا بانی تھا۔ اس کی اہم ترین کتاب "کنز الولا" ہے۔

حامدی کا بیٹا حاتم تھا جو تیسرے داعی مطلق کی حیثیت سے اپنے باپ کا جانشین بنا۔

حامیم

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف مقطعات۔ ان سورتوں کی تعداد سات ہے۔

۱۔ سورۃ المومن ۲۔ سورۃ فصلت ۳۔ سورۃ الشوریٰ ۴۔ سورۃ الزخرف ۵ سورۃ الدخان ۶۔ سورۃ الجاثیہ ۷۔ سورۃ الاحقاف۔

ان سورتوں کو الحوامیم، آل حٰم یا ذوات حٰم کہلاتی ہیں۔

اس لفظ کے معنی الازہری کے قول کے مطابق "جو کچھ ہونا تھا اس کا فیصلہ ہو چکا ہے" ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے حامیم کے معنی کے سلسلے میں تین اقوال ہیں۔ ۱۔ یہ اللہ کا اسم اعظم ہے ۲۔ یہ قسم ہے ۳۔ یہ اللہ کے اسم مبارک کے حروف ہیں۔

علامہ الآلوسی کا قول ہے کہ حوامیم میں تین باتیں مشترک ہیں۔

۱۔ لفظ حامیم سے آغاز ۲۔ نزول کتاب اور وحی کے ذکر سے شروع ہوتی ہیں ۳۔ تمام کی تمام مکی سورتیں ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ سورتیں قرآن مجید کا لب لباب ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے حوامیم کو قرآن کا دیباچہ یا جمال و رونق کہا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حوامیم جنت کے باغات ہیں۔ نیز حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ مجھے سبع طوال (سات لمبی سورتیں) تورات کی جگہ۔ راآت اور طواسین انجیل کی جگہ اور طواسیں و حوامیم کے درمیان کی سورتیں زبور کی جگہ عطا ہوئی ہیں۔ لیکن حوامیم اور مفصلات سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی نوازہ ہے کسی اور نبی نے ان کی تلاوت نہیں کی۔

حامیم بن من اللہ

ابو محمد کنیت، النسب نامہ یہ ہے حامیم بن من اللہ بن حریز بن عمروؒ۔ المعروف بہ المفتری۔ ایک جھوٹا مدعی نبوت جو ریف کے بربر قبیلے غزوال سے تھا۔ ریف نے سرزمین ریف، واقع ملک مغرب میں دعوائے نبوت کیا اور اپنی فریب کاریوں کا جال پھیلا کر ہزارہا زود اعتقاد بربری عوام کو اپنا ہیرو بنایا۔ اس نے غمارہ بربروں میں اور زیادہ صحیح الفاظ میں قبیلہ مجکاسہ میں ایک نیا مذہب رائج کرنے کی کوشش کی یہ قبیلہ تطوان کے نواح میں آباد تھا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کے لئے ایک نیا آئین جاری کیا جو اسلامی شریعت سے بہت مختلف تھا۔ اس نے صرف دو نمازوں کا حکم جاری کیا۔ پہلی طلوع آفتاب کے وقت اور دوسری غروب کے وقت۔ اس نے ماہ رمضان کے تیس روزے بھی ختم کر دیئے اور ان کی جگہ صرف رمضان کے آخری عشرے کے تین، شوال کے دو اور ہر بدھ اور جمعرات کو دوپہر تک کا روزہ متعین کیا۔ اس نے اپنی امت سے حج زکوٰۃ اور وضو کو بھی ساقط کر دیا۔ جو شخص اس آئین کی خلاف ورزی کرتا اس سے چھ راس مویشی کفارہ یا تاوان وصول کر کے بیت المال میں داخل کیا جاتا۔ اس نے خنزیر کو حلال کر دیا۔ اس نے اس مچھلی کو حلال قرار دیا جو اس کے خانہ ساز شرعی طریقہ سے ذبح کی گئی ہو۔ تمام حلال جانوروں کے سر اور انڈے کھانے کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ اس علاقے کے بربر قبائل آج تک انڈوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے قرآن مجید کی نقل میں ایک کتاب بنانے کی بھی مذموم کوشش کی۔

اس کی پھوپھی جس کا نام تنجیت یا تابعیت تھا کاہنہ اور ساحرہ تھی۔ وہ بھی نہایت منصور ہوتی تھی اور اس کا نام بھی نمازوں میں لیا جاتا تھا۔ اس طرح اس کی بہن جس کا نام دجو تھا اور وہ بھی کاہنہ اور ساحرہ تھی اس کو بھی پیغمبر کا درجہ دیا جاتا تھا۔

اس نے اپنے پیروؤں کی رہنمائی کے لئے بربری زبان میں کتاب بھی لکھی جسے کلام الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا کرتا تھا اور جس کے الفاظ نمازوں میں پڑھے جاتے تھے نمونے کے طور پر اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"اے وہ جو آنکھوں سے پنہاں ہے مجھے گناہوں سے پاک کر دے۔ اے وہ جس نے موسیٰؑ کو دریا سے صحیح و سلامت پار کر دیا میں حامیم پر اس باپ ابو خلف من اللہ پر ایمان لایا ہوں۔ میرا سر اور میری عقل میرا سینہ اور میرا خون اور میرا گوشت و پوست سب پر ایمان لائے ہیں۔ میں حامیم کی پھوپھی تابعیت پر بھی جو

ابوخلف من اللہ کی بہن پر ایمان لایا ہوں"
حامیم کے پیرو امساک باراں کے وقت اور ایام قحط میں حامیم کی پھوپھی اور اس کی بہن کے توسل سے دعا مانگتے تھے۔ حامیم ایک لڑائی میں مارا گیا جو ۳۱۹ھ/۹۳۱ء یا ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں تیجز کے پاس احواز میں قبیلہ مصمودہ سے ہوئی۔ لیکن جو مذہب اس نے جاری کیا تھا وہ ایک طویل عرصے تک موجود رہا۔ اس خاندان میں ایک اور چھوٹا نبی عاصم بن جمیل بھی گزرا ہے۔

حائطیہ :
ایک فرقے کا نام۔ اس فرقے کا بانی مبانی احمد بن حائط ہے۔ اس فرقے کا عقیدہ ہے کہ خدا دو ہیں۔ ایک قدیم خدا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور دوسرا بعد میں پیدا ہوا ہے وہ مسیح ہے اور اس نے وقت کی تخلیق کی ہے۔ قیامت کے روز دوسرا خدا ہی فیصلے کرے گا۔

حائر :
ایک اصطلاح جس کے معنی عرب مصنفین کے مطابق ایسی تفریح گاہیں یا باغات تھے جن میں بعض اوقات کوئی مکلف عمارت بھی ہوتی تھی۔ زیادہ صحیح طور پر اس سے مراد اس قسم کے باغ حیوانات تھے جیسے سامرا اور مدینۃ الزہرا میں موجود تھے۔ عراق میں بغداد اور سامرا جیوں کی متعدد فصیلوں کے اندر نادر اقسام کے درخت لگائے جاتے تھے اور یہاں شکار کی غرض سے جانور رکھے جاتے تھے۔ اگرچہ آجکل یہ فصیلیں نیست و نابود ہو چکی ہیں تاہم امویوں کے زمانے کے بعض آثار ایسے ملتے ہیں جن میں مختلف قسم کی چار دیواریاں اس حد تک محفوظ رہ گئی ہیں کہ ان کے اندر واقع باغات کی شکل و صورت اور وسعت سے متعلق خاصی معلومات مل جاتی ہیں۔

حائر یا حیر کسی خاص جگہ یا مقام کا نام بھی ہے مثلاً حیرون یا حبرا کا وہ مقدس خطہ جہاں انبیائے بنی اسرائیل کے مقابر ہیں۔ کربلا کے اس علاقے کو بھی جو شہادت امام حسینؑ کی وجہ سے مقدس سمجھا جاتا ہے، حیر کہتے ہیں۔ سامرا کا ایک بڑا محلہ حیر کہلاتا تھا۔ اس میں وسطی شہر کا وہ سارا عقبی علاقہ شامل تھا جو ابتدا میں خلیفہ المعتصم کے وسیع باغ حیوانات کا ایک حصہ تھا۔

محمد بن شاکر کی تصنیف "عیون التواریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ حائر نامی ایک باغ بھی تھا جو امیر معاویہ کے دبیر سرجون بن منصور الرومی کی ملکیت تھا۔ المقدسی نے صور کی بندرگاہ کا نام حیر لکھا ہے اور طبری کے بقول بخت نصر نے وہاں ایک حیر عرب تاجروں کے لئے تعمیر کرایا تھا جو منڈی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

حائل :
مغربی نجد میں جبل شمر کے علاقے کا دارالحکومت جو سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک سطح مرتفع الجمتیہ کے عین وسط میں واقع ہے۔ یہ شہر ایران سے مکہ جانے والے زائرین کے راستے کی بڑی منازل میں سے ہے۔ اور تقریباً بیس فٹ اونچی دیواروں اور گول اور مربع برجوں سے محصور ہے یہ گیارہ محلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک بڑی مسجد اور ایک قلعہ بند محل ہے۔ یہاں ایک اہم منڈی ہے۔ اس کے علاوہ وسیع سیرگاہیں اور باغات ہیں۔ آبادی تین ہزار کے قریب ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہاں قحط کے بعد وبا پھیل گئی جس میں کافی جانی نقصان ہوا۔

حائل کی حکومت گذشتہ صدی میں بیت علی خاندان کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۸۲۰ء میں سردار عبداللہ بن رشید نے اپنے کثیر التعداد اور بارسوخ رشتے داروں کی مدد سے تاج و تخت حاصل کرنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی۔ عبداللہ ناکام رہا اپنے وطن کو خیرباد کہہ گیا۔ لیکن دس سال بعد وہابی سردار فیصل کی مدد سے دوبارہ حائل واپس آیا۔ جس کے لئے عبداللہ نے الاحسا کا صوبہ فتح کیا۔ اس وہابی امیر نے اس کی خدمات کے صلے میں اسے جبل شمر کا موروثی امیر بنا دیا۔

عبداللہ کے بڑے بھائی عبید نے بیت علی کو شہر سے نکال دیا۔ عبداللہ نے یہاں ایک بڑا محل بنوایا۔ اس کے بیٹے اور جانشین طلال کے عہد میں حائل میں خوشحال تھے۔ اس بادشاہ نے جامع مسجد اور منڈی بنوائی اور خوب صورت باغات لگوائے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے اس نے بصرے، واسط اور دوسرے شہروں سے تاجروں کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس نے مدینہ منورہ اور یمن سے کاریگر بھی بلوائے۔

الھمدانی نے ایک وادی حائل کا بھی ذکر کیا ہے غالباً وہ یہی شہر ہے یاقوت نے بھی حائل کا ذکر ایک وادی کے طور پر کیا ہے جو قبیلہ طے کے دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان واقع ہے اس نے اس کا ذکر ایک ضلع کے طور پر کیا ہے۔ حائل پر عبدالعزیز ابن سعود نے یکم ربیع الاول ۱۳۴۰ھ/۲ نومبر ۱۹۲۱ء میں قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے یہ شہر تجارتی اور زراعتی ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے۔

حُب
پیار، محبت
قرآن مجید میں یہ لفظ پیار کے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اس کے لئے مودۃ وود کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

"وہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں رحمٰن ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا (۱۹: ۹۶)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے (۵: ۵۴)

"اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔ (۳۰: ۲۱)۔ ان اقتباسات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لفظ مودۃ صرف دوستی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جبکہ دوسرے الفاظ ان کے متوقی پیار کے معنی میں ہی استعمال ہوئے ہیں۔

روایات کے مطابق حُب ہر طرح کے پیار اور دوستی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس حدیث مبارک سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے "آپس میں نیک لوگوں سے پیار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے"۔

ایک حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ "روحیں ابتدا میں اکٹھی تھیں جیسے کسی فوج کو ترتیب دیا گیا ہو، بعد میں انہیں الگ الگ جسموں میں حلول کر دیا گیا۔ جو روحیں عالم ارواح میں ایک دوسرے کو جانتی تھیں وہ اب بھی اسی طرح ہیں اور جو وہاں اجنبی تھیں وہ یہاں بھی اجنبی ہیں۔" (مشکوٰۃ)

اخلاق جلالی کے مصنف نے حیوانی پیار اور روحانی پیار میں فرق بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ حیوانی پیار خواہشات کی زیادتی کی وجہ سے عمل میں آتا ہے لیکن روحانی پیار دو روحوں کی آپس میں ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے اس سے ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

عشق یا پیار حُب کے مفہوم میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ عشق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ العشاقہ سے نکلا ہے۔ العشقہ ایک بیل ہوتی ہے جو مختلف درختوں

پر لپٹی رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ عبرانی زبان سے آیا ہو۔ ابن سینا جیسے عظیم فلسفی بھی لفظ العشق کے بارے میں (اس جذبے کو قدرتی رجحان تصوّر کرتے ہوئے) لکھتے ہیں کہ "یہ جذبہ بطور خاص صرف آدمی کی مختلف اصناف تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تمام موجودات تک پھیلا ہوا ہے، خواہ وہ جنت میں ہوں یا زمین پر، جانور ہوں یا نباتات اور یہاں تک کہ زمین میں موجود مختلف اشیاء کی کانوں تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔
میر ابوالبقاء اپنی کلیات میں حُب کے مختلف مدارج بیان کرتے ہیں جو مرد اور عورت کے درمیان شدتِ جذبات کے مفروضوں پر مبنی ہیں۔

حبِ دنیا
دنیا کی محبت

مسلمانوں کو دنیا کی محبت میں پڑنے اور یادِ الٰہی سے غفلت برتنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں حبِ دنیا کی چیزیں یہ گنوائی گئی ہیں۔
"لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ اس دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے" (۳:۱۴)
حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ کا گزر ایک مردہ بکری پر سے ہوا۔ آپ نے فرمایا بھلا تم میں سے کوئی شخص اس کو ایک درہم میں لینا پسند کرے گا صحابہ نے عرض کی کہ ہم تو اسے کسی چیز کے عوض میں بھی خریدنا پسند نہیں کرتے، فرمایا خدا کی قسم جتنی یہ مردہ بکری تمہارے نزدیک حقیر ہے۔ دنیا خدا کے نزدیک اس سے بہت زیادہ حقیر ہے۔" (مشکوٰۃ)

حباب بن منذر
(صحابیؓ) کنیت ابوعمر، قبیلہ خزرج سے تھے۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے

اور تمام غزوات میں شمولیت کی۔ غزوۂ بدر میں قبیلۂ خزرج کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر جنگ سے متعلق جتنی تجاویز آپ نے پیش کیں، آنحضورؐ نے ان سب کو قبول فرمایا۔ آپ غزوۂ اُحد کے وقت آنحضورؐ کے حکم کے مطابق دشمن کے لشکر میں گھوم پھر کر وہاں کے حالات معلوم کر کے آپؐ تک پہنچاتے تھے۔
حبابؓ شاعر بھی تھے اور عموماً رزمیہ اشعار کہتے تھے۔ آپؓ اس قدر فصاحت و بلاغت سے خطبہ دیتے تھے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔ علم حدیث کے ماہر تھے اور بیشتر احادیث آپؓ کے سینے میں محفوظ تھیں۔ پچاس سال کی عمر میں آپؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں وفات پائی۔

حبری:
(۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳-۱۶۰۴ء — ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۶ء)

عبدالرحمٰن بن حسن، ادرنہ کا مؤرخ۔ ادرنہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد معلّم تھا۔ حبری نے ادرنہ اور استانبول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس نے بطور مدرس عمر کا زیادہ حصہ ادرنہ میں گزارا۔ ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء کے بعد وہ مختلف شہروں میں قاضی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ آخری وقت میں وہ سیرز میں قاضی تھا اس نے وہیں وفات پائی۔
حبری کی تصانیف میں "ریاض العارفین"، "حدائق الجنان"، "دفتر اخبار" وغیرہ مشہور ہیں۔ "انیس المسامرین" حبری کی سب سے مشہور تصنیف ہے جو اس کے آبائی شہر کی تاریخ اور حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حبری نے مساجد اور رفاہِ عامہ کی دوسری عمارتوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اس میں شہر کے مشاہیر کا بھی ذکر ہے۔

حُبس:
شرعی اصطلاح میں حبس کے معنی وقف کے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے "خالد نے اپنی زرہیں وقف کر دیں۔" (مجمع البحار) ہر وہ چیز حبس کہلاتی ہے جو خدا کے نام سے مخصوص کر دی جائے۔ ایام جاہلیت میں مشرک لوگ جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے ان کو بھی حبس کہتے تھے۔ غرض حبس کے معنی ہیں جو چیز خدا کے لیے ٹھہرا دی جائے۔

حبش:
ایک صوبے کا عثمانی نام جو مصر کے جنوب میں خلیج عدن تک بحرِ احمر کے افریقی ساحلی علاقوں پر مشتمل ہے اس میں جدّہ کی سنجاق بھی شامل ہے۔ دیگر اہم سنجاقیں جو اس علاقے میں شامل ہیں یہ ہیں:۔
ابریم، سواکن، ارکیکو، مصوع، زیلع اور جدّہ۔ اس صوبے کی بنیاد پرتگیزیوں کو نکال باہر کرنے کے ارادے سے رکھی گئی۔ پرتگیزی مملوک سلطان کے آخری برسوں میں بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ واقع اپنے اڈوں سے سفر حج اور گرم مصالحہ کی تجارت میں خلل ڈال رہے تھے۔ ان کے حملوں سے جدّہ سویز اور طور جیسی بندرگاہوں کے محاصل میں کافی کمی واقع ہو گئی۔ چنانچہ خادم الحرمین کی حیثیت سے عثمانی سلطان کو ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ لیکن پانچ مختلف مہموں میں ناکامی کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان علاقوں پر مشتمل ایک صوبہ قائم کر دیا جائے۔
۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء میں اوزدہ میر پاشا کو اس صوبے کا بیگلر بیگی مقرر کیا گیا۔ اس نے مصر میں فوج جمع کر کے دریائے نیل کے پار حملہ کیا جو ناکام رہا۔ دوسری مہم میں وہ اپنی فوجیں لے کر سویز کے راستے میں سواکن کے ساحل پر اترا اور اس نے مصوع سے زیلع تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ ترک اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لیے اوزدہ میر پاشا کے انتقال تک اس علاقے میں توسیع کرتے رہے لیکن اس کے انتقال کے بعد ترکوں کا اقتدار زوال پذیر ہونے لگا۔ چنانچہ دور دراز کے اضلاع کو یا تو چھوڑ دیا گیا یا ان کا نظم و نسق علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۷۸۹ء میں مصوع عثمانی حکومت کے بجائے ایک قبائلی سردار کے ماتحت تھا جس کا لقب نائب تھا۔ یمن اور حرمین شریفین میں امن قائم رکھنا چونکہ بیگلر بیگی کا فرض تھا اس لیے دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں اس صوبے کا صدر مقام جدّہ بنایا گیا بعد میں اس علاقے کی شورشوں کی وجہ سے مدینہ منوّرہ کو عارضی طور پر صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں عثمانی سلطان نے صوبے کے افریقی حصوں پر اپنے اختیار مصر کے پاشا کو منتقل کر دیے۔

حبش الحاسب المروزی:
احمد بن عبداللہ اسلامی فلکیات میں ایک اہم شخصیت۔ مرو میں پیدا ہوا بعد میں بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ اس نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ ابن القفطی نے اس کا زمانہ حیات المامون اور المعتصم کا عہدِ حکومت قرار دیا ہے۔ ابن الندیم نے اس کی تصانیف کی فہرست اس طرح دی ہے۔
۱۔ کتاب الزیج الدمشقی ۲۔ کتاب الزیج المامونی ۳۔ کتاب الابعاد والاجرام ۴۔ کتاب عمل الاسطرلاب ۵۔ کتاب الرخائم ۶۔ کتاب الدوائر

اشکال المماستہ وکیفیتہ الاوصال۔ ۷۔ کتاب عمل السطوح المبسوطۃ والقائمۃ المائلۃ۔ والمنحرفۃ۔

حبش علم مثلثات کے اعمال، جیب مستوی، جیب معکوس، مماس، مماس التام اور فلکیاتی مسائل میں ان کے اطلاق میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ تمام مؤرخین کی متفقہ رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حبش عباسی عہد کے ابتدائی حصے کے چند بڑے ماہرین فلکیات میں ایک تھا۔

ابو جعفر بن احمد بن عبداللہ حبش کا بیٹا تھا جو علم ہیئت اور صناعت آلات میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بھی "الاصطرلاب المسطح" کے نام سے لکھی تھی۔

حبشہ: عربی میں اس کا اطلاق حبشہ کے باشندوں اور ملک دونوں پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات براعظم افریقہ کے مشرقی خاکنائے پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ حبشہ میں اگرچہ ہمیشہ عیسائیوں کی اکثریت رہی لیکن اس میں مسلم آبادی بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ حبشہ کے آنحضورؐ کے دور سے لے کر ہمیشہ عالم اسلام سے تعلقات رہے ہیں۔

تاریخ میں آنحضورؐ اور نجاشی کے درمیان دوستانہ مراسم کا ذکر موجود ہے۔ اس علاقے میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر اس وقت ہوئی جب اکسومی ریاست اپنے دورِ زوال میں تھی۔ ایرانی بحیرۂ قلزم اور اس کے تجارتی راستوں کو درہم برہم کر چکے تھے مسلمانوں کی سلطنت میں پورا عرب اور شمالی افریقہ شامل ہو چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام عیسائی سلطنت کے دروازوں پر دستک دے چکا تھا۔ جزائر دہلک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اسلام کی زبردست اشاعت کے مقابلے میں یہاں کے لوگوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے ناقابل تسخیر پہاڑی قلعوں میں پڑے رہیں۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر مسلمان حبشہ کی سرحدوں پر چھاتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس حسن سلوک کے پیش نظر جو یہاں کے لوگوں نے ابتدا میں صحابۂ کرامؓ کے ساتھ کیا تھا، اس علاقہ کو اپنے دائرۂ فتوحات میں شامل نہ کیا۔ لیکن سرحدوں پر جو بورشیں شروع ہو چکی تھیں ان کے اثرات کو مٹایا نہ جا سکا۔ زیریں علاقوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا اور مسلم طاقتیں یکے بعد دیگرے بحیرۂ قلزم کے افریقی ساحلوں پر اپنا اقتدار قائم کرتی رہیں۔

اسلام کا لفوذ نہ صرف ان ساحلی علاقوں میں ہو رہا تھا جہاں سے حکومت حبشہ کا اقتدار مسلط چکا تھا بلکہ وہ خانہ بدوش بھی اسلام قبول کر رہے تھے جو سمندر اور مشرقی ڈھلانوں کے درمیانی علاقوں میں آباد ہوتے اور آتے جاتے رہتے تھے۔ آخر کار اسلام مشرقی سواحل اور مملکت سدامہ تک پہنچ گیا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی اور چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانے میں اسلام کی اشاعت بڑے منظم طور سے ایک وسیع علاقے میں ہوئی۔ چنانچہ جزیرہ نماے دہلک، دنقلی، صومالی سواحل، شمال میں بجا یہ جنوب میں سدامہ، مشرقی شوآ کی ریاست افات میں، مشرق میں ہرار اور مغرب میں جھیل زوای کے قریب اسلام پہنچ چکا تھا۔

ساحلی میدانوں میں اسلام مسلمان تاجروں کے ذریعے پھیلا۔ ان علاقوں میں اسلام کی اشاعت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام غلامی کا مخالف ہے۔ اور لوگوں کو غلام بن کر نوج میں بھرتی ہونے سے یہ بہتر نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر کے آزاد

وسطی پہاڑی علاقے کی عیسائی ریاستوں اور مسلم سلطنتوں کے درمیان ایک طویل اور مہلک جنگ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی تک کے دور میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ہرار ایک مسلم شہری ریاست اور اسلامی تجارت اور تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز بن گیا۔ سطح مرتفع شوآ کا جنوب مشرقی حصہ اور وادیٔ اوش کی ڈھلانیں افات کے قبضے میں رہیں۔ یہ سب سے اہم سلطنت تھی۔ جنوبی حبشہ کے بڑے حصوں پر دوار کا سلطنت کا قبضہ تھا۔ شرقہ اور اربنی کی چھوٹی چھوٹی ماتحت ریاستیں دوارو اور انتہائی مغربی مسلم ریاست بدیہ کے درمیان [illegible] تھیں۔ بدیہ کی مسلم ریاست سدامہ اور گراجہ کے علاقوں پر مشتمل تھی۔

یہ مسلم ریاستیں شہنشاہ آمدہ سیون (۱۳۱۴ء تا ۱۳۴۴ء) کے [illegible] تھیں۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے زیر نگیں علاقے منتشر تھے اور ان علاقوں [illegible] کوئی مناسب مواصلاتی انتظام نہ تھا چنانچہ آمدہ سیون نے افات اور بدیہ پر [illegible] اور دونوں کو شکست دی اس نے دریائے اوش تک پوری سطح مرتفع پر [illegible] قبضہ ہو گیا۔

اس فتح سے بہت سے لوگ عیسائی ہو گئے۔ اس زمانے میں [illegible] اور گرجے تعمیر کیے گئے۔

آمدہ سیون کا جانشین اور بیٹا سیفہ ارعد [illegible] کے خلاف اپنی انتقامی کارروائیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

ارعد کے بیٹے داؤد [illegible] نے مصری حکمران [illegible]

حبشیوں نے محسوس کیا کہ اپنے قریبی پڑوسیوں یعنی بحیرۂ قلزم [illegible] تعلق رکھنے والے مسلمانوں سے بیک وقت [illegible] عملی کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے انہوں نے [illegible] امداد حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ [illegible] کیا جائے۔ لیکن پرتگیزی قوت کے نہ پہنچنے کی وجہ سے [illegible] ناکامی ہوئی۔

اسی دوران میں اندرونی شورشوں کی وجہ سے [illegible] ہو چکا تھا۔ خاندان [illegible] کے [illegible] کو ایک شکست کی وجہ [illegible] جس کے وقار کو اب امیر اور فوجی سالار رہے تھے۔ [illegible] ہرار میں منتقل کر لیا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان جرنیلوں [illegible] تھا جنہیں دنقلی اور صومالی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ [illegible] ابراہیم جلد ہی حبشہ میں مسلم مقبوضات کا مالک بن گیا [illegible] لیا۔ سردار احمد بن ابراہیم نے پہلے اول میں اپنی طاقت [illegible] صومالیوں کو ایک زبردست اور طاقتور فوج میں منظم کیا۔ [illegible] حبشی شہنشاہ لبنہ ڈنگل پر حملہ کیا اور اسے شکست [illegible] فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی فوج میں [illegible] تھی۔ دو سال بعد اس نے دوبارہ حملہ شروع کیا جس سے وہ تقریباً [illegible] حبشہ پر قابض ہو گیا۔ لیکن سردار احمد بن ابراہیم کی وفات کے بعد حبشہ کو پہلے مسلمانوں کی طرف سے عملاً کوئی خاص خطرہ نہ رہا۔ یورپ کی ایک عیسائی حکومت کے سپاہیوں کی مدد سے حبشیوں نے آخر کار اپنی قدیم عیسائی سلطنت [illegible] لیکن اس وقت حبشہ بہت خستہ حال ہو چکا تھا۔ اس نے بہت سے [illegible]

معدوم اور اس کے پادری طاقت سے محروم ہو چکے تھے۔

جب مصر میں خدیو اسماعیل کی حکومت تھی تو اس نے حبشہ کی فتح کے منصوبے بنائے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں مصر نے اس پر تین سمت سے حملہ کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ اس شکست سے مصریوں کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر انہوں نے فوراً ایک اور مہم تیار کی جس کی قیادت خدیو کے بیٹے نے کی۔ جس میں تقریباً بیس ہزار افراد شامل تھے۔ اس مرتبہ شہنشاہ نے حبشیوں کی فوج منظم کی۔ ۱۸۷۶ء میں گرا کے قریب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ مصریوں نے انہیں شکست فاش دی۔ اہل حبشہ اور مسلمانوں کی آخری لڑائی ۱۸۸۸ء میں ہوئی جبکہ مہدوی ریاست کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد سوڈان اور حبشہ میں عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔

مہدویوں کا ایک زبردست دستہ مغربی حبشہ میں داخل ہو گیا۔ جس نے گوندار کے کچھ حصے جلا دیئے اور سرحد پر پڑاؤ ڈال دیا۔ جنگ میں مہدویوں نے شہنشاہ جون کو شکست دی۔

موجودہ دور میں افریقی مشرقی خاکنائے کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان ہے لیکن حبشہ کی سیاست اور معاشرت پر ان کا اثر بہت ہی معمولی ہے۔ حبشہ کی سیاسی اور ثقافتی زندگی عیسائیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ شمال مشرقی افریقہ کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سوائے جنوبی افریقہ کے جہاں غیر مسلم حکومت ہے حبشہ حکومت مسلم علاقوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہجرت حبشہ میں مسلمانوں کا سب سے پہلا ذکر گزرا ہے۔ زیریں علاقوں میں کشتی اور نیلوتی عوام میں اسلام سب سے تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں بحیرہ قلزم کے ساحلوں پر واقع تجارتی مقامات مسلمانوں سے آباد ہو جانے سے ساحلی بندروں میں رہنے والے خانہ بدوشوں میں اسلام پھیلا۔ انتہائی شمال میں رہنے والے خانہ بدوش یعنی بجایہ اور نیلوتی نسلیں ساحلی آبادیوں دونوں سے متاثر ہوئے۔ ذریعہ اشاعت اسلام کا اہم مرکز بن گیا۔ تجارتی تعلقات کے سبب مغرب میں دریائے گنگا کے دونوں جانب حبشہ کی مسلم ریاست کی ترقی یافتہ جنوبی سلطنتوں کے حکمران طبقوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مشرقی پہاڑی علاقوں کے ساتھ ساتھ مسلم ریاستوں میں مشہور ترین اوقاف اور دل نشین۔ بلی اور دوارو کی مسلم ریاستوں کا بہت سا حصہ کلہ کے بڑے حصے سے مغلوب ہو گیا۔ چنانچہ ایک شہر ہرار کے سوا تمام علاقے سے اسلام غائب ہو گیا۔ یہاں اسلام صرف صومالی قبائل میں پھیلا۔

عرب مصنف اکثر لفظ حبشہ اتنا ہی مبہم طور پر استعمال کرتے ہیں جتنا ہم زمانہ قدیم و متوسط کے یورپ میں لفظ ابتھوپیا استعمال ہوتا تھا۔ یعنی تقریباً تمام صحرائی افریقہ کے قابل زراعت حصے کے لئے۔

حبشی: برعظیم پاک و ہند میں حبشی کی اصطلاح ان افریقی قوموں کے لئے استعمال ہوتی ہے جن کے آبا و اجداد شروع میں اس ملک میں غلاموں کی حیثیت سے آئے۔ ان میں سے بعض ہمسایہ مسلم ممالک کے غلاموں کے بیٹے گردیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس نام کا اطلاق بلا کسی تمیز کے تمام افریقیوں پر ہوتا ہے۔

ابتدائے عہد اسلام میں حبشیوں کی تعداد، حیثیت اور فرائض کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان کی ملکہ رضیہ کے حبشی غلام یاقوت کے اقتدار سے یہ بات واضح ہے کہ اس دور میں بھی حبشی اختیار و شہرت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ تغلق عہد تک حبشی برعظیم میں ہر طرف پھیل چکے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنی سیاحت کے دوران میں (۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء) حبشیوں کو ہندوستان سے لے کر سیلون تک ملازمت کرتے ہوئے دیکھا جن کی اکثریت چوکیداروں اور بری و بحری سپاہیوں کی حیثیت سے ملازم تھی۔

غلام ملک سرور نے جو غالباً ایک حبشی خواجہ سرا تھا آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطان محمد بن فیروز تغلق اور بعد کے تغلق بادشاہوں کے دور میں اہم حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں "خواجہ جہاں" کے لقب سے وزیر مقرر ہوا۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں اسے سلطنت کے مشرقی صوبوں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کے متبنٰی قرنفل نے ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں مبارک شاہ کے نام سے ملک سرور کا جانشین بننے کے بعد اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کیا اور سکے ڈھلوائے۔ اس کے بعد اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم شاہ نے، جونپور پر تقریباً چالیس سال تک حکومت کی۔

حبشی بنگال میں سمندر کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ ایک روایت کے ذریعے الیاس شاہی سلطان رکن الدین باربک شاہ کے پاس آٹھ ہزار کے قریب غلام تھے۔ یہ غلام فوجی مقاصد کے لئے رکھے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ جلال الدین فتح شاہ کے دور حکومت میں وہ خطرناک طور پر طاقتور ہو گئے۔ حبشیوں کے سب سے پہلے شخص نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء سے لے کر ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء تک بنگال پر حکومت کی۔ ۹۰۰ھ/۱۴۹۳ء میں ایک عرب وزیر علاء الدین حسین کو بادشاہ چن لیا گیا تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد تمام افریقیوں کو بنگال سے نکال باہر کیا گیا۔ ان میں سے اکثر گجرات اور دکن چلے گئے۔

حبشی غالباً دکن ہی میں ایک طویل عرصے تک زیادہ نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔ بقول رفیع الدین شیرازی صاحب تذکرۃ الملوک "بہمنی سلطان فیروز (۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء تا ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) کے حرم میں اس کے ذاتی خدام کے طور پر بہت سے حبشی موجود تھے۔ جب ایرانیوں اور ترکوں کی تعداد میں احمد کے تخت نشین ہونے کے بعد اضافہ کر دیا گیا تو حبشی دربار کی عنایات سے محروم ہو گئے اور وہ دکن کے مقامی مسلمانوں کی حمایت کرنے لگے۔ احمد شاہ ولی کے عہد حکومت کے آخری برسوں میں دو بہمنی صوبوں "ماھور" اور "گلبرگہ" پر حبشی حکمرانی کرتے تھے۔ قصبہ بیدر کے باہر جس پہاڑی پر حبشی جماعت کا قلعہ تھا وہ اب بھی حبشی کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ حبشیوں نے بری افواج میں اہم عہدے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ گجرات اور دکن کی بحری فوجوں میں بھی اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں حبشیوں کو سمندر کے راستے سے بھروچ، سورت، رندیر اور کھمبایت کی بندرگاہوں کے راستے مسلسل برآمد کیا جاتا رہا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق صرف احمد آباد میں پانچ ہزار حبشی تھے۔ اس طرح پرتگیزی فتح کے وقت سیف الملک حر مفتاح قلعہ دامان کا گورنر تھا کے پاس چار ہزار حبشیوں کی فوج تھی۔ گجرات کی بحریہ میں قائد اور سپاہی دونوں حیثیتوں میں حبشی غالب تھے۔ حبشی غلام پورے مغل دور میں جوق در جوق ہندوستان میں آتے رہے۔ اسی لیے حبشی افراد کے نام مغل تاریخوں میں بکثرت ملتے ہیں۔

حبل اللہ: اللہ کی رسی۔ دین اسلام۔
حبل اللہ سے مراد اللہ تعالٰے کا دین ہے۔ قرآن مجید

ہیں دین کو اللہ کی رسّی سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ کیونکہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے ۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالےٰ ہے :-

"سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو"۔

(۳ : ۱۰۳)

بقول مولانا مودودی "اس رسّی کو "مضبوط پکڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیّت "دین" کی ہو۔ اس سے ان کو دلچسپی ہو۔ اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لئے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں۔ پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے "۔

حبیب اللہ خان : (افغانستان کا حکمران) (دورِ حکومت ۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۹ء)

امیر عبدالرحمٰن کا بیٹا، باپ کے بعد افغانستان کا حکمران بنا۔ اس نے مملکت کے خارجی معاملات میں برطانیہ کے ثالثی کی درخواست کی۔ جہاں تک سرحد کے تعین کا تعلق تھا، دونوں ملکوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ اس کے عہد میں برطانیہ نے [illegible] کو ان شرائط پر آزادی دینے کا وعدہ کیا۔

۱۔ امیر دوسرے ملکوں سے تعلقات کے سلسلے میں برطانوی حکومت کے مشورے کے مطابق قدم اٹھائے گا۔

۲۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ سٹرلنگ سالانہ فوجی تعاون کے سلسلے میں امداد کے طور پر وصول کرے گا۔

۳۔ افغانستان کے جنگی سامان کی درآمد پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔

۴۔ غیر معیّنہ عرصے کے لئے وائسرائے ہند کے دربار میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ اور ہندوستان اور برطانیہ میں افغان تجارتی ایجنٹوں کا تقرر تسلیم کیا جاتا ہے۔

امیر نے یہ وعدہ بھی کیا برطانیہ سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے گا اور کسی بیرونی حکومت کوئی معاملہ طے کرنے سے پہلے برطانیہ سے مشورہ کرے گا تاہم اس نے برطانیہ کی یہ درخواست کہ وہ ہلمند پر قلعے تعمیر کرے مسترد کر دی۔ اس کے عہد میں تمام بیرونی روابط کو برطانوی ایجنٹ کے اختیار میں دے دیا گیا۔

حبیب اللہ اپنے باپ کی طرح مستعد و سرگرم تو نہ تھا لیکن داخلی حکمت عملی کے تحت اس نے بحالی امن کے لئے ایک پروگرام شروع کیا۔ جو قبائلی اقدامات پر مبنی تھا۔

اس نے ملک کی تشویشناک معاشی صورت حال کے پیش نظر مالی حکمت عملی کے تحت بعض اقدامات کئے جن کی رُو سے ہندوستان سے تجارت میں اضافے کی اجازت دی گئی۔ ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو اس نے وادی النگار میں قلعہ السراج کے قریب [illegible] پڑاؤ ڈال رکھا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے قتل سے امن و سکون اور برطانیہ سے دوستی کا یہ عبوری دور اچانک ختم ہو گیا۔ لیکن ملک کے جدید قومی تنظیموں کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

حبیب اللہ قندھاری : (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء - رمضان ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء) بن فیض اللہ افغانستان

کے ایک بڑے عالم دین اور صوفی، قندھار میں پیدا ہوئے۔ چھبیس سال تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اس دوران میں علم کے حصول کے لئے ایران اور بلاد عرب بھی گئے۔ بعد ازاں قندھار میں تدریس و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

میاں فرح الدین کی وساطت سے میاں فقیر اللہ شکارپوری کی نقشبندی کی بیعت کی۔ آپ نے "استاد الکل" اور "محقق قندھاری" کے القاب سے شہرت پائی جب ۱۲۴۱ھ میں مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی قیادت میں مجاہدین کا قافلہ قندھار پہنچا تو آپ کابل تک کے سفر میں ان کے ہمرکاب رہے۔

آپ کے علم و فضل کی شہرت ان کے شاگردوں اور ان کی تالیفات کے ذریعے ہندوستان تک پہنچی۔ ان کے شاگردوں میں ایک مولوی عبداللہ غزنوی تھے جنہوں نے امرتسر میں بالخصوص اور پنجاب میں بالعموم مشعل ہدایت روشن کی۔ انہوں نے پنجاب میں علم حدیث پھیلانے میں نمایاں خدمت سرانجام دی۔

آپ نے باون سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کا مزار قندھار میں ہے۔ آپ کی تصانیف عربی، فارسی اور پشتو تینوں زبانوں میں ہیں۔ جن کی تعداد چالیس سے اوپر ہے۔ ان تصانیف میں "منتہی الحصول فی علم الاصول" جو اصول فقہ پر ہے "التنقیات فی ترتیب الموضوعات" فارسی زبان میں حدیث کے موضوع پر ہے [illegible] "مقامات حریری (فارسی)" "منتخب تحریر اقلیدس" (عربی) [illegible] "تقویم الاذہان" عربی زبان میں علم منطق پر لکھی گئی ہے۔ [illegible] "[illegible] القضیہ" (عربی) خاص طور پر مشہور ہیں۔

حبیب النجّار : انطاکیہ کے باشندے [illegible]

بائیبل میں ان کا ذکر [illegible]

بعض مفسرین کے نزدیک ان کا قصہ [illegible] قرآن مجید [illegible]

"انہیں مثال کے طور پر اس بستی والوں کا قصہ سناؤ [illegible] رسول آئے تھے۔ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے [illegible] دونوں کو جھٹلایا۔ پھر ہم نے تیسرا [illegible] بھیجا [illegible] کہا ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں"۔

بستی والوں نے کہا :

"تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے [illegible] کوئی چیز نازل نہیں کی ہے۔ تم محض جھوٹ بولتے ہو"۔

رسولوں نے کہا :

"ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف [illegible] ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں [illegible]"

بستی والے کہنے لگے :

"ہم تو تمہیں اپنے لئے فال بد سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز [illegible] سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک [illegible]"

رسولوں نے جواب دیا :

"تمہاری فال بد اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ باتیں [illegible] کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ [illegible]"

گزرے ہوئے لوگ ہو۔"
اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے" ایک شخص" دوڑتا ہوا آیا اور بولا:
"اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی اختیار کر لو، پیروی کرو ان
لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔ آخر
کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس
کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے۔ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود
بنا لوں؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے
تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ مجھے چھڑا ہی سکتے
ہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا
میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو"
آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ :
"داخل ہو جا جنت میں" اس نے کہا "کاش میری قوم کو معلوم ہوتا
کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی۔ اور مجھے
عزت والوں میں داخل فرمایا" (۳۶ : ۱۳ تا ۲۷)

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ شخص حبیب نجار تھا جو بت بنایا کرتا تھا۔ بعد میں
اس نے رسولوں کے معجزے دیکھے تو اس نے دین حق قبول کر لیا۔ دمشقی نے تو اس
کے بارے میں عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے کہ حبیب نے اپنا کٹا ہوا سر پہلے اپنے
ہاتھ ... اور پھر دائیں ہاتھ پر رکھ لیا اور اس انداز سے ... دن ...
شہر ... گشت کرتا رہا۔ اس کا مقبرہ ابھی تک انطاکیہ میں موجود ہے۔
... لوگ اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ بعض مفسرین نے ان تینوں
... یونس و شمعون ہیں اور بعض کے نزدیک یہ حضرت
عیسیٰ ... تھے لیکن نہ تو قرآن میں کسی بستی کا تعین کیا گیا ہے نہ کسی صحیح
حدیث ... کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسول کون تھے اور
کس زمانے میں بھیجے گئے تھے۔

حبیب بن عبدالملک :
دمشق کے اموی خلیفہ ولید اول کا پوتا۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد وہ شام سے
... فرار اختیار کر کے اندلس چلا گیا تھا۔ جب اس کا چچا عبدالرحمٰن وہاں پہنچا اور اس
نے وہاں اموی خلافت کا دعویٰ کیا تو حبیب نے اس کی حمایت کی۔ ... المصارہ کی لڑائی میں
... کا فیصلہ عبدالرحمٰن کے حق میں ہوا۔ حبیب اس جنگ میں رسالے کا
سپہ سالار تھا۔ فتح حاصل کرنے کے بعد عبدالرحمٰن نے اسے مستقلاً اپنی ملازمت میں
... بعد میں اسے طلیطلہ کی حکومت سونپی گئی۔ جب تک وہ طلیطلہ میں رہا اس شہر میں
بغاوت کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ حبیب نے طلیطلہ کو ان دنوں اپنے گرد و نواح میں
ہونے والی شورشوں کے خلاف کارروائیوں کے لئے ایک مستقر کے طور پر استعمال کیا۔ ۱۶۲ھ/
... میں اسے ایک بار پھر اپنے علاقے میں ہونے والی بغاوت کو کچلنے کیلئے کارروائی
کرنی پڑی۔ یہ بغاوت قائد ... نے برپا کی تھی۔ امیر عبدالرحمٰن الداخل نے اسے ان
خدمات کے صلے میں بڑے انعامات سے نوازا۔ کئی جاگیریں عطا کیں۔ اس کی وفات
پر عبدالرحمٰن نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔
وہ بنو حبیب کا بانی تھا۔ اس خاندان میں اندلس کے بعض مشاہیر اور علماء پیدا
ہوئے۔ ... اس خاندان کی ممتاز ترین شاخ تھے۔

حبیب بن عمرو رضؓ :
(صحابی)، آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے :۔ حبیب بن عمرو بن محسن الانصاری بن ثعلبہ
بن مبذول بن غنم بن مازن بن النجار۔
آپ ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے یمامہ کی جنگ میں شہادت پائی۔ آپ
راستے میں پیدل چلے جا رہے تھے کہ دشمن نے وار کر کے شہید کر دیا۔

حبیب بن مسلمہ : (ا ـــ ؟ ـــ ۴۲ھ/ ۶۶۲ء)
بن مالک القرشی الفہری۔ کنیت ابو عبدالرحمٰن
اسلام کے اولین فاتحین اور قائدین میں سے تھے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف
ہے۔ امام بخاریؒ نے انہیں صحابہؓ میں شمار کیا ہے کیونکہ ان کے بارے میں ایک
روایت ہے کہ وہ نوجوانی کی عمر میں آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حبیب ابوبکرؓ
کے عہد خلافت میں شام کی فتح میں شریک تھے اور غزوہ یرموک میں لشکر کے ایک
حصے کے سپہ سالار تھے۔ بعد میں دمشق جا کر سکونت اختیار کر لی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے
عیاض بن غنم کو معزول کر دینے کے بعد انہیں جزیرے کے علاقے کا والی بنایا تھا۔
پھر ان کی ولایت میں آذربائیجان اور آرمینیہ بھی شامل کر دیئے گئے۔ بعد میں انہیں
معزول کر دیا گیا۔
جنگ صفین میں حبیب حضرت معاویہؓ کے طرفداروں میں شامل تھے اور لشکر
کے بائیں بازو کے سرلشکر تھے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں انہوں نے بزنطینیوں کے
خلاف کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ ان جنگوں میں انہیں اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے
کا خوب موقع ملا۔ شعراء نے ان کی بہادری اور جرأت کی تعریف کی۔ جنگوں میں بہادری
دکھانے کی وجہ سے ان کا لقب "حبیب الروم" مشہور ہو گیا تھا۔
ان کے مقام وفات کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے آرمینیہ اور
بعض نے دمشق کو ان کا مقام وفات بتایا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے دمشق
میں انتقال کیا۔

حبیب بورقیبہ
تونس کے صدر۔ ان کے والد ایک فوجی افسر تھے۔ ۱۹۲۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے
لیے پیرس گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک فرانسیسی عورت سے شادی کر لی۔ ۱۹۲۷ء میں واپس آ
کر وکالت شروع کی اور ۱۹۳۰ء میں "صوت التیونس" اخبار کے ادارے میں شامل
ہو گئے۔ جو دستور پارٹی کا ترجمان تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل ہیں۔
۱۹۳۴ء میں انھوں نے نیو دستور پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اسی برس انھیں سیاسی
سرگرمیوں کی بناء پر نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء رہا ہونے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع
کی۔ ۱۹۳۸ء میں انھیں ملک بدر کر دیا گیا اور ۱۹۴۲ء تک فرانس میں نظر بند رہے
یہاں تک کہ جرمن فوجوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا تو انھیں رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۴۳ء
تک مشرق وسطیٰ کا دورہ کرتے رہے اور تونس کی آزادی کے لیے مدد حاصل کرنے
کی کوشش کی۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں آئینی اصلاحات کے لیے بات چیت کرنے پیرس گئے
مگر گفتگو ناکام رہی۔ چنانچہ تونس واپس آنے پر ۱۸ جنوری ۱۹۵۲ء کو گرفتار کر لیے گئے
اور دوبارہ ملک بدر کر دیا گیا۔ عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا اور تشدد شروع کر دیا
چنانچہ یکم جون ۱۹۵۵ء کو وہ فاتحانہ شان سے وطن واپس آئے کیونکہ فرانس اور
تونس کے درمیان بات چیت کے بعد تونس کو خود مختاری دینے کا معاہدہ ہو گیا تھا

اس لیے انھوں نے دوبارہ "دستور پارٹی" کو منظم کیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے اپریل ۱۹۵۶ء میں انھیں تونس کی نئی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ اسمبلی کے سپیکر تھے چنانچہ انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ اور انھوں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے فرائض سنبھالے ۲۱ر جولائی کو انھوں نے ملک میں بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کیا اور جمہوریہ تونس وجود میں آئی تو حبیب بورقیبہ نئی جمہوریہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے تونس کی حکمران جماعت ۔ دستور سوشلسٹ پارٹی نے صدر حبیب بورقیبہ کو تاحیات تونس کا صدر منتخب کیا۔ وہ حکمران جماعت کے صدر بھی ہیں۔

حبیب بورقیبہ اعتدال پسند ہیں تونس کی آزادی میں اگرچہ وہ فرانس کے بد ترین دشمن تھے لیکن آزادی کے بعد انھوں نے خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں کسی قسم کی تاخیر نہ کی۔

۱۹۵۹ء کے انتخابات نے ان کے اس عہدے کی تصدیق کر دی۔ ۱۹۶۹ء میں وہ تیسری بار ملک کے سربراہ منتخب ہوئے۔

حبیب عجمی : (۔۔۔۔ء ۔۔۔۔ ۱۵۶ھ/۷۷۲ء) ابو محمد کنیت، ایک بزرگ اور مشائخ کبار میں سے ہیں۔ شروع میں آپ بہت زیادہ دولت مند تھے۔ ساہوکار تھے اور مال پر سود لیا کرتے تھے۔ ہر روز قرضداروں کے ہاں تقاضا کرنے جاتے اور جس سے جو لینا ہوتا جب تک مل نہ جاتا اسے نہ چھوڑتے۔ اپنی آمدورفت کا خرچ بھی قرضداروں ہی سے وصول کرتے لیکن ایک واقعہ نے پوری زندگی بدل کے رکھ دی۔ یہ واقعہ مندرجہ ذیل ہے :-

ایک روز آپ کسی مقروض کے ہاں تقاضا کرنے گئے۔ مقروض گھر پہ نہ تھا اس کی بیوی موجود تھی۔ اس نے کہا "میرا خاوند گھر پہ نہیں ہے نہ ہی گھر میں کوئی روپیہ ہے جو ادا کر سکوں۔ ہاں ایک بکری ذبح کی تھی اس کی گردن موجود ہے۔ آپ چاہیں تو وہی لے جائیں"

آپ نے کہا "وہی دے دو" چنانچہ گردن لے کر گھر آئے اور بیوی سے کہا یہ سود میں ملی ہے اسے پکالو۔ بیوی بولی "آٹا اور لکڑی بھی ختم ہے" کہنے لگے "اچھا میں ابھی جا کر دونوں چیزیں بھی سود میں لے آتا ہوں" یہ کہہ کر دوسرے قرضداروں کے ہاں گئے اور ان سے لکڑی اور آٹا بھی سود میں لے آئے۔ بیوی نے گردن پکائی جب کھانا تیار ہو گیا اور کھانے کے لئے بیٹھے تو باہر سے کسی سوالی نے آواز دی۔ "میں بھوکا ہوں کچھ کھانے کے لئے دیا جائے" آپ نے اندر ہی سے اسے جھڑک دیا۔ سائل چلا گیا۔

جب آپ کی بیوی نے سالن میں چمچہ ڈال کر نکالا تو معلوم ہوا کہ وہ خون ہی خون ہے۔ بیوی نے حیران ہو کر شوہر کی طرف دیکھا اور کہا کہ اپنی سختی اور کنجوسی کا نتیجہ دیکھ لو۔ خواجہ عجمی نے ہنڈیا میں خون دیکھا تو حیران رہ گئے۔ دل میں جو چنگاری تھی بھڑک اٹھی اسی وقت اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کر لی۔ اگلے روز جمعہ تھا آپ باہر نکلے تاکہ باری باری سب قرضداروں کے پاس جا کر انہیں سود معاف کر دیں۔ راستے میں بچے کھیل رہے تھے انہوں نے آپ کو دیکھ کر چلانا شروع کیا۔ ہٹ جاؤ حبیب سودخور آرہا ہے ہم پر اس کی گرد پڑ گئی تو ہم بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔ یہ سن کر آپ کے دل پر اور چوٹ پڑی۔ اور اپنا ارادہ ترک کر کے سیدھے خواجہ حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ حسن بصری نے آپ کو نصیحتیں کیں۔ اور توبہ کرائی۔ پھر آپ باہر تشریف لے گئے اور اعلان کر دیا جس کسی کے ذمے میرا کچھ نکلتا ہے وہ آئے اور مجھ سے دستاویز لے جائے۔ چنانچہ قرضدار آتے اور آپ سے اپنی دستاویزیں لے گئے۔ سب مال و اسباب جو آپ کے پاس جمع تھا راہ خدا میں لٹا دیا۔ اب یہ عالم تھا کہ دن میں خواجہ حسن بصری کی مجلس میں تشریف لے جاتے۔ ان سے علم سیکھتے اور معرفت الہی کے رموز سے آگہی حاصل کرتے۔ رات کو علیحدگی میں بیٹھ کر عبادت الہی کرتے۔ صاحب اخبار الصالحین نے آپ کے انقلابی واقعے کو اس طرح درج کیا ہے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں :-

حبیب بن محمد سوداگر تھے اور دراہم کا بیوپار کیا کرتے تھے۔ ایک دن چند لڑکوں کے پاس سے گزرے جو کھیل کود میں مصروف تھے۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے کہا کہ دیکھو سودخور آگیا۔ یہ سن کر آپ نے سر جھکا لیا اور کہا کہ اب بچوں تک پر تو نے میرا حال ظاہر کر دیا ہے۔ جب گھر پہنچے تو ایک صوف کا کرتہ پہن لیا اور تمام مال و اسباب سامنے رکھ کر دعا کی کہ اے پروردگار میں اس مال کے عوض تجھ سے اپنا نفس خریدنا چاہتا ہوں مجھے آزاد فرما دے۔ جب دوسرا دن ہوا تو اپنا تمام مال راہ خدا میں خیرات کر دیا اور عبادت الہی میں مصروف ہو گئے اور صائم الدھر اور قائم اللیل رہنے لگے اور ہر وقت ذکر الہی میں مشغول رہتے۔

ایک روز پھر لڑکوں کے پاس سے گزرے تو لڑکوں نے آپس میں کہا خاموش ہو حبیب العابد آتے ہیں یہ سن کر رونے لگے اور کہا اے اللہ سب تیری طرف سے ہے۔

صاحب مرآۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ آپ سب کچھ راہ خدا میں لٹا دینے کے بعد دریائے فرات کے کنارے ایک مکان بنا کر عبادت میں مشغول ہو گئے دن کو خواجہ حسن بصری سے علم حاصل کرتے اور رات کو عبادت کرتے رہتے۔

روایت ہے جب اس طرح عبادت کرتے ایک مدت گزر گئی تو ایک دن بیوی نے شکایت کی کہ خرچ نہیں ہے۔ ضروریات کیسے پوری کی جائیں۔ آپ نے کہا [illegible] کام پہ جاتا ہوں مزدوری سے جو ملے گا لے آؤں گا۔ چنانچہ آپ دن بھر شہر سے باہر رہ کر عبادت کرتے شام کو واپس گھر آجاتے۔ جب بیوی [illegible] تو کہتے یہ معاملہ کیا ہے تو آپ فرماتے میں کام کر رہا ہوں [illegible] بڑا سخی ہے کہتا ہے کہ وقت آنے پر خود ہی اجرت دے دیا کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ مجھے اس سے مانگتے شرم آتی ہے۔ وہ کہتا ہے دس روز میں مزدوری دیا کروں گا۔ چنانچہ بیوی نے صبر کیا۔ اور جب دسویں روز بھی شام کو خالی ہاتھ [illegible] تو راستے میں سوچ رہے تھے اب بیوی کو کیا جواب دوں گا۔ [illegible] جب گھر پہنچے تو دیکھا عمدہ کھانا تیار ہے۔ بیوی آپ کو دیکھتے ہی بولی "تم کس [illegible] کا کام کرتے ہو جس نے دس دن کی اجرت اس قدر [illegible] بھیجے ہیں۔ یہ بھی کہلا بھیجا ہے کہ کام زیادہ محنت سے کرو [illegible] اجرت [illegible] یہ ماجرا دیکھ کر آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ [illegible] گنہگار بندے کی دس روز کی عبادت کا صلہ دیا۔ اگر زیادہ حضور قلب سے عبادت کروں گا تو نہ جانے کیا کچھ دے گا۔ یہ سوچ کر علائق دنیا سے [illegible] گئے اور ایسی ایسی عبادتیں اور ریاضتیں کیں کہ [illegible] الہی کا نزول شروع ہو گیا۔ اور مستجاب الدعوات کا درجہ مل گیا۔

جب آپ کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تھا تو آپ بہت زیادہ روتے تھے [illegible] نے کہا کہ تم سمجھتے تو ہو نہیں، روتے کیوں ہو؟ فرمایا "میری زبان عجمی ہے مگر دل عربی ہے"

ایک روز امام احمد حنبل اور امام شافعی بیٹھے تھے۔ آپ کا وہاں سے گزر ہوا۔ امام احمد بن حنبل نے کہا ہم آج ان سے ایک سوال کریں گے۔ چنانچہ جب

آپ قریب آئے تو انہوں نے سوال کیا کہ آپ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کی پانچ نمازوں میں سے ایک نماز قضا ہو گئی ہو اور اسے یہ یاد نہ ہو کہ وہ کونسی نماز تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیئے ؟
آپ نے فرمایا ایسے شخص کا دل خدا سے غافل ہے اسے ادب کرنا چاہیئے۔ اور پانچوں وقت کی نماز میں قضا سمجھ کر ادا کرنی چاہیئں۔ امام احمد بن حنبل جواب سن کر حیران رہ گئے۔

تذکرۃ الاولیاء میں آپ کی وفات ۹ رمضان ۱۲۰ھ/ ۷۳۷ء بعہد ہشام بن عبدالملک ہوئی۔ آپ کا مزار بصرہ میں ہے۔ آپ اکابرین طائفہ و عظمائے اولیاء و کبرائے فقہا میں سے تھے۔ جب کبھی دوسرے بزرگان کرام کو کسی مسئلہ میں باہم اختلاف ہوتا تو وہ آپ ہی کو منصف مقرر کرتے تھے۔ آپ کے مشہور اقوال یہ ہیں :-
۱۔ علم کے ساتھ یقین بھی ضروری ہے۔
۲۔ جس دل میں نفاق کا غبار نہ ہو رضا اسی دل میں ہے۔
۳۔ مرید کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے اسے کوئی لگاؤ نہ ہو۔

(۱۳۰۴/ ۱۸۸۶ء — ؟)

حتی : ایک مستشرق

پورا نام ڈاکٹر فلپ کے حتی ہے۔ شملان کے مقام پر لبنان میں پیدا ہوئے۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۸ء میں فارغ ہو کر امریکہ چلے گئے اور کولمبیا یونیورسٹی میں ریسرچ کرتے رہے۔ وہاں سے مشرقی ادبیات و لسانیات میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور وہیں پروفیسر مقرر ہو گئے پہلی جنگ [illegible] ختم ہوئی تو انہیں بیروت کی یونیورسٹی میں طلب کر لیا گیا۔ اور وہ تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء تک وہیں رہے۔ پھر امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں تاریخ عرب کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں انہیں مشرقی ادبیات کے شعبے کا [illegible] بنا دیا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ تمام مناصب سے سبکدوش [illegible] مختلف [illegible] اور [illegible] میں انہیں منفرد حیثیت حاصل ہے۔
[illegible] تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت "تاریخ عرب" کو حاصل [illegible] کا مختصر [illegible] بھی انہوں نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] اور "تاریخ لبنان" "[illegible] ریاست کی ابتداء" ان کی مشہور [illegible]

حج

[illegible] لغوی معنی قصد کرنا، ارادہ کر کے کسی جگہ جانا۔ شرعی اصطلاح [illegible] ہیں مکہ معظمہ میں جا کر بیت اللہ، عرفات، مزدلفہ اور منیٰ وغیرہ کا [illegible] و طواف وغیرہ مناسک حج ادا کرنے اور مقررہ آداب و اعمال بجالانے [illegible] بیت اللہ ہے۔
[illegible] اسلام کے پانچ ارکان بنیادی میں سے آخری رکن ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :
"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔" (۳ : ۹۷)
حج کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو مرکز اجتماع قرار دیا۔ یہ خدا کا پہلا گھر تھا جو نوع انسانی کے لئے قبلہ مقرر کیا گیا۔ قرآن مجید کی رو سے اس کا محل وقوع مکہ

مکرمہ میں ہے۔ ارشاد ربانی ہے :
"یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ تجویز کی تھی...... اور لوگوں کو حج کے لئے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں"۔ (۲۲ : ۲۷)
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لئے حج کرے پس اس میں نہ شہوت کی بات کرے نہ گناہ کرے وہ (گناہوں سے) اس دن کی طرح (پاک صاف) ہو جاتا ہے جبکہ اس کی ماں نے جنا تھا۔ (مشکوٰۃ)
اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا عورتوں کا جہاد حج ہے (مشکوٰۃ)

حج کی حقیقت

حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے۔ یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا۔ اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اس ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لئے اتنے دنوں تک (یعنی احرام کے زمانے میں) سر کے بال نہ منڈواتے ہیں نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں یعنی نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ سلے کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں نہ شکار کرتے ہیں نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں، نہ بیوی سے ہم بستر ہو سکتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ان دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے، دوڑتے ہوئے، خدا کے گھر میں آئے تھے آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کے لبوں پر ہوتا ہے۔
"میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔"
یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور معبدوں میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پہ نذر کرنے چلتے ہیں اس لئے مثل آپ کو سات دفعہ اس بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا و مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑے گئے تھے کہ مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے، وہاں سب دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشائش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، قصور معاف کراتے، روتے اور آئندہ زندگی کے لئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے۔

یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثر دل کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل وصورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار، اب بے آب وگیاہ اور خشک میدان اور جلتے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا مغفرت کی پکار گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی۔ پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی عبودیت، اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اس میدان میں، اس موقع پر اور اسی حالت میں، اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

"میں ہر طرف سے منہ موڑ کر اس طرف منہ کیا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔"

"میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے سے پہلے فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔" (۲۰:۱۶)

حج زمانہ جاہلیت میں

زمانہ جاہلیت میں حج ایک میلہ تھا جو سال کے سال لگتا تھا۔ بڑے بڑے اپنے جتھوں کے ساتھ یہاں آتے اور اپنے پڑاؤ الگ الگ ڈالتے۔ پھر ہر قبیلے کا شاعر یا بھاٹ اور اپنے قبیلے والوں کی بہادری، ناموری، عزت، طاقت اور سخاوت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا اور ہر ایک ڈینگیں مارنے میں دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ دوسرے کی ہجو تک نوبت پہنچ جاتی۔ پھر فیاضی کا مقابلہ ہوتا۔ ہر قبیلے کے سردار اپنی بڑائی جتانے کے لئے دیگیں چڑھاتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اونٹ پر اونٹ کاٹتے چلے جاتے۔ اس فضول خرچی سے ان لوگوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ

خانہ کعبہ میں حج کا ایک روح پرور منظر

اس میلے کے موقع پر ان کا نام سارے عرب میں اونچا ہوجائے۔ اور یہ چرچے ہوں کہ فلاں صاحب نے اتنے اونٹ کاٹے اور فلاں صاحب نے اتنے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ ان مجلسوں میں راگ رنگ، شراب خوری، زنا اور ہر قسم کی فحش کاری خوب دھڑلے سے ہوتی تھی اور خدا کا خیال مشکل ہی سے کسی کو آتا تھا۔ کعبے کے گرد طواف ہوتا تھا مگر اس طرح کہ عورت مرد سب ننگے ہو کر گھومتے اور کہتے کہ ہم اسی حالت میں خدا کے سامنے جائیں گے جس میں ہماری ماؤں نے ہمیں جنا ہے۔ ابراہیمؑ کی مسجد میں جو عبادت ہوتی تھی، وہ ایسی ہوتی تھی کہ تالیاں پیٹی جاتیں، سیٹیاں بجائی جاتیں اور سنکھ پھونکے جاتے۔ خدا کا نام بھی پکارا جاتا تھا مگر کس شان سے؟ کہتے تھے "میں حاضر ہوں۔ میرے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔ مگر وہ جو تیرا ہونے کی وجہ سے تیرا شریک ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور اس کی ملکیت کا بھی مالک ہے۔ خدا کے نام پر قربانیاں کرتے تھے، مگر کس بدتمیزی کے ساتھ؟ قربانی کا خون کعبہ کی دیواروں سے لتھیڑا جاتا اور گوشت دروازے پر لٹکایا جاتا اس خیال سے کہ نعوذ باللہ یہ خون اور گوشت خدا کو مطلوب ہے۔

اسلام نے جاہلیت کے ان تمام طریقوں کی اصطلاح کی اور صحیح انبیاء کے طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو:

۱۔ عاقل ہو، مجنوں مکلف نہیں
۲۔ بالغ ہو، بچوں کے لئے ضروری نہیں۔
۳۔ اس کے پاس اتنا مال ہو جو نہ صرف اس کے مصارف حج کے لئے کافی ہو بلکہ ان تمام افراد کے لئے کافی ہو جن کے معاش کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہے۔
۴۔ تندرست اور صحت مند ہو اور اس کے بدن میں اتنی طاقت ہو کہ حج کا سفر کر سکے۔ اور احکام بجا لا سکے۔
۵۔ اس کے لئے راستہ پُرامن ہو۔
۶۔ ذریعہ سفر میسر ہو، خواہ بحری، خواہ ہوائی۔
۷۔ کوئی عمل روک ٹوک اور بندش نہ ہو مثلاً حکومت وقت نے حج کو جانے والوں کی تعداد مقرر کر رکھی ہو اور اس میں اس کا نام نہیں آسکا یا روپیہ تو موجود ہے۔ زرمبادلہ میسر نہیں۔ چنانچہ جو شخص یہ تمام شرائط پورا کرتا ہو تو امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس شخص پر اسی وقت حج ہو جاتا ہے اور امام شافعی نے تاخیر کرنے والے کو گنہگار قرار دیا ہے۔

چونکہ حج کے لئے کافی روپیہ، مشقت اور وقت درکار ہے اور اگر تمام احکام محفوظ رکھ کر صحیح طور پر حج کر لیا جائے تو ساری عمر کے لئے کافی تربیت ہو جاتی ہے اس لئے شریعت نے عمر بھر میں ایک ہی دفعہ حج فرض قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سے زائد حج کرتا ہے تو یہ اس کے لئے نفلی حج ہوگا۔

حج کے معین ایام صرف چھ ہیں۔ یعنی اسلامی قمری تقویم کے مطابق آٹھ ذوالحجہ سے لے کر تیرہ ذوالحجہ تک بلکہ ضرورت اور مجبوری ہو تو گیارہ ذوالحجہ تک بھی۔ لیکن اس کا احرام یکم شوال سے آٹھ ذوالحجہ تک جب چاہیں باندھا جا سکتا ہے۔

مواقیتِ حج

شریعت نے اطراف عالم کے لئے چند مقامات متعین کر دیئے ہیں کہ جو شخص حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جانا چاہے وہ ان مقامات سے بغیر احرام باندھے نہ گزرے گویا یہ مقامات ہی وہ حدود ہیں کہ یہیں سے ظاہری طور پر بھی تذلل انکسار اور تواضع کی حالت ضروری ہے۔ ان مقامات کو اصطلاح میں مواقیت کہتے ہیں۔ ان کی تعداد پانچ ہے۔

۱۔ **یلملم**: ایک پہاڑی کا نام ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہے۔ یہ پاکستان ہندوستان اور یمن وغیرہ کی طرف سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا حج سے پہلے مدینہ جانے کا ارادہ ہو تو اسے چاہیے کہ یلملم سے احرام نہ باندھے بلکہ جدہ اتر کر مدینہ منورہ احرام کے بغیر چلا جائے پھر وہاں سے واپسی پر مدینہ منورہ کے میقات یعنی ذوالحلیفہ سے احرام باندھے۔
۲۔ **جحفہ**: یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک بستی تھی۔ جو اب موجود نہیں اس وقت اس کے قریب ایک اور بستی ہے جسے رابغ کہتے ہیں۔ یہ جگہ مکہ مکرمہ سے جانب شمال تقریباً ایک سو چالیس کے فاصلے پر ہے اور مصر شام طرابلس اور یورپ وغیرہ سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔
۳۔ **ذات عرق**: یہ عراق والوں کا میقات ہے۔
۴۔ **قرن المنازل**: یہ بھی ایک پہاڑ کا نام ہے جو عرفات کی طرف واقع ہے۔ یہ نجد والوں کا میقات ہے اسے مخفف کر کے صرف "قرن" بولتے ہیں۔
۵۔ **ذوالحلیفہ**: اس جگہ کو آج کل بئر علی کہتے ہیں۔ یہ مدینے سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے یہ مدینے والوں کا میقات ہے۔ مکہ سے بعید ترین میقات یہی ہے۔

آنحضورؐ نے یہ میقات ان اطراف کے لئے مقرر کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ میقات ان ملکوں کے لئے اور جو شخص یہاں سے یا ان ملکوں سے گزرے جو ان کے آس پاس یا آمنے سامنے میں پڑتے ہیں اور اس کی نیت حج کرنے کی ہو تو اس پر فرض ہے کہ یہاں سے بغیر احرام باندھے نہ گزرے۔ جو ان مواقیت کے اندر رہتے ہیں وہ اپنے گھروں سے احرام باندھیں حتیٰ کہ جو لوگ مکے میں رہتے ہیں وہ اپنے گھروں ہی سے احرام باندھیں۔

ارکان حج

احرام: جس طرح نماز کے لئے تکبیر اس کی نیت کا اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے۔ اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔ نیز دیکھئے "احرام"۔

طواف کرنا

خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعا مانگنا۔ اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھر کر ادا کی جاتی ہے چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے ..... اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت کی دعائیں کرتا ہے

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے اس لئے آنحضورؐ نے فرمایا کہ "خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو۔" (ترمذی و نسائی) (نیز دیکھئے "طواف")

حجر اسود کا استلام

یہ ایک کالا پتھر ہے جو کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہوا ہے۔ جس کی طرف رخ

کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا۔ اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشے کا نام "رکن شامی" ہے۔ اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے شروع شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں سینے سے بھی لگا سکتے ہیں ہاتھ یا کسی لکڑی یا کسی اور چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں۔ (نیز دیکھیے "الاسود، حجر")

سعی

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں جو اب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پہ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور بیٹے کی جگہ مینڈھا قربانی کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا یہ صفا و مروہ کی سعی ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔ بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اور دعا مانگتے ہیں۔ پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہ کو نظر آئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اس پہ اس کا طواف کرنا گناہ نہیں (۲: ۱۵۸)

وقوف عرفہ

عرفات میں نویں ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اور اصل حج اسی کا نام ہے اگر اس دن کوئی شخص عرفات میں نہ پہنچ سکے تو اس کا حج نہیں ہوتا۔ یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے۔ اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا یہ نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے۔ ہر شخص کو داہنے بائیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے اس لیے انھوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا۔ اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے۔

"تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام

شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک میدان کو اس لیے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں۔ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"خدا کو گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔" (۲: ۲۰۳)

کیونکہ جاہلیت کے دور میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخر کیا کرتے تھے جو اکثر لڑائی جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس بے ہودہ رسم کے رد کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کے مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف محبت، مساوات، یک جہتی کا مقام قرار دیا جائے۔

قربانی

یہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں۔

یہ قربانی ان لوگوں کے لیے ہے جو حج اور عمرہ بصورت قِران یا بصورت تمتع ادا کریں اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہے

حلقِ راس

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈا دیتے ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا ارشاد چھپا ہے۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

رمی جمار

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں حاجی خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں آنحضورؐ نے ایک حدیث میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ کنکریاں پھینکنے سے مقصود اس بہانے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں (مشکوٰۃ) (نیز دیکھیے "جمرہ")

ذوالحجہ کی گیارھویں تاریخ کو جسے یوم النفر الاول کہتے ہیں۔ اس دن سورج ڈھلنے کے بعد جمرہ اولیٰ کے پاس آکر جسے جمرہ دنیا بھی کہتے ہیں۔ سات کنکریاں ماری جائیں اور پھر کعبے کی سمت کر کے منہ اٹھا کر دعا مانگی جائے آنحضورؐ نے اس جگہ پون گھنٹے تک مانگی تھی۔ اس کے بعد جمرہ وسطیٰ میں آجائے وہاں بھی اسی طرح سات

کنکریاں مارے اور اسی طرح تقریباً اتنی دیر دعا میں صرف کیا جائے۔ اس کے بعد جمرۂ عقبیٰ میں آجائے اور یہاں بھی اسی طرح کنکریاں مارے یہ رمی جمار سورج ڈھلنے سے لے کر شام تک کسی وقت کی جا سکتی ہے۔

ذوالحجہ کی بارہویں تاریخ کو یوم التشریق الثانی کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام یوم النفر الاول بھی ہے کیونکہ اس دن حاجت مند حج کے مناسک ختم کرکے مکہ واپس جا سکتے ہیں۔ اس روز بھی سورج ڈھلنے کے بعد سے لے کر شام تک پہلے روز کی طرح تینوں جمروں پر کنکریاں پھینکی جائیں۔

ذوالحجہ کی تیرھویں تاریخ کو یوم التشریق الثالث کہتے ہیں اس کا دوسرا نام یوم النفر الثانی ہے پہلے دو دنوں کی طرح اس دن بھی تینوں جمروں پر رمی جمار کی جائے اور پھر مکہ مکرمہ کو واپسی ہو۔ یہ حج کے مناسک کا اختتام ہے۔

حج کے آداب

شریعت کے ہر حکم اور اسلام کے ہر رکن کے ساتھ کچھ آداب بھی وابستہ ہیں چنانچہ حج کے آداب یہ ہیں۔

حج کا ارادہ کرنے سے پہلے استخارہ کر لینا چاہیئے حج کے لیے نیت خالص ہونی چاہیئے۔ ریا کا دخل، حاجی اور الحاج کہلانے کا اشتیاق اور دیگر فاسد ارادے نہ ہوں۔

راستے کا خرچ ساتھ ہو پیچھے اہل و عیال کے اخراجات کا پورا بندوبست ہو محض توکل پر چل دینا ہر شخص کا کام نہیں مال حلال ہونا چاہیئے۔ رشوت، چوربازاری اور ظلم سے حاصل کیا ہوا مال نہ ہو۔ روانگی سے قبل دو رکعت نماز نفل ادا کرنا چاہیئے اور کچھ صدقہ وخیرات دینا چاہیئے دو یا دو سے زیادہ ہم سفر ہوں تو کسی دیندار، تجربہ کار اور متحمل مزاج آدمی کو اپنا امیر بنا لینا چاہیئے۔ حج کا تمام سفر ذکر الٰہی، تہلیل، تحمید، تسبیح، استغفار، دعا، تلاوت قرآن اور انابت الی اللہ میں صرف ہونا چاہیئے۔

حج کے لیے ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو۔ وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے کسی کو تکلیف نہ دے یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے۔ شکار تک اس کے لیے جائز نہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے۔ مناسک حج ادا کرتے وقت کسی کو دھکیلا نہ جائے، گرایا نہ جائے اور کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور وہ وقت سامنے رکھا جائے جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے تسلیم و رضا کی مثالیں پیش کی تھیں۔ اسلام کی آواز حق سرزمین سے بلند ہوئی تھی اور صحابہ کرام نے کمال صبر و اطاعت کا نمونہ بھی دکھایا تھا۔

حج کی ابتداء :

حج ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے اور ان عبادات کی یادگار ہے جو حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر آں حضورؐ تک کسی نہ کسی شکل میں مختلف اقوام میں موجود تھیں۔ اور "اپنے حقیقی معنوں میں حج کی اصلیت ہر قوم میں موجود ہے۔" ہر ایک قوم اور اہل ملک کے ہاں ایک جگہ ہوتی ہے جسے وہ متبرک خیال کرتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر وہ مناسک اور آداب زیارت بجا لاتے اور قربانیاں کرتے ہیں جو ان کے اسلاف سے منقول ہیں۔

حج میں بیت اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "یہ دنیا میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔" (۳ : ۹۶)

چنانچہ بیت اللہ کے ساتھ زمانہ قدیم سے روحانی عقیدتیں وابستہ رہی ہیں۔

بقول ابن اسحاق اور المسعودی ایک مرتبہ جب قوم عاد پر قحط مسلط ہوا تو وہ ایک وفد کی صورت میں بیت اللہ آئے اور یہاں انہوں نے دعائیں کیں۔

طبرانی کی روایت کے مطابق آں حضورؐ نے فرمایا۔ مسجد خیف میں ستر انبیاء نے نماز پڑھی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ بیت اللہ کا حج ستر انبیاء نے کیا۔ اسی قسم کی اور دوسری روایات جن کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے روحانی وابستگی تاریخ کا ایک قدیم واقعہ ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں :

آں حضورؐ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اس کا ایک ایک مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے۔ چنانچہ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی اسی قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں۔

۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا مولد و مسکن ہو۔

۲۔ حضرت ابراہیم نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر بے نشان نہ ہو جائے۔ اور آخر میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

۳۔ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں۔ اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو اس بے ثمر اور شور زمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۴۔ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کرنا ہر قریب اور دور کے راستے سے لوگ لبیک کہیں گے۔ تاکہ یہاں آکر دین و دنیا کا کوئی فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں داخل ہوتے ہیں۔ جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں۔ اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس میں ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں۔ اور ایک ہی بولی میں خدا سے عبادت کرتی ہیں۔ یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اس معنی میں اللہ کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کرکے ان تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں اسے خداوندا تو ان کے گناہ معاف کر تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶۔ خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب اور مظہر اور میرے راستے پر چلے اس لئے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

اس حج کے مناسک احکام اور ہدایات، طبیعتوں میں حوصلہ، صبر، تواضع تعاون، شفقت اور سادگی پیدا کرنے کے لئے ایک روحانی وجسمانی تربیت اور اصلاحی مشق ہے۔

حج کی قسمیں

حج قران :

حج قران یہ ہے کہ انسان احرام باندھتے وقت حج وعمرہ دونوں کی اکٹھی نیت کرے اور کہے اللّٰھم لبیک

بالحج والعمرۃ

"اے اللہ! میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے حاضر ہوں۔"

نیز یہ کہ اختتام عمرہ و حج احرام نہ کھولے۔ جیسا بھی موقع ہو۔ خواہ عمرہ پہلے کرے خواہ حج۔

آں حضورؐ نے حج قرآن کی نیت کی تھی لیکن امت کے لئے آپ کو حج تمتع پسند تھا۔

حج تمتع : حج تمتع یہ ہے کہ انسان احرام باندھتے وقت حج اور عمرہ دونوں کی نیت کرے لیکن یا تو پہلے مرحلے پر صرف یہ کہے **اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ بِالْعُمْرَۃ** (اے اللہ میں عمرے کے لئے حاضر ہوا ہوں) پھر عمرہ کرکے سر منڈوانے کے بعد احرام کھول دے اور پھر اس کے بعد یوم عرفہ یعنی حج سے ایک دن پہلے حج کا احرام یوم الترویہ ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو باندھے اور **اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ بِالْحَج** ۔ (یا اللہ میں حج کے لئے حاضر ہوا ہوں) کہہ کر حج کے مناسک ادا کرے یا اسی طرح پہلے حج کرے اور پھر عمرہ کرے۔ حج تمتع کا یہ طریقہ ہے کہ میقات سے حج تمتع کا احرام باندھ کر روانہ ہو جائے اور راستے بھر کثرت سے دعائے استغفار اور ذکر الٰہی کرتا رہے اور مکہ مکرمہ پہنچنے کے ساتھ ہی وضو کرے اور عمرہ کرکے احرام کھول دے۔ احرام کھول دینے کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن ذکر الٰہی میں ہر وقت مصروف رہنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ساتویں ذوالحجہ سے مناسک حج شروع ہوتے ہیں جو ایک ہفتے میں ختم ہوتے ہیں۔

حج منفرد : حج قرآن یا حج تمتع کی نیت کر لینے کے بعد اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صورت کے سوا کہ آدمی نے حج تمتع کی نیت کی ہو۔ اور پھر اس کا خیال ہو کہ میں حج قرآن کروں تو وہ طواف عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج قرآن کی نیت کر سکتا ہے۔ اس میں فقہا میں سے کسی کو اختلاف نہیں۔

حجاب : چھپنا چھپانا، نظر سے پوشیدہ ہونا، رکاوٹ، اوٹ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ سات بار آیا ہے۔ بعض آیات میں اس کا مفہوم آڑ یا کوئی ایسی شے ہے جو نظروں سے ایک دوسرے کو پوشیدہ رکھے۔ یا طرفین کو کسی حائل شے کے ذریعے علیحدہ علیحدہ کر دے مثلاً

"مریم نے اپنے آپ کو گھر والوں سے الگ کر لیا۔ (۱۹ : ۱۷)

قیامت کے دن ناجیوں اور مستحقین عذاب کے مابین حجاب۔

"جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ جس میں سے ایک دروازہ ہوگا۔" (۵۷ : ۱۳)

"یہ کسی انسان کو نصیب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بات کرے مگر وحی کے ذریعے کے سوا یا ایک حجاب کے پیچھے سے۔" (۴۲ : ۵۱)

"میں نے دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے یہاں تک کہ سورج چھپ گیا اوٹ میں۔" (۳۸ : ۳۲)

ایک حدیث میں موت کو بھی حجاب قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں حجاب پردے کے دستور یا حکم کی بنیاد قرآن کی آیات پر ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے "پردہ")

حجاب سے مراد وہ پردہ بھی ہے جس کے پیچھے بیٹھ کر خلفاء اور حکمران اپنے آپ کو دوسروں کی نظر سے وقار کی خاطر پوشیدہ کر لیتے تھے۔ یہ دستور اسلام میں بنو امیہ نے ساسانی تمدن کے زیر اثر داخل کیا۔ جس نے بعد میں ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی چنانچہ حاجب کا منصب وضع کیا گیا۔

(نیز دیکھئے "حاجب")

حجاب تصوف کی اصطلاح میں صوفیوں کے نزدیک ہر وہ چیز ہے جو مقصود حقیقی پر پردہ ڈال دے۔ یعنی ہر وہ چیز جس کی وجہ سے انسان حقیقت ربانی محسوس کرنے کے قابل نہ رہے۔

حجاب ایک پردہ ہے جو سالک اور اس کی خواہش کے مابین یا جیسے نشانچی اور اس کے نشانے کے درمیان حائل کر دیا جائے۔ جو دل پر مادی دنیا کی صورتوں کے نقش سے پیدا ہوتا ہے جو حق کے حضور میں مانع ہوتی ہیں۔ چنانچہ محجوب وہ شخص ہے جس کا قلب اللہ کے نور کے لئے بند ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آگاہی پر حسی یا ذہنی جذبات کا غلبہ ہے۔

بقول حلاج: "تمہارا حجاب تمہاری حرص و ہوا ہے۔"

محجوب ہو جانے کے بہت سے اسباب ہیں۔ بقول علی ہجویری انسان کی طبعی خواہشات کو جتنی بھی غذا دی جائے اس کی جبلت اتنی ہی طاقت ور ہو جاتی ہے اور حرص و ہوا اس کے اعضا میں بے روک ٹوک پھیل جاتی ہے اور ہر رگ میں ایک مختلف پردہ وجود میں آ جاتا ہے۔

حجاب کی ضد کشف ہے۔ علائق دنیا سے صوفیا کا قطع تعلق بھی حجاب کہلاتا ہے۔ اس کے معنی تعویذ بھی ہے جو اپنے پہننے والے کو ہر قسم کی تکلیف اور گزند سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اس کے کاموں میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

حجاج بن یوسف : (۴۱ھ/۶۶۱ء — رمضان ۹۵ھ/۷۱۴ء)

بنو امیہ کا ایک بہترین اور لائق ترین گورنر۔ اموی دور کا ایک بڑا سیاست دان۔ قبیلہ بنو ثقیف کی شاخ احلاف سے تھا۔ طائف میں پیدا ہوا۔ حجاج ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ جن کا ذریعہ معاش سنگ برداری اور معماری تھا۔ اس کی والدہ قبیلہ بنو ثقیف سے تھی اور مغیرہ بن شعبہ کی مطلقہ بیوی تھی جسے حضرت امیر معاویہ نے کوفے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ جوانی کے زمانے میں وہ طائف میں ایک مدرس تھا۔ اس نے مدینہ کے الحرہ اور الربذہ کی لڑائیوں میں جو ۶۵ھ/۶۸۴ء میں ہوئیں۔ یا تہامہ میں تبالہ کے گورنر کی حیثیت سے قابل ذکر خدمات سرانجام دیں۔

حجاج خلیفہ عبدالملک کے ابتدائی عہد میں طائف سے دمشق آیا۔ جہاں خلیفہ کے وزیر ابو زرعہ روح بن زنباع الجذامی نے اس کی ذہانت دیکھ کر اپنی پولیس میں ملازم رکھ لیا۔ اس نے جلد ہی خلیفہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ اور خلیفہ نے اسے سپہ سالار افواج مقرر کر دیا۔

حجاج کی قیادت میں سب سے پہلی لشکر کشی عبداللہ بن زبیر کے خلاف ہوئی جو حجاز میں خلافت کے دعویدار تھے۔ چنانچہ ۷۲ھ/۶۹۱ء میں دیر جاثلیق یا مسکن کے مقام پر مصعب کے خلاف فتح کے بعد سن ... میں وہ دو ہزار شامیوں کو لے کر عبداللہ ابن زبیر کے مقابلے کے لئے کوفے سے مکہ روانہ ہوا۔ اس نے طائف پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا اور بعد میں اسے اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ خلیفہ نے حکم دیا تھا کہ سب سے پہلے وہ عبداللہ ابن زبیر سے مذاکرات کرے لیکن اگر مخالفت جاری رہے تو محاصرہ کر کے اس کی رسد بند کر دے۔ لیکن اس ...

شہر میں کسی صورت میں بھی خونریزی نہ کی جائے۔ جب گفت وشنید ناکام ہوگئی تو حجاج نے خلیفہ سے مکہ مکرمہ کو بزور شمشیر فتح کرنے کی اجازت مانگی اور کمک بھی طلب کی۔ جب اسے ان دونوں باتوں کی اجازت مل گئی تو اس نے جبل ابوقبیس پر پتھر برسائے چونکہ عبداللہ ابن زبیر نے اسے طواف اور سعی کی اجازت نہ دی تھی۔ اس لئے اس نے ناراض ہو کر خانہ کعبہ اور حاجیوں پر بھی پتھر برسانے سے دریغ نہ کیا۔ چنانچہ محاصرے کے سات مہینے گذر جانے کے بعد جب ابن زبیر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ کے قریب لڑائی میں شہید ہو گئے اور مکہ پر بھی حجاج کا قبضہ ہو گیا تو عبدالملک نے اس کو حجاز، یمن اور یمامہ کی گورنری عطا کر دی۔

۷۳ اور ۷۴ھ / ۶۹۳ء میں گورنر حجاج نے خود فوج کی قیادت کی اور خانہ کعبہ کو اس کی اصل بنیادوں پر تعمیر کے لئے اخراجات مہیا کئے۔ اس نے حجاز میں بڑی سختی کے ساتھ امن وامان بحال کیا لیکن وہ بڑا سخت طبیعت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ کو اکثر مداخلت کرنی پڑتی تھی۔

۷۵ھ / ۶۹۴ء میں حجاج کو عراق کا گورنر مقرر کیا گیا کیونکہ خارجیوں کی مسلسل سازشوں کے باعث عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم اور ذمے دار انتظامی عہدہ تھا۔ حجاج نے ۳۳ سال کی عمر میں یہ گورنری سنبھالی۔ سب سے زیادہ اہم کام کوفے اور بصرے کے دستوں میں نظم وضبط بحال کرنا تھا۔ چنانچہ حجاج نے دھمکی دی کہ جو سپاہی تین دن کے اندر اندر واپس نہ آیا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کی جائداد اور مال ومتاع لوٹ لیا جائے گا۔ یہ تدبیر بڑی کارگر ہوئی اور سپاہی اپنے خیموں میں آگئے۔ ان میں تنخواہیں تقسیم کرنے کا کام حجاج نے خود سنبھالا تاکہ ایک خطرناک بغاوت کچلی جا سکے جس کی قیادت ابن الجارود کر رہا تھا۔

اسی زمانے میں حجاج اور حضرت انس ؓ بن مالک ؓ کے درمیان ایک جھگڑا ہوا جو خلیفہ کی مداخلت سے حضرت انس ؓ کی اخلاقی فتح پر ختم ہوا۔ عراق سے خارجیوں کے خطرے کے ختم ہو جانے کے بعد حجاج کو ۷۸ھ / ۶۹۷ء میں خراسان کا انتظام مہلب کو سونپا اور سجستان کی طرف جسے زیر نو مطیع کرنا تھا۔ عبدالرحمن بن الاشعث کو ایک مسلح فوج جیش الطواویس کا قائد بنا کر بھیجا۔ ابن الاشعث نے یہ مہم بڑی احتیاط سے اور احکام کے مطابق چلائی لیکن حجاج نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور اس نے کئی ایک خطوط میں ابن الاشعث کو حکم دیا کہ وہ بلا تاخیر پیش قدمی کرے اور دھمکی دی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو قیادت اس کے بھائی اسحاق کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ ابن الاشعث نے اپنے بڑے افسروں سے مشورہ کیا اور اس نے ایک فوج لے کر جس کی تعداد جلد ہی ایک لاکھ ہو گئی حجاج کے خلاف چڑھائی کر کے کوفے اور بصرے پر قبضہ کر لیا اور بصرے کے نواح میں گورنر حجاج کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ۸۲ھ / ۷۰۱ء میں ابن الاشعث دیر الجماجم اور مسکن میں دجیل پر فیصلہ کن شکست اٹھانی پڑی۔)

چنانچہ حجاج کے خلاف عراق کے عربوں کی یہ آخری بغاوت تھی۔ حجاج نے اس بغاوت کو دبانے اور کردی و دیلمی زمینداروں کو کچل دینے کے بعد امن وامان قائم کر لیا تو اس نے ملک پر شامی فوج کی حکومت کو مضبوط کر لیا۔

۸۳ھ / ۷۰۲ء میں اس نے کوفے اور بصرے کے درمیان قلعہ بند شہر واسط تعمیر کرایا۔ یہاں خود سکونت اختیار کی اور بیشتر شامی فوج کو یہیں منتقل کر دیا۔ تاکہ لوگوں کو شامیوں کی لوٹ مار سے محفوظ کر سکے۔ چنانچہ اب حجاج خراسان کے سوا تمام اسلامی مشرق کا حکمران تھا۔

عبدالملک کے بعد جب ولید تخت نشین ہوا تو اس نے ہر معاملے میں حجاج کو کھلی چھٹی دے دی۔ وہ اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ کیونکہ حجاج نے عبدالعزیز بن مروان کے دعوے کے خلاف عبدالملک کو اس کی جانشینی کے لئے آمادہ کیا تھا۔ نیز مشرق میں ولید کی شاندار فتوحات بھی حجاج ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ حجاج نے قتیبہ بن مسلم مجاعہ بن سعر اور محمد بن قاسم کی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ان ممتاز سپہ سالاروں کو مختلف مقامات پر متعین کیا۔ چنانچہ قتیبہ بن مسلم نے ماوراء النہر کو مجاعہ بن سعر نے عمان کو اور محمد بن قاسم نے ہندوستان کو فتح کیا۔ اگرچہ حجاج نے ان مہمات میں خود حصہ نہ لیا لیکن وہ ان کے لئے بڑی احتیاط سے تیاری کرتا تھا۔ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے بھاری سے بھاری اخراجات کو بھی بطیب خاطر برداشت کرتا۔

حجاج ملک کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لئے بڑا فکر مند تھا جو بیس سالہ جنگ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ زراعت کو ترقی دینے میں بھی حجاج نے بہت کوششیں کیں۔ اس نے بشار بن مسلم جیسے ممتاز عربوں کو جاگیروں کے طور پہ غیر مزروعہ اراضی عطا کیں دیہاتی لوگوں کے شہروں میں انتقال کے خلاف جس کی وجہ سے خراج میں تباہ کن کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس نے مزید اقدامات کئے اور نومسلموں کو مجبور کیا کہ وہ ان کھیتوں میں واپس جائیں جنہیں وہ چھوڑ کر آئے تھے

قرآن مجید کے نسخوں میں یکسانیت پیدا کرنا بھی اس کا منتہائے مقصود تھا اس کی خواہش تھی کہ ایک طرف تو قرآن حکیم کی مختلف قراتوں کے بارے میں متکلمین کے جھگڑوں کو ختم کیا جائے اور ایک ہی متن مقرر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کی علیحدہ علیحدہ اجزاء یا پاروں میں تقسیم اس کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ نیز قرآن کے اعراب بھی اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اس نے عبدالملک کی مالی اصلاحات کے سلسلے میں خالص عربی سکے ڈھلوانے شروع کئے جو رفتہ رفتہ بزنطی سکوں پر غالب آگئے۔ حجاج نے ۵۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ کام کی کثرت، خطرے اور مایوسی کی وجہ سے جس کا اسے سامنا پڑا۔ وقت سے پہلے ہی بوڑھا اور ضعیف ہو گیا تھا۔ وہ واسط میں دفن ہوا۔

المسعودی کے بقول اس کی موت کا سبب معدے کا سرطان تھا۔ اس کی قبر کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے اس کی قبر کے آثار مٹا دیئے گئے تھے۔ اس کی موت پر صرف چند لوگوں نے آنسو بہائے۔ حجاج نہایت ظالم گورنر تھا۔ اگرچہ اس کا دامن سیرت ظلم وتشدد کے داغوں سے آلودہ ہے لیکن اس کے مابہ الامتیاز محاسن کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ وہ ایک بے بدل سپہ سالار تھا۔ مشرقی فتوحات میں اس کا کمال سیاست دانی کارفرما تھا وہ ایک فصیح البیان قرآن کریم کا حافظ اور بلند پایہ قاری تھا۔ کلام اللہ پر اعراب لگوانے کی اولیت کا سہرا اس کے سر ہے۔ غیر عرب علاقوں میں عربی زبان کو دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کرنا حجاج کی ایک سیاسی دوراندیشی تھی۔ حجاج بنو امیہ کا سب سے زیادہ وفادار خادم تھا۔ اس کی اطاعت شعاری اور جذبہ خدمت گذاری کی کوئی انتہا نہ تھی اور اموی خلفاء نے بھی اس کا صلہ بے دریغ عنایات کے ساتھ دیا۔

حجاز : جزیرہ العرب کا شمالی مغربی حصہ سعودی عرب کا مغربی صوبہ جو بحر قلزم کے ساتھ مغربی ساحل پر واقع ہے۔ آں حضور ؐ کا وطن مالوف مسلمانوں کا روحانی مرکز، لفظی معنی وہ چیز جو دو چیزوں کو جدا کرے چونکہ یہ حصہ بھی نجد اور تہامہ کے درمیان حائل اور حاجز ہے اس لئے اسے بھی حجاز کہتے ہیں۔ حجاز کا علاقہ شمال میں فلسطین تک چلا جاتا ہے۔ جنوب میں کسی وقت حجاز کی سرحد یمن سے ملتی تھی لیکن زمانہ حال میں دونوں کے درمیان عسیر کو حائل کر دیا گیا۔ عام طور پر حجاز کو ان تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شمالی حصّہ
۲۔ وسطی حصّہ
۳۔ جنوبی حصّہ

شمالی حصّہ سعودی عرب اور اردن کی درمیانی سرحد تک چلا گیا ہے۔ جو العقبہ کے جنوب میں ایک نقطے سے شروع ہوکر الطبیق کے پہاڑی سلسلے کے اوپر تک چلی گئی ہے چونکہ اسرائیل نے خلیج عقبہ کے ایک مقام پر قبضہ کرلیا ہے اس لئے حاجیوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ قدیم خشکی کے راستے سے جو سینا سے عقبہ ہوتا ہوا جاتا تھا آ جا سکیں۔ حجاز کی چھوٹی بندرگاہوں میں خلیج عقبہ پر واقع حقل اور مقنا ہیں اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر المویلح، ضبا، الوجہ اور املج ہیں۔ چھوٹے چھوٹے راستے الوجہ سے گذرتے ہوئے اندرونی بڑی سڑک سے العلا پر یا اس کے قریب مل جاتے ہیں۔ شمالی حصّے میں زیادہ تر آمد و رفت ان راستوں پر رہی ہے جو اسرات کے مشرق میں واقع ہیں۔

وسطی حصّہ تاریخ اسلام کے نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس حصّے کے حدود یہ ہیں۔ جنوب میں وہ علاقے جو طائف، مکّہ اور جدہ کے نواح میں ہیں۔ اور شمال میں وہ علاقے جو مدینہ اور ینبوع کے نزدیک ہیں۔ قدیم سڑک طائف سے شروع ہوکر شمال کی سمت النخلہ الیمانیہ کی وادی تک جاتی تھی۔ جہاں سے نیچے اتر کر وہ مکّے کی جانب چلی جاتی تھی۔ اس وادی میں قرن المنازل واقع تھا۔ جو جنوبی نجد اور عمان سے آنے والے حاجیوں کے لئے میقات میقات کا کام دیتا تھا۔ موجودہ میقات اسی وادی میں السیل الکبیر کہلاتی ہے۔

النخلہ الشامیہ میں ذات العرق تھا۔ جو ان حاجیوں کے لئے جو شمال نجد اور عراق سے درب زبیدہ کے ساتھ ساتھ آتے تھے اس سمت میں ذات العرق کا ذکر حجاز کی حد کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اب پہاڑوں میں سے ایک پختہ راستہ بل کھاتا ہوا براہ راست طائف سے مکّے جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کرنے والے دو راستوں میں سے ایک راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ الارب السلطان ساحل کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ اور دوسرا الارب الشرقی بڑے حرے کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ مکّے کے باہر تین گھنٹے کی مسافت پر بمقام سرف ام المومنین حضرت میمونہ کا مقبرہ اور مسجد تھی۔ وادی فاطمہ کے شمال میں یہ سڑک عسفان میں سے گذرتی ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آنحضورؐ نے بنو لحیان پر حملہ کیا تھا۔ قدیمہ کے تھوڑے ہی فاصلے پر سمندر نظر آتا ہے۔ رابغ اگرچہ ساحل سمندر پر واقع تھا لیکن باقاعدہ بندرگاہ نہ تھی۔ رابغ ان حاجیوں کے میقات کی حیثیت سے جو خشکی کے راستے شام، مصر اور مغرب سے آتے تھے۔ الجحفہ کی جگہ لے لی۔ جو اب ایک ویران گاؤں اور ایک وادی میں واقع ہے۔ حاجی بحیرہ قلزم میں سے ہوکر آتے ہیں۔ وہ اس وقت احرام باندھ لیتے ہیں۔ جب جہاز رابغ کے پاس سے گذرتا ہے۔ رابغ کے شمال میں ابواء کے مقام پر آنحضورؐ کی والدہ ماجدہ کا مرقد مدفن ہے۔

آج کل ایک تارکول کی پختہ سڑک جدہ سے رابغ اور بدر سے ہوتی ہوئی مکّے اور مدینے کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ اس لئے یہ راستہ زیادہ آسان ہوگیا ہے۔

حجاز کے جنوبی حصّے میں باقی دو حصّوں سے زیادہ اونچے پہاڑ ہیں۔ وہاں بارش اور زراعت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جدے سے چل کر ایک سڑک ابیت القنفدہ اور حلی سے گذرتی ہوئی ساحل کے نواح میں القنفذہ تک جاتی ہے۔ طائف سے ایک شاہراہ الحزم نخلستان کو جاتی ہے۔ بلند علاقے میں واقع ایک اور سڑک طائف کو تربہ سے ملاتی ہے۔

حجاز کی تاریخ کا تعلق مکّے مدینے اور ان نسبت سے مقامات کی تاریخ سے بہت قریب کا ہے۔ لہٰذا ان علاقوں کی تاریخ میں اس کا ذکر بھی ہوجائے گا۔ تاریخ میں حجاز کی خود مختار سلطنت کا سرکاری نام صرف دس برس سے کم عرصہ کے لئے رہا۔ یہ زمانہ شاہ حسین بن علی کا عہد حکومت ہے جو ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء تا ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ہے۔ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء سے پورا حجاز سعودی خاندان مملکت میں شامل کرلیا گیا۔ حجاز کا اکثر حصّہ بنجر اور پہاڑی ہے اس لئے اشیائے خوردنی اکثر دوسرے ملکوں سے آتی ہیں۔ اس کے زرخیز قطعات میں سے ایک تو وادی فاطمہ ہے۔ جو ایک اچھی شاداب جگہ ہے۔ اور جہاں اناج اور ترکاریاں اچھی پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرا شہر طائف جو ایک چھوٹا سا شہر ہے مکّے سے مشرقی سمت میں ۷۰ میل کے فاصلے پر جبل غزوان پر آباد ہے۔ تمام حجاز میں اس سے زیادہ شاداب اور بہار افزا مقام نہیں۔ یہاں میوے کثرت پیدا ہوتے ہیں۔ حجاز کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔

حجامت

بال کٹوانا۔

اسلام چونکہ صفائی اور طہارت کا دین ہے [illegible] کی صفائی اور طہارت کی طرف خاص توجہ دلائی ہے۔ حجامت کرانا مسنون ہے۔ [illegible] سے مروی ہے آنحضورؐ نے فرمایا انسانی طبیعت کے پانچ تقاضے ہیں۔
۱۔ ختنہ کرانا۔ ۲۔ استرہ لینا۔ ۳۔ ناخن تراشنا ۴۔ لبیں لینا ۵۔ بغل [illegible] اکھیڑنا۔ (بخاری و مسلم)

آدھا سر منڈوانا اور آدھا چھوڑنا منع ہے جیسا کہ ابن عمرؓ سے [illegible] نے ایک بچے کو دیکھا جس کا کچھ سر منڈا ہوا تھا اور کچھ [illegible] تو آپ نے اس سے منع کیا اور فرمایا سارا سر منڈوا [illegible] دو۔ (مشکوٰۃ)

حج بدل :

اگر کسی شخص پر حج فرض ہوچکا ہے [illegible] حج نہ کرسکے [illegible]
سواری میسر نہیں یا اس کی صحت اس قابل نہیں تو وہ [illegible] شخص کو حج کرسکتا ہے۔ اگر حج فرض ہونے کے بعد کوئی شخص فوت ہو [illegible] تو اس کے ورثا کو چاہئے کہ وہ [illegible] سے حج بدل کرائیں [illegible] نے کہا ہے کہ [illegible] تقسیم [illegible] رحمۃ اللہ علیہ کی جاسکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ [illegible] شخص سے [illegible] جو خود حج کرچکا ہے لیکن یہ ضروری نہیں۔

حُجّت

ثبوت، برہان، دلیل

قرآن مجید میں حُجّت کا لفظ [illegible]
حق کا اثبات اور باطل کا ابطال ہوتا ہو۔
بقول امام راغب "حجت اس دلیل کو [illegible] مقصد [illegible] میں سے کسی ایک کی صحت کی مقتضی ہو"
مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" پھر کہو (تمہاری اس حجت کے مقابلہ میں) حقیقت اس حجت تو اللہ کے پاس ہے"
(۶: ۱۴۹) اور لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں"
(۴۲: ۱۵) چنانچہ حجت کے معنی بحث و تکرار اور جھگڑے کے بھی ہیں ۔

قرآن مجید میں حجت کے مادے سے دیگر الفاظ پندرہ بار استعمال ہوئے ہیں ۔

بقول الازہری "حجت ہر اس طریق کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بحث و مباحثہ کے وقت مخالف فریق پر فتح پائی جائے ۔

عام طور پر حجت کا لفظ دلیل کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے کبھی کبھی حجت قاطعہ کی ترکیب آتی ہے جس کے معنی فیصلہ کن دلیل یا ثبوت کے ہیں ۔

متکلمین اور فلاسفہ کے ہاں اس کا استعمال، ان کے فکری مسلک پر موقوف ہے ابن سینا نے حجت کو وسیع معنی میں استعمال کیا ہے ۔

علم کلام میں حجت کے اصطلاح کا استعمال دلیل کے ساتھ بار بار ملتا ہے ۔

باقلانی نے حجت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ دلیل جو دلالت بھی کہلاتی ہے اور جس سے کوئی چیز ثابت بھی کی جاتی ہے حجت ہے ۔

امام غزالی کے ہاں حجت کا لفظ " قائل کرنے والی دلیل " کے معنوں میں استعمال [illegible] [illegible] اور اذعان کا تقاضا کرتی ہے ۔

[illegible] اور علم کلام کی اصطلاحوں میں حجت کے مختلف معنی آتے ہیں کبھی یہ [illegible] [illegible] معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس سے الگ ۔

حدیث کی اصطلاح میں حجت اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے مع متن و سند [illegible] احادیث یاد ہوں اور وہ اس کے راویوں کے متعلق پوری بصیرت رکھتا ہو۔ اہل تشیع کے فرقہ سبعیہ کے ہاں حجت وہ شخص ہے جو " امام " اور " ذومصتہ " کے درمیان [illegible] ۔

اہل تشیع حضرات کے ہاں حجت کی اصطلاح تین معنی میں استعمال ہوتی ہے وہ عام طور پر اس شخص کو حجت کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک رسائی ہوتی ہے ۔ یا جو [illegible] میں ہی نوع انسان میں اللہ یا اس کی مشیت کا مظہر بن کر دین کا [illegible] آنحضورؐ بھی اللہ تعالیٰ کی حجت تھے ۔

[illegible] کی اس شہادت کو کہ حضرت علیؓ امامت کے درجے پر فائز ہیں [illegible] ۔

کبھی یہ اصطلاح خلافت میں اس ہستی پر دلالت کرتی ہے جس کے واسطے سے [illegible] [illegible] رسائی حاصل کرتے ہیں جس تک عام طور پر رسائی نہیں ہوتی ۔

اسمعیلیوں کے ہاں یہ اصطلاح خلافت کی اس خاص شخصیت کے بارے میں استعمال ہوتی ہے جس کی نسبت یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ وحی کے منصب کی بجا آوری کا کام [illegible] فاطمی عہد میں یہ اصطلاح ان بڑے داعیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو عام [illegible] [illegible] کرتے تھے ۔ تعداد میں بارہ حجت تھے ۔

[illegible] کی حدیث کی مشہور کتاب الکافی کو بھی حجت کہا جاتا ہے ۔

حجۃ الوداع

آنحضورؐ کا آخری حج ۔

آنحضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری سال سنہ ۱۰ھ میں حج کا ارادہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مجھ سے حج کے احکام سیکھ لو ۔ شاید میں اگلے سال حج نہ کر سکوں اور تم میں نہ ہوں "

آپؐ کو اپنے وصال کے بارے میں معلوم تھا چنانچہ آپؐ چاہتے تھے حج کے احکام بیان کرکے شریعت کی تکمیل کر دینی چاہئے اس لیئے اس حج کا نام حجۃ الوداع قرار پایا۔

چنانچہ ذوالقعدہ کے آخری ایام میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپ حج کرنے کی غرض سے مدینہ سے روانہ ہوئے ۔ ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ کو صبح کے وقت مکہ مکرمہ آپ کے قدم مبارک سے مشرف ہوا اور نوویں تاریخ کو جمعہ کے روز عرفات کا میدان اسلام کی شان و عظمت کا بہترین نمونہ بن گیا ۔

عرفات میں ہی یہ آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے ۔

" آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیئے مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور اسلام کو بحیثیت دین کے تمہارے لیئے پسند کر لیا" تکمیل دین کی بشارت سے سب کو خوشی تھی اور اس آیت کے نزول سے سب خوش تھے

دوپہر کے بعد آنحضورؐ نے ایک لمبا اور پر تاثیر خطبہ دیا ۔ جس میں لوگوں کو جامع طور پر دینی اور دنیوی امور کے متعلق شرعی احکام سنائے خطبے کے بعد فرمایا لوگو! قیامت کے دن تم سے پوچھ جائے گا کہ میں نے تم سے کیا معاملہ کیا اور تم میں کیونکر زندگی بسر کی ۔ تم اس کا کیا جواب دوگے ۔ اس پر چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئی کہ یا رسول اللہ آپؐ نے خدا کے سب احکام ہمیں پہنچا دیئے اور رسالت کا پورا حق ادا کر دیا ۔ یہ سن کر آپؐ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا الہٰی تو گواہ ہے ۔ الہٰی تو گواہ ہے ۔ الہٰی تو گواہ ہے میں نے رسالت کا حق ادا کر دیا ۔

حجر

منع کرنا ، روکنا ۔ کسی کو تصرفات سے روکنے کو حجر کہتے ہیں ۔

۔ اسباب موجبہ حجر بالاتفاق تین ہیں ۔ صغر سنی ، غلامی ، جنون یعنی ان تینوں صفات میں سے جس میں ایک پائی جائے گی اسے مال میں تصرف کرنے سے روکا جائے گا حتیٰ کہ وہ صفت اس سے زائل ہو جائے ۔ اگر لڑکا بالغ ہو جائے مگر صاحب تمیز نہ ہو تو اسے مال سپرد نہ کیا جائے گا ۔ صاحب مال جب تمیز دار ہو جائے تو بالاتفاق اسے اس کا مال سپرد کر دیا جائے گا

تمیز کی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے ۔ امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل نے تمیز کی تعریف یوں کی ہے ۔ کہ تمیز اس ہوشیاری اور دانائی کا نام ہے جس کے باعث لڑکا اپنے مال کی اصلاح کرے اور اپنے مال کو بڑھائے اور بے اندازہ خرچ نہ کرے ۔

امام شافعی کے نزدیک تمیز وہ ہے جس سے صلاح مال اور دین ہو ۔

حجر جن پر عائد ہو سکتا ہے وہ یہ ہیں ۱ ۔ نابالغ ۲ ۔ غیر عاقل ۳ ۔ غیر ذمے دار اور بالخصوص فضول خرچ ۴ ۔ دیوالیہ ۵ ۔ غلام ۔

حجر کا لفظ خود بخود ہو جاتا ہے یا قاضی کی طرف سے عائد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔

حجر

جنوبی عرب کا ایک شہر ۔ جو تیماء کے جنوب میں وادی القریٰ سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا ۔ یہ شہر اب موجود ہیں ۔ آج کل بدوی لوگ اس نام کا اطلاق اس سپاٹ وادی پر کرتے ہیں جو مبرک الناقہ اور بیر الغنم کے درمیان کئی میل تک پھیلی ہوئی ہے اس کی زرخیز زمین میں بہت سے کنویں ہیں جہاں بدوی بڑی تعداد میں اپنے گلوں سمیت آکر خیمہ زن ہوتے ہیں ۔

حجر سے دو سڑکیں مکہ کی طرف جاتی ہیں ان میں سے ایک نجد کی سڑک ہے جس سے آجکل حاجی گزرتے ہیں دوسری شاہراہ مرو ہے جس سے قدیم زمانے کے زائرین

کئے جایا کرتے تھے۔ اس کے مغرب میں ایک پہاڑ ہے جو ریت کے پتھر کی پانچ منفرد چٹانوں پر مشتمل ہے اور جن پر بہت ہی خوشنما یادگاریں تراش کر بنائی گئی ہیں۔ ان عمارات میں قصر البنت، بیت الشیخ، بیت الحریمات، محل المجلس اور دیوان شامل ہیں۔ کئے جانے والے زائرین ایک دن کے لئے جبل اثالث پر قیام کرتے اور نماز ادا کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہاں پر بے دین اور منکبر الن آباد تھے۔ قرآن نے انھیں قوم ثمود کہا ہے۔ جن کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ چٹانوں کو کاٹ کر وہاں اپنے مسکن بناتے تھے۔ ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنا کر بھیجا اور معجزے کے طور پر ایک اونٹنی بھیجی لیکن جب ان لوگوں نے اس اونٹنی کو مار کر اللہ تعالیٰ کی نشانی کی بے حرمتی کی تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عذاب نازل ہوا۔ اس شہر کا نام مدائن صالح بھی ہے۔

عربوں کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو الحجر میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ یہاں اپنی والدہ کے پہلو میں دفن ہیں۔

سیرت نبوی میں بھی حجر کا ذکر آیا ہے ۹ھ/۶۳۱ء میں جب آنحضورؐ تبوک کی طرف جہاد کی طرف جا رہے تھے تو اس علاقے سے آپ کا گزر ہوا۔ صحابہ کرام نے اپنے آپ کو تازہ دم کرنے کے لئے یہاں کے کنوؤں سے پانی حاصل کرنا چاہا لیکن آپؐ نے منع فرمایا کہ وہ ایسی جگہ نہ ٹھہریں جہاں عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا۔

امیر سعود نے یہاں پر ایک شہر بسانا چاہا تھا لیکن علماء نے ایسے علاقے پر جو مورد عذاب ہو چکا تھا از سر نو ایک شہر آباد کرنے پر شدید اعتراضات کئے جن کی وجہ سے یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

حجر بن عدی

بعض حجر کو صحابی کا درجہ دیتے ہیں لیکن قدیم ترین مصادر سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔ حجر ابتدا ہی سے حضرت علیؓ کی نصرت و حمایت میں دل و جان سے کوشاں رہے۔ انھوں نے جنگ جمل، جنگ صفین میں شرکت کی۔ وہ اپنے زمانہ قیام کوفہ میں بنو امیہ کے خلاف نیز علویوں کے حق میں سرگرم عمل رہا۔

حضرت امام حسنؓ کے انتقال کے بعد حجر نے امام حسینؓ کو کوفے آکر فوج کی سرداری قبول کرنے کی دعوت دی۔ جب زیاد بصرے میں تھا تو گفت و شنید ناکام رہی تو زیاد نے حجر کو اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے شام میں حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا جہاں شام کے لوگوں کے مشورے سے انھیں موت کی سزا دی گئی چنانچہ دمشق کے قریب مرج عذرا کے مقام پر انھیں قتل کر دیا گیا۔

حُجرہ

کمرہ، کوٹھری، وہ مکان جس میں آنحضورؐ نے وفات پائی تھی اور وہیں مدفون ہوئے۔ یہ حجرہ حضرت عائشہؓ کا تھا۔ اس کا رقبہ ۵۵ مربع فٹ ہے اور مسجد نبوی سے پیچھے واقع ہے۔ مسجد نبوی اور اس کے درمیان تقریباً ۲۶ فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تین قبریں ہیں ایک میں آنحضورؐ موجود ہیں دوسری حضرت ابوبکرؓ اور تیسری حضرت عمرؓ کی ہے۔

حُجریہ

یمن کا ایک مشہور ضلع [illegible] نیز یہ ایک انتظامی ضلع کا نام بھی ہے جو تعز کے جنوب میں [illegible]

سرزمین کے شمال میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے جس کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ اس علاقے کے پہاڑوں میں جبل صبر خاص طور پر مشہور رہے۔ یہ ادبی و زبانی اور ثقافتی مقتہ بھی اس علاقے میں ہیں۔ وہاں اس علاقے کا قابل ذکر شہر ہے ایک اور شہر ہروہ ہے جس کی آبادی پانچسو کے قریب ہے۔

حجریہ لپنے آپ کو خالص حمیری بتاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور رہے کہ کسی زمانے میں وہ اور صبیحی ایک ہی قبیلے میں شامل تھے۔ کچھ عرصہ قبل وہ صنعاء کے امام کے زیر اثر تھے۔ جب اس کا اقتدار کمزور پڑ گیا تو وہ آزاد ہو گئے۔ گذشتہ تین سو برسوں سے حجریہ قبیلہ زیدی مذہب کے زیر اثر آگئے ہیں۔ قبیلہ ذو محمد کے لوگ بافعل کی وجہ سے ہیں جو پہلے صنعاء کے اماموں کی ملازمت کرتے تھے۔ یہاں جب انہیں زوال آگیا تو وہ خود زمین کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔

ذو محمد زیدیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے بہت سے حجریہ ان سے بچنے کے لئے عدن کی طرف جا کر آباد ہو گئے ہیں جہاں وہ محنت مزدوری کر کے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔

حج مبرور

مقبول حج۔ احادیث میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آنحضورؐ کی حدیث مبارک ہے :-

"ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک [illegible] کے گناہوں کا ــــــــ اور [illegible] حج مبرور [illegible] بدلہ تو بس جنت ہے [illegible]

آپؐ نے فرمایا :

"حج اور عمرہ پے در پے کیا کرو [illegible] حج اور عمرہ [illegible] اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح [illegible] اور سونے چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے [illegible] حج [illegible] ثواب تو بس جنت ہی ہے [illegible]

ان احادیث سے واضح ہے کہ حج مبرور [illegible] کا نتیجہ [illegible] ہے۔

حد

دو چیزوں کے درمیان [illegible] کسی شے کی [illegible] اصطلاح میں حد کے معنی [illegible] ارتکاب سے روکا جاتا ہے۔ حد [illegible] میں [illegible] سزا ہے [illegible] حد میں سزا مقرر [illegible] تعیین قاضی یا حاکم حالات کے مطابق کرتا ہے۔ بقول شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ :

"بعض معصیتیں ایسی ہیں جن پر عذاب آخرت [illegible] اور بعض ایسی ہیں جو نظام تمدن [illegible] تعلق [illegible] انسان کے اطمینان و سکون [illegible]

ہوتی ہیں۔ ان کے لئے شرع نے حد مقرر کر دی ہے۔ یعنی (معتوس)

سزا تجویز کی ہے۔ تاکہ اس دنیا میں ان افعال کے ارتکاب کی حوصلہ شکنی

ہو اور نظام تمدن یا انفرادی انسانی امن و سکون قائم رہ سکے۔"

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے جرم و سزا کے مسئلے پر کسی انتقامی نظریے پر عمل نہیں کیا بلکہ اس کے نزدیک سزا نفس انسانی کے تزکیہ و تصفیہ اور معاشرے کی تطہیر کا ایک ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سنگین جرائم کے سوا دوسری معصیتوں میں توبہ اور پشیمانی کو بھی اہمیت دی گئی ہے تاکہ داخلی انقلاب کی وجہ سے نفس رضاکارانہ طور پر جرائم سے بچ سکیں۔ اسلامی اصطلاح میں ہر جرم معصیت ہے اور اس میں خدا کی طرف سے بھی مؤاخذہ ہوگا۔ فقہا کے نزدیک حد کی تعریف یہ ہے: "شریعت کی رو سے چند مقررہ سزائیں حد ہیں۔ اس کے تحت بقول بعض فقہا قصاص حد ہے لیکن اکثریت کے نزدیک حدود یہ ہیں:۔

۱۔ زنا ۲۔ قذف

۳۔ سرقہ ۴۔ قطع الطریق

قصاص حد نہیں کیونکہ اس کا تعلق حق العبد سے ہے قصاص کی ایک تخفیفی صورت دیت ہے۔ فتح الباری میں مندرج ہے کہ حد سترہ وجوہ سے لازم آتی ہے۔ ان وجوہ میں زنا، قذف اور سرقے کے علاوہ ردۃ، حرابہ اور قذف شامل ہیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سزاؤں کے بارے میں ممکن حد تک شفقت اور تخفیف کی طرف میلان رکھتے تھے۔ چنانچہ زنا، قذف وغیرہ کے ثبوت کے بارے میں بڑی احتیاطیں ملحوظ رکھی جاتی تھیں تاکہ جرم پوری طرح ثابت ہو جائے اور کسی شخص کو ناکردہ گناہ کی سزا نہ ملنے پائے۔

اسلام میں سزاؤں کا مقصد اور حدود کا نفاذ انتقام یا بے رحمی کی بنا پر نہیں ہے۔ چونکہ حد مانع اور زاجر کی حیثیت رکھتی اور وہ کافہ انام کی مصلحت کے لئے مقرر کی گئی ہے اس لئے وہ حقوق اللہ میں داخل ہے۔ گویا اس کا مقصد ان باتوں سے منع کرنا ہے جو بندوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مثلاً ان باتوں سے ملت اسلامیہ کو محفوظ رکھنا جو تباہی لاتی اور فساد پیدا کرتی ہیں۔ زنا کی حد سے نسب محفوظ رہتے ہیں۔ چوری کی حد سے مال محفوظ رہتا ہے۔ شراب کی حد سے عقل کی حفاظت مقصود ہے اور تہمت کی حد سے آبرو کا بچاؤ ہوتا ہے۔ پس اگر تعزیری نظام نافذ نہ کیا جاتا تو معاشرے میں بعض ناقابل تلافی رخنے پیدا ہو جاتے۔

جرائم کا معاشرے کے معاشی، اخلاقی اور اقتصادی حالات سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے اسلام نے جرائم کی روک تھام کے لئے سزاؤں کے نفاذ کے مناسب طریقے اختیار کئے ہیں۔ شریعت اسلامی میں جو حدود رکھی گئی ہیں ان کا مقصد گناہگاروں سے انتقام لینا نہیں۔ بلکہ اس بات کا شعور پیدا کرنا ہے کہ ان کی آگاہی کے بعد آدمی گناہ کے ارتکاب سے باز رہے ان کے ذریعے ذاتی کردار میں صالحیت پیدا کرنے کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور کی بیخ کنی ہو اور لوگوں کے جان و مال اور عزت کا تحفظ کیا جائے۔

اسلام میں حد کی سزا سب کے لئے یکساں ہے جو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہوتی ہے۔ کسی کے لئے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں۔ حدود کا نفاذ قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہے۔ آنحضورؐ کا واضح ارشاد موجود ہے۔

"پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں کہ وہ معاشرے کے پست طبقے پر حدود کا نفاذ کرتی تھیں لیکن اکابر کو چھوڑ دیتی تھیں۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔"

مختلف علوم میں 'حد' کا مفہوم مختلف ہے۔ مثلاً ہندسین کے ہاں 'حد' کے معنی خط اور سطح کے ہیں۔ علوم نجوم میں حدالکواکب سے مراد کواکب کا جرم (جسم) اور آسمان میں ان کے نور کے پھیلاؤ کی حد ہے۔ ایسے کواکب کو صاحب الحد کہا جاتا ہے۔ علم کلام اور فلسفے میں 'حد' کی اصطلاح تعین کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ منطق میں حد قیاس کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔

نحویوں اور صرفیوں کے نزدیک 'حد' سے مراد ہے المعرف الجامع المانع۔ جبکہ صوفیوں کے ہاں 'حد' سے مراد خدا اور بندے کے درمیان وہ فصل ہے جو زمان و مکان کی قید کی بنا پر قائم ہے۔ چنانچہ انسان، مکان اور زمان دونوں کے اعتبار سے محدود ہے۔ (نیز دیکھئے "تعزیر")

حدِ قذف

زنا کی تہمت لگانے والے کی سزا۔ قرآن مجید میں قذف کی حد یہ بیان ہوئی ہے:

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔" (۲۴: ۴)

تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حکم عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے بلکہ پاکدامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے۔ اس طرح اگرچہ الزام لگانے والوں کے لئے اس آیت میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر یہ صرف مردوں ہی کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی جرم قذف کی مرتکب ہوں تو وہ بھی اسی حکم کی سزاوار ہوں گی۔

قاذف (الزام لگانے والے) کا درج ذیل شرائط پر پورا اترنا ضروری ہے۔

۱۔ بالغ ہو۔ بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اسے تعزیر دی جا سکتی ہے مگر اس پر حد جاری نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ عاقل ہو۔ مجنوں پر حد قذف جاری نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (طائعاً) یہ حرکت کی ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ قاذف، مقذوف (جس پر الزام لگایا گیا ہو) کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو۔ کیونکہ ان پر قذف جاری نہیں کی جا سکتی۔ ان کے علاوہ حنفیہ کے نزدیک ایک شرط یہ بھی ہے کہ ناطق ہو، گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حد قذف کا مستوجب نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تو وہ قاذف ہے۔

حدِ قذف کے بارے میں فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی نسبت ہلکی مار ماری جائے یعنی کوڑے تو اسی ہی ہوں مگر ضرب اتنی سخت نہ ہو جتنی زانی پر لگائی جاتی ہے۔ نیز اگر قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو اس پر ایک ہی حد جاری کی جائے گی لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک اس پر الگ الگ ہر شخص کے لئے پوری حد جاری ہوگی۔

جو شخص حدث اصغر کی حالت میں ہو اس کے لئے نہ صرف نماز پڑھنے کی ممانعت

حدث

ناپاکی۔ شریعت میں حدث کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ حدث اکبر ۲۔ حدث اصغر۔ حدث اکبر کی صورت میں غسل سے اور حدث اصغر سے وضو کے ذریعے آدمی طہارت حاصل کر سکتا ہے۔

ہے بلکہ اسے کعبے کے گرد طواف کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ نیز وہ اس حالت میں قرآن بھی نہیں چھو سکتا۔ ان احکامات کا استنباط قرآن مجید کی ان آیات سے کیا گیا ہے:۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب نماز کے لئے اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سر پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ" (۵ : ٦)

"یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا" (۵٦ : ۷۷ تا ۷۹) نیز دیکھئے جنابت۔

حدوثِ عالم

آغاز عالم۔ حدوث، حدث سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونا، اٹھنا، زمانہ حال میں وقوع پذیر ہونا ہیں۔ مسلم مفکر کے نزدیک اس اصطلاح کے دو معنی ہیں:

۱۔ کسی چیز کا عارضی طور پر عدم سے وجود میں آنا اس کو حدوث زمانی کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابل کی اصطلاح قدم زمانی ہے۔ متکلمین کے ہاں حدوث العالم کے معنی آغاز وقت کے لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہستی باری کے اثبات کے لئے آغاز عالم کو مانتے ہیں۔ امام غزالی اپنے قیاس منطقی کو اس طرح ثابت کرتے ہیں "ہر حادث وجود کو عدم سے وجود میں لانے کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے چونکہ یہ عالم بھی وجود رکھتا ہے جس کی پیدائش کا آغاز ہے۔ لہذا ضروری طور پر وہ کوئی نہ کوئی سبب رکھتا ہے۔"

۲۔ اس اصطلاح کے دوسرے معنی یونانی فلسفے کے پرستاروں کے نزدیک یہ ہیں "حدوث سے حادثے کا اظہار ہوتا ہے یعنی کسی چیز کا عدم سے وجود میں آنا۔ لیکن علم الوجود کے اعتبار سے یہ ضروری نہیں کہ اس میں زمان کی بھی آمیزش ہو۔ اس کا نام حدوث ذاتی ہے۔"

حدیبیہ

حرم مکہ کی مغربی حد۔ جو مکے سے ایک دن کی منزل اور جدے سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہ پہاڑ جو مکہ کو [illegible] یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ شہری مملکت کی موزوں حد ہے۔

ابتدائے اسلام میں یہاں ایک کنواں موجود تھا جو مسافروں اور حاجیوں کے کام آتا تھا۔ لیکن یہاں کسی آبادی کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہاں سے [illegible] کا تعلق اسلامی دور سے شروع ہوا۔ کیونکہ اس سے نبی آنحضرت [illegible] صحابہ [illegible] سے جان نثاری کا عہد لیا تھا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

"اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہوگا اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔" (۴۸ : ۱۰)

جب اس درخت کے سائے میں مریضوں کی صحت وغیرہ کے غیر اسلامی معتقدات توہم کی شکل اختیار کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے اس درخت کو اکھڑوا دیا۔ بعد میں اس جگہ مسجد تعمیر کی گئی جو آج بھی موجود ہے۔ کچھ عرصے بعد یہ جگہ حاجیوں کی ضرورتوں کے تحت آباد ہونے لگی [illegible] کی اہم چوکی ہے۔ حدیبیہ کی شہرت اس بنا پر بھی ہے کہ ۶ھ میں آنحضور نے یہاں قریش سے ایک معاہدہ کیا تھا۔

حدیبیہ، صلح

ایک معاہدہ جو آنحضورؐ نے ٦ھ میں قریش کے ساتھ کیا۔ ذوالقعدہ ٦ھ میں آنحضورؐ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرے کے لئے مدینے سے روانہ ہوئے۔ عمرے کا احرام باندھا ہوا تھا اور قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ مقصد خانہ کعبہ کی زیارت تھی اس لئے ہتھیار ساتھ نہیں لائے گئے تھے۔ حالات معلوم کرنے کے لئے جاسوس بھیجا گیا۔ جس نے آکر بتایا کہ قریش کو مسلمانوں کی آمد کا علم ہو چکا ہے اور وہ جنگ کے لئے اپنے حبشیوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حدیبیہ کے مقام پر قریش نے مسلمانوں کا راستہ روک لیا۔ گفت و شنید شروع ہوئی۔ آنحضرت نے حضرت عثمانؓ کو سفیر اور معاہدہ صلح کے لئے مختار بنا کر بھیجا۔ قریش نے انہیں نظر بند کر دیا۔ بعد میں افواہ اڑی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ [illegible] نے مسلمانوں سے بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے [illegible] مسلمانوں نے عہد کیا [illegible] قریش [illegible] (دیکھئے بیعت رضوان)

مسلمانوں کے اس عزم پر قریش گھبرا گئے [illegible] تھوڑی سی رد و قدح کے بعد ایک صلح نامہ [illegible] مطالبات مان لئے گئے جو یہ تھے:

۱۔ مسلمان اس سال بغیر [illegible] کے [illegible]

۲۔ اگر مکہ سے کوئی شخص بھاگ کر آنحضورؐ کے پاس [illegible] [illegible] تو قریش [illegible] نہیں [illegible]

۳۔ دس سال تک جنگ [illegible] مکمل طور پر [illegible] کے علاقے میں [illegible]

۴۔ ان معاہدات [illegible] [illegible] الرحمن الرحیم [illegible] محمد رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا [illegible] جب حضرت عمرؓ [illegible] پریشان ہوئے [illegible] آنحضورؐ [illegible] حدیبیہ کو قرآن مجید [illegible] مسلمانوں [illegible]

ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ **باسمک اللّٰھم** لکھنے میں کوئی شرک نہیں تھا۔ محمد بن عبداللہ لکھنے سے صورت حال بدل نہیں جاتی۔ عمرے میں عارضی رکاوٹ معمولی بات تھی اور "من استطاع الیہ سبیلا" کے باعث وہ مسلمانوں پر واجب نہ رہا تھا۔ تحویل ملزمین میں مدینے سے بھاگ گئے والا منافق یا مرتد ہی ہو سکتا تھا۔ کی پناہ گزین نومسلم ہی ہو سکتا تھا اور نومسلم مظلوموں کا مکہ اور اس کے اطراف میں روز افزوں ہوتے جانا خود اہل مکہ ہی کے لئے خطرے کا باعث اور کسی اسلامی اقدام کے وقت مسلمان لشکر کے لئے قیمتی امداد ہو سکتا تھا۔

معاہدے کی تکمیل تیار ہونے کے بعد قریش کے وفد کو اس وقت تک روکے رکھا گیا جب تک حضرت عثمانؓ بخیریت واپس نہیں آ گئے۔ پھر جانوروں کی قربانی مکے کی بجائے حدیبیہ ہی میں انجام دے کر آنحضورؐ واپس مدینہ تشریف لائے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حدیبیہ میں دو عورتوں نے اسلامی پڑاؤ میں پناہ لی جب قریش نے ان کی واپسی پر اصرار کیا تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ تحویل کی شرط صرف مردوں سے متعلق ہے۔ قریش نے اس تعبیر کو تسلیم کر لیا۔ دو نومسلم نوجوان جو مکے سے بھاگ کر آئے تھے آنحضورؐ نے انہیں واپس کر دیا۔ بعد میں جب یہ دونوں اور دوسرے نومسلم ذوالمروہ کے دشوار گذار قبیے میں جمع ہو کر قریش کی تجارت کے لئے خطرہ بن گئے تو قریش ہی نے تحویل ملزمین کی یک طرفہ شرط منسوخ کرائی اور مکے سے فرار ہونے والے مسلمان مدینہ پہنچ گئے۔

حدیث

[illegible] اصطلاح میں اس چیز کو حدیث کہتے ہیں جس میں آنحضورؐ کا قول یا فعل یا تقریر بیان ہو۔ بعض دفعات کسی صحابی کے اقوال وافعال کو بھی حدیث کہہ دیا جاتا ہے۔ آنحضورؐ نے حدیث کا لفظ اپنے کلام کے لئے خود پسند فرمایا تاکہ آپ کے اور دوسروں کے کلام میں فرق ہو سکے۔ حدیث کے لئے خبر، اثر اور سنت کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ حدیث اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے۔ سنت اور حدیث ہم معنی نہیں۔ سنت کے بیان کو حدیث کہتے ہیں۔

آنحضورؐ کو خود حدیث کی حفاظت اور روایت منظور و مطلوب تھی۔ جب آپ گفتگو فرماتے تو ٹھہر ٹھہر کر اور خوب وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے تاکہ سننے والے کو پورا پورا مفہوم حاصل ہو جائے۔ ضروری باتوں کو آپ تین تین بار دہراتے تاکہ حاضرین مجلس [illegible]۔ آپ نے حدیث کی ترغیب دلاتے ہوئے مختلف مواقع پر ارشاد فرمایا:

"[illegible] لوگوں تک پہنچا دیں۔ تم مجھ سے سنتے ہو دوسرے لوگ تم سے سنیں گے پھر ان سے اور لوگ سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو رونق و تازگی بخشے جس نے میری بات سنی اور یاد رکھی یہاں تک کہ وہ بات اس شخص تک پہنچا دی جس نے نہیں سنا۔"

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ آپ نے حدیث کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے فرمایا کہ:

"جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا تو اس کا ٹھکانا آگ ہے۔"

[illegible] فرمایا:

"میری حدیث جیسی سنو ویسی بیان کرو۔" آپؐ نے اپنی سنت (حدیث) کی اہمیت، حفاظت اور اشاعت کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: "جس نے میری سنت سے منہ موڑا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

حدیث کے بغیر قرآن کی توضیح درست نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر کوئی شخص قرآن میں فقط اپنی رائے سے کام لے کر ٹھیک نتیجے پر پہنچ بھی جائے تو وہ غلطی پر ہوگا۔"

ضرورتِ حدیث

فہم قرآن کے لئے حدیث کی ضرورت ہے۔ ہم اس زبان کے محتاج ہیں جس میں قرآن نازل ہوا۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کے محتاج ہیں۔ مثلاً قرآن "اقامت الصلوٰۃ" کا حکم دے کر خاموش ہو جاتا ہے اور یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا کیا مطلب ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا "صلو کما رایتمونی" (نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) لوگوں نے جب تک آپؐ کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھ نہ لیا اس وقت تک اقامت صلوٰۃ کا مطلب سمجھ میں نہ آ سکا۔ سنت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان و نماز باجماعت کا طریقہ، نماز کے اوقات، نماز ہیئت اس کی رکعتیں اور جمعہ و عیدین کی مخصوص نمازیں اور ان کی عملی صورت اور بہت سی تفاصیل بتائی ہیں۔ حدیث رسول قرآنی احکام کی عملی تفصیل اور قولی تفسیر ہے اگر سنت رسول سامنے نہ ہو تو کوئی شخص ایک رکعت نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اسی طرح دوسرے احکام کا معاملہ ہے۔

تدوینِ حدیث

اسلام میں چونکہ اطاعت رسول ابتدا ہی سے ایک لازمی امر تھا اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے حفظ و اشاعت کی طرف خاص توجہ دی۔ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے عہد میں سنت رسول کا واحد اور مستند ذریعہ حدیث ہوتی ہی تھا لہٰذا تدوین حدیث کے سلسلہ میں محدثین نے مقدور بھر کوششیں کیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حدیث کی کتابت عہد نبوی میں شروع ہو چکی تھی۔ عہد صحابہؓ اور عہد تابعینؒ میں مسلسل جاری رہی۔ مختلف علماء نے حدیث کے متعدد مجموعے مرتب کئے۔

بعد میں احادیث کی تشریح اور وضاحت نیز استنباط مسائل و احکام کے پیش نظر کئی علماء نے حدیث کے مجموعوں کی شرحیں تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حدیث کی معروف اقسام:۔

حدیث متواتر

وہ حدیث جس میں مندرجہ ذیل صفات ہوں:

۱۔ کثرت رواۃ۔
۲۔ ان راویوں کا جھوٹ پر اتفاق عادتاً محال اور ناممکن ہو۔
۳۔ یہ کثرت ابتدائے سند سے لے کر انتہائے سند تک بدستور قائم رہے۔
۴۔ وہ بات جو بیان کی جا رہی ہے جو اس حسیہ سے تعلق رکھتی ہو۔
۵۔ وہ خبر مفید علم یقینی ہو یعنی علم یقین کا فائدہ دینے والی۔

حدیث مرسل

اگر انتہائے سند میں یعنی تابعی کے بعد سکوت واقع ہو تو ایسی حدیث مرسل کہلاتی ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ مرسل کو مردود کی قسم اس لئے کہا جاتا ہے کہ محذوف راوی کا حال مجہول ہوتا ہے۔ وہ تابعی بھی ہو سکتا ہے اور صحابیؓ بھی اور تابعی ہونے کی

صورت میں ضعیف بھی ہو سکتا ہے۔

حدیث مرفوع

اگر سلسلہ اسناد حضور ﷺ تک پہنچے تو یہ حدیث مرفوع کہلائے گی۔ حدیث کا مرفوع ہونا یا تو صریحاً ہوگا یا حکماً۔ اس کی آگے چھ اقسام ہیں:۔

۱۔ مرفوع قولی صریحی۔
۲۔ مرفوع فعلی صریحی۔
۳۔ مرفوع تقریری صریحی۔
۴۔ مرفوع قولی حکمی۔
۵۔ مرفوع فعلی حکمی۔
۶۔ مرفوع تقریری حکمی۔

حدیث موقوف

اگر سلسلہ اسناد صحابی تک پہنچے تو وہ روایت موقوف کہلائے گی۔ جیسے کہا جائے قال او فعل ابن عمر۔ یا عن ابن عمر موقوفاً

حدیث مقلوب المتن

وہ حدیث جس کے متن میں تقدیم و تاخیر ہو جائے۔

حدیث منقطوع

اگر سلسلہ اسناد تابعی یا تبع تابعی تک پہنچ کر ختم ہو جائے تو وہ حدیث مقطوع کہلاتی ہے۔

حدیث متروک

وہ حدیث جس کے راوی پر کذب کی تہمت ہو یعنی حدیث نبوی ﷺ میں اس کا کذب ثابت نہ ہو لیکن عام گفتگو میں دروغ گو مشہور ہو۔

حدیث مرسل خفی

ہم عصر غیر ملاقی کی روایت کو مرسل خفی کہا جاتا ہے۔

حدیث احاد

اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایت میں اس قدر کثرت نہ ہو جیسی کہ متواتر میں۔

حدیث حسن

احاد مقبول کی ایک قسم ہے یعنی وہ حدیث جو صحیح کی طرح ہو لیکن راویوں کا درجہ حفظ و یاد وغیرہ میں صحیح کے راویوں سے کم ہو۔ گو عمل کرنے میں دونوں برابر ہیں اور دونوں حجت ہیں۔ البتہ یہ صحیح سے رتبہ میں کم ہے۔

حدیث شاذ

شاذ کے لغوی معنی تنہا کے ہیں اور اصطلاحاً شاذ سے مراد راوی کا اپنے سے زیادہ ثقہ اور راجح کی مخالفت کرنا ہے۔

حدیث صحیح

احاد مقبول کی ایک قسم ہے یعنی وہ حدیث کہ جس کو پرہیزگار اور نیک اور خوب یاد رکھنے والوں نے ہر زمانے میں برابر روایت کیا ہے۔ اس میں کوئی عیب پوشیدہ نہ ہو اور معتبر لوگوں کی مخالفت بھی نہ ہو۔

حدیث ضعیف

وہ حدیث جو صحیح اور حسن کے مخالف ہو یا اس کے راوی میں ضعف کی کوئی وجہ مثلاً نقصان حفظ یا فسق یا جہالت یا بدعت وغیرہ پائی جاتی ہو یا اس کا راوی درمیان سے ساقط ہو گیا ہو یا اس کے راوی پر لوگ طعن کرتے ہوں

حدیث عزیز

وہ حدیث جس کو ہر زمانے میں دو راویوں نے روایت کیا ہو۔ یہ حدیث احاد کی ایک قسم ہے۔

حدیث غریب

وہ حدیث ہے جس کی روایت کسی زمانے میں ایک ہی راوی سے ہو۔ یہ بھی احاد کی قسم ہے۔

حدیث متروک

وہ موضوع حدیث ہے جس کے راوی پر جھوٹ کی تہمت لگی ہو۔

حدیث مدلس

جس کے راوی نے اپنے شیخ کو کسی مصلحت سے حذف کر دیا ہو اور اس کا نام نہ لیا ہو۔

حدیث مشہور

جسے ہر زمانے میں تین یا تین سے زیادہ راویوں نے روایت کیا ہو۔ یہ حدیث احاد کی ایک قسم ہے۔

حدیث منکر

وہ حدیث ضعیف ہے جس کا راوی بہت غلطی کرتا ہو۔ غافل ہو [illegible] وہم ہو یا اس کی روایت اچھے لوگوں کی روایت کے مخالف ہو یا وہ فاسق ہو [illegible] بدعتی۔

کتب حدیث

وضع و ترتیب مسائل کے لحاظ سے محدثین نے کتب حدیث کی [illegible] بیان کی ہیں:۔

۱۔ **جامع**: وہ کتاب حدیث جس میں ہر قسم کے مسائل کی احادیث [illegible] عقائد، احکام، آداب، تفسیر، تاریخ، سیر، شمائل، [illegible] مناقب و مثالب مندرج ہوں۔ جیسے جامع بخاری، جامع ترمذی وغیرہ۔

۲۔ **سنن**: وہ کتاب حدیث جس میں احکام کی روایات فقہی ترتیب سے بیان کی ہوں جیسے سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ۔

۳۔ **مسند**: جس میں صحابہ کرام کی ترتیب [illegible] تقدم و تاخیر اسلامی کے لحاظ سے احادیث درج ہوں جیسے مسند احمد بن حنبل، مسند دارمی، مسند موصلی کا تمہ وغیرہ۔

۴۔ **معجم**: وہ کتاب حدیث جس میں [illegible] کا لحاظ رکھا گیا ہو جیسے معجم طبرانی [illegible]

۵۔ **مستدرک**: جس کتاب حدیث میں [illegible] کے موافق اس کی رہ گئی حدیثوں کو [illegible] علی الصحیحین۔

۶۔ **مستخرج**: مستخرج وہ کتاب حدیث جس میں کسی دوسری کتاب کی احادیث کی زائد سند [illegible] تخریج کیا ہو جیسے [illegible] البخاری، مستخرج ابو عوانہ علی صحیح مسلم وغیرہ۔

۷۔ **جزء**: وہ کتاب حدیث جس میں فقط ایک شخص [illegible] احادیث [illegible] ہوں۔ جیسے جزء القراۃ للبخاری، جزء رفع الیدین للبخاری۔

۸۔ **مفرد**: جس میں صرف ایک شخص کی [illegible]

۹۔ **اربعین**: وہ کتاب حدیث جس میں [illegible]

منتخب کرکے درج کیا گیا ہو۔ جیسے اربعین نووی۔

صحابہ کرامؓ شب و روز آنحضورؐ کی خدمت میں رہتے تھے اور براہِ راست آپؐ سے احادیث سنتے تھے۔ تمام صحابہ ثقہ اور قابلِ اعتماد تھے۔ بعد میں جب دوسرے لوگوں نے ان کی جگہ لی تو ان کے بارے میں ان احتیاط کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے محدثین نے حدیث کی چھان پھٹک کے لئے کچھ اصول روایت و درایت قائم کئے۔ چنانچہ وہ ہر حدیث کو ان اصولوں پہ جانچتے اور پرکھتے تھے۔ مندرجہ بالا اقسام احادیث انہی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ محدثین نے اصول درایت قائم کرکے بتایا کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت مجروح ہو جاتی ہے۔ اور قابل اعتبار و اعتماد نہیں رہتی۔

۱۔ جب کوئی حدیث عقل و فہم کے منافی و معارض ہو۔
۲۔ کسی اصول مسلمہ سے معارض ہو۔
۳۔ محسوسات و مشاہدات سے معارض ہو۔
۴۔ قرآن مجید سے معارض ہو۔
۵۔ سنت نبوی سے معارض ہو۔
۶۔ حدیث متواتر سے معارض ہو۔
۷۔ اجماع قطعی و یقینی سے معارض ہو۔
۸۔ معمولی فروگذاشت پر ابدی اور سخت عذاب کی دھمکی پر مشتمل ہو۔
۹۔ رکیک المعنی ہو اور اس میں شائبہ لغویت پایا جاتا ہو۔
۱۰۔ اسے صرف ایک راوی روایت کرے۔ حالانکہ اس میں کوئی قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آیا ہوتا تو بہت سے لوگوں کو اس سے واقف و آگاہ ہونا چاہئے تھا۔
۱۱۔ اس میں ایسی فضول باتیں ہوں جو آنحضورؐ کی زبان مبارک سے نہیں نکل سکتیں۔
۱۲۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو۔
۱۳۔ اس میں آئندہ واقعات کی بقید تاریخ و وقت ٹھیک ٹھیک پیشگوئی بیان کی گئی ہو۔
۱۴۔ حضرت خضرؑ کے متعلق باتیں۔

حدیث قدسی

مقدس حدیث۔ اس کو حدیث الٰہی بھی کہتے ہیں اصطلاح میں ایسی حدیث جس میں الفاظ اللہ تعالےٰ کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ آنحضورؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوتے ہیں۔ حدیث قدسی قرآن حکیم سے مختلف ہے۔

حدیث قدسی کے لئے ضروری نہیں کہ جبرائیل کی وساطت سے آئی ہو وہ بذریعہ الہام بھی آسکتی ہے اور حالت خواب میں بھی۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حدیث قدسی کے الفاظ اللہ تعالےٰ کے ہوتے ہیں جبکہ علماء کی اکثریت کی رائے ہے کہ یہ بعینہٖ اللہ تعالےٰ کے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالےٰ کے معنی و مفہوم کو آنحضورؐ الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ حدیث قدسی کو نماز میں تلاوت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی حدیث قدسی کا حوالہ دیتے وقت یہ کہنا چاہئے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا حدیث قدسی کو کتب حدیث میں کوئی جداگانہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ بعض مجموعے صحاح ستہ سے مرتب کئے گئے ہیں۔

حدیدہ

عرب کی ایک بندرگاہ اور حدیدہ نامی صوبے کا دارالحکومت جو بحیرۂ احمر میں ثنا کے شمال اور شمال مغرب میں تقریباً ایک سو دس میل کے فاصلے پر واقع ہے حدیدہ یمن کی سب سے اہم بندرگاہ ہے وسطی افریقہ سے آنے والے حاجیوں کے جہاز یہیں لنگر انداز ہوتے ہیں۔

پہلے حدیدہ صنعاء کے امام کے زیر نگین تھا۔ ۱۸۳۷ء میں ابراہیم پاشا اس شہر کا کمانڈر تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ شہر یمن کی ولایت کا ایک حصہ تھا۔ لیکن بعد میں اس نے ایک الگ ولایت کی حیثیت اختیار کر لی۔

یہ قلعہ بند شہر ہے جس کے چاروں طرف نخلستان اور پھلوں کے باغات ہیں یہاں کے بازار چھوٹے مگر گنجان آباد ہیں۔ امیر تاجروں کے مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ بڑے بازار میں تمام ضروریات زندگی کا وافر ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ مضافات میں عربوں کے علاوہ بہت سے ہندوستانی، پاکستانی، سومالی، ایرانی، یہودی اور حبشی آباد ہیں۔ حدیدہ کی آب و ہوا صحت افزا ہے۔ حدیدہ کی بندرگاہ سے قہوہ، کھالیں، باجرہ، خشک میوہ جات، کھجور، لوبان، بیروزہ، کپڑا اور موتی دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ حدیدہ صوبے کی آبادی تقریباً ۶ لاکھ ۶۰ ہزار اور شہر کی آبادی ۵۰ ہزار ہے۔

حذیفہ بن یمان

ایک جلیل القدر صحابی۔

(؟ ——— ۳۵ھ / ۶۵۵ء یا ۳۶ھ / ۶۵۶ء)

ابو عبداللہ کنیت۔ آپؓ آنحضرتؐ کے ہمراز تھے۔ آپؓ سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابو درداءؓ وغیرہ صحابہؓ اور تابعینؒ نے روایت کی ہے۔ آپؓ کی وفات مدائن میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس روز بعد ہوئی۔ آپؓ بڑے نیک اور زہد و ورع میں بہت آگے تھے۔

حذیفہ مرعشی

ایک بزرگ اور ولی اللہ۔ آپ نواح شام میں مرعش نامی مقام کے رہنے والے تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ قرأت بہت عمدہ کرتے تھے۔ آپ نے باطنی علوم خواجہ ابراہیم ادھم سے حاصل کیا۔ جب آپ نے مرشد کی خدمت میں حاضری دی تو انہوں نے آپ کو گلے سے لگا کر فرمایا، اطمینان رکھو۔ تم عنقریب اپنے مقصد میں اونچے درجے کو پہنچو گے۔ چنانچہ آپ نے حضرت خواجہ ادھم کی بیعت کی اور خرقہ ملازمت حاصل کیا۔ آپ تقریباً چھ ماہ تک پیر و مرشد کی خدمت میں گوشہ نشین ہو کر عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سلوک کے راستے کے لئے جس بات کی ضرورت ہے وہ تم میں موجود ہے چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں آپ پیر کامل کے درجے تک پہنچ گئے۔ جب مرشد کا وقتِ وصال آیا تو انہوں نے آپ کو بلا کر اپنی جانشینی کا شرف بخشا اور ہدایت فرمائی کہ خلق خدا کی رہنمائی کرو۔ نیز فرمایا:

"اے حذیفہ! دنیا کی طرف ہرگز توجہ نہ دینا اور ہمیشہ اپنے پیران طریقت کے راستے پر چلنا۔ یاد رکھو 'دنیا' درویشوں کی رہزن ہے۔"

آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے واقفِ اسرار اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ زہد و ورع و تجرید میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کے زمانے کے بڑے بڑے بزرگ اور صاحب کمال شخصیتیں آپ کی مجلس میں کسب فیض کے لئے حاضر رہتی تھیں۔ آپ کو تنہائی پسند تھی۔ فقراء کی دوستی بھی عزیز تھی۔ اہل دنیا اور ان کی محبت سے اجتناب کرتے تھے آپ فرمایا کرتے تھے صحبت اپنا اثر ضرور رکھتی ہے خواہ ایک ساعت کی ہی کیوں نہ ہو۔

آپ ٹاٹ کا لباس پہنتے تھے اور ہر وقت آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ

کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ ڈرتے کیوں رہتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک دوزخ میں مجھے معلوم نہیں کہ میں کس گروہ میں ہوں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ آپ فرماتے تھے کہ اچھے اعمال میں سے مجھے کوئی چیز گھر میں بیٹھنے سے افضل معلوم نہیں ہوتی اور اگر میرے پاس کوئی ایسی تدبیر ہوتی کہ فرائض کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہوتی تو میں ضرور اس پر عمل کرتا۔

حُر

آزاد۔ سندھ (پاکستان) میں پیر پگاڑو کے مریدین کا لقب۔ یہ لوگ اپنے پیر و مُرشد کے حکم پر اپنی زندگیاں قربان کر دینا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ حر بہت بہادر اور جیالے لوگ ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنے پیر صبغت اللہ کے حکم پر اسلام کی سربلندی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے انگریزوں نے انہیں کچلنے کے لئے فضائی، بری اور انتظامی طاقتوں سے پُورا پُورا کام لیا حرّوں کی اکثریت نے اس جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔ حر سالہا سال اس جنگ میں مصروف رہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے پاکستان پر اچانک حملہ کیا تو حروں نے ایک بار پھر اپنے پیر و مرشد کے حکم پر پاکستانی فوج کے دوش بدوش محاذ جنگ پر نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ حروں کا ایک مشہور نعرہ "بھیج پگارا" ہے۔

حر العاملی

(۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء ــــ ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء - ۱۷۰۹ء) ایک شیعہ عالم۔ محمد بن الحسن بن علی بن حسین عاملی لقب تھا۔ جبل عامل کے علاقے مشغر میں پیدا ہوا۔ مشغر ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر شیخ حسین طاہر اور زین الدین سے جبع میں علم حاصل کیا۔ جبل عامل میں چالیس سال تک رہائش اختیار کئے رکھی۔ دو بار حج بیت اللہ کیا۔ دوسری بار حج کے سفر میں اصفہان سے گزرے جہاں محمد باقر مجلسی نے ان کا استقبال کیا عمر کا آخری حصہ مشہد میں امام علی رضا کے روضۂ مبارک میں شیخ الاسلام کی حیثیت سے گزارا۔

شیخ محمد نے مشہد ہی میں وفات پائی اور مرزا جعفر کے مدرسے سے متصل دفن ہوئے۔ ان میں حد درجہ سادگی تھی یہی وجہ ہے کہ جب شاہ سلیمان نے انہیں دیکھا تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ ان میں شیخ والی کوئی خو بو نہ تھی۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تفصیل وسائل الشیعہ الی احکام الشریعہ" ہے جو احادیث کا وسیع مجموعہ ہے۔ ان کے مخالف بھی اس مجموعے کی وسعت اور فضیلت تسلیم کرتے ہیں۔ علم حدیث میں ان کی دوسری تصنیف "جواہر السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ" ہے جو احادیث قدسی کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے اپنی تیسری تصنیف "اثنا عشریہ فی رد الصوفیہ" میں تصوف سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ایک اور مشہور تصنیف "رسائل امل الامل فی علماء جبل عامل" ہے جو انہوں نے اپنے وطن کے علماء کے بارے میں لکھی۔

حرا، غار

مکہ معظمہ سے شمال مشرق کی سمت تین میل کے فاصلے پر واقع غار۔ اس کے بالمقابل جبل ثبیر نامی مشہور پہاڑ ہے۔ ان پہاڑوں پر غار اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔

حرا، جبل ثبیر سے زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ اس کے اوپر ایک سیدھی ڈھلوان اور پھسلوان چوٹی ہے۔ اس چوٹی پر آنحضورؐ اپنے صحابہ کے ساتھ ایک مرتبہ چڑھے تھے۔ بعثت سے پہلے آنحضورؐ اسی غار میں کئی کئی دن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بسر کرتے تھے۔ جب سامان خورد و نوش ختم ہو جاتا تو آپؐ گھر تشریف لے آتے۔ پھر کھانے کا سامان لے کر واپس اسی غار میں آ جاتے اور یاد الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ غار حرا ہی میں آنحضورؐ پر پہلی وحی مبارک نازل ہوئی۔

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کو۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا" (۹۶: ۱ تا ۵)

جب وحی نازل ہوئی تو آپ کی عمر چالیس سال تھی اور رمضان المبارک کی ۲۷ ویں تاریخ تھی۔ بقول ابن حزم "آنحضورؐ ارادۃ الٰہی کے تحت غار حرا میں تشریف لے جاتے۔ نہ تو آپؐ نے کسی کو وہاں جاتے دیکھا نہ آپ اس کی تائید کرتے" آج کل حاجی لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

حرازم

(؟ ــــ شعبان ۵۵۹ھ/ جولائی ۱۱۶۴ء) ابو الحسن علی بن اسماعیل بن محمد بن عبد اللہ امام غزالی کے مکتب فکر کا ایک فقیہ اور صوفی۔ فاس کا رہنے والا تھا۔ اوائل عمر ہی میں اس کے تعلقات شیخ ابو الفضل ابن النحوی سے قائم ہو گئے تھے۔ ابو الفضل امام غزالی کے افکار کا پیرو تھا۔ بعد ازاں اس نے اپنے چچا ابو صالح محمد بن حرزہم سے امام غزالی کے تصوف سے [illegible] فاس میں نہایت ذہین لوگوں سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

حرازم مرابطی عہد حکومت کے کشمکش ادوار میں جب [illegible] سختی اور طاقت بڑھتی جا رہی تھی اپنے نظریات پر سختی سے [illegible] اسے خوف و ہراس کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک [illegible] کی دھمکیوں اور مطالبات کے پیش نظر اپنے [illegible] "احیاء علوم الدین" کو جلانے کا تہیہ کر لیا [illegible] کرنے سے باز رہا۔ بعض اوقات [illegible] خطرے میں [illegible] ابو یعزا [illegible]

اس نے مرابطیوں کے زوال سے [illegible] حرازم ہی ہے جو فاس سے [illegible] زیارت [illegible] کے مزار پر آتے جاتے رہتے ہیں۔

حرازم نہایت دلیر اور تندرست [illegible] خاص طور پر اندلس اور کسی حد تک مغرب اقصیٰ [illegible] کی صحبتوں [illegible]

حرّان

ایک شہر جہاں کے باشندوں کا مذہب بت پرستی تھا۔ شمالی [illegible] سے دریا جلاب پر واقع ہے جہاں ایشیائے کوچک، شام، عراق کو جانے والے اہم تجارتی راستے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔

آج کل یہ ترکی مقبوضات میں شامل ہے۔ بقول یاقوت "حران اقلیم چہارم میں واقع ہے اور ارفہ سے صرف ایک دن کی اور رقہ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ حران ایک قدیم شہر ہے اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی جائے پیدائش خیال کیا جاتا ہے یہ چاند دیوتا سین کا گھر تھا۔" البیرونی نے اسے سین ہی سے منسوب کیا ہے اس شہر کی شکل چاند سے مشابہ ہے۔

حران شہر پر عربوں نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ۱۹ھ/۶۴۰ء میں بغیر لڑائی کے قبضہ کیا تھا۔ اس دور میں یہ شہر دیار مضر کے اہم ترین شہروں میں سے تھا البلاذری نے لکھا ہے کہ اس شہر نے عیاض بن غنمؓ کے آگے ہتھیار ڈالے تھے۔ ابن ابی اصیبعہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے طب کے ایک مدرسے کو اسکندریہ سے حران میں منتقل کر دیا تھا۔ مروان ثانی نے یہاں سکونت اختیار کر کے اسے اموی سلطنت کا دارالحکومت بنایا۔ حران کی پہلی مسجد اس کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ یعقوبی کے بقول مروان نے اپنا محل اس مقام پر بنایا تھا جو داب لبین کہلاتا تھا اور اس کی تعمیر پر ایک کروڑ درہم خرچ کئے تھے۔ جب بنو عباس نے ایران اور عراق کے بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا تو مروان ثانی عباسی فوج سے جنگ کرنے کے لئے حران ہی سے بارہ ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوا تھا۔ ہارون الرشید نے دریائے جلاب سے حران تک ایک نہر بنوائی تھی۔

عباسی عہد کے آغاز میں یہ شہر مترجمین کے ایک اہم مکتب کا گھر تھا۔ مشہور مترجم البتانی بھی حران ہی کا باشندہ تھا یہ شہر حنبلیوں کا بھی اہم مرکز تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے اس شہر پر ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں قبضہ کیا۔ سلطان صلاح الدین نے اپنے عہد حکومت میں شہر کی جامع مسجد کی توسیع کی۔ کیونکہ اس کے عہد میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ ۵۸۶ھ/۱۱۹۱ء میں صلاح الدین نے حران اپنے بھائی ملک عادل کو پیش کر دیا جس نے قلعے کو از سر نو تعمیر کیا۔

مشہور عالم دین امام ابن تیمیہ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء میں حران پر تاتاریوں کے حملے کے بعد منگول نے یہاں کے باشندوں کو موصل اور ماردین میں منتقل کر کے اس شہر کی مسجدوں اور دیگر عمارتوں کو تباہ کر ڈالا۔ اور دروازوں کو اینٹوں سے چنوا دیا۔

آج کل پورا شہر نہایت خراب و خستہ حالت میں ہے اور یہاں صرف خانہ بدوش بدو آباد ہیں۔ شہر کی یادگار عمارتوں اور کھنڈروں میں بڑی مسجد یا جامع الفردوس قلعہ، ایک باسیلکی کلیسا، مسجد کے جنوب میں ایک بڑا ٹیلا مقبرہ شیخ حیات وغیرہ ہیں۔

حرب

قتال، دو یا دو سے زائد فریقوں میں حالت جنگ۔ عہد جاہلیت میں کسی منظم حکومت کی عدم موجودگی کی وجہ سے قبائل اکثر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں ہونے والی جنگوں کا مقصد عام طور پر انتقام لینا ہوتا تھا۔ اسلام نے اس غایت جنگ کو ممنوع قرار دیا۔ اور صرف اسی جنگ کو جائز قرار دیا جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ یا دفاع ہو۔ (دیکھئے "جہاد")

حرب بعاث

زمانہ جاہلیت کی ایک مشہور و معروف لڑائی جو قبیلہ بنی اوس اور بنی خزرج کے مابین مسلسل بیس سال تک لڑی جاتی رہی۔ آخر اسلام نے ان دونوں قبیلوں کی باہمی رنجش اور دشمنی کو ختم کر کے انہیں باہم گلے ملا دیا۔ اس لڑائی کے چھ

سال بعد آنحضورؐ نے مدینہ ہجرت کی۔

حرب بن امیہ

بن شمس، ابوسفیان کا باپ اور ابولہب کا خسر۔ حرب مکے کی اہم شخصیتوں میں سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے عربی تحریر استعمال کی۔ وہ ان پہلے اشخاص میں سے ہے جنہوں نے شراب ترک کی۔ حرب آنحضورؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا ساتھی تھا۔ وہ فوجی قائد کے طور پر ان کا جانشین ہوا۔ اس نے حرب فجار میں قبیلہ عبد شمس اور بعض راویوں کے مطابق قریش کی قیادت کی۔ حرب کے بعد قیادت بنو ہاشم میں آئی۔

حرب، بنو

ایک طاقت ور یمنی الاصل عربی قبیلہ جو مکہ اور مدینے کے درمیان دو بڑی جماعتوں یعنی بنو سالم اور بنو مسروح میں منقسم ہے۔ بنو سالم میں مندرجہ ذیل اہم خاندان شامل ہیں:

الاحامدہ، الصبح، عمرو، معرہ، ولد سلیم، تمیم، مزینہ، الحوازم اور السعادین۔
بنو مسروح میں یہ اور بعض دوسرے خاندان شامل ہیں:
سعدی، بحیہ، بشر، الحمران، علی، الجہم اور بنو عمرو۔
بنو سالم کے حسب ذیل گاؤں مدینے اور ینبع کے مابین اور وادی فرا کے کنارے آباد ہیں:
الجدیدہ، ام ثیان، کیف، دارالحمرہ، الکسہ، الخرمتہ، الواسطہ، المسانیہ الصفرہ: جہاں وسیع نخلستان اور ایک بڑی منڈی ہے۔ یہاں پر مکے کا اصلی بلسم بھی فروخت ہوتا ہے۔ بنو حرب کے کچھ لوگ وادی الحمض ینبع کی چھوٹی بندرگاہ اور جبل مجزہ میں بھی رہتے ہیں۔

حرب فجار

زمانہ جاہلیت کی ایک لڑائی۔ یہ لڑائی ۱۵ھ عام الفیل میں قریش اور بنی قیس کے درمیان لڑی گئی۔ حرب فجار لڑنے کے ممنوعہ دنوں میں لڑی گئی اس لئے اسے حرب فجار کا نام دیا گیا ہے۔ اس لڑائی میں آنحضورؐ بھی شریک ہوئے۔ اگرچہ قریش حق پر تھے۔ لیکن آپ نے کشت و خون میں حصہ نہ لیا۔ آپ صرف دشمن کے پھینکے ہوئے تیر اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے رہے۔ یہ لڑائی صلح پر منتج ہوئی۔ چنانچہ آپس میں معاہدہ کیا گیا کہ ملک میں ہر طرح سے امن و امان قائم رکھا جائے اور مسافروں، غریبوں اور مظلوموں کی، خواہ وہ کسی قبیلے سے ہو مدد کی جائے۔

آنحضورؐ عہد رسالت میں بھی اس معاہدے پر فخر فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اس معاہدے کے لئے میں اب بھی حاضر ہوں۔ اس معاہدے کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ کیونکہ اس معاہدہ پر آمادہ کرنے والے تین سرداروں کے نام میں لفظ "فضل" مشترک تھا۔

حُرّ بن عبدالرحمٰن الثقفی

(دور حکومت ۹۸ھ/۷۱۷ء — ۱۰۰ھ/۷۱۹ء) اندلس کا ایک والی۔
اس نے اپنے دور حکومت میں اندلس کے بہت سے اضلاع کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ اپنے تین سالہ دور حکومت میں اس نے جبل البرانس کی دوسری جانب حملے شروع کئے۔ عرب تواریخ میں اس بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ عیسائی

مصنفین نے اسے "الاحر" لکھا ہے۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی اس سے ڈرتے تھے۔ بعض لوگ اس کے مطالبات کی وجہ سے اس کے خلاف تھے۔ اسی وجہ سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اسے برطرف کر دیا۔

حُرّ بن یزید

(ر ——— ؟ ——— ۱۰ محرم ۶۱ھ / ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء) عبیداللہ بن زیاد کی فوج کا امیر لشکر بن ناجیہ بن قعنب بن عتاب بن [illegible] الحارث بن عمرو بن ہمام الریاحی۔

حر ایک ہزار سواروں کا لشکر قادسیہ سے لا کر ان فوجوں کے ہراول دستے میں شامل ہو گیا جو عراق کے والی عبیداللہ بن زیاد نے حضرت امام حسینؓ کے مقابلے کے لئے بھیجی تھیں۔ اس وقت حضرت امام حسینؓ اپنے عزیزوں اور ہمراہیوں کے ساتھ کوفے کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ چنانچہ حُر کو حکم دیا گیا کہ [illegible] حضرت امام حسینؓ کی جماعت کا بالکل نزدیک سے تعاقب کرے اور انہیں پکڑ کر عبیداللہ بن زیاد کے پاس لے آئے۔ حر کو جنگ کرنے اور قتل و غارت سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ حضرت امام حسینؓ کے کیمپ کے بالکل قریب رہا اور انہیں مدینے واپس نہ جانے دیا۔ آخر کار حُر اس بات پر راضی ہو گیا کہ آپؓ کوفے جانے کا ارادہ ترک کر کے کسی دوسری طرف نکل جائیں۔ ابتدا میں حضرت امام حسینؓ سے حر کے تعلقات خراب نہیں تھے۔ چنانچہ وہ کبھی کبھی آپؓ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتا تھا۔

بعد میں عبیداللہ بن زیاد نے حُر کو حکم دیا کہ حضرت امام حسینؓ کو کسی آباد جگہ نہ جانے دیا جائے تو اس نے آپؓ کو کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ جب عمر بن سعد بن ابی وقاص کو عبیداللہ بن زیاد نے امیر لشکر بنایا اور اس نے امام حسینؓ کی تجاویز کو رد کرتے ہوئے ان سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو حُر نے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ جا ملنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ آپ کی حالت مخالف فریق کے مقابلے میں کمزور ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؓ نے اس کے لئے دعائے مغفرت کی دعا کی۔ حر نے میدان کربلا میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ مگر بالآخر اسے شہید کر دیا گیا۔

حربہ

نیزہ۔ حربہ قائد جیش اور شیخ قبیلہ وغیرہ کا نشان خاص ہوتا تھا۔ روایت ہے کہ فرعون کے لشکر کے سردار ہامان کے ہاتھ میں حربہ تھا۔ ایک اور روایت میں آنحضورؐ کو حبشہ سے ایک حربہ یا عنزہ بطور تحفہ آیا تھا۔ موجودہ دور میں بھی ایسے عصا اہل حبشہ کی مذہبی رسوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسلامی رسم و رواج میں حربہ کا وہی مصرف ہے جو عنزہ کا ہے۔

حربیہ

ترکوں کا عسکری تربیت دینے والا ادارہ۔ اٹھارھویں صدی میں عثمانی سلطنت میں فوجی تربیت سے متعلق نئی اصلاحات ہوئیں۔ اس دور میں سلطان محمد ثانی کی نئی فوج کے لئے کئی تربیتی مرکز استنبول میں قائم کئے گئے۔ ان میں "آلائی مکتب حربیہ سی"، توپخانہ، عامرہ مکتبی اور مکتب حربیہ شاہانہ شامل تھے۔ ۱۸۴۶ء میں ان سب کو استنبول کے محلے پانگ آلتی میں واقع ایک مرکزی مکتب حربیہ میں اکٹھا کر دیا گیا۔ اس میں ان ثانوی مکتبوں کے طالب علموں کو داخل کیا جاتا تھا جو استنبول اور بعض دوسرے شہروں میں قائم کئے گئے تھے۔ حربیہ کے نصاب تعلیم میں مخصوص فوجی مضامین کے علاوہ حساب اور غیر ملکی زبانوں پر زور دیا جاتا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں دو سالہ نصاب کے بعد مزید دو سال کا نصاب جاری کیا گیا۔ یہ نصاب جنرل سٹاف کے افسروں کے لئے تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کا عرصہ دو سے بڑھا کر تین برس کر دیا گیا۔

۱۹۰۹ء میں مکتب حربیہ میں نو جرمن، آٹھ ترک اور دو [illegible] اساتذہ شامل تھے۔ پہلی عالمی جنگ کی ابتدا پر اس مکتب کے اساتذہ اور طالب علموں کو فوجی ملازمت میں لے لیا گیا۔ اس طرح یہ مکتب معطل ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں مصطفٰے کمال پاشا کے زیر نگرانی انقرہ کے قریب جبہ جی میں ایک عارضی مکتب حربیہ کھولا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں پانگ آلتی کا مکتب حربیہ دوبارہ کھولا گیا اور اس کا نام [illegible] رکھا گیا ہے۔ انقرہ کی ایک نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ [illegible] کے درمیان حربیہ سے ۲۷۹۹ لفٹیننٹوں نے سند حاصل کی۔ [illegible] ۱۸۹۰ء کے درمیان سند حاصل کرنے والوں کی سالانہ اوسط ۲۵ سے [illegible] ہو گئی۔ انیسویں صدی کے اختتام پر یہ تعداد پانچ سے زیادہ [illegible]

نظم و نسق کو مغربی رنگ میں رنگنے کی عثمانی اصلاحات میں حربیہ کا قیام [illegible] دیرپا اقدامات میں سے ایک تھا۔ اس کے طلبا [illegible] سیاسی انقلاب میں پیش پیش رہے۔ [illegible] ۱۸۳۹ء میں علیحدہ فوجی طبی کالج میں خفیہ طور پر [illegible] ایک فوجی عدالت میں حربیہ کے طلبا پر تخریبی سرگرمیوں کے [illegible] گیا اور ان میں سے [illegible] جلا وطن کر دیا [illegible]

[illegible] حصہ تھا جو سلطنت [illegible] تبدیلیاں [illegible]

حرکت و سکون

۱۔ [illegible] فلسفہ [illegible] فلسفہ اپنے تصور کی بنیاد یونانی نظریات پر [illegible] طرح زمان اور حرکت کے مابین تعلق [illegible] مدت ہے جس کا شمار حرکت سے کیا [illegible] نقل کرتا ہے۔ زمان سے [illegible] دیتا ہے۔ حرکت [illegible] کسی حرکت [illegible] افتاد کا تعلق ہے۔ [illegible] حرکت [illegible] وہ جسم جو کسی اور فاصلے [illegible] دوسرا فاصلہ طے کیا جاتا ہے [illegible] فاصلے کی نسبت [illegible] کا خیال کیا جائے تو حرکت [illegible] اس مساوات کو لیا جائے تو حرکت [illegible] فاصلہ [illegible] ہوتا ہے [illegible] کی ایک ایسی [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] فعل صادر ہوتا ہے [illegible] رہتا ہے جو ثبات اور سکون [illegible] اس کو حرکت کہتے ہیں۔

حرکت سے قبل سکون کے خیال کو اخوان الصفا نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ مثلاً [illegible] جسمیت کی وجہ سے قابل حرکت نہیں [illegible]

والا ایک اور جوہر روح ہے۔ روح حیّ بالذات ہے۔ اسی طرح حرکت زندگی ہے۔ بعض اجسام میں یہ ذاتی ہے جیسے آگ میں۔ جب اس کی حرکت بند ہوتی ہے اور یہ سکون کی حالت میں ہوتی ہے تو یہ بجھ جاتی ہے اور کہیں یہ حادث ہوتی ہے۔ جیسا کہ پانی ہوا اور زمین میں کہ اگر ان کی حرکت رک بھی جائے تو ان کا وجود برقرار رہتا ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت :

"اللہ ہی نے تمہارے لئے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو"

(۴۰ : ۶۱)

کی تشریح اور تفسیر میں امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ حرکات تھکن پیدا کرتی ہیں کیونکہ وہ لازمی طور پر حرارت اور خشکی پیدا کرتی ہیں جو اذیت ہیجان کا باعث بنتی ہیں۔ مزید براں حرکات کی بڑی تعداد حیوانی جذبات کو منتشر کر دیتی ہے جو احساس میں حصہ لیتے ہیں اور حواس کی تیزی کند ہو جاتی ہے۔ اس سے نیند آتی ہے۔

۲۔ عرب نحویوں کے نزدیک حرف متحرک ہوتا ہے یا ساکن۔ متحرک ہونے کی صورت میں صرف تین حرکات زبر، زیر، پیش میں سے کوئی ایک حرکت ہوتی ہے اور جب ساکن ہو تو اس پر حرکت کی بجائے سکون کی علامت (ْ) ہوتی ہے۔ سکون کی ایک مخصوص صورت جزم (د) یعنی مضارع کے آخری حرف کا سکون۔

حرقوص بن زہیر سعدی

ایک سپہ سالار جس نے سوق الاھواز کو فتح کیا تھا۔ حرقوص کا نام پہلی مرتبہ عرب مورخین نے ۱۷ھ / ۶۳۸ء میں لیا ہے۔ جب ایرانی سپہ سالار ہرمزان کا ونچ کر رہا تھا اور مسلمانوں کو باوجود معاہدۂ صلح کے دھمکیاں دے رہا تھا۔ عتبہ بن غزوان عامل بصرہ نے اس بات سے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کو مطلع کیا تو آپ نے حرقوص کی زیر قیادت فوجی دستے بھیجے انہوں نے فوج کے ساتھ ہرمزان کے خلاف پیش قدمی کی اور سوق الاھواز کے پل کے دہانے شکست دی۔ یہ حرقوص ہی تھے جس نے اس علاقے کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا۔ جب دربار خلافت میں فتح کی خبر اور مال غنیمت پہنچا تو حضرت عمرؓ نے حرقوص کو امیر القتال کا خطاب دیا اور اسے حاصل شدہ علاقے کا منتظم بنایا۔ لیکن جب ہرمزان کے خلاف دوبارہ فوج کشی کی گئی اور اس سے معاہدہ واپس لیا گیا تو حرقوص نے اس معرکے میں ثانوی حیثیت سے شرکت کی۔ حرقوص بصرے میں دوبارہ ۳۵ھ/۶۵۶ء میں نمودار ہوا جبکہ کوفے اور مصر سے ناراضین حضرت عثمانؓ کا ایک گروہ احتجاج کے لئے مدینے آیا تھا۔ چنانچہ حرقوص اس گروہ کا قائد تھا۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ کے گھر کے محاصرے، شہادت اور انتخاب حضرت علیؓ میں حرقوص نے کوئی اہم حصہ نہیں لیا۔ جب حضرت عائشہؓ طلحہؓ اور ابن زبیرؓ حضرت علیؓ کے خلاف بصرے میں جمع ہوئے تو حرقوص ایک بار پھر بصرے میں تھا اور اس نے بصرے کے رئیس پولیس حکم بن جبلہ کی معیت میں اور شہادت عثمانؓ میں ملوث دوسرے لوگوں کے ساتھ اس معرکے میں شرکت کی۔

جنگ صفین میں حرقوص حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھا۔ لیکن بعد میں اس نے خوارج کی حمایت کر کے بالکل متشدد رویہ اختیار کر لیا۔ تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس نے جنگ حروراء میں بھی شرکت کی۔ جب حضرت علیؓ نے معاہدۂ صفین برقرار رہنے کا عوام میں اعلان کیا تو اس نے کوفے میں مخالفین علیؓ کے خفیہ اجتماع میں شرکت کی جس میں خوارج نے حضرت علیؓ کے خلاف نہروان میں جمع ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

حرم

قابل عزت۔ قرآن مجید میں آیا ہے :

"اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لئے بہتر ہے" (۲۲ : ۳۰)

بخاری شریف کی ایک حدیث ہے :

"میں تجھے بیت اللہ کی عزت کی قسم دیتا ہوں"

قرآن و حدیث میں جہاں یہ لفظ آیا ہے ان سب جگہوں پر حرمت سے عزت و تعظیم ہی مراد ہے۔ حرم کے ایک اور معنی ممنوع کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں مکے مدینے اور ان کے گرداگرد کے چند میل کے علاقے کو حرم کہتے ہیں۔ اسے حرم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عزت قائم کی ہے اور ان مقامات پر بعض افعال اور اقدامات ممنوع ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں جنگ نہیں ہو سکتی۔ درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا۔ نیز اس میں داخل ہونے والا ہر گزند سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مکے اور اس کے ماحول کی حرمت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے قائم فرمائی تھی۔ ابن ماجہ کی حدیث ہے :

"الٰہی تو نے مکے کی حرمت حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے نافذ کی تھی اب میں تیرے ہی حکم سے مدینے کی حرمت کا اعلان کرتا ہوں۔ آئندہ سے مدینہ اپنے گرداگرد حرہ تک حرم ہے۔"

حرم کا لفظ زنان خانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جہاں غیر مرد نہ جا سکیں۔ نیز یہ لفظ اس کے مکینوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

حرمتِ رضاع

جب کوئی بچہ ماں کے سوا کسی اور عورت کا دودھ پیتا ہے تو وہ عورت اس کی ماں بن جاتی ہے۔ اس عورت کے ساتھ اور اس کی بیٹیوں، بہنوں وغیرہ کے ساتھ نکاح اس لڑکے کے لئے حرام ہو جاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اس کو حرمتِ رضاع کہتے ہیں۔

حرمین الشریفین

دو مقدس مقامات۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو حرمین شریفین یعنی دو مقدس اور قابلِ عزت مقامات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں مقامات کے خادم کے لقب کے لئے خادم الحرمین شریفین کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ (نیز دیکھئے "حرم")

حروراءؔ

کوفے کے قریب ایک گاؤں، یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے پہلی بار خروج کیا تھا۔ یہ لوگ صفین کی جنگ میں حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے پیش کردہ تحکیم کے خلاف تھے۔ اگرچہ مقام صفین پر صرف چند لوگوں نے اپنی مخالفت کا اظہار کیا تھا لیکن بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ حروراء کے مقام پر ۳۷ھ/۶۵۸ء میں جو لوگ جمع ہوئے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ حروریوں کے خروج سے فکرمند ہو کر حضرت علیؓ نے اپنے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کو ان

کی طرف گفت وشنید کے لئے بھیجا۔ بعدازاں خود بھی تشریف لاتے۔ حروراء میں دو جنگیں ہوئیں۔ ایک ۶۶ھ/۶۸۶ء میں اور دوسری ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں۔

حروف مقطعات

حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ یہ سورۃ الشوریٰ کے ابتدا میں آئے ہیں۔

حروف مقطعات کے معنی کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سورتوں کے نام ہیں اور اسی غرض سے ان کے شروع میں آتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حروف دراصل کلمات محذوفہ کا اختصار ہیں۔ مثلاً الف سے مراد اللہ۔ میم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور لام سے مراد جبرائیلؑ ہیں۔ ابن عباسؓ نے اسی قول کا اظہار کیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ان حروف کے اعداد سے اقوام عالم کی مدت اور زندگی مقصود ہے جبکہ دوسرے علماء کا خیال یہ ہے کہ حروف مقطعات اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہیں جو کسی کو معلوم نہیں۔ امام بیضاوی کے نزدیک ان کا مقصد اعجاز قرآن ثابت کرنا ہے۔ گویا ان کے ذکر سے عرب کے فصحا وعقلا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالےٰ کی کتاب بھی انہیں حروف سے مرتب ہے جن سے وہ اپنا کلام ترتیب دیتے ہیں۔ حضرت عباسؓ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ان حروف میں اللہ کا اسم اعظم مخفی ہے۔

بقول مولانا مودودی "جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے نمونے میں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کی ابتداء میں بولتے ہو اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے آنحضورؐ سے ان کے معنے پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معنی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔

علیحدہ شکل میں، الگ کئے ہوئے۔ کٹے ہوئے حروف۔ اسلامی علوم کی اصطلاح میں مقطعات سے مراد وہ حروف ہیں جو قرآن کریم کی بعض سورتوں کے شروع میں الگ الگ واقع ہوئے ہیں۔ یہ حروف قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ ان میں سے دو مدنی سورتیں ہیں اور باقی سب مکی ہیں۔ یہ حروف قرآنی سورتوں کے شروع میں پانچ شکلوں میں موجود ہیں۔

۱۔ مفرد شکل میں یہ صرف تین جگہ آتے ہیں۔ ص، ق اور ن۔ یہ سورتیں بھی ان ہی حروف کے نام سے موسوم ہیں۔

۲۔ دو دو کی شکل میں یہ نو مقامات پر آئے ہیں۔ طٰہٰ، طٰسٓ (النمل)، یٰسٓ اور حٰمٓ جو ان چھ سورتوں کے شروع میں واقع ہیں۔ المومن، حٰمٓ السجدہ، الزخرف، الدخان، الجاثیہ اور الاحقاف۔

۳۔ تین تین کی شکل میں یہ تیرہ سورتوں کے شروع میں آتے ہیں آلٓمٓ جو ان چھ سورتوں کے شروع میں واقع ہیں۔
البقرہ، آل عمران، العنکبوت، الروم، لقمان اور السجدہ۔
الٓرٰ یہ ان پانچ سورتوں کے شروع میں آتے ہیں:
یونس، ہود، یوسف، ابراہیم، الحجر۔
طٰسٓمٓ یہ ان دو سورتوں کے شروع میں آتے ہیں:
الشعراء اور القصص۔

۴۔ چار چار کی شکل میں یہ صرف دو جگہ پر آتے ہیں:
المٓصٓ سورۃ الاعراف کے شروع میں اور المٓرٰ سورۃ الرعد کے شروع میں۔

۵۔ پانچ پانچ کی شکل میں یہ دو مقامات پر واقع ہوئے ہیں:
کٓھٰیٰعٓصٓ۔ یہ سورۃ مریم کے شروع میں واقع ہیں۔
حٰمٓعٓسٓقٓ سورہ شوریٰ کے آغاز میں واقع ہیں۔

حروفیہ

ایک بدعتی فرقہ جس کی ابتداء آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں ایران میں ہوئی۔ اس فرقے کا بانی فضل اللہ استرابادی تھا۔ فضل اللہ ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء میں استراباد میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک صوفی کی حیثیت سے کیا اور وہ حرام غذا کھانے سے حد درجہ احتیاط واجتناب کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ اتنا محتاط تھا کہ لوگ اسے "حلال خور" کہتے تھے۔ اس کا میلان شروع ہی سے تصوف اور زاہدانہ اعمال کی طرف تھا۔ نوجوانی میں اسے الہامی خواب دکھائی دینے لگے ابتدا میں اس کے مریدین کی تعداد چند نفوس پر مشتمل تھا۔ لیکن جب اس نے اصفہان میں سکونت اختیار کی تو اس کے مریدین کی تعداد بڑھنے لگی۔ کئی دوسرے ملکوں کے لوگ بھی فضل اللہ کی تعبیر رویا میں قابلیت اور اس کے مریدین کی سادگی اور دیانتدارانہ زندگی سے متاثر ہو کر اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے گئے۔

چالیس سال کی عمر میں فضل اللہ تبریز میں اقامت گزیں تھا تو اسے ایک نیا تجربہ ہوا۔ اسے حروف کے خفیہ معنی اور نبوت کی اہمیت کا علم حاصل ہو گیا تین دن اور رات اس پر وجدانی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد وہ ایک نئی مذہبی تحریک کا بانی بن گیا۔

اس نے اپنی تصنیف جاودان نامہ کبیر میں حکمرانوں اور بادشاہوں کو اپنے عقیدے کا پیرو بننے کی دعوت دی۔ اس نے تیمور لنگ کو بھی اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دی۔ بعد میں اس نے تیمور لنگ کے عتاب سے بچنے کے لئے اس کے بیٹے میران شاہ کے پاس پناہ لی۔ لیکن میران شاہ نے اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے گرفتار کرا کے نخجوان کے قریب قلعہ جنق میں قید کر دیا۔ اور آخر میں ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

جس جگہ فضل قتل ہوا کچھ عرصہ تک یہ مقام اس کے پیروؤں کا قبلہ اور مکہ بن گیا اور میران شاہ اس نئے مذہب کا دجال کہلانے لگا۔

فضل اللہ کا پہلا خلیفہ اس کا مرید علی الاعلیٰ بنا جو حروفی مذہب سے متعلق کئی کتابوں کا مصنف ہے ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء میں اس نے ملک روم (اناطولیہ) میں حروفی عقیدے کی اشاعت کی۔ اناطولیہ میں حروفی عقائد دیگر عقائد کے پہلو بہ پہلو بکتاشیوں کی عجیب وغریب برادری میں باقی رہے۔ یہ فرقہ قلیل مدت تک ایک منظم تحریک کی شکل میں قائم رہا۔ بعد میں اس فرقے کو کئی مذہبی افتراقات کا سامنا کرنا پڑا۔

معتقدات: اس فرقے میں مذہب کی باطنی خصوصیت پر زور دیا گیا ہے۔ نبوت کے بارے میں حروفیوں کا نظریہ یہ ہے کہ آنحضورؐ کو واقعی خاتم النبیین

کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ پر نبوت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ایک نیا دور جو دور نبوت سے برتر ہے۔ شروع ہوتا ہے یعنی دور ولایت اور یہ بھی نفضل اللہ میں خدا کے ظہور والے دور سے مرتبے میں پیچھے رہ گیا۔

حروفیوں کے نزدیک کائنات قدیم ہے کیونکہ تخلیق کا عمل دائمی ہے۔ خدا کی صفات ذات خداوندی کی مترادف ہیں جو خود ایک ناقابل رسائی پوشیدہ خزانہ ہے۔ ظہور خداوندی ادوار میں حرکت کرتا ہے اور ہر دور میں گزشتہ ادوار کے واقعات اور اشخاص دوبارہ ظاہر ہوتے ہیں۔

ان کے نزدیک انسان سے مراد قدرتی طور پر کوئی بالخصوص پاک اور مقدس انسان "مفضل اللہ" ہے۔ "تمام دنیا خود خدا ہے آدم روح ہے اور سورج چہرہ" حروفیوں نے قرآن مجید کی اپنی باطنی تعبیر کرلی۔ نیز ہر ذرہ ایک "زبان" ہے جو بولتی ہے۔

ابتدا میں حروفیوں کی ایک الگ تنظیم تھی اور ان کی اپنی رسوم اور نمازیں تھیں۔ جنہیں علی الاعلیٰ کے ایک اہم باب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اذان میں ایسے کلمات شامل تھے:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا ف۔ع۔ ه"

میں گواہی دیتا ہوں کہ ف۔ع۔ه کے سوا کوئی معبود نہیں۔

"اَشْهَدُ اَنْ آدم خلیفۃ اللہ"

میں گواہی دیتا ہوں کہ آدم اللہ کا نائب ہے۔

فضل اللہ کے قتل کی جگہ کا حج ذوالقعدہ کے مہینے میں کیا جاتا تھا۔ مقتل کے دروازے کا اٹھائیس مرتبہ طواف کرنے کے بعد حروفی دنیا کے مشرق و مغرب کے چالیس عارفان حق کے نام لیتے ہیں۔ دریا کے مجری میں اتر کر تین بار اکیس اکیس یعنی ۶۳ سنگریزے چنتے ہیں۔ اکیس مٹی کے لئے، اکیس ہوا کے لئے اور اکیس پانی کے لئے۔ اور پھر انہیں آگ میں ڈال دیتے ہیں جو شیطان کا منبع ہے۔ یہ عمل کرتے وقت ان کا منہ میران شاہ کے قلعے کی طرف ہوتا ہے اور زبان سے "ملعون و بدکار" کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔

حرہ

مدینہ منورہ کے باغات میں سے ہوتا ہوا اس شہر کی شمال مشرقی جانب میں پھیلا ہوا ہے جسے حرہ واقم کہتے ہیں۔ اس کو ۶۳ھ/ ۶۸۳ء میں ہونے والی ایک لڑائی کی بدولت اس حرہ کو مزید اہمیت ملی۔ یزید بن معاویہؓ کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد مدینہ منورہ میں صورت حال خراب ہوگئی۔ یزید کی حکومت کو بنظر استحسان نہ دیکھا گیا۔ دینی حلقوں نے اس کی امامت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مدینہ منورہ کا گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان جسے یزید نے مقرر کیا تھا۔ ایک نوجوان اور ناتجربہ کار شخص تھا۔ اس لئے صورت حال پر قابو نہ پاسکا۔ پھر یزید نے اہل مدینہ کے ایک وفد کو دعوت دی تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکالی جائے۔ اور ان سے فیاضی کا سلوک کرکے ان کی دلجوئی کی جائے۔ لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔

کے لئے کافی ہوگا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ المری کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ اس لشکر کی تعداد ۴ ہزار سے ۱۲ ہزار تک بتائی گئی۔ مدینہ کے نخلستان میں پہنچ کر مسلم حرہ میں اپنا خیمہ نصب کرنے کے لئے چلا گیا۔ اہل مدینہ کو شہر کی غیر محفوظ جانب میں ایک خندق کھودنے اور اسے محفوظ بنانے کا وقت مل گیا۔ تین روز بعد اس مقام پر خونریز لڑائی ہوئی جس میں اہل مدینہ کو شکست ہوئی۔ شہر میں پناہ گزینوں کا تعاقب کرتے ہوئے شامی خوفناک لوٹ مار میں مصروف ہوگئے جو تین دن تک جاری رہی حبشیوں کا فساد برپا کرنے کا موقع مل گیا۔ حرہ میں بے دریغ قتل و غارت کی وجہ سے مسلم بن عقبہ کو مسرف کا خطاب دیا گیا، جس کے معنی ہیں "انسانی خون کو ارزاں کرنے والا"

حُرّیت

آزادی، شریف۔ بقول امام راغب "حریت" کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کسی کا غلام نہ ہونا۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔

"اے ایمان والو، تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت" (۲: ۱۷۸)

۲۔ صفاتِ ذمیمہ یعنی حرص اور دنیوی مال و متاع کے لالچ سے آزاد ہونا اور اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دینا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

"اے میرے رب میں نے تیری نذر کیا، جو کچھ میرے پیٹ میں ہے سب سے آزاد رکھ کر" (۳: ۳۵)

احادیث میں حر، حرۃ اور احرار وغیرہ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "دیت الحر" یعنی آزاد شریف کے خون بہا کے ذکر میں یا غلاموں کو آزاد کرنے کے سلسلے میں کوئی آقا اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے تو اعلان کرتا ہے "میں اسے اللہ کی رضا جوئی کے لئے آزاد کرتا ہوں" (بخاری)

زمانہ جاہلیت میں عرب میں یہ اصطلاح عبد کی ضد کے معنی میں استعمال ہوتی تھی جس کے مصداق صفاتِ حمیدہ اور اعلیٰ اخلاق کے حامل افراد ہوتے تھے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کے اکثر ممالک میں غلامی موجود تھی اور غلاموں کا درجہ آزاد انسانوں کے مقابلے میں نہ صرف کمتر تھا بلکہ ان کی حالت حیوانوں سے بھی بدتر تھی۔ اسلام نے غلامی کو اس وقت کی ایک عالمگیر، ناگزیر عادت سمجھ کر اس کا انسداد تدریجی طور پر، قانونی، اخلاقی، ترغیبی اور نفسیاتی انداز میں کیا ہے تاکہ اس قبیح رسم کا انسداد معاشرے کی روحانی امنگ بن جائے۔ لوگ خود بخود اس سے نفرت کرنے لگیں اور رفتہ رفتہ یہ رسم خود بخود مٹ جائے۔

اسلام نے مذہبی آزادی کا اتنا اعلیٰ تصور عام کیا۔ جس کی مثال آج کی نام نہاد مہذب دنیا میں بھی کہیں نہیں ملتی۔ حریت تصوف کی ایک اصطلاح بھی ہے صوفیوں کے نزدیک حریت نام ہے خدا اور اس کی بندگی کے سوا ہر چیز سے چھٹکارا پانے کا۔ یہ اس رشتے کے اقرار کا نام ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہے کہ وہ کامل طور پر اس کے محتاج ہیں۔

اس لفظ کا جدید سیاسی معنوں میں واضح استعمال اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر کی حکومتِ ترکیہ کی یادگار رہے۔

حریر

ریشمی کپڑا۔ قرآن مجید میں حریر کا لفظ تین مقامات پر آیا ہے:

"بے شک اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان

کو وہاں سونے کے کنگنوں اور موتیوں کا گہنا پہنایا جائے گا اور وہاں
ان کی پوشاک ریشم کی ہوگی۔" (۲۲ : ۲۳)
" اور انہیں ان کے صبر پہ جنت اور ریشمی پوشاک کا بدلہ دیا
جائے گا۔" (۷۶ : ۱۲)
" اور انہیں ان کے صبر پہ جنت اور ریشمی پوشاک کا بدلہ دیا جائے
گا۔" (۷۶ : ۱۲)
" ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے۔
وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا
جائے گا۔ وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا۔" (۳۵ : ۳۳)

اسی طرح قرآن مجید میں استبرق کا لفظ بھی کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ وہ بھی اسی مفہوم میں کہ جنت میں لوگوں کا لباس اور تکیے وغیرہ استبرق کے ہوں گے۔

حریر کے لباس اور دوسرے ساز و سامان کو اسلام میں مردوں کے لئے ناپسندیدہ اور مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ فقہا کے ایک بڑے گروہ نے اسے حرام قرار دیا گیا ہے بعض فقہا نے بعض شرائط کے ساتھ اس کے استعمال کو مردوں کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ عورتوں کے لئے حریر کا استعمال جائز ہے۔ اگرچہ بعض فقہا نے بعض خاص حالات میں عورتوں کے لئے بھی اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

کتب حدیث میں اس بارے میں آنحضورؐ کے اقوال اور عمل کے واقعات اور اس کے متعلق ہدایات ملتی ہیں۔

ان کتب میں ولیمہ اور شادی اور دوسرے موقعوں کے بارے میں بھی احکام موجود ہیں جو کم و بیش فرق کے ساتھ مردوں کے لئے حریر کے لباس کو ناپسندیدہ اور ممنوع اور عورتوں کے لئے جائز قرار دیتے ہیں۔

حریر کی ممانعت کی حکمت بالکل واضح ہے اور یہ احکام اسلام کے معاشی اور معاشرتی تصورات سے مربوط ہیں۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے جس کے لئے جدوجہد اور جہاد ناگزیر ہے۔ جہاد کی یہ ضرورت سخت کوشی خشن پوشی اور سادہ خوراک کی متقاضی ہے

اسلام ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں سب افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں اس لئے ایسے لباس اور ساز و سامان اور خوراک و پوشاک پر زور دیتا ہے جو عادلانہ معاشی تنظیم کے تحت ہر کسی کو میسر آسکیں۔

اسلام کے اصول مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ خوراک و پوشاک کے ان لوازم کی ممانعت کی جائے جو خواہ مخواہ برتری کا تاثر پیدا کرتے ہوں یا ان میں تکلف اور اسراف کا شائبہ ہو۔

عورتوں کے لئے حریر کے استعمال کی اجازت نسوانی نفسیات کے عین مطابق ہے زیب و زینت کا ذوق عورتوں کی فطرت کا حصہ ہے اور ان کا لباس نرم و نازک سے آراستہ و پیراستہ ہونے کا شوق قوانین فطرت کے عین مطابق ہے۔

حریری

(۴۴۶ھ / ۱۰۵۴ء ـــ ۶ رجب ۵۱۶ھ / ۱۰ ستمبر ۱۱۲۲ء) ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بن عثمان۔ عربی زبان کا مشہور شاعر اور ماہر لسانیات بصرے کے قریب مشان میں پیدا ہوا تعلیم بصرے میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ صاحب الخبر یعنی رئیس محکمہ خفیہ اطلاعات کے فرائض انجام دیتا رہا۔ فرائض منصبی کی بجا آوری کے بعد بھی اسے اتنی فرصت مل جاتی تھی کہ وہ اپنے دور کے بے کیف اور ردی انحطاط بصرے کے درمیانہ طبقے کی سنجیدہ گفتگو میں حصہ لے سکے۔

اس کی شاہکار تصنیف "مقامات" ایک کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے جو ہمدانی کے مقامات کے نمونے پر ہے۔ اس کا قصہ گو حارث بن ہمام ہے اور ہیرو ابو زید سروجی ہے جو ایک چرب زبان بدمعاش رند مشرب آدمی ہے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی عربی، فارسی، عبرانی اور شامی زبان میں لاتعداد نقلیں ہوئیں حریری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے عربی زبان پر بے نظیر قدرت حاصل ہے اور اس کا ذخیرہ الفاظ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ لفاظی کے ایسے کرتب دکھاتا ہے کہ اس کے مداح حریری کو اس اسلوب کا مکمل نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ حریری کی دوسری تصانیف میں "درۃ الغواص فی اوھام الخواص" "فرید القصر" "ارجوزۃ ملحۃ الاعراب" اور "ایک دیوان" ہے۔

حریم

عربی زبان میں اس کے کئی مفہوم ہیں:-

۱۔ جسے چھونا منع ہو اور جس کے قریب جانے کی اجازت نہ ہو۔
۲۔ حریم ان کپڑوں کو کہتے ہیں جنہیں مُحرِم (حرم والے) جب اتار دیتے تھے تو پھر پہنتے نہیں تھے۔ (جب تک حرم میں رہتے تھے)
۳۔ محرم (حرم والے) کے کپڑوں کو بھی حریم کہتے ہیں جنہیں ایام جاہلیت میں عرب طواف کرتے وقت اتار دیتے تھے۔
۴۔ شاہی محل کے گرد کی اس جگہ کو بھی حریم کہتے ہیں جہاں داخلہ ممنوع ہے اور اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔
۵۔ بیوی کو بھی حریم کہتے ہیں کیونکہ خاوند اس کی مدافعت و حفاظت کرتا ہے
۶۔ خانہ کعبہ کے ارد گرد چار دیواری کے اندر کے حصے نیز ہر مقدس مقام کو بھی حریم کہتے ہیں۔
۷۔ حریم کا لفظ کسی مکان کے اس حصے کے لئے بھی مستعمل ہے جہاں غیر کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس سے ان سب مستورات کو بھی حرم کہتے ہیں جو حرم کے اندر مقیم ہوں۔

فارسی میں حریم عام مکان کا احاطے اور مکان کی چار دیواری کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

حریریہ

دمشق کے ضلع میں رفاعیہ درویشوں کا ایک فرقہ۔ اس فرقے کا بانی علی بن حسن حریری تھا جو ۶۴۵ھ / ۱۲۴۷ء میں حوران کے شہر بسر میں فوت ہوا۔ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس کے خاص عقیدے کو شاعر نجم الدین بن اسرائیل نے جس انداز میں بیان کیا ہے اسے ابن تیمیہ نے ایک بد نمونے کا ارتداد قرار دیا تھا۔

حزب

طائفہ جماعت، ہم خیال اور ہم مسلک لوگ خواہ وہ ایک جگہ رہتے ہوں یا نہ رہتے ہوں۔ حزب کا لفظ نیک اور بد، اچھی اور بری دونوں طرح کی جماعتوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے اچھے لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

" بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے۔" (۵ : ۵۶)

اور بُرے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے :

" پس انہوں نے اللہ کا ذکر بھلا دیا۔ یہی لوگ ہیں شیطان کی جماعت " (۱۹ : ۵۸)

جنگ خندق کے موقع پر قریش، غطفان اور بنو قریظہ وغیرھم کے جو لشکر صحابہ کرامؓ کی جماعت کے خلاف مدینے پر حملہ آور ہوئے تھے انہیں بھی قرآن مجید میں احزاب کہا گیا ہے۔ (۳۳ : ۲۲)

علامہ راغب اصفہانی نے حزب کے معنی یہ بتائے ہیں : " وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے "

حزب کے معنی ہتھیار کے بھی ہیں۔ نیز حزب کے معنی ورد کے بھی ہیں قرآن کا وہ حصہ جس کی انسان تلاوت کرتا ہے۔

قرآن مجید کے جزو کے لئے بھی حزب کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ مصر میں ہر طریقہ تصوف ایک حزب ہے۔

حزب

گروہ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مذہبی گروہوں کے لئے استعمال ہوا ہے :

" اللہ ہی کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے " (۵ : ۵۶)

ابتدائی زمانے میں یہ لفظ ٹکڑے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے خاص طور پر قرآن حکیم کیلئے کیونکہ مصریوں نے قرآن کو ساٹھ احزاب (حصوں) میں تقسیم کر رکھا تھا۔ موجودہ دور میں قرآن کا وہ نسخہ نہیں ملتا۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیا" میں قرآن مجید کے حصوں کے لئے حزب کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔

حزب اللہ

اللہ کی جماعت، مومن۔ قرآن مجید میں یہ ترکیب انہی الفاظ میں استعمال ہوئی ہے :

" اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے " (۵ : ۵۶)

حزب اللہ کے افراد کی صفات یہ ہیں۔ جو مومنین پر نرم اور کفار پر سخت ہوں۔ جو اللہ کی راہ میں جد و جہد کریں، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہوتے ہیں۔

حزقی ایل

ایک نبی۔ بن بوری۔ جب آپ کی والدہ کی عمر زیادہ ہوگئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کے لئے دعا مانگی جو قبول ہوئی۔

حزقی ایل، کالب کے جانشین تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں نام کے ساتھ نہیں آیا۔ لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سورہ بقرہ میں جو یہ کہا گیا ہے :

" اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکل کھڑے ہوئے اور وہ ہزاروں ہی تھے پھر خدا نے ان کو حکم دیا کہ مر جاؤ (اور وہ مر گئے) پھر اللہ نے انہیں جلا اٹھایا " (۲ : ۲۴۳)

اس آیت میں حزقی ایل ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی اس آیت :

" اور یہی نعمت اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحین میں سے تھے " (۲۱ : ۸۵)

میں ذوالکفل کا ذکر آیا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود کے نزدیک ذوالکفل سے مراد حزقی ایل ہی ہیں۔

بقول ثعلبی فرعون مصر کی مجلس مشاورت کے ایک رکن کا نام بھی حزقیل تھا جو بقول الکسائی ابتدا میں ایک بڑھئی تھا اور حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اسے ایک صندوق بنانے کے لئے کہا تھا تاکہ اس میں نوزائیدہ بچے کو محفوظ کر سکیں اس نے یہ راز شاہی پولیس کو بتانا چاہا لیکن جونہی اس نے یہ ارادہ کیا اس کی زبان بند ہوگئی اور یہ معاملہ اس کے ساتھ اس وقت تک رہا جب تک اس نے یہ قسم نہ کھا لی کہ اب وہ یہ بات کسی سے نہیں کہے گا۔

چنانچہ اس واقعے کے بعد سے وہ حضرت موسیٰؑ کی عزت کرنے لگا

حسا

مشرقی سعودی عرب میں ایک نخلستان۔ یہ نخلستانوں کا ایک مجموعہ ہے گرمیوں میں اس علاقے کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہوتی ہے۔ آبادی دو لاکھ سے زائد ہے۔ یہاں کے باشندے سنی اور اثنا عشری شیعہ ہیں۔

یہ علاقہ مالکی علماء کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ یہ سعودی عرب کا سب سے بڑا اور زرخیز نخلستان ہے۔ حسا کی مشہور پیداوار کھجوریں ہیں۔ یہاں کھجوروں کی ستر سے زائد قسمیں ہیں۔ یہ علاقہ آنحضورؐ کے زمانے میں الحسا یا الاحسا کہلاتا تھا یہاں کے باشندوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ عباسیوں کے عہد میں جب عباسیوں کا زوال شروع ہوا تو اس علاقے کے لوگوں نے کئی بار بغاوت کی۔ ان بغاوتوں میں سب سے مشہور قرامطہ کی بغاوت ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے عرب ماخذوں میں الحسا کو بحرین میں واقع ایک قلعہ بتایا گیا ہے۔ اس قلعے کی بنیاد ۳۱۴ھ/۹۲۶ء میں قرمطی رہنما ابوطاہر جنابی نے رکھی تھی۔ اس نے قلعے کا نام المومنیہ رکھا تھا لیکن اس کے اردگرد کی بستی اپنے پرانے نام الحسا ہی کے نام سے معروف رہی۔ قرامطی اقتدار کا خاتمہ الحسا کے مقامی حکمران خاندان بنو عیون کے ہاتھوں ہوا۔

یہ علاقہ ابتدائے عہدِ اسلام ہی میں گنجان آباد ہو چکا تھا اس کے جغرافیائی محل وقوع اور وسائل کی وجہ سے نجدی وہابی اور ترک اسے اپنے قبضے میں لینے کے ہمیشہ خواہشمند رہے۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں اسے وہابیوں نے قبضے میں لے لیا۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء سے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء تک اس پر محمد علی پاشا کی مصری فوجوں کا قبضہ رہا۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۰ء میں اس پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۵۲ء تک الحسا مشرقی سعودی عرب کے پورے علاقے کا مرکز حکومت رہا اور اس زمانے میں صوبہ الحسا کہلاتا تھا۔

۱۹۵۲ء میں صوبے کا دارالحکومت الحسا سے الدمام میں منتقل کر دیا گیا۔ اور خود صوبے کا نام الحسا کے بدلے مشرقی صوبہ ہو گیا سعودی حکومت نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک اس نخلستان میں بڑے اہتمام سے زراعتی کام کی توسیع شروع کی۔

حساب

گنتی، شمار، حساب کتاب وغیرہ۔ قرآنی اصطلاح میں یہ لفظ اس حساب کتاب کے مفہوم میں آتا ہے جو اللہ تعالٰے اپنے بندوں سے لے گا۔ یوم الحساب کا لفظ قرآن مجید میں کئی مقام پر آیا ہے۔ ارشاد باری تعالٰے ہے۔

اور موسیٰ نے کہا " میں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے " (۴۰:۲۷)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے :

" یہ پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو، جب کہ حساب قائم ہوگا " (۱۴:۴۱)

" جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی ان کے لئے بھلائی ہے اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا " (۱۳:۱۸)

" اور جو لوگ ان روابط کو جن کا اللہ نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے " (۱۳:۲۱)

اسی طرح ایک مقام پر فرمایا گیا ہے :

" اللہ جلد ہی حساب لینے والا ہے " (۲:۲۰۲)

" اور اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی (۳:۱۹)

قیامت میں ہر بندے کو ایک نامۂ اعمال دیا جائے گا، جو بندے کے حساب کا گوشوارہ ہوگا۔ گویا یہ ایک فرد ہوگی جس پر اس کے اعمال لکھے ہوں گے۔ اگر نیکیاں برائیوں سے زیادہ ہوں گی تو یہ اعمال نامہ بندے کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ (۸۴:۷ تا ۱۰، ۱۹، ۲۰، ۲۹)

سخت حساب کی صورت میں یہ اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی۔ (۶۹:۲۵ تا ۲۶)

حسام الدین چلپی

(؟ — ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء) حسن بن محمد بن حسن بن اخی ترک۔ جلال الدین رومی کے شاگرد رشید۔ ان کا خاندان ارمیہ سے آکر قونیہ میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ نو عمری میں ہی مولانا جلال الدین رومی کے مرید ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ مولانا رومی اور ان کے حلقے کی نذر کر دیا۔ اس عقیدت اور خاطر داری نے مولانا رومی کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے حسام الدین کو اوقاف کی آمدنی اور لوگوں سے ملنے والے عطیات کا نگران مقرر کر دیا۔ یہ رقوم حسام الدین کو بھیج دی جاتی تھیں اور وہ انہیں سب سے پہلے مولانا رومی کے گھر والوں اور پھر ان کے حلقے کے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ حسام الدین اپنے زہد، تقویٰ اور مولانا رومی سے عقیدت مندی کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔

وہ شمس الدین تبریزی کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کی اس بات سے مولانا رومی بہت خوش تھے۔ مولانا رومی نے سرکاری حکام سے سفارش کر کے حسام الدین کو قونیہ میں خانقاہ ضیا اور خانقاہ لالا کا شیخ بنوا دیا۔ شیخ صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا جلال الدین رومی نے حسام الدین کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ مولانا کے انتقال تک وہ ان کے خلیفہ اور کاتب کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ حسام الدین نے قونیہ میں انتقال کیا اور مولانا جلال الدین رومی کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

ان کی شہرت اس اعانت کی وجہ سے ہے جو انہوں نے مثنوی مولانا روم کے لکھنے میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنی تصنیف کو حسام نامہ بھی کہا ہے۔ مولانا کو جب اور جہاں کہیں مثنوی لکھوانے کا موقع ملتا حسام الدین اشعار لکھنے اور پھر ان کو پڑھ کر سنانے کے لئے تیار رہتے تھے۔

حسان بن ثابت

(؟ — ۴۰ھ / ۶۶۰ء) ایک مشہور صحابی شاعر جو قبیلہ خزرج سے تھے۔ کنیت ابوالولید انصاری تھی۔ بقول ابو عبیدہ تمام عرب والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حسان بن ثابت تمام گاؤں کے بہترین شعراء میں سے تھے۔ آپ آنحضرتؐ کے مداح خواں تھے۔ آپؐ نے ان کے حق میں فرمایا :

" مشرکین کی ہجو کرو۔ کیونکہ جبرئیلؑ تمہاری مدد کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں "

آپؓ ۱۲۰ برس زندہ رہے ۶۰ سال بت پرستی میں اور ۶۰ سال اسلام کے دامن میں زندگی بسر کی۔

آپؓ سے حضرت عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ نے حدیث روایت کی ہیں۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔ آپؓ کے لئے مسجد نبوی میں منبر بچھایا جاتا تھا اور آپؓ سرورِ عالمؐ کے میلاد شریف اور مناقب بیان فرمایا کرتے تھے۔

حسان بن مالک

(؟ — ۶۵ھ / ۶۸۵ء یا ۶۹ھ / ۶۸۹ء)

خلیفہ یزید اوّل کا قرابت دار۔ اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے حسان بن مالک بن بحدل بن انیف جو بنی کلب کا سردار تھا۔ چونکہ اس کا دادا بحدل یزید کی ماں میسون بنت بحدل کا بھائی تھا چنانچہ ان تعلقات کی وجہ سے وراثت میں جو ایک صاحب اقتدار قبیلہ تھا، کی بنا پر اس نے حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کے عہد حکومت میں فلسطین اور اردن کے علاقے کے والی کے عہدے پر فائز رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے جنگ صفین میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا۔ جب یزید تخت نشین ہونے کے لئے دمشق گیا تو حسان اس کے ساتھ تھا۔ چنانچہ یزید کے دربار میں اسے ایک اہم حیثیت حاصل رہی۔ یزید کے انتقال کے بعد معاویہ ثانی کے تخت نشین ہونے پر وہ چند روز اردن کا والی ہوگیا۔ چنانچہ اس ایک واحد ضلع تھا جو حسان کے اثر سے امویوں کا وفادار رہا۔ بعد میں اس نے دمشق پر چڑھائی کی تاکہ وہ یزید کے کم سن بیٹوں کے مفادات کی نگہداشت کر سکے۔ حسان نے ان کے ساتھ جابیہ میں سکونت اختیار کی۔ اس قیام کے دوران میں وہ اپنی چالوں کی

وجہ سے ضحاک ابن قیس کی پردہ دری کرنے میں کامیاب ہوا۔ جو دراصل امویوں کے مفاد سے غداری کر رہا تھا۔

جب حسان نے خالد بن یزید کے دعوے کی حمایت شروع کی تو اموی خاندان کے ارکان اور ان کے مددگاروں کو مجبوراً جابیہ آنا پڑا اور یہاں پر اس کی صدارت میں ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ چالیس روز کی گفت و شنید کے بعد مروان کو خلیفہ چنا گیا لیکن حسان نے اسے خلیفہ تسلیم کر لینے سے پہلے اسے اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ اس کے بعد خالد اس کا جانشین ہوگا۔ نیز اس کو اور اس کے خاندان کو وہ تمام مراعات حاصل ہوں گی جو انھیں بنو سفیان کے عہد میں حاصل تھے۔ اس کے بعد حسان کا اثر و رسوخ کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مروان نے اپنی وفات سے پہلے اپنے بیٹے عبدالملک کی جانشینی حسان سے تسلیم کرا لی تھی۔ عمر والاشدق کی بغاوت کے دوران میں حسان عبدالملک کا حامی تھا۔ اس کے بعد اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

یہ بات واضح ہے کہ ایک عرصے تک اس کے ہاتھ میں اموی خاندان کی حکومت کی باگ دوڑ رہی۔

حسان بن نعمان

(۔۔۔۔۔۔ ؟ ۔۔۔۔۔۔ ۸۶ھ/ ۷۰۵ء)

ایک نامور مسلمان جرنیل، مدبر، سیاستدان اور فاتح۔

حسان بن نعمان شاہان غسان کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں افریقہ کا والی رہا۔ اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں مصر کا عامل مقرر ہوا۔

۷۶ھ/ ۶۹۵ء میں جب افریقہ میں شورش برپا ہوئی تو خلیفہ عبدالملک نے حسان کو اس شورش کو فرو کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حسان ۷۸ھ/ ۶۹۷ء میں ایک لشکر جرار لے کر وہاں پہنچے اور سب سے پہلے قرطاجنہ کو فتح کیا جو ابھی تک بزنطیوں کے قبضے میں تھا۔ قیروان میں کچھ روز ستانے کے بعد حسان ملکہ کاہنہ پر حملہ کرنے کی غرض سے جبل اوراس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے وادی مسکیانہ میں داخل ہوا۔

ملکہ کاہنہ کی بربر فوجوں سے اس کا نہایت سخت مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو بہت سا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ چنانچہ حسان پسپا ہو کر برقہ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ جہاں پر اس نے خلیفہ کی طرف سے مزید کمک پہنچنے کا انتظار کیا۔ ۷۹ھ/ ۶۹۸ء میں مسلمانوں نے دوبارہ قرطاجنہ کا خشکی اور سمندر کی جانب سے محاصرہ کر لیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ حسان نے ان سب قلعوں کو جو افریقہ میں رومیوں کے قبضے میں تھے، فتح کر لیا۔ اس کے بعد حسان نے جبل اوراس کی جانب پیش قدمی کر کے ملکہ کاہنہ کے خلاف مہم کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ ملکہ کاہنہ کی بربر فوج مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا سکی اور میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی حسان نے تعاقب کر کے ملکہ کاہنہ کو قتل کر دیا۔ اور بربر قبائل نے حسان کو بارہ ہزار مجاہد مہیا کر کے امان حاصل کی۔ جب بربر قبائل نے اسلام قبول کر کے اطاعت کا اظہار کیا تو حسان بن نعمان اطمینان کر کے قیروان واپس لوٹ آیا۔ کیونکہ اب سارا علاقہ اس کے زیر نگین آ چکا تھا۔ اس کے بعد حسان اس علاقے کے نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔ عین اسی زمانے میں کہ جب اس نے انتظام کی طرف توجہ دی تھی مصر کے والی عبدالعزیز بن مروان نے اسے اچانک معزول کر دیا اور اس کی تمام املاک ضبط کر لی۔

حسان نے افریقہ کو فتح کر کے اسلامی حکومت کو وہاں مضبوط و مستحکم بنایا۔ اس نے تونس میں ایک دارالصناعۃ قائم کر کے بحری بیڑے کو مضبوط کیا۔ قیروان میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

حسان نے اپنی آخری عمر میں کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ البتہ وہ رومیوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

اس کی وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے اس کا سال انتقال ۸۰ھ/ ۶۹۹ء بتایا ہے۔

حسان، بنو

ایک عربی قبیلے کی شاخ جو کندہ کے جنوب میں آباد ہے۔ یہ لوگ پہلے حضرموت میں رہتے تھے اور حسان بن معاویہ بن حارث بن معاویہ بن ثور بن مرتع بن کندہ کی اولاد ہیں۔

اس قبیلے کا ایک فرد عبدالرحمٰن بن علی بن باحسان الحضرمی (۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء تا ۸۱۸ھ/ ۱۴۱۵ء) تھا جس کی تاریخ کو عبداللہ بن احمد ابو اور اس کے بیٹے طیب نے تذکروں کی نعت تلاوۃ النحر کے لئے استعمال کیا۔

قلقشندی کے نزدیک حسان کا ایک اور بطن کلب کی ایک شاخ عذرہ بن زید اللات سے تعلق رکھتا ہے۔

حسب و نسب

حسب کے معنی کرم، شرف اور وہ فضیلت ہے جو اچھے اعمال کی وجہ سے حاصل ہو۔ اور نسب وہ قرابت ہے جو آباؤ اجداد کی طرف سے ہو۔

بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے آباؤ اجداد تو نیک ہوتے ہیں لیکن ان کے اپنے اعمال اچھے نہیں ہوتے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حسیب وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جو خود بلند مرتبہ ہو جس کے آباؤ اجداد گو اعلیٰ درجے کے نہ ہوں۔ ہمسر شان کی تعیین میں فقہا حسب کو بھی دیکھتے ہیں اور نسب کو بھی۔

بقول صاحب غریب القرآن "حسب ان اعلیٰ اعمال کو کہا جاتا ہے جو کسی خاندان میں باپ کے بعد بیٹے میں منتقل ہوتے چلے جائیں۔"

حسب کے معنی رشتے دار کے بھی ہیں۔

کسی فرد یا قبیلے کا نسب نامہ زمانہ جاہلیت میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اور نسب کے ماہرین کو نسابہ کہا جاتا تھا۔

نسب عزت و تکریم کا ایک عنصر تھا۔ یہ نہ صرف پدری بلکہ مادری نسل پر بھی مبنی تھا۔ عام طور پر قبیلے کے تمام افراد کا ایک اجتماعی نسب ہوتا تھا۔ جو اس کے جد اعلیٰ تک جاتا تھا۔ مگر اس کے علاوہ ایک قریب تر نسب بھی ہوتا تھا۔

عربوں میں کسی شخص یا قبیلے کا مقام اعزاز و اکرام متعین کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ اس کے اعمال دیکھے جائیں نیز یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اس کی قرابت داری معزز لوگوں سے ہے یا معمولی درجہ کے لوگوں سے یہ رشتہ داری ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے رکھی جاتی تھی یعنی اس کے آباؤ اجداد کون ہیں اور اس کے شادی بیاہ کے تعلقات کن لوگوں سے قائم ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں حسب اور نسب بڑی حد تک لازم و ملزوم تھے۔ نسب کے ساتھ ساتھ، کسی فرد یا قبیلے کی عزت و تکریم اس پر بھی منحصر تھی کہ اس کے

آباؤ اجداد نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اور ان میں سخاوت وشجاعت وغیرہ کے اعلیٰ اوصاف کہاں تک پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ اس قسم کا شخص بہر حال افضل تھا جس کا نسب بھی اعلیٰ ہو اور حسب بھی۔ اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعے حسب نسب کے معیار سے ہٹ کر ایک اور معیار قائم کیا ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے" (۴۹:۱۳)

حدیث میں آیا ہے۔

"اپنے باپ دادوں پر فخر نہ کرو" (احمد)

اسلام نے طعن فی النسب سے منع فرمایا ہے۔

عرب اپنے رواج کے مطابق اپنے اباؤ اجداد کی قسمیں کھاتے تھے۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔

"خبردار اللہ تمہیں اس سے منع فرماتا ہے کہ تم اپنے آباؤ کی قسمیں کھاؤ" (بخاری)
لیکن اپنے بزرگوں کے اچھے اوصاف کی یاد منع نہیں ہے۔

ایک اور جگہ پر آنحضورؐ نے فرمایا۔

"کسی شخص کا حسب اس کے اخلاقی اوصاف ہیں۔"

دوسری جگہ فرمایا:۔

"دامن کی پاکیزگی ہی انسان کا اصل حسب (شرف) ہے۔"

اسلام نے قبائل وشعوب کی بناء پر ترجیح کے تصور کے مقابلے میں تقویٰ کو معیار اکرمیت قرار دیا ہے۔ اس نے قبائل وشعوب کی بناء پر فخریہ جذبات کی بڑی حوصلہ شکنی کی ہے۔

حسبہ

اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ دوسری طرف یہ لفظ اس شخص کے فرائض کے معنوں میں آتا ہے جو کسی شہر میں عوام کے اخلاق کی نگرانی کے لئے سرکاری طور پر مقرر کیا جائے۔ اس شخص کو محتسب کا نام دیا جاتا ہے۔

حسبہ کے چونکہ دو مفہوم نکلتے ہیں اس لئے اس کے بارے میں معلومات مختلف قسم کے ماخذوں میں ملتی ہیں۔ اس کے ایک مفہوم کے بارے میں معلومات ان تمام کتب میں ملتی ہیں جو اخلاق عامہ، بدعت اور تجارت اور اس کے قانون کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔

بعض تصانیف میں حسبہ کے فضائل، محتسب کی ذمہ داریوں اور اس کے منصب کے مذہبی اور قانونی پہلوؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ اور بعض تصانیف میں محتسب کے فرائض منصبی کی انجام دہی کے لئے عملی اور فنی ہدایات ومعلومات درج ہیں۔

ایسی تصانیف جن میں حسبہ کے بارے میں عام بحث بھی پائی جاتی ہے بے شمار ہیں۔ ان میں دو کتابیں الماوردی کی "الاحکام السلطانیہ" اور امام غزالی کی "احیاء العلوم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی میں ایک مصری عالم ابن الاخوۃ کی تصنیف "معالم القربۃ فی احکام الحسبہ" ہے اس کے علاوہ اس موضوع پر اور کئی ایک رسائل موجود ہیں اور یہی وہ ماخذ ہیں جنہیں بنیاد مان کر حسبہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ حسبہ کے وسیع معنوں کے پیش نظر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نیکی کو فروغ دے اور بدی سے نبرد آزما ہو اس لئے عام حالات میں سمجھانے بجھانے سے کام لے سکتا ہے بلکہ قانونی مداخلت کا بھی سہارا لے سکتا ہے۔ غیر معمولی حالات میں حکومت کی نگرانی مہیا نہ ہونے کی صورت میں ان کے نفاذ کے لئے اپنے بل بوتے پر بھی کام کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ طاقتور ہو۔ وہ اصل یہ فریضہ نظری ہے اور موقع ومحل کے مطابق نیکی کی ترویج اور بدی کی روک تھام کے لئے وہ جو کچھ کر سکتا ہو اسے کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت موجود ہو تو اسے اس امر کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور جائز حکومت کی موجودگی میں اس کے فرائض انجام دینے لگے۔ البتہ وہ حکومت کی توجہ دلا سکتا ہے۔

حسبہ کا ادارہ اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن اس کا آغاز زیادہ واضح نہیں ہے ابتداء میں حسبہ اور محتسب کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے تھے۔ [illegible]ماموں کے دور حکومت میں صاحب السوق کی بجائے محتسب کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ اس سے پہلے یہ لفظ اس شخص کے لئے بولا جاتا تھا جو انفرادی حیثیت سے حسبہ کا فریضہ انجام دیتا تھا قدیم محتسب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے بنیادی مذہبی فریضے یعنی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کے علاوہ منڈی کے کاروبار کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ محتسب ان اعمال سے سروکار رکھتا تھا جو کھلے بندوں ہوتے تھے اس لئے اسے کسی قسم کی تفتیش کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ کسی کی شکایت کے بغیر دخل اندازی کر سکتا تھا۔ بازار کی نگرانی کے علاوہ محتسب کے وظائف کی تین قسمیں تھیں۔ وہ مذہبی فرائض کی انجام دہی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ مثلاً نماز باجماعت کا اہتمام اور مساجد کی خبر گیری وغیرہ گلیوں اور حماموں میں مردوں اور عورتوں کے درمیان شائستگی اخلاق کی [illegible] اور آخر میں ذمیوں کے بارے میں قانون کا نفاذ کرتا تھا۔

محتسب کو بعض اوقات حکومت براہ راست مقرر کر دیتی تھی [illegible] اوقات ان کا تقرر گورنر اور قاضی کیا کرتے تھے جنہیں حسبہ کا منصب تفویض ہوتا تھا یعنی وہ خود کام کرنے کی بجائے دوسروں سے کرا سکیں۔ محتسب عام طور پر فقیہہ ہوتے [illegible]۔

عہد ممالیک میں دیگر مناصب کی طرح بعض اوقات حسبہ کی ملازمت رشوت سے کر حاصل کر لی جاتی تھی۔

موجودہ زمانے کی اصلاحات کے رائج ہونے سے قبل عام مسلم ممالک میں محتسب ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے آغاز تک مراکش [illegible] موجود تھے۔ سلجوقی عہد میں ایران وترکیہ میں اس منصب کو احتساب کے نام سے پکارتے تھے اور حسبہ کا لفظ اس صلاحیت کے لئے مخصوص تھا جس کا [illegible] کو ہونا چاہیئے۔

حسد

کسی شخص نعمت سے [illegible] نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام [illegible] اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے مثلاً اس کے علم [illegible] عزت وشہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے اور ان چیزوں کو دیکھ کر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو تو اسے رشک کہتے تھے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسروں کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کا نام حسد ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے:

"پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا" (۴:۵۴)

"اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پلٹالے جائیں! اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔"
(۲ : ۱۰۹)

ایک حدیث میں آیا ہے :
"مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے۔" (النہایۃ)
حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں :-

۱۔ یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کرلی جائے۔ گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہیے یہ حسد کی مذموم ترین قسم ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی انہی کی طرح کافر ہو جائیں۔

۲۔ کسی کی یہ خواہش ہو کہ وہ نعمت اسے حاصل ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو نہیں مل سکتی اس لیے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کرلی جائے۔

۳۔ کوئی شخص خود اس قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ دوسرے سے سلب کرلی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے۔ دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو حقیقی معنی میں حسد نہیں کہا جاسکتا قرآن مجید میں ارشاد باری تعالےٰ ہے :

"اور خدا نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے۔
اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔" (۴ : ۳۲)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ بھی مذموم ہے۔ لیکن تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اس کو منافست کہتے ہیں۔

حسد کے سات اسباب ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ **بغض و عداوت :** یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کے لئے دشمن کی برائی اور بھلائی یکساں ہو۔ اس لئے ہر ایک کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اس کی بجائے جب خدا اس پر احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ اور اسی کا نام حسد ہے۔

۲۔ **ذاتی فخر کا غلط خیال :** جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گزرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع (بلندی) کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

۳۔ حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنا مطیع بنانا چاہتا ہے۔ مگر جب دوسرا کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع ہو سکے۔ کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے :

"کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام) کی توفیق دے کر اپنا فضل کیا ہے۔"

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

۴۔ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے شرف کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔

۵۔ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے۔

۶۔ جاہ پرستی اور ریاست طلبی بھی حسد کی ایک وجہ ہے اس لئے جو لوگ اقتدار چاہتے ہیں جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک ہو گیا ہے تو انہیں یہ چیز گراں گزرتی ہے اور وہ خواہش کرتے ہیں کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

۷۔ خبثِ نفس اور بدطینتی حسد کا ایک سبب ہے۔ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو انہیں مسرت ہوتی ہے۔

حسد ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ کوئی شخص تشگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کہا گیا ان سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو آپؐ نے فرمایا تشگون کا خیال پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔

آنحضورؐ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے "تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔" (ابوداؤد)

حسدائی بن شپروط

(۲۹۴ھ/۹۰۵ء ـــــــ ۳۶۵ھ/۹۷۵ء)

قرطبہ میں عبدالرحمٰن الثالث اور الحکم ثانی کے دربار کا ایک معزز یہودی عہدے دار۔

حسدائی عربی، عبرانی اور لاطینی زبانوں اور ملکی عشقیہ داستانوں پر عبور رکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اسے طب میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ ابتدا میں وہ ایک درباری طبیب تھا۔ لیکن جلد ہی وہ محاصل کا نگران اور پھر بزنطی اور جرمنی سفارتوں سے متعلق معاملات کا ذمے دار بنا دیا گیا۔

حسدائی ایک اہم مقصد کے لیے لیونش گیا، نبرہ کی ملکہ اور اس کے پوتے کو جو لیونش کا شہزادہ تھا قرطبہ لایا۔ اس نے ایک یونانی راہب کی مدد سے دیسقوریدس کی تصنیف کا مطالعہ کیا اور اس کے پرانے عربی ترجمے کی اصلاح کی۔

حسدائی یہودی علاقے کا سربراہ تھا۔ اس کے دربار میں عبرانی علماء اور شعراء حاضر رہتے تھے۔ اس کی کوششوں سے یہودی علوم کے ایک مقامی مدرسے کو بہت ترقی ملی۔ اس نے اندلس، المشرق، بزنطی اطالیہ طلوشہ اور خزر سلطنت کے یہودیوں کے لئے بہت سی خدمات انجام دیں۔

حسرت موہانی، مولانا

(۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء ـــ ۱۳۷۱ھ/۱۳ مئی ۱۹۵۱ء) اردو کے بلند

پایہ شاعر، سیاست دان وقومی لیڈر۔ سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص تھا۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ اودھ میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب امام علی موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے۔ پہلے قرآن شریف، اردو وفارسی کی متداول کتابیں میاں جی، غلام علی موہانی سے پڑھیں۔ ۱۸۹۴ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان خاص امتیاز سے حاصل کیا۔ فتح پور سیوہ کی آب و ہوا حسرت کی ادبی و ذہنی تعلیم کے لئے بہت راس آئی۔ یہاں مولانا سید ظہور اسلام، مولانا نور محمد، مولانا حبیب الدین جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اردوئے معلیٰ نامی رسالہ نکالا جس میں ادبی مضامین کے ساتھ سیاسی مضامین بھی ہوتے تھے۔ مئی ۱۹۰۴ء میں
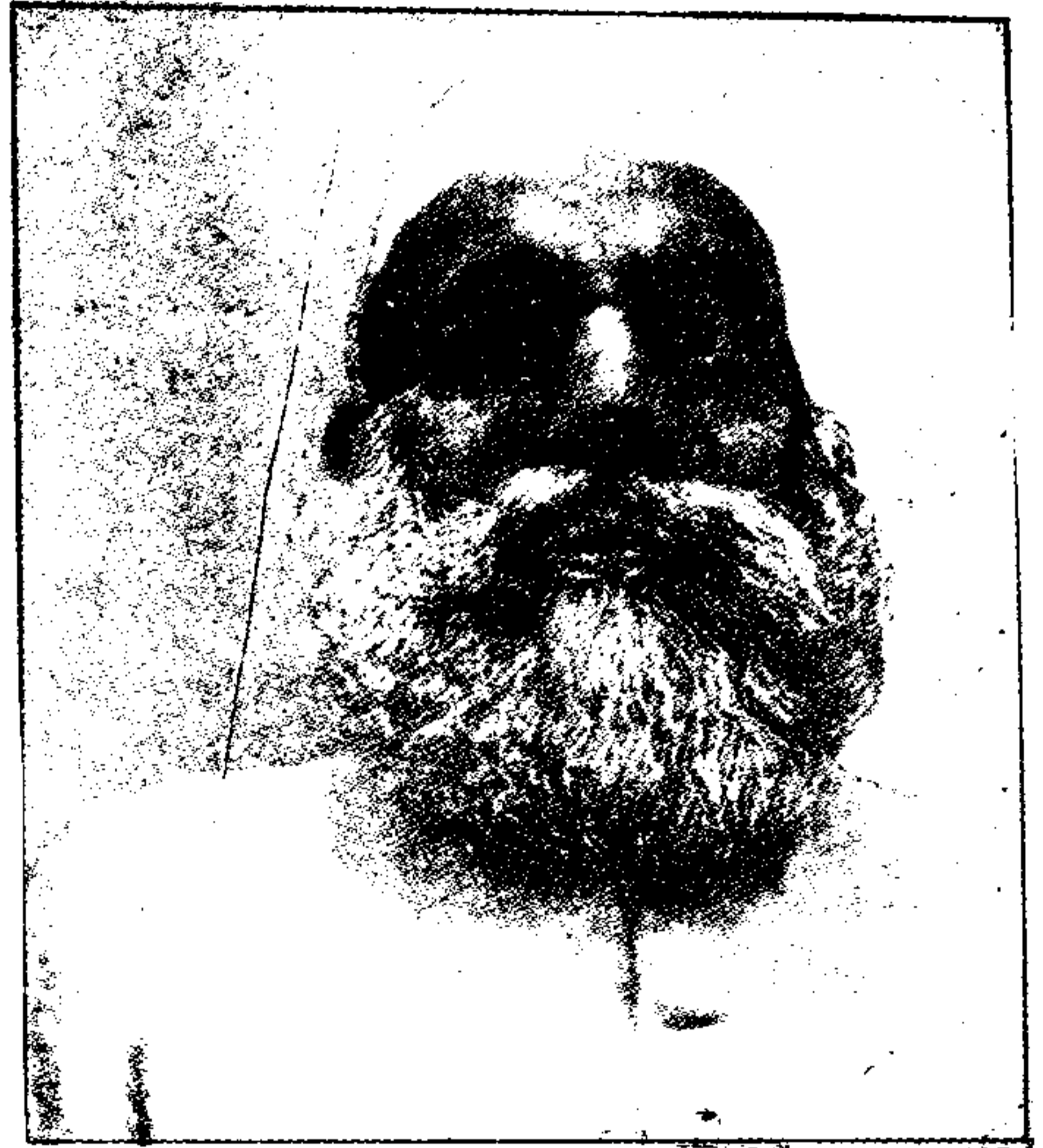
مولانا حسرت موہانی

مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا کانفرنس میں حصہ لیا اور اسی وقت سے سودیشی تحریک کے مبلغ بن گئے۔

۱۹۰۷ء میں کانگرس کو چھوڑ دیا۔ ۱۹۰۸ء میں اپنے رسالے میں ایک مضمون شائع کرنے کی پاداش میں قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس قید کے زمانے میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں قید سے رہا ہونے کے بعد پرچہ دوبارہ جاری کیا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ نے پرچہ دوبارہ بند کر دیا تو مولانا نے وطنی مال کا ایک اسٹور شروع کیا۔

اسی زمانے میں جب مسلمانوں میں احرار نے جنم لیا، اس جماعت کے رہنماؤں اور رہبروں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہیں سے مولانا حسرت موہانی رئیس الاحرار کہلائے۔ حکومت مولانا کو تحریک آزادی کے اول صف اول کے قائدین میں شمار کرتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں للت پور جیل میں قید کر دیئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا، مسلم لیگ کا جلسہ بھی اس کے ساتھ ہوا۔ مولانا نے اس میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ مولانا نے ترک موالات کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں تیسری اور آخری مرتبہ قید (دو) سال کے لئے قید ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں اردوئے معلیٰ پھر سے جاری کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا مسلم لیگ کی تنظیم جدید سے وابستہ ہوئے۔ اور یوپی پارلیمنٹ بورڈ کے سرگرم ممبر تھے۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کو عوام میں مقبول بنانے میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی اور مولانا حسرت موہانی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ہندی مسلمانوں کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے مولانا قاہرہ کی فلسطین کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

تقسیم پاکستان کے بعد مولانا ہندوستان ہی میں رہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان کا وجود بہت بڑا سہارا تھا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب مولانا حسرت موہانی کے علاوہ کوئی ایسا ممبر نہ تھا جو مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے۔ مولانا نے [illegible] برس کی عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں باغ مولانا انوار میں دفن ہوئے۔ [illegible] پہلی بیوی سے اور ایک لڑکی دوسری بیوی سے ہے۔

مولانا کی زندگی صحیح معنوں میں ایک مرد مسلمان کی زندگی تھی۔ [illegible] باطن یکساں تھا۔ مولانا جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتے [illegible] کے بغیر کھل کر کہہ جاتے۔ بغیر نمبر کئے [illegible] کئے بغیر رہ نہ سکتے تھے۔ مولانا نے مالی خدمت کے [illegible] مرتبہ مدینہ طیبہ میں حاضری دی۔ مولانا کی [illegible] متروکات سخن، مشاہدات زنداں، انتخاب سخن [illegible]

حسن

خوبصورت، جمیل۔ [illegible] مذہب [illegible] میں [illegible]
قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔
اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ [illegible]

([illegible] ۲۵ - ۱۲۵)

علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے [illegible]
حسن وہ حدیث ہے جس کے راویوں کے ثقہ ہونے پر [illegible]
دوسری معمولی وجہ سے کچھ کمزوری بھی پائی جاتی ہو۔

حسن آغا

(— ؟ —— ۹۵۰ھ [illegible] ۵۴ [illegible])

الجزائر میں خیرالدین کا نائب۔

[illegible] میں پیدا ہوا۔ خیرالدین نے ایک حملے کے دوران [illegible] کے اپنے خواجہ سراؤں میں شامل کر لیا تھا۔ حسن آغا نے جلد ہی [illegible] حاصل کر لیا۔ چنانچہ اس نے حسن آغا کو کہیں [illegible] بنا دیا۔ جب [illegible] پر چڑھائی کی تو الجزائر کی حکومت حسن آغا کے سپرد کر دی۔ جب [illegible] خیرالدین کو ترکی واپس بلا لیا تو وہاں کی حکومت اس نے حسن آغا [illegible] حسن نے اپنے فرائض نہایت عمدگی سے سرانجام دیئے [illegible] اس سے خوش تھی۔ بقول [illegible] ''اس سے زیادہ منصف مزاج [illegible] نہیں [illegible]

جب ۱۵۴۱ء میں چارلس پنجم نے الجزائر پر حملہ کیا تو اس نے اس موقع پر حد درجہ شجاعت و بہادری دکھائی۔ اور شہنشاہ کی فوج کو شکست دینے میں بذات خود حصہ لیا۔ ہسپانوی فوج کی ناکامی کے بعد حسن نے ۱۵۴۲ء میں کوکو کے بادشاہ کے خلاف فوج کشی کی اور اسے خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس نے تلمسان کے بادشاہ کو وہران کے ہسپانویوں سے بچانے کے لئے المغرب میں فوج کشی کی۔ اس کے بعد اسے معزول کر دیا گیا۔

حسن نے اٹھاون سال کی عمر میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں وفات پائی۔ وفات کے بعد اسے اس قبے میں دفن کیا گیا جو اس کے کہنے پر باب الوید کے قریب بنوایا تھا۔

حسن البنّا

(۱۳۲۴ھ/اکتوبر ۱۹۰۶ء – ۱۳۶۹ھ/فروری ۱۹۴۹ء) اخوان المسلمون (مصر) کے بانی۔ والد کا نام احمد بن عبدالرحمٰن تھا۔ محمودیہ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ والد کا پیشہ گھڑی سازی تھا لیکن وہ ازہر کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کا ایک حصہ روزی کمانے کے لئے گھڑی سازی میں صرف کرتے اور بقیہ اوقات فقہ و حدیث کے مطالعے اور قرآن کی تدریس میں گذارتے۔ بعد میں اعزازی طور پر اپنے گاؤں کی مسجد میں خطیب ہو گئے۔ چنانچہ حسن البنا نے ایسے گھرانے میں پرورش پائی جو دینی ماحول، علم و فضل اور اعلیٰ اسلامی اصولوں سے آراستہ تھا۔

آپ کی ابتدائی تعلیم میں آپ کے والد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ نے بچپن میں اپنے والد سے قرآن حفظ کیا۔ بعد میں محمودیہ کی ایک ابتدائی درس گاہ میں داخلہ لیا۔ جہاں آپ نے استاد محمد زہران سے اخلاقی تربیت پائی۔ پھر مدرسہ رشادیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ تین سالہ کورس پاس کرنے کے بعد آپ کو ضلعی بورڈ کی طرف سے معلمی کے فرائض سونپے گئے لیکن آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے قاہرہ کے دارالعلوم (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لے لیا۔ جو اس زمانے میں چھوٹا ازہر کہلاتا تھا۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں آپ نے دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی اور اسمٰعیلیہ میں مدرس ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ آپ ۱۹۳۲ء تک یہیں رہے۔ اس دوران میں آپ نے اسمٰعیلیہ کے معاشرتی حالات کا مطالعہ کیا تاکہ دعوت و تبلیغ کے لئے ایسا اسلوب اور طریق کار اختیار کریں جو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ چنانچہ ابتدائی مطالعہ و تفکر کے بعد آپ نے مسجدوں کے بجائے قہوہ خانوں میں اشاعت دعوت اور اصلاح فکر کا کام شروع کر دیا۔ اجتماعات کے لئے تکیوں اور زاویوں کو منتخب کیا گیا۔

۱۹۲۸ء میں اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۳۲ء تک جماعت کا کام اس حد تک بڑھا کہ تھوڑے عرصے کے بعد آپ کو معلمی کا منصب ترک کر کے ہمہ تن تحریک کے لئے وقف ہونا پڑا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں حسن البنا کے ساتھ حکومت کا رویہ خاصا سخت ہو گیا۔ سری پاشا اور پھر نقراشی پاشا کی وزارت کے زمانوں میں دبا دیا گیا۔ لڑائی کے بعد اخوان اور حکومت کی باہمی کشمکش بڑھ گئی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں نقراشی قتل ہوا تو اس تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد آپ کو شہید کر دیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں "مذکرات الدعوۃ والداعیہ"، "رسالۃ الجہاد" — "دعوتنا فی طور جدید"، "الرسائل الثلاث"، "بین الامس والیوم"، "الاخوان المسلمون تحت رایۃ القرآن"، "مشکلاتنا فی ضوء النظام الاسلامی" وغیرہ ہیں۔

حسن البنا بیک وقت داعی، مجاہد، مربی اور نا شر کے ساتھ انسان نظر آتے ہیں۔ آپ کے دن اسلام کی دعوت اور انسانیت کی خدمت میں گزرے اور راتیں خدا کے سامنے حاضری اور آہ و زاری کے لئے وقف رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ روحانیت، بے کراں جذبۂ عشق اور اخلاص و عزیمت کی عظیم دولت عطا فرمائی تھی۔
آپ نے پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا اپنے پسماندگان میں چھوڑا۔

حسن ابدال

پاکستان کے ضلع کیمبل پور کا قصبہ جو اٹک سے چالیس کلومیٹر مشرق میں واقع ہے یہ قدیم ٹیکسلا کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے آثار کا ایک حصہ ہے۔ یہ سطح سمندر سے اوسطاً ۱۵۰۴ فٹ بلند ہے۔ چشموں اور باغات کی کثرت کی وجہ سے مغل مورخین نے اسے لاہور سے کابل جانے والی شاہراہ پر حسین ترین منزل لکھا ہے۔ یہاں پر کوئی خاندان ایسا نہیں ہے جو ۱۷۴۵ء سے پہلے کا آباد ہو۔ ۱۸۹۶ء میں یہاں پر ریلوے سٹیشن بنایا گیا۔
ٹیکسلا اور حسن ابدال کا درمیانی فاصلہ بارہ میل ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں یہاں پر چھ سو سے زائد کنوئیں کھودے گئے ہیں لیکن کسی میں سے ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ موجودہ قصبہ مسلم عہد سے پہلے آباد تھا۔

موجودہ قصبہ پندرھویں صدی کے نصف اول میں سبزوار کے ایک مجذوب بزرگ حضرت بابا حسن ابدال نے جو بابا ولی قندھاری کے نام سے مشہور تھے کے نام پر آباد ہوا۔ یہ بزرگ تیمور کے لشکر کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ یہ قصبہ جس پہاڑی کے دامن میں آباد ہے اس بابا ولی قندھاری کی پہاڑی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ ۱۵۸۱ء میں قلعہ اٹک کی تعمیر اور اس کے پانچ سال بعد کشمیر کا راستہ محفوظ ہو جانے سے حسن ابدال ایک اہم مقام بن گیا۔

یہاں کئی ایک مقبرے ہیں جو خستہ حالت میں ہیں ان میں سے ایک کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کی دختر کا ہے۔ جو آجکل "لالہ رخ" کے نام سے موسوم ہے۔ مغل عہد کی سرائے جس کا کننگھم نے ذکر کیا ہے۔ اسے ۱۹۰۷ء میں مسمار کر کے کمپنی باغ بنا دیا گیا۔ یہ باغ ۱۹۶۲ء میں کیڈٹ کالج میں شامل کر لیا گیا۔
شاہان مغلیہ حسن ابدال میں اکثر آتے رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے یہاں پر تقریباً اٹھارہ ماہ قیام کیا۔ ۱۷۵۲ء سے ۱۸۱۳ء تک یہ علاقہ درانی کے قبضے میں رہا۔ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۴۹ء تک اس قصبے پر سکھوں کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔
آجکل اس کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار سے زائد ہے۔ یہاں پر فوجیوں کی ٹریننگ کے لیے ایک کالج بنایا گیا ہے۔

حسن الاعصم

(۲۷۸ھ/۸۹۱ء – ۳۶۶ھ/۹۷۷ء) بحرین کا ایک مشہور قرمطی رہنما۔ حسن الاحساء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ احمد بن ابی سعید ابوطاہر سلیمان کا بھائی تھا حسن ابوطاہر کی وفات کے بعد اکیلا کبھی اقتدار کا مالک رہا۔ بلکہ ابوطاہر کے بھائی مجموعی حیثیت سے اقتدار کے مالک تھے۔ وہ متعدد مواقع پر قرمطی افواج کا سپہ سالار رہا۔
۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا اور اخشیدی گورنر کو شکست دی لیکن کچھ مال غنیمت کے غلط استعمال کی وجہ سے اس کی تذلیل ہوئی۔ شام کی فاطمی فتح اور قرامطہ کے رویے میں تبدیلی کے بعد جو عباسی خلیفہ کے حلیف بن گئے تھے اس نے کمان دوبارہ حاصل کر لی۔ مختار ابو یحییٰ اور ابو تغلب کی مدد سے

حسن نے ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں دمشق کے باہر فاطمی سپہ سالار جعفر بن فلاح کے قتل ہو جانے کے بعد مکمل فتح حاصل کرلی۔ اس کے بعد اس نے رملہ پر قبضہ کر لیا اور مصر میں جاکر قاہرہ کا محاصرہ کر لیا لیکن اپنے حلیفوں عقیل اور طی کے دھوکہ دینے کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑا۔ اور الاحساء واپس لوٹ آیا۔ لیکن دمشق قرامطہ کے قبضے ہی میں رہا۔

۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں اس نے ایک بار پھر مصر پر چڑھائی کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی اس کے حلیف حسن بن الجراح نے غداری کی۔ چنانچہ فاطمی دستوں نے اسے شکست دی جو قرامطہ شام ہی رہے وہ ترک الپتگین کی فوج میں شامل ہوگئے جوہر کی کمان میں ایک فاطمی فوج دمشق کے باہر آ پہنچی۔ الپتگین اور دمشق کے باشندوں نے حسن سے مدد مانگی جس نے جوہر کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ حسن اور الپتگین نے جوہر کا تعاقب کیا۔ جوہر کو رملہ اور پھر عسقلان بھی ذلت آمیز شرائط پر چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد العزیز خلیفہ ۳۶۵ھ/۹۷۵ء میں خود میدان جنگ میں نکلا۔ اس نے الپتگین اور حسن کو شکست فاش دی۔ بعد میں حسن نے خلیفہ سے اس شرط پر کہ خلیفہ اسے تیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرے گا صلح کرلی۔

حسن رملہ میں بیمار ہو کر فوت ہوا۔ اسے فاطمیوں کے متعلق قرامطہ کے رویئے میں بڑی تبدیلی کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔

حسن الملک الناصر

(۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء ـــــــــــــ ۷۶۲ھ/۱۳۶۲ء)

ناصر الدین ابوالمعالی۔ دولت الترک خاندان کا انیسواں مملوک سلطان۔

حسن قلاوون کے آٹھ بیٹوں میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ خاندانی جانشینی کے لئے مسلسل کوشش کی وجہ سے پہلی بار سلطنت حاصل کرنے کے وقت ۱۴ رمضان ۷۴۸ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۳۴۷ء میں اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اس نے پہلے دور حکومت میں جس کی معیاد چار سال تھی دراصل حکومت نہیں کی اور جیسا کہ ممالیک کے عہد میں اکثر ہوتا تھا عملاً اقتدار سابق سلطان کے دور کے باقی ماندہ امراء کے باہم حریف گروہوں میں بٹا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بلوغ کو پہنچنے کے نو ماہ بعد امیر طاز اور امیر منکلی کے دباؤ کی وجہ سے حسن تخت سے دستبردار ہوگیا۔ اور اس کی جگہ اس کا بڑا بھائی صالح تخت نشین ہوا جو تین سال تک حکومت کرتا رہا۔

حسن کی دوبارہ بحالی میں صیر غتمش اور شیخون جیسے امراء نے خاص طور پر حصہ لیا۔ دوسری بار تخت نشینی کے فوراً ہی بعد شیخون ایک مملوک کے ساتھ جھگڑے کے دوران میں مارا گیا اس کے بعد حسن کی حیثیت کمزور ہوگئی۔ آخر کار حسن کا دوسرا اور آخری دور حکومت اس کے اپنے ہی ایک جاہ طلب مملوک یلبغا نے ختم کر دیا۔ جب سلطان سازش کی اطلاع پاکر بدوی لباس میں شام کی طرف بھاگ جانے کا انتظام کر رہا تھا تو اسے قلعے میں قتل کر ڈالا گیا۔

حسن کا دورِ حکومت نہ تو طوالت ہی وجہ سے اہم ہے اور نہ اس کے عہد حکومت میں کوئی ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس نے تاریخ پر کچھ اثرات مرتب کئے ہیں۔

حسن بابا

الجزائر کا دے (Dey)

ابتداء میں حسن بابا بحری قزاقوں کا سردار تھا۔ اس نے ۱۶۷۱ء کے انقلاب میں حصہ لیا جس سے آغاؤں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ان کی جگہ دایات کی حکومت قائم ہوگئی۔ حاج محمد جو پہلا دای تھا حسن کا خسر تھا اس وجہ سے حقیقی اقتدار اس کے ہی ہاتھ میں تھا۔ اس کی نخوت بے اعتمادی اور بے رحمی کی بناء پر اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے بغاوت کی تمام کوششوں کو سختی سے دبائے رکھا۔ جب مراد بک کے بیٹوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے تونس میں انتشار پیدا ہوا تو اس نے امن و امان بحال کرنے کے بہانے ۱۶۸۰ء میں تونس پر حملہ کر دیا۔ اس نے ۱۶۸۱ء میں المغرب میں مولوی اسمعیل کی فوج سے جنگ لڑی۔ ۱۶۸۲ء میں حاج محمد یہ اطلاع پاکر کہ فرانسیسیوں نے ایک بیڑا اس کے خلاف روانہ کیا ہے طرابلس بھاگ گیا۔ چنانچہ اب عنان حکومت حسن نے سنبھال لی جب الجزائر پر پہلی گولہ باری (۱۶۸۲ء) ہوئی تو حسن اس دوران میں نہایت سختی سے حکومت کرتا رہا۔ دوسرے سال ڈیوک سن دوبارہ شہر کے بالمقابل آ دھمکا اور کئی دن کی گولہ باری کے بعد دای فرانسیسی امیر البحر سے گفت وشنید کرنے پر مجبور ہوگیا۔ حسن عیسائیوں کے مرد، حاج حسین مزو مرتو کو بطور یرغمال اس کے حوالے کر دیا اور عیسائی قیدی رہا کر دیئے۔ چونکہ فرانسیسیوں کو تاوان ادا کئے جانے کے بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا اس لئے حاج حسین کا یہ کہنا تھا کہ وہ گفت وشنید کو جلد ہی کامیابی سے ختم کرے گا۔ لیکن جہاز سے ساحل پر اترتے ہی اس نے رئیسوں کو جمع کیا اور جنینہ میں زبردستی داخل ہو کر حسن بابا کو قتل کر دیا اور خود نے دای کا عہدہ سنبھال لیا۔

حسن بادشاہ قادری

(۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء ـــ ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء [illegible])

سید عبداللہ۔ سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے سید عبدالقادر جیلانی [illegible] قصبہ کے مقام پر سندھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد [illegible] سولہ برس کی عمر میں علوم درسیہ کی تمام کتب کی تکمیل کر لی۔ [illegible] شریعت کی تصوف میں والد محترم [illegible] مجاہدہ ریاضت کے لئے آپ دریائے تور [illegible] ایک مشقت اٹھاتے رہے تبلیغ و ارشاد [illegible] کا ٹھیاواڑ میں کئی [illegible] سے ہوتے ہوئے دہلی اور وہاں سے [illegible] کشمیر گئے اور چھ ماہ تک قیام کیا۔ قیام کے دوران میں [illegible] میں سو آدمی روزانہ کھانا کھاتے تھے۔ آپ نے [illegible] بھی آپ نے اختیار کی [illegible] سے ملاقات کی۔

آپ نے اورنگ زیب [illegible] پشاور [illegible] ہے۔

حسن بزرگ

(ــــــــــ ؟ ـــــــ ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء)

بغداد میں جلائری خاندان کا بانی۔ حسن بن حسین ورگان بن [illegible] ایلخان المعروف بہ شیخ حسن۔

ابوسعید کی زندگی ہی میں اس نے ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا کیونکہ اس کی ماں ایلخان ارغون کی بیٹی تھی اسی وجہ سے جب ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء میں [illegible]

ایلخان ابوسعید کے قتل کا منصوبہ بنانے کا غالباً جھوٹا الزام عائد کیا گیا تو اس کی جان بخشی تو ہو گئی لیکن سزائے موت کے بدلے اسے کماخ میں جلا وطن کر دیا گیا۔ اگلے سال اسے ایشیائے کوچک کا والی بنا دیا گیا۔ ابوسعید کی وفات کے بعد جب تخت کے لئے کشمکش شروع ہو گئی خان آرپا جسے بادشاہت کے لئے چنا گیا تھا وہ بغداد کے والی علی پادشاہ کے ساتھ جنگ میں مارا گیا۔ علی نے ہلاگو کی نسل سے ایک اور حاکم موسیٰ کی بادشاہت تسلیم کر لی۔ اس پر شیخ حسن نے اس کی مخالفت میں بادشاہت کے ایک اور دعویدار محمد کو موسیٰ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ جنگ میں شیخ حسن نے فتح پائی اور اس نے تبریز کو اپنا صدر مقام بنایا۔ موسیٰ نے بغداد کی طرف مراجعت کی۔ یہ نزاع چونکہ دو مغول قبیلوں کے درمیان تھی، اس لئے خراسان کے امراء نے طغا تیمور کو خان منتخب کر لیا۔ اور موسیٰ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن ان امراء نے ۷۳۷ھ/ ۱۳۳۷ء میں شیخ حسن کے ہاتھوں مراغہ کے قریب ایک لڑائی میں شکست کھائی۔ موسیٰ گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں شیخ حسن کا ایک اور حریف حسن کوچک پیدا ہو گیا۔ اس نے جنگ میں شیخ حسن کے تسلیم کردہ خان محمد کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور شیخ حسن پر [illegible] کی۔ شیخ حسن نے تبریز بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ بعد ازاں وہ [illegible] اپنے قدم مضبوط کر کے اس نے شاہ جہان تیمور کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ [illegible] کے بعد سے اپنی وفات تک شیخ حسن بغداد پر خودمختار طور پر [illegible]

حسن بصری، خواجہ

([illegible] — ۱۱۰ھ) تابعی، بزرگ صوفی اور صاحب [illegible] کنیت ابو سعید [illegible] والد کا نام موسیٰ راعی تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد زید بن ثابت انصاری کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے ۱۲ھ میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ آپ کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھیں۔ جب آپ پیدا ہوئے تو حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں لائے گئے۔ آپ بڑے خوش رو تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کو دیکھ کر فرمایا "اس کا نام حسن رکھو کیونکہ اس کا چہرہ حسین ہے۔"

ابتداء میں آپ جواہرات بیچا کرتے تھے۔ چنانچہ لوگ آپ کو حسن لولوئی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کاروبار میں آپ نے بہت سا روپیہ کمایا۔ جب عشق الٰہی کا غلبہ ہوا تو آپ نے سارا مال و اسباب راہ خدا میں لٹا دیا اور دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو کر عبادت، ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ سنت نبوی اور متابعت مصطفویؐ کے بڑے پابند تھے۔ خوف الٰہی سے ہر وقت روتے رہتے تھے۔ کثرت گریہ کے باعث آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ کمزور اتنے ہو گئے تھے کہ بدن پر گوشت نظر نہیں آتا تھا۔ بقول صاحب تذکرۃ الاولیاء حضرت علیؓ بصرہ تشریف لائے تو تمام واعظین اور ذاکرین کو منع کر دیا۔ مگر حسن بصری کا منبر باقی رہنے دیا۔ آپ حضرت علیؓ کے خلیفہ اور حضرت امام حسنؓ اور خواجہ کمیل بن زیاد کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ نے ہشام بن عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں نواسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار مبارک بصرہ میں ہے۔

آپ کا معمول تھا کہ ہفتے میں ایک بار مجمع عام میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ معرفتیں اٹھ گئیں اور برائیاں رہ گئیں۔ اور مسلمانوں میں جو باقی رہ گیا وہ مغموم و متفکر ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مالک بن دینارؒ نے پوچھا "لوگوں کی خرابی کس بات میں ہے؟" فرمایا "دل کے مرنے میں" پوچھا "دل کا مرنا کیا ہوتا ہے؟" فرمایا "دنیا کی محبت" حضرت جبیرؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

۱۔ بادشاہوں کی بساط پر قدم نہ رکھنا اگرچہ وہ شفقت کریں۔
۲۔ کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا خواہ وہ رابعہ وقت ہو اور تو اسے کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہو۔
۳۔ مزامیر نہ سننا اگرچہ تو مردان مرد کا درجہ رکھتا ہو۔

آپ بڑے مستجاب الدعوات، صاحب کرامات، عالی مقامات اور ظاہری و باطنی علوم میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ نے ایک سو بیس صحابہ کرام کو دیکھا جن میں ستر اصحاب بدر تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ آپ کو بہت اچھا جانتی تھیں۔ آپ کے کلام میں بے حد اثر و قبولیت تھی چنانچہ ہزارہا افراد نے آپ کی مجلس سے ہدایت پائی۔

بقول ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی، آپ خوف الٰہی کے حلیف تھے۔ حسن بصری حزن والم کو دوست رکھتے تھے۔ راتوں کو جاگتے اور عبادت کرتے تھے۔ دن ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کرتے وہ فقیہ بھی تھے اور زاہد بھی اور عابد بھی تھے۔ اور دنیا سے بیزار بھی۔ وہ دنیا اور اس کی زینت کو ہیچ اور ناکارہ سمجھتے تھے۔ نفس کی خواہشات سے بغاوت کیے ہوئے تھے۔

حسن بن استاد ہرمز

(——— ؟ ——— ۴۰۱ھ/ ۱۰۱۰ء / ۱۰۱۱ء)

ابوعلی کنیت۔ دیلمی فوج کا ایک سردار

۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء میں صمصام الدولہ کے قتل کے بعد حسن نے بویہی خاندان کے حکمران بہاء الدولہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے حسن کو ۳۹۰ھ/ ۱۰۰۰ء میں خوزستان کا والی مقرر کر دیا۔ اور اسے عمید الجیوش کا خطاب بھی عطا کیا۔ بعد میں اس نے حسن کو اسی حیثیت سے العراق روانہ کیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے پیشرو ابوجعفر حجاج اور ابوالعباس بن واصل اور دوسرے لوگوں سے کئی ایک جنگیں لڑیں۔

حسن نے اپنے والد کی ہی زندگی میں انچاس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس نے بغداد میں وفات پائی اور اہل قریش کے قبرستان میں دفن ہوا۔

حسن بن بہرام

(——— ؟ ——— ۳۰۱ھ/ ۹۱۳ء)

ابوسعید کنیت۔ شیعان قطیف کا سرگروہ جو عمال خلافت کے خلاف خروج کیلئے کوشش کر رہا تھا۔

۲۸۱ھ/ ۸۹۴ء میں ایک شخص یحییٰ بن مہدی قطیف (مضافات بحرین) میں وارد ہوا اس کا دعویٰ تھا کہ مجھے مہدی آخر زمان نے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا ہے اور وہ عنقریب خروج چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس شخص کے بارے میں تاریخ میں کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کس مہدی نے اپنا ایلچی بنایا تھا۔ اس شخص کا میزبان علی بن معلی نہایت غالی شیعہ تھا اس نے شیعان قطیف کو جمع کر کے مہدی آخر الزمان کا خط سنایا۔ شیعان قطیف نے خانہ ساز مہدی کے خط کو نہایت غور سے سنا اور سب نے حلف اٹھایا کہ جب اس مہدی کا ظہور ہوگا تو وہ سب ان کے ہمراہ ان کے دشمن سے لڑیں گے۔ ایک مرتبہ یحییٰ بن مہدی حسن بن بہرام کے گھر آیا اور سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جب حاکم کو حسن بن بہرام کے ایک شرمناک واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے حسن کو گرفتار کر کے سزا دی۔ چنانچہ اس کے بعد حسن اپنے اصل وطن موضع جنابا کی طرف بھاگ گیا۔ اور یحییٰ بن مہدی قبائلی بنی کلاب عقیل و خریس کے پاس چلا گیا۔ چنانچہ یہ لوگ حسن بن بہرام کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح

حسن کے کافی لوگ طرفدار ہوگئے۔ جب حسن کو ایک جمعیت حاصل ہوگئی تو وہ خود ہی دعوائے مہدویت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے قرب و جوار کے قصبات و دیہات کو تاراج کیا پھر بصرہ کو تسخیر کرنے کا عزم کیا۔ جب خلیفہ معتضد باللہ کو اس کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو اس نے بصرہ کی محافظت کے خیال سے ایک فصیل شہر کے گرد بنانے کا حکم دیا جس پر چودہ ہزار دینار صرف ہوئے۔

۲۸۷ھ/ ۹۰۰ء میں حسن بصرہ کے قریب پہنچا۔ ادھر سے عباس بن عمر عامل فارس دو ہزار سواروں کے ساتھ بصرہ کی مدافعت کے لئے آگیا۔ بصرے سے کچھ فاصلے پر دونوں میں تصادم ہوا لڑائی میں حسن کو فتح ہوئی۔ حسن کے لشکر نے شاہی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر اس کے حکم سے بہت سی لکڑیاں جمع کی گئیں اور آگ کا الاؤ تیار کیا گیا بعد میں مسلمان قیدیوں کو اس آگ میں ایک ایک کرکے جھونکا۔ اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حسن نے ہجر پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کرلیا۔

حسن اپنے خادم صقلبی کے ہاتھوں حمام میں مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سعید اس کا جانشین ہوا لیکن اس کا چھوٹا بھائی ابوطاہر سلیمان اپنے بھائی کو مغلوب کرکے تخت پر قابض ہوگیا۔

حسن کے مرنے کے بعد اس کے پیروؤں نے اس کی قبر پر بڑا گنبد تعمیر کرکے اس پر ایک پرندہ بنایا اور مشہور کیا کہ جب یہ پرندہ اڑے گا تو ابوسعید اپنی قبر سے اٹھ کھڑا ہوگا۔ نیز اس کی قبر کے پاس ایک گھوڑا باندھا اور خلعت شاہی اور تلوار رکھی تاکہ جب وہ اٹھے تو گھوڑے پر سوار ہوکر گنبد سے باہر نکلے۔

حسن اپنے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود بڑا زندیق تھا۔ اگرچہ وہ قرمطی مشہور تھا لیکن قرامطہ کے مسلک کے خلاف باطنی طریقہ کا دلدادہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حشر نشر کے سارے قصے من گھڑت اور فضول ہیں اور جو شخص کسی کو صوم و صلوٰۃ جیسے ظاہری اعمال کی ترغیب دے وہ واجب القتل ہے۔ وہ انتہا درجے کا سفاک تھا۔ اس نے بے شمار مسلمانوں کو نہایت سفاکی کے ساتھ شہید کیا۔ بہت سی مساجد منہدم کرادیں اور بے شمار عازمین حج کے قافلے لوٹے۔

حسن بن جابر

حضورؐ کے صحابی۔ آپ ابن ابی جابر السلمی کے نام سے بھی موسوم ہیں۔ طائف" میں حضور کے ہمراہ آپ بھی موجود تھے۔ انھوں نے کچھ احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

حسن بن زید بن حسنؓ

(؟ ——— ۱۶۷ھ/ ۷۸۳ء)

حضرت علیؓ کے پڑپوتے

آپ کو اپنے باپ دادا کی طرح حکومت و اقتدار کی کوئی ہوس نہ تھی۔ آپ عباسی حکومت پر رضامند تھے۔ آپ کی بیٹی خلیفہ ابوالعباس سے بیاہی ہوئی تھی۔ آپ خود بھی خلیفہ کے دربار میں رہتے تھے۔ ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء میں آپ کو مدینے کا والی مقرر کیا گیا۔ لیکن اس کے پانچ سال ہی بعد خلیفہ کسی بات پر آپ سے ناراض ہوگیا۔ چنانچہ ۱۵۵ھ/ ۷۷۲ء میں آپ کو اس عہدے سے برطرف ہونا پڑا۔ برطرفی کے ساتھ ہی آپ کو قید میں ڈال دیا گیا اور آپ کی جائداد بھی ضبط کرلی گئی۔ اگرچہ منصور کی وفات کے بعد اس کے جانشین مہدی نے اس کی تلافی کی اور جو کچھ آپ سے چھین لیا گیا تھا وہ آپ کو واپس کردیا گیا۔ آپ حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جارہے تھے کہ الحاجر کے مقام پر آپ کا انتقال ہوگیا اور آپ وہیں پر دفن ہوئے۔ آپ بڑے متقی اور متدین تھے۔

حسن بن زید بن محمد

(؟ ——— ۲۷۰ھ/ ۸۸۳ء، ۸۸۴ء)

طبرستان میں ایک علوی حکمران خاندان کے بانی۔

آپ حسن بن زید بن حسنؓ کے پرپوتے تھے۔ طبرستان میں طاہری خاندان کی جابرانہ حکومت کی وجہ سے حد درجہ بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ بعض لوگوں نے اس عقیدت کی وجہ سے جو انھیں علویوں سے تھی حضرت علیؓ کی اولاد میں سے کسی ایسے شخص کی تلاش کی جس کو وہ حکومت کا کاروبار سونپ سکیں۔ ان کی نظر حسن پر پڑی جو اس وقت رے میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا یہ انتخاب موزوں ترین رہا کیونکہ حسن میں مستعدی اور ارادے کی پختگی دوسرے تمام لوگوں سے بڑھ کر پائی جاتی ہے۔ حسن طاہری فوجوں کو شکست دینے اور آمل اور ساریہ کے شہروں اور رے پر بھی قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن انھیں چاروں طرف سے حملوں کی مدافعت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا۔

حسن کو کئی بار اپنی مملکت کو چھوڑنا پڑا۔ لیکن تھوڑے سے وقت کے بعد جب بھی وہ واپس آئے تو قسمت ان کا ساتھ دیتی۔ ۲۵۷ھ/ ۸۷۱ء میں حسن کا جرجان پر قبضہ ہوگیا۔ اسی سال ان کا ایک اور دشمن یعقوب الصفار ان کے مقابل آیا۔ اس وقت حسن میں اپنے اس طاقتور دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی چنانچہ وہ دیلم چلے جانے پر مجبور ہوگئے لیکن سخت بارشوں کی وجہ سے یعقوب کو ہزیمت اٹھانی پڑی حسن واپس آگئے۔ ۲۶۶ھ/ ۸۸۰ء میں ایک سجستانی نے جس کا نام احمد بن عبداللہ تھا جرجان پر چڑھائی کردی اور اس ملک کا ایک حصہ فتح کرلیا۔ جب حسن آمل سے برسرپیکار تھے تو ایک اور علوی نے اپنے حق میں اعلان حکومت کرانے کے لئے یہ خبر مشہور کردی کہ حسن قتل ہوگئے لیکن جب حسن واپس آئے تو اس کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور مارا گیا۔

حسن نے جب انتقال کیا تو اس وقت اپنے علاقے پر حکمران تھے بعد میں ان کا خاندان ۳۱۶ھ/ ۹۲۸ء تک طبرستان پر حکومت کرتا رہا۔

حسن بن سہل

(؟ ——— ۲۳۵ھ/ ۸۵۰ء)

بن عبداللہ سرخسی۔ خلیفہ المامون کا ایک والی۔

شروع میں یہ آتش پرست تھا۔ لیکن بعد میں اپنے بھائی فضل کے ساتھ مسلمان ہوگیا۔ ۱۹۶ھ/ ۸۱۲ء میں مشرقی صوبوں کی حکومت جب المامون نے فضل کے سپرد کردی تو حسن کو اس کا وزیر خزانہ بنادیا۔ ۱۹۸ھ/ ۸۱۴ء میں حسن اپنے بھائی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے عرب اور عراق کا والی بن گیا۔ لیکن چونکہ حسن ایرانی نسل تھا اس لیے عربوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کرسکا۔ چنانچہ اس علاقے میں جلد ہی فتنہ و فساد برپا ہوگیا۔ اگرچہ حسن نے اس فتنہ و فساد اور غنڈہ گردی کا خاتمہ کردیا لیکن یہ امن و امان دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔

۲۰۱ھ/ ۸۱۷ء میں المامون نے علی بن موسیٰ کو اپنا جانشین مقرر کیا تو بغداد میں

بغاوت برپا ہوگئی اور مہدی کے ایک بیٹے ابراہیم کی خلافت کا اعلان کردیا گیا ۲۰۲ھ/۸۱۸ء میں باغیوں نے واسط پر حملہ کردیا لیکن انھیں پسپا ہونا پڑا۔ جب حسن کا بھائی فضل قتل کر دیا گیا تو وہ دماغی توازن کھو بیٹھا۔ لیکن اسے دوبارہ صحت حاصل ہوگئی ۲۱۰ھ/۸۲۶ء میں اس نے اپنی لڑکی بوران کی شادی المامون سے کردی۔

حسن علما اور شعرا سے فیاضی کا سلوک روا رکھتا تھا۔ خاص کر علما کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔

حسن بن صالح

(غالباً ۱۰۰ھ/۷۱۸ء، ۷۱۹ء ——— ۱۶۸ھ/۷۸۵ء)

ابو عبداللہ کنیت۔ محدث اور ایک زیدی متکلم۔

اس کے بارے میں بہت کم حالات معلوم ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی امام زین العابدین کے بیٹے عیسیٰ بن زید کے ساتھ کرنے کے بعد اپنے داماد کے ساتھ روپوش ہوگیا تھا تاکہ المہدی کی تلاش سے بچ سکے۔ وہ ساری عمر روپوش رہا۔ اس نے کوفے میں وفات پائی۔ اسے صالحیہ کے زیدی فرقے کا بانی قرار دیا گیا ہے۔

ابن قتیبہ نے اسے اصحاب الحدیث کے زمرے میں جگہ دی ہے۔ ابن ندیم کے بقول محدثین کی ایک بڑی تعداد زیدی ہے۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ امامت کے مسئلے پر حسن بن صالح کی رائے بھی وہی ہے جو معتزلہ کی ہے یعنی خلیفہ کسی بھی خاندان سے ہوسکتا ہے۔

حسن کے نزدیک امامت انتخابی ہے اور مفضول کو بھی تفویض کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ فضل معلوم و معروف بھی ہو۔ اس کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت برحق ہے کیونکہ حضرت علیؓ جو آنحضورؐ کے بعد تمام مسلمانوں سے افضل تھے خلافت چھوڑنے پر رضامند ہوگئے تھے چنانچہ دوسرے شیعہ کے برعکس صالحیہ کا خیال تھا کہ صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کو ترجیح دینے میں قصوروار نہیں ہیں۔ جہاں تک حضرت عثمانؓ کا تعلق ہے صالحیہ انھیں اسلام سے خارج نہیں کرتے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اس لئے مومن ہیں اور دوسری طرف انھوں نے ایسے اعمال کئے جن کی وجہ سے وہ (نعوذ باللہ) کافر ہوجاتے ہیں چنانچہ یہ لوگ کوئی ایک پہلو اپنانے سے انکار کردیتے ہیں۔

ان کے نزدیک امام حسنؓ یا امام حسینؓ کی کسی ایسی اولاد کے لئے جو امامت کی اہل ہو امامت تسلیم کرنے کے لئے قوت (سیف) کے استعمال کے حق میں ہے ان کے نزدیک دو امام دو مختلف ملکوں میں حکومت کرسکتے ہیں۔

حسن کی تصانیف میں سے "کتاب التوحید" "کتاب امامۃ ولد علی من فاطمہ" "الجامع فی الفقہ" وغیرہ مشہور ہیں

حسن بن صباح

(——— ؟ ——— ۵۱۸ھ/ ۱۱۲۴ء)

صباحیہ فرقے کا بانی۔ جسے مہبط وحی ہونے اور اللہ تعالیٰ سے احکام پانے کا دعویٰ تھا۔ خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ علی اسمٰعیلی مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ حسن بن علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح حمیری۔

اس کا باپ بڑا شریر و عیار قسم کا آدمی تھا اور اپنے خبث باطن اور رفض و زندقہ میں بدنام تھا وہ ابو مسلم رازی کو جو ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ میں بھی صحیح العقیدہ مسلمان ہوں۔ اسی وجہ سے کہ کسی طرح اس سے رفض و الحاد کا الزام دور ہو جب اہل سنت وجماعت کے ایک بڑے عالم دین امام موفق نے نیشاپور میں مسند درس سنبھالی اور مختلف شہروں اور ممالک کے لوگ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے لئے آئے تو علی نے بھی اپنے بیٹے حسن کو نیشاپور لے جاکر امام موفق کے درس میں داخل کرایا۔ وہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے والد کے پاس آگیا جو رے میں بود و باش رکھتا تھا۔ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں اپنے ہم مکتب اور دوست نظام الملک کے پاس نیشاپور پہنچا۔ نظام الملک نے اس کی سلطان ملک شاہ سے ملاقات کرائی اور اسے سلطان کا معتمد خاص مقرر کرادیا۔ لیکن چونکہ حسن بہت ہی بدسرشت تھا اب وہ ہر وقت اس فکر میں رہنے لگا کہ کس طرح نظام الملک کو بادشاہ کی نظروں سے گرا دے اور خود اس کے عہدے پر پہنچ جائے۔ چنانچہ حسن کو اپنی ان حرکتوں کے سبب سلجوقیوں کے دربار سے نکلنا پڑا۔ یہاں سے نکل کر وہ اصفہان پہنچا۔ کچھ عرصے کے بعد اسے اصفہان کو بھی خیرباد کہنا پڑا اور ایک بار پھر عازم رے ہونا پڑا۔ رے پہنچ کر حسن کو معلوم ہوا کہ اسمٰعیلی مذاہب کا داعی الکبیر یہیں رہتا ہے۔ جو اسمٰعیلی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مبلغ ملازم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے داعی الکبیر سے مل کر درخواست دی کہ اسے بھی کوئی خدمت سپرد کی جائے۔ داعی الکبیر نے اسے ملازم رکھ لیا اور کچھ عرصے بعد اسے مصر بھیجا جہاں پر اس وقت عبیدیوں کی سلطنت تھی جو بظاہر اسمٰعیلی تھے اور در پردہ باطنی تھے۔ حسن کی مصر میں بہت قدر و منزلت کی گئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ مصر میں ایک سازش میں ملوث پایا گیا جس کی بنا پر اسے قلعہ دمیاط میں قید کردیا گیا۔ اتفاق سے اسی روز قلعہ کا ایک نہایت مضبوط برج گر پڑا۔ لوگوں نے اس واقع کو حسن کے باطنی تصرف پر محمول کیا۔ امیر الجیوش نے برافروختہ ہوکر اسے اس قلعہ سے نکال کر چند عیسائیوں کے ہمراہ ایک جہاز پر بٹھا دیا اور افریقہ کی طرف بھیج دیا۔ جہاز سے اتر کر وہ حلب بغداد، خوزستان سے ہوتا ہوا اصفہان پہنچا اور ان تمام علاقوں میں اسمٰعیلی مذہب کی دعوت دیتا رہا۔

اسی اثنا میں حسن کا استاد زادہ اور بعض دوسرے باطنی چند مضبوط قلعوں پر قابض ہوگئے۔ سب سے پہلے وہ جس قلعے پر قابض ہوئے وہ فارس کے قریب تھا جب یہاں پر ان کی جمعیت بڑھنے لگی تو انھوں نے قافلوں کو لوٹنا شروع کردیا۔ چند ہی دنوں میں ان کی چیرہ دستیاں ان اطراف میں عام ہوگئیں تھوڑے ہی عرصے بعد باطنیوں نے قلعہ اصفہان پر قبضہ کرلیا۔

حسن بن صباح نے اصفہان آنے کے بعد اپنے چند لوگ اس غرض سے قلعہ الموت کی طرف بھیج دیئے تھے کہ اس کے گرد و نواح میں اسمٰعیلی مذہب کو پھیلائیں چنانچہ اسمٰعیلی مناد قلعہ الموت کے چاروں طرف نہایت زبردست طریق سے اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے اور خود حسن الموت کے قریب قیام کرکے لوگوں کے دلوں پر اپنے ریاکارانہ زہد و اتقا کا سکہ جما رہا تھا۔ چنانچہ ہزارہا آدمیوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ جب اس کے مریدین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو حاکم علاقہ اس سے بہت متردد ہوا اس نے سپاہیوں کے ایک دستے کو رات کی تاریکی میں حسن کو گرفتار کرکے قلعے میں بند کرنے کا حکم دیا۔ لیکن قلعہ میں داخل ہونے کے بعد حسن ایک ایسی چال چلا کہ حاکم علاقہ اس قلعے سے بالکل بے دخل ہوگیا۔ حسن نے یہ زمین تین ہزار دینار کے بدلے خرید لی۔ اگرچہ اس نے نماز پڑھنے کے لئے ایک چرسہ زمین مانگی تھی جب بیعنامہ تیار ہوگیا تو اس نے ایک بیل کی کھال منگوا کر اس کے باریک

یا ریک ٹکڑے کرا کے اس سارے علاقے پر اپنے قبضے کا دعوےٰ کر دیا۔ جب حسن کو الموت جیسا مستحکم اور محفوظ قلعہ مل گیا تو اس نے صوبہ رود بار اور قزوین میں بڑے استقلال کے ساتھ اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ شروع کی۔ اس صوبے کے بہت سے لوگ بطیب خاطر اور بہت سے جبراً و قہراً اس کے داخل مذہب ہوگئے۔ اور مذہب کی آڑ ہی آڑ میں تمام صوبہ رود بار اور کوہستان میں حسن کی حکومت قائم ہوگئی اس نے قلعہ الموت کو بحیثیت مستقر حکومت خوب مستحکم کیا اور اس کے چاروں طرف عالیشان محل تعمیر کرائے اور باغات لگوائے۔

اب حسن پر ہر وقت یہ دھن سوار تھی کہ کسی طرح سلطان ملک شاہ اور اپنے دوست نظام الملک طوسی کا قلع قمع کر دے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اتنے بڑے اور زبردست حریفوں کا مقابلہ اس کے لئے آسان نہیں۔ چنانچہ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب سوچی۔ اس نے جانبازوں کی ایک جماعت تیار کی اور ان کے لوح دل پر یہ بات مرتسم کرا دی کہ شیخ الجبل یعنی حسن بن صباح تمام دنیا کا مالک اور دارو دنیا میں بڑا قادر و متصرف اور فعال لما یرید ہے اس تعلیم و تلقین کے علاوہ اس نے ایک ایسی تدبیر کی جس کی وجہ سے اس جماعت کو جان سپاری پر آمادہ کرنا بالکل آسان تھا۔ اس نے قلعہ الموت کے ارد گرد خوبصورت مرغزاروں اور جان بخش نزہت گاہوں میں نہایت خوبصورت محل، برج اور کوشکیں تعمیر کرائیں عالیشان محلات کی پاکیزگی اور خوشنمائی۔ باغوں اور مرغزاروں کی نزہت و تر و تازگی دیکھنے والے کے دل پر جادو کا اثر کرتی تھی۔ ان کے بیچوں بیچ جنت کے نام سے ایک خوش سواد باغ بنوایا جس میں وہ تمام سامان مہیا کئے جو انسان کے لئے موجب تفریح ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اشیائے بدلیعہ ہر قسم کے میوہ دار درخت، پھول، چینی کے خوبصورت ظروف، بلوری، طلائی اور نقری سامان، بیش قیمت فرش و فروش، یونان کے اسباب تعیشات، پر تکلف سامان خورد و نوش، چنگ و چغانہ، نغمہ و سرور، جنت کی دیواروں پر نقش و نگار کا نہایت نازک کام بنوایا۔ نلوں کے ذریعے محلات میں پانی، دودھ، شراب اور شہد جاتا تھا۔ ان تمام تکلفات کے علاوہ دل بہلانے کے لئے پری تمثال کم سن نازنینیں موجود تھیں ان ماہ وش اچھوتیوں کی سادگی وضع اور ان کے حسن و جمال کی دلربائی معاً دیکھنے والے کو یہ یقین دلاتی تھی کہ یہ عالم اسفل کے سوا کسی اور ہی عالم کے نورانی پیکر ہیں۔ اس بارے میں کوشش یہ کی گئی تھی کہ داخلہ کے بعد زائرین کے دل پر فرحت و انبساط کا ایک ایسا شیریں اثر پیدا کیا جائے کہ وہ اس فرحت و مسرت کو دنیاوی نہیں بلکہ اخروی یقین کرے۔

حسن نے اپنے مریدین کو تین جماعتوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک تو داعی و مناد تھے جو دور دراز ممالک میں خفیہ لوگوں کو اس مذہب کی دعوت دیتے تھے۔ دوسرے رفیق جن کو حسن کا معتمد علیہ ہونے کی عزت حاصل تھی۔ تیسرا گروہ فدائیوں کا تھا جس کے لئے یہ جنت بنائی گئی تھی۔ ابن صباح علاقہ طالقان اور رود بار وغیرہ کے خوبصورت تندرست اور قوی ہیکل نوجوان جو سادہ لوح ہوتے اور ان میں ہر بیان کے باور کرنے اور جلد ایمان لانے کی صلاحیت نظر آتی فدائیوں کی جماعت میں بھرتی کرتا۔ وہ حسن کے ہر حکم کی بلا عذر آنکھیں بند کر کے تعمیل کرتے تھے۔ بھنگ جسے حشیش کہتے ہیں شاید ان ایام میں غیر معمولی چیز تھی۔ اور غالباً حسن بن صباح ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی دانشمندی سے بھنگ سے وہ کام لیا جو اس سے پہلے شاید کسی نے لیا ہو گا۔ جب فدائی سپاہی امیدواری کا دور ختم کر لیتا تو حسن اسے بھنگ کے اثر سے بے ہوش کر کے جنت میں بھجوا دیتا۔ جہاں وہ جان پرور روحوں کی گود میں آنکھ کھولتا اور اپنے آپ کو ایسے عالم میں پاتا جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں شاید بڑے بڑے شاہان عالم کو بھی نصیب نہیں۔ یہاں وہ انواع و اقسام کی نزہت گاہوں کی سیر کرتا۔ حوروں کے حسن سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا۔ ان مہ وشوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر مئے ارغوانی کے جام اڑاتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں اور بہترین قسم کے میوے کھاتا اور ہر طرح کے تعیشات میں محو رہتا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد جب ان محبت شعار حوروں کی الفت کا نقش ان کے دل پر اتنا گہرا پڑ لیتا کہ پھر مدت العمر کبھی مٹ نہ سکے تب وہی حوریں بھنگ کا ایک جام پلا کر اسے شیخ الجبل کے پاس بھجوا دیتیں جہاں وہ شیخ کے قدموں میں آنکھ کھولتا اور جنت کے چند روزہ قیام کی خوشگوار یاد اس کو سخت بے چین کر دیتی تو حسن بن صباح اس کو جنت میں بھیجنے کی پھر امید دلاتا اور کہتا کہ جنت کے دائمی قیام کی لازمی شرط جاں سپاری ہے۔ چنانچہ وہ حسن کے احکام کی تعمیل میں کس طرح کوتاہی کر سکتا تھا۔ جب حسن کو کسی دشمن کا قتل کرانا مقصود ہوتا تو ایک فدائی نوجوان کو حکم دیتا کہ جا فلاں شخص کو قتل کر کے قتل ہو جا مرنے کے بعد فرشتے تجھے جنت میں پہنچا دیں گے یہی وہ خطرناک لوگ تھے جن سے خون آشامی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو جس کے قتل کا اشارہ ہوتا وہ وہاں روپ بھر کر جاتے رسائی اور آشنائی پیدا کرتے۔ اس کے معتمد علیہ بنتے اور موقع پاتے ہی اس کا کام تمام کر دیتے۔ یہی وہ فدائی تھے جن کی وجہ سے دنیا بھر کے امراء و سلاطین حسن بن صباح کے نام سے کانپتے تھے۔ ان فدائیوں کو بلی کا گوشت کھلایا جاتا تھا کیونکہ بلی غضب کے وقت آپے میں نہیں رہتی اور مخالف پر سخت بے جگری کے ساتھ حملہ کرتی ہے۔ جب خواجہ نظام الملک نے قلعہ الموت پر لشکر کشی کی تو ستمبر ایک ایسے ہی فدائی نے درخواست دینے کے بہانے سے شہید کر ڈالا۔ جب یہ کامیاب رہا تو حسن نے یہ بات طے کر لی کہ فوجوں کے لڑنے کی نسبت یہ بات کہیں زیادہ بہتر ہے کہ جو بادشاہ بھی اس پر حملہ کرنے کے لئے آئے اس بادشاہ کو کسی فدائی کے ہاتھوں مروا دیا جائے۔

حسن بن صباح نے ۹۰ سال کی عمر میں پینتیس سال تک قلعہ الموت میں بڑی کامیابی سے حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا۔

حسن بن صباح کا فرقہ حسنی سب سے آخری مسلح آزاد فرقہ [illegible] عالم اسلام کو سابقہ پڑا۔ ان اسمٰعیلی فرقوں کی تعداد جنہوں نے [illegible] خروج کیا کم از کم اکیس تک پہنچتی ہے پہلا فرقہ اسمٰعیلی [illegible] میں جو اپنے داعی کی طرف منسوب ہو کر یا کسی خاص عقیدہ کے [illegible] شہرت پذیر ہوئیں۔ حسن بن صباح کے فرقے کو حسنی کے علاوہ [illegible] حشاشین، باطنیہ، صباحیہ، ملاحدہ وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

حسنؓ بن علیؓ

(رمضان المبارک ۳ھ / ۶۲۴ء - ۴۹ یا ۵۰ھ / ۶۶۹ یا ۶۷۰ء) [illegible] اور آنحضورؐ کے نواسے۔ ابو محمد کنیت، سید اور ریحانۃ النبی خطاب [illegible] لقب والد کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے:

ابو محمد حسن بن علی بن ابی طالب بن عبد المطلب اور والدہ کی طرف سے فاطمہ بنت محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب۔

مدینے میں پیدا ہوئے۔ آنحضورؐ کو آپ کی پیدائش کی اطلاع ہوئی تو آپ بستر فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا میرے بچے کو دکھانا، کیا نام رکھا ہے۔ عرض کیا حرب، آپؐ نے فرمایا نہیں اس کا نام حسن ہے۔ پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ [illegible]

آپؐ کو حسنؓ سے غیر معمولی محبت تھی۔ آپ ہر روز نواسے کو دیکھنے کے لئے تشریف لے جاتے۔ آپؐ نے بڑے ناز و نعم کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ آٹھ سال کے تھے کہ آنحضورؐ کا وصال ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں سب سے پہلے طبرستان کی فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ یہ فوج کشی سعید ابن العاص کی ماتحتی میں ہوئی تھی۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں بھی شامل رہے۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد اس علاقے کے سوا جس پر حضرت امیر معاویہؓ کا قبضہ تھا، باقی سارے ملک کی نظریں حضرت حسنؓ پر لگی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں نے آپ کی بیعت کر لی۔

حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں قدیم اختلاف چلا آ رہا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کی حیات ہی میں عالم اسلامی پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جناب علیؓ کی زندگی میں ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ لیکن حضرت علیؓ کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے فوراً فوجی پیش قدمی شروع کر دی اور عبداللہ بن عامر کو مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بھیجا۔ حضرت حسنؓ اس وقت کوفہ میں تھے۔ آپؓ کو عبداللہ بن عامر کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو آپؓ بھی مقابلہ کے لئے کوفہ سے مدائن کی طرف بڑھے۔ ساباط پہنچ کر اپنی فوج میں کمزوری اور جنگ سے پہلو تہی کے آثار دیکھے۔ اس لئے اسی مقام پر رک کر یہ تقریر فرمائی:۔

"میں کسی مسلمان کے لئے اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور تمہارے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ اسے مسترد نہیں کرو گے۔ جس اتحاد و یک جہتی کو تم پسند کرتے ہو وہ اس تفرقہ و اختلاف سے کہیں افضل و بہتر ہے جسے تم چاہتے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر اشخاص جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ اور لڑنے سے بزدلی دکھا رہے ہیں۔ میں تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف مجبور کرنا نہیں چاہتا"

یہ تقریر سن کر خارجی عقائد کے لوگ جو آپؓ کے ساتھ تھے اور حضرت معاویہؓ سے لڑنا فرض عین سمجھتے تھے انہوں نے حضرت علیؓ کی طرح حضرت حسنؓ کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت حسنؓ نے یہ برہمی دیکھی تو گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ربیعہ و ہمدان کو آواز دی انہوں نے بڑھ کر خارجیوں کے زغہ سے چھڑایا۔ آپؓ سیدھے مدائن روانہ ہو گئے۔ راستے میں جراح بن قبیصہ خارجی حملے کی تاک میں چھپا بیٹھا تھا۔ آپؓ جیسے ہی اس کے قریب سے گزرے اس نے حملہ کر کے زانوئے مبارک زخمی کر دیا۔ حضرت حسنؓ مدائن پہنچ کر قصر ابیض میں قیام پذیر ہو گئے اور زخم بھرنے تک یہیں ٹھہرے رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد عبداللہ بن عامر کے مقابلے کے لئے تیار ہوئے۔

آپؓ کے مدائن چلے آنے کے بعد عبداللہ بن عامر کو موقع مل گیا اس نے بڑھ کر مدائن کو گھیر لیا۔ آپؓ اپنی فوج کی بددلی دیکھتے ہوئے پہلے ہی لڑائی کا ارادہ ترک کر چکے تھے۔ چنانچہ آپؓ نے چند شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت حسنؓ اور امیر معاویہؓ کی مصالحت کے بعد عمرو بن العاص نے جو امیر معاویہؓ کے ہمراہ تھے ان سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ مجمع عام میں حسنؓ سے دستبرداری کا اعلان کرا دو تاکہ لوگ خود ان کی زبان سے اس صلح نامے کو سن لیں۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کی فرمائش پر مجمع عام میں آپؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

" لوگو! خدا نے ہمارے اگلوں سے تمہاری ہدایت اور پچھلوں سے تمہاری خونریزی کرائی۔ دانائیوں میں بہترین دانائی تقویٰ اور کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری بداعمالیاں ہیں یہ امر (خلافت)، جو ہمارے اور امیر معاویہؓ کے درمیان متنازعہ فیہ ہے وہ اس کے حقدار ہیں یا میں، دونوں صورتوں میں امتِ محمدیہؐ کی اصلاح اور تم لوگوں کی خونریزی سے بچنے کے لئے میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

پھر معاویہؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"یہ خلافت تمہارے لئے فتنہ اور چند روزہ سرمایہ ہے۔"

اس خاتم الفتن دستبرداری کے بعد حضرت حسنؓ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینۃ الرسول چلے گئے اس طرح آنحضورؐ کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی کہ "میرا یہ بیٹا سید ہے خدا اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے گا۔"

آپؓ کی مدتِ خلافت میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک پانچ مہینہ ہے اور بعض کے نزدیک چھ ماہ سے کچھ زیادہ۔ بعض نے اسے سات ماہ سے کچھ زیادہ بتایا ہے۔

دستبرداری کے بعد حضرت حسنؓ آخری لمحہ حیات تک مدینے میں خاموشی اور سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ۵۰ھ میں آپؓ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے کسی وجہ سے زہر دے دیا، سم قاتل تھا قلب و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ جب حالت زیادہ نازک ہوئی اور زندگی سے مایوس ہو گئے تو حضرت امام حسینؓ کو بلا کر ان سے واقعہ بیان کیا۔ آپ کو اپنے نانا کے پہلو میں دفن ہونے کی تمنا تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ سے حجرہ نبوی میں دفن ہونے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے خوشی کے ساتھ اجازت دے دی۔ لیکن اجازت ملنے کے بعد بھی احتیاطاً فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد دوبارہ اجازت لینا، ممکن ہے میری زندگی میں مروت سے اجازت دے دی ہو۔ اگر دوبارہ اجازت مل جائے تو روضۂ نبوی میں دفن کرنا۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس میں بنی امیہ مزاحم ہوں گے۔ اگر مزاحم کی صورت پیش آئے تو زیادہ اصرار نہ کرنا۔

آپ نے ۴۷ یا ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مروان کو جب حضرت حسنؓ کو حجرہ نبوی میں دفن کرنے کا معلوم ہوا تو اس نے مزاحمت کی۔ چنانچہ آپؓ کو جنت البقیع میں حضرت فاطمہؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپؓ کے جنازہ میں انسانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اس سے پہلے مدینہ میں کم دیکھنے میں آیا تھا۔

آپؓ صورت و سیرت دونوں میں آنحضورؐ کے مشابہ تھے۔ روایات میں ہے کہ آپ نے نہایت کثرت سے شادیاں کیں۔ اور اسی کثرت کے ساتھ طلاقیں دیں۔ بعض روایات میں آپؓ کی ازدواج کی تعداد نوے تک پہنچتی ہے۔ اگرچہ یہ روایتیں مبالغہ آمیز ہیں۔ آپ کی کثرت ازدواج و طلاق کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے کوفہ میں اعلان کر دیا تھا کہ انہیں کوئی اپنی لڑکی نہ دے۔ لیکن مسلمانوں میں خانوادۂ نبوی سے رشتہ پیدا کرنے کا شوق اتنا غالب تھا کہ حضرت علیؓ کی مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ کی اولاد میں آٹھ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

آپؓ کی کل مرویات کی تعداد تیرہ ہے۔ آپ عرب کے اخطب الخطباء کے فرزند تھے۔ اس لئے خطابت آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کی ذات باطنی اور معنوی لحاظ سے بھی اسوۂ حسنہ نبویؐ کا نمونہ تھی۔ آپ تمام مکارم اخلاق کا پیکر مجسم تھے لیکن زہد و ورع، دنیاوی جاہ و حشم سے بے نیازی اور بے تعلقی آپؓ کا ایسا خاص اور امتیازی وصف تھا جس میں کوئی آپؓ کا حریف نہیں

آپ نے ایک عظیم الشان سلطنت کو محض چند انسانوں کے خون خرابے سے بچنے کے لئے چھوڑ دیا۔ عبادت الٰہی آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور وقت کا بڑا حصہ آپ اس میں صرف کرتے تھے۔ آپ نہ صرف خود فیاض بلکہ دوسروں کی فیاضی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آپ میں ضبط و تحمل بھی بہت زیادہ تھا۔ آنحضورؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ حسن کو میرا حلم اور میری صورت ملی ہے۔

حسن بن علی

دورِ حکومت ۵۱۵ھ/۲۲-۱۱۲۱ء — ۵۴۳ھ/۴۹-۱۱۴۸ء) مہدیہ کے زیری خاندان کا آخری حکمران جس کا والد بچپن ہی میں وفات پا گیا۔ انتقال کے وقت وہ ملک کا انتظام اپنے آزاد کردہ غلاموں کو تفویض کر گیا۔ ۱۱۲۲ء میں امیرالبحر جارج انطاکی نے قوصرہ کے جزیرے اور راس دیمس کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے المہدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۱۳۵ء میں عیسائی بیڑہ دوبارہ زیری دارالسلطنت کے سامنے نمودار ہوا۔ اس بار وہ حسن کو بچانے کے لئے آیا تھا۔ کیونکہ حسن نے روجر ثانی سے مدد کی درخواست کی تھی جب کہ حمادی خاندان کے بادشاہوں نے خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے حملہ کر رکھا تھا۔ مسلم حکمران نے عیسائی بادشاہ کو اس کی اعانت کے صلے میں ساحلی علاقوں کے بڑے حصے پر اپنا اقتدار جمانے کی اجازت دے دی۔

۱۱۴۲ء میں مہدیہ کے سامنے امیرالبحر جارج انطاکی کے ایک نئے بحری بیڑے نے حسن کو روجر ثانی کی پیش کردہ شرائط منظور کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب حسن ایک حد تک اس کا باجگزار بن گیا تھا لیکن یہ ساری ذلت اٹھانے کے باوجود زیری سلطنت قائم نہ رہ سکی۔ روجر ثانی نے قابس کے سردار یوسف بن محمد کے بیٹوں کے حقوق کی حمایت کے بہانے سے جنہیں خود وہاں کے باشندوں کی درخواست پر بے دخل کر دیا گیا تھا۔ جارج انطاکی کو ایک بار پھر مہدیہ کی طرف روانہ کیا اور ۵۴۳ھ/۴۹-۱۱۴۸ء میں عیسائیوں پر بغیر کسی جنگ کے قبضہ ہو گیا۔ کیونکہ حسن اور کچھ باشندے قبضے سے پہلے ہی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ حسن نے قبیلہ الریاح کے ہاں اور بعد میں بونہ اور بجایہ میں پناہ لی۔ بجایہ کے بادشاہ نے حسن کو الجزائر میں نظر بند کر دیا۔ ابھی یہ یہاں نظر بندی کے ایام گزار رہا تھا کہ شہر الموحدون کے ہاتھ آ گیا۔ عبدالمومن نے حسن کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا اور جب ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء میں مہدیہ کو عیسائیوں سے واپس لیا گیا تو حسن ایک والی کی حیثیت سے دوبارہ وہاں آیا۔ اس کے بعد عبدالمومن نے اسے مراکش واپس بلا لیا۔

حسن نے ۵۶۳ھ/۱۱۶۸ء میں تمسنا کے صوبے الریزلو کے مقام پر انتقال کیا۔

حسن بن محمد انوران

۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء — ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء) غرناطہ میں پیدا ہوا اور فاس میں پرورش پائی۔ بنو وطاس نے اسے تین مرتبہ سیاسی مہمات پر ٹمبکٹو، مراکش بھیجا ۹۲۱ھ/۱۵۱۶ء وغیرہ اور پھر استانبول گیا۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں واپسی پر اسے بحری ڈاکو گرفتار کر کے پہلے نیپلز اور پھر روم لے گئے۔ اور پاپائے روم لیودھم کی خدمت میں غلام کی حیثیت سے پیش کیا۔ پاپائے روم نے اسے عیسائیت میں داخل کیا۔ اور اس کا نام یوحنا الاسد الغرناطی رکھا۔ لیکن اس کا یہ ارتداد بظاہر مجبوری اور عارضی تھا۔ اس نے روم میں چند کتابیں لکھیں جن میں عربی زبان [illegible]

لاطینی لغت، "فہرست مخطوطات عربی در اسکوریال" در [illegible] "apud illustribus viris [illegible]" ہیں۔ ان تصانیف سے اہل عرب و تاریخ [illegible] کی بابت پہلی بار مواد مہیا ہوا۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء سے پہلے [illegible] تونس گیا اور اس نے وہاں پر عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور [illegible] اس کا خاتمہ ہوا۔

حسن بے زادہ

ایک ترک مورخ۔

وہ حسن بے کوچک کا بیٹا تھا۔ جو [illegible] پاشا کی وزارت عظمیٰ کے دوران میں رئیس الکتاب رہا تھا۔ حسن نے بھی اپنے والد کا [illegible] کے دیوان [illegible] بطور منشی شامل ہو گیا۔

۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں اور ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۹ء میں حسن [illegible] کے دبیر کی حیثیت سے اس کی ہنگری کی مہمات میں شریک رہا [illegible] تذکرہ جی کی حیثیت سے اور ۱۶۰۱ء کے بعد بادشاہی موصوف کے [illegible] ابراہیم پاشا اور بعد میں حسن پاشا کے رئیس الکتاب کے طور پر خدمات [illegible] دیتا رہا۔ وہ اناطولی کے دفتر مال کا ناظر بھی رہا۔

حسن کی تصانیف میں [illegible] کی سب سے اہم تصنیف تاریخ آل عثمان ہے جس میں [illegible] سلطان مصطفےٰ کی کمر [illegible] تخت نشینی تک کے زمانے کے [illegible]

حسن پاشا

(۱۰۶۹ھ/۱۶۵۷ء — [illegible])

ولایت بغداد کا گورنر [illegible] پاشا کا [illegible] حسن [illegible] بیٹا تھا۔ عراق میں پیدا ہوا۔ [illegible] سے قونیہ، حلب [illegible] اور دیار بکر کی گورنری [illegible] کے مملوک حکمرانوں کے سلسلے کی بنیاد رکھی [illegible]

عراق میں حسن پاشا نے اپنے غور [illegible] عرب اور کردی قبائل کو کامیابی سے [illegible] کا مقابلہ کیا۔ حسن نے [illegible] بھی انصاف اور دیانت داری کا [illegible]

۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں ایران کے خلاف [illegible] اور دشمن کے علاقے پر چڑھائی کرنے پر [illegible]

حسن پاشا نے کرمان شاہ میں [illegible] ہمدان کا خطاب دیا گیا۔

حسن پاشا

(۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء — ۹۹۰ھ/[illegible])

الجزائر کا بیگلر بیگ۔

حسن پاشا خیرالدین کا بیٹا تھا جو ایک [illegible] کشتی [illegible] جس نے [illegible] ۱۵۴۴ء میں الجزائر کا پاشا بنایا گیا۔ اور مغربی الجزائر میں ترکی اقتدار [illegible] کام اس کے سپرد کیا گیا کیونکہ وہاں پر ترکوں کی حکومت [illegible]

میں اس نے تلمسان کے ضلع میں اہل ہسپانیہ کے خلاف فوج کشی کی۔ لیکن اسے جلد ہی الجزائر واپس جانا پڑا کیونکہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہاں وہ بیگلر بیگ کی حیثیت سے اپنے والد کا جانشین ہوا۔ یہ عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے ایک نئی مہم کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ فوج کشی اہل مراکش کے خلاف تھی جنھوں نے ۱۵۵۱ء میں تلمسان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے اہل مراکش کو شکست دی۔ اور تلمسان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حسن الجزائر میں اہم تعمیری کاموں میں مشغول رہا۔ اس نے قلعہ بندیوں کی توسیع کی۔ عوام کے لئے حمام بنوائے اور ایک شفاخانہ ینی چری سپاہیوں کیلئے قائم کیا۔ چونکہ حسن پاشا فرانسیسی حکمتِ عملی کے مخالف تھا اس لئے باب عالی نے اسے قسطنطنیہ واپس بلا لیا۔

۱۵۵۷ء میں حسن پاشا افریقہ واپس چلا آیا لیکن ان فسادات نے جو صلاح رئیس کی وفات پر رونما ہوئے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے دوبارہ بیگلر بیگ کی حیثیت سے الجزائر روانہ کرے۔ چنانچہ الجزائر میں امن بحال کرنے کے بعد حسن نے اہلِ مراکش کے خلاف فوج کشی کی۔ انھوں نے اس کی آمد پر تلمسان کو خالی کر دیا۔ ترکوں نے فاس کی دیواروں تک ان کا تعاقب کیا اور وہاں انھیں تباہ کن شکست دی۔

دوسرے سال جب ہسپانویوں نے مستغانم کا محاصرہ کیا تو حسن اس شہر کی امداد کو پہنچا اور اس نے انھیں مار بھگایا۔ اس شکست سے عیسائیوں کو وہران تک محدود رہنا پڑا اور ترکوں کے لئے خطرہ جاتا رہا۔

حسن نے اس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کے بعد یہاں کے قبائل کو زیر کرنے کی مہم کی۔ اس نے ینی چری سپاہیوں کی کسی آئندہ سرکشی سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کیلئے ہسپانوی نومسلموں کی ایک فوج تیار کی۔ اس نے کوکو کے سلطان کی بیٹی سے شادی کر کے ان قبیلوں کی اعانت حاصل کر لی۔ اس نے بنی عباس کے سردار [illegible] کے خلاف جہاد کی طرح ڈالی جس میں احمد نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

[illegible] ہسپانیوں کی بحری تیاریوں کی وجہ سے [illegible] کو پورے طور پر [illegible] و منقاد نہ بنا سکا۔ اس نے وقتی طور پر اپنے مخالفین سے کوئی تعرض نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۵۶۱ء میں اسے اپنی توجہ اہل مراکش کے خلاف صرف کرنے کا موقع ملا لیکن وہ ان سے جنگ شروع کرنے ہی والا تھا کہ ینی چریوں نے جو اس سے ناخوش تھے اسے گرفتار کر لیا اور قسطنطنیہ بھیج دیا۔

حسن نے تمام الزامات کو جو اس کے خلاف لگائے گئے تھے باب عالی کے سامنے غلط ثابت کر دیا۔ چنانچہ وہ دوسری بار الجزائر آیا۔ سلطان کے ایک ایلچی نے اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی از سر نو امن و امان قائم کر دیا تھا۔ اس مرتبہ حسن نے ہسپانویوں کو ملک سے نکال دینے اور وہران اور المرسی الکبیر پر قبضہ کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ اس نے [illegible] سپاہیوں کی معیت میں دونوں شہروں کا محاصرہ کر لیا۔ اور ساتھ ہی اس کے بیڑے نے سمندر کی طرف سے اس کی ناکہ بندی کر دی۔ دو ماہ کی بے سود کوشش اور پے در پے حملوں کے بعد ہسپانویوں کے ایک امدادی بیڑے کی آمد نے ترکوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد حسن کو اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد اسے الجزائر کے جہازوں کو اپنی قیادت میں مالٹا لے جانا پڑا جس کا ترک محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر حسن نے شجاعت کے خوب جوہر دکھائے۔ اسے قپودان پاشا (امیر البحر) کا منصب دیا گیا۔ وفات کے بعد حسن کو اس کے والد خیر الدین کے پہلو میں بویوک درہ میں دفن کیا گیا۔

حسن پاشا بن حسین

(؟ ——— ۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۷ء)

یمن کا والی۔

وہ البانیا کا باشندہ تھا۔ اور قسطنطنیہ میں بوستان جی باشی کے عہدے پر مامور تھا۔ ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں ترکی اقتدار کو قائم کرنے کیلئے یمن روانہ کیا۔ جہاں پانچ سال کے عرصے میں کچھ تو زور بازو سے اور کچھ حیلہ سازی سے وہ سرکش اشراف کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مزید بغاوتوں کی روک تھام کے لئے ۱۵۸۴ء کے آخر میں اس نے آلِ مطہر کو قسطنطنیہ میں جلا وطن کر دیا۔ آنے والے چند سالوں کے دوران میں اس نے متعدد چھوٹے قلعوں کو مسخر کیا اس نے یافع اور دیگر اضلاع کو فتح کر لیا۔

۱۵۹۷ء میں زیدیوں نے ایک نئی اور خطرناک بغاوت برپا کر دی۔ اس بغاوت کا سربراہ مہدی القاسم بن محمد تھا۔ اس نے کوکبان کے ضلع اور ثُلا کے قلعے پر قبضہ حاصل کر لیا۔ ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۶ء کے شروع میں حسن پاشا کو اس کی اپنی درخواست پر واپسی کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ وہ قسطنطنیہ واپس آگیا۔

۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۶ء میں حسن پاشا مصر کا والی بنایا گیا اور وہ اس عہدے پر ۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۷ء کے اختتام تک براجمان رہا۔ اس نے وہاں سے واپس قسطنطنیہ آنے کے بعد وفات پائی۔

حسن پاشا شریف

(؟ ——— ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۱ء) الحاج سلیمان آغا کا بیٹا۔

اس کا ذکر ۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء میں روس کے خلاف جنگ کے دوران میں روسچق، سلسترہ اور میرگوگی کی افواج کے قائد کے طور پر آتا ہے۔ اس نے ۱۷۶۹ء میں یوکرین میں کریم خان گیرائی کی سرکردگی میں بحیثیت سالار رضاکاران نمایاں حصہ لیا۔ اس مہم کے دوران میں اس نے صدر اعظم محسن زادہ محمد پاشا کو جو مالی امداد دی تھی اس کے صلے میں اسے قپوجی باشی کا منصب عطا کیا گیا۔

۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں حسن پاشا منصب وزارت کے ساتھ روسچق کا فوجی حاکم بھی مقرر کیا گیا۔ جہاں اس نے بڑی کامیابی سے روسی حملے کی مدافعت کی۔ صلحنامہ ہونے کے بعد حسن پاشا معتوب ہو گیا۔ چنانچہ اسے وزارت کے عہدے سے الگ ہونا پڑا۔ اس نے جلا وطنی کی حالت میں کئی سال فلیپوپولس اور سالونیکا میں گزارے لیکن ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۷ء پر روس سے جنگ چھڑ جانے کے بعد اسے دوبارہ ڈینیوب کے محاذ پر مختلف حیثیتوں میں فوج کی کمان دے دی گئی۔ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء کو جزائرلی حسن پاشا کی وفات کے بعد اس کی جگہ "صدر اعظم" اور سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء کے آخر میں بڑی سرعت کے ساتھ یکے بعد دیگرے کیکیا طولجی الساقجی اور اسمٰعیل کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

اس کے علاوہ شریف حسن پاشا نے اپنے آپ کو ہر قسم کی من مانی کارروائی اور صاف گوئی سے مورد شک و شبہہ بنا لیا تھا چنانچہ ایک رات اس کی قیام گاہ واقع شمنی میں اچانک گھیر لیا گیا اور گولی مار دی گئی۔

حسن پشاوری

(؟ ——— ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء)

ایک بزرگ صوفی۔

والد کا نام سید عبداللہ گیلانی۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ سید حسین بن سید عبداللہ بن سید محمود بن سید عبدالقادر بن سید عبدالباسط بن سید حسین بن سید قطب عالم بن سید احمد بن سید شرف الدین قاسم بن سید شرف بن سید بدرالدین حسن بن سید علاؤالدین علی بن شمس الدین محمد بن شرف الدین یحییٰ بن سید شہاب الدین احمد بن سید قطب عالم بن سید صالح النصر بن قطب الادائرہ سید عبدالرزاق بن عبدالقادر جیلانی الحسنی والحسینی۔

آپ کے دادا سید محمود بغداد سے ٹھٹھہ آئے اور یہیں سادات میں شادی کر لی۔ آپ کی پیدائش ٹھٹھہ میں ہوئی۔ آپ کا قلب شروع ہی سے زہد و انقار کی طرف مائل تھا۔ آپ نے اپنے والد اور دوسرے بزرگوں سے روحانی فیض حاصل کیا اور اپنی عمر کا بڑا حصہ ریاضتوں، مجاہدوں، صفائی قلب اور عزلت و تنہائی میں بسر کیا۔ والد کی وفات کے بعد پاک و ہند اور حجاز کا سفر کرتے ہوئے اور مختلف بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوتے ہوئے پشاور آئے اور یہیں پر سکونت پذیر ہوئے۔ سلسلہ قادریہ میں آپ اپنے والد سے بیعت تھے اور ان ہی سے خرقہ خلافت حاصل کی۔

آپ اکثر ذکر و شغل اور عبادت میں مشغول رہتے۔ راتوں کو جاگتے اور عبادت و مراقبے میں مشغول رہتے۔ خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی آدمی خدا کا نام زبان پر لاتا تو آپ کے آنسو جاری ہو جاتے۔ آپ اکثر روتے رہتے تھے اور جس پر توجہ دیتے اس پر بھی درد اور شغل کی حالت طاری ہو جاتی۔

آپ نے پشاور میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پشاور میں مرجع خاص و عام ہے۔

آپ کے سیرت و اخلاق میں خدمتِ خلق اور استغناء کا جوہر سب سے زیادہ نظر آتا ہے۔ آپ فقراء اور مساکین کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے اور ان کی بہت خدمت کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا سب لوگ آپ کے عیال ہیں۔ آپ کے صاحبزادوں میں شاہ محمد غوث لاہوری ہیں جنہوں نے عرفان و تصوّف میں غیر معمولی شہرت و عظمت حاصل کی اور اپنے والد کی وفات کے بعد خلیفہ ہوئے۔

حسن پاشا، داماد

(——— ؟ ——— ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء)

عثمانی وزیر اعظم۔

پہلے وہ چوک دار ہو گیا اور پھر ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۳ء میں سلاح دار کے رتبے کو پہنچا۔ محرم ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں سلیمان ثانی کی تخت نشینی کے بعد اسے مصر کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء، ۱۶۹۰ء تک فائز رہا۔ اسی سال وہ برسہ اور ازمد کا متصرف ہو گیا۔

حسن پاشا نے ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء میں محمد چہارم کی بیٹی خدیجہ سلطان کے ساتھ شادی کر لی۔ کچھ عرصہ بغاز محافظی کی حیثیت سے خدمت سرانجام دینے کے بعد اسے ۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۴ء میں جزیرہ ساقیز کا گورنر بنا دیا گیا۔

۱۱۰۶ھ/۱۶۹۴ء میں اسے ساقیز کے مقام پر وینس کی ایک بحری فوج کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ موثر مزاحمت ممکن نہ تھی اس لئے حسن پاشا نے مختصر محاصرے کے بعد جزیرہ اہل وینس کے حوالے کر دیا۔ اس پسپائی کی پاداش میں حسن پاشا کو تھوڑی سی مدت کی قید کی سزا ملی۔ اس کے بعد اسے کریمیا میں کفہ کا گورنر بنا

حسن پاشا، سیّد

(——— ؟ ——— ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء)

ضلع قرہ حصار شرقی کے ایک گاؤں کا باشندہ تھا۔ وہ ینی چری فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء میں اس نے فوں کاہ یسی بجی لفٹیننٹ جنرل کا عہدہ حاصل کر لیا۔ وہ برابر ایرانی مہمات میں شریک رہا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں آسٹریا سے جنگ کے دوران میں وہ ترقی کر کے ینی چری فوج کا آغا (سردار) بن گیا۔ اس جنگ میں اس کی شجاعت اور بہادری کے صلے میں اسے وزیر کا لقب مل گیا۔ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء سے دیا گیا۔ ۱۱۰۶ھ/ ۱۶۹۵ء میں اسے ترقی دے کر پانچویں درجہ دوسرے وزیر کا رتبہ دے دیا گیا۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے اورنہ کے محافظ، اناطولی کے بیگلر بیگی اور حلب کے بیگلر بیگی کے عہدوں پر فائز رہا۔

۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء میں استنبول میں "قائم مقام" مقرر ہو جانے کے بعد حسن پاشا مختلف حیثیتوں میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔ تا آنکہ احمد ثالث کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصے بعد ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں سے وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔

۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں دوسری مرتبہ مصر کا گورنر پھر ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء میں شام میں طرابلس کا گورنر ہو گیا۔ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں ایک بار پھر ناظوں کے بیگلر بیگی کی حیثیت سے خدمت کے بعد میں اسی سال اس کا شام رقہ میں اس کا تبادلہ ہو گیا اور وہ اس عہدے پر اپنی وفات تک فائز رہا۔

معاہدے کی رو سے آسٹریا سے سرحدی جنگ کا خاتمہ جو مجزاد کے صلح نامے کے وقت سے غیر مسلسل طور پر جاری تھی اور متفرق سیاسی اقدامات جن کا محرک مشہور ... احمد پاشا بونیوال تھا۔ اور جن کا مقصد یہ تھا کہ باب عالی کو یورپ ... کر لیا جائے۔ یہ تمام واقعات اس عہد وزارت میں ہوئے۔ محل ... کے باعث اسے ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں معزول کرنے کے بعد ... کر دیا گیا۔ لیکن اگلے ہی سال اسے ایچ ... اور کچھ عرصہ بعد دیار بکر کا ... گیا۔ اس نے دیار بکر میں وفات پائی۔

حسن پاشا ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑا دانا اور تجربہ کار تھا ... کامیابی کے ساتھ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ اس نے ... ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا۔

حسن چلپی قنالی زادہ

(۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء ——— ۱۲ شوال ۱۰۱۲ھ/ ۴ مارچ ۱۶۰۴ء)

ایک مشہور ترکی عالم۔

بروسہ میں پیدا ہوا۔ والد کا نام علی چلپی بن امر اللہ کا بیٹا تھا۔ حسن کا والد عالم اور شاعر کی حیثیت میں مشہور تھا چنانچہ حسن نے بھی فقہ اور دینیات کی ... تعلیم سے فارغ ہو کر وہ بروسہ، ادرنہ، حلب، قاہرہ، گیلی پولی، ایوب ... میں مدرس رہا۔

حسن نے مصر میں وفات پائی۔ اس وقت وہ رشید کا قاضی تھا۔ اسے شاعری میں بھی درک تھا۔ اس نے دینیات کی بعض اہم کتابوں پر حاشیے اور تعلیقات لکھیں۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف جس نے اس کی شہرت کو چار چاند لگائے "تذکرۃ الشعراء" ہے۔ اس کتاب میں تقریباً سات سو شعراء کے حالات درج ہیں۔

حسن دوم

(۱۹۲۹ء) مراکش کے موجودہ بادشاہ۔ ۹ جولائی ۱۹۲۹ء کو رباط میں پیدا ہوئے۔ فرانس کی ایک یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ سائنس اور فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقتصادیات اور امور خارجہ کا بھی مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بادشاہت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے قبل اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور کئی بار بیرونی ممالک میں اپنے ملک کی نمائندگی کی۔

۱۹۶۰ء میں انھیں نائب وزیراعظم بنا دیا گیا۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں اپنے والد شاہ محمد بن یوسف کی وفات پر مراکش کا تاج و تخت سنبھالا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد مراکش کو مختلف سمتوں میں ترقی دینے کی کوشش کی۔ متعدد اصلاحات نافذ کیں۔ ۱۹۶۵ء میں وزارت عظمیٰ کا عہدہ بھی خود سنبھال لیا۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں رباط میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کرنے کے انتظامات کئے۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں اور پھر فروری ۱۹۷۴ء میں ان کے خلاف فوجی بغاوت ناکام ہوئی۔

حسن دہلوی

(۶۵۶ھ ۱۲۵۷ء)

امیر نجم الدین المعروف حسن دہلوی۔ والد کا نام علاء الدین سیستانی تھا۔

انھوں نے اپنے دوست امیر خسرو کے ساتھ ملتان میں غیاث الدین بلبن کے سب سے بڑے بیٹے سلطان محمد کی ملازمت میں پانچ سال بسر کئے اور بعد کے زمانے میں علاؤ الدین خلجی کے دربار کے شعراء میں شامل ہوگئے۔ جب انھوں نے خواجہ نظام الدین اولیا کی بیعت کی تو اس وقت ان کی عمر ۵۳ برس تھی۔

حسن دہلوی نے خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ایک کتاب میں جمع کئے۔ اس کتاب کا نام "فوائد الفواد" ہے۔ اس کتاب میں ایک سو اٹھاسی مجالس کے ملفوظات جمع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو ادبی محاسن، شگفتہ انداز بیان اور عارفانہ موضوعات کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں کے صوفیانہ ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں امیر خسرو کہا کرتے تھے "کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام سے ہوتیں اور یہ کتاب میرے نام سے ہوتی۔

حسن دہلوی نے ایک فارسی دیوان بھی چھوڑا ہے جو تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں عارفانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے نثر میں بھی چند کتابیں تصنیف کی ہیں۔

حسن ذکی محمد

ایک مؤرخ اور پروفیسر۔ آپ ۱۹۰۸ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں پر حاصل کی۔ پھر پیرس چلے گئے اور وہاں تعلیم حاصل کی ۱۹۳۴ء میں آپ مسلم آرٹ کے عجائب خانہ جو قاہرہ میں واقع ہے کیوریٹر (CURATOR) بن گئے ۱۹۳۹ء میں آپ فواد اول کی یونیورسٹی میں شعبہ جات آرٹس کے لیکچرار مقرر ہوئے ۱۹۴۶ء میں مسلم آثار قدیمہ کے پروفیسر بن گئے اور پھر دو سال بعد ہی فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین مقرر ہوگئے۔ لیکن بعد میں انہیں مسلم آرٹ کے عجائب خانہ میں ڈائریکٹر کا عہدہ مل گیا۔ آپ اب تک اسی عہدے پر فائز ہیں۔ محمد حسن ذکی نے مسلم آرٹ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اسی لئے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں "اسلام میں مصوری" "فاطمیوں کے خزانے" "قرون وسطیٰ میں عرب ملکوں کا دستور نسکارہ" "اسلامی عہد میں ایرانی آرٹ" "اسلام کے فنون" "فواد اول یونیورسٹی عجائب خانہ میں آرٹ" وغیرہ شامل ہیں۔

حسن روملو

(۹۳۷ھ/۱۵۳۱ء - ۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء) ساوج بلاغ کا گورنر وہ قزلباش امیر اعلیٰ سلطان روملو کا پوتا تھا۔ قم میں پیدا ہوا اس نے صفوی فوج میں بحیثیت قورچی تربیت حاصل کی اس کی ناموری اور شہرت کا دارومدار زیادہ تر احسن التواریخ کی وجہ سے ہے۔ وہ ایک قزلباش افسر کی حیثیت سے فوجی معاملات پر خاص توجہ دیتا تھا۔ سیاسی احتیاط کی وجہ سے اس نے قزلباش کے افعال کو اچھے رنگ میں پیش کیا ہے۔

حسن کی یہ کتاب شاہ طہماسپ کے دور حکومت کے لئے بڑی مستند کتاب ہے اس کی "احسن التواریخ" سلطان محمد شاہ کی تخت نشینی کے حالات تک ہے۔ کیونکہ حسن ۹۴۸ھ/۱۵۴۲ء سے طہماسپ کی بیشتر مہمات میں شاہ کا مصاحب رہا۔ چنانچہ ۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء تک کے واقعات کے لئے وہ ایک عینی شاہد ہے۔

حسن سلیم

مصری مورخ اور ماہر آثار قدیمہ۔ آپ ایک پرائمری سکول میں استاد تھے۔ انھوں نے نہایت محنت اور لگن کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر پیرس اور وی آنا گئے ۱۹۲۸ء میں آپ قاہرہ یونیورسٹی میں "مصریات" کے پروفیسر بن گئے۔ جب قاہرہ یونیورسٹی نے غزا میں کھدائی شروع کرائی تو آپ کو اس کا انچارج بھی بنا دیا گیا پھر جب حکومت نے غزا کی کھدائی اپنے ہاتھ میں لی تو ایک الگ محکمہ کھول کر انھیں اس کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ آپ نے انگریزی اور عربی میں کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے "تاریخ مصر و ترکی" "تاریخ یورپ" "تاریخ مملوکین" "تاریخ محمد علی کا ایک ورق" "مصری مذہب کی تاریخ" "غزا کے آثار قدیمہ انگریزی میں اور "قدیم مصر کی جغرافیائی تقسیم" "قدیم مصری ادب" عربی میں لکھی گئی ہیں۔

حسن صنعانی

(۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء - ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) رضی الدین لقب اور کنیت ابوالفضل۔ آپ حضرت عمر فاروق رضؓ کی اولاد سے تھے۔ حسن کے والد نے صغانیاں کو خیر باد کہہ کر لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حسن لاہور میں پیدا ہوتے لیکن ان کی پرورش غزنین میں ہوئی۔ بقول مولانا عبدالحیٔ لکھنوی ان کی پرورش بھی لاہور میں ہوئی تھی انہوں نے تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کا شمار بہت جلد ارباب علم و فضل میں ہونے لگا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کا قاضی بنانا چاہا۔ لیکن انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے غزنین چلے گئے جہاں پر کچھ عرصہ تک تحصیل علم میں مصروف رہے بعد میں وہ غزنین سے عراق چلے گئے اور وہاں کے علماء سے بھی فیض حاصل کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ بغرض حج بیت اللہ گئے اور وہاں پر بھی محدثین سے حدیث پڑھی۔

حسن ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء میں عدن پہنچے اور وہاں سے پھر مکہ مکرمہ گئے اور اس کے بعد بغداد گئے۔ اس وقت عباسی خلیفہ الناصر باللہ کی حکومت تھی۔ اس نے ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء

میں حسن صنعانی کو سلطان التمش کے دربار میں خیر سگالی کے مشن پر بھیجا۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں وہ دوبارہ بغداد واپس گئے اس وقت المستنصر باللہ کا عہدِ حکومت تھا جس نے انہیں دوبارہ ہندوستان اسی مشن پر بھیجا۔ یہ زمانہ سلطانہ رضیہ کا تھا اس طرح حسن دو سلطانوں کے عہد میں ہندوستان میں اقامت گزیں رہے۔

بقول صاحب فوائد الفوائد رضی الدین بداؤں سے علی گڑھ کے مشرف کے نائب مقرر ہوئے۔ بعد میں ملازمت ترک کر کے والی علی گڑھ کے بیٹے کو پڑھانے لگے لیکن بعد میں اس سے بھی دل برداشتہ ہو کر بغداد چلے گئے۔ حسن کو یمن جانے کا اکثر اتفاق ہوا۔ یہاں ان کا قیام عدن میں ہوتا تھا۔ وہاں پر وہ طلبہ کو خطابی کی معالم السنن کا درس دیتے تھے۔

حسن صنعانی کا انتقال بغداد میں مستعصم باللہ کے عہدِ حکومت میں ہوا۔ ابتدا میں انہیں بغداد میں دفن کیا گیا۔ لیکن بعد میں ان کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا۔ انہوں نے مکہ مکرمہ، عدن اور ہندوستان میں بہت سے شیوخ سے حدیث سماعت کی تھی۔

انہیں تمام علوم متداولہ میں اور خاص طور پر لغت، حدیث اور فقہ میں خاص مہارت حاصل تھی۔ بقول الذہبی علم اللغۃ میں وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ الزبیدی نے انہیں الامام الحافظ فی علم اللغۃ، الفقیہ المحدث الرحال کہا ہے۔ اور سیوطی نے انہیں علم لغت کا علمبردار کہا ہے۔ بقول الدمیاطی وہ لغت، حدیث اور فقہ تینوں علوم کے امام تھے۔

حسن صنعانی کی تصانیف میں ۱۔ مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ" ۲۔ "الرسالۃ فی الاحادیث الموضوعہ" جس کا پورا نام "الدار الملتقط فی تبیین الغلط ونفی اللغط فی الاحادیث الموضوعہ" ۳۔ "دراسحابۃ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ" ۴۔ "الشمس المنیرۃ" ۵۔ "اسمار شیوخ البخاری" ۶۔ "کتاب الاضداد" ۷۔ "کتاب اسماء الذئب" ۸۔ "کتاب یفعول" ۹۔ "العباب الزاخر واللباب الفاخر" جو بیس جلدوں میں ہے۔ ۱۰۔ "التکملہ والذیل والصلۃ" ۱۱۔ "مجمع البحرین فی اللغۃ" ۱۲۔ "کتاب خلق الانسان" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

حسن عسکری، امام

(ربیع الاول ۲۳۰ھ/نومبر ۸۴۴ء ـ ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) ابو محمد حسن بن علی اثنا عشری شیعہ کے گیارھویں امام۔ الصامت الزکی، الخالص التقی، الرفیق اور الہادی آپ کے القابات تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: "حسن بن علی بن محمد الجواد بن علی الرضا بن موسیٰ الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین ابن الحسین بن علی بن ابی طالب۔ آپ کی نسبت آپ کے والد ماجد ابو الحسن علی العسکری کی طرح العسکری ہے۔ یہ نسبت سامرا دسر من رای کی طرف ہے اسے مدینۃ العسکر کہتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ۲۳۱ھ اور بعض کے نزدیک ربیع الآخر ۲۳۲ھ/اپریل ۸۴۷ء ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام حُدیث تھا۔ بعض جگہوں پر ان کا نام سوسن اور سلیل بھی بتایا گیا ہے۔ آپ اپنے والد کے ساتھ سامرا آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آپ نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ آپ اپنی امامت کے تقریباً ۶ برسوں کے دوران میں مسلسل حکومت کے زیرِ نگرانی رہے۔ المعتمد نے تو آپ کو کچھ عرصہ کے لئے قید میں ڈالا تھا۔

اثنا عشری روایات کے مطابق آپ کے والد نے پہلے اپنے بیٹے محمد ابو جعفر کو امام مقرر کیا تھا۔ لیکن ان کی وفات ہو جانے کی وجہ سے ۲۵۴ھ/۸۶۸ء آپ کو امام نامزد کیا۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک کا خیال تھا کہ محمد ابو جعفر ہی امام ہیں کیونکہ امام علی العسکری نے انہیں امام نامزد کیا تھا اور امام کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا لہٰذا امام محمد ابو جعفر ہی ہیں اور وہ القائم المہدی اور غائب ہیں۔

امام حسن العسکری جو دوسرے گروہ کی نظر میں گیارھویں امام ہیں۔ ۲۶۰ھ/۸۷۳ء میں بیمار ہوئے اور ایک ہفتے بعد وفات پا گئے اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کے مسئلے پر اہل [illegible] میں مزید اختلاف ہوا۔ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ نے محمد جو آپ کے صاحبزادے تھے چھوڑے۔ لیکن دوسروں نے اس کا [illegible] کیا ہے۔ بعض کے خیال کے مطابق آپ القائم تھے اور واپس آئیں گے۔ دوسروں نے آپ کے لاولد فوت ہونے کو آپ کی امامت کے خلاف ایک حجت مانا ہے اور وہ آپ کے بھائی جعفر کی طرف پلٹ گئے۔ آپ کی وفات کے بعد اہل التشیع کے چودہ فرقے ہوئے۔ المسعودی نے ۲۰ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ امام شہرستانی نے آپ کی وفات کے بعد بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔

حسن فہمی

ایک ترک صحافی۔ اس نے ۱۹۰۸ء میں اخبار سربستی کے مدیر کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی۔ اس نے اپنے اخبار میں مجلس اتحاد و ترقی پر شدید تنقید کی تھی۔ اسے اپریل ۱۹۰۹ء میں گلاٹا پل پر کسی نامعلوم شخص نے قتل کر دیا۔ آزاد خیال طبقے اور اتحاد محمدی والوں نے مجلس اتحاد و ترقی کو اس کے قتل کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس کے قتل کے بعد مخالفانہ مظاہرے اور ہنگامے ہوئے۔

حسن فہمی

(؟ ـ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء) ایک عثمانی سیاست دان۔ اس کے والد کا نام حاجی اوغلو شریف تھا۔ باطوم کے نزدیک پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد استانبول چلا گیا۔ یہاں پر اس نے عربی فارسی، فرانسیسی زبانیں اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

۱۸۵۰ء میں اس نے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ بعد ازاں مختلف تجارتی ایوانوں میں وہ ایک عہدہ دار رہا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں اس نے اجازت کے لئے تنظیم تجارت اور جدید حوادث تحریر کئے۔

۱۸۶۸ء میں وہ ایوان تجارت کی پہلی مجلس کا صدر بن گیا۔ بعد ازاں جب مدحت پاشا اور عبدالحمید ثانی کی دستوری حکومت قائم ہوئی تو اس وقت اس [illegible] کا نائب تھا۔

مارچ ۱۸۷۷ء میں حسن انتخابات میں نائب چنا گیا۔ نومبر میں اسے [illegible] انتخاب کے نتیجے میں ایوان کا صدر چنا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں وہ امور تعمیرات عامہ کا وزیر مقرر ہوا۔ وہ استانبول میں قانون تجارت اور بین الاقوامی قانون بھی پڑھاتا رہا۔ ۱۸۸۱ء میں حسن وزیر انصاف بنایا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں ایک خاص مقصد کے لئے اسے لندن بھیجا گیا۔ ۱۸۸۸ء میں اسے جامع المحاصل اور ۱۸۹۲ء میں آیدین کا والی بنایا گیا۔ وہ دوسرا ترکی نمائندہ تھا جس نے ۱۸۹۷ء میں جنگ یونان ترکی کے بعد عہد نامہ پر دستخط کئے۔

اگرچہ وہ بہت سے عہدوں پر فائز رہا لیکن اس نے کبھی بھی حکومت کی خوشامد نہ کی۔ انقلاب کے بعد نوجوان ترکوں نے اسے "بوڑھا جوان ہمت ترک" کا خطاب دیا اس کا ادرنہ پتی میں انتقال ہوا۔

حسن فہمی آفندی

(۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء — ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) ایک عثمانی شیخ الاسلام، جو افتخار لی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا والد عثمان افندی تھا۔ ابغین میں پیدا ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر محکمہ علمیہ کے شعبۂ تدریس میں مختلف حیثیتوں میں ملازم رہا ہے۔ ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں درس وکیلی کے عہدے پر فائز ہوا اس کے ذمے شیخ الاسلام کی طرف سے تدریس اور تبلیغ کا فریضہ بھی تھا۔ سلطان عبدالعزیز کی تخت نشینی کے بعد اس کی حیثیت بہت مضبوط ہو گئی کیونکہ وہ سلطان کا استاد تھا۔ ۶۳-۱۸ء میں وہ سلطان کے ساتھ مصر گیا۔

وہ ۱۸۶۷ء میں اناطولی کا اور پھر روم ایلی کا قاضی عسکر بن گیا۔ ۱۸۶۸ء میں وہ پہلی مرتبہ شیخ الاسلام بنایا گیا۔ ستمبر ۱۸۷۱ء میں اس کو شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ جولائی ۱۸۷۴ء میں وہ دوسری بار اس عہدے پر فائز ہوا اور مئی ۱۸۷۶ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس تمام عرصے میں اس کی اور جودت پاشا کی آپس میں چپقلش رہی جب محمود ندیم کی وزارت ختم ہوئی تو حسن کو بھی اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔

حسن نظامی، خواجہ

(۱۸۷۸ء — ۱۹۵۵ء) اردو ادیب و انشا پرداز۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ہمشیر کی اولاد سے تھے۔ زندگی کی ابتدا اخبار فروشی سے کی۔ رفتہ رفتہ اخباروں میں مضامین لکھنے لگے۔ پھر کتابیں لکھنا شروع کیں۔ کئی اخبار اور رسالے جاری کئے۔ رسالہ منادی میں اپنا روزنامچہ لکھتے تھے۔ مصر، شام و عرب کی سیاحت کی۔ جامعہ ازہر (قاہرہ) میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کتابوں اور دواؤں کا کاروبار بھی تھا۔ ادبی خدمات کے صلے میں

خواجہ حسن نظامی

برطانوی حکومت ہند سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ دہلی میں ۷۹ برس کی عمر میں انتقال ہوا اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں سپردِ خاک ہوئے۔

خواجہ صاحب کی تصانیف پچاس سے زیادہ ہیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔ کرشن بیتی۔ غدر دہلی کے افسانے، بیگمات کے آنسو، سیپارۂ دل، محرم نامہ۔ آپ کا اسلوب نگارش نہایت سادہ، سلیس اور دلنشین تھا۔ صاحب طرز ادیب تھے اور تحریر میں روزمرہ اور عام بول چال کی زبان استعمال کرتے تھے۔

حسنک

(؟ — ۲۸ صفر ۴۲۳ھ/ ۱۴ فروری ۱۰۳۲ء) ابو علی حسن بن محمد عباس، محمود غزنوی کا وزیر۔ وہ کم عمری ہی میں خراسان کا گورنر بننے کے بعد ۴۱۴ھ/ ۱۰۲۳ء میں حج کے لئے گیا۔ وہ براستہ قاہرہ واپس آیا تو مصر کے فاطمی خلیفہ الظاہر نے اسے خلعت دی حسن کو اس نے قبول کر لیا۔ اس بنا پر عباسی خلیفہ القادر کو شک گزرا کہ حسنک کہیں فاطمیہ کی خلافت کا حامی نہ بن گیا ہو۔ اسی بنا پر اس نے غزنہ میں اس کی واپسی پر سلطان محمود کو لکھا کہ وہ اسے قرمطی ہونے کی وجہ سے موت کی سزا دے۔ محمود غزنوی نے خلیفہ کے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے حسنک کو وزیر مقرر کر دیا۔

سلطان محمود کے دورِ حکومت کے آخری چند سالوں میں اس نے سلطان کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس نے اس کے بیٹے مسعود کی مخالفت اور مسعود کے بھائی محمد کی حمایت کی۔ چنانچہ محمود کے انتقال کے بعد اس کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے ہرات کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ بعد میں اس پر قرمطی ہونے کے پرانے الزام کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا اور آخرکار اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔

حسن مولای

(دورِ حکومت ۱۲ ستمبر ۱۸۷۳ء تا ۹ جون ۱۸۹۴ء) ابو علی مراکش کا سلطان اس کے والد کا نام سیدی محمد بن عبدالرحمن تھا۔ ۳۷ برس کی عمر میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد بغاوتیں برپا ہو گئیں۔ لیکن اس نے تیزی سے بغاوتوں کو دبا دیا۔

حسن نے اپنے عہدِ حکومت کا بڑا حصہ مہموں میں گزارا ان مہموں کا مقصد بربر قبائل کو مطیع رکھنا تھا۔ ایک ایسی ہی مہم کے دوران میں وہ تافیلات تک جا پہنچا۔ وہ اس مہم کے دوران میں تادلا میں وفات پا گیا۔ اس کی موت کو صیغہ راز میں رکھا گیا اور جب فوج رباط پہنچ گئی تو اس کے بیٹے عبدالعزیز نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

حسنویہ بن حسین

(؟ — ۳۶۹ھ/ ۹۷۹ء) ایک کرد سردار جس نے دسویں صدی عیسوی کے دوران میں مغربی ایران اور بالائی الجزیرہ میں خود مختار اور مستقل ریاستیں قائم کیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ انہیں برقرار رکھا۔

وہ برزکانی کرد قبیلے کی ایک شاخ سے تھا۔ اپنے دو چچاؤں کے انتقال کی وجہ سے وہ وسطی جبال میں متعدد قلعوں اور محفوظ مقامات پر قبضہ کرنے کے قابل ہو گیا۔

حسنی

حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بیٹے امام حسنؓ کی اولاد میں سے علوی شریفوں کا نام۔ حسنی کا لقب خاص طور پر ان شریفوں کے لئے وقف ہے جو عبداللہ الکامل

حسنی شرفاء کا شجرۂ نسب

عبداللہ الکامل بن الحسن بن الحسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب

- سلیمان — اشراق تلمسان (دسویں صدی)
- موسیٰ — فاس کے قادری شرفآ، عبدالقادر جیلانی (بارھویں صدی)
- محمد النفس الزکیہ
  - قاسم
  - اسمٰعیل
  - احمد
  - حسن
  - علی
  - ابوبکر
  - الحسن
  - عزیز
  - ابو محمد
  - عبداللہ
  - الحسن
  - محمد
  - ابوالقاسم
  - محمد
- ادریس — (بادشاہ فاس، مورث خانوادہ ادریسیہ)
- یحییٰ — متوفی درسوداں (مورث شاہان غرناطہ) (گیارھویں صدی)
- جعفر
  - احمد موسیٰ (سولھویں صدی)
  - جزولی (انیدرسویں صدی)

محمد (ابوالقاسم کے بیٹے) کی اولاد:

- احمد
  - زیدان
  - مخلوف
  - علی
  - عبدالرحمن
  - محمد
  - محمد القائم
    - احمد الاعرج
    - محمد المہدی
- قاسم
  - الحسن الداخل
  - محمد
  - الحسن
    - عبدالرحمن
      - اولاد عبدالحمید
      - شرفائے زہ وال
    - علی شریف
      - محمد — مورث شرفائے اولاد محمد
      - یوسف
        - محمد
        - رتو
        - الحسین
        - الحسن
        - ابوالغیث
        - ضیب
        - عبداللہ
        - احمد علی

محمد، رتو، الحسین، الحسن: تافیلالت کے شرفائے اخوس

احمد علی کی اولاد:

- ہاشم — مورث شرفائے الیمینین
- محرز
- محمد
  - علی المراکشی

سعید، مبارک، زکریا، نفیس، ہارون، محرز، تاج، حافظ، شریف

مہدی، علی، ہاشم، سعید، عباس، حمادہ، کبیر، احمد، بوستہ، محرز، ا۔ال، اسمٰعیل

کے صاحبزادے محمد النفس الزکیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ اس خاندان نے المغرب اور مغربی صحرا کی تاریخ میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے دو عظیم شریفی خانوادوں نے یعنی خانوادہ سعدیہ نے دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں خانوادۂ علویہ نے مراکش میں گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں موجودہ زمانے تک حکومت کی۔

حسین احمد مدنی، مولانا

(۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ / ۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء - ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) دیوبند کے ایک جید عالم۔ والد کا نام حبیب اللہ تھا جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ حسینی سید ہیں آپ کے مورث اعلیٰ کا نام شاہ نور الحسن تھا ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو ایک بلند پایہ بزرگ اور عالم دین تھے۔ تیرہ سال میں دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ دیوبند میں جن اساتذہ سے آپ نے علم حاصل کیا۔ ان میں مولانا محمود الحسن، مولانا ذوالفقار علی مولانا عبد العلی محدث دہلوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تھے

۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں آپ کے والد نے مع اہل وعیال مدینہ منورہ کو ہجرت کی۔ اس وقت مدینہ منورہ میں دو کتب خانے بہت مشہور تھے۔ آپ نے ان کتب خانوں سے پورا پورا استفادہ کیا۔ ادبیات کی تکمیل آپ نے مدینہ منورہ کے معمر ادیب مولانا شیخ آفندی عبد الجلیل سے کی جو علمائے حجاز میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

تحصیل علم کے ساتھ ہی آپ نے مدینہ منورہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء میں آپ ہندوستان تشریف لائے۔ دو سال یہاں قیام پذیر رہے۔ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں واپس مدینہ منورہ چلے گئے۔ اس مرتبہ آپ کا حلقہ درس بہت وسیع ہوا اور طلبا کا ایک جم غفیر آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ دور دراز کے ممالک سے تشنگان علم آپ کے حلقہ درس میں شرکت کے لئے آنے لگے۔ آپ کے درس کی شہرت عرب کے علاوہ دیگر ممالک تک جا پہنچی اور چوبیس سال کی عمر میں آپ کو شیخ العرب والعجم کے لقب سے نوازا گیا۔

آپ تصوف میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہیں ۱۸۹۸ء میں حضرت نے آپ کو چاروں سلسلوں میں بیعت فرما لیا۔ اسی عرصے میں آپ کے والد مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اس لئے شیخ نے حکم دیا تھا کہ مکہ معظمہ میں چونکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تشریف فرما ہیں اس لئے ان ہی سے ذکر وشغل کی تلقین حاصل کر لینا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے آپ پر نہایت شفقت فرمائی۔

مولانا حسین احمد مدنی تقریباً سولہ سترہ برس تک مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ جب شریف مکہ نے انگریزوں کی شاطرانہ اور پُر فریب سازش میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

۱۹۱۴ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب بھی حجاز تشریف لے گئے۔ انگریز ہر قیمت پر شیخ الہند کو گرفتار کرنا چاہتا تھا اور چونکہ وہ حدود حرم میں داخل ہو چکے تھے اس لئے انہیں صرف شریف حسین کی حکومت ہی گرفتار کر سکتی تھی مگر شریف مکہ انگریزوں کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا یوں ان لوگوں کو مع ان کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل اور دیگر ساتھیوں کے گرفتار کر کے جزیرۂ مالٹا میں بھیج دیا گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے استاد کی معیت میں ساڑھے چار سال کا عرصہ قید میں گزارا۔ آپ نے اسی عرصہ میں قرآن پاک حفظ کیا۔ مالٹا سے رہائی پانے کے بعد آپ اپنے استاد محترم کے ساتھ ہندوستان آئے۔ چونکہ اس وقت حجاز، عراق شرق اردن، ٹکڑوں کی صورت میں برطانوی تولیت میں دیئے جا چکے تھے اور آپ کے نزدیک آزاد ہند ملت اسلامیہ کے نقطہ نظر سے ممالک اسلامی کی آزادی کا واحد ذریعہ تھی اس لئے آپ نے مدینہ منورہ جانا مفید خیال نہ کیا۔ اور ہندوستان ہی میں قیام فرمایا۔

شیخ الہند محمود الحسن نے آپ کو دار العلوم کی صدر مدرسی کے لئے نامزد کیا۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا حسین احمد مدنی دار العلوم دیوبند کی مسند صدارت پر مستقل طور پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے دار العلوم میں درس حدیث دیا اور ۳۱ سال تک دار العلوم میں علوم نبوی کی خدمت کرتے رہے۔

مسند ارشاد وہدایت پر بیٹھ کر مولانا حسین احمد مدنی نے جو کام کیا وہ اتنا زیادہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ایک شیخ الحدیث، سیاسی لیڈر اور مدبر و مفکر اپنی بے پناہ مصروفیات سے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ مسترشدین پر بھی توجہ دے سکے اور اپنے لاکھوں مریدوں کے حالات وکوائف معلوم کر کے ان کی تربیت کر سکے۔

خودداری، ذوق عبادت، اتباع شریعت، عزم واستقلال، سادگی و بے تکلفی، احساس فرض منصبی، تواضع وانکساری، فیاضی ومہمان نوازی، ایثار و قربانی، قناعت واستغنا آپ کی وہ صفات ہیں جنہوں نے آپ کی شخصیت کو بہت بلند مقام عطا کیا ہے۔ اولاد میں آپ نے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں چھوڑیں۔

حسین آفندی

ایک جادوگر عامل جنات۔ عثمانی سلطنت کے سلطان ابراہیم کا استاد۔ اس کے والد کا نام شیخ ابراہیم تھا۔ حسین آفندی اپنے آپ کو صدر الدین القونوی کی اولاد میں سے کہا کرتا تھا۔ استنبول میں وہ سلیمانیہ کے ایک مدرسے میں داخل ہو گیا اور جادوگری کے ذریعے زندگی بسر کرنے لگا۔ یہ علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اسی لئے اسے جنجی (جادوگر) کا لقب مل گیا۔ اس کی ماں نے دعویٰ کیا تھا کہ حسین آفندی سلطان ابراہیم کے جنوں کو دور کر سکتا ہے اسی لئے سلطان کی ماں نے فوراً اپنے پاس بلایا اور اسے ابراہیم کا اتالیق بنا لیا اس وقت دراصل ابراہیم کی والدہ ہی صحیح معنی میں حکمرانی کر رہی تھی۔ بعد میں شیخ الاسلام یحییٰ آفندی کی مخالفت کے باوجود ۲۰ ذیقعدہ کو ۱۰۵۴ھ / ۱۹ جنوری ۱۶۴۵ء کو غلطہ کا قاضی بنا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی استنبول کے قاضی کا درجہ بھی مل گیا۔ اس نے عہدے سے فائدہ اٹھایا اور رشوت لے کر لوگوں کو مختلف عہدوں پر مامور کرنے لگا۔ اس طرح اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ اسی جرم میں اسے تھوڑے تھوڑے دنوں کے لئے منصب سے برطرف بھی کیا گیا۔ آخری مرتبہ تو اسے جلاوطن کر کے گیلی پولی بھیج دیا۔ پھر سلطان محمد رابع تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اس کے تمام مال واسباب کو ضبط کر لیا۔ اسے گیلی پولی سے لا کر جیل میں ڈال دیا۔ ایک ماہ تک جیل میں رکھنے کے بعد دوبارہ جلاوطن کر کے مخایلچ (MIKHALIC) بھیج دیا۔ پھر جب اسے موت کی سزا دی گئی تو اس کی جائیداد کا آخری مشہور محل بھی شہزادی کو دے دیا گیا۔ اور پھر اسے شوال ۱۰۵۸ھ / ستمبر ۱۶۴۸ء میں سزائے موت دے دی گئی۔

حسین بن دلدار علی

سیدؒ نامور شیعہ مجتہد۔ آپ کے والد کا نام سید دلدار علی تھا۔ ۱۴ ربیع الآخر ۱۲۱۱ھ/ اکتوبر ۱۷۹۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ آپ کے استادوں میں آپکے بڑے بھائی سید محمد اور سید محمد مہدی نام مشہور ہیں۔ سترہ سال کی عمر میں آپ نے دو کتابیں "رسالۂ تجزی" فی الاجتہاد اور "رسالۂ حکم ظن در رکعتین اولین" لکھیں۔ ان کتابوں کو دیکھ کر ہی آپ کے والد نے آپ کو اجتہاد کی اجازت دی۔

آپ ذہانت و ذکاوت، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور اخلاق و سخاوت میں بہت مشہور تھے۔ والد کی وفات کے بعد لوگ آپ کی جانب زیادہ مائل ہونے لگے بشاہ اودھ کو ان سے بہت لگاؤ اور عقیدت تھی۔ اس نے آپ کو خطاب سے سرفراز فرمایا اور ایک مُہر عنایت کی اس مُہر پر یہ عبارت کندہ تھی "عمادی علوم دین، حامی سادات و مومنین، حافظ احکام اللہ، مجتہد العصر سید العلماء" اس نے حسین بن دلدار کے کہنے پر ایک عالی شان دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔ اس مدرسے کے استاد اور نگران کی حیثیت میں آپ نے ہی کام کیا۔ عراق اور ایران کے علماء ان کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اردو اور فارسی کے مشہور شاعر مرزا غالب کو جو شاہِ اودھ سے تعلق پیدا ہوا تھا وہ سید حسین بن دلدار کی وجہ سے ہی تھا۔

آپ کا انتقال ۱۷ رمضان ۱۲۷۳ھ/ اکتوبر ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ اور آپ کو امام باڑہ لکھنؤ میں دفن کیا گیا۔

آپ کے تین بیٹے تھے ان میں سے سید محمد تقی نے بڑی شہرت اور عظمت حاصل کی۔ حسین بن دلدار نے بیس سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک "حدیقۂ سلطانیہ" جو فارسی زبان میں ہے شیعہ عقائد پر مبنی ہے۔ اور اسی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئی۔

حسن بن زکرویہ

مہدویت کا مدعی۔

اس نے اپنے آپ کو احمد کے نام سے موسوم کر کے اپنی کنیت ابوالعباس رکھی۔ بادیہ نشینوں کے اکثر قبائل نے اس کو مہدی موعود سمجھتے ہوئے اس کی پیروی اختیار کی۔ اس کے چہرے پر ایک تل تھا جس کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی کہتا تھا۔ اسی وجہ سے صاحب الشامہ کے لقب سے مشہور تھا۔

اس نے عیسیٰ کو جو اس کا عم زاد بھائی تھا مدثر کا لقب دیا۔ اور اسے اپنا ولی عہد بنایا۔ وہ کچھ عرصہ تک اپنے پیروؤں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہا۔ اس کے بعد اس نے دمشق پر چڑھائی کر دی۔ چنانچہ دمشق عرصہ تک محصور رہا۔ آخر کار اہل دمشق نے محاصرے سے تنگ آکر نقد زر پیش کر کے اس سے مصالحت کر لی۔ اس کے بعد اس نے حمص پر حملہ آور ہو کر اسے تسخیر کر کے وہاں کے منبروں پر اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ یہاں سے اس نے حماۃ اور معرۃ النعمان پر فوج کشی کی اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس نے عورتوں اور بچوں تک کو بھی معاف نہ کیا۔ پھر بعلبک کی طرف متوجہ ہوا۔ اور یہاں کی آبادی کے قتل و غارت کا حکم دیا چنانچہ اس کی یہ قتل و غارت گری اس وقت تک جاری رہی جب تک بعلبک میں سوائے چند آدمیوں کے تمام آبادی کا خاتمہ نہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سلمیہ کی طرف رخ کیا اور وہاں بھی قتل و خونریزی کی انتہا کر دی۔ یہاں تک کہ مدرسوں اور مکتبوں میں پڑھنے والے کم سن بچوں کی جان لینے سے بھی گریز نہ کیا۔

حسین بن سعید

ایک ممتاز شیعہ عالم دین۔ آپ کے والد سعید بن حماد بن سعید بن میران تھے انھوں نے اپنے دو بیٹوں کے نام حسن اور حسین رکھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حسین بن سعید کی پیدائش مدینے میں یا کوفے میں ۱۸۵ھ میں ہوئی۔ علمائے رجال کے بقول آپ کو امام رضاؑ، امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کی صحبت نصیب ہوئی۔ آپ کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا۔

آپ کے بارے میں ابن ندیم اپنی الکتاب الفہرست میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ و آثار و مناقب میں سب سے زیادہ وسیع علم رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اپنے بھائی حسن کے ساتھ مل کر تمام کام کیا کرتے تھے اور دونوں نے مل کر فقہ، تفسیر اور اپنے عقائد پر مبنی کتابیں لکھیں۔ شیعہ حضرات میں بہت مقبول ہوئیں۔

حسین بن سلیمان

ایک ایرانی بادشاہ۔ تخت نشینی سے پہلے وہ سلطان حسین مرزا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کا باپ شاہ سلیمان صفوی ایران کا حکمران تھا۔ ابتدائی عمر میں وہ خاموش طبع، محنتی اور زہد و تقوی کی جانب مائل تھا جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ حسین بن سلیمان سلطنت کے امور سے قطعی ناآشنا تھا۔ اسی لئے حرم میں موجود خواجہ سراؤں نے اس بات کا خوب فائدہ اٹھایا اور تمام کاروبارِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر کچھ مدت بعد پیشواؤں اور حرم کے خواجہ سراؤں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑکنے لگی۔ چنانچہ حسین کو ایک سازش کے تحت شراب نوشی کا عادی بنا دیا۔ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی چند سالوں تک تو کسی خاص فتنے نے سر نہ ابھارا لیکن بعد میں بلوچستان کے علاقے میں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور کچھ باغیوں نے سر اٹھایا۔ شیخ علی خان نے خوب محنت اور لگن کے ساتھ کام کر کے رفع کر دیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد قندھار میں شورش رونما ہوئی۔ چنانچہ حسین نے گرگین کو ایک لشکر جرار دے کر اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ جس نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اس مہم کو نبٹا دیا۔

یہ بغاوت ایک غلزئی سردار میر ویس کے اشارے پر ہوئی تھی جب یہ گرگین خان نے میر ویس کو اصفہان جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی بہت چالاک آدمی تھا اس لئے جلد ہی حسین شاہ کا منظور نظر بن گیا۔ دربار میں گرگین خان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی کہ میر ویس کو قندھار جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد سب سے پہلا کام میر ویس نے یہی کیا کہ گرگین خان کو قتل کرا دیا۔ میر ویس کا انتقال ۱۱۲۷ھ/ ۱۷۱۵ء کو ہوا۔ عبداللہ کی ناکامی کے بعد ابدالی قبیلہ کو جوش آیا اور اس نے بھی ہرات میں بغاوت کر دی۔ ہرات کو مطیع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

عین اسی وقت محمود نے بھی قندھار میں بغاوت ختم کرنے کے بعد کرمان پر حملہ کر دیا۔ اور اصفہان کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ حسین شاہ کی فوج تعداد میں کم تھی پھر بھی اس نے محمود کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اس موقع پر محمود کی فوجوں نے اصفہان کا محاصرہ کر لیا۔ جس کی طوالت کے باعث دارالحکومت میں بھوک و بیماری کا دیو آن وارد ہوا۔ بے شمار شہریوں نے محل کو لپیٹ لیا۔ چنانچہ حسین شاہ کی فوجوں نے تنگ آکر شاہ محمود کو رہا کرا دیا۔

اسی دوران میں نپولین اعظم نے بھی ایران پر حملہ کردیا۔ ترکی نے بھی اس ملک پر چڑھائی کر دی۔ روس نے ترکی پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح یہ جنگ پھیل گئی۔ لیکن ترکی میں موجود فرانسیسی سفیر نے روس اور ترکی میں بیچ بچاؤ کرادیا اور ان کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا جس میں یہ لکھا تھا کہ وہ مفتوحہ علاقے آپس میں بانٹ لیں گے۔

حسین شاہ کو معزولی کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن محمود جلد ہی اپنی موت مرگیا۔ اس کے بعد سازشیوں اور عثمانی فوجوں میں ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ ترکی کے سپہ سالار اعظم احمد پاشا نے حسین شاہ کو دوبارہ تخت نشین کرنا چاہا لیکن بات نہ بن سکی اور حسین شاہ کو قتل کر دیا گیا۔

۱۹۳۵ء عمان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی پرورش ان کے دادا شاہ عبداللہ بن

حسین بن طلال حسین، ان کے والد شاہ طلال اور ان کی والدہ ملکہ زین کی نگرانی میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز عمان کے خلیل سکول برائے اطفال سے کیا اور ازاں بعد سعودی تعلیمی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے لئے اسکندریہ میں وکٹوریہ کالج میں داخلہ لیا۔ پھر انگلستان کے ہیرو کالج میں داخل ہو گئے۔ ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء کو اردن کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے انھیں ہاشمی سلطنت کا بادشاہ قرار دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد انھوں نے انگلستان کے سینڈھرسٹ ملٹری کالج میں داخلہ لیا جہاں انھوں نے فوجی تعلیم مکمل کی۔ تخت نشینی کے بعد سے [illegible] اردن نے [illegible] میں نمایاں ترقی کی ہے۔ [illegible] ممالک سے برادرانہ روابط قائم کئے گئے ہیں۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے اردن کی فوج کو برطانوی فوجی افسروں سے پاک کرنے کی مہم چلائی اور سب سے پہلے چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل جان گلب کو برخاست کیا۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے عراق سے الحاق کر کے عرب یونین قائم کی جو زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں ان کی فوجیں دوسرے عرب ملکوں کے شانہ بشانہ لڑیں۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ میں انھوں نے اپنی فوجوں کو شام کی مدد کے لئے شام کے محاذ پر بھیجا جہاں انھوں نے پہلے کے مقابلے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ شاہ حسین بن طلال کے مشغلوں میں اپنے نجی شاہی طیاروں کو چلانا، کاریں چلانا، گھڑ سواری اور فوٹو گرافی شامل ہیں۔ ادب، قانون اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ ذوق و شوق سے کرتے ہیں (نیز دیکھئے "اُردن")

حسین رضؓ بن علی رضؓ

(۳ شعبان ۴ ھ/جنوری ۶۲۶ء - ۱۰ محرم ۶۱ ھ/اکتوبر ۶۸۰ء)

آنحضورؐ کے چھوٹے نواسے، اہل تشیع اثنا عشریہ کے تیسرے امام۔ ابو عبداللہ کنیت، سیّد شباب اہل الجنۃ، ریحانۃ النبی اور سیّد الشہداء لقب۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے فرزند۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ولادت کی خبر سن کر آنحضورؐ تشریف لائے۔ بچے کو منگا کر دائیں کان میں اذان کہی اور بائیں کان میں اقامت۔ والدین نے آپؓ کا نام حرب رکھا تھا۔ آنحضورؐ کو یہ نام پسند نہ آیا۔ آپؐ نے بدل کر حسینؓ رکھا۔ آپؓ نے آنحضورؐ کی گود مبارک میں پرورش پائی۔ آپؓ کے بچپن کے حالات میں آپؓ کے ساتھ آنحضورؐ کے پیار اور محبت کے کئی واقعات ملتے ہیں۔ آپؐ حضرت حسینؓ کے ساتھ غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ آپ روزانہ اپنے دونوں نواسوں کو دیکھنے جاتے تھے۔ ابھی آپؓ کی عمر سات سال ہی کی تھی کہ نانا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں آپؓ کی عمر سات آٹھ سال کی تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے آخری ایام میں آپ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ آپ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور قرابت رسولؐ کا خاص لحاظ رکھتے۔ حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں آپ جوان ہو چکے تھے۔ ان کے عہدِ خلافت ہی میں سب سے پہلے میدان جہاد میں قدم رکھا۔ ۳۰ھ/۶۵۰ء میں طبرستان کی فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کے دوران میں جب باغیوں نے قصرِ خلافت کا محاصرہ کرلیا تو آپؓ بھی حضرت حسنؓ کے ساتھ قصرِ خلافت کے دروازے پر حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لئے مامور ہوئے۔

جب حضرت علیؓ نے کوفہ کو دارالخلافہ بنا لیا تو آپؓ مدینے سے کوفہ تشریف لے آئے۔ جنگ جمل میں اپنے والد کے ساتھ تھے۔ جنگ کے اختتام پر کئی میل تک حضرت عائشہ کو مدینہ پہنچانے کے لئے گئے۔ جنگ صفین میں بھی آپ نے سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیا۔ جنگ صفین کے بعد خوارج کی سرکوبی میں بھی بڑے انہماک سے حصّہ لیا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت آپ کوفے میں موجود تھے۔ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا فیصلہ کیا تو آپؓ نے اس بات کی سخت مخالفت کی۔

آپؓ نے امیر معاویہؓ کے عہد کی لڑائیوں میں بھی شرکت کی قسطنطنیہ کی مشہور مہم میں آپؓ مجاہدانہ شریک تھے۔ آپؓ ابتدائی عمر ہی سے اصلاح و تعلیم کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ چنانچہ حجر بن عدی کا قتل ہوا تو آپؓ نے حضرت معاویہؓ سے ملاقات کے وقت سخت احتجاج کیا اور حالات و معاملات کی بگڑی ہوئی صورت حال پر گفتگو کی۔

آپؓ قرآن مجید کے مطالب اور احادیث بیان فرماتے تھے۔ عبادت و ریاضت بکثرت نوافل پڑھنا اور قیام اللیل آپ کا عام دستور تھا۔ اکثر روزہ رکھتے تھے۔ آپ نے پچیس حج کئے۔ میدان کربلا میں آپ کی شہادت کا کارنامہ جس نے پوری تاریخ میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، محدثین و مؤرخین نے اس واقعہ پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

امام حسینؓ نے اسلام کا ارتقا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسلامی تاریخ کے جملہ واقعات ان کے سامنے ہوئے۔ آپؓ نے تمام مراحل تبلیغ و دعوت کو آزمایا اور ان کا جائزہ لیتے رہے۔ ۵۶ھ/۶۷۲ء میں جب صورت حال زیادہ بگڑ گئی۔ یزید

کو ولی عہد نامزد کیا گیا ۔ آپؓ نے اس بات کی سخت مخالفت کی ۔ اس پر شام سے جواب طلبی ہوئی ۔ جس کے جواب میں آپؓ نے حکومت پر سخت تنقید کی ۔ اور اپنے خیالات واضح کرتے ہوئے یزید کی ولی عہدی کے ناجائز ہونے کا اعلان کر دیا ۔ معاملات نازک صورت اختیار کرتے چلے گئے ۔ یہاں تک کہ کربلا کا سانحہ پیش آیا ۔ جس میں آپ نے شہادت پائی ۔

آپ کی شہادت کا واقعہ بھی منجملہ ان واقعات کے ہے جن میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں نے بڑی افراط و تفریط سے کام لیا ہے ۔ بقول مولانا معین الدین ندوی "آپ کی تقریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت امام حسینؓ کا یزید کے مقابلے میں آنا محض حصول خلافت کے لئے نہ تھا بلکہ اس کا مقصد اسلامی خلافت کا احیاء تھا ۔ یعنی موروثی حکومت کے اثر سے اس کے نظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کر کے پھر خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی جائے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نے خود اس کی خواہش نہیں کی بلکہ جب اہل عراق نے پیہم خطوط سے آپ کو اس کا یقین دلا دیا کہ ان کے لئے یزید کی حکومت ناقابل برداشت ہے ۔ اس وقت آپؓ نے کوفہ کا قصد فرمایا ۔ آپؓ کے تشریف لانے کے بعد جب عراقیوں نے دھوکہ دیا تو آپؓ واپس جانے پر آمادہ ہو گئے اور فرمایا کہ تم نے اپنی شکایات کی بنا پر مجھے بلایا تھا ۔ اب جبکہ تم اسے پسند نہیں کرتے تو مجھے بھی آپ کی خواہش نہیں ہے میں جہاں سے آیا ہوں ، واپس چلا جاؤں گا ۔"

آپ کی شہادت کے بارے میں افراط و تفریط سے پاک اور صحیح مسلک یہ ہے کہ آپ کوفیوں کی دعوت پر ایک نیک مقصد تجدید خلافت کے لئے اٹھے تھے اور اس کی راہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے ۔

آپؓ سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد آٹھ ہے ۔ کیونکہ آپؓ آنحضورؐ کے زمانے میں نہایت کمسن تھے البتہ بالواسطہ روایات کی تعداد بہت ہے ۔ آپؓ نے جن بزرگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں ان میں حضرت علیؓ ، حضرت فاطمہؓ ، ہند بن ابی ہالہؓ ، حضرت عمر بن خطابؓ وغیرہ ہیں ۔

آپؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں ۔ آپ کی ازدواج میں لیلیٰ ، شہربانو ، حباب ، حرار ، سکینہ اور عزالہ تھیں ۔ آپ کی اولاد میں صرف امام زین العابدین زندہ بچے تھے ، باقی سب لڑکے میدان کربلا میں شہید ہو گئے تھے ۔ صاحبزادیوں میں سکینہ ، فاطمہ اور زینب تھیں ۔

حسین بن علی

(---- ؟ ---- ۸ ذوالحجہ ۱۶۹ھ / ۱۱ جون ۷۸۶ء) ایک علوی جس نے خلیفہ الہادی کے عہد خلافت میں مدینے میں ایک خروج کی قیادت کی ۔ والد کا نام علی العابد تھا جو اپنے زہد و تقا کی وجہ سے مشہور رہتے ۔ ان کی والدہ زینب بھی متقی و پرہیزگار خاتون تھیں ۔ جس کی پرورش انتہائی زہد و تقویٰ اور بنو عباس سے خفیہ طور پر سخت نفرت کے ماحول میں ہوئی ۔

خلیفہ المہدی سے ان کے اچھے خاصے تعلقات تھے ۔ خلیفہ انہیں مالی عطیات دیتا رہتا تھا لیکن جس خروج کی انہوں نے مدینے میں قیادت کی اس کا فوری محرک وہ اہانت آمیز سلوک تھا جو حاکم مدینہ کے ایک نائب عبدالعزیز بن عبداللہ نے اس شہر کے ہو طالب کے ساتھ ۱۶۹ھ / ۷۸۶ء میں کیا تھا ۔

عبدالعزیز بن عبداللہ کو جب یہ خبر ملی کہ بعض شیعی حاجیوں نے اپنے قیام مدینہ کے دوران میں حسین اور دوسرے علویوں سے ملاقاتیں کی ہیں تو اس نے شہر میں طالبیوں کے آنے جانے پر پابندیاں لگانے کی کوشش کی ۔ اسی طرح کے بعض دوسرے واقعات سے صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی ۔

۱۳ ذوالقعدہ کی ایک صبح پو پھٹتے ہی ۲۶ علویوں ، ان کے بہت سے موالی اور دس حاجیوں نے مسجد نبوی پر قبضہ کر لیا ۔ اور مؤذن کو مجبور کیا کہ اذان اہل تشیع کے مطابق کہے ۔ یہ اذان سن کر عبدالعزیز روپوش ہو گیا ۔ حسین نے نماز پڑھوانے کے بعد ایک تقریر کی اور لوگوں سے بیعت لی ۔ دو علویوں نے حسین کی تائید سے انکار کیا ۔ ان میں سے ایک موسیٰ بن جعفر الکاظم تھے جنہیں اثنا عشری اپنا ساتواں امام مانتے ہیں ۔

حسین کا یہ خروج عام نہ تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے آئے اور جب انہوں نے حسین کو منبر پر سفید چغہ اور عمامہ پہنے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ ان کے کیا ارادے ہیں اس لئے واپس چلے گئے ۔ بہت سے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور حاکم کے دو سو سپاہیوں اور متعدد رضاکاروں نے مسجد پر فوراً دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی ۔ پورا شہر ابھی باغیوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا ۔ اس لئے ان کی حالت نازک ہو گئی ۔ وہ مسجد ہی میں [illegible] رہے ۔ بعد میں حسین نے اپنے آپ کو اس صورت حال سے [illegible] کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ وہ اپنے تین سو مسلح آدمیوں کی قیادت کرتا ہوا مدینے سے [illegible]

عباسیوں اور حسین کے حامیوں کے درمیان مکے سے [illegible] پر جنگ ہوئی ۔ دوران جنگ حسین اور اس کے ساتھیوں کو امان کی پیشکش کی گئی جسے انہوں نے رد کر دیا ۔ اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ۔ ان کے دو [illegible] قتل ہوئے ۔ جب حسین کی شکست کی خبر مدینے پہنچی تو عبدالعزیز اپنی [illegible] نکل کر اپنے عہدے پر واپس آ گیا ۔ اس نے علویوں اور حسین کے [illegible] حامیوں کے گھر جلوا دیئے ۔ اور ان کا مال و اسباب بطور مال غنیمت ضبط کر لیا ۔ یوں اس [illegible] کا خاتمہ ہو گیا ۔

حسین بن محمد تقی

ایک شیعہ عالم اور محدث ۔

آپ علامہ نوری کے نام سے زیادہ مشہور ہیں ۔ آپ ۱۸ [illegible] ۱۸۳۹ء جنوری ۱۸۳۹ء کو قریہ نور طبرستان میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم [illegible] حاصل کی ۔ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں آپ عراق آ گئے ۔ [illegible] آپ نے عبدالحسین طہرانی اور شیخ مرتضیٰ انصاری سے فیض حاصل کیا ۔ حسین بن محمد تقی نے [illegible] حج کیا اور کئی ہی مرتبہ مشہد کی زیارت کو بھی گئے ۔ آپ سامرے میں کافی [illegible] تک مقیم رہے ۔ [illegible] جمادی الآخر ۱۳۲۰ھ / ستمبر ۱۹۰۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا ۔ آپ کو نجف میں دفن کیا گیا ۔

حسین بن محمد تقی نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں [illegible] "مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل" شامل ہیں ۔

حسین، بنو

ایک شاہی خاندان جس نے ۱۷۰۵ء سے ۱۹۵۷ء تک تیونس پر حکومت کی ۔ اس خاندان کا بانی حسین بن علی تھا جو ۱۷۰۵ء میں [illegible] کے ہاتھوں شکست اور گرفتاری کے بعد جب [illegible] نے اسے تونس کا [illegible] بنا دیا تو [illegible]

اس نے فوجی رہنماؤں کی مجلس مشاورت کو اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ اس کے خاندان میں اولاد نرینہ میں سب سے بڑے لڑکے کے موروثی حق جانشینی کا اصول اختیار کر لیا جائے۔ اس کے دور حکومت کا بیشتر حصہ کسی الجھن کے بغیر گزرا۔ لیکن آخر میں اس کے بھتیجے علی نے الجزائریوں کی مدد سے اسے معزول کر دیا اور خود بے بنا علی پاشا بیس سال تک (۱۷۳۵ء تا ۱۷۵۶ء) حکومت کرتا رہا۔ بعد میں اسے اپنے بیٹے یونس اور پھر اپنے عم زاد محمد بن حسین کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔

محمد نے (۱۷۵۶ تا ۱۷۵۹ء) الجزائری فوجوں کی مدد سے تونس پر قبضہ کر لیا۔ ان افواج نے تھوڑا ... کیا۔ پھر اس کا بھائی علی بے (۱۷۵۹ء تا ۱۷۸۲ء) اس کا جانشین بنا۔ گو یہ حکومت ترکیہ اسے محض والی تونس تسلیم کرتی تھی تاہم اسے عملاً خود مختاری حاصل رہی۔ کیونکہ حکومت ترکیہ تونس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ تونس اور فرانس کے درمیان پہلی مرتبہ اختلاف رونما اس کے عہد میں ہوا۔

علی بے کے بعد حمودہ پاشا (۱۷۸۲ء تا ۱۸۱۴ء) بے بنا۔ جس کا ... وینس سے سخت تصادم ہوا۔ اس نے ... اور طرابلس پر گولہ باری کی۔ حمودہ پاشا کے بعد عثمان بے بنا جس کا عہد حکومت صرف دو تین ماہ رہا۔ اس کے بعد محمود (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۴ء) بے بنا جس نے ینی چریوں کو دوبارہ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ الجزائری ... کو ... جا سکے۔ اس سے پہلے حمودہ بے نے ینی چری فوج کو ختم کر ... اس کے بعد حسین (۱۸۲۴ تا ۱۸۳۵ء) اس کا جانشین بنا۔ جس نے ... کے ضمن میں مختلف مدارج پر سلطنت عثمانیہ ... کی۔ حسین کے بعد مصطفیٰ (۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۷ء) بے بنا اس کے بعد احمد (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۵ء) اس کا جانشین ہوا۔ تونس میں سب سے پہلے اصلاحات اسی نے نافذ کیں۔ اس نے رفاہ عامہ کے بڑے بڑے کام شروع کیے۔

محمد بے (۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۹ء) اور اس کا بھائی محمد الصادق (۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۲ء) دونوں باعزم مصلح تھے۔ علی بے (۱۸۸۲ء تا ۱۹۰۲ء) ان کا جانشین بنا۔ اس کے دور میں فرانس کی ... حکومت مکمل طور پر قائم ہوئی۔ اس اثنا میں فرانس کی جانب سے ... نمایاں ہوتی رہیں۔ جن کی بنا پر نئے حکمرانوں محمد الہادی (۱۹۰۲ تا ۱۹۰۶ء) محمد الناصر (۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۲ء) اور محمد الحبیب (۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۹ء) کی حیثیت محض ... نام ... گئی۔ احمد بے (۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۲ء) فرانسیسی ریزیڈنٹوں کی ہدایت پر کاربند رہا۔ حالانکہ ۱۹۳۴ء میں حبیب بورقیبہ کی سرکردگی میں نئی دستور پارٹی نے ملک کے قومی سیاسی احساسات کو مزید تقویت دی۔

احمد کے بعد منصف بے (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء) نے قوم پرست تحریک قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے اپنے مختصر عہد حکومت میں اپنے آپ کو ایک مستعد حکمران ثابت کیا۔ اس ... الامین (۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۷ء) کو بے بنا دیا گیا۔ لیکن اس میں احمد جیسی مستعدی اور قوت کردار نہ تھی اس لئے قومی تحریک ... کا سرچشمہ عمل پھر بورقیبہ ... پارٹی کے ہاتھ آ گیا۔

کچھ عرصہ بعد بنو حسین کو خاص حقوق حاصل نہ رہے اور ۱۹۵۶ء کے قانون کی رو سے حکومت بے ... کر کے وزیراعظم کو منتقل کر دی گئی۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء کو مجلس آئین ساز نے خاندان بنو حسین کے خاتمے اور جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔

حسین پاشا

امیر البحر۔ الجزائر کا بحری ہیرو۔ یہ مزہ مورتہ کے نام سے زیادہ مشہور تھا یہ اس کا اطالوی لقب تھا۔ اسکا مطلب ہے "نیم مردہ" یہ لقب اس لئے پڑا تھا کہ ہسپانوی فوجوں کے ساتھ ایک جنگ میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ جب سے ہی اس کا یہ لقب پڑ گیا تھا۔ وہ مالورقہ میں پیدا ہوا۔ ۱۶۷۴ء میں ایک بحری ہیرو کے طور پر اس کی شہرت کا آغاز ہوا بعد میں الجزائر کی ایک مشہور و معروف شخصیت بن گیا۔ جب فرانسیسی بحری بیڑے نے الجزائر پر بمباری کی تو دای بابا حسن نے اسے برغمال بنا کر فرانسیسیوں کے سپرد کر دیا۔ لیکن حسین پاشا نے اپنی کوششوں اور جدوجہد سے رہائی پالی۔ اور الجزائر آ کر حسن بابا حسن کے خلاف سازش تیار کر کے اُسے مروا دیا اور خود دای بن گیا۔ اور فرانسیسی بیڑے پر آگ کے گولے برسا کر اُسے الجزاری ساحل کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۶۸۴ء میں اس نے لوئیس ۱۴ سے صلح کر لی۔ لیکن ۱۶۸۶ء میں حکومت عثمانیہ نے الجزائر سے واپس بلا بھیجا۔ اسی اثنا میں فرانسیسیوں نے صلح نامہ توڑ دیا اور پھر الجزائری ساحلوں پر بمباری شروع کر دی۔ حسین پاشا نے انتقال کے طور پر فرانسیسی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ ۱۶۸۹ء میں باب عالی نے حسین پاشا کو عثمانی بیڑے کا امیر البحر بنانے کا فیصلہ کیا لیکن الجزائر میں سلطانی فرمان آنے سے پہلے ہی اندرونی اختلافات کے باعث حسین نے راہ فرار اختیار کی اور استنبول چلا گیا۔ وہاں ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں ترکی بحریہ کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ حسین پاشا نے دو جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ حسین پاشا کا انتقال ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء میں ہوا۔

حسین پاشا نے حکومتِ عثمانیہ کی بہت خدمت کی۔ اس نے عثمانی بیڑے کی اصلاح کر کے اُسے مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اور بحری ملازمت اور نظم و ضبط کے لئے قانون بنائے۔

حسین پاشا

ایک غلام۔ قد چھوٹا ہونے کے باعث کُوچک کے لقب سے مشہور ہوا۔ اسے اس کے آقا سلاحدار ابراہیم پاشا نے ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء میں سلطان مصطفیٰ ثالث کو دے دیا تھا۔ اس نے اپنے رضاعی بھائی جو سلیم ثالث کے نام سے تخت پر بیٹھا تھا کے ساتھ پرورش پائی۔ سلیم نے ۱۱ رجب ۱۲۰۳ھ/۷ اپریل ۱۷۸۹ء کو تخت پر بیٹھتے ہی اسے اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔ پھر چند سال بعد ہی ۱۶ رجب ۱۲۰۶ھ/۱۰ مارچ ۱۷۹۲ء کو اسے وزیر کا درجہ دے دیا۔ سلطان کی طرف سے اسے لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ اس نے بڑی محنت اور ہشیاری سے بحری فوج اور اسلحہ خانے کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ اور تمام عثمانی فوجوں کو فرانسیسی فوجوں کے انداز میں منظم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کام میں اس نے غیر ملکی ماہروں سے بھی مدد لی۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ مل کر فرانسیسیوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اور مصر کا فاتح ثانی مانا جانے لگا کیونکہ اس کی تدبیروں کے باعث فرانسیسیوں کو مصر سے نکلنا پڑا تھا۔ سلطان نے اسے بے شمار اعزازات سے بھی نوازا۔ ۲۲ شعبان ۱۲۱۸ھ/۷ دسمبر ۱۸۰۳ء کو انتقال ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چھیالیس سال سے بھی کم تھی۔ جامع ایوب میں اسکا مقبرہ بنا ہوا ہے۔

حسین پاشا

ایک ترکی وزیر۔ آغا حسین پاشا کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے والد کا نام حاجی مصطفیٰ تھا۔ اس کی پیدائش ادرنہ میں ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں

ہوئی۔ حسین پاشا ینی چری کے نویں دستے بلوک میں بھرتی ہوکر ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء میں قسطنطنیہ آگیا۔ اس نے ۱۸۰۷ تا ۱۸۱۲ تک روسی جنگ میں حصّہ بھی لیا۔ جلد ہی اسے ینی چری کا سار جنٹ بنا دیا گیا۔ اُس نے اپنی خدمات اور ذہانت کی بنا پر بہت سے امتیازات حاصل کرلیے۔ وزیر اعظم سلحدار علی پاشا نے سلطان کی توجہ حسین پاشا کی قابلیت اور محنت کی لگن کی جانب مبذول کرائی۔ چنانچہ سلطان نے اسے ینی چری کے اہم ترین عہدے پر ترقی دے دی۔ حسین پاشا نے ۴ جمادی الآخر ۱۲۲۸ھ/۲۶ فروری ۱۸۲۳ء میں اس عہدے کا حلف اٹھایا اور پھر چند ماہ بعد ہی ینی چری کے بعض اہم عہدوں پر فائز آدمیوں کو ہٹایا' اور انھیں مختلف صوبوں میں بھیج دیا۔ بعد میں اس نے زیادہ سخت تدبیریں کرکے ینی چری کے دستے کو اختتام کے قریب کردیا۔ سلطان یہی چاہتا تھا۔ اسی لئے اُس نے فوراً حسین پاشا کو اپنا وزیر بنا لیا اور اُسے آغا پاشا کا لقب دے دیا۔ لیکن ینی چری نے اسے اپنا دشمن سمجھنا شروع کردیا۔ اس لئے ۲۶ اکتوبر کو سلطان نے اسے وزارت سے الگ کر دیا اور اسے ازمید اور بُروسہ کا گورنر مقرر کیا۔ ساتھ ہی باسفورس کے قلعوں اور وہاں کی فوج کا افسرِ اعلیٰ بھی بنا دیا۔ تین سال بعد ہی ینی چری میں بغاوت ہوگئی جسے حسین پاشا نے بڑی بہادری کے ساتھ فرو کردیا۔

۱۸۲۸ تا ۱۸۲۹ء میں ہونے والی روسی جنگ میں اسے سپہ سالار کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن روسیوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہ کرسکا۔ بالآخر ۲ جمادی الآخر ۱۲۶۵ھ/ ۲۵ اپریل ۱۸۴۹ء کو انتقال ہوگیا۔

حسین پاشا

حسین پاشا نام تھا۔ اس کے چچا زاد بھائی نے اُسے عموجہ زادہ کا نام دیا۔ جسکے معنی ہیں چچا کا بیٹا۔ حسین پاشا نے اُس زمانے میں پرورش پائی جب کوپرولو خاندان اپنے عروج پر تھا۔ تیس سال کی عمر تک حسین پاشا نے کوئی خطاب حاصل نہ کیا۔ کیونکہ وہ پُرآسائش اور تن آسان زندگی کو پسند کرتا تھا۔ ۱۶۸۳ء میں ویانا کی جنگ میں صدر اعظم قرا مصطفیٰ پاشا نے شکست کے بعد حسین پاشا کو دارالسلطنت سے ذلیل کرکے نکال باہر کیا۔ بعد میں اسے شہر زور کا گورنر بنا دیا پھر ایک سال بعد ہی درۂ دانیال میں چار طاق کا فوجی گورنر مقرر کردیا۔ پانچ سال تک اس عہدے پر رہنے کے بعد ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں اسے وزیر کا عہدہ عطا کیا گیا۔ اسطرح وہ شعبان ۱۱۰۲ھ/مئی ۱۶۹۱ء میں قسطنطنیہ واپس آگیا۔ یہاں آکر اس نے صدر اعظم کے قائم مقام کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ کیونکہ وہ خود میدانِ جنگ میں مصروفِ عمل تھا۔ حسین پاشا شوال ۱۱۰۵ھ/ جون ۱۶۹۴ء تک قائم مقام صدر رہا۔ بعد میں دوبارہ اپنے سابق عہدے پر درہ دانیال واپس چلا گیا۔ ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۴ء میں اسے قپودان پاشا کا عہدہ دے دیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد اُس نے ساقز کو دوبارہ فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس علاقے پر اہل وینس نے قبضہ کرلیا تھا۔ حسین پاشا نے وینس کے بحری بیڑے کو فروری ۱۶۹۵ء میں شکست دی تو اہل وینس خود ہی ساقز کو چھوڑ کے چلے گئے۔ پھر حسین پاشا نے مئی ۱۶۹۵ء میں فوج کی سپہ سالاری چھوڑ دی اور ساقز میں صرف ایک محافظ کی حیثیت سے رہنے لگا۔

۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں اُسے وہاں سے تبدیل کرکے بغداد کا محافظ بنا دیا گیا۔ انہی دنوں وزیر اعظم الماس پاشا زنطہ کی جنگ میں مارا گیا تو حسین پاشا اس کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ شکست خوردہ فوج کو لے کر ادرنہ آگیا اور ایک معاہدے کے ذریعے اس جنگ کو ختم کردیا۔ یہ جنگ پندرہ سال تک جاری رہی۔ حسین پاشا پانچ سال تک وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہا۔ اور ۱۱ ربیع الآخر ۱۱۱۴ھ/۴ ستمبر ۱۷۰۲ء کو ایک لاعلاج مرض کے باعث استعفا دے دیا۔ اور گوشہ نشین ہوگیا۔ اس کا اسی سال ۲۲ ستمبر کو انتقال ہوگیا۔

حسین پاشا اپنی زندگی میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ اور ملک وملت کی خدمات انجام دیتا رہا۔ تدبّر' دیانت' محنت اور لگن اس کے کردار کی اہم خوبیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

حسین جاہد

ایک ترک ادیب۔ اخبار نویس اور سیاست دان۔ ان کے والد استنبول کے رہنے والے تھے۔ آپ کی پیدائش بلیکسر میں ہوئی۔ ان کے والد علی رضا صوبے میں سرکاری ملازم تھے۔ حسین جاہد نے ابتدائی تعلیم مقدونیہ کے شہر سریس میں پائی۔ بعد میں استنبول آگئے اور یہاں باقی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ اسی دوران فرانسیسی زبان سیکھ کر ترکی کے کئی سکولوں میں فرانسیسی اور ترکی کے استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ اور ایک اخبار طنین کا آغاز کیا۔ حسین جاہد پارلیمنٹ کے رکن بن گئے۔ لیکن ۳۱ مارچ تا ۱۳ اپریل کے غدر میں قدامت پسند عناصر نے انقلاب برپا کردیا۔ اس دوران میں باغیوں نے آپ کے پریس اور اخبار کے دفتر پر حملہ کرکے تباہ کردیا اور آپ کی شکل کے ایک اور شخص کو قتل کردیا۔ ۱۹۱۸ء میں ترکی کی حکومت اور اتحادیوں میں جب عارضی صلح ہوئی تو انگریزوں نے حسین جاہد سمیت کئی سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں اور سیاست دانوں کو جلاوطن کرکے مالٹا بھیج دیا۔ آپ نے مالٹا سے رہائی پانے کے بعد ترکی آکر مصطفےٰ پاشا کی حکومت پر تنقید [illegible] شروع کردی اور اپنے اخبار طنین کا دوبارہ اجرا کیا۔ حکومت نے آپ کو [illegible] لیا اور آپکے طرزِ عمل کو شکست خوردہ ذہنیت کا مظہر قرار دے کر آپ پر مقدمہ چلایا۔ ۱۹۲۶ء میں رہا ہوئے تو پھر آپ نے سیاست سے کنارہ کشی کرلی۔ اتاترک کے انتقال کے بعد آپ نے دوبارہ سیاست [illegible] کیا۔ اور ۱۹۳۹ تا ۱۹۵۰ تک پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ آپکا انتقال ۱۹۵۷ء [illegible] استنبول میں ہوا۔

آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ جو سیاسی تاریخی جغرافی [illegible] [illegible] نے بعض انگریزی' فرانسیسی اور اطالوی کتابوں کا ترجمہ بھی کئے۔

حسین حلمی پاشا

۱۸۵۵ء میں متیلین میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ایک متوسط طبقے کا نمائندہ تھا۔ آپ کے والد ایک معمولی تاجر تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک مدرسے میں [illegible] رشدیہ میں باقی تعلیم حاصل کی۔ فقہ کی تعلیم اور فرانسیسی زبان پرائیویٹ استاد سے پڑھی۔ آپ ۱۸۷۴ء میں مقامی سرکاری ادارے میں ملازم ہوگئے۔ دو نو سال تک متیلین میں ہی رہے۔ بعد میں ۱۸۸۲ء میں ایدین کا تبادلہ کردیا گیا۔ یہاں سے آپ کو [illegible] اور پھر بغداد بھی بھیجا گیا۔ دولتِ عثمانیہ کی جانب سے ۱۸۹۶ء میں آپ کو یمن کی گورنری سونپ دی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں دستوری انقلاب برپا ہوا تو آپ کامل پاشا کی کابینہ میں بطور وزیر داخلہ شامل ہوگئے۔ لیکن جب کامل پاشا نے دو وزیروں کو برطرف کرکے ان کی جگہ نئے وزیر مقرر کئے تو آپ نے بھی احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ اسکے صرف دو دن بعد ہی کامل پاشا کو بھی اقتدار سے الگ کردیا گیا۔ وراس طرح

حلمی پاشا مملکتِ عثمانیہ کا پہلی مرتبہ وزیرِ اعظم بنا۔ تقریباً دو ماہ بعد ہی ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء میں حلمی پاشا وزارتِ عظمیٰ سے بھی مستعفی ہوگئے۔ مئی ۱۹۰۹ء کو دوبارہ وزیرِ اعظم بنے۔ اس مرتبہ بھی انجمن اتحاد و ترقی اور فوج نے حکومت کے معاملات میں دخل اندازی ترک نہ کی تو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۹ء کو دوبارہ استعفیٰ دے دیا۔

حسین حلمی پاشا کا انتقال ۳ اپریل ۱۹۲۲ء کو وی آنا میں ہوا۔

حسین شاہ

آپ بنگالہ کے حسین شاہی حکمران خاندان کے بانی تھے۔ اور اشرافِ مکہ کی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ آپ کے والد نے تبریز سے آکر ضلع چاندپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں رادھ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہاں آپ نے بچپن میں قاضی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر حبشی سلطان شمس الدین مظفر شاہ کی ملازمت اختیار کر لی اور اپنی ذاتی قابلیت اور کردار کے باعث بہت جلد وزیر کا منصب جلیل حاصل کر لیا حسین شاہ نے اپنے ظالم آقا کے خلاف بغاوت کی اور قلعہ گور کا چار ماہ تک محاصرہ کئے رکھا۔ بالآخر مظفر شاہ نے قلعے سے باہر نکل کر حملہ کرنا چاہا اور قتل ہوگیا۔ اس وقت حسین شاہ بنگالہ کے تخت پر بیٹھ گئے۔ حبشی گذشتہ دورِ حکومت میں سرکش اور باغی ہوگئے تھے۔ ان کی طرف رجوع ہوا اور انہیں زیر کر لیا۔

آپ کی وفات ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ء میں ہوئی اور آپ کا بیٹا نصرت شاہ تخت نشین ہوگیا۔ آپ نے اپنے دورِ حکومت میں بے شمار مساجد خیرات خانے، سکول اور مدرسے رفاہِ عام کے دوسرے کام کئے۔

حسین شاہ ارغون

سندھ کے ارغون خاندان کا بانی۔ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش خیال کیا جاتا ہے کہ قندھار میں ہوئی۔ یہ علاقہ اس کے باپ کے زیرِ نگیں تھا۔ ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء میں بابر نے قندھار پر قبضہ کر لیا تو اس کا والد شال اور سیوی میں جاکر آباد ہوگیا جو آجکل سبی کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اس نے ان علاقوں کو اپنا مقبوضہ تصور کرنا شروع کر دیا۔ ۹۲۱ھ/۱۵۱۰ء میں حسین شاہ نے اپنے باپ سے لڑ کر بابر کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور دو سال تک ملازمت میں رہا۔ پھر جب گھریلو تنازعہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا تو وہ واپس اپنے باپ کے پاس آگیا۔ اس کے باپ نے ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ء میں اسے ٹھٹھے کے حکمران کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ اس علاقے پر اس کے حریف جام صلاح الدین نے چڑھائی کر دی تھی۔ اس جنگ میں جام صلاح الدین مارا گیا۔ اور اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ جب ۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا تو بالائی سندھ پر اس کی حکمرانی کا اعلان ہوا۔ چنانچہ اس نے موقع ملتے ہی ٹھٹھہ پر چڑھائی کر دی اور جام فیروز کو شکست دے کر شہر پر قابض ہوگیا۔ جام فیروز بھاگ کر گجرات چلا گیا اور جلاوطنی میں وفات پائی۔

۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء میں حسین شاہ نے ملتان پر حملہ کیا۔ حاکم ملتان محمود خان لنگاہ نے بھی اسی ہزار فوج کے ساتھ اسکا مقابلہ کیا لیکن بہت جلد بیمار ہوکر مر گیا۔ اس کے جانشین سلطان محمود خاں لنگاہ دوم نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے حسین شاہ ارغون سے صلح کر لی۔ اس کے بعد اس نے دراوڑ اور ملتان پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ لیکن جب وہ فاتحانہ بھکر کی میں داخل ہو رہا تھا تو اسے اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ پر کچھ لوگ حملہ کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ لشکر لے کر ادھر متوجہ ہوا اور اسے شکست دی۔

حسین شاہ ۱۲ ربیع الاول ۹۶۲ھ/۴ فروری ۱۵۵۵ء کو ۳۴ سال تک حکمران رہنے کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ بہت بہادر حکمران تھا۔ علماء اور ماہرین فقہ کا بہت قدردان تھا۔ خود بھی فارسی زبان میں شعر بھی کہتا تھا۔

حسین شاہ شرقی

ریاست جونپور کا آخری بادشاہ۔ اپنے بڑے بھائی محمد شاہ کے انتقال کے بعد ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس وقت دہلی پر بہلول لودھی کی حکومت تھی۔ حسین شاہ شرقی نے حکومت سنبھالتے ہی بہلول لودھی سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ جو چار سال کے لئے تھا۔ اس مہلت سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ترہت اور اڑلیسہ پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اڑلیسہ کے ہندو راجا نے بھاری تاوان دینا منظور کر لیا۔ پھر ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں انھوں نے گوالیار کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت یہاں راجہ مان سنگھ کا قبضہ تھا اس نے بھی تاوان دینا منظور کر لیا۔ ملکہ جہاں نے حسین شاہ کو اس بات پر اکسایا کہ وہ خاندانِ سادات کے علاء الدین شاہ کو اس کی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ دلانے کی کوشش کرے۔ اس لئے آپ نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ اس وقت بہلول لودھی پنجاب کے دورہ پر تھا۔ چنانچہ بہلول نے حسین شاہ شرقی سے صلح کی درخواست کی کیونکہ اس کی فوجیں بہت کم تھیں اور حسین کی فوجوں سے جنگ کرنے کے ناقابل تھیں حسین شاہ نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ لیکن جب جنگ ہوئی تو نتیجہ اس کے خلاف نکلا۔ اور بڑی مشکل سے حسین شاہ نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء میں حسین شاہ نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اوٹاوہ پر حملہ کر دیا۔ یہاں قطب خاں لودھی کی حکومت تھی لیکن یہاں بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا اور ایک بار پھر شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی لیکن کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ۸۸۳ھ/۱۴۷۹ء میں بالآخر حسین شاہ شرقی نے اپنی فوجی چالوں کے ذریعے لودھیوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اس مرتبہ جب آپ کی فتح مند فوج واپس جا رہی تھی تو بہلول لودھی نے پیچھے سے اس پر حملہ کر دیا اور حسین شاہ کو مجبوراً کانپلی پٹیالی اور دوآب کے کئی شہروں پر بہلول لودھی کا قبضہ ماننا پڑا۔ اس شکست کے بعد آپ نے ایک مرتبہ پھر ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء میں اٹاوہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس میں بھی شکست مقدر رہی اور ریاست جونپور پر بہلول لودھی کا قبضہ ہوگیا۔ چنانچہ آپ اپنی جان بچا کر بہار کی طرف بھاگ گئے۔ حسین شاہ شرقی کو اپنی ریاست جونپور کی بازیابی کی جب کوئی امید نظر نہ آئی تو بنگال کے ایک گاؤں کہل چلے گئے اور یہیں پر ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء میں وفات پائی۔ آپ کی وصیت کے مطابق جسد خاکی جونپور لا کر جامع مسجد کے قریب شیخ عیسیٰ تاج بن احمد عیسیٰ کی خانقاہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یہ مسجد ان کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئی تھی۔ اور شرقی فن کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔

آپ کی وفات کے ساتھ ہی ریاست جونپور کے شرقی بادشاہوں کا خاندان ختم ہوگیا حسین شاہ شرقی موسیقی نواز تھے اور خود بھی موسیقی کا شوق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک راگ جسے "خیال" کہا جاتا ہے ایجاد بھی کیا تھا۔

حسین قادری

(۱۷۳۷ء/۱۷۹۷ء) سلسلۂ قادریہ کے بزرگ، عالم دین۔ آپ نے ظاہری علوم و فنون کی تعلیم اپنے والد ماجد قطب الاقطاب شیخ کمال قادری سے حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف مقامات سے بے شمار لوگوں سے اکتسابِ فیض کیا۔ لاہور میں حضرت شیخ

عبداللہ بوچ قادری سے شرف بیعت حاصل کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۲ء میں جب کلانور کو مستقل ہیڈ کوارٹر بنا کر سکھوں کے خلاف کارروائی کی تو خواجہ حسین نے بھرپور طریقے سے اس کارروائی میں حصہ لیا۔ بلاقی چک کے معرکے میں آپ خصوصی طور پہ شریک رہے۔ اس معرکے میں ہزاروں سکھ ہلاک ہوئے جہاد کے علاوہ ریاضت و عبادت میں بھی آپ نے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ عام طور پر آپ جامع مسجد میاں کو ...میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ ریاضت کے لئے آپ نے خانقاہ حضرت حاجی حسین میں، مقبرہ حضرت صاحب کے مغرب میں، ایک حجرہ مخصوص کر رکھا تھا۔ مرقد منور خاندانی قبرستان میاں کوٹ میں تالاب کے کنارے واقع ہے۔ (ش۔ ج)

حسین نظام شاہ

احمد نگر کے نظام شاہی سلاطین کا تیسرا فرمانروا اور برہان نظام شاہ اوّل کا سب سے بڑا بیٹا برہان نظام شاہ کے بعد ۱۵۵۴ء میں المؤید من عند اللہ کا لقب اختیار کر کے مسند نشین ہوا۔ احمد نگر سے تخت کے کئی دعویدار بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جن میں عبدالقادر خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ حسین نظام شاہ شیعی عقائد اختیار کئے ہوئے تھا۔ عبدالقادر نے شیعی عقائد قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے شاہی دربار کے دکنی گروہ کی حمایت حاصل تھی۔ حسین نظام شاہ کے چھوٹے بھائی نے اپنے خسر خواجہ جہان پہند کی مدد سے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر دونوں حسین شاہ سے شکست کھا کر بیجاپور میں عادل شاہی سلطان کے پاس گئے اور اسے احمد نگر پہ حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ نے تخت کے دعویدار میران شاہ علی کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی عادل شاہی اور نظام شاہی سلاطین کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کا اہم واقعہ وجیانگر کے حکمران رام رائے کی شمولیت ہے۔ رام رائے نے عادل شاہی سلطان کا ساتھ دیا۔ ہندو راجہ کے مسلمانوں پر ظلم و ستم سے تنگ آ کر مسلمانوں نے اپنی رقابتیں ترک کر کے آپس میں مفاہمت اور اتحاد کا راستہ اختیار کر لیا اور رام رائے کو ۱۵۶۵ء میں تلی کوٹے کی جنگ میں شکست فاش دی۔ وجیانگر سلطنت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس جنگ میں قلب پر حسین نظام شاہ مامور تھا۔ جنگ کے چھ ماہ بعد حسین نظام شاہ انتقال کر گیا۔

حسین ہمدانی

ایک بابی مصنف جس نے مرزا علی باب کی تاریخ لکھی۔ شاہ ایران کے ہمراہ یورپ کے سفر پہ گیا۔ کچھ وقت استنبول میں گزارا۔ ۱۸۷۴ء میں ایران واپس آیا تو کچھ مدت کے لئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد ایک زرتشتی مانک جی کی ملازمت اختیار کر لی۔ مانک نے حسین ہمدانی کو باب کی تاریخ لکھنے پہ آمادہ کیا۔ تاریخ باب کی تکمیل کے بعد اس کی خواہش تھی کہ وہ باب کی پوری طرح وضاحت کرے لیکن اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور ۱۸۸۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ (ش۔ ج)

حسینی سادات، امیر

ایک ممتاز صوفی، مصنف اور شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کے ممتاز شاگرد۔ پورا نام حسین بن عالم بن الحسن الحسینی۔ غور کے گاؤں گزیو میں پیدا ہوئے۔ والد کے ہمراہ ملتان آ کر سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہو گئے۔ امیر حسینی کی شادی شیخ زکریا ملتانی کی بیٹی سے ہوئی۔ انہوں نے بلبن اور فیروز شاہ خلجی (۱۲۹۰ء - ۱۲۹۶ء) کے عہدِ حکومت میں ملتان میں قیام کیا۔ امیر حسینی ہرات میں ۱۲۲۸ء کے بعد فوت ہوئے اور عبداللہ بن جعفر طیار کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

حسینی ایک نامور صوفی مفکر تھے۔ دولت شاہ نے انہیں علمیت اور شہرت میں جنید ثانی کہا ہے۔ تاریخ ادبیاتِ فارسی در راہ نمائے کتاب کے مصنف نے آپ کا مقام سعدی اور رومی کے بعد بتایا ہے۔ صوفیانہ خیالات کو قصے کہانیوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کا انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں: نزہۃ الارواح، ...، ... کی شرح، طرب المجالس، زاد المسافرین اور کنز الرموز۔ آپ کی تصانیف میں معاشرتی اور اخلاقی انتشار کے خلاف نمایاں صوفیانہ ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ (ش۔ ج)

حشویہ

ایک اصطلاح، جسے ظواہر پر انحصار کر کے تجسیم کے قائل ہو جانے والے لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ ظاہری کلمات کو قابل ترجیح سمجھتے تھے۔ سالمیہ بھی انہی لوگوں میں شامل ہیں۔ معتزلہ اصحاب الحدیث کی پوری جماعت کو حشویہ کہتے تھے۔ کیونکہ وہ ایسے کلمات کا استعمال جائز سمجھتے تھے۔ جن میں خدا کی طرف اعضائے انسانی منسوب کئے گئے ہیں۔ (ش۔ ج)

حصن کیفا

الجزیرہ کا ایک شہر جو دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہ دیار بکر اور جزیرہ ابن عمر کے درمیان واقع ہے۔ کلدانیوں کے زمانے کے قدیم غاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ... ق م میں ایک بستی تھی۔ رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان ... کی شہنشاہیت کے زمانے میں جو سرحدی جنگیں ہوئیں۔ ان میں شہر کیفا نے اپنے بلند ... مستحکم قلعے کی وجہ سے اہم حصہ لیا۔ جنگی اہمیت کی وجہ یہاں کا مضبوط قلعہ تھا اور یہ جگہ دیار بکر اور جزیرہ ابن عمر کے درمیان تجارتی مرکز تھی۔ یہ شہر ۱۱۰۱ء سے ۱۲۳۲ء تک ارتقی خاندان کا دارالسلطنت رہا۔ ۱۲۳۲ء میں ایوبیوں نے حصن کیفا کی ارتقی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ۱۲۶۰ء میں مغلوں نے اس شہر پر قبضہ کر کے برباد کر دیا۔ اس کے بعد اس کی حالت برابر گرتی چلی گئی۔

قرونِ وسطیٰ کے اسلامی دور میں حصن کیفا کو جو ... خوشحالی نصیب ہوئی۔ اس کا بیّن ثبوت وہاں کی شاندار عمارتوں سے ملتا ہے۔ ان عمارتوں میں حسب ذیل خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ قلعہ اپنے شاندار دروازوں کے ساتھ شہر کے اوپر واقع ہے۔

۲۔ شہر کے وسط میں جامع الملوک مسجد ہے۔

۳۔ ایک مسجد دریائے دجلہ کے کنارے کے قریب واقع ہے۔

۴۔ ایک قدیم مدرسے کے کھنڈرات جو زیریں شہر کی مشرقی دیوار کے پاس ہیں یہ سب کی سب باقیات دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہیں۔ مغربی کنارے پر ایرانی طرز کا ایک قبرستان ہے جس میں زینب بیگ ... اور ... حسن کا مقبرہ ہے۔ (ش۔ ج)

حصید، جنگ

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ۱۲ ہجری میں حصید کے مقام پر لڑی گئی۔ حضرت خالد بن ولید جنگ حیرہ کی کامیابی کے بعد انبار، عین التمر اور دومۃ الجندل کے معرکوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ ایرانیوں نے جب یہ دیکھا تو وہ حیرہ واپس لینے کے منصوبے بنانے لگے۔ حیرہ کے عیسائی بھی جوش انتقام میں ایرانیوں کے ساتھ مل گئے۔

ایرانی سردار زرمہر اور روزبہ اپنی فوج کے ساتھ حصید کی طرف بڑھے۔ اسلامی سپاہ کے قعقاعؓ اور ابو لیلیٰؓ بھی اسلامی فوج کے دستوں کی کمان سنبھال کر حصید پہنچ گئے۔ خونریز جنگ میں دونوں ایرانی سردار ہلاک ہو گئے۔ نصف سے زیادہ فوج قتل ہوئی، باقی نے راہِ فرار اختیار کی۔ (ش۔ ج)

حصین بن نمیر

بنو امیہ کا ایک سپہ سالار، جو جنگ صفین میں امویوں کی طرف سے لڑا۔ یزید (بن معاویہ) کی تخت نشینی کے وقت وہ حمص کا حاکم تھا۔ حجاز کے خلاف فوج کشی میں وہ سپہ سالار مسلم بن عقبہ المری کا نائب مقرر ہوا۔ مکے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے مسلم نے لشکر کی کمان حصین کے سپرد کر دی۔ مسلم مشلل کے مقام پر فوت ہوا۔ مشلل کے باشندوں نے مسلم کی نعش کو قبر سے نکال کر سنگسار کر دیا تھا۔ حصین بن نمیر نے مشلل کے سب باشندوں کو قتل کر دیا۔ اس نے دو مہینے تک مکے کا محاصرہ جاری رکھا۔ فتح مکہ سے قبل ہی یزید کا انتقال ہو گیا اور حصین نے محاصرہ اٹھا لیا۔ حصین نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو خلیفہ بنانے کے سلسلے میں ناکام کوشش کی۔ مروان بن الحکم کی تخت نشینی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ اس نے قبیلہ کے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ خالد بن معاویہ کی جگہ مروان کو خلیفہ تسلیم کریں۔ حصین جزیرہ کی جنگ میں ۶ر اگست ۶۸۶ء کو ابراہیم بن اشتر کے ہاتھوں مارا گیا۔ (ش۔ ج)

حضانت

فقہا کی اصطلاحی زبان میں بچے کی سرپرستی کا حق۔ سرپرستی کا یہ حق بچے کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے علیحدہ نہ ہونے کی صورت میں صرف دو حالتوں میں حق سرپرستی کے معاملے میں بیوی پر خاوند کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اوّل جبکہ بیوی کی سکونت خاوند کی سکونت سے الگ ہے یا تو اس لئے کہ خاوند اسے سرپرستی کی اجازت دیتا ہے (حنفی مسلک) یا اس لئے کہ بیوی نے نکاح کی شرائط میں سے ایک شرط کے ذریعے یہ حق اپنے لئے تسلیم کرا رکھا ہے (مالکی اور حنبلی مسلک)، دوسری صورت یہ کہ خاوند اپنے بچے کو ایک سفر پر ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے اور بیوی کو اپنے ہمراہ نہیں لے جاتا۔ حنفیوں کے نزدیک اصولاً حضانت ماں کا حق ہے۔ باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ ماں کی سرپرستی کے بغیر اور اس کی مرضی کے خلاف بچے کو سفر پر ساتھ لے جائے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حق حضانت اس عمر تک کے لئے ہوتا ہے جب لڑکا خود کھانے پینے، لباس پہننے اور استنجا کرنے لگے۔ لڑکی کی صورت میں اس کے بالغ ہونے تک ہے۔ یہی قول امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک جب لڑکی میں جنسی خواہش ظاہر ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک حق حضانت اس وقت تک رہتا ہے جب تک لڑکا واضح طور پر بات چیت کر سکے اور لڑکی کی بلوغت تک۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی دونوں کے لئے سات سال کی عمر تک حق حضانت ہوتا ہے۔ شیعی فقہ کی رو سے لڑکے کے متعلق دو سال اور لڑکیوں کے متعلق سات سال تک حق حضانت حاصل رہتا ہے۔

حنفی، شافعی اور حنبلی فقہ میں (جن کے نزدیک حق حضانت جلد ختم ہو جاتا ہے) یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس چھوٹے بچے کا کیا ہو گا جو اب ماں کی سرپرستی میں نہیں رہا۔ حنفی فقہ میں اس عمر میں بچے کو واجبی طور پر باپ کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور باپ کے انتقال کی صورت میں یا سرپرستی کے قابل نہ ہونے کی صورت میں، اس مرد رشتے دار کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس پر بچے کی ولایت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ لڑکی کی صورت میں یہ شرط ہے کہ ولی لازمی طور پر "محرمات" میں شامل ہو۔ سات سال کے لڑکے یا نو سال کی لڑکی سے مشورہ نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اس عمر میں اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی عقلمندانہ فیصلہ کر سکیں۔ شافعیؒ سات سال کے لڑکے کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں کہ وہ چاہے تو اپنی ماں کے ساتھ رہے اور چاہے تو اپنے باپ کے گھر چلا جائے۔ شافعیؒ یہی حق نو سال کی لڑکی کو بھی دیتے ہیں۔

حنفی پندرہ سال کے لڑکے کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے باپ سے الگ ہو کر یا اپنی ماں سے علیحدہ ہو کر اپنا گھر بنائے بشرطیکہ اس نے سات برس کی عمر میں ماں کو اپنا سرپرست منتخب کیا ہو۔ سن بلوغت کو پہنچنے والی لڑکی کی صورت میں شافعی مذہب سب سے زیادہ رخصت سے کام لیتا ہے۔ کیونکہ اس مکتب کے فقہا بالغ لڑکی کو علیحدہ مسکن رکھنے سے منع نہیں کرتے۔ مالکی فقہ کی رو سے ایک دوشیزہ بالغ ہو کر بھی اپنے باپ سے الگ نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف ایک لڑکی جو بیوہ یا مطلقہ ہو تو اسے نقل و حرکت کی پوری آزادی حاصل ہے۔ حنفی فقہا کے نزدیک ایسی لڑکی اب بھی اپنے باپ کے ساتھ رہے گی۔

حضانت کی تفویض مختلف مذاہب میں مختلف ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مختلف مذاہب کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حنفی اور مالکی حق حضانت کو ایسی شکل دیتے ہیں جس میں ہمیشہ عورتیں ہی فوقیت حاصل کرتی ہیں۔ ننھیال کی عورتوں کو ددھیال کی عورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ شافعی اور حنبلی مذاہب کچھ عورتوں (ماں، نانی، پرنانی) کو اوّلیت دیتے ہیں۔ مگر خاص حالات میں مردوں کو عورتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ بچے کی بہت ہی قریبی رشتہ دار عورتیں بھی موجود ہوں۔ حنفی اور مالکی فقہا کے نزدیک حضانت ماں کا حق ہے۔ ماں کی وفات یا جانے یا اس کے قابل سرپرستی ہونے یا اس صورت میں کہ وہ اپنے حق کو کسی وجہ سے ضائع کر دے۔ یہ حق ماں کی قریبی رشتہ دار عورتوں کو اور پھر باپ کی قریبی عورتوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ان کے بعد سگی بہن اور ننھیال میں سے بہن، ددھیال سے پہلے بھتیجیاں (سوائے ہم جد کے)، خالہ کو پھوپھی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مالکی فقہ میں خالہ کو باپ کی قریبی رشتہ دار عورتوں پر ترجیح دی گئی ہے۔ حنفی اور مالکی مذاہب میں مردوں کو حضانت کا حق صرف اس وقت دیا جاتا ہے جب تمام رشتہ دار عورتیں مفقود ہوں جن سے شادی نہ ہو سکے۔ حق حضانت کے لحاظ سے مردوں میں سب سے پہلے عصبات (مرد جو مردوں کے واسطہ سے رشتہ دار ہیں) آتے ہیں۔ سب سے پہلے باپ، پھر کسی عصبہ کے نہ ہونے کی صورت میں (حنفی فقہ کی رو سے) عورتوں کے واسطے سے رشتہ دار مرد لڑکی کی صورت میں صرف وہ مرد جن کے ساتھ شادی حرام ہے۔ آخر میں ان مردوں اور عورتوں کا حق ہے جن سے شادی کرنا حرام نہیں۔ تمام رشتے داروں کی عدم موجودگی میں قاضی کسی اور قابل اعتبار شخص کو حضانت کے لئے مقرر کر سکتا ہے۔ شافعی اور حنبلی مذاہب میں قریبی رشتے دار عورتوں کے موجود ہونے کے باوجود مرد حق حضانت استعمال کر سکتے ہیں۔ ان دو مذاہب میں باپ کی طرف سے بہن کو (ماں کی طرف سے بہن پر) اور پھوپھی کو خالہ پر ترجیح دی جاتی ہے۔

استحقاق کے سلسلے میں اہم مسئلہ اکثر مختلف المذاہب والدین کے بچے سے متعلق پیش آتا ہے۔ شافعی مذہب کے نزدیک بچے کا باپ مسلمان ہو اور بیوہ یا مطلقہ مسلمان نہ ہو تو حضانت کا حق عورت کو نہیں دیا جائے گا۔ مالکیوں کا اس بارے میں قدرے نرم رویہ ہے؟ ... نازل ہے اور حنفیوں کا فیصلہ ہے کہ ذمیہ (عیسائی یا یہودی عورت) حضانت کا حق رکھتی ہے۔ حنفیوں کے نزدیک ایک غیر مسلم عورت اس وقت حق حضانت سے محروم

ہو جاتی ہے جب وہ بچے کو اس کے باپ کے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کر چکی ہو۔ ہر مسلک فقہ کے مطابق وہ زیادہ حضانت سے خارج ہے۔ (شریف جاوید)

حضر موت

جنوبی عرب میں یمن کے مشرق میں ایک مملکت۔ زمانۂ قبل از اسلام میں حضر موت میں قبیلۂ صدف آباد تھا۔ بنو کندہ نے جو تیس ہزار کی تعداد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ ولادت کے قریب بحرین سے ترک وطن کر کے حضر موت چلے آئے

حضر موت کا مشہور شہر المکلا

تھے، اپنے آپ کو انہی سے وابستہ کر لیا تھا۔ رسول اللہ کے زمانے میں کندہ کے سردار قیس بن اشعث نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

حضر موت ایک پہاڑی سرزمین ہے جس کے آر پار ایک ندی ہے۔ اس میں سے کئی بڑی بڑی ندیاں نکلتی ہیں۔ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ پہاڑیاں ہیں اور ان کے پیچھے پہاڑوں کا ایک بلند کوہستانی سلسلہ ہے جس میں سب سے اونچا جبل العرشہ ہے۔ پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ شمالی سمت میں بڑی وادی سے ملحق ہے اور صحرائے اعظم تک پھیلا ہوا ہے۔ قدیم دار الحکومت تریم، عبنات اور القسم تھے۔

آج کل حضر موت جمہوریہ جنوبی یمن کا حصہ ہے۔ ۱۹۶۱ء میں اس کی آبادی تقریباً تین لاکھ تھی۔ اہم ترین شہر اور بندرگاہ المکلا ہے۔ (ش۔ ج)

حضور

جنوبی عرب کا ایک پہاڑ جو صنعا کے مغرب میں وادی سام اور وادی سُردُد کے درمیان حراز کے پہاڑی سلسلے کے قریب واقع ہے۔ حضور کا نام حضور بن عدی بن مالک کے نام سے ماخوذ ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام بن نہدم کے اجداد میں سے تھے۔ یہ پہاڑ ۱۰۰۰۴ فٹ بلند ہے۔ عربوں کی روایت کے مطابق ان تین پہاڑوں میں یہ سب سے اونچا ہے جہاں طوفانِ نوحؑ میں سمندر کی لہریں نہیں پہنچ سکی تھیں۔ اس کی بلند ترین چوٹی جبل قاہر ہے جس کے اوپر حضرت شعیبؑ کا مقبرہ اور مسجد ہے۔ زائرین یہاں بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ حضور شعیب میں کئی کئی فٹ برفباری بھی ہوتی ہے۔ (ش۔ ت)

حضین

بن منذر بن حارث، بصرے کے شاعر۔ آپ کا شمار سر برآوردہ تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ نے چھوٹی عمر ہی میں جنگ صفین میں داد شجاعت پائی۔ آپ حضرت علیؓ کے لشکر میں بنو ربیعہ کے علمبردار تھے۔ بعد میں آپ کا ذکر صرف شاعر کی حیثیت سے ملتا ہے۔ آپ نے چند حدیثیں روایت کی ہیں۔ جن میں بعض احادیث شاہان فارس کے بارے میں ہیں۔ آپ کی کنیت ابو ساسان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا خاندان ایران سے

جاتا رہا ہے۔ (ش۔ ج)

حفص، بنو

شمالی افریقہ کا ایک خاندان (۱۲۲۹ء تا [illegible]ء) جس کا نام اس کے مورثِ اعلیٰ شیخ ابوحفص عمر بن یحییٰ الہنتاتی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ابوحفص موحدین کی سلطنت کا بانی تھا۔ اس کے فرزند شیخ ابو محمد عبدالواحد نے ۱۲۰۷ء سے ۱۲۲۱ء تک افریقیہ پر حکومت کی۔ اس کا پوتا ابو محمد عبداللہ بن عبدالواحد ۱۲۲۶ء میں افریقیہ کا حاکم بنا۔ [illegible] کی معزولی کے بعد ۱۲۲۸ء میں اس کے بھائی ابو زکریا یحییٰ نے افریقیہ [illegible] نے ۱۲۳۰ء میں قسطنطنیہ اور بجایہ پر قبضہ کر کے جزائر المغرب اور قسطنطنیہ کے جنوبی علاقے کو بنی غانیہ سے چھڑا کر سارے افریقی مقبوضات کو [illegible] میں ہموار کیا۔ ۱۲۳۱ء میں الجزائر کو اپنی مملکت میں شامل کیا۔ [illegible] ۱۲۴۲ء میں تلمسان کا شہر فتح کیا۔ ۱۲۴۹ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو [illegible] علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔ بنو نصر اور بنو [illegible] اس کی ماتحتی [illegible] تھے۔ اس خاندان کے دیگر حکمرانوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ خلیفہ المستنصر باللہ ابو عبداللہ محمد بن ابو زکریا یحییٰ، عہد حکومت ۱۲۴۹ء تا ۱۲۷۷ء

۲۔ الواثق بن مستنصر عہد حکومت ۱۲۷۷ء تا ۱۲۷۹ء

۳۔ ابو اسحاق ۱۲۷۹ء تا ۱۲۸۳ء

۴۔ ابن ابی عمارہ ۱۲۸۳ء تا ۱۲۸۴ء

۵۔ ابو حفص ۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۵ء

۶۔ ابو عصیدہ بن الواثق ۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۹ء

۷۔ ابو یحییٰ ابو بکر الشہید ۱۳۰۹ء

۸۔ ابو البقاء ۱۳۰۹ء تا [illegible]ء

۹۔ ابن اللحیانی ۱۳۱۱ء تا ۱۳۱۷ء

۱۰۔ ابو ضربہ بن اللحیانی ۱۳۱۷ء تا ۱۳۱۸ء

۱۱۔ ابو یحییٰ ابو بکر ۱۳۱۸ء تا ۱۳۴۶ء

۱۲۔ ابو العباس احمد ۱۳۴۶ء [illegible]

۱۳۔ ابو الفضل بن ابو یحییٰ ابو بکر [illegible]

۱۴۔ ابو اسحاق بن ابو یحییٰ ابو بکر [illegible]

۱۵۔ ابو البقاء خالد ۱۳۶۹ء تا ۱۳۷۰ء

۱۶۔ ابو العباس ۱۳۷۰ء تا ۱۳۹۴ء

۱۷۔ ابو فارس بن ابو العباس ۱۳۹۴ء تا ۱۴۳۴ء

۱۸۔ المستنصر ابو فارس کا پوتا ۱۴۳۴ء تا ۱۴۳۵ء

۱۹۔ عثمان المستنصر کا بھائی ۱۴۳۵ء تا ۱۴۸۸ء

۲۰۔ ابو زکریا یحییٰ عثمان کا پوتا ۱۴۸۸ء تا ۱۴۸۹ء

۲۱۔ عبدالمؤمن بن ابراہیم ۱۴۸۹ء تا ۱۴۹۰ء

۲۲۔ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ ۱۴۹۰ء تا ۱۴۹۴ء

۲۳۔ ابو یحییٰ سابق حکمران کا بھائی، ۱۴۹۴ء تا ۱۵۲۶ء

۲۴۔ الحسن بن ابو یحییٰ ۱۵۲۶ء تا ۱۵۴۳ء

۲۵۔ احمد بن الحسن ۱۵۴۳ء تا ۱۵۶۹ء

۱۵۶۹ء میں الجزائر کے پاشا نے تونس پر قبضہ کر لیا اور احمد اپنے بھائی

کے ہاں حلق الوادی چلا گیا۔ ۱۵۷۴ء میں تونس مملکت عثمانیہ کے ماتحت صوبے کا صدر مقام بن کر رہ گیا۔ (شریف جاوید)

حفصہؓ

اُم المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمر بن الخطاب۔ آنحضرت صلعم کی چوتھی زوجۂ مطہرہ جو حضرت عائشہؓ کے بعد آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ آپ ہجرت نبوی سے اٹھارہ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ ہجرت سے قبل آپ حضرت خنیس بن حذافہ کے نکاح میں تھیں دونوں میاں بیوی ایک ساتھ اسلام لائے اور مدینہ کو ہجرت کی۔ آپ کے شوہر حضرت خنیس غزوۂ بدر میں زخمی ہوئے انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اکثر روایتوں میں ہے کہ آپ کے شوہر غزوۂ بدر میں زخمی ہو کر فوت ہوئے۔ مگر حافظ ذہبی ابن حجر اور ابن البر کا قول ہے کہ آپ کے شوہر ۳ ہجری میں غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے اور اسی سال آپ رسولؐ اللہ کے نکاح میں آئیں۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہؓ کو ایک طلاق دی اور پھر رجوع فرما لیا تھا۔

حضرت حفصہؓ رسول کریم صلعم کے وصال کے بعد مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہیں حافظ ابن اثیر کے قول کے مطابق حضرت حفصہؓ کا انتقال جمادی الاوّل ۴۱ھ میں ہوا۔ نماز جنازہ مروان بن حکم والیٔ مدینہ نے پڑھائی۔ ابن حجر اور ابن سعد کی روایت کے مطابق مروان نے بنو حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک ان کے جنازے کو کندھا دیا اور وہاں سے جنت البقیع تک حضرت ابو ہریرہؓ نے کندھا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عاصم بن عمرؓ نے انہیں قبر میں اتارا۔ مسلم اور بخاری نے ان سے دس احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت حفصہؓ اکثر روزہ سے رہتی تھیں اور نماز و یادِ خدا میں مشغول رہتی تھیں۔ (ش ج)

حفظ الرحمٰن سیوہاروی

(۱۹۰۰ء – ۲ اگست ۱۹۶۲ء) برصغیر کے مشہور عالم دین۔ سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولوی شمس الدین صدیقی اپنے قصبے کے معززین اور عمائدین سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے مدرسہ فیض عام میں حاصل کی اس کے بعد مشہور علمی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں آپ کو علامہ انور شاہ محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور میاں اصغر حسین صاحب جیسے نادرِ روزگار اساتذہ سے استفادہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مدراس سے ایک فرمائش پر علامہ انور کشمیری نے آپ کو وہاں بھیج دیا۔ چرامبیٹ میں کم و بیش سال بھر تدریس و تبلیغ میں مصروف رہے۔ یہیں آپ نے دو مختصر رسالے "حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان" اور "مالا بار میں اسلام" تحریر کیے۔ ۱۹۲۴ء میں حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر کلکتہ تشریف لے گئے۔ انجمن کے سرپرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے یہاں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ مل کر درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا آزاد کی رفاقت نے آپ کے سیاسی ذوق و لگن کو دو آتشہ کر دیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمان صاحب کی ابتدا ہی سے خواہش تھی کہ ایک ایسے تالیفی و تصنیفی ادارے کی بنیاد رکھی جائے جس میں کتاب و سنت، فقہ و تاریخ اسلامی کی مستند اور معیاری کتب شائع کی جائیں۔ کلکتہ میں رہائش کے دوران مفتی صاحب کو خاصی رقم مہیا ہو گئی چنانچہ دونوں حضرات دہلی آ گئے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی کو شریک مجلس ادارت کر کے ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی۔ مولانا کی مشہور کتابیں قصص القرآن (چار جلد) اخلاق اور فلسفۂ اخلاق اور اسلام کا اقتصادی نظام اسی ادارہ سے شائع ہوئیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیت علمائے ہند کے رکن اور آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ نے تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور کئی بار گرفتار ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ انڈیا کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے۔ آپ کا شمار سیکولرزم کے صف اول کے حامیوں میں ہوتا تھا۔ سیکولرزم کو بھارت کے دستور کی بنیاد قرار دیئے جانے میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ آپ کانگرسی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو اور کورٹ کے رکن تھے۔ آپ کی ذات مسلم یونیورسٹی اور اس کے وقار کو باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔

آپ کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ آپ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی۔ پرجوش خطیب بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی ماہر و تجربہ کار معلم مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف بھی تھے "بلاغ المبین" آپ کی اہم تصنیف ہے۔ اس کے تین حصے ہیں پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں تبلیغ اسلام کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں تیسرے حصے میں تبلیغ کے اثرات و نتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ آپ کا انتقال کینسر کے موذی مرض کے باعث ہوا۔ جنازے میں دو لاکھ افراد نے شرکت کی۔ نماز جنازہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی۔

حفیظ

(۱۸۸۰ء / ۴ اپریل ۱۹۳۷ء) عبدالحفیظ بن سلطان مولائی حسن۔ مراکش کا علوی سلطان۔ ۱۶ اگست ۱۹۰۷ء کو مراکش میں اور جنوری ۱۹۰۸ء میں فاس میں اس کے سلطان ہونے کا اعلان کیا گیا۔ مولائی حفیظ فقیہ اور عالم دین تھا۔ اس کے عہد حکومت میں فرانس اور جرمنی کے مابین ۱۹۰۹ء کا وہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے مراکش کے معاملات میں فرانس کے "خاص حقوق" تسلیم کر لیے گئے۔ ۴ مارچ ۱۹۱۰ء کو فرانسیسی مراکشی عہد نامے پر دستخط ہو گئے۔ اس مدبرانہ عمل سے دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت پیدا ہو گئی۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں ملّہ کی شورش فرو کرنے کے نتیجے میں مراکش اور اندلس کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء کے آغاز میں مراکش میں بعض شورشیں رونما ہوئیں۔ جنہیں مولائی حفیظ نے فرانسیسی فوج کی مدد سے فرو کیا۔ ہسپانیہ نے فرانسیسی کارروائیوں کے مقابلے میں العرائش، القصر، الکبیر اور اصیلیہ پر قبضہ کر لیا۔ اس مداخلت سے جرمنی افروختہ ہو گیا۔ لیکن جلد ہی نومبر ۱۹۱۱ء میں فرانس اور جرمنی نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ جس کی رو سے فرانس کو مراکش میں مداخلت کی کھلی آزادی مل گئی اور جرمنی کو استوائی افریقہ کے وسیع و عریض علاقے مل گئے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۲ء کے معاہدے کے تحت مراکش اور فرانس کا زیر حمایت ملک بن گیا۔ اپریل میں فاس میں زبردست ہنگامے ہوئے۔ جس کے نتیجے میں سلطان حفیظ نے ۱۲ جولائی ۱۹۱۲ء کو اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سلطان فرانس اور وہاں سے طنجہ آ گیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک وہ ہسپانیہ میں مقیم رہا۔ فرانس میں وفات پائی۔ اس کی لاش کو فاس میں لا کر شایان شان طریقے سے دفن کیا گیا۔ (ش ج)

حق

علم دینیات میں حق سچائی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی حق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک ہے اور ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

لفظ حق کے مختلف مفہوم ہیں۔

۱۔ وہ چیز جس کا واقع ہونا قطعی ہو قیامت کو اسی لحاظ سے حق کہا گیا ہے۔

۲۔ وہ چیز جو اخلاقی حیثیت سے واجب ہو عدل اسی لئے حق ہے۔

۳۔ وہ چیز جو جھگڑے اور اختلاف کے درمیان قول فیصل ہو جیسے قرآن مجید کو حق کہا گیا۔

۴۔ وہ چیز جو کوئی مقصد اور غایت رکھتی ہو۔ اس اعتبار سے قرآن مجید میں آسمان و زمین کی تخلیق کو "بالحق" کہا گیا۔

۵۔ جو چیز اپنے ظہور کے لحاظ سے بالکل واضح اور بین ہو اُسے بھی قرآن مجید میں حق کہا گیا ہے۔ (دیکھئے سورہ البقرہ کی آیت ۱۴۷)

حقوق العباد

انسانوں کے حقوق انسانوں پر۔ اسلامی تعلیمات میں حقوق العباد پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ میدان حشر میں بھی حقوق العباد کے متعلق بھی زیادہ پوچھ گچھ کی جائے گی اور اس بارے میں ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی بھی قابل گرفت ٹھہرے گی۔ ہر انسان اپنے عزیز و اقارب، مساکین و یتامیٰ مہمان و مسافر اور ملک و ملّت کے متعلق اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ماں باپ سے، محلہ داروں سے، ہمسایوں سے، ہموطنوں سے اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتا ہے۔ اُن کا ہر آن خیال رکھتا ہے۔ حقوق العباد میں آداب مجلس، گفتگو کے آداب اور آداب ملاقات بھی شامل ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔"

(سورۃ حجرات ۔ آیت ۱۰)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک عالمگیر برادری بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان بے انتہا اخوت اور روا داری پیدا کر دی ہے جو دوسری قوموں میں نہیں پائی جاتی۔ اس آیت میں دیئے گئے حکم کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت جریرؓ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا۔ تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر۔" (بخاری)

ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان و مال اور عزت حرام ہے۔"

قرآن میں آیا ہے: "آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بڑی بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔"

(حجرات: ۱۱)

پھبتیاں کسنا، الزام لگانا، اعتراض کرنا، عیب جوئی کرنا اور کھلم کھلا زیر لب یا اشاروں کے ذریعے کسی کو نشانہ ملامت بنانا طعن و تشنیع کے زمرے میں آتا ہے۔ چونکہ ان افعال سے آپس کے تعلقات بگڑتے ہیں اور معاشرے میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان سب افعال سے منع فرما دیا ہے۔

نعمانؓ بن بشیر کہتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے ایک عطیہ دیا۔ میری والدہ عمرہؓ بنت رواحہ نے کہا "جب تک آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنالیں گے میں راضی نہ ہوں گی۔ چنانچہ نعمان بن بشیر کے والد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے عرض کی کہ: یارسول اللہؐ میں نے اپنے بیٹے کو جو عمرہ کے بطن سے ہے ایک عطیہ دیا ہے۔ عمرہ نے مجھے تاکید کی ہے کہ (اس پر) آپ کو گواہ بنالوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "کیا تم نے باقی بچوں کو بھی اسی طرح عطیہ دیا ہے؟" نعمان کے والد نے کہا نہیں۔ حضورؐ نے جواب دیا۔ "اللہ سے ڈرو اور اولاد کے درمیان انصاف کرو۔" نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ ان کے والد فوراً گھر آئے اور اپنا عطیہ مجھ سے واپس لے لیا۔"

اس حدیث سے علم ہوتا ہے کہ اولاد کا والدین پر یہ حق ہے کہ لین دین میں اولاد کے درمیان انصاف ہو۔ لیکن ساتھ ہی اولاد پر بھی والدین کے کچھ حقوق ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ "اللہ تعالیٰ جس گناہ کو چاہتا ہے (سزا کے واسطے) قیامت تک کے لیے مؤخر کر دیتا ہے۔ ہاں تین قسم کے گناہ ایسے ہیں جن کی سزا انسان کو موت سے قبل ہی بھگتنی پڑتی ہے۔ (۱) بغاوت، سرکشی۔ (۲) والدین کی نافرمانی۔ (۳) قطع رحم۔

کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔ پڑوسی کے ساتھ ۔۔۔ رکھنا۔ مہمان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ یتامیٰ کی امداد کرنا ۔۔۔ حسن سلوک سے پیش آنا۔ محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرنا ۔۔۔ لڑانے سے باز رہنا۔ عام لوگوں پر رحم کرنا سب حقوق العباد ۔۔۔ جسے پورا کرنے والا خدا کا نیک بندہ کہلاتا ہے۔

قرآن مجید میں حقوق العباد کی تاکید و تفصیل کے لئے سورۃ ۔۔۔

حقوق اللہ

ارکان اسلام کی پابندی کرنا۔ کسی شخص کا خدا سے ڈرتے ہوئے ۔۔۔ اس کی عطا کی ہوئی جسمانی و نفسانی قوتوں سے۔ ۔۔۔ زمین، رزق اور ذرائع سے فائدہ اٹھانا خود بخود ختم ۔۔۔ کر دیتا ہے۔ حقوق اللہ کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسے معبود مانیں۔ اسی کے آگے اعتراف بندگی میں سر جھکائیں۔ اپنی حاجتوں میں اسی کی طرف رجوع کریں، اسی کو مدد کے لیے پکاریں۔ اسی پر توکل کریں۔ اسی سے امیدیں وابستہ کریں اور اسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیت کے لیے حلال و حرام کی حدود مقرر کرے۔ ان کے حقوق و فرائض معین کرے۔ ان کو امر و نہی کے احکام دے اور انہیں یہ بتلائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع و وسائل کو وہ کس طرح کن کاموں میں کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں، اس کے حکم کو منبع قانون

مانیں اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اسی کی طرف رجوع کریں۔

قرآن مجید کی سورہ آل عمران کی ۹۷ ویں آیت میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

"لوگوں پہ اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر (خانہ کعبہ) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔" اسی طرح سورہ المدثر کی ۵۶ ویں آیت میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے: "وہ (اللہ) اس کا حق دار ہے کہ اس سے تقوی کیا جائے۔" اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا ذکر و اظہار کیا جائے (سورہ الضحیٰ: ۱۱)۔ لوگوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل یکسو ہو کر دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کریں۔ (البیّنۃ: ۵) حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے پانچوں نمازوں کے پڑھنے، رمضان کے روزے رکھنے، زکوٰۃ دینے، صاحب امر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا ایسا آدمی جنت میں داخل ہو گا۔ (شریف جاوید)

حقیقت

وہ چیز جس کی حمایت لوگوں پر واجب ہو، سچائی۔ حقیقت سے استعارہ کے طور پر سچائی بھی مراد لی جاتی ہے۔ جس کا مترادف مجاز ہے۔ اہل شریعت نے اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ حقیقت فی المفرد۔ جسے ہم حقیقتِ لغوی کہہ سکتے ہیں اور دوسری حقیقت فی الجملہ ہے' جسے عام طور پر عقلی حقیقت کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ حقیقت سے اللہ کی صفات مراد لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک حقیقت سے مراد توحید ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ حقیقت و شریعت دونوں لازم و ملزوم ہیں حقیقت کے بغیر شریعت کا وجود نہیں ہے کیونکہ شریعت بذات خود حقیقت ہے۔ ایک سے ظاہری حال کی سمت مراد لی جاتی ہے اور دوسری سے باطنی حالت کی درستی! اس مسئلے پر علماء دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ شریعت خود حقیقت ہے اور حقیقت شریعت جبکہ دوسرا گروہ ان دونوں کو لازم و ملزوم نہیں گردانتا۔

حقیقت سے مراد وہ معنی ہیں جن میں نسخ جائز نہیں اور عہدِ عالم سے لے کر عالم کے فنا ہونے تک اس کا حکم ایک ہی ہے۔ جبکہ شریعت سے مراد وہ معنی ہیں جس میں تغیر و تبدل جائز ہے جیسا کہ امرِ الٰہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت تو خالصتاً بندے کا کام ہے اور حقیقت خداوند تعالٰے کی نگہبانی اور اس کی حفاظت اور عصمت کا نام ہے اس لئے شریعت صرف حقیقت کے وجود ہی سے قائم ہو سکتی ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ حقیقت سے اللہ تعالٰی کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔

صوفیاء نے حقیقت اللہ اور حق اللہ میں بھی امتیاز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت سے صفاتِ الٰہیہ کا اظہار ہوتا ہے اور حق سے صرف اس کی ذات کا۔ حقیقت تقریباً تمام صوفیانہ طریقوں کی آخری منزل مانی جاتی ہے۔ خدا کو بھی حقیقت الحقائق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں اور وہ تمام حقائق پر حاوی ہے دوسرے لفظوں میں وہ حضرۃ الوجود ہے۔

حکم

منصف، قاضی، ثالث جو تنازعہ کا فیصلہ کرتا ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عرب میں باقاعدہ قاضی یا منصف کوئی نہیں ہوتا تھا بلکہ لوگ باہمی افہام و تفہیم ہی سے اپنے تنازعات کا حل نکال کیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات کسی تنازعے کے حل کے لئے دونوں فریق اپنی رضامندی سے کسی بھی شخص کو حکم بنا لیتے تھے۔ فیصلہ کرنے والا آزادانہ طور پر مناسب فیصلہ دیتا تھا لیکن اس کے فیصلے پر عمل کرانے کے لئے فریقین کی اخلاقی قوت کے علاوہ اور کوئی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ عوام انصاف کی حد تک اس طرح کی ثالثی نے باقاعدہ ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ عرب میں میلوں وغیرہ کے موقع پر ایک حکم نامزد کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسی حکم سے لوگ اپنے جھگڑوں کے فیصلے کرانے لگے اس طرح عربوں میں اس کا رواج ہوا۔

اسلام کے ظہور کے بعد بھی عرب معاشرے میں یہ رسم باقی رہی۔ کیونکہ قرآن مجید نے اصولی طور پر تحکیم کو موجود رکھا۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ

"ایک حکم مرد کے خاندان میں سے اور ایک حکم عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔" (۴ (النساء) ۳۵)

ایک مشہور تحکیم سے اس کی مثال بھی لی جاتی ہے جس کے ذریعے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ آپس میں کسی بات پر راضی ہو گئے تھے! اسلام میں تحکیم کی ابتدا اگرچہ فریقین کی مرضی سے ہوتی ہے جو بعد میں ایک عدالتی کارروائی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تحکیم صرف شخصی حقوق کے متعلق تنازعات میں جائز ہے۔ بعض ایسے تنازعات جو جرائم کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں جیسے زنا، قتل، اتہام وغیرہ کے متعلق حکم بنانا جائز نہیں۔

ایک یا ایک سے زائد حکم بھی بنائے جا سکتے ہیں اس صورت میں صرف متفقہ فیصلہ ہی قابل قبول ہوتا ہے۔ حکم کے فیصلے کو تقریباً تمام فرقے تسلیم کرتے ہیں صرف شافعی فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اسے مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتے! اسلام میں حکم کے فیصلے کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اس فیصلے کی کسی قاضی یا عدالت سے توثیق کرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حکم کا فیصلہ کسی عدالت کے فیصلے کی طرح قوت اور اختیار نہیں رکھتا

حکم اوّل

بن ہشام قرطبہ کا تیسرا اموی امیر۔ ۳ صفر ۱۸۰ھ/ ۱۷ اپریل ۷۹۶ء کو اس کی بیعت کی گئی۔ اس وقت الحکم کی عمر چھبیس برس تھی۔ اس کے چچا سلیمان اور عبداللہ اس کے خلاف ہو گئے۔ لیکن ان دونوں کی پیدا کردہ کوئی شورش کامیاب نہ ہو سکی سلیمان کو قتل کر دیا گیا اور عبداللہ کو معافی دے دی گئی! الحکم کا پورا عہدِ حکومت بغاوتوں کو فرد کرنے میں گزرا جو طلیطلہ سرقسطہ اور ماردہ کی سرحدوں پر متواتر ہوتی رہیں۔ الحکم بیرونی بغاوتیں فرد کرنے میں مصروف تھا۔ ہسپانوی ثغور کے عیسائی حکمرانوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۵ھ/ ۸۰۱ء میں برشلونہ پر قبضہ کر لیا۔ الحکم نے اپنے بھائی معاویہ بن ہشام کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا جس نے وادی ارعون میں شکست کھائی۔ ۱۹۲ھ/ ۸۰۸ء میں الحکم نے اپنے بیٹے ہشام کی قیادت میں لشکر بھیجا جس نے جلیقیہ میں فتح حاصل کی۔

الحکم اوّل کا عہد حکومت مسلسل لڑائیوں اور بغاوتوں کے باوجود اندلس کی ترقی کا دور رہا۔ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن الثانی کے جانشین قرار دیئے جانے کے دو ہی ہفتوں کے اندر ۲۵ ذوالحجہ ۲۰۶ھ/ ۲۱ مئی ۸۲۲ء کو الحکم نے وفات پائی۔ وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے اندلس میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج رکھی۔ اور اسے سامان حرب سے لیس کیا۔ اس نے اپنے محل کے دروازے پر ایک ہزار گھوڑ سوار رکھے ہوئے تھے جو ہر وقت لڑائی کے لئے تیار رہتے تھے۔ الحکم اندلس کا بڑا صاحب عزیمت و بصیرت پر شکوہ اور مدبر فرمانروا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ فصیح و بلیغ شاعر بھی تھا۔ (ش۔ ج)

حکم بن عمرو غفاری

حضورؐ کے مشہور صحابیوں میں سے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ بصرہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ جنگِ صفین میں حضرت علیؓ نے اپنے لشکر میں شامل ہونے کی دعوت دی جسے حکم بن عمرو غفاری نے رد کر دیا۔ ۴۷ھ میں آپ نے امیر معاویہؓ کے عہد میں غور میں ہونے والی بغاوت کچلنے کے لئے کام کیا۔ آپ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ آناً فاناً علاقہ غور کے چپہ چپہ میں امن قائم کر دیا۔ بعد میں حضرت امیر معاویہؓ نے آپ کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ آپ کئی سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۵۰ھ میں خراسان ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔

حکمت

اس کلام کو کہتے ہیں جو جہالت سے روکے اور انسان کو اس سے بچنے میں مدد دے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے مثلاً (البقرہ : ۱۲۹) (آل عمران : ۸۱) (نساء ۵۴) قرآن میں آیا ہے حضرت داؤد علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکمت عطا کی گئی۔ اس کا ذکر ان سورتوں میں آیا ہے۔ البقرہ آیت ۲۵۱، المائدہ آیت ۱۱۰، الزخرف آیت ۶۳ اور لقمان ۱۲۔

حکمت دراصل ایک عظیم اثاثہ ہے جس کا تصور تقویٰ سے وابستہ ہے۔ حکمت کی تشریح میں کئی مفہوم ملتے ہیں۔ سورۂ لقمان کی آیت ۱۲ میں ہے :

"ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے لئے ہی مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے۔"

اس آیت میں حکمت کے معنی علم و عقل کے ذریعے سچی بات معلوم کرنے کے ہیں حکمت الٰہی کا مطلب اشیاء کی معرفت اور ماہیت کا علم ہوتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد قرآن کی تفسیر یا قرآن کی حقیقتوں کا سمجھنا ہے۔ ایک حدیث میں بھی حکمت کا لفظ آیا ہے اس میں اس لفظ کے معنی تقریباً یہی ہیں۔

بعض علماء نے حکمت اور علم میں فرق کو واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حکمت علم کی ایک شاخ ہے اور حکمت اور علم میں ماہیت کا نہیں بلکہ غایت و نوعیت کا فرق نظر آتا ہے۔ الجرجانی کہتے ہیں کہ لفظ حکمت سے حقیقت مراد لی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے۔ ہدایت الحکمت میں حکمت کی تعریف یوں کی گئی ہے :

"ان اعمال و افعال کا علم جو ہماری قدرت و اختیار میں ہیں حکمت عملی کہلاتا ہے۔"

حکمت کی اس تعریف پر عام علماء متفق نہیں ہیں۔ ابن سینا نے حکمت کی تعریف یوں کی ہے :

"علم اور عمل کی حدود کے اندر رہ کر روح کے ادراک کمال کا نام حکمت ہے۔"

اس تعریف میں ایک جانب تو عدل کی صفت کا کمال اور دوسری جانب نفس عاقلہ کی تکمیل کو شامل کیا گیا ہے۔

حکمت الاشراق

اس مسلک فکر کا بانی شہاب الدین یحییٰ بن امیرک السہروردی تھا جو ۱۱۵۰ء اور ۱۱۵۵ء کے درمیان زنجان کے قریب ایک گاؤں سہرورد میں پیدا ہوا۔ اس نے زندگی بھر میں پچاس کتابیں لکھیں۔ جن میں الحلاج، الغزالی اور ابن سینا شامل ہیں۔ قدیم حکماء میں فیثا غورث، افلاطون اور ہرمز کے افکار سے استفادہ کیا۔ شیخ الاشراق کا دعویٰ ہے کہ وہ الحکمت اللدنیہ اور الحکمت العتیقہ کو باہم جمع کر رہا ہے۔ الجرجانی نے اشراقیوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ حکما ہیں جن کا معلم اوّل افلاطون تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سہروردی سے پہلے بھی حکمائے اسلام نے اشراق کے اساس حکمت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ ابن سینا اشراق اور تصوف میں فرق کرتا ہے کیونکہ تصوف محض طلب، ذوق اور وجد ہے جبکہ اشراق میں ذوق و عقل دونوں شامل ہیں۔ لیکن سہروردی کے نزدیک معرفت حقیقتِ ذوق پر منحصر ہے نہ کہ بحث پر۔ یہ وہی خیال ہے جس میں اللہ تعالےٰ پر گہرے اعتقاد (تالّہ) کو حکمت کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔

حکمت الاشراق کا اساسی خیال یہ ہے کہ خدا کا نور سرچشمہ اور کائنات کا منبع ہے۔ سہروردی کے نزدیک اشراق حقیقت عالیہ تک پہنچنے کی ایک سبیل ہے اور یہ فیض اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک سالک قلب حکمت کے ذوق سے [illegible] نہ ہو جائے۔ دوسرے عارف و مفکر حقیقت کو جمال یا ارادہ میں دیکھتے ہیں لیکن سہروردی حقیقت میں نور کا مشاہدہ کرتا ہے۔ سہروردی کے نزدیک [illegible] وہ ہے جسے مشاہدہ امور علویہ حاصل ہو۔ اور ان کا ذوق بھی ہو اور [illegible] رکھتا ہو۔ حکمت کی ابتدا دنیا سے کامل انقطاع اور مشاہدہ انوار الٰہیہ [illegible] نے قدیم و جدید حکمت و فلسفہ و تصوف کے مابین [illegible] پیدا کیا [illegible] اسے الحکیم المتالہ کہا جاتا ہے۔ اور وہ بقائے روح کے مسئلے پر [illegible] رائے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک روح ایک جوہر نورانی ہے۔ [illegible] کے نظریئے میں بھی وہ مشائین سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک [illegible] اشراق کے نتیجے میں ہے اور ایک [illegible] روح و حس [illegible] عبارت ہے۔ نور سے شے کے انعکاس کے کئی درجے [illegible] کی ذات ہے جسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اس حکمت کے معتقد علماء و حکماء خصوصاً [illegible] خاصی تعداد میں ہیں۔ ایران میں اس مکتب کو خاص مقبولیت [illegible] برصغیر پاک و ہند میں متعدد کتابوں کے ذریعے یہ مسلک [illegible]

حکم ثانی

المستنصر باللہ بن عبد الرحمٰن ثالث اندلس کا اموی خلیفہ [illegible] کی عمر میں رمضان المبارک ۳۵۰ھ / اکتوبر ۹۶۱ء میں خلافت [illegible] حکمران خاندان میں سے الحکم ثانی کا عہد حکومت بہت [illegible] میں قرطبہ ایک علمی مرکز کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ [illegible] پرامن تھا۔ صرف ایک خطرے نے امن میں خلل [illegible] حملہ تھا جسے ۳۶۰ھ / ۹۷۱ء میں بحرین کے میدان میں شکست ہوئی۔ [illegible] کی عظیم الشان مسجد کی توسیع و تزئین بڑے انہماک [illegible] نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ ۳ صفر ۳۶۶ھ / یکم اکتوبر ۹۷۶ء [illegible] کا انتقال ہوا۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے علماء، ادبا اور ماہرین علوم کی صحبت کا متلاشی رہتا تھا۔ اس نے کتابیں لکھنے کے لئے بڑے بڑے عطیات دیئے۔ [illegible] ملکوں سے کثیر تعداد میں کتابیں خرید کر اپنے ملک کے کتب خانوں میں جمع کیں [illegible] کئی ادبا، شعراء اور علماء کو وزارت کے منصب سے سرفراز کیا۔

حکیم بن حزام

حضرت خدیجہ بنت خویلد ام المومنین کے بھائی تھے۔ آپ کی کنیت ابو خالد تھی ولادت کعبہ میں ہوئی۔ آپ قریش کے اشراف میں سے تھے۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اسلام قبول کرنے کے تقریباً ساٹھ سال بعد آپ کا انتقال ہوا۔ آپ نے اپنی بقیہ زندگی اسلام کی تبلیغ میں صرف کی۔ روایت ہے کہ آپ اسلام لانے سے پہلے بھی بہت فیاض واقع ہوتے تھے اور تقریباً ایک سو غلام آزاد کرنے کے بعد انہیں ایک ایک اونٹ دے کر رخصت کر چکے تھے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد بھی آپ نے اسی مروّت، فیاضی اور خدا ترسی کو برقرار رکھا

حضرت ابو حازم کہتے ہیں کہ ہم نے مدینہ میں کسی آدمی کے متعلق نہیں سنا کہ اس نے اللہ کے راستے پر حکیم بن حزام سے زیادہ سواریاں دی ہوں۔ ابو حازم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ میں دو اعرابی آئے جن کا سوال یہ تھا کہ وہ کون شخص ہے جو اللہ کے راستے پر ہمیں سواریاں دے۔ کسی نے انہیں حکیم بن حزام کا پتا دیا۔ وہ دونوں اُن کے پاس چلے گئے عرض کیا کہ ہمیں اللہ کے راستے پر دو سواریاں چاہئیں آپ دونوں کو ٹھہرا کر بازار گئے۔ اور دو بہترین اونٹنیاں جو گابھن تھیں خرید کر دونوں اعرابیوں کو دیدیں۔

حکیم بن حزامؓ کے بارے میں حضرت سعید بن مسیبؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم بن حزام کو یوم حنین میں کچھ عطیہ دیا۔ آپ نے اسے کم سمجھا۔ حضورؐ نے اور زیادہ کر دیا۔ اس پر حکیم نے پوچھا کہ یا رسولؐ اللہ آپ کا کونسا عطیہ بہتر ہے۔ حضورؐ نے اس کا جواب دیا کہ پہلا۔ بعد میں کہنے لگے کہ یہ مال سبز و شیریں ہے جس نے اس کو سخاوت نفس اور اچھے کمانے کے لئے لیا اس کے لئے اس میں برکت ہے اور جس نے اپنی طمع نفس کے لئے لیا تو اس میں برکت نہ ہوگی اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔) اس دن کے بعد سے حکیم بن حزام کسی قسم کا عطیہ لینے کے لئے نہیں آئے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ کو کچھ دینے کے لئے بلایا۔ آپ ان کے پاس پہنچے مگر عطیہ لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے فرمایا کہ تم سب گواہ ہو جاؤ میں ان کے سامنے ان کا حق پیش کرتا ہوں اور یہ اس کے لینے سے انکار کرتے ہیں۔

حکیم بن حزام کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی بات پر مکمل طور پر ثابت قدم رہے اور دمِ آخر تک کسی سے کوئی عطیہ وصول نہ کیا البتہ خود نہایت فیاضی اور سخاوت سے لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے رہے۔

حکیمیہ

ایک فرقہ۔ حضرت ابی عبداللہ محمد بن علی الحکیم ترمذیؒ کے پیروکار حکیمیہ کہلاتے ہیں۔ ابی عبداللہ محمد ظاہری اور باطنی علوم میں اپنے وقت کے اماموں میں سے ایک تھے انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جنہیں حکیمیہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے افراد قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کے زیادہ تر کلام اور طریقت کی بنیاد ولایت پر ہے۔ آپ ولایت اولیا کے درجات اور ان کی ترتیب کی رعایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایک بالکل الگ نفلگ سمندر کا ناپید کنارہ ہے۔ جس میں بہت سے عجائبات پوشیدہ ہیں۔

حکیمیہ فرقہ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بہت سے اولیا ہیں جن کو اس نے اپنی مخلوق میں سے چُن رکھا ہے۔ خدا نے ان لوگوں کے ارادہ کو دنیا کے تمام تعلقات سے الگ اور نفس کے تقاضوں سے آزاد کر لیا ہے ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ درجوں پر فائز کر کے ان پر اپنے اسرار و معارف کا دروازہ کھول دیا ہے۔

حلّاج، حسین بن منصور

حسین بن منصور الحلاج شہر بیضا (فارس) ۲۴۴ھ / ۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کا ابتدائی حصّہ عراق کے شہر واسط میں گزرا۔ آپ کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اس لئے سولہ سال کی عمر میں مختلف شہروں کی سیاحت کی آپ نے بصرہ میں عمرو مکی کی صحبت سے استفادہ کیا۔ ۲۶۴ھ میں بغداد آئے اور جنید بغدادی کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہو گئے۔

آپ تین مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور ہر بار حج کی سعادت حاصل کی۔ آپ کی طبیعت میں انتہا کی بے باکی تھی جو بات ایک مرتبہ آپ کے دل میں آجاتی اُسے برملا کہنے سے نہ کتراتے تھے۔ اپنے عقیدے کے پکے اور سخت تھے۔ رواداری اور مصلحت کے بالکل قائل نہیں تھے۔ اگر آپ کے عقائد اور مذہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نظم و نثر میں مندرجہ ذیل تین چیزوں پر مشتمل عقائد کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ آدمی کی ذات میں اللہ تعالےٰ کا حلول۔

۲۔ حقیقت محمدیہ کا قدم۔

۳۔ توحید ادیان۔

آپ کے نظریۂ حلول کے بارے میں صفوان کے شخص اصطخری نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ" حسین بن منصور پیشہ کے اعتبار سے جلاہے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اطاعت میں اپنے نفس کو پختہ کرے اپنے دل کو عمل صالح کا عادی بنا لے، دنیاوی لذتوں کو چھوڑ دے، اپنی خواہشات اور شہوانیت پر غلبہ حاصل کر لے، وہ مقام مقربین تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب اس کا تزکیہ اور تنقیہ زیادہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ بشریت کی حدود پھلانگ جاتا ہے اور جب اس میں بشریت ختم ہو جاتی ہے تو وہ خدا کی روح میں تحلیل ہو جاتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ بن مریم پھر وہ خود کسی کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ دوسرے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں اور وہ جس کام کا ارادہ کر لیتا ہے وہ وہی ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی فعل اپنا نہیں رہتا بلکہ خدا کا فعل بن جاتا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ حسین بن منصور حلاج انسان میں اللہ تعالےٰ کے حلول کے قائل تھے لیکن اس عقیدہ میں تنہا نہیں تھے بلکہ شیعہ حضرات کے عقائد میں بھی ایک اہم عقیدہ ہے اس لئے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ منصور حلاج نے یہ عقیدہ یہیں سے لیا ہو۔ اپنے اشعار میں وہ کہتے ہیں کہ" ہم دو روحیں ہیں جنہوں نے ایک صورت بنا لی ہے۔ جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو میں بھی اسے دیکھتا ہوں اور جب میں اسے دیکھتا ہوں تو وہ مجھے دیکھتا ہے۔"

اسی طرح وہ اپنے ایک اور شعر میں کہتے کہ " تو میری رگ و پے میں دل و دماغ میں اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح تیری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ میرے ضمیر، دل و دماغ میں اس طرح حل ہو گیا جیسے روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے۔"

آپ" انا الحق" یعنی میں خدا ہوں کا نعرہ اکثر لگایا کرتے تھے اسی جرم کی پاداش میں ابن داؤد الاصفہانی الظاہری نے آپ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ اور ۲۹۷ھ میں آپ پہلی مرتبہ گرفتار کر لئے گئے لیکن آپ جیل سے ٹھیک ایک سال بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اہواز کے ایک مقام سوس میں چھپ کر رہنے لگے ۳۰۱ھ میں آپ کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور آٹھ سال تک مختلف قید خانوں میں اسیر رہے۔ ۳۰۹ھ میں ان کے مقدمے کا آخری فیصلہ ہوا۔ جس کی رو سے انہیں ۱۸ ذیقعدہ کو سزائے موت

دی گئی۔

اس فیصلہ میں لکھا تھا "آپ کو کوڑے مارے جائیں، پھر ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور بعد میں سر تن سے جدا کر کے اُن کے اعضاء کو آگ میں جھلسا کر دجلہ کے پانیوں میں بہا دیا جائے۔"

آپ کی ہلاکت کے بعد آپ کے عقیدے کے بارے میں مختلف لوگوں نے طرح طرح کی آراء ظاہر کیں۔ ایک فریق نے کہنا شروع کیا کہ وہ کافر تھے اور کتاب و سنت کی رو سے انہیں صحیح سزا دی گئی ہے۔ لیکن دوسرا گروہ انہیں ولی اور برگزیدہ شخصیت گردانتا ہے وہ کہتے ہیں کہ منصور حلاج اللہ تعالیٰ کے مقربوں کی فہرست میں شامل تھے۔ اُن سے جو اقوال منسوب ہیں ان کے ظاہری مفہوم و معنی سے لوگ مغالطے میں پڑ گئے۔ ورنہ ان کے اصل مطالب پر غور کرتے تو انہیں کافر نہ کہتے۔ حضرت جلال الدین رومی جو فارسی کے عظیم المرتبت شاعر تھے۔ منصور حلاج کی تعریف اعلانیہ کرتے نظر آتے ہیں اور حضرت فرید الدین عطار تو آپ سے بے حد عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور آپ نے انہیں "شہید حق" کا خطاب تک دے ڈالا تھا۔

حسین بن منصور حلاج نے تصوف، طریق تصوف اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی تشریح کرنے کے لئے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں ۴۷ کتابوں کی تفصیل دی ہے جس میں سے چند یہ ہیں: کتاب الاحرف المحدثہ والازلیۃ والاسماء الکلیۃ، کتاب الاصول والفروع، کتاب العالم والمبعوث، کتاب العدل والتوحید، کتاب علم البقا والفناء، کتاب مدح النبی والمثل الاعلیٰ۔

حلال

مُباح۔ جائز، روا یا غیر ممنوع۔ وہ کام جس کا کرنا غیر ممنوع ہو۔ اسلامی شریعت کے مطابق وہ چیز حلال ہے جس کا جائز ہونا قرآن مجید یا حدیث یا سنت سے واضح ہو جائے۔ اس کے علاوہ حلال کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ جس سے غیر کا حق منقطع ہو چکا ہو اور جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ پائی جاتی ہو۔ حدیث نبوی ہے "جس نے چالیس دن تک رزق حلال کھایا اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو منور کر دے گا اور اس سے حکمت کے سرچشمے پھوٹیں گے۔"

ہم مختلف جانوروں کو کھانے سے پہلے یہ جائزہ لیتے ہیں کہ یہ حلال ہیں یا نہیں۔ اور صرف انہی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جن کی حلت ثابت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر حلال شے کو ہم ضرور کھائیں یا استعمال کریں۔ یہ انسانوں کا اپنا اختیار ہے کہ وہ حلال چیزوں میں جنہیں چاہیں استعمال کریں اور جنہیں چاہیں ترک کر دیں۔

بعض فقہا نے مشتبہ اشیاء کی طرف بھی دھیان دیا ہے۔ کچھ جانور یا چیزیں ایسی ہیں جن کی حلت آسانی سے واضح نہیں ہوتی انہیں مشتبہ کے زمرے میں رکھتے ہیں اور ان کے لئے حلال کی بجائے ایک اور لفظ "مباح" استعمال کرتے ہیں۔ مباح کا مطلب ہے جائز یا روا قرار دیا ہوا۔ مباح کے بارے میں امام شوکانی کا قول ہے کہ مباح وہ ہے جس کا کرنے والا یا نہ کرنے والا کسی مدح یا مذمت کا مستحق نہ ہو یا صاحب شریعت نے انسان کو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دے دیا ہو۔ اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اسے کرے یا نہ کرے۔

اس بات کی تصدیق امام ابوبکر الجصاص کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے کہ تمام پاکیزہ اور مزیدار چیزیں مباح ہیں تاوقتیکہ حرام یا ممنوع ہونے کے بارے میں ثبوت نہ مل جائے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حلال ہیں وہ چیزیں جن کے حلال ہونے کے بارے میں کتاب و سنت سے قطعی طور پر یا اجماع اُمت سے ثبوت مل جائیں لیکن جس چیز کا حلال ہونا یا نہ ہونا اجماع امت یا قرآن و سنت سے واضح نہ ہو وہ مشتبہ میں شامل ہوگی۔ حدیث نبوی ہے "حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کر دیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جس کے بارے میں اللہ نے اپنی کتاب میں سکوت اختیار کیا وہ تمہارے لئے معاف [illegible] ہے۔"

حلالہ

کسی چیز کو شرعاً جائز بنا لینا۔ عرب میں اسلام سے پہلے یہ دستور تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس کے ساتھ دوبارہ شادی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے طلاق حاصل نہ کرے۔ اسلام میں بھی اس طریقے کو کچھ رد و بدل کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔

حلالہ طلاق کی ایک قسم بھی ہے جو تین طلاقوں کے بعد واقع ہو جاتی ہے۔ اس طلاق کے بعد عورت کے ساتھ پہلے شوہر کا نکاح کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد اس سے [illegible] اگر اس سے طلاق حاصل کرے یا بیوہ ہو جائے۔

احادیث کی اکثر کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے کہ [illegible] سے کسی شخص نے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں [illegible] نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور دوسرے شوہر کے ساتھ اس کی خلوت بھی [illegible] مگر مباشرت نہ ہوئی۔ پھر اس نے اُسے طلاق دے دی۔ اب کیا اس عورت کا [illegible] شوہر اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے؟ حضور نے جواب دیا [illegible] دوسرا شوہر اس سے اسی طرح لطف اندوز نہ ہو جیسا کہ [illegible] ہوا تھا۔"

بعض لوگ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینے کے بعد بہت پچھتاتے [illegible] اس سے نکاح کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ عورت [illegible] کے لئے دوسرے مرد کے ساتھ اس کا نکاح اس شرط پر [illegible] کے بعد اُسے طلاق دے دے گا۔ ایسا کرنا خلاف شریعت ہے [illegible] ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایسے لوگوں [illegible] کی حدیث مبارکہ ہے کہ:

"اللہ نے تحلیل کرنے والے اور [illegible] دونوں پر لعنت [illegible] حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں حضور نے [illegible] "کیا میں تمہیں [illegible] بتاؤں کہ کرائے کا سانڈ کیا ہوتا ہے [illegible] عرض کیا ارشاد فرمائیں۔ اس پر آپ نے کہا [illegible] تحلیل [illegible] ہے۔ خدا کی لعنت ہے تحلیل کرنے والے پر [illegible] کے لئے تحلیل کی جاتی ہے۔"

حلب

شمال مغربی شام کا ایک بڑا شہر۔ جو کسی زمانے میں [illegible] کے باعث خاصی شہرت رکھتا تھا۔ بغداد جانے والے [illegible] گزرا کرتے تھے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں بھی اس شہر کو [illegible] حیثیت حاصل تھی۔ بازنطینی عہد میں اس شہر کو کافی ترقی ملی۔ ساتویں صدی میں عربوں نے پہلی بار اس شہر پر قبضہ کیا۔ تین سو سال بعد [illegible]

نے ایک مرتبہ پھر اسے عربوں سے واپس لے لیا۔ گیارھویں صدی کے اواخر میں اس پر سلجوقیوں (ترکوں) نے قبضہ کر لیا۔ ۱۱۲۴ء میں صلیبیوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء میں اس شہر کو
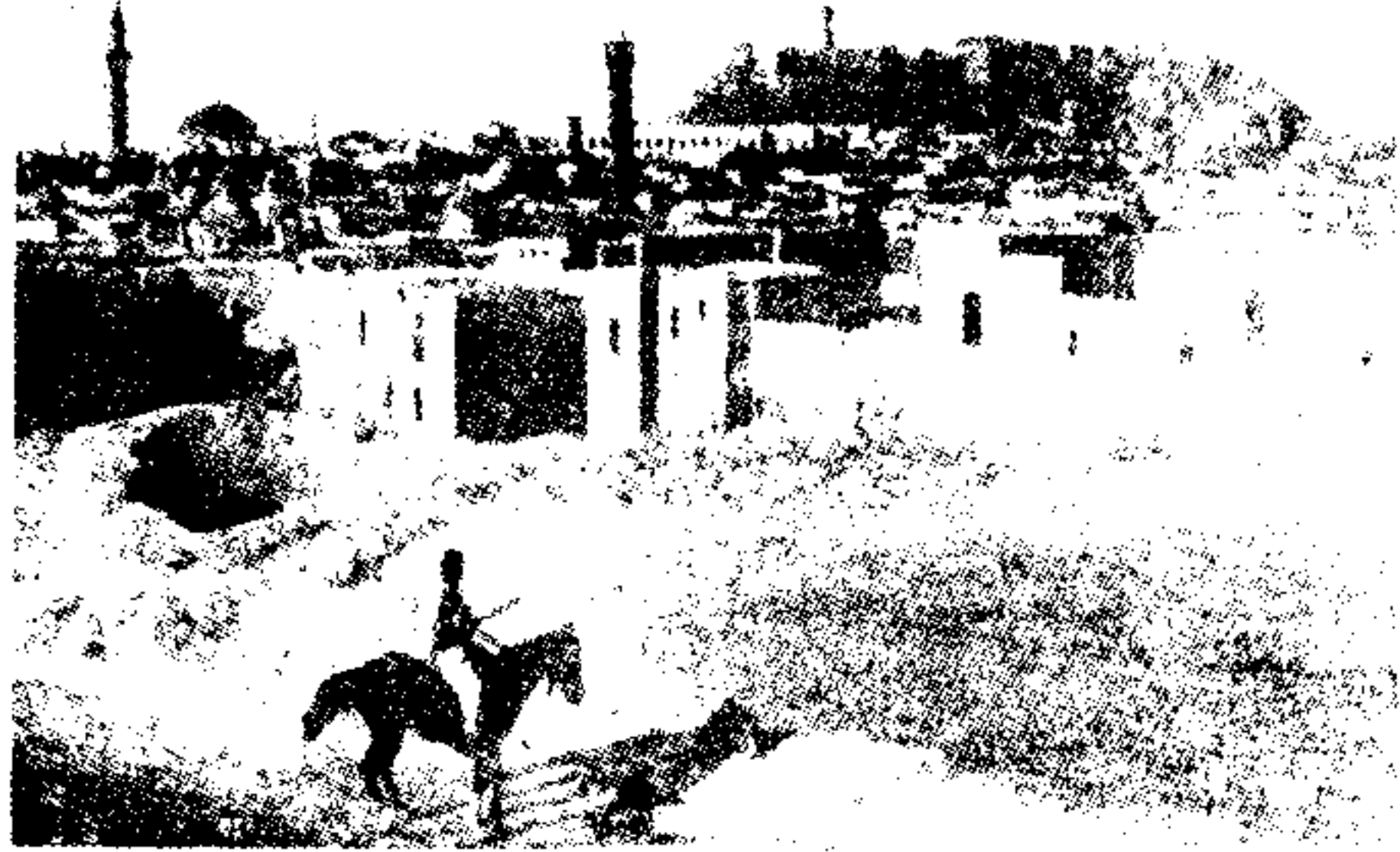
شہر حلب

فتح کیا۔ ہلاکو خان نے ۱۲۶۰ء میں حلب پر قبضہ کیا۔ ۱۴۰۱ء میں تیمور نے یہ شہر فتح کیا۔ عثمانی ترکوں نے ۱۵۱۶ء میں حلب کو اپنی حکومت میں شامل کیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ خاصی تاریخی اہمیت کا شہر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ریشمی اور سوتی کپڑا تیار کرنے کے کارخانے موجود ہیں۔ یہاں میوے اور صابون کی تجارت بھی ہوتی ہے پرانے زمانے میں اس شہر کے بنے ہوئے آبگینے اور تلواریں بہت مشہور تھیں۔

حلبی، برہان الدین

ایک مشہور حنفی مصنف۔ برہان الدین ابراہیم بن محمد بن ابراہیم، حلب میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حلب میں حاصل کی بعد میں قاہرہ چلے گئے جہاں آپ نے جلال الدین السیوطی جیسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ قاہرہ سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ یہاں آپ پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک رہائش پذیر رہے۔ پھر آپ سلطان محمد فاتح ثانی کی مسجد میں امام اور خطیب بن گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ مفتی اعظم سعدی چلپی کے قائم کردہ دارالقراۃ میں استاد بن گئے۔ آپ عربی زبان، قرآن کی تفسیر، قرآت، حدیث اور خاص طور پر علم فقہ میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی تمام تر زندگی دنیاوی ضرورتوں اور آلائشوں سے پاک رہ کر گزاری اور اپنی زندگی کو صرف مطالعے اور تعلیم و تدریس کے لئے وقف رکھا۔

آپ کا انتقال ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء میں ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک اہم تصنیف "ملتقی الابحر" ہے۔ یہ کتاب آپ نے فقہ حنفی کے بارے میں لکھی ہے اس کی چار جلدیں ہیں۔

یہ کتاب آپ نے ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں مکمل کی۔ کئی علماء نے اس کتاب کی شرحیں لکھی ہیں۔ ترکی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سلطنت عثمانیہ میں اس کتاب کو حنفی مسلک کی مستند کتاب کا درجہ حاصل تھا۔

حلبی، نورالدین

نورالدین حلبی بن برہان الدین حلبی ایک مصنف تھے۔ ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ صلاحیہ میں پروفیسر رہے۔ آپ کا انتقال یہیں ۳۰ شعبان المعظم ۱۰۴۴ھ/۱۷ فروری ۱۶۳۴ء کو ہوا۔

ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت پاک ہے اس کا نام 'انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون' ہے سیرتہ الحلبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے اس میں شمس الدین صالحی کی کتاب السیرۃ الشامیہ کی تلخیص کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے بھی کئے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی اور بھی کتابیں ہیں جن میں عقد المرجان فیما یتعلق بالجان اور النصیحۃ العلویۃ شامل ہیں۔

حلف الفضول

قبل از اسلام مکہ میں ہونے والے دو معاہدے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اپنے شہر میں کسی پر ظلم نہ ہونے دیں گے۔ چاہے وہ مکے کا شہری ہو یا اجنبی۔ پہلا معاہدہ قبیلہ جرہم کے تین سرداروں کے درمیان ہوا۔ جن میں سے ایک الفضل بن وداعہ تھا یہ حلف لگ بھگ چار ہزار برس پہلے ہوا تھا۔

دوسرا معاہدہ سن ہجری سے پینتیس برس قبل ۵۸۹ء کا ہے۔ اس میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو زہرہ، بنو تیم اور بنو حارث بن فہر شامل تھے۔ بنو ہاشم میں سے زبیر بن عبدالمطلب کے علاوہ آنحضرتؐ بھی پوری گرمجوشی سے اس معاہدے میں شریک ہوئے۔ اس معاہدے کا ماحصل یہ تھا:

۱۔ خدا کی قسم شہر مکہ میں کسی پر ظلم ہوا تو ہم سب ظالم کے خلاف مظلوم کی تائید میں ایک ہاتھ بن کر اٹھیں گے چاہے وہ شریف ہو یا وضیع، ہم میں سے ہو یا اجنبیوں میں سے تا آنکہ مظلوم کو اس کا حق نہ مل جائے۔

۲۔ ہم حلف کی خلاف ورزی نہ کریں گے جب تک سمندر اسفنج کو بھگوتا رہے اور جب تک حرا اور ثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ قائم رہیں اور

۳۔ روزمرہ زندگی میں سب باہم مالی اعانت کریں گے۔

اس پر سب ماخذ کا اتفاق ہے کہ بعثت کے بعد آنحضرت نے فرمایا کہ اسلام اس حلف کو منسوخ تو کجا مضبوط تر ہی کرتا ہے اور یہ کہ خود آپ اس کی دہائی پر اب بھی مدد کریں گے۔

حلم

اسلامی اخلاقیات کی رو سے ایک صفت حسنہ، قرآن مجید اور احادیث کی رو سے صفت رحمانی رسول پاک صلعم کا اسوۂ حسنہ، ایک عقلی رویہ اور ایک عملی تدبیر۔ "لسان العرب" میں حلم کے معنی عقلی توازن اور حلیم کے معنی صابر بتائے گئے ہیں۔ "عام طور پر حلم سے مراد نفس کی ایسی حالت ہے جو اس کے سکون کو قائم رکھتی ہے اور اسے غصے میں آسانی سے آپے سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ قرآن حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک صفت حلم بھی بتائی ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نہ صرف خود حلیم تھے بلکہ حلم کو خلق عظیم سمجھتے تھے۔ روایت ہے کہ کسی شخص نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو (البخاری) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا اصل میں زبردست اور طاقتور شخص وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو گرا دے۔ بلکہ غصے پر قابو پانے والا انسان طاقتور ہوتا ہے (البخاری)۔ احادیث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جس طرح علم کیلئے

حلم ضروری ہے اسی طرح مدں کے لئے بھی حلم ضروری ہے ۔چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول ہے کہ قاضی میں ان پانچ صفات میں سے اگر ایک بھی کم ہو تو اس کی شخصیت داغدار ہو جاتی ہے۔ (۱) فقاہت (۲) حلم (۳) عفت (۴) محکمی کردار (۵) علم کا شغف ۔

حضور اکرم صلعم یہ دعا فرمایا کرتے تھے : " اللہ تعالےٰ مجھے اور تمہیں وہ زمانہ نہ دکھلائے جس میں لوگ عالم کی مطابعت نہ کریں اور حلیم سے حیا نہ کریں ۔ ان کے دل عجمیوں جیسے (سخت) اور ان کی زبانیں عربوں جیسی (فصیح) ہوں گی ۔

(مسند احمد بن حنبل) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے کبھی کسی شخص سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا ۔لیکن احکام الٰہی کی بے حرمتی کی گئی ۔تو آپ نے اللہ کے واسطے انتقام لیا (البخاری) ، قریش نے آپ کو گالیاں دیں ، مارنے کی دھمکی دی ۔ راستوں میں کانٹے بچھائے ۔جسم اطہر پہ نجاستیں ڈالیں ۔ گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا ۔ آپؐ کی شان میں گستاخیاں کیں ۔کبھی جادوگر ، کبھی مجنون ، کبھی شاعر کہا ۔لیکن آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی نہیں فرمائی (مسند احمد بن حنبل)

قرآن مجید نے متقی لوگوں کی ایک صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ غصہ پی جاتے ہیں غصہ پی جانے کو نیکی اور غصہ پی جانے والے کو " محسن " کہا گیا ہے ۔ یہ بھی حلم ہی کا ایک انداز ہے ۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ علم سیکھنے سے آتا ہے اور حلم مزاولت سے حاصل ہوتا ہے ۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو حلم کے باعث شب بیدار اور روزہ دار کے برابر درجہ ملتا ہے ۔امام حسنؓ کا قول ہے کہ علم حاصل کرو اور اسے وقار اور حلم سے حسین بناؤ ۔ اکثم بن صیفی کے نزدیک حلم عقل کا ستون ہے ۔ ملا دوانی کے نزدیک حلم ایک اخلاقی فضیلت ہے ۔حلم طمانیت قلب ہے کیونکہ حلم کے باعث انسان مغلوب الجذبات نہیں ہوتا ۔ ابن مسکویہ بھی حلم کو اخلاقی فضائل میں شمار کرتے ہیں ۔ ایک غیر مسلم مستشرق (T. Izutsu) نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم نے جاہلیت کی روح کے خلاف آخری حد تک جہاد کرنے ، اسے مکمل طور پر منسیت ونابود کرنے اور اسے علم کی روح سے بدلنے کی بھرپور کوشش کی ۔

حلمانیہ

صوفیوں کا ایک سلسلہ ۔ اس کے بانی ابوحلمان الفارسی الحلبی کو کلاباذی کی تصنیف " التعرف " میں صوفی شیوخ میں سے تسلیم کیا گیا ہے ۔ مگر اشاعرہ نے اسے بعض عقائد کی بنیاد پر اسلام سے خارج کر دیا ۔ ابوحلمان کے عقیدے یہ تھے :

۱۔ خدا جسمانی طور پہ خوب صورت اشخاص کے اندر موجود ہے ۔

۲۔ ہر چیز اس شخص کے لئے جائز ہے جو یہ جانتا ہے کہ اس چیز میں ذات باری تعالےٰ کی پرستش کس طرح کی جائے ۔

حلوائی ، مولانا محمد نبی

عالم دین ، صوفی اور پنجابی زبان کے ایک مفسر قرآن ۔ آپ ۱۸۰۰ء میں لاہور کے دلی دروازہ کے اندرونی محلے میں رہائش پذیر میاں محمد وارث کے ہاں پیدا ہوئے ۔ ان کا خاندان ارائیں تھا اور پیشہ کھیتی باڑی ۔موجودہ فیض باغ (نولکھا گاؤں) میں آپ کے خاندان کی زمین تھی ۔ آپ کے خاندان نے مولانا کو دس سال کی عمر میں ایک حلوائی کی شاگردی میں دے دیا ۔جس کے پاس ابتدا میں آپ صبح سے شام تک کام کیا کرتے ۔بعد میں استاد نے قرآنی تعلیمات کے حصول کے لئے آپ کو کچھ وقت صرف کرنے کی اجازت دے دی ۔

آپ نے اپنی ذہانت اور محنت سے بہت جلد قرآن پاک کے معانی ازبر کر لئے ۔مختلف اساتذہ سے علم حاصل کرنے کے بعد آپ حضرت مولانا دستگیر قصوریؒ سے بیعت ہوئے اور ان سے دینی علوم کی مزید تعلیم حاصل کی ۔ آپ نے قرآن پاک کی پنجابی میں تفسیر کی جو پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے ۔

آپ کی زندگی کا ایک پہلو دوسرے علماء سے ممتاز ہے آپ صبح صبح حلوا تیار کر کے دہلی دروازہ کے باہر آ کر بیٹھ جاتے تھے ۔ ریلوے شیڈ میں جانے والے مزدور آپ سے حلوا خریدتے اور کھاتے اور آپ حلوا فروشی کے ساتھ ساتھ دین کی باتیں بھی نہایت متانت کے ساتھ بیان کیا کرتے ۔ آپ نے پنجابی زبان میں سیرت نبویؐ لکھی جو لوگوں میں بہت مقبول ہوئی ۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں انتصار المغلوب ، رسالہ جمعہ ، رسالہ اربعہ ، اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ المحبین ، الامتیاز بین الحقیقت [illegible] المعاویہ ، انواعِ نبوی ، جامع الشواہد اور [illegible] بہت مشہور ہوئیں ۔

غلام دستگیر قصوریؒ کی وفات کے بعد پیر جماعت علی لاثانی علی پوری کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ آپ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ آپ کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا ۔ جامع مسجد کوتوالی میں دفن ہوئے ۔

حلول

ایک فلسفیانہ اصطلاح ۔ اس کے لغوی معنی ڈھیلا کرنا ، کھولنا ، نازل ہونا ہیں لیکن اسلامی علوم اور فلسفے میں اس کے معنی ذرا مختلف ہیں ۔فلسفے میں اس سے مراد روح اور بدن کا حقیقی اتحاد یعنی حلول الروح فی البدن ہے ۔ تصوف میں [illegible] کسی مخلوق میں سما جانے کو حلول کہتے ہیں ۔

مختلف علماء نے اس کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں ۔علماء کے ایک گروہ [illegible] نزدیک حلول ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے اندر [illegible] [illegible] شے کی جانب اشارہ کریں تو دوسری شے کی طرف [illegible] [illegible] ہو سکتا ہے جیسے برتنوں میں پانی [illegible] بھی ہو سکتا ہے ۔ کچھ علماء اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں [illegible] دوسری چیز میں ایسے مل جائے کہ اس کا [illegible] پہلی چیز دوسری چیز کا لازمی حصہ بن جائے ۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ خدا [illegible] بھی مخلوق میں حلول نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے [illegible] جاتی ہے ۔علماء نے حلول کی چار قسمیں بیان کی ہیں :

۱۔ حلول الوصفی ۔ جیسے کسی جسم میں سفیدی یا سیاہی کا حلول ۔

۲۔ حلول الجواری ۔یعنی ایک جسم [illegible] دوسرے کے [illegible] جیسے پیالے میں پانی کا حلول ۔

۳۔ حلول السریانی ۔ جیسے کسی [illegible] میں [illegible] کسی صورت کا حلول ۔

۴۔ حلول الحرفی ۔یعنی اجسام کا [illegible] میں حلول ۔

[illegible] نے بھی عیسائیوں کے عقیدہ حلول کی طرح یہ خیال [illegible] روح [illegible] ہر ایک خاص شکل میں کسی مادے سے متحد ہو جاتا ہے ۔

علماء اور مشائخ اسلام نے اس عقیدے کی عام طور پر نفی کی ہے ۔ لیکن بعض ایسے علماء جو ایمی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں [illegible] درست خیال کرتے ہیں حلول کے عقیدے سے اتفاق کرتے ہیں ۔ [illegible] الاشعری [illegible] کرتے ہو [illegible]

حلول کو جسم اور روح کے اتحاد کی صورت میں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کیونکہ روح ایک جسم لطیف ہے خواہ وہ جنوں، فرشتوں یا کسی بھی مخلوق میں کیوں نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی بھی مخلوق میں حلول روح کے عقیدے کو یکسر ختم کر دیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر غدا کے اصلی جوہر یعنی جوہر الٰہیہ کا تجزیہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے جبکہ خداوند کریم کی ذات کا ہم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم تجزیہ کریں تو دو ہستیوں کو ابدی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ایک خدا کی ہستی اور دوسری حلول کرنے والی۔ جس سے خدا کی وحدانیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ حلول کا عقیدہ رکھنے والوں کو مسلمان نہیں گردانا جا سکتا۔ اسی لئے علمائے اہل سنت اور اہل تشیع نے حلولیہ فرقے کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔

حلولیہ

متصوفہ سیطلہ کا ایک فرقہ۔ اس فرقہ کے لوگ عورتوں اور بغیر داڑھی کے لڑکوں کو دیکھنا جائز خیال کرتے ہیں۔ یہ سماع اور رقص کے شوقین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی صفت ہے جو ہم پر نازل ہوتی ہے۔ اسی لئے جائز اور حلال ہے۔ بعض لوگ درویشانہ لباس پہن کر آہیں بھرتے ہیں۔ شور و شغب مچاتے ہیں اور اوقات گریبان اور آستینیں تک پھاڑ دیتے ہیں۔

حلولیہ فرقہ کے لوگ ابی حلمان دمشقی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ علماء اور مشائخ اس فرقے کو دین سے خارج قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے نظریات و خیالات و اعتقادات بدعت اور کفر کے قریب تر ہیں۔ وہ حلولیہ فرقے کے لوگوں کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ روح کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں حلول کرنے کے نظریہ کو درست خیال کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا چیز ہے۔ بقول علماء اور مشائخ حلولیہ فرقے کے افراد بھی دراصل حق چھوڑ کر گمراہی کے راستوں پہ چل پڑے ہیں۔

حلّی

(رمضان ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء - محرم ۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء) علامہ جمال الدین ابو منصور حسن بن یوسف۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے شیعہ امامیہ کے معروف عالم۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سدید الدین، خالو نجم الدین جعفر محقق حلّی (مصنف شرائع، وفات ۶۷۶ھ) اور نجیب الدین یحییٰ (مصنف جامع) سے حاصل کی۔ خاندان طاؤس سے حدیث کی تعلیم پائی۔

نقد الرجال کے مصنف لکھتے ہیں کہ حلّی نے ستر سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ مؤلف "روضات الجنات" کا بیان ہے کہ حلّی نے نوّے سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ خود حلّی نے مرنے سے چھ سال قبل مہنّا ابن سنان کے نام اجازہ میں لکھی ہوئی اپنی ستر کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ مدرسی خیابانی نے "ریحانۃ الادب" میں حلّی کی ایک سو بیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے پندرہ فقہ پر اور دس اصول فقہ سے متعلق ہیں۔ "ایضاح المقاصد" کے مقدمے میں حلّی کی فلسفے، کلام اور منطق پر چالیس کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ حلّی نے اپنی کتاب "منتہی الوصول" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں اپنی فلسفیانہ تالیفات کو ختم کر دیا اور فقہ و اصول پر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

آپ نے دریائے فرات کے کنارے واقع شہر حلّہ میں وفات پائی اور نجف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔ (س۔ج)

حمات

شام کا ایک شہر، جو حمص سے ۴۵ کلومیٹر شمال میں اور حلب سے ۱۵۲ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ حمات کی تاریخ عہد عتیق سے وابستہ ہے۔ اس شہر پر حِتّیوں کا قبضہ تھا گیارھویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ یہ شہر آرامی بادشاہوں کے قبضے میں آ گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں آرامی بادشاہوں نے مجبوراً یہودیوں کی بالادستی تسلیم کر لی۔ لیکن بعد ازاں وہ خود مختار بن گئے۔ ۷۲۰ ق م میں یہاں ایک بغاوت ہوئی جس کے نتیجے میں حمات کی آرامی بادشاہت کو سلطنت آشوریہ میں شامل کر لیا گیا۔ ۶۳۷ء میں ایک معاہدے کے تحت اس شہر نے عربوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ ۱۱۱۴ء میں آخری سلجوقی فرمانروا رضوان کی وفات کے بعد دمشق کے اتابک طغتگین نے حماۃ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۱۷ء میں حمات حمص کے والی خیرخان کی ماتحتی میں آ گیا اس کے بعد مختلف فرمانروا حمات پر حکمران رہے۔ ۱۱۷۵ء میں یہ شہر سلطان صلاح الدین ایوبی کے زیر تسلط آ گیا۔ ۱۲۹۹ء میں یہ شہر شام کی مملوک نیابت کا صدر مقام قرار پایا۔ عثمانی عہدِ حکومت میں حمات طرابلس کا صدر مقام بنا۔ انیسویں صدی عیسوی میں حمات کو دمشق کی ولایت کے ماتحت کر دیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں حمات کی آبادی ساٹھ ہزار تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زائد تھی۔

حمات میں بہت سی قابلِ ذکر عمارتیں موجود ہیں۔ اہم ترین یادگار اموی جامع مسجد ہے۔ مسجد کا ایوان آج بھی اپنی اصلی صورت پر قائم ہے۔ نہر العاصی کے دائیں کنارے جامع النوری ہے جس کی بنیاد سلطان نور الدین نے رکھی تھی۔

حماد الرّاویہ

انہیں حماد الروایہ بھی کہا جاتا ہے۔ کوفہ میں ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ والد دیلمی (ایرانی) جنگی قیدی تھے۔ عربی روانی سے نہیں بول سکتے تھے۔ لیکن عرب روایات کے بارے میں ان کی یادداشت اور حافظہ بہت تیز تھا۔ آپ نے بنو امیّہ کے دور میں اسلام سے پہلے کی جانے والی شاعری کی تدوین و تجدید کی سب سے پہلی کوشش کی۔ السبعات المعلقۃ (المعلقات) کی تدوین و تجمیع کا سہرا انہی کے سر ہے۔ آپ نے خلیفہ وقت ولید ثانی کے ایک سوال کے جواب میں صرف جاہلیت کی نظمیں اور قصائد ہر ردیف تہجی کی ذیل میں کم از کم ایک سو اور دوسرے بے شمار قصائد اور نظمیں پڑھنے کی پیشکش کی۔ چنانچہ خلیفہ ولید ثانی نے اصالتاً اور وکالتاً تقریباً انتیس سو سے زائد قصیدے سنے اور اس کے صلے میں حماد کو ایک لاکھ درہم بطور انعام عطا کئے۔

حماد بن بلکین الزیری

حمادی خاندان کا بانی، ایک بربر حکمران۔ حماد فاطمی خلیفہ المعزّ کے عہد میں المغرب کا والی رہا۔ ۳۷۷ھ/۹۸۸ء میں اس کے بھائی المنصور نے اسے اشیر کی ولایت دے دی۔ حماد نے تمام وسطی المغرب میں خاندان صنہاجہ کی برتری قائم کر دی۔ حماد اور بادیس کے بیٹے المعزّ کے درمیان لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں زیری سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ حماد کو میلہ، طبنہ، الزاب، اشیر اور المغرب کے علاقے مل گئے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ دونوں حریفوں نے سلطنت کو آپس میں تقسیم کر کے شادی بیاہ کے ذریعے یگانگت پیدا کر لی۔ اس طرح خاندان صنہاجہ دو شاخوں

میں تقسیم ہو گیا۔ یعنی قیروان میں المنصور کا خاندان اور القلعہ میں حماد کا۔ حماد نے ۴۱۹ھ/ ۱۰۲۸ء میں وفات پائی۔ اس خانوادے کا شجرہ نسب ذیل میں دیا جاتا ہے۔

(۱) حماد بن بلکین بن زیری
۱۰۱۵ء — ۱۰۲۸ء

- ۲۔ القائد (۱۰۲۸ء—۱۰۵۴ء)
  - ۳۔ محسن (۱۰۵۴ء — ۱۰۵۵ء)
- علناس
  - ۵۔ الناصر (۱۰۶۲ء—۱۰۸۹ء)
    - ۶۔ المنصور (۱۰۸۹ء—۱۱۰۵ء)
      - ۷۔ بادیس
      - ۸۔ العزیز (۱۱۰۵ء—۱۱۲۵ء)
        - ۹۔ یحییٰ (۱۱۲۵ء—۱۱۵۲ء)
- محمد
  - ۴۔ بلکین ۱۰۵۵ء—۱۰۶۲ء

حمائل

وہ شے جو گلے میں لٹکائی جائے۔ عام طور پر تعویز وغیرہ۔ یا چھوٹے سائز کا قرآن پاک جو بطور تعویز استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ کاندھے کے ساتھ یا بازو پر باندھے جاتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں اسے حرز کہا جاتا ہے۔ عرب لوگ اسے حمایہ۔ نسخہ یا حمائل کہتے ہیں۔ اسے عام طور پر چمڑے کے ٹکڑے یا موم جامہ میں لپیٹ کر سونے یا چاندی سے بنے ہوئے خول میں رکھ دیا جاتا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں چھوٹے سائز کے قرآن پاک کو حمائل کہتے ہیں جنہیں لوگ عام طور پر دوران سفر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ تعویز کے طور پر اکثر اوقات مختلف فرشتوں کے نام بھی لکھے جاتے ہیں۔ یوں تو بے شمار فرشتے ہیں لیکن چار اہم فرشتوں کے نام اکثر تعویزوں میں لکھے جاتے ہیں وہ حضرت جبرائیل، میکائیل، حضرت عزرائیل اور حضرت اسرافیل شامل ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جو ملائکہ سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔ تعویزوں میں شامل دعائیں، علامتیں اور اعداد وغیرہ مختلف جگہوں سے لئے جاتے ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر تعویزوں میں اللہ تعالےٰ کے نام نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آیات قرآنی، علامات زیچ، یہود کے علم الاسرار کے حروف بھی تعویزوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض تعویزوں میں جانوروں اور انسانوں کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر حافظ کا ایک تعویز ملاحظہ ہو۔

ح	ا	ف	ظ
ا	ف	ظ	ح
ف	ظ	ح	ا
ظ	ح	ا	ف

حمد

تعریف، ستائش۔ خاص طور پر اللہ کی تعریف۔ قرآن پاک میں سب سے پہلی سورۃ کا نام بھی حمد ہے۔ اس سورۃ کے آغاز میں حمد آیا ہے۔ الحمد للہ رب العلمین ۝ خدا کی تعریف تین طرح کی جا سکتی ہے۔ زبان سے جسے حمد قولی کہتے ہیں، اعضا سے جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ اسے حمد فعلی کہتے ہیں اور دل سے خدا کی تعریف کرنے کو حمد حالی کہا جاتا ہے۔

اسلام میں جو تہذیب و اخلاق سکھلائی گئی ہے اس کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے۔ بندہ اپنے ہر کام کی ابتدا اللہ کی تعریف سے کرے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ ایک تو یہ انسان برے کاموں سے بچا رہتا ہے کیونکہ خدا کا نام لے کر یا اس کی تعریف کے کلمات پڑھنے کے بعد وہ اپنے کام کے بارے میں ضرور سوچے گا کہ آیا وہ کوئی اچھا کام کر رہا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی تعریف کرنے اور اس کا نام لینے سے یہ بھی مراد ہوتی ہے کہ اس کے کام میں اللہ کی تائید شامل ہو جائے گی۔ وہ اسے شیطان کی [illegible] سے بچائے گا۔

تعریف کرنے کی عام طور پر دو وجوہات ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ جس کی تعریف کی جائے وہ اپنے اندر حسن و خوبی اور کمال ہنرمندی رکھتا ہو [illegible] نعمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔

ہم اللہ تعالےٰ کی تعریف انہی دو حیثیتوں سے کرتے ہیں [illegible] جس کے پیدا کردہ مخلوق پر تیری کی جڑ [illegible] جاتی ہے [illegible] میں بھی کوئی حسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے اس کا [illegible] ذات ہے اس لئے تعریف صرف اللہ ہی کے لئے ہے [illegible] حقیقت کی موجودگی میں کسی انسان، فرشتے، مخلوق [illegible] کریں۔

حمدان بن اشعث قرمط

حمدان بن اشعث قرمط [illegible] زیادہ مشہور [illegible] کھودنے کا کام کرتا تھا۔ حمدان عام طور پر بیل کی سواری [illegible] وجہ سے اسے قرمیطہ کہا جانے لگا۔ [illegible] تقشف کی جانب مائل تھا۔ بعد میں ایک باطنی [illegible] ہو گیا۔ وہ ایک [illegible] اسے ایک باطنی فرقہ کا داعی ملا۔ حمدان نے [illegible] اس کا نام لیا جہاں حمدان جا رہا تھا۔ چنانچہ حمدان نے اسے [illegible] دوران سفر اس شخص نے حمدان کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ اس [illegible] رہ کر اور باطنی فرقہ کے مبلغ کی حیثیت سے کام کرتا [illegible] باطنی پیروں کی نسبت سے قرمطی کہلانے لگے۔

حمدان بن اشعث نے دوسرے فرقوں کے خلاف [illegible] ساتھ ساتھ بعض ظاہری اصولوں کو بھی اپنے مذہب میں شامل رکھا [illegible] حنیفہ [illegible] کے مذکورہ [illegible] وہ زہد و تقویٰ کا پرچار کرتا تھا۔ اس سے بہت سے [illegible] یقین کر کے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اس نے اپنے [illegible] کسی نیکی لوگوں نے تشکر کیا۔ اس طرح تو ہم اپنے [illegible] یہ صاحب [illegible] کہتا تھا [illegible] ذات باری [illegible] تھا اور لوگوں کو ایک تحریر دکھاتا جس میں حمدان کو خطاب کر کے [illegible]

ہو، تم ہی کلمہ ہو، تم ہی مہدی ہو، تم ہی محمد بن حنیفہ ہو اور تم ہی جبریل ہو" اس کے بعد کہنے لگا کہ جناب مسیح بن مریم میرے پاس انسانی صورت میں آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ تم ہی داعی ہو، تم ہی حجۃ ہو، تم ہی ناقہ ہو، تم ہی دابہ ہو، تم ہی روح القدس ہو اور تم ہی یحییٰ بن زکریا ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ نماز صرف چار رکعتیں فرض ہیں دو رکعت فجر سے پہلے، دو رکعت غروب آفتاب سے پہلے۔ حمدان نے اذان دینے کا بھی نیا طریقہ بتایا کہ پہلے چار مرتبہ اللہ اکبر، پھر دو مرتبہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اور پھر ایک مرتبہ یہ کلمات کہیں۔ اشہد ان آدم رسول اللہ۔ اشہد ان نوحاً رسول اللہ اشہد ان ابراہیم رسول اللہ۔ اشہد ان موسیٰ رسول اللہ۔ اشہد ان عیسیٰ رسول اللہ اشہد ان محمداً رسول اللہ، اشہد ان احمد بن محمد بن حنیفہ رسول اللہ۔ اس نے سال بھر میں دو روزے رکھنے کا حکم بھی دیا۔ اور کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح حمدان نے بھی قرآن کی آیات کے بعض حصوں کو چوری کر کے اپنا کلام بنا لیا اور ظاہر کیا کہ یہ اس پر وحی کی صورت میں نازل ہوئے ہیں۔ اس نے حضور کی بعض احادیث میں تبدیلیاں کر کے انہیں اپنی وحی میں شامل کر لیا اور قرآن کی سورتوں کی بجائے وہ صرف اس کی بنائی ہوئی سورتوں ہی کو نماز میں پڑھا کریں۔ حمدان نے نماز پڑھنے کے لئے بھی اپنا الگ طریقہ اختیار کر لیا۔

جب حمدان کے پیروؤں کی تعداد بڑھنے لگی تو اس نے بارہ آدمیوں کو اپنا نقیب بنایا اور انہیں اطراف و اکناف کے علاقوں میں پھیل کر اس کے مذہب کی تبلیغ کریں۔ اس نے ... سلام کے ... ہیں جب ہیصم عامل کوفہ نے حمدان کے جھوٹے مذہب کے بارے میں سنا تو فوراً اسے گرفتار کر لیا اور اس نے حمدان کو ... ایک ... میں مقید کر دیا۔ اور اس کی چابی اپنے تکیہ کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس نے ... کہ وہ صبح ہوتے ہی حمدان کو ضرور قتل کرا دے گا۔ لیکن ہیصم کے گھر کی ایک لونڈی تھی جس نے رحم دلی کے طور پر حمدان کو آزاد کرنے کے بعد چابی دوبارہ اس کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

حمدان نے اپنی اس آزادی سے فائدہ اٹھایا اور کہنے لگا کہ مجھے کوئی شخص بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس واقعے کے بعد اس کے پیروؤں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی انہوں نے ... تباہی مچائی اور خراسان سے شام تک تمام علاقہ اس کے دست ستم سے چیخ اٹھا۔ اس کے پیروکار نے کو ... اور معاندین اسلام تھے بیت اللہ کو مسمار کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے وہ حجر اسود لوا اکھاڑ کر عمان لے گئے۔

برعظیم میں قرمطی فرقے کے لوگ مختلف اوقات میں آتے رہے۔ یہاں انہوں نے ملتان میں ایک نیم خود مختار حکومت بھی بنائی جسے سلطان محمود غزنوی کی فوجوں نے ۱۰۰۰ء میں قرمطی لشکر سے لڑائی کے بعد فتح کر لیا اور اس طرح ہندوستان میں ان کا زور ختم ہوا۔

حمدان، بنو

ایک عرب خانوادہ جس کے دو چھوٹے خاندان دسویں صدی عیسوی میں خلافت بنو عباس کے زوال کے بعد موصل اور حلب میں برسراقتدار آئے۔ بنو حمدان عادی بن اسامہ بن تغلب کی اولاد ہیں۔ عبداللہ ابوالہیجا ابن حمدون کے دونوں فرزند بنو حمدان کے نامور ارکان میں سے تھے۔ ابوالہیجا موصل کی امارت اور حمدانی خاندان کا بانی تھا۔ ابوالہیجا ۹۰۶ء میں موصل کی ولایت پر فائز ہوا اور ۹۲۹ء میں وفات پائی۔ حسن بن ابوالہیجا موصل کا امیر بنا۔ ۹۳۵ء میں خلیفہ الراضی نے اسے موصل کے علاوہ الجزیرہ کے تین صوبوں (دیار ربیعہ، دیار مضر اور دیار بکر) کا والی بنا دیا ۹۳۶ء میں سارے الجزیرہ کا حاکم بنا ۹۶۷ء میں اسے اردمشت کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں ۹۶۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوتغلب فضل اللہ الغضنفر والی بنا۔ اسے خلیفہ کی طرف سے عدۃ الدولہ کا لقب دیا گیا۔ ۹۷۹ء میں دملہ کے امیر مفرج نے ایک جنگ کے بعد اسے قید کر لیا بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔

حلب میں بنو حمدان کی امارت کا قیام علی بن عبداللہ ابوالہیجا کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ ۹۴۷ء میں علی (جو سیف الدولہ کے نام سے مشہور ہوا) ایک ایسی ریاست کا مالک بن گیا جس میں حمص، قنسرین، عواصم کی حدود، دیار مضر اور دیار بکر کا بیشتر حصہ شامل تھا۔ شام کے سرحدی علاقے بھی اس کی قلمرو میں شامل تھے۔ سیف الدولہ نے ۹۴۷ء سے ۹۶۷ء تک حلب پر حکومت کی۔ فروری ۹۶۷ء میں اکاون سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ سیف الدولہ کے بعد اس کا فرزند سعد الدولہ ابوالمعالی جانشین ہوا مسند نشینی کے وقت اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ دسمبر ۹۶۹ء میں حلب پر بوزنطینی سیادت قائم ہو گئی۔ ۹۷۷ء میں وہ دوبارہ حلب پر قابض ہو گیا۔ دسمبر ۹۹۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ سعد الدولہ کے بعد اس کا بیٹا سعید الدولہ مسند نشین ہوا اس کے عہد میں مصر کے فاطمیوں نے حلب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جسے سعید الدولہ نے بوزنطینی شہنشاہ کی مدد سے ناکام بنا دیا۔ سعید الدولہ نے اپنی لڑکی کی شادی اپنے لؤلؤ سے کر دی۔ اس وزیر نے سعید الدولہ کو ۱۰۰۲ء میں قتل کرا دیا۔ اس کے بعد بنو حمدان کے ارکان نے حلب کی امارت کے لئے بہت کاوشیں کیں لیکن ناکام رہے۔ (ش ح)

حمدون القصار

حمدون بن احمد بن عمارۃ ابو صالح القصار، ایک مشہور صوفی اور بزرگ عالم جو سفیان ثوری کے مرید اور فرقہ ملامتیہ کے شیخ تھے۔ آپ نیشاپور میں رہتے اور تعلیم دیتے تھے۔ آپ کا قول ہے "قناعت تمہیں بغیر کسی غم و فکر کے سکون دے گی۔ تم زیادہ کی جستجو میں اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالتے ہو۔ صوفیا کی صحبت تحمل سکھاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کی قباحتوں سے درگزر کرتے ہیں اور محاسن کی تعریف نہیں کرتے تاکہ تعریف تکبر کا موجب نہ بن جائے"۔

فرقہ ملامتیہ کے پیرو خود پسندی اور تکبر سے بچنے کے لئے اپنے محاسن چھپاتے اور اپنے آپ کو قابل ملامت ظاہر کرتے تھے۔ ایک شخص نے آپ کو برا بھلا کہا تو آپ نے فرمایا "میرے بھائی! اگر تم تمام بداعمالیاں مجھ سے منسوب کر دو تو بھی تم مجھے اتنا برا نہیں کہہ سکتے۔ جتنا برا میں خود اپنے آپ کو سمجھتا ہوں"۔

حمدون القصار نے ۲۷۱ھ/۸۸۴ء میں وفات پائی اور حیرہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کے رفقا میں ابوتراب بخشی، علی نصیر آبادی اور ابوعلی ثقفی قابل ذکر ہیں۔ (ش ح)

حمرالاسد، غزوہ

مدینہ منورہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں یا قصبہ۔ یہاں غزوہ احد کے بعد ۳ھ میں جنگ ہوئی تھی۔ جنگ احد ختم ہونے کے بعد قریش کا لشکر واپس مکہ روانہ ہو گیا۔ لیکن ابوسفیان کو اچانک خیال آیا کہ مسلمان اس وقت کمزور ہو گئے ہیں لہٰذا ایسے وقت میں اگر ان پر حملہ کریں تو انہیں نیچا دکھا سکیں گے۔ عین اسی وقت حضورؐ بھی اسی مسئلہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ آپؐ نے کفار مکہ کی ممکنہ چڑھائی کے پیش نظر جنگ کے دوسرے روز ہی اعلان فرمایا کہ تمام مسلمان جو جنگ میں شریک تھے دوبارہ

میدان میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ حضورؐ کے ارشاد پر تمام جاں نثار آ کر جمع ہو گئے بیشتر جاں نثاروں کے بدن زخموں سے چور تھے۔ حضورؐ اس چھوٹے سے لشکر کو لے کر حمراالاسد پہنچے۔ اُدھر کفار مکہ بھی وہاں پہلے سے موجود تھے مسلمانوں کی پیش قدمی کو دیکھ کر بوکھلا گئے۔ اور فوراً راہِ فرار اختیار کی۔ یہاں اسلامی لشکر نے تین روز تک قیام کیا۔ اس غزوہ میں دو افراد کو قیدی بھی بنا لیا گیا۔ ان میں سے ایک عبدالعزیٰ شاعر تھا۔ اس نے مسلمانوں سے وعدہ خلافی کی تھی اور عرب قبیلوں کو جنگ کے لئے آمادہ کیا تھا۔ حضورؐ نے اسے دیکھا تو فرمایا "مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا"۔ چنانچہ عبدالعزیٰ کو قتل کر دیا گیا۔ دوسرا قیدی معاویہ بن مغیرہ تھا یہ حضرت عثمانؓ کا عزیز تھا اس نے بھی مسلمانوں کو بہت ایذائیں پہنچائی تھیں۔ حضورؐ نے اسے مدینہ سے تین روز کے اندر اندر نکل جانے کا حکم دے کر رہا کر دیا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ تین دن گذرنے کے بعد بھی مدینہ میں گھوم رہا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ اس غزوہ میں قتال کی نوبت نہیں آئی تھی۔

حمزہ بن حبیب

(۸۰ھ/۶۹۹ء - ۱۵۶ھ/۷۷۲ء) بن عمارہ بن اسماعیل۔ قرآن مجید کے سات قاریوں میں سے ایک۔ آپ عکرمہ بن ربیع التیمی کے خاندان کے ایک مولیٰ تھے آپ کے لقب "الزیات" کی وجہ یہ ہے کہ آپ کوفے سے حلوان تیل لے جاتے تھے۔ علم قرأت میں آپ اعمش، حمران بن اعین عاصم اور ابن ابی لیلےٰ کے شاگرد تھے آپ کے شاگردوں میں قابل ذکر سفیان ثوری الکسائی تھے۔ (ش ج)

حمزہ بن عبدالمطلب

حضرت عبدالمطلبؓ کے بیٹے اور حضورؐ کے چچا۔ نام حمزہ تھا اور کنیت ابوعمارہ۔ عمر میں حضورؐ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ آپ کی والدہ ہالہ بنت وہیب تھیں جو حضورؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ کی چچازاد بہن تھیں۔ حضرت حمزہؓ رسول اکرمؐ کے رضاعی بھائی تھے۔

آپ کی طبیعت مہم جو اور خطر آزما تھی۔ آپ کے والد حضرت عبدالمطلبؓ کا انتقال ہوا تو آپ کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت ننھیال میں ہوئی۔ عرب میں اس وقت شاعری اور انساب کا علم ہی تعلیم کے زمرے میں آتا تھا۔ جنگی مہارت، گھڑ سواری اور شکار وغیرہ معزز فنون میں شامل تھے شاید اسی لئے حضرت حمزہؓ کو شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ آپ بہت دلیر اور جنگجو تھے اکثر جنگلوں میں جا کر گھڑ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شکار سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک عورت ملی جس نے بتایا کہ ابوجہل نے حضورؐ کو گالیاں دی ہیں۔ آپ یہ سن کر جوش میں آ گئے سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے اور کہنے لگے "کیا تو سمجھتا ہے کہ محمد بن عبداللہ بے سہارا ہے؟ کیا تو نے سمجھ لیا ہے کہ بنو ہاشم سارے کے سارے مر گئے ہیں؟"

ابوجہل کے ساتھی یہ سنتے ہی جوش میں آ گئے لیکن انہیں ابوجہل نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ "اسے کچھ نہ کہو۔ کیونکہ میں نے بھی آج اس کے بھتیجے کو گالیاں دی تھیں۔"

حضرت حمزہؓ اس کے بعد سیدھے حضورؐ کے پاس پہنچے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ حضورؐ نے آپ سے تمام واقعہ سن کر کہا کہ "چچا جان میں اس وقت زیادہ خوش ہوں گا جب آپ اس دین میں داخل ہو جائیں گے، جس کو لے کر میں آیا ہوں۔"

آپؐ کے ان الفاظ میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ حضرت حمزہؓ مسلمان ہو گئے۔ ہجرت کے وقت آپ بھی مکہ سے مدینہ آ گئے تھے۔ حضورؐ نے مدینہ میں حضرت حمزہؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ میں بھائی چارہ کرا دیا۔ ہجرت کے فوراً بعد حضورؐ اکرم نے صحابہؓ کی ایک جماعت کو کفار کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ میدان جنگ میں کفار اور مسلمان باقاعدہ صف بندی کر چکے تھے کہ اسی دوران میں قبیلہ بنو جہینہ کے سردار ابن عمرو نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس مہم میں اسلامی تاریخ میں پہلی بار جسے علم دیا گیا وہ آپ ہی تھے۔

۲ ہجری میں غزوہ بدر کے آغاز میں جب قریش کا سردار عتبہ اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید میدان میں نکلے تو حضورؐ نے ان کے مقابلے کے لئے چند انصاری صحابہؓ کو بھیجا لیکن عتبہ کہنے لگا کہ ہم صرف قریشی لوگوں ہی سے مقابلہ کریں گے۔ اس پر آپؐ نے حضرت حمزہؓ، ابو عبیدہؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کو مقابلہ پر بھیجا۔ حضرت حمزہؓ نے پہلے ہی وار میں عتبہ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ آپ غزوۂ بدر میں بے جگری سے لڑے ۳ھ میں غزوۂ اُحد میں بھی آپ نے کفار کے کتنے ہی لوگوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ آپ کی شمشیر بے نیام دشمنوں کا صفایا کر رہی تھی کہ ایک نیزہ آپ کے آ کر لگا اور جگر کے پار ہو گیا۔ جس کی وجہ سے آپؓ شہید ہو گئے۔ وہ ایک حبشی غلام نے آپ پر پھینکا تھا جسے قریش کے سرداروں نے آزادی کا لالچ دے کر کسی جگہ تاک میں بٹھا رکھا تھا۔ جب آپ شہید ہو گئے تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آپؓ کے جگر کے ٹکڑے کئے اور انہیں چبا کر تھوک دیا۔ بعد میں ناک کان کاٹ کر ان کا ہار بنایا اور گلے میں ڈال دیا۔ جب حضورؐ نے اپنے محبوب چچا کی لاش دیکھی تو آنکھیں بھر آئیں اور آپؐ نے فرمایا "تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم رشتہ داروں کے حقوق کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور تمام نیک کاموں میں سب سے آگے رہتے تھے۔ اگر مجھے صفیہ کے رنج و غم کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں اس طرح چھوڑ دیتا کہ درندے اور پرندے تمہیں کھا جائیں اور قیامت کے دن تم ان کے پیٹ سے اٹھائے جاؤ۔ خدا کی قسم مجھ پر تمہارا انتقام واجب ہے میں تمہارے بدلے ستر کافروں کا مثلہ کروں گا۔" بعد میں وحی کے ذریعے اللہ نے آپ کو اس بات سے ممانعت کر دی اور آپ نے کفارہ ادا کر کے قسم توڑ دی۔

حبشی غلام نے آپؓ کو شہید کرنے کے بعد آزادی تو حاصل کر لی تھی لیکن بعد میں اسے ندامت ہوئی اور اس نے کچھ عرصہ بعد اسلام قبول کر لیا۔ جب وہ حضورؐ کے پاس آ کر اسلام قبول کر چکا تو آپؐ نے اُسے اپنے سامنے آنے سے منع فرما دیا تھا۔

حمزہ بن علی دروزی

دروز قوم کا بانی جس نے ۴۱۰ھ یا ۱۰۱۹ء میں اور بقول خود اس سے قبل ۴۰۸ھ یا ۱۰۱۷ء میں پہلی بار اپنے عقائد کا اعلان کیا تھا۔ وہ ۴۰۵ھ کے لگ بھگ مصر آیا۔ جب اس نے قاہرہ کی مسجد میں اپنے عقائد کا اعلان کیا تو لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ عوام میں ایک فساد برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ خلیفہ کی پناہ گاہ میں گزارنا پڑا۔ ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء میں خلیفہ کے غائب ہو جانے کے بعد اس کے انجام کا علم نہ ہو سکا۔ پھر بھی دروزیوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے اُسے امتیازی درجہ حاصل ہے۔ وہ اسے ہادیٔ اعظم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ تاریخ دان النویری لکھتے ہیں "وہ علاقہ زوزان (فارس) کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے مصر میں مختلف قسم کے لباس تیار کرتا تھا اور کپڑوں کی تجارت بھی کرتا تھا۔"

حمزہ بن علی دروزی نے اپنے مذہبی عقائد اور نظام کے بارے میں کئی کتابیں لکھیں جنہیں اس کے پیرو کار مقدس کتابوں کا درجہ دیتے ہیں۔

حمزہ بیگ

داغستان کے دوسرے امام اور سیاسی و مذہبی تحریک مریدیہ کے قائد۔ داغستان

کے امام اول غازی محمد اکتوبر ۱۸۳۲ء میں ایک روسی دستے کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اور حمزہ بیگ (GAMZAT BEK) داغستان کے امام بنے۔ تحریک مریدیہ کے باعث ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۹ء تک شمالی قفقاز بدامنی کا شکار رہا۔ یہ تحریک اسلامی تصوف کے ان اثرات پر مبنی تھی جو بخارا پیدا ہوئے اور جن کی تبلیغ نقشبندیوں نے کی۔ جہاد کے عملی تصور سے اس تحریک کا بہت قریبی تعلق تھا۔ یہ تحریک نہ صرف روسیوں کے خلاف تھی بلکہ ان اور خانیوں کے بھی خلاف تھی جنہوں نے روسی تسلط کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

۳ اگست ۱۸۳۴ء کو حمزہ بیگ نے اور خانی دارالحکومت خونزاق کے قریب دریائے تیور پر اور خانیوں کو شکست دی اور ان کا قتل عام کرنے کے بعد روسیوں کو دارالحکومت سے نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۴ء کو امام شامل کے نائب اور گوریلا لیڈر حاجی مراد کے بھائی نے حمزہ بیگ کو قتل کر دیا۔ امام شامل تیسرے امام بنے اور انھی کے ہاتھوں مریدیت کی تحریک نے ایک قطعی صورت اختیار کی اور ۲۵ اگست ۱۸۵۹ء کو امام شامل کے ہتھیار ڈالنے تک جاری رہی۔ (ش۔ ج)

حمس

وہ نام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے وقت حرم مکہ کے رہنے والوں کو دیا جاتا تھا۔ حج اور حرم مکہ کے مراسم و لوازم کے نقطۂ نظر سے زمانہ جاہلیت میں عرب قبائل تین طبقوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ حُمس، حلّہ اور طُلس۔ محبّر کے مصنف ابن حبیب نے لکھا ہے کہ قریش سارے کے سارے نیز مکہ میں رہنے والے اجنبی قریش کی لڑکیوں کی اولاد بیرون مکہ میں حمس میں شامل تھے۔ ابن حبیب نے اپنی ایک دوسری کتاب "منمق" میں حمس کے بارے میں لکھا ہے کہ قریش نے ایک دن سوچا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں اور حدود حرم میں رہتے ہیں اس لئے اجنبیوں سے خود کو ممتاز کرنے اور ان سے اپنی عظمت منوانے کیلئے کچھ کرنا چاہیئے۔ اس لئے انھوں نے حج میں عرفات جانا ترک کر دیا اور کہا کہ اہل حرم کو حدود حرم سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔ بعد ازاں بعض اور قبائل کو بھی پاس رہنے یا رشتے دار ہونے کے باعث یہی امتیاز عطا کیا۔ اس کے بعد کچھ اور امور اضافہ کیے جو پہلے نہ تھے۔ مثلاً گھی، دہی، پنیر اور اُونی خیموں کی مرمت اور بیرون حرم سے حج یا عمرے کے لئے آنے والوں کے ساتھ آئی ہوئی غذا کو بھی اپنے لئے حرام قرار دیا۔ اجنبیوں پر یہ پابندی عائد کی کہ طواف قدوم کیلئے اہل حرم سے حاصل کئے ہوئے لباس ہی میں ہوں ورنہ برہنہ رہیں۔ اگر کوئی اجنبی کسی وجہ سے اپنے لباس میں طواف کرتا تو طواف کے بعد لباس کو مطاف ہی میں پھینک دینا پڑتا تھا۔ باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیرونی قبائل نے فوراً یہ پابندیاں گوارا کر لیں۔ بیرونی عورتیں اپنا سارا لباس اتارنے پر مجبور نہ تھیں۔ کسی حمسی کا لباس نہ ملتا تو وہ اپنے جسم پر اپنی کُرتی (قمیص) باقی رکھتی تھیں۔ قرآن مجید نے مقامی اور اجنبی کا فرق منسوخ کر دیا۔ عرفات جانا سب کیلئے ضروری قرار دیا۔ برہنگی کی ممانعت ہوئی اور ہر عبادت کے وقت اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کا حکم ہوا۔ بیرونی غذاؤں کی ممانعت کو منسوخ کیا گیا۔ دروازوں سے نہ آنے کی پابندی بھی منسوخ ہوئی۔ پرانی باتوں میں جو برقرار رکھی گئیں ان میں احرام کی حالت میں شکار نہ کرنا اور ناخن نہ تراشنا اور ہم بستر نہ ہونا قابل ذکر ہیں۔

حمص

شام کا ایک شہر جو دریائے عاصی کے مشرقی کنارے پر سطح سمندر سے پانچ سو میٹر بلند کوہ لبنان اور جبل انصاریہ کے درمیان ایک نشیب کے دہانے پر واقع ہے۔ خلیج فارس سے پامیرا ہو کر بحیرۂ روم جانے کا آسان ترین راستہ یہیں سے گزرتا ہے کرکوک سے پیٹرول کی پائپ لائن حمص سے گزرتی ہوئی طرابلس الشام اور بانیاس تک جاتی ہے۔ اس شہر کی پچھلے پانچ ہزار سال کی تاریخ اہم واقعات سے پُر ہے۔ دو ہزار سال قبل از مسیح حمص غیر معروف مقام تھا۔ شہر کی بنیاد قدیم یونانیوں کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس شہر پر رومی نقشۂ تعمیر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ۸۱ ق م سے ۹۶ء تک حمص پر عربوں کا ایک مقامی خاندان حکمران تھا۔ پانچویں صدی عیسوی تک عیسائیت یہاں جڑ پکڑ چکی تھی۔ جنگ یرموک کے بعد شہنشاہ ہرقل حمص چھوڑ کر چل دیا۔ اسلامی فوجیں حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح کی زیر کمان حضرت خالدؓ بن ولید کی ہمراہی میں شہر کی دیواروں کے سامنے نمودار ہوئیں تو باشندوں نے امان طلب کر لیا۔ مسلمان ۱۶ھ/۶۳۷ء میں حمص میں داخل ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے پانچسو صحابی مفتوحہ شہر حمص میں سکونت کے لئے چلے آئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حمص کا گورنر سعید بن عامر تھا۔ ۲۶ھ/۶۴۷ء میں حضرت امیر معاویہؓ نے حمص اور قنسرین پر قبضہ کر کے ان کا الحاق صوبہ شام سے کر دیا۔ جب ۳۷ھ/۶۵۷ء میں جنگ صفین ہوئی تو حمص کے باشندے حضرت علیؓ کے طرفدار تھے اور شیعیت کو اس علاقے میں عرصۂ دراز تک اقتدار حاصل رہا۔

آجکل حمص زراعتی اعتبار سے اہم مرکز ہے۔ یہاں صنعت کو فروغ حاصل ہے۔ ۱۹۶۰ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ آبادی کا پانچواں حصہ عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ حمص اہم راستوں کے چوراہے پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ زرعی اور صنعتی مرکز رہا ہے اور شام کی معیشت میں اب بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ تہذیب قدیم کے آثار سے معمور ہے۔ پرانی مسجدیں حمام مزارات خانقاہیں اب بھی محفوظ ہیں۔ (ش۔ ج)

حملۃ العرش

وہ آٹھ فرشتے جنہوں نے عرش معلّٰی کو اٹھایا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے "جو فرشتے (عرش الٰہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گردا گرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کے لئے (اس طرح) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تیری رحمت (عامہ) اور ہر چیز جو شامل ہے سو ان لوگوں کو بخش دیجئے (جنہوں نے شرک وکفر سے) توبہ کر لی ہے اور تیرے رستہ پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔" (سورۃ ۴۰ - آیت ۷)

بیضاوی کہتے ہیں کہ حملۃ العرش۔ وہ آٹھ فرشتے ہیں جو اپنے مرتبے کے لحاظ سے تمام فرشتوں میں افضل ہیں وہ اتنے لمبے ہیں کہ ان کے پاؤں زمین کی آخری تہہ تک اور سر سب سے بالا جنّت تک پہنچے ہوئے ہیں۔ تمام کائنات ان کی ناف تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اگر ہم ان کے کانوں سے لے کر کندھوں تک کا فاصلہ طے کرنا چاہیں تو ہمیں سات سو سال لگ جائیں۔

حمنہ بنت حجش

حجش کی بیٹی، حضرت زینبؓ کی رضاعی بہن۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کے ہمراہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں اور انہی سے نکاح ہوا۔ حضورؐ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے گئے تو آپ بھی مدینہ ہجرت کر گئیں۔ آپ نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔

غزوۂ اُحد میں آپ شریک تھیں۔ آپ کے شوہر مصعبؓ بن عمیر نے اس غزوہ میں شہادت پائی۔ بعد میں حضرت حمنہ نے طلحہؓ سے نکاح کر لیا۔ آپ کی درست تاریخ وفات کا علم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت زینبؓ کی وفات تک زندہ تھیں اور حضرت زینبؓ نے ۲۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے حضرت طلحہؓ سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام محمد تھا جو محمد سجاد کے لقب سے مشہور ہوئے دوسرے کا نام عمران تھا۔

حمید الدین ناگوری

خواجہ بختیار کاکیؒ کے دوست اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ کا اسم گرامی محمد تھا لیکن حمید الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عطاء اللہ محمود تھا جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں بخارا سے ہندوستان آکر دہلی میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

شیخ حمید الدین ناگوریؒ علوم ظاہری میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اس خوبی کے باعث آپ کے والد کی وفات کے بعد بادشاہ نے آپ کو ناگور کا قاضی مقرر کر دیا۔ تین سال تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ بعد میں دست بردار ہو کر بغداد چلے گئے اور شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضری دی ان سے بیعت ہوئے اور ایک سال تک ان کی خدمت کے علاوہ مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ اسی دوران میں آپ کے خواجہ بختیار کاکیؒ سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے وہ بھی بغداد میں مقیم تھے۔ یہاں سے آپ مدینہ تشریف لے گئے۔ اور ایک سال تک حضورؐ کے روضۂ مبارک کے مجاور رہے۔ پھر آپ مکہ چلے گئے۔ اور تین سال تک وہاں کے مختلف بزرگوں سے کسب فیض کیا۔ سلطان شمس الدین کے زمانہ میں دہلی تشریف [illegible] پر قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی۔ چنانچہ آپ کے ان کے ساتھ گہرے مراسم قائم ہو گئے۔ اور آپ نے انہی کے ساتھ رہائش اختیار کی۔

آپ کو سماع کا بہت شوق تھا اور اکثر محفل سماع منعقد کرتے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے لیکن آپ کے زمانے کے بیشتر علماء سماع کو جائز خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سلطان التمش کے محل کے قریب محفل سماع منعقد تھی جس میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور خواجہ بختیار کاکیؒ موجود تھے۔ رکن الدین سمرقندی (جو سماع کو جائز نہیں سمجھتے تھے) کو علم ہوا تو آپ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس محفل کو روک دینے کے لئے آئے۔ لیکن حمید الدین ناگوری صاحب کو علم ہو گیا۔ آپ نے صاحب خانہ کو اندر کمرے میں بھیج دیا تاکہ انہیں اندر آنے کے لئے اجازت طلب کرنی پڑے۔ چنانچہ رکن الدین سمرقندی نے محفل میں آنے کی اجازت طلب کی تو یہ معلوم ہونے پر واپس چلے گئے کہ صاحب خانہ غیر حاضر ہے۔

آپ کو بابا فریدؒ سے بہت محبت اور عقیدت تھی۔ بابا فریدؒ نے آپ کی دو کتابوں "تواریخ" اور "راحة الارواح" کا حوالہ اپنے ملفوظات میں دیا ہے۔ "سیر العارفین" میں ایک اور کتاب "لوائح" کا ذکر بھی ملتا ہے۔

آپ کی وفات دہلی میں ۶۴۱ھ میں ہوئی اور آپ کا مزار قطب الدین بختیار کاکیؒ کے قریب ہی واقع ہے۔

حمید اللہ، ڈاکٹر

پورا نام محمد حمید اللہ۔ آپ حیدر آباد دکن میں ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے دار العلوم حیدر آباد دکن میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایم اے جامعہ عثمانیہ سے کیا ایل ایل بی کرنے کے بعد طیلسان چلے گئے۔ جرمنی کے [illegible] یونیورسٹی سے ڈی فل اور پیرس (فرانس) سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ واپس آ گئے اور وہاں تاریخ اور قانون پڑھانے لگے۔ آپ نے یورپ کی [illegible] میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ آج کل آپ [illegible] میں تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں اس کے ساتھ ساتھ آپ تحقیق کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں [illegible] ڈاکٹر کے خطبات کا جو ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے اس پر نظر ثانی آپ ہی نے کی تھی آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں سیاسی وثیقہ جات [illegible] اور لائیڈن، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، قانون بین الممالک، سیرت [illegible] اور قرآن پاک کا فرانسیسی ترجمہ شامل ہیں۔

آپ نے ایک زمانہ میں پاکستان کا دستور بنانے کے سلسلے میں [illegible] کے ساتھ مل کر بھی کام کیا۔ نیز جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک کو [illegible] زیادہ سے زیادہ اسلامی تصورات کے قریب [illegible]

حمید احمد سنبھلی

آپ سنبھل میں پیدا ہوئے آپ نے قرآن مجید [illegible] میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ آپ [illegible] عظیم مفسر قرآن ہونے کے باعث آپ [illegible] ہمایوں کو جنگ میں شکست ہوئی تو آپ بھی [illegible] ہمایوں شیر شاہ سے [illegible] ہندوستان پر [illegible] ہندوستان آ گئے۔ [illegible] مختلف [illegible] محفلوں میں آپ قرآن [illegible] بے شمار [illegible] اپنے دربار میں بلایا [illegible] کو شیعہ پایا۔

[illegible] نے تمہارے [illegible] میں کسی اور [illegible] بادشاہ اس جواب پر [illegible] کا نام [illegible] کے ناموں [illegible]

اس واقعے سے [illegible] دولت کو [illegible]

حنا

مہندی کو عربی میں حنا کہتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا

"یہود و نصاریٰ خضاب نہیں کرتے تو تم ان کی مخالفت کرو" (صحیح بخاری)

اس حدیث میں ہمیں خضاب کئے جانے کے بارے میں حکم ملتا ہے لیکن صرف مہندی سے۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے بہتر چیز جس سے بڑھاپا بدل جائے مہندی اور وسمہ ہے۔"

حضورؐ خود بھی ریش مبارک کو مہندی لگایا کرتے تھے۔ آپ نے عورتوں کو بھی تلقین کی ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر مہندی لگائیں۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ سے ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے کہا کہ "یا نبیؐ مجھ سے بیعت لے لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا' جب تک تو اپنے دونوں ہاتھ متغیر نہ کرے گی۔ (یعنی مہندی نہ لگائے گی) میں تجھ سے بیعت نہیں لوں گا۔ تیری دونوں ہتھیلیاں گویا درندے کی ہتھیلیاں ہیں۔" کیونکہ درندوں کی ہتھیلیاں بے رنگ اور سفید ہوتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا ہاتھوں پر مہندی لگانا مستحب ہے۔

حناد

جنت میں داخل ہونے والا آخری انسان۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آخری جنتی کے جنت کا واقعہ مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے آخری شخص جو جنت میں جائے گا وہ دوزخ سے نکلنے کی ہمت کرکے پاؤں چلے گا کبھی گر پڑے گا اور کبھی اس کو آگ کی لپیٹ جھلسے گی۔ جب دوزخ سے نکل کر آگے بڑھ جائے گا تو اس کی طرف دیکھ کر کہے گا کہ بابرکت ہے جس نے مجھے تجھ سے نجات بخشی۔ درحقیقت اللہ نے مجھے وہ نعمت دی ہے۔ جو اولین و آخرین میں سے کسی کو بھی نہ دی۔ اس کے بعد ایک درخت اس کی نظر کے سامنے کیا جائے گا۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب مجھے اس درخت کے قریب کر دیجئے تاکہ اس کا سایہ حاصل کروں اور پانی نوش کروں جو اس کے نیچے بہہ رہا ہے حق تعالیٰ فرمائے گا عجب نہیں اگر میں تجھے یہ نعمت دے دوں تو اس کے بعد تو کوئی اور درخواست کرنے لگے؟ وہ عرض کرے گا کہ اے رب نہیں ایسا نہ کروں گا اور عہد کرے گا کہ اس کے بعد اور کچھ نہ مانگوں گا۔ اور رب العالمین اس کو معذور قرار دے گا۔ کیونکہ اس کو وہ چیز نظر آئے گی جس سے بغیر صبر نہ کر سکے گا۔ چنانچہ اس کو درخت کے قریب کر دیا جائے گا۔ وہ اس کے سایہ میں بیٹھے گا اور پانی پئے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر کے سامنے دوسرا درخت نمایاں کر دیا جائے گا جو پہلے سے بہت اچھا ہوگا۔ پس وہ عرض کرے گا کہ اے رب مجھے اس کے نزدیک پہنچا دے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ مانگوں گا۔ دوسرے درخت سے مستفید ہو چکے گا تو جنت کے دروازے کے قریب ایک درخت اس کے سامنے کر دیا جائے گا۔ پس وہ عرض کرے گا کہ اے رب مجھے اس کے قریب پہنچا دے۔ اس کے سوا آپ سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ارشاد ہوگا۔ کہ اے ابن آدم کیا تو نے مجھ سے پختہ عہد نہیں کیا تھا کہ اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ عرض کرے گا بے شک اے رب عہد کیا تھا۔ حق تعالیٰ اُسے معذور قرار دے گا چنانچہ اسے درخت کے قریب کر دیا جائے گا۔ جب وہ اس درخت کے قریب ہو جائے گا تو اُسے جنتیوں کی آوازیں سنائی دیں گی اور کہے گا کہ اے رب مجھے اس کے اندر پہنچا دیجئے۔ ارشاد ہوگا کہ اے ابن آدم آخر تیرا سوال کرنا کسی طرح ختم بھی ہوگا؟ کیا تو اس سے راضی ہوگا کہ تجھے دُنیا کی بقدر جگہ دے دوں اور اس کے ساتھ اسی قدر اور دے دوں۔ وہ عرض کرے گا آپ مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا۔ میں جو بھی چاہوں اس پر قادر ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے آخر میں ہے کہ جب وہ شخص جنت میں داخل ہو جائے گا تو اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ جو تیری آرزو ہو لے۔ وہ آرزوئیں کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرمائیں گے کہ تمنا کر لے۔ فلاں نعمت آرزو کر لے۔ فلاں چیز کی تمنا کرے۔ اس طرح اللہ تعالےٰ اس کو آرزوئیں یاد دلاتے جائیں گے یہاں تک کہ آرزوئیں ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ جو کچھ تو نے تمنائیں کی ہیں وہ سب تجھ کو دیا اور اسی قدر اور دیا۔ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت ہے کہ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے تو نے جو کچھ تمنائیں کی ہیں وہ سب تجھے دیا اور اس کا دس گنا اور دیا۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ ادنیٰ جنتی وہ ہوگا جس کے لیے اسّی ہزار خادم اور بہتّر بیویاں ہوں گی۔ (ش۔ ج)

حنظلہ بن ابی عامر

آپ کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ آپ کا باپ قبیلے کا بااثر مگر مسلمان دشمن آدمی تھا۔ حضرت حنظلہؓ بن ابی عامر مسلمان ہو گئے۔ مگر کسی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ جب آپ نے غزوۂ اُحد کے لئے نفیرِ عام سنی تو فوراً شمشیر بدست میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جس وقت آپ نے غزوۂ اُحد کا اعلان نامہ سنا تو آپ اپنی زوجہ سے ہم بستر تھے اسی وقت اُٹھے اور نہائے بغیر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ ابوسفیان بن حرب رئیس کفار سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ آپ اُسے اُٹھا کر زمین پر دے مارنا چاہتے تھے کہ شداد بن اسود لیثی نے دیکھ لیا اس نے جھپٹ کر ایسا وار کیا کہ حضرت حنظلہؓ کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ حضرت حنظلہؓ چونکہ حالت جنابت میں شہید ہوئے تھے اس لئے فرشتوں نے آپ کو غسل دیا۔ حضورؐ نے جب یہ حالت دیکھی تو فوراً فرمایا "ان کی زوجہ سے دریافت کرو کیا بات تھی؟" حضرت حنظلہؓ کی بیوی نے پورا واقعہ بیان کیا۔ جس پر حضورؐ نے ارشاد کیا "اسی وجہ سے ملائکہ غسل دے رہے تھے" اسی دن سے آپ کا لقب 'غسیل الملائکہ' پڑ گیا۔

حنظلہ بن ربیع

رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب۔ آپ کی کنیت ابو ربعی تھی حضورؐ نے آپ کو غزوۂ طائف سے پہلے بنی ثقیف کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جنگ قادسیہ میں شرکت کی۔ کچھ عرصہ کوفہ میں رہائش پذیر رہنے کے بعد قرقیسیا چلے گئے اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں وفات پائی۔ حنظلہ بن ربیعؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

حنظلہ بن صفون کلبی

بنو امیہ کا ایک سپہ سالار اور والی جسے شوال ۱۰۲ھ/اپریل ۷۲۱ء میں یزید ثانی نے اس کے بھائی بشر بن صفوان کی جگہ مصر کا والی مقرر کیا۔ اس نے مصر میں تین سال تک حکومت کی اپنے دورِ حکومت میں اس نے مجسموں کو مسمار اور تصویروں کو مٹوا دیا۔ ہشام نے اسے والیٔ مصر کے عہدے سے برطرف کر دیا لیکن اس کے جانشین عبدالرحمٰن بن خالد کی نااہلی کے باعث دوبارہ حنظلہ بن صفوان بن زھیر الکلبی کو والیٔ مصر بنایا گیا۔ کیونکہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ صوبہ مصر پر بوزنطی یلغار کر کے قبضہ کر لیں گے۔ اس کے دوبارہ یہ عہدہ سنبھالنے پر صوبے کے مغرب میں خارجی بربروں نے بغاوت کر دی۔ یہ حکومت کے لئے ایک سنگین خطرہ تھا۔ باغیوں نے عرب فوج کو کافی نقصان پہنچایا۔ افریقہ کے ایک گورنر کلثوم بن عیاض کو قتل کر دیا۔ ہشام کے حکم پر حنظلہ بن صفوان نے ایک بہت بڑی فوج کی مدد سے باغیوں کو شکست فاش دی۔

بنو امیّہ کے زوال کے بعد ہونے والے ہنگاموں کے اثرات مغرب میں بھی محسوس کئے جانے لگے۔ اسی زمانے میں ایک غاصب عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری

نے تونس میں بغاوت کر دی اور حنظلہ سے کہا کہ قیروان کا علاقہ اس کے حوالے کر دے حنظلہ بن صفوان نے مذہبی رواداری کے پیش نظر کسی مزاحمت کے بغیر تمام علاقہ اسے دیدیا اور خود مشرق کی طرف چلا گیا۔

حنفی

مسلمانوں کا ایک فرقہ۔ حنفی کی تیغ اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نعمان بن ثابت نے اس کی ابتدا کی اور یہی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ سے پہلے بہت سے صحابہ نے استنباط اور اجتہاد سے کام کیا اور مجتہد اور فقیہہ کہلائے۔
فقہ حنفی کے ابتدائی ماخذوں میں مندرجہ ذیل تین چیزیں ہیں:-

۱۔ امام صاحب کی اپنی کتابیں اور فتوے۔
۲۔ مجلس فقیہہ کے فیصلے، یہ مجلس فقیہہ امام ابوحنیفہؒ نے غیر سرکاری طور پر شریعت کی تدوین کے لئے قائم کی تھی۔
۳۔ ان کے علاوہ آپ کے نامور شاگردوں مثلاً قاضی ابویوسفؒ امام محمد بن الحسن اور امام زُفرؒ کی تمام تصانیف اور آراء۔

آپ کے شاگردوں میں سے امام ابویوسفؒ نے حنفی فقہ کے استحکام اور تدوین کے لئے بہت کام کیا۔ ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں کچھ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک کتاب "الخراج" بھی شامل ہے۔ یہ کتاب بہت بہترین ہے۔ خود امام ابو شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ فقہ حنفی کو اس اعتبار سے فضیلت ملی کیونکہ یہ شروع ہی سے قوانین کا مجموعہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے گروہ کے بیشتر افراد بہترین متقن تھے۔ اسی لئے انہوں نے قاضی بن کر اسے عملی طور پر بنو عباس کی مملکت میں بھی نافذ کر دیا۔ حنیفہؒ کا قول ہے "میرے شاگردوں میں سے جس نے سب سے زیادہ علم حاصل کیا وہ ابو یوسفؒ ہے۔"

فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب فتاویٰ عالمگیریہ ہے۔ یہ کتاب مختلف فتاویٰ کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں حنفی مذہب کے بارے میں لکھی گئی تمام کتابوں کے اقتباسات شامل ہیں۔

فقہ حنفی کے لوگوں کو اہل الرائے بھی کہا جاتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ "امام صاحبؒ نے فقہ کی تدوین کی تو اس میں ہزاروں نئے پیش آئے جس میں کوئی صحیح حدیث یا صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا۔ اس لئے انہیں قیاس سے کام لینا پڑا۔ اس سے پہلے بھی قیاس کیا جاتا تھا لیکن اس وقت مسائل اتنی کثرت کے ساتھ موجود نہیں تھے۔

امام مالکؒ بھی رائے میں اعتقاد رکھتے تھے اور اہل الرائے میں شامل خیال کئے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار قیاس کی زیادتی کے باعث اہل الرائے کا لقب دیا گیا۔ ویسے بھی قرآن اور حدیث کے بعد قیاس کا عمل بذات خود کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ صحابہ کرامؓ بھی اکثر قرآن و حدیث میں کوئی تصریح نہ پا کر مجبوراً قیاس کرتے تھے جسے عام زبان میں رائے کہا جاتا ہے۔

فقہ حنفی میں ایک اور متنازعہ بات مسئلہ تقلید ہے۔ سقوط بغداد کے بعد سیاسی مرکزیت کے زوال کے ساتھ ساتھ فقہ کی روح بھی کمزور ہو گئی تو بعض علماء تقلید شخصی پہ زور دینے لگے اور اس طرح انہوں نے اجتہاد کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے تقلید پر اصرار کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس وقت بے شمار فرقے وجود میں آ چکے تھے جس کے باعث خیالات میں انتشار بڑھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ اجتہاد کے لئے جس بلند معیار اور علم و تقویٰ کی ضرورت تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا تھا لیکن یہ احناف اجتہاد کے خلاف نہیں۔

حنفی فقہ کے قبول عام کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ کا رائیہ فقہ 'انسانی ضرورتوں کی موجودگی میں نہایت موزوں اور مناسب لگتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت کی تہذیب سے بھی اس طریقہ فقہ کو بہت مناسبت تھی۔

حنیف

دین حق کا حامی اور ماننے والا۔ وہ شخص جو باطل سے حق کی جانب مائل ہو اور اس پر قائم رہے۔ خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دین کے پیروؤں کے لئے یہ لفظ قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ اس کے مقابلے میں بت پرستوں کا تذکرہ ہے۔ حنفائے الٰہی سے مراد وہ لوگ ہیں جو طرح طرح کی صعوبتیں و تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود سیدھے راستے سے نہ ہٹ سکیں۔ ابن ہشام کی ایک روایت ہے کہ حنیف کے معنی مسلمان کے ہیں اس لئے اسلام کو حنیفیت السمحۃ اور [illegible] الفطرۃ کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر کچھ اس طرح آتا ہے۔

"(اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو نہیں بلکہ ہم ابراہیمؑ کے طریقے پر ہیں جو ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" (سورۃ بقرہ ع ۱۶)

"ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ہمارے ایک بندہ [illegible] تھے وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" (سورۃ آل عمران ع ۱۰)

"بے شک ابراہیمؑ (لوگوں کے) پیشوا ہو گزرے ہیں۔ خدا کے فرمانبردار بندے جو ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔" (سورۃ نحل ع ۱۶)

حنین بن اسحاق

ایک حکیم اور مترجم۔ آپ کا تعلق مسیحی مذہب قبیلہ عباد کے ایک گھرانے سے تھا۔ حیرہ میں ۱۹۴ھ/۸۰۹ء - ۸۱۰ء یا ۱۹۲ھ / ۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عطار تھے آپ ایک طبیب اور یونانی و بعض دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے مشہور رہیں۔ عمر کے ابتدائی ایام میں آپ بغداد گئے اور [illegible] طبیب یوحنا ماسویہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ اور علم طب میں مہارت حاصل کی۔ آپ کے تراجم بہت مقبول ہوئے۔ چنانچہ مامون نے آپ کو دیوان الترجمہ کا انچارج بنا دیا۔ اور ان کی ہر ترجمہ شدہ کتاب کے وزن کے برابر سونا دیا جانے لگا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ آپ نے بعد میں زیادہ سونا حاصل کرنے کے لئے موٹا کاغذ اور جلی قلم کا استعمال شروع کر دیا۔ بعد میں خلیفہ متوکل نے انہیں طبیب خاص بنا لیا۔

حنین طبعاً بہت پرہیزگار تھے اس لئے [illegible] (THEODOSIUS) نے کفر کے شبے میں انہیں دائرہ مسیحیت سے خارج کر دیا اس رنج سے حنین نے زہر کھا کر صفر ۲۶۰ھ / دسمبر ۸۷۳ء میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

آپ کی لکھی ہوئی جو کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان میں سے ایک 'المسائل فی الطب للمتعلمین' ہے جس کا لاطینی اور عبرانی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب 'اجتماعات الفلاسفہ فی بیوت الحکمۃ فی الاعیاد و تفاوض الحکمۃ بینہم' ہے انہوں نے امراض چشم اور ان کے علاج پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں اس کے علاوہ دانتوں، معدے اور نبض کے متعلق لکھی گئی کتابوں کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے لیکن یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ترجموں میں زیادہ تر افلاطون، ارسطاطالیس اور بقراط کی کتابیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیسقوریدوس (DIOSCORIDES)

کی لکھی ہوئی کتاب مخزن الادویہ کا ترجمہ بھی انہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حکیم جالینوس کی کتابوں کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جس کی حنین بن اسحاق نے اصلاح یا ترجمہ نہ کیا ہو۔ ان کے تراجم بھی انہی سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

حنین، غزوہ

مکہ سے کوئی بیس پچیس میل دور ایک وادی تھی جس کا نام حنین تھا۔ یہاں پر ہوازن اور ثقیف دو قبیلے آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے اپنے آپ کو بہت جنگجو اور بہادر سمجھتے تھے۔ جب حضورؐ نے مکہ فتح کیا تو یہ دونوں قبیلے بجائے قبول اسلام کے مکہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ ہوازن کے رئیس اعظم مالک بن عوف النضری نے جو تیس سال کا پرجوش جوان تھا سب سے پہلے جنگ کا فیصلہ کیا اور تمام قبائل اور گروہوں کو اس جنگ میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ بنو جشم اور بنو نضر قبیلے مکمل طور پر لشکر میں شامل ہو گئے۔ بنو سعد بن بکر اور بنو ہلال میں سے بھی چند لوگ لڑائی کے لئے آ گئے۔ ثقیف قبیلہ کے بھی تمام سردار اور رئیس افراد شامل تھے۔

جب رسول اللہؐ کو ان کی تیاریوں کا علم ہوا تو آپؐ نے عبداللہ بن ابی حدرد کو حالات کی آگاہی کے لئے بھیجا۔ وہ سب قبیلوں کے پاس گئے اور تمام حالات حضورؐ کے سامنے بیان کئے جس کے بعد حضورؐ نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۶ شوال ۸ ہجری مطابق ۲۷ جنوری ۶۳۰ کو آپ ۱۲ ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے وادی حنین پہنچے۔ یہاں کفار نے اپنی کمین گاہوں سے اسلامی لشکر پر حملہ کر دیا جس سے گھبراہٹ پیدا ہو گئی اور دو ہزار نو مسلم افراد گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ انہیں دیکھ کر شروع میں شامل کچھ غیر مسلم اور دوسرے مسلمان بھی منتشر ہونے لگے۔ حضورؐ کے صرف چند جان نثار صحابہؓ میدان میں بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔ اس موقع پر رسولؐ خدا خود بھی ہاتھ میں تلوار لئے رجز پڑھ رہے تھے۔ "انا النبی لاکذب، انا ابن المطلب"۔

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ بھی ثابت قدم اصحاب میں شامل تھیں۔ وہ اپنے شوہر ابو طلحہؓ کے ہمراہ آئی تھیں۔ انہوں نے کمر کو چادر سے کس کر باندھ رکھا تھا اور اونٹ کی نکیل کھینچ کر اس کے نتھنوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں تاکہ وہ بے قابو نہ ہو اور ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی طرف سے سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور کافروں کی یہی جزا ہے۔" (سورۃ التوبہ: ۲۶)

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا "زور سے پکارو اے گروہ انصار! اے حدیبیہ میں درخت کے زیر سایہ بیعت کرنے والو!"

ابن ہشام سے روایت ہے کہ جونہی حضرت عباسؓ نے پکارا تو جس جس نے بھی اُن کی آواز سنی وہ لبیک لبیک کہتا ہوا واپس مڑا۔ جس کا اونٹ نہ مڑ سکا وہ ڈھال اور تلوار لے کر اونٹ سے اتر گیا۔ اس طرح پلک جھپکتے ہی میں ایک بہت بڑا گروہ حضورؐ کے گرد جمع ہو گیا۔ اور اپنے مخالفوں پر اس زور سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور تمام کفار سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں میدان خالی ہو گیا اور جگہ جگہ مال و اسباب اور دشمنوں کے اہل و عیال پیچھے رہ گئے۔ دشمنوں نے بھاگتے وقت اپنے تمام مال و اسباب اور اہل و عیال تک کی پرواہ نہ کی۔ چنانچہ یہ تمام مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ حضورؐ نے بھاگنے والوں کے تعاقب کا انتظام فرمایا اور ابو عامر اشعریؓ کو اوطاس کی طرف مامور فرمایا۔ انہوں نے بہت سے کافروں کو جہنم واصل کیا۔ لیکن آخر میں سلمہ بن دُرید کے تیر سے مہلک زخم لگا جس کے باعث آپ نے شہادت پائی۔ ابو عامر نے اپنی شہادت سے پہلے ہی اس کام پر ابو موسیٰ کو مقرر کر دیا تھا۔ بالآخر ابو عامر اشعریؓ کو نیزہ مارنے والے سلمہ بن درید کو بھی قتل کر دیا گیا۔ یہاں سے مسلمان یہ تمام علاقہ فتح کرتے ہوئے طائف پہنچ گئے۔ اس غزوہ میں جو مال غنیمت ہاتھ لگا اسے جعرانہ بھیج دیا گیا۔ ہوازن قبیلہ کے کچھ لوگ اوطاس میں جا کر جمع ہو گئے تھے مسلمانوں نے وہاں جا کر انہیں شکست دی۔

اس غزوہ میں جو صحابہؓ شہید ہوئے وہ ایمنؓ بن عبید اسامہؓ کے سگے بھائی، یزیدؓ بن زمعہ، سراقہ بن حارثؓ انصاری اور ابو عامر اشعریؓ ہیں۔

اس غزوہ میں چھ ہزار عورتیں اور بچے قیدی بنا لئے گئے۔ بے شمار اونٹ، بھیڑ بکریاں، تقریباً چالیس ہزار اوقیہ چاندی اور دوسرا سامان حرب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

حوّا

حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ۔ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کے سوتے وقت ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن ان کی پیدائش کے اس عمل کے دوران میں آدمؑ کو کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ علماء کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حوّا کو پیدا کرنے کا یہ طریقہ اس وجہ سے اختیار کیا کہ اس کے ذریعے میاں بیوی کی زندگی میں خوشگواری اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ آپ کا نام حوّا اس لئے رکھا گیا کیونکہ وہ ایک زندہ ہستی سے پیدا کی گئی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ انہیں حوّا اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر آدمی کی ماں ہے۔ خداوند کریم نے حضرت آدمؑ اور حوّا کو جنت میں رہنے کا حکم دیا اور انہیں ایک خاص درخت کے پاس جانے اور اس کا پھل کھانے سے منع فرما دیا۔ لیکن ابلیس نے اُکسایا اور دونوں کو شجر ممنوعہ کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر انہیں بہلا پھسلا کر اس درخت کا پھل کھانے پر بھی آمادہ کر لیا۔ بالآخر ان دونوں نے وہ پھل کھا لیا جس کے نتیجے میں انہیں اپنی عریانیت کا احساس ہونے لگا اور انہوں نے جنت میں موجود مختلف درختوں کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپنے کی کوشش شروع کر دی۔ اللہ تعالےٰ نے اس واقعہ کے بعد حضرت آدمؑ اور حوّا کو جنت سے زمین پر اُتار دیا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت آدمؑ ہندوستان کی سرزمین پر اُترے اور حضرت حوّا جدہ میں۔ بعد میں دونوں کی ملاقات مزدلفہ میں ہوئی۔

حواری

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی۔ قرآن پاک کی سورت آل عمران میں لفظ حَوَارِیُّوْنَ آیا ہے جو انہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر سورۂ نسا میں یوں آیا ہے "جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان (یہودیوں) سے انکار محسوس کیا تو کہا کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں میری مدد کریں گے۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کی راہ میں مدد دینے والے ہیں۔"

لفظ حواری حور سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں خالص سفیدی۔ اسی وجہ سے خالص اور صاف دل دوستوں کو بھی حواری کہا جا سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے ساتھ چونکہ صاف دل تھے اسی وجہ سے حواری کہلائے۔

اکثر ماہرین لغت کا خیال ہے کہ حواری کا مطلب دھوبی ہوتا ہے جو کپڑوں کو میل

میل سے پاک کرتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بھی ایک طرح کے دھوبی تھے جو لوگوں کو گناہوں کے میل سے پاک صاف کیا کرتے تھے۔

لسان نے نبی کی بڑھ چڑھ کر مدد کرنے والے کو حواری گردانا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں کے نام کچھ یوں ہیں۔ (۱) شمعون یعنی پطرس (۲) اندریاس جو شمعون کا بھائی تھا (۳) یعقوب بن زبدی (۴) یوحنا (۵) فلپس (۶) برتلمائی (۷) توما (۸) متی (۹) یعقوب بن حلفئی (۱۰) تدی (۱۱) شمعون قنانی (۱۲) یہودا اسکریوطی۔

بقول متی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سب کو حکم دیا تھا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا بلکہ صرف اسرائیل کے گھرانے کی بھیڑوں کے پاس جا کر چلتے چلتے یہ منادی کر دینا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے۔

آج کل انجیل کے جو مختلف نسخے ملتے ہیں ان میں ان بارہ حواریوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں لکھی ہوئی ہیں جنہیں تسلیم کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ متی سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بارہ حواریوں کے بارے میں فرمایا کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت بیٹھے گا تو تم بھی، جو میرے پیچھے ہو لئے ہو، بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے۔"

انجیلوں میں ان حواریوں کی ذاتی کمزوریوں کے بارے میں بھی مختلف بیانات ملتے ہیں مثلاً یہودا اسکریوطی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو معمولی سے لالچ میں آ کر یہودیوں کے ہاتھ پکڑوا دیا تھا۔ لیکن قرآن میں ان کے بارے میں ایسی باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا البتہ اُن کی خوبیوں کا تذکرہ کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔

حوالہ

علم فقہ کی ایک اصطلاح۔ اگر کوئی شخص اپنا قرض کسی تحریر یا ضمانت کے ذریعے سے دوسرے شخص کو منتقل کر دے تو اس تحریر یا ضمانت کو حوالہ کہا جاتا ہے اہلِ سنت والجماعت کے علماء کہتے ہیں کہ کسی کا قرض دوسرے پر ہو اور دوسرا فرد اپنے قرض کا حوالہ کسی تیسرے پر کرنا چاہے تو یہ بالکل درست ہو گا لیکن جس کے لئے حوالہ کیا جا رہا ہو اُسے اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو اسے قبول کرے یا انکار کر دے لیکن جس پر حوالہ کیا جا رہا ہو تو اُسے سوائے قبول کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ امام مالکؒ حوالے کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر محال (جس کے لئے حوالہ کیا جائے) محال علیہ (جس پر حوالہ کیا جا رہا ہے) کا دشمن ہو تو پھر یہ لازمی نہیں کہ وہ حوالے کو قبول کرے۔

حُور

بہت زیادہ گوری چٹی عورت جس کی آنکھوں کی پتلیاں چمکدار سیاہ ہوں۔ قرآن مجید کی بہت سی سورتوں اور آیات میں حورانِ بہشت کا ذکر آیا ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ جنت میں حوریں موجود ہوں گی، جو بے انتہا خوبصورت ہوں گی اور بد اخلاقی، بدصورتی، بد نمائی اور سوءِ معاشرت جیسی آلودگیوں سے یکسر پاک ہوں گی۔ ان کی دوشیزگی کا یہ عالم ہو گا کہ انھیں کسی جن و بشر نے اس سے پہلے چھوا تک نہ ہو گا۔ اُن کی آنکھیں موتی کی طرح چمکدار اور یاقوت و مرجان سے ملتی جلتی ہوں گی۔ قرآن مجید کی سورۃ الدُّخان میں آیا ہے۔ "اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں اُن سے بیاہ دیں گے۔"

علماء نے حوروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی حورانِ انس اور دوسری حورانِ جنّ۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ مختلف جنتوں میں مختلف اوصاف کی مالک حوریں ہوں گی۔ بہت سے علماء حوروں کے بیان کے سلسلے میں آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض مفسرین ان جمالی پیکروں کو حقیقی معنی میں لیتے ہیں اور بعض مجازی۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں حورانِ بہشت کا ذکر صرف تمثیل کے طور پر آیا ہے۔ حقیقت میں ان سے مراد جنت کی لذتیں اور خوشیاں مراد ہیں جن کے اظہار کے لیے یہ مادی اور جسمانی استعارے استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کی مختلف آیات میں حوروں کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان کی تعبیر حسن بصریؒ نے اس طرح کی ہے کہ حوریں دراصل بنو آدم کی نیک عورتیں ہیں۔"

قرآن مجید کی ایک آیت " زَوَّجْنَا هُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ

ترجمہ: "خوبصورت آنکھوں والی حوریں اُن سے بیاہ دیں گے۔" میں لفظ زَوَّجْنَا کے لفظ سے ہمارا ذہن شادی یا نکاح کی جانب مائل ہو جاتا ہے لیکن یونسؒ کہتے ہیں کہ جنت میں نکاح نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کو حوروں سے ملا دیا گیا۔ اور انسانوں کو ان کا ساتھی بنا دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی حور کا لفظ قرآن مجید میں بہت سی آیات میں آیا ہے جن میں حوروں کی بے شمار صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام صفات ہمارے شعور سے بلند ہیں۔

حوریں درحقیقت جنت کی نعمتوں میں شامل ہیں۔ جس طرح ہم جنت کے پھلوں کو دنیاوی پھلوں پر، جنت کے پانی، دودھ، نہروں اور چشموں [illegible] دنیا کے پانی، دودھ، نہروں اور چشموں پر فوقیت دیتے ہیں [illegible] یا مٹھاس کا درست اندازہ لگانے سے قاصر ہیں بالکل اسی طرح [illegible] حوروں کے بارے میں دنیا کی عورتوں کو سامنے رکھ کر کوئی [illegible] اس کے علاوہ جس طرح جنت کے پھل، دودھ، شہد اور [illegible] اور عورتوں دونوں کے لیے ہیں اسی طرح حوریں بھی مردوں [illegible] ہیں۔ لفظ حور صرف حسن، خوبصورتی، نزاکت [illegible] استعمال ہوا ہے۔

حوضِ کوثر

جنت میں موجود ایک حوض۔ حوضِ کوثر کے بارے میں بہت سی [illegible] ملتی ہیں۔ حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے شب معراج [illegible] بتایا "میں ایک حوض کے پاس سے گزرا [illegible] کے کنارے موتیوں کی [illegible] تھے۔ میں نے جبرائیل سے کہا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا حوض کوثر [illegible] کہ اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ اس کی مٹی مشک کی طرح خوشبودار تھی۔"

ایک اور حدیث حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا [illegible] حوض ایک مہینے کے سفر کی مسافت جتنا لمبا ہو گا۔ اور اس کے سب کنارے برابر ہوں گے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید۔ مشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار اور اس کے کنارے پر پینے کے برتن آسمان پر موجود ستاروں سے زیادہ ہوں گے۔ حوضِ کوثر کا پانی جو بھی پیئے گا وہ کبھی پیاسا نہ رہے گا۔

ہر جنتی اس حوضِ کوثر سے پانی پی سکے گا جو اتنا لذیذ و شیریں ہے کہ دنیا کی کوئی شئے اتنی لذیذ اور شیریں نہیں ہے۔ حضرت سہل بن سعدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں حوضِ کوثر کی نگرانی کروں گا اور جو میرے قریب سے گزرے گا وہ سیراب ہوگا اور جس نے اس کا پانی پی لیا وہ پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ اس وقت میرے پاس کئی گروہ آئیں گے جن کو میں جانتا ہوں گا۔ وہ بھی مجھے پہچان لیں گے۔ مگر پھر میرے اور اُن لوگوں کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا۔ اس وقت میں کہوں گا۔ یہ تو میرے اُمتی ہیں تب خدا کہے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ انہوں نے بدعتیں کیں۔ ان کی تباہی ہو۔ پھر میں بھی کہوں گا کہ ایسے لوگوں کی تباہی ہو جنہوں نے میرے بعد بدعتیں کیں۔ (متفق علیہ)

حیا

شرم کرنا۔ حیار کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم نفسانی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں پیدا کیا ہے۔ جیسے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں برہنہ ہونے سے حیا کرنا یا لوگوں کی موجودگی میں جماع کرنے سے پرہیز کرنا وغیرہ۔ حیار کی دوسری قسم ایمان سے تعلق رکھتی ہے جس کی وجہ سے مسلمان اللہ تعالیٰ کے خوف کے باعث گناہ کرنے سے بچا رہتا ہے۔

حیار کی فضیلت کے بارے میں حضور اکرمؐ کی کئی احادیث ملتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "حیار ایمان کی شاخ ہے"۔ ایک اور حدیث ہے "حیار بھلائی ہی بھلائی ہے"۔ ایک اور موقع پر آپ نے اسلام کی صفات گنا تے ہوئے کہا کہ "اسلام کی صفت حیا ہے"۔ ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی صفت ہوتی ہے۔ حیار کو اسلام میں اتنا دخل ہے کہ حضورؐ نے اسے اسلام کی ایک صفت قرار دیا۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ کا گذر ایک انصاری شخص کے قریب سے ہوا۔ وہ شخص اپنے بھائی کو حیار کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا کہ زیادہ حیا نہ کیا کر، حضورؐ نے فوراً اس سے کہا "اسے چھوڑ دے کیونکہ حیار ایمان کی شاخ ہے۔ جس قدر زیادہ ہو بہتر ہے (صحیح بخاری)

ابن مسعود کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "سابق انبیار کی باتوں میں جو بات بغیر کسی ترمیم اور تبدیلی کے بغیر پائی ہے وہ یہ ہے کہ جب تو شرم نہیں رکھتا تو جو چاہے کر۔ ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کنواری لڑکی سے زیادہ شرمیلے تھے جو ہمہ وقت پردے میں رہتی ہے۔ رسولؐ اکرم جب کسی ایسی چیز کو دیکھتے جو آپ کو ناگوار معلوم ہوتی تو (اگرچہ آپ شرم کی وجہ سے ناگواری کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر) ہم لوگ اسے آپ کے چہرہ مبارک ہی سے معلوم کر لیتے تھے۔ (صحیح بخاری)

حیار کرنے کے بارے میں جہاں ہمیں احکامات یا احادیث ملتی ہیں وہاں بعض جگہ حیار نہ کرنے کے بارے میں احکامات ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ حق کہنے میں حیار نہیں کرتا" پس حق بات کہنے میں حیا یا شرم کو آڑے نہیں آنا چاہیئے۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور اہلِ ایمان بہشت میں جائیں گے جبکہ بے حیائی اکھڑ پن ہے اور اکھڑ لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے"۔

حیات المیر قادری

پورا نام جمال حیات المیر قادری تھا۔ حضرت سید نصر آپ کے بھائی اور حضرت غوث الاعظم آپ کے دادا ہیں۔ آپ کے بارے میں خزینۃ الاصفیار کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری نے حضرت شاہ ابوالمعالی قادری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ حیات المیرؒ قادری شکل و صورت میں حضرت غوث الاعظمؒ سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ بہت خوبصورت تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ابھی تک زندہ ہیں کیونکہ حضرت غوث الاعظمؒ نے اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کی حیات جاوداں کے لئے دعا کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ مخازن صفات الاولیار کے مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ حیات المیر سے جب کبھی عمر کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے کہا کہ مجھے حضرت غوث الاعظمؒ کبھی کبھار گود میں بٹھا لیتے اور محبت بھرے جذبات کے ساتھ سینے سے چمٹا لیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کی ملاقات حضرت امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوگی اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو میرا بھی سلام کہنا۔

آپ لاہور تشریف لائے تو قبرستان میانی صاحب کے احاطہ ہی میں ٹھہرے۔ آپ نے اپنی لاہور میں رہائش کے دوران میں حضرت محکم الدین شاہ مقیم قادری حجروی سے بیعت لی اس کے علاوہ کتنے ہی دوسرے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور بے شمار لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا یہاں تک کہ لاہور میں آپ کا فیض عام ہوگیا۔

بہت سے لوگوں نے آپ کی پیدائش کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ تحقیقات چشتی کے مطابق آپ کی ولادت ۵۲۲ھ یعنی ۱۱۲۸ء میں ہوئی۔ کتاب اذکار الاخیار کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے اپنی وفات سے پہلے حیات المیر کو اپنے پاس بلایا اور کہا آپ کی عمر بہت لمبی ہوگی۔ یہاں تک کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور جب یہ موقع آئے تو انہیں ہمارا سلام کہنا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بری امام قادری آپ کے خلیفہ تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی کتاب 'حدیقۃ الاولیار' میں لکھا ہے کہ آپ نے حضرت حیات المیر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

حیات بعد الموت

پرانے زمانے میں قومیں زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ لوگ موت کو ایک لمبی نیند سے تعبیر کرتے تھے اور مُردے کے ساتھ اس کی روزمرہ ضروریات کی تمام اشیا دفن کر دیتے تھے تاکہ نیند سے جاگنے کے بعد اُسے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ پرانے زمانے کے مصر میں اس کے آثار، اہرامِ مصر کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ جن میں اس وقت کے بادشاہوں کو دفن کیا گیا تھا۔ وادیٔ سندھ، سومیری اور اشوری قوموں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد انسان کو ظلمات کی ملکہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ لوحِ محفوظ کی مدد سے انسان کے عملوں کا محاسبہ کرتی ہے اور اگر اعمال نیک ہوں تو اُسے جنت میں بھیج دیتی ہے لیکن اگر اعمال بد ہوں تو پھر اس کے لئے جہنم کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ہندو بھی آواگون (تناسخ) کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آتما (روح) امر ہوتی ہے اور انسان کے اعمال کے مطابق جون بدلتی رہتی ہے۔ اور آخر کار دیوتا بن جاتی ہے۔ بدھ مذہب کے ماننے والے افراد حیات بعد الممات کو نہیں مانتے۔

اسلام کے بنیادی ارکان میں حیات بعدالممات بھی شامل ہے ۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ :

" تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ۔ حالانکہ تم بے جان تھے ، اس نے تمہیں زندگی عطا کی ۔ پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا ۔ وہی تمہیں زندگی عطا کرے گا ۔ پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے ۔" (البقر ۔ آیت ۲۸)

قرآن مجید میں حیاۃ الدنیا کا ذکر کئی جگہ آیا ہے جو دنیاوی زندگی اور آخرت کے بعد کی زندگی میں واضح فرق بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ دنیا میں اللہ تعالےٰ کی مخلوق زندگی کے حسن و جمال سے بھرپور ہے ۔ لیکن اس میں ایسی کوئی کوئی چیز نہیں جسے آئندہ کی زندگی کے لئے مثال کے طور پر پیش کیا جاسکے ۔ قرآن میں آیا ہے کہ :

" دنیاوی زندگی اُخروی زندگی کے مقابلے میں صرف کھیل کود کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ حقیقی زندگی کو دوام حاصل ہے ۔"

قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کو بارش سے مشابہ قرار دیا ہے جو کھیتوں کو زرخیز بناتی ہے اور انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ تمام فصلیں جو زمین پر لہلہا رہی ہیں اس کی محنت کا نتیجہ ہے ۔ وہ انہیں کاٹنے لگتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا فیصلہ سامنے آتا ہے وہ ان فصلوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے ۔ اور ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے وہ کبھی موجود ہی نہ تھی ۔ یعنی دنیاوی زندگی ہی سب کچھ سمجھ لینے اور جزا و سزا اور آخرت کی زندگی سے بے نیاز ہو جانے کو بھی غلط ٹھہراتا ہے ۔ لیکن اسلام دنیاوی زندگی کی مذمت نہیں کرتا ۔ کیونکہ اس زندگی کے اعمال پر آئندہ زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے ۔

قرآن مجید کی سورۂ بقر میں آیا ہے کہ " اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک بستی میں ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی ۔ اس نے کہا ۔ یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا ؟ " اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی ۔ اور وہ سو سال تک مردہ پڑا رہا ۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا ۔ " بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو ؟ " اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا ۔" فرمایا ۔ " تم پر سو سال اسی حالت میں گزر چکے ہیں ۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے ۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں ۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں ۔" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا ۔ " میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔" (سورۂ بقر آیت ۲۵۹)

اس سے ہمیں علم ہو جاتا ہے کہ خدا نے حیات بعدالموت کے عقیدے کو انسانوں کے لئے ماننا ضروری بنا دیا ہے ۔ اس واقعے میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی نبی ہو لیکن ان کا نام کہیں نہیں آیا ۔

اللہ تعالےٰ نے اسی لئے شہید کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے قرآن مجید میں آیا ہے :

" جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو وہ حقیقت میں زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں ۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم اور مطمئن ہیں (آل عمران ۔ آیت ۱۶۹)

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ موت کا لفظ اور اس کا تصور انسان کے ذہن پر ایک ہمت شکن اثر ڈالتا ہے اسی لئے اللہ تعالےٰ نے لوگوں کو اس اثر سے بچانے کے لئے بھی شہدا کو مُردہ کہنے سے منع فرمایا ہے ۔ اور ان کے ذہنوں میں یہ تصور اجاگر کر دیا ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے وہ حقیقت میں حیات جاوداں پاتا ہے ۔

حیدر

حضرت علیؓ بن ابی طالب کا ایک لقب تو آپ کی والدہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد نے آپ کو دیا تھا ۔ ۷ھ میں خیبر کی لڑائی میں حضرت علیؓ نے مرحب یہودی کے جوابی رجز میں اپنا یہ نام استعمال فرمایا تھا ۔ حیدر کرار آپ کا نام شجاعت اور فتح خیبر کی وجہ سے زبان زد ہے ۔ آنحضرت صلعم نے اسی موقع پر فرمایا تھا کہ کل انشاء اللہ جھنڈا اس مرد کو دوں گا جو کرار (بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا) اور نہ بھاگنے والا ہوگا ۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوگا ۔ اللہ اور اس کا رسولؐ اس سے محبت کرتے ہونگے ۔ وہ میدان سے اس وقت تک واپس نہ آئے گا جب (خیبر) تک اللہ اس کے ہاتھوں فتح نہ کر دے ۔ (ش ۔ ق)

حیدرآباد دکن

غیر منقسم ہندوستان کی ایک ریاست ۔ تقسیم کے بعد یہ ریاست انگریز کے اثر سے آزاد ہو گئی ۔ بعد میں ہندوستان نے اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا ۔ اسے ہندوستان میں شمول سے پہلے آصفیہ سلطنت بھی کہتے تھے ۔ اس سلطنت کی بنیاد مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت آصف جاہ صوبیدار نے ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء میں رکھی ۔ اس وقت یہ سلطنت دریائے نربدا [illegible] کوکن سے مدراس تک پھیلی ہوئی تھی ۔ انگریزوں نے [illegible] مستحکم کرنا شروع کر دیئے تھے اور یہاں [illegible] چھیننا چاہا تو انہوں نے آصف جاہ سے امداد طلب کی ۔

آصف جاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا مظفر [illegible] نے اسے قتل کر دیا ۔ اس کے بعد آصف جاہ کا بیٹا صلابت [illegible] بن گیا ۔ اس کے دور میں فرانسیسی کافی عروج حاصل کر چکے تھے [illegible] نے اس ریاست میں سر اٹھایا ۔ اور ریاست کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا [illegible] میں یورپ کی سیاست نے کروٹ بدلی اور فرانس [illegible] ساتھ ہی انگریزوں نے [illegible] کرنا شروع کر دیا ۔ [illegible] کے وزیروں نے اسے قید کر لیا اور آصف جاہ کے چوتھے بیٹے نظام علی [illegible] تخت پر بٹھا دیا ۔ اس نے آصف جاہ ثانی کے نام سے حکومت کرنا شروع کر دی ۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی ۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آصف جاہ ثانی نے مرہٹوں کے مفتوحہ علاقوں کو پھر سے اپنی ریاست میں شامل کر لیا ۔ اس کے انتقال کے بعد آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ تخت نشین ہوا ۔ اس کے دور حکومت میں [illegible] ریاست حیدرآباد کی داخلی سیاست میں اپنے قدم جما لیے تھے [illegible] وزیر ارسطو کا انتقال ہوا تو انہوں نے میر عالم کو وزیر مقرر کر دیا ۔ اس [illegible] میں ریاست کا مالی نظام بگڑ گیا اور [illegible]

ثالث کو قرض کی ضرورت پڑی۔ حیدر آباد میں ایک انگریز ساہوکار نے ۲۴٪ سود کی شرح پر قرض دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۳ء تک ریاست کے ذمّہ ایک کروڑ سولہ لاکھ کا قرض واجب الادا ہو چکا تھا۔

آصف جاہ ثالث کے بعد آصف جاہ رابع نواب ناصر الدولہ اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں تخت پر بیٹھے۔ انہوں نے چندو لعل کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا۔ کیونکہ ریاست اس وقت تک دو کروڑ روپیہ کی مقروض ہو چکی تھی۔ انہوں نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ انگریزوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اور انہوں نے اس کی حکومت کو طرح طرح کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ پھر قرض کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ چنانچہ ۳۶ لاکھ سالانہ کی قسط مقرر کی گئی۔ ناصر الدولہ نے اسے اپنی تذلیل گردانا۔ اور تمام قرض کی ادائیگی کے لیے چار ماہ کی مہلت مانگی۔ انگریزوں نے اسے مہلت نہ دی بلکہ حیدر آباد پر چڑھائی کی دھمکی دی۔ اس کے بعد ایک معاہدہ طے پایا جس کی رُو سے مئی ۱۸۵۳ء میں برار کا علاقہ انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں ناصر الدولہ کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ افضل الدولہ آصف جاہ خامس تخت نشین ہو گئے۔ جنگِ آزادی کے بعد حیدر آباد دکن انگریزوں کے دباؤ میں آ گیا اور مجبوراً انگریزوں

۔ فنِ تعمیر کا شاہکار "چار مینار"

کی امداد و اعانت کرنا پڑی۔ اس کے بعد انگریزوں کا ریاست حیدر آباد میں اثر و رسوخ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۰، مارچ [illegible]ء کو انگریزوں نے ریاست حیدر آباد کو اپنا زیرِ دست علاقہ بنا لیا۔

حیدر آباد ریاست تعلیم کے میدان میں بہت پیش پیش نظر آتی ہے۔ یہاں [illegible] میں اعلیٰ مغربی تعلیم کا ایک کالج کھولا گیا جس میں ۱۹۰۷ء میں پہلی مرتبہ اعلیٰ مغربی تعلیم کا آغاز ہوا اور اسی دن سے مشرقی تعلیمی نظام رُو بہ زوال ہونا شروع ہوا۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۶ء تک دارالعلوم کی ترقی قرطبہ اور بغداد کا منظر پیش کرتی رہی۔ لیکن جب ۱۹۰۷ء میں اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع کر دیا۔ تو اس کی تمام تر ساکھ ختم ہو گئی۔ دو سال بعد حیدر آباد میں ایک جامعہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جو بالآخر آصف جاہ رابع میر عثمان علی کے عہد میں قائم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ ۱۳۲۶ھ/۱۹۱۸ء میں تقریباً قائم ہو چکی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کی تشکیل میں بارہ سال کا عرصہ لگا۔ جامعہ میں درس و تدریس کا ذریعہ اردو زبان کو بنایا گیا تھا اس لیے سب سے پہلے شعبہ دارالتصنیف و ترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور یورپی زبانوں کے اردو میں ترجمے کا کام شروع ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ نے پہلا میٹرک کا امتحان اور ۱۹۲۲ء میں بی اے کا پہلا امتحان منعقد کیا اور ۱۹۲۵ء تک اس جامعہ سے ایم اے تک کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سلطنت آصفیہ کے زمانے میں یہاں کے فرمانرواؤں نے شعر و ادب کی سرپرستی کی۔ مشہور شعرا جو اس دور میں حیدر آباد دکن میں آئے اُن میں مرزا داغ دہلوی نمایاں نظر آتے ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اپنی زندگی کا زیادہ تر حصّہ اسی علاقے میں بسر کیا۔

حیدر آباد سندھ

کراچی سے ۱۲۶ میل کے فاصلے پر واقع پاکستان کا چوتھا بڑا شہر۔ مشہور ہے کہ حیدر آباد ایک قدیم شہر نیرون (یا نیراں) کوٹ کی جگہ پر آباد ہے۔ اس شہر کو محمد بن قاسم الثقفی نے دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں فتح کیا تھا۔ لیکن موجودہ شہر حیدر آباد کی بنیاد زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس شہر کو ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑا نے بسایا تھا۔ اس نے ایک ٹیلے پر جو آج بھی حیدر آباد میں موجود ہے، ایک قلعہ بنوایا اور اس شہر کا نام حضرت علیؓ کے لقب پر حیدر آباد رکھا۔ آجکل یہ ٹیلہ گنجو ٹکر کے نام سے مشہور ہے۔ غلام شاہ کلہوڑا کا ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد حیدر آباد شہر پر تالپوروں کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ نئے حاکم فتح علی خاں نے اس شہر کو اپنی مرضی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرایا۔ حیدر آباد سندھ پر تالپوروں کا خاندان ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء تک حکمران رہا۔ میانی کی جنگ کے بعد تمام سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے اس علاقے کا دارالحکومت حیدر آباد سے کراچی منتقل کر دیا۔

حیدر آباد کی مشہور عمارتوں میں سندھ کے سابق حکمرانوں کے مقبرے ہیں جو میروں کے مقبرے کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ مقبرے ٹیلے کے شمالی جانب واقع ہیں اور کلہوڑوں کے فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے یہ شہر پاکستان کا حصّہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں سندھ یونیورسٹی کو حیدر آباد منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۲ء سے سندھی زبان اور ادب کے فروغ اور قدیم سندھی مصنّفین کی عربی اور فارسی تصانیف کی طباعت اور اشاعت کا ایک بورڈ بھی حیدر آباد ہی میں قائم ہوا۔ حیدر آباد کے مشرقی جانب پاکستان کا عظیم الشان غلام محمد بیراج ہے۔ اس کا افتتاح ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔
حیدر آباد پاکستان کے بڑے بڑے صنعتی مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس

شہر میں کپڑا بننے کے بے شمار ہیں کارخانے ہیں۔ اس کے علاوہ شیشے کا سامان مٹی کے برتن، صندوق اور فرنیچر کی صنعتوں میں اس شہر کا ایک منفرد مقام ہے۔

یہاں کی زیادہ تر آبادی بلوچوں، سیّدوں، راجپوتوں، جاٹوں میرنسل کے سندھیوں، میواتیوں اور مہاجروں پر مشتمل ہے۔ سندھی اور اردو عام بول چال کی زبانیں ہیں۔

حیدر بن علی

(ولادت ۹۹۲ھ ۱۵۸۵ء) حسینی رازی ایرانی مورخ۔ ایک بڑی تاریخ عالم "تاریخ حیدری" کا مصنف۔ اس تصنیف کو جغرافیائی تقسیم کے مطابق پانچ حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ (۱) عالم عرب (۲) ایران (۳) وسطی ایشیا اور مشرق بعید (۴) المغرب (۵) ہندوستان۔ یہ سیاسی تاریخ پر بحث کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی قدروقیمت خاص طور پر ان معلومات کے لیے ہے جو یہ وسطی ایشیا کے متعلق بہم پہنچاتی ہے۔ (ش۔ ج)

حیدر علی

(۱۷۲۱ء — ۶ دسمبر ۱۷۸۲ء) جنوبی ہند کی سلطنت خداداد میسور کے بانی۔ آپ قریشی النسب تھے۔ آپ کا خاندان سولہویں صدی عیسوی میں مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے ہندوستان آیا۔ آپ کے والد شیخ فتح محمد جنوبی ہند کے مغل صوبے سرا کے منصب دار تھے۔ آپ کی والدہ مجیدہ بیگم وہاں کے زمیندار اکبر علی خان کی دختر تھی۔ حیدر علی کی عمر پانچ برس کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی پرورش آپ کے چچا زاد بھائی حیدر صاحب نے کی جو میسور کی فوج میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے آپ کو فن سپاہ گری میں طاق کردیا حیدر علی نے سب سے پہلے کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ کے بھائی عبدالوہاب کی ملازمت اختیار کی بعد میں میسور کے راجہ نے آپ کو سرنگا پٹم میں ریاستی فوج کے ایک دستے کی کمان دے دی۔ کرناٹک کی جنگوں میں آپ کی جانبازی اور فوجی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ۱۷۵۲ء میں آپ کو ڈنڈیگل کا گورنر مقرر کردیا گیا۔ جس زمانے میں [illegible] کی فوجیں کرناٹک کی لڑائی میں مصروف تھیں مرہٹہ پیشوا بالاجی باجی راؤ نے میسور پر حملہ کردیا۔ راجا نے ایک کروڑ روپیہ دینے کا وعدہ کیا اور بطور ضمانت ریاست کا بیشتر حصہ مرہٹوں کی تحویل میں دے دیا۔ جب رقم ادا کی گئی تو مرہٹے ۱۷۵۵ء میں دوبارہ حملے کی سوچنے لگے۔ حیدر علی نے مطلوبہ رقم راجا کو فراہم کرکے دی۔ اس پر راجا نے آپ کو فتح حیدر بہادر کا خطاب دیا اور میسور کی افواج کا سپہ سالار مقرر کرکے مرہٹوں سے معاملات طے کرنے کے کل اختیارات دے دیئے۔ حیدر علی نے صلح کی بجائے جنگ کا راستہ اختیار کیا۔ مرہٹہ فوج بھاگ گئی۔ ۱۷۶۰ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کے خلاف نظام دکن کے بھائی بسالت جنگ کو فوجی مدد دی اور قلعہ ہوسکوٹہ فتح کیا۔ اس کے عوض بسالت جنگ کی سفارش پر شہنشاہ دہلی نے صوبہ سرا کی صوبیداری کا فرمان حیدر علی کے نام جاری کردیا۔ اگست ۱۷۶۰ء میں میسور کے وزیر کھنڈے راؤ نے راجا کے ساتھ مل کر حیدر علی کو بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ حیدر علی نے اسے شکست دی اور سرنگاپٹم پر قبضہ کرلیا۔ کھنڈے راؤ کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا اور راجا کے مصارف کا انتظام کرکے حکومت کے اختیارات خود سنبھال لیے۔

اب حیدر علی نے نندی، بدنور اور منگلور کو فتح کرکے گوا پر چڑھائی کردی۔ پرتگیزیوں نے کاروار کا علاقہ دے کر جان بچائی۔ اسی زمانے میں حیدر علی نے ایک بحری بیڑا تیار کرکے علی راجا کو امیر البحر مقرر کردیا۔ علی راجا نے جزیرہ مالدیپ پر قبضہ کرکے راجا کی آنکھیں نکلوا دیں۔ حیدر علی نے اسے معزول کردیا۔ اس پر نائروں نے بغاوت کردی۔ حیدر علی انھیں شکست دیتا ہوا کالی کٹ تک پہنچ گیا کالی کٹ کی تسخیر کے بعد کوچین کے راجا نے بھی اطاعت قبول کرلی۔ ۱۷۶۳ء میں مرہٹوں نے پھر میسور کا رخ کیا اور بدنور پر قبضہ کرلیا لیکن حیدر علی کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گئے۔ حیدر علی کی فتوحات سے خوفزدہ ہو کر انگریزوں نے نظام و مرہٹوں سے اتحاد کرلیا۔ کرناٹک کا نواب بھی انگریزوں کی سرپرستی قبول کر چکا تھا۔ ان سب کی متحدہ فوجوں نے میسور پر حملہ کردیا۔ یہ میسور کی پہلی جنگ ۱۷۶۷ء — ۱۷۶۹ء کے نام سے معروف ہے۔ اس جنگ میں حیدر علی کو فتح ہوئی انگریزی فوج سراسیمگی کی حالت میں سارا سامان چھوڑ کر واپس ہوئی۔ مرہٹے اور نظام دونوں حیدر علی سے سمجھوتا کرکے جنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ [illegible] سپہ سالار [illegible] کی طرف بڑھا تو حیدر علی نے [illegible] کے [illegible] قبضہ کرلیا۔ [illegible]

ایرو تو بھی فتح [illegible]
مجبور ہو [illegible]
علاقے اور قیدی واپس کردیئے [illegible]
محمد علی کی [illegible] حیدر علی کے [illegible]

۱۷۷۰ء میں پیشوا [illegible] میسور پر [illegible]
انگریزوں نے حیدر علی کی مدد کرنے سے [illegible]
مرہٹہ فوج کا مقابلہ کرنا [illegible] مرہٹوں نے [illegible]
۱۷۷۲ء میں پیشوا مر گیا۔ [illegible] سپہ سالار [illegible]
واپسی کے بعد ۱۷۷۲ء میں حیدر علی نے [illegible]
نیلگری ۱۷۷۴ء میں بلاری اور ۱۷۷۵ء میں [illegible]
۱۷۷۹ء میں کڈپہ فتح کرکے ایک وسیع اور مستحکم ریاست قائم کرلی۔

۱۷۸۰ء میں میسور کی دوسری جنگ شروع ہوگئی۔ [illegible] مدراس کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس سے حیدر علی [illegible] انگریزوں نے پانڈیچری فتح کرکے فرانسیسیوں کی دوسری بندرگاہ [illegible] کرلیا۔ یہ بندرگاہ حیدر علی کے مقبوضہ علاقے میں [illegible] کرناٹک پر حملہ کردیا اور آرکاٹ [illegible] بندر فتح کرلیا

۱۷۸۱ء میں پولی پور کی مشہور لڑائی میں انگریزوں کی فوج کو شکست فاش دی اور سپہ سالار کرنل بیلی کے علاوہ دو ہزار سپاہی گرفتار کر لیے۔ پھر پیش قدمی کرتے ہوئے ویلور اور ارکاٹ کے مستحکم قلعے فتح کیے۔ انگریزوں کا ایک وفد صلح کی درخواست لے کر آیا لیکن حیدر علی نے وفد کو ناکام لوٹا دیا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے یہ دیکھ کر کہ کرناٹک پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا ہے اور رفتہ رفتہ مدراس کا علاقہ بھی ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، جنرل آئر کو سپہ سالار بنا کر مدراس روانہ کیا۔ لیکن چند روز میں ۱۷۸۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ کڈلور کے مقام پر شدید جنگ کے بعد انگریزوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور قلعہ آرنی پر بھی حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت جب انگریزوں کی حالت بہت کمزور تھی حیدر علی کا ارکاٹ کے قریب انتقال ہو گیا۔ حیدر علی کی میت کو سرنگا پٹم لا کر لال باغ میں دفن کیا گیا۔ جس پر ٹیپو سلطان نے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا۔ حیدر علی طویل قامت، گرانڈیل اور بارعب شخص تھا۔ ان پڑھ مگر ادب شناس تھے۔ آپ کی سلطنت اسی ہزار مربع میل علاقے پر پھیلی ہوئی تھی اور کئی نواب اور راجا ان کے خراج گزار تھے۔ (شریف جاوید)

حیدر مرزا

(۱۵۰۰ء — ۱۵۵۱ء) ایک فارسی مؤرخ۔ تاریخ رشیدی کا مصنف وہ چغتائی خان یونس کا نواسہ اور بابر کا خالہ زاد بھائی تھا۔ ۱۵۰۸ء میں اپنے باپ کے قتل کے بعد ۱۵۰۹ء میں کابل پہنچا۔ بابر نے بیٹے کے طور پر اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے ازبکوں کے خلاف فاتحانہ مہموں میں اور بخارا و سمرقند کی دوبارہ فتح میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ بابر کو چھوڑ کر فرغانہ میں منگول حکمران سعید خان کے پاس چلا گیا۔ سعید خان نے اسے گرگان کا خطاب دیا۔ خان کے حکم پر اس نے بدخشاں، کافرستان، لداخ اور تبت میں کئی مہمیں سر کیں۔ ۱۵۳۳ء میں خان کی وفات پر حیدر مرزا کو ملک چھوڑ کر تیموریوں کے پاس جانا پڑا۔ ۱۵۴۰ء میں وہ کشمیر فتح کرنے اور وہاں اپنی آزاد سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کشمیر کی حکمرانی کے زمانے میں اس نے اپنی کتاب تالیف کی جو کشمیر کے سابق حکمران عبدالرشید کے نام کی مناسبت سے "تاریخ رشیدی" مشہور ہوئی۔ یہ کتاب نہ صرف حیدر کے ہم وطنوں میں مقبول ہوئی بلکہ برصغیر، ترکستان اور ایران میں بھی مشہور ہوئی۔ بعد کے تمام جغرافیہ نویسوں اور مورخین نے اسے بطور سند استعمال کیا ہے۔ (ش۔ ج)

حیرہ

لخمی بادشاہوں کا دارالسلطنت، جو کوفے سے مغرب، مشہد علیؓ سے جنوب مغرب کی جانب نجف کی جھیل کے کنارے واقع تھا۔ یہ شہر تمدن کے ایک خاص معیار کو پہنچ گیا تھا۔ ان بادشاہوں کے دربار میں شعرا جمع رہتے تھے۔ حیرہ کے لوگ فن کتابت بخوبی جانتے تھے اور وہیں سے یہ فن عرب میں پھیلا۔ ۶۰۲ء میں نعمان سوم کی موت کے بعد ایرانی بادشاہوں نے لخمی باجگزار سرداروں کا نظام ختم کر کے وہاں ایرانی گورنروں کو مقرر کیا اور عرب سرداروں کو ان کا ماتحت بنا دیا۔ ۶۳۳ء تک یہی نظام قائم تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے مسلم افواج کے ساتھ حیرہ پر حملہ کیا تو اس شہر نے بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے بعد اس شہر کی اہمیت ختم ہو گئی۔ کوفے کی روز افزوں ترقی نے اس شہر کو رفتہ رفتہ اور بھی پس پشت ڈال دیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کچھ دنوں حیرہ میں مقیم رہے تھے اور کچھ عمارتیں بھی تعمیر کرائیں مگر اس سے کوفے میں ناراضی پھیل گئی اس لیے شہر کی اقامت چھوڑ گئے۔ دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یہ شہر بہت وسیع مگر بہت کم آباد تھا۔ پورت صنائع کے زوال و انحطاط کی وجہ سے بعد میں حیرہ پر اتنا سخت اثر پڑا کہ آخر میں وہ روئے زمین سے معدوم ہو گیا۔ اس کی جائے وقوع پر اب ایک چراگاہ ہے جہاں پست ٹیلے اور ٹھیکریوں کے ڈھیر اس کے ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ (ش۔ ج)

حیض

ماہواری۔ ایام حیض طبی حیثیت سے ایک ایسی حالت ہے جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے قریب تر ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں یہودی اور دوسری غیر مسلم قومیں حائضہ عورت سے بے انتہا پرہیز کرتی تھیں۔ اور انہیں ایام ماہواری میں اچھوت بنا دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس غلط روش کا خاتمہ کیا۔

"پوچھتے ہیں: حیض کا حکم کیا ہے؟ قرآن میں آیا ہے کہ:

کہو: "وہ ایک گندگی کی حالت ہے۔ اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، جب تک وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ۔ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں۔ اور پاکیزگی اختیار کریں۔" (سورۃ بقرہ)

یہاں حکم سے مراد حکم شرعی نہیں ہے بلکہ وہ فطری حکم جو انسان اور حیوان سب کی جبلت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر نفس طبعاً واقف ہے۔ حضورؐ نے اس ارشاد کی جو مزید توضیح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعل مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

ایک حدیث حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں اور آنحضرت صلعم حالت جنابت میں ایک ہی برتن سے غسل کر لیتے۔ مجھے حالت حیض میں تہ بند باندھنے کا حکم دیتے اور پھر آپ بدن مجھ سے مس کرتے۔ نیز اعتکاف کی حالت میں سر مبارک باہر نکالتے اور میں آپ کا سر دھو دیتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ نے اور بھی بہت سی احادیث اسی موضوع پر بیان کی ہیں۔ وہؓ کہتی ہیں کہ "میں حائضہ ہونے کے باوجود پانی پی کر اپنا بچا ہوا حضور صلعم کو دے دیتی۔ اور آپ میرے پینے کی جگہ منہ لگا کر پیتے۔ اسی حالت میں میں ہڈی چوس کر آپ کو دیتی اور آپؐ اسے اسی جگہ سے منہ لگا کر چوستے۔" (امام مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ "مجھے مسجد سے چھوٹا بوریا لا دو۔ میں نے کہا۔ "میں تو حائضہ ہوں۔" آپ نے فرمایا کہ "حیض تمہارے ہاتھ کو تو لگا ہوا نہیں ہے۔" (مسلم)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حائضہ عورت کے ساتھ وہ سلوک روا نہیں رکھا جا سکتا جو غیر مسلم قومیں رکھتی ہیں۔

حیوان

جانوروں کی دنیا، جس میں انسان بھی شامل ہیں۔ انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ صرف ایک بار سورۂ عنکبوت کی ۶۴ ویں آیت میں آیا ہے اور "زندگی" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جنت کا ایک چشمہ بھی اسی نام سے موسوم ہے قدیم عرب کے متعدد قبیلوں کے نام جانوروں کے ناموں پر ہیں جیسے اسد (شیر)، قریش

(آدم خور مچھلی) وغیرہ قدیم عرب مرنے والوں کی روحوں کو کسی پرندے کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ یہ الو ہوتا تھا جو کچھ عرصے تک قبر کے ارد گرد اڑتا رہتا تھا۔ رسول کریم صلعم نے اس عقیدے کو مردود قرار دیا۔ قرآن مجید کی سورۃ المائدہ اور انعام میں جاہلیت کی ان رسوم کی مذمت کی گئی ہے جن کی رو سے بعض جانوروں کو خاص خاص دیوتاؤں سے منسوب کر دیا جاتا تھا یا بعض اونٹوں بھیڑوں اور دوسرے جانوروں کو حرام قرار دے دیا جاتا تھا۔

پالتو جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسلام میں بعض جانوروں کا کھانا حلال ہے اور بعض کا حرام۔ ایک حدیث (ابو داؤد) کی رو سے تمام گوشت خور جانور حرام ہیں خواہ وہ دودھ پلانے والے جانور ہوں جن کے تیز دانت ہوتے ہیں یا وہ پرندے جن کے پنجے ہوں۔ لیکن اس حکم کو سب فقہا نے تسلیم نہیں کیا۔ مالکیوں کے ہاں شکاری پرندوں کا گوشت کھانا جائز ہے۔ تمام فقہا بلی، کتے، بھیڑیئے، مگرمچھ وغیرہ کو حرام سمجھتے ہیں۔ بعض جانور اس لیے حرام ہیں کہ رسول اللہ نے انہیں ان کے فاسقانہ طرزِ عمل کی بنا پر مارنے کا حکم دیا ہے۔ ان میں چیل، سیاہ و سفید کوا، بچھو، چوہا اور دیوانہ کتا شامل ہیں۔ پالتو چوپایوں میں سے اونٹ، بیل، بھیڑ، بکری کے بارے میں کوئی نزاع نہیں لیکن گھوڑے کی طرح کے جانوروں کے معاملے میں اختلافات ہیں۔ شافعیوں اور حنبلیوں کے نزدیک گھوڑا حلال ہے لیکن دوسرے مذاہب اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ گھریلو گدھا حرام ہے لیکن حنابلہ اسے مکروہ مانتے ہیں۔ جنگلی گدھا حنفیوں کے سوا اور سب مذاہب میں حلال ہے۔ خچر حرام ہے۔ ظاہریہ اور ابن حزم ان ممانعتوں کو رد کرتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں۔

مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ جانوروں بالخصوص سواری کے جانوروں سے اچھا سلوک کریں کیونکہ آخرت کی زندگی میں ظلم کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ انسانوں کی مانند دیگر حیوانات بھی قیامت کے روز دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور دنیا میں جو جو ظلم ان پر بندوں کی طرف سے کئے گئے ہیں ان کا بدلہ ان سے دلوایا جائے گا۔ (اش۔ ع)

خ

خارجہ پالیسی

تمام ممالک دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات اور روابط قائم کرنے کے لئے کچھ اصول بناتے ہیں ان اصولوں کو خارجہ پالیسی کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں طاقتور قومیں اپنے سے کمزور ملکوں کو اپنا غلام بنانے کی فکر میں لگی رہتی تھیں اور کمزور ملک بھی اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہوتے تھے۔ اس لئے تمام ممالک کی خارجہ پالیسی یا خارجہ سیاست سوائے جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کے اور کچھ نہیں ہوتی تھی لیکن موجودہ زمانے میں خارجہ پالیسی کا یہ انداز کافی حد تک ختم ہو گیا ہے اور اب زیادہ تر ممالک ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں تمام ممالک اپنی ضرورت کی ہر ایک شئے خود پیدا نہیں کرتے اس لئے انہیں بہت سی چیزیں دوسرے ممالک سے خریدنا پڑتی ہیں۔ یہ حاجاتِ مبادلہ انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے خارجہ تعلقات کو مستحکم بنیادوں پر قائم کریں۔ ان کے لئے کچھ قوانین بنائے گئے ہیں جن کے ذریعے ہر حکومت کے حقوق ایک دوسرے سے رابطہ وغیرہ، ایک دوسرے کے فرائض، واجبات، جنگ اور صلح کے زمانہ میں واضح ہو گئے ہیں۔

اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے جنگ و صلح اور امن و پیکار میں اسلامی ممالک کے لئے مختلف قواعد کی تشکیل کر دی تھی۔ علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ دولتِ اسلامیہ کا قیام وحدت دینیہ پر مبنی ہے اس وحدت کے اجزاء کا مجموعہ ہی امتِ واحدہ ہے۔ بے شک ان کی زبان مختلف ہو، بادشاہت مختلف ہو یا قومیتیں مختلف ہوں۔ اس لئے کہ دین کی وحدت ان تمام چیزوں پر غالب ہے لہذا ان تمام اختلافات کے باوجود "امتِ واحدہ" اپنی جگہ قائم رہے گی۔

کسی اسلامی اور غیر اسلامی ملک کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے

اس بات پر علمائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ اسلام اپنے مخالف کو قبولِ اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت دو طرح سے دی جا سکتی ہے:

۱۔ زبان سے اور

۲۔ تلوار سے۔

علماء کہتے ہیں کہ پہلے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔ اگر وہ اس دعوت کو ٹھکرا دیں تو ان سے جنگ کریں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں یا جزیہ یا خراج دینے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ اگر مسلمان کمزور ہو گئے ہوں تو وقتی طور پر مصالحت جائز تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر جیسے ہی یہ ضرورت ختم ہو گی دوبارہ جنگ کرنا واجب ہو جائے گا۔

اس نظریہ کے حامل علماء بے شمار دلائل پیش کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "یعنی تم پر قتال واجب کر دیا گیا ہے خواہ وہ تمہیں گراں ہی کیوں نہ گزرے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کو تم برا سمجھتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے بھلی ہوتی ہیں۔"

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے:

"آپ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان لوگوں سے قتال کیجئے جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خرید لی ہے۔"

اس موضوع پر حضورؐ نے بھی فرمایا ہے۔ بخاری اور مسلم کی ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ:

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک مقاتلہ کروں جب تک وہ کلمۂ توحید اور رسالت محمدیؐ پر ایمان نہ لے آئیں۔ نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ کرنے لگیں تو جان و مال کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے۔ سوا اس کے کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ان سے مواخذہ کی نوبت آئے اور ان کا حساب کتاب اللہ کے ذمہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی جگہ مسلمانوں کو کافروں سے دوستی کرنے کی ممانعت کی ہے اور مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ ربط و محبت کے تعلقات قائم کر کے انہیں اپنا حلیف بنانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

"مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں۔"

اسی طرح سورہ مائدہ میں آیا ہے کہ :

"مسلمانو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا، اس کا شمار انہی میں ہوگا"

مختلف علماء نے مسلمان ملکوں کے لئے خارجہ پالیسی کے جو اصول بنائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :

اسلام کی طرف سے غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینا اُمّتِ اسلامیہ پر فرضِ کفایہ ہے لیکن اگر کوئی جماعت یا گروہ اسلام کا پیغام اور دعوتِ اسلام دینا شروع کر دے تو یہ فرض باقی امت پر سے ساقط ہو جائے گا۔ لیکن اگر تمام امت میں سے کوئی بھی دعوتِ اسلام کو عام کرنے کے لئے آگے نہ بڑھے گا تو پھر پوری اُمّتِ اسلامیہ گناہ گار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا تھا کہ جو کچھ ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اس کی تبلیغ فرمائیں۔ اسی لئے آپ زندگی بھر دعوت و تبلیغ پر قائم رہے۔ اور زبانِ مبارک خطوط اور پیغامبروں کے ذریعے دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا۔

خارجہ بن حذافہ سہمی

عرب کے بہترین شہسواروں میں سے ایک۔ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح مصر کے موقع پر جنگی خدمات انجام دیں حضرت عمرؓ نے جن چار افسروں کے ماتحت چار ہزار کی کمک با ہر بھیجی تھی ان میں سے ایک آپ تھے۔ مصر فتح ہونے کے بعد عمروؓ بن العاص نے آپ کو مصر کا حاکم مقرر کیا۔ جنگِ صفین کے بعد خارجیوں نے حضرت علیؓ، معاویہؓ اور عمرو بن العاص کے خلاف سازش قتل کے سلسلے میں عمرو بن العاص کی بجائے رمضان ۴۰ھ میں آپ کو شہید کر دیا۔ آپ چند احادیث کے راوی ہیں۔

خارجہ بن زید

ایک صحابی جو قبیلہ خزرج کے مشہور خاندان اغر سے تعلق رکھتے تھے۔ بیعت عقبہ میں اسلام قبول کیا۔ ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مدینہ آ کر آپ کے ہاں قیام کیا تھا۔ آپ نے اپنی ایک بیٹی حبیبہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں دی تھی ام کلثوم بنت ابی بکرؓ ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ اسی وجہ سے حضرت خارجہؓ حضرت ابوبکرؓ کے اسلامی بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ خسر بھی تھے آپ غزوہ بدر میں شریک رہے۔ اس غزوہ میں اُمیہ بن خلف کو آپ نے کئی آدمیوں کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ آپ غزوۂ اُحد میں بھی شریک ہوئے۔ اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ اسی غزوہ میں آپ نے نیزوں کے دس سے زیادہ زخم کھائے اور شہید ہوئے۔ آپ کے بیٹے سعدؓ بن ربیع بھی اسی غزوہ میں شہید ہوئے۔ دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔

خارجی

اسلام کے قدیم ترین فرقے کے پیرو۔ اسلام کی سیاسی تاریخ میں ان کا کردار یہ تھا کہ انھوں نے متواتر بغاوتیں کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر اوقات پورے کے پورے صوبے عارضی طور پر ان کے قبضے میں آ گئے۔ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے سامنے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے متعلق جو تجویز جنگ صفین میں پیش کی تھی اس سے خوارج کا ایک علیحدہ فرقہ پیدا ہوا۔ باغیوں کا پڑاؤ نہروان کی نہر کے کنارے تھا۔ ان کے کوفے سے باہر نکلنے کی وجہ سے اس فرقے کا نام "خوارج" ہو گیا۔ خوارج نے جلد ہی اپنے انتہائی تعصب اور تنگ نظری کا اظہار ایسے پے انتہا پسند اعلانات اور وحشتناک افعال کی صورت میں کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ حضرت علیؓ کا دعویٰ خلافت باطل ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے حضرت عثمانؓ کے مسلک کی بھی مذمت کی اور ان کی شہادت کا انتقام لینے کے ارادے سے بھی اپنی برأت کا اظہار کیا۔ جو شخص ان کے نظریے کو تسلیم نہ کرتا اسے کافر اور دین سے خارج قرار دینے لگے انھوں نے بہت سے لوگ قتل کیے۔ رفتہ رفتہ ان کی قوت بڑھتی گئی۔ بہت سے غیر عرب بھی ان میں شامل ہو گئے۔ جب خوارج سے حضرت علیؓ کی ابتدائی گفت و شنید ناکام رہی تو مجبوراً اس بڑھتے ہوئے خطرے کو دور کرنے کیلئے کارروائی کرنی پڑی۔ ۹ صفر ۳۸ھ/۱۷ جولائی ۶۵۸ء کو جنگ نہروان لڑی گئی خارجیوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ آئندہ دو برسوں میں بھی مقامی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ خود حضرت علیؓ ایک خارجی عبدالرحمان ابن ملجم المرادی کے خنجر سے شہید ہوئے۔ ابن ملجم کے سسرال میں بہت سے لوگ جنگ نہروان میں قتل ہو چکے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ خارجیوں کی سازش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کو بیک وقت قتل کر دیا جائے حملے کیلئے ایک ہی تاریخ کا ایک ہی وقت مقرر ہوا۔ امیر معاویہؓ پر حملہ ہوا وہ زخمی ہوئے۔ عمروؓ بن العاص اس رات بیمار تھے ان کی جگہ خارجہؓ بن حذافہ امامت کیلئے مسجد قاہرہ میں آئے اور شہید کر دیئے گئے۔

امیر معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں کوفے اور بصرے میں خارجیوں نے کئی بغاوتیں کیں لیکن امیر معاویہؓ کے حسن تدبر اور سیاسی بصیرت کے باعث انہوں کو پھیلنے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن وہ بھی خوارج کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ [illegible] کی ہلاکت میں اضافہ ہوتا گیا جن کے قتل کا بدلہ [illegible] نمایاں علامت [illegible] باقی خوارج کے حملے اب [illegible] جنگ [illegible] یزید اول کے مرنے کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی اس [illegible] تحریک نے بہت زور پکڑا اور ملک کی صورت حال نازک ہو گئی۔ خارجیوں [illegible] سلطنت کے استحکام کے لئے جو تحریک سب سے زیادہ [illegible] کے اعتبار سے سب سے شدید اور غیر مصالحانہ [illegible] نافع بن ازرق [illegible] ابھری۔ جس کی وجہ سے خوارج کو کچھ عرصے کے لئے کرمان، فارس اور دوسرے [illegible] صوبوں پر تسلط ہو گیا۔ اس بغاوت پر مہلب بن ابی صفرہ [illegible] کی کئی سال کی جدوجہد کے بعد قابو پایا جا سکا۔ حجاج کی [illegible] خارجی تحریک کا قطعی طور پر خاتمہ کر دیا۔ جب اموی عہد کے [illegible] میں ناقابلِ تدارک [illegible] آیا تو خوارج نے پھر سر اٹھایا اور دوبارہ [illegible] کردی۔ اس دور کی دو بڑی بغاوتیں ضحاک بن قیس شیبانی کی بغاوت [illegible] اور عراق میں اور عبداللہ بن یحییٰ کی بغاوت عرب میں [illegible] جو فتنہ و فساد برپا کیا اس سے اموی حکومت کی مشرقی [illegible] کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ آسانی سے سلطنت کے [illegible] کے عہد میں چند مقامی بغاوتیں ہوئیں لیکن [illegible] عملی طور پر ختم ہو گئی اور اس کی حیثیت محض ایک مذہبی فرقے کی سی رہ گئی۔

خوارج کے مذہبی عقائد میں کوئی یکسانی نہ تھی۔ ان کے متعدد [illegible] فرقوں کے اپنے اپنے خاص عقائد تھے۔ ان فرقوں کی مجموعی تعداد بیس [illegible] خلافت کے بارے میں خوارج کے تمام فرقوں میں اتفاق ہے۔ ان کا عقیدہ [illegible] کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے امام کے خلاف شرع ہونے کا اعلان کریں جو صحیح [illegible] منحرف ہو گیا ہو اور اس کو اسی بنا پر معزول کر دیں۔ دوسری طرف وہ یہ دعویٰ کرتے

ہیں کہ ہر مردِ مومن جس کا کردار اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے ناقابلِ ملامت ہو اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ جماعت کی متفقہ رائے سے امامت کے بزرگ ترین عہدے کیلئے منتخب کرلیا جائے۔ اپنے خلفاء کے علاوہ وہ جن خلفا کو برحق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔ حضرت عثمانؓ کو وہ ان کے عہد خلافت کے ابتدائی چھ سال تک خلیفہ مانتے ہیں اور حضرت علیؓ کو جنگ صفین تک۔

خوارج کا ایک بڑا عقیدہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے بغیر صرف ایمان حصولِ نجات کیلئے کافی نہیں۔ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے تو اس کے مومن ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اسے مرتد تصور کرتے ہیں۔ خوارج کے ایک انتہا پسند فرقے ازارقہ کا کہنا ہے کہ جو کوئی اس طرح کافر ہو جائے وہ اسلام کے دائرے میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا اور اسے ارتداد کے جرم میں بیوی بچوں سمیت قتل کر دینا چاہیئے۔ وہ ان مسلمانوں کو جو خارجی نہیں مرتد سمجھتے ہیں۔ خوارج کے بعض فرقے یہودیوں یا عیسائیوں کو ہر طرح کا امن دے کر ان کے گھروں تک بحفاظت تمام پہنچانے کا ذمہ لیتے ہیں۔ (شریف جاوید)

خازن

(وفات ۳۴۹ھ/۹۶۰ء) پورا نام ابوجعفر خازن خراسانی۔ علم ہیئت کا عظیم ترین ماہر۔ وہ اپنی کنیت ابوجعفر کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ علم الحساب میں اس نے عددی مسائل پر بحث کی اور ارشمیدس کے ایک مسئلے کو حل کیا جو آخر میں ایک مکعب تعدیل کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس نے اقلیدس کی دسویں کتاب کے پہلے حصے کی شرح بھی لکھی جو تقسیم سے متعلق ہے۔ خازن کی علمی تحقیقات کا ایک بڑا میدان علم الہیئت تھا۔ کتاب "الالات العجیبۃ الرصدیۃ" میں اس نے فلکی مشاہدے کے بعض آلات کی کیفیت بیان کی ہے۔ ابن خلدون کے مقدمے میں بھی اس کتاب کا ذکر آیا ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسے آلے کا بھی بیان ہے جو سورج کے ارتفاع کی پیمائش کے کام آتا تھا۔ خازن کی دوسری کتاب "زیج الصفائح" کئی مقالات اور ایک طویل مقدمے پر مشتمل ہے۔ البیرونی کے بیان کے مطابق اس تصنیف میں اجرام فلکی کی حرکات کی تشریح کی گئی ہے۔ اپنی تیسری کتاب "المدخل الکبیر فی علم النجوم" میں اس نے علم التواریخ کے مسائل پر بحث کی ہے۔ "سرالعالمین" میں خازن نے ابن الہیثم کے نظریۂ تکوینِ عالم سے بحث کی ہے۔ ابوجعفر نے دنیا کی ایک ایسی صورت بھی اختراع کی تھی، جو ایک خارج از مرکز کرۂ ارض اور ایک دائرے کے محیط پر مرکوز گردش کے نظریے سے مختلف ہے۔ اس نظریے کی رو سے سورج اور زمین کی گردش کے فرق کے باوجود ان کا باہمی فاصلہ یکساں رہتا ہے۔ اسی طرح وہ دنیا کے دو طبقے مستنبط کرتا ہے، ایک شمالی اور ایک جنوبی جن میں گرمی اور سردی کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ (ش - ج)

خاطر

ایک صوفیانہ اصطلاح جس سے مراد کسی ایسی بات کا خیال دل میں آنا جسے خود ہی کسی دوسرے خیال کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن تیسرا خیال آکر پہلے خیال کو اجاگر کر دے۔ صاحب خیال میں اس خیال کو دل سے دور کر دینے کی صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔

حضرت خیر نساجؒ کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ حضرت جنیدؒ دروازے پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے اس خیال کو ہٹانا چاہا لیکن تیسرے خیال نے آکر دوسرے خیال کی تردید کر دی۔ چنانچہ حضرت موصوف تیسرا خیال آنے کے بعد باہر نکلے تو دروازے پر حضرت جنیدؒ کو کھڑے پایا۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ اگر تم پہلے خیال کی پیروی کرتے تو مجھے اتنی دیر تک باہر انتظار نہ کرنا پڑتا۔

اس واقعے سے مشائخ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر خیال وہی تھا جو حضرت خیر نساجؒ کے دل پہ گزرا تو پھر حضرت جنیدؒ کا خیال کیا تھا؟ حضرت جنیدؒ حضرت خیر نساجؒ کے پیر تھے اور پیر چونکہ لامحالہ اپنے مرید کے احوال پہ واقف ہوتا ہے اسی لیے یہ واقعہ رونما ہوا۔

خافی خان

(۱۶۶۴ء – ۱۷۳۲ء) ہندوستان کا ایک مؤرخ۔ اس کا باپ خواجہ میر شاہجہاں کے بیٹے مراد بخش کا ایک رازدار ملازم تھا۔ اورنگ زیب، بہادر شاہ اور محمد شاہ کے عہد میں خافی خاں دکن اور گجرات میں ملازم رہا۔ زندگی کے آخری ایام آصف جاہ نظام الملک کی ملازمت میں بسر کیے۔ اس نے "منتخب اللباب" کے نام سے ہندوستان کے تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کی۔ یہ ایک معیاری کتاب تصور کی جاتی ہے۔ یہ تاریخ دو سو سال کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا اختتام محمد شاہ کے چودھویں سال جلوس (۱۷۳۲ء) پر ہوتا ہے۔ اس تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قصہ در قصہ روایتیں پائی جاتی ہیں۔ مصنف نے جگہ جگہ اپنے مشاہدے بیان کیے ہیں۔ (ش - ج)

خاقانی

(۱۱۲۶ء – ۱۱۹۸ء) حسان العجم افضل الدین بدیل خاقانی شروانی، ایران کا جلیل القدر قصیدہ گو۔ اس کا لقب "افضل الدین" تھا۔ قصیدہ گوئی میں بلند مرتبہ حاصل ہونے کی بنا پر "حسان العجم" کا لقب پایا۔ خاقانی آذربائیجان کے قریب ایک مشہور شہر شروان میں پیدا ہوا۔ اس کا والد علی بڑھئی کا کام کرتا تھا اور والدہ نسطوری عیسائی تھی لیکن بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئی۔ والد کی وفات کے بعد خاقانی کی پرورش اس کے چچا طبیب مرزا کافی بن عثمان نے کی۔ طب، ہیئت، الٰہیات ایسے علوم کی تحصیل اسی سے ہوئی۔ ذوق شعر کی تربیت ابوالعلا گنجوی نے کی جو خاقانی اکبر ابوالہیجا فخر الدین منوچہر بن فریدون شروانشاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ خاقانی کی شادی ابوالعلا کی بیٹی سے ہوئی۔ ابوالعلا ہی کے توسط سے خاقانی نے دربار شروانشاہ میں رسائی پائی اور پہلا تخلص "حقائقی" ترک کرکے "خاقانی" اختیار کرلیا۔ شروانشاہ کے دربار میں اسے خاصی قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ قصائد پر گراں بہا انعامات بھی پائے۔ شروانشاہ سے اجازت پاکر وہ ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں حج کیلئے روانہ ہوا۔ موصل کے وزیر جمال الدین محمد بن علی اصفہانی کی وساطت سے عباسی خلیفہ المقتفی بن مستظہر تک رسائی ہوئی۔ حج کے دوران میں اس نے کمال ارادت سے مکہ معظمہ کی توصیف پر پُرتاثیر قصیدے کہے۔ واپس شروان آنے پر پھر دربار شروانشاہ سے وابستہ رہا۔ دربار سے کنارہ کشی کی کوشش میں قید ہوا اور اسیری کے دوران اس نے وہ نظمیں لکھیں، جن سے فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں اس نے دوبارہ حج کیا۔ آخر میں وہ تبریز میں زاویہ نشین ہو گیا۔ وہیں وفات پائی اور مقبرۃ الشعرا میں مدفون ہوا۔

خاقانی نے قوت فکر، فنی مہارت، تراکیب الفاظ، تخلیق معانی اور مضامین نو کی بدولت ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی جو عراق عجم کی نسبت سے "سبک عراقی" کہلایا۔

خاقانی کا دیوان قصائد، غزلیات، مقطعات، متفرقات، مرثیوں، ترجیع بندوں، ترکیب بندوں، رباعیوں، صوفیانہ نظموں اور عربی قصیدوں پر مشتمل ہے۔ (ش - ج)

خالد بن سعید العاص

آپ مسلمان ہوئے تو والد نے آپ کو بری طرح زدوکوب کیا اور بے شمار اذیتیں دیں۔ بالآخر آپ کہیں روپوش ہو گئے اور کافی عرصہ ایسے ہی گزارا۔ حبشہ کی ہجرت کے وقت آپ اپنی زوجہ امیمہ اور بھائی عمر کو ہمراہ لے کر حبشہ چلے گئے۔ غزوۂ خیبر کے دنوں میں آپ حبشہ سے مدینہ آ گئے۔ اور تمام غزوات میں حضور اکرمؐ کے ساتھ شریک ہوئے۔ آپ کو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ اس لئے حضورؐ کے خطوط بھی اکثر آپ ہی پڑھا کرتے تھے۔ ۹ ہجری میں ثقیف کے وفد سے آپ ہی نے رسولؐ خدا کی طرف سے گفتگو کی۔ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا وہ بھی آپ نے ہی تحریر کیا۔ بعد میں حضورؐ نے آپ کو یمن کا گورنر بنا دیا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ گورنری سے سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ حضرت ابوبکرؓ آپ سے اصرار کرتے رہے کہ آپ سبکدوش نہ ہوں پھر آپ مدینے چلے گئے کیونکہ آپ کو ان کی خلافت پر اعتراض تھا۔ لیکن چند ماہ کے بعد ہی آپ نے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ شام کی فتوحات میں آپ شامل ہوئے اور ان فتوحات کے دوران ہی میں آپ نے جام شہادت نوش کیا۔ آپ کی ایک بیٹی ام خالد حضورؐ کے مشہور صحابی زبیرؓ بن العوام کے نکاح میں تھیں۔

خالد بن عرفطہ

خالدؓ حضورؐ کی زندگی ہی میں مسلمان ہو گئے تھے لیکن کسی غزوہ میں شریک نہ ہو سکے۔ آپ نے رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد فتوحات ایران میں شمولیت کی۔ جنگ قادسیہ کے وقت سعدؓ بن ابی وقاص نے انہیں فوج کے ایک دستے کا امیر بنا کر بھیجا۔ جنگ قادسیہ کے بعد انہوں نے ساباط کو فتح کرنے کے لئے جنگ لڑی جس میں انہیں فتح ہوئی۔ ۴۱ھ میں آپ امیر معاویہؓ کی طرف سے اُن کے مخالفوں سے لڑے۔ اور ابی حوسا کو قتل کیا۔ اس کے قتل سے امیر معاویہؓ کے خلاف اٹھنے والی بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ نے حضورؐ کی کچھ احادیث بھی بیان فرمائیں۔ ۶۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس وقت آپ کوفہ میں رہائش پذیر تھے۔

خالدؓ بن ولید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خالو تھے۔ جب آنحضورؐ نے اہل قریش کو بتوں کی پوجا کرنے سے منع فرمایا تو وہ سب آپ کے خلاف ہو گئے۔ اس وقت خالد بن ولیدؓ کی عمر تقریباً ۱۷ سال تھی۔ آپ بھی اپنے والد کے ساتھ حضورؐ کے دشمن تھے بعد میں خالدؓ بن ولید نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن آپ کے والد نے اسلام قبول نہ کیا۔ اور اسلام دشمنی پر قائم رہے۔

خالدؓ بن ولید نے تلوار کے سائے میں پرورش پائی تھی اس لئے وہ بہت پھرتیلے اور نڈر تھے۔ گھڑسواری اور نیزہ بازی کے ماہر تھے۔ ان کے بچپن کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کشتی لڑی۔ کشتی آپ نے جیت لی۔ اس کشتی میں حضرت عمرؓ کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

حضرت خالدؓ بن ولید ابتدا میں مسلمانوں کے خلاف اہل قریش کے لشکر میں شریک رہے۔ بخاص طور پر جنگ اُحد میں شرکت کے بعد کافروں میں آپ کا نام بہت چمکا کیونکہ آپ نے جنگ اُحد میں مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر کے انہیں بہت نقصان پہنچایا تھا۔ آپ کے مسلمان ہونے کا واقعہ کچھ یوں ہے۔ ایک مرتبہ آنحضورؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ خالدؓ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آپؐ پر وار کر دوں۔ لیکن پھر قریب آتے ہی رُک گئے۔ اور دل میں کہنے لگے کہ جس پر میں حملہ کرنے لگا ہوں ان کی حفاظت تو خدا کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ان کے دل میں آنحضورؐ سے محبت پیدا ہو گئی۔

دوسری طرف حضورؐ نے خالدؓ بن ولید کے بھائی جو مسلمان ہو چکے تھے سے فرمایا کہ خالدؓ سے کہو کہ "جب تمہارا دل سچائی کو مان گیا ہے تو پھر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے میں کیا رکاوٹ ہے" خالدؓ کے بھائی نے فوراً آپ کو خط لکھا کہ "بھائی! تمہارا دل تو اسلام کی سچائی مان چکا ہے۔ اب دیر کس بات کی ہے۔ ایمان لے آؤ۔"

خالدؓ بن ولید نے اپنے بھائی کا خط پڑھا تو ان کی آتش اور بھڑک اٹھی فوراً مکہ پہنچے۔ لیکن رسول اللہ صلعم کو وہاں نہ پایا۔ پھر آپ مدینے آئے اور رسول اکرم صلعم کی خدمت میں پہنچے اور اونچی آواز میں کلمہ کا ورد کرنے لگے۔ حضورؐ کو آپ کے اسلام لانے کی بہت خوشی ہوئی۔ یہ خبر ابوسفیان تک پہنچی تو وہ بہت بھڑک اٹھا۔ جونہی اس نے خالد بن ولید کو دیکھا تو پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ تم اسلام لے آئے ہو۔ خالدؓ نے جواب دیا اور کہا کہ "ہاں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حامی ہوں۔ میں دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا ہوں۔ اس پر ابوسفیان نے خالدؓ بن ولید پر تلوار تان لی۔ لیکن عکرمہ نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

ایک بار حضورؐ نے خالدؓ کو بنی حارث قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس قبیلے کے لوگ نجران میں آباد تھے۔ آپ نے حضرت خالدؓ کو حکم دیا تھا کہ پہلے تین دن تک لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اور ان کے سامنے دین پیش کرنا لیکن اگر وہ اسلام نہ لائیں یا اسلام لانے پر تیار نہ ہوں تو ان سے جنگ کرنا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ اپنے چند ساتھیوں سمیت نجران پہنچ گئے اور تمام لوگوں کو دعوت اسلام دی۔ آپ کے ساتھی بھی اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ نتیجہ لوگ اسلام لے آئے اور انہوں نے حضرت خالدؓ اور ان کے ساتھیوں کی دعوت قبول کی۔

حضرت خالدؓ بن ولید کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد رومیوں کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے تین ہزار صحابہؓ کی فوج تیار ہوئی اس میں آپ بھی شامل تھے۔ اس جنگ میں مخالفین کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ خونریز معرکہ ہوا۔ ابتدا میں مسلمانوں کا کافی جانی نقصان ہوا۔ دوسرے دن اسلامی لشکر کی کمان حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنے ہاتھوں میں لی۔ اور عمدہ جنگی اصولوں پر اپنی فوج کی تنظیم کی اور چھوٹی سی فوج نے حاکم شام کی ٹڈی دل فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور فتح پائی۔

رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عرب کے کچھ قبائل اسلام سے پھر گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں آپ ہی کو لشکروں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ معرکہ یمامہ میں آپ نے صرف تیرہ ہزار فوجیوں کے ساتھ مسیلمہ بن کذاب کی فوج کو بُری طرح شکست دی جبکہ مسیلمہ بن کذاب کے لشکر کی تعداد ۱ لاکھ تک پہنچتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے انہوں نے خالدؓ بن ولیدؓ کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ۲۱ھ میں وفات پائی آپ کی قبر حمص میں ہے۔ لوگ اب بھی ہزاروں کی تعداد میں فاتحہ پڑھنے کے لئے ان کی قبر پر جاتے ہیں۔ خالدؓ بن ولید جب بستر علالت پر تھے تو اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"میں نے ان گنت جنگوں میں حصہ لیا۔ کئی بار لینے آپ کو ایسے خطروں

میں ڈالا کر جان بچانا مشکل نظر آتا تھا لیکن شہادت کی تمنا پوری نہ ہوئی میرے جسم پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تلوار، تیر یا نیزے کے زخم کا نشان نہ ہو۔ لیکن افسوس! موت نے مجھے بستر پر آ دبوچا۔ میدانِ کارزار میں شہادت نصیب نہ ہوئی!"

خالد ہزلی

مسلمانوں کا دشمن۔ ایک کافر۔

ایک مرتبہ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ خالد ہزلی مسلمانوں سے جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو حالات جاننے کے لیے بھیجا حضرت عبداللہؓ جلد ہی میلوں کا سفر طے کر کے خالد ہزلی کے پاس جا پہنچے۔ اس وقت خالد ہزلی کے ساتھ کئی عورتیں تھیں اور وہ مکان کی تلاش میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ آپ نے اُسے روک لیا۔ خالد ہزلی نے رکتے ہی حضرت عبداللہؓ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں"۔ آپ نے فوراً جواب دیا۔" میں ایک عرب ہوں، میں نے سنا ہے کہ آپ نبی کریمؐ حضرت محمد رسول اللہؐ سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں"۔ اس پر خالد نے کہا کہ" میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑی فوج ترتیب دے رہا ہوں"۔

یہ جواب سنتے ہی حضرت عبداللہؓ نے خالد ہزلی کو قتل کر دیا اور عورتوں کو اس کی لاش پر روتا ہوا چھوڑ کر واپس حضورؐ کے پاس آ گئے۔ آپ نے انہیں تمام واقعہ بیان کیا۔ خالد ہزلی کے قبیلہ کے افراد کافی عرصہ تک خاموش رہے پھر ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ان کے چند افراد جمع ہو کر حضورؐ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ آپ ہماری تعلیم و تربیت کے لیے کچھ صحابہؓ کرام کو ہمارے ساتھ بھیجیں تاکہ وہ ہمیں قرآن اور دینی مسائل کی تعلیم دیں۔ لیکن یہ سب ان کی چال تھی۔ اس طرح وہ حضرت عبداللہؓ بن انیس اور کئی دوسرے صحابہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور راستے میں جا کر ان میں سے چند کو شہید کر دیا اور کچھ کو قید کر لیا۔

خباب بن ارت

آپ تمیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور لوہار کا کام کرتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں آپ کو غلام بنا کر مکہ میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ آپ اس وقت مسلمان ہوئے تھے جب حضورؐ ارقمؓ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت تک چند افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ انہیں قریشِ مکہ نے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ ایک مرتبہ آپ کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر ایک کافر آپ کے سینے پر بیٹھ گیا جس سے آپ کی پیٹھ جل کر سفید ہو گئی۔ ان کا جرم صرف اسلام قبول کرنا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں آپ مرتبہ آپ حضرت عمرؓ کو ان اذیتوں کے نشانات دکھانے لگے جو آپ کو پچیس تیس سال پہلے کفارِ مکہ نے پہنچائی تھیں حضرت عمرؓ نے آپ کو فوراً اپنی مسند پر بٹھایا اور کہنے لگے کہ "ایک شخص اور ہے جس نے آپ سے بھی زیادہ اذیتیں برداشت کی ہیں اور وہ ہیں بلال حبشیؓ"۔

"جناب فوراً بول اُٹھے وہ کس طرح ان کے تو کئی دوست تھے جو انہیں مختلف اذیتوں سے نجات دلانے کی کوششیں کرتے تھے لیکن میری مدد کے لئے تو کوئی بھی نہیں تھا۔"

خبر

بیان اور اطلاع۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کسی خاص سیاق و سباق کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ حدیث میں اس کا استعمال علاوہ اور مقامات کے اس روایت میں ہوا ہے جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح جنّ چوری چھپے آسمان سے اطلاع حاصل کرتے ہیں اور کس طرح اُن پر دہکتے ہوئے شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں کہ ان کو سخن چینی سے باز رکھا جائے۔ امام الغزالی نے اخبار کی اصطلاح ایسی احادیث کے لئے استعمال کی ہے جن کا سلسلہ رسول اکرم صلعم تک پہنچتا ہے۔ (ش۔ ج)

خبیب بن عدی

اسلام کے ابتدائی شہداء میں سے ایک۔ آپ مدینہ کے رہنے والے تھے اور حضورؐ کے صحابی تھے۔ آپ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد میں شریک ہوئے۔ جنگِ اُحد میں آپ کو ہذیل کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ مکہ لے گئے۔ وہاں آپ کو غلام بنا کر بنوحارث کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بنوحارث نے آپ کو رسیوں سے باندھ کر نیزوں سے زخمی کیا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔

مسلمان تاریخ دانوں نے اس واقع کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ کس طرح آپ نے راہِ حق میں صبر و شکر کے ساتھ جان دی۔ اس واقعہ کا مکہ کے کافروں پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ابوسفیان جیسے سخت مزاج انسان کا دل بھی اس واقعہ سے پگھل گیا۔

بنو حارث آپ کو نیزوں سے بری طرح زخمی کر چکا تھا تو آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اگر آپ اسلام سے منحرف ہو جائیں تو میں آپ کو زندہ چھوڑ دوں گا"۔ لیکن آپ نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ اور کہنے لگے کہ میں دنیا تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن اسلام نہیں"۔

آپ کے بارے میں ایک واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کو شہید کر دیا گیا تو زمین اسی وقت شق ہو گئی اور آپ کی لاش اس میں سما گئی۔

ختّان

احادیث میں جہاں دین فطرت کے خصائل کا بیان آیا ہے وہاں ناخن تراشنے مسواک، مونچھیں کترنے، داڑھی بڑھانے کے ساتھ ختنہ کا بھی ذکر موجود ہے۔ النووی کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ اور بہت سے دوسرے علماء کے نزدیک ختنہ واجب ہے امام مالک اور اکثر علماء کے نزدیک سنت ہے۔ صحیح صورت جس سے اصحاب کی اکثریت کو اتفاق ہے یہ ہے کہ ختنہ بچپن میں جائز ہے مگر واجب نہیں۔ بعض کے نزدیک ولادت کے بعد ساتویں دن ختنہ کرنا مستحب ہے۔ ابن سعد نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلعم مختون پیدا ہوئے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں ختنہ کو مسلمانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ سندھ میں جہاں رسم ختنہ کو طہار کہا جاتا ہے بچوں کا ختنہ تین سے سات سال کی عمر میں ہو جاتا ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں ختنہ پیدائش کے بعد سات دن سے لے کر تیرہ سال تک مختلف عمروں میں حجام کرتا ہے۔ عموماً حجام عملِ جراحی انجام دیتا ہے۔ حشفہ کے آگے کی کھال کو ایک آلے سے سمیٹ کر استرے سے کاٹ ڈالتا ہے اور زخم پر لیپ کر کے پٹی باندھ دیتا ہے۔ زخم عموماً ایک ہفتے میں مندمل ہو جاتا ہے۔ (ش۔ ج)

ختمِ نبوت

مسلمانوں کا عقیدہ ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ۔ آپ پہ نازل شدہ کتاب قرآن مجید پرانی تمام آسمانی کتابوں کے احکام کو منسوخ کرنے والی اور تمام معاملات کے احکام و قوانین میں جامع و مانع ہے ۔ اس کے بعد نہ کوئی کتاب اللہ کی جانب سے نازل ہوگی نہ ہی کوئی اور نبی آئے گا ۔ بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں ، یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں ۔ مطلب یہ تھا کہ ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ۔ اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے : اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو ، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں ۔ (سورۃ الاعراف : ۱۵۸) اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو ، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں ۔ (سورۃ الاعراف : ۱۵۸) ۔ بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پہ فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبہ کرنے والا ہو (الفرقان : ۱) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے (احزاب : ۴۰)

ایک گروہ لفظ " خاتم النبیین " کے معنی نبیوں کی مہر کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلعم کے بعد جو انبیا بھی آئیں گے وہ آپ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے ۔ ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ " خاتم النبیین " کے معنی افضل النبیین کے ہیں ۔ یعنی نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے البتہ کمالات نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں ۔ عربی لغت اور محاورے کی رُو سے " ختم " کے معنی مُہر لگانے ، بند کرنے ، آخر تک پہنچانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں ۔ قرآن کے سیاق و سباق اور لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی کریم صلعم کی ان احادیث سے ہوتی ہے ۔

(۱) آنحضرت نے فرمایا بنی اسرائیل کی قیادت انبیا کیا کرتے تھے ۔ جب کوئی نبی مر جاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفا ہوں گے ۔ (بخاری شریف کتاب المناقب)

(۲) نبی صلعم نے فرمایا میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی ۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی ؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیینؐ ہوں ۔ (بخاری شریف ، کتاب المناقب) ۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، مجھے چھ باتوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے ۔ اور چھٹی فضیلت آپ نے یہ بیان فرمائی کہ میرے اوپر انبیا کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ۔ (مسلم ، ترمذی ، ابن ماجہ) ۔

(۴) رسول اللہ صلعم نے فرمایا ، رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی ۔ (ترمذی ، مسند احمد)

(۵) رسولِ کریم صلعم نے فرمایا ، اللہ تعالٰے نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو ۔ اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو ۔ لامحالہ اس کو تمہارے اندر ہی نکلنا ہے (ابن ماجہ ، کتاب الفتن)

(۶) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتے ۔ (ترمذی ، کتاب المناقب)

(۷) رسول کریم صلعم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی ، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے ۔ (بخاری و مسلم)

(۸) رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعوےٰ کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں ، میرے بعد کوئی نبی نہیں ۔ (ابو داؤد ، کتاب الفتن)

منکرین ختمِ نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا : " یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں " ۔ حضرت عائشہؓ کی طرف جس روایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود غیر مستند ہے اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابل ذکر محدث نے نقل نہیں کیا ۔ تفسیر کی کتاب دُرِّ منثور اور لغت حدیث کی ایک کتاب تکملہ مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے ۔ مگر اس کی سند کا کچھ پتا نہیں ۔ ایسی ایک ضعیف ترین روایت کو نبی کریم صلعم کے اُن ارشادات کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے ۔

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابہ کرام کے اجماع کی ہے ۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلعم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعوے کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی ، ان سب کے خلاف صحابہ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی ۔ اس سلسلے میں مسیلمہ کذاب کا معاملہ قابل ذکر ہے ۔ یہ شخص نبی صلعم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعوے یہ تھا کہ اسے حضور صلعم کے ساتھ شریک نبوت بنایا [illegible] گیا ہے ۔ بنو حنیفہ نیک نیتی کے ساتھ اس پر ایمان لائے تھے [illegible] اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اس کو خود [illegible] کیا ہے ۔ مگر صحابہ کرام نے بنو حنیفہ کو مسلمان تسلیم نہیں کیا [illegible] مسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو صحابہ [illegible] کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے [illegible] ان کو غلام بنا لیا گیا ۔ یہ کارروائی حضور صلعم کی [illegible] کی قیادت میں اور صحابہ کی پوری جماعت کے [illegible] کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو ۔

اجماع صحابہ کے بعد جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ [illegible] صحابہ کے بعد کے علمائے امت کا اجماع ہے ۔ پہلی صدی سے لے کر [illegible] ہر زمانے کے اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علما اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو بھی آپؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے یا اس کو مانے ، وہ کافر و خارج از ملت اسلام ہے ۔ اس سلسلے کے چند شواہد درج ذیل ہیں :

(۱) امام ابو حنیفہؒ (۸۰ھ ۔ ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا اور کہا " مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں ۔ اس پہ امام اعظمؒ نے فرمایا : " جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے

گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم فرما چکے ہیں ' لا نبی بعدی'۔"
(مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ)

(۲) علامہ ابن جریر طبری (۲۲۴ھ - ۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پہ مہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا۔"

(۳) امام طحاوی (۲۳۹ھ - ۳۲۱ھ) سلف صالحین اور خصوصًا امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوّت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: " اور یہ کہ محمد رسول اللہ صلعم اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی، اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیاء، امام الاتقیا، سیّد المرسلین اور حبیب رب العالمین ہیں۔ ان کے بعد نبوّت کا ہر دعوے گمراہی اور خواہش نفس کی بندگی ہے"۔ (شرح الطحاویہ فی العقیدۃ السلفیہ)۔

(۴) علامہ ابن حزم اندلسی (۳۸۴ھ - ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی کریم صلعم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزّ وجلّ فرما چکا ہے کہ محمد نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں"۔ (المحلّی)۔

(۵) امام غزالی (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں کہ امّت نے بالاتفاق لفظ لا نبی بعدی سے اور نبی کریم صلعم کے قرائن احوال سے یہ سمجھا ہے کہ حضور کا مطلب یہ تھا کہ آپ کے بعد کبھی نہ کوئی نبی آئے گا نہ رسول۔ نیز امّت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں کسی تاویل اور تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو منکر اجماع کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا" (الاقتصاد فی الاعتقاد)۔

(۶) علامہ زمخشری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں "اگر تم کہو کہ نبی کریم صلعم آخری نبی کیسے ہوئے جبکہ حضرت عیسیٰؑ آخری زمانے میں نازل ہوں گے، تو میں کہوں گا کہ آپ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدیہ کے پیرو اور آپ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ گویا کہ وہ آپ ہی کی امّت کے ایک فرد ہیں"۔

(۷) علامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر 'انوار التنزیل' میں لکھتے ہیں "آپ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا یا جس سے انبیاء کے سلسلے پہ مہر کر دی گئی اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کے بعد نازل ہونا ختم نبوت میں قادح نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ہی کے دین پہ ہوں گے"۔

(۸) علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں "پس یہ آیت (احزاب : ۴۰) اس باب میں نصّ صریح ہے کہ نبی کریم صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ حضور کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعوے کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے خواہ وہ کیسے ہی فرق عادت، شعبدے، جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے"۔

(۹) فتاویٰ عالمگیری جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے مرتب کیا تھا، اس میں لکھا ہے "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔"

قرآن مجید کی رُو سے ختم نبوت اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پہ آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے نازک معاملے میں اللہ تعالےٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجۂ اولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالےٰ خود قرآن میں صاف صاف اس کی تصریح فرماتا۔ رسول اللہ صلعم کے ذریعے اس کا کھلم کھلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امّت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمہیں ان کو ماننا ہو گا۔

قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی قوم میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا ہو اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ دوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو یا اس میں تحریف ہو گئی ہو اور اس کے نقش قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔ سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔ چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی کریم صلعم کے بعد باقی نہیں رہی۔ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں تک پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر پہ شہادت دے رہا ہے کہ حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ آنحضورؐ کے ذریعے سے دین کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ لہٰذا تکمیل دین کے لیے کوئی نبی درکار نہیں۔ چوتھی ضرورت کے لیے اگر کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی ٭ (شریف جاوید)

خجندی

(وفات ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء) ابو محمود حامد بن خضر خجندی، ماہر فلکیات۔ بویہی خاندان کے حکمران فخر الدولہ کے عہد حکومت (۹۷۶ء - ۹۹۷ء) میں شہر رے میں مقیم تھا اس نے ایک سُدس (مقیاس ارتفاع) ایجاد کیا۔ یہ دو متوازی اور مستقیم دیواروں پر مشتمل تھا جن کا درمیانی فاصلہ بارہ فٹ تھا۔ سطح زمین سے تیس فٹ اوپر اور تیس فٹ نیچے تک جاتی تھیں اور اس پہ دس دس انچ کے فاصلے پر نشان لگائے گئے تھے۔ شمالی سرے پر موجود سوراخ میں سے گزرنے

والی شعاعیں ایک سفید سطح پر منعکس ہوتی تھیں جو محیط دائرے کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی تھیں چنانچہ اس طرح سے سورج کا انتہائی ارتفاع دریافت کرلیا گیا خجندی نے ۳۸۴ھ / ۹۹۴ء میں سُدس کی مدد سے منطقۃ البروج کی سطح کا اندازہ کیا۔ منطقۃ البروج کی سطح کا یہ اندازہ پہلے اندازوں سے قدرے مختلف ثابت ہوا یعنی ۲۳ درجے ۳۲ دقیقے ۲۱ ثانئے۔ جو مروجہ اندازے سے ۱/۳ ۴ دقیقے مختلف ہے۔

خجندی نے بہت شرح بسط سے یہ عذر پیش کیا ہے کہ علم ہیئت سے متعلق مقداریں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے سطح منطقۃ البروج کے مائل بہ تبدیل ہونے کے خلاف اصولاً کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ خجندی نے ایک اور آلہ بھی ایجاد کیا تھا جو "شاملہ" کہلاتا تھا یا اصطرلاب اور مقیاس الارتفاع دونوں کی جگہ کام آتا تھا ابتدا میں یہ ایک عرض بلد کے لیے ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بعد میں ابن حنین اصطرلابی نے اُسے سب اعراض بلدی کے لیے قابل استعمال بنا دیا۔ (ش۔ ج)

خدیجہ رضؓ

ام المؤمنین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ محترمہ قریش کے ممتاز خاندان اسد بن عبدالعزیٰ سے تھیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔ خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ اسد بن عبدالعزیٰ قریش کے ان نو ممتاز خاندانوں میں سے تھا جن میں دس قومی اور ملکی اعزازات منقسم تھے جب قریش کو قومی اور ملکی مسائل درپیش ہوتے تو وہ صلاح مشورے کے لیے اس قبیلے کے پاس آتے تھے۔ آبائی سلسلۂ نسب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ آنحضرت صلعم کی پھوپھی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ عام الفیل سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ کا پہلا نکاح ابو ہالہ تمیمی سے ہوا۔ بنو تمیم قریش کے ہم جد تھے۔ اس شوہر سے آپ کی تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے ہند اور حارث اور ایک لڑکی زینب۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ سے ہوا۔

دوسرے شوہر سے آپ کی ایک لڑکی ہوئی جو ام محمد کی کنیت سے مشہور ہوئی۔ عتیق بن عائذ رشتے میں حضرت خالدؓ بن ولید کے چچا تھے آپ بنو مخزوم سے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۳۵ برس تھی کہ آپ کے والد خویلد کا انتقال ہو گیا قریش کی طرح حضرت خدیجہؓ کا ذریعۂ آمدنی بھی تجارتی کاروبار تھا۔ حضرت خدیجہؓ ایک متمول خاتون تھیں۔ ان کا مال شام جایا کرتا تھا اور تنہا ان کا سامان تمام قریش کے سامان کے برابر ہوتا تھا۔ وہ معاوضے پر دوسرے لوگوں سے تجارت کا کام لیتی تھیں۔ آنحضرتؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ حضرت خدیجہؓ کی بھاوج تھیں۔ آپؐ اپنے چچا ابو طالبؓ کے ساتھ بعض تجارتی سفر کرنے کے بعد تجارت اور کاروبار میں ماہر ہوچکے تھے۔ آپؐ کی راست بازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق کا چرچا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے صدق و دیانت کا حال سُن کر آپؐ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرا مال تجارت لے کر شام جائیں۔ میرا غلام میسرہ آپؐ کے ہمراہ ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ جو معاوضہ میں آپ کے ہم قوموں کو دیتی ہوں آپؐ کو اس کا دگنا دوں گی۔ آپؐ جو سامان ساتھ لے کر گئے اسے فروخت کرکے دوسرا سامان خرید لیا۔ نیا سامان مکے میں فروخت ہونے سے اور بھی منافع ہوا۔ حضرت خدیجہؓ نے خوش ہو کر طے شدہ معاوضے کا دگنا ادا کیا۔ تجارتی سفر کے تین ماہ بعد حضرت خدیجہؓ نے نفیسہ بنت منیہ کے ذریعے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ آنحضرت صلعم، ابو طالب اور تمام رؤسائے خاندان حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے۔ ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانسو درہم طلائی مہر قرار پایا۔ شادی کے وقت آنحضرت صلعم کا سن مبارک ۲۵ برس اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی تھیں۔

غار حرا میں آنحضرت صلعم پر پہلی بار وحی نازل ہوئی تو آپ نے گھر آکر حضرت خدیجہؓ سے فرمایا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ اور ساری کیفیت بیان کی۔ حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا: "ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ بیکسوں اور فقیروں کے معاون ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ مصائب میں حق کی حمایت کرتے ہیں"۔ مسلمانوں کا [illegible] ہے کہ سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ آپ پر ایمان لائیں۔ قبول اسلام کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر پچپن سال تھی۔ قبول اسلام کے بعد حضرت خدیجہؓ کی دولت و ثروت تبلیغ دین و اشاعت اسلام کے لیے وقف ہوگئی۔ آنحضرت صلعم کو مشرکین کی تردید یا تکذیب سے جو صدمہ پہنچا، حضرت خدیجہؓ کے پاس آکر دور ہو جاتا۔ وہ آپ کو تسلی دیتیں آپ کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ آپ کی باتوں کی تصدیق کرتیں اور مشرکین کی بدسلوکیوں کو آپ کے سامنے ہلکا کرکے بیان کرتی تھیں۔ محرم [illegible] نبوت میں آپ کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ یہاں آنحضرت صلعم کے ساتھ حضرت خدیجہؓ بھی تین سال تک محصور رہیں۔

آنحضرت صلعم کے نکاح میں آنے کے بعد آپ کے چھ اولادیں ہوئیں۔ دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں۔ یعنی قاسمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہ، عبد اللہؓ۔ دونوں صاحبزادے صغر سنی میں فوت ہوئے۔ حضرت خدیجہؓ کو [illegible] حاصل ہے کہ حضرت ابراہیمؓ کے علاوہ آنحضرت صلعم کی تمام اولاد انہی سے پیدا ہوئی۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں آنحضرت صلعم نے دوسری شادی نہیں کی۔

شعب ابی طالب سے نکلنے کے چند روز بعد [illegible] رمضان ۱۰ بعثت نبوت کو ۶۵ برس کی عمر میں حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ آنحضرت [illegible] آپ کو حجون میں دفن کیا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات ابو طالب کی وفات سے تین دن بعد ہوئی۔ ان دونوں عزیزوں کی وفات سے آنحضرت صلعم کو جب صدمہ ہوا [illegible] نسبت سے وہ سال عام الحزن کہلایا۔ آنحضرت صلعم فرمایا کرتے تھے۔ خدیجہ نے اس وقت میری تصدیق کی اور مجھ پر ایمان لائی جب لوگوں نے میری [illegible] حضرت جبریلؑ حضرت خدیجہؓ کے لیے اللہ تعالیٰ کا سلام لے کر آتے تھے۔ [illegible]

خذلان

ایک اصطلاح۔ یہ صرف اس وقت استعمال ہوتی ہے جب اللہ [illegible] انسان کو اپنے فضل اور مدد سے محروم کر دے۔ بحث سورۂ آل عمران [illegible] سے شروع ہوتی [illegible] وہ تمہیں چھوڑ دے [illegible] تو کون ہے جو تمہاری [illegible] لہٰذا اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں [illegible] فرماتے ہیں [illegible] اسی آیت سے صحابہ کرامؓ نے یہ [illegible] اللہ کی مدد پر منحصر ہے اور ایمان سے محرومی کا سبب اللہ کی طرف سے خذلان [illegible] یہ بات ظاہر ہے کیونکہ آیت بالا صاف بتاتی ہے کہ [illegible] بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے [illegible] ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ صحیح حدیث [illegible] اسی وقت ممکن ہے جب [illegible] کی طرف سے [illegible] ہوتی ہے اور مومن کو ان اچھے کاموں کی توفیق ہوتی ہے جن کے لیے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ ابن حزم کا [illegible] ہے [illegible] نے آدمی کو دو صلاحیتیں دی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک تمیز اور دوسری

ہوا (یعنی خواہش اور ہوس)۔ جب اللہ کسی نفس کی حفاظت کرتا ہے تو اس وقت اللہ کی تائید و توفیق سے اس کی قوت تمیز غالب آجاتی ہے لیکن جب وہ نفس کو خود اسی پر چھوڑ دیتا ہے (خذل) تو پھر "ہوا" کو قوت دے کر اتنا غالب کر دیتا ہے کہ آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ یہی اضلال ہے۔" معتزلہ اس تصور کو اللہ کے عدل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اللہ کسی انسان کو بُرے کام کی رغبت نہیں دلاتا۔ چنانچہ ان کی اصطلاح میں خذلان کا مطلب ہے اللہ کا اپنے فضل سے محروم کر دینا۔ اشعریوں کے نزدیک خذلان کا مطلب نافرمانی کرنے کا میلان عطا کرنا ہے۔

خراج

زرعی ٹیکس جو غیر مسلم مالکوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ ہر اس زمین کا خراج وصول کیا جا سکتا ہے جسے مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد غیر مسلم مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا ہو۔ زرعی ٹیکس کے بارے میں حضورؐ کی ایک حدیث مبارک ہے جس زمین کو بارش نے سیراب کیا ہو اس پر عشر ہے اور جسے ڈول یا چھال سے سینچا گیا ہو اس پر نصف عشر ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین مسلمان کی ملکیت ہو گی تو اس پر دسواں حصہ یا پانچواں حصہ زرعی ٹیکس کی صورت میں دیا جانا ضروری ہے چونکہ غیر مسلم اس حدیث کا مخاطب نہیں ہو سکتا اس لیے وہ اپنی زمین کا ٹیکس خراج کی صورت میں ادا کرے گا۔ جو آپس میں باہم طے کیا جاتا ہے۔ خراج وصول کرنے والے کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے خراج مقرر کرے۔

خراج وصول کرنے کی ابتدا حضرت عمرؓ فاروق کے زمانے سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے غیر مسلم علاقہ فتح کرنے کے بعد صحابہ کبارؓ کے مشورے سے خراج کی ابتدا کی تھی اور ارض سواد پر پہلی مرتبہ خراج عائد کیا تھا اس کے بعد یہ سنت جاریہ بن گئی اور آپ کے بعد بھی مسلمانوں نے غیر مسلموں کے علاقے فتح کرنے کے بعد زمین دوبارہ ان کے سپرد کی تو ان پر خراج عائد کیا۔

مختلف فقہا نے خراجی زمین کی تین قسمیں بتائی ہیں جو خراج مقرر کرنے اس کی کمی یا زیادتی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ زمین زرخیز ہے یا بنجر جس سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کھیتی اچھی ہو گی یا خراب۔ اس کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ کھیتی کیسی ہے۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ آمدنی کتنی ہو گی۔ سب سے آخر میں آلات کشاورزی کو پرکھا جاتا ہے یہ تینوں باتیں کسی زمین پر خراج کی شرح عائد کرتے وقت ذہن میں رکھی جاتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے بعد خراج ان حکومتوں سے بھی وصول کیا جانے لگا جو طاقت و قوت میں کم تر ہوں یا ان کا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو اور لڑائی کے بغیر ہی صلح کر لیں۔ ایسی صورت میں صلح کے معاہدے میں خراج کے طور پر ایک رقم جو سالانہ وصول کی جاتی تھی مقرر کر لیتے تھے۔ عباسی دور کے فقہا نے جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں ان میں خراج کے بارے میں ضرور لکھا ہے۔ کیونکہ اس وقت خراج حکومت کا ایک اہم ذریعۂ آمدنی بن چکا تھا۔

کوئی زمین ابتدا ہی میں مسلمان کے پاس ہو تو اس پر خراج نہیں لگایا جا سکتا بلکہ عشر لگایا جائے گا۔ اور اگر وہ زمین کسی وجہ سے غیر مسلم کی ملکیت بن جائے تو بھی وہ عشری ہی رہے گی۔ اسی طرح اگر کوئی زمین پہلے کسی غیر مسلم کی ہو اور اس پر خراج عائد کیا جا چکا ہو اور وہ مسلمان کے پاس آجائے تو وہ زمین خراجی ہی رہے گی۔ حضورؐ اپنے زمانے میں جزیہ وصول کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ان لوگوں سے مقابلہ کرو جنہوں نے اللہ کا دین قبول نہیں کیا، نہ وہ یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، نہ دین کی پیروی کرتے ہیں یہاں تک کہ فروتنی کے ساتھ جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔"

خراج مقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ خراج دینے والے کو غیر ضروری تکلیف نہ پہنچے۔ علمائے فقہ کا قول ہے کہ عشر میں جو تکلیف ہے وہ مسلمان کو عبادت کا ثواب پہنچاتی ہے۔ اور خراج میں جو تکلیف ہے اس کا مطلب عقوبت ہوتا ہے۔

خراسان

ایران کے مشرق میں ایک وسیع صوبہ۔ عرب جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ اس کی سرحدیں مشرق میں سجستان اور ہند، مغرب میں صحرائے غزّ اور جرجان، شمال میں بلاد ماوراء النہر، جنوب میں صحرائے ایران اور ضلع قومس (عراق عجم)۔ اس صوبے کے بڑے شہر نیشاپور، مرو، شاہجان، ہرات اور بلخ تھے۔ موجودہ صوبہ خراسان میں قدیم صوبے کا نصف حصہ بھی شامل نہیں۔ سرخس سے شروع ہو کر جنوب کی طرف مشہد اور ہرات کے درمیان کا علاقہ افغانستان میں شامل ہو گیا ہے۔ مرو سے دریائے جیحون تک پھیلا ہوا علاقہ روسی قلمرو میں ہے۔

۳۱ھ/۶۵۲ء میں عبداللہ بن عامر نے ضحاک بن قیس کی کمان میں جو لشکر فارس اور خوزستان سے روانہ کیا تھا، وہ خراسان پر حملہ آور ہوا۔ ابن قتیبہ کے مطابق یہاں کے باشندوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں مناقشت ہوئی تو عربوں کو نیشاپور سے نکلنا پڑا۔ حضرت امیر معاویہؓ حکمران ہوئے تو انھوں نے خراسان کو پھر سے زیر نگین کر لیا۔ خراسان ہی وہ صوبہ ہے جہاں ابومسلم نے عباسیوں کے حق میں پراپیگنڈا کیا اور ان کی حمایت کے لیے فوجی بھرتی شروع کی اور بالآخر خلافت بنوامیہ کے زوال کا باعث بنا۔ خراسان حقیقی طور پر طاہری عہد میں آزاد ہوا جس کا مؤسس طاہر بن حسین تھا۔ اسے ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں خلیفہ مامون الرشید نے مشرقی علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔ ۹۰۰ء میں اسمٰعیل سامانی نے خراسان کو بلاد ماوراء النہر میں شامل کر لیا۔ ۹۹۴ء میں سلطان محمود بن سبکتگین اس پر قابض ہوا۔ ۱۰۳۸ء میں سلطان مسعود غزنوی نے خراسان فتح کیا۔ اگلے سال طغرل بیگ خراسان پر قابض ہوا۔ اس کے بعد خراسان خوارزم شاہیوں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۲۲۰ء میں چنگیز خاں کے حملوں نے خراسان کی آزادی کلیتہً ختم کر دی۔ ۱۲۲۰ء کے بعد خراسان میں آل کُرت اور سربداروں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ۱۳۸۱ء میں یہاں تیمور کا ورود ہوا۔ شیبک خاں ازبک نے شاہ اسمٰعیل اول کو شکست دے کر ۱۵۰۷ء میں خراسان فتح کر لیا۔ نادر شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نیشاپور اور مشہد کے سوا باقی علاقہ افغانستان میں شامل کر لیا۔ (ش۔ج)

خرقہ

کپڑے کا پھٹا ہوا ٹکڑا کسی صوفی کا موٹا جھوٹا اونی لبادہ۔ صوفی کے فقر و قناعت کی ظاہری علامت۔ علی ہجویریؒ کا مقولہ ہے۔ "صوفی وہ ہے جو دل میں حرقہ (سوزِ دروں) رکھتا ہو نہ کہ وہ جو تن پر خرقہ (ظاہری لباسِ درویشی)"۔ ابتدا میں بالعموم خرقہ نیلے رنگ کا ہوتا تھا۔ بعض اہل تصوف کوئی خاص لباس پہننا پسند نہیں کرتے تھے ان کی نظر میں یہ محض دکھاوا اور ریاکاری تھی۔ کسی مرید کو اپنے استاد (شیخ یا پیر) کی جانب سے خرقہ عطا کیا جانا ایک رسمی تقریب ہوتی تھی۔ خرقہ اس

بات کا پتا دیتا ہے کہ اس کے پہننے والے نے سچائی کا راستہ یعنی صوفیا کا طریقہ اختیار کر لیا ہے اور اپنی خودی کو ترک کرکے مکمل طور پر اپنے آپ کو شیخ کے حوالے کر دیا ہے۔

خرقے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک "خرقۃ الارادہ" جس کا کوئی شخص اپنے شیخ سے خواستگار ہوتا ہے اور اس کے قبول کرنے سے وہ بے چون و چرا فرمانبرداری کا پابند رہتا ہے۔ دوسرا خرقۂ تبرک ہے جسے شیخ اپنی منصبی حیثیت سے ایسے آدمیوں کو عطا کرتا ہے جن کے متعلق اسے خیال ہو کہ ان کو طریقۂ تصوف پڑا نا کار آمد ہوگا۔ (ش۔ ج)

خرقہ شریف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرہن کا نام جو قسطنطنیہ میں محفوظ ہے اور جس کی تبرک کے طور پر تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ ہر سال پندرھویں رمضان کو اس کی زیارت کا دن تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ یہ پہلے محل سلطانی کے ایک خاص کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ خرقہ شریف ایک چوڑی آستینوں والی عبا ہے جو اونٹ کی سفید اون کی بنی ہوتی ہے۔ ۱۸۴۹ء میں خرقہ شریف کو ایک مسجد میں منتقل کر دیا گیا جو سلطان عبد الحمید کی والدہ نے خاص طور پر اس کے لیے بنوائی تھی۔ یہ یادگار عمارت خرقہ شریف جامعی کہلاتی ہے اور استنبول کے ینی باغچہ محلے میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک وسیع باغ ہے۔ مسجد ایک خوش قطع ہشت پہلو عمارت ہے جس کے اوپر ایک گنبد ہے اور پہلوؤں میں ایوان ہیں جن سے یہ عمارت شیشے دار رواقوں کے ذریعے مل جاتی ہے۔ چھت کے کنارے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف لوہے کا خوبصورت جنگلا ہے۔ (ش۔ ج)

خرگوشی

(وفات ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء) ابو سعید عبد الملک ابن محمد خرگوشی ایک مشہور واعظ اور زاہد۔ نیشا پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پہلی کتاب "شرف النبی" آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ پر ہے۔ اس میں وہ تمام احادیث جمع کی گئی ہیں جو سیرت پاک سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کی آٹھ جلدیں ہیں۔ دوسری کتاب "البشارۃ والنذارۃ فی تعبیر الرؤیا" یہ ایک زاہدانہ تالیف ہے جو خوابوں کی تعبیر پر لکھی گئی ہے۔ ان کی تیسری اور سب سے اہم کتاب "تہذیب الاسرار" ہے۔ اس کتاب میں تصوف کی تاریخ کے متعلق کافی مواد ملتا ہے۔ اس میں تصوف کے اقوال باقاعدہ مرتب کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت ابو نصر السراج کی تالیف "کتاب اللمع" کا سرقہ ہے۔ (ش۔ ج)

خرمیّہ

ایک فرقہ جس نے ۱۳۶ھ میں ابو مسلم خراسانی کے قتل کے بعد شہرت پائی۔ ان میں سے ایک شخص سنبذ نے ابو مسلم کے انتقام کا مطالبہ کرتے ہوئے خراسان میں بغاوت کا آغاز کیا۔ اس بغاوت کو تین ماہ کے اندر دبا دیا گیا۔ اس کے بعد ان کا ذکر المامون کے عہد میں آتا ہے جب اس فرقے کے ایک شخص بابک خرمی نے اسلامی حکومت کے خلاف سرکشی اختیار کی۔ ۲۲۳ھ میں اسے ہلاک کر دیا گیا۔ المسعودی کے زمانے (۳۳۲ھ/۹۴۳ء) میں اس فرقے کے لوگ رے، اصفہان، آذربائیجان، کرخ، برخ، اور مسبذان میں پائے جاتے تھے۔

خرمیہ کے عقائد کے بارے میں مطہر بن طاہر نے "کتاب بدء الخلق والتاریخ" میں بیان کیا ہے کہ یہ لوگ مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہیں لیکن یہ سب کسی برگزیدہ ہستی کی دنیا میں واپسی کے عقیدے پر متفق ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ سب کے سب پیغمبر خواہ ان کی شریعت اور مذہبی طریقے ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ایک ہی جذبے سے متاثر ہوتے ہیں۔ الہام اور وحی کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ تمام مذاہب کے پیرو راستی پر ہیں جب تک کہ وہ دل میں جزا کی امید اور سزا کا خوف رکھیں۔ وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی شخص کو بدنام کیا جائے یا اسے کوئی ضرر پہنچایا جائے۔ جب تک کہ وہ ان کی جماعت کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرے یا ان کے دینی نظام پر حملہ کرنے کا خواہاں نہ ہو۔ وہ ابو مسلم کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ ان کے اپنے امام ہوتے ہیں جن سے وہ شرعی معاملات میں مشورہ لیتے ہیں اور ان میں ایسے مبلغین بھی ہیں جو ان کے درمیان دورہ کرتے رہتے ہیں انھیں وہ "فرشتوں" سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خمر اور دوسری شرابیں دیگر سب چیزوں سے بڑھ کر خوشی اور برکت کا موجب ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ اشتراک ازواج کو ممنوع تصور نہیں کرتے بشرطیکہ عورتیں اس پر راضی ہوں۔ (ش۔ ج)

خزاعہ بن عمرو

جنوبی عرب کا ایک قبیلہ جو عمر بن لحی بن ربیعہ بن حارثہ کی اولاد سے تھا۔ یہ لوگ قبیلہ آزد کی دوسری شاخوں کے ہمراہ عہد قدیم میں جنوبی عرب کو چھوڑ کر مکہ پہنچے اور بنو جرہم کے ساتھ ایک شدید جنگ کے بعد شہر مکہ اور حرم مکہ پر پورا تسلط جما لیا۔ ربیعہ بن حارثہ بن عمرو نے مکے کے آخری حکمران عامر بن عمرو بن حارث کی بیٹی فہیرہ سے شادی کر لی تاکہ بیت الحرام کی تولیت پر اپنا دعویٰ قانونی طور پر قائم کر لے۔ ربیعہ نے حج کی رسوم کا دوبارہ اجرا کیا اور زائرین کے آرام و آسائش کا انتظام کیا۔ اس نے سب سے پہلے کعبے کے گرد بت [illegible] خاص طور پر عرق عرب میں مقام ہیئت سے ہبل نامی بت [illegible] اللہ کے زمانے تک کچھ اور بتوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ بعض عرب [illegible] بیان کے مطابق اس قبیلے کے لوگ تین سو اور پانچ سو سال تک کعبے [illegible] آخری حکمران خلیل بن حبشیہ بن سلول بن کعب بن عمرو تھا جس نے [illegible] کی شادی قبیلۂ قریش کے سردار قصی بن کلاب سے کر دی۔ [illegible] اور خزاعہ کے درمیان جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں کعبے کی تولیت [illegible] حکمرانی اہل قریش کو مل گئی۔ (ش۔ ج)

خزرج، بنو

عرب کا ایک قبیلہ جو اپنے ساتھی قبیلے اوس کے ہمراہ آغاز اسلام کے وقت مدینہ، خیبر اور تیما میں آباد تھا۔ چونکہ ان دونوں قبیلوں نے اسلام کی [illegible] ترقی میں نمایاں حصہ لیا اس لیے انھیں "انصار" کے باعزت لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب رسول اللہ صلعم نے ۱۲ ربیع الاول ۱۳ نبوی (۲۴ ستمبر ۶۲۲ء) کو شہر یثرب (مدینہ) کے باہر کی بستی قبا میں نزول فرمایا تو یہ دونوں متحد ہو کر [illegible] شیر و شکر ہوئے۔ غزوۂ بدر میں خزرج کے ۱۷۵ افراد شریک جہاد تھے۔ انصار کو بھی مہاجرین ہی کی طرح معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ رسول اللہ کی مدح سرائی کرنے والے شاعر خزرجی تھے یعنی حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبد اللہ [illegible]

بن رواحہ۔ (ش۔ج)

خزیمہ بن ثابت انصاری

صحابیٔ رسولؐ۔ راوی احادیث نبوی۔کنیت ابوعمارہ تھی۔ خاندان ساعدہ، قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ ہجرت مدینہ منورہ سے قبل مسلمان ہوئے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ رسول کریم صلعم نے ایک بدو سے گھوڑا خریدا۔ آپ نے گھوڑے کی قیمت ابھی ادا نہیں کی تھی کہ بدو نے گھوڑا کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آنحضرت صلعم نے بدو سے فرمایا کہ میں تم سے گھوڑا خرید چکا ہوں۔ بدو نے کہا کہ گواہ لائیے۔ گواہ کے مطالبے پر سب مسلمان خاموش رہے لیکن حضرت خزیمہؓ نے کہا کہ میں گواہ ہوں کہ تم نے رسولؐ اللہ کے ہاتھ گھوڑا فروخت کیا۔ رسولؐ اللہ نے پوچھا کہ سودا کرتے وقت تم موجود نہ تھے تم کس طرح گواہی دیتے ہو؟ خزیمہؓ نے کہا میں آپ کی بات کی تصدیق کرتا ہوں آنحضورؐ نے خوش ہو کر "ذوالشہادتین" کا لقب دیا۔ جنگ جمل میں حضرت عمارؓ بن یاسر کو شامی افواج نے شہید کیا تو حضرت خزیمہؓ تلوار اٹھا کر شامی افواج کے خلاف برسر پیکار ہوئے اور شہادت پائی۔ حضرت خزیمہؓ فرماتے تھے "میں نے رسولؐ اللہ سے سنا تھا کہ عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا"۔ آپ نے رسولؐ اللہ سے ۳۸ احادیث بیان کی ہیں آپ انصار میں بڑی عزت اور وقار کے مالک تھے۔ (ش۔ج)

خسرو، امیر

(۱۲۵۳ء ــــــ ۱۳۲۵ء) برعظیم پاک و ہند کے عظیم المرتبت فارسی شاعر۔ اتر پردیش کے ضلع پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیف الدین محمود سلطان التتمش کے عہد حکومت میں فوجی ملازم تھے۔ خسرو آٹھ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا اور وہ نانا کی نگہداشت میں آ گئے۔ نانا کی وفات کے بعد خسرو نے پہلے سامانہ کے حاکم اور سلطان بلبن کے بھتیجے علاؤالدین کشلو خان کی ملازمت اختیار کی بعد میں سلطان کے بڑے بیٹے محمد قان کی ملازمت اختیار کی اور اس کے ساتھ ملتان چلے گئے ۱۲۸۴ء میں شہزادہ محمد مغلوں سے جنگ میں مارا گیا اور خسرو قید ہو گئے۔ تھوڑی مدت بعد رہائی پا کر دہلی پہنچے۔ ۱۲۸۷ء میں سلطان معزالدین کیقباد اپنے والد بغرا خاں سے ملنے کے لیے بنگال گیا تو خسرو بھی ساتھ گئے۔ واپسی پر حاتم خان حاکم اودھ کے پاس دو سال گزارے۔ بعد ازاں حاتم خان کی اجازت سے دہلی آئے اور کیقباد کی سرپرستی سے بہرہ اندوز ہوئے۔ سلطان جلال الدین خلجی کے دور حکومت (۱۲۹۰ - ۱۲۹۵) میں خسرو کو خلعت امارت عطا ہوا اور بارہ سو تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد سلطان علاؤالدین خلجی نے خسرو کا وظیفہ برقرار رکھا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ (۱۳۱۶ء - ۱۳۲۰ء) اور سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء) کے دور حکومت میں بھی امیر خسرو کو بادشاہ کا قرب اور سرپرستی حاصل رہی۔ آخر عمر میں امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے۔ سلطان محمد بن تغلق کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد امیر خسرو کا انتقال ہوا اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی پائنتی دفن ہوئے۔

امیر خسرو کی حسب ذیل تصانیف دستیاب ہیں۔ ۱۔ پانچ دیوان، تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ، نہایۃ الکمال (۲) خمسہ یعنی مطلع الانوار، شیریں و خسرو، آئینہ سکندری، ہشت بہشت، مجنوں و لیلیٰ (۳) غزلیات، مختلف مجموعے (۴) منثور تصانیف یعنی خزائن الفتوح، افضل الفوائد (حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات) اعجاز خسروی (۵) تاریخی مثنویاں یعنی قرآن السعدین، مفتاح الفتوح، دول رانی خضر خان، نہ سپہر، تغلق نامہ۔ امیر خسرو کی تصانیف قرون وسطیٰ کے ہندی اسلامی تمدن کا مفصل مرقع پیش کرتی ہیں امیر خسرو احساسات و واردات کے اظہار کے لیے نئی نئی تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں۔ گہرا مشاہدہ اور شدت احساس امیر خسرو کے کلام میں بدرجہ کمال نظر آتی ہے امیر خسرو کو الفاظ کے انتخاب کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ امیر خسرو کے واردات سالک و عارف کے واردات ہیں جو

امیر خسرو دہلوی

انہوں نے مجازی رنگ میں پیش کئے ہیں فلسفۂ حیات ان کا خاص موضوع ہے جس کے اہم عناصر آرزو، جستجو اور امن پسندی ہیں۔ وہ عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ماہر موسیقی بھی تھے وہ فن موسیقی کے استادوں میں شمار ہوتے تھے انہوں نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کی باہمی آمیزش سے کئی راگ اور راگنیاں تخلیق کیں۔ ستار کے موجد بھی وہی سمجھے جاتے ہیں۔ (ش۔ج)

خسرو، مُلّا

(وفات ۱۴۶۹ء) محمد بن فرامرز بن علی محمد خسرو، دولت عثمانیہ کا مشہور فقیہہ۔ خسرو نے تفتازانی کے مشہور و معروف شاگرد برہان الدین حیدر ہروی کی شاگردی اختیار کی اور ادرنہ کے "شاہ ملک" مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۴۴۴ء میں ادرنہ کے قاضی اور اس کے بعد رومیلیا کے قاضیٔ عسکر متعین ہوئے۔ قسطنطنیہ کے سب سے پہلے قاضی خضر بیگ کی وفات پر اس کے جانشین بنے۔ اسی دوران میں ایا صوفیہ میں مدرس بھی رہے ۱۴۶۲ء میں بروسہ چلے گئے جہاں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ ۱۴۶۹ء میں سلطان کے حکم سے استنبول آئے اور شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ استنبول ہی میں وفات پائی۔ ملا خسرو ایک مشہور و معروف فقیہہ تھے مصنف کی حیثیت سے بھی انہوں نے بڑی شہرت پائی۔ ان کی دو اہم تصانیف دُرر الحکام فی شرح غرر الاحکام، میں فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اور مرقات الوصول فی علم الاصول، اصول فقہ پر مشتمل ہے۔ (ش۔ج)

خسوف وکسوف

چاند گرہن اور سورج گرہن۔ زمین اپنی گردش کے دوران میں جب سورج اور چاند کے درمیان آ جاتی ہے تو چاند پر اس کا سایہ پڑنے لگتا ہے جسے عرف عام میں چاند گرہن کہتے ہیں۔ چاند گرہن کبھی مکمل لگتا ہے اور کبھی جزوی۔ زمین اور چاند دونوں

دراصل تاریک سیارے ہیں جو سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد اپنے مدار پر گردش کر رہی ہے اور چاند زمین کے گرد۔ یہ دونوں سیارے سال میں تقریبًا دو مرتبہ ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں۔ سورج گرہن اس وقت ہوتا ہے جب چاند زمین کے گرد اپنے مدار پر گردش کرتا ہوا زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے تو اس کا سایہ سورج پر پڑنے لگتا ہے۔ یہ سایہ کبھی تاریک ہوتا اور کبھی نیم تاریک۔ جب سورج کو گرہن لگتا ہے تو اس وقت سورج، چاند اور زمین ایک دوسرے کی سیدھ میں ہوتے ہیں۔ سورج کو عام طور پر جزوی گرہن لگتا ہے لیکن جب کبھی سورج مکمل گرہن ہوتا ہے تو دن کے وقت بھی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ستارے نظر آنے لگتے ہیں۔ سورج ایک سیاہ گیند کی طرح نظر آنے لگتا ہے جس کے گرد ایک زرد ہالہ بنا ہوتا ہے۔ مکمل سورج گرہن زیادہ سے زیادہ سات منٹ تک رہتا ہے اور اس کے بعد گرہن اترنا شروع ہو جاتا ہے۔ سورج گرہن کو ننگی آنکھ سے یا عام رنگ دار شیشوں کی مدد سے نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ اس وقت سورج سے ایسی شعاعیں خارج ہو رہی ہوتی ہیں جن سے آنکھوں کی بینائی کو نقصان پہنچتا ہے۔ ۲۱ جون ۱۹۵۵ء کو دنیا کے بیشتر ملکوں میں مکمل سورج گرہن ہوا تھا۔ بہت سی قومیں سورج گرہن، چاند گرہن کو برا خیال کرتی ہیں اور ان سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ ہندو ان دنوں دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ مسلمان بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نماز خسوف وکسوف ادا کرتے ہیں۔

حضرت ابوموسٰی نماز خسوف کے بارے میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ "ایک بار سورج گرہن ہوا، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھبرائے اور ڈرے کہ قیامت نہ آجائے چنانچہ مسجد میں آئے اور نماز پڑھی۔ اس میں رکوع وسجود اتنا طویل کیا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر فرمایا "یہ اللہ کی نشانیاں ہیں، کسی کے مرنے اور پیدا ہونے کے سبب گرہن نہیں لگتا۔ بلکہ خدا نشانیوں کے ذریعے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ لہٰذا جب گرہن دیکھو تو اللہ سے ڈرو، ذکر، دعا اور استغفار کرو۔" (متفق علیہ)

ایک اور حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ "جس دن حضرت ابراہیمؑ (آنحضرتؐ کے بیٹے) کی وفات ہوئی تو سورج کو گرہن لگا۔ چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو چھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھائی۔" (مسلم)

خضاب

مہندی کو کہتے ہیں۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ونصاریٰ خضاب نہیں کرتے تو تم ان کی مخالفت کرو۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سب سے بہتر چیز جس سے بڑھاپا بدل جائے مہندی اور وسمہ ہے۔ ہمام کی بیٹی کریمہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے امّ المومنین حضرت عائشہؓ سے مہندی کے خضاب کے بارے میں دریافت کیا۔ امّ المومنین نے فرمایا کہ خضاب میں کچھ حرج نہیں لیکن اپنے لیے اس کو اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی بُو ناپسند تھی۔ خضاب کی ممانعت کہیں سے ثابت نہیں۔ (ش۔ ج)

خضرؑ

اللہ کے نبی اور برگزیدہ بندے۔ آپ کی حیات ووفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض صوفیا اور اہل معرفت ان کی حیات کے قائل ومعتقد ہیں۔ وفات کے قائل مکتب کا کہنا ہے کہ اگر حضرت خضرؑ عہد نبویؐ میں زندہ ہوتے تو ضرور آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ پر ایمان لاتے اور آپؐ کی رفاقت میں جہاد کرتے مستند روایات سے ثابت ہے کہ حضرت خضرؑ نہ کسی صحابی کو ملے اور نہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت خضرؑ کے متعلق جو روایتیں اور حکایتیں مشہور ہیں ان کا تعلق قرآن مجید کے اس بیان سے ہے جو سورۃ کہف میں مذکور ہے امام بخاریؒ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک دن بنو اسرائیل کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے سوال کیا: لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: "میں" اس پر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ سے ناراض ہو گئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ "مجمع البحرین" کے مقام پر ایک بندے سے ملیں جو ان سے زیادہ عالم ہے۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ زنبیل میں ایک مچھلی ساتھ لے جائیں اور جہاں پہنچ کر مچھلی گم ہو جائے وہاں حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوگی۔ حضرت موسیٰؑ اپنے خادم کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے جس کی منزل مجمع البحرین تھی وہاں ان کو خدا کے برگزیدہ بندہ ملے۔ حضرت موسیٰ نے ان کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی تاکہ وہ حضرت خضرؑ کے علوم باطن سے بہرہ ور ہو سکیں۔ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے تاکیدًا کہا کہ وہ ان سے کسی بات کی تشریح طلب نہ کریں۔ اور یہ بھی کہا کہ انجام کار موسیٰؑ ان کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ سفر کے دوران میں حضرت خضرؑ نے چند ایسی باتیں کیں [illegible] غریبوں کی کشتی میں سوراخ کرنا، ایک لڑکے کو قتل کرنا، ایک گرتی دیوار تعمیر کرنا جن سے حضرت موسیٰؑ کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ حضرت خضرؑ نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ بالآخر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کا ساتھ چھوڑ دیا اور چلتے وقت اپنے افعال کی تشریح وتوجیہہ بتائی۔

"مجمع البحرین" کے بارے میں بھی علما میں اختلاف ہے بعض مفسرین نے [illegible] سے مراد وہ جگہ ہے جہاں باب المندب کے پاس بحر ہند اور بحیرہ [illegible] یہ مقام طنجہ کے قریب ہے جہاں بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس ملتے ہیں [illegible] بحیرہ قلزم اور بحیرہ روم ملتے ہیں۔ (ش۔ ج)

خضر بیگ

(م اگست ۱۴۰۷ء ۔ ۸۵۹ھ) عثمانی عالم و شاعر [illegible] خاندان سے تھا اور سیوری حصار کا قاضی تھا۔ [illegible] پہلے قاضی اور پھر مدرس مقرر ہوئے۔ [illegible] میں مدرس اور بالآخر قسطنطنیہ کی فتح پر وہاں کے پہلے قاضی [illegible] علوم اسلامیہ کے ماہر اور عربی، فارسی اور ترکی ادبیات کے [illegible] خضر نے بحر بسیط میں ایک واعظانہ [illegible] متعدد تصانیف ہیں جو زیادہ منظوم ہیں۔ خضر بیگ کا [illegible] بالمقابل ایشیائی ساحل پر ان کی بڑی جاگیر تھی [illegible] قاضی کوی" یعنی قاضی کا گاؤں کہلاتا ہے۔ (س۔ ج)

خضر خان سید

(وفات ۲۰ مئی ۱۴۲۱ء) [illegible] خضر خان [illegible] تغلق کے امیر مردان دولت کا متبنّی تھا۔ خضر خان کو ملتان کی جاگیر [illegible] میں تیمور نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو خضر خان بھاگ کر میوات چلا گیا۔ [illegible] کے بعد وہ تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملتان و دیپالپور کی جاگیر [illegible] محمود کے وزیر اقبال خان نے ملتان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جسے خضر خان نے [illegible]

۱۲ر نومبر ۱۴۰۵ء کو ہلاک کر دیا۔ محمود تغلق کی وفات کے بعد امرائے دہلی نے دولت خان کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ خضر خان نے دولت خان کا محاصرہ کر لیا۔ دولت خان نے ناچار شہر دولت خاں کے سپرد کر دیا۔ ۴ر جون ۱۴۱۴ء کو دولت خان کو حصار فیروزہ میں قید کر دیا گیا ہے۔ بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔

دہلی کی فرمانروائی حاصل کرنے کے بعد خضر خان نے روہیل کھنڈ اور دوآبہ گنگا جمنا کے باغی صوبوں کو دوبارہ مطیع بنا لیا اور ۱۴۱۶ء میں گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ سرہند میں ترکوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۱۴۲۱ء میں خضر خان نے میوات پر فوج کشی کی جہاں سے وہ اٹاوہ کے راستے واپس ہوا۔ دہلی واپس آنے پر علالت کے باعث اس کا انتقال ہوا۔

خطا

صحیح سمت یا راستے سے منحرف ہو جانا۔ خطا وہ عمل ہے جو بلا ارادہ نہ کیا گیا ہو۔ لغت نویسوں میں یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ خطا کو غیر ارادی سمجھنا چاہیئے یا ارادی۔ ایک علمی اصطلاح کے طور پر خطا کا استعمال صواب کی ضد کے معنوں میں ہوتا ہے۔ اس کی دو بڑی صورتیں یہ ہیں (۱) کوئی منطقی غلطی، ناقابل قبول۔ اوّل الذکر کا استعمال مسائل اجتہاد میں اور مؤخر الذکر کا استعمال عقائد میں ہوتا ہے۔ (۲) فعل غیر ارادی۔ یعنی وہ فعل جو خلاف قانون تو ہے لیکن جو اس نیت سے نہیں کیا گیا کہ قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ خواہ یہ فعل عمداً ہی کیوں نہ سرزد ہو۔ معتزلہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس قسم کے افعال پر بارگاہ الٰہی سے کوئی سزا نہیں مل سکتی کیونکہ سزا صرف اس فعل پر ملتی ہے جس میں عمداً قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ اہل سنّت کا نظریہ یہ ہے کہ اگرچہ خطا کو اثم (گناہ) نہیں ٹھہرایا جا سکتا، تاہم مغفرت بہرحال ایک فعل ارادی ہے، اگر جرم اس طرح سرزد ہو گی۔ اس کی سزا مل سکتی ہے۔

خطابیہ

ایک فرقہ جس کا شمار انتہا پسند شیعوں میں ہوتا ہے۔ یہ فرقہ ابوالخطاب محمد بن ابی زینب سدی اجدعی سے منسوب ہے۔ ۲۰۰ھ کے قریب اس فرقے کے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تھی اور سواد کوفہ اور یمن میں آباد تھے۔ ابوالخطاب اپنے مخالفین سے قطعی بے رحمی کا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ مردوں، عورتوں، بچوں سبھی کو اس کے خیال میں قتل کر دینا ضروری تھا وہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں جھوٹی گواہی دینا بھی جائز قرار دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالخطاب کی وفات کے بعد اس کے معتقدین نے محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادقؒ کو امام تسلیم کر لیا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خم غدیر کے روز رسول اللہؐ نے اپنا منصب نبوت حضرت علیؓ کو منتقل کر دیا تھا۔ اس فرقے پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ تمام قوانین اخلاق اور شریعت اسلام سے منکر ہو گیا تھا اس کے پیرو تناسخ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ چونکہ بظاہر اس فرقے کی کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا دشوار ہے کہ یہ بیانات کہاں تک صحیح ہیں۔

خطبہ

وہ خطاب یا تقریریں جو عبادت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ رسول اللہؐ کے خطبات کلمۂ "امابعد" سے شروع ہوتے۔ حمد باری تعالےٰ کے ساتھ شہادت (تشہد) کا بھی ذکر ہوتا بہت سی حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہؐ خطبے میں قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تھے۔ اذان کے دوران میں رسول اللہؐ منبر پر تشریف فرما رہتے تھے۔ اقامت اس وقت پڑھی جاتی جب آپؐ خطبہ ختم کر کے منبر سے نیچے اتر آتے تھے۔ عیدین کے موقع پر آپؐ صلوٰۃ کا اختتام تسلیم سے کرنے کے بعد کھڑے ہو جاتے اور حاضرین کی جانب متوجہ ہوتے۔

جمعہ کی نماز میں دو خطبے نماز سے پہلے پڑھے جاتے ہیں۔ باقی نمازوں میں صلوٰۃ پہلے اور خطبہ بعد میں ہوتا ہے ان خطبوں کے متعلق یہ شرائط مقرر ہیں۔ خطیب کو طہارت شرعیہ کی حالت میں ہونا چاہیئے۔ اس کا لباس مقررہ طرز کا ہونا چاہیئے۔ اُسے دونوں خطبے کھڑے ہو کر پڑھنے چاہئیں اور ان کے درمیانی وقفے میں بیٹھ جانا چاہیئے۔ جمعہ کے اجتماع میں سامعین کی جو تعداد شرعاً ضروری ہے وہ موجود ہونی چاہیئے۔ خطبے کے واجبات یہ ہیں۔ حمد باری تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام۔ دونوں خطبوں میں دینداری کی تلقین۔ جمہور کے لیے دعائے خیر۔ پہلے خطبے میں قرآن کے ایک جزو کی تلاوت (بعض فقہا کے نزدیک دونوں خطبوں میں)۔ خطیب کے لیے یہ بات مستحسن ہے کہ وہ منبر پر یا اونچی جگہ پر کھڑا ہو۔ منبر پر قدم رکھنے کے بعد حاضرین کو السلام وعلیکم کہے۔ مؤذن کے اذان ختم کرنے تک بیٹھ جائے کسی کمان تلوار یا عصا کے سہارے کھڑا ہو۔ سامعین کی طرف فوراً متوجہ ہو جائے۔ اہل اسلام کی طرف سے دُعا مانگے اور اپنے خطبے کو مختصر کرے۔

عیدین کے خطبے مندرجہ ذیل باتوں کے سوا خطبہ جمعہ کی طرح ہوتے ہیں۔ خطیب اپنے خطبے کا آغاز تکبیروں سے کرتا ہے۔ عید الفطر کے موقع پر سامعین کو صدقہ فطر کے فوائد و قواعد سے آگاہ کرتا ہے۔ عید الاضحیٰ کے دن قربانی کی اہمیت اور شرائط سے آگاہ کرتا ہے۔

خطیب

وعظ کہنے والا۔ جمعہ وعیدین کا خطبہ پڑھنے والا اور فصیح البیان مقرر۔ خطیب اور وعظ میں یہ فرق ہے کہ خطیب بعض خاص مواقع پر زور خطابت دکھاتا ہے اور وعظ وقع یا محل کا پابند نہیں ہوتا۔ مکہ معظمہ کی فتح کے بعد خود رسول اللہؐ بطور خطیب لوگوں کے سامنے آئے اور آپؐ نے مجمع عام میں تقریر فرمائی۔ یہ صورت حال پہلے چار خلفا اور بنو امیہ کے عہد میں قائم رہی اور ان کے مقرر کئے ہوئے حکام بھی خطبا کے فرائض انجام دیتے تھے وہ عصا یا نیزہ جو مسلم خطیب خطبہ پڑھتے وقت اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑے رہتا ہے، قدیم عرب کی ایک موروثی یادگار ہے۔ خطبے اور نماز کی دینی اہمیت نے خطیب کو ایک خصوصی اہمیت دی ہے۔ ہارون الرشید کے عہد سے خلیفہ نے نماز کے موقع پر خطبہ پڑھنے کا کام قضاۃ پر چھوڑ دیا اور خود سامعین میں شامل ہو گیا۔ مملوک سلاطین کے عہد میں ہر مسجد کا اپنا خطیب ہوتا تھا۔ صرف بڑی مساجد کے معاملات سے سلطان واسطہ رکھتا تھا۔

ماوردی کے بقول خطیب کے لیے بہتر یہ ہے کہ سیاہ لباس پہنے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک سیاہ لباس کا پہننا بدعت میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں سفید لباس پہننا چاہیئے۔ خطیب کے نشان عودان (دو لکڑی کی چیزیں) ہیں یعنی منبر اور عصا یا لکڑی کی تلوار خاص جسے وعظ کے دوران میں اپنے ہاتھ میں رکھنا، کتب فقہ کی رُو سے خطیب کے لیے ضروری ہے۔ مسجد نبوی میں ۱۹۰۹ء میں ۴۶ خطیب اور مکہ معظمہ میں ۱۲۲ خطیب تھے۔

خطیب بغدادی

(۱۰ر مئی ۱۰۰۲ء۔ ۵ ستمبر ۱۰۷۱ء) ابوبکر احمد بن علی بن ثابت، مشہور محدّث اور خطیب۔ بغداد کے جنوب میں درزجان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لڑکپن کا زمانہ حدیث کی جُستجو میں سفر کرنے میں گزارا۔ اس جُستجو میں وہ بصرے، نیشاپور، اصفہان، ہمدان اور دمشق گئے۔ بالآخر انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی اور خطیب کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی بنا پر خطیب بغدادی کے نام سے معروف ہوئے۔ علم حدیث میں متبحرانہ دسترس رکھنے کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ شروع میں حنبلی رہنے کے بعد ان کا شافعی مذہب کو ترجیح دینا ان کے فقیہانہ نظریئے رجحن پر اشعریت کا اثر غالب تھا) ان سب باتوں نے امام احمدؒ کے شاگردوں کو ان سے متنفر کر دیا تھا لیکن حنبلیوں کی مخالفت کے

باوجود خلیفہ القائم اور وزیر ابن مسلمہ کی تائید اور حمایت سے خطیب بغدادی ،المنصور کی کی مسجد میں حدیث سے متعلق ایک سلسلۂ درس جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔جب البساسیری کی کامیاب بغاوت ابن مسلمہ کی تباہی کا باعث ہوئی تو خطیب بغدادی نے دمشق میں پناہ لی۔دمشق کے فاطمی حکمران نے انہیں گرفتار کرلیا۔لیکن آپ نے فرار ہوکر صور اور حلب کا رخ اختیار کیا سلجوقیوں نے بغداد میں امن وامان بحال کیا تو خطیب بغدادی واپس بغداد آگئے۔اس کے ایک سال بعد وہیں وفات پائی۔ان کے سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔ان میں سب سے مشہور "تاریخ بغداد" ہے

خفاجی

(۱۵۷۱ء - ۳ر جون ۱۶۵۹) شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر الخفاجی مصری حنفی۔ مصنّف ، عالم دین اور قاضی عسکر۔ اپنے ماموں ابوبکر شنوانی سے نقہ حنفی اور فقہ شافعی پڑھی۔طب داؤد بصیر سے پڑھی۔حج کے دوران میں مکہ اور مدینہ کے علماء سے استفادہ کیا۔واپسی پر قسطنطنیہ گئے جہاں انہوں نے ریاضیات اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں۔ اپنے استاد سعدالدین بن حسن کی وفات کے بعد انہیں قسطنطنیہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور انہیں روم ایلی کا قاضی بنادیا گیا۔بعد میں مصر میں قاضی عسکر بناکر بھیجے گئے جلد ہی معزول ہوئے۔ان کی قابلیت کے اعتراف میں انہیں قاہرہ میں قاضی بنادیا گیا۔قاہرہ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ان کی سب سے بڑی کتاب تفسیر بیضاوی کی شرح ہے جس کا نام عنایۃ القاضی ہے یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے دوسری بڑی تصنیف قاضی عیاض کی کتاب الشفاء کی شرح "نسیم الریاض" ہے۔خفاجی نے "مقامات الرومیہ" قسطنطنیہ کے عالموں کی تنقیص میں لکھی۔اور بھی کئی تصانیف آپ سے منسوب ہیں۔ (ش۔ج)

خفیفیہ

ایک فرقہ جس کے لوگ حضرت ابی عبد اللہ محمد بن خفیف شیرازیؒ سے عقیدت رکھتے ہیں۔حضرت ابی عبد اللہ علوم ظاہر و باطن کے بہترین عالم تھے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے چار سو نکاح کیے لیکن شہوت نفسانی کی متابعت سے منہ موڑے رکھا۔آپ کی تمام منکوحہ بیویوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے شیخ کو خلوت میں اسباب شہوت کے تابع کبھی نہیں پایا۔

آپ نے علم طریقت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھیں جو آپ کے پیروکاروں میں بہت مقبول ہیں۔حضرت ابی عبد اللہ کے مسلک اور مذہب کا اصول غیبت اور حضور ہے۔انہوں نے اپنی کتابوں میں سب سے زیادہ اسی کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

غیبت وحضور دو ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی اس طرح واضح کیے جاسکتے ہیں جیسے کسی آنکھ میں اصل چیز کا عکس پڑتا ہے۔پھر وہ عکس اصل سے متضاد دکھائی دیتا ہے۔بالکل اسی طرح حضور سے مراد یقینی دلالت کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے سامنے دل کا حاضر ہونا ہے۔تاکہ غیبی حکم اس کے لیے عینی حکم بن جائے۔

غیبت سے مراد ہے کہ کسی بھی شخص کا دل اپنے آپ سے اس طرح غائب ہوجائے جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو اور وہ اس غیبت میں اپنے آپ کو دیکھ سکے، پرکھ سکے۔

وہ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ سے غائب ہوجاتا ہے وہ خدا تعالےٰ کے حضور میں حاضر ہوجاتا ہے۔کیونکہ حبیب اللہ تعالےٰ کی کششوں کے باعث اس کا دل غائب ہوتا ہے تو دل سے کسی اور کی کشش ختم ہوجاتی ہے اور وہ کسی دوسری شئے کو اس سے نسبت نہیں دیتا۔

حضرت جنیدؒ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا "ایک وقت میری حالت یہ تھی کہ اہل آسمان وزمین میری حیرانی پر روتے تھے اور پھر ایسا ہوا کہ میں ان کی غیبت پر رونے لگا۔لیکن اب یہ حال ہے کہ نہ اُن کی مجھے خبر ہے اور نہ اپنی۔ اور یہی حضور کی طرف ہیبت آمیز اشارہ ہے۔"

خلافت

اس کے ایک معنی خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا ، دوسرے معنی خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امر شرعی کے تحت اختیارات خلافت کو استعمال کرنا اور تیسرے معنی ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا ہیں۔قرآن مجید کی رو سے انسان کو خلافت الٰہی یعنی زمین پر خدا کی نیابت بخشی گئی۔حضرت آدمؑ کی تخلیق کے وقت فرشتوں کو مخاطب کرکے اللہ تعالےٰ نے فرمایا: "میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔ (البقرہ: ۳۰) انبیاء میں حضرت داؤدؑ کے بارے میں صریحاً حکم ہوا: "اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ اس لیے لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔" (ص: ۲۶)۔ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو خلافت ارضی کی بشارت دی: "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں خلافت ارضی ضرور عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی گئی" (النور: ۵۵)۔ قرآن میں خلافت کے ساتھ ساتھ اس کے فرائض بھی بتائے گئے ہیں "خلافت کے مستحق وہ لوگ ہیں کہ اگر انھیں ہم زمین میں غلبہ و اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ سب چیزوں کا انجام کار اللہ کے اختیار میں ہے" (حج: ۴۱)۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: تمہیں میری اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا چاہیے (ابن ماجہ)۔ صاحب شریعت کی نیابت خلافت اور امامت کہلاتی ہے اور اس منصب کا حامل خلیفہ یا امام کہلاتا ہے امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "السیاست الشرعیہ" میں (امام یا خلیفہ) کا سب سے بڑا منصب یہ بتایا ہے کہ وہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کریں اور خدا اور رسول کے احکامات کے مطابق عمل کریں۔

شیعی فقیہوں نے امامت کے اصول کو اپنے عقیدے کا ایک بنیادی جزو قرار دیا ہے۔ انھوں نے نص پر زور دیا ہے اور خلیفہ کے عہدے کو حضرت قریش کے خاندان بلکہ صرف حضرت علیؓ کے خاندان تک محدود کردیا ہے اور یہ عقیدہ رکھا کہ حضرت علیؓ کو رسول اللہ نے براہ راست اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور حضرت علیؓ کی صفات کو ان کی اولاد نے وراثتاً پایا اور یہ لوگ ابتدا سے خدا ہی سے اس اعلیٰ عہدے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ رسول اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کو کچھ بڑا اسرار علوم سکھائے تھے جو حضرت علیؓ نے بعد میں اپنے فرزندوں کو بتائے اور اس طرح سے وہ نسلاً بعد نسل ایک دوسرے کو منتقل ہوتے رہے۔ ابن خلدون نے شیعی نقطہ نظر بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"امامت عوامی مسائل میں سے نہیں کہ اسے امت کے سپرد کردیا جائے اور امت کا نگران خود امت کے مقرر کرنے سے متعین ہوا کرے بلکہ یہ تو دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے کسی نبی کے لیے اس مسئلے سے غفلت کرنا یا امت کو تفویض کرنا جائز نہیں بلکہ نبی کے لیے واجب ہے کہ وہ امت کا امام خود متعین

کرکے جائے۔ یہ امام کبیرہ وصغیرہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کو رسول اللہؐ نے نصوص کے ذریعے متعین کیا تھا۔"

خلافت، تحریک

پہلی عالمگیر جنگ میں ترکوں نے انگریزوں کے خلاف جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ دیا تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کو فتح ہوئی۔ ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے پارلیمنٹ میں تقریبا تقریر کرتے ہوئے زور دے کر واضح کیا تھا کہ ہم ترکی کی سلطنت اور اس کے دارالحکومت قسطنطنیہ کے لیے قطعاً کسی خطرے کا سبب نہیں بنیں گے اور ہماری طرف سے ترکی کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ لیکن ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس میں سلطنت ترکی کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خلافت بھی عملاً ختم کر دی گئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ تحریک خلافت کا آغاز احتجاجی جلسوں سے ہوا۔ مسلم کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ملک بھر میں یوم خلافت منایا گیا۔ تمام کاروبار بند رہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے ہفتہ تقریبات امن منانے کا اعلان کیا لیکن مسلمانوں نے ان تقریبات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں مسٹر فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مسٹر گاندھی، موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالوی بھی شریک ہوئے۔ مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔ ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اور فیصلہ ہوا کہ خلافت کے مسئلے پر لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک وفد یورپ روانہ کیا جائے۔ دوسری طرف برطانیہ دنیا بھر میں یہ جھوٹا پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھا کہ ترکی کی حرکتیں اسے سخت ترین سزا کا حقدار بناتی ہیں۔ ترکی اسی سلوک کا مستحق ہے کہ اسے کچل دیا جائے۔ وفد عدن اور پورٹ سعید کے شہروں سے ہوتا ہوا لندن پہنچا۔ اس وفد میں مولانا محمد علی، مولانا سید سلیمان ندوی اور سید حسن امام بیرسٹر پٹنہ شامل تھے۔ وفد نے برطانوی وزیراعظم سے ملاقات کی لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ مفتوحہ قوم خواہ مسلمان ہو یا عیسائی، ایک جیسے سلوک کی مستحق ہے۔ ترکی نے برطانیہ سے شکست کھائی ہے لہذا اب اسے شکست کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مولانا محمد علی نے اس گفتگو کا جواب دینا چاہا تو برطانوی وزیراعظم نے کہا کہ میں رات بھر بیٹھ کر آپ کی بحث نہیں سننا چاہتا۔ ملاقات کے خاتمے پر مولانا سید سلیمان ندوی نے خلافت کی اہمیت کے بارے میں ایک کتابچہ دینا چاہا تو برطانوی وزیراعظم نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وفد خلافت نے فرانس اور اٹلی کے متعدد شہروں کا دورہ کیا اور اپنے مشن سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں وفد واپس ہندوستان پہنچا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی اور علی برادران کے مشورے سے طے پایا کہ عدم تعاون کی ملک گیر تحریک چلائی جائے۔ عدم تعاون کے پروگرام کی کانگریس، جمعیت علمائے ہند اور خلافت کمیٹی نے حمایت کر دی۔ عدم تعاون کی اپیل کا ہندوؤں اور مسلمانوں نے کھلے دل سے خیر مقدم کیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء سے جنوری ۱۹۲۲ء کے درمیانی عرصے میں تین ہزار سے زائد ہندو مسلم تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار کئے گئے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین اور پیر غلام مجدد نثار احمد کو دو دو سال کے لیے قید کر دیا گیا۔ عدم تعاون کی تحریک کو گرفتاریوں سے زبردست دھچکا لگا، لیکن اس کے مکمل خاتمے میں تشدد آمیز واقعات نے حصہ لیا۔ تحریک خلافت سے کانگریس کو دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو مسلمان دھڑا دھڑ کانگریس میں شامل ہونے لگے۔ دوسرے کانگریس کو وہ طاقت حاصل ہوگئی جو پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی، لیکن جس طریق سے گاندھی نے اس تحریک کو ختم کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے بارے میں اس قسم کے شکوک وشبہات پیدا کئے جن کو پھر کبھی دور نہ کیا جا سکا۔ تحریک خلافت بے نتیجہ ثابت ہوئی، کیونکہ ترکی میں مسلمانوں نے دوبارہ طاقت پکڑ کر جو آزاد حکومت قائم کی اس کی اسمبلی کے سربراہ کمال اتاترک نے خلافت کے باقاعدہ خاتمے کا اعلان کر دیا۔

خلافتِ راشدہ

صالحین کا وہ عہد حکومت جسے امت محمدیہؐ کی اجتماعی تائید وحمایت حاصل تھی اور جس نے عدل اور حق کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دین اسلام کے تمام ظاہری باطنی، دنیوی اور اخروی تقاضے پورے کیے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک خلفائے راشدین سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ امراد ہیں جو رشد وہدایت سے بہرہ مند اور راہ حق وعدل پر گامزن تھے۔ انھوں نے کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے اسلام کی اشاعت اور امتِ اسلامیہ کی دینی ودنیوی فلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ خلافت راشدہ کے بارے میں رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ خلافت علی منہاج النبوت (طریقہ نبوی پر عمل پیرا ہونے والی خلافت) تیس سال تک ہوگی (ابو داؤد: السنن) رسول کریم صلعم کی وفات کے وقت صحابۂ کرامؓ میں دو قسم کے مکتب فکر ظاہر ہوئے ایک نظریہ یہ تھا کہ آپؐ کی نیابت کا منصب خاص ہے۔ دوسرا یہ تھا کہ یہ منصب عام ہے اور ہر مسلمان جو لازمی اوصاف سے متصف ہو، بلا امتیاز، رنگ ونسل خلیفہ بن سکتا ہے۔ موخر الذکر نظریہ انصار کا تھا جو آپؐ کی رحلت کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہ انصاریؓ نے انصار کی اسلامی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انصار کا استحقاق خلافت ثابت کیا۔ مہاجرین کی ایک بہت بڑی جماعت خلافت کو قریش میں مختص سمجھتی تھی اور بعض مہاجرین کا خیال تھا کہ یہ منصب قرابت رسول کی اساس پر حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ یا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کو بحیثیت وارث (العاصب) ملنا چاہیے۔ لیکن اس موقع پر اکثریت نے مہاجرین کی عظیم جماعت کے اس موقف کی تائید کی جو یہ کہتا تھا کہ نیابت رسول خاندانی موروثی ہونے کی بجائے شوریٰ اور بیعت عام کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اس موقع پر ایک صحابی الحبابؓ ابن منذر انصاری نے کہا کہ ایک امیر انصار سے اور ایک امیر مہاجرین سے ہو لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح سما سکتی ہیں۔ بنو خزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ کو امیر بنانا چاہتے تھے مگر قبیلہ اوس نے اس کی مخالفت کی۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے نہایت نرمی اور آشتی سے انصار کو سمجھایا۔ آپ نے فرمایا: "مجھے تم لوگوں کے فضائل مناقب اور تمہاری خدماتِ اسلامی سے انکار نہیں لیکن عرب قریش کے علاوہ اور کسی خاندان کی سیادت تسلیم نہیں کر سکتے پھر مہاجرین اپنے تقدم فی الاسلام اور آنحضرت صلعم کے ساتھ خاندانی تعلق کی بنا پر آپؐ کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں یہ ابو عبیدہؓ اور عمر بن الخطابؓ موجود ہیں ان میں سے جس کے ہاتھ چاہو بیعت کر لو۔" یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ آپ ہم سب میں بزرگ ہم سب میں بہتر اور رسول اللہؐ کے سب سے مقرب ہیں، اس لئے ہم آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہیں (بخاری شریف) دوسرے دن مسجد نبویؐ میں عام بیعت ہوئی اور ربیع الاول ۱۲ھ میں حضرت ابوبکر صدیق

مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ: ۔ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کا آغاز بڑی مشکلات اور بڑے اہم حوادث کے ساتھ ہوا۔ لیکن آپ نے اپنے تدبر، عاقبت اندیشی اور مذہبی بصیرت سے ان سب پر قابو پا لیا۔ سب سے اہم انقلاب عرب کا ارتداد تھا بہت سے قبائل نے آنحضرت صلعم کی زندگی میں اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن ان کے دلوں میں وہ راسخ نہ ہوا تھا اس لئے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد وہ مرتد ہو گئے۔ دوسری جانب جھوٹے مدعیان نبوت اٹھ کھڑے ہوئے بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا غرض مدعیان نبوت کے بعد آپؓ مرتد امرا کی طرف متوجہ ہوئے۔ نعمان بن منذر نے بحرین میں لقیط بن مالک نے عمان میں اور متعدد سرداران قبائل نے کندہ کے علاقے میں مرتد ہو کر خودسری کا اعلان کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے علاءؓ بن حضرمی، حذیفہ بن محصن اور زیادؓ بن لبید کو ان سرداروں کے مقابلے پر بھیجا۔ حذیفہؓ نے لقیط کو قتل کیا، علاءؓ نے نعمان کی سرکوبی کی، اور زیادؓ نے کندہ کے سرداروں کو زیر کر کے دوبارہ اسلام پر قائم کیا (طبری، ابن اثیر)۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کی متوجہ ہوئے جو زکوٰۃ کے منکر تھے۔ آپ نے منکرین زکوٰۃ کے مقابلہ پر فوجیں روانہ کیں بنی عبس اور بنی ذبیان کے مقابلہ میں خود گئے اور انھیں زیر کیا۔ چند دنوں میں تمام منکرین نے زکوٰۃ ادا کر دی۔

اندرونی انقلاب فرو کرنے کے بعد آپ نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی درخواست پر حضرت خالدؓ بن ولید کو عراق روانہ کیا۔ جنگ میں عراق کے ایرانی حاکم ہرمز کو شکست فاش ہوئی۔ ہرمز جنگ میں مارا گیا۔ ایران کے فرمانروا اردشیر نے قارن کی ماتحتی میں ایک فوج گراں روانہ کی۔ مذار کے مقام پر جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے شکست کھائی۔ ان کی تیس ہزار سپاہ کام آئی۔ قارن سمیت تمام بڑے بڑے افسر مارے گئے۔ اردشیر نے ایران کے ممتاز بہادر اندرزگر اور بہمن جاذویہ کو ایک لشکر عظیم کے ساتھ روانہ کیا۔ دلجہ کے مقام پر حضرت خالدؓ بن ولید نے انھیں بھی شکست سے دوچار کیا۔ زغرجان بچ کر بھاگ نکلا لیکن کچھ دور آگے جا کر پیاس کی شدت سے مر گیا (طبری)۔ اس جنگ میں بہت سے عیسائی عرب بھی مارے گئے ان عیسائیوں نے ایرانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ انتقام کی خاطر عیسائی قبائل ادلیس کے مقام پر بہمن جاذویہ سے جا ملے۔ حضرت خالدؓ بن ولید ادلیس پہنچے اور انھیں شکست دی۔ ادلیس کے بعد امغیشیا پہنچے۔ وہاں کے باشندے حضرت خالدؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی شہر خالی کر گئے۔ حضرت خالد حیرہ کی طرف بڑھے۔ ایرانیوں نے ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔ حیرہ کے قرب و جوار کے باشندوں نے بھی بیس ہزار درہم پر صلح کر لی اور جنوبی عراق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت خالدؓ اب انبار کی طرف بڑھے جہاں ایرانی فوجیں قلعہ بند تھیں جنگ ہوئی اور بالآخر ایرانیوں نے سپر ڈال کر صلح کر لی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ عین التمر پہنچے اور قلعہ بند ایرانیوں کو شکست دی۔ عراق و شام کی سرحد دومۃ الجندل میں عہد نبوی سے عربی عیسائی قبائل مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ حضرت خالدؓ اور عیاضؓ بن غنم نے انھیں شکست دی۔ بنی کلب کو ایک مسلمان عاصم نے امان دے دی باقی قبائل قتل کر دیئے گئے۔ حضرت خالدؓ دومۃ الجندل کی مہم سے فراغت حاصل کر کے حیرہ پہنچ گئے اور عین التمر میں قعقاع اور ابولیلیٰ سے جا ملے۔ یہ دونوں سردار ایرانیوں سے مقابلے کے لئے خنافس جا رہے تھے۔ قعقاع نے حصید پہنچ کر زرمہر اور روزبہ کو شکست دے کر قتل کیا عین اس وقت ابولیلیٰ بھی پہنچ گئے ایرانی مصیخ کی طرف ہٹ گئے حضرت خالدؓ ابولیلیٰ اور قعقاع کو لیتے ہوئے مصیخ پہنچے اور ایرانیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ فراض کی طرف بڑھے۔ یہاں شام عراق اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔ رومی اپنی حفاظت کے لیے ایرانیوں سے مل گئے۔ فرات کے لب ساحل جنگ ہوئی۔ ایرانیوں اور رومیوں نے شکست کھائی۔ قریب قریب کل فوجیں برباد ہو گئیں۔ اس جنگ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو شام کی مہم پر بھیج دیا۔ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے کبار صحابہؓ کے مشورہ سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا تھا۔ شام کے ہر حصے کے لئے علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کی گئیں۔ ان فوجوں کی مجموعی تعداد ستائیس ہزار تھی۔ مسلمانوں کے حملے کے وقت ہرقل شام کا والی تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید عراق سے شام روانہ ہوئے۔ سرزمین شام میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلے بصرہ فتح کیا اس کے بعد عمرو بن العاص کی مدد کو پہنچے اور رومیوں کو شکست دے کر اجنادین پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ مل کر دمشق کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ھ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہو گیا۔ آپؓ کی مدت خلافت دو سال تین ماہ اور دس دن تھی۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کسی کام میں عہد نبوی سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہ کرتے تھے اس لئے آپ کے زمانہ میں جملہ امور عہد رسالت کے نظام پر قائم رہے۔ کام امور اکابر صحابہ کے مشورے سے انجام پاتے تھے۔ آپ نے انتظامی سہولت کے خیال سے جزیرۃ العرب کو مدینہ، مکہ، طائف، صنعا، نجران، حضرموت، بحرین اور دومۃ الجندل مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ عہد صدیقی میں زکوٰۃ، عشر، جزیہ اور غنیمت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا لیکن آپؓ نے کوئی خزانہ قائم نہ کیا جو آمدنی ہوتی، اسلامی ضروریات پر صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچتا اسے بلا تفریق عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے۔ عہد صدیقی میں فوج کا باقاعدہ نظام نہ تھا۔ عہد رسالت کی طرح مسلمان ضرورت کے وقت خود ہی جہاد کیلئے جمع ہو جاتے تھے۔ بیت المال کی آمدنی سے فوجی اخراجات کے لئے ایک رقم الگ نکال لیتے تھے جس سے اسلحہ اور بار برداری کے جانور خریدتے تھے اور جہاد کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں کی پرورش کیلئے بعض چراگاہیں مخصوص کر دی تھیں۔ عہد صدیقی کا ایک کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی تدوین ہے۔ جنگ یمامہ میں حافظ قرآن کی بڑی تعداد شہید ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے بہم اصرار کیا کہ قرآن کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عہد نبوی کے کاتب وحی حضرت زیدؓ بن ثابت کو اس کام پر مامور کیا۔ حضرت زیدؓ نے مختلف لکھے ہوئے اجزاء اور حفاظ قرآن کے سینوں سے قرآن کی سورتوں کو جمع کر کے کتابی صورت میں مدون کیا۔ حیات نبوی میں قرآن کی پوری ترتیب ہو چکی تھی موجودہ قرآن اسی ترتیب کے مطابق ہے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ: ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرض الموت میں اکابر صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت نامہ لکھوایا اور حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ وصیت نامہ مکمل کروانے کے بعد اپنے غلام کو حکم دیا کہ اسے لے جا کر صحابہ کے عام مجمع میں سناؤ اور خود بالاخانہ پر جا کر حاضرین سے فرمایا میں نے اپنے کسی عزیز کو خلیفہ نہیں بنایا۔ میں نے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو میرے نزدیک سب میں بہتر ہے۔" سب نے بالاتفاق اس حسن انتخاب کی تائید کی اس کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر ضروری وصیتیں کیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جمادی الثانی ۱۳ھ میں حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہوئے۔ آپ کی جانشینی کے وقت شام و عراق میں جنگ جاری ہو رہی تھی۔ آپ نے ابوعبیدہ ثقفی کو چند ہزار سپاہ کے ساتھ ایران کی مہم پر روانہ کیا۔ ایران کی فوجوں کا سپہ سالار خراسان کا نامور مدبر اور مشہور بہادر رستم تھا۔ ایران کے دو نامور بہادر نرسی اور جاپان بھی اس کی امداد پر مامور تھے۔ مقام نمارق میں جاپان کے ساتھ مقابلہ ہوا اور مسلمان سپاہ فتحیاب ہوئی۔ رستم نے ایرانیوں کا مقدس علم "درفش کاویانی" دے کر مردان شاہ کو تازہ دم فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ دریائے فرات کے کنارے جنگ ہوئی ابوعبید ثقفی کو ایک ہاتھی نے سونڈ میں لپیٹ کر پیروں کے نیچے مسل ڈالا ابوعبیدہ کی

شہادت کے بعد مثنیٰ بن حارثہ بڑی مشکل سے تین ہزار جانیں بچا کر پسپا ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بجلی کی کمان میں تازہ دم فوج روانہ کی۔ ایرانیوں کی جانب سے مہران بن جاذویہ بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ دریائے فرات کے قریب بویہ کے مقام پر جنگ ہوئی مہران قتل اور اس کی فوجیں شکست سے دوچار ہوئیں۔ ایرانیوں نے جوشِ انتقام میں بوران وخت کو تخت سے اتار کر سترہ سالہ یزدگرد کو تخت نشین کیا اور زبردست جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیلا دی۔ حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو آپ نے سعد بن ابی وقاص کو سپہ سالارِ اعظم مقرر کر کے بیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ پونے دو لاکھ ایرانی لشکر رستم کی کمان میں جنگ کے لیے آگے بڑھا۔ محرم ١٦ھ میں جنگ قادسیہ کا واقعہ پیش آیا۔ تین روز تک جنگ ہوتی رہی بالآخر ایرانی شکست سے دوچار ہوئے، رستم میدانِ جنگ میں قتل ہوا۔ قادسیہ کی شکست کے بعد سعد بن ابی وقاص بابل، کوثی اور بہرہ شیر کو فتح کرتے ہوئے ایران کے پایۂ تخت مدائن کے قریب پہنچ گئے۔ مدائن باقاعدہ جنگ کے بغیر ہی فتح ہو گیا۔ یزدگرد پایۂ تخت چھوڑ کر بھاگ گیا اور حضرت سعد بن ابی وقاص صفر ١٦ھ میں مدائن میں داخل ہو گئے۔ مدائن سے نکلنے کے بعد ایرانیوں نے جلولا کو مرکز بنایا۔ مسلم سپاہ نے کئی مہینوں کی لڑائیوں کے بعد جلولا فتح کیا۔ جلولا عراق کا آخری مقام تھا اس کے بعد عراق کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ یزدگرد حلوان میں تھا اسے خبر ہوئی تو حلوان چھوڑ کر رے بھاگ گیا۔ قعقاع نے حلوان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن غنم کو جزیرہ کی مہم پر روانہ کیا۔ ١٦ھ اور ١٧ھ میں اسلامی لشکر نے جزیرہ کا پورا علاقہ فتح کر لیا۔ عراق کا سرحدی علاقہ خوزستان ایرانیوں کے قبضے میں تھا ١٦ھ میں ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمار بن یاسر نے خوزستان فتح کیا خوزستان کی فتح کی خبر سن کر یزدگرد کو خطرہ محسوس ہوا کہ مسلمان پورے ایران پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس نے کافی تگ و دو کے بعد ڈیڑھ لاکھ فوج مسلمانوں کے مقابلے کے لئے نہاوند روانہ کی۔ حضرت عمرؓ نے نعمان بن مقرن کو سپہ سالار بنا کر نہاوند روانہ کیا۔ جنگ قادسیہ کے بعد یہ سب سے بڑا معرکہ تھا۔ اس جنگ میں بھی ایرانیوں کو شکست ہوئی تیس ہزار ایرانی سپاہ کام آئی۔ میدان جنگ میں سپہ سالار نعمان بن مقرن زخمی ہو کر شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کے بعد مختلف مہمیں ایران کی فتح کے لئے روانہ کیں اسلامی لشکر نے اصفہان، ہمدان، رے، طبرستان، آذربائیجان، آرمینیا، فارس، کرمان اور سیستان فتح کر لیے۔ یزدگرد خراسان میں تھا۔ جب خراسان فتح ہوا تو یزدگرد ملک چھوڑ کر ترکستان چلا گیا ایرانیوں نے سارا خزانہ مسلمانوں کے حوالے کر کے صلح کر لی۔ دمشق، حمص اور اردن بھی عہدِ فاروقی میں فتح ہوئے۔ جنگ یرموک میں مسلمانوں نے رومیوں کی قوت پاش پاش کر دی۔ ١٨ھ میں بیت المقدس فتح ہوا۔ ١٩ھ میں امیر معاویہؓ نے قیساریہ فتح کیا۔ ٢١ھ میں عمرو بن عاص نے مصر فتح کیا عمرو بن العاص نے طرابلس الغرب پر بھی فوج کشی کی۔ ایک معمولی سی جنگ کے بعد فتح کر لیا گیا۔ ٢٣ھ کے اواخر میں فیروز پارسی نے حضرت عمرؓ پر مسجد میں خنجر سے حملہ کیا۔ آپؓ یکم محرم الحرام ٢٤ھ کو انتقال فرما گئے۔

فتوحات کی کثرت، محاصل کی فراوانی، انتظامات کی خوبی، جور و ظلم کے انسداد، عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام، ملک کی خوشحالی اور رعایا کی فارغ البالی وغیرہ تمام اوصاف و کمالات کے لحاظ سے دنیا کا کوئی حکمران فاروق اعظمؓ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے دس سالہ دورِ خلافت میں ایران و روم کی عظیم الشان سلطنتوں کے پرزے اڑ گئے اور ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ فتوحات سے بڑھ کر حضرت عمرؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی بنیادوں پر ایسا آئینِ حکومت مرتب کیا اور ایسا عادلانہ نظام قائم کر دیا جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور

ترقیوں کا ضامن تھا۔ آپؓ نے شوریٰ کی بنیاد پر خلافت اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس نظام میں کوئی اہم کام اہل الرائے صحابہؓ کے مشورہ کے بغیر انجام نہ پاتا تھا (طبری) خاص خاص حالات میں عامۂ مسلمین کا مشورہ بھی ضروری ہوتا تھا آپ فرمایا کرتے تھے لاخلافۃ الا عن مشورۃ (کنز العمال)۔ مجلسِ شوریٰ کے ممتاز ارکان یہ تھے، حضرت علیؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف حضرت معاذؓ بن جبل حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت زیدؓ بن ثابت (کنز العمال)۔ حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ علاقوں کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا، مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر اور فلسطین، مشرق میں خراسان، آذربائیجان اور فارس کے تین صوبے علیحدہ تھے۔ ہر صوبے میں حاکم اعلیٰ، میر منشی، دفتر فوج کا منشی، کلکٹر، افسر پولیس، خزانچی اور قاضی ہوتے تھے۔ عموماً فوج کی سپہ سالاری حاکم عام سے متعلق ہوتی تھی۔ بعض حالات میں سپہ سالار بھی الگ ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا اصول یہ تھا کہ ہر عامل کے تقرر کے وقت اس کو ایک پروانہ دیتے تھے جس میں اس کے اختیارات کی تصریح ہوتی تھی۔ جائے تقرر پر یہ پروانہ مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا (طبری) تاکہ عامل اپنی حدود سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ تمام عمال کو حج کے موقع پر حاضری کا حکم تھا۔ ان کی موجودگی میں اعلانِ عام کیا جاتا تاکہ کسی شخص کو کسی عامل سے شکایات ہو تو پیش کرے (طبری) ارکانِ حکومت کو علی الاعلان سزا دیتے۔ آپ کے ایوان عدالت میں ادنیٰ و اعلیٰ اور خویش و بیگانہ سب برابر تھے۔ عہدِ فاروقی سے پہلے عرب میں جیل خانوں کا رواج نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے جیل خانے قائم کئے۔ زمین کی آبادی اور زراعت کی ترقی کے لئے یہ قانون بنایا کہ جو شخص غیر آباد زمین آباد کرے گا وہ اسکی ملک ہو جائیگی لیکن زمین لے کر تین برس کے اندر اسے آباد کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اس قانون سے افتادہ زمینیں کاشت کی جانے لگیں۔ زمین کی سیرابی کے لئے نہریں جاری کی گئیں۔ بند باندھے گئے تالاب بنائے گئے اور پانی کی تقسیم کے لئے دہانے بنائے گئے مقریزی کا بیان ہے کہ صرف مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور حکومت کی جانب سے اس کام پر لگے رہتے تھے۔

خراج کے علاوہ آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے۔

زکوٰۃ، جزیہ اور مالِ غنیمت۔ عشور تجارتی ٹیکس تھا جسے اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے جاری کیا۔ آپؓ نے تمام صوبوں اور مرکزی مقامات میں بیت المال قائم کئے اور ان کے لئے وسیع عمارتیں بنوائیں اور ان پر لائق اور دیانت دار افسر مقرر کیے۔ (طبری) بیت المال کے مداخل و مخارج کا انتظام یہ تھا کہ ہر صوبے کی آمدنی وہاں کے بیت المال میں آتی تھی۔ صوبائی حکومت کے مصارف سے جو رقم بچتی تھی وہ صدر خزانہ مدینہ منورہ میں بھیج دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں فوج کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نے ١٥ھ میں ولید بن ہشام کے مشورہ سے نہایت وسیع اور منظم صیغۂ فوج قائم کیا۔ تنخواہ داروں کے بیوی بچوں کو وظائف ملتے تھے۔ جن لوگوں کی جتنی تنخواہ مقرر ہوتی تھی ان کے غلاموں کو بھی اتنی ہی ملتی تھی۔ فوجی تنخواہ داروں میں دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو ہر وقت جنگی مہمات میں مشغول رہتے تھے یہ باقاعدہ فوج تھی دوسرے وہ جو اپنے گھروں پر رہتے تھے اور ضرورت کے وقت طلب کیے جاتے تھے یہ ریزرو فوج تھی۔ سارے ممالک محروسہ میں فوجی مرکز تھے۔ مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، اردن وغیرہ بڑے بڑے فوجی مرکز تھے۔ ان مرکزی مقامات کے علاوہ تمام ممالک محروسہ میں حسب ضرورت، بکثرت چھاؤنیاں قائم تھیں۔ سرحدی علاقوں اور ساحلی مقامات کی حفاظت کا انتظام مستقل اور جداگانہ تھا۔ فوجی بھرتی کو اتنی وسعت دی گئی کہ مہاجرین و انصار سے بڑھتے بڑھتے سارے عرب لوگوں کو اس میں شامل کیا جانے لگا۔ تقریباً دس لاکھ ہتھیار بند فوج ہر وقت تیار رہتی تھی اور اس میں ہر سال تیس ہزار فوج کا اضافہ ہوتا تھا (کنز العمال)۔ عہدِ صدیقی میں آپ ہی کے

خلافتِ راشدہ

اصرار سے کلام اللہ کی تدوین ہوئی تھی۔ اپنے زمانے میں حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ملکوں میں قرآن کی تعلیم کے مکتب قائم کیے اور ان کے لیے تنخواہ دار معلم مقرر کیے (سیرۃ العمر ابن جوزی)۔ سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور (جن میں احکام ہیں) کا ذکر کرنا ضروری قرار دیا گیا (اصابہ تذکرہ اوس بن خالد)۔ قرآن پاک کے صحیح پڑھنے اور اعراب کے لیے ادب و عربیت کی تعلیم کی تاکید کی۔ جو لوگ لغت کے عالم نہ ہوں انھیں قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کردی گئی۔ قرآن کے طلبہ کے لئے وظائف مقرر کئے (کنز العمال) ان تدبیروں سے ہزاروں حفاظ قرآن پیدا ہوگئے۔ کلام اللہ کے بعد حدیث نبوی کا درجہ ہے چنانچہ اس کی تلاش، حفاظت اور اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ مسائل اور احکام کی حدیثوں کو بالفاظہا نقل کرکے اضلاع کے حکام کے پاس بھیجے۔ آپ روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیتے تھے۔ لوگوں کو کثرت روایت سے روکتے تھے۔ عہد فاروقی میں اسلامی تمدن کی ترقی سے سینکڑوں مسائل پیدا ہوئے۔ اس لیے اس زمانہ میں علم فقہ کی بڑی ترقی و اشاعت ہوئی۔ آپ خود لوگوں کو فقہی مسائل بتاتے تھے۔ مسائل کو صحابہ کے مجمع میں پیش کرکے طے کراتے تھے۔ اضلاع کے احکام اور افسروں کو فقہی احکام لکھ کر بھیجتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عمال و حکام کے علاوہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیے تمام ممالک محروسہ میں مستقل فقہا اور معلم مقرر کیے (اسد الغابہ)۔ روضۃ الاحباب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے چار ہزار مسجدیں تعمیر کرائیں اور تنخواہ دار امام اور موذن مقرر کئے۔ ۱۷ھ میں حرم کی عمارت کو وسیع کیا۔ اور اس کے گرد دیوار کھنچوا کر عام آبادی سے ممتاز کیا (بخاری شریف) مسجد نبوی کی توسیع کی۔ ازواج مطہرات کے گھروں کو چھوڑ کر مسجد نبوی سے متصل جتنے مکانات تھے سب کو خرید کر مسجد کی عمارت میں شامل کردیا۔ مسجد کا طول سو گز کی بجائے ایک سو بیس گز ہوگیا۔ مسجد کے گوشہ میں ایک چبوترہ بنوادیا کہ جن لوگوں کو بات چیت کرنا ہو یا شعر پڑھنا ہو وہ اس گوشہ میں آجائیں (خلاصۃ الوفاء)

حضرت عمرؓ نے ہر صیغہ میں جو نئی باتیں ایجاد کیں، مورخین انھیں اوّلیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اولیات کی فہرست یہ ہے۔ یہ اولیات طبری، تاریخ الخلفاء اور سیرۃ عمر ابن جوزی میں مذکور ہیں: (۱) بیت المال کا قیام (۲) عدالتوں کا قیام اور قاضیوں کا تقرر (۳) تاریخ اور سن کا قیام جو آج تک جاری ہے (۴) امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ (۵) فوجی دفتر ترتیب دیا (۶) رضاکاروں کی تنخواہ مقرر کی (۷) دفتر مال کا قیام (۸) پیمائش کا طریقہ جاری کیا (۹) مردم شماری کرائی (۱۰) عشور تجارتی ٹیکس مقرر کیا (۱۱) نہریں کھدوائیں (۱۲) شہر آباد کرائے (۱۳) ممالک محروسہ کو صوبوں میں تقسیم کیا (۱۴) دریا کی پیداوار پر محصول لگایا (۱۵) حربی تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی۔ (۱۶) جیل خانہ قائم کیا (۱۷) درہ کا استعمال کیا (۱۸) راتوں کو گشت کرکے رعایا کا حال دریافت کرنے کا طریقہ نکالا (۱۹) پولیس کا محکمہ قائم کیا (۲۰) فوجی چھاؤنیاں قائم کیں (۲۱) گھوڑوں کی نسل میں اصیل اور مخنس کی تمیز قائم کی جو عرب میں نہ تھی (۲۲) پرچہ نویس مقرر کیے (۲۳) مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے آرام کے لئے چوکیاں اور سرائیں بنوائیں (۲۴) بے سہارا بچوں کی پرورش اور پرداخت کے لئے روزینے مقرر کیے (۲۵) قاعدہ بنایا کہ اہل عرب غلام نہیں بنائے جاسکتے (۲۶) مفلوک الحال عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے (۲۷) مکاتیب قائم کیے (۲۸) معلموں اور مدرسوں کے مشاہرے مقرر کیے (۲۹) حضرت ابوبکرؓ سے باصرار کلام اللہ کی تدوین کروائی (۳۰) قیاس کا اصول قائم کیا (۳۱) فرائض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا (۳۲) فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا (۳۳) نماز تراویح جماعت سے قائم کی (۳۴) تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی جائیں، بائن قرار دیا (۳۵) شراب کی حد اسّی کوڑے مقرر کی (۳۶) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی (۳۷) بنی تغلب کے عیسائیوں پر جزیہ کی بجائے زکوٰۃ مقرر کی (۳۸) وقف کا طریقہ ایجاد کیا (۳۹) نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (۴۰) مساجد میں وعظ کا طریقہ جاری کیا (۴۱) اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں (۴۲) مسجدوں میں روشنی کا انتظام کیا (۴۳) ہجو کہنے والے کے لئے تعزیر مقرر کی (۴۴) غزلیہ اشعار میں عورتوں کے نام لینے سے منع کیا۔

خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ:۔ حضرت عمرؓ کی وفات سے قبل صحابۂ کرام نے ان سے جانشین نامزد کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ اور عبدالرحمٰن بن عوف چھ آدمیوں کو نامزد کرکے فرمایا کہ ان میں سے جس پر کثرت رائے ہوجائے اسے امیر بنانا اور تاکید کردی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے کردیا جائے۔ میری وفات کے بعد ان چھ نامزد حضرات کو ایک مکان میں بند کردیا جائے اور جب تک ان میں سے کسی کا انتخاب نہ ہوجائے اس وقت تک انھیں مکان سے باہر نہ آنے دینا۔ کثرت رائے کے بعد بھی اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی رہے تو اسے قتل کردینا (ابن سعد، تاریخ الخلفاء سیوطی)۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مقدادؓ نے مذکورہ چھ افراد کو مسور بن مخرمہ کے گھر میں جمع کیا۔ دو دن میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ تیسرے دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا کہ انتخاب کی صورت یہ ہے کہ چھ کی تعداد کو اور کم کردیا جائے۔ اس تجویز پر حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کا نام پیش کیا۔ لیکن انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا۔ حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کا اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا کہ اگر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیں تو زیادہ مناسب ہے۔ دونوں راضی ہوگئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کے مجمع میں مؤثر تقریر کی اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ آپ کی بیعت کے بعد حضرت علیؓ نے ہاتھ بڑھایا۔ بیعت عام کے بعد محرم ۲۴ھ میں حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے (ابن سعد طبقات وغیرہ)

عہد عثمانی میں ۲۵ھ میں اسکندریہ میں رومیوں نے بغاوت کی جسے عمرو بن عاص کے ذریعے دبایا گیا۔ اسی سال آذربائیجان اور آرمینیا کے علاقے صلح توڑ کر باغی ہوگئے ولید بن عقبہ اور سلمان بن ربیعہ باہلی کے ذریعے ان دونوں علاقوں کو فتح کرلیا گیا۔ ... لوچک کے بطریق اعظم نے اسی ہزار فوجیں حبیب بن مسلمہ کے مقابلے میں بھیجیں۔ حبیب نے انھیں شکست دی۔ بہت سے علاقوں کو مطیع بنایا اور ... کو فتح کیا۔ اسی سال امیر معاویہؓ نے ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی اور بردسہ تک بڑھتے چلے گئے انطاکیہ اور طرطوس کے درمیان جس قدر قلعے تھے سب میں اسلامی فوجیں قائم کردیں (ابن اثیر)۔ ۲۷ھ میں عبداللہ بن سرح نے شمالی افریقہ پر فوج کشی کی جس میں عبداللہ بن زبیر بھی تازہ دم فوج کے ساتھ ان سے آملے۔ چنانچہ طرابلس، تونس، مراکش اور الجزائر وغیرہ تمام علاقے فتح کرلیے گئے۔ شام کے والی امیر معاویہؓ نے ... شمشاط، عموریہ اور ملطیہ فتح کیے۔ حضرت عثمانؓ سے باقاعدہ اجازت حاصل کرکے امیر معاویہؓ نے قبرص پر چڑھائی کی اور اسے فتح کرلیا ۳۲ھ میں اہل قبرص نے مسلمانوں کے خلاف رومیوں کو مدد دی اس لیے امیر معاویہؓ نے دوبارہ فوج کشی کرکے قبرص کو اسلامی مقبوضات میں شامل کرلیا اور یہاں مسلمانوں کی نوآبادی قائم کردی (فتوح البلدان)۔ ۲۹ھ میں یزدگرد نے فارس اور کرمان سے لے کر خراسان تک سارے عجم میں بغاوت کردی۔ ابن عامر والی بصرہ نے اس مہم کو سر کیا اور فارس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ ۳۰ھ میں سعید بن العاص نے طبرستان کی بغاوت کو فرو کیا اور پورے طبرستان پر قبضہ کرلیا۔ عبداللہ بن عامر نے خراسان کی بغاوت فرو کی۔ یزدگرد خراسان میں ایک دہقانی کے ہاتھوں مارا

گیا اور اس کے ساتھ ہی ساسانی خاندان اور اس کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ ہو گیا طخارستان کرمان اور سجستان کے علاقے بھی عہد فاروقی میں فتح ہوئے۔ عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ نے غزنہ سے کابل تک کا علاقہ فتح کیا۔ ۳۱ھ میں قیصر روم نے پانچ سو جہازوں کے ساتھ سواحل شام پر ہجوم کیا۔ امیر معاویہؓ اور عبیداللہ بن ابی سرح نے اسے شکست فاش دی۔ ۳۲ھ میں امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ اور ۳۳ھ میں اناطولیہ کے قلعہ حصن المراۃ پر قبضہ کر لیا۔ دس سال کے عرصے میں اسلامی حکومت کے حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔

دور عثمانی کے ابتدائی پانچ چھ سال نہایت امن و سکون سے گزرے۔ فتوحات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، محاصل و خراج کی زیادتی، وظائف کی کثرت اور زراعت و تجارت کی ترقی نے ملک کو فارغ البالی اور عیش و نعم کے سامانوں سے معمور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے لوازم و نتائج کے طور پر بغض و حسد اور شک و رقابت کا قدم بھی آیا۔ اندرونی تغیرات اور بیرونی اسباب نے مل کر حضرت عثمانؓ کے خلاف ایسا انقلاب بپا کیا جس نے نظام خلافت کو درہم برہم کر دیا۔ مخالفین میں سب سے بڑا فتنہ انگیز بظاہر نومسلم لیکن منافق یہودی عبداللہ بن سبا تھا۔ اس نے زبانی و تحریری پروپیگنڈہ کے علاوہ خود عراق اور مصر جا کر خفیہ جماعتیں قائم کیں۔ بالآخر اس کی باغیانہ سرگرمیاں حضرت عثمانؓ کی شہادت پر منتج ہوئیں۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو کنانہ بن بشیر، عمرو بن الحمق اور سودان بن حمران نے مل کر آپ کو شہید کر دیا۔ مدینہ پر باغیوں کا قبضہ تھا۔ بدامنی کی وجہ سے کسی کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دو دن تک لاش مبارک بے گور و کفن پڑی رہی ۱۹ ذی الحجہ کی شام چند آدمیوں نے جان پر کھیل کر تجہیز و تکفین کی ہمت کی کاہل سے مالکش تک کے فرمانروا کو سترہ آدمیوں کی مختصر جماعت نے خفیہ طور پر جنت البقیع سے متصل حش کوکب میں سپرد خاک کیا اور باغیوں کے خوف سے قبر کا نشان چھپا دیا (ابن سعد، طبری، ابن اثیر)۔

حضرت عثمانؓ کو اگرچہ اطمینان و سکون کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع صرف پانچ سال ملا لیکن اس قلیل مدت میں آپ نے امت اسلامیہ کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ گو عثمانی دور میں عہد فاروقی کی طرح شوریٰ کا نظام نہ رہ گیا لیکن مہمات کے امور میں حضرت عثمانؓ اکابر صحابہ اور عمال حکومت سے مشورہ فرماتے تھے۔ صوبوں کی تقسیم قریب قریب وہی رہی جو عہد فاروقی میں تھی البتہ شام کے ملک کو جو کئی صوبوں میں منقسم تھا ایک صوبہ بنا دیا گیا اور امیر معاویہؓ پورے صوبے کے والی مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ فطرتاً نہایت حلیم الطبع، نرم خو اور خطا پوش تھے۔ آپ میں عفو و درگزر کا پہلو غالب تھا اس لئے آپ میں احتساب کی وہ سختی نہ تھی جو حضرت عمرؓ کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ بعض ایسے امور سے چشم پوشی فرما جاتے تھے جن پر حضرت عمرؓ بڑے سے بڑے عہدہ دار کو بھی سزا دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ اس فطری افتاد طبع کے باوجود کسی ایسی بے عنوانی کو نظر انداز نہ کرتے تھے جس سے اصول اسلام، اخلاق عامہ، یا حکومت کے نظام پر کوئی اثر پڑتا ہو۔ چنانچہ سعدؓ بن ابی وقاص کو بیت المال کا قرض نہ ادا کرنے کے الزام میں معزول کر دیا گیا سعیدؓ بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو رعایا کی شکایت پر برطرف کیا۔ عہد عثمانی میں سپاہیوں کی تنخواہ میں سو سو روپے کا اضافہ ہوا (طبری) نئے مفتوحہ علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم ہوئیں۔ شام میں بحر روم کے ساحل پر انطاکیہ سے لے کر طرطوس تک فوجی نوآبادیاں بسائی گئیں (ابن اثیر) عہد فاروقی میں جہاد کے گھوڑوں اور دیگر مولیشیوں کیلئے متعدد چراگاہیں بنائی گئی تھیں۔ حضرت عثمانؓ نے ان میں اور اضافہ کیا۔ یہ چراگاہیں اتنی وسیع تھیں کہ صرف ضربہ کی ایک چراگاہ میں چالیس ہزار اونٹ پرورش پاتے (وفاء الوفاء)۔ سب سے نمایاں اور اہم ترقی بحری فوج کا قیام ہے۔ عہد عثمانی میں اسلامی بیڑے کو اتنی ترقی دی گئی کہ وہ اس عہد کے طاقتور رومی بیڑے سے بھی بڑھ گیا۔ بحری بیڑے کے قیام کے بعد بحر روم مسلمانوں کی آماجگاہ بن گیا۔ رفاہ عام کے بہت سے کام انجام پائے۔ دفاتر کے لئے وسیع عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ سڑکیں، پل اور مسافر خانے بنوائے گئے۔ کوفہ میں عقیل اور ابن ہبار کے مکانات خرید کر ایک وسیع مہمانخانہ بنوایا گیا۔ مدینہ اور نجد کی راہ میں ایک سرائے تعمیر ہوئی۔ کئی کنویں کھدوائے گئے۔ سیلاب کی روک تھام کیلئے مدینہ سے تھوڑے فاصلے پر بند بندھوایا اور نہر کھدوا کر سیلاب کا رخ دوسری طرف پھیر دیا گیا۔ ۲۹ھ میں مسجد نبوی کی دوبارہ تعمیر و توسیع ہوئی مسجد کے طول میں بیس گز اور عرض میں تیس گز کا اضافہ ہوا (ابن اثیر)۔ کلام اللہ کی تدوین حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ہو چکی تھی حضرت عثمانؓ نے مدون شدہ نسخے کی نقلیں کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ (بخاری شریف)

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ: حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تین دن تک مسند خلافت خالی رہی۔ مدینہ میں ہر طرف باغی چھائے ہوئے تھے۔ خلافت کا انتظام بہرحال ضروری تھا۔ مہاجرین و انصار (حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سمیت حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خلیفہ کا انتخاب ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے اشارہ سمجھ کر جواب دیا کہ مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں جسے تم منتخب کرو گے میں بھی اسے قبول کر لونگا حاضرین نے پھر اصرار کیا۔ حضرت علیؓ نے پھر عذر کیا کہ امیر ہونے کے مقابلہ میں مجھے وزیر ہونا زیادہ پسند ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے غرض مسلمانوں کے اصرار پر آپ نے قبول فرما لیا۔ مجمع عام میں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی (طبری)، بیعت کے بعد ذی الحجہ ۳۵ھ میں آپ نے مسند خلافت پر قدم رکھا۔ حضرت علیؓ کا پورا عہد خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ ایک دن کے لئے بھی آپ کو ملکی نظم و نسق کے قیام اور بیرونی فتوحات کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی۔ حضرت علیؓ عہد عثمانی کے اکثر عمال خصوصاً امیر معاویہؓ والی شام کے سخت خلاف تھے اس لئے تخت پر بیٹھتے ہی آپ نے سب عمال کو معزول کر دیا۔ آپ کے بہی خواہوں نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے عرض کیا کہ ابھی آپ معاویہؓ اور دوسرے عثمانی عمال کو ان کے عہدوں سے نہ ہٹایئے جب وہ بیعت کر کے آپ کی خلافت تسلیم کرلیں تو اس وقت جو دل میں آئے کیجئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے سختی سے انکار کیا حضرت ابن عباسؓ نے مشورہ دیا کہ ابھی معاویہؓ کو معزول نہ کیجئے۔ اگر وہ اپنے عہدہ پر قائم رہیں گے تو پھر انھیں اس بات کی پرواہ نہ ہوگی کہ خلیفہ کون ہے۔ لیکن اگر وہ معزول کر دیئے گئے تو حضرت عثمانؓ کے قصاص کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور سارے عراق و شام کو آپ کے خلاف کر دیں گے لیکن حضرت علیؓ نے ان کا مشورہ قبول نہ فرمایا (ابن اثیر) ۳۶ھ میں تمام عثمانی عمال کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے عمال مقرر کیئے۔ شام پر سہیل بن حنیف کا تقرر ہوا۔ امیر معاویہؓ بیس بائیس سال سے شام کے والی چلے آرہے تھے انھیں معزول کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے سہیل بن حنیف کو شام کی سرحد تبوک ہی سے واپس کر دیا (طبری)۔ امیر معاویہؓ کو معزول کرنے کے ساتھ ہی حضرت علیؓ نے ان کے پاس بیعت کے لئے علیحدہ ایک خط لکھا۔ اس وقت بڑے بڑے صحابہ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور ان کے قاتلوں کا پتہ نہ چلنے سے سخت متاثر تھے۔ امیر معاویہؓ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور مدینہ سے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیراہن اور ان کی اہلیہ نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں منگا کر دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر آویزاں کرا دیں اس سے شام کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے لوگ اس منظر کو دیکھ کر زار زار روتے تھے۔ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے قاصد کو روانہ کیا۔ حضرت علیؓ نے خالی لفافہ دیکھنے کے بعد قاصد سے پوچھا کہ شام میں کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں ساٹھ ہزار شیوخ

حضرت عثمانؓ کے پیراہن پر رو رہے ہیں اور قصاص لینے کا عہد کر چکے ہیں۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا خدایا میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں (طبری)۔

حضرت علیؓ کو واقعات کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ آپ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن امیر معاویہؓ کے خلاف کسی کارروائی سے قبل ہی ایک اور نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دنوں میں حضرت عائشہؓ حج کے سلسلہ میں مکہ میں تھیں۔ مکہ سے واپسی میں راستہ میں آپ کو اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور مدینہ میں بدامنی بپا ہے (طبری)۔ یہ سن کر آپ مکہ تشریف لے گئیں۔ اس کے بعد حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ بھی مکہ پہنچ گئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ مدینہ میں لوگ حیران و سرگرداں ہیں ان کا حال یہ ہے کہ حق کو پہچان سکتے ہیں نہ باطل سے گریز کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں اپنی حفاظت کی طاقت ہے (طبری)۔ حضرت عائشہؓ کے واپس آنے کی خبر سن کر بہت سے مسلمان جمع ہو گئے تھے آپ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "کہ مختلف ملکوں کے عوام، اجنبیوں اور اہل مدینہ کے غلاموں نے چند معمولی باتوں پر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ .... میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لے کر اسلام کو معزز کرو (طبری) قصاص کی اس دعوت پر تین ہزار مسلمان سرفروشی کے لئے تیار ہو گئے۔ غرض صفر ۳۵ھ میں حضرت عائشہؓ مدینہ سے بصرہ کے لئے روانہ ہوئیں۔ طبری کے الفاظ ہیں کہ "اس دن مسلمان اسلام پر اتنا روئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ روئے تھے" بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف نے ان لوگوں کو بصرہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور فوج لے کر مقابلہ پر نکل آیا۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ بھی مقابلے کے لئے بڑھے۔ بصرہ کے والی کو شکست ہوئی۔ حضرت علیؓ ۳۶ھ میں مدینہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ذی قار پہنچ کر آپ نے منزل کی اور کوفہ اور بصرہ سے مدد کے لیے دعاۃ بھیجے۔ حضرت امام حسنؓ، عمارؓ بن یاسر اور ہاشم بن عتبہ کوفہ پہنچے۔ ابو موسیٰ اشعری نے لوگوں کو غیر جانبداری کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت حسنؓ نے تقریر کی اور دس ہزار آدمیوں نے ساتھ دیا (اخبار الطوال)۔ حضرت علیؓ نے قعقاعؓ بن عمرو کو حضرت عائشہؓ سے مفاہمت کی گفتگو کے لیے بھیجا قعقاعؓ وہاں پہنچے تو انھوں نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی حضرت عائشہؓ کے پاس بلوا لیا۔ قعقاعؓ نے پوچھا آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے جواب دیا: "قاتلین عثمانؓ کا قصاص اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو قرآن کو چھوڑ دیا گیا اور اسے لیا گیا تو قرآن کو زندہ کیا گیا۔"

قعقاعؓ نے کہا کہ میرے نزدیک تو بہتر طریقہ امن و سکون ہے جب حالات سکون پذیر ہو جائیں گے تو قاتلین عثمانؓ کو بھی پریشانی ہو گی اور ان سے قصاص بھی لیا جا سکے گا۔ آپ بیعت کر لیجئے اگر اپنی ضد پر قائم رہے تو نہ امن و امان قائم ہو گا اور نہ قصاص لیا جا سکے گا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ تم بالکل سچ کہتے ہو علیؓ کے پاس جا کر ان کی بھی رائے لو اگر وہ بھی تمہارے ہم خیال ہوں تو معاملات اصلاح پذیر ہو جائیں گے۔ قعقاعؓ واپس آکر حضرت علیؓ کو یہ مژدہ سنایا۔ آپ بہت مسرور ہوئے اور مخلص مسلمانوں کی بڑی جماعت مصالحت کے لیے تیار ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ کے قاتلین سبائی جماعت کے افراد کو صلح کی گفتگو کا علم ہوا تو انھیں فکر ہوئی کہ ایسی صورت میں قصاص ضرور لیا جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مصالحت کی تکمیل سے پہلے جنگ چھیڑ دو جب ایک مرتبہ شعلہ بھڑک جائے گا تو پھر علیؓ اپنے بچاؤ کے لیے جنگ پر مجبور ہو جائیں گے (طبری)۔ حضرت علیؓ بصرہ پہنچے تو ان کے اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان صلح کی آخری کامیاب گفتگو ہوئی۔ مصالحت کی تکمیل کے بعد فریقین اپنے لشکرگاہوں میں سکون کے ساتھ سوئے (طبری)، صبح ہونے سے قبل ہی سبائیوں نے دونوں فوجوں پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ نے جنگ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سبائیوں کی سازش کامیاب ثابت ہوئی اور جنگ روکنے کی پر خلوص کاوشیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جنگ میں شریک نہ ہوئے اور واپس جاتے ہوئے سبائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ فوج کے درمیان اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ محمل پر ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی چار ہزار جاں نثاروں نے حضرت عائشہؓ اور اونٹ کی حفاظت میں جانیں فدا کیں (یعقوبی)۔ بالآخر حضرت عائشہؓ کا اونٹ زخمی ہو کر بیٹھ گیا اور حضرت علیؓ نے جنگ روک دی۔ چند روز بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو ان کے بھائی محمدؓ بن ابی بکرؓ، امام حسن و حسین اور بصرہ کی چالیس معزز خواتین کے ہمراہ روانہ کیا حضرت عائشہؓ مکہ سے ہوتی ہوئی مدینہ تشریف لے گئیں جنگ جمل کے بعد رجب ۳۶ھ میں حضرت علیؓ نے کوفہ کو مرکز خلافت قرار دیا۔

جنگ جمل سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کے خلاف کارروائی کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ قاصدوں کے ذریعے گفت و شنید ہوتی رہی اور امیر معاویہؓ قصاص کی ضد پر اڑے رہے ان کا مطالبہ تھا کہ قاتلین عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیں ہم سب سے پہلے بیعت کے لیے تیار ہیں۔ ذی الحجہ ۳۶ھ میں اسی ہزار فوج کے ساتھ حضرت علیؓ شام کی طرف بڑھے۔ فرات کے ساحل پر صفین کے میدان میں طرفین کی فوجیں خیمہ زن ہوئیں۔ صلح کی ناکام کوشش دوبارہ ہوئی اور جمادی الاول ۳۷ھ میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ کئی مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی کام آئے۔ بالآخر شامی ہزاروں قرآن نیزوں پر بلند کر کے نکلے اور کہا کہ اگر شامی ختم ہو گئے تو رومیوں سے شام کی حفاظت کون کرے گا اور عراقی فنا ہو گئے تو اہل عجم سے عراق کو کون بچائے گا۔ آؤ ہم تم قرآن کو حکم مان لیں اس کا فیصلہ ہم دونوں کے لیے واجب تسلیم ہو گا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی جنگ بند ہو گئی اور طے پایا کہ دونوں فریق ایک ایک حکم (ثالث) مقرر کریں یہ دونوں کتاب اللہ کی رو سے جو فیصلہ کر دیں وہ فریقین کے لئے واجب التسلیم ہو۔ شامیوں نے عمرو بن عاص کو حضرت علیؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم مقرر کیا ثالثین نے طے کیا کہ امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کو نئے سرے سے خلیفہ کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ دومۃ الجندل کی جامع مسجد میں ابو موسیٰ اشعریؓ نے متفقہ فیصلے کا اعلان کیا۔ اس کے فوراً بعد عمروؓ بن عاص کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اشعری نے حضرت علیؓ کو معزول کر دیا میں امیر معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔ یہ فیصلہ سن کر ابو موسیٰ چلائے کہ یہ غداری ہے لیکن اب تلافی ممکن نہ تھی۔ اس فیصلہ کے بعد امیر معاویہؓ کے حامیوں نے انھیں باضابطہ خلیفہ تسلیم کر لیا (طبری و اخبار الطوال)۔ اس نامنصفانہ فیصلے کے بعد حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہی دنوں خارجیوں نے عراق میں شورش اور بدامنی پھیلا دی۔ تحکیم کی تجویز طے ہو جانے کے بعد آپ کے حامیوں کی ایک جماعت اس کے خلاف ہو گئی تھی اور تحکیم کو کفر قرار دیا تھا یہی جماعت بعد میں خوارج کہلائی۔ حضرت علیؓ بھی تحکیم کی تجویز کے مخالف تھے لیکن اپنی ہی فوج کے اصرار پر انھیں مجبوراً تحکیم کی تجویز قبول کرنا پڑی تھی۔ خارجیوں کا عقیدہ تھا کہ معاملاتِ دین میں انسان کو حکم بنانا کفر ہے۔ اور اس کا فیصلہ ماننے والے سب کافر ہیں اور ان سے جہاد فرض ہے۔ حضرت علیؓ نے خارجیوں سے صلح کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ خارجیوں نے قتل و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ حضرت علیؓ اسی ہزار فوجوں کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے۔ خونریز جنگ کے بعد خوارج کو شکست ہوئی۔

عرب کے نامور مدبر قیس بن سعد مصر کے گورنر تھے۔ امیر معاویہؓ نے انھیں اپنے ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ امیر معاویہؓ نے مشہور کر دیا کہ قیس ہمارے آدمی ہیں ان کے خطوط خفیہ طور پر ہمارے پاس آتے رہتے ہیں۔ حضرت

علیؓ کو اِن باتوں کی اطلاع ہوئی تو آپ نے محمد بن ابی بکرؓ کو مصر روانہ کیا۔ قیسؓ بن سعد مستعفی ہو کر مدینہ چلے گئے (ابن اثیر) محمد بن ابی بکر بالکل ناتجربہ کار تھے ان کی ناتجربہ کاری کے باعث مصر کے لوگ بھی حضرت علیؓ کے مخالف ہوگئے اور انھوں نے بھی شامیوں کی طرح قصاص کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر امیر معاویہؓ نے ۳۸ھ میں مصر پر فوج کشی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ محمد بن ابی بکرؓ اسی جنگ میں مارے گئے۔ امیر معاویہؓ نے عمرو بن العاص کو مصر کا والی مقرر کر دیا۔ ۴۰ھ میں امیر معاویہؓ نے مشہور جفاکار بسر بن ابی ارطات کو تین ہزار سپاہ کے ساتھ حجاز اور یمن روانہ کیا حجاز کے علوی حاکم ابوایوب انصاریؓ نے حرمِ نبوی کے احترام میں مزاحمت مناسب نہ سمجھی اور مدینہ چھوڑ کر کوفہ چلے گئے۔ بسر نے بزور اہل مکہ، اہل مدینہ اور اہل یمن سے بیعت لی۔ حضرت علیؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود کو چار ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا بسر اس وقت نجران میں تھا وہ علوی فوج کی خبر سن کر بھاگ نکلا۔ جاریہ اہل مکہ سے حضرت علیؓ کی اور اہل مدینہ سے حضرت حسنؓ کی بیعت لے کر واپس آگئے (طبری)۔ ۴۰ھ میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان صلح ہوگئی۔ اس صلح کی رو سے حجاز و عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہا۔ شام، مصر اور مغرب کا علاقہ امیر معاویہؓ کے حصہ میں آیا۔ اسی سال حضرت علیؓ کی شہادت کا حادثۂ عظمیٰ پیش آیا۔ خارجیوں نے باہم مشورہ کے بعد طے کیا کہ معاویہؓ اور علیؓ دونوں میں سے کوئی بھی حکومت کا اہل نہیں۔ ان کی خانہ جنگی کی وجہ سے خلق اللہ مصیبت میں ہے۔ ان دونوں کو ختم کیے بغیر امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو، برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ کو اور عمرو بن بکر نے عمرو بن عاص کو شہید کرنے کا بیڑہ اٹھایا تینوں نے ایک ہی دن رمضان ۴۰ھ میں نمازِ فجر کے وقت تینوں بزرگوں پر حملہ کیا۔ عمرو بن عاص کی جگہ ایک اور شخص نماز پڑھا رہا تھا وہ دھوکے میں مارا گیا۔ امیر معاویہؓ پر اوچھا وار پڑا اور وہ علاج معالجہ سے بچ گئے۔ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو شدید زخمی کر دیا۔ آپ نے لوگوں کو ہدایت کی کہ اگر میں جانبر نہ ہو سکوں تو خدا کے حکم کے مطابق گرفتار شدہ قاتل ابن ملجم کو قتل کر دینا اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میرے بعد میرے ایک خون کے بدلے میں مسلمانوں کا خون نہ بہانا صرف میرا قاتل قتل کیا جائے۔ زخمی ہونے کے تیسرے روز ۲۰ رمضان ۴۰ھ کو حضرت علیؓ نے انتقال فرمایا۔

حضرت علیؓ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں گزرا۔ آپ جس تقویٰ، دینداری اور عدل کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے، حالات کے تغیر سے لوگوں میں اس کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہ گئی تھی۔ آپ بیت المال کا ایک حبہ بھی بےجا صرف نہ ہونے دیتے تھے دوسری طرف امیر معاویہؓ اپنی کامیابی کے لیے ہر جائز و ناجائز وسیلہ اختیار کرتے تھے اور اپنے حامیوں کے لیے خزانہ کا منہ کھول دیا تھا۔ آپ بیت المال کی کوڑی کوڑی کا حساب لیتے تھے اور امیر معاویہؓ کی داد و دہش مخالفین تک کا منہ بند کر دیتی تھی۔ حضرت علیؓ کے عہد میں صیغۂ مال میں کئی مفید اصلاحات ہوئیں آپ نے جنگلات کو قابلِ محصول قرار دیا چنانچہ صرف صحرائے برس سے چار ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ عہدِ رسالت میں گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کی باقاعدہ تجارت ہونے لگی تو ان پر زکوٰۃ مقرر کر دی گئی۔ حضرت علیؓ نے اسے منسوخ کر دیا عمال سے حاصل و خراج کی آمدنی کا نہایت سختی کے ساتھ احتساب کرتے۔ بازار کی نگرانی، نرخ اور ناپ تول کی نگرانی خود کرتے۔ درّہ لیکر بازار نکل جاتے اور بیچنے والوں کو حسنِ معاملت اور ناپ تول میں ایمانداری کی ہدایت فرماتے۔

خلجی (دہلی)

دہلی کا شاہی خاندان جس نے ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک حکومت کی۔ غوری خاندان کے آخری فرمانروا سلطان معز الدین کیقباد کے قتل کے بعد خلجی خاندان کا پہلا حکمران جلال الدین فیروز شاہ خلجی ۱۳ جون ۱۲۹۰ء کو کیلو کھری کے مقام پر تخت نشین ہوا۔ ابتداء میں شہر دہلی کے عمائد اس کے حامی نہ تھے۔ لیکن بالآخر تمام چھوٹے بڑوں نے بیعت کر کے فیروز خاں کو دہلی میں رہنے کی درخواست کی۔ سلطان بڑے جاہ جلال کے ساتھ دہلی پہنچا۔ جشن کے بعد ملک کے نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔ حسبِ مراتب جاگیریں اور تنخواہیں مقرر کیں۔ امیر خسرو دہلوی کو مصحف داری کی خدمت سپرد ہوئی۔ کڑہ مانک پور کے صوبیدار اور سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے بغاوت کی اور لشکر جرار لے کر دہلی پر حملہ آور ہوا۔ جنگ میں ملک چھجو کو شکست ہوئی اور وہ بلبنی امراء سمیت گرفتار ہوا۔ بعد میں سلطان فیروز شاہ نے سب کو معاف کر دیا۔ چنگیز خاں کے مغلوں نے پنجاب میں یورش کی۔ سلطان فیروز شاہ بےشمار فوج اور توپ خانے کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ مغلوں نے شکست کے آثار دیکھ کر صلح کر لی۔ مغل سپہ سالار سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چند مغل امراء سمیت مسلمان ہو گیا۔ سلطان نے اسے بیٹا بنا لیا سلطان فیروز شاہ نے اپنے بھتیجے اور داماد ملک علاؤ الدین کو کڑہ مانک پور کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس نے آس پاس کے علاقے فتح کر کے اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔ سلطان فیروز شاہ بغاوت کا خطرہ محسوس کر کے کڑہ مانک پور کی جانب روانہ ہوا۔ ملک علاؤ الدین نے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لی۔ اسی لمحے علاؤ الدین کے ایک آدمی نے سلطان فیروز شاہ پر تلوار سے وار کیا، اور ۱۷ رمضان المبارک / ۱۹ جولائی ۱۲۹۶ء کو سلطان فیروز شاہ خلجی کا انتقال ہو گیا۔

سلطان فیروز شاہ کے قتل کے بعد علاؤ الدین خلجی سکندر ثانی ۳ اکتوبر ۱۲۹۶ء کو تخت نشین ہوا۔ اس نے فیروز شاہ کے دونوں بیٹوں رکن الدین حاکم ملتان اور ابراہیم کو اندھا کرانے کے بعد انہیں ہلاک کرا دیا۔ یہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے دکن فتح کرنے کی کوشش کی۔ وارنگل اور دوارہ وتی پورہ کی حکومتوں کو سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ گجرات، رنتھنبور اور چتوڑ پر قبضہ کیا۔ مغلوں کی فوج نے ماوراء النہر سے آکر دہلی کا محاصرہ کیا۔ تھوڑے سے مقابلے کے بعد مغل شکست کھا کر فرار ہو گئے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں جتنی فتوحات علاؤ الدین کو حاصل ہوئیں اور جیسی شاندار عمارتیں اس نے بنوائیں، ان کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس کے دور کے مشہور احکام وہ ہیں جن کی رو سے ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء کی قیمتیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ سلطان العارفین شیخ قطب الدین قدوۃ الاصفیا حضرت نظام الدین اولیا، زبدۃ العارفین شیخ صدر الدین عارف اور رکن الدین ملتانی اسی کے عہد میں تھے۔ امیر خسرو دہلوی جنھوں نے خمسۂ نظامی کے جواب میں سلطان کے نام پر خمسہ لکھا، دو ہزار تنکے (ٹکے) تنخواہ پاتے تھے۔ آخر عمر میں یہ سلطان صوم و صلوٰۃ کا پابند اور ریاضت و عبادت کا اتنا شائق ہو گیا تھا کہ لوگ اسے فرشتہ سمجھتے تھے۔ ۲ جنوری ۱۳۱۶ء کو ملک نائب وزیر مدار المہام نے سلطان علاؤ الدین کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

علاؤ الدین کی وفات کے بعد ملک نائب نے خضر خاں ولی عہد کی بجائے تخت سلطنت پر علاؤ الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر

کو بٹھا دیا۔ تخت نشینی کے وقت شہاب الدین کی عمر سات برس تھی۔ ملک نائب

مقبرہ علاء الدین خلجی

نے شہاب الدین کے غیر مادری بھائی خضر خاں اور شادی خاں کی آنکھوں میں سلائی پھروادی۔ شہاب الدین کے حقیقی بھائی قطب الدین مبارک شاہ کو اندھا کرانا چاہا۔ لیکن شہزادے نے ملک نائب کے کارندوں کو انعام دے کر آمادہ کرلیا کہ وہ ملک نائب کو ہلاک کر دیں۔ ملک نائب کی ہلاکت کے بعد مبارک شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو اندھا کرا کے قید میں ڈال دیا۔ کم عمر شہاب الدین کی نام نہاد سلطنت صرف تین ماہ تک قائم رہی۔

اپریل ۱۳۱۶ء میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ عرف مبارک خاں تخت نشین ہوا۔ مبارک خاں نے خسرو خاں کو مدار المہام بنایا۔ خسرو خاں کے مشورے پر اس نے اپنے تینوں اندھے اور قیدی بھائیوں کو قتل کروا دیا۔ مبارک خاں کے عہد میں ظفر خاں صوبے دار گجرات نے بغاوت کی۔ بغاوت فرو کر دی گئی اور ظفر خاں کو ہلاک کر دیا گیا۔ مبارک خاں نے خسرو خاں کو گجرات کا صوبیدار مقرر کر دیا گجرات خسرو خاں کا وطن تھا۔ اس نے گجرات میں قدم جما کر بغاوت کا ارادہ کیا لیکن امرا نے ساتھ نہ دیا۔ خسرو خاں دہلی آیا اور دوبارہ سلطان کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خسرو خاں نے ۱۴ اپریل ۱۳۲۰ء کو مبارک خاں کو قتل کروا دیا۔ علاؤ الدین نے کم سن شہزادوں فرید خاں اور منگو خاں کو بھی قتل کر دیا۔

قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کر کے خسرو خاں نے اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ اس کے عہد حکومت میں ہندی رسمیں اور بت پرستی خوب پھیلی۔ دہلی میں ہندو مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ پانچ ماہ کے بعد پنجاب کے حاکم غازی خاں نے دہلی پر چڑھائی کی۔ خسرو خاں اندرپت کے مقام پر شکست کھا کر گرفتار ہوا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی خاں، غیاث الدین تغلق کے لقب سے دہلی میں تخت نشین ہوا اور اس کے ساتھ خلجی خاندان کا عہد حکومت اختتام کو پہنچا۔

خلجی (مالوہ)

مالوے کا شاہی خاندان، جس نے ۱۴۳۶ء سے ۱۵۳۱ء تک حکومت کی۔ محمود شاہ خلجی اول نے اس کی بنیاد ڈالی۔ محمود شاہ، مالوے کے فرمانروا ہوشنگ شاہ کے وزیر اعظم خان جہاں ملک مغیث کا بیٹا تھا۔ دونوں باپ بیٹے نے ہوشنگ شاہ کے بیٹے اور جانشین غزنین خاں (محمد شاہ) کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ ملک مغیث اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہوگیا۔ ۲۹ شوال ۸۳۹ھ/۱۵ مئی ۱۴۳۶ء کو محمود شاہ مالوے کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں گجرات، چتوڑ، خاندیش، کھیڑلا اور جونپور فتح ہوئے۔ دکن فتح کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ [illegible] برس کی عمر میں ۱۹ ذیقعدہ ۸۷۳ھ/۲۷ مئی ۱۴۶۹ء کو محمود شاہ اول کا انتقال ہوگیا۔

محمود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا غیاث الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ غیاث الدین نے اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ سلطان غیاث اپنا زیادہ تر وقت حرم کے انتظام میں صرف کرتا اور سلطنت کا کام [illegible] اور اپنے مشیروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۵۰۰ء کو ناصر الدین نے اپنے چھوٹے بھائی شجاعت خاں کو ہلاک کر دیا۔ ۲۷ ربیع الثانی ۹۰۶ھ/۲۰ اکتوبر ۱۵۰۰ء کو غیاث الدین کا انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ناصر الدین نے [illegible] غیاث کو زہر دیا گیا تھا۔

غیاث الدین خلجی کے انتقال کے بعد اکتوبر ۱۵۰۰ء میں ناصر الدین خلجی مسند نشین ہوا۔ سلطان ناصر نے اپنے دوسرے بیٹے شہاب الدین کو [illegible] کیا۔ مگر شہاب الدین نے بغاوت کی اور بالآخر فرار اختیار کی۔ [illegible] کو ناصر الدین کی وفات پر اس کا تیسرا بیٹا محمود شاہ خلجی دوم تخت پر بیٹھا۔ محمود [illegible] اور انتظامی قابلیت سے عاری تھا۔ اس نے [illegible] خوشامدیوں کو بڑے بڑے عہدے دے کر اپنے امرا کی وفاداری سے ہاتھ دھو لیے۔ [illegible] کچھ عرصے تک محمود کے بڑے بھائی صاحب خاں کو محمد شاہ کے لقب سے [illegible] بنا دیا۔ مدعیان سلطنت کے مٹ جانے کے بعد محمود ثانی [illegible] کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ ۹ شعبان [illegible] کو گجرات کے فرمانروا سلطان بہادر شاہ نے [illegible] کرلیا۔ محمود ثانی اپنے سات بیٹوں سمیت گرفتار [illegible] اسے ہلاک کر دیا گیا۔ محمود ثانی کے ساتھ خلجی خاندان [illegible]

خلع

ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے کر اس سے علیحدگی [illegible] اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر ہی میں معاملہ طے ہو جائے [illegible] اگر عدالت میں معاملہ جائے تو عدالت [illegible] اس مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس [illegible] کی تحقیق ہو جائے پر عدالت کو اختیار ہے [illegible] اس فدیہ کو قبول کرے شوہر تو اسے طلاق دینا [illegible] کیا کہ جو مال شوہر نے اس عورت کو دیا تو اس کی [illegible] خلع کی صورت میں جو طلاق دی جاتی ہے وہ [illegible] دے کر اس طلاق کو گویا خرید لیا ہے اس نے شوہر کو [illegible] رجوع کر سکے البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر بھی [illegible] نکاح کرنا چاہیں تو ایسا کرنا بالکل جائز ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی [illegible] جمہور کے نزدیک خلع کی عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے مگر ابو داؤد [illegible] وغیرہ میں متعدد روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے اس کی مدت

ایک ہی حیض قرار دی تھی اور اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کیا (ابن اثیر)۔

خلیل بن احمد

(۷۱۹ء - ۷۹۱ء ؟) ابو عبدالرحمٰن خلیل بن احمد بن عمرو بن تمام، ایک نحوی اور لغوی۔ خلیل متدین اور پرہیزگار شخص تھا۔ لغت اور نحو میں وہ بصرے کے دبستان کا مسلمہ رئیس الاساتذہ ہے۔ اس نے ریاضی، موسیقی اور عروض پر بھی کتابیں لکھیں۔ خلیل کو عروض کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے شعر کے اوزان، بحور اور اصطلاحاتِ عروض کو معیّن اور مدوّن کیا۔ اسی کا طریقہ آج تک رائج چلا آتا ہے۔ فارسی، ترکی اور اردو کے شعر و سخن میں بھی اسی کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ خلیل ہی نے سب سے پہلے عربی کی لغات "کتاب العینؓ" تالیف کی۔ گو عربی نحو میں خلیل کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی مگر اس کے اثر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سیبویہ کی "الکتاب" میں دوسرے نحویوں میں سے کل ۵۸۵ شواہد لیے گئے ہیں جن میں ۵۲۲ خلیل کے ہیں۔

خلیل بن اسحاق

(وفات ۱۳ ربیع الاوّل ۷۷۶ھ/۲۲ اگست ۱۳۷۴ء) بن موسیٰ بن شعیب، مصر کے ایک مالکی فقیہہ۔ انہوں نے ابن عبدالہادی، رشیدی اور عبداللہ منوفی سے تعلیم پائی۔ آپ حنفی مسلک کے تھے۔ منوفی کے کہنے سے مالکی طریقہ اختیار کیا۔ فقہی نقطۂ نظر سے وہ اپنے راہنما ابن حاجب کی طرح فقہ کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو مالکی مسلک میں مصر اور المغرب کے شافعی رجحانات سے متاثر ہے۔ ان کی کتاب "المختصر" فقہ کا ایک ایسا دستور العمل ہے جس کا الجزائر میں سب سے زیادہ مطالعہ ہوتا رہا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف یہ ہیں: (۱) التوضیح ابن حاجب کی المختصر کی شرح (۲) کتاب المناسک (۳) مناقب الشیخ عبداللہ منوفی۔ منوفی کے سوانح حیات (۴) ضبط الموجہات و تعلیقہا۔

خلیل پاشا

اس نام کے دو ترکی وزرائے اعظم گزرے ہیں: (۱) قیصریلی خلیل پاشا احمد اوّل اور مراد رابع کے زمانے میں وزیر اعظم تھا۔ محرم ۱۰۲۶ھ/جنوری ۱۶۱۷ء میں اوکوز پاشا کی جگہ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اسی سال فروری میں عیسائی سفیروں کی حمایت کر کے اپنی آزاد خیالی کا ثبوت دیا۔ وہ وینس، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان سے اچھے تعلقات قائم کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ۱۶۱۸ء میں ترک فوج خلیل کی کمان میں ایران بھیجی گئی۔ ترک فوج کو سراو کے میدان میں شکست ہوئی۔ وہ واپس دارالسلطنت پہنچا تو اسے برطرف کر دیا گیا۔ ۴ ذی قعدہ ۱۰۳۲ھ/۳۰ اگست ۱۶۲۳ء کو مصطفیٰ اوّل کو تخت سے اتار کر مراد رابع تخت نشین ہوا۔ ۱۶۲۶ء میں خلیل کو دوبارہ وزیر اعظم بنایا گیا۔ جولائی ۱۶۲۷ء میں ترک فوج دیار بکر گئی۔ پہلے اخسخہ کے خلاف مہم روانہ کی گئی جہاں ایرانیوں سے خطرہ تھا۔ اسی دوران خلیل نے اباز اپاشا کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اباز اپاشا نے عثمان ثانی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بغاوت کر رکھی تھی۔ عثمان کو مئی ۱۶۲۲ء میں ینی چیریوں نے قتل کر دیا تھا۔ اباز انے شروع میں تو مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں فریب کا شبہ محسوس کرتے ہوئے ارز روم میں ینی چری کا قتل عام کر دیا۔ خلیل نے مجبوراً ارز روم کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ستّر دن کے محاصرے کے بعد فوج کو سخت سردی کے باعث لوٹنا پڑا۔ برف کی وجہ سے فوج کو سخت نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ یہ مہم خلیل کی برخاستگی کا سبب بن گئی۔ ۱۶۲۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔ یورپی اور ترک مصنفین کے نزدیک خلیل پاشا اعتدال پسند اور انصاف پسند شخصیت کا حامل تھا۔ وہ مذہبی آدمی تھا اس نے قسطنطنیہ میں محمد فاتح کی مسجد کے قرب میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔

(۲) ارنائد خلیل پاشا، احمد سوم کے زمانے کا وزیر اعظم۔ ۵ اگست ۱۷۱۶ء کو پیٹرو ڈائن کی جنگ میں وزیر اعظم علی پاشا کی شہادت کے بعد خلیل ۱۷۱۶ء کو پیٹرو ڈائن کی جنگ میں آسٹریوں کے ہاتھوں وزیر اعظم علی پاشا کی شہادت کے بعد خلیل کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ دوسرے سال جنگ پھر سے شروع کی گئی اور خلیل بلغراد تک بڑھ گیا۔ ۱۶ اگست ۱۷۱۷ء کو بلغراد کی جنگ میں خلیل کو مکمل شکست ہوئی۔ بلغراد پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا اور ترک نیش کو لوٹ گئے۔ اکتوبر ۱۷۱۷ء میں خلیل کو برخاست کر دیا گیا۔ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ نرم مزاج، پرہیزگار اور نیک آدمی تھا۔

خلیل سلطان

(۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء - ۱۷ رجب ۸۱۴ھ/۱۴۱۱ء) امیر تیمور کا پوتا جس نے سمرقند میں ۱۴۰۵ء سے ۱۴۰۹ء تک حکومت کی۔ خلیل جب پندرہ برس کا تھا تو اس نے ۱۳۹۹ء میں تیمور کی ہندوستان کی مہم میں بہت نام پیدا کیا۔ ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کو تیمور کی وفات پر فوج نے خلیل کو تسلیم کر لیا۔ وہ پانچ برس تک سمرقند میں جما رہا لیکن اس کی حکومت ماوراء النہر سے باہر کہیں بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ آلتون اردو (GOLDEN - HORDE) کے تاتاری پہلے خوارزم پر قابض تھے، اب انھوں نے بخارا تک قدم بڑھا لیے۔ ۱۴۰۹ء کے موسم بہار میں جب تاتار حملہ آور شاہرخ کی فوج بادغیس میں اور خلیل سلطان کی فوج شہر سبز میں جنگ کے لیے تیار تھی تو شمال میں امیر خدائے داد نے بغاوت کر دی۔ خلیل سلطان صرف چار ہزار سپاہی لے کر بغاوت فرو کرنے کے لیے بڑھا۔ ۱۳ ذی قعدہ ۸۱۱ھ/۳۰ مارچ ۱۴۰۹ء کو اسے سمرقند کے شمال میں خدائے داد نے گرفتار کر لیا۔ پہلے سمرقند اور بعد ازاں اسے فرغانہ لے جایا گیا۔ بالآخر امیر شیخ نورالدین کی مداخلت پر اس نے شاہرخ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے خلیل سلطان نے ماوراء النہر پر اپنی بادشاہت کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کے بدلے میں اسے رَے ملا جہاں وہ مرتے دم تک مقیم رہا۔

خمارویہ

(پیدائش ۲۵۰ھ/۸۶۴ء) بن احمد بن طولون، مصر کا حکمران۔ طولون خاندان کے بانی احمد بن طولون نے ۲۶۹ھ/۸۸۲ء میں خمارویہ کو مصر میں اپنا قائم مقام مقرر کر دیا تھا۔ دمشق کی بغاوت فرو کرنے کے لیے خمارویہ نے فوج روانہ کی جس نے نہ صرف بغاوت فرو کی بلکہ نہر العاصی کے کنارے شیزر تک پیش قدمی کر لی۔ خلیفہ المعتمد کے بھائی الموفق کا بیٹا احمد خلیفہ کی فوج کی قیادت کرنے شام آیا۔ احمد نے دمشق کے والی ابن کنداج کے ساتھ مل کر مصری افواج پر حملہ کیا۔ مصری فوجیں دمشق اور پھر رملہ تک پسپا ہو گئیں۔ اسی اثنا میں خمارویہ سات ہزار سپاہیوں کو لے

کربلا پہنچا۔ ۱۹ رشوال ۲۷۱ھ / ۶ راپریل ۸۸۴ء کو طواحین کی مشہور جنگ ہوئی
خمارویہ اپنی بیشتر فوج کے ساتھ واپس مصر بھاگ گیا۔ ۲۷۳ھ / ۸۸۶ء میں اسے
برائے نام خراج کے عوض تین سال کے لیے مصر و شام کے علاوہ سرحدات الشیائے
کوچک و آرمینیا کا والی تسلیم کر لیا گیا۔ ۸۸۶ء اور ۸۹۰ء میں صوبوں کے باغی
والیوں اور خمارویہ میں جنگ ہوئی، نتیجتاً خمارویہ کو عراق عرب کا بھی حکمران تسلیم کر
لیا گیا۔ رجب ۲۷۹ھ / اکتوبر ۸۹۲ء میں خلیفہ المعتمد نے وفات پائی اور الموفق کا بیٹا
محمد المعتضد کے لقب سے مسند نشین ہوا۔ المعتضد نے لقب سے مسند نشین
خمارویہ کے عہدے کی توثیق کر دی۔ خمارویہ عالم جوانی میں اپنے خادم کے ہاتھوں
ہلاک ہوا۔ اس کی فضول خرچیوں سے ملک کو ایسا نقصان پہنچا کہ طولون خاندان
کے حکمران مسلسل کمزور ہوتے گئے۔ ۲۹۲ھ / ۹۰۵ء تک آل طولون کی حکومت ختم
ہو چکی تھی ۔

خمر

نشہ آور چیز۔ خمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا ہے
مجازاً گیہوں، جو، کشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی خمر کا لفظ استعمال
ہوتا ہے۔ خمر (شراب) کی حرمت کے بارے میں پہلا حکم قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی
آیت ۲۱۹ میں نازل ہوا: "پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں
چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ دوسرا حکم سورۂ نساء آیت ۴۳ میں نازل ہوا: اے لوگو
جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت
پڑھنی چاہیئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔" آخری حکم سورۂ المائدہ کی آیت
۹۰ میں نازل ہوا: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے
اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں
فلاح نصیب ہوگی۔" اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی اکرم صلعم نے ایک خطبہ
میں لوگوں کو متنبہ فرما دیا تھا کہ اللہ تعالےٰ کو شراب سخت ناپسند ہے۔ بعید نہیں کہ
اس کی قطعی حرمت کا حکم آجائے۔ لہٰذا جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے
فروخت کر دیں۔ جب سورہ المائدہ کی آیت ۹۰ نازل ہوئی تو آپ نے اعلان کرایا کہ
اب جن کے پاس شراب ہے وہ نہ اسے پی سکتے ہیں نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع
کر دیں۔ لوگوں نے پوچھا ہم یہودیوں کو تحفتاً کیوں نہ دے دیں؟ آپ نے فرمایا جس
نے یہ چیز حرام کی ہے اس نے اسے تحفتاً دینے سے منع کر دیا ہے۔ بعض نے پوچھا ہم شراب
کو سرکے میں کیوں نہ تبدیل کر دیں۔ آپ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ نہیں اسے
بہا دو۔ ایک صاحب نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے
ہیں جو نہایت سرد ہے اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے
تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ نے پوچھا جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی
ہے۔ عرض کیا ہاں۔ آپ نے فرمایا، تو اس سے پرہیز کرو۔ عرض کیا ہمارے علاقے کے
لوگ تو نہ مانیں گے۔ آپ نے فرمایا، اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔

ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "اللہ تعالےٰ نے لعنت فرمائی ہے
شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے
والے پر اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لے جانے والے
پر اور اس شخص پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔" نبی صلعم نے یہ اصول
بھی بیان فرمایا کہ جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام
ہے، اور جس چیز کا ایک پورا فرق نشہ پیدا کرتا ہو۔ اس کا ایک چُلّو پینا بھی حرام ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلعم نے اس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا
جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ ابتداءً آپ نے ان برتنوں تک کے استعمال کو منع فرمایا
تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حرمت کا حکم پوری
طرح نافذ ہو گیا تب آپ نے برتنوں پر سے یہ قید اٹھا دی۔ حضرت عمرؓ نے جمعہ کے
خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو
ڈھانک لے۔

نبی صلعم کے زمانے میں شراب پینے والے کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی جو
شخص اس جرم میں گرفتار ہو کر آتا اسے جوتے، لاتیں، مکے، [illegible] بل دی ہوئی چادروں کے
سونٹے اور کھجور کے سانٹے مارے جاتے تھے۔ آپ کے زمانے میں اس جرم پر زیادہ
سے زیادہ چالیس ضربیں لگائی گئی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں چالیس کوڑوں کی
سزا رہی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس جرم سے باز نہیں آتے تو انھوں نے
صحابۂ کرام کے مشورے سے اسی کوڑے سزا مقرر کی۔ اسی سزا کو امام مالکؒ اور
امام ابوحنیفہؒ شراب کی حد قرار دیتے ہیں۔ ایک اور روایت کے بموجب امام شافعیؒ
بھی اسی سزا کو حد قرار دیتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ چالیس کوڑوں کے قائل ہیں
ایک روایت کے مطابق امام شافعیؒ بھی چالیس کوڑوں کے قائل ہیں حضرت علیؓ نے
بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔

شریعت کی رُو سے یہ بات حکومت اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ
وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزورِ قوت نافذ کرے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے
میں بنی ثقیف کے ایک شخص رویشد کی دکان اس بنا پر جلوا دی گئی [illegible]
پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت عمرؓ نے [illegible]
ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقے سے شراب کشید اور فروخت کی جا رہی [illegible]

خمس

پانچواں حصہ۔ مخالفین اسلام سے جو مال [illegible]
ہے اور جو مال بغیر لڑائی کے حاصل ہو [illegible]
[illegible] سب کا سب عام مسلمانوں کا ہے [illegible]
خمس نہیں نکالا جائے گا۔ بعض فقہا [illegible]
کا خمس کی پھر پانچ حصوں میں تقسیم [illegible]
رسولؐ کا ہے۔ دوسرا رسولؐ کے [illegible]
مساکین کا اور پانچواں مسافروں کا۔ [illegible]
بعد آپؐ کا حصہ آپ کے [illegible] کا بعض [illegible]
جو آپؐ کا خلیفہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں [illegible]
ہو گیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک [illegible]
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ذوی القربیٰ کا [illegible]
شافعیؒ کہتے ہیں کہ ان کا حق خمس میں باقی ہے [illegible]
کا ہے باقی ماندہ قلیل کا [illegible] کوئی حق نہیں ہے

اثنا عشریہ کے معتبر عالم محقق [illegible]
خمس مفصلہ ذیل اموال سے لیا جاتا ہے (۱) مال غنیمت [illegible]
سے (۲) ان خزانوں مدفونہ سے، جن کے مالک کا پتہ نہ چلے [illegible]
کی پیداوار سے جو کسی مسلم نے ذمی کے ہاتھ فروخت کر دی ہو [illegible]
میں حلال اور حرام کی آپس میں اس قدر آمیزش ہو جائے کہ ان کا [illegible]

کے بعد اس خمس کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ (۱) اللہ (۲) اس کے رسولؐ (۳) ذوالقربیٰ۔ حصّہ اوّل اور دوم کے حقدار رسولؐ کے وارث ہیں جن سے مراد عبدالمطلب کی صلبی اولاد ہے یعنی اولاد ابوطالب، عباس، حارث اور ابولہب۔ بشرطیکہ وہ اثنا عشری ہوں (۳) ان کو دیا جائے گا جو قانوناً آپؐ کے جانشین یعنی امام لاصل ہیں بعض شیعہ فقہانے فقط بارہ اماموں کو اس کا صحیح حقدار تسلیم کیا ہے۔

خندق، غزوه

تاریخ اسلام کا ایک مشہور غزوہ جو مسلمانوں اور کفار عرب کے درمیان ذیقعدہ ۵ ھ (بعض کے نزدیک شوال ۵ ھ) میں ہوا۔ ۳ ھ غزوۂ احد میں قریش یہ دعویٰ کرکے گئے تھے کہ شوال ۴ ھ میں پھر لڑنے آئیں گے۔ مگر نہیں آئے۔ محرم ۵ ھ میں بنو نضیر مدینہ سے نکالے گئے تو ان کا بڑا حصہ خیبر میں جا بسا۔ بنو نضیر میں حیی بن اخطب بڑا مفسد اور شرارت پیشہ شخص تھا۔ حیی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، سلام بن مشکم، کنانہ بن الربیع وغیرہ اور سرداران بنو وائل ہوذہ بن قیس اور ابو عمارہ

غزوۂ خندق
مدینہ و مضافات

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

وغیرہ متحد ہو کر پہلے مکہ گئے۔ قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف حملے کے لیے تیار کیا اور مصارف جنگ کیلئے مال و زر اکٹھا ہوا۔ اس کے بعد یہ سردار قبائل بنوغطفان اور بنوکنانہ میں گئے اور انھیں جنگ کے لیے برانگیختہ کیا۔ قبائل قریش بنوسلیم، فزارہ، اشجع، بنوسعد، بنوعامرہ، بنونضیر، بنوغطفان اور بنوکنانہ کے قریباً پچاس سرداروں نے خانہ کعبہ میں جاکر قسمیں کھائیں کہ جب تک زندہ ہیں، مسلمانوں کی مخالفت سے منہ نہ موڑیں گے اور اسلام دشمنی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں گے چنانچہ اسلام دشمن قبائل پر مشتمل دس ہزار سے چوبیس ہزار کی تعداد میں لشکر ابوسفیان کی کمان میں مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ اس لشکر میں ساڑھے چار ہزار اونٹ اور تین سو گھوڑے تھے۔

آنحضرت صلعم کو جب اس لشکر کے کوچ کی خبر ملی تو آپ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ طے پایا کہ مدینہ کے اندر رہ کر مدافعت کی جائے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ حملہ آور فوج سے محفوظ رہنے کے لیے خندق کھودی جائے۔ نبی کریم صلعم نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔ ایک طرف مدینہ منورہ کے مکانات کی دیواریں فصیل کا کام دے رہی تھیں۔ ایک طرف پہاڑیاں تھیں۔ جو سمت کھلی ہوئی تھی اور جہاں سے دشمن حملہ آور ہو سکتا تھا، اس طرف خندق کی کھدائی شروع کی گئی۔ دس دس رضا کاروں پر مشتمل تین سو ٹولیوں نے بیس بیس گز خندق کھودی۔ خندق پانچ گز چوڑی پانچ گز گہری اور ساڑھے تین میل لمبی تھی۔ کھدائی کے دوران میں ایک جگہ بڑا سخت پتھر آگیا۔ سب زور آزمائی کر چکے لیکن پتھر نہ ٹوٹا۔ بالآخر رسولؐ اللہ نے اس پر ضرب لگائی تو پتھر میں شگاف پڑ گیا ساتھ ہی روشنی نکلی۔ آپؐ نے اللہ اکبر کہا سب صحابہؓ نے تقلید کی۔ آپؐ نے فرمایا مجھ کو ملک شام کی کنجیاں دی گئیں۔ پھر آپ نے دوسری ضرب لگائی۔ اس ضرب سے بھی روشنی نکلی آپؐ نے فرمایا مجھے ملک فارس کی کنجیاں دی گئیں۔ تیسری ضرب پر روشنی نکلنے پر آپؐ نے فرمایا مجھے یمن کی کنجیاں دی گئیں۔ تیسری ضرب سے پتھر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ آپؐ نے صحابہؓ کو خبر دی کہ مجھے جبریلؑ نے خبر دی ہے کہ یہ تینوں ملک آپؐ کی امت کے قبضے میں آجائیں گے۔

مدینہ کے یہودی قبائل بنو قریظہ ایک معاہدہ کے تحت مسلمانوں کے حلیف تھے۔ بنونضیر کے حیی بن اخطب نے انھیں بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ مسلمانوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو مدینہ کی ایک گڑھی میں جمع کر دیا تھا۔ بنو قریظہ اور منافقین کی طرف سے سخت خطرہ تھا۔ اس صورتِ حال میں لشکر کفار خندق کے سامنے آیا۔ اس نے کئی مرتبہ خندق عبور کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ چند دنوں تک کفار خندق کے پار سے تیر اور پتھر برساتے رہے جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو عرب کے نامور بہادر ضرار، جبیرہ، نوفل اور عمرو بن عبدار ایک تنگ مقام سے خندق پار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عمرو بن عبدار کو حضرت علیؓ نے قتل کر دیا۔ وہ ہزار سوار کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ باقی تین کفار عمرو کے قتل کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ نوفل خندق میں گر گیا اسے بھی حضرت علیؓ نے بڑھ کر ہلاک کر دیا۔ باقی دو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ آنحضرت صلعم کی کئی نمازیں قضا ہوگئیں لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ سامانِ رسد کہیں سے میسر نہ آسکتا تھا۔ ایک صحابی نے بھوک کی شکایت کی اور کرتا اٹھا کر دکھایا جس کے نیچے پتھر باندھ رکھا تھا۔ آپؐ نے اپنا کرتا اٹھا کر دکھایا تو دو پتھر پیٹ پر باندھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے انصار کے دو سرداروں سعدؓ بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے مشورہ کیا کہ کفار سے اس شرط پر صلح کر لی جائے کہ مدینے کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ انکو دے دیا جائے انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ جب ہم مشرک اور بت پرست تھے تو اس زمانے میں یہ لوگ ایک کھجور بھی ہم سے نہیں لے سکتے تھے اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت عطا کی ہے کیا اس حالت میں ہم ان کو اپنا مال دیں۔ بخدا ان کے لئے ہمارے پاس تلوار کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

بنو قریظہ کے ایک نومسلم نعیمؓ بن مسعود نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں بنو قریظہ اور لشکرِ کفار میں پھوٹ ڈلوائے دیتا ہوں۔ چنانچہ نعیمؓ بن مسعود پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب رہے۔ بنو قریظہ و قریش کے تعاون کے امکانات ختم ہوگئے جب محاصرے کو ستائیس روز گزر گئے تو ایک رات تیز و تند آندھی چلی جس سے خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں اور چولہوں پر سے دیگچیاں گر گئیں۔ [illegible] کفار مایوسی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر واپس چل دیئے۔ کفار کے فرار ہونے کی خبر آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی۔ مسلم لشکر کے مخبر حذیفہؓ بن یمان نے اطلاع دی کہ کفار بھاگ گئے ہیں اور ان کی لشکرگاہ خالی پڑی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب کفارِ قریش ہم پر کبھی حملہ آور نہ ہونگے۔

خوات بن جبیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی۔ آپ کا تعلق قبیلۂ اوس سے تھا ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں تمام غزوات میں حصہ لیا۔ بہادر اور [illegible] تھے اسی وجہ سے رسول اللہ صلعم نے انھیں اپنا سوار مقرر کیا تھا۔ شاعر [illegible] اور زندہ دل صحابی تھے۔ آخری عمر میں بصارت جاتی رہی۔

خواجو کرمانی

(۵ شوال ۶۷۹ھ / ۷ فروری ۱۲۸۱ء — [illegible] ۷۴۴ھ [illegible])

کمال الدین ابوالعطا محمود بن علی بن محمود، ایران کا نامور شاعر [illegible] ایک سربرآوردہ خاندان کا فرد تھا۔ کرمان [illegible] تعلیم پائی [illegible] و دیگر علوم میں دسترس حاصل کی۔ وطن کی سیر و سیاحت کے بعد [illegible] بغداد سے واپس ہوا تو اس نے مظفری خاندان کے حکمران [illegible] (۱۳۱۴ء — ۱۳۵۸ء) کے قصیدے کہے۔ [illegible] کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس کی شان میں متعدد قصیدے [illegible] خواجو کی حافظ شیرازی سے بھی صحبت رہی۔ [illegible] میں بھی قصیدے کہے۔ خواجو نے نظم گنجوی کے خمسے کے [illegible] کا دیوان قصائد، غزلیات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ [illegible] بتائی جاتی ہے۔ اس کی مشہور عشقیہ مثنوی [illegible] کے اعتبار سے شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ اس مثنوی [illegible] ہے۔ یہ مثنوی خراسان کے حکمران فیروز کے بیٹے [illegible] گل کے معاشقے کی داستان ہے جو نظامی کی مثنوی [illegible] گئی ہے۔ شبلی نعمانی نے خواجو اور حافظ کی غزلیات کا [illegible] یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ حافظ نے خواجو کا [illegible] میں بھی اس کی پیروی کی۔ خواجو نے عشق و عاشقی کے جذبات [illegible] بے ثباتی، وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ [illegible] غزلیں دنیا کی بے ثباتی پر [illegible] ہیں۔ خواجو کی غزل گوئی کی [illegible] خصوصیت [illegible]

پر حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی اور اس کے اسلوب میں غزل سرائی کی۔ حافظ نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ع استادِ غزل سعدی است پیشِ ہمہ کس امّا
دارد سخنِ حافظ طرزِ روشِ خواجو

خوارزمی، ابوعبداللہ محمد

(وفات ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء) مسلمانوں کے قدیم ترین دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) "مفاتیح العلوم" کا مصنف۔ یہ کتاب اس نے سامانی بادشاہ نوح ثانی (۹۷۶ء — ۹۹۷ء) کے وزیر ابوالحسن عبیداللہ بن احمد العتبی کے نام سے معنون کی گئی۔ یہ تصنیف دو مقالوں میں منقسم ہے۔ مقالۂ اول میں شریعت اور اس سے متعلق علوم، فقہ، کلام، عروض، تاریخ اور دوسرے مقالے میں فلسفہ، منطق، طب، فلسفہ، ہندسہ، فلکیات، موسیقی، حیل اور کیمیا سے بحث کی گئی ہے۔ [illegible] کے متعلق معلومات کے لیے یہ کتاب بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے۔

خوارزمی، محمد بن موسیٰ

(وفات ۲۳۵ھ — ۸۴۷ء ؟) ماہر فلکیات، ریاضی دان اور مؤرخ۔ [illegible] کے عہد میں شہرت پائی۔ وہ مطالعہ کا بیشتر وقت المامون کے کتب [illegible] مامون نے [illegible] یونانی کتابیں جمع کرنے اور ان کے تراجم کروانے کا [illegible] تاریخ پر اس کی تصنیف "کتاب التاریخ" اور ریاضیات [illegible] سب سے [illegible] حساب میں خوارزمی کی ایک اور تصنیف [illegible] فلکیات میں اس نے "فی زیج" لکھی۔ [illegible] پر قلم اٹھایا۔ اس نے اس امر کی تحقیق کی کہ [illegible] ولادت مبارک کے وقت کواکب کے قرانات سے آپ [illegible] تک چل سکتا تھا۔ المامون کے ایما پر اس نے [illegible] خوارزمی نے اصطرلاب کے بارے [illegible] اور کتاب عمل الاصطرلاب بھی مدون کیں [illegible] سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔

خواندامیر

(۱۴۷۵ء — ۱۵۳۵ء) غیاث الدین بن خواجہ ہمام الدین بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ برہان الدین محمد شیرازی، ایرانی مؤرخ۔ اس کا باپ برسوں سمرقند کے سلطان محمود کا وزیر رہا۔ خواندامیر نے سلطان حسین اور اس کی وفات کے بعد بدیع الزماں کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۵۱۴ء میں وہ گرجستان کے ایک گاؤں بشت میں تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہوگیا۔ مارچ ۱۵۲۸ء میں اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ پہلے بابر اور بعد میں ہمایوں کی ملازمت اختیار کی۔ ہمایوں کی ہجرت کے دوران انتقال ہوا اور اپنی وصیت کے مطابق دہلی میں نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی قبروں کے قریب دفن ہوا۔ خواندامیر کی پہلی تصنیف "خلاصۃ الاخبار" ہے۔ اس کی گراں قدر تصنیف "حبیب السیر" ہے۔ یہ عمومی تاریخ ہے اس میں ابتدائے آفرینش سے اسمٰعیل صفوی اول کی وفات (۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء) تک کے حالات درج ہیں۔ کتاب کے سب سے مفید حصے وہ ہیں جو ہرات سلطان حسین بایقرا اور اسمٰعیل اول کی زندگی کے حالات پر لکھے گئے ہیں۔ ضمنی طور پر اس نے شیبانی اور بابر کے بارے میں بھی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ خواندامیر بیرجانب دار اور صاحبِ اصول مصنف ہے۔

خوجہ آفندی

(۹۴۳ھ/ ۱۵۳۷ء — ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ء) سعدالدین بن حسن جان بن حافظ محمد بن حافظ جمال الدین اصفہانی، مشہور ترکی مورخ اور شیخ الاسلام۔ ان کے والد حسن جان نے سلطان سلیم اول کے عہد کے آخری سات سال میں حاجب کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ خوجہ آفندی نے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور جلد ہی ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے۔ ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء میں مشہور فقیہہ ابوالسعود کے ہاں ملازم ہوگئے۔ ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۴ء میں ولی عہد مراد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۵۷۴ء میں مراد سوم کی تخت نشینی پر اس کے معتمد مشیر مقرر ہوئے۔ آپ ترکی کی مشہور تاریخ "تاج التواریخ" کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں آلِ عثمان کی تاریخ اس کی ابتداء سے لے کر سلیم اوّل کی وفات (ستمبر ۱۵۲۰ء) تک بیان کی گئی ہے۔

خوشحال خان خٹک

(۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء — ۲۸ ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ/ ۱۹ فروری ۱۶۸۹ء) بن شہباز خاں بن یحییٰ خاں بن ملک اکوڑی، پشتو کا عظیم شاعر، سپہ سالار اور پٹھانوں کے مشہور قبیلے خٹک کا سردار۔ شہنشاہ اکبر نے ملک اکوڑی کو اپنا منصب دار مقرر کرکے اٹک اور پشاور کے درمیان شاہراہ کا محصول وصول کرنے کا اختیار دیا تھا جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں یحییٰ خاں اور بعد میں شہباز خاں منصب دار مقرر ہوتے۔ یکم شوال ۱۰۵۰ھ/ ۴ جنوری ۱۶۴۱ء کو شہباز خاں قبائل کی باہمی جنگ میں مارا گیا۔ خوشحال خاں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ مارچ ۱۶۴۲ء میں اس نے تارا گڑھ کا قلعہ فتح کیا جس پر اسے چار لاکھ روپیہ نقد اور ڈھائی لاکھ روپے کی جاگیر لاہور میں عطا ہوئی۔ ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۴۵ء میں اس نے اندراب اور ہندوکش کی حفاظت کی اور ۱۰۵۶ھ/ ۱۶۴۶ء میں بلخ و بدخشاں کی فوجی مہم میں شہنشاہ کا ہم رکاب رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شہنشاہ سے خوشحال خاں کے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ خوشحال خاں مغلوں کا وفادار رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی تمنا یہ بھی تھی کہ پٹھانوں کی خود مختاری پر آنچ نہ آنے پائے۔ وہ پٹھانوں اور مغلوں کے درمیان ثالث کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا تھا یہ بات شہنشاہ اور کابل و پشاور کے حاکموں کے لئے قابل قبول نہ تھی۔

۱۶۶۱ء میں سید امیر خاں کابل کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے دربار شاہی سے خوشحال خاں کا منصب اور تمام مراعات منسوخ کرائیں پھر اسے گرفتار کرکے دہلی روانہ کر دیا۔ اپریل ۱۶۶۴ء تک وہ دہلی اور قلعہ رنتھنبور میں قید رہا۔ قید سے رہائی پانے کے بعد بھی اس پر بلاناغہ دربار میں حاضر رہنے کی پابندی تھی۔ ۱۶۶۸ء میں اس کی جلاوطنی ختم ہوئی۔ ۱۶۷۲ء میں درۂ خیبر کے قبائل نے بغاوت کر دی۔ آفریدی سردار اکمل خاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرکے مغلوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ خوشحال خاں بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ ۲ مارچ ۱۶۷۴ء کو کڑپہ کی لڑائی میں شاہی لشکر کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسار جولائی ۱۶۷۴ء کو خود عالمگیر حسن ابدال پہنچا اور ایک سال تک وہاں مقیم رہا۔ ۱۶۷۵ء میں خوشحال خاں نے خاپلش اور بعد ازاں گنیپت میں مغل فوج کو شکست دی۔

شاہی دربار کی طرف سے مامور لوگوں نے خوشحال خاں کے خاندان میں نفاق کا بیج بویا اور اس کا بیٹا اشرف خاں اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ دوسرے بیٹے بہرام خاں نے بھی اس کے خلاف جنگ کی۔ آخر بیرانہ سالی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۷۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔ اکوڑہ سے چار میل مغرب میں اسوڑی کے مقام پر پہاڑ کے دامن میں دفن ہوا۔ لوح مزار پر اس کا ایک شعر کندہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے: "میں نے افغان قوم کی عزت و ناموس کے لیے تلوار کمر سے باندھ لی ہے میں ہوں زمانے کا غیور و جسور اور کلاہ حمیت خوشحال خاں خٹک"

خوشحال خاں حنفی المذہب تھا۔ اس نے رجب ۱۰۶۳ھ میں کاکا صاحب سے بیعت کی تھی۔ اس نے پشتو اور فارسی میں پینتالیس ہزار اشعار کہے جن میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں، قطعے، مسدس، مخمس، معشر، ترکیب بند وغیرہ عروض پشتو کے مطابق شامل ہیں۔ اسے بابائے پشتو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اس کے اشعار میں عشق، اخلاق، تصوف اور اجتماعی مسائل کے مضامین ہیں بعض مؤرخوں نے اس کی کتابوں کی تعداد دو سو بتائی ہے۔ مشہور اور موجود تصانیف حسب ذیل ہیں: (۱) دیوان، اس میں سولہ ہزار اشعار ہیں۔ (۲) باز نامہ۔ پشتو زبان کی اس نثری کتاب میں شکار کا طریقہ اور شہباز کے امراض کا بیان ہے (۳) صحت الابدان، ایک مشہور پشتو نظم جس میں طب اور اصول صحت بیان کیے گئے ہیں (۴) ترجمۂ ہدایہ۔ نثر کی یہ کتاب فقہ حنفی پر ہے۔ (۵) آئینہ، فقہ کی ایک عربی کتاب کا پشتو نثر میں ترجمہ (۶) فضل نامہ، فقہی مسائل پر ایک پشتو مثنوی (۷) سوات نامہ، پشتو کے چار سو اشعار پر مشتمل ایک نظم جس میں سوات کے سفر کے حالات ہیں (۸) فرخ نامہ، پشتو میں شمشیر و قلم کا مناظرہ (۹) فراق نامہ، پشتو نظم میں قید و بند کے حالات (۱۰) دستار نامہ، پشتو نثر میں اخلاق، سیاست اور اجتماعیات پر ایک تالیف (۱۱) بیاض، پشتو نثر میں تاریخی یادداشتیں۔ (۱۲) زنجیری، پشتو نثر میں خوش نویسی کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ (۱۳) بیاض الحکیمات۔

خوف نماز

وہ نماز جو خوف، پریشانی یا مصیبت کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ حضرت ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ جب آندھی چلتی تو حضورؐ فوراً مسجد میں تشریف لے جاتے۔ جب سورج یا چاند گرہن ہو جاتا تو آنحضرتؐ فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ حضرت صہیبؓ حضور اقدس صلعم سے نقل کرتے ہیں کہ پہلے انبیاء کا بھی یہی معمول تھا کہ ہر پریشانی کے وقت نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ حضرت نضرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دن میں سخت اندھیرا ہو گیا۔ میں دوڑا ہوا حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ حضورؐ کے زمانے میں بھی ایسی نوبت آئی ہے؟ انھوں نے فرمایا، خدا کی پناہ، حضورؐ کے زمانے میں تو ذرا بھی تیز ہوا چلتی تو ہم سب مسجدوں کو دوڑ جاتے تھے کہ کہیں قیامت تو نہیں آ گئی۔ عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلعم کے گھر والوں پر کسی قسم کی تنگی پیش آتی تو ان کو نماز پڑھنے کا حکم فرماتے۔ حضرت ابن عباسؓ ایک مرتبہ سفر میں تھے راستے میں اطلاع ملی کہ بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے۔ اونٹ سے اتر کر دو رکعت نماز پڑھی پھر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور پھر فرمایا کہ میں نے وہ کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا۔

آنحضرتؐ نے بحالت خوف یوں نماز پڑھی کہ ایک گروہ کو دو رکعت پڑھائی اور پیچھے چلا گیا پھر دوسرے گروہ کو دو رکعت پڑھائی اس طرح حضور صلعم کی چار اور دوسرے لوگوں کی دو رکعتیں ہوئیں۔ (نسائی)۔ سہل بن ابی حثمہ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے بحالت خوف سب کو اپنے پشت پر دو صفوں میں بانٹ دیا۔ پھر قریب تر صف نے آپ کے پیچھے ایک رکعت ادا کی اور حضور صلعم کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے کہ اس صف نے ایک رکعت اور ادا کر لی۔ اس کے بعد یہ لوگ جو اگلی صف میں تھے پیچھے چلے گئے اور پچھلی صف آگے چلی آئی۔ انھیں بھی حضورؐ نے ایک رکعت پڑھائی اور قعدے میں اتنی دیر رہے کہ انھوں نے ایک رکعت اور ادا کر لی۔ اس کے بعد حضورؐ نے سلام پھیرا (مالک، ترمذی، ابو داؤد)۔

خولان

جنوبی عرب کا ایک قبیلہ، جو ایک ہزار سال قبل مسیح میں اس علاقے میں آباد ہوا۔ عرب ماہرین انساب خولان بن عمرو بن مالک بن حارث بن مرہ بن اُدد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا کو اس قبیلے کا جد امجد قرار دیتے ہیں۔ شعبان ۱۰ھ/ نومبر ۶۳۱ء میں خولان کا وفد رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے قبیلے کے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا۔ رسول اللہؐ نے انھیں اسلام کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بت عم انس کو توڑ دیں گے۔ ان کی عزت افزائی کے طور پر آپؐ نے ۱۲ اوقیہ چاندی کا تحفہ دیا۔ نبی کریم صلعم کی رحلت کے بعد ابتدا میں وہ بھی ارتداد کی تحریک میں شریک ہوئے۔ ۱۱ھ/ ۶۳۲ء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یعلی بن منیہ کو کچھ تحدیری فوج دے کر بھیجا اور بنو خولان دوبارہ دائرہ اسلام میں آ گئے۔ ۲۱ھ میں مصر کی فتح کے بعد جب اسلام خولان کے علاقے میں پوری طرح پھیل گیا تو جنوبی عرب کے جن باشندوں نے مصر کی فتح میں حصہ لیا تھا وہ وہیں آباد ہو گئے۔ قبیلۂ خولان اب قبیلۂ بکیل کبری کا ایک جزو ہے۔

خولہ بنت ازور

قرون اولیٰ کی ممتاز سرفروش اور بہادر خاتون۔ حضرت ضرار بن ازور کی بہن تھیں۔ جب جنگ اجنادین میں حضرت ضرار رومیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو حضرت خالد بن ولید ان کی رہائی کے لیے ایک فوجی دستے کو روانہ ہوئے۔ خولہ بنت ازور بھائی کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی اتنی سرعت سے روانہ ہوئیں کہ سب سے پہلے رومیوں پر حملہ آور ہوئیں۔ بہادری کے کئی حیرت انگیز واقعات آپ سے منسوب ہیں۔

خولہ بنت حکیم

آنحضرت صلعم کی صحابیہ۔ آپ سے علم و بیش پندرہ حدیثیں مروی ہیں۔ آپ کا نکاح حضرت عثمان بن مظعون سے ہوا۔ مدینہ میں ہجرت کی۔ ۲ھ میں حضرت عثمانؓ نے وفات پائی تو خولہؓ نے دوسرا نکاح کیا۔

خونجی

(۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء ——— رمضان ۶۴۶ھ / دسمبر ۱۲۴۸ء) افضل الدین محمد بن ناماور بن عبدالملک شافعی مصری مشہور عالم دین تھے۔ وہ مدرسہ صلاحیہ قرافہ اور دیگر مدرسوں میں درس دیتے رہے۔ عمر کے آخری حصے میں مصر اور اعمال مصر کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خونجی نے طب اور منطق پر حسب ذیل کتابیں لکھیں: (۱) شرح ما قالہ الرئیس ابن سینا فی النبض

(۲) شرح الجمل فی علم المنطق (۶) کتاب کشف الاسرار عن غوامض الافکار فی المنطق (۷) کتاب الموجز فی المنطق ۔

خیبر (درّہ)

پاکستان اور افغانستان کے درمیان شمالی راستہ، جو پشاور سے کابل کو جاتا ہے یہ ایک پیچ و خم کھاتی ہوئی تنگ سی گھاٹی ہے جس کے دونوں جانب ۶۰۰ فٹ سے ۱۰۰۰ فٹ بلند پہاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پشاور سے دس میل کے فاصلے سے شروع ہو کر یہ درّہ ۳۳ میل تک مسلسل چلا گیا ہے اور افغانستان میں لوئی ڈکہ کی وادی میں ختم ہو جاتا ہے۔ پشاور سے سات میل مغرب میں قلعہ جمرود سے تین میل آگے چڑھائی شروع ہو جاتی ہے اور قلعہ علی مسجد تک بتدریج بلند ہوتی گئی ہے۔ ۳۱۷۴ فٹ بلند علی مسجد سے پانچ میل تک پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک تنگ گھاٹی ہے جس کی چوڑائی کہیں بھی دو سو گز سے زیادہ نہیں موضع زنتاھ کے قریب واقع قلعہ کی دیواریں کچی اور برج بلند ہیں۔ یہاں سے قریباً ایک میل تک وادی چوڑی ہوتی چلی گئی ہے۔ دونوں طرف قلعے، دیہات اور زیر کاشت اراضی کے قطعات نظر آتے ہیں۔ علی مسجد سے دس میل کے فاصلے پر ۳۵۱۸ فٹ بلند لنڈی کوتل کا قلعہ اور چھاؤنی ہے۔ یہ درّے کا بلند ترین مقام اور اہم ترین منڈی ہے۔ لنڈی کوتل سے شنواریوں کے علاقے سے گزر کر لنڈی خانہ پہنچتے ہیں جہاں سے ایک اور گھاٹی شروع ہوتی ہے لنڈی کوتل سے چھ میل دور طورخم کے مقام پر یہ درہ افغانستان کو جاتا ہے۔

ہمایوں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد اسی درّے سے واپس آیا تھا۔ اکبر اور اس کے جانشین پنجاب سے کابل جانے کیلئے درہ خیبر استعمال کرتے رہے۔ اکبر کے چھوٹے بھائی اور کابل کے حاکم مرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد ۱۵۸۶ء میں راجا مان سنگھ شہنشاہ کی طرف سے

تاریخی اور عسکری اعتبار سے یہ دنیا کا اہم درّہ ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد اقوام یہاں سے گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایران کے شہنشاہ داریوش اعظم نے کابل فتح کرنے کے بعد درۂ خیبر کے راستے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ دو صدی بعد سکندر اعظم حملہ آور ہوا۔ اسلامی عہد میں ہندوستان پر حملے کے لئے یہ راستہ کئی بار استعمال ہوا۔ محمود غزنوی اسی درّے سے گزر کر جے پال سے مقابلے کے لئے وادی پشاور میں آیا تھا۔ امیر تیمور ۱۳۹۸ء میں اسی راستے سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ۱۳۹۹ء میں واپسی کے لیے یہی راستہ استعمال کیا۔ ۱۵۲۵ء میں بابر نے اسی راستے سے ہندوستان پر یلغار کی۔ کابل پر قبضہ کرنے کے لیے اسی درّے سے گزرا۔ اس درّے پر عہد مغلیہ ہی سے آفریدیوں کا قبضہ رہا ہے۔ ۱۶۷۲ء میں قبائل نے کابل کے صوبیدار محمد امین خان پر درّہ خیبر میں حملہ کر کے چالیس ہزار فوج تباہ کر دی۔ عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کے علاوہ شاہی خزانے اور ہاتھیوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ نے کابل کے مغل صوبیدار ناصر خاں پر حملہ کرنے کے لئے درّہ خیبر سے گزرنا چاہا لیکن قبائلیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ مگر نادر خاں نے ناصر خاں پر حملہ کر کے اسے جمرود کے قریب شکست دی۔ پنجاب پر حملہ کرتے وقت احمد شاہ درانی اور اس کے پوتے شاہ زمان نے بھی کئی بار درّہ خیبر کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی حکومت نے پہلی بار

تاریخ ساز درۂ خیبر

درّہ خیبر کو ۱۸۳۹ء میں استعمال کیا جب کرنل کلاڈ ویڈ شہزادہ تیمور کو پشاور کے راستے کابل لے کر گیا۔ ۱۸۷۸ء میں سر نیول چیمبرلین کے سفارتی وفد کو علی مسجد کے قریب روک لیا گیا جس کے نتیجے میں دوسری جنگ افغانستان چھڑ گئی اور ۱۸۷۹ء میں صلح نامہ گندمک کی رو سے درے کی دیکھ بھال اور قبائلی علاقے کا نظم و نسق برطانوی حکومت کے سپرد ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں آفریدیوں نے دوبارہ درّے پر قبضہ کر لیا۔ انگریزی فوج کئی ماہ کی جدوجہد کے بعد دوبارہ قدم جما سکی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد درۂ خیبر اور اس کے نواحی علاقے میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ حکومتِ پاکستان نے انگریزی دور کی تمام فوجوں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔ قانون ساز اسمبلیوں میں قبائلیوں کو نمائندگی دی گئی۔

خیبر، غزوہ

عرب میں یہودیوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز خیبر تھا۔ بنو نضیر مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہودی قبائل کو مسلمانوں کے خلاف کسانا شروع کیا۔ قریب ہی بنو غطفان آباد تھے۔ بنو نضیر نے بنو غطفان کو اس شرط پر اپنا شریک بنایا کہ مدینہ کی نصف پیداوار تمھیں دی جائیگی۔ یہودیوں کا سردار اسلام بن ابی الحقیق بڑا بااثر تھا۔ اس نے آس پاس کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کر لیا۔ جنگی تیاریوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے مدینہ کے منافقین کو بھی اپنا شریک کار بنا لیا۔ آنحضرت صلعم نے یہودیوں کی جنگی تیاریوں کا حال سن کر محرم ۷ھ میں مدینہ سے خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ مجاہدین کی تعداد بارہ سو سے سولہ سو تک بیان کی جاتی ہے۔ آپ نے خیبر اور بنی غطفان کے درمیانی مقام رجیع کو لشکر گاہ کیلئے تجویز فرمایا۔ بنو غطفان نے جب اپنی بستیوں کو خطرے میں دیکھا تو انھیں خیبر کے یہودیوں کی مدد کیلئے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خیبر متعدد چھوٹے چھوٹے قبائلی محلوں پر مشتمل تھا۔ ہر محلہ دوسرے محلے سے کچھ فاصلے پر تھا یہود خیبر سات بڑے اور متعدد چھوٹے قلعوں میں محفوظ تھے جن میں سے بعض میں منجنیقیں نصب تھیں۔ ہر قلعے کو تین تین فصیلوں سے اس طرح گھیرا گیا تھا کہ سوار و پیدل سپاہ ان کے سامنے بے بس تھی۔ یہودی جنگجو سپاہیوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔

لشکر اسلام نے سب سے پہلے قلعہ ناعم فتح کیا۔ اندرونِ شہر سب سے اہم قلعہ قموص تھا۔ حضور نے یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مامور فرمایا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ آخر میں آپؐ نے حضرت علیؓ کو علم مرحمت فرمایا۔ بیس دن کے محاصرہ کے بعد قلعہ قموص فتح ہوا۔ اسی قلعے میں سے صفیہؓ بنت حیی بن اخطب قید ہوئی جو بعد میں آنحضرت صلعم کی زوجیت میں آئیں۔ فتح قموص کے بعد قلعہ شق، نطارہ اور کتیبہ فتح ہوئے۔ آخر میں دو قلعے وطیح اور سالم دس روز کے محاصرے کے بعد فتح ہوئے۔ اگر یہودیوں کے ساتھ انھی کی توریت کے احکام کے مطابق برتاؤ کیا جاتا تو سارے بالغ مرد قتل اور عورتیں و بچے غلام بنائے جا سکتے تھے مگر نبی کریم صلعم نے رحمدلی اور درگزر سے کام لیا۔ سب کی جان بخشی کی اور فرمایا کہ مال چھوڑ کر جسم کے کپڑوں کے ساتھ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ جب قبضہ مکمل ہو گیا تو آپؐ نے شرائط صلح میں مزید رعایت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہود خیبر ہی میں رہیں اور بٹائی پر کاشت کر کے نصف پیداوار لگان میں دیا کریں۔ آنحضرت صلعم نے نصف علاقہ بحق حکومت محفوظ کر دیا اور باقی فاتحوں میں بانٹ دیا۔ غزوۂ خیبر میں پندرہ مسلمان شہید ہوئے اور ۹۲ یہودی مارے گئے۔

خیراللہ آفندی

(وفات ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) ترک مؤرخ۔ اس کا باپ عبدالحق آفندی عالم دین اور طبیب تھا۔ عبدالحق تین بار رئیس الاطباء مقرر ہوا۔ ۱۲۶۹ھ میں اسے رئیس العلماء کا خطاب ملا۔ خیراللہ نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر طبیب فقیہہ کی زندگی اختیار کی۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں وہ [illegible] مقرر ہوا۔ ۱۲۶۵ھ میں وہ انجمنِ دانش کا دوسرا صدر مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ بہت سے علمی اداروں اور طب کے مدرسے کا صدر رہا۔ پھر وزارت [illegible] رہا۔ ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں اسے سفیر بنا کر ایران بھیجا گیا۔ [illegible] کا منتقل ہوا۔ خیراللہ نے تاریخ، جغرافیہ، طب، سائنس [illegible] متعدد کتب تصنیف کیں۔ اس کی شہرت تاریخ نویسی کی وجہ سے ہے۔ [illegible] کے علاوہ اس نے "دولت عالیۂ عثمانیہ تاریخی" لکھی۔ [illegible] کے لئے ایک جلد مختص کی گئی ہے جس میں عصر اسلام اور عیسائی [illegible] جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی کل پندرہ جلدیں [illegible] کے عہد سے احمد اول کے زمانے کے حالات سے متعلق ہیں۔

خیرالدین

سلطان ولی بایزید ثانی کے زمانے ([illegible]) [illegible] ماہر فن تعمیر۔ اس کا شاہکار قسطنطنیہ کی مسجد بایزید ہے جو [illegible] بہترین نمونہ ہے۔ خیرالدین ترکی فن تعمیر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ [illegible] ایک مسجد بھی ہے جس کا نام اس کے نام پر ہے۔ یہ مسجد [illegible] وزیر اعظم سنان پاشا کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ [illegible] کے مقبرے کے سامنے ہے۔

د

دابۃ الارض

جانور جو علاماتِ قُربِ قیامت میں سے ہے۔ دابہ ایک خاص قسم کا جانور ہے جو اس وقت ظاہر ہوگا جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکل چھوڑ دیں گے اور دنیا کی حالت اس قدر بگڑ چکی ہو گی کہ اس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ حدیث میں دابہ کو قیامت کی دس علامات میں سے ایک کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس جانور کو اپنی حجت کے طور پر لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا۔ اس کے خروج کے بعد توبہ کا موقع کسی کو نہیں دیا جائے گا۔ امام ابن کثیر نے اس جانور کے خروج کو اللہ تعالیٰ کی آخری حجت اور قیامت کی علامات میں سے ایک قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دابۃ الارض ظاہر ہو گا تو وہ لوگوں سے کلام کرے گا جسے سب سنیں گے۔ اس جانور کے خروج کی جگہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں کہ وہ تہامہ سے نکلے گا یا طائف میں یا مکے میں صفا و مروہ کے درمیان سے خروج کرے گا۔ ابو داؤد کی روایت کے مطابق یہ جانور تین بار ظاہر ہو گا۔ دو بار تو دور دراز کے علاقوں میں ظاہر ہو گا۔ پہلی بار کے خروج سے اس کا ذکر شہر مکہ تک نہ پہنچ پائے گا۔ دوسری بار اس کا قصہ شہرت پائے گا اور اس کا ذکر مکہ میں بھی پہنچ جائے گا۔ جب لوگ مسجد حرام میں ہوں گے تو تیسری بار اچانک دابۃ الارض لوگوں کو دکھائی دے گا۔

داتا گنج بخش

(۴۰۰ھ — ۱۹ صفر ۴۶۵ھ) بلند پایہ صوفی بزرگ۔ نام علی، کنیت ابوالحسن اور عرفیت داتا گنج بخش ہے۔

حضرت گنج بخش خود اپنی تصنیف "کشف الاسرار" میں فرماتے ہیں کہ "اے علی تجھے خلقت گنج بخش کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال ہرگز دل میں نہ لا ورنہ محض دعویٰ اور غرور ہو گا۔ گنج بخش تو وہی ذات پاک (اللہ تعالیٰ) ہے اس کے ساتھ شرک نہ کرنا ورنہ تیری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ بے شک وہ اکیلا خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں" اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ کی زندگی میں بھی یہ لقب مشہور تھا۔ خواجہ غریب نوازؒ نے بھی اپنے شعر میں آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہی لقب استعمال کیا ہے۔

آپ کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت علیؓ سے جاملتا ہے۔ سیّد علی ہجویری بن سیّد عثمان غزنوی بن سیّد علی بن عبدالرحمٰن بن سیّد عبداللہ بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سیّد زید بن امام حسن بن حضرت علیؓ۔ آپ فقہی اعتبار سے حنفی المذہب تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کا سلسلۂ طریقت نو واسطوں سے حضرت علیؓ سے جاملتا ہے۔ مخدوم حضرت سید علی ہجویریؒ حضرت شیخ ابوالفضل غزنویؒ کے خلیفہ تھے۔ شیخ ابوالفضلؒ حضرت علی حصریؒ کے مرید تھے۔ حضرت علیؒ حضرت ابوبکر شبلیؒ سے بیعت تھے۔ وہ حضرت جنید بغدادیؒ سے بیعت تھے۔ حضرت بغدادیؒ خواجہ سری سقطیؒ کے مرید تھے اور خواجہ سقطیؒ خواجہ معروف کرخیؒ سے بیعت تھے۔ خواجہ کرخیؒ نے حضرت داؤد طائیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔ حضرت طائیؒ کے مرشد حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ تھے۔ خواجہ عجمیؒ خواجہ حسن بصریؒ کے مرید تھے اور خواجہ حسن بصریؒ کے مُرشد سید علی مرتضےٰؓ کرم اللہ وجہہ تھے۔

دارا شکوہ مؤلف "سفینۃ الاولیا" نے حضرت گنج بخش کا آبائی وطن غزنی بتایا ہے آپ کا خاندان ہجویر میں رہتا تھا۔ ہجویر غزنی سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے غزنی کا ایک محلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ کا خاندان جلاب آ گیا۔ جلاب قصبہ غزنی سے ہجویر کی نسبت زیادہ قریب تھا۔ حضرت گنج بخش کے والد ماجد کا نام عثمان جلابیؒ مشہور ہے۔ حضرت ہجویریؒ نے دینی تعلیم اپنے آبائی وطن میں ابو العلا عبدالرحیم اور ابو العباس بن احمد سے حاصل کی۔ حضرت شیخ ابوجعفر محمد سے حسین بن منصور حلاج کی تصانیف پڑھیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ روحانی تجربات اور تزکیۂ نفس کی خاطر سیر و سیاحت میں گزارا۔ دوران سیاحت بغداد، طبرستان، خراسان، کرمان، ماوراءالنہر، شام، عراق اور ترکی تشریف لے گئے۔ دوران سیاحت آپ نے اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے فیض حاصل کیا۔ ایک روز حضرت داتا کے مرشد ابوالفضل غزنویؒ نے آپ کو حکم دیا کہ رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کرنے کی خاطر لاہور چلے جائیں۔ آپ نے تعمیل فرمائی اور اپنے دو پیر بھائیوں حضرت ابو سعیدؒ اور سید لطفیؒ کے ہمراہ لاہور شہر کے شمالی جانب دریائے راوی کے نزدیک شب بسری کے لئے ٹھہرے۔ اگلے روز شہر میں داخل ہوئے اور اس

طرف چل دیجیے جہاں آپ کا روضۂ مبارک ہے۔ داراشکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ آپ نے اپنی خانقاہ میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ بعض علمائے لاہور کو مسجد کی سمتِ کعبہ پر اعتراض ہوا۔ آپ نے ایک شام معترضین کو دعوت پر بلایا۔ نماز کی امامت کے فرائض انجام دینے کے بعد آپ نے اُن سے فرمایا کہ آپ کو اس مسجد کے سمتِ کعبہ پر اعتراض ہے ذرا نظر اٹھا کر دیکھیے کہ سامنے کعبہ نظر آ رہا ہے کہ نہیں۔ چنانچہ سب نے بچشم خود کعبہ کو سامنے پایا اور حضرت ہجویری کے کمالات کے قائل ہو گئے۔

کشف المحجوب میں آپ لکھتے ہیں کہ ایک بار میں عراق میں دنیا کو حاصل کرنے اور اسے لٹا دینے میں بُری طرح مشغول تھا اور بہت قرضدار ہو گیا تھا۔ جس کسی کو بھی کسی چیز کی آرزو ہوتی میری طرف رجوع کرتا اور میں اس فکر میں رہتا کہ سب کی آرزو کیسے پوری کروں اندریں حالات ایک شیخ نے مجھے لکھا کہ اے فرزند اگر ممکن ہو تو دوسروں کی حاجت ضرور پوری کرو مگر سب کے لیے اپنا دل پریشان بھی نہ کیا کرو۔ کیونکہ رب العالمین ہی حقیقی حاجت روا ہے اور اپنے بندوں کے لئے کافی ہے حضرت شیخ ابوالعباسؒ سے شرفِ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ وہ ضرب اللہ پڑھ رہے ہیں اور ان پر رقت طاری ہے پھر انھوں نے اس زور سے نعرہ لگایا جس سے مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ وہ وفات پا جائیں گے۔ میں نے پوچھا یا شیخ یہ کیا کیفیت ہے؟ شیخ نے فرمایا آج گیارہ سال ہو گئے ہیں اور اسی مقام پر ہوں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ کشف المحجوب سے ماخوذ ہے کہ آپ نے تین ماہ تک حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزار مبارک پر مراقبہ کیا۔

آپ نے کشف المحجوب، کشف الاسرار، منہاج الدین اور دیوان علی تصنیف فرمائے جن میں سے کشف المحجوب اور کشف الاسرار دستیاب ہیں۔

داراشکوہ

(۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء ـــــ ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء) شاہجہاں اور ممتاز محل کا سب سے بڑا بیٹا۔ ۱۶۳۳ء میں اس کی ولی عہدی کا اعلان ہوا۔ حصار کی سرکار تفویض ہوئی اور فیروزہ کی جاگیر بھی ملی جسے ولی عہد کا تعلقہ تصور کیا جاتا تھا۔ ۱۶۴۵ء میں اسے الٰہ آباد کی صوبیداری عطا ہوئی۔ ۱۶۴۷ء میں پنجاب کا ۱۶۴۹ء میں گجرات کا اور ۱۶۵۲ء میں ملتان اور بہار کا صوبیدار مقرر ہوا۔ صوبوں کی حکومت اس کے نائبوں کے سپرد تھی اور خود وہ دربار سے وابستہ تھا۔ ۱۶۴۸ء تک داراشکوہ کو "تیس ہزار" ذات" اور "دس ہزار سوار" کا منصب مل چکا تھا۔ یہ وہی بلند ترین منصب تھا جو تخت نشینی سے پہلے شاہجہاں کو ملا تھا۔ ایرانیوں نے ۱۶۴۹ء میں قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسے واپس لینے کی دو کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ ۱۶۵۳ء میں دارا نے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ قندھار فتح نہ ہو سکا اور دارا کو اس ناکامی سے بحیثیت ایک سیاسی اور فوجی رہنما کے نقصان پہنچا۔ ۱۶۵۷ء میں دارا کو ساٹھ ہزاری اور چالیس ہزاری کا اعلیٰ منصب عطا ہوا۔ اسی زمانے میں شاہجہاں بیمار ہوا۔ شہزادوں میں تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ آگرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ساموگڑھ میں ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء کو دارا اور اورنگ زیب میں فیصلہ کن جنگ ہوئی جو دارا کے لئے تخت و تاج سے محرومی کا پیغام لائی۔ ۲۳ مارچ ۱۶۵۹ء کو اجمیر کے قریب دیورائی کے مقام پر آخری مرتبہ دارا نے قسمت آزمائی کرنا چاہی لیکن یہاں بھی اسے شکست ہوئی۔ دارا نے شاہ عباس دوم سے ایران آنے کی اجازت مانگی۔ شاہ ایران نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ حکام اور والیوں کے نام فرمان جاری کیا کہ جہاں جہاں شہزادہ پہنچے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا جائے۔ دارا نے ایران جانے کے لیے قندھار کا رُخ کیا۔ راستے میں ڈھاڈر (سبی سے سترہ میل اور کوئٹہ سے ۸۵ میل) کے افغان سردار ملک جیون کے ہاں ٹھہرا۔ ملک جیون نے حکومتِ وقت سے وفاداری کرتے ہوئے دارا کو گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ دارا پر الحاد و بے دینی کے الزام میں مقدمہ چلا اور علماء کے فتوے سے اسے قتل کر دیا گیا۔ مقبرہ ہمایوں کے احاطے میں دفن ہوا۔ دارا ہندو فلسفے کے زیر اثر تھا۔ اس کے مسلمان صوفیا اور ہندو سنیاسیوں سے گہرے تعلقات تھے۔ دارا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف باہم مخالف نہیں۔ اس کے ذریعے حق کا ادراک کرنا چاہیئے۔ اپنشدوں کے ترجمے میں (جسے وہ وحدت کا سرچشمہ بیان کرتا ہے) دارا نے اسلام اور ہندو مت کے پیروؤں کے مشترک نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ہندو فلسفے اور سنسکرت ادبیات سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ متعدد ملحدانہ نظریات کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ ذیل کی تصانیف داراشکوہ کی یادگار ہیں۔ (۱) سفینۃ الاولیاء (۲) سکینۃ الاولیاء (۳) رسالہ حق نما (۴) حسنات العارفین اس میں مختلف سلسلوں کے اولیا کے اقوال درج ہیں (۵) مکالمۂ بابالال و داراشکوہ (۶) مجمع البحرین، ویدانت اور تصوف کی مصطلحات کا تقابلی مطالعہ (۷) سرِ اکبر پچاس اپنشدوں کا ترجمہ۔

دارالاسلام

اسلام کا گھر۔ فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام سے مراد [illegible] ریاست یا ملک ہے جس کا سربراہ مسلمان ہو [illegible] عمل ہو [illegible] نافذ ہوں [illegible] کی رعایا [illegible] مشتمل ہو۔ لوگ بت پرست اور مشرک [illegible] برضا و رغبت اسلامی ریاست کی تشکیل میں [illegible] کے لئے اپنے مسلمان ہم وطنوں کے ساتھ [illegible] کا عہد و پیمان کیا ہو تو شہریت میں ان کے حقوق [illegible] گے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو [illegible] غیر مسلم شوکت [illegible] سے متاثر ہو کر یہ مفتوح قوم کی حیثیت سے [illegible] تو انھیں ذمی کہا جائے گا [illegible] ذمیوں [illegible] اس کے کچھ فرق [illegible] کا فرض ہوتا [illegible] ذمیوں کا فرض ہوگا کہ وہ جزیہ [illegible] شہری حقوق میں ذمیوں کے ساتھ [illegible]

دارالاسلام کے [illegible]

یا بغاوت [illegible] دعوت [illegible] قتال واجب ہے [illegible] ہے۔ دارالاسلام [illegible] کام انجام دے۔ اگر مسلمانوں پر ظلم ہو [illegible] تو امام وقت (سربراہ ریاست) [illegible] کا حکم ہے اگر صلح پر آمادہ نہ ہوں تو سرکوبی کرنا ضروری ہے [illegible] دارالاسلام کو کوئی خطرہ ہو تو اس وقت بھی جہاد [illegible] حکومت کو بحال کرتے ہوئے فرائض اسلام یا بیت المال کے واجبات [illegible] سے انکار کرے۔

دار الحدیث

حدیث شریف پڑھانے کے مخصوص ادارے۔ جب تک حدیث کی تعلیم کیلئے مخصوص ادارے وجود میں نہ آئے تھے، حدیث کی تعلیم مسجدوں میں ہوا کرتی تھی۔ امام مالکؒ مسجد نبوی میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بصرہ آئے اور ایک مسجد میں درس حدیث دینا شروع کیا۔ قاہرہ میں امام شافعی کا ایک شاگرد تیسری صدی ہجری میں مسجد ابن طولون میں حدیث کا درس دیا کرتا تھا۔ جب مخصوص اداروں کی بنیاد پڑ گئی تو لوگ مسجدوں اور استادوں کے ذاتی مکانات کی بجائے دار الحدیث کی طرف کھنچنے لگے۔ پہلا ادارہ جو خاص طور پر دار الحدیث کہلایا اس کی بنیاد اتابک نور الدین (وفات ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء) نے رکھی وہ تو حنفی تھا لیکن اس نے اس مدرسے کو شافعیوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ مورخ و محدث عبداللہ بن عساکر (وفات ۵۷۱ھ/۱۱۷۶ء) دار الحدیث کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دار الحدیث کے کھل جانے سے اسی قسم کے متعدد ادارے قائم ہوئے جن کے ساتھ مشہور مورخین اور محدثین وابستہ تھے۔ پہلے پہل یہ زیادہ تر دمشق اور اس کے نواح میں کھلے اور پھر جلد تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئے۔

دار الحرب

فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں دشمنان اسلام کا وہ علاقہ یا ملک جس کے باشندے دعوت اسلام کو مسترد کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرکشی اور عداوت کا اظہار کریں اور جہاں مسلمانوں اور ذمیوں کی عبادت گاہیں محفوظ نہ ہوں دار الاسلام کا کوئی علاقہ کفار کے قبضے میں چلا جائے تو وہ بھی دار الحرب بن جاتا ہے بشرطیکہ وہاں اسلامی شریعت کے بجائے کفار کے قوانین نافذ ہو جائیں۔ بعض علمائے اسلام کی عملداری سے نکل جانے والے علاقے کو اس وقت تک دار الحرب کہنے میں احتیاط برتتے ہیں جب تک اس میں اسلام کا ایک حکم بھی نافذ رہے۔ شرک وعناد کی سرزمین دار الحرب قرار پاتی ہے۔ کفار کی سرزمین اس وقت تک دار الحرب نہیں بنتی جب تک لوگ دعوتِ اسلام کو مسترد کر کے دار الاسلام کے خلاف برسرپیکار نہ ہوں۔ امام ابن قیم نے لکھا ہے کہ دار الحرب پر بلاوجہ حملہ جائز نہیں۔ پہلے دعوت اسلام واجب ہے اور مسترد ہو جانے پر جہاد فرض ہوگا۔ اگر دار الحرب دار الاسلام پر حملہ آور ہو تو اس وقت دعوت اسلام کی شرط کے بغیر جہاد فرض ہوگا۔ بلاد اہل حرب پر اگر لشکر اسلام بزور شمشیر قبضہ کرلے تو ان پر جزیہ عاید کیا جائے گا۔ ذمیوں میں سے کوئی شخص بھاگ کر دار الحرب چلا جائے تو وہ حربی قرار پائے گا اور گرفتاری کی صورت میں اسے قتل یا غلامی کی سزا دی جاسکے گی۔ اگر دار الحرب کا کوئی باشندہ مسلمان ہو جائے تو دار الحرب کے فتح ہونے پر اس کی جائداد و مال غنیمت میں شامل نہیں ہوگی۔ دار الحرب کے کسی باشندے کو عموماً تین ماہ سے زائد دار الاسلام میں قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی اگر وہ اس سے زائد عرصہ دار الاسلام میں قیام کرنا چاہے تو ذمّی کی حیثیت سے رہے گا اور جزیہ ادا کرے گا۔ دار الحرب کے خلاف میدانِ قتال میں مسلمان پر شرعی حد قائم نہیں کی جاسکتی۔

دار الصلح

فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں وہ علاقہ یا ملک جس کے باشندے دار الاسلام کے امام (سربراہ ریاست) یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر صلح کرلیں۔ جب تک دار الصلح کے باشندے مقررہ شرائط کی پابندی کرتے رہیں ان سے کسی قسم کا تعرض جائز نہیں۔ اگر وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کریں یا دار الاسلام کے خلاف دار الحرب سے تعاون کریں تو اس صورت میں وہ ملک دار الصلح نہیں رہے گا بلکہ دار الحرب بن جائے گا اور اس کے ساتھ ہی معاہدہ صلح ختم ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ اور بعد کے حنفی فقہا دار الاسلام اور دار الحرب کے درمیان دار الصلح کو مستقل طور پر تسلیم نہیں کرتے لیکن امام شافعیؒ اسے تسلیم کرتے ہیں۔

دار قطنی

(۳۰۶ھ/۹۱۸ء — ۸ ذیقعدہ ۳۸۵ھ/۴ دسمبر ۹۹۵ء) ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی، ایک نامور محدث جنہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کا لقب دیا گیا۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ مشاہیر محدثین سے تعلیم حدیث کی تحصیل کے لئے بصرہ، کوفہ، واسط، مصر اور شام کا سفر کیا۔ دار قطنی نے ادبیات کا بھی مطالعہ کیا۔ دیوان حمیری انھیں ازبر تھا اسی وجہ سے ان پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ وہ شیعیت کی طرف مائل تھے۔ دار قطنی نے احادیث کے تنقیدی مطالعے کو آگے بڑھانے میں بہت حصہ لیا۔ ان کی بیشتر تصانیف علم الحدیث سے متعلق ہیں: (۱) السنن اس کتاب میں مختلف اسناد اور اختلاف روایات کے ساتھ احادیث ابواب کی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں اور دوسری صحاح یا "جوامع" کے خلاف اس میں فقط وہ حدیثیں دی گئی ہیں جن کا تعلق فقہ سے ہے۔ (۲) کتاب علل الحدیث (۳) الالزامات علی الصحیحین: قابل وثوق احادیث کا مجموعہ جو بخاری و مسلم کے شروط کے مطابق ہیں لیکن ان کتابوں میں درج نہیں۔ (۴) الاستدراکات والتتبع، بخاری اور مسلم کی ایسی دو سو حدیثوں کی فہرست جو دار قطنی کے نزدیک ضعیف ہیں۔ (۵) کتاب الاربعین (۶) کتاب الافراد (۷) کتاب الامالی (۸) کتاب المستجاد (۹) کتاب التردید یا۔ (۱۰) کتاب التصحیف، اغلاط کتب حدیث پر (۱۱) کتاب المدبج، ان احادیث پر جو ہمعصر محدثوں نے ایک دوسرے سے لیں (۱۲) غریب الحدیث (۱۳) کتاب المختلف والموتلف فی اسماء الرجال (۱۴) کتاب الضعفاء (۱۵) کتاب القراءات اس میں قراءت قرآن کے اصول بیان کئے گئے ہیں (۱۶) کتاب الاسخیاء والاجواد۔ ایک ادبی کتاب

دارمی

(۱۸۱ھ/۷۹۷ء — ۲۵۵ھ/۸۶۹ء) ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد تمیمی سمرقندی، ایک نامور محدث۔ انھوں نے احادیث کی تلاش میں عراق، شام اور مصر کے مستند علما سے ملاقاتیں کیں۔ مسلم بن حجاج اور ابوعیسیٰ ترمذی نے دارمی کی سند پر احادیث روایت کیں۔ وہ علم حدیث، ثقاہت، صداقت اور اصابت رائے کی وجہ سے مشہور تھے۔ دارمی کا مجموعہ احادیث "المسند" یا "سنن الدارمی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تالیف کو صحاح ستہ کے برابر مقام نہیں دیا گیا۔ ابن حجر عسقلانی اسے ابن ماجہ کی سنن سے افضل قرار دیتے ہیں۔ دارمی کو تفسیر قرآن لکھنے کا امتیاز بھی حاصل ہوا۔

دانی، ابوعمرو عثمان

(۳۷۱ھ/۹۸۲ء — ۴۴۴ھ/۱۰۵۳ء) بن سعید بن عمر الاموی مالکی

فقیہ اور قاری قرآن - قاطبہ میں پیدا ہوئے - ۳۹۷ھ سے ۳۹۹ھ تک کا زمانہ قاہرہ میں گزارا اس کے بعد قرطبہ المریہ اور بعد میں دانیہ گئے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی - ان کی ۱۲۰ تصانیف میں سے صرف دس دستیاب ہیں - ان میں دو مسائل نحویہ سے بحث کرتی ہیں اور باقی قرارت کے فن سے تعلق رکھتی ہیں - زیادہ مشہور تصانیف یہ ہیں (۱) کتاب المقنع فی معرفۃ رسم مصاحف الامصار (۲) التیسیر فی القرارات السبع' ابن خلدون کے بیان کے مطابق اس کتاب کا کثرت سے مطالعہ کیا جاتا تھا - (۳) المحکم فی نقط المصاحف -

دانیالؑ

اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت دانیالؑ انکے چار اکابر انبیاء میں شمار ہوتے ہیں - صحیفہ دانیال' عہد نامہ قدیم' کے بعد صحیفوں میں شامل ہے - قرآن و حدیث میں کہیں ان کا بالصراحت ذکر نہیں آیا - بقول بلاذری (فتوح البلدان) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو فتح سوس کے بعد قلعے سے دانیال نبی کی نعش ملی - انھوں نے حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے حکم سے دریا کا پانی بند کر کے وسط دریا میں سے کفن میں دفن کر دیا اور پھر پانی جاری کر دیا - بلاذری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بخت نصر حضرت دانیالؑ کو قید کر کے بابل لے آیا تھا اور وہ وہیں فوت ہوئے - اہل سوس کے ہاں قحط پڑا تو انھوں نے اہل بابل سے حضرت دانیالؑ کی نعش عاریتاً مانگ لی تاکہ ان کے ذریعے بارش حاصل کر سکیں - اس طرح ان کی نعش سوس والوں کے پاس پہنچ گئی -

دانیال مرزا، سلطان

(۲۲ ستمبر ۱۵۷۲ء — ۲۸ اپریل ۱۶۰۵ء) مغل شہزادہ' شہنشاہ اکبر کا تیسرا بیٹا - شہزادہ سلطان مراد کی وفات کے بعد ۱۵۹۹ء میں دکن کا فوجی صوبیدار مقرر کیا گیا - ۱۶۰۰ء میں اس نے احمد نگر فتح کیا - فتح کی خوشی میں اکبر نے اسے خاندیش کا صوبہ عطا کیا - ابو الفضل نے آئین اکبری میں اسے ہفت ہزاری دکھایا ہے - دانیال نے کثرت شراب نوشی کے باعث برہان پور میں وفات پائی -

داؤدؑ

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر' جو بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے - آپ کا سلسلہ نسب گیارہ پشتوں سے حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے - آپ کا ذکر قرآن مجید کی نو سورتوں میں سولہ مقامات پر آیا ہے - اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو ان کا مطیع بنا دیا تھا جو تسبیح شام ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے تھے (سبا: ۱۰' ص: ۱۷ — ۱۹) - اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولیوں کی تعلیم اور فہم عطا کیا (النمل: ۱۷) - اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے لیے موم کی طرح نرم کر دیا تھا اور وہ اسے جس طرح چاہتے موڑ لیتے تھے (سبا: ۱۰) - اللہ تعالیٰ نے انہیں زرہ سازی کا فن عطا کیا جس سے وہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے (الانبیاء: ۸۰' سبا: ۱۰) ہم نے انھیں ایسا لباس تیار کرنے کا فن سکھایا جو تمہیں شدت جنگ کے وقت محفوظ رکھتا ہے (الانبیاء: ۸۰' الکشاف ۱۲۸) - ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور انھیں خلافت ارضی عطا کر کے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا (ص: ۲۵) - خدا نے انھیں منصب نبوت' خطابت کی وضاحت اور صحیح فیصلے کی قوت بخشی تھی (ص: ۱۹) اللہ تعالیٰ نے "زبور" حضرت داؤدؑ پر نازل فرمائی تھی (النساء: ۱۶۳' بنی اسرائیل ۵۵) - زہد و عبادت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں انہماک بخشا تھا - چنانچہ وہ نصف شب تک آرام کرتے اور تہائی شب عبادت میں گزارتے ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے تھے -

قرآن مجید میں حضرت داؤدؑ کی زندگی کا ایک واقعہ یوں مذکور ہے کہ ایک روز حضرت داؤدؑ فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں تشریف فرما تھے آپؑ کے فرزند حضرت سلیمانؑ بھی آپؑ کے پاس موجود تھے - مقدمہ درپیش تھا کہ کسی ریوڑ والے کی بھیڑوں نے رات کو کسی کی پکی ہوئی فصل کھالی - حضرت داؤدؑ نے فیصلہ دیا کہ کھیت والے کو بھیڑیں بطور تاوان دے دی جائیں - گیارہ سالہ حضرت سلیمانؑ نے مشورہ دیا کہ فیصلے میں دونوں فریقوں کا خیال رکھئے - حضرت داؤد نے فرمایا تم فیصلہ دو - حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ بھیڑیں کھیت والے کو دے دی جائیں وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بھیڑوں والے کو دیا جائے جو اس پر محنت کرے اس حالت پر لے آئے جو کھیت برباد ہونے کے وقت تھی - حضرت داؤد نے اس فیصلے سے اتفاق فرمایا -

داؤد بن علی

(۸۱۸ء ؟ — ۸۸۴ء) بن خلف اصفہانی فرقہ ظاہریہ [illegible] کے امام فقہ - ان کا مسلک یہ تھا کہ قرآن حکیم اور حدیث کے [illegible] لغوی معنی لینے چاہییں - داؤد نے اجماع کے تصور کو بھی [illegible] دیا - صرف ایک امام کی تقلید کو رد کر دیا - آپ کوفے میں پیدا [illegible] بغداد اور نیشاپور کے مشہور اساتذہ سے حدیث پڑھی [illegible] میں سکونت اختیار کر لی - بغداد میں مفتی اور معلم کی حیثیت سے [illegible] کی جانے لگی - آپ کے والد حنفی تھے لیکن داؤد کو امام شافعی [illegible] بیان کیا جاتا ہے

داؤد پاشا

ترکی کی تاریخ میں اس نام کی تین نامور شخصیتیں [illegible] مملوک حکمران اور دو عثمانی وزرائے اعظم تھے -

(۱) ترکی کا آخری مملوک حکمران ۱۷۶۷ء — ۱۸۵۱ء [illegible] نے ۱۸۱۷ء سے ۱۸۳۱ء تک حکومت کی - اس نے منصوبہ [illegible] کی - فتنہ پرور یزیدیوں کی گوشمالی کی - ۱۸۲۲ء میں [illegible] کی تجارت میں یورپ کے [illegible] کا زوال حکام استنبول کی حکم عدولی کی بنا پر ہوا - ۱۸۵۱ء میں [illegible] مدینہ منورہ میں روضۃ المبارک کا محافظ مقرر کیا گیا -

(۲) عثمانی وزیر اعظم (وفات ۹۰۴ھ ۱۴۹۸ء) بایزید دوم کی تخت نشینی کے بعد وزیر مقرر ہوا - ۱۴۸۳ء میں صدر اعظم [illegible] پندرہ برس تک اس عہدے پر فائز رہا - ۱۴۸۷ء میں [illegible] فوجی کارروائیوں میں ادانہ اور ترسوس [illegible] ۱۴۹۲ء میں [illegible] کو شکست دی - ۸ مارچ ۱۴۹۷ء کو اسے برطرف کر دیا گیا - [illegible] کہ محمد دوم کے پوتے آق قویونلو کو وہ احمد سے کہتے تیریزی کی طرف [illegible]

غصلت پر محمول کیا گیا۔ وہ ایک قابل، راست باز، مدبر اور علم کا مربی تھا۔ وہ اپنے وقت کے متموّل ترین مدبّروں میں سے تھا۔

(۳) عثمانی وزیرِ اعظم (وفات ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء)۔ اس کی شادی سلطان مصطفیٰ کی سگی بہن سے ہوئی۔ مصطفیٰ اول کی والدہ کی کوششوں سے ۲۰۔ مئی ۱۶۲۲ء کو وزیرِ اعظم مقرر ہوا۔ اس نے معزول شدہ سلطان عثمانی دوم کو فوراً قتل کر دیا۔ ۱۳۔ جون ۱۶۲۲ء کو داؤد پاشا کو وزارت سے برطرف کر دیا گیا۔ باب عالی میں سیاسی دھڑوں کی مناقشت کی وجہ سے داؤد پاشا کو موت کی سزا دی گئی۔ وہ استنبول کی مسجد مراد پاشا میں دفن ہوا۔

داؤد پوترے

ریاست بہاولپور کا حکمران خانوادہ۔ داؤد پوترے اور کلہوڑے دونوں اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ابوالفضل العباس بن عبدالمطلب کی نسل سے ہیں۔ کلہوڑوں اور داؤد پوتروں کا مشترک جدِ امجد محمد چنّے خاں خیال کیا جاتا ہے۔ چنّے کے بعد اس کے بیٹے محمد مہدی اور داؤد خاں قبیلے کے سردار بنے۔ محمد مہدی کی اولاد اس کے بیٹے ابراہیم عرف کلہوڑے خاں کے نام پر کلہوڑا کہلانے لگی۔ داؤد خاں کے بعد محمود خاں اور پوتا محمد خاں سردار بنے۔ محمد خاں کے بیٹے داؤد خاں ثانی کی سرداری کے زمانے میں ان کی اولاد اور متعلقین داؤد پوترے کہلانے لگے۔ داؤد خاں ثانی کے جانشین آٹھ سردار ہوئے جن میں سے بہادر خاں ثانی قابلِ ذکر ہے۔ اس نے ۱۷۰۶ء میں شکارپور شہر کی بنیاد رکھی۔ داؤد پوتروں کا سردار مبارک خاں اول ۱۷۲۳ء میں اپنے بیٹے صادق محمد خاں عباسی اول کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔ ۱۷۲۶ء میں مبارک خاں اول کا انتقال ہوا۔ [illegible] اور قلعہ ڈیراور کا الحاق کیا۔ [illegible] جب نادر شاہ [illegible] نے ہندوستان پر حملہ کیا تو صادق محمد خاں اول [illegible] خاں جا کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور نواب کا خطاب حاصل کیا۔ [illegible] سیوستان اور لاڑکانہ تک پرگنے عطا کیے گئے۔ [illegible] سردار خدا یار خاں نے شکارپور پر حملہ کیا۔ صادق محمد خاں جنگ میں مارا گیا۔ محمد بہاول خاں اول اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۱۷۴۸ء میں بہاولپور [illegible] کی بنیاد رکھی۔ بالآخر اسی نام سے پوری ریاست موسوم ہوئی۔ [illegible] میں بہاول خاں اول کی وفات پر محمد مبارک خاں ثانی تخت نشین ہوا۔ ۱۷۵۵ء میں درانی افواج نے اُچ اور بہاولپور پر حملہ کیا جس میں [illegible]۔ ۱۷۶۱ء میں سندھ کے حکمران شاہ کلہوڑا نے بہاولپور پر حملہ کر دیا۔ غلام شاہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے باغی بھائی عطر خاں کو اس کے حوالے کر دیا۔ ۱۷۷۲ء میں محمد مبارک خاں ثانی کے انتقال پر اس کا بھتیجا محمد جعفر خاں اس کا جانشین ہوا اور بہاول خاں ثانی کا لقب اختیار کیا۔ ۱۷۷۷ء میں ملتان سکھوں نے چھین لیا۔ ۱۷۸۰ء میں بہاول خاں ثانی کو شہنشاہ دہلی شاہ عالم ثانی نے رکن الدولہ نصرت جنگ اور حافظ الملک کے خطابات عطا کیے۔ ۱۷۸۶ء میں تیمور شاہ درانی نے شہر بہاولپور پر قبضہ کر کے اسے جلا دیا۔ درانی والیِ ریاست کے بیٹے شہزادہ مبارک خاں عباسی کو یرغمال کے طور پر ساتھ لے گیا۔ بعد میں بہاول خاں ثانی کو عملاً معزول کر کے مبارک خاں کو حکمران بنا دیا۔ ۱۷۸۸ء تک بہاول خاں درانیوں کا صفایا کرنے میں مصروف رہا۔ ۱۸۰۵ء میں بہاول کی وفات پر اس کا بیٹا عبداللہ خاں جانشین ہوا اور صادق محمد خاں ثانی کا لقب اختیار کیا۔ اسی کا عہدِ حکومت ایران سندھ کے حملوں کو پسپا کرنے اور اپنے امراء کی بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا۔ ۱۸۲۵ء میں اس کی وفات کے بعد رحیم یار خاں ملقب بہ محمد بہاول خاں ثالث جانشین ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ اور ملتان ہمیشہ کے لیے بہاولپور کے تسلط سے نکل گئے۔ یہ علاقے فرانسیسی جرنیل وانتورا نے ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ کے لیے فتح کیے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ریاست بہاولپور نے برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لیا۔ ۱۸۵۲ء میں محمد بہاول خاں ثالث کی وفات کے بعد صادق محمد خاں ثالث جانشین ہوا۔ اس کے بڑے بھائی شہزادہ حاجی خاں نے اسے معزول کر کے قلعہ دراوڑ میں قید کر دیا۔ بعد میں ایک قلیل رقم بطور وظیفہ مقرر کر کے لاہور جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۸۵۳ء میں حاجی خاں، فتح خاں کے لقب سے جانشین ہوا۔ داؤد پوترے اس کے خلاف مسلسل ناکام سازشوں میں مصروف رہے۔ ۱۸۵۸ء میں اس کے انتقال کے بعد محمد بہاول خاں چہارم اس کا جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی اندرونی خلفشار جاری رہا۔ ۱۸۶۶ء میں اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر اس کا نابالغ بیٹا صادق محمد خاں چہارم تخت نشین ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں وہ بالغ ہوا تو برطانوی ہند کی حکومت نے اسے حکمرانی کے باضابطہ اختیارات تفویض کر دیئے۔ اس نے متعدد خوبصورت محل تعمیر کرائے جن میں صادق گڑھ محل اور نور محل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۸۹۹ء میں مبارک خاں، محمد بہاول خاں پنجم کے لقب سے جانشین ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ وہ حج کے بعد واپس آ رہا تھا کہ عدن میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تین سالہ چھوٹا بھائی صادق محمد خاں پنجم تخت نشین ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں بہاولپور پاکستان میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ریاست بہاولپور وحدتِ مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی۔

موجودہ امیر محمد عباس عباسی ہیں جو ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۷ء صوبہ پنجاب کے گورنر رہ چکے ہیں وزیرِ حج بھی رہ چکے ہیں۔

داؤد خان کررانی

(وفات ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء) بنگال کا مطلق العنان حکمران۔ ۱۵۷۲ء میں افغان امراء نے اسے تخت پر بٹھایا۔ ۱۵۷۴ء میں داؤد نے شہنشاہ اکبر سے سرتابی کر کے غازی پور کی شاہی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ منعم خاں کو اس کے مقابلے پر بھیجا گیا۔ جس نے دارالحکومت ٹانڈا پر قبضہ کر کے داؤد کو اڑیسہ میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ داؤد نے جوابی حملہ کیا۔ بالآخر صلح کر کے اکبر کو خراج ادا کرنے پر راضی ہوا۔ اڑیسہ کا صوبہ داؤد خاں کے پاس رہنے دیا گیا۔ ۱۵۷۵ء میں منعم خاں فرمانروائے بنگال کا انتقال ہوا تو داؤد خاں نے پھر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۷۶ء میں خان جہاں اور ٹوڈرمل نے مغلوں کی طرف سے دوبارہ حملہ کیا۔ نتیجتاً داؤد خاں مارا گیا اور بنگال پر مغلوں نے قبضہ کر لیا۔

داؤد طائی

(وفات ۱۶۲ھ) امام الفقہ، امام اعظمؒ کے شاگرد۔ آپ کا شمار حضرت حبیب عجمی کے جلیل القدر خلفا میں ہوتا ہے۔ علوم ظاہری و باطنی میں باکمال تھے۔ حضرت کرخیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوسلیمان داؤد بن نصر طائی سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کا انتقال بغداد میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

داؤد قادری، شیخ

(وفات ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) صوفی اور عالم دین۔ آپ کی نسبت ستائیس واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک پہنچتی ہے۔ آپ کے بزرگ عرب سے ملتان آئے تھے آپ کے والد سید فتح اللہ ملتان کے قریب بیت پور میں مقیم تھے وہاں سے چونی وال میں منتقل ہوئے۔ شیخ داؤد نے ابتدائی تعلیم اسی قصبے میں حاصل کی۔ لاہور میں مولانا جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اس کے بعد آپ نے سلسلہ قادریہ میں شیخ عبدالقادر ثانی اوچی کے پوتے سید حامد گنج بخش قادری اوچی سے بیعت کی بیعت کے بعد آپ نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ چند برس صحراؤں اور ویرانوں میں بھی گزارے۔ ان مجاہدات کے بعد نسبت اویسی آپ نے حضرت غوث الاعظم سے حاصل کی۔ مجاہدات کی تکمیل کے بعد آپ نے مستقل طور پر شیر گڑھ ضلع ساہیوال میں اقامت اختیار کی۔ آپ قرآن و حدیث کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ آپ کی روحانیت اور تقدس کی شہرت اطراف میں پھیل چکی تھی۔ آپ کے خلفا میں مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ دہلوی شاہ ابوالمعالی لاہوری اور شاہ ابو اسحاق قادری لاہوری مشہور ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی (مؤلف منتخب التواریخ) لکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جس میں سو سو پچاس پچاس غیر مسلم بمعہ اہل و عیال آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔

داہومی

جنوبی افریقہ میں واقع چند قدیم ترین تہذیبوں والے ممالک میں سے ایک۔ یکم اگست ۱۹۶۰ء کو فرانس سے آزادی حاصل کی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو اقوام متحدہ کا رکن بنا۔ داہومی کی آبادی (۱۹۶۵ء) چوبیس لاکھ ہے جس میں سے تین لاکھ مسلمان ہیں۔ کوٹونو یہاں کا سب سے بڑا شہر، بندرگاہ اور تجارتی مرکز ہے۔ کوٹونو کی آبادی ایک لاکھ گیارہ ہزار ہے۔ دوسرے بڑے شہر اور دارالحکومت پورٹو نوو کی آبادی ستر ہزار ہے۔ داہومی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ زیادہ تر آبادی زراعت پیشہ ہے۔ ارواح پرستی (Animism) داہومی کا سرکاری مذہب ہے مسلمانوں کے نفوذ کا آغاز شمال مشرق سے ہوا۔ تیرھویں صدی میں مالی سلطنت کی ایک چھوٹی سی تجارتی نوآبادی قائم کی گئی۔ جلد ہی چھوٹی چھوٹی مسلم نوآبادیاں قائم ہو گئیں اور اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنیں۔ سترھویں صدی میں مراکش نے سونگھائی فتح کیا تو وہاں کے مسلمان داہومی کے شمالی حصے میں جا کر آباد ہو گئے۔ اٹھارہویں صدی میں مسلمان فلانی چرواہوں نے شمالی علاقوں میں اسلامی مرکز قائم کر لیا۔ بیسویں صدی کے آخری برسوں میں اسلام نے جنوب مشرق کے لوگوں کو متاثر کیا۔ کچھ مسلمان تاجر دارالحکومت پورٹو نوو میں آباد ہو گئے۔ ان کی تعداد بسرعت بڑھتی گئی۔ ان تاجروں نے داہومی کے یوروبہ خاندان کو مشرف بہ اسلام کیا۔ پورٹو نوو اور پراکو اسلام کے بڑے مرکز بن گئے۔ آج کل داہومی کو باقاعدہ ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت حاصل ہے اور سول برادری کا ایک فرد ہے۔

دبیر، مرزا سلامت علی

(۲۹ اگست ۱۸۰۳ء — ۸ مارچ ۱۸۷۵ء) مرثیہ گو اردو شاعر۔ دبیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کے ساتھ لکھنؤ آئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ شعر کہنے کا آغاز ابتدائی عمر میں کیا۔ کم و بیش ساٹھ برس مرثیہ گوئی کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں سیتاپور منتقل ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء میں کانپور اور ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد گئے۔ انجام کار لکھنؤ واپس چلے آئے اور یہیں انتقال ہوا۔ اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

دبیر ایک پرہیزگار، متقی کریم النفس مہمان نواز اور سنجیدہ و متین بزرگ تھے۔ اچھے اشعار بڑی تیزی سے کہہ لیتے تھے۔ ان کا بیشتر کلام مراثی سلام اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ عربی و فارسی کے عالم ہونے کی وجہ سے دبیر نے ان زبانوں کے ادب سے خوب فائدہ اٹھایا۔ شاعری کے میدان میں ان کے ہم عصر حریف میر انیس تھے۔ لکھنؤ میں انیس کا نام چمکنے سے بہت عرصہ پیشتر دبیر شہرت کے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔

دجّال

اسلامی اصطلاح میں دجّال سے مراد جھوٹا مسیح ہے اور اس کا دجل اس کی جعلسازی اور کذب و فریب ہے (لسان العرب) دجّال وہ ہے جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا اور الوہیت کا دعویٰ کرے گا (ابن الاثیر) دجّال کا خروج و ظہور علامات قیامت میں سے ہے (بخاری و مسلم) دجّال کا ظہور اوّلاً عراق و شام کے درمیان ہوگا وہ نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ پھر وہ اصفہان کی طرف جائے گا۔ جہاں وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور ستر ہزار یہودی اس کی پیروی کریں گے (شاہ رفیع الدین، صحیح مسلم) اس کے ظہور سے پہلے بڑی قحط سالی ہوگی اور لوگوں کو سختی کا سامنا ہوگا (مسند احمد) دجّال کی شکل و صورت بھی احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ وہ کانا ہوگا۔ اس کی آنکھ ایسی ہوگی جیسے انگور کے خوشے کی پھولی ہوئی معلوم ہوگی۔ اس کے بال حبشیوں کی طرح گھنگریالے ہوں گے۔ چوڑا چکلا ہوگا۔ اس کی پیشانی پر کافر لکھا ہوگا اور اس کا رنگ سرخی مائل ہوگا [illegible] (بخاری، صحیح مسلم، ابو داؤد)

دجّال کے پاس ایک باغ ہوگا جسے وہ جنت کہے گا [illegible] دیا جائے گا اور اس کے ہاتھ میں خرق عادات ظاہر ہوں گی جیسے [illegible] درختوں کا پھل لگانا۔ شیاطین کو لوگوں کے مردہ ماں باپ کی شکل [illegible] کمال اور بڑی تیزی سے ادھر سے ادھر جانا جس طرح [illegible] مسلم، شاہ رفیع الدین) وہ تمام دنیا فتح کرے گا مگر مکہ و مدینہ [illegible] کی فتنہ پردازی کی مدت چالیس دن، چالیس [illegible] چالیس سال ہوگی [illegible] ماجہ، شاہ رفیع الدین) اس کے بعد حضرت عیسیٰ دمشق کی جامع مسجد [illegible] پر نازل ہوں گے اور لُد (بیت المقدس کے قریب) کے مقام پر دجال [illegible]

دحلان

(وفات ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) سید احمد بن زینی [illegible] اور مؤرخ۔ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ [illegible] علماء کے صدر رہے۔ جب [illegible] سے مخالفت کے باعث مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے [illegible] بھی ان کی تقلید کی۔ زندگی کے آخری برسوں میں دحلان [illegible] میں مصروف رہے۔ انھوں نے [illegible] روایتی اسلامی علوم [illegible] بنایا بلکہ مکہ میں تاریخ نویسی کے واحد نمائندہ بن گئے۔ [illegible] النبویہ اور السیرۃ الزینیہ آپ کی مقبول عام تصانیف ہیں۔ [illegible] تصانیف میں الفتوحات الاسلامیہ اور خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام

(تاریخ مکہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دحیہ رضؓ

بن خلیفہ بن فروہ کلبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صحابی اور مالدار تاجر۔ مدینہ منورہ میں آپ کے حُسن کے بڑے چرچے تھے۔ حضرت جبریلؑ ان کی صورت اختیار کرکے نبی کریم صلعم کے پاس آیا کرتے تھے۔ غزوۂ یرموک میں ایک دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ ۵ ھ میں رسولؐ اللہ کا مکتوب شاہ روم ہرقل کو پہنچانے کا کام انھی کے سپرد کیا گیا تھا۔ حضرت دحیہؓ نے جب یہ خط ہرقل کو پہنچایا تو اس نے حسب دستور پادری کو طلب کرکے اسے خط سنایا۔ پادری خط سن کر کہنے لگا کہ بخدا یہ اللہ کا وہی رسولؐ ہے جس کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ نے پیش گوئی کی تھی۔ شاہ روم نے آپؐ کی رسالت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ مکتوب نبوی بعض دوسرے خطوں کے ساتھ اب تک موجود ہے اور اس کی نقول بصورت فوٹو دستیاب ہیں۔

درجینی

ابو العباس احمد بن سعید بن سلیمان بن علی بن ایخلف، اباضی فقیہ، شاعر اور مؤرخ۔ ان کا تعلق علمار کے بربر اباضی خاندان سے تھا۔ ان کے جد ایخلف اور دادا سلیمان دونوں مشہور فقیہہ تھے۔ ان کے والد سعید بن سلیمان ممتاز محدث تھے۔ درجینی نے اباضی علمار کی درخواست پر اباضیوں کے متعلق تاریخی اور سوانحی کتاب "طبقات المشائخ" تحریر کی۔ بحیثیت ایک فقیہہ انھوں نے تقسیم وراثت کے متعدد مسائل کا تصفیہ کیا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں مرتب ہوئے۔ بحیثیت شاعر ان کا ایک "دیوان" اور منظوم خطوط یادگار ہیں۔

درد، خواجہ میر

(۱۱۳۳ھ — ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ / ۳ جنوری ۱۷۸۵ء) سید خواجہ میر بن خواجہ محمد ناصر عندلیب، اردو کے مشہور صوفی شاعر۔ ۲۸ برس کی عمر میں درد نے لباس فقر پہن لیا۔ والد کی وفات کے بعد مسند نشیں ہوئے۔ سلطنت دہلی کی تباہی کے زمانے میں دہلی میں موجود رہے۔ درد تفسیر، حدیث، تصوف اور دوسرے علوم رسمی کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ہر ماہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی جس میں علمار، مشائخ اور امرا شرکت کرتے۔ تصانیف میں اردو اور فارسی دواوین کے علاوہ تصوف کی یہ کتب شامل ہیں (۱) اسرار الصلوٰۃ (۲) واردات، اس میں ایک سو گیارہ عنوانوں میں تصوف کے رموز و معاملات بیان ہوئے ہیں۔ آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ "درد کی شاعری کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ تصوف جیسا انھوں نے لکھا، اردو میں آج تک کسی سے نہ ہوا"۔ درد کا دیوان اعلیٰ واردات قلب اور روحانی ارتقا کا ایک سچا تجربہ ہے۔ ان کی غزل میں صوفیانہ خیالات کے علاوہ مجازی عشق کے مضامین بھی موجود ہیں مگر درد نے پیرایۂ بیان ایسا رکھا ہے کہ اکثر غزلوں میں مجاز اور حقیقت دونوں طرح کے مفہوم شعر میں قائم رہتے ہیں۔ درد کی فارسی شاعری اردو شاعری سے کم تر ہے البتہ فارسی میں ان کی رباعیات پُرتاثیر ہیں۔

درزی

(وفات ۴۱۰ھ / ۱۰۲۰ء) ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل۔ اسمٰعیلی داعی، فرقہ دُرُوز کے بانیوں میں سے ایک۔ وہ خلیفہ الحاکم کا بہت ہی منظور نظر تھا۔ اس نے الحاکم کی الوہیت کا اعلان کیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ کی روح، جو حضرت آدمؑ میں حلول کر گئی تھی، حضرت علیؓ میں اور پھر الحاکم میں منتقل ہوتی ہے۔ اس نے قاہرہ کی جامع مسجد میں الحاکم کی الوہیت پر ایمان لانے کا علی الاعلان مطالبہ کیا۔ اس سے متعدد بلوے ہوئے جو بالآخر درزی کی موت کا باعث بنے۔

درود

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو لوگ ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو" (احزاب: ۵۶)۔ یہ حکم نازل ہوا تو متعدد صحابہ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ آپؐ پر درود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے افراد کو مختلف اوقات میں درود سکھائے۔ چند درود حسب ذیل ہیں:-

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلّیت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم انّک حمیدٌ مجید وبارک علیٰ محمّد وعلیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم انک حمید مجید۔

یہ درود کعب بن عجرہؓ سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام احمد، ابن ابی شیبہ، عبد الرزاق، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔ ابن عباسؓ سے بھی خفیف فرق کے ساتھ یہی درود مروی ہے (ابن جریر)

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمّد و ازواجہ و ذریتہ کما صلّیت علیٰ ابراہیم وبارک علیٰ محمدؐ وازواجہ و ذرّیتہ کما بارکت علیٰ آل ابراہیم انک حمید مجید۔

یہ درود ابوحمید ساعدیؓ سے امام مالک، احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمّد وعلیٰ آل محمد کما صلّیت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم وبارک علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراہیم فی العالمین انک حمید مجید۔

یہ درود ابومسعود بدریؓ سے امام مالک، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، احمد، ابن جریر، ابن حبّان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضورؐ پر درود بھیجنا سنت اسلام ہے۔ جب آپؐ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے اور خصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب تشہد پڑھا جاتا ہے اس میں درود پڑھنا فرض ہے اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔ صحابہ میں سے ابن مسعودؓ، ابومسعود انصاریؓ، ابن عمرؓ اور جابرؓ بن عبد اللہ، تابعین میں سے شعبیؒ، امام محمد باقرؒ، محمد بن کعب قرظی اور مقاتل بن حیان اور فقہا میں سے اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک تھا۔ آخر میں امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور جمہور علمار کا مسلک یہ ہے کہ درود عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمۂ شہادت کی طرح ہے جس نے ایک مرتبہ پر اقرار کر لیا اس نے فرض ادا کر دیا۔ اختلافات صرف وجوب کے معاملہ میں ہیں۔ درود کی فضیلت اور اس کا موجب اجر و ثواب ہونا اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا، اس پر ساری امت متفق ہے۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہوگی۔ اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلعم کے

احسانات کی بھی ہوگی اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدرشناس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حضورؐ پر درود بھیجے گا۔ درحقیقت کثرت درود ایک پیمانہ ہے جو بتا دیتا ہے کہ دین محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمتِ ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے ملائکہ اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہتا ہے (احمد، ابن ماجہ)۔ پھر فرمایا: "جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے (مسلم)۔ قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا (ترمذی)۔ حضرت ابوہریرہؓ آنحضور صلعم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص میرے اوپر میری قبر کے قریب درود بھیجتا ہے وہ میں اس کو خود سنتا ہوں اور جو دور سے مجھ پر درود بھیجتا ہے وہ مجھ کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کذا فی المشکوٰۃ و بسط السخاوی فی تخریجہ)۔ علامہ سخاویؒ نے قول بدیع میں متعدد روایات سے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ جو شخص دور سے درود بھیجے فرشتہ اس پر متعین ہے کہ حضورؐ تک پہنچائے اور جو شخص قریب سے پڑھتا ہے حضورؐ اس کو خود سنتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب نے ایک مرتبہ آنحضور صلعم سے عرض کیا کہ میں آپ پر درود کثرت سے بھیجنا چاہتا ہوں میں اس کی مقدار اپنے اوقات دعا میں سے کتنی مقرر کر دوں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا جتنا تیرا جی چاہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ایک چوتھائی؟ آنحضورؐ نے فرمایا تجھے اختیار ہے اور اگر اس پر بڑھا دے تو تیرے لیے بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا نصف کر دوں۔ آپؐ نے فرمایا تجھے اختیار ہے اور اگر اس سے بڑھا دے تو تیرے لیے زیادہ بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ پھر میں اپنے سارے وقت کو آپ کے درود کے لیے مقرر کرتا ہوں۔ حضور اقدس صلعم نے فرمایا تو اس صورت میں تیرے سارے فکروں کی کفایت کی جائے اور تیرے گناہ بھی معاف کر دیئے جائیں گے۔ (ترمذی، سخاوی) ۞

درویش

حضرت داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ "فقیر (درویش) وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ کسی چیز سے اس کا نقصان ہو۔ نہ تو اسباب دنیاوی کے موجود ہونے سے وہ غنی ہوتا ہے اور نہ ان کی عدم موجودگی سے اس کا محتاج ہوتا ہے۔ اسباب کا ہونا نہ ہونا اس کے نزدیک برابر ہے اور اگر ان اسباب کے نہ ہونے پر وہ خوش ہو تو جائز ہے۔ اسی لئے کہ مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ درویش جتنا تنگ دست ہوتا ہے اتنا ہی وہ خوش ہوتا ہے کیونکہ اسباب کا ہونا درویش کے لیے بہت برا ہے"۔ یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح فقیر کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمال ولایت و قیام مشاہدہ کی صفت جاتے رہنے اور حق سے دور ہو جانے سے ڈرتا رہے۔ رویم بن محمد فرماتے ہیں کہ فقیر کی تعریف یہ ہے کہ فقیر کا باطن اغراض نفسانی سے اور اس کا بدن آفت سے محفوظ ہو اور جو احکام اس پر فرض ہیں، برابر ادا ہوتے رہیں۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے غنی نہیں ہوتا۔ ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کی صفت یہ ہے کہ چیز کے نہ ہونے کی صورت میں خاموش رہے اور ہونے کی صورت میں اس کو خرچ کرے ———
درویشوں کے چار بنیادی سلسلے ہیں، نقشبندی، سہروردی، قادری اور چشتی۔

درویش محمد پاشا

ترکی کے چار وزرائے اعظم اسی نام سے گزرے ہیں۔ (۱) (وفات ۱۰۱۵ھ / دسمبر ۱۶۰۶ء) جنوری ۱۶۰۲ء میں اسے وزیر کا درجہ دے کر قپودان پاشا بنایا گیا۔ جون ۱۶۰۶ء میں وزیراعظم مقرر ہوئے۔ لیکن اس کے دشمنوں نے بہت جلد سلطان کو اس کے خلاف کر دیا۔ سلطان کی بدگمانی بالآخر درویش محمد پاشا کے قتل پر منتج ہوئی۔ ترکی وقائع نگار اسے تندمزاج، بے انصاف اور نااہل شخص بتاتے ہیں۔

(۲) (وفات ۵ ربیع الاول ۱۰۶۵ھ / ۱۳ جنوری ۱۶۵۵ء) وہ شام، دیار بکر، بغداد، حلب، اناطولی، سلسٹریا اور بوسنہ کا بیگلر بیگ رہا۔ مارچ ۱۶۵۳ء میں وزیر اعظم بنا۔ اکتوبر ۱۶۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ وہ اپنے زمانے کے تمام اکابر میں سب سے دولت مند تھا۔

(۳) (۱۱۴۲ھ / ۱۷۳۰ء — ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء) وہ ۶ جولائی ۱۷۷۵ء کو وزیر اعظم بنا۔ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوتے ہی ذاتی جنبش اور آسائش کے حصول میں مصروف ہو گیا۔ مملکت کے معاملات کی طرف بے توجہی نے افواہوں کو جنم دیا۔ بالآخر ۱۹ دسمبر ۱۷۷۶ء کو اسے عہدے سے معزول کر کے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۰ فروری ۱۷۷۷ء کو اسے خانیہ کا والی مقرر کیا گیا۔ مگر وہ بحری سفر کے دوران میں بیمار ہو گیا اور اس نے ساقز میں وفات پائی۔

(۴) (۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۵ء — ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء) یا اثر محمد حالت آفندی کے مشورے پر سلطان محمود ثانی نے اسے ۶ جنوری ۱۸۱۸ء کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ دو سال تک وہ اس منصب پر فائز رہا لیکن اس مدت میں وہ امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ۵ جنوری ۱۸۲۰ء کو اسے معزول کر کے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۶ جنوری ۱۸۲۱ء کو دمشق کا والی مقرر ہوا۔ بعد میں [illegible] بھیج دیا گیا۔ جہاں اس کے داماد حمدی بے کے ظالمانہ [illegible] کی وجہ سے [illegible] ہونا پڑا۔ جون ۱۸۲۷ء میں مدینہ منورہ کا والی مقرر کیا گیا۔ اسی سال [illegible] ہوا۔ ترکی کے وزرائے اعظم میں اسے سب سے پہلے [illegible]

درہ بیگی

ایشیائے کوچک کا حکمران خاندان جنہیں ترک [illegible] کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ درہ بیگیوں کے زیادہ مشہور گھرانے [illegible]

(۱) آیدین، منسا اور برغمہ کے قرہ عثمان اوغلو۔ [illegible] پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا اقتدار دریائے مندرس [illegible] کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا۔ (۲) یوزوق کے [illegible] اور عملاً قرہ عثمان اوغلو سے [illegible] تھے ان کی حکومت [illegible] القرہ اور نیگدہ کی سنجاق [illegible] رہے۔ اس خاندان کا پہلا [illegible] احمد پاشا ۸ [illegible] معزول ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مصطفیٰ جانبلی [illegible] سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مصطفیٰ کے قتل کے بعد [illegible] ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا علاقہ مرکزی حکومت [illegible]

(۳) طرابزون اور جانیک کے علی پاشا کا خاندان۔ [illegible] علی [illegible] اور والی دمشق کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد [illegible] طرابزون کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۷۶۰ء میں روسیوں کے ساتھ جنگ میں [illegible] ۱۷۹۹ء میں اسے روس کی سفارش پر دوبارہ [illegible] کی ملازمت [illegible] جلال الدین [illegible] پاشا گورنر [illegible] ۱۷۹۲ء میں [illegible]

دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس خاندان کا خود مختارانہ سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔

دساسی، سلوستر

(١٧٥٨ء — ٢١ فروری ١٨٣٨ء) فرانس کا ممتاز مستشرق، جس نے فرانس میں عربی دبستان کی بنیاد ڈالی۔ دساسی پیرس میں پیدا ہوا۔ مشرقی زبانوں میں غیر معمولی تبحر حاصل کیا اور ہمعصروں میں امام المستشرقین تسلیم کیا گیا۔ ١٧٧٨ء میں فرانس کے شاہ لوئی ہژدہم نے مشرقی زبانوں کے مخطوطات کی اشاعت کے لیے آٹھ علماء کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی کا ایک رکن دساسی بھی تھا۔ ١٧٩٥ء میں پیرس میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے مدرسہ عربی کا پہلا استاد مقرر ہوا۔ اس نے طلبہ کے لیے عربی زبانوں کی مستند کتابوں کے اقتباسات کا ایک مجموعہ "التحفۃ السنیۃ فی علم العربیۃ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے لئے اس نے اسی قسم کا ایک مجموعہ "انیس المفید للطالب المستفید" کے نام سے مرتب کیا۔ ١٨١٣ء میں فرانس کی حکومت نے اسے بیرون کا خطاب دیا۔ ١٨١٩ء میں اس نے شیخ فریدالدین عطار کا "پندنامہ" فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ ١٨٢٢ء میں دساسی نے اپنے احباب کی شرکت سے ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ دساسی اس سوسائٹی کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ اس سوسائٹی نے علمی مجلہ "جرنل ایشیاٹک" جاری کیا۔ دساسی کے بہت سے مضامین اسی رسالے میں طبع ہوئے۔ علم و فضل کی بنا پر دساسی کو ملک بھر میں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جرمنی اور روس نے بہت دفعہ مشرقی علوم کی تنظیم و ترویج کے لئے دساسی سے مشورہ لیتے تھے۔ دساسی کے بعد یورپ کے متعدد ملکوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم اور مشرقی علوم کی تحقیق کے لئے ادارے قائم ہوئے اور اس کے مشورے سے اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔

دسوقی

(٦٣٣ھ / ١٢٢٥ء — ١٢٦٨ء ؟) برہان الدین ابراہیم بن ابو المجد عبدالعزیز بن قریش بن محمد، سلسلۂ دسوقیہ کے بانی۔ قریۂ مرقس میں زیریں مصر کے ضلع غربیہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا زیادہ حصہ قریب کے گاؤں دسوق کے گرد و نواح میں گزارا۔ ان کے والد مشہور مقامی ولی اور نانا ابوالفتح واسطی ضلع غربیہ میں رفاعی فرقے کے خلیفہ اور امام تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں (١) الجوہرہ۔ یہ زیادہ تر مبتدیوں کے لئے ہدایات اور عملی احکام کا مجموعہ ہے۔ (٢) الجوہرہ۔ اس میں دسوقی کی کرامات کا ذکر ہے (٣) الحقائق۔ اس میں وہ مناجات درج ہیں جو انھوں نے اللہ سے کیں۔ کتاب الجواہر۔ یہ ان کی سب سے بڑی کتاب ہے جس میں حقیقت اور شریعت کے درمیان دلائل سے تطبیق دی گئی ہے۔ دسوقی کہتے ہیں کہ صرف غلبۂ حال کے وقت شریعت کی پیروی ساقط ہو جاتی ہے۔ سنوسی نے اپنی کتاب سلسبیل المعین میں برہانیہ (دسوقیہ) سلسلے کی یہ خصوصیات گنوائی ہیں۔ الذکر بالجہر، مجاہدات نفس کشی اور "یا دائم" کا ورد۔

دعا

انسان کا اپنی طلب اور خواہش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔ اس سے مدد طلب کرنا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اور اے نبی، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں" (البقرہ: ١٨٦) "اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ زیادہ دیا ہے، اس کی تمنا نہ کرو، جو کچھ مردوں نے کمایا ہے، اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا، اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے (النساء: ٣٢)

غیر اللہ کو سجدہ کرنا ہی شرک نہیں ہے، بلکہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے دعا مانگنا یا اس کو مدد کے لیے پکارنا بھی شرک ہے دعا اور استمداد و استعانت اپنی حقیقت کے اعتبار سے عبادت ہیں ہیں اور غیر اللہ سے مناجات کرنے والا ویسا ہی مجرم ہے جیسا ایک بت پرست مجرم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ان سے کہو، پکار دیکھو ان معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو۔ وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں، جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں۔ وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں (بنی اسرائیل: ٥٦-٥٧)

حاجت روائی اور مشکل کشائی کے سارے اختیارات اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے صرف اسی سے دعائیں مانگنا برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اسی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے، جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا۔ حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں مگر ایک تیر بے ہدف (الرعد: ١٤) اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے! اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو، جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔ (الاعراف: ٥٦)

دنیا کی تدبیر و انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار کوئی اتنا بھی اختیار نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کر کے اس کا فیصلہ بدلوا دے یا کسی کی قسمت بنوا دے یا بگڑوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ خدا سے دعا کرے، مگر اس کی دعا کا قبول ہونا یا نہ ہونا بالکل خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ بعض اوقات تو نبی تک کی دعا رد کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں الا یہ کہ اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے" (یونس: ٣) نوح نے اپنے رب کو پکارا، کہا اے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے" جواب میں ارشاد ہوا "اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تم اس کی بات کی مجھ سے درخواست نہ کرو جس کی حقیقت تو نہیں جانتا۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے" نوح نے فوراً عرض کیا۔ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا، تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ (ہود: ٤٦-٤٧)

دعویٰ

قانونی چارہ جوئی۔ فقہاء کی اصطلاح میں دعویٰ سے مراد قاضی یا حکم

(ثالث) کے سامنے کسی شخص کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنے حق کی اطلاع کرنا یعنی قاضی کے سامنے کسی شخص کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنے حق کا مطالبہ کرنا۔ دعویٰ ذیل کی صورتوں میں متحقق ہوتا ہے۔ (۱) اس مقدمہ میں جس میں کوئی فرد رنج یا نقصان پہنچانے والے فرد کے خلاف استغاثہ دائر کرے۔ جس میں قصاص کا اجرا یا دیت (خون بہا) دلوانے کا مطالبہ ہو (۲) ان مقدمات میں جہاں مختلف حدود شرعیہ کے ماتحت کسی مظلوم کے کلی یا جزوی نقصان کی تلافی کے لئے ظالم کو عدالت میں طلب کیا جائے، جیسے سرقہ یا زنا کی صورت میں (۳) فرائض منصبی کے تحت فوجداری مقدموں میں جہاں ضرر رسیدہ کو واسطہ بنا کر یا "حسبہ" کے اختیارات کے بموجب کارروائی کی جائے۔ یہ کارروائی اس اصول پر مبنی ہوتی ہے کہ شخصی شکایات کے علاوہ ہر مسلمان قانون شکنی کرنے والے کے خلاف چارہ جوئی کا مجاز ہے (۴) ان مقدمات میں جو ظالم کی غیر معمولی کارروائی کے مطابق دائر کیے جائیں۔ فریقین کا حاضر ہونا مقدمہ کی کارروائی کے لئے اصولاً ضروری ہے۔ اسلامی قانون کے تحت کوئی فیصلہ غیر حاضری کی حالت میں نہیں ہو سکتا۔ حاضری سے گریز کرنے والے مدعیٰ علیہ کو حاضر ہونے پر مجبور کرنے کے لئے مختلف طریقے مقرر ہیں۔ انتہائی اقدام کے طور پر قاضی مدعیٰ علیہ کی بجائے ایک سرکاری نمائندہ مقرر کرے گا۔ مالکی، شافعی اور شیعہ مسلک میں جب دعویٰ میں مدعیٰ علیہ کا نام اور دیگر کوائف موجود ہوں تو پھر صحتِ دعویٰ کے لئے اس کی حاضری ضروری نہیں اور جو فیصلہ صادر کیا جائے گا وہ ویسا ہی جائز اور صحیح ہو گا جیسا کہ مدعیٰ علیہ کی حاضری کی صورت میں ہوتا۔

مقدمے کی کارروائی زبانی ہوتی ہے ہر چند کہ فریقین کو اپنے دلائل تحریری طور پر پیش کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن جب تک فریق مقدمہ حاکم کے سامنے اس کے صحیح ہونے کا اقرار نہ کر لے اس کے تحریری بیان کو سند نہ مانا جائے گا۔ دعویٰ کا بارِ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے۔ اقبال، گواہی، حلف، تحریر اور قانونی قرائن یہ سب قانونی اثبات میں شامل ہیں۔ اثبات دعویٰ کے لئے سب سے زیادہ قوی دلیل مدعیٰ علیہ کا اقرار ہے لیکن صحت اقرار کے لئے ضروری ہے کہ مُقِر بالغ اور عاقل ہو اور اس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔ اثبات دعویٰ کی دوسری دلیل قسم ہے۔ اگر مدعی شہادت پیش نہ کر سکے تو وہ مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کا مجاز ہے لیکن قسم فوجداری مقدمات میں جائز نہیں۔ اس مسئلے میں فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کے بعد مدعی گواہ پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک شہادت قابلِ قبول ہو گی۔ امام مالکؒ کے نزدیک گواہی اس شرط کے ساتھ قابلِ قبول ہو گی کہ قسم لینے سے قبل یہ علم نہ ہو کہ اس کے پاس گواہ موجود ہے اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو اس صورت میں احناف اور امام احمدؒ بن حنبل کے مطابق فیصلہ اس کے خلاف صادر کیا جائے گا اور مدعی سے قسم نہیں لی جائے گی۔ اثباتِ دعویٰ کا یہ شرعی اصول ہے کہ جب دعویٰ کا ایسا ثبوت بہم پہنچا دیا جائے جو قانونی تقاضوں کو پورا کرتا ہو تو قاضی کو مقدمے کا فیصلہ اس ثبوت کے مطابق کرنا ہو گا چاہے اس کا یقین کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

دلاور پاشا

(وفات ۸ رجب ۱۰۳۱ھ ۱۹ مئی ۱۶۲۲ء) عثمانی وزیر اعظم۔ جنوری ۱۶۱۴ء میں بغداد کا اور ۱۶۱۵ء میں دیار بکر کا بیگلر بیگی مقرر ہوا۔ جولائی ۱۶۲۰ء میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۶۲۱ء کو سلطان عثمانی نے اسے وزارت عظمیٰ پر فائز کیا۔ لیکن اس کے عہدے کی مدت ایک سال سے بھی کم تھی۔ دلاور پاشا ینی چریوں کی بغاوت میں مارا گیا یہی بغاوت عثمان ثانی کی معزولی اور موت پر منتج ہوئی۔

دلاور خان

(وفات ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) سلطنت مالوہ کا بانی جس کا اصل نام حسن تھا۔ دہار میں شیخ کمال الدین مالوی کے مزار کے احاطے سے سنگِ مزار کا جو کتبہ دستیاب ہوا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں دلاور خاں مالوے کا والی تھا۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دلاور خاں نے ناصر الدین محمود شاہ تغلق کو پناہ دی۔ محمود تغلق ۱۴۰۱ء میں دہلی روانہ ہوا تو دلاور خاں نے اپنے بیٹے الپ خاں (بعد ازاں ہوشنگ غوری) کے اکسانے پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ دلاور خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان ہوشنگ شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

دُلدُل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خاکستری رنگ کے خچر کا نام دُلدُل [illegible] نے آپؐ کے غزوات میں آپؐ کی سواری کا کام دیا۔ دلدل نبی کریم صلعم کی رحلت کے بعد تک زندہ رہا۔ وہ اس قدر سن رسیدہ اور بے دندان ہو گیا کہ [illegible] کھلانے کے لئے جو اس کے منہ میں ڈالن پڑتے تھے۔ شیعی روایت کی رو سے جنگ جمل میں حضرت علیؓ اسی دُلدُل پر سوار تھے اور جنگ صفین میں بھی حضرت علیؓ نے اسی پر سواری کی۔ یہ خچر رسول کریم صلعم کو مقوقس نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ دُلدُل کے ساتھ اس نے ایک گدھا بھی بھیجا تھا جو غفیر کہلاتا تھا۔

دمرداشی احمد

بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کا مصری مورخ۔ [illegible] تاریخی تصنیف "الدرة المصانة فی اخبار الکنانة" ۱۶۸۸ء سے [illegible] احوال پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں قاہرہ کے حالات کا مفصل بیان [illegible] ترکی عہد کے مصر کے حالات پر یہ واحد کتاب ہے جو [illegible] لکھی ہے۔

دمشق

شام کا سب سے بڑا شہر اور دار الحکومت۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً سات سو میٹر بلند صحرا کی حد پر اور لبنان شرقیہ کے سلسلہ کوہ کی شرقی [illegible] جبل قاسیون کے دامن میں واقع ہے۔ دمشق سے جنوب مشرق میں [illegible] کے مقام پر جو کھدائیاں ہوئیں ان سے یہاں چار ہزار سال قبل مسیح سے ایک شہری مرکز ہونے کا انکشاف ہوا ہے۔ یہ شہر حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں دمشق کے بادشاہ نے شمال کے شاہان آشور اور جنوب کے ملوک اسرائیل کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ ۷۳۲ ق م میں تغلت پلیسر سوم نے دمشق کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں، ساتویں صدی میں بابلیوں، چھٹی صدی میں ہخامنشیوں، چوتھی صدی

دمشق کے قبرستان باب الصغیر میں حضرت امام حسین رضؓ کی صاحبزادیوں
سیدہ سکینہ رضؓ اور سیدہ امِ کلثوم کے مقبرے

میں یونانیوں اور پہلی صدی ق م میں بوزنطیوں کا دمشق پر یکے بعد دیگرے قبضہ رہا۔ ۶۴ ق م میں دمشق رومی سلطنت کا ایک صوبہ بنا۔ رومیوں کی جگہ بوزنطیوں نے سنبھالی۔ ۲۹۵ء میں یہ سلطنت شرقیہ کا ایک حصہ بن گیا۔ ۶۱۲ء میں خسرو ثانی نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ ۶۲۷ء میں ایرانی شہنشاہ کی وفات پر دمشق خالی کر دیا گیا اور ۶۲۶ء میں ہرقل شام میں واپس آگیا۔

رجب ۱۴ھ ستمبر ۶۳۵ء میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابوعبیدہؓ نے دمشق فتح کیا۔ دمشق کی فتح نے مغرب کی ہزار سالہ سیادت کا خاتمہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے یزید بن ابی سفیان کو دمشق کا والی نامزد کیا۔ بہت جلد دمشق کو ایک مقدس شہر کا درجہ حاصل ہو گیا۔ روایات کی روشنی میں ان مقامات کا سراغ لگ گیا جنہیں انبیائے سابقین نے شہرت عطا کی تھی۔ چنانچہ زائرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ زیادہ تر لوگ جبل قاسیون میں کہف آدم (جہاں ہابیل کا قتل ہوا) یا کہف جبرئیلؑ میں جایا کرتے۔ برزہ میں حضرت ابراہیمؑ کے مقام ولادت کی تعظیم و تکریم کی جاتی۔ ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کے انتقال کے بعد دمشق کی قیادت حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں آئی۔ ۴۰ھ/ ۶۶۰ء میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ حاکم بنے تو انھوں نے دمشق میں اقامت اختیار کر لی۔ ایک صدی تک یہ خلافت کے مرکزی صوبے کا مدنی مرکز رہا۔ خلیفہ ابوالعباس سفّاح کے چچا عبداللہ بن علی نے خاندان بنوامیّہ کا خاتمہ کرنے کے بعد رمضان ۱۳۲ھ/ اپریل ۷۵۰ء میں دمشق فتح کیا اور وہ دمشق کا پہلا عباسی والی مقرر ہوا۔ اموی عمارتیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ اس کی حیثیت ایک صوبائی شہر کی رہ گئی اور خلافت عباسیہ نے اپنا صدر مقام عراق میں قائم کر لیا۔ خلیفہ المتوکل نے اپنا دارالخلافہ دمشق میں تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف اڑتیس یوم قیام کرنے کے بعد سامرا واپس چلا گیا۔ ۲۵۴ھ/ ۸۶۸ء میں بخارا کے ترک احمد بن طولون کو خلیفہ نے دمشق کا والی مقرر کیا۔ اس نے

خلافت کی کمزوریوں کے مدنظر ۲۶۴ھ/ ۸۷۸ء میں دمشق پر قبضہ کر لیا۔ بنوطولون کے زوال اور قرامطہ کی روزافزوں سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے خلیفۂ وقت نے اپنی فوجیں دمشق روانہ کر دیں۔ ۲۸۹ھ/ ۹۰۲ء میں قرامطہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۳۳۴ھ/ ۹۴۵ء میں ایک معاہدہ کی رو سے اخشیدی دمشق پر قابض ہو گئے اور اس کے عوض انھوں نے فرمانروایان حلب کو خراج دینا منظور کیا۔ ۳۵۷ھ/ ۹۶۸ء میں بنوفاطمہ خاندانِ اخشیدیہ کے قاہرہ میں جانشین ہوئے۔

۴۶۸ھ/ ۱۰۷۶ء میں بنوفاطمہ کا ملازم ترکمان سردار اتسز بن اوک دمشق پر قابض ہو گیا اور مصریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ سلجوقی سلطان نے اس کے جواب میں دمشق اپنے بھائی تتش کو جاگیر میں دے دیا۔ تتش نے ۴۷۱ھ/ ۱۰۷۹ء میں اتسز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۴۸۸ھ/ ۱۰۹۵ء میں تتش اپنے بھتیجے برکیاروق کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ دمشق اس کے بیٹے دقاق کے قبضے میں آگیا۔ رمضان ۴۹۷ھ/ جون ۱۱۰۴ء میں دقاق کی وفات کے بعد تتش ثانی حکمران ہوا لیکن وہ جلد ہی وفات پا گیا۔ اب اتابک ظہیرالدین طغتکین دمشق کا واحد مالک تھا۔ صفر ۵۲۲ھ/ فروری ۱۱۲۸ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا تاج الملوک بوری جانشین ہوا۔ ۵۴۹ھ/ ۱۱۵۴ء میں نورالدین نے خاندان بوریہ کا خاتمہ کر دیا۔ نورالدین حلب پر پہلے ہی قابض ہو چکا تھا۔ اس نے دمشق میں اقامت اختیار کر لی بنوامیّہ کے دور کے بعد پہلی بار دمشق پھر ایک وسیع، متحد اور خودمختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت بنا۔ دمشق اہل سُنت والجماعت کا مرکز بن گیا۔ کثیر تعداد میں مذہبی عمارات، مساجد اور مدارس کی تعمیر ہوئی۔ شافعی المذہب بنوعساکر اور حنبلی المذہب بنوقدامہ بہت ممتاز ہوئے نورالدین نے حدیث کی تعلیم کے لئے پہلا مدرسہ دارالحدیث کے نام سے قائم کیا۔ اس کا پہلا معلّم شافعی مؤرخ ابن عساکر تھا۔ ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۴ء میں نورالدین کی وفات پر اس کا بیٹا الملک الصالح اسمٰعیل تخت نشین ہوا۔ ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۶ء میں صلاح الدین ایوبی

نے دمشق پر قبضہ کر لیا ۔ ۲۷ صفر ۵۸۹ھ/ ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین ایوبی نے دمشق میں وفات پائی ۔ ۶۸۵ھ/ ۱۲۶۰ء تک یہاں ایوبیہ خاندان کی حکومت رہی ۔ عام خوشحالی کی بدولت آل ایوب کے علماء اور مصنفین کی دریا دلی سے سرپرستی کی ۔ ربیع الاول ۶۸۵ھ/ مارچ ۱۲۶۰ء میں ہلاکو خاں نے دمشق پر قبضہ کر لیا ۔ پہلا مملوک سلطان بیبرس اپنے عہد حکومت (۱۲۶۰ء ــــ ۱۲۷۷ء) میں اکثر دمشق جاتا رہا ۔ ۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء تک ممالیک سلاطین دمشق پر قابض رہے ۔ رمضان ۹۲۲ھ/ اکتوبر ۱۵۱۶ء میں آخری مملوک سلطان قانصوہ الغوری، آل عثمان کے مقابلے میں مارا گیا اور سلطان سلیم اول کی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں ۔ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء تک دمشق آل عثمان کے زیر سیادت رہا ۔ ۱۸۳۲ء میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے فلسطین کا علاقہ عبور کر کے دمشق پر قبضہ کر لیا ۔ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۰ء کے دوران میں مصری تسلّط کے باعث فارغ البالی پیدا ہو گئی ۔ ۱۸۴۰ء میں دمشق ایک بار پھر آل عثمان کے قبضے میں آگیا ۔

اگست ۱۸۶۰ء میں نپولین سوم کی فوجیں دمشق کے ساحل پر اتریں ۔ ۷ مارچ ۱۹۲۰ء میں مجلسِ ملی نے شام کی آزادی کا اعلان کر کے فیصل کو بادشاہ منتخب کر لیا ۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سان ریمو کی رُو سے فرانس کو جمعیت اقوام کے نمائندے کی حیثیت سے شام پر انتداب کا حق مل گیا ۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کو شام کی آزادی کا اعلان ہوا ۔ اگست ۱۹۴۵ء میں شکری القوتلی صدر جمہوریہ شام منتخب ہوئے ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو شام اقوام متحدہ کا رکن بنا ۔

دمشقی

(وفات ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۷ء) شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی طالب الصوفی المعروف بہ ابن شیخ حطّین، جغرافیہ دان جو دمشق کے قریب واقع الربوہ کا شیخ اور امام تھا ۔ اس کی مشہور تصنیف "نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر" جغرافیے سے متعلق ہے ۔ اس کی ایک اور کتاب "المقامات الفلسفیۃ والترجمات الصوفیہ" ہے ۔ یہ کتاب طبیعات، ریاضیات اور الہیات کی دائرۃ المعارف ہے ۔

دمیاطی، البنّا

(وفات محرم ۱۱۱۷ھ/ مئی ۱۷۰۵ء) احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن عبدالغنی دمیاطی، مصر کا مشہور مصنف سلسلۂ نقشبندیہ کے رکن رکین کی حیثیت سے مشہور تھا ۔ دمیاطی نے قاہرہ سے المراحی اور شبرا ملسی سے علم القرات، حدیث اور شافعی فقہ پڑھی ۔ مکہ معظمہ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد الکورانی سے علم حدیث حاصل کیا ۔ دمیاط واپس آکر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "اتحاف فضلاء البشر" شائع کی ۔ اس کتاب میں ابن محیصن المکی، الیزیدی البصری اور اعمش کوفی کی قرأتیں جمع ہیں ۔ اس میں علم قرأت پر ایک فاضلانہ مقالہ بطور مقدمہ شامل ہے ۔ دمیاطی نے مشہور کتاب "السیرت الحلبیۃ" کا ایک جلد میں ملخص بھی تیار کیا اور روز قیامت کی نشانیوں سے متعلق رسالہ "الذخائر المہمات" تالیف کیا ۔ دمیاطی نے تین بار حج کیا ۔ مدینہ منورہ میں وفات پائی اور البقیع میں دفن ہوئے ۔

دمیاطی، عبدالمومن

(۶۱۳ھ/ ۱۲۱۷ء ــــ ۷۰۵ھ/ ۱۳۰۶ء) بن خلف شرف الدین التونی الدمیاطی الشافعی، تیرھویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں حدیث کا اہم ترین راوی ۔ انھوں نے "معجم شیوخ" کے نام سے لغت اسناد تصنیف کی ۔ زمانہ مابعد کے مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے اکثر اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں ۔ اس تصنیف میں وہ احادیث اور متون شامل ہیں جو دمیاطی نے مصر، حرمین شریفین، شام، الجزیرہ اور عراق کے متعدد سفروں کے دوران میں اکٹھے کیے تھے ۔

دمیری، محمد

(۷۴۲ھ/ ۱۳۴۱ء ــــ ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین علم الحیوانات کے دائرۃ المعارف "حیات الحیوان" کا مصنف ۔ دمیری نے تحصیل علم کے لیے مشہور شافعی عالم بہاء الدین السبکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جمال الدین الاسنوی، ابن عقیل، برہان الدین قیراطی اور دیگر کئی علماء سے علمی درس لیا ۔ جب دمیری کو متداول علوم اسلامیہ کی تدریس اور فتوے دینے کی اجازت مل گئی تو وہ بعض دینی درس گاہوں اور خانقاہوں سے وابستہ رہا ۔ دمیری اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے مشہور تھا اور لوگ اسے صاحب کرامات سمجھتے تھے وہ اپنی وفات تک مکہ میں مقیم رہا "حیات الحیوان" کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں اس کی شہرت ہوئی ۔ اس کتاب کے مقالات حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں اور ترتیب میں حیوانات کے ناموں کے پہلے حروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ مقالے میں مندرجہ ذیل امور پر بحث کی گئی ہے (۱) حیوانی نام کے لسانی پہلو (۲) حیوان اور اس کی عادات کی تفصیل (۳) حدیث کی کتابوں میں حیوانات کا ذکر (۴) بحیثیت غذا مختلف حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق مختلف مذہبی آراء (۵) حیوانات کے نام سے تعلق رکھنے والی ضرب الامثال (۶) ہر حیوان کے اعضا اور اجزا کے طبی اور دیگر خواص (۷) مختلف حیوانات کے خواب میں دکھائی دینے کی تعبیر کتاب میں ۱۰۶۹ مقالات ہیں جن کی بنیاد سینکڑوں ماخذ پر رکھی گئی ہے ۔

دندان، ابو جعفر احمد

بن حسین، تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کا شیعی محدث ۔ ان کا باپ ایک معتبر راوی تھے جس نے امام علی رضاؑ، امام محمد جوادؑ اور امام علی نقیؑ سے احادیث روایات کی ہیں ۔ دندان نے بھی اپنے والد کے شیوخ کی سند پر حدیث روایت کی ہیں لیکن چونکہ وہ غلاۃ میں سے متصور ہوتے تھے اس لیے بطور راوی حدیث ان کی ذات قابلِ گرفت سمجھی جاتی رہی ہے ۔ دندان قم میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے ۔

دوارد

جنوبی حبشہ (ایتھوپیا) کی مسلم ریاست ۔ اس کا ذکر حبشہ کے وقائع ناموں میں پہلے پہل عمدہ صیون اول کے عہد (۱۳۱۲ء ــــ ۱۳۴۲ء) میں آیا ہے ۔ حبشہ کی دیگر مسلم ریاستوں کی طرح دوارد بھی الگ بادشاہ کے زیر حکومت تھا ۔ یہ بادشاہ، شاہِ حبشہ کا باجگزار ہوتا تھا ۔ العمری کے بیان کے مطابق گو اس کا طول فقط پانچ دن اور عرض دو دن کی مسافت کے برابر تھا پھر بھی اس ریاست کی فوج بڑی طاقتور تھی ۔ یہاں کے باشندے حنفی مسلمان تھے ۔

دوست محمد، امیر

(وفات ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ / ۹ جون ۱۸۶۳ء) افغانستان میں بارک زئی حکومت کا بانی اور پائندہ خاں کا بیسواں فرزند۔ محمود شاہ کی دوسری بار حکومت کے زمانے میں دوست محمد ممتاز عہدوں پر فائز رہا۔ دوست کا بھائی فتح خاں محمود شاہ کا وزیر تھا۔ محمود نے فتح خاں کی طاقت پر حسد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نکلوا کر اسے قتل کرا دیا۔ دوست محمد نے کشمیر میں فوج اکٹھی کر کے کشمیر اور کابل پر قبضہ کر لیا اور شہزادہ سلطان علی کو وہاں کا حکمران بنا دیا۔ محمود نے اسے بے دخل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا تاہم سلطان علی نے کابل اپنے بھائی محمد اعظم خاں کے حوالے کر دیا۔ محمد اعظم خاں اس سے قبل کشمیر کا گورنر رہ چکا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں اعظم کی وفات کے بعد دوست محمد نے اعظم کے بیٹے اور وارثِ تخت حبیب اللہ خاں کو شکست دی۔ لیکن کابل اس کے ایک اور بھائی سلطان محمد خاں پشاوری کو ملا۔ ۱۸۲۶ء میں دوست محمد کابل میں تخت نشین ہوا۔ ۱۸۳۴ء میں اس نے امیر کا لقب اختیار کیا۔ ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریز فوجوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے ۵ مئی ۱۸۳۹ء کو شجاع کو کابل کا فرمانروا بنا دیا۔ ۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو دوست محمد نے انگریز فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۱۸۴۰ء میں اسے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ دوست محمد کے بیٹے اکبر خاں نے شاہ شجاع کو قتل کر کے کابل پر قبضہ کر لیا۔ نومبر ۱۸۴۲ء میں دوست محمد خاں کو رہائی ملی اور وہ کابل پہنچا۔ دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے ۱۸۵۰ء میں بلخ اور خلم، ۱۸۵۴ء میں شبرغان، ۱۸۵۵ء میں میمنہ اور اندخوئی اور ۱۸۵۹ء میں کندز فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ ۱۸۵۵ء میں قندھار اور ۱۸۶۳ء میں ہرات فتح کیا۔ اس نے غلزئیوں کی طاقت کو ختم کر دیا۔ ممتاز قبائلی سرداروں کو قتل یا قید اور بعض کو جلاوطن کر دیا دوست محمد کا تمام تر انحصار اپنے بیٹوں پر تھا جنھیں اس نے اہم علاقوں میں گورنر مقرر کر رکھا تھا۔ اس نے افغانستان جدید کی جغرافیائی حدود کو مضبوط بنایا اور داخلی استحکام کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بیٹوں میں محمد افضل خاں، محمد اعظم خاں، ولی محمد خاں، محمد اکبر خاں، شیر علی خاں، محمد امین خاں اور محمد شریف خاں قابلِ ذکر ہیں۔ دوست محمد کی وفات کے بعد شیر علی خاں تخت نشین ہوا۔

دولت آبادی

(وفات ۸۴۸ھ / ۱۴۴۵ء) شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر زاولی الہندی، ممتاز ہندوستانی عالم۔ دکن کے شہر دولت آباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں شیخ نصیر الدین چراغ کے ممتاز شاگردوں قاضی عبد المقتدر اور مولانا خواجگی سے تعلیم حاصل کی۔ امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو شہاب الدین دہلی چھوڑ کر جونپور آ گئے۔ جہاں سلطان ابراہیم شرقی نے انھیں اپنی سلطنت کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور "ملک العلماء" کا خطاب عطا کیا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان شرقی نے دربار میں شہاب الدین کے لئے چاندی کی ایک خاص کرسی مہیا کی گئی تھی۔ وہ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ان کی درج ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) شرح الہندی، "کافیہ" کی شرح (۲) شرح اصول البزدوی (۳) العقائد الاسلامیہ، علم کلام پر ہے (۴) الارشاد، عربی نحو پر (۵) مصدق الفضل، مشہور قصیدہ "بانت سعاد" کی شرح (۶) بحر المواج، قرآن مجید کی فارسی تفسیر (۷) تاریخ المدینہ (۸) فتاویٰ ابراہیم شاہی (۹) بدائع البیان (۱۰) مناقب السادات، آلِ رسول کے فضائل و حقوق پر۔

دولتِ سامیہ، ملتان

قبیلہ مضر کی شاخ کنانہ میں فہر بن مالک پیدا ہوئے جن کا لقب قریش تھا اسی کی مناسبت سے پورا قبیلہ قریش مشہور ہوا۔ فہر کے پوتا لوئی بن غالب بن فہر سے کئی قریش خاندانوں کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ لوئی بن غالب کے سات بیٹے تھے۔ کعب، عامر، سامہ، خزیمہ، حارث اور عوف۔ کعب بن لوئی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسبی تعلق ہے اور سامہ بن لوئی سے ملتان کے سامی حکمران ہیں۔ سامہ بن لوئی نے مکہ سے نکل کر عمان میں سکونت اختیار کی، وہیں فوت ہوا اور اس کی اولاد وہیں آباد ہوئی اور بنو ناجیہ کے نام سے موسوم ہوئی سامہ کی اہلیہ کا نام ناجیہ بنت جرم بن ربان ہے۔ اسی ناجیہ کی طرف اس کے شوہر کی اولاد منسوب ہو کر بنو ناجیہ کہلائی۔ عمان میں بنو سامہ کا اقتدار ۲۷۹ھ اور ۲۸۶ھ کے درمیان شروع کر ۳۷۵ھ میں ختم ہو گیا۔

بنو سامہ کے ایک غلام فضل بن ماہان نے ۱۹۸ھ اور ۲۱۸ھ کے درمیان عہد مامونی میں ہندوستان کے علاقہ سندان میں حکومت قائم کر لی تھی۔ محمد بن قاسم سامی (یہی محمد بن قاسم بن منبہ ہے) نے ۲۸۰ھ سے قبل متغلب حاکم سے مقابلہ کر کے ملتان فتح کیا اس نے ملتان میں سامی حکومت قائم کر کے اسے مرکز خلافت سے وابستہ رکھا اور عباسی خلفاء کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ ملک سے تمام خرابیوں کو دور کیا۔ قرب و جوار کے ہندو مہاراجوں سے جنگ کر کے ان کی طاقت توڑی اور اپنی ساکھ قائم کی۔ ملتان میں سامی حکومت کا تذکرہ سب سے پہلے ابن رستہ نے "الاعلاق النفیسہ" میں کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے "ملتان میں ایک قوم ہے جو اپنے کو سامہ بن لوئی کی اولاد بتاتی ہے اور ان کو وہاں بنو منبہ کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ ہندوستان میں ملتان پر حکمران ہیں۔ یہ امیر المؤمنین کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ملتان منصورہ سے ملا ہوا ہے۔ ملتان میں ایک بت خانہ ہے جس کی آمدنی بہت زیادہ ہے۔ بنو منبہ کی دولت اسی بت خانہ کی آمدنی سے ہے۔ اس کی آمدنی بے حساب ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے راجے بنو منبہ سے جنگ کے لیے ملتان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور بنو منبہ اپنی خوش حالی، طاقت اور مالداری کی وجہ سے ان پر غالب آ جاتے ہیں۔"

ملتان میں بنو سامہ کی حکومت کا ذکر ابن رستہ کے بعد مسعودی نے اپنی کتاب "مروج الذہب" میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "ملتان میں میرا جانا ۳۰۰ھ کے بعد ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کا بادشاہ ابو اللہاب منبہ بن اسد قرشی تھا جو بنو سامہ بن لوئی بن غالب کی اولاد سے ہے"۔ مسعودی کے تقریباً چالیس سال بعد ۳۴۰ھ کے حدود میں ابو اسحاق ابراہیم فارسی اصطخری نے "مسالک والممالک" میں ملتان اور اس کے سامی حکمرانوں کا تذکرہ یوں کیا ہے، "شہر ملتان کے باہر آدھے فرسخ کی دوری پر بہت سی عمارتیں ہیں۔ اس بستی کو جندراور کہتے ہیں۔ یہ امیر ملتان کا فوجی کیمپ ہے۔ وہ اسی جگہ مستقل سکونت پذیر ہے۔ صرف جمعہ کے دن ملتان جاتا ہے۔ ہاتھی پر سوار ہو کر نماز جمعہ کے لئے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ ملتان کا امیر ایک قرشی ہے جو سامہ بن لوئی کی اولاد سے ہے۔ اس نے ملتان پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ امیر منصورہ کا مطیع نہیں ہے بلکہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے"۔ اسی کتاب میں اصطخری نے ملتان کے مشہور بت اور بت خانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "جو مال بھی اس بت کی نذر کیا جاتا ہے اسے امیر ملتان بت خانہ کے پجاریوں اور محافظوں پر خرچ کرتا ہے جب ہندو راجے ملتان پر چڑھائی کرتے ہیں اور اس بت کو بنو سامہ سے چھیننا چاہتے ہیں تو امیر ملتان بت کو توڑنے اور جلانے کی دھمکی دیتے ہیں جس کی وجہ سے حملہ آور واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہندو راجے ملتان کو یقیناً ویران اور تباہ کر دیتے۔ ملتان میں کئی مضبوط قلعے ہیں اس کی سرسبزی

اور آبادی منصورہ کے مقابلہ میں کم ہے"۔

اصطخری کے پندرہ بیس سال بعد ابن حوقل تاجر بغدادی (موجود ۳۵۸ھ) نے اپنی کتاب "صورالارض" میں ملتان کے سامی امیر کا یوں ذکر کیا ہے" ملتان کے باہر نصف فرسخ پر امیر کی لشکرگاہ ہے یہ امیر سامہ بن لوئی بن غالب کی اولاد سے ہے اور وہ کسی کی اطاعت و ماتحتی میں نہیں بلکہ بنی عباس کا خطبہ پڑھتا ہے"۔ یہ تحریر ملتان میں بنو سامہ کی حکومت کی آخری شہادت ہے۔ ۳۶۰ھ تا ۳۷۵ھ کا زمانہ بنو سامہ کے خاتمہ اور باطنیوں کے قبضے کا ہے۔ بنو سامہ کے بعد ملتان کے اسمٰعیلی شیعی حکمرانوں میں سب سے پہلا نام جلم بن شیبان کا ملتا ہے جس نے سب سے پہلے ملتان کی سنی حکومت کو ختم کرکے یہاں اسمٰعیلی حکومت قائم کی۔ ملتان کے بنو سامہ کے بارے میں اگرچہ ایسی کوئی تصریح نہیں ملتی لیکن قرائن سے ان کا سنی ہونا یقینی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ عمان کے سنی بنو سامہ کے خاندان سے تھے دوسرے یہ کہ وہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے۔ تیسرے یہ کہ جمعہ کی نماز بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے۔ سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسمٰعیلی شیعوں نے ان کی حکومت ختم اگر وہ بھی اسمٰعیلی شیعہ ہوتے تو افریقہ کے عبیدیوں کا پروانہ ان کے پاس آتا اور بنو سامہ کو ختم کرکے شیعی حکومت قائم کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

وزیر مہلبی نے "احسن التقاسیم" میں لکھا ہے کہ ملتان کی عملداری لمبی چوڑی ہے۔ مغرب کی طرف حدود مکران تک اور جنوب کی طرف منصورہ تک ہے۔ مسعودی نے "مروج الذہب" میں ملتان کی حدود میں ایک لاکھ بیس گاؤں بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ ملتان مسلمانوں کی بڑی سرحدوں میں سے ہے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ۳۰۳ھ سے پہلے اور اس کے بعد قنوج، ملتان کی حدود میں تھا۔ قنوج کے واسطے سے لاہور بھی مملکت ملتان میں شامل تھا۔

مملکت ملتان کے عوام کی پوشش اور لباس پر ہندوانہ طرز غالب تھا مسلمان اور ہندو دونوں کے سر پر بڑے بڑے بال اور جسم پر تہبند اور چادر ہوتی تھی۔ اہل ملتان کا عام لباس تہبند اور چادر تھا۔ باشندوں کا رنگ گندمی اور سیاہ دونوں قسم کا تھا۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ ملتان اور اس کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی تھی۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ ملتان شہر میں فارسی بھی سمجھی جاتی ہے۔ شہر ملتان تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ عوام میں بڑی خوشحالی اور فارغ البالی تھی۔ ایک درہم میں تیس سیر روٹی دستیاب تھی اس سے اشیاء کی ارزانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں منصورہ کے بعد ملتان دوسرا بڑا مرکز تھا۔ جہاں اسلامی علوم و فنون اور مسلم تہذیب و ثقافت کی بہاریں صدیوں تک قائم رہیں۔ ابو دلف نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ ملتان میں اسلام کو ظہور و غلبہ حاصل ہے اور یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عام ہے۔ مملکت ملتان کی غالب آبادی غیر مسلموں کی تھی۔ مسلمان زیادہ تر مرکزی شہروں میں رہتے تھے۔ پورے سامی دور حکومت میں غیر مسلموں پر ظلم و ستم کا پتہ نہیں چلتا۔ ملتان کے علاوہ قنوج اور لاہور بھی مسلمانوں کے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے ملتان میں سامی دور میں جو علماء پیدا ہوئے ان کے نام سامی حکمرانوں کی طرح ناپید ہیں لاہور کے چند قدیم علماء کے حالات ملتے ہیں جنہوں نے اپنے دور میں عالمی شہرت پائی۔ ان کا شمار سامی دورِ حکومت کے حسنات و برکات میں ہوتا ہے۔ ان علماء میں شیخ اسمٰعیل لاہوری، ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن لاہوری، ابوالحسن علی بن عمرو بن حکم لاہوری اور عمرو بن سعید لاہوری شامل ہیں۔

دولت شاہ، امیر

(وفات ۸۹۲ھ/ ۱۴۸۷ء؟) بن علاء الدولہ بختی شاہ ایک ایرانی مصنف یہ خراسان کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس کی کتاب "تذکرۃ الشعراء" سات حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے میں بیس یا کچھ کم شاعروں کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان ملوک اور سلاطین کا بھی حال لکھا ہے جو اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ آخری حصہ ان سات شاعروں کے لئے وقف ہے جو مصنف کے ہمعصر تھے۔ شاعروں کے کلام کا نہایت عمدہ انتخاب دیا گیا ہے

دولت ماہانیہ، سنجان

ہندوستان کی خود مختار مسلم ریاست سنجان (سندان) ۱۹۸ھ سے ۲۲۲ھ تک قائم رہی۔ سندان موجودہ مہاراشٹر اور گجرات کے درمیان بمبئی سنٹرل ریلوے سٹیشن سے شمال کی طرف ۱۴۵ کلومیٹر پر اور سورت سے جنوب کی طرف ۱۸۱ کلومیٹر پر ایک معمولی سٹیشن ہے۔ قدیم عرب جغرافیہ نویس اور مؤرخ اسے سندان لکھتے ہیں موجودہ مقامی زبان میں اسے سنجان کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ بلاد ہند کا مشہور شہر اور بندرگاہ تھی اور یہاں بحری تجارت کی عالمی منڈی تھی۔ اصطخری نے [illegible] میں لکھا ہے کہ سندان سمندر سے نصف فرسخ پر واقع ہے۔ دوسری صدی [illegible] کے اواخر میں سندھ میں خود مختاری، اقتدار و غلبہ قبائلی عصبیت اور مذہبی [illegible] طرف سے اطمینانی برپا تھی۔ سندھ کا علاقہ چونکہ مرکز خلافت بغداد سے بہت دور [illegible] تھا اس لئے خلافت کے مخالفین قرامطہ، خوارج اور [illegible] اسمٰعیلی [illegible] اطراف کو اپنی معاندانہ سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ ان [illegible] حالات میں جو سامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے سندھ کی [illegible] کے ایک مشہور شہر سندان پر قبضہ کر لیا۔ یہ گجرات کے [illegible] تھا۔ فضل بن ماہان نے اپنی خود مختار حکومت قائم کرکے دور اندیشی [illegible] سے کام لے کر براہ راست خلافت عباسیہ سے تعلق قائم کر [illegible] کی قلمرو میں شامل ہو گیا [illegible] یہ چھوٹی سی مسلم حکومت [illegible] سندان کی داستان بلاذری کی اس تصریح کی رہین منت ہے [illegible] بیان ہے کہ فضل بن ماہان مولیٰ بنی سامہ نے سندان فتح [illegible] لیا اور خلیفہ مامون کی خدمت میں ہاتھی کا تحفہ بھیجا [illegible] لکھی اور اس کے لئے سندان کی جامع مسجد میں دعا کی جب [illegible] ہوا تو اس کا لڑکا محمد بن فضل بن ماہان جانشین ہوا اور [illegible] لے کر ہندوستان کے [illegible] سمندری ڈاکوؤں کی [illegible] بہت بڑی تعداد کو ختم کیا [illegible] واپس آیا تو اس کا بھائی ماہان بن فضل بن ماہان [illegible] اس نے امیر المومنین معتصم باللہ سے تعلق پیدا کر [illegible] کی خدمت میں ساگوان کا تحفہ بھیجا [illegible] میں نہیں [illegible] ہندوستان کے لوگ اس کے بھائی [illegible] انھوں نے ماہان بن فضل کو قتل کرکے [illegible] سندان پر قابض ہو گئے اور وہاں کی جامع مسجد [illegible] اس میں وہ نماز باجماعت اور جمعہ پڑھتے اور خلیفہ کے لئے دعا [illegible]

سندان کی دولت ماہانیہ میں تین حکمران گزرے ہیں [illegible] بانی دولت [illegible] ماہان (۲) محمد بن فضل بن ماہان (۳) ماہان بن فضل بن ماہان۔ دولت [illegible] بانی فضل بن ماہان نے سندان میں ایک عظیم الشان جامع مسجد [illegible]

سندان کے امرائے بنو ماہان اپنے آقا بنو سامہ کی طرح اہل سنت والجماعت میں سے تھے اور جس طرح بنو سامہ، عمان اور ملتان میں اپنی حکومتیں قائم کرکے خلفائے عباسیہ کے نام کا خطبہ پڑھ کر خلافت کے طرفداروں میں تھے اسی طرح ان کے موالی مسلمان جمعہ اور پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرتے۔ اس سے پہلے ابوجعفر منصور کے دور میں سندان کے قریب گندھارا میں عمرو بن جمل نے فتح کے بعد ایک مسجد تعمیر کی تھی لیکن سندان کی جامع مسجد اپنی شان و شوکت اور پائداری کے اعتبار سے بلاد ہند میں اسلام کا پہلا قلعہ تھی اور مدتوں اسی شان سے قائم رہی۔ سندان کی یہ حکومت چونکہ شخصی تھی اس لئے فضل بن ماہان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا محمد بن فضل جانشین ہوا۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی اس کی حدود بڑھانے اور مزید امن و امان قائم کرنے کی مہم شروع کردی۔ سندان اہم ترین بندرگاہ تھی جہاں سے سیراف، بصرہ، عدن، حبشہ، سرندیپ اور چین تک تجارتی جہاز آتے جاتے تھے اس لئے محمد بن فضل نے اپنے دور میں بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کیا۔ وہ بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے ستر جہاز لے کر نکلا۔ بحری قزاقوں کی آبادیاں گجرات سے سندھ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ قزاق مالابار، گجرات، سندھ بلکہ سقوطرہ تک کی بحری راہ مسافروں اور تاجروں پر تنگ کیے ہوئے تھے۔ اسی گروہ نے راجہ داہر کے زمانے میں سندھ میں ایک جہاز کو لوٹا جس کے نتیجے میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔

بحری قزاقوں کو شکست دینے کے بعد محمد بن فضل نے پالی کو فتح کرکے مسلم ریاست کا حلقہ وسیع کیا۔ پالی سوراشٹر میں گھوگھ بندرگاہ کے قریب واقع ہے۔ جب وہ اس مہم سے کامیاب واپس آیا تو سندان کا نقشہ ہی اور بن گیا تھا۔ اس کے بھائی ماہان بن فضل نے اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سندان پر قبضہ کرلیا تھا اور امیر المؤمنین معتصم باللہ سے سرکاری طور پر مراسلت جاری کرلی تھی۔ ماہان کی یہ بغاوت سندان کی خود مختار حکومت کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ ہندوؤں نے محمد بن فضل کا ساتھ دے کر ماہان کو سولی پر لٹکا دیا اس کے بعد ہندوؤں نے خود سندان پر قبضہ کرلیا اس طرح سندان کی اٹھائیس سالہ دولت ماہانیہ کا چراغ گل ہوگیا۔

بنو ماہان سندان کے مقبوضہ علاقہ میں خلفا کے نام کا خطبہ پڑھ کر ان کے حق میں منبروں پر دعائے خیر کرتے تھے۔ سندان کی شاندار حکومت اور مسلمانوں کے بلند کردار نے مملکت بلہرا کو اپنا وطن بنالیا تھا اور یہاں عوام اور انکے حکام اسلام اور مسلمانوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ سندان کی مسلم حکومت کے خاتمے پر بھی یہاں کی مسجدوں اور میناروں سے اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا۔ سندان اور اس کے اطراف و جوانب کے ساحلی علاقہ کی زبان بحر لاروی کی نسبت سے لاریہ تھی جسے اب کوکنی یا مرہٹی کہتے ہیں۔ ماہانیوں کا اٹھائیس سالہ دور حکومت عالم اسلام میں وہ مقام و شہرت نہ پاسکا جو اسے اسلامی علوم و فنون اور مسلم تہذیب و ثقافت کا ایک مرکز بنا سکے۔ اس وقت مسلمانوں کا مرکز سندھ تھا۔ البتہ تیسری اور چوتھی صدی کے بعد سندان اپنی گذشتہ روایت و عظمت کی وجہ سے پرکشش ہوگیا۔

سندان عرب اور چین کے درمیان بحری تجارت کا چوراہہ تھا۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ سندان قسط، بالس اور بید کا دیس ہے۔ یہاں پر چاول، شہد، ناریل، کیلے آم، مرچ، ساگوان بکثرت ہوتے تھے اور بھاری تعداد میں عرب ممالک کو بھیجے جاتے تھے۔ سندان صنعتی مقام بھی تھا یہاں کی کئی صنعتیں عرب ممالک میں مشہور تھیں۔ خاص طور پر یہاں کے بنے ہوئے جوتے اور کپڑے بڑی شہرت رکھتے تھے۔

دولتِ متغلبہ طوران

ایک مسلم ریاست جو ۳۴۰ھ سے ۵۷۱ھ تک قائم رہی۔ طوران کسی زمانے میں سندھ کا ایک صوبہ تھا۔ طوران کے مغرب میں کرمان کا ملک اور سجستان کا ریگستانی علاقہ تھا۔ مشرق میں بحر فارس، شمال میں بلاد ہند اور جنوب میں مکران واقع تھا۔ طوران میں حسب ذیل شہر اور مقامات تھے: محالی، کیز، کانان، سورہ، قصدار، قندابیل، بجشرد، کنزو، نوزی، رستا کہن، رستاق روذ، موردان، رستاق، ماسکان اور کہرکور۔ قصدار، طوران کا قدیم دارالسلطنت اور مرکزی شہر تھا۔ اس کا موجودہ نام خضدار ہے اور آجکل یہ قلات ڈویژن کا جدید صدر مقام ہے۔ قندابیل بہت بڑا شہر تھا۔ ابوالفدا نے تقویم البلدان میں اسے طوران کا دارالسلطنت بتایا ہے۔ اس کا موجودہ نام گندھاوا (گنداوہ) ہے۔ درہ بولان اسی میں واقع ہے۔

۳۴۰ھ کے حدود میں مغیرہ بن احمد نے اس مملکت کی بنیاد رکھی۔ اس نے طوران پر قبضہ کرکے خلیفہ کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اس نے خود اقتدار و غلبہ حاصل کیا تھا۔ اس کی حکومت موروثی اور خاندانی نہیں تھی۔ اپنی حکومت میں وہ بالکل خود مختار اور آزاد تھا۔ اس نے طوران کے مرکزی شہر قندابیل اور قصدار سے الگ ایک تیسرے مقام کیزکان کو اپنا مستقر بنایا۔ جیسے منصورہ، ملتان اور مکران کے اکثر متغلب حکمرانوں نے مرکزی شہر سے ہٹ کر کسی چھوٹے سے مقام کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ مغیرہ بن احمد کے بعد بصرہ کا ابوالقاسم حکمران ملتا ہے جس کے بارے میں ابن حوقل کا بیان ہے کہ: "طوران پر اہل بصرہ میں سے ایک شخص ابوالقاسم حکومت کرتا ہے۔ وہی حاکم ہے قاضی بھی اور فوج کا امیر بھی۔ اس کے باوجود اس کی جہالت کا یہ حال تھا کہ تین اور دس میں تمیز تک نہیں کرسکتا۔" اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالقاسم کا مغیرہ بن احمد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مغیرہ خارجی نہیں تھا بلکہ اہل سنت والجماعت میں سے تھا۔ مقدسی بشاری نے اپنی کتاب "احسن التقاسیم" (تالیف ۳۷۵ھ) میں لکھا ہے کہ دارالسلطنت قصدار کے دو حصے ہیں اور درمیان میں خشک وادی ہے ایک حصہ میں قاضی ہے اور یہیں بادشاہ بھی رہتا ہے جو عادل و متواضع ہے۔ یہ بادشاہ ابوالقاسم بصری کے بعد ہوا ہے۔ یاقوت حموی کی "معجم البلدان" کے مطابق چوتھی صدی کے آخر میں قصدار پر کسی خارجی کی حکومت تھی جو خوارج کا مذہبی پیشوا بھی تھا۔ اس کے دور میں خوارج کو یہاں بڑی شان و شوکت حاصل تھی۔ ۳۸۴ھ کے حدود میں سبکتگین نے قصدار پر قبضہ کرکے یہاں کے بادشاہ کو سامانی بادشاہ کا مطیع و باجگذار بنا دیا۔ ۴۰۲ھ میں سلطان محمود غزنوی نے قصدار پر فوج کشی کرکے فتح پائی اور وہاں کے سلطان کو اپنا مطیع و باجگذار بنایا۔ ۵۷۱ھ میں غوری سلطنت کے پرشکوہ حکمران ابوالفتح غیاث الدین غوری نے طوران کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔

طوران کے امراء و سلاطین کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ شروع سے آخر تک ان کے یہاں نہ کوئی ذمہ دار حکومت تھی اور نہ کوئی باقاعدہ حکمران تھا۔ بلکہ اس دشوار گزار علاقہ میں جس کا بس چلتا وہی اپنی حکومت قائم کرلیتا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ نہایت متمدن اور یہاں کے باشندے عموماً خوارج تھے اس لئے وہ کسی حکمران اور متغلب سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ طوران کے متغلبین کے دو دور ہیں ایک وہ جس میں رؤسائے عرب قندابیل پر قابض ہوئے جن کو عمران بن موسیٰ برمکی نے ختم کیا اور ان کے بعد محمد بن خلیل نے قبضہ کرکے اپنی حکومت قائم کی۔ اس دور کے بعد سینکڑوں سال تک علاقہ طوران میں کوئی فتنہ برپا نہیں ہوا۔ یہ علاقہ براہ راست خلافت عباسیہ سے مربوط و متعلق رہا۔ اس کے بعد دوسرا دور مغیرہ بن احمد کے اقتدار سے ۳۴۰ھ میں شروع

اسے کوئی نہ پوچھتا۔ اگر تم مشرق و مغرب کا چکر کاٹ کر آؤ تب بھی یہ کپڑا اسی محراب میں ملے گا۔ ہم لوگ چوری اور فتنہ فساد نہیں جانتے۔ کئی کئی سال کے بعد جب اس قسم کی کوئی بات ہو جاتی ہے تو ہم اسے کسی اجنبی اور پردیسی کی حرکت سمجھتے ہیں۔ ہم یا ہوا یہ جو ۷۱ ۴ھ میں ختم ہوا۔ ان حالات میں مملکت طوران کے اندر کسی قابل ذکر ترقی کا پتا نہیں چلتا۔ دینی اور علمی میدان میں بھی کوئی خاص سرگرمی نظر نہیں آتی حالانکہ یہ دور اسلامی علوم و فنون کا دور بہار تھا اور مسلمانوں کی بستیاں علم اور اہل علم کے وجود سے معمور تھیں۔ پورے علاقۂ طوران میں خوارج کا غلبہ تھا اور عام طور پر حکمران خارجی ہوا کرتے تھے۔ ان خاص معتقدات کی بنا پر عوام اور حکمران طبقوں میں مذہبی تشقت و تعصب پایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہاں امن و امان تھا اور دینی و اخلاقی قدریں پورے علاقے میں موجود تھیں۔ ذیل کے واقعہ سے طوران کے امن و امان، اخلاق و عادات اور عوام کے دینی حالات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

قاضی ابو علی تنوخی (متوفی ۳۸۴ھ) نے ''معجم البلدان'' میں لکھا ہے کہ فرقہ ہاشمیہ کے معتزلی متکلم و فلسفی ابوالحسن بن لطیف نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ قصدار کے علاقہ سے گزر رہا تھا وہاں خوارج کا خلیفہ مقیم تھا۔ میں نے ایک گاؤں میں ایک بوڑھے درزی کو دیکھا جو ایک مسجد میں تھا۔ میں اسے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی دے کر باہر تربوز کے ایک کھیت میں چلا گیا۔ میں نے کھیت سے ایک تربوز خرید کر کھایا جس سے فوراً بخار میں مبتلا ہو گیا۔ رات بھر اسی کھیت میں پڑا رہا۔ جب طبیعت سنبھلی اور دوسرے دن مسجد میں آیا تو دیکھا کہ درزی غائب ہے اور کپڑوں کی گٹھڑی اسی طرح محراب میں پڑی ہے۔ ابھی میں اپنے سامان کی جانچ پڑتال کر ہی رہا تھا کہ درزی آ گیا۔ میں نے کہا تم میرے کپڑے یہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ درزی نے کہا کہ میں ان کپڑوں کو رات یہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس پر میں اس سے الجھتا رہا اور وہ ہنسی میں ٹالتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ تم لوگوں نے گندی باتوں اور گرے اخلاق کی عادت ڈال رکھی ہے تم لوگوں کی نشو و نما بلاد کفر میں ہوئی ہے جہاں چوری اور خیانت کی وبا عام ہے۔ ہم اپنے یہاں ان باتوں کو جانتے تک نہیں۔ اگر تمہارا کپڑا یہاں پڑا پڑا پرانا ہو جاتا تب بھی اسے پکڑ کر قتل کر دیتے ہیں یا اس کا ہاتھ کہنی سے کاٹ دیتے ہیں۔ ابوالحسن بن لطیف کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد میں نے مختلف طریقوں سے قصدار کے لوگوں کے حالات معلوم کیے تو واقعی درزی کی بات صحیح نکلی۔ یہاں تک کہ لوگ راتوں کو گھر کے دروازے تک بند نہیں کرتے۔ بہت سے مکانات میں تو دروازے ہی نہیں ہیں۔

سوبہ طوران خصوصی اعتبار سے خشک و گرم تھا۔ زمین پہاڑی اور ریگستانی تھی مکانات زیادہ کچے تھے پانی کی کمی تھی۔ دریا اور ندیاں بہت کم تھیں۔ طوران کا علاقہ اگرچہ پہاڑی اور صحرائی تھا لیکن تجارت کا مرکز تھا۔ تاجروں کے مستقل مکانات، مال گودام و سامانِ تجارت تھے۔ خراسان، ایران، کرمان اور ہندوستان کے تاجر یہاں آتے جاتے اور قیام کرتے تھے۔ اس علاقہ میں پیداوار کی کمی کے باوجود چیزوں کی کثرت اور ارزانی کا حال یہ تھا کہ چالیس سیر گیہوں چار درہم سے آٹھ درہم میں ملتا تھا۔ طوران کی حکومت نے درآمدی برآمدی سامان پر محصول عائد کر رکھا تھا۔ محصول سے دس لاکھ درہم سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اصطخری نے اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' میں لکھا ہے کہ طوران کے مسلمانوں اور کافروں کا لباس اور سر کے بال بڑھانے اور لٹکانے کا طریقہ ایک ہی قسم کا تھا۔ ان کا لباس چادر اور تہبند تھا۔

دولت معدانیہ، مکران

حدود ۳۴۰ھ میں عیسیٰ بن معدان مہاراج نے مکران پر غلبہ و اقتدار حاصل کر کے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کیا۔ یہی دولت معدانیہ مکران کا بانی تھا۔ اس کا تذکرہ سب سے پہلے اصطخری نے اپنی کتاب ''مسالک والممالک'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''عیسیٰ بن معدان نامی ایک شخص مکران پر قابض و دخیل ہے جسے لوگ اپنی زبان میں مہراج کہتے ہیں اس کی جائے قیام شہر کیز ہے''۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکران پر ایک شخص ۳۴۰ھ کے حدود میں قابض ہو گیا۔ ان دونوں بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن معدان پہلا شخصی حکمران تھا جس نے مکران میں حکومت قائم کی۔ وہ خلفائے عباسیہ کا خطبہ نہیں پڑھتا تھا اور نہ ہی کسی کی اطاعت و امان میں تھا۔ پانچویں صدی کے ربع اول میں مکران کے دوسرے حاکم معدان بن عیسیٰ بن معدان کا پتا چلتا ہے جو مکران کے دارالسلطنت تیز میں رہتا تھا۔ اس کا انتقال ۴۲۲ھ میں یا اس سے کچھ پہلے ہوا۔ ابن اثیر نے اپنی کتاب ''کامل ابن اثیر'' میں لکھا ہے کہ ''۴۲۲ھ میں سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود نے تیز کی طرف فوج روانہ کی۔ اس پر اور اس کے اطراف پر قبضہ کیا۔ اس کی طرف فوج کشی کی وجہ یہ ہوئی کہ مکران کے بادشاہ معدان نے انتقال کیا اور اس نے دو لڑکے چھوڑے''۔

دولت معدانیہ مکران کا تیسرا حکمران عیسیٰ بن معدان تھا۔ ۴۲۲ھ میں جب معدان بن عیسیٰ کا انتقال ہوا تو اس نے دو بیٹے ابوالعساکر اور عیسیٰ چھوڑے۔ عیسیٰ نے خزانے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ابوالعساکر نے خراسان جا کر اپنے بھائی سے مقابلے کے لیے سلطان مسعود سے مدد طلب کی۔ سلطانی فوج نے مکران پہنچ کر عیسیٰ کو اطاعت اور اپنے بھائی سے صلح کی دعوت دی لیکن وہ اٹھارہ ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ جنگ میں عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پھر سنبھلا اور دوبارہ اپنے آدمیوں کو لے کر مقابلہ پر آیا اور عین معرکہ میں مارا گیا۔ ابوالعساکر نے مکران پر قبضہ کر کے تین دن تک لوٹ مار کی اور باشندوں کو زیر کیا۔ عیسیٰ کے بعد اس کا بھائی ابوالعساکر حسین بن معدان مکران کا حکمران بنا۔ وہ علم طب میں [illegible] تھا۔ اس کی علم دوستی اور بیرونی ممالک کے اہل علم سے علمی مباحث و [illegible] کا پتا چلتا ہے۔ اس نے سلطان مسعود کے نام کا خطبہ پڑھا اور اس کی [illegible] اپنی حکومت قائم کی۔ ۴۷۱ھ میں سلطان غیاث الدین غوری نے [illegible] مکران ختم ہو گئی۔ اس کی مدت حکومت ۱۳۱ سال ہے۔

معدانی حکمرانوں میں سے کسی کے بارے میں [illegible] کہ وہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا یا خلافت عباسیہ سے تعلق [illegible] آزاد حکمران تھے۔ وہ نہ سنی تھے نہ شیعہ بلکہ وہ خارجی تھے۔ مسعودی [illegible] میں لکھا ہے کہ بلاد مکران خارجیوں کا مسکن ہے۔ بنو معدان [illegible] معدانیہ کے عام حکمران عادل و منصف اور شریف تھے [illegible] لقب تھا مقدسی نے احسن التقاسیم میں لکھا ہے کہ مکران کا [illegible] بادشاہ [illegible] منکسر المزاج اور عادل و منصف ہے تم لوگ یہاں سے [illegible] نے ۳۷۵ھ سے پہلے کے مکران کے بارے میں یہ بات بیان کی ہے۔

عرب جغرافیہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مکران ایک وسیع و [illegible] سمندر پر واقع ہے اس میں بہت سے شہر و قریات ہیں [illegible] میں سجستان جنوب میں سمندر اور مشرق میں ہندوستان ہے [illegible] مکران کا نام حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں مکران بن [illegible] پر ہے جو بابل سے نکل کر اس علاقے میں آباد ہوا تھا۔ اصطخری نے ۳۴۰ھ کے حدود میں مکران کے شہروں میں یہ نام لکھے ہیں: کیز، تیز، قنزبور، دزک [illegible] دزک، قلابندہ، ارمائیل اور قنبلی۔ مقدسی نے ۳۷۵ھ سے پہلے مکران کی وسعت بیان

کرتے ہوئے بنجپور (پنجگور) کو یہاں کا دارالسلطنت بنایا ہے۔ اور شہروں میں مشکہ، کیبج، سرائے شہر، میر بور، خواش، دمندان، جالک، وزک، دشت علی اور تیز کے نام لکھے ہیں۔

مکران کے باشندے عموماً گندمی رنگ کے غیر مہذب اور جاہل تھے۔ مسلمانوں میں قابلِ ذکر علمی اور دینی زندگی کا ذوق نہیں تھا۔ عام لوگ خارجی عقیدہ کے تھے۔ ان کی زبان فارسی اور مکرانی تھی۔ بعض علاقوں میں بلوچی بھی رائج تھی۔ طرزِ زندگی عام طور سے ہندوانہ تھا۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ مکران کے لوگوں کا عام لباس کرتہ ہے۔ تاجر لوگ قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں۔ مقدسی نے مکران کا حال یوں بیان کیا ہے کہ اہل مکران میں کند ذہنی ہے ان کا رنگ گندمی ہے ان کی زبان وحشی ہے وہ کرتے پہنتے ہیں اور بالوں کو بڑھا کر لٹکاتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح کان چھدواتے ہیں۔ مکران میں جانوں کی آبادیاں زیادہ تھیں جو پھوس کے چھپروں میں رہتے تھے ان کا ذریعہ معاش مچھلیوں اور مرغابیوں کا شکار تھا۔ یہاں نہ کوئی قابلِ ذکر پیداوار ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی خاص صنعت وحرفت تھی۔ البتہ فانید (مٹھائی) مکران میں پورے عالم اسلام میں سب سے اچھی اور زیادہ ہوتی تھی اور دنیا بھر میں بھیجی جاتی تھی۔

دولتِ ہباریہ منصوریہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی حضرت ہبار بن اسود اسدی قرشی فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ وہ بہت جری اور بہادر تھے۔ ان کی اولاد بھی اولوالعزمی سے متصف تھی۔ شام، بصرہ، سیراف، سندھ، بلخ اور مصر جہاں جہاں ان کی اولاد رہی غلبہ واقتدار اور شان وشوکت کی مالک بن کر رہی۔ انہی میں سے ایک شخص منذر بن زبیر ہباری قرشی د... میں سندھ آیا۔ سندھ میں اس کا خاندان وقت اور حالات کا منتظر رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پوتے عمر بن عبدالعزیز بن منذر ہباری نے سندھ پر قبضہ کرکے منصورہ میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ ابن حزم کی رو سے ۲۴۷ھ میں خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد وہ سندھ کا حاکم بن گیا تھا۔ مورخ یعقوبی کا بیان ہے کہ سندھ کے والی ہارون بن خالد نے ۲۴۰ھ میں انتقال کیا تو عمر بن عبدالعزیز نے جو سندھ پر قابض تھا دربارِ خلافت کو لکھ کر سندھ کی ولایت حاصل کی۔

دولت ہباریہ منصورہ کے بانی عمر بن عبدالعزیز بن ہباری قرشی کے علاوہ دیگر حکمرانوں کا پتا نہیں ملتا صرف مسعودی نے اپنے ایک معاصر ہباری حکمران عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ابن حزم متوفی ۴۵۶ھ نے جمہرۃ الانساب میں عمر بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ سندھ کی حکومت اس کی اولاد میں چلی یہاں تک کہ اس خاندان کی حکومت ہمارے زمانہ میں سلطان محمود بن سبکتگین کے دور میں ختم ہوئی۔ زبیر بن بکار متوفی ۲۵۶ھ نے لکھا ہے کہ سندھ کا حاکم آج کل عمر بن منذر کی اولاد میں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۵۶ھ میں عمر کے بجائے اس کی اولاد سندھ پر حکمران تھی۔ ابن حوقل بغدادی (۳۵۸ھ) نے لکھا ہے کہ سندھ کے باشندے مسلمان ہیں۔ یہاں کا بادشاہ ہبار بن اسود کی اولاد سے ہے اصطخری (۳۴۰ھ) نے مسالک والممالک میں لکھا ہے کہ سندھ کے باشندے مسلمان ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کا بادشاہ ہبار بن اسود کی اولاد سے ہے۔ مقدسی بشاری نے لکھا ہے کہ شاہان منصورہ خلیفہ عباسی کا خطبہ پڑھتے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز کے مرنے پر اس کا بیٹا عبداللہ بن عمر جانشین ہوا۔ یہ ۲۷۰ھ میں حکمران تھا اس نے بھی باپ کی طرح پورے سندھ پر نہایت کامیاب حکومت کی دین داری و دینی خدمت میں دور دور تک اس کا شہرہ تھا اس کے دربار میں علماء، فضلاء، ادبا، شعرا اور ارباب علم وفن رہا کرتے تھے۔ اس نے آبائی وطن پایۂ چھوڑ کر منصورہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کشمیر کے اطراف میں الورہ کا راجہ مہروق بن رائق ہندوستان کے نامی گرامی بادشاہوں میں سے تھا وہ ۲۷۰ھ میں عبداللہ بن عمر کی کوششوں سے مسلمان ہوا۔ ۲۷۱ھ میں عبداللہ کے بھائی موسیٰ بن عمر بن عبدالعزیز ہباری قرشی کے حکمران ہونے کا پتا چلتا ہے۔ دولت ہباریہ کا چوتھا حکمران ابو المنذر عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز ہباری قرشی تھا مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ "میں ۳۰۰ھ کے بعد بلاد منصورہ میں داخل ہوا تو یہاں کا حاکم ابوالمنذر عمر بن عبداللہ تھا۔ بادشاہ کے دو لڑکے ہیں ایک کا نام محمد اور دوسرے کا علی ہے۔ ان کا پایۂ تخت منصورہ ہے جو ملتان سے ۷۵ فرسخ کی دوری پر ہے ایک فرسخ آٹھ میل کا ہوتا ہے۔ منصورہ سے متعلق جو علاقہ ہے اس میں تین لاکھ دیہات اور بستیاں ہیں۔ پوری مملکت میں کھیتیاں، درخت اور قریب قریب آبادیاں ہیں۔ اس میں مید (سمندری ڈاکو) نامی ایک قوم ہے جس سے اکثر جنگ رہا کرتی ہے۔ منصورہ کے بادشاہ کے پاس اسی جنگی ہاتھی ہیں اور یہاں کے جنگی اصول کے مطابق ہر ہاتھی کے اردگرد پانچسو پیدل فوج ہوتی ہے"۔

سندھ اور ملتان کی دوسری خود مختار حکومتوں کی طرح منصورہ کی ہباری حکومت بھی سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ۴۱۶ھ میں ختم ہوئی۔

ملوکِ منصورہ انتہائی دیندار اور اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔ امام داؤد ظاہری کے طریقے پر شدت سے عامل تھے۔ منصورہ میں بڑے بڑے ظاہری علماء، فقہا اور قضاۃ تھے۔ دولت ہباریہ کا سرکاری مذہب ظاہری تھا۔ اول سے آخر تک عباسی خلفاء سے متعلق رہے۔ آس پاس کے ہندو راجوں مہاراجوں سے ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ "ہباری حکمرانوں نے ملکی انتظام میں وہ قابلیت دکھائی جس نے رعایا کے دلوں کو ان کی طرف کھینچ لیا اور وہ دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں ہباریوں کو چاہنے لگے البتہ خطبہ عباسی خلفا کا جاری رہا"۔ ہباریوں کی دینداری کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے یہاں باقاعدہ عہدہ قضا قائم تھا جہاں خالص دینی قوانین کی رو سے فیصلے ہوتے تھے حدود وتعزیرات جاری ہوتی تھیں اور پوری مملکت میں اسلامی احکام نافذ تھے

قدیم جغرافیہ نویسوں کے بیان کے مطابق اقلیم سندھ (منصورہ) کے مشرق میں بحر فارس مغرب میں کرمان اور سجستان کا صحرا، شمال میں ہندوستان اور جنوب میں مکران اور بلوچستان کا درمیانی صحرا واقع تھا۔ مقدسی بشاری نے اقلیم سندھ کے بڑے بڑے شہر یہ بتائے ہیں منصورہ، دیبل، زندریج، کدار، مایل، قنبلی، نیرون، قالری، اتری، بلری، مسواہی، بہرج، بانیہ، منجابری، سدوسان، الرور، سوپارہ، کیناس، چیمور۔ منصورہ اس مملکت کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت تھا۔ یہاں سے ملتان بارہ مرحلہ پر اور طوران پندرہ مرحلہ پر واقع تھا۔ اس کے چاروں طرف چار دروازے تھے: باب البحر، باب طوران، باب سندان، باب ملتان۔ منصورہ کے بعد دولت ہباریہ کا دوسرا بڑا شہر دیبل ساحلِ سمندر پر واقع تھا۔ ہباری دور حکومت میں دیبل تباہ کن زلزلے سے دوچار ہوا۔ یہ زلزلہ ۲۸۰ھ میں پیش آیا جس سے پورا شہر نیست ونابود ہوگیا صرف سو مکانات بچ سکے۔ پوری آبادی زندہ دفن ہوگئی۔ اس تباہی کے بعد پانچ مرتبہ زلزلہ آیا اور ڈیڑھ لاکھ لاشیں ملبے سے نکالی گئیں۔ علامہ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں اس زلزلے کا ذکر کیا ہے۔

اقلیم سندھ کا ہباری علاقہ سرسبز وشاداب تھا کہیں کہیں ریگستانی اور پہاڑی علاقے بھی تھے۔ چاول، ہر قسم کی کھجور، گنا، آم، لیموں، ناریل، کیلا، شہد، السی وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ منصورہ کی بھینس اور سندھ کا پالہ اونٹ بہت مشہور تھا اس علاقے میں بڑی بڑی چراگاہیں اور مویشیوں کی کثرت تھی۔ سندھ کی مخصوص اور مشہور چیزوں میں آم، لیموں، کھمبائت کے جوتے اور پالہ اونٹ تھے جو پورے عالم اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

سندھ کا ملک ہباری حکومت میں بڑا خوشحال اور فارغ البال تھا۔ ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز بافراط اور سستی ملتی تھی۔ دیبل اور منصورہ کے تاجر دور دور تک شہرت رکھتے تھے اور عالم اسلام کے بڑے تاجروں اور مالداروں میں شمار ہوتے تھے۔ ہباری دورِ حکومت میں سندھ کی بری اور بحری تجارت بہت ترقی پر تھی اور پورے عالم اسلام سے اس کا تجارتی تعلق قائم تھا۔ دیبل اور الور بحری تجارت کے مراکز تھے۔ الور کی آبادی ملتان کے برابر تھی۔

دومۃ الجندل

عرب میں ایک واحہ (نخلستان)۔ وادی سرحان اس کے جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ایک سرے پر وسطی عرب اور دوسرے سرے پر حوران اور شام کا کوہستان ہے۔ مدینہ سے پندرہ دن اور دمشق سے سات دن کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔ اس کا طول تین میل اور عرض آدھ میل ہے۔ دومہ حضرت اسمٰعیلؑ کے لڑکے کا نام تھا۔ جو ہجرت کر کے یہاں چلے آئے تھے۔ انہی کے نام پر اس علاقے کا نام دومہ پڑ گیا۔ دُومۃ الجندل کو عہد نبوت میں خاص شہرت حاصل رہی۔ آنحضرت صلعم نے اسے فتح کرنے کے لئے تین بار کوشش کی۔ ۵ھ/ ۶۲۶ء کے غزوہ میں نبی کریم صلعم خود قائد الجیش تھے۔ اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا کیونکہ یہاں کے باشندے اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی تتر بتر ہو گئے تھے۔ دوسری بار ۶ھ میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف قائد الجیش تھے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار اصبغ بن عمرو کلبی اسلام لے آیا۔ تیسری بار ۹ھ میں خالدؓ بن ولید نے دومۃ الجندل پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ صفین میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکمین ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ جب حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی باہمی نزاع کے بارے میں اپنی تحقیقات مکمل کر چکیں تو دومۃ الجندل میں اکٹھے ہوں اور اپنا فیصلہ سنائیں حضرت علیؓ کو پریشان کرنے والی کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ امیر معاویہ نے ۳۹ھ/۶۶۰ء میں ایک فوج دومۃ الجندل روانہ کی تھی۔ حضرت علیؓ اس فوج کو پسپا کر دینے میں کامیاب ہو گئے لیکن نخلستان کے باشندوں نے حضرت علیؓ اور معاویہؓ ہر دو کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جب ممالک اسلامیہ کا مرکز بنو امیہ کے زمانے میں شام اور بنو عباس کے زمانے میں عراق مقرر ہوا تو دومۃ الجندل کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔

سلطنتِ عثمانیہ کی آخری صدیوں میں جب وہابیوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا تو دومۃ الجندل بھی ان کے قبضے میں آ گیا اور یہ قبضہ آل رشید کے امیر شمر طلال کے حکومت سنبھالنے تک رہا۔ ۱۹۰۹ء میں قبائل روالہ کے سردار نوری ابن شعلان نے اس پر قبضہ جمایا۔ ۱۹۲۰ء میں امیر شمر نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں عبدالعزیز بن سعود نے حکومت شمر کا قلع قمع کرنے کے بعد اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

دہریہ

وہ گروہ جو دنیا کو ماضی اور حال دونوں میں قدیم اور دائمی جانتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے قیامت اور آخرت کی زندگی سے انکار کرتا ہے۔ دہری وہ شخص ہے جو رب، خلق، ثواب و عذاب، دین اور قانون سب سے انکار کرتا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اور سمجھتا ہے کہ بدی صرف اس چیز میں ہے جو اس کی خواہشات کی تکمیل میں حائل ہو۔ اس کے نزدیک انسان، پالتو جانوروں اور وحشی درندوں میں کوئی فرق نہیں۔ خیر، اس کے نزدیک صرف وہ چیز ہے جو اس کے مفاد کے حصول میں مدد دے۔ اس کے خیال میں عالم کی ابتدا ذرات جوہری کے اتفاقی تصادم سے ہوتی ہے جو اس سے پہلے فضا میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔ جمال الدین افغانی دہری کے معنی "نیچری مادہ پرست" کرتے ہیں۔

دہلی

دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر واقع ہندوستانی شہر۔ دہلی ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ء سے ۱۸۵۸ء تک شمالی ہندوستان کے شاہی خانوادوں کا پایۂ تخت رہا (کچھ مدت کے لیے دولت آباد، آگرہ اور لاہور کو بعض حکمرانوں نے اپنا مرکز بنانا پسند کیا) ۱۹۱۱ء میں برطانوی حکومت کا دارالسلطنت قرار پایا اور اگست ۱۹۴۷ء سے بھارت کا دارالحکومت ہے۔

تاریخ کی کتب سے ثابت ہے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان کے فرمانرواؤں کا دارالسلطنت ہستناپور تھا۔ یہ شہر دریائے گنگا کے ساحل پر آباد تھا۔ جب کورو پانڈو کی مشترکہ فرمانروائی میں نفاق و اختلاف پیدا ہوا تو پانڈوؤں نے دریائے جمنا کے کنارے شہر اندرپت (اندر پرستھ) کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ قرنوں بعد ۴۴۰ بکرمی میں راجا اننگ پال ترنور نے اندرپت کے نزدیک ڈلی شہر آباد کیا۔ اس کے بعد رائے پتھورا نے بارہ سو کچھ بکرمی میں ایک قلعہ اور شہر اپنے نام پر تعمیر کیا۔ قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کا مسکن یہی شہر رہا۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے دوسرا قلعہ بنایا جو ۶۶۶ھ میں مرزغن کے نام سے مشہور ہوا۔ ۶۸۶ھ میں معز الدین کیقباد نے دریائے جمنا کے کنارے کیلو کھری نام کا ایک نفیس شہر آباد کیا۔ جلال الدین خلجی نے شہر کوشک لعل اور علاؤ الدین خلجی نے کوشک سیری آباد کر کے انھیں اپنے دارالحکومت قرار دیا۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں غیاث الدین تغلق نے ایک اور شہر کی بنا ڈالی فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۵ھ میں فیروز آباد کی بنیاد رکھی جسے دریائے جمنا سے نکالی ہوئی نہر شاداب کرتی تھی۔ مبارک شاہ نے مبارک آباد بسایا۔ ہمایوں نے ۹۳۸ھ میں قلعہ اندرپت کی مرمت کر کے دین پناہ نام رکھا اور تخت گاہ قرار دیا۔ شیر شاہ افغان نے شہر کوشک سیری کو ویران کر کے ایک اور شہر آباد کیا۔ اس کے بیٹے سلیم شاہ نے ۹۵۳ھ میں قلعہ سلیم گڑھ تعمیر کیا۔ اگرچہ ان فرمانرواؤں نے الگ الگ بستیاں بسا کر تخت گاہ قرار دیں لیکن بیرونی ممالک میں دہلی ہی کو ہندوستان کا دارالسلطنت سمجھا جاتا تھا۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۸ھ میں دہلی کے نزدیک شاہجہاں آباد نام کا شہر آباد کیا۔ اس شہر کی آبادی اور رونق اتنی بڑھی کہ یہ تمام پرانے شہر اس میں شامل ہو گئے۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء کو ایک نئے قلعے کی بنیاد رکھی جسے لال قلعہ کہتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں خاندانِ مغلیہ کے خاتمے کے ساتھ انگریزوں نے جنگ آزادی کے دوران میں دہلی کی عمارات کو شدید نقصان پہنچایا اور دارالحکومت کلکتہ منتقل کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت دہلی منتقل ہوا اور نئے شہر کی تعمیر شروع ہوئی جسے بعد میں رائے سینا اور بعد میں نئی دہلی کہنے لگے۔

دہلی کی یادگار عمارتیں درج ذیل ہیں۔ جامع مسجد، موتی مسجد، کلاں مسجد، خونی مسجد، کوٹلا کی مسجد، مسجد قطب الدین ایبک، لال قلعہ، قطب مینار، مقبرہ کبیر الدین اولیا، مقبرہ نظام الدین اولیا، مقبرہ امیر خسرو دہلوی، مقبرہ نصیر الدین چراغ دہلی، مقبرہ قطب الدین بختیار کاکی، مقبرہ التمش، مقبرہ ناصر الدین بن محمود، مقبرہ علاؤ الدین خلجی، مقبرہ غیاث الدین خلجی، مقبرہ فیروز ادہم خاں، مقبرہ عبدالرحیم خانخاناں

دیوان خاص، دہلی

دیار بکری

(۹۵۰ھ/۸۲-۱۵ء؟) حسین بن محمد بن حسن، مشہور مورخ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تاریخ بعنوان "تاریخ الخمیس فی احوال نفس نفیس" تصنیف کی۔ یہ تاریخ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی۔ مصنف نے خانہ کعبہ کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ تاریخ اسلام کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔ اختتام پر عثمانی حکمرانوں کے نام گنوائے گئے ہیں۔ مصنف مکہ معظمہ میں رہتا تھا۔ اس نے اس تاریخی کتاب کا خاتمہ مراد سوم (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) پر کیا ہے۔

دیبل

سندھ کی قدیم بندرگاہ اور شہر۔ یہ دریائے سندھ کے مغربی جانب ایک کھاڑی کے دہانے پر واقع تھا۔ محمد بن قاسم نے ۹۲ھ/۷۱۲ء میں دیبل تسخیر کیا تھا۔ راجا داہر حاکم سندھ پر یہ الزام تھا کہ دیبل کے مقام پر بحری قزاقوں نے بعض ایسی کشتیوں کو لوٹ لیا جو مسلمان مرد اور عورتوں کو لنکا سے عراق اور مکہ لے جا رہی تھیں، راجا داہر نے اغماض سے کام لیا۔ محمد بن قاسم سے قبل دیبل کو فتح کرنے کے لیے عربوں کے دو بحری حملے ناکام ہو چکے تھے۔ ان کے قائد عبید اللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ بجلی تھے۔ تیسری بار محمد بن قاسم خشکی کی طرف سے حملہ آور ہوا۔ عربوں نے ہندوستان میں پہلی بار منجنیق استعمال کر کے دیبل کے ۴۰ گز اونچے برج کو زمین بوس کر دیا گیا۔ شہر پر قابض ہو جانے کے بعد محمد بن قاسم نے مغلوب غیر مسلموں کے سامنے نرم شرائط پیش کیں اور ذمیوں کی حیثیت سے انھیں پورے حفظ و امان کا یقین دلایا۔ محمد بن قاسم نے دیبل میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ اس نے ایک نیا محلہ بھی تعمیر کرایا اور اس میں چار ہزار عرب خاندان آباد کیے۔ دیبل ایک بارونق شہر تھا جو بحری تجارت اور کاروبار کا مرکز تھا۔ اس کے باشندوں کی بڑی تعداد تاجروں اور کاریگروں کی تھی۔

دیت

خوں بہا۔ مال کی وہ معین مقدار جو کسی کو قتل کرنے یا ظالمانہ طور پر کسی کو جسمانی ضرب پہنچانے کی صورت میں واجب الادا ہو۔ قانون کی زبان میں دیت وہ معاوضہ ہے جو قتل کے عوض واجب الادا ہو۔ جسمانی ضرر پہنچانے کے عوضانے کو "ارش" کہتے۔ دیت کہیں اختیاری ہے کہیں واجب۔ اختیاری دیت وہاں ہوتی ہے جہاں ضرر رسانی کا عمداً ارتکاب کیا گیا ہو۔ قتل عمد کی صورت میں نمایاں قید یہ ہے کہ قتل کا ارتکاب مہلک آلے سے کیا گیا ہو۔ اگر یہ آلہ جان سے مارنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا تو اس قتل کو قتلِ شبہ عمد قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں دیت اختیاری نہیں رہتی۔ مالکی مذہب میں جب قتل کا ارادہ ثابت ہو جائے تو خواہ مارنے کے لیے کوئی سا آلہ استعمال کیا جائے، دیت اختیاری ہوگی۔ قتل عمد کی اس صورت کے سوا جہاں قصاص ثابت ہو جاتا ہے، دیگر صورتوں میں دیت واجب ہوگی۔ دیت کی مقداریں پوری پوری اس صورت میں واجب ہوتی ہیں جب ضرر رسیدہ شخص مسلم مرد اور رتبے میں آزاد ہو۔ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہوتی ہے۔ مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ آدھی دیت انھی صورتوں میں ہوگی جہاں دیت، پوری دیت کے تیسرے حصے سے بڑھی ہوئی ہو۔ جہاں جرم کی نوعیت پوری دیت کے فقط چوتھائی حصے کی متقاضی ہو تو عورت کے لیے بھی چوتھائی دیت دینا ہوگی جو مرد کے لیے مقرر ہے۔ ذمی اور مستامن (وہ غیر مسلم اجنبی جو اسلامی علاقے میں عارضی طور پر

اجازت لے کر آیا ہو) کے لیے اکثر فقہا کے نزدیک دیت ایک تہائی یا نصف ہے حنفی مساوی شرح کے قائل ہیں۔ دیت صرف اس صورت میں واجب الادا ہو گی جب ارتکاب جرم مسلم علاقے میں ہوا ہو۔ غلام اگر جرم کا شکار ہوا ہو تو وہ نظامِ دیت میں نہیں آتا۔ غلام کے مالک کو جتنا نقصان پہنچا ہو وہ اسی لحاظ سے معاوضے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ پوری دیت کے ادائے مؤجّل کے بارے میں شافعی، مالکی اور حنبلی قتل عمد اور بلا عمد میں فرق کرتے ہیں۔ قتل عمد کی صورت میں دیت کی ادائیگی کا مطالبہ اس سال کے اندر اندر کیا جا سکتا ہے جس میں ارتکاب جرم ہوا ہو۔ بلا عمد کی صورت میں دیت کو تین سال کے اندر ایک تہائی فی سال کی قسط میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک دیت ہر حال میں تین سال کے اندر ادا کی جا سکتی ہے۔ جب دیت پوری دیت کی ایک تہائی ہو تو ہر مذہب میں پہلے سال کے اندر بالجبر وصول کی جا سکتی ہے۔

اگر فریقین میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو جائے تو دیت کی مقدار کا ایک معین اور محدود پیمانہ مقرر ہے۔ قتل نفس کی صورت میں اونٹوں کی تعداد سو مقرر ہے جو برابر تعداد کے پانچوں گروہوں میں منقسم ہے: ۴ ۲ سالہ، ۲۳ سالہ، ۲۲ سالہ مادہ اونٹ اور ۱ ۲ سالہ نر اونٹ۔ جہاں کسی پورے عضو کے کاٹ دینے یا جسمانی یا ذہنی وظیفے کے مختل کر دینے کا نتیجہ اتفاقی موت نہ واقع ہو تو دیت ہر ضائع شدہ عضو کے مناسب ہوگی۔ ایک بازو، ٹانگ، آنکھ یا اس کے ڈیلے کے بدلے کامل دیت کا نصف واجب الادا ہوگا۔ پلکوں کے ضائع کر دینے کے عوض چوتھائی دیت دینا ہوگا۔ ہاتھ یا پاؤں کی ایک انگلی کاٹ ڈالنے کے بدلے دیت کا دسواں حصّہ دینا ہوگا۔ ایک دانت کے بدلے دیت کا بیسواں حصّہ واجب ادا ہوگا۔ اگرچہ اصل قاعدے کی رُو سے دیت میں اونٹ دینا چاہئیں۔ لیکن سونے کے سکوں (ایک ہزار دینار) یا چاندی کے سکوں (دس یا بارہ ہزار درہم) ادا کرنا بھی بالکل اسی کے برابر ہے۔ بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ دیت مویشی (دو سو)، بھیڑ (ایک ہزار) یا لباس (دو سو حُلّہ) کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے۔

دیتریسی، فریڈرش

(۱۸۲۱ء۔ اگست ۱۹۰۳ء) ممتاز جرمن مستشرق، جس نے عربی ادب اور مسلمانوں کے فلسفے کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ اس نے برلن یونیورسٹی، لائپزگ اور ہالہ کی دانش گاہوں سے تحصیل علم کی۔ مصر، شام اور فلسطین کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ وہ ۱۸۵۰ء میں برلن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور عمر بھر اسی دانش گاہ سے وابستہ رہا۔ اس نے عربوں کے مشہور شاعر المتنبّی کے دیوان کو واحدی کی شرح کے ساتھ دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ اس نے رسائل "اخوان الصفا" کے مندرجات سے بحث کی اور ان میں سے بعض کو جرمن زبان میں منتقل کیا۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں فارابی کی کتاب "السیاست المدینہ" کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہا تھا، لیکن ترجمے کی تکمیل سے قبل ہی اس کا انتقال ہو گیا ٭

دیر

ایک نوابی ریاست، جس کا الحاق ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے ہوا۔ ریاست دیر کم و بیش اس علاقے پر مشتمل ہے جسے پنج کوڑا اور اس کی معاون ندیاں سیراب کرتی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کر کے مالاکنڈ ڈویژن کی تشکیل کی گئی۔ یہ ڈویژن شمال مغربی سرحدی صوبے کا حصّہ ہے۔ دیر کا آخری نواب سلطان محمد شاہ خسرو تھا۔ دیر کے حکمران خاندان کے بانی مُلّا الیاس ملقب بہ اخوند بابا نے گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں فروغ پایا۔ اس کا پوتا غزن خاں بن قاسم خاں بن طغرخاں ۱۸۶۳ء میں دس ہزار فوج کے ساتھ امبیلا کی مہم میں قبائلی لشکروں کے ساتھ شریک ہوا۔ یہ مہم برطانوی ہندوستانی فوج نے سید احمد بریلویؒ کے مجاہدین کے خلاف شروع کی تھی۔ جب غزن خاں نے دیکھا کہ لڑائی کا پلہ انگریزوں کے حق میں جھک رہا ہے تو وہ اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔ غزن خاں کے بعد اس کا لڑکا رحمت اللہ خاں جانشین ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں رحمت اللہ خاں کے انتقال پر اس کا لڑکا محمد شریف خاں مسند نشین ہوا۔ اس کے عہد میں چترال اور دیر کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ نواب دیر کو شکست ہوئی اور وہ سوات میں پناہ گزین ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں محمد شریف برطانوی فوجوں کی مدد سے دیر کو واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۸۹۷ء میں اسے انگریزوں کی طرف سے نواب کا خطاب ملا۔ وہ انگریزوں کا پکا حلیف رہا۔ اسے ۲۶ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا اورنگ زیب خاں تخت نشین ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں سوات کی ستائی ہوئی رعایا نے میاں گل شہزادہ کے تحت اورنگ زیب کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے مفتوحہ علاقہ اسے واپس دلا دیا۔ ۱۹۲۵ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس کا بڑا بیٹا محمد شاہ جہان خاں اس کا جانشین ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں پورا شمال مغربی سرحدی صوبہ انگریزی حکومت کے خلاف اٹھا تو اس نے اپنے تمام وسائل برطانوی حکومت کو پیش کر دیئے۔ ۱۹۳۰ء ہی میں دیر اور سوات کی موجودہ سرحدوں کی توثیق ہوئی اور صدیوں پرانی عداوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں حکومتِ پاکستان نے محمد شاہ جہاں کو سنگین الزامات کی بنا پر معزول کر کے نظر بند کر دیا اور اس کے بڑے بیٹے محمد شاہ خسرو کو ۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو باضابطہ دیر کا نواب بنایا ٭

دیسلان، میک گوکن

(۱۸۰۱ء۔ ۴ اگست ۱۸۷۸ء) ممتاز فرانسیسی مستشرق۔ اس نے تاریخ ابن خلدون کے اقوام بربر سے متعلق حصّے کو فرانسیسی ترجمے کے ساتھ الجزائر سے متعدد جلدوں میں شائع کیا۔ البکری کی کتاب "المسالک والممالک" کا وہ حصّہ طبع کیا جو شمالی افریقہ کے جغرافیہ سے متعلق ہے۔ دیسلان نے قاضی ابن خلکان کی کتاب "وفیات الاعیان" کو انگلستان کے اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی فرمائش پر انگریزی کا جامہ پہنایا جو لندن سے چار جلدوں میں شائع ہوا۔ اس نے مقدمہ ابن خلدون کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ جو فرانس کے سرکاری مطبع سے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۸ء کے درمیان تین جلدوں میں شائع ہوا ٭

دین

وہ نظام زندگی یا طریق زندگی جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مُطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ عربی زبان میں دین کا ایک مفہوم ہے غلبہ و اقتدار۔ مالکانہ و حاکمانہ تصرف۔ سیاست و فرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ دوسرا مفہوم ہے طاعت فرمانبرداری اور غلامی۔ تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ قرآن

مجید میں ارشاد ربانی ہے اور ان کو حکم نہیں دیا گیا، مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی راست رو ملت کا دین ہے (البیّنۃ ۱ ۵)

تمہارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سُوّر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور جو گلا گھونٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے۔ لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا۔ (المائدہ ۱ ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکام شریعت بھی دین ہی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: جنگ کرو، ان لوگوں سے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے اُسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (التوبہ: ۲۹) یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام کے ان احکام کو ماننا اور ان کی پابندی کرنا بھی دین ہے، جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "زانیہ عورت اور مرد دونوں میں ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامنگیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو (النور ۱ ۲)" یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔ (یوسف: ۷۶) اس سے معلوم ہوا کہ فوجداری قانون بھی دین ہے۔

اللہ تعالےٰ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظام زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و درست ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے، بلکہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت بھیجی ہے، کمی بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرز فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے اور اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے۔ اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی اُس نے اسلام ہی کی تعلیم دی۔ اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوع انسانی میں رائج کیئے گئے ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھکر حقوق، فائدے اور امتیازات حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق دین کے عقائد اصول اور احکام میں ردّ و بدل کر ڈالا۔ ارشاد ربانی ہے ا۔

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے۔ اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی (آل عمران: ۱۹)

دین الٰہی

ہندوستان کے مغل شہنشاہ اکبر کا جاری کردہ دین۔ دین الٰہی کا اجرا ۹۸۹ھ / ۱۵۸۱ء میں ہوا۔ اس میں نفس پرستی، غبن، فریب، غیبت، جبر، تعدّی، تخویف اور تکبّر کی ممانعت تھی۔ ان میں جین مت کے عقیدۂ اہنسا اور کیتھولک عیسائیوں کی تجرّد پسندی کا اضافہ کیا گیا۔ دین الٰہی میں ان دس فضائل کی تاکید کی جاتی ہے: کشادہ نظری، اعمال بد سے اجتناب، غیض کو علم سے دبانا، تشدد آمیز مادی مشاغل سے پرہیز، پرہیزگاری، تقویٰ، زہد، احتیاط، نرمی، شفقت اور صوفیہ کے طریق پر آرزوئے الٰہی کے ذریعہ تزکیۂ نفس۔ اس میں نور، شمس اور نار پر مبالغے کی حد تک زور دیا جاتا تھا۔ اس سے زرتشتی، ہندوانہ اور صوفیانہ اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ شہنشاہ کو بالواسطہ طور پر ہی بلکہ خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے تمام مرید آپس میں ملتے وقت اللہ اکبر اور جلّ جلالہ کہہ کر سلام کرتے تھے۔ دین الٰہی میں نہ تو کسی الہامی کتاب کے نازل ہونے کا دعویٰ کیا گیا، نہ اس سے مذہبی پیشواؤں کے کسی سلسلے کا آغاز ہوا۔ ابوالفضل نے اکبر کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ اکبر نے کم از کم مجازاً اور کنایتہً ترک اسلام کا اقرار کیا تھا۔ بہرحال اکبر کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نے علی الاعلان خدا یا نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کسی کو اپنا نیا مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ہندوؤں کے دل جیتنے کے لیئے اکبر تمام حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اس نے ایسی رسوم اختیار اور رائج کیں جو سراسر ہندوانہ تھیں۔ مثلاً ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت، جھروکہ درشن، داڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگانا اور ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر ان کی مذہبی رسموں میں حصہ لینا۔ دربار کی اس روش سے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ ملا محمد یزدی نے فتویٰ دیا کہ بادشاہ بدمذہب ہو گیا ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ہے۔ قطب الدین کوکہ اور شہباز خاں کنبوہ جیسے امرا نے جرأت سے کام لیکر اکبر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بادشاہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے تمام مخالفین ترغیب و تخویف یا تشدد کا نشانہ بن گئے۔ حاشیہ نشینوں نے یہ بات اڑادی کہ بعثت نبوی پر ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد اسلامی شریعت کی عمر پوری ہو چکی ہے لہٰذا ایک نئے دین اور نئے شارع کی ضرورت ہے اور اس منصب کے لیئے اکبر ہی سزاوار ہے۔ اس کی تصدیق میں طرح طرح کی جھوٹی سچی پیش گوئیاں، اقوال اور اشعار پیش کئے گئے بالآخر دین الٰہی اکبر شاہی کا اعلان کر دیا گیا۔

جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے انھیں بیعت کرتے وقت کلمہ "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" کے ساتھ دین اسلام سے علیحدگی اور اخلاص چہارگانہ (ترکِ مال، ترکِ جان، ترک ناموس، ترک دین) کا اقرار کرنا پڑتا۔ ان مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں چیلا کہا جاتا۔ بادشاہ کی طرف سے زناد یا انگشتری اور بطور شجرہ بادشاہ کی تصویر عطا ہوتی۔ جسے وہ مرصع غلاف میں رکھ کر دستار میں لگاتے۔ بادشاہ قرآن، وحی، حیات بعد الموت اور یوم جزا کا منکر ہو گیا۔ آفتاب پرستی اور مسئلہ تناسخ کا قائل ہو گیا۔ سجدۂ تعظیمی پر زور دیا گیا۔ شراب حلال کی گئی۔ سور کا گوشت خوراک کا جزو بن گیا۔ جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ جوئے کی حلت کا اعلان ہوا۔ صوم و صلوٰۃ اور حج منسوخ کر دیئے گئے۔ دیوان حکومت میں اذان اور نماز باجماعت موقوف ہو گئی عربی کے مطالعے کو بنظر تحقیر دیکھا جانے لگا۔ فقہ، تفسیر اور حدیث کی بجائے نجوم و طب اور حساب و فلسفہ کی تعلیم رائج کی گئی۔ تقویم اسلامی کا استعمال ترک کر دیا گیا۔ ہندوؤں کو اجازت مل گئی کہ وہ رمضان شریف میں علی الاعلان کھائیں پیئیں۔ مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ جب ہندو برت رکھیں تو مسلمان علانیہ کھانے پینے سے باز رہیں۔

دین الٰہی کی تشکیل میں ملکی مصالح کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اکبر ہندوستان میں ایک عظیم الشان اور مستحکم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا لیکن علماء بالخصوص مخدوم الملک اور صدر الصدور اس قدر باثر اور مقتدر ہو چکے تھے کہ ملک کے فوجداری اور دیوانی معاملات ان کی رائے کے مطابق طے پاتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ بادشاہ مختار بالذات ہے یا علماء کے فتووں کا پابند ہے؟۔ ابتدا میں اکبر ایک سیدھا سادہ خوش

عقیدہ مسلمان تھا۔ وہ علماء مشائخ اور صوفیہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور علمی و مذہبی حقائق کا جویا رہتا تھا اس نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ کے قریب ایک عبادت خانہ تعمیر کرایا جس میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے علماء اور پیشوا بھی جمع ہوتے اور بادشاہ کے سامنے مختلف مسائل پر آزادانہ بحث و تمحیص کرتے۔ ان مجالس میں اسے محسوس ہوا کہ علماء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کج بحثی اور بہتان طرازی پر اتر آتے ہیں۔ ایک عالم کسی بات کو حرام قرار دیتا ہے تو دوسرا اسے حلال ٹھیراتا ہے۔ اسی زمانے میں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کا تقرب حاصل ہوا۔ یہ دونوں اپنی آزاد خیالی کے باعث علماء کے ہاتھوں تکلیفیں جھیل چکے تھے۔ علماء کا زور توڑنے کے لیے انھوں نے ایک محضر تیار کیا جس کی رو سے اکبر کو سلطان عادل قرار دیتے ہوئے اسے مختلف فیہ دینی مسائل میں اجتہاد کے وسیع اختیارات دے دیئے اور اس پر بعض علماء کے دستخط بھی ثبت کرا لیے۔ ۱۰۰۱ھ میں شیخ مبارک اور ۱۰۰۴ھ میں فیضی کے انتقال کے بعد دین الٰہی کے دو بڑے ستون گر پڑے۔ ۱۰۰۷ھ میں ابوالفضل دکن کی مہمات پر بھیج دیا گیا تو دربار میں دین الٰہی کی سرگرمیاں مدھم پڑ گئیں۔ ۱۰۱۱ھ میں ابوالفضل کے خاتمے کے بعد اکبر کی بداعتقادی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہوا اور اس کے ساتھ ہی دین الٰہی کا سورج بھی غروب ہو گیا۔

دینوری

(وفات ۲۶ جمادی الاول ۲۸۲ھ) ابوحنیفہ احمد بن داؤد بن ونند شہرۂ آفاق ماہر نباتیات۔ ادبیات اور عربیت کی حد تک تعلیم بصرہ اور کوفہ کے دبستانوں میں حاصل کی۔ اگرچہ وہ ماہر نباتات کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا لیکن نحو، لغت، ہندسہ، نجوم، ریاضی اور تاریخ میں قابل وثوق سمجھا جاتا ہے۔ فقہ اور تفسیر میں بھی اس نے گراں قدر آثار چھوڑے ہیں۔ اس کا شاہکار "کتاب النبات" ہے جو نباتاتی دائرۃ المعارف ہے۔ یہ چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس میں پودوں کی خاصیتوں میں طبی خواص و اثرات کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ دینوری پودوں کے ناموں اور اصطلاحوں کو کثرت سے عربی اور فارسی دونوں میں لکھتا ہے اس طرح یہ کتاب تیسری صدی ہجری کی فارسی کا گراں قدر مآخذ معلومات بھی ہے۔ پودوں کے ناموں کی تفصیل میں جب بھی موقع ملتا ہے وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ اس کے مترادفات دیگر عرب علاقوں میں کیا ہیں۔ پودوں کی ساخت، ان کے غذائی و طبی اور دیگر خواص کا بہت دقیقہ رس اور جامع ذکر کرتا ہے۔ پودوں کی جنس وار تقسیم بھی اس نے ایک مستقل باب میں کی تھی۔ زمین، بارش، نہروں اور پودا پھوٹنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک مفصل حال بھی اس نے دیا تھا۔ "کتاب النبات" سہ گانہ مآخذوں سے مرتب ہوئی ہے: ا۔ اپنے پیشروؤں کے بیانات کا اعادہ اپنے ذاتی مشاہدات اور اپنے ہمعصروں کے بیانات کی نقل۔ ذاتی مشاہدات کے سلسلے میں وہ ایران، عراق، بوزنطی سرحد، شام، عرب، افغانستان، بلوچستان اور خراسان کے پودوں کا ذکر کرتا ہے۔ جرمن محقق زلیبر برگ کا کہنا ہے کہ یونانیوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ اور اپنے علم و فضل کی انتہا کے زمانے میں نباتات پر جو لکھا ہے ابوحنیفہ دینوری ان کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

دینوری کی بیس کتابوں کا پتا چلتا ہے جس میں "کتاب النبات" (کچھ حصے) اور "الاخبار الطوال" دستیاب ہیں۔ اس کی دیگر کتب یہ ہیں: (۱) تفسیر تیرہ جلدوں میں (۲) کتاب الوصایا، فقہ میں (۳) کتاب فی حساب الدور، فقہ میں (۴) کتاب القبلۃ والزوال نیم فقہی فلکیاتی (۵) ما یلحن فیہ العامۃ، کتاب اصلاح المنطق، کتاب الفصاحۃ، کتاب الجمع والتفریق، کتاب الشعر والشعراء، ادبیات اور لغت میں (۶) کتاب الباہ، طب میں (۷) البحث فی حساب الہند، کتاب الجبر والمقابلہ، کتاب نوادر الجبر، کتاب الکسوف ریاضی اور فلکیات میں (۸) کتاب البلدان، جغرافیہ میں (۹) الاخبار الطوال، خلافت راشدہ میں ایران کی فتح کے متعلق ایک قابل قدر مآخذ۔

دیوبندی

اتر پردیش (بھارت) کے ایک مشہور اور دو ہزار سال قدیم قصبے دیوبند سے نسبت رکھنے والا۔ اکثر و بیشتر دیوبند میں واقع اسلامی دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء اور ان کے تلامذہ دیوبندی کہلاتے ہیں۔ دارالعلوم کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء کو دیوبند کی ایک قدیم مسجد چھتہ میں مشہور عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء ——— ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے چند اہل فضل و تقویٰ بزرگوں کے تعاون اور مشورے سے رکھی تھی۔ جن میں مولانا فضل الرحمن عثمانی (علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حاجی عابد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس درس گاہ کے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی، پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن، پہلے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی مقرر ہوئے۔ دارالعلوم کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں رکھا۔ یہ درسگاہ درج ذیل مقاصد کے پیش نظر قائم کی گئی تھی۔ (۱) آزادیٔ ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق (۲) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جدوجہد کرنا (۳) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسالک کی حفاظت و اشاعت (۴) مسلم معاشرے سے خود غرضی اور استبداد کا خاتمہ (۵) علوم دینی کا احیا (۶) علوم عقلیہ کی صحیح ترتیب (۷) دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علما تیار کرنا۔ درس گاہ کی مالی ضروریات کے سلسلے میں مولانا نانوتوی نے ... اصول مقرر کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت وقت اور امرا و اغنیا کے تسلط سے درس گاہ آزاد رہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نظم و نسق کے لیے ایک مجلس شوریٰ ہے۔ مجلس ... مہتمم (رئیس الجامعہ) ہے۔ شیخ الحدیث یا صدر المدرسین کا منصب ... علم و تقویٰ کو ملتا ہے۔ یہاں علم صرف و نحو، ادب، علم المعانی، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، علم الفرائض، علم العقائد، علم الکلام، علم ادب، علم مناظرہ، علم ہیئت اور علم قرات و تجوید کے علاوہ فارسی زبان و ادب اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ... سال کا نصاب ہے۔ اس درس گاہ کا دورۂ حدیث کی بڑی شان ہے۔ ... دراز کے طالب علم مبادیات کی تکمیل کے بعد شریک ہوتے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد میں ... دینی ادارے موجود تھے۔ دہلی کے ادارے تفسیر و حدیث کی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ لکھنؤ فقہ پر اور خیرآباد علم الکلام اور منطق کے لیے مخصوص تھا۔ دیوبند ان ... امتزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ دیوبند میں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں سے طلبہ آتے رہتے ہیں۔ درس گاہ میں پندرہ سو طلبہ کے قیام کا بندوبست ہے۔ دارالعلوم کی عمارت ... ایک مسجد، ایک کتاب خانے اور حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کے متعدد درسی کمروں پر مشتمل ہے۔ دیوبند کے کتب خانہ کا شمار ہندوستان میں مخطوطات کے سب سے بڑے کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں ستر ہزار کتابیں موجود ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی تین واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ دیوبندی فقہی مذاہب میں سے امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں۔ قرآن و سنت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اکثر علمائے دیوبند روحانی مسلک

کے لحاظ سے حاجی امداد اللہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں جو نقشبندی، چشتی، قادری اور سہروردی چاروں سلسلوں سے منسلک تھے۔ عقائد و علم الکلام میں امام ابوالحسن اشعریؒ کے مقلد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و عظمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ کثرت درود کو عین ثواب سمجھتے ہیں۔ دین میں غلو اور انتہا پسندی کے بجائے وہ اعتدال کے قائل اور عامۃ المسلمین کی تکفیر سے اجتناب و احتیاط لازم سمجھتے ہیں۔

دیوبندی علمائے کرام نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ آزادی ہند کے لئے ریشمی رومال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے منظم کی تھی۔ تحریک خلافت میں بھی دیوبندیوں نے بڑا حصہ لیا۔ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں دیوبندی دو حصوں میں منقسم تھے ایک حصے نے قیام پاکستان کی مخالفت کی اور دوسرے حصے نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع وغیرہ نے مسلم لیگ کے موقف کی حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد دیوبندی علماء کا علمی و روحانی مرکز بھارت میں رہ گیا اس لئے پاکستان کے مختلف مقامات پر علمی مراکز قائم کئے گئے۔ جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدینہ لاہور، مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار خاں، دارالعلوم کھڈہ کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور، مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی کی درسگاہ ہیں۔ دیوبندی مکتب فکر کی علمی یادگار ان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ط
ڈ

ڈوزی راتن ہارٹ

(۱۸۲۰ء۔۔۔۔۱۸۸۳ء) ہالینڈ کا نامور مؤرخ اور مستشرق۔ علمی حلقوں میں پروفیسر ڈوزی کی شہرت "تاریخِ مسلمانانِ اندلس" پر موقوف ہے جو اس نے فرانسیسی زبان میں چار جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے۔ مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی نے "کارنامۂ اندلس" کے نام سے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ڈوزی نے عربی کی ایک لغت بھی مرتب کی ہے جو نہایت مفید کتب مراجع میں شمار ہوتی ہے۔ اس نے جن عربی تواریخ کے متن تحقیق و تصحیح کے بعد شائع کیے ان میں سے ذیل کے قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) تاریخ بنی زیان ملوک تلمسان (۲) شرح قصیدہ ابن عبدون (۳) عبدالواحد المراکشی و المعجب فی تلخیص اخبار المغرب (۴) ابن عذاری، البیان المغرب فی اخبار المغرب (۵) کلام کتاب العرب فی دولتہ العبادین (۶) المقری، نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب۔

ڈھاکہ

بنگلہ دیش کا دارالحکومت۔ یہ سمندر سے تقریباً ایک سو میل دور آبی شاہراہوں کے سرے پر واقع ہے۔ مشہور دریائی بندرگاہ نرائن گنج یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ڈھاکہ کا رقبہ ۲۸ مربع میل اور آبادی (۱۹۶۱ء) ۵٫۶۰٫۰۰۰ ہے۔ ۱۶۰۸ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت یہ مغلوں کا عارضی فوجی مستقر تھا۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے صوبۂ بنگالہ کا نیا دارالحکومت بن گیا۔ شہنشاہ جہانگیر کے نام پر اس کا نام جہانگیر آباد رکھا گیا۔ سترھویں صدی عیسوی میں اسے اراکانی مگھوں اور پرتگالی بحری قزاقوں کی یلغاروں کا سدِباب کرنے کے لیے دریائی قلعہ بندیوں سے محفوظ کیا گیا۔ یہ قلعہ بندیاں منشی گنج، نرائن گنج اور سونا کنڈا میں اب بھی موجود ہیں۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا بھائی شاہ شجاع اور شہنشاہ کا بیٹا محمد اعظم یہاں کے صوبیداروں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ دوسرے صوبیداروں میں سے میر جملہ کی شہرت توفتح آسام کی بدولت ہوئی البتہ شائستہ خاں کی شہرت کے اسباب میں اس کی پچیس سالہ خدمات اور چاٹگام کی تسخیر (۱۶۶۶ء) شامل ہیں۔ ۱۷۰۶ء میں دارالحکومت مرشد آباد منتقل ہوگیا۔ اس کے باوجود ڈھاکہ کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ ململ سازی کی صنعت کا بدستور مرکز بنا رہا۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں یہاں پرتگیزیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے کئی کارخانے قائم کیے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک نیا صوبہ بنایا گیا تو ڈھاکہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ ۱۹۱۲ء میں یہ انتظامی اقدام ہندوؤں کی مخالفت کی بنا پر کالعدم ہوگیا۔ ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈھاکہ مشرقی بنگال (بعد ازاں مشرقی پاکستان) کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ بنگلہ دیش کا دارالحکومت بنا۔

ڈھاکہ گھریلو صنعتوں کے لیے مشہور ہے نفیس ململ کے لیے ڈھاکہ کی شہرت ہمیشہ مسلمہ رہی ہے۔ یہ سوتی ساڑھیوں اور پٹ سن کے قالینوں کی صنعت کا مرکز ہے ڈھاکہ وسائل نقل و حمل کا بھی مرکز ہے یہاں کی بندرگاہ سے ستیہ ملک کے مختلف حصوں کو جاتے ہیں۔ ڈھاکہ کی قدیم عمارتوں میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں، بڑا کٹڑا، چھوٹا کٹڑا، حسینی دالان قلعہ اورنگ آباد اور بی بی پری کا مقبرہ۔ یہاں سات سو سے زائد مسجدیں ہیں جن میں سے سات گنبد مسجد اور ستارہ مسجد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جدید عمارتوں میں ہائی کورٹ ڈھاکہ یونیورسٹی، سکرٹریٹ، کرزن ہال، گورنمنٹ ہاؤس، زراعتی انسٹی ٹیوٹ، پبلک لائبریری، ڈھاکہ سٹیڈیم اور عجائب گھر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کا عجائب گھر عہد مغلیہ کے اسلحہ اور زیورات، بت تراشی اور مصوری کے نادر نمونوں، قدیم سکوں، مخطوطات، پارچات اور دیگر فنی نوادر کے لیے خاص شہرت کا حامل ہے۔

ذ

ذات الرقاع، غزوہ

غزوہ بنو نضیر (ربیع الاول ۴ھ) کے بعد آنحضرت صلعم مدینہ میں مقیم تھے کہ اوائل جمادی الاوّل میں یہ خبر ملی کہ بنی غطفان کے قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ نبی کریم صلعم چار سو (یا سات سو) صحابہؓ کے ہمراہ نجد کی طرف روانہ ہوئے۔ نجد پہنچے تو بنی غطفان کی ایک بڑی جمعیت مقابلہ پر آئی مگر جنگ نہ ہوئی۔ واپسی پر آنحضرت صلعم اپنی تلوار ایک درخت کے ساتھ لٹکا کر خود سایہ میں استراحت فرمانے لگے۔ ایک مشرک دعثور بن حارث آیا اور تلوار اتار کر اسے حرکت دینے لگا۔ اس نے آنحضور صلعم سے پوچھا کہ بتلایئے اب میرے ہاتھ سے آپ کو کون بچائے گا۔ آپؐ نے فرمایا "خدا بچانے والا ہے"۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت جبریلؑ نے اس مشرک کے سینہ پر ایک گھونسہ رسید کیا جس کی وجہ سے تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ آنحضرت صلعم نے تلوار اٹھا کر فرمایا: اب بتلا میرے ہاتھ سے تجھے کون بچا سکتا ہے۔ اس نے عرض کیا کوئی نہیں۔ رسول اللہؐ نے اس مشرک کو معاف کر دیا۔ دعثور بن حارث اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ یہاں سے چل کر آنحضرت صلعم ایک گھاٹی میں ٹھہرے حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت عبادؓ بن بشر کو درّہ کی پاسبانی پر مقرر فرمایا دونوں صحابہ نے طے کیا کہ پہلی نصف شب حضرت عبادؓ اور نصف آخر میں عمارؓ بن یاسر پاسبان ہوں گے۔ پاسبانی کے دوران میں حضرت عبادؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک مشرک نے انھیں تیر مارا۔ آپ نے جسم سے تیر نکال کر پھینک دیا اور نماز پڑھتے رہے۔ کافر نے یکے بعد دیگرے تین تیر مارے۔ آپ نے تیر نکال کر نماز جاری رکھی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت یاسرؓ کو جگایا۔ آپ کے جسم کو خون میں لت پت دیکھ کر حضرت عمارؓ نے کہا کہ آپ نے مجھے پہلے ہی تیر پر کیوں نہ بیدار کیا حضرت عبادؓ نے فرمایا کہ میں ایک سورت پڑھ رہا تھا۔ یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کو پورا نہ کروں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ اس غزوہ کو ذات الرقاع اس لیے کہتے ہیں کہ چلتے چلتے ہمارے پیر پھٹ گئے تھے اور ہم نے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لیے تھے اس لیے اسے غزوہ ذات الرقاع یعنی چیتھڑوں والا غزوہ کہنے لگے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ذات الرقاع ایک پہاڑ کا نام ہے۔

ذات السلاسل، جنگ

یہ جنگ خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں (محرم ۱۲ھ) لڑی گئی۔ مسلمان پہلی مرتبہ عجم کی عظیم الشان سلطنت کے خلاف صف آرا ہوئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید جنگ یمامہ سے فارغ ہوئے تو ان کے پاس دو ہزار سپاہی رہ گئے تھے۔ دربارِ خلافت سے حکم ملا کر خسرو عجم ہرمز سے مقابلہ کرو۔ ہرمز نے عراق عرب میں مسلمانوں کی زندگی تنگ کر رکھی تھی۔ حضرت خالدؓ نے جواب بھیجا کہ میرے پاس فوج کم ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے قعقاعؓ بن عمرو تمیمی کو روانگی کا حکم دیا اور فرمایا جس لشکر میں ان جیسا ایک جانباز بھی ہو اسے اور کیا چاہیے۔ ادھر حضرت خالدؓ نے قبائل مضر اور ربیعہ سے کچھ فوج اکٹھی کی۔ مثنیٰ بن حارثہ بھی کچھ سپاہیوں کے ساتھ آن ملے۔ اس طرح اسلامی لشکر کی تعداد دس ہزار سے زائد ہو گئی۔ جنگ شروع ہوئی مسلمانوں نے دیکھا کہ ہاتھی گھوڑے اور سپاہ ٹھٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح سامنے ہیں۔ ہاتھیوں کا رسالہ پہاڑ بن کر کھڑا تھا۔ مسلمانوں کو جنگ میں ہاتھیوں سے سابقہ پیش نہ آیا تھا۔ ہرمز نے سب سے پہلے حضرت خالدؓ کو مقابلے کے لیے للکارا اور نتیجتاً حضرت خالدؓ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ تھوڑی دیر مقابلے کے بعد ہرمز کی ایرانی فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ اس لڑائی میں ایرانی فوج کے ایک حصے نے اپنے پاؤں میں زنجیریں باندھ لی تھیں تاکہ مقابلہ میں میدان سے بھاگ نہ سکیں۔ اس لیے اسے جنگ ذات السلاسل کہتے ہیں۔

ذبیحہ

کوئی جانور یا جاندار جسے اسلامی شریعت کے مطابق ذبح کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا ہو۔ شریعت کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق ذبح کرنے کو ذکات (ذکاۃ، تزکیہ) کہتے ہیں۔ ذکات کی متعدد صورتیں ہیں: (۱) ذبح (۲) نحر (۳) عقر (۴) کوئی اور جائز طریقہ۔ احناف کے نزدیک ذکات شرعی کی دو قسمیں ہیں: (۱) ذکات الاختیار (۲) ذکات الضرورت۔ قسم اوّل سے مراد ذبیحہ کو تیز آلے سے ذبح کرنا ہے۔ اس کے بارے میں پوری احتیاط بروئے کار لائی جاتی ہے۔ پہلی احتیاط یہ کہ مذبوح کو کم سے کم تکلیف ہو۔ دوسری یہ کہ خون کا بہاؤ پورا ہو۔ گلے کو بالکل کاٹ دینے کی بھی ممانعت ہے۔ تیسری احتیاط یہ ہے کہ ذبح کرنے والے کے ارادے میں ظالمانہ رجحان پیدا نہ

ہونے پاتے۔ اسی لیئے حکم دیا گیا ہے کہ وہ ذبح کرنے کے دوران میں خدا کا نام لے اور اسے یاد کرے۔ بسم اللہ یا اللہ اکبر کہنا مستحب ہے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ذبح کرنے والا مسلم یا اہل کتاب میں سے ہو۔ مرجح یہ ہے کہ جانور کو بائیں پہلو پر اس طرح لٹایا جائے کہ جانور کا رُخ قبلہ کی طرف ہو۔ سب مذاہب نے ضروری قرار دیا ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے لیئے آلہ تیز ہونا چاہیئے تاکہ وہ غیر ضروری اذیت سے محفوظ رہے۔ بہت سے جانوروں کو ایک ہی دفعہ اکٹھا ذبح کرنا مکروہ ہے۔ یہ بھی مکروہ ہے کہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے جانور کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔

ذکر

اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: "اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو (احزاب: ۴۱) اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات میں ذکر کا حکم آیا ہے۔ حضرت ابی ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا کہ وہ میرے ساتھ گمان کرتا ہے اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میرا مجمع میں ذکر کرتا ہے تو میں اُس مجمع سے بہتر یعنی فرشتوں کے مجمع میں تذکرہ کرتا ہوں اور اگر بندہ میری طرف ایک بالشت متوجہ ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں (بخاری، مسلم، ترمذی)۔ رسول اکرم صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس فرشتوں کی ایک جماعت ایسی ہے جو مجالس ذکر کی تلاش میں گھومتی پھرتی رہتی ہے اور جب کبھی وہ فرشتے مجلس ذکر کو پاتے ہیں تو اصحاب مجلس کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں حتیٰ کہ زمین اور پہلے آسمان کے درمیان کی تمام کائنات ان سے بھر جاتی ہے اور جب وہ منتشر ہوتے ہیں تو فرشتے آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اللہ عزوجل اپنے علم کے باوجود ان سے پوچھتا ہے تم کہاں سے آئے؟ تو وہ کہتے ہیں ہم روئے زمین میں تیرے ایسے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو تیری تسبیح، تکبیر، تہلیل اور حمد بیان کر رہے تھے (مسلم)۔ نبی اکرم صلعم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا۔ ان دونوں کی مثال زندہ اور مُردہ کی سی ہے کہ ذکر کرنے والا زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ (مسلم، بخاری، مشکوٰۃ)

مشہور محدّث حافظ ابن قیمؒ نے اپنے رسالہ "الوابل الصیّب" میں ذکر کے فضائل یہ بیان کئے ہیں: (۱) ذکر شیطان کو دفع کرتا ہے اور اس کی قوت کو توڑتا ہے (۲) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے (۳) دل سے فکر و غم کو دور کرتا ہے (۴) دل میں فرحت سرور اور انبساط پیدا کرتا ہے (۵) بدن کو اور خاص طور پر دل کو قوت بخشتا ہے۔ (۶) چہرے اور دل کو منور کرتا ہے (۷) رزق کو بڑھاتا ہے (۸) ذکر کرنے والے کو ہیبت اور حلاوت کا لباس پہناتا ہے (۹) اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے (۱۰) ذکر سے مراقبہ نصیب ہوتا ہے (۱۱) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع پیدا کرتا ہے (۱۲) اللہ کا قرب پیدا کرتا ہے (۱۳) معرفت کا دروازہ کھولتا ہے (۱۴) اللہ کی ہیبت اور بڑائی دل میں پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری پیدا کرتا ہے (۱۵) اللہ کی بارگاہ میں ذکر کا سبب بنتا ہے (۱۶) دل کو زندہ کرتا ہے (۱۷) دل اور روح کی روزی ہے (۱۸) دل کو صاف کرتا ہے (۱۹) لغزشوں اور خطاؤں کو دور کرتا ہے (۲۰) اللہ کے عذاب سے نجات کا ذریعہ ہے (۲۱) سکینہ اور رحمت کے اترنے کا سبب ہے (۲۲) اس کی برکت سے زبان غیبت، چغل خوری، جھوٹ، بدگوئی اور لغوگوئی سے محفوظ رہتی ہے۔ (۲۳) ذکر کی وجہ سے ذکر کرنے والا بھی سعید (نیک بخت) ہوتا ہے اور اس کے آس پاس بیٹھنے والا بھی (۲۴) قیامت کے دن حسرت سے محفوظ رکھتا ہے (۲۵) دوام ذکر سے اپنے نفس کو بھلا دینے کا سبب ہوتا ہے (۲۶) ذکر آدمی کی ترقی کرتا رہتا ہے (۲۷) ذکر کا نور دنیا میں بھی ساتھ رہتا ہے اور آخرت میں بھی (۲۸) اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا دروازہ کھل جاتا ہے (۲۹) ذکر کرنے والا بغیر مال کے غنی ہو جاتا ہے۔ (۳۰) دل کو نیند سے جگاتا ہے (۳۱) ذکر غلاموں کے آزاد کرنے، مالوں کے خرچ کرنے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے برابر ہے۔ (۳۲) دل کی سختی دور ہوتی ہے۔ (۳۳) ذکر نعمتوں کو کھینچنے والا اور عذاب کو ہٹانے والا ہے (۳۴) ذکر کرنے والے پر اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا ہوتی ہے (۳۵) ذکر پر مداومت (پابندی) کرنے والا جنت میں ہنستا ہوا داخل ہوگا (۳۶) ذکر نفل عبادات کا قائم مقام ہے۔ (۳۷) ذکر دوسری عبادات کے لیے معین و مددگار ہے (۳۸) دل سے خوف و ہراس دور ہو جاتا ہے (۳۹) ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ سچا بتاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں (۴۰) ذکر جہنم کے لیے آڑ ہے (۴۱) ذکر کرنے والے کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں (۴۲) ذکر کی کثرت نفاق سے بری ہونے کی سند ہے (۴۳) ذکر کرنے والے کسی چیز میں بھی ذکر کے برابر لذت نہیں پاتے (۴۳) ذکر کرنے والوں کا چہرہ دنیا میں پر رونق اور آخرت میں پُر نور ہوگا۔ (۴۴) کثرت سے ذکر کرنے والے کے گواہ بھی کثرت سے ہونگے۔

ذکوانؓ بن عبد قیس

رسول اللہ کے صحابی۔ سب سے پہلے انصاری جو اسلام لائے۔ آپ اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ اکٹھے مکہ جا رہے تھے کہ نبی کریم صلعم کے متعلق سنا۔ آستانۂ نبوت پر حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور مدینہ واپس آ گئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ دونوں عقبہ میں حاضر ہوئے تھے اور دیگر صحابہ کے ساتھ ہی مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ آپ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ ابو الحکم بن اخنس ثقفی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر ابو الحکم پر حملہ کیا۔ اور اس کی آدھی ران کاٹ دی۔ پھر گھوڑے سے گرا کر ہلاک کر دیا

ذمّہ

وہ ذمہ داری جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال، عزت اور حرمت کے تحفظ کے سلسلے میں قبول کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو ذمّی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے۔ اسلامی قانون میں غیر مسلم رعایا کی دو اقسام تجویز ہوئی ہیں اول وہ لوگ جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعے اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں ایسے ذمیوں کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو صلح نامے میں درج ہیں۔ رسول اللہ صلعم کا فرمان ہے: "اگر تمہیں کسی قوم سے جنگ پیش آ جائے اور تم ان پر غالب آ جاؤ اور وہ تم سے صلح نامہ طے کرے تو تم پر ان شرائط کا بجا لانا فرض ہے اور اس سے بڑھ کر ان پر کوئی حق نہیں رکھتے (ابو داؤد)۔ ابو داؤد ہی کی حدیث ہے کہ "جو شخص کسی معاہدہ پر ظلم کرے گا یا اس کے پورے حقوق نہیں دے گا یا اس کی استطاعت سے بڑھ کر اس پر بار ڈالے گا یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی چیز وصول کرے گا تو میں اس کے خلاف آخرت میں خود مستغیث بنوں گا۔" دوسرے وہ لوگ جنہیں بزور شمشیر فتح کیا گیا ہو۔ ان لوگوں کی طرف سے بیگانگی، شورش، بغاوت کے امکانات کو ختم کرنے کے لیئے قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور یہ حکومت کا فرض ہے کہ اپنی مملکت میں

امن وسلامتی کی فضا قائم رکھنے کے لیے حسب ضرورت قوانین بناسکے۔

عمومی رنگ میں جو کم سے کم حقوق اسلام نے ذمیوں کو دیئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) ذمیوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ جو مذہب چاہیں اختیار کریں ان کے مذہب سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ وہ اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے میں آزاد ہونگے۔ ان کے عبادت خانے منہدم نہیں کیے جائیں گے اور مذہبی ضرورت کے لیے وہ نئی عبادت گاہیں بھی بنا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "دین کے معاملے میں کسی بھی شخص کے ساتھ جبر و اکراہ کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ ہدایت گمراہی کے مقابلے میں بالکل واضح اور عیاں ہے (بقرہ: ۲۵۶)۔ ارشاد ربانی ہے" اگر اللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ذریعے دفاع کا بندوبست نہ کرتا رہتا تو یقیناً نصاریٰ کے صوامع، گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت ذکر کیا جاتا ہے منہدم کر دی جاتیں (الحج: ۴۰)۔ چنانچہ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ پرانے معبد قائم رکھے اور ذمیوں کو نئے معبدوں کی اجازت دی بلکہ معبدوں کے متعلق تمام عہدے اور تمام جائدادیں بحال رکھیں جو ان معبدوں کے لیے وقف تھیں۔ پجاریوں اور مجاوروں کے روزینے بھی اسی طرح جاری رکھے گئے (۲) ذمیوں کے سلسلے میں اسلامی حکومت دوسری ذمہ داری یہ لیتی ہے کہ جب کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو حملہ آور کی مزاحمت کی جائے گی اور ذمیوں کی حفاظت کی جائے گی۔ (۳) ذمی کی جان محفوظ رہے گی اور اس بارے میں اس کی حیثیت قانوناً دوسرے شہریوں کے برابر ہوگی۔ حقوق میں سے سب سے مقدم قصاص کا حق ہے۔ (۴) ذمی کا مال محفوظ رہے گا اور اس کے مال و جائداد کے حقوق مسلمان شہریوں کے برابر ہونگے۔ آغاز اسلام ہی میں یہ مسئلہ طے پا گیا تھا کہ مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعایا کی مقبوضہ زمینیں انہی کے قبضہ میں رہیں گی (امام ابو یوسف: کتاب الخراج) امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ حکومت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ذمیوں سے ان کی زمین چھین لے۔ وہ زمین ان کی ملک ہے۔ انھیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی اور وہ اس کی خرید و فروخت کے مجاز ہیں (۵) ذمیوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے گی۔ اسلامی ریاست میں مسلمان اور ذمی شہری حقوق کے مسئلے میں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذمیوں کے متعلق کسی قسم کا تحقیر کا لفظ استعمال کرنا ناپسند خیال کیا جاتا ہے۔

آنحضور صلعم نے ایک ارشاد میں نجران کے ذمیوں کو جو حقوق دیئے اس کے الفاظ تاریخوں میں اس طرح درج ہیں (ترجمہ) "نجرانیوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ داری دی جاتی ہے کہ ان کی جان، مذہب، زمین اور اموال محفوظ رکھے جائیں گے یہ معاہدہ ان لوگوں پر بھی اطلاق پائے گا جو اس وقت، اس موقع پر موجود نہیں۔ ان کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ ان کے تجارتی قافلوں اور وفود وغیرہ کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کے کسی حق کو تلف نہیں ہونے دیا جائے گا۔ کسی اسقف کو اس کے عہدے سے برطرف، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے بے دخل اور گرجا کے متولی و ناظم کو اس کے فرائض سے منع نہیں کیا جائے گا۔ انھیں زمانۂ جاہلیت کے جرائم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ان پر عشر (ٹیکس) عائد نہیں ہوگا اور نہ فوج ان کے علاقے میں داخل ہوگی" (امام ابو یوسف، کتاب الخراج، فتوح البلدان)

اسلام کا اصول حکمرانی یہ ہے کہ ہر شخص کو بوقت ضرورت فوجی خدمت کے لئے بلایا جا سکتا لیکن ذمیوں کے ساتھ یہ رعایت ہے کہ فوجی خدمت ان کے لئے لازمی نہیں۔ اس کے بدلے ان سے جزیہ کی معمولی رقم لی جاتی ہے۔ کمزور، بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار اور بے روزگار لوگوں کو جزیہ سے مستثنیٰ ٹھہرایا گیا ہے۔ جزیہ ذمیوں کے جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں ہوتا ہے۔

ذوالحجہ

عربی، اسلامی، قمری تقویم کے بارھویں مہینے کا نام۔ اسلامی عبادات میں سے حج اسی ماہ کی نو تاریخ کو ادا کیا جاتا ہے اور اس کی دسویں تاریخ کو عیدالاضحیٰ (عید قربان) ہوتی ہے۔

ذوالخلصہ

وہ بت، جس کی زمانۂ جاہلیت میں قبائل دوس، خثعم، بجیلہ، ازدالسرات اور تبالہ کے عرب پوجا کرتے تھے۔ علاماتِ قیامت کی ایک حدیث میں اس بت کا ذکر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک قبیلہ دوس کی عورتیں ذوالخلصہ کے گرد پھر نہ جمع ہو جائیں گی اور اس کی اسی طرح پوجا نہ کریں گی جیسی پہلے زمانے میں کی جاتی تھی" یہ بت ایک سفید پتھر تھا جس پر تاج ایسی ایک شکل منقوش تھی۔ یہ تبالہ میں العبلاء کے مقام پر تھا۔ یہ مقام مکہ اور یمن کے درمیان مکہ سے تقریباً ۱۱۹ میل کے فاصلے پر تھا (ابن الکلبی: کتاب الاصنام)۔ بت پرست اسے بیت اللہ کے مقابلے میں کعبۃ الیمانیہ کہتے تھے (ابن سعد) جب اسلام پھیلا تو حضرت جریر بن عبداللہ البجلی نے اس بت کو اکھاڑ پھینکا۔ (کتاب الاصنام)

ذوالجناح

سید الشہداء حضرت امام حسین بن علیؓ سے منسوب گھوڑا۔ اہل تشیع ہر سال دس محرم کو یوم عاشورہ سوگ کے طور پر مناتے ہیں۔ اس روز ذوالجناح نکالا جاتا ہے خوبصورت اور سجائے ہوئے گھوڑے پر جگہ جگہ تیر باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ذوالجناح کو امام حسینؓ کی سواری کا مظہر قرار دیا جاتا ہے۔

ذوالفقار

ایک مشہور تلوار جو آنحضرت صلعم کو غزوۂ بدر میں مال غنیمت میں ملی تھی۔ اس سے پہلے ذوالفقار کا مالک ایک مشرک عاص بن منبہ تھا جو غزوۂ بدر میں مارا گیا۔ اس کا ذکر کئی احادیث میں آیا ہے۔ ذوالفقار کی وجہ تسمیہ میں کہا گیا ہے کہ اس تلوار میں دندانے یا کھدی ہوئی لکیریں تھیں۔ آنحضرت صلعم نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپ کی تلوار ذوالفقار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو اس کی تعبیر آپ نے یہ فرمائی کہ آپ کی ذات پر کوئی تکلیف آنے والی ہے اور اس سے مراد وہ تکلیف لی گئی جو غزوۂ احد میں آپ کو پیش آئی (البلاذری: انساب الاشراف)۔ تلوار اگرچہ نبی کریم صلعم کی تھی لیکن حضرت علیؓ کے پاس رہنے کے بعد خلفائے عباسیہ کے ہاتھ لگ گئی۔ تاہم "ذوالفقار" حضرت علیؓ کی طرف منسوب رہی ہے اور ایک علوی نشان سمجھی جاتی ہے۔

ذوالقدر

ایک ترکمان خاندان جس نے دو صدیوں تک (۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء — ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء) البستان سے مرعش و ملطیہ تک کے علاقے پر حکومت کی۔ یہ حکمران پہلے مصر کے ممالیک اور بعد میں عثمانی سلاطین کے باجگزار رہے۔ اس خاندان کا بانی زین الدین قرہ جہ بن ذوالقدر تھا۔ ایلخان ابو سعید کی وفات کے بعد جو ابتری پھیلی، اس سے فائدہ اٹھا کر قرہ جہ نے البستان پر قبضہ کر کے مملوک سلطان سے مسند حکومت حاصل کر لی۔

اس کی باقی عمر اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کشمکش میں اور مصر کی سیادت کے خلاف بغاوتوں میں گزری۔ اس نے حلب کے والی سے شکست کھائی اور اس کے حریف محمد بن ارتنہ نے اسے مصریوں کے حوالے کر دیا۔ مصریوں نے ۱۳۵۲ء میں اسے سزائے موت دی۔ قرہ جہ کے فرزند اور جانشین خلیل نے اپنے والد کے ساتھ غداری کا انتقام لینے کے لیے ارتنہ اوغلو سے خرپوت چھین لیا۔ ۱۳۸۱ء میں مصری افواج نے خلیل کو البستان سے نکال دیا۔ انجام کار ۱۳۸۶ء میں سلطان برقوق نے اسے قتل کروا دیا۔ ترکمانوں نے خلیل کے چھوٹے بھائی سولی کو جانشین تسلیم کر لیا۔ اس نے مصری فوج کو گوکسون کے قریب شکست دی۔ شام کے والیوں نے برقوق کے خلاف بغاوت کی تو سولی نے ان کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیجیں۔ ۱۳۹۱ء میں اس نے سلطان برقوق کی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۳۹۸ء میں سلطان برقوق نے سولی کو قتل کروا دیا۔ عین اس موقع پر عثمانی سلطان بایزید اول نمودار ہوا اس نے ۱۳۹۹ء میں خلیل کے لڑکے ناصر الدین محمد کو حاکم بنا دیا۔ اپنے طویل عہدِ حکومت میں محمد نے نہ صرف مصر سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات قائم رکھے بلکہ عثمانی سلطنت سے بھی دوستانہ تعلقات استوار کر لیے۔ ۱۴۱۹ء میں محمد نے قرہ مان اوغلو کے خلاف مصر کی تادیبی مہم میں حصہ لیا اور اسے شکست دی۔ قرہ مان اوغلو کو گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا۔ ان خدمات کے صلہ میں سلطان مصر المؤید نے قیصریہ اس کے حوالے کر دیا۔ ۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ میں اس نے وفات پائی۔ محمد کے فرزند سلیمان کا عہدِ حکومت (۸۴۶ھ ـــ ۸۵۸ھ) سکون سے گزرا۔ ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء میں سلیمان کی بیٹی کی شادی آئندہ سلطان محمد ثانی سے کر دی گئی۔ سلیمان کے فرزند ملک ارسلان کے عہدِ حکومت (۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء ـــ ۸۷۰ھ/۱۴۶۵ء) میں ریاست کو اوزون حسن کی طرف سے خطرہ لاحق ہوا تو اس نے خرپوت پر قبضہ کر لیا۔ عثمانیوں اور مصریوں کی سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں۔ ارسلان کے بھائی شاہ بداق نے مملوک سلطان خوشقدم کے ایما پر سازش کر کے ملک ارسلان کو قتل کر دیا۔ اس کی جگہ شاہ بداق تخت نشین ہوا۔ محمد ثانی نے ملک ارسلان کے دوسرے بھائی شاہ سوار کو اس کے سارے آبائی علاقے پر والی بنا دیا ۔ شاہ سوار نے شاہ بداق کو نکال دیا اور اتنی قوت پکڑی کہ محمد ثانی کی حمایت سے بھی آزاد ہو گیا۔ مصری اسے گرفتار کر کے قاہرہ لے گئے اور ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں اسے قتل کر دیا۔ شاہ بداق پھر سے حاکم بنا۔ اس کے ایک اور بھائی علاء الدولہ کی بیٹی کی شادی شاہزادہ بایزید سے ہو چکی تھی (اسی کے بطن سے سلطان سلیم اوّل پیدا ہوا)۔ علاء الدولہ نے محمد ثانی سے حمایت کی درخواست کی۔ ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں شاہ بداق کو نکال دیا گیا۔ جب سلطان سلیم اول نے شاہ اسمٰعیل پر حملہ کیا تو علاء الدولہ نے عثمانی فوج کو کمک دینے سے انکار کر دیا۔ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں عثمانی فوجوں نے حملہ کر کے علاء الدولہ کو قتل کر دیا۔ علاء الدولہ کی جگہ علی بیگ جانشین ہوا۔ اس نے سلیم اول کے حملہ مصر کے وقت خوب نام پیدا کیا۔ فرہاد پاشا نے سلیم اول سے مل بھگت کر کے علی کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے ساتھ خاندانِ ذوالقدر کا دو صد سالہ عہدِ حکومت اختتام کو پہنچا۔

ذوالقرنین

عظیم فرمانروا، زبردست فاتح اور عظیم الشان ذرائع کا مالک ۔ ذوالقرنین کا ذکر قرآن مجید میں سورہ کہف میں آیا۔ اس سے پانچ مختلف شخصیتوں کی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے۔ (۱) یمن کے ملوک حمیر کے سلسلے کا ایک طاقتور بادشاہ جس کا نام الصعب بن قرین بن الہمال بیان کیا جاتا ہے (۲) ملوک حیرہ کے خاندان لخم کا فرمانروا منذر بن امرء القیس المعروف بہ منذر الاکبر (۳) مشہور یونانی فاتح سکندر بن فیلقوس۔ اسے اکثر مؤرخین اور مفسرین نے قرآنی ذوالقرنین کا مصداق بتایا ہے۔ امام رازیؒ نے جزم و یقین کے ساتھ سکندر یونانی ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ مؤرخوں میں طبری اور ابن ہشام نے بھی سکندر یونانی ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ (۴) خورس بانی سلطنت ایران۔ اس کے نام مختلف زبانوں میں سائرس، کوروش اور کیخسرو آئے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے اسے قرآنی ذوالقرنین کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ ابن کثیر نے ایک اور سکندر کا نام لیا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا معاصر، موحد اور صاحب ایمان تھا اور اس مشہور سکندر یونانی سے دو ہزار سال قبل گزرا ہے۔ تاریخ میں اس سکندر کا ذکر نہیں ملتا۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے: "اور اے محمدؐ یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہو میں اس کا کچھ حال تم کو سناتا ہوں۔ ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سرو سامان کیا۔ حتیٰ کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے سورج کو کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا (ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل) وہاں اسے ایک قوم ملی ہم نے کہا اے ذوالقرنین تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔ اس نے کہا جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے۔ پھر اس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔ یہ حال تھا ان کا اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اسے ہم جانتے ہیں۔ پھر اس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا (کاکیشیا کے پہاڑی سلسلے) تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔ ان لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟ اس نے کہا جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے تم بس محنت سے میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لادو۔ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ۔ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ ہو گئی تو اس نے کہا لاؤ اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا۔ (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آ سکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لئے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (الکہف آیت ۸۳ تا ۹۸)

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ نزول قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحین گزرے ہیں ان میں سے خورس ہی کے اندر "ذوالقرنین" کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں لیکن تعین کے ساتھ اسی کو ذوالقرنین قرار دینے کے لیے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خورس ہے خورس ایک ایرانی فرمانروا تھا جس کا عروج ۵۴۹ ق م کے زمانے میں شروع ہوا۔ اس نے چند سال کے عرصے میں میڈیا (الجبال) اور لیڈیا (ایشیائے کوچک) کی سلطنتوں کو مسخر کرنے کے بعد ۵۳۹ ق م میں بابل کو بھی فتح کر لیا جس کے بعد کوئی طاقت اس کے راستے میں مزاحم نہ رہی۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ سندھ اور صغد (موجودہ ترکستان) سے لے کر ایک طرف مصر اور لیبیا تک اور دوسری طرف تھریس اور مقدونیہ تک وسیع ہو گیا اور شمال میں اس کی سلطنت قفقاز (کاکیشیا) اور خوارزم

تک پھیل گئی۔ عملاً اس وقت کی پوری مہذب دنیا اس کی تابع فرمان تھی۔

ذوالقرنین کی آہنی دیوار قفقاز کے علاقہ داغستان میں دربند اور داریال کے درمیان بنائی گئی تھی۔ قفقاز اس ملک کو کہتے ہیں جو بحیرۂ اسود اور بحیرہ خزر کے درمیان واقع ہے۔ اس ملک میں بحیرۂ اسود سے داریال تک تو نہایت بلند پہاڑ ہیں اور ان کے درمیان اتنے تنگ درے ہیں کہ ان سے کوئی بڑی حملہ آور فوج نہیں گزر سکتی۔ البتہ دربند اور داریال کے درمیان جو علاقہ ہے اس میں پہاڑ زیادہ بلند نہیں ہیں اور کوہستانی راستے خاصے وسیع ہیں۔ قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی طرف سے جنوب کی طرف غارت گرانہ حملے کرتی تھیں اور ایرانی فرمانرواؤں کو اسی طرف سے اپنی مملکت پر حملوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ انہی حملوں کو روکنے کے لیے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی جو ۵۰ میل لمبی' ۲۹ فٹ بلند اور دس فٹ چوڑی تھی۔ ابھی تک تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ دیوار ابتداءً کب اور کس نے بنائی تھی مگر مسلمان مورخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدِ ذوالقرنین قرار دیتے ہیں اور اسی کی تعمیر کی جو کیفیت قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔ ابن جریرؒ طبری اور ابن کثیر نے اپنی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہے اور یاقوت نے بھی معجم البلدان میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے آذربائیجان کی فتح کے بعد ۲۲ھ میں سراقہ بن عمرو کو باب الابواب (دربند) کی مہم پر روانہ کیا اور سراقہ نے عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو اپنے مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر آگے بھیجا۔ عبدالرحمٰن جب آرمینیا کے علاقے میں داخل ہوئے تو وہاں کے فرمانروا شہر براز نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے باب الابواب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر شہر براز نے ان سے کہا کہ میں نے ایک آدمی کو سد ذوالقرنین کا مشاہدہ اور اس علاقے کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا تھا وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے عبدالرحمٰن کے سامنے اس شخص کو پیش کیا۔

اس واقعہ کے دو سو برس بعد عباسی خلیفہ واثق (۲۲۷ھ ـ ۲۳۳ھ) نے سدِ ذوالقرنین کا مشاہدہ کرنے کے لئے سلام الترجمان کی قیادت میں پچاس آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی جس کے حالات یاقوت نے معجم البلدان میں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ وفد سامرہ سے تفلیس' وہاں سے السریر' وہاں سے اللان ہوتا ہوا فیلان شاہ کے علاقے میں پہنچا پھر خزر کے ملک میں داخل ہوا اور اس کے بعد دربند پہنچ کر اس نے سدّ کا مشاہدہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مسلمان عام طور پر قفقاز کی اس دیوار ہی کو سدّ ذوالقرنین سمجھتے تھے۔
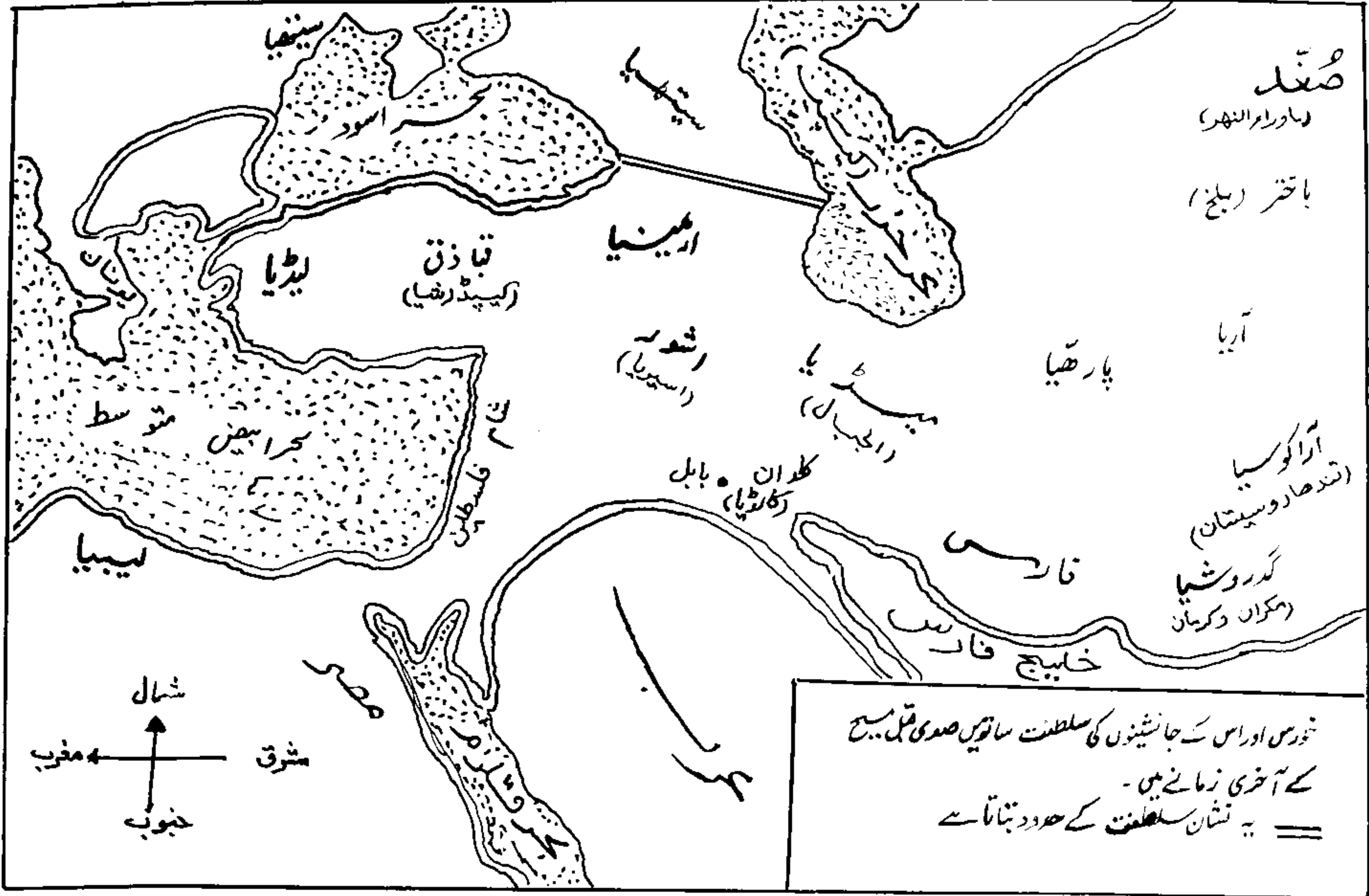
خورس اور اس کے جانشینوں کی سلطنت ساتویں صدی قبل مسیح کے آخری زمانے میں۔
یہ نشان سلطنت کے حدود بتاتا ہے

ذوالقعد

اسلامی ہجری تقویم کا گیارھواں مہینہ جو حرمت والے چار مہینوں اور حج کے مہینوں میں شمار ہوتا ہے۔

ذوالکفلؑ

ایک بزرگ کا لقب جن کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حضرت زکریا کا دوسرا نام ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ حضرت الیاسؑ ہیں۔ کوئی یوشع بن نون کا نام لیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ الیسعؑ ہیں۔ کوئی انھیں الیسعؑ کا خلیفہ بتاتا ہے اور کسی کا قول یہ ہے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بشیر تھا۔ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقی ایلؑ نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری (۵۹۷ ق م) کے زمانے میں نبوت پر سرفراز

ہوئے اور نہر خابور کے کنارے ایک بستی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے۔"

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ "یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایل نبی کی طرف ظاہر کیا ہے۔ لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکے تاہم اگر اس کے لئے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے کیونکہ بائیبل کے صحیفہ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں یعنی صابر و صالح۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بخت نصر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بخت نصر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نوآبادی دریائے خابور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تل ابیب تھا۔ اسی مقام پر ۵۹۴ ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے جبکہ ان کی عمر تیس سال تھی اور مسلسل بائیس سال ایک طرف گرفتار بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کی بیداری کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کار عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال اُن کی بیوی (جنہیں وہ خود منظورِ نظر کہتے تھے) انتقال کر جاتی ہیں لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں اور حزقی ایل اپنا دکھڑا چھوڑ کر اپنی ملت کو خدا کے اُس عذاب سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں جو اس کے سر پر تلا کھڑا تھا۔"

اس سلسلے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا ابوالکلام کی رائے یہ ہے کہ "ذوالکفل" درحقیقت "کپل وستو" کا معرب ہے جو بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کا اصل نام ہے۔

ذوالنون

(۱۸۰ھ/۷۹۶ء ــــ ۲۴۶ھ/۸۶۱ء) ابوالفیض ثوبان بن ابراہیم مصر کے ایک صوفی بزرگ۔ ان کے والد نوبیہ کے رہنے والے تھے۔ ذوالنون نے طب اور کیمیا کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے استاد اور مرشد سعدون مصری تھے ذوالنون نے مکہ مکرمہ اور دمشق کی سیاحت کی۔ آخری عمر میں انھیں گرفتار کر کے بغداد میں قید کیا گیا لیکن بالآخر خلیفہ المتوکل کے حکم سے رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد مصر واپس آ گئے۔ ذوالنون "رئیس الصوفیاء" کہلاتے ہیں۔ سحر اور کیمیا کی چند کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ ان کی بہت سی دعائیں اور بعض اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ روحانی ترقی کے راستے میں نفس امارہ اصل رکاوٹ ہے جسے قابو میں لانے کا طریقہ ریاضت اور نفس کشی ہے۔ سب سے پہلے ذوالنون ہی نے صوفیاء کے عقائد بیان کیے اور معرفت کے حقیقی معنی سمجھائے۔ انھوں نے بتایا کہ معرفت توحید حقیقی کی صفات کے پہچاننے کا نام ہے اور یہ پہچان اولیاء اللہ کا خاصہ ہے جو اپنے دل کے اندر "وجہ اللہ" کا مراقبہ کرتے ہیں اس لئے اللہ انھیں اپنی بابت وہ کشف عطا فرماتا ہے جو دنیا میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا ذوالنون ایک باعمل صوفی تھے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ روح کو منزلِ مقصود کی طرف بلند پروازی میں کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں۔ انھوں نے فنا فی اللہ ہو کر زندگی بسر کرنے کے صوفیانہ تصور کی صراحت بھی کی ہے۔

ذہبی

(۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء ــــ ۷۴۸ھ/۱۳۴۸ء) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز بن عبداللہ الترکمانی الفارقی الدمشقی الشافعی عرب مؤرخ اور عالمِ دین۔ انھوں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ کے مستند علماء کے پاس سب سے زیادہ مدت گزاری ان کے اساتذہ کی تعداد تیرہ سو سے زیادہ ہے۔ تحصیل علم کے بعد دمشق میں حدیث کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں حدیث، فقہ اور تاریخ میں ممتاز حیثیت حاصل تھی وہ دن رات مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ ۷۴۱ھ اور ۷۴۳ھ کے درمیان ان کی بینائی جاتی رہی سیرت نگاروں نے انھیں محدث العصر اور خاتم الحفاظ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان کی تصانیف حدیث میں اور علم الرجال میں بہت مقبول ہوئیں۔ "تاریخ الاسلام" ان کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ تاریخ رسول کریم صلعم کے نسب نامے سے شروع ہو کر ۷۰۰ھ پر ختم ہوتی ہے۔ حدیث کے شعبے میں ان کی تصانیف یہ ہیں: (۱) تذہیب الکمال فی اسماء الرجال (۲) المشتبہ فی اسماء الرجال۔

ر

رابعہ بصری رح

(۹۵ھ/۷۱۴ء — ۱۸۵ھ/۸۰۱ء) بصرہ کی مشہور عارفہ جن کا شمار اولیا میں ہوتا ہے۔ غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ بچپن میں کسی شخص نے انھیں پکڑ کر فروخت کر دیا۔ ان کی پاک باطنی نے انھیں رہائی دلوائی۔ انھوں نے گوشہ نشینی اور تجرد کی زندگی بسر کرنے کے لیے صحرا میں عزلت اختیار کر لی۔ بصرہ میں آئیں تو ان کے گرد معتقدین اور رفقا جمع ہو گئے۔ دان سے دعائے خیر اور ان کی تعلیم سے مستفید ہونے کیلئے ان کے پاس آتے تھے۔ ان میں مشہور صوفی مالک بن دینارؒ، درویش صفت رباح بلخیؒ، محدث سفیان ثوریؒ اور صوفی شقیق بلخیؒ شامل تھے۔ رابعہ بصریؒ نے انتہائی زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی۔ دیگر اولیا کی طرح ان سے بھی بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔

ان کی جو دعائیں منقول ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے جو وہ معمولاً رات کے وقت اپنے مکان کی چھت پر جا کر مانگا کرتی تھیں: "اے میرے مالک! ستارے چمک رہے ہیں اور آدمیوں کی آنکھیں نیند میں بند ہیں اور ہر کوئی اپنی اپنی خلوت میں ہے اور میں ہوں کہ یہاں اکیلی ہوں تیرے ساتھ۔ اے میرے مالک! اگر میں دوزخ کے خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں تو تو مجھے دوزخ میں جھونک دے اور اگر میں جنت کی توقع میں تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے جنت سے محروم کر دے۔ لیکن اگر میں محض تیری ہی خاطر تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھ سے اپنے لازوال حسن کو پوشیدہ نہ رکھیو"۔ ایک بار جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے ولایت کا مرتبہ کیسے حاصل کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا "ان چیزوں کو ترک کر دینے سے جن کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں اور اس کی محبت سے جو ابدی ہے"۔

دوسرے اہل تصوف کی طرح رابعہ بصریؒ بھی خدا سے وصل کی متمنی تھیں۔ وہ معرفت حقیقی رکھتے ہوئے والہانہ محبت سے سرشار تھیں وہ ان اوّلین اہل تصوف میں سے تھیں جنھوں نے خالص محبت (بے غرض محبت) کی تلقین کی اور اس تعلیم کو نظریۂ کشف کے امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کا وقت آخر تھا تو انھوں نے اپنے رفقا سے کہا کہ وہ ان کے پاس سے ہٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ کے قاصدوں کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ جونہی رفقا باہر نکلے انھوں نے رابعہ بصریؒ کو کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے سنا۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

رادھن پور

برطانوی ہند میں ایک مسلم ریاست جو ریاست ہائے مغربی ہند، کاٹھیاواڑ اور بمبئی میں شامل تھی اور اب بھارت کے صوبۂ گجرات میں مدغم ہو چکی ہے۔ یہ ریاست گجرات کے شمالی مغربی کونے میں رن کچھ کے قریب واقع تھی۔ اس کا رقبہ ۱۱۵۰ مربع میل اور آبادی (۱۹۴۱ء) ۶۸۰۰۰ تھی۔ اس ریاست کا بانی بہادر خان اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایران سے آیا تھا۔ ۱۷۳۲ء میں اس خاندان کے سربراہ جوانمرد خاں کو رادھن پور اور چند دوسرے اضلاع جاگیر میں ملے۔ ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اسے نواب کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ ۱۷۵۶ء میں مرہٹہ پیشوا رگھوناتھ راؤ نے احمد آباد میں اس کا محاصرہ کر کے اسے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کیا اور اس شرط پر اس کی جاگیر واگزار کی گئی کہ وہ بوقتِ ضرورت پانچسو سپاہی اور تین سو گھوڑے پیشوا کو مہیا کرے گا۔ جوانمرد خاں کے بعد اس کے بیٹے نظام الدین اور غازی الدین ریاست کے مالک بنے۔ ۱۸۱۳ء میں غازی الدین کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شیر خاں کو رادھن پور اور کمال الدین کو سامی اور منج پور کے اضلاع ملے۔ ۱۸۲۴ء میں کمال الدین کی وفات کے بعد شیر خاں کے تحت ریاست پھر متحد ہو گئی۔ ۱۸۱۳ء میں ریاست کا حکومت برطانیہ سے رابطہ قائم ہوا اور بڑودہ کے مہاراجہ گائیکوار کو رادھن پور اور دیگر ریاستوں کا نگران مقرر کیا گیا۔ ۱۸۲۰ء میں نواب رادھن پور انگریزوں کا باج گزار قرار دیا گیا۔ شیر خاں کے بعد زور آور خاں (۱۸۲۰ء — ۱۸۷۴ء) اور بسم اللہ خاں (۱۸۷۴ء — ۱۸۹۰ء) حکمران ہوئے۔ بسم اللہ کا جانشین اس کا نابالغ بیٹا محمد شیر خاں بنا۔ اس کی بلوغت تک ریاست کا انتظام انگریزی حکومت کے ہاتھ میں رہا۔ ۱۹۰۰ء میں ریاست میں انگریزی سکہ رائج ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت نواب مرتضیٰ خاں ریاست کے حکمران تھے۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کو یہ ریاست سوراشٹر کی یونین کا حصہ بن گئی۔ ۱۹۵۶ء میں رادھن پور کو بمبئی میں شامل کر دیا گیا۔ یکم مئی ۱۹۶۰ء کو صوبہ بمبئی، مہاراشٹر اور گجرات کے صوبوں میں منقسم ہوا تو سوراشٹر گجرات کا حصہ بنا۔

رازی

اسلامی اندلس کے تین ممتاز مؤرخین اس نام سے مشہور ہوئے۔ (۱) محمد بن موسیٰ بن بشیر بن جناد بن لقیط الکنانی الرازی۔ وہ ایران کے شہر رے میں پیدا ہوا۔ بلادِ مشرق سے تیسری صدی ہجری کے وسط میں تجارت کرنے کے لیے قرطبہ آیا۔ عربی میں تبحر کی بدولت اموی دارالخلافہ کے علمی حلقوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے کئی مواقع پر بلادِ مشرق اور

اندلس میں سفارتی خدمات اس کے سپرد کیں۔ امیر موصوف کے بیٹے اور جانشین نے بھی رازی پر اسی اعتماد کا اظہار کیا۔ رازی منذر کی سفارت کے سلسلے میں البیرہ سے واپس ہو رہا تھا کہ ۲۷۳ھ/ ۸۸۶ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی تصنیف "کتاب الرایات" ہے جو مسلمانوں کی فتوحات اندلس سے متعلق ہے۔ اس میں عربوں کی ان امدادی افواج کی تفصیل درج ہے جو اپنے اپنے پرچموں کے ساتھ جزیرہ نمامیں موسیٰ بن نصیر کے ساتھ داخل ہوئی تھیں۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

(۲) احمد بن محمد (۱۰ ذوالحجہ ۲۷۴ھ/ ۲۶ اپریل ۸۸۸ء ـــ ۱۲ رجب ۳۴۴ھ/ یکم نومبر ۹۵۵ء) مقدم الذکر مؤرخ کا بیٹا جو اندلس میں پیدا ہوا۔ تاریخی تقدم کے لحاظ سے اندلس کے مؤرخین میں یہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخ اندلس پر کئی کتب اور رسالے لکھے: (۱) تاریخ ملوک الاندلس (۲) کتاب فی صفت قرطبہ، (۳) کتاب الاستیجاب، اندلسی عربوں کے انساب پر ضخیم تالیف۔ اس مؤرخ کی کوئی کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

(۳) عیسیٰ بن احمد بن محمد۔ محمد بن موسیٰ رازی کا پوتا اور احمد بن محمد رازی کا بیٹا۔ اس نے اپنے باپ کے لکھے ہوئے وقائع کا سلسلہ اپنے زمانے تک جاری رکھا اور ایسے مآخذ استعمال کرکے، جو احمد رازی کو نہیں ملے تھے، ان حصوں میں اضافہ کیا جن میں ابتدائی زمانوں کا بیان ہے۔

رازی ابُوبکر محمّد

(۲۵۰ھ/ ۸۶۴ء ـــ ۳۱۳ھ/ ۹۲۵ء) ابوبکر محمد بن زکریا، مشہور طبیب، کیمیا دان اور فلسفی۔ رے میں پیدا ہوا۔ حاکم رے کی ملازمت میں داخل ہونے کے بعد جلد ہی شہر کے نئے ہسپتال کا نگران اعلیٰ بن گیا۔ بغداد میں بھی اسی منصب پر فائز رہا۔ اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیب ہونے کی شہرت اسے ایک دربار سے دوسرے دربار میں پہنچاتی رہی۔ فلسفی یحییٰ بن عدی (ارسطاطالیس کا پیرو، یعقوبی فرقے کا معتقد اور فارابی کا شاگرد) کے متعلق المسعودی کہتے ہیں کہ اس نے فلسفے کی تحصیل کا آغاز رازی سے کیا تھا۔ داتا گنج بخشؒ کی کشف المحجوب میں مشہور صوفی حسین بن منصور حلاجؒ اور رازی کے درمیان تعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ رازی کا اہم ان کی طبابت ہے۔ اسے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا طبیب مانا جاتا ہے۔ اس نے مختلف امراض پر متعدد رسائل لکھے جن میں چیچک اور خسرہ پر رسالہ "کتاب الجدری والحصبۃ" سب سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ طب پر دستور العمل کی کئی بڑی کتابیں لکھیں۔ اس نے کتاب "طب المنصوری" والیٔ رے منصور بن اسحاق کے نام اور طب الملوکی، والیٔ طبرستان علی بن دیمسوذان کے نام معنون کیں۔ کتاب الحاوی عربی زبان میں سب سے بڑا طبی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ اس کتاب میں طب کے ہر مسئلے پر تمام یونانی اور عرب اطبا کی آرا نقل کی گئی ہے۔ طبیعات، ریاضیات، فلکیات اور بصریات پر کتابیات نویسوں نے اس کی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں ہے۔ البیرونی نے رازی کے سوانح حیات اور تالیفات کے لیے ایک پورا رسالہ وقف کیا ہے۔ مابعد الطبیعیات پر رازی نے جو کتابیں لکھیں وہ بھی دستیاب نہیں ہیں۔ رازی سائنس اور فلسفیانہ علم کے ارتقا پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بہت قدیم فلسفہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ارسطاطالیس اور افلاطون سے فائق سمجھتا ہے۔ فلسفے میں وہ اپنے آپ کو سقراط کے قریب اور طب میں بقراط کے درجے کا سمجھتا ہے۔

رازی محمّد امین

ایرانی تذکرہ نویس۔ اس کی شہرت کا باعث "تذکرۂ ہفت اقلیم" ہے جو ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ سات اقلیموں کی جغرافیائی ترتیب کے مطابق لکھا گیا ہے۔ ہر اقلیم میں مختصر جغرافیائی و تاریخی تعارف ہے اور اس کے بعد شعرا، علما اور مشہور شیوخ کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ شعرا کے حالات لکھتے ہوئے ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ تذکرہ حسب ذیل فصول پر مشتمل ہے: (۱) اقلیم اول: یمن، الزنج، نوبیہ اور چین (۲) اقلیم دوم: مکہ، مدینہ، یمامہ، ہرمز، دکن، احمد نگر، دولت آباد، گولکنڈہ، احمد آباد، سورت، بنگال، اوڑیسہ اور کوش (کوچ) (۳) اقلیم سوم: عراق، بغداد، کوفہ، نجف، بصرہ، یزد، فارس، سیستان، قندھار، غزنین، لاہور، دہلی، ہندوستان، شام اور مصر (۴) اقلیم چہارم: خراسان، بلخ، ہرات، جام، مشہد، نیشاپور، سبزوار، اسفرائن، اصفہان، کاشان، قم، سنہ، ہمدان، طہران، دماوند، استرآباد، طبرستان، مازندران، گیلان، قزوین، آذربائیجان، تبریز، اردبیل، مراغہ (۵) اقلیم پنجم: شیروان، گنجہ، خوارزم، ماوراء النہر، سمرقند، بخارا، فرغانہ (۶) اقلیم ششم: ترکستان، فاراب، یارقند، روس، قسطنطنیہ، روم (۷) اقلیم ہفتم: بلغار، صقلب، یاجوج ماجوج۔

راس، سر ایڈورڈ

(۱۸۷۱ء ـــ ۱۹۴۰ء) برطانیہ کا مشہور مستشرق۔ لندن میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ اعلیٰ تعلیم سٹراسبرگ اور پیرس کی یونیورسٹیوں سے حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں یونیورسٹی کالج لندن میں فارسی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل اور ۱۹۱۴ء تک بنگال گورنمنٹ کی ملازمت میں رہا۔ اس دوران میں اس نے لارڈ کرزن کے ایما پر پٹنہ کی خدابخش اور ٹیٹل لائبریری کے عربی فارسی مخطوطات کی فہرست نگاری کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ اس نے بابر بادشاہ کا ترکی دیوان شائع کیا۔ عربی کی کتاب "تاریخ گجرات" ہندوستانی فضلا کی مدد سے تین جلدوں میں طبع کیا۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں وہ سکول آف اورینٹل سٹڈیز لندن کا پہلا ڈائرکٹر مقرر ہوا اور بیس بائیس سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ نے اسے سر کا خطاب دیا۔ سبکدوش ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے اسے ۱۹۳۹ء [illegible] استنبول بھیجا تاکہ وہ ترکوں سے برطانیہ کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات [illegible] میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوا۔

راسم احمد

(۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء ـــ [illegible]) سو سے زائد کتب کا ترک مصنف۔ [illegible] میں استنبول کے مشہور مدرسے دارالشفقہ سے فارغ التحصیل ہو [illegible] طرح راسم نے بھی ادبی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا۔ [illegible] اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہو کرتے تھے۔ جو بعد میں [illegible] شائع ہوئے۔ ان کی کتاب "عثمانلی تاریخی" چار جلدوں میں شائع [illegible] ارتقا اور ان احساسات وجذبات کا عکس نظر آتا ہے جو [illegible] ہوتے رہے۔ اس کا طرز بیان اسلوب نگارش سے تمام مروجہ [illegible] الگ اور آزاد تھا۔ وہ نئے دبستان نگاری کا موجد تھا۔ اس لیے ادبی [illegible] اور داستانوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں ناول "میل دل"، "تجارت" [illegible] قابل ذکر ہیں۔ افسانے "تجرابہ"، "مشق مکتب" [illegible] قابل ذکر ہیں۔

راشد الدین سنان

(وفات ۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء) ابوالحسن سنان بن سلیمان بن محمد اسمٰعیلی [illegible] شام [illegible] پیشوا جو شیخ الجبل کے نام سے بھی معروف ہوا۔ [illegible] بصرہ میں پیدا ہوا۔ [illegible] تعلیم پائی۔ ۵۵۸ھ/ ۱۱۶۳ء میں الموت کے امام حسن کی جانب سے شام کے اسمٰعیلی [illegible]

مقرر ہوئے۔ اپنی موت تک اسی منصب پر فائز رہے۔ راشد نے اپنے زمانے کی مصری و شامی سیاسیات میں نمایاں حصہ لیا۔ سنان کے بارے میں جو قصے ملتے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر اس کی فدائیوں کی تنظیم سے ہے اس تنظیم کے ذریعے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو بذریعہ قتل ختم کرنے کا کام لیا کرتے تھے۔ بہت سے مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ سنان اس فرقے کا سب سے اعلیٰ اور فوق البشر سردار سمجھا جاتا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ وہ امام کے بعد بلند ترین منصب "حجۃ" پر فائز تھے۔

راشد باللہ

(۵۰۰ھ — رمضان ۵۳۲ھ) ابوجعفر منصور بن مسترشد، عباسی خلیفہ۔ ۲ ربیع الآخر ۵۱۳ھ/ ۱۳ جولائی ۱۱۱۹ء کو خلیفہ مسترشد نے لوگوں سے اپنے بیٹے ابوجعفر منصور کے لئے ولیعہدی کی بیعت لی۔ ذوالقعدہ ۵۲۹ھ میں راشد باللہ کے نام سے اس کی خلافت کی خوشی منائی گئی۔ اس نے تخت نشین ہونے کے بعد لوگوں سے مال و دولت لینے میں کسی قدر ظلم و زیادتی سے کام لیا۔ سلطان مسعود کو لوگوں نے شکایات لکھ کر بھیجیں۔ سلجوقی سلطان مسعود بن محمد نے اس سے چار لاکھ دینار طلب کیے۔ راشد نے انکار کر دیا کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے سلطان کے بھتیجے داؤد بن محمود نے آذربائیجان سے بغداد پر فوج کشی کی اور صفر ۵۳۰ھ/ نومبر ۱۱۳۵ء میں وہاں پہنچ گیا۔ عماد الدین زنگی اتابک موصل بھی اس سے آملا اور بغداد میں داؤد کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ خبر سن کر سلطان مسعود نے بڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ پچاس دن کے محاصرے کے بعد وہ نہروان کی طرف پسپا ہو گیا اور پھر ہمذان چلا گیا۔ طرنطائی والیٔ واسط نے کشتیوں کی کافی تعداد سلطان مسعود کو فراہم کی۔ اس طرح مسعود نے دجلہ کو عبور کر کے مغربی سمت پر قبضہ کر لیا۔ داؤد آذربائیجان واپس ہوا۔ زنگی خلیفہ کے ساتھ موصل چلا گیا اور مسعود ذوالقعدہ ۵۳۰ھ/ اگست ۱۱۳۶ء میں بغداد میں داخل ہوا۔ مسعود نے لوٹ مار اور دوسری بدعنوانیوں کی ممانعت کر دی اور انتظام بحال کر دیا۔ اس نے قاضیوں کی ایک مجلس طلب کی جنہوں نے مفرور خلیفہ کے تخت و تاج کے لئے نااہل ہونے کا اعلان کیا۔ سلطان مسعود نے راشد باللہ کے چچا محمد بن مستظہر کو ۱۶ ذوالقعدہ ۵۳۰ھ کو امیر المومنین مقرر کر دیا۔ راشد باللہ کو اپنی معزولی کا حال معلوم ہوا تو وہ موصل سے چلا آذربائیجان کی طرف چلا گیا۔ اپنے لشکر کو مال و دولت تقسیم کیا۔ آذربائیجان کے شہروں کو لوٹ مار سے برباد کیا وہاں سے ہمذان آیا۔ یہاں بھی خوب فتنہ و فساد برپا کیا۔ پھر اصفہان پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں بیمار ہوا بیماری کے دوران ہی عجمیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

راشد محمد

(وفات ۸ صفر ۱۱۴۸ھ/ ۱۰ جولائی ۱۷۳۵ء) سلطنت عثمانیہ کا شاہی تاریخ نویس۔ ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء میں شاہی مؤرخ مقرر ہوا۔ ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۰ء میں حلب کا قاضی مقرر ہونے تک شاہی مؤرخ کے منصب پر مامور رہا۔ کچھ مدت بعد قاضیٔ مکہ مقرر ہوا۔ ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۳۰ء میں استنبول کا قاضی مقرر ہوا۔ چند ماہ بعد علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۲ء میں اناطولی کا قاضیٔ عسکر بنا۔ اس نے نعیما کی تاریخ سلطنت عثمانیہ کا تکملہ (۱۱۳۴ھ تا ۱۱۳۴ھ) لکھا۔ یہ تکملہ عام طور سے "تاریخ راشد" کے نام سے مشہور ہے۔

راضی باللہ

(ربیع الآخر ۲۹۷ھ/ دسمبر ۹۰۹ء — ربیع الاول ۳۲۹ھ/ دسمبر ۹۴۰ء) ابوالعباس محمد بن مقتدر باللہ، خاندان عباسیہ کا بیسواں خلیفہ۔ مقتدر باللہ کے قتل کے بعد راضی باللہ کا نام خلافت کے لئے تجویز ہوا لیکن قرعۂ فال قاہر باللہ کے نام پڑا۔ اس نے راضی باللہ کو جیل خانے میں ڈال دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جمادی الثانی ۳۲۲ھ میں فوج کے بلوائیوں نے قاہر کو گرفتار کر لیا اور راضی باللہ کو جیل سے نکال کر تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ راضی باللہ نے قاہر کو اندھا کرا دیا۔ راضی نے مقتدر کے وزیر علی بن موسیٰ کو وزیر بنانا چاہا لیکن اس نے پیری کے باعث معذرت کر دی۔ اس پر قلمدان وزارت علی بن مقلہ کے سپرد ہوا۔ عہدے داروں میں سب سے زیادہ بارسوخ اور بااختیار محمد بن یاقوت تھا اور وہی معاملات سلطنت پر حاوی تھا۔ جمادی الاول ۳۲۳ھ/ اپریل ۹۳۵ء میں محمد بن یاقوت کو معزول کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ جمادی الاول ۳۲۴ھ/ اپریل ۹۳۶ء میں ابن مقلہ کو محمد بن یاقوت کے بھائی مظفر بن یاقوت نے گرفتار کر لیا۔ خلیفہ نے مجبوراً ابن مقلہ کو معزول کیا۔ اسی سال واسط اور بصرہ کے والی محمد بن رائق کو بغداد بلا کر امیر الامرا کا منصب تفویض کر دیا گیا۔ خلیفہ کی حکومت بغداد اور اس کے مضافات کے سوا اور کہیں نہ تھی نہ کسی صوبہ سے خراج آتا تھا۔ ہر جگہ لوگوں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں جنہوں نے خراج بھیجنے کے وعدے پر سندیں حاصل کی تھیں انھوں نے بھی اپنے وعدوں کو پورا نہ کیا۔ ۳۲۶ھ/ ۹۳۸ء میں ابن رائق کی جگہ بجکم کو وزیر مقرر کیا گیا۔

خلیفہ راضی باللہ کے عہد خلافت میں محمد بن علی سمعانی معروف بہ ابن ابی العزاقر نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اسے اور اس کے ہمراہیوں کو خلیفہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ قرامطہ نے بغداد اور مکہ کے درمیان ایسی لوٹ مار مچائی کہ ۳۲۷ھ تک اہل بغداد حج نہ کر سکے۔ ۳۲۷ھ میں ابوطاہر قرمطی نے حاجیوں پر فی شتر پانچ دینار محصول قائم کیا اور لوگوں کو حج کی اجازت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حاجیوں کو حج کرنے کے لیے محصول ادا کرنا پڑا۔ راضی آخری خلیفہ تھا جس نے خطبۂ جمعہ لوگوں کو سنایا۔ اس کے بعد خلفا نے یہ کام بھی دوسروں کے سپرد کر دیا۔ عرب مؤرخین اس کی پارسائی، عدل و انصاف، رحمدلی اور فیاضی کی تعریف کرتے ہیں۔

راغب اصفہانی

(وفات (۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء ؟) ابوالقاسم حسین بن محمد بن مفضل، دینی علوم کا نامور عربی مصنف۔ امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب "اساس التقدیس" میں اس کے اہل السنت اور صحیح العقیدہ ہونے کی توثیق کی ہے۔ راغب کی تصانیف تفسیر القرآن اور ادب و ثقافت سے متعلق ہیں۔ جامع التفاسیر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ امام راغب نے قرآن مجید کا ایک عمدہ لغت "المفردات" کے نام سے تالیف کیا۔ اس کا نام "کتاب المفردات فی غریب القرآن" ہے۔ المفردات کا اردو ترجمہ "مفردات القرآن" کے عنوان سے محمد عبدہ الفلاح فیروزپوری نے ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء میں لاہور سے شائع کیا۔ امام راغب نے مفردات سے پہلے اخلاقیات پر اپنی کتاب "الذریعۃ الی مکارم الشریعت" تالیف کر لی تھی امام غزالیؒ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا ایک نسخہ ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ امام راغب کی مقبول ترین ادبی تصنیف کتاب المحاضرات ہے جو عام ادبی موضوعات پر مشتمل ہے۔

راغب پاشا

(۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء — ۲۴ رمضان ۱۱۷۶ھ/ ۸ اپریل ۱۷۶۳ء) راغب محمد پاشا بن کاتب محمد شوقی، عثمانی وزیر اعظم۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۱۷۰ھ/ ۱۳ دسمبر ۱۷۵۶ء کو مصطفیٰ پاشا کو معزول کر کے راغب پاشا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ وہ سات برس تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کا شمار سلطنت عثمانیہ کے ممتاز وزرائے اعظم میں ہوتا ہے۔ وہ محض ایک بہت بڑا مدبر ہی نہیں بلکہ ترکی ادب کا ایک مستند مصنف اور ادیب بھی ہے۔ اس کی تصانیف ادب کی ہر صنف پر حاوی ہیں اور حسن اسلوب و شکوہ بیان کی دولت

سے مالا مال ہیں۔ وہ ایک ممتاز سیاسی مورخ بھی تھا۔ اس نے میرخواند کی تاریخ عالم اور عبدالرزاق بن اسحٰق کی تاریخ آل تیمور دونوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کا دیوان اس کی اہم ترین منظومات پر مشتمل ہے۔

رافضی

امام اعشری کے نزدیک سب سے پہلے وہ لوگ رافضی کہلائے جنہوں نے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ امام اعشری نے روافض، زیدیہ اور غلات کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ طبری نے لکھا ہے کہ یہ لقب کوفہ کے زیدیوں کو ملا جنہوں نے زید بن علیؓ کو اس بنا پر چھوڑ دیا تھا کہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ بعض کے نزدیک عبداللہ بن سبا کے ساتھی سب سے پہلے رافضی کہلائے۔

رافع بن خدیج

رسول اللہ کے صحابی، جو بنو حارثہ کے رئیس اور سردار تھے۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ غزوۂ بدر میں کم سنی کی وجہ سے حصہ لینے کی اجازت نہ ملی۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ کے دوران ان کے سینے میں تیر لگا۔ تیر نکالنے کی کوشش میں تیر کی نوک جسم کے اندر ہی رہ گئی۔ ۷۴ھ میں سینے کا یہی زخم ابھرا اور انہوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں وفات پائی۔ جنگ صفین میں آپ نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ آپ سے ۷۸ حدیثیں روایت کی گئی۔

رافع بن مالک

بن عجلان بن عمرو بن زریق۔ نبی کریم صلعم کے صحابی جو قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ آپ انصار مدینہ کے اس گروہ میں شامل تھے جس نے سب سے پہلے رسول اللہؐ کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ آپ بنو زریق کے نقیب مقرر کیے گئے۔ بنی زریق کی مسجد میں سب سے پہلے قرآن پاک آپ ہی نے پڑھایا۔ جو آیتیں بھی نازل ہوتی تھیں آپ فوراً لکھ کر لوگوں کو سناتے۔ سورۂ یوسف سب سے پہلے مدینہ میں انھی نے پہنچائی۔ غزوہ احد میں شہید ہوئے۔

رام پور

برطانوی ہند کی ایک مسلم ریاست۔ رام پور کے شمال میں ضلع نینی تال، مشرق میں ضلع بریلی، جنوب میں ضلع بدایوں کی تحصیل بسولی اور مغرب میں ضلع مراد آباد تھا۔ قصبہ رام پور کی ابتدائی تاریخ روہیل کھنڈ میں روہیلا طاقت کے نشوونما کی تاریخ ہے۔ روہیلے افغانستان کے علاقہ روہ کے باشندے تھے جو ہندوستان آکر روہیل کھنڈ میں بس گئے۔ ریاست کا بانی داؤد خاں تھا۔ اس کی وفات پر اس کا متبنٰی علی محمد خاں مسند نشین ہوا۔ کچھ عرصے میں علی محمد خاں اتنا طاقت ور ہو گیا کہ اس کی طاقت کے ذریعے سے اودھ کا نواب صفدر جنگ چوکنا ہو گیا اور اس نے شہنشاہ کو علی محمد خاں کے خلاف ایک مہم روانہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ علی محمد خاں نے شاہی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے گرفتار کر کے دہلی لے جایا گیا اور کچھ مدت بعد رہا کر کے سرہند کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ علی محمد خاں نے چھ بیٹے چھوڑے۔ ان میں سے دو عبداللہ خاں اور فیض اللہ خاں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قید میں تھے۔ باقی چار بالکل نوعمر تھے۔ علی محمد خاں نے حافظ رحمت خاں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا لیکن وہ اس کے کمسن بیٹے سعد اللہ خاں کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ ۱۷۵۲ء میں عبداللہ خاں اور فیض اللہ خاں قید سے رہائی پا کر روہیل کھنڈ پہنچ گئے۔ حافظ رحمت خاں نے ریاست کا علاقہ تینوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۷۶۳ء میں نواب سعد اللہ کی وفات پر سرداران روہیل کھنڈ نے حافظ رحمت کی سرداری میں رہنا قبول کر لیا۔ ۱۷۷۰ء میں مرہٹوں نے اپنی توجہ روہیل کھنڈ کی فتح کی طرف منعطف کی۔ ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ وزیر شجاع الدولہ نے انگریزوں کی اعانت سے حملہ کر دیا۔ فیض اللہ خاں اور بعض روہیلہ سرداروں نے جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو روہیلوں کو شکست ہوئی۔ حافظ رحمت خاں جنگ میں شہید ہوا۔ جنگ کے خاتمے پر فیض اللہ خاں کو جو جاگیر ملی اس میں رام پور اور دوسرے اضلاع شامل تھے۔ اسے اپنی فوج میں پانچ ہزار سے زائد سپاہی رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی وفات پر اس کا بیٹا آصف الدولہ جانشین ہوا۔ ۱۷۸۱ء میں ہیسٹنگز کے کہنے پر آصف الدولہ نے فیض اللہ خاں سے ایک نیا معاہدہ کیا جس کی رو سے نواب اودھ کے لیے فوج مہیا کرنے کی شرط کمپنی کی ضمانت کے تحت پندرہ لاکھ روپے کی نقد ادائیگی سے بدل دی گئی۔ ۱۸۰۱ء میں جب روہیل کھنڈ انگریزوں کی تحویل میں آیا تو فیض اللہ خاں کے خاندان کے مقبوضات برقرار رکھے گئے۔ رام پور کا رقبہ ۸۹۳ مربع میل اور آبادی [illegible] ۱۹۲۱ء [illegible] لاکھ تھی جس میں پچاس فیصد لوگ مسلمان تھے۔ رام پور ان چھ تحصیلوں میں منقسم تھا: حضور، شاہ آباد، [illegible]، بلاس پور، سوار اور ٹانڈا۔ رام پور شہر میں ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ قائم تھا جس میں مخطوطات کا بیش قیمت ذخیرہ موجود تھا۔ رام پور میں [illegible] کی کثرت ہے۔ ۱۹۴۷ء تک یہ ریاست گوالیار ریذیڈنسی سے متعلق رہی۔ یکم دسمبر ۱۹۴۹ء کو اسے ضلع کا درجہ دے کر اتر پردیش میں ضم کر دیا گیا۔ اس کے آخری فرمانروا میجر جنرل [illegible] نواب سید محمد رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ تھے۔ موجودہ ضلع رام پور کا رقبہ [illegible] مربع میل اور آبادی (۱۹۶۱ء) سات لاکھ ہے۔ صدر مقام رام پور کی آبادی [illegible] ہے۔ رام پور شہر دریائے کوسی کے بائیں کنارے دہلی سے [illegible] میل مشرق میں واقع ہے۔

رائی

[illegible] بن محمد شرف الدین، صاحب طرز ایرانی ادیب۔ [illegible] کی وجہ سے ہوئی۔ یہ ان معروف عام [illegible] تشبیہات و [illegible] مختلف اعضا کے بیان میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ کتاب [illegible] العشاق کے علاوہ اس کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔

[illegible] محمد پاشا

[illegible] ۱۰۶۶ھ [illegible] ۱۶۵۷ء [illegible] ۱۰۸ [illegible]

[illegible] رمضان ۱۱۱۴ھ/ ۲۴ جنوری ۱۷۰۳ء کو [illegible] وزیر اعظم [illegible] لیا گیا۔ اس کے دیوانی انتظامات میں [illegible] مسلمات پر توجہ [illegible] سرحدوں پر قلعوں کا [illegible] مخالفت اور ایشیائے کوچک [illegible] ۱۱۱۵ھ/ ۲۲ اگست ۱۷۰۳ء کو سلطان مصطفیٰ کی معزولی [illegible] کی۔ اسی سال اسے قبرص کا والی مقرر کیا گیا۔ [illegible] ۱۱۱۸ھ/ ستمبر ۱۷۰۶ء میں اسے [illegible] جزیرہ [illegible] بھیج دیا گیا [illegible] پائی۔ اس نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ [illegible] کے دو مجموعوں کی بنیاد پر صاحب طرز ادیب سمجھا جاتا ہے۔

راولپنڈی

پاکستان کا ایک اہم شہر اور چھاؤنی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک پاکستان کا عبوری دارالحکومت

رہا۔ یہ شارع پاکستان (جی ٹی روڈ) پر لاہور سے ۱۸۰ میل شمال مغرب میں اور پشاور سے ۱۰۸ میل مشرق و جنوب مشرق میں واقع ہے کراچی سے ۹۳۷ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کسی زمانے میں جگوں کے قبیلہ راول کا بسایا ہوا ایک گاؤں تھا۔ چھاؤنی کے قریب پرانے شہر کے کھنڈر موجود ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ بھٹی قبیلے کے دارالحکومت گنجی پور کے آثار ہیں۔ یہ شہر تاتاریوں کے حملوں میں اجڑ گیا تھا۔ گکھڑ سردار جھنڈے خاں نے اسے دوبارہ بسایا اور اس کا نام پنڈی یا راولپنڈی رکھا۔ ۱۷۶۵ء میں اس پر سکھ سردار ملکا سنگھ قابض ہوا۔ اس نے جہلم اور شاہ پور کے تجارت پیشہ لوگوں کو لاکر آباد کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں افغانستان کے جلا وطن امیر شاہ شجاع اور اس کے بھائی شاہ زمان نے راولپنڈی میں آکر پناہ لی۔ گجرات کی لڑائی کے بعد ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو چھتر سنگھ اور شیر سنگھ کی سکھ فوجوں نے راولپنڈی میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ برطانوی عہد حکومت میں یہاں فوجی مرکز قائم کرنے کے علاوہ اسے ضلع اور ڈویژن کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد افواج پاکستان کا صدر مقام قرار پایا۔ قیام پاکستان کے بعد شہر کے شمال میں مری روڈ پر ایک اضافی شہر وجود میں آیا اور اس کے قریب ہی پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد تعمیر ہوا۔ لیاقت باغ، ایوب نیشنل پارک اور راول ڈیم قابل دید تفریحی مقامات ہیں۔ راولپنڈی ایک اہم علمی اور صنعتی مرکز ہے۔

رائٹ، ولیم

(وفات ۱۸۸۹ء) برطانوی مستشرق جو برطانیہ میں سامی زبانوں خصوصاً عربی میں سند تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی پیدائش اور پرورش بنگال میں ہوئی۔ اس نے سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی سکاٹ لینڈ اور جرمنی میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں لائڈن میں پروفیسر ڈوزی سے اکتساب فیض کیا اور وہیں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ لندن اور ڈبلن کی یونیورسٹیوں میں ملازمت کے بعد ۱۸۷۰ء میں وہ کیمبرج میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور ۱۹ برس تک اسی عہدے پر فائز رہا۔ رائٹ کی علمی زندگی کا آغاز ابن جبیر اندلسی کے سفر نامہ کی تدوین سے ہوتا ہے۔ پھر اس نے مبرد کی کتاب الکامل فی الادب کو مرتب کیا۔ اس کتاب میں سیکڑوں ادبی، نحوی اور تاریخی مسائل کا ذکر آتا ہے۔ رائٹ کی سب سے مشہور اور متداول کتاب عربی کی صرف و نحو (عربی گرامر) ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے اور انگریزی میں عربی کی جامع اور مستند قواعد سمجھی جاتی ہے۔ رائٹ نے سامی زبانوں کی تقابلی قواعد بھی لکھی تھی۔

ربا (ربوا)

یا ربوٰا۔ عربی میں اس کے معنی زیادتی اور اضافے کے ہیں۔ اصطلاحاً اہل عرب ربا کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں وہ یہ تھیں۔ (۱) ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا ہے اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا ہے۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ (۲) ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنا ہوگی۔ (۳) قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع اضافہ ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔

ارشاد ربانی ہے: "جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے"۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ وہ سود خواری سے باز آ جائے تو وہ جو کچھ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے گا وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔ (البقرہ: ۲۷۴ تا ۲۷۶) حدیث نبویؐ ہے: "سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ ان میں سے ایک سود کھانا ہے (مشکوٰۃ شریف)۔

تجارت اور سود کا اصولی فرق جس کی بنا پر دونوں کی معاشی اور اخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے: (۱) تجارت بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اُجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقررہ مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے لیکن اس کے مقابلے میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں اگر اس نے سرمایہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے فریق کے نقصان پر ہوتا ہے یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے ایک ہی بار لیتا ہے لیکن سود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائل معیشت، حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مشتری کو کوئی بائع کو واپس نہیں دینی ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرائے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہٖ کرایہ دار کو واپس دے دی جاتی ہے لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ حاصل کرتا ہے مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنی ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو

نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے جو اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسبِ نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔

خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سود اخلاقی، روحانی، معاشی اور تمدنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ تنزل کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کے برعکس صدقات سے اخلاق و روحانیت اور تمدن و معیشت ہر چیز کو نشوو نما نصیب ہوتا ہے۔ اخلاقی و روحانی حیثیت سے دیکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سود دراصل خود غرضی، بخل، تنگ دلی اور سنگ دلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ انھی صفات کو انسان میں نشوو نما بھی دیتا ہے۔ اس کے برعکس صدقات فیاضی، ہمدردی، فراخ دلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔ تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو جس سوسائٹی میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں۔ کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے، اور مالدار طبقوں کا مفاد عامۃ الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائٹی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی محبت کے بجائے باہمی بغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نشوو نما پائے گی۔ معاشیات کے نقطۂ نظر سے سودی قرض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قرض جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے مجبور اور حاجت مند لوگ لیتے ہیں۔ دوسرا وہ قرض جو تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کے کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے قرض پر سود وصول کرنے کا طریقہ نہایت تباہ کن ہے۔ مہاجن افراد اور مہاجنی ادارے اس ذریعے سے غریب مزدوروں، کاشت کاروں اور قلیل المعاش عوام کا خون چوستے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے سود کی وجہ سے قرض کا ادا کرنا مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے وہ دوسرا اور پھر تیسرا قرض لیتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رقم سے کئی گنا سود دے چکنے کے بعد بھی اصل رقم جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ سودی قرض کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ چند افراد تو لاکھوں محنت کشوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے رہتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی پوری قوم کی پیدائش دولت اپنے امکانی معیار کی بہ نسبت بہت گھٹ جاتی ہے۔ غریب عوام کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ ان کی بدولت مالدار لوگوں کے خلاف غصے اور نفرت کا ایک طوفان دلوں میں اٹھتا رہتا ہے اور کسی انقلابی ہیجان کے موقع پر جب یہ آتش فشاں پھٹتا ہے تو ان ظالم مالداروں کو اپنے مال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

دوسری قسم کا قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے اس پر ایک مقرر شرح سود کے عائد ہونے سے بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں۔ جو کام رائج الوقت شرح سود کے برابر نفع نہ لا سکتے ہوں، چاہے ملک اور قوم کے لیے کتنے ہی ضروری اور مفید ہوں، ان پر لگانے کے لیے روپیہ نہیں ملتا اور ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے جو بازار کی شرح سود کے برابر یا اس سے زیادہ نفع لا سکتے ہوں چاہے اجتماعی حیثیت سے ان کی ضرورت اور ان کا فائدہ بہت کم ہو یا کچھ بھی نہ ہو۔ جن کاموں کے لیے سود پر سرمایہ ملتا ہے خواہ وہ تجارتی کام ہوں یا صنعتی یا زراعتی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کا منافع اس ایک مقرر میعاد سے اوپر اوپر ہی رہے گا اور کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا بلکہ کسی کاروبار میں اس بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ اس میں ضرور منافع ہی ہوگا اور نقصان کبھی نہ ہوگا لہٰذا کسی کاروبار میں ایسے سرمایہ کا لگنا جس پر سرمایہ دار کو ایک مقررہ شرح کے مطابق منافع دینے کی ضمانت دی گئی ہو نقصان اور خطرے کے پہلوؤں سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ ایک مقرر شرح منافع کی ضمانت پر روپیہ دیتا ہے۔ جب کبھی اسے ذرا سا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ منڈی پر کساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیہ کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ اس طرح کبھی تو محض اس کے خود غرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کساد بازاری کا واقعی حملہ ہو جاتا ہے اور کبھی اگر دوسرے اسباب سے کساد بازاری آ گئی ہو تو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

جب سود کی بندش کے لیے قرآن حکیم نازل ہوا تو اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو نبی صلعم نے اپنے عمال کے ذریعے سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی تو معاہدے میں تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمھارے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی۔ ابن عباس، حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دار الاسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اسے نہ چھوڑا جائے۔

صحابہ کے متواتر عمل سے ثابت ہے کہ وہ سود کی ہر مقدار کو حرام سمجھتے تھے اور قرض پر معاہدے میں طے کیا جانے والا ہر اضافہ ان کے نزدیک ربا تھا۔

رباط

مراکش کا شہر اور دار الحکومت۔ رباط کی تاسیس موحدین کے ہاتھوں ہوئی۔ ۵۴۵ھ میں موحدین کے خانوادۂ عبد المومن کے بانی عبد المومن نے قلعے اور مسجد کے ساتھ [illegible] تیاری کا مرکز بنایا۔ یہ لشکر اندلس میں جہاد کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ یہاں مستقل [illegible] مسجد اور شاہی قیام گاہ سے ایک چھوٹے شہر کی تشکیل ہوئی [illegible] عبد المومن کے جانشین ابو یوسف یعقوب المنصور (۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء) [illegible] یہاں تعمیرات اور ترقی جاری رہی۔ ۱۱۹۵ء میں موحدون نے [illegible] فتح حاصل کی تھی اس کی یادگار میں اس شہر کا نام رباط الفتح رکھ دیا گیا۔ یعقوب المنصور نے [illegible] کے اندر ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی لیکن وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی [illegible] اور ۰۰۷ فٹ چوڑی تھی اور اس سے زیادہ وسیع مسجد دنیائے اسلام میں [illegible] سولہ دروازے اور تین صحن تھے۔

رباط کے بالمقابل شہر سلا کی سیاسی اور تجارتی اہمیت چودھویں صدی عیسوی تک [illegible] رہی۔ ۱۲۴۸ء میں رباط اور سلا بنو مرین کے زیر نگیں آ گئے۔ ۱۶۱۰ء میں سقوط غرناطہ کے بعد رباط اور سلا اندلسی پناہ گزینوں کی نوآبادی بن گئے۔ رباط جلد ہی ایک چھوٹی سی بحری [illegible] گیا جس کی باگ ڈور ان اندلسی موروں کے ہاتھوں میں تھی۔ رباط کے [illegible] موروں کے جذبۂ حریت

اور اُن کی دولت نے جلد ہی شہر کو مراکش کے سلاطین کی نگاہوں میں مرغوب ترین چیز بنا دیا۔ ۱۹ار بولائی ۱۹۱۱ء کو سلا اور رباط پر فرانسیسی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۹۳۱ء میں رباط کی آبادی ۳۲ ہزار تھی جس میں ۲۸ ہزار مسلمان اور چار ہزار یہودی تھے۔ ۱۹۶۱ء میں مسلمانوں کی آبادی ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ فرانسیسی عملداری کے زمانے سے یہ شہر دولت شریفیہ کا انتظامی پایۂ تخت اور فرانسیسی
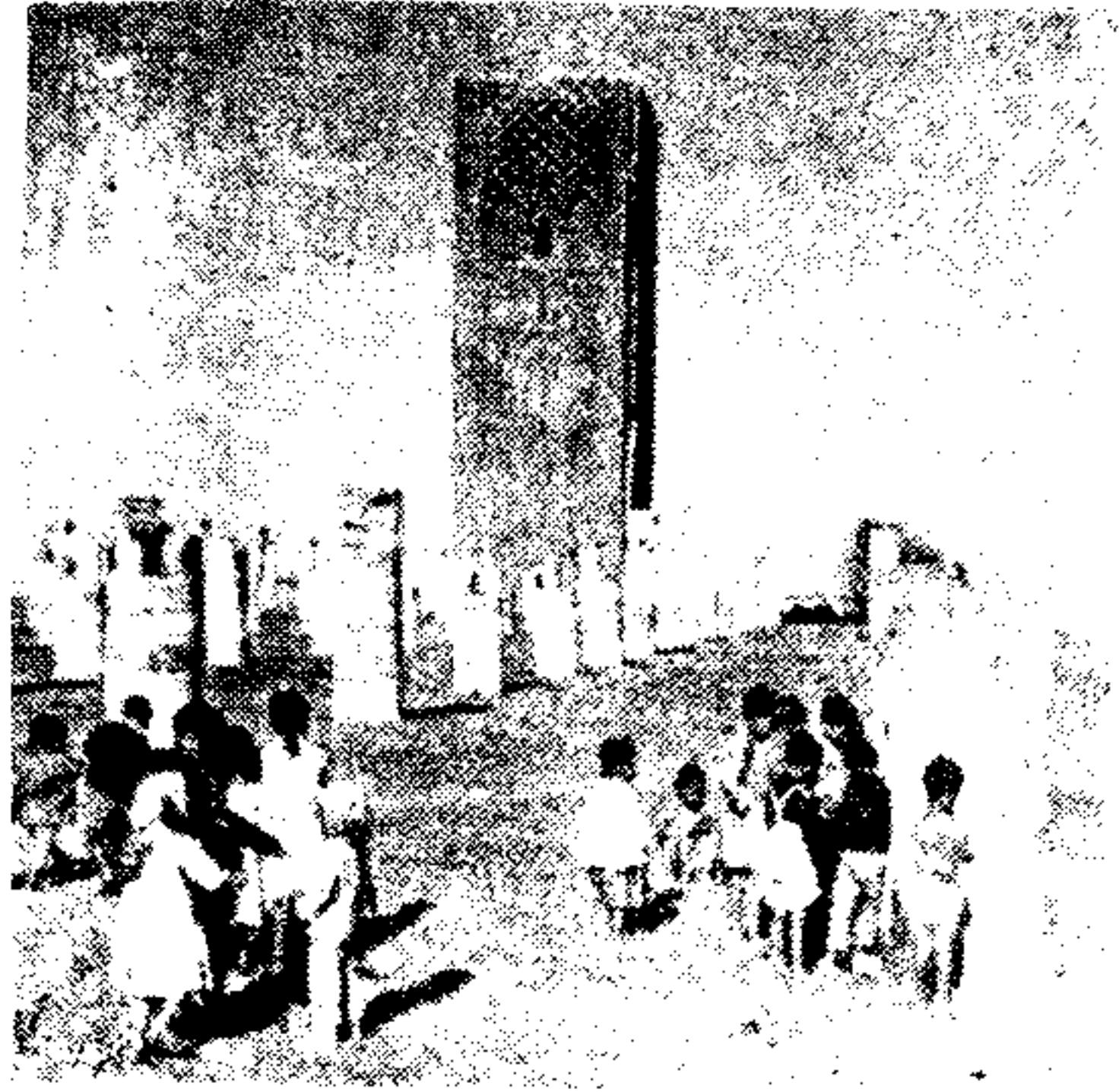
شہر رباط کا ایک منظر

حکام کا صدر مقام رہا۔ عموماً سلطان مراکش کا قیام بھی یہیں رہتا تھا۔ مراکش کا انتظامی مرکز منتخب ہو جانے کے بعد اسے مزید ترقی حاصل ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں یہاں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۲۵ اسلامی ممالک نے شرکت کی۔

ربیع الاوّل

اسلامی تقویم کا تیسرا مہینہ۔ اس ماہ کے خاص واقعات یہ ہیں: یکم ربیع الاول ۴۹ھ وفات حضرت امام حسنؓ۔ ۲۰ ربیع الاوّل ۴۶۵ھ وفات داتا گنج بخشؒ۔ ۵ ربیع الاوّل وفات امام ابو یوسفؒ۔ ۱۱ ربیع الاوّل ۱۷۹ھ وفات حضرت امام مالکؒ۔ ۱۲ ربیع الاوّل ۲۴۱ھ وفات حضرت امام احمد بن حنبلؒ۔ ۱۲ ربیع الاول رحلت حضرت محمد صلعم۔ ۱۸ ربیع الاوّل وفات حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

ربیع الآخر

یا ربیع الثانی۔ اسلامی تقویم کا چوتھا مہینہ۔ اس ماہ کے اہم واقعات ہیں وفات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (۱۷ ربیع الآخر ۵۶۱ھ) قابلِ ذکر ہیں۔

ربیع بن زیاد

بن ربیع حارثی۔ رسول اللہ کے صحابی۔ ۱۷ھ میں جنگ مناذر آپ کی قیادت میں لڑی گئی جس میں دشمن کو شکست ہوئی۔ امیر معاویہؓ نے انھیں سجستان کا والی مقرر کیا۔ بعد میں مغیرہ بن شعبہ کی وفات پر کوفہ کے حاکم بنے۔ زیاد نے انھیں سجستان سے ہٹا کر خراسان کا حاکم بنایا۔ آپ نے بلخ فتح کیا۔

ربیعہ و مضر

قدیم شمال عرب کے دو بڑے اور طاقتور قبیلے جو نزار بن معد بن عدنان کی اولاد تھے۔ مضر کے گروہ میں ربیعہ نام کے مشہور قبائل یہ ہیں:۔ ربیعہ بن عامر بن صعصعہ جن میں سے کعب کلاب اور کلیب نکلے، ربیعہ بن عبداللہ بن کعب، ربیعہ بن کلاب، ربیعہ بن اضبط، ربیعہ بن مالک بن جعفر، ربیعہ بن عقیل اور ربیعہ بن جعدہ۔ عبد شمس کی تین شاخیں بھی ربیعہ کہلاتی ہیں۔ یمن کے بڑے بڑے قبائل میں درج ذیل قابلِ ذکر ہیں: ربیعہ بن خیار، ربیعہ بن جرول اور ربیعہ بن حارث بن کعب۔ بنو ربیعہ (یا بنوابی ربیعہ) شیبان کی ایک شاخ ہے۔ ربیعۃ الکبریٰ، یا ربیعۃ الوسطیٰ اور ربیعۃ الصغریٰ تمیم کی ان تین شاخوں کو دیئے جاتے ہیں (۱) ربیعہ بن مالک بن زید مناۃ (۲) ربیعہ بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ اور (۳) ربیعہ بن مالک بن حنظلہ۔

نزار بن معد کے تین بیٹے مضر، ایاد اور ربیعہ تھے۔ شجرۂ نسب کے مطابق مضر کے دو بیٹے تھے الیاس اور عیلان الناس۔ الیاس کی نسل بنو خندف کے نام سے مشہور ہوئی۔ الیاس کے تین بیٹے تھے: مدرکہ طابخہ اور قمعہ۔ مدرکہ اور طابخہ مشہور قبیلوں کے جد بنے مدرکہ کے بیٹے ہذیل اور خذیمہ تھے۔ خذیمہ، اسد اور کنانہ کے جد بنے۔ انہی کی نسل سے دیگر قبیلوں کے علاوہ قریش بھی ہوئے۔ اُدّ بن طابخہ کے یہ بیٹے تھے، ضبہ، عبد مناۃ، عمرو، مر اور حمیس۔ تمیم بن مر عربوں کے ایک بزرگ ترین قبیلے کا جد ہے۔

ربیعۃ الفرس (ربیعہ بن نزار) کے تین بیٹے تھے اکلب، ضبیعہ اور اسد۔ اسد کے یہ بیٹے تھے: عمیرہ، عنزہ اور جدیلہ۔ جدیلہ سے عبد القیس، النمر اور وائل بن واسط اپنا نسب ملاتے ہیں۔ وائل عربوں کے نہایت طاقتور قبیلوں بکر اور تغلب کا مورث اعلیٰ تھا۔ حنیفہ، شیبان، ذہل، قیس بن ثعلبہ اور دیگر قبائل بکر کی نسل سے ہیں (ابن درید، ابن حزم)

ربیعہ اور مضر یمن کے زیر اقتدار رہے یہاں تک کہ حبشیوں نے حمیری سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ کچھ عرصہ تک ان کا تعلق کندہ کی سلطنت سے رہا جس کے حکمران معد اور ربیعہ کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ کندیوں نے یمن کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تو بکر اور تغلب کے درمیان حرب بسوس چھڑ گئی۔ اس جنگ کا خاتمہ تغلب کے حق میں ہوا اور انھوں نے بنو کر شاہ حیرہ منذر ثالث کی طرف رجوع کرلیا۔ اس نے ربیعہ، مضر اور وسطی عربستان کے دیگر قبائل کو مسخر کرلیا۔ اسی زمانے میں بنو تغلب نے الجزیرہ پر چڑھائی کی اور وہیں آباد ہوئے۔ ان کے بعد بنو نمر بن قاسط اور دیگر ربیعہ قبائل وہاں آگئے۔ تہامہ کے حکمران اور کعبہ کے پاسبان جرہم کو ایاد اور مضر نے مکہ سے نکال دیا۔ کعبہ کی جنگ میں مضر فتح مند ہوئے۔ کعبہ اور مکہ کا نظم و نسق بنو خزاعہ کے سپرد ہوا۔ حج سے متعلق صرف تین مذہبی عہدے ان کے پاس رہ گئے: عرفات کا اجازہ، مزدلفہ کا افاضہ اور منیٰ کا اجازہ۔ یہ عہدے قصیّ کی از سر نو تقسیم کے بعد بھی خاندان مضر ہی میں رہے (ابن خلدون)۔

آنحضرت صلعم کے زمانے میں بنو ربیعہ میں عیسائیت کا چرچا تھا لیکن مضر قدیم مشرکانہ طور طریقوں پر عامل رہے۔ قبیلہ مزینہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ قبائل مضر میں سے سب سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ ۸ھ میں خالد بن ولید نے نخلہ میں عزّیٰ کا بت توڑا۔ قریش، کنانہ اور تمام مضر اس بت کی تعظیم کرتے تھے (طبری)۔ سنۃ الوفود (۹ھ) میں بنو مضر اور بنو ربیعہ کی کئی بڑی شاخیں، تمیم، ثقیف، عبد القیس اور بکر بن وائل، مسلمان ہوگئیں۔

وائل مسلمان ہوگئیں۔ یہ دونوں قبیلے بھیڑ بکریاں کثرت سے پالنے اور رکھنے میں بھی شہرت رکھتے تھے۔

رٹر، ہلموٹ

(۱۸۹۲ء — جون ۱۹۷۱ء) جرمن مستشرق جو عنفوان شباب ہی سے استنبول

کے کتب خانوں میں عربی اور فارسی مخطوطات کی تحقیق و جستجو میں معروف ہو گیا اور اسلامی ثقافت کے ادبی آثار کو دریافت کرنے میں حصہ لیا۔ مشرقی ادبیات کی اشاعت کے لیے ۱۹۲۹ء میں ایک سلسلہ BIBLIOTHECA ISLAMICA کے نام سے جاری کیا اور ذیل کی کتابیں شائع کیں، (۱) ابوالحسن اشعری، مقالات اسلامیین (۲) الصفدی: الوافی بالوفیات (۳) النوبختی: فرق الشیعہ (۴) فریدالدین عطار: الٰہی نامہ۔ اس کے تحقیقی اور علمی کارناموں میں استنبول کے ذخائرِ حدیث کی فہارس اور اسرار البلاغہ کا جرمن ترجمہ قابلِ ذکر ہے۔

رجب

اسلامی تقویم کے ساتویں مہینے کا نام جو اشہرِ حرم میں سے ہے۔ اسی مہینے میں عمرہ ادا کیا جاتا تھا جو ظہورِ اسلام سے پہلے حج کے لازمی ارکان میں سے تھا۔ اسی مہینے میں حرب الفجار لڑی گئی جس میں آنحضرت صلعم نے چودہ یا بیس برس کی عمر میں شرکت فرمائی تھی۔ رجب نے اسلام میں شبِ معراج (۲۷ رجب) کی وجہ سے زیادہ اہمیت حاصل کی ہے۔ رجب کی ستائیسویں شب کو لیلۃ المعراج کہتے ہیں۔

رجم

سنگساری کی وہ سزا جو کسی محصنہ (شادی شدہ عورت) اور محصن (شادی شدہ مرد) کو زنا کے ارتکاب پر دی جاتی ہے۔ زنا بعدِ احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ پہلی شرط یہ ہے کہ مجرم آزاد ہو۔ غلام کو رجم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ لونڈی اگر نکاح کے بعد زنا کی مرتکب ہو تو اسے غیر شادی شدہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدھی سزا دینی چاہیئے۔ فقہا نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کا یہی قانون غلام پر بھی نافذ ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مجرم باقاعدہ شادی شدہ ہو۔ پہلی شرط کی طرح یہ شرط بھی متفق علیہ ہے اس شرط کی رو سے کوئی ایسا شخص جو ملک یمین کی بنا پر تمتع کر چکا ہو یا جس کا نکاح کسی فاسد طریقے سے ہوا ہو شادی شدہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا محض نکاح ہی نہ ہوا ہو بلکہ نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ بھی ہو چکی ہو صرف عقدِ نکاح کسی مرد کو محصن یا عورت کو محصنہ نہیں بنا دیتا۔ اس شرط پر اکثر فقہا متفق ہیں مگر امام ابوحنیفہ اور امام محمد اس میں اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ایک مرد یا ایک عورت کو محصن صرف اسی صورت میں قرار دیا جائے گا جب کہ نکاح اور خلوت صحیحہ کے وقت زوجین آزاد، بالغ اور عاقل ہوں۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ مجرم مسلمان ہو۔ اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ذمی بھی اگر زنا بعد احصان کا مرتکب ہو تو رجم کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس امر پر متفق ہیں کہ زنا بعد احصان کی سزا رجم صرف مسلمان کے لیے ہے۔

شرعی سزا کے طور پر رجم کا تذکرہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں ملتا ہے۔ بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ موسوی شریعت میں متعدد جرائم کی سزا رجم کر کے ہلاک کر دینا تھی۔ قرآن مجید میں رجم کا حکم مذکور نہیں لیکن متواتر احادیث اور اجماعی تعامل کی وجہ سے اس کا ثبوت ناقابلِ انکار ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر زمانہ دراز گزر جائے تو کوئی کہنے والا یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے پھر کہیں لوگ ایسے فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ نہ ہو جائیں جو اللہ نے نازل کیا تھا۔ خوب سن لو کہ رجم کا حکم اس شخص کے لیے حق ہے جو محصن ہونے کی حالت میں زنا کرے جب کہ اس پر گواہیاں قائم ہو جائیں یا حمل ثابت ہو جائے یا ملزم خود اعتراف کر لے (بخاری: الصحیح)۔ جن صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلعم سے زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم یا عمل روایت کیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت علیؓ ابن ابی طالب، عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ، جابرؓ بن عبداللہ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، زید بن خالدؓ۔ ان سب کی روایات "بخاری: الصحیح" میں موجود ہیں۔ عبادہؓ بن صامت، سلمہؓ بن المحبق، ابو برزہؓ، ہزالؓ، جابرؓ بن سمرہ، لجلاجؓ، ابوبکر صدیقؓ، بریدہؓ، ابوذر غفاریؓ، نصرؓ بن دہر اسلمی، عمران بن حصین، ابوبکرہؓ، ابوسعید خدریؓ، نعمان بن بشیر، براءؓ بن عازب کی روایات مسند احمد میں مروی ہیں۔

رجم کا طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو کسی کھلی جگہ میں لے جایا جائے جہاں عام لوگ بھی موجود ہوں۔ اگر مجرم عورت ہو تو اس کے لیے گڑھا کھود کر عورت کو اس میں کھڑا کر دینا مناسب ہے۔ اگر زنا کا ثبوت گواہوں سے ہوا ہے تو پتھر مارنے کی ابتدا گواہ کریں گے اور اگر اعتراف ہوا ہے تو ابتدا امام المسلمین کرے گا۔ پھر تمام حاضرین رجم میں حصہ لیں گے یہاں تک کہ مجرم کی موت واقع ہو جائے (ابن الہمام: فتح القدیر)۔ اسلام کا اصل منشا یہ ہے رجم کی سزا کم سے کم جاری ہو لیکن جب جاری ہو تو سالہا سال کے لیے سامانِ عبرت بن جائے۔ چنانچہ اول تو معاشرہ میں عفت و عصمت عام کرنے کے لیے ایسے احکام وضع کیے گئے ہیں جن کی موجودگی میں زنا کا صدور مشکل سے مشکل تر ہو جائے پھر قابلِ رجم زنا کے ثبوت کے لیے شرائط انتہائی سخت رکھی گئی ہیں یعنی چار قابلِ اعتماد گواہوں کا بغیر کسی کنایہ کے صریح الفاظ میں چشم دید واقعہ کی گواہی دینا۔ اگر سزا جاری ہونے سے پہلے ان گواہوں میں سے کوئی ایک بھی رجوع کر لے یا گواہی دیتے وقت ان میں کوئی معمولی اختلاف ہو جائے یا اقرار کی صورت میں مجرم کسی بھی وقت (سزا جاری ہونے کے دوران میں بھی) اپنے اقرار سے منحرف ہو جائے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے (فتح القدیر)۔ دوسری طرف اگر کسی پر زنا کا الزام لگانے کے بعد کوئی شخص قانونی شرائط کے مطابق اسے ثابت نہ کر سکے تو اس کے لیے اسی کوڑوں کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔

رحم

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: جو شخص رزق میں فراخی چاہتا ہو اور یہ چاہتا ہو کہ اس کی عمر میں ڈھیل دی جائے تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے (مشکوٰۃ شریف)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ سے عرض کیا رسول اللہ میرے رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں تو ان سے ملتا ہوں مگر وہ مجھ سے کٹتے ہیں میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ برائی سے پیش آتے ہیں میں ان کی باتوں سے درگزر کرتا ہوں مگر وہ مجھے برا کہتے ہیں۔ فرمایا اگر تو ایسا ہی کرتا ہے جیسا کہ تو کہہ رہا ہے تو تو گویا جلتی بھوبھل ان کے منہ میں جھونک رہا ہے اور جب تک تو ایسا کرتا رہے گا خدا کی طرف سے ایک مددگار ہمیشہ ان کے مقابلے میں تیری مدد کرے گا (مشکوٰۃ شریف)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا قرابت داری اللہ کی رحمت کی ایک شاخ ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ جو قرابت داری اور رشتہ داری کا خیال رکھے گا میں اس کے ساتھ ہوں اور جو اس سے گریز کرے گا میں اس کا ساتھی نہیں ہوں (مشکوٰۃ شریف)۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس قوم پر رحمت نازل نہیں ہوتی جس کے اندر ایسا شخص موجود ہو جو قرابت داروں سے قطع تعلق کرنے والا ہو۔

رحمٰن بابا

(پیدائش ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء) پشتو کے مشہور و معروف اور مقبول شاعر۔ وہ افغانستان کی شان سٹرین کی ذیلی شاخ غوریا خیل میں قبیلہ مہمند سے تھے۔ وہ پشاور کے قریب میں واقع گاؤں بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ ملا یوسف زئی سے فقہ و تصوف کی تحصیل کی۔ بعد ازاں جا کر علوم کی تکمیل کی۔ رحمٰن بابا نے ساری زندگی زہد و تقویٰ سے بسر کی۔ افغانوں میں خدا شناسی، پرہیزگاری اور حق پرستی کی وجہ سے شہرت پائی۔ ان کا مسلک صلح کل تھا اور وہ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے دور رہتے تھے۔ دو حصوں پر مشتمل ان کے دیوان میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔

اس میں چند قصائد و مخمس اور زیادہ تر غزلیں ہیں۔ انھوں نے معرفت، تصوف اور بشر دوستی کے مضامین کو کمال سلاست و روانی سے بیان کیا ہے۔ ان کے کلام میں دینی، اخلاقی اور اجتماعی مضامین ملتے ہیں۔ عاشقانہ غزلیں ان کے دردِ دل اور معنوی احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کا کلام اہم درسی کتابوں میں شامل ہے۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۸ء اور ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۲ء کے درمیان ان کا انتقال ہوا۔ رحمٰن بابا کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خانہ کے مقام پر اخوند درویزہ کے مزار کے نزدیک واقع ہے۔ زیارت کے لیے لوگ بڑی عقیدت و ارادت کے ساتھ دور دور سے آتے ہیں۔

رحمت

اللہ تعالیٰ کی شفقت و احسان۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ رحمت باری تعالیٰ کی صفات ذاتیہ میں سے ہے جس سے مقصود بندوں کو بھلائی پہنچانا اور شر سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس لیے اللہ کی رحمت کا نتیجہ یا انتہائی غایت اپنے بندوں کو ایسا اجر عطا فرما دینا ہے جو ان کے استحقاق سے بالاتر ہو اور ایسی عقوبت سے محفوظ رکھنا ہے جس کے وہ مستحق قرار پا چکے ہیں۔ امام راغب نے رحمت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد ایسی نرمی ہے جو احسان و انعام کی مقتضی ہو۔ چنانچہ رسول کریم صلعم سے جو روایات منقول ہیں ان سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ جب رحمت کی نسبت اللہ سے ہو تو اس سے مراد بندوں پر احسان و افضال اور انعام و اکرام ہے اور اگر آدمیوں سے ہو تو اس سے مقصود رقتِ قلب ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا چاہیئے (الزمر ۳۹: ۵۳)۔ ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں رحمت کے تصور کو نہایت وسیع تر مفہوم سے وابستہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ کائنات کا جمال خدا کی صفت رحمت ہی کا عکس ہے اور یہی صفت زندگی کی نشو و ارتقا کی ذمہ دار ہے۔ خدا کی صفات قہریہ اپنی جگہ ہے مگر اس کی صفاتِ رحمت عام اور وسیع تر ہیں جو صرف نیکوکار تک محدود نہیں بلکہ ساری کائنات کے لیے افادہ و فیضانِ عام کا سرچشمہ ہیں۔

رحمت اللہ کیرانوی

(۱۲۳۳ھ - ۱۳۰۸ھ) مبلغ اسلام۔ والد کا نام خلیل اللہ۔ کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امیرالمومنین حضرت عثمانؓ سے ملتا ہے۔ مولانا محمد حیات (خلیفہ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی)، مفتی سعداللہ مراد آبادی، مولانا احمد علی مظفر نگری، مولانا عبدالرحمٰن چشتی اور مولانا امام بخش صہبائی سے علوم اسلامیہ کی تحصیل کی۔ حکیم فیض محمد سے طب اور مصنف لوگا انم سے ریاضی پڑھی۔

۱۲۵۶ھ میں شادی ہوئی اور ۱۲۵۷ھ میں مہاراجہ ہندو راؤ کے ہاں دہلی میں میر منشی مقرر ہوئے۔ کچھ مدت بعد ملازمت چھوڑ دی اور کیرانہ جا کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ کو آگرہ میں پادری فنڈر کو ایک مناظرے میں شکستِ فاش دی اور مولانا کیرانوی نے انجیل میں تحریف ثابت کر دی۔ جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپ کی گرفتاری کے لیے انگریزوں نے ایک ہزار روپے کا انعام مقرر کیا۔ لیکن آپ ایک بادبانی کشتی کے ذریعے جدہ پہنچے۔ اور مکہ مکرمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہاں کلکتہ کی ایک صاحب حیثیت خاتون صولت النساء بیگم کے مالی تعاون سے مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور وہاں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ جب نہر زبیدہ کی دوبارہ کھدائی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تو آپ اس کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ سلطان عبدالحمید نے آپ کو قسطنطنیہ بلایا اور ضعف بصارت کا علاج کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر واپس مکہ مکرمہ آ گئے اور ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

رحمت علی، چودھری

(۱۸۹۳ء - ۱۹۵۱ء) لفظ پاکستان کے خالق۔ ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جالندھر سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور یہیں سے ۱۹۱۹ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۳۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں جبکہ آپ کیمبرج یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔

آپ نے ایک پمفلٹ بعنوان "NOW OR NEVER" شائع کیا جس میں پہلی بار لفظ پاکستان" لکھا گیا۔ آپ نے اس لفظ کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت بھی کی۔ وہ اس طرح کہ برصغیر کے شمال مغرب میں مسلم علاقوں یعنی پنجاب، افغانیہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر، ایران، سندھ، ترکستان افغانستان اور بلوچستان کے ناموں کے پہلے حروف جمع کر لیے اور لفظ پاکستان "تخلیق کیا۔ یعنی پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ۔ علامہ اقبال اور چودھری رحمت علی کے تصورات میں فرق تھا۔ چودھری صاحب کی سکیم میں جن صوبوں کا ذکر ہے۔ ان کے لیے آپ نے علیحدہ وفاق کی تجویز پیش کی ہے۔ دوسری طرف آپ نے برصغیر کا باقاعدہ نقشہ شائع کیا جس میں تین خود مختار مسلم ریاستیں ایک وفاق کے تحت متحد ہوتی دکھائی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان جو برصغیر کے شمال مغرب میں ہوگا۔ "بانگ اسلام" جو بنگال اور آسام پر مشتمل ہوگا اور برصغیر کے شمال مشرق میں ہوگا اور آخر میں عثمانستان، جو برصغیر کے جنوب میں ہوگا۔ اور جس کی بنیاد ریاست حیدرآباد ہوگی۔ پاکستان کی جو سکیم بالآخر مسلم لیگ نے اپنائی، چودھری صاحب اس سے مطمئن نہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے کے لئے یہاں آئے۔ لیکن پھر انگلستان چلے گئے اور مایوسی کے عالم میں کیمبرج میں فروری ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔

رزق

اُردو زبان میں اس کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے ۔ لیکن عربی میں اس کے معنی عطا، بخشش اور نصیب کے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے وہ نصیب اس کا رزق ہے ۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق، اس کی مدت عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے رزق سے مراد رزقِ حلال ہے ۔ ارشادِ ربّانی ہے : " اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے ۔ وہ تو ہم نے انھیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے ۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے ۔ رزق تو ہم ہی تمھیں دے رہے ہیں ۔ اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے ۔" (طٰہٰ : ۱۳۱ تا ۱۳۲) ۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے رزق عطا فرماتا ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے : " تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے اور رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے ۔ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی ۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے ۔" (بنی اسرائیل : ۳۱) رزق کی کمی بیشی اخلاق کے حسن و قبح پر مبنی نہیں ہوتی ۔ ارشاد ربانی ہے :" اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے (النور : ۳۸) ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے ۔ ارشادِ ربانی ہے : " زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سوتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے ۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے ۔" (ہود : ۶) ۔ جنت میں جانے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بطور " رزق " عطا ہوگا ۔ اس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے :" مگر اللہ کے چیدہ بندے محفوظ ہوں گے ۔ ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے ہر طرح کی لذیذ چیزیں ۔ اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے ۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے ۔ شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے ۔ چمکتی ہوئی شراب ، جو پینے والوں کے لیے لذّت ہوگی ۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی ۔ ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلّی ۔" (الصّٰفّٰت : ۴۱ تا ۵۰)

رس ، بنو

یمن کا ایک حکمران خاندان ۔ بنو رس کا نام مکہ معظمہ کے قریب واقع ایک جاگیر "الرّس" سے ماخوذ تھا ۔ یہ جائداد امام اوّل کے دادا قاسم رسی کی ملکیت تھی جو حضرت حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی اولاد میں سے تھے ۔ ۲۸۰ھ/۸۹۳ء میں یحییٰ المعروف بہ الہادی الی الحق حجاز سے یمن میں داخل ہوئے اور صنعا کے قریب تک پہنچ گئے ۔ وہ اس ملک کو فتح نہ کرسکے اور انھیں پسپا ہونا پڑا ۔ ۲۸۴ھ میں انھوں نے صعدہ پر قبضہ کرکے نجران بھی فتح کرلیا ۔ قرامطہ نے ۲۹۳ھ میں صنعا کو مسخر کیا اور دوسرے قصبات فتح کرنے کے علاوہ صنعا پر بھی تین سال تک قابض رہے ۔ امام موصوف نے ۲۹۸ھ میں وفات پائی ۔ ان کی زندگی میں یمن میں عباسی والی مقرر ہوتے رہے ۔ یحییٰ نے قرامطہ سے ستّر جنگیں کیں ۔ یحییٰ کے انتقال پر ان کے بیٹے محمد کے ہاتھ پر فوراً بیعت ہوگئی ۔ محمد ۳۰۱ھ میں تخت سے دستبردار ہوگئے ۔ ان کے بھائی احمد جانشین ہوئے ۔ ۳۲۲ھ/۹۳۴ء میں احمد نے بنو یعفر سے شکست کھائی اور اس کے بعد فوت ہوئے ۔ احمد کے بیٹے حسن نے امام ہونے کا دعویٰ کیا ۔ لیکن احمد کے دوسرے بیٹے قاسم المختار کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی ۔ نزاع کے باعث دونوں بھائی معزول کردیئے گئے ۔ قاسم نے ۳۴۵ھ/۹۵۶ء میں صنعا کو مسخر کرلیا ۔ اسی سال کے اواخر میں قاسم قتل ہوگیا حسن اس سے قبل وفات پاچکا تھا ۔ ۳۸۸ھ/۹۹۸ء میں قاسم منصور نے صعدا اور صنعا پر قبضہ کیا ۔ اس نے ۳۹۳ھ میں وفات پائی ۔ اس کے بیٹے نے ۴۰۴ھ تک حکومت کی ۔ اسی برس وہ قتل ہوا ۔ دوسرا امام حجاز سے آیا اور اسے کچھ کامیابی حاصل ہوئی ۔ اس کی وفات سے قبل باہر کے ایک شخص ابوالفتح نے ۴۳۰ھ میں صعدا اور دوسرے مقامات فتح کرلیے اور بالآخر صلیحی سلطان سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ ۵۳۲ھ میں احمد بن سلیمان کی فرمانروائی کا اعلان ہوا ۔ اس نے ہمدانی سلطان سے صعدہ لیا اور قرامطہ کے ساتھ بھی کامیابی کے ساتھ جنگیں لڑیں ۔ ۵۶۶ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ ۵۹۳ھ میں عبداللہ بن حمزہ نے امام کی حیثیت سے استحکام حاصل کرلیا ۔ وہ کچھ عرصہ صنعا پر قابض رہا لیکن اسے ایوبی سلطان کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑا ۔ ۶۱۱ھ میں اس نے صنعا اور ذمار پر قبضہ کر لا کر چڑھائی ۔ آخر اسے صنعا سے ہاتھ دھونے پڑے ۔ ۶۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کے بعد قریباً دو سو برس تک رسولیہ حکمران رہے ۔ طاہریوں کی حکومت کے آغاز میں صنعا میں ایک امام نے ان سے جنگ کی لیکن شکست کھائی اور طاہری صنعا پر قابض ہوگئے ۔ ۸۶۹ھ میں امام محمد بن ناصر نے صنعا پر دوبارہ قبضہ کرلیا ۔ یحییٰ شرف الدین کا مختصر عہد ۹۱۲ھ میں شروع ہوا ۔ طاہریوں اور امرا کی مزاحمت کے علی الرغم امام نے بہت سے کوہستانی علاقے اور جاذان اور ابوعریش فتح کرلیے ۔ ترکوں نے امام اور اس کے بیٹوں کے باہمی نزاعات کی وجہ سے قوت حاصل کرکے جلد ہی جازان تعز اور صنعا پر قبضہ کرلیا ۔ ۹۵۳ھ میں امام نے اپنا ملک اپنے بیٹوں میں تقسیم کردیا ۔ امام کے بیٹے مطہر نے [illegible] میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی ۔ ترکوں نے مطہر کو شکست دی اور اسے [illegible] جانے کی اجازت دے دی اس کے بعد کسی اور خاندان کے ایک امام نے [illegible] سات برس تک [illegible] رہا ۔ بالآخر ترکوں نے اسے قید کرلیا ۔ ۹۹۹ھ [illegible] میں [illegible] گیری کی یہ مہم پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ ۱۰۰۶ھ میں مطہر کے ایک بزرگ قاسم نے [illegible] اعلان کیا ۔ اس کے بیٹے نے ۱۰۴۵ھ میں ترکوں کو نکال باہر کیا ۔ [illegible] اس وقت سے [illegible] خاندان یمن کا حکمران چلا آرہا ہے ۔

رسم الخط

قرآن کا رسم الخط عربی سے ماخوذ ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس خط کو حضرت اسمٰعیلؑ نے ایجاد کیا تھا ۔ نبطی ، حمیری ، حیری اور کوفی وغیرہ اس خط کی مختلف شاخیں اور اصلاح یافتہ شکلیں ہیں ۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے پڑپوتے [illegible] نے خطِ عربی میں اصلاح کرکے جس خط کو باقی رکھا اس کا نام نبطی ہوا ۔ [illegible] نے اصلاح کی تو وہ جزم کہلایا ۔ جزم کو اہل سبا نے مزید ترقی دی تو وہ مسند حمیری بنا ۔ حمیری میں بنی ہاشم کے قیدار بن موز نے اصلاح کی تو [illegible] مشہور ہوا ۔ اہل عراق نے اس میں اصلاح کرکے خط کوفی بنا لیا ۔ ایک دوسری روایت کے مطابق عربی خط کا سلسلۂ نسب فنیقی خط سے جا ملتا ہے ۔ جب فنیقی خط کا زوال ہوا تو آرامی خط کو غلبہ حاصل ہوا ۔ غالباً سب سے پہلے آرامی خط میں حروف

کو ملاکر لکھنے کی کوشش کی گئی۔ عبرانی، نبطی، سریانی، سینائی اور عربی، یہ سب آرامی خط کی شاخیں ہیں۔ عربوں نے تیسری صدی عیسوی میں نبطی خط کو اختیار کر لیا تھا۔ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں اس میں تبدیلی کر کے انفرادیت پیدا کرلی تھی ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں خط حمیری (خط انباری) رائج تھا جسے اہل مکہ نے اہلِ حیرہ اور انبار (عراق کے دو مقامات) سے سیکھا تھا۔ غالبًا اسی کو بعد میں خط کوفی کہا گیا۔ ۵۷ء میں نبی صلعم نے جو تبلیغی خطوط مختلف حکمرانوں کو ارسال فرمائے تھے ان میں سے بعض کے جو عکس دستیاب ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خطوط خط کوفی میں لکھے گئے تھے۔ مورخین کا اس بات پر اجماع ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے خط کا تعارف حرب بن امیہؓ کے ذریعے ہوا۔ مدینہ میں ماسکہ کے یہودیوں میں سے ایک یہودی تھا جو بچوں کو پڑھنا سکھایا کرتا تھا چنانچہ جب وہاں آنحضور صلعم پہنچے تو اس سے کچھ اور لوگ اس فن سے متعارف تھے۔ ان ہی میں حضرت زید بن ثابت بھی تھے جو عربی اور سریانی دونوں زبانوں میں لکھ پڑھ سکتے تھے۔ آنحضور صلعم کی تحریص و ترغیب پر مدینہ میں کثرت سے لوگوں نے فن کتابت سیکھ لیا۔ غالب گمان یہی ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن مجید کی کتابت بھی اسی خط میں کرائی ہوگی جسے بعد میں خطِ کوفی کا کام نام دیا گیا۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ وغیرہ کے لکھے ہوئے مصاحف کے جو عکس ملتے ہیں وہ خط کوفی میں ہیں۔

عام روایات کی رُو سے حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں قرآن کو لغتِ قریش (جس میں رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا) کے مطابق تحریر کرایا تھا۔ اسی رسم الخط کی پیروی آج بھی جاری ہے۔ سوادِ اعظم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے یعنی وہی ہے جس کے مطابق حضرت عثمان نے تدوین کرائی اور جس میں رسول اللہ نے بھی تحریر کرایا تھا۔ آنحضور صلعم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں قرآن مجید کو مدوّن کیا گیا۔ حضرت عمر کے دَور میں اس سلسلے میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں قرآن مجید لغتِ قریش کے مطابق لکھا گیا اور اس کی نقول تمام قلمرو ئے سلطنت میں ارسال کی گئیں۔ ابن اسٹر کے بقول یہ نسخہ ۳۰ھ میں تیار ہوا۔ اور بلاشبہ وہ خط کوفی میں تھا۔ یہ نسخہ مصحف امام کہلاتا ہے۔ مصحف امام اور حضرت عثمانؓ کے عہد کے دوسرے مصاحف بلا نقطہ تھے۔ اور اس پر تقریبًا تمام علماء کا اجماع ہے کہ آجکل معرّبا حروف کے علاوہ جو زیادات دکھائی دیتے ہیں وہ اس وقت موجود نہ تھے۔

ایک رائے یہ ہے کہ یہ صحابہ ہی تھے جنہوں نے مصاحف میں نقاط کا اضافہ کیا، تخمیس (ہر پانچ آیتوں کے بعد نشان) اور تعشیر (ہر دس آیتوں کے بعد نشان) کی۔ البتہ باقاعدہ نظام کی تشکیل نہیں ہوئی تھی جس کے تحت نقاط الفاظ قرآنی پر لگائے جاتے۔ صحابہ کے بعد تابعین نے آکر اس کا اہتمام کیا اور نقاط و اعراب لگانے کے اصول و قواعد وضع کیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کام کو صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے انجام دیا۔ سرفہرست نام ابوالاسود دؤلی کا آتا ہے بعض کا خیال ہے کہ وہ پہلا شخص یحییٰ بن عمیر ہے اور بعض کے نزدیک نصر بن عاصم اللیثی ہے۔ اس اوّلین مرحلے میں نقاط کا وجود تو ہے مگر ان کی حیثیت ان نقاط کی نہیں ہے جن سے ہم آج واقف ہیں۔ اس کے بعد بھی بہت سے ہم شکل حروف کے درمیان امتیاز مشکل تھا۔ ب، ت، ٹ، ج ح خ، د ذ، ر ز، س ش، ع غ کا صحیح تلفظ اور ادائیگی ایک مسئلہ تھا۔ الفاظ کو ملانے اور جوڑنے کے لیے کوئی خاص نظام نہ تھا۔ جملوں کے درمیان وقف و امتیاز کی دوسری علامتیں مفقود تھیں۔ نقاط کی ایجاد امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں ہوئی۔ دوسرا قدم عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اٹھایا گیا۔ حجاج بن یوسف نے غالبًا ۷۵ھ میں یحییٰ ابن عمیر اور نصر بن عاصم کو اس غرض کے لیے طلب کیا۔ نصر بن عاصم کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ انھوں نے حجاج کی منشا کے مطابق باقاعدہ نقطے وضع کیے جن کے ذریعے ہم شکل حروف میں امتیاز قائم ہو گیا۔ سوادِ اعظم کو اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔ الفاظ کا تلفظ اور ہجے آسان ہو گئے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان اور اس کے جانشین ولید نے مصاحب کی کتابت کے لئے خالد بن ابی ہیاج کو مقرر کیا۔ جو اپنے خط کی خوبصورتی میں مشہور تھے۔ انہوں نے مسجدِ نبویؐ کی محراب میں بھی خطاطی و نقاشی کی تھی۔

رسم الخط کو عام فہم، آسان اور حسین بنانے کی کوششیں جاری رہیں۔ بنو عباس کے زمانے میں خلیل بن احمد نے اعراب کی خاص شکلیں وضع کیں۔ لفظوں کی حسین شکل متعین کی اور کتابت میں اصول و قواعد کو منضبط کیا۔ تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ابن مقلہ نے رسم الخط میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ خط کی تاریخ میں ابن مقلہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس نے قدیم اور مروج خطوط کو پیش نظر رکھتے ہوئے چھ خطوط ایجاد کیے۔ جن میں سے "نسخ" قابلِ ذکر ہے۔ ان میں سے ہر خط کا دار و مدار "سطح" اور "قدر" پر رکھا اور پہلی مرتبہ خطاطی کے اصول و قواعد اور حروف کے ناپ مقرر کیے، تاکہ ہر خط میں امتیاز اور خفی و جلی قلم میں یکسانی برقرار رہے۔ خطِ نسخ ۳۱۰ میں ایجاد ہوا۔ یہ خط قرآن مجید لکھنے کے لیے مخصوص ہوا۔ چوتھی صدی ہجری کے آواخر تک قرآن مجید کا رسم الخط کوفی تھا۔ پانچویں صدی کے اوائل میں اس کی جگہ خطِ نسخ نے لے لی۔ اس کی ایجاد کے بعد تمام پچھلے خطوط منسوخ ہو گئے۔ نسخ میں سب نقاط، حرکتیں علامتیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ ساری اصولی اور بنیادی ضرورتیں جو ابتدائے کتابت میں محسوس کی جاتی تھیں، نسخ کے ذریعے پوری ہو گئیں۔ ساتویں صدی ہجری میں میر علی تبریزی نے خط نستعلیق ایجاد کیا۔ اس کے لیے قواعد و ضوابط بھی وضع کیے اور نظم میں انھیں تالیف کر دیا۔ یہ خط بھی بہت مقبول ہوا اور عمومًا اختیار کر لیا گیا۔ (نیز دیکھئے مقالہ "کاتبان وحی")

رسول

اللہ کا وہ برگزیدہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے کہ رسول منتخب کرنا اللہ عزوجل کا اپنا کام ہے (الحج ۷۵) کیونکہ وہی بہتر جانتا ہے کہ منصبِ رسالت کہاں اور کسے سونپا جائے (الانعام ۱۲۴) اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ڈرانے اور خوش خبری دینے کا فریضہ انجام دیں (النساء: ۱۶۵) اللہ تعالیٰ نے ہر قریہ اور قصبہ میں اپنا رسول بھیجا مگر ہر امت میں سے بعض نے اپنے رسول کو ضرور جھٹلایا (آل عمران ۱۸۴) اور ان جھٹلانے والوں میں ہمیشہ اہل ثروت پیش پیش رہے (سبا: ۳۴)۔ رسول سب کے سب انسان تھے اور انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے (الفرقان: ۲۱)۔ سب واضح دلائل لے کر آئے تھے (الروم: ۴۷)۔ سب کا پیغام ایک ہوتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (انبیاء ۲۵)۔ ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل تھی (البقرہ: ۲۵۳) تمام رسولوں کو یہی حکم تھا کہ وہ پاکیزہ چیزیں کھائیں اور اعمال صالحہ پر کاربند رہیں (المؤمنون: ۵۱)۔ رسولوں میں بعض کے بارے میں آنحضرت صلعم کو بتایا گیا اور بعض کے بارے میں نہیں بتایا گیا (النساء)۔ سب رسول اپنی اپنی امت اور اپنے اپنے زمانے کے لیے

تھے مگر حضرت محمد صلعم ہر زمانے کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے (سبا: ۲۸؛ اعراف: ۱۵۸)؛ آپؐ ہی تمام جہانوں کے لیے رسولِ رحمت ہیں (انبیاء: ۱۰۷؛ القصص: ۷۵)۔ آنحضرت صلعم کو ایسی امت میں بھیجا گیا ہے جس کے پاس اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول نہیں بھیجا تھا (القصص: ۴۶؛ السجدہ: ۳؛ سبا: ۴۴) ۔ آنحضرت صلعم صرف پیغمبر نہ تھے بلکہ کلام الٰہی کی تشریح و توضیح بھی ان کے فرائض منصبی میں شامل تھی (النحل: ۴۴)۔ اولوالعزم رسول پانچ ہیں (احقاف: ۳۵)۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلعم۔ اور یہی صاحب شریعت بھی ہیں۔ قرآن مجید نے حضرت لوطؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کو بھی رسول کا اعزاز دیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، ذوالنونؑ اور آنحضرت صلعم کو قرآن مجید میں بعض اوقات رسول کہا گیا ہے اور بعض اوقات نبی۔ رسول اور نبی میں فرق یہ ہے کہ رسول بیک وقت رسول بھی ہوتا ہے اور نبی بھی لیکن نبی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسول وہ ہے جسے جبرئیلؑ کے ذریعے وحی آتی ہو۔ صاحب کتاب و شریعت ہو، اسے تبلیغ رسالت کا حکم ملا ہو اور وہ اپنے سے پہلے رسولوں میں سے کسی کی شریعت یا کتاب کے تابع نہ ہو۔ نبی وہ ہے جسے فرشتے کے ذریعہ قلبی الہام کے ذریعے وحی ہو خواہ اسے تبلیغ کا حکم ہو یا نہ ہو (تھانوی، کشاف؛ دستور العلماء)

رسول اور اس کی امت کے درمیان ایک قریبی تعلق ہوتا ہے۔ رسول اللہ کا پیغام اپنی امت کو پہنچاتا ہے۔ سب سے پہلے وہ خود وحی الٰہی پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے ماننے والے بھی اللہ کے کلام اور احکام پر ایمان لاتے ہیں۔ رسول خود بھی احکام الٰہی پر عمل کرتا ہے اور اپنے ملنے والوں کو بھی عمل کی تلقین کرتا ہے۔ نیز وہ احکام الٰہی کی توضیح و تشریح کر کے امت کے لیے لائحہ عمل اور صحیح طریق کار متعین کرتا ہے۔ رسول زمام قیادت و سیادت اپنے ہاتھ میں لے کر انسانی فلاح کے لیے روحانی بنیادوں پر انقلاب برپا کرتا ہے۔

رشید احمد گنگوہی

(۶ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء — ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ/ ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء)

مشہور محدث۔ مولانا ہدایت احمد انصاری گنگوہی کے فرزند۔ قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ابوایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو دادا نے پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے کرنال میں اپنے ماموں اور فارسی کے مسلم الثبوت استاد مولوی محمد تقی سے فارسی پڑھی۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں محمد بخش رامپوری سے پڑھیں۔ ۱۲۶۱ھ میں دہلی گئے اور مولوی قاضی احمد الدین جہلمی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مولانا مملوک العلی نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق ہوئے۔ حدیث شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی۔ درسیات سے فارغ ہو کر قرآن مجید حفظ کیا۔ تحصیل علم کے بعد تھانہ بھون گئے اور مولانا شیخ محمد تھانوی سے بیعت ہوئے اور کچھ عرصہ وہیں قیام کرنے کے بعد چاروں سلسلوں کی اجازت و خلافت حاصل کی۔ ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء میں تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کے الزام میں چھ مہینے جیل میں رہے۔ تین مرتبہ حج کیا۔ پچاس برس انھوں نے گنگوہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیا۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۵ء کے بعد ان کی بصارت جاتی رہی۔ ان کے درس حدیث سے تین سو سے زائد جید علما فیض یاب ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی اور سید حسین احمد مدنی بھی آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ چاروں طریقوں میں بیعت کرتے تھے لیکن عام تعلیم چشتیہ صابریہ طریقے کی تھی۔ "تذکرۃ الرشید" میں آپ کی کم و بیش پندرہ تصانیف کا ذکر آیا ہے۔ ترمذی پر آپ کی تقاریر کا مجموعہ "الکوکب الدری" دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ مکاتیب اور فتاویٰ کے مجموعے بھی ہیں۔

رشید الدین طبیب

(۱۲۴۷ء — ۱۸ جولائی ۱۳۱۸ء) ایران کا نامور مورخ۔ ہمدان میں پیدا ہوا۔ اس کا عروج مغول فرمانروا اباقا خان (۱۲۶۵ء — ۱۲۸۲ء) کے عہدِ حکومت میں طبیب کی حیثیت سے ہوا۔ غازی خاں کے عہد (۱۲۹۵ء — ۱۳۰۴ء) میں صدر جہاں اور درباری مورخ مقرر ہوا۔ الجائتو کے عہد (۱۳۰۴ء — ۱۳۱۶ء) میں رشید الدین کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ اس نے اپنی دولت خیراتی عمارات پر صرف کی۔ ایک نئی بستی تعمیر کرائی جو اس کے نام سے "ربع رشیدیہ" کہلائی۔ یہ بستی ایک مسجد، ایک مدرسہ، ایک ہسپتال اور کئی ہزار مکانات پر مشتمل تھی۔ ۱۴ اپریل ۱۳۰۶ء کو اس نے تاریخ عالم "جامع التواریخ" کی پہلی جلد بادشاہ کو پیش کی۔ وہ الجائتو کو شافعی بنانے میں بھی کامیاب ہوا۔ ۱۳۰۹ء میں اس نے تبریز کے مشرق میں غازانیہ کے مضافات میں ایک اور بستی بنوائی۔ اس بستی کو سرا و رود سے ایک بڑی نہر کے ذریعے پانی مہیا کیا۔ اکتوبر ۱۳۱۷ء میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ اس پر الجائتو کو زہر دے کر ہلاک کرنے کا اتہام لگا چنانچہ رشید الدین اور اس کے بیٹے خواجہ ابراہیم کو قتل کر دیا گیا۔ ۱۳۳۶ء میں اس کے بڑے بیٹے غیاث الدین کو بھی سزائے موت دے دی گئی۔ اسی سال بعد تیمور کے بیٹے میران شاہ (۱۴۰۴ء — ۱۴۰۷ء) نے رشید الدین کی ہڈیاں نکلوا کر انھیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

"جامع التواریخ" رشید کی غیر فانی تالیف ہے۔ جلد اول میں ترک و مغول قبائل کی تاریخ اور جلد دوم میں آنحضرت صلعم اور خلفاء (۱۲۵۸ء تک)، ایران کے فرمانروا خاندانوں کی تاریخ، مشرقی و مغربی اسمٰعیلی، اوغز اور ترک، چینی، یہودی، افرنگی [illegible] اور یورپ، ہندوستان، مہاتما بدھ اور بدھ مت۔ "مجموعۃ الرشیدیہ" میں رشید کی [illegible] کتابیں شامل ہیں: (۱) توجیہات، متصوفانہ دینی رسالہ (۲) مفتاح التفاسیر [illegible] فصاحت اور تفاسیر کے بارے میں (۳) الرسالۃ السلطانیہ، ایک دینی [illegible] (۴) لطائف الحقائق، متصوفانہ اور الٰہیاتی نوعیت کے چار [illegible]۔

رشید مولائی

([illegible]ھ/ [illegible]ء — ۱۱ ذوالحجہ ۱۰۸۲ھ/ ۹ اپریل ۱۶۷۲ء [illegible])

علی بن محمد بن علی علوی، سلطان مراکش اور اس خاندان کا حقیقی بانی [illegible] علمبردار۔ اس کے اسلاف نے مراکش کے جنوب میں [illegible] اقتدار پیدا کر لیا۔ مراکش میں اس زمانے میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی [illegible] حسنی شرفا بڑے بڑے صحرائی قطعات کے مالک بن گئے۔ [illegible] واقع تھے مولائی محمد نے مراکش کے جنوب مغرب میں [illegible] کامیاب جنگ کی [illegible]ھ/ ۱۶۴۶ء میں [illegible] لقب اختیار کر کے [illegible] مؤثر اقتدار قائم ہو گیا۔ ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء میں [illegible] شریف کی وفات پر [illegible] نے اپنے بھائی مولائی محمد پر اعتماد نہ کیا [illegible] میں چلا گیا۔ [illegible] حاکم دریدی نے اسے داخلے کی اجازت نہ دی [illegible] حامیوں کی بڑی تعداد جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ [illegible]ھ/ ۱۶۶۳ء میں [illegible] اس کے جھنڈے تلے آ گیا اور [illegible] میں اس نے باقاعدہ فرمانروائی حیثیت سے [illegible] یہ خبر سن کر تافیلالت سے رشید مولائی پر حملہ آور ہوا۔ مولائی محمد لڑائی کے آغاز میں مارا گیا اور اس کے آدمی رشید سے آ ملے۔ اس کے بعد رشید نے تازا پر قبضہ کیا۔ مارچ ۱۶۶۶ء میں اس

نے ریف کے حکمران ابو محمد عبداللہ اعراص کو بے دخل کرکے قبضہ کرلیا۔ ۳ ذوالحجہ ۱۰۷۶ھ/ ۶ جون ۱۶۶۶ء کو رشید نے فاس فتح کیا۔ دریدی فرار ہوگیا۔ اس کے بعد کے چند سال رشید نے اس کوشش میں صرف کیے کہ اپنے مقبوضات کو مغرب اور جنوب کی طرف وسعت دی تیمرالکبیر' مکناس' تطوان' تارا اور زاویۃ الدلاء پر قبضہ کیا۔ ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں اس نے مراکش پر قبضہ کرکے مقامی رئیس عبدالکریم الشبانی کو سزائے موت دی۔ اب وہ تمام مراکش کا مالک ہوگیا تھا۔ رشید گھوڑے سے گرکر ہلاک ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی مولائی اسمٰعیل ۱۵ ذوالحجہ کو سلطان بنا۔ مراکش کے مسلمان مؤرخین مولائی رشید کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔

رضا شاہ پہلوی

(۱۶ مارچ ۱۸۷۸ء ــــ ؟) شاہ ایران۔ رضا خاں نام۔ ماژندران کے قلعہ اشت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عباس علی خاں ماژندران میں مقیم فوج کے ذمہ دار افسر اور متوسط طبقے کے زمیندار تھے۔ اپریل ۱۸۷۸ء میں والد کا انتقال ہوا تو والدہ اپنے شوہر کے عزیزوں کے پاس تہران سے آئیں۔ چودہ سال کے تھے تو ایرانی قزاق بریگیڈ میں بھرتی ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے جنگی قبائل کے خلاف کاروائی میں نام پیدا کیا جب بریگیڈ کو دوبارہ منظم کیا گیا تو انھیں جونیئر کرنل بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ملک کی بدحالی کے پیش نظر نوجوانوں میں احمد شاہ قاچار کی حکومت کے خلاف عام اضطراب پایا جاتا تھا۔ ۱۵ فروری ۱۹۲۱ء کو قزاق بریگیڈ نے رضا شاہ کی قیادت میں تہران کی طرف کوچ کیا۔ ۲۱ فروری کو انھوں نے تہران پر قبضہ کرلیا۔ رضا خاں نے احمد شاہ قاچار کے ساتھ وفاداری کا اعلان کردیا دوسرے ہی دن احمد شاہ نے ضیاء الدین طباطبائی کو وزیراعظم اور رضا خاں کو ایرانی فوج کا "سردار سپاہ" بنا دیا۔ رضا خاں کے مطالبے پر حکومت کے نااہل افسران برطرف کردیئے

گئے۔ وزارتوں کی جانچ پڑتال کی گئی اور غیر ملکی زیر حمایت ملازمین کو الگ کردیا گیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۲۱ء کو ضیاء الدین مستعفی ہوا اور وزارت عظمیٰ قوام السلطنت نے سنبھالی۔ وزارت جنگ رضا خاں کے سپرد ہوئی۔ اس نے فوجی جمعیت اڑھائی ہزار سے بڑھا کر پچاس ہزار کردی اور اسے جدید اسلحہ سے مسلح کردیا گیا۔ محصولات وصول کرنے اور خرچ کرنے کے اختیارات اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ رضا خاں نے شمال ایران میں باغیوں کی سرکوبی کی۔ دوسرا اقدام کردوں' لوریوں' بختیاریوں' قاشقائیوں اور دوسرے جنگجو قبائل کے خلاف اٹھایا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان قبائل کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ آذربائیجان کو مرکز کے تحت لانا بڑا کارنامہ سمجھا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں خرم آباد کے لوریوں کو غیر مسلح کیا گیا۔ قوام السلطنت نے رضا خاں کو ہٹانے کی سازش کی لیکن رضا خاں کو اس سازش کا بروقت پتا چل گیا اور قوام السلطنت کو سازشیوں سمیت گرفتار کرلیا گیا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو رضا خاں وزیراعظم بنا۔ احمد شاہ خرابی صحت کے باعث فرانس چلا گیا اور اپنے بھائی کو ولی عہد بنا دیا۔ ایران کے تمام صوبوں سے رضا خاں کو عرضداشتیں موصول ہونے لگیں کہ ملک میں جمہوریت کا اعلان کردیا جائے۔ مجتہدین نے تحریک جمہوریت کی شدید مخالفت کی۔ بالآخر رضا خاں کو ملک میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ رضا خاں نے مذہبی پیشواؤں سے گفت و شنید کے بعد تحریک جمہوریت ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ محمرہ کے شیخ خزعل نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ رضا خاں ۶ نومبر ۱۹۲۴ء کو پانچ ہزار فوج کے ساتھ خوزستان کی طرف بڑھے۔ ۶ دسمبر کو خزعل نے غیر مشروط طور پر اطاعت کی۔ اسی عرصے میں رضا خاں کی فوج نے خوزستان پر قبضہ کرلیا۔ شیخ محمرہ نے وعدہ کیا کہ وہ بقایا پانچ لاکھ تومان کے علاوہ نئے ٹیکس بھی ادا کرے گا۔ رضا خاں تہران واپس آئے تو ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اب تہران' تبریز' اصفہان' کرمان' شیراز اور خوزستان کے عوام مطالبہ کرنے لگے تھے کہ بادشاہ کو معزول کرکے قاچاری خاندان کا خاتمہ کردیا جائے۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے قرارداد منظور کی کہ مجلس شوریٰ ملی فلاح عامہ کے پیش نظر قاچاری حکومت کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے اور دستور اور دوسرے قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے عبوری حکومت رضا خاں کے سپرد کرتی ہے۔ رضا شاہ صرف چھ ہفتے ریجنٹ رہے۔ مجتہدین' حکام' سیاستدانوں' رجعت پسندوں' قوم پرستوں اور اعتدال پسندوں' سب نے استدعا کی کہ رضا خاں ایران کا تاج و تخت قبول کریں۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں مجلس دستور ساز کا اجلاس ہوا اور دستور میں ترمیم کرکے خاندان قاچار کے افراد کو تخت سے محروم کردیا گیا۔

رضا خاں کی تاجپوشی کی رسم ۵ اپریل ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔ رضا شاہ پہلوی نے اسلامی ممالک کے ساتھ الگ الگ معاہدے کیے۔ نتیجتاً ایران کا خام مال اسلامی ممالک میں برآمد ہونے لگا۔ پارلیمنٹ نے ملک بھر میں جدید تعلیم عام کرنے کے لیے قانون منظور کیا اور ملکی مالیات کا نصف حصہ تعلیم کے لیے وقف کردیا گیا۔ ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو دانشگاہ تہران کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ ملٹری اکیڈمی قائم ہوئی اور ابتدائی فوجی سکول تہران' تبریز' مشہد' اصفہان اور کرمان شاہ میں قائم کئے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ٹیکنیکل سکول کا قیام عمل میں آیا۔ یہ سکول جرمن ماہرین صنعت نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں تمام غیر ملکیوں کے سکول وزارت تعلیم نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ مگر ٹیکنیکل سکول کو اس فیصلے سے مستثنیٰ کردیا گیا۔ شمالی ایران کو جنوبی ایران سے اور مشرقی ایران کو مغربی ایران سے بذریعہ ریل ملانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ ریلوے ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۹ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ ریلوے کی تعمیر پر قومی جشن منائے گئے ۱۹۳۹ء میں سوتی کپڑے کے کارخانے ماژندران' اصفہان اور تہران میں اور ریشمی پارچہ بافی کے کارخانے چالوس اور ماژندران میں قائم ہوئے۔ اصفہان میں اونی کپڑا بننے کے کارخانے قائم ہوئے۔ ان کے علاوہ سیمنٹ بنانے اور شکر سازی کے کارخانے بھی قائم ہوئے ۱۹۲۷ء میں ملکی سرمائے سے قومی بنک قائم ہوا جس سے ملکی معیشت میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں وزارتِ صحت قائم ہوئی۔ متعدد شہروں اور بڑے دیہات میں ہسپتال قائم کیے گئے۔

۲۲ر جون ۱۹۴۱ء کو جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے روس کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ ایران نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ ۲۵ر اگست کو روس اور برطانیہ نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر دیں۔ بالآخر ایران نے رسد کے لیے خلیج فارس کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ محمد رضا خان پہلوی اپنے جانشین محمد رضا شاہ پہلوی کے حق میں دستبردار ہو کر جنوبی افریقہ چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کا جسد خاکی تہران لایا گیا اور شاہ عبدالعظیم کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ شہزادہ محمد رضا شاہ پہلوی نے ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو دستور کے مطابق حلف اٹھایا۔

رضاعت

فقہی اصطلاح اس سے مراد وہ رشتہ ہے جس کی بنا پر دودھ کے رشتہ داروں کا باہمی نکاح ناجائز ہو جاتا ہے۔ اس امر پر امت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے۔ تمام وہ رشتہ دار جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں۔ رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حرمتِ رضاعت کتنا دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے اتنی ہی مقدار میں اگر بچہ کسی کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مختلف فقہا کے اقوال حسب ذیل ہیں: (۱) اعتبار صرف اس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جبکہ بچے کا دودھ چھڑایا نہ جا چکا ہو اور شیر خوارگی ہی پر اس کے تغذیہ کا انحصار ہو۔ ورنہ دودھ چھٹائی کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اس نے پانی پی لیا ہو۔ یہ رائے ام سلمہ اور ابن عباس کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت اسی معنی میں آئی ہے۔ زہریؒ، حسن بصریؒ، قتادہ، عکرمہؒ اور اوزاعی اسی کے قائل ہیں (۲) دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دودھ پیا گیا ہو صرف اسی سے حرمت رضاعت ثابت ہو گی۔ یہ حضرت عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ کا قول ہے۔ فقہا میں امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور سفیان ثوری نے اسے قبول کیا ہے۔ (۳) امام ابوحنیفہؒ اور امام زفر کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانۂ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ (۴) خواہ کسی عمر میں دودھ پیا جائے، حرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اصل اعتبار دودھ کا ہے نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بوڑھا بھی ہو تو وہی حکم ہے جو شیر خوار بچے کے لیے ہے۔ یہی رائے حضرت عائشہؓ کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی صحیح تر روایت اسی تائید میں منقول ہے۔ فقہا میں سے عروہ بن زبیر، عطاء، لیث بن سعد اور ابن حزم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

رضا قلی خان ہدایت

(۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء ـــ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء) بن محمد ہادی بن اسمٰعیل کمال، ایرانی فاضل، ادیب اور مورخ۔ ۱۸۰۲ء میں رضا قلی یتیم ہو گیا۔ اس کی زندگی کے ابتدائی ایام فارس میں گزرے۔ اس کے بعد وہ تہران آگیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ فارس کے نائب السلطنت کی سرپرستی میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوا۔ ۱۸۳۸ء میں محمد شاہ نے اپنے بیٹے عباس مرزا کی تعلیم رضا قلی کے سپرد کر دی۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۱۸۵۱ء میں ناصر الدین شاہ نے اسے ایک سفارت پر خیوہ روانہ کیا۔ اس کے بعد وہ وزیر معارف مقرر ہوا۔ پندرہ برس بعد شاہزادہ مظفر الدین کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس کی درج ذیل کتب قابل ذکر ہیں: (۱) دیوان، مشتمل اشعار کا مجموعہ، اشعار کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے۔ (۲) فہرس التواریخ، ترتیب وار تاریخی واقعات (۳) اجمل التواریخ، ایران کی تاریخ کا اختصار (۴) روضۃ الصفائے ناصری، یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں سیاسی واقعات کے علاوہ بہت سی جغرافیائی، ادبی اور فنون لطیفہ سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ (۵) ریاض العارفین، صوفی شعرا کا تذکرہ (۶) مجمع الفصحا، یہ کتاب ایرانی شاعری کی تاریخ کے لیے اولین اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مصنف کی بہترین تالیف ہے۔ ایرانی شاعری کی تاریخ پر ایک عمومی مقدمے کے علاوہ تمام شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے منتخب نمونے دیئے گئے ہیں۔ آخر میں ہدایت کے اشعار کا انتخاب اور خود نوشت سوانح عمری درج ہے (۷) فرہنگ انجمن آرائے ناصری، اس میں فارسی الفاظ کے مختلف معنی اور سند میں مشہور شعرا کے اشعار درج کیے گئے ہیں۔ (۸) مدارج البلاغہ، خطیبانہ و شاعرانہ اصطلاحوں کی فرہنگ۔

رضیہ سلطانہ

(عہد حکومت: ۱۲۳۶ء ـــ ۱۲۴۰ء) سلطنت دہلی کی فرمانروا ترک خاتون سلطان شمس الدین التمش نے رضیہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ لیکن التمش کی وفات پر درباریوں نے اس کے ایک بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ عیش پرست انسان تھا حکومت کا حقیقی اقتدار اس کی ماں شاہ ترکان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے التمش کے ایک بیٹے قطب الدین کو بلا وجہ قتل کروا دیا۔ اس کی بے رحمی سے ارکان سلطنت باغی ہو گئے۔ ملتان کا صوبیدار ملک اعز الدین ایاز سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے دہلی کی طرف بڑھا تو رکن الدین اپنی فوج لے کر بہرام میں پہنچا۔ امرائے سلطنت اس کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آگئے اور رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کر دیا۔ شاہ ترکان کو قید میں ڈال دیا گیا۔ رکن الدین رضیہ کے خلاف بھی آمادہ ہوا۔ شکست کھا کر گرفتار ہوا۔

رضیہ سلطانہ بڑی زیرک اور تیز فہم تھی۔ اس نے تمام مخالفوں کو کچل ڈالا۔ اس نے خواجہ مہذب الدین حسین کو وزیر مقرر کیا۔ جب ایک حبشی ملک جمال الدین یاقوت مہتمم اصطبل کو امیر الامرا کا خطاب ملا تو ترک امرا بگڑ گئے اور بھٹنڈے کے ملک التونیہ کی قیادت میں بغاوت کر دی۔ باغی امرا نے یاقوت حبشی کو قتل کر دیا اور رضیہ کو قید کر کے اس کے سوتیلے بھائی بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملک اختیار الدین التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ ملک التونیہ اور رضیہ دونوں میدان جنگ میں کام آئے۔

رفاعہ بک طہطاوی

(۱۸۰۱ء ـــ ۱۸۷۳ء) انیسویں صدی کا مشہور مصنف۔ اس کا شمار ان اہل قلم کی دور میں ہوتا ہے جنہوں نے جدید عربی نشاۃ کی داغ بیل ڈالی۔ رفاعہ بالائی مصر کے مقام طہطا میں پیدا ہوا۔ ۱۸۲۴ء میں وہ ازہر سے فارغ التحصیل ہوا۔ اس نے فرانسیسی میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۳۲ء میں مدرسہ طب میں فرانسیسی زبان کا ترجمان اور معلم مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ مختلف مدرسوں میں کام کرتا رہا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ پندرہ روزہ تعلیمی مجلہ "روضۃ المدارس" کا مدیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ رفاعہ نے تاریخ، جغرافیہ، صرف و نحو، قانون، طب میں معتدبہ تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ رفاعہ اور اس کے شاگردوں نے عربی اور ترکی زبانوں میں تقریباً دو ہزار کتابوں کے ترجمے کیے۔

رفاعہ بن رافع

بن مالک بن عجلان بن عمرو بن زریق، رسول اللہ کے صحابی۔ عقبۂ ثانیہ میں اسلام قبول کیا۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا

۴۱ھ میں امیر معاویہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

رفاعی ، احمد

(۱۱۰۶ء ـــ ۲۳ ستمبر ۱۱۸۲ء) طریقۂ رفاعیہ کے بانی۔ ضلع بصرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد علی ابوالعباس ۵۱۹ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔ رفاعی کی پرورش ان کے ماموں منصور بطائحی نے کی۔ رفاعی کی تعلیم ستائیس برس کی عمر تک جاری رہی۔ تب انھیں علامہ ابوالفضل علی الواسطی کی طرف سے ''اجازہ'' اور اپنے ماموں امام منصور کی طرف سے خرقہ ملا۔ ۵۴۰ھ میں منصور کا انتقال ہوا اور وہ اپنے فرقے ''مشیخہ'' کی مشیخت احمد رفاعی کے لیے چھوڑ گئے۔ رفاعی کی سرگرمیاں ام عبیدہ اور نواحی دیہات تک محدود رہیں۔ سبط ابن الجوزی کہتے ہیں کہ ان کے شیوخ میں سے ایک کے بیان کے مطابق رفاعی کے پاس شعبان کی ایک رات کو ایک لاکھ آدمی دیکھے گئے (مرآۃ الزمان)

رفیع الدین

(۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء ـــ ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/ ۹ اگست ۱۸۱۸ء) مولانا شاہ محمد رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری ممتاز عالم دین۔ انھوں نے حدیث اپنے والد شاہ ولی اللہ سے پڑھی۔ ۱۱۷۶ھ میں والد کے انتقال کے بعد ان کی تربیت بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء ـــ ۱۸۲۳ء) نے کی۔ ان کے پاس رفیع الدین نے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ بیس سال کی عمر میں مفتی اور مدرس کا منصب سنبھالا انھوں نے کم و بیش بیس کتابیں لکھیں جن میں سے بیشتر عربی اور فارسی میں اور چند اردو میں ہیں، چند مشہور تصانیف یہ ہیں۔ (۱) قرآن مجید کا اردو ترجمہ (۲) تکمیل الصناعت الاذہان (۳) مقدمتہ العلم (۴) اسرار المحبت (۵) تفسیر آیۃ النور (۶) العروض والقافیہ (۷) دمغ الباطل (۸) قیامت نامہ (۹) فتاوی (۱۰) لطائف خمسہ۔

رُقیّہ بنتِ محمدؐ

آنحضرت صلعم کی دوسری صاحبزادی اور تیسری اولاد۔ حضرت رقیہؓ ہجرت مدینہ سے انیس سال قبل مکہ معظمہ میں اپنی والدہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے مکان میں پیدا ہوئیں نبی کریم کی رسالت کے پہلے روز مسلمان ہوئیں۔ آنحضرت صلعم کے چچا ابولہب کے لڑکے عتبہ سے آپ کا نکاح ہوا۔ عتبہ کی ماں ام جمیل ابوسفیانؓ کی ہمشیرہ تھی۔ اسلام کے مخالفین میں آنحضرت صلعم کے یہ دونوں چچا چچی پیش پیش تھے۔ ابولہب آپؐ کے پڑوس میں رہتا تھا۔ بعثت کے تین سال بعد جب اعلانِ دعوت کا حکم آیا تو آپؐ نے قریش کو جمع کرکے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر تبلیغ فرمائی۔ ابولہب نے مخالفت میں آواز اٹھائی۔ اس پر سورہ تبت نازل ہوئی۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب اور حمالتہ الحطب (ام جمیل) نے عتبہ سے کہا کہ تم محمدؐ کی بیٹی کو چھوڑ دو۔ آنحضرت صلعم کی دوسری بیٹی ام کلثومؓ عتیبہ بن ابی لہب سے بیاہی ہوئی تھیں۔ دونوں بہنوں کو طلاق دے دی گئی۔ استیعاب اور ابن ہشام دونوں کی روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ طلاق کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب چچا اور بھتیجے (آنحضرت صلعم) کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ صاحبزادیاں ازدواجی تعلقات سے پیشتر ہی علیحدہ ہوگئیں۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے سن ۲ بعثت میں ہوا۔ اس وقت حضرت رقیہؓ کی عمر دس برس تھی۔

حضرت رقیہؓ بارہ برس کی تھیں کہ رجب ۵ بعثت میں انھیں حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہجرت حبشہ کا سفر پیش آیا۔ حضرت رقیہؓ نے حبشہ میں آٹھ سال قیام فرمایا۔ پندرہ سال کی تھیں کہ ان کا ایک بچہ ساقط ہوا (ابن سعد)۔ ۱۰ بعثت میں حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ اس وقت حضرت رقیہؓ حبشہ میں مقیم تھیں۔ ۱۱ بعثت میں جب ان کی عمر اٹھارہ سال تھی تو ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ آنحضرت صلعم نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ انھی کے نام پر حضرت عثمانؓ کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ ۱۲ بعثت میں حضرت رقیہؓ مکہ واپس آئیں۔ حضرت عثمانؓ تنہا ہجرت نبوی سے پہلے مدینہ آگئے تھے۔ حضرت رقیہؓ آنحضرت صلعم کی ہجرت کے بعد مدینہ پہنچیں (ابن سعد)۔ صرف حضرت رقیہؓ ہی آپؐ کی وہ صاحبزادی ہیں جنھوں نے دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہے۔

فیاض اور رئیس ہونے کی بنا پر حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں آسائش اور آسودگی کی زندگی گزارتے تھے اسی قسم کی زندگی حضرت رقیہؓ کی بھی تھی۔ گیارہ سال کی رفاقت میں ناگواری کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ عرب میں ضرب المثل کے طور پر یہ مقولہ رائج تھا (ترجمہ) ''میاں بیوی کے جوڑوں میں سب سے بہتر جوڑا جو کسی انسانی آنکھ نے دیکھا وہ حضرت رقیہؓ اور ان کے شوہر حضرت عثمانؓ ہیں۔ رمضان المبارک ۲ ہجری میں حضرت رقیہؓ کو دانے (خسرہ) نکل آئے۔ ۱۲ رمضان کو آنحضور صلعم غزوۂ بدر کے لئے روانہ ہوئے۔ آپؐ حضرت عثمانؓ کو حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے چھوڑ گئے اور فرمایا تمہیں اور شخص کے برابر ثواب اور حصہ ملے گا جو بدر میں شریک ہوگا (بخاری شریف)۔ ۱۷ رمضان المبارک کو غزوۂ بدر لڑی گئی۔ جس روز حضرت زیدؓ بن حارثہ فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ منورہ پہنچے اسی روز حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا۔

رکن الدین

(وفات ۶ ذوالقعدہ ۶۰۰ھ/ ۶ جولائی ۱۲۰۴ء) سلیمان ثانی بن قلیج ارسلان ثانی، روم کا ایک سلجوقی فرمانروا۔ اس کا باپ بوڑھا ہوا تو اس نے سلطنت اپنے متعدد بیٹوں میں تقسیم کردی۔ شعبان ۵۸۸ھ/ اگست ۱۱۹۲ء میں جب قلیج ارسلان کا انتقال ہوا تو رکن الدین پوری سلطنت پر قابض ہوگیا۔ اس نے سیواس، آق سرائے، قیساریہ، قونیہ، ملطیہ، ارض روم، انقرہ کے علاقے اپنے بھائیوں سے چھین لیے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ رکن الدین ایک زبردست اور باہمت حکمران تھا۔

رُکن الدّین ابوالفتح

(۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء ـ ۷۳۵ھ/۱۳۳۴ء) صوفی بزرگ۔ شیخ صدرالدین کے بیٹے، شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے اور حضرت مخدوم جہانیاں

مزار ابوالفتح رکن الدین (ملتان)

جہاں گشت کے مرشد۔ ملتان میں پیدا ہوئے۔ شیخ ابوالفتح رکن الدین نے ظاہری تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور باطنی تعلیم اپنے دادا سے پائی۔ ۱۲۸۵ء میں والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ حضرت نظام الدین اولیا سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ اُن سے ملاقات کے لیے کئی بار دہلی گئے۔ ملتان میں وفات پائی۔ مزار قلعے کے اندر ایک عالیشان روضے میں ہے۔

رکوع

نماز میں ایک خاص انداز میں جھکنا۔ رکوع کی کیفیت علما نے یہ بیان کی ہے کہ قیام کے بعد تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھلی رکھ کر دونوں گھٹنوں کو اچھی طرح پکڑے اور سر کو زیادہ نیچے نہ لے جائے۔ جمہور علمائے امت اس بات پر متفق ہیں کہ حالت رکوع میں اطمینان و اعتدال واجبات میں سے ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول کریم صلعم رکوع میں جاتے تو نہ تو سر کو بہت نیچے جاتے اور نہ اوپر کو اٹھائے رکھتے بلکہ اعتدال سے کام لیتے۔ عورتوں کو انگلیاں ملا کر صرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لینا کافی ہے۔ مرد رکوع کی حالت میں پنڈلیاں سیدھی رکھیں اور دونوں بازو پہلوؤں سے جدا رکھیں۔ حضرت علیؓ سے مروی ایک حدیث کی بنیاد پر حالت رکوع و سجود میں تسبیح کے سوا کچھ اور پڑھنا منع ہے۔ امام شافعیؒ نے رکوع کی حالت میں بہت ادعیہ ماثورہ نقل فرمائی ہیں جن میں سے مختصر ترین "سبحان ربی العظیم" ہے۔ رسول کریم صلعم کا فرمان ہے کہ جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو تین بار سبحان ربی العظیم کہے کیونکہ تسبیح کی یہ کم سے کم مقدار ہے جو حالت رکوع میں ضروری ہے۔ نمازی رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہو جائے اور ہاتھ کھلے چھوڑ کر ربنا لک الحمد کہے۔ نماز باجماعت میں امام رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدی رکوع سے کھڑے ہو کر ربنا لک الحمد کہیں۔

رمضان المبارک

اسلامی تقویم کا نواں مہینہ۔ رمضان ہی وہ بابرکت مہینہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ رمضان کے مہینے میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ (البقرہ: ۱۸۵)۔ اس مہینے میں ایک رات (لیلۃ القدر) ایسی آتی ہے جو ہزار راتوں سے افضل و بہتر ہے (القدر: ۳) حضرت سلمانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے شعبان کی آخری تاریخ کو فرمایا کہ تمہارے اوپر ایک مہینہ آ رہا ہے جو بہت بڑا اور مبارک مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزاروں مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزہ کو فرض فرمایا اور اس کے رات کے قیام کو ثواب کی چیز بنایا۔ جو شخص اس مہینہ میں کسی نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے وہ ایسا ہے جیسے غیر رمضان میں فرض ادا کیا اور جو شخص کسی فرض کو ادا کرے وہ ایسا ہے جیسے غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے۔ یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غمخواری کرنے کا ہے۔ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ تمام آسمانی کتابیں اسی ماہ میں نازل ہوئیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے یکم یا تین رمضان، حضرت داؤدؑ کو زبور ۱۲ یا ۱۸ رمضان کو، حضرت موسیٰؑ کو تورات ۶ رمضان کو، اور حضرت عیسیٰؑ کو انجیل ۱۲ یا ۱۳ رمضان المبارک کو عطا ہوئی۔

ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری امت کو رمضان شریف کے بارے میں پانچ چیزیں خصوصی طور پر دی گئی ہیں جو پہلی امتوں کو نہیں ملیں: (۱) ان کے (روزہ دار) منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (۲) ان کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں۔ (۳) جنت ہر روز ان کے لیے آراستہ کی جاتی ہے۔ (۴) اس میں سرکش شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ (۵) رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کے لیے مغفرت کی جاتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، یہ شب مغفرت شب قدر ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ دستور یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم ہونے کے وقت مزدوری دی جاتی ہے۔ (ابن حبان)

رمضان زادہ

(وفات: جمادی الاولیٰ ۹۷۹ھ / ستمبر ۱۵۷۱ء) محمد پاشا معروف بہ کوچک نشانجی ایک عثمانی مورخ۔ ابتدا میں بطور کاتب ملازمت کرتا تھا۔ ۱۵۵۴ء میں وہ وزیر مملکت اور ۱۵۵۸ء میں سلطان کا مہر بردار (کاتب طغریٰ) مقرر ہوا۔ اس کے بعد دفتر دار حلب اور بعد ازاں عامل مصر مقرر ہوا۔ ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ سلیمان اعظم کے حکم سے ایک تاریخ لکھی جو "تاریخ رمضان زادہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ کتاب کا اصل نام "ابنیئے عظام و احوال خلفائے قرآن و مناقب سلاطین آل عثمان" ہے۔ اس کا شمار آل عثمان کی مقبول ترین تاریخوں میں ہوتا ہے۔

رملہ

فلسطین کا صدر مقام جو بیت المقدس کے شمال مشرق میں ۲۵ میل کے فاصلے پر [illegible] ہے۔ ولید کے عہد خلافت میں اس کے بھائی سلیمان والیٔ فلسطین نے نئے قصبے رملہ کی بنیاد رکھی۔ صوبے کا صدر مقام ۱۸ھ / ۶۳۹ء میں لُدّ سے رملہ منتقل کیا۔ جب سلیمان خلیفہ ہو تو وہ رملہ ہی میں مقیم رہا (۷۱۵ء — ۷۱۷ء)۔ لُدّ کی پوری آبادی رملہ میں منتقل [illegible] سلیمان نے یہاں اپنا محل تعمیر کرایا۔ اس نے مسجد کی تعمیر بھی شروع [illegible] کے عہد میں مکمل ہوئی۔ رملہ ایک مربع میل کے رقبہ میں تعمیر ہوا تھا۔ [illegible] میں رملہ کی سیاحت کی۔ اس کا بیان ہے کہ رملہ ایک بڑا قصبہ ہے [illegible] مضبوط فصیلیں اور آہنی کے دروازے تھے۔ شہر [illegible] بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے تہہ خانے بنا رکھے تھے۔ [illegible] زلزلے نے رملہ کا ایک تہائی حصہ تباہ کر دیا اور مسجد بھی [illegible] صلاح الدین نے ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں اس قصبے کو [illegible] صحت بخش [illegible]

روح

[illegible] چکوں اور اس میں اپنی روح [illegible] میں گر جانا (الحجر: ۲۸، ۲۹) مخلوقات میں پائی [illegible] منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ حدیث نبوی [illegible]

رحمت کو سَو حصّوں میں تقسیم فرمایا۔ پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصّہ زمین میں اتارا۔ یہ اُسی ایک حصّے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھُرا اٹھاتا ہے کہ بچے کو ضرر نہ پہنچے تو یہ بھی دراصل اسی حصّہ رحمت کا اثر ہے۔" (بخاری و مسلم)

قرآن و حدیث کی رو سے موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔

رُوح اللہ خمینی

ایران کی ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کا خاتمہ کر کے وہاں اسلامی جمہوریہ قائم کرنے والے انقلابی رہنما۔ عالم دین۔ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۲۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۰۲ء کو خمین میں پیدا ہوئے۔ چند ماہ بعد اُن کے والد آیت اللہ، سید مصطفیٰ، ۴۲ برس کی عمر میں کچھ "بہرامی" کے ہاتھوں گولیوں کا نشانہ بنے اور جاں بحق ہو گئے۔ ان کا جنازہ خمین سے نجف اشرف لے جا کر دفن کیا گیا۔ یتیم کی پرورش اُن کی والدہ اور پھوپھی نے کی۔ میرزا محمود سے گھر پر ابجد و قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ اصفہان کے مدرسے میں داخلہ لیا۔ پھر اراک کے حوزۂ علمیہ میں آیت اللہ شیخ عبدالکریم سے فقہ و کلام کی تعلیم پائی۔ پھر استاد کے ساتھ ہی قم چلے آئے۔ یہاں فلسفہ پڑھا۔ آقائے بروجردی نے ۱۹۶۲ء میں وفات پائی تو آیت اللہ خمینی درس دینے لگے۔ ان کے درس میں بارہ سو طلبہ تک کی حاضری ہو گئی۔ یہ درس مسجد سلماسی اور مدرسہ فیضیہ قم میں ہوتا تھا۔ پھر کچھ عرصہ نجف میں بھی تدریس و تبلیغی فرائض انجام دیئے۔

لیکن درس کا کام خاموشی و سکون سے انجام نہ پا سکا۔ کیونکہ اردگرد سیاسی، معاشرتی و تہذیبی حالات خراب سے خراب تر ہو رہے تھے۔ عراق میں علماءؒ و طلباءؒ و اکابر کا قتل اور اسلام دشمن قوتوں کا غلبہ، ایران میں شاہ کے آمرانہ مظالم، حوزۂ علمیہ کا زوال، اسرائیل کی بڑھتی ہوئی قوت کے ساتھ ساتھ عربوں کی گرتی ہوئی حالت، مصر کی شکست، لبنان و شام پر اسرائیل کا دباؤ، فلسطینیوں کی ہجرت اور بے وطنی، پاکستان کا دولخت ہونا، ایران میں مغرب زدگی کی شدید لہر، شاہ ایران کے مظالم سے ٹکرانے والے مجاہدین کی شہادت اور خود اُن کے فرزند سید مصطفیٰ کی شہادت۔ ان غموں نے انھیں درس و تدریس کے پُرسکون گوشے سے نکل کر میدان سیاست میں نکل آنے اور تحریک انقلاب کی قیادت سنبھال لینے پر مجبور کر دیا۔

لیکن شاہِ ایران ان کو برداشت نہ کر سکا اور انھیں ملک بدر کر دیا گیا۔ آیت اللہ خمینی نومبر ۱۹۶۴ء کو قم سے نکلے اور بورسا پہنچائے گئے۔ مارچ ۱۹۶۶ء کو نجف اور ۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو فرانس پہنچے اور وہاں بیٹھ کر شاہ ایران کے خلاف انقلابی تحریک کی رہنمائی کی جس نے بالآخر کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۷۹ء میں شاہ ایران شاہ پور بختیار کو وزیر اعظم بنا کر ایران سے فرار ہو گئے۔ جلاوطن رہنما آیت اللہ خمینی نے اس کے جواب میں اسلامی انقلابی کونسل بنا دی۔ وہ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد فاتحانہ ایران میں آئے۔ اور مہدی بازرگان کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ فوج نے پہلے تو شاہ پور بختیار کا ساتھ دیا۔ پھر غیر جانب دار ہو گئی اور یوں شاہ پور بختیار کی حکومت بیٹھ گئی۔

اسلامی انقلاب کی آمد کے ساتھ ہی نئے نئے بحران بھی پیدا ہو گئے۔ ملک کا خزانہ پہلے ہی خالی ہو چکا تھا۔ کُردوں نے اگرچہ شاہ ایران کے خلاف تحریک میں ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب وہ اسلامی حکومت کے خلاف گوریلا جنگ کرنے لگے۔ آذربائیجانیوں اور بلوچیوں نے روس کے زیر اثر وقتاً فوقتاً شورش پھیلانے کی کوشش کی۔ طالب علموں نے جب امریکی سفارت خانے کے اہل کاروں کو یرغمالی بنا لیا تو خود آیت اللہ خمینی کے بعض قریبی رفقائے کار اُن کے خلاف ہو گئے۔ وزیر اعظم بازرگان نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ ابوالحسن بنی صدر بھی یرغمالیوں کے مسئلے پر ہی آیت اللہ سے خفا ہو کر واپس فرانس چلے گئے۔ جون ۱۹۸۱ء مقننہ کے صدر آیت اللہ محمد بہشتی اور دوسرے ممتاز ارکان دوران اجلاس بم کے حادثے سے وفات پا گئے۔

اگست میں نئے صدر علی رجائی اور نئے وزیر اعظم بہنار بھی بم کے ایک اور حادثے میں شہید ہوئے۔ عراق سے جنگ چھڑ گئی۔ جو اب تک جاری ہے۔ امریکا اور روس جیسی سُپر طاقتوں سے نفسیاتی جنگ بھی چل رہی ہے۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی باوجود ضعیفی بڑی استقامت سے اپنے اصولوں کے مطابق ان تمام حالات سے نبرد آزما ہیں۔

رُوح بن حاتم

(وفات ۱۹ رمضان ۱۷۴ھ/۳ فروری ۷۹۱ء) والیِ افریقیہ۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ۱۷۱ھ/۷۸۷ء میں اسے افریقیہ کا والی مقرر کیا۔ اس سے قبل وہ بصرہ کا والی رہ چکا تھا۔ مہدی نے اسے یکے بعد دیگرے کوفہ، سندھ، طبرستان اور فلسطین کا والی مقرر کیا۔ سوانح نگار اس کے حسن تدبر، علم، جرأت اور بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔

رُودس

بحر ایجیئن کے مجمع الجزائر میں مشرق کی جانب آخری جزیرہ جو ایشیائے کوچک کے

جزبی ساحل سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ تین براعظموں کے قریب ہونے کے باعث اس کا محل وقوع جہاز رانی کے نقطۂ نظر اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم رہا ہے۔ امیر معاویہؓ نے ۵۳ھ۔۶۷۲ء میں جنادہ بن ابی الامیہ الازدی کی قیادت میں ایک بیڑہ رودس روانہ کیا تھا جس نے وہاں ایک عارضی بستی کی بنا ڈالی۔ ۶۰ھ میں یزید بن معاویہ نے اسے خالی کرا دیا۔ اور رودس بوزنطی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں رودس صلیبی جنگوں کا اہم مرکز بن گیا۔ یہیں سے وہ ترکیہ اور مصر کے خلاف صلیبی جنگوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۴۴۰ء میں مملوک فرمانروا جقمق نے ایک بحری بیڑا رودس کی طرف روانہ کیا مگر اسے پسپا ہونا پڑا۔ ۱۴۴۴ء میں مملوک افواج نے چالیس روز تک شہر کا محاصرہ جاری رکھا لیکن محصورین کے اچانک حملے سے شدید نقصان اٹھا کر انھیں واپس دمیاط آنا پڑا۔ سلیمان اعظم کے عہد میں رودس پر باقاعدہ قبضہ ہوا اور جزیرے کو صلیبیوں سے بالکل خالی کرا لیا گیا۔ ۲۲ دسمبر ۱۵۲۲ء میں یہ ایک ترکی پاشا کا مستقر بنا۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ میں اس پر اٹلی کا قبضہ ہوگیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو رودس اطالوی حکومت کے زیرِ تسلط چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں اٹلی سے صلح کرتے وقت اتحادیوں نے رودس یونان کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۶۱ء میں جزیرے کی آبادی ۴۶ ہزار اور صدر مقام کی ساڑھے ستائیس ہزار تھی۔

رودکی

(وفات ۳۲۹ھ/۹۴۱ء) ابوعبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمٰن بن آدم عبدالکریم بن محمد سمعانی، مشہور شاعر جسے اہل ایران نے "استادِ شاعران و مقدم شعرائے عجم" کہا ہے۔ رودکی نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت کا فن بھی سیکھا۔ خوش گوئی میں کمال حاصل کیا۔ موسیقی کی وجہ سے بھی اس کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ بعض مصنفین کے بیان کے مطابق رودکی نے تیرہ لاکھ اشعار اور چھ مثنویاں لکھیں۔ اشعار کی یہ تعداد اس کے دیوان کے علاوہ تھی۔ اس نے کلیلہ و دمنہ کو ایک فارسی نثر سے نظم کا جامہ پہنایا۔ رودکی کو قصیدہ گوئی میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ قصیدے میں اسلوب "سبک خراسانی" کا وہ موجد ہے۔ بعد کے شعرا اسے قصیدے کا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ غزل میں عنصری اس کی برتری کا معترف ہے۔ وہ فارسی میں زندانہ شاعری کا موجد تھا۔

روزہ

ارکانِ خمسۂ اسلام میں سے ایک اہم رکن۔ ارشادِ ربانی ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی مقدار پوری کرلے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں اور (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھلانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو (البقرہ: ۱۸۳ تا ۱۸۵)۔ اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ آنحضرت صلعم نے ابتدا میں مسلمانوں کو ہر مہینے میں صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا۔ مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض، مسافر، حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بوڑھے لوگوں کے لیے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔ اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے: "تمہارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم [illegible] کے لیے۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔ مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ اور تم سے درگزر فرمایا۔ [illegible] بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لیے جائز [illegible] دیا ہے اسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ تم کو سیاہی [illegible] کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔ تب یہ سب [illegible] کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو [illegible] سے مباشرت نہ کرو۔ (البقرہ ۱۸۷)

شریعت نے سحری اور افطار دونوں اوقات کی کوئی [illegible] نہیں کی جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ ادھر ادھر ہو جانے سے [illegible] خراب ہو جاتا ہو۔ حدیث نبوی ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا [illegible] سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آجائے تو فوراً [illegible] پھر کھا پی لے۔ اسی طرح افطار کے وقت [illegible] محض دن کی روشنی ختم ہونے کا انتظار [illegible] ہی حضرت بلالؓ کو آواز دیتے تھے [illegible] کہ یا رسول اللہ ابھی تو دن [illegible] مشرق سے اٹھنے لگے تو روزے کا وقت ختم [illegible]

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کی دعا رد نہیں [illegible] کی افطار کے وقت کی دعا [illegible] دعا جس کو حق تعالیٰ بادلوں سے [illegible] اس کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں [illegible] گو (کسی مصلحت سے) کچھ دیر ہو جائے [illegible] کا ارشاد ہے کہ جو شخص بلا کسی شرعی عذر [illegible] کو افطار کر دے، غیر رمضان کا روزہ [illegible] کا بدل نہیں ہو سکتا۔ (ترمذی، ابوداؤد [illegible]) [illegible] خدری کہتے ہیں کہ آنحضور صلعم نے رمضان المبارک [illegible] فرمایا۔ اور پھر دوسرے عشرہ میں بھی [illegible] تھے، باہر سر نکال کر ارشاد فرمایا کہ میں نے پہلے عشرہ کا [illegible]

تلاش اور اہتمام کی وجہ سے کیا تھا، پھر اسی کی وجہ سے دوسرے عشرہ میں اعتکاف کیا۔ پھر مجھے کسی تبلانے والے نے تبلایا کہ وہ رات اخیر عشرہ میں ہے لہٰذا جو لوگ میرے ساتھ اعتکاف کر رہے ہیں وہ اخیر عشرہ کا بھی اعتکاف کریں۔ (متفق علیہ)

روزے کی چھ قسمیں ہیں: فرض، واجب، سنت، نفل، مکروہ اور حرام۔ سال بھر میں صرف رمضان المبارک کے تیس روزے مسلمانوں پر فرض ہیں۔ رمضان کے روزوں کا فرض ہونا قرآن و حدیث سے صراحتاً ثابت ہے۔ جو شخص روزۂ رمضان کے فرض ہونے کا انکار کرے وہ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص بغیر کسی عذر کے ترک کرے وہ فاسق اور سخت گنہگار ہے۔ رمضان کے روزے اگر کسی عذر سے یا محض غفلت سے رہ جائیں تو ان کی قضا رکھنی فرض ہے۔ نذر اور کفارے کے روزے واجب ہیں اگر کسی متعین دن کے روزے کی نذر مانی جائے تو اسی دن رکھنا ضروری ہے۔ اگر دن متعین نہیں کیا ہے تو پھر جب چاہیں رکھ سکتے ہیں لیکن بلا وجہ تاخیر نہ کرنا چاہیئے۔ جو روزے خود نبی صلعم نے رکھے یا جن کے رکھنے کی آپؐ نے ترغیب دی ہے وہ روزے سنت ہیں اور ان کے رکھنے کا بڑا اجر اور ثواب ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی روزہ سنت مؤکدہ نہیں۔ مسنون روزے یہ ہیں: (۱) عاشورے کے روزے، یعنی محرّم کی نویں اور دسویں تاریخ کے دو روزے۔ (۲) یوم عرفہ کا روزہ، یعنی ذوالحجہ کی نویں تاریخ کا روزہ (۳) ایام بیض کے روزے، یعنی ہر مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزے۔ نفلی روزوں میں، ماہ شوال کے چھ روزے، پیر اور جمعرات کا روزہ، ماہ شعبان کی پندرہویں تاریخ کا روزہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی عشرے کے آٹھ روزے شامل ہیں۔ مکروہ روزوں میں صرف سنیچر یا اتوار کے دن کا روزہ رکھنا، صرف یوم عاشورہ کا روزہ رکھنا، کسی خاتون کا شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنا اور بیچ میں ناغہ کیے بغیر مسلسل روزے رکھنا شامل ہیں۔ سال بھر میں چھ روزے رکھنا حرام ہے: عیدالفطر کے دن کا روزہ، عیدالاضحیٰ کے دن کا روزہ۔ ایام تشریق، ۱۱ ذوالحجہ اور ۱۳ ذوالحجہ کا روزہ۔

روزوں میں صبح صادق نمودار ہونے سے غروب آفتاب تک تین باتوں سے رکا رہنا فرض ہے۔ (۱) کچھ نہ کھانا۔ (۲) کچھ نہ پینا۔ (۳) جنسی لذّت سے پرہیز کرنا۔ سحری کا اہتمام کرنا سنت ہے۔ چاہے چند گھونٹ پانی ہی ہو۔ سحری اخیر وقت میں کھانا مستحب ہے جبکہ صبح صادق ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہو۔ روزے کی نیت رات ہی سے کر لینا مستحب ہے۔ افطار جلد مستحب ہے یعنی غروب آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دیر نہ کرنا چاہیئے۔ چھوہارے، کھجور یا پانی سے افطار کرنا مستحب ہے۔ غیبت، چغلی، غلط بیانی، شور و ہنگامہ، غصّہ اور زیادتی سے بچنے کا اہتمام کرنا مسنون ہے۔ یہ کام ویسے بھی ناجائز ہیں، لیکن روزوں میں ان سے بچنے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے۔ وجوب کفارہ اور قضا میں یہ اصولی باتیں شامل ہیں: (۱) اگر کوئی چیز قصداً پیٹ میں پہنچ جائے اور اس کو نفع بخش ہونے کا خیال بھی ہو جائے، یا کوئی ایسا فعل کیا جائے جس کی لذت جنسی فعل جیسی نہ ہو تو صرف روزے کی قضا واجب ہو گی کفارہ لازم نہ آئے گا۔ (۳) کفارہ صرف رمضان کا روزہ فاسد ہونے سے واجب ہوتا ہے۔ (۴) رمضان کا قضا روزہ فاسد ہونے سے کفارہ واجب نہیں ہوتا، جیسے مسافر کا روزہ نابالغ کا روزہ، حیض و نفاس والی خواتین کا روزہ (۶) ہر وہ فعل جس میں اپنے قصد اور ارادہ کو دخل نہ ہو تو کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ (۷) جنسی فعل میں فاعل و مفعول دونوں کا عاقل ہونا شرط نہیں۔ دونوں میں سے جو عاقل ہو اور قصداً یہ فعل کرے اس پر کفارہ لازم آئے گا۔ (۸) رمضان میں روزے کی نیت کیے بغیر کوئی کھائے پیئے تو اس پر کفارہ واجب نہیں صرف قضا واجب ہے۔ کفارہ اسی صورت میں واجب ہوگا جب روزے کی نیت کر لینے کے بعد روزہ توڑنے۔ (۹) کسی شبہ کی بنیاد پر اگر کوئی اپنا روزہ فاسد کر دے تو کفارہ واجب نہ ہوگا (۱۰) کسی کی آنکھ دیر میں کھلی اور یہ سمجھ کر کھا لیا کہ ابھی سحری کا وقت باقی ہے پھر معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی ہے تو اس روزے کی قضا رکھنا واجب ہے۔ (۱۱) کسی نے غروب آفتاب سے قبل یہ سمجھ کر افطار کر لیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو قضا واجب ہے۔ (۱۳) کسی نے روزہ دار کو زبردستی کچھ کھلا پلا دیا تو صرف قضا واجب ہے۔ (۱۴) کسی نے روزے کی نیت ہی نہیں کی لیکن کھانے پینے سے رکا رہا تو قضا لازم ہوگی۔ (۱۵) روزہ دار نے قصداً منہ بھر قے کی تو قضا واجب ہوگی۔ (۱۶) کسی نے روزے میں بھولے سے کھا پی لیا اور پھر یہ سمجھ لیا کہ روزہ ٹوٹ گیا ہے قصداً کچھ کھا پی لیا تو قضا واجب ہے۔ (۱۷) کسی خاتون نے اپنی شرمگاہ میں انگلی یا روئی وغیرہ داخل کی تو قضا لازم ہوگی۔ (۱۸) جماع اور لواطت کے علاوہ جنسی لذت کا کوئی ایسا فعل کیا جس سے انزال ہو گیا تو قضا لازم ہوگی۔

ان امور سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا۔ (۱) کسی چیز کا ذائقہ چکھنا۔ اگر کوئی عورت بد مزاج اور سخت گیر شوہر کے خوف سے چیزوں کا ذائقہ پکاتے وقت چکھ لے تو مکروہ نہیں۔ (۲) منہ میں کوئی چیز ڈالے رکھنا یا چبانا۔ کسی کا بچہ بھوکا ہے اور وہ صرف وہی چیز کھاتا ہے جو منہ میں چبا کر دی جائے تو اس صورت میں چبا کر کھلانا مکروہ نہیں بشرطیکہ کوئی بے روزہ آدمی بھی موجود نہ ہو۔ (۳) روزے میں ایسا کام کرنا مکروہ ہے جس کی وجہ سے روزہ توڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ (۴) کلّی کرتے یا ناک میں پانی ڈالنے میں ضرورت سے زیادہ اہتمام کرنا۔ (۵) بلا وجہ منہ میں تھوک جمع کر کے نگلنا۔ (۶) غسل کی حاجت ہو اور بلا وجہ غسل نہ کرنا۔ (۷) منجن، پیسٹ یا کوئلہ وغیرہ چبا کر دانت صاف کرنا مکروہ ہے۔ دن میں سرمہ لگانا، سر میں تیل ڈالنا یا بدن پر مالش کرنا، خوشبو سونگھنا، مسواک کرنا سب درست ہے۔ ان سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا۔ خواب میں انزال ہو جائے یا کسی جسمانی تصادم کے بغیر انزال ہو جائے تو روزہ مکروہ نہیں ہوگا۔

کان میں پانی چلا جائے یا کوئی قصداً پانی ڈال لے تو اس سے روزہ مکروہ نہیں ہوگا۔ دانتوں کے درمیان غذا یا بوٹی یا ریشہ یا چھالیہ کا کوئی ٹکڑا رہ گیا ہو اور روزہ دار اسے نگل لے۔ اگر اس کی مقدار چنے کی مقدار سے کم ہے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ بے اختیار قے ہونے سے روزہ مکروہ نہیں ہوگا۔

رومی، جلال الدّین

(۱۲۰۷ء۔ ۱۲۷۲ء) عظیم صوفی شاعر۔ بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بہاء الدین اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ سے اُن کی ان بن ہو گئی۔ اس لیے وطن کو خیر باد کہہ کر مغرب کا رُخ کیا۔ مولانا روم اس وقت کم سن تھے۔ نیشاپور کے مقام پر مشہور صوفی شاعر فریدالدین عطار سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے رومی کو گود میں لے کر دعائیں دیں۔ اُن کے والد انھیں ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں لے آئے اور یہیں بس گئے۔ روم میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے مولانا رومی کے نام سے

مشہور ہیں۔

مولانا رومی کا زمانہ بڑا پرآشوب تھا۔ لیکن یہ حالات آپ کے ذہنی ارتقا میں حارج نہیں ہوئے۔ اکتساب علوم کے بعد آپ نے اپنی توجہ روحانیت کی طرف مبذول کی۔ پہلے برہان الدین ترمذی کی شاگردی میں رہے اور پھر ایک صوفی درویش شمس تبریزؒ کی صحبت اختیار کی۔ شمس تبریزؒ سے آپ کی عقیدت والہانہ عشق تک پہنچ گئی تھی۔ اور جب شمس تبریزؒ مولانا رومی کے بیٹوں اور شاگردوں کے تنگ کرنے پر قونیہ سے چلے گئے تو مولانا رومی نے ان کے فراق میں غزلیں کہیں جو "دیوان شمس تبریزؒ" کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۲۴۵ء میں شمس تبریزؒ کی وفات پر مولانا رومی نے صوفیانہ درویشی کا ایک نیا سلسلہ ان کی یاد میں قائم کیا۔ جس کے پیرو مولادی یا تصوف کی اصطلاح میں "سماعی" کہلاتے ہیں۔

مولانا رومی کی شاعری تصوف سے پُر ہے، مگر جو چیز مولانا کی عالمگیر شہرت وعظمت کا باعث اور ان کا لازوال شاہکار ہے، وہ اُن کی مثنوی ہے جس کے متعلق یہ شعر مشہور ہے۔

مثنوی مولوی معنی

ہست قرآن در زبان پہلوی

اس مثنوی میں مولانا رومی نے مسائل تصوف کو حکایات اور نصیحت آمیز تمثیلوں سے حل کیا ہے۔ آپ نے قونیہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

رویا

حکما کے نزدیک سونے میں نفس انسانی کی ایک حرکت یا نفس انسانی کی متعدد اشکال کی تصویر کا نام خواب ہے جو مستقبل کے اچھے یا برے واقعات پر دلالت کرے۔ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ خواب حقیقت میں انسان کی تصویر کی کسی جھلک کے مشاہدے کا نام ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نفس ناطقہ جب جسم کی مادیت اور بدن کی حدود سے کسی شکل میں آزاد ہو کر روحانیت کی کیفیت اختیار کرے تو اس وقت وہ مستقبل کے معاملات کو دیکھ کر اپنی قوت حافظہ یا قوت ادراک کے ذریعے انھیں محفوظ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ نفس ناطقہ کی یہ قوت حافظہ و ادراک مستقبل کے واقعات کی تصاویر کا جو اقتباس حاصل کرتی ہے کبھی تو وہ اتنا واضح ہوتا ہے کہ تفسیر وتعبیر کی حاجت نہیں رہتی لیکن کبھی کبھار یہ اقتباس اتنا ضعیف اور مبہم ہوتا ہے کہ تعبیر وتفسیر کا محتاج ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک انسانی نفس ناطقہ کا بدن کی قیود سے آزاد ہو کر حالت خواب میں مستقبل کے واقعات کی جھلک دیکھنا اس لیے ممکن ہے کہ نفس ناطقہ جب تک بدن کی قیود میں پابند ہے اس وقت تک اس میں روحانی قوت تو ہوگی لیکن عملی طور پر بالفعل روحانی بننے کے لئے اس کا جسمانی قیود سے آزاد ہونا ضروری ہے تاکہ وہ تعقل محض کی صورت اختیار کر کے جسمانی وسائل کے بغیر واقعات کا ادراک کرنے کے قابل ہو جائے۔ انسانی نفس ناطقہ کو جس قدر عملی طور پر روحانیت کی دنیا کے قریب تر آنے کا موقع ملے گا اسی قدر حالت خواب میں واقعات کا ادراک مکمل اور صحیح ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آدمی کے خواب سے ایک ولی اللہ کا خواب زیادہ مکمل اور صحیح ہوتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کو اس قسم کی جو استعداد ودیعت ہوتی ہے وہ روحانیت کے بلند ترین مدارج کی حامل ہوتی ہے اور بشری خصائص سے قطعی آزاد ہو کر خالص عالم ملکوت و روحانیت میں پہنچی ہوئی ہوتی ہے (مقدمہ ابن خلدون)۔

قرآن مجید اور حدیث نبوی کی رو سے الرؤیا (خواب) کا برحق اور قابل عمل ہونا صراحت سے ثابت ہے۔ نص قرآنی صراحت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ قالب انسانی میں دو نفس یا روحیں موجود ہوتی ہیں ایک نفس التمییز (تمیز کرنے والا) اور دوسرا نفس الحیات (جس پر زندگی کا دارومدار ہے)۔ حالت بیداری میں دونوں نفس جسم میں موجود رہتے ہیں لیکن حالت خواب میں نفس التمییز کو جسمانی قید سے اللہ کے حکم سے آزادی مل جاتی ہے (الزمر: ۴۲)۔ حدیث نبوی ہے کہ اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے (بخاری، مسلم)۔ ابو قتادہؓ کی حدیث میں ہے کہ الرویا (اچھا خواب) تو من جانب اللہ ہوتا ہے لیکن الحلم (پریشان کن خواب) شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور جب کوئی برا خواب دیکھے تو اسے بائیں جانب تھوک دینا چاہیئے اور اعوذ باللہ پڑھنا چاہیئے۔ برا خواب کسی کو بتانا نہیں چاہیئے۔ اگر کوئی اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور صرف پسندیدہ لوگوں کو سنائے (مسلم، بخاری)۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو گویا اس نے واقعی مجھے دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل میں نہیں آسکتا (بخاری، مسلم)۔

رہبانیت

خانقاہی زندگی۔ ترک وتجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں افضل واعلیٰ سمجھنا رہبانیت کی بنیاد ہے۔ رہبانیت کا مطلب ہے مسلک خوف زدگی۔ اصطلاحاً اس سے مراد کسی شخص کا خوف کی بنا پر تارک الدنیا ہو جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہ ہائے عزلت میں جا بیٹھنا (سید ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن)۔

مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس رحم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں [illegible] کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا اور اپنے نفس کو دنیاوی لذتوں سے محروم کرنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ارشاد ربانی ہے: "اور رہبانیت [illegible] نے خود ایجاد کر لی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں [illegible] نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے [illegible] (الحدید ۲۷)۔ نبی کریم صلعم کا فرمان ہے کہ "اسلام میں رہبانیت نہیں" (مسند احمد)۔ [illegible] رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے" (مسند احمد، مسند ابی یعلیٰ)۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ صحابہؓ میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا [illegible] کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا اور عورت سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔ رسول اللہؐ نے ان کی [illegible] خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس سے تقوی کرتا ہوں مگر میرا [illegible] کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس کو میرا طریقہ پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایک صحابی کے متعلق نبی کریم صلعم نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی سے [illegible] گئے اور شب وروز عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ آپؐ نے بلا کر ان کو حکم دیا کہ [illegible] کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا روزہ توڑ دو [illegible]۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ کعبؓ بن سورالازدی کو ان کے مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر فرمایا۔ [illegible] نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے حق ہے کہ جتنی عبادت چاہیں کریں مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے۔

رہن

گروی ضمانت۔ارشاد ربانی ہے: "اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے والا میسر نہیں تو رہن بالقبض پر معاملہ کرلو (البقرہ ۲۸۳:) ۔رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہوجائے۔اگر دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے سکتا ہے۔گروی رکھنے والا شے مرہونہ کے قائم رکھنے کا پابند ہے۔شافعیوں کے نزدیک اسے استعمال کرسکتا ہے۔گروی لینے والے کے لیے بھی اس کا استعمال ناجائز ہے (باستثنائے حنابلہ) منافع گروی رکھنے والے کا ہے۔لیکن وہ کفالت کا جزو بھی بن جاتا ہے (باستثنائے شوافع)۔اگر کوئی شخص رہن لیے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے تو دراصل سود کھاتا ہے۔قرض پر براہ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جا سکتی ہے کیونکہ دراصل یہ اس چارے کا معاوضہ ہے جو مرتہن اس جانور کو کھلاتا ہے (سید ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن)۔

ریاست

اسلامی ریاست کی غایتیں کچھ تو ایسی ہیں جن سے نسل انسانی کی روحانی پاکیزگی قائم رکھی جاسکتی ہے۔کچھ ایسی ہیں جو نظام تمدن کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔مجموعی طور سے اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے جس میں فرد وجماعت کو فوز و فلاح اور سعادت سے ہمکنار کرنا ہے۔اس طرح اسلامی ریاست کا اصل مقصد اس اصلاحی اور فلاحی لائحہ عمل کو نافذ کرنا ہے۔جو اسلام نے دنیا کی بہتری اور برتری کے لیے پیش کیا ہے۔اسلامی زندگی کے لیے اسلامی اجتماعیت اور اسلامی اجتماعیت کے لیے اسلامی حکومت کے ناگزیر ہونے پر امت کا اجماع ہے۔اسلامی معاشرے کے تمام افراد کو مل کر بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ ریاست کے ادارے کو ختم کردیں۔اسلامی ریاست کے دستور کے لیے اصول مستقل طور پر طے شدہ ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے۔مسلمان کی انفرادی زندگی اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام دونوں کا مرکز ومحور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت ووفاداری کی مدّمقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور تابع ہوں۔نبی کریم صلعم کا فرمان ہے: خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔کوئی اطاعتِ خدا کے رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں۔اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت کرنا ہے حدیث نبوی ہے: جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔

(۳) تیسری اطاعت جو مسلمانوں پر فرض ہے وہ اُن "اولی الامر" کی اطاعت ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں۔جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسولؐ کا مطیع ہو۔حدیث نبوی ہے: "تم میں سے ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کے بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے بعض کو منکر۔تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔صحابہؓ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں۔آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں" (مسلم)

(۴) اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ پر نزاع ہو اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنّت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

تنظیم تمدن کے لیے اسلام نے کچھ بنیادی انسانی حقوق تسلیم کیے ہیں۔یہ حقوق اسلامی ریاست کے دستور کا ناقابل تغیّر جزو ہیں اور ان کے نفاذ کا ذمہ دار ریاست کو ٹھہرایا گیا ہے۔(۱) حرمت جان۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ناحق کسی کی جان ضائع کرنا حرام ہے (بنی اسرائیل ۳۳:) (۲) حرمت ناموس۔(۳) حیثیت عرفی یعنی انسان کی عزت وتکریم (۴) بنیادی حقوق شہریت کا تحفظ (۵) معصیت سے اجتناب کا حق۔کسی شخص کو معصیت کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔قرآن مجید کا واضح حکم ہے: حد سے بڑھنے والوں کی بات نہ مانو (الشعراء ۱۵۱)۔(۶) انصاف کا حق۔(۷) بربنائے ضمیر برائی سے عدم تعاون کا حق (۸) مساوات کا حق۔ہر شہری کو اصولاً برابر کے حقوق حاصل ہیں۔(۹) حکومت میں شرکت کا حق۔سب مومن خلافت کے حامل ہیں اور ہر ایک خلافت وحکومت میں برابر کا شریک ہے ضروری ہے کہ حکومت کا نظام مشورے سے چلایا جائے (۱۰) ضمیر کی آزادی۔ارشاد ربانی ہے: جنہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں انھیں لعن طعن نہ کرو۔یہ ہر شخص کا ذاتی حق ہے کہ اس کے مذہب کے پیشواؤں کی عزت کی جائے اور مذہبی دل آزاری سے اجتناب کیا جائے (۱۱) شخصی ذمہ داری۔انسان صرف اپنے اعمال اور اپنے جرائم کا ذمہ دار ہے دوسروں کے اعمال اور جرائم کے بارے میں اس سے مؤاخذہ نہیں ہوسکتا۔(۱۲) معاشی تحفظ۔کوئی شخص بھوکا، پیاسا، ننگا اور بغیر مکان کے نہ رہے۔

اسلام دین وسیاست کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔دین وسیاست کے یکجا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امور سیاست (دنیا) میں بھی یہ دیکھا جائے کہ ریاست کی اساس دینی اخلاقیات کے مطابق ہے۔ریاست کے بنیادی رہنما اصول قرآن مجید میں آگئے ہیں اور اس کے عملی نمونے آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین نے قائم کردیئے ہیں۔یہ اخلاقی اساس اسلامی ریاست کی قطعی بنیاد ہے۔اس بنیاد پر قائم رہ کر ریاست کی تفصیلی تشکیل میں عقل اور تمدنی تجربوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔

اسلامی ریاست کے قوانین کا مستند مآخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور یہی وہ بالاتر قانون ہے جو اس حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔قرآن مجید اور سنت نبوی اسلامی نظام حکومت میں قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔اسلام نے حکومت کا جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ حاکمیت حقیقی کا سرچشمہ صرف ذات خداوندی ہے اس کا قانون وہ شریعت ہے جس نے انسانوں کے اجتماعی اور انفرادی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح معیار قائم کیا ہے۔ربانی قانون انسان کو گمراہی اور ہلاکت سے بچانے کے لیے ہے۔ایک اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی شرائط اور مزاج کے مطابق تمدنی امور کے انصرام کے لیے جو قانون وضع کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔

اسلامی ریاست کے سربراہ (امام یا خلیفہ) کا انتخاب عام رائے سے ہوتا ہے۔وہ تنقیدِ عوام سے بالاتر نہیں۔ہر شہری اس کی ساری زندگی پر نکتہ چینی کرسکتا ہے۔قرآن وسنت کے خلاف حکم دینے کا نہ انھیں حق حاصل ہے اور نہ ایسے حکم کی اطاعت ضروری ہے۔مسلمان کے لیے حکومت کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ احکام وقوانین اسے پسند ہوں یا ناپسند لیکن یہ اطاعت اسی وقت تک لازم ہے جب تک شریعت کی نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا۔(نیز دیکھئے "خلافت" اور "خلافت راشدہ")۔

ریاض

سعودی عرب کا دارالسلطنت۔جو نخلستانِ ریاض میں وادی حنیفہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔نخلستان تین میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔یہ شہر شمال مشرق کے سوا تمام اطراف میں کھجوروں کے گھنے جھنڈوں میں گھرا ہوا ہے۔ریاض چونے کے پتھر کے ایک پست ٹیکرے پر بے قاعدہ سی مستطیل شکل میں آباد ہے۔شہر کے گرد ۲۵ فٹ بلند فصیل کو برجوں اور

مناروں سے مستحکم کیا گیا ہے۔ برج اور مینار دیوار سے تیس سے چالیس فٹ تک بلند ہیں۔
شہر کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔

رینان ، ارنسٹ

(۱۸۲۲ء—۱۸۹۲ء) فرانسیسی مستشرق، ادیب اور مؤرخ، جس نے یہود و نصاریٰ کے مذہب اور ان کی تاریخ کا علمی اور فلسفیانہ انداز سے مطالعہ کیا۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا منکر تھا مگر انھیں "بے نظیر انسان" تسلیم کرتا تھا۔ کیتھولک پادری اسے ملحد قرار دیتے تھے۔ یورپ کے علمی حلقوں میں وہ بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ رینان نے ۲۹ مارچ ۱۸۸۳ء کو پیرس یونیورسٹی میں "اسلام اور علم" کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ اسلام علم کے راستے میں حارج رہا ہے۔ سید جمال الدین افغانی ان دنوں پیرس میں مقیم تھے۔ انھوں نے رینان کے رد میں (JOURNAL DES DABAIS) میں ایک مضمون لکھا اور تاریخی دلائل اور براہین سے رینان کے قول کی تردید و تغلیط کی۔ رینان کی حسب ذیل تالیفات قابلِ ذکر ہیں (۱) سیرت حضرت مسیحؑ (۲) تاریخ بنی اسرائیل (۳) نصرانی مذہب کے اصول و مبادی (۴) السنۂ سامیہ کی تاریخ۔

ریو ، چارلس

(۱۸۲۰ء—۱۹۰۲ء) سوئس مستشرق جس نے برٹش میوزیم لندن کے اسلامی مخطوطات کی فہرست نگاری میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس سے قبل کیورٹن عربی قلمی کتابوں کی فہرست (جلد اول) شائع کر چکا تھا۔ ریو نے ۱۸۷۱ء میں اس فہرست کی دوسری جلد اور ۱۸۹۴ء میں اس کا تکملہ شائع کیا۔ ۱۸۸۸ء میں ترکی مخطوطات کی فہرست شائع کی۔ فارسی مخطوطات کی فہرست تین جلدوں اور ایک ضمیمے کی صورت میں مرتب کی۔ ۱۸۸۵ء میں ریو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اور اپنی وفات تک اس منصب پر کام کرتا رہا۔

ز

زبور

آسمانی کتاب جو حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی۔ امام راغب فرماتے ہیں "بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف عقلی حکمتوں پر مشتمل ہو۔ اس میں شرعی احکام نہ ہوں اور کتاب وہ ہے جس میں احکام اور حکمتیں ہوں۔ حضرت داؤدؑ کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہ تھا۔" حمد بن عبداللہ بن سلام مولیٰ خلیفہ ہارون الرشید سے منقول ہے کہ زبور سے مراد وہی مزامیر ہیں جو یہود و نصاریٰ کے ہاں متداول ہیں اور جن کی تعداد ڈیڑھ سو ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں بیان کرتے ہیں کہ "موجودہ بائبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبورِ داؤد نہیں ہے اس میں بکثرت مزامیر بھی بھر دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلامِ حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔" موجودہ صحیفہ پانچ دواوین کا مجموعہ ہے اس میں حضرت داؤد کے علاوہ دوسرے عبرانی شعرا کا کلام بھی شامل ہے۔ اس طرح الہامی اور غیر الہامی کلام مخلوط ہو گیا ہے۔

زبیرؓ بن عوام

بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب ان کی والدہ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب آنحضرت صلعم کی پھوپھی تھیں۔ حضرت زبیرؓ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ حدیث کے مطابق وہ پانچویں شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ اس وقت حضرت زبیرؓ کی عمر آٹھ برس تھی۔ آپ ان دس حضرات میں شامل ہیں جن کے جنتی ہونے کی آنحضرت صلعم نے بشارت دی تھی۔ حضرت زبیرؓ نے حبشہ اور مدینہ دونوں طرف ہجرت کی۔ نبی کریم صلعم کی زندگی میں تمام بڑی بڑی جنگوں میں شریک ہوئے۔ آنحضور صلعم نے حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب ان خدمات کے سلسلے میں عطا فرمایا تھا جو انھوں نے بنو قریظہ سے جنگ کے دوران میں بطور مخبر انجام دی تھیں۔ فتح مکہ کے دن حضرت زبیرؓ کے ہاتھوں میں دو جھنڈے تھے۔ ان کا شمار بڑے بہادر اور دلیر صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت زبیرؓ کے کارناموں کے لیے دیکھئے مقالہ "خلافتِ راشدہ"۔ حضرت زبیرؓ نے جنگ جمل میں شہادت پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

زخاؤ، ایڈورڈ

(۱۸۴۵ء — ۱۹۳۰ء) ممتاز جرمن مستشرق جس نے مشرقیات کے شعبوں میں خدمات سرانجام دیں۔ اس نے جوالیقی کی کتاب "المعرب من الکلام الاعجمی" کو مرتب کیا اور اس پر مفید حواشی لکھے اور اس کے صلے میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۸۶۹ء میں وی آنا کی یونیورسٹی میں عربی کا استاد مقرر ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں برلن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۸۸۸ء میں جب برلن میں مدرسۃ السنۃ مشرقیہ کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت زخاؤ کے سپرد ہوئی۔ زخاؤ کا نمایاں کام یہ ہے کہ اس نے البیرونی کی "کتاب الہند" اور "الاٰثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" کے عربی متن شائع کیے اور ان کے انگریزی تراجم تیار کیے۔ زخاؤ نے محمد بن سعد (کاتب الواقدی) کی کتاب الطبقات الکبیر شائع کی۔ اس کام میں اسے چند فضلاء کی معاونت حاصل تھی۔ یہ کتاب سیرت نبوی، صحابہ کرام اور تابعین کے حالات میں ایک قدیم ماخذ کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

زکوٰۃ

شرائط مخصوصہ کے ساتھ کسی مستحق آدمی کو اپنے مال کے ایک معین حصے کا مالک بنا دینا۔ امام راغب کے الفاظ میں وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقرا کو دیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ صدقہ مفروضہ اور ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اسے زکوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی اور اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں "زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے۔ ایک "پاکیزگی" دوسرے "نشو و نما"۔ کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں ان کو دور کرنا اور ان کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا۔ یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو مقصدِ تزکیہ کے لیے نکالا جائے۔ دوسرے زکوٰۃ بجائے خود تزکیہ کا فعل ہے۔" زکوٰۃ کا لفظ عام صدقات کے معنوں میں ابتدائے اسلام ہی سے مروّج ہو گیا تھا۔ اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح مل جاتی ہے۔ محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام قوانین و احکام مکمل ہو کر نافذ ہو گئے تھے (سید سلیمان ندوی: سیرت النبی)۔ زکوٰۃ ہر زمانے میں دینِ اسلام کا اہم رکن رہی ہے۔ تمام انبیا کی طرح انبیائے بنی اسرائیل نے بھی اس کی سخت تاکید کی تھی۔ زکوٰۃ کے احکام تورات اور انجیل دونوں میں

موجود ہیں لیکن ان کتب سماوی ہیں مدت کی تعیین میں قطعیت نہ تھی۔

زکوٰۃ صرف مسلمان پر ہے کافر پر نہیں۔ زکوٰۃ چار قسم کے اموال پر فرض ہے (۱) سائمہ جانوروں پر۔ سائمہ کے معنی وہ جانور ہیں جو سال کا اکثر حصہ باہر چر کے گزر کرتے ہیں، گھر میں نہیں کھاتے (۲) سونے چاندی پر (۳) ہر قسم کے تجارتی مال پر (۴) کھیتی اور درختوں کی پیداوار پر۔ ان اقسام کے نصاب اپنے اپنے ہیں۔ نصاب مال کی وہ خاص مقدار ہے جس پر شریعت نے زکوٰۃ فرض کی ہے۔ چاندی، سونے اور تمام تجارتی مال میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے جس کے ساڑھے باون تولے بنتے ہیں بعض کے نزدیک ۳۶ تولے ۵ ماشے بنتے ہیں (مفتی محمد شفیع: قرآن میں نظام زکوٰۃ)۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے جس کے ساڑھے سات تولے اور بعض نزدیک پانچ تولے ڈھائی ماشے بنتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے وقت سونے چاندی کی جو قیمت ہو اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ قیمت خرید کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنا درست نہیں۔ تجارتی مال کا نصاب قیمت کے اعتبار سے ہوگا اگر مال کی قیمت ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کے برابر ہو یا اس سے زائد ہو تو سال گزر جانے پر اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ دینا فرض ہے۔

زکوٰۃ کے مستحقین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: "یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو صدقات کے کام پر مامور ہوں۔ اور ان کیلئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو نیز یہ غلاموں کے آزاد کرانے، قرضداروں کی مدد کرنے، راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے (التوبہ: ۶۰)۔ فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انھیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔ مسکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی نسبت زیادہ خستہ حال ہوں نبی کریم صلعم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحق امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پاتے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ وہ لوگ صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے یا ان کا حساب کتاب رکھنے اور انھیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں ایسے لوگ خواہ وہ فقیر و مسکین نہ ہوں ان کی تنخواہیں صدقات کی مد میں سے دی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ ان پر فرض ہے لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ تالیفِ قلب کے لیے زکوٰۃ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوش عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو۔ جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر انھیں مال سے توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہیں یا جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی دل جوئی نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط ضروری نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے بلکہ وہ مالدار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو گئی ہے اور اب تالیف قلب کے لیے کچھ دینا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے مگر کفار کو نہیں۔ اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں رقمطراز ہیں کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیف قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے ان پر فرض نہیں کیا کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہ کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانے میں جو حالات تھے ان میں تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہ کے اجماع نے اس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا ہے جو قرآن میں بعض اہم دینی مصالح کے لئے رکھی گئی تھی۔

زکوٰۃ کا ذکر قرآن مجید میں نماز (صلوٰۃ) کے ساتھ بیس مقامات پر آیا ہے کئی مقامات پر اس کا ذکر علیحدہ بھی آیا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے اجر عظیم کی بشارت ہے اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لیے سزا اور عذاب کی وعید ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والے یہی لوگ ہیں جنہیں ہم اجر عظیم دیں گے (النساء: ۱۶۲)۔" جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ بخل ان کے لیے اچھا ہے۔ بخل تو ان کے حق میں برا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن ان کا مال ان کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ (آل عمران: ۱۸۰)۔" "اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اے نبی! آپ انھیں دردناک عذاب کی بشارت دیجئے۔ جس دن کہ سونا اور چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی سونا چاندی ہے جس کو تم نے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب تم اس چیز کا مزا چکھو جو تم جمع کرتے رہتے ہو (التوبہ: ۳۴—۳۵)۔

زکریا

انبیائے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اس نے عرض کیا اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی برائیوں کا خوف ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کی میراث بھی پائے اور اے پروردگار اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔ (جواب دیا گیا) اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔ عرض کیا پروردگار بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں۔ جواب ملا ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے۔ آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا۔ زکریا نے کہا اے پروردگار میرے لیے کوئی

نشانی مقرر کردے۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔ چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔" (مریم: ۲ تا ۱۱)۔ اس واقع کی تفصیل لوقا کی انجیل میں یوں بیان ہوتی ہے: "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں ابیاہ کے فریق سے زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بےعیب چلنے والے تھے اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مذبح کی داہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا اور زکریا دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی مگر فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سن لی گئی اور تیرے لئے تیری بیوی الیشبع کے بیٹا ہوگا تو اس کا نام یوحنا (یعنی یحییٰ) رکھنا اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی۔ اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب سے خوش ہونگے کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے اور نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے، پھیرے گا۔ اور وہ ایلیا (الیاسؑ) کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے۔ اور خداوند کے لیے مستعد قوم تیار کرے۔" زکریا نے فرشتے سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں؟ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے اس سے کہا میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے پر پوری ہونگی یقین نہ کیا۔ اور لوگ زکریا کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا" (لوقا باب ۱ آیت ۵ تا ۲۲)۔

حضرت زکریاؑ حضرت ہارون کے خاندان سے تھے۔ بنی اسرائیل نے فلسطین پر قابض ہونے کے بعد ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوب کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا اور تیرھواں قبیلہ (لاوی بن یعقوب کا گھرانہ) مذہبی خدمات کے لیے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی حضرت ہارون کا خاندان "مقدس" میں خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت اور پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام کرتا تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوی "مقدس" کے اندر جا سکتے تھے بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے۔ سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مقدس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انھی خاندانوں میں سے ایک ابیاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریاؑ تھے اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مقدس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب تواریخ اول باب ۲۳-۲۴)۔

حضرت زکریاؑ کے والد کے بارے میں مختلف روایات ہیں: زکریا بن ادن، زکریا بن برخیاہ (فتح الباری، الثعلبی، طبری، ابن اثیر)۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت مریم کے والد عمران بن ماثان ہم زلف تھے (طبری)۔ حضرت زکریاؑ کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش بابل پر سکندر کے حملے کے تین سو تیس سال بعد اور حضرت مسیحؑ کی ولادت چھ ماہ قبل ہوئی تھی (طبری)۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰ کا قتل رفع مسیح سے ایک سال قبل ہوا (ابن اثیر: الکامل)۔ حضرت زکریاؑ کی شہادت کے سلسلے میں ابن اثیر نے بیان کیا ہے کہ بعثت مسیحؑ سے جو احکام تورات منسوخ ہوئے ان میں سے ایک بھتیجی سے نکاح بھی تھا۔ بنی اسرائیل کا بادشاہ ہیرودس اپنی ایک بھتیجی سے نکاح سے کرنا چاہتا تھا۔ حضرت یحییٰؑ چونکہ شریعت عیسوی پر ایمان رکھتے تھے اس لیے وہ مانع آئے تب بادشاہ کے حکم سے حضرت یحییٰؑ کو ذبح کر دیا گیا اس واقع سے حضرت زکریاؑ بھاگ کر ایک باغ میں پہنچے اور ایک درخت کے تنے میں پناہ لی۔ بادشاہ کے آدمیوں نے درخت کو حضرت زکریاؑ سمیت آرے سے چیر دیا۔ ثعلبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہودیوں نے حضرت زکریاؑ پر حضرت مریم کے ساتھ تعلقات رکھنے کی تہمت لگائی اور کہا کہ یہی ان کے حجرے میں داخل ہوتے تھے۔ چنانچہ یہودی آپ کی تلاش میں نکلے اور آرے سے چیرنے کا واقع پیش آیا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی زکریاؑ اپنی روزی کمانے کے لئے بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

زمخشری

(۲۷ رجب ۴۶۷ھ/۸ مارچ ۱۰۷۵ء — ۹ ذوالحجہ ۵۳۸ھ/۱۴ جون ۱۱۴۴ء)

ابوالقاسم محمود بن عمر، فقہ، کلام اور لسانیات کے ایرانی عالم۔ خوارزم میں پیدا ہوئے زمخشری کی اہم ترین تصنیف قرآن مجید کی تفسیر "الکشاف عن حقائق التنزیل" ہے جو ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء میں مکمل ہوئی۔ ان کی توجہ زیادہ تر عقائد کی فلسفیانہ تفسیر پر ہے اور وہ حدیث سے کم سے کم استفادہ کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر معتزلی تھا۔ ابن خلدون نے انھیں کئی دوسرے مفسرین پر فضیلت دی ہے۔ قواعد عربی میں زمخشری کی تصنیفات میں سے "المفصل" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود بڑی جامع ہے اور اس کا اسلوب بیان بے حد صاف اور واضح ہے۔ زمخشری نے علم النحو میں دو رسالے "المفرد والمؤلف فی النحو" اور "الانموذج فی النحو" لکھے جو بے حد مقبول ہوئے زمخشری نے مقدمۃ الادب اور فارسی میں اس کی شرح لکھ کر اہل علم کیلئے عربی زبان کا ایک وسیع ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ لغت حدیث میں انھوں نے "کتاب الفائق" لکھی۔ ان کی کتاب "المستقصی فی الامثال" قدیم ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ ان کی نظموں کا ایک دیوان مرتب ہو چکا ہے حدیث میں انھوں نے دو کتب تالیف کیں (۱) مختصر الموافقت بین آل البیت والصحابہ (۲) خصائص العشرۃ الکرام البررۃ۔

زنا

ایسی عورت کے ساتھ صحیح اور مکمل قسم کے جنسی تعلقات جو شرعاً صحیح نکاح کے ذریعے مرد کی زوجیت میں نہ ہو، اپنی مطلقہ بائنہ نہ ہو، عقد فاسد سے نکاح میں لائی گئی ہو، محرمات میں سے ہو۔ زنا کی قانونی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ اس کی یہ تعریف کرتے ہیں "ایک مرد کا کسی ایسی عورت سے قُبُل میں مباشرت کرنا جو نہ تو اس کے نکاح یا ملک یمین میں ہو اور نہ اس امر کے شبہ کی کوئی معقول وجہ ہو کہ اس نے منکوحہ یا مملوکہ سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کی ہے"۔ شافعیہ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "شرمگاہ کو ایسی شرمگاہ میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو مگر طبعاً جس کی طرف رغبت کی جا سکتی ہو" اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے: "شرعی حق یا اس کے شبہ کے بغیر قُبُل یا دُبُر میں مرد یا عورت سے وطی کرنا" سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم

القرآن میں رقمطراز ہیں: "قانو" ایک فعلِ زنا کو مستلزم سزا قرار دینے کے لیے صرف ادخال حشفہ کافی ہے۔ پورا ادخال یا تکمیل فعل اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ادخال حشفہ نہ ہو تو محض ایک بستر پر یکجا پایا جانا یا ملاعبت کرتے ہوئے دیکھا جانا یا برہنہ پایا جانا کسی کو زانی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے اور اسلامی شریعت اس حد تک بھی نہیں جاتی کہ کوئی جوڑا ایسی حالت میں پایا جائے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ کرا کے زنا کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور پھر اس پر حدِ زنا جاری کی جا سکے۔"

"قرآن مجید میں اس فعل کو قبیح سے شدید نفرت کا اظہار ہوا ہے: "زنا کے قریب بھی مت جاؤ کیونکہ یہ بے حیائی کی بات اور بُرا راستہ ہے" (بنی اسرائیل: ۳۲)۔

سورہ الممتحنہ میں (آیت ۱۲) نبی کریم صلعم کو حکم دیا گیا ہے کہ جب مومنات آپ سے بیعت کرنے کے لیے آئیں تو انھیں زنا سے بچنے کی بھی تلقین کیجیے۔ سورہ النور (آیت ۱۹) میں ان لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب الیم کی وعید ہوئی ہے جو اسلامی معاشرے میں بدکاری کو پھیلانے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سورہ الطلاق میں (آیت ۱) میں ارشاد ربانی ہے کہ اگر کوئی مطلقہ عدت کے دوران بدکاری کا ارتکاب کرے تو اس کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں۔ سورہ النساء میں (آیت ۲۵) پاکیزہ اور زنا سے اجتناب کرنے والی لونڈیوں کو عقد زوجیت میں لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ النور (آیت ۳ اور ۳۳) میں اللہ تعالیٰ نے عصمت فروشی اور بدکاری کی لعنت سے منع فرما دیا ہے۔ زانی کو مشرک کی طرح اور زانیہ کو مشرکہ کے برابر ٹھہرا کر زنا کو بھی شرک کی طرح اکبر الکبائر قرار دیا گیا۔ سورہ النور (آیت ۲ تا ۳) میں ہے کہ "بدکار مرد اور بدکار عورت میں سے ہر ایک کو سو دُرّے مارو۔ اللہ کا حکم نافذ کرنے میں تمھیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور اس سزا کو دیکھنے کے لیے مومنین کی ایک جماعت بھی موجود ہونی چاہیے"۔ حدیث نبوی ہے: "مجھ سے لے لو، مجھ سے لو۔ اللہ نے ان کے لیے صورت پیدا کر دی کنوارا مرد اور کنواری عورت زنا کریں تو سو سو دُرّے اور ایک سال کی جلا وطنی سزا ہے اور اگر شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت زنا کریں تو سو سو دُرّے اور رجم (سنگساری) کی سزا ہے (مسلم: الصحیح)۔

شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ قتل میں قصاص، زنا میں رجم اور سرقے میں قطع ید ہماری طرح ہم سے پہلے کی سماوی شریعتوں میں بھی معمول تھا۔ تمام انبیائے کرام اور تمام امتوں نے اس پر عمل کیا (حجۃ اللہ البالغہ)۔ بائیبل میں زنا کے متعلق جو حکم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "اگر کوئی آدمی کسی کنواری کو جس کی نسبت نہ ہوئی ہو پھسلا کر اس سے مباشرت کرے تو وہ ضرور ہی اسے مہر دے کر اس سے بیاہ کرے لیکن اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق اسے نقدی دے (کتاب خروج باب ۲۲ آیت ۱۶-۱۷)۔ ہندوؤں کے ہاں منو کی دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ: "جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ زنا کرے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔ لڑکی کا باپ راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دے کر شادی کر لے۔ البتہ اگر لڑکی اونچی ذات کی ہو اور مرد نیچ ذات کا تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہیے اور مرد کو قطع اعضا کی سزا دینی چاہیے (ادھیائے ۸ شلوک ۳۶۵-۳۶۶) اور یہ سزا زندہ جلا دیے جانے کی سزا میں تبدیل کی جا سکتی ہے جبکہ لڑکی برہمن ہو (اشلوک ۳۷۷)۔ یہودی قانون میں زنا بزنِ غیر کے یہ احکام پائے جاتے ہیں: "اگر کوئی کسی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ ہی وہ آزاد کی گئی ہو تو ان دونوں کو سزا ملے لیکن وہ جان سے نہ مارے جائیں اس لیے کہ عورت آزاد نہ تھی" (احبار ۱۹ - ۲۰)۔ "جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں" (احبار ۲۰ - ۱۰)۔ "اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں (استثنا ۲۲: ۲۲)۔ اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کر لے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسائے کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ اگر اس آدمی کو منسوبہ لڑکی کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے تو فقط وہ آدمی ہی جس نے صحبت کی مار ڈالا جائے پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا (استثنا ۲۲: ۲۳ تا ۲۶)۔

ملتِ اسلامیہ کے تمام فرقوں کے نزدیک زنا حرام ہے۔ اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کسی مرد یا عورت کو مجرم قرار دینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ اس سے فعل زنا صادر ہوا ہے بلکہ اس کے لیے مجرم میں کچھ شرطیں پائی جانی چاہیں۔ زنائے محض کے معاملے میں شرط یہ ہے کہ مجرم عاقل ہو اور بالغ ہو۔ اگر کسی مجنون یا کسی بچے سے یہ فعل سرزد ہو تو وہ حد زنا کا مستحق نہیں ہے۔ زنا بعد احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ بھی چند شرطیں ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے : رجم)۔ فعل زنا کے مرتکب کو مجرم قرار دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے یہ فعل کیا ہو۔ جبر و اکراہ سے اگر کسی شخص کو اس فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا گیا ہو تو وہ نہ مجرم ہے نہ سزا کا مستحق۔ اس معاملے میں شریعت کا صرف یہ عام قاعدہ ہی منطبق نہیں ہوتا کہ آدمی جبراً کرائے ہوئے کاموں کی ذمہ داری سے بری ہے بلکہ خود قرآن ان عورتوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے جن کو زنا پر مجبور کیا گیا ہو۔ عورت کے معاملے میں تو قانون متفق علیہ ہے لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا مرد کے معاملے میں بھی جبر و اکراہ معتبر ہے کہ نہیں۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام حسن بن صالح کہتے ہیں کہ مرد بھی اگر زنا کرنے پر مجبور کیا گیا ہو تو معاف کیا جائے گا۔ امام زفر کہتے ہیں کہ اسے معاف نہ کیا جائے گا کیونکہ انتشار عضو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی اپنی شہوت اس کی محرک ہوئی تھی۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اگر حکومت یا اس کے کسی حاکم نے آدمی کو زنا پر مجبور کیا ہو تو سزا نہیں دی جائے گی لیکن اگر حکومت کے سوا کسی اور نے مجبور کیا ہو تو زانی کو سزا دی جائے گی۔ اسلامی قانون حکومت کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ زانی اور زانیہ کے خلاف کارروائی کرے اور عدالت کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس پر سزا دے۔ اس امر پر تمام امت کے فقہا کا اتفاق ہے۔ اسلامی قانون زنا کی سزا کو قانون مملکت کا ایک حصہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے مملکت کی تمام رعایا پر یہ حکم جاری ہوگا خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس امر سے امام مالک کے سوا کسی کو اختلاف نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ غیر مسلم زانی کو رجم کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ مستامن اگر دار الاسلام میں زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی (امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ)۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔ اسلامی قانون میں یہ جرم قابل راضی نامہ نہیں ہے۔ قریب قریب تمام کتب حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک لڑکا ایک شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس شخص کو راضی کر لیا مگر جب مقدمہ نبی صلعم تک پہنچا تو آپ نے فرمایا: "تیری بکریاں تیری لونڈی تجھی کو واپس" اور پھر آپ نے زانی اور زانیہ دونوں پر حد جاری فرما دی۔ اسلامی حکومت کسی شخص کے خلاف زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہ کرے گی جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت نہ مل جائے۔ قرآن مجید تصریح کرتا ہے کہ زنا کے لیے کم سے کم چار عینی شاہد ہونے چاہییں۔ شہادت کے بغیر قاضی محض اپنے علم کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا خواہ وہ اپنی آنکھوں سے ارتکاب جرم ہوتے دیکھ چکا ہو۔ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہییں جو اسلامی قانون شہادت کی رو سے قابل اعتماد ہوں یعنی وہ پہلے کسی مقدمے میں جھوٹے گواہ ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں اور ملزم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو۔ گواہوں کو اس بات کی

شہادت دینی چاہیئے کہ انھوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنوئیں میں رسی۔ گواہوں کو اس امر پر متفق ہونا چاہیئے کہ انھوں نے کب کہاں اور کس کو کس کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے۔ (ابو محمد عبداللہ ابن قدامہ حنبلی: المغنی، امام شافعی: کتاب الأم)۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پایا جانا ثبوتِ زنا کے لیے کافی شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں جبکہ عورت کا کوئی شوہر یا لونڈی کا کوئی آقا معلوم و معروف نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی شہادت ہے اور اسی کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے مگر جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر رجم کر دیا جائے یا کسی کی پیٹھ پر سو کوڑے برسا دیئے جائیں۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ شبہ سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ معاف کرنے کیلئے محرک ہونا چاہیئے۔ حدیث نبوی ہے کہ مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اگر کسی ملزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہو تو اسے چھوڑ دو کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے (ترمذی)۔

شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیئے۔ (امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ، ابن ابی لیلیٰ، اسحاق بن راہویہ، حسن بن صالح)۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک ہی اقرار کافی ہے (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، عثمان البتی، حسن بصری)۔ ایسی صورت میں اگر مجرم اقرارِ جرم سے پھر جائے (عین سنگساری کے دوران میں بھی) تو سزا کو روک دینا چاہیئے۔ اس امر میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اگر فریق ثانی اس کے ساتھ مرتکب زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے تو اقرارِ جرم کرنے والے پر حدِ زنا جاری کی جائے گی یا حدِ قذف۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ حدِ زنا کا مستوجب ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے میں اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی کیونکہ فریق ثانی کے انکار نے اس کے جرمِ زنا کو مشکوک کر دیا ہے۔ امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ اسے زنا اور قذف دونوں کی سزا دی جائے گی۔

ثبوتِ جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو کیا سزا دی جائے؟ اس مسئلے پر فقہا میں اختلاف ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سو کوڑے لگانا اور اس کے بعد سنگسار کرنا یہ امام احمدؒ، داؤد ظاہری اور اسحاق بن راہویہ کا مسلک ہے۔ باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سزا صرف سنگساری ہے۔ رجم اور سزائے تازیانہ کو جمع نہ کیا جائے گا۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، یہ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اسحاقؒ، داؤد ظاہری، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن صالح کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک مرد کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور عورت کے لیے صرف سو کوڑے۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حدِ زنا مرد اور عورت دونوں کے لیے صرف سو کوڑے ہے۔ ضربِ تازیانہ ایسی ہونی چاہیئے جس کا اثر جلد تک رہے گوشت تک نہ پہنچے۔ ایسی ضربِ تازیانہ قرآن کے خلاف ہے جس سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے۔ مؤطا میں امام مالکؒ کی روایت ہے کہ نبی صلعم نے ضربِ تازیانہ کے لیے کوڑا طلب کیا اور وہ کثرتِ استعمال سے بہت کمزور ہو چکا تھا آپ نے فرمایا اس سے زیادہ سخت لاؤ۔ پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا جو ابھی استعمال سے نرم نہیں پڑا تھا آپ نے فرمایا دونوں کے درمیان۔ پھر ایسا کوڑا لایا گیا جو سواری میں استعمال ہو چکا تھا اس سے آپ نے ضرب لگوائی گرہ لگا ہوا کوڑا، دو شاخہ یا سہ شاخہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے۔ تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ ضرب مبرح نہیں ہونی چاہیئے یعنی زخم ڈال دینے والی نہ ہو۔ ایک ہی جگہ نہیں مارنا چاہیئے صرف منہ، شرمگاہ اور سر کو بچا کر باقی ہر عضو پر کچھ نہ کچھ مار پڑنی چاہیئے۔ مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہیئے اور عورت کو بٹھا کر۔ جاڑے میں گرم وقت اور گرمی میں ٹھنڈے وقت مارنے کا حکم ہے۔ باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں۔ الّا یہ کہ مجرم بھاگنے کی کوشش کرے۔ فقہا نے اس کو جائز رکھا ہے کہ روزانہ کم از کم بیس بیس کوڑے مارے جائیں لیکن اولیٰ یہی ہے کہ یک وقت پوری سزا دی جائے۔ مار کا کام اجڈ جلادوں سے نہیں لینا چاہیئے بلکہ صاحب علم و بصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہیئے جو یہ جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی صلعم کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، مقدادؓ بن عمرو، محمدؓ بن مسلمہ، عاصمؓ بن ثابت اور ضحاکؓ بن سفیان جیسے صحابہ سے جلادی کی خدمت لی جاتی تھی۔

زندیق

وہ شخص جو آنحضرت صلعم کی نبوت کا اعتراف کرنے کے باوجود کافرانہ عقائد رکھتا ہو۔ فقہ اسلامی میں یہ اصطلاح اس فاسد العقیدہ بدعتی کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کی تعلیم حکومت کے لیے خطرہ بن جائے۔ یہ جرم سزائے موت اور عذاب جہنم کا مستوجب ہے۔ مالکیوں کے نزدیک مجرم سے توبہ کرنے کے لیے کہنا بھی بے فائدہ ہے۔ بقول تھانوی یہ فرقہ ثنویت کا قائل ہے جو دو خالقوں کو مانتا ہے یعنی یزداں و اہرمن۔ یزدان خالقِ خیر اور اہرمن خالق شر ہے زندیق حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اگر ایمان ظاہر بھی کرے تو در حقیقت باطن میں کافر ہوتا ہے۔ مسعودی کے نزدیک مزدکیوں میں اس بدعتی کو زندیق کہتے تھے جو اوستا کی کسی عبارت کی تاویل کر کے اس کی نئی شرح نکالتا تھا۔ داتا گنج بخش بھی اسی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ خوارزمی کے نزدیک مزدک کے پیرو کو زندیق کہتے ہیں جو مانوی خارجی تھا۔ ادبی روایات میں تین مشہور مصنفوں: ابن راوندی، توحیدی اور معری کو اسلام کے تین زندیقوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عملاً قدامت پسند لوگ مناظرانہ تحریروں میں ہر اس شخص کو زندیق یا آزاد خیال بتا دیتے ہیں جو ان کے نزدیک دین کا ظاہری اقرار کرنے میں کافی خلوص نہ رکھتا ہو۔ فقہا نے زندقہ کو بتدریج ایسی ذہنی بغاوت بنا لیا جس میں نبی کریم صلعم کی عزت کا استخفاف ہوتا ہے (امام ابن تیمیہؒ، ابن حجر ہیتمی)۔ حنبلیوں کے نزدیک زندیقوں کے پانچ فرقے ہیں۔ (۱) معطلہ، جو خلق و خالق کے منکر ہیں (۲) مانویہ (۳) مزدکیہ۔ جو ثنوی ہیں۔ (۴) عبدکیہ (۵) روحانیہ جو عشق کے ذریعے روح کو خدا سے واصل کر کے اپنے آپ کو شرعی قیود و قوانین سے نجات دلوانا چاہتے ہیں۔ امام غزالی کے نزدیک زندقہ میں خدا کے وجود سے انکار پایا جاتا ہے۔ حسین بن منصور حلاج (جو خود اسی جرم میں سزائے موت سے ہمکنار ہوئے) اخبار الحلاج میں لکھتے ہیں کہ قلب ماہیت کرنے والے وصال کے آستانے پر پہنچ کر تصوف میں عین ذات (خدا) ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جو زندقہ ہے۔

زنگی، عمادالدین

(وفات ربیع الآخر ۵۴۱ھ/ ستمبر ۱۱۴۶ء) بن قاسم الدولہ آق سنقر بن عبداللہ، موصل کے اتابک اور سلجوقی دور کے ممتاز ترین امرا میں سے تھا۔ زنگی کے باپ آق سنقر کو حلب کا شہر سلطان ملک شاہ نے بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ ملک شاہ فوت ہوا تو آق سنقر نے اس کے بھائی تتش کے خلاف بغاوت کر دی۔ نتیجتاً ۱۰۹۴ء میں قتل کر دیا گیا۔ زنگی کی عمر اس وقت دس برس تھی۔ باپ کی جاگیر اس سے چھین لی گئی۔ ۵۱۶ھ/ ۱۱۲۲ء میں وہ واسط کا حاکم مقرر ہوا اور ۵۲۱ھ/ ۱۱۲۷ء میں موصل کا والی بنا۔ سلطان محمود سلجوقی نے اپنے دونوں بیٹوں الپ ارسلان اور فرخ شاہ کی تعلیم زنگی کے سپرد کر دی اور اسی بنا پر زنگی کو اتابک کا لقب عطا ہوا۔ زنگی نے جزیرہ ابن عمر، نصیبین، سنجار، حران، حمات اور قلعہ اثارب فتح کیے۔ ۱۱۳۷ء میں اس نے قلعہ بعرین فتح کیا۔ ۱۱۳۸ء میں دمشق کے حاکم شہاب الدین محمود نے حمص کا شہر زنگی کے حوالے کر دیا۔ ۵۳۹ھ/ ۱۱۴۴ء میں اس نے صلیبی سپاہیوں سے اہم شہر رہا چھین لیا۔

۱۱۴۶ء میں اس نے عراق عرب کے قلعہ الجعبر پر حملہ کیا اور مملوکوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مشرقی مؤرخین آتابک زنگی کی سیاسی صفات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ابن اثیر نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں وہ ممالک کیسے بحال و بارونق ہو گئے جن کو فرنگیوں کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور جنہیں والیوں کے بار بار تبادلے اور زبردستانیوں نے کنگال کر دیا تھا۔

زہاوی

(۱۸ جون ۱۸۶۳ء — ۲۳ فروری ۱۹۳۶ء) جمیل صدقی، عراق کے دورِ جدید کا سب سے بڑا عربی شاعر۔ اس کا باپ محمد فیضی الزہاوی بغداد کا مفتی تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب حضرت خالدؓ بن ولید سے ملاتا تھا۔ اس کا باپ کچھ عرصہ تک زہاو (ایران) میں رہا۔ اسی نسبت سے وہ زہاوی کہلایا۔ اس نے مغربی علوم کو عربی، فارسی، ترکی اور کردی کتابوں کے ذریعے حاصل کیا۔ آزاد خیال اور زندیق مشہور ہونے کی وجہ سے کوئی مستقل جگہ حاصل نہ کر سکا۔ شاعری میں اس کا پہلا مجموعہ "الکلم المنظوم" ۱۹۰۹ء میں، دوسرا مجموعہ "رباعیات زہاوی" ۱۹۲۴ء میں "دیوان زہاوی" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ آخری مجموعۂ کلام "الاوشال" ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اسے موضوع اور اسلوب دونوں میں عربی شاعری کا حقیقی مجدد کہا جاتا ہے۔ جدید عربی ادبیات میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔

زہری، امام

(۵۰ھ — ۱۲۴ھ) ابوبکر محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ الاصغر بن شہاب، مشہور محدث اور فقیہ۔ قریش مکہ کے مشہور قبیلہ بنو زہرہ سے تعلق کی وجہ سے ان کی نسبت زہری ہوئی۔ عمر بن عبد العزیزؒ کے نزدیک وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔ یزید ثانی نے انھیں قاضی مقرر کیا۔ یزید ثانی کے جانشین ہشام نے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کیا۔ شغب کے قریب اپنی جاگیر ادامی میں ان کا انتقال ہوا۔ نوجوانوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں سے دریافت کرتے رہنے کی وجہ سے زہری نے احادیث کا وسیع ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ انھوں نے آثارِ صحابہ کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی۔ زہری علم الانساب کے بڑے ماہر تھے۔ وہ شعر و شاعری کے نقاد اور سیرت کے بھی امام ہیں۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد کے بیس سال کے واقعات کے لیے ان کا حوالہ طبری میں اکثر آتا ہے۔

زیاد بن ابیہ

والیِ عراق۔ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ کے والی تھے تو زیاد ان کے کاتب کے فرائض انجام دیتا تھا۔ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کئی اہم امور اسکے سپرد کیے۔ امیر معاویہؓ خلیفہ ہوئے تو زیاد کی ذہانت اور قابلیت سے استفادہ کرنے کے لیے انھوں نے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا کہ زیاد ان کے والد ابو سفیان کا بیٹا ہے اور اسے بصرہ کا والی مقرر کیا۔ زیاد نے سخت سزاؤں کے ذریعے بصرہ میں امن و امان قائم کیا۔ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے اسے کوفہ کی حکومت بھی سونپ دی۔ عرب مؤرخین نے اس کی بھی وہی خوبیاں گنوائی ہیں جو امیر معاویہؓ میں موجود تھیں۔ زیاد کا شمار عرب کے چار اعلیٰ درجے کے مدبروں میں ہوتا ہے باقی تین مدبر حضرت امیر معاویہؓ، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت عمروؓ بن عاص ہیں۔ مگلویوں اور عراق کے عربی قبائل کی مخالفت کا سدِ باب کرنے کے لیے زیاد نے پچاس ہزار بدویوں کو خراسان منتقل کر دیا تھا۔

زیار، آل

سامانیوں کا ایک باجگزار خاندان جس نے ۳۱۶ھ/۹۲۸ء سے ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء تک عراق عجم، طبرستان اور بعد ازاں جرجان پر حکومت کی۔ یہ خاندان گیلان کے بادشاہ وردان شاہ کے باپ زیاد سے منسوب ہے۔ اس خاندان کا بانی مرداویج بن زیاد تھا۔ اس نے ۳۱۶ھ/۹۲۸ء سے ۳۲۳ھ/۹۳۵ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد وشمگیر بن زیار نے ۳۲۳ھ/۹۳۵ء سے ۳۵۶ھ/۹۶۷ء تک حکومت کی۔ اس کے بیٹے ظہیر الدولہ ابو منصور بیستون نے ۳۵۶ھ/۹۶۷ء سے ۳۶۶ھ/۹۷۶ء تک حکومت کی۔ چوتھا حکمران قابوس اول (شمس المعالی) تھا جس نے ۳۶۶/۹۷۶ء سے ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء تک حکومت کی۔ منوچہر بن قابوس اول پانچواں حکمران تھا جس نے ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء سے ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں سلطان محمود نے رے پر حملہ کیا تو منوچہر نے ۵ لاکھ دینار دے کر صلح کر لی اور محمود کو اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ چھٹا حکمران انوشروان بن منوچہر ہوا۔ اس نے ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء سے ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء تک حکومت کی۔ اس نے سلطان محمود کے جانشین سلطان مسعود کی فرمانروائی تسلیم کی۔ ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء میں سلجوقی سلطان طغرل بیگ نے جرجان کا علاقہ اس سے چھین لیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں دارا بن قابوس اول کو سلطان مسعود نے جرجان اور طبرستان کا والی مقرر کیا تھا۔ ساتواں حکمران قابوس ثانی بن دارا ثانی سلطان محمود کا داماد تھا۔ آل زیار کا آٹھواں اور آخری حکمران گیلان شاہ بن قابوس ثانی تھا۔ وہ صرف پہاڑی علاقے کا حکمران تھا کیونکہ طغرل بیگ نے طبرستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی نے اسے تخت سے اتار دیا اور ۱۰۷۷ء میں گیلان شاہ نے وفات پائی۔

زیب النساءؒ

(۱۰ شوال ۱۰۴۷ھ — محرم ۱۱۱۴ھ) نامور مغل شہزادی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی اولاد۔ جب وہ چار سال کی ہوئی تو اورنگ زیب کے معتمد عنایت اللہ خاں کی والدہ حافظ مریم کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ ان کی کوشش سے زیب النساء نے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی تو اس نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں عنایت کیں۔ زیب النساء نے علم صرف و نحو ملا جیون سے حاصل کیا۔ ملا سعید اشرف مازندرانی سے دوسرے ضروری علوم حاصل کیے (مقالات شبلی نعمانی)۔ ملا اشرف نے زیب النساء کو چودہ سال پڑھایا۔ علم فقہ و حدیث کی تعلیم کے علاوہ شعر فہمی کا شوق بھی زیب النساء کو ملا اشرف ہی کی بدولت حاصل ہوا۔ ۱۰۷۳ھ میں جب اورنگ زیب کشمیر جانے کے ارادے سے لاہور آیا تو بیمار ہو گیا۔ اس پر اس نے زیب النساء کو مع حرم شاہی لاہور بلا لیا۔ زیب النساء کو لاہور میں قیام کا خاصا موقع ملا۔ زیب النساء درباری سیاست سے الگ رہتی تھی اور ہمیشہ علمی و ادبی مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔ زیب النساء کے متعلق کئی بے بنیاد عشقیہ قصے کہانیاں مشہور ہوئیں۔ تاریخی شواہد کی رو سے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ زیب النساء نے

ایک مسجد آگرہ میں اور ایک مسجد کشمیر میں تعمیر کرائی ۔ زیب النساء شعر ضرور کہتی تھی لیکن اس کا کوئی مجموعہ محفوظ نہیں رہا ۔ زیب النساء نے دہلی میں وفات پائی اور تیس ہزاری باغ میں دفن ہوئی ۔ مقبرہ انگریزوں کی آمد تک موجود تھا (سرسیّد احمد خاں : آثار الصنادید) ۔ جب " راجپوتانہ ۔ مالوہ " ریلوے لائین ۱۸۸۵ء میں تیار ہوئی تو یہ مقبرہ اس کی زد میں آگیا ۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ زیب النساء کا مقبرہ لاہور میں نواں کوٹ کے پاس ہے مگر یہ درست نہیں ۔

زید بن ارقم

رسول اللہ کے صحابی ۔ قبیلہ خزرج میں سے تھے ۔ بیشتر غزوات میں شریک ہوئے ۔ جنگ صفین میں حضرت علی کا ساتھ دیا ۔ آپ کوفہ میں مقیم رہے ۔ ۶۸ھ میں یہیں انتقال ہُوا ۔ ۹۰ حدیثیں آپ سے مروی ہیں ۔ علم و فضل میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا ۔ اعلیٰ پایہ کے صحابہ بھی کئی باتوں میں آپ سے مشورہ لیتے تھے ۔ آغاز نبوتؐ میں آپ کا گھر اسلامی تحریک کا مرکز تھا ، حضرت عمرؓ نے یہاں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا ۔

زید بن اسلم

حضرت عمر کے غلام جو قرآن پاک ، حدیث اور فقہ کے بلند پایہ عالم تھے مسجد نبوی میں درسِ حدیث دیا کرتے تھے ۔ آپ کی شخصیت بڑی بارعب تھی ۔ درسِ حدیث کے دوران میں کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ۔ ۱۳۶ھ میں آپ کا انتقال ہُوا ۔ تابعین میں شمار ہوتے ہیں ۔

زید بن ثابت

بن ضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن نجار انصاری خزرجی ، نامور صحابی اور کاتب وحی ۔ ان کے والد ہجرت سے پانچ سال قبل جنگ بعاث میں مارے گئے تھے اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر چھ سال تھی ۔ گیارہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا ۔ ہجرت کے بعد نبی کریم صلعم کے کاتب وحی مقرر ہوئے ۔ یہودیوں کے ساتھ خط و کتابت کے فرائض بھی حضرت زیدؓ ہی سرانجام دیتے تھے ۔ سریانی زبان انھوں نے سترہ دن کے اندر سیکھ لی تھی مسعودی کہتے ہیں کہ وہ فارسی ، رومی ، قبطی اور حبشی زبانوں سے بھی واقف تھے ۔ حضرت زیدؓ قرأت ، فرائض ، قضا اور فتویٰ میں نہایت ممتاز تھے ۔ غزوۂ بدر کے وقت ان کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی چنانچہ رسول اللہ نے انھیں جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی ۔ غزوہ خندق میں شریک ہوئے ۔ غزوۂ تبوک میں اپنے قبیلے کے علم بردار تھے ۔ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب خلافت کا مسئلہ پیش ہوا تو حضرت زیدؓ پہلے انصاری تھے جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کی تائید کی ۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کا کام انھی کو تفویض ہوا ۔ حضرت زیدؓ نے مسیلمہ کذاب کے خلاف مہم میں بھی حصہ لیا ۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ کے قاضی مقرر ہوئے ۔ جنگِ یرموک میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا اس کی تقسیم کے قواعد بھی حضرت زیدؓ کے مشورے پر مقرر ہوئے ۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ناظر بیت المال کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ حضرت زیدؓ کا انتقال ۴۵ھ اور ۵۶ھ کے درمیان ہوا ۔ مروان بن حکم والی مدینہ نے نماز جنازہ پڑھائی ۔

زید بن حارثہ

آنحضور صلعم کے آزاد کردہ غلام اور صحابی ۔ حضرت زیدؓ قبیلۂ کلب کے حارثہ بن شراحیل کے بیٹے تھے ۔ ان کی ماں سعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں ۔

حضرت زیدؓ کی عمر آٹھ سال تھی کہ ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے کر گئیں ۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ کر لے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے ۔ پھر انھوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں زیدؓ کو بیچ دیا ۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے ۔ انھوں نے زیدؓ کو مکہ لا کر اپنی پھوپھی کی خدمت میں نذر کر دیا ۔ آنحضور صلعم سے حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہوا تو حضرت خدیجہؓ نے زیدؓ کو بعثت سے قبل ہدیتاً آنحضور کی خدمت میں پیش کر دیا ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر پندرہ سال تھی ۔ کچھ مدت بعد حضرت زیدؓ کے باپ اور چچا کو پتہ چلا تو وہ آنحضور صلعم کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ آپ جو چاہیں فدیہ لے لیں مگر ہمارا بچہ ہمیں دے دیں ۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ لیے بغیر چھوڑ دوں گا لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ اسے خواہ مخواہ نکال دوں ۔ آنحضور صلعم نے حضرت زیدؓ کو بلا کر ان سے ان کی خواہش دریافت فرمائی ۔ حضرت زیدؓ نے جواب دیا کہ میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا ۔ آنحضور صلعم نے اسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع میں اعلان فرمایا کہ آپ سب گواہ رہیں آج سے زید میرا بیٹا ہے یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے ۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے لگے ۔ نبی کریم صلعم منصب نبوت سے سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ایک لمحہ شک و تردّد کے بغیر آپؐ کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کر لیا ۔ ایک حضرت خدیجہؓ دوسرے حضرت زیدؓ تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکرؓ ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۳۰ سال تھی ۔ ۴ھ میں نبی کریم صلعم نے حضرت زیدؓ کے لیے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا ۔ حضرت زینب اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا ۔ اس پر قرآن مجید کی سورہ احزاب کی آیت ۳۶ نازل ہوئی : " کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے ۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا " ۔ اس آیت کے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان والے راضی ہو گئے ۔ نبی صلعم نے ان کا نکاح پڑھایا ، زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ۶۰ درہم مہر ادا کیا ۔ کپڑے دیئے اور کچھ سامان خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا ۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان کر زیدؓ کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا لیکن اپنے دل سے وہ اس احساس کو نہ مٹا سکیں کہ زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام ہیں اور ان کے اپنے ہی خاندان کے پروردہ ہیں ۔ یہی بات تلخیوں کو بڑھانے کا سبب بنی ۔ ایک سال سے کچھ ہی مدت زیادہ گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی ۔ حضرت زینبؓ کے بعد حضرت زیدؓ نے ام کلثوم بنت عقبہ سے شادی کی ۔ جن کے بطن سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے ۔ اس کے بعد ان کی شادی دُرّہ بنت ابی لہب سے ہوئی ۔ لیکن ان دونوں کو بھی حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی ۔ انھوں نے ہند بنت عوام اور آنحضرتؐ کی آزاد کردہ کنیز ام ایمنؓ سے بھی شادی کی تھی ۔ ام ایمنؓ سے ان کے ہاں اسامہؓ پیدا ہوئے ۔

حضرت زیدؓ بہادر سپاہی تھے ۔ بدر سے موتہ تک تمام اہم غزوات میں شریک رہے ۔ غزوہ مریسیع میں آنحضرت صلعم نے انھیں مدینہ منورہ میں اپنی جانشینی کا فخر بخشا تھا ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی میں زیدؓ شریک ہوتے امارت کا عہدہ انھی کو عطا ہوتا ۔ اس طرح وہ نو بار سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے ۔ غزوہ موتہ میں شہادت پائی ۔ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اگر زیدؓ زندہ رہتے تو رسول اللہؐ انھی کو جانشین بناتے ۔

زید بن دثنہ

بن معاویہ بن عبید ، رسول اللہ کے صحابی ۔ آپ کا تعلق بنو خزرج کے

خاندان بیاضہ سے تھا۔ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ حضرت زیدؓ ان صحابہ کے ساتھ تھے جنہیں رسول کریم صلعم نے حضرت عاصمؓ کی امارت میں قبیلہ عضل وقارہ کی درخواست پر تبلیغ دین کے لیے بھیجا تھا۔ راستہ میں مقام رجیع پر جو المناک واقعہ پیش آیا اس میں حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ اسیر ہوئے۔ مشرکین انھیں رسیوں میں جکڑ کر مکہ لائے۔ حضرت زیدؓ کو صفوان بن امیہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ صفوان کا باپ امیہ بن خلف حضرت زید کے ہاتھوں ایک غزوہ میں ہلاک ہوا تھا۔ صفوان نے قتل کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مقام تنعیم مقتل قرار پایا۔ قتل گاہ میں ابوسفیان سمیت تمام رؤسائے قریش موجود تھے۔ صفوان کے غلام نسطاس نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے پوچھا: "زید تمہیں خدا کی قسم سچ سچ بتانا اگر تمہارے بجائے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں اور ہم ان کی گردن ماریں اور تم اپنے گھر میں محفوظ رہو تو تم اس کو پسند کرتے ہو؟" حضرت زیدؓ نے فرمایا: "واللہ مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ محمدؐ کے کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر بیٹھا رہوں"۔ ابوسفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا، اس نے کہا: "محمدؐ کے اصحاب اُن سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ دنیا میں کسی کے دوست ایسے گرویدہ نہیں"۔ اس کے بعد نسطاس نے حضرت زیدؓ کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔

زید بن علی بن حسینؓ

(۸۰ھ ــــ ۱۲۲ھ) فاطمی وعلوی خانوادے کے جید عالم اور فرقۂ زیدیہ کے امام۔ زیدؒ امام زین العابدین علیؒ جیسے والد اور باقر العلوم محمد باقرؒ جیسے بھائی کی شفقت و رحمت کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ امام محمد باقرؒ سے درس لیتے رہے۔ اس عہد کے دوسرے مدنی علما و فقہا و محدثین سے مستفید ہوئے انھیں بچپن ہی سے قرآن مجید سے غیر معمولی شغف تھا۔ اس لیے جوانی میں "حلیف القرآن" کہلائے۔ تدبر فی القرآن کی وجہ سے ان میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور قرآنی نظام فکر وعمل کا جذبہ پیدا ہوا جسے عام کرنے کیلئے انھوں نے تقریریں کیں۔ مدینہ سے دمشق گئے اور قید میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ابوعسان ازدی بیان کرتے ہیں کہ ہشام نے زید بن علی کو پانچ ماہ تک قید رکھا۔ وہ وہاں سورہ الحمد و بقرہ کی تفسیر بیان فرماتے۔ میں نے ان جیسا عالم قرآن نہیں دیکھا (تاریخ الکوفہ)۔ عمر بن موسیٰ کے نزدیک ناسخ ومنسوخ اور متشابہات میں زید بن علی سب سے بڑے عالم تھے (طوسی: الفہرست)۔ فقہ میں ان کے معاصران سے مستفید ہوتے تھے۔ بلا اختلاف تمام فقہا ان کی حیثیت کو مسلم جانتے تھے۔ (ابوزہرہ: الامام زید)۔ عبادت میں خشوع وخضوع کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے اور دیکھنے والے سمجھتے کہ روح پرواز کر گئی ہے (ناجی حسن: ثورہ زید) شب فروز نماز، طویل سجدے، ایک دن بیچ روزہ رکھنا عام دستور تھا (الامام زید: المسند) سخاوت، خودداری، بلند ہمتی اور حق گوئی کے علاوہ ان کا طرۂ امتیاز خطابت وادب و بلاغت، حاضر جوابی اور توضیح مدعا تھا۔ لوگ ان کے جملے حفظ کیا کرتے تھے (ثورہ زید)

زیدؒ ابھی پینتیس چالیس سال کے درمیان تھے کہ ہشام بن عبدالملک نے انھیں قید کر دیا۔ پھر خالد بن عبداللہ کے عائد کردہ الزامات کا جواب دینے کے لیے کوفہ بھیجا گیا۔ ۱۲۰ھ میں خالد معزول ہوا اور ان کی جگہ یوسف بن عمر نیا والی مقرر ہوا۔ خالد اور زیدؒ کی بات چیت ہوئی اور زیدؒ بے گناہ ثابت ہوئے۔ زیدؒ نے کوفہ میں تبلیغ شروع کی حکومت پر تنقید کی وجہ سے انھیں کوفہ چھوڑنے کا حکم ہوا۔ زیدؒ کوفہ ہی میں رہے۔ حکومت نے ان کی تلاش میں گھروں میں چھاپے مارے۔ زیدؒ نے وقت معینہ سے ایک ہفتہ قبل ہی کوفہ میں اعلانِ انقلاب کر دیا۔ رات بھر مشعل بردار جلوس کوفہ کے بازار میں نعرے لگاتا رہا۔ صبح کو حکومت کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ زید کے مخلص فوجی سالار قتل ہوئے۔ دوسرے روز بھی جنگ جاری رہی۔ تازہ کمک کے باوجود سرکاری فوج شکست کھاتی رہی۔ زید جامع مسجد میں جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ لڑتے رہے۔ دوسرے روز کئی ساتھی مارے گئے۔ یوسف بن عمر نے تجربہ کار فوجی سالاروں کے ساتھ تازہ حملہ کیا۔ تیروں کی بارش نے بہت سی جانیں لے لیں۔ ایک تیر زید کی پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ بچے کھچے جاں نثار آپ کو سبخہ لے گئے جہاں آپ نے انتقال فرمایا۔ جاں نثاروں نے رات ہی کو سبخہ میں دفن کر کے قبر پر نہر کا پانی جمع کر دیا۔ صبح کو حکومت کے آدمی نعش نکال کر لے گئے۔ یوسف بن عمر سر تن سے جدا کر کے ہشام کے پاس لے گیا۔

امام زیدؒ کے بعد ان کی تحریک کو ان کے دو فرزندوں یحییٰ اور عیسیٰ نے خون دے کر آگے بڑھایا۔ یہ خون رنگ لایا اور ابومسلم خراسانی اور پھر خاتمۂ حکومت بنو امیہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ بنی عباس کے زمانے میں زیدیوں نے طبرستان میں حکومت بھی قائم کی اور اہل دیانت نے ان کے اصول وافکار کو مستقل مذہب کی شکل دی جو فرقۂ زیدیہ کی شکل میں اب باقی ہے۔

زیدان

(۱۴ ستمبر ۱۸۶۱ء ــــ ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء) جرجی بن حبیب زیدان عیسائی عرب ناشر صحافی اور ادیب جو بیروت میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں وفات پائی۔ یورپ کے دو سفروں کے علاوہ اس کی تمام ادبی سرگرمیاں مصر تک محدود رہیں۔ اس کی قابل ذکر تصنیفات یہ ہیں: (۱) الفلسفۃ اللغویۃ یہ لسانیات سے متعلق ہے (۲) تاریخ اللغت العربیہ، یہ بھی لسانیات سے متعلق ہے۔ (۳) تاریخ مصر الحدیث (۴) تاریخ الماسونیۃ العام (۵) التاریخ العام (۶) تاریخ یونان وروما (۷) مختصر جغرافیہ مصر (۸) انساب العرب قدماء (۹) تاریخ تمدن اسلامی پانچ جلدوں میں۔ اسلامی ممالک میں اس کا شمار صف اول کی تصنیفات میں ہوتا ہے (۱۰) تاریخ آداب اللغت العربیہ، یہ عربی زبان کی پہلی کتاب ہے جو یورپی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی۔ اس نے بائیس ناول لکھے۔

زیدیہ

شیعوں کی ایک شاخ جسے زید بن زین العابدین علی کو امام تسلیم کرنے کی بنا پر اثنا عشریہ اور سبعیہ سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ زیدیہ کے نزدیک امام حسینؓ کے بعد حسنی و حسینی سادات میں جو شخص شرائط امامت کا حامل ہو وہ امام ہوگا ان کے نزدیک شرائط امامت یہ ہیں: بالغ، عاقل، مرد، زندہ، مسلمان، عادل، مجتہد، صاحب تقویٰ اور سخی ہو، سیاست دان، منتظم، حقوق [illegible] نہ کرے رعایا کے معاملات خود انجام دے، صحیح الرائے ہو، بہادر و جرات مند ہو اور [illegible] بادرست ہو (ناجی حسن: ثورۂ زید بن علی)۔ زیدیہ کے نزدیک امام کے لیے جہاد کرنا [illegible] تقیہ ہونا لازمی ہے۔ وہ زید بن علی کو اصول وفروع کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ توحید [illegible] بیشتر عقائد شیعہ اثنا عشریہ و معتزلہ کے مطابق ہیں۔ مثلاً ذات [illegible] کو منزہ عن [illegible] الجسمات اور صفات کو عین ذات مانتے ہیں۔ رؤیت کی نفی کرتے ہیں۔ عدل کے قائل ہیں اور وعد و عید میں شفاعت کو خلف وعدہ کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں جس کی جو سزا ہے وہ اسے ضرور ملے گی۔ اصحاب کبائر کی شفاعت ماننے سے اللہ کا وعدہ و وعید [illegible] جائے گا۔

امام برحق حضرت علیؓ پھر امام حسنؓ و امام حسینؓ ہیں پھر حضرت زید۔ بعض کے نزدیک زین العابدین علی اور ان کے بعد زید بن علی ان کے بعد حسنی و حسینی سادات میں جو بھی [illegible] ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت دو امام ہوں (اشعری: کتاب المقالات، الفرق [illegible] میں زیدیوں کی اکثریت اور معتزلہ کے عقائد میں بال برابر بھی اختلاف نہیں تھا۔ زیدی فقہ میں عموماً امام ابوحنیفہ سے اور بعض مسائل میں امام شافعی سے متفق ہیں (ابوزہرہ: الامام زید) زیدیوں کے فلسفۂ دعوت پر عہد حاضر کے فاضل زیدی بزرگ ابراہیم بن علی بن [illegible]

"العرفان" میں قلم اٹھایا ہے جس کا ملخص یہ ہے: "زید نے اپنی دعوت کے مرکزی نکتے یہ قرار دیئے ہیں۔ (۱) مسلمانوں کے معاملات شوریٰ سے طے ہوں۔ استبداد، بدعت اور شہنشاہیت کا مقابلہ کیا جائے (۲) شوریٰ کا انکار اور استبداد۔ اگر حکومت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو یکسر نظر انداز کر دے تو امام کو حکومت سے ٹکر لینے کی اجازت ہوگی۔ امام عادل قرآنی معاشرہ و نظام کا ذمہ دار ہوگا۔ کتب تاریخ میں زیدیوں کے بہت سے فرقے بتائے گئے ہیں: جارودیہ، سلیمانیہ، بتریہ، یعقوبیہ، نعیمیہ، مطرفیہ، زیدیہ وامامیہ، ابریہ، عقبیہ، جریریہ، صالحیہ، صباحیہ، محمدیہ، طالقانیہ، عمریہ، رکبیہ، خشبیہ، حاسفیہ اور قاسمیہ (ثورہ زید)۔

زینب رضؓ بنت ابی سلمہ

بن عبدالاسد بن عمرو بن مخزوم صحابیہ۔ حبشہ میں ام سلمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ انھی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے دودھ پلایا (ابن سعد)۔ پہلے برّہ نام تھا۔ آنحضور صلعم نے زینب نام رکھا (مسلم)۔ ۴ھ میں ابو سلمہؓ نے وفات پائی تو حضرت ام سلمہؓ آنحضرت صلعم کے نکاح میں آئیں۔ والدہ ماجدہ کے ساتھ زینب آنحضرتؐ کے آغوشِ تربیت میں آئیں۔ آپؐ غسل فرماتے تو ان کے منہ پر پانی چھڑکتے۔ اسی کی برکت سے بڑھاپے تک ان کے چہرے پر شباب کا آب و رنگ باقی رہا۔ حضرت عبداللہ بن زمعہ بن اسود اسدی سے شادی ہوئی۔ دو لڑکے ہوئے ایک کا نام ابو عبیدہ تھا ۶۳ھ میں حرہ کی لڑائی میں دونوں کام آئے۔ حضرت زینبؓ نے ۷۳ھ میں انتقال فرمایا۔ وہ اپنے زمانے کی فقیہہ بیوی تھیں۔ (اسد الغابہ)۔ جن محدثین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: امام زین العابدینؒ، ابو عبیدہ، محمد بن عطار، عراک بن مالک، حمید بن نافع، ابو سلمہ، کلیب بن وائل، ابو قلابہ حرمی۔

زینب رضؓ بنت جحش

بن رباب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کثیر بن غنم بن دودان بن سعد بن خزیمہ، آنحضور صلعم کی پھوپھی زاد بہن، امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی۔ نبوت کے ابتدائی دور میں اسلام لائیں۔ ابتدا ہی میں سارا کنبہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلا گیا اور ان کے خالی مکانوں پر قریش نے قبضہ کر لیا۔ ۴ھ میں حضرت زینب کا نکاح رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ زیدؓ بن حارثہ سے ہوا۔ ایک سال کے بعد حضرت زیدؓ رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: "زینب مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں (ترمذی)۔ آپ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ شکایتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر ربّانی حکم نازل ہوا (احزاب: ۳۸) اور حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی۔ نسائی اور طبری نے حضرت زینبؓ کے مزاج کی تیزی کا ذکر کیا ہے۔ حضرت زینبؓ ابتدا میں حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی نہ تھیں لیکن جب آنحضورؐ نے سورہ احزاب کی آیت ۳۶ پڑھ کر سنائی جو بطور خاص نازل ہوئی تھی تو حضرت زینبؓ تیار ہو گئی تھیں۔

عدّت گزرنے کے بعد حضرت زینبؓ رسول کریم صلعم کے نکاح میں آئیں چار سو درہم مہر بندھا۔ دعوت ولیمہ میں تین سو افراد شریک ہوئے۔ آنحضرتؐ نے دس دس کی ٹولیاں کر دی تھیں باری باری آتے اور کھانا کھا کر واپس جاتے۔ ولیمے کی دعوت کے بعد آیت حجاب اتری (احزاب: ۵۳)۔ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے۔ آنحضرت صلعم حضرت زینبؓ کی عبادت و ریاضت کے باعث انھیں بہت محبوب رکھتے تھے (نسائی)۔ ابن سعد کے مطابق وہ ہاتھ کی محنت میں اعتقاد رکھتی تھیں۔ چمڑوں کی دباغت اور منکوں کے ہار پرونے سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ راہ خدا میں خیرات کر دیتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بارہ ہزار درہم سالانہ ان کا وظیفہ آیا تو آپؓ نے اس رقم کو ہاتھ تک نہ لگایا اور سب خیرات کر دی۔ تمام رقم تقسیم ہو چکی تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں۔ دعا قبول ہوئی اور اسی سال آپ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ازواج میں سے وہی (حضرت زینب) رسول اللہ کی نگاہ میں عزت و مرتبہ میں میرا مقابلہ کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کوئی عورت زینبؓ سے زیادہ دیندار، زیادہ پرہیزگار، زیادہ راست گفتار، مخیر اور خدا کی رضا جوئی میں اتنی سرگرم نہیں دیکھی۔ فقط مزاج میں ذرا تیزی تھی جس پر ان کو بہت جلد ندامت بھی ہوتی تھی (مسلم)۔ آنحضرت صلعم نے پیشن گوئی کی تھی کہ "مجھ سے میری بیویوں میں سب سے پہلے وہ آملے گی جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہوں گے"۔ ہاتھوں کی لمبائی سے آپؐ کی مراد فیاضی تھی۔ حضرت زینبؓ نہایت قانع اور فیاض تھیں۔ آپ نے ۲۰ھ میں ۵۳ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ازواج مطہرات میں سے سب سے پہلے آپ نے انتقال فرمایا۔ کفن کا سامان آپ نے خود کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک کو صدقہ کر دینا۔ چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اسامہ بن زیدؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے انھیں قبر میں اتارا۔ بقیع میں دفن ہوئیں۔ مال متروکہ میں صرف ایک مکان یادگار چھوڑا تھا جس کو ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد حکومت میں پچاس ہزار درہم میں خرید کر مسجد نبوی میں شامل کر دیا۔ (طبری)

زینب رضؓ بنت خزیمہ

بن حارث بن عبداللہ بن عمر بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ، ازواج نبی کریم صلعم میں سے تھیں۔ فقرا اور مساکین کی خدمت کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت ہی میں آپ کا نام ام المساکین مشہور ہو گیا تھا۔ آپ کے پہلے شوہر طفیل بن حارث نے آپ کو طلاق دے دی تو آپ عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں آئیں۔ وہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ آنحضرت صلعم نے رمضان ۴ھ میں آپ سے شادی کی۔ چار سو درہم مہر ادا ہوا۔ دو تین ماہ بعد حضرت زینبؓ رحلت کر گئیں۔ آنحضرت صلعم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں

زینب بنت عبداللہؓ

بن معاویہ بن عتاب بن اسد بن غاضرہ بن حطیط بن حشم بن ثقیف صحابیہ۔ عبداللہؓ بن مسعود سے آپ کا نکاح ہوا۔ ان کا ذریعہ معاش کوئی نہ تھا اور حضرت زینب دستکار تھیں جو کچھ کماتیں گھر ہی میں خرچ ہو جاتا۔ ایک دن حضرت زینبؓ رسول اللہؐ کے پاس پہنچیں اور عرض کیا کہ میں دست کار ہوں اور جو کچھ پیدا کرتی ہوں شوہر اور بچوں پر صرف ہو جاتا ہے اس بنا پر میں محتاجوں کو صدقہ نہیں دے سکتی۔ اس حالت میں کیا مجھ کو کچھ ثواب ملتا ہے؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہاں تم کو ان کی خبرگیری کرنا چاہیے (مسلم)۔ آپؓ کے بیٹے ابو عبیدہؓ مشہور محدث گزرے ہیں چند حدیثیں حضرت زینبؓ سے بھی مروی ہیں۔

زینب بنت علیؓ

(۵ جمادی الاولیٰ ۵ھ — ۱۵ رجب ۶۲ھ) فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ صلعم کی بیٹی اور تاریخ اسلام کی محترم شخصیت۔ حضرت علیؓ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں انھیں عقیلۂ بنی ہاشم کہا جاتا تھا۔ ام کلثوم و ام الحسن آپ کی کنیت تھی صدیقہ صغریٰ ان کا لقب تھا محدثین حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہوئے انھیں "ابی زینب" سے یاد کرتے تھے۔ ولادت کے بعد آپ کا نام رسول اللہؐ نے زینب رکھا۔ ساتویں دن آنحضورؐ نے عقیقہ فرمایا۔ چھ سات برس کی تھیں کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد آپ کو ام البنین اور اسماء جیسی بلند پایہ خواتین کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ امام حسینؓ حضرت زینبؓ کی بڑی تعظیم

دیتے۔ جب وہ آتیں تو کھڑے ہوجاتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ بڑی صاحبزادی ہونے کی بنا پر گھر کے تمام معاملات کی ذمہ دار تھیں حضرت علیؓ کے بڑے بھائی اور رسول اللہؐ کے چچیرے بھائی جعفر طیارؓ کے فرزند عبداللہؓ سے آپ کی شادی ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ عرب کے مشہور جواد و کریم اور حضرت علیؓ کے جاں نثار تھے۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے جو اولاد ہوئی ان کے نام یہ ہیں: علی، عون اکبر، عباس، ام کلثوم، جعفر اکبر، محمد، عون اکبر محمد کربلا میں شہید ہوئے۔ واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینبؓ دمشق میں اہل بیت کے ساتھ

حضرت زینبؓ کا مزار۔ دمشق

رہیں۔ استقامت، عبادت، ایثار، جہاد و حمایت دین کا جو مظاہرہ آپ نے فرمایا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کا امام حسینؓ کے ساتھ ترکِ مدینہ اور وہاں سے کربلا تک کا سفر غیر معمولی کارنامہ ہے۔ دس محرم کو امام حسینؓ کے شہید ہوجانے پر یتیموں، بیواؤں، بچوں، جوانوں عورتوں اور مردوں کی نگرانی، دشمنوں کے مقابلے میں صبر و تحمل کا مظاہرہ، لٹے ہوئے قافلے کا قید ہونا، کوفہ میں ان کی لاجواب تقریریں اور عبیداللہ بن زیاد کی گستاخیوں کا جواب اس کے بعد شام کا سفر، شام کے بازار اور یزید کے دربار میں اپنی حقانیت اور واقعات کربلا کا اعلان، فصیح و بلیغ خطبے اور برجستہ جوابات، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علیؓ خطبہ دے رہے ہیں۔ امام زین العابدین کو ابن زیاد کے بے رحم ہاتھوں سے زندہ بچا لانا بھی ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔ دمشق سے رہا ہوکر مدینہ تشریف لائیں تو واقعات کربلا کو مؤثر انداز میں بیان فرمایا۔

زینب بنتِ محمدؐ

آنحضرت صلعم کی سب سے بڑی صاحبزادی۔ بعثتِ نبوی سے دس برس قبل پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی بعثتِ نبوی سے قبل ابوالعاص بن ربیع لقیط سے ہوئی جو حضرت زینبؓ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ نبی کریم صلعم نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس وقت وہ طائف میں تھیں۔ ان کے شوہر ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ ابوالعاص غزوۂ بدر میں گرفتار ہوئے حضرت زینبؓ نے اپنا ہار (جو حضرت خدیجہؓ کی ملکیت تھا) بطور فدیہ ارسال کیا۔ رسول اللہؐ نے انھیں اس شرط پر رہا کیا کہ وہ حضرت زینب کو بھیج دیں گے۔ ابوالعاص نے مکہ جاکر حضرت زینب کو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینہ روانہ کیا۔ مقام ذی طویٰ میں پہنچے تو قریش کے چند آدمیوں نے تعاقب کیا اور حضرت زینبؓ کو نیزہ سے زمین پر گرا دیا۔ ان کا حمل ساقط ہوگیا۔ ابوسفیان نے [illegible] رسول اللہؐ کی لڑکی کو ہمارے قبضے سے نکال کر نہیں لے جاسکتے جب شور و غل [illegible] چوری چھپے جانا۔ [illegible] حضرت زینبؓ لوٹ کر مکہ واپس آگئیں۔ چند روز بعد [illegible] لے کر روانہ ہوئے۔ آنحضرت صلعم نے زید بن حارثہ کو پہلے بھیج دیا تھا۔ [illegible] زینب [illegible] حوالے کیا اور وہ زینب کو مدینہ لے گئے۔ [illegible] گرفتار ہوئے۔ حضرت زینبؓ کی سفارش پر وہ رہا [illegible] قبول کیا اور مدینہ میں ہجرت کی۔ مدینہ آکے تو حضرت زینبؓ [illegible] ان کا انتقال [illegible] مدینہ منورہ میں ہوا۔ [illegible] ام عطیہؓ نے غسل دیا۔ رسول اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ [illegible] علیؓ [illegible] سے نکاح [illegible]

[illegible]

[illegible]

زینبی [illegible] قرار دے دیا۔ سلجوقی سلطان مسعود [illegible] اور وہ مستقی کے لقب سے [illegible] سلطان مسعود کے [illegible] برطرف کر دیا گیا۔

زین الدین

[illegible]

سلسلۂ [illegible] خراسان [illegible] نور الدین عبد الرحمٰن [illegible] نے ان کی بیعت کی۔ تصانیف [illegible] قابل ذکر ہیں۔ آپ کا پوتا زین الدین [illegible] کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

س

سادات، انور

۱۹۱۸ء – ۱۹۸۰ء مصر کے سابق صدر۔ نیل ڈالٹا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملٹری ہسپتال میں بطور کلرک ملازم تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گاؤں ہی کے ایک دینی مدرسے میں حاصل کی۔ جہاں انھوں نے قرآن پاک پڑھا اور ثانوی تعلیم کی تکمیل قاہرہ میں کی۔ ۱۹۳۶ء میں عباسیہ [illegible] میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کی ملاقات جمال عبدالناصر سے ہوئی۔ [illegible] دوستی ہو گئی۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے گریجویشن مکمل کی اور [illegible] بعد میں مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا [illegible]

۱۹۴۲ء میں انور السادات قید کر دیے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں رہائی ملی اور وہ اخباری رپورٹر بن گئے۔ ۱۹۵۰ء میں انھیں فوجی ملازمت پر بحال کر دیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں صدر ناصر کی انقلابی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۶ء وزیر مملکت اور از اں بعد مصری قومی اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ افریشیائی استحکام کی کانفرنس کے چیئرمین تھے۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۴ء وہ صدارتی کونسل کے رکن رہے۔ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ تک وہ مصر کے چار نائب صدور میں سے ایک تھے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو جب صدر ناصر کو دل کا دورہ پڑا تو انھیں مصر کا صدر بنا دیا گیا۔ اور ۱۵ اکتوبر کو انھیں صدر منتخب کر لیا گیا۔ انتخابات میں انھیں ۹۰.۴ فی صد ووٹ ملے۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تو انور السادات کی قیادت میں مصری فوجوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور صحرائے سینا کا بہت سا علاقہ آزاد کرا لیا۔ اسرائیل سے صلح جوئی اور کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ان کے انتہا پسندانہ اقدامات تھے۔ جو ایک طرف تو دوسرے عرب ممالک کو پسند نہ تھے اور دوسری طرف مصر کے عوام نے بھی پسند نہ کیے۔ بالآخر اسی وجہ سے ۶ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو جلسہ عام میں انھیں قتل کر دیا گیا۔

ساسانیاں

ایرانی شاہی خاندان، جس نے ۲۲۶ء سے ۶۵۱ء تک حکومت کی۔ ساسانی سلطنت میں ایران و عراق شامل تھے۔ عموماً خراسان، آرمینیا اور جارجیا شامل رہے۔ افغانستان (موجودہ) ترکستان، شام، مصر، عرب اور شمال مغربی ہندوستان کے بعض حصے بھی عارضی طور پر ساسانی سلطنت میں شامل رہے۔ یہ سلطنت رومی اور بوزنطی سلطنتوں کی بہت بڑی مد مقابل تھی اور ہتھیاروں سے مسلح پہلوانوں کے ذریعے جنگ کرنے کی حامی تھی۔ ساسانی سلطنت اشکانیوں کی سلطنت (۲۵۰ ق م تا ۲۲۴ء) سے ترقی پا کر بنی تھی۔ ساسانی سلطنت بہت سی ایسی سلطنتوں کے وسیع وفاق تھے جن پر ان کے اپنے موروثی بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ ان سب کے اوپر شاہنشاہ کی حکومت ہوتی تھی۔ یہ بادشاہی بہت سی ریاستوں اور جاگیروں پر مشتمل ہوتی تھی جو اپنے اپنے امیروں کے قبضے میں تھیں۔ ساسانی، فارس (ایران) کے باشندے تھے اور اپنے آپ کو ہخامنشی بادشاہ دارا کی اولاد بتاتے تھے۔ یہ ایک اصلاح یافتہ زردشتی مسلک اور خالص ایرانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔

اس خاندان کے بادشاہوں کے نام جدید فارسی میں یہ ہیں: (۱) اردشیر

۲۲۶ء تا ۲۴۱ء - (۲) شاہ پور اوّل ۲۴۱ء تا ۲۷۲ء (۳) ہرمز اوّل ۲۷۲ء تا ۲۷۳ء (۴) بہرام اوّل ۲۷۳ء تا ۲۷۶ء - (۵) بہرام دوم ۲۷۶ء تا ۲۹۳ء (۶) بہرام سوم ۲۹۳ء (۷) نرسی ۲۹۳ء تا ۳۰۳ء (۸) ہرمز دوم ۳۰۳ء تا ۳۱۰ء - آذر نرسی - ۳۱۰ء (۹) شاپور دوم ۳۱۰ء تا ۳۷۹ء (۱۰) اردشیر دوم ۳۷۹ء تا ۳۸۳ء (۱۱) شاپور سوم ۳۸۳ء تا ۳۸۸ء (۱۲) یزدگرد اول ۳۹۹ء تا ۴۲۰ء (۱۳) بہرام پنجم ۴۲۰ء تا ۴۳۸ء (۱۴) یزدگرد دوم ۴۳۸ء تا ۴۵۷ء (۱۵) ہرمز سوم ۴۵۷ء تا ۴۵۹ء (۱۶) فیروز ۴۵۹ء تا ۴۸۴ء بلاش ۴۸۴ء تا ۴۸۸ء (۱۷) قباذ اول ۴۸۸ء تا ۵۳۱ء (۱۸) خسرو اوّل ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء (۱۹) ہرمز چہارم ۵۷۹ء تا ۵۹۰ء (۲۰) خسرو دوم ۵۹۰ء تا ۶۲۸ء (۲۱) قباذ دوم ۶۲۸ء (۲۲) اردشیر سوم ۶۲۸ء تا ۶۳۰ء (۲۳) متعدد مختصر مدت کے حکمران ۶۳۰ء تا ۶۳۲ء (۲۴) یزدگرد سوم ۶۳۲ء تا ۶۵۱ء۔

عرب سے دعوت اسلام بڑے زور سے پھیل رہی تھی۔ ساسانی سلطنت کی عربی سرحد کی حفاظت حیرہ سلیحی بادشاہوں کے سپرد تھی۔ ۶۰۲ء میں خسرو دوم نے آخری لخمی بادشاہ نعمان سوم کو قتل کر کے حیرہ پر ایک ایرانی حاکم مقرر کر دیا تھا۔ ۶۳۳ء میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں عراق پر فوج کشی کی گئی۔ ابتدائی لڑائیاں ذات السلاسل، مذار، دلجہ اور الیس کی فتح پر ختم ہوئیں۔ اسی سال حیرہ نے حضرت خالد بن ولید کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۶۳۶ء میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے قادسیہ کے مقام پر رستم کو جا لیا۔ تین دن کی خونریز جنگ کے بعد مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ رستم قتل ہوا اور بالآخر مدائن جو ایک ہزار سال تک ایرانی دنیا کا پایۂ تخت رہا تھا مسلمانوں نے زیرنگیں کر لیا۔ یزدگرد سوم حلوان کی طرف بھاگ گیا پھر آذربائیجان پہنچ گیا۔ یزدگرد نے ایک اور فوج فراہم کی اور جرنیل فیروزان کو کمان دے کر مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجا۔ ۶۴۲ء میں اس فوج کو بھی شکست ہوئی۔ فیروزان قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اصفہان مغلوب ہوا تو یزدگرد اصطخر کی طرف بھاگ گیا۔ وہ مشرقی ولایات سے فوج جمع کرنے کی غرض سے سیستان اور خراسان گیا مگر خوزستان کی حفاظت کرنے والی فوج ناکام ہو گئی۔ اس کا پایۂ تخت ایران خورہ شاپور سوسہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یزدگرد نے نیشاپور، طوس اور مرو کی طرف کوچ کیا۔ مشرقی ولایات نے یزدگرد کی امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ ۶۵۱ء میں نخلستان مرو کے مفصلات میں سو رہا تھا کہ کسی نے طلائی ملبوسات کے لالچ میں اسے قتل کر دیا۔ یزدگرد کے دوسرے بیٹے فیروز نے چینیوں کی مدد سے آخری ناکام کوشش کی جس کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ یزدگرد کی ایک شہزادی شہربانو نے حضرت حسین بن علی سے شادی کر لی تھی۔ سلطنت ساسانیاں کے زوال کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے مقالہ "خلافت راشدہ"۔

سالم بن محمد

(وفات ۳ رجمادی الآخر ۱۰۱۵ھ / ۷ اکتوبر ۱۶۰۶ء)

بن محمد بن عز الدین ابو النجا سنہوری مصری، نامور مالکی فقیہہ اور محدث۔ سنہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ برس کی عمر میں قاہرہ آئے اور مالکیوں کے مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ وہ اپنے زمانے میں مخزن علوم تھے۔ مصر، شام اور حرمین کے بے شمار لوگوں نے ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے صرف شیخ خلیل کی "المختصر" پر "حاشیہ" باقی بچی ہے۔

سالم، محمد امین

ترک فقیہہ شیخ الاسلام میرزا مصطفیٰ افندی کا بیٹا۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد استنبول میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر محکمہ قضا کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ذوی القعدہ ۱۱۳۴ھ / اگست ۱۷۲۲ء میں مکہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ / نومبر ۱۷۳۰ء میں استنبول کے قاضی اور اناطولی کے قاضی عسکر مقرر ہوئے۔ ربیع الآخر ۱۱۴۶ھ / اگست ۱۷۳۳ء میں روم ایلی کے قاضی عسکر بنے۔ ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۵ء میں سانقز کی طرف جلاوطن کر دیئے گئے۔ ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء میں دوبارہ مکہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ۱۱۵۱ھ میں انھیں دمشق جانے کی ہدایت کی گئی۔ محرم ۱۱۵۲ھ / اپریل ۱۷۳۹ء میں دمشق کے نزدیک معرّق کے مقام پر راستے ہی میں انتقال ہو گیا۔

انھوں نے کئی کتب فقہ کے ترجمے کیے اور شرحیں لکھیں۔ ترکی فارسی لغت لکھی۔ جہاد پر کتاب "نیل الرشاد فی امرا لجہاد" تصنیف کی۔ عینی کی تاریخ عقد الجمان فی تاریخ اہل الزمان" کا ترکی میں ترجمہ کیا جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ [illegible] کی مشہور تصنیف "تذکرہ شعراء" ہے جو اہم شعراء اور [illegible] کے حالات [illegible]

سالمیہ

متکلمین کا ایک فرقہ۔ اس کے عقائد میں تصوف کے رجحانات [illegible] ہیں۔ اس کا آغاز تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بصرہ [illegible] سالمیہ کے بانی ابو محمد سہل بن عبداللہ [illegible] ۸۹۶ء میں ہوا۔ لیکن اس فرقے کا نام [illegible] (وفات ۲۹۷ھ [illegible]) کے نام پر مشہور ہوا۔ [illegible]

سالمیہ کے عقائد [illegible]

خدا تعالےٰ کا فعل خلق [illegible]

[illegible] طور پر قرآن مجید کے [illegible]

اور [illegible] دونوں [illegible]

کا سبب بنتا ہے اگرچہ [illegible]

ہے۔

[illegible]

[illegible] صورت ایک انسانی شکل [illegible]

[illegible]

[illegible] حاصل ہوتا ہے [illegible]

درجہ اولیاء سے بلند [illegible]

اصل کے سامنے انسان [illegible]

کا شعور حاصل کرے جس قدر [illegible]

چکی ہے۔ ابن الفرّاء سے لے کر ابن جوزی اور امام ابن تیمیہ تک [illegible] ہیں انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ ان کے [illegible] میلانات کی مخالفت کی ہے۔ چونکہ سالمیہ ہی علمائے اہل سنت کا [illegible]

جو بدن سے جدا ہو جانے کے بعد روح کی تا قیامت بالاستقلال بقا کا قائل ہے اس لیے سنی متصوفین کی اکثریت انھی کی طرف مائل رہی ہے ۔

سام ابن نوح

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے ۔ انھیں ثعلبی کی قصص الانبیا میں قطعی طور پر نوحؑ کا پہلا بیٹا بتایا گیا ہے ۔ طبری نے حضرت نوحؑ کے بیٹوں کی ترتیب بصورت یافث، حام اور سام بتائی ہے ۔ سام حضرت نوحؑ کے چہیتے بیٹے تھے وہ باپ کی دعا سے برکت میں شریک تھے حضرت نوحؑ نے مرتے وقت انھیں اپنا جانشین مقرر کیا ۔ سام کی بیوی صلیب حضرت نوحؑ کے دوسرے بیٹوں کی بیویوں کی طرح قبین بن آدم کی نسل سے تھی ۔ عربوں کو ہمیشہ سام کی اولاد بتایا جاتا ہے ۔ جب نوحؑ نے زمین اپنے بیٹوں میں تقسیم کی تو اس کا مرکزی حصہ یعنی دریائے نیل، فرات، دجلہ اور جیحون، سیحون کا درمیانی علاقہ سام کو دیا ۔ سام خود مکہ میں رہتے تھے ۔

سامری

[illegible] قبیلے کا ایک شخص جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑی کی پرستش کرائی [illegible] سامری نے [illegible] بنی اسرائیل نے اپنے [illegible] اس نے ان زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑا بنا لیا [illegible] بنی اسرائیل نے اس کی عبادت شروع کر دی ۔ حضرت ہارونؑ [illegible] جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ [illegible] آپ نے انھیں کیوں نہ روکا ۔ [illegible] اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے ۔ [illegible] علیہ السلام نے سامری کی سرزنش کی تو اس نے [illegible] کی کوشش [illegible] اس کا جرم ثابت ہوتے پر حضرت موسیٰؑ [illegible] تو زندہ رہے گا تو جس سے ملے گا اس سے [illegible]

قرآن [illegible] یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے : "موسیٰؑ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنا لیا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی ۔ کیا انھیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا ہے ؟ مگر پھر بھی انھوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے ۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے ۔ ادھر سے موسیٰؑ غصے اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا ۔ آتے ہی اس نے کہا بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد ۔ کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے ؟ اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارونؑ) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا ۔ ہارونؑ نے کہا ، اے میری ماں کے بیٹے ! ان لوگوں نے مجھے دبا لیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے ۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے شامل نہ کر ۔ تب موسیٰؑ نے کہا اے رب مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو سب سے بڑا رحیم ہے ۔ (جواب میں ارشاد ہوا) جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے ۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں" (اعراف ۱۴۸ تا ۱۵۲) ۔ سورہ طٰہٰ میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے : "اور کیا چیز تمھیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰؑ ؟ ۔ اس نے عرض کیا وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں ۔ میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں ۔ اے میرے رب تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے ۔ فرمایا اچھا تو سنو ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انھیں گمراہ کر ڈالا ۔ موسیٰؑ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا ۔ جا کر اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے ؟ کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی ہے ؟ ۔ انھوں نے جواب دیا ۔ ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی ۔ معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا ۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی لوگ پکار اٹھے "یہی ہے تمہارا اور موسیٰؑ کا خدا ۔ موسیٰؑ اسے بھول گیا" ۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے ؟ ۔

ہارونؑ (موسیٰؑ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ لوگو تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو ۔ تمہارا رب تو رحمٰن ہے پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو ۔ مگر انھوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ واپس نہ آ جائے ۔ موسیٰؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد) بولا ہارون ! تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو ؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ؟" ہارونؑ نے جواب دیا ۔ اے میری ماں کے بیٹے ! میری ڈاڑھی نہ پکڑ نہ میرے سر کے بال کھینچ ۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا ۔ موسیٰؑ نے کہا اور سامری تیرا کیا معاملہ ہے ؟ اس نے جواب دیا میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی پس میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی (خاک) اٹھا لی اور اس کو ڈال دیا ۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا ۔ موسیٰؑ نے کہا اچھا تو جا ۔ اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا ۔ اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے ۔ لوگو تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے ۔ ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے" (طٰہٰ : ۸۳ تا ۹۸) ۔

قرآن مجید کے برعکس بائبل حضرت ہارونؑ پر یہ الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا گناہ عظیم سامری کی بجائے ہارونؑ سے سرزد ہوا تھا (خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶) ۔

ساؤجی

تین عثمانی شہزادے ، جو مندرجہ ذیل ہیں : ۔

(۱) **ساؤجی بیگ** : سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان کا چھوٹا بھائی اور ارطغرل کا بیٹا تھا ۔ اس نے کئی مہمات میں اپنے بھائی عثمان کا ساتھ دیا اور ۶۸۴ھ/۱۲۸۶ء ایتحیلوکوم کے حاکم کے خلاف ایک جنگ میں صنوبر کے درخت کے نیچے مارا گیا ۔ اس درخت کو آج بھی "صنوبر قندیل دار" کہا جاتا ہے ۔

۲ ۔ عثمان نے اپنے ایک بیٹے کا نام بھی ساؤجی رکھا تھا ۔ لیکن اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں ۔ وہ ایک جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا ۔

۳ ۔ مراد اول کا بیٹا بھی ساؤجی کہلاتا تھا ۔ اس نے اپنے باپ کے خلاف ہی سازش تیار کر کے بغاوت کر دی تھی ۔ مراد اول نے اپنے باغی شہزادے کے خلاف جنگ کی جس میں ساؤجی شکست کھا کر دیدیموتیخوس کی طرف بھاگ گیا جہاں اسے

گھیر کر باپ کی اطاعت پر مجبور کر دیا گیا لیکن ۷۸۷ھ/۱۳۸۶ء میں اُسے آنکھوں سے محروم کر کے قتل کر دیا اور لاش کو برسہ لے جا کر دفن کیا۔

سبا

جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم جس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجا لاؤ اُس کا، ملک ہے عمدہ پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انھیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔ اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور ان میں سفر کی مسافتیں ایک انداز سے پر رکھ دی تھیں۔ چلو پھرو ان راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ۔ مگر انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے۔ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ آخر کار ہم نے انھیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انھیں بالکل تتر بتر کر ڈالا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو" (سبا: ۱۵ تا ۱۹)

تاریخ کی رو سے سبا جنوبی عرب کی ایک بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر اور ترمذی نے رسول اللہ صلعم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسب ذیل قبیلے پیدا ہوئے، کندہ، حمیر، ازد، اشعری، مذحج، انمار، عاملہ، جذام، لخم اور غسان۔ قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ اس کا وطن عرب کا جنوب مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے اس کا عروج گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک سورج پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (۹۶۵—۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت بھی ایمان لے آئی لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے المقہ (چاند دیوتا) عشتر (زہرہ) ذات حمیم اور ذات بعدان (سورج دیوی) جیسے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ المقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں اور خصوصاً المقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا

آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً تین ہزار کتبات ملے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان معلومات کی رو سے سبا قوم کی تاریخ کے اہم ادوار یہ ہیں۔ (۱) ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دور۔ اس زمانے میں ملوک سبا کا لقب مکرب سبا تھا۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب پائے جاتے ہیں اور خریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس دور میں مارب کے مشہور بند کی بنیاد رکھی گئی۔ وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔ (۲) ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور۔ اس دور میں بادشاہوں نے مکرب کا لقب چھوڑ کر ملک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس زمانے میں ملوک سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے ۳۹۰۰ فٹ کی بلندی پر صنعاء سے ۶۰ میل مشرق کی جانب واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک متمدن قوم کا مرکز تھا۔ (۳) ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حمیر کا قبیلہ غالب ہو گیا۔ اس دور میں مارب کو اجاڑ کر ریدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلہ حمیر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب ایک قبیلہ حمیر کے نام سے آباد ہے۔ اسی زمانے میں پہلی مرتبہ یمنت اور یمنات کے لفظ کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوب مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضر موت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا (۴) ۳۰۰ء کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور۔ یہ دور قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑ دیا۔ [illegible] آزادی ختم ہو گئی۔ ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر [illegible] مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ابرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی نہ ہی آب پاشی اور زراعت کا نظام دوبارہ بحال ہو سکا۔ ۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہوئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے [illegible] حبشی اثر میں لانے کے لیے ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ [illegible] فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب فیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی۔ ایک وقت تھا [illegible] کی دولت کے افسانے سن سن کر یونان اور روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ [illegible] لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت سونے چاندی اور جواہر کا کام کیا ہوا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے یہ اس وقت دنیا کی سب سے مالدار قوم ہے۔ اور اس کا سر سبز و شاداب ملک باغات، کھیتوں اور مواشی سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹیمیڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی عام لکڑی کی بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سے ساحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعاء کی بلند پہاڑی پر وہ فلک بوس عمارت تعمیر کی جو قصر غمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی بیس منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ اس وقت تک جاری رہا جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ جب انھوں نے کفران نعمت کی حد کر دی تو خدا وند تعالیٰ کی نظر عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

سبأ، سورۃ

قرآن مجید کی چونتیسویں سورت۔ اس سورت کے چھ رکوع اور چوّن آیات ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس کی سب آیات مکّی ہیں، صرف چھٹی آیت کے بارے میں بعض علماء کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں ہے کہ جب ابو سفیان نے سنا کر قرآن کی رو سے منافق و مشرک عذاب میں ڈالے جائیں گے تو از راہ تمسخر و استہزا کہنے لگا "لات اور عزّیٰ کی قسم! نہ قیامت آئے گی نہ کوئی حشر و نشر ہوگا"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ سورۂ سبا کے شروع میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد کفار کے انکارِ قیامت اور ان کے مدلل جواب کا ذکر ہے۔ پھر رسول اللہ صلعم سے کافروں کے استہزا اور آپ پر بہتان کے افترا کا ذکر ہے۔ پھر حضرت داؤدؑ پر اللہ کی نعمتوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد قوم سبا کے عیش و آرام اور تباہی کا ذکر ہے۔ پھر بت پرستوں کی ناکامی اور خسارے کا تذکرہ کرنے کے بعد قیامت کے دن گمراہ کرنے والے قائدین اور ان کے متبعین کے درمیان مخاصمت کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی کے نقشے میں لوگوں نے انبیائے کرام کی مخالفت کی۔ اس کے بعد قرآن مجید کے بارے میں کفار کے ردِّ عمل کا بیان ہے۔ پھر تمام رسالت کے بیان کے بعد قیامت کے دن کافروں کے پچھتانے اور دوبارہ دنیا میں نیک عمل کے لئے لوٹ آنے کی خواہش کا ذکر ہے۔

سورۂ سبا کے فضائل کے سلسلے میں حدیث نبوی ہے کہ جس نے سورت سبا کی تلاوت کی قیامت کے دن تمام رسول اور نبیا اس سے مصافحہ کریں گے اور اسے ان کی مصاحبت نصیب ہوگی (کشاف، البیضاوی)

سبحان اللہ

"اللہ کی ذات منزّہ اور پاک ہے" ایک جملہ جو قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ فعل سَبَّحَ کا مشتق اسم ہے۔ قرآن مجید میں یہ ایک باقاعدہ جملہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام (الاعراف: ۱۴۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام (المائدہ ۵: ۱۱۶) خوش نصیب اہل جنت (یونس ۱۰) اور فرشتوں (البقرہ ۲: ۳۲) ۔ النمل) کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ جملہ قرآن میں مختلف مقامات پر مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً پاک ہے وہ ذات جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات ..... (بنی اسرائیل: ۱) "پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارا مطیع بنا دیا (الزخرف ۱۳) "پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے پیدا کیے"۔ (یٰسین ۳۶) "اللہ کی پاکیزگی بیان کرو جب شام اور جب صبح ہو" (الروم: ۱۷) "جن لوگوں کو اس سے قبل علم عطا ہوا تھا جب ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہے تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں"۔ (بنی اسرائیل: ۱۰۷، ۱۰۸) "وہ کہیں گے پاک ہے ہمارا رب، بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔" (القلم: ۲۹) اس کے علاوہ بعض ایسی جگہوں پر یہ جملہ استعمال ہوا ہے جب اللہ تعالیٰ کی کسی صفت پر حرف آتا ہو۔ جیسے "پاک ہے اللہ، جو مالک ہے عرش کا، ان کے بیان کردہ اوصاف سے (الانبیاء: ۲۲)۔" اللہ تعالیٰ پاک ہے ان چیزوں سے جن میں وہ شریک ٹھہراتے ہیں" (الزمر: ۶۷)

اس کے علاوہ مکی سورتوں میں اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کو کفر قرار دے کر اس کی مخالفت کرتے وقت اس جملے کا استعمال ہوا ہے۔ ان سورتوں میں اس کلمے کی تکرار سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور تقدس بیان کرنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ مثلاً

"وہ جس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں"۔ (۹ التوبہ: ۳۱)

"اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔
(۱۲ (یوسف): ۱۰۸)

"پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں"۔
(۱۷۔ بنی اسرائیل: ۴۳)

اسی طرح بعض ان مقامات پر بھی اس جملے کا استعمال ہوا ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض غلط قسم کے معجزے دکھانے کے مطالبے کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا ہے کہ وہ صرف ایک انسان اور رسول ہیں۔ ۱۷ (بنی اسرائیل: ۹۳)

سبعۃ احرف

وہ سات حرف جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف ان حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ اور ہر ایک لفظ کافی و شافی ہے"۔ (متفق علیہ)

اس حدیث پر تمام علماء متفق ہیں لیکن سب نے اس کی تفسیر مختلف بیان کی ہے کچھ علماء کہتے ہیں کہ سات حروف سے خاص قبائل عرب یا قبائل قریش کے وہ مختلف محاورات مراد لیے جاتے ہیں جن سے مطلب میں کوئی تغیر نہ آئے۔ اور ہر ایک کو ادا کرنے میں بھی آسانی ہو۔ چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی استدعا کے مطابق خدا نے اس بات کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ لیکن حضورؐ نے قرآن مجید کی تمام آیات اپنی مخصوص زبان میں ہی لکھوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سات زبانیں ان قبیلوں کی تھیں قریش، طی، ہوازن، یمن، ثقیف، ہذیل، تمیم ۔

سبکی

ایک دینی مصلح۔ جن کا نام شیخ محمد بن محمد بن احمد تھا۔ انھیں سبکی کا خطاب ملا ہوا تھا۔ آپ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں سبک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں ہی آپ پر تصوّف کا غلبہ معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ والدین نے انھیں دنیوی زندگی بسر کرنے کے لیے ان کی تربیت کی تھی۔ جامع الازہر میں داخل ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے اساتذہ سے کتاب و سنّت کے مسائل پر سیر حاصل بحث کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں آپ نے بدعت کے خلاف کئی رسالے لکھے۔ جامع الازہر سے سندِ فضیلت حاصل کر چکنے کے بعد مرتے وقت تک تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ سلسلہ انہوں نے دورانِ طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا۔ سبکی نے اپنے خیالات کا پرچار اور اشاعت کے لیے ایک تنظیم قائم کی۔ اس جماعت نے ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں کام شروع کیا۔ اس جماعت کے ارکان ہر طرح کی بدعت سے اجتناب کرنے کا حلف اٹھاتے تھے اور ہر ماہ ایک مخصوص رقم بطور چندہ ادا کرتے تھے۔ اس کے ارکان کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ وہ تجارت بھی جماعت کے ارکان کے درمیان ہی محدود رکھیں بلکہ یہاں تک کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بھی ایک دوسرے سے ہی مشورہ کریں۔ اس جماعت کا کام مساجد کی تعمیر، مبلغین کا تقرر اور غریب اور مستحق لوگوں میں خیرات کی تقسیم ہے۔ اس جماعت کی کوششوں کے باعث ۱۹۳۵ء تک مصر میں ۱۰۰ سے زیادہ مساجد موجود تھیں۔ اس جماعت کی آمدنی کا سب سے زیادہ اور بڑا ذریعہ مصری کپڑے کی صنعت ہے۔ ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء میں شیخ محمد سبکی نے اپنی رہائش گاہ تعمیر کی جو اب تک سلسلۂ سبکیہ کا مرکز بنی ہوئی ہے آپکو سلسلۂ سبکیہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

آپ کا انتقال ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں قاہرہ میں ہوا۔ آپ کی وفات کے

بعد آپ کا بیٹا اس جماعت کے کا منتظم اعلیٰ بن گیا۔ شیخ محمد سبکی نے اپنی تمام عمر بدعات کی مخالفت میں بسر کی۔ وہ اذان کو ترنم کے ساتھ، سورۂ کہف کی خصوصی تلاوت اور اعمال صوفیہ کو سنت نبویؐ کے خلاف سمجھتے تھے۔ قبا کو نوپی اور عمامے کے بغیر ٹوپی پہننے کو انہوں نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ ان کے احکام کو بجا لانے کی کوشش میں ان کے پیروکار سفید لباس کو دوسرے لباسوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم تصنیف" سنن ابی داؤد" کی مفصل شرح ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں ہی شائع ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن مکمل ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی چھپیس کتابیں لکھی ہیں۔

سبیل

سبیل کے لغوی معنیٰ ہیں " ایسا راستہ جس پر چلنا آسان ہو"۔ یہ لفظ سُبُل کی جمع ہے۔ قرآن مجید میں بھی سبیل کا لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔" وہ جو اس کی طرف سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہو" (آلِ عمران ۔ ۹۷) " کاش میں نے رسول اللہؐ کے ساتھ (حق کا) راستہ اختیار کیا ہوتا"۔ (الفرقان ۔ ۲۷) اس آیت میں مجازاً سیدھے راستے کے معنوں میں سبیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ مجازاً ذریعہ حصول مقصد، کسی مصیبت یا مشکل سے نکلنے کے راستہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے" یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے"۔ (النساء ۱۵)

برعظیم پاک و ہند میں سر راہ پینے کے پانی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس انتظام کو بھی سبیل کہتے ہیں۔ اس لفظ کو اس کام کے لیے استعمال کرنے کا رواج غالباً " فی سبیل اللہ" کے جملے کے باعث پڑ گیا ہے۔ کیونکہ یہ جملہ ہر اس کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے اللہ کے نام پر کیا جائے ۔

سجاح، اُمِ صادر

عرب کی ایک مشہور کاہنہ جس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے شجرہ نسب سے علم ہوتا ہے کہ وہ بنو تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ جبکہ اس کی ماں کا تعلق بنو تغلب سے تھا۔ بنو تغلب ایک عیسائی قبیلہ تھا۔ وہ عیسائیت کے متعلق بہت سی معلومات رکھتی تھی۔ بلکہ وہ اکثر اوقات تقریروں کے ذریعے اس کا پرچار بھی کیا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ خدا کے بہت سے القاب میں سے ایک لقب رَبُّ السَّحَاب تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد کھل کر منظرِ عام پر آئی اور اپنے نبی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے بنو تمیم جس کے افراد زیادہ تر مصلحتاً حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے، کا شیرازہ بکھرتا ہوا دیکھ کر اپنی تیز گفتاری اور چرب زبانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنا پیرو بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئی۔ چنانچہ سجاح نے ایک فوج تیار کر کے ایک من گھڑت الہام کی متابعت میں بنو رباب پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں سجاح کی فوج کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث وہ النباج کی جانب بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن راستے میں بنو عمرو کے ساتھ جھڑپ ہو گئی جس میں ایک بار پھر اس کی فوج کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس پر سجاح نے یہ عہد کر لیا کہ وہ بنو تمیم کا علاقہ چھوڑ جائے گی اور ساتھ ہی مسیلمہ کذاب سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ انھی دنوں اسلامی فوج مسیلمہ کذاب پر جنگ چھیڑے کر رہی تھی اس لیے سجاح اور مسیلمہ کذاب میں ایک عجیب و غریب سمجھوتہ ہو گیا، اور ان دونوں نے آپس میں شادی کر لی جس کے باعث سجاح کے معتقدین اس سے علیحدہ ہونے لگے۔ جب حضرت امیر معاویہؓ کا زمانہ آیا تو ایک سال سخت قحط پڑا جس کے باعث قبیلہ بنی تغلب کو بصرہ لا کر آباد کیا گیا۔ تو سجاح بھی جوئن کے ساتھ خاموشی کی زندگی بسر کر رہی تھی، بصرہ آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے اور قبیلہ بنی تغلب نے اسلام قبول کر لیا۔ سجاح ام صادر کا انتقال بطور ایک پکی مسلمان کے ہوا۔ حضورؐ کے صحابی حضرت سمرہ بن جندبؓ جو اُن دنوں بصرہ کے حاکم تھے، نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی ۔

سجادہ

جائے نماز، مُصلّٰی ۔ وہ چٹائیاں جن پر نماز پڑھی جاتی ہو۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں ملتا۔ لیکن لوگ اس سے ابتدا سے ہی واقف تھے۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے صحابہ سمیت مدینہ منورہ کی مسجد کے فرش پر موسلا دھار بارش کے بعد نماز ادا کی جس کے نتیجے کے طور پر آپؐ کی ناک اور سر مبارک کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ (بخاری) اس کے علاوہ کئی حدیثیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں حضورؐ کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ" ساری زمین آپؐ کے لیے مسجد بنا دی گئی ہے"۔ (بخاری) اس کے علاوہ بعض علماء اور فقہا بھی سوکھی زمین پر نماز ادا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آج کل مصر اور مراکش میں بھی نماز ادا کرنے کے لیے چٹائیاں وغیرہ استعمال نہیں کرتے۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ اپنے پہننے کے کپڑوں پر سجدہ کرنا منع ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ" آنحضرت ... فرش پر نماز ادا فرمائی۔"

بعض احادیث سے ہمیں اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ نماز چٹائیوں پر ادا کی جاتی تھی۔ فقہا کا ایک عام فتویٰ ہے کہ ہر اس چیز پر جو زمین سے ... ہو ... سے بنائی جائے، نماز پڑھنا جائز ہے ۔

آجکل مکہ میں تمام لوگ مخملی چٹائیوں پر نماز ادا کرتے ہیں۔ ... بڑی ہوتی ہیں جن پر بآسانی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ نماز پڑھنے کے بعد ... لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ اگر جائے نماز کو ... لپیٹا نہ جائے تو شیطان کو اس پر نماز پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے ... چٹائیوں کی سر ملتی جلتی شکلیں اور ... ہوتے ہیں ... کے جانشینوں کو بھی سجادہ نشین کہتے ہیں کیونکہ وہ ... میں مشغول رہتے ہیں ۔

سجاوندی

... حنفی فقیہ۔ آپ کا نام ... الدین ابو طاہر محمد بن ... بن عبد الرشید ہے۔ لیکن سجاوندی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ آپ کی سب سے مشہور تصنیف" الفرائض السراجیہ" یا صرف" سراجیہ" ہے۔ اس کتاب میں ... وراثت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ... فن میراث ... شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ اس کتاب پر خود سجاوندی نے سب سے پہلے حاشیہ ... بعد میں دوسرے علما بھی اس کتاب پر حواشی لکھتے رہے ہیں۔ یہ کتاب ترکی ... فارسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔

سجاوندی کا زمانہ حیات ۶۰۰ھ / ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے لیکن ان کی پیدائش کا سال معلوم نہیں ہو سکا ۔

سجدہ

جھکنا۔ خاص انداز میں جھک کر ماتھے اور ناک کو زمین پر رکھنا۔ سجدہ نماز کا ضروری حصہ ہے۔ ہر سجدے میں کم سے کم تین تسبیحیں پڑھنا، سجدہ میں جاتے وقت پہلے دونوں گھٹنے، پھر دونوں ہاتھ دونوں کانوں کے قریب اس انداز میں رکھنا کہ منہ ان دونوں کے درمیان رہے اور سجدہ میں ناک اور ماتھا زمین پر ٹکے رہیں۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں سے اور دونوں بازو پیٹ سے اور پیٹ رانوں سے الگ رہے، جبکہ پاؤں کی انگلیوں کا رُخ قبلہ کی جانب ہونا ضروری ہے۔

سجدہ صرف اللہ تعالےٰ کے حضور کرنا جائز ہے۔ کسی پیر، صوفی، ولی، عالمؔ یعنی خدا کے سوا ہر چیز کے آگے سجدہ کرنا حرام اور گناہ ہے۔ کیونکہ خدا کے علاوہ کسی اور چیز یا شخص کے سامنے عبادت کی نیت کے ساتھ سجدہ کرنے والا شخص کافر ہوجاتا ہے۔ تعظیم کی خاطر بھی سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ ایک حدیث ہے جو سعد کے بیٹے قیس سے مروی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ "میں حیرہ میں گیا۔ وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے دل میں سوچا کہ اس طرح سے تو رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سجدہ کیے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ پھر جب میں حضورؐ کے پاس پہنچا تو میں نے آپؐ سے کہا کہ حیرہ میں تو لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا دل کہتا ہے کہ آپؐ کو اس بات کا زیادہ حق ہے کہ آپؐ کو سجدہ کیا جائے۔ اس پر رسولِ خدا نے کہا کہ نہیں۔ تم ایسا نہ کرو۔ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو وہ عورتوں کو دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے خاوندوں کا ان پر حق رکھا ہے۔"

اس کے علاوہ قرآن مجید کی ۴۱ اور ۳۲ ویں سورت کا نام بھی حٰمٓ سجدہ اور الٓمٓ سجدہ ہے۔

یوں تو حضرت آدمؑ کو ابلیس کے علاوہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا تھا لیکن وہ صرف اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا تھا۔ اسی لیے وہ سجدہ حضرت آدمؑ کے لیے نہیں تھا۔ اسی طرح یوسف برادران نے جو سجدہ کیا تھا وہ بھی یوسفؑ کے آگے نہیں بلکہ خدا کے آگے اس کام کے شکریہ کے طور پر کیا تھا کہ یوسفؑ نے ان کی بہت بڑی خطا کو معاف کردیا تھا۔

سجدہ، سورۃ

قرآن مجید کی ۳۲ ویں سورۃ ہے۔ اس کا زمانۂ نزول مکّہ کا دورِ متوسط ہے۔ بلکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے بھی ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں کل ۳۰ آیات ہیں جن میں سے ۱۶ تا ۲۰ آیتوں کے علاوہ باقی تمام مکّی ہیں۔ اس سورت میں تین رکوع ہیں۔ یہ الٓمٓ کے حروف مقطعات سے شروع ہونے والی آخری سورت ہے۔ اس کو سورۃ "حٰمٓ السجدۃ" سے ممتاز کرنے کے لیے "الٓمٓ السجدہ" یا "سجدۃ لقمٰن" بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سے مفسروں نے اس سورۃ کا اس سے پہلی سورۃ لقمٰن کے ساتھ تعلق بھی بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لقمٰن میں اللہ تعالےٰ کی ذات اور توحیدِ خداوندی کے دلائل بیان کیے گئے ہیں جبکہ سجدہ میں بھی اللہ کے وجود اور توحید کے دلائل ہی بیان کیے ہیں۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ لقمٰن میں توحید خداوندی کے ساتھ یومِ آخرت کا ذکر بھی ملتا ہے جو عقیدۂ اسلام کی دو اہم بنیادیں ہیں۔ جبکہ سجدہ میں دینِ اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے یعنی اللہ تعالےٰ کے رسولوں پر ایمان لانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ لقمٰن میں علمِ غیب کی پانچ باتیں جن کا علم صرف خدا کو ہے یعنی قیامت کب آئے گی؟ (۲) بارش کب ہوگی؟ (۳) موت کب آئے گی؟ (۴) حاملہ کے پیٹ میں کیا ہے؟ اور (۵) کل کیا ہوگا؟ کا صرف اجمالی سا ذکر آیا ہے۔ جبکہ سجدہ میں ان سب باتوں کا ذکر تفصیلًا ملتا ہے۔ سورۃ السجدہ کے مضمون میں ہمیں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے اللہ کی جانب سے ہونے کا بیان ملتا ہے۔ اس کے بعد حشر و نشر کے ساتھ ساتھ انسانی تخلیق اور زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر ہے۔ اس سورت کے آخر میں قیامت کے بارے میں کافروں کے شکوک و شبہات بیان کرکے کافروں کی رسوائی اور اہلِ ایمان کی سرخروئی کا تذکرہ ہے۔

اس سورت کے بارے میں حضورؐ نے بھی کئی احادیث ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک حدیث میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ آپؐ اس وقت تک نہیں سوتے جب تک کہ سورۃ السجدہ اور سورۃ الملک کی تلاوت نہیں کرلیتے تھے"۔ (روح المعانی: ۱۱، ۱۱۵) ایک اور حدیث ہے کہ "جس نے سورۃ السجدہ اور سورۃ الملک کی تلاوت کی اُسے لیلۃ القدر کے برابر اجر اور ثواب ملے گا۔" (الکشاف - ۳)

اس سورۃ کے خاتمۂ کلام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ آپؐ کی باتیں سن کر مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ حضرت یہ فیصلہ کن فتح آپؐ کو کب ملنے والی ہے، ذرا تاریخ تو بتادیں۔ ان سے کہو کہ جب ہمارے اور تمہارے فیصلے کا وقت آجائے گا تو اس وقت میری باتوں کو ماننا تمہارے لیے بالکل مفید نہیں ہوگا۔ اگر ماننا ہے تو ابھی مان لو اور آخری فیصلے ہی کا انتظار کرنا ہے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔

سجدۂ تلاوت

قرآن مجید میں چودہ ایسی آیتیں ہیں جن کے پڑھنے یا سننے کے بعد ایک سجدہ واجب ہوجاتا ہے۔ اس سجدے کو سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔ سجدہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جائیں اور کم سے کم تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ کہہ کر تکبیر کے ساتھ سر اٹھائیں۔ اس کے بعد تشہد، درود اور دعا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باقی تمام شرائط اور مسائل نماز کے سجدے کے ہی ہیں یعنی اس سجدے کو ادا کرنے سے پہلے باوضو ہونا اور قبلہ رُو ہوکر سجدہ کرنا وغیرہ۔

سجدہ کی آیات مندرجہ ذیل سورتوں میں آئی ہیں۔

(۱) سورۂ اعراف (۲) سورۂ رعد (۳) سورۂ نحل، (۴) سورۂ بنی اسرائیل (۵) سورۂ مریم۔ (۶) سورۂ حج۔ (۷) سورۂ فرقان۔ (۸) سورۂ نمل۔ (۹) سورۂ الم سجدہ (۱۰) سورۂ صٓ، (۱۱) سورۂ حٰمٓ سجدہ (۱۲) سورۂ النجم۔ (۱۳) سورۂ انشقاق (۱۴) سورۂ اقراء۔

اس سجدہ کو جب واجب ہوجائے تو فورًا ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر طہارت سے نہ ہوں اور سجدۂ تلاوت واجب ہوجائے تو پھر جب وہ طہارت میں ہوں تو اس طرح کے واجب سجدے اکٹھے ادا کردیں۔

اگر نماز کے دوران ان سورتوں کی قرأت کی جائے تو سجدہ فورًا واجب ہوجاتا ہے جسے اسی وقت ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ قیام کرکے باقی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اگر نماز میں سجدہ ادا نہ کیا جائے تو پھر اس سجدے کے ادا ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی بلکہ صرف توبہ استغفار لازم ہوجاتا ہے۔ اگر سجدے کی کئی آیات اکٹھی تلاوت کی جائیں تو بھی اتنے ہی سجدے واجب ہوجاتے ہیں۔

سجدۂ سہو

بھول چوک کا سجدہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "تمہاری نمازمیں شیطان آکر شبہ ڈالتا ہے۔ حتیٰ کہ تم رکعتیں بھول جاتے ہو۔ لہٰذا جب کبھی ایسا ہو تو بیٹھے ہوئے دو سجدے کر لو۔" (متفق علیہ)

اگر نماز پڑھتے وقت کوئی واجب یا کئی واجب رہ جائیں یا ان کی ترتیب بگڑ جائے، کوئی فرض زیادہ ہوجائے، یا پھر نماز میں سوچتے سوچتے اتنی دیر لگ جائے کہ اس مدت میں تین مرتبہ تسبیح پڑھ سکیں یا چار رکعت نماز ادا کرتے ہوئے پہلا تشہد دو مرتبہ پڑھ لیں یا درود شریف اس کے ساتھ ملانے لگیں تو سجدہ سہو کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ اگر یہ سجدہ نہ کیا جائے تو نماز مکمل نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک حدیث بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ظہر کی نماز ادا کی تو بجائے چار رکعت کے پانچ رکعت پڑھ لیں۔ چنانچہ آپ کو بتایا گیا کہ نماز میں زیادتی ہوگئی ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا "کیا ہوا" صحابہ نے آپ کو بتایا کہ آپ نے پانچ رکعت نماز ادا کی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے سلام کے بعد دو سجدے کیے۔ ایک روایت میں یہ بات کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "حقیقتاً میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہی ہوں، اور بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہوں۔ لہٰذا تم لوگ مجھے یاد دلا دیا کرو۔ اور جب تم کو نماز میں شک ہو جائے تو پہلے تو یاد کرو۔ اگر یاد نہ آئے تو سلام پھیر کر دو سجدے کر لیا کرو۔" (متفق علیہ)

اگر فرض نماز پڑھ رہے ہوں اور نماز ادا کرتے وقت پہلا قعدہ یاد نہ رہے اور تیسری رکعت کے لیے اٹھتے ہوئے یاد آجائے۔ ایسی صورت میں اگر نیچے کا دھڑ ابھی سیدھا نہ ہوا ہو تو فوراً قعدے میں بیٹھ جانا چاہیے، سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ لیکن اگر نیچے کا دھڑ سیدھا ہوجائے تو پھر قعدے میں جانا گناہ ہے۔ ایسی صورت میں قیام میں چلے جانا ہی درست ہوتا ہے۔ لیکن نماز سجدۂ سہو کے ساتھ ختم کرنا پڑتی ہے۔ اگر نفلی نماز ادا کر رہے ہوں اور قعدہ بھول جائیں تو فوراً قعدہ میں آکر سجدۂ سہو کرنا درست ہے۔

سجدۂ سہو ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدہ میں صرف تشہد پڑھ کر دائیں جانب سلام پھیر لیا جائے۔ پھر دو سجدے کر کے قعدہ کریں اور تشہد، درود شریف اور دعا پڑھنے کے بعد سلام پھیریں۔ اگر نماز باجماعت ادا کی جا رہی ہو اور امام سے کوئی غلطی ہوجائے یا بھول چوک ہوجائے تو اس کے باعث تمام مقتدین پر سجدہ سہو لازم ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر کسی مقتدی سے بھول چوک ہو جائے تو تمام جماعت پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

بعض فقہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ جب سجدۂ سہو واجب ہو تو پہلا سلام پھیرنے سے نمازی نماز سے نہیں نکلتا خواہ وہ دونوں جانب سلام پھیر لے۔ اس لیے مقتدی سجدۂ سہو میں بھی شامل جماعت ہوسکتا ہے۔

سجدۂ شکر

کسی خوشی یا نعمت کے حاصل ہونے پر بطور شکر سجدہ کرنا۔ حضرت ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو جب کوئی خوشی حاصل ہوتی یا کوئی کام خوشی کا سبب بنتا تو آپؐ سجدے میں جا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے تھے۔ ابوجعفر بھی ایک حدیث بیان فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک بونے کو دیکھا تو سجدے میں گر پڑے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اشاعتِ دین کے لیے یمن بھیجا۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اہلِ یمن کے مسلمان ہونے کی اطلاع پہنچائی تو آپ بہت خوش ہوئے اور سجدۂ شکر ادا کیا۔

سجّیل

قرآن مجید کی سورۃ الفیل اور الحجر میں یہ لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی کے بارے میں علمائے تفسیر اور اہلِ لغت کی رائے مختلف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ سجیل کا مطلب مٹی کا پتھر ہے۔ اس بات کا ثبوت قرآن مجید کی سورت الذّٰریٰت کی ایک آیت سے مل جاتا ہے۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ ۝ (ذاریات: ۳۳)
"تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر برسا دیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سجیل اور حجارہ من طین ایک ہی چیز ہے۔
ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ سجیل کا مطلب ہے: اَلشَّدِيْدُ اَلْكَثِيْرُ "بہت سخت" اس سلسلے میں الفرا کہتے ہیں کہ سجیل اس پتھر کو کہا جاتا ہے جو چکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ابن عباس، ابن جبیر وغیرہ کہتے ہیں کہ اصحاب الفیل پر جو پتھر پھینکے گئے تھے وہ اینٹوں کی طرح پختہ تھے۔ لیکن حسن بصری اور مجاہد نے سجیل کے معنی سخت پتھر جو گارے سے خشک ہو کر سخت پتھر بن گیا تھا کہہ کر تمام اختلافات کو کافی حد تک ختم کر دیا ہے۔ امام راغب نے بھی سجیل کے معنی پتھر اور گارا ملا ہوا بیان کیے ہیں۔

اس لفظ کے معنی کے بارے میں دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ لفظ درحقیقت عربی الاصل ہے جو اَلسِّجِلّ سے ماخوذ ہے۔ اَلسِّجِلّ عربی میں کسی عہد نامے یا دستاویز یا رجسٹر وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ اس سے انہوں نے یہ مطلب اخذ کیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ پتھر مرنے والوں کے مقدر میں لکھ دیے تھے۔ بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے گارے کے ان پتھروں کو دوزخ کی آگ میں پکایا تھا اور ہر ایک پتھر پر مرنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس بات کی تائید قرآن مجید کی سورۃ المطففین کی آیت ۷ تا ۹ کے ذریعے بھی ہوجاتی ہے جس میں "لکھی ہوئی کتاب" کے الفاظ آئے ہیں۔

سجّین

سجّین کا لفظ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ ... یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین میں ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سجین کیا ہے؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔" (المطففین: ۷تا۹)

مفسرین اس لفظ کو ایسی جگہ سے تعبیر کرتے ہیں جہاں ... محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ یہ لفظ صرف اعمال نامے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ سجین دوزخ میں ایک وادی ہے، ساتواں طبقہ جہاں شیطان جکڑا ہوا ہے، زمین کے نیچے چٹان یا ساتواں طبقہ، مقام ابلیس کے نیچے ایک جگہ ہے جہاں ... روحیں ہوتی ہیں، یا ایک رجسٹر جس میں جنوں اور انسانوں کے نامہ اعمال درج ہیں اگر السجین سے ال کا لفظ کاٹ دیا جائے تو یہ نام جہنم کا نام بھی بن جاتا ہے۔

بہت سے لغت داں اسے لفظ سجن کا مترادف بھی بتاتے ہیں جبکہ سجن کا مطلب قیدخانہ ہوتا ہے۔ اسی لیے امکان غالب ہے کہ علما نے جو لفظ سجین سے جگہ کا مطلب لیا ہے اس کی وجہ لغت دانوں کا قول ہی ہے۔ قرآن مجید سے ان دونوں مطالب و توضیحات کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اس لیے ہم کسی ایک مطلب حرفِ آخر کا درجہ نہیں دے سکتے۔

سچل سرمست

صوبہ سندھ کے نامور صوفی بزرگ و شاعر۔ آپ کا اصل نام عبدالوہاب ہے۔ آپ کو بچپن سے ہی سچی بات کہنے کی عادت تھی اسی لیے انھیں اس صفت کے باعث "سچو" "سچل" یا "سچیڈنہ" کہا جانے لگا۔ انہیں سچل سرمست کے نام سے زیادہ ناموری اور شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے اب وجد شیخ شہاب الدین، محمد بن قاسم کے ساتھ اس کے خصوصی مشیر کی حیثیت سے سندھ تشریف لائے تھے۔ جب سندھ کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا گیا تو انہوں نے محمد بن قاسم کو اس علاقے کی خوشحالی اور بہبودی کے لیے سنہری مفید اور کارآمد مشورے دیے۔ جن کے باعث سندھ میں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گیا۔ جب مسلمانوں نے سیوستان موجودہ سیون شریف فتح کر لیا تو شہاب الدین کو وہاں کا عامل بنا دیا گیا۔ اس طرح سچل سرمست کے جد امجد سندھ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ سچل سرمست کے والد کا نام میاں صلاح الدین تھا۔ آپ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر صرف چھ سال کی ہوئی تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ سچل سرمست کی پرورش ان کے دادا نے کی۔ ان کے دادا عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ سندھی اور پنجابی کے شاعر بھی تھے اور ان کے چچا بھی سندھی اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے بزرگوں کی صحبت میں پرورش پانے سے ان کی شخصیت کو نکھرنے اور جلا حاصل کرنے کا موقع ملا۔

سچل سرمست بچپن سے ہی فقیری کی جانب مائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے [illegible] بہت سی منزلیں طے کیں اور چالیس سال کی عمر میں ان [illegible] حاصل کر لیا۔

آپ نے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی۔ ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ / [illegible] کو آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کو درازا شریف میں دفن کیا گیا۔

سچل سرمست کے عہد اور دور میں سندھ میں جا بجا جنگ و جدل کا دور دورہ تھا۔ [illegible] بہت پر آشوب تھا۔ ہر جانب طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ عوام میں خوف و ہراس اور مایوسی عام تھی۔ آپ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس زمانے میں فارسی زبان سرکاری طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ سندھ کے میروں کی زبان پنجابی تھی جبکہ اردو تمام سندھ میں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اسی لیے سچل سرمست نے سندھی جو ان کی مادری زبان تھی، کے علاوہ فارسی، پنجابی اور اردو کو بھی اپنی تخلیقات کا ذریعہ بنایا۔ آپ کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

سندھی: (۱) "بیت، کافیاں اور دوہے" (۲) "مرغ نامہ" (۳) "وحدت نامہ" (۴) "عشق نامہ" (۵) مرثی۔

پنجابی: (۱) "کافیاں اور دوہے" (۲) جھولنے اور گھڑولیاں۔

اردو: (۱) غزلیات، (۲) کافیاں

فارسی: (۱) دیوان آشکار (۲) رازنامہ (۳) وحدت نامہ (۴) رہبر نامہ (۵) عشق نامہ (۶) گداز نامہ (۷) وصلت نامہ (۸) تار نامہ (۹) درد نامہ۔ (۱۰) غزل بحر طویل۔

آپ فارسی کلام کے لیے آشکار تخلص کرتے تھے جبکہ سندھی کے لیے سچو اور سچیڈنہ، اور اردو کے لیے سرسچل سرمست کا تخلص اختیار کرتے تھے۔

سحنون

ایک مشہور محدث اور فقیہ۔ آپ کا نام عبدالسلام بن سعید بن حبیب لتنوخی تھا۔ آپ چونکہ بہت جلدی سے ہر ایک بات کا مطلب سمجھ لیا کرتے تھے اسی خاصیت کی بنا پر آپ کو سحنون کہا جانے لگا۔ اس نام کا ایک پرندہ بھی ہوتا ہے۔ جو بہت بشاش اور خوش کن حرکات کرتا ہے۔ آپ کے والد سعید حمصی سے ایک سپاہی کی حیثیت سے قیروان پہنچے۔ قیروان میں رہائش کے دوران میں ہی سحنون ۱۶۰ھ/ ۷۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے زمانے کے مشہور علما خاص طور پر بہلول بن راشد سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد سحنون مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے تونس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے علی بن زیاد سے اکتساب فیض کیا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے جہاں عبدالرحمٰن بن القاسم، ابن وہب اور اشہب سے ملے جو امام مالکؒ کے پیروتھے۔ جب سحنون قیروان سے واپس آئے تو اپنے ہمراہ موطا کے کچھ حصے لے آئے۔ یہ حصے اسد بن فرات نے خود امام مالکؒ سے سنے تھے۔ اس کے بعد سحنون نے سیاحت شروع کی اور اشہب ابن وہب کی معیت میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ بعد میں مدینہ منورہ اور شام کی سیر کو بھی گئے۔ ۱۹۱ھ میں وہ دوبارہ قیروان آ گئے اور امام مالکؒ کے مسلک کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے بڑی محنت سے ایک کتاب المدونہ میں امام مالکؒ کے فقہی مسائل کو جمع کیا۔ اس کتاب میں فیصلوں کی بنیاد زیادہ تر ایسے دلائل پر رکھی گئی ہے جنہیں عقل سلیم مان لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مسئلوں کی تائید میں صحیح یا موضوع احادیث کو پیش نہیں کیا۔

آپ نے اس کتاب کے علاوہ اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ سحنون کا انتقال ۹، یا ۷، رجب ۲۴۰ھ/ کو قیروان میں ہوا۔

سخاوت

اپنے حق کو بخوشی دوسرے کے حوالے کر دینے کو سخاوت کہا جاتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں مثلاً اپنا حق کسی کو معاف کر دینا۔ اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنا یا کسی دوسرے کی خاطر اپنے جسم کی توانائی خرچ کرنا، اپنے ذہن اور دماغ کی قوت کو دوسروں کے لیے خرچ کرنا۔ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا یا کسی کو بچاتے ہوئے یا حق و صداقت کی حمایت میں جان دے دینا، سب سخاوت کے زمرے میں آتی ہیں۔

سخاوت اور فیاضی کی تعلیم بہت وسیع اور اپنے اندر بے انتہا معنویت کو لیے ہوئے ہے۔ اس تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ سخاوت کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے متقی اور پرہیزگار لوگوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سورۂ بقر میں فرمایا ہے کہ "اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں"۔ اسی طرح سورۂ بقر ۴۳ ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خرید ناہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش اور کافر ہی ظالم ہیں۔"

اس آیت کی تلاوت کے بعد ہمیں علم ہوتا ہے کہ جو شخص سخاوت اور فیاضی سے کام لے کر خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے احتراز کرتا ہے درحقیقت وہ کفر کے نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ پھر خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی نیت کو بھی دیکھا جاتا ہے اگر وہ خلوص نیت سے یہ کام انجام دے رہا ہو یعنی اللہ کی راہ میں سخاوت کر رہا ہو تو وہ ہی درست تصور ہو گی۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "جو اپنی دولت خدا کی راہ میں

خرچ کرتے ہیں پھر اس کے خرچ کیے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ اُلاہنا دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے، اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (سورۂ بقرہ: ۲۶) سخاوت کے بارے حضورؐ کی بھی حدیثیں ملتی ہیں حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے کہا کہ "اے بنی آدم جو مال تمہاری ضروریات سے بچ رہتا ہے اس کو صرف کرنا ہی افضل ہے اور جمع کر لینا اچھا نہیں ہے۔ البتہ اپنی ضروریات کے لیے روکنے میں کوئی جمع نہیں اور سخاوت کی ابتدا گھر والوں سے کرنا چاہیئے۔ (مسلمؒ)

سخاوت کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ سے دو حدیثیں مروی ہیں کہ (۱) آنحضرتؐ نے فرمایا "سخی اور کنجوس ان دو آدمیوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جن کو لوہے کی زرہ پہنا دی جائے اور ان کے ہاتھ ان کے سینوں سے باندھ دیئے جائیں چنانچہ جب سخی صدقہ دے تو اس کی زرہ کشادہ ہو جائے اور جب کنجوس ارادہ کرے تو اس کی زرہ کے حلقے ایک دوسرے سے مل جل جائیں (بخاری، مسلم)

(۲) حضورؐ نے فرمایا کہ سخا ایک جنت کا درخت ہے لہذا جو شخص بھی سخاوت کرے گا دراصل اس درخت کی ایک شاخ کو پکڑے گا تو وہ شاخ اسے جنت میں لے جائے گی۔ اسی طرح کنجوس بھی ایک درخت ہے جو جہنم میں ہے جس نے کنجوسی کی اس نے بھی اس کی شاخ پکڑلی جو اسے جہنم میں لے جانے کا موجب بنے گی۔ (امام بیہقیؒ)

ان احادیث اور آیات سے ہمیں سخاوت کی اہمیت اور ضرورت کا بہت حد تک احساس ہو جاتا ہے۔

سخاوی

ایک مؤرخ۔ آپ کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن ہے۔ لیکن سخاوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ ربیع الاوّل ۸۳۱ھ/ نومبر ۱۴۲۷ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے استادوں میں ابن حجر عسقلانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کی وفات کے بعد سخاوی نے حجاز کے دوسرے عالموں سے استفادہ کیا تھا۔ آپ قاہرہ میں استاذ بھی رہے۔ بعد میں مدینہ منورہ چلے گئے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ ترک نہ کیا۔ آپ کی وفات مدینہ میں ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۷ء میں ہوئی۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں زیادہ مشہور "الاعلان بالتوبیخ" ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر یوسف صاحب نے کیا تھا جو لاہور بورڈ نے شائع کیا ہے۔

سخی سرور، سلطان

آپ کا اصل نام سید احمد تھا کیونکہ کوئی بھی ضرورت مند آپ کے دروازے سے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا اسی نسبت سے لوگ انھیں سخی سرور کہنے لگے۔ آپ ملتان کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب آخری پیڑی میں حضرت علیؓ سے مل جاتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد اسحاق لاہوری سے حاصل کی۔ انھیں تصوف کی تعلیم اپنے والد سے ملی۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت غوث الاعظمؒ اور شہاب الدین سہروردی سے بھی فیضان حاصل کیا۔ آپ بکریاں چرا کر گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو تلقین و درس کا سلسلہ سودھرا اور بعد میں موضع دھونکل میں شروع کیا۔ لیکن یہاں زیادہ عرصہ نہ رہے کیونکہ وطن کی یاد ستانے لگی تھی۔ چنانچہ آپ اپنے آبائی وطن چلے گئے۔ بعد میں ڈیرہ غازیخاں کے ایک گاؤں شاہ کوٹ میں رہائش پذیر ہوئے۔ آپ کے معتقدوں میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی شریک ہیں۔ آپ کے ہندو معتقد اپنے آپ کو سلطانی کہتے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں سلطانیوں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوبند سنگھ کے زمانے میں تقریباً تمام جاٹ اپنے آپ کو سلطانی کہتے تھے۔ یہ سلطانی سخی سرور کے مزار کی زیارت کو اپنی سب سے بڑی رسم گردانتے ہیں۔ یہ زیارت فروری کے وسط میں شروع ہوتی ہے اور تمام علاقوں سے سلطانی آکر آپ کے مزار کی زیارت کرتے ہیں۔ آجکل ان کے مسلمان معتقد بھی اپنے آپ کو سلطانی کہتے ہیں اور مزار کی زیارت کرنے کے لیے مخصوص دنوں میں ٹولیاں بنا کر آتے ہیں۔ ان کا عرس ہر سال ۸ [illegible] کو ہوتا ہے۔ آپ کا مزار ڈیرہ غازی خاں کے نزدیک قصبہ سخی سرور میں واقع ہے۔

سدوم

حضرت لوطؑ علیہ السلام کے شہر کو سدوم کہا جاتا ہے۔ [illegible] الٹ دیا تھا۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "کیا ان [منافقوں] کو ان لوگوں کی خبر نہیں ملی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (یعنی) نوحؑ کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین کے لوگ اور الٹی ہوئی بستیوں (یعنی قوم لوط) کے رہنے والے" (سورہ توبہ [illegible])

اب سدوم کے علاوہ چند بستیوں کو [illegible] آبادی تھی فرشتوں نے الٹ دیا تھا [illegible] وہاں کے لوگوں کی بدکرداریاں [illegible] بعد میں خود سدوم کے باشندے بھی [illegible] ان بستیوں کے لوگ [illegible] الٹ کر رکھ دیا۔

سراج الدین عثمانی

[illegible]

سراج الدولہ، نواب

اصل نام [illegible] نواب علی وردی خاں [illegible] بہار اور اڑیسہ کے ناظم تھے۔ انھیں سراج الدولہ کا لقب [illegible] اپنے نام کی بہ نسبت لقب سے زیادہ مشہور ہو [illegible] اور بہترین انداز سے ہوئی۔ نواب وردی علی خاں کا [illegible] کوئی بیٹا نہیں تھا [illegible] اس نے سراج الدولہ کی [illegible]

سراج الدولہ کے باپ کو دربھنگے کے پٹھانوں نے مار دیا جس کے بعد علی وردی خاں نے اسے بہار کا ناظم مقرر کر دیا اور مرنے سے پہلے ہی سراج الدولہ کی ولی عہدی کا اعلان بھی ۹ راپریل ۱۷۵۶ء کو کر دیا۔ نواب علی وردی خان کی وفات کے بعد سراج الدولہ تخت نشین ہوتے ہی اپنے چچا صولت جنگ کے بیٹے شوکت جنگ

نواب سراج الدولہ

پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوا۔ شوکت جنگ اُن دنوں پورنیہ کا فوجدار تھا، اور خود کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا ناظم سمجھتا تھا لیکن انگریزوں نے شوکت جنگ کی پشت پناہی کی جس کے باعث سراج الدولہ نے فورٹ ولیم کی جانب ہی رجوع کیا۔ اس وقت تک یورپین لوگوں کو بنگال میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی قلعہ بندی کا حق نہیں تھا لیکن انگریزوں نے کلکتے کے قلعہ کو اپنے قبضہ میں لانے کے بعد وہاں فوجی نوعیت کے سخت انتظامات جاری رکھے۔ انھی دنوں ڈھاکہ کے دیوان کے بیٹے کرشن داس کو بھی انگریزوں نے اپنی پناہ میں رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ اس پر سرکاری خزانہ سے ۵۳ لاکھ روپیہ خرد بُرد کرنے کا الزام تھا۔ نواب سراج الدولہ نے اس موقع پر فورٹ ولیم کے گورنر کے پاس اپنا ایلچی بھیجا اور مطالبہ کیا کہ فورٹ ولیم کونسل قلعہ بندی میں مزید اضافہ فوری طور پر روک دے، "مرہٹہ خندق" جو شہر کے ارد گرد تیار کی گئی ہے، اسے بند کر دے اور کرشن داس کو واپس بھیج دے۔ لیکن انگریزوں نے اُس کے یہ تینوں مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب نے ہگلی کی بندرگاہ سے انگریزوں کے جہاز روانہ ہونے پر پابندی لگا دی، اور فوج کے ایک دستے کو قاسم بازار فیکٹری کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیج دیا جس نے اپنا کام احسن طریقے پر انجام دیا۔ ۴ر جون کو نواب سراج الدولہ خود بھی ہگلی کی بندرگاہ کے پاس پہنچ گیا۔ چنانچہ درلبھ رام نے ولیم واٹس کو نواب کے سامنے پیش ہونے کے لیے خط لکھا جس کے بعد وہ سراج الدولہ کے پاس حاضر ہوا۔ نواب نے انگریزوں کی روش پر اُسے سرزنش کی۔ اس پر واٹس نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا اور نواب کے تمام مطالبات مان لیے۔ لیکن کمپنی نے ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ڈریک نے فوج کو تیار کر کے سکھ ساگر اور قلعہ تھانہ کی طرف بھیج دیا۔ اس فوج نے دونوں جگہ نواب کی فوجوں سے شکست کھائی۔ اس کے بعد ۱۶ر جون کو نواب خود تیس ہزار سپاہیوں کی معیت میں فورٹ ولیم کے سامنے آ گیا۔ دونوں فوجوں میں زبردست معرکہ ہوا۔ انگریزی دستے پسپا ہوئے۔ اور انگریزوں نے اپنے بیوی بچوں کو جہاز پر سوار کرا کر فرار کرا دیا۔ خود ڈریک بھی بھاگ نکلا۔ اس کے بعد ڈریک کی جگہ ہال ویل نے لے لی، اور نواب کے ساتھ صلح کرنے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۲۰ر جون کو انگریزوں کی تمام فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس

طرح نواب سراج الدولہ کی فوجیں بآسانی فورٹ ولیم میں داخل ہو گئیں۔ فورٹ ولیم کی فتح حاصل کر چکنے کے بعد ۱۶ر اکتوبر ۱۷۵۶ء کو سراج الدولہ نے راجہ رام نرائن کی مدد سے شوکت جنگ کو منہاری کے مقام پر شکست دی۔ اس جنگ میں شوکت جنگ مارا گیا۔ اس کے بعد سراج الدولہ کی فوجوں نے کلکتہ اور پورنیہ کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔ لیکن اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اسی دوران میں مدراس سے کرنل کلائیو اور واٹسن بری اور بحری فوج لے کر مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے لگے۔ راجہ مانک رام نے بھی انگریزوں کے خلاف مزاحمت نہ کی۔ اس طرح انہیں کلکتہ پر قبضہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔ جب نواب نے کلکتہ کا رُخ کرنا چاہا تو میر جعفر، درلبھ رام اور جگت سیٹھ جیسے غداروں نے انگریزوں کو خفیہ پیغامات پہنچانے شروع کر دیئے دوسری جانب سے احمد شاہ ابدالی کے حملے کی اطلاع بھی نواب کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ نواب سراج الدولہ نے فروری ۱۷۵۷ء کو معاہدۂ علی نگر پر دستخط کر دیئے، جس کی رُو سے بنگال کے تمام مقبوضات دوبارہ کمپنی کو واپس مل گئے۔ اس کے علاوہ "تاوان" کے طور پر انگریزوں کو سکہ سازی اور قلعہ بندیوں کے حقوق بھی دے دیئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صلح عارضی ثابت ہوئی اور پانچ ماہ کے بعد ہی یہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں جنگ شروع ہو چکی تھی جو سات سال تک جاری رہی۔ انگریزوں نے نواب کی مرضی کے خلاف فرانسیسی مقبوضات پر خود قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کچھ فرانسیسی نواب کے پاس پناہ کے لیے آ گئے۔ جنہیں انگریزوں نے واپس مانگا۔ نواب نے انھیں دینے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں انگریزوں نے میر جعفر سے سازباز مکمل کر لی تھی۔ چنانچہ نواب کے ساتھ انگریزوں کی جنگ تقریباً ناگزیر ہو چکی تھی اور ۱۳ر جون کو کلائیو نے شمالی علاقوں پر حملہ کر بھی دیا۔ نواب سراج الدولہ نے کسی مزاحمت کے بغیر قتوہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ نواب نے بھاگیرتی ندی کے پاس ہی ۵۰ ہزار پیدل ۱۸ ہزار سوار فوج پچاس توپوں کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ فوج کا بیشتر حصہ غدارِ اعظم میر جعفر کے ماتحت تھا۔ نواب نے انگریزوں کی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ لیکن گھیرے میں رہنے والی فوج میر جعفر کے ساتھ تھی جو خفیہ طور پر انگریزوں سے مل چکا تھا۔ اس لیے جنگ شروع ہوتے ہی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ نواب کا معتمد اور حق نمک ادا کرنے والا ساتھی میر مدن لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔ شام تک نواب کو میر جعفر کی غداری کا بھی علم ہو گیا تھا چنانچہ وہ اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا، اور مرشد آباد پہنچ گیا۔ میر جعفر نے انگریزوں کا استقبال کیا اور پلاسی کی یہ مشہور جنگ اپنے بھیانک انجام کو پہنچی۔ اس لڑائی کے بعد میر جعفر نے نواب سراج الدولہ کو گرفتار کر کے نہایت اذیتیں دے کر شہید کر دیا ؛

سراقہ بن عمرو

حضورؐ کے ممتاز صحابی۔ آپ کا سلسلہ نسب کچھ یوں ہے :-

سراقہؓ بن عمرو بن عطیہ بن خنساء بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مالک بن النجار الانصاری۔ آپ نے حضورؐ کے زمانے میں بیشتر غزوات میں شرکت کی۔ جنگ موتہ میں بھی آپ شریک ہوئے تھے۔ اسی جنگ میں آپ نے بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا ؛

سراقہ بن مالک

جب حضورؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کر لی تو کفارِ مکہ نے آپؐ کو اور

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو گرفتار کرکے لانے والے کو ایک سو اونٹ انعام میں دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی سُراقہ بن مالک آپؐ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جب وہ آپؐ کے قریب پہنچا تو اُس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ اس نے گرنے کے بعد ترکش سے تیر نکالے اور سوچا کہ استعمال کیا جائے یا نہیں۔ لیکن اس کے ذہن میں انعام کا لالچ زیادہ تھا اس لیے تیر زیادہ استعمال نہ کیئے اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر حضورؐ کے تعاقب میں چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اس مرتبہ گھوڑے کے پاؤں ٹخنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ چنانچہ وہ مجبوراً گھوڑے سے اترا اور فال نکالی۔ جواب نفی میں پا کر وہ سمجھ گیا کہ حضورؐ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی مرضی شامل ہے۔ چنانچہ فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر تحریری طور پر امان کی درخواست کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر "امان کا فرمان" لکھ دیا۔ حضورؐ نے سراقہ کو دیکھ کر کہا "میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں"۔ سراقہؓ فوراً اسلام لے آئے۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا تو انہوں نے کسریٰ کے کنگن بھی پہنے۔ اس طرح حضورؐ کی دعا بھی پوری ہوئی۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ۲۵ھ میں وفات پائی۔ آپ نے حضورؐ کی کتنی ہی احادیث بیان کی ہیں۔ سراقہؓ بن مالک ایک بلند پایہ عربی شاعر بھی تھے۔

سربراہی کانفرنس، اسلامی

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کا جو واقعہ پیش آیا، اس نے پورے عالمِ اسلامی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس ضمن میں ۲۵ اگست کو قاہرہ میں عرب لیگ کے چودہ رکن ممالک کے وزرائے خارجہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں متفقہ طور پر سعودی عرب کے شاہ فیصل اور مراکش کے شاہ حسن دوم کو اختیار دیا گیا کہ دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس بلانے کا انتظام کریں۔ چنانچہ کانفرنس کے باضابطہ اجلاس سے پہلے ۲۹ اگست کو رباط (مراکش) میں پاکستان سمیت سات اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ پر مشتمل تیاری کمیٹی کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کانفرنس کی تاریخ اور جگہ کا انتخاب کیا گیا اور دنیا بھر کے اسلامی ممالک اور اسلامی اداروں کے سربراہوں کی فہرست تیار کی گئی۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے ۳۵ اسلامی ممالک کے سربراہوں کو کانفرنس میں شرکت کی باضابطہ دی، جن میں سے ۲۵ ممالک کے سربراہوں نے کانفرنس میں شرکت کرنا منظور کر لیا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کو رباط میں اسلامی ممالک کے سربراہوں کا تین روزہ اجلاس شروع ہوا جس کا افتتاح مراکش کے شاہ حسن دوم نے کیا۔ یہ کانفرنس تین روز تک جاری رہی۔ اس میں مندرجہ ذیل فیصلے ہوئے۔

۱۔ مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کا مستقل سیکرٹیریٹ قائم کرنا جس کا صدر دفتر جدّہ میں ہو گا۔

۲۔ آئندہ کانفرنس میں صرف بھارتی مسلمانوں کو نمائندگی دینا

۳۔ سیکرٹیریٹ کا انتظامی ڈھانچہ مرتب کرنے کے لیے مارچ ۱۹۷۰ء میں وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس جدّہ میں منعقد کرنا۔

۴۔ جب فلسطین آزاد ہو جائے گا تو اس کا صدر دفتر بیت المقدس میں منتقل کرنا۔

کانفرنس کی کارروائی نوٹ کرنے کے لیئے عربی، انگریزی اور فرانسیسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ سیکرٹیری جنرل اسلامی سیکرٹیریٹ کا سربراہ ہے۔ اسے دو سال کے لیے منتخب کیا جاتا۔ جناب تنکو عبدالرحمٰن کو اس کا پہلا سیکرٹیری جنرل منتخب کیا گیا۔

اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں سیکرٹیری جنرل اپنے نائبین کا تقرر بھی کر سکتا ہے۔ سیکرٹیریٹ کے انتظامی اخراجات رکن ممالک اپنی قومی آمدنی کے مطابق برداشت کرتے ہیں۔ اسلامی سیکرٹیریٹ کی تنظیم ان ممالک پر مشتمل ہے، جنھوں نے رباط میں بادشاہوں مملکتوں اور حکومتوں کے سربراہوں کی کانفرنس میں نیز جدّہ، کراچی، طہران، قاہرہ اور کوالالمپور میں وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والی وزرائے خارجہ کانفرنس میں شرکت کی اور منشور پر دستخط کیئے۔ ہر وہ مسلمان ملک سیکرٹیریٹ کا رکن بننے کا اہل ہے جو تحریری درخواست کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کرے اور اس کے منشور کو قبول کرے۔

اسلامی سیکرٹیریٹ کے تین شعبے ہیں۔

۱۔ بادشاہوں، مملکتوں اور حکومتوں کے سربراہوں کی کانفرنس۔

۲۔ اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس۔

۳۔ جنرل سیکرٹیریٹ اور ذیلی تنظیمیں۔

اسلامی سیکرٹیریٹ کے قیام کے اغراض و مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ رکن ممالک کے درمیان اسلامی اتحاد کو فروغ دینا۔

۲۔ اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور سائنسی سرگرمیوں کے دوسرے اہم شعبوں میں رکن ممالک کے درمیان تعاون کو مستحکم کرنا اور بین الاقوامی تنظیموں کے اندر اس تنظیم کے رکن ممالک کے درمیان صلاح مشوروں کو عملی جامہ پہنانا۔

۳۔ نسلی منافرت اور امتیاز کو ختم کرنے کی کوشش کرنا اور نوآبادیاتی نظام کو ہر شکل میں مٹانے کی جدوجہد کرنا۔

۴۔ انصاف پر مبنی بین الاقوامی امن اور سلامتی کی حمایت کے لیے ضروری [illegible]

۵۔ مقدس مقامات کے تحفظ کی سعی کرنا اور فلسطینی عوام کی آزادی میں مدد دینا۔

۶۔ تمام مسلمان ملکوں کی جدوجہد کو تقویت پہنچانا تاکہ ان کے وقار، آزادی اور قومی حقوق کی حفاظت کی جائے۔

۷۔ رکن ممالک اور دوسرے ممالک کے درمیان تعاون اور مفاہمت کو فروغ دینے کے لیئے سازگار ماحول پیدا کرنا۔

اسلامی سیکرٹیریٹ کے تحت اسلامی ممالک کے سربراہوں کی اس وقت تک دو کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ پہلی کانفرنس رباط (مراکش) میں اور دوسری [illegible] ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء لاہور میں منعقد ہوئی۔ عالم [illegible] کی [illegible] نشانی کے طور پر دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کی یاد میں ایک [illegible] لاہور کے فیصل اسکوائر میں اسمبلی ہال کے سامنے تعمیر کیا گیا ہے۔ [illegible] مشہور ماہرِ تعمیر وحدد لوکے نے بنایا۔ اس کا مرمریں مینار [illegible] فٹ چوڑا ہے۔ اس کا افتتاح ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء کو سابق وزیر اعظم [illegible] ذوالفقار علی بھٹو نے کیا۔

سرپل

افغانستانی ترکستان کا ایک شہر جس کا نام [illegible] ہے یہ عرب جغرافیہ دان اسے راس القنطرہ کہتے ہیں۔ [illegible] کی شمالی سرحد پر واقع پہاڑیوں دریائے جیحوں کے جنوب میں [illegible] ایک زرخیز علاقے میں چار ازبک ریاستیں [illegible] کہلاتی تھیں۔ لیکن افغانستان کے والی اور بارک زئی امیر [illegible] ختم کر دیا اور انہیں اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا [illegible] آخر میں کابل کے بادشاہ کے سامنے [illegible] سرنگوں ہوا۔ آج کل [illegible]

کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ ان چاروں ریاستوں کی سیاسی حد بندیاں آج بھی برقرار ہیں۔ اس شہر میں ازبک باشندے بھی کافی تعداد میں آباد ہیں جنہیں فوجی خدمت سے مستثنے کر دیا گیا۔

سرخسی

آپ کا پورا نام ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل تھا لیکن آپ کو سرخسی بھی کہا جاتا تھا۔ آپ کی پیدائش کا سال معلوم نہیں ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بخارا میں پائی۔ عبدالعزیز حلوائی آپ کے استادوں میں سے تھے۔ آپ پر زیادہ عرصہ تک حکومتِ وقت کے عتاب نازل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا گیا۔ آپ کنوئیں کی منڈیر پر آکر بیٹھ جانے والے شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے۔ ان شاگردوں نے ان کے درس کی باتوں کو لکھ لیا۔ بعد میں انہی تحریروں سے "المبسوط" نامی کتاب ترتیب دی گئی۔ یہ کتاب فقہ کے بارے میں بہت اہم تصنیف کے طور پر مشہور رہی۔ آپ نے اپنی قید کے دوران میں ہی "السیرالکبیر" کی شرح مرتب کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا انتقال ۴۸۳ھ/ ۱۰۹۰ء میں ہوا۔

سردار احمد خان تپانی

آپ کا تعلق بلوچی قبیلہ تپانی سے تھا۔ یہ قبیلہ جام پور سے ڈیڑھ میل دور دریا کے کنارے ایک گاؤں لنڈی تپانی میں آباد ہے۔ یہ تمام گاؤں تپانی خاندان کی ملکیت ہے۔ سردار احمد خاں نے ابتدائی تعلیم باقاعدہ کسی مدرسے وغیرہ میں حاصل نہیں کی۔ دین و دنیا کی بھی واجبی تعلیم حاصل کی تھی۔ البتہ انگریزی، فارسی اور اردو زبانیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اردو زبان تو لکھ بھی لیتے تھے جبکہ باقی دو صرف پڑھنے تک ہی محدود تھیں۔ آپ دینی علوم کا عربی مکتب یا مدرسے سے باقاعدہ پڑھے بغیر صرف از خود مطالعہ کے ذریعے وسیع علم رکھتے تھے۔ آپ حالانکہ زمیندار اور نواب کے چشم و چراغ تھے لیکن آپ کا اپنا دل و دماغ زمیندارانہ نہیں تھا۔

سردار صاحب میں اسلام کی تبلیغ کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کے لیے آپ نے روپیہ پیسہ بے دریغ خرچ کیا۔ آپ نے ضلع ڈیرہ غازی خاں میں جہاں جہالت و بدعت کی ظلمت اور تاریکی چھائی ہوئی تھی اسلام کی تبلیغ کا کٹھن کام انجام دیا۔ ان دنوں آریہ سماج اور مرزائیت کا بہت چرچا تھا۔ سردار احمد خاں صاحب نے آریہ سماج کے برہمنوں کو مناظرہ کا چیلنج کر دیا۔ چنانچہ جام پور میں یہ مناظرہ ہوا۔ اس مناظرہ کو سننے کے لئے تمام ضلع سے لوگ جوق در جوق آئے۔ اس مناظرہ کا اہتمام سردار صاحب نے ہی کیا تھا۔ جب یہ مناظرہ شروع ہوا تو مسلمانوں کی جانب سے اکیلے مولانا لال حسین صاحب نے ہی آریہ سماج کے دو چوٹی کے افراد کو مناظرے میں شکست فاش دی۔ آپ نے تبلیغی کام کو منظم کرنے کے لیے لاہور، دیوبند اور دہلی کا سفر بھی کیا اور مختلف علماء سے اس موضوع پر بات چیت کی۔ آپ نے تبلیغ دین کی تحریک کا آغاز ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ/ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ڈیرہ غازیخاں میں کیا۔ اس دن بہت سے دین کے مبلغوں کا اجتماع آپ کے دولت خانے پر ہوا۔

وفات سے ایک سال پہلے آپ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ آپ نے مقامی حکیموں اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا لیکن صحت بحال نہ ہو سکی۔ بالآخر ۲۵ نومبر ۶۰ء کو جمعہ کے روز انتقال کر گئے۔

آپ نے ترکہ میں تقریباً پون لاکھ روپیہ نقد چھوڑا، جو ان کی وصیت کے مطابق تعلیمی اور تبلیغی اداروں میں تقسیم کر دیا گیا۔

سرقسطہ

ہسپانیہ کا ایک شہر ہے جو اپنے ہی نام کے موجودہ صوبے کا صدر مقام ہے پرانے زمانے میں یہ شہر سلطنت ارغون کا دارالحکومت تھا یہ شہر دریائے ابرو ABRO کے دائیں کنارے پر آباد ہے۔ سطح سمندر سے اس کی اونچائی چھ سو فٹ ہے۔ اس شہر کے اردگرد کا علاقہ سرسبز ہے کیونکہ اس علاقے میں پانی کی بہتات ہے جس کے باعث زراعت آسان ہے۔ آج کل اس شہر کا نیا نام رکھ دیا گیا ہے جو زاراگوزا ZARAGAZA ہے جو پرانے زمانے کے لاطینی نام سے اخذ کیا گیا ہے۔ شہر کا یہ نیا نام عربی میں سرقسطہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں دوبارہ آنے سے پہلے اندلس کی اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں سرقسطہ کی آبادی بہت گنجان تھی۔ اس شہر میں ایک فصیل بنی ہوئی تھی اس فصیل کا رنگ سفید تھا۔ اسی لیے سرقسطہ کو المدینۃ البیضا یعنی سفید شہر بھی کہا جاتا تھا۔ اس شہر کو مسلمانوں نے ۹۴ھ/ ۷۱۲ء میں فتح کیا تھا۔ سرقسطہ کے باغات کے پھل تمام اندلس میں مشہور تھے اور بہترین پھلوں میں شمار ہوا کرتے تھے یہاں پر اود بلاؤ کی کھال سے بنائے ہوئے گریبان اور کالر تمام اسلامی ممالک میں مشہور تھے۔ ۱۱۱۹ء میں یہ شہر دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ آج کل اس شہر میں مسلمانوں کے دور کی بہت کم یادگاریں باقی رہ گئی ہیں۔ سرقسطہ میں موجود قدیم ترین جامع مسجد کی جگہ "سیو" (SEO) کا گرجا تعمیر کیا جا چکا ہے۔ آج کل اس شہر میں مسلمانوں کی سب سے اہم یادگار ایک محل ہے "الجعفریہ" کہا جاتا ہے۔

سرقسطہ میں پیدا ہونے والے مشاہیر میں ایک بہت بڑے محدث ابوعلی حسین بن محمد بن فیرہ بن حیون الصدفی بھی شامل ہیں۔ یہ عام طور پر ابن سکرہ کے نام سے مشہور ہیں

سرمد

ایک صوفی شاعر۔ اصل نام محمد سعید تھا ۱۶۱۸ء میں کاشان کے یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ خاندانی روایات کے مطابق سرمد نے مذہبی تعلیم ایک مذہبی درس گاہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے طور پر عربی اور فارسی زبان اور ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سرمد نے عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ لیکن اپنے مطالعہ سے مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ اسی غرض سے اصفہان آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد اس وقت کے دو بڑے عالموں ملا صدرا شیرازی اور ملا ابوالقاسم فندارسکی سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اصفہان میں ہی وہ مشرف بہ اسلام ہوا اس کے بعد ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شامل ہو کر ٹھٹھہ آ گیا۔ اس وقت کے عہد میں ٹھٹھہ، سندھ کا صدر مقام تھا۔ یہاں اسے کسی سے محبت ہو گئی جس کے عشق نے اس کی دنیا ہی بدل دی۔ اس واقعہ کے باعث اسے عالمی شہرت بھی ملی۔ سرمد نے اپنی تمام دولت غریبوں میں تقسیم کر دی۔ پھر ٹھٹھہ سے لاہور آیا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد دہلی چلا گیا۔ بعد میں ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء میں وہ حیدر آباد (دکن) چلا گیا۔ جہاں گولکنڈہ کے حاکم نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور اسے اپنا مرشد بنا لیا لیکن داراشکوہ کے قتل ہو جانے کے بعد سرمد کے مخالف عالموں نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ چنانچہ سرمد کو گرفتار کر کے ملا قوی، جو قاضیٔ شہر تھا، کی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔ سرمد کو جامع مسجد کے عین سامنے سرِعام پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بعد میں اس کا مزار بھی اسی مقام پر بنایا گیا یہ واقعہ سلطان

اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکمرانی کا ہے۔

سری بن منصور

سری بن منصور "ابوسرایا" کے نام سے زیادہ معروف تھا۔ کیونکہ وہ گدھوں کو کرائے پر چلایا کرتا تھا۔ بعد میں یزید بن مزید بن الشیبانی کے ہاں ملازمت اختیار کرلی جس نے اسے اپنی فوج

اختیار کرلی جس نے اسے خرمیوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیا۔ جب الامین اور المامون کی خانہ جنگی شروع ہوئی تو وہ ہرثمہ کا ساتھی بن گیا جس نے اسے اپنی فوج کے ایک دستے کا سالار مقرر کردیا۔ جب ہرثمہ نے اسے بیس ہزار درہم کی غیر معمولی رقم دے کر حج پر جانے کی اجازت دی تو اس نے وہ تمام دولت اپنے سپاہیوں میں تقسیم کردی، اور خود حج کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ اس نے راستے میں مسافروں کو گرفتار کرکے ان سے رہائی کا فدیہ وصول کرنا شروع کردیا۔ اس طرح حج کے اخراجات پورے کرنے لگا۔ جب ہرثمہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے کچھ فوج اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجی جسے سری بن منصور نے باآسانی شکست دی۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل راستے سے ہٹ کر صحرا کی جانب ہوگیا جہاں رقہ پہنچنے پر وہ محمد بن ابراہیم طباطبا العلوی سے ملا اور اس کا حامی بن گیا۔ یہاں سے اس نے ایک کشتی میں بیٹھ کر دریائے فرات کے راستے کوفے جانے کا پروگرام بنایا۔ کوفے پہنچ کر اس نے ابن طباطبا کو ذاتی رنجشوں کے باعث زہر دے کر ہلاک کر دیا اور اس کی جگہ محمد بن محمد بن زید کو مامور کر دیا۔ اس طرح کوفے کے تمام اختیارات سری بن منصور کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس کے بعد اس نے بصرہ اور واسط کی تسخیر کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی اپنی پسند کے حاکم مقرر کر دیے۔

ہرثمہ نے اسے اس بغاوت کا مزا چکھانے کے لیے فوج مدائن بھیج دی جس

سری بن منصور کی فوجوں کو شکست دی۔ سری بن منصور کوفے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ جب اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہونے لگے تو وہ آٹھ سو سواروں کو لے کر سوسہ کی طرف بھاگ نکلا۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ حسن بن علی المامونی کی فوجوں سے ہوگئی۔ لڑائی میں اس کے ساتھی مقابلہ نہ کر سکے اور سری بن منصور گرفتار کر لیا گیا۔ اسے خلیفہ المامون کے پاس بھیج دیا جو اس وقت نہروان میں مقیم تھا۔ اس نے سری بن منصور کو موت کی سزا دی۔ چنانچہ ۱۰ ربیع الاوّل [illegible] ۱۸ اکتوبر ۸۱۵ء کو اس کا سر قلم کر دیا گیا اور بغیر سر کے دھڑ کو بغداد کے پُل پر لٹکا دیا گیا۔ سری بن منصور بغاوت کو دس ماہ تک جاری رکھ سکا تھا۔

سریجیہ

اصولِ فقہ کا ایک بہت پرانا مسئلہ۔ اس کا شمار ان مسئلوں میں ہوتا ہے جو وضع کرنے والوں کے نام سے موسوم ہیں۔ (جیسے الغزالی، حنبلی، ابن سریج وغیرہ)۔ اس مسئلے کی رو سے "یمین بالدائرہ" سے کام لے کر کسی بھی ایسے حلفیہ معاہدے کو منسوخ کیا جا سکتا ہے جس میں معاہدہ کرنے والا اس بات کا عہد کرے کہ اگر وہ اپنے عہد سے پھر جائے تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ مسئلہ ابن سریج نے وضع کیا تھا اسی اعتبار سے سریجیہ کہلایا۔

سریکت اسلام

انڈونیشیا کی ایک سیاسی جماعت جس کی بنیاد سوراکارتا (جاوا) میں رکھی گئی۔ مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنا، غیر اسلامی طرزِ معاشرت اور فرسودہ رسم و رواج کی بیخ کنی، اسلامی اخوت، رواداری اور بین الاسلامی اتحاد کو فروغ دینا، ملک میں بسنے والے لوگوں کی تعلیمی اور ذہنی ترقی کے لیے کام کرنا اور صنعت و تجارت کو فروغ اور عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا، اس جماعت کے بنیادی مقاصد تھے۔

اس جماعت کے وجود میں آنے کے بارے میں ایک معمولی سے واقع کا پورا پورا ہاتھ ہے جو ۱۹۱۰ء میں ظہور پذیر ہوا۔ جاوا کے نواح میں ایک قصبے لاوین میں بہت سے جاوی تاجر اور سوداگر رہتے تھے۔ یہاں چینی سوداگروں اور جاویوں میں بہت مقابلہ ہوتا تھا۔ ایک چینی کونگسی (KONGSI) (کمپنی) کی بددیانتی کا قصہ زبانِ زدِ عام ہوگیا۔ اس موقع پر جاوی تاجروں نے متحد ہو کر چینی مال و اسباب کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ اس وقت تاجروں نے متحد ہو کر ایک جماعت "سریکت دگانگ اسلام" یعنی اسلامی تاجروں کی جماعت تشکیل دی تھی۔ چینی مال و اسباب کے مقاطع کی تحریک کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کے باعث عام لوگ بھی اس میں شامل ہونے لگے۔ چنانچہ لاوین کے تمام مسلمانوں نے متحد ہو کر ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام انہوں نے "سریکت اسلام" یعنی اسلامی جماعت رکھا۔

اس جماعت کی تاریخ کو لوگ عام طور پر تین ادوار میں بانٹتے ہیں :

الف۔ پہلی قومی کانگرس تک کا دور۔

ب۔ قومی کانگرس کے عروج کا دور۔

ج۔ انتہا پسند سریکت رعایا کے قیام سے قبل سریکت اسلام کے زوال کا دور۔

سریکت اسلام اپنی بعض خامیوں کے باعث زوال پذیر ہوئی جس کی وجہ اقتصادی میدان میں ناکامیاں تھیں۔ جاویوں میں [illegible] تربیت مفقود تھی [illegible] اقتصادی سرگرمیوں کو نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ بعض رہنماؤں نے سریکت [illegible] کا سرمایہ اپنی ذاتی منفعتوں میں خرچ کر دیا تھا۔

بہرحال سریکت اسلام نے کچھ نہ کچھ مثبت کام بھی سرانجام دیئے [illegible] اسلام کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی [illegible] کا کام [illegible] سنبھالا جو انڈونیشیا کی آزادی کے بعد ملک کی سب سے بڑی [illegible] سے وابستہ ہوگئی۔

سری السقطی

ایک صوفی بزرگ۔ آپ کا پورا نام ابو الحسن بن مغلس [illegible] کے ماموں اور نوری، خراز اور خیر نساج کے مرشد تھے۔ صوفیوں کے [illegible] خرقہ میں آپ کا ذکر حضرت معروف الکرخیؒ اور حضرت جنیدؒ کے درمیان [illegible] حضرت جنیدؒ آپ کے مرید تھے اس لیے وہ اپنی خواہش کے مطابق [illegible] کے مقبرے میں ہی مدفون ہیں۔ آپ کی وفات بغداد میں ۲۸ رمضان [illegible] ۸۷۰ء یا ۲۵۳ھ ۸۶۷ء کو ۹۸ یا ۹۷ سال کی عمر میں ہوئی۔ آپ کا مقبرہ [illegible] میں آج بھی موجود ہے۔

سری السقطیؒ اپنے عقائد کے مطابق المحاسبی کے شاگرد تھے [illegible] وہ ایک ایسی دو طرفہ محبت حقیقی پر زور دیتے نظر آتے ہیں جو خدا کو بندے سے [illegible] ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عشق حقیقی کو پا لینے کے بعد کوئی جسمانی تکلیف کا احساس باقی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ قیامت کے روز عاشقوں کا مقام موسیٰ، عیسیٰ اور [illegible]

صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی اُمتوں سے بلند تر ہوگا۔ آپ پر امام حنبل نے اس لیے اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن مجید کو مخلوق مانتے تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں زہد سے کام نہیں لیا کرتے تھے۔

سعادت

نیک بختی۔ یہ لفظ اسلام کے بہت سے تصوّرات کے ساتھ مختلف النوع صورتوں میں وابستہ ہے۔ عام انداز میں اس لفظ کے معنی نیک فال اور خوش نصیبی کے لیے جاتے ہیں۔ اس لفظ کے بہت سے مفاہیم ہیں لیکن یہ لفظ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث میں ضرور آیا ہے۔

"اللہ سعادت کے کاموں میں اہلِ سعادت کی مدد کرتا ہے۔" (بخاری مسلم)

دربار کی اصطلاح میں اس لفظ سے شان و عظمت لیے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ کا ایک نام "درِ سعادت" بھی تھا۔ اس کے علاوہ ترک عہدے داروں کا ایک خطاب "سعادتلی" بھی تھا۔ ابنِ مسکویہ نے اپنی کتاب الفوز الاصغر میں لفظ سعادت کو نفس کی ایک حالت بیان کیا ہے۔ بقول اُن کے، یہ حالت اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب نفس پیدا کرنے والے اور مبدا کی طرف رجوع کرے، اس سے توحّد اختیار کرے اور ہر موجود میں وحدت محسوس کرے۔ ابنِ مسکویہ نے یہ بھی کہا ہے کہ سعادت حاصل کرنا حکمت پر منحصر ہے اور حکمت نظری و عملی ہے، جو انفرادی اور اجتماعی امور میں عدل کی کیفیت عمل پیدا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں بار بار سعادت کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس سے مراد اطمینانِ نفس کے علاوہ فوز و فلاحِ کلّی بھی لیا ہے۔

سعدان

سعدان سے مراد دو مشہور ستارے زہرہ اور مشتری ہیں۔ یہ لفظ زحل اور مریخ کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مشتری کو سعدِ اکبر کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جو شخص اس کے زیرِ سایہ پیدا ہوگا وہ آئندہ زندگی میں خوش و خرم رہے گا۔ وہ عبودیت، خدا کے خوف، راستبازی اور زہد و ارتقا میں امتیازی حیثیت کا مالک ہوگا۔ زہرہ کو سعدِ اصغر کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اس کے زیرِ سایہ پیدا ہونے والا آدمی اپنی زندگی میں خوش بختی اور تمام دنیوی مسرتیں حاصل کرنے میں کامیابی کی توقع رکھ سکتا ہے۔

سعد الدین حموی

سعد الدین حموی بن محمد بن المؤیّد بن ابی الحسن بن محمد حمّویہ ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء یا ۵۹۵ھ / ۱۱۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خاندانِ حموی کا ایک قصبے حما کے نام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ الیافعی کہتے ہیں کہ آپ دراصل بحرین کے رہنے والے تھے۔ سعد الدین اپنی جوانی کے زمانے میں خوارزمی درویشوں کی ایک جماعت میں شامل ہوگئے تھے۔ یہ جماعت ایک مقتدر صوفی نجم الدین کبریٰ کے زیرِ اثر قائم ہوئی تھی۔

سعد الدین اپنے زمانے کے مشہور و معروف صوفیہؒ کے گروہ میں سے ایک تھے۔ الیافعی نے بھی اپنی کئی کتابوں میں ان کی کرامتوں اور ان کے مریدوں کا ذکر کیا ہے، انہوں نے ان کے ملفوظات بھی نقل کیے ہیں۔ ایک کتاب جو مناقب و کرامات سے متعلق ہے میں الیافعی نے لکھا ہے کہ سعد الدین کی روح تیرہ دن تک ان کے جسم سے الگ رہی۔ سعد الدین نے فارسی اور عربی میں بے شمار صوفیانہ نظمیں اور رباعیات لکھی ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں تصوّف کے بارے میں شائع ہونے والے کئی رسائل کے مصنف تھے۔ آپ نے شام میں جبل قاسیون کے مقام پر کافی عرصہ تک گمنامی کی زندگی بسر کی۔ بعد میں خراسان کی جانب مراجعت کی اور بحرآباد میں رہائش اختیار کرلی۔ آپ کا انتقال ۱۰ ذی الحجہ ۶۵۸ھ / ۱۰ نومبر ۱۲۶۰ء کو ہوا۔ آپ کا مزار آج بھی بحرآباد میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

سعد الدین کوپک

ایشیائے کوچک کی ایک اہم شخصیت۔ اس کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے مذہب اسلام خود اختیار کیا تھا۔ لیکن اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے والد کا نام محمد بتایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور حسب و نسب کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ علاؤالدین کے عہدِ حکومت میں سعد الدّین سلطنت کی ایک اہم شخصیت مانا جاتا تھا۔ ایک سرائے جو قونیہ سے تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے کے بارے میں مشہور ہے کہ سعد الدّین کوپک نے بنوائی تھی۔ اس کا اندرونی حصّہ علاؤالدین کے دورِ حکومت کے آخری سال ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں مکمل کیا گیا تھا بعد میں غیاث الدین کیخسرو کے دَور میں سعد الدین کا کردار خاصا اہم نظر آتا ہے وہ غیاث الدین کے ساتھ وابستہ تھا اور اسی کے زیرِ اثر یہ واقع بھی رونما ہوا۔ کہ حسام الدین قیرخان کو جو سیواس کا والی تھا اور جو سلجوقیوں کے دامن میں پناہ گزین تھا، کو عزّ الدّین کی حمایت کرنے کا الزام لگا کر گرفتار کرلیا گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خوارزم کے امیروں نے جو اس وقت ایشیائے کوچک میں رہائش پذیر تھے، ہزاروں خوارزمیوں کی مدد سے سلطنتِ سلجوق کو تباہ و برباد کر دیا اور خود شام اور عراق کی جانب چلے گئے۔

سعد الدین کی تعمیر کردہ سرائے لوگوں میں زازادین خانی کے نام سے مشہور ہے۔ اس سرائے کے بیرونی دروازے پر ۶۳۴ھ کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے جو غیاث الدین کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔

سعد بن ابی وقاص

ایک نامور سپہ سالار اور صحابیٔ رسولؐ۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ آپ کا نام سعد اور کنیت ابو اسحاق ہے، سعد بن ابی وقاص کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ اسی لیے کئی مواقع پر رسولِ اکرمؐ آپ کو ماموں کہہ کر بھی مخاطب کر لیا کرتے تھے۔ آپ اسلام کے آغاز میں ہی مسلمان ہوگئے تھے۔ اس سلسلے میں بعض علماء انھیں چھٹے اور بعض چوتھے مسلمان قرار دیتے ہیں۔ قبولِ اسلام کے وقت آپ کی عمر ۱۷ سال تھی۔ آپ نہ صرف تمام غزوات میں بھی شریک رہے۔ بلکہ اسلام اور کفر کے تقریباً ہر معرکے میں شامل ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں: خالدؓ بن ولید کے واپس چلے جانے کے بعد الحیرہ میں المثنیٰؓ بن حارثہ نے فوج کی قیادت سنبھال لی۔ لیکن جب ایران کے حملہ کر دینے کا خطرہ محسوس ہوا تو حضرت عمر فاروقؓ سے کمک کی درخواست کی۔ اس پر حضرت عمرؓ پہلے تو فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے تیار ہوگئے لیکن بعد میں آپ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو سپہ سالارِ اعظم کا عہدہ سونپ دیا۔ اس کے بعد آپ نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ ایرانیوں پر چڑھائی کر دی اور قادسیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیئے۔ یہاں ۱۶ھ میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سعدؓ

خود عملی حصہ نہ لے سکے کیونکہ وہ بیمار تھے۔ لیکن اپنی فوجوں کو برابر احکامات اور جنگی نقل و حرکت کے بارے میں ہدایات جاری کرتے رہے۔ بالآخر ساسانی سردار رستم کے مارے جانے کے بعد یہ جنگ ختم ہو گئی اور ایرانی شکست کھا کر مدائن کی طرف کوچ کر گئے۔

یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہے۔ لیکن ایرانی زیادہ عرصہ تک مدائن پر بھی قابض نہ رہ سکے اور ساسانی بادشاہ یزدگرد کو یہاں سے بھی بھاگ جانا پڑا اس کے بعد سعدؓ اس شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں سے آپ کو بے شمار مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا۔ آپ نے مدائن کو ہی اپنا عارضی طور پر صدر مقام بنا لیا۔ اس سال حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے ایرانیوں کو جلولاء کے مقام پر شکست فاش سے دوچار کیا اور اس کے قریب ہی کوفے کی بنیاد رکھ دی حضرت سعدؓ نے کوفے آ کر فوجی چھاؤنی قائم کر دی۔ یہ مسلمانوں کی پہلی چھاؤنی تھی۔ یہ نیا شہر تیزی سے ترقی کی جانب منازل طے کرنے لگا تو خلیفہ حضرت عمرؓ نے سعدؓ کو اس شہر کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہاں آپ نے طاقِ خسرو سے ملتا جلتا ایک محل تعمیر کرایا۔ جسے حضرت عمرؓ نے ناپسندیگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو سادہ زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو ۲۰ھ/۶۴۱ء میں اس عہدے سے برخاست کر دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے آپ کی عظیم الشان فوجی اور انتظامی خدمات کا نمایاں شان اعتراف کیا۔ جب حضرت عمرؓ بستر علالت پر تھے تو انھوں نے نئے خلیفہ کا چناؤ کرنے کے لیے جن چھ صحابہ کرام کو منتخب کیا تھا ان میں سے ایک آپ بھی تھے

بعد میں حضرت عثمانؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو دوبارہ کوفے کی گورنری سونپ دی لیکن سعدؓ زیادہ عرصہ تک گورنر نہ رہے بلکہ جلد ہی انھیں ایک بار پھر برخاست کر دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد آپ نے سیاسی زندگی سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی، اور بقیہ زندگی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر گزار دی۔ ایک روایت کے مطابق آپ کا انتقال ۵۰ھ/۶۷۱ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا۔ آپ نے اپنے پیچھے کچھ ترکہ بھی چھوڑا تھا۔ آپ کو مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

سعد بن حبتہ

حضورؐ کے مشہور صحابی۔ آپ کا نام سعد تھا۔ حبتہ آپ کی والدہ کا نام تھا جو آپ کے نام کے ساتھ بطور ابن کے لگایا جاتا ہے۔ آپ نے پندرہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا تھا۔ جب غزوہ خندق ہوا تو آپ کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ آپ نے اس غزوہ میں بھرپور شرکت کی۔ حضورؐ نے بھی آپ کی بہادری اور جانبازی دیکھ کر اُن کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ سعد بن حبتہ نے اپنی وفات کے بعد تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ آپ حنفی فقہ کے دست راست کے طور پہ مشہور ہیں۔ اسلام کے پہلے قاضی بھی آپ ہی تھے۔ امام ابو یوسفؒ آپ کی اولاد میں سے ہی ہیں۔ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ نے کوفہ میں رہائش اختیار کر لی یہاں ہی آپ کا انتقال ہوا۔

سعد بن ربیع

خزرج قبیلہ کے سردار اور حضور کے ممتاز صحابہ میں سے ایک تھے۔ آپ بیعت عقبہ اولیٰ میں مسلمان ہوئے۔ آپ کا نام اسلامی بھائی چارہ کا بہترین مظاہرہ کرنے والے انصاروں میں شامل ہے۔ آپ نے اپنے تمام مال و دولت، جائیداد وغیرہ میں سے آدھا حصہ مہاجرین کو دے دیا تھا، بلکہ آپ اس کام میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک بیوی بھی حضرت عبدالرحمٰنؓ مہاجر کو پیش کر دی تھی۔ لیکن انہوں نے اس پیش کش کو بصد احترام شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ آپ کتابت بھی بہت اچھی کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہؓ بھی آپ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ غزوہ احد میں آپ نے شرکت کی۔ دشمنوں کے ساتھ لڑائی میں آپ کے نیزوں سے بارہ زخم لگے۔ آپ نے اسی لڑائی میں جامِ شہادت نوش کیا۔ آپ کو ان کے چچا خارجہ بن ابی زبیر کے ساتھ ہی، ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

سعد بن زید

ایک مشہور صحابی۔ آپ کا نام سعد بن زید انصاری الاشہلی تھا۔ ابن اسحاق کہا کرتے تھے کہ سعدؓ بن زید کا سلسلہ نسب سعد بن زید بن مالک بن عبید بن کعب بن عبید الاشہل ہے۔ آپ نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی۔ اس کے بعد بھی ہونے والے کئی غزوات میں شریک ہوئے اور حضورؐ کے ہمرکاب رہے۔ جنگ خندق میں بھی آپ شریک ہوئے اور اس میں بہادری اور جانبازی کے خوب جوہر دکھائے۔

سعد بن عائذ

آپ حضرت عمارؓ بن یاسرؓ جو مشہور صحابی تھے کے غلام تھے۔ [illegible] سعدؓ القرظ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ حضورؐ نے انھیں مسجد قبا میں مؤذن مقرر کیا۔ جب حضورؐ کا وصال ہو گیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دینا ترک کر دی [illegible] وقت ابو بکر صدیقؓ نے سعد بن عائذ کو مسجد نبوی میں اذان دینے پر مقرر کر دیا۔ یہاں آپ اپنے انتقال سے قبل تک اذان دیتے رہے۔ بعد میں [illegible] اور ورثاء نے اذان دینے کا کام کیا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے [illegible] دینے کے لیے قبا سے مدینہ بلایا تھا۔

سعد بن عبادہ

حضورؐ کے صحابی۔ آپ کا نسب سعد بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ [illegible] بن ثعلبہ بن طریف ہے۔ سعدؓ بن عبادہ ایک متمول شخص تھے [illegible] جاہلیت میں عرب میں لکھنا جاننے والے لوگوں میں ہوتا تھا۔ آپ [illegible] تیر انداز کے طور پر بھی مشہور تھے۔ آپ جنگ بدر میں شریک نہیں [illegible] جنگ احد میں شریک ہوئے۔ آپ نے حضرت سعد بن معاذؓ کے ساتھ [illegible] تیمارداری بھی کی تھی۔ کیونکہ اس جنگ میں حضرت [illegible] زخم بھی آئے تھے۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ [illegible] غزوات میں ایک جانباز سپاہی کے طور پر شرکت کی۔ [illegible] بھی سونپی گئی۔ آپ کو سخاوت میں بھی خاص مقام حاصل تھا۔ [illegible] محاصرہ کیا گیا تھا تو محاصرے کے دوران میں اپنے خرچ پر کھجوریں [illegible] مسلمانوں [illegible] تقسیم کیں۔ اسی طرح بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے والی فوجوں کو انہوں نے [illegible] فراہم کیا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض لوگوں نے آپ کو جانشین مقرر کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ کے وصال کی خبر مدینے میں مشہور ہوئی

تو اوس اور خزرج کے قبیلے جمع ہو گئے اور سعدؓ بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن اسی وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اجتماع نے معمولی سی بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت سعد بن عبادہ اس کے بعد سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے، اور شام کی طرف ہجرت کر گئے جہاں آپ کا انتقال ۱۵ھ / ۶۳۷ء میں ہوا۔

سعد بن مالک

ایک ممتاز صحابی۔ آپ کا نسب کچھ یوں ہے۔ سعد بن مالک بن منان بن عبید بن ثعلبۃ بن الابجر۔ آپ کی کنیت "خدری" مشہور ہے۔ آپ حضورؐ کے ساتھ کئی غزوات میں شامل ہوئے۔ آپ غزوہ خندق میں بھی شامل تھے۔ آپ ایک بلند پایہ عالم اور فاضل شخص تھے۔ آپ کو حضورؐ کی بہت سی حدیثیں یاد تھیں۔ آپ کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا۔

سعد بن معاذ

ایک ممتاز اور جلیل القدر صحابی۔ آپ کا تعلق بنی اوس سے تھا۔ آپ مدینہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سعد بن معاذؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد بنو عبدالاشہل بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ حضور نے آپ کا لقب سید الانصار یعنی انصار کا سردار، رکھا تھا۔ آپ کا شمار اپنی قوم کے پیشوا اور اکابر صحابہ میں کیا جاتا ہے۔ آپ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استقلال اور جوانمردی سے کھڑے رہے۔ جنگ خندق میں بھی آپ شریک تھے۔ جنگ کے دوران آپ کی آنکھ میں تیر لگا۔ جس سے ایک ماہ تک خون جاری رہا۔ بعد میں آپ اسی زخم کے باعث ذیقعد ۵ھ میں صرف ۳۷ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔

سعد بنو

مراکش کے ایک خاندان کا نام۔ یہ خاندان ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں وطاس خاندان کے بعد مراکش پر حکمران ہوا۔ ان دنوں پرتگالیوں اور ہسپانویوں نے اندلس اور شمالی افریقہ کی اسلامی حکومت کے خلاف زبردست مہمات کا آغاز کر رکھا تھا۔ ان دنوں بیشتر خاندان جو اپنی مدافعت نہ کر سکے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ خاندان بنو سعد کا سب سے پہلا شخص جو برسراقتدار آیا اس کا نام محمد الملقب بہ المہدی والقائم بامراللہ تھا۔ اس نے انوغال کے علاقہ الحاحہ میں ۹۲۴ھ / ۱۵۱۷ء یا ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ اس کے دونوں بیٹے احمد الاعرج اور محمد ملقب بہ مہدی اس کے جانشین ہوئے انہوں نے دارالسلطنت تاردانت کے مقام پر اپنا مضبوط مرکز بنا لیا تھا۔ کیونکہ انہیں عیسائیوں کے حملے کا شدت کے ساتھ احساس تھا۔

خاندان بنو سعد کے آخری حکمران احمد العباس کو حکمران ہونے کا اعلان کرنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ محمد شیخ الاصغر نے ۱۶۵۴ء تک حکومت کی اور اس کے ساتھ ہی سا تھ خاندان بنو سعد کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ حکومت ختم ہو گئی اس خاندان کے مختلف لوگوں کی ترتیب جانشینی یہ تھی۔

(۱) القائم بامراللہ ۱۵۰۹ء میں بادشاہ بنا (۲) محمد المہدی اپنے بھائی سمیت ۱۵۲۴ء میں بادشاہ بنا (۳) محمد المہدی ۱۵۵۴ء (۴) عبداللہ ۱۵۵۴ء (۵) المتوکل ۱۵۷۴ء (۶) عبدالملک ۱۵۷۶ء (۷) احمد المنصور ۱۵۷۸ء (۸) ابو فارس عبداللہ زیدان ۱۶۰۵ء

محمد قائم بامراللہ ۱۵۰۹ء

- احمد الاعرج (۱۵۲۴ء)
  - زیدان
- محمد المہدی (۱۵۲۴ء)
  - محمد المہدی (۱۵۲۴ء)
    - الحران
    - عبدالقادر
    - عبداللہ (۱۵۵۷ء)
      - محمد المتوکل (۱۵۷۴ء)
      - الناصر
    - عبدالملک (۱۵۷۶ء)
    - احمد المنصور (۱۵۷۸ء)
      - محمد شیخ المامون (۱۶۰۵)
        - عبدالملک
        - عبداللہ
        - محمد الزغدہ
      - زیدان (۱۵۰۶)
        - عبدالملک (۱۶۳۰)
        - الولید (۱۶۳۵)
        - محمد شیخ الاصغر (۱۶۳۶ء)
          - احمد العباس
        - احمد ۱۶۴۵ء
      - ابو فارس عبداللہ
        - عبدالملک
      - عبداللہ الزبدہ
    - عثمان
    - عبدالمومن
      - محمد
      - داؤد
    - عمر

نوٹ:- قوسوں میں جو سنین لکھے ہیں وہ حکمران کے پہلے اعلان تخت نشینی کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۹) عبدالملک بن زیدان ۱۶۳۰ء (۱۰) الولید ۱۶۳۵ء (۱۱) محمد شیخ الاصغر ۱۶۳۶ء تا ۱۶۵۴ء اس کے بیٹے احمد العباس کو بادشاہ بننے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

سعد زاغلول پاشا

سعد زغلول پاشا مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں ابیانہ میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ اس کے والد کا نام ابراہیم زغلول تھا۔ وہ ایک کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ جب سعد زغلول چھ سال کا ہوا تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش اس کے بڑے بھائی نے کی۔ سعد زغلول نے پانچ سال تک مکتب میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں اس نے پڑھنا لکھنا اور حساب کتاب سیکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کر لیا۔ بعد میں علم نحو اور فقہ کی تعلیم جامع الدسوقی میں حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعہ الازہر چلے گئے۔ اس وقت یہ ادارہ علوم اسلامیہ کا بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ سعد زغلول شیخ محمد عبدہ کا شاگرد تھا۔ اسی لئے ان کے افکار و خیالات کا بھی دل و جان سے حامی تھا اتفاق سے انہی دنوں سید جمال الدین افغانی بھی مصر تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ سعد زغلول ان کے اصلاحی خیالات سے مستفید ہوئے۔ اسی لئے مصری تحریک آزادی میں سعد زغلول نے خوب خوب تقاریر کیں اور عملی حصہ لیا۔ جب ۱۸۸۰ء میں شیخ محمد عبدہ الوقائع مصری کے مدیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے زغلول کو بھی مجلس ادارت میں شامل کر لیا۔ یہ ملازمت تقریباً دو سال تک جاری رہ سکی۔ کیونکہ ان پر اعرابی پاشا کی بغاوت میں شریک ہونے کا الزام لگا کر قید کر لیا گیا تھا زغلول کو تین ماہ تک قید میں رکھا گیا۔ جب کہ شیخ محمد عبدہ کو ملک بدر کر دیا گیا قید سے رہائی حاصل کرنے کے بعد زغلول نے وکالت کی تعلیم حاصل کی اور

کامیابی کے بعد وکالت شروع کر دی اس پیشہ میں اسے قانونی قابلیت اور معاملہ فہمی کے باعث اسے مصری عدالتوں کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں سعد زغلول کو وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں مصر کے تمام سکول اور مدرسے سیاسی تحریکوں کا گڑھ بنے ہوئے تھے ان کے نظم و نسق کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ زغلول نے بڑی محنت اور لگن سے ان مسائل پر قابو پایا۔ اس کے دور وزارت کا نمایاں ترین کارنامہ انگریزی کی بجائے عربی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ہے۔

۱۹۱۰ء میں سعد زغلول کو وزیر انصاف بنا دیا گیا۔ لیکن دو سال بعد لارڈ کچنر نے اسے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر ۱۹۱۷ء میں پہلی مصری پارلیمنٹ قائم ہوئی تو زغلول اس کا نائب صدر بن گیا۔ لیکن جب ۱۴ر جولائی کو پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں نے مصر کے خدیو عباس کو معزول کر کے حسین کامل کو تخت کی ذمہ داری سونپ دی۔ حسین کامل کی وفات کے بعد ۹ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو سلطان احمد فؤاد تخت نشین ہو گیا۔ ان دنوں مصر میں مارشل لا جاری تھا۔ جنگ کے خاتمے تک سعد زغلول انتظار کرتا رہا۔ جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو سعد زغلول نے پیرس کی صلح کانفرنس میں مصر کے قومی مطالبات پیش کرنے کی کوشش کی جو برطانوی ہائی کمشنر کی بھرپور مخالفت کے باعث پیش نہ کی جا سکی۔

۸ر مارچ ۱۹۱۹ء کو برطانیہ نے سعد زغلول پاشا کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد تمام مصر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ سعد زغلول نے ایک وفد پیرس کی صلح کانفرنس میں بھیجنے کے لئے تشکیل دیا تھا لوگوں نے اس کی رعایت سے زغلول کے حامیوں کو وفد پارٹی کا نام دے دیا چنانچہ اس کی گرفتاری پر وفد پارٹی نے خوب خوب احتجاجی تحریک چلائی۔ لارڈ ایلنبی نے ہڑتالوں اور مظاہروں کے پیش نظر سعد زغلول اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ رہائی پاتے ہی وہ مالٹا سے پیرس آ گیا۔ جہاں سیاسی لوگوں سے مصر کے مطالبات منوانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مصر آ گیا۔ مصر آنے کے بعد مصری لوگوں نے مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد تیز تر کر دی۔

۱۹۲۱ء کے آخری دنوں میں مصر ایک بار دوبارہ ہڑتالوں، مظاہروں اور توڑ پھوڑ کی زد میں آ گیا۔ زغلول پاشا کو بھی دوبارہ گرفتار کر کے عدن اور پھر سیشلز کے جزائر میں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کے دوران میں اس نے انگریزی زبان سیکھ لی۔ ۴ر اپریل ۱۹۲۳ء کو اسے خرابی صحت کے باعث رہا کر دیا گیا چنانچہ جب وہ مصر واپس آیا تو اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس سے پہلے انگریزوں نے مصر کو نیم آزاد ملک بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ مصری لوگ اس اعلان سے قطعاً ناخوش تھے۔ کیونکہ اس کی رو سے سول پولیس اور اعلیٰ افسران فوج جو برطانوی تھے کو زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ جب کہ بادشاہ کو کم اختیارات ملنے تھے۔ پھر جب اس نئے قانون کے تحت ۱۹۲۴ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو وفد پارٹی نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی۔ سعد زغلول نے وزارت بنائی۔ اس وقت مصر کی فوجوں کا کمانڈر انچیف بھی انگریز تھا اور مصر پر برطانوی فوجوں کا قبضہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ نومبر ۱۹۲۴ء کو کسی مصری شخص نے برطانوی کمانڈر انچیف کو قتل کر دیا۔ وفد پارٹی نے اس واقعے کی پرزور مذمت کی۔ لیکن برطانیہ کا پارہ عروج پر پہنچا ہوا تھا چنانچہ اس نے مصری حکومت کو ایک الٹی میٹم دے دیا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر معافی مانگے۔ مجرموں کو سزا دے۔ پانچ لاکھ پونڈ ہرجانے کے طور پر ادا کرے اور ہر قسم کے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کو بند کر دے اور مصر پر برطانوی بالادستی قبول کرے۔ ساتھ ہی سوڈان سے مصری افواج کو نکال لیا جائے حکومت مصر نے برطانیہ کے آخری مطالبے کے علاوہ باقی تمام مطالبے منظور کر لئے لیکن برطانیہ نے اسی پر بس نہ کی بلکہ سوڈان میں جبر و تشدد کا بازار گرم کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مصری نوجوانوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سعد زغلول نے پارلیمنٹ کو برخاست کر کے خود بھی استعفیٰ دے دیا۔ مئی ۱۹۲۶ء میں مصر کی پارلیمنٹ کے دوبارہ انتخابات ہوئے۔ ان میں بھی وفد پارٹی نے بہت سی نشستیں حاصل کریں۔ لیکن سعد زغلول نے وزارت بنانے سے احتراز کیا اور اپنی مرضی سے ثروت پاشا کو وزیراعظم بنا دیا۔ اس کے بعد برطانیہ کی حکومت سے صلح کی بات چیت شروع کر دی گئی۔ بات چیت کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ سعد زغلول پاشا بیمار ہو گیا اور چند دن بیمار رہنے کے بعد ۲۳ر اگست ۱۹۲۷ء کو انتقال ہو گیا۔ تمام مصر میں اس کی موت سے صف ماتم بچھ گئی۔ وفد پارٹی میں اس کے جانشین مصطفےٰ نحاس پاشا نے مصر کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی

سعدی شیرازی

آپ کا نام شیخ مشرف الدین تھا۔ آپ تقریباً [illegible] میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ چھوٹے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کے بعد سعد بن زنگی جو اتابک تھا، نے ان کی اپنی نگرانی میں پرورش کی۔ اسی لئے آپ نے اپنا تخلص سعدی رکھ لیا۔ آپ کو ابتدائی تعلیم دلا کر مزید تعلیم کے حصول کے لئے بغداد بھیج دیا۔ آپ نے یہاں پر مشہور درسگاہ نظامیہ میں علم حاصل کیا اور بعد میں علم باطن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے ساتھ ہی حج کا مقدس فریضہ بھی انجام دیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں چودہ حج کئے۔ آپ بہترین شاعر کے طور پر بھی مشہور ہیں۔ [illegible] لئے آپ کو بھی فردوسی اور حافظ شیرازی کی طرح شہرت حاصل ہوئی۔ آپ نے اپنی طویل زندگی کے پہلے تیس سال صرف مطالعے میں صرف کئے۔ اس کے بعد تیس سال تک سیر و سیاحت اور شعر گوئی کرتے رہے۔ تیسرے [illegible] میں آپ نے مراقبہ و مجاہدہ اور اپنے کلام کی تکمیل اور ترتیب کی [illegible] بارہ سال تصوف کی اشاعت و تبلیغ میں صرف کئے۔

جن دنوں آپ سیاحت کر رہے تھے تو آپ ہندوستان بھی تشریف [illegible] آپ نے اپنی ہندوستان میں آمد کا ذکر بوستان میں کیا ہے۔ [illegible] گلستان اور بوستان بہت زیادہ مشہور ہیں۔ بوستان [illegible] ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں لکھی گئیں۔ بوستان میں اخلاقی موضوعات پر نظمیں ہیں جب کہ گلستان بنیادی طور پر نثر میں ہے۔ اس میں بھی اہم اخلاقی مسائل کو کہانیوں [illegible] پیش کیا ہے۔ آپ نے ان دو کتابوں کے علاوہ غزلوں کا دیوان، قصائد [illegible] کے مجموعے طیبات اور ہزلیات کی صورت میں بھی لکھے ہیں۔

سعدی شیرازی کا انتقال ذیقعد ۶۹۱ھ ستمبر ۱۲۹۲ء میں [illegible] آپ شیراز میں ہی مقیم تھے۔ ان کا مزار شہر کے مشرقی جانب [illegible]

سعدیہ: جبادیہ

درویشوں کا ایک فرقہ۔ اس فرقے کے بانی سعد الدین الجباوی تھے [illegible]

علاقے میں مقیم تھے۔ درویشوں کا فرقہ ان کے اعتبار سے ہی سعدیہ یا جبادیہ کہلانے لگا۔ سعدالدین جبادی کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے عہد شباب میں والد سے نافرمانی کی اور گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ گھر سے نکل کر وہ ڈاکوؤں کی جماعت کا سرغنہ بن گئے لیکن والد کی دعا سے کشف ہوا اور ان کی اصلاح ہو گئی۔ سعدالدین نے انتہائی زہد و تقشف کی زندگی اپنائی تھی۔ بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کو گئے اور پھر شام واپس آ گئے۔ یہاں آ کر دمشق میں سلسلہ طریقت کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے کا تعلق حضرت جنیدؒ، سری السقطیؒ اور معروف الکرخیؒ سے ہوتا ہوا اہل بیت تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض مؤرخین سعدیہ کو فرقہ رفاعیہ کی ایک شاخ تصور کرتے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ فرقہ سعدیہ کی ٹوپیوں میں بارہ ترک ہوتے ہیں جو زرد رنگ کی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ان کی ٹوپیوں میں چھ کلیاں ہوتیں اور لمبے لمبے بال رکھے ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ مصر میں کافی تعداد میں رہائش پذیر تھا۔ وہ "مولد" کی رات سے ایک دن پہلے ایک رسم ادا کیا کرتے تھے جسے وہ دوسہ کا نام دیتے تھے۔ اس رسم کی ادائیگی کے وقت اس فرقے کا شیخ ایک گھوڑے پر سوار ہوتا جو درویشوں کی پشت پر چلتا تھا۔ بہت سے درویش اس مقصد کے لئے منہ کے بل زمین پر لیٹ جاتے تھے۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ان لوگوں کو گھوڑوں کے پاؤں سے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچتی۔ رسم دوسہ کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں بعض درویش زندہ سانپوں کو کھا جایا کرتے تھے۔ اس رسم کو مصر کے خدیو توفیق نے حکماً بند کرا دیا تھا۔ اس کے بعد رسم دوسہ کی ادائیگی کے بعد ذکر کیا جانے لگا جس کے الفاظ کی ترتیب مقرر تھی۔ جو "اللہ حیّ" اور "یا دائم" تھے۔

تصوف کے بارے میں لکھنے والے اصحاب نے اس فرقہ کی جانب بہت کم توجہ دی ہے۔ جن اصحاب نے اس کی جانب توجہ کی بھی تو وہ صرف اجمالی ذکر سے آگے نہ بڑھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس فرقے نے ابتداً ٹونے ٹوٹکے سے ہی شروع کیا ہوگا اور بعد میں یہ صوفیوں کا ایک فرقہ بن گیا ہوگا۔

سعدیہ، حلیمہ رضؓ

آپ حضرت محمد الرسول صلے اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ تھیں۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنو سعد بن بکر سے تھا۔ عرب میں رواج تھا کہ بچوں کو ان کی مائیں خود دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ انہیں دوسری خواتین کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو انہیں دودھ پلاتی تھیں۔ اسی طرح جب آنحضورؐ پیدا ہوئے تو انہیں بی بی حلیمہؓ سعدیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سال عرب میں قحط پڑا تھا۔ اس لئے دائی حلیمہؓ مکہ آئیں تاکہ کسی بچے کو دودھ پلانے کے لئے حاصل کر سکیں۔ آخرکار وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ جب وہ حضورؐ کو اپنے ہمراہ لے گئیں تو جلد ہی آپؐ کی برکت سے گھر میں خوشحالی آ گئی۔ روایت ہے کہ جب آپؐ دائی حلیمہؓ کے ہاں مقیم تھے تو دو فرشتے آئے جنہوں نے آپ کے سینے کو چاک کر کے خون کا ایک سیاہ جما ہوا قطرہ نکال لیا (الطبری) بچوں کو ان کی رضاعی والدہ کے حوالے کرنے کا رواج صرف متمول گھرانوں میں تھا۔

حضرت حلیمہؓ بنت ابی ذؤیب کا خاوند الحارث تھا۔ اس طرح ان کا ایک بیٹا عبداللہ آپ کا رضاعی بھائی بن گیا۔ آپ کی انیسہ اور شیما دو رضاعی بہنیں تھیں۔ جب غزوۂ حنین ہوا تو شیما ہوازن کے قیدیوں کے ساتھ قید ہو کر مسلمانوں کے پاس پہنچیں۔ جب حضورؐ نے انہیں دیکھا تو ان کی عزت کی اور کئی تحفے تحائف دے کر آزاد کر دیا۔

سعودی عرب

آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے اپنی سرتوڑ کوششوں سے حجاز اور نجد کی مملکتوں کو متحد کر کے ایک لڑی میں پرو لیا۔ اس طرح دنیا میں ایک نئے ملک کی بنیاد پڑی۔ ریاستوں کو باہم مدغم کرنے کے بعد اس نئے ملک کا نام المملکۃ العربیہ السعودیہ رکھا گیا۔ اس ملک کا کل رقبہ تقریباً ۹۲۷۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب کا تقریباً ۹/۱۰ حصہ سعودی عرب میں شامل ہے۔

سعودی عرب ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں اسلامی قوانین نافذ العمل ہیں۔ تمام سربراہان مملکت کا قوانین شرعیہ کا پابند ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اسی لیے حکومت کو اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ملک میں موجود تمام علماء کا مکمل تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔ اس ملک میں رائج قوانین کی اساس قرآن حکیم کے احکامات پر رکھی گئی ہے اسی لیے ملک میں باقاعدہ کوئی پارلیمنٹ یا آئین نہیں ہے۔ بادشاہ جو سربراہ مملکت اور وزیراعظم ہوتا ہے، اپنی مجلس وزراء کے مشورہ سے انتظامی اور مذہبی اختیارات استعمال کرتا ہے۔ اس ملک کے پرچم کا رنگ سبز ہے جس پر کلمہ طیبہ تحریر ہوتا ہے۔ سعودی عرب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور آبادی تقریباً ایک کروڑ ہے۔ یہاں کے تمام لوگوں کی عام بول چال عربی زبان ہے۔

سعودی عرب کا شاہی دارالحکومت ریاض ہے لیکن انتظامی دارالحکومت کا درجہ جدّہ کو حاصل ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جیسے قابل احترام شہر بھی اسی ملک میں شامل ہیں۔ اسی لیے بادشاہ سعودی عرب کو پاسبان حرم بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک سے لاکھوں مسلمان یہاں آ کر فریضۂ حج ادا کرتے ہیں جن کے لیے حکومت عرب خصوصی انتظامات کرتی ہے۔

ایک عرب بچی کھجور توڑ رہی ہے

سعودی عرب کی معیشت کا دارومدار تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات پر ہے کیونکہ یہ تیل پیدا کرنے والا دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ یہاں سے تیل اور پٹرولیم

خانہ کعبہ کا ایک منظر

کی مصنوعات بھاری مقدار میں دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ سعودی عرب میں تیل کی پیداوار ۸۵ لاکھ بیرل روزانہ سے زیادہ ہے۔ تیل کی پیداوار کا نصف حصہ مغربی یورپ اور بقیہ نصف امریکہ اور ایشیا کو برآمد کیا جاتا ہے جس سے اربوں ڈالر سالانہ کا زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ تیل کے علاوہ یہاں خام لوہا، تانبہ، چاندی، نمک اور جپسم کے بھی وسیع ذخائر موجود ہیں۔ ان اشیا کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔

سعودی عرب نے گزشتہ برسوں میں زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ آجکل وہاں زراعت کو ترقی دینے کے ایک منصوبہ پر تیزی سے عمل جاری ہے اس کے لیے آبی وسائل کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ بند بھی تعمیر کیے جا رہے ہیں تعلیم کے شعبہ میں بھی گزشتہ سالوں کے دوران میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ شاہی دارالحکومت ریاض میں شاہ سعود یونیورسٹی ہے جس میں آرٹس، سائنسی مضامین، کامرس، ادویہ سازی (بی فارمیسی) اور اسلامیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی سے ملحق کئی کالج بھی بنائے گئے ہیں۔ جن میں سینکڑوں طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جس کا مقام دنیائے اسلام میں بہت بلند ہے۔ بیشتر اسلامی ملکوں سے طالب علم اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز ابن سعود کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ ان کی جگہ شاہ سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ بعد میں نومبر ۱۹۶۴ء میں ان کے بھائی شاہ فیصل بادشاہ بنے اور شاہ سعود بن عبدالعزیز معزول کر دیے گئے۔ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں شاہ فیصل کو قتل کر دیا گیا۔ جن کے بعد ان کے بھائی شاہ خالد نے تاج و تخت سنبھال لیا۔ شاہ خالد نے سعودی عرب کی تعمیر و ترقی کے متعلق کوششوں کو تیز سے تیز تر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ فیصل کے زمانے میں عرب نے اتحاد عالم اسلامی کے لیے جو کردار ادا کیا تھا اس کو بھی شاہ خالد نے مزید مضبوط اور مؤثر بنانے کا کام کیا ہے۔ اب شاہ فہد کے دور میں ترقی کا سفر جاری ہے۔

سعودی عرب کی حکومت اب غریب اور برادر اسلامی ملکوں کو بغیر سود کے بھاری قرضے اور امداد فراہم کر رہی ہے۔ جس سے یقیناً اتحاد عالم اسلامی کے کام کو مزید تقویت ملی ہے۔

حکومت عرب اپنی ضروریات کی چیزیں مثلاً ٹرانسپورٹ، تعمیراتی سامان، کیمیاوی سامان وغیرہ دوسرے ممالک سے درآمد کرتی ہے۔ عرب کے سکے کا نام سعودی ریال ہے جو پاکستان کے ڈھائی روپے کے برابر ہوتا ہے۔

سعی

سَعْی کے لغوی معنی تیز چلنے کے ہیں۔ اس کے بارے میں ایک حدیث ہے "جب نماز کے لیے آؤ تو دوڑتے ہوئے، بے چینی اور اضطراب کے ساتھ نہ آؤ۔ بلکہ سکون، وقار اور اطمینان کے ساتھ آؤ۔"

الزجاج کہتے ہیں کہ ہر کام میں ذوق و شوق، کوشش، عمل [illegible] دکھانا سعی ہے۔ قرآن مجید میں بھی سعی کا ذکر آیا ہے جس کی چند مثالیں [illegible] اس کا عمل رائیگاں نہیں جائے گا" (الانبیاء - [illegible]) [illegible] انسان کو وہی کچھ [illegible] ہے جو وہ عمل کرتا ہے اور اس کا عمل اسے ضرور دکھایا جائے گا [illegible] "جب وہ کام کاج میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے اور سرگرم عمل ہونے [illegible] گئے" (الصّٰفّٰت - ۱۰۲) سعی کا لفظ عام طور پر کسی کام کے لیے سرگرم [illegible] یا کوشش کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن اصطلاحی معنوں میں [illegible] مناسک حج کے سلسلے میں صفا اور مروہ کے درمیان تیز تیز چلنے کے لیے مخصوص [illegible]

سعید بن العاص

حضور ﷺ کے مشہور صحابی [illegible] جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر [illegible] میں اہل کفار کی جانب سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ آپ کے خاندان کا تعلق [illegible] کے بہت ہی اونچے اور ممتاز گھرانوں میں ہوتا تھا۔ حضرت عثمان [illegible] عزت و تکریم کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے قرآن مجید نقل کرنے کا پروگرام بنایا تو سعید بن العاص کو حضور ﷺ کے لہجے سے مشابہت کے باعث قرآن نقل کرنے والی جماعت کا رکن بنایا۔ حضرت عثمان نے آپ کو ۳۰ھ میں [illegible] الولید بن عقبہ کی جگہ [illegible]

سعید رضؓ کو کوفہ کا والی مقرر کیا۔ آپ رضؓ نے اپنے زمانہ ولایت میں طبرستان اور جرجان کے خلاف کئی مہمیں سر کیں۔ لیکن کوفہ کے لوگ آپ کی عزت و احترام بجا طور پر نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے اہل کوفہ کا ایک گروہ خلیفۂ وقت کے پاس آپ کی شکایت لے کر بھی گیا تھا۔ لیکن حضرت عثمان رضؓ نے ان کی شکایت کو نظر انداز کر دیا اور سعید بن العاصؓ کو بطور والئ کوفہ کام کرتے رہنے کے لئے کہا۔ جب آپ کوفہ واپس جا رہے تھے تو راستے میں کچھ لوگوں نے روک لیا اور مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد آپ مدینہ ہی میں رہے۔ بعد میں جب ایک بار کچھ باغیوں نے حضرت عثمان رضؓ پر حملہ کیا تھا تو آپ ان کی جانب سے لڑے۔ اس لڑائی میں سعید رضؓ بن العاص شدید مجروح بھی ہو گئے تھے۔ شہادت عثمان کے بعد آپ مکہ تشریف لے گئے۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ کے زمانے میں والئ مدینہ بھی رہے آپ نے مدینہ سے تین میل دور قصر العقیق کے مقام پر جہاں آپ کی کچھ زمین تھی وفات پائی اس علاقے میں حضرت سعید نے اجازت حاصل کر کے اپنے لئے ایک محل اور باغات وغیرہ بنوائے تھے۔

سعید بن جبیر

آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور آپ کا شمار آئمہ کبار میں کیا جاتا ہے۔ علم حدیث میں آپ کو بہت کمال حاصل تھا۔ فقہ کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ آپ صحابہ کرام سے وقتاً فوقتاً مسائل اور احادیث سن کر اپنے پاس لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ قرآن مجید کے بھی بہترین قاری تھے۔ قرائت اور تفسیر کا فن آپ نے عبداللہ بن عباس سے سیکھا تھا۔ ریاضی کے علم میں بھی آپ کو کافی مہارت حاصل تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی آپ کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے آپ کو کوفہ کا قاضی بھی مقرر کر دیا تھا۔ سعیدؒ بن جبیر، حجاج بن یوسف کو اس کے کاموں کے باعث اچھا خیال نہیں کرتے تھے۔ جب ابن اشعث نے حجاج اور بنو امیہ کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تو سعیدؒ بن جبیر نے ابن اشعث کی حمایت کی۔ لیکن ابن اشعث کو اس لڑائی میں شکست ہوئی۔ جس کے بعد حجاج بن یوسف نے آپ کو گرفتار کروا کر بلایا اور انہیں قتل کرا دیا۔

سعید بن زید

[illegible] صحابیٔ رسولؐ ہیں۔ آپ حضرت عمر رضؓ بن الخطاب کے بھتیجے اور بہنوئی تھے آپ کے والد زید بن عمرو اپنے زمانے میں عرب کے مشہور موحد مانے جاتے تھے۔ صحیح بخاری میں ان کے بارے میں درج ہے کہ دور جاہلیت میں ہی زید بن عمرو نے حق کا [illegible] دیکھ کر بت پرستی ترک کر دی اور دین ابراہیمی کی جانب رجوع کر لیا تھا ان کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے ہو گیا تھا اور انہیں کوہ حرا کے نیچے دفن کیا گیا۔ حضرت سعید بن زید کے اسلام لانے کے بارے میں بہت سی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ حضرت سعید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الارقم میں داخل ہونے اور دعوت حق شروع کرنے سے پیشتر ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یوں بھی اسلام لانے والے جلیل القدر صحابہ میں ان کا نمبر اٹھائیسواں بتایا گیا ہے۔ جب کہ ان کی بیوی کا نمبر ستائیسواں ہے۔ حضرت سعید کی شادی دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے بہت پہلے ہی ہو چکی تھی۔ آپ کی زوجیت میں حضرت فاطمہ رضؓ بنت خطاب تھیں جو رشتے میں آپ کی پھوپھی بھی تھیں۔ حضرت سعیدؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ اسلام لانے سے قبل ہی لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔ اس کا علم ہمیں اس واقعے سے بھی ہوتا ہے۔ جسے ابن سعد نے حضرت عمر کے اسلام لانے کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ”حضرت عمر رضؓ کی بہن اور بہنوئی (یعنی حضرت فاطمہ رضؓ اور حضرت سعید رضؓ) سورہ طٰہٰ پڑھ رہے تھے جو ان کے پاس لکھی ہوئی موجود تھی۔“

آپ غزوۂ بدر میں شریک رہے اس کے علاوہ غزوہ، احد، خندق اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ہجرت کے موقع پر حضرت رافع بن مالک زرقی کو آپ کا اسلامی بھائی بنایا گیا تھا۔ وہ انصار کے ابتدائی مسلمانوں اور بیعت عقبہ کے بارہ افراد میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں آپ کو شام پر حملہ کرنے والی ایک پیدل فوج کی کمان بھی سونپی گئی۔ رجب ۱۴ھ میں دمشق فتح ہوا۔ اس کے محاصرے میں حضرت سعید بن زید نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ اسی لئے جنگ کے دوران ہی حضرت ابوعبیدہ رضؓ نے آپ کو دمشق کا گورنر مقرر کر دیا۔ آپ نے یہ منصب سنبھال تو لیا لیکن شوق جہاد کے ہاتھوں بے چین رہے۔ چنانچہ گورنری سے خود ہی دستبردار ہو گئے اور دوبارہ جہاد میں شامل ہوئے۔ جب ۲۳ھ میں حضرت عمر رضؓ زخمی ہوئے تھے تو اس وقت حضرت سعید رضؓ ان کے گھر ہی موجود تھے۔

آپ نے ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں وفات پائی تھی۔ آپ کا جنازہ مدینہ لا کر دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۰ برس سے زیادہ تھی۔ آپ کی اولاد میں چودہ لڑکے اور بیس لڑکیاں تھیں۔

سعید بن عامر

آپ غزوۂ خیبر سے پہلے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر لی۔ غزوہ خیبر اور اس کے بعد ہونے والے جنگی معرکوں میں شریک رہے۔ بعد میں حضرت عمر رضؓ کے دور خلافت میں یرموک کی جنگ میں لڑنے والی فوج کو بھیجی جانے والی امدادی فوج کا دستہ لے کر پہنچے۔ حضرت عمر رضؓ نے آپ کو حمص کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ سعیدؓ بن عامر کا صرف چالیس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آپ نے اپنی حمص کی گورنری کے دوران میں بھی فقیرانہ زندگی گزاری اور ہمیشہ رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا۔

سعید بن مسیب

نام سعید اور کنیت ابومحمد تھی۔ آپ کے والد مسیب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کی پیدائش ۲ھ میں ہوئی۔ آپ کا شمار مدینہ کے سات مشہور فقہا میں ہوتا ہے۔ آپ بہت بڑے محدث اور امام تھے۔ جابر بن اسود نے جو آپ سے عبداللہ بن زبیر رضؓ کے حق میں بیعت لینے آیا تھا آپ کے بیعت سے انکار پر کوڑوں سے پٹوایا۔ عبداللہ بن زبیر کے بعد عبدالملک خلیفہ ہوا لیکن سعیدؒ بن مسیب نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ آپ کو قید بھی ہونا پڑا۔ آپ کا انتقال ۹۴ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں ہوا۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ خواب کی تعبیر بتانے میں بہت ماہر تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ لباس کے معاملے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے لیکن صفائی پسند تھے۔ آپ کو حکومت کی جانب سے وظیفہ دیا جاتا تھا جسے آپ نے حکومت سے اختلاف کے باعث لینا بند کر دیا۔ چنانچہ آپ کی وظیفہ کی رقم بیت المال

میں جمع ہونے لگی۔ یہ رقم آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ تیس ہزار ہوگئی بیت المال کے منتظم کی جانب سے آپ کو بار بار بلایا جاتا رہا لیکن سعیدؒ بن مسیب اس رقم کو لینے سے مسلسل انکار کرتے رہے ؛

سعید پاشا

محمد سعید پاشا مصر کا خدیو (نائب السلطنت) تھا۔ اس کے باپ کا نام محمد علی پاشا تھا۔ محمد سعید پاشا ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا لیکن اس کا باپ اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اسی لیے انیس سال کی عمر میں سعید پاشا کو مصر کے ذمے واجب الوصول خراج کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) بھیجا تھا۔

وہ نیک سیرت اور ہر دل عزیز شہزادہ تھا۔ سعید پاشا ۱۸۵۴ء میں مصر کا خدیو بنا۔ اس نے نومبر ۱۸۵۶ء میں ایک مجلس شوریٰ کی بنیاد رکھی جس میں شاہی خاندان کے تمام شہزادوں، چار جرنیلوں اور چار اعلیٰ عہدیداروں کو شامل کیا۔ اس نے اپنے نظام میں نظم و نسق کی سخت گیر مرکزیت کو نرم کردیا۔ سعید پاشا اپنے دور کا پہلا فرد تھا، جس نے حبشی غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے کے لیے بہت کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء میں اس نے سوڈان کے شہر خرطوم کا دورہ کیا۔

سعید پاشا کے دور میں قاہرہ اور سویز کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اس کے علاوہ ایسٹرن ٹیلیگراف کمپنی کو تار برقی کا نظام لگانے کی اجازت ملی۔ اس کمپنی کو تار برقی کے نظام کی اجارہ داری حاصل تھی۔ اس نے اپنے عہد میں نہر سویز کھودنے کا کام بھی انجام دیا۔ نہر سویز پر ۱۸۵۹ء میں کام شروع کردیا گیا تھا۔ آج بھی پورٹ سعید جو نہر سویز کے شمالی نکاس پر واقع ہے اسی کے نام سے موسوم ہے مصر میں بنکاری کی ابتدا بھی اسی کے عہد میں ہوئی۔

۱۸۶۰ء میں سعید پاشا یورپ کی سیاحت کی غرض سے مصر سے باہر گیا تو اس کی غیر حاضری سے اس کے بھتیجے اسماعیل پاشا نے فائدہ اٹھایا اور اس کی جگہ خود سنبھال لی حالانکہ وہ سعید پاشا کا متوقع وارث بھی تھا۔

سعید پاشا کا انتقال سکندریہ میں ۱۷ جنوری ۱۸۶۳ء میں ہوا اور یہیں پر دفن کیا گیا ؛

سعید پاشا

ترکی کا ایک سیاسی مصلح۔ جو اکتوبر ۱۸۷۹ء تا جون ۱۸۸۰ء، ستمبر ۱۸۸۰ء یا ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۵ء، ۱۸ نومبر ۱۹۰۱ء تا ۱۵ جنوری ۱۹۰۳ء، ۲۲ جولائی ۱۹۰۸ء تا ۶ اگست ۱۹۰۸ء اور ۴ اکتوبر ۱۹۱۱ء تا ۱۷ جولائی ۱۹۱۲ء تک ترکی کا وزیر اعظم رہا۔ سعید پاشا ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں سرزمین روم میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد علی نامی آفندی اپنے زمانے میں تہران میں قونصلر اور بعد میں نائب سفیر ترکی رہا تھا۔

سعید پاشا نے ابتدائی تعلیم روم میں حاصل کی اور سولہ سال کی عمر میں محکمہ دیوانی میں ملازم ہوگیا۔ جہاں اسے خدمات کی بہترین ادائیگی پر خوب ترقیاں اور مناصب ملتے چلے گئے۔ چنانچہ وہ دو سال کے قلیل عرصے میں ہی اناطولیہ کے فوجی محکمہ نظم و نسق میں ایک انتہائی اہم عہدے پر فائز ہوگیا۔ وہ ملازمت کے دوران ہی قسطنطنیہ آیا اور اپنی ذہانت کے باعث قسطنطنیہ کی مجلس اعلیٰ کے دفتر میں اونچا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۸۷۵ء میں سعید پاشا وزارت تجارت و زراعت کا رکن مجلس اور اصلاحات کرنے والے کمیشن کا رکن بھی بن گیا۔ بعد میں تھوڑے عرصے تک انقرہ اور برسہ کے والی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۸۷۹ء میں وہ پہلی بار وزیر اعظم کے جلیل القدر منصب تک رسائی حاصل کرسکا۔

سعید پاشا ایک ایسے نازک دور میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا جب جدید یورپی ترقی سے رابطہ قائم کرلینے کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ اس نے اپنے ملک کی بہترین نمائندگی اور رہنمائی کی۔ سیاست دان کے طور پر اس کا تعلق قدامت پسند عوام سے تھا لیکن وہ اصلاحات کا بھرپور حامی تھا۔ اس نے سلطان ترکی عبدالحمید کی بڑی قابلیت اور لیاقت کے ساتھ تائید و حمایت کی اور ہمیشہ یہ کوشش کی کہ کسی طرح سلطان کے ہاتھ تمام قوت اور اختیارات آجائیں۔ اس نے ترکی میں غیر ملکی اثرات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

سعید پاشا کا انتقال یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو قسطنطنیہ میں ہوا۔ اسے گورستان ایوب میں حضرت خالدؓ کی مسجد کے نزدیک دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی یادداشتیں خود ہی ایک کتابی صورت میں تحریر کی ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۲۸ھ میں "سعید پاشا نن خاطرات" کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی ؛

سفاح ابوالعباس

پہلا عباسی خلیفہ۔ لقب سفاح تھا۔ اصل نام عبداللہ بن محمد بن علی ابن عبداللہ بن العباس تھا۔ کوفے پر حسن بن قحطبہ کے قبضہ کے تھوڑی عرصہ بعد صفر ۱۳۲ھ/ستمبر ۷۴۹ء کو فے میں آکر پناہ لی۔ بعد میں ۱۲ ربیع الثانی [illegible] کوشہر کی جامع مسجد میں پہلی مرتبہ اس کی خلافت کا اعلان

کوشہر کی جامع مسجد میں پہلی مرتبہ اس کی خلافت کا اعلان کردیا گیا۔ اس موقع پر [illegible] خطبہ بھی دیا تھا جو کافی مشہور ہوا۔ سفاح نے خلافت کا اعلان کرنے کے بعد [illegible] کو مکمل طور پر شکست دینے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے [illegible] کرنے کے بعد کامیاب بھی ہوا۔ اور آہستہ آہستہ تمام علاقے [illegible] شمار کیے جانے لگے۔ ۱۳۴ھ/۷۵۱ء میں علویوں نے [illegible] میں بغاوت کردی۔ سفاح نے شدید خونریز مقابلہ کرکے [illegible]

ابوالعباس سفاح کا ذوالحجہ ۱۳۶ھ [illegible] ہوگیا۔ جہاں اس نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ [illegible] رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اتنا ضرور کہہ سکتے [illegible] میں خونریزی بہت کی گئی۔ جہاں تک عباسی حکومت کا [illegible] میں عباسی تحریک انقلابی دور سے گزر کر آ بھی [illegible] ابوالعباس سفاح نے خلافت پر اپنے پاؤں بھی خوب [illegible] انتقال کے بعد المنصور مسندِ خلافت پر متمکن ہوا۔

سفاقس

تیونس کا ایک شہر جو مشرقی ساحل پر خلیج [illegible] آباد ہے۔ اصل شہر ایک صاف ستھری اور ہموار جگہ پر واقع ہے۔ [illegible] باقاعدہ ایک نقشہ بنا کر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی شکل مستطیل ہے [illegible] ایک دوسری کو قائمہ زاویہ پر کاٹ کر گزرتی ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک [illegible] مسجد ہے جو ۷۷۵ء/۸۴۹ء میں تیار کی گئی تھی۔ لیکن اس کی حالت بہت مخدوش

ہوجانے کے باعث دسویں صدی ہجری کے آخر میں دوبارہ از سر نو تعمیر کی گئی۔ شہر کے گرد ایک فصیل بنی اغلب کے عہد میں مٹی، گارے اور اینٹوں سے بنائی گئی تھی جس کے بعض حصوں کے گرجانے کے بعد انھیں پتھروں سے بنا دیا گیا۔

بنو ہلال کے حملہ کے باعث پھیلنے والی بدنظمی کے نتیجے میں سفاقس ۱۰۹۵ء تا ۱۰۹۹ء ایک چھوٹی سی ریاست کا صدر مقام بنا رہا۔ اس ریاست کے لوگ عروب کی حمایت کرتے تھے۔ ۱۱۴۸ء میں اسے صقلیہ کے بادشاہ روجر (ROGER) نے فتح کر لیا۔ ۱۱۵۹ء میں تقریباً گیارہ سال بعد عبدالمؤمن نے اس شہر کو دوبارہ اپنے زیر نگیں کر لیا۔ لیکن اس وقت تک سفاقس کی عظمت اور شان و شوکت ماند پڑ چکی تھی۔ بنو ہلال کے حملے سے پہلے یہ شہر نمایاں اقتصادی اہمیت کا حامل تھا، اور اسے زیتون کی کاشت کرنے والے بڑے بڑے مرکزوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس شہر کے تاجر زیتون کا تیل خاص طور پر اٹلی کو برآمد کرتے تھے۔ سفاقس شہر کپڑے کی صنعت کے لیے بھی بہت مشہور تھا۔ یہاں کے رہنے والوں کا ذریعہ آمدنی زیادہ تر ماہی گیری تھا۔

۱۸۸۱ء میں سفاقس نے فرانسیسی تسلط کا زبردست مقابلہ کیا۔ فرانس کے جنگی جہازوں کا ایک دستہ اس شہر پر بمباری کرنے کے لیے آیا جس کے باعث شہر کو بہت نقصان پہنچا لیکن اس کے بعد یہاں خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ آجکل اس کی آبادی چار لاکھ سے زیادہ ہے۔ لوگ خلیج قابس سے اسفنج اکٹھا کر کے برآمد کرتے ہیں۔ تمام شہر میں زیتون کے باغات ہی باغات موجود ہیں۔ یہ درخت نہایت ہی خوبصورت اور ترقی یافتہ طریقہ ہائے کاشت کے مطابق لگائے گئے ہیں۔

سفانہؓ

آپ ایک مشہور صحابی عدیؓ بن حاتم الطائیؓ کی بہن تھیں۔ ان کا تعلق عیسائیوں کے ایک قبیلہ طے سے تھا۔ عدی بن حاتم طائیؓ اس قبیلے کا سردار تھا۔ جب مسلمانوں نے اس قبیلے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو عدیؓ علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن ان کی بہن سفانہؓ وہیں رہ گئیں۔ جنہیں مسلمانوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ پکڑ لیا اور مدینہ لے آئے۔ یہاں آکر تمام قیدی حضورؐ کے سامنے لائے گئے۔ سفانہؓ نے آپؐ سے رہائی کی درخواست کی جسے حضورؐ نے مان لیا، اور سفانہؓ کو نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ ان کے شایان شان سواری، لباس اور خوراک وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا۔ آپؐ نے سفانہ کو تنہا جانے سے بھی منع فرما دیا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی عدیؓ بن حاتم کے پاس پہنچیں تو ان کے سامنے حضور کی بہت تعریف کی۔ جس کے بعد عدیؓ بن حاتم الطائیؓ اپنی بہن کے کہنے پر مدینہ آکر رسول خداؐ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ ملاقات کے دوران ہی آپ نے اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں آپ کی بہن سفانہؓ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

سفر

ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ہمیں سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر مختلف نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ تجارتی سفر یا تفریحی سفر۔ رسول پاکؐ کی کچھ احادیث اس موضوع پر ہمیں ملتی ہیں مثلاً بخاری شریف میں حضرت کعب بن مالکؓ سے مروی ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعرات کے دن غزوۂ تبوک کو تشریف لے گئے۔ آپ جمعرات کو سفر پہ جانا پسند فرماتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ "رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ اگر لوگوں کو تنہا سفر کرنے کے نقصانات کا اندازہ ہو جائے تو وہ کبھی بھی رات کو اکیلے میں سفر نہ کریں۔ (بخاری)

حضرت ابوسعید حذریؓ کے بیان کے مطابق وہ ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک سفر تھے کہ ایک آدمی اونٹ پہ آیا اور اونٹ کو دائیں بائیں پھیرنا شروع کر دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس پہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی فالتو سواری ہے تو وہ اس راہ گیر کو دے دے کیونکہ اس کی سواری کمزور اور تھکی ہوئی ہے اور جس کے پاس زادِ راہ فالتو ہو وہ بھی اس شخص کو دے دے۔ اس کے بعد آپؐ نے زادِ راہ اور مال اسباب کی اقسام بیان فرمائیں۔ یہاں تک کہ ہم نے یہ محسوس کر لیا کہ کسی بھی شخص کو ضرورت سے زیادہ زادِ راہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (مسلم)

اس کے علاوہ دو حدیثیں حضرت جابر سے مروی ہیں۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جب تم میں سے کسی کو سفر میں زیادہ عرصہ گزر جائے تو وہ رات کے وقت اپنے گھر میں داخل نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

ایک مرتبہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ "جب تو رات کے وقت سفر سے واپس آئے تو اپنے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ تیری بیوی زیر ناف بالوں کو صاف نہ کر لے اور کنگھی کر کے پریشان بالوں کو درست نہ کر لے۔" (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی سفر پہ روانہ ہوتے تو سفر کی ابتداد دعاؤں سے کرتے تھے۔ آپؐ جب رکاب میں پاؤں مبارک رکھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: "اللہ کے نام سے شروع ہے۔ خداوند تو سفر میں میرا رفیق اور اہل و عیال میں جانشین ہے۔ خداوند تو زمین کو ہمارے واسطے طے کر دے اور ہم پر سفر کو آسان کر دے۔ خداوند میں سفر کی سختی اور رنج واپسی اور اہل و مال کی بدحالی دیکھنے سے پناہ مانگتا ہوں۔"

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ سفر سے واپسی پر بھی دعا مانگا کرتے تھے۔ اس دعا کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا ملک ہے اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اپنے پروردگار کو سجدہ کرنے والے، اس کی تعریف کرنے والے ہیں۔ خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا تمام لشکروں کو بھگا دیا۔"

سفی

اوقیانوس کے کنارے مراکش کا ایک صوبہ اور بندرگاہ جو راس کینٹن کے جنوب کی طرف چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں تقریباً پچیس ہزار افراد آباد ہیں۔ جن میں سے ساڑھے تین ہزار یہودی اور ایک ہزار کے قریب یورپی باشندے ہیں۔ سفی کی شہرت پرتگالیوں کی آمد کے بعد ہی ہوئی۔ وہ مراکش کے ساحل کے ساتھ ساتھ مسلسل بڑھتے بڑھتے ۱۵۰۷ء تک سفی آکر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر ایک چھاؤنی بھی قائم کر لی تھی جس کے باعث انہوں نے ۱۵۱۵ء میں ایک زبردست حملے کے خلاف دفاع کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پرتگالیوں نے ایک مقامی سربراہ یحییٰ بن تفوف کی مدد اور اعانت سے سفی کو اپنی مہمات کا مرکز بنائے رکھا انہوں نے آس پاس کے قبیلوں کے سرداروں کی حمایت حاصل کر کے اپنی عمل داری قائم کر لی۔ بنو سعد کے اشراف نے سفی پہ اپنا قبضہ جما لیا اور اس علاقے کو اپنی صدر بندرگاہ کا درجہ دے دیا۔ سفی کی شہرت سولہویں اور سترھویں صدی تک

عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یہ بندرگاہ عیسائیوں کی تجارت کا بڑا مرکز بن چکی تھی۔ لیکن جب علوی برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنا دار الحکومت شمالی قصبوں میں منتقل کر لیا جس کے باعث سفی کے نزدیک ایک اور بندرگاہ سلا (SALE) پُر رونق ہوگئی اور سفی میں رونق کم ہونے لگی۔ انیسویں صدی میں اس علاقے کو بہت زوال آیا اب سفی ایک چھوٹا سا بارونق قصبہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں سے عبدہ کے زرخیز علاقے کی پیداوار اب بھی دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے۔ اور سفی کا علاقہ عبدہ کا مرکزی علاقہ مانا جاتا ہے۔

سفیان بن عبداللہ

آپ کا شمار اہلِ طائف میں ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ طائف کے عامل مقرر ہوئے۔ آپ کی تقرری عثمان بن ابی العاص کے اس عہدے سے علیحدگی کے بعد عمل میں آئی تھی۔ عثمان بن ابی العاص کو بحرین میں عامل مقرر کر دیا تھا۔ آپ کا پورا نام سفیان بن عبداللہ الثقفی تھا۔

سفیان ثوری

دوسری صدی ہجری کے ایک مشہور عالم، محدث اور صوفی۔ آپ کا نام ابو عبداللہ سفیان بن سعید بن مسروق الثوری الکوفی تھا۔ آپ کی پیدائش کا سال عام طور پہ ۹۵ھ یا ۹۶ھ یا ۹۷ھ بتایا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر علماء ۹۷ھ/۱۵-۷۱۶ء پر متفق ہیں۔ حضرت سفیانؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جنہوں نے آپ کو حدیث کی اعلیٰ تعلیم دی۔ کیونکہ ان کا شمار اس عہد کے جیّد عالم فاضل اشخاص میں ہوتا تھا۔ سفیان ثوریؒ کا شمار ان عالموں میں ہوتا ہے جنہوں نے اہم سرکاری عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور صرف اسی وجہ سے حکومتوں کے زیرِ عتاب آئے۔ آپ کو اکثر اوقات حکام کی جانب سے تحفے تحائف ارسال کئے جاتے تھے جنہیں آپ لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ اسی لیے ۱۵۰ھ میں کوفے سے ہجرت کر لی۔ سفیان ثوری سرکار کی جانب سے تحائف لینے سے انکار اس خیال کے تحت کرتے تھے کہ سرکاری منصب یا تحائف قبول کرنے کے بعد ان میں دنیاداری کے بعض بُرے اثرات پیدا ہو جائیں گے اور یہ کہ ممکن ہے کہ حکومتِ وقت انھیں اپنے غلط فیصلوں کی تائید پر مجبور کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ طریقِ حکومت سے بھی بہت بیزار تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اقتدار میں جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جبر کی حقیقی اسلامی سیاست میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے وہ حکومت سے تعاون کرنے کو "تعاون عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان" خیال کرتے تھے۔

اس کے علاوہ آپ کو سلطان اور خلفا کی ذاتی زندگی سے گزارنے کے طریقوں پر بھی اعتراض تھا۔ امام سفیان ثوریؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابوحنیفہؒ جیسے جیّد عالموں نے ہمیشہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا اور تکالیف برداشت کیں۔ اسی لیے سفیان ثوریؒ بھی عراق کی حدود سے نکل کر یمن پہنچے۔ یہاں پر بھی وہ بغداد کی حکمرانوں کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ انھوں نے آپ کو تلاش کر لیا۔ اسی لیے سفیان ثوری یمن سے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ مکے کے امیر محمد بن ابراہیم کو ۱۵۸ھ میں خلیفہ نے حکم دیا کہ انھیں تلاش کر کے قتل کر دیا جائے۔ لیکن امیر مکہ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ ابن سعد کہتا ہے کہ اس نے آپ کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے آپ جلد ہی روپوش ہوگئے۔ طبری کہتا ہے کہ اس نے آپ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد خود ہی رہا کر دیا۔

ابن سعد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آپ کو اپنا پیچھا کرنے والوں سے کعبہ کے اندر جا کر اپنی جان بچانی پڑی۔ آخر کار مکہ میں بھی ان کا رہنا دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کو یہاں سے بصرہ ہجرت کرنا پڑی۔ جہاں بہت سے عالموں نے آپ سے حدیث کا درس لینا شروع کر دیا۔ لیکن بعد میں آپ کے دشمنوں نے بصرہ میں رہنا بھی آپ کے لیے محال کر دیا اور انھیں دربارِ خلافت سے مصالحت کرنے کے لیے خط و کتابت شروع کرنا پڑی۔ جس کے بعد آپ کسی قسم کا معاہدہ آپس میں طے ہو جانے کے بعد بغداد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھی دنوں آپ بیمار ہو گئے اور شعبان ۱۶۱ھ/مئی ۷۷۸ء میں ۶۴ سال کی عمر پا کر جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

ایک راوی کی حیثیت سے ان کے "تبحّرِ علمی اور ثقاہت" کا ہر ایک فرد معترف ہے۔ ابن ندیم کی الفہرست میں آپ کی جن تالیفات کا ذکر آیا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) الجامع الکبیر (۲) الجامع الصغیر (۳) کتاب الفرائض ۴ اور ۵ دو رسالے۔ لیکن ان کے موضوعات کی بابت کچھ درج نہیں ہے۔

بطور فقیہہ آپ ایک مسلک کے بانی تھے۔ لیکن یہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہو گیا۔ آپ صفاتِ باری تعالےٰ کو جیسا کہ وہ قرآنِ پاک میں مذکور ہیں۔ لغوی معنوں میں مانتے تھے اور صرف خدا کے ساتھ ہی مخصوص جانتے تھے۔ آپ قرآنِ پاک کے غیر مخلوق ہونے کا ذکر کرنے کے بعد کہتے تھے کہ ایمان، قول، عمل اور نیت پر مشتمل ہے۔

آپ کے دیگر عقائد کچھ یوں ہیں۔ (۱) ایمان بڑھ سکتا ہے اور گھٹ سکتا ہے (۲) عقیدے میں فضیلت (حضرت علیؓ پر) شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ہی حاصل ہے۔ (۳) وضو میں پاؤں کو دھونے کی بجائے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے (۴) بسم اللہ کا اخفا اس کے جہر سے اولیٰ ہے۔ (۵) تقدیر پہ ایمان لانا ضروری ہے (۶) آدمی جمعہ اور عیدین میں کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن دوسرے تمام موقعوں پہ اس آدمی کو اپنا امام منتخب کرنا چاہیئے جس کے تقویٰ پر مکمل اعتماد ہو اور جس کے بارے میں اسے یقین ہو کر وہ اہل سنت والجماعت میں سے ہے۔ (۷) جہاد روزِ قیامت تک جاری ہے۔ (۸) [illegible] اولی الامر کی اطاعت کرنی چاہیئے وہ عادل ہو یا غیر عادل۔

آپ کے یہ تمام عقائد اہل سنت کے عقائد کے مطابق ہیں لیکن بعض لوگ آپ کو مائل بہ تشیع بھی کہتے ہیں۔ طبری کہتا ہے کہ وہ پہلے شیعہ تھے لیکن بعد میں [illegible] ملاقات دو ایسے علماء سے ہوئی جنہوں نے انھیں عقیدہ بدلنے پر [illegible] لوگ ان کے زیدی ہونے کا شبہ بھی ظاہر کرتے ہیں۔ بہت سے صوفی انھیں [illegible] مشائخ کبار میں خیال کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کو ایک صوفی کا درجہ بھی حاصل ہے۔ شیخ فرید الدین عطار نے سفیان ثوریؒ کے بارے میں اپنی کتاب "تذکرۃ الاولیاء" میں [illegible] کے صوفی ہونے کے بارے میں ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔ الفہرست میں بھی آپ کا ذکر صوفیاء کے ضمن میں ہی آیا ہے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور محدث تھے آپ امام ابوحنیفہؒ کے ہمعصر بھی تھے۔ اسی لیے آپ دونوں میں باہمی اختلاف بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد غالباً یہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ اہل الرائے میں شمار کیے جاتے تھے جبکہ حضرت سفیان ثوری کا شمار اہل الحدیث میں ہوتا تھا۔

سفید کوہ

افغانستان کے شمالی علاقے کا مشہور پہاڑی سلسلہ۔ اس سلسلہ کوہ کی سب سے اونچی چوٹی کوہ سکارام ہے، جس کی اونچائی سطح سمندر سے ۱۵۶۲۰ فٹ ہے۔ یہ پہاڑ دریائے سندھ کے شہر اٹک تک پھیلا ہوا ہے اور دریائے کابل کی وادی کو وادیٔ کرم اور آفریدی تراہ سے الگ کرنے کا باعث ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کا آخری سرا پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ کوہِ سفید کے شمالی اور مشرقی حصے جو آگے کو نکلے ہوئے ہیں، میں درۂ خیبر پشاور اور دوسرے کئی دشوار گزار درّے موجود ہیں۔ ان درّوں میں ۱۸۴۱ء۔ ۱۸۴۲ء کی جنگ میں برطانوی اور ہندوستانی فوجوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ کوہ سفید کے شمالی سلسلے چٹیل ہیں، جبکہ بالائی ڈھلوانوں پر صنوبر، دیودار اور دوسرے درختوں کے جنگلات بکثرت موجود ہیں۔ سلسلے کے جنوبی حصوں میں اکثر پہاڑوں پر صنوبر اور خود رو زیتون کے جنگل پائے جاتے ہیں۔ ان سلسلوں کی وادیوں میں میوہ دار درختوں کے باغات اور کھیت بھی موجود ہیں۔

سفینہ

سمندری جہاز یا کشتی۔ عربی زبان میں اس معنی اور مفہوم پر مبنی کئی لفظ موجود ہیں۔ کئی لفظ قرآن مجید میں بھی آئے ہیں مثلاً فلک، قرآن کریم میں تیئس ۲۳ جگہ آیا ہے۔

لغت کے عرب عالموں کے نزدیک سفینہ سفن سے مشتق ہے۔ جہازرانی کے طور پر عربی میں عام طور پر **سفانة** اور **ملاحة** کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ہی عرب لوگ کشتی رانی اور جہازرانی سے آگاہ تھے۔ جب عرب میں اسلام کا ظہور ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ عربوں میں جسمانی اور ذہنی نشوونما اور ترقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز سازی کے فن اور جہاز رانی کو بھی ترقی ملی۔ اسی لیے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی جہاز سازی اور جہازرانی میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

قرآن مجید میں کشتی، سمندر اور ان کے متعلقات کا ذکر بہت آیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد کے طوفان اور اس کشتی کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ جو انہوں نے اللہ کے حکم سے تیار کی تھی اور اس کا حکم ملتے ہی اپنے تمام ہمسفروں سمیت اس میں سوار ہو گئے۔ "وہ کشتی نوحؑ اور ان کے ہمسفروں کو لے کر پہاڑوں کی سی بلند موجوں میں تیرتی چلی جاتی تھی"۔ (ہود: ۳۷ تا ۴۲)

اس کے علاوہ قرآن مجید کی سورۂ شوریٰ میں جہازرانی اور قوت بحریہ کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ اس میں سمندر میں پہاڑوں کی مانند فلک بوس رواں دواں کشتیوں کو خدا کی کائنات کے عجائبات قرار دیا ہے۔

پھر بحری تجارت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ: "اللہ نے سمندروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس میں سے تر و تازہ گوشت نکال کر کھا سکو، سمندر میں اللہ کا فضل و کرم (مال و تجارت) تلاش کر سکو اور اس کے شکر گزار ہو سکو"۔ (النحل: ۱۴)

قرآن مجید کی سورۂ الروم میں جہازرانی کے لیے موافق اور مددگار ہواؤں کو اللہ کی آیات سے تعبیر کیا ہے اور بحری تجارتی کاروانوں کے لیے اسے ایک خوشخبری قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جہازرانی کے لیے ضروری چیزوں مثلاً بندرگاہوں، سمندری اور دریائی راستوں اور بحری سفر میں راہنمائی کے لیے زمین اور آسمان پر مختلف علامتوں کا ذکر بھی آیا ہے!

"اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے ہیں تاکہ زمین تمہیں لے کر ایک طرف کو جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیے تاکہ تم راہ پاؤ، اور علامتیں بنا دی ہیں اور ستاروں کے ذریعے بھی وہ راہ پاتے ہیں"۔ (النحل - ۱۵ تا ۱۶)

ان آیات کے ذریعے انسانوں کو اللہ کی نعمتوں اور اس کی ہیبت و قدرت کا احساس دلا کر انہیں نیکی اور خدا ترسی کی جانب مائل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان آیات میں ہمیں جہازرانی اور سمندر شناسی کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس کے بھی واضح تاریخی شواہد ملتے ہیں کہ زمانہ قبل از اسلام میں بلادِ عرب کی بندرگاہوں پر تجارتی بحری جہاز معمول کے مطابق آتے جاتے تھے۔ اور بیشتر عرب تاجر سمندری تجارت اور سمندری سفروں سے اچھی طرح آشنا تھے۔

اسلام آنے کے بعد حضورؐ کے زمانے میں مسلمانوں نے کئی بحری سفر کیے۔ اس کے بعد خلفاء راشدینؓ کے عہد میں تو بحری سفروں کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا تھا۔ خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے مہذب دنیا کی بڑی بڑی بندرگاہوں اور تمام سمندری راستوں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی دریائے نیل اور بحر احمر کو تجارتی اغراض کے لیے ایک مصنوعی نہر کے ذریعے ملا دیا گیا تھا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے موجودہ نہر سویز کی جگہ بھی ایک نہر کھودنے کی اجازت چاہی تو حضرت عمرؓ نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس وقت اسی میں مصلحت تھی۔ اس زمانے میں ایران کی بحری قوت زیادہ تھی۔ اس لئے بحر احمر اور بحر روم کو آپس میں مصنوعی نہر کے ذریعے ملانے سے اسلامی مملکت کا دفاع خطرہ میں پڑ سکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے اپنی بحری قوت میں خوب خوب اضافہ کیا۔ اور اپنے دشمنوں پر اپنی سمندری طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی نگرانی میں مسلم بحری بیڑے نے بحیرہ روم میں اپنی قوت کا لوہا منوا لیا۔

اموی عہد میں عکا کی بندرگاہ میں عربوں کا جہاز سازی کا سب سے پہلا کارخانہ قائم ہوا تھا۔ مسلمان جہازرانوں اور عرب علماء نے بحری راستوں کی نشاندہی، سمندروں کی پیمائش، جہازرانوں کی رہنمائی کے لیے خطرات کے نشانات، ستاروں، ہواؤں، قطب نما، فنِ جہازرانی اور دیگر مفید ملکی آلات کے بارے میں کتنے ہی ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔

سقمان

حصین کیفا کا فرمانروا۔ سقمان بن ارتق، معین الدولہ کے لقب سے بھی مشہور تھا۔ اپنے والد ارتق کی وفات کے بعد ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں سقمان اور اس کے بھائی کو بیت المقدس کا شہر بطور جاگیر مل گیا۔ لیکن شعبان ۴۸۹ھ/جولائی ۱۰۹۶ء میں ان سے یہ شہر فاطمیوں نے چھین لیا۔ یہ دونوں بھائی وہاں سے دمشق چلے گئے دمشق سے سقمان کا بھائی عراق چلا گیا اور خود سقمان نے الرھا EDEES میں پناہ لے لی۔ یہاں پر رہنے والے ارمن باشندوں نے انگریزوں کو بلا کر سقمان کو وہاں سے جانے پر مجبور کرنا چاہا۔ لیکن اس نے ان چند جان نثار سپاہیوں کی مدد سے مقابلہ کیا اور شہر سروج کو فتح کر لیا۔ اس کے تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی انگریزوں نے سروج میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا جس کے بعد سقمان کی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقع کے تھوڑے عرصہ بعد سقمان کو حصین کیفا کا قبضہ مل گیا۔ ۴۹۷ھ/۱۱۰۴ء میں حرّان پر انگریزوں نے حملہ کر دیا جس کے باعث سقمان نے اپنے دشمن جکرمش سے صلح کر لی اور اس طرح دونوں اکٹھے ہو کر حرّان میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے پہنچ

گئے ۔ جب وہاں کے باشندے بے بس ہو چکنے کے بعد انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کے لیے بات چیت کر رہے تھے ۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا جس میں انگریزوں کو شکست ہوئی ۔ اس کے بعد انگریزوں نے سقمان اور جکرمش میں دوبارہ حالتِ جنگ پیدا کرا دی ۔ لیکن اس وقت سقمان نے ہوش سے کام لیا ۔ جکرمش نے حران پر قبضہ کر لیا ۔ اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ابن عمار جو طرابلس کا امیر تھا ، نے سقمان سے انگریزوں کے خلاف مدد چاہی ۔ سقمان فوراً اس کی مدد کے لیے دمشق کی طرف چل دیا ۔ لیکن راستے میں ہی اس کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے بعد سقمان کا بیٹا حصین کیفا میں اور اس کا بھائی ایلغازی ماردین میں اس کے جانشین بن گئے ۔

سقیفہ بنی ساعدہ

بنو خزرج کے سردار ۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ کے مکان کے پاس ایک سائبان بنا ہوا تھا ۔ اس سائبان کو سقیفہ بنی ساعدہ کہا جاتا ہے ۔ جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو بہت سے انصاری سردار اس سائبان میں جمع ہو گئے ۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ سعدؓ بن عبادہ کو حضورؐ کا جانشین منتخب کیا جائے ۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے بھی ایک تقریر کی ۔ انہوں نے کہا کہ امارت ہمارا حق ہے ۔ تمام سرداروں نے اس بات کی تائید و حمایت کی ۔ اس موقع پر ان سرداروں نے مہاجرین سے بھی ایک امیر لینے کی تجویز پیش کی ۔ جب اس واقعے کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ صدیق کو ملی تو وہ فوراً حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے اور تمام انصاری سرداروں کی موجودگی میں نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ خطاب فرمایا جس میں انصار کی خدمات کا اعتراف کیا اور ساتھ ہی یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے ، نومسلم بدو قبائل کے لوگ قریشی سردار کے علاوہ کسی اور کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دیں ۔ پھر یہ بھی بتایا کہ انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج میں باہمی جھگڑے موجود رہتے ہیں ، اس لیے اگر کسی ایک قبیلے کے سردار کو حضورؐ کے جانشین کے طور پر چن لیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا قبیلہ اس کے خلاف سازشوں میں مصروفِ عمل ہو جائے اس لیے بہتر یہی ہے کہ قریش کے کسی سردار کو ہی امیر منتخب کر لیا جائے ۔ اس پر آپس میں جھگڑے کے سے آثار نمایاں نظر آنے لگے تو حضرت ابوعبیدہؓ تمام حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ سب سے پہلے اسلام کی حمایت انصار نے ہی کی تھی اب انہیں اسلام کی تباہی میں پہل نہیں کرنی چاہیئے ۔ چنانچہ اس کے بعد سعدؓ انصاری نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے رسولؐ خدا کی رضا کے لیے قربانیاں دی ہیں ۔ اس لیے یہ بات نامناسب ہے کہ ہم اپنی قربانیوں کے بدلے دنیا کے طلب گار ہوں ۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ حضورؐ کی قوم آپؐ کی جانشینی کی زیادہ مستحق ہو سکتی ہے ۔" سعدؓ انصاری کے خطاب کے بعد انصاری سرداروں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ۔ جس کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق نے کہا کہ یہاں پر حضرت ابوعبیدہؓ بھی موجود ہیں ۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لو ۔ اس پر ان دونوں نے کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس منصب کا حقدار نہیں ہو سکتا ۔ یہ کہہ کر آپ دونوں نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے ہاتھ پر بیعت کر لی جس کے بعد تمام انصاری سرداروں نے بھی خوشی خوشی حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں میں جس اختلاف کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا ، وہ انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گیا ۔

سکاکی

سراج الدین یوسف بن ابوبکر بن محمد ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں پیدا ہوا ۔ وہ ایک صنعت کار تھا اور دھاتوں پر نقش کاری کے فن میں خوب طاق تھا اسی لئے لوگ اسے سکاکی کے لقب سے بلانے لگے ۔ سکاکی تالے بنانے کے فن میں بھی بہت ماہر تھا اور طرح طرح کے پر پیچ تالے بنا تا تھا ۔ ایک مرتبہ اس نے ایک خوب صورت قلمدان بنایا ۔ اس قلمدان میں ایک نہایت چھوٹا سا تالا بھی بنا کر لگایا ۔ اس تالے کا وزن ایک قیراط تھا اس قلمدان کو اس نے حاکم شہر کو بطور تحفہ پیش کر دیا جس کا اسے بہت انعام ملا اور اس کی خوب آؤ بھگت بھی ہونے لگی ۔ لیکن چند دنوں بعد اسی حاکم کے ہاں ایک اور آدمی آیا جس کی سکاکی سے زیادہ قدر و منزلت ہوتی تھی ۔ اس پر اس نے معلوم کیا کہ ایسا کس وجہ سے ہوتا ہے جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شخص عالم ہے تو اس نے خود بھی عالم بننے کا ارادہ کر لیا ۔ لیکن اس کی علم کے حصول کی ابتدائی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور اس نے ہمت ہار دی پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک جگہ بھاری پتھر پر قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا ہے اور پانی کے مسلسل ٹپکنے کے باعث پتھر میں کافی گہرا سوراخ پیدا ہو گیا ہے تو اس نے بھی دوبارہ علم حاصل کرنا شروع کر دیا ۔ سکاکی نے فقہ حنفی کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے ۔ جس کا نام الکلیہ ہے ۔ سکاکی کو زیادہ شہرت اپنی کتاب مفتاح العلوم کے باعث حاصل ہوئی ۔ یہ کتاب بلاغت پر اپنی نوعیت کی واحد مگر جامع کتاب سمجھی جاتی ہے سکاکی کا انتقال فرغانہ کے شہر المالیغ کے قریب قریہ الکندی میں ۶۲۶ھ / ۱۱۲۵ء کو ہوا ۔

سکندر قادری

شاہ سکندر قادری ۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد حضرت شاہ عماد الدینؒ تھے ۔ آپ نے روحانی تعلیم اپنے جد امجد سے بچپن میں ہی حاصل کر لی تھی ۔ یوں بھی آپ کا سلسلۂ نسب چودھویں پشت پر غوث اعظم عبدالقادر جیلانیؒ سے مل جاتا ہے ۔ آپ کا اصل نام عبداللہ اور شاہ سکندر ہے ۔ رئیس الاولیا لقب اور ابوالحسنات کنیت ہے ۔

سیر و سیاحت آپ کی عادت تھی ۔ اسی لیے زیادہ عرصہ سیر و سیاحت میں گزارا جس کے دوران میں اشاعتِ دین اور اسلام کی تبلیغ بھی فرمائی ۔

آپ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ لاہور آئے اور حضرت شاہ بندگی کے مکان کے سامنے آ کر رک گئے شیخ شاہ بندگی اس وقت اپنے مکان کی دوسری منزل پر تھے ۔ انہوں نے آپ کو دیکھتے ہی یہ چاہا کہ اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر حضرت سکندر قادریؒ کی قدم بوسی کریں ۔ اس بات کا انہیں فوراً علم ہو گیا چنانچہ آپ نے فرمایا " شاہ تم جلدی نہ کرو اور زینے کے راستے سے آ جاؤ ۔"

اس واقعے کے بعد اہلِ لاہور جوق در جوق آپ کے مرید ہونے لگے ۔ آپ نے لوگوں سے حاصل کی ہوئی نذر کی تمام رقم اور اشیاء کو یتیموں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا ۔ آپ کی وفات ۱۴ جمادی الاول ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء کو ہوئی ۔ آپ کا مزار کیتھل میں آج بھی ہر خاص و عام کے لیے زیارت گاہ ہے ۔ آپ کے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے ۔

سکینہ

عربی اور عبرانی زبان کا ایک لفظ، جس کے معنی عربی میں اطمینان سکون اور وقار کے ہیں ۔ عبرانی میں اس لفظ کو خالص روحانی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس لفظ سے ذاتِ باری تعالےٰ کی موجودگی مراد لی جاتی ہے ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کتنی ہی جگہ پر استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً " اس میں تمہارے رب کی جانب سے سکینہ (تسلی کا سامان) ہے (البقرہ ۲۴۸)

" وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی" (الفتح : ۴)

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، مفسرین اس سے عام طور پر سکون، اطمینان اور سکونِ قلب، سکونِ روح ہی مراد لیتے ہیں ۔ امام راغب اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ سکینہ مومن کے دل کو تسکین دینے والا فرشتہ ہے ۔ وہ تسکین دل کے ساتھ ساتھ حفاظت کرنے کا کام بھی سرانجام دیتا ہے ۔ امام راغب سکینہ کے ایک معنی عقل بھی لیتے ہیں ۔ فضائلِ قرآن بیان کرتے ہوئے بخاری شریف میں آیا ہے کہ " جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کی برکت سے سکینہ و ملائکہ کا نزول ہوتا ہے "۔

بعض مفسرینِ قرآن لفظ "سکینہ" کو ایک حیوان سے ملتی جلتی مخلوق قرار دیتے ہیں ۔ لیکن امام سیوطی اور سید رشید رضا نے اس بات کو غلط قرار دیا ہے ۔

سکینہ رضا

حضرت امام حسینؓ کی بیٹی ۔ آپ کی والدہ رباب بنوکلب کی شاخ بنوعدی کے مشہور سردار امرأالقیس بن عدی بن اوس کی دختر تھیں ۔ سانحۂ کربلا کے وقت حضرت سکینہؓ اور ان کی والدہ دونوں میدانِ کربلا میں موجود تھیں ۔ شہادتِ حسینؓ کے بعد آپ کو گرفتار کر کے کوفہ اور بعد میں شام پہنچا دیا گیا ۔ جب آپ کو کافی عرصہ کے بعد رہائی ملی تو آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئیں ۔ یہاں آنے کے بعد آپؓ کی زندگی کے حالات منظرِ عام پر نہیں آئے ۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سوگ نشین ہو گئی تھیں اور اسی غم میں اس دنیا سے رخصت ہوئیں ۔

شیعہ مورخ اپنی کتابوں میں حضرت سکینہ کے بارے میں لکھتے ہیں : سانحۂ کربلا کے وقت وہ کم عمر تھیں ۔ ایک کتاب " اسعاف الراغبین " میں حضرت امام حسینؓ سے منسوب کر کے یہ جملہ بھی لکھا ہوا ہے کہ " سکینہؓ پر استغراق مع اللہ غالب ہے "

آغا مہدی اپنی کتاب " سکینہ بنتِ حسینؓ " میں لکھتے ہیں کہ حضرت سکینہ نے قیدِ شام کے دوران میں وفات پائی اور دمشق میں سکینہؓ کا مزار موجود ہے ۔

بعض غیر شیعی مورخ کہتے ہیں کہ حضرت سکینہ نے لمبی عمر پائی ۔ آپ کا نکاح یکے بعد دیگرے ابوبکر عبداللہ بن امام حسینؓ، مصعب بن الزبیرؓ، عبداللہ بن عثمان خزامی اور زید بن عمرو بن عثمانؓ بن عفان سے ہوا ۔ آپ کے ہاں حضرت زید سے ایک بیٹا عثمان اور حضرت عبداللہ سے ایک بیٹی رباب پیدا ہوئی ۔ رباب کمسنی میں ہی فوت ہو گئی جبکہ عثمان نے مدینہ منورہ میں اپنی زندگی گزاری ۔ لوگوں میں وہ " قرین " کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ بیشتر مورخین نے حضرت سکینہ کے حسنِ صورت و سیرت، جرأت، کریم النفسی اور سخن پروری کی بے حد تعریف کی ہے ۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنے عہد کے مشہور شاعروں اور مغنیوں کی سرپرستی کی ۔ ابن خلکان اُن کی وفات کی تاریخ ۵ ربیع الاول ۱۱۷ھ بتاتے ہیں ۔ نیز یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی ۔

سلاح دار

اسلحہ رکھنے والا ۔ مملوکوں کے دربار میں ایک عہدہ تھا جسے سلاح دار کہا جاتا تھا ۔ ان کے پاس بادشاہ کے ہتھیار موجود ہوتے تھے ۔ ہر سلاح دار صرف ایک ہتھیار اپنے پاس رکھتا تھا جسے وہ بوقتِ ضرورت بادشاہ کو پیش کر دیا کرتا تھا ۔ اس طرح ہر بادشاہ کے بے شمار سلاح دار ہوتے تھے ۔ ان سب سلاح داروں کا ایک سردار بھی ہوتا تھا جسے امیر سلاح کہا جاتا تھا ۔ وہ سلاح داروں کی سرداری کے علاوہ اسلحہ خانے کے محافظ کے طور پر بھی کام کرتا تھا ۔ اس عہدے کو عثمانی ترکوں نے بھی بطور خطاب برقرار رکھا ۔ سلاح دار آغا اور چوقہ دار دو عہدے دار عثمانی ترکوں کے عہد میں ملتے ہیں ۔ وہ سلطانِ وقت کو مسجد میں داخل ہوتے ہی تین مرتبہ عرقِ گلاب اور عود کا عطر پیش کیا کرتے تھے ۔

سلافیہ

ایک جماعت جس کی بنیاد روس نے عثمانیہ سلطنت کو سبوتاژ کرنے کے لیے رکھی تھی ۔ اس جماعت کا نام جمعیتِ سلافیہ رکھا گیا ۔ اس نے سلافی قوموں میں روس کے ادب کی اشاعت کی ابتدا کی اور آہستہ آہستہ لوگوں کے دل میں گھر کرتی گئی ۔ یہاں تک کہ بہت قلیل مدت میں ریاستِ بلقان کے بیشتر عیسائی جمعیتِ سلافیہ کے ہمدرد اور طرف دار بن گئے ۔ جمعیتِ سلافیہ کو ایک روسی مفکر اگناتیف چلا رہا تھا ۔ جنگِ کریمیا کے بعد سے اتحادِ سلافی کا چرچا شروع کیا گیا ۔ روسیوں نے سلافی لوگوں کو اپنی ہم نسل قوموں میں پروپیگنڈا کرنے پر اکسائے رکھا ۔ اس زہریلے پروپیگنڈے کے نتیجے میں ۱۸۶۷ء میں " اتحادِ سلافی " کی ایک بہت بڑی کانگرس منعقد ہوئی ۔ یہ کانگرس ایک علمی اور ادبی انجمن کا جبہ پہنا کر منعقد کرائی گئی تھی ۔ اس کانگرس میں اتحادِ سلافی کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا صدر مقام ماسکو میں بنایا گیا ۔ ساتھ ہی اس کی ایک ذیلی شاخ بخارسٹ میں بھی قائم ہوئی ۔ جمعیت سلافیہ نے سلافی نوجوان لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے پردے میں روسی یونیورسٹیوں میں بھیجنا شروع کر دیا ۔ جہاں سے وہ اتحادِ سلافی کے کٹر مبلغ بن کر نکلتے تھے ۔ جب مدحت پاشا کو اس ساری روئداد کا علم ہوا تو اس نے بلغاریہ کے تمام شہروں میں اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے درسگاہیں کھولنے کا پروگرام سلطان کے سامنے پیش کیا کہ عیسائی اور مسلمان اکٹھے ہی تعلیم حاصل کریں ۔ مدحت پاشا کے اس پروگرام کو جنرل اگناتیف نے درہم برہم کر دیا ۔ اس طرح جمعیتِ سلافیہ نے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اپنا معاندانہ رویہ برقرار رکھا ۔ اور اس میں آہستہ آہستہ کامیابیاں حاصل کرتی رہی ۔

سلام

ایک عربی زبان کا لفظ ہے جو بطور اسم بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ سلام سے سلامتی کا مطلب بھی لیا جاتا ہے ۔ عربی میں سلام کرنے یا نماز کے اختتام پر سلام کو "تسلیمۃ" کہتے ہیں ۔ قرآن مجید میں لفظ سلام ۴۳ مختلف آیات میں موجود ہے جیسے :-

" اہلِ جنت ایک دوسرے کو لفظ سلام سے تحیہ پیش کریں گے " (یونس ۱۰) اسی طرح " سلام ہو کہ تم نے صبر کیا اب دارِ آخرت تمہارے لیے بہت عمدہ ٹھکانا ہو گا (الرعد ۲۴)

قرآن پاک میں یہ لفظ بطور امن اور سلامتی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔

" امن اور سلامتی طلوعِ فجر تک رہتی ہے " (القدر ۵) اس کے علاوہ ہم عام زندگی

میں بھی ایک دوسرے سے ملتے وقت یا جدا ہوتے وقت اس کی سلامتی کی دعا کے طور پر بھی سلام کرتے ہیں۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے شخص سے کہے "السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) تو دوسرے آدمی کو اس کا جواب "وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ" (اور تم پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) کہہ کر دینا چاہیئے اسی طرح اگر پہلا شخص ہی رحمتہ اللہ کا لفظ بھی سلام کے ساتھ کہے تو دوسرے شخص کو چاہیئے کہ وہ جواب دیتے وقت "وبرکاتہ" کا اضافہ کر دے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک کی سورت النساء کی آیت ۸۶ میں فرمایا ہے کہ "اگر تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر کلمے سے اس کا جواب دو" شرعی نقطۂ نظر سے سلام کرنا سنت رسولؐ ہے لیکن اس کا جواب فرض کفایہ ہے جس کا مطلب ہے کہ اگر خطاب کسی اجتماع سے ہو تو ان میں سے ایک یا کئی افراد جواب دے دیں تو کافی ہے لیکن اگر مخاطب تنہا ہو تو پھر یہ سلام کا جواب فرض عین ہو جاتا ہے۔ ابن العربی کے بقول اگر کسی شخص سے صرف جان پہچان ہو تو سلام فرض ہے لیکن اگر جان پہچان نہ ہو تو پھر سنت اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر جان پہچان والے شخص کو سلام نہ کیا جائے تو دل میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ (احکام القرآن از ابن العربی) ایک مرتبہ حضور نے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس سے تمہاری باہمی محبت میں اضافہ ہو گا؟ آپس میں سلام کو عام کرو!" (تفسیر القرطبی) سلام کرنے میں پہل کرنا مستحسن ہے کیونکہ حضور کا طریقہ یہی تھا۔ خطبہ، نماز، تلاوت، غسل اور رفع حاجت کے وقت سلام کا جواب واجب نہیں۔

سلانیکی مصطفیٰ

ایک ترک مؤرخ سالونیکا، ترکی میں پیدا ہوا۔ مصطفیٰ کے والد کا انتقال بہت جلد ہو گیا جس کے بعد وہ روم ایلی کے شمسی احمد پاشا کے پاس قرآن خواں کی حیثیت میں ملازم ہو گیا۔ ۱۵۸۴ء میں تھوڑے عرصے تک نشانچی محمد پاشا کے کاتب کے طور پر کام کرتا رہا بعد میں سلحدار کا کاتب بن گیا۔ اس کے بعد فوج کا کاتب اور پھر حرمین کے دفتر محاسبہ حسابات کا صدر بن گیا۔ جہاں سے بہت جلد اُسے میر سامان شاہی بنا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۵۵۸ء میں قسطنطنیہ آ کر ایرانی شہزادے حیدر کا مہمان دار بن گیا۔ اس نے ایک تاریخ کی کتاب "تاریخ سلانیکی" لکھی۔ جو ۱۲۸۱ھ میں استنبول سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے آخری سالوں سلیم ثانی، مراد ثالث کے پورے عہد اور محمد ثالث کے ابتدائی پانچ سالوں کے واقعات و حالات پر شامل ہیں۔

مصطفیٰ سلانیکی کے انتقال کا اصل سال معلوم نہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۰۰۸ھ ۱۵۹۹ء کے لگ بھگ استنبول میں انتقال ہوا۔

سلجوق، آل

ایک ترک شاہی خاندان۔ اس خاندان نے گیارھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک وسطی ایشیا اور ایشیائے قریب کے بہت بڑے علاقوں پر حکومت کی۔ ان میں چند نمایاں خاندان یہ ہیں۔ (۱) سلجوقیان ایشیائے کوچک (۲) سلجوقیان اعظم (۳) سلجوقیان عراق (۴) سلجوقیان شام اور (۵) سلجوقیان کرمان۔

سلجوق خاندان کا مورث اعلیٰ سلجوق بن دُقاق تھا۔ اسے تیمور یلیغ یعنی "لوہے کی کمان والا" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ترکوں کا لیڈر تھا۔ تمام لوگوں کو اس پر غیر متزلزل اعتماد تھا اسی لیے وہ اس کی کسی تقریر یا عمل پر قطعاً حرف گیری نہ کرتے تھے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے میں عجلت سے کام لیتے تھے اور جلد از جلد اس کے حکم کی بجا آوری اپنا فرض سمجھتے تھے انہیں دنوں اتفاقاً ترکوں کے بادشاہ بیغو نے اپنی فوجوں کو جمع کر کے اسلامی ممالک پر چڑھائی کرنے کا پروگرام بنایا۔ سلجوق بن دقاق نے اس کی مخالفت کی اور دربار میں بادشاہ کے خلاف تقریر کر دی۔ بادشاہ نے سلجوق کے خلاف چند نازیبا الفاظ کہے جس پر اس نے بادشاہ کے کان پر ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ بادشاہ کا سر اس ضرب کاری کے باعث زخمی ہو گیا اس کے خادموں نے سلجوق بن دقاق کو گرفتار کرنا چاہا تو اس نے ان کے ساتھ باقاعدہ لڑائی کی جس کے باعث بادشاہ کے تمام خدام اُسے تنہا چھوڑ گئے بعد میں سلجوق بن دقاق اور بادشاہ میں صلح ہو گئی۔ (ابن الاثیر۔ الکامل)

سلجوقیوں کے بارے میں بعض روسی علماء نے رائے ظاہر کی ہے کہ وہ عیسائیت اختیار کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے سلجوق بن دقاق کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ ایک سو سات سال کی عمر پا کر جند کے مقام پر انتقال کر گیا۔ بعد میں اس کے بیٹوں میں سے ایک جس کا نام ارسلان تھا نے اپنے باقی بھائیوں کی قیادت سنبھال لی تھی۔

مختلف سلجوقیوں نے جتنے عرصہ حکومت کی ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:۔

۱۔ سلجوقیان اعظم (۱۰۳۸ء تا ۱۱۵۷ء)

(ا) طغرل بیگ ۱۰۶۳ء تک۔ ب۔ الپ ارسلان ۱۰۷۲ء تک۔ ج۔ ملک شاہ ۱۰۹۲ء تک۔ د۔ محمود اور برکیارق ۱۱۰۴ء تک۔ ہ۔ ملک شاہ ثانی اور محمد ۱۱۱۷ء تک س۔ سنجر ۱۱۵۷ء تک۔

۲۔ سلاجقۂ عراق۔ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۹۴ء)

محمد سلجوقی کی وفات کے بعد اس کا تیرہ سالہ بیٹا محمود خراسان اور شمال مشرقی سرحدی علاقوں کے علاوہ باقی تمام سلطنت کا وارث بنا۔ سلاجقۂ عراق میں مندرجہ ذیل بادشاہ تھے۔

۱۔ محمود ۱۱۳۱ء تک ۲۔ داؤد ۱۱۳۲ء تک۔ ۳۔ طغرل اول ۱۱۳۴ء تک ۴۔ مسعود ۱۱۵۲ء تک۔ ۵۔ ملک شاہ ثانی ۱۱۵۳ء تک۔ ۶۔ محمد ثانی ۱۱۵۹ء تک ۷۔ سلیمان شاہ ۱۱۶۱ء تک ۸۔ ارسلان شاہ ۱۱۷۵ء تک ۹۔ طغرل ثانی ۱۱۹۴ء تک۔

۳۔ سلاجقۂ کرمان۔ ۱۰۴۱ء تا ۱۱۸۶ء۔

(۱) اس سلسلے کا بانی اور جدّ اعلیٰ چغری بیگ کا بیٹا قاورد (قرہ ارسلان بیگ) تھا اس نے ۱۰۴۱ء سے ۱۰۷۴ء تک حکومت کی۔ (۲) سلطان شاہ ۱۰۷۴ء تک (۳) توران شاہ ۱۰۹۷ء تک (۴) ایران شاہ ۱۱۰۱ء تک (۵) ارسلان شاہ ۱۱۴۲ء تک (۶) محمد ۱۱۵۶ء تک (۷) طغرل شاہ ۱۱۶۹ء تک (۸) بہرام شاہ اور ارسلان شاہ ۱۱۷۶ء تک (۹) توران شاہ ثانی ۱۱۸۳ء تک (۱۰) محمد شاہ ۱۱۸۶ء تک۔

۴۔ سلاجقۂ شام ۱۰۷۶ء تا ۱۱۱۷ء۔

(۱) نصر مردانی حلبی ۱۰۸۵ء (۲) ملک شاہ ۱۰۹۲ء (۳) تتش ۱۰۹۵ء تک (۴) رضوان ۱۱۱۴ء تک (۵) الپ ارسلان ۱۱۱۷ء تک۔

۵۔ سلاجقۂ ایشیائے کوچک۔ ۱۰۷۷ء تا ۱۳۰۲ء

اس خاندان کا بانی سلیمان بن قتلمش بن ارسلان تھا۔ ابتداء میں وہ طغرل بیگ کے ماتحت سرداروں میں سے ایک تھا لیکن بعد میں اس نے بغاوت کر دی اور ۱۰۶۴ء میں طغرل بیگ کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ سلاجقۂ ایشیائے کوچک میں سب سے پہلے ہم سلیمان کو ۱۰۷۷ء میں فرمانروائی کی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔

(۱) سلیمان ۱۰۸۶ء تک (۲) قلیج ارسلان اول ۱۱۰۷ء تک (۳) ملک شاہ اور مسعود ۱۱۵۵ء تک (۴) قلیج ارسلان ثانی ۱۱۹۲ء تک (۵) رکن الدین سلیمان ثانی ۱۲۰۴ء تک (۶) قلیج ارسلان ثالث اور غیاث الدین کیخسرو اول ۱۲۱۰ء تک (۷) عزالدین کیکاؤس اول ۱۲۱۹ء تک (۸) علاء الدین کیقباد ۱۲۳۷ء تک (۹) عزالدین کیخسرو ثانی ۱۲۴۵ء تک (۱۰) عزالدین کیکاؤس ثانی ۱۲۶۵ء تک (۱۱)

رکن الدین قلیج ارسلان رابع ۱۲۶۶ء تک (۱۲) غیاث الدین کیخسرو ثالث ۱۲۸۴ء تک (۱۳) غیاث الدین مسعود ثانی اور علاء الدین کیقباد ثالث ۱۳۰۲ء تک۔

سلسبیل

جنت کے ایک چشمے کا نام۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے "ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو گی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے" (الدھر: ۱۷-۱۸)

سلسبیل جنت کا ایسا چشمہ ہو گا جس کے پانی میں سونٹھ کی خوشبو موجود ہو گی۔ مولانا مودودی اس کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا، ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بسہولت گزر جائے۔

اس کے بارے میں ہمیں ایک حدیث صحیح مسلم میں ملتی ہے۔" بہشت کا وہ چشمہ جس سے مومنین شادکام ہوں گے، سلسبیل کہلاتا ہے۔" امام راغب کے بقول سلسبیل ہر اس چشمے کو کہتے ہیں جو تیزی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ اس لفظ کے بارے میں صرف و نحو کے ماہرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

سلطان باہو

آپ ضلع جھنگ کے ایک گاؤں اعوان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سلطان بایزید تھا۔ آپ کے جد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عرب سے ہندوستان ہجرت کر آئے تھے۔ ابتدا میں وہ ضلع جہلم کے گاؤں پنڈ دادن خان میں رہائش پذیر ہوئے۔ وہاں ہزاروں ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ بعد میں رہائش شورکوٹ منتقل کر لی۔ مغلیہ شہنشاہ شاہجہاں سلطان باہو کے خاندان کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کے والد کو بہت بڑی جاگیر بھی دے رکھی تھی۔

سلطان باہو نے حبیب اللہ قادری سے باطنی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے آپ کو تعلیم سے فارغ کرنے کے بعد اپنے استاد پیر عبدالرحمٰن کے پاس بھیجا۔ جو ان دنوں دہلی میں مقیم تھے بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سلطان باہو نے پیر عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی لیکن زیادہ تر اس واقعے سے اختلاف کیا جاتا ہے۔ حاجی محمد دین گجراتی اپنی کتاب "فیض ہدایت" میں لکھتے ہیں کہ سلطان باہو روحانی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہوئے تھے۔

سلطان بخش قادری جنہوں نے تواریخ سلطان باہو لکھی ہے اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے تصوف کے مسائل پر فارسی اور عربی زبان میں ایک سو چالیس کتابیں لکھی تھیں۔ (مناقب السلطانی، ص ۸)

ان کے علاوہ سلطان باہو نے پنجابی زبان میں صرف ایک شعری کتاب ابیات سلطان باہو لکھی جو آج تک دستیاب ہے آپ کی چند فارسی کتابوں کے نام یہ ہیں "شمس العارفین، مفتاح العارفین، محکم الفقر، عین الفقر، عقل بیدار اور دیوان باہو۔"

سلطان باہو کی ازدواجی زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ آپ نے چار شادیاں کی تھیں جن سے آپ کے ہاں آٹھ بیٹے پیدا ہوئے۔

جب ہم آپ کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا کہ آپ صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے عقائد میں اتباع کتاب و سنت کو درجہ اوّل پر رکھتے ہیں آپ کسی ایسے قول و فعل کے قائل نہیں تھے جن سے شرع محمدی کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ آپ نے تصوف کے نہایت گمبھیر مسائل کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ آپ نے اپنی بات کو وزن دینے کے لیے جگہ جگہ قرآن مجید اور احادیث نبوی سے دلائل اور حوالے پیش کئے ہیں۔ آپ نے ۶۳ سال کی عمر میں بروز جمعۃ المبارک جمادی الآخر ۱۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کو ابتداً کاہجان نامی مقام پر سپرد خاک کیا گیا تھا لیکن بعد میں ۱۱۹۰ھ / ۱۷۷۵ء میں موجودہ مزار میں دفن کیا گیا جہاں ہر سال ۴ جمادی الاوّل کو عرس ہوتا ہے جس میں لوگ جوق در جوق شرکت کے لیے جاتے ہیں۔

سلف

سلف یا سَلَم کو فقہ میں جائز بیع تصور کیا جاتا ہے۔ اس بیع میں گاہک کو قیمت خرید پیشگی ادا کرنا پڑتی ہے اور دوسری جانب بائع کی ذمہ داری صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ خریدی گئی چیز کو ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد خریدار کے سپرد کر دے۔ بیع کردہ شے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیز ہونی چاہیئے جس کا بدل موجود ہو، اور معاہدے میں اس چیز کی نوعیت کا نام لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی تمام کیفیات کا بیان کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس جگہ کا تعین بھی ہونا چاہیئے جہاں وہ شے خریدار کے سپرد کی جائے گی۔ شافعی مذہب کے پیروکار خریدی جانے والی چیز کو خریدار کے سپرد کرنے کا وقت مقرر کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن دوسرے فرقوں کے افراد معاہدے میں ایک خاص مدت کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ حجازی فقہا ایسی بیع کو سَلَم کہتے تھے، لیکن عراق میں سلف کہا جاتا تھا۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

ایک مشہور صحابی، آپ کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ آپ سلمان الخیر رضی اللہ عنہ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ آپ کے والد آتش پرست تھے۔ اس لیے وہ ایک آتش کدے کے مہتمم تھے۔ ان کے قبیلے کے لوگ ایک گھوڑے "الخیل البلق" کی پرستش بھی کیا کرتے تھے لیکن حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی نے نہ تو آگ کی پرستش کی اور نہ ہی گھوڑے کو پوجا۔ آپ کی پرورش بڑی احتیاط کے ساتھ ہوئی کیونکہ ان کے والدین کو سلمان رضی اللہ عنہ سے بہت پیار تھا۔ ایک مرتبہ حضرت سلمان کو ان کے والد نے زمین کی نگہداشت کے لیے بھیجا۔ راستے میں آپ کا گذر ایک گرجا کے قریب سے ہوا۔ عیسائی اس وقت عبادت میں مصروف تھے آپ کو ان کا انداز عبادت بہت پسند آیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کھڑے ان کو دیکھتے رہے۔ جب وہ عبادت سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے مذہب میں دلچسپی رکھتا ہوں اس مذہب کی تعلیمات حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے ان لوگوں نے آپ کو بتایا کہ ملک شام میں عیسائیت کا مرکز ہے اس کے بعد آپ گھر واپس آ گئے اور اپنے والد کو تمام قصّہ بتلا دیا جسے سنکر وہ بہت سخت ناراض ہوئے اور ان کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ لیکن جب عیسائیوں کے ایک قافلے نے جو ارض شام جا رہا تھا آپ کو اطلاع دی تو وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح شام پہنچ گئے۔ وہاں آپ پادریوں کے ساتھ رہے اور عیسائیوں کے تمام علوم سیکھے۔ آپ کو عیسائیت کی تعلیمات میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ ارض حجاز میں ایک پیغمبر آئیں گے چنانچہ آپ حجاز مقدس چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو آپ ہر ایک شخص کو غور سے دیکھتے۔ خاص طور پر کشادہ پیشانی والے اصحاب کو۔ بالآخر ایک دن آپ نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد کی خبر سنی، چنانچہ آپ کچھ صدقے کی کھجوریں لے کر حضور کے پاس پہنچے، لیکن جب کھجوریں حضور کو پیش کیں تو آپ نے انہیں نوش فرمانے سے احتراز کیا۔ اس طرح سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں ایک علامت مل گئی تھی چنانچہ جب حضور دوبارہ مدینے میں قیام پذیر ہوئے تو آپ نے دوبارہ کھجوروں کا تحفہ پیش کیا جنہیں آپ نے یہ معلوم کر کے کہ یہ صدقہ نہیں ہیں خود

بھی نوش فرمایا اور دوسرے صحابہ کو بھی کھانے کے لیے دیا۔

سلمان فارسی اس کے بعد آپؐ میں دوسری علامات نبوی تلاش کرنے لگے اور جب آپ کو یقین ہوگیا کہ آپ ہی پیغمبر ہیں تو ایمان لے آئے ۵ھ میں حضرت سلمانؓ فارسی کے مشورہ سے کفار سے اپنی حفاظت کرنے کے لیے خندق کھودی گئی جس کے باعث کفار لشکر کو خندق کے دوسری جانب ہی رکنا پڑا۔ اس غزوہ میں خندق کے باعث مسلمانوں نے کفار کو اپنے ارادے میں کامیاب ہونے سے باز رکھا اور وہ شکست کھا کر واپس چلے گئے۔

سلمانؓ فارسی اصحاب صفہ کے رکن بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے ساتھ طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حذیفہ بن یمان کے بعد سلمان فارسی کو مدائن کا گورنر بھی بنایا تھا۔ آپ نے مدائن میں حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت سلمانؓ فارسی کی اولاد کا سلسلہ ابھی تک باقی ہے۔

سلمہ بن اکوع

ایک صحابی۔ آپ کا نام سنان اور کنیت ابو ایاس تھی۔ آپ ۶ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسلام لانے کے بعد آپ نے بھی مکہ سے مدینہ ہجرت کرلی تھی۔ سلمہؓ بن اکوع نے بیعتِ رضوان کے موقعہ پر حضورؐ کے دستِ مبارک پر تین مرتبہ بیعت کی۔ ایک مرتبہ جب ذی قردہ کی چراگاہ سے کافروں کا ایک ٹولہ رسول اللہؐ کے اونٹ لے بھاگا تو آپ نے اُن کا پیچھا کیا۔ سلمہؓ بن اکوع ایک ماہر تیر انداز بھی تھے۔ چنانچہ کافروں پر اتنی شدت کے ساتھ تیر اندازی کی کہ وہ حضورؐ کے تمام اونٹ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بلکہ ساتھ ہی اپنی چادریں تک چھوڑ گئے۔ اس کے بعد غزوۂ خیبر میں بھی آپ شریک ہوئے بعد میں جب ہوازن اور ثقیف کے ساتھ غزوات ہوئے تو ان میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ۷ھ میں حضرت ابو بکرؓ کی قیادت میں بنو فرادہ کی سرکوبی میں بھی شریک ہوئے اس لڑائی سے واپسی پہ سلمہؓ بن اکوع نے کئی عورتوں کو گرفتار کرلیا تھا جنھیں وہ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان میں ایک لڑکی بہت حسین و جمیل تھی۔ حضورؐ نے اس لڑکی کو واپس مدینہ بھیج کر کتنے ہی مسلمانوں کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرایا۔

سلمہؓ بن اکوع حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ سے زبدہ چلے گئے جہاں سے ۷۴ھ میں دوبارہ مدینہ واپس آئے لیکن اسی سال آپ کا انتقال ہوگیا آپ بہت دلیر، شجاع اور بہترین تیر انداز تھے۔ پیدل دوڑنے میں آپ تمام صحابہؓ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اکثر اوقات فیض یاب ہوتے رہتے تھے اسی لیے آپ نے بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً اسّی کے لگ بھگ احادیث آپ سے مروی ہیں۔

سلمہ بن ہشام

آپ رشتے میں ابوجہل کے بھائی تھے۔ اسلام کی ابتدا ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے۔ بعد میں کچھ عرصہ کے بعد جب وہ واپس مکہ آئے تو ابوجہل نے انہیں قید کردیا اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچانا شروع کردیں۔ وہ دن رات آپ کو پیٹتا رہتا تھا یہاں تک کہ انہیں کھانے کو بھی کچھ نہ دیتا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے تمام سختیاں صبر کے ساتھ برداشت کیں اور دینِ اسلام پر قائم رہے۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے چند قیدی واپس کرکے انھیں اس مصیبت سے نجات دلائی۔ رہائی پانے کے بعد آپ مدینہ چلے گئے۔ آپ غزوات میں برابر حصہ لیتے رہے۔ حضرت ابو بکرؓ صدیق کے دورِ خلافت میں بھی مختلف جنگوں میں شریک ہوتے رہے۔ آپ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت ۱۴ھ میں ہونے والے "مرج روم" کے معرکے میں شہید ہوگئے۔

سلوک

راہ طریقت پر وہ سفر جس کا آغاز کوئی صوفی کسی طریقے میں داخل ہونے پر اپنے شیخ و پیر کی ہدایت پر کرتا ہے۔ اس کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی استعداد کے مطابق بلند ترین درجہ حاصل کرلیتا۔ بعض صوفیوں کے نزدیک سلوک سے مراد وہ تعلق باللہ کی جستجو ہے جو عمداً اختیار کی جاتی ہے اور جسے باقاعدہ جاری رکھا جاتا ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذکر، توکل، فقر، عشق اور معرفت وغیرہ جیسے تمام مقامات سے گزرے۔ ان میں کمال پیدا کرے۔ یہ تمام کمالات ذات الٰہی سے واصل ہونے سے پہلے ہی مکمل کر لینے چاہئیں۔ بہت سے علما سلوک کو جذب کی ضد خیال کرتے ہیں۔

سلول

سلول نام کے دو قبیلے عرب میں آباد ہیں۔ جنوبی عرب میں رہنے والا سلول قبیلہ دراصل خزاعہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ ابتدا میں حجاز آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس قبیلے کو کعبے کی تولیت بھی مل گئی تھی۔ اس قبیلے کے ایک شخص ابو غبشان المحترش بن حبشی بن سلول نے کعبے کی تولیت ایک اور شخص کے ہاتھ فروخت کردی تھی۔

۲۔ اس نام کا دوسرا قبیلہ شمالی عرب کے علاقے میں آباد تھا۔ اس قبیلے کے لوگ بھی بنیادی طور پر ہوازن قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ بنو [illegible] کی بزرگ [illegible] ذہل ابن شیبان کی بیٹی کے نام پر سلول کہلانے لگا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ [illegible] بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ہوازن تھے۔ یہ لوگ مکے کے مشرق جانب آباد تھے [illegible] میں مقیم تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی عمران بن حصین کو حضرت [illegible] کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ انکا اسی قبیلے کے ایک خاندان خاندان سے تعلق تھا۔

جب ہم اس قبیلے کا شجرہ نسب بتاتے ہیں تو یہ [illegible] سلول کسی مرد کا نام نہیں تھا بلکہ ایک عورت کا نام تھا [illegible] عورتوں کے نام سے پکارے جانے والے قبیلے کی خاص [illegible]

سلیط بن عمرو

آپ کا نام سلیطؓ اور تعلق قریشی خاندان سے تھا۔ [illegible] میں مسلمان ہوکر مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کرلی۔ [illegible] غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ ۶ھ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کو دعوتِ حق دینے کے لیے خطوط [illegible] کیے تھے [illegible] زمانے میں ایک خط ہوزہ بن علی حنفی کے پاس پہنچانے کی ذمہ داری حضرت سلیط کے سپرد کی گئی۔ ہوزہ بن علی حنفی آپؐ کا نامہ مبارک پڑھ کر مسلمان ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔ اور حضرت سلیطؓ کو نہایت احترام کے ساتھ خط کا جواب دے کر رخصت کیا۔ اس جواب میں ہوزہ نے اس شرط کے ساتھ مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ایک سردار کی حیثیت سے اسے بھی بعض امور میں شریک کرلیا جائے۔ [illegible] حضورؐ نے اُسے جواب دیا کہ تمہیں زمین کا ایک ادنیٰ ترین خطہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔

سلیطؓ بن عمرو نے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ہونے والی مشہور جنگِ یمامہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

سلیم اوّل

عثمانی سلطنت کا نواں خلیفہ۔ وہ بایزید کا بیٹا تھا اور ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۸ء یا ۸۷۵ھ/ ۱۴۷۰ء میں پیدا ہوا۔ سلیم کے باپ بایزید نے بڑے بیٹے احمد کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ لیکن سلیم کو تخت کی زیادہ آرزو تھی۔ چنانچہ دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فوج کا ایک بڑا حصہ سلیم کی حمایت کر رہا تھا۔ تقریباً دو سال تک ان میں اقتدار کے حصول کے لیے رسّہ کشی ہوتی رہی۔ بالآخر جنوری ۱۵۱۲ء میں قسطنطنیہ کے لوگوں اور ینی چریوں نے سلیم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ۸ صفر ۹۱۸ھ/ ۲۵ اپریل ۱۵۱۲ء کو سلیم کے طرفداروں نے بایزید کو تخت سے محروم کر دیا۔ اس طرح سلیم نے تمام عثمانی سلطنت پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس نے حکومت کا پہلا سال اپنے بھائی بھتیجوں کا استیصال کرنے میں گزارا۔ اس نے تقریباً آٹھ سال حکومت کی جس کے دوران میں کتنے ہی معرکے اور مہمیں سر کیں اور بغاوتوں کو کچلا۔ ۱۵۱۹ء میں سلیم ادرنہ سے قسطنطنیہ کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں بیمار ہو گیا اور اسی بیماری میں ۷ شوال ۹۲۶ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۵۲۰ء کو وفات پا گیا۔ اس کی موت کو اس کے وزیروں نے اخفا میں رکھا۔ جب نیا سلطان سلیمان قسطنطنیہ پہنچ گیا تو اس کی موت کا اعلان کیا گیا۔ سلیم اوّل کی میّت کو استنبول میں شمال مغرب کی جانب ایک پہاڑی پر دفن کیا گیا۔ بعد میں یہاں ایک مسجد بھی بنوا دی گئی تھی۔ اس کی قبر کے نزدیک ہی سلیم کی والدہ، بیٹیوں اور چند بیٹوں کی قبریں بھی بنا دی گئیں۔

سلیم نہایت سخت گیر رویّہ کے باعث یا دوز کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ جس کا مطلب دہشت پسند لیا جاتا تھا جو بعد میں ایک طرح سے اعترافِ عظمت کا لفظ سمجھا جانے لگا تھا۔

سلیم اوّل کی شخصیت اس کے دورِ حکومت کے تمام واقعات پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ ایک شاعر کے طور پر بھی اتنی ہی شہرت کا مالک تھا جتنی کہ بادشاہ ہونے کے ناطے سے اسے حاصل تھی۔ اس کا دیوان فارسی میں ہے جو ۱۳۰۶ھ میں قسطنطنیہ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔

سلیم ثالث

سلیم ثالث سلطنتِ عثمانیہ کا اٹھائیسواں سلطان بنا تھا۔ وہ سلطان مصطفیٰ ثالث کے ہاں ۲۴ دسمبر ۱۷۶۱ء کو پیدا ہوا۔ سلیم ثالث اپنے چچا عبدالحمید اوّل کے انتقال کے فوراً بعد ۱۱ رجب ۱۲۰۳ھ/ ۷ اپریل ۱۷۷۹ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں انگریزوں کے خلاف جنگیں اور اندرونی بغاوتیں بہت زیادہ ہوئیں۔ سلیم ثالث نے اپنے دور میں ملک کے تمام پُرانے فرسودہ اور زوال پذیر اداروں کو منظم اور فعال بنانے کی بہت سی کوششیں کیں جو اس کے عہد کی ایک نمایاں خصوصیت [illegible] ہیں۔ لیکن انہی کوششوں کے باعث وہ خود معزولی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ ۲۲ ربیع الاوّل ۱۲۲۲ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۰۷ء کو وہ مجبوراً تخت سے دستبردار ہو گیا۔ سلیم ثالث کا چونکہ کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے سلطان عبدالحمید کے دو بیٹوں میں سے بڑے لڑکے مصطفیٰ کو تخت نشین کرا دیا گیا۔ جس نے مصطفیٰ چہارم کے نام سے حکومت کرنا شروع کر دی۔

بعد میں سلیم ثالث کو مصطفیٰ چہارم کے حکم پر قتل کر دیا گیا، اس لیے کہ بعض وزیر اور دوسرے لوگ اسے دوبارہ تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔

سلیم ثالث بذاتِ خود بہت سے کمالات اور فنون کا مالک تھا۔ وہ بہترین اشعار کہتا تھا۔ اس نے اپنے اٹھارہ سالہ دورِ حکومت میں دس وزیرِ اعظم بدلے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے نزدیک مضبوط کردار کے لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں حضرت ایوبؓ انصاری کے مزار پر ایک چاندی کا خوبصورت دروازہ بھی بنوایا۔ اور مسجد فاتح کو نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس کی زیادہ تر تعمیرات اصلاحی منصوبوں کے لیے بارکوں اور مدرسوں پر مشتمل ہیں

سلیم ثانی

ترکی کا گیارہواں بادشاہ۔ وہ مشہور ملکہ خرم سلطان کا بیٹا تھا جو ایک خیال کے مطابق ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء میں پیدا ہوا۔ سلطان سلیمان کی وفات کے بعد ترکی کے تخت پر بیٹھا اور فوج سے بیعت لینے کی بجائے خود ہی ان میں تخت نشینی کے تحائف تقسیم کرا دیے۔ فوجیوں نے ان تحائف کو کم سمجھا۔ اس کے بعد سلیمان کی میّت کو شاہی رسم و رواج ادا کیے بغیر ہی دفنا دیا۔ اسی دوران میں سلیم کے قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے ہی ینی چریوں نے بغاوت کرتے ہوئے ادرنہ پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح سلیم ثانی دارالحکومت میں داخل ہونے سے رک گیا۔ فوج نے اسے اپنے من مانے تحائف وصول کرنے کا وعدہ لینے کے بعد ہی ادرنہ میں داخلے کی اجازت دی۔ سلیم ثانی نے اس مرتبہ تحائف خوب جی کھول کر دیے۔ ینی چریوں نے علماء و امراء کو اور خاص طور پر مفتی ابوسعود کو نہایت قیمتی تحائف دیئے۔ یہاں تک کہ شاہی خزانہ خالی ہو گیا اور اس کے پاس فوج کو ان کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے بھی روپیہ موجود نہ رہا۔

محل میں آنے کے بعد سلیم اپنی عادات کے مطابق مختلف خرافات میں مشغول ہو گیا۔ سلیمان ثانی کے دور میں سلطان سلیمان کے دورِ حکومت کی اعلیٰ روایات کو اس کے وزیرِ اعظم صوقولی نے برقرار رکھا۔ سلیم نے حکومت کے بیشتر اختیارات اپنے وزیرِ اعظم کو دے دیئے تھے۔

سلیم ثانی ۱۲ اور ۱۳ دسمبر ۱۵۷۴ء کی درمیانی رات کو اپنے محل میں ہی کسی حادثے کے باعث فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت کی ساری زندگی اپنے حرم سرا میں ہی گزار دی۔ اس کے حرم سرا میں نوربانو کا بہت بول بالا رہا۔ اس کے زمانے میں لہو و لعب کی عادتیں جو اونچے درجے کے عاملوں میں بُری طرح سرایت کر چکی تھیں، معاشرے کے تمام طبقوں میں پھیل گئیں۔ رشوت اور بدعنوانیوں کا بازار گرم ہونے لگا۔ اس نازک وقت میں اس کے وزیرِ اعظم صوقولی نے سلیمان اوّل کے قانون نامے کو مفتیٔ اعظم کے فتوے کے بعد ملک میں نافذ کر دیا۔ یہ کام سلطنتِ عثمانیہ کی اونچی شان و شوکت کو برقرار رکھنے میں خاصی حد تک کامیاب ثابت ہوا۔

سلیم ثانی کے دور کی تعمیرات میں سے ایک مسجد سب سے زیادہ مشہور ہے جو ادرنہ کی سلیمیہ مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجد سنانی معماروں نے ۱۵۶۷ء سے ۱۵۷۴ء تک کے عرصے میں تعمیر کی تھی۔ اس کے عہد میں آیا صوفیا اور قسطنطنیہ میں بھی کئی عمارتیں اور مسجدیں بنوائیں یا ان کی مرمت کرائی گئی۔ سلیم ثانی کو شاعری کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے اس کے اردگرد شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ خود بھی شاعری کرتا تھا۔ اس نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں۔ اس کا تخلص سلیمی تھا۔

سلیمانؑ

حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مشہور پیغمبر تھے وہ بنی اسرائیل پر حکومت بھی کرتے تھے آپ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد بادشاہ بنے تھے۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان کا ذکر کئی صورتوں میں آیا ہے مثلاً البقرہ، النسآء، الانعام، الانبیاء، النمل، سبا اور صٓ۔

حضرت سلیمان نے بہت جلد بنی اسرائیل کے دشمنوں کو زیر کرکے ایک بہت بڑی سلطنت بنا لی تھی حضرت داؤد علیہ السلام جس ہیکل بیت المقدس کی تعمیر کو ادھورا چھوڑ گئے تھے آپ نے اُسے مکمل کرایا آپ علم و حکمت اور فہم و فراست میں نہایت بلند مرتبہ تھے تمام وحشی جانور پرندے اور جن و انس آپ کے تابع فرمان تھے مقدمات کے فیصلے کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ان کی تمام تر عبادات اور معاملات مملکت شریعت تورات کے مطابق ہوتے تھے۔ قرآن مجید نے آپ کا درجہ انبیا کے شایان شان بیان فرمایا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے آپ سے ایک مرتبہ مشورہ بھی لیا تھا۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر ہوا ہے: "اے پیغمبر داؤد اور سلیمان کا واقعہ بھی لوگوں کو یاد دلاؤ۔ جب کہ وہ دونوں ایک کھیتی کے بارے میں جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں جا پڑی تھیں فیصلہ کرنے لگے اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے اور ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا تھا" (الانبیاء ۷۸، ۷۹)

حضرت سلیمان نے چالیس سال تک حکومت کی اور ۵۳ یا ۶۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ آپ کو داؤد علیہ السلام کے شہر میں ہی دفن کیا گیا۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان کی کچھ خصوصیات کا ذکر بھی آیا ہے جیسے :۔

"ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل مہینہ بھر کی راہ ہوتی تھی اور شام کی منزل مہینہ بھر کی راہ ہوتی تھی اور پگھلے ہوئے تانبے کا اس کے لیے چشمہ بہا دیا تھا کہ اس کو سانچوں میں ڈھال کر جنات بڑے بڑے برتن دیگیں اور لگن وغیرہ تیار کرتے تھے۔ (انبیاء ۱۲،۱۳)

ان آیات میں پگھلے ہوئے تانبے کے جس چشمہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے آثار تانبے کی ان بھٹیوں کی صورت میں مل چکے ہیں جو ایلات کی بندرگاہ کے آس پاس دریافت ہوئی ہیں

بعض لوگوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق بھی طرح طرح کے من گھڑت افسانے بنا کر لوگوں کو دغلانا شروع کر دیا اور ان کے سطوت اور اقتدار کا باعث کفر اور جادو کو قرار دینے لگے اور بنی اسرائیل ان گمراہوں کے پیرو ہو کر اللہ کی کتاب (تورات) سے غافل ہو گئے۔ ان گمراہ لوگوں کو بخت نصر قید کرکے بابل لے گیا۔ وہاں انہوں نے ہاروت اور ماروت کے بارے میں سنا کہ انہیں جادو آتا ہے چنانچہ وہ ان سے جادو سیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

آج کل کی انجیل میں حضرت سلیمانؑ کے بارے میں بے شمار ایسے قصے درج ہیں جو ایک پیغمبر اور نبی کی شان کے قطعاً منافی ہیں لیکن مذہب اسلام میں تمام پیغمبروں کے بارے میں بڑا واضح موقف پایا جاتا ہے۔ اسلام میں کسی بھی پیغمبر یا نبی کے بارے میں ایک بھی نازیبا واقعہ یا بات کی گنجائش نہیں ہے۔

آپ کے بارے میں ایک واقعہ قرآن مجید میں سورۂ النمل میں بیان ہوا ہے :۔

"حضرت سلیمانؑ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ملکۂ سبا آپ کے پاس آ رہی ہے تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے آنے سے پہلے اس کا تخت وہاں سے اُٹھ کر آ جائے یہ حکم یا خواہش سن کر ایک جن جو بہت قوی ہیکل تھا کہنے لگا کہ میں ملکہ کا تخت آپ کا (حضرت سلیمانؑ) کا دربار برخاست ہونے سے پہلے لے آؤں گا لیکن ایک اور شخص جو صاحب علم الکتاب تھا کہنے لگا کہ میں پلک جھپکنے میں ایسا کر سکتا ہوں۔ جب حضرت سلیمانؑ نے اپنے سامنے تخت پایا تو اللہ تعالےٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے اتنا اقتدار عطا کیا ہے۔ (دیکھیے سورہ النمل آیات ۳۸ تا ۴۱)

اس واقعے سے ہمیں علم نہیں ہوتا کہ آیا تخت کو لانے کا کام صاحب علم الکتاب شخص نے انجام دیا یا جن نے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ملکۂ سبا کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت حضرت سلیمان کے پاس ضرور آ گیا تھا اور جن ایک ایسی ہستی تھی جو جسمانی طاقت اور مادی ذرائع کی مالک تھی اسی طرح صاحب "علم من الکتاب" ممکن ہے ایک ماہر طبیعیات ہو جیسے حرارت نور، صوت، مقناطیس اور بجلی سے کام لینے کے طریقوں کا علم تھا۔ بعض مفسرین قرآن سورۂ النمل کی تفسیر بیان کرتے وقت لکھتے ہیں کہ یہاں جو مدت بیان ہوئی ہے اس سے حقیقی مدت مراد لینا درست نہیں۔ بعض مفسرین اس سارے واقعے کو ایک بہت بڑا معجزہ قرار دیتے ہیں۔

حضرت سلیمان کے بارے ہی قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے اور اپنے خاندان پر خدا کی نعمتیں گنواتے ہوئے کہا کہ "ہمیں جانوروں کی بولی سمجھنی سکھائی گئی تھی (النمل: ۱۶)

حضرت سلیمان کے جس فیصلے کا ذکر اوپر آیا ہے وہ واقع کچھ اس طرح ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد حکومت میں ایک شخص کے باغ میں ایک گلہ بان کی بکریاں گھس گئیں اور خوب نقصان کیا۔ باغ والے نے داؤدؑ سے جا کر تمام واقعہ بیان کیا جس پر آپ خود باغ میں گئے اور نقصان کا اندازہ لگایا اور اس کی قیمت گلہ بان کے سارے ریوڑ کے برابر ہوئی چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ گلہ بان اپنی تمام بکریاں بطور تاوان باغ والے کے سپرد کر دے۔ یہ فیصلہ سنکر دونوں فریق باہر آئے تو ان کی ملاقات حضرت سلیمانؑ سے ہوئی آپ نے کہا کہ ایک اور فیصلہ جو فریقین کے حق میں اس سے زیادہ بہتر ہے۔ دوسرے حضرت داؤد کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے سلیمان کو بلایا اور معلوم کیا کہ وہ بہتر فیصلہ کیا ہے اس پر حضرت سلیمان نے انہیں بتایا کہ گلہ بان کی تمام بکریاں باغ والے کے سپرد کر دیں اور باغ گلہ بان کے سپرد کر دیں تاکہ گلہ بان باغ کی دیکھ بھال کرے یہاں تک کہ اس میں انگور آ جائیں اس مدت کے دوران میں باغ والا گلہ بان کی بکریوں سے دودھ اور اون وغیرہ سے فائدہ اٹھاتا رہے لیکن جب باغ میں انگور آ جائیں تو باغ واپس باغ والے کو لوٹا دیا جائے۔ اور بکریاں گلہ بان کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو آپ کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔

جن حضرت سلیمانؑ کے تابع تھے اور ان کے لیے بہت سے کام بھی کرتے تھے۔ اس بات کا ذکر سورۂ سبا اور صٓ میں آیا ہے۔ کوئی بھی جن فطرتاً سرکش ہونے کے باوجود آپ کے فرمان سے سرتابی نہیں کرتا تھا۔

حضرت سلیمان کی وفات کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے کہ آپ ہیکل کی تعمیر کرا رہے تھے۔ آپ عصا کے سہارے کھڑے ہو کر خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے اسی طرح عبادت کے دوران آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی لیکن آپ کا جسم عصا کے سہارے کھڑا رہا جس کے باعث ہیکل کی تعمیر کا کام پورے زور شور سے جاری رہا۔ اگر آپ کی وفات کا علم ہو جاتا تو جن جو ہیکل کی تعمیر میں مصروف تھے کام چھوڑ دیتے کیونکہ وہ صرف حضرت سلیمان کا حکم ہی مانتے تھے۔ جب کئی ماہ بعد عصا کو دیمک نے کھا لیا تو حضرت سلیمان کا جسد خاکی گر پڑا جس کے باعث لوگوں کو آپ کی وفات کے بارے میں علم ہوا۔ اس وقت کے بعد جنوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ علم غیب سے بے بہرہ ہیں۔

سلیمان اشرف

آپ کی پیدائش ضلع پٹنہ کے نزدیک محلہ میر میں ہوئی۔ آپ نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم بھی محلہ میر میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور گئے۔

آپ حضرت فاضل بریلوی کے جلیل القدر خلفاء میں سے تھے اور اُن کے ہی کہنے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہوئے تھے۔ آپ رشد و ہدایت اور صداقت و ریاضت کے بہترین مجسمہ تھے۔ آپ کی سیاسی بصیرت بھی بہت تیز تھی۔ آپ

اکثر اوقات لاہور تشریف لاتے رہتے تھے۔ یہاں آپ کے شاگردوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ آپ کی وفات ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کو علی گڑھ میں ہوئی اور یونیورسٹی کے قبرستان میں ہی دفن ہوئے۔

سلیمان اوّل

سلطنت عثمانیہ کا دسواں حکمران۔ اس نے ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء یعنی ۴۶ سال تک حکومت کی۔ ترک اسے سلیمان قانونی کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ عائشہ سلطان کریمیا کے خاندان منگلی گرامی میں سے تھی اور اپنے حسن و جمال کے باعث بہت مشہور تھی۔ سلیمان اپنے دادا بایزید کے دورِ حکومت میں کفہ کا حاکم تھا۔ بعد میں سلیم اوّل کے دور میں مغنیسا کے والی کے طور پر کام کرتا رہا۔ جب اس کے والد سلیم کا انتقال ہوا تو تقریباً ایک ہفتے بعد ۳۰ ستمبر ۱۵۲۰ء کو وہ دارالحکومت پہنچ گیا۔ اس وقت اسے کوئی بھی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔

سلیمان اوّل فطرتاً صلح پسند تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دورِ حکومت میں تیرہ سے زائد بڑی بڑی جنگی مہموں میں شریک ہوا۔ عام طور پر وہ یورپ پر فوج کشی کیا کرتا تھا جس کے نتیجے میں عثمانی سلطنت وسیع سے وسیع تر ہوجاتی تھی۔ اس نے دس مرتبہ یورپ پر اور تین مرتبہ ایشیا پر لشکر کشی کی۔ اس طرح تیرہ مرتبہ اس نے اپنی سلطنت کو کشادہ کیا۔ وہ پکا دین دار آدمی تھا۔ اس نے آٹھ قرآن پاک اپنے ہاتھ سے نقل کیے تھے جو آج بھی سلیمانیہ میں بحفاظت موجود ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی اسلامی اسخ الاعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ سلیمانی دور میں سلطنت عثمانیہ کا سلطنت کے ارتقاء کے عمل میں اس کی قائدانہ اور نظم و نسق کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ہاتھ تھا۔ اسی طرح ترکی تہذیب اور علم و ادب نے بھی اس کے دور میں ترقی کی کئی منازل طے کیں۔ سلیمان نے بطور ایک شاہ کے شعراء اور عالموں کا مربی و سرپرست ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ اپنے دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کی حوصلہ افزائی کرکے انھیں قصائد، شاہنامے اور تاریخ لکھنے کی ترغیب دی۔ سلیمان اوّل نے اپنے دور میں بے شمار مساجد اور عمارتیں بنوائیں۔ ایک مسجد اس نے پایۂ تخت میں سلیمانیہ مسجد کے نام سے بنوائی جسے بہت اونچا مقام حاصل ہوا۔ یہ مسجد ۱۵۵۰ء اور ۱۵۵۶ء کے درمیان مکمل ہوئی تھی۔ بغداد میں امام ابوحنیفہؒ کا مزار اور قونیہ میں جلال الدینؒ رومی کا مزار بھی سلیمان نے ہی بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ مکہ میں پختہ کاریزیں تعمیر کرائیں۔

سلیمان اوّل کی زندگی کے آخری ایام بڑے پریشانی میں گزرے کیونکہ ان دنوں شہزادہ سلیم اور بایزید کے درمیان آپس میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بایزید مارا گیا تھا۔ اسی دوران آسٹریا سے جنگ شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ سلیمان اوّل نے خود فوجوں کی قیادت سنبھال لی تھی اور ایک شہر سگتوار کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے کے دوران ہی میں سلیمان کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ پانچ اور چھ ستمبر ۱۵۶۶ء کو ناسازیٔ طبع کے باعث خالقِ حقیقی سے جاملا۔ ۸ ستمبر کو شہر سگتوار بھی فتح کرلیا گیا اس کی موت کو ابتداء میں تین ہفتہ تک اخفاء میں رکھا گیا۔ اسی دوران سلیم ثانی نے آکر کاروبارِ حکومت سنبھال لیا۔

سلیمان بن صرد الخزاعی

صحابیٔ رسولؐ۔ آپ کا اصلی نام یسار تھا لیکن جب آپ نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نام تبدیل کرکے سلیمان رکھ دیا۔ جب مسلمان کوفے میں جاکر آباد ہونے لگے تو آپ نے بھی وہاں پہنچ کر رہائش اختیار کرلی۔ جنگ جمل اور صفین میں حضرت علیؓ کی جانب سے شریک ہوئے حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت امام حسینؓ کے بہت بڑے ہمدرد اور طرفدار بن گئے چنانچہ واقعہ کربلا سے پہلے حضرت امام حسینؓ کو آپ نے ہی پیغام بھیجا تھا کہ وہ کوفہ تشریف لے آئیں لیکن جب حضرت امام حسینؓ اپنے جانثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں خیمہ زن تھے تو اس وقت آپ نے امام حسینؓ کی مطلقاً کوئی مدد نہ کی پھر جب ۱۰ محرم ۶۱ھ/۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو حضرت امام حسینؓ شہید کر دیئے گئے تو تمام کوفی اپنی بزدلی اور بےعملی پر نادم اور پشیمان ہوئے اس کے بعد انہوں نے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے ایک جماعت کی طرح ڈالی۔ اس جماعت کا سالار اعظم حضرت سلیمانؓ کو بنایا گیا۔ اس جماعت میں شریک تمام افراد ساٹھ سال سے زائد عمر کے تھے ابتدا میں یہ تحریک بےجان رہی لیکن یزید بن معاویہ کے انتقال کے بعد اس تحریک میں تیزی آگئی جب عبیداللہ بن زیاد کوفے میں داخل ہونے لگا تو سلیمانؓ نے یہاں آنے کی اجازت نہ دی۔ بعد میں رمضان ۶۴ھ/مئی ۶۸۴ میں مختار بن ابی عبید کوفے پہنچ گیا۔ اس نے حضرت سلیمانؓ کو وہاں سے نکالنا چاہا لیکن حضرت سلیمانؓ اس کے ساتھ باقاعدہ جنگ کے لیے تیار ہوگئے۔ سب سے پہلے اکٹھے ہوکر تمام لوگ کربلا میں امام حسینؓ کے مزار پر حاضر ہوئے اور چوبیس گھنٹے وہاں انتظار کرنے کے بعد عین الوردۃ کی جانب چل پڑے جہاں ۲۲ جمادی الاوّل ۶۵ھ ۴ جنوری ۶۸۵ء کو جنگ شروع ہو گئی دشمن کی فوجیں حسین بن نمیر کی سرکردگی میں لڑ رہی تھیں۔ لڑائی تین روز تک جاری رہی جنگ کے تیسرے روز حضرت سلیمانؓ ترانوے برس کی عمر میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ اس جنگ کا انجام بہت خوفناک نکلا شیعیوں کی شکست کے بعد ان کا زبردست استیصال ہوا۔ حضرت سلیمانؓ نے حضورؐ کی پندرہ احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک

ایک اموی خلیفہ: ۶۰ھ/۶۸۰ء میں پیدا ہوا۔ عبدالعزیز بن مروان کی وفات کے بعد عبدالملک نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان دونوں کے لیے بحیثیت آئندہ جانشین کے حلف وفاداری لیا۔ بعض لوگوں نے کوشش کی کہ سلیمان اپنے بھائی ولید کے حق میں دستبردار ہوجائے لیکن سلیمان جمادی الآخر ۹۶ھ/فروری ۷۱۵ء میں امیرالمومنین بن گیا اور تقریباً تین سال حکومت کی اس کے دورِ حکومت کے آخری سال میں قسطنطنیہ کا محاصرہ جاری تھا کہ صفر ۹۹ھ/ستمبر اکتوبر ۷۱۷ء میں دابق میں سلیمان کا انتقال ہوگیا۔ قسطنطنیہ کا محاصرہ بھی عین اس کی موت کے فوراً بعد اٹھا لیا گیا۔ اس وقت تک اگرچہ عبدالملک اپنے بھائی یزید کو سلیمان کا جانشین نامزد کرا چکا تھا۔ تاہم سلیمان نے وفات سے قبل اپنی جانشینی کے احکامات کو تبدیل کر دیا اور اپنے بیٹے ایوب کی ولی عہدی کے لیے لوگوں سے بیعت لی۔ بعد میں بستر مرگ پر اُس نے ایک با اثر عالم دین رجاءؒ بن حَیوۃ کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ اس کے چچازاد بھائی عمرؒ اپنی نیکوکاری اور پارسائی کی بابت مشہور تھے مسندنشین ہوں گے۔ اس کے اس اعلان کے بعد لوگوں نے سلیمان کو "مفتاح الخیر" کا لقب بھی دیا۔ بعض عرب تاریخ دانوں کے مطابق سلیمان کسی حد تک پرہیز گار ہونے کے باوجود بے رحم اور نفسانی خواہشوں کے شکنجے کا اسیر تھا۔

سلیمان بن سلیمان بن محمد

مراکش کا سلطان جو ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء کو پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ابتدائی اور بعد کی تعلیم سیاست میں حصہ لیے بغیر حاصل کی۔ اس کا باپ مراکش کا سلطان تھا۔ جب اس کا انتقال ہوگیا تو مراکش کے کچھ لوگوں نے سلیمان کے ایک بھائی مولائی

یزید کو اپنا سلطان بنا لیا۔ لیکن بعض علاقوں کے لوگ اس کے خلاف رہے۔ انھوں نے اس کے دوسرے بھائی مولائی ہشام کو سلطان بنانے کا اعلان کر دیا۔ مولائی یزید اور مولائی ہشام میں جنگ ہوئی جس میں یزید مارا گیا۔ اس کے بعد تمام مراکش میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ایسی صورت میں بہت سے علاقوں کے لوگوں نے مولائی سلیمان بن محمد علوی کو اپنا سلطان بنانے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلیمان کے اعلانِ بادشاہت کے ساتھ ہی اس کے بڑے بھائی مولائی مسلمہ نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلیمان اور مسلمہ میں جنگ ہوئی۔ جس کا نتیجہ سلیمان کے حق میں برآمد ہوا۔ اس طرح سلیمان مراکش کا سلطان بن گیا۔ اس نے رجب ۱۱۷۷ھ/مارچ ۱۷۹۲ء سے ۱۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ/۲۸ نومبر ۱۸۲۲ء تک حکومت کی۔ لیکن اس تمام وقت میں بہت کم ایسا عرصہ گزرا جب اُسے اپنے خلاف ہونے والی بغاوتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے خلاف نبرد آزما رہنے والے زیادہ تر بربروں کے جتھے تھے۔ جو عربی تسلط کے خلاف اس کے ساتھ بغاوت پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ اس کے دورِ اقتدار کے آخری چند سال تو لامتناہی شورشوں اور بغاوتوں کی نذر ہو گئے۔

اسی کشمکش کے دوران ۱۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ/۲۸ نومبر ۱۸۲۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ سلیمان نے اس ابتلائی دور میں حکومت کرنے کے باوجود چند ایسے کام انجام دیے جن کے باعث وہ آج تک مشہور ہے۔ اس نے خدا پرستی، عدل و انصاف اور جود و کرم میں بہت نام کمایا۔ اس کے علاوہ اس نے تمام غیر اسلامی محاصل (مثلاً مکوس) یک جنبش قلم سے منسوخ کر دیے۔ اسے خوبصورت عمارتیں بنوانے کا بھی بہت شوق تھا اسی لیے اپنے زمانے میں کتنی ہی خوبصورت عمارات بنوائیں۔

سلیمان پھلواری

آپ عظیم آباد پٹنہ کے قریب موضع پھلواری میں ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی محمد داؤد تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ بعد میں لکھنؤ میں مولانا عبد الحئی فرنگی، سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث اور دہلی میں سید نذیر حسین مونگیری سے کسبِ فیض کیا۔

آپ ہر سال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شریک ہوا کرتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی اور موضع پھلواری میں دفن ہوئے۔ آپ کے مکتوبات ۱۹۴۹ء میں کراچی سے شمس المعارف کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

سلیمان ثانی

سلطنتِ عثمانیہ کا بیسواں سلطان۔ اس نے ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء تا ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء تک حکومت کی۔ سلیمان ثانی سلطان ابراہیم کا بیٹا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مورخین کو آپس میں اختلاف ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ قید و بند میں گزارا۔ کیونکہ اس کے والد کی وفات کے بعد اس کا بھائی محمد چہارم تخت پر بیٹھ گیا تھا جس نے اسے قید میں ڈال دیا۔ لیکن جب مہاج کے مقام پر ہونے والی مہم میں ترکی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے بعد محمد چہارم کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ سلیمان ثانی کو ۸ نومبر ۱۶۸۷ء کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لوگوں کو اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن سلیمان ثانی میں بہترین انتظامی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی جنگی صلاحیتوں کا برملا اظہار کیا اور دو مرتبہ فوج کو اپنی قیادت میں میدانِ جنگ میں لے کر گیا۔ لیکن انھی دنوں باغی فوج ہنگری سے واپسی پر دارالسلطنت پر حملہ آور ہو گئی۔ اس بغاوت میں وزیر اعظم سیاوش پاشا کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد دارالحکومت کے باشندے باغیوں کے مقابلے کو اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بغاوت کو جلد ہی کچل دیا۔ اس کے بعد بھی سلیمان ثانی کو کئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سلیمان ثانی کتنی ہی جنگوں اور مہموں میں کامیاب و ناکام ہوتا رہا۔ بالآخر ۲۳ جون ۱۶۹۱ء یا بعض لوگوں کے مطابق ۱۲ جولائی ۱۶۹۱ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بھائی احمد ثانی تخت نشین ہوا۔ سلیمان ثانی کو قسطنطنیہ کی جامع مسجد سلیمانیہ میں سلیمان اوّل کی قبر کے پاس ہی دفن کیا گیا۔

سلیمان ندوی

سید سلیمان ندوی صوبہ بہار کے گاؤں دیسنہ میں جو پٹنہ کے ضلع میں تھا ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق زیدی سادات کے خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں بہت سے علما اور اطبا گزرے ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر [illegible] حاصل کی بعد میں پھلواری شریف اور دربھنگہ میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے۔ آپ نے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے طلبہ کی انجمن میں ایک مضمون پڑھا تو استادوں نے بہت [illegible] بعد میں آپ کی یہ تحریر پٹنہ کے مشہور ہفت روزہ اخبار "پنچ" میں شائع ہوئی۔ آپ [illegible] میں دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ ندوے میں آپ کے ادبی ذوق [illegible] کو بہت جلا ملی۔ آپ نے اس زمانے میں بہت سے مضامین لکھے۔ اسی زمانے میں [illegible] نواب محسن الملک دار العلوم ندوہ میں تشریف لائے تو آپ نے [illegible] زبان میں ایک قصیدہ پڑھا جسے سن کر نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ [illegible] جب شبلی نعمانی ندوۃ العلما کے معتمد بن کر لکھنؤ آئے تو سید سلیمان نے [illegible] قصیدہ لکھا۔ مولانا اس سے بہت متاثر ہوئے [illegible] لے لیا۔ سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے [illegible] شوق سے پڑھنے لگے۔ آپ جدید عربی کے بھی بہت اچھے ادیب [illegible]

۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی نعمانی نے جب ندوۃ العلما کی جانب سے [illegible] "الندوہ" نکالا اس رسالے کی [illegible] کا کام سید سلیمان کے سپرد [illegible]

۱۹۰۶ء میں دستار بندی کے موقع پر [illegible] بندی کا جلسہ جاری تھا کہ خود [illegible] سید سلیمان سے [illegible] کی فرمائش کی چنانچہ آپ نے نہایت فصیح و بلیغ [illegible] محو حیرت ہو گئے مولانا شبلی نعمانی کا خوشی کے باعث [illegible] کر اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔ [illegible] میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد بھی مقرر ہو گئے۔ [illegible] کے زمانے میں دو عربی کتابیں [illegible] درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۱۲ء تک [illegible] ابو الکلام آزاد کے رسالے الہلال کے ساتھ منسلک ہوئے [illegible] علماء کے معتمد تعلیمات مقرر ہوئے [illegible]

آپ نے اپنے استاد مرحوم کی تحریر کردہ سیرۃ النبی [illegible] سید سلیمان ندوی نے خلافت کی تحریک میں بھی [illegible] ترکی کے معاملات میں انصاف کے حصول [illegible] کے لیے یورپ گیا تو اس کے تین ارکان میں سے ایک آپ تھے۔ آپ [illegible] انگلستان میں [illegible] وفد اور دعوت [illegible] یورپ سے واپسی کے بعد آپ نے تمام ملک کا دورہ کیا۔ [illegible]

کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا تو آپ نے اس کی صدارت بھی کی آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے چلائی جانے والی تقریباً ہر تحریک میں بھرپور حصّہ لیا۔ آپ جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی یونیورسٹی کی سینٹ اور پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے رکن رہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ادارۂ تعلیمات اسلام کا جو بورڈ قائم کیا تھا اس کے باضابطہ صدر بھی آپ ہی تھے انہوں نے اس بات پر بھرپور طریقے سے زور دیا کہ پاکستان کی حکومت کے تمام قوانین قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ کے مطابق ہوں۔

بالآخر ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو آپ اس فانی جہان سے کوچ کر گئے۔ آپ نے بے شمار علمی یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں حیات شبلی، رحمت عالم (بچوں کے لیے)، نقوش سلیمانی، خیام، اور خطبات مدارس، شامل ہیں۔ آپ نے "سیرت النبی" بھی مرتب کر کے شائع کرائی جس کی چھ جلدیں ہیں۔

سماٹرا

انڈونیشیا کا ایک جزیرہ۔ یہ دنیا کے بڑے ترین جزیروں میں پانچویں نمبر پر ہے۔ اس جزیرے کے تقریباً درمیان سے خطِ استوا گزرتا ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ پہلے صرف اس جزیرے کے ایک مخصوص علاقے کا نام سماٹرا تھا لیکن آہستہ آہستہ یہی نام تمام جزیرے کے لیے رواج پا گیا۔

سماٹرا کے جزیرے میں اسلام کی اشاعت تیرھویں صدی میں ہوئی۔ مشہور سیاح مارکوپولو نے ۱۲۹۲ء میں اپنے سفرنامے میں یہاں کے مسلمانوں کا تذکرہ کیا۔ مارکوپولو کی اس بات کا ثبوت بھی مسلمانوں کی پرانی قبروں کے کتبے کو پڑھنے کے بعد مل جاتا ہے کہ آچے کے شمال مغربی ساحل سمودرہ پاسائی کی مسلم حکومت کا بانی ۱۲۹۷ء میں وفات پا گیا تھا۔

اس ثبوت کے مل جانے کے باعث علماء کا کہنا ہے کہ سماٹرا میں ۱۲۷۰ء اور ۱۲۷۵ء کے درمیانی عرصے میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔

آجکل سماٹرا کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اس خطے کی آب و ہوا اور گرم موسم کے باعث نہایت پرجوش اور سرگرم مسلمان ہیں۔

سماع

یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔ لیکن پرانے زمانے کی عربی میں یہ لفظ گانا یا گانا بجانا کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی سماعی کے ہیں یعنی جو کسی سند پر مبنی ہو لیکن ایک مفکر دساسی کے نزدیک سماع اور سمع دونوں عقل کے مقابلے میں استعمال ہوتے ہیں۔

درحقیقت یہ لفظ سب سے زیادہ اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بطور اصطلاح سماع سے مراد موسیقی نہیں۔ انہماک، گانا، الاپنا اور مذہبی جوش اور وجد پیدا کرنے کے لئے کسی خاص انداز یا سر تال میں گانے بجانے کے ہیں۔ الغزالی نے اپنی کتاب "احیاء" میں ایک باب سماع کے بارے میں ہی تحریر کیا ہے۔ الغزالی نے اس موضوع پر ایک محقق صوفی ایک صاحب حال اور ایک راسخ العقیدہ اشعری اور شافعی کی حیثیت سے غور کیا ہے۔ اسی طرح ہجویری عرف داتا گنج بخش نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں سماع کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سماع اس صورت میں درست ہے کہ ۱۔ خواہ مخواہ اور تکلف کر کے سماع نہ سنے جب تقاضا از خود غالب ہو صرف اسی وقت سنے ۲۔ سماع زیادہ بھی نہیں سننا چاہیے تاکہ طبیعت کو اس کی عادت نہ پڑ جائے ۳۔ مرشد یا شیخ طریقت محفل سماع میں موجود رہے ۴۔ محفل میں عوام شریک نہ ہوں ۵۔ قوال پاکباز ہوں اور فسق و فجور کے عادی نہ ہوں ۶۔ دل مکروہات دنیوی سے خالی ہو ۷۔ طبیعت لہو لعب کی جانب آمادہ نہ ہو ۸۔ تکلف و اہتمام نہ کیا جائے۔

سماع سننے کے بارے میں مندرجہ بالا ہدایات کے باوجود آپ مزید لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں گمراہوں کا ایک بہت بڑا گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ فاسقوں کی محفل سماع میں شریک ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم سماع حق کے لئے سنتے ہیں۔ حالانکہ فاسق اس سے فسق و فجور پر اور زیادہ حریص ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ اور وہ دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔

سمرقند

روسی ترکستان میں صوبہ سغد کا صدر مقام۔ سمرقند شہر دریائے سغد کے جنوبی کنارے پر آباد ہے۔ اس شہر کے محل وقوع کا ذکر کرتے ہوئے روسی، یورپی اور بیشتر مشرقی سیاح کہتے ہیں کہ یہ شہر درحقیقت جنت الفردوس ہے۔

عربوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے سمرقند کے مقامی حکمرانوں کو طرخون کہا جاتا تھا۔ لیکن جب قتیبہ بن مسلم خراسان کے والی مقرر ہوئے تو انہوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا جو کافی عرصہ تک جاری رہا۔ بالآخر یہاں کے حکمران ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت وہاں کے حکمران اخشید غورک کو تخت پر بحال رکھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عرب والی بھی طاقتور فوجی جمعیت کے ساتھ مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں یہ شہر بخارا کے ساتھ مل کر آئندہ فتوحات اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں مامون الرشید نے سمرقند کی گورنری اسد بن سامان کے بیٹوں کو سونپ دی۔ اس کے بعد یہ اعلیٰ منصب کافی عرصہ تک سامانی خاندان کے پاس ہی رہا یہاں تک کہ اسمٰعیل بن احمد نے ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں سامانی حکومت قائم کر لی۔ اس زمانے میں سمرقند و بخارا کو بہت عروج حاصل ہوا لیکن اس کے بعد پھر پانچ صدیوں تک زوال پذیر رہا۔ اور امیر تیمور اور اس کے جانشینوں کے دور میں ہی دوبارہ عروج ملا۔ اس کے زمانے میں دارالسلطنت کو بخارا منتقل کر دیا گیا مگر اسلامی ممالک میں تجارتی اور ثقافتی مرکز کے طور پر سمرقند کو اوّلیت حاصل رہی۔

سمرقند شہر ایرانی شہروں کی طرح سہ گونہ ترکیب کا ایک نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ اصل شہر اور مضافات تینوں حصّوں کو جنوب سے شمال کی جانب ترتیب وار بنایا گیا ہے۔ قلعہ شہر کے جنوب میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ اونچائی پر واقع ہے۔ اصل شہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔

سمرقند کا کاغذ بہت مشہور ہے۔ اس شہر کے بنے ہوئے کاغذ کی بابر نے بھی خاص طور پر تعریف کی ہے۔ شہر میں سب سے زیادہ مشہور عمارت حضرت قثمؓ ابن عباس کا مقبرہ اور مسجد ہے۔ حضرت قثمؓ ابن عباس کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے ہی سمرقند کے لوگوں میں مذہب اسلام کی تبلیغ کی۔ جس کے نتیجہ میں بیشتر اہل شہر مسلمان ہو گئے تھے۔ آجکل اس شہر کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔

سمرہ بن جندب

صحابیؓ رسولؐ۔ آپ کے والد کا انتقال آپ کی کم سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ ہجرت کے بعد آپ اپنی والدہ کے ہمراہ مسلمان ہو گئے۔ اپنی کم عمری کے باعث ابتدائی غزوات میں حصّہ نہ لے سکے۔ جوان ہونے کے بعد تمام غزوات میں شامل رہے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ بصرہ چلے گئے۔ ۵۰ھ میں زیاد بن سمیہ نے، جو ان دنوں کوفہ کا حاکم تھا، آپ کو اپنا نائب مقرر کر لیا۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں آپ نے خوارج کے فتنہ کو دبانے میں نمایاں اور بھرپور حصّہ لیا۔ اس کے بعد آپ کو بصرہ کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ آپ

کی وفات کا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ آپ کو سخت سردی لگی، جس کے باعث آپ نے ایک دیگ کھولتے ہوئے پانی سے بھروائی اور اس پر بیٹھ گئے تاکہ کچھ افاقہ ہو، لیکن آپ دیگ میں گر پڑے اور فوراً ہی انتقال کر گئے۔ آپ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں جل کر مرنے کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ سمرہؓ بن جندب نے حضور کی بہت سی احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

سمعیہ رضؓ

حضرت عمارؓ بن یاسر کی والدہ۔ آپ ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی کی کنیز تھیں آپ کا نکاح ابوحذیفہ کے حلیف یاسر سے ہوا۔ آپ کے ہاں جب عمار بن یاسر پیدا ہوئے تو ابوحذیفہ نے آپ کو آزاد کر دیا تھا۔ آپ پر اسلام لانے کے بعد طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ آپ کو مکہ کی ریت پر لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ آپ اسلام کی سب سے پہلی شہید بھی ہیں۔ ابوجہل نے آپ کو برچھی مار کر شہید کر دیا تھا۔

سنت

سنت کا لفظی مطلب طریقہ، نہج، سیرت یا راستہ ہیں۔ اس کے علاوہ لفظ سنت اچھے طریقہ اور برے طریقہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضور اکرمؐ کی ایک حدیث سے ہمیں ان دونوں معنوں کا علم ہوتا ہے۔ حدیث مبارک ہے کہ:

"جس نے اسلام میں ایک اچھا طریقہ رائج کیا اور اس کے بعد اس پر عمل ہوا تو اس کے لیے ان تمام لوگوں جیسا اجر لکھا جائے گا۔ جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے اجروں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جس نے اسلام میں برا طریقہ رائج کیا اور اس کے بعد اس پر عمل ہوا تو اس پر ان تمام لوگوں جیسا گناہ لکھا جائے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔"

سنت کا لفظ قرآن مجید میں مختلف سورتوں میں آیا ہے:

"اور اگر وہ پھر (ظلم و قتال کی طرف) لوٹیں گے تو بے شک پچھلوں کا طور طریقہ پڑ چکا ہے۔" (الانفال: ۳۸)

"(یہ مجرم) رسولؐ پر ایمان نہیں لاتے اور بے شک پہلی قوموں کا طریقہ گزر چکا ہے۔" (الحجر: ۱۳)

"(ان لوگوں کا انجام) اسی قانون کے مطابق (ہوگا) جو ان رسولوں کے بارے میں تھا جو آپؐ سے پہلے ہم نے بھیجے تھے اور تو ہمارے قانون میں تغیر نہیں پائے گا۔ (بنی اسرائیل: ۷۷)

"اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آئی تو ان کو ایمان لانے اور اپنے رب سے گناہوں کی مغفرت طلب کرنے سے اور کسی بات نے نہیں روکا صرف یہی کہ ان کو پچھلی قوموں کا سا معاملہ پیش آ جائے۔" (الکہف: ۵۵)

"پس کیا وہ انتظار نہیں کرتے مگر اس قانون کا جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ پس تو اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا اور تو اللہ کے قانون کو کبھی ٹلتا نہیں پائے گا۔" (فاطر: ۴۳)

"یہ اللہ کا قانون ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت منکر خسران میں رہتے ہیں۔" (المؤمن: ۸۵)

ان تمام آیات میں لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔ یہاں سنت اللہ سے مراد وہ قانون ہے جو اس نے ہمیشہ اپنے پیغمبروں کے بارے میں جاری رکھا۔ جو لوگ ان پیغمبروں پر ایمان لاتے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑتے، وہ کامیاب قرار دیئے جاتے تھے۔ اور ایسے لوگ جو پیغمبروں کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے رکھتے اور ان کے بتائے ہوئے راستوں سے دور بھاگتے تھے، ان پر اللہ تعالیٰ اپنا قہر اور عذاب نازل کرتا تھا۔ سورۃ النساء کی آیت ۲۶ کی جانب دیکھئے:

"اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (احکام) کھول کر بیان کر دے اور تمہیں ان لوگوں کے سنن (قوانین اور ضابطے) بتادے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔"

اس آیت میں سنن سے مراد شریعت ہے جس کی پابندی پرانے زمانے میں علماء اور صالحوں نے کی تھی۔ ممکن ہے قرآن مجید میں لفظ سنت کے اس استعمال کے باعث ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و اعمال کو سنت کہا جانے لگا ہو۔

آنحضورؐ کی احادیث میں بھی سنت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں بھی اس لفظ کے معنی طریقے کے ہی لیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند احادیث کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) "اللہ کے ہاں تین طرح کے آدمی مبغوض ترین ہیں: ایک وہ جو حرم میں بے راہ روی (ظلم) کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو اسلام میں دور جاہلیت کے رسم و رواج چاہتا ہے اور تیسرا وہ جو ناحق کسی شخص کا خون بہانے کے درپے ہے۔" (بخاری۔ کتاب الدیات باب ۹۱)

اس حدیث میں سُنَّۃَ الْجَاہِلِیَّۃِ کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب دور جاہلیت کے طور طریقے یا رسم و رواج لیا جاتا ہے۔

(۲) "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ تم ان لوگوں کے طریقے پر چلنے لگو گے جو تم سے پہلے گزر رہے ہیں۔" (الترمذی۔ کتاب الفتن، باب)

(۳) "تم ضرور ان لوگوں کے راستے پر چلو گے جو تم سے پہلے گزر رہے ہیں۔ بالشت در بالشت اور گز در گز، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں چلے ہوتے تو تم بھی اس میں چلے جاتے۔" (بخاری۔ کتاب الانبیاء)

صرف چند جگہ کو چھوڑ کر یہاں کہیں بھی لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہی ہوتی ہے۔

علوم دینیہ کی ایک اصطلاح کے طور پر سنت کے تین معنی بیان کیے جاتے ہیں

(۱) سنت اس نظام کا نام ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا اور اس کی پابندی کی۔ پھر آپؐ کے بعد آپ کے خلفائے راشدینؓ بھی اس کے پابند رہے اور ان کے بعد امت مسلمہ کی اکثریت بھی اس نام پر کاربند رہی۔

اس سلسلے میں ایک حدیث بھی ان معانی کو واضح کرتی ہے

"اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی کسی امت میں بھیجا اس کی امت میں اس کے کچھ مقرب ساتھی اور صحبت یافتہ افراد ایسے ہوتے جو اس کے طریق کار پر کاربند رہتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے رہتے پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آتے رہتے جو زبان سے وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں اور کرتے وہ ہیں جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا۔"

(مسلم، کتاب الایمان)

اس اصطلاح کے مطابق سنت اس طریق کار کو کہا جاتا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رائج فرمایا اور جو آپؐ کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف نہیں، چاہے اس طریق کار کا ثبوت قرآن مجید کی کسی آیت سے ہو یا آپؐ کی حدیث سے یا خلفائے راشدین کے طریقہ سے۔

اصولِ فقہ میں سنت سے مراد وہ امور لیے جاتے ہیں جو حضور اکرمؐ سے کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کے علاوہ منقول ہوئے ہیں۔ امام راغب نے اصولِ فقہ کی اس اصطلاح کے بارے میں لکھا ہے کہ "نبیؐ کی سنّت ان کا وہ طریق کار تھا جو وہ سوچ سمجھ کر اختیار فرمایا کرتے تھے۔" (مفردات القرآن)

مجد الدین ابن الاثیر اس بارے میں رقم طراز ہیں "جب اصطلاح شرع میں سنت کا لفظ بغیر کسی قید کے استعمال ہو تو اس سے مراد وہ امور ہوتے ہیں جن کا نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے حکم دیا ہو یا اُن سے منع فرمایا ہو قولاً یا فعلاً اور وہ امور ایسے ہوں کہ قرآن مجید میں ان کی تصریح نہ ہوئی ہو۔" (النہایۃ)

اس طرح ہمیں اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ حضور اکرمؐ کے قول و فعل کے ذریعے جو امور قرآن مجید کے علاوہ ثابت ہوں وہ سنت ہیں

شاطبی نے سنت کے تین معنی بیان کیے ہیں۔ (۱) سنّت بمقابلہ بدعت۔ (۲) سنت بمعنی اقوال و افعال رسول اللہ۔ (۳) سنت کے معنی وہ احکام ہیں جن پر صحابہ کرامؓ کا عمل رہا ہو، چاہے ان کا ذکر کتاب و سنت میں ہو یا نہ ہو۔ (الموافقات)

امام شاطبی کی اس اصطلاح کے مطابق حدیثِ موقوف یعنی کسی صحابیؓ کا قول فعل یا تقریر وغیرہ بھی سنن میں شامل ہو جاتی ہے وہ اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ہمارے گزشتہ بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سنت کا اطلاق چار اشیاء پر ہوتا ہے۔ (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قول، (۲) آپؐ کا فعل، (۳) آپؐ کا اقرار (اجازت) چاہے یہ اشیاء بذریعہ وحی آپؐ تک پہنچی ہوں۔ یا آپؐ کے اجتہاد کا نتیجہ ہوں۔ بشرطیکہ یہ قول صحیح ہو کہ آپؐ اجتہاد بھی کیا کرتے تھے، (۴) ان تین اشیاء کے ساتھ چوتھی شے وہ احکام ہیں جو صحابہ کرامؓ یا خلفاء سے منقول ہوں۔" (الموافقات)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت جن الفاظ میں کی وہ امام شاطبی کے بیانات کو درست ثابت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا "میں تمہاری بیعت، اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے بعد کے دو خلفاء کی سنت پر کرتا ہوں۔

حجیّت سنّت: اہلِ اسلام کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ کتاب و سنت شریعتِ اسلامی کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ یعنی ایسے احکامات جو حضورؐ کے قول، فعل یا تقریر کے ذریعے ثابت ہوتے ہیں، اور بالکل اسی طرح واجب التعمیل ہیں جیسے خود قرآن مجید کے ذریعے ثابت شدہ احکامات ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جن قرآنی آیات کا سہارا لیا جاتا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ (اللہ) کی اطاعت کرو۔" (آل عمران: ۳۲، المائدہ: ۹۲)، الانفال: ۲۰، ۱)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب اختیار کی اطاعت کرو پھر اگر تم کسی امر میں آپس میں نزاع کرنے لگو تو اسے (فیصلے کے لیے) اللہ اور رسولؐ کے پاس لے جاؤ۔ اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لاتے ہو۔" (النساء: ۵۹)

"تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں اچھا نمونہ ہے اس شخص کے لیے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہو۔" (الاحزاب: ۲۱)

"تیرے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں کہلائیں گے جب تک یہ نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے آپس کے تنازعوں میں حَکَم تسلیم کر لیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر وہ اپنے دلوں میں گھٹن محسوس نہ کریں اور پورے طور پر آپ کے اطاعت گزار ہیں۔" (الانساء: ۶۵)

ان آیات کی روح سے نبیؐ کریمؐ کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے اور آپس کے تنازعات میں آپؐ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ اس لیے آپؐ کی پیروی کرنا چاہیئے۔

سنّت کو حجت شرعیہ ثابت کرنے کے لیے چند احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً "جو کچھ تم کو کتاب اللہ میں سے دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا (لازم ہے) اس کے چھوڑنے پر کسی کا عذر قبول نہ ہوگا۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو میری کوئی سنتِ جاریہ ہو۔ اگر میری سنتِ جاریہ بھی نہ ہو تو جو میرے اصحاب (اجماعاً) فرما دیں۔"

"علم میں تین قسم کی باتیں ہیں اور ان تین کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زائد (یعنی علم سے خارج) ہے۔ آیت محکمہ (جو متشابہات میں سے نہ ہو)، سنتِ قائمہ (جو منسوخ نہ ہو) اور فریضۂ عادلہ (مسائلِ علمِ میراث)۔" (ابو داؤد۔ کتاب الفرائض)

اہلِ یمن نبیؐ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دیجیے جو ہمیں اپنے رب کی کتاب اور سنّت سکھا دے۔ حضور اکرمؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ کا ہاتھ پکڑ کر ان کے حوالے کیا اور فرمایا۔ "یہ اس اُمت کے امین ہیں۔"

(احمد بن حنبل! المسند")

دراصل مسلمانوں کا حضور اکرمؐ کی ذات سے گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے بعض علماء اور متکلمین احتیاجِ ایمان بالرسول کے عقیدے پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر برہان سے یا اذعان سے نبی کی رسالت پر عقیدہ مضبوط ہو جائے تو دوسرے تمام عقائد و احکام اس کی فرع کی حیثیت سے خود بخود ماننے پڑیں گے کیونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو نبیؐ صادق مان لینے کے بعد آپؐ جو کچھ بھی فرمائیں۔ اس کی پیروی کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ حضورؐ نے جس کلام کو قرآن مجید کہا، ہم نے اسے قرآن مجید کہا۔ جس کے بارے میں آپؐ نے کہا کہ یہ وحی ہے، ہم نے اسے وحی مانا، جس کے بارے میں حضورؐ نے بتایا کہ یہ حکم الٰہی ہے، ہم نے اُسے حکمِ الٰہی تسلیم کیا۔ اور جسے حضورؐ نے متروک گردانا ہم بھی اسے متروک ہی کہتے ہیں۔

ابن حزم اپنی کتاب الاحکام میں لکھتے ہیں کہ "دو مسلمان بھی ایسے نہیں ملیں گے جن کو اس امر سے اختلاف ہو کہ جس بات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے یہ ثبوت مل جائے کہ یہ آپؐ کا ارشاد اور فرمان ہے تو اس کی پیروی لازم ہے اور وہی قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کی مراد کی تفسیر اور اس کے اجمال کی تشریح ہے۔"

امام شافعیؒ اپنی تصنیف "الرسالہ" میں رقم طراز ہیں کہ "مجھے اہلِ علم میں اس رائے سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں کہ سنتِ نبوی تین طرح کی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی حکم قرآن مجید میں موجود ہو اور حضورؐ بھی وہی حکم سنّت میں بیان فرما دیں، دوسری یہ کہ قرآن مجید کا حکم اجمالی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم خدا کے حکم کے ... یوں اس کی تفصیل بیان کر دیں۔ تیسری قسم کی سنّت وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید [illegible] نہ ہو۔ مگر آنحضرتؐ کے احکام موجود ہوں۔ قرآن مجید میں حکمت کا جو ذکر آتا ہے اس سے یہی سنّت مراد ہے۔"

لفظ سنّت ان احکامِ شریعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو فرض اور واجب نہیں۔ اس قسم کی سنت کی دو قسمیں ہیں۔ سننِ ہدیٰ (۲) سنن زوائد۔ پہلی قسم کی سنت کا ترک کرنا بُرا اور مکروہ ہے۔ مثلاً جماعت اور اذان و اقامت وغیرہ۔ دوسری قسم یعنی سنن زوائد کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسے حضورؐ کا طریقۂ لباس اور نشست و برخاست۔ اس میں حضورؐ کے وہ مستحب اعمال بھی شامل ہیں جو آپؐ نے بطور عبادت اختیار کیے اور ان کی عادات کا جزو بن گئے۔ نفل پڑھنے والے کو ثواب ملے گا اور

ترک کرنے والے پہ کوئی ملامت نہیں ۔لیکن نفل کا تعلق سنن زوائد سے نہیں بلکہ یہ اس کے بعد ہے ۔کیونکہ وہ فرض، واجب اور سنت سے زائد احکام میں شامل ہیں ۔ نفل عام طور پہ وہ امور ہیں جن پہ حضورؐ نے دوام نہیں کیا ۔مگر ان کے بارے میں استحباب کی کوئی عام یا خاص دلیل موجود ہو ۔بعض اوقات سُنن کو بھی نفل کہہ لیا جاتا ہے کیونکہ وہ لازم امور کے علاوہ ہیں ۔

سنّت کے چند مثالیں : صبح کی نماز میں دو رکعتیں فرض ہیں ان سے پہلے دو رکعتیں سنت ہیں ۔ اسی طرح ظہر کی نماز میں فرض سے پہلے چار اور فرض کے بعد دو رکعت سنّت ہیں ۔مغرب اور عشاء کی نمازوں میں فرض کے بعد دو دو رکعتیں سنّت کی ہیں ۔ ہر نماز میں قیام ، قرأت ، رکوع و سجود سب فرض ہیں ۔لیکن رکوع و سجود میں تسبیحات وغیرہ اعمال سنت ہیں ۔

سنت موکدہ ، نماز

سنّت مؤکدہ سے مراد وہ اُمور ہیں جو حضرت اکرمؐ یا صحابہؓ نے ہمیشہ کیا ہو اور ایک یا دو دفعہ کے سوا نہ چھوڑا ہو ۔ اس کے نہ کرنے میں گناہ ہو ۔ یہ سنت اللہ یا سنت موکدہ کہلاتی ہے ۔

سنت موکدہ سے مراد فجر کی دو سنتیں ، ظہر کی چھ سنتیں ، مغرب اور عشا کے بعد فرضوں کی دو دو سنتیں ہیں ۔

احادیث میں ان کا بارہا اور بیشتر جگہ ذکر آیا ہے ۔چند ایک احادیث درج ذیل ہیں :۔

اُم حبیبہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو آدمی دن اور رات میں بارہ رکعتیں نماز پڑھے اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنایا جاتا ہے ۔ چار ظہر سے قبل اور دو بعد میں ۔ دو مغرب کے بعد اور دو عشاء کے بعد اور دو قبل فجر ۔ (ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ صبح کی دو رکعتیں عالم و عالمیان اور جو کچھ اس میں ہے سب سے افضل ہیں (مسلم)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ، چار رکعتیں ظہر سے پہلے جن میں سلام کی ضرورت نہیں ہے ان کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔ (ابوداؤد اور ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلعم آفتاب ڈھلنے کے بعد قبل ظہر چار رکعتیں پڑھا کرتے اور فرماتے کہ اس وقت آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں لہذا اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرے نیک اعمال وہاں جائیں ۔ (ترمذی)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس نے بعدِ مغرب چھ رکعتیں پڑھیں اور درمیان میں کلام بد نہ کیا تو وہ چھ رکعتیں بارہ برس کی عبادت کے برابر ہو جاتی ہیں ۔ (ترمذی)

سنجاق شریف

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عَلم مبارک ۔ یہ عَلم آج بھی استنبول (قسطنطنیہ) میں بحفاظت رکھا ہوا ہے ۔ اس کی لمبائی ۱۲ فٹ ہے ۔ اس عَلم یا جھنڈے پہ ایک مکعب شکل کا چاندی کا خول ہے جس کے اندر قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھا ہوا ہے ۔ اس قرآن مجید کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا ۔ اس عَلم پہ ایک اور رایت (جھنڈا) لپٹا ہوا ہے ۔ اس رایت کو حضرت عمر فاروقؓ کی جانب سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد اس عَلم پہ چالیس غلاف جو تافتے کے بنے ہوئے ہیں چڑھائے گئے ہیں ۔ یہ سب کچھ ایک سبز رنگ کے غلاف کے اندر لپٹا ہوا ہے ۔ ان تمام غلافوں کے اندر ایک اور چھوٹا سا قرآن مجید موجود ہے جو حضرت عمرؓ کا ہے ۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ کی ایک نقرئی کنجی بھی اسی میں لپٹی ہوئی ہے ۔ یہ کنجی شریف مکہ نے سلطان سلیم اوّل کو پیش کی تھی ۔

یہ عَلم مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں کے قبضے میں رہا ۔ وہ اسے مختلف مہموں پر جاتے ہوئے اپنے ہمراہ لے کر چلتے تھے اور مہم کے اختتام کے بعد اس عَلم کو آبنوس کے عصاء سے اتار کر بہت سی رسومات کی ادائیگی اور دعائیں مانگ کر اور عنبر و عود کی خوشبو میں بسا کر ، نہایت خوبصورتی سے آراستہ صندوق میں بند کر دیا جاتا تھا ۔ اس صندوق کو حضورؐ کے دوسرے تبرکات مثلاً خرقہ شریف وغیرہ کے ساتھ رکھ دیا جاتا تھا ۔

سنجر بن ملک شاہ

ناصرالدین ابوالحارث ایک سلجوقی سلطان ۔ اس کا اسلامی نام احمد تھا ۔مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۵ رجب ۴۷۹ھ / ۵ نومبر ۱۰۸۶ء کو پیدا ہوا ۔ بعض کے نزدیک اس کی پیدائش دو سال قبل ہوئی ۔

۴۹۰ھ / دسمبر ۱۰۹۶ء میں اس کے چچا ارسلان ارغوان کے قتل کے بعد نوجوان سنجر کو اس کے بھائی برکیا روق نے خراسان کا والی مقرر کر دیا ۔ کچھ عرصے بعد تیسرے بھائی محمد نے برکیا روق کے خلاف بغاوت کر دی ۔ برکیا روق شکست کھا کر خراسان کی طرف مراجعت کر گیا ۔ اسی دوران میں سنجر نے محمد کے ساتھ ، جو ماں کی طرف سے اس کا بھائی تھا گٹھ جوڑ کر لیا اور جب برکیاروق طبرستان ، جرجان اور خراسان کے والی امیر داد کا حلیف بنا تو سنجر کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا اور انہیں شکست دی اور اپنے بھائی سنجر کا نہایت وفاشعاری سے ساتھ دیا ۔

جنگی مصروفیات کے باعث سمرقند کے حاکم بدرخان نے سنجر کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر اور سنجر کے ایک امیر سے سمجھوتہ کر کے اپنی حکومت کو خراسان تک وسیع کرنا چاہا مگر گرفتار ہو کر مارا گیا ۔ اور سنجر نے اپنے خواہر زادہ محمد ارسلان خان بن سلیمان کو سمرقند اور دریائے جیحون پر واقع صوبوں کا حاکم مقرر کر دیا ۔

ارسلان شاہ بن مسعود غزنوی سے بھی سنجر کی جنگ ہوئی جس میں ارسلان شاہ نے غزنی فتح کر لیا اور بہرام شاہ کو تخت نشین کر دیا ۔سلطان محمد کی وصیت کے مطابق اس کی وفات کے بعد سلطنت اس کے بیٹے محمود کو ملنی چاہیے تھی لیکن نہ تو محمود کا بھائی مسعود (جو موصل اور آذربائیجان کا حاکم تھا) اور سنجر اس سے مطمئن تھے ۔ محمود نے [illegible] سمجھونہ کرنے میں تو کوئی دشواری پیش نہ آئی [illegible] سنجر کو مطمئن کرنا بہت مشکل [illegible] تھا ۔ اسی کشمکش میں سنجر ایک بڑی فوج ہمراہ لے کر خراسان سے نکل پڑا ۔ اور ساوہ کے مقام پہ ایک لڑائی لڑی ۔ ابتدا میں لڑائی کا پلہ محمود کی طرف جھکا لیکن جو ہاتھی سنجر کے ہاتھیوں نے محمود کی فوج میں ابتری پیدا کر دی تھی اس سے اس لڑائی کا انجام محمود کی مکمل شکست اور تباہی پہ ہوا اور آخر طویل گفت و شنید کے بعد ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے محمود کو ری کے سوا باقی عراق کا والی تسلیم کر لیا گیا اور قرار پایا کہ سنجر کا نام خطبے میں پہلے لیا جائے گا ۔ جب سمرقند کا حاکم محمد ارسلان خان اپاہج ہو گیا تو اس نے حکومت اپنے بیٹے نصر خان کو تفویض کر دی لیکن اس کو بہت جلد قتل کر دیا گیا جس پر محمد ارسلان خان نے سنجر سے مدد کی درخواست کی ۔سلطان سنجر کے سمرقند پہنچنے سے پہلے ہی ارسلان خان کا ایک بھائی بغاوت ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ارسلان خان نے سنجر کو پیغام بھیجا کہ

اب وہ واپس چلا جائے۔ ارسلان خان نے سنجر کو پیغام بھیجا کہ اب وہ واپس چلا جائے لیکن سلطان سنجر اس پر برافروختہ ہوگیا۔ اسے ارسلان خان پر شبہ ہوگیا کہ وہ اس کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ارسلان خان کے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں وہ پناہ گزین تھا۔ آخر ارسلان خان ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا اور سنجر نے اس کی جاں بخشی کر دی۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے داؤد کو تخت نشین ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے دونوں چچا سلجوق اور مسعود بھی تخت کے دعوے دار بن بیٹھے۔ بعد میں دونوں دعوے دار اس پر متفق ہو گئے کہ مسعود کو سلطان اور سلجوق کو اس کا ولی عہد تسلیم کر لیا جائے اور عراق کا نظم و نسق خلیفہ المسترشد کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن سنجر اس سمجھوتے پر رضامند نہ ہوا۔ اس کے برعکس اس نے محمود کی جانشینی کے لیے تغرل بن محمد کا اعلان کر دیا جو اس وقت اس کے پاس خراسان میں موجود تھا۔ علاوہ ازیں اس نے عماد الدین زنگی سے اتحاد کر کے اس کو بغداد کا والی مقرر کر دیا۔ اور دُبیس بن صدقہ کو حلّہ کی حکومت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اب جنگ ناگزیر ہوگئی۔

چنانچہ ۱۸ رجب ۵۲۶ھ / ۲ مئی ۱۱۳۲ء کو دینور کے مقام پر سنجر کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد مسعود خراسان کی سمت چل دیا۔ ستمبر ۱۱۳۵ء میں اس نے غزنی پر فوج کشی کی کیونکہ وہاں بہرام خان خود مختار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بہرام خان نے اطاعت قبول کر لی۔ اور سنجر نے اس کی جاں بخشی کر دی۔

سلطان سنجر اس کے بعد خوارزم کے حاکم عزیز بن محمد کے ساتھ ایک طویل جنگ میں الجھ گیا لیکن پے بہ پے جنگوں اور شکستوں کے بعد وہ آخر کار گرفتار ہوگیا اور تین سال کی قید کے بعد رہائی حاصل کی۔

اس کی وفات ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء میں ہوئی۔ اس بالغ نظر اور طاقتور سلطان کی موت کے بعد سلجوقی سلطنت تیزی کے رو بہ زوال ہونے لگی۔

سندھ

پاکستان کا جنوب مشرقی صوبہ۔ اس کا کل رقبہ اٹھاون ہزار آٹھ سو اکیس مربع میل اور آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ سندھ کے شمال مغرب میں پنجاب اور بلوچستان کے صوبے ہیں۔ مشرق و جنوب میں اس کی حدیں ہندوستانی علاقے سے جا ملتی ہیں۔ جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب کا ۱۵۰ میل لمبا ساحل واقع ہے۔ اس صوبے کا زیادہ تر حصہ دریائے سندھ کا ڈیلٹائی علاقہ ہے۔ ایرانیوں اور عربوں نے دریائے سندھ کو مہران کا نام دیا ہے۔ اسی لیے اس علاقے کو وادیٔ مہران کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد وحدتِ پاکستان کا قانون بن جانے کے بعد مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کی انفرادیت ختم کر دی گئی تھی۔ لیکن یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو سابق مغربی پاکستان کو دوبارہ چار صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ حیدرآباد ڈویژن، خیرپور ڈویژن اور ضلع کراچی کو ملا کر صوبہ سندھ بنایا گیا۔ موجودہ صوبہ سندھ کے گیارہ اضلاع ہیں۔ لیکن ۱۹۷۷ء کے مالی سال کے دوران میں لاڑکانہ کو بھی ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

سندھ کی قدیم تہذیب کے آثار موہنجوڈارو، عامری اور کوٹ ڈیجی کی صورت میں دریافت ہو چکے ہیں۔ محمد بن قاسم بھی دیبل کے علاقے میں پہنچا تھا۔ اس کے بعد ہی یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی اور اس برِعظیم پاک و ہند میں مذہب اسلام پھیلا۔ سندھ کا علاقہ نیم گرم منطقے میں واقع ہے اس لیے یہاں موسم گرما میں سخت گرمی اور سرما میں شدید سردی پڑتی ہے۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ (تقریباً سات انچ سالانہ) یہاں کی زمین ریتلی ہے۔ وسطی علاقے میں ببول کے خودرو درخت بہت زیادہ ملتے ہیں اس کے علاوہ سندھ کے علاقے میں بیر، جھاؤ، ککہ بیر (کیر) اور کنڈی کے درخت کافی پائے جاتے ہیں پھل دار درختوں میں آم، کھجور، امرود، نارنگی اور کیلے کے درخت عام ہوتے ہیں۔ سندھ کے بیشتر علاقوں میں بیلوں، بکریوں اور اونٹوں کی بہترین نسلیں پالی جاتی ہیں جنگلی جانوروں میں اڑیال (جنگلی بھیڑ) اور جنگلی بکرہ سیرہ مغربی چٹانی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ پہلے یہاں سیاہ ریچھ اور چیتے بھی پائے جاتے تھے لیکن اب کمیاب ہو گئے ہیں۔

یہاں کی عام بول چال کی زبان سندھی ہے۔ اُردو بھی عام سمجھی جاتی ہے۔ کراچی سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ صرف کراچی کی آبادی تقریباً ۵۴ لاکھ ہے۔ کراچی شہر ساحلِ سمندر پر واقع ہے اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ صوبائی دار الحکومت کا درجہ بھی اسی شہر کو حاصل ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بیشتر مہاجرین کراچی حیدرآباد اور سکھر میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس کے علاوہ ملحقہ صوبوں، پنجاب، سرحد، اور بلوچستان سے اب بھی آبادکار سندھ جا کر آباد ہو رہے ہیں۔ سندھ پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ بھی ہے۔

سنوسی

ایک اشعری فقیہ۔ ابو عبداللہ، محمد بن یوسف بن عمر بن شعیب تلمسان کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس نے اسلامی علوم، ریاضی اور علم ہیئت کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی جس میں اس کے اپنے والد ابو یعقوب یوسف، التلوتی، ابو عبداللہ الحباک، ابو الحسن القلصادی، ابن مرزوق اور قاسم العقبانی ہیں۔ سنوسی کے بارے میں مشہور ہے کہ تحصیلِ علم کی غرض سے وہ الجزائر بھی گیا تھا جہاں اس نے عبدالرحمن الثعالبی سے علم حاصل کیا۔ مغرب کے بیشتر علماء اسے نویں صدی ہجری کا مجدّد اور عالم تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کے تفقہ، زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ سنوسی کے شاگردوں میں ابن الحاج الیبدری، ابن العباس الصغیر، ابن صعد اور ابو القاسم الزواوی شامل ہیں۔

سنوسی نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کتابیں شمالی افریقہ میں بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) "عقیدۃ اهل التوحید المخرجۃ من ظلمۃ الجهل و ربقۃ التقلید" یا "العقیدۃ الکبریٰ"۔ (۲) "عمدۃ اهل التوفیق والتسدید" یہ کتاب پہلی کتاب کی شرح ہے۔ (۳) "عقیدہ اهل التوحید الصغریٰ" یا "اُم البراهین" اس کتاب کو عرفِ عام میں "سنوسیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ (۴) شرح علیٰ اُم البراهین در کتاب خانۂ ملی۔ (۵) "السنوسیۃ الوسطیٰ یا العقیدہ الوسطیٰ"۔ سنوسی نے ان کے علاوہ اور بھی بیسیوں کتابیں تصنیف کی ہیں۔

سنوسی، ادریس

سید محمد بن علی السنوسی المجاہری الحسنی الادریسی۔ آپ دینی اور فوجی جماعت سنوسیہ کے بانی تھے۔ آپ ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء میں الجزائر کے شہر مستغانم کے قریب ترش میں پیدا ہوئے۔ آپ زیانی بربر نسل کے خطاطیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے ابتدائی تعلیم الوطن میں پائی۔ بعد میں ۱۸۲۱ء تک فاس میں تفسیر القرآن، حدیث اور اصولِ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ تیونس اور قاہرہ سے ہوتے

ہونے تک پہنچ گئے۔ جہاں سب سے پہلے فریضۂ حج ادا کیا۔ آپ ١٨٣٠ء سے ١٨٤٣ء تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔ یہاں قیام کے دوران میں ادریسیہ سلسلے کے بانی احمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اجازۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ ١٨٣٧ء میں آپ نے ابوقبیس پر اپنے سلسلے کا پہلا زاویہ قائم کیا۔ اس کے بعد آپ نے رفاعہ کے زاویے کی بنیاد رکھی، پھر درنہ کے قریب البیضا کے زاویے کی، اس کے بعد آپ نے تمسہ اور آخر میں جغبوب میں زاویے قائم کیے۔ یہ زاویے دینی اور اجتماعی مرکز ہوتے تھے جہاں آس پاس کی آبادی کے بچوں کو قرآن مجید اور معمولی پڑھائی لکھائی کے علاوہ زراعت و باغبانی، کپڑا سازی، معماری اور نجاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان بچوں میں جذبہ جہاد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا تھا۔ ان زاویوں میں اساتذہ اور متعلمین اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے بھی کوشش کرتے رہتے تھے۔

آپ کی وفات ١٢٧٦ھ/١٨٥٩ء کو ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے جن میں سے بڑا بیٹا آپ کا جانشین بنا جس کا نام سید محمد المہدی تھا اور دوسرے کا نام سید محمد شریف تھا۔

سنوسی اگرچہ مالکی مذہب کے مقلد تھے لیکن اجتہاد کے بھی داعی تھے۔ آپ کی دعوت کا مدار توحید خالص قرآن مجید اور سنتِ نبوی ؐ پر تھا۔ آپ ابن تیمیہ اور الغزالی کے افکار سے بھی متاثر تھے۔ آپ کی کتابوں میں " الدرر السنیۃ فی اخبار السلالۃ الادریسیۃ " " الشموس الشارقۃ من اسانید المغاربۃ والمشارقۃ" " کتاب المسائل العشر المسمی بغیۃ المقاصد فی خلاصۃ المراصد" "السلسبیل المعین فی الطرائق الاربعین" اور" ایقاظ الوسنان فی العمل بالحدیث والقرآن " شامل ہیں۔

سنوسی، تحریک

شمالی افریقہ میں چلائی گئی ایک مذہبی تحریک۔ اس کا بنیادی مقصد سنت نبوی اور شریعت پر عمل کرانا تھا۔ اس تحریک کی ابتدا سید محمد بن علی سنوسی نے کی تھی جو اٹھارھویں صدی میں الجزائر کے ایک چھوٹے سے قصبے سنوس میں پیدا ہوئے تھے سنوسی تحریک کے عقائد نہایت سادہ اور اصلاحی تھے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ظاہر و باطن میں یکسانیت پیدا کرنا اور ہر انسان کو بلا امتیازِ مذہب اپنا بھائی سمجھنا اس تحریک کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ سنوسی تحریک کو منظم طریقے پر چلانے کے لیے جگہ جگہ تربیت گاہیں بنائی گئی تھیں جہاں پر لوگوں کو عبادت، مذہبی تعلیم اور فن حرب سکھائے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان تربیت گاہوں نے عوام میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ اس تحریک کے، نجد میں چلائی جانے والی" وہابی تحریک" سے بھی اچھے تعلقات استوار تھے۔ سنوسی تحریک کے پیروکار اسلامی ممالک میں یورپی اقتدار کے سخت مخالف تھے۔ اسی کے باعث اس تحریک کو مبشر اسلامی ممالک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ١٨٦٠ء میں اس تحریک کے بانی کا انتقال ہو گیا جس کے بعد احمد الشریف ان کے جانشین بنے۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر اب تک مراکش اور سوڈان سے جتنی بھی تحریکیں اٹھیں ان سب پر سنوسی تحریک کا اثر موجود تھا۔ جنگِ طرابلس ١٩١١ - ١٢ء میں سنوسیوں نے ترکوں کے ساتھ مل کر اٹلی کی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا اور پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں انہوں نے تمام طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ١٩٢٣ء میں مسولینی نے سنوسیوں کو کچلنے کی مہم شروع کر دی اور اس طرح ١٩٢٠ء تک سنوسی تحریک کو عارضی طور پر کچل دیا گیا۔ سنوسی تحریک کے مرکز کفرہ میں اٹلی کی فوجیں ١٢ جنوری ١٩٣١ء کو داخل ہو گئیں۔ یہاں انہوں نے مذہبی راہنماؤں اور تحریک کے دوسرے لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔ لیکن سنوسی تحریک کو مکمل طور پر نیست و نابود نہ کر سکے۔ دوسری جنگ عالمگیر میں سنوسی تحریک کے راہنماؤں نے اتحادی فوجوں کا ساتھ دیا۔ اسی لیے جنگ کے اختتام پر طرابلس میں سنوسیوں کے راہنما شیخ سنوسی کے ماتحت ایک خود مختار حکومت قائم کر دی گئی۔

سُنّی

سنّت رسولؐ اور اجماعِ امّت کرنے والے مسلمانوں کا گروہ سنی کہلاتا ہے سنی مسلمان عام طور پر ان چار اماموں کے پیروکار اور مقلد ہوتے ہیں۔ (١) امام ابو حنیفہؒ (٢) امام مالکؒ (٣) امام شافعیؒ (٤) امام احمد بن حنبلؒ۔

سنی عقیدے کے افراد چاروں خلفائے راشدین کو ترتیب وار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جائز جانشین مانتے ہیں جن کی ترتیب یہ ہے: حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ ابن الخطاب، (٣) حضرت عثمانؓ غنی اور حضرت علیؓ۔ ان چاروں خلفاء کے دور کو اسلامی دور حکومت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ آجکل تمام دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت سنی عقیدے سے تعلق رکھتی ہے۔

سواد

عراق کا ایک نام۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ لفظ عراق عربی میں پہلوی زبان سے مستعار ہے۔ عربی فتوحات کے مورخ عراق کے لیے معمولاً لفظ سواد کی سیاسی تقسیم مراد لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ محاصل پر مخصوص کتابوں اور سیاسی رسائل کے مصنفین (دیکھیے ابو یوسف، یحییٰ بن آدم، قدامۃ، الماوردی، نیز ابن خلدون) ... کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے کے پیمائش اراضی و مال گزاری کے قواعد و ضوابط میں لفظ سواد سرکاری طور پر استعمال ہوتا تھا۔

یہ لفظ یا نام کسی ضلعے کے اندر مزروعہ علاقے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً سواد العراق، سواد خوزستان، سواد الاردن۔

ایک اور معنی میں اس سے مراد شہر کے نام سے پہلے شہر کے وہ کھیت ہوتے ہیں جن کی باقاعدہ آب پاشی کی جائے۔ مثلاً سواد البصرہ، کوفہ، واسط، بغداد، بخارا وغیرہ۔

سُود

وہ رقم جو ادھار پر دیئے ہوئے روپے کے صلے میں مقررہ وقفوں سے واجب ادا ہوتی ہے۔ سود مقررہ فیصد سالانہ کے حساب سے لگایا جاتا ہے روپیہ جو قرض دیا جاتا ہے اصل زر کہلاتا ہے۔ اگر واجب الادا ہونے پر سود ادا نہ کیا جائے اور سود پر سود نہ لیا جائے تو اسے سود مفرد کہتے ہیں۔ اگر سود کو ... جبکہ وہ واجب الادا ہو اصل زر میں شامل کر دیا جائے تو اسے سود مرکب یا سود در سود کہتے ہیں۔

عربی میں یہ لفظ ربوٰ ہے اور اس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باولا کر دیا ہو اور اس میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

اسی سورہ میں آگے ذکر ہے کہ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔"

سورہ بقرہ میں ہے کہ جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خوری سے باز آ جائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اس حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بد اعمال انسان کو پسند نہیں کرتا ٭

سودۃ، ام المؤمنین

اُمّ المومنین۔ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی دوسری بیوی۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے بعد اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پہلے کاشانۂ نبویؐ میں آئیں۔ حضرت سودۃ بنتِ زمعہ کا خاندان عامر بن لُوّی کے بیٹے حِسل سے چلا۔ عامر، کعب کے بھائی تھے۔ کعب بن لوّی آنحضورؐ کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ حضرت سودۃؓ کا نکاح سب سے پہلے السکرانؓ بن عمرو سے ہوا۔ آپ ان کے ساتھ مسلمان بھی ہوئی تھیں۔ اسلام لانے کے بعد السکرانؓ کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کی۔ بعد میں وہ دوبارہ مکے چلے گئے۔ لیکن مکہ جانے کے بعد السکرانؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت سودۃؓ حضورؐ کی نبوت کے دسویں سال، حضرتِ خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے عقد میں آئیں۔

حضرت خدیجہؓ کا انتقال ۱۰ رمضان ۱۰ نبوی کو ہوا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد بچوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے حضرت خولہؓ بنتِ حکیم نے حضورؐ کو مشورہ دیا کہ آپ حضرت سودۃؓ بنتِ زمعہ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ جب تمام مراحل طے ہو گئے تو حضورؐ ان کے گھر خود تشریف لے گئے۔ حضرت سودۃؓ کے والد نے آپؐ کے ساتھ نکاح پڑھا دیا اور بچوں کی نگرانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی کے لیے فوراً ہی رخصت بھی کر دیا

حضرت سودۃؓ کو تقریباً ساڑھے بارہ سال تک آپؐ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد تقریباً گیارہ سال تک حیات رہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۵۴ھ ہے۔

حضرت سودۃؓ کے پہلے شوہر سکرانؓ سے ان کے ہاں ایک صاحبزادے حضرت عبد الرحمٰنؓ پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے جنگِ جلولا میں شہادت پائی۔ حضرت سودۃؓ کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی حضرت سودۃؓ میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف کے طور پر نظر آتی ہے۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی جس میں درہم تھے۔ آپ نے لانے والے سے سوال کیا کہ "اس میں کیا ہے؟" لانے والے نے جواب دیا کہ "درہم"۔ آپ نے فوراً کہا۔ "کھجور کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں؟" اس کے بعد کنیز کو حکم دیا کہ ان تمام درہموں کو اہلِ حاجت میں تقسیم کر دیا جائے۔" (ابن سعد)

آپ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ طائف کی کھالیں بناتی تھیں اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی تھی اسے نہایت فیاضی کے ساتھ نیک کاموں میں خرچ کیا کرتی تھیں۔ (الاصابہ)

آپ کے اخلاق کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ "سودۃؓ کے سوا کسی عورت کو دیکھ کر مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ اس کے قالب میں میری روح ہوتی۔" (ابن سعد) ٭

سوڈان

افریقہ کا ایک آزاد ملک۔ سوڈان کو ۱۹۵۶ء میں آزادی ملی۔ وہاں پر جمہوری نظام رائج ہے۔ برطانیہ اور مصر کی مشترکہ عملداری ۱۹۵۶ء میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہاں پر آجکل دس افراد پر مشتمل ایک انقلابی کونسل قائم ہے جو صدر نمیری کی نگرانی میں ملک کا انتظام و انصرام چلا رہی ہے۔ سوڈان کا کل رقبہ نو لاکھ سڑسٹھ ہزار پانچ سو مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ آبادی کی اکثریت یعنی ¾ حصہ مسلمان ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر عرب اور نوبی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد چھ صوبوں میں آباد ہیں جبکہ باقی تین صوبوں میں نیلی اور زندگی نسل کے قبائل رہتے ہیں۔

اس ملک کا دارالحکومت خرطوم ہے جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

سوڈان کے دوسرے بڑے بڑے شہر اور ان کی آبادی مندرجہ ذیل ہے:

(۱) اُم درمان۔ ۷۵،۰۰۰ تقریباً (۲) خرطوم شمالی۔ ۶۲،۰۰۰ تقریباً
(۳) پورٹ سوڈان۔ ۶۰،۰۰۰ تقریباً (۴) اتبرا۔ ۵۰،۰۰۰ تقریباً
(۵) کوستی۔ ۳۵،۰۰۰ تقریباً

سوڈان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ زرعی پیداوار میں لمبے ریشے کی کپاس خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے ذریعے کافی زرِ مبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ کپاس کے علاوہ کھجوریں، تیل اور کھالیں بھی دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔

سوڈان میں رسل و رسائل کا نظام بہت عمدہ ہے۔ جا بجا سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ دور دراز کے تمام علاقوں کو ریلوے لائن کے ذریعے خرطوم سے ملا دیا گیا ہے۔ ہوائی سروس بھی نہایت موثر ہے۔

سوڈان میں خرطوم یونیورسٹی موجود ہے جس میں تقریباً چار ہزار طلبا زیرِ تعلیم ہیں اس کے علاوہ کتنے ہی دینی مدارس ہیں۔ پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس بھی سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں ہی منعقد ہوئی تھی ٭

سُورت

قرآن مجید کے مختلف ابواب۔ سورت کے معنی ایک قطعہ کے ہیں۔ اس لیے سورت القرآن کا مطلب ہوا کہ قرآن مجید کا ایک ٹکڑا۔ سورت قرآن مجید کی آیات کے ایک ایسے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ جس کا آغاز اور انجام ہو اور وحی الٰہی کی بنا پر، یا رسولِ خدا کے حکم سے دیگر آیات سے الگ کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں کچھ سورتیں ایسی ہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں اور کچھ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔

قرآن مجید میں مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں لفظ سورت کا مفہوم بیان ہوا ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ کا مفہوم وحی کے وہ مختلف اجزا ہیں جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے۔ سورۃ البقرہ کی تئیسویں آیت میں آپؐ کے مخالفین کو دعوت دی گئی کہ وہ ان سورتوں جیسی ایک سورت ہی بنا لائیں۔" اور (دیکھو) اگر تمہیں اس (کلام) کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) پر نازل کیا ہے تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ" (البقرہ: ۲۳)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی رسولِ خدا) نے اللہ کے نام پہ یہ اختراع کیا ہے؟ تم کہو۔" اگر تم اپنے قول میں سچے ہو (اور اگر ایک آدمی اپنے جی سے گھڑ کر ایسا کلام بنا سکتا ہے) تو قرآن کی مانند ایک سورت ہی بنا کر تم پیش کر دو۔ (یونس : ۳۸)

اسی طرح ایک اور جگہ آیا ہے کہ " یہ سورت ہے کہ ہم نے اسے اتارا ہے اور اسے فرض کر دیا ہے اور اس میں اپنی نشانیاں اتار دی ہیں۔" (النور : ۱)

قرآن مجید میں کُل ایک سَو چودہ سورتیں ہیں۔ جن میں سب سے پہلی سورۃ " الفاتحہ" اور آخری " والناس" ہے۔ ان ایک سَو چودہ سورتوں میں سے ہر ایک سوائے سورۂ توبہ کے بسم اللہ سے شروع ہوتی ہے جو پہلی سورت کے اختتام اور نئی سورت کے آغاز یعنی افتتاح کی علامت ہے۔ کسی بھی سورت کی کم سے کم آیات کی تعداد تین قرار دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حضورؐ کی ایک حدیث کا حوالہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ " مجھے اللہ تعالےٰ نے تورات کی جگہ السبع الطوال (البقرہ، آلِ عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور الکہف)، زبور کی جگہ المئین (یعنی سَو آیت یا اس سے زیادہ والی سورتیں) اور انجیل کی جگہ المثانی (وہ چھوٹی سورتیں جن کی آیات سَو سے کم ہوں) عطا کی ہیں، المفصّل (مختصر سورتیں) عطا کر کے مجھے سب پر فضیلت دی گئی ہے۔"

اسی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف علماء نے قرآن مجید کی تمام سورتوں کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے لمبی سورتوں کو " الطوال" ان سے کم آیات والی سورتوں کو المؤن، ان سے کم آیات والی کو المثانی (المثانی تمام قرآن مجید اور سورۂ الفاتحہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے) اور اُن سے کم آیات والی کو المفصّل کہا جاتا ہے۔ المفصل کے زمرے میں آنے والی سورتوں کو مزید تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سورۃ النباء تک کو طوالِ مفصّل کہا گیا ہے۔ الضحیٰ تک کی سورتیں اوساطِ مفصل قرار پاتی ہیں اور الضحیٰ سے آخر تک والی سورتوں کو قصار مفصل کہتے ہیں۔ (دیکھیے بخاری اور کشاف اصطلاحات الفنون")

ہجرت سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں کو مکی اور ہجرت کے بعد نازل ہونے والی سورتوں کو مدنی سورتیں کہا جاتا ہے۔ جبکہ بعض مدنی سورتوں میں مکی آیات اور مکی سورتوں میں مدنی آیات بھی شامل ہیں۔ مکے میں سب سے پہلی سورۃ العلق اور سب سے آخری سورت المطففین نازل ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مدنی سورتیں زیادہ تر لمبی ہیں اور مکی چھوٹی۔

سوری خاندان

افغانوں کا ایک قبیلہ۔ جس کے ایک شخص فرید ملقب بہ شیر شاہ سوری نے ہندوستان پر حکومت بھی کی۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سور اپنا سلسلۂ نسب شنسبانیان غور سے ملاتے ہیں۔ لیکن عام لوگ اس شجرہ کو فرضی خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ شجرہ شیر شاہ سوری کی خوشنودی کے لیے بنایا گیا ہو۔

سوری خاندان کے لوگ اصل میں لودھیوں کے ایک قبیلے کی شاخ ہیں جس سے بہلول لودھی اور اس کے دو جانشین تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک محقق سر جن جنرل بلیو (BELLEW) نے تحقیق کی ہے وہ کہتا ہے کہ لودھی قبیلے کی تین بڑی بڑی شاخیں ہیں : سیانی، نیازی اور ڈوٹانی۔ سیانی شاخ مزید دو شاخوں پرنگی اور اسمٰعیل میں بٹی ہوئی ہے۔ اسمٰعیل پھر تین شاخوں میں بٹ جاتی ہے : سور، لوہانی، اور مہپال۔

جب بہلول لودھی ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس کے دور میں بہت سے افغانی قبیلے یہاں آکر آباد ہوگئے۔ اسی دوران میں ابراہیم خان سور کی قیادت میں ایک جماعت بھی یہاں آکر آباد ہوگئی۔ ابراہیم خان سور کو حصار، فیروزہ اور نارنول کے اضلاع میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر بھی متعین کیا گیا۔

ابراہیم خان سور کے چار بیٹے تھے۔ حسن، احمد، محمد اور غازی۔ حسن کے بھی چار بیٹے تھے۔ فرید، نظام، سلیمان اور احمد۔ فرید (شیر شاہ سوری) ہندوستان کا بادشاہ بھی بن گیا۔ سوری خاندان کا شجرہ نسب کچھ یوں ہے :-

ابراہیم خان سُور
- حسن
  - فرید (شیر شاہ سوری)
    - عادل خاں
    - جلال خاں
    - اسلام شاہ
      - سلیم شاہ
        - فیروز
  - نظام
    - بی بی بائی
    - مبارز خاں (محمد شاہ عادل عدلی)
  - سلیمان
  - احمد
- احمد
  - احمد (سکندر شاہ)
- محمد
- غازی
  - ابراہیم
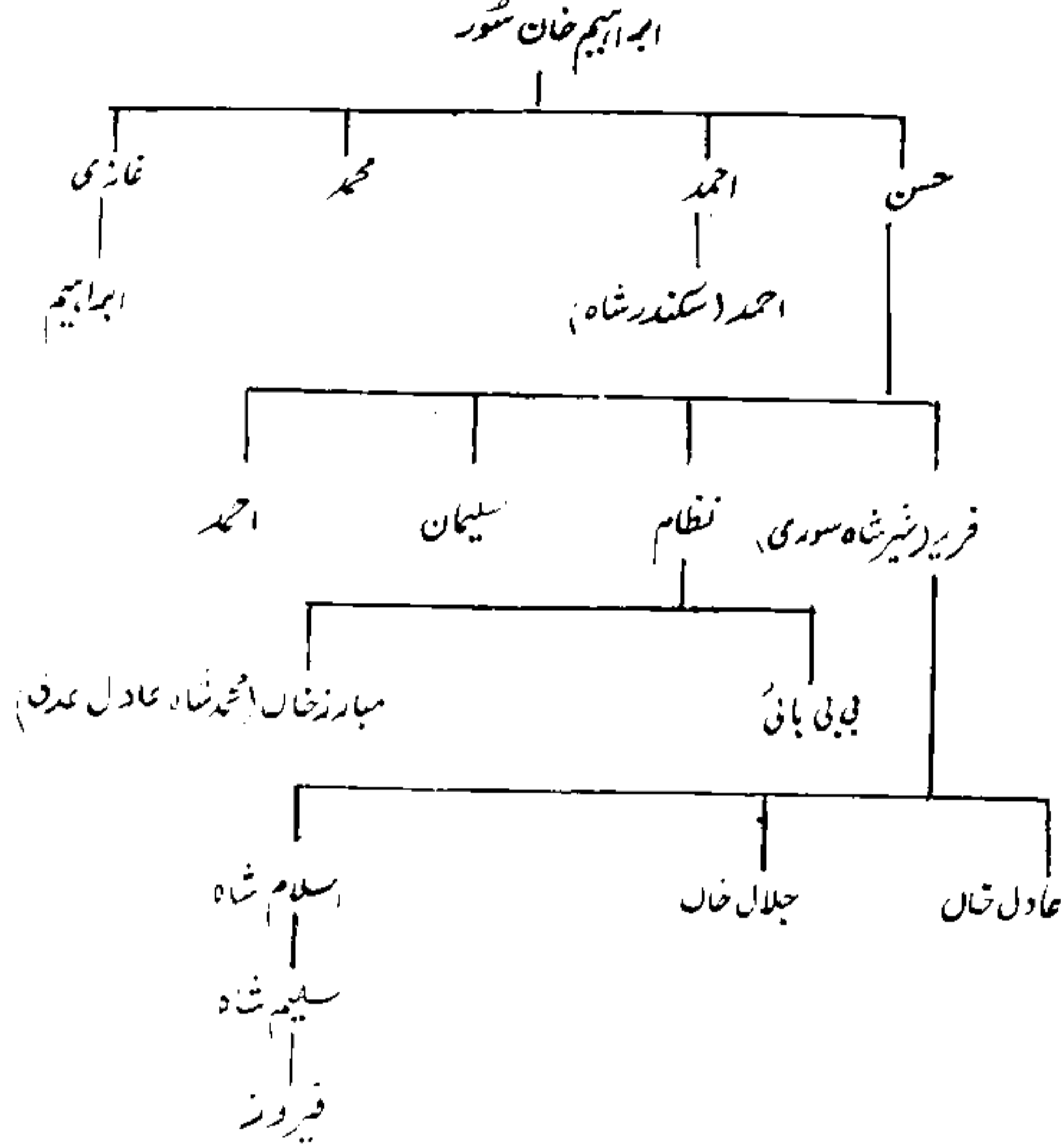
شیر شاہ سوری نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور کردار کی مضبوطی سے باغی [illegible] کی گردنیں اور علاقوں کو سختی سے دبا دیا تھا۔ لیکن شیر کی موت کے بعد کوئی بھی ایسا باصلاحیت شخص نہیں تھا جو اس کا جانشین بنتا۔ شیر شاہ کا بیٹا جلال خاں [illegible] یا سلیم شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا لیکن صحیح طرح سے حکومت نہ چلا سکے۔ [illegible] جلال خاں نے حکومت کی۔ اس کے بعد سلیم شاہ کا نوعمر بیٹا فیروز تخت پر بیٹھا جو اپنے ماموں مبارز خاں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس وقت مبارز خاں محمد شاہ عادل کے لقب سے تخت [illegible] ہوا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں تین افراد اپنے آپ کو [illegible] سمجھتے تھے۔ (۱) ابراہیم جس نے دہلی اور آگرے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ (۲) محمد شاہ عادل جو [illegible] تھا اور (۳) احمد سور جس نے پنجاب کے علاقے میں سکندر شاہ کے لقب سے حکومت [illegible] تھی۔ اس نے ابراہیم کو دہلی اور آگرے سے لڑائی کے بعد [illegible] باہر کیا تھا [illegible] ہمایوں نے ان سب کو تخت سے محروم کر دیا۔

سومنات

ریاست جوناگڑھ واقع گجرات کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے ایک مشہور شہر۔ سومنات کے مندر میں چاند دیوتا کا ایک قوی ہیکل بُت رکھا تھا۔ ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے اس بت سے عقیدت رکھتے تھے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقع پر یہاں ایک زبردست میلہ لگتا اور سونا چاندی، ہیرے جواہرات بت کی خاطر نذر کیے جاتے تھے۔ مندر کے مصارف پورے کرنے کے لیے مختلف راجاؤں

نے دس ہزار گاؤں وقف کر رکھے تھے۔

سلطان محمود غزنوی جب ہندوستان کے مختلف مقامات فتح کر رہا تھا تو بت پرستوں کا خیال یہ تھا کہ ان پر عتاب سومنات کی ناراضی کے باعث ہوا ہے سلطان کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے بت کو توڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا تاکہ لوگوں کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے لیکن طویل صحرائی سفر کا انتظام کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پھر سومنات پہ حملہ کرنا پورے ہندوستان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا تھا۔ مگر محمود نے ان تمام مشکلات پہ فتح پائی اور تیس ہزار بہادر سپاہیوں کے ہمراہ غزنوی سے روانہ ہوا اور سومنات پہنچ گیا۔ سومنات کے لیے ہندو راجاؤں کا ایک لشکر جرار موجود تھا۔ مگر محمود نے نہایت شجاعت اور بہادری سے اس پہ حملہ کر دیا۔ مندر کی فصیلوں سے ہونے والی تیر اندازی اور مختلف سمتوں سے آنے والی ہندو راجاؤں کی مسلسل عسکری امداد نے بھی اس کے پائے استقلال کو ڈگمگانے نہ دیا۔

نہایت گھمسان کی خونریز جنگ کے بعد ہندوؤں کو شکست دے کر محمود غزنوی مندر کے اندر داخل ہو گیا۔ پجاریوں اور دیگر ہندو راجاؤں نے محمود سے التجائیں کیں کہ وہ اس بت کو نہ توڑے بلکہ اس کی منہ مانگی قیمت لے کر اس سے باز آ جائے لیکن اس موقع پر محمود نے جو الفاظ کہے وہ تاریخ کا ورثہ ہیں۔ اس نے کہا میں تاریخ میں اپنا نام بت فروش کی حیثیت سے نہیں بلکہ بت شکن کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں چنانچہ اس نے اپنا گرز مار کر اس بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس بت کے اندر محفوظ اس قدر دولت نکلی جو سلطان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس طرح محمود کو اپنی دیانت اور دین داری کا صلہ مل گیا۔

سونا

قیمتی دھات کی ایک قسم۔ عموماً زیورات بنانے اور سکہ سازی کے کام آتی ہے اسلام میں ذاتی ملکیت کے سونے پر بیس مثقال یعنی ساڑھے سات تولہ یا بعض کے نزدیک پانچ تولہ ڈھائی ماشہ کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر کی خواتین سونے کے زیورات نہایت شوق سے استعمال کرتی ہیں۔ آنحضرتؐ نے مردوں کو سونے کی انگوٹھی یا اس کا کوئی اور زیور پہننے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ آپؐ نے انگوٹھی کو اس کے ہاتھ سے اتار لیا اور پھینک دیا۔ پھر فرمایا "تم میں سے کوئی دوزخ کی آگ کے انگارے کا ارادہ کرتا اور اس کو ہاتھ کی انگلی میں پہن لیتا۔" (مسلم)

سوید بن صامت

سوید بن صامت مدینہ کا رہنے والا تھا اور قبیلہ اوس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی شرافت، شجاعت، اور ہمت کی وجہ سے اس کا لقب "کامل" پڑ گیا۔ ایک مرتبہ وہ مکہ کی زیارت کے لیے گیا تو وہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دعوتِ اسلام دی۔

سوید نے حضورؐ سے کہا۔ "آپ کے پاس جو چیز ہے شاید ایسی ہی میرے پاس بھی ہے" رسول اللہ صلعم نے اس سے معلوم کیا کہ "بتاؤ وہ کونسی چیز ہے؟" سوید نے جواب دیا کہ "حکمت لقمان"۔ حضورؐ نے اس میں سے کچھ سنانے کو کہا۔ سوید نے لقمان کے چند مقولے سنائے۔ جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ واقعی بہت اچھی چیز ہے لیکن جو چیز میرے پاس ہے وہ اس سے بھی بہتر ہے۔ وہ قرآنِ حکیم ہے جو اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے، وہ ہدایت اور نور ہے۔" یہ کہہ کر حضورؐ نے کچھ قرآنی آیات سوید کو سنائیں اور پھر دعوتِ اسلام دی۔ قرآنی آیات سن لینے کے بعد سوید کہنے لگا کہ یہ کلام واقعتاً میرے کلام سے بہتر ہے۔" سوید بن صامت یہ کہتا ہوا چلا گیا لیکن باقاعدہ دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب خزرجیوں نے اسے قتل کیا تو اس وقت تک وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

سویق، غزوہ

جَو کا آٹا (ستو)، گندم کا آٹا یا خشک میووں کا آٹا۔ اس کے علاوہ اس شوربے کو بھی سویق کہا جاتا ہے جو اس آٹے میں پانی ملا کر بنایا جائے۔ یا ہریرہ جس میں شہد، تیل یا شربت انار وغیرہ ملا دیا جائے۔

غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لیے ابوسفیان ذوالحجہ ۲ ہجری کو اپنے ساتھ سواروں کا ایک گروہ لے کر مدینہ منورہ کی جانب چل پڑا۔ مدینہ کے قریب مسلمانوں کے ساتھ اس کی ایک معمولی سی جھڑپ بھی ہوئی۔ اس جھڑپ میں جب حضورؐ اپنے رفقا سمیت مقابلے کے لیے آئے تو تمام کفار بھاگ نکلے اور جاتے وقت اپنا سامانِ خوراک جو سویق کی شکل میں تھا پھینک گئے۔ اس سویق کو مسلمانوں نے اٹھا لیا۔ اس واقعے کے باعث مختلف کتابوں میں اس جھڑپ کو غزوہ السویق بھی لکھا جاتا ہے۔

سہارتو، جنرل

انڈونیشیا کے موجودہ صدر مملکت۔ ۲۰ فروری ۱۹۲۱ء کو جاوا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گریجولیشن مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ایک بنک میں بطور کلرک ملازمت اختیار کر لی۔ ازاں بعد وہ ولندیزی نوآبادیاتی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے ملٹری اکیڈمی، گومبونگ (جاوا) میں خصوصی فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ جب ۱۹۴۲ء میں جاپانی فوجوں نے نیدرلینڈ اور ایسٹ انڈیز پر قبضہ کیا تو انھیں تربیت کے لیے آفیسرز ٹریننگ اسکول بھیج دیا گیا۔ کمیشن حاصل کرنے کے بعد انھیں جکارتہ میں تعینات کر دیا گیا۔

جنرل سوہارتو

انڈونیشیا کی آزادی کی تحریک کے دوران میں جب ولندیزیوں کے خلاف ڈاکٹر سوکارنو کی قیادت میں چار سالہ گوریلا جنگ ہوئی تو سہارتو اس گوریلا جنگ میں شریک تھے۔ جب ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء کو انڈونیشیا کو جمہوریہ قرار دیا گیا تو اس وقت انھیں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں وہ بریگیڈیئر جنرل اور بری فوج کے ڈپٹی چیف آف اسٹاف بنے۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں میجر جنرل بنا دیا گیا۔ اسی سال انھیں بلغراد، بون اور پیرس میں بحیثیت ملٹری اتاشی تعینات کیا گیا۔

فروری ۱۹۶۷ء میں انڈونیشیا کی قومی مشاورتی کانگرس نے صدر سوہارتو کو

صدرِ مملکت کے عہدے سے علیحدہ کرنے کے لئے ووٹ دیا تو انھیں قائم مقام صدر مملکت بنا دیا گیا۔

۱۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو جنرل سہارتو نے صدرِ مملکت کے اختیارات سنبھال لیے۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں انھیں پانچ سال کے لیے بلامقابلہ انڈونیشیا کا صدر منتخب کر لیا گیا ۱۹۷۳ء میں دوسری پانچ سالہ میقات کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں تیسری میقات کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ اس موقع پر حکومت نے دس ہزار سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا اعلان کیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب انڈونیشیا کے ۵۰ ممتاز سیاست دانوں نے ایک مشترکہ بیان میں صدر سہارتو کے آمرانہ اقدامات کی مذمت کی۔ تو جنرل سہارتو نے اخبارات اور آزادی تحریر و تقریر کے دوسرے وسائل و ذرائع پر کڑی پابندیاں عائد کر دیں۔

سہارن پور

یو۔ پی (بھارت) کا ایک شہر۔ اس شہر کی بنیاد محمد بن تغلق کے عہد میں ۱۳۴۰ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کا نام اسی علاقے میں رہنے والی مشہور ولی شاہ ہرن یا شاہ ہارن چشتی کے نام پر سہارنپور رکھ دیا گیا تھا۔ یہ اتر پردیش کا ایک ضلع بھی ہے۔ اس ضلع کا رقبہ ۲۲۲۸ مربع میل اور آبادی تقریباً ۱۸ لاکھ ہے۔ اس ضلع میں دریائے گنگا اور جمنا کا دوآبہ واقع ہے۔ شہر کی شمالی سرحد پر شوالک کی پہاڑیاں ہیں جن میں کئی پُرپیچ درّے موجود ہیں۔ یہاں پر زیادہ تر گندم، چاول، چنا، باجرہ، مکئی، جَو، گنا اور کپاس کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ اصل شہر ایک نشیبی اور مرطوب جگہ پر دھرم ملاندی کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

یہاں ایک درس گاہ مدرسۂ مظاہرالعلوم واقع ہے جو علوم عربیہ کے بارے میں بہت مشہور ہے۔ اس درسگاہ میں ہر سال ایک ہزار کے لگ بھگ طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مولانا خلیل احمدؒ سہارنپوری، مولانا ظفر احمد تھانوی اور مولانا محمد زکریا کاندھلوی اسی درس گاہ سے متعلق رہے تھے۔ لیکن اب ان کی سیاسی اہمیت زوال پذیر ہے۔

سہروردی

شہاب الدین ابوحفص عمر ابن عبداللہ۔ ایک صوفی بزرگ۔ آپ شافعی المذہب کے عالم دین مانے جاتے ہیں۔ ۵۳۹ھ/۱۱۴۵ء میں ایران کے صوبہ جبال کے ایک مقام سہرورد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تصوف کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا ابوالنجیب اور مشہور صوفی بزرگ عبدالقادر جیلانیؒ سے حاصل کی۔ آپ زیادہ عرصے تک بغداد میں مقیم رہے۔ شیخ سعدیؒ نے شہاب الدین سہروردی سے تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ انہوں نے بوستانِ سعدی میں ایک حکایت ان سے منسوب کر کے بھی لکھی ہے۔ سہروردی نے کئی بار حج بھی کیا تھا۔ آپ سب سے زیادہ راسخ الاعتقاد صوفیوں کے نمائندہ مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے "عوارف المعارف"، اور "النصائح الایمانیہ وکشف الفصائح الیونانیہ" ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر علم الاخلاق اور عملی تصوف پر لکھی گئی ہیں۔ آپ کا ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں انتقال ہو گیا۔ آپ نے طویل عمر پائی۔

سہروردی

شہاب الدین یحییٰ بن حبش بن امیرک۔ ایک فلسفی اور صوفی بزرگ۔ آپ کی درست تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ آپ بارھویں صدی عیسوی وسط میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قانون کی تعلیم مراغہ میں حاصل کی اور بعد میں فلسفی اور صوفی کی حیثیت میں اصفہان چلے گئے۔ جہاں سے بعد میں حلب پہنچے۔ اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدا میں حلب کے والی نے آپ کے صوفیانہ عقائد کی سرپرستی کی لیکن اس زمانے کے بہت سے دوسرے علماء نے ان کے عقائد کو درست ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ آپ پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ بھی کیا۔ کیونکہ ان کے بقول سہروردی کے ہاں متناسخ تصورات کے ساتھ ساتھ وہ سارا متصوفانہ فلسفہ موجود ہے جو اسلام نے یونانی نظریہ تطبیق معتقدات اور اتحادِ مذاہب سے اخذ کیا تھا۔ علماء کہتے تھے کہ اسلام میں اتحادِ مذاہب کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس اتحادِ مذہب کا تصور موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور ازل سے ہے۔ اور اس کی آخری صورت وہ ہے جو نبی کریم آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کی صورت میں نازل ہوئی۔ اس میں اسلامی تعلیم سے قریب ترین یہود و نصاریٰ ہیں لیکن اسلام مکمل آجانے کی صورت میں یہ شریعتیں منسوخ قرار پا چکی ہیں۔ اسی لیے اتحادِ مذاہب کا عقیدہ باطل ہے اور صرف اتحادِ مذہب کا عقیدہ درست ہے۔

ان علماء کے مطالبہ کرنے پر والیٔ حلب الملک الظاہر بن صلاح الدین نے سہروردی کو قید کر کے قتل کرا دیا۔ اس وقت سہروردی کی عمر تقریباً ۳۶ یا ۳۸ سال تھی۔

سہروردی ابوالنجیب

چھٹی صدی کے ایک صوفی بزرگ۔ آپ صفر ۴۹۰ھ کو سہرورد نام کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ جوانی کے زمانہ میں آپ بغداد چلے گئے جہاں آپ نے جامعہ نظامیہ میں علم حاصل کیا۔ آپ نے امام اسعد مہینی سے فقہ، اصولِ فقہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ امام بیہقیؒ، خطیب بغدادیؒ، اور امام قشیریؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ کو حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا "سفینۃ الاولیا" کے مطابق آپ نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے خرقہ بھی حاصل کیا تھا۔

آپ علوم ظاہری حاصل کر لینے کے بعد علوم باطنی کی جانب بھی متوجہ ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑ کر درویشوں کی صحبت میں شامل ہو گئے۔ کتنے ہی چلّے اور مجاہدے کیے۔ حضرت احمد غزالیؒ کی صحبت میں رہ کر بھی سلوک کی منزلیں طے کیں۔ آپ کا فیض صرف عالموں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بعض مقتدر افراد اور یہاں تک کہ خلیفۂ وقت تک آپ کے معتقد تھے۔

آپ کی وفات ۵۶۳ھ کو بغداد میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر بہتّر سال تھی۔

سہروردی بہاؤالدین زکریاؒ

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے آب و جد مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ملتان آکر آباد ہو گئے۔ بہاؤالدین زکریاؒ کے سن پیدائش کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ آپ ۵۶۵ھ یا ۵۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام وجیہہ الدین تھا جب زکریاؒ کی عمر بارہ سال ہوئی تو آپ کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ نے قرآن پاک حفظ کیا اور پھر مزید تعلیم کے حصول کے لیے خراسان چلے گئے جہاں سات سال تک بزرگوں سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیا۔ خراسان سے بخارا گئے۔ جہاں مزید علم حاصل کیا آپ کے اوصافِ حمیدہ کے باعث اہلِ بخارا بہاؤالدین فرشتہ کہنے لگے تھے۔ آٹھ سال تک بخارا میں رہنے کے بعد آپ حج کے لیے مکہ گئے وہاں سے روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے مدینہ چلے گئے جہاں پانچ سال رہے۔ مدینہ میں رہائش کے دوران میں آپ نے مولانا کمال الدین محمد جیسے جلیل القدر محدّث سے حدیث پڑھی۔ آپ نے روضۂ اقدس کے نزدیک تزکیہ قلب اور تصفیہ باطن کے لیے مجاہدہ بھی شروع کیا۔ بعد میں یہاں سے بیت المقدس پہنچے اور وہاں

سے بغداد چلے گئے۔ یہاں آپ نے شہاب الدین سہروردی کی صحبت سے کسب فیض کیا۔ اور خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ آپ اپنے مرشد شہاب الدین کے پاس صرف سترہ دن رہے تھے۔ خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان آگئے اور یہاں اپنے رشد و ہدایت کا فیض جاری کیا۔ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ سہروردی بابا گنج شکرؒ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت زکریاؒ اور گنج شکرؒ خالہ زاد بھائی تھے۔

حضرت بہاؤ الدین زکریا کے سن وفات میں بھی علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اخبار الاخیار میں آپ کی وفات کا سال ۶۶۱ھ درج ہے جبکہ سفینۃ الاولیا اور تاریخ فرشتہ میں ۶۶۶ھ درج ہے۔ آپ کا مزار ملتان میں ہے جہاں ہزاروں مرید باصفا ہر سال اکٹھے ہوتے ہیں۔

حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ کی کسی تصنیف کا علم نہیں اور نہ ہی ملفوظات کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن آپ نے جو خطوط اپنے مریدوں کو لکھے تھے۔ ان کے اقتباسات کو اخبار الاخیار میں درج کر دیا گیا ہے۔ ان اقتباسات سے آپ کی صوفیانہ تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے۔

سہیل التستری

ایک سنی متکلم اور صوفی۔ ابو محمد سہل بن عبداللہ بن یونس۔ ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں تستر (اہواز) میں پیدا ہوئے۔ ابن خلکان کو اس تاریخ پیدائش سے اختلاف ہے وہ پیدائش کا سال ۲۰۰ھ/۸۱۵ء بتاتا ہے۔

سہل الثوری اور ابو عمرو بن العلاء جیسے سنی عالموں کے شاگرد تھے۔ آپ زہد و تقشف میں بڑے کڑے ضابطۂ اخلاق کے پابند تھے۔ اسی لیے علمائے متکلمین میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔ اہواز کے علماء نے آپ کے "رسالہ عقائد" کی جو فرضیت توبہ سے متعلق تھا، شدید مذمت کی جس کے باعث انہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔ سہل نے خود کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ان کے شاگرد محمد بن سالم نے "ایک ہزار ملفوظات" مرتب کیے ہیں۔ آپ کے عقائد میں بہت تسلسل اور باہمی ربط موجود تھا۔ اسی لیے ان کے باعث ایک الگ مذہب، سالمیہ وجود میں آگیا۔ سالمیہ مذہب کی بیشتر خصوصیات سہل کے عقائد سے ہی ماخذ ہیں۔

سہل التستری کا ایک قول ہے کہ "ہمارے سات اصول ہیں (۱) کتاب اللہ سے تمسک، (۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء، (۳) اکل حلال، (۴) کسی کو تکلیف و اذیت دینے سے بچنا، (۵) گناہوں سے اجتناب، (۶) توبہ، (۷) ادائے حقوق۔"

ان کا ایک اور قول بھی کافی مشہور ہے کہ "جو دل آخرت کے ذکر سے خالی ہو گا اس میں شیطانی وسوسے گھر کر لیں گے۔"

سہل التستری کا انتقال جلاوطنی کی حالت میں ہی ۲۸۳ھ/۸۹۶ء میں بصرے میں ہوا۔

سہیل بن حنیف

آپ کی کنیت ابو سعد تھی۔ ہجرت سے پہلے ہی آپ دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں آپ کو مدینہ کی امیری بھی ملی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کوفہ چلے گئے۔ جنگ جمل کے خاتمے کے بعد آپ بصرہ کے حاکم بھی مقرر ہوئے۔ جب جنگ صفین کا آغاز ہوا تو آپ حضرت علیؓ کی فوجوں کے ساتھ مل کر لڑے۔ لڑائی کے اختتام پر آپ دوبارہ کوفہ تشریف لے آئے۔ آپ ایک مرتبہ فارس کے حاکم بھی بنے۔ لیکن اہل فارس نے بغاوت کر دی۔ اور انہیں وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کے فارس سے نکالے جانے کے بعد زیاد بن ابیہ کو وہاں کا حاکم بنا دیا گیا۔ سہیلؓ بن حنیف فارس سے نکل کر واپس کوفہ پہنچے۔ جہاں ۳۸ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ نہایت خوبصورت اور مناسب قد و قامت کے حامل شخص تھے کہ ہر کوئی انہیں دیکھ کر تعریفی کلمات کہے بغیر نہیں رہتا تھا۔ غزوۂ احد میں آپ ان چند جانثاروں میں شامل تھے جو میدان جنگ میں حضورؐ کی حفاظت کے لیے ثابت قدمی سے جمے رہے۔ آپ نہایت بہادر اور جری مجاہد تھے۔

سہیل بن سعد

آپ کا اصل نام حزن تھا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نام تبدیل کر کے سہیل رکھ دیا۔ آپ کی کنیت ابو مالک، ابو یحییٰ تھی اور قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام سعد بن مالک تھا جنہوں نے ہجرت سے قبل ہی سہیل بن سعد کے ہمراہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ جنگ احد اور خندق کے وقت آپ کمسن تھے۔ اس لیے شریک نہ ہوئے۔ جب آپ کی عمر ۱۰ برس ہوئی تو حضورؐ کا وصال ہو گیا۔ آپ حضورؐ سے بہت محبت کرتے تھے۔ رسول اللہؐ خطبہ دیتے وقت کھڑے کھڑے تھک جایا کرتے تھے، سہیلؓ بن سعد کو جب اس بات کا علم ہوا تو فوراً جنگل سے ایک لکڑی کاٹ لائے اور ممبر کے پاس ستون کی مانند کھڑا کر دیا۔ تاکہ حضورؐ تھک جانے کی صورت میں اس لکڑی کا سہارا لے سکیں۔ آپ نے ۹۶ سال کی عمر پائی اور ۹۱ھ میں انتقال ہوا۔

۷۴ھ میں مدینہ کے گورنر حجاج بن یوسف نے دوسرے بزرگوں کے ساتھ ظلم و ستم کرتے وقت آپ کی گردن پر بھی اپنے ظلم کی مہر ثبت کر دی تھی۔ آپ نے ۱۸۸ احادیث بیان فرمائی ہیں جن میں سے ۲۸ پر تمام متفق ہیں۔

سہیل بن عامر

حضورؐ کے ایک ممتاز صحابی۔ آپ کا پورا نام سہیل بن عامر بن سعد الانصاری ہے۔ آپ نے غزوہ بیر معونہ میں شرکت کی اور اسی غزوہ میں لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

سہیل بن عمرو

اسلام لانے سے پہلے آپ حضورؐ کے بدترین دشمن تھے۔ عام اجتماعات میں حضورؐ کے خلاف تقاریر کرتے تھے اور اسلام قبول کرنے والوں پر ہر طرح کے مظالم اور سختیاں کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ میں قریش کی جانب سے معاہدہ لکھنے پر مامور بھی ہوئے تھے۔ معاہدے میں لفظ "رسول" لکھنے پر بھی آپ نے ہی اعتراض کیا تھا۔ آپ جنگ حنین سے واپس آتے وقت جعرانہ کے مقام پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ نے رسول اللہؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جنگ یمامہ میں آپ کے بڑے بیٹے عبداللہ شہید ہوئے۔ آپ جنگ یرموک میں ایک دستے کے افسر بھی مقرر ہوئے۔ شام کی مہم کے دوران ۱۸ھ میں آپ پر طاعون کا حملہ ہوا جس کے باعث آپ نے وفات پائی۔ آپ کے ایک اور بیٹے ابوجندلؓ نے بھی بطور ایک سپاہیٔ اسلام کے خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

سہیلیہ

اس فرقے کی بنیاد سہیل بن عبداللہ تستریؒ نے رکھی تھی۔ آپ کا طریقۂ تصوف سخت

محنت اور نفس کا جہاد و ریاضت ہے۔ آپ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نے ایک مرید سے کہا کہ کوشش کر یہاں تک کہ ایک روز دن بھر تو اللہ اللہ ہی کہتا رہے اور اس طرح دوسرے اور تیسرے روز بھی۔ جب اسے اس کی عادت ہوگئی تو پھر اس سے کہا کہ اب رات کو بھی شامل کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا تو خواب میں بھی اللہ اللہ کہتا۔ یہ اس کی طبعی عادت ہوگئی تھی۔ تب آپ نے اس سے کہا کہ اب اس سے باز آجا اور دوست کے خیال میں مشغول ہوجا۔ یہاں تک کہ اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ وہ تمام وقت اسی میں مستغرق رہنے لگا۔

اس فرقے کے لوگوں کا طریقہ درویشوں کی خدمت کرنا تھا۔ وہ حمدونیوں کی طرح درویشوں کی حرمت کرتے تھے اور باطن کا مراقبہ جنیدیوں کی طرح کرتے تھے۔ اس فرقے کے لوگوں کا خیال تھا کہ ریاضت و مجاہدہ سب کچھ نفس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا۔ خاص طور پر جس کو نفس کی شناخت نہ ہو ریاضت اور مجاہدوں سے اُسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا ان کے نزدیک نفس کی رہبر ناقص خواہشات اور عقل کی تدبیر حق ہے۔ جبکہ خواہش کی تدبیر خطا۔ اس لیے حق کے طالب افراد کو ہمیشہ نفس کی مخالفت میں چلنا چاہیئے۔ تاکہ اس کے خلاف روح و عقل کی مدد کر سکیں ؏

سیالکوٹ

پاکستان کا ایک مشہور شہر۔ صوبہ پنجاب کا ضلع۔ اس ضلع کا کل رقبہ تقریباً ۲۰۶۷ مربع میل ہے۔ سیالکوٹ ضلع کی آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ سیالکوٹ کا اصل شہر سطح سمندر سے ۸۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ مشرق اور شمال کی جانب اس کی حدیں بھارت اور کشمیر سے جا ملتی ہیں۔ ضلع سیالکوٹ دریائے راوی اور چناب کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔ اس کا بالائی علاقہ بہت زرخیز ہے۔ یہاں پر سالانہ بارش کا اوسط ۳۶ انچ کے قریب ہے۔ گندم، چاول، جو، جوار اور گنے کی فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

صرف شہر سیالکوٹ کی آبادی ۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس شہر کا محلِ وقوع سیاسی اور فوجی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ شہر صنعت و حرفت کا بہت اہم مرکز بن چکا ہے اس شہر کا بنا ہوا کھیلوں کا سامان، آلاتِ جراحی اور آلاتِ موسیقی بہت مشہور ہیں۔ تمام دنیا میں ان چیزوں کی بہت مانگ ہے۔

اس شہر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی بنیاد راجہ سَل (یا سَلا) نے رکھی تھی۔ وہ پانڈوؤں کا ماموں تھا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ بھی بنوایا تھا اور اس بستی کا نام اپنے نام کی مناسبت سے سَلکوٹ رکھ دیا تھا۔ بعد میں بکرماجیت کے عہد میں ایک اور ہندو راجہ سالی واہن نے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔

آجکل اس کے بارے میں ایک نیا نظریہ بھی سننے میں آتا ہے کہ سیالکوٹ ایک قدیم شہر "سکالا" کے کھنڈرات پر آباد ہے اور یہ کہ یونانی بادشاہوں کے زمانے میں یہ شہر ایوتھی ڈیمس (EUTHYDEMUS) خاندان کے بادشاہوں کا دارالحکومت بھی بنا رہا۔ لیکن بعد میں اس پر ہن قبائل نے اپنا قبضہ جما لیا۔

شہر سیالکوٹ میں ایک گوردوارہ جو "بابے کی بیری" کے نام سے مشہور ہے موجود ہے۔ یہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشہور صوفی بزرگ حضرت علی الحق کا مزار بھی یہاں موجود ہے جسے دیکھنے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔

مغلوں کے زمانے میں سیالکوٹ شہر تمام ہندوستان کے علمی مرکزوں میں خاصا اہم مرکز شمار ہوتا تھا۔ پاکستان کے قومی شاعر حضرت علامہ اقبالؔ اور آجکل کے مشہور شاعر فیض احمد فیضؔ اسی شہر میں پیدا ہوئے ؏

سیّد

سردار، حاکم، شہزادہ یا مالک جو اپنے اوصاف، املاک یا کسی اور وجہ سے ممتاز ہو۔ آخری معنی میں یہ لفظ تمام عالمِ اسلام میں بلاشرکتِ غیرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اولاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ دو جگہ استعمال ہُوا ہے۔ ایک جگہ سورۂ آل عمران کی ۳۹ ویں آیت میں حضرت یحییٰؑ کے لیے اور دوسری جگہ سورۂ یوسف کی ۲۵ ویں آیت میں زلیخا کے شوہر کے لیے آیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الاحزاب کی ۶۷ ویں آیت میں سیّد کی جمع سادۃ دنیوی اور مذہبی گمراہ سرداروں کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ عرب کے باشندے لفظ سیّد کو انسانوں کے علاوہ جنوں، حیوانوں اور بے جان چیزوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں ؏

سیرت

لفظ سیرۃ، سار یسیر سیرا و مَسیرا سے نکلا ہے۔ اس کے معنی ہیں جانا، چلنا، طریقہ و مذہب، سنت، ہیئت، حالت، کردار، کہانی، پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان، بایوگرافی۔ لیکن سیرت کے اولین اصطلاحی معنی آنحضرتؐ کے مغازی اور سوانح حیات ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بمعنی ہیئت و حالت آیا ہے۔ ابتدا میں عرب کی عام روایت میں مغازی کا رواج ہُوا جن میں حضور کی فتوحات اور معرکوں کا ذکر ہوتا تھا لیکن بعد از خلفائے راشدین نے سیرت میں ان پہلوؤں پر زور دیا جن کا تعلق شرعی احکامات سے تھا۔ چنانچہ اس لحاظ سے سیرت ابن ہشام غالباً پہلی کتاب ہے جسے مغازی سے ممتاز کیا جاسکے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ابن سعد نے اپنی تصنیف "طبقات" میں اس کا پہلے استعمال کیا۔ سیرت نگاری کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے آپؐ کی زندگی کو قابلِ تقلید مثالی زندگی قرار دیا۔ اسی وجہ سے امّت نے آپ کی زندگی کا ہر واقعہ اور ہر گوشہ محفوظ کرنے کا پورا اہتمام کیا۔ بقول شبلی مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے حالات و واقعات کا ایک ایک حرف استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہوسکے اور نہ آئندہ کیے جاسکتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے افعال اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار اشخاص کے نام اور حالات قلمبند کیے گئے۔ شپرنگر کی رائے میں نہ کوئی قوم دنیا میں گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال حدیث کے راویوں کے تراجم اور چھان بین) کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب فراہمیٔ معلومات کے وسائل کم سے کم اور مشکلات زیادہ سے زیادہ تھیں۔ حدیث و سیرت کے مواد کی فراہمی اور ان کی تنقید دنیا بھر میں بایوگرافی اور تاریخ کے فن کا محیرالعقول اور عقیدت و محبت کا ناقابلِ یقین کارنامہ ہے۔ دنیا کی ہر مہذب اور معزز زبان میں حضور اکرمؐ کی سیرت پر علمی، فنی اور ادبی بنیادوں پر نہایت اعلیٰ تصانیف لکھی گئی ہیں ؏

سیرین

حضرت سیرینؓ اور ان کی حقیقی بہن ماریہ قبطیہؓ مصر کے بادشاہ مقوقس نے تحفہ کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجی تھیں۔ حضورؐ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ سے خود نکاح کر لیا تھا۔ جبکہ حضرت سیرینؓ کا نکاح حضورؐ کے صحابی اور

شاعر حسانؓ بن ثابت سے ہوا ۔ یہ دونوں بہنیں مذہبًا نصرانی تھیں لیکن مدینہ آکر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی تھیں ۔ ان کا بھائی مابور بھی مصر سے ان کے ساتھ آیا تھا ۔ ابتدا میں وہ کافی عرصہ تک اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن بعد میں وہ بھی مسلمان ہو گئے تھے ۔

سیاریہ

ایک فرقہ سیاریہ یہ فرقہ سے متعلق لوگ حضرت ابوالعباس رحؒ سے عقیدت ومحبت رکھتے ہیں ۔ آپ مرُد میں امام تھے اور سب علوم کے عالم اور حضرت ابوبکر واسطی رح کے ہم نشین تھے ۔ آج بھی نسا اور مرُو میں آپ کے طبقہ کے بہت سے لوگ موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ آپ کے مذہب کے سوا کوئی اور مذہب تصوف میں اپنے حال پہ نہیں رہا کیونکہ کسی وقت بھی مرُو اور نسا کسی ایسے پیشوا سے خالی نہیں رہا ہے جو آپ کے اصحاب کو آپ کے مذہب پر قائم رکھنے کے لیے آج تک ان کی حفاظت نہ کرتا رہا ہو آپ کے ان اصحاب کی طرف سے جو اہل نسا کی طرف سے ہیں ۔ کچھ عمدہ رسالے اور خطوط اہل مرو کے نام بھیجے گئے تھے اور جن کے ذریعے انہوں نے اہل مرو سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔ ان کی عبارتیں جمع وتفریق پر مبنی ہیں ۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو تمام اہل علوم کے درمیان مشترک ہے اور ایک خاص گروہ خاص طور پر اسی لفظ کو اپنی عبارت کے سمجھنے میں استعمال کرتا ہے لیکن ہر ایک گروہ کی مراد اس سے جُدا جُدا ہے ۔

سیل جارج

جارج سیل (George Sale) ایک انگریز عالم ۔ اس نے سب سے پہلے قرآن مجید کا براہ راست عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور توضیحی حواشی لکھے ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بہت بڑا مقدمہ بھی لکھا تھا ۔

سیل لندن کے ایک تاجر کے ہاں ۱۶۹۷ء میں پیدا ہوا تھا ۔ اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ۔ ساتھ ہی اپنے فارغ وقت میں عربی زبان سیکھی ۔ پھر ۱۷۳۴ء میں قرآن مجید کا مشہور عالم انگریزی ترجمہ کیا ۔ سیل کا کیا ہوا ترجمہ لفظی نہیں اور نہ ہی بالکل آزاد ، اس نے درمیانی راستہ اختیار کیا ہے ۔ سیل نے اپنے مقدمے میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں کافی معلومات اور واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے ۔ اسی لیے اس کے بعض ہمعصر مذاقًا نصف مسلمان کا خطاب دیتے ہیں ۔ اس ترجمے کے باعث سیل کی شہرت یورپ کے تقریبًا تمام ملکوں میں پھیل گئی تھی ۔ جب بائیل (Bayle) نے اپنا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا تو عربی اور مسلم موضوعات پر سیل سے ہی مقالے لکھوائے گئے ۔

۱۳ نومبر ۱۷۳۶ء کو سیل کا انتقال ہوگیا ۔ وہ زیادہ عمر نہ پا سکا ۔ انتقال کے وقت اس کی عمر چالیس سال سے بھی کم تھی ۔

سیئات

سَیِّئَۃ کی جمع ۔ یہ کلمہ سَآءَ یَسُوْءُ سُوْءً وَ سَوْءًا سے مشتق ہے ۔ السَّیِّئَۃُ کا لفظ عملِ قبیح کے لیے ہوتا ہے ۔ مذکر کی صفت میں السَّیِّئ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ السَّیِّئَۃُ کا لفظ مونث کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ یہ لفظ قرآن پاک میں بھی مختلف سورتوں میں آیا ہے جن میں سے کچھ پیش خدمت ہیں :

" اور بُری تدبیر کا وبال صرف اس کے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ۔" (فاطر : ۴۳)

" اور جنہوں نے بُرے کام کئے ۔" (یونس : ۲۷)

" ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) بُرے کام کرتے رہیں ۔"

(النساء : ۱۸)

یہ لفظ بعض سورتوں میں عذاب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ جیسے " ان پر ان کے اعمال کے وبال پڑ گئے ۔" (الزمر : ۵۱)

سورۂ ھود کی دسویں آیت میں یہ لفظ بطور ضرر ، دکھ ، تکلیف کے استعمال ہوا ہے ۔" اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزا چکھائیں تو (خوش ہو کر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دُور ہوگئیں ۔

ان معنی کے علاوہ کچھ جگہ یہ لفظ بے حیائی اور گناہ کے ضمن میں آیا ہے ۔ جیسے :

" اور یہ لوگ (قوم لوطؑ) پہلے ہی سے فعل شنیع کیا کرتے تھے " (ھود : ۷۸)

" اور ان کے گناہوں سے درگزر فرمائیں گے ۔" (الاحقاف : ۱۶)

" کچھ شک نہیں کہ نیکیاں ، گناہوں کو دور کر دیتی ہیں ۔" (ہود : ۱۱۴)

راغب اصفہانی السیئۃ اور السوٗ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ " السوٗ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں مبتلا کر دے ، خواہ اس کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے اور اسی طرح احوال نفس سے ہو یا احوالِ بدن سے ۔ عزت اور مذہب کا زوال یا کسی عزیز کی موت بھی السوٗ ہے ، عیب ، اعمالِ فاحشہ اور عذاب بھی اس کے معانی میں شامل ہیں ۔ السیئۃ کے معنی عام استعمال کی رو سے برائی کے ہیں جیسے کہ سورۂ المؤمنون کی آیت ۹۶ میں آیا ہے " اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو ۔" انہی میں ایک حدیث مبارک بھی بیان کی جاتی ہے ۔" اے انسؓ برائی کا تعاقب نیکی سے کرو کہ اس کا اثر زائل کرے گی ۔" ۔

طاہر پٹنی السیئۃ کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں : " جس چیز سے خدا نے روکا ہو وہ سیئۃ ہے ۔" علمائے تصوف نے انسان کی اس کمزوری پر خاص تنبیہ کی ہے کہ وہ سیئات صغار (گناہ) کے ارتکاب کو سہل انگاری کی بنا پر کچھ زیادہ موجب خاطر نہیں سمجھتا حالانکہ عملِ فاحشہ اور گناہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اس کا مرتکب ہو کر انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کی نافرمانی کرتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ بلال بن سعد کا یہ قول پیش کرتے ہیں : " کسی گناہ کے چھوٹا ہونے کی جانب نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ تم کس ذات کی نافرمانی کر رہے ہو ۔"

ش

شاباشیہ

بصرے اور الاحساء کے علاقے میں آباد ایک قبیلے کا نام۔ یہ قبیلہ غُلاۃ قرامطہ میں سے تھا اور اس کی قیادت شیخ بنو شاباشش کے ہاتھ تھی۔ ان لوگوں کی سیاسی سرگرمیاں تقریبًا ایک صدی تک خلیج فارس کے علاقوں میں جاری رہیں۔ راسخ العقیدہ علمائے کرام اس قبیلے کے لوگوں کو دائرۂ اسلام سے خارج گردانتے تھے لیکن دروزی فرقے کے لوگ انہیں اپنے مذہب کا پیرو خیال کرتے تھے۔ دروزی قانون نامے ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۷ء میں لکھا ہوا مقتنیٰ کا ایک رسالہ ملتا ہے۔ یہ رسالہ خاص طور پر شاباشیہ کے لوگوں کے بارے میں ہی ہے۔

شاذلی، ابوالحسن

ایک معروف صوفی بزرگ۔ انھوں نے تصوّف میں ایک سلسلے کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ جسے شاذلیہ کہا جاتا ہے۔

آپ سبتہ کے نزدیک غمارہ میں ۵۹۳ھ/۱۱۹۶ء کے قریب پیدا ہوئے لیکن بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ تونس میں جبل ظفران کے قریب شاذلہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے مرید انھیں سادات میں شامل کرتے ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب امام حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالبؓ تک پہنچاتے ہیں۔

جوانی میں ہی آپ مطالعے میں مشغول رہنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ کی بینائی کو ضعف پہنچا۔ آپ نے فاس میں حضرت جنیدؒ جو ایک عظیم صوفی تھے کے خلفاء کے خطبے سنے۔ آپ الومدین شعیب تلمسانی کے شاگرد تھے۔ جب آپ کی تعلیمات مقبول ہونے لگیں تو آپ پر جبر و تشدد کیا جانے لگا۔ اس نازک وقت میں آپ نے مصر کے شہر سکندریہ میں پناہ حاصل کی۔ یہاں آنے کے بعد آپ کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ آپ نے کئی مرتبہ حج کیا۔ جب آپ آخری مرتبہ حج کو جا رہے تھے تو بالائی مصر کے صحرائے عیذاب کو عبور کرتے ہوئے ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں انتقال ہو گیا۔ آپ کا مزار آج بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ شاذلی نے اپنی زندگی سیر و سیاحت میں بسر کی جس کے دوران میں ذکر و فکر میں بھی مشغول رہتے تھے اور خدا کے ساتھ وصالِ دائمی اور ابدی وجدانی مسرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آپ اپنے مریدوں کو تمام وقت عبادت میں صرف کرنے کے لیے کہا کرتے تھے۔

شاذلیہ

افریقہ میں اس کا تلفظ شادلیہ ہے۔ یہ تصوّف کا ایک سلسلہ ہے جس نے ابوالحسن علی بن عبداللہ الشاذلی کی نسبت سے یہ نام پایا۔ الشاذلی نے کوئی ضخیم کتاب نہیں لکھی البتہ کئی ایک ملفوظات، متعدد ادعیہ اور ایک نظم ان سے منسوب ہے۔ شاذلی کی تصانیف میں سے سب سے زیادہ مشہور "حزب البحر" ہے۔ غالبًا الشاذلی کا اصل مقصد یہ تھا کہ اخلاق عالیہ کی تلقین کریں۔ اس سلسلے کے پانچ اصول یہ ہیں ۱۔ ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرنا۔ ۲۔ قول و فعل میں سنت کی پابندی ۳۔ فقر و غنا میں دنیا سے نفرت۔ ۴۔ چھوٹی بڑی ہر بات میں رضائے الٰہی پر قانع رہنا۔ ۵۔ غم ہو یا مسرت اللہ تعالیٰ ہی سے رجوع کرنا۔ الشاذلی چاہتے تھے کہ ان کے پیرو اپنے اپنے پیشے میں لگے رہیں اور ممکن ہو سکے تو اپنی روزمرہ کی باتوں کے ساتھ ساتھ عبادت میں بھی مشغول رہیں۔ دوسرے صوفیاء کی طرح الشاذلی کا منتہائے نظر بھی [illegible] اور اس کے حصول کا طریقہ بھی مجوزہ ریاضتیں ہی تھیں۔ ان کے طریقے کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ الشاذلی ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کا کوئی الہام اگر سنت سے ٹکراتا تھا تو وہ [illegible] کر دیتے تھے کہ سنت کو ترجیح دی جائے۔ اس کے باوجود ان کے بعض [illegible] کے اعتراضات کا ہدف بنے۔ اس سلسلے پر چلنے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی [illegible] خصوصیات تین ہیں۔ ایک یہ کہ ان سب کا انتخاب لوح محفوظ سے ہو [illegible] لیے روزِ اوّل ہی سے اس حلقے میں شمولیت مقدر ہو چکی تھی۔ دوم یہ کہ [illegible] کیفیت فورًا ہوش میں بدل جاتی ہے یعنی ان کے روحانی مشاغل ان کو روزمرہ کی زندگی سے خارج نہیں کرتے اور سوم یہ کہ ہر زمانے میں جو بھی قطب ہو گا [illegible] ہو گا۔ غالبًا ان کی اولین جماعت تونس میں قائم ہوئی۔ سلسلۂ شاذلیہ کا اصل مرکز [illegible] کا وہ علاقہ تھا جو مصر کے مغرب میں واقع ہے بالخصوص الجزائر اور تونس۔ [illegible] میں اس سلسلے کی بہت توسیع ہوئی۔

شافعی، امام

(۷۶۷ء - ۸۲۰ء) ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع بن السائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن

عبد مناف ۔ اہل سنت کے ائمۂ اربعہ میں شمار ہوتے ہیں اور شوافع کا فقہی مسلک ان سے منسوب ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب عبد مناف پر آنحضرتؐ سے مل جاتا ہے ۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا ۔ پندرہ برس کی عمر میں انہیں فتویٰ دینے کی اجازت مل چکی تھی ۔ انہوں نے خاصا عرصہ بدوی قبائل میں گزارا ۔ اس لیے انہیں زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی ۔ اپنے وقت کے ماہرین زبان و ادب ان کے شاگردوں میں رہے ۔ پرورش مکہ مکرمہ میں ہوئی ۔ تیرہ برس کی عمر میں امام مالکؒ بن انس کے پاس مدینہ منورہ چلے گئے اور ان کی وفات تک ان کی شاگردی میں رہے امام مالکؒ کی وفات کے بعد مکہ واپس آئے اور وہاں مختلف علماء سے حدیث و فقہ کا علم حاصل کیا ۔ حاکم یمن نے انہیں ایک سرکاری عہدہ پیش کیا لیکن وہاں مخالفین نے ان پر الزام عائد کر دیا کہ آپ درپردہ زیدی مُدعی خلافت یحییٰ بن عبد اللہ کے حامی ہیں انہیں گرفتار کر کے خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہ ان کے دلائل سن کر قائل ہو گیا اور انہیں رہا کر دیا ۔

۸۱۰ء / ۸۱۱ء میں وہ بغداد آ کر مقیم ہو گئے ۔ اور ایک حلقۂ درس قائم کیا بعد میں آپ مصر چلے گئے ۔

انہیں بجا طور پر اصول فقہ کا مؤسس و بانی سمجھا جاتا ہے ۔ ان کی تصانیف مکالمے کی صورت میں ہیں وہ مخالفین کا رد کرتے ہوئے ان کا نام نہیں لیتے ۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کے علم و فضل کی داد دیتے ہوئے فرمایا ۔ اس قرشی نوجوان سے زیادہ کتاب اللہ کا فقیہہ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ۔ امام شافعیؒ نے بکثرت لکھا اور ان کی تصانیف اپنی اہمیت کے اعتبار سے فقہ کے طالب علموں کے لیے نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان کی زیادہ توجہ ان احادیث کی تحقیق پر تھی جن سے احکام شرعی کے ثبوت مہیا ہوں ۔ اس وقت شافعیؒ فقہ کا ذوق شوق سے مطالعہ ہوتا ہے ۔ مشرق وسطیٰ ، افریقہ ، وسط ایشیا کے بعض حصوں میں اس وقت بھی شافعی مذہب کو ہی اقتدار حاصل ہے ۔

شام

مشرق وسطیٰ کا ایک اسلامی ملک سرکاری نام جمہوریہ عربیہ سریا ۔ موجودہ رقبہ ۷۲۰۰۰ مربع میل ہے ۔ اس کے مغرب میں بحیرہ روم اور لبنان ، جنوب میں اسرائیل اور اردن ، مشرق میں عراق اور شمال میں ترکی ہے ۔ ملک کی موجودہ آبادی تک بھگ ساٹھ لاکھ ہے ۔ بیشتر آبادی سنی مسلمانوں کی ہے ۔ شیعہ ، اسمعیلی ، دروز اور عیسائی بھی تھوڑی تعداد میں رہتے ہیں ۔ اس کے مشہور شہر دمشق (دارالحکومت) ، حلب ، حمص اور حماۃ ہیں ۔ اور صدیوں سے اسلامی علوم و فنون کے مراکز رہے ہیں ۔ قاہرہ کے بعد دمشق دنیائے اسلام کا دوسرا علمی و ثقافتی مرکز ہے ۔ یہاں کی جامعہ دمشق ۱۹۲۴ء سے قائم ہے ۔

شام بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے ۔ گندم ، جَو اور دالیں بکثرت پیدا ہوتی ہیں ۔ ان کے علاوہ شکر قند ، زیتون اور تمباکو کی کاشت بھی ہوتی ہے ۔ یہ ملک ریشمی مصنوعات اور کانچ کے کام کے لیے مشہور ہے ۔ حلب کے بلوری برتنوں اور آرائشی اشیا کی یورپ اور ایشیا میں بہت مانگ ہے ۔

گزشتہ سالوں میں دمشق اور حلب میں مختلف چھوٹی صنعتوں کے کارخانے قائم ہوئے ہیں ۔ عراقی پٹرولیم کمپنی کے پائپ لائن شام سے ہو کر گزرتی ہے جس سے شام کو بھاری رقم رائلٹی کے طور پر ملتی ہے ۔

تاریخی اعتبار سے شام ایک قدیم تہذیبی و ثقافتی مرکز ہے ۔ اس اپنی زرخیزی کے باعث یہ سرزمین لٹیرے بدوؤں کے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ۔ دوسری صدی ق ۔ م کے آغاز ہی میں ان عرب بدوؤں نے حمص ، تدمر اور الحجر میں اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں ۔ شام کی زبان و ثقافت کے اختیار کرنے میں انہیں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا ۔

پانچویں صدی عیسوی میں شامی سرحدوں کی حفاظت و مدافعت کا کام غسانی سرداروں کے سپرد تھا ۔ جو نسلاً عرب اور مذہباً عیسائی تھے ۔ یہ شامی عرب ایک ایسی بولی بولتے تھے جو عربی اور ارامی کے اختلاط سے بنی تھی ۔

تبوک عرب اور شام کا سرحدی مقام ہے ۔ اس علاقے میں بازنطینی حکومت کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے ۔ آغاز اسلام سے عرب پر ان کے حملوں کی افواہیں پھیلتی رہتی تھیں ۔ اس خطرے کے پیش نظر آنحضرت صلعم نے ۹ ھ میں تبوک کا قصد کیا ۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ حملے کی افواہیں غلط تھیں ۔ آپ نے بیس روز تبوک میں قیام کیا اور اردگرد کے حکمرانوں کو جن کی جانب سے خطرات تھے مطیع بنا کر مدینہ شریف تشریف لے آئے ۔

آنحضرت صلعم کی وفات تک ہر وقت رومیوں کے حملے کا خطرہ رہتا تھا ۔ اسی اس خطرے کے انسداد اور شہدائے موتہ کے انتقام کے لیے حضورؐ نے اسامہ بن زیدؓ کو شام بھیجنے کا ارادہ کیا تھا کہ آپؐ کی وفات ہو گئی ۔ اس لیے ۱۳ ھ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کبار صحابہ کے مشورے پر شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا ۔ دمشق کی مہم پر یزید ابن ابی سفیانؓ ، حمص پر ابو عبیدہؓ بن الجراح اُردن پر شرجیل بن حسنہ اور فلسطین پر عمرو بن العاص مقرر ہوئے ۔ حضرت ابو عبیدہ ان سب کے سالار مقرر ہوئے ۔ بازنطینی افواج کی کثرت کا اندازہ کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو جو اس وقت عراق میں تھے حکم دیا کہ وہ شام چلے جائیں چنانچہ وہ شام کے لیے روانہ ہو گئے ۔

مارچ ۶۳۵ء میں عربوں نے دمشق کی دیواروں کے زیر سایہ ڈیرے ڈال دیئے ۔ لڑائی میں شامی عربوں نے رومی شہنشاہ کی افواج کا ساتھ چھوڑ دیا ۔ اس لیے انہیں مکمل طور پر شکست ہوئی ۔ جنگ یرموک (۶۳۶ء) نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا ۔ اور کئی علاقے بغیر تلوار اٹھائے فتح ہوتے چلے گئے ۔

ہجری کا اٹھارھواں سال عموماً اس میں طاعون کی وبا پھیلنے کے لیے مشہور ہے اس میں ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل ہوئے ۔ حضرت عمرؓ نے شام کا سفر کیا اور مناسب اقدامات کیے ۔ یزید بن ابوسفیان کا انتقال ۱۸ ھ میں ہوا تو حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ کو ان کی جگہ حاکم مقرر کیا اور حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں پورے شام کا والی بنا دیا ۔ امیر معاویہؓ نے شام کے سرحدی علاقے فتح کر کے اس کی حدود کو وسعت دی ۔ حضرت عثمانؓ کی اجازت سے امیر معاویہؓ نے ایک بحری بیڑہ بھی تیار کیا اور اس کے ذریعے جزیرہ قبرص فتح کیا ۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان خانہ جنگیوں کے باعث حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں امیر معاویہؓ شام کے آزاد حکمران ہو گئے ۔ حضرت علیؓ کے انتقال اور حضرت امام حسنؓ کی دستبرداری کے بعد امیر معاویہؓ تمام عالم اسلام کے خلیفہ ہو گئے ، اور ان کی خلافت کا دارالحکومت دمشق قرار پایا ۔ ان کے عہد میں اسلامی سلطنت کی سرحدوں میں وسعت ہوئی ۔ امیر معاویہؓ کی کامیابیاں ان کی ذاتی فہم و فراست کے علاوہ ان کے مشیروں کی بھی مرہون منت ہیں ۔ امیر معاویہؓ کا انتقال ۶۰ ھ میں ہوا ۔

امیر معاویہؓ کے جانشین ان کے بیٹے یزید بن معاویہ کو صحابہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ۔ اس کے عہد حکومت میں شہادت امام حسینؓ ، مدینۃ الرسول کی پامالی

اور حرم محترم کی بے حرمتی ہوئی جس کی وجہ سے عالم اسلام میں بنو امیہ کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ یزید شعر و شاعری کا دلدادہ اور سیر و شکار کا شوقین تھا۔

یزید کے بیٹے دائم المرض معاویہ ثانی کا عہد حکومت محض چند روزہ تھا۔ وہ ۶۸۴ھ میں طاعون کا شکار ہو گیا۔ اس کے دوسرے بھائیوں کی کم سنی کے باعث امرائے شام مروان بن الحکم کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ مروانی خاندان کا پہلا خلیفہ بنا۔ اس کا عہد حکومت پیہم لڑائیوں اور جنگوں کا عہد تھا اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا عبدالملک تخت نشین ہوا وہ اموی حکومت کا دوسرا بانی تھا۔ اس نے نہایت عزم و استقلال سے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ اسلامی سکے کا اجراء اس
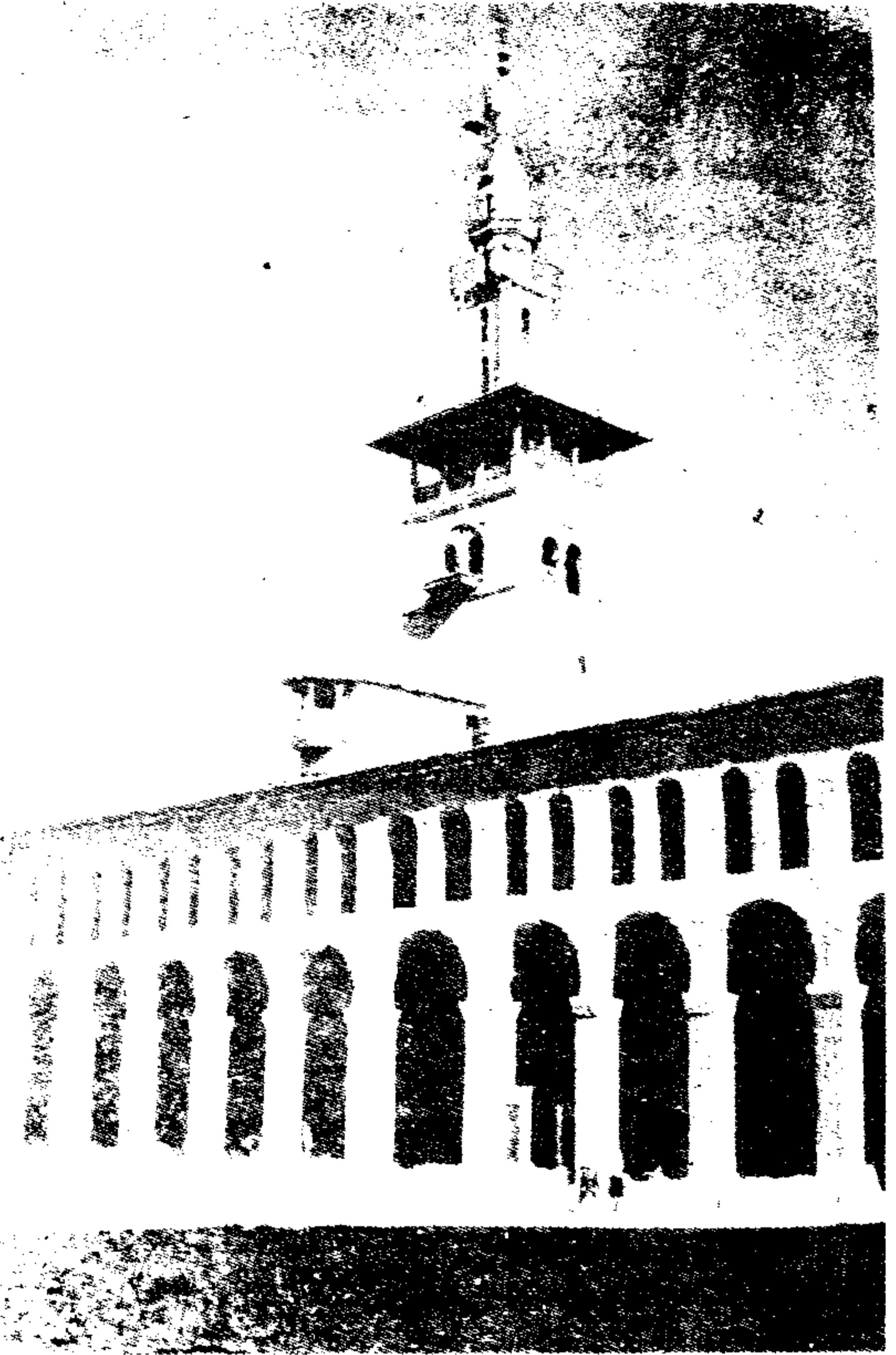
دمشق کی ایک قدیم مسجد

کا ممتاز کارنامہ ہے۔ اس کا دوسرا کارنامہ عربی کو دفتری زبان قرار دینا ہے۔ وہ عقل و دانش، تدبیر و سیاست اور علم و فضل جیسے اوصاف میں بھی کامل تھا۔ عبدالملک نے بیس سال حکومت کی۔ اس کا انتقال ۷۰۵ھ میں ہوا۔

اس کے بعد اس کا جانشین ولید اول تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد کا زریں کارنامہ فتح اندلس ہے۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک اور اس کے بعد اس کا

چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز نے کوئی فرق

چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ان کے عدل و انصاف نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ ذمیوں اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت میں عمر بن عبدالعزیز نے کوئی فرق روا نہ رکھا۔

عمر بن العزیز کے بعد نا اہل لوگ خلافت پر قابض ہو گئے جس [illegible] ملک میں فساد پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ خارجیوں کی بغاوت نے ملک میں [illegible] مچا رکھی تھی۔

اہل شام کی بے چینی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابو العباس السفاح نے کوفے میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ مروان کو اس کے خلاف لڑائی میں شکست ہوئی۔ پہلے تو اس نے عراق عرب کا علاقہ خالی کیا۔ بعد ازاں شام بھی چھوڑ دینا [illegible] شامی اس کا ساتھ دینے پر رضامند نہ تھے۔ اس نے مصر میں پناہ لی جہاں [illegible] اس کا انتقال ہو گیا۔

بنو امیہ کا ہر جگہ تعاقب کیا گیا اور انہیں فنا کے گھاٹ [illegible] کو اکھاڑ کر ان کی خاک ہوا میں اڑا دی گئی۔ شامیوں نے نہایت کوشش [illegible] طور اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لے لیں لیکن انہیں [illegible]

فتح شام کے بعد اہل شام کی زبان عربی ہو گئی۔ [illegible] زبان قرار دیا تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کے لیے بھی عربی کا سیکھنا لازمی [illegible] شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت سے نامور شاعر [illegible] فرزدق، ابن ابی ربیعہ اور جمیل ابن معمر وغیرہ [illegible] بن یوسف حسن بصری اور طارق بن زیاد [illegible]

اس زمانے میں دینی علوم کی تحصیل کا عام ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ [illegible] و بصرے میں اکابر صحابہ کے [illegible] تعلیم دیتے تھے۔ حدیث کی تدوین و اشاعت [illegible] شامل ہے۔ مغازی و سیرت کے [illegible] [illegible] ہر قسم کی [illegible] بنو امیہ کے [illegible] شامیوں کی [illegible] [illegible] کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ [illegible] [illegible] کر دیا۔

عباسی دور میں اسلام کی اشاعت و [illegible] تبلیغ [illegible] کوشش [illegible] اور ہیئت سے بھی [illegible] میں منتقل کی گئیں۔ [illegible] ارسطو [illegible] میں آ گئیں۔

شام کی سرحدی قلعہ بندیوں کا [illegible] قلعے بوزنطی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

۹۷۷ سے ۱۰۹۸ء تک شام [illegible] یعنی فاطمیوں کے قبضے میں رہا۔ [illegible] اس وقت تک [illegible]

تک کہ ان کی افواج ملک پر قابض رہیں۔

۱۰۹۷ء میں صلیبی جنگجوؤں کی ایک فوج انطاکیہ کی دیواروں تک آموجود ہوئی اور ایک ہمت آزما محاصرے کے بعد ۳ رجون ۱۰۹۸ء کو یہ فوجیں قلعے میں داخل ہوگئیں۔ اور ہوتے ہوتے یہ فرنگی بیت المقدس کی دیواروں کے سامنے آنکلے اور ۱۰۹۹ء میں دھاوا بول کر یہ علاقہ فتح کر لیا اور اس کو ایک لاطینی ریاست بنا کر بوئیلوں کے گوڈ فرے کو اس کا سردار بنا دیا گیا۔ لیکن بیت المقدس کا پہلا بادشاہ دراصل اس کا بھائی اور جانشین بالڈون اوّل تھا۔ اس نے ساحل کے کئی شہر سر کیے۔ اس کے جانشین بالڈون ثانی نے ۱۱۲۴ء میں صور فتح کر لیا۔ دمشق کے سامنے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

بالڈون ثانی کے بعد لاطینی ریاست کا زوال شروع ہوگیا اور اس کی بنیادی وجہ صلیبی سپاہیوں کا عدمِ تعاون اور فقدانِ اتحاد تھا۔ ہر گروہ اپنی اپنی علیحدہ سلطنت اور اقتدار کا خواہش مند تھا۔ اس اتحاد کے فقدان کا فائدہ اٹھا مسلمان نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ اور صلیبیوں کے ساتھ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس میں بالآخر صلاح الدین کو کامیابی نصیب ہوئی۔

صلاح الدین کے انتقال کے بعد متعدد وارثوں میں تنازعے شروع ہوگئے اس سے فائدہ اٹھا کر خوارزمیوں نے حملہ کر دیا اور غزہ کے مقام پر شامی اور فرنگیوں کی متعدد افواج کو شکست فاش دی اور مصریوں کو بیت المقدس، دمشق اور حمص پر قبضہ کرنے کا موقع دیا۔

اس جنگی حالت نے مسلمانان شام کی ذہنی سرگرمیوں میں رکاوٹ تو پیدا کی لیکن اسے بالکل ہی روک دیا۔ سلطان صلاح الدین کے عہد کی علمی اور ثقافتی سرگرمیاں اس بات کا ثبوت ہیں۔

ایوبیوں کے بعد مملوک سلاطین مصر و شام میں برسرِ اقتدار آئے۔ ان کے نامور فرمانروا بیبرس نے جالوت کے مقام پر تاتاریوں کے مقام پر کو شکست فاش دی اور صلیبیوں کے خلاف شاندار کامیابی حاصل کی۔ شام پر تاتاری یورشوں میں آخری یورش امیر تیمور کی تھی۔ وہ آندھی کی طرح وسط ایشیا سے اٹھا اور طوفان کی طرح اسلامی دنیا پر چھا گیا۔ اس نے ۱۴۰۰ء میں حلب فتح کر لیا۔ اور تین روز تک قتل و غارتگری کا نشانہ بنائے رکھا۔ نوری و ایوبی عمارتیں جلا کر خاک کر دیں، شہر کو لوٹا اور مساجد کو آگ لگوا دی۔ دمشق کے بہترین اربابِ فن، مشاہیر اور علما سمرقند بھیج دیئے گئے اور یوں شام کی علمی فنی اور صنعتی برتری ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں تین اشخاص منظرِ شہرت پر آئے۔ یہ الظاہر العمر، احمد پاشا الجزار اور نپولین بونا پارٹ تھے۔ الظاہر نے عکہ پر قبضہ کر لیا لیکن آخر مارا گیا۔ احمد پاشا الجزار کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے نپولین کی پیش قدمی روک دی۔ ترکوں کے تین سو سالہ عہد حکومت تک شام اور فلسطین کی آبادی جو عرب فتوحات کے وقت چالیس لاکھ تھی صرف پندرہ لاکھ باقی رہ گئی تھی۔

۱۸۶۴ء کے بعد شام دو ولایتوں میں بٹ گیا۔ حلب اور دمشق۔ ۱۸۸۸ء میں بیروت کو جو شام کی بڑی بندرگاہ تھی اور اہم تجارتی مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا، علیحدہ ولایت بنا دیا گیا۔

ابراہیم پاشا کے زمانے سے شام کے دروازے مغرب کے ثقافتی اثرات کے لیے کھل گئے تھے۔ اس کے بعد امریکی مشنریوں نے مضبوطی سے وہاں قدم جمانا شروع کر دیے فرانسیسی اور انگریزی کتابیں بکثرت عربی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ یسوع فرقے نے بیروت میں سینٹ جوزف یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ حفظانِ صحت کے وسائل بہتر ہوگئے۔ اور درجۂ معیشت بلند ہونے لگا۔

۲۹ ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ترکیہ پہلی جنگِ عظیم میں شامل ہوگیا۔ جمال پاشا (ترکی) نے سارے شام کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بہت سے قوم پرور عرب رہنماؤں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ وہ نہر سویز پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا لیکن ناکام رہا۔ اور دھیرے دھیرے انگریزوں نے بزور قوت ملک پر قبضہ کر لیا اور فرانسیسی امدادی فوج نے بھی شام کی طرف اپنے قدم جما لیے۔

۲۴ ر جولائی ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی دمشق میں داخل ہوگئے۔ ایک معاہدے کی رو سے شام کو ترکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔

آہستہ آہستہ شامی عوام کو یہ محسوس ہونے لگا کہ فرانسیسی اقتدار ترکی حکومت کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کو لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے آخر کار تنگ آمد بجنگ آمد ہڑتالوں اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ بغاوتیں ۱۹۲۵ء کی عام بغاوت کا باعث بنیں۔ فرانسیسیوں نے اڑتالیس گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کی۔ ان کے اس اقدام کو دنیا بھر میں غم و غصہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ بالآخر ایک سمجھوتے کے تحت ۱۷ ر اپریل ۱۹۴۶ء کو تمام فرانسیسی فوجیں شام سے ہمیشہ کے لیے نکل گئیں۔

اب شام نے صدر شکری القواتلی کی رہنمائی میں آزادی کا سفر شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام نے عالم عرب میں ہیجان پیدا کر دیا۔ عرب ممالک (جن میں شام بھی شامل تھا) نے اسرائیل کے خلاف ناکام پیش قدمی کی۔ اس دوران شام کے حالات بگڑتے چلے گئے اس سیاسی خلفشار کے پیش نظر یکم فروری ۱۹۵۸ء میں قاہرہ سے دونوں ملکوں مصر اور شام کے اتحاد کا اعلان ہوگیا اور اس کا نام جمہوریہ متحدہ عرب رکھا گیا۔ اور جمال عبدالناصر اس کے صدر منتخب ہوئے لیکن مصریوں کی بالادستی کے باعث یہ اتحاد برقرار نہ رہ سکا۔ اور ۲۸ ر ستمبر ۱۹۶۱ء میں شامیوں نے مصریوں کو شام سے علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ ۸ مارچ ۱۹۶۳ء میں سوشلسٹ بعث پارٹی نے فوج کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نئی حکومت نے اسلامی اقدامات کے طور پر پیٹرول اور دیگر معدنیات کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ۱۹۶۶ء میں پھر فوجی انقلاب آیا۔ جس میں بعث پارٹی کے انتہا پسند برسرِ اقتدار آ گئے۔

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے جولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ شام نے اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ میں کچھ علاقہ واگزار کر دیا۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل حافظ الاسد شام کے صدر بنے اور نورالدین عطاشی کو معزول کر دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں لبنان میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو شام کی افواج وہاں داخل ہوگئیں۔ ۱۹۸۰ء میں صدر حافظ الاسد نے اپنی کابینہ سے بعث پارٹی کے چودہ ارکان کو برطرف کیا۔ جن میں وزیراعظم حلبی بھی شامل تھے۔ ۳۷ رکنی نئی کابینہ بنائی اور عبدالرؤف القاسم کو وزیراعظم مقرر کیے۔ اسی سال شام اور لیبیا کے الحاق کا فیصلہ کیا گیا لیکن اس پر عملدرآمد نہ ہوسکا۔ ۱۹۸۱ء میں شام نے اسرائیل کے جیٹ طیاروں کو مار گرانے کے لیے پہلی مرتبہ میزائل استعمال کیے۔ ۱۹۸۲ء میں بیروت کے اسرائیلی حملے کے دوران میں شام نے یاسر عرفات اور فلسطینیوں کی ہر ممکن مدد کی۔

شامل امام

داغستان کے ایک ہر دلعزیز قائد۔ نقشبندیہ سلسلے کے پیشوا، روسی حکومت کے خلاف جہاد آزادی کا سب سے آخری اور سب سے کامیاب رہنما اپنے پیشروؤں کی طرح وہ

بھی اوراسے تعلق رکھتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں خونزاق کے قلعے پہ ناکام حملہ کرکے شہرت حاصل کی۔ ۱۸۳۴ء میں ان کے پیشرو حمزہ بیگ کی شہادت کے بعد حریت پسندوں نے انہیں اپنا سالار بنا لیا۔ ۱۸۳۰ء میں شکست کھائی اور ہتھیار ڈال دیئے ایک سال بعد پھر حملہ کیا اور داغستان کے ایک بڑے حصے پہ اپنی حکومت قائم کر لی ان کا نظام حکومت احکام شریعت پر مبنی تھا۔ ترکوں کے عدم تعاون اور اپنے فوجی قبائل میں اتحاد نہ ہونے کے باعث انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ مجبوراً اطاعت زار کا حلف اٹھایا۔ ۱۸۶۹ء میں انہیں مکہ مکرمہ جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۸۷۱ء میں مدینہ منورہ میں وفات پا گئے۔

شامی

شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن علی بن یوسف الدمشقی الصالحی الشامی الشافعی۔ دسویں صدی ہجری کے نامور محدث شہرہ آفاق سیرت نگار ر مورخ تھے۔ شام کو خیرباد کہہ کر مصر چلے گئے اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے انہوں نے بہت سی قابلِ ذکر اور اہم کتابیں تصنیف کیں۔

شاہ احمد نورانی

عالم دین۔ مبلغ۔ ۱۷ر رمضان ۱۳۴۴ھ/۳۱ر مارچ ۱۹۲۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ اسی نسبت سے آپ صدیقی کہلاتے ہیں۔ آپ کے والد علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی، اعلیحضرت شاہ احمد رضا خان بریلوی کے خلیفہ مجاز تھے۔ علامہ نورانی نے آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ عربک کالج میرٹھ سے ڈگریاں حاصل کیں۔ درس نظامی کی متداولہ کتب مدرسہ اسلامیہ قومیہ، میرٹھ میں پڑھیں۔ علامہ نورانی کے والد ماجد علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے دنیا کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام ہدایت پہنچایا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ فریضہ آپ کے فرزند ارجمند شاہ احمد نورانی نے اپنے ذمے لیا اور ۱۹۵۵ء سے اب تک مصر، روس، مشرق وسطی مشرقی افریقہ، مڈغاسکر، ماریشس، سری لنکا، شمالی افریقہ، صومالیہ، کینیا، ٹانگانیکا یوگنڈا، ترکی، فرانس، جرمنی، برطانیہ، نائیجیریا، چین، امریکا۔ جنوبی امریکا۔ اور کینیڈا کے بار بار تبلیغی دورے کر چکے ہیں۔ آپ کی تبلیغ سے سینکڑوں غیر مسلموں نے شرف اسلام قبول کیا ہے۔ جن میں، پادری۔ راہب، وکلا، انجینئر، ڈاکٹر اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگ شامل ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ورلڈ اسلامک مشن کی کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ اس کانفرنس میں آپ کو مشن کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ نیز نورانی ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۴ء تک ورلڈ مسلم علما آرگنائزیشن کے سیکرٹری جنرل رہے۔ اس عالمی تنظیم کے صدر مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی مرحوم تھے۔

علامہ نورانی نے ۱۹۵۳ء میں اور پھر ۱۹۷۴ء میں ختم نبوتؐ کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں آپ جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں آپ کو جمعیت علمائے پاکستان کا مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے قومی انتخابات میں دھاندلی کے خلاف جو عوامی تحریک اٹھی۔ اس میں علامہ نورانی پیش پیش تھے۔ آپ نے زبردست تبلیغی کاموں کے ساتھ ساتھ تحریری میدان میں بھی کام کیا ہے۔ اسلام کی ابتدائی معلومات پر مبنی متعدد کتابچے اردو، انگریزی، فرانسیسی اور متعدد دوسری زبانوں میں شائع کرکے پاکستان اور بیرونی ممالک میں مفت تقسیم کے انتظامات کئے ہیں۔ حق گوئی و بے باکی آپ کی طرز خاص ہے۔

شاہجہان

ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہاں۔ خاندان مغلیہ کا مشہور فرمانروائے ہند نورالدین جہانگیر کا تیسرا بیٹا جس کا نام خرم تھا۔ ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا۔ ایک سلیم المزاج فن دوست اور شریفانہ جذبات رکھنے والا بادشاہ جس کے عہد میں علم و فن، سپہ گری، عام زندگی کے ہر شعبے میں دوررس تبدیلیاں اور ارتقا ہوا۔

۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی وفات پہ بغاوتوں اور سازشوں کو فرو کرنے کے بعد ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ۱۶۳۲ء میں اس نے دولت آباد فتح کر لیا۔ پھر جلد بعد گولکنڈہ اور بیجاپور کو شاہی اقتدار تسلیم کرنے پہ مجبور کر دیا۔ اسی سال یعنی ۱۶۳۲ء میں ہگلی کا محاصرہ کرکے اسے انگریزوں سے چھین لیا۔

شاہجہان نے دور تک مغلوں کی سلطنت میں وسعت [illegible] تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے اورنگ زیب نے جو دکن کا نائب الحکومت [illegible] میں شاہجہان کی خرابی صحت کی خبر پا کر بغاوت کر دی۔ [illegible] کے درمیان تخت کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب [illegible] شکست دی، اپنے دوسرے بھائی مراد کو قید کرکے قتل کروا [illegible] شاہجہان کو [illegible] کرکے خود تخت نشین ہو گیا۔

شاہجہان کا انتقال اسی قید میں ۲ر جنوری ۱۶۶۶ء کو آگرے کے قلعے میں [illegible] سال کی عمر میں ہوا۔

شاہجہان کی بشری کمزوریوں سے قطع نظر اس کا عہد بہت سے امتیازات کا حامل ہے۔ اس کا دور آسودگی اور معاشی اطمینان کا دور تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی قدر اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ فن موسیقی میں اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ مصوری، خطاطی اور کندہ کاری کے فنون میں قدر اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ فن تعمیر کے اعتبار سے شاہجہان کا عہد تمام مغل بادشاہوں سے زیادہ شاندار ہے۔ مغل فن تعمیر کے لیے یہی دور سنہری دور کہلا سکتا ہے۔ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ، آگرے میں تاج محل، لاہور میں شالا مار باغ اور مقبرہ جہانگیر اپنے حسن تعمیر

کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں :

شاہ حسین

۹۴۵ھ - ۱۰۰۸ھ / ۱۵۳۹ء - ۱۵۹۹ء -

معروف صوفی، مجذوب، پنجابی زبان کے عظیم شاعر۔ عوام میں مادھولال حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مزار باغبانپورہ لاہور میں ہے۔ جہاں ہر سال میلہ چراغاں کے نام سے شاندار عوامی تقریب ہوتی ہے۔ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف "شطحیات" میں ان کی بہت سی کرامات درج کی ہیں۔ شاہ حسین کا تعلق درویشوں کے فرقہ ملامتیہ سے تھا۔ داڑھی مونچھ منڈوا کر ناچنا گانا ان کا معمول تھا۔ عمر کا آخری حصہ جذب و سُکر کی حالت میں بسر ہُوا۔ شاہ حسین کی کافیاں پنجاب بھر میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہے۔ پنجابی شاعری میں انہیں ایک اعلیٰ منصب حاصل ہے۔ انہوں نے پنجابی زبان میں پہلی بار کوشش کی کہ مختلف راگ اور راگنیوں کا اپنی کافیوں میں استعمال کریں۔ ان کی شاعری، زبان کے رس اور بہاؤ، تصوف کی بلند فکری، روحانیت اور عجز و انکسار کی روح سے بھری ہوئی ہے :

شاہ دولہ گجراتی

نام دولہ۔ سلسلۂ نسب بہلول لودھی سے اور سلسلۂ طریقت بہاؤالدین ذکریا ملتانی سے جا ملتا ہے۔ بچپن ہی میں کسی بردہ فروش نے انہیں اٹھا کر ایک ہندو کے پاس بیچ دیا۔ آپ نے اس ہندو کی اتنی خدمت کی کہ اس نے خوش ہو کر آزاد کر دیا۔ آزادی ملنے کے بعد انہوں نے سرمست سیالکوٹی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سخی اور فیاض تھے۔ سماع سے شغف تھا۔ لوگ آپ کے بہت معتقد تھے۔ اور آپ سے اولاد کے لیے دعا کرنے کو کہتے آپ اس شرط پر دعا کرتے تھے کہ پہلا بچہ ہونے پر ان کی خدمت میں دے دیا جائے گا۔ یہ بچے مخبوط الحواس ہوتے تھے۔ ان کے سر چھوٹے ہوتے اور وہ گویائی سے محروم ہوتے تھے۔ اس طرح کے بچے اب بھی آپ کے مزار پر موجود ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۰۷۵ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار گجرات میں ہے۔ ہر سال ۱۹ ربیع الاوّل کو ان کا عُرس ہوتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز

آپ شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حلیم ہے۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ سترہ سال کی عمر تک تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، عقائد، منطق، کلام، ہندسہ، ہیئت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ تقریر نہایت شستہ اور فصیح ہوتی تھی۔ نہایت مشکل مسائل کو حیرت انگیز انداز میں بیان کرتے تھے۔ والد کی وفات پر مسندِ درس سنبھالی اور اپنے انتقال تک محوِ درس و تدریس رہے۔ حافظہ بے مثل تھا۔ غیر معروف کتابوں کی لمبی لمبی عبارتیں فقط یاد کے زور پر لکھوا دیتے تھے۔ تمام علوم عقلی و نقلی از بر تھے۔ گفتگو کرتے تو حاضرین پر حالتِ استغراق طاری ہو جاتی۔ سلیقہ وعظ و انشاء، تحقیق و جستجو اور مذاکرہ و مباحثہ میں انہیں درجۂ امتیاز حاصل تھا۔ ان کی تالیفات فضلاء کے نزدیک معتمد علیہ ہیں۔ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء کو انتقال ہوا :

شاہ عبدالغنی

شاہ عبدالغنی دہلوی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے چھوٹے صاحبزادے۔ ممتاز مفسر، محدث اور فقیہہ۔ درس و تدریس اور اشاعتِ اسلام ان کا شب و روز کا معمول تھا۔ یادِ خدا میں ہمیشہ مشغول رہتے۔ ان کی صحبت میں جذبۂ ایثار اور اخلاص کا فیض عام تھا :

شاہ عبدالقادر

شاہ ولی اللہ کے تیسرے صاحبزادے۔ انہیں علمِ فقہ و حدیث میں کمال حاصل تھا۔ گوشہ نشینی پسند کرتے تھے۔ دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں ساری عمر گزار دی۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام "موضح القرآن" رکھا۔ ان کی وفات دہلی میں ہوئی۔ آپ کی شہرت کا باعث قرآن مجید کا ترجمہ ہے کیونکہ اردو زبان میں یہ پہلا ترجمہ ہے۔

شاہ محمد مخصوص اللہ

مغلیہ عہد کے آخری دور کے مشہور عالم اور محدث۔ دہلی کے متقی بزرگوں کے سربراہ اور سالک تھے۔ علم و عمل میں اسم بامسمّا اور فی الحقیقت اللہ تعالےٰ کے مخصوص بندوں میں سے تھے۔ آپ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے چچا زاد بھائی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے بعض امور پر شاہ شہید سے اختلافات رائے کیا۔

شاہ مدار

سید بدیع الدین احمد شاہ مدار بن قاضی قطب الدین علی بن بہاؤالدین احمد بن ظہیر الدین احمد بن اسماعیل احمد بن احمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر۔ قطب المدار جو عوام میں شاہ مدار کے نام سے معروف ہیں۔ انہوں نے نہایت طویل عمر پائی۔ ان کی پیدائش یکم شوال ۲۴۲ھ بتائی جاتی ہے۔ ایک جگہ ان کی تاریخ پیدائش ۷۵۰ھ بھی درج ہے۔ اور تاریخ وفات ۸۳۸ھ اور ایک جگہ ۸۴۴ھ درج ہے۔ اس طرح انہوں نے پونے چھ سو سال سے زائد کی عمر پائی۔ جہاں گرد تھے۔ کئی بار حج کے لیے گئے۔ ہندوستان میں ان کی آمد کی تاریخ ۲۴۲ھ ہے جو غلط فہمی کی بنا پر ان کی تاریخ پیدائش بھی سمجھی جاتی ہے۔ نہایت خوبصورت شخص تھے اور اس خوف سے چہرے پر نقاب ڈالے رہتے تھے کہ ان کے حسن سے مسحور ہو کر خدا کی مخلوق انہیں سجدہ نہ کرنے لگے۔ ان کا لباس کبھی میلا نہیں ہوا۔ تمام عمر دائم الصوم اور مجرد رہے۔ وہ نیرنجات اور الکیمیا کے ماہر تھے۔ ان سے اور ان کے پیروؤں سے عجیب و غریب کرامات منسوب ہیں۔ شاہ مدار کے جسم پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی اور تا ہنوز دربار کے اندر نہیں جاتی۔ مزار کے اندر قدرتی روشنی ہے اور ان کے مزار کے گنبد کا سایہ نہیں ہے۔

آپ زندہ شاہ مدار کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ باون ڈاکوؤں کا ایک گروہ شاہ مدار کے اوصاف سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے بعض افراد بازی گر تھے۔ بعد میں وہ پورا گروہ بازی گری پر اتر آیا جو باون گولی کے نام سے معروف ہے۔ غلط فہمی کی بنا پر سارے بازی گروں کو شاہ مدار سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ان کے مزار پر ان کے سالانہ عرس کے موقع پر برصغیر کے مختلف حصوں سے بے شمار پیرو وہاں آتے ہیں۔ ان کا مزار مکن پورہ میں ہے جو کانپور (بھارت) سے چالیس میل دور واقع ایک گاؤں ہے :

شاہد

شہادت دینے والا۔ گواہی دینے والا۔ کسی شخص یا واقعے کے جھوٹے یا سچے ہونے کو گواہی دینے والا۔ اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے

جو انصاف کے قیام کے لیے عدالت کو اصل صورتِ حال سے واقف ہونے میں مدد دیتا ہے۔ کیونکہ صورتِ حال کا عینی شاہد ہونے کی حیثیت میں وہ واقعات کا معتبر اور حقیقت سے زیادہ نزدیک بیان کر سکتا ہے۔ لیکن اس نظامِ شہادت میں جو اسلام نے عدل کو قائم کرنے کے لیے وضع کیا بنیادی شرط یہ ہے کہ شاہد (گواہ) اپنی گزشتہ زندگی میں جھوٹا نہ رہا ہو اور وہ اس بات کا یقین عدالت کو دلا دے یا اس کو جاننے والے لوگ اس کا اعتراف کریں۔

اسلام میں مختلف معاملات کے لیے گواہوں کی تعداد مختلف ہے اور ان میں مردوں اور عورتوں کی شہادتیں بھی مختلف ہیں۔ زنا کے معاملے میں سزا کی شرعی حد مقرر کرنے کے لیے چار مرد شاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ معاملات جن میں مال کا کوئی معاملہ نہ ہو مثلاً چوری، قتل، شادی، طلاق یا غلاموں کی رہائی وغیرہ، ان میں دو مردوں کی شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان معاملات میں جن کا تعلق نسوانی امور سے ہو (مثلاً بچے کی پیدائش یا عورتوں کے جسمانی نقائص وغیرہ) شافعی فرقے کے مطابق چار، مالکی کے مطابق دو اور حنفی فرقے کے مطابق ایک خاتون کی شہادت کافی ہے۔ مال کے معاملے میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو خواتین کی گواہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔

ایک شاہد اپنی شہادت سے بری الذمہ ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنے دیئے گئے بیان کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اگر زنا کے معاملے میں کوئی شاہد اپنی شہادت سے پھر جاتا ہے تو اس کے لیے سزا کی حد مقرر ہے۔

شاتیہ

سرمائی فوج۔ رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کے معرکوں کے دوران دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے امیر معاویہؓ نے زبردست عسکری قوت اور تنظیم کا اہتمام کیا۔ سامانِ حرب کے دو ہزار جہاز ایسے تھے جو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انہوں نے خشکی کی جنگ کے لیے "شاتیہ" یعنی سرمائی فوج اور "صائفہ" یعنی گرمائی فوج کے نام سے دو مستقل لشکر تیار کیے جو اپنے اپنے موسموں میں سرحدوں پر برسرِ پیکار رہتے تھے۔

شب برات

قمری سال کے آٹھویں مہینے شعبان کی پندرہویں رات۔ قرآن میں اسے لیلۂ مبارکہ کہا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس رات ہر معاملے کا حکیمانہ اور محکم فیصلہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ اس رات افراد، قوموں، ملکوں اور قسمتوں کے فیصلے کر کے اللہ تعالےٰ اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ آنحضرتؐ نے نصف شعبان کی اس مبارک رات قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ حدیث ہے کہ اس رات اللہ تعالےٰ سب سے نچلے آسمان پر اُتر آتا ہے اور انسانوں کو ان کے گناہ معاف کرنے کے لیے پکارتا ہے۔ یہ رات لیلۃ البراۃ بھی کہلاتی ہے۔ یعنی مغفرت کی رات۔

شبلی ۔ ابوبکر

ایک جلیل القدر مالکی المذہب صوفی۔ بغداد میں ۲۴۷ھ/۸۶۱ء کو پیدا ہوئے اور ۸۷ سال کی عمر میں بغداد ہی میں وفات پائی۔ علم و معرفت کے اعتبار سے یگانۂ روزگار۔ مسلک مالکی کے سربرآوردہ فقیہہ اور عالم تھے۔ حدیث بکثرت لکھتے رہے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ انہوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن ان کے بعض اقوال مستند مجموعوں میں ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف "تألف و تعطف" کا نام ہے۔ ان سے زہد کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ دل کو اشیاء سے ہٹا کر رب الاشیاء کی طرف پھیر دینا زہد ہے۔ شبلی کا قول ہے کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا ہر چیز اس کے تابع ہو گئی۔ نیز فرمایا کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ کبھی غم سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا کہ اہلِ معرفت کی اللہ سے ایک لمحہ کی غفلت شرک باللہ کے مترادف ہے۔

انتقالِ خرقہ کے دستور کی روح سے شبلی حضرت جنیدؒ اور نصر آبادی کے مابین ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موخرالذکر شبلی کے شاگرد تھے۔ ان کا مزار بغداد میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے قریب ہے جسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شبلی نعمانی

محمد شبلی منسوب بہ امام اعظم نعمان بن ثابت بوجہ عقیدت۔ ان کی پیدائش بندول (اعظم گڑھ) میں ۱۸۵۷ء کو شیخ حبیب اللہ کے ہاں ہوئی جو ایک متمول تاجر، زمیندار اور کامیاب وکیل تھے۔ سلسلۂ نسب ایک نومسلم راجپوت شیخ سراج الدین سے ملتا ہے۔ بھائیوں میں بڑے تھے۔ تعلیم قدیم طرز پر ہوئی۔ اساتذہ میں زیادہ مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے متاثر ہوئے۔

علمی شغل سے پہلے انہوں نے نقل نویسی، نیل سازی کی تجارت اور وکالت کی طرف توجہ کی لیکن ذہنی میلان اس طرف نہ ہونے کے باعث ان کا دل نہ لگا۔ ۱۸۸۲ء میں علیگڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور سرسید کے رفقاء میں شامل ہو گئے۔ یہاں انہیں اپنے مزاج اور خواہش کے مطابق ماحول اور مشغلہ نصیب ہو گیا۔ شبلی کی زندگی کے اہم واقعات کچھ اس طرح ہیں۔

۱۸۸۳ء میں اعظم گڑھ میں ایک نیشنل سکول کا قیام۔ ندوۃ العلماء کی تحریک میں شرکت۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک حیدرآباد میں قیام اور سررشتۂ علوم و فنون و انجمن ترقیٔ اُردو کی نظامت۔

دارالعلوم ندوہ کی معتمدی (۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک)۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک ندوۃ العلماء کے رسالے "الندوہ" کی ادارت۔

تمغۂ مجیدی کا حاصل ہونا۔

دوسرے بہت سے تعلیمی اور سیاسی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کی تجویز کی تکمیل کے کچھ ہی عرصہ قبل ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی بیشتر تصانیف علم کلام، تاریخ، ادب اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ سرسید احمد خاں کے رفقاء میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے خصوصی علمی تصانیف کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک مدرسۃ العلوم کے استاد رہے۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے مصر اور ترکی کی سیاحت کی اور سفرنامہ شام و روم کے نام سے سفر کے مشاہدات تحریر کیے۔ ۱۸۹۳ء میں "سیرت النعمان" کے نام سے امام ابوحنیفہؒ کی سیرت لکھی۔ ان کا ایک اہم علمی کارنامہ "الفاروق" ہے جو حضرت عمرؓ کی سیرت پر ہے۔ یہ ۱۸۹۹ء میں مکمل ہوئی۔ ان کی ایک اور اہم ادبی تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" ہے جو تنقیدی تحریر پر مشتمل ہے۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ شبلی کی ذہنی پریشانیوں کا زمانہ تھا جس میں سیاسی نظریات کے انتشار اور علمی و مجلسی منصوبوں کی تجویز و تشکیل کے معاملات شامل تھے۔ اسی عہد میں انہوں نے فارسی شاعری کی تاریخ پر "شعر العجم" کے عنوان سے پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔

ندوۃ العلماء سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی اہم ترین تصنیف "سیرت النبیؐ" کی تالیف کی طرف توجہ کی۔ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ لیکن ابھی پہلی جلد ہی لکھ پائے تھے

کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ سیرت النبیؐ کی کل چھ جلدیں ہیں باقی کا کام ان کے لائق جانشین سید سلیمان ندوی نے پورا کیا۔

شبلی ایک حساس اور اثر پذیر شخص تھے اور اسی کے باعث ان کے ذہنی رجحانات میں عہد بہ عہد تغیر رونما ہوتا تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر وہ سرسید کو پسند کرتے تھے لیکن کچھ معاملات میں ان سے بیزاری کا اظہار بھی ان کے ذہنی رجحانات میں تبدیلیوں کا ثبوت ہے۔ ان کی زندگی پر ان کی طبیعت کے باعث طرح طرح کے اثرات مرتب ہوئے لیکن سب سے زیادہ گہرا اور پائیدار تاثر ان کی شخصیت پر مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور سرسید احمد خاں ہی کا مرتب ہوا۔

شبلی کے لیے سرسید کی رفاقت بہت مفید تھی۔ انہوں نے سرسید کے کتب خانے سے بہت استفادہ کیا۔ گو بعد میں شبلی اور سرسید کے نقطۂ نظر میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا لیکن ان کی شخصیت پر سرسید اور علی گڑھ کے اثرات سے انکار کرنا تاریخی واقعے سے انکار کے مترادف ہے۔

شبلی علی گڑھ تحریک کے اہم رہنما تھے۔ شبلی کی مصنفانہ حیثیتوں میں سب سے اہم ان کی مورخانہ حیثیت ہے۔ المامون، الفاروق، تاریخی مقالات و مضامین اور سیرۃ النبی کی پہلی جلد ان کی تاریخی کاوشوں کے شاہکار ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ کو فلسفۂ اجتماعی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اسے تہذیب انسانی کی صورت میں پیش کرتے ہیں شبلی ایک نقاد، ایک اچھے مکتوب نگار اور نثر لکھنے والے کی حیثیت سے اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ ان کی دیگر حیثیتیں اردو اور فارسی کے ایک اچھے شاعر، سیاست دان، ماہر تعلیم، صحافی مقالہ نگار کی ہیں۔

شبیب بن یزید

ابن نعیم۔ ایک خارجی سردار۔ وہ چھاپہ مار جنگ کا ماہر تھا۔ وہ کبھی جم کر ایک جگہ نہیں رہتا تھا۔ بلکہ مستقل اپنا مقام بدلتا رہتا تھا۔ حجاج نے اس کے تعاقب اور خاتمے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہت چوکنا اور باخبر رہتا تھا۔ حجاج نے اپنی مدد کے لیے خلیفہ سے درخواست کی اور ایک بڑی جمعیت اس کی مدد کے لیے آگئی۔ آخر ایک خونریز لڑائی کے بعد شبیب پسپا ہو کر پیچھے ہٹا اور ایک دریا عبور کرتے وقت ڈوب گیا۔ اس کی شکل و صورت قد کاٹھ اور جسمانی طاقت اس کے افسانوی معرکوں کے عین مطابق تھی۔

شبیر احمد عثمانی

معروف فقیہ و عالم۔ پیدائش ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء۔ والد کا نام مولانا فضل الرحمٰن عثمانی تھا جو مولانا محمد قاسمؒ کے ساتھ بانئ دارالعلوم دیوبند میں برابر کے شریک تھے۔ جو علامہ شبیر احمدؒ کی پیدائش کے وقت بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کی تعلیم کا آغاز ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ اور ۱۳۲۵ھ میں وہ تمام دورے کے طلبہ میں اول رہ کر تعلیم سے فارغ ہوئے۔

عہد طالب علمی میں ہی ذہانت و فطانت کا شہرہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں طلبہ کو منطق وغیرہ کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ آپ نے مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی لیکن ان میں سب سے بڑے استاذ الحدیث مولانا محمد حسن صاحب مالٹا تھے۔ منطق و فلسفہ انہوں نے مولانا غلام رسول صاحب سے کسب فیض کیا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے چند ماہ دارالعلوم میں اونچے درجے کی کتابیں پڑھائیں بعد ازاں فتح پوری مسجد دہلی کے عربی مدرسے میں صدر مدرس کے عہدے پر ۱۹۰۹ء میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی تقاریر کے باعث آپ کے علم اور حسن بیان کا بہت شہرہ ہوا۔ علامہ کے قیام دہلی کے دوران مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند پہنچ چکے تھے۔ اور وہاں انہوں نے جمعیۃ الانصار کی بنیاد ڈال دی تھی۔ علامہ بھی دہلی سے دیوبند کی مجالس میں شرکت کے لیے جاتے تھے۔ اس انجمن کا مقصد مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ جمعیۃ الانصار کے پہلے جلسے میں جو مراد آباد میں ہوا۔ علامہ نے اپنا مقالہ "اسلام" پڑھا جس کو سن کر علما و فضلا حیرت زدہ رہ گئے اور ان کے علم و

فضل کے معترف ہو گئے۔ بعد میں ہونے والے جلسوں میں بھی انہوں نے تقاریر کیں۔ اور مقالے پڑھے اور ہندوستان بھر میں ایک جید عالم کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

آپ کو فنِ تفسیر سے کمال حاصل تھا۔ آپ کا زبردست شاہکار قرآن کریم کے وہ تفسیری فوائد ہیں جو پاک و ہند میں چھپ کر مقبول ہوئے۔ فن حدیث و فقہ میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مسلم کی شرح، فتح الملہم کی تین جلدیں نہ صرف ہند و پاک کے مسلمانوں بلکہ تمام عالمِ اسلام کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ وہ فقط اپنے دور کے مفسرِ اعظم ہی نہ تھے ایک اعلیٰ متکلم بھی تھے اور علمِ کلام میں انھیں مایۂ ناز دسترس حاصل تھی۔ وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ قادر الکلام عالم تھے۔ بخاری شرح موسومہ

علامہ نے ۱۹۱۱ء کی جنگِ بلقان و طرابلس سے سیاسیات میں حصّہ لینا شروع کیا اور مسلمانوں کی بڑی سیاسی خدمت سرانجام دی۔ تحریکِ خلافت میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد علامہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اور تحریکِ پاکستان کے ہندوستان کے طول و عرض میں دورے کیے۔ علامہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی وہ ملک و قوم اور دین کی خدمت میں مشغول رہے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

شبینہ

ایک مذہبی اصطلاح۔ اس کا مطلب ہے ایک رات میں نمازِ تراویح کے دوران قرآن ختم کرنا۔ پاک و ہند میں اس کا بڑا رواج ہے۔ ایک یا کئی حافظ مل کر رمضان کی آخری راتوں میں قرآن ختم کرتے ہیں۔ اس خوشی میں چراغاں کیا جاتا ہے اور شیرینی تقسیم کی جاتی ہے۔ بعض علماء نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔ اور بالعموم رمضان کے علاوہ بھی محافلِ شبینہ منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

شجاع بن وہب

ایک صحابئ رسولؐ۔ جو شرجیل بن عمرو والی بصریٰ کے پاس آنحضرتؐ کا مکتوب لے کر گئے جس میں حضورؐ نے اسے دعوتِ اسلام دی تھی۔ لیکن شرجیل والی بصریٰ کو دعوت اسلام دینے پر آگ بگولا ہو کر شہید کروا دیا۔

شجرِ ممنوعہ

وہ درخت جس کا پھل کھانے کی آدم اور حوّا کو جنت میں ممانعت کر دی گئی تھی۔ قرآن میں باقاعدہ ایک آیت درج ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم (آدم و حوّا) جنت میں جہاں چاہو پھرو اور جو چاہو کھاؤ لیکن اس درخت کے نزدیک مت جانا۔ یہ درخت کس پھل کا تھا اس پر مختلف مذاہب میں اختلاف ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک وہ گندم کا پودا تھا۔ عیسائیوں کے نزدیک وہ سیب کا درخت تھا۔ ایک اور نظریے کے مطابق یہ گیہوں کا پودا تھا۔ اور بعض کے نزدیک انگور کا پودا بھی مراد ہے کیونکہ اس کا کشیدہ رس نشہ آور ہوتا ہے جو ہر جاندار کو بدمست کر دیتا ہے۔ (دیکھیے: آدم کا پھل)

شجر الدر

اسلامی دور کی ایک عورت جو مصر کی تخت نشین ہوئی۔ وہ الصالح نجم الدین ایوب کی کنیز تھی۔ جس نے اسے اپنے چچا زاد بھائی الملک ناصر داؤد کے پاس اس کے زمانہ قید میں بھجوا دیا۔ شجر الدر کے پیروؤں کو اس کی عقل و دانش پر بہت اعتماد تھا انہوں نے اپنے سکے پر اس کا نام "ملکہ المسلمین" لکھوایا۔ اہلِ مصر تو اسے ملکہ تسلیم کرتے تھے لیکن امرائے شام نے ان کی موافقت نہ کی۔ دمشق ملک الناصر یوسف ثانی کے سپرد کر دیا۔ خلیفہ نے اہلِ شام کی طرفداری میں اہلِ مصر کو حکم دیا کہ وہ اپنے لیے کوئی نیا سلطان منتخب کر لیں۔ مصریوں نے اتابک عزالدین کو سلطان منتخب کر لیا جس کے مراسم پہلے ہی سے شجر الدر کے ساتھ تھے۔ اس نے سلطان منتخب ہوتے ہی اس سے شادی کر لی۔ شجر الدر کی حکمرانی کی مدّت کل ۸۰ دن ہے۔ اقتدار کی کشمکش میں اتابک قتل ہو گیا۔ اس کے قتل کے بعد اس کی پہلی بیوی کی باندیوں نے شجر الدر کو کھڑانویں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ ایسی۔ اس جیسی زبردست عورت مصر کے اسلامی عہد میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ نہایت مدبر اور منتظم تھی۔

شجرہ

وہ جدول جس سے سلسلۂ نسب، سلسلۂ تلمذ یا سلسلۂ طریقت بیان کیا جائے اس کی شکل درخت کی سی ہوتی ہے۔ اس میں اصول جڑ اور فروع شاخوں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے، اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی سی ہے اول اول اس کا رواج شجرہ انساب میں ہوا۔ پھر صوفیا وغیرہ نے اپنے شجرے بنا لیے اور پھر علوم و فنون میں بھی اس طرح کی شکلیں بنائی جانے لگیں۔

شداد بن اوس

نام شداد۔ کنیت ابویعلیٰ نیز ابوعبدالرحمٰن۔ قبیلہ خزرج۔ اپنے سارے خاندان کے ساتھ اسلام لائے۔ آپ نے پچاس کے قریب احادیث روایت کی ہیں۔ نہایت عابد اور پرہیزگار تھے۔ اکثر تمام رات مشغولِ عبادت رہتے، حلیم الطبع، کم سخن۔ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی شہرت دُور دُور تھی۔ ۵۸ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بیت المقدس میں دفن ہوئے۔

شر

عربی زبان کا لفظ جو اردو میں مستعمل ہے۔ اس کے معنی، فساد، شرارت، خرابی کے ہیں۔ یہ لفظ خیر کے اختلاف میں استعمال ہوتا ہے۔ اسلام نے خیر کو پسند اور شر کو ناپسند کیا ہے اور رفع شر کے لیے تاکید و قیام خیر کی ہدایت کی ہے۔

شراب

نشہ آور مائع جو پانی اور دیگر چیزوں کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کا مخصوص طریقہ ہے۔ اس کا مرکب ایلکحل ایسڈ اور پانی ہے۔ یہ اناج و نباتات اور دیگر پھلوں سے بھی تیار کی جاتی ہے۔ عموماً انگور سے تیار ہوتی ہے۔ شراب بہت قدیم نشہ آور مشروب ہے۔ انجیل میں اس کا ذکر حضرت نوحؑ کے حوالے سے آتا ہے۔ اسے پی کر آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔ زیادہ پینے سے بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس کے استعمال سے اخلاق اور معاشرتی نظم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور اسلام میں اس کے لیے سزا کی حد مقرر ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے شراب پینے کی سزا میں کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دورانِ خلافت شرابی کو چالیس درّے لگوائے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شرابی کے لیے کوڑوں کی سزا اسّی تک ہو گئی تھی۔

شرات

ایک قرآنی اصطلاح جس کا مطلب ہے "وہ جنہوں نے اپنی جانیں خدا کو بیچ دیں" یعنی ان کا مقصودِ حیات خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہونا ہے اس اصطلاح کو انتہا پسند خارجیوں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

شرجیل بن حسنہؓ

کنیت ابو عبداللہ۔ ان کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام حسنہ تھا۔ جنہوں نے عبداللہ کی وفات کے بعد سفیان انصاری سے شادی کر لی۔ اس لیے ماں کے نام سے منسوب ہوئے۔ آغاز اسلام میں ہی مسلمان ہوئے۔ مکہ سے حبشہ ہجرت کی اور بہت عرصہ وہاں گزارا۔ بعد میں مدینہ آ گئے۔ حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں پہلے معرکۂ بصریٰ میں افسر مقرر ہوئے۔ بعد میں سپہ سالارِ اعظم مقرر ہوئے۔

۱۸ھ کو اسلامی فتوحات کے دوران ہی شام میں طاعون کا مرض پھیلا جس میں آپ کا انتقال ۶۷ سال کی عمر میں ہو گیا۔ بہت بہادر اور قوی ہیکل تھے۔ علم و فضل میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ نے چند احادیث بھی روایت کیں۔

شرف الدین احمد منیری

خطۂ ہند کے ان صوفیاء اور اولیائے کرام میں سے ہیں جنہوں نے اتباعِ سنت خدمتِ خلق اور تعلیماتِ دین کی ترویج و ترقی کے لیے بہت کوششیں کیں۔ تصوف اور فقہ پر ان کی تصانیف اہمیت کی حامل ہیں۔ ۲۶ شعبان ۶۶۱ھ میں منیر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ہاشم بن عبد مناف سے ملتا ہے۔ والدہ کا نسب نامہ جو دھویں پشت میں حضرت امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔ ان کا خاندان بیت المقدس سے ہندوستان آیا۔ اس کا امتیاز زہد و تقویٰ تھا۔ بہت سے لوگ اس خاندان کی بدولت مسلمان ہوئے۔ ابوتوامہ نے انھیں کلام پاک، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم دی۔ شیخ نجیب الدین کی بیعت کی۔ شرف الدینؒ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔

وہ سماع کی محافل منعقد کرتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تین شرائط وضع کیں۔

۱۔ مکان یعنی مجلس سماع مشائخ کی جگہ ہو، پاکیزہ، کشادہ اور روشن ہو۔

۲۔ اخوان یعنی مجلس سماع کے شریک درویش ہوں یا ان کے دوست ہوں۔ اہلِ تمیز اور تربیت یافتہ ہوں۔

۳۔ زمان یعنی وقت سماع دل تمام چیزوں سے خالی ہو۔

آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑیں۔ زیادہ اہمیت آپ کے مکتوبات کو ہے۔ آپ اپنے مریدوں کو عموماً مکتوبات کے ذریعے ہدایت اور دعوتِ شریعت دیا کرتے تھے۔ ان مکتوبات میں تصوف و فقہ پر عالمانہ فکر اور مدبرانہ حل ہوتے تھے۔

شرک

قرآن میں توحید کے انکار کو شرک کہا گیا ہے اور منکر کو "مشرک" کہا گیا ہے۔ شرک کے لفظی معنی کسی کو شریک کرنے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں کسی کو خدا کی ذات یا صفات میں شریک بنانا شرک کہلاتا ہے۔ قرآن نے شرک کو بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کے لیے معافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ثنویت، تثلیث اور بت پرستی کو باطل قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان کسی وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔

شرود

لغوی معنی بھاگنا۔ اصطلاحی معنوں میں خدا تک پہنچنے میں جو موانع اور پردوں سے دل میں بے قراری پیدا ہوتی ہے اس سے خلاصی پانے کے لیے بھاگنا۔ طالب حق کے تمام مصائب حق تعالیٰ سے حجاب کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اس حجاب کو دور کرنے میں طالبان حق کی ہر تدبیر کو شرود کہتے ہیں۔

شریح، قاضی

تفسیر، حدیث اور فقہ کے جید عالم۔ اپنے وقت کے قاضی القضاۃ تھے۔ انہوں نے تدوین حدیث کے باب میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ ان کا تعلق تابعین سے ہے آپ کے عدل و انصاف کے متعدد فیصلے شہرتِ دوام کے حامل ہیں۔ آپ مسلسل تین سال منصب قضا پر فائز رہے۔

شریعت

لغوی معنی کھلا اور سیدھا راستہ۔ اصطلاحی معانی میں اسلامی قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں تعین شدہ اصولوں اور قوانین پر مشتمل ایک دستاویز جس میں بحث یا اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کا نفاذ در ترتیب عین خدائی احکامات پر مبنی ہے۔

شریعت دراصل وہ خدائی احکامات ہیں جو اخلاقیات سے علیحدہ ہیں۔ ان میں حقوق، فرائض، وراثت، جرم و سزا وغیرہ شامل ہیں۔ شریعت کی بنیاد چونکہ قرآن اور سنت پر ہے۔ اس لیے کسی جماعت یا فرقے کو اس میں تنقید کا حق حاصل نہیں۔

قوانین شریعت دو قسموں پر مشتمل ہیں:

۱۔ حقوق اللہ: جن میں عبادت وغیرہ سے متعلق قوانین و احکام ہیں۔

۲۔ حقوق العباد۔ ان میں عدالتی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر احکام شامل ہیں۔

اسلامی شریعت میں انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے صاف، کھلے اور واضح احکام موجود ہیں۔ کسی عہد یا کسی شخص کو ان میں رد و بدل کی اجازت نہیں انھیں ان کی اصل حالت میں تسلیم و قبول کا حکم ہے۔

شریف حسین بن علی

حجازی سادات کے ایک مقتدر گھرانے کا فرزند۔ اس خاندان کے متعدد افراد عثمانی حکومت میں مکہ معظمہ کے والی رہ چکے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ شریف حسین نے مکہ معظمہ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ جوانی میں شعر و شاعری اور شکار کا دلدادہ تھا۔ شریف حسین نے حجاز کی خود مختار حکمرانی کے لالچ کے عوض ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ شریف حسین جاہ طلب اور طالب اقتدار تھا۔ اس نے فرات سے نیل تک اپنی حکمرانی قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ وہ آخری عمر میں ناکامی اور محرومی کا شکار تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر شریف حسین اور اس کے بیٹے انگریزوں کے دام فریب میں آ کر خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت نہ کرتے تو آج اسرائیل کا کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

شطاریہ

یہ لفظ، عیاری اور چابکدستی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صوفیا کا ایک فرقہ جو بنو عباس کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس گروہ کے سیاسی عقائد دوسرے لوگوں کے نظریات سے مختلف تھے۔ شطاریہ شکایت سے گریز کرتے ہیں اور جو کچھ کھانے کو مل جائے کھا لیتے اور یہ کہ خدا بقا میں وہ فنا کے شغل کو فعل عبث گردانتے ہیں جس کا نفس ربوبیت میں ہے اور تمہارا نفس (مخلوق مراد ہے) عبودیت میں ہے ؛

شط العرب

لفظ شط کے معنی کسی ندی کا کنارہ ہیں۔ عراق عرب میں بڑے دریاؤں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ شط العرب وہ مدوجزری چوڑا دہانہ ہے جو دریائے فرات اور دجلہ کے سنگم سے بنتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں اسے "دجلۃ العورہ" (دجلۂ بصرہ) کہتے تھے۔ عام طور سے اس کا پاٹ قرنہ سے ادانا ابادان تک سمجھا جاتا ہے۔ بڑے دریاؤں کے علاوہ شط العرب میں دریائے کارون اور ان کی معاون ندیاں بھی ملتی ہیں۔ شط العرب تقریباً ۱۰۰ میل لمبا اور ۱۲۰۰ گز چوڑا ہے۔ اس میں وہ جہاز چل سکتے ہیں جن کے لیے پندرہ فٹ پانی کی گہرائی درکار ہوتی ہے ؛

شطح

عربی لفظ جمع شطحات۔ تصوف کی ایک اصطلاح جس سے مراد عالم سکر میں کہے گئے الفاظ مراد ہیں نیز خلاف شرع الفاظ زبان سے ادا کرنا۔ کشف کی رو سے وہ کلمات جو عالم مستی میں بے اختیار زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً منصور کا انا الحق کہنا۔ مشائخ نے ایسے کلمات کو نہ رد کیا ہے اور نہ تسلیم کیا ہے۔ یہ اصطلاح دسویں صدی عیسوی میں صوفیائے اختیار کی۔ مسلم صوفیا متفقہ طور پر اس میں وہ علامات دیکھتے ہیں جو ابتدائی صوفیانہ واردات کے ظہور کے بعد صوفی کی روح تک پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن اہل علم کی اکثریت نے عقیدۂ توحید اور پابندیٔ شرع کے خیال سے فنائے ذات کے مقام سے قبل اس سے گریز کرنے پر اتفاق کیا ہے ؛

شعب ابی طالب

مکہ معظمہ کے قریب ایک درہ جو بنو ہاشم کی موروثی تھا۔ ۷ھ میں کفار مکہ نے طے کیا کہ بنو ہاشم اگر آنحضرتؐ کو ہمارے حوالے نہیں کرتے تو ان سے ہر قسم کے تعلقات توڑ لیے جائیں۔ بنو ہاشم اور خاص طور پر حضورؐ کے چچا یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ رسولِ خداؐ کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ سوائے ابولہب کے تمام بنو ہاشم اس درے میں چلے گئے۔ اور تین سال تک نہایت تنگی اور تکلیف سے وہاں گزارے۔ ایک دن حضورؐ نے ابوطالب سے کہا کہ میرے پاس آنے والے فرشتے نے خبر دی ہے کہ مقاطعے کی عبارت کو کیڑے کھا گئے ہیں۔ ابوطالب نے کفار مکہ سے کہا کہ میرے بھتیجے نے اس طرح کہا ہے اگر یہ درست ہے تو یہ مقاطعہ ختم کر دو۔ اگر یہ بات درست نہ ہوئی تو ہم اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ کاغذ دیکھا گیا تو حضورؐ کا ارشاد درست تھا۔ اس طرح ۱۰ھ میں حضورؐ بنو ہاشم کے ساتھ اس درے سے باہر آئے ؛

شعبان

قمری سال کا آٹھواں مہینہ۔ پاک و ہند میں یہ مہینہ شب برات کے لیے مشہور ہے۔ حدیث کی رُو سے حضور اکرمؐ نفلی روزے ترجیحاً شعبان ہی میں رکھا کرتے تھے۔ شعبان کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس مہینے میں عرب پانی وغیرہ کی تلاش یا لوٹ مار کے لیے نکل جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے شعبان سے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان آتا ہے۔ ؛

شعبی

ابوعمرو بن شراحیل بن عمرو الشعبی محدث۔ ابتدائے اسلام کے ان مشاہیر میں سے ہیں جنہوں نے ناموری اور شہرت حاصل کی۔ ان کے والد ممتاز ترین قاریوں میں سے تھے۔ شعبی ایک دبلے پتلے مختصر سے آدمی تھے اور اس کی وجہ وہ اپنی جڑواں پیدائش بتاتے تھے۔ دوسرے علمائے دین کے برعکس ان میں ظرافت بھی موجود تھی۔ شعبی کہتے ہیں کہ انہوں نے ۵۰۰ صحابہ سے احادیث سنیں۔ امام ابوحنیفہ ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے خود کبھی فقیہہ ہونے کا دعوے نہیں کیا لیکن کوفے کے فقہا ان سے مشورہ کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے بقول وہ ایک ماہ تک مسلسل اشعار سن سکتے اور ان کے اشعار کا ذخیرہ پھر بھی ختم نہیں ہوتا تھا ؛

شعرانی

ایک نسبت جس سے بہت سے لوگ مشہور ہیں۔ ابوالواہب الشعرانی ایک جامع العلوم صوفی۔ وہ نقد و جرح کے قائل نہ تھے اور اپنی قدر و منزلت کے متعلق حد سے بڑا ہوا مبالغہ ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ اپنی تصانیف کے متعلق ان کا دعوے ہے کہ انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اسلامی دنیا پر اپنے دُوررس اثر کے لیے وہ اپنی ذہنی قابلیت و استعداد کے علاوہ وہ اپنی کثرت تصنیف کے ممنون ہیں۔ ان کا سہل اور قابلِ فہم انداز ان کی مقبولیت کا باعث ہے ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں مقبول عام ہو گئیں۔ ان کے اپنے دعووں کے باوجود ان کے ہاں کوئی خاص جدت نہیں۔ مثلاً وہ بعض کتابوں میں محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحات مکیہ" سے متاثر ہیں بلکہ ان کی ایک تصنیف تو محض ابن عربی کی اس کتاب کا خلاصہ ہے۔ الشعرانی نے اپنے اندر فقہ اور تصوف کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اس لیے وہ کسی طور شریعت کے مخالف نہیں کہے جا سکتے ۔

شعریٰ

ایک روشن اور چمکدار ستارہ۔ اپنی چمک دمک میں اسے سب ثوابت پر سبقت حاصل ہے۔ عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت میں بھی یہ ستارہ معروف تھا اسے المرزم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دو ہیں۔ ایک الشعریٰ العبور اور دوسرا الشعریٰ الغمیصا۔ کچھ جاہل عرب شعریٰ العبور کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ قدیم عربی شاعری میں شعریٰ کا ذکر آتا ہے۔

مسلمانوں کے علم نجوم میں اس ستارے کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس کے دور کی بنا پر پیش گوئی کے امکانات بے شمار ہیں۔ چاند کے ساتھ اس کے بیک وقت طلوع کو منجموں نے ہمیشہ اسے ایک مسعود قِران تصور کیا ہے ؛

شعوبیہ

عجمیوں کی وہ جماعت جو اپنے مقابلے پر عربوں کے تفاخر کو اعتراض کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس جماعت سے تعلق رکھنے والے کو شعوبی کہا جاتا ہے۔

گو اسلام نے عرب وعجم کے رہنے والوں کے درمیان رنگ ونسل کے تمام تر امتیازات کو ختم کر دیا اور ان کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ لیکن عربوں کے مقامی اور اہلِ عجم کے غیر مقامی ہونے کے باعث بعض عرب جو برتری کا احساس روا رکھتے تھے ان پر اعتراض کرتے ہوئے شعوبیوں نے قرآن کی آیات اور حضورؐ کی احادیث بطور سند پیش کیں۔ عربی میں شعوب کا لفظ غیر عرب قبائل کے لیے استعمال ہوتا ہے ؛

شعیاءؑ

ابن آموص - ایک نبی جو یہودا کے بادشاہ حزقیا بن آحاز (۷۲۹ - ۶۸۸ ق م) کے عہدِ حکومت میں بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ جب سنحریب نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو وہ بھی بنی اسرائیل کے ساتھ محصور تھے۔ انہوں نے اس بادشاہ کو خبر دی کہ تیری موت پندرہ سال کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے علاوہ باقی تمام محاصرین فنا ہو گئے۔

محمد بن اسحاق کے بیان کے مطابق شعیا یہودیوں سے بھاگ کر جو ان کی پیشگوئیوں کی بنا پر ان کے خلاف ہو گئے تھے ایک درخت کے پاس پہنچے جو ان کے لیے جھک گیا۔ اور انہوں نے اس میں پناہ لے لی۔ شیطان نے ان کے لبادے کا ایک کونہ پکڑ لیا جو درخت سے نکلا ہوا نظر آتا تھا اور ان کا سراغ دیتا تھا۔ بنو اسرائیل نے درخت کو درمیان میں آرے سے کاٹ دیا۔ ؛

شعیبؑ

شعیب علیہ السلام - ایک پیغمبر جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہ حضرت هودؑ، صالحؑ اور لوطؑ کے بعد مبعوث ہوئے۔ وہ اصحاب الایکہ کی طرف بھیجے گئے تھے۔ بعد کے مفسرین انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر تصور کرتے ہیں حالانکہ قرآن نے حضرت موسیٰؑ کے خسر کا کوئی نام نہیں بتایا۔

اشاعتِ توحید کے علاوہ انہوں نے اپنی قوم کو ناپ تول میں ایمانداری برتنے کی تاکید کی اور حقوق العباد ادا کرنے، اور امن عامہ میں خلل اندازی سے انہیں ڈرایا۔ لیکن قوم کے امرا نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ اور انہیں اور ان کے پیروکار، کو نکال دینے کی دھمکی دی۔ قوم کے دلوں میں ان کے لیے احترام اور عزت نہیں تھی اور اگر قوم کو ان کے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ انہیں سنگسار کر دیتی۔ ان گناہوں کی پاداش میں وہ ایک زلزلے کی زد میں آ گئے اور اپنے اپنے گھروں میں مردہ پائے گئے ؛

شفاعت

بمعنی دعا، سفارش، توسط، میانجی گری - میانجی کو شفیع کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح امور دنیا و آخرت دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ عدلیہ اور قضا کے سلسلے میں سفارش کے متعلق بہت کم ذکر ہے۔ خصوصاً یہ اصطلاح دینی مفہوم میں اور خاص کر قیامت کے سلسلے میں مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں لفظ شفاعت زیادہ تر ایک منفی سیاق و سباق میں ملتا ہے۔ قیامت وہ دن ہوگا جب کسی کی شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔ اسلام میں شفاعت کو کاملاً امکان سے خارج قرار نہیں دیا گیا۔ روزِ حساب آنحضورؐ کی شفاعت کا ذکر ایک حدیث میں ملتا ہے ؛

شفائی

ایران کے دو طبیبوں کا تخلص جو شاعر بھی تھے

(۱) مظفر بن محمد حسینی شفائی کاشانی جو حکیم شفائی کے نام سے معروف ہے اپنے عہد کے نامور اطبا میں سے تھا۔

ابتدا میں اس کا تعلق کاشان کے لوگوں سے تھا۔ لیکن اس نے اپنی زندگی اصفہان میں گزاری۔ اس کا انتقال ۹۶۳ھ میں ہوا۔ فارسی زبان میں اس نے طب پر چند کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک قرابادین (علم الادویہ) کے موضوع پر قرابادین حکیم شفائی کے نام سے مشہور ہے۔

۲۔ حکیم شرف الدین حسین بن حکیم ملا اصفہانی المتخلص بہ شفائی - اس کا باپ اصفہان کے مشہور طبیبوں میں سے تھا۔ اس نے طب کی تحصیل اپنے باپ ہی سے کی۔ اور خود بھی اپنے دور کے نامور اطباء میں شمار ہونے لگا۔ وہ شاہ عباس کا طبیب خاص تھا جو اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔

شفائی نے رمضان ۱۰۳۷ھ میں وفات پائی وہ ایک حاذق اور دانش مند طبیب تھا۔ طب میں اس نے کئی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں اس کی ایک کتاب قرابادین ہے۔

علاوہ بریں وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا۔ شروع میں اس نے جی بھر کے ہجویہ شاعری کی اور اپنے ہمعصروں کی ہجویں لکھیں لیکن آخر میں تائب ہو گیا۔ اس کی کلیات اشعار، قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات اور چند مثنویوں پر مشتمل ہے۔

شفق

(الصبح ، الفجر)

طلوعِ سحر اور شام کی وہ سرخی جو افقِ آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔ اس کو دنیائے اسلام اور اسلامی علمِ ہیئت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس سے نماز کے دو اہم ترین اوقات کا تعین ہوتا ہے۔

البیرونی نے اپنی کتاب میں شفق کی تشریح کی ہے۔ صبح کے وقت پہلے روشنی کا ایک پتلا اور لمباسا عمود نمودار ہوتا ہے جو اس مقام کے عرض بلد کے لحاظ سے افق کی جانب کم وبیش جھکا ہوا ہوتا ہے، اسے صبح کاذب یا الفجر الکاذب کہتے ہیں۔ اس کے بعد صبح صادق کا ظہور ہوتا ہے جو پہلے ہلکی سی سفید روشنی پر مشتمل ہوتی ہے۔ پھر افق پر بتدریج پھیل کر ہلال کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اس سے نمازِ فجر کے وقت کے آغاز کی نشاندہی ہوتی ہے اس کے بعد صبح کی سرخی نظر آنے لگتی ہے۔ بعینہٖ یہی مظاہر شام کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ صرف ان کی ترتیب برعکس ہوتی ہے۔

شافعی، مالکی اور حنبلی اس پر متفق ہیں کہ نماز مغرب کے وقت کا آخر اور نمازِ عشاء کے وقت کا آغاز اس لمحے ہوتا ہے جب شفق الاحمر کی سرخ جھلک غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ سفیدی کی جھلک پر اعتبار کرتے ہیں ؛

شقران صالح

نام صالح - لقب شقران - والد کا نام عدی، عبدالرحمٰن بن عوفؓ مشہور صحابی رسول اللہؐ کے حبشی نژاد غلام تھے جنہیں بعد میں رسول اللہؐ نے خرید لیا۔ آپ اسلام کے اولین دنوں میں مسلمان ہوئے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور مستقل وہیں رہے۔ عموماً جنگوں میں قیدیوں کی حفاظت کرتے تھے۔ غزوہ بدر میں انہوں نے محافظت کے فرائض اس دیانت داری اور محنت سے ادا کیے کہ حضور اکرمؐ نے خوش ہو کر انہیں آزاد کر دیا۔

شق صدر

شق کھولنا ، پھاڑنا ۔ صدر ، سینہ ۔ سینے کا کھولنا یا پھاڑنا ۔

قرآن میں حضرت محمد صلعم کا سینہ شق کرنے کا ذکر ہے ۔ روایت ہے کہ بی بی حلیمہ کے پاس پرورش کے دوران ایک دن جبکہ حضورؐ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف تھے ، جبرائیلؑ ان کے پاس آئے اور انھیں لے گئے ۔ پھر انہیں زمین پر لٹایا اور ان کا سینہ شق کیا اور پھر ان کے دل کو کھول کر اس میں سے کچھ خون نکالا ۔ آپؐ سے کہا یہ نفس شیطانی کا حصّہ تھا ۔ اس کے بعد آپ کا دل اور سینہ اپنی اصل حالت میں لوٹا دیا ۔ حضورؐ کے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں نے حلیمہؓ کو جاکر بتایا کہ آپؐ کے ساتھ یہ ماجرا پیش آگیا ہے ۔ لیکن فوراً ہی آپؐ حسب معمول مشاغل میں لگ گئے ۔

شق قمر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معجزہ ۔ اہل مکہ نے آنحضرتؐ سے کہا تھا کہ اگر آپؐ خدا کے نبی ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے کر دیجئے ۔ آپؐ نے انگلی سے اشارہ کیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے ۔ اس معجزہ کی طرف سورہ القمر میں اشارہ ہے ۔ معتزلہ اس معجزے سے انکار کرتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب امریکی خلا باز چاند پر اترے تو واپسی پر انہوں نے چاند پر قیام کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے چاند پر ایک ایسی دراڑ دیکھی جو نگاہ کی حد سے بھی آگے چلی جاتی ہے ۔ معجزہ شق القمر کے تیرہ سو سال بعد ایک غیر مسلم خلا باز کا یہ تائیدی بیان اس روایت کو نہ ماننے والوں کے لیے فکر پیدا کرتا ہے ۔

شکر

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں ، روحانی ، ذہنی ، جسمانی قوتوں ، اختیارات اور مال و متاع کا صحیح طور پر استعمال کرنا اور ان کے غلط استعمال سے گریز اور احتیاط کرنا ۔ اس کے برعکس کفر یا کفران نعمت ہے ۔ اس کا مفہوم ناشکر گزاری میں داخل ہے ۔

شگون

شگون لینے کا رواج زمانہ قدیم سے ہے باوجودیکہ انسانی عقل و ذہن میں بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن اس کے باوصف عوام کی کثیر تعداد اس پر اعتقاد رکھتی ہے مختلف مذاہب اور گروہوں میں شگون کے مختلف طریقے اور انداز ہیں ۔

یہ توہمات فقط مشرق تک ہی محدود نہیں بلکہ مغرب کی جدید تہذیب بھی اس کی اسیر ہے ۔ اسلام نے ان توہمات کی شدید مذمت کی ہے ۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے سنا کہ شگون کوئی چیز نہیں ہے ۔ بہترین چیز فال نیک ہے ۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ فال کیا چیز ہے تو فرمایا کہ وہ اچھا کلمہ جس کو تم میں سے کوئی شخص کسی شخص سے یا کسی ذریعہ سے سنے ۔

شماس بن عثمان

نہایت خوش شکل ہونے کے باعث شماس نام پڑا ۔ اس سے قبل ابن عثمان کے نام سے پکارے جاتے تھے ۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے ۔ مکہ سے حبشہ کو ہجرت کی اور وہاں سے مدینہ چلے آئے ۔ جنگ بدر میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ۔ جنگ احد میں بھی داد شجاعت دی ۔ جنگ احد میں جبکہ دوسرے مجاہدین میدان چھوڑ چکے تھے آپ ثابت قدم رہے ۔ یہاں کے زخموں سے چور ہو کر گر پڑے ۔ آپ کو نزع کی حالت میں ، مدینہ لایا گیا لیکن جانبر نہ ہو سکے ۔ ۳۴ برس کی عمر میں وفات پائی ۔

شمر ذی الجوشن

یزید اوّل کا ایک جرنیل ۔ سخت دل سخت طبیعت کا مالک تھا ۔ ابن زیاد نے اسے اپنی خوبیوں کے باعث حضرت امام حسینؓ کے مقابلے پر بھیجا تھا ۔ اس نے امام حسینؓ پر ناروا سختیاں کیں ۔ شہید اسے کہ بلاکے سر قلم کرنے کا حکم اسی نے دیا تھا ۔ شمر پہلے حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں تھا اور جنگ صفین میں ان کی جانب سے بہت بہادری سے لڑا تھا ۔ اس نے اپنی ایک بہن کی شادی بھی حضرت علیؓ سے کی ۔ حضرت عباسؓ اس کے ہمشیر زاد تھے ۔ لیکن بعد میں وہ یزید کے ساتھ شامل ہو گیا ۔

شمس الحق افغانی

(۱۹۰۱ء - ۱۹۸۳ء) عالم دین ، ضلع پشاور کے گاؤں ترنگ زئی میں مولانا غلام حیدر کے گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ۔ دارالعلوم دیوبند میں علم حدیث کا درس لیا ۔ پھر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی ۔ واپسی پر ۱۹۲۲ء میں لکی کے مشہور مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریس کا آغاز کیا ۔ چار سال تک دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت میں پڑھاتے رہے ۔

۱۹۳۶ء میں اور پھر ۱۹۴۷ء میں ریاست قلات کے وزیر معارف مقرر ہوئے ۔ ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا شیخ التفسیر منتخب کیا گیا ۔ اس عہدے پر دو تین سال تک خدمات انجام دیتے رہے ۔

تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا افغانی نے تبلیغ دین کی بھی بہت سی خدمت کی ۔ شدھی تحریک کی مزاحمت میں اپنے اساتذہ کے ساتھ بھرپور حصہ لیا ۔ مناظروں میں آریہ سماجیوں کو شکست دی ۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے تحریک ختم نبوت اور اشتراکیت کے خلاف بھی بھرپور کردار ادا کیا ۔ آپ کو اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن منتخب کیا گیا ۔ لیکن علالت کی بنا پر آپ مستعفی ہو گئے ۔

تدریسی و تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تحریری میدان میں بھی ۔۔۔ عربی اور اردو کی درج ذیل مشہور کتابیں آپ نے تصنیف کیں ۔ علوم القرآن ، اشتراکیت اور اسلام ، سرمایہ داری اور اشتراکیت ، مشکلات القرآن ۔۔۔ ان کا قرآنی حل ، ترقی اور اسلام ، اسلامی ۔۔۔ القرآن ، خطبات ، زمان و مکان ۔

شمس الدین ترک

نام شمس الدین ، شمس الدولہ یا خطاب ہے ۔ ۔۔۔ تھے ۔ سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہؓ تک ہوتا ہے جو حضرت علیؓ کے فرزند تھے ۔ حضرت شیخ علاؤالدین صابرؒ کے خلیفہ و جانشین ۔ سلسلۂ صابری چشتی آپ ہی کے واسطے سے جاری ہے ۔ ریاضت و مجاہدات ، ذوق و شوق و استغراق میں بے نظیر ۔ علوم ظاہری و باطنی ، کشف و کرامات میں کمال درجہ رکھتے تھے ۔

جب حضرت علی احمد صابر کلیریؒ کی وفات کے دن قریب آئے تو حضرت شمس الدین کو بلا کر خرقہ خلافت عطا کیا اور وصیت کی کہ میرے انتقال کے بعد تین دن سے زیادہ یہاں قیام مت کرنا بلکہ پانی پت جاکر خلق خدا کی خدمت کا فرض سرانجام دینا ۔ پانی پت میں آپ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہو گئے ۔ وصال سے قبل خرقہ خلافت شیخ

جلال الدین پانی پتی کو عطا کیا اور جانشین مقرر کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ۷۵۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

شمس الدین تبریزی

پیدائش سبزوار (عراق) ۵۶۰ھ، وفات ملتان ۶۴۵ھ۔ اصل نام محمد تھا ان کا سلسلہ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس طرح ملتا ہے۔

محمد تبریزی ابن سید صلاح الدین محمد نور بخش ابن سید علی ملقب سلام الدین ابن سید عبدالمومن بادشاہ افریقہ ابن سید علی خالد الدین ابن سید محمد محب الدین ابن سید محمود سبزواری ابن سید محمد ابن ہاشم علی ابن سید احمد ہادی ابن سید منتظر باللہ ابن سید عبدالمجید ابن سید غالب الدین ابن سید محمد منصور ابن اسماعیل ثانی ابن سید محمد عریضی ابن سید اسماعیل المرج اکبر ابن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام۔ شاہ شمس الدین تبریزی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ سبزوار میں پیدا ہوئے اس لیے آپ کو سبزواری بھی کہتے ہیں۔ کشمیر گئے تو وہاں میر شمس الدین عراقی کہلائے شام و مصر میں آپ کو شمس مغربی کہتے تھے۔ تبریز میں کافی عرصہ قیام کیا تو شمس تبریزی کہلائے۔

شمس تبریزی کے حالات زندگی، پیدائش، وفات اور قیام مزار وغیرہ کے معاملے میں مورخین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا مزار ملتان میں ہے۔ بعض کے نزدیک ان کا مزار تبریز میں ہے۔ ان کی وفات کے بارے میں اخبار الصالحین کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شمس سبزواری مولانا روم کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی نے دروازے سے آپ کو باہر بلایا۔ آپ نے مولانا سے کہا کہ مجھے قتل کرنے کو بلاتے ہیں پھر اٹھ کر باہر چلے گئے جہاں سات افراد کھڑے تھے۔ انہوں نے آپ پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ قتل ہوتے وقت آپ نے اس قدر زور سے نعرہ لگایا کہ ساتوں دشمن بے ہوش ہو گئے۔ ان میں مولانا روم کا بیٹا علاؤالدین محمد بھی تھا۔ قتل کی جگہ آپ کی لاش موجود نہیں تھی فقط خون کے چند قطرے تھے۔ علاؤالدین ایک عجیب بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ مولانا روم نے اس کے جنازے میں شرکت نہیں کی۔

شمس الدین سیالوی

(۱۲۱۴ھ۔ ۱۳۰۰ھ) حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی بن میاں محمد یار سیال شریف ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا۔ مولانا محمد علی مکھڈوی اور مولانا حافظ دراز پشاوری سے علوم اسلامیہ کی تکمیل کی۔ مولانا محمد علی مکھڈوی کے ہمراہ تونسہ شریف حاضر ہوئے اور حضرت خواجہ تونسوی سے بیعت کی اور کتب تصوف کا درس بھی لیا۔ سولہ برس مرشد طریقت کے پاس قیام پذیر رہے۔ روحانی مدارج طے کئے اور خلافت پائی۔ سیال میں مستقل قیام فرمایا۔ علم و عرفان کے جامع اور شریعت و طریقت کا سنگم تھے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو آپ کی ذات گرامی سے بڑی وسعت نصیب ہوئی۔ دور دراز سے لوگ آپ کی زیارت کو آتے۔ حضرت خواجہ محمد الدین سیالوی، حضرت خواجہ ضیاء الدین سیالوی اور شیخ الاسلام حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی آپ کی خانقاہ عالیہ کے متولی اور سجادہ نشین تھے۔ جن کی اسلامی اور ملی خدمات برصغیر کے مسلمانوں کے لئے لافانی ہیں۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور پیر حیدر شاہ جلال پوری آپ ہی کی درگاہ کے فیض یافتہ تھے۔ جو اپنی اسلامی خدمات کے پیش نظر عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔

۲۴ صفر سنہ ۱۳۰۰ھ کو انتقال فرمایا اور سیال شریف میں دفن ہوئے۔

مراۃ العاشقین کے نام سے مولانا محمد سعید نے آپ کے ملفوظات جمع کئے۔ اور انوارِ شمسیہ کے نام سے منشی امیر بخش خوشابی نے آپ کی سوانح حیات لکھی۔ جو طبع ہو چکی ہے۔

شمس الدین ہراتی

تاریخ وفات ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء ہے۔ شجرہ نسب اس طرح ہے۔

شیخ شمس الدین ہراتیؒ بن شیخ اندقی بن خواجہ حسن اندقی بن شیخ حسین بن امام عاقل فقیہ حقانی اندقی بن قاضی عبدالکریم اندقی بن ابی حنیفہ اندقی۔

آپ کے آباؤ اجداد بغداد سے بخارا کے ایک مضافاتی علاقے اندق آ کر بسے تھے۔ آپ نے اندق سے ہرات نقل مکانی کر لی۔ سلسلہ عالیہ قادریہ سے منسلک تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں کامل ہونے کے علاوہ کشف و کرامات میں بھی یکتا تھے۔ اپنے وقت کے فاضل تھے۔ آپ نے خواجہ عارف ابوگری مرید حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی زیارت کی اور ان سے فیض حاصل کیا۔ سیر و سیاحت کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلے میں لاہور بھی آئے لیکن جلد ہی واپس لوٹ گئے۔

شروع ہی سے آپ کی طبیعت مجاہدہ اور ریاضت کی طرف مائل تھی۔ اسی لیے آپ جنگلوں، بیابانوں اور ویرانوں میں ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ شریعت کے نہایت پابند تھے۔ رزق حلال کماتے اور کھاتے تھے۔ امراء و سلاطین کے ہاں جانا معیوب سمجھتے تھے۔ آپ محب اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۸۲ء/۷۸۴ھ کو ہرات میں ہوئی۔ آج بھی ان کا مزار ہرات میں مرجع خلائق ہے۔ ہزاروں لوگ یہاں سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

شمسیہ

درویشوں کا ایک سلسلہ جو شمس الدین ابوالثنا احمد بن ابی البرکات محمد سیواسی محمد ثالث کے عہد حکومت میں ان اولیاء کا ذکر ملتا ہے۔ سلسلوں کے ایک سلسلے میں جو ایک نقشبندی نے تیار کیا ہے شمسیہ کو خلوتیہ کی ایک شاخ بتایا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط سیواس تک ہی محدود تھے۔ ایک اور مصنف اس نام کے ایک مصری سلسلے کا بدویہ کی ایک شاخ کے طور پر ذکر کرتا ہے۔

شوال

قمری سال کا دسواں مہینہ۔ اس کی پہلی تاریخ کو عید الفطر ہوتی ہے۔ اس مہینہ کی فضیلت عید کی وجہ سے ہے ایک حدیث میں نفلی روزہ رکھنے کے واسطے عید کے بعد چھ دن کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

شوریٰ (سورۃ)

لفظی معانی رائے، مشورہ، مجلس، تشا مدے ماخوذ جس کے معنی باہم صلاح مشورے کے ہیں۔

قرآن مجید کی ایک مکی سورت کا نام ہے جسے حمعسق یا عسق بھی کہتے ہیں۔ اس کا عدد تلاوت ۴۲ اور عدد نزول ۶۲ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس کی پانچ آیات مدینے میں نازل ہوئیں۔ اس سورۃ میں رکوع ۵، ۵۳ آیات ۸۶۰ کلمات ۳۵۸۸ حروف آئے ہیں۔

سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی نبوت اور انبیائے گزشتہ کی نبوت کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم ایک ہی تھی۔ اور فروع

میں اختلاف اور ان ایک قدرتی امر ہے لیکن دین کے معاملے میں جھگڑا کرنا اور بے معنی مخالفت پر اتر آنا سرکشی اور عناد کے مترادف ہے ۔ اس کے بعد قیامت کا ذکر ہے کہ مشرکین کو قیامت کی جلدی ہے لیکن اہلِ ایمان اس کے برپا ہونے سے ڈرتے ہیں کیونکہ مشرکین دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور آخرت پر ان کا ایمان نہیں لیکن اہلِ ایمان قیامت پر یقین کے باعث اس سے ڈرتے ہیں ۔ پھر تقسیم رزق کو مشیت ایزدی قرار دیا گیا ہے اور اس کا ذکر ہے ۔ اس کے بعد نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا ذکر ہے ۔ آخر میں منصب رسالت کے لوازم کے ساتھ ربوبیت و مشیت مطلقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔

شوکت علی مولانا

مولانا شوکت علی ۔ تحریکِ پاکستان کے ایک قابلِ ذکر راہنما ۔ مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی تھے لیکن جو امتیازی حیثیت مولانا محمد علی نے سیاسی زندگی میں حاصل کی وہ مولانا شوکت علی کے حصے میں نہ آئی ۔ لیکن بہرحال جرأت و بے باکی اور ایثار و قربانی میں اپنے بھائی سے پیچھے نہ تھے ۔

ابتدا میں بریلی میں زیرِ تعلیم رہے ۔ ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ چلے گئے اور وہاں کھیلوں میں بہت شہرت حاصل کی ۔

مولانا شوکت علی

پہلی جنگِ عظیم کے آغاز پر جب مولانا محمد علی جوہر نے ترکی کے حق میں اپنے رسالے کامریڈ میں ایک طویل اور زوردار مضمون لکھا تو ان کے ساتھ مولانا شوکت علی کو بھی گرفتار کر لیا گیا ۔ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے اور تحریکِ خلافت میں نہایت جوش و خروش سے شامل ہو گئے ۔ ۱۹۲۱ء میں پھر نظربند ہو گئے ۔

" تحریکِ خلافت " کے حوالے سے " علی برادران " کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور وہ مسلّمہ طور پر مسلمانوں کے راہنما تسلیم کیے جانے لگے ۔

کانگرس نے علی برادران کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کے خلاف اپنی کارروائیوں میں ان کو شامل کر لیا لیکن برصغیر میں تحریکِ خلافت کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی اس کے تحت مسلمان ایک علیحدہ قوت کی حیثیت سے اُبھر رہے تھے ۔ بعد میں کانگریسی کارروائیوں کی ہندی ذہنیت کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد مولانا شوکت علی مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کرتے رہے ۔

جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک چلی تو مولانا شوکت علی زیادہ نمایاں طور پر قوم کے سامنے آئے ۔ یونیورسٹی کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا گیا ۔ اور اس مقصد کے لیے آغا خان نے سارے برصغیر کا دورہ کیا ۔ مولانا شوکت علی سیکرٹری کے طور پر آغا خان کے ساتھ اس مہم میں شامل ہو گئے ۔ یہ چندہ مہم بہت کامیاب رہی ۔

۱۹۳۸ء میں آپ کا انتقال ہو گیا ۔ علی برادران نے چالیس سال تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور برصغیر کی تاریخ میں اپنے لیے جگہ محفوظ کر لی ۔

شہادت

لغوی معنی گواہی ، قطعی خبر ۔ عام طور پر اس سے مراد وہ بیان جو کسی علم کی بنا پر ہو جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدہ بصر سے حاصل ہوا ہو ۔ وہ بات جو کامل یقین اور علم سے کہی جائے ۔

شریعت کی اصطلاح میں ایک مسلمان کی بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حضور اکرمؐ کی رسالت کے اقرار کو شہادت کہا گیا ہے ۔ روئے زمین پر اللہ کی حاکمیت اور کلمۃ اللہ کی اشاعت کی غرض سے ایک مسلمان کا اپنی جان دے دینا بھی شہادت ہے ۔ شہید کا لفظ شہادت ہی سے مشتق ہے ۔ [illegible] قرآن مجید میں شہید بمعنی شاہد آیا ہے ۔ شہید وہ شخص جس کے حق میں جنت کی شہادت دی گئی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک شہید بھی ہے ۔ جب اللہ تعالیٰ کا تعلق علم نظر میں ہو تو اللہ علیم ہے اور امورِ باطنہ کے حوالے سے شہید ہے اور امورِ ظاہرہ کی نسبت سے شہید ہے ۔ اس معنی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ اللہ قیامت [illegible] خلق پر گواہ ہو گا ۔ اسلامی شریعت میں شہادت کا لفظ خاص [illegible] معنی [illegible] استعمال ہوا ہے ۔ اس کے لیے دیکھئے " شاہد " ۔

شہد

ایک بہت گاڑھا مائع جسے مخصوص قسم کی مکھیاں پھولوں کا رس چوس کر [illegible] نہایت قلیل تعداد میں شہد تیار کرنے کے لیے مکھیوں کو سینکڑوں پھولوں [illegible] چوسنا پڑتا ہے ۔ شہد قدیم ترین غذا اور دوا [illegible] [illegible] تک اپنی اصل حالت میں رہتا ہے ۔ قدیم یونانی دیوتاؤں کی غذا کے طور پر شہد کا ذکر ان کی کتابوں میں ہے ۔ مصریوں کے ہاں بھی اس کی افادیت کا ذکر ہے ۔ [illegible] کے لیے نہایت مفید قرار دیا گیا ہے ۔ قرآن میں سے خدا کا تحفہ کہا گیا ہے ۔ [illegible] میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے ۔ طولِ عمر اور قیامِ صحت کے لیے اطباء نے [illegible] تجویز [illegible] اس کی مختلف اقسام اور ذائقے بھی ہوتے ہیں ۔ ان دنوں شہد کی مکھیوں کو [illegible] کر کے مصنوعی طور پر شہد تیار کرنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے ۔

شیبا ، بنو

قریش مکہ کا ایک خاندان جو حضرت شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ عبد اللہ بن عبد [illegible]

بن عثمان بن عبد الدار بن قصی کی اولاد ہیں۔ اس خاندان کو حاجب کعبہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بیت اللہ کی کلید برداری اور پاسبانی ان کے سپرد تھی اور یہ سعادت قبل اسلام بھی انہیں حاصل تھی۔ فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے یہ پاسبانی حضور نے اسی خاندان کو سپرد کر دی۔ عہد اسلام نے میں یہ سعادت اسی خاندان میں چلی آ رہی ہے

حضرت عثمانؓ کے والد طلحہ اور حضرت شیبہؓ کے والد عثمان دونوں بھائی غزوہ احد میں مشرکین مکہ کی طرف سے اسلام کے خلاف لڑتے ہوئے حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس خاندان کے کئی اور آدمی بھی مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ خاندان شیبہ کی نمایاں اسلام دشمنی کے باوجود فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے کلید برداری اور حجابت و شدانت بیت اللہ کا شرف اسی خاندان کے سپرد کر دیا۔

شیبانی ابو عبداللہ

ابو عبداللہ محمد بن الحسن بن فرقد۔ بنو شیبان کے ایک مولیٰ۔ نامور بزرگ حنفی فقیہ۔ ۱۳۲ھ/ ۷۴۹ — ۷۵۰ء میں واسط میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں پرورش پائی اور چودہ سال کی عمر میں امام ابو حنیفہ سے تعلیم حاصل کی اور اپنے آپ کو علم فقہ کی تحصیل کے لیے وقف کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں وہ مسجد کوفہ میں خطبہ دیا کرتے تھے۔

انہوں نے علم حدیث حضرت سفیان الثوری اور امام مالک بن انس سے حاصل کیا۔ فقہ میں ان کی تربیت زیادہ تر امام ابو یوسف کی مرہون منت ہے۔

۷۹۳ء میں خلیفہ ہارون الرشید نے زیدی امام یحییٰ بن عبداللہ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے خلیفہ کی منشا کے خلاف رائے دی۔ خلیفہ یحییٰ بن عبداللہ کو سزا دینا چاہتا تھا اور امام محمد شیبانی کا مؤقف یہ تھا کہ یحییٰ بن عبداللہ کو امان دے کر عہد سے پھرنا اور انہیں سزا دینا کسی طور جائز نہیں۔ اس پر ناراض ہو کر خلیفہ نے عہدہ قضا سے انہیں ہٹا دیا اور آئندہ افتا سے بھی روک دیا۔

وہ اصحاب الرائے میں اعتدال پسند تھے اور اپنی تعلیم کو حدیث تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ ایک قابل نحوی مانے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں امام شافعی کا نام بھی لیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے استاد سے کئی مسائل پہ اختلاف کیا ہے۔ حنفی مذہب کی نشر و اشاعت کا سہرا ابو یوسف اور شیبانی کے سر ہے انہوں نے کئی قابل قدر تصانیف چھوڑیں۔

شیثؑ

لغوی معنی اللہ کی بخشش۔ حضرت آدم علیہ السلام کے تیسرے بیٹے جو ہابیل کے قتل کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے جبکہ ان کے والد کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ چونکہ قابیل کے ہاتھوں ہابیل قتل ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نعم البدل کے طور پر اسے عطا کیا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام شیث یعنی اللہ کا عطیہ رکھا گیا ابن الاثیر کی تصریح کے مطابق وہ اللہ کے نبی تھے جن پر پچاس صحیفے نازل ہوئے۔ جب حضرت آدم فوت ہوئے تو انہوں نے انہیں اپنا وارث اور وصی مقرر کیا تھا۔ یہ شیث ہی ہیں جن سے نسل انسانی چلی کیونکہ ہابیل نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا تھا اور قابیل کے وارث سیلاب میں غرق ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ مکہ میں رہتے تھے اور تا زیست رسم حج ادا کرتے رہے۔ انہوں نے ان صحائف کو ایک جگہ اکٹھا کیا جو ان پر اور حضرت آدم پر نازل ہوئے تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کو پتھر اور چکنی مٹی سے بنایا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے انوش جانشین ہوئے۔ ان کی عمر ۹۱۲ سال بیان کی گئی۔ حضرت آدم بے ریش تھے۔ حضرت شیث کی داڑھی تھی۔ انہیں اوریا بھی کہا جاتا۔ اس سریانی لفظ کو "استاد" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے عہد کے انسان دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو ان کی اطاعت کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو قابیل کی اولاد کے پیرو تھے۔ حضرت شیث حضرت آدم کے چہیتے بیٹے تھے۔ ان کے بہت سے اقوال و حکم نقل کیے جاتے ہیں۔ المقنع کے خیال سے روح الوہیت حضرت آدم سے حضرت شیث میں منتقل ہو گئی تھی۔ یہ اعتقاد ایک مصری باطنی فرقے سے آیا ہے۔

شیخ

لفظ شیخ سے دو مفہوم وابستہ ہیں ۱۔ خاص ۲۔ عام

پہلے مفہوم کے مطابق شیخ الطریقہ اپنے سلسلے کا دینی اور دنیادی طور پر پیشوا ہوتا ہے۔ اس میں اخلاق حسنہ کا ہونا لازم ہے۔ اُسے عالی ظرف، زہد کیش اور تمام اوصاف حمیدہ کا حامل ہونا چاہیئے۔ وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے اس لیے اس میں علم وافر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسے شریعت کا گہرا علم اور نفس کے وسوسوں کا علاج معلوم ہوتا ہے۔ وہ بندے کو اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اپنے طریقے کی مخصوص تعلیمات یا بانی یا وارث ہوتا ہے اس لیے اس کی رضا کو خدا کی مشیت حاصل ہوتی ہے عطا کو خدا کی ہدایات کا جاری رکھنے والا ہوتا ہے۔ اسے کشف و کرامات کی

بسا اوقات مرید متعدد شیوخ کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان شیوخ کو سالکوں کے رہنما ہونے کے باعث مخصوص خطاب دیئے جاتے ہیں جن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ فلاں شیخ نے سالک کی کس طور راہنمائی کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سب سے پہلے شیخ الارادۃ ہے جو طریقۂ صوفیا کا سب سے بلند مرتبہ شخص ہوتا ہے۔ اور صوفیا کے خیال کے مطابق جس کی رضا کے ساتھ قضائے الٰہی ہوتی ہے اور جس کی ہدایت یا وسیلے سے مرید روحانی اور جسمانی طور پہ سلسلے میں داخل ہوتا ہے۔

۲۔ شیخ الاقتداء وہ ہے جس کی تقلید قولاً فعلاً مرید کرتا ہے۔

۳۔ شیخ التبرک وہ شخص جس کے پاس مرید برکت و فیض سے مالا مال ہونے کے لیے جائے۔

۴۔ شیخ الانتساب وہ ہے جس کی سفارش سے مرید کو جماعت میں داخل کیا جاتا ہے اور جس کا وہ خادم ہو کر رہتا ہے اور دنیوی امور میں اسی کی فرمانبرداری کرتا ہے اور اس کا خادم ہو کر رہتا ہے۔

۵۔ شیخ التلقین روحانی استاد ہوتا ہے جو جماعت کے ہر فرد کے لیے پڑھنے کے واسطے اوراد و وظائف کی تعداد و مقدار کا تعین کرتا ہے۔

۶۔ شیخ التربیہ وہ ہے جس کے ذمہ ابتدائے سلوک میں سالکوں کی تربیت ہوتی ہے۔ ان سب عہدوں کا حامل، جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے کوئی ایک شخص یا مختلف اشخاص ہو سکتے ہیں۔

شیخ کے دوسرے مفہوم کے مطابق اس سے مراد اس شخص سے ہے جو معمر ہو اور اس کی عمر پچاس سے زائد ہو چکی ہو۔ قوم یا خاندان کا سردار بھی شیخ کہلاتا ہے۔ اسلامی دور کی تاریخ میں یہ لفظ کثرت کے ساتھ اعلیٰ سردار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک مہذب طریقۂ خطاب بھی ہے۔ اور اس کے لیے عمر اور مرتبے کی تفریق نہیں ہے عموماً ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں عنان اقتدار ہو یا کوئی اعلیٰ

منصب رکھتے ہوں۔ علماء فضلاء کے لیے یہ لفظ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو بھی شیخین کہا جاتا ہے۔ مفتی اعظم کو شیخ الاسلام اور پولیس کے اعلیٰ افسر کو شیخ المدینہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کی اصل اہمیت مخصوص طور پر اسلامی مذہبی اخوت یا طریقے میں ظاہر ہوتی ہے ؛

شیخ الاسلام

یہ ان اعزازی القاب میں سے ایک ہے جو چوتھی ہجری کے نصف آخر میں اختیار کیے گئے لفظ اسلام سے مرکب بعض دوسرے القاب مثلاً عز الاسلام، جلال الاسلام، سیف الاسلام وغیرہ ان لوگوں نے اختیار کیے جو زیادہ تر دنیوی اقتدار کے مالک تھے۔ لیکن شیخ الاسلام ان القاب مثلاً شیخ الدین، شیخ الفتیا وغیرہ میں سے ہے جو صرف علماء اور کبھی کبھی صوفیا کے لیے مخصوص رہا۔

یہ لقب بہت کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں خراسان میں اسماعیل بن عبدالرحمٰن کو وہاں کے سنی شیخ الاسلام کہتے تھے اسی زمانے میں صوفی ابو اسماعیل الانصاری اس لقب کے دعوے دار تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں فخر الدین رازی شیخ الاسلام کہلائے۔ شام اور مصر میں شیخ الاسلام ایک اعزازی لقب بن گیا تھا۔ جو صرف ان فقہا کو دیا جا سکتا تھا۔ جو فتاویٰ کی بنا پر خاص شہرت حاصل کر چکے ہوں۔ ایران میں شیخ الاسلام ایک عدالتی منصب قرار پا چکا ہے۔

اس لقب کو زیادہ شوکت اس وقت حاصل ہوئی جب اس کا اطلاق مخصوص طور پر قسطنطنیہ کے مفتی اعظم پر ہونے لگا ایک وقت میں علماء و فضلاء کا اثر و رسوخ اسلامی حکمرانوں میں بہت زیادہ ہوتا تھا اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ اس وقت شیخ الاسلام کی سیاسی و مذہبی حیثیت نہایت احترام و اعزاز کی مستحق تھی لیکن جوں جوں سلطانوں اور حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عام معاشرت میں بھی دنیوی مشغولیت بڑھتی گئی۔ ان کے اثرات اور رسوخ کم ہوتے گئے۔ لیکن عام عوام میں ان کا احترام بہرحال کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ؛

شیر محمد شرقپوری

میاں شیر محمدؒ بن میاں عزیز الدین بن محمد حسین بن حافظ محمد عمر بن محمد صالح بن حافظ محمد بن حافظ ہاشم۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں شرقپور میں پیدا ہوئے۔ میاں شیر محمد شرقپوری پاک و ہند کے ان صوفیا کرام میں سے تھے جنہوں نے اس صدی میں اپنی قوتِ روحانی اور عظمتِ کردار کی بدولت لاکھوں گم کردہ راہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا ان کا ہر لمحہ سنتِ نبویؐ کے مطابق گزرتا تھا۔ خلاف سنت و شریعت فعل انھیں دیکھنا بھی برداشت نہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں جن بزرگوں کی علمی و باطنی تبلیغ سے نقشبندی سلسلہ کو آخری دور میں فروغ حاصل ہوا ان میں میاں صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا میاں حمید الدین سے حاصل کی اور اس کے بعد طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں خواجہ امیر الدین سے بیعت ہوئے۔ ان کا سلسلۂ طریقت حضرت مجدد الف ثانی تک پہنچتا ہے۔

میاں صاحب کی ساری زندگی اتباع شریعت کی تبلیغ میں صرف ہوئی۔ میاں صاحب نے ۳ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ/ ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء بروز پیر وفات پائی ؛

شیطان

لفظی معانی خبیث، سرکش، خودسر، دور ہونے والا، سرکشی دکھانے والا، مخالفت کرنے والا۔ کیونکہ ابلیس نے سرکشی دکھائی اور حکم الٰہی کی مخالفت کی اس لیے اسے یہ نام دیا گیا۔ عربی زبان میں شیطان سانپ کی ایک قسم کو بھی کہتے ہیں جو نہایت سرکش اور خبیث ہوتا ہے۔

کشاف اصطلاحات الفنون کے مصنف لکھتے ہیں کہ شیطان کی دو جنسیں ہیں۔ ایک وہ جو جنوں کو گمراہ کرتے ہیں انہیں شیاطین الجن کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں انہیں شیاطین الانس کہتے ہیں۔

روایت ہے کہ ابلیس ملائکہ کے ایک گروہ میں سے تھا جس کو الجن کہتے ہیں، نیز وہ جنت کے خازنوں میں سے تھا۔ ابلیس کا نام عزازیل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حسن خلق اور شرف سے نوازا تھا۔ آسمانی دنیا کی عملداری اسی کے سپرد تھی اور اللہ کی عبادت و تقدیس میں بھی اسے سب ملائکہ پر سبقت حاصل تھی لیکن اللہ کی نافرمانی اور اپنے تکبر سے شیطانِ لعین قرار پایا۔ اس کے تین اسباب تھے ؛

۱۔ غرور زہد و عبادت

۲۔ سلک و اقتدا کا غرور۔

۳۔ سجودِ آدم کے سلسلے میں باری تعالیٰ کے حکم سے انکار۔

قرآن میں شیطان کا لفظ اور اس کا ذکر بدی کی ایک زبردست قوت کے طور پر آیا ہے جو ازل سے آدم کو گمراہ کرنے کے لیے برسرِ پیکار رہتے۔ وہ عظمت آدم کا بھی انکاری ہے۔ وہ آدم و حوا کے جنت سے نکالے جانے کا سبب تھا۔ منافقین کے گمراہ کن قائدین کو بھی قرآن میں شیاطین (جمع شیطان) کہا گیا ہے ؛

شیعہ

عموماً واحد جمع، مذکر مؤنث کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اسم دوست، پیروکار، جماعت، گروہ، رفقاء، کسی کے پیچھے چلنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوست داران علیؓ و اولاد علیؓ۔ سلف سے بعد کے فقہا و متکلمین کے روزمرہ میں حضرت علیؓ کے پیروکاروں کو شیعہ کہا جاتا ہے۔

النوبختی کا قول ہے ؛ وفاتِ رسول اللہ کے بعد امت کے تین گروہ ہو گئے

۱۔ شیعہ جو حضرت علیؓ بن ابی طالب کے پیروکار ہو گئے۔ ۲۔ انصار جنہوں نے امارت کی سعی کی اور سعدؓ بن عبادہ کو امیر بنانا چاہا۔ ۳۔ اور تیسرا وہ جس نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ درحقیقت شروع ہی سے حامیان علیؓ شیعہ ہو گئے تھے لیکن جنگ جمل اور جنگ صفین نے علیؓ کے طرف داروں کو نمایاں کر دیا۔

شیعہ عقائد و فقہ میں قرآن و سنت اور تمام مسائل میں آئمہ اہل بیت سے رجوع کرتے ہیں۔ شیعہ نقطۂ نظر سے اسلام چند عقائد و اعمال کا مجموعہ ہے۔ شیعہ اللہ کے لیے ترکیب و تجسیم اور حلول و اتحاد جائز نہیں سمجھتے۔ نہ اس کے لیے مکان اور سمت تجویز کرتے ہیں اور نہ اسے قابل رویت سمجھتے ہیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ شیعہ تمام صحابہ کو یکساں حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں شیعہ عقائد دوسرے فرقوں سے اختلافی ہیں۔ عراق اور ایران شیعیت کے اہم مراکز ہیں۔ پاک و ہند، دمشق، لبنان، بیروت، بحرین، افغانستان اور روس میں کافی تعداد میں شیعہ آباد ہیں ؛

شیعہ کئی ایک گروہوں میں منقسم ہیں۔ جن میں امامیہ اثنا عشریہ، زیدیہ، اسماعیلیہ بہت مشہور ہیں۔

ص

ص، سورة

ص (صاد) قرآن کریم کی ایک مکی سورۃ عدد تلاوت ۳۸، عدد نزول ۳۸۔ یہ سورۃ القمر کے بعد نازل ہوئی، لیکن ترتیب میں یہ سورۃ الصفت کے بعد اور سورۃ الزمر سے قبل واقع ہے ص ان حروف مقطعات میں سے ہے جو بالاجماع آیت شمار نہیں ہوتے۔ اس سورۃ میں اٹھاسی آیات ہیں اور پانچ رکوع ہیں۔ اس حرف کے مفہوم کے بارے میں چونکہ علماء کے مختلف اقوال ہیں، اس لیے اس کے تلفظ کے بارے میں بھی مختلف روایات ہیں۔ ایک قول کے مطابق صاد دراصل مصاداۃ بمعنی معارضہ اور مقابلہ سے امر کا صیغہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کا تلفظ "صَادِ" (دال کے زیر کے ساتھ) اور معنی یہ ہوں گے "ان منکرین کا بذریعہ قرآن ذی الذکر معارضہ اور مقابلہ کیجئے۔ اہل علم کی اکثریت نے اس پر اعتماد کیا ہے کہ یہ ایک علیحدہ حرف ہے جس کے معنی دیگر حروف مقطعات کی طرح صرف خدا کے علم میں ہیں۔

اس کی شان نزول کے سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی جاتی ہے کہ جب آنحضرت صلعم کے چچا ابوطالب علیل ہوئے تو ان کی عیادت کے لیے قریش مکہ حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ بھی تشریف لائے۔ ابوجہل اور دیگر سرداروں نے ابی طالب سے شکایت کی کہ یہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ابوطالب پوچھنے لگے، اے بھتیجے! اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: میں ان سے فقط ایک کلمہ کہلوانا چاہتا ہوں، جس کے طفیل سارے عرب ان کے مطیع اور تمام عجم ان کے باجگزار بن جائیں گے۔ وہ کہنے لگے صرف ایک کلمہ؟ ہم اس کے لیے تیار ہیں، مگر وہ کلمہ ہے کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر قریش یک زبان ہو کر بول اٹھے: کیا اس نے کئی معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا ہے۔ یہ تو بڑی ہی انوکھی بات ہے۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

اس سورۃ کا اپنی پہلی سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ یہ گذشتہ سورۃ کا تتمہ ہے یعنی جو مضامین سورۃ الصفت میں بیان ہوئے ان کے تکملہ کے طور پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اس سورۃ کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ یہ قرآن ذی الذکر تمہاری ہدایت کے لیے آیا ہے۔ اس سورۃ میں کفار کی ہٹ دھرمی اور انکار توحید و نبوت کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد جنت اور اہل جنت کا بیان ہے پھر رسولؐ اللہ کو تبلیغ رسالت کا حکم ہے پھر کہا گیا ہے کہ قرآن ساری کائنات جن وانس کے لیے ہدایت ہے اور آخر میں ذکر ہے کہ حقائق قرآن قیامت تک دنیا پر منکشف ہوتے رہیں گے۔

ابوبکر ابن العربی کے مطابق سورۃ "ص" میں گیارہ آیات ایسی ہیں جن سے انچاس شرعی احکام اور فقہی مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس سورۃ کی فضیلت کے بارے میں حدیث ہے کہ جس نے اس کی تلاوت کی اُسے اللہ تعالےٰ ان پہاڑوں سے دس گنا زیادہ نیکیاں عطا فرمائے گا۔ جو حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے اللہ نے مسخر کئے تھے۔

صابر کلیری

اِن کا اصل نام علی احمد ہے۔ القاب علاؤالدین، مخدوم، صابر ہیں۔ سلسلہ نسب یوں ہے: علی احمد صابر بن سید شاہ عبدالرحیم بن عبدالسلام بن سید سیف الدین بن سید عبدالوہاب بن حضرت غوث اعظمؒ عبدالقادر جیلانی۔ آپ کی والدہ فریدالملت والدین بابا شکر گنجؒ کی ہمشیرہ ہیں۔ اخبار الاخیار میں ہے کہ آپ بابا کے داماد بھی تھے۔ سہارن پور کے قصبے پیران کلیر میں آپ کا مزار ہے۔ ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ میں پیدا ہوئے اخبار الصالحین میں آپ کی تاریخ پیدائش ۱۷ شعبان ۵۱۲ھ درج ہے۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا۔ والدہ آپ کو لے کر اپنے بھائی فرید شکر گنج کے پاس حاضر ہوئیں حضرت شیخ نے انہیں اپنے مسلک ارادت میں داخل کر لیا۔ بارہ سال تک ان کی خدمت میں رہے اور علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ آپ کا زہد و تقویٰ کمال کا تھا۔ ہمیشہ روزے سے رہتے اور اکثر تنہا رہا کرتے ہمیشہ پابرہنہ رہتے تھے۔

۶۲۵ھ میں حضرت بابا فرید شکر گنج نے آپ کو خلافت عطا کر دی اور ان کی ہدایت پر کلیر شریف تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ آپ قلندرانہ مشرب کے آدمی تھے اور ظاہری رسوم و قیود کی زیادہ پابندی نہ کرتے تھے۔ خواجہ شمس الدین ترک آپ کے خلیفہ اور جانشین تھے جن سے سلسلہ صابری چشتی جاری ہوا۔

صابی

ابواسحٰق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن زہرون الحرانی مذہباً صابی تھا۔ صابی انہیں کہتے ہیں، جو فرقہ الصابئون میں سے ہوں۔ الصابئون کے نام سے دو فرقے موسوم ہیں۔ ایک یہودی عیسائی فرقہ جو اسم اصطباغ کا پابند ہے دوسرا وہ مشرک فرقہ جو اسلامی عہد میں بھی خاصے عرصے تک باقی رہا۔ ابراہیم علم طب، ہیئت اور ریاضی میں کامل دسترس رکھتے تھے

وہ دیوان الانشا میں کاتب تھا اس وقت شہرت ہوئی جب معزالدولہ نے وزیر المہلبی کے پاس ایک قاصد بھیجا اور حکم دیا کہ کرمان کے والی محمد بن الیاس کے نام فوراً ایک خط لکھے جس میں اس کی بیٹی کا رشتہ شہزادہ بختیار کے لیے طلب کرے۔ یہ مکتوب ابراہیم نے لکھا۔ اس کی تحریر کو سب نے پسند کیا۔ ممکن ہے اس واقعے نے اس کی وقعت بڑھادی ہو۔ اس نے گو اسلام قبول نہیں کیا تھا اور مرتے دم تک اپنے مذہبی عقائد پر قائم تھا لیکن وہ اچھے اخلاق وعادات کا مالک تھا اور جہاں تک ممکن تھا وہ مسلمانوں کے رسم ورواج کی پیروی کرتا تھا اور رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا تھا۔ اُسے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل تھی اور اپنی سرکاری خط وکتابت میں وہ اکثر قرآنی آیات کا حوالہ دیا کرتا تھا اس کی زیادہ تر شہرت اس کے رسائل یا سرکاری مکاتیب پر مشتمل تھی۔

صالح

ایک پیغمبر جو عرب کی قوم ثمود میں بھیجے گئے۔ آپ کا ذکر قرآن مجید میں تمثیل کے طور پر آیا ہے آپ نے جب اپنی قوم کو دعوت توحید دی تو ان میں دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو آپ کی بات پر ایمان لایا اور دوسرا گروہ وہ تھا، جو آپ کی مخالفت میں تھا انہوں نے لوگوں کو ان نعمتوں کے بارے میں بتایا، جو خدا نے ان پر بھیجی تھیں انہیں اس بات پہ فخر تھا کہ وہ اپنی خدمت کا کوئی اجر نہیں چاہتے۔ جو لوگ ان پر ایمان لائے وہ کمزور لوگ تھے، لیکن طاقت ور لوگ آپ کے مخالف تھے۔ وہ آپ کی باتوں کی تردید کرتے آپ کو سحر زدہ بتاتے اور یوم جزا کے خیال کی تکذیب کرتے۔ تبلیغ سے قبل قوم ثمود کو حضرت صالحؑ پر بہت اعتماد تھا اور ان سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن تبلیغ کے بعد وہ لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ قرآن میں ذکر آتا ہے کہ اللہ نے حضرت صالحؑ کو نشانی کے طور پر ایک اونٹنی عطا کی۔ حضرت صالحؑ نے لوگوں سے کہا کہ اسے بے ضرر چرنے دیں اور اسے اپنے پینے کے پانی میں شریک کریں، لیکن لوگوں نے الٹا اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالحؑ نے کہا کہ تم ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہو اسے اب ہم پر لے آؤ۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے گھروں میں تین دن مزے کریں۔ پھر ایک زبردست طوفان آگیا اور تب اگلی صبح وہ اپنے گھروں میں مردہ پڑے تھے۔

صالحات

لفظی معنی اچھے کام، پاک دامن، نیک عورتیں۔ اسلام میں اچھے کاموں کی جزا ایمان کے ساتھ ہے یعنی اگر اچھے کاموں کی بنیاد ایمان باللہ پر نہیں ہے تو دوزخ کی آگ سے حفاظت مشکوک ہے۔ بغیر ایمان کے نیک کاموں کی چونکہ کوئی سمت متعین نہیں ہوتی اور ان کا کوئی منبع نہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ بے سمتی نیک اعمال کے باوصف انسان کو فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔ اس لیے نیک اعمال کے ساتھ ایمان کی شرط ایسی ہے جو روز حشر انسان کو نار دوزخ سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

صالحین

(واحد صالح جمع صالحین) صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال وافعال میں راہ راست پر قائم ہوں اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویّہ رکھتے ہوں۔ قرآن مجید میں ہے کہ جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جس کو میسر آئیں یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔

صائفہ

گرمائی فوج کے ایک لشکر کا نام جو امیر معاویہؓ نے رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے موسم گرما میں جنگ جاری رکھنے کے لیے تیار کیا۔ (مزید دیکھیے شاتیہ)

صبر

عربی لفظ ہے۔ یہ ایک اہم اسلامی تصور ہے۔ ایک خاص ذہنی و روحانی رویّہ ہے جو کردار میں توازن اور استقامت پیدا کرتا ہے۔ عرب لغت نویسوں کے نزدیک صبر مادہ ص ب ر سے ہے جس کے معنی روکنا باندھنا کے ہیں۔ صبر کا یہ اسلامی تصور جہاد کے ساتھ خاص طور پر وابستہ کیا جاتا ہے بعض اوقات صبر کا لفظ صلوٰۃ کے ساتھ بھی آیا ہے مفسرین کے قول کے مطابق ان عبارتوں میں یہ لفظ روزے کے مترادف بھی استعمال ہوا ہے اس کی تاکید اس بات سے کی جاتی ہے کہ ماہ رمضان کو شہر الصبر بھی کہا گیا ہے۔ صبر کی نمایاں اہمیت کا اس حقیقت سے بھی اظہار ہوتا ہے کہ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں الصبور بھی شامل ہے اخلاقی نظام فکر میں صبر ایک بنیادی فضیلت ہے۔ اس کا مفہوم ضبط نفس کے طور پر بھی آیا ہے۔ امام غزالیؒ نے صبر کی بحث کو سات عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

اشاعت اسلام اور قیام اسلام کے سلسلے میں مصائب اور دشواریوں کے باعث قرآن اور احادیث میں بیشتر جگہ مومنین کو صبر اور استقامت سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے صلے میں نصرت وکامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ صبر کی فطری اہمیت یہ ہے کہ اس کے باعث انسان میں قوت ارادی اور قوت عمل میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ کٹھن حالات اور مشکل معاملات کو قابل برداشت بناتے ہیں اس کا بنیادی حصہ ہوتا ہے عام معاشرے میں نظم برقرار رکھنے اور خوشگوار تعلقات باہمی کے لیے صبر کی بنیادی اہمیت ہے صبر اپنے مفاہیم کے لحاظ سے ایک وسیع اصطلاح ہے۔

صحابی

(جمع صحابہ) لفظی معنی رفیق، ساتھی، ایک ساتھ زندگی گزارنے والا یا صحبت میں رہنے والا۔ اسلامی اصطلاح میں صحابی سے مراد آنحضرت صلعم کے رفیق سے ہے [illegible] یعنی جس نے حالت ایمان میں حضرت محمد صلعم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا [illegible] ایمان کی حالت میں وفات پائی۔ وہ لوگ جن کی زندگی اس اعزاز کے ساتھ بسر ہوئی [illegible] صحابہ کہلاتے ہیں صحابی کے زمرے میں شامل ہونے کے لیے تین شرائط موجود ہیں [illegible] پر ایمان - ۲ - اسی ایمان کی کیفیت میں آپ سے ملاقات - ۳ - اسلام کی حالت [illegible]

ان میں سے کوئی ایک شرط بھی اگر پوری نہ ہوتی ہو تو صحابی کہلانے کا شرف حاصل [illegible] ہوتا۔ بعض لوگوں نے ملاقات کی جگہ رویت (دیکھنا) لکھا ہے۔ مگر یہ [illegible] کیونکہ اس طرح بعض وہ اصحاب جو بصارت سے محروم تھے اور انہوں نے [illegible] شرائط پوری کیں ان کو صحابی نہ کہنا بہت مختلف بات ہے۔ علمائے کرام کا اس بات پر [illegible] ہے کہ صحبت رسولؐ ایک ایسا شرف ہے جس کے برابر اور کوئی بزرگی اور شرف [illegible] صحبت کے علاوہ انہوں کام دین۔ تبلیغ اسلام اور خدمت شریعت کے [illegible] کی بدولت مسلمانوں کی نظر میں صحابہ کرام کو خاص تقدس اور علو مرتبت حاصل ہے۔ [illegible] نے صحابہ کرام کی مطلق مداح کی اور کہا کہ محمد صلعم اللہ کے رسول ہیں اور جو آپ کے ساتھی ہیں وہ کفار کے لیے سخت ہیں آپس میں مہربانی سے پیش آنے والے ہیں اللہ کی رضا اور اس کے فضل کی خاطر رکوع وسجود میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی پیشانیوں پر عبادت کے اثرات ہیں آپؐ نے فرمایا میری امت میں میرے صحابیوں کا وہی مقام ہے جو کھانے میں نمک کا ہے

اور کوئی کھانا نمک کے بغیر اچھا نہیں ہو سکتا۔ ایک اور موقعہ پر آپؐ نے فرمایا میرے صحابی ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے راہ ہدایت پاؤ گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہا مختلف طبقات میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام کے ایک ایسے طبقے کی نشاندہی کی گئی ہے جو ایمان اور اسلام لانے میں سبقت لے گئے اور اپنے کردار و عمل اور ایثار و قربانی کی بدولت صحابہ میں سرفہرست شمار ہوئے۔ اس طبقے کے چیدہ اور نامور صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت بلالؓ، حضرت [illegible]ؓ اور حضرت خدیجہؓ کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ایک طبقہ ان صحابہ کرامؓ کا ہے جنہوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ صحابیوں کے ایک طبقے کو العقبی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے یہ وہ صحابہ کرامؓ ہیں جو مدینہ منورہ سے چل کر مکہ مکرمہ میں پہنچے اور عقبہ کے مقام پر آنحضرتؐ کی بیعت کی۔ پہلی بیعت ہجرت کے نویں سال ہوئی۔ دوسری بیعت نبوت کے گیارہویں سال ہوئی۔ غزوہ بدر میں شرکت کرنے والوں کا الگ طبقہ قرار دیا ہے جو البدری یا اصحاب بدر کہلائے۔ ایک طبقہ عشرہ مبشرہ کہلایا ایک طبقہ ان صحابہ کرام کا ہے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر ایک درخت کے نیچے آنحضرت صلعم کی بیعت کی۔ انہیں اہل بیعت رضوان کہتے ہیں۔ صحابہ کرام میں ایک طبقہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے حدیث رسول صلعم کو روایت کیا۔ اس طرح کچھ صحابہ اپنے فتوؤں کی وجہ سے مشہور ہوئے ان کے نام بھی محفوظ ہوئے۔ ایک طبقہ ان صحابہ کا ہے جنہوں نے عالم طفولیت [illegible] حضورؐ کی زیارت کی۔

قرآن اور حدیث صحابہ کرام کے لیے تعریف اور توقیر کے الفاظ آئے ہیں اور دین کے لیے ان کی علمی جسمانی، مالی اور روحانی کوششوں کے باعث مسلمانوں میں ان کی عظمت کردار کو نہایت عقیدت و احترام حاصل ہے۔

صحابیات

وہ خواتین جنہوں نے ایمان باللہ کے ساتھ مسلمانوں کی حیثیت سے حضور کی زیارت کی اور ان کی وفات اسلام پر ہوئی انہیں صحابیاتؓ کہا جاتا ہے اسلام میں خواتین کے بارے میں جو رویہ اختیار کرنے ہدایت کی گئی ہے اور اُسے جن اعزازات سے نوازا ہے دنیا کی کوئی تہذیب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ قدیم تہذیبوں میں روما، بابل، یونان کے فلسفے میں عورت کے لیے نہایت اظہار ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے عیسائیت میں عورت کے لیے کوئی معزز مقام متعین نہیں، بلکہ اُسے نفس کے لیے بہکاوا سمجھا گیا ہے۔ جدید تہذیبوں میں بھی عورت کی انفرادی وقار اور احترام کے بارے میں کوئی مستحسن رویہ نہیں ہے بلکہ اُسے ہوس نفس کے بہلاوے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام دُنیا بھر کی قدیم و جدید تہذیبوں میں سے وہ واحد تہذیب و مذہب ہے جس نے مرد کے ساتھ ساتھ عورت کے مقام اعلیٰ کا بھی تعین کیا اور اُسے اس منصب پر فائز کیا۔ صحابی ہونے کا شرف فقط مردوں پر ہی موقوف نہیں تھا، بلکہ عورتوں کے لیے صحابیات کا لفظ استعمال کر کے ان کی انفرادی حیثیت کو اعزاز بخشا گیا ہے۔

صحاح ستہ

صحاح ستہ حدیث کی اِن چھ مشہور کتابوں کو کہا جاتا ہے جو سب سے زیادہ مستند مانی جاتی ہیں ان میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری۔ یہ ۲۳۰ھ ہجری میں تکمیل کو پہنچی۔ ان کے مرتب کرنے والے محمد بن اسماعیل الملقب بہ امام بخاری ہیں ان کی پیدائش ۱۹۴ھ اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی اس میں ۷۲۷۵ احادیث مذکور ہیں۔

۲۔ سنن ابی داؤد۔ یہ ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی کی تالیف ہے ان کی پیدائش ۲۰۲ھ اور پیدائش ۲۷۵ھ میں ہوئی۔ سنن ابی داؤد میں ۴۸۰۰ حدیثیں ہیں۔

۳۔ سنن ابن ماجہ۔ یہ ابن ماجہ الربعی کی تالیف ہے۔ ان کی پیدائش ۲۰۹ھ اور اور وفات ۲۷۳ھ میں ہوئی۔ سنن ابن ماجہ میں چار ہزار احادیث درج ہیں۔

۴۔ جامع ترمذی۔ ابو عیسیٰ الترمذی کی تالیف ہے۔ ان کی پیدائش ۲۰۲ھ اور وفات ۲۷۹ھ میں ہوئی۔

۵۔ سنن نسائی۔ یہ ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی کی تالیف ہے۔ ان کی پیدائش ۲۱۵ھ اور وفات ۳۰۳ھ میں ہوئی۔

۶۔ صحیح مسلم۔ مسلم بن حجاج قشیری کی تالیف ہے ان کی پیدائش ۲۰۶ھ اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔ صحیح مسلم میں ۷۵۰۰ احادیث کا مذکور ہے۔

احادیث کی اور بہت سی کتابیں بھی موجود ہیں اور ان میں بعض نہایت اہم بھی ہیں لیکن مندرجہ بالا چھ کتابیں ایسی ہیں جو اپنے مولفوں اور احادیث کی مستند رواتیوں کے باعث زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کے مولفین کی تاریخ پیدائش و انتقال سے یہ بات بھی آسانی کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ان سب کی تالیف تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔

صحبت

عربی زبان کا لفظ۔ لفظی معنی دوستی، ہم نشینی، مجلس، محفل، باہمی ملاقات۔

قرآن مجید میں صحبت کے انتخاب کا بیان آیا ہے۔ " بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اللہ تعالےٰ ان کے لیے دوستی پیدا کر دے گا"۔ یعنی جن مسلمانوں کے اعمال اچھے ہیں خدا تعالےٰ ان کو اپنا دوست بنا لیتا ہے۔

رسول اللہ حضرت محمدؐ نے فرمایا " تین چیزیں ہیں جو تیرے بھائی کی دوستی تیرے لیے مصفا کر دیں گی۔ اول یہ کہ اگر توؐ اسے ملے تو اُسے سلام کرے اور دوم مجلس میں اس کے لیے جگہ کشادہ کرے اور سوم یہ کہ اس کو اس نام سے پکارے جو اس کا زیادہ پسندیدہ ہو۔

مالک بن دینارؒ نے اپنے داماد مغیرہ بن شعبہؓ سے فرمایا " اے مغیرہ! جس بھائی اور دوست سے تو اپنے دین کا کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اُس کی صحبت ترک کر دے تاکہ تو سلامت رہے۔ کیونکہ ایسے شخص کی صحبت تجھ پر حرام ہے

عام انسانی فطرت کا تنوع یہ ہے کہ وہ جس ماحول میں پرورش پاتی ہے یا جن لوگوں سے تعلقات استوار کیے جاتے ہیں وہ اس ماحول اور ان لوگوں کے آداب زندگی سے متاثر ہو جاتی ہے۔ ایک عام انسان اپنے ارد گرد کے رہن سہن، بول چال، لین دین یعنی زندگی کے ایک مخصوص طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر شعوری یا لاشعوری پر خود کو اسی کے مطابق ڈھال لیتا ہے چنانچہ اس طرح آدمی پر سب سے زیادہ گہرا [illegible] اس کے ماحول کا ہوتا ہے جس ماحول میں وہ سانس لیتا ہے اس کا طریق حیات بھی ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لیے اخلاقیات اور اسلامی زاویہ نگاہ سے صالح فکر، عمل اور تعلقات کے لیے اچھی، پاکیزہ، فکری اور علمی لحاظ سے سود مند، خیر کی پرورش اور شر سے گریز کرنے والی صحبت کی تاکید کی گئی ہے۔

اسلامی تصوف میں صحبت کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ اُس مجلس یا تعلق کو فوقیت دی گئی ہے جس سے ایک شخص دوسرے سے دینی فائدہ حاصل کرے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا " بلاشبہ جو شخص نہیں جانتا اس کو سکھانا پوری پرہیزگاری ہے۔ حضرت یحییٰ بن معاذؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا " بُرا دوست ہے

وہ شخص کہ تجھے اس کو یہ بات کہنے کی ضرورت ہو کہ مجھے اپنی دعا میں یاد رکھنا کیونکہ ایک ساعت کی صحبت کا حق ہمیشہ دوست کے حق میں دعائے خیر کرنا ہے اور بُرا ہے وہ دوست کہ اس قصور کی بابت جو تجھ سے اس کے متعلق سرزد ہوا ہے تجھے اُس سے عذر کی ضرورت ہو کیونکہ عذر کرنا بیگانوں کی شرط ہے اور صحبت میں بیگانگی ظلم ہے ؛

رسول اکرم نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے کسی کو غور کرنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی پیدا کر رہا ہے کیونکہ اگر وہ نیک لوگوں سے صحبت رکھتا ہے تو اگرچہ وہ بُرا ہی ہو نیک ہوگا کیونکہ ان کی صحبت اس کو نیک کر دے گی۔ اور اگر وہ بُروں سے صحبت رکھتا ہے تو اگرچہ وہ خود نیک ہی ہے بُرا ہو جائے گا۔ کیونکہ ان کے فعل بد پر اس کی رضامندی ہے۔

تصوّف میں صحبت کے لیے باقاعدہ حقوق و فرائض کی بحث ہے۔ طریقت کے مشائخ پہلے ایک دوسرے سے صحبت کا حق طلب کرتے اور ایک دوسرے کو اس کی ترغیب دلاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات ان کے درمیان ایک فریضہ کی طرح ہو گئی ہے ؛

صحیح بخاری

محمد بن اسمٰعیل المعروف امام بخاریؒ (۱۹۴ھ-۲۵۶ھ) کی مشہور تالیف۔ اس میں مکررات سمیت ۷۲۷۵ حدیثیں ہیں۔ یہ حدیث کی سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی ہے قرآن کے بعد اسے اصح الکتب کہا گیا ہے۔ امام بخاری نے اس کی ترتیب ۲۱۲ھ میں شروع کی اور اٹھارہ سال میں اس کی تکمیل کی۔ امام بخاری کو تقریباً ایک لاکھ احادیث یاد تھیں۔ صحیح بخاری انہی احادیث کا انتخاب ہے۔ امام بخاری ۱۹۴ھ میں بخارہ میں پیدا ہوئے اور سمرقند کے ایک نزدیکی علاقے میں ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ صحیح بخاری صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس کتاب کی ایک سو کے لگ بھگ عربی، اُردو اور فارسی میں شرح لکھی گئیں اور اس کتاب کو سبقاً ہزاروں لاکھوں مرتبہ پڑھا گیا۔

صحیح مسلم

احادیث کا مجموعہ جسے حجۃ الاسلام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری نیشا پوری نے مرتب کیا۔ مسلم بن حجاج عرب کے مشہور قبیلے بنو قشیر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں امام بخاری سے بہت زیادہ انس تھا۔ صحیح مسلم میں تقریباً ۴۵۰۰ حدیثیں ہیں۔ امام نووی نے اس کی شرح لکھی ہے۔ مسلم نے ان احادیث کے جمع کرنے میں شام، مصر، عرب اور عراق کا سفر کیا تھا۔

اور عراق کا سفر کیا تھا۔ بخاری کے بعد اس کتاب کا مرتبہ ہے بلکہ بعض محققین اسے بوجوہ بخاری سے مستند مانتے ہیں۔ اس کی بھی متعدد شرحیں ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کو بالعموم "صحیحین" کہا جاتا ہے۔

صحیفہ

(جمع صحف، صحائف۔ لغوی معنوں میں وہ چیز جس پر کچھ لکھا جا سکے۔ اسی مناسبت سے ورق کی ایک جانب یعنی صفحہ کو بھی صحیفہ کہتے ہیں۔ جدید عربی میں صحیفہ جریدے یا اخبار کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم، حدیث نبوی اور عربی ادب میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً نامہ اعمال، مکتوب، حکم نامہ اور کتب سماویہ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ آٹھ مرتبہ جمع (صحف) وارد ہوا ہے لیکن مفرد (صحیفہ) کی شکل میں نہیں آیا۔

حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ جب سورۃ الاعلیٰ نازل ہوئی اور اس کی آخری دو آیات میں یہ فرمایا گیا کہ قرآن کریم کی یہ سورۃ یا جملہ مضامین قرآن وہ ہدایات ربانی اور مقدس پیغامات ہیں جو صحف اولیٰ یعنی گزشتہ انبیائے کرام کے صحیفوں، اور خاص طور پر صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں موجود تھے تو میں نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ اللہ تعالےٰ نے کتنی کتابیں نازل کی ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں سے دس حضرت آدمؑ پر، پچاس صحیفے حضرت شعیبؑ پر، تیس صحیفے اشنوخ پر یعنی حضرت ادریسؑ پر اترے، دس صحیفے حضرت ابراہیمؑ پر اتارے گئے اور چار کتابیں تورات، زبور، انجیل اور فرقان (قرآن مجید) نازل ہوئیں۔

قرآن کریم میں جن انبیائے کرام کے قصص اور تذکرے موجود ہیں ان کے بارے میں یہ تو صراحت سے بیان ہوا ہے کہ ان پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی مگر ان سب کی کتب سماویہ کا ذکر نہیں آیا صرف صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور چار کتب سماویہ یعنی تورات (قانون) انجیل (بشارت) زبور (یعنی نوشتہ) اور فرقان (حق و باطل کے درمیان فرق واضح کرنے والا) کا صراحت سے ذکر ہوا ہے۔ فرقان مجید کو زیادہ تر قرآن کے لفظ مقدس سے یاد کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں دیگر کتب سماویہ کے لیے انزال (اتارنا) اور قرآن کے لیے تنزیل (اچھے طریقے سے ٹھہر ٹھہر کر اتارنا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ؛

صدرالدین عارف

شیخ صدرالدین عارف خطۂ ملتان کے اکابر اولیا میں سے ہیں۔ شیخ بہاؤ [illegible] کے فرزند ارجمند انہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اپنے زمانے کے سرحلقۂ [illegible] تھے۔ جب کلام پڑھنے یا ختم کرتے تو معرفت کے نئے نئے اسرار و رموز [illegible] ہوتے اس لیے "عارف" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کی پیدائش ۶۱۲ھ کو ملتان میں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کے مسلک پر چل کر نعمت [illegible] یہی نہیں بلکہ اس فیض سے دوسرے لوگوں کو بھی مالا مال کیا۔ شیخ صدرالدین سے متعلق بہت سی کرامات اور حکایات مشہور ہیں۔ شیخ صدرالدین [illegible] کے علاوہ ایک علمی یادگار "کنوز الفوائد" بھی چھوڑی ہے۔ یہ ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو ان کے ایک مرید خواجہ ضیاء الدین نے مرتب کیا تھا۔ ان کی صوفیانہ تعلیمات کا اندازہ اور اہمیت ان سے ہوتا ہے۔ ان کا وصال ملتان میں [illegible] کو ظہر اور عصر کے درمیان ہوا۔ تاریخ فرشتہ میں سن وفات ۷۰۹ھ ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ سفینۃ الاولیاء میں ۶۸۴ھ درج ہے۔ ان کے سن وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے ؛

صدق

عربی لفظ جس کے لفظی معنی سچائی کے ہیں۔ [illegible] اخلاقیات میں "صدق" ایک ایسی بنیادی اہمیت کی صفت ہے کہ جس کے بغیر صحت مند اخلاق اور معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔ اسلام نے صدق کو نہایت درجہ اہمیت دی ہے۔ اور دوسرے بیشتر گناہوں کی نسبت کذب (صدق کے خلاف معنوں میں استعمال ہوتا ہے) کو زیادہ بدتر کہا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کے پاس ایک آدمی حاضر ہوا اور کہا کہ یا رسول اللہ مجھ میں چار بُری عادتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں۔ دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں اور چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے جس ایک کو آپؐ فرمائیں آپؐ کی خاطر چھوڑ دوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جھوٹ مت بولا کرو [illegible]

شخص نے حامی بھر لی۔ پھر اس کا جی جب رات کو شراب کے لیے چاہا، چوری کرنے کو چاہا۔ بدکاری پر آمادہ ہوا تو اس احساس حقت سے کہ جھوٹ نہ بولنے کے عہد پر اگر کسی نے ان تینوں معاملوں کے بارے میں پوچھا تو سچ سچ بتانا ہوگا اور اس کے عوض شرمندگی اور ذلت اٹھانا پڑے گی۔ وہ آدمی باقی عیوب سے بھی پاک ہوگیا۔ صدق پر استوار معاشرہ ہی وہ معاشرہ ہے جس کی جڑیں گہری اور تنا مضبوط ہوتا ہے۔ صدق صفات ربانی میں سب سے بڑی صفت ہے۔ خدا سے بڑھ کر اور کوئی سچا نہیں ہوسکتا۔ حضور اکرمؐ نے منافق کی جو چار علامتیں فرمائیں ان میں سے ایک جھوٹ بھی ہے۔ زبان، دل اور عمل۔ ان تینوں میں اگر صدق کا عنصر موجود ہو تو انسانی شخصیت عظمت سے ہمکنار ہو سکتی ہے ؛

صدقہ

انفاق فی سبیل اللہ، خیرات۔ ۔ یہ اصطلاح قرآن و حدیث میں زکوٰۃ کے لیے بھی استعمال ہوئی ہے اسے صدقہ واجبہ کہا گیا ہے۔ صدق کے معنی سچائی کے ہیں اور اس کی ضد ہے کذب۔ دونوں لفظ عموماً قول کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور قول میں بھی صرف خبر کے لیے کوئی شخص جنگ میں دادِ شجاعت دے اور جو کچھ کہ اس پر حق ہے کر گزرے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے صَدَقَ فی القتال نجات کے لیے صرف زبان ہی سے حق کا اعتراف کافی نہیں۔ صدقہ اس مال کو کہتے ہیں جو دل کی سچائی کے ساتھ راہِ خدا میں خرچ کیا جائے نفلی طور پر ثواب کی غرض سے جو کچھ بھی خرچ کیا جائے اسے صدقہ کہتے ہیں۔ بلکہ ہر نیک کام کو جس میں قربانی و ایثار کا کوئی پہلو ہو یہاں تک کہ عام تحمل اور بردباری کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔

علمائے اسلام لفظ صدقہ کو دو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں یعنی ایک زکوٰۃ کے معنوں میں جس کی ادائی فرض اور جس کی شرح معین ہے۔ صحیح بخاری میں صدقہ اور زکوٰۃ ایک ہی مفہوم میں استعمال کیے گئے ہیں، تاہم صدقہ کا عام استعمال رضاکارانہ طور پر خیرات کرنے کے معنوں میں ہے، امام مالکؒ لکھتے ہیں کہ سادات کے لیے صدقہ قبول کرنا ناجائز ہے جو محض انسانوں کا میل کچیل ہے۔

شاہ ولی اللہ کے مطابق صدقات سے نظام مدنیت کو فروغ ملتا ہے۔ ایک اور مقصد مالی تنظیم بھی ہے۔ اسلام کی معاشیات میں کفالت کے دو سلسلے ہیں ایک اجتماعی غیر اختیاری اور دوسرا انفرادی اختیاری، دونوں کے اجتماع سے ایک ایسا فلاحی معاشرہ وجود میں آیا اور آسکتا ہے جس کی نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی ؛

صدقہ فطر

فطرانہ۔ وہ صدقہ جو رمضان کے اختتام پر شکرانے کے طور پر دیا جاتا ہے۔ صدقہ فطر کے متعلق حکم یہ ہے کہ دو سیر گیہوں اور چار سیر جَو (یا اس کی قیمت) فی کس کے حساب سے نماز عید الفطر سے قبل دے دیا جائے۔ اگر قبل نماز ممکن نہ ہو تو نماز کے فوری بعد بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلعم کے عہد میں صدقہ فطر ایک جگہ جمع کر کے مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کی طرح یہ صدقہ ان لوگوں پر جو صاحب نصاب ہوں یعنی ۵۲ تولے چاندی یا اندازاً سو روپے کے مالک ہوں اپنے اور اپنے زیر کفالت افراد کی طرف سے واجب ہے اس نصاب پر سال گزرنا شرط نہیں۔ عید کی صبح کو بھی اتنا مال آ جائے جو نصاب کے برابر ہو تو صدقہ فطر واجب ہو جاتا ہے۔ نابالغ بچوں حتیٰ کہ عید کی صبح پیدا ہونے والے بچوں پر بھی صدقہ فطر واجب ہے ؛

صدیق

اسلام کے پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکرؓ کا لقب۔ اس کے لغوی معنی ہیں سچا راست گو، سچائی کو تسلیم کرنے والا، سچ کی تصدیق کرنے والا۔ وفادار دوست۔ ابو اسحٰق سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر کو صدیق کا لقب اس وقت پڑا جب انہوں نے واقعہ معراج کی تصدیق کی۔ لوگوں کے اذہان میں اس بارے میں تذبذب تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی روانگی و آمد کی تصدیق کی اور ان کا لقب صدیق پڑ گیا۔ قرآن میں حضرت یوسفؑ کو راست باز کے معنی میں صدیق کہا گیا ہے ؛

صراطِ مستقیم

لفظی معنی سیدھا راستہ، کھلا راستہ۔ اصطلاحی معنوں میں صراطِ مستقیم سے مراد دین اسلام ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صراطِ مستقیم کی تعریف یوں کرتے ہیں: وہ سیدھا راستہ جس کا علم ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ تیرے منظورِ نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانہ سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر رہا۔ قرآن میں ہے اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے ایک اور جگہ قرآن مجید میں آیا ہے اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ ایک اور جگہ آیا ہے جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے پھر کہا گیا ہے اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے یہ وہ ہدایت ہے جو تمہارے رب نے تمہیں دی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو ؛

صفا

مکہ مکرمہ کی دو پہاڑیوں میں سے ایک کا نام ہے۔ دوسری پہاڑی کا نام مروہ ہے۔ حج اور عمرہ کے دوران ان دونوں پہاڑیوں کے مابین سعی کی جاتی ہے یہ رسم روایت کی رو سے اس واقعہ کی یادگار ہے کہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہؑ اپنے پیاسے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں سات مرتبہ ادھر سے ادھر دوڑیں۔ جاہلیت کے دور تک صفا اور مروہ میں دینی شعائر ادا کیے جاتے تھے۔ اکثر روایتوں کے مطابق وہاں پتھر کے دو بت تھے۔ الصفا میں اساف اور المروہ میں نائلہ جنہیں بت پرست عرب دوڑنے کے دوران چھوتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق وہاں تانبے کی مورتیاں بھی تھیں ؛

صفاتِ الٰہی

اسمائے حسنیٰ ہی دراصل از خود صفات الٰہی کے اظہار کے لیے کافی ہیں کیونکہ جو اسم اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا گیا وہ دراصل اس کی صفت بیان کرنے کے لیے ہی کیا گیا اس لیے صفات الٰہی کو جاننے کا براہِ راست اور معتبر طریقہ خدا تعالیٰ کے لیے استعمال ہونے والے ناموں سے واقفیت ہی ہے۔ ہم اسے جس نام سے بھی پکارتے ہیں درحقیقت اس کی کسی صفت کی بنا پر ہی وہ اسم استعمال کرتے ہیں ؛

صفاتیہ

ایک مکتب فکر۔ راسخ العقیدہ مسلمان اپنے آپ کو صفاتی کہتے ہیں۔ بعض جگہ "صفاتیہ" کو مسلمانوں کے ایک فرقے کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے لیکن دراصل یہ کوئی علیحدہ فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک طبقہ فکر اس سے متعلق ہے۔ صفاتیہ صفت سے آیا ہے ؛

صَفَر

اسلامی تقویم کے دوسرے مہینے کا نام۔ جسے اسلام سے قبل منحوس سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان اسے صفر الخیر یا صفر المظفر کہتے ہیں۔

ایک بیان کے مطابق قدیم عربی تقویم میں صفر دو مہینوں کے عرصے کا ہوتا تھا جس میں محرم شامل تھا۔ روایت کی رو سے شروع کے عرب محرم کو صَفَر کہتے تھے۔ اور حج کے مہینے میں عمرے کو قابلِ اعتراض عمل سمجھتے تھے اور ان کی ایک کہاوت تھی کہ جب اونٹوں کی زخمی پیٹھیں اچھی ہو جائیں اور قدموں کے نشان مٹ جائیں اور صفر گزر چکے تو عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔ ؛

صفوان بن اُمیّہ

عرب کے ایک معزز خاندان سے تعلق تھا۔ نام صفوان اور کنیت ابو راہب تھی ان کا باپ اموی خاندان کا سردار اور نہایت سخت دشمنِ اسلام تھا۔ حضرت بلال رضؓ حبشی اس کے غلام تھے جنہیں وہ قبولِ اسلام کے جرم میں سخت سزائیں دیا کرتا تھا۔ جنگ بدر میں امیہ اپنے اسی غلام حضرت بلالؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔ صفوانؓ نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے عمر کو بہت سا لالچ دے کر حضرت صلعم کے قتل کے ارادے سے مدینہ بھیجا لیکن وہ مسلمان ہو گیا۔ اس سے صفوان کا جوشِ انتقام اور بڑھ گیا۔ اس حالتِ کفر میں بھی اس کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہؐ نے ۷ھ میں غزوہ خیبر کے سلسلے میں آپ سے زرہیں مانگیں۔ دشمنِ اسلام ہوتے ہوئے بھی آپ نے زرہیں رسول اللہ کو عاریتاً دے دیں جو حضورؐ نے جنگ کے بعد لوٹا دیں۔ فتح مکہ کے بعد بھی آپ اسلام نہ لائے۔ حضرت محمد صلعم نے عرب کو مسلمان ہونے کے لیے چار ماہ کی مہلت دے دی۔ چنانچہ اس دوران میں جنگِ حنین اور غزوہ طائف ہوا۔ آپ نے غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی اسلحہ سے مسلمانوں کی مدد کی۔ بالآخر غزوہ طائف سے چند روز بعد مسلمان ہو گئے۔ اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جنگِ یرموک میں اسلام کی مدافعت میں تلوار استعمال کی۔

آپ نے امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں انتقال کیا۔ آپ نے چند احادیث بھی روایت کی ہیں ؛

صفوانؓ بن معطل

نام صفوان اور کنیت ابو عمر تھی۔ آپ ۵ھ میں اسلام لائے اور غزوہ خندق و دیگر غزوات میں حضور اکرم کے ساتھ رہے۔ عموماً فوج کے آخری حصہ پر مامور ہوتے تھے تاکہ فوج میں پیچھے رہنے والے لوگوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ چنانچہ غزوہ بنی مصطلق میں ام المومنین حضرت عائشہؓ پیچھے رہ گئیں تو آپ انہیں لے کر لشکر میں شامل ہوئے۔ جس پر چند منافقین کو غلط فہمی ہو گئی اور انہوں نے صفوانؓ اور حضرت عائشہؓ پر تہمت لگا دی۔ اس پر خدا کی جانب سے ایک وحی آئی جس میں اس بہتان اور تہمت کی نفی کی گئی تھی۔ آپ کو مذہبی مسائل کی بڑی جستجو رہتی تھی۔ آپ حضور اکرمؐ سے عجیب عجیب سوالات پوچھا کرتے جن کے جوابات سے آپ کی شرعی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ آپ نے چند احادیثِ رسولؐ بھی روایت کی ہیں ؛

صفہ

آنحضرت صلعم کے عہد میں مسجد نبوی دراصل مٹی کی ایک چار دیواری تھی۔ اس احاطے کے شمالی سمت (سمت قبلہ) کھجور کے پتوں کا ایک سائبان تھا۔ اس سائبان میں وہ صحابہ رہا کرتے تھے جن کا اپنا کوئی گھر بار نہ تھا اور جو فقر و غنا کی زندگی بسر کرتے تھے ان کو اصحابِ صفہ کہا جاتا ہے ؛

صفین

ایک مقام کا نام جو دریائے فرات سے زیادہ دور نہیں۔ یہاں بید کے گھنے درخت اور فراتی کھجوروں کے پیڑ کثرت سے ہیں اور جگہ جگہ پانی کے گڑھے ہیں جن کے درمیان سے ہوتی ہوئی صرف ایک پکی سڑک فرات کو جاتی ہے۔ صفین کی شہرت درحقیقت اس بڑی لڑائی کی وجہ سے ہے جو ۳۷ھ / ۶۵۷ء میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان وہاں پر ہوئی۔ حضرت علیؓ کوفہ سے فوج لے کر جیسے اور یہاں پہنچے تو شامی پہلے سے اس کے کھنڈرات میں پڑاؤ ڈالے ہوئے بیٹھے تھے اور ان کی ایک جمعیت فرات کو جانے والی سڑک پر متمکن تھی۔ ہر چند حضرت علیؓ نے یقین دلایا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ حضرت امیر معاویہؓ سے کوئی تصفیہ کرنے آئے ہیں، اور اس کے باوجود کہ ان کے مشیر کار عمرو بن العاصؓ نے بھی انہیں ایسا کرنے کا مشورہ دیا لیکن وہ نہیں مانے۔ اس پر حضرت علی نے اپنی فوج کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح حضرت علیؓ کی فوج انہیں پسپا کرنے اور اپنے لیے دریا تک کا راستہ نکالنے میں کامیاب ہو گئی۔ حضرت علیؓ نے ازراہِ مروت شامیوں کو فرات سے پانی لے جانے کی کھلی اجازت دے دی۔

امیر معاویہؓ کا اصرار تھا کہ خلیفہ قاتلین عثمانؓ کو ان کے حوالے کر دیں جو وہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ جب لڑائی چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو دونوں طرف کے صلح پسندوں نے اس کی روک تھام کر دی۔ ایک بیان کے مطابق ربیع الآخر اور جمادی الاول ۳۷ھ کے پورے دو مہینے یہی صورت قائم رہی، لیکن اگر یہ روایت مان لی جائے تو جنگ کی ابتدائی کارروائیوں کو بہت طولانی ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ایک بیان کے مطابق جنگ آغاز صفر میں شروع ہوئی۔ جنگ سے قبل جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن دونوں فریق عام جنگ کے مہلک نتائج سے خائف ہونے کے باعث اس سے گریز کرتے تھے۔ صلح کے ہر امکان کی گنجائش باقی رکھنے کی غرض سے فریقین اس پر متفق ہو گئے کہ امن کے روایتی مہینے محرم میں عارضی صلح کر لی جائے لیکن یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہوئی چنانچہ آغازِ صَفَر میں جنگ کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اور جنگ صفین باقاعدہ شروع ہو گئی۔ یہ نہایت خونریز جنگ تھی اور اس میں بہت سے مشہور لوگ کام آئے۔

جب لڑائی کچھ مدت تک بغیر فیصلے کے ہوتی رہی تو حضرت امیر معاویہؓ کی ہمت پست ہو گئی اور وہ فرار کی سوچنے لگے۔ اس خطرناک حالت میں حضرت عمرو بن العاص نے انھیں مشورہ دیا کہ قرآن مجید کے قلمی نسخے نیزوں کے سروں پر باندھے جائیں جس سے رمزاً یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ لڑائی بند ہو جانی چاہیے۔ اور فیصلہ کتاب اللہ پر چھوڑا جائے۔ بخلاف حضرت علیؓ کے جو اللہ کا فیصلہ جنگ کے نتیجے میں تلاش

کر رہے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کا یہ اندازہ کہ ان کی یہ تجویز حضرت علیؓ کے متبعین میں تفریق پیدا کر دے گی، صحیح ثابت ہوا۔ ان لوگوں کی ایک معقول تعداد نے کہہ دیا کہ اللہ سے فیصلہ چاہنے کی یہ استدعا مسترد نہیں کی جا سکتی اور یوں حضرت علیؓ جو سمجھے تھے کہ وہ جنگ جیت چکے ہیں، ہراول دستے کو واپس بلانے پر مجبور ہو گئے اس طرح لڑائی رک گئی۔ پھر حضرت علی کی فوج کی اکثریت نے حضرت امیر معاویہؓ کی یہ تجویز بھی مان لی کہ دونوں فریق ایک ایک "حکم" کا انتخاب کریں اور یہ دونوں "حکم" کسی آئندہ تاریخ کو مل کر قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچ جائیں۔ شامیوں نے حضرت عمرو بن العاص کا انتخاب کیا۔ حضرت علیؓ حضرت ابو موسیٰؓ کو نامزد کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ اقرار نامے پر الطبری کے مطابق ۱۳ صفر ۳۷ھ اور ایک اور بیان کے مطابق ۲۷ صفر کو دستخط ہوئے۔ پھر فوجیں منتشر ہو کر گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

صفیہؓ ام المومنین

آپ کا نام زینب تھا۔ عرب میں مال غنیمت کے ایسے حصے کو جو بادشاہ کو ملے صفیہ کہتے ہیں۔ جنگ خیبر میں آپ اسیر ہوئیں۔ اور حضرت محمد صلعم کے حصے میں آئیں۔ اسی لیے آپ کا نام صفیہ پڑا۔ آپ کا باپ بنو نضیر کا سردار تھا اور ماں سموؤل رئیس قریظہ کی لڑکی تھی۔ ان کے باپ حیی بن اخطب اور چچا ابو یسیر نے مسلمانوں کے خلاف بیشتر جنگوں میں حصہ لیا۔ حضرت صفیہؓ مدینہ میں پیدا ہوئیں۔ جب بنو نضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا تو حضرت صفیہؓ کا باپ ان لوگوں میں سے تھا جو خیبر میں جا کر آباد ہوئے حضرت صفیہ کی شادی پہلے سلام بن شکم القرظی سے ہوئی۔ اس سے طلاق لینے کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں جو رئیس خیبر کا بھتیجا تھا۔ فتح خیبر کے بعد جب آپ مسلمانوں کی اسیر ہوئیں اور مال غنیمت میں آئیں تو حضرت محمد صلعم نے انہیں اپنے لیے پسند کر لیا۔ چنانچہ ۷ھ میں آپ کی شادی حضورؐ سے ہوئی۔ ۱۰ھ میں آپ نے حضورؐ کے ساتھ حج کیا۔ ۳۵ھ میں ایام محاصرہ کے دوران آپ نے حضرت عثمان کی مدد کی۔ ۵۰ھ یا ۵۲ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ حضرت محمدؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے حضرت صفیہؓ کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ حضور اکرمؐ کے آخری ایام علالت میں انہوں نے نہایت تندہی سے آپؐ کی خدمت کی۔ آپ کا قد چھوٹا تھا۔ نہایت حسین اور خوش خلق تھیں۔

صفیہؓ بنت عبد المطلب

عبد المطلب جد رسول اللہ کی دختر۔ ماں کا نام ہالہ بنت وہب تھا، جو آنحضرت صلعم کی والدہ حضرت آمنہ کی ہمشیر تھیں۔ اس بنا پر حضرت صفیہؓ آپؐ کی پھوپھی ہونے کے علاوہ خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ حضرت حمزہؓ بھی ہالہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اور حضرت صفیہؓ حقیقی بھائی بہن تھے۔ آپ کی شادی ابو سفیان بن حرب کے بھائی حارث سے ہوئی جس سے آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد آپ کا نکاح حضرت خدیجہ کے بھائی عوام بن خویلد سے ہوا جس سے حضرت زبیرؓ پیدا ہوئے۔ آنحضرتؐ کی پھوپھیوں میں سے یہ شرف فقط حضرت صفیہؓ کو حاصل ہوا کہ وہ اسلام لے آئیں۔ آپ نے ۲۰ھ میں ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

صلاح الدین ایوبی

سلطان الملک الناصر صلاح الدین یوسف اوّل۔ امیر نجم الدین ایوب کا بیٹا۔ ۵۳۲ھ / ۱۱۳۸ء کو تکریت کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب شیرکوہ مصر کے خلاف اپنی پہلی مہم میں ان کو اپنے ساتھ لے گیا۔ شیرکوہ نے صلاح الدین کو حکم دیا کہ وہ بلبیس اور اس ضلع کا محاصرہ کر کے وہاں سے خراج وصول کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ شاور نے اپنے آپ کو مشکل میں مبتلا پا کر شاہ اموری کو امداد کے لیے مدعو کیا۔ چنانچہ شیرکوہ اور صلاح الدین بلبیس میں قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔ دونوں نے اس پامردی سے مدافعت کی کہ شاور اور شاہ اموری اسے سر نہ کر سکے۔

۵۶۰ھ کے آغاز میں شیرکوہ صلاح الدین کے ہمراہ اپنی فوجوں کو صحیح سالم لے کر شام پہنچ گیا۔ اس جنگ کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ نورالدین اور اس کے ساتھیوں کو مصر، اس کی دولت اور اس کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ شیرکوہ کے دل میں اسے فتح کرنے اور اس میں آباد ہونے کا شوق پیدا ہوا لیکن صلیبی جنگوں کے باعث نورالدین اپنی افواج کو منتشر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تین سال بعد شاور نے اموری سے ایک نیا معاہدہ کر لیا۔ اور شیرکوہ کو دوبارہ مصر پر چڑھائی کرنے کا حکم ہوا۔ اس نے پھر صلاح الدین کو اپنے ساتھ لے لیا۔
شیرکوہ جب قاہرہ پہنچا تو لوگوں نے نجات دہندہ کی حیثیت سے اس کا استقبال کیا۔ مگر شاور اس کے خلاف ہی رہا۔ اس نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک ضیافت کے موقع پر قید کرنے کی سازش کی لیکن انھیں اس کا علم ہو گیا۔ صلاح الدین نے شاور سے بدلہ لینے کی ٹھانی اور ایک دن جب شاور گھوڑے پر تنہا سواری کر رہا تھا۔ صلاح الدین نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ خلیفہ کو اپنے ظالم وزیر سے نجات حاصل کر کے خوشی ہوئی اس نے شیرکوہ کو اپنا وزیر مقرر کر دیا۔ لیکن دو مہینے بعد شیرکوہ کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ نے صلاح الدین کی نیک فطرت کے باعث الملک الناصر کا خطاب دے کر ان کو وزیر مقرر کیا۔ سیاہ فام محافظین محل سازشوں میں لگے رہے۔ فرنگیوں کو صلاح الدین کی حکومت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ بجا طور پر ان کو یروشلم کے لیے ایک خطرہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے فرانس، جرمنی، انگلستان، بوزنطی شہنشاہ اور پاپائے روم کی طرف فوری مدد کے لیے ایلچی روانہ کر دیے۔ اور وہ قسطنطنیہ کی طرف سے ایک فوجی بیڑہ اور جنوبی اطالیہ کی طرف سے ایک امدادی فوج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

صلاح الدین نورالدین سے مدد کے خواہاں ہوئے اور یہ درخواست بھی کی کہ وہ کمک ان کے والد کے زیر کمان بھیجی جائے۔ بوزنطی فوج کو رسد کی کمی کی دقت پیش آنا شروع ہو گئی۔ اور اموری کو اپنی مکمل فتح کے متعلق شبہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے اس نے صلاح الدین سے گفتگو کرنے اور ایک معقول رقم کے عوض مصالحت کر لینا زیادہ قرین مصلحت خیال کیا۔
اگلے سال صلاح الدین نے فلسطین پر یلغار کر کے رملہ اور عسقلان تک پیش قدمی کر لی۔ اس سال وہ ایلہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے سال انہوں نے خطبہ جمعہ میں فاطمی خلیفہ کے نام کی جگہ عباسی خلیفہ کے نام کا اجرا کر کے نورالدین کی دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ اس کے بہت جلد بعد خلیفہ العاضد فوت ہو گیا۔ نورالدین صلیبی فوجوں کے مقابلے کے لیے لشکر جمع کر چکا تھا کہ اچانک دمشق میں ایک شدید بیماری میں مبتلا ہو گیا اور چند دن بیمار رہنے کے بعد

فوت ہوگیا۔

صلاح الدین نے نورالدین کے کمسن بیٹے الملک الصالح اسمٰعیل کو بادشاہ تسلیم کرلیا۔ اور خود صقلیہ کے نارمنوں سے لڑنے میں مصروف ہوگئے۔ صلاح الدین کو اس لڑائی میں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ نورالدین بھی وفات پاچکا تھا بعد ازاں صلاح الدین بلا خوف و خطر وسیع اختیارات کے مالک تھے اور اپنی تمام تر توجہ اپنے نصب العین یعنی صلیبیوں کے خلاف جنگ میں صرف کرسکتے تھے۔

انہوں نے اپنے کام کی ابتدا شام سے کی۔ شام کے حالات مخدوش تھے اور مسلمانوں کا کوئی صحیح راہنما نہ تھا۔ ان حالات میں صلاح الدین یہ سوچنے پر حق بجانب تھے کہ وہ شام میں اقتدار حاصل کرلیں۔ انھوں نے حلب پر صالح دیا۔ اور اپنے خط میں نورالدین نے انھیں شامی فوجوں کا سالار تسلیم کیا۔ اس وقت سے صلاح الدین کی عظمت کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ مستقبل میں ہونے والے واقعات نے ثابت کردیا کہ وہ ایک بہترین صلاحیتوں کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔

ان کا نمایاں نصب العین خلافت فاطمیہ کا خاتمہ اور عیسائیوں سے فیصلہ کن جنگ تھا۔ جن کے جنگی اقدام سے مشرق وسطیٰ کا امن و امان خطرے میں پڑ گیا تھا اور حج کا راستہ بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلطان صلاح الدین ان مقاصد کے حصول میں کامیاب رہے۔

وہ ایک لائق سپہ سالار تھے مگر اس سے زیادہ وہ اعلیٰ درجے کے سیاستدان بھی تھے۔ اور لائق مشیروں کے مشوروں کو قبول کرتے تھے۔ نیز اپنے رفقائے کار منتخب کرنے میں ہوشیار اور کامیاب تھے لیکن وہ اقتدار کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ صلاح الدین کے خطوط بے شمار ہیں اور ان میں سیاسی حکمت عملی کی وافر معلومات پائی جاتی ہیں۔

صلاح الدین نے مصر میں عنانِ حکومت نہایت مضبوطی سے تھام لی لیکن

فاتح بیت المقدس، صلاح الدین ایوبی

اسمٰعیل کا قبضہ رہنے دیا جو ان کو بے ضرر معلوم ہوتا تھا اور حماۃ، حمص اور بعلبک جو بغیر لڑائی کے ہی فتح ہوگئے تھے اپنے عزیزوں کو جاگیر کے طور پر دے دیے۔ پھر خلیفہ نے ان کو مصر، سوڈان، فلسطین اور وسطی شام کی حکومت عطا کردی۔ چنانچہ وہ سلطان الاسلام والمسلمین کہلایا کرتے تھے۔

۵۷۳ھ میں وہ فوج کے ساتھ فلسطین آئے اور غزہ اور عسقلان کے علاقے ویران کردیے۔ بالڈون چہارم کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوا لیکن صلاح الدین کی نمایاں برتری کے پیش نظر اُسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس نے اردگرد کے صلیبی جنگ آزماؤں کو اکٹھا کیا اور پھر جنگ میں آ دھمکا۔ رملہ کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور عیسائیوں کا پلہ بھاری رہا۔ ۵۷۶ھ/ ۱۱۸۰ء میں بالڈون اور صلاح الدین کے درمیان دو سال کے لیے صلح کا معاہدہ ہوگیا۔

صلاح الدین مسلم علاقوں میں بلاشرکت غیرے قبضہ حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ انہوں نے چند سال شام کا باقی علاقہ فتح کرنے اور عراق پر [illegible] حاصل کرنے میں صرف کیے۔ ۵۷۹ھ/ ۱۱۸۳ء میں صلاح الدین اور بالڈوین پنجم کے درمیان [illegible] کے لیے ایک صلح نامہ طے ہوگیا۔ جلد ہی بالڈوین پنجم فوت ہوگیا اور [illegible] جانشین کی۔

ریمنڈ کے دشمنوں نے اُسے صلاح الدین پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا [illegible] ہی کیا۔ لیکن اسے شکست فاش ہوئی اور بادشاہ اور اس کے [illegible] رہے گئے۔ صلاح الدین نے بادشاہ کا دوستانہ استقبال کیا [illegible] پر قبضہ ہوگیا۔

جس طرح جنگ قرون حماۃ کے بعد انھیں شام کی حکومت مل گئی تھی [illegible] حطین کی جنگ کے بعد ان کا فلسطین اور یروشلم پر قبضہ ہوگیا۔ صلاح [illegible] اعلان کیا کہ چالیس دن کے اندر اندر عیسائی شہر سے نکل جائیں [illegible] مرد دس دینار، فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ ایک دینار [illegible] بہت سے لوگوں کو انہوں نے زرفدیہ لیے بغیر چھوڑ دیا [illegible] خود ادا کیا۔ لین پول سلطان کی عظمت [illegible] لکھتا ہے کہ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ کسی عیسائی [illegible] ہو۔ قبۃ الصخرۃ اور مسجد اقصیٰ کو بحال کردیا گیا۔ [illegible] پوری اسلامی دنیا شریک تھی۔ فلسطین کا [illegible] کے پرچم تلے آچکا تھا۔

صلاح الدین کو اپنی باقی زندگی [illegible] مل گئی۔ انہوں نے یروشلم کو مستحکم کیا [illegible] لوگوں نے دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا۔

صفر ۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء میں وہ [illegible] عمر میں فوت ہوگئے۔ ان کے [illegible] صلاحیت، رحم دلی، خدا ترسی، عفو و درگزر [illegible] اہل سنت والجماعت کے مسلک پر عمل پیرا تھے۔

صلاح الدین اپنی رعایا میں محترم اور مقبول تھے [illegible] کا نمونہ مانا جاتا ہے۔ انھوں نے کبھی بلا وجہ سختی کا [illegible] نہیں کیا۔

صلاح الدین کا نام آج بھی اسلامی دنیا میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے خون میں زندگی کی لہر دوڑا تا ہے۔ ان کے لیے سلطان کی شخصیت روشنی اور ہدایت کا مینار رہی ہے۔ وہ علوم دینیہ کے دلدادہ، علما کے سرپرست اور تعمیرات کے شائق تھے۔

صلح

عربی زبان کا لفظ جو فساد کی ضد میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظی معانی میل ملاپ آشتی۔ یہ لفظ نیک آدمی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ صلح کو انسانی اور خصوصاً اسلامی معاشرہ میں تنظیم معاشرہ کے لیے بہت اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس میں بھی حد قائم ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی صلح جائز ہے بجز اس صلح کے جس سے کوئی حلال چیز حرام اور کوئی حرام چیز حلال ہوتی ہو اور مسلمانوں کو ہر شرط پر قائم رکھنا چاہیے بجز اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام اور کسی حرام کو حلال کرنے والی ہو۔

صلوٰۃ

عربی زبان کا لفظ۔ جمع صلوات ہے۔ لغوی معنی ہیں، دُعا، تسبیح، استغفار رحمتہ، ثنا، طلب رحم۔ لفظ صلوٰۃ جب اللہ تعالٰی سے منسوب ہو تو اس کے معنی رحمت ہیں۔ اور جب مخلوق یعنی ملائکہ و جن و انس سے منسوب ہو تو اس کے معنی قیام اور رکوع و سجود کے ہیں، اور جب پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کے لیے استعمال ہو تو اس کا مطلب تسبیح ہوگا۔

اصطلاحاً صلوٰۃ (نماز) اُس مخصوص عبادت کا نام ہے جو اسلام کے ارکان میں سے ہے۔ اس کو صلوٰۃ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے اصل معانی تعظیم کے ہیں۔ اور یہ مخصوص عبادت اللہ تعالٰی کے لیے فرض کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں لفظ صلوٰۃ کا استعمال سو بار ہوا ہے اور مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ابن الاثیر نے النہایتہ میں صلوٰۃ کے دو معنی لکھے ہیں۔ اول دُعا۔ چونکہ دُعا نماز کا ایک جز ہے اس لیے جز پر کُل کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ دوم لغوی معنی تعظیم۔ اور اس مخصوص عبادت کو صلوٰۃ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں اللہ تعالٰی کی تعظیم مقصود ہے۔

صلوٰۃ (نماز) اسلام کا وہ فریضہ ہے جسے کوئی باہوش و حواس مسلمان کسی حالت میں بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ ہر عاقل بالغ پر فرض مؤکد ہے۔ توحید کے بعد سب سے پہلے پہلا حکم جو آنحضرتؐ کو ملا وہ نماز کا تھا یہ وہ فرض ہے جو آغاز اسلام سے ادا کیا جاتا رہا۔ اور شب معراج اس کی باقاعدہ فرضیت کا حکم ہوا۔ قرآن مجید میں بیشتر جگہ نماز کے قیام کی تاکید آئی ہے۔ حضورؐ اکرم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل بہترین اور افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا "نماز وقت مقررہ پر"۔ نماز کے لیے بہت سی احادیث بھی موجود ہیں۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے جس سے اس اہم رکن اسلام کی فضیلت، عظمت و رجلالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اہل دوزخ سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لائی تو وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہ پڑھتے تھے۔

نماز ایک مرکزی عبادت ہے یعنی صرف جوارح کا عمل نہیں بلکہ ایک ایسی روحانی کیفیت ہے جس میں نمازگزار کی ساری شخصیت جذب ہو جانی چاہیئے تاکہ زندگی کا ہر عمل چاہے اس کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے یا معاملات سے اس کے مطابق خود بخود صحیح نتائج کی سمت نمودار ہو جائے۔ نماز انسان کے باطن میں ایک پاسبان کی حیثیت رکھتی ہے جو بدی کے خلاف رکاوٹ بن سکتی ہے۔ نماز کی ایک غایت پاکیزگی کا ذوق پیدا کرنا اور پاکیزہ۔ لوگوں میں اجتماعی نظم کی ایک صورت کی تشکیل ہے۔ نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فوائد بے شمار ہیں۔ با جماعت نماز کی تائید و تاکید بیشتر جگہ کی گئی ہے کیونکہ اس میں باہمی تعلقات و اخلاق و مروت کو رواج اور استحکام ملتا ہے۔

صلوٰۃ التسبیح

یہ چار رکعت نماز بہت ثواب رکھتی ہے۔ اس سے سب گناہ اگلے، پچھلے، نئے پرانے، چھوٹے بڑے، چھپے کھلے، غرض سب کے سب معاف ہو جاتے ہیں۔ ہو سکے تو یہ نماز روز ادا کی جائے ورنہ ہر جمعہ کو۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو مہینے میں ایک بار۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو سال میں ایک بار، اور اگر اس درجہ بھی توفیق نہ ہو تو زندگی میں ایک بار ضرور اس کی ادائیگی کرنی چاہیئے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ ہر رکعت میں فاتحہ اور سورۃ کے بعد پندرہ مرتبہ پڑھیں:

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر

اور ہر رکوع، سجدہ، جلسہ اور قعدہ میں دس دس بار پڑھیں۔

صلیب

عربی زبان کا لفظ۔ جمع صُلُب، صُلبان۔ بمعنی سُولی۔

ان عام معنوں کا اطلاق بعض مخصوص صورتوں میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً وہ نشان جسے اونٹوں کی کھال پہ داغ کر بنایا جاتا ہے اور جو صلیب کی شکل کا ہوتا ہے صلیب کی ایک خاص شکل عیسائیوں کے ہاں مروج ہے۔ قرآن میں اس کا استعمال فعل کی صورت میں ہوا ہے۔ "انہوں نے حضرت عیسٰیؑ کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔" (النساء)

احادیث میں صلیب کا ذکر قیامت کے بیان میں بھی آیا ہے "حضرت عیسٰیؑ کا آخری ایام میں دوبارہ ظہور ہو گا وہ دجال سے لڑیں گے، سوروں کو قتل کریں گے اور صلیب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔" (بخاری، مسلم)

"قیامت کے دن سب امتیں اپنے نشانات یا اصنام کے ساتھ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گی۔ نصاریٰ صلیب کے پیچھے ہوں گے اور یہ اعتراف کرنے پر کہ وہ مسیح ابن مریم کی پرستش کرتے تھے دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔" (بخاری)

صحیح بخاری میں ایک ثوب مُصَلّب کا ذکر ہے یعنی ایسا کپڑا جس میں صلیب کی شکل بُنتی میں بنائی گئی تھی اور حضرت عائشہؓ نے آنحضرتؐ کے حکم سے اس حصے کو کاٹ دیا تھا۔ کیونکہ اس سے نماز میں خلل پڑتا تھا۔

علمائے لغت کا قول ہے کہ نصاریٰ صلیب کو بطور قبلہ بھی استعمال کرتے تھے یا اس سے حضرت عیسٰیؑ کی مصلوب تصویر کے سامنے دعا کرنے کی نصرانی رسم کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

صلیبی جنگیں

عیسائی یورپ اور اسلامی مشرق وسطیٰ کے درمیان ہونے والی مذہبی جنگیں اور مہمات۔

یورپ کی عیسائی سلطنتیں مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر تقریباً دو سو سال (۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء سے ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء) تک مشرق وسطیٰ پر مسلسل چڑھائی کرتی رہیں جن کا بظاہر مقصد مقامات مقدسہ کو مسلمانوں کے قبضے سے چھیننا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور کشش بھی ان کو اس طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ فلسطین کی زمین اور باقی اسلامی مشرق وسطیٰ پر قبضہ کرکے یہاں کی دولت و ثروت اور وسائل کو اپنے تصرف میں لانا چاہتے تھے۔

ان جنگوں میں شریک ہونے والے عیسائی پوپ اربن ثانی کی اسی اپیل پر آگے بڑھے تھے جو اس نے صلیب کے نام پر کی تھی اور پھر اپنی مہموں میں بھی صلیب ہی کو جنگی علَم کے طور استعمال کیا گیا۔ اسی مناسبت سے ان کا نام صلیبی جنگیں رکھا گیا۔ ان جنگوں میں شریک ہونے والے "صلیبی جنگجو" کہلاتے۔

یہ معروف صلیبی جنگیں گو پانچویں صدی ہجری اور گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوئیں۔ لیکن بہرصورت ان کے بنیادی محرکات کی تلاش میں ہمیں اس وقت سے بھی پہلے کی تاریخ کے بارے میں جاننا ہوگا۔ کیونکہ ان جنگوں کے تاریخی پس منظر کے بغیر ہمیں اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں دشواری ہوسکتی ہے۔ ______ بحر متوسط دو پانی کے قطعوں پر مشتمل ہے، ایک مغربی اور دوسرا مشرقی۔ مغربی قطعہ آب پر لاطینی تہذیب نے جنم لیا اور جب اس پر عیسائیت کا غلبہ ہوگیا تو اس کی مذہبی بنیادوں پر عیسائی حکومت قائم ہوگئی۔ ادھر مشرقی قطعۂ آب کے ساحل سے یونانی تہذیب اٹھی جس کی نمائندگی کا شرف یونانی کلیسا اور مشرقی رومی سلطنت کو حاصل ہوا۔

ساتویں صدی عیسوی یعنی پہلی صدی ہجری میں جب اسلام ایک مضبوط اور توانا قوت کی حیثیت سے آگے بڑھا تو ایک طرف بوزنطی سلطنت سے اس کا تصادم ہوا اور دوسری جانب اندلس اور فرانس میں مسلمانوں کا مقابلہ عیسائی حکومتوں سے ہوا۔ گو صلیب و ہلال کے درمیان ہونے والے ان معرکوں کی بھی اپنی اہمیت اور حیثیت ہے لیکن ہم انہیں "حروب صلیبیہ" کا اصطلاحی نام نہیں دے سکتے۔ جن جنگوں کو ہم اصطلاحی معنوں میں صلیبی جنگیں کہتے ہیں اُن کی اہمیت یوں زیادہ ہے کہ ان کی بدولت مغربی عیسائیت مشرقی عیسائیت سے آن ملی اور اگرچہ دونوں میں تاریخی رقابت اور عداوت موجود تھی لیکن اسلام کے خلاف دونوں نے سمجھوتہ کرکے مسلمانوں کے مقابلے پر محاذ قائم کر لیا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں صلیبی جنگوں کے آغاز سے قبل اسلامی مشرق وسطیٰ میں دو اہم واقعات رونما ہوئے جو آگے چل کر صلیبی جنگوں کا سبب بن گئے۔

بغداد پر سلجوقی ترکوں کی حکمرانی تھی اور وہ اس قدر طاقتور ہو چکے تھے کہ ۴۶۲ھ/۱۰۷۰ء میں انہوں نے مصر کے فاطمیوں سے شام چھین لیا۔ فاطمیوں کو اس کا سخت رنج ہوا اور اس رنج کی صورت یہ نکلی کہ فاطمی وزیر افضل بن بدر الجمالی سلجوقی ترکوں کے خلاف صلیبیوں کے ساتھ ساز باز کرنے سے بھی باز نہ آیا۔ پھر مصر پر قبضہ کرنے کے اگلے ہی سال سلجوقی ترکوں نے بوزنطیوں کو ایشیائے کوچک میں ایسی فیصلہ کن شکست دی کہ بوزنطی سلطنت متزلزل ہو گئی۔ اور اس طرح بوزنطی شہنشاہ بھی ایشیائے کوچک میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کے لیے پوپ سے فریاد کرنے پر مجبور ہوگیا۔ یہی دو واقعات پہلی صلیبی جنگ کا ہراول بنے لیکن ان دو اسباب کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا۔ نجی شہادت کے ساتھ موجود ہے یورپی جاگیرداروں کے وہ وراثت سے محروم چھوٹے بیٹے جن کے لیے اب اپنے وطن میں کوئی کشش یا فائدہ نہ رہا تھا۔ اسلامی مشرق میں قسمت آزمائی کرکے نوآبادیاں قائم کرنا چاہتے تھے۔

ایک اور بنیادی اہمیت کا سبب یہ بھی تھا کہ جاگیرداری نظام کی روزافزوں ترقی اور بادشاہوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے مغربی یورپ کے لیے دو اہم خطرات پیدا کردیئے تھے۔ ایک طرف تو اس جنگجو معاشرے کی باہمی عداوت و منافرت سے شدید تصادم کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا دوسرے پوپ کا روحانی اقتدار خطرے میں تھا۔ چنانچہ مغربی عیسائیت کی وحدت کو برقرار رکھنے اور پاپائیت کے اقتدار کو بحال رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلسل اکسانے اور بےچین رکھنے والی ان قوتوں کا رخ بدلا جائے جو کوئی رخ نہ ملنے کی صورت میں عیسائی معاشرے کے لیے تباہی کا سبب بن سکتی تھیں۔

مغربی یورپ کے مذہب پرست عیسائیوں کو گناہ بخشوانے اور تزکیہ نفس کے لیے بیت المقدس کی زیارت کے لیے آنا پڑتا تھا۔ زائرین کے گروہ بلا روک ٹوک مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ لیکن سلجوقی ترکوں نے اپنے سیاسی غلبے کے بعد زائرین کو ملکی قوانین کا احترام کرتے ہوئے آگے بڑھنے اور راستے کی آبادیوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنے پر مجبور کردیا جس کے نتیجے میں یورپ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عناد کی آگ بھڑک اٹھی اور مقامات مقدسہ تک پہنچنے کے راستوں کو آزاد کرانا دینی فریضہ قرار پایا۔ یہ صلیبی جنگوں کا پہلا سبب تھا۔

۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء میں کلیرماؤنٹ کے تاریخی اجتماع میں مسلمانوں کے خلاف "مقدس جنگ" کا اعلان کیا گیا جس پر سب نے لبیک کہا اور زائرین کے مسلح قافلوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔

اٹلی کی تجارتی بندرگاہ کے تجارتی عزائم نے چھپے سبب کا کام دیا۔ ان کے تجارتی جہاز زائر مجاہدوں کی نقل و حمل کے پردے میں تجارتی مال بھی لانے اور لے جانے لگے۔ اس طرح مقدس جہاد کا رشتہ تجارتی نفع اندوزی سے جا ملا۔

ادھر اسلامی مشرق وسطیٰ کے اولوالعزم بادشاہ ملک شاہ سلجوقی کا انتقال ہو چکا تھا اور ۱۰۹۵ء میں شام و فلسطین کے مدبر اور بہادر حکمران سلطان تتش کے قتل کے بعد کوئی ایسا حکمران باقی نہیں رہا تھا جو صلیبی یلغار کو روکنے کا دم خم رکھتا ہو۔ چنانچہ پوپ اربن ثانی کو جب بوزنطی شہنشاہ نے مقبوضہ علاقوں کی سلاجقہ سے واپسی کے لیے عسکری امداد کی درخواست کی تو پوپ نے اسے غنیمت جانا۔ شہنشاہ نے گو فقط چند فوجی دستوں کی درخواست کی تھی لیکن پوپ جانتا تھا کہ یورپ میں اپنا روحانی اقتدار جمانے اور اسلامی مشرق پر کاری زخم کا اس سے اچھا موقع ہاتھ نہیں آسکتا۔ چنانچہ فرانس کے شہر اوفرن میں کلیرماؤنٹ کے تاریخی اجتماع میں صلیبی جنگوں کو خدا کی مشیت قرار دیا اور مغربی یورپ کو اسلامی مشرق پر ٹوٹ پڑنے کی تلقین کی اور بتایا گیا کہ مقدس جنگ سے بیت المقدس کی تسخیر کے علاوہ ایشیائی ممالک کی دولت و ثروت پر بھی مکمل قبضہ کرنا مقصود ہے۔

پوپ اربن ثانی نے کہا: "بیت المقدس کو بہانہ بناؤ اور ارض مقدس کو مسلمانوں سے چھین کر خود اس کے مالک بن جاؤ۔ یہ سرزمین تمہاری ہے اور اس سے ان کافروں (ملت اسلامیہ) کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ارض مقدس کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ اس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہیں۔"

آخرکار اس ساری منصوبہ بندی اور تیاری کے بعد ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء میں پہلا صلیبی حملہ ہوا جس کے نتیجے میں شام اور فلسطین میں چار آزاد عیسائی ریاستیں

(بیت المقدس، انطاکیہ، طرابلس اور الرہا) قائم ہوئیں۔ اس حملے میں مختلف یورپی ممالک کی مسلح زائرین کی جو جماعتیں شریک ہوئیں ان کا ظاہری مقصد بیت المقدس تک رسائی کے لیے عیسائی زائرین کو سہولتیں مہیا کرنا تھا لیکن باہمی مخاصمت اور عدم تنظیم ہونے کے باوجود ان کا سامنا جب سلجوقی ترکوں سے ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ سلجوقیوں میں وحدت عمل اور اتفاق مفقود ہے اور پھر انہیں بعض غدار سلجوقی قائدین کا تعاون بھی حاصل ہوگیا۔ اس سے صلیبیوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ اور وہ قلعے پر قلعے فتح کرکے وہاں اپنی ریاستیں قائم کرنے لگے۔ اور اس ہوس میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ انھیں زیارت بیت المقدس کا مقدس فریضہ تک بھول گیا۔ اور وہ کہیں تین سال بعد یعنی ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں بیت المقدس میں داخل ہوسکے۔

صلیبیوں کی یہ یلغار جس تیزی اور قوت کے ساتھ بڑھ رہی تھی ممکن تھا کہ شام اور مصر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی، عماد الدین زنگی اور اس کا بیٹا نور الدین زنگی صلیبیوں کے آگے ڈٹ گئے۔

دوسری صلیبی جنگ کا آغاز ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں جرمنی کے بادشاہ کونراد ثالث اور فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم کی قیادت میں ہوا۔ اس کا بڑا مقصد مشرق میں عیسائی اقتدار کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینا اور الرہا کی عیسائی ریاست کو دوبارہ حاصل کرنا تھا جسے عماد الدین زنگی نے ختم کر دیا تھا۔ صلیبیوں کا یہ حملہ بالکل ناکام رہا۔ اور دو سال کی ناکام جد وجہد کے بعد ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں دونوں بادشاہوں کو بڑی ذلت کے ساتھ واپس جانا پڑا۔

تیسری صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین ایوبی کی شاندار فتوحات کے ردِ عمل میں ہوئی۔ سلطان نے ۵۶۶ھ/۱۱۷۱ء میں مصر سے فاطمی خلافت ختم کرکے وہاں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ جاری کر دیا تھا اور مصر پہ اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔ پھر نور الدین زنگی کے انتقال کے بعد اسلامی قوتوں میں اتحاد اور تنظیم پیدا کرنے کی کوششیں بھی سلطان ہی کی محنت کا نتیجہ تھیں۔ صلاح الدین نے شام اور فلسطین کی یکے بعد دیگرے تمام ریاستیں ختم کر دیں اور بیت المقدس کو دوبارہ فتح کر لیا۔ حتیٰ کہ عیسائیوں کے پاس انطاکیہ، طرابلس اور صور کی ریاستوں کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رہا۔

بیت المقدس چھن جانے کے باعث عیسائیوں میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ اور تیسرا صلیبی حملہ اس کا ردِ عمل تھا۔ اس میں جرمنی کے بادشاہ فریڈرک باربروسا، انگلستان کے بادشاہ رچرڈ شیر دل اور فرانس کے بادشاہ فلپ آگسٹس نے شرکت کی۔ ان میں سے جرمنی کا بادشاہ تو ایشیائے کوچک کے ایک دریا میں ڈوب کر مرگیا اور فرانس کا بادشاہ، رچرڈ سے اختلاف کی بنیاد پہ دو سال عکا کا محاصرہ کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ البتہ رچرڈ شیر دل سلطان صلاح الدین ایوبی سے صلح کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس معاہدہ صلح کو تاریخ میں "صلح رملہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی رو سے عکا سے یافہ تک کے ساحلی شہر عیسائیوں کو دے دیئے گئے اور عیسائیوں کو زیارت بیت المقدس کی پوری آزادی مل گئی۔

۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں سلطان صلاح الدین کے انتقال کے دو سال بعد یعنی ۵۹۱ھ/۱۱۹۵ء میں پاپائے روم کی دعوت پر جرمن بادشاہ ہنری ششم کی قیادت میں چوتھا صلیبی حملہ کیا گیا مگر عکا پہنچ کر بادشاہ کا انتقال ہوگیا اور یوں یہ حملہ ناکام رہا۔

پھر پانچواں حملہ شروع ہوا۔ اس کی دعوت پاپائے روم اور قسطنطنیہ کی طرف سے مشترکہ طور پہ دی گئی تھی۔ اس میں قبرص، ارمینیا، آسٹریا اور ہنگری کے حکمران شریک ہوئے۔ چونکہ اس جنگ میں جرمنی اور فرانس کے نوعمر لڑکے شریک ہوئے تھے اس لیے اسے "حملۂ اطفال" بھی کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے دوران ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں صلیبیوں کو مصر کے مشہور شہر دمیاط میں عبرتناک شکست ہوئی اور بالآخر الملک العادل کے بیٹوں سے معاہدۂ صلح کرکے واپس ہونا پڑا۔

متحدہ عیسائی یورپ کا چھٹا حملہ ۶۲۴ھ/۱۲۲۸ء میں شاہ جرمنی فریڈرک دوم کی قیادت میں ہوا۔ اس کے نتیجے میں الملک الکامل کے ساتھ صلیبیوں کا نیا معاہدۂ صلح طے پایا۔ اور بیت المقدس ایک بار پھر صلیبیوں کے حوالے کر دیا گیا لیکن ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں الکامل کے بھائی المعظم نے بیت المقدس سے صلیبیوں کو نکال باہر کیا۔

اسی ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ ہلال و صلیب کا معرکہ گرم تھا، ایشیا میں ایک نئی عظیم قوت اٹھی جس سے پوپ اور یورپ کے بادشاہوں نے بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں اور یہ عظیم قوت تھی چنگیز خاں کی قائم کردہ مغول سلطنت۔ پوپ نے مغول حکمرانوں کو عیسائی بنانے کے لیے کئی ایک تبلیغی وفود بھیجے اور یورپ کے عیسائی حکمرانوں نے اپنے سفارتی ذرائع سے حتی الوسع ان سے اپنی حمایت حاصل کرنے اور عالم اسلام کے خلاف بھڑکانے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔

اگرچہ تیرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے آغاز میں مغول نے بغداد کی عباسی خلافت کا تو خاتمہ کر دیا لیکن شام اور مصر کے بارے میں نہ تو مغول کی آرزوئیں پوری ہوئیں اور نہ وہ عیسائی صلیبیوں کے حامی بن کر مسلمانوں کو بیت المقدس سے نکال سکے بلکہ ہوا یوں کہ مصر میں مملوک ترکوں کی جس سلطنت کی بنیاد ایک ذہین اور ہوشیار ترک خاتون شجرۃ الدر نے رکھی تھی، اس کے بادشاہوں اور قائدین نے نہ صرف یہ کہ مغول کی یلغار کو روک دیا بلکہ شام میں انہیں پے درپے ایسی شکستیں دیں کہ جنہوں نے ان کی عسکری قوت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ان ہی مملوک سلاطین نے ارض مقدس سے عیسائیوں کے آخری نشانات بھی مٹا دیے ہے۔

مملوک ترک سلطان ظاہر بیبرس نے ۱۲۶۱ء سے ۱۲۷۱ء تک مسلسل دس سال صلیبیوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء میں اس نے

انطاکیہ کی عیسائی ریاست کا خاتمہ کر دیا جس سے صلیبیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ چنانچہ پاپائے روم کی دعوت پر فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے صلیبی قیادت سنبھالنا قبول کر لیا۔ یہ صلیبیوں کا آخری بڑا حملہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ حملہ شمالی افریقہ میں تونس کے ناکام محاصرے پر ختم ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صلیبی لشکر میں ایک مہلک وبا پھوٹ پڑی جس میں لوئی نہم بھی ختم ہو گیا۔ اس حملہ آور لشکر کا ایک حصہ انگلستان کے ولی عہد شہزادہ ایڈورڈ کی قیادت میں عکّا پہنچ گیا۔ شہزادے نے فارس کے مغول کو مصر و شام کے مملوک ترکوں پر حملہ کرنے کی دعوت دی مگر ناکام رہا اور بالآخر ظاہر بیبرس سے معاہدۂ صلح کرنے پر تیار ہو گیا جس کے نتیجے میں ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۱ء میں قیساریہ کا تاریخی معاہدہ طے پایا۔

ظاہر بیبرس کے بعد مصر و شام کی مملوک سلطنت کے تخت پر الملک المنصور سیف الدین قلاوون بیٹھا تو شام اور فلسطین میں چار عیسائی ریاستیں موجود تھیں:

۱۔ حصن المرقب ۲۔ طرابلس ۳ طرطوس ۴۔ عکّا۔

لیکن ۱۲۹۰ء میں جب وہ فوت ہوا تو صرف عکّا کی ساحلی ریاست باقی رہ گئی تھی۔

سیف الدین قلاوون بہادر سپاہی اور ماہر جنگجو ہونے کے علاوہ بیدار مغز سیاست دان بھی تھا۔ اس نے جب اسلامی مشرق سے صلیبیوں کے اخراج کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے بیرونی خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ کر

غازی صلاح الدین ایوبی

لیا۔ اس نے مشرق کے ہمسایہ ملکوں سے تعاون اور صلح کے معاہدے طے کیے اور دوسری جانب یورپ کے بعض بادشاہوں کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔ اس کے نتیجے میں یورپ داخلی جنگوں اور خلفشار کا شکار ہو گیا۔ سیف الدین نے تین عیسائی ریاستیں ختم کر دیں۔ چوتھی ریاست عکّا کو وہ فتح نہ کر سکا تھا اور یہ کام اس کے نوجوان بیٹے اور جانشین الملک الاشرف خلیل نے سرانجام دیا۔ اس نے ربیع الثانی ۶۸۹ھ/ اپریل ۱۲۹۰ء میں عکّا کا محاصرہ کر لیا۔ اور آخر کار ۱۷ ر جمادی الآخر ۶۹۰ھ/ ۱۸ر مئی ۱۲۹۱ء میں صلیبیوں کا یہ آخری قلعہ بھی فتح ہو گیا۔ یوں صلیبی جنگوں کا وہ ہولناک ڈرامہ انجام کو پہنچا جسے پوپ اربن ثانی نے شروع کیا تھا۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ان جنگوں میں عیسائی یورپ نے ہمیشہ جارحیت کا کردار ادا کیا۔ جبکہ مسلمان سلاطین اور قائدین کا رویہ مدافعانہ رہا۔ وہ ہمیشہ عیسائیوں کی جارح اور متحدہ قوت کے سامنے ڈٹ جانے پر مجبور ہوتے رہے۔

ان صلیبی جنگوں کا علمبردار ہونے کا شرف فرانس کو حاصل ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلی آواز فرانس ہی میں اٹھی تھی اور اس پر لبیک کہنے والے بھی فرانس ہی کے لوگ تھے۔ اس کے علاوہ ان جنگوں کا مثالی سپاہی بھی فرانس کا بادشاہ سینٹ لوئی تھا اور آخری حملہ بھی فرانسیسی بادشاہ لوئی نہم کی قیادت میں ہوا۔

صلیبی جنگوں سے جو نتائج برآمد ہوئے اور مشرق و مغرب پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ دُور رس بھی تھے۔ مجموعی طور پر ان سے مغرب کو فوائد زیادہ اور نقصان کم ہوئے۔ اس کے برعکس اسلامی دنیا کو ان جنگوں سے جو نقصانات ہوئے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جو فوائد حاصل ہوئے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ پوپ اربن کے اعلانِ جنگ سے عیسائی یورپ کا جو عسکری سیلاب اسلامی مشرق کی طرف بڑھا تھا اور دو سو سال تک اس کے ساحل سے ٹکراتا رہا تھا اس کا زور گو تیرھویں صدی کے خاتمے کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا لیکن اس کے باوجود مختلف صورتوں میں آئندہ دو صدیوں تک اس کا تموج اپنے وجود کا پتہ دیتا رہا۔ اس طرح تقریباً چار پانچ سو سال تک کا یہ سلسلہ اپنے ساتھ کتنے دُور رس امکانات اور تبدیلیاں لایا ہو گا۔ اس کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں۔

بوزنطی شہنشاہ، جس نے سلاجقہ سے اپنے مقبوضہ علاقے خالی کرانے کے لیے صلیبیوں سے امداد طلب کی تھی۔ عیسائیوں کے مشرق میں پہنچتے ہی تمام صورت حال سے آشنا ہو گیا۔ اس نے ان کو اپنی سلطنت کے استحکام میں مدد دینے کے لیے بلوایا تھا نہ کہ اس کے کھنڈرات پر اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کی دعوت دی تھی چنانچہ پہلے صلیبی حملے کے وقت ہی بوزنطیوں نے صلیبیوں سے سرد مہری شروع کر دی تھی۔ ان یورپی عیسائیوں کے حملہ آور لشکروں نے جس جس طرح خونریزی اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا وہ تاریخ میں عبرتناک واقعہ کے طور پر محفوظ ہے۔

ان صلیبی جنگوں کا یورپ کو بہت اقتصادی فائدہ پہنچا۔ جنگوں سے قبل تک تو فقط زمین کی پیداوار پر محاصل وصول کیے جاتے تھے لیکن صلیبی جنگوں کے شروع ہوتے ہی یورپ میں محاصل کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تو جنگ کے جنگوں سے عیسائیوں کو پہنچا وہ یورپی عوام میں متحدہ یورپ کا تصور تھا۔ باہمی طور پر گو وہ بہت نزاعی اور اختلافی صورت حال سے دوچار رہتے تھے لیکن اسلام کے خلاف ان کا محاذ منظم اور متحد تھا۔ تیرھویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک یورپی عیسائی مفکرین اور سیاسی زعما برابر غور و فکر اور منصوبہ بندی کرتے رہے کہ کس طرح یورپ کی قوت کو مجتمع کر کے مشرقی یورپ سے عثمانی ترکوں کو باہر نکالا جائے۔

صلیبی جنگوں کے نتیجے میں طاقت کا توازن بھی بدل گیا اور بوزنطی سلطنت کی بجائے اب یورپ کی طاقت کا مرکز مغربی یورپ کا ملک فرانس بن گیا، کیونکہ فرانس نے صلیبی جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔

صلیبی جنگوں کے نتائج میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ایشیا اور افریقہ کی دولت نے یورپی صلیبیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور یورپ کے اہلِ فکر و نظر نے اس دولت کے استحصال کا فیصلہ کیا۔ صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد پوپ اور اہلِ کلیسا کی نظر

مغلوں کی عروج پذیر قوت پر پڑی اور انہوں نے انہیں عیسائی بنا لینا چاہا، تاکہ اسلامی دنیا محکوم و مجبور ہو جائے چنانچہ بہت سے پادری اور تبلیغی مشن روانہ کیے گئے لیکن انھیں کوئی کامیابی نہ ہوئی بلکہ چودھویں صدی عیسوی کے شروع

بیت المقدس کا ایک منظر

میں فارس کے تمام خوانین نے اسلام قبول کر لیا۔

صلیبی جنگوں کے زمانے میں عالم اسلام مجموعی طور پر روبہ زوال تھا۔ باہمی مخاصمت اور افتراق پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے شام، فلسطین اور مصر کے سوا باہر کی اسلامی دنیا کو اس کا بہت کم احساس ہوا۔ یہ بات معجزہ سمجھی جاتی ہے اور ماہرین حرب اس بات پر حیران ہیں کہ یورپی عیسائیوں کے متحدہ لشکری سیلاب کے سامنے مصر و شام جیسے دو چھوٹے چھوٹے ملک کس طرح ڈٹ گئے اور ان میں عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی، محمود زنگی، صلاح الدین ایوبی، الملک العادل، ظاہر بیبرس اور سیف الدین قلادون جیسے اولوالعزم قائدین کیسے پیدا ہوگئے۔ جن کی عظمت کا لوہا ان کے دشمن بھی مانتے ہیں۔

عسکری محاذ پر زبردست ناکامی کے بعد یورپ کے اہلِ کلیسا نے مسلمانوں کو فکری محاذ پر شکست دینے کی کوششیں شروع کر دیں اور اسلامی علوم کی حفاظت و تحقیق کے پردے میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے اور اُسے پھیلانے کا منصوبہ بنایا اور آج بھی اس منصوبہ بندی پر عمل

بیت المقدس کا ایک اور منظر

جاری ہے۔

صلیبی جنگوں کی ایک اہم یادگار وہ علمی و ادبی سرمایہ ہے جو اس تاریخی تصادم اور اختلاط کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اس سرمائے میں مسلمان اہل علم سے متاثر ہو کر مسیحی علماء نے جو کارنامے انجام دیے وہ بھی شامل ہیں اور صلیبی دور اور صلاح الدین ایوبی کے عہد کا عظیم شعری و ادبی سرمایہ بھی ہے۔

صنعا

یمن کا پایہ تخت جو وادی کوہ میں مشرقی سراۃ پر واقع ہے۔ یہ وادی مغرب میں جبل عیبان کی پہاڑیوں کے سلسلے تک کھلی ہے۔ مشرق کی طرف اس شہر پر جبل نقم سایہ فگن ہے جو اس کی سطح سے ۱۶۰۰ فٹ اونچا ہے۔ سطح سمندر سے ۷۲۰۰ فٹ بلند ہونے کی وجہ سے اس کی آب و ہوا معتدل ہے۔ گرمی کے موسم میں یہاں دن بھر ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ سردیوں میں درجہ حرارت رات کو صفر تک گر جاتا ہے جس سے برف پڑنے لگتی ہے۔ موسم بہار اور وسط گرما میں بہت بارش ہوتی ہے۔ خشک گرمیاں کم ہوتی ہیں لیکن جب ہوتی ہیں تو بہت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

صور

فینقیہ کا ایک شہر جو ایک جزیرے میں آباد ہے۔ عہد عمارنہ سے اس شہر کا شمار شامی ساحل کے مالدار تجارتی مرکزوں میں ہوتا تھا۔ سکندر کے ہاتھوں اس شہر کی فتح اور تباہی نے اس خوشحال شہر کو تھوڑے عرصے کے لیے اس کی اہمیت سے محروم کر دیا۔ لیکن اس سے ایک اور اہم نتیجہ برآمد ہوا کہ جزیرے پر آباد یہ شہر برّ اعظم کی اصل زمین سے سد اسکندری کے ذریعے مل گیا۔

شرجیلؓ بن حسنہ نے دمشق پر قبضہ کرنے کے بعد صور اور صفوریہ کو بھی دوسرے مقامات کے ساتھ ساتھ لے لیا۔

صوفی

یہ اصطلاح سب سے پہلے کوفہ میں آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جابر ابن حیان شیعی اور ابوہاشم مشہور صوفی کے لیے استعمال کی گئی۔ محاسبی اور جاحظ کے قول کے مطابق صوفی لقب ان شیعہ مسلک رکھنے والے کوفیوں کے لیے استعمال ہوا

جنہوں نے ترک لحم کیا اور صرف سبزی خوری پہ اکتفا کیا۔ ان کا آخری لیڈر عبدک الصوفی ۲۱۰ھ/۸۲۵ء میں فوت ہوا۔ پچاس سال کے اندر اندر یہ لقب تمام عراق کے صوفی منش لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کے دو سو سال بعد تمام اسلامی ممالک میں اس کا رواج ہو گیا۔ (مزید دیکھیے : "تصوّف")

صوق وللی

محمد صوق وللی عثمانیوں کے عہد کا ایک بالغ نظر اور مدبرانہ ذہن رکھنے والا وزیر جو اپنے حکمرانوں کے دلوں میں اپنے لیے بہت اعتماد رکھتا تھا۔ سلیمان اعظم کے بعد جب سلیم ثانی تخت نشین ہوا تو اپنی نا اہلی اور عیش و عشرت کے باعث عنان اقتدار سنبھال کر معاملاتِ حکومت چلانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اس کے عہد میں نظامِ حکومت کی حقیقی باگ ڈور سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ صوق وللی کے ہاتھ میں تھی۔

صوق وللی نے عثمانی سلطنت و حکومت کو مستحکم کرنے اور سلطنت سے باہر کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے بہت اہم تجاویز پیش کیں اور ان پر حتی الوسع سعی کر کے عمل کی کوشش کی۔ اس نے دولتِ عثمانیہ کی سرحدوں کو پھیلانے میں بہت نمایاں خدمت سر انجام دی ؛

صومالیہ

مشرقی افریقہ کی ایک آزاد اسلامی جمہوریہ۔ اس کا قیام یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو عمل میں آیا۔ موجودہ رقبہ ۲۴۶۱۵۵ مربع میل اور آبادی ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۷۰۰۰۰۰ ہے۔ مقامی آبادی تقریباً ۷۵ فیصد ہے لگ بھگ ۸۰۰۰۰ کے قریب بنتو اور سواحلی بولنے والے جنوبی ساحلوں پر آباد ہیں اور ۴۰۰۰۰ کے لگ بھگ عرب، ایرانی، پاکستانی، بھارتی اور ایتھوپیا کے تارکینِ وطن ہیں۔

آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ بعض علاقوں میں سال کے کچھ حصّوں میں درجۂ حرارت ۱۰۵ ڈگری فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے اور سالانہ بارش کا اوسطاً ریکارڈ تقریباً تین انچ ہے۔ لیکن زمین کی ریتلی سطح کو نیچے تک کھود کر پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ برآمدات میں جانوروں کی کھالیں، کیلے، ربڑ اور کچھ دوسری اشیاء شامل ہیں۔ اس سرزمین پر پٹرولیم مل جانے کے امکانات روشن ہیں اور کہیں کہیں یورینیم کا سراغ بھی ملا ہے۔ ریلوے لائن بہت مختصر سی جگہ پر ہے۔ سڑکیں البتہ سفر کے لیے بنائی گئی ہیں۔ بحری راستہ کوئی نہیں ہے۔

جوار اور باجرہ یہاں کی خاص پیداوار ہے اور برآمدات میں سب سے زیادہ اہمیت کیلے کو حاصل ہے جو ملک کے کثیر حصّے میں آبپاشی کر کے کاشت کیا جاتا ہے۔ زندہ جانور بھی برآمد کیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر تجارت روس، اٹلی اور کینیا سے ہوتی ہے۔ صومالیہ کی بندرگاہیں تجارتی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔

صومالیہ میں پارلیمانی نظام حکومت رائج ہے۔ ۱۲۲ ممبروں کی قومی اسمبلی انتظامی اختیارات کی مالک ہوتی ہے، اور اس کا انتخاب پانچ سال کے لیے ہوتا ہے۔ ملک کا سربراہ صدر ہوتا ہے جس کا انتخاب قومی اسمبلی چھ سال کی مدت کے لیے کرتی ہے لیکن انتظامی اختیارات کا استعمال وزیرِ اعظم کرتا ہے جو اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے معیّنہ مدّت کے لیے حکومت تشکیل دیتا ہے۔

تاریخی طور پر صومالیہ کے مقامی لوگ بہت مدّت پہلے ایتھوپیا سے ترکِ وطن کر کے یہاں آئے اور انہوں نے یہاں پر پہلے سے آباد بنتو بولنے والوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ اٹھارہویں صدی میں زنجبار کے سلطان نے اس ملک کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۷۴ء-۱۸۸۵ء کے دوران مصریوں نے اس پر اپنا تسلّط قائم کر لیا۔ اور یہ تسلّط اس وقت ختم ہوا جب برطانیہ نے صومالیہ کے ایک حصّے پر حملہ کر کے اسے مصریوں سے آزاد کرا لیا۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۰ء تک برطانیہ اور اٹلی کی فوجوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں کیونکہ صومالیہ کے ایک حصّے پر ۱۸۸۹ء میں اٹلی نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کے دوران اٹلی نے اس پر باقاعدہ کنٹرول حاصل کر لیا اور اس کو ایتھوپیا پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کرنے کا پروگرام بنایا اور اسے اٹلی کی ایک نو آبادی کی حیثیت دے دی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس پر اٹلی کا تسلّط بھی ختم ہو گیا اور یہ علاقہ برطانیہ کے زیرِ اثر آ گیا۔

۱۹۴۹ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس بات کے حق میں قرارداد پاس کی کہ جنوبی صومالیہ کا علاقہ اٹلی کو واپس کر دیا جائے تاکہ دس سال کے عرصے میں اٹلی اسے ایک آزاد ریاست کے طور پر تیار کر سکے۔

یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو جبکہ اٹلی کی دس سالہ سرپرستی کی مدت ختم ہو گئی۔ اٹلی اور برطانیہ کی مشترکہ کوششوں سے صومالیہ کی آزاد ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ عبداللہ عثمان کو پارلیمنٹ نے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا اور عبدالرشید کا انتخاب بحیثیت وزیرِ اعظم عمل میں آیا۔ اس طرح صومالیہ نے آزادی کا سفر شروع کیا ؛

صہیبؓ بن سنان

صحابیِ رسولؐ۔ کنیت ابو یحییٰ، والد کا نام سنان، والدہ کا نام سلمیٰ بنت مقید مسکن الجزیرہ۔ والد اور چچا شہنشاہ ایران کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے عامل تھے۔ رومی افواج ابلہ پر حملہ کے وقت انہیں بھی ساتھ لے گئیں۔ اس وقت کم سن تھے، بڑے ہونے پر وہاں فروخت ہوئے اور بنو کلب خرید کر مکہ لے آئے۔ جس وقت وہ مکہ آئے اس وقت اسلام کی تبلیغ نہایت خاموشی سے ہو رہی تھی اور بڑی حد تک لوگ خفیہ طور پر اسلام قبول کر رہے تھے۔ تبلیغ اسلام کی موجود روشنی میں نے انھیں ہدایت کی راہ دکھائی اور وہ حضور اکرمؐ کے پاس پہنچ کر اسلام لے آئے۔ آپ اس جماعت میں شامل ہیں جو شاعت اسلام کے ابتدائی تین سالوں میں خفیہ طور پر منظم مسلمانوں کی پہلی جماعت کہلاتی ہے اور آپ اس میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔

آپ مہاجرین مکہ میں سے آخری مہاجر تھے جو ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ آپ تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے لہٰذا تمام غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی تیر اندازی کے جوہر دکھاتے حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق ان کے بعد تین روز تک خلیفہ رہے جب تک کہ مجلس شوریٰ نے نئے خلیفہ کا انتخاب نہ کر لیا۔

آپ مہمان نوازی اور سخاوت میں مشہور تھے۔ حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی بہت شہرت رکھتے تھے۔

۳۸ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ حضورؐ کے مقتدر صحابہ میں شمار کیے جاتے ہیں ؛

صیہون

(۱) عبرانی میں صیون (SIYON) تلفظ ہے۔ صیہون بھی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ یاقوت کے بیان کے مطابق یروشلم کا ایک مشہور مقام ہے یعنی وہ محلہ جہاں صیہون کی عبادت گاہ ہے۔ مسلمانوں کی ادبیات میں اس مسجد کو جو صیہون کی پہاڑی پہ واقع ہے، وہ مقام سمجھا جاتا ہے جہاں حضرت مریمؑ (حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ) اور حضرت یوسفؑ نے اپنی جوانی کے زمانے میں عبادت گاہ کی خدمت کی تھی۔ صہیون (صیہون) کا ذکر قدیم زمانے میں ایک شاعر نے یوں کیا کہ وہ ایک سلطنت ہے جو شاید عربوں کے خلاف ایک فوج تیار کر لیتی ہے۔ شارحین کے مطابق اس سے مراد بوزنطہ ہے۔ البکری کے قول کے مطابق یہ ایک قبیلے کا نام ہے لیکن ابن درید اس کا ذکر نہیں کرتا۔

(۲) شمالی شام میں ایک قبیلے کا نام بھی یہی کہا جاتا ہے۔ بقول یاقوت یہ بحرہ روم کے قریب ایک قلعہ ہے۔ حروب صلیبیہ کے دوران یہ فوجی قلعہ بہت عرصے تک فرانسیسیوں کے قبضے میں رہا۔ ۵۸۴ھ میں صلاح الدین ایوبی نے اس پہ قبضہ کر لیا اس مقام کو صلیبی کہتے تھے۔ اور آج تک وہ صیہون کے نام سے موسوم ہے۔

صیہونیت

ایک تحریک جس کا مقصد فلسطین میں یہودیوں کے لیے قومی وطن کا قیام تھا۔ یہ تحریک وسطی یورپ سے اٹھی لیکن اس کی زیادہ تر امداد امریکی اور یورپی یہودیوں نے کی۔ انیسویں صدی کے دوران میں اسلام دشمن تحریکیں یہودیوں کی اس تحریک کے لیے بہت ممد اور معاون ثابت ہوئیں۔

اس وقت تک بہت سے یورپی یہودیوں کے نزدیک جس کی اساس یہودی قومیت کے نظریے پہ تھی لغو اور بے معنی تھی۔ صیہونیت کی پہلی کانگریس سوئٹزرلینڈ میں باسیل کے مقام پہ ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے بھی اعلان بالفور کی رو سے یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کی تائید کی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد خفیہ طور پہ فلسطین میں ان کو آباد ہونے میں مدد دی۔ اس صورت حال سے عربوں میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا اور وہ یہودیت کی اس تحریک کی زبردست مخالفت کرنے لگے۔

۱۹۳۰ء میں انگریزوں نے ایک فلسطینی کمیشن مقرر کیا جس کی سفارشات کی بنیاد پہ فلسطین میں یہودیوں کے مزید داخلے پہ پابندی عائد کر دی گئی لیکن اس کے باوجود وہ فلسطین میں زیادہ تعداد میں آباد ہوتے رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران بھی جرمنی نازیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے بھی ایک کثیر تعداد نے فلسطین میں پناہ لی۔

امریکی صیہونی ادارے چونکہ دولت اور وسائل کے اعتبار سے بہت بااثر ہیں چنانچہ ان کی مدد سے اسلامی ملکوں کی مخالفت کے باوجود یہودیوں نے فلسطین کے ایک حصے پہ اپنی حکومت قائم کر لی۔ جس کا نام اسرائیل رکھا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل مسلم عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان مسلح تصادم کی صورت حال ہے۔ فلسطینی اپنے مقبوضہ علاقے خالی کرانے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں لیکن اسرائیل کی پشت پہ بہت سی غیر اسلامی بڑی قوتیں سرگرم کار ہونے کے باعث ابھی تک انہیں اس مقصد میں مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن فلسطینی عوام کی مسلح جدوجہد اور جوش آزادی اب اور زیادہ عرصے تک اس جبری جلاوطنی کو جو یہودیوں نے ان کا نصیب کر دی ہے، برداشت کرتے نظر نہیں آتے۔ (مزید دیکھیے: "اسرائیل)

ض

ضحاک بن قیس
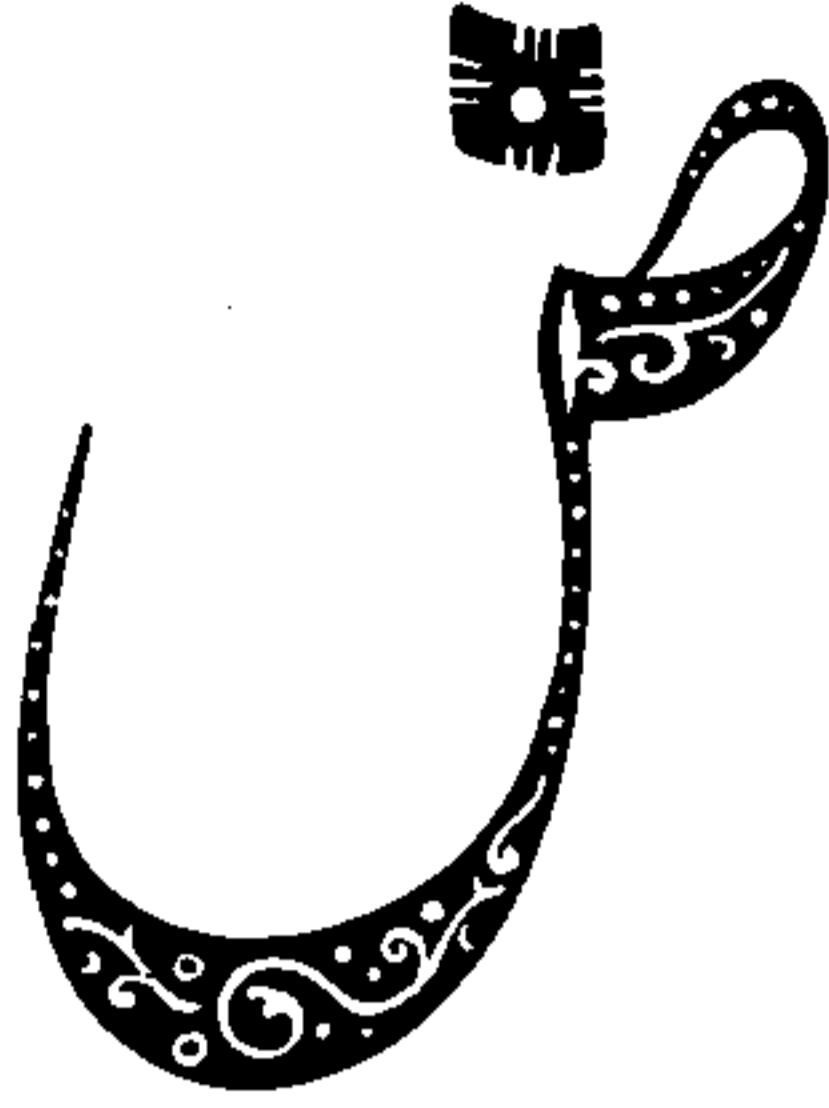
شیعیان بنی ہاشم کی شہ پر ایک ہاشمی بزرگ عبد اللہ بن معاویہ نبیرہ حضرت جعفر طیار نے کوفہ پر خروج کیا تو عراق کے والی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بن عبد العزیز کے جھنڈے تلے ایک جمعیت کثیر نے جمع ہو کر عبد اللہ بن معاویہ کی قوت توڑ دی۔ بنو امیہ کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے دیرینہ رفیق خوارج نے کوفہ پر حملہ بول دیا۔ ان کی قیادت ضحاک بن قیس شیبانی نے کی۔ عبد اللہ بن عمرؓ بن عبد العزیز نے مدافعت کی لیکن زک اٹھا کر کوفہ چھوڑ کر عازم واسط ہوئے۔ ضحاک ان کے تعاقب میں واسط پہنچا۔ طویل معرکہ آرائی کے بعد عبد اللہ نے صلح کا ہاتھ بڑھایا اور واسط بھی ضحاک کے قبضے میں آ گیا۔ اس اثنا میں سلیمان بن ہشام بھی ضحاک سے آ ملا اور ان کی طاقت میں اضافہ ہو گیا اس نے موصل پر بھی قبضہ کر لیا۔

مروان ان دنوں حمص میں تھا اس نے اپنے بیٹے عبد اللہ عامل جزیرہ کو فرمان بھیجا کہ ضحاک کو جزیرہ میں داخل نہ ہونے دے۔ عبد اللہ ضحاک کو روکنے کے لیے سات ہزار کی فوج لے کر نصیبین میں اقامت پذیر ہوا۔ ضحاک نے نصیبین کا محاصرہ چھوڑ کر مروان کے مقابلے کے لیے پیش قدمی کی۔ کفر توثا کے پاس طرفین کے درمیان خونریز معرکہ ہوا جس میں ضحاک مارا گیا۔ خوارج نے ایک اور شخص خیبری کی زیر سرکردگی لڑائی جاری رکھی لیکن وہ بھی مارا گیا۔

ضحاک خوارج کا ایک بہادر نڈر اور عسکری تدبر رکھنے والا رہنما تھا۔

ضرارؓ بن ازوار

ممتاز صحابی۔ اپنے قبیلے کے امیر و کبیر آدمی تھے۔ اونٹ جو عربوں کی بڑی دولت ہیں، ایک ہزار ان کی ملکیت میں تھے۔ آپ اپنی بہن خولہ بنت ازوار کے ہمراہ مسلمان ہوئے۔ ضرار بہت دلیر، جانباز اور شجاع مسلمان تھے۔ اسلام کے لیے جان دینا ان کے لیے فخر کا باعث تھا۔ زبردست شہسوار تھے۔ جنگ میں عموماً گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر لنگوٹ کس کر بیٹھ جاتے اور زرہ بکتر استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کی بہن خولہ بھی ان ہی کی طرح شجاع تھی اور جنگ میں بھائی کے ہمراہ ہوتی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں فتنۂ ارتداد کے خلاف بڑی جاں فروشی سے ہر لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ترک اسلام کرنے والوں کو جانبازانہ طور پر سیدھے راستے پر لانے کی کوششیں کیں۔

خالد بن ولیدؓ کے بہت قابلِ اعتماد رفقا میں سے تھے۔ جنگ یمامہ میں آپ نے نہایت شجاعت و جانبازی کا مظاہرہ کیا اور بلا مبالغہ سینکڑوں دشمن آپ کی تلوار سے مارے گئے۔ جنگِ اجنادین میں ایک بار آپ دشمنوں کے پھندے میں پھنس کر اسیر ہو گئے لیکن آپ کی بہن خولہ نے ایسی شجاعانہ تیغ زنی کی کہ اپنے بھائی کو دشمنوں کے نرغے سے نکال لائیں۔

جنگِ یرموک کے پہلے روز خالدؓ بن ولید نے جن ساٹھ مجاہدین کو کفار کے ساٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیجا ان میں ضرار بھی تھے۔

آپ اور آپ کی بہن خولہ فتوحاتِ شام میں برابر کے شریک رہے اور بہادری و فداکاری کی غیر فانی مثالیں قائم کیں۔

ضرار، مسجد

ضرار کا لفظ ضرر سے ہے۔ ضرار مسجد اصطلاح میں ایسی مسجد کو کہتے ہیں جو پہلے سے موجود کسی مسجد کے مقابلے پر اس کی ضرر رسانی کے لیے بنائی جائے۔ ضرار کے شرائط و کوائف فقہ میں موجود ہیں۔ بعض اوقات ہم مساجد پر یا کسی دوسری مسجد کو ضرار کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس صورت میں شریعت کی روشنی میں ان الزامات کو دیکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

ابتدا میں اس مسجد کو ضرار کہا گیا جو مدینہ کے منافقوں نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے بنائی تھی اور جسے حضور اکرمؐ کے حکم سے گرا دیا گیا تھا۔

ضیاء الدین نخشبی

صوفی۔ نام ضیاء الدین اور تخلص نخشبی تھا۔ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیاء کے مطابق آپ کی ارادت حضرت شیخ حمید الدین ناگوری کے پوتے حضرت شیخ فرید سے تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ آپ نے متعدد تصانیف چھوڑیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں:

۱۔ سلک السلوک۔ ۲۔ عشرہ مبشرہ ۳۔ کلیات و جزئیات۔ ۴۔

شرح دعائے سریانی ۵۔ طوطی نامہ ۶۔ چند ایک کے نام اور بھی لیے جاتے ہیں لیکن ان میں سے طوطی نامہ اور سلک السلوک بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی ایک اور کتاب ناموس اکبری میں صوفیانہ طرز پر اعضائے جسم یعنی ناک کان آنکھ ہاتھ پاؤں وغیرہ کے اوصاف گنوائے گئے ہیں۔ طوطی نامہ میں ۵۲ عبرت آموز کہانیاں ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ایک یورپین مترجم نے کیا ہے۔

آپ کی وفات ۷۵۱ھ میں ہوئی۔ آپ نے زندگی گوشۂ تنہائی میں گزاری لیکن اپنی استعداد کے باعث بڑی شہرت حاصل کی۔ زندگی بھر تصنیف و تالیف کا مشغلہ رکھا ؛

ضیافت

اسلام میں ضیافت اور میزبانی کے متعلق بہت تاکید اور تعلیم دی گئی ہے ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلعم نے فرمایا جو شخص اللہ اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کا احترام کرے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے اور مہمان کے ساتھ لطف و احسان اور خاطر مدارات کرنے کی مدت ایک دن ایک رات ہے اور مہمانداری تین دن ہے اس کے بعد جو احسان کیا جائے وہ خیرات ہے۔

ابوہریرہؓ سے ایک اور روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، سنت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے مہمان کے ساتھ (جب وہ رخصت ہونے لگے) اس کی تعظیم و تکریم کے لیے حویلی کے دروازے تک پہنچانے جائے۔

اسلام میں جہاں میزبانی کے بہت سے آداب کی تعلیم دی گئی ہے وہاں مہمان کے ذمہ بھی بہت سے آداب کا لحاظ رکھنا سکھایا گیا ہے۔ مثلاً مہمان کو اپنے میزبان کے گھر بلا اجازت نہیں جانا چاہیئے، اور جب جائے تو گھر والوں کو سلام کرے۔ مہمان کے ساتھ کوئی اور شخص بھی ہو جس کو دعوت نہ دی گئی ہو تو اس کی اطلاع میزبان کو کر دینی چاہیئے۔ دستر خوان بچھ چکے تو کوئی اٹھ کر چلا نہ جائے۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ نبئ اکرمؐ نے فرمایا۔ جب کھانے کے لیے دستر خوان بچھا دیا جائے تو کوئی شخص نہ اٹھے حتیٰ کہ کھانے سے فراغت کے بعد دستر خوان اٹھا لیا جائے۔ اور مہمان اطمینان سے کھانا کھا چکیں، اور اگر کوئی مہمان اوروں سے قبل کھانے سے ہاتھ کھینچنا چاہتا ہے تو اس کا عذر بتا دے کیونکہ دوسروں سے قبل کھانے سے ہاتھ اٹھا لینا دوسرے مہمانوں کے لیے شرمندگی کا باعث بن سکتا ہے۔ امام محمد باقر سے روایت ہے کہ حضورؐ جب لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے تو سب سے آخر میں کھانے سے فارغ ہوتے۔

مہمان کو یہ بھی چاہیئے کہ کھانے سے فارغ ہو کر میزبان کے حق میں دعا کرے مہمان کو میزبان سے فرمائش نہیں کرنی چاہیئے۔ کھانے پر نکتہ چینی نہ کرے ؛

ط

طارق بن زیاد

طارق بن زیاد بن عبداللہ۔ ہسپانیہ کا پہلا فاتح اور اس کا پہلا والی تھے۔ دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں سے ایک۔ طارق بن زیاد نے ایک مختصر فوج کے ساتھ یورپ کے عظیم سپین کو فتح کیا تھا اور یہاں دین اسلام کا علَم بلند کیا تھا۔ سپین کی فتح اور یہاں پہ اسلامی حکومت کا قیام ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس نے یورپ کو سیاسی، معاشی اور ثقافتی پسماندگی سے نکال کر ایک نئی بصیرتِ فکر عطا کی تھی، اور اس پر ناقابلِ فراموش اثرات مرتب کیے تھے۔

طارق بن زیاد ایک متقی، فرض شناس اور بلند ہمت انسان تھا۔ اس کے حسنِ اخلاق کی بنا پہ عوام اور فوجی سپاہی انہیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ان کے حسب نسب کے بارے میں معلومات اختلافی ہیں۔ الادریسی کے نزدیک وہ زناتہ کا بربر تھا جبکہ ابن خلدون نے اُسے طارق بن زیاد اللیثی لکھا بعض مؤرخین نے اُسے ایرانی النسل اور ہمدان کا باشندہ بتایا ہے۔ ابن عذاری نے اس کا مکمل شجرہ لکھا ہے اور اس کا تعلق بنو نفزہ سے ملایا ہے۔ بہرحال یہ غیر اختلافی امر ہے کہ وہ موسیٰ بن نصیر کا آزاد کردہ غلام اور اس کا نائب تھا۔

طارقؒ بن زیاد کی تعلیم و تربیت موسیٰ بن نصیر کے زیرِ نگرانی ہوئی جو ایک ماہرِ حرب اور عظیم سپہ سالار تھا۔ طارق نے بہت جلد فنِ سپہ گری میں شہرت حاصل کر لی۔ اور اس کی بہادری اور عسکری چالوں کے چرچے ہونے لگے۔ وہ جنگی منصوبہ بندی میں بہت ماہر تھا اور غیر معمولی ذہین، دُوربین اور مستعد قائد تھا۔ ہسپانیہ پر حملہ آور ہونے سے قبل طارق کی انتظامی صلاحیت کے باعث اُسے طنجہ کا والی مقرر کیا گیا۔

افریقہ کی اسلامی سلطنت کو اندلس کی بحری قوت سے خطرہ لاحق تھا نیز دوسرے محرکات کی بنا پہ موسیٰ بن نصیر نے دشمن کی طاقت اور دفاعی استحکامات کا جائزہ لے کر طارقؒ بن زیاد کی کمان میں سات ہزار (بعض کے نزدیک بارہ ہزار) فوج دے کر اسے ہسپانیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ اس فوج میں بربروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس معاہدے میں طارق بن زیاد نے کاؤنٹ جولین کے بحری جہاز بھی استعمال کیے۔ جو اس نے ایک معاہدے کے تحت بھیجے تھے۔

اسلامی لشکر ہسپانیہ کے ساحل پہ اترا اور پہاڑ کے نزدیک اپنے قدم جما لیے۔ یہ پہاڑ بعد میں جبل الطارق کہلایا جو یورپی زبان میں بگڑ کر جبرالٹر بن گیا۔ پھر تلو قرطاجنہ پہ قبضہ کر لیا۔

طارق نے جنگ کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو اسلامی لشکر کے لیے فوجی لحاظ سے محفوظ تھی۔ اور اس کے نزدیک پانی و رسد کی سہولتیں موجود تھیں۔ یہ جگہ وادیٔ رباط یا وادی بکہ کے کنارے تھی۔ اس موقع پہ طارق نے اپنی فوج کو ایک نہایت دلوز خطبہ دیا اور کہا کہ تمہارے سامنے دشمن اور تمہارے پیچھے سمندر ہے۔ جنگ سے قبل اس نے جہازوں کو جلا دینے کا حکم دیا تھا تاکہ دشمن کی کثیر تعداد کے باعث اسلامی لشکر بددل ہو کر اگر پسپائی کا خیال لائے تو واپسی کا راستہ مسدود ہو۔ اس صورت میں صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا تھا کہ یا تو دشمن کو شکست دے دی جائے یا لڑتے ہوئے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی جائے۔ یہ ایک ایسی زبردست جنگی چال تھی جس نے اپنی اہمیت کی داد آنے والے عظیم سپہ سالاروں سے بھی پائی۔ اسلامی لٹریچر میں طارق کے اس خطبے کو محترم مقام حاصل ہے۔

آٹھ دن کا رن پڑا اور آخرکار دشمن فوج کو شکست ہوئی اور شہنشاہ راڈرک بھاگ نکلا جس کے انجام کا پتہ نہ چل سکا۔ اس اعتبار سے یہ جنگ فیصلہ کن تھی کہ اس کے بعد ہسپانوی فوج کبھی متحد ہو کر مسلمانوں کے مقابلے پہ آنے کی جرأت نہ کر سکی۔

قوطی بادشاہ راڈرک کی شکست فاش اور طارق کی حیرت انگیز فتوحات کی خبر سن کر افریقہ کے والی موسیٰ بن نصیر نے حکومت اپنے بیٹے عبداللہ کے سپرد کی اور خود اٹھارہ ہزار کی فوج لے کر ہسپانوی جزیرہ خضرا میں اترا جس پہاڑ کے قریب وہ اترا وہ جبلِ موسیٰ کہلائی۔ اس کی فوج میں زیادہ تر عرب و قریشی سپاہی تھے۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق کے مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر غیر مفتوحہ علاقوں کا رُخ کیا اور مدینہ، قرمونہ، اشبیلیہ اور ماردہ فتح کیے۔

موسیٰ اور طارق کی ملاقات طلیطلہ میں ہوئی۔ دونوں سپہ سالاروں نے مفتوحہ علاقوں کی انتظامی صورت حال کا جائزہ لیا۔ جنگی حکمت عملی کا فیصلہ کر کے مزید فتوحات کی منصوبہ بندی کی۔ علاوہ ازیں عربی اور لاطینی زبانوں میں سکے مضروب کیے اور نئی مہمات کا آغاز کر دیا اور شمال مشرقی اندلس کے علاوہ جنوبی فرانس پہ پیش قدمی کر کے اہم شہروں اربونہ، لودون اور اودینون پر قبضہ کر لیا۔

موسیٰ اور طارق کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا قاصد دمشق سے یہ حکم نامہ لایا کہ موسیٰ اور طارق جلد از جلد دارالحکومت دمشق پہنچ جائیں۔ دمشق واپس پہنچ کر موسیٰ اور طارق ایسے عظیم سپہ سالاروں کی عسکری زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور وہ گمنامی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر طارق اور موسیٰ دربار دمشق کی غیر دانش مندانہ مداخلت سے آزاد رہتے تو نہ صرف اندلس کی تاریخ مختلف ہوتی بلکہ آج یورپ اسلامی دنیا کا حصہ ہوتا:

طاغوت

عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی ہیں بُت، جادو، جادوگر، گمراہوں کا سردار، سرکش، دیو اور کاہن۔ شرعی اصطلاح میں طاغوت سے مراد خاص طور پر وہ شخص ہے جو ارتکاب جرائم میں ناجائز امور میں اپنے گروہ کا سرغنہ یا سربراہ ہو۔ اسلامی اصطلاح میں اس سلسلے میں مزید وسعت ہے۔ طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے علاوہ کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور وہ نظام عدالت بھی اسی میں آتا ہے جو نہ تو اقتدار اعلیٰ یعنی اللہ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو سند مانتا ہو۔ لہٰذا قرآن مجید میں ایک آیت کے حوالے سے ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہے اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے کر جانا ایمان کے منافی ہے۔

قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر یعنی انکار دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ قرآن توحید کا مذہب ہے اور اگر خدا اور طاغوت دونوں کے سامنے سر جھکایا جائے تو ایمان کی بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی:

طالوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اسرائیلیوں نے اپنے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ وہ خدا سے دعا کریں کہ انہیں ایک بادشاہ عطا کیا جائے۔ پیغمبر نے کہا تم لیبیا اس کی نافرمانی کرو گے مگر ان کے اصرار پر خدا نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا جو علم اور قوت کے اعتبار سے فوق الفطرت تھا لیکن بنی اسرائیل نے حسب عادت اس پر اعتراض کیا کہ نہ تو اس کے پاس دولت ہے اور نہ وہ ان سے زیادہ عزت دار ہے۔ پیغمبر نے کہا کہ اس کے حقیقی بادشاہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ تابوت سکینہ اور حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ کے تبرکات جو خدا کے دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں اس کے دروازے پر آ جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور بنی اسرائیل کو طوعاً و کرہاً اُسے بادشاہ تسلیم کرنا ہی پڑا۔ جب یہ لوگ طالوت کے ساتھ جالوت کے خلاف جہاد کی غرض سے روانہ ہوئے تو بادشاہ نے فوج کو حکم دیا کہ دریا میں سے صرف ایک چلو پانی پئیں مگر انہوں نے حکم نہ مانا جس کی پاداش میں اُن کے پیٹ پھول گئے۔ جنگ کے دوران میں طالوت نے ان سے وعدہ کیا کہ جو شخص جالوت کو مارے گا وہ تہائی سلطنت پائے گا اور ان کا جانشین بنے گا۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ نے جالوت کو ہلاک کر دیا۔

فلسطیوں کی فوج کے گرانڈیل پہلوان جالوت سے حضرت داؤدؑ (جو ابھی ایک کمسن نوجوان تھے) کے مقابلے اور ان کی کامیابی نے انھیں اسرائیلیوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ طالوت نے ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور آخر کار وہ اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے۔

طاہر

خلیفہ مامون الرشید کا ایرانی جرنیل، جس نے مامون کی وفات کے بعد شمال مشرقی ایران میں طاہریہ خاندان کی خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی۔ کہتے ہیں وہ ایک غلام کا بیٹا تھا۔ ہارون الرشید کی وفات کے بعد جب امین اور مامون میں خلافت کے تخت کے لیے جنگ چھڑی تو طاہر نے مامون کا ساتھ دیا اور امین کی فوج کے سپہ سالار کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور امین کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا بغداد تک پہنچ گیا اور ایک سال کے محاصرے کے بعد دارالحکومت کو فتح کر لیا۔ امین گرفتار ہوا اور ایرانی سپاہیوں نے اُسے قتل کر دیا: (مزید دیکھیے، طاہریہ)

طاہر الجزائری، شیخ

طاہر بن صالح بن احمد بن موہوب بن ابی القاسم ابن موسیٰ الوفیسی السمعونی الادریسی الحسنی الجزائری ثم الدمشقی۔

تیرھویں صدی ہجری، بیسویں صدی عیسوی کے شروع زمانے کا ایک لغت دان، ادیب، ماہر السنۂ الشرقیہ، قدیم عربی مخطوطات کا قدردان، شام میں تعلیم عام کرنے کا اولیں علمبردار۔ طاہر الجزائری کو دمشق و قاہرہ کے علمی و ادبی حلقوں کی جان سمجھا جاتا تھا۔ ان کا خانوادہ ادریسی سادات میں سے ہے جو ادریس بن عبداللہ الکامل بن الحسن المسنیٰ بن الحسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی نسل سے ہیں۔ شیخ طاہر کے والد شیخ صالح بن احمد جو ایک بلند عالم اور فقہ مالکی کے ماہر تھے الجزائر سے ہجرت کر کے دمشق آ گئے۔ اور مفتی المالکیہ مقرر ہوئے۔ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں ان کے ہاں ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی جس کا نام طاہر رکھا گیا۔

شیخ طاہر نے دمشق کی درسگاہوں میں علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی اور اپنے عہد کے جید اساتذہ سے علوم عربیہ و اسلامیہ کے علاوہ طبعیات، ریاضی، فلکیات تاریخ اور آثار قدیمہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی اور فارسی میں بھی کمال حاصل کیا اور حبشی، زوادی، سریانی اور عبرانی بھی سیکھی۔

شیخ طاہر کی عمر اٹھارہ برس تھی جب ان کے والد کی وفات ہوئی لیکن انہوں نے درس و مطالعہ جاری رکھا۔ اور جب بتیس برس کے ہوئے تو تمام علوم جدید و قدیم پر عبور حاصل کر کے عملی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ عملی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ شام میں مقیم رہے اور علم و ادب اور تعلیم کے میدان میں شاندار خدمات سر انجام دیں۔ ۱۸۹۴ء میں مدحت پاشا کی سرپرستی میں "جمعیت الخیریت" کے نام سے ایک فلاحی انجمن قائم کی جس نے تعلیم کی اصلاح و ترقی اور توسیع کے لیے بہت کام کیا۔ طلبہ و طالبات کے لیے علیحدہ علیحدہ مدارس قائم کرنے کے علاوہ شیخ طاہر نے تعلیمی نصاب پر بھی نظر ڈالی اور نئی نصابی کتب تصنیف کیں۔ عثمانی حکومت نے انہیں صوبہ شام کی تعلیم کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا۔ شیخ طاہر نے اس دوران مدارس میں توسیع کے علاوہ درسی کتب چھاپنے کے لیے ایک پریس بھی لگایا۔

اس دور میں شیخ طاہر نے عربی کے قدیم مخطوطات کی بھی عظیم الشان خدمات سر انجام دیں۔ دمشق کے عظیم کتب خانے "مکتبہ الظاہریہ" کا سہرا انہی کے سر ہے۔ عربی کے نہایت قیمتی لیکن منتشر مخطوطات کو ایک کتاب خانے میں جمع کیا۔ شیخ کو عربی مخطوطات سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا چنانچہ ساری عمر ان کی حفاظت جلد سازی اور احیاء و تحقیق پر صرف کر دی۔

دمشق میں مستقل رہائش کے دوران ایک بار جب شیخ طاہر فلسطین کی سیاحت

پر تھے تو حکومت نے ان کی جائداد ضبط کر لی۔ انہیں اس سے بہت صدمہ پہنچا اور انہوں نے دمشق سے مستقلاً قاہرہ منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء کے آغاز تک وہ قاہرہ ہی میں رہے لیکن دمے کے مرض میں شدت کے باعث دوبارہ دمشق چلے گئے۔ اور اپنی علمی زندگی کے تیسرے اور آخری دور کا آغاز کیا۔ اس دوران وہ دمشق کی عربی زبان کی اکیڈمی کے رکن ہونے کے علاوہ "دارالکتب الظاہریہ" کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے لیکن چند ہی ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

شیخ طاہر ایک ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ ایک فلسفی اور مفکر بھی تھے فرقہ پرستی سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کی محبّت اور نفرت فقط حق کی خاطر ہوتی تھی۔ خوددار، بیباک اور جراٴت مند انسان تھے۔

طاہریہ

خراسان کا ایک حکمران خاندان۔ اس کا بانی خلیفہ مامون الرشید کا ایرانی جرنیل طاہر تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق اس حکمران خاندان کی بنیاد طاہر کی اولاد نے رکھی یہ مشرق میں ایرانی خاندان کی پہلی سلطنت تھی۔ ایک اور بیان کے مطابق طاہریہ خاندان کا مورثِ اعلیٰ رستم بن زال سیستانی تھا۔

ہارون الرشید کی وفات کے بعد طاہر مامون الرشید کی فوج میں شامل ہو گیا۔ مامون اور امین میں تختِ خلافت کے لیے چپقلش جاری تھی۔ طاہر نے مامون کی طرف سے لڑائی میں حصہ لیا اور امین کی فوج کے سپہ سالار کو خود قتل کیا۔ جب مامون نے خلیفہ مشرق کا لقب اختیار کیا تو اس وقت طاہر گمنامی سے نکل کر شہرت حاصل کر رہا تھا۔

ایرانی ماں کا بیٹا ہونے کے باعث مامون کو ایران میں بہت مقبولیت حاصل تھی، وہ خود بھی ایرانی تہذیب و معاشرت کا دلدادہ تھا۔ اور شیعہ مذہب سے ہمدردی رکھتا تھا۔ امین کے مقابلے میں مامون کی فتح کے باعث ایرانیوں کو عربوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہو گئی چنانچہ نسلی اور ثقافتی اختلاف اور رقابتیں بڑھنے لگیں۔ امورِ سلطنت کی باگ ڈور تمام تر ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور درباری منصبوں پر ایرانی لوگ ہی فائز ہونے لگے۔

طاہر کی فتح بغداد سے تخت و تاج تو مامون کی دسترس میں آ گیا لیکن درحقیقت سلطنتِ عباسیہ کی بنیادیں کمزور ہو گئیں اور یہی انقلاب اس کے آخری زوال کا باعث ہوا۔

مامون نے صوبہ خراسان کی حکومت مستقل طور پر طاہر اور اس کے ورثا کو عطا کر دی۔ طاہر کی خدمات کے باعث مامون کے نزدیک اس کی بہت قدر و منزلت تھی لیکن مامون کی عطا کے باعث طاہر کو جو اقتدار و اختیار حاصل ہوا تھا اس میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اب مامون کو وہ ایک خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے طاہر کو ایک غلام کے ذریعے زہر دے کر مروا دیا۔

طاہر ایک وجیہہ و شکیل نوجوان تھا۔ البتہ اس کی ایک آنکھ کسی معرکے میں ضائع ہو گئی تھی۔ دانائی، قوتِ فیصلہ اور سخاوت اس کے مخصوص اوصاف تھے۔ وہ علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔

طائع للہ

عبدالکریم بن الفضل۔ عباسی خلیفہ۔ پیدائش ۳۱۷ھ/ ۹۳۰-۹۲۹ء۔ اس کا باپ خلیفہ المطیع تھا۔ ۹۷۴ء کو المطیع کی معزولی کے بعد اس کے امیرالمومنین ہونے کا اعلان ہوا۔ اس کی والدہ کا نام عتنب تھا جنہوں نے طائع للہ سے لمبی عمر پائی۔ اور اس کی وفات کے بعد بھی زندہ رہیں۔

ابن الاثیر کا بیان ہے کہ طائع کو اپنے دورِ حکومت میں اتنا اختیار حاصل نہ تھا کہ کسی قابلِ ذکر کارنامے میں اس کا نام آ سکے۔ اس کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ میں اس کا نام عہدوں کی تقرری، تعزیت کے خطوط اور اسی طرح کی دوسری رسمی باتوں کے سلسلے میں آتا ہے۔ البتہ اس کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی کہ جسمانی طور پر وہ غیر معمولی طاقتور تھا۔

اصلی حکمران پہلے تو آلِ بویہ تھے لیکن جب ان کا سب سے بڑا امیر عضدالدولہ جو خلیفہ کا خسر بھی تھا، فوت ہو گیا۔ تو اس کے بیٹے آپس میں لڑنے لگے۔ ایک سازش کے تحت طائع کو بے خبری کے عالم میں تخت پر سے اتار کر بہاؤ الدولہ کے گھر بھیج دیا گیا جہاں اسے قید کر دیا گیا۔ اس کی جگہ اس کا عم زاد بھائی ابوالعباس احمد اس کا جانشین بنا جس نے القادر کا لقب اختیار کیا۔ بعد میں سابق خلیفہ طائع للہ کو القادر کے محل میں آنے کی اجازت مل گئی۔ جہاں اس سے اچھا سلوک کیا گیا۔

اس نے یکم شوال ۳۹۳ھ/ ۳ اگست ۱۰۰۳ء میں وفات پائی۔

طائف

عرب کا ایک شہر۔ مکے کے جنوب مشرق میں سطح مرتفع پر واقع ہے۔ سلسلہ کوہ سراۃ میں سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ طائف سے مکہ تک جانے والی سڑک پیچیدہ گھاٹیوں سے گزرتی ہے۔ اس کی لمبائی ۷۵ میل ہے لیکن براہ راست فاصلہ خاصا کم ہے۔ ایک بدوی افسانے کے مطابق جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی ہاجرہ کے ساتھ شام سے صحرائے عرب روانہ ہوئے تو خدا نے مرغزارِ شام کا ایک ٹکڑا ساتھ کر دیا یہی طائف ہے۔ سردیوں میں بعض اوقات یہاں پانی جم جاتا ہے۔

قبلِ اسلام ہی سے طائف اور مکہ توام شہر رہے ہیں۔ طائف کی پیداوار کی مکے میں نکاسی ہوتی ہے۔ مکہ کے متمول لوگ طائف میں زمینیں خریدتے اور گرمیوں کا موسم گزارنے آتے تھے اور طائف کے لوگ تجارتی سلسلوں میں مکہ میں رہائش رکھتے تھے۔

قرآن مجید میں مکہ اور طائف کو ملا کر "قریتین" (دو شہر) کہا گیا ہے۔ آغازِ اسلام کے وقت یہ مغربی عرب کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا یہاں کا بت خانہ مکہ کے بت خانے کا حریف تھا۔ سعودی دور میں اس شہر نے گرمائی قیام گاہ کے طور پر شہرت حاصل کی ہے۔ اسلام سے قبل یہاں سے میووں اور ترکاری کے علاوہ انگور کی شراب، گیہوں، لکڑی اور دباغت شدہ کھالیں برآمد ہوتی تھیں۔ مکتوبِ محمد صلعم میں سے ایک میں جو اہلِ طائف کے نام ہے سبیرا (مکئی کی شراب) کو بھی حرام سمجھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

طائف میں شروع میں عامر بن الظرب کا قبیلہ عدوان بستا تھا پھر ثقیف اور ایاد آئے۔ بعد ازاں بعض دیگر قبائل، جو احلاف کے نام سے مشہور ہیں۔

خاندان بنو ہاشم کی طائف میں رشتہ داریاں تھیں۔ بنو عبیدہ یا لیل کو رسول اللہ کے ماموؤں کا خاندان کہا جاتا ہے۔ ابولہب کی بیٹیوں کی اہلِ طائف سے شادیاں ہوئی تھیں۔ حضرت عباسؓ کا بھی اہلِ طائف سے کاروباری تعلق بہت تھا

حضور اکرم محمد صلعم جب اپنے ہم وطنوں کو تبلیغ اسلام کر کے تھک گئے اور یہاں سے مایوسی کا احساس پیدا ہونے لگا تو انھوں نے اپنے ماموؤں کا رُخ کیا

لیکن وہاں بھی جسمانی اور روحانی تکالیف کے سوا کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ہجرت کے بعد جلد ہی ۲ ھ میں سریہ نخلہ (مابین مکہ و طائف) پیش آیا جو اگرچہ اہلِ مکہ پر معاشی دباؤ ڈالنے کے لیے تھا مگر مکہ سے تجارت میں رکاوٹ پڑنے پر طائف کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

مکہ اور مدینہ کی جنگوں میں اہلِ طائف ہمیشہ مکہ کی تائید کرتے رہے۔ جنگِ احد میں بھی طائف کے چند باشندے فوجی عملے میں شریک تھے۔ جنگ خندق میں تو ثقیفیوں کا ایک پورا دستہ مدینہ کے محاصرے میں شریک تھا۔

اہلِ طائف کی تجارت یمن اور مکہ کے علاوہ عرب کے شمالی حصے سے بھی خاصی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابو عبیدہ نے صلحنامہ حدیبیہ کا جو متن دیا ہے اس میں صراحت ہے کہ جو مسلمان تجارت کے لیے طائف یا یمن جاتے ہوئے مکے سے گزریں گے انہیں امان حاصل رہے گی۔

۸ ھ میں فتح مکہ پر اہلِ طائف اور ان کے بدوی رشتہ داروں نے چراغ پا ہو کر شدید مخالفت دکھائی۔ اس موقع پر حنین میں پہلی کشمکش ہوئی پھر اس کا سلسلہ خود طائف میں جاری رہا جس کا رسول اللہؐ نے کئی ہفتوں تک محاصرہ کیے رکھا۔ دوسری طرف حضورؐ کے حکم پر بعض مسلمان قبائل نے ان پر معاشی دباؤ ڈالنا شروع کیا اور ایک سال کے اندر اندر پریشان ہو کر اہلِ طائف نے اطاعت قبول کر لی۔

اطاعت کے بعد بھی وہ اسلامی ارکان کی ادائیگی اور سود و شراب نوشی سے گریز پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ لیکن حضورؐ کے سمجھانے پر آہستہ آہستہ بالآخر ان میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔

شہر طائف کی موجودہ فصیل ترکی دور کی ہے۔ محاصرہ طائف کے شہداء کا قبرستان موجودہ فصیل کے باہر واقع ہے۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ بھی اسی میں دفن ہیں۔

عہدِ اسلام میں طائف کبھی بڑا سیاسی مرکز نہ رہا۔ لیکن اس کی سرپرستی معاشی لحاظ سے ضرور جاری رہی۔ روایت ہے کہ دورِ عباسیہ میں نہر زبیدہ کی تعمیر کے بعد اس کی نگہداشت کے لیے ملکہ زبیدہ نے طائف کے بعض رقبے وقف کر دیے تھے۔ عہد عباسی کا تعمیر شدہ ایک راستہ جو جبل کرا سے ہو کر طائف کو جاتا ہے۔ اب بھی موجود ہے گو مسلسل غفلت کے باعث وہ کافی خراب ہو چکا ہے لیکن اب بھی گدھوں کے قافلوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری اور بعد کے جغرافیہ داں اسے ایک چھوٹا شہر (بلدۂ صغیر) بتاتے ہیں۔ یہاں کی موجودہ آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے اور اس وقت یہ سعودی عرب کے بہت زیادہ ترقی یافتہ شہروں میں سے ہے۔ شہر اب فصیل سے باہر دُور دُور تک پھیل گیا ہے۔

طب

حکمت علاج۔ جسمانی امراض کے علاج کا علم۔

ابو داؤدؒ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ نے بیماری بھی پیدا کی ہے اور دوا بھی۔ ہر مرض کی دوا بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا دوائیں استعمال کیا کرو۔ ہاں حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال مت کرو۔ ایک اور حدیث روایت ہے کہ دوا استعمال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ہر مرض کے لیے دوا بھی پیدا کی ہے صرف ایک مرض کی دوا نہیں ہے اور وہ ہے بڑھاپا۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ شفا تین چیزوں میں ہے: (۱) سینگی کھچنے والی میں۔ (۲) شہد پینے میں۔ (۳) آگ کے داغنے میں۔

لیکن میں اپنی اُمت کو داغنے کے علاج سے منع کرتا ہوں۔

دیگر بہت سی احادیث میں حضورؐ نے کئی جسمانی امراض کے علاج بھی تجویز کیے ہیں جو مجرب ہیں۔

طباطبائی، ضیاالدین

ایک ایرانی راہنما۔ جو ۱۹۲۱ء میں اٹھنے والی تحریک کا لیڈر تھا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب برپا ہوا اور زاریت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کی جگہ بالشویک کا طوطی بولنے لگا تو روس کی یہ جدید حکومت ایران پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکی اور وہاں سے روسی اقتدار کے اٹھ جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ ایرانی بادشاہوں کی روایت کے مطابق موجودہ شاہِ ایران بھی عیش و طرب میں مست تھا۔ اور عسکری و انتظامی طور پر کمزور ہو چکا تھا اور عام ملکی حالات ابتری کا شکار تھے۔ اس لیے ایک گمنام فوجی افسر رضا شاہ پہلوی نے جب ۱۹۲۱ء میں تھوڑی سی فوج لے کر تہران پر چڑھائی کی تو اسے کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی۔ ایک معاہدے کے تحت ضیاءالدین کو وزیراعظم اور رضا خاں کو وزیر جنگ بنا دیا گیا۔ بعد میں ضیاءالدین اور رضا خان میں اَن بن ہو گئی اور وزیراعظم کا منصب بھی رضا خان نے سنبھال لیا۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں جبکہ رضا خاں کے قدم خوب جم گئے تھے اس نے شاہ ایران کو معزول کر کے شاہی اختیارات عوام کی مرضی سے خود سنبھال لیے۔ اس کا لقب رضا شاہ پہلوی قرار پایا۔ ۱۹۲۱ء کی وہ تحریک جس کے باعث ۱۹۲۵ء میں ایران کی بادشاہت منتقل ہو گئی۔ اس کا اصل بانی ضیاءالدین طباطبائی ہی تھا۔

طبری، ابو جعفر محمد جریر

ایک عرب مورخ۔ ۲۲۴ھ۔ ۲۲۵ھ / ۸۳۹ء میں صوبہ طبرستان کے دارالحکومت آمل میں پیدائش ہوئی۔ چھوٹی عمر سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں حافظِ قرآن ہو گئے۔ والد ایک خوشحال آدمی تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں پائی۔ اسلامی دنیا کے علمی مراکز کا دورہ کیا۔ علاقہ رے اور گردونواح کی سیر کرتے ہوئے بغداد پہنچے جہاں وہ امام احمد بن حنبلؒ سے کسب فیض کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ان کے بغداد آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد امام کا انتقال ہو گیا۔ بصرے اور کوفے کے چند روزہ قیام کے بعد واپس بغداد آئے۔ اور پھر مصر روانہ ہوئے۔ شام کے شہروں میں علمِ حدیث کے حصول کے لیے کچھ مدت ٹھہرے۔ مصر اور شام سے واپس بغداد لوٹے اور اپنی وفات ۹۲۳ء تک وہیں رہے اس دوران دو بار طبرستان کا سفر بھی کیا۔

طبری عالمانہ مزاج اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ عمر کے ابتدائی ایام میں انھوں نے عرب اور اسلام کی روایات کے سلسلے میں مواد جمع کرنے کی انتہائی کوشش کی اور عمر کا باقی حصہ تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔ انہوں نے ہمیشہ جلیل القدر مراتب و مناصب قبول کرنے سے انکار و گریز کیا۔ اس طرح انہیں ہمہ گیر اور سیر حاصل ادبی خدمت سرانجام دینے کا موقع مل گیا۔

اپنے خاص مضامین مثلاً علم تاریخ، علم فقہ، علم قراۃ اور علم تفسیر القرآن کے علاوہ انہوں نے علم عروض، علم ترانی، حروف نحو، علم الاخلاق بلکہ ریاضیات اور علمِ طب کی طرف بھی گہری توجہ دی۔

مصر سے واپسی پہ دس سال تک وہ شافعی مذہب کے پیرو رہے پھر اپنا ایک الگ دبستان قائم کیا جس کے پیرو اپنے آپ کو ان کے والد کی نسبت سے جریریہ کہتے تھے۔ چونکہ اعتقادات میں شافعی مذہب سے اختلاف اتنا زیادہ نہ تھا جتنا عمل میں، اس لیے یہ تحریک جلد فراموش ہو گئی۔ البتہ امام احمد بن حنبلؒ سے ان کا اختلاف زیادہ بنیادی تھا۔ طبری امام صاحب کو حدیث کا امام تو مانتے تھے لیکن فقہ میں ان کے خیالات کے قائل نہ تھے۔ اس لیے وہ حنبلیوں کی ناراضگی کا نشانہ بن گئے۔ اور انہوں نے طبری کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ جان بچانے کے لیے طبری کو اپنے گھر ہی نظر بند ہونا پڑا۔

طبری کی تصانیف ہم تک کسی طور بھی مکمل صورت میں نہیں پہنچی ہیں اور ان کی بعض نہایت اہم اور نادر تحریریں لاپتہ ہیں۔ طبری کی ایک جلیل القدر تصنیف تاریخ عالم یعنی تاریخ الرسل والملوک ہے۔ پوری کتاب بہت ضخیم ہے اور کئی ہزار صفحات پہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز انبیاء اور قدیم ترین حکمرانوں کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ پھر ساسانیوں کے عہد کی تاریخ پھر عہد نبویؐ اور خلفائے راشدین اور آخر میں بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ بیان ہے۔ اس کتاب کے لیے مواد انہوں نے تحریروں اور زبانی روایات سے جمع کیا تھا جس کے لیے انہیں طویل سیر و سیاحت کرنا پڑی۔

طبری نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو تاریخی واقعات کے تسلسل میں بیان نہیں کیا بلکہ یہ دیکھا کہ جو مختلف بیانات بھی مل جائیں چاہے وہ باہم متضاد ہی کیوں نہ ہوں۔ انھیں اس شکل میں تحریر کیا ہے جس صورت میں وہ طبری تک پہنچے۔ چنانچہ ان واقعات کی صحت کی ذمہ داری لینے سے وہ منکر ہیں جو انہوں نے جمع کیے ہیں۔ اور درحقیقت اس بے لوث اور غیر مرتب مجموعۂ روایات کی تکرار ہی میں موجودہ زمانے کی تاریخی تحقیق و جستجو کے سلسلے میں اس تصنیف کی اصل قدر و قیمت مضمر ہے۔ بالخصوص اس وقت جب اسلام کے ابتدائی زمانے کے واقعات کو از سر نو مرتب کرنے کا سوال درپیش ہو ؎

طبقات ابن سعد

طبقات نام کی تصانیف کا ایک پورا سلسلہ ہے جن میں سے زیادہ تر باقی نہیں رہیں اور جو قرآن کے قاریوں، فقہا، شعراء اور مغنیوں کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔

اسی سلسلۂ طبقات میں ایک مشہور تصنیف ابن سعد کی بھی ہے جو "طبقات ابن سعد" کے نام سے معروف ہے۔ یہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی دو جلدوں میں خاص حضور اکرمؐ کے حالات ہیں۔ باقی صحابہؓ اور تابعین کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی اور دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کا نسخہ موجود نہ تھا۔ چنانچہ شہنشاہِ جرمن کو اس کی طباعت و اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے پروفیسر ساخو کو اس پہ مامور کیا۔ وہ قسطنطنیہ، مصر اور یورپ میں جا بجا پھر کر اس کتاب کے اجزاء فراہم کر کے لائے۔ یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔ طبقات ابن سعد کو ایک مستند اور اہم تصنیف سمجھا جاتا ہے۔

طبقات ناصری

سلسلۂ طبقات کی ایک اور کتاب۔ یہ ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی کی تالیف ہے جو التمش کے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ تالیف ۱۲۶۹ء میں مکمل ہوئی۔ یہ سلاطین ہند کی تاریخ ہے لیکن ضمناً دورِ غزنویہ اور دورِ مغول کے اہم واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جو غوری غزنوی، خوارزم شاہی اور تاتاری حکمرانوں کی بہترین تاریخ سمجھی جاتی ہے ؎

طرابلس

یونانی افریقہ کے شمالی ساحل کے ایک شہر کا نام۔ عرب جمہوریہ لیبیا کا ایک دارالحکومت اور اہم بندرگاہ۔ دوسرا دارالحکومت ایک اور شہر بن غازی ہے جو اس سے چار سو میل دُور مشرق میں واقع ہے۔ طرابلس ایک انتظامی وحدت کا صدر مقام بھی ہے۔ اس کی موجودہ آبادی ۲۴۵۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے۔ بحری تار کے ذریعے یہ شہر مالٹا سے ملا ہوا ہے۔ بین الاقوامی پروازیں یہاں سے گزرتی ہیں۔ اس طرح اس کا ربط ساری دنیا سے قائم ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء سے لیبیا کی پروازیں بھی بیرون ملک کے بین الاقوامی ہوائی اڈوں سے گزرتی ہیں۔

تونس سے بن غازی جانے والی ساحلی سڑک طرابلس سے گزرتی ہے جس کے ساتھ ساتھ ایک ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے۔ دوسرے شہروں تک سفر کے لیے باقاعدہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔

برآمدات میں شتر مرغ کے پر، ہاتھی دانت، کھالیں، اسفنج، چمڑا، نبات البردی (کاغذ سازی کے کام آنے والی گھاس کی ایک قسم) [illegible] اور گھوڑے اہمیت رکھتے ہیں۔ درآمدی تجارت میں دھاتیں شامل ہیں جو انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے کارخانوں سے آتی ہیں۔

ٹریپولی (طرابلس) کا نام، جو تین شہروں یعنی صبراتہ، اویا [illegible] کے علاقے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور جن کا تعلق فینیقیو[illegible] کے زمانے سے تھا، چوتھی صدی کے رومی مؤرخین سے پہلے استعمال نہیں ہوا اگرچہ ٹریپو لیٹینیا کا نام تیسری صدی ہی میں اس علاقے کو دے دیا گیا تھا جسے سرت بھی کہتے تھے۔

بوزنطی عہد میں ٹریپولی کے نام کا اطلاق شہر [illegible] پایا جاتا تھا [illegible] کا قدیم شہر جو اویا کی دساوری منڈی کا کام دیتا تھا پہلے فینیقیوں [illegible] اہل قرطاجنہ کی نو آبادی بنا۔ دوسری صدی میں رومیوں کا رسوخ [illegible] لگا۔ ۴۲۹ء میں وندالوں نے اس شہر پہ قبضہ کر لیا۔

مؤرخین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ طرابلس پہ مسلمانوں کا قبضہ کب ہوا۔ بعض کے نزدیک ۲۲ھ / ۶۴۲ء اور بعض ۲۳ھ میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بہرحال یہی وہ عرصہ تھا جب پہلے پہل عرب فاتحین مصر کی فوجیں طرابلس تک بڑھ آئیں۔ مسلمانوں کے یہ ابتدائی حملے قبضہ جمانے کے لیے نہیں بلکہ دیکھ بھال کے لیے تھے۔

۱۳۱ھ / ۷۴۸-۹ء میں عبدالرحمٰن بن حبیب نے جو ۱۲۶ھ سے افریقہ کا والی تھا طرابلس پر چڑھائی کی۔ ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء سے ۲۹۶ھ / ۹۰۹ء تک اغلبیو کی حکومت رہی۔ اس کے بعد مختلف سمتوں سے مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگ اس پہ حملہ آور ہوئے اور قابض رہے۔

۸۵-۱۷۸۴ء میں طرابلس میں طاعون اور بہت قحط کی وجہ سے بہت

تباہی آئی۔ شہر کے چودہ ہزار باشندوں میں سے ایک چوتھائی آبادی اس کی نذر ہوگئی۔

طرابلس میں تعمیر شدہ بہت سی قدیم عمارتیں اس کے گزشتہ حکمرانوں کے ذوق وطرز حکومت کی خاموش ترجمان ہیں۔ اس شہر پہ یورپ و ایشیا کی تقریبًا ہر اس قوم نے حملہ کیا۔ جو مضبوط فوج رکھتی تھی۔ اس لحاظ سے تاریخی طور پہ یہ شہر دنیا بھر میں ایک اہمیت کا حامل بنتا ہے۔ کبھی یہ شہر قدیم حکمرانوں کی دسترس میں رہا۔ کبھی فرانسیسی، کبھی امریکی، کبھی عباسی، کبھی عرب غرض دنیا کی تقریبًا سبھی نمایاں جدید و قدیم تہذیبوں کا گزر یہاں سے ضرور ہوا ہے۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ آج جہاں اس شہر میں ایک یونیورسٹی قائم ہے وہیں نہ صرف دینی مدارس ہیں بلکہ غیر ملکی مشنریوں کے مخصوص مکتب فکر کے حامل مدرسے بھی قائم ہیں۔

طریقت

لفظی معنی، سڑک، راستہ، پگڈنڈی۔ عربی لفظ ہے۔

یہ لفظ اسلامی تصوّف میں یکے بعد دیگرے دو اصطلاحی مفاہیم میں استعمال ہوا۔

۱۔ نویں صدی عیسوی میں یہ ان افراد کی عملی راہنمائی کے لیے اخلاقی نفسیات کا ایک طریقہ تھا جن پہ وجدانی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

۲۔ گیارہویں صدی کے بعد یہ روحانی تعلیم کے اس دستورالعمل کا نام ہوگیا۔ جو مختلف سلسلوں میں اس وقت مسلمانوں کے ہاں قائم ہو رہے تھے عام زندگی کے لیے معین کیا گیا۔

اسلامی تصوّف بطور خود اپنی ابتدار، تصوّرات اور رجحانات کے لحاظ سے ایک الگ مضمون ہے جو اپنی جگہ ایک طویل بحث ہے۔

پہلے معنوں میں لفظ طریقہ ابھی تک مبہم ہے۔ اس کے معنی فقط اس نظری طریق کے ہیں جو ہر مرید کی روحانی مسلک کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو اسے خدا کی طرف لے جاتا ہے اور احکام شریعت کی لفظی پابندی کے نفسیاتی مقامات و مدارج سے گزرنے کے بعد حقیقت خداوندی سے روشناس کراتا ہے لیکن اس پہ فقہا کی جانب سے بے تحاشا نکتہ چینی ہونے لگی اور معلمین تصوّف اپنے مسلک کی وضاحت اور اپنے اعمال کو دائرہ شریعت میں پابند کرنے کی طرف مائل ہوئے۔

الغرض طریقہ کا مفہوم آخرکار وہ عام زندگی یا معاشرہ ہوگیا جو احکام اسلام کی عام پابندیوں کے علاوہ مخصوص قواعد کے ایک سلسلے پر مبنی ہو۔

راسخ العقیدہ فقہا نے ان بدعتوں کے خلاف ہمیشہ جنگ جاری رکھی جن کی تبلیغ بعض صوفی طریقے کرتے رہے۔ یعنی ان کی نفلی عبادتوں، ان کے مخصوص لباسوں، ان کی مستثنیات، منشی اشیاء، مثلاً قہوہ، حشیش، افیون کا استعمال، ان کی شعبدہ بازی وغیرہ۔ بہرحال طریقہ کو پورے طور پہ نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام میں جن لوگوں نے ایک مشترک معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی انہیں کہیں ۸۱۴ء میں صوفیا کے اصطلاحی نام سے یاد کیا گیا۔ ۸۵۰ء کے بعد یہ اصطلاح کسی قدر غیر معین طور پہ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگی جنہیں عراق میں تصوّف کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد تقریبًا دو صدیوں تک اس کے نام کے مقابلے پہ ملامتیہ کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی رہی۔ اس کا اطلاق خراسان کے زیادہ سرگرم عمل اور انتہا پسند صوفیوں پہ ہوتا ہے کیونکہ انھیں لوگوں کی ملامت سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ تھا۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں بہت سے سلسلہ ہائے تصوّف کے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کی تفاصیل مختلف کتابوں سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ آجکل سلسلہ سنوسیہ اور سلسلہ مولویہ کے سوا کسی دوسرے سلسلے کا کوئی مخصوص مرکز نہیں ہے۔

رشتہ بیعت جس میں مرید منسلک ہوتا ہے دائمی نہیں ہوتا۔ عام طور پہ کسی بھی اسلامی ملک میں کل آبادی کے تین فیصد سے زیادہ لوگ ان سلسلوں سے وابستہ نہیں۔ جن سلسلوں کی موجودہ زمانے میں وسیع تبلیغ و اشاعت ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

قادریہ ! عراق، ترکی، پاکستان، بھارت، ترکستان، چین، نوبہ، سوڈان۔
نقشبندیہ ! ترکستان، پاک وہند، چین، ترکی، ملایا۔
شاذلیہ ! مغرب، شام، پاکستان، بھارت۔
بکتاشیہ ! ترکی، البانیہ، تجانیہ۔
سنوسیہ ! صحرائے اعظم، حجاز
شطاریہ ! پاکستان، بھارت، ملایا۔

عہد حمیدی میں تمام سلسلوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں ایک عجیب قسم کا متحدہ نظام قائم کیا گیا جس میں چار عالمی سطح پہ شفاعت کرنے والوں یعنی رفاعی (صدر) جیلانی، بدوی اور دسوقی کی ایک مستقل جماعت بنائی گئی جس کے ساتھ موجودہ وقت کے قطب اور ابدال بھی شامل تھے۔

طغرا

ادعوز کی رمزیہ تحریر یا خوشخط نشان جسے بعد میں سلجوقی اور عثمانی فرمانرواؤں نے بھی اختیار کرلیا اور جو آگے چل کر نشان سلطنت یا علامت سلطانی کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ بادشاہ کی طرف سے یہ علامت نہ صرف شاہی احکام اور فرمانوں بلکہ دستاویزات، ملکیت، سکوں، یادگار سرکاری عمارتوں اور جنگی جہازوں پر بھی لگائی جاتی تھی۔ موجودہ زمانے میں تو کاغذات شناخت، راہداری کے پروانوں، ڈاک کے ٹکٹوں، اسٹامپ کے کاغذوں اور سونے چاندی پر صرافی کے نشانوں وغیرہ سب کے لیے یہی نشان مستعمل ہونے لگا ہے۔

طغریٰ فارسی زبان کے لفظ نشان، نشانہ بمعنی " علامت " اور عربی زبان کے لفظ توقیع کا ہم معنی ہے یعنی خفیہ تحریر دستخط وغیرہ۔ چنانچہ فرامین کی آخری رسمی تحریر میں طغریٰ کو علامت کہتے ہیں۔

ایک بیان یہ بھی ہے کہ یہ لفظ ادعوز زبان کے تغراغ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہیں:

(۱) مہر اور تحریر معمّہ جو ادعوز بادشاہ استعمال کرتا تھا۔ لیکن ترک شہری اسے نہیں جانتے۔

(۲) وہ گھوڑا جو عارضی طور پہ فوج کو کسی عارضی معائنے کے دنوں میں یا تا اختتام مستعار دیا جائے۔

ایک اور روایت کے مطابق طغریٰ کو ایک خیالی پرندے تغری سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

وہ طغریٰ جو ادعوز اور سلجوق استعمال کرتے تھے اس کے نمونے سے ہم لاعلم ہیں۔ البتہ جو طغریٰ شاہان مصر منشور پہ استعمال کرتے تھے۔ اس کی تفصیل ملتی ہے۔ منشور وہ ہدایات یا احکام ہیں جو ہزار سواروں کے سردار یا امیر

طبل خانہ کے نام جاری ہوا کرتے تھے۔ شاہانِ مصر کے ہاں ایک خاص عہدیدار کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کے طغرے مستطیل کاغذ کے ٹکڑوں پہ بنائے۔ پھر محررین ان ٹکڑوں کو دستاویزات کی پیشانی یعنی طغرے پہ ان کی مخصوص جگہ پر "بسم اللہ" سے اوپر چسپاں کر دیا کرتے تھے۔

طغرے میں سلطان کے القاب ایک سطر میں لکھ دیئے جاتے تھے اور ان کے بعد باقی عبارت ہوتی تھی۔ مختلف طغرے مختلف اشکال کے ہوتے تھے۔ پھر مختلف سلطنتوں اور ادوار میں بھی طغروں کی شکلیں بدلتی رہیں اور ان پہ لکھی سرکاری عبارتیں بھی بدلتی رہیں۔ لیکن اپنی بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ آج بھی ان کا استعمال جاری ہے۔

طغرل بیگ

رکن الدین ابوطالب محمد بن میکائیل۔ پہلا سلجوق سلطان۔

سلجوق سرداروں میں سے طغرل بیگ، جغری بیگ، ... قابلِ ذکر ہیں جو ہمیشہ اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے لیکن ان میں سے ہر کوئی اپنی اپنی ذات کے لیے سرگرم رہتا تھا۔ ان میں طغرل بیگ کو فوقیت حاصل تھی۔

پہلے پہل جرجان اور طبرستان کے زیاریوں نے سالانہ خراج ... پہ اس کی اطاعت قبول کی۔ قزوین اور ہمدان نے بھی سلجوقی حکومت تسلیم کی اور اصفہان حکمران فرامرز نے بھی ایک خطیر رقم کی ادائیگی قبول کی۔ بعد ... فرامرز کے بدلنے پہ اس نے اصفہان پہ بھی قبضہ کر لیا اور دوسرے علاقوں پہ قبضہ کرتا ہوا بغداد تک پہنچا اور خلیفہ کی بیٹی سے شادی کی۔ طغرل بیگ جب ... داخل ہوا تو اس کا نام خطبہ میں پڑھا گیا۔

اس کا انتقال ستر سال کی عمر میں ... ہوا۔

طفیل بن عمرو دوسی

قبیلۂ دوس کا یہ ... شریف ... مکے آیا تو قریش کے لوگ اس کے پاس آئے ... کہا کہ ان کی باتوں میں جادو ہے، ایسا جادو جو آدمی کو ... آپ سے بھی جدا کر دیتا ہے۔ تم ان کے پاس نہ جانا ... میں تشتت و افتراق کی وبا پھوٹ نکلے گی ... اور نہ ان سے کلام کرنا۔

ایک روز اتفاق سے طفیل بن عمرو دوسی کا گزر خانہ کعبہ کی جانب ... وہاں آنحضرتؐ تشریف رکھتے تھے۔ اس نے ان کی کچھ باتیں سنیں ... گیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا میں صاحب عقل و رائے ہوں ... کمال حاصل ہے جس نتیجے میں تمیز کی صلاحیت مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے ... کہ میں اس شخص (رسول اللہ) کی باتیں نہ سنوں۔ باتوں میں ... میں کیا مضائقہ ہے، اگر کوئی نقص یا خرابی ہے تو اس سے اجتناب کیا جا سکتا ہے ... خیال سے طفیل بن عمرو آنحضرتؐ کے پیچھے پیچھے آپ کے دولت خانے تک پہنچا ...

جو خیال تھا اس کا اظہار کیا۔ آپؐ نے اُسے اسلام کی دعوت دی اس نے لبیک کہا اور مسلمان ہوگیا۔

طلاق

عربی لفظ۔ خاوند کا اپنی بیوی کو پابندیٔ نکاح سے آزاد کردینا۔
یہ اسلام کے عائلی قوانین کا ایک اہم حصّہ ہے۔ خاوند کا اپنی بیوی سے انت طالق کہنا۔ طالق کا فعل طلق سے ہے جس کا مطلب ہے (اونٹ وغیرہ کا) بند سے رہا ہو جانا پھر مجازاً اس کا استعمال خاوند کی زوجیت سے عورت کے آزاد ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ طلق کا مطلب رہا کردینا۔ بیوی کو نکاح سے آزاد کردینا اور طالق کا مطلب اسی سے کھلنے ہوا اونٹ یا قید نکاح سے آزاد کی گئی عورت

اسلام میں اپنی منکوحہ سے علیحدگی اختیار کرنے کا ایک شرعی طریقہ ہے۔
دورِ جاہلیت کے عربوں کے ہاں صرف مرد کو یک طرفہ یہ حق حاصل تھا کہ وہ جب چاہتا عقد ازواج کو ختم کردیتا۔ حضور اکرمؐ سے پہلے اس قسم کی طلاق کا رواج عام طور پر موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مرد کو عورت پر جو حقوق شادی کی وجہ سے حاصل ہیں اور وہ شادی کی شرائط میں شامل تھے ان سے فوری اور قطعی طور پر دستبردار ہوگیا۔

قرآن مجید نے طلاق کے ایسے ضوابط مقرر کیے جو اس اقدام کے ہر پہلو پر حاوی ہیں۔ ان کی ہمہ گیری سے اور اس سے بھی زیادہ ان پر درستی کے ساتھ عمل کرنے کی ہدایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آنحضرت صلعم طلاق کے بارے میں جب حکم قرآن نے قواعد جاری کرنے ... آپ سے قبل آپ کے معاصرین نابلد تھے۔

آپ نے مشاہدہ کیا کہ ولی یا خاوند عام طور پر اور طلاق کے معاملے میں بالخصوص ناجائز دباؤ ڈالتے تھے اور یہ امر آپ کو خصوصیت کے ساتھ شاق گزرتا تھا۔ پہلا حکم طلاق بالجبر کے بارے میں صادر ہوا وہ یہ تھا کہ طلاق کو عورت سے استحصال مال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اور اگر ایک عورت کی جگہ دوسری عورت بدلنا چاہو اور اس کو بہت سا مال بطور مہر دے چکے ہو تو مت واپس لو اس میں سے کچھ، اور آگے قرآن میں درج ہے کیا لیا چاہتے ہو اس کو ناحق اور صریح گناہ سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ طلاق کو فی نفسہ جائز مانا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک اور آیت جو طلاق سے متعلق ہے وہ اس سلسلے میں ایک اور نئے حکم کا اضافہ کرتی ہے یعنی زمانہ انتظار (عدت) کا جس کا ایک طرف تو یہ فائدہ ہے کہ مطلقہ عورت کے ہاں اگر کوئی بچہ پیدا ہو تو اس کی ولدیت کے متعلق کوئی شک وشبہ نہ رہے اور دوسرے خاوند کو اتنی مہلت مل جائے کہ وہ طلاق واپس لے کر اپنی جلد بازی کی تلافی کرسکے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو طلاق دی، وہ اپنے آپ کو تین قروء تک روک رکھیں۔ (قروء امورحیض سے متعلق ہے)۔ انھیں اس بات کی اجازت نہیں کہ جو کچھ اللہ تعالےٰ نے ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے اسے چھپائیں، اگر انھیں اللہ اور روزِ محشر پر اعتبار ہے، ان کے خاوند زیادہ حقدار ہیں اس بات کے کہ وہ انھیں ایام عدت میں واپس لے لیں۔ اگر وہ اصلاح حال کرنا چاہیں اور عورتوں کا بھی مردوں پر حق ہے جیسا مردوں کا ان پر حق ہے لیکن مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت ہے۔

اس آیت میں مرد کو اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ ایام عدّت میں اپنی بیوی کو واپس لے لے۔

زمانہ جاہلیت میں عدد طلاق معیّن نہ تھا۔ اس لیے ہر وقت رجعت ممکن تھی خواہ دس بار طلاق ہوچکی ہو۔ اس لیے آئندہ آیت میں طلاق کا عدد جس کے بعد رجعت (واپسی) ہوسکتی ہے مقرر کردیا گیا۔ اور طلاق کے بدلے مال لینے کا طریقہ بھی معین کردیا۔ قرآن میں ہے۔

"طلاق (رجعی) ہے دو بار۔ اس کے بعد رکھ لینا یا چھوڑ دینا اچھی طرح سے اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے۔"

پہلی دو طلاقوں میں رجعت (واپسی) بغیر نکاح ہوگی اس کے بعد تیسری طلاق کا حکم دونوں صورتوں کے لیے عام ہے۔ یعنی تیسری طلاق کے بعد اُسی عورت سے دوبارہ نکاح کرنے سے پہلے دونوں صورتوں میں حلالہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد اس سے متصل جملۂ استثنائیہ میں خلع کی اجازت دی گئی ہے جس کی رُو سے عورت اپنی رضامندی سے کچھ مال اپنی طرف سے دے کر طلاق حاصل کرسکتی ہے گو زبردستی لینا بدستور منع ہے۔

اس کے بعد سورۃ البقرہ میں دو بار سے زائد طلاق دینے کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

"پھر اگر اس عورت کو طلاق (تیسری بار) دی تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا۔ پھر اگر طلاق دے دے دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ باہم مل جائیں۔ اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں بندھی ہوئی اللہ کی۔"

ایک اور جگہ قرآن مجید میں حکم طلاق آیا ہے:

"جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت تک تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے یا چھوڑ دو ان کو بھلی طرح سے۔ اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لیے تاکہ ان کے ساتھ زیادتی کرو اور جو ایسا کرے گا وہ بے شک اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنسی۔"

سورہ "الطلاق" میں ہے:

"اے نبی! جب تم طلاق دو عورتوں کو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت تک اور گنتے رہو عدت کو اور ڈرو اللہ سے جو رب ہے تمہارا۔ اور مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں مگر (جب وہ) کریں صریح بے حیائی اور یہ حدیں ہیں بندھی ہوئی اللہ کی اور جو کوئی بڑھے اللہ کی حدوں سے تو اس نے بڑا کیا اپنا اس کو خبر نہیں شاید اللہ پیدا کردے اس طلاق کے بعد نئی صورت (یعنی مرد کا خیال عورت کے بارے میں بدل جائے اور وہ اسے واپس لے لے۔")

پھر اسی سورۃ میں آگے فرمایا گیا ہے کہ:

"پھر جب پہنچیں اپنی عدّت کو تو رکھ لو ان کے دستور کے موافق یا چھوڑ دو ان کو دستور کے موافق اور گواہ کرلو دو معتبر اپنے میں سے اور سیدھی ادا کرو گواہی واسطے اللہ کے۔ یہ بات جو ہے اس سے سمجھ جائے گا جو کوئی یقین رکھتا ہے اللہ پر اور پچھلے دن پر۔"

مزید اسی سورہ میں ہے:

"اور جو عورتیں ناامید ہوگئیں حیض سے تمہاری عورتوں میں اگر اس کی وجہ سے تمہیں شبہ رہ گیا ان کے زمانِ عدت میں تو ان کی عدت ہے تین مہینے اور ایسے ہی جن کو حیض نہیں آیا اور جن کے پیٹ میں بچّہ ہے ان کی عدت یہ ہے کہ جن لیں پیٹ کا بچّہ اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے کر دیتا ہے وہ اس کے کام میں آسانی۔"

پانچویں سال کے آخری حصے میں یہ احکام نازل ہوئے :

"اے ایمان والو! جب تم نکاح میں لاؤ مسلمان عورتوں کو پھر ان کو چھوڑ دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ، سو ان پر تم کو حق نہیں عدت میں بٹھلانا کہ گنتی پوری کراؤ، ان کو دو کچھ فائدہ اور رخصت کرو بھلی طرح سے۔"

سورۃ بقرہ میں ہے کہ اگر نکاح کے بعد ہاتھ لگانے سے قبل ہی طلاق دے دی جائے اور حق مہر طے ہو چکا ہو تو لازم ہے کہ اس کا آدھا ادا کیا جائے جو کہ مقرر ہو چکا مگر اس میں مرد یا عورت کی طرف سے اگر درگزر کیا جائے تو بھلا۔ طلاق کا ذکر قرآن میں مکمل تفاصیل کے ساتھ آیا ہے پھر بھی نہیں بلکہ احادیث میں بھی اس کے نزاعی پہلوؤں پر سیر حاصل ارشادات موجود ہیں۔

لیکن اس ساری تفصیل کے ساتھ ساتھ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ طلاق ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ ایام حیض میں عورتوں کو طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر اگر بامر مجبوری عام حالات میں نوبت طلاق تک پہنچ ہی جائے تو اس کی اجازت دیتے ہوئے بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے۔

طلاق، سورۃ

قرآن مجید کی ایک سورۃ کا نام۔ عدد ترتیب ۶۵۔ عدد نزول ۹۹۔ اس سورۃ کا دوسرا نام النساء القصریٰ (چھوٹی سورۃ النساء) ہے یہ مدنی سورۃ ہے۔ اس کی آیات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بصرے کے قاریوں کے نزدیک اس میں گیارہ آیات ہیں مگر اکثر علماء کے نزدیک بارہ آیات ہیں۔

علماء نے اس سورۃ کے نازل ہونے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کو طلاق دے دی تو اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی اور آپؐ سے کہا گیا کہ حضرت حفصہؓ سے رجوع کر لیجئے۔ کیونکہ وہ پابند صوم و صلوٰۃ ہیں اور جنت میں آپ کی ازواج مطہرات میں سے ہوں گی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت عبداللہؓ بن عمر اور بعض دیگر صحابہؓ نے حالت حیض میں اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی اور عدت کے مطابق بیویوں کو طلاق دینے کا حکم ہوا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ نکاح، طلاق اور عدت وغیرہ کے کچھ احکام تو دیگر سورتوں میں بیان ہو گئے تھے۔ باقی ضروری احکام عطا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

امام ابوبکر الجصاص نے سورۃ الطلاق کی ابتدائی سات آیات کی روشنی میں طلاق، عدت اور رضاعت کے احکام پر مفید بحث کی ہے اسی طرح قاضی ابوبکر ابن العربی نے بھی اس سورۃ کی پانچ آیات سے ۴۴ کے قریب مختلف شرعی احکام اور فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔

اس سورۃ کے سلسلے میں آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ جس نے سورۃ الطلاق کی تلاوت کی وہ سنت رسول اللہؐ پر فوت ہوگا۔

طلحہؓ بن عبیداللہ

کنیت ابومحمد۔ لقب فیاض اور خیر۔ آپ کی پیدائش ہجرت نبویؐ سے ۲۴ برس قبل ہوئی۔ ابتدائی آٹھ مسلمانوں میں سے ہیں۔ مشہور صحابی زبیرؓ بن عوام کے اسلامی بھائی، حضرت ابوبکرؓ کے اہل و عیال کے ہمراہ مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور تمام غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جنگ احد میں جب مسلمان گھبرا کر بھاگے تو حضرت طلحہؓ میدان میں ڈٹے رہے اور ایسی دادِ شجاعت دی کہ ہر جگہ آپؓ کی بہادری کا چرچا ہونے لگا۔ اس جنگ میں آپ کے بدن پر ستر سے زائد زخم آئے۔

۹ھ میں جب رسول اللہؐ نے قیصر روم پر حملہ کرنے کے لیے عظیم الشان لشکر تیار کیا تو اسی لشکر کی امداد کے لیے حضرت طلحہؓ نے بہت بڑی رقم دی جس کی وجہ سے رسول اللہؐ نے آپؓ کو فیاض کا لقب دیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل جن چھ اشخاص میں سے اپنی جگہ خلیفہ منتخب کرنے کی تجویز پیش کی تھی ان میں سے ایک حضرت طلحہؓ بھی تھے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب باغیوں نے ملک میں شورش اور بدامنی بپا کر دی اور حضرت علیؓ کوفہ سے فوج لے کر بصرہ کی طرف بڑھے تو حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مقابلے پر آئے۔ دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی۔ حضرت زبیرؓ کسی وجہ سے جنگ سے کنارہ کش ہو گئے جس کی بنا پر آپ کا ارادہ بھی متزلزل ہو گیا اور آپ نے جنگ سے ہاتھ روک لیا۔ لیکن مروان نے ایک تیر مارا جو پاؤں پر لگا۔ اور اسی سے وفات پائی اس وقت آپ کی عمر ۶۴ برس تھی۔

آپ بہت مالدار تھے۔ خداترسی اور سخاوت کا یہ حال تھا کہ کسی موقع پر بھی خدا کی راہ میں بے دریغ خرچ کرنے سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ چنانچہ آپ کے اس وصف کی تعریف میں قرآن پاک کی سورۃ احزاب میں ایک آیت بھی اشارۃً نازل ہوئی۔

اسلام لانے سے قبل آپ تجارت کیا کرتے تھے۔ بعد میں مدینہ کر زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ خیبر اور عراق عرب میں بھی اراضی آپ کی ملکیت تھی۔ جس سے آپ کی روزانہ آمد اوسطاً ایک ہزار دینار تھی۔ وفات کے وقت آپ نے بائیس لاکھ درہم اور دو لاکھ دینار چھوڑے۔ غیر منقولہ جائیداد کی قیمت تین کروڑ درہم سے کم نہ تھی۔ اس کے باوجود آپ زندگی بھر سادہ خوراک استعمال کرتے رہے اور سادہ زندگی [illegible] کی البتہ کبھی کبھی رنگین اور قیمتی قبا پہن لیا کرتے تھے۔

طلحہؓ بن عتبہ

آپ قبیلہ اوس کے خونجی میں سے ہیں۔ غزوہ [illegible] میں شریک تھے [illegible] میں شہید ہوئے۔ حضورؐ کے جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ سے متعدد احادیث [illegible] مروی ہیں۔

طلیبؓ ابن عمیر

نام طلیب، کنیت ابوعدی۔ آپ کی والدہ اروی بنت عبدالمطلب تھیں جو حضور اکرمؐ کی پھوپھی تھیں۔ مکہ میں ابتدا ہی سے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور اپنی والدہ کو بھی تبلیغ کے ذریعے مسلمان کر لیا۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مشرکین مکہ مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے۔ ان موقعوں پر حضرت طلیبؓ ہر طرح سے آپؐ کو بچاتے اور مشرکین سے مقابلہ کرنے سے بھی نہ ہچکچاتے۔ چنانچہ مشرکین کے سرغنہ ابولہب جو حضور اکرمؐ کو اذیتیں دینے میں سب سے آگے ہوتا تھا حضرت طلیبؓ کا ماموں تھا۔ اسے طلیبؓ نے بری طرح مارا جس سے تمام مشرکین برانگیختہ ہو گئے اور ابولہب نے اپنی بہن سے شکایت کی مگر انہوں نے کچھ نہ کہا۔

کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر جب مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تو آپ

بھی مکہ سے حبشہ چلے گئے۔ جہاں سے کچھ عرصہ بعد مدینہ واپس آ گئے۔ اور جنگِ بدر اور بعد کے سب معرکوں میں جانبازی سے حصہ لیا۔

۱۳ھ میں جنگِ اجنادین میں شہادت پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۵ سال تھی؟

طلیحہ اسدی

مُدعیانِ نبوّت میں سے ایک شخص۔ بنو اسد کا سردار۔ عرب کے بہادر آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسلام کی شہرت جب دور دور تک پھیل گئی، اور مسلمانوں کی عظمت کا سکہ جم گیا تو دور دراز کے علاقوں میں بعض کفار سرداروں نے نبوّت کا دعوےٰ کر دیا۔ اس دعوے کے پس منظر میں اس عقیدت و احترام اور جاہ و جلال کے حصول کی خواہش کار فرما تھی جو حضور اکرم محمد صلعم کو حاصل تھا۔ پھر بعض لوگوں نے بھی ان جھوٹے نبیوں کی اطاعت گزاری شروع کر دی تاکہ جس طرح قریش کو اطاعتِ رسول کے باعث عزت و توقیر حاصل ہوئی انھیں بھی حاصل ہو سکے۔ لیکن حضورؐ نے اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانے اور اس کو پھیلانے کے لیے جن مصائب کا سامنا کیا تھا کسی اور شخص میں ان کی تاب لانے کا حوصلہ نہ تھا اس لیے جھوٹے دعوے داران نبوّت کا فریب بہت جلد کھل کر سامنے آ جاتا تھا۔

طلیحہ ایک بار اپنے قبیلے کے چند لوگوں کے ساتھ صحرا میں سفر کر رہا تھا۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور دور دور تک پانی کا نشان نہ تھا۔ قافلے کے لوگ پیاس سے بے تاب تھے۔ اچانک طلیحہ کے منہ سے نکل گیا کہ تمہیں بہت جلد پانی مل جائے گا اور اتفاق ایسا ہی ہوا۔ قافلہ بہت جلد پانی کے ایک چشمے کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ واقعہ اس کی نبوّت کے لیے ایک سہارا بن گیا۔ اور اس نے اس "معجزہ" کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ تاہم آنحضرت صلعم کی زندگی میں وہ آپؐ کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کی بغاوت کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی خلافت کے زمانے میں ہوا۔ لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ نے اسے شکست فاش دی اور وہ دوبارہ اسلام کی صفوں میں شامل ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ استقامت کے ساتھ اسلام پر قائم رہا۔

طواف

عربی لفظ۔ جس کے معنی ہیں گھومنا، چکر لگانا۔

شرعی اصطلاح کے مطابق طواف سے مراد مخصوص طریقے سے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگانا اور پھر چکر لگانا ہے۔ اسلامی نقطہ سے بیت اللہ کا طواف نماز روزے کی طرح ایک مقصود بالذات عبادت ہے اس لیے طواف کرتے وقت ضروری ہے کہ انسان کا بدن اور لباس پاک صاف ہو۔

طواف سنت ابراہیمی ہے اور اسلام میں اسے حضرت ابراہیمؑ کی سنّت کے طور پہ باقی رکھا گیا ہے۔ قرآن میں دو مقامات پہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے بیت اللہ پاک صاف رکھنے کا حکم دیا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۴ میں جن دس چیزوں کا ذکر ہے ان میں طواف کعبہ اور حج کے دوسرے مناسک بھی شامل ہیں۔

طواف اللہ تعالےٰ کے حکم کی بجا آوری میں اس کے گھر کے ارد گرد انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ گھومنے اور اپنا سب کچھ اس کے حکم کے مطابق اس کی راہ میں نثار کرنے کا عملی ثبوت پیش کرنے کے مترادف ہے۔ طواف کرتے وقت ایک مسلمان اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کی قربان گاہ پہ پیش کرتا ہے۔ دنیا کے تمام تعلقات حتیٰ کہ روزمرہ کا لباس تک ترک کر کے بیت اللہ کے گرد گھومتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے حضور فقیرانہ اپنی مغفرت کی دعا مانگتا ہے۔

قبل اسلام کے زمانے میں اہلِ عرب دینِ ابراہیم علیہ السلام کا ایک حصہ سمجھ کر بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ لیکن دیگر جاہلانہ اور غیر شرعی تصوّرات کی طرح فریضۂ حج کی بجا آوری کے سلسلے میں بھی ان کے ہاں کئی من گھڑت اور خلافِ تہذیب رسومات جڑ پکڑ گئی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ لوگ طوافِ کعبہ ننگے ہو کر کیا کرتے تھے۔ ابن عباسؓ کی روایت (منقولہ مسلم کتاب التفسیر حدیث ۲۵) کے مطابق زمانہ جاہلیت میں عورتیں برہنہ ہو کر طوافِ کعبہ کیا کرتی تھیں۔ اس پر باقاعدہ ایک آیت نازل ہوئی۔

فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا تو اس موقع پہ اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی مشرک حج کر سکے گا اور نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر طوافِ بیت کر سکے گا۔

طواف ارکان حج میں سے ایک ہے۔ مختلف احادیث میں اس کے بارے میں بیان آیا ہے اور اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ حائضہ اور نفساء کے لیے اس میں رخصت ہے۔

اس کے کچھ ارکان، اداب اور شرائط ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

نیت۔ طہارت، بدن، لباس۔ طواف کا آغاز حجرِ اسود سے ہو، طواف مسجد حرام کے اندر ہو نہ کہ مسجد کے باہر یعنی طواف خانہ کعبہ کا لازم ہے نہ کہ مسجد حرام کا۔

حنفیہ کے نزدیک طواف کے واجبات آٹھ ہیں:

طہارت بدن (بے وضو شخص اور حیض و نفاس والی عورتیں نیز جنبی طواف نہ کرے) ستر عورت کے برابر کپڑے کا پاک ہونا، ستر عورت، پا پیادہ ہونا، دائیں طرف سے ابتداء، حجرِ اسود سے شروع کرنا، حطیم کو طواف میں داخل کرنا۔ بعد طواف دو رکعت نماز ادا کرنا۔

ارکان طواف۔ سات چکر ہیں جنھیں اشواط کہا جاتا ہے۔ ہر چکر حجرِ اسود سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے۔ پہلے تین چکروں میں رمل کرنا چاہیئے۔ یعنی طواف کرنے والا اپنے کندھوں کو تھوڑا ہلا کر، قدرے اکڑ کر اور کچھ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلے۔ (عورتوں کے لیے رمل کا حکم نہیں ہے) باقی چار چکروں میں عام رفتار سے چلنا چاہیئے۔

رمل کی حقیقت یہ ہے کہ ہجرت کے بعد پہلی دفعہ جب رسول اللہؐ اصحاب کے ساتھ عمرے کے لیے تشریف لائے تو مشرکین مکہ نے کہا دیکھو انہیں یثرب کی گرمی نے نحیف و نزار بنا دیا ہے۔ اس پر آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ پہلے تین اشواط میں ذرا اکڑ کر اور سینہ تان کر چلو۔ یہ رسم آج بھی اداب طواف کے طور پہ جاری ہے۔ ہر پھیرے میں طواف کرنے والا جب رکن یمانی (بیت اللہ کا وہ گوشہ جو جنوبی جانب بطرف یمن واقع ہے) پہ پہنچے تو اس کو بھی ہاتھ سے چھو لینا مستحب ہے۔ یہ رکن یمانی کا استلام ہے۔

ہر مرتبہ حجرِ اسود پہ پہنچ کر بغیر تکلیف اٹھائے یا بغیر کسی اور کو تکلیف دیئے اسے بوسہ دینا چاہیئے۔ طواف کرتے ہوئے دعائیں پڑھتے رہنا اور اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا میں مشغول رہنا چاہیئے۔ طواف کے لیے کوئی خاص دعا ضروری نہیں ہے۔ آپؐ سے بہت سی مختصر اور جامع دعائیں مروی ہیں۔

طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم پہ اور اگر وہاں ممکن نہ ہو تو جہاں بھی سہولت

سے جگہ میسر ہو دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے اس کے بعد دعا مانگنی چاہیئے۔
طواف کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ طواف القدوم۔ مکے میں داخل ہونے والے ہر شخص کے لیے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک سنت ہے۔ امام مالکؒ اسے واجب قرار دیتے ہیں۔

۲۔ طواف الافاضۃ: یہ ارکان حج و عمرہ میں سے ہے۔ اسے طواف الزیارۃ بھی کہا جاتا ہے۔

۳۔ طواف الوداع۔ اسے طواف الصدر بھی کہتے ہیں اور یہ مسنون ہے یہ مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ادا کیا جاتا ہے۔

طور

لغوی معنی ہیں سرسبز پہاڑ۔ اگر پہاڑ سرسبز نہ ہو تو اسے طور نہیں کہتے (تاج العروس) ابن فارسی کے مطابق اس مادے کے بنیادی معنی کسی چیز کے لمبا ہونے یا بڑھنے کے ہیں۔ خواہ وہ لمبائی مکان سے تعلق رکھتی ہو یا زمان سے اور پہاڑ کو طور اس کے طول، عرض اور بلندی میں پھیلنے اور بڑھنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔

صحیح بخاری میں مجاہد سے مروی ہے کہ طور سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ علامہ سیوطی سے مروی ہے کہ یہ نبطی زبان کا لفظ ہے اور نہ صرف نبطی اور سریانی بلکہ بہت سی قدیم زبانوں میں بھی طور پہاڑی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن میں جس طور (طور سینا) کا ذکر ہے وہ حضرت موسیٰؑ پر تجلی الٰہی کی وجہ سے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں معروف ہے۔ وہ کون سا پہاڑ ہے۔ اس بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔

طور دراصل ایک سلسلۂ کوہ کا نام ہے جو خلیج سویز اور خلیج عقبہ کے درمیان ایک تکون سی بناتا ہے۔ مغرب کی طرف خلیج سویز کے ذریعے یہ مصر اور مشرق کی طرف خلیج عقبہ کے ذریعے بلاد عرب سے الگ ہوتا ہے۔ اس کے اضلاع کوئی ایک سو چالیس میل لمبے ہیں۔ شمال کی طرف۔ ان کی اونچائی بہت کم ہے اور جگہ جگہ ریت کے تودے ہیں۔ لیکن جنوبی سمت اس کی بعض چوٹیاں نو نو ہزار فٹ بلند ہیں اور یہ حصہ سرسبز و شاداب ہے۔ طور سینین سے فلسطین کی حدود تک تیہ کا صحرا ہے۔ اس پہاڑ پر جو بحیرہ قلزم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے الامن (الیم؟) کے مقام سے لوگ چڑھا کرتے تھے۔ جہاں ایک بار بنی اسرائیل نے پڑاؤ ڈالا تھا اس کے قریب وادیٔ طویٰ ہے۔ اسی مقام پر حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی طرف بھیجے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ سے کلام کیا تھا۔ یہ پہاڑ اب جبل موسیٰ بھی کہلاتا ہے۔ اس کے شمالی جانب ایک وادی "وادیٔ شعیب" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر خانقاہ کیتھرین واقع ہے جس کو جسٹینین اول نے غالباً ۵۴۸ھ سے ۵۶۲ھ کے درمیان طور سینا کے راہبوں کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ خانقاہ کے راہبوں کے پاس ایک خط موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضرتؐ نے انہیں عطا فرمایا تھا جس میں انھیں امان دی گئی تھی۔

قرآن مجید میں طور کا لفظ دس بار آیا ہے۔ تورات میں اس مخصوص پہاڑ کا نام حورب ہے جہاں حضرت موسیٰؑ پر تجلی ہوئی۔

ایک عالم اثریات کی رو سے بائبل کی قدیم ترین روایات سے ہمیں بہت سے ایسے اشارے ملتے ہیں کہ طور سینا ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ عرب کی قدیم روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ حضرت موسیٰؑ کی مہمات کی آماجگاہ تھا۔

الطور کا چھوٹا سا قصبہ جبل موسیٰ کے جنوب مغرب میں خلیج سویز کے اندر راس محمد سے پچاس میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ الطور میں پانی کی بہم رسانی کے ذرائع بہت اچھے ہیں اور اس کے مضافات میں کھجوروں کے بڑے بڑے نخلستان ہیں۔ یہ جزیرہ نمائے سینا کی اہم ترین بندرگاہ ہے۔ جب پرتگالیوں نے ہندوستان بحری راستہ دریافت کرلیا تو الطور کی اہمیت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور اس کی حیثیت محض ماہی گیروں کے ایک گاؤں کی سی رہ گئی۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں یہاں مکہ مدینے سے لوٹنے والے حاجیوں کے لیے قرنطینہ کا مقام قائم کیا گیا۔ اس کے بعد یہ قصبہ پھر پھلنے پھولنے لگا۔

کوہ طور (جبل طور) پر حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں پر ظہور پذیر ہوئے تھے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس پہاڑ کی چوٹی پر موجود قلعے پر صلاح الدین ایوبی نے قبضہ کر لیا تھا جسے ملک العادل نے ۱۲۱۲ء میں از سر نو تعمیر کیا۔ صلیبیوں نے اسی سال اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ بیبرس نے عکا پر حملہ کرنے کے لیے اس کو اپنا فوجی مرکز بنایا۔

یہودیوں کی روایت کے مطابق الطور نابلس کے اوپر ۳۰۰۰ فٹ بلند سامریوں کی ایک مقدس پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسحاق کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔

طوسی، نصیر الدین

نصیر الدین ابو جعفر محمد بن محمد بن الحسن، منجم، مؤرخ اور شیعہ متکلم۔ اس کا زمانہ حیات مغول کے حملوں کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

۵۹۷ھ / ۱۲۰۱ء کو طوس میں پیدا ہوا اور ۶۷۲ھ / ۱۲۷۴ء کو بغداد میں وفات پائی۔ نصیر الدین طوسی نے اسمٰعیلی حاکم ناصر الدین عبد الرحیم بن ابی منصور کے منجم کی حیثیت سے سرتخت میں ملازمت شروع کی۔ جب اس کی یہ کوشش افشا ہوگئی کہ وہ دربار خلافت میں جانا چاہتا ہے تو اسے نظر بند کر دیا لیکن اس کی ملازمت بحال رکھی گئی اور اسے اجازت دے دی گئی کہ وہ علم ہیئت میں تحقیق و تدقیق جاری رکھے۔

۱۲۵۶ء میں اس نے حشیشین کے شیخ رکن الدین خورشاہ کو ہلاکو کے حوالے کرا دیا اور پھر اس کا معتمد مشیر ہو کر فتح بغداد کی مہم پر اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ [illegible] میں اس کے حکم سے ایک رصدگاہ قائم کی۔ پھر ہلاکو کے وزیر و معتمد [illegible] نے اپنے اثر و اقتدار کو مرتے دم تک قائم رکھا۔

اس کے سیاسی رویے کی تعیین اس کے ثنا عشری عقائد [illegible] رکھنے سے ہوتی تھی چنانچہ وہ ہمہ گیریت اور قابلیت کے باعث [illegible] شیعہ منظم جماعت کا سردار بن گیا اور خلافت عباسیہ کا مخالف بن کر مغلوں سے مل گیا۔ یہ اس کے رسوخ کا اثر تھا کہ مغلوں کی پیدا کردہ عالمگیر بربادی میں شیعوں پر کچھ تھوڑا بہت رحم کیا گیا اور جنوبی عراق میں ان کے مقدس مقامات دست برد سے محفوظ رہے۔

طوسی کی دو کتابیں اصول و عقائد مذہب پر ہیں جن کی اس کے ہم مذہب بے حد قدر و منزلت کرتے ہیں۔ ان پر کئی بار شرحیں لکھی گئی ہیں۔

وہ راسخ العقیدہ شیعہ اور دوازدہ اماموں کا عقیدت مند تھا۔

اس کا ثبوت اس کی متصوفانہ کتاب "کتاب الاشراف" سے ملتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ تصوف کا قائل اور الحلاج کا مداح تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنے بہت سے ہم مذہبوں میں ممتاز ہے۔ فقہ میں اس نے قانونِ وراثت پر کتابیں لکھیں۔ اس کی ایک ادبی تصنیف اخلاق ناصری ہے۔ اپنے فرقے سے محبت و عقیدت کے باوجود اس کے تعلقات دوسروں سے خوشگوار طور پر استوار تھے۔ اس نے جلال الدین رومیؒ سے خطوط کے ذریعے اور نجم الدین کاتبی سے بالمشافہ علمی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔

طوسی کی طبی کتابیں علمی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں لیکن طوسی کی وہ محنت قابلِ داد ہے جو اس نے ثابت بن قرہ، قسطا بن لوقا اور اسحاق بن حنین کے ان ترجموں کی صحت و اشاعت میں کی جو انہوں نے یونانی مہندسوں اور ہیئت دانوں کی کتابوں سے کیے تھے۔ علم ہیئت میں اپنی کامیابیوں کے لحاظ سے طوسی نے بہت شہرت پائی۔

طوفانِ نوحؑ

ایک تاریخی واقعہ جو حضرت نوحؑ کی رسالت کے دوران پیش آیا۔ قصص القرآن کے مؤلف کے مطابق حضرت نوحؑ حضرت آدمؑ کے بعد پہلے نبی ہیں جن کو رسالت سے نوازا گیا۔

حضرت نوحؑ اور طوفانِ نوح کا ذکر قرآن میں تفصیلی طور پر آیا ہے لیکن اس تفصیل میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ قرآن پاک میں گزشتہ واقعات کی فقط انہی جزئیات کا ذکر و نقل ہوتا ہے جو مقصد کے لیے ضروری ہوں چنانچہ اس اسلوبِ بیان کے مطابق قرآن پاک میں حضرت نوحؑ کا ذکر چالیس مقامات پر ہے۔ اور طوفانِ نوحؑ کے واقعے کی اہم تفصیلات سورہ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر اور سورۂ نوحؑ ہی میں بیان ہوئیں۔

حضرت نوحؑ کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے نا آشنا ہو چکی تھی اور خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی۔ آخر سنت اللہ کے مطابق ان ہی میں سے ایک ہادی اور خدا کے سچے رسول نوحؑ کو مبعوث کیا گیا۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا اور سچے مذہب کی دعوت دی۔ لیکن قوم نے نفرت و حقارت سے انکار پر اصرار کیا۔ ان کی قوم کے امراء و رؤسا نے نوحؑ کی ہر طرف سے تکذیب و تحقیر کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ جو شخص نہ دولت و ثروت میں ہم سے برتر ہے اور نہ انسانیت کے رتبہ سے بلند "فرشتہ" ہیکل" اس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے اور ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں۔

حضرت نوحؑ کے گرد جمع ہونے والے لوگ کمزور اور غریب تھے اور امراء ان سے تمسخر کا رویہ رکھتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ پہلے ان پست غریب افراد کو اپنے پاس سے نکال دو پھر ہم تمہاری بات سنیں گے۔ کیونکہ ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے لیکن حضرت نوحؑ کا کہنا تھا کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ اور اگر میں ایسا کروں تو خدا کے عذاب سے میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے کیونکہ اس کے ہاں غریب و امیر کا کوئی سوال نہیں ہے اور فرماتے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے اور نہ اس کے یہاں سعادت و ہدایت کا اصول و ادراک سرمایہ کی رونق کے زیرِ اثر ہے بلکہ اس کے برعکس طمانیتِ نفس، رضائے الٰہی، غناءِ قلب اور اخلاص نیت و عمل پر موقوف ہے۔

حضرت نوحؑ نے یہ بھی بارہا تنبیہ کی کہ مجھے اپنی اس ابلاغِ دعوت و ارسالِ ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ و منصب کی۔ میں اجرت کا طلب گار نہیں ہوں۔ اس خدمت کا حقیقی اجر و ثواب تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی بہترین قدردان ہے۔

یوں حضرت نوح نے اپنی تمام کوششیں اور صلاحیتیں اس امر پر صرف کر دیں کہ کسی طرح ان کی قوم سمجھ جائے، اور صراطِ مستقیم اختیار کر لے۔ لیکن قوم نے نہ مانا اور جس قدر نبیٔ خدا کی طرف سے تبلیغ حق میں جد و جہد ہوتی تھی اتنا ہی اُدھر سے بغض و عناد میں سرگرمی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور ان کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی صورت میں بھی وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جیسے بتوں کی پرستش نہ چھوڑو۔

یہ مباحث سورۂ نوحؑ میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ دعوتِ دین کے مسائل کیا تھے اور ان کا کیسے کیسے سامنا کیا گیا اور کس کس طرح قومِ نوحؑ کو دعوتِ دین دی گئی لیکن اپنی کج روی اور بدبختی کے باعث وہ لوگ نہ مانے اور یہاں تک کہہ دیا کہ اے نوحؑ تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کیا اب اس کو ختم کر اور جو تو نے ہم سے (عذابِ الٰہی کا) وعدہ کیا تھا وہ لے آ (سورۂ ہود)

بالآخر جب حضرت نوحؑ اپنی قوم سے بالکل مایوس ہو گئے اور اس کی باطل کوشی، عناد اور ہٹ دھرمی ان پر واضح ہو گئی اور ساڑھے نو سو سال کی پیہم کوشش اور جد و جہد کے باوجود انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ بہت ملول اور پریشان ہوئے۔ تب خدا نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے اب ان میں کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ پس ان کی حرکات پر غم نہ کر۔

جب حضرت نوحؑ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغِ حق میں کوئی کمی یا کوتاہی نہیں رہ گئی تھی بلکہ یہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے اور ان کی سرکشی کا نتیجہ، تب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کی۔

"اے پروردگار! تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کر لیں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہو گی۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی دعا قبول فرمائی۔ اور قانونِ اجرائے اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی کی سزا کا اعلان کر دیا۔ اور حضرت نوحؑ کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں تاکہ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنینِ قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں جو خدا کی نافرمانی کرنے والوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرت نوحؑ نے حکمِ الٰہی سے کشتی بنانا شروع کر دی۔ اس عمل پر ان کی قوم کے منکر افراد نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور جب کبھی ادھر سے گزرتے تو کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تو تو اور تیرے پیرو اس کشتی پر سوار ہو کر محفوظ ہو جائیں کیسا احمقانہ خیال ہے۔ حضرت نوحؑ ان کو انہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

آخر سفینۂ نوحؑ بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرت نوحؑ نے اس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا یعنی زمین کی تہہ سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی کے ذریعے انہیں حکم ہوا کہ وہ اپنے خاندان کو کشتی میں بیٹھنے کا حکم دیں۔ اور جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک ایک جوڑا کشتی میں پناہ گزیں ہو اور وہ چالیس نفر بھی جو ان پر ایمان لا چکے ہیں کشتی

میں سوار ہو جائیں ۔

جب وحی الٰہی کی تکمیل ہو گئی تو آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح ابل پڑیں۔ چنانچہ حکم الٰہی کے تحت ایسا ہی ہوا اور کشتی پانی میں تیرتی رہی یہاں تک کہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے ۔

حضرت نوحؑ نے طوفانی عذاب کے وقت خدا تعالٰے سے اپنے بیٹے کے عذاب کے متعلق سفارش کی لیکن خدا تعالٰے نے انہیں اس سفارش سے روک دیا۔ سورہ ہود میں اس کا ذکر اس طرح ہے ؛

" اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا، اے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل ہی میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حاکموں میں سے ہے۔ اللہ تعالٰے نے کہا۔ اے نوحؑ! یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے یہ بدکردار ہے، پس مجھ کو ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ جس کے بارے میں تجھ کو علم نہ ہو میں بلاشبہ تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن، نوحؑ نے کہا۔ اے اللہ! میں بلا تردد اس بارے میں کہ جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو تجھ سے سوال کروں تیری پناہ چاہتا ہوں اور اگر تو نے معاف نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گا۔ نوحؑ سے کہہ دیا گیا۔ اے نوحؑ! ہماری جانب سے تو اور تیرے ہمراہی ہماری سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر اترو۔"

قرآن میں اس بات کا واضح طور پر ذکر کر کے دراصل یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ وعدۂ نجات کا منشاء نسل و خاندان قطعاً نہیں بلکہ "ایمان باللہ" ہے ۔

کافروں کی غرقابی کے بعد پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہوا اور کشتیٔ نوحؑ کے سواروں نے دوسری بار امن و سلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا اسی بنا پر حضرت نوح علیہ السلام کا لقب ابوالبشر ثانی یا آدم ثانی (انسانوں کا دوسرا باپ) مشہور ہوا اور غالباً اسی اعتبار سے حدیث میں ان کو "اول الرسل" کہا گیا۔

واقعہ کی تفصیلات کے اعتبار سے اس کا ذکر یہاں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس میں بعض علمی اور تاریخی پہلو ابھی تشنۂ تحریر ہیں۔

اس طوفان کے متعلق علماء میں ہمیشہ دو رائیں رہی ہیں۔ علمائے اسلام میں سے ایک جماعت، علمائے یہود و نصاریٰ اور بعض ماہرین علوم فلکیات، طبقات الارض اور تاریخ طبعیات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارض پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اسی خطے میں محدود تھا جہاں حضرت نوحؑ کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کلومیٹر مربع ہوتا ہے ان کے مطابق اس طوفان کے آثار کرۂ ارض کے ان گوشوں اور حصوں پر نہیں ملتے جو اس مخصوص علاقوں سے دور تھے۔ اس کے علاوہ انسانی آبادی میں ابھی زیادہ اضافہ بھی نہیں ہوا تھا اور نسل آدم صرف اسی خطے میں آباد تھی جہاں عذاب نازل ہوا ۔

لیکن بعض علمائے اسلام، ماہرین طبقات الارض اور علمائے طبعیات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارض پر حاوی تھا اور یہ ایک ہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس سرزمین پر متعدد ایسے طوفان آئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ "جزیرہ" یا عراق عرب کی اس سرزمین کے علاوہ بلند پہاڑ پر بھی ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں۔ جن کے متعلق ماہرین کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مائی ہی ہیں اور صرف پانی میں ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔

طوفان نوحؑ زمین کے کسی خاص حصے سے متعلق رہا ہو یا تمام کرۂ ارض سے۔ بہرحال مذاہب عالم کی تاریخ اور علم آثار ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تورات کے علاوہ قدیم ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے ۔

طٰہٰ، سورۃ

(طٰهٰ) حروفِ مقطعات میں سے ہیں۔ قرآن مجید کی ایک سورت کا نام جو ترتیب کے اعتبار سے بیسویں ہے۔ سورت مریم کے بعد اور سورت انبیاء سے پہلے مندرج ہے۔ ترتیب نزول کے اعتبار سے پینتالیسویں[۴۵] سورت ہے۔ جو سورۃ مریم کے بعد اور سورۃ الواقعہ سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

کفار مکہ میں ابوجہل اور النضر بن الحارث وغیرہ نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اللہ تعالٰے نے محمدؐ پر قرآن مجید نازل کر کے انہیں تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالٰے نے ان کا جواب دیا اور فرمایا کہ قرآن کسی کی تکلیف کے لیے نہیں بلکہ ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے ۔

القرطبی نے لفظ طٰہٰ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سورت کا دوسرا نام سورۃ الکلیم بھی ہے۔ یہ پوری سورت جمہور علماء کے نزدیک مکی ہے مگر بعض کے نزدیک ایک سو تیسویں اور ایک سو اکتیسویں آیت مدنی ہے۔ سورت طٰہٰ میں کل [illegible] آیات ہیں ۔

گزشتہ سورت کے ساتھ اس کا ربط اور مناسبت یہ ہے کہ پچھلی سورت (سورۃ مریم) ترتیب کے لحاظ سے بھی اس سے قبل نازل ہوئی۔ دونوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ گزشتہ سورت کے آخر میں بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید کو لوگوں کی سہولت اور ہدایت کے لیے عربی میں نازل کیا گیا ہے۔ اس سورت کے آغاز میں بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ سے ڈرنے والوں کی [illegible] نازل کیا گیا ہے۔ گزشتہ سورت میں بہت سے انبیاء کے قصے بیان [illegible] سورت میں ان قصوں میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بڑی تفصیل [illegible] بیان کیا گیا ہے اس میں طور سینا پر موسیٰؑ کا اللہ سے ہمکلام ہونا [illegible] حضرت ہارونؑ کی نبوت کے لیے حضرت موسیٰؑ کی دعا، فرعون [illegible] موسیٰؑ کی اللہ تعالٰے سے التجا، فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰؑ کی پرورش [illegible] کا حق کے سامنے سربسجود ہونا، مصر سے بنی اسرائیل کا [illegible] فرعون [illegible] سامری کے بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کا ذکر ہے ۔

اس کے بعد قرآن مجید سے اعراض کرنے والوں کی [illegible] کے احوال، قصۂ آدمؑ کے بعض پہلو، اللہ کی یاد سے غافل ہونے [illegible] گزشتہ امتوں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے اور قیامت کے [illegible] مشرکین کے لیے مہلت کا ذکر ہے اور سب سے آخر میں کفار [illegible] کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید پر ثابت قدم رہنے اور اللہ کی یاد [illegible] مشغول رہنے کا حکم دیا گیا ہے ۔

قاضی ابوبکر ابن العربی نے سورت طٰہٰ کی مختلف آیات [illegible] مختلف شرعی احکام اور فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔ اسی طرح امام [illegible] نے اس سورت کی بعض آیات کی روشنی میں متعدد علمی مسائل اور فقہی مباحث کی تفصیل پیش کی ہے ۔

اس سورت کے فضائل کے ضمن میں یہ بات [illegible] خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ [illegible]

وہ سورت ہے جو حضرت عمرؓ بن الخطاب کے قبولِ اسلام کا سبب بنی تھی۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تخلیقِ ارض و سما سے دو ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے سورت طٰہٰ اور سورت یٰسین کی قرأت کی تو فرشتے سن کر یہ کہنے لگے۔" وہ اُمت خوش نصیب ہوگی جس کے سینوں میں اور جس کی زبانوں پہ اللہ کا یہ کلام ہوگا۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ جنت فقط سورۃ طٰہٰ اور سورۃ یٰسین کی تلاوت کیا کریں گے۔"

طہارت

لفظی معنی صفائی، پاکی۔ اسلام نے اس پہ بہت زور دیا ہے اور تصوّف میں اس پہ مختلف پہلوؤں سے باقاعدہ بحث کی گئی ہے۔ ایمان لانے کے بعد سب سے پہلے جو چیز ایک بندے پہ فرض ہے وہ ادائیگی نماز کے لیے طہارت ہے، اور طہارت کا مطلب ہے بدن کو نجاست اور جنابت سے پاک کرنا۔ اور وہ شریعت کے مطابق تین اعضا یعنی منہ، ہاتھ اور پیروں کا دھونا اور سر کا مسح کرنا ہے۔ پانی نہ ہونے یا مرض کی صورت میں تیمم کرنا ہے۔

طہارت کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک بدن کی طہارت دوسری دل کی طہارت۔ کشف المحجوب میں ہے کہ جس طرح بدن کی طہارت نہ ہونے کے باعث نماز درست نہیں اسی طرح دل کی طہارت نہ ہونے کے باعث معرفتِ حق درست نہیں ہوتی اور جیسا کہ بدنی طہارت کے لیے پاک صاف پانی درکار ہے اسی طرح دل کی طہارت کے لیے خالص توحیدِ الٰہی کی ضرورت ہے۔ خلط ملط اور پریشان اعتقاد کی گنجائش نہیں۔ پس صوفیا ہمیشہ ظاہر میں بدنی طہارت کے ساتھ اور باطن میں دل کی طہارت یعنی توحیدِ خالص کے ساتھ رہتے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے ایک صحابی سے فرمایا کہ تو ہمیشہ باوضو رہ تاکہ دونوں محافظ فرشتے تجھے دوست رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور خوب پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ پس جو شخص ظاہر میں طہارت رکھتا ہے اُسے فرشتے دوست رکھتے ہیں اور جو شخص باطنی طہارت کے ساتھ رہتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ اپنا دوست رکھتا ہے۔

رسول اللہؐ ہمیشہ دُعا میں فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ میرے دل کو نفاق سے پاک کر دے۔ حالانکہ کسی بھی وجہ سے آپؐ کے دل میں نفاق متصور نہیں ہو سکتا تھا لیکن اپنی بزرگیوں کا دیکھنا ہی خود کو غیر کا ثابت کرنا ہوا اور غیر کا ثابت کرنا خود کو توحید کے محل میں نفاق کا شکار ظاہر کرنا ہے۔ گو صوفیا کے ہاں مشائخ کی کرامات کا ایک ذرہ بھی مریدوں کی آنکھ کا سرمہ ہے مگر وہ کمال صاحبِ کمال کے لیے ایک حجاب ہی رہا ہے اس لیے کہ جو کچھ غیر اللہ ہو اس کا دیکھنا آفت ہوتا ہے۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا۔ عارفوں کا نفاق طالبوں کے اخلاص سے بہتر ہے۔ یعنی جو کچھ مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کا حجاب ہوتا ہے کیونکہ مرید کا قصد تو یہ ہوتا ہے کہ کرامات حاصل کرے اور کامل کا قصد یہ ہوتا ہے کہ کرامات عطا کرنے والی ذاتِ حق تعالیٰ کو پالے۔

ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت کے موافق ہونی چاہیے یعنی جب ہاتھ کو دھویا جائے تو دل کو بھی دنیا کی محبت سے دھو ڈالا جائے۔ اسی طرح باطن میں غیر کی محبت سے بھی نجات ڈھونڈی جائے۔

حضرت ابراہیم خواص سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے خدا تعالیٰ کا حق ادا کرنے کے لیے ابدی عمر چاہیے تاکہ سب لوگ دنیا کی نعمتوں میں مشغول ہو کر حق تعالیٰ کو فراموش کر دیں تو میں دنیا کی مصیبت میں شریعت کے آداب پہ قائم رہ کر حق تعالیٰ کو یاد رکھ سکوں۔

روایت ہے کہ ابوجعفر حرمیؒ چالیس سال تک مکہ میں مجاور رہے اور حرم کعبہ کے اندر طہارت نہیں کی بلکہ ہر بار طہارت کے لیے حرم کی حدود سے باہر جاتے۔ فرماتے کہ جس زمین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے میں ناپسند کرتا ہوں کہ مستعمل پانی اس پہ گراؤں۔

حضرت ابراہیم خواص سے روایت ہے کہ آپ رَی کی جامع مسجد میں دردِ شکم میں مبتلا تھے تو ایک دن رات میں ساٹھ غسل کیے تھے اور آخرکار آپ کی وفات بھی پانی ہی میں ہوئی تھی۔

ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے مسجد میں داخل ہونے کے لیے وضو کیا تو ہاتف نے آواز دی کہ تُو نے ظاہر کو آراستہ کر لیا باطن کی صفائی کہاں ہے۔ آپ وہاں سے لوٹے اور سارا مال و اسباب راہِ خدا میں دے دیا اور ایک سال تک اتنے کپڑے کے سوا نہ پہنا جس سے نماز درست ہو جائے۔ پھر حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔ انہوں نے فرمایا اے ابوبکر! وہ نہایت مفید طہارت تھی جو تُو نے کی۔ خدا تعالیٰ تجھے ہمیشہ پاک رکھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد آپ کبھی بے طہارت نہ رہے یہاں تک کہ جب آپ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ کا وضو ٹوٹ گیا۔ آپ نے ایک مرید کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مجھے طہارت کرا دے۔ چنانچہ اس نے آپ کا وضو کرا دیا۔ اور ریشِ مبارک کا خلال کرنا بھول گیا۔ آپ اس وقت بول نہیں سکتے تھے۔ مرید کا ہاتھ پکڑ کر ریشِ مبارک کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خلال کر دیا۔

حضرت بایزیدؒ سے روایت ہے کہ میرے دل میں جب دنیا کا خیال گزرتا ہے تو میں وضو کر لیتا ہوں اور جب عقبیٰ کا خیال آتا ہے تو غسل کر لیتا ہوں کیونکہ دنیا حادث ہے اس کا خیال حدث (بے وضو) ہوتا ہے اور عقبیٰ آرام کا محل ہے اور اس کا خیال جنابت یعنی حکمی ناپاکی موجبِ غسل ہے۔

اسلام میں طہارت کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ طہارت پانی سے کی جاتی ہے اور تیمم اُسے کہتے ہیں جو پانی کی عدم موجودگی یا کسی مرض کی شدت میں پانی کے بجائے پاک مٹی سے کیا جائے۔

طہارت پر حضور اکرمؐ کی بہت سی احادیث روایت کی گئی ہیں۔ مثلاً ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب کوئی مومن یا مسلمان وضو کے وقت چہرے پہ پانی کا چلّو ڈالتا ہے تو چہرے کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوتے ہیں۔ پانی کے ساتھ یا پانی کے قطرے کے ساتھ ہاتھ دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ ہاتھ سے کیے ہوئے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ جب پیر دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ وہ تمام گناہ دُھل جاتے ہیں جو اس نے پیر سے کیے تھے حتیٰ کہ تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ بہترین عمل نماز ہے اور مومن ہی وضو کو مکمل طور پہ کرتا ہے۔

ایک اور حدیث حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ نماز جنت کی کنجی ہے اور طہارت نماز کی کنجی ہے۔

الغرض طہارت کو اسلام میں نہایت درجہ اہمیت دی گئی ہے۔ فقہ میں ظاہر کی طہارت کا ذکر ہے لیکن اسلامی تصوّف اور عام اسلامی فکر میں جہاں ظاہری طہارت یعنی بدن اور لباس پہ زور دیا گیا ہے وہیں پہ باطنی طہارت یعنی دل اور

روح میں یکسوئی کے ساتھ توحید الٰہی کا قیام بھی لازم بتایا گیا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظریے میں اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

طے، بنو

عرب کا ایک مشہور و معروف قبیلہ۔ غالباً تیسری صدی عیسوی میں اس قبیلے کے لوگ یمن سے نجد میں آکر آباد ہوئے۔ ان میں سے کچھ یہودیت اور کچھ عیسائیت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ بعد میں یہ لوگ اسلام قبول کرنے والوں میں شامل ہوئے اور ایمان لائے۔

اس قبیلے کے لوگ بحیثیت جماعت شجاعت، سخاوت، جوانمردی اور بہادری میں مشہور ہیں۔ عرب کا ممتاز سخی اور فیاض شخص حاتم طائی اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ حاتم طائی قبل اسلام ہوئے۔ ایک دفعہ کسی جنگ میں حضورؐ کے سامنے حاتم کی بیٹی اسیر ہو کر آئی تو حضورؐ نے اُس سخی مرد کی یاد میں اس کی بیٹی کو آزاد کر دیا ؛

طیفوریہ

صوفیا کا ایک فرقہ جو حضرت بایزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بسطامیؒ سے محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ آپ طریقت میں بڑے سردار اور بزرگ صوفیاء میں سے ہوئے ہیں۔ آپ کا طریقہ غلبۂ شوق اور جذب و مستی تھا۔ وہ لوگوں کی صحبت کو ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کرتے تھے اور اپنے مریدوں سے بھی یہی تلقین کرتے تھے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کے ماننے والے سُکر کو صحو پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ خود حضرت نے بھی اسی طرح کیا ہے۔ سُکر ہوشیاری کی صفت نہیں ہے۔ آدمی کو اپنے اندر خود سُکر پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے مجذوب مغلوب ہوتا ہے اُس کی توجہ خلقت کی طرف قطعاً نہیں ہوتی۔ سُکر اور غلبۂ محبت اکتساب سے نہیں آتے (حالانکہ اہل طریقت کا ایک علیحدہ گروہ اس بات کی بھی توثیق کرتا ہے کہ کوئی شخص تکلف سے غلبۂ عشق الٰہی اور جذب محبت کی راہ اختیار کرے) مجاہدہ اور ریاضت صحو کی حالت ہے اور صاحب صحو کا رخ سُکر کے قبول کرنے کی طرف نہیں ہوتا لہٰذا مجاہدے اور ریاضت سے جذب و مستی کو حاصل کرنا محال ہے۔ سُکر سرتاسر گمانِ فنا ہے جبکہ صحو سرتاسر دیدارِ بقا ہے۔

فرقہ طیفوریہ کے لوگ سُکر کے ماننے والے ہیں۔ گو حقیقت ازلی کے سامنے سُکر اور صحو طفیلی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوصف سُکر اور صحو پر صوفیا میں باقاعدہ بحث موجود ہے اور ان کے مختلف گروہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں ؛

ظاہر بامر اللہ

ابو نصر محمد بن الناصر عباسی خلیفہ۔ خلیفہ الناصر نے صفر ۵۸۵ھ ہی میں اپنے سب سے بڑے بیٹے محمد کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں اپنے چھوٹے بیٹے علی کے حق میں اپنا فیصلہ بدل دیا۔ علی کا ۶۱۲ھ میں انتقال ہو گیا اور ناصر کی اور کوئی نرینہ اولاد نہ تھی لہٰذا اسے پھر محمد کی طرف رجوع کرنا پڑا تاکہ اس کو اپنا جانشین مقرر کر سکے۔ الظاہر سے اس کے باپ کے محل میں جو سلوک کیا جاتا تھا اس کے متعلق ابن الاثیر لکھتا ہے کہ اس کی نقل و حرکت پر شدید نگرانی رکھی جاتی تھی اور وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ ناصر کی موت کے بعد رمضان ۶۲۲ھ میں محمد مسند خلافت پر الظاہر بامر اللہ کے لقب سے متمکن ہوا۔ لیکن اس کی حکومت فقط نو ماہ چودہ دن رہی۔ اس لیے کہ رجب ۶۲۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بڑا بیٹا مسند آرائے خلافت ہوا۔

مسلم مؤرخوں نے ظاہر کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کی بہت تعریف کی ہے وہ رعایا کے ساتھ عدل و انصاف برتتا تھا اور خدا کے حضور خشوع و خضوع کے ساتھ حاضر ہوتا تھا۔ اس کے اس مختصر سے عرصہ خلافت کو اکثر اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ سے تقابل کیا جاتا ہے جو اپنے زہد و تقویٰ کے لیے مشہور ہیں۔

سیاسی اعتبار سے ظاہر نے کوئی اہمیت یا شہرت حاصل نہ کی اور اموی سلطنت میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہ دیا ؛

ظاہر شاہ

افغانستان کا آخری بادشاہ۔ اس کی حکومت کا تختہ جولائی ۱۹۷۳ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے الٹ دیا گیا۔

ظاہر شاہ کے والد کا نام نادر شاہ تھا جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں امیر امان اللہ خان کے وطن چھوڑ جانے کے بعد بچہ سقہ کو شکست دے کر افغانستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں قلعہ ارک کے تقسیم اسناد کے موقع پر ایک نوجوان نے نادر شاہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ باپ کی ہلاکت کے بعد ظاہر شاہ تخت نشین ہوا۔

ظاہر شاہ نے پیرس میں تعلیم حاصل کی اور عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد ملکی ترقی میں کافی حصہ لیا۔ صنعت و زراعت کے شعبوں میں مزید ارتقا کیا عمارات، سڑکوں وغیرہ کی تعمیر میں دلچسپی لی۔ اس کے عہد میں قومی زندگی کے تمام شعبوں میں دُور رس اصلاحات ہوئیں۔ اور افغانستان نے معاشرتی، معاشی اور سیاسی میدان میں نمایاں ترقی کی۔

لیکن ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو سردار داؤد کی سرکردگی میں فوجی انقلاب نے ظاہر شاہ کی بادشاہت کو ختم کر کے ملک کو آئینی جمہوریہ میں تبدیل کر دیا۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر نور محمد ترہ کئی نے خونی انقلاب برپا کر کے صدر داؤد کو ان کے قریبی ساتھیوں کو ہلاک کر دیا۔ انقلاب میں کم و بیش دس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ انقلاب فوج نے برپا کیا مگر فوراً ہی اقتدار سول کے حوالے کر دیا۔ اور نور محمد ترہ کئی نے صدر وزیر اعظم و چیف آف اسٹاف کا عہدہ سنبھال لیا۔

ظاھـــریہ

فقہ کا ایک دبستان۔

اس میں احکام کا استخراج الفاظِ قرآن و سنت کے ظاہری معانی سے کیا جاتا ہے اس کی نشو و نما میں اس امر نے خاصی مساعدت کی ہے کہ اس میں رائے، قیاس، استصواب اور استحسان اور اس کے علاوہ تقلید کی بڑی شدید مخالفت کی گئی ہے عراق میں مذہب ظاہری اپنے بانی داؤد بن خلف کے نام پر داؤدی بھی کہلاتا ہے۔

یہ دبستانِ فقہ ایک فقہی مسلک بن گیا اور اس کا اثر رفتہ رفتہ ایران اور خراسان تک پھیل گیا۔ لیکن اندلس میں ابن حزم ہی اس مسلک کا علمبردار تھا۔ الموحد یعقوب المنصور کے عہد میں مسلک ظاہری سرکاری قانون کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا لیکن ظاہری نظریہ رکھنے والے لوگ پہلے سے موجود تھے اگرچہ وہ کسی فرقے کی صورت میں منظم نہ تھے۔ اور وہ اس وقت بھی موجود تھے جب یہ مسلک ان مسائل کے حل میں ناکام ثابت ہوا۔ جو آنحضرتؐ کے زمانے میں یا صحابہ اور ابتدائی رواۃ حدیث کے زمانے میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ انہیں حل کرنے کے لیے اسے اپنے حریفوں کے بعض اصول بھی اپنانا پڑے۔

۷۸۸ھ میں شام میں ظاہریوں کی ایک بغاوت کا ذکر ملتا ہے حالانکہ یہ مسلک

وہاں کبھی زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

وہ لوگ جنہیں روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے واسطہ نہ پڑتا تھا۔ اور جو مختلف فرقوں کے مناظرات کو ناپسند کرتے ہوئے کسی مخصوص مذہب کے پابند نہ رہے تھے، ظاہریہ رجحانات کو بالخصوص نظریاتی طور پہ اپنا سکتے تھے لہٰذا یہ کوئی زیادہ توجہ کی بات نہیں کہ ظاہریہ کی بہت سی آرا کو محفوظ کر دینے والا شخص الشعرانی ہے جو صوفی تھا۔

بعض مفسرین قرآن خاص طور پہ فخر الدین رازی اور شارحین کتب حدیث، ظاہریہ کی مخصوص تفاسیر کا بکثرت ذکر کرتے ہیں لیکن دوسری طرف متاخر فقہا ظاہریہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

مجموعی طور پہ اس مسلک فقہ کو نرم یا سخت نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ بعض معاملات میں اس کے ماننے والوں کا رویہ نہایت متشدد ہوتا ہے لیکن دیگر بہت سے امور میں تحمل اور بردباری کی بہت گنجائش ہے۔ ان کے ہاں کسی قانون کی علت تلاش کرنا ممنوع ہے۔

ظاہریہ نے قدرتی طور پہ احادیث کو بکثرت استعمال کیا لیکن ان پہ الزام ہے کہ انھوں نے ان احادیث کی جانچ پڑتال اچھی طرح نہیں کی۔

ظاہریہ مذہب وحدت کا نشان یا علامت نہ بن سکا۔ عام طور پہ یہ لوگ دینی جھگڑوں میں احتیاط کے ساتھ غیر جانبدار رہتے تھے۔

ظفر علی خاں

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۶ء) اردو کے شاعر، ادیب، صحافی۔ کوٹ مہرتھ ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول وزیرآباد میں پائی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد نواب محسن الملک کے سیکرٹری مقرر ہوئے جو ان دنوں بمبئی میں تھے۔ اس کے

ظفر الملت مولانا ظفر علی خان

بعد حیدرآباد چلے گئے۔ اور ایک مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ حیدرآباد سے قطع تعلق کرنے کے بعد مولانا نے لاہور سے روزنامہ "زمیندار" جاری کیا جس کے بانی ان کے والد مولوی سراج دین احمد تھے۔ مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ عملی سیاست میں گزرا۔ آپ بہت بڑے شاعر، شعلہ بیان مقرر، صاحب طرز انشا پرداز اور بے باک صحافی تھے۔ شاعری میں کوئی تخلص نہ تھا۔ لیکن شعر خوب کہتے تھے۔ برجستگی ان پر ختم تھی۔ شاعری میں مذہب اور سیاست کا غلبہ ہے۔ ہنگامی نوعیت کی نظمیں خوب کہتے تھے۔ آپ کو اسلام سے حقیقی محبت اور آنحضورؐ کے فدائی تھے۔ معرکۂ مذہب وسائنس غلبۂ روم، منظوم ڈراما "جنگ روس وجاپان" "سیر ظلمات" آپ کے مشہور تراجم ہیں۔ آپ کے کلام کے متعدد مجموعے ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہیں۔ بہارستان، نگارستان اور چمنستان۔ آپ موضع کرم آباد متصل وزیرآباد میں دفن ہوئے۔

ظلم

کسی شئے کو اس کی مخصوص جگہ پہ نہ رکھنا یا رہنے دینا۔ ایک معنی خیز لفظ ہے حق تلفی کو بھی ظلم کہتے ہیں وہ شخص ظالم ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔

قرآن اور احادیث میں ظلم کی تشریح اور بیان موجود ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ "پھر ہم نے آدمؑ سے کہا۔ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے۔"

نافرمانی بھی ظلم ہی کے زمرے میں آتی ہے کیونکہ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اول خدا کا حق کیونکہ خدا کا حق یہ ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ دوم ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ یعنی اس کے اعضائے جسمانی، اس کے ہم معاشرت لوگ، وہ اشیاء جو استعمال ہوئیں اور وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں اور سوم خود اپنا حق، کیونکہ اس پہ اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو، اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پہ ظلم کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

ظلم کی اصطلاح اسلامی فکر و عمل میں بہت وسیع معنی کی حامل ہے اور اس کا اطلاق بہت سے معاملات میں ہوتا ہے۔ مساجد میں عبادت سے روکنا اور انھیں ویران کرنا بھی ظلم ہی ہے۔ پھر خدا کے علم (اسلام) کو چھوڑ کر دوسرے افکار و مذاہب کی پیروی کرنا بھی ظلم کہلاتا ہے۔ قیام عدل میں اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ دینا بھی ظلم ہے۔ اللہ پہ بہتان طرازی، آیات الٰہی کو جھٹلانا اور ان پہ نکتہ چینی سب سے بڑا ظلم ہے اور اس کا مرتکب سب سے بڑا ظالم ہے اور قرآن کے مطابق ظالم کے لیے کوئی فلاح نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کوئی ہدایت ہے۔

احادیث میں بھی ظلم اور ظالم کے بارے میں تفصیلی بیان ملتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ظلم قیامت کے روز قطعی تاریک ہوگا۔

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا، خداوند ظالم کو برابر مہلت دیتا رہتا ہے۔ آخر ش پکڑتا ہے مگر پھر اس کو نہیں چھوڑتا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی "اللہ کی گرفت جب کسی ظالم شہر والوں کو پکڑ لیتی ہے۔"

حضرت ابن عمرؓ سے ایک اور حدیث روایت ہے کہ آنحضرت صلعم ایک بار وادیٔ حجر سے گزرے تو فرمایا ان لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہو تاکہ وہ عذاب جو ان پہ ہوا تم پہ نہ ہو، یہ فرما کر آپ نے اپنا سر چادر سے ڈھانپ لیا اور بہت تیزی سے وادیٔ حجر سے گزر گئے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جس آدمی پر کسی مسلمان کے ظلم کا بدلہ واجب ہو تو چاہیے کہ یہاں معاف کر دے قبل اس کے کہ جہاں

اشرفیاں ہیں نہ درہم ورنہ قیامت کے روز ظالم کا جو عمل نیک ہے ظلم کے برابر کم کر کے مظلوم کو دیا جائے گا۔ اور اگر اس کے اعمال میں نیکی ہوگی ہی نہیں تو مظلوم کے گناہوں سے گناہ لے کر ظالم کے نام لکھ جائے گا۔

ظلم خدا کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے یہاں تک کہ مظلوم کے لیے بدکلامی کی رخصت دی گئی ہے ۔

ظہار

عربی زبان کا لفظ۔ قرآن میں اس کی وضاحت اور بیان موجود ہے اس کا مطلب اصطلاحی معنوں میں خاوند کا اپنی بیوی سے یہ کہنا ہے کہ تو میری ماں کے برابر ہے اور مجھ پر حرام ہے۔ ایسی صورت میں جب تک وہ مرد کفارہ نہ دے وہ عورت اس پر حرام ہوتی ہے۔ کفارہ کی شکل یہ ہے کہ یا تو مرد ایک غلام آزاد کرے یا دو مہینے متواتر روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ نیز شرط یہ ہے کہ کفارہ جماع سے پہلے ادا کیا جائے۔

اسلام سے قبل ظہار کو طلاق کے مترادف سمجھا جاتا تھا لیکن حضور اکرمؐ نے اسے نرم کر کے کفارہ ادا کرنے تک کی وقتی پابندی میں تبدیل کر دیا ۔

ظہر

دن کے اوقات میں سے ایک مخصوص وقت۔ عین دوپہر کے بعد جب سورج ڈھلنے لگتا ہے اور مغرب کی طرف بڑھنے لگتا ہے اُسے ظہر کہتے ہیں۔

ظہر کی نماز دن ڈھلے سے لے کر آدمی کے قد سے دوگنا سایہ ہونے تک ہوتی ہے ۔

ع

عابد

لغوی معنی عبادت کرنے والا ۔ اصطلاحی معنی خدا کی عبادت کرنے والا ۔ قرآن میں عابد کی تعریف بیان کی گئی ہے اور اس کی توصیف کی گئی ہے ۔عبادت کی فضیلت ہی جبکہ مسلمہ ہے ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ایک عبادت کرنے والا کن خدائی انعامات کا مستحق ہوسکتا ہے ۔ ایک عبادت گزار اس دنیا دی معاشرے ہی میں نہیں خود خدا کی نگاہ میں بھی عزت و احترام کا حامل ہوتا ہے ۔

عاتکہؓ

مکہ کی ایک خاتون ۔ زید (حنیف) ابن عمرو کی بیٹی اور حضرت سعیدؓ بن زید کی بہن ۔ عدی بن کعب کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں ۔ سابقین اسلام میں سے تھیں ۔ انھوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی ۔ پہلے ان کی شادی عبداللہ بن ابی بکرؓ سے ہوئی تھی ۔ عبداللہؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ بن خطاب سے ان کا عقد ہوا ، جس سے عیاض نام کا ایک لڑکا پیدا ہوا ۔ حضرت عمرؓ کے شہید ہو جانے کے بعد حضرت عاتکہؓ کی شادی حضرت زبیرؓ بن عوام سے ہوئی جن کی موت پر انھوں نے ایک مشہور مرثیہ لکھا جو اکثر نقل کیا جاتا ہے ۔

عاد

ہود علیہ السلام کی قوم ۔ عرب کے قدیم قبائل ، سامی اقوام کے صاحب اقتدار افراد کا نام ہے ۔ عرب کے قدیم باشندے عرب سے نکل کر شام ، مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں پہ طاقتور حکومتوں کی بنیاد ڈالی ۔ قرآن کریم میں ان کو عاد اولیٰ کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔ گویا عرب کی قدیم قوم سام اور عاد اولیٰ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں ۔

عاد کا زمانہ دو ہزار سال قبل مسیح مانا جاتا ہے ۔ ان کا مرکز "حضر موت" کا علاقہ تھا ۔ یہ لوگ مذہباً بت پرست تھے ۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی اصلاح اور سچّے دین کی طرف ان کو موڑنے کے لیے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا مگر انہوں نے خدا کے پیغمبر کو جھٹلایا ، اور ہدایت قبول کرنے سے انکار کر دیا جس پہ خدا نے ان پہ اپنا عذاب نازل کر دیا ۔ ایک ہفتہ تک تند اور تیز ہوا کے طوفان اٹھتے اور عاد اور ان کی آبادیاں تہہ و بالا ہو کر رہ گئیں ۔

عاشورہ

عربی زبان کا لفظ ۔ عشر سے بنا ہے جس کے لغوی معنی دس کے ہیں ۔ اصطلاحاً معنوں میں اسلامی مہینے محرم کی دس تاریخ ۔

ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں پہ رمضان کے روزے فرض ہوئے ۔ اس سے قبل یہ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے ۔ یہودی بھی اسی دن روزہ رکھتے ہیں ۔ کیونکہ اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے فرعون اور اس کے لشکر سے نجات حاصل کی تھی ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی دن آدم و حوّا کی تخلیق ہوئی ۔ جنّت ، دوزخ ، زندگی موت اور تقدیر کو خدا نے پیدا کیا ۔ اسی دن حضرت نوحؑ کی کشتی کنارے پر لگی اور لوگ اس میں سے باعافیت اترے ۔ اسی دن زائرین کے لیے کعبہ کو کھولا گیا ۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں یہ دن خوشی کے اظہار کے لیے مخصوص تھا مگر دس محرم ۶۱ ھ بمطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ ء کو میدان کربلا میں یزیدی فوجوں نے امام حسینؓ اور آپ کے کنبہ کے دوسرے افراد کو بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا ۔ اس دن سے عاشورہ غم اور ماتم کے طور پہ منایا جاتا ہے ۔ اسی دن حضرت امام حسینؓ کی یاد کو مختلف طریقوں سے زندہ کیا جاتا ہے ۔ اہلِ شیعہ ذوالجناح اور تعزیے نکالتے ہیں ۔ ماتم کرتے ہیں ۔ اہل سنت والجماعت اس دن روزہ رکھتے ہیں اور امامؓ موصوف کے نام کی نذر نیاز دلاتے ہیں ۔

عاصمؓ بن ثابت

نام عاصم ۔ کنیت ابو سلمان ۔ قبیلہ اوس ۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے ۔ جنگِ بدر اور اس کے بعد کی تمام لڑائیوں میں شامل ہوئے ۔ جنگِ بدر میں بہت سے نامور کفار کو ہلاک کیا ۔ صفر ۳ ھ میں حضور اکرم صلعم نے انہیں دس افراد کے ہمراہ جاسوسی کے لیے روانہ کیا ۔ بنو لحیان کو پتہ چلا تو انہوں نے ایک پہاڑی پہ ان کو گھیر لیا اور سات آدمیوں کو شہید کر دیا جن میں حضرت عاصمؓ بھی شامل تھے ۔

جنگ بدر میں عقبہ بن معیط نامی ایک کافر سردار کو آپؓ نے قتل کیا تھا چنانچہ اس کی ماں نے عہد کیا تھا کہ عاصمؓ کا سر ملے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پیوں گی ۔ قریش کو موقع مل گیا کہ وہ عاصمؓ کا سر اس عورت کے پاس فروخت کر دیں چنانچہ جب وہ

ان کی نعش کے نزدیک آئے تو اس پر بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ خوف کے مارے کوئی قریب نہ گیا ۔ دوسرے دن بہت تیز بارش ہوئی جس سے سیلاب آ گیا اور ان کا جسم سیلاب میں بہہ کر جانے کہاں پہنچ گیا ۔ اس طرح کفار کو موقع نہ مل سکا کہ وہ ان کی نعش کی بے حرمتی کر سکیں ۔

عاصمؓ کی ہمشیرہ حضرت عمرؓ کے عقد میں تھیں ۔ عرب کا مشہور شاعر احوص عاصمؓ کا پوتا تھا ۔

انصار میں آپ اپنی پاکبازی ، بہادری ، خلوص اور جوشِ ایمانی کے باعث بہت بلند رتبہ رکھتے تھے ۔

عاصمؓ بن عدی

نام عاصم ، کنیت ابو عمر ، قبیلہ قضاعہ ۔ اپنے قبیلے کے سردار تھے ۔ ہجرت کے بعد دستِ رسول اللہؐ پر اسلام لائے ۔ جنگ بدر میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے لیکن حضور اکرم صلعم نے قبا کا والی بنا کر راستے ہی سے واپس کر دیا ۔ بعد میں جنگ احد اور دوسرے تمام غزوات میں شرکت کی ۔ ۴۵ھ میں ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ علم حدیث سے کافی واقفیت تھی ۔ چنانچہ کتب احادیث میں ان کے نام سے رسولِ خدا محمد صلعم کی بہت سی احادیث روایت ہیں ۔ ان کی صاحبزادی سہلہ مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے نکاح میں تھیں جو قبیلۂ بنو زہرہ کے جید عالم اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے ۔

عاصم بن عمرو

عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد کے معروف عالم فاضل ۔

آنحضرت محمد صلعم کے حالات و اخلاق اور حضور علیہ السلام کے غزوات و سرایا کے سب سے بڑے ماہر اور فاضل سمجھے جاتے تھے ۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں اس کام پر مقرر کیا کہ جامع دمشق میں بیٹھ کر عاشقانِ رسولؐ کو آپؐ کی دو جہاں کے مبارک حالات و واقعات بطور درس سنایا کریں ۔ وہ یہ فریضہ اپنی وفات تک سرانجام دیتے رہے اور اس عرصہ میں ہزاروں لوگوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح حیات سے آگاہ کیا ۔

اس فاضلِ جلیل تابعی کا انتقال ۱۲۱ھ میں ہوا ۔ " سیرتِ رسول " کے مصنف ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے مطابق یہ سب سے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے فنِ سیرۃ کی ابتدا کی ۔

عاقل

لغوی معنی عقل مند ، دانا ، زیرک ، صحیح الدماغ ۔ اسلامیات میں جو شخص سنِ بلوغت کو پہنچ چکا ہو اور عاقل ہو اس پر مذہبی فرائض کی انجام دہی لازم ہوتی ہے اور وہ حدود و قصاص میں مسئول ہے ۔

عقل مندی ایک انسانی وصف ہے جس کے تحت وہ انفرادی اور اجتماعی معاملات اور خدا کے فرائض اور خود پر لوگوں کے حقوق کے بارے میں جاننا اور ان پر عمل کرتا ہے ۔ چنانچہ عاقل شخص پر معاشرہ اور عقیدہ دونوں اطراف سے کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کو سنبھالنا ہی اس کے صحیح الدماغ ہونے کا ثبوت ہے ۔ جو شخص بالغ اور عاقل ہونے کے باوجود اپنے فرائض اور حقوق کے بارے میں ذمہ داری سے کام نہیں لیتا ، معاشرہ اور عقیدہ دونوں اس کے بارے میں اپنے رویّے کو بدل لیتے ہیں ۔

عَالَم

عربی زبان کا لفظ ۔ لغوی معنی جہان ۔ بعض مقامات پر اس سے مراد قوم یا لوگ بھی ہیں ۔ جمع عالمون ، عوالم ۔

یہ لفظ قدیم زمانے سے مستعمل ہے ، اور قرآن مجید میں بھی رب العالمین اور سبع سمٰوٰت کا ذکر موجود ہے ۔ اللہ عَالَم کا مالک اور خالق ہے جس نے اسے انسان کے لیے اپنی قدرت کاملہ کی نشانی کے طور پر پیدا کیا ہے ۔

اسلامی فکر میں اس عالم کو ناپائدار اور فانی بتایا گیا ہے ۔ عَالَم آخرت کے مقابلے میں اسے پرِ پشہ کی حیثیت بھی حاصل نہیں ۔ قرآن مجید اور احادیث میں جن موضوعات کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے وہ اللہ عالم ارواح اور انسان ہیں ۔

عالم مجموعی حیثیت سے ایک وحدت ہے جو کثرت کے اندر وحدت کا اظہار ہے ۔ یہاں تک کہ وہ " جوہری " متکلمین بھی جو موجودات فطرت میں کوئی باہمی ربط اور تعلق نہیں مانتے یہ رائے رکھتے تھے کہ عالم کی بنا کا امکان فقط اسی طرح ہے کہ اس کا کوئی حقیقی نہیں بلکہ کل کا کل اللہ کے امر فنا پر یا ترک امر بقا سے ایک دم تباہ و برباد ہو جائے گا ۔

عالم ایک کثرت ہے زمین و آسمان یا دنیا و آخرت کے مابین روحانی تمیز قائم رہے لیکن یونانی توسطی نظریات نے عالم کے اس سیدھے سادے ابتدائی تصور کو پیچیدہ بنا دیا ۔

افلاطونی فلاسفہ کے نزدیک تمام کائنات کا مرکز عالم لاہوت [illegible] وجود روحانیت ہے ۔

مسلمان مفکرین کا فلسفۂ وجود عالم اسی نقطے سے مسیحی فرقہ [illegible] کلیسائے مشرقی کے عقیدۂ کیفیت وجود عالم کا آغاز ہوا تھا ۔ چونکہ [illegible] ترین ہستی ہے اور بلند ترین معنوں میں ہر حقیقت پر حاوی ہے [illegible] بھی وہی ہے ۔

عالم الجبروت ، عالم الملکوت ، عالم امثال [illegible] اصطلاحات [illegible] عالم دائرۂ وجود کے عارفانہ مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے ۔

عالم کے بارے میں مختلف نظریات کی بحث نہایت قدیم ہے [illegible] فلاسفہ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ۔ مسلمان مفکرین نے بعد [illegible] واضح انداز میں اپنے انداز فکر کا اظہار کیا اور اس بارے میں مختلف خیالات اس وقت بھی موجود ہیں ۔ گو بہت حد تک اس بارے میں بات [illegible]

عالِم

لغوی معنی اہلِ علم ۔ علم رکھنے والے ۔ جاننے والے ۔ [illegible] علماء ۔ یہ اصطلاح عموماً تمام مذہبی مبلغین کے لیے استعمال کی جاتی ہے [illegible] امام ، مفتی ، قائد اور مولوی حضرات آتے ہیں ۔ عام معنوں میں [illegible] وسیع ہے اور کسی بھی موضوع پر اختلاف [illegible] عقلی و منطقی علم رکھنے کو عالم کہا جاتا ہے ۔ مخصوص طور پر عالم کا اسم اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی ایک یا ایک سے زیادہ موضوعات کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہو ۔ یا کم از کم عام لوگوں سے اس کی معلومات ان کے بارے میں زیادہ ہوں ۔

سارے انسانی معاشرے میں عموماً اور اسلامی عقائد و معاشرت میں خصوصاً عالم احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ علم ایسی بے مثل دولت کا مالک ہونے کے باعث۔ اس میں فضیلت و برتری کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس احترام اور عزت کا حق حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ عالم پر ایک نہایت اہم اور کٹھن ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے اور وہ انتقال علم کی ذمہ داری ہے۔ یہ عالم کا اوّل و آخر فرض ہے کہ وہ جب ایک شئے کے بارے میں اصل علم کو حاصل کرلے تو اُسے اپنی ذات تک محدود نہ رکھے بلکہ اُسے ان لوگوں تک منتقل کرے جو نہیں جانتے۔ حضرت زید بن حارثؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "خدا اُسے سرخ رُو کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی، یاد رکھی اور دوسروں کو پہنچائی۔"

حضرت ابوبکرؓ صدیق سے روایت ہے کہ منیٰ کا خطبہ دیتے وقت حضور اکرم صلعم نے فرمایا:

"جو حاضر ہیں غیر حاضروں کو سب پہنچا دیں۔ کیا عجب جنہیں پہنچاؤ گے وہ زیادہ سمجھدار ہوں۔" حضور نے فرمایا "خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جس نے ایک دو فرض سیکھے، ان پر عمل کیا اور ایسے لوگوں کو سکھایا جو اس پر عمل کریں۔" ایک اور موقع پر حضور اکرم نے فرمایا۔

"جو شخص علم حاصل کرتا ہے مگر اشاعت نہیں کرتا وہ ایسا ہی ہے جو خزانہ حاصل کرکے خرچ نہیں کرتا۔"

اشاعت علم میں مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا وہ انسانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مشہور مؤرخ گبن نے مسلمانوں کی اشاعت علم و فضل کا بڑے عمدہ الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے علم کی اشاعت کا اتنا مربوط اور جامع پروگرام بنا رکھا تھا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ صوبوں کے خود مختار امراء بھی علم و ہنر کی سرپرستی سے دست کش نہ ہوتے۔ ان کی رقیبانہ مسابقت بسا اوقات اشاعت علم کے لیے بڑی مفید ثابت ہوتی اور حکمران اہل علم کو نوازنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح ان لوگوں نے علم کے نور کو سمرقند و بخارا سے لے کر قرطبہ تک پھیلا دیا۔

فرانسیسی مؤرخ لیبان لکھتا ہے کہ یورپ کی یونیورسٹیاں چھ سو سال تک عربی کتابوں کے تراجم پر زندہ رہیں اور عربوں کے قائم کردہ مدارس سے اکتساب علم کرتی رہیں۔ اس وقت کے اسلامی مدارس کا شمار بے حساب ہے ہر شہر اور قصبے میں علم کی اشاعت کے ادارے سرگرم عمل تھے۔

انسانی زندگی کا اولین و اعلیٰ ترین مقصد طلب علم ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا: "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔" اور جب ایک شخص اس اوّلین و اعلیٰ ترین مقصد کو کسی حد تک حاصل کرلیتا ہے تو اس کا منصب یہی ہے کہ وہ اس علم کی اشاعت کرے۔ کیونکہ اشاعت علم انسان کا کسب اولیٰ ہے۔ پیغمبر جو انسانوں میں افضل ترین قرار پائے بنیادی اور منصبی طور پر عالم ہی تھے جن کے ذمہ توحید الٰہی اور تنظیم معاشرہ کا علم پھیلانے اور سکھانے کی ذمہ داری تھی۔

عام الحزن

غم کا سال۔ نبوت کا دسواں برس جو مخصوص حالات اور واقعات کے باعث عام الحزن مشہور ہوگیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین سال کی محصوری کے بعد شعب ابی طالب سے باہر آئے تو خیال تھا کہ اب قریش کی جانب سے مظالم کا سلسلہ کچھ کم ہو جائے گا، یا کچھ نرمی کا برتاؤ ہوگا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ابو طالب بیمار ہو کر فوت ہو گئے۔ ان کی وفات سے میدان خالی پاکر قریش نے اور زیادہ پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ابو طالب کی وفات کے دو ماہ بعد ہی حضورؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان دو سچے اور ہمدرد ساتھیوں کی موت نے حضور اکرم صلعم کو بہت غمگین کر دیا۔ اس لیے یہ سال ہی عام الحزن کہلایا۔

عام الفیل

۵۷۰ء کا سال جس میں یمن کے بادشاہ ابراہہ نے کعبے کے انہدام کی نیت سے مکہ پر چڑھائی کی۔ مکہ کی مرکزی حیثیت اور اہمیت کو دیکھ کر بعض دیگر علاقوں پر وہاں کے حکمرانوں نے ایسی عبادت گاہیں تعمیر کروانا شروع کیں جن کا مقصد لوگوں کو مکہ کی عبادت گاہ کی بجائے ان کی تعمیر کردہ عبادت گاہوں کی طرف مائل کرنا تھا۔ عیسائیوں نے حیرہ میں اور ابراہہ نے یمن میں عبادت گاہیں تعمیر کیں۔

ابراہہ الاشرم نے یمن کی عبادت گاہ کو ہر ممکن طریقے سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ اس کی تزئین کے لیے اس نے بیش قیمت اور نادر اشیاء فراہم کیں۔ لیکن لوگوں کا میلان اس عبادت گاہ کی طرف نہ ہوا۔ کیونکہ وہ یقین رکھتے کہ کعبہ کے سوائے اور کسی جگہ حج کا ثواب نہیں مل سکتا۔

ابراہہ کو جب اس صورت حال کا اندازہ ہوا تو وہ بہت پریشان ہوا اور اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا کہ انہدام کعبہ کے لیے ایک فوج ترتیب دی اور ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر اس فوج کے قائد کی حیثیت سے مکہ کا رُخ کیا۔ عربوں کو اس فوج کشی کی اطلاع ملی تو انہیں سخت تشویش ہوئی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حبشیوں کے ہاتھوں ان کی یہ عبادت گاہ مسمار ہو۔ یمن کے ایک شخص ذوالنفر نے ابراہہ سے مقابلہ کے لیے ایک جماعت تیار کی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ ابراہہ کو کعبہ کے انہدام سے باز رکھے لیکن یہ جماعت مقابلے پر نہ ٹھہر سکی اور ابراہہ کی فوج نے اس جماعت کے تمام افراد کو حراست میں لے لیا۔ اسی طرح نفیل بن حبیب خثعمی نے شہران اور ناہس کے قبیلے کے کچھ لوگوں کو اپنے ہمراہ لے کر ابراہہ سے ٹکر لی۔ لیکن انہیں بھی شکست ہوئی اور انہیں بھی قید کر لیا گیا۔

ابراہہ کی سرکردگی میں ان اصحاب الفیل کا لشکر طائف کے قریب پہنچا تو اہل طائف ابراہہ سے ملے اور کہا کہ ہماری عبادت گاہوں میں تو لات کی پرستش ہوتی ہے۔ آپ جس عبادت گاہ کو مسمار کرنا چاہتے ہیں؛ وہ تو مکہ میں ہے اور چند اہل طائف راہنمائی کے لیے لشکر کے ساتھ ہو لیے۔ جب یہ لشکر مکہ کے نزدیک پہنچا تو ابراہہ نے حکم دیا کہ چند فوجی مکہ کی حدود میں داخل ہو جائیں اور اہل تہامہ کے مال و اسباب میں سے جو ہاتھ لگے لوٹ لائیں۔ اس لوٹ میں عبدالمطلب کے سَو اونٹ بھی حبشیوں کے تصرف میں آ گئے۔

قریش اور اہل مکہ شروع شروع میں ابراہہ کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے لیکن پھر یہ غور کیا کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس اثنا میں ابراہہ کی فوج کا ایک سپاہی قاصد کی حیثیت سے امیر قریش کے پاس آیا اور عبدالمطلب کے پاس پہنچ کر کہا کہ ہمارا مقصد جنگ نہیں بلکہ انہدام کعبہ ہے اگر اہل مکہ مقابلے پر نہ آئیں تو ہم بھی ان پر حملہ نہیں کریں گے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ ہم مقابلہ کرنا نہیں چاہتے۔ یہ فرما کر آپ اپنے فرزندوں اور اہل مکہ میں سے چند معتبر اشخاص کو اپنے

ہمراہ لے کر ابراہہ کے لشکر میں پہنچے۔

ابراہہ نے ان کی تعظیم کی اور ان کے اونٹ بھی واپس کر دیے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ میں کعبہ کا انہدام نہیں کروں گا۔ اہلِ کعبہ نے پیش کش کی تھی کہ اگر آپ کعبہ کو منہدم نہ کریں تو ہم اپنا ایک تہائی مال آپ کی نذر کر دیں گے۔ لیکن ابراہہ نے یہ پیش کش قبول نہ کی اور اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ عبدالمطلب اہلِ مکہ کے ہمراہ واپس آ گئے۔ اور لوگوں سے کہا کہ پہاڑوں کے دامن میں پناہ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ ابراہہ کی فوج کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچے۔

اہلِ مکہ شہر سے نکل گئے اور وہ وقت آیا کہ ابراہہ کعبہ کو منہدم کر دے تو اچانک اس کی فوج میں چیچک کی وبا پھوٹ نکلی اور اس میں اتنے سپاہی لقمۂ اجل ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ غالباً یہ ہوا سمندر سے آئی تھی۔ ابراہہ بھی اس وبا میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے خوف و دہشت کے عالم میں اپنی فوج کو حکم دیا کہ یمن کا رخ کرے۔ فوج کے کچھ رہنما اس اثنا میں گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ وبا کی زد میں گھرے ہوئے تھے وبا کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ابراہہ بدحواسی میں صنعا تک پہنچا تھا کہ اس دوران اس کا جسم بھی اسی وبا سے چھلنی چھلنی ہو گیا اور اسی حال میں اس نے جان دے دی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔

اہلِ مکہ نے اس سال کو "عام الفیل" کے نام سے موسوم کیا۔ قرآن کریم کا اس باب میں ارشاد ہے: کیا (اے رسول) آپؐ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے اصحابِ فیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس نے اس کے مکر و فریب کا طلسم پاش پاش نہیں کر ڈالا اور ان پر ایسے اڑتے ہوئے ابابیل نہیں بھیجے جو ان پر سنگریزوں کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ پس اس نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔

عام الوفود

غزوہ تبوک کے بعد دنیائے عرب میں دینِ حق کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہو گئی تھیں وہ اہلِ عرب جو تا حال شرک کی آلودگیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ سوچ میں پڑ گئے۔ رومیوں کی پسپائی نے بھی اہلِ عرب پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ پھر آنحضرت کے حکم سے مشہور بت "لات" کو بھی مغیرہؓ بن شعبہ نے منہدم کر دیا۔ اور اہلِ طائف نے بھی قبولِ اسلام کر لیا تھا۔ چنانچہ اس صورتِ حال کا اثر ہر شخص محسوس کر رہا تھا اور قبولِ اسلام پر آمادہ تھا۔ جنوبی عرب کے باقی ماندہ غیر مسلم بھی قبولِ حق کے لیے تیار تھے۔ سو مختلف سمتوں سے ان کے وفود مدینے میں آنے لگے تاکہ حلقۂ اطاعت میں داخل ہو کر مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔ اس طرح ان وفود کی آمد پے در پے کئی ماہ تک جاری رہی یہاں تک کہ ایامِ حج آ گئے۔

اس سال چونکہ والہانہ طور پر لوگوں کے وفود قبولِ اسلام کے لیے کھنچے چلے آ رہے تھے اس لیے یہ سال "عام الوفود" کے نام سے مشہور ہوا۔

عامر بن ربیعہ

نام عامر۔ کنیت ابوعبداللہ۔ والد کا نام ربیعہ۔ ان کا خاندان حضرت عمرؓ کے والد خطاب کا حلیف تھا۔ خطاب نے حضرت عامرؓ کو متبنیٰ کر لیا تھا اور وہ عامر بن خطاب کہلانے لگے مگر بعد میں قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اصل نسبت یعنی بن ربیعہ سے پکارے جانے لگے۔ بہرکیف اسی نسبت سے آپ کے حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ تا دمِ آخر نہایت اچھے تعلقات قائم رہے اور انھوں نے بیت المقدس کے سفر میں بھی انہیں اپنے ساتھ رکھا۔ آپ نے مکہ میں اسلام قبول کیا اور قریش کے مظالم سے تنگ آ کر اپنی زوجہ ابی حثمہؓ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی جہاں سے لوٹ کر مدینہ چلے آئے اور بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں نبی اکرم صلعم کا ساتھ دیا۔ بڑی لڑائیوں کے علاوہ تمام چھوٹے چھوٹے معرکوں میں بھی پیش پیش رہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے آخری دورِ خلافت میں جب مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی شروع ہوئی تو آپؓ گوشہ نشین ہو گئے۔ اور تمام جھگڑوں سے الگ تھلگ ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اور اسی حالت میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چند دن بعد وفات پائی۔

عامر بن شراحیل الشعبی

نام عامر۔ کنیت ابوعمر۔ قبیلہ شعبی۔ ۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ جلولہ کے قیدیوں میں سے تھیں جو عامر کے والد شراحیل کے حصے میں آئیں۔ بے شمار صحابہ سے آپ کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا۔ ان سے آپ نے علمی استفادہ کیا اور فقہ اور حدیث میں مکمل استاد بن گئے۔ اور اپنے وقت کے امام کہلائے۔ ریاضی اور شاعری میں دسترس حاصل تھی۔ قرآن کے اعلیٰ قاری تھے۔

عہدِ اموی میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ حجاج ان کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا اور اکثر سرکاری کام ان کے سپرد کرتا تھا۔ ایک بار آپ کو سجستان کے رتبیل کے پاس سفیر بنا کر بھیجا اور ایک بار سفارتی طور پر قیصرِ روم کے پاس بھی بھیجے گئے۔

حجاج اور عبدالملک کی مخالفت میں انہوں نے ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ اور جب ابن اشعث کو شکست ہوئی تو عامر روپوش ہو گئے۔ بعد میں جب گرفتار کر کے حجاج کے پاس لے گئے تو انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ پس حجاج نے ان کو رہا کر دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں کوفہ کے قاضی بنائے گئے۔ ... قریب ۷۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

عامرؓ بن فہیرہ

کنیت ابوعمرو۔ والد کا نام فہیرہ۔ جو طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے۔ ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ ان کے آقا نے انہیں بڑی اذیتیں دیں۔ آخر بعد میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ جب رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ غارِ ثور میں پوشیدہ تھے۔ حضرت عامر دن بھر حضرت ابوبکرؓ کی بکریاں چراتے اور شام کو غار کے قریب لے آتے۔ حضرت ابوبکرؓ حسبِ ضرورت ان سے دودھ لیتے۔

آپ نے بھی دیگر مسلمانوں کے ساتھ مدینہ ہجرت کی اور تمام لڑائیوں میں مسلمانوں کی طرف سے لڑے۔

۴ھ میں ستر قاریوں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک قبیلے کی طرف برائے تبلیغ بھیجے۔ راستے میں رعل اور ذکوان قبائل نے غداری کر کے سب کو شہید کر دیا۔ ان شہدا میں عامر بن فہیرہ بھی شامل تھے۔

آپ شکل و صورت سے سیاہ فام حبشی تھے۔ ذاتی کردار بہت بلند تھا بہت بہادر اور معاملہ فہم تھے۔ اس لیے رسول اللہ نے کئی نازک موقعوں پر آپ کو اپنا رازدار اور مشیر بنایا۔

عائشہ صدیقہؓ ام المومنین

نام عائشہ۔ لقب صدیقہ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریک حیات۔

آپ کی ولادت نبوت کے پانچویں سال اور ہجرت سے نو سال قبل جولائی ۶۱۴ء کو مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ آنحضرتؐ نے ان کی کنیت ان کے بھانجے عبداللہ ابن زبیرؓ کے نام پر اُم عبداللہ رکھی جن کو حضرت عائشہؓ نے متبنّیٰ بنا لیا تھا۔ والدہ کا نام اُم رومانؓ ہے۔ والد کی جانب سے ان کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت سے اور والدہ کی طرف سے گیارہویں پشت میں رسول اللہؐ سے جا ملتا ہے۔

آنحضرت صلعم سے ان کے نکاح کی تحریک حضرت عثمانؓ بن مظعون کی بیوی خولہ بنت حکیمؓ نے کی۔ حضرت خدیجہؓ جیسی غمگسار شریک حیات کی وفات کے بعد آپؐ بہت ملول اور غمگین رہا کرتے تھے۔ اس صورت حال کے باعث آپؐ کے اصحابؓ فکرمند تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد حضرت خولہؓ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپؐ دوسرا نکاح کر لیں۔ اور اس سلسلے میں سودہ بنت زمعہؓ جو تقریباً پچیس سالہ خاتون تھیں اور مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں، اور جن کے خاوند سکران بن عمرو کا مکہ واپسی پر انتقال ہو چکا تھا، اور عائشہ بنت ابوبکرؓ کے نام پیش کیے۔ آنحضرتؐ نے اس تجویز پر اتفاق فرمایا۔ اس سے قبل حضرت عائشہؓ جبیر بن مطعم سے منسوب تھیں جن کا خاندان تا حال مسلمان نہیں ہوا تھا۔

آنحضرتؐ کا پیغام ملنے پر حضرت ابوبکرؓ نے مناسب سمجھا کہ پہلے ان لوگوں سے پوچھ لیا جائے۔ مطعم کی بیوی نے اس خیال سے کہ حضرت عائشہؓ ان کے گھر آ گئیں تو ان کے ہاں اسلام کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا خود ہی رشتے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہ نسبت منسوخ کر دی گئی۔

آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا نکاح نبوت کے دسویں سال ہوا۔ مہر کی رقم پانچ سو درہم مقرر ہوئی۔ اور رخصتی ہجرت کے چند ماہ بعد یعنی شوال بمطابق اپریل ۶۲۳ء کو مدینہ منورہ میں نہایت سادگی کے ساتھ ہوئی۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر نو برس تھی۔ (بعض جدید سیرت نگاروں کے مطابق رخصتی کے وقت آپؓ کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔)

اس شادی سے عربوں کی کئی لغو روایات کی اصلاح ہو گئی۔ مثلاً وہ لوگ منہ بولے بھائی کی لڑکی سے شادی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اہل عرب ماہ شوال کو منحوس سمجھتے تھے کیونکہ قدیم زمانے میں شوال ہی میں طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح اور رخصتی دونوں اسی مہینے میں ہوئے اور اس طرح اس خیال کو باطل قرار دیا گیا کہ کوئی مہینہ یا دن منحوس ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ میں رخصتانہ کے بعد حضرت عائشہؓ نے مسجد نبویؐ کے اردگرد بنے ہوئے حجروں میں سے ایک میں قیام کیا۔ یہی حجرے ازواج مطہراتؓ کے مستقل گھر تھے۔ حضرت عائشہؓ زندگی بھر مسجد نبوی کے اس حجرے میں مقیم رہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کا گھرانہ سب سے پہلے نور اسلام سے منور ہوا تھا چنانچہ حضرت عائشہؓ نے مسلمان ماں باپ کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔ وہ حضورؐ کی محبوب ترین رفیقہ حیات تھیں۔ اگرچہ وہ نہایت صاحب جمال تھیں اور سرخ و سپید رنگت کی مالک تھیں لیکن حضورؐ کی ان سے محبت فقط حسن و جمال نسوانی میں پوشیدہ نہیں تھی۔ اس صفت میں تو دیگر ازواج مطہراتؓ حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، اور حضرت صفیہؓ بھی ان کی شریک تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ شروع ہی سے نہایت ذہین، عقل مند، معاملہ فہم، باریک بین، دور رس نگاہ کی مالک اور دینی مسائل کے فہم و شعور میں اور احکام کے اجتہاد اور استنباط میں ازواج مطہراتؓ میں امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضور اکرمؐ کی نگاہ میں بے حد محبوب تھیں۔

کتب احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تفسیر قرآن، علم حدیث، فقہ و قیاس، عقائد، علم اسرار دین، اسلامی تاریخ، افتا و ارشاد اور خصوصاً عورتوں سے متعلق دینی مسائل پر جس قدر گہری نگاہ حضرت عائشہؓ کی تھی وہ ان کے علاوہ چند اصحاب اکابر ہی کا حصّہ ہے۔

حضرت عائشہ کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ان پر وہ تہمت ہے جس کے جھوٹ ہونے کی گواہی ایک وحی کی صورت میں خود خدا نے دی۔ یہ واقعہ ۵ھ/ ۶۲۷ء میں غزوہ بنو مصطلق میں پیش آیا۔ اس سفر میں حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھیں۔ مدینہ کو واپسی پر کوئی ایک منزل پہلے حضرت عائشہؓ کسی ضرورت سے کیمپ سے کچھ فاصلے پر تشریف لے گئیں۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ وہ ہار جو وہ اپنی ہمشیرہ اسماء بنت ابوبکرؓ سے عاریتاً لے گئی تھیں کہیں گر گیا۔ اس کی تلاش میں کچھ وقت لگ گیا۔ اتنے میں قافلے کی روانگی کا حکم دیا جا چکا تھا۔ حضرت عائشہ کا جسم اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھنے والوں کو شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ خالی ہے۔ چنانچہ ان کی غیر موجودگی کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ جب وہ واپس آئیں تو قافلے کو وہاں نہ پا کر بہت گھبرائیں، لیکن اس خیال سے وہیں چادر اوڑھ کر بیٹھ گئیں کہ جب دیکھنے والے ہودج کو خالی پائیں گے تو ان کی تلاش میں یہاں آ کر انہیں لے جائیں گے۔

ایک صحابی صفوانؓ بن معطل کو آنحضرتؐ نے اس خدمت پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ لشکر کی گری پڑی چیزوں کے انتظام کے لیے لشکر کے پیچھے پیچھے رہا کریں۔ حضرت عائشہؓ صبح تک وہیں لیٹی رہیں۔ صبح سویرے جب صفوانؓ بیدار ہوئے تو انھیں دور سے میدان میں کوئی سیاہ چیز پڑی نظر آئی۔ قریب آئے تو پہچان لیا کہ حضرت عائشہؓ ہیں۔ اور بلند آواز سے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ حضرت عائشہؓ آواز سن کر چونک پڑیں۔ صفوان نے اپنا اونٹ قریب لا کر بٹھا دیا۔ اور وہ اس پر سوار ہو گئیں۔ صفوانؓ نے اونٹ کی مہار پکڑی اور روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے قریب قافلے سے جا ملے۔

اس بات کو ہوا دینے والوں میں نہ صرف حضرت عائشہؓ کے خاندان کے ذاتی دشمن تھے بلکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہا تھا۔ اس غزوے کے دوران بھی وہ اپنی بدطینتی اور شیطنت کا مظاہرہ کر چکا تھا اور ایسے آثار دکھائی دے رہے تھے کہ اس کی کینہ پروری اور اسلام و نبیؐ اکرمؐ کے خلاف اس کا عناد ضرور ظاہر ہو کر رہے گا۔ اس فتنے کو پھیلانے کا مقصد منافقین کے دل میں حضرت ابوبکرؓ اور حضور اکرمؐ کے درمیان اختلاف پیدا کرنا تھا۔ عام مسلمانوں کے دلوں میں آنحضرتؐ اور آپؐ کے اہل بیت کے تقدس کے خلاف بدگمانی کے جذبات ابھارے جائیں۔ اور انصار و مہاجرین میں مناقشہ پیدا کر کے اہل مدینہ کو اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔

حضرت عائشہؓ پر الزام طرازی فقط ایک معصوم خاتون کو بدنام کرنا ہی نہ تھا بلکہ اس کا پس منظر رسول اللہ اور اسلام کو بدنام کرنے بدنیتی پر مبنی ایک سازش تھی۔ اس سلسلے میں کچھ دن بعد جبکہ سارا مسلم معاشرہ اور خود حضور اکرمؐ بے چین و مضطرب تھے۔ قرآن مجید کی ایک عظیم الشان سورۃ "النور" نازل ہوئی

جس میں حضرت عائشہؓ کی برأت کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے دی۔ اور منافقین و دشمنانِ اسلام کو لوگوں میں ذلت و رسوائی اٹھانا پڑی۔

حضرت عائشہؓ کی ازدواجی زندگی کا ایک اور اہم واقعہ "ایلاء و تخییر" کا واقعہ ہے جس میں دوسری ازواجِ مطہراتؓ بھی شامل تھیں۔ آنحضرت کی زندگی زہد تقویٰ قناعت کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ دنیوی زیب و زینت اور شان و شوکت کا آپ کے گھر دُور دُور تک نشان نہ تھا۔ اگرچہ ازواجِ مطہراتؓ ان مادی نعمتوں سے بے نیاز ہو چکی تھیں لیکن بشریت کے تقاضے کے باعث کبھی کبھی انھیں بھی خیال گزرتا کہ دنیا کے آرام و آسائش میں کچھ حصّہ انھیں بھی ملنا چاہیے۔ خصوصاً فتوحات کا دائرہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں میں خوشحالی کے آثار نمودار ہونے لگے تو ازواجِ مطہرات کی طرف سے حضور اکرمؐ کو توسیعِ نفقہ کا تقاضا ہونے لگا۔

اس تقاضے نے زور پکڑا تو آنحضرتؐ نے ایک ماہ تک تنہائی کی زندگی گزارنے کا قصد کر لیا۔ اور ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں میں تشریف نہیں لے گئے۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد آیتِ تخییر نازل ہوئی جس میں ازواجِ رسولؐ کو دنیا کے نازو نعم یا آنحضرت صلعم کی رفاقت اور آخرت کی زندگی میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے مطلع فرمایا۔ انہوں نے فرمایا میں اللہ اور اس کے رسولؐ کو اختیار کرتی ہوں۔ بعد میں باقی تمام ازواج نے بھی یہی جواب دیا۔

حضرت عائشہؓ کی زندگی ایک خانہ دار خاتون کے لیے ایک مثالی نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپؓ اپنی سوتیلی اولاد سے بھی نہایت حسن سلوک سے پیش آتی تھیں۔ ان کے تعلقات اپنی سوکنوں کے ساتھ بھی نہایت خوشگوار رہتے۔ بعض معمولی بشری اور اتفاقی واقعات کے علاوہ ان پاک ہستیوں میں کسی دلی رنجش کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔

آنحضرت صلعم وفات سے پیشتر فقط تیرہ دن بیمار رہے جن میں سے آخری آٹھ دن آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں گزارے۔ حضرت عائشہؓ نے علالت کے دوران آپؐ کی تیمارداری کی۔ وصال کے بعد آپؐ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ہی دفن کیا گیا۔

فتح خیبر کے بعد آنحضرتؐ نے اپنی ازواج کے وظیفے مقرر کر دیے تھے۔ فتح مکہ کے بعد پورا عرب آپؐ کے قدموں میں تھا لیکن اس زمانے میں بھی آپؐ کی ازواج نے تنگ دستی کی زندگی بسر کی۔ البتہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں امہات المومنین کے لیے عام صحابہ کرامؓ سے زیادہ وظائف مقرر کیے۔ تمام ازواج کے لیے دس دس ہزار اور حضرت عائشہؓ کے لیے بارہ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کیا کہ وہ آنحضرتؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھیں۔

آنحضرتؐ کی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حضورؐ کی وفات کے بعد دو سال تک حضرت عائشہؓ کے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ رہے اور ان کے بعد دس سال تک حضرت عمر فاروقؓ کا عہدِ خلافت رہا۔ تاریخ سے کوئی ایسا واقعہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا کہ شیخینؓ کے زمانے میں حضرت عائشہؓ نے کبھی سیاسی امور میں حصّہ لیا ہو۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے پہلے چھ سال امن و سکون سے گزرے۔ لیکن اس کے بعد بعض طبقوں کو ان سے شکایات پیدا ہو گئیں اور یہ لوگ ان کے مخالف ہو گئے۔ ام المومنینؓ ہونے کی حیثیت سے لوگ ان کے پاس آ کر بھی شکایت کرتے اور وہ انہیں صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید کرتیں۔ انہوں نے کبھی گروہ بندی سے کوئی سروکار نہ رکھا۔

۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کو باغیوں نے شہید کر دیا۔ اس دوران حضرت عائشہؓ مکہ معظمہ میں مقیم تھیں جہاں وہ حج کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ انہیں اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ ادھر حضرت علیؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہو گئی اور ہر طرف سے خلیفہ ثالث کا قصاص لینے کا مطالبہ ہونے لگا۔ مدینے سے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے آ کر حضرت عائشہؓ کو وہاں کی صورت سے مطلع کیا۔

شہادت حضرت عثمانؓ سے کوئی چار ماہ بعد حضرت عائشہؓ دعوت اصلاح کی خاطر بصرے کو روانہ ہوئیں۔ ان کے بصرے جانے کی خبر سن کر حضرت علیؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ فریقین میں سے کسی کو گمان تک نہ تھا کہ نوبت جنگ تک پہنچ جائے گی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر جمادی الآخر ۳۶ھ دسمبر ۶۵۶ء میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے حامیوں کے درمیان وہ جنگ برپا ہوئی جو تاریخ اسلام میں جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ تمام جنگ کا زور اس اونٹ کے گرد تھا جس پر حضرت عائشہؓ محمل میں سوار تھیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ شہید ہوئے۔ اور حضرت علیؓ کا پلڑا بھاری رہا۔

یہ جنگ اگرچہ بالکل اتفاقی طور پر ہوئی لیکن پھر بھی صدمہ کا باعث بنی۔ اختیار کرتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کو اپنی اجتہادی غلطی کا ہمیشہ افسوس رہا۔ تاریخی روایات کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں نے عام لوگوں کے سامنے دل صاف ہو جانے کا اعتراف کیا۔

جنگ کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو بحفاظت حجاز روانہ کر دیا۔ انہوں نے زندگی کا باقی حصّہ مدینہ منورہ میں نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ دین کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہ کر گزارا۔ ان کی وفات ۱۷ رمضان المبارک ۵۸ھ ۱۳ جولائی ۶۷۸ء کو ہوئی۔ وصیت کے مطابق ان کو مدینے کے قبرستان جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

آپ خلق اسلامی کے بہترین مرتبے پر فائز تھیں۔ آپ کی پرورش حضور اکرمؐ کی صحبت میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر [illegible] سنجیدگی، فیاضی، قناعت، عبادت گزاری، [illegible] انسانی اوصاف آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ صحابہ کرامؓ میں [illegible] سے منفرد مرتبے اور شخصیت کی مالک تھیں۔

آپؓ کا شمار کثیر روایت کرنے والے [illegible] روایات کی کل تعداد دو ہزار دو سو دس ہے۔ [illegible] صحیحین میں شامل ہیں۔ ان کے پاس قرآن مجید کا [illegible] انہوں نے اپنے غلام ابو یونس سے لکھوایا تھا۔ [illegible] مروی ہیں۔ تابعین میں سے اکابر علماء کی اکثریت [illegible] ہے۔ تاریخ عرب سے خوب واقف تھیں۔ شعر و سخن سے [illegible] موقع شعر پڑھ دینے کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی فصاحت [illegible]

عبادؓ بن بشر

نام عباد۔ کنیت ابو البشر، ابو رافع۔ قبیلہ عبد الاشہل [illegible] مصعبؓ بن عمیر کے ذریعے دعوت اسلام قبول کی اور [illegible]

حصہ لیا۔ جنگِ خندق کے موقع پر حضرت رسول اللہ کے خیمے کا پہرہ دیتے تھے۔ ۹ھ میں مزینہ میں صدقات کے عامل بنا کر بھیجے گئے۔ جہاں اس کام کے علاوہ اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کا کام بھی آپؓ نے نہایت گرم جوشی سے سرانجام دیا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر رات کو گشت لگا کر پہرہ دینے والے مجاہدین کے افسر تھے۔

۱۱ھ میں جنگِ یمامہ میں ۴۵ برس کی عمر میں شہادت پائی۔ انصار میں بڑی فضیلت کے بزرگ تھے۔ اور اکابر صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ نے بہت سی احادیث جمع کر رکھی تھیں جن میں سے چند مروجہ کتب احادیث میں آپ سے مروی ہیں۔

بنو مصطلق کو روزانہ قرآن پاک سنایا کرتے تھے اور انہیں ضروری مسائل سنایا کرتے تھے۔ اکثر شب بیدار رہ کر عبادت کیا کرتے تھے ❊

عبادت

معنی نہایت تعظیم۔ اصطلاحی معنوں میں خدا تعالےٰ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اس کی تعظیم کا عملی اظہار۔ عبادت کا زیادہ تر تعلق بدن سے ہے یعنی رجوعِ دل کے ساتھ عملی طور پر خدا کی تعظیم۔

عبادت کا مادہ ع ب د سے ہے۔ عبادت کے ایک معنی غایت تذلل (عبودیت) بھی ہیں۔ لیکن عبادت اور عبودیت میں ایک لطیف لیکن بنیادی فرق ہے عبودیت یہ ہے کہ رب جو کرے عبد اس پر راضی ہو یا رضا کا اظہار کرے لیکن عبادت یہ ہے کہ عبد وہ کرے جو مولا کی رضا ہو۔

"مطالب الحقانی" کے مطابق عبادت کے تین مراتب ہیں۔ (۱) عبد ثواب کی امید اور عتاب کے خوف سے رب کی عبادت کرے (۲) ثواب کے لیے عبادت کرے لیکن مرتبہ اخلاص سے باہر نہ نکلے (۳) عبدیت کا مقام اشرف حاصل کرنے کے لیے عبادت کرے اور اس کے علاوہ کوئی طلب نہ ہو۔

الراغب نے لکھا ہے کہ عبادت دو طرح کی ہے (۱) عبادت بالتسخیر، ۲۔ عبادت بالاختیار۔ اوّل الذکر سے مراد وہ عبادت ہے جس کا صدور از روئے فطرت وجدان ہوتا ہے اور ثانی الذکر اختیاری ہے۔ مثلاً عبادات شرعیہ وغیرہ۔ عبادت کے عام معنی پرستش کے ہیں۔ جو کسی شے کی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً آگ، پانی، بت، سورج، چاند، درخت وغیرہ۔ لیکن اصل عبادت خدا کی عبادت ہے اور وہی حقیقی ہے۔ اس حقیقی عبادت کی طرف قرآن بار بار انسان کو بلاتا ہے عبادت کی ایک عمومی غیر رسمی شکل دعا ہے۔ لیکن شریعت کی طرف سے نافذ عبادات میں نماز کو اپنی رسمی شکل میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ اس میں نیت اور اخلاص ضروری شرائط ہیں۔ عبادت میں خشوع و خضوع پر زیادہ زور دیا گیا ہے جس کے رب کی عظمت اور عبد کے تذلل کا اظہار ہوتا ہے۔ نماز کے ضمن میں بھی یہی حکم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ خدا کے حضور اس طرح کھڑے ہو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہو تو یوں کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

عبادت کا اہم مقام اخلاص ہے جس میں بندے کو رب کی رضا کے سوا کچھ درکار نہیں ہوتا لیکن اس کا بشری پہلو بھی ہے جس میں انسان اپنی ضرورتوں اور تکلیفوں کا ذکر خود سے کر کے ان کا ازالہ چاہتا ہے۔ انسان فطری اور خلقی طور پر ناقص اور کمزور ہے، بے بس۔ بے کسی، کوتاہی اور محرومی اس کی تقدیر ہے۔ وہ جب اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو اس بے بسی سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے رب کو پکارتا ہے۔ اپنی ہستی اور ضرورتوں پر انحصار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ عبادت میں خدا سے استعانت کا ایک احتیاجی پہلو بھی آ جاتا ہے لیکن یہ ایک اضطراری پہلو ہے۔

عبادت کا اصل مقصد شرف حضور حاصل کرنا اور رب العالمین کی تعظیم کا اظہار ہے۔ بشری سطح پر عبادت تکمیل شخصیت اور توسیع صلاحیت کا کام دیتی ہے۔ انبیاء نے بھی نازک لمحات میں خدا سے دعا کی اور وہ قبول ہوئی۔ عبادت قلب کو صاف رکھتی ہے اور ارادوں میں خلوص و استقامت پیدا کرتی ہے۔ جو لوگ عبادت و دعا کے قائل نہیں ہوتے وہ دشوار اور نازک لمحات میں نا امید اور مایوس ہو کر بے توازن ہو جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے عبادت کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبادت رب العالمین کا اس کے بے پایاں انعام کی وجہ سے بندے پر حق ہے اور یہ امر فطری طور سے بندے (مخلوق) کے وجدان میں موجود ہے۔

کسی برتر وجود سے مکالمہ، مناجات، سرگوشی، استعانت اور ذوق محبت انسان کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے۔ عبادت اس آرزو کی عملی کوشش کا نام ہے جو انسانی قلب میں روحانی مقامات کی برتری و بلندی کے حصول کے لیے موجود رہتی ہے۔

اسلام میں عبادات کا ایک رُخ داخلی و قلبی ہے، دوسرا خارجی، جسمانی، اور محسوس۔ ان دونوں رخوں کے بارے میں قرآن و حدیث اور کتب فقہ میں مفصل احکام موجود ہیں۔ اسلام میں عبادت فقط وہی نہیں جو خدا سے مناجات و مکالمے کا روپ دھارتی ہو بلکہ وہ بھی ہے جو اندر کی طہارت کے ذریعے انسان کے خارجی عمل اور فعل کے بارے میں بھی صدق و اخلاق، حسنِ نیت اور حسنِ عمل کے اوصاف پیدا کرتی ہے۔ داخلی عبادت کے بغیر عبادت کے ظاہری رخ ناقص رہتے ہیں۔

اسلام کا نظام احکام تین بنیادوں پر قائم ہے:

(۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات۔

فقہ کی کتابوں میں عبادات کے عام عنوان کے تحت مندرجہ ذیل امور شامل کیے جاتے ہیں: طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج اور بعض اوقات جہاد بھی ❊

عبادہؓ بن صامت

نام عبادہ۔ کنیت ابو الولید۔ قبیلہ خزرج۔ خاندان سالم۔ انصار کے پہلے وفد کے ساتھ مکہ آ کر اسلام قبول کیا اور خاندان قوافل کے نقیب مقرر کئے گئے۔ ۲ھ میں غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ بیعت رضوان کے وقت بھی موجود تھے۔

مصر فتح ہونے میں دیر لگی تو حضرت عمر فاروقؓ نے ایک ہزار کی فوج پر انھیں افسر بنا کر مصر بھیجا۔ وہاں پہنچتے ہی حضرت عمرو بن العاص نے جو مصر میں سپہ سالار کی حیثیت سے لڑ رہے تھے ان کے ہاتھ سے ان کا نیزہ لے کر اپنا عمامہ اس پر لگا کر ان کے حوالے کر دیا اور کہا کہ آج سے آپؓ سپہ سالار ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پہلے ہی حملے میں مصر فتح کر لیا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فلسطین کے قاضی رہے۔ امیر معاویہ سے ناراض ہو کر واپس مدینہ چلے آئے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایک خط میں امیر معاویہؓ کو سرزنش کی اور انھیں واپس ان کی جگہ بھیج دیا اور امیر معاویہؓ کی ماتحتی سے الگ کر دیا۔

حضرت عبیدہؓ شام کے امیر تھے، انہوں نے انھیں حمص کا نائب بنایا۔ انہوں

نے وہاں لاذقیہ کو فتح کیا۔ اور ایک خاص جنگی چال ایجاد کی۔ یعنی بڑے گڑھے کھدوائے جن میں ایک شخص ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بخوبی چھپ سکتا تھا۔ یہ طریقہ یورپ میں آج بھی رائج ہے۔

۳۴ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ فضلائے انصارؓ اور صحابہؓ میں سے تھے۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں پورا قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ اصحاب صفہ کے لیے جو مدرسہ عہدِ نبویؐ میں قائم ہوا اس میں یہ دوسرے مسلمانوں کو درس قرآن وفقہ دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ کی ۱۸۱ احادیث آپ سے روایت ہوئی ہیں جو مروجہ کتب احادیث میں مرقوم ہیں۔

عبادی سلطنت

ہسپانیہ کی ایک عرب سلطنت جس نے ۱۰۲۳ء سے ۱۰۹۱ء تک اشبلیہ پر حکومت کی۔ جب خلافت قرطبہ میں انتشار اور کمزوری پیدا ہوئی تو اشبیلیہ کے گورنر ابوالقاسم محمد نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے عبادی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ۱۰۴۲ء میں اس کا بیٹا ابوعمر عباد معتضد کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ جس نے ۴۴۵ھ میں قرطبہ پر قبضہ کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔

۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں اس کی وفات کے بعد عباد سوم معتمد کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ شاعری اور آرٹ کا بڑا دلدادہ تھا لیکن ایک کمزور حکمران تھا جب الفانسو چہارم نے اس پر حملہ کیا تو اس نے مراکش کے حاکم یوسف بن تاشفین سے امداد طلب کی جس نے آکر الفانسو کو ذلاقہ کے مقام پر شکست دی اور واپس چلا گیا، لیکن جب معتمد کی بد اطواریاں حد سے بڑھ گئیں تو یوسف نے اس کو پکڑ کر مراکش کے ایک شہر میں قید کر دیا جہاں چار سال کے بعد وہ فوت ہو گیا اور اڑسٹھ سال حکومت کرنے کے بعد ہسپانیہ سے عبادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

عباس اوّل صفوی

(دورِ حکومت ۱۵۸۷ء - ۱۶۲۹ء) مشہور ایرانی شہنشاہ جو اکبر اعظم کا ہمعصر تھا۔ اوائل عمر میں خراسان کا گورنر مقرر ہوا اور تیس سال کی عمر میں اپنے باپ محمد خدابندہ کی دستبرداری کے بعد تخت نشین ہوا۔ اپنا دارالسلطنت اصفہان بنایا۔ ۱۵۹۷ء کو ازبکوں کو ہرات کے مقام پر شکست فاش دی۔ اس کے بعد گیلان مازندران اور افغانستان پر یکے بعد دیگرے قبضہ کیا۔ ۱۶۰۵ء میں ترکوں کو بصرہ کے مقام پر شکست دی۔ اور ایران کے سابقہ علاقے واپس لیے۔ جب تک زندہ رہا ترکوں سے تاوانِ جنگ وصول کرتا رہا۔ ۱۶۱۲ء کے ایک معاہدے کی رُو سے شیروان اور کردستان کے صوبے بھی ایران میں شامل ہو گئے۔ ۱۶۲۲ء میں ہرمز کا علاقہ پرتگیزوں سے چھینا اور ۱۶۲۳ء میں بغداد پر ایک سال کے محاصرے کے بعد قبضہ کیا۔

عباس کی وفات کے وقت ایرانی سلطنت دجلہ سے لے کر سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ فنون لطیفہ کا بڑا سرپرست تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی۔

عباس اوّل

(۱۸۱۶ء - ۱۸۵۴ء) خدیو مصر محمد علی پاشا کا پوتا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے دورِ حکومت میں مغرب کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی رُک تھام کی گئی۔ مخالفین نے اسے برسر دربار قتل کر دیا۔

عباس بن عبد المطلب

کنیت ابوالفضل۔ رسول اکرم صلعم کے چچا۔ حضور کے والد بزرگوار عبداللہ کے سوتیلے بھائی۔ ان کی والدہ قبیلۂ النمر کی نتیلہ بنت خباب تھیں۔ خاندانِ عباسیہ جو ان کے بیٹے عبداللہ کی اولاد میں سے ہے انھی سے منسوب ہے۔ عہد عباسیہ کے مؤرخین ان کی بے حد تکریم و تعظیم کرتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں شدت عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔

وہ تجارت کرتے تھے اور اپنے سوتیلے بھائی ابوطالب سے زیادہ خوشحال تھے ابوطالب نے ایک قرض کی ادائیگی یوں کی کہ حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے کا منصب بھی انہیں تفویض کر دیا تھا۔ اگرچہ طائف میں ان کا ایک باغ بھی تھا۔ پھر بھی وہ دولت و ثروت کے اعتبار سے قبائل عبدشمس اور مخزوم کے سرکردہ لوگوں کے ہمسر نہ تھے۔

حضرت عباسؓ بڑے قد آور، بارعب، عقل مند اور حسین و جمیل آدمی تھے آنحضرت صلعم کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ آپؐ سے تین برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔

بنوہاشم کے بے کسوں، محتاجوں اور غریبوں کے لیے روٹی کپڑا اور دیگر ضروریات کی فراہمی اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ کی ہمیشہ حمایت کی۔ ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے عقبہ کے اجتماع میں حضور کی حمایت کی تھی۔

حضرت عباسؓ جنگِ بدر میں قریش کی طرف سے لڑتے ہوئے قید ہوئے لیکن بعد میں رہا کر دیے گئے۔

انہوں نے ۸ھ/۶۳۰ء میں فتح مکہ کے وقت اسلام کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ آنحضرت صلعم نے فرطِ مسرت سے ان کی پذیرائی کی اور فتح مکہ کے بعد سقایہ کا منصب انہی کے پاس رہنے دیا۔

روایت ہے کہ انہوں نے غزوہ حنین میں نہایت بہادری کا ثبوت دیا اور اپنے گرجدار نعرے سے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی اور غزوہ تبوک میں مالی امداد دی تھی۔ بعض روایات کی رُو سے انہوں نے محاربات شام میں حصہ لیا تھا۔

جب حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی کی توسیع کرنا چاہی تو انھوں نے اپنا مکان اس مقصد کے لیے ان کی نذر کر دیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ حضور اکرمؐ انہیں خیبر کی پیداوار میں سے سالانہ حصہ دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وظائف کی فہرست پر نظرثانی کر کے انہیں اصحاب بدر کے برابر کر دیا تھا۔

ان کا انتقال ۳۲ھ/۶۵۳ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۸ یا ۸۹ برس تھی۔

ان کے نامور فرزند عبداللہ بن عبداللہ کا مرتبہ صحابہ اور فقہا و مفسرین مدینہ میں بہت بلند تھا۔ آنحضرتؐ کی ہجرت مدینہ کی ابتدائی تجاویز میں وہ بھی شامل تھے۔

عباس بن مرداس

نام عباس۔ کنیت ابوالفضل۔ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ زمانہ جاہلیت

میں بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ جب حضورؐ نے نبوت کا دعوےٰ کیا تو آپ حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ اور اپنے قبیلے کے نوسو مسلح آدمیوں کو لے کر آنحضرتؐ کی مدد کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آپ عرب کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ فتح مکہ کے روز انھوں نے ایک پرزور قصیدہ تحریر کیا۔ جنگ حنین، طائف اور اوطاس کے غزوات میں نبی اکرمؐ کے ہم کاب رہے اور ہر جنگ کے خاتمے پر قصیدہ کہتے تھے۔

زیادہ تر آپ کا قیام بصرہ میں رہا۔ بعض احادیث نبوی بھی آپ سے روایت ہیں۔

عباس، بنو (عباسیہ)

خاندان خلفاء ۱۳۲ھ/۷۵۰ء تا ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء۔

اس خاندان کی نسبت حضور اکرمؐ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے نام سے ہے جو حضورؐ کے والد عبداللہ کے سوتیلے بھائی تھے۔

خلافت عباسیہ کا قیام اموی خلافت کے خاتمے پر عمل میں آیا۔ بنو عباس کی وہ جماعت جس نے امویوں سے سلطنت چھینی تھی ہاشمیہ کہلاتی تھی۔ مورخین کے قول کے مطابق اس نام کی نسبت ہاشم سے تھی جو حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ اور آنحضرتؐ کے مورث اعلیٰ تھے اور اس کا استعمال دعوےٰ استحقاق خلافت کو نبی اکرمؐ کی قرابت کی بنا پر منوانے کے لیے کیا گیا تھا۔ لیکن در اصل اس نام ہاشمیہ کا مفہوم کچھ اور ہی تھا۔ اور اس سے بنو عباس کے صحیح منبع و منشا کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔

عہد اموی میں شیعوں اور ان کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد اور ان سب جماعتوں کو جن کا سلطنت کے مختلف حصّوں، خاص طور پر جنوبی عراق میں کچھ زیادہ چرچا ہوا۔ ہم مجموعی طور پر دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو اُن مدعیان خلافت کی پیروی کرتے تھے جو حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے تھے اور جن کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ اعتدال پسند تھے اور عقائد جمہور (سنیوں) سے صرف اتنا اختلاف رکھتے تھے کہ وہ ان کے موروثی حقوق کی بنا پر بنو علی کے سیاسی دعووں کی تائید کرتے تھے۔

دوسرا گروہ پہلے پہل ۶۶ھ/۶۸۵ء میں ظاہر ہوا۔ جب مختار نے محمد بن علیؓ کے نام پر علم بغاوت بلند کیا۔ آئندہ ساٹھ ستر برس میں محمد بن حنفیہ اور ان کے جانشینوں کے دعاوی کی حمایت فرقوں کے ایک ایسے سلسلے نے کی جو زیادہ انتہا پسند کردار کے لوگ تھے۔ انھیں کچھ آزردہ خاطر اور ناقص الاسلام موالی سے بھی تائید حاصل ہوئی۔ یہ نومسلم لوگ بہت سے غیر اسلامی خیالات اپنے سابق مذاہب کے لے کر آئے تھے۔

۸۱ھ/۷۰۰-۷۰۱ء میں محمد بن حنفیہ کی وفات پر ان کے پیرو تین بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ جن میں سے ایک ان کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ کے متبعین کا تھا۔ اور ان کے نام کی نسبت سے ہاشمیہ کہلاتا تھا۔

ابو ہاشم کے لاولد وفات پا جانے کے بعد ان کے پیرو بھی کئی جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ جن میں سے ایک کا یہ دعوےٰ تھا کہ ابو ہاشم نے اپنی وفات سے ذرا ہی پہلے امامت بذریعہ وصیت محمد بنؒ علیؒ بن عبداللہ بن عباس کو منتقل کر دی تھی۔ یہ جماعت برابر ہاشمیہ کہلاتی رہی۔ اسے راوندیہ بھی کہتے تھے۔

محمد بن علی نے ابو ہاشم کے دعاوی اختیار کر لیے اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہاشمیہ فرقے اور اس کی تبلیغی تنظیم کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جو بالآخر عباسیوں کے کام آئی۔

عباسیوں کے ابتدائی تبلیغی سرگرمیوں کے حالات غیر مکمل اور متضاد ہیں۔ ہاشمیوں نے اپنے صدر مقام کوفے سے خراسان میں ایلچی بھیجے جن میں سے خداش کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی لیکن اس کا راز قبل از وقت افشا ہو گیا۔ جس کی پاداش میں وہ ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں قتل کر دیا گیا۔ شیعوں کا اعتدال پسند طبقہ، جس کی حمایت محمد بن علی ابھی تک حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ ان سے برگشتہ ہو گیا۔ چنانچہ خداش کی موت پر محمد نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنی لاتعلقی کا اظہار کر دیں اور خراسان میں اپنے ارادے کو سلیمان بن کثیر کی نگرانی میں دے دیں جو شیعوں کا بڑا مبلغ تھا۔ ۱۲۵ھ/۷۴۳ء میں محمد کی وفات ہو گئی۔

محمد بن علی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا ابراہیم امامت کا مدعی ہوا اور خراسانی پیرووں نے سلیمان بن کثیر سمیت اس کے دعووں کو تسلیم کر لیا۔ ابراہیم نے اپنے مولیٰ ابومسلم کو اپنا ذاتی نمائندہ بنا کر خراسان بھیجا۔ اس کی دعوت نے خراسان میں نمایاں کامیابی حاصل کی نہ صرف ایرانی بلکہ یمنی عربوں میں بھی قابل ذکر مقبولیت حاصل کی۔ بہت سے زرتشتی اور بدھ دہقان بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ ابومسلم ہاشمیہ کا وفادار کارندہ انتہا پسند طبقے میں شامل تھا۔ ابومسلم کی سرگرمیوں سے وہ عرب اعتدال پسند شیعہ جن کی قیادت سلیمان بن کثیر کے پاس تھی کسی حد تک مخالف ہو گئے۔ لیکن امویوں کے خلاف اعتدال پسند شیعہ اور خوارج کی دو تحریکیں چلیں۔ ان کے نتائج ہاشمیہ کے حق میں برآمد ہوئے یعنی ایک طرف تو اموی سلطنت کمزور ہو گئی دوسری طرف خود اعتدال پسندوں کا زور کم ہو گیا۔ چنانچہ جب ابومسلم ایک بار خراسان سے جا کر دوبارہ واپس لوٹا اور اپنا ہنر دکھانے کو تیار ہوا تو کوئی دوسری قوت ایسی باقی نہ تھی جو ہاشمیوں کے برسر اقتدار آنے کے سلسلے میں ان کی مد مقابل ثابت ہوتی۔

فعال اور جنگجو ایرانی باشندے جن میں مذہبی اور سرحدی فوجی روایات نے جوش و خروش پیدا کر رکھا تھا اموی حکومت کے غیر مساویانہ سلوک سے بہت برافروختہ تھے۔ اس ساری صورت حال کے تحت ابومسلم نے بہت جلد مرو پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اپنے سپہ سالار قحطبہ طائی کی مدد سے تمام خراسان کو اموی سلطنت سے خرید لیا۔

خراسان سے عباسی افواج پہلے رے کی طرف بڑھیں وہاں ایک مکمل فوج کو شکست دے کر نہاوند پر قابض ہو گئیں۔ ۱۳۲ھ/۷۴۹ء میں عباسی فوج نے دریائے فرات کو شہر کوفہ سے کوئی تیس چالیس میل شمال میں عبور کیا۔ اور ایک اموی فوج سے مقابلہ کر کے اسے شکست دی۔ قحطبہ خود میدان جنگ میں مارا گیا لیکن اس کے بیٹے الحسن بن قحطبہ نے فوج کی کمان سنبھال لی اور فتح پہ فتح حاصل کرتا ہوا کوفے پر قابض ہو گیا۔

۱۳۰ھ/۷۴۸ء میں ابراہیم الامام کو اموی خلیفہ مروان نے گرفتار کر لیا اور کچھ عرصے کے بعد ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا اس کے بھائی ابوالعباس کو ہاشمی افواج نے ۱۳۲ھ میں کوفے میں السفاح کے لقب سے خلیفہ بنا دیا۔ اس طرح بنو عباس کی خلافت کا آغاز ہوا۔ عباسیوں کے پہلے خلیفہ کے تخت نشین ہوتے ہی عباسیوں اور انقلاب پسندوں کے تعلقات میں پہلا رخنہ نمودار ہوا۔ جب داعی ابوسلمہ مشتبہ حالات میں مار ڈالا گیا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ وہ خلافت کو آل عباس کی بجائے آل علی میں منتقل کرنے کی کوشش میں ہے۔ ابومسلم نے ذمہ لیا کہ وہ ابوسلمہ کو ٹھکانے لگا دے گا شاید اس خیال سے کہ اس کے عوض عباسی سلیمان بن کثیر کی موت پر سکوت اختیار کریں گے۔

اسی دوران میں عباسیوں کی ایک اور فوج ابوعون کی قیادت میں نہاوند سے الجزیرہ کی طرف بڑھی۔ امویوں کو ایک شکست ہونے کے بعد جب مروان خود

جنگ میں مروان نے ابو عون کا مقابلہ کرے ۔ تو اس نے اپنی فوج کی کمان السفاح کے چچا عبداللہ کے سپرد کر دی جو کوفہ سے کمک لے کر اس کی مدد کو پہنچا تھا ۔ ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء میں زاب اعلیٰ کے معرکے نے اموی خلافت کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لیے کر دیا مروان شکست کھا کر شام کی طرف بھاگا ۔ جہاں سے اس نے مزاحمت کی ایک اور ناکام کوشش کی ۔ عباسی فوجیں حران میں سے ہوتی ہوئیں شام میں داخل ہو گئیں اور انھوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا ۔ پھر مروان کا تعاقب کرتی ہوئی مصر تک پہنچ گئیں ۔ جہاں مروان قتل کر دیا گیا اور اس کا سر کوفے میں السفاح کے پاس بھیجا گیا ۔ اب نئے عباسی خلیفہ کا اقتدار تمام مشرق وسطیٰ پر قائم ہو گیا ۔

انیسویں صدی کے بہت سے مستشرقین کو عباسیوں اور امویوں کی لڑائی میں ایران کی آریائیت اور عرب کی سامیت کی کشمکش نظر آتی ہے ۔ جو عربوں پر ایرانیوں کی فتح پر منتج ہوئی ۔ لیکن جدید تر مصنفین نے عربوں کی شکست کے متعلق ان نظریات میں بہت کچھ ترمیمات کی ہیں ۔ کیونکہ اس انقلاب میں شیعیت کا بہت بڑا حصہ ہے اور شیعیت ایک حد تک " ایرانیوں کے قومی شعور " کا مظہر سمجھی جاتی ہے ۔ حالانکہ اس کی ابتدا عرب ہی میں ہوئی ۔ پھر اس انقلاب کا اصل مرکز جنوبی عراق کی مخلوط آبادی میں تھا جو عربوں اور ایرانیوں پر مشتمل تھی ۔ اس کے علاوہ اس بغاوت میں فقط ایرانی ہی نہ تھے بلکہ بہت سے عربوں نے اس کی تائید کی خصوصاً اہل یمن نے اور اس کے سرغنوں میں بھی بہت سے عرب موجود تھے ۔

عباسی فتح کے بعد سب سے مقدم تبدیلی یہ تھی کہ مرکز ثقل شام سے ہٹ کر عراق میں آ گیا : عباسیوں کے پہلے خلیفہ السفاح نے اپنا دار الخلافت ایک چھوٹے سے قصبے ہاشمیہ میں قائم کیا جو کوفے کے قریب دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر آباد کیا تھا ۔ بعد میں اس نے اپنا پایہ تخت الانبار منتقل کر دیا ۔ اس کے بھائی اور جانشین المنصور نے جو کئی لحاظ سے خلافت عباسیہ کا حقیقی بانی تھا اپنا مستقل دار الخلافہ ایک نئے شہر کو بنایا جو دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر مدائن کے کھنڈروں کے قریب تھا ۔ اس کا سرکاری نام مدینۃ السلام تھا لیکن اس کا غیر سرکاری نام بغداد ہے ۔ پہلے اس شہر یا اس کے نواح سے خاندان عباسیہ نے حکومت کی ۔ پھر پانچ صدیوں تک عالم اسلام کے بیشتر حصے میں خلیفہ تسلیم کیے جاتے رہے ۔ ان کے دور حکومت پر، جسے اعلیٰ ترین اسلامی تہذیب و تمدن کا پر عظمت زمانہ کہنا چاہیے ۔ بغرض سہولت دو ادوار مقرر کیے جا سکتے ہیں ۔

پہلا دور ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء تک رہا ۔ خلافت عباسیہ اپنے قیام کے فوراً بعد نامساعد حالات سے دوچار ہوئی ۔ اس کے خلاف ہر طرف بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ شام میں معزول شدہ اموی خاندان کے عرب حمایتی گڑبڑ کرتے رہتے تھے ۔ خوارج بھی مخالفت سے باز نہ آتے تھے ۔ ابو العباس السفاح کے انتقال کے بعد جب اس کا بھائی ابو جعفر المنصور کا لقب اختیار کر کے اس کی جگہ تخت خلافت پر بیٹھا تو اس کے چچا عبداللہ بن علی نے جو اس وقت بوزنطی سرحد پر غازیوں کی قیادت کر رہا تھا، علم بغاوت بلند کیا اور اپنی خلافت کا اعلان کر دیا لیکن یہ آفت ابو مسلم کی کوشش سے ٹل گئی ۔ اب خود ابو مسلم اور ہاشمیہ کا مسئلہ باقی تھا ۔

عباسیوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ان کے سامنے دو متضاد مسائل ہیں یعنی آیا انہیں اپنی تحریک کے اصول و مقاصد کا لحاظ رکھنا چاہیے یا ملک اور حکومت کی ضرورت کو پیش نظر رکھنا چاہیے ۔ عباسیوں نے اس سلسلے میں دوام سلطنت اور پابندیٔ شریعت کو ترجیح دی جس سے ان کے بعض پیرو مایوس اور ناراض ہو گئے ۔

المنصور نے جیسے ہی یہ محسوس کیا کہ اب اس میں ابو مسلم جیسے شخص کے تکلیف دہ وجود سے نجات حاصل کرنے کی قوت موجود ہے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ ان اقدامات سے عباسیوں کے بہت سے انتہا پسند حمایتی ان سے برگشتہ ہو گئے ۔ ان میں سے بعض نے اپنی نفرت کا اظہار اس طرح کیا کہ ایران میں نیم مذہبی، نیم سیاسی بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور دوسرے لوگ آگے چل کر اسماعیلیوں میں شریک ہو گئے ۔ جو فاطمی شیعوں کا ایک انتہا پسند فرقہ تھا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان تغیرات نے راسخ العقیدہ طبقے میں ایک تازہ اعتماد پیدا کر دیا ۔ جس کی بدولت منصور ہر قسم کی بغاوت اور بیرونی حملے سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا ۔ اس طرح اس نے اپنے طویل اور درخشاں عہد میں عباسی سلطنت کی بنا ڈالی ۔

اس کام میں برامکہ خاندان نے منصور کا ہاتھ نہایت قابلیت کے ساتھ بٹایا برامکہ عام طور پر ایرانی بتائے جاتے ہیں لیکن وہ ان خراسانی باغیوں سے بالکل مختلف قسم کے تھے جنہوں نے ابو مسلم کا ساتھ دیا تھا ۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ بدھ مت کے پیرو تھے ۔ اس خاندان کا اثر و رسوخ اقتدار پر ہارون الرشید تک رہا اور اسی کے عہد میں حیرت انگیز طور پر ختم ہو گیا ۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے عہد میں عباسی اقتدار اپنے عروج پر تھا لیکن یہی وہ زمانہ ہے جب تنزل کی اولین علامتیں نظر آنا شروع ہو گئیں ۔ ایران کی مذہبی بغاوتیں جو ابو مسلم کے قتل سے شروع ہوئی تھیں خوفناک نہ ہوتی چلی گئیں ۔ بحیرہ خزر کے صوبوں اور خراسان میں عباسی اقتدار کو دعوت مبارزت دے [illegible] مغرب میں عباسی اقتدار تقریباً معدوم ہو چکا تھا ۔ اندلس عباسیوں سے منحرف ہو کر ایک اموی خاندان کی قیادت میں خود مختار بن چکا تھا ۔ آخرکار خلافت کی موثر حکومت صرف وسطی اور جنوبی عراق تک محدود رہ گئی ۔

ہارون الرشید کے انتقال کے بعد منافقت کی آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اس خانہ جنگی کی صورت میں بھڑک اٹھی جو الامین اور المامون [illegible] امین کی قوت زیادہ تر دار السلطنت اور عراق میں تھی ۔ اور مامون کی [illegible] خانہ جنگی مامون کی فتح پر ختم ہوئی ۔

مامون نے مشرق کی امداد پر بھروسہ کرتے ہوئے کچھ عرصہ [illegible] سمجھا کہ اپنا پایۂ تخت بغداد سے مرو میں منتقل کر دے ۔ لیکن [illegible] بعد اس نے دانش مندی سے سابق مرکز کی طرف لوٹ [illegible] اہل خراسان نے اپنے عزائم کی تکمیل کا یہ راستہ نکالا کہ مقامی [illegible] کر لیں ۔ مامون کا ایک سپہ سالار طاہر خراسان میں خود مختار [illegible] قائم کر لی ۔ دوسرے لوگوں نے اس کی تقلید کی ۔ [illegible] خلیفہ کو [illegible] میں حاکمانہ اقتدار سے محروم کر دیا ۔ اور نوبت یہاں تک [illegible] زمانے سے تو خلفا اپنے سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن [illegible] اپنی خواہش کے مطابق خلفا کو مقرر اور معزول کرتے رہتے تھے ۔

واثق کے جانشین متوکل نے خلافت کے اقتدار کو [illegible] کوشش کی لیکن وہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا ۔ ۲۴۷ھ میں متوکل قتل کر دیا [illegible] ملک میں افراتفری پھیل گئی ۔ نو برس کی مختصر مدت میں یکے بعد دیگرے [illegible] نشین ہوئے ۔ خلیفہ معتمد جو ۲۵۶ھ / ۸۷۰ء میں تخت خلافت پر بیٹھا کوئی [illegible] نہ تھا لیکن اس کا بھائی موافق جلد ہی دار الخلافہ کا خلیفہ بالقوہ بن [illegible] بیس سالہ حکومت میں خاندان عباسی کے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل [illegible] کی بہت کوشش کی اور اسے اس میں اس حد تک کامیابی نہ ہوئی [illegible]

بڑھتے ہوئے حوصلوں کا سدِ باب ہوگیا اور خود موافق کے جانشینوں کا کام سہل ہو گیا ۔

موافق کی موت پر اس کا بیٹا معتضد باپ کے قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا ۔ اس سے اگلے سال معتضد اور اس کا جانشین مکتفی دونوں قابل اور طاقتور حکمران تھے ۔ ایران اور مصر میں خلافت کا اقتدار پھر قائم ہوگیا ۔

معتضد اور مکتفی کی وفات پر مقتدر تختِ خلافت پر بیٹھا جس کی عمر اس وقت فقط تیرہ سال تھی ۔ اس کے کمزور اور طویل عرصہ حکومت میں ایک بار پھر ساری شورشیں بیدار ہوگئیں ۔ دارالسلطنت میں بدنظمی اور ابتری اس حد تک بڑی کہ خلیفہ اپنے سپہ سالار سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ اس کے جانشینوں قاہر اور راضی کے زمانے میں خلافت کا اقتدار کلیتہً ختم ہوگیا ۔ خلیفہ سلطنت اور دین کا محض ایک رسمی سربراہ اور اسلام کی مذہبی وحدت کا نمائندہ ہوکر رہ گیا ۔ ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں انتہائی انحطاط نمودار ہوا جب بویہی امیر معز الدولہ بغداد میں داخل ہوا ۔

سفاح کی تخت نشینی سے معز الدولہ کی آمد تک تقریباً دو صدیوں کا عرصہ ہے ۔ ابتدائی عباسی خلفاء اپنی طرز حکومت میں انھی خطوط پر چلتے رہے جن کے نقش آخری زمانے کے اموی حکمران قائم کر چکے تھے ۔ عباسیوں نے ایک دینی تحریک کی بنا پر قوت حاصل کی اور جس سلطنت کے حکمران تھے اس کے اتحاد و اقتدار کی بنیاد انہوں نے مذہب ہی پر رکھنا چاہی ۔ گو اس میں بہت حد تک وہ کامیاب ہوئے لیکن انھیں مسلسل مذہبی تحریکوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی کے سیاسی انحطاط کی وجہ سے سلطنت کی قوت مجموعی طور پر پارہ پارہ ہوچکی تھی ۔ دارالخلافہ میں پہلے خلفاء کے اقتدار پر زوال آیا اور پھر کلی طور پر خاتمہ ہوگیا ۔

تاہم ان امور کا خلافت کی معاشی اور ثقافتی زندگی پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑا ۔ عباسیوں کے برسر اقتدار آتے ہی ملک میں بحالی کی لہر دوڑ گئی ۔ اندرونِ سلطنت نیز بیرونی دنیا میں تجارتی تعلقات کا جال بچھا دیا گیا ۔ اس دور کے ادب، فنون لطیفہ علوم دینی، فلسفے اور سائنس نے جو ارتقائی مراحل طے کیے وہ نہایت شاندار ہیں ۔ یہ اسلامی سلطنت کا دورِ عروج تھا اور اس میں ان کی تہذیب اوج کمال پر تھیں ۔

دوسرا دور ۳۳۴ھ/۹۴۵ء سے ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء تک ہے ۔ بغداد پر بویہیوں کے قبضے سے لے کر مغول کے اس کو فتح کرنے تک جو طویل مدت گزری اس میں خلافت کی حیثیت ایک برائے نام ادارے کی حیثیت کی ہوگئی ۔ جو اہل سنت کی قیادت کا فرض انجام دیتا تھا ۔

دسویں صدی عیسوی کے ربع ثانی میں بہت سے امراء نے جو مذہباً شیعی تھے اور ایرانی خاندان بویہ سے تعلق رکھتے تھے، مغربی ایران کے بیشتر حصے پر اپنے تسلط کو وسعت دی اور خلفاء کو مجبور کیا کہ ان کی حکومت قانونی طور پر تسلیم کی جائے ۔ ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں بویہی حکمران معز الدولہ بغداد میں داخل ہوا اور خلیفہ مستکفی سے امیرالامرا کا خطاب جبراً حاصل کیا ۔

کچھ عرصے بعد بویہیوں کی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی جن میں سے بعض پر اسی خاندان کے لوگ اور بعض پر دوسرے لوگ حکمران تھے ۔ ادھر ایران میں ایک نیا خاندان "سلجوقی" مسلسل قوت حاصل کر رہا تھا ۔ گیارہویں صدی کے وسط تک بویہیوں کی قوت کا خاتمہ ہوگیا ۔ اور ایک ترکی سپہ سالار مسمی البساسیری نے بغداد پر قبضہ کرکے وہاں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا ۔ یہ مختصر سا واقعہ فاطمیوں کے عروج کا انتہائی نقطہ تھا ۔ ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں طغرل بیگ سلجوقی نے بغداد میں داخل ہوکر اپنے سلطان ہونے کا اعلان کردیا ۔ سلجوقیوں کی یہ سلطنتِ عظمیٰ ایک صدی تک قائم رہی ۔ انہوں نے بہت اہم تبدیلیاں کیں ۔ وہ ترک اور سنّی تھے ۔

سلاجقہ کبار کی سلطنت کے زوال کے بعد عراق پر سلجوقی فرمانرواؤں کا خاندان حکمران ہوگیا جس کا سلسلہ تغرل ثانی پر ختم ہوا ۔ اس کی قوت ٹوٹ جانے پر اور کسی دوسری قوت کی عدم موجودگی میں خلیفہ ناصر کے لیے گم شدہ اقتدار کو بحال کرنے کا آخری موقع پیدا ہوگیا ۔ مشرق وسطیٰ کی دو بڑی طاقتیں اپنے حریفوں سے برسرِ پیکار تھیں اس لیے حالات اور بھی سازگار تھے ۔ ناصر نے خلافت کے لیے بغداد اور ایران میں ایک مذہبی رنگ کی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مختلف مذہبی حوالوں اور ذرائع سے کام لیا ۔ لیکن ناصر کے جانشین کمزور اور نااہل تھے اور جب مغل سپہ سالار ہلاکو ایران کو فتح کر کے بغداد آ پہنچا تو آخری عباسی خلیفہ مستعصم کسی قابل ذکر مزاحمت کی اہلیت نہ رکھتا تھا ۔

بغداد پر مغول کے قبضے اور خلافت کی تباہی کی تاریخ اسلام میں عام طور پر ایک بڑی مصیبت قرار دیا جاتا ہے ۔ خروج تاتار سے مسلمانوں کا تمدن ہی بدل کر رہ گیا ۔ وہ ایک ایسے نئے دھارے میں بہنے لگا جو گزشتہ صدیوں کے دھاروں سے مختلف تھا ۔

آئندہ ڈھائی سو سال تک عباسیوں کا ایک سلسلہ قاہرہ کے مملوک سلاطین کے زیرِ حکومت برائے نام خلفاء کی حیثیت سے یکے بعد دیگرے جانشین ہوتا رہا ۔ قاہرہ کے یہ خلیفہ بالکل بےبس اور مجبور تھے اور ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ دربار کے معمولی وظیفہ خوار تھے ۔

۱۵۱۷ء میں سلیم اوّل نے جو مصر اور شام کا عثمانی فاتح تھا آخری خلیفہ متوکل کو معزول کر دیا اور اس طرح مصر کی ظلّی خلافتِ عباسیہ کو ختم کر دیا ۔ تاریخی روایت کے مطابق متوکل نے اپنا حق سلیم کو اور اس کی وساطت سے خاندانِ عثمانی کو منتقل کر دیا تھا ۔

بغداد کے خلفائے بنو عباس کی کل تعداد سینتیس ۳۷ تھی ۔ اس کا دورِ حکومت ۱۳۲ھ/۷۵۰ء سے ۶۴۰ھ - ۶۵۶ھ/ ۱۲۴۲ء - ۱۲۵۸ء تک رہا ۔ ان کے بعد عنانِ اقتدار مصر کے عباسی خلفاء کے ہاتھ میں آگئی ۔ ان کی کل تعداد ۲۱ ہے ۔ اس کا دورِ اقتدار ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء سے شروع ہوکر ۹۲۲ - ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۶ء - ۱۵۱۷ء تک رہا ۔

خلافتِ عباسیہ پر بے شمار لکھا گیا ہے ۔ اس لیے بھی کہ اس کا دورِ اقتدار ایک طویل عرصے تک قائم رہا ۔ اس کے علاوہ اس کی بنیادی اہمیت یہ بھی ہے کہ عباسی دورِ حکومت اسلامی عہد کا سب سے زیادہ شاندار، روشن اور ارتقائی عہد تھا ۔ اس عہدِ حکومت میں فقط اندرونی طور پر ہی دُور رس تبدیلیاں نہیں آئیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کے اثرات نہایت ہمہ گیر اور وسعت پذیر تھے ۔ اس عظیم الشان عہدِ حکومت کے بعد مسلمانوں کا جاہ و جلال اور اسلامی عظمت روبہ زوال ہونا شروع ہو گئی ۔ اور پوری دنیا پر اس کی برتری کا منصب اس سے چھننے لگا ۔

عباس علمدار

ابوالفضل العباس بن علی رض ۔ آپ کی والدہ عرب کے ایک معزز خاندان کلاب سے تھیں ۔ حضرت فاطمہ رض کے انتقال کے بعد چھ ماہ بعد حضرت علی رض نے بی بی ام البنین

سے شادی کی جن کے بطن سے حضرت عباس علمدار پیدا ہوئے۔

ان کی ولادت ۲۶ھ میں ہوئی۔ چودہ برس اپنے والد حضرت علیؓ کے سایۂ عاطفت میں گزارے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد سے دس برس اپنے بھائی امام حسنؓ کی زیر تربیت رہے۔ ۵۰ھ میں امام حسن شہید ہوئے تو عاشورۂ محرم ۶۱ھ تک کا زمانہ اپنے دوسرے بھائی امام حسینؓ کی رفاقت میں بسر کیا۔ واقعہ کربلا کے وقت آپ کی عمر ۳۴ سال تھی۔

حسن و جمال اور قوت و شجاعت میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور عام طور پر "قمر بنی ہاشم" کے لقب سے مشہور تھے۔

امام جعفر صادق ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہمارے چچا عباس بن علیؓ بڑے دین دار اور کامل الایمان تھے۔

واقعہ کربلا میں جب عاشورہ کی صبح امام حسینؓ نے اپنی اس مختصر سی جماعت کو لشکر کے عنوان سے ترتیب دیا تو علم برداری کا شرف ابوالفضل عباس کو عطا ہوا۔ اس حسینی پرچم کے وقار کو انہوں نے جس طرح قائم رکھا یہ ایک یادگار واقعہ ہے۔ عباس بن علیؓ کی شجاعت کا ایک مرقع وہ ہے جب عمر بن خالد صیدلوی و عمرو مجاہد ایک ساتھ دشمن پر حملہ آور ہوئے تھے اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرتے ہوئے چاروں طرف سے گھر کر باقی انصار حسینؓ سے جدا ہو گئے تھے اور امام حسینؓ نے حضرت عباسؓ کو ان کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ انہوں نے تن تنہا حملہ کر کے ایسی تلوار چلائی کہ دشمن کا لشکر منتشر ہو گیا اور وہ ان زخمی مجاہدوں کو مستقر کی طرف واپس لے آئے۔

عباس علمدار کی شہادت اصحاب و اعزا میں سب سے آخر میں ہوئی۔ ان کے باقی تینوں بھائی جو ام البنین کے بطن سے تھے شہید ہو چکے تھے اور حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے سوا کوئی قافلۂ حسینؓ میں سے جہاد کے لیے باقی نہ رہا تھا تو انہوں نے امام حسینؓ سے اذنِ جہاد طلب کیا۔ امام حسینؓ نے انھیں روکنا چاہا لیکن انہوں نے کہا اب مجھ میں تابِ ضبط نہیں ہے اور مشکیزہ لے کر نہر کی طرف روانہ ہوئے۔ دشمن نے مزاحمت کی۔ آپ نے نہر کا راستہ صاف کرنے کے لیے حملہ کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ نہر پر پہنچ کر مشکیزہ پانی سے بھر لیا۔ خود بھی پیاسے تھے لہذا ایک چلو بھر کر منہ کی طرف لے گئے تاکہ پیاس بجھا سکیں لیکن پھر امام حسینؓ اور بچوں کی پیاس کو یاد کر کے چلو والا پانی پھینک دیا۔ جب مشکیزہ کمر پر سنبھالے خیموں کی طرف لوٹے تو دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اب صورت یہ تھی کہ دشمن آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ آپ کے دوش پر پانی کا مشکیزہ تھا اور ہاتھ میں حسینی علم تھا اور وہ کسی بھی طرح پانی خیموں تک لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسی عالم میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ حملے کرنا شروع کر دیے اور ساتھ ساتھ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ حکیم بن طفیل سنبسی نے آپ کے داہنے ہاتھ پر تلوار ماری۔ عباسؓ کو ہاتھ سے زیادہ علم کا خیال تھا۔ اس لیے علم کو گرنے نہیں دیا۔ اور بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ زید بن ورقا جہنی نے موقع پا کر بائیں بازو پر تلوار ماری اور وہ بھی کٹ گیا۔

حضرت عباسؓ نے گھوڑے کی پشت پر جھک کر علم کو سینے سے روکنا چاہا تو ایک شخص نے گرز کا وار کیا جس سے وہ زمین پر گر گئے اور امام حسینؓ کو پکارا۔

حضرت امام حسینؓ کے کانوں میں ان کی آواز پڑی تو جھپٹ کر ان تک پہنچے عباسؓ کے دونوں بازو کٹے ہوئے تھے، پیشانی شکستہ، ایک آنکھ میں تیر پیوست تھا اور وہ زمین پر پڑے دم توڑ رہے تھے۔

امام حسینؓ اپنے بھائی کے سرہانے بیٹھ گئے تو عباسؓ کے آخری الفاظ آپ کے کانوں میں پڑے:

"خدا خود آزادی اور حریت ہے۔ اے حریت، اے خدا میں تیرے ہی پاس آتا ہوں۔"

اور حضرت عباسؓ کی زبان خاموش ہو گئی۔

حضرت عباس بن علیؓ کی حق کے لیے جاں نثاری اور عزم شجاعت کا ذکر مرثیوں میں تواتر اور احترام کے ساتھ آتا ہے۔ مشہور اور اہم مرثیوں میں شہادتِ حسینؓ کا واقعہ ایک علیحدہ باب کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی شہادت فقط حضرت امام حسینؓ کے ایک ساتھی یا بھائی کی شہادت ہی نہیں تھی بلکہ ہر عہد کی انسانیت کے لیے ایمان اور جرأت کی ایک قابلِ قدر مثال ہے۔

عباسیہ

تونس کا ایک قدیم شہر جو قیروان سے جنوب مشرق کی طرف تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ قصر اغالبہ اور قصر قدیم کے ناموں سے بھی معروف تھا۔ خاندان بنو اغلب کے بانی ابراہیم بن اغلب نے اسے تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر ۱۸۴ھ/ ۸۰۰ء میں ہوئی۔ ابراہیم بن اغلب نے اس نو تعمیر شہر کا نام اپنے عباسی آقاؤں کے اعزاز میں عباسیہ رکھا۔

شہر میں حمام، سرائیں، اسواق، بازار اور ایک جامع مسجد تھی۔ اس مسجد کا مینار اسطوانی شکل کا تھا اور اسے اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور چھوٹے چھوٹے ستونوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جو سات طبقوں میں مرتب تھے۔ قیروان کی بڑی مسجد کی طرح اس میں بھی محراب کے نزدیک تراشیدہ لکڑی کا ایک مقصورہ بنایا گیا تھا جو امیر اور عمائد کے لیے مخصوص تھا۔

شہر کے کئی دروازے تھے جن میں سے زیادہ اہم حسب ذیل ہیں: باب رحمت، باب حدید، باب غلبون (منسوب بہ اغلب بن عبداللہ بن اغلب جو زیادۃ اللہ اول کا وزیر اور رشتہ دار تھا)۔ باب ریح۔

یہ سب دروازے شہر کی مشرقی سمت میں واقع تھے۔ باب سعادۃ شہر کے مغرب میں تھا۔ شہر کے عین وسط میں ایک چوک تھا جسے المیدان کہتے تھے اور جہاں فوج کی قواعد ہوتی تھی اور فوج کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ [illegible] ہی اصافہ کا محل واقع تھا۔ یہ وہی محل تھا جس میں ابراہیم [illegible] سفرا کو بار یاب کیا تھا جو سینٹ سپرین کے آثار و تبرکات [illegible] اور اپنے ساتھ وہ تحائف بھی لائے تھے جو خلیفہ ہارون الرشید [illegible] تھے۔

عباسیہ میں اپنی بنا کے وقت ہی سے ایک ٹکسال قائم ہو گئی تھی جہاں طلائی دینار اور نقرئی درہم ڈھالے جاتے تھے اور ان پر شہر کا نام ہوتا تھا۔ [illegible] ایک سرکاری کارخانہ خلعت اور پرچم تیار کیا کرتا تھا۔

ابراہیم اول کے جانشینوں کے عہد میں عباسیہ میں نجی اور عوامی مفاد کی یادگار عمارات بنوائی گئیں۔ ابو ابراہیم احمد نے ایک بہت بڑا ذخیرۂ آب تعمیر کرایا۔ اس کے بعض اہم آثار اب تک محفوظ ہیں۔

ابراہیم ثانی نے ۲۶۴ھ/ ۸۷۷ء میں عباسیہ کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر رقادہ بسایا جو عباسیہ کی جگہ شاہی سکونت گاہ بن گیا اور شہر

کی حیثیت گھٹ کر ایک معمولی قصبے کی سی رہ گئی جس میں صرف موالی اور دکاندار رہتے تھے تاہم عباسیہ بنو ہلال کے حملے (پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے وسط) تک معمولی حالت میں موجود رہا۔ اور اس حملے کے بعد ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا۔

۱۹۲۳ء میں اس ٹیلے (تل) کی سرسری کھدائی کی گئی جس پر عباسیہ واقع تھا۔ تو بنو اغلب کے دَور کے بہت سے مٹی کے ظروف کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ یہ مٹی کے سفید برتن، جن پر سیاہ، سبز اور نیلے رنگ کے جلی نقش و نگار تھے۔

عباسیہ کو متعدد اہل علم کی جائے پیدائش ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان میں سے قیروان کا اولین مؤرّخ ابوالعرب محمد بن احمد بن تمیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ؛

عبد

عربی زبان کا لفظ۔ "غلام" کے لیے ایک عام اصطلاح۔ جمع عام طور پر عبید آتی ہے۔

عبد ایک نہایت پُرمعنی قرآنی اصطلاح ہے۔ عام معنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ نیز قرآنی اصطلاح میں عبد وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبدیت کا درجہ حاصل کر کے اللہ کا مخلص بندہ بن جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اکثر انبیاء کو عبد کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جب عبد کا لفظ ان معنوں میں بولا جائے تو اس کی جمع عباد آتی ہے۔

غلام مذکر کے لیے اور جاریہ (لونڈی) مؤنث کے لیے، دونوں الفاظ کا استعمال عام ہے ؛

عَبدِ ابرّ

(۹۷۸ء - ۱۰۷۱ء) - قاضی و محدث - قرطبہ (اندلس) میں پیدا ہوا۔ شاطبہ میں وفات پائی۔ قرطبہ کا سب سے زیادہ فاضل محدث شمار ہوتا ہے۔ لشبونہ میں منصب قضاء پر فائز رہا۔ اپنی تصنیف "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" کے باعث اس نے بہت شہرت پائی۔ اس کتاب کی ترتیب حروف ہجا کے مطابق ہے ؛

عبدالبہا

(۱۸۴۴ء - ۱۹۲۱ء) - بہائی مذہب کا ممتاز قائد - شیراز میں پیدا ہوا۔ بہائی مذہب کے بانی بہاءاللہ کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ بہاءاللہ کی وفات کے بعد بہائی مذہب کی دو شاخیں ہو گئیں۔ دونوں کا صدر مقام بغداد تھا۔ ۱۸۶۸ء میں حکومت ایران کی مداخلت کے باعث ترکوں نے انھیں ملک بدر کر دیا۔ بہاءاللہ عکرہ چلا گیا۔ جہاں اس کے مسلک نے بہت عروج پایا۔ دوسری شاخ کے سربراہ قبرص چلے گئے۔ لیکن وہاں یہ تحریک کچھ عرصے کے بعد خود بخود ختم ہو گئی۔

بہاءاللہ کی وفات ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ عبدالبہا کو باپ کا روحانی جانشین تسلیم کیا گیا۔ عبدالبہا نے تفسیر و الہام کا بھی دعوےٰ کیا جس کو اس کے بھائی باطل قرار دیتے تھے۔ اس کے باقی تین بھائیوں کا دعوےٰ تھا کہ حضرت بہاءاللہ کے بعد ہزاروں برس تک کسی کو الہام نصیب نہ ہو گا۔ بہر حال عبدالبہا نے بہت جلد اپنا اختیار منوا لیا۔

نوجوان ترکوں کی انقلابی تحریک کے نتیجے میں وہ چالیس برس کی مسلسل قید کے بعد رہا ہوا۔ اور عکرہ میں سکونت اختیار کی۔ جلاوطنی کے اس زمانے میں پورے ایشیا سے لوگ جوق در جوق اس سے ملنے آتے۔

اس نے نسل، مذہبی تعصب، ذات پات اور رنگ کے امتیازات کے خلاف تبلیغ کی اور کہا کہ دنیا کے نسلی مسائل صرف روحانی اتحاد اور بھائی چارے سے طے ہو سکتے ہیں۔ وہ بین الاقوامی امن کے لیے پہلی شرط تخفیف اسلحہ قرار دیتا تھا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک کی درمیانی مدت میں یورپ اور امریکہ کا سفر کیا ؛

عبدالجلیلؒ جوہر شاہ بندگی

(--/-- - ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء) سہروردی سلسلے کے سب سے پہلے بزرگ جو سلطان بہلول لودھی کے عہد میں لاہور وارد ہوئے۔ حضرت عبدالجلیلؒ نے متحدہ پنجاب میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بہلول لودھی نے اپنی بیٹی آپ سے بیاہ دی۔ آپ کے زہد و اتقا کے باعث کثیر التعداد لوگ جن میں زیادہ تر راجپوت تھے آپ کے مُرید ہو گئے۔ آپ کا مزار لاہور میں میکلوڈ روڈ پر واقع ہے ؛

عبدالحقؒ محدث دہلوی

(۹۵۶ھ/۱۵۵۱ء - ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) علامہ شیخ عبدالحقؒ۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سیف الدین بہت بزرگ اور صاحب علم تھے۔ اس لیے آپ کی تعلیم بھی انہی اصولوں کے مطابق ہوئی۔ علم کے بڑے شائق تھے۔ رات دن کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ ہندوستان میں تحصیلِ علم کے بعد ۹۹۶ھ میں حرمین کا رخ کیا اور تین چار سال وہاں رہ کر فنِ حدیث حاصل کیا اور اکثر تصانیف کیں۔

اشعۃ اللمعات" جو مشکوٰۃ شریف کی شرح ہے بہت اہم تصنیف ہے۔

اس کے علاوہ "تاریخ مدینہ" اور "مدارج النبوۃ" بھی ہیں۔ لیکن آپ کی معرکۃ آلارا تصنیف "اخبار الاخیار" ہے جس میں آپ نے ہندوستان کے اولیاء اور بزرگوں کے حالات لکھے ہیں۔

آپ شاعر بھی تھے۔ اور حنفی تخلص کرتے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس نے اس کتاب کی بہت تعریف کی۔ آپ کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں۔ جن سے اس زمانہ کے حالات پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔

۹۶ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب دفن ہوئے ؛

عبدالحمید اوّل

ایک عثمانی سلطان - پیدائش ۵ رجب ۱۱۳۷ھ/۲۰ مارچ ۱۷۲۵ء۔ ۸ ذی القعدہ ۱۱۸۷ھ/ ۲۱ جنوری ۱۷۷۴ء کو اپنے بھائی مصطفیٰ کا جانشین بنا۔

عبدالحمید نے بہت ہنگامی اوقات میں حکومت سنبھالی۔ جب وہ جانشین بنا تو روس سے جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ سلطنت مالی مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی۔ مختلف صوبوں میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی اور جنگ میں کوئی کامیابی نہ ہونے کے باعث قوم پہ پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ ان حالات کا قطعی تقاضا یہ تھا کہ جنگ بند کر دی جائے۔ اس زمانے میں اپنے حالات کے باعث روس بھی مجبور

تھا کہ صلح کا خیر مقدم کرے لیکن سلطان کسی چھوٹی بڑی کامیابی کے بغیر جنگ ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس لیے روس کی پیش کردہ صلح کی تجاویز کو رد کر دیا گیا۔ چنانچہ جنگ دوبارہ شروع ہوگئی۔ ترکی فوج کو کوزلوجہ کے مقام پر شکست ہوئی۔ چنانچہ وزیراعظم روسی سپہ سالار سے صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح صلحنامے پر دستخط ہونے پر جنگ ختم ہوگئی۔ لیکن شرائطِ صلح روس کی مرضی سے طے ہوئیں۔ اس طرح اس نے بہت سی مراعات اور توسیعات حاصل کرلیں۔

ترکی کے لیے اس صلحنامے کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ بعض دفعات کے الفاظ ایسے تھے جن کے ذریعے روس کو یہ دعوےٰ پیدا ہوگیا کہ وہ ان عیسائیوں کی حفاظت کر سکتا ہے جو ترکی رعایا میں مشرقی کلیسا سے تعلق رکھتے تھے تاہم اس کے عوض روس نے سلطان کے اس مبہم دعوے کو تسلیم کر لیا کہ بحیثیت خلیفہ اسے تمام مسلمانوں پر مذہبی اقتدار حاصل ہوگا۔ اس صلح کے بعد آسٹریا نے بھی سلطان کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور بوکوویتا کو ہتھیا لیا۔ جو اب تک ریاست مالدیویا کا ایک حصہ تھا

۱۷۷۴ء میں ایران نے کردستان پر چڑھائی کر دی اور نتیجتہً ایران و ترکی میں جنگ چھڑ گئی۔ ۱۷۷۵ء میں بغداد پر مملوکوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے ترکی افواج بھیجی گئیں۔ لیکن باب عالی ان کی حکومت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اگلے سال بصرہ ایران کے ہاتھ آ گیا لیکن ۱۷۷۹ء میں داخلی گڑبڑ کی وجہ سے ایران نے اسے خالی کر دیا۔ اور اس پر مملوک سلیمان آغا دوبارہ قابض ہو گیا۔ لہٰذا باب عالی کی طرف سے بھی اسے عراق کی تینوں ولایات دے دی گئیں۔

روس اور ترکی کے درمیان کوچوک قینارجہ کی صلح عارضی ثابت ہوئی اور جنگ ناگزیر دکھائی دینے لگی۔ لیکن فرانس کی مصالحانہ کوششوں سے ایک مجلس نے صلح نامے کی تمام دفعات کی تشریح اور دوبارہ تصدیق کی اور اس پر استنبول میں دستخط ہوئے۔

کیتھرین دوم نے ترکی کے خلاف جوزف دوم سے اتحاد کر لیا اور خان شاہین گرائے کے خلاف کریمیا میں بغاوت کی آگ لگا دی۔ اور اس بہانے فوج کو بھیج کر کریمیا پر قبضہ کر لیا۔ گویا اقدام عبدالحمید اول کے لیے نہایت اشتعال انگیز تھا لیکن اپنی سلطنت کی کمزوری کو دیکھ کر وہ اعلان جنگ نہ کر سکا۔

گو سلطان اگرچہ بہت امن پسند تھا لیکن جب کریمیا کو لوٹا دینے کی درخواست مسترد کر دی گئی تو اس کے صدر اعظم قوجہ یوسف پاشا کو روس اور آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا ہی پڑا۔ اس سلسلے میں سویڈن ترکی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ترکی بیڑے کا حملہ کیلبورون کی سمت میں ناکام رہا۔ اور روسیوں نے اوچاکوف کے قلعے کو گھیر لیا۔ ترکی فوج اسٹروی مہم کو زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ چنانچہ اسٹروی فوج کو دو شکستیں دینے کے بعد بنت پر حملہ آور ہو گئیں۔

دوسری طرف ترکی بیڑا اوچاکوف میں ناکام رہا۔ اور طویل مدافعت کے بعد یہ مقام روسیوں کے قبضے میں چلا گیا اور اس کے باشندے قتل کر دیے گئے۔

عبدالحمید اول کی صحت جنگی پریشانیوں کی وجہ سے پہلے ہی خراب ہو چکی تھی یہ خبر پڑھ کر اس پر بیماری کا اچانک حملہ ہوا اور وہ ۲۵ رجب ۱۲۰۳ھ/ ۷ اپریل ۱۷۸۹ء کو فوت ہو گیا۔

عبدالحمید اوّل خاصی بڑی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ تخت نشینی سے قبل اس کی زندگی شاہی محل کی خلوت میں بسر ہوئی تھی۔ گو اسے کامیاب اور باہمت نہیں کہہ سکتے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے جوش، اخلاق کریمانہ اور انسانی ہمدردی کی بنا پر ممتاز تھا۔ اس نے اپنے وزرائے اعظم کو اس زمانے کے لحاظ سے وسیع اختیارات دے رکھے تھے اور ان کے کام میں دخل نہیں دیتا تھا۔ اس کی کوشش یہ رہی کہ سلطنت کے اندرونی باغیانہ عناصر کے خلاف مرکز کو ہمیشہ مضبوط رکھا جائے۔

اس نے تربیت یافتہ افسروں کی تعلیم کے لیے مہندس خانۂ بحریۂ ہمایوں کے سکول کا افتتاح کیا۔ ابراہیم متفرقہ کے مطبع کو دوبارہ جاری کیا جو بند پڑا تھا متعدد رفاہی ادارے، کتب خانے، مدارس، لنگر خانے اور مساجد تعمیر کروائیں۔

عبدالحمید ثانی، غازی

چھتیسواں عثمانی سلطان۔ سلطان عبدالحمید کے تیس بیٹوں میں سے پانچواں بیٹا۔ پیدائش ۲۱ ستمبر ۱۸۴۲ء۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی سے بہت کم آمیز اور زود رنج تھا۔ نہایت ذہین ہونے کے باوجود اسے پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جوانی شوریدہ سری میں بسر کرنے کے بعد اس نے کفایت شعارانہ زندگی اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے اس کا عرف "ہنتی حمید" یعنی "کنجوس حمید" ہو گیا۔ حالانکہ وہ اس کا مستحق نہ تھا۔

عبدالحمید شروع ہی سے دیندار لوگوں کی صحبت میں رہنے کا شائق تھا نیز صوفیوں، رمالوں اور کرامات دکھانے والوں کی طرف بہت مائل تھا۔

یکم ستمبر ۱۸۷۶ء میں اپنے بھائی سلطان مراد خامس کا جانشین ہوا۔ جسے "نوجوان ترکوں" کی مدد سے معزول کر دیا گیا تھا۔ ان "نوجوان ترکوں" کا سرگروہ سلطان عبدالعزیز کا شہرہ آفاق سابق وزیر اعظم مدحت پاشا تھا جو معزول کر دیا گیا تھا۔

عبدالخالق غجدوانی

صوفی بزرگ۔ عارف ربّانی خطاب تھا۔ سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبندی سے فیض حاصل کیا تھا۔ خواجہ ابویوسف ہمدانی کے جو تھے خلیفہ تھے۔ آپ کے والدین ملاطیہ (مالٹا) سے ماوراءالنہر آئے اور غجدوان میں سکونت اختیار کی جو بخارا سے چھ سات کوس کے فاصلے پر ایک قصبہ تھا۔ یہیں آپ کی ولادت ہوئی۔ روایت ہے کہ خواجہ خضر علیہ السلام نے آپ کی والدہ کو آپ کی ولادت کی بشارت دی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کو والدہ نے بخارا کے مشہور عالم شیخ صدرالدین کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ ماوراءالنہر میں رہ کر آپ تمام تر ریاضت اور مجاہدے میں لگے رہے۔

آپ ذکر خفی کے طریقے پر کاربند رہے۔ لوگوں سے پوشیدہ رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ہوش دردم، نظر بر قدم، سفر در وطن اور خلوت در انجمن کی جو اصطلاحات سلسلہ نقشبندیہ میں قائم ہوئیں آپ ہی سے منسوب ہیں۔

بعد میں آپ اصفہان اور بخارا گئے۔ پھر عراق، خراسان و خوارزم میں ریاضت کی۔

عبدالرحمٰن اوّل (الداخل)

ایک اموی شہزادہ جس نے اندلس میں اموی خلافت قائم کی۔

عبدالرحمٰن اوّل معاویہ بن ہشام کا بیٹا تھا جب اس کے رشتہ داروں کو عباسی چن چن کر قتل کر رہے تھے تو عبدالرحمٰن جو اس وقت نوعمر لڑکا تھا، ۱۱۳ھ/ ۷۳۱ء

میں پیدا ہوا تھا، اپنی جان بچا کر خفیہ طور پر فلسطین پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں سے وہ اپنے آزاد کردہ غلام بدر کی معیت میں پہلے مصر اور پھر افریقہ چلا گیا۔ قیروان میں افریقہ کے والی عبدالرحمٰن بن حبیب کی معاندانہ روش نے اسے المغرب میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کچھ عرصہ تک وہ تاہرت کے علاقے میں رہا۔ بعد ازاں پہلے مکناسہ کے بربر قبیلے کے ہاں مہمان رہا۔ پھر اپنے خاندانی تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بحیرہ روم کے مراکشی ساحل کے ایک قبیلے نفزہ کے ہاں چلا گیا۔ کیونکہ اس کی ماں اسی قبیلے کی گرفتار شدہ عورت تھی۔ بربروں نے اس نوجوان شامی نوزوارد کے سیاسی منصوبوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ اس لئے اس نے اپنے موالی کی مدد سے ہسپانیہ میں جاکر طالع آزمائی کا فیصلہ کیا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ نے انتہائی تدبر سے کام لیتے ہوئے اُن تلخ رقابتوں سے فائدہ اٹھایا جن کی وجہ سے ان دونوں بنو قیس اور یمنی عرب جزیرہ نمائے آئی بیریا میں ایک دوسرے کے حریف بن گئے تھے۔ اسی طرح وہ بنو امیہ کے ان کثیر التعداد موالی کی تائید و حمایت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا جو بلج بن بشر کے ساتھ ہسپانیہ آئے تھے۔ اور جو شامی جنود کی ایک مستقل فوج بنا کر جنوبی اندلس کے ایک بڑے حصے پر چھائے ہوئے تھے۔ بدر نے جزیرہ نما میں عبدالرحمٰن کے داخل ہونے سے پہلے ہی زمین ہموار کر لی تھی۔

وہ یکم ربیع الاوّل ۱۳۸ھ / ۱۴ اگست ۷۵۵ء کو المنکب کے مقام پر جہاز سے اترا اور آتے ہی اندلس کا حکمرانِ اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اندلس کا والی یوسف بن عبدالرحمٰن جلد ہی اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوگیا۔ عبدالرحمٰن اشبیلیہ میں داخل ہوا۔ قرطبہ کے قریب یوسف الفہری کو شکست دی اور دارالسلطنت میں داخل ہوگیا، جہاں اس کے امیرِ اندلس ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

قرطبہ میں اموی امارت کے اس بانی کو کل ۳۳ سال حکمرانی کرنے کا موقع ملا اور اس مدت کا زیادہ حصہ اس نے دارالحکومت میں اپنی حیثیت کو مضبوط بنانے میں صرف کیا۔

اس کامیابی کی اطلاع مشرق میں پھیلی اور جلد ہی بنو امیہ کے حامیوں اور متوسلوں کی ایک رو اندلس کی طرف بہنے لگی۔ تاکہ مغرب میں اس خاندان کی بحالی میں ممد و معاون بنے جس کا اقتدار مشرق میں ساقط ہوگیا تھا۔

قرطبہ کے اس امیر کو بہت جلد بعض عظیم سیاسی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا سب سے پہلا کام اندلس کے سابق والی یوسف الفہری کو قطعی طور پر مطیع بنانا تھا۔ اسے ۷۵۸ء میں شکست دی اور وہ قتل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی حسب سابق بغاوت کی چنگاریاں اس نئی بادشاہت میں سلگنے لگیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن اوّل کو مختلف مقامات پر متعدد بغاوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

۲۵ ربیع الآخر ۱۷۲ھ / ۳۰ ستمبر ۷۸۸ء کو عبدالرحمٰن قرطبہ میں فوت ہوگیا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس سے کچھ کم تھی۔ قرطبہ کی سلطنت ابھی غیر محفوظ حالت میں تھی۔ تاہم اس نے چھوٹے پیمانے پر اس کے لیے اس قسم کا مکمل اور فوجی نظام مہیا کر دیا تھا جیسا کہ دمشق کی سابقہ خلافت میں قائم تھا۔ یہ نظام اس وقت تک برقرار رہا جب تک کہ اندلس کے آل مروان شامی روایات کے پابند رہے۔

بہرکیف عبدالرحمٰن الداخل کی کامیابی نے مشرق کو بہت متاثر کیا۔

عبدالرحمٰن بارکر

مشہور نومسلم مستشرق۔ ریاست واشنگٹن کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محکمۂ تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے بیٹے کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ ۱۹۵۱ء میں فلبرائٹ سکالرشپ پر بھارت آئے۔ یہاں آنے کا مقصد مختلف النسل باشندوں کی لسانی اور تہذیبی تاریخ و روایات پر تحقیق کرنا تھا۔ یہاں پانچ چھ سال گزرنے کے بعد واپس امریکا چلے گئے۔ وہاں سے کینیڈا آئے۔ یہاں مشہور مستشرق مسٹر سمتھ کی زیرِ نگرانی مختلف مذاہب پر کام کرتے رہے۔ ریڈ انڈین قبائل پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم و تدریس کے مختلف مراحل پر دس بارہ زبانیں سیکھنے کے مواقع ملے۔ انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، بلوچی، پشتو، براہوئی، سیامی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، سنسکرت اور جنوبی ہند کی چار پانچ بولیاں سیکھیں۔ ۱۹۵۹ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کی تحریک پر پاکستان آئے تاکہ اردو زبان پر جدید انداز میں تحقیق کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا جس کے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر صدر مقرر ہوئے۔ ان کو شروع ہی سے کسی سچے اور حقیقت پسند مذہب کی جستجو تھی۔ بالآخر پکتھال صاحب کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ اُن کے ہاتھ لگا۔ سورہ کوثر کے مطالعے نے دل کھینچ لیا۔ اور یوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جب ڈاکٹر بارکر واپس امریکا گئے تو ان کے غیر مسلم والد نے پوچھا "کیا تم اب بھی شراب پیتے ہو؟" ڈاکٹر بارکر نے جواب دیا "شراب تو اسلام میں حرام ہے"۔ اس پر ان کے والد صاحب نے اظہارِ خوشی کرتے ہوئے فرمایا "بیٹا، جو مذہب تمھیں شراب پینے سے منع کرتا ہے وہ یقیناً ایک اچھا مذہب ہوگا۔"

عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ

ابوعبداللہ (و ابومحمد و ابوعثمان) خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے۔ ان کی اور حضرت عائشہؓ کی والدہ ام رومان تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اصلی نام عبدالکعبہ (یا عبدالعزیٰ) تھا جسے ان کے قبولِ اسلام کے بعد حضرت اکرم صلعم نے عبدالرحمان سے بدل دیا۔

انہوں نے خاصی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا۔ چنانچہ غزوہ بدر میں انہوں نے مشرکین مکہ کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑی۔ غزوہ احد میں بھی وہ مشرکین مکہ کے ساتھ تھے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ صلح حدیبیہ کے موقع پر ایمان لائے اور مدینہ منورہ میں والد کے ساتھ رہنے لگے۔ اس کے بعد نبوت کے تمام معرکوں میں جانبازی اور بہادری کے جوہر دکھائے۔

جنگِ جمل کے موقع پر وہ اپنی ہمشیرہ حضرت عائشہؓ کی معیت میں تھے۔ بعد میں وہ عمرو بن العاص کے ساتھ بھی رہے جبکہ مؤخر الذکر نے ان کے بھائی محمد بن ابی بکر والیٔ مصر کے خلاف فوج کشی کی تھی لیکن عبدالرحمٰن اپنے بھائی کی زندگی نہ بچا سکے۔

عہدِ بنو امیہ میں انہوں نے حضرت امام حسینؓ بن علیؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کا ساتھ دیا جنہیں اہلِ مدینہ کے اس حزبِ اختلاف کا رئیس سمجھا جاتا تھا جس نے یزید بن معاویہ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

عبدالرحمٰن فطرۃً نہایت بہادر اور شجاع تھے۔ تیراندازی میں انہیں کمال حاصل تھا جس کا شاندار ثبوت جنگِ یمامہ میں نظر آتا ہے۔ جنگِ جمل میں وہ حضرت

عائشہؓ کی طرف تھے اور انکے بھائی محمد بن ابوبکرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔
بخاری کی ایک روایت کے مطابق عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے ۵۸ھ/۶۷۸ء میں مکہ کے نواح میں واقع حبیشی نامی ایک پہاڑی میں وفات پائی اور مکہ مکرمہ میں دفن ہوئے۔ بعض دوسری روایات میں ۵۳ھ/یا ۵۴ھ اور سنین دیئے ہوئے ہیں۔
آپ حضرت ابوبکرؓ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صحاح میں ان سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی مخالفت کی۔ ابن مسیّب سے روایت ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ان کے گھر میں چار نسلیں صحابیؓ تھیں یعنی ان کے دادا، والد، وہ خود اور ان کے بیٹے محمد ؛

عبدالرحمٰن الحکم

(۸۲۲ء تا ۸۵۲ء) - عبدالرحمٰن ثانی بن الحکم بن ہشام بن عبدالرحمان بن معاویہ - الداخل کا پرپوتا۔ جو ۲۵ ذوالحجہ ۲۰۶ھ/۲۱ مئی ۸۲۲ء کو اپنے باپ الحکم الاوّل کا جانشین بنا۔ یہ قرطبہ کا چوتھا اموی خلیفہ تھا۔
عبدالرحمٰن ثانی ۱۷۶ھ/۷۹۲ء میں طیطلہ میں پیدا ہوا۔ اور اس کے باپ نے اسے اپنا ولی عہد نامزد کر دیا۔ عبدالرحمٰن کے عہد کے آغاز میں الحکم الاوّل کے آہنی طرز حکومت کے خلاف ردعمل کے طور پر کچھ شورشیں رونما ہوئیں جنہیں آسانی سے فرو کر دیا گیا۔ لیوانت (شرق الاندلس) کے علاقے بتدریج تاج شاہی کے زیرنگیں لائے گئے۔ اور البیو کے ایک اہم شہر کی جگہ ایک نیا شہر مرسیہ بسایا گیا۔
عبدالرحمٰن ثانی کے عہد میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ پہلا یہ کہ طیطلہ اور قرطبہ کے عیسائی مصاربہ نے قوم پرستی کی دعوت سے متاثر ہو کر بغاوت کر دی۔ یہ آگ مذہبی انتہاپسندوں نے بھڑکائی تھی۔ عرب مورخین نے اس بغاوت کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک جدید لاطینی ماخذ سے یہ معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ قرطبہ کی حکومت کو بادلِ نخواستہ اس بغاوت کے خلاف سخت کارروائی کرنا پڑی کیونکہ مذکورہ مصاربہ اسلام کے متعلق بدزبانی سے کام لیا کرتے تھے۔ ان میں پادری اور عوام سب شامل تھے۔ انہی دنوں ایک نئی شورش برپا ہوگئی اور وہ یہ کہ عیسائیوں نے منصب شہادت حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی جرم کرنا شروع کر دیا۔ اس تحریک کو ایک مجلسِ مشاورت نے ختم کر دیا جو اشبیلیہ کے اسقفِ اعظم کی صدارت میں ہوئی تھی۔ سات سال کے بعد اس تحریک کے روح رواں پادری بولوجس نے اسے از سرِ نو شروع کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسے امیر محمد الدولہ کے حکم سے گرفتار کر کے اس کا سر قلم کر دیا گیا۔
۲۳۰ھ/۸۴۴ء میں اسلامی ہسپانیہ پر نارمنوں کی یورش نہایت شدید تھی۔ نارمنوں کے ایک جنگی بیڑے نے ملک کے اندر داخل ہو کر اشبیلیہ اور اردگرد کے سارے علاقے کو تاراج کر ڈالا۔ اس کا جواب بھی فوراً ہی دیا گیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد اشبیلیہ کا شہر ان بحری ڈاکوؤں کے پنجے سے چھڑا لیا گیا۔ اس کے بعد بحری فوج کو مضبوط کرنے کی طرف فوری توجہ دی گئی۔
عبدالرحمٰن ثانی کو ایک اعلیٰ منتظم، بانیٔ تعمیرات اور سرپرستِ علوم و فنون ہونے کے اعتبار سے نہایت شہرت اور نیک نامی حاصل ہے۔ اس نے اپنی مملکت کا نظم و نسق از سرِ نو عباسیوں کے طریق پر قائم کیا۔
۸۲۲ء میں مشہور موسیقار زریاب قرطبہ میں وارد ہوا جس سے شاہی دربار کی رونق دوبالا ہوگئی۔ عبدالرحمٰن ثانی کے عہد میں قرطبہ کے مالکی مکتب فقہ نے بہت ترقی کی اور متعدد علماء نے فقہ میں شہرت پائی۔ ان میں بربر عالم یحییٰ اللیثی بہت ممتاز تھا اور عبدالرحمٰن قاضیوں کے تقرر میں اسی کے مشوروں پر عمل کرتا تھا۔
امیر کے آخری ایام زندگی شاہی محل کی ان سازشوں کی وجہ سے بہت پریشانی میں گزرے جنہیں اس کے فتی نصر اور کنیز طروب کی طرف سے شہ مل رہی تھی۔
عبدالرحمان ثانی قرطبہ میں ۳ ربیع الثانی ۲۳۸ھ/۲۲ ستمبر ۸۵۲ء کو وفات پا گیا۔ اس کا عہدِ حکومت مجموعی حیثیت میں بہت شاندار اور کامیاب کہا جا سکتا ہے اور اموی ہسپانیہ کی تاریخ میں اس عہد کو اب وہی مقام دینا چاہیئے جس کا وہ مستحق ہے ؛

عبدالرحمٰن بن ربیعہ

صحابیٔ رسولؐ۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں آپ پر عہدہ قضا کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ایسا آئین حکومت مرتب کیا جو ایک بہترین معاشرے کی تشکیل کے لیے نہایت سودمند تھا۔ چنانچہ اس کے تحت انہوں نے نہایت احتیاط اور تدبر کے ساتھ حکومتی نظام چلایا۔ ذمہ دار عہدوں پر لوگوں کو مقرر کرنے کے سلسلے میں بھی بہت خیال کے ساتھ اقدامات کیے اور خاص طور پر قاضیوں کے انتخاب میں جس وسعت نظر اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اُسے بروئے کار لا کر مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر، فلسطین وغیرہ میں قاضیوں کا تقرر کیا۔ ان میں سے ایک عبدالرحمٰن بن ربیعہؓ بھی تھے ؛

عبدالرحمٰن بن سمرۃؓ

عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ بن حبیب بن عبدشمس بن عبد مناف بن قُصی ؛ ایک عرب سپہ سالار۔ ان کا سابق نام عبدالکعبہ تھا۔ اسلام لانے پر رسول کریمؐ نے عبدالرحمٰن نام رکھا۔
حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری برسوں میں سپہ سالاری کا عہدہ ملا [illegible] سجستان میں ربیع بن زیادہ کے جانشین کی حیثیت سے ملا۔ انہوں نے زرنج [illegible] داور کو فتح کیا اور والیٔ کرمان سے معاہدہ کر لیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد عبدالرحمٰن اس علاقے سے چلے گئے۔
جب امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن عامر کو حضرت حسن بن علیؓ کی خدمت میں بھیجا تو عبدالرحمٰن بھی ان کے ساتھ سفارت میں شریک تھے۔ عبداللہ بن عامر [illegible] و مشرقی خراسان اور سجستان میں عربی حکومت قائم کرنے کے لیے روانہ کیا [illegible] ۶۶۳ء میں عبدالرحمٰن سجستان پر قابض ہو گئے۔ اور چند ماہ کے محاصرے کے بعد انہوں نے کابل بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد زرنج اور غزنی کے علاقے زابلستان کی طرف توجہ کی۔ اس دوران میں کابل میں بغاوت رونما ہوگئی تھی لہٰذا وہ پلٹ آئے اور [illegible] کیا اور دوبارہ کابل کو مسخر کر لیا۔ بعد میں امیر معاویہؓ نے انہیں براہ راست خود کے ماتحت کر دیا لیکن زیاد کو بصرے کا والی مقرر کیا گیا تو ان کا منصب کسی اور کو مل گیا۔ کابل سے وہ چند اسیران جنگ اپنے ہمراہ لے گئے تھے جنہوں نے ان کے بصرے کے قصر میں کابلی طرز کی ایک مسجد بنائی تھی۔
ان کی وفات ۵۰ھ/۶۷۰ء میں بصرے میں ہوئی اور آئندہ صدی میں ان کی اولاد کو بہت اثر و اقتدار حاصل رہا۔

عبدالرحمٰن بن شبلؓ

نام عبدالرحمٰن۔ قبیلہ اوس۔ انصار کے نقیب تھے۔ فاضل صحابہؓ میں سے ہیں۔ رسول اللہ کی احادیث صحابہؓ کو سنایا کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ نے بذریعہ خط ان سے مطالبہ کیا کہ جتنی احادیث ان کو یاد ہوں وہ سب لوگوں کو سنادی جائیں چنانچہ انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے وہ سب احادیث بیان کر دیں جو انھیں یاد تھیں۔ موجودہ کتب احادیث میں کم از کم چودہ احادیث ان سے منسوب ہیں۔

عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز

فنِ مغازی کے ایک ماہر۔ امام زہری کے ایک شاگرد۔
مولانا شبلی نعمانی امام زہری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اعلم العلماً تھے۔ فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز بھی امام زہری کے شاگردوں میں سے ہیں، اور ان شاگردوں میں سے، جنہوں نے بالخصوص فنِ مغازی میں بڑا نام پیدا کیا اور اس فنِ شریف کے درس و تدریس میں اپنی عمریں صَرف کر دیں۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ

اصل نام عبد عمرو۔ اسلامی نام عبدالرحمٰن جو رسول اکرم صلعم نے رکھا۔ کنیت ابو محمد۔ ان کی والدہ بھی ان کے والد کی طرح بنو زہرہ سے تھیں۔ یہ دونوں چچازاد بھائی بہن تھے۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بن عبدعوف بن عبد بن حارث بن زہرہ بن کلاب۔ والدہ کا سلسلہ نسب یہ ہے الشفاء بنت عوف بن عبد۔ اس سے آگے وہی سلسلہ ہے جو عبدالرحمٰن کے والد عوف کا ہے۔ کلاب پہ (چھٹی پشت میں) وہ آنحضرت صلعم کی ددھیال سے مل جاتے ہیں اور اس رشتے سے وہ ان کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں۔

آنحضرت سے ان کا ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ وہ آپ کے ہم زلف تھے۔ لیکن قریش کے خاندانوں میں بنو زہرہ کثرتِ تعداد اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ممتاز نہ تھے۔ ان کو مناصبِ حرم میں کوئی منصب نہ مل سکا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کے والد عوف تجارت پیشہ تھے۔ ایک بار وہ حضرت عثمان غنیؓ کے والد عفان اور فاکہ بن مغیرہ کے ساتھ تجارت کے لیے یمن گئے۔ راستے میں بنو جذیمہ نے عوف اور فاکہ کو قتل کر دیا۔ عفان، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بچ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے والد کے قاتل کو وہیں قتل کر دیا۔

ابن سعد کے مطابق ان کی ولادت عام الفیل (وہ سال جب ابراہہ نے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ پر انہدامِ کعبہ کی نیت سے حملہ کیا تھا) کے دس برس بعد ہوئی۔ آنحضرتؐ سے دس یا تیرہ برس چھوٹے تھے اور حضرت عمرؓ کے تقریباً ہم سن تھے۔

بعثتِ نبوی کے وقت ان کی عمر ستائیس یا تیس سال تھی۔ ایک روایت کے مطابق وہ اپنی فطری سلامت روی اور پاکیزہ نفسی کے باعث ایامِ جاہلیت میں ہی شراب ترک کر چکے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دعوت پہ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اسلام کے ابتدائی عرصے کا واقعہ ہے۔ اسلام لانے والوں میں وہ تیرھویں شخص تھے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حبش اور مدینے کی ہجرتوں میں حصہ لیا۔ حبش کی ہجرت میں جو ۵ نبوی کو ہوئی تھی پہلے وہ پندرہ مہاجرین کے ساتھ روانہ ہوئے اور اپنے بچوں اور بیویوں کو چھوڑ کر تنہا گئے۔ حبش سے پلٹ کر وہ مکے آئے اور ۱۳ نبوی کو پھر مدینے کو ہجرت کی اور ابن اسحٰق کے مطابق وہ چند مہاجرین کے ساتھ سعد بن ربیع کے گھر میں اترے۔ یہ حارث بن خزرج کے قبیلے سے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا یہ قول نقل ہے کہ رسول اللہؐ نے میرے اور سعد بن ربیع کے درمیان مواخاۃ کا رشتہ قائم کیا۔ مواخاۃ کا مقصد مہاجرین کی اعانت تھی۔ عبدالرحمٰن کے اسلامی بھائی نے ان کی بھرپور اعانت کرنے کی کوشش کی لیکن عبدالرحمٰن کی بے نیاز اور غیور طبیعت نے شکریے کے ساتھ اعانت نامنظور کر دی اور خود کاروبار شروع کر دیا اور خود بقول ان کے جلد ہی یہ صورت ہو گئی کہ اگر پتھر بھی اٹھاتا تو یہ خیال ہوتا کہ اس کے نیچے سونا یا چاندی ہو گی۔ ایک دن ان کے مالِ تجارت کا قافلہ آیا تو غل مچ گیا۔ اس قافلے میں غلے اور خوراک سے لدے ہوئے سات سو اونٹ تھے۔

تجارت شروع کرنے کے چند ہی روز بعد عبدالرحمٰنؓ نے ایک انصار خاتون سے شادی کی۔ یہ بیوی غالباً سہلہ بنت عاصم تھیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تمام غزوات و مشاہد میں آنحضرتؐ کے ساتھ شرکت کی۔ غزوہ احد میں جب مسلمانوں کے پاؤں ایک بار اکھڑ گئے تو عبدالرحمٰنؓ ان چند صحابہ کے ساتھ تھے جو آنحضرت صلعم کے گرداگرد جمع تھے۔ اس روز انھوں نے ۲۱ زخم کھائے۔ پیر میں ایسا زخم لگا کہ عمر بھر لنگڑا کر چلتے رہے۔

شعبان ۶ھ میں ایک سریہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی امارت میں دومۃ الجندل روانہ ہوا۔ اس میں سات سو آدمی تھے۔ امارت کے علاوہ اس میں آنحضرتؐ نے ان کو ایک اعزاز یہ بخشا کہ ان کا عمامہ کھول ڈالا اور خود دستِ مبارک سے ان کے سر پہ سیاہ عمامہ باندھا۔ پیچھے شملہ چھوڑا اور ہاتھ میں عَلَم عنایت فرمایا۔
دومہ پہنچ کر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اسلام کی دعوت دی۔ قبیلۂ کلب کا سردار اصبغ بن عمرو جو نصرانی مذہب رکھتا تھا مشرف بہ اسلام ہو گیا اور اس کی قوم کے بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ فرمانِ نبوی کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن نے اصبغ کی صاحبزادی تماضر سے شادی کی اور رخصتی کرا کے مدینے ساتھ لائے۔ ابو سلمہ، مشہور راویٔ حدیث انہی کے بطن سے تھے۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت خالد بن ولید کو غزوۂ حدیبیہ میں صلح نامے کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ کو بنو جذیمہ میں اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجا۔

۱۱ھ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ حج کو نہ جا سکے۔ ایک قول کے مطابق اس سال حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو امیر الحج بنایا۔ ایک قول کے مطابق ۱۲ھ میں بھی حضرت عبدالرحمٰنؓ امیرِ حج تھے (گو اس میں اختلاف بھی ہے کہ اس سال امیرِ حج کون تھا) ۱۳ھ میں انتقال سے پیشتر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنانا چاہا تو حضرت عبدالرحمٰن سے بھی مشورہ لیا۔

۱۴ھ میں حضرت عمر فاروقؓ حج پہ نہ جا سکے چنانچہ اس سال بھی حضرت عبدالرحمٰن ہی کو امیرِ حج بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عثمانؓ کی طرح حضرت عبدالرحمٰن بھی مقرب سمجھے جاتے تھے۔ امیر المومنین سے لوگ کچھ پوچھنا چاہتے تو انہی دونوں میں سے ایک کو واسطہ بناتے تھے۔ اس زمانے میں جو مجلسِ شوریٰ قائم ہوئی حضرت عبدالرحمٰن اس کے مستقل اور سرگرم رکن تھے۔

۱۴ھ میں جب عراق پہ فوج کشی کا مسئلہ درپیش ہوا تو ایک عظیم الشان لشکر دار الخلافہ کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اس لشکر میں میمنہ کے افسر بنائے گئے لوگوں نے سپہ سالار کی حیثیت سے خود خلیفہ کو ساتھ چلنے پہ زور دیا۔ اس موقع پہ مجلس

شوریٰ کا جو اجلاس ہوا اس میں صرف حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی تھے جنہوں نے سختی کے ساتھ اس خیال کی مخالفت کی اور خلیفہ پر زور دیا کہ لشکر کی ذمہ داری خود ان پر یعنی حضرت عبدالرحمانؓ پر ڈال دی جائے۔ کیونکہ اگر لشکر کو شکست ہوئی تو یہ خود خلیفہ کی شکست نہ ہوگی۔ اور اگر خلیفہ میدان جنگ میں کام آ گئے تو مسلمانوں کی ترقی رک جائے گی۔ اس موقف نے تمام اکابر صحابہؓ کی آنکھیں کھول دیں۔ اور سب نے پر زور انداز میں اس کی تائید کی لیکن اتنے عظیم الشان لشکر کے شایان شان سپہ سالار کا انتخاب ایک مسئلہ بن کر سامنے آیا اور اس موقع پر بھی حضرت عبدالرحمٰن نے سعد بن مالکؓ کا نام تجویز کیا جس پر سب نے صاد کیا اور حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب کس قدر موزوں تھا۔

یرموک کی تیاریوں میں گو تمام انصار و مہاجرین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن ان میں سب سے آگے تھے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ میں انھوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ سپہ سالار بنیں لیکن اور صحابہؓ نے اس سے اختلاف کیا اور یہ ٹھہری کہ اور امدادی فوجیں بھیجی جائیں۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بھی جہاد کی نیت سے شام روانہ ہو گئے۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد جو معاہدہ تحریر ہوا اس میں شاہد کی حیثیت سے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ ۱۵ھ میں جابیہ کے مقام پر حضرت عمرؓ کی موجودگی میں لکھا گیا۔

اسی طرح اور بہت سے واقعات بھی درج ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں حضرت عمرؓ کا کتنا قرب حاصل تھا۔ جب بھی کسی کو کوئی بات حضرت عمرؓ تک پہنچانی ہوتی تو انہی کو وسیلہ بناتے اور حضرت عمرؓ بھی ان کے مشوروں پر اعتماد فرماتے تھے۔

۲۳ھ میں حضرت عمرؓ نے آخری حج کیا۔ اس سفر میں امہات المومنینؓ کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان کی حفاظت پر حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ مامور تھے۔ چند ہی روز بعد ۲۶ ذوالحجہ کو بدھ کے روز نمازِ فجر پڑھانے کے لیے حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اتنے میں حضرت مغیرہؓ کے پارسی غلام فیروز ابولولو نے حضرت عمرؓ پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا ہاتھ پکڑا اور انہیں اپنی جگہ کھڑا کر دیا۔

بعض قرائن و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے بعد خلافت کی ذمہ داری حضرت عبدالرحمٰن پر ڈالنا چاہتے تھے لیکن وہ راضی نہ ہوئے حضرت عمرؓ کو جن پانچ صحابہؓ نے قبر میں اتارا ان میں ایک حضرت عبدالرحمانؓ بھی تھے۔

حضرت عمرؓ کی تجہیز و تکفین کے بعد ارباب شوریٰ جب خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تو مشکل پیدا ہو گئی۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن نے اسے خوش اسلوبی سے طے کر دیا اور آخر میں حضرت عثمانؓ کے حق میں فیصلہ ہوا۔

۲۴ھ کو حضرت عثمانؓ حج کو نہ جا سکے تو اس سال بھی حضرت عبدالرحمانؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف کوفے، بصرے اور مصر میں سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ اس ساری فضا میں جہاں تک بن پڑا حضرت عبدالرحمٰن حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیتے رہے۔

آپؓ نے ۳۲ھ میں وفات پائی۔ ابن سعد کے مطابق ان کی عمر ۷۵ برس لیکن الاصابہ کے مطابق ۷۲ سال تھی۔ جنازے کی نماز وصیت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے پڑھائی اور البقیع میں دفن کیے گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اغنیائے صحابہ میں سے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا لیکن زراعت کا کام بھی وسیع پیمانے پر ہوتا تھا اور وسیع جائداد تھی۔ انہوں نے وافر دولت چھوڑی لیکن ان کی فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ کے واقعات بہت سی کتابوں میں مثالی حیثیت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے مکارم اخلاق میں تقویٰ، حبِ رسول، صدق و عفاف، فیاضی، اصابتِ رائے، ایثار، وفائے عہد، امانت، امر بالمعروف، رقتِ قلب، انکسار، عیادتِ مریض اور شجاعت نمایاں ابواب ہیں۔ اصابت رائے کا یہ کافی ثبوت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی بیعت کے وقت انھیں حکم بنایا گیا تھا۔

ایثار ایسا تھا کہ خلافت کے اعزاز کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ حالانکہ چھ ارباب شوریٰ میں سے حضرت سعدؓ نے ان کی نسبت اپنی رائے دی تھی۔ اس لحاظ سے ان کا پلہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے برابر ہو گیا تھا۔ اسی طرح ان کے دوسرے اوصاف حسنہ تھے۔ قومی و مذہبی ضرورتوں کے لیے گرانقدر رقمیں دیں۔ سورۃ براۃ کے نزول کے موقع پر چار ہزار درہم پیش کیے۔ دو بار چالیس چالیس ہزار درہم پیش کیے۔ جہاد کے لیے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ فراہم کیے۔ ایک دفعہ اپنی زمین کا ایک حصہ چالیس ہزار دینا میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کیا اور ساری رقم فقرا و اہلِ حاجت اور امہات المومنینؓ میں تقسیم کر دی۔ وفات کے وقت پچاس ہزار گھوڑے راہ خدا میں وقف کیے اور اصحاب بدر میں سے ہر ایک کے لیے چار چار سو دینار کی وصیت کی۔ یہ مجموعی طور پر چالیس ہزار دینار ہوئی۔ کیونکہ اس وقت سو اصحاب بدر بقید حیات تھے امہات المومنینؓ کے لیے ایک باغ کی وصیت کی جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ ہجرت کے وقت مکہ سے خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تھے اور بازار قینقاع میں [illegible] پیمانے پر کام شروع کیا تھا اور کاروبار اتنا چمکا کہ صحابہؓ کے غنی ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت عبدالرحمانؓ صحابہؓ میں بلند رتبے کے مالک تھے۔ حدیث کی رو سے عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور شیخین کی نظر میں بہت محترم تھے۔ ایک روایت سے [illegible] عبدالرحمانؓ ان بزرگوں میں سے تھے جو عہدِ نبوت میں فتویٰ دیتے تھے۔

ان کی اولاد ذکور بیس اور اولاد اناث آٹھ بیان کی گئی ہے۔

عبدالرحمٰن تنکو

(۸ فروری ۱۹۰۳ء [illegible] ملائشیا کے [illegible]
وزیر اعظم، اسلامی سیکرٹریٹ کے سابق سیکرٹری جنرل [illegible]

ریاست قدح کے دارالحکومت الورستار میں پیدا ہوئے۔ وہ سلطان [illegible] ساتویں اولاد ہیں۔ چار سال کی عمر میں انھیں [illegible] کے لیے اسکول بھیجا گیا۔ ازاں بعد انھیں گورنمنٹ انگلش سکول [illegible] میں داخل کر دیا گیا۔ آٹھ سال کی عمر میں ان کے والد نے ان کے بھائی [illegible] پاس بنکاک بھیج دیا۔ جو ان دنوں تھائی لینڈ کی فوج میں تھے۔ ایک سال کے [illegible] ان کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو وہ وطن چلے آئے۔ بارہ سال کی عمر میں وہ [illegible] سکول میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۱۹ء میں انھیں وظیفہ ملا۔ ازاں بعد انھوں نے [illegible] کالج کیمبرج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے انھوں نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ریاست قدح کے پہلے شہزادے تھے جنھوں نے کسی برطانوی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی۔

گریجولیشن کے بعد ملایا چلے آئے۔ مگر ان کے بڑے بھائی نے انھیں قانون کی تعلیم

حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ مگر پانچ سال وہاں گزارنے کے باوجود قانون کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۳۸ء میں دوبارہ انگلستان گئے۔ لیکن جنگِ عظیم کی بناء پر وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ اور ملایا واپس آ گئے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ جنوبی قدح میں شہری ڈسٹرکٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں سیاست میں حصہ لیا اور یونائیٹڈ ملایا نیشنل آرگنائزیشن کے صدر منتخب ہوئے۔ ملایا کی تحریکِ آزادی کی قیادت کی اور بالآخر ۳۱ اگست ۱۹۵۷ء کو ملایا آزاد ہوا۔ وہ ملایا کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

۶ جون ۱۹۶۰ء کو کیمبرج یونیورسٹی نے انھیں قانون میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ انھوں نے اسی نوع کی ڈگری ملایا یونیورسٹی، سڈنی یونیورسٹی، آرانیتا یونیورسٹی (ملیائن)، سائیگون یونیورسٹی (۱۹۶۱ء)، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۶۲ء) اور سیئول یونیورسٹی کوریا (۱۹۶۵ء) سے حاصل کی۔ انھوں نے بہت سے بیرونی ممالک کا دورہ کیا اور اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو اُن کی کوششوں سے ملائیشیا کا قیام عمل میں آیا۔ اپریل ۱۹۶۴ء میں ملک میں انتخابات منعقد ہوئے۔ جس میں ان کی پارٹی نے ۱۰۴ میں سے ۸۹ نشستیں جیت لیں۔ مارچ ۱۹۷۰ء میں انھیں اسلامی سیکرٹریٹ کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اور ان کی جگہ تنکو عبدالرزاق وزیر اعظم بنے۔ حکومت پاکستان نے تنکو عبدالرحمٰن کو ان کی اعلیٰ اسلامی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۲ء میں گراں قدر خطاب و انعام سے نوازا۔

عبدالرحمٰن ثالث

عبدالرحمٰن ثالث بن محمد بن عبداللہ۔ ہسپانیہ کے بنو امیہ میں سے سب سے بڑا حکمران۔ اندلس کا خلیفۂ اوّل۔

امیر عبداللہ کا یہ جانشین تخت نشینی کے وقت صرف تیئس سال کا تھا اس کے دادا نے اس کی اعلیٰ صفات کی وجہ سے اسے جواں سال ہونے کے باوجود اپنا ولی عہد منتخب کر لیا تھا۔

ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ کا کوئی عہد اتنا درخشاں اور شاندار نہیں تھا جتنا کہ اس کا عہد تھا۔ اس نے نصف صدی یعنی ۳۰۰ھ/۹۱۲ء سے ۳۵۰ھ/۹۶۱ء تک حکومت کی۔ اپنے طویل عہد حکومت سے عبدالرحمٰن ثالث کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ اپنی حکمت عملی کو ایک تسلسل سے جاری رکھ سکا اور اس نے اندلس کے شورش پسند مراکز کو یکے بعد دیگرے تابع فرمان بنا لیا۔

عبدالرحمٰن ثالث کے عہد کا پہلا دور داخلی امن و استحکام کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت قرطبہ میں سیاسی وحدت پیدا ہوئی۔ امیر عبداللہ کے عہد میں یہ وحدت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ دوسرا طویل دور زیادہ تر خارجہ حکمت عملی کی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔

عبدالرحمٰن ثالث نے تخت نشین ہوتے ہی جنوبی اندلس کی بغاوت کا قلع قمع کرنے اور اس کے سرغنہ عمر بن حفصون کی جارحانہ طاقت کو ختم کرنے کے لیے اپنی طاقت جمع کرنا شروع کر دی۔ ۳۰۵ھ/۹۱۷ء تک وہ اندلس کے باغیوں کو منتشر کرتا رہا اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف علاقوں میں عرب امراء پر حملے کیے یہاں تک کہ وہ مطیع بننے پر مجبور ہو گئے۔ چار سال بعد وہ اپنے جنگی اقدامات میں کامیابی کے باعث اس قابل ہو گیا تھا کہ ملکی سرحدوں کو کئی سال تک کے لیے محفوظ کر لے۔ لیکن جلد ہی اسے ایک طاقت ور دشمن (لیون کے نئے بادشاہ) رامیرو ثانی سے مقابلہ آن پڑا۔ جس نے تخت نشین ہوتے ہی مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدامات شروع کر دیے تھے۔ متعدد لڑائیوں کے بعد وہ ۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں وہ قرطبہ کے امیر کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو گیا۔

عبدالرحمان ثالث ۲۲ رمضان ۳۵۰ھ/۱۵ اکتوبر ۹۶۱ء کو جب اس کے اقتدار اور اس کی شہرت کا ستارہ نصف النہار پر تھا فوت ہو گیا۔ اپنے عہدِ حکومت کے آخری ایام میں وہ فی الواقع ایک مطلق العنان بادشاہ کی سی زندگی بسر کرتا رہا اور اس نے اپنی سکونت قرطبہ کے دروازوں پر مدینۃ الزہرہ کے شاہی محل میں اختیار کر لی تھی جسے بجائے خود اس نے ایک شہر بنا دیا تھا۔ اس نے اندلس کی متزلزل مملکت کو ایک پُر امن، خوشحال اور نہایت با اثر ریاست بنانے کے لیے کامیاب تدابیر اختیار کیں۔ اس کے وقت سے قرطبہ دنیائے اسلام کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا اور مرکزی یورپ کے تمام مراکزِ حکومت سے بازی لے گیا۔ بحیرہ روم کے ملکوں میں اسے اس قدر شہرت و عزت حاصل تھی کہ اس کا مقابلہ قسطنطنیہ سے کیا جا سکتا ہے۔

عبدالرحمٰن پانی پتی

مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۶ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد قاری محمدی انصاری سے حاصل کی اور پھر دہلی آئے تو مولانا سید محمد دہلوی، مولانا حاجی قاسم، مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی سے علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔ دورہ حدیث حضرت مولانا شاہ اسحٰق دہلوی سے پڑھا۔ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا قاری امام الدین امروہوی سے قراۃ و تجوید اور سلوک کی تعلیم حاصل کی۔

علوم اسلامیہ سے فراغت کے بعد حضرت شاہ اسحٰق کے حکم سے ریاست باندھ میں سولہ برس قیام کیا۔ ۱۲۶۰ھ میں حج کی سعادت حاصل کی۔ ۱۲۷۳ھ میں پانی پت تشریف لے آئے اور آخر عمر تک یہیں قیام فرمایا۔ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں ۹۰ برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور پانی پت میں دفن ہوئے۔

آپ نے ۵۶ برس علوم اسلامیہ کی تدریس کی۔ بے شمار افراد نے استفادہ کیا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے طریقے کے مطابق درس بھی دیتے تھے۔ کثرت مشاغل کے باوجود چند کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ تحفہ نذیریہ، محمد الصادق تلفظ الضاد، کشف الحجاب۔

آپ کے شاگرد رشید، مولانا الطاف حسین حالی "تذکرہ رحمانیہ" میں لکھتے ہیں۔ ان کی تمام عمر کتب درسیہ کی تدریس میں گزری تھی۔ ایک ایک کتاب کو بیس، بیس تیس تیس دفعہ اول سے آخر تک پڑھایا۔ اس سبب سے تمام کتابیں ایسی منجھ گئی تھیں۔ مشکل سے مشکل کتاب بلا تردد اور بغیر مطالعہ کے نہایت عمدگی سے پڑھاتے تھے۔ جامع سنہ کو جس محدثانہ احتیاط اور ادب و تعظیم کے ساتھ وہ پڑھاتے تھے اس کی نظیر کہیں دیکھی نہیں گئی۔

عبدالرحمٰن خامس

عبدالرحمٰن الخامس بن ہشام بن عبدالجبار۔ اندلس کے آخری اموی خلفاء میں سے ایک۔

۶ رمضان ۴۱۴ھ/۲ دسمبر ۱۰۲۳ء کو قرطبہ میں اس کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ اس نے المستظہر باللہ کا اعزازی لقب اختیار کیا۔ اس وقت وہ بمشکل سن بلوغ کو پہنچا تھا۔ لیکن اس میں ادبی صلاحیتیں موجود تھیں۔

اس نے اپنے گرد و پیش ایسے مشیر جمع کر لیے جنہیں دار السلطنت کے شرفاء میں سے منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن وہ فقط سینتالیس روز برسر اقتدار رہا۔ قرطبہ کے

ایک ہجوم نے بلوہ کر کے اسے معزول کر دیا اور اس کی جگہ محمد بن ثالث مستکفی کو خلیفہ بنا دیا۔ اس کے جانشین محمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عبد الرحمان خامس کو قتل کروا دیا۔

عبدالرحمٰن مکّی

مولانا قاری عبدالرحمٰن مکی ۱۲۶۸ھ میں قصبہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ سن شعور میں قدم رکھا ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ والدین اور بھائیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ چلے گئے وہیں پر ابتدائی کتب اپنے برادر اکبر مولانا قاری عبداللہ مکی سے پڑھیں۔ بقیہ کتابیں قاری ابراہیم سعد مصری اور مبلغ اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے پڑھیں۔ تکمیل کے بعد مولانا کیرانوی کے حکم سے ہندوستان آ گئے اور علم قرأت و تجوید کا احیا فرمایا۔ شروع میں مدرسہ احیا العلوم الٰہ آباد میں اور پھر مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں تدریس فرمائی اور قرأ کی ایک پوری جماعت تیار کی۔ اعلیٰ حضرت مجدد گولڑوی سے بیعت طریقت رکھتے تھے۔ ہمیشہ اس نسبت پر فخر کرتے۔

آپ کی کتاب "فوائد مکیہ" نے لازوال شہرت پائی ہے۔ برصغیر کی شاید ہی کوئی ایسی درس گاہ ہو جس کے نصاب میں یہ کتاب شامل نہ ہو۔ پچاس برس میں اس کتاب کی چھ سے زیادہ شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ ۶ جمادی الاوّل ۱۳۵۹ھ کو انتقال فرمایا۔ محبت گنج لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

عبدالرسول قصوری

اہل سنت والجماعت کے ایک عالم اور روحانی بزرگ۔ ۱۲۳۵ھ میں قصور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام غلام محی الدین قصوری تھا۔

مولانا عبدالرسول کی پیدائش سے ایک سال قبل ان کے والد نے اپنی تصنیف تحفۂ رسولیہ میں ان کی پیدائش کی بشارت دی تھی۔ اور اس میں سن پیدائش، نام کنیت معمولات زندگی حتیٰ کہ سال وفات تک ایک طویل نظم میں لکھ دیئے۔

مولانا عبدالرسول نے ابتدائی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔

قرآن و تجوید کے اصول و قوانین کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ علوم ظاہری اپنے والد بزرگوار کے مدرسے میں پڑھے۔ آپ ہی سے خلافت و اجازت بیعت سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ حاصل کی۔

"حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" کے مؤلف نے لکھا کہ آپ کی جبلت اخلاق حمیدہ پر تھی۔ اپنی تعریف سے ناخوش ہوتے۔ کتب منقولہ پر اتنا عبور تھا کہ طلبہ کو دور بیٹھے پڑھاتے رہتے اور ایک لفظ بھی غلط نہ ہوتا۔ عاجزوں اور مسکینوں کی امداد فرماتے۔ صاحبزادہ عبدالرسول کو لوگوں نے بتایا کہ لاہور اور اس کے نواح کے غیر مقلد آپ کو گالیاں دیتے ہیں۔ انہوں نے سن کر کہا کہ الحمد للہ ان کا گالیاں دینا اس بات کی علامت ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں شامل کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی زبانیں میرے خلاف کھلتی ہیں۔ ان لوگوں کی زبانیں اکثر اہل اللہ کے خلاف ہی وا ہوتی ہیں۔ میں ان لوگوں کا ممنون ہوں کہ مجھے سلسلۂ اہل اللہ میں مسلک سمجھنے لگے ہیں۔

عربی اور فارسی زبان میں انھیں کمال درجہ کی مہارت حاصل تھی اور نہایت پختہ اشعار کہا کرتے تھے۔ ۱۲۹۴ھ میں وفات پائی۔

عبدالستّار خان نیازی

عالم دین، تحریک پاکستان کے صف اول کے قائد مولانا عبدالستار خان نیازی اکتوبر ۱۹۱۵ء میں بمقام اٹک پنیالہ (ضلع میانوالی) میں پیدا ہوئے۔ علامہ نیازی نے ۱۹۳۳ء میں عیسیٰ خیل سے میٹرک پاس کیا اور اسی سال لاہور آئے۔ اور علامہ اقبال کے جاری کردہ اشاعت اسلام کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ نے قرآن، حدیث، فقہ، سیرت نبویؐ، تاریخ، مذاہب کے تقابلی مطالعے، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی تحریکوں پر مشتمل دو سالہ نصاب کی تکمیل کر کے شاعر مشرق سے سند حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج سے بی اے اور ۱۹۴۰ء میں ایم اے پاس کیا۔ بعد ازاں کئی سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے انگریزوں کے خلاف "راست اقدام" کا فیصلہ کیا تو آپ کالج سے مستعفی ہو کر تحریک پاکستان کے لیے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اگرچہ مولانا صاحب طالب علمی کے زمانے ہی سے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیتے رہے تھے۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں ضلع میانوالی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں میانوالی سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء میں بھی دوسری بار صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں قائدانہ کردار ادا کیا، گرفتار ہوئے۔ خصوصی فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی۔ مولانا نیازی سات دن اور سات راتیں پھانسی کی کوٹھڑی میں رہے۔ ۱۴ مئی کو آپ کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ اور پھر مئی ۱۹۵۵ء میں آپ کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں بھی تحریک ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ آج کل جمعیت علمائے پاکستان کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ پاکستان سے باہر غیر ممالک میں کئی تبلیغی دوروں پر جا چکے ہیں۔

عبدالعزیز ابن موسیٰ

عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر۔ اندلس کے مشہور فاتح موسیٰ بن نصیر کا بیٹا اور اپنے باپ کے شام روانہ ہونے کے بعد اندلس کا پہلا والی۔

موسیٰ نے جاتے وقت اسے نصیحت کی تھی کہ وہ فتوحات کے سلسلے کو جاری رکھے اور مفتوحہ علاقوں میں امن و آشتی قائم کرے۔ بعض تذکروں میں ہے کہ موجودہ پرتگال کا ایک حصہ نیز بنبلونہ اور ناربون کے درمیانی علاقے کوہستانی علاقے اس کے عہد حکومت میں فتح ہوئے۔ مالقہ اور البیرہ کو اس نے خود فتح کیا۔ اور تدمیر مرسیہ کے علاقے کو فتح کیا۔ جہاں گوتھ نسل کے ایک سردار سے وہ معاہدہ صلح طے کیا جس کا عربی متن ابھی تک محفوظ ہے۔

عبدالعزیز نے عرب گوتھوں کے آخری بادشاہ راڈرک کی بیوہ ایجیلونا سے شادی کر لی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام ام عاصم رکھا تھا۔ یہ شہزادی اپنے شوہر پر اس قدر چھا گئی کہ عبدالعزیز کے ہم وطن اس سے بدظن ہو گئے۔ اور اس پر اختیارات کے ناجائز استعمال کا الزام لگانے لگے۔ وہ مستقلاً اشبیلیہ میں رہنے لگا تھا اور یہیں رجب ۹۷ھ / مارچ ۷۱۶ء کے آغاز میں ایک شخص زیاد بن عذرۃ البلوی نے اسے قتل کر دیا۔ اس کا ماموں زاد بھائی ایوب بن حبیب اللخمی اس کا جانشین ہوا۔

عبدالعزیز باسندی

موضع باسند علاقہ صغانیاں کا رہنے والا ایک جھوٹا مدعیٔ نبوت۔ اس نے ۳۲۲ھ میں دعویٰ نبوت کرکے ایک پہاڑی مقام پر اپنے مکر وفریب کا جال بچھایا۔ یہ شخص ایک بڑا شعبدہ باز تھا۔ پانی کے حوض میں ہاتھ ڈال کر واپس باہر نکالتا تو مٹھی سرخ دیناروں سے بھری ہوتی تھی۔ اس قسم کی شعبدہ بازیوں اور نظر بندیوں نے ہزارہا مایوس و متزلزل لوگوں کے ایمان کو متلاطم کر دیا۔ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی اور وہ اس سے اظہار عقیدت میں شدت اختیار کرنے لگے۔

باسندی علمائے حق نے جب یہ صورت حال دیکھی اور لوگوں کو گمراہی کے دام میں الجھتے دیکھا تو ان لوگوں میں سے کہ جو عبدالعزیز باسندی کے معتقد ہو چکے تھے، صحیح الدماغ اور عقل مند لوگوں کو اصل بات سے آگاہ کیا اور انہیں ہدایت کی راہ دکھائی۔ ان میں جو لوگ بات کو سمجھ گئے وہ اس گرداب سے نکل گئے، لیکن باقی کے لوگ ان علماء کو برا بھلا کہنے لگے۔

باسندی کی دعوت نے اتنا زور پکڑا کہ لوگ بے تحاشا اس کے تابع ہدایت ہوتے چلے گئے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باسندی نے ان لوگوں کے خلاف دست انتقام بڑھانا شروع کر دیا جو اس کی جھوٹی نبوت کے خلاف تھے۔ ہزارہا صحیح العقیدہ مسلمان اس کے ظلم کا نشانہ بن کر زندگی سے محروم ہو گئے۔

جب حکومت کو اس کی کارروائیوں اور اس کی بڑھتی ہوئی جمعیت سے خطرہ لاحق ہوا تو وہاں کے حاکم ابوعلی بن محمد بن مظفر نے اس کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا۔ باسندی ایک بلند پہاڑ پر چڑھ گیا اور مسلمانوں کے لشکر نے اس پہاڑ کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ دن بعد جب باسندی کا سامان رسد ختم ہونے لگا تو اس کے ساتھ کے لوگوں میں ابتری پھیلنے لگی۔ آخر مسلمان پہاڑ پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور منکروں اور مرتدوں کو ہزارہا کی تعداد میں پیوند خاک کر دیا۔ خود باسندی کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے لشکر کے سپہ سالار نے اس کا سر کاٹ کر ابوعلی کے پاس بھیج دیا۔

باسندی کہا کرتا تھا کہ میں مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں آؤں گا۔ وہ لوگ جو اسلام کے مرتد ہو کر اس جھوٹے شعبدہ باز کے ساتھ ہو گئے۔ مدتوں تک شارع اسلام سے علیحدہ رہ کر حیران و سرگشتہ رہے۔ آخر آہستہ آہستہ اسلام میں مدغم ہو گئے اور یہ فرقہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو گیا۔

عبدالعزیز پرہاروی

علامہ حافظ عبدالعزیز بن محمد بن حامد تقریباً ۱۲۰۹ھ میں ایک غیر معروف بستی پرہار نزد کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے قرآن حکیم حفظ کیا۔ بقیہ علوم و فنون حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کے خلیفہ حضرت حافظ جمال ملتانی سے حاصل کیے۔ علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ روزگار تھے۔ علما و فقرا سے بے حد محبت و الفت کرتے۔ مطالعہ میں بڑا انہماک تھا۔ رشد و تدریس کے سلسلہ کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا ذوق کامل بھی رکھتے تھے۔ نبراس شرح شرح عقائد، الصمصام، کوثر النبی، السر المکتوم ما اخفاہ المتقدمون، الناہیہ عن ذم معاویہ، نعم الوجیز، مرام الکلام فی عقائد الاسلام، لوح محفوظ سر السماء، زمرد اخضر، یاقوت احمر، اکسیر وغیرہ آپ کی کتابیں ہیں۔ علوم دینیہ کی تدریس، بیعت و ارشاد اور طب کا کام بیک وقت کرتے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور حیرت یہ ہے کہ عمر صرف تیس برس تھی۔ ۱۲۳۹ھ میں انتقال فرمایا۔

عبدالعزیز سلطان

بتیسواں عثمانی سلطان۔ سلطان محمود ثانی کا تیسرا بیٹا۔ ۹ر فروری ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوا اور اپنے بھائی عبدالمجید کا جانشین بنا۔

وہ ۱۸۶۱ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد حکومت کی یادگار وہ شورشیں اور بغاوتیں ہیں جو بلقان کے صوبوں میں برپا ہوئیں اور جن کی وجہ سے بڑی طاقتوں نے مداخلت کی۔

۱۸۷۰ء سے استنبول میں فرانس اور انگلستان کی جگہ روس کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ترکی کے صدر اعظم محمود ندیم پاشا کو اکثر اوقات روس کے سفیر کی رائے کے مطابق کام کرنا پڑا۔ روس کی کوشش یہ بھی تھی کہ عثمانی رعایا مثلاً سلاویوں، البانیوں، یہاں تک کہ عربوں اور مصریوں میں بھی بے چینی پیدا کرے

اس ساری داخلی بحرانی صورت حال کے باوجود اصلاحات کی حکمت عملی ترک نہیں کی گئی۔ چنانچہ صوبائی نظم و نسق میں تبدیلیاں کی گئیں۔ قانون ولایات، فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا۔ ادارۂ اوقاف میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ سلطنت کے انتظامی امور کے لیے فرانس کے مشورے پر ایک مجلس اور دوسری عدالتی امور سے متعلق مجلس قائم کی۔ تعلیم کا انتظام بھی فرانسیسی طرز پر ہوا۔ ایک یونیورسٹی بھی قائم کی گئی۔ تمام فوج اور خصوصاً بحریہ کو دوبارہ منظم کیا گیا۔

لیکن آخر حکومت کو خود احساس ہو گیا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتی چنانچہ اس نے اپنے قرض پر سود کی ادائی نصف کر کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر مختلف حصوں میں بغاوتوں اور شورشوں کے باعث بھی قانون کا نفاذ مشکل ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان کے خلاف عوام میں ناراضی پھیل گئی اور بالآخر ۳۰ر مارچ ۱۸۷۶ء کو اسے معزول کر دیا گیا۔ چند روز بعد اس نے خودکشی کر لی (یا اسے قتل کر دیا گیا)۔

عبدالعلیم صدیقی قادری

سلسلہ قادریہ کے ایک مفکر، مقرر، ادیب، عالم اور مبلغ اسلام۔

۱۵ر رمضان ۱۳۱۰ھ/ ۳ر اپریل ۱۸۹۲ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالحکیم صدیقی تھا جو درویش منش عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ جوش تخلص تھا۔

مولانا عبدالعلیم نے سولہ سال کی عمر میں جامعہ اسلامیہ قومیہ میرٹھ سے درس نظامی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں بی اے پاس کر لیا۔ اور پھر اسلامی تبلیغ کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اس کے بعد بریلی پہنچے اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے قادری سلسلہ میں بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

انگریزی میں بہت روانی سے تقریر کرتے تھے۔ لاہور میں اکثر و بیشتر دربار حضرت داتا گنج بخش پر حاضری دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مدرسہ نعمانیہ اور حزب الاحناف کے اجلاس میں شرکت کیا کرتے تھے۔

مولانا نے چالیس سال تک افریقہ، امریکہ، انگلینڈ، انڈونیشیا، سنگاپور ملایا اور کئی دیگر ممالک میں اپنے محدود وسائل کے باوجود اسلام کا پیغام پہنچایا۔ اس کے نتیجے میں پچاس ہزار سے زائد غیر مسلموں نے حلقۂ اسلام میں شمولیت اختیار کی۔ انہوں نے مختلف ممالک کے تبلیغی دورے کیے۔ مذاہب عالم پر کانفرنسیں منعقد کیں تبلیغی سوسائٹیاں، لائبریریاں، کالج اور مساجد قائم کیں۔ ۱۹۵۱ء میں پوری دنیا کا طویل دورہ کیا جس سے مختلف ممالک کی کئی بااثر اور صاحب علم شخصیات

نے تاثر قبول کیا۔

ان کی کئی تصانیف ہیں جن میں 'ذکرِ حبیب' کتابِ تصوّف، بہارِ شباب اور کئی دوسری کتابیں شامل ہیں۔

۲۲ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ/ ۲۲ اگست ۱۹۵۱ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

آپ کے صاحبزادوں میں بین الاقوامی شہرت کے مالک مولانا شاہ احمد نورانی ہیں جو اس وقت پاکستان کی معروف سیاسی و مذہبی جماعت "جمعیت علما پاکستان" کے مرکزی صدر ہیں۔

عبدالغفور ہزاروی

شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی بن مولانا عبدالحمید ۹ ذوالحجہ ۱۳۳۷ھ/ یکم اپریل ۱۹۱۵ء بروز جمعہ موضع چنبہ پنڈ ضلع ہزارہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جدِ امجد حضرت مولانا محمد عالم ہزاروی نے اپنے مرشدِ طریقت حضرت عبدالغفور اخوند سوات کی مناسبت سے عبدالغفور نام رکھا۔

ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی۔ پھر مولانا محب النبی، مولانا احمد الدین، مولانا یار محمد بندیالوی، مولانا قطب الدین غور غشتوی، مولانا عبدالحق غور غشتوی اور مولانا مشتاق احمد کانپوری سے علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔ دورہ حدیث بریلی میں پڑھا۔ فراغت کے بعد موضع بچار ضلع فیصل آباد اور مدرسہ خدام الصوفیہ گجرات میں تدریس کی ۱۹۳۵ء میں وزیر آباد آئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ جامعہ نظامیہ غوثیہ کے نام سے ایک دینی درس گاہ قائم کی اور آخر وقت تک علوم دینیہ کی تدریس کرتے رہے۔ اور ساتھ ہی وزیر آباد میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ہر سال تعطیلات میں دورہ قرآن پڑھاتے جس میں پورے ملک سے سینکڑوں طلبہ شریک ہوتے آپ بڑے بارعب وجاہت عالم اور بے مثل خطیب تھے۔

مولانا ظفر علی خان کے ساتھ قومی سیاست میں حصہ لیا۔ مجلس اتحاد ملت وزیر آباد کے صدر رہے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے اور قیام پاکستان تک اس تحریک میں پیش پیش رہے۔ مولانا ظفر علی خان نے آپ کے مشورہ سے مجلس اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔ ۱۹۴۰ء میں منٹو پارک لاہور میں مسلم لیگ کے جس اجلاس میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی۔ اس میں مولانا ظفر علی خان کے ہمراہ آپ بھی موجود تھے۔ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم آپ کی دعوت پر وزیر آباد آئے اور ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا۔ ۱۹۴۶ء میں گورنر پنجاب مسٹر ڈگلس نے پنجاب میں مسلم لیگ کے ارکان کو باغی قرار دیا اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا تو ضلع گوجرانوالہ میں سب سے پہلے گرفتاری کی سعادت آپ کو نصیب ہوئی۔ اسی طرح حضرت خواجہ غلام محی الدین گولڑوی کے حکم سے ۱۹۴۶ء میں ہونے والی آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس میں شرکت کی اور مطالبہ پاکستان کی حمایت میں تقریر کی۔

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آبادکاری میں بھرپور حصہ لیا اور لاکھوں روپے جمع کر کے مہاجرین میں تقسیم کیے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ملتان میں جمعیۃ علما پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو آپ کو مرکزی نائب صدر مقرر کیا گیا اور بعد میں صدر منتخب کیا گیا۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ گرفتار ہوئے اور چھ ماہ تک راولپنڈی جیل میں رہے۔ ۸ شعبان ۱۳۹۰ھ/ ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ایک حادثے میں انتقال فرمایا۔ دوسرے روز لاکھوں افراد جن میں علماء و مشائخ بھی شامل تھے۔ شریکِ جنازہ ہوئے۔ حضرت مولانا محب النبی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور وزیر آباد میں دفن کیے گئے۔

عبدالقادر جیلانی

سلسلۂ قادریہ کے بانی۔ حنبلی عالم اور واعظ۔ ان کا شمار اولیائے کبار اور صوفیائے عظام میں ہوتا ہے۔ ایک جگہ ان کا اسمِ گرامی محی الدین ابو محمد بن ابی صالح (موسیٰ) جنگی دوست (بن عبداللہ) درج ہے۔ لیکن الذہبی نے ان کا نام عبدالقادر بن ابی صالح عبداللہ بن جنگی دوست لکھا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ان کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسینؓ سے جا ملتا ہے۔ دیباچۂ فتوح میں انہیں نہ صرف حسنی بلکہ حسینی بھی لکھا گیا ہے۔

ان کی پیدائش ۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء - ۱۰۷۸ء میں اور وفات ۱۰ ربیع الآخر ۵۶۱ھ/ ۱۱ اپریل ۱۱۶۶ء کو ہوئی۔

ان کے حالاتِ زندگی پر لکھنے والے ان کے عقیدت مند مصنفین انہیں اسلام کا سب سے بڑا ولی خیال کرتے ہیں۔ ان لکھنے والوں کے بیانات تاریخی ہونے سے زیادہ اخلاقی اور تبلیغی نوعیت کے ہیں۔ ابن تغری بردی نے اس کے مولد کا نام جیل لکھا ہے جو واسط اور بغداد کے درمیان ایک گاؤں ہے لیکن باقی سب مآخذ اس پر متفق ہیں کہ شیخ عبدالقادرؒ عجمی الاصل اور بحیرہ خزر کے جنوبی صوبے جیلان کے ایک مقام نیف کے رہنے والے تھے۔ وہ بغداد میں تحصیل علم کی غرض سے اٹھارہ سال کی عمر میں آئے اور اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک یہی شہر ان کی سرگرمیوں کی جولاں گاہ بنا رہا۔

دوسرے بہت سے اساتذہ کے علاوہ انہوں نے فنون و ادب کی تعلیم تبریزی سے، حنبلی فقہ کی تعلیم ابوالوفا ابن العقیل سے (جنہوں نے اعتزال چھوڑ کر حنبلی مذہب اختیار کر لیا تھا) اور ابو سعد مبارک مخرمی سے اور حدیث کی تعلیم مصارع العشاق کے مصنف ابو محمد جعفر سراج سے حاصل کی۔ تصوّف سے انہیں ابوالخیر حماد الدباس نے روشناس کرایا۔ ابوالخیر جن کی نسبت شیرہ فروشی سے ماخوذ ہے اور جنہوں نے بظاہر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اپنے وقت کے نہایت محترم و مسلم صوفی بزرگ تھے۔ ان کی اس سخت ریاضت کا ذکر جو وہ اپنے زیرِ تربیت مریدوں سے کرایا کرتے تھے۔ ابن اثیر نے بھی کیا ہے۔ شیخ عبدالقادر کو سلوک کی مدت ختم کر لینے کی علامت کے طور پر خرقہ مخرمی نے پہنایا۔

پچاس سال کی عمر میں انہوں نے سب سے پہلے واعظ ایک مجلس میں کیا۔ یہ ۵۲۱ھ/ ۱۱۲۷ء کا واقعہ ہے۔ ان کے واعظ اور درس کا چرچا بہت دور دور تک پھیل گیا۔ ان کے پہلے واعظ کے چھ سال بعد ان کے استاد مخرمی کا مدرسہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ جس کے لیے دولت مند اصحاب نے مالی مدد دی۔ اور غریبوں نے مفت بالی مشقت کے ساتھ اعانت کی۔ یہاں ان کے اہم مشاغل افتاء، درس تفسیر، حدیث و فقہ اور بالخصوص وعظ تھے۔ جن کے لیے ان کی شہرت دور دور تک تھی جو دنیائے اسلام سے بے شمار شاگردوں کو کھینچ لائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دلنشیں حسنِ واعظ کے باعث بہت سے عیسائی اور یہودی بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

وہ دنیوی ضروریات سے بے نیاز تھے اور بے خوفی سے کلمۂ حق کہتے تھے۔ جس سے دربار خلافت بھی متاثر ہوتا تھا۔ وہ غریبوں کی امداد کیا کرتے تھے۔

شیخؒ نے ایسے دور میں زندگی بسر کی جب تصوف کا عروج تھا اور صوفیا کے مسلک میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ ان سے پہلے کی صدی میں ایک نزاع جو مدت

سے جاری تھی بہت شدید شکل اختیار کر گئی تھی جس سے اسلامی معاشرے کا ہر فرد متاثر ہو رہا تھا۔ نزاع یہ تھی کہ آیا انسان کو ایسا لادینی مسلک اختیار کر لینا چاہیئے جو اہلِ دین کے مسلمات و عقائد سے متصادم ہو۔ ان حالات میں شیخ عبدالقادرؒ سے پہلے کی پشت کے لوگوں میں تصوف نے اپنے روحانی اور جذباتی اثر کی وجہ سے ایک ہمہ گیر تحریک کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ تاریخی حالات نے ایک سوال اٹھا رکھا تھا اور وہ یہ کہ زہد و تصوّف کے عناصر کو شریعت کے ساتھ ہم آہنگ کس طرح کیا جائے۔ شیخ کے استاد ابو عقیل نے تصوف کی ضرورت و افادیت سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد متشدد اور کٹر حنبلیوں نے کئی دفعہ تصوّف کے متعلق یہی روش اختیار کی لیکن ایسا بھی ہوا کہ حنبلی مذہب پر قائم رہتے ہوئے کئی لوگوں نے فقہی مناظرے کئے اور تصوّف پر کتابیں لکھیں جن کی اپیل جذباتی ہے۔

یہ وہ دور تھا جس میں شیخؒ نے عملی سرگرمیاں شروع کیں۔ اپنی ایک تصنیف "الغنیۃ الطالبین طریق الحق" میں انہوں نے ایک معلم دینیات کی حیثیت میں ایک سنی مسلمان کے اخلاقی اور معاشرتی فرائض کی وضاحت کی ہے بعد ازاں اس میں حنبلی مسلک کے ایک رسالے کی شکل میں وہ معلومات درج کر دی گئی ہیں جن کا حاصل کرنا ہر مومن کے لیے ضروری ہے۔ اس میں اسلام کے تہتّر فرقوں کی ایک مختصر سی تشریح بھی شامل ہے اور آخر میں تصوف کے مخصوص طریقے کا ذکر کیا گیا ہے غنیۃ الطالبین ان کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے۔ اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مختلف فرقوں کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں ان کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اس تصنیف کو عبدالقادرؒ سے منسوخ کرنے میں تامل کرتے ہیں "فتوح الغیب" علم تصوف اور معرفت میں معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کے اٹھہتر وعظ شامل ہیں جو آپؐ نے مختلف اوقات میں ارشاد فرمائے۔ فتح رحمانی و فیض ربانی شیخ کے تریسٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو ان کے ایک نواسے شیخ عفیف الدین مبارک نے ترتیب دیے۔ ان کے علاوہ دیگر بہت سی معروف اور اہم تصانیف آپ سے منسوب ہیں۔ ایک خطوط کا مجموعہ بھی ہے جن میں معرفت و طریقت کے اسرار و رموز سلجھائے گئے ہیں۔

آپ کا مقبرہ بغداد میں ہے اور پوری دنیا کے مقابر اولیاء میں ممتاز مقام و حیثیت رکھتا ہے۔ ہر سال لاکھوں افراد حاضری کے لیے وہاں جاتے ہیں اور فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

شیخؒ نے مختلف اوقات میں چار شادیاں کیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ نے عائلی زندگی کا آغاز پچاس سال کی عمر کے بعد کیا جبکہ مجاہدہ و ریاضت کی منزل سے گزر چکے تھے۔ ایک کتاب میں آپؒ کی ازواج کے نام اس طرح درج ہیں: ۱۔ سیدہ بی بی مدینہؒ بنت سید میر محمد۔ ۲۔ سیدہ بی بی صادقہؒ بنت سید محمد شفیع۔ ۳۔ سیدہ بی بی مومنہؒ۔ ۴۔ سیدہ بی بی محبوبہؒ۔

آپؒ اخلاق میں اپنے تمام معاصر اولیاء سے ممتاز تھے۔ تذکرۂ مشائخِ اولیاء میں درج ہے کہ سیرت و کردار کے لحاظ سے کوئی ولی آپ کا ہم پلہ نہ تھا۔ حق گوئی ایثار و سخاوت، عفو و کرم کا پیکر تھے۔ کسی پر ظلم برداشت نہ کرتے اور فوراً مظلوم کی امداد کے لیے کمربستہ ہو جاتے اور شریعت کے معاملہ میں کبھی نرمی نہیں برتتے تھے۔

عبدالقدوسؒ گنگوہی

(۸۶۱ھ - ۹۴۵ھ) سلسلہ مداریہ۔ سہروردیہ۔ نظامیہ کے صوفی درویش عالم بزرگ۔

ان کی پیدائش کی بشارت پیدائش سے بہت پہلے دی جا چکی تھی۔ اور ان کے بارے میں ایک بزرگ کا کہنا تھا کہ وہ شخص قطب ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تمام عمر درویشی لباس و معمولات میں رہے۔ انکسار و عاجزی کو اپنا وصف اولی بنایا اور لوگوں کی خدمت اور مرشد کی حضوری کو اپنا منصب جانا۔ روحانی و باطنی صفات آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ابتدائے حال میں ردولی میں مقیم رہے۔ ۱۴۹۰ - ۹۱ء میں ردولی کے حالات خراب ہوئے اور ترک وطن کر کے شاہ آباد آ گئے۔ جہاں ۳۸ سال تک ارشاد و تلقین میں گم رہے۔ آخری عمر میں گنگوہ تشریف لے گئے۔ اور وہیں پر ۹۴۵ھ/۱۵۳۷ء میں وفات پائی۔

شیخ عبدالقدوسؒ کو ہندوستان کے نہایت غیر یقینی حالات میں تبلیغ و اشاعت دین کی ذمہ داری ادا کرنا پڑی۔ سلطنت دہلی دم توڑ رہی تھی۔ مستحکم مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا اور صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم تھیں۔ اول اول شیخ عبدالقدوسؒ سیاست و سلطان سے مشائخ چشت کے قدیم اصول کے مطابق علیحدہ رہے لیکن بعد میں انہیں سیاست میں حصہ لینا پڑا اور سلاطین سے ربط پیدا کرنا پڑا۔ اپنے ایک طویل خط میں انہوں نے سکندر لودھی کو عام خلق اور علماء کی نگہداری و تیمارداری پر خاص طور سے توجہ دلائی۔

شیخ نے عوارف کی شرح لکھی اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فصوص الحکم پر حاشیہ تیار کیا۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں:
۱۔ رسالہ قدسیہ، ۲۔ غرائب الفوائد۔ ۳، رشد نامہ۔ ۴، مظہر العجائب، ۵۔ مکتوبات قدسیہ۔

انہوں نے اپنی تصانیف میں وحدت الوجود پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ صابریہ سلسلہ کو منظم کرنے اور پھیلانے میں ان کا بہت حصہ ہے۔

عبدالقیس

مشرقی عرب کا ایک قدیم عربی قبیلہ۔ (شاذونادر طور پر عبدِ قیس یعنی قیس دیوتا کا غلام)

قبیلہ عبدالقیس قبائل کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو حد ید صوبہ عارض میں آباد تھا۔ یہاں سے وہ شمال مغرب کی جانب سدیر تک پھیل گیا۔ اور جنوب مشرق کی طرف خرج تک جا پہنچا۔ پانچویں صدی عیسوی میں اس قبائلی گروہ کے بعض حصے الگ ہو گئے تھے۔ اور ان میں سے کچھ کوہستان طویق کے اندرونی علاقے میں اور کچھ اس کے باہر خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ ان بیرون قوس خانہ بدوشوں میں عبدالقیس بھی شامل تھا۔ جو چھٹی صدی عیسوی میں اندرونِ ملک بحرین اور قطیف میں جا گھسے۔ بحرین کا نخلستان کنوؤں، قدرتی اور مصنوعی ندیوں سے خوب شاداب ہے۔

عبدالقیس دو گروہوں میں منقسم تھے۔ شن اور لکیز۔ لکیز کا گروہ نکرہ، الدیل، عجل اور محارب بن عمرو کے قبائل پر مشتمل تھا۔

عبدالقیس نے رسول اللہ صلعم کے سفیروں اور مکتوبات کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ مدینے میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ

اسلام ہوئے۔ ان کے سرداروں میں سے منذر بن عائذ اور الجارود بن عمرو بھی اس وفد میں شامل تھا۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ نقل مکانی کی ایک نئی تحریک شروع ہوگئی۔ یہ نقل مکانی کا زیادہ تر رخ بصرے کی طرف تھا۔ کوفے میں عبدالقیس کی نمائندگی چنداں قوی نہ تھی۔ کوفے کی افواج کے ساتھ وہ کوفے اور بصرے کے عساکر کے ساتھ خراسان پہنچ گئے۔ جہاں ۷۱۵ء میں ان کی تعداد چار ہزار نفوس تھی۔ عبدالقیس نے نومفتوحہ صوبوں کی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ وہ اکثر حالات میں اپنے آپ کو مقامی حالات کے مطابق ڈھال لیتے تھے۔ علوی کوفے میں وہ علوی تھے اور بصرے اور خراسان میں قبائل کے باہمی جھگڑوں میں وہ شریک تھے۔ بصرے میں اسلام کے اولین زہاد اور خیار مسلمان میں سے ہرم بن حیان جو حسن بصری کے پیش رو تھے اسی قبیلے کے فرد تھے۔

عبدالقیس نے اپنے اصل وطن میں بحدہ کی خارجی تحریک کے مقابلے میں جس کا مرکز یمامہ تھا بڑی استقامت دکھائی لیکن انہیں چنداں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے عبدالقیس کی غالب اکثریت نصرانی تھی۔ ان کا نسب نامہ دوسرے قبائل کے نسب ناموں سے نمایاں طور پر نامکمل ہے خلیفہ عبدالملک بن مروان کا قول ہے کہ عبدالقیس وہ عرب قبیلہ ہے جس میں "اشد الناس" (حکیم بن جبلہ) اور "اسخی الناس" (عبداللہ بن سوار) اور خطیب الناس واطوع الناس لقومہ (الجارود بن العلاء) اور احضرھم جوابا (صعصعة بن صوحان) اور احلم الناس پایا گیا۔

عبدالکریم بن ابراہیم الجیلیؒ

پیدائش تقریباً ۷۶۷ھ/ ۱۳۶۵ء - ۶۶ء - وفات غالباً ۸۱۱ھ کے بعد اور ۸۲۰ھ سے پہلے۔

مشہور صوفی۔ وہ اپنے آپ کو بغداد کا باشندہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی صاحبزادی کی اولاد میں سے بتاتے ہیں۔ اسی نسبت سے الجیلی کہلاتے ہیں۔ طریقۂ قادریہ کے پیرو تھے۔ ان کے مرشد شیخ شرف الدین اسمٰعیل بن ابراہیم الجرتی تھے۔ انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا اور کچھ عرصہ اپنے مرشد کے ساتھ یمن میں بھی رہے۔ ان کی بیس تصانیف محفوظ ہیں اور تقریباً اتنی ہی معدوم ہو چکی ہیں۔

الجیلیؒ کے عقائد شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان جو تضاد نظر آتے ہیں وہ نکتہ نظر یا تاویل کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس عقیدے کا مرکزی تصور وحدت الوجود ہے۔ الجیلیؒ نے دنیا کو برف سے تشبیہ دی ہے اور اللہ کو ایک حقیقت مستور کی حیثیت سے پانی کے مماثل قرار دیا ہے۔ جس سے برف بنتی ہے، برف پھر پانی بن جائے گی۔

الجیلیؒ کے مسلک بنیادی موضوع ہمیشہ مابعد الطبیعی تناقضات پر مبنی ہوتے ہیں، گو اس کی تعبیرات اکثر جدلی ہوتی ہیں اور ابن العربی کی تحریروں کے مقابلے میں ان میں زیادہ باقاعدگی ہے۔ ان کی کتاب الانسان الکامل کو ابن عربی کی مابعد الطبیعیات اور عمومی حیثیت سے پورے تصوف کی مابعد الطبیعیات کی پہلی باقاعدہ مرتب صورت کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب نے مراکش سے لے کر جاوا تک تصوف پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

الانسان الکامل کا تصور (جس میں ظہور ذات کے تمام پہلو مجتمع ہیں) اس سے پہلے ابن عربی پیش کر چکے تھے۔ تصوف کا یہ ایک بنیادی تصور ہے اور قرآن کے قصۂ تخلیق آدم سے براہ راست ماخوذ ہے جس میں خدا کے اپنی روح آدمؑ میں پھونک دینے اور اسے سب نام سکھانے کا ذکر ہے۔ لہذا انسان اپنی حقیقی اور بنیادی نوعیت میں اللہ کا مکمل ترین آئینہ اور اس کے اور دوسری مخلوقات کے درمیان واسطہ ہے۔

عبدالکریم غازی، ایف

(۱۸۸۰ء - ۱۹۶۳ء) مراکش کی جنگ آزادی کا مشہور رہنما۔ قبیلہ الیف کا سردار۔ پہلی جنگ عظیم میں ہسپانیہ کی طرف سے لڑتا رہا۔ لیکن جنگ کے بعد آزادیٔ وطن کا مطالبہ کیا اور ہسپانیہ کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ [illegible] میں ملیلہ کے قریب ہسپانوی فوج کے بیس ہزار سپاہیوں کو شکست دی۔ فرانس کی بیشتر لڑائیوں میں بھی کامیاب رہا۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں فیز کے مقام پر گھر گیا اور خود کو فرانس کے حوالے کر دیا۔ فرانسیسی حکومت نے اسے جزیرہ ری یونین میں قید کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں فرانس نے اسے واپس لانے کا فیصلہ کیا لیکن جب جہاز سویز پہنچا تو غازی عبدالکریم نے جہاز سے اتر کر مصر میں [illegible] بعد وہیں [illegible]

عبدالکریم قاسم

(۱۹۱۴ء - ۱۹۶۳ء) عراقی جمہوریہ کا پہلا وزیر اعظم۔ [illegible] حاصل کی اور فوج میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف [illegible] ۱۹۵۵ء میں عراقی فوج کے انیسویں بریگیڈ کا کمانڈر مقرر ہوا [illegible] نوجوان افسروں کے ساتھ مل کر شاہی حکومت کا تختہ [illegible] منصوبہ [illegible]

۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو شاہ کو وزیر اعظم نوری السعید کی حکومت [illegible] عبدالکریم قاسم کو حکم دیا کہ وہ اردن کی شاہی حکومت کی [illegible] اردن چلے جائے، لیکن اردن جانے کی بجائے شاہی حکومت کا [illegible] فیصل، ولی عہد امیر عبداللہ اور نوری السعید کو موت [illegible] قبضہ کر لیا۔

۱۹۶۳ء کے [illegible] میں فوجی باغیوں کے ہاتھوں [illegible]

عبداللطیف، مولانا

مولانا عبداللطیف بن [illegible] دیوبند میں [illegible] اسلامیہ اندر کوٹ میرٹھ میں قاری [illegible] حافظ [illegible] تنزھاروی اور مولانا احمد علی سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ [illegible] مسجد آگرہ میں مدرس مقرر ہوئے اور مولانا [illegible] مفتی اعظم آگرہ ہوئے۔ تقریباً بیس برس بعد [illegible] واپس آئے [illegible] ہوتی مردان میں منتقل ہو گئے جہاں پر خاموشی سے [illegible] کی خدمت کر رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں۔ تفسیر [illegible] کاشف الصافی (پارہ اول)، لطائف [illegible] شرح جامی۔ [illegible] فتاوی شمائیہ، شرح دیوان حافظ شیرازی، دار المکنون، شرح [illegible] تحریم حلق لحی و شرب دخان، تحفۃ الواعظین، تحفۃ الذاکرین۔ [illegible]

سے علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف ہیں۔ خاموش مزاج اور درویش منش ہیں۔ اسلاف کی سی پاکیزہ طبیعت رکھتے ہیں اعلیٰ حضرت مجدد گولڑوی سے بیعت طریقت رکھتے ہیں۔ عمر ایک سو برس کے قریب ہے۔

عبداللہ بن ابی

عبداللہ بن ابی بن سلول (سلول اُبی کی ماں کا نام تھا)

اولین تاریخ اسلام کا مشہور منافق۔ بنو الحُبلیٰ (جنہیں بنو سالم بھی کہتے ہیں اور جو قبیلہ خزرج کی شاخ عوف کا ایک حصہ تھا) کا سردار اور مدینہ کے ممتاز لوگوں میں سے ایک۔ ہجرت سے پہلے اس نے خزرج کے چند آدمیوں کی جنگ فجار میں صرف پہلے دن قیادت کی تھی۔ لیکن دوسرے دن کی جنگ میں اس نے حصہ نہ لیا اور نہ جنگ بُعاث ہی میں شرکت کی۔

مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر رسول خداؐ　　مدینہ تشریف نہ لاتے تو شائد عبداللہ مدینے کا "ملک" ہوجاتا۔

جب چند آدمیوں کے سوا سارا مدینہ مسلمان ہوگیا تو عبداللہ ابن ابی نے بھی اکثریت کا ساتھ دیا لیکن اس کے اسلام میں اخلاص نہیں تھا۔

جب ۲ھ میں حضور اکرم صلعم نے بنو قینقاع پر حملہ کیا تو اس نے حضورؐ سے ان کی سفارش کی۔ کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں وہ اس کے حلیف رہے تھے۔ جنگ احد سے پہلے جو مشورے ہوئے ان میں عبداللہ نے اس تجویز کی حمایت کی کہ قلعوں میں رہا جائے۔ ابتدا میں رسول اللہ صلعم کا خیال بھی یہی تھا لیکن بعد میں جب آپ نے اکثریتی رائے کے موجب شہر سے باہر دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تو عبداللہ نے اسے ناپسند کیا۔ اور آخر میں تین سو سپاہیوں کو ساتھ لے کر اسلامی فوج کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس سے اس کی بزدلی اور خدا اور اس کے رسول پر پختہ ایمان کی کمزوری صاف ظاہر ہے۔

اس وقت تک عبداللہ کی آنحضرت صلعم کے خلاف سرگرمیاں زبانی نکتہ چینیوں تک محدود تھیں۔ لیکن اس کے بعد وہ آپؐ کے خلاف سازشیں بھی کرنے لگا۔ جب رسول اللہ صلعم نے بنو نضیر کو حکم دیا کہ وہ اپنے مکانات خالی کردیں تو اس نے نہ صرف ان کو اکسایا بلکہ فوجی امداد کا وعدہ بھی کیا۔

مریسیع کی مہم میں اس نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ کے خلاف سازش کی کوشش کی اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرنا چاہا کہ وہ آپؐ کو مدینہ سے نکال دیں۔ پھر اس کے فوراً بعد ہی اس نے حضرت عائشہؓ ام المومنین کے خلاف بہتان تراشی میں نمایاں اور شدید حصہ لیا۔ اس پر حضور اکرمؐ نے ایک مجلس مشاورت طلب کی۔ گو قبیلۂ اوس اور خزرج کے تعلقات سخت کشیدہ رہے تھے تاہم اب یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ عبداللہ کا حمایتی کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ غزوۂ تبوک میں شامل نہیں ہوا، اور اس کے چند روز بعد وفات پا گیا۔ یہ ۹ھ/۶۳۱ء کا واقعہ ہے۔ حضور اکرم صلعم نے ازراہ شفقت خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنی قمیض اس کے کفن کے لیے دی لیکن قرآن مجید نے آئندہ کے لیے منافقوں کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع فرما دیا۔

آپؐ نے عبداللہ بن ابی کے ساتھ معاملات میں ہمیشہ بڑے ضبط و تحمل کا مظاہرہ فرمایا۔

عبداللہ کا ایک بیٹا عبداللہ بن عبداللہ تھا اور کئی بیٹیاں تھیں۔ یہ سب کے سب مخلص مسلمان تھے خصوصاً عبداللہ ابن عبداللہ کا اخلاص بہت بڑھا ہوا تھا۔

عبداللہ بن اُمیہ

نام عبداللہ۔ والد کا نام حذیفہ۔ والدہ کا نام عاتکہ جو عبدالمطلب کی لڑکی تھیں۔ اس طرح آپ نبی اکرم صلعم کے پھوپھیرے بھائی اور ام المومنین ام سلمہؓ کے ماں جائے بھائی تھے۔ عبداللہ کے والد ابوامیہ قریش کے ایک معزز خاندان کے رئیس تھے۔ رسول اللہؐ نے جب دعوت اسلام دی تو دیگر سرداران قریش کے ساتھ عبداللہ اور ان کے والد نے بھی رسولؐ اللہ کی سخت مخالفت کی۔ رسول اللہؐ نے اپنے چچا ابوطالب کو بوقت وفات کلمہ شہادت پڑھنے کی درخواست کی۔ اس وقت حضرت عبداللہ نے انھیں کلمہ پڑھنے سے روک دیا۔ آپ حضور اکرمؐ صلعم کا ہر جگہ تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ رسولؐ اللہ کو آپ سے بہت نقصان پہنچتا رہا۔

بالآخر فتح مکہ سے کچھ دن پیشتر اسلام کی تعلیم کا ان کے دل پر کچھ اثر ہوا۔ اور رسول اللہ سے ملاقات کی سوچی۔ چنانچہ اپنی بہن ام سلمہؓ (ام المومنین) کے ذریعے رسول اکرمؐ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ رسول اللہؐ نے ان کے گزشتہ افعال کے پیش نظر ملاقات سے انکار کردیا اور ام سلمہؓ کے اصرار کے باوجود ملاقات نہ کی۔ آخر بہت مجبور ہوگئے۔ تو عبداللہ کو ملنے کی اجازت دے دی اور عبداللہ نے گزشتہ افعال سے توبہ کرکے اسلام قبول کرلیا۔

بعد میں وہ فتح مکہ۔ حنین اور طائف کی جنگوں میں بڑی بے جگری سے لڑے۔ حتیٰ کہ جنگ طائف میں شہید ہوگئے۔

عبداللہ بن ارقمؓ

نام عبداللہ۔ والد کا نام ارقم۔ آنحضرتؐ کی والدہ حضرت آمنہ ارقم کی پھوپھی تھیں۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے۔ رسول اکرم صلعم نے انہیں مراسلت اور کتابت کا سارا کام سپرد کر رکھا تھا۔ تمام امرا اور سلاطین کو رسول اکرمؐ کی طرف سے یہی خط لکھتے تھے۔ اور خفیہ خط و کتابت بھی انہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں بھی یہی خدمت انجام دیتے رہے علاوہ ازیں بیت المال کی نگرانی بھی کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی۔ ۵۳ھ میں انتقال کرگئے۔ ان سے بہت سی حادیثؒ مروی ہیں۔

عبداللہ بن اریقط

ایک غیر مسلم لیکن قابل اعتماد شخص۔

حضور اکرمؐ جب ابوبکرؓ کے ساتھ غار ثور میں پوشیدہ تھے اور کفار نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص حضور اکرم صلعم کو گرفتار کرکے لائے گا اسے سو اونٹ دیئے جائیں گے۔ انعام کے لالچ میں بہت سے لوگ آپ کو گرفتار کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ آخر سراغ لیتے ہوئے بالکل غار ثور کے نزدیک آن پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے پاؤں دیکھے تو گھبرا کر بولے "حضورؐ، کفار تو یہاں بھی آن پہنچے" آپؐ نے فرمایا۔ مطلق نہ ڈرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔ کفار تلاش کے بعد مایوس ہوکر واپس لوٹ گئے۔ اور آپؐ نے اطمینان سے عبداللہ بن اریقط

العامری ہے۔ قریش کی ایک شاخ عامر بن لوی سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت عثمانؓ کا رضاعی بھائی ہونے کے باعث بنوامیہ کا خاص طرف دار تھا۔ یہ سپاہی کم تھا اور ماہر مالیات زیادہ۔ اس کے کردار کے متعلق مؤرخین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابتدائے اسلام کے واقعات میں اس کا ذکر کئی طرح سے ملتا ہے مثلاً اسے رسول اکرم صلعم کے کاتبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

وہ ان مہاجرین صحابہ میں سے تھا جنہوں نے عمروؓ بن عاص کے زیر کمان فتح مصر میں حصہ لیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن سعد نے عمروؓ بن عاص کی ماتحتی سے آزاد ہو کر براہ راست حضرت عمرؓ کے تحت بالائی مصر پر حکومت بھی کی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی خواہش یہ تھی کہ عبداللہ کو ناظم مالیات اور عمرو بن عاص کو مصر کا فوجی حاکم رکھیں لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا۔ اب عبداللہ نے حکومت مصر کی آمدنی میں کافی اضافہ کیا جو حضرت عثمانؓ کی خوشنودی کا باعث ہوا۔

گو عبداللہ کا بڑا مقصد مالیات کا انتظام کرنا تھا تاہم اس نے بحیثیت سپہ سالار بھی بڑی شہرت حاصل کی۔ اس نے مسلمانوں اور باشندگان نوبہ کے تعلقات کو استوار کیا۔ اور جب معاویہؓ نے جزیرہ قبرص پر حملہ کیا تو اس نے معاویہؓ کی مدد کی۔ اس نے بارہا افریقہ کے ان حصوں پر حملہ کیا جو بوزنطی رومیوں کے قبضے میں تھے۔ پہلا حملہ غالباً ۲۵ھ میں کیا۔ لیکن جو حملہ ۲۷ھ میں کیا گیا وہ بہت کامیاب تھا۔ اس سے قرطاجنہ کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ تاہم عبداللہ بن سعد کا سب سے زیادہ شاندار فوجی کارنامہ ذات الصواری کی وہ بحری جنگ تھی جس میں رومیوں کا جنگی بیڑہ مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ یہ جنگ اہمیت کے اعتبار سے جنگ یرموک کے ہم پلہ تھی۔

جب حضرت عثمانؓ غنی کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو عبداللہ عثمانی خلافت کا سب سے بڑا حامی نظر آتا تھا۔ اس نے خلیفہ کو خبردار کرنے کی کوشش کی اور خلیفہ کی مدد کے لیے مصر چھوڑ کر خود آیا۔ اس کے نائب الصائب ابن ہشام کو انقلابی جماعت نے مصر سے نکال دیا۔ اس انقلابی جماعت کا رہنما محمد بن حذیفہ تھا۔ اس جماعت نے خود عبداللہ کو مصر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ عبداللہ ابھی سرحد پر ہی تھا کہ اسے خلیفہ کے شہید ہونے کی خبر ملی۔ یہ بھاگ کر معاویہؓ کے پاس پہنچا۔ جب معاویہؓ صفین کے لیے روانہ ہوئے تو اس سے ذرا پہلے عبداللہ عسقلان یا رملہ میں وفات پا چکا تھا۔ اس لیے وہ جنگ صفین میں شامل نہیں تھا۔ بعض مآخذ میں اس کے لیے ہے کہ وہ اس جنگ میں شریک تھا لیکن یہ ان افسانوں میں سے ایک ہے جو اس جنگ کے متعلق تراش لیے گئے ہیں۔

عبداللہ بن سلامؓ

قبول اسلام سے پہلے مدینے کے ایک یہودی تھے۔ بنو قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اصلی نام الحصین تھا۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلعم نے ان کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضور اکرمؐ کی مدینہ آمد کے معاً بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور بعض کے قول کے مطابق حضورؐ ابھی مکہ ہی میں تھے کہ عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے ۸ھ میں اسلام قبول کیا۔ یہ زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عبداللہ بن سلام کا نام ان لڑائیوں کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا جو رسول اکرمؐ کو مدینے میں لڑنا پڑی تھیں۔

المغازی میں بعض غیر اہم امور کے لیے عبداللہ کا ذکر ملتا ہے انہوں نے جو کام کیے ان کے بارے میں بھی جزئیات موجود ہیں۔ عبداللہ جابیہ اور یروشلم میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا اور باغیوں کو قتل خلیفہ سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی اور جب حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ سے لڑنے کے لیے عراق کی طرف جانے لگے تو عبداللہ بن سلام نے انھیں مودبانہ طور پر اس ارادے کو ترک کر دینے کا اظہار کیا۔

بعض روایات کی رو سے ابن سلام کا تعلق حضرت امیر معاویہؓ سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

ان کی وفات ۴۳ھ میں ہوئی۔ اسلامی روایت کے مطابق عبداللہ بن سلام ان یہودی کتاب کے مثالی نمائندے تھے جو حق کے آگے سر جھکاتے تھے اور رسول اکرم صلعم کو بشارات توراۃ کے مطابق رسول مانتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں کی فتنہ سامانیوں سے حضورؐ کو بچاتے تھے۔

وہ سوالات جو عبداللہ بن سلام نے رسول اللہ صلعم سے پوچھے تھے کتب احادیث میں ان کی طرف سے منسوب ہیں۔

بعض ایسی احادیث بھی مشہور ہیں جن میں انہیں جنت کی بشارت دی گئی ہے، یا آپؐ کے صحابہ کبار نے ان کی تعریف کی ہے۔ بعض قرآنی آیات میں بھی ان کی طرف اشارہ بتایا جاتا ہے۔ جو سوالات انھوں نے رسول کریمؐ سے پوچھے تھے انہیں پھیلا کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس طرف دیگر متعدد کتابیں بھی ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔

عبداللہ بن سہیل

نام عبداللہ۔ کنیت ابوسہیل۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان ہو گئے اور حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں سے کچھ عرصہ بعد مکہ آ گئے۔ ان کے والد نے انہیں اسلام قبول کرنے کے جرم میں قید کر دیا اور اذیتیں دینے لگے۔ چنانچہ مجبور ہو کر انہوں نے اسلام سے توبہ کر لی لیکن ہجرت کے بعد جب قریش مسلمانوں کا مقابلہ کرنے نکلے تو ان کا والد بھی انہیں اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے گیا۔ وہ یہ موقع پا کر مشرکین کی صفوں سے نکل کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ تمام غزوات میں رسول اکرم صلعم کے ہم رکاب رہے۔

فتح کے بعد ان کا والد بھی گرفتار ہوا لیکن رسول اکرمؐ نے عبداللہ کی سفارش پر اس کی جاں بخشی فرما دی۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

عبداللہ بن شبیل الاحمسی

اسلامی جرنیل جس نے حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں آذربائیجان پر حملہ کیا چنانچہ اہل آذربائیجان نے انہی شرائط پر صلح قبول کر لی جو حذیفہ نے اس سے پہلے ان کو پیش کی تھیں۔

عبداللہ بن عامر

حضرت عثمان بن عفانؓ کے چچا زاد بھائی۔ ۴ھ میں بمقام مکہ پیدا ہوئے ایرانی فتوحات کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔ ۲۹ھ میں جب حضرت عثمانؓ نے آپ کو بصرے کا گورنر مقرر کیا تو آپ نے پہلے خراسان، سیستان اور پھر نیشاپور وغیرہ کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کیا۔ آپ ان چند پہلے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی خونِ عثمان کی دعوتِ انتقام پر لبیک کہا اور جب انہوں نے بصرے کا رخ کیا تو انہیں روپے اور اونٹ مہیا کیے۔

حضرت علیؓ کے ہاتھوں حضرت عائشہؓ کی فوج کی شکست کے بعد آپ دمشق چلے گئے۔ بعد میں ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ نے آپ کو دوبارہ بصرے کا گورنر مقرر کر دیا۔ ۴۴ھ میں آپ کو اس عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔

عبداللہ بن عامر اپنے اوصاف میں عسکریت اور سخاوت دونوں کو سموئے ہوئے۔ ان کے ذاتی اوصافِ حمیدہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے بصرے میں دو نہریں کھدوائیں اور عرفات میں حاجیوں کے لیے پانی کی بہم رسانی کے انتظامات کی اصلاح و ترقی کی۔

عبداللہ بن عباد

یہ اس جماعت سے تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کے اس فیصلے کی مخالفت کی کہ ان کے اور امیر معاویہؓ کے درمیان خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے دو ثالث مقرر کیے جائیں مگر انھوں نے خارجیوں کی طرح حد سے تجاوز نہیں کیا بلکہ عام اسلامی حدود کے اندر رہے۔ جابر بن زید کے مشورے کے مطابق ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور ان کے خارجیوں سے بہت سے جھگڑے بھی ہوئے۔ بعد میں یہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

البرادی نے کتاب "الجواہر" میں ان کا ایک جامع خط شائع کیا ہے جو انھوں نے عبدالملک بن مروان کے استفسار کے جواب میں متنازعہ فی مذہبی مسائل کے متعلق تحریر کیا تھا۔ یہ پہلی صدی ہجری کے دوسرے نصف کے جید عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس

رسول اکرم صلعم کے عم زاد۔ ممتاز فقیہہ و مفسر۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ ان کی سگی خالہ تھیں۔

انھیں اسلام کے دورِ اول میں اگر سب سے بڑا عالم نہیں تو علمائے عظام میں سے ایک ضرور سمجھا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر میں مہارت کی وجہ سے انھیں امام المفسرین کہا گیا ہے انھوں نے ایسے وقت میں قرآن مجید کی تفسیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا جب کہ مسلمانوں کے معاشرے میں گہری تبدیلیاں رونما ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا کہ معاشرے کے نئے تقاضوں کے پیشِ نظر قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تشریح کی جائے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کام کو بڑی مہارت اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔

ابن عباسؓ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے جبکہ بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہو زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی والدہ نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے وہ پیدائش کے وقت ہی سے مسلمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں لڑکپن ہی سے صحیح تحقیق علمی کا جہاں تک کہ اس زمانے میں اس کا تصور ممکن تھا، رجحان موجود تھا۔ ان کے دل میں بہت جلد یہ خیال پیدا ہو گیا کہ صحابہ کرامؓ سے استفسارات کر کے رسول اکرم صلعم کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔

ابھی وہ نو عمر ہی تھے کہ معلم بن گئے اور حصولِ علم کے خواہش مند لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کا علم و فضل فقط حافظے تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے پاس تحریری یادداشتوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ انہوں نے عوام میں درس دینا شروع کر دیا۔ بلکہ تعلیم کے لیے باقاعدہ جماعتیں بنا دیں اور تقریباً معین نظام الاوقات کے مطابق ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف موضوعات مثلاً تفسیر قرآن، فقہی مسائل، غزوات نبی اکرم صلعم، تاریخ ازمنۂ قبل اسلام اور قدیم شاعری کا باقاعدہ درس دینے لگے۔ قرآن مجید کے الفاظ و محاورات کی تشریح کرتے وقت ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے بیان کی تائید میں قدیم عرب شعراء کے اشعار پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اس طریقِ کار کی وجہ سے مسلمان علمائے دین کے ہاں قدیم عرب شاعری کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ چنانچہ انھیں ایک مستند عالم دین سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ان سے فتوے لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے بہت سے اہم فتووں کی وجہ سے بہت مشہور رہیں۔

ابن عباس کی مطالب قرآنیہ کی تشریح کو جمع کر کے خاص خاص مجموعے تیار کر لیے گئے۔ اسی طرح ان کے فتاویٰ بھی جمع کر لیے گئے۔ آج ان تفسیروں کے متعدد مخطوطات اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں جنہیں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

ابن عباسؓ نے عہدِ طفولیت سے وفاتِ نبوی تک آٹھ دس سال کی مدت رسولِ اکرمؐ کی صحبت میں بسر کی۔ آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ کبارؓ کی صحبت اختیار کی۔ اور ان سے آنحضرتؐ کی احادیث سننے اور یاد کرنے کا خاص اہتمام کیا۔ کتبِ احادیث میں ان سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث مروی ہیں۔

خوش اخلاقی، وجاہت اور تفقہ فی کتاب اللہ کے باعث حضرت عمرؓ ان کی بے حد قدر کرتے اور مشکل مسائل میں ان سے مشورہ لیا کرتے اور اکثر ان کی رائے پر عمل کرتے اور کہا کرتے تھے کہ ابنِ عباسؓ تم سب سے بڑے عالم ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ وہ تفسیر قرآن مجید میں یوں لگتا ہے کہ شفاف پردے کے پس منظر سے غیب کی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ ابنِ مسعودؓ کا قول ہے کہ وہ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔ ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اسے امتِ محمدیہ میں سے ابنِ عباسؓ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ التفسیر والمفسرون کے مؤلف محمد حسین الذہبی نے عبداللہ بن عباسؓ کے بلند مرتبہ علمیت کے پانچ اسباب گنوائے ہیں۔ (۱) حضرت محمد صلعم نے ابنِ عباسؓ کے لیے دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ اسے کتاب و حکمت کا علم، دین کی سمجھ اور تاویل قرآن کا فہم عطا کر۔ (۲) خانوادۂ نبوت میں تربیت ہوئی (۳) کبار صحابہؓ کی صحبت (۴) قوتِ حافظہ کے ساتھ لغت و ادبِ عربی کا حفظ ہونا (۵) انہیں اجتہاد کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔

اسلامی افواج کے ساتھ بہت سے معرکوں میں بھی شریک ہوئے مثلاً معرکۂ مصر، معرکہ افریقہ، معرکہ ہائے جرجان و طبرستان۔ اس کے بہت دن بعد

وہ قسطنطنیہ کی مہم پر بھی گئے۔ جنگِ جمل اور صفین میں وہ حضرت علیؓ کے لشکر میں ایک بازو کے سپہ سالار تھے۔ وہ خلفائے راشدین دوم و سوم حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کے مشیروں میں سے تھے اور وہ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ وہ حضرت علیؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت امام حسینؓ کے بھی مشیر تھے۔

ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے سے پہلے سیاست میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اور حضرت علیؓ کے عہد میں بھی انھوں نے سیاست میں عملی طور پر زیادہ سے زیادہ تین چار سال حصہ لیا۔

حضرت عثمان نے انہیں اپنی خلافت کے آخر میں اس وقت امیر حج مقرر کیا جب وہ مدینے میں اپنے مکان میں محصور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت ابن عباسؓ مدینہ میں موجود نہ تھے۔ اس کے کچھ دن بعد جب وہ مدینہ لوٹے تو انہوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس وقت سے انہیں اس شہر کا والی مقرر کر دیا گیا۔

۳۷ھ کے معاہدہ صفین پر دستخط ثبت کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔ جن کی رو سے قرار پایا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے جھگڑے کے فیصلے کے لیے دو حکم مقرر کیے جائیں۔

امام حسنؓ نے انہیں اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ اسی اثنا میں انہوں نے امیر معاویہؓ کے ساتھ مصالحت کی کوششیں شروع کیں لیکن یہ بات واضح نہیں کہ انہوں نے یہ کام خود اپنی مرضی سے کیا یا امام حسینؓ کے کہنے پر۔ غالباً یہ عبداللہ ابن عباسؓ ہی تھے جنہوں نے ان دو دعوے دارانِ خلافت کے درمیان مصالحت کروائی۔

امیر معاویہؓ کے طویل عہدِ خلافت میں ابن عباسؓ حجاز میں رہے۔ اس اثنا میں انہیں کئی بار بظاہر بنو ہاشم کے مفاد کی محافظت کے لیے جو ان کے اپنے بھی تھے، دربارِ خلافت میں دمشق جانا پڑا۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد جب عبداللہ ابن زبیرؓ نے مکہ میں بغاوت کا علم بلند کیا اور متوازی خلافت قائم کر لی تو وہ ابنِ عباس کے طرزِ عمل پر سخت برافروختہ ہوئے۔ کیونکہ ابنِ عباسؓ اور حضرت علیؓ کے بیٹے ابنِ حنفیہ نے انہیں خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ دونوں کو مکے سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ۶۴ھ میں جب مکے کا محاصرہ ہوا تو وہ واپس مکے آ گئے لیکن انہوں نے ابنِ زبیرؓ کی مخالفت جاری رکھی۔ اس کے نتیجے میں ان دونوں (ابن عباسؓ اور ابنِ حنفیہ) کو قید کر دیا گیا۔

جب مختار کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے کوفے سے سواروں کا ایک دستہ بھیجا اس دستے نے اچانک چھاپہ مار کر انہیں رہائی دلائی۔ اس بات کا سہرا ابن عباسؓ کے سر ہے کہ اس موقع پہ مکہ کا مقدس شہر خونریزی سے بچا رہا۔

زندگی کے آخری ایام میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ طائف میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں ۶۸ھ/۶۸۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ حضور اکرم صلعم سے تعلق و نسبت کی وجہ سے صحابہؓ کرام سے بہت عزت و تکریم سے پیش آتے تھے۔ جب وہ والی بصرے تھے تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ ان کے پاس آئے اور ان سے اپنی احتیاج کا ذکر کیا تو انہوں نے رسولِ اکرم کی مہمانی کے سلسلے میں ابو ایوب انصاریؓ کی خدمات کے پیش نظر دل کھول کر ان کی اعانت فرمائی۔ چالیس ہزار درہم اور بیس خادموں کے علاوہ گھر کا سارا اثاثہ ان کے حوالے کر دیا۔

عبداللہ بن عبداللہ بن ابی

نام عبداللہ۔ قبیلہ خزرج۔ خاندان حبلی۔ عبداللہ بن ابی (آپ کا والد) مشہور منافقین میں سے تھا، اپنے خاندان میں وہ اپنی قوت، اثر و رسوخ اور عقل و فہم کے باعث اتنا ممتاز تھا کہ لوگ اسے مدینے کا بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن رسول اکرم صلعم کی آمد کی وجہ سے اسے یہ عزت حاصل نہ ہو سکی اس لیے وہ اسلام کا دشمن ہو گیا۔ لیکن بظاہر اس نے اکثریتی قوت کو دیکھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ مگر اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح حضور اکرمؐ اور اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہا۔ لیکن عبداللہ بن عبداللہ بن ابی پر اپنے باپ کی عادات و افعال کا کچھ عکس و تاثر نہ تھا۔ آپ ہجرت سے قبل ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ اور تمام غزوات میں رسولِ اکرم صلعم کے رفیق تھے۔ جنگ بدر میں سامنے کے دو دانت شہید ہو گئے، اور ناک بھی جاتی رہی تھی۔ آپ نے اپنے باپ کی حرکات کے پیش نظر حضور اکرمؐ سے اسے قتل کرنے کی اجازت مانگی لیکن آپؐ نے اجازت نہ دی۔ عبداللہ بن ابی کی وفات پر انہوں نے حضور اکرمؐ سے اپنے باپ کی مغفرت کے لیے درخواست کی چنانچہ حضور اکرمؐ نے اپنی ایک قمیص اتار کر اسے کفن کے طور پر پہنائی اپنا لعابِ دہن اس کے منہ پر ملا اور خود نمازِ جنازہ پڑھ کر دفن کرایا۔

حضرت عبداللہ نے ۱۲ھ میں جنگ یمامہ میں شہادت پائی۔ آپ کا شمار افضل صحابہ میں ہوتا ہے۔ آپ کاتبِ وحی بھی تھے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن مناف بن قصی۔ حضور اکرم صلعم کے والد ماجد ان کی اور ابو طالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران [illegible] تھیں۔ جناب عبداللہ اور ام الحکیم البیضا توام پیدا ہوئے تھے۔ عبداللہ حضرت عبدالمطلب کی آخری اولاد تھے۔ "سیرۃ النبی" کے مطابق [illegible] بھائی تھے۔ ان میں زبیر، ابو طالب، ابو لہبؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ کسی نہ کسی خصوصیت، اسلام یا کفر کی وجہ سے مشہور رہے۔

ان کی ولادت غالباً ۵۴۵ء میں ہوئی۔

ان کی زندگی کے اہم واقعات میں ان کی قربانی کا واقعہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کر دی تو قرعہ [illegible] عبداللہ کے نام نکلا۔ بعد میں بہنوں کی التجا اور اہل قریش کی [illegible] سے عبداللہ کی قربانی کی بجائے سو اونٹوں کی قربانی دی گئی۔ اسی لیے حضور اکرم صلعم کو ابن الذبیحین یعنی حضرت اسمٰعیل اور عبداللہ والد رسول اکرمؐ [illegible]۔

جناب عبداللہ کی شادی قبیلۂ زہرہ کی ممتاز خاتون حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے ہوئی۔ شبلیؒ نے سیرۃ النبی میں اس وقت ان کی عمر ۱۷ برس سے کچھ زیادہ اور الزرقانی نے ۱۸ برس لکھی ہے۔

قریش تجارت پیشہ لوگ تھے۔ جناب عبدالمطلب کے بیٹوں کا بھی یہی شغل تھا۔ الزرقانی کی روایت کے مطابق جناب عبداللہ نکاح کے بعد قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے جہاں قریش عموماً جایا کرتے تھے مگر وہاں بیمار ہو گئے۔ واپسی پر چونکہ کمزوری زیادہ تھی اس لیے مدینے ہی میں ٹھہر گئے۔ وہ

ایک ماہ تک علیل رہے۔ یہاں بنو نجار نے تیمار داری کی۔ ادھر قافلے والوں نے مکے آکر عبدالمطلب کو خبر کی۔ عبدالمطلب نے اپنے صاحبزادے حارث کو اور الزرقانی کی روایت کے مطابق زبیر کو مدینے روانہ کیا لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ الزرقانی کے مطابق یہ واقعہ یکم رمضان (اکتوبر ۵۷۰ء) عام الفیل سے چار ماہ ۱۷ دن پیشتر مدینے پیش آیا۔ وہ وہیں دفن ہوئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ عبداللہ ابوا میں دفن ہیں لیکن طبری کی روایت کے مطابق ان کی قبر مدینے میں موجود ہے۔

وفات کے وقت عبداللہ کی عمر تقریباً ۱۸ سال تھی۔ اس وقت عیسوی سن شاید ۵۷۰ تھا۔ البلاذری وغیرہ نے ۲۵، ۲۸ اور ۳۰ سال لکھی ہے۔

عبداللہ کی واحد اولاد حضور اکرم صلعم تھے جو وفات کے چند ماہ بعد (ربیع الاوّل عام الفیل) میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید میں آپؐ کو یتیم کہا گیا ہے۔ شبلی نعمانیؒ کے مطابق عبداللہ نے ترکے میں پانچ اونٹ، کچھ بکریاں، ایک تلوار اور ایک لونڈی ام ایمن نامی چھوڑی تھی جو آنحضرت صلعم کو ورثے میں ملیں۔

عبداللہ بن عتبہ

عبداللہ بن عتبہ بن مسعود الہذلی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے بھتیجے۔ کوفہ کے ممتاز تابعین میں سے تھے۔ گو بعض اوقات ان کا ذکر غلط طور پر صحابہ کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ حضورؐ کی حیات مبارک میں پیدا ہوئے اور جب حضورؐ کے سامنے انہیں پیش کیا گیا تو آپؐ نے ان کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور دعائے خیر و برکت کی۔

عبداللہ بن عتیک

نام عبداللہ خاندان سلمہ۔ ہجرت سے پیشتر مسلمان ہوئے۔ اور بدر کے علاوہ سب جنگوں میں شریک ہوئے۔ ۶ھ میں آنحضرتؐ نے چار آدمیوں پہ امیر بنا کر ابو رافع کے قتل کے لیے خیبر بھیجا۔ ابو رافع قبیلۂ غطفان کا ایک متمول تاجر تھا جو غطفانیوں کو مسلمانوں کے خلاف کھڑکا کر جنگ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ حضرت عبداللہ نے کمال بہادری سے اس کے مکان میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ اور کوٹھے پر سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرنے سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی مگر بچ کر چاروں ہمراہوں سمیت رسول اکرم صلعم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ رسول اللہؐ نے اپنے دست مبارک سے اس ہڈی کو جوڑا جس سے وہ ٹھیک ہو گئے۔

۹ھ میں بنو طے کا بت توڑنے کے بعد جو مال و زر حضرت علیؓ اپنے ہمراہ لائے تھے اس کی حفاظت حضرت عبداللہ کے سپرد تھی۔ حضرت عبداللہ کے زمانۂ خلافت میں جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ آپ بہت بہادر اور باہمت صحابی تھے۔ مسند میں ایک حدیث بھی آپ سے روایت ہے۔

عبداللہ بن علی

عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح اور خلیفہ ابوجعفر منصور کا چچا۔

عبداللہ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کے خلاف بنو عباس کی جدوجہد میں سب سے بڑھ چڑھ کر سرگرم حصہ لینے والوں میں سے ایک تھا۔ وہ زاب کبیر کی فیصلہ کن جنگ میں، جس میں مروان اپنا تاج و تخت کھو بیٹھا، عباسی افواج کا سپہ سالار اعظم تھا۔ جب مروان بھاگ نکلا تو عبداللہ نے اس کا تعاقب کیا اور بسرعت دمشق پہ قبضہ کر کے فلسطین کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے بھاگتے ہوئے خلیفہ کا مصر تک تعاقب کیا۔

وہ خاندان بنو امیہ کے خلاف تلوار کو بے نیام رکھنے کے معاملے میں اپنے بھائی داؤد بن علی سے بھی زیادہ بے رحم اور سنگدل تھا۔ اور اس نے اس کے کلی استیصال کرنے میں کسی قسم کی کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی۔ رملہ (فلسطین) میں بنو امیہ کے اسّی افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس ظلم و ستم نے طبعی طور پر نئے حکمران کے لیے نفرت کے احساسات کو جنم دیا اور اس کے نتیجے میں معاویہ کی اولاد میں سے ایک شخص کے زیر اثر ایک خطرناک بغاوت پھوٹ پڑی۔ ابتدا میں باغیوں نے ایک عباسی دستے کو شکست بھی دی لیکن بعد ازاں عبداللہ نے انھیں ہزیمت دی۔ بعد میں عبداللہ والیٔ شام کی حیثیت سے نئے خاندان کی بقا کے لیے خطرے کا باعث بن گیا۔ سفاح کی وفات پہ اس نے خلافت کا دعوےٰ کر دیا جس کی بنیاد اس پہ تھی کہ اس نے بنو عباس کی حکمرانی کے لیے بنو امیہ کے خلاف جنگ کے دوران میں اہم خدمات سرانجام دی ہیں اور اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ سفاح نے اسے اپنے بعد خلیفہ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس فوج کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ جو درحقیقت اس لیے تھی کہ وہ اسے اپنی قیادت میں رومیوں کے خلاف مہم پہ لے جائے گا۔ جب اسے پتہ چلا کہ خراسان کے طاقتور والی ابومسلم نے منصور کی خلافت کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے اور فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے آ رہا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے لشکر کے سترہ ہزار خراسانی قتل کروا دیے۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ یہ لوگ کسی حال میں بھی ابومسلم کے خلاف نہیں لڑیں گے باقی ماندہ لشکر لے کر وہ ابومسلم کے مقابلے کے لیے بڑھا لیکن ابومسلم نے نصیبین کے مقام پہ اسے شکست دی اور اسے بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان والیٔ بصرہ کے پاس پناہ لینا پڑی۔ دو سال بعد معزول ہو گیا اور عبداللہ کو خلیفہ منصور کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا کوئی سات سال وہ قید میں رہا۔ بعد ازاں اُسے ایک ایسے مکان میں لے گئے جس کی بنیادیں عمداً کھود ڈالی گئی تھیں۔ یہ مکان اس پہ گر پڑا اور وہ اس کے ملبے کے نیچے دب کر مر گیا۔

وفات کے وقت اس کی عمر باون برس بیان کی جاتی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ

نبی اکرم صلعم کے مشہور صحابی۔ قریش مکہ کے معزز گھرانے کے نامور فرزند اور احادیث نبویؐ کے شہرۂ آفاق راوی۔ جن سے ۲۶۳۰ حدیثیں روایت ہیں۔ ان کا شمار مفتی صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ وہ ساٹھ سال تک افتا کے سلسلے میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔

جب مسلمان جذبات کا شکار ہو کر اور بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے خانہ جنگی میں الجھ گئے۔ تو اس وقت بھی ابن عمر ان تمام معاملات سے الگ تھلگ رہے وہ تعلیمات اسلامی پہ اس باقاعدگی سے عمل پیرا تھے کہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بن گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو تلاش ہونے لگی کہ وہ پہنتے کیا تھے اور ریش مبارک کو کس طرح تراشتے اور خضاب لگاتے تھے۔

کتب سیر میں ان کی فطری ذہانت، کمال تقویٰ، علم و انکسار، اعتدال اور قناعت پسندی کی روشن مثالیں ہیں۔ ان کی بلند شخصیت، علمی حیثیت

العامری ہے۔ قریش کی ایک شاخ عامر بن لوئی سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت عثمانؓ کا رضاعی بھائی ہونے کے باعث بنو امیہ کا خاص طرف دار تھا۔ یہ سپاہی کم تھا اور ماہر مالیات زیادہ۔ اس کے کردار کے متعلق مؤرخین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابتدائے اسلام کے واقعات میں اس کا ذکر کئی طرح سے ملتا ہے۔ مثلاً اسے رسول اکرم صلعم کے کاتبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

وہ ان مہاجرین صحابہ میں سے تھا جنہوں نے عمروؓ بن عاص کے زیر کمان فتح مصر میں حصہ لیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن سعد نے عمروؓ بن عاص کی ماتحتی سے آزاد ہو کر براہِ راست حضرت عمرؓ کے تحت بالائی مصر پر حکومت بھی کی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی خواہش یہ تھی کہ عبداللہ کو ناظم مالیات اور عمرو بن عاص کو مصر کا فوجی حاکم رکھیں لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا۔ اب عبداللہ نے حکومت مصر کی آمدنی میں کافی اضافہ کیا جو حضرت عثمانؓ کی خوشنودی کا باعث ہوا۔

گو عبداللہ کا بڑا مقصد مالیات کا انتظام کرنا تھا تاہم اس نے بحیثیت سپہ سالار بھی بڑی شہرت حاصل کی۔ اس نے مسلمانوں اور باشندگان نوبہ کے تعلقات کو استوار کیا۔ اور جب معاویہؓ نے جزیرہ قبرص پر حملہ کیا تو اس نے معاویہؓ کی مدد کی۔ اس نے بارہا افریقیہ کے ان حصوں پر حملہ کیا جو بوزنطی رومیوں کے قبضے میں تھے۔ پہلا حملہ غالباً ۲۵ھ میں کیا۔ لیکن جو حملہ ۲۷ھ میں کیا گیا وہ بہت کامیاب تھا۔ اس سے قرطاجنہ کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ تاہم عبداللہ بن سعد کا سب سے زیادہ شاندار فوجی کارنامہ ذات الصواری کی وہ بحری جنگ تھی جس میں رومیوں کا جنگی بیڑہ مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ یہ جنگ اہمیت کے اعتبار سے جنگِ یرموک کے ہم پلہ تھی۔

جب حضرت عثمانؓ غنی کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو عبداللہ عثمانیؓ خلافت کا سب سے بڑا حامی نظر آتا تھا۔ اس نے خلیفہ کو خبردار کرنے کی کوشش کی اور خلیفہ کی مدد کے لیے مصر چھوڑ کر خود آیا۔ اس کے نائب الصائب ابن ہشام کو انقلابی جماعت نے مصر سے نکال دیا۔ اس انقلابی جماعت کا رہنما محمد بن حذیفہ تھا۔ اس جماعت نے خود عبداللہ کو مصر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ عبداللہ ابھی سرحد پر ہی تھا کہ اسے خلیفہ کے شہید ہونے کی خبر ملی۔ یہ بھاگ کر معاویہؓ کے پاس پہنچا۔ جب معاویہؓ صفین کے لیے روانہ ہوئے تو اس سے ذرا پہلے عبداللہ عسقلان یا رملہ میں وفات پا چکا تھا۔ اس لیے وہ جنگ صفین میں شامل نہیں تھا۔ بعض مآخذ میں اس کے لیے ہے کہ وہ اس جنگ میں شریک تھا لیکن یہ ان افسانوں میں سے ایک ہے جو اس جنگ کے متعلق تراش لیے گئے ہیں۔

عبداللہ بن سلامؓ

قبول اسلام سے پہلے مدینے کے ایک یہودی تھے۔ بنو قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اصلی نام الحصین تھا۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلعم نے ان کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضور اکرمؐ کی مدینہ آمد کے معاً بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور بعض کے قول کے مطابق حضورؐ ابھی مکہ ہی میں تھے کہ عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے ۸ھ میں اسلام قبول کیا۔ یہ زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عبداللہ بن سلام کا نام ان لڑائیوں کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا جو رسول اکرمؐ کو مدینے میں لڑنا پڑی تھیں۔

المغازی میں بعض غیر اہم امور کے لیے عبداللہ کا ذکر ملتا ہے انہوں نے جو کام کیے ان کے بارے میں بھی جزئیات موجود ہیں۔ عبداللہ جابیہ اور بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا اور باغیوں کو قتل خلیفہ سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی اور جب حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ سے لڑنے کے لیے عراق کی طرف جانے لگے تو عبداللہ بن سلام نے انھیں مودبانہ طور پر اس ارادے کو ترک کر دینے کا اظہار کیا۔

بعض روایات کی رُو سے ابن سلام کا تعلق حضرت امیر معاویہؓ سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

ان کی وفات ۴۳ھ میں ہوئی۔ اسلامی روایت کے مطابق عبداللہ بن سلام ان یہودی کتاب کے مثالی نمائندے تھے جو حق کے آگے سر جھکاتے تھے اور رسول اکرم صلعم کو بشارات توراۃ کے مطابق رسول مانتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں کی فتنہ سامانیوں سے حضورؐ کو بچاتے تھے۔

وہ سوالات جو عبداللہ بن سلام نے رسول اللہ صلعم سے پوچھے تھے کتب احادیث میں ان کی طرف سے منسوب ہیں۔

بعض ایسی احادیث بھی مشہور ہیں جن میں انہیں جنت کی بشارت دی گئی ہے، یا آپؐ کے صحابہ کبار نے ان کی تعریف کی ہے۔ بعض قرآنی آیات میں بھی ان کی طرف اشارہ بتایا جاتا ہے۔ جو سوالات انھوں نے رسول [illegible] سے پوچھے تھے انہیں پھیلا کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس طرف دیگر متعدد [illegible] بھی ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔

عبداللہ بن سہیل

نام عبداللہ۔ کنیت ابوسہیل۔ ابتدائے اسلام میں [illegible] حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں سے کچھ عرصہ بعد مکہ آ گئے۔ ان کے والد نے [illegible] قبول کرنے کے جرم میں قید کر دیا اور اذیتیں دینے لگے۔ چنانچہ مجبور [illegible] نے اسلام سے توبہ کر لی لیکن ہجرت کے بعد جب قریش مسلمانوں کا [illegible] نکلے تو ان کا والد بھی انہیں اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے گیا، اور [illegible] پا کر مشرکین کی صفوں سے نکل کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے تمام غزو[illegible] اکرم صلعم کے ہمرکاب رہے۔

فتح کے بعد ان کا والد بھی گرفتار ہوا لیکن رسول اکرمؐ نے عبداللہ کی [illegible] پر اس کی جاں بخشی فرما دی۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

عبداللہ بن شبیل الاحمسی

اسلامی جرنیل۔ جس نے حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں آذربائیجان پر حملہ کیا چنانچہ اہل آذربائیجان نے انہی شرائط پر صلح قبول کر لی جو حذیفہ نے اس سے پہلے ان کو پیش کی تھیں۔

عبداللہ بن عامر

حضرت عثمان بن عفانؓ کے چچا زاد بھائی۔ ۴ھ میں بمقام مکہ پیدا ہوئے ایرانی فتوحات کے لیے خاص طور پر مشہور رہیں۔ ۲۹ھ میں جب حضرت عثمانؓ نے آپ کو بصرے کا گورنر مقرر کیا تو آپ نے پہلے خراسان، سیستان اور پھر نیشاپور وغیرہ کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کیا۔ آپ ان چند پہلے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی خون عثمان کی دعوتِ انتقام پر لبیک کہا اور جب انہوں نے بصرے کا رخ کیا تو انہیں روپے اور اونٹ مہیا کئے۔

حضرت علیؓ کے ہاتھوں حضرت عائشہؓ کی فوج کی شکست کے بعد آپ دمشق چلے گئے۔ بعد میں ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ نے آپ کو دوبارہ بصرے کا گورنر مقرر کر دیا۔ ۴۴ھ میں آپ کو اس عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔

عبداللہ بن عامر اپنے اوصاف میں عسکریت اور سخاوت دونوں کو سموئے ہوئے۔ ان کے ذاتی اوصاف حمیدہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے بصرے میں دو نہریں کھدوائیں اور عرفات میں حاجیوں کے لیے پانی کی بہم رسانی کے انتظامات کی اصلاح و ترقی کی۔

عبداللہ بن عباد

یہ اس جماعت سے تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کے اس فیصلے کی مخالفت کی کہ ان کے اور امیر معاویہؓ کے درمیان خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے دو ثالث مقرر کئے جائیں مگر انھوں نے خارجیوں کی طرح حد سے تجاوز نہیں کیا بلکہ عام اسلامی حدود کے اندر رہے۔ جابر بن زید کے مشورے کے مطابق ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور ان کے خارجیوں سے بہت سے جھگڑے بھی ہوئے۔ بعد میں یہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

البرادی نے کتاب "الجواہر" میں ان کا ایک جامع خط شائع کیا ہے جو انھوں نے عبدالملک بن مروان کے استفسار کے جواب میں متنازعہ فی مذہبی مسائل کے متعلق تحریر کیا تھا۔ یہ پہلی صدی ہجری کے دوسرے نصف کے جید عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس

رسول اکرم صلعم کے عم زاد۔ ممتاز فقیہہ و مفسر۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ ان کی سگی خالہ تھیں۔

انھیں اسلام کے دورِ اول میں اگر سب سے بڑا عالم نہیں تو علمائے عظام میں سے ایک ضرور سمجھا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر میں مہارت کی وجہ سے انھیں امام المفسرین کہا گیا ہے انھوں نے ایسے وقت میں قرآن مجید کی تفسیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا جب کہ مسلمانوں کے معاشرے میں گہری تبدیلیاں رونما ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا کہ معاشرے کے نئے تقاضوں کے پیش نظر قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تشریح کی جائے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کام کو بڑی مہارت اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔

ابن عباسؓ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے جبکہ بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہو زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی والدہ نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے وہ پیدائش کے وقت ہی سے مسلمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں لڑکپن ہی سے صحیح تحقیق علمی کا جہاں تک کہ اس زمانے میں اس کا تصور ممکن تھا، رجحان موجود تھا۔ ان کے دل میں بہت جلد یہ خیال پیدا ہو گیا کہ صحابہ کرامؓ سے استفسارات کر کے رسول اکرم صلعم کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔

ابھی وہ نوعمر ہی تھے کہ معلم بن گئے اور حصولِ علم کے خواہش مند لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کا علم و فضل فقط حافظے تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے پاس تحریری یادداشتوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ انہوں نے عوام میں درس دینا شروع کر دیا۔ بلکہ تعلیم کے لیے باقاعدہ جماعتیں بنا دیں اور تقریباً معین نظام الاوقات کے مطابق ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف موضوعات مثلاً تفسیر قرآن، فقہی مسائل، غزوات نبی اکرم صلعم، تاریخ ازمنہ قبل اسلام اور قدیم شاعری کا باقاعدہ درس دینے لگے۔ قرآن مجید کے الفاظ و محاورات کی تشریح کرتے وقت ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے بیان کی تائید میں قدیم عرب شعراء کے اشعار پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اس طریقِ کار کی وجہ سے مسلمان علمائے دین کے ہاں قدیم عرب شاعری کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ چنانچہ انھیں ایک مستند عالم دین سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ان سے فتوے لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے بہت سے اہم فتووں کی وجہ سے بہت مشہور رہیں۔

ابن عباس کی مطالب قرانیہ کی تشریح کو جمع کر کے خاص خاص مجموعے تیار کر لیے گئے۔ اسی طرح ان کے فتاویٰ بھی جمع کر لیے گئے۔ آج ان تفسیروں کے متعدد مخطوطات اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں جنہیں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

ابن عباسؓ نے عہدِ طفولیت سے وفاتِ نبوی تک آٹھ دس سال کی مدت رسولِ اکرمؐ کی صحبت میں بسر کی۔ آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ کبارؓ کی صحبت اختیار کی۔ اور ان سے آنحضرتؐ کی احادیث سننے اور یاد کرنے کا خاص اہتمام کیا۔ کتبِ احادیث میں ان سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث مروی ہیں۔

خوش اخلاقی، وجاہت اور تفقہ فی کتاب اللہ کے باعث حضرت عمرؓ ان کی بے حد قدر کرتے اور مشکل مسائل میں ان سے مشورہ لیا کرتے اور اکثر ان کی رائے پر عمل کرتے اور کہا کرتے تھے کہ ابنِ عباسؓ تم سب سے بڑے عالم ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ وہ تفسیر قرآن مجید میں یوں لگتا ہے کہ شفاف پردے کے پس منظر سے غیب کی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ ابنِ مسعودؓ کا قول ہے کہ وہ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔ ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اسے امّتِ محمدیہ میں سے ابنِ عباسؓ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ التفسیر والمفسرون کے مؤلف محمد حسین الذہبی نے عبداللہ بن عباسؓ کے بلند مرتبہ علمیت کے پانچ اسباب گنوائے ہیں۔ (۱) حضرت محمد صلعم نے ابنِ عباسؓ کے لیے دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ اسے کتاب و حکمت کا علم، دین کی سمجھ اور تاویل قرآن کا فہم عطا کر۔ (۲) خانوادۂ نبوت میں تربیت ہوئی (۳) کبار صحابہؓ کی صحبت (۴) قوتِ حافظہ کے ساتھ لغت و ادبِ عربی کا حفظ ہونا (۵) انہیں اجتہاد کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔

اسلامی افواج کے ساتھ بہت سے معرکوں میں بھی شریک ہوئے مثلاً معرکۂ مصر، معرکہ افریقہ، معرکہ ہائے جرجان و طبرستان۔ اس کے بہت دن بعد

وہ قسطنطنیہ کی مہم پر بھی گئے۔ جنگ جمل اور صفین میں وہ حضرت علیؓ کے لشکر میں ایک بازو کے سپہ سالار تھے۔ وہ خلفائے راشدین دوم و سوم حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کے مشیروں میں سے تھے اور وہ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ وہ حضرت علیؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت امام حسینؓ کے بھی مشیر تھے۔

ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے سے پہلے سیاست میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اور حضرت علیؓ کے عہد میں بھی انھوں نے سیاست میں عملی طور پر زیادہ سے زیادہ تین چار سال حصہ لیا۔

حضرت عثمان نے انہیں اپنی خلافت کے آخر میں اس وقت امیر حج مقرر کیا جب وہ مدینے میں اپنے مکان میں محصور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت ابن عباسؓ مدینہ میں موجود نہ تھے۔ اس کے کچھ دن بعد جب وہ مدینہ لوٹے تو انہوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس وقت سے انہیں اس شہر کا والی مقرر کر دیا گیا۔

۳۷ھ کے معاہدہ صفین پر دستخط ثبت کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔ جن کی رو سے قرار پایا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے جھگڑے کے فیصلے کے لیے دو حکم مقرر کیے جائیں۔

امام حسنؓ نے انہیں اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ اسی اثنا میں انہوں نے امیر معاویہؓ کے ساتھ مصالحت کی کوششیں شروع کیں لیکن یہ بات واضح نہیں کہ انہوں نے یہ کام خود اپنی مرضی سے کیا یا امام حسینؓ کے کہنے پر۔ غالباً یہ عبداللہ ابن عباسؓ ہی تھے جنہوں نے ان دو دعوے دارانِ خلافت کے درمیان مصالحت کروائی۔

امیر معاویہؓ کے طویل عہدِ خلافت میں ابن عباسؓ حجاز میں رہے۔ اس اثنا میں انہیں کئی بار بظاہر بنو ہاشم کے مفاد کی محافظت کے لیے جو ان کے اپنے بھی تھے، دربار خلافت میں دمشق جانا پڑا۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد جب عبداللہ ابن زبیرؓ نے مکہ میں بغاوت کا علم بلند کیا اور متوازی خلافت قائم کر لی تو وہ ابن عباس کے طرز عمل پر سخت برافروختہ ہوئے۔ کیونکہ ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے بیٹے ابن حنفیہ نے انہیں خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ دونوں کو مکے سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ۶۴ھ میں جب مکے کا محاصرہ ہوا تو وہ واپس مکے آ گئے لیکن انہوں نے ابن زبیرؓ کی مخالفت جاری رکھی۔ اس کے نتیجے میں ان دونوں (ابن عباسؓ اور ابن حنفیہ) کو قید کر دیا گیا۔

جب مختار کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے کوفے سے سواروں کا ایک دستہ بھیجا اس دستے نے اچانک چھاپہ مار کر انہیں رہائی دلائی۔ اس بات کا سہرا ابن عباسؓ کے سر ہے کہ اس موقع پر مکہ کا مقدس شہر خونریزی سے بچا رہا۔

زندگی کے آخری ایام میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ طائف میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں ۶۸ھ/۶۸۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ حضور اکرم صلعم سے تعلق و نسبت کی وجہ سے صحابہؓ کرام سے بہت عزت و تکریم سے پیش آتے تھے۔ جب وہ والی بصرہ تھے تو حضرت ابوایوب انصاریؓ ان کے پاس آئے اور ان سے اپنی احتیاج کا ذکر کیا تو انہوں نے رسولِ اکرم کی مہمانی کے سلسلے میں ابوایوب انصاریؓ کی خدمات کے پیش نظر دل کھول کر ان کی اعانت فرمائی۔ چالیس ہزار درہم اور بیس خادموں کے علاوہ گھر کا سارا اثاثہ ان کے حوالے کر دیا۔

عبداللہ بن عبداللہ بن ابی

نام عبداللہ۔ قبیلہ خزرج۔ خاندان حبلی۔ عبداللہ بن ابی (آپ کا والد) مشہور منافقین میں سے تھا، اپنے خاندان میں وہ اپنی قوت، اثر و رسوخ اور عقل و فہم کے باعث اتنا ممتاز تھا کہ لوگ اسے مدینے کا بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن رسولِ اکرم صلعم کی آمد کی وجہ سے اسے یہ عزت حاصل نہ ہو سکی اس لیے وہ اسلام کا دشمن ہو گیا۔ لیکن بظاہر اس نے اکثریتی قوت کو دیکھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ مگر اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح حضور اکرمؐ اور اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہا۔ لیکن عبداللہ بن عبداللہ بن ابی پر اپنے باپ کی عادات و افعال کا کچھ عکس و تاثر نہ تھا۔ آپ ہجرت سے قبل ہی مسلمان ہو چکے تھے اور تمام غزوات میں رسولِ اکرم صلعم کے رفیق تھے۔ جنگ بدر میں سامنے کے دو دانت شہید ہو گئے، اور ناک بھی جاتی رہی تھی۔ آپ نے اپنے باپ کی حرکات کے پیش نظر حضور اکرمؐ سے اسے قتل کرنے کی اجازت مانگی لیکن آپؐ نے اجازت نہ دی۔ عبداللہ بن ابی کی وفات پر انہوں نے حضور اکرمؐ سے اپنے باپ کی مغفرت کے لیے درخواست کی چنانچہ حضور اکرمؐ نے اپنی ایک قمیص اتار کر اسے کفن کے طور پر پہنائی اپنا لعاب دہن اس کے منہ پر مل اور خود نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا۔

حضرت عبداللہ نے ۱۲ھ میں جنگ یمامہ میں شہادت پائی۔ آپ کا شمار افضل صحابہ میں ہوتا ہے۔ آپ کاتب وحی بھی تھے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن مناف بن قصی۔ حضور اکرم صلعم کے والد ماجد ان کی اور ابوطالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران مخزومی تھیں۔ جناب عبداللہ اور ام حکیم البیضا توام پیدا ہوئے تھے۔ عبداللہ جناب عبدالمطلب کی آخری اولاد تھے۔ "سیرۃ النبی" کے مطابق ان کے [illegible] بھائی تھے۔ ان میں زبیر، ابوطالب، ابولہب، حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ کسی نہ کسی خصوصیت، اسلام یا کفر کی وجہ سے مشہور ہیں۔

ان کی ولادت غالباً ۴۵۵ء میں ہوئی۔

ان کی زندگی کے اہم واقعات میں ان کی قربانی کا واقعہ ہے۔ حضرت عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کر دی تو قرعہ [illegible] عبداللہ کے نام نکلا۔ بعد میں بہنوں کی التجا اور قریش کی [illegible] سے عبداللہ کی قربانی کی بجائے سو اونٹوں کی قربانی دی گئی۔ [illegible] حضور اکرم صلعم [illegible] الذبیحین حضرت اسمعیل اور عبداللہ والد رسول اکرمؐ [illegible]۔

جناب عبداللہ کی شادی قبیلۂ زہرہ کی معزز خاتون حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے ہوئی۔ شبلی نے سیرۃ النبی میں اس وقت ان کی عمر ۱۷ برس سے کچھ زیادہ اور الزرقانی نے ۱۸ برس لکھی ہے۔

قریش تجارت پیشہ لوگ تھے۔ جناب عبدالمطلب کے بیٹوں کا بھی یہی شغل تھا۔ الزرقانی کی روایت کے مطابق جناب عبداللہ نکاح کے بعد قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے جہاں قریش عموماً جایا کرتے تھے مگر وہاں بیمار ہو گئے۔ واپسی پر چونکہ کمزوری زیادہ تھی اس لیے مدینے ہی میں ٹھہر گئے۔ وہ

ایک ماہ تک علیل رہے۔ یہاں بنو نجار نے تیمار داری کی۔ ادھر قافلے والوں نے مکے آکر عبدالمطلب کو خبر کی۔ عبدالمطلب نے اپنے صاحبزادے حارث کو اور الزرقانی کی روایت کے مطابق زبیر کو مدینے روانہ کیا لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ الزرقانی کے مطابق یہ واقعہ یکم رمضان (اکتوبر ۵۷۰ء)، عام الفیل سے چار ماہ ۱۷ دن پیشتر مدینے پیش آیا۔ وہ وہیں دفن ہوئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ عبداللہ الابواء میں دفن ہیں لیکن طبری کی روایت کے مطابق ان کی قبر مدینے میں موجود ہے۔

وفات کے وقت عبداللہ کی عمر تقریباً ۱۸ سال تھی۔ اس وقت عیسوی سن شاید ۵۷۰ تھا۔ البلاذری وغیرہ نے ۲۵، ۲۸ اور ۳۰ سال لکھی ہے۔

عبداللہ کی واحد اولاد حضور اکرم صلعم تھے جو وفات کے چھ ماہ بعد (ربیع الاول عام الفیل) میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید میں آپؐ کو یتیم کہا گیا ہے۔ شبلی نعمانیؒ کے مطابق عبداللہ نے ترکے میں پانچ اونٹ، کچھ بکریاں، ایک تلوار اور ایک لونڈی ام ایمن نامی چھوڑی تھی جو آنحضرت صلعم کو ورثے میں ملیں۔

عبداللہ بن عتبہ

عبداللہ بن عتبہ بن مسعود الہذلی، حضرت عبداللہ بن مسعود کے بھتیجے۔ کوفہ کے ممتاز تابعین میں سے تھے۔ گو بعض اوقات ان کا ذکر غلط طور پر صحابہ کے زمرہ میں بھی آتا ہے۔ حضورؐ کی حیات مبارک میں پیدا ہوئے اور جب حضورؐ کے سامنے انہیں پیش کیا گیا تو آپؐ نے ان کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور دعائے خیر و برکت کی۔

عبداللہ بن عتیک

عبداللہ خاندان سلمہ۔ ہجرت سے پیشتر مسلمان ہوئے۔ اور بدر کے سوا وہ سب جنگوں میں شریک ہوئے۔ ۶ھ میں آنحضرتؐ نے چار آدمیوں کے ہمراہ ابو رافع کے قتل کے لیے خیبر بھیجا۔ ابو رافع قبیلہ غطفان کا ایک متمول تاجر تھا جو غطفانیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر جنگ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ حضرت عبداللہ نے کمال بہادری سے اس کے مکان میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ اور کوٹھے پر سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرنے سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی مگر بچ کر چاروں ہمراہیوں سمیت رسول اکرم صلعم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ رسول اللہؐ نے اپنے دست مبارک سے اس ہڈی کو جوڑا جس سے وہ ٹھیک ہو گئے۔

۹ھ میں بنو طے کا بت توڑنے کے بعد جو مال و زر حضرت علیؓ اپنے ہمراہ لائے تھے اس کی حفاظت حضرت عبداللہ کے سپرد تھی۔ حضرت عبداللہ کے زمانۂ خلافت میں جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ آپ بہت بہادر اور باہمت صحابی تھے۔ مسند میں ایک حدیث بھی آپ سے روایت ہے۔

عبداللہ بن علی

عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح اور خلیفہ ابوجعفر منصور کا چچا۔ عبداللہ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کے خلاف بنو عباس کی جد و جہد میں سب سے بڑھ چڑھ کر سرگرم حصہ لینے والوں میں سے ایک تھا۔ وہ زاب کبیر کی فیصلہ کن جنگ میں، جس میں مروان اپنا تاج و تخت کھو بیٹھا، عباسی افواج کا سپہ سالارِ اعظم تھا۔ جب مروان بھاگ نکلا تو عبداللہ نے اس کا تعاقب کیا اور بسرعت دمشق پہ قبضہ کر کے فلسطین کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے بھاگتے ہوئے خلیفہ کا مصر تک تعاقب کیا۔

وہ خاندانِ بنو امیہ کے خلاف تلوار کو بے نیام رکھنے کے معاملے میں اپنے بھائی داؤد بن علی سے بھی زیادہ بے رحم اور سنگدل تھا۔ اور اس نے اس کے کلی استیصال کرنے میں کسی قسم کی کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی۔ رملہ (فلسطین) میں بنو امیہ کے اسّی افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس ظلم و ستم نے طبعی طور پر نئے حکمران کے لیے نفرت کے احساسات کو جنم دیا اور اس کے نتیجے میں معاویہ کی اولاد میں سے ایک شخص کے زیر اثر ایک خطرناک بغاوت پھوٹ پڑی۔ ابتدا میں باغیوں نے ایک عباسی دستے کو شکست بھی دی لیکن بعد ازاں عبداللہ نے انھیں ہزیمت دی۔ بعد میں عبداللہ والیٔ شام کی حیثیت سے نئے خاندان کی بقا کے لیے خطرے کا باعث بن گیا۔ سفاح کی وفات پہ اس نے خلافت کا دعوےٰ کر دیا جس کی بنیاد اس پہ تھی کہ اس نے بنو عباس کی حکمرانی کے لیے بنو امیہ کے خلاف جنگ کے دوران میں اہم خدمات سرانجام دی ہیں اور اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ سفاح نے اسے اپنے بعد خلیفہ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس فوج کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ جو درحقیقت اس لیے تھی کہ وہ اسے اپنی قیادت میں رومیوں کے خلاف مہم پر لے جائے گا۔ جب اسے پتہ چلا کہ خراسان کے طاقتور والی ابومسلم نے منصور کی خلافت کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے اور فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے آ رہا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے لشکر کے سترہ ہزار خراسانی قتل کروا دیے۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ یہ لوگ کسی حال میں بھی ابومسلم کے خلاف نہیں لڑیں گے باقی ماندہ لشکر لے کر وہ ابومسلم کے مقابلے کے لیے بڑھا لیکن ابومسلم نے نصیبین کے مقام پہ اسے شکست دی اور اسے بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان والیٔ بصرہ کے پاس پناہ لینا پڑی۔ دو سال بعد معزول ہو گیا اور عبداللہ کو خلیفہ منصور کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا کوئی سات سال وہ قید میں رہا۔ بعد ازاں اُسے ایک ایسے مکان میں لے گئے جس کی بنیادیں عمداً کھود ڈالی گئی تھیں۔ یہ مکان اس پہ گر پڑا اور وہ اس کے ملبے کے نیچے دب کر مر گیا۔

وفات کے وقت اس کی عمر باون برس بیان کی جاتی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ

نبی اکرم صلعم کے مشہور صحابی۔ قریش مکہ کے معزز گھرانے کے نامور فرزند اور احادیث نبویؐ کے شہرہ آفاق راوی۔ جن سے ۲۶۳۰ حدیثیں روایت ہیں۔ ان کا شمار مفتی صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ وہ ساٹھ سال تک افتا کے سلسلے میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔

جب مسلمان جذبات کا شکار ہو کر اور بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے خانہ جنگی میں الجھ گئے۔ تو اس وقت بھی ابن عمر ان تمام معاملات سے الگ تھلگ رہے وہ تعلیمات اسلامی پہ اس باقاعدگی سے عمل پیرا تھے کہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بن گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو تلاش ہونے لگی کہ وہ پہنتے کیا تھے اور ریش مبارک کو کس طرح تراشتے اور خضاب لگاتے تھے۔

کتب سیر میں ان کی فطری ذہانت، کمال تقویٰ، حلم و انکسار، اعتدال اور قناعت پسندی کی روشن مثالیں ہیں۔ ان کی بلند شخصیت، علمی حیثیت

اور روحانی عظمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

بحیثیت وہ حد درجہ محتاط تھے۔ روایت میں وہ اپنی طرف سے نہ کوئی کمی کرتے تھے اور نہ بیشی۔

انہیں تین بار خلافت پیش کی گئی۔ پہلی بار حضرت عثمانؓ کی شہادت کے فوراً بعد، دوسری بار اس گفتگو کے دوران میں جب صفین کے مقام حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے تنازعے کو ختم کرنے کے لیے دو حکم مقرر ہوئے تھے اور تیسری دفعہ یزید اول کی وفات پر، لیکن انہوں نے تینوں مرتبہ یہ پیشکش مسترد کر دی۔ وہ متفقہ انتخاب کے خواہاں تھے اور حصول خلافت کے سلسلے میں خونریزی سے بچنا چاہتے تھے، اس کی وجہ بے حوصلگی نہیں تھی۔

ابن عمر کے حالات زندگی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ وہ ہجرت سے تقریباً دس سال پہلے پیدا ہوئے، اور اپنے والد کے ہمراہ اسلام لائے۔ لیکن والد سے کچھ پہلے ہجرت کی۔ جب وہ جنگ بدر اور جنگ احد میں جہاد کے لیے حاضر ہوئے تو رسول اکرم صلعم نے انھیں ان کی کم سنی کے باعث واپس کر دیا۔ لیکن محاصرہ مدینہ کے وقت جس کو جنگ خندق کہتے ہیں۔ انہیں جہاد کی اجازت مل گئی۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ بعدازاں وہ موتہ کی سخت مہم اور فتح مکہ میں شامل ہوئے نیز نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کے خلاف جہاد میں حصّہ لیا۔ مہم مصر، جنگ نہاوند، مہم جرجان وطبرستان اور یزید کی مہم قسطنطنیہ میں شریک ہوئے

سیاسی معاملات میں وہ پہلی مرتبہ اس وقت نمایاں ہوئے جب حضرت عمرؓ نے وفات سے پہلے انہیں مجلس شوریٰ کا مشیر مقرر کر دیا جس کا کام اپنے ارکان میں سے خلیفہ کا انتخاب کرنا تھا۔ لیکن انہیں ووٹ دینے کا حق صرف اس وقت تھا جب بقیہ ارکان برابر برابر دو حصوں میں منقسم ہوں اور یہ وصیت بھی تھی کہ ان کا ہرگز بطور خلیفہ انتخاب نہیں کیا جائے گا اور نہ وہ اپنے انتخاب کے لیے اپنا ووٹ استعمال کر سکتے ہیں دیگر خلفاء کے انتخاب میں انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی اکثریت کا ساتھ دیا۔ البتہ انہوں نے یزید کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بظاہر وہ اس روش کے خلاف تھے۔ جو حضرت امیر معاویہؓ نے جانشینی کے فیصلے میں اختیار کی تھی۔ لیکن جب حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی تو انہوں نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں تامّل نہیں کیا۔ وہ سلطنت کے کسی بڑے انتظامی عہدے پر فائز نہیں ہوئے۔ ہاں چند سفارتوں میں ضرور شامل تھے۔ غالباً وہ ان کاموں سے جان بوجھ کر علیحدہ رہے۔

انھوں نے اپنی تمام زندگی علمی و مذہبی مشاغل کے لیے وقف کر دی تھی روایت ہے کہ انہوں نے منصب قضا محض اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ کہیں احکام شریعت کی تعبیر میں ان سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔

عبداللہ ابن عمرؓ نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ حج کے موقع پر جب حاجیوں کا ہجوم عرفات سے لوٹ رہا تھا تو حجاج کے ایک سپاہی نے اپنے نیزے کی نوک ان کے پاؤں میں چبھو دی تھی۔ جب حجاج ان کی عیادت کے لیے گیا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس سپاہی کو پہچان سکتے ہیں تاکہ اسے سزا دی جا سکے تو انہوں نے حجاج کو ملامت کی کہ اُس نے اپنے سپاہیوں کو مقامات مقدسہ پر ہتھیار لے کر آنے کی اجازت کیوں دی۔

ابن عمر کو حدیث میں سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ حضور اکرمؐ کی اکثر مجالس میں شریک رہنے کی کوشش کرتے اور اگر کبھی غیر حاضر رہ جاتے تو حاضرین مجلس سے آپؐ کے ارشادات دریافت کر لیتے۔

عبداللہ بن عمر بن حرام

نام عبداللہ، کنیت ابوجابر۔ قبیلہ بنو سلمہ۔ مشہور صحابی ابوجابر کے والد اپنے قبیلے کے ممتاز فرد تھے۔ بعثتِ نبوی کے تیرھویں سال ایمان لائے اور بنو سلمہ کے نقیب مقرر ہوئے۔ غزوہ بدر میں شرکت کی اور غزوہ احد میں ۳ھ میں وفات پائی۔ انھوں نے حضرت جابرؓ کے علاوہ نو بیٹیاں چھوڑیں۔ وفات سے پہلے حضرت جابرؓ کو نصیحت کی کہ اپنی بہنوں کی نگہداشت کرنا اور میرا قرض ادا کرنا۔ حضرت جابرؓ نے حرف بحرف تعمیل کی۔ اشاعت اسلام میں آپؓ نے بہت زیادہ سرگرمی دکھائی۔ کردار کے لحاظ سے بھی افضل اور ممتاز صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے۔ چھ ماہ بعد حضرت جابرؓ نے قبر کھود کر لاش نکال لی تاکہ انھیں علیحدہ دفن کریں۔ دیکھا کان کے سوا باقی تمام جسم صحیح و سالم تھا گویا ابھی دفن کیے گئے ہوں۔

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

نام عبداللہ، کنیت ابو محمد اور ابو عبدالرحمٰن۔ والد کا نام عمرو بن العاص اپنے والد سے پہلے مسلمان ہوئے اور رسول اکرمؐ کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی۔ آپ لکھنا جانتے تھے۔ چنانچہ جو رسول اللہؐ سے سنتے تھے فوراً لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے اس لیے بہت سی احادیث آپ سے منسوب ہیں۔ زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اہل و عیال سے کنارہ کش ہو کر ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے۔ عہد نبوی کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگ یرموک میں نمایاں حصّہ لیا۔ جنگ صفین میں والد کی وجہ سے امیر معاویہؓ کی حمایت کی۔

۶۵ھ میں فسطاط کے مقام پر وفات پائی۔ بہت بڑے عالم [illegible] تھے۔ رسول اللہؐ کی احادیث کا سب سے پہلا مجموعہ انہوں نے [illegible] کا نام صادقہ رکھا۔ آپ کی مرویات کی تعداد ۷۰۰ ہے۔ جن میں سے [illegible] بخاری اور امام مسلم دونوں متفق ہیں۔

آپ کو والد سے ورثے میں بہت دولت ملی تھی۔ [illegible] مالیت کی ایک جاگیر تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو [illegible]

عبداللہ بن قیس انصاری

عبداللہ بن قیس کے متعلق محمد بن اسحاق ابو معشر محمد بن [illegible] بن محمد بن عمارۃ الانصاری نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے کہ وہ جنگ [illegible] ہونے والے مجاہدین میں سے تھے لیکن موسیٰ بن عقبہ نے [illegible] اصحاب بدر کے ساتھ نہیں کیا۔ غزوہ احد میں [illegible]

عبداللہ بن مبارک

(۱۱۸ھ - ۱۸۱ھ)۔ مرو کے رہنے والے تھے۔ علم حدیث کے بہت [illegible] امام تھے۔ ان کی بلندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین ان کو "امیر المومنین فی الحدیث" کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور امام صاحب کے ساتھ ان کو خاص عقیدت تھی۔ [illegible] تھا کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا ہے امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوریؒ کے فیض کے طفیل ہے۔

حدیث کے مشہور امام بخاری اور امام مسلم ان کے تلامذہ میں سے ہیں ۔

عبداللہ بن مسعود

عبداللہ ابن مسعود ابو عبدالرحمٰن ۔ صحابیٔ رسول ۔ ۱۲ عام الفیل میں پیدا ہوئے ۔ رسول اللہ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے بیشتر کی طرح وہ بھی معاشرہ مکہ کے ادنیٰ طبقے میں سے تھے ۔ جوانی میں عقبہ بن ابی معیط کے مویشی چراتے تھے ۔ اسی لیے بعد کے زمانے میں سعد بن ابی وقاص نے ایک بحث کے دوران میں انہیں ایک ہذلی غلام کہا تھا ۔

انہیں عام طور پر بنی زہرہ کا حلیف بتایا جاتا ہے ۔ عبداللہ کا بھائی عقبہ اور ان کی ماں اُم عبد قدیم تر صحابہ میں سے ہیں ۔

ان کے قبول اسلام کو ایک معجزہ سمجھا گیا ہے جب حضور اکرم صلعم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر رہے تھے تو ان کی ملاقات اس دوران عبداللہ سے ہوئی جو بکریوں کا ایک ریوڑ چرا رہے تھے ۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضور اکرم صلعم نے دودھ مانگا تو عبداللہ نے اپنی ایمانداری کے باعث ان بکریوں کا دودھ دینے سے انکار کر دیا ۔ اس پر حضور اکرم صلعم نے ایک بن دودھ کی بھیڑ کو پکڑ لیا اور اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا ۔ تھن بڑے ہو گئے اور ان میں بہت مقدار میں دودھ نکل آیا ۔ اس کے بعد آنحضرت صلعم نے اس کے تھنوں کو ویسا ہی کر دیا جیسے کہ وہ تھے

عبداللہ بن مسعود اولین صحابہ میں سے تھے چنانچہ وہ فخریہ طور پر اپنے آپ کو چھٹا یا سے چھٹا کہا کرتے تھے ۔

دوسری روایات کے مطابق وہ اس وقت ایمان لائے جبکہ آنحضرت صلعم ابھی ارقم کے گھر میں نہیں گئے تھے ۔ بلکہ وہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے بھی ایمان لائے ۔ قبول اسلام کے وقت ان کی عمر انیس بیس سال تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مکہ میں سب سے پہلے علی الاعلان قرآن مجید پڑھا ۔ حالانکہ ان کے دوست انہیں اس بات سے روکتے تھے ۔ کیونکہ ان کی پشت پر ان کی حفاظت کے لیے ان کا اپنا قبیلہ کوئی نہیں تھا ۔ روایات کی رو سے وہ دو بار حبشہ گئے تھے ۔

مدینے میں بھی وہ مسجد نبوی کی پشت پر رہتے تھے ۔ عبداللہ اور ان کی والدہ کا حضور اکرم صلعم کے گھر میں آنا جانا کافی تھا ۔

عبداللہ کی ٹانگیں پتلی تھیں، بال سرخ اور لمبے تھے ۔

جنگ بدر میں ابوجہل سخت زخمی ہو گیا تو وہ اس کا سر کاٹ کر آنحضرت صلعم کے پاس لائے ۔ عبداللہ نے یرموک کی جنگ میں بھی حصہ لیا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے فتنہ ارتداد کے دوران جن لوگوں کو مدینے کے کمزور مقامات کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا ۔ عبداللہ ان میں شامل تھے ۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفے کے بیت المال کے انتظام اور اسلام کی تلقین کے لیے بھیجا ۔

قرآن اور سنت کا عالم ہونے کی وجہ سے لوگ اکثر ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ ان سے ۸۴۸ احادیث مروی ہیں ۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آنحضرت کی کوئی حدیث بیان کرتے وقت ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا ۔ یہاں تک کہ ان کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا ۔ جو کچھ بیان کرتے نہایت احتیاط سے بیان کرتے مبادا کوئی غلط بات کہہ دیں ۔ حرمت شراب کی ایک نرم تر تعبیر ان سے منسوب کی جاتی ہے ۔

ان کے انجام کے متعلق متضاد روایات ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں ان کے کوفے کے عہدے سے معزول کر دیا تھا ۔ جب لوگوں کو خبر ملی تو انہوں نے روکنا چاہا لیکن انہوں نے کہا "مجھے جانے دو کیونکہ اگر فتنے برپا ہونے والے ہیں تو میں ان کا باعث نہیں بننا چاہتا" ۔ ایک اور حوالے میں ان کی معزولی حضرت عثمانؓ سے منسوب ہے ۔ وہ مدینے واپس چلے آئے اور ۳۲ یا ۳۳ھ میں ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر پا کر وفات پائی ۔

انہوں نے زبیرؓ کو اپنا وصی مقرر کیا ۔ ایک روایت میں ان کی وفات کوفے میں ہوئی ۔

عبداللہ کی زیادہ تر شہرت محدث و مفسر قرآن کی ہے ۔ مسند احمد میں ان کی روایات کردہ احادیث جمع ہیں ۔

عبداللہ بن مغفلؓ

کنیت ابوسعید ۔ ۶ھ میں مسلمان ہوئے ۔ غزوۂ حدیبیہ اور بعد کے سب غزوات میں رسول اللہ کے ساتھ شریک ہوئے ۔ حضرت عمرؓ نے انہیں اپنے دورِ خلافت میں بصرہ میں مسلمانوں کی دینی تعلیم پر مامور کیا ۔ عراق کی مہم میں بھی مجاہدانہ شرکت کی ۔ بصرے میں وفات پائی ۔ آپ کافی عرصہ تک حضورؐ کی خدمت میں رہے اس لیے بہت سی احادیث سننے کا موقع ملا ۔ آپ سے ۴۳ احادیث منسوب ہیں جو کتبِ احادیث میں درج ہیں ۔

عبداللہ بن میمون اہوازی

اہواز کا ایک باشندہ ۔ اہواز مضافات کوفہ میں ہے ۔ یہ شخص شعبدہ کے فنون کا ماہر تھا ۔ سحر و طلسمات میں ید طولیٰ رکھتا تھا ۔ نبوت و مہدویت کا دعوے دار تھا ۔ ابتدا میں حضرت امام جعفر صادقؒ اور ان کے صاحبزادے اسماعیل کی خدمت میں رہا کرتا تھا ۔ اسمٰعیل کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد کے پاس رہنے لگا ۔ محمد ہی کے ساتھ وہ مصر گیا ۔ اس نے محمد کی وفات کے بعد ان کے غلام کو جس کا نام مبارک تھا اس غرض سے کوفہ بھیجا کہ لوگوں کو مذہب اسماعیلیہ کی دعوت دے وہاں وہ اسمٰعیلی مذہب کے داعی کی حیثیت میں مدت تک کام کرتا رہا ۔ اسی اثنا میں عبداللہ بھی پہلے کوہستانِ عراق میں اور پھر شہر بصرہ میں جا کر اسمٰعیلی مذہب کی اشاعت و ترویج میں کوشاں رہا ۔

عبداللہ بن میمون کو باطنی فرقہ کا بانی سمجھا جاتا ہے جو صحیح نہیں ۔ باطنی فرقہ کا بانی دراصل عبداللہ کا باپ میمون بن دیصان تھا جو امام جعفر صادقؒ کا آزاد کردہ غلام تھا ۔ یہ شخص درپردہ اسلام کا بدترین دشمن تھا ۔ جب اسے والیٔ عراق نے کسی جرم میں قید کیا تو اس نے عزم کیا کہ اسلام میں الحاد کے جراثیم شامل کر کے اسے بگاڑ دے گا ۔ چنانچہ اسی قید خانے میں اس نے باطنی مسلک کے اصول قائم کیے ۔ قید سے رہا ہونے کے بعد میمون نے اپنے بیٹے عبداللہ کو پہلے تو شعبدہ بازی اور ڈھنڈ بندی سکھائی اور پھر اپنے ملحدانہ مسلک کی تعلیم دی ۔ اس سے پیشتر عبداللہ نے مسلمان ہو کر اسمٰعیلی مذہب اختیار کر چکا تھا اور اسماعیلیہ کا سرگرم رکن تھا ۔

عبداللہ کو اپنے باپ کے وضع کردہ اصول پسند آئے اور اس نے باپ کا مذہب اختیار کر لیا اور باطنی مسلک کی دعوت و تبلیغ شروع کر دی اور یہ مسلک مختلف علاقوں میں بہت پھولا پھلا ۔ کیونکہ اس میں حد درجہ کی آزادی اور بے باکی تھی لہذا اس میں روز افزوں نفری میں اضافہ ہونے لگا ۔ لیکن میمون نے جب علمائے اہلِ سنت سے مناظرے کیے تو اس کو بہت شکست و ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔

بہرحال اس کی مقبولیت میں فرق نہ آیا۔ اسی دوران اس خوف سے کہ اہل سنت کے روسا انہیں گرفتار نہ کرلیں وہ فرار ہو کر مرو چلا گیا اور خفیہ طور پر اپنے مسلک کی تبلیغ کرتا رہا۔ وہاں سے وہ رے لوٹا لیکن دوران سفر ہی مر گیا۔

عبداللہ بن میمون کو باپ کی وفات سے اس درجہ صدمہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گیا اور جانبر نہ ہو سکا۔

عبداللہ بن نافع رض

صحابیٔ رسولؐ۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں مصر کے حاکم مقرر ہوئے۔ افریقہ کی مہم سے کامیابی کے ساتھ لوٹنے پر حضرت عبداللہ بن سعد جب واپس لوٹے تو انھیں دوسری ذمہ داریاں سونپ دی گئیں اور ان کی جگہ عبداللہ بن نافع کو حاکم مصر مقرر کیا گیا۔ اس کے اس ذمہ داری کے سنبھالتے ہی قسطنطنیہ پھر جنگی تیاریاں کرنے لگا۔ ۲۸ھ میں اس نے ایک بحری فوج افریقہ کی جانب روانہ کی۔ رومی فوج نے اہل افریقہ سے ادائے خراج کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر طرفین میں مقابلہ ہوا اور رومیوں نے فتح حاصل کر کے سکندریہ کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں حضرت عبداللہ بن نافع رض مدافعت کے لیے نکلے۔ ادھر خود قیصر روم ایک زبردست فوج لے کر عازم سکندریہ ہوا۔ رومیوں کی دونوں فوجیں وہاں جمع ہو گئیں اور اسلامی لشکر کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ آخر رومی ناکام و نامراد پسپا ہو کر اپنے جنگی مرکز قبرص کی طرف چلے گئے۔

عبداللہ بن وہب

راسبی۔ خارجی سردار۔ اس کا تعلق قبیلہ بجیلہ سے تھا اور یہ صنجاعت و تقویٰ میں معروف اور "ذوالثفنات" کے لقب سے مشہور تھا۔ یعنی گھٹنوں والا۔ یہ گھٹے اس کی پیشانی پر کثرت سجود سے پڑ گئے تھے۔ وہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے تحت عراق میں اور حضرت علی رض کے تحت صفین میں شریک ہوا۔ لیکن جب حضرت علی رض نے اپنی طرف سے حکم مقرر کیا تو حضرت علی رض سے الگ ہو کر حرورا میں ان کا ساتھ چھوڑ دینے والوں میں شامل ہو گیا۔

شوال ۳۷ھ میں خارجیوں نے کوفہ کو آخری دفعہ چھوڑنے سے ذرا پہلے اسے اپنا سپہ سالار (امیر) چن لیا۔

وہ ۹ صفر ۳۸ھ کو جنگ نہروان میں مارا گیا۔

عبداللہ بن یاسر

آپ عمار بن یاسر کے بھائی تھے۔ اپنے والد یاسر کے ہم نشین و ہم مجلس تھے۔ عمار بہت بلند پایہ صحابہ میں سے ہیں۔ یاسر اور ان کے بیٹے مکہ میں مسلمان ہو کر فوت ہوئے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہیں فی سبیل اللہ کفار نے نہایت سخت اذیتیں پہنچائیں۔

عبداللہ روپڑی

(۱۳۰۲ھ/۸۵-۱۸۸۴ء — ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء) مشہور محدث

نام عبداللہ۔ کنیت ابو احمد۔ والد کا نام میاں روشن دین۔ آباؤ اجداد امین آباد ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں ان کے کسی بڑے کبیر نامی شخص کو کمیر پور میں جاگیر ملی تھی اس نے اپنے بڑے بھائی کمیر کو بھی یہاں بلا لیا۔

کمیر پور اسی نام سے مشہور ہوا۔ مولانا عبداللہ کے والد انہی کی اولاد سے ہیں۔ مولانا کی پیدائش یہیں ہوئی۔ کچھ مدت بعد ان کے والد نے کمیر پور سے سکونت ختم کر کے چھانگا مانگا میں رہائش اختیار کی تو حافظ صاحب کی عمر اڑھائی برس کی تھی۔ وہیں قرآن مجید آٹھ برس کی عمر میں حفظ کیا۔ ان کے بڑے بھائی میاں رکن دین مزید تعلیم کے لیے "لکھوکے" آئے تو انہیں بھی اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر میرٹھ چلے گئے۔ وہاں نعمانیہ مدرسہ جو اونچی مسجد والا کے نام سے مشہور تھا، میں ایک سال رہے۔ پھر ان کے والد نے انہیں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے مدرسہ غزنویہ امرتسر بھیج دیا۔ اس مدرسہ میں آپ کی ابتدائی تعلیم مکمل ہوئی اور عمل تربیت بھی مولانا عبدالجبار نے کی۔ سند فراغت حاصل کر کے آپ دہلی چلے گئے۔ دہلی کے مشہور محدث استاذ میاں نذیر حسینؒ آٹھ برس قبل وفات پا چکے تھے۔ دہلی میں آپ نے تین سال قیام کیا اور منطق و فلسفہ، فقہ و اصول فقہ پر عبور حاصل کیا۔ اجازت حدیث کی سند آپ نے حافظ پنجاب عبدالمنانؒ وزیرآبادی سے حاصل کی۔ دہلی سے آپ مدرسہ [illegible] رام پور چلے گئے۔ وہاں سے بھی علمی تشنگی بجھائی۔ [illegible] میں آپ روپڑ آ گئے اور یہاں مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ کچھ تصانیف آپ نے اسی دوران تصنیف کیں اور ساتھ ساتھ تنظیمی اور تبلیغی مقاصد کے لیے پندرہ روزہ "تنظیم اہل حدیث" جاری کیا جسے کچھ عرصہ بعد ہفت روزہ کر دیا گیا۔ جریدہ تنظیم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے سلیس عبارت میں تحقیق و تدقیق کے حامل مجتہدانہ [illegible] مشتمل [illegible] تھے۔ روپڑ اور اس کے نواح میں برسوں خصوصی علمی، اصلاحی اور تبلیغی کام کرنے کے سبب ہی شاید "روپڑی" آپ کے نام کا حصہ بن گیا۔ [illegible] تھے اور خود اپنے آپ کو امرتسری لکھا کرتے تھے۔ [illegible] برس پہلے آپ امرتسر مبارک مسجد آ گئے اور وہاں کا کام [illegible] روپڑی کے سپرد کر دیا۔ ۴۷ء میں لاہور آ گئے۔ یہاں مسجد قدس کی بنیاد رکھی [illegible] قائم کر دیا۔ درس و تدریس کا فریضہ بھی خود ہی سنبھالا۔ [illegible] ایک سال میں پڑھایا کرتے تھے۔

مولانا عبداللہ روپڑی کا شمار جماعت اہل حدیث کی [illegible] علماء و فضلاء میں ہوتا ہے جنہیں تمام مکاتب فکر کے علماء، محققین [illegible] نامور محدثین و فضلا کی تائید و حمایت اور عقیدت حاصل ہے۔

حافظ صاحب علوم قرآن و حدیث کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، صرف، نحو [illegible] و ادب، عقائد و کلام اور فنون لطیفہ میں تدریسا و تحریرا دسترس رکھتے تھے۔ [illegible] جو دنیائے علم کا انتہائی نازک موضوع ہے، میں یک گونہ بصیرت حاصل تھی۔

حضرت کی جلالت علم مسلمہ تھی۔ بڑے سے بڑے مسائل [illegible] ۲×۲ سے حل کرنے میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ نامور محقق بھی تھے [illegible] دائرہ بڑا وسیع تھا۔ سلف امت میں سے [illegible] کمی رہ گئی۔ حافظ صاحبؒ نے اس سے چشم پوشی نہیں کی [illegible] کی لکھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخری دنوں [illegible] حاشیہ لکھنا شروع کر دیا تھا مگر پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ [illegible] سب سے زیادہ خدمت خاندان دہلوی (کراچی)، خاندان غزنوی [illegible] اور خاندان روپڑی نے کی۔ حضرت روپڑی اس خاندان کے بانی ہیں۔ [illegible] آپ کے برادر زادہ مولانا عبدالقادر روپڑی [illegible]

محدث روپڑی نے اپنی زندگی میں تین حج کیے۔ [illegible] تبلیغ سے سرشار۔ [illegible] عبادت میں [illegible]

لباس میں سادگی شعار ۔ وعظ پر تاثیر ۔ مدلل اور سنجیدہ بحث و تحریر ۔ عقائد سلف صالح میں چٹان کی طرح ناقابل تسخیر تھے ۔ کھانا ایک وقت کھاتے ۔ سفر و حضر میں تہجد کبھی نہیں چھوڑی ۔ فرضی نماز ہمیشہ با جماعت پڑھی ۔ شمس العلما محمد حسین بٹالوی اور محدث مبارکپوری انہیں رازی و عارف رومی قرار دیتے تھے ۔ چند یوم علیل رہ کر ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو لاہور میں انتقال کر گئے ۔ گارڈن ٹاؤن لاہور میں دفن ہیں ۔

عبداللہ صحابیؒ ، سید

سید عبداللہ صحابیؒ ۔ صوفی بزرگ ۔ ان کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے ۔ ذکر خفی میں مشغول رہتے ۔ بچپن ہی سے یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے ۔ جوانی میں بھی روز مرہ کی زندگی میں پھنس کر ذکر الٰہی سے دور ہونا پسند نہیں کیا بلکہ تمام عمر مجرد رہ کر خدا کی یاد اور تسبیح میں گزاری ۔ الگ تھلگ رہ کر عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے ۔ اس لیے آپ کے حالات زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے اور کسی تذکرہ نگار نے آپ کا سن پیدائش و سن وفات نہیں لکھا ۔

سید عبداللہ گجرات میں اپنے دوستوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے اور ذکر خدا میں منہمک تھے کہ ان کے دوستوں نے سندھ کے حکمران مرزا شاہ بیگ ارغون (۹۲۴ھ تا ۹۳۸ھ) کی علم دوستی اور علم دوستی رعایا پروری کا حال سن کر گجرات سے ٹھٹھہ کا قصد کیا ۔ سید عبداللہ صحابیؒ بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ ٹھٹھہ آ گئے ۔ آپ چونکہ تنہائی میں ذکر خدا کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے ٹھٹھہ کی بجائے مکلی میں قیام کو ترجیح دی ۔ مکلی تقریباً ۲ میل لمبی ایک پہاڑی ہے جو ٹھٹھہ کے بالکل متصل ہے ۔ اس پہاڑی پر ان گنت (بعض کے نزدیک سوا لاکھ) اولیاء اللہ ، علماء و فضلاء ، سفراء ، مورخین ، حکمران اور یگانۂ روزگار ہستیاں مدفون ہیں ۔ اس لیے ٹھٹھہ کے اس قبرستان کو تاریخی حیثیت حاصل ہے ۔ مکلی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ٹھٹھہ کے متصل اور مکلی سے بالکل ملی ہوئی زمین کا نام ساموئی تھا ۔ اس کے زیریں حصے میں شیخ حماد جمالیؒ کی خانقاہ تھی ۔ سندھ کا حکمران جام تماچی سندھ کے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد شیخ حماد جمالی کی خدمت میں ایک بھاری رقم بطور نذر لے کر آیا تھا ۔ آپ نے اسے کہا کہ وہ ان کی خانقاہ کے متصل اس رقم سے ایک مسجد تعمیر کرا دے ۔ جام تماچی نے حکم کی تعمیل کی اور خانقاہ کے متصل ایک مسجد تعمیر کرا دی ۔ اسی زمانے میں ایک درویش جو حرمین شریف کی زیارت کے قصد سے سفر میں تھے اس مسجد میں مقیم ہوئے تو انہوں نے مسجد کے اردگرد واقع وسیع و عریض قبرستان میں غیر معمولی انوار و برکات محسوس کرنے کے بعد " یہی میرے لیے مکہ ہے " کہنا شروع کر دیا ۔ شیخ حماد جمالیؒ کو ان کی اس کیفیت سے آگاہی ہوئی ۔ انہوں نے اس مسجد کا نام مکلی رکھ دیا ۔ اس وقت سے وہ پہاڑی جس پر یہ مسجد واقع ہے مکلی کے نام سے مشہور ہو گئی ۔ اور آج اس وسیع قبرستان کے سارے علاقے کو مکلی کہتے ہیں ۔

سید عبداللہ مکلی میں جس جگہ ابتدا میں مقیم ہوئے تھے آخری عمر تک اسی جگہ سکونت پذیر رہ کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہے ۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کو اسی جگہ دفن کیا گیا ۔

سندھ میں شہباز قلندرؒ کے مزار کے بعد سب سے زیادہ ، عقیدت مندوں کا اژدحام آپ کے مزار مبارک پر ہوتا ہے اور ہر سال سندھ کے دور دراز کے علاقوں سے لاکھوں زائرین آپ کے سالانہ عرس کے موقع پر مزار پر حاضری دیتے ہیں ۔

عبدالمجید ، سلطان

عبدالمجید اوّل ۔ عثمانی سلطان ۔ سلطان محمود ثانی کا بیٹا ۔ ۱۴ شعبان ۱۲۳۸ھ / ۲۵ اپریل ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوا ۔ اس کی ماں "بزم عالم" غیر معمولی قابلیت کی ایک خاتون تھی ۔

عبدالمجید ۱۹ ربیع الآخر ۱۲۵۵ھ / یکم جولائی ۱۸۳۹ء کو اپنے باپ کی مسند پر بیٹھا ۔ یعنی نیزیب کی شکست کے چند روز بعد جو ترکوں نے ابراہیم پاشا سے کھائی ۔ تاہم اتحاد دول نے جس میں ترکی پہلی بار شامل ہوا تھا ۔ گو فرانس اس میں شامل نہ تھا ، سلطنت عثمانیہ کو بچا لیا ۔ عبدالمجید اول نے اپنے باپ کی نافذ کردہ اصلاحات کو جاری رکھا ۔

اس کے بعد کے اہم ترین واقعات میں سے ایک توکل خانہ کے خط شریف یا خط ہمایوں کے اعلان شاہی کا اجراء ہے ۔

اس کے عہد میں مسلسل فسادات ، بغاوتیں اور قتل عام رونما ہوتے رہے وضع قوانین کے علاوہ سلطان بہت سی اصلاحات کا بانی بھی ہے ۔ اس نے عسکری اور تعلیمی نظام میں خصوصاً اصلاحات کو فروغ دیا ۔ متعدد شفاخانے اور عمارات تعمیر کرائیں ۔ سرکاری اسناد و اوراق کے لیے سب سے پہلا " خزینۂ اوراق " اس نے بنوایا ۔ سب سے پہلا تھیٹر اسی کے عہد میں تعمیر ہوا ۔

عبدالمجید اول وہ پہلا سلطان تھا جو کوئی یورپی زبان (فرانسیسی) بول سکتا تھا ۔ وہ ایک زیرک اور مہذب ، چھریرے بدن کا آدمی تھا ۔ مگر اس کی صحت جرم کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے خراب رہتی تھی ۔ وہ فضول خرچ اور متلون مزاج تھا مگر دلیر تھا ۔

اس نے ۱۸۴۹ء میں پناہ گزینوں کو آسٹریا کے حوالے کرنے سے انکار کر کے عالم گیر سطح پر نیک نامی حاصل کی ۔ ترکی کی تاریخ میں ابھی تک اس سے زیادہ رحم دل ، شریف اور ایسے رجحانات سے مزین حکمران مذکور نہیں ہوا ۔ اس کے لطیف اور دلکش خدوخال اپنے اندر عالی حوصلگی کی روح رکھنے کی خبر دیتے تھے ۔

وہ ۱۷ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ / ۲۵ جون ۱۸۶۱ء کو جوان عمری ہی میں فوت ہو گیا ۔ اس کی وفات کے وقت اس کا ملک مالی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا ۔ اسے جامع سلطان سلیم کے نزدیک ایک معمولی سے مقبرے میں دفن کیا گیا ۔

عبدالمطلب بن ہاشم

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دادا ۔ قریش مکہ کے نامور سردار ۔ ان کا نام عامر ، کنیت ابوحارث اور لقب شیبہ ہے ۔ (انہیں فیاض اور مطعم (کھانا کھلانے والے) کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے) ۔

حضرت نبی اکرم صلعم کے پردادا ہاشم بن عبد مناف شام کے تجارتی سفر پر جاتے ہوئے مدینہ سے گزرے تو قبیلہ خزرج کے خاندان عدی بن نجار میں اپنے ایک دوست عمرو بن زید کے ہاں مہمان ٹھہرے ۔ اسی اثنا میں عمرو کی بیوہ صاحب زادی سلمٰی سے شادی کی صورت بن گئی ۔ نکاح کے بعد دونوں میاں بیوی مکہ چلے آئے ۔

اس قبیلے کے دستور کے مطابق بچے کی پیدائش سے پہلے ہاشم اپنی بیوی سلمٰی بنت عمرو کو لے کر اپنے سسرال یثرب میں آئے ۔ بیوی کو اس کے باپ کے گھر چھوڑا اور خود بغرض تجارت شام کا رخ کیا ۔ اتفاق یہ ہوا کہ فلسطین کے شہر غزہ میں

پہنچے تو ہاشم بیس پچیس برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ادھر سلمیٰ بنت عمرو کے ہاں عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ ان کے سر میں چند سفید بالوں کی وجہ سے انہیں "شیبۃ الحمد" پکارا گیا۔ مادری سلسلہ قرابت داری کے رواج کی بنا پر جو اس خاندان میں رائج تھا۔ ماں بیٹے یثرب ہی میں اپنے گھر میں رہے۔ یہ مدت قیام سات آٹھ سال ہے۔ ہاشم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہاشم کے بھائی مطلب اپنے ہونہار بھتیجے کو مدینہ سے مکہ لے آئے۔ یہ عام خیال ہے کہ اس بچے کا نام عبدالمطلب اس لیے پڑا کہ لوگوں نے غلطی سے انہیں مطلب کا غلام سمجھ لیا تھا۔

عبدالمطلب مکے کے سرکردہ رئیس، قریش کے نامور قائد اور سردار تھے۔ انہوں نے مکے کے نواحی قبائل مثلاً خزاعہ، کنانہ اور ثقیف سے حلف (اتحاد) کے معاہدے کر رکھے تھے۔ وہ طائف میں ایک کنوئیں کے مالک بھی تھے۔ ان کی خوشحالی کی ایک وجہ تو ان کی تجارت تھی جو وہ شام اور یمن سے کرتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انہیں سقایہ و افادہ (کعبے کے زائرین کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے) کا امتیازی حق بھی حاصل تھا۔ یہ حق انہیں اپنے باپ ہاشم سے وراثت میں ملا تھا۔ کئی کنوئیں، خاص طور پر چاہ زم زم کو ازسرنو کھدوانے کا سہرا انھی کے سر ہے۔ کیونکہ چاہ زم زم کو عمرو بن حارث جرہمی نے بند کر دیا تھا اور بہت مدت گزرنے کے بعد لوگ یہ بھول ہی گئے تھے کہ یہ کنواں کہاں تھا۔ عبدالمطلب تین راتیں مسلسل چاہ زم زم کو کھودنے کے بارے میں خواب دیکھتے رہے اور خواب ہی میں انھیں چاہ زم زم کی جگہ بھی دکھائی گئی۔

ان کی زیادہ تر اولاد کی ماں قبیلہ بنو مخزوم کی فاطمہ بنت عمرو تھیں۔ ان کے بطن سے عبداللہ (نبی اکرمؐ کے والد محترم) اور ابوطالب بھی پیدا ہوئے۔ جناب عبدالمطلب کی اور بیویاں بھی تھیں جو قریش کے قبائل بنو زہرہ النمر، عامر بن صعصعہ اور خزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ بالترتیب حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، حارثؓ اور ابولہب کی مائیں تھیں۔

جب آنحضرت صلعم کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ تو عبدالمطلب چھ سال کے اس بچے کو اپنے گھر لے آئے۔ اور نہایت محبت و شفقت سے آپؐ کی پرورش کی۔ اور اپنے بعد آپؐ کو اپنے صاحبزادے حضرت ابوطالب کے سپرد کر گئے۔

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر پا کر ۵۷۹ء میں وفات پائی۔ ان کی عام نصیحت یہ تھی "اچھے اور اعلیٰ اخلاق حاصل کرو اور ظلم و سرکشی اختیار نہ کرو"۔

عبدالملک الاصمعی

(۷۴۰ء – ۸۲۸ء)۔ بصرہ میں پیدا ہوئے۔ عرب کے مشاہیر اہل لغت میں شمار ہوتا ہے۔ اساتذہ میں خلیل، عیسیٰ، ابن عمر اور ابوعمر بن العلا جیسے لوگ ہیں۔ اصمعی کے شاگرد ابوعبیدہ، سجستانی اور سکری ہیں۔ ان کو عربی زبان کے تمام لہجوں اور بولیوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے امین کی اتالیقی اور تعلیم پر مامور کیا۔ اصمعی کی تصانیف میں "الفرس"، "الاراجیز"، "المیسر" اور "مجموعہ الاصمعیات" مشہور ہیں۔

عربی ادب کے مؤرخوں کا خیال ہے کہ اگر عبدالمطلب اصمعی پیدا نہ ہوتا تو ادب اور لغت کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔

عبدالملک بن مروان

بنو امیہ کا پانچواں خلیفہ جس نے ۶۵ھ/۶۸۵ء سے ۸۶ھ/۷۰۵ء تک حکومت کی۔ اس کا باپ مروان بن الحکم اور ماں عائشہ بنت معاویہ بنت مغیرہ تھی۔

اس کی عمر دس برس تھی جب اس نے حضرت عثمانؓ کے گھر پر باغیوں کے حملے کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سولہ سال کی عمر میں امیر معاویہؓ نے اسے بوزنطیوں کے مقابلے میں مدینے کی افواج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ یزید اول کے خلاف بغاوت کے شعلے بلند ہونے کے وقت تک وہ مدینے ہی میں تھا۔ جب باغیوں نے بنو امیہ کو مدینے سے نکال دیا تو وہ اپنے باپ کے ہمراہ مدینے سے نکل گیا۔ راہ میں ان کی ملاقات اس فوج سے ہوئی جو مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں مدینے کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے مسلم کو مدینے اور اس کے دفاع کے بارے میں ضروری اطلاعات بہم پہنچائیں۔ اور فوج کے ساتھ ہی مدینہ لوٹ آیا۔ مدینے کے قریب حرہ کے مقام پر لڑائی ہوئی اور اہل مدینہ نے شکست کھائی۔

رمضان ۶۵ھ میں بنو امیہ کے طرف داروں نے عبدالملک کو باقاعدہ خلیفہ تسلیم کر لیا۔ لیکن اسے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرحدوں پر بوزنطیوں نے فساد کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے ۶۸ھ میں انطاکیہ پر دوبارہ قبضہ جما لیا تھا۔ اور وہ شام میں بھی بعض قبائل کو مدد دے رہے تھے۔ مکے میں عبداللہ بن زبیرؓ کو خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا گیا تھا اور سلطنت کے اکثر صوبوں میں انہیں برائے نام خلیفہ تسلیم کیا جا رہا تھا۔ عبدالملک نے ان مشکلات سے خود سے عہدہ برآ ہونے کا اہل ثابت کیا اور چند ہی سال میں شامی قیادت کے تحت عربوں کا اتحاد بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

عراق سے نمٹنے کے لیے عبدالملک نے ۶۹ھ میں بوزنطی شہنشاہ سے دس سال کے لیے صلح کر لی۔ اس صلح کے فوراً بعد عبدالملک مصعب کے مقابلے کے لیے دمشق سے روانہ ہو گیا۔ لیکن دارالحکومت میں ایک بغاوت برپا ہو جانے کے باعث اسے واپس آنا پڑا۔ بغاوت کے سرغنہ کو اس نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ اگلے سال مصعب کے خلاف ازسرنو مہم اختیار کی گئی جزیرہ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تیسرے سال اس نے بنو قیس کی کمک کے ساتھ عراق پر چڑھائی کی۔ مصعب اور ابن اشعر کو شکست دی اور وہ دونوں مارے گئے۔ عراق کی اکثریت جنگ و جدال سے تنگ آ چکی تھی کیونکہ ان لوگوں کو سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ چنانچہ جب خلیفہ کوفے میں داخل ہوا تو ساری ولایت نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے فوراً بعد خلیفہ نے دو ہزار شامیوں کا لشکر حجاج کی قیادت میں عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف مکے روانہ کیا۔ حجاج نے مکے کا محاصرہ کیا اور چھ ماہ بعد عبداللہ ابن زبیرؓ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور اہل شہر نے حجاج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ حجاج کو اس فتح کے صلے میں حجاز کا والی بنا دیا گیا۔

عراق کی بازیابی سے عبدالملک کے سامنے خارجیوں کے خلاف فوری کارروائی کی ضرورت پیدا ہو گئی، اور کوفے اور بصرے کی متحدہ افواج نے ابتدائی ناکامی کے بعد ۷۳ھ میں مشتہر کے مقام پر کے نجدیہ کو شکست دی اور اس کے بعد بھی بہت سی بغاوتوں اور فسادات سے عبدالملک کا سامنا رہا اور وہ انہیں رفع کرنے کے لیے حکمت عملی سے کام لیتا رہا۔

گو عبدالملک اندرونی خلفشار اور بیرونی جنگوں کے باعث نہایت مصروف رہتا تھا لیکن اس نے مملکت کے نظم و نسق پر پوری توجہ دی۔ قبائل کے منتشر رجحانات کے علاج کے لیے اس نے مرکزیت کے قیام کے سلسلے میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ ان میں ایک اہم اصلاحی اقدام یہ تھا کہ دیوان میں حسابات کے اندراج کے لیے یونانی اور فارسی کی جگہ عربی زبان رائج کی گئی۔ ایک دوسری اصلاح یہ کی گئی کہ قرآن

مجید کا مشکول و منقوط نسخہ تیار کیا گیا۔ مشہور یہی ہے کہ یہ کام حجاج نے کیا تھا عبدالملک کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ تعمیر کرایا۔

اس کے عہد کے آخری سال خوش حالی و امن و استحکام کے سال تھے اگر اسے کوئی پریشانی تھی تو جانشینی کے سوال پر تھی۔ کیونکہ مروان اپنے بھائی عبدالعزیز کو اس کا جانشین مقرر کرنا چاہتا تھا۔ اور عبدالملک اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔

۸۶ھ/۷۰۵ء میں جب عبدالملک کی وفات ہوئی تو عبدالعزیز پانچ ماہ پہلے انتقال کر چکا تھا۔ چنانچہ عبدالملک کے بعد اس کا بیٹا باپ کا جانشین بنا۔

عبدمناف

قریش کے باداء حضورؐ کے جد امجد اور قصی کے بیٹے۔ عبدمناف کے بیٹے عبدشمس اور ہاشم تھے۔ عبدشمس کے بیٹے کا نام امیہ تھا۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب نام کے تھے۔ عبدالمطلب کے لڑکے عباس، عبداللہ، ابولہب اور ابوطالب نام کے تھے۔ ان میں عبداللہ رسول اکرم صلعم کے والد تھے۔

عبدالمنان وزیرآبادی

(۱۲۶۷ھ — ۱۳۳۴ھ)، محدث پنجاب۔ مقام پیدائش کردل ضلع جہلم ۸ سال کی عمر میں آشوب چشم کے مرض میں بینائی چھن گئی۔ تحصیل علم کے لیے مختلف مقامات پر گئے۔ آخر میں دہلی شیخ الکل سید نذیر حسین دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں جملہ علوم و فنون بالخصوص حدیث و تفسیر کی تکمیل کی۔ شیخ الکل کے علاوہ امام شوکانی کے تلمیذ خصوصی شیخ عبدالحق سے بھی حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ قیام دہلی کے دوران بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ و دیگر نامی گرامی علماء سے ملاقاتیں کیں۔ تکمیل دورہ حدیث کے بعد امرتسر مولانا عبداللہ غزنویؒ کے پاس آ گئے۔ مولانا غزنوی نے انہیں مسند درس حدیث پر بٹھا دیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد وزیرآباد گئے۔ جہاں تاحیات رہے۔

وزیرآباد میں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو بعد میں برصغیر کا ممتاز مدرسہ بن گیا۔ مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ، مولانا میر سیالکوٹیؒ۔ سیف بنارسیؒ، مولانا اسمٰعیل گوجرانوالویؒ وغیرہ نے یہیں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ حافظ عبدالمنانؒ کو محدث پنجاب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ پنجاب میں پہلے مدرس ہیں جنہیں حدیث کی امام کتاب "بخاری شریف" ساٹھ مرتبہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ وزیرآباد میں کچھ عرصہ آپ کی مخالفت ہوئی۔ لیکن آپ کی درویشانہ عادات نے جلد ہی آتش شورش کو ٹھنڈا کر دیا۔ آپ کا چہرہ بارعب، آواز بلند، قد دراز طبیعت قلندری اور عادات سکندری تھیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ آئمہ دین کا احترام بے حد کرتے۔ مسائل میں متشدد اور تنگ دل نہیں تھے۔

۱۳۱۹ھ میں جب دہلی شیخ الکلؒ کے پاس پہنچے تو واپسی پر شیخؒ نے خدمت حدیث کے باعث آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور اپنی پگڑی دیتے ہوئے کہا "کرتہ عبدالجبار (غزنوی) لے گیا۔ پگڑی تم لے جاؤ"۔ چنانچہ پگڑی آپ کی وفات کے بعد آپ کے کفن میں رکھ دی گئی۔ آپ کا کتب خانہ بڑا وسیع تھا۔ جو آپ کی وفات کے بعد جامع مسجد اہل حدیث وزیرآباد کی تحویل میں رکھا گیا۔

مولانا عبدالمنانؒ کا انتقال رمضان ۱۳۳۴ھ میں وزیرآباد میں ہوا۔ آپ کی قبر وزیرآباد سیالکوٹ روڈ چونگی کے قبرستان میں ہے۔ ان کی وفات پر مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ نے کہا "آج زمانہ حاضر کا امام بخاری فوت ہو گیا ہے"۔

عبرانی

ایک سامی زبان جو یہودیوں کی قدیم ترین زبان ہے۔ عہد قدیم کی بیشتر تحریریں عبرانی زبان میں ملتی ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں عبرانی نے کافی ترقی کی ہے اور فلسطین کے یہودیوں کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ جدید عبرانی میں اب شعر و ادب کا ذخیرہ ملتا ہے۔ عبرانی زبان دائیں سے بائیں ہاتھ کی طرف لکھی جاتی ہے۔ عبرانی اور عربی کے بعض اصول باہم مشترک اور یکساں ہیں۔

عَبَسَ، سورۃ

قرآن مجید کی ایک سورت کا نام۔ لفظی ترجمہ، اس ایک آدمی نے تیوری چڑھائی یا ترش روئی کی۔

اس سورت میں "اس آدمی" سے مراد خود حضور اکرم صلعم کی ذات ہے۔

اس سورت کا عدد تلاوت ۸۰ ہے۔ قرآن پاک میں یہ سورۃ "النّٰزعٰت" کے بعد اور سورۃ "التکویر" سے پہلے درج ہے۔ اس سورت کے دوسرے نام "الساخۃ" "السفرۃ" اور "الاعمیٰ" بھی منقول ہیں۔ یہ مکی سورت ہے۔ اس کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی "ابن ام مکتومؓ"، حضور اکرم صلعم کی خدمت میں تعلیم قرآن مجید کے لیے حاضر ہوئے۔ آپؐ اس وقت قریش کے سرداروں سے گفتگو کر رہے تھے اور انہیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ ان میں عتبہ، شیبہ، ابوجہل، عباسؓ بن عبدالمطلب، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ بھی شامل تھے۔ ابن ام مکتومؓ مادر زاد نابینا تھے۔ بلاجھجک حضورؐ کے پاس آ گئے، اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہؐ! مجھے قرآن مجید پڑھایئے اور جو کچھ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو سکھایا ہے مجھے بھی سکھایئے۔ وہ لاعلمی میں یہ الفاظ دہراتے چلے گئے۔ آپؐ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی تو انہیں چپ رہنے کو کہا اور ان سے منہ پھیر کر وفد قریش کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالےٰ کو یہ ادا بھلی نہ لگی اور اس نے اپنے پیغمبر پر یہ سورۃ نازل کی کہ اس نابینا سے جس کا دل ایمان کی پاکیزگی سے آباد ہے یہ اعراض کیوں ہوا؟ کیسے معلوم کہ حق کی تعلیم کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہو اور حق سے لاپروائی برتنے والوں پر اتنی توجہ دینے کا کیا فائدہ؟ اگر یہ حق پر نہ بھی چلیں تو اس سے آپ کو کیا فرق پڑ جاتا۔

یہ سورۃ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایک جانب تو حق کے لیے ذوق و شوق کا اظہار کرنے والوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے اور دوسری جانب خود رسول اکرمؐ پر کسی اور ہستی کے نگراں ہونے کی دلیل مہیا کی گئی ہے اور وہ منکرین جو کہتے ہیں کہ قرآنی آیات نعوذ باللہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ خود حضورؐ نے وضع کی ہیں، اب اس سورۃ کے نزول کے بعد بے جواز اور لاجواب ہو جاتے ہیں۔ رسول اکرم صلعم سے مروی ہے کہ جس نے اس سورۃ کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن ہشاش بشاش مسکراتے چہرے کے ساتھ آئے گا۔

عبیداللہ احرار خواجہ

ماوراءالنہر کے بلند پایہ بزرگ۔ خواجہ یعقوب چرخی کے مرید اور خلیفہ۔ آپ کا نام عبیداللہ اور لقب ناصرالدین تھا مگر خواجہ احرار کے نام سے شہرت پائی۔ رمضان ۸۰۶ھ میں یاغستان تاشقند میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۹ ربیع الاول ۸۹۵ھ

کو سمرقند میں وفات پائی وہیں دفن ہوئے۔ آپ کے جد امجد ایک بہت بڑے ولی تھے انہوں نے حضرت قاسم تبریزی اور مولانا سعد الدین کاشغری سے روحانی تربیت حاصل کی۔ مشہور شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی ان کے درست تھے۔

عبیداللہ بن عامر

شامی فوج کا ایک سردار۔ اس نے حضرت امیر معاویہؓ اور امام حسنؓ کے درمیان امر خلافت امیر معاویہؓ کے حوالے کر دینے کا معاہدہ طے کرایا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کی خبر پاتے ہی امیر معاویہؓ نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر لیا۔ اور اہل شام سے تجدید بیعت کرائی، اور ساٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ کوفہ پر چڑھائی کر دی۔ اور امام حسنؓ سے کہلا بھیجا کہ جنگ سے صلح اچھی ہے۔ اور آپ مجھے خلیفہ وقت مانتے ہوئے میرے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ اس پر حضرت امام حسنؓ چالیس ہزار کا لشکر لے کر کوفہ روانہ ہوئے اور مقام دیر عبدالرحمٰن میں پہنچنے کے بعد قیس بن سعدؓ کو بارہ ہزار فوج دے کر مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بھیجا۔ لشکر ساباط مدائن پہنچا تو قیس بن سعد کے مارے جانے کی خبر مشہور ہو گئی۔ حضرت امام حسنؓ نے فوج سے خطاب فرمایا اور کہا کہ تم میں سے اکثر جنگ سے احتراز کرتے ہوئے کمزوری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس لیے میں تمہاری مرضی کے خلاف تم پر جبر کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر فوج میں شامل خارجی اور منافقین آپ کے خلاف ہو گئے اور آپ کے خیمے میں داخل ہو کر سامان لوٹ لیا اور بدن کا لباس تار تار کر دیا۔

یہ شورش ختم ہونے کے بعد امام حسنؓ مدائن روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک خارجی نے نیزے سے وار کیا۔ اور آپ کی ران میں زخم آیا۔ اسی دوران انہوں نے سنا کہ عبیداللہ بن عامر شامی فوج کے ساتھ مدائن میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے حضرت امام حسن مقابلے کے لیے نکلے۔ عبیداللہ نے قریب پہنچ کر اہل عراق سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا۔ تم لوگ میری طرف سے امام حسنؓ کی خدمت میں سلام پہنچانے کے بعد عرض کرو کہ جنگ سے احتراز کریں تاکہ ہلاکت سے بچ جائیں۔ کیونکہ امیر معاویہ کی عسکری قوت بہت زیادہ ہے اس پر امام حسنؓ نے کہلا بھیجا کہ مندرجہ ذیل شرائط پر صلح کرنے اور خلافت سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں:

۱۔ امیر معاویہؓ کتاب و سنت پر عامل رہیں۔
۲۔ پہلی دشمنی کو بھلا کر کسی کی جان و مال سے مزاحمت نہ کریں۔
۳۔ ہمارے طرف داروں کی جان کی حفاظت کا عہد کریں۔

عبیداللہ بن عامر نے یہی الفاظ امیر معاویہؓ کے سامنے دہرائے۔ امیر معاویہؓ نے یہ شرائط منظور کر لیں اور ایک سادہ کاغذ پر اپنے دستخط کر کے مہر لگائی اور عبیداللہ کو دیتے ہوئے کہا۔ یہ کاغذ حضرت امام حسنؓ کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اس پر جو شرائط چاہیں لکھ دیں میں سب کی سب پوری کروں گا۔

عبیداللہ بن عامر یہ کاغذ لے کر امام حسنؓ کے پاس پہنچا اور ان سے ایک صلحنامہ تحریر کروایا جس میں امام حسنؓ حق خلافت سے دستبردار ہو گئے۔

عبیداللہ سندھیؒ، مولانا

ہندوستان میں تحریک آزادی کے معروف رہنما اور دینی بزرگ۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ زرگری تھا پیدائش سے چار ماہ قبل والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ بچپن میں ہی خاندان کے دیگر سربراہوں کی وفات کے باعث ان کی والدہ انہیں ان کے ماموں کے پاس جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں لے آئیں۔ یہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر میں اسلام کے ساتھ محبت پیدا ہوئی تو جستجو میں سیالکوٹ پہنچے۔ یہاں آکر مشن سکول میں داخل ہو گئے۔ اسی دوران آپ نے حافظ محمد لکھویؒ کی معروف پنجابی کتاب "احوال الآخرۃ"، مولانا عبیداللہؒ کی "تحفۃ الہند" اور سید اسماعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" کا مطالعہ کیا۔ تو قبول اسلام کا اظہار کر دیا۔ خاندان نے تعاقب کیا تو آپ سندھ چلے آئے۔ یہاں سے روحانی تربیت حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی والے) سے حاصل کی۔ ۱۳۰۶ھ میں آپ ہند کی عظیم دینی و تحریکی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ یہاں صرف و نحو اور فقہ و حدیث کی کتابیں پڑھیں اور مزید تعلیم کے لیے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں پہنچے

بیمار ہو کر آپ گنگوہ سے دہلی چلے آئے یہاں سے آپ نے مولوی عبدالکریم اور شیخ الکل سید نذیر حسین دہلویؒ سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ میں دہلی سے سندھ پہنچے اور درس حدیث شروع کر دیا۔ ان دنوں تحریک آزادی کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ اور عالم اسلام کے اتحاد کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں آپ شیخ الہندؒ کے حکم پر کابل روانہ ہوئے۔ یہاں کانگریس کی تشکیل کی۔ ۱۹۲۳ء میں کابل سے روس روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ روس رہنے کے بعد ترکی چلے گئے۔ اس بین الاقوامی دورے کے اختتام پر آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں مولانا عبدالوہاب دہلویؒ۔ مولانا عبدالستار دہلوی (کراچی) اور ابوالشرف مجددی وغیرہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور یہاں آکر تحریکی کام شروع کر دیا۔

مولانا سندھیؒ نے تحریک ریشمی رومال میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے ان کی فکر ملی غیرت سے متشکل ہوئی تھی۔ آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے کسی کے پوچھنے پر دکھ اور حسرت کے لہجہ میں فرمایا۔ میری ٹوپی اس دن سے ہی اتر گئی تھی جس دن لال قلعہ ہم سے چھن گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں مولانا لاہور اپنی صاحبزادی کے [illegible] تو یہیں راہی ملک بقا ہوئے۔

عبیداللہ مہدی

مصر کے عبیدی فرمانرواؤں کا مورث اعلیٰ۔ [illegible] اور اسماعیلیہ بھی کہتے ہیں۔ عبیداللہ کی جائے پیدائش غالباً کوفہ تھی۔ [illegible] آپ کو ہاشمی کہتا اور سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراء [illegible] تھا لیکن اکثر مورخوں نے اس کے فاطمی ہونے سے انکار اور اس کے نسب پر [illegible] کیا ہے۔

اس نے ۲۷۰ھ میں مہدویت کا دعوےٰ کیا اور [illegible] ۲۷۸ھ میں اس نے حج کیا۔ بنو کنانہ کے لوگ اس کی مہدویت پر ایمان لے آئے اور اس کے ساتھ ہو لیے۔ وہ باون برس اپنے دعوے پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ ۳۲۲ھ میں اس کی وفات ہو گئی۔

عبیدہ بن حارثؓ

مشہور صحابیؓ۔ کنیت ابو حارث یا ابو معاویہؓ۔ خاندان قریشی۔ حضرت عبیدہ، ابو سلم بن اسدؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ قبل از ہجرت ایک ساتھ مسلمان ہوئے۔ اور آنحضرتؐ ہی کے حکم سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے

مدینہ ہجرت کی جہاں رسول اللہؐ نے انھیں اپنے کنبہ کی سکونت کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا عطا کیا۔ ہجرت کے آٹھ ماہ بعد مجاہدین اسلام کے امیر بنا کر وادی رابغ کی طرف بھیجے گئے تاکہ قریش کی نقل و حرکت کا اندازہ لگائیں۔ اسلام میں یہ دوسرا عہدۂ امارت تھا جو حضرت عبیدہ کو دیا گیا۔ راستہ میں ابوسفیان اور اس کے دوسو ساتھیوں کے ساتھ معمولی سی جھڑپ ہوئی، اور واپس آگئے۔ جنگ بدر کے موقع پر ولید کے مقابلہ میں سخت زخمی ہوئے۔ ایک ٹانگ جاتی رہی اور اسی باعث ۶۳ برس کی عمر میں وفات پاگئے۔ مقام صفرا میں دفن ہوئے۔ آپ نہایت خوبصورت اور میانہ قد تھے۔ آنحضرتؐ آپؓ کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔

عتبان بن مالک

نام عتبان۔ قبیلہ سالم۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ جنگ بدر میں شامل تھے۔ اس کے بعد نابینا ہوجانے کے باعث باقی غزوات میں شریک نہ ہوسکے۔ بڑے پائے کے صحابی اور بزرگ تھے۔ علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ مسجد بنو سالم کے امام مقرر کیے گئے۔ اور عمر بھر اسی عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ مسجد اور مکان کے درمیان ایک وادی تھی جس میں پانی جمع رہتا تھا۔ آپؓ نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ نابینا ہوں گھر سے مسجد تک جانا دشوار ہے۔ اجازت ہو تو گھر پر ہی نماز ادا کرلیا کروں۔ آنحضرت صلعم نے پوچھا کیا اذان کی آواز گھر تک پہنچتی ہے، فرمایا ہاں۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا جب آپ اذان کی آواز سن سکتے ہیں تو مسجد میں جاکر نماز ادا کیا کیجیے۔

قرآن و حدیث سننے کا اس قدر شوق تھا کہ قبا میں رہنے کی وجہ سے دربارِ رسالت دو میل دور پڑتا تھا اور آپ نابینا تھے۔ اس لیے آپ نبیؐ اکرم صلعم کی خدمت میں ایک دن حاضر ہوکر جو کچھ سنتے حضرت عمرؓ کو آکر سنا دیتے۔ دوسرے دن آپ نہ جاتے اور حضرت عمرؓ جاکر سن آتے تو گھر آکر آپ کو سناتے۔ چنانچہ حدیث میں آپ کے حوالے سے بہت سی احادیث درج ہیں۔

اتباع رسول کا یہ عالم تھا کہ باوجود نابینا اور عمر رسیدہ ہونے کے رسول اللہ کے حکم کے اتباع میں مسجد میں جاکر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

عتبہؓ بن ابی لہب

حضور کے چچا، اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابی لہب کے بیٹے فتح مکہ کے وقت عتبہؓ مسلمانوں کے خوف سے مکہ چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیے۔ حضرت محمد صلعم نے حضرت عباسؓ کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا۔ حضرت عباسؓ انھیں اپنے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں لے آئے جہاں پہنچ کر آپؓ نے اسلام قبول کرلیا۔ غزوہ حنین میں اسلام کی مدافعت میں جنگ لڑی۔ اس غزوہ کے بعد جنگ طائف میں بھی بڑی سرفروشی دکھائی۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی۔

عتبہ بن ربیعہ

امیر معاویہؓ کا نانا تھا۔ زمانہ قبل اسلام میں قریش میں نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست شمار ہوتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جو قریش کی طرف سے حضور اکرمؐ کے پاس آیا اور دولت کی پیش کش کی اور دعوت اسلام ترک کر دینے کو کہا لیکن جواب میں حضورؐ نے چند آیاتِ قرآنی پڑھ کر سنائیں۔ اس نے واپس جاکر کہا محمد (صلعم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہوکر عرب پر غالب آگئے تو اس میں تمہاری عزت ہے ورنہ عرب انھیں خود فنا کر دے گا۔ مگر قریش نے اس کی بات نہ مانی۔

جنگِ بدر میں لشکرِ قریش کا سردار تھا۔ اسی جنگ میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔

عتبہؓ بن غزوان

کنیت ابوعبداللہ۔ والد کا نام غزوان بن جابر۔ ابتدائی زمانۂ اسلام میں مسلمان ہوئے۔ کفار کے مظالم سے تنگ آکر دوسری ہجرت میں مکہ سے حبشہ چلے گئے۔ پھر حالات موافق ہونے پر واپس چلے آئے۔ یہاں سے پھر مدینہ کو ہجرت کی جنگ احد اور دیگر غزوات میں رسول اللہ کے ہمراہ لڑے۔

۱۴ھ میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے میں آپ نے بحیثیت ایک جرنیل کے دجلہ کا سارا ساحلی علاقہ فتح کرلیا۔ اسی سال بندرگاہ ابلہ کے قریب ۸۰۰ افراد کو ساتھ لے کر ایک نیا شہر بسایا اور اسی شہر کے والی مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد حکومت چھوڑ کر مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا لیکن حضرت عمرؓ نے بصرہ واپس جانے کو کہا۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں واپس ہوئے لیکن راستے میں اونٹ سے گر کر وفات پاگئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۷ برس تھی۔

صحابہؓ میں آپ بہت متقی اور پرہیزگار مانے جاتے تھے۔ غرور و تکبر سے بہت نفرت تھی ہر شخص کے ساتھ انکسار سے پیش آتے تھے۔

عتبہؓ بن مسعود

مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کے سگے بھائی۔ دعوتِ اسلام کے آغاز میں اسلام قبول کیا، ہجرت ثانیہ میں حبشہ اور پھر وہاں سے مدینہ گئے۔ سب سے پہلے غزوہ احد میں شریک ہوئے۔ بعد کے تمام غزوات میں بھی شریک رہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں وفات پائی۔

عثمان اوّل

خاندانِ سلاطین عثمانیہ کا بانی اور تاریخی روایات سے اس خاندان کا پہلا فرد۔ اسے عثمان غازی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں تاریخ کے تحریر شدہ ابواب میں کچھ ایسی زیادہ تفصیل نہیں ہے لیکن اس کے نام سے ایک سلسلہ سلاطین کا آغاز یقیناً اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر حوالہ ضرور پوشیدہ ہے۔

عثمان اوّل

متفقہ روایت کے مطابق عثمان ارطغرل کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد ایک نیم خانہ بدوش قبیلے کا سردار بنا جس کی سرمائی قیام گاہ وادی قرہ صو میں سغد کے مقام پر تھی۔ عثمان نے اپنے پہلے دور میں عثمانی طاقت کے اس چھوٹے سے مرکز کو اپنے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کرکے وسعت دی۔ اس سے قبل یہ علاقہ بوزنطیوں کے باج گزار تھا۔ قرہ جہ حصار میں عثمان کے نام پر پہلی دفعہ خطبہ پڑھا شاید فتوحات

کے اسی دَور سے متعلق ہے ۔ اس دوران میں مفتوحہ علاقے میں اضافہ ہوا ۔

عثمان کا دوسرا دَور وہ ہے جس میں اس نے اپنے مرکز یکیشہر سے مغربی سمت برسہ کی جانب اور شمال کی طرف ازنیق کی جانب فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا ۔ ترکوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان شہروں پہ قبضہ کرتے ۔

اس کا تیسرا دور وہ ہے جو جس میں وہ فوجی مہمات میں ذاتی طور پر شریک نہیں ہوتا تھا اور اس کے ساتھی ان فتوحات کے سلسلے کو آگے بڑھا رہے تھے ۔ اس کے ایک ساتھی خان کا پہلا معرکہ تاتاریوں کے ایک جمِ غفیر کا اخراج تھا جنہوں نے اس کے شہر کے ایک حصے پہ یلغار کر دی تھی ۔

آخری دَور میں عثمان نے اپنے آپ کو ازنیق اور بُرسہ کے شدید محاصرے کے لیے وقف کر رکھا تھا ۔ آخر الذکر شہر ۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء میں فتح ہوگیا ۔ یہ واقعہ عثمان کی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے ظہور پذیر ہوا ۔

عثمان اوّل کو اپنے عہد کے آغاز میں ہی مخلص ساتھیوں کا ایک حلقہ مل گیا تھا ۔ ان میں کچھ اس کے بھائی بھتیجے تھے اور کچھ شیخ ادب علی جیسے لوگ شامل تھے ۔ شیخ ادب علی کی لڑکی مال خاتون (ایک دو اور حوالوں میں اس کا نام "رابعہ" درج ہے) کی شادی عثمان سے ہوئی ۔ عثمان نے مفتوحہ علاقوں کا شہری اور فوجی انتظام اپنے دوستوں میں بانٹ دیا تھا ۔

اس کے حالاتِ زندگی کی تاریخ یقینی نہیں ہے اس لیے اس کے عہدِ حکومت یا ذاتی حالات و واقعات کا اندراج معتبر نہیں معلوم ہوتا ۔

عثمانؓ بن ابی العاص

کنیت ابوعبداللہ ۔ غزوہ طائف کے بعد بنی ثقیف کے وفد کے ساتھ مدینہ گئے ۔ یہ اس وفد میں سب سے کم عمر تھے ۔ اس وفد کے اسلام لانے کے بعد حضور اکرم صلعم نے حضرت عثمانؓ کو مشہور محافظ اور مفسر قرآن ، ابی بن کعبؓ کے سپرد کر دیا ۔ چنانچہ آپ نے اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث جلد ہی سارا دینی علم اخذ کر لیا اور بنی ثقیف کی درخواست پر حضور اکرم صلعم نے عثمانؓ کو ان کی تربیت کے لیے بھیجا ۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بصرہ چلے آئے اور یہی فرائض وہاں انجام دیتے رہے ۔ اسی دوران میں حضرت عمرؓ نے انھیں بحرین اور عمان کا حاکم بنایا ۔ عثمانؓ نے اپنے بھائی مغیرہ کو بحرین میں اپنا قائم مقام بنایا اور خود ایران کے مختلف حصوں میں لشکر کشی کی ۔ ابوموسیٰ الاشعری ان کی امداد پہ تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ایران کے بہت سے علاقے فتح کر لیے ۔

۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ غنی کے دورِ خلافت میں عثمان ابی العاص نے اصطخر کا علاقہ دوبارہ فتح کر لیا ۔ کہ وہ لوگ باغی ہو گئے تھے ۔

۵۵ھ میں امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات پائی ۔ احادیث کے سلسلے میں ان کی مرویات کی تعداد تیس کے قریب ہے ۔

عثمانؓ بن حنیف

نام عثمان ۔ کنیت ابوعمر ۔ قبیلہ اوس اصحابِ رسولؐ میں سے ہیں ۔ انصار میں بڑی عزت رکھتے تھے ۔ علم حساب میں بڑی دسترس اور مہارت تھی ۔ اسی لیے حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں عراق اور کوفہ فتح کرنے کے بعد مالگزاری کے نظم و نسق کے لیے مجلسِ شوریٰ کی تجویز پر انہیں وہاں بھیجا اور یہ فرض انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ۔ واپسی پر کوفہ کے صاحب الخراج مقرر ہوئے ۔ انہوں نے زمین کا ایسا اعلیٰ بندوبست کیا کہ آمدنی ہر سال بڑھنے لگی ۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کے اختیار کردہ طریقے کو ساری اسلامی دنیا میں رائج کر دیا ۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بصرہ کے حاکم مقرر ہوئے ۔

مسلمانوں کی خانہ جنگی کے وقت جب بصرہ ظلم و ستم کا مرکز بنا تو حضرت عثمانؓ بھی اس سے نہ بچ سکے چنانچہ انہیں گرفتار کر کے حضرت عائشہؓ ، طلحہؓ اور زبیر کے سامنے لایا گیا اور بڑی بے رحمی سے ان کی داڑھی اور سر کے بال نوچے گئے اور کوڑے مار مار کر ان کی بُری حالت کی گئی ۔

ان کا انتقال امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ہوا ۔ علم حساب میں مہارت کے علاوہ حدیث اور فقہ میں بھی طاق تھے ۔ چند احادیث نبوی آپ سے مروی ہیں ۔

عثمانؓ بن طلحہ

ماں کا نام سلامہ ۔ زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کی کلید برداری کا منصب عثمان کے والد طلحہ کے سپرد تھا جو جنگِ احد میں حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارا گیا قبولِ اسلام کے بعد یہی عہدہ عثمانؓ کو باپ کی وراثت کی وجہ سے دلایا گیا ۔ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ۸ھ میں ہجرت کر کے مدینہ میں مقیم ہو گئے ۔

فتح مکہ کے بعد جب حضورؐ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے اندر داخل ہونے لگے تو وہ دروازہ مقفل تھا اور چابی حضرت عثمانؓ کی والدہ کے پاس تھی ۔ انہوں نے ماں سے چابی مانگی ۔ وہ مشرکہ تھی لہذا اس نے پس و پیش کی ۔ جس پر آپ نے غضب ناک ہو کر چابی چھین لی اور رسول اللہؐ کے سامنے لا کر پیش کی ۔ آپؐ نے دروازہ کھولا اور عثمانؓ کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوئے ۔ باہر آئے تو آپؐ نے چابی حضرت عثمانؓ بن طلحہ کے حوالے کر دی اور فرمایا جو شخص تم سے یہ چابی چھینے گا وہ ظالم ہوگا ۔

آپؓ ہمیشہ رسول اللہؐ کے ساتھ مدینہ میں رہے اور آپؐ کی وفات کے بعد کعبہ کے کلید بردار ہونے کی وجہ سے مکہ چلے آئے اور یہیں ۴۲ھ میں فوت ہوئے ۔

عثمانؓ بن عفان

عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبدشمس بن عبد مناف تیسرے خلیفہ راشد ۔ امیر المومنین ۔ قریش کی مشہور شاخ بنو امیہ میں سے تھے ۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کا قومی علم "عقاب" جنگ کے وقت ان کے سپرد ہوتا تھا ۔

حضرت عثمانؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں عبد مناف پر رسول اللہ سے مل جاتا ہے ۔ ان کی والدہ کا نام اروی بنت کریز ہے اور نانی ام حکیم البیضاء بنت عبد المطلب ۔ ان کی نانی حضرت محمد صلعم کی سگی پھوپھی تھیں ۔ اور آنحضرت کے والد عبداللہ کی توام بہن ۔

حضرت عثمانؓ کی ولادت عام الفیل کے چھ سال بعد ۵۷۶ء میں ہوئی اس طرح وہ حضور اکرمؐ سے چھ سال چھوٹے تھے ۔ ان کا شمار ان چند ایک لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا ۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے انھیں بھی وحی لکھنے پر مامور کیا ۔ اس طرح وہ وحی کے کاتبوں میں بھی شمار ہوتے ہیں ۔ آنحضرتؐ کے معتمد کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیے ۔

بہت نیک فطرت تھے۔ قبل اسلام کی زندگی میں بھی ان کا دامن آلودگیوں سے بچا رہا۔ شرم اور حیا ان کے اعلیٰ اخلاق کا امتیاز تھا۔ مسلمانوں میں "کامل الحیاء والایمان" کے الفاظ حضرت عثمان کے لیے ہی استعمال کیے گئے ہیں۔

جوانی میں انہوں نے اہلِ قریش ہی کی طرح تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اپنی دیانت اور صداقت کے باعث تجارت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ وہ مکے کے معاشرے میں ایک ممتاز، معزز اور دولت مند تاجر کی حیثیت سے مشہور تھے اور "غنی" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کا شمار سابقون الاولون، عشرہ مبشرہ اور ان چھ اکابر صحابہؓ میں ہوتا ہے جن سے رسول اکرم صلعم تمام زندگی خوش رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کے گہرے مراسم تھے اور ان ہی کی تبلیغ و تحریک پر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ انہوں نے بعثت نبوی کے آغاز ہی میں رسول اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور پھر عمر بھر اپنی جان و مال و دولت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مشغول رہے۔ خود حضرت عثمانؓ کا قول ہے "میں اسلام قبول کرنے والے چار میں سے چوتھا ہوں۔" آپؓ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن حارث کے بعد اسلام قبول کرنے والے پہلے شخص تھے۔

گو وہ قریش کے معزز افراد میں سے تھے لیکن اسلام قبول کرنے پر انھیں بھی سختیوں اور ایذا رسانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؓ کا چچا حکم بن ابی العاص رسیوں سے جکڑ کر مارا کرتا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا۔

رسول اکرم صلعم نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا عقد حضرت عثمانؓ سے کیا۔ یہ عقد اتنا بابرکت تھا کہ مکے میں عام طور پر لوگ کہا کرتے تھے کہ بہترین جوڑا جو کسی انسان نے دیکھا۔ رقیہؓ اور ان کے خاوند عثمانؓ ہیں۔

بعثت کے پانچویں سال حبشہ کو ہجرت کرنے والوں میں حضرت عثمانؓ اور ان کی زوجہ حضرت رقیہؓ شامل تھیں۔ یہ اسلام میں سب سے پہلی ہجرت تھی یعنی حضرت عثمانؓ اول المہاجرین تھے۔ حبشہ میں قیام کے دوران ان کے ایک صاحبزادے کی ولادت ہوئی جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اسی لیے حضرت عثمان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔

دوسری ہجرت انھوں نے مدینہ کی طرف کی۔ یہاں حضور اکرم صلعم نے حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری کے بھائی اوس بن ثابتؓ سے ان کی مواخاۃ کر دی۔ اس تعلق سے دونوں گھرانوں میں انس و محبت بہت بڑھ گیا۔ اسی لیے جب حضرت عثمان کی شہادت ہوئی تو حضرت حسانؓ نے ایک دردناک مرثیہ کہا اور تمام عمر اس سانحے پر رنجیدہ رہے۔

آپؓ بڑے مالدار تاجر تھے اور حد درجہ سخی اور فیاض بھی۔ اپنا مال ہمیشہ رفاہی و اسلامی امور پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ غزوات کے موقع پر خصوصاً ان کا مال بے تحاشا کام آتا تھا۔ ان کی فیاضی اور سخاوت کے واقعات اسلامی تاریخی کتب میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

آپؓ عہد نبوی کے تمام غزوات میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کی زوجہ حضرت رقیہؓ علیل تھیں۔ حضور اکرمؐ نے انھیں ان کے پاس ہی ٹھہرنے کے لیے کہا اور فرمایا کہ تمہیں اس جنگ میں شریک لوگوں ایسا اجر اور مالِ غنیمت ملے گا۔ اسی لیے غزوہ بدر میں شامل مجاہدین کی جو فہرست بخاری میں چھپی ہے اس میں آپؓ کا نام درج ہے۔ غزوہ ذات الرقاع اور غزوہ بنی غطفان دونوں مواقع پر آنحضرت صلعم نے انھیں اپنا قائم مقام مقرر فرمایا۔

حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضرت محمد صلعم نے اپنی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمان سے کر دیا۔ یہ نکاح منشائے الٰہی کے مطابق تھا۔ شعبان ۹ ہجری کو ام کلثوم کی وفات پر حضور صلعم نے فرمایا اگر میری کوئی اور بیٹی بھی ہوتی تو میں عثمانؓ سے بیاہ دیتا۔ ابن الاثیر نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے نبی اکرمؐ سے سنا۔ آپؐ نے فرمایا اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں انہیں یکے بعد دیگرے عثمانؓ سے بیاہ دیتا۔ حضرت علیؓ ہی سے نقل ہے کہ لوگوں نے ان سے حضرت عثمانؓ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا "وہ ایک ایسے شخص تھے جنہیں ملاءِ اعلیٰ میں "ذوالنورین" کہہ کر پکارا گیا۔ یہ اس لیے کہ وہ آنحضرتؐ کی دو بیٹیوں کے خاوند تھے۔

مسجد حدیبیہ، جہاں بیعت رضوان لی گئی

حضرت عثمانؓ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جب آنحضرت صلعم نے انھیں ذوالقعدہ ۶ ھ میں اہلِ مکہ کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اسی کے نتیجے میں "بیعت رضوان" اور صلح حدیبیہ کے واقعات پیش آئے۔

حضرت عثمانؓ، خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں ان کے مشیر تھے اور بعض دیگر صحابہ کے ساتھ افتا کی خدمت بھی انہی کے سپرد تھی۔ اور کاتب کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ کے ممتاز ارکان میں شامل رہے۔ عثمانؓ کی فضیلت صحابہ کرام میں تسلیم شدہ ہے۔ نافع نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہؐ کی زندگی میں اثنائے گفتگو میں نام لیتے وقت یہ ترتیب اختیار کیا کرتے تھے: ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اس سے ان حضرات کا درجہ فضیلت مدِنظر تھا۔

حضرت عمرؓ جب ابولولوہ کے خنجر سے مجروح ہوئے اور ان کی زندگی کی امید باقی نہ رہی تو صحابہؓ نے ان کے سامنے ان کے جانشین کا مسئلہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا: "اگر امین الامت ابوعبیدہؓ بن جراح زندہ ہوتے تو میں انہیں اپنا جانشین بنا دیتا۔" جب حضرت عمرؓ کی حالت زیادہ بگڑتی نظر آئی تو پھر جانشین کا مسئلہ پیش ہوا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں اس امر کا حقدار ان لوگوں سے زیادہ کسی کو نہیں پاتا جن سے رسول اللہ اپنی وفات تک راضی رہے۔ پھر انھوں نے عشرہ مبشرہ میں سے مندرجہ ذیل چھ اصحاب کی ایک مجلس قائم کر دی۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، اور عبدالرحمٰن بن عوف۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو بھی مشورے کے لیے ان کے ساتھ کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے خاندان کو خلافت سے محروم کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد ان کی تدفین سے فارغ ہو کر مجلس کے مندرجہ بالا چھ اصحاب مسور بن مخرمہ کے مکان میں مشاورت کے لیے جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا تم اس معاملے کو تین شخصیتوں میں محدود کر دو۔ اس پر اتفاق ہوا۔ اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کے لیے، حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کے لیے اور حضرت سعدؓ نے عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں دست برداری کا اظہار کیا۔ بعد میں عبدالرحمٰنؓ

بھی دستبردار ہوگئے، اور باقی کے دو حضرات (حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ) سے کہا کہ اس امر کو مجھ پر چھوڑ دیں۔ دونوں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے "ہاں" کہا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مسلسل تین دن تک خلافت کے امیدواروں، شہر کے اہل الرائے افراد اور لشکروں کے سپہ سالاروں سے مل کر مشورہ کیا اور جب انہیں یقین ہوگیا کہ اکثریت کی رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے تو مسجد نبوی میں مسلمانوں کے سامنے مختصر لیکن مؤثر تقریر کی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کردیا۔ اور سب سے پہلے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے بیعت کی اور بعد میں باقی حضرات نے باری باری ان کی بیعت کرلی۔ عثمانؓ کی بیعت حضرت عمرؓ کی وفات کے تین دن بعد محرم ۲۴ھ / نومبر ۶۴۴ء میں ہوئی۔ عبداللہؓ بن مسعود نے اس موقع پر کہا، ہم نے اپنے میں سے بہترین شخص کی بیعت کی۔

خلافت عثمانیؓ کی مدت ٹھیک بارہ سال ہے اور یہ عرصہ اسلامی فتوحات کے سلسلے میں پہلا عظیم الشان عہد ہے جس کی مثال اس سے قبل کی تاریخ اسلام میں نہیں ہے۔ ان فتوحات کا سہرا عثمانیؓ عہد کے سپہ سالاروں ولید بن عقبہ، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور حضرت معاویہؓ کے سر تھا۔ اس زمانے میں اسلامی جغرافیائی حدود میں بہت وسعت ہوئی۔ اس کی حدود سندھ سے اندلس تک جا پہنچیں۔ اسلامی افواج اسی عہد میں بحری قوت کو بھی منظم کیا اور قبرص و روڈس کے جزائر فتح کیے۔ ایک عظیم بحری بیڑہ تیار کیا گیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کے پاس ایک کشتی بھی نہیں تھی۔ حضرت معاویہؓ تو سمندری راستے سے اتنی دور نکل گئے کہ ۳۲ھ میں آبنائے قسطنطنیہ (باسفورس) تک جا پہنچے۔ اس لحاظ سے خلافت اسلام کا دور اسلام میں فتح و کامیابی کا باب ثابت ہوا۔ اس عہد میں دو طرح کی فتوحات ہوئیں۔ ایک تو وہ ممالک جو حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی فتح ہوگئے لیکن رومیوں اور ایرانیوں کی شہ پاکر باغی ہوگئے تھے حضرت عثمانؓ کے عہد میں انھیں دوبارہ زیر اطاعت لایا گیا۔ ۲۵ھ میں سکندریہ میں بغاوت ہوئی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے فوراً بڑھ کر رومیوں کو شکست دی اور امن و امان قائم کردیا۔ اسی سال آذربائیجان اور آرمینیہ میں بغاوتیں ہوئیں جنہیں کوفے کے امیر ولید بن عقبہ اور سلیمان بن ربیعہ باہلی نے فرو کیا۔ مغرب میں رومیوں نے شامی سرحد کے قریب ایشیائے کوچک کی طرف چھیڑ چھاڑ کی تو امیر معاویہؓ بڑھے اور انطاکیہ و طرطوس کے درمیان واقع رومی قلعوں کو فتح کرلیا۔

دوم وہ ممالک جو پہلی بار عہد عثمانیؓ میں حلقہ اطاعت میں آئے۔ ۲۵ھ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح امیر مصر نے طرابلس (لیبیا) پر فوج کشی کی۔ دو ہی سال بعد تونس، الجزائر اور مراکش کے علاقوں کو فتح کرلیا۔ مشرقی افریقہ کی فتوحات میں عبداللہ بن زبیرؓ نے بہت نام کمایا۔ اسی سال عبداللہ بن نافع نے سمندر پار کرکے اندلس کا محاصرہ کرلیا کچھ فتوحات بھی ہوئیں۔ لیکن اس جانب مستقل مہم کا آغاز نہ کیا گیا۔ شمال کی طرف حبیب بن مسلمہ اور سلیمان بن ربیعہ نے علاقے فتح کیے۔ مسلمانوں کی فوجیں بحرہ اسود تک جا پہنچیں۔ ۳۰ھ میں عبداللہ بن عامر اور سعید بن العاص نے خراسان اور طبرستان کی طرف پیش قدمی کی۔ سعید بن العاص نے جرجان، خراسان اور طبرستان کو فتح کیا اور عبداللہ بن عامر نے مزید آگے جاکر سوات کابل، سجستان، نیشاپور اور گرد کے علاقوں کو مطیع بنایا۔ عہد عثمانیؓ میں مسلمانوں نے تقریباً پچاس بحری لڑائیاں لڑیں اور بحری قوت کا انتظام اسی عہد کا کارنامہ ہے۔

اسی عہد میں مسلمانوں نے ہندوستان کی طرف بھی توجہ کی۔ اور گجرات کے ساحل علاقوں تک جا پہنچے اور یہ فتوحات کا سارا سلسلہ صرف ۶ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ اس نے عثمانؓ کی زبردست سیاسی بصیرت اور پرجوش خدمت دین کا پتہ چل جاتا ہے۔

ان کے عہد میں تہذیب و تمدن۔ صنعت و حرفت، تجارت اور علوم و فنون کو بھی ترقی ہوئی۔ دولت اور فارغ البالی و خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ اور قرب و جوار میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ قدیم بازاروں کے علاوہ نئے بازار بھی قائم کیے گئے۔ اور عمائد قریش حجاز سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پہنچ گئے عثمانؓ کی اسلامی خدمات کا تذکرہ طویل ہے۔ ان کی ایک اہم خدمت مسجد الحرام کی توسیع ہے جو ۲۶ھ میں کی گئی۔ ۲۹ھ میں انہوں نے مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کرائی۔ اس کام میں پورے دس ماہ صرف ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسجد کا طول ۱۴۰ گز اور عرض ایک سو بیس گز تھا۔ اب طول ۱۶۰ گز اور عرض ۱۵۰ گز ہوگیا۔ سب سے بڑا کارنامہ جو ان کے عہد میں ہوا وہ عالم اسلام کو ایک مصحف اور ایک قرأت پر جمع کرنا تھا۔ قرآن مجید کو لکھوا کر تمام ممالک اسلامیہ میں شائع کرنا اور ایک ہی قرأت پر تمام عالم اسلام کو متفق کردیا عثمانؓ کا نہایت بڑا کام ہے اور اسی باعث امت میں ان کا لقب جامع القرآن مشہور ہوا۔

روایات اس طرح ہیں کہ عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ مصحف کی سات نقلیں کروائیں اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفے میں ایک ایک نسخہ محفوظ کیا گیا۔ مصحف عثمانی کے ان نسخوں میں سے اس وقت چار نسخے دنیا میں محفوظ ہیں:

۱۔ حجرہ نبوی کا نسخہ۔
۲۔ خزانہ آثار نبویہ استنبول۔
۳۔ کتاب خانہ مصریہ۔
۴۔ کتاب خانہ ماسکو۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کا نصف آخر نہایت پرسکون رہا۔ فتوحات کی کثرت کے سبب مال غنیمت اور محاصل میں اضافہ ہوا۔ تجارت و زراعت میں ترقی ہوئی۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں خوشحالی پیدا ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں فساد اور بگاڑ بھی پیدا ہوگیا۔ اس بگاڑ اور فساد میں بہت سے عناصر کا حصہ تھا۔ کچھ عرب قبائل کی باہمی چپقلش، کچھ غیر مسلم اقوام اور علاقوں کا حلقہ اسلام میں [illegible] اور کچھ غیر مسلمان یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی سازشیں، یہ سب باتیں [illegible] فتنے کے ظہور کا باعث بنیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مزاج میں جو تحمل، بردباری اور فطری نرم دلی تھی اس نے سازشیوں کو دلیر بنا دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکنے والی اس آگ کے مراکز کوفہ، بصرہ اور [illegible] تھے گو اس سازش میں اور بہت سے لوگ بھی شریک تھے لیکن اس کا سرغنہ [illegible] (بظاہر مسلمان) عبداللہ بن سبا تھا۔ (اس کے خلاف بہت سی متضاد [illegible] ہیں۔ نیز دیکھیے مضمون "عبداللہ بن سبا")۔ اس نے حب [illegible] بیعت [illegible] بنی ہاشم کے پردے میں حضرت عثمانؓ اور پھر بنو امیہ کے خلاف وسیع پیمانے پر منظم [illegible] کا جال بچھا دیا۔ یہ سب غلط بیانیوں اور غلط شکایات پر مبنی تھا۔ حضرت عبد [illegible] عمرؓ نے کہا کہ عثمانؓ کے خلاف ان چیزوں پر اظہار ناراضگی کیا گیا کہ اگر عمرؓ نے کی ہوتیں تو لوگ خفا نہ ہوتے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت عمرؓ ایک سخت گیر خلیفہ تھے جبکہ عثمانؓ نہایت گداز دل اور نرم جو آدمی تھے اور اسی بات سے سازشی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ حالانکہ ان پر جو الزامات لگائے گئے ان کو جب بعد میں پرکھا گیا تو کوئی الزام بھی مضبوط اور قابل گرفت نہ تھا۔

اپنے خلاف ابھرنے والی افواہوں کی حقیقت جاننے کے لیے انہوں نے

ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی اور مختلف صحابہ کو مختلف مقامات پر بھیجا تاکہ وہ ٹھیک ٹھیک صورت حال کا اندازہ کرسکیں۔ پھر پورے ملک میں اعلان کردیا کہ جس شخص کو میرے عمّال کے خلاف شکایت ہو وہ حج کے موقع پر بیان کرے۔ میں ظالم سے مظلوم کا حق دلاؤں گا۔

۳۵ھ کے آخر میں باغیوں نے مدینے کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں حج کے باعث مدینہ تقریبًا خالی تھا۔ ان لوگوں نے پہلے تو امیرالمومنین مسجد میں آنا جانا دشوار کردیا پھر ان کے مکان کا محاصرہ کرلیا جو کم وبیش چالیس دن تک جاری رہا۔ اس دوران کئی بار امیرالمومنین نے اپنے مکان کی چھت سے باغیوں کو خطاب فرمایا، شورش پسندوں کو نصیحت کی حضور اکرم صلعم کے ساتھ اپنی نیازمندی کے حوالے دیے۔ اسلام کے واسطے اپنی خدمات گنوائیں لیکن کسی نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ انہوں نے باغیوں کو تنبیہہ کی کہ بخدا اگر تم نے مجھے قتل کردیا تو پھر تاقیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھوگے اور نہ ایک ساتھ جہاد کروگے۔ باغیوں نے ان سے خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کیا اور بعض صحابہ نے مدینہ منورہ چھوڑ کر مملکت کے کسی اور حصے میں چلے جانے کی رائے دی۔ لیکن انہوں نے انکار کردیا کہ نہ تو میں اس قمیض کو اتاروں گا جو مجھے اللہ تعالےٰ نے پہنائی ہے اور نہ جوارِ رسولؐ سے جدائی ہی برداشت کروں گا۔ ان کی حفاظت کے لیے بعض اکابر صحابہؓ نے اپنے فرزندوں کو ان کے مکان کے باہر مقرر کردیا تھا ان میں حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ایک جمِ غفیر ان کے پاس موجود تھا۔ ان کے پاس موجود لوگوں نے ان سے باغیوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن حضرت عثمان نے منع کردیا اور فرمایا جس پر میرا کچھ بھی حق ہے میں اسے اللہ کی قسم دلا کر کہتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روکے رکھے اور اپنے گھر کو چلا جائے۔

آخر یہ حالت تھی کہ خلیفۂ امتِ رسولؐ کا پانی بند کردیا گیا، انھیں پتھر مارے گئے ان کے گھر کو آگ لگا دی گئی لیکن انہوں نے اس ساری صورتِ حال کا حیرت انگیز استقلال اور استقامت کے ساتھ سامنا کیا اور اپنی حمایت میں کسی کو جنگ کی اجازت نہ دی۔

جنت البقیع، جہاں حضرت عثمان کا مزار ہے

انھیں حضرت محمد صلعم کی پیش گوئی کے مطابق اپنی شہادت کا یقین ہوچکا تھا آخری رات انہوں نے نبی اکرم صلعم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا: "اے عثمانؓ! ہمارے ساتھ روزہ افطار کرنا۔"

۱۸؍ ذوالحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن چند باغیوں نے گھر میں داخل ہوکر رسول اللہؐ کے تیسرے خلیفہ کو اس وقت شہید کردیا جب وہ تلاوت کلام پاک میں مشغول تھے شہادت کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے اوپر تھی۔ ابن جریر کے مطابق امیرالمومنینؓ کی میت کو چند صحابہؓ نے جن میں علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، کعبؓ بن مالک، زیدؓ بن ثابت اور حزامؓ شامل تھے، اٹھایا اور البقیع کی مشرقی جانب "حش کوکب" میں سپردِ خاک کردیا۔

شہادتِ عثمانؓ پر صحابہ کرامؓ دم بخود تھے۔ حذیفہؓ نے فرمایا سب سے پہلا فتنہ قتلِ عثمان ہے اور سب سے آخری فتنہ دجال ہوگا۔ حضرت علیؓ نے شہادتِ عثمانؓ کی خبر مسجدِ نبوی میں سُنی اور فرمایا: جاؤ اب ہمیشہ کے لیے تمہارے واسطے ہلاکت اور بربادی ہے۔ عبداللہؓ بن سلام نے کہا قتلِ عثمان سے فتنوں کا جو دروازہ کھل گیا وہ اب تاقیامت بند نہ ہوسکے گا اور دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی طرح رنج و تاسف کا اظہار کیا۔ حسان بن ثابتؓ کے علاوہ کعب بن مالکؓ، حمید بن ثور الہلالی، قاسم بن امیۃ بن صامت، زینب بنتِ عوام نے ان کی وفات پر الم انگیز مرثیے لکھے۔

حضرت عثمانؓ سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں جن میں سے تین متفق علیہ ہیں۔ آٹھ صرف بخاری میں ہیں اور پانچ صرف مسلم میں۔

نیز دیکھیے "خلافت راشدہ"

عثمانؓ بن مظعون

قدیم ترین اور فاضل صحابۂ رسولؐ میں شمار ہوتے ہیں۔ کنیت ابوالسائب تھی۔ ان سے پہلے فقط تیرہ افراد اسلام لائے تھے۔ حبشہ کی ہجرت میں شریک تھے۔ بعد میں واپس آگئے تھے۔ پھر عثمانؓ نے مدینے کو ہجرت کی۔ ان کے صاحبزادے سائب ان کے ہمراہ تھے۔ عثمانؓ کے بھائی قدامہؓ، عبداللہ اور سائبؓ بھی مہاجر اور بدری تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی اور ۲ھ میں وفات پائی۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو بقیع الغرقد میں مدفون ہوئے۔

رسولؐ خدا کی نگاہ میں ان کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ اس رنج وغم سے ہوتا ہے جس کا اظہار آپؐ نے عثمانؓ کی میت دیکھ کر کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے حضورؐ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کو ان کی قبر کے نزدیک دفن کیا۔

عثمانؓ بہت زاہد، عابد اور متقی انسان تھے۔ عبادت و ریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ شراب کے ممنوع قرار دیے جانے سے قبل ہی اس سے اجتناب کرتے تھے۔ رات بھر نوافل پڑھتے اور دن بھر روزہ رکھتے۔

عثمان ثالث

عثمانی حکمران جو اپنے بھائی سلطان محمود خان کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء تک فقط تین سال حکومت کی اور اسی دوران اپنے بھائی سلطان محمود ہی کے سیاسی اصولوں کا پابند رہا۔ چنانچہ ہمسایہ حکومتوں سے اس کی کوئی آویزش نہیں ہوئی۔

۱۷۵۶ء میں آسٹریا کی جنگِ ہفت سالہ شروع ہوگئی جس نے یورپین حکومتوں کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کرکے سات سال تک وسطِ یورپ کو میدانِ کارزار بنائے رکھا۔ دولتِ عثمانیہ کے لیے یہ دوسرا نادر موقع تھا جب وہ دشمنوں کی باہمی جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی مگر عثمان ثالث اس جنگ میں اخلاق و شرافت کے اسی اصول پر کاربند رہا جس کی مثال محمود اول نے آسٹریا کی

جنگِ جانشینی کے موقع پر پیش کی تھی۔

سلطنت کے اندرونی نظم و نسق میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس عہد میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۶؍صفر ۱۱۷۱ھ/۳۰؍اکتوبر ۱۷۵۷ء کو سلطان عثمان ثالث نے وفات پائی۔

عثمان ثانی

ایک عثمانی سلطان اور سلطان احمد اوّل کا بیٹا۔ سلطان احمد اوّل کا پہلا جانشین اس کا بھائی مصطفےٰ ہوا۔ لیکن اس کی سادہ لوحی اور نا اہلیت کے باعث تین ہی مہینے بعد اُسے معزول کر کے ارکینِ سلطنت نے ۲۶؍جنوری ۱۶۱۸ء کو چودہ سالہ شہزادہ عثمان (ثانی) کو تخت پر بٹھا دیا۔

عثمان ثانی کا عہد حکومت بھی بہت مختصر رہا اور سلطنت اور خود اس کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ ترکوں کی مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنا پڑی (۱۶۱۸ء) اور وہ تمام فتوحات جو مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں حاصل ہوئی تھیں ایرانیوں کو واپس کر دی گئیں۔ سلطنت عثمانیہ کی سرحد پھر اُسی خط پہ پہنچ گئی جہاں سلطان سلیم ثانی کے زمانے میں تھی۔ اُدھر سے فارغ ہو کر عثمان سلطنت کے اندرونی دشمنوں یعنی سپاہی دستوں کی جانب متوجہ ہوا جن کی خودسری اور سرکشی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ تھی۔

عثمان ثانی

۱۶۲۱ء میں سلطان نے پولینڈ کے ساتھ جنگ چھیڑ دی جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس فوج کی قوت بھی کچھ کمزور پڑ جائے۔ یہ مقصد ایک حد تک پورا تو ہوا اور سلطانی فوجوں کو جزوی کامیابی کے بعد کافی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ لیکن اس جنگ سے عثمان کے خلاف ایک عام برگشتگی پیدا ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ وہ رعایا کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے قوانین و ضوابط میں نامناسب تبدیلیاں اور سختیاں نافذ کر کے اور نہ علمائے سلطنت کو اپنے برتاؤں سے خوش کر کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بیزار کر دیا۔

۱۶۲۲ء میں اس نے سفر حج کا ارادہ کیا لیکن یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اس کا اصلی مقصد دمشق پہنچ کر کُردوں اور دوسرے سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کرنا ہے جسے جدید طرز پہ منظم کر کے وہ ینی چری اور اسپاہی کی بیخ کنی کے لیے قسطنطنیہ لانا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو سلطنت کی بیشتر خرابیاں دور ہو جاتیں لیکن چونکہ اس مہم کی رازداری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اس لیے ینی چری کو اس کے مقصد کا علم ہو گیا۔ اور انہوں نے برافروختہ ہو کر سلطان کو اس سفر سے روک دیا اور موجودہ وزیروں کے قتل کا مطالبہ کیا۔ عثمان کے پاس ایسی فوج نہ تھی جو ان کا مقابلہ کر سکتی اور نہ عوامی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں باغیوں نے وزرا سے بڑھ کر خود سلطان کی ذات پر حملہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے عثمان کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور مصطفےٰ کو رہا کر کے دوبارہ تخت سلطنت پر بٹھایا۔ داؤد پاشا جس کو اس بغاوت میں بہت دخل حاصل تھا، صدر اعظم بن گیا۔ انقلاب کے کسی آئندہ خدشے کے پیش نظر وہ اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ عثمان کے قید خانے میں داخل ہوا اور نہایت بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ اسے پھانسی دے کر ختم کر دیا۔

عثمان ھارونیؒ

معروف صوفی۔ ان کی پیدائش خراسان کے قصبہ ہارون میں ہوئی۔ تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ وفات ۶ شوال ۶۱۷ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی اور وہیں مزار ہے۔

زیادہ تر زندگی سفر میں گزاری اور اپنے وقت کے تقریباً تمام مشہور مشائخ سے ملاقات کی۔ بڑے پائے کے ولی اللہ تھے۔ ان کے پیر حاجی شریف زندنیؒ نے خرقۂ خلافت عطا کرتے وقت آپ کے فرقِ مبارک پہ ایک کلاہ رکھی اور فرمایا: "عثمان! اس کے چار گوشوں سے مراد چار چیزوں کا ترک یعنی ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک خورد و خواب مگر بقدر ضرورت اور ترک خواہش نفس۔ پھر فرمایا یہ کلاہ اس شخص کو اپنے سر پر رکھنا جائز ہے جو ان چاروں چیزوں کو ترک کرے۔ سب لوگوں کو اپنے سے بہتر اور اپنے آپ کو سب سے کمتر جانے جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ اس کا اہل نہیں اور اس کے لیے یہ حرام ہے۔

خواجہ عثمان ہارونیؒ نے اپنے پیر کی ان باتوں پہ پوری طرح عمل کیا اور [illegible] ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ تین سال تک ایسی زندگی بسر کی جب پیر و مرشد نے امتحان لے لیا اور دیکھا کہ آپ ہر طرح سے کامیاب ہو گئے ہیں تو خرقۂ خلافت عنایت کیا۔ اس کے بعد پیر کی اجازت سے سفر کا آغاز کیا اور مختلف علاقوں کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔

خواجہ اجمیریؒ کو مرید کرنے کے بعد آپ مکہ معظمہ [illegible] بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ مکہ سے مدینہ پھر بدخشاں اور بغداد [illegible] قیام کے بعد پھر طویل سفر اختیار کیا۔

"انیس الارواح" کے نام سے ایک کتاب [illegible] جمع کیے ہیں۔ خواجہ عثمان ہارونیؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی [illegible] کے لیے حاصل کیا جائے۔ اور دوسرا علم [illegible] طرح عمل کی بھی دو قسمیں بتائیں۔ [illegible] جو لوگوں کے لیے کیا جائے۔ مزید فرمایا مومن وہ شخص ہے جو [illegible] رکھے موت، فاقہ اور درویشی۔

عجمی

لغوی معنی گونگا۔ اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ [illegible] جو عرب کی جغرافیائی حدود سے باہر کے علاقوں سے تعلق [illegible] دیے گئے۔ اس لقب کی تہ میں اہلِ عرب کا اپنی زبان [illegible] ناز پوشیدہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ [illegible] انسان اپنا مافی الضمیر پوری صحت کے ساتھ [illegible] اظہار نہ کرنا گونگے ہونے کے برابر ہے۔ اس لفظ [illegible] یعنی ان کی نگاہ میں امتیاز صرف زبان ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ خیال [illegible] قرار دیا اور بتایا کہ سبھی انسان برابر ہیں۔ اگر کسی میں کوئی امتیاز ہے تو وہ [illegible] ڈرنے کی وجہ سے۔ کیونکہ [illegible] لوگوں نے مر کر اپنے خدا کے حضور جانا ہے تو وہاں صرف اس کی فرمانبرداری ہی کام آئے گی۔ زبان و بیان کسی پہلو بھی کام نہیں آ سکے گا۔ اصل کامیابی اور وجہ عزت خدا کی رضامندی یعنی جنت میں داخلہ ہے [illegible] وہ تبھی ممکن ہے جب اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر انسان عمل پیرا ہو۔ [illegible]

بزرگی اور فضیلت اللہ کی اطاعت پر منحصر ہے۔ فصاحت و بلاغت یا زبان دانی نہیں۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے اپنے آخری خطبہ میں بھی فرمایا کسی عربی کو عجمی پر محض عربی ہونے کی بنا پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کے لیے عربی پر کوئی بڑائی نہیں بلکہ فضیلت اللہ سے زیادہ ڈرنے میں ہے۔

عداس مسیحی

ایک مسیحی غلام۔

حضور اکرم صلعم جب طائف پہنچے اور قبیلہ بنی ثقیف سے مدد چاہی اور انھیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے جواباً اپنے [illegible] میں سے بعض دریدہ دہن لوگوں کو آپؐ پر آوازے کسنے پر اکسایا۔ ان لوگوں نے نازیبا باتیں کہنے کے ساتھ ساتھ آپؐ پر پتھر بھی برسائے۔ آپؐ زخمی ہو کر لہولہان ہو گئے۔ اور ایک باغ میں پناہ لی۔ باغ کے مالکان [illegible] انہیں خیال آیا اور انہوں نے عداس مسیحی نامی عیسائی [illegible] انگور رکھانے سے قبل بسم اللہ کہا۔ [illegible] رہا تھا کہ اس علاقے کے لوگ تو کھانے [illegible] آپ کون ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یونس [illegible] آپؐ کے سر اور پاؤں کو [illegible] انہوں نے کہا تیرا دین [illegible] کر دے اور یہ [illegible] ہے۔

[illegible] اسلام کے [illegible] خود دلیل ہے۔

عدل

عربی زبان کا لفظ۔ لغوی معنی برابری۔ ظلم کے اختلاف میں استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ اسلام نے عدل کو بنیادی اہمیت دی ہے کیونکہ اس کے بغیر ایک صالح معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آ سکتا۔ علاوہ ازیں کسی بھی معاشرے میں خوشحالی، امن اور ارتقاء کے مراحل اسی وقت طے ہو سکتے ہیں جب وہاں عدل موجود ہو۔ بصورت دیگر معاشرہ میں بسنے والے افراد خوف و ہراس اور بے راہ روی کا شکار ہو کر سوسائٹی کے قیام کے اصل مطالب سے ہٹ جائیں گے۔

ریاست یا فرد کی حفاظت ایک لازمی امر ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عدل کے ذریعے حق دار کو حق دلایا جائے اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ کسی قانون کے تحت ہی ہو سکتا ہے اور اسلام اسی قانون کو عدل کا نام دیتا ہے۔ جہاں مخلوق کے درمیان برابری کی بنیاد پر حقوق اور فرائض کی تقسیم کی جائے ایک فرد یا گروہ دوسرے فرد یا گروہ کو زک یا تکلیف نہ پہنچائے اور اگر ایسا ہو جائے تو ایک عادل (یا عدالت) غلط اور صحیح کا فیصلہ کر کے معاملے کو احسن طریقے پر نمٹائے عدل کے تحت خون کا بدلہ خون اور عضو کا بدلہ عضو ہے یعنی اگر ایک شخص دوسرے کو جتنی تکلیف یا نقصان پہنچاتا ہے، اسلامی نگاہ میں مظلوم کو حق ہے کہ وہ ظالم کو اتنی ہی تکلیف یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس میں کسی رعایت یا لچک کی گنجائش نہیں ہے البتہ اگر مظلوم ظالم کو معاف کر دے تو یہ احسان ہے۔ تاریخ اسلام کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

رسول اللہؐ کے پاس قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت فاطمہ چوری کے جرم میں پکڑ کے لائی گئی۔ آپؐ نے اس پر تعزیر نافذ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ تو اس قبیلے کے کچھ معزز افراد نے آنحضرتؐ سے حضرت اسامہ بن زید کے ذریعے سفارش کی۔ تو آپؐ کا چہرہ مارے غصہ کے سرخ ہو گیا اور لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ خبردار تم سے پہلی قومیں اسی لیے عذاب الٰہی کا شکار ہوئیں کہ ان میں جب کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو قانون سے چشم پوشی کر لیتے۔ لیکن اگر کوئی غریب اور لوگوں کی نگاہوں میں غیر معزز جرم کر بیٹھتا تو اسے سزا دی جاتی۔ سنو۔ اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ یہ تو مخزوم قبیلے کی فاطمہ ہے اگر کہیں فاطمہ محمدؐ کی بیٹی اس جرم میں ملوث ہوتی تو میں اس پر بھی قانون نافذ ضرور کرتا اور اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس کا نام عدل ہے کہ یہاں لحاظ شخصیت کا نہیں اصول کا ہے۔ عدل کے لفظ کے ساتھ ایک اور لفظ بھی ہے۔

"احسان"۔ قانونی زبان میں اس کی ترکیب یوں ہو گی، قانون اور اخلاق۔ قانون کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور اخلاق میں ہر شخص مختار ہے۔ مثلاً مقتول کے ورثاء قاتل کو سزا دینے کے حقدار نہیں۔ اگر اس طرح کیا جائے گا تو عدل ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر شخص اپنی مرضی سے جسے چاہے زندگی سے محروم کر دے۔ اور اس بے اعتدالی سے قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا۔ جسے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون مقرر کیا ہے۔ عدالت کو عدالت بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں سے انصاف ملتا ہے۔ اب عدالت مقتول کے وارثوں کو اختیار دے گی قتل کیا جائے یا معاف کر دیا جائے۔ اگر ورثاء قتل پر آمادہ ہوں تو یہ عدل ہے اور اگر معاف کر دیں تو یہ احسان ہے۔

قرآن مجید میں عدل، شرک کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی برابری کا مفہوم یہ تو نہیں کہ خدا کے ساتھ اس کی مخلوق میں سے کسی کو صفات و خصوصیات میں برابر کر دیا جائے بلکہ یہ برابری انسانوں میں انسان ہونے کی بنا پر ہے خالق کے ساتھ نہیں۔

ایک اور مقام پر مال کے معنی استعمال ہوا۔ یعنی قیامت کے روز کسی کے لیے جہاں سفارش و عذر فائدہ نہ دے گی وہاں مال بھی بدلے میں دے کر قانون کی گرفت سے بے قابو نہ ہوا جا سکے گا۔ اہل لغت نے عدل کے معنی مثلاً یہ لکھے کہ اونٹ کے دونوں کجاوے ایک جیسے بھرے ہوں۔ ایک جیسا وزن ہو۔ تو اس کے معنی دراصل برابری کے ہیں۔ مخلوق کے حق میں ہو تو عدل۔ اور خدا کے ساتھ کی جائے تو یہ شرک۔

عـدن

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے میں برطانیہ کی ایک نو آبادی۔ برطانیہ یہاں ۱۸۳۸ء میں قابض ہوا۔ رقبہ تقریباً ۷۵ مربع میل ہے۔ یہاں بالواسطہ برطانیہ کا عمل ہے۔ آبادی تقریباً ساڑھے تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے

عدن کی نو آبادی کی قانون ساز کونسل بارہ منتخب۔ پانچ بہ لحاظ عہدہ اور چھ نامزد ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ انگریزی اور عربی دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ عدن کی صنعت سمندر کے پانی سے نمک حاصل کرنا ہے۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے بھی یہاں موجود ہیں۔

۱۹۶۵ء سے برطانیہ نے عدن کی حکومت برطرف کرکے آئین معطل کر رکھا ہے۔ حریت پسندوں اور انگریز فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ جنوبی عربی عرب کی تحریک آزادی کا موقف ہے کہ برطانیہ کے خلاف جنگ کرکے ہی عدن کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ جب سے عدن کو جنوبی عرب وفاق میں شامل کیا گیا ہے۔ عدن کے قوم پرستوں نے اپنی جدوجہد آزادی تیز تر کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وفاق میں شامل گیارہ عرب ریاستیں عدن کے مقابلے میں پسماندہ ہیں۔ وفاق [illegible] چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں جن کے سربراہ کا نام امیر یا سلطان ہوتا ہے۔ [illegible] کا صدر مقام "الاتحاد" ہے۔ ادھر برطانیہ عدن سے [illegible] تیار نہیں۔ اقوام متحدہ کئی بار تحریک پیش کر چکی ہے کہ عدن کے عوام کو اپنے [illegible] کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔

عـدنان [illegible]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے [illegible] ایک شخص سرزمین عرب میں عدنان نامی گزرا ہے [illegible] عدنان کے دو لڑکے تھے۔ [illegible] نزار سے چلی۔ اس سے پانچ قبیلے مشہور نکلے [illegible] حاصل ہوئی ہو [illegible]

[illegible] البتہ ربیعہ اور مضر نے کثرت تعداد [illegible] لحاظ سے بڑی شہرت پائی۔ ربیعہ [illegible] بڑے قبائل منقسم مشہور ہے [illegible] قائم کیں۔ مشہور قبائل یہ ہیں: [illegible] صہیب رومیؓ، بنو وائل، بنو عجل، بنو قیس، بنو تغلب اور [illegible] ان سے بھی بہت سے قبائل شاخ در شاخ ہو کر نکلے۔ ان سب قبائل [illegible] یا عدنانی کہا جاتا ہے۔

عدیؓ بن حاتمؓ

عدی بن حاتم بن عبداللہ بن سعد طائی۔ ابو ظریف حضور اکرم صلعم کے صحابی جو حضرت علیؓ کے حامیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مشہور شاعر حاتم طائی کے بیٹے اور اسی کے ہم مذہب یعنی عیسائی تھے۔ قبیلے کی سرداری بھی انہیں اپنے باپ سے ورثے میں ملی۔

ایک وفد کی صورت میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور [illegible] عزت افزائی فرمائی۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر ۹ھ/۶۳۰ء میں اسلام قبول کر لیا۔ ایک جگہ عدی کا اپنا بیان نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے مشرف بہ اسلام ہونے کی وجہ حضور اکرمؐ کے اخلاق و انصاف سے متاثر ہونا بتایا ہے۔

نبی اکرم کی وفات کے بعد عدی اسلام پر ثابت قدم رہے اور [illegible] کے دوران انہوں نے اپنے قبیلے کو مرتد ہونے سے بچائے رکھا۔ بعد ازاں انہوں نے عراق کی فتح میں حصہ لیا اور حضرت عثمانؓ سے نہر عیسٰی پر [illegible] جاگیر پائی۔

جنگ جمل میں عدی بن حاتم حضرت علیؓ کے ماتحت رہے۔ جنگ صفین [illegible] پہلے جو نامہ و پیام فریقین کے درمیان ہوا اس میں وہ اس وفد میں شامل تھے جو حضرت علیؓ کی طرف سے امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا گیا۔ [illegible] بن کر اس جنگ میں رہے [illegible]

ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

شیخ عدی [illegible]

ان کے بھائی صخر کی اولاد میں چلی گئی [illegible]

خادم کے بیٹے حسن ابو ب کو متبنٰی کر لیا تھا [illegible]

پیشوا ہوئے [illegible]

دینا فرض سمجھتے تھے۔ یہ سلسلہ زیادہ کردوں ہی تک محدود تھا۔
اس کی ایک خانقاہ قاہرہ میں قرافہ کے مقام پر بھی تھی۔ اس سلسلے کے ارادت مند شیخ عدی کی عقیدت و احترام میں اس حد تک بڑھ گئے کہ یہ اعتقاد رکھنے لگے کہ شیخ عدی اپنے معتقدین کو روزی دیتے ہیں۔ یہ فرقہ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ حکومت کو اس طرف توجہ کرنا پڑی اور ان کے استیصال پر آمادہ ہونا پڑا۔

عدی ، بنو

عرب کا مشہور قبیلہ، اہل عرب عموماً عدنان یا قحطان کی اولاد ہیں۔ عدنان کا سلسلہ حضرت اسمٰعیلؑ تک پہنچتا ہے۔ عدنان کے گیارہویں پشت میں فہر بن مالک بڑے صاحب اقتدار تھے۔ قریش انہی کی اولاد ہیں۔ قریش کی نسل میں دس شخصیتوں نے اپنی لیاقت کے باعث بڑا امتیاز حاصل کیا۔ اور ان کے انتساب سے دس جدا نامور قبیلے بنے۔ ان میں سے ایک نامور قبیلہ عدی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ انہی کی اولاد سے ہیں۔ عدی کا ایک اور بھائی مُرّہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی سے ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کا سلسلۂ نسب آنحضرتؐ سے آٹھویں پشت میں جا کر مل جاتا ہے۔

عذاب

عربی زبان کا لفظ ثواب کے مقابل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انسان [illegible] اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا اور اس پر طرح طرح کے انعامات کیے [illegible] ان نعمتوں [illegible] انعامات کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت [illegible] ہوئے راستہ پر چلے۔ جو شخص اس مقصد کو [illegible] اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتے [illegible] دنیا و دین میں اسے سرفراز کرتے ہیں۔ مرنے کے بعد قبر سے لے کر قیامت کے [illegible] اللہ کی رحمتیں اس پر ہوتی ہیں۔ بالآخر اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ [illegible] ثواب ہے لیکن اس کے برعکس جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے [illegible] رسولوں پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی زندگی کو نیک کاموں میں [illegible] نہیں کرتا۔ ایسے شخص پر اللہ ناراض ہوتے اور دنیا و دین میں اس سے امن و سکون چھین لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ بڑا طویل ہے۔ مرنے کے بعد اس کا ٹھکانہ بھڑکتی ہوئی آگ ہوگا۔

عذاب کا اطلاق افراد کے علاوہ قوموں پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ان تباہ شدہ قوموں کا تذکرہ بالتفصیل آیا ہے جنہوں نے انبیاء علیہ السلام کی دعوت کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی زندگی کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ آخرکار وہ تباہ ہو گئے۔ یہ نہیں کہ وہ مال و دولت سے محروم تھے بلکہ ان کے پاس سربفلک عمارتیں بھی تھیں۔ شان و شوکت کے بھی مالک تھے۔ صرف نافرمانی کے جرم میں عذاب کا شکار ہو گئے۔

عذاب کے سلسلے میں اللہ نے کچھ اصول بتائے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ اس قوم پر عذاب نہیں بھیجتا جن میں کوئی نبی یا رسول نہ آیا ہو۔
۲۔ جس قوم میں اصلاح کی گنجائش ہو وہ بھی عذاب کا شکار نہیں ہوتی۔
۳۔ جن میں چند افراد نیک اور صالح ہوں، ساتھ ساتھ اچھائی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے روکتے ہوں، ایسی قوم پر بھی عذاب نہیں آتا۔
۴۔ دنیا میں جو لوگ عذاب سے ہلاک کر دیئے جائیں، آخرت میں بھی وہ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔
۵۔ عذاب کی آمد سے پہلے انہیں آخری مرتبہ تنبیہہ کی جاتی ہے۔
۶۔ نیک اور صالح لوگوں سے بستی خالی ہو جاتی ہے۔
۷۔ خوشحالی کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور پھر یکدم تنگ دستی ان پر چھا جاتی ہے۔

اور جب عذاب آ جاتا ہے تو :

۱۔ ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔
۲۔ نفع کی چیزیں ہی عذاب بن جایا کرتی ہیں۔
۳۔ کوئی ایک شخص بھی بچ نہیں سکتا۔
۴۔ مال و دولت، حسن و جمال اور فنکاری کسی کام نہیں آتی۔

قرآن مجید میں عذاب کا شکار ہونے والی جن قوموں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم شعیبؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ اور بنی اسرائیل کے کچھ گروہ خاص طور پر مذکور ہیں۔

ان کے جرائم یہ تھے :

۱۔ قوم نوحؑ، قبر پرستی اور شرک کے مرض میں مبتلا تھی۔
۲۔ قوم ہودؑ، ناشکر گزاری کے باعث۔
۳۔ قوم شعیبؑ، خرید و فروخت میں بددیانتی کی وجہ سے۔
۴۔ قوم صالحؑ، اللہ تعالیٰ سے معجزہ مانگا پھر بھی ایمان نہ لائی اور معجزہ (اونٹنی) کو نقصان پہنچانے کے باعث۔
۵۔ قوم لوطؑ، بدفعلی کے باعث۔
۶۔ بنی اسرائیل، نافرمانی اور نعمتوں کی ناقدری کے باعث۔

مجموعی طور پر یہ قومیں شرک کے علاوہ دیگر معاشرتی، معیشی، اخلاقی، تہذیبی برائیوں میں ملوث تھیں۔

عذاب کی صورتیں عموماً یہ ہوئیں :

۱۔ زور دار آندھی اور طوفان۔ (۲)۔ پانی کا سیلاب۔ (۳) پتھروں کی بارش، (۴) زلزلہ۔ ۵۔ قحط سالی۔ ۶۔ طاعون۔

عذاب کی تین قسمیں ہیں :

(۱) الیم۔ منافقوں اور ان جیسے کردار والوں کے لیے۔ (۲) عظیم۔ کفار و مشرکین اور متکبروں کے لیے۔ (۳) مھین، احکامات الٰہیہ سے بے نیاز رہنے والوں کے لیے۔

عذاب کس قوم پر اور کب آتا ہے۔؟

جب عدالتوں سے عدل و انصاف کی توقع اٹھ جائے۔
جب فحاشی و عریانی، بے غیرتی اور بے شرمی حد سے بڑھ جائے۔
جب احکامات الٰہیہ کے ساتھ تمسخر کیا جانے لگے۔
جب شراب و نشہ عام ہو جائے۔
جب زنا کی وبا پھیل جائے۔
جب ماپ تول اور ترازو میں بددیانتی معمول بن جائے۔
جب اخلاق، رحم، شرافت اور عصمت کالعدم ہو جائے۔
جب شرک و بدعات، توحید و سنت کی جگہ لے لیں۔ تو وہ قوم عذاب الٰہی کا شکار ہو جایا کرتی ہے۔

عذاب قبر

روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ۔ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور لوگ واپس ہو جاتے ہیں تو دو فرشتے اس کے پاس آکر اسے (میت کو) بٹھا دیتے ہیں۔ پھر دریافت کرتے ہیں کہ محمد صلعم کے متعلق تیرا کیا عقیدہ ہے ۔ اگر تو وہ (مُردہ) مومن ہوتا ہے تو جواب دیتا ہے کہ مَیں گواہی دیتا ہوں ، محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ۔ تو اس سے کہا جاتا ہے ۔ ذرا دوزخ کی حالت دیکھ لے اور خدا نے تجھے جنت عطا کی ہے ۔ اور اگر وہ منافق یا کافر ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ مَیں تو لوگوں کی سنا سنی میں ہی کہہ دیا کرتا تھا ۔ اس سے فرشتے کہتے ہیں ۔ تو نے عقل سے کام نہ لیا اور انہیں رسول نہ مانا ۔ نہ قرآن پڑھا ۔ پھر اسے لوہے کے گرز سے مارا جاتا ہے اور اتنی سخت مار لگائی جاتی ہے کہ وہ چیخنے لگتا ہے ۔ اس کی چیخ کو سوائے انسان و جن کے ہر چیز سنتی ہے ۔ بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان سے قبر میں سوال ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے ۔ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ۔ اور محمدؐ اللہ کے برحق رسول ہیں اور خداوند تعالےٰ کا یہ فرمان کہ "ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے دنیا و آخرت میں اور بھٹکا دیتا ہے ظالموں کو ، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔ (یہ آیت کریمہ) عذاب قبر کے سلسلہ میں نازل ہوئی ۔ مومن سے قبر میں سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے ۔ تو وہ جواب دیتا ہے ۔ میرا رب اللہ تعالےٰ ہے ۔ میرے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (اور میرا دین اسلام ہے) ۔

مسلم کی ایک حدیث حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ آیک بار آنحضرت صلعم بنی نجّار کے باغ میں خچر پر سوار تھے ۔ ہم لوگ بھی ہمرکاب تھے کہ خچر بدکنے لگا قریب تھا کہ حضورؐ کو گرا دے ۔ وہاں پانچ چھ قبریں نظر آئیں ۔ آپ نے دریافت فرمایا تم لوگ ان قبروں کے مُردوں کو جانتے ہو ۔ ہم میں سے ایک شخص نے عرض کیا حضور مَیں جانتا ہوں ۔ آپؐ نے فرمایا یہ کس دین پہ مَرے تھے ۔ عرض کیا ، حالتِ شرک میں مرے تھے ۔ تو آپؐ نے فرمایا ، قبروں کے اندر ان کی آزمائش ہوتی ہے ۔ اور اگر مجھے اس کا یقین ہوتا کہ وہ تمام امور جو عذاب قبر کے متعلق مجھے خداوند عالم بتاتا ہے سن کر مردے کو دفن کرنا ترک نہ کر دو گے تو وہ سب مَیں تمہیں بھی بتا دیتا ۔ اس کے بعد آپؐ نے ہم سے فرمایا ۔ دوزخ کی آگ سے پناہ مانگو ۔ حاضرین نے عرض کیا ہم توبہ کرتے ہیں ۔

قرآن مجید کی اس آیات سے اشارۃً عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے ۔ قرآن میں اس عالم کو "برزخ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں ۔ چار جہان ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے :

(۱) عالم ارواح : جہاں اللہ تعالےٰ کو تمام انسانوں کی روحوں نے اپنا رب تسلیم کیا ۔

(۲) عالم دنیا : جس میں زندہ لوگ موجود ہیں ۔

(۳) عالم برزخ : روح کے بدن سے جدا ہونے کے بعد جس جہان میں انسان قدم رکھتا ہے ۔

(۴) عالم محشر : جب اسرافیل دوبارہ صور پھونکیں گے تو سبھی مردے جی اٹھیں گے ۔ اور خدا کے حضور پہنچ جائیں گے ۔ حساب و کتاب ہوگا ۔ پھر جنت و دوزخ میں داخلے کا فیصلہ ہوگا ۔ اس عالم کے بعد کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں ابدالآباد تک رہیں گے ۔ ہر عالم کی کیفیات جدا جدا ہیں ۔ مثلاً قرآن کریم کا بیان ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عالم ارواح میں سب سے اپنے رب ہونے کے بارے میں پوچھا ۔ تو سب نے اس کا اقرار کیا ۔ مگر اس واقعہ کا ہمیں کوئی احساس نہیں ۔ انسانی عقل سے اس عالم کی کیفیات ماورا ہے اسی طرح قرآن میں یہ ہے کہ جب لوگوں کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا تو وہ کہیں گے ۔ ہمیں ہماری سونے کی جگہ سے کس نے بیدار کیا ؟ حالانکہ نیک لوگ تو واقعی آرام سے سو رہے ہوں گے ۔ جس طرح کہ حدیث میں ہے مگر بُرے لوگ عذاب میں مبتلا ہوں گے ۔ تو ان کا یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ سابقہ عالم سے انہیں کچھ بھی یاد نہیں ۔

عذاب قبر سے ہر نماز میں پناہ مانگنے کی تاکید ہے ۔ آنحضرتؐ نے فرمایا قبر قیامت کی پہلی گھاٹی ہے جو اس میں کامیاب ہوگیا وہ آخرت میں بھی کامیاب ہوگا ۔ اور جو اس میں ناکام ہوگیا وہ آخرت میں بھی ناکام رہے گا ۔ قرآن مجید کی دس آیات سے عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے اور احادیث کی تعداد ستر ہے ۔

عراق

رقبہ ۱۷۱۶۰۰ مربع میل ، آبادی ۷۰۸۵۰۰۰ ۔ دارالحکومت کا نام بغداد ہے ۔ دریائے دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ ہے ۔ جسے پہلے میسوپوٹیمیا (MESOPTAMIA) کہتے تھے ۔ اس کے جنوب میں کویت اور سعودی عرب مغرب میں اردن اور شام ، شمال میں ترکی اور مشرق میں ایران ہے ۔ اس کے جنوب مغرب میں صحرائے شام ہے ۔ بحری آمد و رفت خلیج فارس سے ہوتی ہے ۔ ملک کی اقتصادیات کا انحصار تیل اور زراعت ہے تیل کی صنعت پر انگریزوں کا قبضہ ہے ۔ ۱۹۲۵ء کے معاہدہ کے مطابق ۲۰۰۰ سال تک تیل کی کشید ، صفائی و برآمد کے حقوق حاصل کر رکھے ہیں ۔ خوراک کے معاملے میں ملک خود کفیل ہے ۔ تیل کے علاوہ کھجور سب سے بڑی برآمدی پیداوار ہے ۔

عراق کی تاریخ کا آغاز غیر ملکی حملہ آوروں سے ہوتا ہے ۔ جو ۳۵۰۰ ق م اور ۲۳۰۰ ق م کے مابین دریائے فرات اور دجلہ کے سنگم پر اُر کے مقام پر آباد ہوئے اور انہوں نے سمیر SUMER کی دو تاج والی منسلک بادشاہت قائم کی ۔ سمیری لوگوں نے غالباً سب سے پہلے پہیہ گاڑیاں استعمال کیں ۔ اس کے علاوہ انہوں نے کیونی فارم (CUNEI FORM) نامی طرز تحریر ایجاد کیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ہندوستان کے قدیم باشندوں سے روابط تھے کیونکہ ان کی مہروں پر بعض ہندوستانی جانوروں کی تصاویر ہیں اور موہنجو ڈارو کے مقام پر بعض ایسی اشیا دستیاب ہوتی ہیں جو سمیر یا ہے۔ سے بھی ملیں سمیری لوگ تاریخ عالم کے اولین سیاسی منظم لوگوں میں سے ہیں ۔ سمیر اور عکاد کی حکومت ۲۳۰۰ ق مسیح تک قائم رہی جس کے بعد بابل کو تقویت حاصل ہوئی ۔ اور اس پر عموری (یا عاموری) کی حکومت قائم ہوئی ۔ یہ لوگ سمیریوں سے ۔۔۔ سامی نسل سے تھے اور غالباً شمالی شام سے آئے تھے ۔ حمورابی ۱۷۰۰ ق م ان کا سب سے مشہور حکمران گزرا ہے جس کے عہد حکومت میں حتی لوگوں نے شمال مغرب سے اور کاسی لوگوں نے شمال مشرق سے حملے شروع کر دیے ۔

۱۷۴۶ ق م میں ایک کاسی بادشاہ نے اپنے آپ کو چار ممنکتوں سمیر عکاد اور بابل وغیرہ کا بادشاہ قرار دیا ۔ اور ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھی جو ۔۔۔ ۴۰۰ برس تک بابل پر حکمران رہا ۔ ۱۱۸۲ ق م میں ایلام سے ایک حملہ ہوا جس نے کاسی حکومت کو شکست دی ۔ اس کے چند برس بعد بابل میں بغاوت ہوئی ۔ اور ایک مقامی خاندان پاشے کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آگئی ۔ یہ خاندان ۱۲۰ برس حکمران رہا ۔ حتیٰ کہ ایل اشور نے ۱۰۲۵ ق ۔ م میں اس خاندان کے سب سے نامور بادشاہ بخت نصر اول کو شکست دی ۔ ۷۳۸ ق م کے قریب یعنی دو صدیوں کے

اندرونی خلفشار کے بعد تمام بابل اہل اشور کی عملداری میں آ گیا۔ اہل اشور نے غالباً سب سے پہلے ڈاک رسانی کا شعبہ قائم کیا۔ ان کا دارالحکومت نینوا تھا۔

۶۲۵ ق م کے قریب بابل پھر برسر اقتدار آیا اور وہاں بنوکد نضر ثانی نے ایک ایسی ہی سلطنت قائم کی جو ۵۳۹ ق م تک قائم رہی۔ ۵۳۹ ق م میں بابل پر پھر اہل ایلام نے حملہ کیا اور آخری بادشاہ بل شیزر کو شکست ہوئی اور فارس کا بادشاہ سائرس فاتح ہو کر بابل میں داخل ہوا۔ اگرچہ بابل کے شہر کو ایرانی عہد حکومت میں بھی اقتدار حاصل رہا۔ مگر اب بابل تجارتی مرکز تھا۔ اس کی وہ سیاسی اور فوجی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ جو اسے اشوری سلطنت کے عہد حکومت میں حاصل تھی۔ عراق پر فارس کی حکومت ۳۳۱ سے ۵۳۹ ق م تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۴۱ ق م تا ۳۴۱ اس پر سکندر مقدونی اور اس کے جانشین جرنیل حکمران رہے۔ اس کے بعد ۱۴۱ ق م سے ۲۲۶ء تک اس پر پاتھیا کی حکومت رہی۔ ۲۲۶ء تا ۶۳۷ء تک اس پر ساسانی بادشاہوں کا تسلط رہا۔ اور ۶۴۱ء سے ۱۲۵۸ علسوی تک اس پر حجازی الن[illegible] مستولی رہے۔

مسلمانوں نے عراق پر پہلا حملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں خالد بن ولیدؓ کی زیر قیادت ۶۳۲ء میں کیا۔ جس کے بعد آئندہ پانچ برسوں میں وہ تمام عراق پر چھا گئے۔ ۷۵۰ء کے قریب اس پر بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی ان کے دور اقتدار میں جو ۱۲۵۸ء تک قائم رہا۔ ایرانی اثرات اس کی زندگی میں دخل پانے لگے۔ بنی عباس کے بعد یکے بعد دیگرے منگولوں، ترکوں اور سفاری حکمرانوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کا مجموعی دور اقتدار ۱۲۵۸ء سے ۱۵۳۴ء تک رہا۔ اس کے اختتام پر عراق، عثمانی ترکوں کی عملداری میں آ گیا۔ اور ۱۹۱۸ء تک ان کے زیر تسلط رہا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۲۰ء میں عراق کو برطانیہ کی تولیت میں دے دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انگریزوں نے شاہ فیصل اوّل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۹۲۴ء میں ملک میں نیا آئین نافذ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں گے اور وہ پارلیمانی حکومت کی زیر ہدایت کار فرما ہو گا۔ شاہ فیصل اوّل جو سابق شاہ شریف حسین کا فرزند اور شاہ اردن عبداللہ کا سوتیلا بھائی تھا ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء میں فوت ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا غازی تخت نشین ہوا۔ جس نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شاہ فیصل ثانی کو بادشاہ بنایا گیا وہ اس وقت کم سن تھا۔ اس لیے اس کا چچا عبدالالہ ایجنٹ مقرر ہوا۔ امیر فیصل دوم کی رسم تاجپوشی ۱۹۵۳ء میں ادا ہوئی۔ اور امیر عبدالالہ کو ولی عہد مقرر کیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۸ء میں جنرل عبدالکریم قاسم نے امیر فیصل کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور امیر فیصل کو قتل کر کے ملک کی زمام حکومت ایک انقلابی کونسل کے سپرد کر دی۔

۱۹۶۳ء میں عبدالسلام عارف نے جو قاسم کا ایک حلیف تھا، فوجی بغاوت کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عبدالکریم قاسم کو پھانسی دے دی گئی۔ ۶۶ء میں عبدالسلام عارف ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن عارف تخت نشین ہوئے۔

عراقی، فخرالدین شیخ

صوفی۔ پورا نام شیخ فخرالدین ابراہیم ہے۔ ولادت ہمدان کے نواح میں ۶۰۰ھ کو ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں ہمدان کے مدرسہ سے معقولات و منقولات پڑھ کر فارغ ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق ہمدان سے بغداد آئے۔ اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے روحانی تربیت حاصل کی۔ اور ان ہی سے بیعت کی۔ اور انہوں نے ہی شیخ فخرالدین کو عراقی کا تخلص عطا کیا۔

قلندروں کی ایک جماعت کے ساتھ ہمدان سے نکلے اور عراق و عرب کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ ملتان آ کر شیخ بہاؤالدین ذکریہ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہاں باہم کشش نے انھیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اور شیخ بہاءالدین نے وقت وصال شیخ عراقی ہی کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنایا۔

ان کی تصانیف میں لمعات کے علاوہ ایک مثنوی اور ایک دیوان بھی ہے۔ مثنوی کا نام برٹش میوزیم کے فارسی خطوط کی فہرست میں عشاق نامہ درج ہے۔

چہرے پر دموی ورم ظاہر ہونے کے باعث ان کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر شیخ محی الدین ابن العربی کے برابر ہے۔

عرب

براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں ایک بڑا ریگستانی جزیرہ نما۔ جسے بحیرۂ قلزم افریقہ سے جدا کرتا ہے اس کے مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں ہند۔ اور خلیج عدن اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقع ہے۔ اس میں سعودی عرب، یمن، عدن، مسقط، عمان، بحرین اور کویت وغیرہ شامل ہیں۔ جو اپنی اپنی جگہ خود مختار علاقے ہیں۔ سخت گرم خطہ ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ ریگستانوں میں کئی کئی میل تک پانی نہیں ملتا۔ بہت کم علاقے قابل کاشت ہیں۔ عموماً کھجور کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ ریگستانوں میں اونٹ بہت کارآمد جانور ہے۔ لوگ زیادہ تر خانہ بدوش ہیں اور بھیڑ بکریاں وغیرہ پالتے ہیں۔ اس ملک کا گھوڑا جسے عربی گھوڑا کہتے ہیں۔ دنیا میں بہترین گھوڑا سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں یہاں تیل کے چشمے دریافت ہوئے۔ جو امریکی تیل کمپنی کے تصرف میں ہیں۔ مکہ اور مدینہ مسلمانوں کے بڑے متبرک مذہبی مقامات ہیں۔ مکہ میں رسول اکرمؐ پیدا ہوئے اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ عرب کا زیادہ علاقہ سعودی عرب کہلاتا ہے جس پر سلطان ابن سعود نے ۱۹۲۵ء میں قبضہ کیا تھا۔ ۷۵ء تک ان کے بیٹے شاہ فیصل حکمران رہے۔ وہ مارچ میں قتل کر دیے گئے۔ ان کی جگہ ان کے ولی عہد شاہ خالد برسر اقتدار ہیں۔ اس خاندان کی سب سے بڑی خواہش یہ رہی ہے کہ عالم اسلام میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ سعودی عرب میں مکہ، مدینہ، ریاض اور جدّہ مشہور شہر ہیں۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز سعودی عرب

ظہور اسلام سے قبل عرب کے لوگ ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا تھے لیکن جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو انہوں نے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے تمام ملک سے برائیوں کا خاتمہ کر دیا اور دین اسلام کو رائج کر کے اہل عرب کو ہر لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا۔ اور ان سب مفتوحہ اقوام نے ان مسلمان عربوں کے اخلاق حسنہ اور سنہری اور افضل اصول دیکھ کر ان کا دین قبول کر لیا۔ اور یوں دین اسلام نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا قبلہ اور متبرک مقام خانہ کعبہ بیت اللہ اسی ملک میں ہے۔ جس کی طرف منہ کر کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور جہاں ہر سال حج کے دنوں میں دنیا بھر سے مسلمان حج کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

دین اسلام کے سیاسی و مذہبی نفاذ کے باعث چوری، ڈاکہ، قتل و ڈکیتی و دیگر معاشرتی و اخلاقی برائیوں سے یہ شہر اور اس سے متعلقہ علاقے پاک اور یہاں کے لوگ بڑی پُر امن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عرب لیگ

عرب ملکوں کی اتحادی تنظیم۔ جس کا اوّلین مقصد عرب ملکوں کے درمیان اتحاد کو فروغ اور ان کے باہمی تنازعوں کو افہام و تفہیم کے ذریعے طے کرنا ہے۔ یہ تنظیم ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء کو معرض وجود میں آئی۔ اس سے قبل ۱۹۴۴ء میں اتحاد عرب کانفرنس سکندریہ میں ہوئی جس میں ایک ایسے سیاسی ادارے کے قیام کی ضرورت پر صاد کیا گیا جو عرب ملکوں کے مفادات کی نگرانی کر سکے۔ اس کے ابتدائی ارکان میں مصر، عراق، اردن، لبنان، سعودی عرب، شام اور یمن شامل ہوئے۔ بعد میں مراکش، تونس، الجزائر، لیبیا، سوڈان وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ [illegible] لیگ نے اس کے بعد رکن ممالک کی آزادی اور حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں ایک ثقافتی معاہدہ طے ہوا جس کے تحت عرب ملکوں کے مابین ثقافتی اور تہذیبی رشتوں کو مضبوط اور استوار کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ عرب لیگ کی کونسل میں تمام رکن ممالک کے نمائندے شامل ہیں۔ لیگ کا صدر دفتر قاہرہ میں ہے۔ عرب لیگ نے فلسطین کا مسئلہ طے کرنے کو اپنے پروگرام میں ہمیشہ اوّلیت دی ہے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء میں علی الترتیب لندن اور اقوام متحدہ میں فلسطین کے مسئلے کی وضاحت اور فلسطینیوں کی نمائندگی کے فرائض بھی عرب لیگ نے ہی ادا کیے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں عرب لیگ کے رکن ممالک نے بالعموم اور مصر و شام اور اردن نے بالخصوص فلسطینی عربوں کی عملی فوجی امداد کی۔

عرب لیگ کے قیام کے بعد میں سے اب تک یہ تنظیم کئی مرتبہ بحران سے دوچار ہوئی۔ ایک موقع تو وہ تھا جب عراق معاہدہ بغداد میں شامل ہوا۔ اس کے نتیجہ میں عرب ملکوں میں اتحاد کی ضرورت کا احساس اور زیادہ بڑھا۔ ۱۹۶۲ء میں متحدہ عرب جمہوریہ نے بعض اختلافات کی بنا پر اس تنظیم سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ لیکن بعد میں جب اختلافات رفع ہو گئے۔ تو وہ پھر سے عرب لیگ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگا۔ اب یہ تنظیم ہر اعتبار سے مؤثر اور فعال ہے۔ اور دنیائے عرب کی صحیح نمائندہ تصوّر ہوتی ہے۔ اس نے شروع سے لے اب تک عرب مفادات کی نگہداشت اور حفاظت کا فرض بڑی سنجیدگی اور دیانت سے انجام دیا ہے۔ عرب لیگ کے اہتمام میں عرب فوجی کمان قائم کرنے کی تجویز بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔

عربی زبان

سرزمین عرب اور بیرون عرب دُنیا کے تقریباً پندرہ کروڑ سے زائد افراد کی بولی عربی کا سب سے قدیم ذکر ان تقریباً چالیس اسمائے معرفہ کی شکل میں آیا ہے جو ۸۵۳ تا ۶۲۶ ق م مسیح کی عربوں کے خلاف جنگوں کے آشوری بیانات میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] پر کچھ ایسے امکانات پائے گئے ہیں کہ ان کی مماثلت جنوبی عربی یا عربی کی [illegible] ابتدائی شکل سے ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ قدیم عربی حیرہ کی زبان ہو جس کے تقریباً ۳۰ الفاظ ابو عبیدہ نے اپنی ایک تصنیف میں دیئے ہیں اور شاید جسے صلاح الدین المنجد نے اسماعیل بن عمرو [illegible] تصنیف کے طور پر شائع کیا۔ جو قدیم یقیناً عرب العاربہ یا البائدہ میں سے تھے [illegible] مورخین ان قبائل سے جو چھٹی صدی عیسوی میں [illegible] حصّہ [illegible] ملک عرب اور عربی زبان پر اپنی سیادت قائم کر لی تھی۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ [illegible] نے بنو صحار کی زبان اختیار کر لی تھی۔

علم لسان کے متعلق عربی ادب میں جن کی ابتدائی بولیوں کے بارے [illegible] مواد منقولات سے اسی طرح حجاز اور جنوب مغرب کے [illegible] اور علاقوں کے بارے میں بہت کم [illegible] بولیوں کو ایک [illegible] سے ان کے بارے میں معلومات [illegible] ان کی صحیح قدر [illegible] جا سکتی ہے اس لیے کہ آج کل یہاں جو عوامی بولی ہے اس میں قدیم بولی کا تسلسل [illegible] حمیری بولی جس کا ذکر عرب ماہرین لسان نے [illegible] مغربی عرب کی [illegible] جو جنوبی عربی سے بہت زیادہ مناسب تھی اس بولی میں چند اشعار [illegible] موجود ہیں [illegible] حمیر اور سبا کے جنوبی عربی بادشاہ [illegible] عیسوی کی [illegible]

عربی کے ابتدائی دور کے [illegible] کتبے موجود ہیں جو [illegible] زبان عملی طور پر خالص عربی ہے۔ عربی میں قدیم ترین [illegible] دیوار پر کندہ نقش میں جس کی تاریخ تقریباً [illegible] بائبل کے کم از کم جزوی ترجمے عربی میں اسلام سے پہلے بھی موجود رہے [illegible] کہ بائبل کے بعض عربی مخطوطات زمانہ قبل اسلام کے ہیں [illegible] ایک حصّہ بھی یونانی رسم الخط میں موجود ہے

کسی حوالے سے ایک ایسی زبان کا پتہ چلتا ہے [illegible] تک عوامی بولیوں کی طرف [illegible] تھی۔ عیسوی عربی ادب [illegible] جو علمی تحریروں کی زبان میں نمایاں ہے اس کا [illegible] سکتا ہے لیکن ایک ایسی عربی زبان نہیں ہو سکتی ہے جسے اب تک تحریر [illegible] نہیں بنایا تھا۔

اس کا امکان کم ہے کہ عرب کے یہودیوں نے کبھی مستند [illegible] کوئی حصّہ لیا ہو [illegible] کہ اس عہد [illegible] نامہ قدیم کے ترجمے [illegible] تھے تاہم یہودی ظہور اسلام سے پہلے مستند عربی [illegible] مدینے میں مسلمانوں کو لکھنا سکھاتے تھے۔

یہ خیال بہت معقول ہے کہ [illegible] عربی کی نشو و نما [illegible] حیرہ کے دربار [illegible] ہے اسلامی روایت ان لوگوں میں جنہوں نے سب سے پہلے عربی [illegible] اس کے بیٹے شاعر عدی کا نام بھی شامل کرتی ہے [illegible] حیرہ کے [illegible] وقت عربی زبان اپنے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی [illegible] عدی کو [illegible] نہیں کہا جا سکتا ہے۔ عدی نے کئی قبائلی بولیوں سے [illegible] کے بقول قریش کی بولی کو ترجیح دی جا سکتی [illegible] بیشتر بدوی بولیوں کی شاعری سے اور حیرہ بدوی شعرا کا مرکز [illegible]

عربی زبان

کی زبان کے ارتقاء اور یکسانیت میں مدد ملی۔ حیرہ میں اس کے تحریری استعمال نے اسے ٹکسالی بنانے میں مزید مدد دی۔

جہاں تک خود اس شاعرانہ کتاب کے منبع کا تعلق ہے قدیم تر اسلامی روایت اسے مختلف قبائل میں تلاش کرتی تھی حالانکہ موخر علماء نے بلاشبہ مذہبی وجوہ کی بنا پر اسے قریش کی بولی قرار دیا۔

حقیقی کلاسیکی عربی کے بارے میں تحقیق کے ماخذ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زمانہ قبل اسلام اور آغاز اسلام کی شاعری۔

۲۔ قرآن مجید۔

۳۔ رسول اکرم صلعم اور خلفائے راشدین کے رسمی خطوط جنہیں ابتدائی مورخین نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے اور قدیم اوراق بردی۔

۴۔ حدیث۔

۵۔ ایام العرب کی نثر۔

زمانہ قبل اسلام اور آغاز اسلام کے اسلامی شعراء کی زبان ایک بدوی روایت کی شاہد ہو سکتی ہے جو قرآن مجید سے جدا گانہ تھی۔

قرآن پاک ایک الہامی کتاب ہے جو اپنے اسلوب اور اعجاز کے باعث منفرد حیثیت رکھتی ہے اس کی نثر میں بھی وہ فصاحت، بلاغت اور حسن و جمال ہے جس کی نظیر بہترین شاعری میں بھی کم ملتی ہے۔ بعض الفاظ کی املا کے بارے میں قرآن مجید کی اولین املا کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل کئے بغیر انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے قرآن مجید قریش کی زبان میں نازل ہوا۔ قریش کی زبان صوتی لطافت، پاکیزگی ساخت اور حسن ترتیب کے اعتبار سے عرب کی تمام بولیوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ قرآن مجید کے اثر سے عربی زبان میں حسن اسلوب، کثرت مضامین اور زور استدلال پیدا ہوا۔

حدیث کی زبان سادہ، دل نشین اور زیادہ تر روزمرہ کی جانب مائل ہے ایام العرب کی زبان میں جو ہم تک ماہرین لسان کے ذریعے پہنچی ہیں صرف چند انحرافی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

کلاسیکی عربی میں ایک بیش بہا ذخیرہ لغت تھا۔ اس کا کچھ تو سبب بدویوں کی قوت مشاہدہ تھی اور کچھ شعر و شاعری کی کثرت و فراوانی۔ عرب کے زمانہ جاہلیت ہی میں فصیح زبان کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور جب غیر عربوں کو بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں اسے سیکھنے کی ضرورت پیش آئی تو جن لوگوں کے پاس یہ محفوظ تھی اور جو اسے سکھاتے تھے یعنی راوی، موقع پر موجود اور تیار تھے۔ خلیل بن احمد انہی میں سے تھے۔ لیکن جلد ہی ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو یونانی فکر سے متاثر تھے اور جنہوں نے راویوں کے روایتی علم کو نحو کی ایک منظم شکل دے دی جو علم صرف و نحو، اس طرح تخلیق ہوا اُسے نہ صرف شاعری بلکہ قرآن مجید کی توضیح و تشریح کے لیے بھی استعمال کیا۔

صرفی اعتبار سے ادبی عربی زبان کا معیار تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے زمانے سے معین ہو گیا تھا اس کے صرف و نحو، تعبیروں کا استعمال، لغات اور محاورات ادب کی تعیین منظم اور پر مشقت تحقیق و تدقیق کے بعد واضح طور پر کر دی گئی تھی اس وقت سے لے کر زمانہ موجود تک اسے ایک مسلسل اور بے روک ٹوک زندگی حاصل رہی ہے اگرچہ ہر عربی بولنے والے ملک میں روزمرہ کی زندگی کے لیے ایک مخصوص عوامی زبان بن گئی ہے تاہم لکھنے کے لیے سب لوگ برابر یہی معیاری ادبی زبان استعمال کرتے رہے ہیں۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں کے علماء نے جن کے سر اس لسانی معیار کی تدوین کا سہرا ہے اپنا نقطہ آغاز قرآن مجید کے متن کو قرار دیا، جو تاریخی لحاظ سے معتبر اور مستند ہے اور اپنی تعریف بطور ایک عربی کتاب کے کرتا ہے اور جس کا انضباط، تالیف اور سرکاری طور پر اشاعت پہلی صدی ہجری کے چوتھے عشرے / ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی احادیث کے مجموعے، رسول اکرم کے رسائل و خطب خلفائے راشدین اور صدر اسلام کے مشہور خطبا کے اقوال و خطبات نیز عربی شاعری کے منتخب مجموعے بھی حواریوں اور ادبی زبان کے تحریری نمونوں کے طور پر سامنے لائے گئے لیکن ان علماء کی سب سے بڑی مساعی زمانہ جاہلیت کے ادب کو جو اب تک راویوں اور بدویوں کے ذہن میں محفوظ تھا، جمع کرنے، اُسے نئی زندگی بخشنے اور اس کی توثیق و تصدیق کی طرف مبذول رہیں زمانہ جاہلیت کے آخری ڈیڑھ سو سال کی شاعری خطبات اور امثال کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کیا گیا ان کی شرحیں لکھی گئیں اور انہیں محاورات قرآنی کی توضیح کے لیے اور لسانی و ادبی صحت کی سند کے طور پر استعمال کیا گیا۔

جب عربوں نے قرآن مجید سنا اور اسے سمجھا تو اس کے ازلی محاسن کے معترف ہوئے اور اس کی اعلیٰ پائے کی وضاحت نے ان پر بہت اثر کیا۔

زمانہ جاہلیت کی شاعری کے مستند ہونے کے لیے جیسے تلاش و جستجو سے حاصل کیا گیا تھا اس کی ترکیب، ساخت، اسلوب بیان اور زبان اس قرآن سے مطابق اور بعد اسلام کی شاعری سے اصول نظم میں مماثلت کے دعویٰ کی تائید میں بہت سے حوالوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے ایک اور حقیقت جس پر تاریخی حوالے متفق ہیں یہ ہے کہ جاہلیت کی شاعری جس شکل میں کہ وہ جمع کی گئی ہے اور ہم تک پہنچی ہے پورے ملک عرب میں پڑھی جاتی تھی اس طرح قرآن مجید اسلام کی پہلی اور اولین تحریر کا سب سے زیادہ مستند نمونہ بن گیا۔

عرب دُنیا کے نقطہ نظر میں یورپ کی دخل اندازی نپولین کی ۱۷۹۸ کی مصری مہم سے شروع ہوتی ہے مغربی تمدن کے بے شمار عناصر کو اپنا لینے سے عربی اسلوب پر دور رس اثرات مرتب ہوئے یہ عمل محمد علی پاشا کی اصلاحات کے لائحہ عمل سے شروع ہو چکا تھا جس میں بلا ارادہ مغربی اسلوب کو اختیار کرنا شروع کیا اور جس کا مرکز توجہ فرانس تھا طلبہ کی جماعتوں کی فرانس میں درس و تدریس کے لیے روانگی مدارس کی یورپی اصولوں پر تاسیس اور ایک عربی پریس کے قیام اور سب سے بڑھ کر بکثرت یورپی کتابوں کے تراجم کے نتیجے میں بے شمار مغربی خیالات کے اظہار کے لیے تعبیرات کی ضرورت پہلے مصر میں اور پھر دوسرے ملکوں میں بھی محسوس کی جانے لگی یعنی ان خیالات کے لیے جن کے متعلق پہلے صرف غیر ملکی الفاظ ہی مل سکتے تھے۔

تاہم ناگزیر ضرورت غیر ملکی الفاظ کے بکثرت استعمال کے برخلاف صحیح معنوں میں کوئی تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے شروع نہیں ہوئی یہ مسئلہ کہ عربی میں نئی تعبیرات کو روز افزوں ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے۔ فکری زندگی کا ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ خود یورپ کے اختلاط سے عربوں میں صدیوں کے وقفے کے بعد اپنی لسانی اور ادبی روایات پر نظر ثانی کا جذبہ بیدار ہوا قدیم عربی تصانیف خاص طور پر عربی لغات اور صرف و نحو کی طباعت سے بہت سی قدیم روایات کے احیا میں سہولت پیدا ہو گئی۔ یہ عقیدہ کہ عربیہ بحیثیت عربی زبان کی قدیم ترین ادبی شکل کسی بھی بعد کی شکل سے بہتر اور زیادہ صحیح تھی اس بنا پر عصر حاضر صحت لسانی کے لیے اس کو اعلیٰ ترین سند ماننا چاہیے، پوری لسانی تحریک کا رہنما خیال بن گیا۔ اگرچہ اس کے خلاف بھی کچھ آوازیں بلند ہوئیں اس طرح قدیم لغت و اسلوب کا دوبارہ احیاء ہوا اور ساتھ ہی اس رجحان کا کہ جہاں کہیں بھی ممکن

ہو قدیم مثالی زبان سے رجوع کر کے ارتقائی زبان کو مصنوعی طریقے سے قابو میں رکھا جائے اس تحریک کا آغاز شامی اور لبنانی علاقے میں ہوا۔

لغات میں ایک معتدبہ بنیادی سرمایہ قدیم ترین زمانے سے محفوظ رہا ہے مابعد کلاسیکی الفاظ جن میں مؤخر تر قرون وسطیٰ کے الفاظ بھی شامل ہیں جدید لغات کے ایک عنصر کی تشکیل کرتے ہیں ان خیالات کے اظہار کے لیے جو یورپ سے آئے ہیں ایک بڑی تعداد ایسی تعبیرات کی موجود ہے جنہیں عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ عربیہ کے فراموش شدہ الفاظ کو از سر نو زندہ کر دیا گیا ہے اور انہیں بغیر کسی رسمی تبدیلی کے، لیکن کم و بیش بدلے ہوئے مفہوموں میں استعمال کیا گیا ہے۔ عربیہ کے ان الفاظ کو جواب یک استعمال میں ہیں نئے اور زائد معنی دے دیئے گئے ہیں بعض دفعہ معنوں کے تغیر میں اس اجنبی لفظ سے مماثلت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جس نے نمونے کا کام دیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بڑی تعداد ایسی اشکال اسمی کی جنہیں پرانی اصلوں سے عربی کے اسمی صیغوں کے اوزان پر بنایا گیا ہے عام طور پر رائج ہو گئی ہے اسی طرح اسم مصدر اور اسم فاعل کی شکلوں کو نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ یائے نسبتی کو وسیع پیمانے پر نئے الفاظ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کے استعمال کو وسعت دے کر اسما ئیں سے بہت سے اسمائے صفات مشتق کر دیئے گئے ہیں ان کے ذریعے یورپی ترکیبوں کو نسبتاً آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے اور اصلی مرکب شکلیں اب تک بھی لائے نفی کے ساتھ مرکب الفاظ تک محدود ہیں۔

پہلی جنگ عظیم تک اکثر الفاظ فرانسیسی سے مستعار لیے جاتے تھے اور بعض اطالوی سے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد انگریزوں کے اثرات بھی نمایاں طور پر مرتب ہوئے خصوصاً مصر اور عراق میں۔ عربی میں اجنبی الفاظ کی قلت فصیح زبان کے شیدائیوں کا شاندار کارنامہ ہے اس صدی کے آخری عشروں میں ترکی الفاظ تقریباً مکمل طور پر غائب ہو گئے ہیں۔ ایسے الفاظ کو جو عربی اسم مصدر سے مطابقت رکھتے ہیں یا جنہیں باآسانی اس میں جذب کیا جا سکتا ہے مستعار الفاظ تصور کئے جا سکتے ہیں یا جنہیں آخر میں یہ کے اضافے سے جو اسم نسبتی کے آخری حصے کا کام دیتا ہے عربی الفاظ سے مماثل بنا لیا گیا ہے۔

یہ متعدد نئے الفاظ جنہیں قبول کر لیا گیا ہے ابھی تک ناکافی ہیں خاص علمی اور فنی جذبات آج بھی عربی میں کسی ایسی شکل میں پیش نہیں کی جا سکتیں جسے سب متعلقہ لوگ سمجھ لیں کسی ایک ملک میں بھی مخصوص فنی مصطلحات وضع کرنے کا باقاعدہ نظام موجود نہیں ہے صورت حال اس بات سے اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر افہام و تفہیم کی غرض سے لاطینی اور یونانی کی جن اصطلاحات سے مدد لی جاتی ہے ان کا عربی میں ترجمہ کر دیا جاتا ہے ایک ہی چیز کے لیے کئی اصطلاحات رائج ہیں دوسری طرف ایسی صورتیں بھی ہیں کہ ایک ہی اصطلاح سے مختلف مصنفین مختلف معنی اخذ کرتے ہیں تاہم علمی و فنی اصطلاحات کو معیاری بنانے کا کام جو آج کل کی عربی زبان کا بنیادی مسئلہ ہے خاصی ترقی کر چکا ہے اور اس طرح مستقبل میں ہمیں مزید تسلی بخش اور حسب دل خواہ نشو و نما کی توقع ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سب عرب ملکوں میں، عراق سے مراکش تک ایک بنیادی طور پر یکساں تحریری زبان موجود ہے عرب اقوام کے لیے بہت فکری اور عملی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ یہ ان کی قدیم ثقافتی یک جہتی اور زمانہ موجود میں ان کی سیاسی وحدت کی علامت ہے اس طرح ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس چیز کا پہلے سے گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ کہیں بھی تحریری زبان کی جگہ کوئی مقامی بولی لے لے گی۔

آج کل جو عربی عام بول چال میں رائج ہے وہ بنیادی طور پر وسطی اور شمالی عرب کی قدیم بولیوں سے مشتق ہے عہد قدیم میں اگرچہ ان میں فرق ضرور کیا جاتا ہے لیکن بظاہر ان کے درمیان بنیادی اختلافات نہ تھے اس لیے کہ کلاسیکی ماہرین لسان صرف تلفظ اور الفاظ کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ بظاہر ان زبانوں کی ساخت یکساں تھی ان ماہرین لسان نے فصاحت کو معیار قرار دے کر قدیم بولیوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا۔ حجاز کی بولیاں جنہیں خالص ترین مانا جاتا ہے نجد کی اور آخر میں ہمسایہ قبائل کی زبانیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک دوسری سامی یا غیر سامی زبانوں کی آمیزش سے بگڑ گئیں تھیں یہ امتیاز جو ہمیشہ سے لطیف رہا ہے آج قابل قبول نہیں اس لیے کہ متعلقہ بولیاں نمایاں حد تک ترقی کر چکی ہیں ان سب تقسیموں میں جو قابل اعتنا ہیں سب سے زیادہ سہل اور قابل قبول اگرچہ وہ ہے جو جغرافیائی اصولوں پر مبنی ہے نہ کہ لسانی معیاروں پر۔

حجاز اور قریش مکہ کی بولی زمانہ جاہلیت کی بولیوں میں سے یک حتی ایسے ترقی دے کر ایک ادبی زبان کا درجہ دے دیا گیا لیکن زمانہ جاہلیت کے شاعرانہ محاورہ زبان میں دخل اندازی کئے بغیر نہیں، تاہم قدیم بولیاں باوجود اس کے باہم لغات کے نمایاں اختلافات مغربی بولیوں کو مشرق قریب کی بولیوں سے جدا کرتے ہیں۔ یا تو واقعی مستعمل الفاظ کے اعتبار سے یا ان کی شکل یا ان کے مخصوص معنی کے اعتبار سے اگر اس سے بڑھ کر نہیں تو اس کے برابر اختلافات خود مغربی بولیوں کے مابین موجود ہیں جو اس وسیع علاقے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں وہ بولی جاتی ہیں، مثلاً متعلق فعل "اب" کے اظہار کے لیے صفات علاقے کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ لیکن المغرب کی بولیوں کے باہمی اختلافات خواہ کچھ بھی ہوں وہ ایک دوسرے سے اب بھی قریبی تعلق رکھتی ہیں اور بڑی حد تک مخصوص طور پر عربی ہیں۔ زبان کی آوازوں کی اکثریت عربی نظام صوتی سے ماخوذ ہے اور اسی طرح اشکال نحوی، مواد نحوی اور خیالات کو پیش کرنے کے طریقے بھی۔ بولیوں کے وہ اختلافات جو مغرب میں پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر ان خصوصیات جیسے ہی ہیں جو درمیانی مشرقی بولیوں میں نظر آتے ہیں۔ نہیں کسی حد تک بیرونی اثرات کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جو عربی سے بیگانہ ہیں۔

۱۔ بربری اساس کا اثر جسے واضح طور پر بعض عادتوں اور خصوصیات کے باعث میں ایک نئی قوت حاصل ہو گئی تھی لیکن بعض علاقے جیسے کہ جہاں بربر لوگوں کی یاد زبان سے بالکل محو ہو چکی ہے۔

۲۔ شمالی خطوں کی سیاہ فام اقوام کا جو حبشی ممالک کی سرحدوں پر آباد ہیں۔

۳۔ رومانی زبانوں کا اور لاطینی کا جو زیادہ تر اندلسی، ہسپانوی اور اطالوی زبانوں کے واسطے سے آیا۔

۴۔ آخر میں فرانسیسی کا ایسا اثر جو ابھی تک کارفرما ہے!

تاہم موروثی اور مستعار عناصر نے جو حصہ لیا ہے، وہ تنہا ایسا سبب نہیں ہے جسے مغربی زبان کے اصلی اور مخلوط کردار کی تشریح کے لیے پیش کیا جا سکے یہ اور اور سبب عربی بولیوں کا تنوع ہے جو اس کے قبل کہ فاتحین انہیں مغرب میں اپنے قدم جماتے وقت مختلف زبانوں میں ساتھ لائے ایک دوسری سے مختلف ہو چکی تھیں علاوہ ازیں ایک اور سبب شاید سب سے اہم، ترک وطن اور بدووں کا تلون تھا جو اختیاری یا اضطراری تھیں جو وجود میں آتی رہیں اور مختلف اطراف میں پھیلتی رہیں۔ بعض اوقات اپنے آپ کو وسیع جغرافیائی حدود میں منتشر کرتے ہوئے اور بعض دفعہ خود کو ایسے اضلاع میں محدود رکھتے ہوئے جو سختی سے الگ الگ حصوں میں منقسم ہیں۔

عربی مہینے

انھیں قمری اور اسلامی مہینے بھی کہا جاتا ہے۔ قمری اس لیے کہ ان کی ابتدا و انتہا کا انحصار چاند دیکھنے پر ہوتا ہے اور اسلامی اس لیے کہ اللہ نے قرآن مجید انہیں حج اور وقت معلوم کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ ان کی تعداد بھی بارہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے: اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ ہے۔ (پ۱۰)۔ ان کے نام یہ ہیں:-

۱۔ محرم۔ ۲۔ صفر۔ ۳۔ ربیع الاوّل۔ ۴۔ ربیع الآخر۔ ۵۔ جمادی الاوّل۔ ۶۔ جمادی الآخر۔ ۷۔ رجب۔ ۸۔ شعبان۔ ۹۔ رمضان۔ ۱۰۔ شوال۔ ۱۱۔ ذی قعد۔ ۱۲۔ ذی الحجہ۔

ان میں چار مہینے ایسے ہیں جن میں لڑائی و قتل حرام ہے: (۱) محرم (۲) رجب (۳) ذی قعد۔ (۴) ذی الحجہ۔ کسی مہینے کے دن ۲۹ اور کسی کے ۳۰ ہوتے ہیں۔ ۲۹ سے کم اور ۳۰ سے زیادہ کبھی بھی نہیں ہوتے۔

عُرس

صوفیاء کرام یا مذہبی پیشواؤں کے مزاروں پہ ہر سال یوم وفات کے موقع پر جو اجتماع ہوتا ہے اسے عرس کہتے ہیں۔ عرس کے موقع پہ مزار پہ چادریں اور پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ معتقد لوگ نذر و نیاز پیش کرتے اور منتیں مانتے ہیں۔ نیز محفل سماع منعقد ہوتی ہے جس میں موسیقار، حمد، نعت اور صوفیانہ و عارفانہ کلام گا کر سناتے ہیں۔ پاکستان میں حضرت علی ہجویریؒ، معروف بہ داتا گنج بخش (لاہور) حضرت بابا فرید شکر گنج (پاکپتن) حضرت شاہ عبدالطیفؒ بھٹائی (سندھ) و دیگر صوفیاء کرام کے مزاروں پہ ہر سال دھوم دھام سے عرس منعقد ہوتے ہیں جن میں پاک و ہند کے ہزاروں مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ عرس کے جواز و عدم جواز میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ معتقد حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بزرگوں کے ساتھ عقیدت و محبّت کا اظہار ہے جبکہ توحید کے مدعی حضرات اسے خطرناک بدعت قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نذر و نیاز و دعا وغیرہ عبادات میں شامل ہیں اور عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیئے۔ مزاروں اور قبروں پہ جانے کی اس لیے اجازت ہے کہ وہاں جانے سے موت یاد آتی ہے۔ لیکن عرس کے موقع پہ یہ مقصد سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ اس کا ثبوت نہ تو قرآن و حدیث میں ہے نہ ہی اسلاف امت یا آئمہ دین کے طرز عمل میں۔ چونکہ یہ امور ایجادِ بندہ ہیں اس لیے ان کے ارتکاب پہ ثواب کی امید غلط ہے۔

عرس پہ والہانہ جوش و خروش

عرفات

مکہ مکرمہ سے تیرہ میل دُور مشرق کی جانب طائف کی راہ پہ ایک میدان جو شمالی جانب سے اسی نام کے ایک پہاڑی سلسلے جبل عرفات سے گھِرا ہوا ہے۔ عرفات ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ یہاں حج کے موقع پہ بعض بنیادی ارکان ادا کیے جاتے ہیں۔ ان مناسک حج کا مرکز اس کے شمال مشرق میں سرخ رنگ کی ایک مخروطی پہاڑی ہے جس کی بلندی دو سو فٹ سے کچھ کم ہے اور عرفات کے اصل پہاڑی سلسلے ذرا الگ سی ہو گئی ہے! اس پہاڑی کو بھی عرفات کہتے ہیں۔ لیکن اس کا زیادہ معروف نام جبلِ رحمت ہے۔ اس کی مشرقی سمت پتھر کی چوڑی سیڑھیاں چوٹی تک چلی گئی ہیں جس کے اوپر ایک مینار بنا ہوا ہے۔ ساٹھویں سیڑھی پہ ایک چبوترہ ہے جس پہ ایک منبر رکھا ہے۔ اس منبر پہ کھڑے ہو کر خطیب نویں ذوالحجہ کو بعد دوپہر خطبہ پڑھتا ہے۔

عرفات کا میدان حرم مکہ (حدودِ حرم) کے باہر واقع ہے۔ یہ شرقاً غرباً عرض میں چار میل کے قریب اور طول میں تقریباً ساڑھے آٹھ میل ہے۔ مکے سے آنے والے حاجی درۂ مازمین سے نکل کر ان ستونوں کے پاس سے گزرتے ہیں۔ جو حرم کی حد بندی کرتے ہیں۔ ان ستونوں کے مشرق کی جانب عرنہ نامی ایک نشیب ہے جس کے دُور کے کونے پہ ایک مسجد ہے جو مسجد ابراہیم، مسجد نمرہ یا مسجد عرفہ کے مختلف ناموں سے موسوم ہے۔ موقف یا مقام اجتماع جو اس مسجد سے مشرق اور جبلِ رحمت سے مغرب کی جانب دُور تک چلا گیا ہے۔ مشرق کی جانب کوہستانِ طائف کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس میدان میں کئی کوئیں کھود سے گئے تھے اور متعدد باغوں اور مکانوں کا ذکر ملتا ہے۔

ملکہ زبیدہ کے حکم سے طائف کے علاقے سے مکے تک پانی لانے کے لیے جو نہر بنائی گئی تھی وہ بھی عرفہ پہاڑی کے دامن میں بہتی ہے۔

یہاں زندگی کے آثار صرف "یوم عرفہ" ہی کو نظر آتے ہیں جبکہ حاجی وقوفِ عرفہ ادا کرنے کے لیے یہاں خیمے نصب کر لیتے ہیں۔ (عرفات میں وقوف و قیام حج کا بڑا ضروری رکن ہے۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے)۔ وقوف ظہر کے خطبے اور نماز کے بعد شروع ہوتا ہے اور مغرب سے تھوڑی دیر بعد تک جاری رہتا ہے۔

عرفہ کے نام کی ابتدار کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ روایات میں اس کی توجیہہ اس طرح کی گئی ہے کہ جب حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جنت سے نکالے گئے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے دوبارہ اس مقام پہ ملے اور انھوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔

ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل نے حضرت ابراہیمؑ کو یوم عرفہ کے مناسک سکھائے تھے بعض نے یہ توجیہہ بھی کی ہے کہ اس مقام پہ لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور اللہ کے حضور استغفار کرتے ہیں۔

عروہ بن زبیرؓ

صحابیٔ رسولؐ۔ عروہ بن زبیر بن عوام اسدی۔ قرشی، مدنی۔ کنیت عبداللہ مدینہ منورہ کے قدیم ترین محدثوں اور ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ ان کا شمار مدینے کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔ ۲۳ھ اور ۲۹ھ کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے اور ۹۱ھ ۹۹ھ کے مابین وفات پائی۔

ان کی والدہ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیق ہیں۔ گویا وہ حضرت ابوبکرؓ صدیق ؓکے نواسے ہیں۔ ان کے والد حضرت زبیرؓ بن عوام بن خویلد ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضرت محمد صلعم کے ہم زلف تھے۔

وہ اپنے بڑے بھائی عبداللہ بن زبیرؓ سے بیس پچیس برس چھوٹے تھے۔ اپنے زمانے کی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر علمی مشاغل میں منہمک رہے۔ جب ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر کو حجاج نے شکست دی تو کچھ عرصے بعد وہ مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ اور وفات تک اپنی ہی جائیداد کو وسیلۂ معاش بنا کر ہمہ تن علمی کاموں میں مصروف رہے۔ یہیں انھوں نے خلیفہ عبدالملک کی فرمائش پر اسلام کے بالکل دور کے متعلق مراسلات کا ایک سلسلہ غالباً خلیفہ کے نام خطوط کی شکل میں لکھنا شروع کیا۔

ان کے متعلق رائے روایت ہے کہ ہر رات ایک چوتھائی قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جب ان کا سرطان زدہ پاؤں کاٹا گیا تو انہوں نے اُف تک نہ کی۔

حضرت عروہؓ اپنی خالہ اُم المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ان کی وفات سے تین سال پہلے تک بہت التزام کے ساتھ حاضر ہوتے رہے اور ان سے سن کر بہت سی اہم احادیث جمع کرلیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنے والدین نیز حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔

خود ان سے جن بزرگوں نے روایت کی ہے اُن میں محمد بن مسلم، ہشام، سلیمان بن یسار، عبداللہ، عثمان اور خود حضرت عروہؓ کے صاحبزادے محمد شامل ہیں۔

انہوں نے ایک کتب خانہ جمع کرلیا تھا جن میں تاریخی و فقہی دونوں طرح کی کتابیں تھیں۔ ایک کتاب "المغازی" تصنیف کی تھی۔ ان کی مرویات کی خصوصیت یہ ہے کہ باقاعدہ اسناد کے بغیر روایت کرتے ہیں۔ اسناد کا دستور بعد میں رائج ہوا۔

عروہ بن مسعود

حضورؐ کے ممتاز اور مشہور صحابیؓ اور راوی حدیث ہیں۔ ان سے کتب حادیث میں بہت ساری روایات مروی ہیں۔ جب حضور طائف سے واپس تشریف لائے تو عروہؓ ان کے ساتھ ہوتے۔ اور اسلام قبول کرلیا۔ اپنے قبیلے میں اشاعت اسلام کی اجازت چاہی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ لوگ تمہاری مخالفت کریں گے اور آپ سے برسرپیکار ہوں گے۔ چنانچہ محبت دین کے جوش سے جب آپ دعوت دین دینے کے لیے گئے تو قبیلہ والوں نے چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ حتیٰ کہ تیر کے ایک زخم کاری لگا اور آپ شہید ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ حضرت عروہؓ کی شکل و صورت حضرت مسیحؑ جیسی تھی۔

عریہ

فروخت کی ایک قسم جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ جب ایک آدمی ایک درخت پر لگے ہوئے پھل کا حساب لگالے (اندازہً) اور اُسے فروخت کر دے، اس سے قبل کہ وہ پھل (جس کو اس نے فروخت کیا) درخت سے اتار لیا گیا ہو۔ اسے عریہ کہتے ہیں۔

عُزّیٰ

عرب کی ایک قدیم دیوی۔ اس کے نام کا مفہوم ہے مضبوط۔ طاقتور۔ اس کا تعلق خاص طور پر قبیلۂ غطفان سے تھا۔ لیکن اس کا بڑا استھان اس راستے پر تھا جو طائف سے مکہ مکرمہ کو جاتا ہے۔ یہاں ببول کے تین درخت تھے جن میں سے ایک پر جاہلی عربوں کے عقیدے کے مطابق اس دیوی نے ظہور کیا تھا۔ یہیں ان کا متبرک پتھر نصب تھا اور ایک غار بھی جو غبغب کہلاتا تھا۔ اس میں ان جانوروں کا خون گرایا جاتا تھا جن کو اس دیوی کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔

خاص عرب کے باہر عزّیٰ کی پرستش خاص طور پر حیرہ لخمی بادشاہوں کے ہاں ہوتی تھی۔

فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے خالد بن ولیدؓ کو عزّیٰ کے استھان پر بھیجا تاکہ وہ اسے تباہ کر دیں۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر حکم رسول اللہؐ کی تعمیل کی اور اس کے بعد جلد ہی یہ مذہب جس کا مرکز یہ بُت تھا ختم ہو گیا۔

عزرائیل

وہ فرشتہ جس کے ذمہ روحیں قبض کرنا ہے۔ جبرائیلؑ، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل، یہ چار فرشتے خدا کے مقرب سمجھے جاتے ہیں۔ اور کاروبار عالم چلانے کے لیے ان کو مختلف فرائض سونپے گئے ہیں۔ قرآن میں صرف جبرائیل اور میکائیل کا نام آیا ہے۔ باقی دو فرشتوں کا نہیں۔ انگریزی ادب میں عزرائیل کا ذکر آتا ہے اسرائیلیات کے ذریعے اس فرشتے کی شکل و صورت کے متعلق جو روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مطابق ان کی شکل بڑی بھیانک اور ڈراؤنی ہے۔ اس کے چار ہزار پر اور ستر ہزار پاؤں ہیں۔ چاروں جانب منہ اور تمام بدن پر آنکھیں ہیں۔ تمام جانداروں کی موت عزرائیل کی وساطت سے ہوتی ہے جس کی تعمیل فرشتے کرتے ہیں عزرائیل صرف نبیوں اور نیک انسانوں کی روح قبض کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب خدا نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتے اس سے خوفزدہ ہو گئے سوائے عزرائیل کے۔ اس پر یہ کام اس کے سپرد کر دیا گیا۔

عزل

لغوی معنی جدا ہونا، کنارہ کش رہنا۔

اصطلاح میں عورت سے مجامعت کرتے وقت بغیر انزال کے علیحدہ ہو جانا۔ قدیم عرب میں بعض لوگ بوجہ غربت اولاد پیدا نہ ہونے کے لیے یہ صورت اختیار کرتے اور مباشرت میں انزال سے قبل ہی عورت سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے اسے طور پر یہ منع تو نہیں تاہم صرف اسی صورت میں اجازت دی ہے کہ عورت کے حاملہ ہو جانے سے یا شیرخوار بچے کی وجہ سے یا اس کی صحت پر خراب اثر پڑنے یا اس کی موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ دوسری شرط یہ بھی ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے عورت کی اجازت ضروری ہے۔

عزیرؑ

(۵۰۰ ق م) حضرت ہارون بن عمران کی نسل سے تھے۔ قرآن مجید کی رو سے عزیرؑ نبی تھے اور یہود انہیں خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔

جب بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے تمام یہودیوں کو گرفتار کر لیا اور انھیں بابل لے آیا۔ اس وقت حضرت عزیرؑ کم عمر تھے۔ چالیس برس کی عمر میں آپ بنی اسرائیل کے نقیب بنے اور رشد و ہدایت کے فرائض انجام دینے لگے۔ [illegible] کے زمانے میں جب بنی اسرائیل نے بیت المقدس کو از سر نو تعمیر کیا [illegible]

میں حضرت عزیرؑ نے شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور بیت المقدس کی تعمیر میں بنی اسرائیل کی مدد کی۔ بیت المقدس کی تباہی کے وقت تورات کے تمام نسخے تباہ ہو چکے تھے۔ حضرت عزیرؑ نے یہ نسخے از سر نو مرتب کرائے۔ غالباً اسی وجہ سے یہود انہیں خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے۔

روایت ہے کہ حضرت عزیرؑ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم یروشلم جاؤ، ہم اسے دوبارہ آباد کریں گے۔ یہ اپنے گدھے کے ساتھ ایک اجڑے ہوئے شہر کے قریب سے گزرے تو ان کے دل میں خیال آیا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ کریم ان مرے ہوئے لوگوں کو زندہ کر دے۔ یہ کہہ کر آرام کی خاطر ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اور قریب ہی آپ نے گدھا باندھ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک سو سال تک سلائے رکھا۔ اور جب بیدار ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ بہت تھوڑی دیر سوئے ہیں، لیکن ان کا گدھا مر چکا تھا جس کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے گدھے کو ان کے سامنے دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور یہ دلیل دی کہ خدا تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرنے پہ قادر ہے۔

عزیز مصر

جس سے آدمی نے حضرت یوسفؑ کو عرب قافلہ والوں سے خریدا تھا۔ قرآن پاک میں اسے عزیز (یعنی صاحب وقار اور بلند پایہ آدمی) کہا گیا ہے۔ تورات میں اس کا نام "فوطی فار" بتایا گیا ہے۔ جو فرعون کا ایک امیر اور سردار فوج تھا۔ عزیز نے حضرت یوسف کو ایک خوبصورت غلام سمجھ کر خریدا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس پر ان کے جوہر کھلے تو انہیں اپنے گھر بار اور علاقہ کا مختار بنا دیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ عزیز مصر اس کا نام نہیں بلکہ اس وقت مصر کے بادشاہ کو عزیز کہا جاتا تھا۔ جیسے کسی وقت فرعون کہا جاتا رہا۔ یا روم کے بادشاہ قیصر اور شام کے حکمران کسریٰ اور ترکی کے بادشاہ کو سلطان کہا جاتا رہا ہے۔

عشر

زرعی پیداوار کا دسواں حصہ جو اسلامی حکومت وصول کرتی ہے۔ یہ اصطلاحی طور پر اشوری زبان کا لفظ ہے۔ چنانچہ اشوری تہذیب میں بھی اناج، کھجور اور دوسری زرعی پیداوار کا دسواں حصہ مندر کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ عبرانی میں اسے معشر کہتے ہیں۔ چنانچہ یہودی بادشاہ بھی زراعت کا دسواں حصہ وصول کیا کرتے تھے۔ جنوبی عرب میں بھی یہی رواج تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ جس زمین کو بارش یا قدرتی چشموں کا پانی سیراب کرتا ہو اس سے زراعت کا دسواں حصہ اور جس زمین کی آبپاشی کنویں، یا نہر سے (قیمتاً یا محنت سے) اس سے بیسواں حصہ وصول کیا جائے۔ اسلامی عہد میں مکہ مدینہ۔ حجاز، یمن اور دیگر عرب علاقوں کی زمین عشری تھی اور غیر عرب علاقوں کی زرعی زمین سے خراج وصول کیا جاتا تھا۔ عشر فقط مسلمانوں سے لیا جاتا تھا۔

عشرہ مبشرہ

یہ وہ دس جلیل القدر صحابہؓ ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ اصطلاح حدیث میں نہیں آئی لیکن یہ تصور انھی سے ماخوذ ہے۔ اس قسم کی حدیثوں میں عموماً یہ الفاظ ہوتے ہیں۔ "عشرۃ فی الجنۃ" (دس حضرات جنت میں ہوں گے) جس کے بعد ان کے نام درج ہیں۔ مختلف فہرستوں میں ان صحابہ کرامؓ کے نام درج ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت زبیرؓ۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ۔ بعض روایات میں ان نو حضرات سے پہلے خود آنحضرت صلعم کا اسم مبارک ہے۔ دوسری روایات میں آنحضرتؐ کا اسم مبارک نہیں بلکہ ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کا نام ہے۔

اس قسم کے رجحانات کی اصل مراتب مذہبی کے وہ تصورات ہیں جو ملت اسلامیہ میں نمایاں تھے۔ دینی خدمت سرانجام دینے، خیر میں سبقت لے جانے اور راہ حق میں ثابت قدمی کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے رسول اکرم صلعم نے مختلف موقعوں پر اصحاب کو مغفرت اور جنت کی بشارت سے نوازا۔

عشق

عربی زبان کا لفظ۔ لفظی معنی وفور محبت۔ شدید شوق۔ انتہائی شدید جذباتی تعلق خاطر۔ یہ لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے کیونکہ قرآن اعتدال کی تلقین کرتا ہے اور عشق ایک انتہائی جذبہ ہے۔ قرآن میں محبّت اور اُنس کی تلقین ہے جو ایک متوازن اور تعقل کی حد میں پرورش پانے والا جذبہ ہے۔

دنیا بھر کے ادب کی طرح عربی ادب میں بھی اس لفظ نے خاصی اہمیت اختیار کی ہے۔ عالموں، فقیہوں، صوفیوں، دانشوروں اور عام لوگوں نے عشق کے اسباب اور مظاہر اور اس کے درجوں کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال کیا ہے مذہبی میں اس پہ ایک خاص طرز پر گفتگو کی جاتی رہی اور اس کو سلجھانے کی کوشش کی گئی۔

عام طور پر مسلمہ تعریف کی رُو سے عشق کسی محبوب شئے یا ہستی کے حصول کی ناقابل مزاحمت خواہش کا نام ہے۔ اس تجربے سے گزرنے والے شخص (عاشق) کو اپنے اندر کسی نہ کسی نقص یا کمی کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے وہ "حصول کمال" کے لیے ہر قیمت پر دور کرنا چاہتا ہے اسی لیے دوسرے کمالات کی طرح جن کی روح اور جسم کو خواہش ہوتی ہے۔ عشق میں بلند و پست مراتب ہوتے ہیں۔ اس کے محرکات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس کی عینیت یا معنی ایک ہی کارفرما ہوتا ہے جو بلاشبہ سب انسانوں کے دل و دماغ پر شدت سے چھایا رہتا ہے۔ یہ اس جمال (حسن) کی انتہائے آرزو ہے جس کو عالم موجودات میں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر تخلیق کرتے وقت ظاہر کیا۔ سب موجودات میں ہستی کے اس مرتبے کے حصول کی خواہش کارفرما ہے جو ان کے اپنے درجے سے اوپر ہے۔ یہ محرک خواہش جو تمام کائنات میں جاری ہے عشق کائناتی ہے۔

انسانوں کے مابین انس اور محبّت کا متوازی جذبہ عشق کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس نے نفسیاتی اور جسمانی کیفیتیں ظہور میں آتی ہیں اور انھیں رائج العام الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بالخصوص شاعری میں استعمال ہوتے ہیں۔

نفسانی خواہشوں سے مبرّا اور پاک ہو کر یہ جذبہ عشق عبادت کی ایک اعلیٰ شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے بعض اوقات ایک دماغی عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے جو اعمال پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یہ کسی مثالی نسوانی شکل کی روحانی پرستش کی کیفیت ہوتی ہے۔

فلسفیوں کے ہاں عشق ایک عقلی چیز ہے۔ یہ اُس بلند ترین خوشی کی جانب غیر ارادی، واضح اور باقاعدہ میلان کے مترادف ہے جو حواس خمسہ کے ذریعے مستقل ہونے والے علم سے آزاد عقل ہو چکی ہے۔ خالص نیکی کا مفہوم حاصل کر لیتی ہے۔

صوفیوں کے ہاں عشق کا شوق و ولولہ کسی حد تک مزاحمت کے باوجود مذہبی زندگی کا ایک جزو ہے۔ کیونکہ یہ اس منظم اُنس و محبت کا قدرتی اقتضاء ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔ "اللہ کی طلب لازمی" کو محبت سے زیادہ عشق یعنی عشق الٰہی کا درجہ دیا جاتا ہے۔

عصر

لغوی معنی، زمانہ۔ وقت۔

قرآن مجید میں ہے: اور قسم ہے وقت (زمانے) کی، انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں (۱۰۳)

نمازوں میں سے ایک نماز کا نام بھی عصر ہے۔ ظہر کے بعد اور مغرب سے پہلے اس کو بروقت ادا کرنے کی بڑی تلقین کی گئی ہے۔

حفاظت کرو تمام نمازوں کی بالخصوص درمیانی نماز کی۔ (۲۳۸:۲)

اس درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک دفعہ نئے آئے ہوئے گھوڑے دیکھنے میں لگ گئے کہ عصر کی نماز کا وقت فوت ہوگیا۔ آپ کو بڑا دکھ ہوا۔ اور تلافی کے طور پر سبھی گھوڑے خیرات کر دیے۔ حدیث میں آتا ہے کہ انسانوں کے اعمال لکھنے والے فرشتے دن میں دو مرتبہ ڈیوٹی بدلتے ہیں۔ ایک صبح اور ایک عصر کے وقت۔ اس لیے عصر کی نماز میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

عصمت انونو

جمہوریہ ترکی کے سابق صدر۔ اب ترکی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے قائد۔ ۱۸۸۴ء کو سمرنا میں پیدا ہوئے۔ حسب دستور مسجد میں دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر سرکاری مکتب سے تحصیل علم کر کے فوجی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر استنبول کے ملٹری کالج میں داخل ہوئے۔ یہیں انجمن اتحاد و ترقی کے رکن بنے۔ ۲۲ برس کی عمر میں کالج سے فارغ ہو کر فوج میں کپتان بنا دیے گئے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی میں پیش پیش تھے۔ جنگ طرابلس اور پہلی جنگ عظیم میں انور پاشا کے ماتحت حصہ لیا۔ گیلی پولی اور درِ دانیال کے مورچوں میں سپلائی پر مامور تھے۔ اور جہاں سے فارغ ہوئے تو انہیں محاذ کا کیپٹن بنا کر بھیج دیا گیا۔ جنگ عظیم کے اختتام پر جب انگریزوں نے قسطنطنیہ اور یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر لیا تو انونو مرکز خلافت سے بھاگ کر اناطولیہ پہنچ گئے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا سے مل کر کسانوں کی ایک فوج تیار کر لی۔ انونو کے مقام پر آپ نے یونانیوں کو فیصلہ کن شکست دے کر اپنے وطن

عصمت انونو۔ سابق صدر۔ ترکی

کو آزاد کرا لیا۔ "فاتح انونو" کی حیثیت سے انونو آپ کا نام کا جزو بن گیا۔

پہلی لوزان کانفرنس میں عصمت انونو نے جس قابلیت، ہوشیاری اور تدبر کا ثبوت دیا وہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لارڈ کرزن کی دھمکیوں کا عصمت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ انگورہ واپس چلے آئے۔ دوسری لوزان کانفرنس میں ترکوں کی حسب منشا صلح ہوگئی۔ جب مصطفےٰ کمال جمہوریہ ترکی کے پہلے صدر بنے تو عصمت کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد چار مرتبہ ترکی کے وزیر اعظم بنے۔ کمال اتاترک کی وفات کے بعد عصمت انونو جمہوریہ ترکی کے دوسرے صدر بنے اور دوسری عالمگیر جنگ میں انتہائی تدبر سے کام لے کر ترکی کو جنگ کے شعلوں سے بچائے رکھا۔ جنگ کے بعد نئے انتخابات میں عصمت انونو کی جماعت ناکام رہی۔ فوجی انقلاب کے بعد یہ پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں کامیاب نہ ہوسکے۔ آج کل پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے قائد ہیں۔

عطاء اللہ حنیف، مولانا

(۱۳۲۷ھ/ ۱۹۱۰ء) کنیت ابوطیب۔ جائے ولادت بھوجیاں ضلع امرتسر۔ والد کا نام صدرالدین حسین۔ ابتدائی تعلیم بھوجیاں ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں دہلی چلے گئے۔ اور مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی اور مولانا عبدالرحمٰن سے حدیث و دیگر علوم پڑھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، حافظ محمد محدث گوندلوی [illegible] عطاء اللہ لکھوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ طے کیا۔ آپ کی تعلیم کا [illegible] کہ حدیث و اصول حدیث کی کتابیں حرف [illegible] [illegible] و دیگر علوم کی تعلیم تکمیل بعد میں کی۔

مولانا حنیف دہلی سے تکمیل علم کے بعد پنجاب آئے تو [illegible] اہل حدیث کی تشکیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس جمعیت کے زیر [illegible] مدرسہ میں بطور شیخ الحدیث آپ ہی کا تقرر ہوا۔ دو سال یہاں [illegible] لکھوکے اور پھر [illegible] کوٹ [illegible] [illegible] رہے اور تحریک آزادی میں سرگرمی دکھانے کے جرم [illegible] کے باعث واپس فیروزپور آگئے۔ ۱۹۴۶ء کے آخر میں [illegible] [illegible] دارالعلوم تعلیم الاسلام [illegible] چکا ہے [illegible] شیخ الحدیث [illegible] مسند سنبھالی [illegible] فیروزپور گئے۔ تو [illegible] سال رمضان میں ملک تقسیم ہوگیا [illegible] آگئے۔ قیام پاکستان کے باعث جماعت اہل حدیث [illegible] مولانا حنیف کی مساعی سے مولانا محمد اسماعیل اور [illegible] کو از سر نو منظم کیا۔ مرکزی [illegible] کا قیام [illegible] جامعہ سلفیہ کے نام سے ایک مرکزی [illegible] میں جاری کیا۔ [illegible] مسند شیخ الحدیث کے [illegible] ۱۹۵۵ء تک [illegible] مدرسہ [illegible] منتقل ہوگیا تو آپ نے تحریر کی طرف توجہ دی۔ [illegible] پر حاشیہ لکھنا شروع کر دیا جسے ۱۹۵۵ء تک [illegible] کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ تھوڑے عرصے بعد [illegible] جو کچھ مدت بعد بند ہوگیا۔ البتہ [illegible] نکل رہا ہے۔ اسی دوران مکتبہ سلفیہ کے [illegible] اشاعتی ادارہ [illegible]

سنن نسائی پر حاشیہ التعلیقات السلفیہ کے نام سے اس ادارہ نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اس ادارے کے زیرِ انتظام کئی ایک نادر کتب شائع ہوئیں۔ ہندوستان میں ان کا ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جو فسادات کی نذر ہوگیا۔ لیکن اب انھوں نے اس سے بھی بڑا کتب خانہ بنا لیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ پروفیسر ابو زہرہ کی عربی کتاب "حیات ابن تیمیہ" کا ترجمہ رئیس جعفریؒ سے کروایا۔ اور اس پر کتاب کی ضخامت کے برابر حاشیہ تحریر کر کے اپنے ادارے سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی کتابوں پر آپ نے حواشی تحریر کیے۔ اور نادر و نایاب کتب کی جستجو کر کے منظرِ عام پر لائے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف جماعت اہل حدیث کے بلند پایہ محققین میں سے ہیں۔ احتساب کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں۔ بدیں وجہ جماعت اہل حدیث سے عملاً علیحدہ رہے۔ ویسے بیس برس سے لاہور کی جمعیت کے امیر چلے آ رہے ہیں۔ مولانا نے مبارک مسجد اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں اکتیس برس تک خطابت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ قیام و طعام سادہ۔ شروع سے ہی کھدر پوشی۔ تکلف سے احتراز اور خلوص و خوش اخلاقی ان کا خاص شعار رہا ہے۔

عطاءاللہ شاہ بخاریؒ، مولانا

۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۰ء — ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء۔ عہد ساز خطیب۔ قافلہ آزادی کے عظیم راہنما، بے باک مجاہد۔ پٹنہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید ضیاء الدین احمد اور والدہ کا نام سیدہ فاطمہ تھا۔ جو ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حافظ قرآن تھیں۔ چار سال کی عمر میں والدہ کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی۔ اُردو خاندانی زبان تھی۔ فارسی و عربی اور شعر و سخن میں ذوق پیدا کیا۔ سترہ سال کی عمر میں پٹنہ سے امرتسر مولانا مفتی غلام مصطفےٰ قاسمیؒ کے پاس آگئے۔ صرف و نحو اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ وہیں ان کے استاد نے تقریر کی مشق کرائی ان کی آواز کی حلاوت نے بہت جلد لوگوں کو اپنی جانب مائل کر لیا۔ ۱۹۱۹ء میں کوچہ جیل خانہ رام باغ امرتسر کے لوگ شدید اصرار کر کے اپنے ہاں لے آئے۔ اس مسجد سے مفتی قاسمی صاحب کی درسگاہ دور تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں مفتی محمد حسنؒ اور مولانا حبیب الرحمٰنؒ جاڑنگامی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ سے بھی کچھ اسباق تبرکاً سنے۔ ان کے علاوہ اساتذہ میں مولانا نور احمدؒ اور مولانا محمد عالمؒ آسی بھی شامل ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں روحانی تربیت کے لیے پیر سید مہر علی شاہؒ گولڑہ شریف کے ہاتھ پر بیعت کی۔

عطاءاللہ شاہ بخاری

یہ وہ دور تھا کہ جنگِ عظیم کے اثرات ابھی باقی تھے۔ ایک طرف تحریکِ آزادی اور تحریکِ خلافت زور پکڑ رہی تھی۔ دوسری طرف برطانوی سامراج اور مرزائی مسلمانوں کے جذبہ ایمانی کے لیے چیلنج بنے ہوئے تھے۔ جلیانوالہ باغ کا سانحہ بھی انہی دنوں رونما ہوا تھا۔ ان حالات سے وہ متاثر ضرور تھے۔ لیکن عملاً سیاست سے کنارہ کش رہتے تھے۔ حتیٰ کہ تحریکِ خلافت کی مخالفت کرنے لگے۔ مولانا سید داؤد غزنوی برصغیر کے وہ پہلے عالم دین ہیں جو اس تحریک کے روح رواں تھے، انہوں نے شاہ صاحب کو کافی محنت سے قائل کر لیا۔ تب سید صاحب نے قولاً و عملاً بڑھ چڑھ کر تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کمیٹی توڑ دی گئی تو آپ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حکم پر امرتسر سے پہلی دفعہ تحریک کے رہنما کی حیثیت سے لاہور آئے۔ موچی دروازے میں تقریر کی اور لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ لوگوں نے بڑھ چڑھ کر روپیہ جمع کیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات تک دے دیے۔ اگلے دن دہلی دروازہ کے باہر تحریک کا دفتر قائم کر دیا گیا۔ انگریز اور مرزائی کی مخالفت آپ کا مشن تھا۔ چنانچہ آپ نے فرنگی سیاست پر بھرپور وار کرنے شروع کر دیے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو راولپنڈی میں تحریکِ آزادی کے موضوع پر ولولہ انگیز تقریر کی۔ پھر ۲۵ مارچ کو امرتسر مسجد میں اس تقریر نے انگریز حکومت سے بغاوت کی تحریک کو دو آتشہ کر دیا۔ چنانچہ انہیں ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور تین سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ اس گرفتاری کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاج ہوا۔ یوں آپ پورے برصغیر کے مسلمانوں کے راہنما بن گئے۔ ۱۹۲۴ء میں رہا ہوتے تو پہلے سے زیادہ جدوجہد شروع کر دی۔ اور یہ جدوجہد آخر دم تک جاری رہی۔ انہی دینی و ملکی خدمات کی بناء پر مارچ ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے زیرِ انتظام لاہور ایک جلسے میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ نے امیرِ شریعت کا خطاب دیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔ یوں پانچ سو کے قریب علماء نے آپ کی بیعت کی۔ عقیدۂ ختمِ نبوت کو تحریکی طور پر عام کرنے کا کام بھی آپ کے ہاتھوں شروع ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں انجمن احرارِ اسلام قائم ہوئی تو پنجاب بھر میں احرار کے دفتر قائم کرنے کا کام بھی آپ کے سپرد ہوا۔

سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں کی دوستی بہت گہری تھی۔ کیوں کہ ان دونوں کا مشن ایک ہی تھا، الہلال اور ستارۂ صبح نے آپ کی فکر کی تشکیل کی۔

سید بخاریؒ کو انگریز اور مرزائیوں سے شدید نفرت تھی۔ انگریز سے آپ کے بغض کی انتہا یہ تھی کہ آپ ولایتی مرغ یا انڈہ تک بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک تقریر پر آپ کو چھ ماہ قید ہوئی۔ اہلِ محلہ نے چپکے سے ضمانت کروا لی۔ شاہ جی ایک عرصہ تک محلہ والوں سے ناراض رہے کہ انھوں نے اپنی حلال کی کمائی اس حکومت کے خزانے میں جمع کیوں کرا دی؟

مرزائیوں کی یہ جسارت تو ایک علیحدہ بات تھی کہ انھوں نے خاتم النبیینؐ کی رسالت میں گستاخی کی۔ لیکن شاہ جی کو اس کے علاوہ ان سے اس بنا پر بھی نفرت تھی کہ مرزائیت انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔

۱۹۲۵ء میں جب کہ آپ نئے نئے میدان سیاست میں اترتے تھے، مرزائیوں کے خلیفہ بشیر الدین نے ایک جلسے میں جو بندے ماترم ہال امرتسر میں ہوا جس میں مرزائیوں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ایک حدیث کے الفاظ غلط پڑھے تو شاہ جی نے فوراً ٹوکا۔ اس پر اچھا بھلا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ خلیفہ صاحب کی سبکی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزائیوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ پھر اس کے بعد مرزا جی کسی بھی میدان میں نظر نہیں آئے۔ تحریکِ ترکِ موالات میں غالباً اسی وجہ

سے حصہ نہیں لیا۔

شاہ جی اس صدی کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کی خطابت کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کہا کرتے تھے کہ جہاں بخاری تقریر کرنے کے لیے جائیں گے وہاں کسی کو جرأت نہیں ہوگی۔ اگر پہلے کی جائے تو یہ بعد میں آکر اثر اڑا دیں گے۔ اگر بعد میں کرنے کی کوشش کی جائے تو سننے گا کون۔؟ ہر جلسے کے آخری مقرر شاہ بخاری ہی ہوتے، فجر کا وقت ہوجانا ایک معمولی بات تھی۔ اپنی تقریر میں بے شمار اشعار، لطیفے، چٹکلے، خصوصًا قرآن مجید بکثرت پڑھتے سادہ غذا اور سادہ لباس استعمال کرتے تھے۔ کھدر کا استعمال آخر تک رہا حتے کہ کھدر کا نام بخاری کھدر پڑ گیا۔

جولائی ۱۹۶۱ء میں لاہور سے ملتان پہنچے اور ۲۰ روز بعد ۲۱ اگست کو جیبن آگاہی میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

عطار شیخ فریدالدین

فارسی کے مشہور صوفی شاعر۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ جوانی کا زمانہ نہ علوم و معارف میں تحصیل علوم میں گذرا۔

آخر میں خود بھی مقام ارشاد پر فائز ہوئے۔ مولانا رومی نے ان کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ اقبال بھی عطار سے بہت متاثر ہیں۔ آپ نے مصر دمشق، ہندوستان، ترکستان اور مکہ کی سیاحت بھی کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عطار فروش تھے۔ کہ ایک روز ایک درویش ان کی دکان کی چوکھٹ پر آکر لیٹ گیا۔ شیخ نے اسے پوچھا کہ کیا چاہیے تو اس نے کہا یہاں ہمیں کیا چاہیے ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ خود اپنی فکر کرو، زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ ادھر دیکھو یہ ہے زندگی۔ یہ کہہ کر وہ لیٹ گیا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ شیخ اس سے بڑے متاثر ہوئے۔ اسی وقت دکان سے نکلے اور مشائخ کی تلاش میں چل پڑے۔

آپ کی تیس کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے تین خاص طور پر مشہور ہیں۔ اول قصائد اور غزلیات کا دیوان جس میں دس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ قصائد نعت اور پند و معرفت پر مشتمل ہیں۔ دوم تذکرۃ الاولیاء۔ سوم مثنوی منطق الطیر ایک پندنامہ عام عربی مدارس کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ آپ کا سن وفات ۶۲۷ھ ہے۔

عفت

(پاکدامنی، پاکبازی:۔ نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہوجانا جس کے ذریعے قوۂ نفس شہوت سے محفوظ رہے۔) عفت ان ساری خوبیوں کی جان ہے جن کا نگاہ عزت و آبرو سے ہے۔ اسی لیے اسلام نے اسے اخلاقی محاسن میں شمار کیا ہے۔

قرآن کریم میں عفت و عصمت کے لیے اصطلاحی "حفظ فروج" یعنی شرمگاہ کی حفاظت ہے۔ "سورۃ مومنون" میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں اس اخلاقی وصف کا خاص طور پر ذکر ہے

(سورۃ المعارج میں بھی یہی مضمون ہے۔ حفظ کے معنی حفاظت اور بچانے کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں مجازی لفظ ہے۔ کتنے ہی الفاظ شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجازی طور پر استعمال ہوتے رہے۔ مگر بعد میں کثرت استعمال کے باعث وہ اپنے مفہوم میں بالکل بے پردہ ہوگئے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کریم نے ایک اور لفظ "احصان" استعمال کیا ہے جو حصن سے بنا ہے اور اس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں یہ لفظ قرآن مجید میں تین مرتبہ آیا ہے۔ دو دفعہ حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے ضمن میں اور ایک دفعہ مجہول صیغے سے۔

یہودنے جو بہتان باندھا تھا۔ قرآن نے نہ صرف اس کی تردید کی۔ بلکہ ان کی پاکدامنی کی شہادت بھی دی۔ جو دو جگہ ہے۔ ایک سورہ تحریم کی آخری آیت میں اور دوسری سورۃ انبیاء کے چھٹے رکوع میں۔ حضرت یوسف کی پاکبازی کا ثبوت خود عزیز مصر کی بیوی نے دیا تھا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مستقل خصلت ہی یہ بیان کی۔ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا "وہ سردار ہوگا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا۔"

اسلام میں اہل بیت کی زندگی جس عفت و پاکبازی سے عبارت تھی [illegible] کی گواہی خود عَلَّامُ الْغُيُوْبِ نے دی۔ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ "یہ (یعنی اہل بیت) لوگ تہمت سے پاک ہیں جو یہ [illegible] ان کے لیے مغفرت و اجر عظیم ہے۔"

عفت کے خلاف کا لفظ قرآن مجید میں فَاحِشَةٌ آیا ہے جس کے معنی کھلی بے حیائی کے ہیں۔ ایک مقام پر فاحشہ کو زنا کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے

زنا اور اس کے تمام محرکات و متعلقات (مثلاً کسی غیر محرم کو شہوت بھری ہوئی نظروں یا برائی کے ارادے سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا، بلا وجہ اس کے بدن کو چھونا [illegible] کسی اس کی بات چیت۔ یا آمد و رفت سے ناجائز لطف [illegible] میں مبتلا ہونے کا نام فاحشہ کھلی بے حیائی ہے۔

اسلام نے عفت کی خاطر عورت پر چند ایک پابندیاں [illegible] کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں۔ غیروں کو اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں [illegible] بازاروں میں نہ گھومیں، تیز خوشبو استعمال نہ کریں۔ غیر محرم [illegible] نہ کریں۔ سینہ کا پردہ رکھیں۔ باہر نکلیں تو چادر لپیٹ کر [illegible] راستہ میں باتیں نہ کریں۔ بغیر اجازت کسی کے گھر میں نہ [illegible] [illegible] پابندیاں [illegible] عصمت [illegible]

[illegible] نے صرف [illegible]

وعفت کا دامن پاک کرنے [illegible] شہوت [illegible]

سزا مقرر کی ہے۔ [illegible]

بدکار مرد و عورت کی سزا سو سو کوڑے [illegible]

بھی رکھی ہے صرف سزا ہی [illegible]

کہ زانی مرد [illegible] زانیہ یا مشرک عورت [illegible]

صرف زانی یا مشرک مرد ہی [illegible]

زنا پاک [illegible] خبیث [illegible]

عورتیں [illegible] پاک باز [illegible]

کے لیے ہیں [illegible] پاک [illegible]

اسلام کی نظر میں [illegible]

معصیت سب سے بڑا [illegible] قتل [illegible]

عصمت و پاکدامنی کا پردہ [illegible] پاک کرنا [illegible]

پاک کرنے کے لیے [illegible]

مانا لیکن جو سزا مرنے کے بعد دی جائے گی [illegible]

انگیز ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک روحانی خواب میں دکھایا گیا کہ بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ تھی۔ یعنی تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا۔ اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور عورتیں تھیں۔ جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا یہ لوگ اس کے اندر سے باہر نکل آئیں گے لیکن جب آگ ٹھنڈی ہو جاتی تو یہ اس کے پھر اندر چلے جاتے ہیں۔ یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے برعکس پاکباز مردوں اور عورتوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالٰی کے عرش کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا خداوند تعالٰی سات قسم کے آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں سے ایک شخص وہ ہوگا جسے ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اللہ تعالٰی سے ڈرتا ہوں۔ یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا۔ لیکن صاحب عفت لوگوں کے لیے دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے قدیم زمانہ کے تین آدمیوں کا قصہ بیان فرمایا۔

جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعتاً بارش شروع ہو گئی تینوں نے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ لی۔ سوء اتفاق سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب نجات کی صورت انہیں سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھی کہ اعمال کے واسطہ سے خدا سے دعا کریں چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور عمل صالحہ کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹتا گیا۔ ان میں سے ایک کی دعا یہ تھی۔

خداوندا! میری ایک چچا زاد بہن تھی جس سے بڑی محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ ایک دفعہ وہ ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے پاس آئی۔ میں نے اسے ضرورت سے زیادہ درہم دیے اور اپنی خواہش کا اظہار پھر کر دیا۔ قریب رضامند ہو گئی۔ عین اس وقت کہ ہم برائی میں ملوث ہونے والے تھے اس نے کہا۔

"اللہ سے ڈر۔"

یہ سنتے ہی میں رک گیا۔ بار الٰہی! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میں نے صرف تیرے ڈر اور رضا کے لیے کیا ہے تو ہمیں اس عذاب سے نجات دے، چنانچہ وہ پتھر ہٹ گیا اور یہ باہر آ گئے۔

عفت و پاکبازی ان اعمال میں سے ہے جن سے خدا کا قرب اور دعا کی قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے نیز عفت ہی عورت کا بہترین زیور ہے

عفریت

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور بلقیس کے ذکر میں اس کا نام آیا ہے قرآن کے بیان کے مطابق اس نے دعوٰی کیا تھا کہ میں وہ تخت آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ عفریت جن نہیں تھا۔ بلکہ انسان تھا جب کہ قرآن کریم کے الفاظ میں ہے ایک عفریت جنوں میں سے تھا جن بطور استعارہ کے استعمال ہوا ہے۔ مگر طبری نے اسے جن ہی شمار کیا ہے۔ عفریت جن اور شیطان دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور عموماً برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

عفو (درگزر کرنا)

اخلاق کی سب سے بڑی بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر گراں گذرتی ہے۔ عفو، درگذر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی تعلیم ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے۔ مثلاً شرک و بت پرستی سب سے سنگین جرم ہے۔ اس کا جو تصور قرآن مجید نے پیش کیا ہے۔ وہ خالص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ ان مشرکوں کے معبودوں کو برا نہ کہو یہ چڑ میں آکے خدا کو برا بھلا کہہ بیٹھیں گے۔ (ب) یہ برداشت کی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار و مشرکین کے ایذا رسانی اور گالی گلوچ پر صبر کرو۔ اور ان سے درگذر کرو۔

اور یہی حکم عام مسلمانوں کو صراحت ہو رہا ہے — معاف کرنے کی عادت بناؤ۔ اچھائی کا حکم دو۔ جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ اور جب شیطان بڑھکائے تو اللہ کی پناہ مانگو(۹)

عام حالت میں عفو و درگذر آسان ہے۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان غصہ کی حالت میں بھی اپنے پر ضبط رکھے۔ قرآن کریم میں صحابہؓ کی تعریف یوں آئی ہے اور جب غصہ میں آتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ نیکوکاروں کی تعریف یوں کی گئی۔

اور یوں غصہ پی کر جانے والے۔ اور لوگوں کو معاف کر دینے والے (یہی نیکوکار ہیں) اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پہلوان کی تعریف یہ بیان فرمائی کہ جو غصہ کی حالت میں اپنے اوپر ضبط رکھتا ہو یعنی غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے غصہ پر قابو پا جانا گویا شیطان پر قابو پا جانا ہے۔ اور یہ بہت بڑا کمال ہے۔ لطف اس بات کا نہیں کہ غصہ آئے ہی نہ۔ بلکہ کمال اس بات کا ہے کہ آئے اور ضبط کر جائے۔

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک مشہور روایت ہے کہ ایک دفعہ لونڈی کے ہاتھوں سے سالن کا برتن آپ کے کپڑوں اور بچھونے پر گر پڑا۔ جب آپ نے غصیلی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا تو فوراً

بولی والکاظمین الغیظ — اور غصہ کو پی جانے والے۔

آپ نے غصہ تھوک دیا۔ پھر بولی۔ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (لوگوں سے درگذر کرنے والے) آپ نے جواباً فرمایا میں نے تجھ سے درگذر کی۔ پھر اس لونڈی نے آخری حصہ پڑھا۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

"تو آپ نے فرمایا جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔"

ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے نصیحت چاہی آپ نے فرمایا۔ لَا تَغْضَبْ۔ غصہ نہ کھاؤ۔ پھر اس کے دوبارہ، سہ بارہ پوچھنے پر بھی آپ نے یہی جواب دہرایا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب آدمی کو غصہ آئے تو جس حالت میں بھی ہو وہ حالت تبدیل کرے۔ اور شیطان سے پناہ مانگے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ یا لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ پڑھے، مثلاً کھڑا ہے تو بیٹھ جائے یا چل پڑے چل رہا ہو تو رک جائے۔ امام ابن حزمؒ نے لکھا ہے غصہ آئے وضو کرنا شروع کر دے غصہ رفع ہو جائے گا۔

امام غزالی فرماتے ہیں۔ آدمی کی عظمت و مقام کا اندازہ لگانا ہو تو جب اسے غصہ آئے اس وقت جانچو — سمجھداری کی علامت یہ بھی ہے کہ جب لڑائی ہو گی تو وہ غضب میں آ کر گالی گلوچ پہ اتر آئے گا۔

قرآن مجید میں صحابہؓ کی شان یہ بھی بیان ہوئی کہ وہ کفار کے لیے سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ یہ سخت اس لیے کہ مومن کا غصہ اور ناراضگی بھی اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے

حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں اپنے دشمن پر قابو پایا۔ اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے تو اس نے آپ پر تھوک دیا، آپ نے اُسے چھوڑ دیا۔ پوچھنے پر فرمایا کہ پہلے غصہ اللہ کے لیے تھا۔ پھر ذاتی انتقام کا خدشہ لاحق ہو گیا تو میں نے چھوڑ دیا۔ غرض عفو میں ہی عافیت ہے۔

عقبہ ابن ابی محیط

بنو امیہ میں سے تھا۔ حضور اکرم صلعم کے اعلان نبوت کے بعد سب سے زیادہ اسلام دشمنی اسی نے کی یہی وہ شخص ہے جس نے نماز کی حالت میں حضورؐ کے کندھوں پر اونٹ کی اوجھ لا کر ڈال دی تھی۔ ایک بار جب حضورؐ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر اس زور سے کھینچا کہ حضورؐ گھٹنوں کے بل گر پڑے

جنگ بدر میں کفار کی جانب سے اسلام کے خلاف جنگ آزما تھا۔ مسلمانوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔ حضور اکرمؐ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ بہ اختلاف روایت حضرت علیؓ یا حضرت عاصم بن ثابتؓ نے اسے تہ تیغ کیا۔

عقبہ بن عامر جہنیؓ

نام عقبہ، کنیت ابو عمرو۔ ایام جاہلیت میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔ مدینہ میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اور یہیں مقیم ہو گئے۔ جنگ صفین میں امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کے خلاف لڑے۔

چنانچہ مصر پر تسلط قائم ہو جانے کے بعد یہ وہاں کے امیر الخراج مقرر ہوئے۔ اور نماز کی امامت بھی انھیں کے سپرد ہوئی ۴۴ھ میں حضرت امیر معاویہ کے حکم سے روڈس پر حملہ کیا۔ لیکن دوران جنگ عہدہ سے معزول ہو گئے۔ ۵۸ھ میں وفات پائی۔

آپ کو قرآن حدیث، فقہ پر عبور حاصل تھا۔ شاعری میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے قرآن پاک کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ جو نویں صدی ہجری تک مصر میں موجود تھا۔ اسی نسخے کے آخر میں ان کی خود نوشتگی کی سند بھی تھی۔ آپ بڑے مشہور تیر انداز اور ماہر فنون جنگ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بڑے شوق سے حاضر ہوتے تھے۔ اسی باعث قرآن و حدیث میں بڑی دل چسپی لی۔ اور کافی مہارت حاصل کی۔ کتب احادیث میں آپ کی ۵۵ مرویات موجود ہیں

عتبہ ثانیہ ــــ دیکھئے بحث عتبیٰ ثانیہ

عقل

کلام پاک میں یہ لفظ "فقہ" یعنی "سمجھ" کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور یہ عربی زبان کے محاورے کے مطابق ہے۔ لیکن علمی لحاظ سے "عقل" کے مختلف نظریوں کو فلسفیانہ، متکلمانہ اور متصوفانہ استعمال کے تحت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر فلسفیانہ لحاظ سے بھی عقل کے دو الگ الگ نظریے ہیں۔ ایک نفسیاتی دوسرا مابعد الطبیعاتی۔ نفسیاتی لحاظ سے ارسطو کے زیر اثر مسلم فلاسفہ نے عقل کو دو بنیادی اجزا میں تقسیم کیا ہے۔ عقل نظری جس کا کام غیر متبدل معقولات کا علم ہے۔ اور عقل عملی۔ جس کا کام کون و فساد کو جاننا اور اس میں عمل کر کے تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ انسانی ذہن میں ان دونوں عقلوں کے ارتقا کے عموماً چار مدارج شمار کیے گئے ہیں۔

۱۔ عقل ہیولانی یا عقل بالقوت یا عقل منفعل۔ ۲۔ عقل بالفعل۔ ۳۔ عقل

کا حصول ہوتا ہے۔ ان کے نظریہ اشراق اور فلطینیوں کے نظریہ اشراق میں فرق یہ ہے کہ جہاں فلطینیوں نے احساس کے موضوعات کے علم کو اشراق قول کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن مابعد الطبیعاتی درجے پر سنی اور اسمٰعیلی منکرین نے عقول کے نظریے کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ایسے طویل بحثوں کا موضوع بھی بنایا ہے۔

متکلمین کے نزدیک عقل (اکثر وہ عقل سریح) ایک فطری قوت ہے جس سے انسان نفسیات و تزکیہ کے درمیان قدرتی طور پر تمیز کرتا ہے۔ یہ عقل فطری طور پر تمام انسانوں کو بخشی گئی ہے۔ اسی لیے ایسے عقل مشترک یا عقل عام کہتے ہیں۔ اس عقل کا اولین ذخیرہ علمی نہیں بلکہ اخلاقی ہے اور اس کے ذریعے انسان اچھے اور برے میں تمیز کرتا ہے۔

عام انسانی فکر میں عقل زندگی کی استواری میں ایک بنیادی فطری خاص صفت ہے۔ عام زندگی میں تدبر کے لیے عقل انسان کے لیے ایک واسطہ کی نشان ہے

عقیدہ

(پختگی، گرہ لگانا) یہ لفظ انسان کے ذہنی طور پر ایک بات پر مطمئن ہو جانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً فلاں شخص کا یہ عقیدہ ہے۔ یعنی اسے اس بات کا یقین ہے کسی بات پر عقیدہ (یا یقین) رکھنے والے کو معتقد کہا جاتا ہے۔

تمام اُمتوں کے اپنے اپنے مذہبی عقائد ہوتے ہیں۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ حضرت عزیرؑ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور ان دونوں کا عقیدہ ہے کہ جنت صرف ہمارے ہی لیے ہے اگر ہم جہنم میں چلے بھی گئے تو صرف چند روز رہیں گے۔ کمیونسٹ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ جہان اپنے ہی آپ بن گیا اور توڑ پھوڑ بھی خود بخود ہوتی ہے۔ چیزوں کا پیدا کرنے والا انسان ہے۔ ہندو لوگوں کا عقیدہ ہے کہ "مایا" ہی ہر چیز کا خالق ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان عقائد میں بنیادی غلطی خالقِ کائنات کے بارے میں ہے جبکہ اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے:

(۱) کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا ہے۔ ساری مخلوق اسی کے حکم کے تابع ہے کسی بھی انسان کو اس پر کوئی اختیار نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ زمین و آسمان کا غیب صرف اسی کو ہے۔

(۲) انسان کو اشرف و اکرم بنایا۔ اس کی ہدایت کے لیے اس نے وقتاً فوقتاً کئی بہترین انسان پیدا کیے۔ انہیں (جن پر کتاب یا شریعت اتری انہیں رسول) اور (جن پر شریعت نہیں اتری بلکہ وہ پہلے کی شریعت کے پیرو رہے اور مبلغ ہوں نبی) کہا جاتا ہے۔ ان کی صحیح تعداد صرف اللہ کو معلوم ہے۔ وہ سب برحق تھے۔

(۳) سب سے آخر میں حضرت محمد صلعم کو بھیجا۔ جن پر اپنا دین پورا کر دیا اور ان پر قرآن مجید نازل کیا۔ وہ بھی دیگر انبیا کی طرح صرف اللہ کے رسول اور نبی ہی تھے۔ اور وہ اسی کے بندے تھے۔

(۴) قرآن و دیگر آسمانی کتابیں و صحیفے اس (اللہ) نے چند پاک فرشتے کے ذریعے نازل کیے۔

(۵) ہر انسان پر ایک دن ایسا آئے گا جب اس کی روح اس کے بدن سے علیحدہ ہو گی اور وہ مر جائے گا۔ پھر ایک روز جی اٹھے گا اور میدان محشر میں جمع ہو

گا۔ اپنے کیے کا حساب دے گا۔ اگر کوئی اچھے کام کرنے والا ہوگا تو اسے جنت میں بھیجا جائے گا اور جو برے عملوں والا ہوگا اسے جہنم میں بھیجا جائے گا۔

(۶) ہر چیز کا خالق بھی اللہ تعالےٰ ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی تکلیف یا خوشی نہیں پہنچ سکتی۔ اس عقیدے میں سارا دارومدار عمل و کردار پر ہے۔ خدا کی توحید انبیاء کی رسالت۔ موت کے بعد زندگی۔ اور جنت و دوزخ میں داخلے کا صحیح ترین تصور صرف اسی عقیدہ میں ہے جس شخص کو ان میں سے کسی ایک شق سے اختلاف ہوگا وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ مزید دیکھیے "ایمان"

عقیقہ

لغوی معنی کسی چیز کا پھاڑنا۔ علیحدہ کرنا، اصلاحی معنی بچے کی پیدائش پر جانور کی قربانی کرنا۔ اس سے پہلے بچے کا نام رکھنا اور اس کے بال منڈوانا سنت ہے۔ لڑکے کے واسطے دو اور لڑکی کے لیے ایک دنبہ یا ایک ایک بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ سنت یا مستحب ہے۔ عقیقہ پیدائش کے ساتویں روز ہوتا ہے۔ ورنہ پھر چودھویں یا اکیسویں دن۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر سال کے اندر کسی دن کرنا چاہیے۔ اگر تب بھی توفیق نہ ہو تو بچے کی بلوغت سے پہلے کیا جائے۔ اگر والدین نہ دے سکیں تو بچہ جوان ہو کر خود کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب تک عقیقہ نہ کیا جائے، برکت و سعادت سے اسے بہت کم حصہ ملتا ہے۔

عقیقہ کے گوشت کا زیادہ حصہ فقیروں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور بچے کے بالوں کے برابر چاندی خیرات کر دیتے ہیں۔

اسلام سے قبل بچے کا نام رکھتے وقت قربانی کرتے تھے اور اس کا خون بچے کے سر پر ملتے تھے۔ عیسائیوں میں اس کی جگہ بپتیسمہ ہے۔ جس میں بچے پر مقدس پانی چھڑکا جاتا ہے۔

عقیل بن ابی طالب

ہاشمی قریشی۔ کنیت ابو یزید۔ حضرت علیؓ اور حضرت جعفر طیار کے بڑے بھائی تھے۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی، گرفتار ہوئے اور حضرت عباسؓ نے فدیہ دے کر رہائی دلائی۔

صلح حدیبیہ کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ۸ھ میں مدینہ کو ہجرت کی۔ ایک مدت تک صاحبِ فراش رہے۔ اسی باعث جنگِ موتہ کے بعد کسی غزوے میں ان کا ذکر نہیں۔

خوشحال آدمی تھے اور کافی خدم و حشم رکھتے تھے۔ غالباً ۵۰ھ/۶۷۰ء میں وفات پائی، مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔ اپنے پیچھے کئی بیٹے چھوڑے جو حضرت امام حسینؓ کے (یزید کے خلاف) جہاد میں ان کے ساتھ ہو گئے تھے ان میں سے ایک یعنی مسلم کو ابن زیاد نے قتل کیا اور باقی جو تعداد میں چھ یا نو تھے، میدانِ کربلا میں شہید ہوئے۔

عقیل علم الانساب و تاریخ قریش پر مسلّم سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کے چار حکموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں فہرست وظائف کی تقرری میں مدد دینے کے لیے بلایا تھا۔

بہت خوش بیان خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی تھے۔

عکاشہ بن محصن

کنیت ابو محصن، والد کا نام محصن بن حرثان۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا خاندان بنو عبدالشمس کا حلیف تھا۔ ہجرت سے پہلے مسلمان ہوئے اور آنحضرتؐ کے ہمراہ مکّہ سے مدینہ ہجرت کی۔ جنگ بدر اور بعد کی ساری جنگوں میں بڑی شجاعت سے لڑے۔ ۶ھ میں چالیس ہزار افراد کی جمعیت کے ساتھ بنو اسد کی سرکوبی کرنے گئے۔ اور کامیاب لوٹے۔ ۱۱ھ میں خلیفہ اوّل کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں طلیحہ کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا گیا۔ جس میں ان کے علاوہ حضرت ثابت بن اقرم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار فوج کے آگے آگے جا رہے تھے۔ کہ راستہ میں غنیم کے چند سوار مل گئے۔ جن میں خود طلیحہ بھی شامل تھا۔ جس نے رسول اللہ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ طلیحہ نے دونوں کو نرغہ میں لے کر شہید کر دیا۔ آپ کا شمارہ آنحضرت کے ممتاز صحابہؓ میں ہے۔

عکاظ

زمانہ جاہلیت میں منعقد ہونے والا عربوں کا ایک مشہور قومی، ملّی اور علمی میلہ جس میں شرکت کے لیے دور دور سے عرب قبائل آتے تھے۔ اس میں زیادہ تر توجہ اپنے اپنے قبائل کی بہادری اور اُنکا کارنامے پیش کرنے کی طرف منعطف ہوتی۔ شعرا اپنا اپنا کلام پیش کرنے اور فیصلے کے لیے بیت اللہ میں لٹکا دیا کرتے۔ ایک روایت کے مطابق سبعہ معلّقہ (سات مشہور عربی قصائد) کی ترتیب عکاظ کے علمی مقابلوں کا نتیجہ ہے۔

عکرمہ بن ابی جہل

مشہور دشمن اسلام ابوجہل کے بیٹے۔ ابوجہل جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔ عکرمہ بھی اسلام لانے سے پہلے اسلام کے سخت مخالف تھے معاذ اور معوذ پر جنہوں نے ابوجہل کو قتل کیا تھا، تلوار کا وار کیا۔ جس سے معاذ کا ایک بازو کٹ گیا۔ باپ کے مارے جانے کے بعد جنگ احد میں اس کا بدلہ لینے کی غرض سے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کی بیوی مسلمان ہو گئی تھیں لیکن عکرمہ اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ اور مکہ چھوڑ کر یمن چلے گئے۔ عام معافی کا سن کر واپس آئے اور آنحضرت کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپؐ نے اتنے بڑے دشمن کی سب خطائیں معاف کر دیں۔ لیکن دوسرے مسلمانوں کو عکرمہ سے پھر بھی پرخاش رہی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جب فتنہ ارتداد اٹھا اس فتنہ کو روکا۔ یمن کے مرتدین کی سرکوبی کی اور بہت سے مرتدین کو تہ تیغ کیا۔ معرکہ شام میں نہایت جانبازی سے لڑے جنگ یرموک میں ایک دستہ کے افسر تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے آپ نے بیت المال سے عمر بھر ایک پائی تک نہ لی۔ جنگ اور زندگی کے تمام مصارف اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔

علاؤالدین علاالحق شیخ

بنگال کے مشہور صوفی۔ آپ نے شیخ اخی سراج کے بعد سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو سب سے زیادہ فروغ بخشا۔ سلسلہ نسبت حضرت خالد بن ولید سے جا ملتا ہے۔ تاریخ پیدائش کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔ ایک متمول اور مالدار خاندان

میں پیدا ہوئے۔

شیخ علاؤ الدینؒ نے حضرت اخی سراجؒ کے ہاتھ پر بیعت کی جو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدینؒ محبوب الٰہی کے خلیفہ مجاز تھے۔ متمول ہونے کے باعث بہت زیادہ فیاض تھے۔ ان کی فیاضی کی وجہ سے بادشاہ کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ملک کے خزانے کو لٹا رہے ہوں کیونکہ ان کے والد شاہی خزانہ کے مہتمم تھے۔ حاکم وقت نے آپ کو دارالخلافہ چھوڑ کر سنار نامی ایک گاؤں جو ڈھاکہ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر تھا چلے جانے کا حکم دیا۔ وہاں آپ نے پہلے سے بڑھ کر سخاوت و فیاضی کی۔ دو سال تک اس گاؤں میں مقیم رہے، مشہور رہے کہ ان کے دو باغ تھے۔ جن کی آمدنی آٹھ ہزار تنکہ تھی۔ کسی نے ان کے دونوں باغوں پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ لیکن انھوں نے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا کثرتِ فیاضی کے باعث آپ نے اپنا لقب گنج نبات رکھ لیا۔ جب اس کی اطلاع ان کے شیخ خواجہ نظام الدینؒ کو پہنچی تو بہت ناراض ہوئے کہ یہ تو ہمارے شیخ خواجہ فرید الدین شکر گنج سے بھی آگے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اس ناراضگی کی وجہ سے آپ کی زبان بند رہی جو حضرت اخی سراج سے بیعت تک رہی۔

شیخ علاؤ الدین اپنے استاد کے بہت زیادہ خادم تھے۔ اس کثرت خدمت کو آپ کے اعزہ و اقربا جو اراکین سلطنت تھے۔ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حضرت اخی سراج نے انہیں خرقہ خلافت عطا کیے۔ آپ کی وفات سنہ ۱۳۹۸ء میں ہوئی جب کہ ایک روایت کے مطابق آپ ۷۸۴ھ ۱۳۸۲ء میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار چھوٹی درس گاہ پنڈوہ میں مرجع خلائق ہے۔

علاؤ الدین، محمد شاہ سلطان

۱۴۴۳ء میں اپنے باپ سلطان محمد شاہ کی وفات پر مبارک آباد کے تخت پر بیٹھا۔ اس کا والد باغیوں کو کچلنے میں ناکام ہو چکا تھا اس کے باوجود اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کے ہاتھ پر ملک بہلول خان خاناں اور دیگر ارکان سلطنت نے خلافت کی بیعت کر لی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اپنے باپ سے بھی ناکارہ ثابت ہوا۔ جس پر ملک بھر میں بغاوت عام ہو گئی۔ اور علاؤ الدین اس پر قابو نہ پا سکا۔ یہ حال دیکھ کر مالوہ، بنگالہ، دکن، گجرات، اور جونپور کے سلاطین نے دہلی کی فتح کے منصوبے باندھے۔ لاہور، دیپال پور، سرہند بلکہ پانی پت تک ملک بہلول کی عملداری تھی۔ خاص دہلی کے نواح میں سرائے لاڈو تک احمد خان میواتی کا قبضہ تھا۔ اس طرح تمام علاقوں کے امرا خود مختار بن گئے۔ اور سلطان کا تصرف صرف دہلی اور بدایوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ یوں بیس سال تک برائے نام بادشاہ رہا۔ آخر کار چند وزیروں کی ملی بھگت سے ملک بہلول نے اقتدار سنبھال لیا۔ اور سلطان علاؤ الدین کو بدایوں کی عملداری سونپ دی۔ ۲۸ سال تک بدایوں ہی رہا۔

علاؤ الدین مسعود شاہ سلطان

خاندان غلاماں کا ایک بادشاہ ۶۳۹ھ اس کے باپ معز الدین بہرام شاہ کو اس کے نظام الملک وزیر نے دھوکہ دے کر اقتدار سے محروم کر کے قتل کر دیا تھا۔ اور خود تختِ خلافت سنبھال لیا۔ لیکن امیر الامرا ملک معز الدین اعظم نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ دولت و شوکت کے باعث تخت چھین لیا۔ اور مقتول خلیفہ بہرام کے بیٹے علاؤ الدین مسعود شاہ کو قید سے نکال کر تخت خلافت سپرد کر دیا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی نظام الملک کو قتل کروا دیا۔ اور اپنے باپ کی دنیا داری کے باعث محبوس کیے گئے افراد کو قید سے نکال کر عہدے دیئے کچھ عرصے بعد سلطان علاؤ الدین نے ظلم و ستم کا طریقہ اپنا لیا۔ اس وسیع پیمانے پر قتل و غارت نے امرا کو بغاوت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے متفقہ طور پر معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔ جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی مدت خلافت چار سال ایک اور ایک ماہ بنتی ہے۔

علا حضرمی

نام علاء:۔ باپ کا نام عبد اللہ۔ اصل وطن یمن۔ لیکن حضرت بن امیہ کے حلیف بن کر مکہ میں مقیم ہو گئے۔ دعوتِ اسلام کے شروع میں مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ نے انھیں منذر بن ساوی حاکم بحرین کے پاس خط دے کر بھیجا جس پر وہ اور اس کی کل رعایا مسلمان ہو گئی۔ رسول اللہ نے علاء کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ معزول ہو گئے۔ اور ان کی جگہ ابان بن سعید بن العاص کو عامل مقرر کیا گیا حضرت ابوبکرؓ نے انھیں اپنے دورِ حکومت میں دوبارہ بحرین کا حاکم بنا دیا۔ اسی زمانہ میں منذر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے لڑکے نے خود سر بن کر بغاوت کر دی اور مرتدین کی کافی تعداد اس کے ساتھ شامل ہو گئی، لیکن علاء نے ان کا اچھی طرح قلع قمع کیا۔ اور حضرت عمر کے خلیفہ بننے تک سارا علاقہ مطیع کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے بصرہ کا حاکم بنا دیا۔ علاء بحرین سے بصرہ جا رہے تھے۔ تو راستہ میں ہی انتقال کیا اور ایک بے آب و گیاہ جنگل میں دفن ہوئے۔

علاج

رفعِ مرض کے لیے کی جانے والی تدبیر علاج کہلاتی ہے حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج فطرت کے پاس موجود نہ ہو۔ ہر مرض کا کوئی نہ کوئی علاج کسی نہ کسی تدبیر میں مضمر ہے۔ چنانچہ آپؐ کا فرمان ہے کہ مریض کو چاہیئے کہ وہ اپنے مرض کے خاتمے کے لیے ہر طریقہ بروئے کار لائے البتہ ان طریقوں سے گریز کرنے کے لیے کہا گیا ہے جن سے توحید و ایمان کو زد پہنچتی ہو ورنہ باقی ان تمام تدابیر علاج کے لیے اصرار کی حد تک کہا گیا کہ ان پر عمل کیا جانا چاہیئے تاکہ مرض کو ختم کیا جا سکے اسی لیے بہت سی مرضوں اور بیماریوں کا علاج خود حضورِ اکرم صلعم نے بتایا جن پر عمل کر کے بیماری سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اچھے معاشرے کے قیام کے لیے اچھی صحت کے لوگوں کا ہونا ضروری عوامل میں سے ہے اور اچھے افکار صحت مند ذہانت اور پرجوش عملی جدوجہد ظاہر ہے کہ صحت مند لوگوں پر منحصر ہے۔ لہذا اسلام نے علاج مرض پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ آج کی جدید دنیا کی زیادہ تر توجہ بھی انسانی صحت کو مستحکم کرنے اور بیماریوں کے علاج دریافت کرنے پر ہی ہے۔

علق، سورۃ

اس سورہ کا عدد تلاوت ۹۶ ہے۔ تیسویں پارے کی انیسویں سورت ہے۔ اس میں آیات بھی انیس ہیں۔ اس کے مضامین دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی پانچ آیات پہلی وحی کے طور پر نازل ہوئیں۔ باقی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب آپ نے حرم

میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل آپ کو دھمکیاں دے کر عبادت سے باز رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں عبادت میں مصروف تھے کہ اچانک ایک فرشتہ آیا اور آپؐ کو بھینچ کر کہنے لگا۔ پڑھیے۔ آپؐ نے جواب دیا، میں نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اس نے دو تین بار بھینچا اور کہا۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ اپنے خالق کے نام سے پڑھیے۔ جب آپؐ گھر آئے تو علیل ہو گئے۔ اور اپنی جان کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ تب حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور اپنے ایک خاندانی بزرگ ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ اس لحاظ سے یہ سورہ آنحضرتؐ کی نبوت کی دلیل تھی۔ چونکہ آپؐ نے اپنی تبلیغ کا آغاز نماز سے ہی کیا تھا اس لیے یہ حصہ یہیں جچتا تھا۔

عِلم

عربی زبان کا لفظ۔ اس کا مادہ ع ل م ہے۔ جہل کی ضد میں استعمال ہوتا ہے۔ مفردات میں ہے۔

اسلامی ادبیات میں علم کے مختلف معنی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں علم کے ساتھ "حکمت" کی اصطلاح بھی آئی ہے یعنی اس طرح حکمت میں علم سے زائد معانی کی نشاندہی ہے۔ امام غزالی نے علم کے ساتھ "فضل" کی اصطلاح کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ یہ علم سے بڑھ کر، یعنی زائد و برتر حقیقت ہے۔ علم کے مترادفات میں ادراک۔ شعور اور معرفت جیسے الفاظ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن کبھی محدود مفہوم میں فن اور صنعت کو بھی علم کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔

سرسری طور پر ہر ادراک (چاہے وہ حسی سطح پر ہو) ادراک کہلا سکتا ہے لیکن لفظ عالم کا اطلاق ان انسانوں پر ہوتا ہے جو ادراکات کے کسی منظم سلسلے میں مزاولت اور ممارست کے بعد درجہ خاص یا امتیاز خاص حاصل کر لیتے ہیں۔ امام غزالی نے اسی تخاطب پر اس بنا پر اعتراض کیا ہے کہ جو الفاظ خدائے تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتے ہیں (مثلاً عالم الغیب) ان کا اطلاق انسانوں پر درست نہیں

شعور اور ادراک اگرچہ ایک سطح پر علم کہلا سکتے ہیں لیکن ایک خاص دائرہ استعمال کی وجہ سے عالم اور عارف و فقیہ میں فرق ہے۔

شعور کے معنی ہیں ادراک جزئیات کرنے والا جو ضروری نہیں کہ کلیات کا بھی مدرک ہو۔ فقیہ کا مطلب ہے معلومات و مدرکات کا عقلی تجزیہ کرنے والا۔ اسی لیے فقیہ عاقل و دانا شخص یا کسی علم کی اصول بندی کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ مرور زمانہ سے فقیہ صرف قانون شریعت کے عالم کو کہا جانے لگا۔ اور عالم و فقیہ کچھ ہم معنی سے الفاظ بن گئے۔

علم کے اس مفہوم میں جب وسعت ہوئی اور حکمت اس کے دائرے میں آ گئی تو ایسے علم کا عالم حکیم اور بعض اوقات محقق کہلایا۔ عمومی طور پر علم میں وسعت اور فوقیت زائدہ رکھنے والوں کو فاضل کہنے لگے۔ تاہم قانون شریعت کے جاننے والوں اور علوم دینیہ میں دسترس رکھنے والوں کو عالم کہنے کا رواج ہر دور میں غالب نظر آتا ہے۔

معرفت اور علم میں جزوی ترادف پایا جاتا ہے۔ قشیری نے اپنے رسالے میں لکھا ہے۔ " المعرفت . . . . . . ھو العلم"۔ اس کے باوجود اس نے ان دونوں لفظوں کے امتیاز پر خاصا لکھا ہے۔ موصوف کے یہ فقرے قابل ذکر ہیں کہ

دراصل عارف وہ شخص ہے جو براہ راست، یعنی حواس و عقل کے واسطے کے بغیر روحانی واردات کے طور پر علم حاصل کرتا ہے اور عالم وہ شخص ہے جو حواس و عقل کے ذریعے بعض حقائق کا ادراک کرتا ہے۔

متکلمین میں سے جن بزرگوں نے علم و معرفت میں امتیاز کیا ہے وہ علم کو مرکبات اور معرفت کو بسائط کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

علم کی اقساط اور مختلف صورتوں کی بحث آگے آتی ہے۔ اس کے بنیادی طور پر دو بڑے عنوانات ہیں: (۱) ذات باری کا علم۔ (۲) وہ علم جو انسان کے لیے میسر کیا گیا ہے۔ عقائد نسفی اور مواقف میں علم کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں: علم قدیم اور علم حادث۔

ان تمام علوم کو جو کسی اصولی نظام کے تحت ضبط تحریر میں آئے، علوم مدونہ کہا جاتا ہے۔

علمائے علم کی کسی قطعی اور جامع و مانع تعریف سے بالعموم احتراز کیا ہے لیکن ان کی پیش کردہ سینکڑوں تعریفوں کو اگر مجمل صورت دے دی جائے تو بھی ان کی تعداد خاصی ہو جاتی ہے۔ یہاں ان میں سے چند نمایاں تعریفات دی جا رہی ہیں۔ علم ایک صفت ہے جس کے ذریعے کسی شے کا ادراک حاصل ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ ایک ذہنی عمل ہے یا صفت اضافیہ ہے۔

علم ادراک یا تخیل یا وجدان حقیقت ہے۔ علم ثبوت ہے۔ علم احاطہ ہے۔ علم معنی النفس ہے، علم اذعان النفس ہے۔ علم نام ہے بیان و اثبات یا تمیز اور قطع کا یا تبیین کا اور یہ صفت النفس ہے۔ علم شکل ذہنی ہے۔ علم ذہن میں اسم و نقش معنی ہے۔ یا معنی کی علامت ہے۔ علم ہیئت برہانیہ ہے۔ علم ذہن میں کسی شے کی صورت و شکل ہے۔ علم شے کی شکل و صورت ہے۔ علم تحقیق ہے۔ علم ارادہ ہے۔ عقل معانی فطرت کا نزول ہے اور علم ان معانی کا اکتساب ہے۔ علم تخیل اور خیال کی ذہنی تحقیق ہے۔ علم ایمان ہے۔ علم اعتقاد ہے، علم معلوم کا خیال ہے۔ علم رائے ہے۔ علم حرکت نفس کا نام ہے۔ علم ضد جہل ہے۔ علم وجدان ہے اور صوفیا اسے تجلی کہتے ہیں۔ علم کلیات کی بصیرت کا نام ہے علم نور ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے دل میں ڈالا جاتا ہے۔ علم شہادت ہے خدا کے وجود کی اور اس کی حقیقت کی۔ علم بدیہی بھی ہے اور اکتسابی بھی۔ علم کشف سر ہے جو نفس کی گہرائیوں میں موجود ہے۔

لیکن ان تمام کثیر التعداد تعریفوں کے باوجود علم کی قطعی تفسیر نہیں ہو سکتی چنانچہ امام غزالی نے اپنی کتب میں کوئی حتمی تعریف پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ البتہ انھوں نے فرمایا کہ تعریف کی بجائے مثال اور تجزیہ سے نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

امام فخرالدین رازی کا قول ہے کہ علم کی تعریف علم ہی سے کی جا سکتی ہے اور یہ دور ہے جو محال ہے لہذا علم کی تعریف کی کوشش لاحاصل ہے۔ اس کے معانی یہ ہوئے کہ علم الیقان و ایمان اور ذوق و کشف کا نام ہے جو ہوتا ضرور ہے مگر اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تعریفیں کی گئی ہیں اور اس کثرت سے علم کی تعریفوں کا سبب نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے، کہیں دینی کہیں منطقی کہیں تصوف کے مابین، کہیں حکمت کے مابین اور ظاہر ہے کہ زاویۂ نظر و فکر کسی بھی بارے میں کوئی تعریف معین کرتے وقت بنیادی اہمیت رکھتا ہے جس کے نتیجے میں ایک ہی شے کے بارے میں مختلف تعریفیں سامنے آتی ہیں۔ لیکن جب ایک شے، واقعے یا صفت کے بارے میں

بے شمار رائیں اور تعریفیں متعین کی جائیں تو ایک طرف یہ اس بات کی دلیل ہے "متعارف" نہایت اہم ہے، دوم یہ کہ جتنی زیادہ تعریفیں سامنے آتی ہیں اتنی ہی زیادہ اس "متعارف" کے بارے میں وسعتِ خیال اور ادراک فہم میں اضافہ ہوتا ہے :۔

علمِ تفسیر

عصرِ تدوینِ علمِ قرآن میں علمِ تفسیر کو باقی تمام علوم پر فوقیت حاصل تھی۔ کیونکہ یہ علم سب علوم کی اساس وبنیاد کا حکم رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں سب سے پہلی تصانیف جو تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں لکھی گئیں۔ نواب صدیق حسن خان کے مطابق شعبہ بن حجاج سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح کی تحریر کردہ تھیں۔

قرآن مجید کی زبان خالص عربی ہے اور قرآن کریم میں شامل ہونے والے الفاظ اس قدر جامع اور بلیغ ہیں کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق اس کے معارف و نکات سے حظ اٹھا سکتا ہے لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کے مضامین جن میں فضائل اعمال کے علاوہ احکام بھی شامل ہیں۔ مجموعی لحاظ سے ان کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ سیاق و سباق، سبب نزول اور کیفیت ہبوط کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ قرآن کے عالم سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر آنحضرتؐ ہیں۔ ان کے بعد صحابہ کرامؓ جو قرآن کے اولین مخاطب تھے۔ ان کا درجہ ہے۔ اس بنا پر قرآن کی تفسیر اور اس کا حقیقی مفہوم احادیث رسولؐ اور عمل صحابہؓ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ لغت یا کسی اور ذریعے سے نہیں۔

محدثین نے دیگر روایات کے ساتھ تفسیری روایات کے بھی مستقل باب باندھے اور ثقہ مفسرین نے تفسیر کے سخت ترین اصول مقرر کیے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن"، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" اور نواب صدیق حسن خاں نے "اکسیر فی اصول التفسیر" میں انہیں مفصل بیان کیا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی سلسلے کے چار اصول بیان کیے۔ انھیں حاصل کیے بغیر کوئی شخص نہ تو قرآن کی تفسیر کرنے کا مجاز ہے اور نہ ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ان میں چند ایک یہ اصول ہیں۔

(۱) مفسر کو علمِ تفسیر کا موضوع اور اس کی مبادیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔
(۲) آیات کی تفسیر کے سلسلے میں صحیح احادیث رسولؐ پر عبور حاصل ہو۔
(۳) دورِ جاہلیت کی شاعری۔ لغت و ادب عربی کی مہارت ہو۔
(۴) اسباب نزول، شانِ نزول اور مقامات نزول سے پوری طرح واقف ہو۔
(۵) تفسیر القرآن بالقرآن اور مفردات القرآن میں مشاق ہو۔
(۶) حالاتِ حاضرہ اور ضرورتِ وقت کے لئے قرآن کریم سے ناشیفک اصولوں پر مبنی سلفی روایات و معتقدات کے ساتھ استدلال و اجتہاد کا ملکہ رکھتا ہو۔ صرف ایسا شخص تفسیر قرآن میں راہ صواب پر رہ سکتا ہے۔

متاخر و متقدم علم تفسیر کے اکثر قواعد و ضوابط پر پورا اترنے والی تفسیر حافظ عماد الدین دمشقی متوفی (۷۷۴ھ) کی تفسیر ہے۔ جو ابن کثیر کے نام سے معروف ہے۔ ان اصولوں کی پابندی اس لیے بھی ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں بغیر علم کے اپنی رائے سے کہتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں سمجھے۔

علم تفسیر کے علامہ سیوطیؒ کے مطابق ۸۰ سے اوپر شعبے ہیں۔ اس سلسلے کی مشہور تصانیف میں سے زرکشی کی البرہان، سید قطب شہید کی التصویر الفنی فی القرآن، علی بن ابراہیم کی البرہان فی علوم القرآن، اور اعراب القرآن۔ ابوالحسن الاشعری کی المختزن فی علوم القرآن۔ محمد بن خلف کی الحاوی فی علوم القرآن نہایت اہم کتابیں ہیں۔

برصغیر میں خاص طور پر شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے علاوہ نواب صدیق حسن خانؒ، مولانا محمود حسنؒ، مولانا نعیم الدین مراد آبادی، علامہ وحید الزمان مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، علامہ ابراہیم سیالکوٹیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبداللہ روپڑیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے علمِ تفسیر کے اکثر مشکل ترین مباحث کی قابلِ قدر تشریح کی ہے۔

علمِ جفر

اس علم میں احوال غیب کو معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد یونانیوں کے قدیم علم الاعداد پر ہے۔ سب سے پہلے عبرانیوں نے اپنی ابجد کے بائیس حروف کو اعداد میں منتقل کر کے ان سے حرف حرف کی تادیبات [illegible] کرنے کا طریقہ رائج کیا ہے۔ عبرانیوں کی ابجد اور ان کے حروف کے اعداد حسب ذیل ہیں۔

عبرانی ابجد

حروف	ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط	ی	ک
اعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰
حروف	ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت
	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰

عربوں نے اس ابجد میں چھ حروف کا اضافہ کیا۔ اس طرح عربی ابجد کے کل ۲۸ حروف وضع ہوئے۔ جن کے مساوی اعداد مقرر کر کے عربوں نے [illegible] گنتی کو ہزار تک پورا کیا۔ عربی ابجد کے حروف اور ان کے [illegible] حسب ذیل ہیں۔

حروف	ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
اعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰

حروف	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ
اعداد	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰

حروف	ذ	ض	ظ	غ
اعداد	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

اشکالِ ابجد عربی ان اٹھائیس حروف [illegible] منطبق کر کے ہر منزل کا ایک الگ حرف مقرر [illegible] اور ہر [illegible] خاص [illegible] کی گئی۔ انھی تاثیرات کے پیش نظر علم جفر کی مشہور و معروف [illegible] کو استوار کیا گیا۔ علم الاثار [illegible] کے اصول و قواعد کے مطابق [illegible] نقوش [illegible] پاتے ہیں۔ اوراد میں وہ وظائف بھی شامل ہیں جو کلام پاک کی آیت [illegible] کر علم الآثار کے مطابق مختلف تاثیرات پیدا کرنے کے [illegible] استعمال [illegible] ہیں۔ بعینہٖ بعض آیات قرآنی کے حروف کی ابجدی قدریں معلوم کر کے نقوش ترتیب دیے جاتے ہیں اور مختلف مطالب کے اخذ و حصول کے کام آتے ہیں۔ جفر کی دوسری [illegible] "علم الاخبار" ہے۔ اس علم کے اصول و قواعد کے مطابق سوال سے حروف [illegible]

جواب پیدا کر لیے جاتے ہیں اور اس طرح ماضی، حال اور مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔ تحقیق سے یہی ثابت ہوا ہے کہ جفر کے موجد عبرانی تھے۔ لیکن جس نوعیت میں وہ فی زمانہ رائج ہے۔ اس کے بانی عرب مسلمان ہیں۔ بلکہ بعض خوش اعتقاد لوگ اسے حضور نبی کریم، حضرت علیؓ اور حضرت جعفر صادقؓ جیسی مقدس ہستیوں سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ علم ایام جاہلیت کے عرب کاہنوں کے پاس بھی تھا جو وقتاً فوقتاً مقفیٰ و مسجع عبارات میں پیش گوئیاں کرتے رہتے تھے۔ کچھ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے جفر و جامع نامی دو رسائل تصنیف فرمائے جن میں ماضی، حال اور مستقبل کے حالات درج تھے۔ اور یہ رسالے بکرے کی کھال کی وصلی پر مندرج تھے۔ لہٰذا روایت ہے کہ ابن خلدون آئمہ جعفر کی تشریح کے تحت رقمطراز ہیں کہ جفر چار ماہ کے بکرے کو بھی کہتے ہیں۔ یہ رسائل نسلاً بعد نسلٍ حضرت علیؓ کی اولاد میں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت امام مہدی ان کو ساتھ لے کر سرداب سُرمن رائے میں رو پوش ہو گئے۔ علم جفر کی بعض اصطلاحات عوام میں بہت مشہور ہیں۔ مثلاً سوال کرنے والے کو سائل کہتے ہیں۔ سوال کی عبارت کو الگ الگ حروف میں پھیلانے کا نام بسط حرفی ہے۔ دوبارہ آپس میں ان حروف کو گرا دینا تکلیق کہلاتا ہے۔ اسی طرح حروف کے اعداد کو آپس میں جمع کر دینے کو جمل کبیر۔ جمل کبیر کے اعداد سے دوبارہ حروف بنانے کو ملحوظ کرنا۔ ان میں سے جو حروف حاصل ہوں ان کو ایک سطر میں بچھا دینے کا نام زمام ہے۔ اسی طرح کی ایک اصطلاح مستحصلہ ہے جو جفاروں کے نزدیک وہی درجہ رکھتی ہے جو کیمیاگروں کے نزدیک اکسیر کا ہوتا ہے۔ کیونکہ مستحصلہ کے ہر حرف سے جو دھوں حرف لے کر جو سطر حروف برآمد ہوتی ہے۔ وہی سوال کا جواب ہوتی ہے اور ان علماء کے نزدیک یہ جواب نص قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ بعض عقائد کی بحث میں اس قسم کے علوم کو خطرناک شمار کیا جاتا ہے اور موحدین حضرات اس کے قطعی نتائج کے انکاری ہیں۔

علم حدیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فعل، فرمان اور کسی بھی کیے گئے کام پر خاموشی کا نام حدیث ہے۔ حدیث اور قرآن میں وہی مماثلت ہے جو نقشے اور عمارت میں۔ عہد نبوی میں قرآن کریم اور اس کی توضیحات (حدیث) انفرادی اور اجتماعی طور پر ضبط کی جاتی رہیں۔ جوں جوں زمانہ نبوت سے دوری ہوتی جاتی تھی۔ اسی مناسبت سے قرآن کریم اور حدیث نبویہ کی تدوین کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ لیکن حدیث کی تدوین ۹۹ ھ میں باضابطہ ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ کرامؓ کے پاس فرامین نبویؐ موجود تو تھے۔ بعض ایسے بھی تھے۔ جو خود آنحضرتؐ نے لکھوائے تھے۔ بعض خود صحابہ کے لکھے ہوئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کتابت حدیث کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ کیونکہ کچھ پیشہ ور لوگ حسن رسول اللہؐ کہہ کر ناجائز فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ اس وضع حدیث کے سد باب کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے امام المحدثین حضرت امام زہریؒ کو مامور کیا۔ تدوین حدیث کا پہلا مرحلہ یہ ہے۔ یہاں آ کر کام رکا نہیں بلکہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ علم حدیث کی گہرائی اور گیرائی کی طرف توجہ بھی بڑھتی رہی۔ محدثین نے اپنی پوری زندگیاں خدمت حدیث میں کھپا دیں۔ ضبط حدیث کے اصول اس قدر سخت اور کڑے وضع کیے گئے کہ اب کوئی شخص کسی غلط بات کو قول رسولؐ کا نام نہیں دے سکتا۔

محدثین نے علم حدیث کو اتنا وسیع اور محتاط بنا دیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حدیث کے طبقات مقرر کیے۔ اس کی اقسام اور نوعیتیں مرتب کیں۔ اسناد و طرق پر بحثیں ہوئیں۔ اجازہ حدیث پر پابندیاں لگائیں وغیرہ۔ اور پھر ہر ہر شعبہ کے بارے میں کئی کئی کتابیں لکھیں۔ مختلف علوم وضع کیے۔ اس جانکاہی و محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ اور اسوہ حسنہ بغیر کسی ملاوٹ و کذب کے ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان علوم کی تعداد کے بارے میں علامہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں کہ علم حدیث کی تکمیل و ترتیب و حفاظت و نصرت کے لیے کم و بیش ایک سو علوم ایجاد ہو گئے۔

علامہ حازمی نے کتاب العجالہ میں لکھا ہے کہ علم حدیث میں بہت سی انواع ہیں جو سو تک پہنچتی ہیں۔ مولانا سید نذیر حسینؒ محدث دہلوی اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ نے ان علوم کی فہرست لکھی ہے۔ ان سو علوم میں سے بنیادی یہ ہیں۔

(۱) علم اسماء الرجال:۔ اس میں راویوں کے حالات سے بحث ہوتی ہے۔
(۲) علم الروایۃ :۔ اس میں روایت و ضبط حدیث پر نظر ہوتی ہے۔
(۳) علم الدرایۃ : اس میں جمع حدیث پر بحث کیا جاتا ہے۔
(۴) علم تدوین الحدیث :۔ اس میں جمع حدیث پر بحث کی جاتی ہے۔
(۵) علم الناسخ المنسوخ: اس میں بحث ہوتی ہے کہ کون سی حدیث ناسخ ہے اور کون سی منسوخ اور کیوں منسوخ ہے۔ اس کے لئے حدیث کے علل و اسباب اور تقاضائے وقت اور شان نزول کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔
(۶) علم النظر الاسناد :۔ اس میں حدیث کی سند پر بحث کی جاتی ہے۔
(۷) علم کیفیۃ الروایۃ :۔ یعنی راوی نے حدیث کس طرح روایت کیا اور اس کے درجات کیا ہیں۔
(۸) علم الفاظ الحدیث: اصطلاحات محدثین کیا ہیں۔ اور آیا زیر بحث روایت کے الفاظ رسول اللہ کے ہو سکتے ہیں یا نہیں۔
(۹) علم المؤتلف والمختلف : بعض صورتوں میں ایک ہی واقعہ ہوتا ہے مگر دو افراد کے متعلق علیحدہ علیحدہ احکام ہوتے ہیں۔ یا اس کے برعکس اس پر بحث ہوتی ہے۔
(۱۰) علم طبقات الحدیث : کس درجہ کی حدیث ہے اور اس کے راوی کس طبقہ سے ہیں۔
(۱۱) علم غریب الحدیث : نامانوس الفاظ کا مطلب کیا ہے۔
(۱۲) علم الجرح والتعدیل :۔ راویوں پر اعتماد یا عدم اعتماد کے وجوہ۔
(۱۳) علم طرق الحدیث : بعض احادیث کئی طریقوں سے مروی ہوتی ہیں۔
(۱۴) علم الموضوعات : "موضوع" احادیث کیونکر شناخت کی جا سکتی ہیں۔
(۱۵) علم علل الحدیث : یہ علم بہت دقیق ہے۔ اس میں وفیات، موالید، مساکن، القاب، اسماء اور لقائے روایت پر عبور حاصل کرنے کے علاوہ ہر ہر راوی کے الفاظ حدیث اور احادیث کا احاطہ ضروری ہے۔ حدیث کی تعلیل میں کم از کم تین مجموعی قوتوں میں کمال ضروری ہے۔ حفظ، فہم اور معرفت۔
(۱۶) علم تصحیف الاسماء : ایک جیسے ناموں کی تحقیق کا علم۔
(۱۷) علم الوحدان : قلیل الحدیث راویوں کا بیان۔
(۱۸) علم روایۃ الآباء عن الابناء : باپ کے بیٹوں سے روایت کرنے کا علم۔
(۱۹) علم روایۃ الصحابی عن التابعی : صحابہ کا تابعین سے روایت کرنا۔

(۲۰) علم الموضح الاوہام الجمع والتفریق: مجہول راویوں کا بیان۔
(۲۱) علم معرفۃ علوم حدیث: علوم حدیث کی حقیقت کا علم۔
(۲۲) علم اسباب: جس میں حدیث کا سبب بیان کیا گیا ہے۔
ان پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نبیؐ کے طریقے کی حفاظت کتنی جانفشانی سے کیا ہے۔

علمِ طبّ

اس علم کا موضوع جسم انسانی ہے۔ اس میں صحت یا تندرستی برقرار رکھنے اور بیماری وغیرہ کو دور کرنے کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ آغاز اسلام کے ساتھ ہی فن طب مسلمانوں میں رائج ہوا۔ طب یونانی کی سینکڑوں کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں اور ہزاروں کتابیں عربی میں مستقل طور پر لکھی گئیں۔ خلفائے وقت نے خود سرپرستی کر کے اس علم کو فروغ بخشا۔ بڑے بڑے عالم فاضل پیدا ہوئے جنہوں نے طبّ یونانی کی سینکڑوں گنا اس حد سے آگے بڑھایا جہاں یونانی حکماء چھوڑ گئے تھے۔ یعنی ان کی جہاں انتہا تھی مسلمان اطبا کی وہاں سے ابتدا ہوئی۔ پہلے سے مختلف ادویات و امراض کا پتا چلایا اور دائرہ تشخیص کو بہت وسیع کیا۔

علم طب کی ابتدا اگرچہ یونانیوں نے کی لیکن اسے فروغ خاندانِ عباسیہ کے دور میں ہوا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ اسقلیبس (ASCLEPIUS) جو اس علم کا موجد تھا۔ پر خدا کی طرف سے الہام ہوا ہے۔ جو اس نے یہ علم تشکیل دیا ہے۔ اسقلیبس نے اولاد کو زبانی اس فن کی تعلیم دی اور وصیت کی کہ یہ علم و فن اس کے خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔ اقلیدس، افلاطون اور سولن ایسے عظماء اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سولھویں نسل میں تقریباً حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پانچ سو برس پہلے بقراط پیدا ہوا۔ اور یونانیوں میں یہ پہلا شخص ہے جس نے علم طب پر اسقلیبس خاندان کی اجارہ داری کو چیلنج کیا اور اُسے عام کیا۔ لیکن اس کے شاگرد جالینوس پر اس علم کا خاتمہ ہو گیا۔

یونانیوں کے نزدیک علمِ طب کے آٹھ ارکان ہیں۔ اوّل اسقلیبس اور آخر جالینوس۔ ان کے شاگرد غورس، مینس، برمانیداس، افلاطون، اسقلیبس دوم اور بقراط تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صاحب تصنیف اطبا گزرے لیکن انھیں ارکان نہیں کہا جا سکتا۔

مسلمانوں نے طب کے اس سرمائے کو عربی زبان میں منتقل کیا اور چونکہ بقراط و جالینوس نے اس فن کو نہایت کمال تک پہنچایا تھا۔ اس لیے ان کی تصنیفات کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ طبی تصانیف کے بہم پہنچانے میں مسلمانوں نے بہت کوشش کی۔ ایک کتاب "البرہان" کی تلاش میں جزیرہ، شام، فلسطین مصر کے ایک ایک شہر کی خاک چھانی گئی۔ مسلمانوں میں ابن جلجل اندلسی نے ان تصانیف پر کئی اضافے کئے۔ سکندریہ میں بہ نسبت دوسرے علاقوں کے اس علم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں ایک شخص یحییٰ نحوی تھا۔ اس نے جالینوس کی ۱۹ کتابوں پر شرح لکھی۔ سکندریہ کے علاوہ شام و روم میں بھی بہت سے نامی گرامی اطبا تھے۔ مثلاً شمعون، ابران، یوحنا، انطلیس، برطلاوس، سندمشار، کہلان اور راس بونبرس اور اطنوس وغیرہ۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس فن کے ماہروں پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور امام ابوبکر رازی نے اپنی کتاب "حاوی" میں انھی کتابوں سے مواد لے کر جمع کیا ہے۔

مسلمانوں میں اس علم کی تحصیل کی ایک بڑی وجہ شریعت کے بعض بنیادی اصول بھی ہیں۔ اور اس علم کی تحصیل کے لیے ترغیب بھی۔ یہ محاورہ بہت عام ہے۔ یعنی العلم علمان۔ علم الادیان و علم الابدان۔ کہ علم دو ہی ہیں۔ (۱) علم دین (۲) علم بدن۔ علم دین روحانی صحت کے لیے اور علم طب جسمانی تندرستی کے لیے۔ کتب احادیث میں محدثین رحمہم اللہ نے کتاب الطب کے عنوان سے مستقل باب باندھے ہیں۔ جن میں صحت انسانی کے متعلق آنحضرتؐ کے ارشادات کو جمع کیا گیا ہے۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اسلام نے اس علم کو علم کتابی کی حد تک نہیں رہنے دیا بلکہ عملاً متشکل کیا ہے۔

رمضان کے ایک ماہ کے روزے۔ نمازوں کے اوقات (عموماً کھانا کھانے کے بعد ہوتے ہیں) مسواک کے بارے میں زبردست تاکید اور بقدر کھانا صحت کے لیے ضروری ہے۔ جیسے اقوال و ہدایات اس علم کا خود سرچشمہ اور منبع ہیں۔ بعض اطبا نے طبّ نبویؐ کے نام سے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ حقیقت بہرحال مسلّمہ ہے کہ خاندان عباسیہ کے زوال کے بعد اس فن کی اس قدر ترویج و ترقی کے لیے کوششیں نہیں ہوئیں کہ یہ زمانہ مجموعی طور پر مسلمانوں کے تہذیبی و علمی تنزل کا زمانہ ہے۔

علمِ فرائض

وہ علم جس میں میّت کے ترکہ کو وارثوں میں تقسیم کرنے کی کیفیت کے بارے میں بحث ہوتی ہے۔ اس کا موضوع ترکہ کو مستحقین میں تقسیم کرنا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں مرنے والے پر اپنے مال کے متعلق وصیّت لازمی تھی۔ لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور ورثا کے حصے شریعت نے خود مقرر کر دیے تاکہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہونے پائے۔ متروکہ میّت کے ساتھ چار حق متعلق ہوتے ہیں۔

(۱) اس کی تجہیز و تکفین بڑی گنجائش کے ساتھ اسراف و تبذیر سے بچتے ہوئے کی جائے۔

(۲) باقی مال میں سے اس کی کی گئی وصیت (اگر مرنے وقت کر گیا ہو) کو پورا کیا جائے۔

(۳) اس سے بھی پہلے میّت کے قرض کی ادائیگی ہے۔

(۴) باقی بچنے والے مال کو اس کے ورثے کے طور پر تقسیم کیا جائے۔ تقسیم یوں اس طرح ہو کہ پہلے اصحاب الفرائض کو دیا جائے۔ گر فرائض نہ ہوں تو عصبہ کو دیا جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو ذوی الارحام پر تقسیم ہو گا۔

اصحاب الفروض

جن کے حصے کتاب سنت میں متعین کیے جا چکے ہیں اور وہ بارہ ہیں۔ چار مرد اور آٹھ عورتیں۔

مردوں میں باپ۔ دادا۔ اخیافی بھائی (یعنی جن کی ماں ایک ہو اور باپ مختلف) شوہر (اگر میّت عورت ہو تو)

عورتوں میں آٹھ ہیں۔ بیوی۔ بیٹی۔ پوتی (پوتی میں اس کی [illegible] اس کی نسل بھی داخل ہے) حقیقی بہن۔ علاتی بہن (باپ کے [illegible]) اخیافی بہن (باپ کے لحاظ سے بہن) والدین کا حصہ قرآن میں [illegible] ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ والدین میں سے باپ کی تین حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں میّت کے مال سے اُسے چھٹا حصہ ملتا ہے۔ اور یہ اس وقت جبکہ میّت کا [illegible] ہو۔ یا بیٹا موجود نہ ہو تو پوتا یا پڑپوتا وغیرہ۔ کیونکہ ولد کا لفظ بیٹے پوتے اور پڑپوتے سب پر عام ہے۔ اسی طرح بیٹی، پوتی اور پڑپوتی کو بھی۔

دوسری حالت میں فرض مطلق اور عصوبت معاً۔ یعنی بحیثیت ذوی الفروض کے

کے بھی اُسے چھٹا ہی حصہ ملے گا۔ اور بحیثیت عصبہ ہونے کے باقی مال کا مالک قرار پائے گا۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میّت کے باپ کے ساتھ میّت کی بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی وغیرہا موجود ہو۔ تیسری حالت یہ ہے کہ محض عصبہ ہو اور یہ اس وقت ہے جبکہ میّت کا بیٹا، بیٹی یا پوتا پوتی کوئی بھی موجود نہ ہو۔

دادا باپ کی جگہ ہے یعنی میت کا باپ نہ ہو تو دادا تمام احکام میراث میں باپ کی جگہ ہے۔ مگر چار صورتیں ایسی ہیں۔ جن میں دادا باپ کے حکم سے مستثنیٰ ہے اور ان کی اور ان کی تفصیل علم فرائض کی طویل کتابوں میں موجود ہے۔

رہی میت کی ماں۔ اس کی بھی تین حالتیں ہیں۔ (۱) میت کا دادا ہو تو ماں کو چھٹا حصّہ ملے گا۔ (۲) میّت کے دو یا دو سے زیادہ بھائی بہن موجود ہوں تو چھٹے حصّے کی مالک ہوگی۔ (۳) میّت کے بیٹا یا بیٹی، پوتا یا پوتی یا دو سے زیادہ بھائی بہن نہ ہوں تو ماں کو کل متروکہ کا تہائی ملے گا۔

زوجین کے بارے میں قرآن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں وہ متروکہ زوجہ کے نصف کا حقدار ہوگا۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو۔ اگر اولاد وغیرہ ہو تو چوتھائی حصّے کا مستحق ہے۔ بیوی کی بھی دو حالتیں ہیں۔ اگر شوہر کی بیوی نہ ہو تو چوتھائی حصّہ اُسے ملے گا۔ اگر ایک یا دو یا تین بیویاں اور ہوں گی تو چوتھا حصّہ سب میں تقسیم ہوگا۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اگر شوہر کی اولاد ہے تو آٹھویں حصّے کی حقدار ہوگی۔ اگر اولاد نہیں تو پھر چوتھائی حصّہ اُسے ملے گا۔

میت کے اخیافی بہن بھائیوں کی بھی تین حالتیں ہیں۔ اگر ایک بھائی یا بہن ہے تو چھٹا حصّہ۔ دو یا زیادہ ہوں تو تہائی حصّے میں سب شریک ہوں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے بیٹا یا پوتا۔ بیٹی یا پوتی ہو تو اخیافی بہن یا بھائی خواہ ایک ہی ہو، کوئی حصّہ نہیں ملے گا۔ اسی طرح اگر باپ نہیں تو دادا بھی محروم ہوگا۔

سگی سوتیلی بہنوں کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ میت کی حقیقی اگر ایک بہن ہے تو نصف مال کی وارث ہوگی۔ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو دو تہائی لیں گی۔ بہنیں حقیقی بھائیوں کے ساتھ مل کر حصّہ لیں گی۔ تو ایک بھائی کے حصّے کے برابر دو بہنوں کو ملے گا۔ اگر ان بہنوں کے ساتھ میّت کی بیٹیاں یا پوتیاں شامل ہوں گی۔ تو بیٹیوں یا پوتیوں کا حصّہ نکال کر باقی انھیں دیا جائے گا۔ میّت کی سوتیلی بہنیں سگی بہنوں کے حکم میں ہیں اور اس کی سات حالتیں ہیں۔

(۱) سگی بہن نہ ہو تو سوتیلی کو اکیلی ہونے کی صورت میں نصف مال ملے گا۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی میں برابر شریک ہوں گی۔

(۳) سوتیلی بہنیں اگر سگی کے ساتھ جمع ہوں تو سوتیلیوں کو صرف چھٹا حصّہ ملے گا۔

(۴) میّت کی دو سگی بہنیں ہوں تو سوتیلی بہنیں ساقط الارث قرار پائیں گی۔

(۵) اگر ان کے ساتھ سوتیلا بھائی ہو تو اس صورت میں بھائی کی وجہ سے عصبہ ہو جائیں گی۔ اور باقی ترکہ للذکر مثل حظ الانثیین (ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے حصّے کے برابر) کے اصول کے تحت ان میں تقسیم ہوگی۔

(۶) سوتیلی بہنیں میّت کی بیٹیوں یا پوتیوں کے ساتھ عصبہ ہو جائیں گی۔

(۷) میّت کی سوتیلی بہن اس کے بیٹے یا پوتے یا پڑپوتے یا باپ اور ایک قول میں دادا کے ہونے سب بالاتفاق وراثت کے حصے سے محروم قرار پائیں گے۔

میّت کی بیٹی کی تین حالتیں ہیں۔ اگر وہ اکیلی ہے تو نصف مال کی حقدار ہوگی۔ اور اگر دو یا دو سے زیادہ ہیں تو دو تہائی میں برابر شریک ہوں گی۔

میت کی بیٹیاں اگر بیٹے کے ساتھ جمع ہوں تو بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصّہ ملے گا۔ میت کی پوتیاں صلبی بیٹیوں کی مانند ہیں۔ ان کا علیحدہ ذکر قرآن میں اس لیے نہیں کہ بیٹیوں میں پوتیاں بھی داخل ہیں تو پوتیوں کی چھ حالتیں ہیں۔

اکیلی ہونے کی صورت میں نصف مال کی حقدار ہوگی۔ دو یا دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی بشرطیکہ میت کی صلبی بیٹیاں نہ ہوں۔ اگر میت کی ایک صلبی بیٹی موجود ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر دو بیٹیاں ہوں تو پوتیاں وراثت سے محروم ہوں گی۔

چھٹی حالت یہ ہے کہ اگر میّت کا بیٹا موجود ہے تو پوتیاں ساقط الارث ہوں گی۔

عصبات کی تفصیل

ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ قرآن کے مقرر کردہ حصّے اہل فرض کو پہنچا دو اور جو باقی بچے وہ اس مرد کا حق ہے جو میّت کے قریب ہو۔ (اسی کو عصبہ کہتے ہیں) عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔ عصبہ نسبی اور عصبہ سببی۔ عصبہ نسبی وہ ہے کہ اس میں اور میّت میں من حیث النسب والقرابۃ تعلق ہو۔ جیسے بیٹا یا بیٹی وغیرہ اور عصبہ سببی اسے کہتے ہیں کہ اس کا میّت کے ساتھ نسبی تعلق نہ ہو۔ جیسے آقا جس نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا ہو تو غلام کے مرنے کے بعد آقا اس کے متروکہ کا وارث ہوگا۔ بشرطیکہ غلام کا کوئی عصبہ نسبی نہ ہو۔ پھر عصبہ نسبی کی تین قسمیں ہیں۔ عصبہ بنفسہ۔ عصبہ لغیرہ۔ عصبہ مع غیرہ۔

عصبہ بنفسہ وہ مذکر ہے جس کی نسبت میّت کی طرف عورت کے واسطہ کے بغیر ہو۔ جیسے میّت کا بیٹا یا پوتا اور جو درمیان میں عورت آ جائے تو عصبہ نہیں کہتے بلکہ وہ اصحاب الفروض بن جاتے ہیں۔ عصبہ بنفسہ میں چار طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو میّت کے جزو ہیں مثلاً بیٹا۔ پوتا۔ دوسرے وہ جو میّت کی اصل ہیں۔ جیسے باپ، دادا۔ تیسرے جو میّت کے باپ کے جزو ہیں۔ مثلاً بھائی بھتیجے۔ چوتھے وہ جو میّت کے دادا کے جزو ہیں۔ جیسے چچا اور اس کی اولاد۔ تقسیم میراث کے موقع پر قریبیوں کو مقدم رکھا جائے گا۔

عصبہ لغیرہ۔ میں چار عورتیں ہیں۔ بیٹی، پوتی، سگی بہن، سوتیلی بہن۔ یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر عصبہ ہوتی ہیں۔

عصبہ مع غیرہ وہ عورت ہے جو دوسری عورت کے ساتھ جمع ہو کر عصبہ بن جاتی ہے جیسے میّت کی سگی یا سوتیلی بہن۔

ذوی الارحام

ذو رحم صاحب قرابت کو کہتے ہیں اور دونوں میں شامل نہیں ہوتے جن کے حصّے متعین ہوتے ہیں۔ ان کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو میّت کی طرف منسوب ہو اور وہ میّت کی بیٹیوں اور پوتیوں کی اولاد ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جن کی طرف میّت منسوب ہے۔ جیسے میّت کا نانا اور نانا کا باپ یا نانا کی ماں یا نانا کی نانی۔ تیسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو میّت کے ماں باپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ جیسے بہنوں کی اولاد۔ بھائیوں کی بیٹیاں اور اخیافی بھائیوں کی اولاد۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو میّت کے دادا یا نانا۔ دادی یا نانی کی طرف منسوب ہیں۔ اور وہ پھوپھیاں، چچا، ماموں اور خالائیں۔ یہ چاروں قسمیں اور جو ان کے واسطے سے میّت کی طرف منسوب ہوں۔ سب ذوی الارحام

ہیں۔ ان میں میت کا زیادہ قریبی رحیثیت رشتے کے تعلق کے نہیں) پہلے حقدار شمار ہوگا۔ باقی رہی اقسامِ اربعہ کی تفصیل۔ وہ علم فرائض کی مطول کتابوں میں موجود ہے۔

علم فرائض اور اس کے احکامات کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان میں کسی مسلک کا اختلاف نہیں۔ سوائے چند ایک فروعات کے اور اسے نصف علم قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ انتہائی مشکل اور مفصل ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ بھی کہنے لگے کہ دادا کی وراثت کے بارے میں میں خود کسی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

اس علم سے غفلت برتنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی طریقہ تقسیم وراثت ختم ہوگیا اور بیٹیوں کا جہیز وراثت سے منہا سمجھا جانے لگا۔ برصغیر میں اس علم کے ماہر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں علامہ انور شاہ کاشمیری اور مولانا حافظ عبداللہ روپڑی۔ محدث اور ان کے تلمیذ ابوالسلام محمد صدیق نے اس علم کے مبادیات کو وسیع پیمانے پر عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ع۔ ر)

علم قرآن

قرآن کے اولین مخاطب صحابہ کرام خالص عرب تھے اور عربی زبان کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ نازل ہونے والا قرآن کا ہر حصہ بخوبی سمجھ جاتے تھے۔ جب بھی قرآن کے فہم وادراک میں دشواری محسوس ہوتی تو مہبط قرآن سے دریافت کرتے تھے۔

خدا نے آنحضورؐ پر کتاب مقدس نازل فرمائی اور اس کی تشریح و توضیح کے علم سے بھی بہرہ ور کیا۔ اس لیے عہد رسالت اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں علم قرآن پر کوئی تحریر نہ لکھی گئی۔ کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر صحابہ کرامؓ لکھنے پڑھنے کے وسائل سے محروم تھے۔ اس لیے بھی کوئی علم ایجاد نہ ہو سکا۔ مزید یہ کہ آنحضرتؐ نے قرآن کے علاوہ کسی بات کو تحریر میں لانے سے روکا تھا۔ صرف روایت کی اجازت تھی۔ زمانہ نبویؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں بھی علم قرآن براہ راست بالمشافہ اخذ و روایت کیا جاتا تھا۔ عہد عثمانؓ میں عرب و عجم باہم مل گھل گئے۔ بدیں وجہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو قرآن کے ایک نسخہ پر جمع کرنے کی مساعی کی۔ یوں علم قرآن کی بنیاد پڑی۔

علامہ ابن حجر کے مطابق حضرت علیؓ نے ابوالاسود متوفی ۶۹ھ کو حکم دیا کہ نحو کے قواعد مرتب کریں تاکہ عربی زبان کا تحفظ کیا جا سکے۔ حضرت علیؓ نے علم اعراب القرآن کی تشکیل و تاسیس کا فریضہ سرانجام دیا۔

ان کے علاوہ علم قرآن کی بنیاد رکھنے والے صحابہ کرام میں سے ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعب۔ ابوموسیٰ اشعریؓ۔ ابن زبیرؓ۔

تابعین میں سے مندرجہ ذیل حضرات۔

مجاہدؒ، عطاءؒ بن یسار۔ عکرمہ۔ قتادہؒ۔ حسن بصریؒ۔ سعید بن جبیر۔ زیدؒ بن اسلم۔ تبع تابعین میں سے امام مالک بن انسؒ صاحب موطا۔

مذکورہ حضرات علم تفسیر۔ علم اسباب النزول۔ علم المکی والمدنی۔ علم ناسخ المنسوخ اور علم غریب القرآن کے واضع و بانی تھے۔

عصر تدوین میں علم تفسیر کو باقی تمام علوم پر فوقیت حاصل تھی۔ کیونکہ یہ علم علوم قرآن کی اساس کا حکم رکھتا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں علوم القرآن کو بڑے وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا۔ علم ناسخ والمنسوخ۔ القرات اور فضائل قرآن ابن سلام کی ومدنی سورتوں کی تدلیل پر محمد بن ایوب متوفی ۲۹۴ھ اور الحادی فی علوم القرآن محمد بن خلف متوفی ۳۰۹ھ اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ ان کے بعد قرآن کے علم کو مزید وسعت دی گئی۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں علم قرآن کے اسی شعبے بتائے ہیں۔ ان میں علم مکی و مدنی۔ علم حضری و سفری۔ علم سبب نزول۔ علم مقدم و موخر۔ علم کیفیت تنزیل۔ علم اسماء قرآن و سور۔ علم جمع و ترتیب قرآن۔ علم تعداد سور۔ علم حفاظ و رواۃ۔ علم اسناد۔ علم وقف وابتدا علم موصول و مفصول۔ علم قرات القرآن۔ علم معرب علم تذکیر و تانیث۔ علم تعریف وتنکیر۔ علم افراد و جمع۔ علم الفاظ مترادفہ۔ علم محکم و متشابہ۔ علم خاص و عام۔ علم ایجاز و اطناب۔ علم خبر و انشاء علم مناسبہ۔ علم آیات متشابہات۔ علم اعجاز قرآن۔ علم استنباط من القرآن۔ علم کنایات و تعریض۔ وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

ان شعبہ ہائے علم قرآن کی تفصیل بذات خود ایک علم ہے۔

مزید دیکھیے۔ ''علم تفسیر''

علم اکتسابی

کسی فن یا ہنر کے سیکھنے کو علم اکتسابی کہا جاتا ہے۔ یہ ان علوم سے ہے جن کا سیکھنا ہر شخص پر واجب ہے تاکہ رزق حلال سے معاشرہ کی پرورش ہو سکے۔ ایک حدیث میں ہے جس شخص کے جسم کی نشوونما میں ایک بھی حرام لقمے کو دخل ہوگا اس پر جنت حرام ہوگی۔

ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا اور یہ کہنا کہ رزق کا ذمہ خدا نے لیا ہے [illegible] خلاف حقیقت بات ہوگی۔ رہبانیت (دنیا سے بالکل منقطع ہو جانا) [illegible] میں حرام ہے۔ آنحضرتؐ نے خود بھی تجارت کی ہے اور ترغیب بھی دی ہے کہ اللہ کو وہ شخص بہت پسند ہے جو اپنے ہاتھوں سے رزق حلال کماتا ہے [illegible] اس کا مقصد یہ نہیں کہ انسان کی زندگی کا حاصل صرف روزی [illegible] اس روزی سے وہ مقصد حقیقی یعنی عبادت خداوندی میں [illegible] اسی لیے قرآن میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ جب نماز کے لیے [illegible] بند کر دو کہ [illegible] ہے۔ اس لیے خاص نیت سے ایسے علوم و فنون کا سیکھنا [illegible] ہے۔ دوسرے معنوں میں ان [illegible] میں ترقی ہو سکے۔ یعنی وجدان و بصیرت تک پہنچنے کے [illegible] لیے جن علوم کا سیکھنا لازمی ہو [illegible] نہیں کر سکتا۔ نیز [illegible] بخود حاصل نہیں ہو سکتے [illegible] جیسے فلسفہ، منطق سے پہلے ان کے مبادیات [illegible] و نحو وغیرہ

علم لدنی

اس کے دو معنی ہیں۔ اول تو یہ کہ اللہ تعالےٰ کے [illegible] میں کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ ان کی شان کے منافی ہے [illegible] جو علم دیتا ہے اسے علم لدنی یعنی وہبی علم کہا جاتا ہے۔

دوسرے وجدان و بصیرت جس میں انسان کے تجربہ و مہارت [illegible] فہم کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ مثلاً کسی بات کا سنتے ہی ذہن میں اس کے اسباب پالیسی، منظر کا گھوم جانا۔

علم نجوم

ان اصولوں کا علم جن سے سورج، چاند اور اجرام فلکی کے احوال واوضاع معلوم کیے جائیں۔ احوال سے مراد وہ آثار ہیں جو ان سے عالم سفلی پر صادر ہوتے ہیں۔ اور علم رمل وعلم جفر اسی کے حصے ہیں جن میں حدیث کا علم تو حاصل ہوتا ہے۔ مگر ستاروں سے بحث نہیں کی جاتی۔ علم نجوم میں ستارے خاص طور پر زیر بحث ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کے بارے میں آیا ہے کہ جب ان کی قوم نے ان سے اپنے ساتھ میلے پر جانے کو کہا تو فرمایا **فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم** جس طرح نجوم زائچہ دیکھتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا میں سقیم ہوں۔ اس آیت کی تفسیر میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اور اس سے علم نجوم کے جواز کی دلیل لی گئی ہے۔ حالانکہ یہ اسی طرح کنایہ ہے جس طرح ستاروں، چاند اور سورج کو دیکھ کر آپؑ نے فرمایا تھا۔ **ھذا ربی** ۔ حالانکہ مقصود ان کی تردید تھی۔ یہاں بھی حضرت ابراہیمؑ نے ان کی تردید کی۔ اور اس کی دلیل وہ حشر ہے جو آپؑ نے ان کے چلے جانے کے بعد ان کے بتوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ خود سمجھ سکتے تھے کہ ستاروں نے سچ نہیں کہا۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ستاروں کے دو مصرف بتائے گئے ہیں۔ اول آسمان دنیا کی زینت اور دوسرے راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ۔

اس لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کے زائچے کا علم یقین پر نہیں بلکہ ظن وتخمین پر ہوتا ہے۔ کیونکہ غیب صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ آنحضرتؐ سے اس سلسلے میں بڑی تنبیہ وترہیب آئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص نجومی سے اپنی قسمت معلوم کرے اور اس کے بیان کی تصدیق کرے۔ اس نے نبوت محمدیؐ کے ساتھ کفر کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایسے شخص کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ مراد اس سے بھی کفر ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا **کذب المنجمون برب الکعبۃ** ۔ رب کعبہ کی قسم نجومی جھوٹ کہتے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نے ان روایات کو جمع کر کے لکھا ہے۔ وجہ ان تنبیہات کی یہ ہے کہ نفع ونقصان کا مالک اللہ تعالےٰ ہے اس قسم کے نظریات سے عقیدۂ توحید کو ٹھیس پہنچتی ہے اور انسان شرک کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے انھیں اتنا مذموم قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ نجومی کے اقوال کا مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ اگر وہ ستاروں کو غیر مخلوق یا فاعل ومختار سمجھتا ہے تو یہ صریح کفر ہے۔ اگر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ مخلوق ہیں اور خود مختار نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے مسخر ہیں اور ان کا اثر (گرمی وروشنی وغیرہ) مخلوق پر اللہ کے حکم سے پڑتا ہے اور یہ بات بھی علم حساب کے ذریعے حاصل ہوئی ہے تو یہ علم غیب نہیں ہے کیونکہ علم غیب وہی ہو سکتا ہے جو کسی علم سے حاصل نہ ہو اور آیت وحدیث کا محل دعوئے علم غیب کی حرمت پر ہو سکتا ہے۔

جواہر القنادی میں لکھا ہے کہ جن علوم سے پرہیز واجب ہے وہ یہ ہیں علم سحر۔ علم حکمت۔ علم طلسمات اور علم نجوم۔ مگر علم نجوم صرف اسی قدر جائز ہے کہ اوقات نماز اور طلوع وغروب وسمت قبلہ کے پہچاننے کا کام دے۔ اس کے علاوہ اس کا سیکھنا خطرے سے بہرحال خالی نہیں۔

علی احمد شاہ

مخدوم علی احمد شاہ قادری وجیلانی۔ خاندان قادریہ سے تعلق تھا۔ سلسلہ نسب کے اعتبار سے حسنی اور مسلک کے لحاظ سے قادری ہیں۔ جائے پیدائش کنیتھل ضلع کرنال ہے۔ والد کا نام مخدوم سید عبد العلی شاہ تھا جو اپنے وقت کے صاحب دل بزرگ تھے۔ انھی سے آپ کو خلافت حاصل ہے۔ سلسلہ نسب بائیسویں پشت میں سید عبد القادر جیلانیؒ سے مل جاتا ہے۔ کم سخن، نرم گفتار، عابد وزاہد اور متقی تھے۔ اپنے شب وروز یاد الٰہی اور بہبود عوام میں بسر کرتے تھے۔

آپ کے مریدوں کی تعداد بے شمار ہے۔ پاک وہند میں ان کے ماننے والے ہر جگہ موجود ہیں۔ آپ کا معمول تھا کہ جب لاہور آتے تو پہلے حضرت داتا گنج بخشؒ کی خانقاہ پر حاضری دیتے۔ پھر حضرت میاں میر قادریؒ کے روضہ پر جاتے اور ابو المعالی قادریؒ کے دربار میں ہوتے ہوئے جائے قیام کو لوٹتے۔

ان کی وفات ۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کو جمعہ کے روز ڈیرہ غازی خاں میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ترلیسٹھ برس اور کچھ ماہ تھی۔ ان کا سالانہ عرس ۲۱/۲۲ دسمبر کو منایا جاتا ہے۔ بے شمار عقیدت مند اس موقع پر مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

علی بلگرامی

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ پیدائش ۱۸۵۱ء وفات ۱۹۱۱ء بلگرام کے مشہور خاندان میں سے تھے۔ ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سالار جنگ نے انھیں انگلستان بھیجا جہاں انھوں نے بہت شہرت حاصل کی سنسکرت۔ فارسی اور عربی کے علاوہ بنگلہ، مرہٹی اور تلنگی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تحریک کے زبردست حامی ومعاون تھے۔

ان کی دو کتابیں "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" بہت مشہور ہیں۔ دونوں کتابیں ڈاکٹر لیبان کی دو کتابوں کا ترجمہ ہیں۔ انھوں نے ان کا ترجمہ نظام حیدرآباد دکن کے ایما پر کیا۔ ان کے علاوہ ایک بہت مشہور طبی کتاب کا بھی ترجمہ کیا۔

علیؓ بن ابی طالب

علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم۔ صحابیٔ رسولؐ۔ چوتھے خلیفہ راشد۔ داماد رسولؐ۔ آنحضرتؐ کے چچا زاد بھائی۔ کمسنوں میں سب سے پہلے رسولؐ خدا کی پکار پر لبیک کہہ کر اسلام قبول کرنے والے۔

آپ کے خاندان بنی ہاشم کو کعبہ کی تولیت کے باعث سارے عرب میں مذہبی سیادت حاصل تھی۔ رسولؐ خدا کے کئی چچا تھے لیکن آپؐ کو جو تعلق خاطر حضرت علیؓ کے والد ابوطالب کے ساتھ تھا وہ کسی اور کے ساتھ نہ تھا۔ حضورؐ کے دادا عبد المطلب کی وفات کے بعد ابوطالب نے ہی ان کی پرورش کی تھی اور اس زمانے میں جبکہ آپؐ ہر طرف سے مشرکین مکہ کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے آپ کی پشت پناہی کرتے تھے ان کی بیوی یعنی حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہؓ بھی آپ پر شفقت کرتی تھیں۔ اس لئے آپ کو ابوطالب اور ان کی اولاد سے خاص انس ومحبت تھی۔

ابوطالب کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس لئے رسول اللہؐ نے چچا کا بار ہلکا کرنے کے لیے حضرت علی کو اپنے دامن پرورش میں لیا تھا۔ اس طرح ابتدا ہی سے حضرت علیؓ نے آغوش نبوت میں پرورش پائی۔ اس کا یہ اثر تھا کہ جب رسول خداؐ نے اوّل اوّل اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے اسی نوجوان لڑکے نے اس پر

لبیک کہا۔ حضرت علیؓ کو ابتدا ہی سے اچھی اور صالح تربیت ملی تھی اس سبب سے زمانۂ جاہلیت کی تمام آلودگیوں سے ان کا دامن محفوظ رہا۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت علیؓ وعظ و پند کے جلسوں اور تبلیغ اسلام کے مجمعوں میں ہروقت آنحضرتؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ بعثت کے چوتھے سال جب قریبی اعزہ کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کا حکم نازل ہوا اور آپ نے اس کی تعمیل کے لئے کوہ صفا پر اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ اے بنی مطلب! میں تمھارے سامنے دنیا کی بہترین نعمت پیش کرتا ہوں۔ تم میں سے کون میرا ساتھ دیتا ہے اور تم میں سے کون میرا معاون و مددگار بنتا ہے تو اس کے جواب میں صرف ایک آواز آئی کہ گو میں عمر میں چھوٹا ہوں اور میری ٹانگیں کمزور ہیں تاہم میں آپؐ کا معاون و مددگار اور قوتِ بازو بنوں گا۔ یہ علیؓ بن ابی طالب کی تھی۔

آنحضرتؐ نے تین مرتبہ اس سوال کو دوہرایا اس کے جواب میں ہر مرتبہ حضرت علی ہی کی آواز ابھری۔ اس صلہ میں آپؐ نے ان کو یہ اعزاز بخشا کہ تم میرے وارث اور بھائی ہو۔ یہ صرف دعویٰ ہی نہ تھا بلکہ عمل اس سے بڑھ کر تھا۔

مدینہ آنے کے بعد ۲ھ میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو دامادی کا شرف بخشا۔ اسی وقت سے حضرت علیؓ کی مستقل زندگی شروع ہوئی۔ ہجرت مدینہ کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت علیؓ ان تمام غزوات بدر، احد، خندق، بنی قریظہ اور حنین وغیرہ میں آنحضرتؐ کے ہمرکاب رہے اور بہادری اور جوانمردی کے کارنامے سرانجام دیئے۔ متعدد سرایا آپ کی رہنمائی میں بھیجے گئے۔ جنہیں آپ نے کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ آنحضرتؐ کی آخری خدمت یعنی آپ کے غسل اور تجہیز و تکفین کی سعادت بھی آپ ہی کے حصہ میں آئی۔

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد آپ کے ساتھ گوناگوں تعلقات و خصوصیات کی بنا پر حضرت علیؓ قدرۃً خلافت کے متوقع تھے اس سے ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب پر آپ کو آزردگی پیدا ہوئی لیکن پھر بہت جلد دور ہو گئی اور آپ دونوں خلفاء کے دور میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو خصوصیت کے ساتھ آپ کے مفید مشوروں پر بہت اعتماد تھا۔ آپ نے اپنے مشوروں سے ملت اسلامیہ کو بہت فائدہ پہنچایا جب تک بس چلا۔ حضرت عثمانؓ کی بھی حمایت کرتے رہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد تین دن تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ مدینہ میں قیامت کا شور بپا تھا۔ ہر طرف باغی پھیلے ہوئے تھے لیکن خلافت کا انتظام بہرحال ضروری تھا۔ اس وقت اکابر صحابہ میں حضرت علیؓ ہی کی ذات ایسی تھی جس پر سب کو اتفاق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مہاجرین و انصار نے جن میں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ خلیفہ کا انتخاب بہت ضروری ہے۔ حضرت علی نے اشارہ سمجھ کر فرمایا کہ مجھ کو اس کی حاجت نہیں جسے تم منتخب کرو گے میں بھی اسے قبول کر لوں گا۔ انہوں نے عرض کی کہ آپ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص اس کا مستحق نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے علاوہ ہم کسی دوسرے کو منتخب ہی نہیں کر سکتے۔ حضرت علیؓ نے پھر عذر کیا کہ امیر ہونے کی نسبت مجھے وزیر ہونا زیادہ پسند ہے۔ آخر میں لوگوں نے پھر عرض کی کہ ہم لوگ آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے غرض مسلمانوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اور سیاست اسلامیہ کے مفاد کا لحاظ کر کے آپ نے قبول کیا اور مجمع عام میں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت میں مدینہ کے تمام صحابہ شریک تھے۔ بیعت کے بعد ذی الحجہ ۳۵ھ میں آپ نے مسند خلافت سنبھالا۔

بیعت خلافت کے بعد حضرت علیؓ کے لئے سب سے اہم مرحلہ اور آپ کا سب سے مقدم فرض، حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا پتہ چلانا اور ان سے قصاص لینا تھا لیکن چند در چند اسباب کی وجہ سے اس میں ناکامی ہوئی۔ حضرت علیؓ کی جانب سے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی تھی۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ متعین طور سے کسی شخص کے خلاف شہادت موجود نہیں تھی۔ حادثۂ شہادت کے وقت گھر میں حضرت عثمانؓ کی بیوی نائلہ تھیں۔ وہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں۔ گھر میں گھسنے والوں میں سے وہ صرف محمد بن ابی بکرؓ کو پہچانتی تھیں لیکن وہ حضرت عثمانؓ کے ایک جملے سے شرمندہ ہو کر واپس لوٹ گئے تھے اور قتل میں شریک نہ تھے۔ ان کے علاوہ نائلہ اور کسی کو نہیں پہچانتی تھیں پھر قاتل جس گروہ سے تعلق رکھتے تھے حضرت علیؓ کا ان پر کوئی قابو نہیں تھا۔ اس لیے حضرت علیؓ مجبور ہو گئے لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کا دلوں پر اتنا اثر تھا کہ عوام تو عوام بہت سے اکابر صحابہ تک صرف قصاص چاہتے تھے اور حضرت علیؓ کی مجبوریوں پر ان کی نظر نہ جاتی تھی چنانچہ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور چند صحابہ نے حضرت علیؓ سے جا کر کہا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں جو جماعت شریک ہے اس سے قصاص لینا ضروری ہے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہو میں اس سے غافل نہیں ہوں لیکن ایسی جماعت کے ساتھ کیا کروں جس پر میرا کوئی قابو نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کے لیے یہ ایک دشوار مرحلہ تو تھا ہی کہ آپ کی بعض سیاسی فروگزاشتوں سے ایک دوسری نازک صورت پیدا ہو گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ عہد عثمانی کے اکثر عمال خصوصاً حضرت امیر معاویہؓ والیٔ شام کے سخت خلاف تھے اس لئے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی آپ نے ان سب کو معزول کر دینے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے عاقبت اندیش خیرخواہوں نے اس کی مخالفت کی۔ مغیرہ بن شعبہ نے جو سیاست میں امیر معاویہؓ کے ہم پلہ تھے حضرت علیؓ سے عرض کیا کہ ابھی آپ امیر معاویہؓ اور دوسرے عثمانی عمال کو ان کے عہدوں سے مت ہٹائیے جب وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کی خلافت کو تسلیم کریں گے اس وقت جو جی میں آئے کیجیے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے نہایت سختی سے انکار کیا۔ حضرت ابن عباس کو خبر ہوئی تو انہوں نے بھی سمجھایا کہ ابھی معاویہؓ کو معزول نہ کیجیے۔ اگر وہ اپنے عہدوں پر فائز رہیں گے تو نہیں اس بات کی پروا نہ ہوگی کہ کون خلیفہ ہے لیکن اگر وہ معزول کر دیئے گئے تو حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور سارے شام و عراق کو آپ کے خلاف کریں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے ان کا مشورہ بھی قبول نہ فرمایا اور ۳۶ھ میں تمام عثمانی عمال کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے عمال مقرر کئے۔ اسی سلسلہ میں شام پر سہیل بن حنیف کا تقرر ہوا وہ دمشق روانہ ہو گئے۔

امیر معاویہؓ خود بڑے مدبر تھے اور پھر بیس بائیس سال سے شام کے والی چلے آرہے تھے یہاں ان کا بہت اثر تھا انھیں معزول کرنا آسان نہ تھا چنانچہ حضرت سہیل بن حنیف کو شام کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا اور شام کی سرحد تبوک ہی سے واپس کر دیا۔

امیر معاویہؓ کو معزول کرنے کے ساتھ حضرت علیؓ نے ان کے پاس بیعت کے لئے علیحدہ ایک خط لکھا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے صحابہ حضرت عثمانؓ کی شہادت خصوصاً آپ کے قاتلوں کا سراغ نہ ملنے سے سخت متاثر تھے۔ امیر معاویہؓ نے اس سے فائدہ اٹھایا اور مدینے سے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیرہن اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر آویزاں کر دیں۔ اس سے شام کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اس منظر کو دیکھ کر زار زار روتے تھے۔

امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے قاصد کو روک لیا تھا یہ منظر دکھانے کے بعد انہیں

کیا اور اس کے ہمراہ اپنا ایک "قاصد ایک سادہ لفافہ دے کر حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔ آپ نے اُسے کھولا تو کچھ نہ تھا۔ آپ کو حالات کا کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔ "قاصد سے پوچھا شام میں کیا حال ہے اس نے کہا وہاں کے ساٹھ ہزار شیوخ عثمانؓ کے پیراہن پر رو رہے ہیں۔ اور قصاص لینے کا عہد کر چکے ہیں۔ اس وقت حضرت علیؓ کے سامنے حقیقت واضح ہوئی۔ آپ نے فرمایا "خدایا! میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں"۔

اب حضرت علیؓ کو واقعات کا پورا اندازہ ہو گیا اور آپ نے امیر معاویہؓ سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی تلواریں آپس ہی میں بے نیام ہونے والی تھیں۔ اس لئے اکثر صحابہ اس کی شرکت کے بارے میں متردد تھے۔ بہتوں نے اس کی مخالفت کی یا کم از کم غیر جانبدار رہے چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمرؓ محمد بن مسلمہؓ وغیرہ نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا کہ مجھے تم لوگوں کی جانب سے ناپسندیدہ خبریں ملی ہیں۔ کیا واقعہ ہے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے فرمایا اگر اس جنگ میں آپ میری شرکت چاہتے ہیں تو ایسی تلوار عنایت کیجیے جو کافر و مسلم میں امتیاز کر لے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا آپ ایسی چیز میں شرکت کے لئے مجھ کو مجبور نہ کریں جس کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ میں نہیں کر سکا۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے فرمایا کہ حضرت محمد صلعم نے مجھے حکم دیا تھا کہ اپنی تلوار کو مشرکوں کے خلاف استعمال کروں اور جب مسلمانوں سے جنگ کا وقت آئے تو اس کو کوہ احد کے پتھر پر پٹک کر توڑ دوں چنانچہ کل میں نے اس کو توڑ دیا۔ حضرت اسامہؓ بن زید نے فرمایا "مجھے اس میں شرکت سے معاف رکھا جائے میں نے عہد کیا ہے کہ کلمہ شہادت پڑھنے والے سے جنگ نہ کروں گا"۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ حضرت علیؓ سے اجازت لے کر مکہ چلے گئے غرض بہت سے محتاط صحابہ نے اس کی شرکت سے احتراز کیا۔

ابھی حضرت علیؓ امیر معاویہؓ سے جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دوسری طرف اس سے بھی نازک صورت پیدا ہو گئی۔

حضرت عائشہؓ ہر سال حج کے لئے تشریف لے جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت وہ مکہ ہی میں تھیں۔ یہیں آپ کو واقعہ شہادت کی اطلاع اور اس کے بعد پیہم مدینہ میں بدامنی کی خبریں ملیں۔ مکہ سے واپسی میں راستہ میں آپ کے ایک عزیز نے اطلاع دی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور مدینہ منورہ میں بدامنی پھیلی ہے۔

یہ اطلاع پا کر آپ مکہ لوٹ گئیں اس کے بعد ہی طلحہؓ اور زبیرؓ پہنچ گئے انہوں نے بیان میں کہا کہ ہم لوگ بدوؤں اور عوام الناس کے ہاتھوں بھاگے چلے آ رہے ہیں اور مدینہ میں لوگ حیران و سرگرداں ہیں ان کا حال یہ ہے کہ نہ حق کو پہچان سکتے ہیں اور نہ باطل سے گریز کر سکتے ہیں اور نہ ان میں اپنی حفاظت کی طاقت ہے۔

یہ حالات سن کر حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمانؓ کے بے گناہ خون کے قصاص اور فتنہ و فساد کی اصلاح کی دعوت دی۔ آپ کے واپس آنے کی خبر سن کر بہت سے مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ آپ نے ان کے سامنے ایک مختصر تقریر کی اور انھیں بھی انہی مطالبات کو اٹھانے کی دعوت دی۔

ام المومنینؓ کی زبان سے خلیفۂ مظلوم کے قصاص کی دعوت پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمان سرفروشی کے لئے آمادہ ہو گئے۔ سب سے پہلے عبداللہ بن عامر حضرمی والی مکہ نے اس کا جواب دیا۔ اموی خاندان کے وہ تمام افراد جو مکہ بھاگ آئے تھے ساتھ ہو لئے ایک رئیس یعلی بن امیہ نے چھ سو اونٹ اور چھ لاکھ درہم نقد پیش کئے۔ عبداللہ بن عامر نے اعلان کرا دیا کہ جو شخص اس دعوت میں شریک ہونا چاہتا ہے اور اس کے پاس سواری اور زاد راہ کا سامان نہیں ہے تو اس کو پورا سامان دیا جائے گا۔ چنانچہ چھ سو سواریوں اور ان کے پورے اخراجات کا انتظام کیا۔ حرمین کے ایک ہزار آدمیوں نے ساتھ دیا اور شرفاء کی مجموعی تعداد تین ہزار ہو گئی۔ ان کے علاوہ تمام امہات المومنین بھی ہمراہ چلنے کے لئے آمادہ ہو گئیں۔

اس تیاری کے بعد حضرت عائشہ کی رائے تھی کہ اصل مقصد مدینہ کے حالات کی اصلاح ہے اور سبائی جماعت اور قاتلین عثمانؓ کا گروہ بھی وہیں ہے۔ اس لئے سیدھے مدینہ چلنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کا مشورہ شام چلنے کا تھا لیکن آخر میں بصرہ جانے کی رائے قرار پائی۔ مدینہ جانے کے لئے امہات المومنین بھی ساتھ دینے کے لئے آمادہ تھیں لیکن بصرہ کا ارادہ ہونے کے بعد انہوں نے ترک کر دیا۔

درحقیقت مسلمانوں کے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ میں بے نیام ہونے والی تھیں اس لئے محتاط بزرگ اس میں شرکت پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر کو جب شرکت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ میں اہل مدینہ کے ساتھ ہوں جو وہ کریں گے ان کی تقلید کروں گا۔ یہ سلسلہ ایسا نازک تھا کہ محتاط لوگ بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ ایک طرف امہات المومنین تھیں مظلوم اور شہید خلیفہ کے خون بے گناہی کی دعوت تھی۔ اور دوسری طرف خلیفۂ وقت علی مرتضیٰؓ تھے۔

غرض ۳۵ھ میں حضرت عائشہ بصرہ روانہ ہوئیں رخصت ہوتے وقت مسلمان اسلام کی اس نازک گھڑی پر زار زار روتے تھے طبری کے الفاظ ہیں کہ اس دن مسلمان اسلام پر اتنا روئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ روئے تھے۔ اور اس دن کا نام ہی "یوم گریہ" پڑ گیا۔

ادھر حضرت علیؓ نے بھی جنگ کی تیاریاں کیں اور تیار ہو کر مدینہ سے نکل پڑے اس دوران صلح اور سمجھوتے کی کوششیں مسلسل جاری رہیں لیکن سبائیوں کی شر انگیزی اور فتنہ پردازی کی چالوں کے باعث کوئی تجویز بار آور نہ پروان نہ چڑھی یہاں تک کہ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں تب بھی گفتگوؤں کے در کھلے تھے تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ سارے خواب پریشان ہو گئے اور مسلمانوں کی دو فوجیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ کئی اکابر صحابہ اور اسلام کی نامور شخصیتیں اس جنگ میں کام آ گئیں۔ لیکن جنگ کا زور نہ ٹوٹا۔ حضرت عائشہ اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنے جاں نثاروں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں اور ہر طرف سے ہودج پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ تیروں کی کثرت سے ہودج ساہی بن گیا تھا۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ جب تک حضرت عائشہ کا اونٹ اپنی جگہ قائم رہے گا یہ خونریز جنگ بند نہ ہو گی۔ اس لئے انہوں نے حکم دیا کہ اونٹ کو زخمی کر کے اسے زمین پر گرا دیا جائے۔ اس پر حضرت علیؓ کے ایک سپاہی نے اونٹ کا پاؤں زخمی کر دیا اور وہ بلبلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی لڑائی کا رنگ بدل گیا اور حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں کی ہمت ساتھ چھوڑ گئی۔

حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ نہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے نہ کسی زخمی کو پامال کیا جائے۔ نہ کسی کا مال لوٹا جائے جو شخص ہتھیار ڈال دے یا گھر کا دروازہ بند کرے وہ مامون ہے۔

یہ اعلان ہوتے ہی حضرت علیؓ کی فوج نے ہاتھ روک لئے جنگ کے اختتام پر حضرت علیؓ نے فوراً حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد بن ابی بکر کو کہا کر جا کر دیکھیں کہیں ام المومنین کو زخم حشم تو نہیں پہنچا اور انہیں لے جا کر عبداللہ بن خلف خزاعی کے محل میں ٹھہرائیں اس کے بعد خود مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے اور پوچھا "اماں مزاج کیسا ہے" حضرت عائشہؓ نے فرمایا "اچھی ہوں"۔ حضرت علیؓ نے بھی فرمایا "خدا ہم دونوں کو معاف

کرے" اس کے جواب میں حضرت عائشہ نے بھی یہ کلمات کہے۔ چند دن آرام کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو بصد احترام اور حفاظت مکہ روانہ کر دیا۔ روانگی سے قبل حضرت عائشہؓ نے لوگوں سے فرمایا۔ "میرے بچو! یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ام المومنینؓ کے اس ارشاد پر حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ام المومنین سچ کہتی ہیں خدا کی قسم میرے اور ان کے درمیان غلط فہمی کے علاوہ اور کوئی رنجش نہ تھی۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمہارے نبیؐ کی حرم ہیں۔"
اس خوش آئند گفتگو اور صاف دلی کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ حضرت علیؓ چند میل تک خود گئے۔ اور اس کے بعد حسنؓ اور حسینؓ کو بھیجا۔

جنگ جمل کے اختتام کے بعد رجب سنہ ۳۶ھ میں حضرت علیؓ کوفہ واپس تشریف لائے اور مدینہ کے بجائے اس کو مرکز خلافت قرار دیا۔ اس تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حرم نبوی کی بہت توہین ہوئی اس لیے آئندہ آپ نے اس کو فتنہ و شر سے بچانے کے لئے آپ نے سیاسی مرکز کو یہاں سے ہٹا دینا مناسب سمجھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے حامیوں کی بڑی تعداد عراق میں تھی۔ اس لئے سیاسی حیثیت سے کوفہ آپ کے لئے زیادہ اہم تھا۔

اس تبدیلی سے یہ فائدہ تو ہوا کہ مدینہ سیاسی انقلابات کے مذموم نتائج سے محفوظ ہو گیا لیکن اس سے مدینہ کی سیاسی اہمیت اور مرکزیت جاتی رہی اور حضرت علیؓ مسلمانوں کے حقیقی مرکز سے دور جا پڑے۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سارا دور حکومت خانہ جنگیوں اور اندرونی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ ایک دن کے لئے بھی آپ کو ملکی نظم و نسق کے قیام اور بیرونی فتوحات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ اس لئے تعمیری کاموں کے لحاظ سے آپ کا عہد خلافت آپ کے پیش روؤں کے مقابلے میں ناکام رہا اور یہ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا جن میں آپ کو منصب خلافت ملا تھا۔

حضرت علیؓ فطرتاً سلیم تھے آنحضرت صلعم کی آغوش میں تربیت حاصل کی تھی اس لئے آپ کی ذات خلق نبوی کا پیکر اور تعلیمات اسلامی کی تصویر تھی۔ آپ کے فضائل اخلاق میں سب سے نمایاں زہد و تقویٰ ہے آپ کی پوری زندگی اسی طرح زہد و تقویٰ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کسی واقعہ کو اس سے الگ کر کے دکھانا مشکل ہے۔ آپ کی زندگی کا ہر پہلو زہد ہی کا مظہر تھا۔ زہد کے بارے میں آپ کا یہ حکیمانہ قول مشہور ہے کہ دنیا مردار ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے اُسے کتوں کی صحبت کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

آپ پر غربت و امارات کے مختلف دور گزرے لیکن کسی دور میں خرافات دنیاوی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ابتدائی چند برسوں کے بعد ہی آپ کو عیش و راحت کے سامان میسر آ گئے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں آپ کی آمدنی اتنی ہو گئی تھی کہ چالیس ہزار سالانہ اس کی زکوٰۃ ہوتی تھی لیکن اس زمانے میں بھی فاقے کی نوبت آ جاتی تھی۔

معمولی سے گھر کے علاوہ تمام عمر کوئی عمارت تعمیر نہیں کروائی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے ساتھ جو مختصر سا جہیز لائی تھیں۔ اس میں تاعمر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ آپ کے سامان میں ایک مینڈھے کی کھال تھی جو بستر کا کام دیتی تھی۔ اوڑھنے کے لئے ایک مختصر سی چادر تھی۔ اگر سر چھپاتے تو پاؤں کھل جاتا تھا اور پاؤں ڈھانکتے تو سر برہنہ ہو جاتا تھا۔

کوئی ملازم نہ تھا۔ گھر کا سارا کام حضرت فاطمہؓ اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ کئی کئی دن تک گھر میں چولہا نہ جلتا تھا۔

ایک مرتبہ کئی فاقوں کی نوبت آ گئی۔ بھوک کی حالت میں مزدوری کی تلاش میں نکلے اور اطراف مدینہ میں ایک بڑھیا کا کھیت سینچ کر مٹھی بھر کھجوریں حاصل کیں۔ ایک مرتبہ گھر میں کچھ نہ تھا اپنی تلوار بیچ کر خورد و نوش کا سامان کیا۔

عبادت و ریاضت ان کی زندگی کا مشغلہ تھا۔ زبیر بن سعید قریشی کا بیان ہے کہ بنی ہاشم میں آپ سے زیادہ کوئی عبادت گزار نہ تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ وہ (علیؓ) قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔

انفاق فی سبیل اللہ آپ کا ایک امتیازی وصف تھا۔ چالیس ہزار سالانہ کے بقدر آمدنی رکھنے کے باوجود پرازعسرت زندگی آپ کے انفاق کا ہی نتیجہ تھی۔ آپ کے در سے کبھی کوئی سائل ناکام و نامراد نہیں لوٹا۔

آپ کا ایک بڑا اعزاز یہ ہے کہ آپ امین امت تھے جس دیانت کے ساتھ آپ مسلمان کی امانت بیت المال کی حفاظت کرتے تھے۔ اس کے بعض واقعات اوپر گزر چکے ہیں۔ ہر طرح کی تکلیفیں اٹھاتے تھے لیکن اپنے حق سے زیادہ ایک حبہ بیت المال سے لینا حرام سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ تیز سردی میں ایک معمولی پرانی چادر اوڑھے تھے بدن کانپ رہا تھا۔ ایک شخص نے عرض کیا "امیر المومنین! بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا بھی حق ہے۔ آپ اپنے اوپر اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں۔ فرمایا میں تمہارے حصہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (یعنی اگر میں اپنے حق سے زیادہ لوں تو دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی ہو گی۔

شجاعت آپ کا ایک خاص وصف تھا۔ غزوات میں آپ نے جس بہادری و دلاوری اور قوت و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور وہ اسلام کی عسکری روایت و تاریخ کا سنہری باب بن گیا ہے۔

زمانہ خلافت میں تنہا بازاروں میں گھومتے پھرتے بھولے بھٹکوں کو راستہ بتلاتے۔ کمزوروں اور ناتوانوں کی مدد کرتے اور تاجروں اور دکانداروں کو عدل کے بارے میں قرآنی آیات سنا کر انہیں صاحب قدرت لوگوں کے لئے عبرت بتاتے۔

غذا معمولی اور لباس سادہ استعمال کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ کے استفسار پر حضرت علیؓ کے ایک حاشیہ نشین ضرار صدائی نے آپ کے حسب ذیل اوصاف بیان کئے تھے جو آپ کی سیرت کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

" وہ بلند حوصلہ اور نہایت قوی تھے۔ فیصلہ کن بات کہتے تھے۔ عادلانہ فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے ہر سمت سے علم پھوٹتا تھا اور حکمت ٹپکتی تھی۔ دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے وحشت کرتے تھے۔ رات کی تاریکی اور اس کی وحشت سے انس رکھتے تھے۔ عبرت پذیر اور بہت غور و فکر کرنے والے تھے۔ چھوٹا لباس اور موٹا جھوٹا کھانا پسند کرتے تھے۔ ہم میں ہم ہی لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ جب ہم کچھ پوچھتے تو اس کا جواب دیتے تھے لیکن باوجودیکہ وہ ہم کو قریب رکھتے تھے اور خود ہمارے قریب رہتے تھے لیکن ہم ہیبت سے ان سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ دینداروں کی تنظیم کرتے تھے۔ غریبوں کو مقرب بناتے تھے۔ ان کے سامنے طاقتور باطل میں طمع نہیں کر سکتا تھا۔ اور کمزور انصاف سے مایوس نہیں ہوتا تھا بعض مواقع پر اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ رات گزر رہی ہے۔ ستارے جھلملا رہے ہیں اور وہ اپنی داڑھی مٹھی میں دبائے مار گزیدہ کی طرح بے قرار اور غم رسیدہ کی طرح اشکبار کھڑے ہیں۔

"اے دنیا والو کسی اور کو فریب دے تو مجھ سے لگاوٹ کرتی ہے۔ میری مشتاق ہے، افسوس، افسوس! میں نے تجھے تین طلاقیں دیں۔ تیری عمر تھوڑی اور تیرا مقصد حقیر ہے۔ ہائے ہائے سفر طویل راستہ وحشت ناک اور زاد سفر

تھوڑا ہے۔"

یہ اوصاف سن کر امیر معاویہؓ رو دیے اور کہا خدا ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے۔ بخدا وہ ایسے ہی تھے۔

حضرت علیؓ کے علم کے بارے میں فقط اتنا کہنا کافی ہے کہ نبی آخرالزماںؐ نے فرمایا۔

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ۔"

حضرت علیؓ کے اوصاف سیرت اور افتخار وراثت کے بارے میں بے شمار لکھا گیا ہے کیونکہ ان کی ذات فقط ایک حکمران، ایک قرابت دار رسول ایک شجاع شخص اور ایک قناعت پسند پرہیزگار ہی کی نہیں بلکہ ان کی شخصیت نے آئندہ کی ہر مسلمان نسل کو جو ذہنی و فکری ورثہ عطا کیا ہے وہ ان کی شخصیت کو ایک عظیم الشان اسرار بنا دیتا ہے۔

کوفہ ہی میں نماز فجر کے وقت مسجد میں عبدالرحمٰن بن ملجم اور اس کے ساتھی شبیب ابن بجرہ نے حضرت علیؓ پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ کو کاری زخم آیا۔ زخمی ہونے کے تیسرے دن یعنی ۲۱ رمضان ۴۰ھ (۶۶۱ء) بعمر ۶۳ سال انتقال فرمایا۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے غسل دیا۔ حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور کوفہ کے غری نامی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی مدت خلافت ۴ سال ۹ ماہ تھی۔

حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ زہرہؓ کے انتقال کے بعد متعدد شادیاں کیں اور ان سے بکثرت اولادیں ہوئیں۔ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے حضرت حسنؓ و حسینؓ و محسن تھے۔ محسن کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔ اور صاحبزادیوں میں زینبؓ اور ام کلثومؓ تھیں۔ یہ بھی حضرت فاطمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ ام کلثومؓ کا عقد حضرت عمر فاروقؓ سے ہوا تھا۔ خولہ کے بطن سے محمد بن علیؓ تھے۔ جو محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کے بعد یہ نامور فرزند تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اولادیں ہوئیں۔ جن کا نہ کوئی کارنامہ ہے اور نہ انہوں نے کوئی خاص شہرت حاصل کی۔

علیؓ بن عبید اللہؓ

علی بن عبید اللہ بن حارث بن رخصہ بن عامر بن رواحہ بن حجر بن عبد بن معیص بن عامر بن لوئی۔ حضور اکرم صلعم کے حلقہ نشین صحابہ میں سے تھے۔ ان سے کوئی روایت حاصل نہیں ہو سکی۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

علی بن عدی

علی بن ابی عدی کے نام سے بھی موسوم ہیں جو صحیح تر نام ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ علی بن ابی عدی بن ربیعہ بن عبدالعزیٰ بن عبد شمس بن عبد مناف۔ حضرت عثمانؓ بن عفان نے اپنی خلافت کے دوران انہیں مکہ کا گورنر مقرر کیا۔ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ عہد نبوی میں مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے تھے۔

علی بن فضل یمنی

نبوت کا مدعی کاذب۔ شروع میں اسماعیلی فرقے کا پیرو تھا۔ ۲۹۲ھ میں صنعا کے مضافات میں اس دعوے کے ساتھ وارد ہوا کہ وہ اللہ کا نبی ہے۔ بہت دنوں تک وہ اہل صنعا کو اپنی خانہ ساز نبوت کی دعوت دیتا رہا لیکن کوئی شخص تصدیق پر آمادہ نہ ہوا۔ جب تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں تو اس نے کسی عقلی تدبیر سے لوگوں کو رام کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک دوا جس کو بصرے میں داحن اور مصر میں سماالذریلی (؟) کہتے ہیں۔ حاصل کر کے اس کا گودا لیا۔ اسی طرح چھ اور اجزا رچھپکلی کی چربی اور شحم جرد ون (جس کے خالص ہونے کی پہچان یہ ہے کہ اسے آگ پر ڈالا جائے تو آگ فوراً بجھ جاتی ہے اور کانچ کا چونا، سنگرف، پارہ اور زنگار فراہم کیے اور ان سب سے نصف وزن (یعنی ساڑھے تین جز) گائے کا گوبر اور ان اجزا کا چوتھائی حصہ (یعنی دو جز) گھوڑے کی پیشانی کے بال لے کر کوفتنی دوائوں کو باریک کیا اور چربیوں کو ملا کر سرکے میں معجون تیار کی پھر گولیاں بنا کر ان کو سایہ میں خشک کیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ رات کے وقت ایک بلند مکان پر چڑھ کر یہ گولیاں دہکتے ہوئے کوئلوں پر ڈال دیں۔ ان سے سرخ رنگ کا دھواں اٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ تمام فضائے بسیط پر محیط ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ کرۂ ہوا آگ کا کرہ بن گیا ہے۔ پھر اس نے کچھ ایسا جادو کیا کہ دھوئیں میں بے شمار آگ کی شکلیں دکھائی دینے لگیں جو گھوڑوں پر سوار تھیں اور ان کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ وہ آپس میں لڑ رہی تھیں اور ایک دوسرے پر حملہ کر رہی تھیں۔

یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر لوگ گھبرا اٹھے اور ان پر یہ وہم سوار ہو گیا کہ انھوں نے خدا کے ایک نبی کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا اس لیے خدا کی طرف سے ان پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ہزارہا لوگ اس کے مرید ہو گئے ان لوگوں میں کافی پڑھے لکھے لوگ بھی تھے۔ علماء حق نے انہیں بہت سمجھایا مگر لوگ اس شعبدہ گر کے افسوں کے اسیر ہو گئے۔

البتہ چند ایک لوگ استقامت سے صراط مستقیم پر جمے رہے۔ علی ابن فضل کو کسی حد تک خدائی کا دعویٰ بھی تھا۔ اس نے اپنے مذہب میں بہت سی حرام چیزوں کو حلال کر دیا تھا یعنی شراب اور بیٹیوں سے عقد اس کے ہاں جائز تھا۔

آخر کار چند شرفائے بغداد ایمان و غیرت سے مجبور ہو کر اس کی ہلاکت کے درپے ہوئے اور اسے ۳۰۳ھ میں زہر دے دیا گیا۔ یہ فتنہ شر انیس سال تک پھیلا رہا۔

علی بن محمد خارجی

نبوت کا ایک جھوٹا مدعی۔ علی بن محمد بن عبدالرحیم۔ قبیلہ عبدالقیس کا ایک شخص رے کے مضافات میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں اس کا ذریعہ معاش قصیدے لکھ کر انعام حاصل کرنا تھا۔ امراء کے قصیدے لکھنے کے دوران اس کی آمدورفت جب ان کی مجلسوں میں ہوئی اور کچھ رسوخ پیدا ہوا تو اس کے دل میں سرداری اور گروہ بندی کے آثار موجزن ہوئے۔ ۲۴۹ھ میں بغداد سے بحرین چلا گیا اور دعوائے نبوت کر کے لوگوں کو اپنے اتباع کی دعوت دینے لگا۔ اس کا بیان تھا کہ مجھ پر بھی کلام الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ اس نے اپنا ایک "صحیفہ آسمانی" بنا رکھا تھا۔ بحرین کے اکثر قبائل نے اس کی متابعت اختیار کر لی۔ وہاں اس نے ایک بڑی جمعیت بنائی۔ پانچ سال تک بحرین رہنے کے بعد اس نے اپنے پیروں سے کہا کہ مجھے خدا کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں بصرے جاؤں۔ چنانچہ ۲۵۴ھ میں چند پیروؤں کی رفاقت میں وہ بصرے پہنچا۔ وہاں اس نے دو قبائل کی درمیانی چپقلش میں مصالحتی فریق کا کردار ادا کرنا چاہا۔ چنانچہ اس قبیلے کے سردار نے اس کی گرفتاری کا حکم اپنے لوگوں کو دے دیا۔ یہ خبر سن کر علی بن محمد بھاگ کھڑا ہوا۔ بہت عرصے بعد وہ واپس بصرے پہنچا اور وہاں عسکری قوت منظم کی اور بہت سی جھڑپیں کیں۔

۲۷ رمضان ۲۷۰ھ کو ایک جھڑپ میں اسلامی فوج کے مجاہدوں نے اس

وقت اس کا تعاقب کرکے گرفتار کرلیا جبکہ وہ فرار ہو رہا تھا۔ اس کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا دیا گیا۔ یہ فتنہ شر بہت سنگین تھا۔ یہ شخص اہل بیت نبوت کا سخت ترین دشمن تھا، خصوصاً حضرت علیؓ سے سخت عناد رکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے لشکر میں سادات عظام کی خواتین کو دو دو تین تین درہم میں نیلام کرکے فروخت کر دیا۔
اس کی ہلاکت کے بعد شکر ادا کیا گیا اور ایک بد نفس شخصیت سے نجات حاصل کی گئی۔

علی الاحق امامؒ

۶۸۶ھ ایک بڑے بزرگ اور ولی اللہ۔ سید امام، سید اسحاق زنجانی سید حسین زنجانی اور سید یعقوب چاروں آپس میں رشتہ دار تھے۔ اور چاروں اکٹھے ترکستان سے ہندوستان آئے۔ لاہور میں سکونت اختیار کی۔ والد کا نام سید حسن مکی تھا جو پہلے شاہی منصب پر فائز تھے پھر اسے ترک کرکے کانگڑہ کے قریب کسی جگہ گوشہ نشین ہو گئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ بابا فریدؒ کے حکم سے سیالکوٹ چلے گئے۔ اس وقت سیالکوٹ پر ایک ہندو راجہ اور تخت دہلی پر فیروز شاہ تغلق متمکن تھا۔ ایک جوتشی نے راجہ کو مشورہ دیا کہ اگر کسی مسلمان کا خون قلعے پر مل دیا جائے تو قلعہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے حملے سے محفوظ ہو جائے گا۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ امام صاحب نے فیروز شاہ کے ایک لشکر کی قیادت میں راجہ کو شکست دی لیکن خود بھی شہید ہو گئے۔ یوں آپ سیالکوٹ کو ہندو راجہ کے تسلط سے آزاد کروا کے اسلامی سلطنت کے زیر نگیں لانے کا موجب بنے۔

عمارؓ بن یاسر

صحابیٔ رسولؐ: قحطانی النسل تھے۔ ان کے والد اپنے ایک مفقود الخبر بھائی کی تلاش میں مکہ آئے اور یہیں رہائش اختیار کرکے ایک لونڈی سمیعہ سے شادی کرلی جس سے حضرت عمار پیدا ہوئے۔ بالغ ہونے پر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں والدہ محترمہ کے ساتھ حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا۔ چونکہ والدہ کنیز تھیں اس لیے ان کے آقاؤں نے ان پر بہت ظلم اور تشدد کیا۔ حضرت عمارؓ پر بھی بے یار و مددگار ہونے کے باعث قریش نے بہت مظالم توڑے۔ حضرت بلالؓ کی طرح انھیں بھی گرم ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا لیکن یہ ثابت قدم رہے۔ ابوجہل نے جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا، نیزہ مار کر نہایت بیدردی سے آپ کی والدہ کو شہید کر دیا۔ یہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلی دردناک شہادت تھی۔ ان کے بھائی حضرت یاسرؓ اور بھائی عبداللہ بھی اذیتیں اٹھا اٹھا کر شہید ہو گئے۔
حضرت عمارؓ نے رسول اکرم صلعم کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حضرت عمارؓ نے خود کام کیا۔ تمام غزوات میں بڑی مردانگی سے لڑے۔ جنگ یمامہ میں ایک کان جاتا رہا۔ ۲۰ھ میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور چند شکایات کی بناء پر نو ماہ بعد معزول کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کی طرف سے کوفہ کی سفارت پر گئے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑے۔ جنگ صفین میں ۹۱ برس کی عمر میں شہید ہوئے۔
بہت سادہ اور جفاکش زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ کوفہ کے گورنر کی حیثیت سے بھی بازار سے خود سودا خریدنے جاتے اور اپنی پیٹھ پر اٹھا کر گھر لے
آتے۔ آپ کے اخلاق حسنہ اور زہد و تقویٰ کی بابت مختلف اوقات میں آیات بھی نازل ہوئیں۔ آپؓ رسول اکرمؐ کے برگزیدہ صحابی تھے۔

عمران

قرآن حکیم کے بیان کے مطابق حضرت مریم کے والد اور حضرت عیسیٰؑ کے نانا تھے۔ حضرت مریم کی والدہ (عمران کی بیوی) کا نام حنّہ تھا۔ انہی کے واقعے کے نام پر قرآن مجید کی ایک سورہ آل عمران بھی ہے۔ اس کا عدد تلاوت تین ہے۔ سورہ بقرہ کے بعد سب سے بڑی سورہ ہے۔ مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی آیات کی تعداد ۱۹۹ ہے۔

عمرانؓ حصین

صحابیٔ رسولؐ: نام عمرانؓ۔ کنیت ابونجید۔ ہجرت کے ابتدائی دنوں میں اپنے والد اور ہمشیرہ کے ہمراہ مسلمان ہوئے اور وطن لوٹ گئے۔ جہاد کے موقع پر اکثر لشکر اسلام میں شامل ہو جاتے تھے۔ فتح مکہ، حنین اور طائف کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلعم کے بعد مدینہ آنا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی باہمی کشمکش کے دنوں میں غیر جانبدار رہے۔ امیر معاویہؓ نے برسر اقتدار آنے پر خراسان کی گورنری پیش کی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کی صحت بہت خراب رہتی تھی۔ استسقاء کا مرض تھا جس کی وجہ سے پیٹ میں شگاف ہو گیا تھا۔ اسی مرض سے ۵۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کا بیٹا محمد خلف الصدق بصرہ کی مسند قضا پر بیٹھا۔ آپ بہت بڑے فاضل اور جید صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کا حلقہ درس و تدریس بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے صحابہ آپ سے احادیث رسولؐ کے بارے پوچھا کرتے تھے۔ موجودہ کتب احادیث میں آپ کی مرویات کی تعداد [illegible] تک ہے۔

عمرؓ بن خطاب

مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ راشد۔ نام عمرؓ۔ سلسلہ نسب یوں ہے عمرؓ بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لوی بن فہر بن مالک۔ عدی پر سلسلہ نسب آنحضرتؐ کے سلسلہ نسب سے آملتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دادا نفیل بن عبدالعزیٰ اپنی قوم میں موروثی طور پر [illegible] مرتبت شخصیت تھے۔ قریش خاندان کے فیصلے آپ ہی کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے والد خطاب قریش کے ممتاز آدمیوں میں سے تھے۔ ان کی ایک شادی قریش فوج کے سپہ سالار کی بیٹی خنتمہ سے ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ خنتمہ کے بطن سے تھے۔
حضرت عمرؓ کی ولادت مشہور روایات کے مطابق ہجرت نبویؐ سے [illegible] برس پہلے ہوئی تھی۔ سن رشد کو پہنچ کر قومی روایات کے مطابق آپؓ نے اونٹ وغیرہ بھی چرائے۔ ضجنان نامی ایک جگہ جو مکے کے قریب ہے۔ حضرت عمرؓ نے دور خلافت میں ایک دفعہ اسے دیکھا اور آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے ایک زمانہ تھا کہ میں نمدہ کا کرتہ پہنے ہوئے اونٹ چرایا کرتا تھا، تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ سے مار کھانی پڑتی۔ آج یہ دن ہے کہ خدا کے سوا مجھ پر کوئی حاکم نہیں۔
آغاز شباب میں حضرت عمرؓ عرب کے معمول کے مطابق تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت تعلیم میں نسب دانی، شہسواری، سپہ گری، پہلوانی اور مقرری تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان میں کمال حاصل کیا۔ شاعری کا ذوق بھی عمدہ رکھتے تھے۔ عکاظ کے

میلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

علوم و فنون سے فارغ ہو کر تجارت جو عرب کا شعار تھی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ اس سلسلے میں آپ کو دور دراز تک جانا پڑتا تھا۔ یوں بڑے بڑے آدمیوں سے میل جول بڑھانے کا موقعہ ملا سفر کی اس کثرت کے باعث حضرت عمرؓ میں خودداری بلند حوصلگی، تجربہ کاری، معاملہ دانی ایسے اوصاف اسلام سے قبل ہی پیدا ہو گئے تھے۔ آپ کی ان بلند خصوصیات کی بناء پر قریش نے سفارت کا منصب دے دیا جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے انتہائی اہم شمار ہوتا تھا۔

جب آنحضرتؐ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو حضرت عمرؓ ۲۷ برس کے تھے ان کے گھرانے میں سب سے پہلے آپ کے بہنوئی سعید مسلمان ہوئے۔ پھر آپؓ کی ہمشیرہ فاطمہؓ مسلمان ہوئیں۔ ایک لونڈی لبینہ نے بھی اسلام قبول کیا۔ حضرت عمرؓ کو جب پتہ چلا تو سخت برہم ہوئے اور اسلام قبول کرنے والوں کے جانی دشمن بن گئے۔ اہل عرب اسلام کی روز بروز ترقی سے بہت برافروختہ ہوئے تھے اور اسلام قبول کرنے والوں کی ثابت قدمی نے ان کے غصے کو دوچند کر دیا تھا۔ ہر قسم کی تدبیر آزمانے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ آنحضرتؐ کا قصّہ ہی تمام کر دیا جائے۔ اس کام کے لیے کوئی اور شخص تیار نہ ہوا لیکن عمرؓ نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔

دوسری جانب آنحضرتؐ نے خدا سے دعا کی کہ اسلام کی مزید ترقی کے لیے دو آدمیوں میں سے ایک آدمی مسلمانوں کو عطا کر دے یعنی ابوجہل یا عمر۔

عمرؓ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سیدھے تلوار لیے رسول اللہؐ کی طرف چلے۔ راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے۔ ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جا رہا ہوں۔ نعیم بولے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بولے سُنا ہے کہ تم مرتد ہو گئی ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریبان ہو گئے۔ پھر بہن کو بھی لہولہان کیا۔ اس کے باوجود وہ کہنے لگے:

"عمرؓ! جو جی چاہے کر گزرو ہم اسلام کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔"

ان الفاظ نے عمرؓ کے دل پر بہت اثر کیا اور قرآن سن کر رقت طاری ہو گئی۔ بولے مجھے بھی حضورؐ کے پاس لے چلو۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت ارقمؓ کے گھر میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا آنحضرت صلعم اور آپ کے مسلمان ساتھی رہا کرتے تھے عمرؓ وہاں پہنچ کر اسلام سے سرفراز ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے قبول اسلام سے مسلمانوں کو بہت مسرت ہوئی مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر ایسے زور سے بلند کیا کہ پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ بدیہی فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان جو اب تک چھپ چھپ کر عبادت کرتے تھے علی الاعلان خانہ کعبہ میں نمازیں ادا کرنے لگے۔

حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بعثت نبویؐ کے چھٹے سال ہوا۔ اسلام کی اس قسم کی روز افزوں ترقی نے قریش کے ظلم و ستم میں پہلے سے زیادہ سختی کر دی۔ اب وہ مسلمانوں پر بے تحاشا ظلم و تشدد کرنے لگے۔ حد ستم جب ٹوٹ گئی تو مسلمانوں کو ہجرت کا حکم ہو گیا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ مدینے جانے لگے کیونکہ مدینہ کے کچھ معزز افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بخاری کی روایت کے مطابق بیس آدمیوں کے ساتھ علانیہ طور پر ہجرت کی۔ قریش میں سے کسی کو الجھنے کی جسارت نہ ہوئی۔ آنحضرتؐ نے ایک انصاری صحابی، قبیلہ بنو سالم کے سردار عتبانؓ بن مالک سے حضرت عمرؓ کی مواخاۃ کرا دی۔

مدینہ پہنچ کر کچھ اطمینان نصیب ہوا تو اسلام کے فرائض و ارکان اور طرز ادا کے متعین کیے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ نماز کے لیے بلانے کے لیے اذان کا طریقہ حضرت عمرؓ کی تجویز کے مطابق رائج ہوا۔ اس لحاظ سے کہ اذان نماز کا دیباچہ اور اسلام کا ممتاز شعار ہے۔ یہ شعار حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق قائم ہوا جو حضرت عمرؓ کا بہت بڑا اعزاز ہے۔

حضرت عمرؓ کو حضور اکرم صلعم کی بہت قربت حاصل تھی۔ آپؐ نے کئی مرتبہ انھیں اسلامی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ ایک بار قبیلہ بنی ہوازن کے مقابلے میں تیس آدمیوں کو حضرت عمرؓ کی قیادت میں بھیجا تو وہ لوگ آپؓ کی آمد کی اطلاع پا کر فرار ہو گئے۔

فتح مکّہ کے موقع پر حضورؐ نے مردوں سے خود بیعت لی اور عورتوں سے بیعت کے لیے حضرت عمرؓ کو مقرر کیا۔ ایک صحابی سے روایت ہے کہ ہم حضور اکرمؐ کے بعد ان کے انتہائی قریبی لوگوں کے نام اس ترتیب سے لیا کرتے تھے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ۔

مسلمانوں کے پہلے خلیفہ راشد نے اپنی وفات سے قبل لوگوں کے اصرار پر خلیفہ کو نامزد کرنے کا اعلان کیا اور چند جید صحابہؓ کے مشورہ سے حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کا خلیفہ نامزد کر دیا۔ بعض لوگوں نے ان کی سخت مزاجی کی شکایت کی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا جب میں نرم تھا تو یہ سخت تھے۔ اب ذمہ داریوں کا بوجھ ان پر پڑے گا تو خود بخود ان کے مزاج میں گداز پیدا ہو جائے گا۔

حضرت عمرؓ کی تخت نشینی کے وقت شام و عراق میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اس لیے مسندِ خلافت پر بیٹھتے وقت حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے ان مہموں کی طرف توجہ کی۔ آپؓ کی بیعت کے سلسلہ میں عرب کے تمام حصّوں کے مسلمان مدینہ آئے ہوئے تھے۔ آپؓ نے ان کے سامنے جہاد پر تقریر کر کے ان کو ایران کی مہم میں شرکت کے لیے ابھارا لیکن ایک شخص نے بھی آمادگی ظاہر نہ کی۔ آپ کئی روز تک مسلسل جوش دلاتے رہے۔ آخر میں مسلمانوں میں حرارت پیدا ہو گئی اور بنی ثقیف کے سردار ابوعبید ثقفی نے اٹھ کر اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کیا۔ ان کی پیش قدمی پر ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں اور تمام مسلمان شرفِ جہاد حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور حضرت عمرؓ نے ابوعبید ثقفی کو چند ہزار سپاہ کے ساتھ ایران کی مہم پر روانہ کیا۔

عراق کی گذشتہ معرکہ آرائیوں نے ایرانیوں کو بہت ہوشیار کر دیا تھا اس لیے انہوں نے بھی از سر نو فوجی تنظیم کی، بوران وقت خراسان کے نامور مدبّر اور مشہور بہادر رستم کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس نے ایرانیوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر سارے ایران میں آگ لگا دی اور پوری ایرانی قوم مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ہمہ تن جوش ہو گئی اور چند دن کے اندر عراق کے تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیل گئی اور فراتی اضلاع مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گئے۔

ادھر ایران کے دو نامور بہادر زبرقان اور جابان رستم کی مدد کے لیے فوجیں لے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے دو مختلف راستوں سے نکل چکے تھے دوسری طرف ابوعبید آ رہے تھے۔ مقام غارق میں ابوعبید اور جابان کا مقابلہ ہو گیا۔ ابوعبید نے اسے فاش شکست دی۔ اس کے دو ممتاز افسر مارے گئے

اور وہ خود گرفتار ہوا۔ جس مسلمان نے اسے گرفتار کیا تھا وہ اسے پہچانتا نہ تھا اس لیے اس نے دو غلام دے کر رہائی حاصل کر لی۔ بعد میں مسلمانوں نے اسے پہچان کر دوبارہ گرفتار کر لیا لیکن ابوعبید نے یہ کہہ کر کہ جسے ایک مسلمان رہا کر چکا ہو اس سے بدعہدی نہیں کی جا سکتی، اسے چھڑا دیا۔ جابان کو شکست دینے کے بعد ابوعبید آگے بڑھے اور مقام سقاطیہ میں دوسرے افسر کو بھی ویسی ہی شکست فاش دی۔ اس کی شکست کے بعد سقاطیہ کے قرب و جوار کے ایرانی امراء نے اطاعت قبول کر لی۔

ان مسلسل شکستوں کی خبر سن کر رستم نے مردان شاہ کو ایک تازہ دم فوج دے کر اور ایرانیوں کا مقدس علَم درفش جو فتح و ظفر کی علامت سمجھا جاتا ہے، کے ہمراہ روانہ کیا۔ اس نے فرات کے ساحل پر فوجیں اتاریں۔ دوسری طرف مسلمان تھے ہر فریق دریا کے پار جانے سے بچنا چاہتا تھا لیکن ابوعبید جوشِ جہاد میں مخمور تھے وہ دوسرے مسلمان امراء کے اختلاف رائے کے باوجود فرات کو عبور کر کے اس پار چلے گئے۔ دریا پار ہوتے ہی جنگ چھڑ گئی۔ مسلمان جس میدان میں اترتے تھے۔ وہ نہایت ناموزوں تھا۔ ایرانی فوج میں دیو پیکر ہاتھی تھے جن سے عربی گھوڑوں کو کبھی سابقہ نہ پڑا تھا اس لیے وہ ہاتھیوں کو دیکھ کر بدک گئے اور مسلمانوں کو پیدل ہو جانا پڑا۔ گھوڑوں سے اتر کر انھوں نے ہودوں کی رسیاں کاٹ کاٹ کر فیل نشینوں کو گرانا شروع کیا۔ ابوعبید نے لپک کر ایک ہاتھی پر وار کیا۔ وار خالی گیا اور ہاتھی نے انھیں اپنی سونڈ میں لپیٹ کر پیروں تلے مسل ڈالا۔ ابوعبید کے شہید ہوتے ہی مسلمان پسپا ہو گئے لیکن جگہ بہت کم تھی، ایرانی کم تھے اور پیچھے دریا تھا اس لیے پسپائی میں کئی ہزار مسلمان پانی میں غرق ہو گئے۔ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے بہت مشکل سے تین ہزار جانیں بچائیں۔

حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی تو آپ کو مسلمانوں کی جانوں کی بربادی کا سخت قلق ہوا۔ آپؓ نے ان کے انتقام کے لیے پرجوش خطبوں سے عربوں میں آگ لگا دی عیسائی عرب بھی قومیت کے جوش میں مسلمانوں کے ساتھ ہو لیے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بجلی کی ماتحتی میں ایک تازہ دم فوج محاذ جنگ پر روانہ کی۔ دوسری طرف مثنیٰ نے اپنے طور پر سرحدی قبائل کی ایک فوج تیار کر لی تھی۔

ایرانیوں کو ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو مہران بن جاذویہ کو بارہ ہزار منتخب بہادروں کے ساتھ مقابلہ کے لیے بھیجا۔ مسلمان بویب میں خیمہ زن تھے۔ مہران سیدھا بویب آیا اور فرات کو عبور کر کے اس کے اس پار صف آراء ہوا۔ مسلمان پہلے سے تیار تھے۔ دونوں میں نہایت سخت مقابلہ ہوا۔ گذشتہ جنگ میں جن مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے وہ اس کی تلافی میں اس بے جگری سے لڑے کہ قریب قریب سب نے درجہ شہادت حاصل کیا۔ مثنیٰ نے اپنے قبیلہ کو لے کر اس زور سے حملہ کیا کہ ایرانیوں کی سرحدیں درہم برہم ہو گئیں اور بے ترتیبی سے پیچھے ہٹے۔ اس ریلے میں بنی تغلب کے ایک آدمی نے مہران کو قتل کر دیا۔ مثنیٰ فرات کے پل کو روک کر کھڑے ہو گئے اور جتنی ایرانی سپاہ نے اس کو عبور کرنے کی کوشش کی سب کو تہہ تیغ کر دیا۔ اس معرکہ کے بعد مسلمان سارے عراق میں آ گئے۔

ایرانی فوجوں کی بربادی و شکست کی خبر پایہ تخت پہنچی تو ایرانیوں میں بڑا جوش پھیل گیا۔ انھوں نے بوران رخت کو تخت سے اتار کر سترہ سالہ یزدگرد کو تخت نشین کیا اور از سر نو فوجی انتظامات کر کے چند دنوں میں تمام قلعوں اور چھاؤنیوں کو جنگی سامانوں سے بھر دیا۔ ان انتظامات کے ساتھ ہی سازش کر کے تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیلا دی۔ اس بغاوت میں بہت سے علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے اور مثنیٰ مجبور ہو کر عرب کی سرحد پر ہٹ آئے اور حضرت عمرؓ کو اس صورتحال کی اطلاع بھجوائی۔

حضرت عمرؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو آپؓ نے تمام عرب کے نامور بہادروں رئیسوں، خطیبوں اور اہل الرائے اشخاص کو مدینہ طلب کیا۔ آپؓ کی دعوت پر سارا عرب امڈ آیا۔ انھیں ساتھ لے کر آپ نے بہ نفس نفیس نکلنے کا ارادہ کیا مگر اکابر صحابہ نے مخالفت کی کہ آپ کا دارالخلافہ چھوڑنا مناسب نہیں ہے اس لیے آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے اور عہد رسالت میں بڑے کارہائے نمایاں ادا کر چکے تھے، سپہ سالارِ اعظم مقرر کر کے بیس ہزار فوج کے ساتھ ایران روانہ کیا اور چلتے وقت بیش قیمت نصیحتیں کیں۔ اس فوج میں ستر بدری صحابی، تین سو بیعتِ رضوان کے جانثار اسی قدر فتح مکہ میں شریک ہونے والے اصحاب اور اتنے ہی صحابہ زادے تھے۔ حضرت عمرؓ تجارت کے سلسلے میں سارے عراق کا سفر کر چکے تھے اور یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھے اس لیے فوج کی نقل و حرکت، اس کی ترتیب و تنظیم اور مورچہ بندی سب اپنے ہاتھ میں رکھی چنانچہ انھوں نے سب سے پہلی منزل شراف کا نقشہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے اسے دیکھ کر فوج کی تنظیم کی اور پیشقدمی کے متعلق مختلف ہدایات بھیجیں۔

شراف کے بعد سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ کا پورا نقشہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے اسے دیکھ کر آئندہ پیش قدمی کے متعلق ہدایات بھیجیں اور حکم دیا کہ جنگ سے پہلے اسلامی سفیروں کو تبلیغ اسلام کے لیے دربار ایران بھیجا جائے۔ اس حکم [illegible] سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ کے میدان میں مورچہ بندی کی اور اشعث بن قیس کندی کو چند آدمیوں کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لیے اسلامی لشکر میں بھیجا۔ انھوں نے جا کر اسلام پیش کیا۔ رستم نے پوچھا تم کس ارادے سے آئے ہو۔ [illegible] نے کہا یزدگرد کے لیے! دونوں میں گفتگو ہوئی۔ آخر میں مسلمانوں نے کہا کہ [illegible] نبیؐ کی پیش گوئی ہے کہ ہم تمہاری زمین پر قابض ہوں گے۔ رستم نے [illegible] کے لیے تھوڑی سی خاک منگوا کر کہا "ہماری زمین میں تمہارا یہ حصہ [illegible]۔"

عمرو بن معدی کرب یہ خاک دامن میں لے کر لوٹ آئے [illegible] سے کہا کہ ان کے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے نیک فال ہے۔ رستم کے بعد [illegible] یزدگرد کے پاس جا کر اسلام پیش کیا۔ اس نے جوش غضب میں [illegible] کو قتل کرنا نادانہ ہوتا تو تم میں سے کوئی گردن سلامت نہ لے جا سکتا [illegible] رستم کو سخت تنبیہ کی کہ اس نے انھیں کیوں آنے دیا۔

رستم کو مسلمانوں کا مکمل تجربہ ہو چکا تھا اور وہ جنگ سے بچنے کے [illegible] بہانے تراش رہا تھا چنانچہ یزدگرد کے تاکیدی احکام کے باوجود جنگ [illegible] قادسیہ پہنچنے کے بعد اس نے پھر کوشش کی اور سعد بن ابی وقاص کو [illegible] وہ گفتگو کے لیے دوبارہ آدمی بھیجیں۔ انھوں نے مغیرہؓ بن شعبہ کو چند [illegible] کے ساتھ بھیجا۔ رستم نے انھیں مرعوب کرنے کے لیے بڑے ٹھاٹھ کا دربار [illegible] کیا۔ مغیرہؓ اس شان سے تھے کہ تلوار بھی قرینہ کی نہ تھی۔ [illegible] لپیٹے ہوئے تھے۔ اسی شان سے دربار میں داخل ہوئے۔ دونوں میں طویل گفتگو ہوئی۔ آخر میں رستم نے انھیں طمع دلائی کہ "غالباً تم لوگ معاش کی تنگی اور پریشان حالی کی وجہ سے جنگ کے لیے نکلے ہو۔ ہم تمہیں اتنا دے سکتے ہیں کہ تمہارا پیٹ بھر جائے اور جو خواہشیں ہوں انھیں بھی ہم پورا کر سکتے ہیں۔"

مغیرہؓ نے جواب دیا کہ بے شک ہم بھوکے تھے لیکن خدا نے ہم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا جس کے اتباع سے ہماری بدبختی، خوش بختی میں بدل گئی۔ اس نے

ہم کو اپنے دین کے معاندین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا ہے اس لیے ہم تم کو خدائے واحد کی پرستش اور نبیٔ اکرم صلعم پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر اسے قبول کر لو تو فبہا، ورنہ ہمارا تمہارا فیصلہ تلوار کرے گی۔

یہ سن کر رستم جوش غضب میں بھر گیا اور کہا کہ آفتاب و ماہتاب کی قسم! کل طلوع صبح سے پہلے خاک میں ملا دوں گا۔ اس گفتگو کے بعد ہی فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا اور راتوں رات ایرانی فوجیں مرتب ہو گئیں۔ صبح ہوتے ہوتے قادسیہ کے میدان میں ہر طرف ایرانی فوجیں سمندر کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔

مسلمان پہلے سے تیار تھے۔ محرم ۱۴ھ میں فریقین صف آراء ہوئے۔ عین اس موقع پر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو عرق النساء کا دورہ ہوا اور نقل و حرکت سے معذور ہو گئے اس لیے اپنی جگہ خالد بن ارفطہ کو سپہ سالار مقرر کیا اور خود میدان جنگ کے قریب ہی ایک محل میں ٹھہر گئے جہاں سے جنگ کا پورا نقشہ نظر آتا تھا۔ یہاں سے لڑائی کا رنگ دیکھ کر احکام بھیجتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنگ کا آغاز ہوا اور تاریکیٔ شب تک نہایت گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ یہ قادسیہ کا پہلا معرکہ تھا جو یوم ارماث کے نام سے مشہور ہے۔

دوسرے دن پھر مقابلہ ہوا اور گھمسان کا رن پڑا۔ عین لڑائی کے وقت حضرت عمرؓ کی بھیجی ہوئی تازہ دم افواج پہنچ گئیں اور اس کے ساتھ ہی سفیر نامور بہادروں کے لیے تحائف لائے اور اعلان کیا کہ امیر المومنینؓ نے یہ تحفے بھیجے ہیں جو اپنے آپ کو ان کا مستحق ثابت کر دیں۔ اس امتیاز کے حصول کے لیے مسلمانوں نے اپنی جانیں لڑا دیں اور شام تک خونریز جنگ جاری رہی۔ اس دن دس ہزار ایرانی فوج کے سپاہی اور افسر ہلاک ہوئے اور دو ہزار مسلمان رتبہ شہادت کو پہنچے۔

تیسرے دن پھر جنگ کا آغاز ہوا اور یہ سب سے شدید معرکہ تھا۔ قتل و خون اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے درمیان میں آخر کار اس دن جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ رستم پسپا ہو کر فرار ہونے کی کوشش میں ایک مجاہد کے ہاتھوں مارا گیا اور یوں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان فتح حاصل کر لی۔

اس فتح کی نوید حضرت عمرؓ کو پہنچائی گئی۔ جنگ قادسیہ کے آغاز سے ہی حضرت عمرؓ بے چین تھے اور خبروں کے منتظر تھے۔ آپؓ قاصد کے انتظار میں روزانہ مدینے سے باہر نکل جاتے اس لیے سعدؓ بن ابی وقاص کا قاصد شہر سے باہر ہی ملا۔ اس سے حالات پوچھے۔ وہ آپؓ کو پہچانتا نہ تھا اس لیے وہ سواری پر سے حالات بتاتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے اسی حالت میں دونوں شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں اس کو معلوم ہوا کہ امیر المومنینؓ یہی ہیں۔ حالات سننے کے بعد حضرت عمرؓ نے تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر کے سعدؓ بن ابی وقاص کا خط سنایا اور ان کے سامنے ایک مختصر تقریر کی۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ کے عہد ہی میں ایران سے مزید جھڑپیں جاری رہیں اس کے علاوہ شام میں بھی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور بیت المقدس کی فتح بھی حاصل ہوئی۔ اس دوران حمص کی بغاوت شروع ہوئی جس کو حکمت و تدبّر سے ختم کیا گیا۔ اس کے علاوہ مصر کی فتوحات، فسطاط کی فتح، سکندریہ اور طرابلس وغیرہ کی فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔

۲۳ھ میں حضرت عمرؓ کی شہادت کا حادثہ عظمیٰ پیش آیا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ایک مرتبہ مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام ابولولوٴ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ اس کے آقا اس سے بہت بھاری ٹیکس وصول کرتے ہیں اور اسے کم کرانے کی درخواست کی۔ آپؓ نے پوچھا کتنا محصول لیتے ہیں۔ ابولولوٴ نے کہا کہ دو درہم روزانہ، پوچھا "تم کیا کام کرتے ہو؟" اس نے کہا، آہن گری نجاری اور نقاشی، فرمایا "ان پیشوں کے مقابلہ میں یہ رقم زیادہ نہیں ہے"۔ اس فیصلہ پر وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے وقت خنجر لے کر مسجد میں آیا۔ جیسے ہی حضرت عمرؓ نے نماز شروع کی، ابولولوٴ نے بڑھ کر چھ وار کیے۔ حضرت عمرؓ زخمی ہو کر گر پڑے۔ آپ کی جگہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی۔ کچھ لوگ ابولولوٴ کو گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے، اس نے انھیں بھی زخمی کیا مگر آخر میں پکڑا گیا۔ گرفتار ہوتے ہی اس نے خودکشی کر لی۔ نماز ختم ہونے پر حضرت عمرؓ اٹھا کر لائے گئے۔ پوچھا "میرا قاتل کون تھا" لوگوں نے عرض کیا "فیروز!" حضرت عمرؓ نے فرمایا "الحمدللہ میرا قاتل مسلمان نہیں ہے"۔

زخم نہایت کاری تھا۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپؓ کو آقائے نامدار کے قریب دفن ہونے کی بڑی تمنا تھی اس لیے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو حضرت عائشہؓ کے پاس حجرہ نبویؐ میں دفن ہونے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا "یہ جگہ میں نے اپنے لیے محفوظ کر رکھی تھی لیکن عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی"۔

اس وقت سب سے اہم مسئلہ جانشینی کا تھا اس میں مختلف قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اس لیے آپؓ کی وفات سے پہلے صحابہ کرامؓ نے آپؓ سے جانشینی نامزد کرنے کی درخواست کی۔ آپ کے لیے یہ مسئلہ ہمیشہ سب سے اہم رہا اور اکثر آپؓ زندگی میں غور کیا کرتے تھے، لیکن کسی پر نگاہ نہ پڑتی تھی اپنے معیار سے سب میں کچھ نہ کچھ کمی محسوس کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے آپؓ کے صاحبزادے عبداللہ کا نام پیش کیا۔ فرمایا "جس کو بیوی کو طلاق دینے کا سلیقہ نہیں وہ خلافت کا بار کیسے سنبھالے گا۔ بالآخر لوگوں کے اصرار پر حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف چھ آدمیوں کو نامزد کر کے فرمایا۔ ان میں جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے امیر بنانا اور تاکید کر دی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جائے اور حضرت صہیبؓ کو ہدایت کر دی کہ میرے دفن سے فراغت کے بعد ان چھ آدمیوں کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک ان میں سے کسی کا انتخاب نہ ہو جائے، اس وقت تک نہ کھولنا۔ عبداللہؓ کے لیے ان کی ہدایت تھی کہ وہ مشاورت میں شریک ہوں گے لیکن امارت میں ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ کثرت رائے کے بعد بھی اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی ہو تو اسے قتل کر دینا۔

نامزدگی کے مرحلہ سے فراغت کے بعد منتخب ہونے والے خلیفہ اور اپنے صاحبزادے عبداللہ کے لیے نصیحتیں کیں۔

ان کے بعد یکم محرم الحرام ۲۴ھ کو شنبہ کے دن آپ کا وصال ہو گیا وصیت کے مطابق حضرت صہیبؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آقائے نامدار کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔ انتقال کے بعد وقت عمر ۶۳ برس تھی اور مدت خلافت ساڑھے دس برس۔

آپؓ کے اس لگ بھگ ساڑھے دس برس کی مدت خلافت میں ایران اور روم کی عظیم الشان سلطنتیں مسلمانوں نے فتح کر لی تھیں۔ ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا تھا اور اس ساری جہد

فتوحات میں ایک بھی واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جسے ظلم وجور کا عنوان دیا جاسکے۔

بلاشبہ سکندر، چنگیز اور تیمور نے اک زمانہ زیر نگیں کیا لیکن اس کے ساتھ زیر وزبر بھی کر ڈالا لیکن جن قوانین کی پابندی کے ساتھ ایران اور روم فتح ہوئے اس احتیاط کے ساتھ کوئی حکمران دنیا کا ایک چپہ بھی فتح نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے عہد فتوحات میں خونِ ناحق کا ایک قطرہ بھی گرنے نہ پایا۔ ان کا حکم تھا کہ ہرے بھرے کھیتوں اور شاداب درختوں کو نہ کاٹا جائے۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر قطعاً تلوار نہ اٹھائی جائے۔

ان فتوحات کے علاوہ حضرت عمرؓ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی بنیادوں پر ایسے آئینِ حکومت مرتب کردیئے۔ ایسا عادلانہ نظام قائم کردیا جو مسلمانوں کی ترقی وارتقاء کا ضامن تھا۔ اسلام کا نظام شوریٰ پہ ہے اور حضرت عمرؓ نے اپنی پوری کوشش سے اس نظام کو مستحکم اور مستقل کرنے کا سامان بہم پہنچایا۔

حضرت عمرؓ نے جس وقت مسندِ خلافت سنبھالی اس وقت کوئی بڑا نظام حکومت نہ تھا۔ آپؓ نے دس سالہ عہد حکومت میں نہایت وسیع نظام قائم کیا۔ آپؓ نے مختلف مفتوحہ علاقوں کو صوبوں میں تقسیم کرکے وہاں عمال مقرر کردیئے اور انہیں ایک حد تک اختیارات سونپے لیکن اس کے باوجود وہ ان سے عوام کی طرف سے کوئی رعائیت نہ کرتے تھے اور ایک عام آدمی کی شکایت پر بھی ان عمّال کو طلب کرلیتے اور ان کا احتساب کرلیتے تھے۔

رشوت کے انسداد کے لیے اتنی تسلی بخش تنخواہیں مقرر کیں کہ رشوت کی طرف دھیان ہی نہ جانے پائے۔ ان کے ہاں قانون کا احترام مکمل طور پر بحال تھا اور کوئی بھی شخص اس سے نہ بچ سکتا تھا۔ ہر ادنیٰ واعلیٰ کو ایک ہی طرح سے ان کے دربار میں آنے اور اپنی ضروریات بیان کرنے کی اجازت تھی۔

حضرت عمرؓ کا عہدِ حکومت مسلمانوں کے طرزِ حکومت کا بنیادی خاکہ تھا۔ قیامِ امن کے لیے انہوں نے پولیس کا نظام قائم کیا اور اسے مستقل محکمہ بنایا۔ ان سے قبل عرب میں جیل خانوں کا رواج نہ تھا، انھوں نے جیل خانے قائم کیے اور اس طرح معاشرے کو ایک پرامن نظام فراہم کیا۔

محاصل کے حصول، مختلف قسم کی آمدنیوں کا حساب کتاب، آبپاشی کا نظام بیت المال کی وسعت اور اس کا صحیح معنوں میں نظم وضبط، فوج کی ایک باقاعدہ صورت اور منظم شکل اور اس کا سارا عسکری انتظام، شعبہ تعلیم، غرضِ ایک حکومت کی جو بھی بنیادی ذمہ داریاں اور فرائض ہوسکتے ہیں، عہدِ فاروقی میں ان سب کا احساس اور انتظام تھا۔

علم قرآن وحدیث وسنت ان سب کے لیے بھی ان کے عہد میں باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔

بعد کی مسلمان حکومتوں نے حضرت عمرؓ کے نظامِ حکومت سے پوری طرح اکتساب کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا عہدِ خلافت دراصل اسلامی طرزِ حکومت اور نظامِ حیات کا ایک صحیح معاشرتی خاکہ ہے۔

عمر بن عبدالعزیز

۹۶ھ/۷۱۷ء تا ۱۰۱ھ/۷۱۹ء۔ خلافت اسلامیہ کے مشہور اموی خلیفہ مروان بن حَکَم کے پوتے اور عبدالعزیز کے بیٹے، ان کی ماں اُمّم عاصم حضرت عمر فاروق رضؓ کی پوتی تھیں اس لیے آپ کی رگوں میں فاروقی خون بھی شامل تھا۔

عبدالعزیز شاہی خاندان اموی کے ممتاز رکن تھے۔ اکیس برس تک مصر کے گورنر رہے اس لیے عمر بن عبدالعزیز کی پرورش تمول وثروت کے گہوارہ میں ہوئی جس کے اثرات خلافت ملنے تک باقی تھے۔ تعلیم وتربیت اہتمام کے ساتھ مشہور محدث صالح بن کیسان کی نگرانی میں ہوئی۔ عمر فطرۃً صالح اور سعید تھے۔ تعلیم وتربیت سے ان کے جوہر اور کھل گئے۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے خاندان سے بالکل جدا تھے۔ علمی لحاظ سے وہ اپنے زمانے کے امام تھے۔ علمی حیثیت سے انھوں نے جو کارنامے سرانجام دیئے وہ تاریخ اسلام میں یاد رکھے جائیں گے۔

عمر بن عبدالعزیز حکمران خاندان کے رکن ہونے کے علاوہ عبدالملک کے بھتیجے اور داماد تھے اس لیے وہ ذمہ دار عہدوں پر ممتاز رہے۔ لیکن ان ایام میں بھی ان کی فطری سعادت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ جہاں جہاں بھی رہے اپنے حسن عمل کی بہترین یادگاریں چھوڑیں۔ ولید نے جب ان کو مدینہ کی گورنری پر بھیجنا چاہا تو انھوں نے اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ وہ دوسرے عمّال کی طرح ظلم نہ کریں گے۔ ولید نے اسے منظور کرلیا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد وہاں کے اکابر وفقہا کو بلا کر کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو ایسے کام کے لیے زحمت دی ہے کہ اس میں میرا ہاتھ بٹانے سے آپ کو ثواب ملے گا اور آپ حامی حق قرار پائیں گے۔ میں آپ لوگوں کے مشورے اور رائے کے بغیر کوئی کام نہ کروں گا۔ جب آپ کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں یا آپ کو کسی ظلم وزیادتی کی خبر ملے تو آپ خدا کی قسم! مجھے ضرور اس کی خبر کیجیے گا۔

اس مبارک اصلاح کے ساتھ انھوں نے حکومت کا آغاز کیا اور اپنے دورِ حکومت میں انھوں نے بہت سے مفید کام انجام دیئے ان میں سب سے بڑا کارنامہ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہے۔

خوش لباسی اور نفاست کا یہ حال تھا کہ جس لباس پر ایک مرتبہ کسی کی نظر پڑ جاتی پھر اسے نہ پہنتے تھے، خوشبویات کا بہت شوق تھا۔ داڑھی پر عنبر کا سفوف چھڑکتے تھے۔ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس اور جامہ زیب آدمی مانے جاتے تھے۔

ان کی خلافت کی نامزدگی خود خلیفہ سلیمان نے اپنی وفات سے قبل کردی تھی کیونکہ ان سے بہتر کسی شخص پر نگاہ نہ پڑتی تھی۔ سلیمان کی وفات کے بعد صفر ۹۹ھ میں تخت خلافت سنبھالا۔ سلیمان کی وفات کے بعد اس خیال سے کہ مبادا اہل خاندان عمر بن عبدالعزیز کی بیعت کرنے میں کچھ تامل محسوس کریں موت کی خبر کو مخفی رکھا گیا اور اہل خاندان کو جمع کرکے ان سے سلیمان کے وصیت نامے پر بیعت لی۔ بیعت کو مستحکم کرنے کے بعد سلیمان کی موت کا اعلان رجاء بن حیوۃ نے کردیا اور وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔ عمر بن عبدالعزیز کا نام سن کر صرف ہشام بن عبدالملک نے انکارِ بیعت کیا لیکن رجاء نے کہا خاموشی سے بیعت کرو ورنہ تمہارا سر قلم کردوں گا اور عمر کا ہاتھ پکڑ کر منبر پر بٹھادیا اور کسی نے چوں وچرا نہ کی۔

خلافت کا بوجھ سر پر محسوس کرتے ہی عمر بن عبدالعزیز کے شب وروز بدل گئے اور تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی ابوذر غفاریؓ اور ابوہریرہؓ کا قالبہ اختیار کیا۔ سلیمان کی تجہیز وتکفین سے فراغت کے بعد حسب معمول جب ان کے سامنے شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے اسے واپس کردیا اور فرمایا

"میرے لیے میرا خچیر کافی ہے۔"

عمر خلافت کی عظیم الشان ذمہ داریوں سے گھبراتے تھے۔ پھر خلافت کے بارے میں ان کا جو نقطہ نظر تھا اس کے اعتبار سے وہ شوریٰ سے منتخب نہیں ہوئے تھے۔ آخر غور و فکر کے بعد اس سے دستبرداری کے لیے آمادہ ہو گئے اور مسلمانوں کو جمع کر کے کہا۔

"لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لیے بغیر مجھے خلافت کی ذمہ داریوں میں مبتلا کیا گیا ہے اس لیے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن میں ہے میں خود اسے اتار دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کر لو۔"

یہ تقریر سن کر مجمع نے شور بلند کیا کہ ہم نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے اور ہم سب آپکی خلافت پر راضی ہیں۔

جب انھیں یقین ہو گیا کہ کسی شخص کو ان کی خلافت سے انکار نہیں ہے تو اس وقت آپ نے اس بار عظیم کو قبول کیا۔

اپنی حیثیت واضح ہو جانے کے بعد امورِ خلافت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس بارے میں ان کا مطمع نظر اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اموی حکومت کے پورے نظام میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔

جب سے اسلامی سلطنت نے شہنشاہی سلطنت کا روپ اختیار کیا تھا اس وقت سے مستبد حکومتوں کی تمام برائیاں آ گئی تھیں۔ مذہبی روح کمزور پڑ گئی تھی اور رعایا کی آزادی ختم ہو گئی تھی۔

عمر بن عبد العزیز کا اصل مقصد خلافت راشدہ کا دوبارہ احیاء تھا لیکن اموی حکومت کو دوبارہ جمہوری بنا دینا آپ کے بس میں نہ تھا اس لیے آپ کم از کم برائیاں ختم کر کے اسے خلافت راشدہ سے قریب تر کر دینا چاہتے تھے۔ یہ انقلاب جتنا اہم تھا اتنا ہی نازک اور خطرناک بھی تھا لیکن اس کے باوجود عمر بن عبد العزیز نے کام شروع کر دیا۔

اس سلسلے میں سب سے مقدم فرض رعایا اور زیر دستوں کے اس مال اور جائداد کی واپسی تھی جسے شاہی خاندان کے ارکان، اموی عمال اور دوسرے عمائد نے اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ سب سے پہلے آپ نے یہیں سے ابتدا کی۔ بعض لوگوں نے عرض کیا کہ اگر جاگیریں واپس کر دیں گے تو اولاد کے لیے کیا چھوڑیں گے عمر نے اس پر ایک تقریر کی اور کہا کہ خدا کی قسم کہ اگر اس حق میں تم میری مدد نہ کرو گے تو میں تمہیں ذلیل اور رسوا کر کے چھوڑوں گا۔ اس زد میں خود ان کے ذاتی جاگیر بھی آئی لیکن آپ نے عدل کے مطابق اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو دوسرے جاگیرداروں کے ساتھ روا رکھا۔ انھوں نے جاگیروں کی اسناد کا خریطہ منگوایا۔ مزاحم ان اسناد کو پڑھ پڑھ کر سناتے جاتے تھے اور عمر بن عبد العزیز انھیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک جاری رہا اور اپنی اور اپنے پورے خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی۔

ان کی بیوی فاطمہ کو ان کے والد عبد الملک نے ایک بیش قیمت پتھر دیا تھا عمر نے کہا کہ اسے بیت المال میں داخل کر دو یا مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اطاعت شعار بیوی نے وہ پتھر بیت المال میں داخل کر دیا۔

فدک کا علاقہ خلفائے راشدین کے زمانہ سے ان میں اور اہل بیت میں تنازعہ کا باعث چلا آ رہا تھا وہ آنحضرتؐ کا خالصہ تھا۔ اس کی آمدنی بنی ہاشم پر خرچ کرتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے ایک بار مانگا تو آپؐ نے نہیں دیا اس لیے خلفائے راشدین نے بھی وہ علاقہ اپنے انتظام میں رکھا اور اس کی آمدنی کو ویسے ہی خرچ کیا جیسے حضورؐ کرتے تھے اس طرح وہ علاقہ عمر بن عبد العزیز کے قبضے میں آیا وہ اہل بیت کی وراثت میں نہ تھا اس لیے انھیں بھی نہ دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل کی تحقیقات کر کے فدک کو اپنے ملک سے نکال کر پھر اس کے قدیم مصارف کے لیے مخصوص کر دیا۔

اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیریں واپس کرنے کے بعد عام مغصوبہ اموال کی طرف متوجہ ہوئے اور عمال کے پاس تاکیدی احکام بھیج کر تمام ممالک محروسہ کے غصب شدہ اموال و املاک کو واپس کرایا۔ عمر بن عبد العزیز کا یہ کارنامہ ایسا تھا جس کی مثال تاریخ میں بمشکل دستیاب ہو گی۔ ان کے کارنامے نے بنو امیہ کو بالکل تہی دست کر دیا تھا لیکن انھوں نے کہا کہ میرے لیے اس کے علاوہ چارہ کار کیا ہے کہ طاقتور سے کمزور اور اعلیٰ سے ادنیٰ کو اس کا حق دلاؤں۔

ان کے خاندانوں والوں کو بیت المال سے جو وظائف اور گزارے ملتے تھے بند کر دیئے۔ اموی خلفاء نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنا دیا تھا۔ اس کی آمدنی اور مصارف کسی چیز میں بھی احتیاط نہ برتی جاتی تھی۔ عمر بن عبد العزیز نے اس کی اس بھرپور اصلاح کی اور ان کے ناجائز مصارف بند کر دیئے۔ انھوں نے بیت المال کی حفاظت کا نہایت سخت انتظام کیا۔ ذرا سی بے احتیاطی پر سخت باز پرس کرتے تھے۔ دفتری اخراجات میں کمی اور خلفاء کے تعیش کا تمام سامان بند کر دیا۔ حاجت مندوں میں صدقات کی تقسیم اور قرض داروں کی ادائیگی قرض کا اہتمام کیا گیا۔ اس ساری اصلاحی صورت حال نے رعایا کی مفلوکی کو بہت حد تک ختم کر دیا اور اس پر خوشحالی کے اثرات مرتب ہونے لگے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے فقط ڈھائی برس خلافت کی۔ اس مختصر مدت میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ لوگ عمال کے پاس صدقہ کا مال تقسیم کرانے کے لیے لے جاتے تھے اور کوئی لینے والا نہ ملتا تھا اور وہ لوگ مجبور ہو کر صدقات واپس لے جاتے تھے۔ حضرت عمر کے عہد میں رعایا اتنی آسودہ حال ہو گئی تھی کہ کوئی شخص حاجت مند نہ رہا تھا۔

اموی عمال عموماً ظلم و جور کے خوگر تھے۔ سلیمان نے ایک حد تک ان کا تدارک کیا لیکن آثار ابھی باقی تھے۔ عمر نے اس جانب بھی خصوصی توجہ دی اور حجاج کے پورے خاندان کو جو سب سے زیادہ ظالم تھا، یمن جلاوطن کر دیا اور وہاں کے عامل کو لکھا کہ میں تمہارے پاس آل عقیل کو بھیج رہا ہوں جو عرب میں بدترین خاندان ہے اس کو اپنی حدود حکومت میں منتشر کر دو۔

ان کا دور سراپا عدل تھا۔ انھوں نے ذمیوں کے حقوق کی جیسی حفاظت کی اور ان کے ساتھ جو نرمی برتی اس کی مثال عہد فاروقی کے علاوہ تاریخ اسلام کے کسی دور میں نہیں مل سکتی۔ ان کے وہ مذہبی حقوق جو گذشتہ خلفاء کے عہد میں سلب ہو گئے تھے از سر نو قائم کیے۔

ان کے عہد میں تمام نرمیوں کے باوجود بیت المال کو کسی نقصان کا سامنا کرنا نہیں پڑا بلکہ اس میں اضافہ ہوا اور محاصل کی آمدنی بڑھ گئی۔

ان کی ہر اصلاحی کوشش رفاہ عام کے لیے تھی۔ ان کے عہد میں رعایا کو جو آسائش اور امن ملا وہ ان سے قبل ایک عرصے سے موقوف تھا۔

عمر بن عبد العزیز نے جس طرح حکومت کا ڈھانچہ بدلا اور اس کے ہر شعبہ میں اصلاحات کیں اسی طرح شریعت کا احیا اور اس کی تجدید کی۔

عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ ایمان چند فرائض، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے جس نے ان اجزا کی تکمیل کی اس نے ایمان کو مکمل کر لیا جس نے اس کی تکمیل نہیں کی اس نے ایمان کی تکمیل نہیں کی۔ اگر میں زندہ رہا تو ان تمام اجزاء کو تمہارے سامنے واضح کر دوں گا کہ تم اس پر عمل کرو اور اگر مر گیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی حرص بھی نہیں ہے۔ دوسرے عیش و طرب کے ساتھ ساتھ انھوں نے شراب نوشی کا انسداد بھی کیا اور شراب کی دکانوں کو حکم کے ذریعے بند کر دیا۔

عمر نے اپنے عہد حکومت میں حدودِ سلطنتِ اسلامیہ سے باہر تبلیغ دین کی کوشش کیں، سندھ کے حکمرانوں اور زمینداروں کو قبولِ اسلام کے لیے دعوتی خط لکھے اور ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے عہد میں تبلیغ کے باعث اتنے ذمی مختلف ممالک میں مسلمان ہو گئے کہ جزیے کی آمدنی گھٹ گئی۔ بعض عمال نے حضرت عمر سے شکایت کی آپ نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ ہادی و رہبر بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیل دار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد سے لے کر اس وقت تک اسلامی تاریخ مسلمان کے خون سے رنگین تھی عمر بن عبد العزیز نے اس کو روکنے کے لیے اتنی احتیاط برتی کہ سرکش اور فتنہ جو اسلامی فرقوں کے خلاف بھی تلوار نہ اٹھائی۔

ان کے عہد حکومت کا بنیادی اور اہم وصف یہ تھا کہ انھوں نے ملوکیت کو پھر سے خلافت بنا دیا تھا اور ملوکیت کے گہرے اثرات کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ انھوں نے واضح کیا کہ میں اپنی جانب سے فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں بلکہ احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں۔

علمی لحاظ سے بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ وہ اپنے عہد کے جید عالم تھے اگر سیاسی حالات نے انھیں تخت شاہی پر نہ بٹھا دیا ہوتا تو وہ مسندِ علم کی زینت ہوتے۔ امام نوویؒ کا بیان ہے کہ ان کی جلالتِ شان، فضیلتِ علمی وفورِ علم، صلاح آثار نبوی کے اتباع اور خلفائے راشدین کی پیروی پر سب کا اتفاق ہے۔

اس عہد کے بھی اکابر علماء ان کے سامنے طفل دبستان تھے اس فضل و کمال کا نتیجہ تھا کہ ان کے دربار میں علماء اور ارباب کمال کا مجمع ہو گیا جہاں ان کی بہت قدردانی ہوتی تھی۔ مذہبی تعلیم کی اشاعت کی جانب آپ کی خاص توجہ تھی جو علماءُ اس فرض میں مشغول تھے انھیں فکر معاش سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ان کا سب سے بڑا تعلیمی و مذہبی کارنامہ احادیث نبویؐ کی حفاظت اور اس کی اشاعت ہے اگر انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی ہوتی تو احادیث نبویؐ کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے غیر اسلامی علماء کے علم سے بھی فائدہ اٹھایا اور کئی یونانی کتب کے تراجم اور اشاعت کروائی۔

خلافت کی ذمہ داریوں کے احساس سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ ان کے فضائل اور اخلاق میں سب سے زیادہ تقویٰ و تورع تھا۔ اس تقویٰ کی مثال مسلمان حکمرانوں میں خال خال ہی ملتی ہے۔ حال یہ تھا کہ رات کو دیر تک خلافت کا کام کرتے تھے۔ اس وقت تک بیت المال کی شمع جلاتے۔ جب ذاتی کام شروع کرتے تو اسے گل کر کے اپنا ذاتی چراغ جلا لیتے تھے۔

خلافت سے قبل زندگی تعیش و تنعم سے بسر کرتے تھے۔ خلیفہ ہونے پر لونڈی غلام، لباس اور تمام دیگر سامانِ عیش فروخت کر کے رقم بیت المال میں جمع کر دی ایک وقت تھا کہ دن میں کئی کئی لباس بدلتے لیکن خلافت کا بار سنبھالنے پر فقط ایک ہی لباس رہ گیا اور اسی کو دھو دھو کر پہنا کرتے۔

مرض الموت میں ایک قمیض کے علاوہ دوسری قمیض نہ تھی کہ بدلوائی جاتی آپ کے سالے نے اپنی بہن سے کہا کہ قمیض میلی ہو گئی ہے لوگ عیادت کو آتے ہیں دوسری بدلوا دو۔ یہ سن کر وہ چپ ہو رہیں۔ بھائی نے جب دوبارہ کہا تو بولیں خدا کی قسم! اس کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا نہیں۔

عمر بن عبد العزیز کی مختصر مدت خلافت میں اسلامی حکومت میں اتنی مثبت تبدیلی پیدا ہو گئی کہ عام نگاہ میں اس پر یقین نہیں آتا لیکن ان کی کوششوں سے بہت حد تک مسلمانوں کے ذہنی معاشرتی اور حکومتی رویے میں انقلاب آ چکا تھا اسی سے بعض اوقات بعض لوگ انھیں پانچواں خلیفہ راشد بھی کہہ لیتے ہیں اور صحیح معنوں میں "مجدّد" کا لقب آپ کو سزاوار ہے۔

عمر خیام

ابو الفتح عمر بن ابراہیم خیام۔ فارسی زبان کا ایک عظیم الشان اور عالمی شہرت کا مالک شاعر۔ ریاضی اور ہیئت کا ماہر کامل۔ طغرل کے عہد حکومت میں اس کے پایۂ تخت نیشاپور میں ۱۰۳۹ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام ابراہیم تھا جس کا پیشہ خیمہ دوزی تھا۔ وہ خیام کہلاتا تھا کیونکہ خیام کے معنی خیمہ سینے والے کے ہیں۔ یہ نام عمر کے نام کا بھی جزو بن گیا اور اس نے عمر خیام کے نام سے شہرت حاصل کی۔

عمر خیام کی شعری عظمت کا اعتراف صرف مشرق ہی نہیں مغرب میں بھی کیا گیا ہے۔ اس کی فارسی رباعیات کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر مہذب زبان میں ہو چکا ہے۔ ذوقِ شعر رکھنے والے عمر خیام کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے اور اس کی عظمت فن کو تسلیم کرتے ہیں۔ شاعری میں عمر خیام کی رباعیات کا مقام اتنا بلند ہے اور اسے شاعر کی حیثیت سے ایسی لازوال شہرت حاصل ہے کہ شعر و ادب کی محفل میں اس کے پرستاروں کے درمیان اگر عمر خیام کا تذکرہ ایک سائنس داں کے طور پر کیا جائے تو انھیں حیرت ہوتی ہے حالانکہ شاعری، جس نے عمر خیام کی موت کے بعد اسے شہرت دوام دی خود اس کی زندگی میں محض اوقاتِ فرصت گزارنے کا ذریعہ تھی ورنہ وہ ریاضی و ہیئت کا ایک ماہر کامل تھا۔ اسے سلجوقی دور کا سب سے بڑا سائنس دان کہا جاتا ہے۔

علم و فنون کی تحصیل کے بعد عمر خیام ترکستان چلا گیا جہاں قاضی ابو طاہر نے اس کی تربیت کی اور پھر شمس الملک خاقان بخارا کے دربار میں پہنچا دیا۔ بعد میں ملک شاہ سلجوقی نے اسے اپنے دربار میں بلایا اور رصدگاہ کی تعمیر اس کے سپرد کر دی۔

خیام کا آبائی شہر نیشاپور علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ خیام کی پیدائش سے ایک سال قبل اس پر سلجوقیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ان حکمرانوں نے اپنے عہد میں اس شہر کی علمی ترقی میں اضافہ کیا۔ یہاں کئی بڑے بڑے مدرسے موجود تھے اور علماء کی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں عمر خیام نے پرورش پائی۔

عمر خیام کو ابن سینا کی صحبت تو میسر نہ آ سکی کیونکہ اس کی ولادت سے دو سال قبل اس کا انتقال ہو چکا تھا لیکن بو علی سینا کے شاگردوں سے اس نے ریاضی، ہیئت اور فلسفے کے سبق لیے تھے۔ اس لیے وہ ابن سینا کے فلسفے سے بہت متاثر تھا اور انہیں اپنی تصانیف میں معلمی یعنی 'میرا استاد' کہہ کر یاد کرتا

تھا۔ اس نے طب کی تعلیم بھی پائی۔ اس نے نیشاپور میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ریاضی پر ایک کتاب 'مکعبات' کے نام سے لکھی جس میں اس نے بہت سی ریاضی سے متعلق الجھنیں صاف کیں لیکن اس کتاب کی تصنیف پر صاحبان اقتدار نے تصنیف اور مصنف دونوں پر کوئی توجہ نہ کی تھی۔ عمر خیام نے دل برداشتہ ہو کر سمرقند جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں ان دنوں ایک صاحب ثروت ابوطاہر نامی رہتا تھا جو شاہ ترکستان شمس الملک کے مقربین میں سے تھا۔ اس نے عمر خیام کو جوہر قابل جان کر اپنی سرکار سے منسلک کر لیا اور اس کی بہت قدر کی۔ ابوطاہر کو ریاضی سے بہت دلچسپی تھی اس کے کہنے پر عمر خیام نے اپنی مشہور تصنیف جبر و مقابلہ لکھی۔ اس کتاب کو اس نے ۱۰۶۷ء میں سمرقند میں لکھنا شروع کیا اور ۱۰۷۴ء میں مکمل کیا۔

اسلامی عہد میں یہ الجبرے پر چوتھی یا پانچویں کتاب تھی جو اس مضمون کی پہلی کتاب، یعنی محمد بن موسیٰ خوارزمی کے ڈھائی سو سال بعد تالیف کی گئی تھی اسے اگرچہ ریاضی سے خاص شغف تھا لیکن وہ طب میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک شاہ کے دربار میں اس کا تعارف ایک طبیب کی حیثیت سے ہوا۔ ملک شاہ کے ایک بیٹے کو چیچک نکل آئی اور طبیبوں کے علاج کے باوجود اس کی حالت غیر ہوتی گئی اس وقت عمر خیام کو طلب کیا گیا جس کے علاج سے خدا نے ملک شاہ کے بیٹے سنجر کو شفا بخشی۔ اس کامیابی کے بعد اسے شاہی طبیب کے عہدے پر سرفراز کیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاضی اور ہیئت کے مقابلے میں طب سے اس کی وابستگی اور دلچسپی کم تھی۔

اسے یہ شکایت تھی کہ عوام و خواص ایک طبیب کی حیثیت سے تو اس کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کا ذاتی مفاد وابستہ ہے لیکن ریاضی اور ہیئت میں اس کی شاندار تحقیقات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔

آخر وقت آیا کہ عمر خیام کو ریاضی اور ہیئت داں کی حیثیت سے اپنی لیاقت کا اعتراف حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ ملک شاہ سلجوقی نے اصفہان میں ایک رصدگاہ تعمیر کی اور اس میں عمر خیام کو اعلیٰ افسر کی حیثیت سے مقرر کیا۔ اس نے ایک کثیر رقم آلاتِ رصد کے لیے دی اور رصدگاہ کے عملے میں عمر خیام کے ساتھ سات دیگر ہیئت داں بھی مامور کیے۔ یہاں عمر خیام نے اپنی تحقیقاتی سرگرمیاں تیز کر دیں اور کئی معاملات میں اجتہادی تبدیلیاں کیں۔

عمر خیام نے ۱۱۳۱ء میں وفات پائی اور نیشاپور کے قبرستان میں دفن ہوا۔

عمروؓ بن العاص

مشہور و ممتاز صحابیٔ رسولؐ۔ حبشہ میں مقیم مسلمان مہاجر قافلہ کو حبشہ سے نکلوانے کے لیے کفار مکہ کا جو وفد شاہ نجاشی کے پاس گیا اس کے آپ سرگرم رکن تھے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے اسلام کے اشد ترین دشمنوں میں سے تھے۔ بالآخر ۶۳۱ء میں مسلمان ہوئے اور ہجرت کے وقت مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور جسطرح اسلام قبول کرنے سے پہلے مسلمانوں کی سخت مخالفت کرتے تھے اسی طرح قبولِ اسلام کے بعد قریش کے خلاف سختی سے نبرد آزما ہوئے اور مختلف مہمات میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ معرکہ ذات السلاسل میں ۲۰۰ مجاہدین پر امیر بنا کر بھیجے گئے اور کامیاب ہوئے۔ فتح مکہ کے بعد عمان کے حکمران کے پاس رسولؐ اللہ کا خط لے کر گئے۔ چنانچہ اس حکمران نے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مرتدین کی سرکوبی میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے انہیں عمان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد فلسطین کی مہم پر امیر لشکر بنا کر بھیجا۔ آپ نے اس جنگ میں رومیوں کو عبرت ناک شکست دی۔ اس کے بعد دمشق، فحل اور میسان فتح کر کے سارے روم اور شام پر قبضہ کر لیا اور فاتح روم و شام کہلائے۔ ان فتوحات کے بعد مصر کا رُخ کیا اور مصر سوڈان، طرابلس الغرب اور بصرہ وغیرہ سب علاقے فتح کر لیے اور حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں مصر کا گورنر مقرر کر دیا لیکن بعد میں حضرت عثمانؓ کے عہد میں چند وجوہ کی بناء پر اس عہدے سے معزول کر دیے گئے۔ جس کے بعد آپ نے فلسطین میں خاموش زندگی بسر کی لیکن جب امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان چپقلش شروع ہوئی تو عمرو بن العاص شامی فوج کے امیر مقرر ہوئے اور حضرت علیؓ کے خلاف حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے لڑے۔ یہ لڑائی جنگِ صفین کہلاتی ہے۔ مصر میں ان دنوں محمد بن ابی بکرؓ حضرت علیؓ کی طرف سے گورنر تھے۔ امیر معاویہؓ کے ایماء پر عمرو بن العاصؓ نے مصر پر حملہ کر دیا اور محمد بن ابی بکرؓ کو شکست دے کر خود گورنر بن گئے۔

۵۱ھ میں مصر ہی میں وفات پائی۔ خارجیوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ انہیں بھی قتل کرنے کی سازش کی تھی مگر اس سے بچ گئے۔ رسولؐ اللہ کی بہت سی احادیث بھی آپ نے روایت کی ہیں۔

عمروؓ بن امیہ

صحابیٔ رسولؐ۔ نام عمرو۔ کنیت ابو امیہ۔ جنگ بدر اور جنگ احد میں مشرکین کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف حصہ لیا تھا۔ بعد میں اسلام قبول کرنے پر مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے اور رسول اکرمؐ کے ہم رکاب تمام غزوات میں حصہ لیا۔

سب سے پہلے ۴ھ میں غزوۂ بیر معونہ میں شریک ہوئے اسی سلسلے میں قبیلہ رعل اور ذکوان نے ان ستر آدمیوں کی جماعت کو جو حضرت منذرؓ بن عمر کی ماتحتی میں تبلیغ اسلام کے لیے گئی تھی۔ تہہ تیغ کر دیا۔ صرف حضرت عمروؓ بن امیہ ہی بچ سکے۔ ۶ھ میں نجاشی (شاہ حبشہ) کے پاس حضور اکرمؐ کا خط لے کر گئے۔ اس خط میں رسولؐ اللہ نے ام حبیبہ کو نکاح کا پیغام بھی دیا تھا جو اس وقت حبشہ میں مقیم تھیں چنانچہ نجاشی نے حضور اکرمؐ کی طرف سے خود وکیل بن کر خود رسم نکاح ادا کی اور چار سو دینار مہر موجل ادا کیے۔

عمروؓ بن جموع

قبیلہ خزرج سے تھا اور بنو سلمہ کے رئیس۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے اتنے کٹر بُت پرست تھے کہ لکڑی کا بت بنا کر گھر میں رکھا تھا اور اسے ہر وقت پوجتے رہتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے دین کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ باوجود ایک ٹانگ سے محروم ہونے کے جہاد میں شرکت کے لیے اصرار کرتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر حضور اکرمؐ نے غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت دے دی۔ لڑنے سے پہلے اپنی شہادت کے لیے دعا کی۔ چنانچہ دوران جنگ اپنے فرزند کے ساتھ شہید ہو گئے۔ ثروت اور سخاوت میں اتنے مشہور تھے کہ اسی بناء پر آپ کو بنو سلمہ کا رئیس بنا دیا گیا۔

رسول اکرمؐ جب بھی نکاح کرتے تھے تو اُن کی طرف سے عمروؓ بن جموع ولیمہ کی دعوت کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

عمروؓ بن حزم

صحابئ رسولؐ۔ نام عمرو۔ کنیت ابوالضحاک۔ خاندان بنجار۔ ہجرت کے بعد اسلام لائے تو غزوۂ خندق اور اس کے بعد تمام غزوات میں شرکت کی۔ ۱۰ھ میں نجران کے حاکم بنائے گئے۔ وصالِ نبیؐ کے بعد مدینہ میں آ گئے۔ ۵۱ھ میں یہیں انتقال ہوا۔

قرآن اور فقہ کے بہت ماہر تھے۔ علمی قابلیت کے لحاظ سے انصار میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ اسی باعث نجران کے حکمران بنائے گئے۔

احادیث کے سلسلے میں بہت سی روایات آپ سے منسوب ہیں۔ امیر معاویہؓ نے جب یزید کی خلافت کے لیے لوگوں سے بیعت لینی شروع کی تو حضرت عمروؓ بن حزم نے اس کی سخت مخالفت کی۔

عمرو بن ربیعہ

عہدِ اسلام کا امام المتغزلین۔ پیدائش ۲۳ھ/۶۴۴ء میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی رات ہوئی۔ خاندانی وجاہت ورثے میں حاصل کی تھی۔ باپ کا نام عبداللہ تھا جو رسولِ اکرمؐ اور خلفائے ثلاثہ کے عہد میں گورنری کے عہدے پر فائز رہے۔

عمر بن ربیعہ بچپن سے شعر کہتا تھا۔ بڑا ہوا تو مغنیات اور اربابِ نشاط کا شاعر بن گیا۔ عورت اس کے اشعار کا خاص موضوع تھی۔ شعروں میں اس کی تعریف کرتا۔ چھپ چھپ کر اس سے ملتا اور اس کے عشوہ و ادا کو شعر میں ڈھالتا تھا۔

اس کی شاعری کے عروج کے زمانے میں پردہ نشین خواتین نے اس کے اشعار کا موضوع بننے کے خوف سے حج پر جانا بند کر دیا تھا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو اموی خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز نے اس کو علاقہ بدر کر دیا۔ توبہ کے بعد واپسی کی اجازت مل گئی۔ پھر ساری زندگی خاموش رہا۔ آخری عمر میں زاہد و پرہیزگار بن گیا تھا۔

صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کا مکمل دیوان پہلی بار ۱۹۰۱ء میں اور دوبارہ ۱۹۰۹ء میں طبع ہوا۔

عمروؓ بن سعید بن العاص

نام عمرو۔ کنیت ابوعقبہ۔ قبیلہ بنو مخزوم۔ اسلام کے مشہور سپہ سالار خالد بن ولید کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور ان سے قبل مکہ میں مسلمان ہوئے تھے۔

ہجرتِ ثانیہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ مکہ سے حبشہ کو ہجرت کی جہاں سے غزواتِ خیبر کے دوران مدینہ آ گئے اور تمام غزوات میں رسول اللہ کا ساتھ دیا۔

آنحضرت صلعم نے اپنی زندگی میں انہیں مختلف مقامات یعنی تبوک، خیبر اور فدک وغیرہ کا گورنر مقرر کیا۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اصرار کے باوجود گورنری چھوڑ دی اور معرکۂ شام میں معمولی سپاہی کی حیثیت میں لڑے۔

۱۳ھ میں جنگ اجنادین میں شہادت پائی۔

عمرو بن عبدود

عربوں کے ایک بہت بڑے بُت کا نام تھا۔ اس کے نام پر مشرکین اکثر اپنے نام رکھ لیا کرتے تھے۔ عمرو بن عبدوُد مشرکین کا ایک شہ زور پہلوان اور سردار تھا۔ اسے حضرت علیؓ نے جنگ میں اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

عمرو بن معدی کرب

عرب جاہلیت کا نامور شاعر۔ یمن کے قبیلہ بنو زبیدہ کا فرزند۔ ۵۴۲ء کو پیدا ہوا۔ شہسوار اور زور آور تھا۔ اسلام کا زمانہ پایا اور ۶۳۱ء میں مسلمان ہوا۔ معرکۂ قادسیہ میں شریک رہا۔ حضور اکرمؐ کے وصال کے بعد مرتد ہوا۔ اس کا کوئی علیحدہ شعری مجموعہ نہیں ملتا۔ ادب کی مختلف کتابوں میں جستہ جستہ اشعار موجود ہیں۔

عمرہ

حج کی ایک قسم۔ بعض لوگ اسے حج اصغر بھی کہتے ہیں۔ حج اور عمرہ میں فرق یہ ہے کہ حج ۸ اور ۱۳ ذوالحجہ کے درمیان ہوتا ہے لیکن عمرہ ایامِ حج کے علاوہ سال بھر میں کسی دن بھی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ عمرہ کے واسطے بھی اسی طرح احرام باندھا جاتا ہے۔ اسی طرح سعی و طواف بھی ہوتا ہے۔ ارکان دونوں کے یکساں ہیں سوائے اس کے کہ وقوفِ عرفات اور قربانی حج میں ہے لیکن عمرہ میں نہیں۔

عمرہ کا بہت ثواب ہے۔ خاص طور پر رمضان کے مہینے میں عمرہ کا ثواب زیادہ ہے۔ حاجی لوگ عموماً حج کے موقعہ پر عمرہ کی نیت بھی کر لیتے ہیں اور عمرہ کا احرام باندھ کر تمام ارکان پورے کر لیتے ہیں اور ۸ ذوالحجہ سے قبل احرام کھول کر دوبارہ حج کا احرام باندھ لیتے ہیں اس کو قران کہا جاتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے ۶ھ میں عمرہ کیا تھا۔ حج ایک اجتماعی عبادت ہے اور عمرہ انفرادی۔

عمرۂ قضا

حضور اکرمؐ نے ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر احرام باندھا تھا مگر اس سال چونکہ صلح کی شرائط کے تحت آپؐ عمرہ نہ فرما سکے اس لیے اگلے سال میں عمرہ ادا کیا۔ چونکہ آپؐ پہلے اس کی نیت فرما چکے تھے لیکن مجبوری کے باعث اسے ادا نہ کر سکے اس لیے اس کو عمرۂ "قضا" کہا جاتا ہے۔

ہجرت کرنے کے بعد آپؐ پہلی مرتبہ مکہ تشریف لائے تھے اس لیے یہ عمرہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کفارِ قریش مسلمانوں کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے نہ دیکھ سکتے تھے اس لیے شہر سے باہر چلے گئے۔ آپؐ نے طواف کے سلسلے میں حکم دیا کہ پہلے تین طواف جلد جلد کیے جائیں چنانچہ اس وقت سے یہ سنت چلی آ رہی ہے۔ اس کو "رمل" کہتے ہیں۔ آپؐ نے تین روز مکہ معظمہ میں قیام فرمایا اور پھر مدینہ تشریف لے گئے۔

عمل سیئہ

بُرے اعمال۔ وہ اعمال جن سے خدا کی نافرمانی ہو اور مخلوق کو انفرادی یا اجتماعی طور پر نقصان پہنچے۔ سود، رشوت، قتل، حرام کاری، غیبت، جھوٹ، خلاف قانون گراوٹ، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹنگ وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ عمل سیئہ (بُرے عمل) کا مرتکب خالق اور مخلوق کی نگاہ میں مغضوب ترین ہے لیکن افادۂ عام کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کی اطاعت کی راہ سے ہٹ کر خدمتِ خلق کیجئے

بلکہ خدمت خلق نتیجہ ہے عبادت خداوندی کا۔

عمل صالح

اچھے عمل۔ ان امور کو عمل صالح کا نام دیا جاتا ہے۔ جو مومن آدمی رضاء الٰہی کی خاطر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ہمیشہ آیا ہے جس کی وجہ سے بعض اسلاف کا موقف ہے کہ ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں یعنی اگر کوئی آدمی کلمہ پڑھتا ہے لیکن نماز روزہ و دیگر فرائض ادا نہیں کرتا تو ایسا شخص مومن نہیں ہو سکتا جبکہ سلف صالحین کا نقطۂ نظر ہے کہ عمل صالح ایمان کا جزو تو نہیں البتہ نتیجہ ضرور ہے یعنی ایمان لانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ انسان عمل صالح کرے۔ عمل صالح نہ کرنے سے ایمان کے ابطال کا نہیں تو فساد ایمان کا اندیشہ ضرور ہے تاہم ایک کلمہ گو کی شان کے یہ بات منافی ہے کہ اس کے قول و عمل میں تضاد اور بُعد ہو۔

عمیر بن ابی وقاص رضؓ

نام عمیر، والد کا نام ابو وقاص۔ حضرت سعد بن ابی وقاص مشہور صحابی اور فاتح ایران کے حقیقی بھائی۔ انہی کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۴ برس تھی۔ چنانچہ آپ اپنے بھائی اور دیگر مسلمانوں کے ہمراہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر آئے اور اسلام کی پہلی باضابطہ جنگ، جنگ بدر میں شریک ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن رسول اللہؐ نے کم سنی کے باعث انہیں اجازت نہ دی لیکن ان کا بے حد اصرار دیکھ کر آپؐ نے شمولیت کی اجازت دے دی چنانچہ یہ بڑی ہمت اور جوانمردی سے لڑے اور عمرو بن عبد ودّ کے ہاتھوں شہادت پائی۔ کمسن مجاہدین میں آپؓ نے شجاعت اور جاں نثاری کی عظیم الشان روایات قائم کیں۔

عمیر بن سعد رضؓ

نام عمیر۔ لقب نسیج وحدہ۔ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہوئے لیکن کم عمری کے باعث کسی غزوہ میں شریک نہ ہو سکے البتہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں فتوحات شام کے سلسلہ میں انہیں ایک لشکر کا افسر بنایا گیا۔ حمص کے حاکم مقرر کیے گئے جہاں آخر دم تک رہے۔ امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں وفات پائی۔ افضل صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ امور خلافت میں حضرت عمرؓ ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ لیاقت و قابلیت میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے اسی لیے آپ کا لقب "نسیج وحدہ" (یکتا و یگانہ) پڑا۔ حضرت عمیرؓ بن سعد سے چند احادیث نبویؐ بھی مروی ہیں۔

عمیر بن عوف

صحابئ رسولؐ۔ انہوں نے اپنی شدت ایمان اور حضورؐ سے فرط عقیدت کے باعث کئی کفار کو اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارا۔

عصما بنت مروان، ایک کافر عورت کا وطیرہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو ابھارتی اکساتی اور کہتی کہ اسلام کوئی اچھا مذہب نہیں ہے۔ حضور اکرمؐ کی شان میں بھی اس نے بہت سی نازیبا باتیں کہیں۔ عمیرؓ بن عوف رات کے وقت اس کے گھر پہنچے عصما اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ عمیرؓ کی نگاہ کمزور تھی اس لیے پہلے تو انہوں نے ٹٹول کر اس سے بچے کو جدا کیا پھر تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔

عمیر بن عوفؓ، نبی اکرمؐ کو عصما کے قتل کی اطلاع دے کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں اسے عصما کے رشتے دار مل گئے۔ ان میں سے کسی نے پوچھا تم نے عصما کو قتل کیا ہے۔ عمیرؓ نے جواب دیا ہاں۔ اس کا قاتل میں ہوں تم سے جو ہو سکے کر لو۔ خدا کی قسم اگر تم بھی وہی بات کہو جو عصما نے کہی تھی تو ابھی تلوار کھینچ لیتا ہوں یا تم مجھے مار ڈالو گے یا میں تمہیں ہلاک کروں گا۔ ان کی بے باکی اور جرأت کا یہ اثر ہوا کہ بنی حطمہ میں قبول اسلام کے لیے زمین ہموار ہو گئی اور لوگ دھڑلے سے حلقۂ اسلام میں آ شامل ہوئے۔

عمیرؓ بن وہب

صحابئ رسولؐ۔ نام عمیرؓ۔ کنیت ابو امیہ۔ قریش کے مشہور بہادر تھے اور ابتداء میں اسلام کے سخت دشمن تھے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف لڑے قریش نے آپ کو رسول اللہؐ کے قتل کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار لے کر رسول اللہؐ کو قتل کرنے مسجد نبویؐ میں پہنچے لیکن وہاں پہنچ کر عقیدہ بدل گیا اور صدق دل سے مسلمان ہو کر واپس لوٹے اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعے مکہ میں بہت سے مشرکین اور کفار کو مسلمان کیا۔ جنگ اُحد سے قبل مدینہ لوٹ آئے اور باقی تمام غزوات میں نبی اکرمؐ کے ہمرکاب رہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں بھی کئی مہموں میں تلوار کے جوہر دکھائے۔ عمرو بن العاصؓ کی فتوحات مصر کے دوران میں جب سکندریہ کی فتح میں دیر لگی تو حضرت عمرؓ نے دس ہزار امدادی فوج جن چار امراء کی سرکردگی میں روانہ کی ان میں سے ایک حضرت عمیرؓ بن وہب بھی تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے آخری دور میں فوت ہوئے۔

عنایت اللہ خان مشرقی، علامہ

خاکسار تحریک کے بانی۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد عطا محمد خان امرتسر کے مشہور رئیس اور غالب و سر سید کے ہم نشین تھے۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان امرتسر کالج سے اعزازی نمبروں میں پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ مزید تعلیم کے لیے لاہور آئے فارمن کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور مزید وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۸ سال کی عمر میں ایم اے ریاضی کے امتحان میں نہ صرف صوبہ بھر میں اوّل آئے بلکہ یونیورسٹی کے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

علامہ مشرقی سے پہلے علم ریاضی برصغیر کے مسلمانوں کے ہاں بہت کم تھا اس لیے "ٹریبیون" نے اس کامیابی پر لکھا کہ اب کوئی شخص مسلمانوں کو ریاضی سے عدم واقفیت کا طعنہ نہیں دے سکے گا۔ برصغیر میں انگریزوں کے تسلّط کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بڑا قحط تھا چنانچہ علامہ مشرقی کو کئی سرکاری عہدے پیش کیے گئے لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے والد نے سرکاری وظیفے کا انتظار کیے بغیر انہیں اپنے خرچ پر انگلستان بھیج دیا۔

۱۹۰۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج سے ریاضی کے مقابلے کے امتحان میں جس میں سترہ کالج شامل تھے، شاندار کامیابی پر انہیں ستّر پونڈ وظیفہ اور "فاؤنڈیشن سکالر" کا لقب ملا۔ ۱۹۰۹ء میں ٹرائی پوس کے تین امتحانات (ریاضی، عربی، فارسی میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ مزید وظیفے کے ساتھ "بیچلر اسکالر" کا خطاب ملا اس سے پہلے یہ خطاب کسی کو نہیں ملا تھا۔ اس پر انگلستان کے اخباروں نے علامہ مشرقی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

۱۹۱۲ء میں انجینئرنگ کے سب سے بڑے امتحان مکینیکل سائنس "ٹرائپس" میں

شامل ہوئے اور صرف ایک سال میں بی۔ای آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

پانچ برس کی قلیل مدت میں چار آنرز حاصل کر لینا صرف علامہ مشرقی کا ہی اعزاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے متعدد رسالوں اور دنیا کے ایک بڑے اخبار لندن ٹائمز نے آپ کو سائنس کے موضوع پر مضامین لکھنے کی دعوت دی۔

۱۹۱۲ء کے اواخر میں ایک بڑی ریاست کے مہاراجہ نے مدعو کر کے ریاست کی وزارت ایک ہزار روپیہ کی ابتدائی تنخواہ پر قبول کرنے کی پیشکش کی لیکن علامہ مشرقی نے شخصی ملازمت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب آپ عازم وطن ہوئے تو اس وقت بھی ایک عہدے کی پیشکش ہوئی مگر انہوں نے منظور نہ کیا۔

وطن پہنچنے سے پہلے علامہ مشرقی نے پورے یورپ کی سیاحت کی اور اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں سے ملے۔ جرمنی ان دنوں ہر لحاظ سے پستی میں تھا۔ ہٹلر ایک مزدور جماعت کے کارکن کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ علامہ مشرقی نے ہٹلر کے علاوہ آئن سٹائن اور وائل سے بھی ملاقاتیں کیں۔

وطن واپس پہنچنے کے بعد گورنر سرحد جارج سیل کے کہنے پر علامہ مشرقی اسلامیہ کالج پشاور کے وائس چانسلر بن گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ترقی دے کر آپ کو چانسلر بنا دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے فیڈ کے انڈر سیکرٹری کا عہدہ دے دیا۔ اختتام ملازمت پر گورنر کی سفارش پر۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کو ایک ہزار روپے ماہوار پر انڈین ایجوکیشنل سروس آئی۔ ای سی کا مستقل عہدہ دے کر پشاور بھیج دیا گیا۔

اس اثناء میں علامہ مشرقی مختلف عہدوں پر یعنی پرنسپل ٹریننگ کالج پشاور، پرنسپل گورنمنٹ ہائی اسکول۔ انسپکٹر آف اسکولز رجسٹرار وغیرہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے صوبہ سرحد کے سرکاری مدارس میں قرآنی تعلیم کا اجراء حکومت کی شدید مخالفت کے باوجود کر دیا۔ جمعیت اسلامی میں علامہ مشرقی بہت آگے تھے۔

۱۹۴۰ء میں جب سرہملٹن گرانٹ گورنر سرحد تھے مسلمان کابل کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اس ہجرت نے انگریز حکومت کو بہت پریشان اور خوفزدہ کر دیا۔ علامہ صاحب اگرچہ ہجرت کے انجام سے بہت پریشان تھے انہیں اس ہجرت کے غیر منظم ہونے کی وجہ سے بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی اس کے باوجود جب حکومت نے علامہ صاحب کو پولیٹیکل سیکرٹری کا عہدہ پیش کرتے ہوئے کہا "اس وقت حکومت کی خدمت کا نادر موقع ہے اور تم سے زیادہ قابل شخص اور کوئی نہیں" نائٹ ہڈ" یعنی سر کا خطاب۔ پندرہ سو روپیہ تنخواہ اور آئندہ چار ہزار ماہوار پر کابل سفارت قبول کر لو" تو علامہ صاحب کی غیرت اسلامی نے گوارا نہ کیا کہ ایک لفظ "سر" کی خاطر مسلمانوں کو جو خدا کی راہ میں اپنا گھر بار لٹ چکے تھے جانے سے روکیں چنانچہ آپ نے حکومت کو لکھ بھیجا کہ مجھے یہ اعزازات منظور نہیں اگر حکومت مجبور کرے گی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ اس واضح انکار پر حکومت کی نظریں علامہ مشرقی کی طرف سے پھر گئیں اور انتقامی طور پر تمام عہدے چھین کر سکول کی ہیڈ ماسٹری کے عہدے پر لا کھڑا کیا۔

علامہ مشرقی مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کے آئینے میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب مسلمان فروعی تعصبات میں الجھے ہوئے تھے۔ توحید و سنت کی جگہ شرک و بدعات نے لے لی تھی۔ علامہ نے ان حالات سے متاثر ہو کر "تذکرہ" نامی کتاب لکھی جسے بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی شہرت کی بناء پر موتمر خلافت کے اجلاس منعقدہ قاہرہ (مصر) میں شیخ الاسلام نے آپ کو شمولیت کی دعوت دی۔ اس موقع پر آپ نے جو تقریر کی اس نے بھی بہت دھوم مچا دی۔ ۱۹۲۶ء میں فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی نے آپ کو فیلوشپ دے دی اور اسی سال جیوا گرافیکل سوسائٹی پیرس کی طرف سے بھی علامہ مشرقی کو فیلوشپ پیش کی گئی۔ ۱۹۳۱ء میں انٹرنیشنل کانگریس آف آرٹس کا ممبر بنا کر دعوت دی گئی کہ "تذکرہ" کے متعلق اجلاس میں تقریر کریں۔ یہ وہ بین الاقوامی مجلس ہے جس کے ممبر تمام دنیا میں بیک وقت ایک سو سے زائد منتخب نہیں ہو سکتے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ نے "اشارات" تصنیف کی اور سیاست میں عملاً حصہ لینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی عسکری قوت ختم ہو چکی تھی۔ علامہ مشرقی نے جذبۂ حریت کی جلا کے لیے خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی جس کا منشور نظم و ضبط، خدمت خلق اور اطاعت امیر تھا۔ اس وقت آپ صوبہ سرحد میں کئی عہدوں پر فائز تھے۔ عملی طور پر میدان میں آنے کی وجہ سے حکومت نے طلب کیا۔ عدم حاضری کی صورت میں سروس سے علیحدہ کر دینے کی دھمکی بھی دی۔ علامہ مشرقی لاہور سے ایک دستہ اپنے جاں نثار سپاہیوں کا لے کر پشاور پہنچے۔ حکومت جو خاکسار تحریک کو اپنے لیے خطرناک سمجھتی تھی اس دستے کو دیکھ کر برہم ہو گئی اور آپ کو سرکاری ملازمت سے سبکدوش کر دینے کی اطلاع دے دی گئی۔

انگریز مسلمانوں میں سپاہیانہ جذبہ دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا جبکہ علامہ مشرقی بہر صورت عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے کوشاں تھے اور خاکسار تحریک کو اسی مقصد کے لیے انہوں نے منظم کیا تھا جو نیم فوجی اور نیم اصلاحی جماعت کے طور پر ابھرتی تھی۔ جلد ہی اس نے ملک گیر صورت اختیار کر لی۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں کافی خون خرابے کے بعد حکومت نے اسے خلاف قانون قرار دے دیا لیکن یہ جماعت کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہی مگر پنپ نہ سکی۔

علامہ مشرقی بلند پایہ انشا پرداز، فلسفی اور مورخ تھے ان کی کتابوں نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ انگریز اور انگریزی تہذیب سے شدید نفرت تھی اور یورپ میں عرصہ دراز و با اعزاز رہنے کے باوجود ان کی نفرت انتقام میں ڈھل چکی تھی۔

علامہ مشرقی بڑی با اصول زندگی گزارتے تھے اور اسی وجہ سے بنا عیب زیادہ تھا۔ سختی بھی کرتے اور کہہ دیتے کہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ قوم کانٹوں سے الجھنا سیکھ لے۔ لباس و طعام میں بہت سادہ تھے۔ اعلیٰ و ادنیٰ سے برابر سلوک کرتے۔

علامہ مشرقی اس دور کے ان بڑے آدمیوں میں سے تھے جنہوں نے ذلت، نکبت اور رسومات و بدعات کے بھنور میں پھنسی ہوئی قوم کو سرخروئی عافیت پر لانے کے لیے بے انتہا جدوجہد کی۔ آپ میدان سیاست و علم کے شہسوار ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ شاعری کو ناپسند ہی نہیں قوم کی تعمیر کے لیے مضر قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں علم ہوگا وہاں شاعری نہیں پنپے گی۔ کسی قوم میں شاعری کا عروج علم کے زوال کی علامت ہوتی ہے تاہم تعمیری شعر کے نہ صرف مداح تھے بلکہ خود بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔

علامہ مشرقی سرسید احمد خان اور مولانا حالی کی طرح مسلکاً سلفی ہونے کی وجہ سے اسلام کو قرن اولیٰ کی طرح صحیح روپ میں پیش کرنے کے شدید خواہشمند تھے اور اس سلسلے میں آپ بعض دفعہ حد اعتدال سے بھی گذر جاتے تھے لیکن مغرب کے باوجود مغرب کے فلسفے سے مرعوب نہیں تھے۔ وہ قرآنی فلسفہ پیش کرنے کے مدعی تھے۔ مسلمانوں کی علمی تہذیبی اور تنظیمی صلاحیتوں کے خلا کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے خاکسار تحریک کو بہت منظم بنایا اور اس پر بڑی محنت کی۔ اپنی جائیداد کو اس کی ترقی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ نے کئی ایک کتابیں لکھیں "تذکرہ" اور "اشارات" کے علاوہ خریطہ، قول فیصل اور مولوی کا غلط مذہب بہت مشہور ہیں۔ ۲۷ اگست ۱۹۶۳ء کو آپ کا لاہور میں انتقال ہوا اور ادارہ علیہ اچھرہ میں دفن ہوئے۔

عنصری

(۹۶۱ء - ۱۰۳۹ء) فارسی زبان کا شاعر- ابوالقاسم حسن بن احمد بلخی، سلطان محمود غزنوی کے دربار کا ملک الشعراء- اس کا باپ تاجر تھا- عنصری نے بھی آبائی پیشے کو ذریعہ معاش بنایا- ایک سفر میں چوروں نے اس کا سارا سرمایہ لوٹ لیا- یہ حادثہ اس کی شاعری کا باعث بن گیا- اس میں اسے خوب شہرت حاصل ہوئی- سلطان محمود غزنوی کے دربار میں اسے بڑی اہمیت حاصل تھی اور امراء کی طرح زندگی بسر کرتا تھا- اس کا دیوان قصائد، قطعات، رباعیات اور مثنویوں کے بعض اشعار پر مشتمل ہے-

عنقا

ایک موہوم اور معدوم پرندہ جس کا ذکر موہومات کے ضمن میں کیا جاتا ہے اگر موجود ہے تو اسے دیکھا کسی نے بھی نہیں اور اگر معدوم ہے تو قصہ ختم- محاوراتی زبان میں یہ بڑا معروف ہے- جو چیز دیکھنے میں نہ آتی ہو اسے عنقا کہا جاتا ہے حالانکہ یہ خود "عنقا" ہے-

عود

خوشبودار لکڑی- سوسن کی قسم کا ایک بہت بڑا پودا جس کی پچاس کے قریب اقسام ہیں- جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے جہاں سے اس کی لکڑی تمام دنیا میں برآمد کی جاتی ہے- برصغیر میں اس کا نام "اگر" ہے- یہ لکڑی خوشبو کے لیے جلائی جاتی ہے- قدیم بادشاہوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درباروں اور محلوں میں عود جلانے کے لیے ایک خاص عملہ مقرر ہوتا تھا- قدیم یونانی دیوتاؤں کی پرستش کے موقع پر یہی لکڑی جلائی جاتی تھی-

جب بنی اسرائیل نے یروشلم میں اپنا عبادت خانہ تعمیر کیا تو ڈیوڑھی پر عود کی لکڑی جلایا کرتے تھے- چنانچہ بائیبل کے "عہدِ عتیق" میں جا بجا اس رسم کا ذکر آتا ہے اسے عودِ ہندی بھی کہا جاتا ہے- بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے (عورتوں سے) فرمایا تم غدرہ (بچوں کے حلق کی بیماری) میں بچوں کے حلق کیوں دباتی ہو، عود ہندی سے ان کا علاج کیا کرو یعنی حلق میں ٹپکایا کرو اس میں سات بیماریوں کی شفا ہے جن میں ایک پسلی کا درد بھی ہے- اس میں عود ہندی کو درد والی جانب سے منہ کے ذریعے ٹپکایا کرو-

عویم بن ساعدہ

صحابئ رسولؐ- نام عویم- کنیت ابوعبدالرحمٰن- قبیلہ اوس- عقبہ ثانیہ کے موقع پر اسلام قبول کیا اور آنحضرتؐ کے اصحابؓ میں شامل ہو گئے اور تمام غزوات میں حضورؐ کے ہمرکاب رہے- وصال نبویؐ پر جب انصار و مہاجرین کے درمیان خلافت پر جھگڑا ہو گیا اور ہر فریق اپنے میں سے خلیفہ کا انتخاب چاہنے لگا تو حضرت عویمؓ انصار سے متعلق ہونے کے باوجود مہاجرین سے خلیفہ کے انتخاب کے حق میں تھے- آپ صفائی اور پاکیزگی میں بہت خیال رکھتے تھے- سب سے پہلے آپ ہی نے استنجا کے لیے پانی کا استعمال کیا جسے حضورؐ نے بہت پسند فرمایا اور جب قرآن پاک میں اس نئے طرزِ عمل کی تعریف کی گئی تو تمام مسلمانوں میں اس کا رواج ہو گیا اور یہ طہارت کا اصول قرار پایا- کتب احادیث میں آپ سے صرف ایک روایت مروی ہے- حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ۶۵ برس کی عمر میں انتقال فرمایا- (ع ر)

عہد

عہد کے معنی اس قول کے ہیں جو کسی بات پر عمل پیرا ہونے کے لیے زبانی دیا جائے اور عملی طور پر اس کا استقامت سے پاس کیا جائے- کسی بات کا وعدہ یا قول کر کے اس سے ہٹ جانا بدعہدی ہے اور انسانی وقار اور فائدے کے لیے بہتر یہی ہے کہ عہد کا پاس کیا جائے- قرآن مجید میں ہے "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو"

مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں "اللہ کے عہد" کی تشریح یوں کی ہے کہ "اس سے مراد عہد بھی ہے جو انسان خدا سے کرے اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے اور وہ بھی جو انسان اور خدا، انسان اور انسان کے درمیان اسی وقت آپ سے بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے"-

پہلے دونوں عہد شعوری و ارادی ہیں اور یہ تیسرا عہد ایک فطری عہد ہے جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے اس کی عطا کی ہوئی جسمی و نفسی قوتوں سے، اس کی زمین، رزق اور ذرائع سے فائدہ اٹھانا، یہ سب کچھ سب فطری طور پر کچھ حقوق انسان پر عائد کر دیتا ہے-

قرآن میں ایک فطری عہد کا ذکر بھی ہے- یہ اسی عہد کا فطری اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے کیونکہ اس کے امر کی پیروی سے منہ موڑنا اور خودسری و خودمختاری یا غیر کی بندگی کی جانب قدم بڑھانا انسان کی طرف سے اس عہد کی اولین خلاف ورزی ہے جس کے بعد ہر قدم پر اس کی دفعات ٹوٹتی چلی جاتی ہیں لیکن یہ طریقہ انسان کے لیے یوں نقصان دہ ہے کہ بدعہدی پر عمل پیرا ہونے کے بعد یکسوئی اور سیدھی راہ آدمی سے چھن جاتی ہے اور اس کے سامنے اتنے مختلف رنگ اور راستے آ جاتے ہیں کہ ان میں صحیح اور غلط کا انتخاب اور پہچان کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے-

عہد نامہ عتیق

انتالیس کتابوں پر مشتمل ہے- ان میں سے پہلی پانچ کتابوں کے مجموعے کو تورات کہا جاتا ہے- یہ کتابیں ابتداء میں ایک ہی وحدت کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن ۸۵-۲۸۴ ق-م میں ۷۲ علمائے یہود نے اس کتاب کا عبرانی زبان سے یونانی میں ترجمہ کیا اور مضامین کے اعتبار سے کتاب کو مذکورہ بالا پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا- آیات و ابواب کی تقسیم ۱۲ ویں کارڈینل ہوگو نے کی- اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی- اس وقت دنیا کے پاس اس کا اصل عبرانی نسخہ موجود نہیں ہے کیونکہ بنی اسرائیل کی تباہیوں کے نتیجے میں ان کا مذہبی اور علمی سرمایہ بار بار مرتب ہوتا رہا- آج تک اس مذہبی سرمائے کی مقدار پر اتفاق نہ ہو سکا بلکہ عہد نامہ عتیق کی کتابوں کی مجموعی تعداد تک میں اختلاف ہے- علاوہ ازیں ان کے مستند اور غیر مستند ہونے کا مسئلہ الگ ہے- بابل کی اسیری کے بعد عذرہ فقیہہ نے ۲۰۴ کتابوں کو املا کرایا- ان کتابوں میں سے ایک بڑی تعداد کو عوام الناس سے پوشیدہ رکھا گیا کہ عام لوگ اس قابل نہیں کہ ان کے سامنے یہ علوم پیش کیے جا سکیں- صرف خواص ہی ان کے سینہ بہ سینہ تعلیم حاصل کر سکتے تھے- ایسی کتابوں کی تعداد ۷۰ تھی لیکن اس کے برعکس یہودیوں کا مستند مورخ جوزیفس جو پہلی صدی عیسوی میں گزرا ہے اور مشہور

کتاب JEWS ANTIQUITIES کا مصنف ہے ان کی تعداد صرف ۲۲ بتاتا ہے موجودہ انتالیس کتابوں میں سے ۱۷ ایسی کتابوں کے نام اور حوالے درج ہیں جو آج ناپید ہیں۔ اس لیے مغربی محققین کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہودیوں نے اپنی لاپرواہی اور دینی غفلت کی وجہ سے متعدد کتابوں کو ضائع کردیا۔ ان کتابوں کے علاوہ ۳۵ یا ۳۸ (باختلاف روایت) ایسی کتابیں تھیں جو کسی نہ کسی وقت عہد نامہ عتیق میں شامل تھیں اور عبادت گاہوں میں ان کی تلاوت سال ہا سال تک ہوتی رہی پروٹسٹنٹ فرقے نے انہیں اپوکریفا قرار دے کر خارج کردیا۔ متفقہ روایات کی رُو سے ۵۲ یا ۵۵ کتابوں کو عہد نامہ عتیق سے خارج کردیا گیا حالانکہ ضروری نہیں کہ جو مواد خارج کیا گیا سب کا سب جعلی ہو۔ یہ کام نقد و جرح کے مسلمہ اصولوں کے مطابق نہیں بلکہ فرقہ وارانہ تعصب اور انفرادی رجحانات کے مطابق کیا گیا کہ جس چیز کو انہوں نے اپنے ذوق و خیالات کے خلاف پایا اس کو وضعی قرار دے کر حذف کردیا خواہ وہ غیر وضعی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر کچھ فرقے ان کتابوں کو مدت تک ملتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ جعلی اور اصل کی پہچان مشکل ہوگئی۔

عہد نامہ قدیم

عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کے تمام انبیاء اور رسولوں کی کتابیں اور صحیفے بالخصوص موسیٰ علیہ السلام سے ذکریا علیہ السلام تک عہد نامہ قدیم سے موسوم ہوتے ہیں عہد نامہ قدیم کا اطلاق جزوی طور پر عہد نامہ عتیق پر بھی ہوتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کی کتابیں اصلاً عبرانی میں لکھی ہوئی ہیں جبکہ عہد نامہ جدید کی کتابیں اصلاً یونانی میں ہیں ان کے تراجم لاطینی زبان میں ہوئے۔

ان کتابوں کو (APOCRYDHA) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صحائف بائیبل کے عہد عتیق کے یونانی نسخے میں تو موجود ہیں لیکن اصل عبرانی نسخے میں ان کا نہ تھا۔ ان تمام صحائف کو پروٹسٹنٹ فرقے کے عیسائی ثقہ نہیں مانتے اور یہودی ان کو الہامی یا مقدس تسلیم نہیں کرتے۔ صرف رومن کیتھولک عیسائیوں کی بائیبل کا جزو ہیں۔ ان صحائف کے نام یہ ہیں۔ الیسدس راس۔ اوّل و دوم۔ طوبیکا کی کتاب۔ جوڈھتھ کی کتاب۔ ایسٹر کی کتاب میں اضافہ۔ سلیمان کی دانش کے احوال کلیات کی کتاب برُوج کی کتاب۔ تین مقدس بچوں کا گیت۔ سوسانہ کی تاریخ۔ بیل اور اژدھا کی کہانی، فلشی کی دُعا۔ حقابی اوّل و دوم۔ اب بر اس اضافہ کو بھی "ایوکرافا" کہتے ہیں۔ عہد قدیم میں تین قسم کے صحائف ہیں۔ پیغمبروں کے تاریخی صحائف۔ دعائیہ زبور اور امثال۔

عیادت

بیمار شخص کی مزاج پرسی کے لیے جانا عیادت کہلاتا ہے۔ ایک مریض اور بیمار شخص کے لیے اس سے مل کر ہمدردی اور نیک جذبات کا اظہار کرنا مریض کے لیے تقویت، حوصلے اور افاقے کا باعث بنتا ہے چنانچہ اسلام نے عیادت کے باب میں بھی خاص احکامات کا ذکر کیا ہے اور احادیث میں باقاعدہ حضور اکرمؐ نے اس کے لیے تاکید فرمائی ہے اور یہ بات اس پر دلیل ہے کہ اسلام میں انسانی تعلقات پر کس قدر زور دیا گیا ہے اور ایک صالح اور خوشگوار معاشرے کے قیام کے لیے کتنی اہم بنیادیں استوار کی ہیں۔

مشکوٰۃ کی ایک حدیث میں روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جاتا ہے وہ اپنے لیے ثمرات بہشت جمع کرتا ہے اس وقت سے جب وہ عیادت کے ارادے سے گھر سے نکلا اس وقت تک جب وہ عیادت سے لوٹ کر اپنے گھر پہنچا۔" اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر عیادت کرنے اور بیمار لوگوں کی مزاج پرسی کی تلقین کی گئی ہے۔

عیاش بن ابی ربیعہ

نام عیاش۔ کنیت ابو عبدالرحمٰن۔ مشہور دشمن اسلام ابوجہل کے بھائی تھے دعوت اسلام کے ابتدائی دنوں میں مکہ میں مسلمان ہوئے اور اپنی بیوی سمیت ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے جہاں سے پھر مکہ اور مکے سے مدینے چلے آئے ابوجہل مکے سے مدینے آیا اور کسی بہانے مکے واپس لے جاکر قید کردیا اور طرح طرح کی اذیتیں دیں تاکہ اسلام چھوڑ دیں مگر ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی بالآخر رسول اللہؐ نے کسی طرح ابوجہل کی قید سے چھڑایا اور مدینے لے آئے حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں فتوحات شام میں نمایاں حصہ لیا۔ شام سے واپس پر مکے میں وفات پائی۔ ان سے کچھ روایات بھی مروی ہیں۔ (ز ع ر)

عید

عید کا لفظ "عود" سے ہے جس کے معنی ہیں "لوٹنا" یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ خوشی کا وہ دن جو بار بار آئے۔ اہل اسلام کے نزدیک سب سے بڑی عید ہے۔ عیدیں دو ہوتی ہیں۔ عید الفطر اور عید الضحیٰ۔ ان دونوں میں تمام مسلمان بہترین لباس پہن کر شہر قصبے یا گاؤں کے باہر عیدگاہ یا کسی میدان میں جمع ہوتے ہیں اور دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ یہ نماز شکرانہ ہوتی ہے۔ عید کی نماز اور دوسری نمازوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ عید کی نماز کے لیے اذان نہیں ہوتی اور ان کی پہلی اور دوسری رکعت میں بارک بارک [illegible] متعدد تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ نماز کے بعد دو حصوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں عید کے احکام اور ان کی فضیلت و اہمیت بیان کی جاتی ہے۔ نماز کے بعد لوگ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں اور باہم خوش و مدارت کرتے ہیں۔

عید الاضحیٰ

بقر عید۔ ۱۰، ۱۲،۱۱ ذی الحجہ یعنی حج کے زمانے میں منائی جاتی ہے۔ یہ سنت ابراہیمیؑ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ خدا [illegible] حکم دے رہا ہے کہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو خدا کی راہ میں قربان کردو۔ آپ نے اسمٰعیلؑ سے خواب کا تذکرہ کیا تو وہ راضی ہوگئے۔ ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو ساتھ لیا اور منیٰ کی سمت روانہ ہوگئے۔ منیٰ کے مقام پر پہنچ کر انہوں نے بیٹے کو زمین پر لٹا کر اس کی گردن پر چھری چلانے کا قصد کیا تو [illegible] خوش ہوئے اور تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا اور [illegible] کرلی۔ تم اپنے بیٹے کی جگہ وہ دنبہ قربان کرو جو [illegible] ہے بھیجی [illegible] ابراہیمؑ نے وہ دنبہ قربان کیا جو جبرئیلؑ ان کے لیے لائے تھے۔ [illegible] ابراہیمی سنت کی یاد میں ایام تشریق میں جانور قربان کرتے ہیں۔ دنبہ بکرا ایک آدمی کی طرف سے۔ گائے سات، اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے ذبح کیے جا سکتے ہیں۔ قربانی کے گوشت میں سے ایک تہائی قربانی والے کا، ایک تہائی عزیزوں دوستوں کا اور ایک تہائی غریبوں کا حق ہوتا ہے۔

قربانی ہر صاحب نصاب پر [illegible] ہے خواہ مال پر سال نہ گزرا ہو۔ قربانی کے

جانور کی کھال وغیرہ بیچنا منع ہے۔ عیدالاضحیٰ کی نماز عیدالفطر کی طرح ہے۔ البتہ یہ نسبتاً جلدی ادا کی جاتی ہے۔

عیدالفطر

ماہِ رمضان کے ختم ہونے پر یکم شوال کو منائی جاتی ہے۔ اس روز نماز کو جانے سے قبل ہر مسلمان مرد، عورت پر اپنی اور اپنے بچوں کی طرف سے فطرہ یا زکوٰۃ الفطر واجب ہے چونکہ یہ عید ایک ماہ کے روزوں کے بعد ہوتی ہے اس لیے اس کی خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ عیدالفطر کی نماز سے قبل مسلمانوں میں کوئی میٹھی چیز کھانا مسنون ہے۔ اس عید کی نماز دو رکعت پر مشتمل ہوتی ہے۔ امام تکبیر تحریمہ کے بعد ثنا (سبحانک اللہ) پڑھتا ہے اور پھر تکبیر کہتے ہوئے دونوں کانوں تک ہاتھ لے جاتا ہے اور پھر چھوڑ دیتا ہے۔ زائد تکبیروں کے بعد ہاتھ باندھ لیتا ہے اسی طرح دوسری رکعت میں احناف کے نزدیک رکوع سے پہلے اور اہلِ حدیث کے نزدیک قرأت سے پہلے زائد تکبیریں حسب سابق پڑھ کر قرأت وغیرہ کرتا ہے احناف کے نزدیک زائد تکبیروں کی تعداد چھ ہے اور اہلِ حدیث کے نزدیک بارہ۔ سات پہلی میں اور پانچ دوسری میں۔ پہلی رکعت میں سورہ الاعلیٰ اور دوسری میں غاشیہ پڑھنا مسنون ہے اور پھر حسب معمول سجدہ اور تشہد کے بعد نماز ختم ہو جاتی ہے۔ نماز عید کی نیت میں یہ لفظ کہے جاتے ہیں۔ دو رکعت نماز عیدالفطر زائد واجب تکبیروں کے ساتھ۔

عیسیٰ بن مریم

خاتم النبیین (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے اور دوسرے تمام انبیاء کے بعد مبعوث ہونے والے نبی۔ ان کے سن ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے موجودہ سن عیسوی کے مطابق آپ کی پیدائش حضرت محمدؐ کی پیدائش سے ۵۰۵ برس پہلے بیت المقدس کی نواحی بستی یروشلم میں ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت رومی سلطنت اپنے جور و ستم کے ساتھ فلسطین پر مسلط تھی احبار و رھبان نے یہودیت کا چہرہ بری طرح مسخ کر رکھا تھا۔ اس عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے وہ خدا کی طرف سے ایک نجات دہندہ کی آمد کے منتظر تھے۔ ان لوگوں کی نظریں زیادہ تر بیت المقدس اور اس کے نواح کی طرف تھیں جہاں حضرت داؤد کی نسل آباد تھی۔ اسی انتظار نے بہت سے جعلی مسیح جنم دیے۔ لوگ ان کی زیر قیادت رومیوں سے الجھ پڑتے اور ان جعلی مسیحوں کی موت کے بعد نئے مسیح کا انتظار ہو جاتا۔ ان حالات میں حضرت عیسیٰؑ، رومی بادشاہ ہیروڈ کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔

آپ کی ولادت سے قبل اور بعد کے بارے میں حیرت انگیز واقعات مروی ہیں۔

انجیل کے بیان کے مطابق ہیروڈ کو خدشہ تھا کہ اگر مسیح آ گیا تو زمام حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر مسیح کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ لہٰذا وہ فکر مند رہتا اور اس نے فرعون کی طرح بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا ہے۔ اس بار اس کے پاس تین مجوسی آئے اور اپنا خواب بیان کرنے لگے کہ انہوں نے ایک ستارہ افق پر طلوع ہوتے دیکھا ہے وہ ستارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ ستارہ یوسف بڑھئی (عیسائیوں کے خیال کے مطابق مریم "کنواری" کا شوہر) کے گھر پر جا کر رک گیا۔ یہ خواب سن کر اس نے تین سال کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا لیکن مریم اور یوسف اس بچے کو لے کر مصر بھاگ گئے۔ ان روایات کے مطابق مریم کی منگنی یوسف نامی ایک بڑھئی سے ہوئی تھی۔ اسی دوران ان کی مقاربت سے پہلے کلمۃ اللہ کے ذریعے آپ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت عیسیٰؑ کے والدین صوبہ گلیلی کے قصبہ ناصرہ میں رہتے تھے لیکن شاہی فرمان کے مطابق مردم شماری میں اپنے نام درج کروانے کے لیے بیت اللحم گئے ہوئے تھے (جہاں عیسیٰؑ عالم وجود میں آئے) مصر میں رہائش کے دوران یوسف نے انہیں متبرک اصول سکھائے۔ صبح و شام کی عبادت کے طریقے اپنی والدہ محترمہ سے سیکھے۔ سبت کی مجالس میں بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے۔ بچپن کے بے شمار معجزات انجیلوں میں موجود ہیں۔ ایک فرانسیسی کو مصر سے ۱۸۶۳ء کی ایک تحریر ملی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام مصر کے دوران مسیح نے کسی طبی ادارے میں داخلہ لے لیا تھا اور اس فن میں اتنے کامل ہو گئے تھے کہ اپنے اساتذہ کو بھی حیران کر دیا۔ متجددین ایسی ہی بے سروپا روایات کی آڑ لے کر آپ کے معجزات کی عقلی توجیہہ کی کوشش کرتے ہیں جبکہ قرآن مجید نے موسیٰؑ اور جادوگروں کے ضمن میں جادو اور معجزے کے فرق کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور پرورش یہودی گھرانے میں ہوئی تھی۔ آپ دینِ موسوی کے مجدد اور مصلح تھے۔ لفظ عیسیٰ عبرانی زبان کے لفظ یسوع کا معرب ہے جو لاطینی یا انگریزی میں JESUS بن گیا۔ آپ کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ عبرانیوں کے عقیدہ کے مطابق واحد خدا کو خوش رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کی خوشی قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ قربانی کا تصوّر یہودیوں کے پے در پے مصائب کے باعث گہرا ہوتا گیا اور وہ کسی ایسی شخصیت کا انتظار کرنے لگے جو انہیں مصائب سے نجات دلا سکے جو خدا کے ہاں مطلوب و مقبول قربانی پیش کر سکے۔ ایسے شخص کو یہ لوگ اپنی زبان میں مسیح یا مسیحا کہتے ہیں، یعنی نجات دہندہ۔ بارہ برس کی عمر میں والدین کے ہمراہ یروشلم کی زیارت کے لیے گئے۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ مذہبی رہنما مقدس قانون (تورات) کی تشریح بڑی مشکل زبان میں کرتے ہیں۔ آپ نے عام فہم انداز میں قانون خداوندی کی تشریح کی اور لوگ آپ کے معتقد ہو گئے۔ یہاں تک کہ انہیں استاد کا لقب دیا۔ روزگار کے لیے آپ نے بڑھئی کا پیشہ اختیار کیا۔

ایک یورپی مصنف کو کوہ ہمالیہ کے پار ہمس نامی جگہ سے پالی زبان میں ایک نوشتہ ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ مسیح تیرہ سال کی عمر میں شادی سے بچنے کے لیے گھر سے نکل کر یہاں آ گئے اور اپنے قیام کے دوران بدھوں کے مذہب کا مطالعہ کیا۔

جوانی کے حالات انجیلوں میں بھی کم ملتے ہیں۔ انہی دنوں ایک اور نبی کا چرچا ہوا۔ یہ یحییٰ تھے جو آپ کے رشتہ دار بھی تھے اور آپ سے کچھ بڑے بھی۔ انہی کو جان (JOHN) کہا جاتا ہے۔ یہ اپنے انداز میں یہود کو راہ ہدایت کی تلقین کرتے تھے "گناہوں سے غسل" ان کا مخصوص طریقہ تھا جسے بپتسمہ کہا جاتا ہے۔ لوگ ان کے پاس آتے۔ گناہوں کا اقرار اور آئندہ اجتناب کا وعدہ کرتے اور یہ انہیں دریائے اُردن کے پانی سے غسل دیتے۔ یہ غسل ایک قسم کی توبہ کی نشانی اور عہد نامہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ مرجع خلائق بنے ہوئے تھے اور حکومت اُن کی سرگرمیوں سے خائف ہو کر ان کی مخالفت کر رہی تھی۔ عیسیٰؑ بھی ان کے پاس گئے۔ یہ ان کی عمر کا انتیسواں سال تھا۔ یحییٰ سے تیس سال کی عمر میں بپتسمہ لیا اور واپسی پر چالیس دن تک جوڈیا کے ریگستانوں میں صحرا نوردی اختیار کیے رکھی۔ کہتے ہیں کہ اس دوران روح القدس سے بھرے ہوئے روح کی زیر ہدایت بیابانوں میں

پھرتے رہے ان دنوں آپ نے کچھ نہیں کھایا۔ ابلیس آپ کو آزمائشوں میں ڈالتا رہا آخر آزمائش کے دن گزر گئے تو آپ یروشلم کی طرف چل دیئے۔ یہ وقت آپکی رسالت اور بعثت کا آغاز ہے۔ عید فسح کے موقع پر آپ ہیکل میں پہنچ گئے۔ ہیکل سخت ابتر حالت میں تھا۔ صحن مویشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ شور بہت زیادہ تھا۔ ہر طرف کاروباری افراد سودا سلف میں مصروف تھے۔ سود خوار یہودیوں نے خانہ خدا کو مارکیٹ میں تبدیل کر رکھا تھا۔ آپ سے برداشت نہ ہوا۔ جانوروں کو صحن سے نکلوا دیا۔ روپیہ کالین دین کرنے والوں کی میز الٹ دی اور چیخ کر فرمایا "خدا کے گھر کو بازار نہ بناؤ" کاہنوں کو آپ پر بڑا غصہ آیا لیکن آپ کی سادہ تعلیمات سے متاثر آپ کے ہمراہ ہو جانیوالے جم غفیر کے خوف سے خاموش رہے۔ عید کے تہوار سے فارغ ہو کر آپ یروشلم سے واپس آ گئے۔ اور اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کر دی۔ علماء نے مذاق اڑایا۔ دوران تبلیغ آپ جھیل طبریہ کے کنارے کپرنوم نامی گاؤں میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے دو بھائیوں پطرس اور اندریا کو آپ کی صداقت کا علم ہو گیا اور بعد ازاں اس گاؤں کی اکثریت آپ کی معتقد ہو گئی۔ آپ نے کپرنوم کی پہاڑی پر ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا جس میں اپنی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا۔ یہ خطبہ سرمن آف دی ماؤنٹ یعنی پہاڑی والا وعظ کے نام سے مشہور ہے اور عیسائیت میں اس کی اہمیت وہی ہے جو بدھ مت میں تقریر بنارس اور مسلمانوں میں خطبہ حجۃ الوداع کی ہے۔

اس کے بعد مسیحؑ نے اپنے پیروؤں میں بارہ آدمیوں کا انتخاب کیا جنہوں نے ملک میں پھیل کر لوگوں کو خوشخبری سنائی کہ مسیح آ گیا ہے وہ ناصرہ کا مسیح ہے اس اعلان پر بے شمار لوگ کپرنوم پہنچے۔ پھر آپ نے تبلیغ کے لیے سیر و سیاحت اور سفر کا ذریعہ اختیار کیا۔ وہ عید مسلم کے موقع پر ہر سال یروشلم آتے اور باقی سال پھرتے رہتے۔ لوگوں کو معجزات دکھاتے۔ وہ جس گاؤں میں جاتے ان کی شہرت کے باعث ہزاروں لوگ وہاں پہنچ جاتے۔ سفر کے دوران تین مرتبہ گلیلی کے پار بھی گئے دو ڈھائی سالوں میں عوام میں ان کی ہر دلعزیزی بہت بڑھ گئی۔ لوگ عام طور انہیں مسیح موعود سمجھنے لگے اور ساتھ ہی یقین کرنے لگے کہ اب آپ تلوار اٹھا کر رومیوں کا قلع قمع کر کے ہمیں حکومت دلوائیں گے اس مقصد کے لیے یہودی علماء نے آپ کی کاوشوں کا رخ موڑنے کی کوشش بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر آپ کامیاب ہو گئے تو حکومت ہاتھ آ جائے گی۔ اگر ناکام ہو کر مارے گئے تو ہمارے راستے کی ایک رکاوٹ جس نے عوام کو ہمارے پیچھے لگا کر ہمارے کاروبار ختم کر دیئے ہیں خود ختم ہو جائے گی لیکن آپ نے اس قسم کی تحریک چلانے سے انکار کر دیا جس پر یہودی علماء نے آپ کی اعلانیہ مخالفت شروع کر دی اور لوگوں کو باور کرانا شروع کر دیا کہ اگر یہ سچا مسیح ہوتا تو حکومت کے حصول کی کوشش کرتا۔

دوسری عید فسح کے موقع پر (یہ تہوار ایک ہفتہ رہتا تھا) جب آپ یروشلم تشریف لائے تو دنیا بھر کے یہودی عوام و خواص بھی موجود تھے۔ عوام نے جس قدر آپ کی پذیرائی کی علماء اس سے محروم رہے' اس طرح حسد پیدا ہوا۔ پھر علماء اس بات سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں رومی حکمران اس شخص کی مقبولیت۔ اس کے گرد جمع ہجوم اور اس کی سرگرمیوں کے باعث یہود کے مخالف نہ ہو جائیں اور اس کے ساتھ ہمیں بھی پکڑ نہ لیں لہٰذا انہوں نے آپ کو یروشلم سے چلے جانے کو کہا۔

لیکن آپ نے آسان اور سادہ زبان میں تعلیمات خداوندی کو پیش کرنے کا کام جاری رکھا۔ اپنی بات تمثیلوں کے انداز میں پیش کرتے۔ سب سے محبت کا درس دیتے' نفرت کے آگے سینہ سپر ہو جاتے' گناہگاروں کو سینے سے لگاتے۔ یہی بات یہودی علماء کو کھٹکتی تھی۔ جب آپ سائمن فریسی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے تو مری آف میگڈالا (ایک زانی عورت) آپ کے پاس آئی۔ اس نے آپ کے پاؤں دھوئے اپنے بالوں سے آپ کے پاؤں کو خشک کیا۔ پھر آپ کو عطر ملا۔ سائمن اس بات سے متنفر ہوا۔ اسی طرح ایک سفر میں آپ نے سامریوں سے پانی لے کر پی لیا حالانکہ سامریوں کو سب یہودی کافر کہتے تھے لیکن آپ کہتے تھے جن کو سب نے دھتکار دیا ہو میں اسے گلے لگاؤں گا۔

ان کے آخری بار یروشلم آنے سے قبل یحییٰؑ (جنہیں انگریز جان اور ان کی بیوی کو الزبتھ کہتے ہیں) کو قتل کر دیا گیا۔ اس سے مسیحؑ نے سمجھ لیا کہ اب ان کے لیے بھی کام کرنا دشوار تر ہو جائے گا اور اسی پر آپ کی تبلیغی کاوشوں میں مزید تیزی آ گئی اور آپ عید فسح سے ایک ہفتہ قبل ہی یروشلم آ گئے۔ اس ہفتہ کو PASSION WEEK کہتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے اس ہفتہ کی تفصیلات کتابوں میں بہت زیادہ ملتی ہیں۔ اس ہفتہ میں زیادہ عرصہ آپ BATHANY ہی رہے جو ایک گاؤں کا نام ہے۔ یہاں آپ کا ایک دوست اور مرید رہتا تھا جو مر گیا تھا تو مسیح نے اسے دوبارہ حکم خداوندی زندہ کر دیا تھا (بائیبل کے مطابق آپ نے تین مردوں کو زندہ کیا تھا جن میں سے ایک یہ تھا) ان ایام کے واقعات پر مبنی عیسائیوں میں ڈرامے ہوتے ہیں جنہیں (PASSION PLAY) کہتے ہیں۔ اسی گاؤں سے آپ وقتاً فوقتاً یروشلم آتے۔ ایک دن بہت سے یہودی علماء آپ کے پاس آئے اور بہت تند و تیز سوالات کیے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ گرما گرم بحث میں آپ سے یا تو کوئی ایسا کلمہ کہلوا لیں جس کے باعث آپ کی تکفیر کر سکیں یا ایسی بات کہلوائی جائے جو رومی حکومت کے خلاف ہو اور آپ پر بغاوت کا الزام لگایا جا سکے۔ فریسی آپ کے بدترین دشمن تھے جو خود کو موسوی شریعت کے محافظ سمجھتے تھے۔ وہ غیر یہودیوں اور نچلے طبقے کے لوگوں سے میل جول رکھنے کے خلاف تھے جبکہ حضرت عیسیٰؑ غیر یہودیوں سے بھی بڑے اخلاص سے ملتے تھے پھر انہوں نے یہودی روایات کا بھی چنداں خیال نہیں رکھا۔ ان کے خیال میں سبت کا دن محض چھٹی کا دن ہی نہیں بلکہ خدمت خلق کا دن تھا۔ بحث و مباحثے سے عاجز آ کر ان لوگوں نے آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔

یہودیوں کو رومیوں نے مذہبی خود مختاری دے رکھی تھی۔ وہ اپنی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے خود کر سکتے تھے۔ ان کے تیس سرکردہ علماء کی ایک عدالتی کونسل تھی جو سزائے موت تک کا فیصلہ کر سکتی تھی لیکن سزا کا نفاذ رومی گورنر کرتا۔ انہوں نے عجلت میں اس کونسل کا اجلاس بلایا اور آپ پر کفر ثابت کر کے سزائے موت کا فیصلہ کر دیا۔ اور رومی ایڈمنسٹریٹر کو فیصلہ پہنچا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسیح نے سزائے موت کا کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی وہ باغی ہے۔ وہ سزا نہیں دینا چاہتا تھا مگر یہودی علماء کے دباؤ کے تحت مان گیا۔ عید فسح کے موقع پر ایک سزا یافتہ قیدی کو رہا کیا جاتا تھا گورنر کی خواہش تھی کہ اس موقع پر مسیح کو رہا کر دیا جائے لیکن یہودیوں نے ایک دوسرے قیدی برابا ڈاکو کی سزا معاف کرا لی اور مسیح کے لیے صلیب کی سزا تجویز کر دی گئی۔

اب مسیح کو پکڑنے کا معاملہ تھا۔ ان کے ساتھ ان کے حواریوں کی فوج تھی۔ وہ رات کو شہر کے باہر گتسمنی نامی ایک باغ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے آپ کے حواری یہودہ بن شمعون کو چند سکوں کے عوض خرید لیا اور اس نے رات کے اندھیرے میں آپ کی نشاندہی کا وعدہ کر لیا۔ آپ عبادت اور مراقبے میں مشغول تھے۔ آپ کے تمام شاگرد یا حواری سو گئے تو یہودہ افسروں اور سپاہیوں کو لے

کر پہنچا اور آپ کو گرفتار کیا گیا۔ اس ہنگامے میں آپ کے تمام حواری اور شاگرد بھاگ گئے۔

صلیب کے لیے آپ کو (GOLGOTHA) نامی پہاڑی تک لے جایا گیا پہاڑی کے دامن میں صلیب کی لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں جنہیں خود اٹھا کر لے جانا پڑتا تھا۔ وہ وزنی تھیں آپ دبلے پتلے تھے، سائمن نامی موٹے تازے شخص سے لکڑی اٹھوائی گئی اور آپ کو چوٹی پر لے جاکر عیسائی اور یہودی روایات کے مطابق صلیب پر لٹکا کر مار دیا گیا۔ نیزہ مار کر آپ کی پسلی توڑ دی گئی۔ جان دینے سے قبل آپ نے نعرہ مار کر کہا "اے میرے مالک! اے میرے مالک، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" اگلے روز آپ کی نعش دفن کر دی گئی۔ تیسرے دن زلزلہ آیا۔ قبر شق ہو گئی اور آپ قبر سے نکل کر گلیلی کی طرف چلے گئے جہاں آپ کے شاگردوں نے آپ کو دیکھا اور باتیں کیں۔ اس کے بعد ایک بادل پر سوار ہو کر آسمان کی طرف چلے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق آپ کی نعش مبارک آپ کا شاگرد یوسف لے گیا تھا۔ اس نے ایک چٹان کے نیچے آپ کی نعش رکھ دی۔ پھر چند دن بعد وہ پتھر ہٹایا گیا تو نعش نہ تھی۔ اور لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ وہ قبر سے زندہ ہو کر نکلے گلیلی کی طرف گئے اور شاگردوں سے ملے، باتیں کیں، ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر آسمان پر جاکر خدا کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔

صلیب پر چڑھانے کا یہ واقعہ جمعہ کے دن پیش آیا اور اس جمعہ کو GOOD FRIDAY کہا جاتا ہے۔ عیسائی آج بھی یہ تہوار مناتے ہیں۔ یہ نام اس جمعہ کو اس لیے دیا گیا کہ اس روز آپ بنی آدم کے لیے کفارہ بنے لیکن اس جمعہ کا تعین مشکل ہے اور اس میں بہت اختلاف ہے کیونکہ یہود کے مہینے قمری تھے اور رومیوں کے شمسی۔ دونوں قسم کے لوگ عیسائیوں میں شامل تھے۔ اوّل الذکر اس مذہب کا رنگ یہودی رکھنا چاہتے تھے اور رومی اس مذہب کو یہودیت کے اثر سے نکالنا چاہتے تھے اس لیے یہودی اس جمعہ کا تعین چاند کے حساب سے کرتے ہیں اور وہ سورج کے حساب سے۔ بہرحال یہ جمعہ ۲۲ مارچ کے لگ بھگ آتا ہے اور اس کے تین دن بعد ایسٹر کا تہوار آتا ہے کیونکہ اس دن مسیح دوبارہ زندہ ہو کر شاگردوں سے ملے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بارے میں اہلِ اسلام اور یہود و عیسائی کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انہیں مصلوب نہیں کیا گیا بلکہ کسی دوسرے پر اشتباہ ڈال کر اللہ نے انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔ قربِ قیامت تشریف لائیں گے اور رسالتِ محمدیؐ کی اتباع کریں گے اور چالیس سال زندہ رہنے کے بعد فوت ہوں گے۔ نیز اُن کی آمد علاماتِ قیامت میں سے ہوگی۔

بہرحال عیسائیوں نے کہا کہ مسیح کو صلیب پر مار دیا گیا اور یہ مسیحیت کا بنیادی عقیدہ ہے کیونکہ اگر وہ مرے نہیں تو کفارہ کب بنے؟ یہودی مذہب کے مطابق جو صلیب پر مرے وہ ملعون ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ اگر عیسیٰ سچے مسیح ہیں تو وہ ملعون ہو کر کیوں مرے۔ عیسائی کہتے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ وہ ملعون کی موت مرے لیکن اپنے جرم کی بناء پر نہیں بلکہ انسانیت کے کفّارہ کے لیے مرے۔ یہ ہے ان لوگوں کا پیغمبروں کی تقدیس کے بارے میں نظریہ و عقیدہ۔ بعد میں اس سے یہ عقیدہ بنا کہ یسوع خدا تھا وہ انسان کی شکل میں آیا۔ چونکہ مریم کے بطن سے پیدا ہوا اس لیے خدا کا بیٹا بھی تھا لہٰذا باپ بیٹا اور روح القدس کا فارمولا تیار کر کے عقیدہ تثلیث قائم کیا۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت اور اس الوہیت کی ماہیت پر مناظروں کا بازار گرم ہوا جس کے بعد عیسائی مذہب کے متعدد فرقے چرچ یا سلسلے قائم ہو گئے۔ مسیح کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ الوہیت ہندوؤں اور بدھوں کے عقیدہ سے ملتا ہے جو کرشن رام چندر اور بدھ کو خدا کا اوتار کہتے ہیں۔ تثلیث کا عقیدہ سکندریہ کے یونانیوں سے ملتا جلتا ہے جو وہاں مسیح کی پیدائش سے قبل مصریوں، یہودیوں اور یونانیوں کے فکری اختلاط کے باعث کافی جڑ پکڑ چکا تھا۔ سکندریہ کے نئے یونانی مذہب کے تین دیوتا تھے۔ ایک سیرابیس کہلاتا تھا۔ دوسری اس کی بیوی الیسیس اور تیسرا ان دونوں کا بیٹا ہورس پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں یہی تثلیث بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں میں پھیلی اور یہی زمانہ عیسائیت کے نشوو ارتقا اور تبلیغ کا ہے۔ یہاں سے یہ عقیدہ اسی طرح عیسائیوں نے اپنا لیا۔

عیسائیت

عیسائی اپنے مذہب کی جس شریعت پر عمل پیرا ہیں اسے عیسائیت کہا جاتا ہے اس مذہب کا اہم عقیدہ تثلیث یعنی باپ بیٹا اور روح القدس تینوں خدا ہیں لیکن انہیں نہ ایک خدا کہا جاتا ہے نہ تین خدا۔ یہ ایک میں تین ہیں اور تینوں میں ایک۔ قرآن مجید نے اس عقیدے کا زبردست بطلان کیا اور بتایا کہ تین نہیں صرف ایک ہے۔ دوسرا عقیدہ ان کا یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر واقعی پھانسی دے دی تھی جس کے بعد تین دن تک ان کی لاش قبر میں رہی اور چوتھے دن وہ مع جسم کے آسمان پر چلے گئے اور خدا کے داہنے بازو پر جا بیٹھے۔ تیسرا ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے خون سے تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے دوسرے پیغمبروں کے بارے میں عیسائیت کی کتابوں میں بہت سی اختلافی روائتیں درج ہیں۔ ان کی چار مقدس۔ متّی۔ مرقس لوقا اور یوحنا کی انجیلیں ہیں۔ انجیل کے ہی بیان کے مطابق یہ کتابیں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے بعد میں لکھیں تھیں اس لیے مسلمان انہیں الہامی نہیں مانتے۔

(مزید دیکھیے عہد نامہ جدید و قدیم، تثلیث و عیسیٰ بن مریم) ع۔ر

عیسوی سن

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ ان کے سن ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کی بناء پر حتمی فیصلہ مشکل ہے۔ بعد کی تحقیقات سے ثابت کیا گیا ہے کہ سن عیسوی کا آغاز حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے چار سال بعد ہوا موجودہ سن عیسوی کی باقاعدہ ترتیب آپ کی ولادت کے ۵۲۹ سال بعد یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ۳۶ سال قبل کی گئی اور اسے تحریری طور پر جاری کیا گیا۔ اسی سن کو بعد میں ۵۲۵ بھی کہا گیا۔ کیلنڈر کو ایجاد کرنے والا مشرقی ایشیائے کوچک کا ایک باشندہ (DIONYSI USSEXIGUS) نامی عیسائی ہے جو بعد میں روم کا ایبٹ مقرر ہوا لیکن اس سے حساب میں غلطی ہوئی ہے بعد میں تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس کی ابتداء ۵۲۹ یا ۵۲۵ میں نہیں ہوئی بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے چار سال بعد ہوئی اور یہ غلطی آج تک چلی آرہی ہے۔

سن عیسوی کو شمسی سال بھی کہا جاتا ہے۔ حسب قانونِ فطرت اس کے بھی بارہ مہینے ہیں۔ مئی جون میں سخت گرمی۔ دسمبر و جنوری میں سخت سردی۔ اگست میں موسم برسات اور مارچ اپریل کے مہینوں میں موسم بہار ہوتا ہے سن عیسوی کے اس وقت ایک ہزار نو سو اٹھہتر سال گزر چکے ہیں۔

غ

غار

قدرتی خلا یا کھوہ جو پہاڑوں میں واقع ہو۔ یہ خلا اکثر آتش فشاں پہاڑوں کے نزدیک واقع ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں اجنتا اور ایلورا کے غار مشہور عالم ہیں۔ پاکستان میں کوہستان پشاور میں کئی ایک غار ہیں اور کھیوڑہ میں نمک کی کانیں کھودنے کے باعث وجود میں آئے اگرچہ قدرتی نہیں لیکن دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مجموعی لمبائی تیس میل ہے۔ انگلستان میں کنٹیو کے غار کئی کئی میل لمبی بھول بھلیاں ہیں۔ سٹافنین جنگل کے غار کے ستون بہت عجیب ہیں۔ پارک شائر میں ملہم اور کرک ڈیل کے کئی غار پائے جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں اصحاب کہف کے جس غار کا ذکر ہے وہ بھی اسی قسم کا غار تھا عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیلیٰؑ کی لاش کو بھی ایسے ہی غار میں رکھا گیا تھا۔

دینِ اسلام کے مجدّد و مہتمم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں وحی نازل ہوئی تھی اور جب مکّہ سے ہجرت کے لیے آپ روانہ ہوئے تو دشمنوں کے تعاقب سے بچنے کے لیے بھی آپؐ ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی تھے جو آپؐ کے ہر حال میں ساتھی اور مصیبت میں شریک تھے۔ غار میں آپ کے ساتھ رہنے کے باعث جو انتہائی مصیبت کا وقت تھا آپؓ کو یارِ غار کہا جاتا ہے۔ اب ''یار غار'' کی ترکیب مخلص دوست کے معنی میں مستعمل ہے احادیث میں غار میں مقیم تین اشخاص کا قصہ بھی عبرت کے لیے حضورؐ نے سنایا تھا کہ انہوں نے بارش سے بچنے کے لیے ایک غار کی پناہ لی۔ شدید آندھی کے باعث ایک پتھر اس کے مُنہ کے آگے آکر رک گیا۔ ان تینوں نے اللہ سے اپنے مخلص اعمال کا واسطہ پیش کرکے دعا مانگی تو وہ پتھر خود بخود ہٹ گیا اور یہ تینوں مومن شخص آزاد ہو گئے۔

غازی پوری عبداللہ محدث

۱۲۶۱ھ میں ضلع اعظم گڑھ میں مئو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر قرآن حفظ کر لیا۔ فارسی و عربی کی بعض درسی کتابیں مولوی قائم صاحب مئوی سے پڑھیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برپا ہوئی تھی۔ آپ کے والدین نے اسی زمانے میں مئو چھوڑ کر غازی پور میں سکونت اختیار کر لی۔ غازی پور کے مدرسہ چشمہ رحمت میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مولانا رحمت اللہ اور مولانا نعمت اللہ لکھنوی سے درسی کتابوں کی تکمیل کی پھر جونپور تشریف لائے اور مدرسہ حنفیہ سے مولانا مفتی محمد یوسفؒ سے استفادہ کیا۔

مولانا عبداللہ غازی پوری نے ایک رات خواب دیکھا کہ ایک مقام پر بہت ہجوم ہے۔ لوگ جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں لوگ آپؐ سے شرف مصافحہ حاصل کر رہے ہیں۔ کسی کے کہنے پر میں بھی آگے بڑھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدو ستہ شرف مصافحہ حاصل کیا۔ بیدار ہوئے تو مسرّت اور کیفیت دل میں باقی تھی۔ مولانا غازی پوری خود فرماتے ہیں۔

اس خواب کی تعبیر مجھے یہ سوجھی کہ حدیث رسولؐ کے چشمہ صافی سے براہ راست فیض یاب ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

اس خواب کے بعد علم حدیث کی پیاس بجھانے کے لیے دہلی پہنچے اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۲۸۰ھ میں حج کی سعادت حاصل کی اور امام شوکانی کے تلمیذ رشید شیخ معمر عباس سے حدیث کی سند حاصل کی۔ وطن واپسی پر غازی پور کے مدرسہ چشمہ رحمت میں تدریس کا کام سرانجام دینے لگے۔ اتباع سنت کی تلقین و ترویج کی وجہ سے آپ کو بہت ایذائیں دی گئیں حتیٰ کہ غازی پور کو خیرباد کہنا پڑا اور مولانا ابراہیم آروی کے اصرار پر مدرسہ احمدیہ میں تدریس شروع کر دی۔ بیس سال تک دولت علم لٹاتے رہے۔ مولانا ابراہیم کے انتقال پر دہلی والوں کے اصرار پر دہلی چلے آئے اور آٹھ سال تک مختلف جگہوں پر درس دیتے رہے۔ جب لکھنؤ میں آپ کے فرزند بہادر فوت ہوئے تو ان کی تعزیت پر لکھنؤ آنا پڑا۔ پھر بعض گھریلو مجبوریوں کے باعث دہلی واپس نہ جا سکے۔ یہاں آپ سے ندوۃ العلماء کے بعض ممتاز طالب علم پڑھنے آئے ان میں سے کچھ طلباء کا تعلق شام کے علاقے سے تھا۔

مولانا غازی پوری میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے ارشد ترین تلامذہ میں

سے تھے۔ میاں صاحب کہا کرتے تھے۔

"میرے پاس دو عبداللہ آئے ہیں۔ ایک عبداللہ غزنوی اور دوسرے عبداللہ غازی پوری۔

مولانا غازی پوری نے کافی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں مقدمہ صحیح مسلم شریف اور تسہیل الفرائض خاصی مشہور ہیں۔ آپ کا حلقہ درس بڑا وسیع تھا۔

مولانا غازی پوری لکھنؤ میں ۱۳۳۷ھ میں فوت ہوئے اور عیش باغ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے آپ کی وفات پر لکھا "عبداللہ جیسا کامل عالم و عابد دیکھا کوئی نہیں، سنے بہت ہیں۔

غزالی، امام

مشہور مسلمان مفکر، محمد نام، لقب مجدد الاسلام، عرفیت غزالی۔ ۴۴۵ کو خراسان کے اضلاع میں طابران میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ محمد روئی فروش تھے اس مناسبت سے ان کا خاندان غزالی کہلایا کیونکہ روئی کاتنے والے کو عربی میں غزالی کہتے ہیں۔

امام صاحب کے والد تعلیم سے محروم تھے جس کا انہیں بہت قلق تھا، مرتے وقت وہ اپنے دونوں بیٹوں کو ایک بزرگ کے سپرد کر گئے کہ ان دونوں بھائیوں کو تعلیم دلانا۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم طابران ہی میں ہوئی۔ فقہ کی کتابیں احمد بن محمد رادکانی سے پڑھیں پھر جرجان ابو نصر اسماعیلی کی خدمت میں پہنچے اور زانوئے تلمذ طے کیا۔ یہی نوٹس جنہیں تعلیقات کہا جاتا تھا آپ نے بھی دیگر طلباء کی طرح تیار کر لیے۔ وطن واپسی پر راستہ میں ڈاکہ پڑا اور سب کچھ لٹ گیا۔ امام صاحب کو اور تو کسی چیز کا غم نہ تھا البتہ تعلیقات کے ضائع ہو جانے پر بہت صدمہ ہوا۔ جب آپ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس نوٹس مانگنے گئے تو اس نے طنزاً کہا ایسے علم کا کیا فائدہ جو کاغذات کا رہین منت ہو۔ اس طنز نے امام صاحب پر بڑا اثر کیا اور وطن واپس پہنچ کر ان تمام کاغذات کو حفظ کر لیا۔ مزید تعلیم کے لیے امام صاحب اس وقت کے سب سے بڑے عالم علامہ ابو اسحق شیرازی کے پاس نیشا پور پہنچے اور تاحیات ان سے پڑھتے رہے۔ اسی دوران امام صاحب نے کئی تصانیف لکھیں۔ ان کے انتقال کے بعد نیشا پور سے اس شان سے نکلے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا اس وقت ان کی عمر ۲۸ برس تھی۔

نیشا پور سے آپ نظام الملک کے دربار میں پہنچے۔ علمی شہرت کی بناء پر نظام نے بڑی تعظیم کی اور علمی مناظروں کا اہتمام کیا۔ مناظروں میں ہمیشہ امام صاحب ہی غالب رہتے۔ اس کامیابی پر آپ کی شہرت بہت چمکی اور نظام نے انہیں مدرسہ نظامیہ کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۴ برس تھی۔ اتنی عمر میں یہ منصب امام غزالی سے پہلے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ مدرسہ نظامیہ کی مسند تدریس جب آپ نے سنبھالی تو تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے علم و فضل کی دھاک بیٹھ گئی حتیٰ کہ سلطنت کے امور اہم بھی ان کی شرکت کے بغیر انجام نہیں پا سکتے تھے، ۴۸۷ھ میں خلیفہ مقتدر باللہ کی وفات کے بعد مستظہر باللہ خلیفہ بنا تو اس بیعت میں دیگر اراکین سلطنت کے ساتھ امام غزالی بھی شریک تھے۔ مستظہر نہایت علم دوست اور قدر دان ہونے کی بنا پر امام صاحب کا حد درجہ احترام کرتا۔ فرقہ باطنیہ نے جب زور پکڑا تو اس نے امام صاحب سے ان کے رد میں کتاب لکھنے کی درخواست کی اس کتاب کا نام بھی انہوں نے "مستظہر" رکھا۔

علمی لحاظ سے آپ کی جلالت کا عالم یہ تھا کہ ان کے درس میں تین سو مدرسین اور سو امراء و رؤسا بالالتزام حاضر ہوتے علمی وعظ بھی کرتے اور ان وعظوں کو آپ کے ایک شاگرد صاعد نے دو ضخیم جلدوں میں جمع کیا اور اس کا نام "مجالس غزالی" مشہور ہوا۔

امام صاحب جس ماحول میں رہ رہے تھے اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ صرف رائج الوقت مسلک پر کاربند رہا جائے لیکن امام غزالی میں اجتہاد کا جذبہ بہت تھا چاہتے تھے کہ دوسروں کے مسائل پر بھی نگاہ ڈالی جائے۔ اس زمانے میں بغداد واحد شہر تھا جو تمام مذاہب کا دنگل سمجھا جاتا تھا۔ امام صاحب خود بغداد گئے اور بڑے قریب سے سارے مذاہب کو پرکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی۔ رفتہ رفتہ یقین کسی بھی مذہب کی تاویلات پر نہ رہا۔ اس وقت چار فرقے مشہور تھے۔ متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ اور صوفیہ۔ ان سب فرقوں کے علوم و عقائد کی تحقیقات شروع کی۔ قدماء کی ساری تصانیف پڑھ ڈالیں لیکن تسلی نہ ہوئی۔

۴۸۸ھ میں بغداد سے بڑی صوفیانہ حالت میں نکلے اور دمشق پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت شروع کر دی۔ مراقبہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ جامع اموی میں درس بھی دیتے رہے۔ دو برس بعد بیت المقدس زیارت کے لیے پہنچے زیارت کے بعد حج کی نیت سے مصر و اسکندریہ سے ہوتے ہوئے مکہ پہنچے۔

۴۹۰ھ میں مقام خلیل پہنچے تو عہد کیا کہ کسی بادشاہ کے دربار نہ جاؤں گا نہ ہی عطیہ قبول کروں گا اور نہ ہی کسی مناظرے میں حصہ لوں گا چنانچہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہے۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ امام صاحب نے احیاء العلوم اسی سفر کے دوران تصنیف کی تھی۔

جب آپ نے تحقیق کا ذوق پورا کر لیا تو ۴۹۹ھ میں امام صاحب نے سلجوقی علم دوست بادشاہ کے اصرار پر دوبارہ نیشا پور کے مدرسہ نظامیہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ فخر الملک ۵۰۰ھ میں فوت ہو گیا تو امام صاحب نے دوبارہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

آپ کی اس عظیم شہرت نے کچھ حاسد بھی پیدا کیے کسی زمانہ میں امام صاحب نے ایک مسئلہ میں امام ابو حنیفہ پر تنقید کی تھی۔ مخالفین نے اسے بنیاد بنا کر سنجر جو خود صاحب علم نہ تھا کے پاس شکایت کر دی اور امام صاحب پر زندقت کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ سنجر نے امام صاحب کو طلب کیا۔ چونکہ امام صاحب عہد کر چکے تھے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جائیں گے اس وجہ سے ایک خط بادشاہ کے نام لکھا اس سے بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے ایک دستہ روانہ کیا۔ امام صاحب کو زبردستی دربار میں لے آیا۔ وہاں پہنچنے پر آپ نے ایک زوردار تقریر کی۔ بادشاہ بہت مرعوب ہوا اور آپ کو دوبارہ مسند تدریس کی پیشکش کر دی۔ اور بھی دعوتیں آئیں لیکن امام صاحب نے معذرت کر دی اور گوشہ عافیت میں جاگزیں ہوئے آپ کو حدیث کی تکمیل کا چونکہ موقعہ ابھی تک نہیں مل سکا تھا اس لیے آپکے دل میں حدیث پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اتفاقاً ان دنوں مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن طوس آئے ہوئے تھے امام صاحب نے انہیں اپنے ہاں مہمان ٹھہرالیا اور یہ صحیح بخاری و مسلم کی سند لی۔

امام غزالی کی عمر صرف ۵۵ برس تھی۔ تقریباً ۲۰ برس کے تھے کہ تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کر لیا۔ دس گیارہ برس صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں گزرے، درس و تدریس ہمیشہ جاری رکھی۔ انکے تلامذہ کی تعداد کسی وقت بھی ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی۔ فقر و تصوف کے مشغلے اس سے جدا، دور دور سے فتاویٰ آتے ان کا جواب الگ لکھتے اس کے باوجود آپ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ فقہ میں آپکی مشہور کتابیں وسیط، بسیط اور خلاصۃ

الرسائل۔ اصول فقہ میں تحصیل الماخذ۔ شفاء العلیل۔ مفصل الخلاف فی اصول القیاس۔ منطق میں معیار العلم، محک النظر، میزان العمل۔ فلسفہ میں مقاصد الفاسفہ علم کلام میں تہافتہ الفلاسفہ۔ منقذ۔ الجام التوام۔ تصوف و اخلاق میں احیاء العلوم کیمیائے سعادت۔ مشکوٰۃ الانوار۔ منہاج العابدین بہت مشہور ہیں۔ امام کی کچھ تصانیف صرف یورپ میں موجود ہیں اور کچھ کا ترجمہ عالم اسلام کی　زبانوں میں ہوچکا ہے۔

علامہ نووی نے بستان المحدثین میں ایک شخص کا بیان نقل کیا کہ امام صاحب کی تصنیفات انکی عمر کے لحاظ سے روزانہ ۱۶ صفحے کے حساب سے لکھی گیئں جو اتنے مشغلوں کے باوجود با التزام حیرت انگیز ہیں۔ یاقوت التاویل تفسیر کے سلسلے میں آپ کی طرف منسوب ہے جس کی ضخامت ۴۰ جلدیں بیان کی جاتی ہیں لیکن علامہ شبلی کے مطابق فن تفسیر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یاقوت التاویل ایک فرضی نام ہے۔ امام زین الدین عراقی، امام نووی، شیخ ابو محمد وغیرہ کا اتفاق ہے کہ سب سے مشہور اور مفید تصنیف احیاء العلوم ہے بعض صوفیا نے پوری کی پوری حفظ کرلی تھی بعض صوفیاء اسے الہامی تصنیف سمجھتے تھے۔ شیخ محی الدین اسے خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے قطب شاہ ولی اپنا خواب بیان کرتے ہیں کہ اسے آنحضرت صلعم نے بہت پسند کیا۔ فرمایا

"امام غزالی کی تصانیف پر بہت سے علماء نے حاشیے لکھے اور یورپ کے علماء نے بالخصوص ان کی قدر کی۔ علم کلام میں امام صاحب کو وہی مقام حاصل ہے جو ارسطو کو منطق میں۔ تقلید کے سخت دشمن تھے اور عقائد کی اصلاح میں بڑے مصروف رہتے۔ آپ نے بڑے بڑے بادشاہوں کو خط لکھے اور ان کی اصلاح عقائد کی دعوت دی اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے۔

آج تقریباً تمام دنیا میں انہیات۔ نبوات امام غزالی ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ آپ کے ان مقرر کردہ اصولوں میں کچھ باتیں بے جا بھی تھیں بعد میں آنیوالے علماء نے ان پر تنقید کی۔ امام غزالی کی بعض تصانیف میں کچھ باتیں واقعی قابل مواخذہ ہیں۔ احیاء العلوم میں نقل حدیث کے سلسلے میں امام صاحب نے بڑے تسامح اور تساہل سے کام لیا۔ موضوع ضعیف اور بے سروپا روائتیں بے ترتیب نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ علامہ ابن قیم نے ان پر سخت تنقید کی ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ امام صاحب پر تصوف کا غلبہ ہی اس بے احتیاطی کا سبب ہے۔

۱۴/جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طاہران انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ امام صاحب کی وفات پر عالم اسلام کو بہت صدمہ پہنچا اور اکثر شعراء نے مرثیے لکھے۔

غزنوی، ابوبکر سید

خاندان غزنویہ کے آخری علمی فرزند۔ سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔ ۲۲ مئی ۱۹۲۷ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر اور لاہور میں حاصل کی۔ دینی علوم میں آپ کے اساتذہ مولانا محمد گوندلوی۔ آپ کے والد مولانا سید غزنوی اور مولانا شریف اللہ ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کیلئے لاہور آئے اور ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ پنجاب بھر میں اوّل آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اسکے بعد قانون میں ایل ایل بی امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار ہوئے۔ شعبہ عربی اور اسلامیات کے سربراہ رہے۔ انہی دنوں حکومت کو انٹر کالج میں جدید ادب پڑھانے کے لیے کسی قابل پروفیسر کی ضرورت تھی، کافی تلاش و تفتیش کے بعد سید ابوبکر غزنوی پر نظر انتخاب پڑی۔ چنانچہ سید صاحب اسلامیہ کالج کی مستقل ملازمت کے ساتھ ساتھ اعزازی طور پر انٹر کالج میں جدید ادب پڑھاتے رہے۔

جب انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ علوم اسلامی کا اجراء ہوا تو اس کی سربراہی کے لیے بھی آپ ہی کا انتخاب ہوا۔ ۱۹۷۵ء تک سید ابوبکر انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اسی سال بہاولپور یونیورسٹی میں آپ کو وائس چانسلر کی حیثیت سے متعین کر دیا گیا۔

برصغیر میں اسلام کی خدمت کرنے والوں میں غزنوی خاندان خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ سید ابوبکر کا تعلق اس خاندان سے ہے۔ مولانا ابوبکر علم جدید و قدیم اور تصوّف و معرفت کا بہترین امتزاج تھے جہاں انہوں نے علوم عصریہ پر عبور حاصل کیا وہاں اثری علوم پر بھی کامل نگاہ رکھتے تھے۔ فلسفہ کی ابتدائی تعلیم کے دوران کچھ دیر تشکیک میں رہے لیکن بعد میں حقیقت تک بہت جلد پہنچ گئے۔ خطابت میں مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، محمد علی جوہر اور مولانا داؤد غزنوی کی صف میں شامل ہوتے ہیں۔ شام ہمدرد کی اکثر تقریبات میں اسلام کے معاشی پہلو نظام اخلاق کے موضوع پر انتہائی موثر و فاضلانہ خطبے دیئے۔ معاشی پہلو پر انکی فکر سلف صالحین کے متصادم تھی ۱۹۶۲ء میں مولانا داؤد غزنوی کی وفات پر اپنے وسیع علم و فضل اور خاندانی وقار کے باعث مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے کچھ مدت بعد اختلافات کی بناء پر علیحدہ ہو گئے۔ افکار سلفیہ میں امام ابن تیمیہ، ابن حزم، شیخ [illegible] تصوف میں امام غزالی، سید عبدالقادر جیلانی اور مجدد الف ثانی۔ حدیث میں امام احمد حنبل، سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کے خوشہ چین تھے۔

نہایت وضع دار اور خود دار تھے۔ تصوف سے محبت موروثی تھی۔ مجلس ذکر بالالتزام کراتے جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ شریک ہوتا۔ سابقہ حکومت نے [illegible] وزارت کی پیشکش کی لیکن انہوں نے معذرت کر دی۔ اپنے دارالعلوم کے ہاں میں باقاعدہ خطبہ جمعہ دیتے رہے اور اس کا اجراء بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ انتہا درجہ کے ذہین تھے۔ فکر و اجتہاد میں زبردست ملکہ رکھتے۔ انگریزی ادب عربی اور اردو کے علاوہ کئی زبانوں کے کامل ماہر تھے۔ علامہ اقبال کے تسوید تشکیل الٰہیات جدیدہ کو عام کرنے کے لیے بڑا جذبہ رکھتے تھے۔ اس کا اظہار بھی انہوں نے کئی دفعہ کیا۔ زبان و ادب پر پورا عبور تھا۔ تقریر کی طرح تحریر میں بھی ان کا انداز منفرد و ممتاز تھا۔ صرف ۴۸ برس کی عمر میں ملک کی ایک بڑی اسلامی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بن جانا آپ کا امتیاز تھا۔ سید ابوبکر نے ستمبر ۱۹۷۵ء سے آخر مارچ ۱۹۷۶ء تک اس کے لیے شب و روز محنت کی۔ ایک قدیم طرز کے دینی مدرسہ کو ایک جدید یونیورسٹی بنانے کے اس تعمیری عمل میں ممکنہ حد تک کام کیا تو ان کا ارادہ تھا کہ اس ادارے کو انٹرنیشنل یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچا دیا جائے گا۔

غلط عقائد و مسالک کے حصار سے نوجوانوں کو نکال کر صحیح اسلامی فکر سے آشنا کرنا آپ کا خصوصی مشن تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے گرانقدر خدمات سر انجام دیں۔ فکر و استغنا میں خاندانی روایات کی پوری پاسداری کی۔ سید اسماعیل شہید کی تحریک احیائے دین کی تشکیل کی۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے مہتمم بھی رہے۔

سابقہ حکومت نے آپ کی اعلیٰ ذہانت اور فاضلانہ صلاحیتوں کے پیش نظر لندن میں ہونے والی اسلامک فیسٹول میں نمائندہ آپ کا انتخاب کیا۔

وہاں لندن میں ۴ اپریل کو ایک حادثے میں زخمی ہو گئے اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اس وجہ سے اپنا مقالہ نہ پڑھ سکے۔ ایک ماہ بعد وہیں ہسپتال میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ آخری وقت تک طہارت و ذکر الٰہی کا پورا خیال رکھا

ان کا ارادہ امریکی جامعات میں اسلام پر لیکچر دینے کا تھا لیکن قدرت کی طرف سے انہیں موقع نہ مل سکا۔ میت کو لاہور لایا گیا۔ مولانا معین الدین لکھنوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ میانی صاحب کے قبرستان میں اپنے والد مولانا داؤد غزنوی کے پہلو میں دفن ہوئے ان کے جنازے میں شریک لوگوں کی اتنی تعداد لاہور میں اس سے قبل کسی جنازے کے ہمراہ کم ہی دیکھی گئی۔

غزنوی سید داؤد مولانا

برصغیر میں تحریک آزادی کے رہنما جمعیت علمائے ہند، جمعیت اہل حدیث خلافت کمیٹی کے بانی، احرار، کانگریس اور مسلم لیگ کے قائد مولانا سید محمد داؤد غزنوی ۱۸۹۵ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید عبداللہ غزنوی غزنی سے عمل بالسنتہ کی پاداش میں جلاوطن ہو کر ہندوستان آئے ان کا شمار سید نذیر حسینؒ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی کے والد سید عبدالجبار غزنوی عالم و صوفی تھے۔ مولانا داؤد نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالاول غزنوی سے حاصل کی۔ اردو اور ریاضی میں آپ کے استاد مولانا محمد گل علوم عقلیہ میں مولانا سیف الرحمٰن کابلی تھے۔

مزید تعلیم کے لیے آپ محدث دہلوی کی درس گاہ دہلی چلے آئے اور حافظ عبداللہ غازی پوری سے حدیث کی تکمیل کی۔ تحصیل علم کے بعد واپس امرتسر آگئے اور اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے تقویۃ الاسلام میں تدریس کے فرائض سر انجام دینے لگے۔

مولانا داؤد نے تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ و اشاعتِ اسلام۔ تحریک آزادی وطن سے اپنی دلچسپی اور کمال خطابت کی وجہ سے امرتسر میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب ترک انگریز کے خلاف صف آراء تھے اور مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں۔ اسی زمانے میں تحریک خلافت کو قائم کیا گیا مولانا غزنوی اس کے سرگرم رکن تھے۔

۱۹۲۰ء میں جمعیت علمائے ہند کی تشکیل ہوئی تو اسکی تاسیس میں موثر کردار ادا کیا۔ مدتوں نائب صدر رہے اسی سال انگریز کے خلاف آوازہ حق بلند کرنے کے جرم میں تین سال کے لیے میانوالی جیل میں نظر بند کر دیئے گئے۔ اسی سال آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک پر آزادیٔ ہند کے لیے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ۱۹۲۵ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور تیسری بار قید و بند کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں چند خلافتی ساتھیوں کو ساتھ لے کر مجلسِ احرارِ اسلام کی بنیاد ڈالی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو کافی کوشش سے ساتھ ملا کر چند سالوں میں اسے منظم اور جاندار تحریک بنا دیا۔ ۱۹۳۲ء میں جب احرار نے تحریک کشمیر شروع کی تو برصغیر کے ہزاروں احرار رضاکاروں کے ساتھ خود بھی گرفتار ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں جب کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی مہم شروع کی تو وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور زبردست سرگرمی دکھائی اور گرفتاری ہوئے۔ رہائی کے کچھ عرصہ بعد ان کو پنجاب کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا اور وہ اس جماعت کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں کانگریس کے ذہنی رویے سے تنگ آکر اس سے مستعفی ہو گئے اور اور مسلم لیگ کے ساتھ بھرپور تعاون کا اعلان کر دیا۔

لیگ میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں کا دورہ کیا اور انگریزوں کے خلاف اپنے زور خطابت سے نفرت کی آگ لگا دی۔ مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک کے پہلے ہی روز نواب ذوالفقار علی ممدوٹ اور مولانا داؤد کے سوا ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان گرفتار کر لیے گئے۔ جب نواب ممدوٹ بھی گرفتار ہو گئے تو تحریک چلانے کی ذمہ داری آپ پر پڑ گئی۔ قائد اعظم نے آپ سے طویل ملاقات کی اور چند ہدایات بھی دیں۔

تحریک آزادی کے سلسلے میں مولانا غزنوی تقریباً ۱۲ سال جیل میں رہے۔ سیّد غزنوی نے ۱۹۲۷ء میں سیاست کے ساتھ ساتھ صحافت بھی شروع کر دی اور امرتسر میں ہفت روزہ "توحید" کا اجراء کیا۔ توحید کا مقصد مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللہ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ پیدا کرنا تھا اس کے مضامین نے مسلمانوں کو چونکا دیا۔ معروف معنوں میں توحید کے مضامین مولانا آزاد کے "الہلال" اور "البلاغ" کا تتمہ سمجھے جانے لگے۔ میدانِ صحافت میں بھی آپ منفرد حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹۵۸ء میں جب ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو ہر طرف ہراس پھیلا ہوا تھا۔ بڑے بڑے جغادری لیڈروں کی تحریر و تقریر مداہنت زدہ ہو گئی تھی۔ اس جمود کو مولانا غزنوی نے پہلی بار منٹو پارک کے میدان میں خطبۂ عید میں توڑا اور مارشل لاء کی دھجیاں بکھیر دیں۔

فروری ۱۹۶۰ء میں حکومت نے ملک میں آئندہ دستور کے لیے ایک آئین کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کی طرف سے چالیس سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ مرتب کیا گیا۔ اس ضمن میں مولانا غزنوی نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علماء سے رابطہ قائم کیا۔ ۵، ۶ مئی کو ملک کے تمام مکاتب فکر علماء کا اجلاس لاہور میں منعقد کیا۔ جواب کا مسودہ مولانا مودودی اور مولانا غزنوی نے مرتب کیا۔ اس میں مکمل جمہوریت اور پارلیمانی نظام حکومت کے قیام کی واضح لفظوں میں تائید کی گئی تھی اور اس مقصد کے لیے علماء کو اکٹھے کرنے اور ایک جواب پر سب علماء کو متفق کرنے میں انہوں نے ایک موثر کردار ادا کیا تھا۔

۱۹ مارچ ۱۹۶۲ء کو اس وقت کے سربراہ سے ملاقات کے دوران آپ نے واضح کر دیا کہ اس آئین میں بعض دفعات اسلام کے خلاف ہیں اس لیے یہ آئین جمہوری ہے نہ اسلامی۔ حکومت کے لیے یہ جواب خلاف توقع تھا۔

مولانا غزنوی بین الاقوامی شخصیت تھے۔ عالم اسلام میں آپ کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ مئی ۱۹۶۲ء میں شاہ سعود بن عبدالعزیز نے اپنے سفیر متعینہ پاکستان کی وساطت سے مولانا داؤد غزنوی کو مطلع کیا کہ انہوں نے مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے آپ کو "مدینہ یونیورسٹی مشاورتی کونسل" کا رکن نامزد کیا ہے چنانچہ آپ شاہ سعود کی دعوت پر حج بیت اللہ کے لیے گئے اور مدینہ یونیورسٹی کی افتتاحی تقریب میں شمولیت کی۔ حکومت پاکستان نے مولانا غزنوی کو جامعہ اسلامیہ (جو اب یونیورسٹی بن چکا ہے) کی نصاب کمیٹی کا رکن بھی منتخب کیا تھا۔

مولانا داؤد غزنوی سیاسی و سماجی ہنگاموں کے باوجود مطالعہ کو برابر جاری رکھتے۔ اہم باتوں پر بالالتزام نشان لگایا کرتے تھے۔

آپ کا کتب خانہ بڑا وسیع تھا۔ علمی مسائل پر گھنٹوں گفتگو کرتے، بات مرتب اور مربوط کرتے۔

فقہ و تصوف کے بارے میں ان کا موقف بہت منجھا ہوا تھا۔ اہل اللہ کی شان

میں گستاخی فیض سے محرومی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ تصوف میں کشف المحجوب، مکتوبات مجدد الف ثانیؒ، احیاء العلوم، فتح الربانی پر پورا عبور تھا۔ تعصب آپ میں بالکل نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد علی لاہوری اور مفتی محمد حسنؒ بانی جامعہ اشرفیہ سے آپ کی دوستی بڑی گہری تھی۔

مصنفات ابن تیمیہ سے آپ کو خصوصی عقیدت تھی۔ آپ نے اسے اپنے دارالعلوم کے نصاب میں شامل کیا۔ مولانا غلام رسول مہر کے مطابق برصغیر میں امام ابن تیمیہ کی تصنیفات کو رواج خاندان غزنوی نے ہی دیا ہے۔ حق گوئی و بے باکی اور علمی ثقاہت، شخصی وجاہت اور طبعی سخاوت آپ کو موروثی طور پر عطا ہوئی تھی۔ آغا شورش کاشمیری مولانا غزنوی کو خطابت کی تمام شرائط پر پورا اترنے والا کہا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں جب شاہ سعود کی دعوت پر آپ حجاز گئے تو دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس وقت آپ کی تیمارداری کرنے والے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔ حجاز سے واپس آئے تو طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ چند دن اسپتال رہے کچھ افاقہ ہوا تو گھر آ گئے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اچانک وفات پا گئے۔ نماز جنازہ مولانا اسماعیل سلفی گوجرانوالوی نے پڑھائی۔ لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

غزنوی، عبداللہؒ، سید

(۱۲۳۰ھ-۱۸۱۱ء - ۱۲۹۸ھ-۱۸۷۹ء) غزنوی خاندان کے بانی۔ علم و تصوف کا حسین امتزاج۔ عارف و مجاہد فی سبیل اللہ۔ قلعہ بہادر خیل (مضافات غزنی) میں پیدا ہوئے۔ محمد اعظم والدین نے نام رکھا۔ غایت تعظیم اسم "محمد" کی خاطر آپ نے عبداللہ رکھ لیا۔ آپ کے جد اعظم محمد شریف اور والد محمد کا شمار بڑے اولیاء میں ہوتا ہے جن کا مزار غزنی میں ہے۔

آپ غزنی کے مشہور سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم غزنی میں حاصل کی۔ تیزیٔ فہم اور سلامتیٔ فکر پر آپ کے اساتذہ حیران تھے۔ تفسیر و حدیث میں آپ کے سوالات کا تسلی بخش جواب نہ ملنے کے باعث بڑے پریشان تھے۔ آپ کو الہام ہوا کہ حضرت شیخ حبیب اللہ قندھاریؒ سے رجوع کرو۔ راستہ طویل ہونے کے باوجود آپ شیخ قندھاری کی خدمت میں پہنچے۔ استعفیٰ دے کر وطن واپس لوٹے۔

سید عبداللہ غزنوی کچھ مدت بعد پھر حاضر ہوئے۔ شیخ کو بڑا تعجب ہوتا کہ معمولی مسائل کے لیے کتنا سفر طے کرنا پڑتا ہے تو شیخ نے مجمع عام میں فرمایا۔ دینی مسائل کو جس طرح آپ سمجھتے ہیں، میں بھی سمجھ نہیں پاتا اگر آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اتنی دور آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کسی در و دیوار سے بھی جواب مل جایا کرے گا۔ مولانا فرماتے تھے میرے شیخ کے ارشاد کے مطابق خدا تعالیٰ نے میرے لیے در و دیوار کو گویا کر دیا۔

مولانا عبدالحیؒ کے مطابق مولانا غزنوی کی روحانی تربیت خدا تعالیٰ نے خود کی تھی۔ بعض علماء ان کی عبادت و پرہیزگاری دیکھ کر حیران ہو جاتے تھے۔ آپ گوشہ نشین ہونے کے باوجود مرجع خلائق بن گئے۔

دور دراز سے علماء و مشائخ آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ لا الٰہ کا جب آپ ورد کرتے تو حیوانات بھی آپ کے ساتھ تسبیح و تہلیل کرتے۔

آپ باجمال تھے امراء اور دنیا دار قسم کے لوگ محض آپ کے چہرے کی زیارت کے لیے بہت کوشش کرتے۔ لیکن آپ انہیں اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب افغانستان میں عوام و خواص نے شرک و بدعات کو دین بنا رکھا تھا۔ توحید و سنت فراموش کر چکے تھے۔ آپ کو الہام کے ذریعے قوم کی اصلاح کی تلقین کی جاتی رہی۔ پہلے پہل آپ حیران ہوتے کہ توحید و سنت کو کہاں سے حاصل کروں اور کیسے پھیلاؤں۔ اللہ کی قدرت سے آپ کو حدیث و تفسیر کی کتابیں غزنی پہنچنے لگیں۔ اور آپ نے محدثین کا مسلک اختیار کر لیا۔ جب آپ مولانا حبیب اللہ کے پاس استفادہ کے لیے قندھار آئے تو علما و فضلا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

جب آپ نے خالص توحید و سنت کی دعوت دینی شروع کی تو جہاں آپ کے کچھ حامی ہوئے وہاں مخالف بھی ہو گئے اور آپ کے عمل بالحدیث پر مباحثہ کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ دوسرے علاقوں کے علماء نے مل جل کر لشکر اکٹھا کیا اور والیٔ کابل امیر دوست محمد خان کے پاس گئے اور آپ کی شکایت کی امیر نے اس جم غفیر سے مرعوب ہوتے ہوئے آپ کو ترک وطن کا حکم دے دیا جس پر مولانا سوات وہاں سے کوچ [illegible] ہزارہ سے ہوتے ہوئے شیخ الکل سید نذیر حسینؒ کے درس سے مستفید ہونے کے لیے دہلی پہنچے اور سند حدیث کی اجازت حاصل کی۔ برصغیر میں تحریک آزادی کا زمانہ تھا، چنانچہ دہلی سے مولانا غزنوی پنجاب آئے اور کچھ دیر قیام کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان کے راستہ سے وطن واپس اس خیال سے چلے گئے کہ شاید امیر دوست محمد کا خیال بدل چکا ہوگا۔ جب آپ غزنی پہنچے تو امیر دوست محمد کا فوجی قاصد اخراج کا پروانہ لے کر پہنچا آپ ملک بدر کیے گئے۔ والیٔ کابل نے وہاں سے بھی نکالنے کا حکم دیا اور آپ کو اہل و عیال سمیت پاغستان کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہونا پڑا۔

جب [illegible] کے علماء سو کو پتہ چلا کہ حضرت غزنوی پاغستان کے پہاڑوں [illegible] بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے ایک لشکر کے ساتھ حملہ [illegible] کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔

انہی دنوں والیٔ کابل امیر دوست محمد فوت ہو گیا تو آپ شیر غزنی پہنچے [illegible] کے بیٹے جو تخت نشین تھا پناہ مانگی۔ اس نے بھی انکار کر دیا اور آپ کو [illegible] حکم دے دیا۔ اہل و عیال سمیت ایک راستے پر چل پڑے [illegible] دکھائی دی اور آگے بڑے بڑے پہاڑ [illegible] آپ نے پہاڑ دیکھ کر سورہ المومنون کی آخری آیات افحسبتم انما خلقنٰکم . . . [illegible] اور ایک غار بن گیا۔ آپ اس قدر [illegible] مدد فرما [illegible] ہوا کہ اللہ ان ظالموں کی جڑ کاٹنے پر قادر ہے چنانچہ اسی زمانے میں [illegible] والیٔ ریاست کا تختہ الٹ دیا گیا۔ آپ پہاڑ سے [illegible] کر واپس پہنچے تو [illegible] درپیش آئی۔ اور گرفتار کر لیا گیا جب آپ نے توحید و سنت کی تبلیغ [illegible] بیان کیے تو امیر بہت متاثر ہوا لیکن علماء سو نے کہا کہ امیر دوست [illegible] ہم اس کا کفر ثابت کر چکے ہیں اب تحقیق کی ضرورت نہیں چنانچہ حضرت غزنوی کے قتل کا فتویٰ تیار کر ڈالا۔ مگر ان علماء میں سے ملا مشکی نامی ایک انصاف پسند تھا اس نے قتل کے فتوے پر دستخط نہ کیے لیکن آپ کو درے مارے گئے [illegible] دی گئی چہرہ پر سیاہی مل دی گئی اور گدھے پر سوار کرا کے شہر بھر میں پھرایا گیا پھر قید خانہ میں ڈال دیا اس ابتلا کے دور میں آپ ثابت قدم رہے دو سال تک اپنے بیٹوں کے ساتھ قید خانے میں رہے۔ ۱۸۶۷ء میں امیر افضل کا انتقال ہو گیا اور امیر اعظم

تخت پر بیٹھا۔ اس نے آپ کی جلاوطنی کے احکام صادر کر دیئے اور پیادہ پا پشاور کی طرف نکال دیا۔ ایک ماہ بھی نہ گذرا تھا کہ امیر اعظم کا تختہ بھی الٹ گیا۔ اور وہ بھی ذلیل و خوار ہوا۔

حضرت غزنوی پشاور میں کچھ مدت قیام کے بعد امرتسر تشریف لے آئے اور کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت میں ڈوب گئے۔ للّٰہیت اور خلوص سید غزنویؒ کا امتیاز تھا۔ آپ کے بارہ صاحبزادے اور پندرہ صاحبزادیاں تھیں۔ جن میں سے ہر ایک عالم باعمل اور محدث و فقیہ تھا۔

مولانا غزنوی کی نیک نفسی، روحانی بلندی اور جرأت و استغنا کے بارے میں بے شمار واقعات مشہور ہیں علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ جب آپ دہلی میں تھے تو ۱۸۵۷ء کی ستاون کا زمانہ تھا گورا فوج نے چاروں طرف گولیوں سے ہلاکت کا طوفان اٹھا رکھا تھا مسجد اور گرد و نواح کا علاقہ خصوصیت کیساتھ اس قتل عام کا مرکز تھا ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو آپ مسجد کے حوض پر آ گئے گولیاں چلتی رہیں ذرہ برابر بھی کھٹکا محسوس نہ کیا۔ اس معجز نما جرأت کو دیکھ کر مقتدیوں نے بھی حوصلہ کیا۔ اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وضو کر کے نماز میں لگ گئے۔ ایک دفعہ آپ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کسی نے مطلع کیا کہ آپ کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ یہ اندوہناک خبر سنی۔ ایک منٹ خاموش رہے پھر کہنے لگے ؛

"وہ خدا کی امانت تھی اس نے اپنا کام کیا ہم اپنا کام کریں" یہ کہہ کر پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے جذب و کیفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی آپ بدستور نماز میں مشغول رہے سلام کے بعد ہاتھ اٹھائے تو داڑھی تر تھی فرمانے لگے ؛

"باراں شد! واللہ عبداللہ را خبر نہ شد"

ربیع الاول ۱۲۹۸ھ - ۱۸۷۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا مزار شہر امرتسر میں دروازہ سلطان ونڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے پر ہے۔

غزنوی محمود

غزنوی محمود (۹۷۱ء - ۱۰۳۰ء) عظیم سلطان اور سپہ سالار ۲ر اکتوبر ۹۷۱ء کو پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام ابوالقاسم محمود تھا۔ باپ کا نام ناصرالدین سبکتگین تھا جو الپتگین کا ترک غلام تھا۔ الپتگین سامانیوں کا ترک سردار تھا۔ اور اس نے ۸۸۱ء میں اپنے زورِ بازو سے غزنی فتح کیا اور اس کا بادشاہ ہو گیا۔ امیر بخارا نے الپتگین سے صلح کر لی اور جو علاقے اس نے فتح کر لیے تھے، ان پر اس کی بادشاہت تسلیم کر لی۔ الپتگین کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق تخت غزنی پر بیٹھا، پھر بلکاتگین اور اس کے بعد پری تگین۔ یہ دونوں الپتگین کے غلام تھے۔ ان تینوں بادشاہوں کا زمانۂ حکومت مختصر رہا۔ آخر میں امرائے دربار نے اتفاق رائے سے سبکتگین کو غزنی کا بادشاہ منتخب کیا (۲۰ر اپریل ۹۷۷ء)۔ ایک دو سال کے اندر ہی امیر سبکتگین نے بہت سی فتوحات کیں۔ بست اور قزدار فتح کیا۔ غزنی اور راجہ جے پال کی سرحدیں مل گئیں۔ جب دو طاقت ور فرماں رواؤں کی سرحدیں متصل ہوں تو جنگ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ نوک جھونک رہنے لگی۔ نیز سبکتگین کے سامنے یہ ایک اہم مقصد بھی تھا کہ ملتان اور سندھ کو باطنیوں کے تسلط سے نجات دے۔ جے پال کو سبکتگین کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر وحشت ہوئی اور دونوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں۔

۹۹۴ء میں محمود کو "سیف الدولہ" کا خطاب دے کر، خراسان کا گورنر بنایا گیا۔

دو سال بعد اس کا باپ امیر سبکتگین اگست ۹۹۷ء میں بلخ میں انتقال کر گیا جہاں وہ ایک بغاوت کچلنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے اسماعیل کو جانشین مقرر کیا جو اس وقت اس کے پاس تھا۔ اسماعیل نے بلخ کے مقام پر فوراً تخت و تاج سنبھال لیا۔ اس وقت محمود نیشاپور میں تھا۔ محمود نے اسے برادرانہ انداز میں پیشکش کی کہ سلطنت کو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، لیکن اسماعیل نے اسے مسترد کر دیا۔ چنانچہ تاج و تخت کی وراثت کے لیے دونوں بھائیوں میں ۹۹۸ء میں جنگ ہوئی۔ محمود فتحیاب ہوا اور ۹۹۸ء میں غزنی کا حکمران بن گیا۔

اُس زمانے میں سامانیوں کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کئی ریاستوں میں بٹ گئی تھی۔ محمود نے پہلے تو سامانیوں کی ماتحتی سے آزادی حاصل کی۔ پھر آس پاس کی ریاستوں کو نیچا دکھا کر غزنی کی حکومت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ عباسی خلیفہ کو محمود کی فتوحات کا حال معلوم ہوا تو خراسان کی حکومت کا پروانہ اور خلعت بھیجا۔ یمین الدولہ امین الملّت کا خطاب بھی دیا۔ چنانچہ آگے چل کر محمود کے خاندان نے یمینی خاندان کے نام سے شہرت پائی۔

سلطان محمود غزنوی سکندر اعظم کی طرح ایک خوش نصیب جوان تھا، جس کے قابل و منتظم باپ نے اسے ورثے میں بہت بڑی سلطنت دی، سکندر کی طرح محمود کو بھی اپنے باپ کی طرف سے ایک جرّار، آزمودہ کار اور منظّم لشکر ملا۔ سکندر کی طرح محمود کو بچپن ہی سے نہ صرف پریڈ گراؤنڈ اور ورزشی اکھاڑے میں فنِ سپاہ گری کا ماہر بنایا، بلکہ ابھی وہ سات برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ اُس کو اپنے جنرل باپ امیر سبکتگین کے ہمراہ خراسان کی مہم میں شرکت کرنا پڑی۔ اسی طرح محمود نے پندرہ برس کی عمر میں غور و طغان کی جنگوں میں اپنی شمشیر زنی اور بہادری کے جوہر دکھا کر اپنا یہ مستقبل متعین کر لیا کہ وہ دنیا کا ایک عظیم فاتح ہو گا۔ محمود غزنوی نے غزنی میں ایک خوبصورت باغ اور مکان بنوا کر اعیانِ حکومت، امرائے سلطنت اور خود شاہ مملکت کی ضیافت کی۔ اس موقع پر امیر سبکتگین نے اپنے نامور بیٹے کو یہ کار آمد نصیحت کی ؛

" یہ باغ اور عمارت بہت عمدہ اور دلفریب ہے مگر اس قسم کا باغ اور . . . مکان ہر وہ امیر بنا سکتا ہے جس کے پاس دولت ہے، مگر بادشاہوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسی عمارت تعمیر کریں جس کی مثال دوسرے امرا تیار نہ کر سکیں۔ یہ عمارت علم و عمل سے بنتی ہے۔"

محمود نے باپ کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی اور اپنی آئندہ زندگی اس پر عمل کرتے گزار دی۔

فتوحات

۹۹۸ء میں سلطان محمود اپنے بھائی اسمٰعیل کو شکست دے کر غزنی اور خراسان کے تخت پر بیٹھا۔ ایک سال بعد سلطان نے امیر منصور سے بلخ، ہرات، ترمز اور بست کی امارت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ امیر نے خراسان کی حوالگی پر اظہار معذرت کیا تو محمود نے نیشاپور پر چڑھائی کر دی۔ امیر منصور مرغاب چلا گیا۔ باغیوں نے امیر منصور کو تخت سے علیحدہ کر کے اس کے بھائی کو تخت نشین کر دیا۔ اس پر سلطان مرو کی طرف بڑھا۔ آخرکار ۶ر مئی ۹۹۹ء کو اس نے دشمنوں کو شکست دے کر خراسان کے بڑے حصّے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۰۰ء میں محمود نے طغان کے نواح میں چند قلعے فتح کر لیے۔ اگلے سال محمود نے جے پال کو شکست دی اور اسے گرفتار کر کے غزنی لوٹ گیا۔ ۱۰۰۲ء میں وہ سیستان چلا گیا اور وہاں بغاوت فرو کر کے غزنی لوٹ آیا، لیکن اسے جلد ہی دوبارہ سیستان جانا پڑا، کیونکہ باغیوں نے دوبارہ علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی زیادہ تر ہندوستان پر اپنے سترہ حملوں کی وجہ سے

عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ ان دنوں ہندو راجاؤں کا ایک خاندان، جو ہندو شاہی کہلاتا تھا، پنجاب پر حکومت کرتا تھا۔ محمود کے باپ امیر سبکتگین کی حکومت کے زمانے میں اس خاندان کے ایک راجہ جے پال نے بہت سے ہندو راجاؤں کو ساتھ لے کر کابل پر چڑھائی کی، لیکن شکست کھائی اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے لوٹا۔ گھر پہنچ کر اس کی نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اب کے پھر سبکتگین سے معرکہ ہوا جس میں جے پال نے پھر شکست کھائی۔ محمود ان معرکوں میں باپ کے ساتھ ساتھ رہا تھا اور ہندو شاہیوں کی طاقت کو اچھی طرح آزما چکا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد جب اسے اندرونی جھگڑوں سے اطمینان نصیب ہوا اور غزنی میں اس کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس نے ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا اور سترہ حملے کر کے اس سرزمین میں ہلچل مچا دی۔ جے پال کا جانشین انند پال بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کا راستہ روکنے آیا۔ کئی راجپوت راجاؤں نے اس کی مدد کی، لیکن محمود نے انھیں ایسی شکستیں دیں کہ وہ اسے راستہ دینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ وہ سرکش راجپوتوں کو نیچا دکھاتا، جنگلوں اور پہاڑوں کے جنگجو قبیلوں کو دباتا، وادیٔ گنگا میں جا پہنچا۔ ان دنوں ملتان پر اسماعیلیوں کی حکومت تھی۔ سلطان نے ان پر دو مرتبہ چڑھائی کی۔ آخر انھوں نے ہار مان کر اطاعت کر لی۔

سلطان محمود نے وادیٔ گنگا پر پورے زور سے پہلی مرتبہ جو حملہ کیا، اس میں قنوج، بلند شہر، متھرا، اٹاوہ، میرٹھ کے علاوہ کئی اور چھوٹے بڑے شہر فتح ہوئے۔ ان شہروں اور ان کے مندروں سے وہ بے شمار دولت سمیٹ کے غزنی لے گیا۔ اس موقع پر اسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی وجہ سے سارے عالم اسلام میں اس کی بہادری اور اولوالعزمی کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور جا بجا اس کا نام بڑی عزت سے لیا جانے لگا۔ اب کے ہندو شاہیوں اور دوسرے راجاؤں نے مل کر ایک جتھا بنایا اور محمود کو روکنے کا منصوبہ باندھا، لیکن دلوں پر اس کی ہیبت ایسی چھائی ہوئی تھی

سومنات کا مندر

کہ جب وہ فوج لے کر سیلاب کی طرح ہندوکش کے پہاڑوں سے اترا تو یہ جتھا خود بخود ٹوٹ گیا اور کسی کو اس کا راستہ روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ محمود نے پنجاب کو غزنوی سلطنت میں مستقل طور پر شامل کر لیا، اور لاہور اس صوبے کا صدر مقام قرار پایا۔ اس نے کالنجر بھی فتح کیا تھا۔ پہلے گوالیار کے قلعے کو جا گھیرا۔ پھر کالنجر پر جا چڑھا۔ یہ مقام دریائے گنگا کی وادی محمود کی فتوحات کی آخری حد ہے۔ اس سے وہ آگے نہیں بڑھا۔

سلطان محمود کا سب سے بڑا کارنامہ سومنات کی فتح ہے۔ سومنات گجرات کاٹھیاواڑ کے علاقے میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہاں ایک مشہور مندر تھا جس کی یاترا کو دور دور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ کہاں غزنی، کہاں گجرات۔ راستے میں ہر طرف لق و دق میدان اور سنسان ریگستان پھیلے ہوئے تھے، جن میں دور دور تک پانی کا پتا چلتا تھا نہ کہیں ہریاول نظر آتی تھی۔ لیکن محمود نے سفر کی صعوبتوں کی پروا نہ کی اور فوج لے کر یلغار کرتا ہوا جا پہنچا۔ اگرچہ راجپوت ہر طرف سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گئے تھے، فوجوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، لیکن محمود نے اس طرح جھپٹ جھپٹ کر حملے کیے کہ راجپوتوں کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اس فتح میں ان گنت دولت ملی سومنات کا بت بھی ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس کامیابی پر اسلامی ملکوں میں جا بجا بڑی خوشیاں منائی گئیں۔

محمود کا لشکر

ان عظیم فتوحات کا سہرا سلطان کے لشکر کے سر ہے جس کا مفصل حال میجر جنرل محمد اکبر خان نے اپنی تصنیف "اسلامی طریق جنگ" میں قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"زمانہ امن میں سلطان کا وزیراعظم فوج کے انتظامی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وزیراعظم اپنی مدد کے لیے ایک تجربہ کار اور ممتاز افسر کو "عارض" کے عہدے پر متعین کر دیتا تھا تاکہ وہ فوجی مسائل سے بخوبی واقف ہونے کے باعث تنظیم، تربیت اور دیگر انتظامی معاملات میں پوری دلچسپی لے سکے۔ وزیراعظم اور عارض سپاہ کی بہبود، جانوروں کی دیکھ بھال، اسلحہ، سامان رسد و حرب وغیرہ کے [illegible] ہوتے تھے۔ وہ ہر سال کم از کم ایک بار تمام فوج کا معائنہ کرتے۔ [illegible] بنفس نفیس بھی اس معائنے میں شرکت کرتا۔ [illegible] اور ہاتھیوں کو موٹا ہونے کے لیے ہندوستان بھیج دیا [illegible]

سپاہیوں کو ہر تین ماہ کے بعد تنخواہ ملتی تھی [illegible] کے اہل و عیال کی خبر گیری بھی عارض کے ذمہ ہوتی تھی۔ فتح کے بعد [illegible] غنیمت جمع کرتا اور سلطان کے حکم کے موجب اسے تقسیم [illegible] تقسیم شرعی طریق پر ہوتی تھی، مثلاً پیادہ کو ایک حصہ [illegible] پانچواں حصہ سلطان کے خزانے میں بھیج دیا [illegible]

فوج کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی [illegible] بہت اضافہ ہو جاتا تھا۔ فوج کا [illegible]

(ا) [illegible]

(ب) [illegible]

(ج) [illegible]

(د) دستے کا سالار جو کہ عموماً [illegible]

سلطان محمود کو اپنی سالاری اور فن حرب کی [illegible] تھا۔ اس کی فوج میں عرب، مغل، سلجوق، ترک، افغان [illegible] لوگ تھے۔ مگر محمود کی زندگی میں اس کی فوج نے کبھی بغاوت [illegible] نازک اور خطرناک حالات میں اپنی جان پر کھیل گئی۔

ملکی انتظام و اخلاق و عادات

سلطان محمود غزنوی نے ۳۲ برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۰ء میں وفات پائی۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا۔ محمود بڑا عادل اور انصاف پسند فرمانروا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی سلطنت کے مختلف حصوں کا دورہ کرتا رہتا تھا تاکہ اسے مختلف علاقوں کے حالات سے آگاہی

ہوتی رہے۔ اہلکار چوکس رہیں اور اپنے فرائض سے غفلت نہ برتیں۔ اس نے سوداگروں اور دکانداروں کی نگرانی کے لیے جا بجا افسر مقرر کر رکھے تھے۔ کوئی تاجر مول تول میں گاہک کو دھوکہ دیتا تو پکڑا جاتا تھا اور اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

محمود غزنوی کی سلطنت بڑی مضبوط تھی۔ ساری سلطنت میں پورا پورا امن و امان تھا۔ سڑکیں محفوظ تھیں اور لوگ خوشحال اور مطمئن۔ دوسری خوبیوں کے علاوہ محمود علماء اور شعراء کا بڑا قدردان تھا۔ احکام شریعت پر بھی پوری طرح عمل کرتا تھا۔ لیکن تعصب اور مذہبی تنگ نظری سے ہمیشہ اس کا دامن پاک رہا۔ اس نے ہندوؤں کی ایک فوج بھرتی کر رکھی تھی۔ یہ فوج غزنی میں رہتی تھی اور بڑی آزادی سے اپنی مذہبی رسمیں بجا لاتی تھی۔ اس نے کبھی کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم کرنے کا سہرا محمود ہی کے سر ہے اس نے اوپر تلے ایسے میدان مارے اور ایسے ایسے دھاوے کیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی شجاعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ہندو شاہی خاندان ایسا طاقتور تھا کہ کابل اور غزنی پر فتح کا پرچم لہرانے کا خواب دیکھ رہا تھا، لیکن محمود نے اس کا زور توڑ کر پنجاب کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور یہاں اس مضبوطی سے قدم جمائے کہ آگے چل کر جب اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے غزنی کا علاقہ نکل گیا تو پنجاب میں اُن کی حکومت قائم رہی۔

سلطان محمود میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ بڑی سختی سے اسلام کا پابند تھا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور ہر روز قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑا شجاع اور بہادر شخص تھا۔ خطرے کے وقت ذرا نہ گھبراتا اور کیسی ہی مصیبت کیوں نہ آ پڑے ہمت نہ ہارتا تھا۔ میدان جنگ میں فوج کے آگے آگے نظر آتا اور بڑھ بڑھ کر تلواریں مارتا تھا۔ اس کی ذاتی شجاعت کی وجہ سے سپاہیوں کے حوصلے بڑھ اور وہ جی توڑ کر لڑتے تھے۔

سلطان محمود نے نہ صرف فتح ممالک اور جمع اموال میں کمال حاصل کیا بلکہ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں زمانے بھر کے منتخب شعراء اور علماء و فضلاء جمع کر دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعراء کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا، ایران و توران کے کسی دوسرے فرمانروا کو میسر نہیں ہوا۔ ان شعرا کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چار چاند لگا دیے۔ جن شعراء نے محمود کے دربار میں شہرت پائی ان میں فردوسی، عنصری، عسجدی اور فرخی خاص طور پر مشہور ہیں۔ اسی زمانے میں البیرونی ہندوستان میں آیا اور ہندوستانی علوم رسوم کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد اس علاقے اور ہندوؤں کے متعلق ایک نہایت اہم اور سیر حاصل کتاب لکھی۔

سلطان محمود ایک عجیب دل گردے کا مالک تھا اور زبردست قوتِ ارادی کا انسان تھا۔ ۱۰۲۷ء میں اُسے بخار رہنے لگا جس نے تپ دق کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے معمولات میں فرق نہ آنے دیا۔ دربار اور باریابی کا سلسلہ اسی طرح برقرار رکھا۔ خراسان سے سلجوقیوں کو نکالا۔ رے کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۱۰۲۹ء کا موسم گرما خراسان میں اور اگلا موسم سرما بلخ میں گزارا۔ لیکن اب صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ اور ۲۲ اپریل ۱۰۳۰ء کو اُسے غزنی واپس آنا پڑا۔ سات آٹھ روز بعد قضا کا پیغام آ پہنچا۔

محمود کا بیٹا مسعود بھی بڑا بہادر سپاہی تھا، لیکن نہ باپ جیسا عقلمند تھا نہ ویسا دُور اندیش۔ اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ سلجوقیوں سے جنگ چھیڑ دی۔ چنانچہ وسط ایشیا کا جتنا علاقہ اس کے قبضے میں تھا، اس لڑائی میں سارا چھنوا بیٹھا، اور پیچھے ہٹ کر غزنی چلا آیا۔ یہاں سے پنجاب کا رُخ کیا، لیکن راستے میں اپنے غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس کا بیٹا مودود تخت پر بیٹھا تو غزنویوں کی وسیع سلطنت گھٹتے گھٹتے پنجاب اور غزنی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر جب غوریوں کو عروج حاصل ہوا تو غزنی بھی چھن گیا اور محمود کے خاندان کے لوگوں کے پاس صرف پنجاب کا علاقہ بھی باقی رہ گیا۔ چنانچہ جن دنوں سلطان معز الدین غوری نے ہندوستان پر چڑھائی تو غزنوی خاندان کی حکومت صرف لاہور اور اس کے آس پاس کے چند اضلاع پر تھی۔

غزوات

غزوات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل ۱۳ نبوی میں ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ مشرکین نے اسی وقت اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کے خلاف طاقت آزمائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ وصال نبوی تک دس برس کی مختصر مدت میں آنحضورؐ کو تقریباً مسلسل حالتِ جنگ میں رہنا پڑا۔ دشمن کے مقابلے میں چوکنا رہنے کی ہر وقت ضرورت ہے۔ آپؐ صحابہؓ کے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے مختلف اطراف میں روانہ فرماتے رہتے تھے۔ ان مہمات کا نام مؤرخین نے سرایا رکھا۔ جن مہمات میں نبی کریمؐ بنفس نفیس شریک ہوئے، انھیں غزوات کہا گیا۔ اصحاب سیر و مغازی نے سرایا کی تعداد میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے ۳۵، بعض نے ۴۸، بعض نے ۵۰، بعض نے ۶۶ اور بعض نے ۴۳ تعداد بیان کی ہے۔ البتہ غزوات کی تعداد بہ اتفاق ۲۷ تھی۔ ان کا مجمل تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ غزوۂ وُدّان یا غزوۂ الابواء

اوائل صفر ۲ھ میں روانہ ہوئے۔ مشرکین مکہ کے حلیف بنو ضمرہ کو مرعوب و خائف کرنا مقصد تھا۔ اسلامی لشکر صرف ساٹھ مہاجرین پر مشتمل تھا۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ مدینے میں نائب مقرر کیے گئے۔ بنو ضمرہ میں نے لڑے بغیر صلح کر لی۔ آپ پندرہ روز مدینے سے باہر رہنے کے بعد تقریباً ۲۰ صفر کو واپس تشریف لے آئے۔

۲۔ غزوۂ بواط

اگلے ہی مہینے ربیع الاوّل ۲ھ میں آپؐ دو سو مہاجرین کو لے کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کو خائف کرنے کی غرض سے بواط تشریف لے گئے۔ سعدؓ بن معاذ مدینے میں نائب مقرر ہوئے۔ لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور آپؐ چند روز بعد واپس تشریف لے آئے۔

(نیز دیکھیے: بواط)

۳۔ غزوۂ سفوان

بواط سے واپسی پر معلوم ہوا کہ کرز بن جابر فہری مسلمانوں کے مویشی لوٹ کر لے گیا ہے۔ آپؐ فوراً چند مہاجرین کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ حضرت زید بن حارثہ کو مدینے میں نائب مقرر کیا۔ بدر کے قریب سفوان کی وادی تک تلاش کیا، مگر وہ ہاتھ نہ آیا لہٰذا واپس تشریف لے آئے۔

۴۔ غزوۂ ذی العُشیرۃ

ایک مہینہ گزر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ قریش نے خلافِ معمول موسم سرما میں ایک بڑا تجارتی قافلہ شام کی طرف روانہ کیا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے ہتھیار خریدنے کو سرمایہ فراہم کیا جائے۔ آپؐ جمادی الآخر ۲ھ میں ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ اس قافلے کو روکنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ینبع کے قریب ذی عُشیرہ کے مقام پر خیمہ زن ہوئے قافلہ ہاتھ نہیں آیا۔ چند روز قیام کے بعد بنو مدلج سے معاہدہ کر کے واپس تشریف لے آئے۔ اس دوران حضرت ابو سَلَمہ بن عبد الاسد مدینے میں آپؐ کے نائب تھے۔

۵۔ غزوۂ بدر

اس کے دو ماہ بعد پہلا غزوہ پیش آیا جس میں لڑائی ہوئی۔ در اصل اسی قافلے نے جس کے خلاف آپؐ ذو عُشیرہ تشریف لے گئے تھے، واپسی کے وقت مکہ والوں کو پیغام بھیج کر فوج بلوائی تھی۔ جو بدر تک پہنچ گئی۔ لڑے بغیر چارہ نہ تھا۔ آپؐ نے حضرت ابو لبابہؓ کو

غزواتِ نبوی پر ایک نظر

مدینے میں نائب بنایا اور ۳۰۵ جانثاروں کے ہمراہ ۸ رمضان ۲ھ کو روانہ ہوئے۔ اس بار انصار بھی لشکر میں شامل تھے۔ ۱۷ رمضان مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کو معرکہ ہوا۔ ۱۴ مسلمان شہید ہوئے اور ستر دشمن ہلاک ہوئے۔ ۲۲ رمضان کو آپؐ واپس مدینہ تشریف لائے۔

(نیز دیکھیے: بدر)

۶۔ غزوہ بنی قینقاع

بدر سے واپسی کے صرف بیس دن بعد یعنی شوال ۲ھ کے آخر میں بنو قینقاع کے یہودی قبیلے کے لفنگوں نے ایک مسلمان خاتون کے چہرے سے پردہ اٹھا دیا۔ حضورؐ نے اُنھیں تنبیہ کی تو وہ اکڑ گئے۔ چنانچہ آپؐ نے مجبوراً صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بنو قینقاع پر چڑھائی کر دی۔ مدینے میں حضرت ابولبابہؓ کو نائب مقرر کیا۔ پندرہ روز کے محاصرے کے بعد دشمن صلح پر آمادہ ہو گئے۔ آپؐ نے ان کی جان تو بخش دی مگر مال و اسباب ضبط کر کے انھیں جلاوطن کر دیا۔ ذی القعدہ کی چاند رات کو غزوۂ بنو قینقاع سے فراغت ہوئی۔

۷۔ غزوۂ سویق

اگلے ہی مہینے ابوسفیان بدر کی شکست کا بدلہ لینے کی غرض سے مدینے پر حملہ آور ہوا۔ دو مسلمانوں کو سوتے میں شہید کر کے فرار ہو گیا۔ رسول کریمؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ حضرت ابولبابہؓ کو نائب مقرر کر کے دو سو صحابہ کے ہمراہ ۵ ذی الحجہ ۲ھ کو تعاقب میں روانہ ہوئے۔ ابوسفیان نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ستو (سویق) کے بورے راستے میں پھینک دیے۔ آنحضورؐ پانچ روز کی مہم کے بعد لوٹ آئے۔

۸۔ غزوۂ قرقرۃ الکدر

اگلے مہینے اطلاع موصول ہوئی کہ عراق اور مکہ کے راستے میں بنو سُلیم اور غطفان شرارت پر آمادہ ہیں۔ آپؐ نے دو سو صحابہ ساتھ لیے۔ حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم کو مدینے میں نائب مقرر کیا اور محرم ۳ھ کے پندرہ روز گزرنے کے بعد دشمنوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ قرقرۃ الکدر پہنچے تو دشمن اپنے مویشی چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ پانچ سو اونٹ مالِ غنیمت میں ہاتھ لگے۔ محرم کے اواخر میں آپؐ واپس تشریف لے آئے۔

۹۔ غزوہ بنی غطفان

ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ ذوامر کے مقام پر ثعلبہ اور محارب کے مشرکین کے اجتماع کی خبر آئی۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ غنی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ چار سو پچاس گھوڑ سوار مجاہدین کے ہمراہ ۱۲ ربیع الاوّل ۳ھ کو روانہ ہوئے۔ دشمن سے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ ۲۴ ربیع الاوّل کو واپس تشریف لے آئے۔

۱۰۔ غزوۂ بنی سُلیم

پھر دو ماہ بعد اطلاع موصول ہوئی کہ بنو سُلیم بحران کے مقام پر جمع ہو رہے ہیں۔ آپؐ عبداللہؓ بن ام مکتوم کو نیابت سپرد کرکے تین سو صحابہ کے ہمراہ ۶ جمادی الاوّل ۳ھ کو اس خطرے کے سدِباب کے لیے روانہ ہوئے۔ دشمن آپؐ کی آمد کی خبر پاکر منتشر ہوگئے۔ چنانچہ جنگ نہیں ہوئی۔ اور آپؐ ۱۷ جمادی الاوّل کو مدینہ لوٹ آئے۔

۱۱۔ غزوۂ احد

تین ماہ بعد مکہ سے خبر آئی کہ قریش بدر کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تین ہزار کا لشکر لے کر آ رہے ہیں۔ ۵ شوال کو دشمن فوج کی آمد کی اطلاع ملی۔ آپؐ اگلے ہی روز حضرت ابن ام مکتومؓ کو نائب مقرر کرنے کے بعد ایک ہزار مسلمانوں کو لے کر مقابلے کے لیے نکلے۔ راستے میں تین سو منافقین ساتھ چھوڑ گئے۔ ۷ شوال کو مدینہ کے شمال مشرق میں جبل اُحد کے دامن میں معرکہ ہوا۔ مسلمان تیر اندازوں کی ایک غلطی کے باعث مجاہدین کا جانی نقصان زیادہ ہوا۔ ستر صحابہ شہید ہوئے۔ دشمن کے ۲۳ آدمی ہلاک ہوئے۔ مشرکین کا پلّہ اگرچہ بھاری تھا، مگر واپس لوٹ گئے۔ (نیز دیکھیے: احد)

۱۲۔ غزوۂ حمراء الاسد

رسول اللہؐ احد میں زخمی ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود آپؐ ۸ شوال کو تھکے ماندے مجاہدین کے ساتھ ہی دشمن کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ پلٹ کر مدینے پر حملہ نہ کر دے۔ اس مہم میں قتال کی نوبت نہیں آئی۔ اور آپؐ تین روز حمراء الاسد میں قیام کے بعد ۱۳ شوال ۳ھ کو مدینے لوٹ آئے۔

۱۳۔ غزوۂ بنی النضیر

جنگ احد کے چار ماہ بعد حضورؐ نے بنو عامر کے لوگوں کے کہنے پر اکتالیس منتخب صحابہ کو تبلیغ کے لیے بئر معونہ بھیجا۔ وہاں بنو سُلیم نے گھیر کر چالیس مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ایک صحابی زندہ بچ کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں جوشِ انتقام میں انھوں نے بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ اس قبیلے کے ساتھ یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کے واسطے سے آنحضرتؐ کا عہد و پیمان تھا۔ رسول اللہؐ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ ان دونوں آدمیوں کی دیت ادا کرنے کے لیے بنو نضیر سے گفتگو کرنے گئے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کی سازش کی۔ آپؐ نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا کہ اس بدعہدی کی پاداش میں تم دس روز کے اندر اندر مدینے سے نکل جاؤ۔ انھوں نے گستاخی سے جواب دیا۔ اس پر آنحضرتؐ نے ابن ام مکتومؓ کو اپنا نائب بنا کر صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ یہودی قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز کے محاصرے کے بعد دشمن نے ہتھیار ڈال دیے۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ یہودیوں کا اسلحہ ضبط کر لیا گیا اور انھیں اجازت دے دی گئی کہ اونٹوں پر جتنا مال لے جا سکتے ہیں، لے جائیں۔ یہ غزوہ ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا۔

۱۴۔ غزوۂ بدر الموعد

شوال ۳ھ میں اُحد سے واپس جاتے وقت ابوسفیان نے للکارا تھا کہ آئندہ سال بدر میں مقابلہ ہوگا لیکن وہ جنگ کی تیاریاں نہ کر سکا۔ اس لیے مدینے میں یہ پروپیگنڈہ کرایا کہ اس سال تو قریش کی بہت تیاری ہے، مسلمان مقابلے پر نکلے تو نقصان اٹھائیں گے۔ آنحضرتؐ نے جب یہ سُنا تو فوراً جہاد کا اعلان فرما دیا۔ اس مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو قائم مقام مقرر فرمایا۔ ۲۶ شوال ۴ھ کو پندرہ سو مجاہدین کی معیت میں بدر کی طرف روانہ ہوئے۔ ذی قعدہ کی چاند رات کو وہاں پہنچے۔ ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر مکّے سے چلا لیکن ہمت ہار کر مرّالظہران سے ہی لوٹ گیا۔ حضورؐ آٹھ روز انتظار کرکے ۱۲ یا ۱۳ ذی قعدہ کو مدینہ لوٹ آئے۔

۱۵۔ غزوۂ ذات الرقاع

ڈیڑھ ماہ بعد اطلاع ملی کہ انمار اور ثعلب نامی قبیلے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے مدینے پر حضرت عثمانؓ کو قائم مقام مقرر کیا۔ چار سو اصحاب کے ساتھ ۱۰ محرم ۵ھ کو ذات الرقاع کے علاقے کی طرف روانہ ہوگئے۔ چار روز کے سفر کے بعد وہاں پہنچے۔ دشمن پہاڑوں میں روپوش ہوگئے۔ قتال کی نوبت نہیں آئی۔ آپؐ چند روز قیام کے بعد ۲۵ محرم کو مدینے لوٹ آئے۔ (نیز دیکھیے: ذات الرقاع)

۱۶۔ غزوۂ دُومۃ الجندل

مدینے سے تیرہ چودہ روز کی مسافت پر شمال میں دُومۃ الجندل کا نصرانی والی اکیدر مسلمانوں کے تجارتی قافلوں کو متواتر پریشان کر رہا تھا۔ آخر آپؐ نے اس کی سرکوبی کے لیے ایک ہزار صحابہ کا جیش تیار کیا۔ مدینے میں حضرت سباعؓ بن عرفطہ انصاری کو اپنا نائب مقرر کرکے ۲۵ ربیع الاول ۵ھ کو روانہ ہوئے۔ دشمن کے علاقے میں پہنچے تو کوئی مقابلے پر نہ آیا۔ چند اونٹ ہاتھ لگے۔ چند روز قیام کے بعد ۲۰ ربیع الآخر کو مدینے واپس پہنچ گئے۔ (نیز دیکھیے: دُومۃ الجندل)

۱۷۔ غزوۂ بنی المصطلق

تین ماہ بعد پتا چلا کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو مصطلق نے مدینے پر حملہ کی تیاری کی ہے۔ آپؐ تحقیق حال کے بعد ایک مختصر سی فوج لے کر ۲ شعبان ۵ھ کو مریسیع کی جانب روانہ ہوئے۔ مدینے میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو قائم مقام چھوڑا۔ دشمن نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر مجاہدین کے حملے کی تاب نہ لا سکے۔ دس کفّار ہلاک ہوئے اور ایک صحابی شہید ہوئے۔ چھ سو کفّار گرفتار ہوئے۔ ان میں سردارِ قبیلہ کی صاحبزادی جویریہ بھی تھیں۔ آنحضورؐ نے ان کی خواہش پر انھیں آزاد کرکے نکاح کر لیا۔ اس پر صحابہ نے دوسرے قیدی بھی آزاد کر دیے۔ ۳۰ شعبان کو مدینے میں واپسی ہوئی۔

۱۸۔ غزوۂ خندق

ابھی ایک مہینہ امن میں گزرا تھا کہ خبر ملی قریش اور یہود نے مل کر مدینے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ آپؐ نے اس مرتبہ مدینے میں رہ کر مقابلے کا فیصلہ کیا۔ شہر کے شمال مغرب میں جہاں سے دشمن آ سکتا تھا، ساڑھے تین میل لمبی سرحا خندق کھود دی گئی تین ہفتے میں یہ کام مکمل ہوا۔ شوّال کے اواخر میں دس ہزار سے زائد دشمنانِ اسلام یلغار کرتے ہوئے آئے۔ ۲۷ یا ۲۸ شوال کو مقابلہ شروع ہوگیا۔ خندق کے باعث بڑا معرکہ نہیں ہو سکا۔ چوبیس روز تک دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی رہیں۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتیں جن میں دو مشرک ہلاک ہوئے۔ ایک صحابی زخمی ہوئے اور ایک ماہ بعد شہید ہوگئے۔ اس دوران مدینے میں حضرت ابن اُم مکتومؓ قائم مقام تھے۔ تین ہزار صحابہ محاذ پر رہے۔ دشمن کی صفوں میں بالآخر پھوٹ پڑ گئی۔ پھر تیز آندھی نے ان کے خیمے اکھاڑ دیے۔ آخر نامراد ہوکر ۲۱ یا ۲۲ ذی قعدہ کو کفّار واپس لوٹ گئے۔ (نیز دیکھیے: خندق)

۱۹۔ غزوۂ بنی قریظہ

مدینے کے نواح میں بنو قریظہ کے یہودیوں نے جنگ خندق میں مسلمانوں سے بدعہدی کی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی حملہ آور رخصت ہوئے، آنحضورؐ نے حضرت ابن اُم مکتومؓ ہی کو نائب مقرر کرکے ۲۳ ذی قعدہ ۵ھ کو تین ہزار صحابہ کے ساتھ بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز تک مسلمان تیر برساتے رہے۔ آخر یہودیوں نے مقابلے سے ہاتھ اٹھا لیے صلح کی درخواست کے ساتھ ہی کہا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ کو ثالث بنا دیا جائے، جو وہ

فیصلہ کریں گے انھیں قبول ہوگا۔ ثالث کے فیصلے کے مطابق بنو قریظہ کے تمام مرد، جن کی تعداد چھ سَو اور سات سَو کے درمیان تھی، قتل کر دیے گئے۔ عورتیں اور بچے قید کر لیے گئے، مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ مہم ۷ ذی الحجہ کو ختم ہوئی۔

۲۰۔ غزوہ بنو لحیان

دو مہینے ہی گزرے تھے کہ الرجیع کے قبیلہ بنو لحیان نے دھوکے سے دس صحابہ کو تعلیمِ اسلام کے لیے بلوایا اور انھیں شہید کر دیا۔ اس غدّاری کی سزا دینے کے لیے آنحضرتؐ نے دو سَو کا جیش تیار کیا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور ۹ صفر ۶ھ کو کوچ کیا۔ دشمن نے آپؐ کی آمد کی اطلاع پاکر راہِ فرار اختیار کی۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی، مگر کوئی ہاتھ نہ آیا۔ پھر آپؐ قریش کو مرعوب کرنے کی غرض سے چند روز عُسفان کے نواح میں فروکش رہے۔ ۱۴ ربیع الاوّل کو واپس تشریف لائے۔

۲۱۔ غزوہ ذی قرد

ابھی آپؐ کو لوٹے ہوئے بمشکل دو روز ہوئے تھے کہ بنو غطفان کے لٹیروں نے مدینے کی چراگاہ پر شب خون مارا۔ ایک صحابی کو شہید کر دیا اور بیس اونٹنیاں ہنکا کر لے گئے۔ آپؐ نے اطلاع ملتے ہی چند سوار تو آگے روانہ فرما دیے اور ۱۶ ربیع الاوّل ۶ھ کو پانچسو مجاہدین کے ہمراہ لٹیروں کے تعاقب میں خود بھی روانہ ہوگئے۔ اس دوران حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ آپؐ ایک شب و روز ذی قرد کے چشمے پر قیام فرما کر ۱۲ ربیع الاوّل کو واپس لوٹ آئے۔ اس واقعہ میں دو مسلمان شہید، اور ایک کافر ہلاک ہوا۔

۲۲۔ غزوہ (صلح) حدیبیہ

اواخر شوال ۶ھ میں آنحضرتؐ چودہ سو صحابہ کے ہمراہ عمرے کی نیت سے عازمِ مکہ ہوئے۔ یہ سفر جنگ کی نیت سے نہیں تھا لیکن چونکہ حضورؐ نے بنفسِ نفیس اس میں شرکت فرمائی اس لیے غزوات میں شمار کیا جاتا ہے اور ایک موقع پر جنگ کا اندیشہ پیدا بھی ہوگیا تھا جس کے پیشِ نظر آپؐ نے صحابہ سے بیعت لی۔ حدیبیہ میں قیام کے دوران قریش سے معاہدۂ امن ہوا اور آپؐ اواخر ذی قعدہ میں واپس تشریف لے آئے۔ اس دوران مدینے میں حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوب ہی آپؐ کے قائم مقام تھے۔ (نیز دیکھیے، حدیبیہ)

۲۳۔ غزوۂ خیبر

صلح حدیبیہ کے ذریعے قریش کے فتنے سے مامون ہوتے ہی آنحضرتؐ نے ایک طرف دعوتِ اسلام کا دائرہ وسیع کیا۔ دوسری طرف یہودیوں کی شرارت کے کلی استیصال کی طرف توجہ دی۔ وہ لوگ خیبر کے علاقے میں مجتمع تھے۔ آپؐ چودہ سو صحابہ کو لے کر اواخر محرم ۷ھ میں خیبر کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت سباعؓ بن عرفطہ انصاری کو مدینے میں قائم مقام چھوڑا۔ ڈیڑھ دو ماہ کی مدت میں مختلف قلعے فتح ہوگئے۔ سترہ مسلمان شہید ہوئے اور ۹۳ دشمن ہلاک ہوئے۔ اس طویل مہم کے نتیجے میں جزیرۃ العرب سے یہودیوں کا اثر ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ آپؐ جمادی الاوّل ۷ھ میں مدینہ واپس تشریف لائے۔ (نیز دیکھیے، خیبر)

۲۴۔ غزوۂ عام الفتح

حدیبیہ کی صلح اور یہودِ خیبر کی سرکوبی کے بعد آنحضرتؐ کو صرف سترہ ماہ کا عرصہ ایسا ملا جس میں آپؐ کو بذاتِ خود ہتھیار نہیں اٹھانے پڑے۔ کیونکہ قریش اور ان کے حلیف بنو بکر دو سال بھی اس معاہدے کو نہ نبھا سکے۔ ان کی عہد شکنی کی سزا دینے کے لیے آپؐ نے وسیع پیمانے پر تیاری فرمائی۔ حضرت ابو رہم غفاریؓ کو مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ۱۷ رمضان کو مرّ الظہران میں خیمہ زن ہوئے۔ دس ہزار حامیانِ دینِ متین آپؐ کے جلَو میں تھے۔ قریش سراسیمہ تھے۔ ۲۰ رمضان کو اسلامی فوجیں مکے میں داخل ہوئیں۔ ایک جگہ چند کفّار نے مزاحمت کی۔ اس جھڑپ میں تین مسلمان شہید ہوئے۔ ۲۴ کفار ہلاک ہوئے۔ چار مشرکین سابقہ جرائم کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ مکہ میں امن رہا۔

۲۵۔ غزوۂ حنین

مکہ معظمہ میں پندرہ روز قیام فرمایا۔ اس اثنا میں ہوازن اور ثقیف کے قبائل نے اسلام کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک لشکرِ جرّار تیار کیا۔ آنحضرتؐ مکہ میں حضرت عتابؓ بن اسید اموی کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے بارہ ہزار صحابہ کی معیت میں ۶ شوال کو روانہ ہوئے۔ حنین کی تنگ گھاٹیوں میں دشمن نے اچانک حملہ کیا جس سے اسلامی لشکر تتر بتر ہوگیا۔ آپؐ نے لوگوں کو پکار کر دوبارہ مجتمع کیا اور کفار پر جوابی حملہ کیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پسپا ہو کر اوطاس میں پہنچے۔ وہاں مسلمانوں نے تعاقب کر کے شکست دی۔ اس جنگ میں چھ مسلمان شہید ہوئے۔ ۷۰ کفار ہلاک ہوئے۔ چھ ہزار قید ہوئے۔ مالِ غنیمت میں چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں شامل تھیں۔ (نیز دیکھیے: حنین)

۲۶۔ غزوۂ طائف

حنین کے معرکے سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے توقف نہیں فرمایا۔ کیونکہ بنو ثقیف شکست کھانے کے بعد طائف میں جا کر قلعہ بند ہوگئے تھے۔ ۱۳ شوال ۸ھ کو آپؐ نے طائف کا محاصرہ کر لیا جو اٹھارہ روز جاری رہا۔ فصیل توڑنے کی کوشش میں بارہ مسلمان شہید ہوئے۔ اصحاب کے مشورہ سے آپؐ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ کیونکہ کفار کی اس جمعیت کی طرف سے اب کوئی بڑا خطرہ نہ تھا۔ آپؐ نے واپسی میں عمرہ ادا کیا اور [illegible] ذی قعدہ کو مدینہ پہنچ گئے۔ (نیز دیکھیے، طائف)

۲۷۔ غزوۂ تبوک

فتح مکہ سے قبل آنحضرتؐ نے جمادی الاوّل ۸ھ میں روم کی فوج [illegible] کے مقابلے کے لیے تین ہزار کا ایک لشکر شام کی طرف روانہ فرمایا تھا جو موتہ کے مقام پر دشمن سے [illegible] ہوا۔ دشمن کی تعداد دو لاکھ تھی۔ مگر لشکرِ اسلام نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ [illegible] اور نو مجاہد شہید ہوئے۔ مورخین نے دشمن کے ہلاک شدگان کی تعداد نہیں بتائی ہے۔ اعداء کی کثرتِ تعداد کے باعث جنگ فیصلہ کن نہیں ہوئی۔ چنانچہ رومی مسلمانوں [illegible] کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ہوئی تو تیس ہزار کا لشکر [illegible] اواخر رجب ۹ھ میں شام کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینے میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ [illegible] نائب مقرر کیا۔ تبوک میں خیمہ زن ہوئے۔ دشمن مقابلے پر نہیں آیا۔ آپؐ نے [illegible] دومۃ الجندل کی طرف بھیجی۔ ایک نصرانی ہلاک ہوا اور دومۃ الجندل [illegible] ہو کر آیا۔ اس نے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ آنحضرتؐ تبوک میں بیس روز قیام کے بعد [illegible] ۹ھ میں مدینے واپس تشریف لائے۔ یہ آخری جنگ تھی جس میں حضورؐ نے [illegible] فرمائی۔ لیکن وہ حالتِ جنگ جو رمضان ۸ھ میں [illegible] رہی۔ وصالِ نبوی تک مسلمانوں کی فوجیں مختلف اطراف میں مشرکین کی سرکوبی [illegible] رہیں اور پھر وفات سے چند روز پہلے آپؐ نے حضرت اسامہؓ کی قیادت میں ایک لشکر [illegible] سے جہاد کے لیے تیار کیا، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں [illegible]

غسّان :- بنی غسّان ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صحرائے شام میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ مذہب کے عیسائی تھے اور [illegible] کے باج گذار تھے۔ ۸ھ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ [illegible] کے پاس ایک قاصد دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا جس کو ان لوگوں نے [illegible] قتل کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کی جمعیت ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے بھیجی۔ اُدھر مخالفین نے ایک لاکھ فوج مقابلہ کے لیے جمع کی۔ موتہ کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں نے سخت نقصان اٹھایا اور زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب

اور عبد اللہ ابن رواحہ جیسے نامی گرامی سپہ گر یکے بعد دیگرے کمال داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔ آخر فوج کی کمان خالد بن ولید کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے اپنی خداداد قابلیت اور شجاعت سے ایک دن کامل محاربہ و مقاتلہ کے بعد دوسرے دن صبح ہوتے ہی دشمن کی فوج میں کھلبلی ڈال دی۔ اور مخالفین کو تتر بتر کر دیا اور اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ اسی فتح سے خوش ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ کو سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا۔

غُسل

(ل)، تمام بدن کا دھونا۔ بعض خاص صورتوں کی حکمی نجاست سے ازالہ کو غسل کہتے ہیں۔ غسل کی کیفیت اس حدیث سے خوب واضح ہوتی ہے۔ حضرت میمونہؓ کہتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے لیے پانی رکھا اور کپڑے کا پردہ کیا۔ حضرتؐ نے پہلے دونوں ہاتھ تین دفعہ دھوئے، پھر داہنے ہاتھ سے بائیں پر پانی ڈال کر ستر دھویا اور رانوں پر پانی بہایا اور وہاں سے علیحدہ ہو کر دونوں پاؤں مبارک دھوئے۔ ایک وقت میں کئی عورتوں یا ایک ہی عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے ایک ہی غسل واجب ہوتا ہے۔ غسل کرتے وقت اگر ایک بال بھی سوکھا رہ جائے، تو پھر سے غسل کرنا پڑے گا۔ ہاں اگر کچھ بدن خشک رہ جائے اور نماز سے پیشتر اپنا تر ہاتھ اس پر پھیر دیا، تو یہی غسل کفایت کرے گا۔

عورت کو غسل جنابت کے لیے بالوں کی مینڈھیاں کھولنے کی ضرورت نہیں صرف بالوں کی جڑیں تر کر لینا کافی ہے۔

کھلے میدان میں جہاں آبادی ہو، ننگا نہانا حرام ہے، البتہ غسل خانے میں یا کسی آڑ میں ننگے نہانے کا مضائقہ نہیں۔ غسل میں چار پانچ سیر پانی سے زیادہ صرف نہ کریں۔ شریعت اسلامی میں نو طرح کے غسل ہیں:۔

۱۔ عورت کو حیض و نفاس سے فارغ ہونے کے بعد۔
۲۔ مرد و عورت کو ہم بستری یا احتلام کے بعد۔
۳۔ جمعہ کے دن، نماز جمعہ کے لیے۔
۴۔ کسی شخص کو مشرف با سلام ہوتے وقت۔
۵۔ عید الفطر اور عید الضحیٰ کے دن، عیدگاہ جانے سے پیشتر۔
۶۔ حج کا احرام باندھتے وقت۔
۷۔ بیت اللہ میں داخل ہونے وقت۔
۸۔ سینگی لگوانے کے بعد۔
۹۔ مردہ نہلانے کے بعد۔

پہلی قسم کے دو غسل فرض ہیں اور نمبر ۳ سے ۵ سنت مؤکدہ۔ اور نمبر ۶ و ۷ کے دونوں غسل سنت مستحبہ اور آخر کے دو غسل احتیاطی ہیں۔ آدمی کے لیے یہ بھی مستحب ہے کہ ہر ہفتے میں کم از کم ایک روز سر اور سارا بدن دھو ڈالے۔

غسل بفتحہ غ فتحہ سے معنے دھونا۔ نجاست کو دور کرنا جس کا قرآن مجید کی اس آیت میں آیا ہے:۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ (والی) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵ ر س، مائدہ۔ ع ۱) مسلمانو! جب تم نماز پڑھنا چاہو (اور بے وضو ہو) تو اپنے منہ دھوؤ اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سر پر مسح کرو اور پاؤں کو دونوں ٹخنوں تک دھوؤ۔ اور اگر تم کو نہانے حاجت ہو، تو اچھی طرح پاک ہو جاؤ اور جو تم بیمار ہو، یا تم میں سے کوئی پاخانہ پھر کر آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو اور پانی نہ پاؤ، تو پاک مٹی کا قصد کرو اور منہ اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ اللہ تعالیٰ تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، بلکہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے اور اپنا احسان تم پر پورا کرنا۔ اس لیے کہ شکر کرو۔

تمام مذاہب اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان آدمی کو نجاست ظاہری کے علاوہ نجاست حکمی کی ذیل کی صورتوں میں بھی بدن پاک کرنا واجب ہے۔ ۱۔ حیض ۲۔ نفاس ۳۔ انزال منی ۴۔ جماع۔

شرعی غسل یعنی نہانے کا وہ طریقہ، جو سنت کے موافق یا شرعی حکم کے مطابق ہے شرع کا حکم ہے کہ بعض حالتوں میں آدمی کا جسم ایک حکمی نجاست کے ساتھ نجس اور بال بال کی جڑ میں پانی پہنچانا شرعاً فرض ہے۔ مثلاً جنب کی حالت میں یا حیض یا نفاس کا خون بند ہو جانے کے بعد۔ غسل کے مواقع نو ہیں۔ ان میں سے تین موقعوں پر غسل کرنا فرض ہے۔

۱۔ جنابت یعنی منی کا جوش کے ساتھ نکلنا۔ یا حشفہ کا مفعول کی آگے یا پیچھے کی راہ میں غائب ہونا۔
۲۔ حیض کا خون آنا۔
۳۔ نفاس کا خون آنا۔

ایک موقع پر غسل واجب ہے اور وہ میت کا غسل ہے۔ چاروں موقعوں پر غسل کرنا سنت ہے:۔

۱۔ جمعہ کے روز۔
۲۔ عید کے روز۔
۳۔ عرفہ کے روز۔
۴۔ احرام باندھتے وقت۔

ایک موقع پر غسل مستحب ہے اور وہ کفر سے اسلام میں داخل ہوتے وقت ہے۔

شرعی غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوئے پھر استنجا کرے اور اس کے بعد بدن پر جہاں کہیں نجاست لگی دھوئے۔ پھر وضو کرے اگر پاؤں کی جگہ زمین پر پانی جمع ہو جاتا ہو تو پاؤں نہ دھوئے۔ پھر سر پر تین چلو پانی ڈال کر بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچائے اس کے بعد سارے بدن پر تین مرتبہ پانی پہنچائے۔ اور پاؤں اگر وضو میں نہیں دھوئے تھے تو آخر میں دھوئے۔ غسل میں بدن کو ملنا شرط نہیں ہے اگر ایک بال کے برابر بھی کوئی جگہ خشک رہ گئی تو غسل نہ ہوگا۔

غِشَاوَة

:۔ آنکھوں کا پردہ۔ سورہ بقر کی آغاز کی آیات میں آیا ہے: (ان کے دلوں پر اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی پردہ پڑا ہے اور (آخرت میں) ان کو بڑا عذاب (ہونے والا) ہے۔

غصب

: چھیننا۔ جبراً لے لینا۔ ظلماً وصول کرنا۔ شریعت نے اس قسم کے سلوک کی سخت ممانعت کی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "مسلمانو! ناحق (ناروا) ایک دوسرے کے مال خورد برد نہ کیا کرو۔ ہاں آپس کی رضا مندی سے خرید و فروخت ہو اور اس میں کچھ ہاتھ لگ جائے تو وہ ناروا نہیں،،

سعید ابن زید سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص بالشت بھر زمین بھی زور و ظلم سے لے لیگا۔ قیامت کے دن اس قطعہ زمین کو ساتویں زمین کی انتہا سے لے کر طوق (بنایا جائے گا) اور اسکی گردن میں ڈالا جائے گا۔ اور فرمایا لوگو خبردار! ظلم نہ کرو اور کسی شخص کا مال اس کی خوشی اور رضا مندی کے بغیر حلال نہیں،، اگر کوئی شخص کسی سے ایسی چیز غصب کر لے جس کی مثل ہو، مثلاً وہ چیز جو موزونات و مکیلات کی قسم سے ہو اور اس کے پاس وہ تلف ہو جائے تو وہ اس کے برابر اسی قسم کی چیز کے مہیا کر دینے کا ذمہ دار ہوگا۔ غاصب کو مجبور کیا جائے گا کہ غصب کردہ چیز واپس

دے دے۔ اگر کوئی شخص کسی کی بکری غصب کرکے ذبح کرلے تو مالک کو اختیار ہے خواہ اُس کی قیمت لے لے اور جو نقصان ہوا ہے، وہ بھی وصول کرے اور ذبیحہ اس کے حوالے کرے یا ذبیحہ بھی لے لے۔ غاصب کو حلال نہیں ہے کہ شئے مغصوب سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے۔

غضب: غصہ میں آنا، خشمناک ہونا، کرودھ کرنا، بھڑک اٹھنا۔ اللہ نے انسان کو غضب فرو کرنے اور غصہ کو دبانے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے "(یعنی جنت تیار ہے پرہیزگاروں) اور غصہ کو فرو کرنے والوں کے لیے اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔"

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے اصل پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے (صحیح) یہ بھی روایت ہے کہ فرمایا آنحضرتؐ نے غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے (مشن)

یہ بھی روایت ہے کہ فرمایا آپؐ نے غضب شیطان (کے بہکانے) سے پیدا ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی ہی سے بجھائی جاتی ہے تو جب کوئی تم میں سے غصہ میں آئے تو اسے وضو کرنا چاہیئے۔

غفار: بنو کنانہ میں سے ایک شخص تھا غفار بن ملیک بن بکر بن عبد مناف بن کنانہ۔ اس کی اولاد قبیلہ بنی غفار کے نام سے مشہور ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اسی قبیلہ سے تھے

غفور: بخشنے والا۔ خدا تعالیٰ کا نام ہے اور اس کے اور غفار کے ایک ہی معنی ہیں، مگر غفور میں مبالغہ ہے یعنی بڑے بڑے گناہ بخشنے اور اس کی بخشش اتم و اکمل ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بندوں کے گناہ اعمالناموں سے محو کر دے یعنی حساب نہ لے، مواخذہ نہ کرے یا دُنیا میں پردہ فاش نہ کرے کیونکہ غفر کے معنی مٹانے اور چھپانے کے بھی آیا کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۂ فاطر رکوع ۴ میں یہ لفظ یوں آیا ہے۔

ترجمہ: بے شک اللہ آسمانوں کو اور نیز زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ (کہیں اپنی جگہ) سے ٹل (نہ) جائیں اور (بالفرض) ٹل جائیں تو پھر اس کے سوا کوئی بھی نہیں جو ان کو تھام سکے۔ بے شک اللہ (بڑا) تحمل والا (بندوں کے گناہوں کا) بخشنے والا ہے۔

غلافِ کعبہ: وہ سیاہ سُوتی اور ریشمی کپڑا، جو خانۂ کعبہ پر چڑھا رہتا ہے یہ غلاف ایک سال کعبے پر چڑھا رہتا ہے۔ اگلے سال نیا غلاف چڑھانے سے پہلے اتار لیا جاتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر حاجیوں میں تبرکاً بانٹ دیئے جاتے ہیں اور نیا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کعبے کو آبِ زمزم سے غسل دیا جاتا ہے اور پھر عرق گلاب چھڑکا جاتا ہے

اسلام سے پہلے بھی یہ غلاف چڑھانے کی رسم ادا کی جاتی تھی جس کو آنحضرتؐ نے بھی جاری رکھا۔ رسول اکرمؐ کے زمانے میں دھاری دار غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ کوئی ایک ہزار سال تک مصر سے غلاف کعبہ تیار ہو کر آتا رہا۔ وہ لوگ بڑی عقیدت و محبت سے تیار کیا کرتے تھے اور بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے اُسے مکہ معظمہ لایا جاتا تھا۔ حکومت مصر نے یہ کام محکمہ اوقاف کے سپرد کر رکھا تھا، مگر جب مصر میں صدر ناصر برسر اقتدار آئے، تو سعودی عرب اور مصر میں شدید اختلاف پیدا ہو گئے چنانچہ سعودی حکومت نے غلاف کعبہ لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ سعادت پاکستان کے حصے میں آئی اور یہاں کے کاریگروں نے بڑی محنت اور عقیدت سے غلاف کعبہ تیار کیا۔ پورے ملک میں اس کی نمائش ہوئی اور عوام نے ہر جگہ اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ غلاف کعبہ میں زری کے تاروں سے قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ عربی زبان میں اس غلاف کو قصوٰی اور دروازے کے کپڑے کو برقعہ کہتے ہیں۔

غلام۔ لونڈ بردہ۔ قرآن میں لونڈی غلاموں کا ان آیتوں میں ذکر آیا ہے:

(۱)۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ تا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (مائدہ۔ ع ۱۲) تمہاری

تمہاری قسموں میں جو لا یعنی ہیں ان پر تو خدا تم سے (کچھ) مواخذہ کرتا نہیں۔ ہاں پکی قسم کھاؤ (اور پھر اس کے خلاف کرو) تو خدا تم سے (اس کا) مواخذہ کرے گا۔ تو (اس پکی قسم کے توڑنے) کا کفارہ دس مسکینوں کو متوسط درجے کا کھانا کھلا دینا ہے۔ جیسا تم اپنے اہل و عیال کو کھلایا کرتے ہو۔ یا ان (ہی دس مسکینوں) کو کپڑا بنا دینا یا ایک بردہ آزاد کر دینا۔ مجھ جس کو (بردہ) میسّر نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم (توڑ) کھا لو (اور اس میں پورے نہ اترو) اور اپنی قسموں (کے پورا کرنے) کی احتیاط رکھو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم اس کی شکر گزاری کرو۔ (کہ وہ تم کو ادب سکھاتا ہے)

۲۔ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ (مجادلہ۔ ع ۱) اور وہ لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں۔ پھر لوٹ کر وہی کام کرنا چاہتے ہیں جس کو کہہ چکے ہیں (کہ نہیں کریں گے) تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے (مرد کو) ایک بردہ آزاد کرنا چاہیے (مسلمانو!) تم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے (تاکہ اس پر کاربند ہو) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی (سب) خبر ہے۔

۳۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعَامٌ تا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ (س۔ بلد)
ترجمہ (گھاٹی سے مراد ہے کسی) گردن کا (غلامی یا قرض کے پھندے سے) چھڑا دینا یا بھوک کے دن یتیم (کو خاص کر جب کہ وہ اپنے) رشتہ دار (بھی ہو) یا محتاج خاک نشین کو (کھانا کھلانا)

۴۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ تا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ (س۔ نور۔ ع ۴) اور (مسلمانو!) اپنی رانڈوں کے نکاح کر دو۔ اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے ان کے جو نیک بخت ہوں۔ اگر یہ لوگ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش والا (اور سب کے حال سے) واقف ہے۔

۵۔ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ تا الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (س۔ نور۔ ع ۴) اور (مسلمانو!) تمہارے ہاتھ کے مال یعنی غلاموں میں سے جو مکاتبت کے خواہاں ہوں تو تم ان کے ساتھ مکاتبت کر لیا کرو بشرطیکہ تم ان میں بہتری (کے آثار) پاؤ اور مال خدا میں سے جو اس نے تم کو دے رکھا ہے ان کو (بھی) دو۔

۶۔ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ تا غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (س۔ نور۔ ع ۴) اور (لوگو!) تمہاری لونڈیاں جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں ان کو دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے کی غرض سے حرامکاری پر مجبور نہ کرو۔

اور جو ان کو مجبور نہ کرو۔ اور جو ان کو مجبور کرے گا تو اللہ ان کے مجبور کئے گئے پیچھے نہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(۱) براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بادیہ نشین جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ مجھے کوئی ایسا کام بتا دیجیے جو مجھے جنت میں لے جا داخل کرے۔ فرمایا۔ تو نے اگرچہ کلام میں بہت اختصار کیا ہے مگر تیرا سوال بڑا لمبا چوڑا ہے۔ اچھا تو تو بردہ آزاد کر اور گردن خلاص کر۔ (بیہقی)

(۲)۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈی کو کہا کرتا تھا کہ جا اور ہمارے لیے خرچی کی کمائی سے کچھ لے آ۔ اس پہ خدا تعالیٰ نے آیت وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا نازل فرمائی۔ (مس)

(۳)۔ ابو ایوب کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول خداؐ کو فرماتے سنا کہ جو شخص (لونڈی) ماں اور اس کے فرزند میں جدائی ڈالے گا (مثلاً ماں کو فروخت کر دے اور اس کے فرزند کو رہنے دے۔ یا فرزند کو بیچ ڈالے اور ماں کو رہنے دے یا ایک کو ایک کے ہاتھ اور دوسرے کو دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالے) تو خدا قیامت کے دن اس میں اور اس کے پیاروں میں جدائی ڈال دے گا۔ (تر)

(۴) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے جناب رسول خداؐ نے دو غلام عطا کئے جو دونوں بھائی بھائی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو فروخت کر دیا۔ پیغمبر خداؐ نے مجھ سے فرمایا۔ علی! تمہارا غلام کیا ہوا۔ میں نے اسے بیچ دینے کی خبر دی۔ فرمایا۔ (بیع کو کر کے) اسے پھیر لو! بیع کو فسخ کر کے۔ (تر)

(۵)۔ ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبر خداؐ نے ان لوگوں پر لعنت کی جو باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں جدائی ڈالیں۔ (ابن)

(۶) ام المومنین حضرت ام سلمہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ اپنی مرض وفات میں فرماتے تھے کہ لوگو! نماز کی پوری پوری محافظت کرنا۔ اور لونڈی غلاموں کے حقوق کی رعایت کرتے اور ان کے ساتھ ہمیشہ نرمی کے ساتھ پیش آتے رہنا۔ (مسند امام احمد)

(۷)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ (لوگو!) جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے لیے کھانا تیار کر کے لائے۔ حالانکہ اس نے آگ کے سامنے بیٹھ کر آگ کی گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ اگر کھانا بہت ہی کم اور تھوڑا ہو تو اس میں سے خدمت گار کے ہاتھ پہ ایک لقمہ یا دو لقمے رکھ دے۔ (مس)

(۸)۔ حضرت جابرؓ جناب نبی اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا جس میں تین خصلتیں ہوتی ہیں خدا اس کی موت آسان کر دیتا ہے۔ اور (آخرت میں) اسے اپنی جنت میں داخل کرے گا۔ (۱) ناتوانوں اور مسکینوں کے ساتھ نرمی کرنا۔ (۲) ماں باپ کے ساتھ نیکی اور مہربانی سے پیش آنا۔ (۳) لونڈی غلاموں کے ساتھ نیکی خوش خلقی۔ (تر)

(۹)، لیث کے بیٹے رافع سے روایت ہے کہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لونڈی غلاموں کے ساتھ نیک خوئی سے برتاؤ کرنا موجب برکت ہے اور بدخلقی سے پیش آنا باعث بے برکتی۔ (ابو)

(۱۰) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (لوگو) میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں بدترین لوگ کون ہیں۔ وہ جو تنہا کھاتا اور اپنے غلام کو تازیانہ مارتا اور اپنی بخشش اس سے روک لیتا یعنی کچھ نہیں دیتا ہے۔ (مس)

(۱۱) معرور بن سوید کہتے ہیں۔ میں نے ابو ذر غفاری کو دیکھا کہ وہ ایک حلّہ (جوڑا) پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ویسا ہی حلّہ پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ویسا ہی حلّہ پہنے ہوئے تھا۔ جب ہم نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہا مجھ میں اور ایک شخص میں گالی گلوچ ہو گئی تھی۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت جا لگائی۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا! ابوذر! کیا تم نے اسے ماں کی گالی دی ہے۔ پھر فرمایا کہ (تمہارے لونڈی غلام جو باعتبار آدم زاد ہونے کے تمہارے) بھائی (ہیں) تمہارے اعوان و انصار ہیں۔ خدا نے ان کو تمہارے قبضے میں کر دیا ہے تو جس کا بھائی اس کے قبضے میں ہو اسے چاہیئے کہ جیسا خود کھاتا ہے اسے کھلائے جیسا خود پہنتا ہے اسے پہنائے۔ (مخ)

(۱۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لونڈی غلام کا کھانا کپڑا اس کا حق ہے اور وہ (یعنی لونڈی غلام) اسی چیز کی تکلیف دیے جائیں جو ان کے بس کی ہو۔ (مس)

(۱۳)۔ ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ لونڈی غلام تمہارے بھائی (بہن) ہیں۔ خدا نے انھیں تمہارا زیر دست کر دیا ہے۔ تو جس کے بھائی (بہن) کو خدا اس کا زیر دست کر دے تو اسی قسم کا کھانا اسے کھلائے جس قسم کا خود کھاتا ہے اور اسی قسم کا لباس پہنائے جیسا آپ پہنتا ہے اور کسی ایسے کام کی (اوّل تو) تکلیف (ہی) نہ دے جو اس پہ غالب آ جائے۔ (اور کرتے بن نہ پڑے) اور اگر (احیاناً ایسے کام کی) تکلیف دے (بھی) جو اس کی طاقت سے باہر ہو تو خود اس کی مدد کرے۔ (صح)

(۱۴)۔ روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر کے پاس ان کا داروغہ آیا تو انھوں نے فرمایا کیا تو غلاموں کو ان کی قوت دے آیا ہے۔ داروغہ نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو جلد جا اور انہیں ان کی قوت دے۔ کیونکہ جناب پیغمبر خداؐ نے فرمایا ہے کہ آدمی کو ایک یہی گناہ بس کرتا ہے کہ وہ اپنے مملوک سے اس کی قوت کو روکے۔

(۱۵) ابو مسعود انصاری کہتے ہیں کہ میں ایک دن اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی کہ ابو مسعود! معلوم کر کہ خدا تجھ پہ زیادہ قدرت رکھتا ہے میں نے جو منہ موڑ کر دیکھا تو جناب پیغمبر خداؐ تھے۔ میں نے جلدی سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اس غلام کو میں نے خدا کی خوشنودی کے لیے آزاد کر دیا۔ فرمایا۔ اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھے جھلس دیتی۔ (مس)

(۱۶) ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے جناب پیغمبر خداؐ کو فرماتے سنا۔ کہ جو شخص اپنے غلام کو حدّ مارے حالانکہ غلام اس (گناہ) کا مرتکب نہیں ہوا ہے۔ (جو موجب حد ہے) یا (ناحق) اس کو طمانچہ مارے تو اس کا کفارہ بس یہی ہے کہ غلام کو آزاد کر دے۔ (مسلم)

(۱۷) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے جناب ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص اپنی لونڈی غلام کو عیب لگائے حالانکہ وہ (اس عیب) سے بری ہے تو عیب لگانے والا قیامت کے روز تہمت لگانے کی حد مارا جائے گا۔ ہاں اگر لونڈی غلام ویسا ہی ہو جیسا اس نے کہا ہے تو اس صورت میں اس پہ کچھ الزام نہیں۔ (صح)

(۱۸) حضرت عمرؓ کے فرزند عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ ہم خدمت گاروں کے قصوروں سے کتنی دفعہ درگزر کیا کریں۔ رسول خداؐ خاموش ہو رہے۔ اس نے پھر اسی بات کو دہرایا۔ حضورؐ اب بھی خاموش ہو

رہے۔ تیسری مرتبہ جب اس نے دریافت کیا تو فرمایا، ہر روز ستر دفعہ درگذر کیا کرو۔ (ابو۔ تر)۔

مکاتب کے سوا دوسرے غلاموں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ امام صاحب کے نزدیک مکاتب کی کھیتی میں عشر واجب ہے۔ اس کے سوا اس کے اور کسی مال میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ امام ابو ثور کے نزدیک مکاتب پر مطلقاً زکوٰۃ واجب ہے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مکاتب پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ بیٹے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ (س۔ آل عمران۔ ع۴) عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میرے ہاں کیسے لڑکا ہو سکتا ہے اور (میرا حال یہ ہے کہ) مجھ پر بڑھاپا آ چکا ہے۔ اور میری بی بی بانجھ ہے۔

غلام احمد پرویز (۱۹۰۳ء —) عالم دین، مفکر۔ بٹالہ (مشرقی پنجاب) کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید اور ابتدائی دینی کتب اپنے دادا سے پڑھیں جو خود بھی بڑے فاضل اور صوفی بزرگ تھے۔ چودھری صاحب نے جوانی میں تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے یہاں چلے آئے اور سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ اسلام، قرآن، اقبالیات اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بھی کرتے رہے اور اپنے افکار و خیالات شائع بھی کراتے رہے۔

عالم دین 'مفکر' غلام احمد پرویز

۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت اسلامی قوانین کا جو کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ چودھری صاحب اس کے رکن نامزد ہوئے تھے۔ قرآن و اقبال پر مبنی ان کی فکری تحریک کا ماہوار ترجمان "طلوع اسلام"، دینی حلقوں میں کافی مقبول ہے۔ ان کی زیادہ مشہور اور قابل ذکر تصانیف یہ ہیں۔ انسان نے کیا سوچا۔ آسمانی کتابیں، من و یزداں۔ ابلیس و آدم، معراج انسانیت، لغات قرآن مفہوم القرآن، جہان فردا۔ کتاب التقدیر۔ شاہکار رسالت (یعنی حضرت عمر فاروقؓ) مطالب الفرقان۔ تبویب القرآن۔

غلام احمد قادیانی: (۱۸۳۶ء - ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء) جماعت احمدیہ کے بانی۔ قادیان ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر ملازم ہو گئے، لیکن چند سال کے بعد مستعفی ہو گئے۔ سیالکوٹ کے دوران قیام ہی میں مذہبی امور سے اُن کی دلچسپی بڑھی اور عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں سے مباحثے اور مناظرے کرنے لگے۔ پھر ۱۸۹۱ء میں آپ نے مہدی اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حضرت مسیحؑ کے متعلق احمدیہ جماعت کا عقیدہ ہے کہ انہیں نہ آسمان پر اٹھایا گیا اور نہ وہ مصلوب ہوئے، بلکہ وہ کشمیر میں آ کر اپنی طبعی موت مرے۔ ۱۸۹۲ء میں مرزا صاحب نے قادیان سے رسالہ "ریویو آف ریلیجنز"، جاری کیا اور اُسے اپنے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ اب ان کا بیشتر وقت مباحثوں، مباہلوں، پیش گوئیوں اور تصنیف و تالیف میں گزرنے لگا۔ مرزا صاحب نے بے شمار کتابیں لکھیں اور پھر نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور اعلان کیا کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ لاہور میں ہیضہ سے مرزا صاحب کا انتقال ہوا۔ لاش قادیان لے جا کر دفنائی گئی۔ مرزا صاحب نے نہ صرف مسیح موعود، مہدی اور نبی ہونے کا دعویٰ کیا، بلکہ کہا کہ کرشن اور گورو گوبند سنگھ بھی میں ہی ہوں۔ اُن کے ان دعوؤں سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ مسلمان احمدیوں کو، اور احمدی مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے تمام زندگی تنسیخ جہاد اور انگریزوں کی وفاداری و اطاعت کی تلقین کی (اردو انسائیکلوپیڈیا)

احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا عوامی مطالبہ ہمیشہ جاری رہا۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان میں تحریک چلی، جو کچل دی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں پھر زبردست تحریک چلی جس کے نتیجے میں پاکستان کی وفاقی پارلیمنٹ نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ [illegible]

غلام حسن شاہ (۱۲۷۲ھ - ۱۳۲۷ھ) عارف کامل اور درویش بزرگ

فخر اولیا حضرت پیر پٹھان خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کی رحلت کے پانچ سال بعد ۱۲۷۲ھ تونسہ شریف کے نواح اور دریائے سلیمان کے دامن [illegible] برسوں کے قدیمی قصبہ مندرانی میں پیدا ہوئے والد ماجد کا نام گرامی سید محمد [illegible] شاہ بخاریؒ تھا جن کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت [illegible] صادق رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ دینی علوم و فنون [illegible] دادا حضرت نور شاہ بخاریؒ سے حاصل کئے اور سلسلہ چشتیہ [illegible] حجۃ الاسلام حضرت خواجہ شاہ اللہ بخش تونسوی [illegible] قرب پایا کہ سفر و حضر میں اپنے مرشد کی رفاقت میں رہتے تھے۔

حرمین شریفین کا سفر اور اجمیر شریف و دہلی [illegible] میں کیا۔ ہزاروں ہندو آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ [illegible] آپ کے ہاتھ پر دین اسلام کی برکت سے مالا مال ہوئے [illegible] میں لینے والے ہزاروں خانہ بدوش آپ سے نسبت کو سعادت [illegible] ہیں۔ مرزا قادیانی کے خلاف آپ نے بھرپور [illegible]

۱۷ صفر المظفر ۱۳۲۷ھ مطابق [illegible] فرمایا۔ مادۂ تاریخ وفات یوں ہے:

قطب اقطاب زمن شاہ حسن
۱۳۲۷ھ

غلام قادر (۱۸۴۲ء - ۱۹۲۴ء) سلسلہ قادریہ کے بزرگ کامل۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں قرآن مجید [illegible] پڑھے ہوئے تو پیر قادری سے بیعت کی۔ مڈل ہیڈ ماسٹر [illegible] تھے وہاں سے پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے مولانا غلام [illegible] آپ کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

آپ نہایت حلیم الطبع اور خوش گفتار تھے۔ آپ کے خلفاء میں حضرت

بابا محمد حسین قادری (وفات ۱۹۱۲ء) بہت مشہور ہیں آپ کا وصال بعمر ۸۳ سال جالندھر میں ہوا۔ آپ کے بعد میاں شمس الحق قادری آپ کے فرزند سجادہ نشین ہوئے۔

مولانا سید غلام مصطفیٰ نوشاہی (۱۸۹۰-۱۹۶۵ء) نوشاہ ثالث

جید عالم اور بزرگ کامل عربی، فارسی اردو اور پنجابی کے شاعر اور نثر نگار نام غلام مصطفیٰ کنیت ابو الشریف اور تخلص ولقب نوشاہی تھا۔ آپ حضرت سید حافظ محمد شاہ صاحب نیک اخترؒ کے فرزند ارجمند، مرید خلیفہ اعظم اور سجادہ نشین تھے آپ کی ولادت ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ علم ادب کی فارسی درسی کتابیں پڑھیں پھر مولانا محمد شیخ احمد سے صرف، نحو اور منطق حاصل کیا۔ علم تجوید کے قواعد حافظ عامدین صاحب اگرویہ والے سے سیکھے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف میں آپ نے خاص ملکہ حاصل کیا۔

آپ کی بیعت طریقت اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تھی اور سلسلہ آبائیہ میں خلافت یافتہ تھے۔

آپ کو خواب اور بیداری میں اکثر مرتبہ رسول اکرمؐ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ دیگر انبیائے کرام اور صحابہ عظام اور اولیا کی زیارتیں اکثر آپ کو ہوتی رہتی تھیں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت اکثر فرماتے تھے ہر تیسرے روز ختم کیا کرتے۔ علاوہ ازیں درود شریف کئی ہزار مرتبہ آپ کا روزانہ ورد تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور تاریخ سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ دینی اور تبلیغی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ کی علمی، ادبی اور تاریخی خدمات یادگار ہیں۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں جو مفید خاص و عام ہیں۔

۱۔ فیض محمد شاہی ۲۔ درس حدیث ۳۔ پنج گنج نوشاہی ۴۔ دیوان شاہی ۵۔ ترجمہ گلستان سعدی ۶۔ ترجمہ بوستان سعدی اور دیگر تصانیف ذخائر ہم آپ کا مزار بمقام ساہن پال ضلع گجرات میں موجود ہے۔

غلام نظام الدین

اسم گرامی غلام نظام الدین سکناً تونسوی مسلکاً سنی حنفی مشرباً چشتی نظامی والد ماجد کا نام حضرت خواجہ محمد محمود چراغ سلیمانی تھا۔ جد امجد حجۃ الاسلام حضرت خواجہ شاہ اللہ بخش تونسویؒ تھے جد اعلیٰ شہرہ آفاق شیخ طریقت حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں بقول سرسید احمد خاں جن کی شہرت قاف سے قاف تک محیط ہے۔

حضرت مولانا علی گوہر چشتی علامہ احمد جراح سے دینی علوم کی تکمیل کی اور علم معرفت کی دولت اپنے والد محترم حضرت چراغ سلیمانیؒ سے پائی۔ اکیس برس کی عمر میں مسند ارشاد پہ رونق افروز ہوئے اور مختصر مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو برسوں کی ریاضت و مجاہدہ سے بھی دوسرے سالکان طریقت کو نصیب نہیں ہوئے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جو بھی کوششیں آپ ان میں پیش پیش رہے۔ تحریک ختم نبوت میں مشائخ کرام کو خانقاہوں سے کھینچ کر باہر لائے۔ کراچی میں منعقدہ آل پاکستان مشائخ کانفرنس میں ایوب خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قرآنی دستور کی فیاضیوں اور حکمرانوں کی حیلہ بازیوں کو واشگاف کیا۔

علامہ اقبال اسی خوبی کی بنا پر آپ سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور متعدد مرتبہ راجہ حسن اختر اور دیگر ساتھیوں کو فرمایا۔ "تونسہ شریف کے یہ صاحبزادے بہت بلند مقام کے مالک ہیں۔" نواب فتح اللہ خاں علیزئی لکھتے ہیں۔ میرے مکان منزل عشقیہ لاہور میں حضرت موصوف رونق افروز تھے علامہ اقبال آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور حسن عقیدت اور جوش محبت کا اظہار فرمایا۔

۱۹۶۴ء میں صدر ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن میں محترمہ کی حمایت میں ملک بھر کا طوفانی دورہ کیا۔ آپ کے مریدوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم ہیں جن کا سلسلہ برصغیر پاک و ہند کے علاوہ مسلم ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ سعودی عرب اور کابل میں لاکھوں کی تعداد میں آپ کے حلقہ بگوش پائے جاتے ہیں۔

۷ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق ۷ جون ۱۹۶۵ء بروز منگل واصل بحق ہوئے۔ مادۂ تاریخ وفات یہ ہے۔

کامل اکمل پیر نظامؒ

۱۳۸۵ھ

غِلمان

غلام کی جمع، جس کے معنی لڑکے کے ہیں۔ قرآن مجید میں جنت کی نعمتوں کے سلسلے میں حوروں کے ساتھ غلمان کا بھی ذکر ہے۔ ایک دو جگہ ان کو ولدان بھی کہا گیا ہے۔ نیز ان کو دُرِّ مکنون سے تشبیہ دی گئی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بچے اہل جنت کے وہ فرزند ہوں گے جو صغر سنی میں انتقال کر گئے تھے، لیکن اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ جس طرح جنت کی اور نعمتیں ہیں، اسی طرح اہل جنت کی دلجوئی کے واسطے یہ لڑکے ہوں گے، جو معصوم بھی ہوں گے اور دیکھنے میں خوبصورت بھی ہوں گے (نیز دیکھئے حور)

غلول

دغا، فریب، مکر، دھوکہ، مال غنیمت میں خیانت کرنا جس کی شریعت نے سخت ممانعت کی ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ آل عمران کے رکوع ۱۷ میں ارشاد ہے: "وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اور پیغمبر (کی شان) سے (نہایت) بعید ہے کہ (پیغمبر ہو کر) خیانت کرے۔ اور جو (جرم) خیانت کا مرتکب ہوگا۔ تو جو چیز خیانت کی ہے قیامت کے دن (خدا کے روبرو) بعینہٖ وہی چیز اس کو لا حاضر کرنی ہوگی۔ پھر جس نے جیسا کیا ہے اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر (کسی طرح کا زور و) ظلم نہیں ہوگا۔"

غم

خدا کے نیک بندوں پر خدا کی طرف سے طرح طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہوتی رہتی ہیں جن سے ان کا امتحان مقصود ہوتا ہے اور یہ دکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ یہ لوگ جو خدا کی محبت کا دم بھرتے ہیں یہ اپنے دعوے میں کہاں تک سچے ہیں جس قدر اولیاء اللہ اور دوسرے نیک بندے گزرے ہیں وہ ہمیشہ رہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ غم سے دل ایسا صاف ہو جاتا ہے جیسے صابن سے کپڑا۔ قرآن و حدیث میں غم کے بے شمار فائدے مذکور ہوئے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۃ ۲۔ آیت ۱۵۵، ۱۵۶۔ رکوع ۱۹ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ

مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ تا رَاجِعُوْنَ ۰ اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جان اور پیداوار (اراضی) کی کمی سے آزمائیں گے۔ اور (اے پیغمبر) صبر کرنے والوں کو (خوشنودی خدا اور کشش کی) خوشخبری سنا دو۔ یہ لوگ جب ان پر مصیبت آ پڑتی ہے تو بول اٹھتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔

غمرات ۔ جمع غمرہ۔ گرداب۔ بھنور۔ پانی کی گہرائی۔ سختی۔ مصیبت، موت کی سختی، موت کی بیہوشی۔ آخری معنے میں یہ لفظ قرآن مجید میں یوں آیا ہے :-
وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ (س۔ انعام۔ ع ۱۱)۔ اور (اے پیغمبر) کاش تم (ان) ظالموں کو اس وقت دیکھو کہ موت کی بیہوشیوں میں (پڑے) ہیں اور فرشتے (ان کی جان نکالنے کے لیے طرح طرح کی) دست درازیاں کر رہے ہیں"۔

غنا ۔ راگ۔ اس مسئلے میں آیات و احادیث متعارض واقع ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ تا اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۰ یعنی بعض آدمی وہ ہے جو بیہودہ بات خرید کرتا ہے تاکہ خدا کے راستے سے گمراہ کرے بغیر علم کے اور اس کو مسخری بنائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔" یہ آیت راگ کی حرمت میں وارد ہوئی ہے۔

(۱)۔ ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، جب کبھی کوئی راگ سے اپنی آواز بلند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کندھوں پر دو شیطان بھیج دیتا ہے جو اس کے سینے پر اپنی ایڑیاں مارتے ہیں، یہاں تک کہ وہ راگ سے باز آتا ہے۔ (الکبیر للطبرانی)

(۲) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے عزّوجل گانے والی لونڈی کو اور اس کی خریداری کو اور اس کی قیمت کو اور اس کی تعلیم کو حرام کر دیا ہے۔ (اوسط للطبرانی)

(۳)۔ ابومالک اشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کہ میری امت میں ایسے گروہ ہوں گے جو شراب اور ریشمی لباس اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔ (بخ)

(۴)۔ قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر شراب اور سامان لہو اور مطرب عورتیں حرام کر دی ہیں۔

(۵) ابوالشیخ نے مکحول کی روایت سے رسول اللہؐ سے بطور مرسل روایت کیا ہے کہ باجوں کا سننا گناہ ہے اور ابوداؤد ابن عمرؓ سے روایت کرتا ہے کہ ابن عمر کو مزمار کی گت سنائی دی، تو آپ نے دونوں ہاتھوں کی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں پر رکھ لیں۔

(۶) عقبہ بن عامر سے اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ مسلمان کا کھیلنا باطل (یعنی حرام) ہے مگر تین موقعوں پر (یعنی اپنی کمان سے (تیراندازی کی) مشق کرنا اور اپنے گھوڑے سے سدھانا اور اپنی بیبیوں سے دل لگی کرنا۔

(۷) حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا راگ دل میں نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتی ہے۔ (شعب الایمان)

راگ کے مباح ہونے کی دلیلیں

مذکورہ بالا احادیث تو راگ اور باجوں کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں

(۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم میرے گھر آئے۔ اس وقت میرے پاس دو لڑکیاں بیٹھی بغاث کا گیت گا رہی تھیں۔ (ساری حدیث صحیحین میں ہے)۔

(بُغاث بضم بار مدینہ منورہ کے قریب ایک مقام ہے جہاں اوس اور خزرج کے قبیلوں کی بابت جنگِ عظیم واقع ہوئی تھی۔ پھر صلح ہو گئی اور دونوں قبیلے متفق ہو گئے۔)

اور ایک روایت میں ہے کہ ابوبکر ان کے پاس آئے اور ان کے پاس دو لڑکیاں دف بجاتی اور گاتی تھیں۔ نبی اکرمؐ نے اپنے کپڑے سے منہ ڈھانپا ہوا تھا۔ تو ان (لڑکیوں) کو ابوبکرؓ نے منع کیا۔ رسول اللہؐ نے منہ کھول کر فرمایا۔ ابوبکر ان کو چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ خوشی کے دن ہیں۔

(۲) سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ جب نبی اکرمؐ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور بنی نجار کے قبیلے میں فروکش ہوئے تو قبیلہ مذکور کی لڑکیاں اس شعر کے ساتھ گاتی بجاتی تھیں ؎

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِیْ نَجَّار
وَحَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِّنْ جَار

ترجمہ: ہم قبیلہ بنی نجّار کی لڑکیاں ہیں اور کیا مبارک بات ہے کہ محمدؐ ہمسایہ ہوں۔

(۳) بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عائشہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث روایت کی ہے جو آنحضرتؐ کے غزوہ تبوک سے تشریف لانے کے وقت عورتوں کے یہ شعر پڑھنے کے متعلق ہے ؎

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاع
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَیْنَا مَا دَعٰى لِلّٰهِ دَاع

ترجمہ: ثنیات الوداع سے ہم پر بدر نے طلوع کیا۔ ہم پر شکر واجب ہے جب تک بلانے والا اللہ کی طرف بلاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے ان کی شعر خوانی دف اور خوش آوازی کے ساتھ بیان کی ہے۔

(۴) محمد بن حاتم سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حرام و حلال کے درمیان فرق یہ ہے کہ نکاح میں سب دف بجائیں اور گائیں۔

(۵) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ نکاح کا اعلان کرو اور اس پر دف بجاؤ۔

(۶) ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ میرے پاس اس وقت آئے جبکہ میں نکاح کے بعد شوہر کے گھر بھیجی گئی تھی۔ پس میرے فرش پر بیٹھ گئے۔ لڑکیاں دف بجا بجا کر اپنے باپوں کے مرثیے پڑھنے لگیں جو جنگ بدر میں کام آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے یہ مصرعہ کہا۔ " وَفِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ یعنی ہم میں وہ نبی ہے جو کل کی آنے والی بات جانتا ہے"۔ پس آپ نے فرمایا۔ اس کو چھوڑ اور وہی گا جو پہلے گا رہی تھی۔

(۷) حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت (نکاح کے بعد) شب عروسی میں انصار میں سے ایک آدمی کی طرف (جو اس کا شوہر تھا) بھیجی گئی تو نبی صلعم نے فرمایا کیا تمہارے ساتھ سامانِ سرود نہ تھا۔ کیونکہ انصار کو گانا بجانا اچھا لگتا ہے۔

(۸) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس انصار کی لڑکی تھی جس کا میں نے

نکاح کر دیا تھا تو رسول اللہؐ نے فرمایا۔ عائشہ! کیا تو گانے کا سامان نہیں کراتی۔ کیونکہ اس قبیلہ انصار کو گانا پسند ہے۔

(۹) عامر بن سعدؓ سے مروی ہے کہ میں قرضہ بن کعب اور ابن مسعودؓ کے پاس شب نکاح میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں گا رہی ہیں۔ میں نے کہا اے مصاحبان رسولؐ اور اہل بدر کیا تمہارے ہاں ایسے کام کیے جاتے ہیں (ان میں سے ایک) بولا۔ اگر تم چاہو تو ہمارے پاس بیٹھ کر سنو۔ اور اگر چاہو تو چلے جاؤ۔ ہم کو تو رسول اللہؐ نے نکاح میں گانے بجانے کی اجازت دے دی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ ایک بار راستے میں چلے جا رہے تھے۔ باجے کی آواز سن کر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ بیان کیا گیا کہ ختنہ کی شادی ہے تو آپؓ خاموش ہو گئے۔ اور منع نہیں فرمایا۔

فیصلہ

چونکہ راگ کی حلت اور حرمت میں متعارض نصوص آئی ہیں۔ اس لیے امام ابو حنیفہؒ نے احتیاطاً اس کی حرمت کا فتوےٰ دیا ہے جیسا کہ اصول کا قاعدہ ہے کہ دلائل کے تعارض کے وقت حرمت کو اباحت پر مقدم رکھتے ہیں۔ یہاں تک آپ نے ولیمہ میں بھی گانا جائز نہیں رکھا۔ چنانچہ ہدایہ کی کتاب الکراہیۃ میں اس مضمون کی عبارت آئی ہے کہ جو شخص ولیمہ یا کسی دوسری ضیافت میں مدعو کیا جائے تو وہ (وہاں) کھیل کا سامان یا گانا پائے تو وہاں بیٹھے اور کھانا کھانے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں خود ایک بار اس میں مبتلا ہو گیا تھا تو میں نے صبر کیا تھا۔ صاحب کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کھیل کے سامان سب حرام ہیں۔ یہاں تک کہ رسل مار مار کر گانا بھی حرام ہے اور اسی لیے امام ابو حنیفہؒ نے "مبتلا ہونے" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ کیونکہ مبتلا ہونا حرام چیز ہی سے ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ نے حرمت سرود کی احادیث کو اس گانے بجانے پر محمول کیا ہے جو محض کھیل اور دل لگی کے لیے ہو۔ یا اس میں فتنے کا خوف ہو۔ اور جو گانا بجانا کسی غرض صحیح پر مبنی ہو۔ مثلاً نکاح کے اعلان یا ایسے ہی کسی دوسرے امر پر۔ اس کو وہ مباح سمجھتے ہیں۔ کتب حنفیہ میں بھی ایسی روایت موجود ہے۔ چنانچہ ہدایہ کی کتاب الغصب میں لکھا ہے کہ "غازیوں کا نقارہ اور وہ دف جس کا بجانا بیاہ میں مباح ہے اس کے ضائع کرنے سے ذمہ داری لازم آتی ہے۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ راگ کی حرمت میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ اس گانے پر محمول ہیں جو شہوت اور عشق مجازی سے دل کی شیطانی مرادیں پوری کرتا ہے لیکن جو گانا خدا کی محبت پیدا کرتا ہے، وہ بذات خود مباح ہے۔ جب گانا سنن شادی کے موقع پر خوشی بڑھاتا ہے تو اگر وہ خوشی مباح ہے تو وہ گانا بھی مباح ہے۔ چنانچہ عید کے روز اور نکاح کے موقع پر۔ اور کسی بچھڑے ہوئے عزیز کی آمد پر۔ اور ولیمہ کی دعوت کے وقت، اور بچے کی پیدائش کی تقریب پر اور عقیقہ اور ختنے کے دن اور حفظ قرآن کی آمین کے دن۔ وغیرہ وغیرہ۔

خزانۃ اور کافی میں لکھا ہے کہ گانے بجانے وغیرہ کی حرمت لہو کے ساتھ مقید ہے اور گانا بجانا لہو کے بغیر کسی اور غرض کے لیے ہو۔ جیسے نکاح کے وقت اور ولیمہ میں۔ اور غازیوں کی تیاری اور قافلے کے کوچ کے وقت۔ اور بندگان خدا یعنی صوفی لوگوں کے دل کو رقت میں لانے کے لیے جن سے خدا راضی ہے حنفیہ کے مذہب میں حرام نہیں۔

امتناع میں ہے کہ راگ سننے سے رقت قلب اور خشوع اور وصال الٰہی کے شوق کا جوش اور اس کے قہر اور عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور جس امر کا نتیجہ یہ ہو وہ ایک عبادت ہے اور جب گانا سننا ایسا ہو تو اس میں کھیل اور بیہودگی کا کیا دخل ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر علمائے ظواہر میں سے ہیں اور اولیاء اللہ کے رئیس ہیں عوارف میں فرماتے ہیں کہ اَلسَّمَاعُ یَسْتَجِیْبُ الرَّحْمَۃَ مِنَ اللّٰہِ الْکَرِیْمِ۔ یعنی سماع خداوند کریم کی رحمت لاتا ہے۔

حضرت خواجہ خواجگان عالیشان خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے سماع کے بارے میں فرمایا ہے کہ نہ "انکارِ میکنم و نہ ایں کار میکنم"۔ یعنی میں نہ انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کام کرتا ہوں۔ چونکہ ان کے طریقے کی بنا کمال اتباع سنت پر ہے اور یقین ہے کہ گانا سننا رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کا دستور نہ تھا اس لیے انھوں نے منع فرمایا کہ "نہ ایں کار میکنم" اور چونکہ ان کے نزدیک سماع کی حرمت ثابت نہیں تھی اس لیے فرمایا کہ "نہ انکار میکنم"۔ اگر وہ حرام سمجھتے تو ضرور انکار کر دیتے۔

پس جب اعلان نکاح کے لیے دف کا بجانا حلال یا مستحب ہے۔ تو ڈھول اور نقارہ اور طنبور وغیرہ میں بمقابلہ دف کے کونسا فرق ہے۔ کھیل اور بیہودگی کے لیے سب حرام ہیں اور صحیح غرض کے لیے سب حلال ہو سکتے ہیں۔ نکاح کا اعلان ہر چیز سے ہو سکتا ہے۔ دف وغیرہ میں فرق کرنا ایک نامعقول بات ہے۔

مزامیر کی حرمت کو تسلیم کرنے کی تقدیر پر حرمت قطعی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دلیل قطعی حرف محکم آیت یا متواتر حدیث یا اجماع امت ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرات کا اہل غنا کے حق میں یہ کہنا کہ لِاَھْلِہٖ مُبَاحٌ یعنی جو اس کے اہل ہیں ان کو مباح ہے۔ حق ہے۔ لیکن موجودہ درویش لوگ اس کے اہل نہیں ہیں بلکہ یہ تکلف اور بناوٹ کے ساتھ وجد کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نہ کہنا چاہیئے کہ اس زمانے میں کوئی شخص اس جماعت سے نہیں ہے جو اس کی اہل تھی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے: میری امت میں برابر ایسا گروہ موجود رہے گا جو خدا کے حکم پر قائم ہو گا۔ ان کی پرواہ چھوڑ دینے والا شخص ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور نہ وہ شخص جو ان کی مخالفت کرے گا"۔ اور فرمایا: میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اس کا اول اچھا ہے یا آخر۔

برادر من! اہل وجد تین قسم کے ہیں۔ ایک تو اہل کمال ہیں جن کے باطن میں درد الٰہی پیدا ہو جاتا ہے اور ان کو بے اختیار کر دیتا ہے۔ یہ جماعت خدائی گروہ ہے۔ اس کا انکار خرابی دین کا موجب ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ حالات کو پیدا کرنے کے لیے راگ سنتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تدبیر سے واردات حاصل کریں۔ یہ بھی محمود ہے۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جو ریا کے طور پر وجد کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو اہل کمال سمجھیں یہ لوگ فاسق اور بدعتی ہیں۔

امام محمد غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تکلف سے وجد کرنے کی ایک قسم مذموم ہے۔ اور یہ وہ ہے جس سے دکھاوا اور احوال شریفہ کا اظہار مقصود ہو۔

اور ایک قسم محمود ہے۔ اور وہ احوال شریفہ کی تلاش کا ذریعہ ڈھونڈنا، اور ان احوال کو اس تدبیر سے پیدا کرنا اور حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ کسب کو احوال پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جسے قرآن کی قرأت میں رونا نہ آئے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ تکلف سے رونی صورت اور غمگین شکل بنائے۔ کیونکہ ان حالات میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے شروع شروع میں تکلف کیا جاتا

ہے اور انجام کار وہ احوال سچ مچ پیدا ہو جاتے ہیں۔

پس یاد رکھنا چاہیئے کہ سماع میں جس شخص کو وجد طاری ہوتا دیکھیں اس کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ (رہ

(رسالہ ازالۃ العنود فی مسئلۃ السماع و وحدۃ الوجود مصنفہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ)

فواد الفواد میں لکھا ہے کہ راگ کا جواز مذکورہ ذیل شرطوں پر موقوف ہے۔

(۱) راگ گانے والا لڑکا اور عورت نہ ہو۔

(۲) بیہودہ اور فحش باتیں راگ میں نہ کہی جائیں۔

(۳) راگ سننے والوں کی غرض خواہش نفسانی کا پورا کرنا نہ ہو۔ بلکہ وہ سب کے سب یادِ حق میں مستغرق ہوں۔

(۴) مزامیر اور سازوں سے راگ نہ گایا جائے۔ پس اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ ہو تو راگ سننا حرام ہے۔

غنی

اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کے معنی ہیں بے پرواہ قرآن میں یہ اسم کئی جگہ آیا ہے۔ سورۃ بقر رکوع ۳۶ میں ارشاد ہے وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ یعنی اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے۔

سورۃ فاطر کے تیسرے رکوع میں آیا ہے: لوگو! تم (ہمہ وقت) اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ (جو ہے تو) وہی بے نیاز ہے (اور ساری) خوبیاں رکھتا ہے۔

سورۃ ممتحنہ میں ہے: "جو شخص منہ پھیرے گا تو اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد و ثنا ہے"۔

غوث

وہ شخص جس سے مدد طلب کی جائے اور وہ فریاد سن کر مدد دینے والا ہو۔ مشہور ہے کہ ولایت کے درجوں میں سب سے بڑے درجہ کا ولی غوث ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک غوث سے بھی بڑا درجہ قطب کا ہوتا ہے۔ غیاث اللغات میں منقول ہے کہ قطب کے دائیں بائیں دو غوث ہوتے ہیں۔ پس اس لحاظ سے قطب کا درجہ غوث سے بڑا ہوا۔

غوری، معز الدّین

(۱۱۷۵ء - ۱۲۰۶ء) وہ پہلا مردِ مجاہد جس نے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے ارادے سے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ریاست غور (افغانستان) کی نسبت سے غوری کہلایا۔ اصل نام محمد تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے معز الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس لیے صحیح طور پر اس کا نام سلطان معز الدین محمد غوری ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ اسے ایام شاہزادگی میں شہاب الدین بھی کہتے تھے اور مملکت ہند میں اس کی اکثر فتوحات اُس زمانے میں ہوئیں جب وہ ابھی شہزادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا نائب تھا، اس لیے اسے بعض تاریخوں میں شہاب الدین غوری بھی کہتے ہیں۔

سلطان معز الدین غوری کو ملک مارنے، علاقے فتح کرنے اور اپنے خاندان کی حکومت کو دُور دُور پھیلانے کا بڑا شوق تھا۔ پھر اس کام کے لیے جن جن خوبیوں کی ضرورت ہے، وہ بھی اس میں موجود تھیں۔ یعنی وہ فوج کی ترتیب اور تنظیم کے علاوہ اس کی رہنمائی کرنے اور اسے لڑانے کا ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی حکومت صرف غزنی کے علاقے پر تھی۔ اس کا بڑا بھائی غیاث الدین غوریوں کا سلطان تھا، اور معز الدین اپنے بھائی کے نائب کی حیثیت سے اس علاقے کا حاکم تھا۔

لیکن اس چھوٹے سے علاقے کی حکومت پر قناعت کرکے بیٹھ رہنا اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس نے شروع ہی سے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ اس نے غزنی کی فتح کے بعد ملتان اور اُچ پر قبضہ کر لیا۔ پھر یہاں سے آگے بڑھا۔ آبو پہاڑ کے پاس پہنچا تو راجپوتوں کی ایک فوج نے راستہ روکا اور اسے شکست کھا کر پلٹنا پڑا۔ ۱۱۷۹ء سے ۱۱۸۶ء تک اس نے تین مرتبہ پنجاب پر چڑھائی کی یہاں ابھی تک غزنوی خاندان کی حکومت چلی آتی تھی (یعنی تقریباً دو صدیاں گزر گئی تھیں) اور لاہور اس حکومت کا صدر مقام تھا۔ معز الدین نے غزنوی خاندان کی حکومت کو ختم کرکے اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔

ان دنوں اجمیر پر پرتھوی راج چوہان کی حکومت تھی جو بڑا طاقتور راجہ تھا۔ دلّی کی حکومت بھی اُس کے قبضے میں آ گئی تھی۔ پنجاب پر معز الدین کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے چوہانوں کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ چھڑ گئی۔ پہلا معرکہ ترائن (موجودہ تراوڑی) کے میدان میں ہوا جس میں غوری نے شکست کھائی۔ اگلے سال وہ پھر لشکر لے کر چڑھ آیا اب کے پھر ترائن کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ پرتھوی راج شکست کھا کر مارا گیا اور دلی اور اجمیر کی حکومت معز الدین کے قبضے میں آ گئی۔ یہ معرکہ ۱۱۹۲ء میں سر ہوا۔ دو سال کے بعد معز الدین پھر غزنی سے چلا اور قنوج پر جا چڑھا۔ ان دنوں قنوج کی ریاست کا شمار راجپوتوں کی بڑی بڑی حکومتوں میں ہوتا تھا۔ اور جے چند یہاں کا حکمران تھا۔ اس حملے میں قنوج کے علاوہ کئی اور علاقے بھی ہاتھ آئے۔ لیکن ۱۱۹۴ء سے ۱۱۹۵ء تک برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اب معز الدین نے ہندوستان کا خاصا بڑا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ جو علاقہ آج کل پاکستان کہلاتا ہے، وہ تو تقریباً سارا کا سارا اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ راجپوتانہ اور بہار کے صوبے کا ایک حصہ بھی غوری سلطنت میں شامل تھا۔

موت سے چند برس پہلے معز الدین غوری نے وسط ایشیا کے ایک معرکے میں شکست کھائی تھی۔ اس شکست کی وجہ سے ہندوستان میں بھی اس کے اقتدار کو بڑا صدمہ پہنچا۔ کھوکھروں نے پنجاب میں سر اٹھایا اور اس صوبے کو غزنی سے علیحدہ کر دیا۔ غوری کو یہ خبریں پہنچیں تو غزنی سے یلغار کرتا چلا اور کھوکھروں کو شکست دے کر اس علاقے میں امن قائم کر دیا۔ وہ ابھی پنجاب ہی میں تھا کہ ایک باطنی فدائی نے اس کے خیمے میں گھس کر اُسے سوتے میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۶ء میں پیش آیا۔

سلطان معز الدین محمد غوری صحیح معنوں میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا بانی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سپہ سالار کی حیثیت سے وہ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن اس میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو محمود میں بھی نہیں تھیں۔ اور اس کی یہی خوبیاں ہیں جن کی بدولت اُس نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ یہ بڑا مستقل مزاج، بردبار، دُور اندیش شخص تھا۔ وہ شکست کھا کر بھی ہمت نہ ہارتا تھا۔ محمود نے کسی معرکے میں شکست نہیں کھائی اور معز الدین محمد غوری کو ہندوستان کے معرکوں میں دو مرتبہ شکست ہوئی، لیکن اس کی فتوحات زیادہ مستقل اور پائیدار ثابت ہوئیں۔ اُس نے جو علاقے فتح کیے وہاں مستقل طور پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

معز الدین غوری دُھن کا بڑا پکا تھا، اور جب کوئی ارادہ کر لیتا تھا تو اسے پورا کرکے چھوڑتا تھا۔ وہ ناکامیوں سے گھبراتا نہیں تھا۔ اُس نے بڑے لائق غلام جمع کر رکھے تھے جو ملکی انتظام اور سپہ گری کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ ان غلاموں کو وہ اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا، اور وہ بھی ہمیشہ جان نثاری پر آمادہ

رہتے تھے۔ چنانچہ ان غلاموں نے کئی علاقے فتح کر کے سلطان معزالدین کی حکومت میں شامل کیے اور اسے ایک مستقل سلطنت بنا دیا۔ سلطان کو خدا نے کوئی فرزند عطا نہیں کیا تھا۔ ایک مرتبہ کسی مصاحب نے کہا کہ اگر اللہ آپ کو فرزند عطا فرماتا تو آپ کے بعد آپ کے تخت و تاراج کا وارث ہوتا۔ سلطان نے جواب دیا "میرے غلام میرے بیٹے ہیں۔ یہی میرے بعد میری سلطنت کے وارث ہوں گے"۔ اور اس نے جو کہا تھا وہ صحیح نکلا یعنی اس کے غلام ہی اس کے وارث ثابت ہوئے۔ اس کی سلطنت اس کے ان غلاموں میں تقسیم ہوئی جن کو اس نے شہزادوں کی طرح تربیت دی تھی۔ ہندوستان قطب الدین ایبک کے حصے میں آیا۔

غول

غول سے مراد وہ بھوت ہے جو بیابان میں طرح طرح کی شکلوں میں نمودار ہو کر راہرووں اور مسافروں کو ڈراتا ہے اور اس کی بنا عموماً ڈرپوک طبائع کے تخیّل و توہمات پر ہوتی ہے۔ اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ شریعت غول کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا: "نہ کسی کو کسی سے بیماری لگتی ہے اور نہ ماہ صفر کی کوئی نحوست ہے جو اثر کرتی ہے اور نہ غول کوئی چیز ہے"۔

غیاث الدّین بلبن

(دورِ حکومت ۱۲۶۶ء - ۱۲۸۶ء) اسلامی ہند کے بادشاہوں میں ایک خاص رنگ اور شان کا بادشاہ۔ اصل میں ایک ترک امیرزادہ تھا۔ چنگیز خان کے حملے میں گرفتار ہوا اور بغداد میں بطور ایک غلام کے بکا۔ وہاں ایک بزرگ جمال الدین بصری نے اسے خریدا اور تربیت کی۔ پھر دہلی میں آیا۔ شروع میں ایک معمولی سپاہی بلکہ بہشتی اور فراش کا کام کیا۔ سلطان التتمش نے اُسے خرید کر اپنے غلاموں میں شامل کر لیا۔ چونکہ وہ بڑا ذہین اور لائق شخص تھا، اس لیے ہر فرمانروا کے عہد میں کوئی نہ کوئی نیا عہدہ پایا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتا سلطان ناصر الدین محمود کے عہدِ حکومت میں نائب المملک کے عہدے پر جا پہنچا۔ چنانچہ چند برس کے سوا اس سلطان کے سارے عہدِ حکومت میں ملکی اختیارات بلبن ہی کے قبضے میں رہے۔ اگرچہ یہ زمانہ بڑا نازک تھا۔ قدم قدم پر مشکلات درپیش تھیں تاہم جس طرح بن پڑا، اس نے ملک میں امن و امان قائم رکھا۔

ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد سارے امیروں کی رائے سے بلبن تخت نشین ہوا۔ بلبن نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلے مفسدوں اور شورش پسندوں کو سزائیں دے کر ملک میں امن و امان قائم کر دیا۔ میواتی بڑے سرکش تھے۔ بلبن نے انھیں ایسا دبایا کہ پھر انھیں سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کے علاقے میں جنگل پھیلے ہوئے تھے جو ضرورت کے وقت قلعوں کا کام دیتے تھے۔ بلبن نے یہ جنگل کٹوا دیئے۔ اور ان لوگوں کے لیے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

گنگا اور جمنا کے درمیان کا زرخیز علاقہ جو عام طور پہ دو آب کہلاتا ہے، یہاں بھی بڑی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ راستے لٹتے تھے۔ اس لیے سفر کرنا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ مالِ تجارت لے جانا مشکل ہو گیا تھا۔ سلطان نے شورش پسندوں اور لٹیروں کو سخت سزائیں دیں۔ اس طرح سڑکیں محفوظ ہو گئیں۔ لوگ اطمینان سے سفر کرنے لگے۔ آنولہ کے کاٹھیریار راجپوتوں نے سرکشی پہ کمر باندھ رکھی تھی۔ بلبن نے انھیں بھی دبا دیا۔ رنتھمبور گوالیار، چندیری اور مالوے نئے سرے سے فتح کیے۔ میوات کی بدنظمی دور کی۔ غرض تھوڑی مدت میں ملک میں بغاوت اور سرکشی کا نام و نشان باقی نہ رہا اور ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔

لیکن بلبن اچھی طرح جانتا تھا کہ ملک کے اندر امن و امان قائم کرنے کے لیے باغیوں اور سرکش لیڈروں کو سزائیں دینا ہی کافی نہیں۔ یہ لوگ جب موقع پائیں گے، ضرور سر اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس نے کئی تدبیریں اختیار کیں۔ جابجا مسلمانوں کی بستیاں بسائیں۔ جگہ جگہ چوکیاں قائم کیں اور آس پاس کے علاقوں میں ترک اور افغان سرداروں کو جاگیریں دیں۔ جو مقامات زیادہ اہمیت رکھتے تھے، وہاں قلعے بنوائے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے فوج مقرر کی۔ لشکر کو اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا۔ پنجاب اور سندھ میں جابجا فوجی چھاؤنیاں قائم کیں تاکہ تاتاری یورشوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ طغرل حاکم بنگال کی بغاوت کا علم ہوا تو اگرچہ بلبن کی عمر اس وقت اسّی برس کی تھی، لیکن اس پیرانہ سالی میں بھی فوج لے کر یلغار کرتا ہوا چلا۔ طغرل مارا گیا اور بنگال پھر سلطنتِ دہلی کے قبضے میں آ گیا۔ وہاں کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خان کے سپرد کر دی۔ تاتاریوں کی مسلسل یورشوں کے باعث پنجاب کو سلطنت کے دفاع میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ بلبن نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کو جو زیادہ تر خان شہید کہلاتا ہے، ملتان اور لاہور کی حکومت پہ مامور کیا جو بڑا قابل سالار اور علم دوست تھا۔ وہ ۱۲۸۵ء میں تاتاریوں (مغلوں) کو شکست دے کر نماز ادا کر رہا تھا کہ اچانک ایک تاتاری دستے نے حملہ کر دیا۔ شہزادہ تیر کھا کر جاں بحق ہوا۔ ساتھی پکڑے گئے۔ ان میں میر حسن اور خواجہ سنجری بھی تھے اور کچھ مدت بعد رہا ہوئے۔ لائق بیٹے کی وفات کے صدمے نے بلبن کی کمر توڑ دی۔ چنانچہ اُس کا آخری زمانہ طرح طرح کے تفکّرات میں گزرا۔ آخر ۱۲۸۶ء میں وفات پائی۔

بلبن بڑا طاقتور حکمران تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ طاقتور کے مقابلے میں ہمیشہ کمزور کی حمایت کرتا تھا۔ جو لوگ قانون پہ چلتے تھے، ان کے حق میں وہ باپ سے زیادہ شفیق تھا۔ لیکن قانون شکنی کرنے والوں کا اُس سے بڑا دشمن کوئی نہ تھا۔ نماز پڑھتے وقت جب اُسے یہ خیال آتا تھا کہ قیامت کے روز اُسے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ علماء اور مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا اور اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی کوششوں سے بادشاہت کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کا رعب قائم ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس نے لٹیروں سے ملک کو نجات دلائی۔ جو لوگ آئے دن بدامنی پھیلاتے رہتے تھے، انھیں بالکل کچل ڈالا اور سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچائے رکھا۔ بلبن کو سلطنت کے استحکام کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی، لیکن اس نے کبھی کوئی نیا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بلکہ جو علاقہ فتح ہو چکا تھا، اسی کو مستحکم کرنے اور اُسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے میں اپنی ساری عمر خرچ کر دی۔ (نیز دیکھیے "بلبن")

غیاث الدّین تغلق

(دورِ حکومت، ۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء) اسلامی ہند میں خاندانِ تغلق کا بانی۔ ۱۳۲۰ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر خاصی ہو چکی تھی۔ بادشاہ بننے سے پہلے ہی وہ بڑی شہرت اور ناموری حاصل کر چکا تھا، کیونکہ مغلوں کو نیچا دکھانے میں علاؤالدین خلجی کو بھی جو کامیابی ہوئی تھی، اس میں غیاث الدین کی شجاعت اور تدبّر کا بڑا دخل تھا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں پنجاب کا حاکم مقرر ہوا۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں اس نے مغلوں کو انتیس لڑائیوں میں شکستیں دیں اور "غازی ملک" کا خطاب حاصل کیا۔ غاصب خسرو کا مقابلہ کرنے کے لیے لاہور سے فوج لے کر روانہ ہوا۔ خسرو کی فوج کو پہلے سرہند کے قریب، پھر دہلی میں شکست فاش دی اور خسرو لڑائی میں مارا گیا۔ چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی اولادِ نرینہ باقی نہ رہی تھی، اس لیے امراء نے غیاث الدین کو بادشاہ بنا لیا۔

غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کے وقت ملک کی جو حالت تھی، اُسے دیکھ کر تو معلوم ہوتا تھا کہ اصلاح کی کوششوں میں زمانہ لگ جائے گا، لیکن اس نے چند برس کے اندر ملک کا سارا انتظام درست کر دیا۔ غیاث الدین کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ دُور اندیشی اور مصلحت اندیشی کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں بڑا اعتدال تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی حکم دیا کہ اراضی کے رقبے کے حساب سے مال گزاری وصول کرنے کی بجائے پیداوار کے حساب سے مال گزاری وصول کی جائے۔ یہ طریقہ بڑا سادہ اور منصفانہ تھا، اس لیے ساری دیہاتی آبادی خوش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی نافذ ہوا کہ اگر کسی علاقے میں زیادہ غلہ پیدا ہونے لگے تو مال گزاری کی شرح میں بتدریج اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر مال گزاری کی شرح یکبارگی بڑھادی گئی تو کسانوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ زمین کو زرخیز بنانے کی جانب زیادہ توجہ نہیں کریں گے۔

غیاث الدین تغلق نے مقدموں اور چودھریوں کو بھی بعض مراعات دیں، کیونکہ یہ لوگ دیہات کے انتظام میں حکومت کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ صوبیداروں کے اعزاز اور منصب میں بھی اضافے کیے گئے۔ غیاث الدین رعایا کی دلجوئی میں تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بڑا سخت گیر بھی تھا۔ جرائم کی سزائیں سنگین تھیں گداگری کا انسداد بھی کیا۔ اس کے عہد میں ایسا امن و امان تھا اور قانون کی پابندی پر اتنا زور دیا جاتا تھا کہ اکثر چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنا پرانا پیشہ چھوڑ کر کھیتی باڑی شروع کر دی۔

قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کے بعد افراتفری پھیل گئی تھی۔ اس لیے تلنگانہ کے راجہ نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ غیاث الدین نے ولی عہد سلطنت جونا خان کو تلنگانہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دو مرتبہ زور کے معرکے ہوئے۔ دونوں مرتبہ تلنگانہ کے راجہ نے شکست کھائی۔ اور یہ علاقہ بھی دہلی کی سلطنت میں شامل ہو کر اس کا صوبہ قرار پایا۔ بلبن کی وفات کے بعد بنگال کا علاقہ بالکل خود مختار ہو گیا تھا اور چالیس سال سے برابر خود مختار چلا آتا تھا۔ غیاث الدین نے اسے فتح کر کے پھر سلطنت دہلی میں شامل کر لیا۔ ترہت کا مضبوط قلعہ جو شمالی بہار میں تھا، اس پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

بنگال اور ترہت کی فتح سے فارغ ہو کر غیاث الدین تغلق نے دہلی کا رُخ کیا لیکن موت نے شہر تک پہنچنے کی مہلت نہ دی۔ جب دہلی کا شہر ایک منزل کے فاصلے پر رہ گیا تو ولی عہد سلطنت جونا خان اور امراء پیشوائی کو حاضر ہوئے۔ افغان پور دہلی کے پاس ایک بستی تھی۔ یہاں ولی عہد نے سلطان کی ضیافت کے لیے ایک کوشک (بنگلہ) بنوایا تھا۔ وہیں لاکر اتارا۔ بدقسمتی سے یہ بنگلہ گر پڑا۔ اور سلطان اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ پینسٹھ برس کی عمر پائی۔ مقبرہ دہلی میں ہے۔ اگرچہ صرف چار سال حکومت کی، مگر نیک دلی، حسنِ انتظام، انصاف اور رعایا پروری میں بڑی شہرت پائی۔ اس کی زندگی بڑی بے داغ تھی اور دین داری اور پرہیزگاری اس کی طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہ میں جو جو خوبیاں ہونی چاہئیں، سلطان غیاث الدین تغلق میں وہ سب موجود تھیں۔

غیب

غیب پوشیدہ۔ اس پوشیدگی کی کئی قسمیں ہیں۔ اوّل اضافی۔ کہ ایک چیز ہمارے سامنے ہے مگر اس شخص سے جو کوس دو کوس دُور ہے غائب اور غیب ہے۔ یہاں تک کہ عالمِ ناسوت کی جمیع چیزیں اگر ایک سے غیب میں ہیں تو دوسرے کے نزدیک موجود ہیں۔ اس قسم کا غیب خاصۂ خدا نہیں۔ کیونکہ یہ غیب مطلق نہیں بلکہ مِن وجہٍ مشہود ہے۔ اس کو ایک جانتا ہے تو دوسرا نہیں جانتا۔ جنّات اکثر اسی قسم کے غیب کاہنوں سے بیان کر دیتے تھے اور اب بھی بیان کر دیں تو کچھ بات نہیں۔

دوم۔ عالمِ ناسوتی سے غیب یعنی عالمِ مثال کی چیزیں عام ہیں کہ وہ ابھی اس عالم میں نہیں آئیں بلکہ آنے والی ہیں یا چلی گئی ہیں۔ اب وہ نہ ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ نہ ان کانوں سے سنی جا سکتی ہیں نہ ان ہاتھوں سے ٹٹولی جا سکتی ہیں۔ نہ ناک سے سونگھی جا سکتی ہیں نہ زبان سے چکھی جا سکتی ہیں۔ اس قسم کا غیب اوّل غیب سے بلند ہے۔ مگر یہ بھی غیب مطلق نہیں جس کو غیب الغیب کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں عالمِ ملکوت کے لوگوں کے سامنے ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کبھی روح خواب میں جبکہ اس کو کثافت جسمانیہ سے نورانیت حاصل ہوتی ہے۔ ان چیزوں میں سے بعض یا کل کو دریافت کر لیتی ہے اور اسی طرح اہلِ کشف صادق بحالت بیداری اپنی روحانی تجلّی میں دریافت کر لیتے ہیں جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السّلام و اولیائے کرام۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث کسوف ہے جس میں روایت ہے کہ نبی صلعم کو نماز میں اس عالمِ غیب کی چیزیں دکھائی گئیں اور اس لیے اشراقی اور اہلِ ریاضت بھی کبھی کبھی بعض چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں اور کاہن اور رمّال و جفار اور نجومی بھی کبھی کبھی اپنے قواعد سے کچھ اڑتی ہوئی بات معلوم کر کے اپنی قوتِ متوہمہ سے ایک قالب میں ڈھالتے ہیں۔ مگر خود ان قواعد کی غلطی یا ان سے استنباط کی لغزش اور اسی طرح خواب و مکاشفہ میں قوتِ وہمیہ کی آمیزش اس علمی مرتبے کو ظن کے مرتبے میں کر دیتی ہے۔ یعنی بجز کشفِ انبیاء علیہ السلام کے اور جس قدر طریقے ہیں علی قدر مراتب ان میں غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے اس لیے ان کے جاننے کو علم بمعنی یقین نہیں کہہ سکتے۔ پس اس قسم کا غیب بھی اس کی طرف سے خاص حضرات انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتا ہے جس کی یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ آگے اور پیچھے ملائکہ کا پہرہ رہتا ہے تاکہ شیاطین اور قوتِ فکریہ و قوتِ وہمیہ و خیالیہ آگے سے اور عادات و طبائع سامنے سے اس میں کچھ بھی دست اندازی نہ کریں۔ رمّالوں، جفاروں، نجومیوں اور کاہنوں وغیرہ کے غیب میں تو ہزاروں من کوڑا کرکٹ ہوتا ہے اور حضرات اولیاء کرام کے مکاشفات میں بھی یہ محافظت نہیں ہوتی اس لیے ان کو بھی آخر الامر کتاب و سنت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو وحی کے اقسام سے ہیں اور اسی لیے اور مکلفین کو بھی ان کے الہامات کا پابند نہیں کیا گیا، اور نہ وہ الہامات حجّتِ قاطعہ ٹھہرائے گئے ہیں۔

تیسری قسم غیب الغیب اور غیب مطلق ہے جس کو حق سبحانہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں کہ جن کے جاننے کی کسی ممکن میں قدرت ہی نہیں اور یہ ایک بے انتہا غیب ہے۔ لَا یَعْلَمُهٗ اِلَّا هُوَ۔ اور بعض ایسی بھی ہیں جن کو ملائکہ مقربین و حاملان عرش جان تو سکتے ہیں مگر نہیں بتلائی جاتیں۔ اور بعض ایسی ہیں کہ کبھی بتلائی بھی جاتی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: "اللہ غیب جاننے والا ہے۔ اپنے غیب پر ایک کو واقف نہیں کرتا مگر اپنے پسندیدہ رسول کو۔ پھر اس کے آگے اور پیچھے پاسبان مقرر کر دیتا ہے (س۔ جن۔ ع۲)

ف

فاتحہ سورۃ فاتحہ۔ قرآن مجید کی پہلی سورت کا نام ہے اور وہ یہ ہے :
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ الحمد للہ رب العالمین الخ
غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ○ اس سورۃ کا نام فاتحۃ الکتاب ہے اس لیے کہ قرآن مجید کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ بعض مدنی کہتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔ ایک بار مکہ میں نازل ہوئی جب نماز فرض کی گئی۔ پھر مدینہ میں نازل ہوئی جب قبلہ کی تبدیلی ہوئی۔ اس کا نام ام الکتاب اور ام القرآن بھی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو ام القرآن نہ پڑھے۔ سورہ وافیہ اور سورہ کافیہ بھی اس کا نام ہے۔ اس لیے کہ یہ قرآن کے اکثر مضامین پر جامعیت کے ساتھ مشتمل ہے۔ سورۃ الکنز بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے : فاتحۃ الکتاب میرے عرش کے خزانوں سے ایک خزانہ ہے۔ سورۃ شفاء اور سورہ شافیہ بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے فاتحۃ الکتاب شفاءٌ من کلّ داءٍ الّا السّام۔ سورۃ المثانی بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ وہ ہر نماز میں دو دو بار پڑھی جاتی ہے۔ سورۃ الصلوٰۃ بھی اس کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نماز میں پڑھنی واجب اور بعض مذاہب کے نزدیک فرض ہے۔ سورۃ الحمد اور سورۃ الاساس بھی اس کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ قرآن مجید کی اساس (بنیاد) ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے : جب تو بیمار ہو جائے یا تجھے صحت کی شکایت ہو جائے تو اساس (الحمد) کو لازم پکڑ۔ سورہ الحمد اس لیے کہ اس میں خدا کی حمد درج ہے۔ یہ سات آیات ہیں :

آنحضرت صلعم نے ابوسعید بن المعلیٰؓ سے فرمایا : کیا نہ سکھلاؤں میں تجھ کو ایسی سورت جو قرآن میں (ازروئے فضائل) سب سورتوں سے بڑی ہے۔ پھر فرمایا وہ سورۃ الحمد للہ ربّ العالمین ہے۔ وہ سات آیات ہیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن ہے بڑا کہ دیا گیا ہے مجھ کو۔ اس حدیث کے آخری کلمات میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے : ولقد اتیناک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم۔ (اے پیغمبر) دی ہم نے تم کو سات آیتیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں نماز میں یا ثنا کی گئی ہے۔ ان کی فصاحت و اعجاز کے متعلق۔ اور دیا ہم نے تم کو قرآن عظیم۔ اس سے مراد فاتحہ ہے۔ چونکہ یہ قرآن کا جزو اعظم ہے۔ اس لیے اس کو قرآن عظیم سے تعبیر فرمایا۔ (نیز دیکھئے : الفاتحہ)

فارابی (۸۷۰ء - ۹۹۰)۔ ابوالنصر محمد بن محمد بن ترخان۔ ترکی النسل عظیم مسلمان فلسفی، محمد نامی ایک ترک سپہ سالار کا بیٹا تھا۔ مغربی دنیا میں لاطینی شکل میں ALPHARABIUS (الفارابیوس) کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے وطن ایران، ترکستان میں تحصیل علوم کے بعد قاضی کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ فارابی نے عربی زبان قیام بغداد کے زمانے میں سیکھی۔ اسی زمانے میں اس نے منطق اور فلسفہ عیسائی فلسفی ابوبشر متّیٰ اور نحو ابوبکر بن السراج سے پڑھی۔ اور یوحنا بن حیلان سے بھی درس لیا جو خلیفہ المقتدر کے زمانے کے تنگ خیال پیشوایانِ دین فلسفیوں اور آزاد خیالی کے خلاف اقدامات کرتے رہتے تھے، ان سے فارابی ضرور متاثر ہوا ہوگا، چنانچہ بغداد چھوڑ کر شام چلا گیا۔

فارابی جب بغداد سے شام گیا تو وہ حمدانی خاندان کے امیر سیف الدولہ کے دربار میں حاضر ہوا جو حلب کا حکمران تھا اور وہاں اس کی بہت عزّت و تکریم ہوئی۔ اس کے باوجود فارابی نے اس امیر سے صرف چار درہم کا روزینہ قبول کیا تھا۔ الغرض فارابی نے سیف الدولہ کے سایۂ عاطفت میں بہت اعتبار اور شرف کی زندگی بسر کی۔ ایک بار وہ امیر کے ہمراہ دمشق گیا اور وہیں اس نے وفات پائی۔

فارابی سکون، تنہائی اور عزلت میں بیٹھ کر کام کرنے کا دلدادہ تھا۔ اکثر اوقات باغوں اور باغیچوں میں گشت کیا کرتا اور لوگوں میں ملنے جلنے سے گھبراتا تھا، وہ اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے : " میں اپنے گھر کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گیا ہوں، کیونکہ میں نے یہ دیکھا کہ زمانہ اپنا سر زانو پر جھکائے ہوئے ہے۔ صحبت سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنے لوگ بڑے بڑے رتبوں پر فائز ہیں، وہ سب غم و اندوہ کا شکار ہیں اور ہر سر کسی نہ کسی درد میں مبتلا ہے۔" فارابی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہمارے پاس معلومات بہت کم ہیں۔ تاہم یہ طے ہے کہ فارابی نے بغداد، حلب اور دمشق میں، یہاں تک کہ مصر میں بھی ہمیشہ ترکی لباس اور وضع قطع قائم رکھی۔

فارابی کو، جو اسلامی فلسفے کا سب سے پہلا فلسفی ہے، نہ صرف مغرب کی علمی دنیا میں بلکہ مشرق میں بھی وہ شہرت نہیں ملی جو اس کے معنوی شاگرد ابن سینا اور ابن رشد کو حاصل ہے۔ علمی تفکر کا سلسلہ الکندی نے شروع کیا تو حقیقی علم کی بنیاد اسی ترکی الاصل نابغہ نے ڈالی تھی اور اسلامی مکتب فلسفہ کی اساس رکھنے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہوا۔ فارابی خاص طور پر علم منطق کے ذریعے علم فلسفہ کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے بعد ما بعد الطبیعیات پر غور و فکر کرتا ہے۔

فارابی نے ارسطو کی تصانیف کے عربی ترجموں کی جس طرح شرح کی ہے، اس کی بدولت فلسفۂ طبعی کی بجائے فلسفۂ ذہنی کا آغاز ہوا۔ اُسے علم طب سے بھی شغف تھا، مگر اس حد تک نہیں، جتنا ابنِ سینا اور ابنِ رشد کو تھا۔ بہرحال فارابی کو سب سے زیادہ دلچسپی ما بعد الطبیعیات اور عقلی افکار سے تھی۔ وہ عربی زبان میں مشرقی مکتب فلسفہ کا بانی اور اسلامی فلسفے کا موجد شمار ہوتا ہے۔ اس نے ایسا ہم آہنگ اور مربوط نظامِ فلسفہ پیش کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور نظام فلسفہ آسانی سے نہیں مل سکتا۔ یہ ہم آہنگی اور ارتباط کا دلدادہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ فارابی نے افلاطون

اور ارسطو کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ قدیم یونان کے ان دو فلسفیوں نے دو علیحدہ علیحدہ فلسفیانہ مسلک قائم کیے تھے، بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نتیجے کے اعتبار سے وہ ایک ہی فلسفیانہ عقیدے کا التزام کرتے تھے۔

چونکہ فارابی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں فلسفے بالکل ایک ہی ہیں۔ اس لیے مستشرقین نے اُسے SYNCRETIST کا خطاب دیا ہے جو حق بجانب ہے۔ چونکہ فارابی اور دیگر مسلمان فلسفیوں کے نزدیک یہ راستہ بہت صحیح اور مناسب ہے اس لیے وہ دوسرے مسلمان مفکرین کی طرح اپنی معلومات کو یکجا کرکے، ایک دوسرے سے مطابقت دینا اور ان میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ فارابی کو بھی مختلف نقطہ ہائے نظر کو یکجا کرکے ایک "کُل" پیدا کرنے سے بے حد ذوق و انہماک ہے۔ اور اس ترکیبی ذہنیت کا فکر اس کے تمام اصول اور اسلوب میں بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک جگہ جمع کرکے ان سے ایک "کل" پیدا کرنے میں فارابی کے احساسِ تاریخی نے بھی اُسے بہت مدد دی ہے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ فارابی نے اپنے سے پہلے کے یونانی فلسفیوں، بالخصوص افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ترتیب اور تجزیے کی باہمی آمیزش سے وہ فلسفی مسلک پیدا کیا تھا جسے فارابی کا نظریۂ اتحادِ عقائدِ گوناگوں (SYNCRETISM) کہا جاتا ہے۔

فارابی تزکیۂ نفس کو تمام فلسفے کی اصل شرط اور ماحصل سمجھتا ہے، اور ارسطو کے نظریے کے برعکس حقیقت کو عشق کے ذریعے تلاش کرنے کا قائل ہے۔ اسی طرح فارابی طبیعی اور معنوی علوم کی چھان بین کرتے وقت بھی یہ چاہتا ہے کہ جو بھی حُکم لگائے جائیں، اُن تک سند سے اور منطق کی راہ سے پہنچا جائے۔ مابعد الطبیعیات اور طبیعیات کا گہرا مطالعہ بھی اس نے اسی اصول کے تحت کیا ہے۔ خدا کو سب موجودات کا علم ہے، اس لیے اگر ہم اس تک پہنچ سکیں تو ہم ایک حد تک خدا سے مشابہ ہو جائیں گے۔ یہ فلسفہ ہی ہے جو ہر چیز پر حاوی ہے اور جو ہمیں اس عالم کو ایک کُل، ایک منظم کائنات کی مانند دکھا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فارابی سب سے پہلے منطق کی اساس پر اپنے فکر کو مستحکم کرنے کے بعد اُس راستے کو اختیار کرتا ہے جس سے تمام موجودات کی علّتِ اولیٰ کے بارے میں تحقیق کی جا سکتی ہے۔ وہ علمِ منطق کو دو بڑی اقسام یعنی تصوّرات اور تصدیقات میں تقسیم کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ تصورات صدق اور کذب دونوں پر محمول ہو سکتے ہیں۔ فارابی کسی معلوم شئے سے شروع کرکے کسی نامعلوم شے کے علم تک پہنچنے کے اصول یعنی "بُرہان" کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ وہی اصلِ منطق ہے۔

منطق کے بعد فارابی کی مابعد الطبیعیات، طبیعیات اور فلسفۂ سیاست کی تدقیق کرنے کے لیے مصنفین ان مباحث کو تین اقسام یعنی نظریۂ الوہیت، نظریۂ عقل اور نظریۂ نبوت میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان تین جدا جدا نظریوں کو فارابی نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہے اور وہ یوں کہ تینوں میں چونکہ ایک ہی مقصد کارفرما ہے۔ لہٰذا نتیجے کے اعتبار سے بھی وہ ایک ہی ہو جاتے ہیں۔

اپنے نظریۂ الوہیت کے مطابق فارابی اس امر کا قائل ہے کہ خدا واحد ہے۔ واجب الوجود ہے۔ کسی شکل، مادّے اور علّت کا محتاج نہیں اور ذات اور موجودیت اس کے لیے مخصوص ہے۔ یہ ذات اور موجودیت، علاوہ انتہائی درجے مکمل ہونے کے، کسی اور وجود (ہستی) میں نہیں ملتی۔ فارابی انسان کو مجرد اللہ کے انتہائی قریب پہنچانے کے لیے تصوّف کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی رائے میں مراقبے کا مقصد عقل کی اللہ سے مشابہت کو یقینی بنانا ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے عالمِ محسوسات ہی سے نہیں بلکہ عالمِ معقولات سے بھی ماورا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ عقل جب اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے تو وہ کمال روحانی

علمِ حقیقی اور آخرکار سعادتِ مطلق کو پا لیتی ہے۔

فارابی کا نظریۂ نبوّت یہ ہے کہ جس طرح علمِ منطق عقل کے اصولوں کی تدقیق اور تحقیق کرتا ہے۔ اسی طرح علمِ اخلاق افعال و حرکات کے بنیادی قاعدوں کی چھان بین کرتا ہے۔ برخلاف میں عقل اور تجربے کو علمِ اخلاق میں منطق سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ فارابی اس عقیدے میں متکلمین سے اختلاف رکھتا ہے کہ عقل کے ذریعے علم حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن صرف حال و حرکت کے قواعد کو (یعنی اخلاق کو) عقل کے ذریعے معیّن کرنا ممکن نہیں اور صاف طور پر یہ مانتا ہے کہ بسا اوقات عقل کسی چیز کے اچھا یا بُرا ہونے کا حکم لگا سکتی ہے۔ اسی طرح یہ دیکھتے ہوئے کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے، وہ لکھتا ہے کہ جو عقل عالمِ بالا سے ہم تک آتی ہے اور ہمیں علوم سکھاتی ہے، وہ ہمیں ہمارے حال و حرکت کے متعلق قاعدے کیوں نہیں بنائے گی؟

روح اپنی طبیعت اور ماہیت کے تقاضے سے آرزو رکھتی ہے۔ روح اپنی قوّتِ ادراک کی وجہ سے ارادے کی بھی مالک ہے۔ پاکیزہ فکر صرف آزادی کی فضا ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ حرّیت جو غور و خوض کے نتیجے کے طور پر حاصل ہوتی ہے، نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ آخر میں محض خدا کی عقلی ماہیت کی وجہ سے حریت حاصل کرتی ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے فارابی ہی نے دینِ اسلام اور فلسفے کی باہمی مناسبت اور دونوں کے درمیان افتراق و اختلاف سے بحث کی، اس کا مسلک زیادہ تر یہ تھا کہ ایک خوش فہم درویش کے انداز پر مذہب اور فلسفے کے باہمی تعلقات کا پتا لگایا جائے۔

تصانیف : إحصاءُ العلوم والتعریف بأغراضها۔ یہ عربی کا اوّلین انسائیکلوپیڈیا ہے جو علوم کی تقسیم و تعریف اور ان کے موضوعات پر حاوی ہے۔

(۲) رسالہ "المجموع" جس میں فارابی کے متعدد مقالات جمع کر دیے گئے ہیں۔

(۳) فصوص الحکم (استنبول - ۱۲۹۱ھ)

(۴) السیاست المدنیۃ (لائیڈن ۱۹۰۴ء)

(۵) کتاب تحصیل السعادت

(۶) رسالہ فی اثبات المفارقات (حیدر آباد ۱۳۴۵ھ)۔ اس کتاب نے ابن سینا کے فلسفے پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

(۷) التعلیقات (حیدر آباد ۱۳۴۶ھ) منقولات کی شکل میں [illegible] تر اس کی مختلف تصانیف کے باقی ماندہ اجزا ہیں۔

فارابی نے ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں لکھی تھیں، لیکن [illegible] ہم تک نہیں پہنچیں اور صرف اُن کے نام دوسرے مشہور مصنفین کی [illegible] ملتے ہیں۔

فارس

فارس : پارس کی معرّب شکل جس کی اصل پرسا (PERSA) ہے [illegible] کے شمال مغرب میں خوزستان، شمال مشرق میں اصفہان، مشرق میں کرمان [illegible] خلیج فارس ہے۔ یہ صوبہ آٹھ اضلاع میں منقسم ہے۔ شیراز، بوشہر، [illegible] جہرم، فیروز آباد اور آبادہ۔ موجودہ آبادی تقریباً [illegible] مجموعی [illegible] تقریباً دو لاکھ کیلو میٹر ہے۔

[illegible] میں ہے، جہاں سے کورش اعظم (۵۹ ق م - ۳۰ ق م) نے اپنی اُن عظیم الشان فتوحات کا آغاز کیا، جو [illegible] دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے قیام پر منتج ہوئیں۔ دو صدیوں کے بعد سکندر اعظم نے پارس کو بقیہ ایران کے ساتھ تاخت و

تاراج کیا۔ کوروش اعظم کی طرح ساسان کا پوتا اور بابک کا بیٹا اردشیر پارس کا رہنے والا تھا اور ۲۲۸ء میں وہاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ساسانیوں کے عہد میں پارس پانچ اضلاع میں منقسم تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں نے پہلی بار فارس کی تسخیر کی کوشش کی۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں عربوں نے فارس پر دوبارہ چڑھائی کی کوشش کی۔ ری شہر کے نزدیک عثمان ابن ابی العاص اور اس کے سپاہی ساسانی افواج کے خلاف بہت بے جگری سے لڑے۔ آخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ساتھ ہی عربوں کی دوسری فوج حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی سپہ سالاری میں بصرے سے روانہ ہو کر مغرب کی طرف فارس پر حملہ آور ہوئی دونوں سپہ سالاروں کے لشکر ایک جگہ آ کر مل گئے اور انہوں نے فارس کے اندرونی علاقے میں پیش قدمی کر کے شیراز پر قبضہ کر لیا۔

بعد میں دارابگرد، فسا، شاہپور اور فیروزآباد پر بھی تسلط ہو گیا اور اس طرح کی تسخیر کمل ہوئی۔ شروع میں خراج تین کروڑ تیس لاکھ درہم مقرر ہوا۔ بعد ازاں المتوکل کے زمانے میں اُسے بڑھا کر تین کروڑ پچاس لاکھ کر دیا گیا۔ جزیے سے سرکاری خزانے کو ایک کروڑ اسی لاکھ درہم کی آمدنی ہوتی تھی۔

نویں صدی عیسوی میں خلافت کے دنیوی اقتدار میں ضعف آیا تو فارس صفاری خاندان کے بانی یعقوب بن لیث کے قبضے میں آ گیا اس نے شیراز کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، جہاں اس کے بھائی عمرو بن لیث نے جامع مسجد تعمیر کرائی۔ بعد ازاں آل بویہ نے فارس پر قبضہ کر لیا۔ بنو بویہ کے بعد سلجوقی فارس کے حکمران ہوئے۔ مظفری خاندان کے بانی مبارز الدین محمد نے ۱۳۵۳ء میں فارس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

صفوی خاندان کے اوّلین حکمران شاہ اسمٰعیل اوّل نے ۱۵۰۳ء میں فارس کو اپنے دائرہ اختیار میں شامل کر لیا۔ شاہ عباس اوّل کے عہد میں فارس کے حاکم اعلیٰ امام قلی خان نے تقریباً شاہانہ شان و شوکت سے شیراز میں حکومت کی شیراز کو فارس کے دوسرے شہروں کی طرح نادر شاہ کی سرکردگی میں ایرانی افواج اور غلزئی افغانوں کی جنگ میں بڑے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ غلزئی افغانوں کی کمان اشرف کر رہا تھا۔ جنگ کا خاتمہ ۱۷۳۰ء میں غلزئیوں کی شکست فاش کی صورت میں ہوا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد شورشوں کے نتیجے میں فارس کو دوبارہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن نیک خصلت کریم خاں زند کے اقتدار سنبھالنے پر جس نے شیراز کو اپنا صدر مقام قرار دیا تھا ایک میں جلد ہی امن و امان اور خوشحالی کا دور بحال ہو گیا۔

زمانۂ حال میں فارس کی تاریخ میں کوئی خاص، قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں خرگ میں کچا تیل بار کرنے کی گودی کا افتتاح ہوا۔ جہاں بڑے بڑے سائز کے تیل بردار جہاز کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ کچا تیل ۱۶۰ کیلومیٹر لمبی پائپ لائن کے ذریعے گچ سران کے تیل کے کنوؤں سے لایا جاتا ہے ۲۷ کیلومیٹر تک یہ پائپ لائن خلیج فارس کے پانی کے نیچے سے ہو کر گزرتی ہے۔

فارس الشدیاق

احمد بن یوسف ایک عرب مصنف اور صحافی بیروت میں پیدا ہوا۔ قاہرہ کے مارونی سکول میں تعلیم پائی۔ کچھ عرصے تک مصر کے سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" میں کام کیا۔ کچھ عرصہ مالٹا میں قیام کیا اور وہاں کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۵۰ء کے بعد چند برسوں میں پیرس کا سفر کیا اس کے بعد وہ لندن گیا اور ایک سفرنامہ لکھا جس میں عربوں اور دوسری اقوام کا ناقدانہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ لندن سے استنبول گیا اور وہاں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے ترکی حکومت کی مالی اعانت سے ایک ہفت روزہ اخبار "الجوائب" جاری کیا جس میں اس نے اسلام کی حمایت کو اپنا موقف قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس نے مسلمانوں کو یورپی علوم سے بھی روشناس کرایا۔ ۱۸۸۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیم اس اخبار کا پرانا معیار قائم نہ رکھ سکا اور کچھ عرصہ بعد اخبار بند ہو گیا۔

فارسی

(۹۰۰ء - ۹۸۷ء) ابو علی الحسن بن علی، چوتھی صدی ہجری کا ایک ممتاز نحوی۔ بغداد میں ابن السراج، الزجاج اور دوسرے نحویوں سے تحصیلِ علم کی۔ بغداد ہی میں وفات پائی۔ اسے اعتزال سے مہتم کیا جاتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے محمد علی الجبائی المعتزلی کی تفسیر کی شرح لکھی۔ جو "المتتبع" کے نام سے موسوم تھی۔ اور اب معدوم ہو چکی ہے۔ الفارسی کی تصانیف میں اہم ترین "الایضاح فی النحو"، علمِ نحو میں اونچے درجے کی کتاب ہے۔ جس کا "تکملہ" اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

فارسیہ

خلیج فارس میں ایک جزیرہ۔ سعودی عرب اور ایران کے ساحلوں کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ جزیرہ العربیہ کی طرح، جو اس سے چودہ میل جنوب میں ہے اور رقبے میں ایک مربع میل سے کم ہے۔ یہ جزیرہ حکومتِ ایران کے ماتحت ہے، جس نے ایک موسمیاتی مرکز قائم کر رکھا ہے اور ایران ہی کا محکمۂ روشنی یہاں جہاز رانی کے لیے روشنی کا انتظام کرتا ہے۔

فارقلیط

۔ انجیل مقدس میں رسولِ اکرمؐ کا نام۔ "ڈکشنری آف اسلام" میں لکھا ہے کہ یہ عبرانی لفظ "Paraclete" کی عربی شکل ہے۔ اس لفظ کے معنی اور تشریح میں سخت اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اس کے معنی "ہمدرد" کے ہیں۔ موجودہ عیسائی اس کے معنی "روح القدس" کرتے ہیں۔ غرضیکہ یہ لفظ بحثوں اور مناظروں میں بہت کھینچا تانی کا موجب بنا ہوا ہے۔ اس بحث کا آغاز انجیل یوحنا کے چودھویں باب کی سولھویں آیت سے ہوتا ہے :- وَ انا من الأب فیعطیکم فارقلیط" (ترجمہ: اور میں باپ سے درخواست کروں گا، تمھیں دوسرا مددگار بخشے کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔") اس کے بعد سترھویں آیت ہے۔" یعنی روحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی۔" یہ ایک قابلِ غور حقیقت ہے کہ آیتِ سابق میں "فارقلیط" کا ترجمہ ہمدرد کیا جاتا ہے اور اگلی آیت میں اسی لفظ کا ترجمہ "روح القدس" کیا گیا ہے۔" اُردو انسائیکلوپیڈیا" کے مطابق " ایک اور نسخے میں اس کے معنی زندگی کی پاک روح کے لکھے ہیں جو انجیل ۱۹۰۷ء میں رائج تھی، اس میں سترھویں آیت تھی ہی نہیں، یہ آیت بعد میں تشریح کے طور پر بڑھائی گئی۔"

مسلمان کہتے ہیں کہ فارقلیط کے معنی احمد کے ہیں، مسلمان مصنفین کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ الصف کی چھٹی آیت میں جس رسول کی خوشخبری دی گئی ہے اور جس کا نام احمد بتایا گیا تو وہ فارقلیط ہی ہے :-

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

(ترجمہ : اور جب عیسٰی ابن مریم نے کہا : "اے بنی اسرائیل، میں تمہاری طرف اللہ تعالےٰ کا رسول ہوں، اُس کی تصدیق کرتا ہوا جو میرے سامنے تورات سے ہے۔ اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوا، جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ اُن کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آیا تو انھوں نے کہا، یہ صریح جادو ہے)

اس آیت میں "احمد" اشارہ ہے نبی صلعم کی طرف۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے وہ شخص جس کی سب زیادہ تعریف کی گئی ہو یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ گویا حضرت عیسیٰؑ نے رسول اللہؐ کا صاف صاف نام لے کر آپؐ کی آمد کی بشارت دی تھی۔

انجیل یوحنا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیح کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے ایلیاہ اور تیسرے وہ "نبی"۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں :-

"اور یوحنا (حضرت یحییٰؑ) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تُو کون ہے تو اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا، بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا، پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تُو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا، پھر تُو کون ہے؟ .... اس نے کہا، میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔ انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تُو نہ مسیح ہے یا ایلیاہ، نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے۔"

(باب ۱، آیات ۱۹-۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیح اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اُس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا۔ یہ کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ "جس کی خبر تورات میں دی گئی ہے۔"

خلاصہ یہ کہ جس نبی کی طرف انجیل مقدس میں پیشین گوئی کی گئی، وہ رسولِ اکرمؐ ہی تھے۔ آپ ہی احمد ہیں یعنی فارقلیط۔ اس موضوع پر انتہائی مفصل اور فاضلانہ بحث سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "تفہیم القرآن" کی جلد پنجم میں "سورۂ صف" میں کی ہے۔ "فارقلیط" کے عنوان سے اُردو کے مشہور شاعر عبدالعزیز خالدؔ نے نہ صرف آنحضورؐ کی خدمت میں منظوم و طویل نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ فارقلیط سے متعلق مباحث اور تاریخی اسناد کو بھی شاملِ نظم کیا ہے۔

فاروقی، ملّا محمود

(۱۵۸۵ء - ۱۶۵۲ء) ملّا محمود بن محمد بن شاہ محمد جونپوری۔ ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور منطقی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد استاذ الملک محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفے کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انھیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیرِ اعلیٰ سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انھیں درباری علماء میں شامل کر لیا گیا اور [illegible] صدی کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ [illegible] شاہی دورہ کے موقع پر ملّا شاہ میر بدخشی نے انھیں سختی سے فہمائش کی کہ وہ دنیاداری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ملّا موصوف نے شاہی ملازمت سے علٰیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گاؤں واپس جا کر تدریس کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اور اس وقت کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو ان سے فلسفے اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انھیں ڈھاکہ بلا لیا۔

فلسفے اور علم البلاغت پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انھیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے منہ سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لینا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ سُنّی علماء و مصنفین کی اکثریت کے نظریات کے برعکس شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شمار قدیم شیعی فقہا میں کیا ہے۔ جونپور میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ملّا صاحب کی تصانیف یہ ہیں :-
(۱) الشمس البازغۃ (۲) الفرائد فی شرح الفوائد (۳) الفرائد المحمودیہ (۴) حاشیہ علی الآداب الباقیہ۔

فاروقیہ

خاندانِ فاروقی، نسبت حضرت عمر فاروقؓ سے ہے۔ [illegible] نے ہندوستان میں دریائے تاپتی اور دریائے نربدا کے مابین واقع خاندیش کی نیم خودمختار مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور ۱۶۰۱ء تک دو سو سال تک حکومت کی۔ [illegible] فاروقی خاندان کے باقی ماندہ بہت سے افراد کو گرفتار کر لیا۔ انھیں مغلوں کا وظیفہ خوار بننے پر مجبور کیا اور خاندیش کے علاقے کو داندیش نام کے ایک مغل صوبے میں تبدیل کر دیا۔

اس خاندان کا بانی ملک راجا احمد غالباً پہلے بہمنی سلطان علاؤ الدین بہمن شاہ اور اس کے جانشین محمد اوّل کے وزیرِ خارجہ جہاں کا بھتیجا تھا۔ فیروز تغلق نے [illegible] میں خدمات کے صلے میں راجا احمد کو اس کی درخواست پر [illegible] دیا تھا۔ وہ [illegible] میں وہاں گیا اور اس نے مقامی [illegible] کے بعد گرد و نواح کا مزید علاقہ زیرِ کاشت لے آیا۔ [illegible] راٹھور راجا کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر کے [illegible] گوندوانہ پر حملہ کر کے [illegible] کر لیے کہ تقریباً ۱۳۸۲ء کے بعد وہ حکومتِ دہلی سے خود مختار ہو [illegible] اور اپریل ۱۳۹۹ء میں فوت ہو گیا۔

اکبر کے عہد تک فاروقی خاندان کی خود مختاری کا [illegible] دہلی کے تعلقات اپنے پڑوس میں واقع مضبوط مسلم سلطنتوں [illegible] سلطنتِ بہمنیہ اور اس کی وارث ریاست احمد نگر سے کس نوعیت [illegible] رہتے ہیں۔ ان حکمرانوں نے فاروقیوں کو اپنے برابر کبھی تسلیم نہیں کیا۔ [illegible] اپنی بیٹی کی شادی سلطنتِ مالوہ کے بانی دلاور خان کے بیٹے ہوشنگ [illegible] تھی۔ آئندہ چل کر فاروقی خاندیش میں [illegible] کا جانشین نصیر خان [illegible] دوستی [illegible] کو ترک کر کے گجرات کی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ مالوہ کا حکمران ہوشنگ شاہ اسے گجرات کے سلطان احمد اوّل کے حملوں سے بچانے میں اپنی نااہلیت ثابت کر چکا تھا چونکہ نصیر خان کو بہمنیوں کے ساتھ تعلق سے جو امیدیں وابستہ تھیں، وہ موہوم ثابت ہوئیں۔ لہٰذا اس نے گجرات کے احمد شاہ کی رضا مندی سے ۱۴۳۵ء میں برار پر حملہ کر دیا لیکن دو مرتبہ بہمنی سپہ سالار ملک التجار کے ہاتھوں سخت شکست کھائی اور اس کا دارالحکومت برہانپور اس کی نظروں کے سامنے تاخت و تاراج ہو گیا۔ [illegible] ۱۴۳۷ء میں وفات پا گیا۔

نصیر خان کے دو فوری جانشینوں عادل خان اور مبارک خان نے کسی ظاہری تامل کے بغیر گجرات کی بالادستی قبول کرلی، لیکن عادل خان ثانی نے گوندوانہ اور جھارکنڈ کے راجاؤں اور کول اور بھیل جیسے رہزن قبیلوں کے خلاف حملوں میں کامیابی حاصل کرکے، مقررہ خراج کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی، یہاں تک کہ ۸۹۴ھ میں محمود بایقرا نے تاپتی کی طرف پیش قدمی کرکے اُسے اس تاخیر کی تلافی کرنے پر مجبور کیا۔

عادل خان ثانی کی وفات کے بعد خاندیش کی سیاسی حالت خاندانی رقابتوں کے باعث ابتر ہوگئی اور اس کی مضبوط تر ہمسایہ ریاستوں کو یہاں مداخلت کا موقع مل گیا۔ خاندیش میں محمد اول کے جانشین مبارک شاہ ثانی کے عہد میں مغلوں کے ساتھ فاروقیوں کا پہلا معرکہ ہوا۔ ۱۵۸۵ء سے یعنی جب اکبر شمال میں اپنی سلطنت کی توسیع کر چکا، جنوبی ہند میں مغلوں کا دباؤ خطرناک طور پر محسوس کیا جانے لگا۔ اور ۱۵۸۶ء میں عادل چہارم سے، جو فاروقی خاندان کا آخری حکمران تھا، مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس مغل فوج کو، جو احمد نگر میں مداخلت کے لیے مامور ہوئی تھی، راستہ دے اور اس کی مدد کرے۔ ۱۶۰۰ء میں عادل خان چہارم احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجوں کے خلاف آشتی کی لڑائی میں مغلوں کی مدد کرتے ہوئے مارا گیا۔ اور یوں فاروقی خاندان کی دو سو سالہ حکومت بھی ختم ہوگئی۔

موجودہ شواہد سے زیادہ تر فاروقیوں کی تاریخ کے اس حصے پر تو روشنی پڑتی ہے

فاس کی جامع مسجد کا اندرونی منظر

جو اُن کے بیرونی طاقتوں سے تعلقات کے متعلق ہے، لیکن ان کے اپنے ملازموں اور رعایا کے ساتھ معاملات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ کتب تصوّف سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروقیوں کے دارالحکومت برُہان پور میں صوفیا کا پسندیدہ قبرستان تھا اور فاروقیوں نے شیخ برہان الدین غریب کے مریدوں اور جانشینوں کو مدد معاش کے طور پر زمینیں دے رکھی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ برہان الدین غریب نے اس جگہ برُہان پور کی تاسیس اور اس میں فاروقیوں کی حکومت کے قیام کی پیش گوئی کی تھی۔

خود مختار فاروقی حکمران خاندان کا قیام، جن کا ملک آبادی اور وسائل کے اعتبار سے اپنے ہمسایوں کے مقابلے میں کمزور تھا، نیز فاروقیوں کی بقا، کسی حد تک خاندیش کے جغرافیائی محلِ وقوع ہی کے باعث ہو سکی، کیونکہ ان کے علاقے کے جو تاپتی اور دریائے نربدا کے درمیان ہے، ایک سرحدی ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ اور مشرق میں وہ گونڈوانہ کے دشوار گزار خطے کے باعث محفوظ تھی۔ جب تک مالوہ، گجرات اور بہمنی سلطنت اور بعد ازاں احمد نگر کے مابین طاقت کا توازن برقرار رہا، خاندیش کو گجرات کے ساتھ ایک معمولی سے رابطے کے علاوہ پوری آزادی تھی۔ بہادر شاہ گجراتی کی وفات کے بعد گجرات میں افراتفری اور انتشار پھیلا۔ باز بہادر کے زمانے میں مالوے پر مغلوں نے قبضہ کر لیا اور بیجاپور اور گولکنڈہ سے مخاصمت میں احمد نگر کے روز افزوں الجھاؤ کے سبب طاقت کا وہ توازن بگڑ گیا جس پر فاروقیوں کی خود مختاری کا انحصار تھا۔ اسی دوران میں ان کی غلط حکمتِ عملی نے اس خاندان کے لیے مغل نظامِ حکومت کے اندر ایک باعزت، نیم خود مختار حیثیت کے امکان کو بھی ختم کر دیا جو اکبر راجپوت سرداروں کو دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

فاس

فاس۔ مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا ایک مقامِ سکونت۔ آبادی دو لاکھ سے زائد۔ محلِ وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے: فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر)۔

فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دارالمخزن ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دارالمخزن، ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت مراکش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ وزرا کے دفاتر اور کوشکِ سلطانی بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان اپنے کنبے کے ساتھ سکونت رکھتا ہے اور جو اپنی سبز رنگ کے ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کوشک، شاہی چڑیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔ متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مسجدِ جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔

فاس الجدید، دراصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دریائے فاس کی تنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مکانات، مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلوان چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو اس فصیل تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پشتوں پر بنائی گئی ہے۔

فاس صرف اپنے محلِ وقوع کی خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصیٰ میں ممتاز و معروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور انھوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں

جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

فاسد و باطل

فاسد و باطل: اصولِ فقہ کی اصطلاح میں فاسد و باطل صحیح کی ضد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ فساد و بطلان، عبادات اور معاملات ہر دو میں جاری ہوتا ہے۔ جب کوئی عبادت یا معاملہ ارکان اور شرائط کے ساتھ مکمل ہو جائے، تو اس پر صحیح عبادت یا صحیح معاملے کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن جب کوئی رکن مفقود ہو جائے، تو اس پر باطل کا اطلاق ہوتا ہے اور جب شرط مفقود ہو تو اُسے فاسد کہا جائے گا۔ فاسد، قابلِ اصلاح ہے، جبکہ باطل قابلِ اصلاح نہیں ہوتا، کیونکہ باطل میں رُکن مفقود ہوتا ہے اور فاسد میں کوئی شرط ناقص ہوتی ہے۔ اگر یہ شرط صحیح طور پر پوری کر دی جائے تو عبادت اور معاملہ دونوں صحیح قرار پا سکتے ہیں۔

فاسق

فاسق: لغت میں کھجور کا پک کر چھلکے سے نکلنا فسق کہلاتا ہے، لیکن شریعت میں فسق کا مطلب ہے۔ حدِ شرع سے نکلنا۔ کافر کو بھی اس بنا پر فاسق کہہ سکتے ہیں کہ شرع کو بھی نہیں مانتا اور عقل اور فطرت کے تقاضوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مومن کو فاسق کی ضد بھی کہا گیا ہے، لیکن زیادہ قطعی طور پر فاسق کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے، جس نے مسلمانوں کی حیثیت سے شرع کو تسلیم تو کیا، لیکن اس سے گناہ صغیرہ یا کبیرہ سرزد ہوئے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک اگر کسی کے دل میں تصدیق موجود رہے، لیکن ضعفِ ایمان کی وجہ سے عمل میں کوتاہ رہے اور فرائض کا تارک اور کبائر کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسے شخص کو فاسق کہتے ہیں۔ یوں منافق اصلی فاسق سے بدتر ہوتا ہے کیونکہ وہ تصدیقِ قلبی بھی نہیں کرتا اور صرف ظاہرداری کرتا ہے۔ لیکن اگر فاسق تصدیق میں بھی کمزور ہے تو یہ بھی منافق کی صف میں شامل ہوگی۔

معتزلہ کے خیال میں مومن وہ ہے، جو دل سے ایمان کی تصدیق کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور اعضا و جوارح سے احکام شریعت بجا لائے۔ جو مسلمان تیسری شرط کو پورا نہیں کرتا، وہ حقیقی طور پر مومن نہیں ہو سکتا اور نہ عذاب آخرت سے بچ سکتا ہے۔

علم کلام کے بیشتر مصنفین بھول چوک کے صغیرہ گناہ کے مرتکب کو فاسق نہیں سمجھتے۔ اب کسے فاسق کہا جائے، تو یہ مسئلہ علم کلام کے اہم مباحث سے تعلق رکھتا ہے جو اصلاً جنگِ صفین میں نمایاں طور پر سامنے آئی۔ جب خلیفہ کے رویے پر بہت سے اعتراضات و سوالات اٹھائے گئے تو معلوم ہوا کہ مسئلہ تحکیم پر دو و متضاد نظریے پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں ایک خوارج کا گروہ تھا۔ یہ گروہ توبہ نہ کرنے والے کو فاسق اور اُسے خلود فی النار کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ فسق کے ارتکاب سے امام، امامت کا منصب کھو دیتا ہے۔ دوسرا بڑا گروہ شیعہ کا تھا، جس کے نزدیک امام برحق معصوم ہوتا ہے۔ واصل بن عطاء کے خیال میں فاسق نہ تو مکمل مومن ہوتا ہے اور نہ مطلق کافر، بلکہ اس کا مقام دونوں کے درمیان ہوتا ہے۔ پس دنیا میں وہ امت کے قوانین کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، لیکن اگر وہ توبہ نہیں کرتا، تو آخرت میں دوزخ کے ابدی عذاب کی سزا دی جائے گی اگرچہ یہ سزا کافر کی سزا سے ہلکی ہوگی۔

فاطر

فاطر: بلفظِ معنی، مُوجِد یا کسی چیز کی ابتدا کرنے والا، جبکہ اس چیز کا پہلے وجود یا اصل بالکل موجود نہ ہو۔ فاطر اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی ایک مکی

سورت کا نام۔ عددِ تلاوت ۳۵۔ عدد نزول ۴۳۔ اس کا دوسرا نام سورہ الملائکہ ہے لیکن فاطر زیادہ مشہور رہے۔ یہ صورت قرآن مجید کی اُن سورتوں میں سے آخری سورت ہے، جن کا آغاز "الحمد للّٰہ۔" سے ہوتا ہے۔

فاضل احمد رضا خان

(۱۰ رشوال ۱۲۷۲ھ/۱۴ رجون ۱۸۵۶ء۔ ۲۵ رصفر ۱۳۴۰ھ/۲۸ راکتوبر ۱۹۲۱ء) اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی قادری بن مولانا نقی علی خاں بن مولانا رضا علی خاں بن مولانا حافظ کاظم علی خاں بن مولانا شاہ محمد اعظم خاں، ہندوستان کے بہت بڑے عالم دین متبحر فاضل، بلند پایہ صوفی اور شاعر تھے۔ بریلی (اتر پردیش) کے محلہ جسولی میں پیدا ہوئے۔ محمد نام رکھا گیا۔ تاریخی نام المختار (۱۲۷۲ھ) تجویز ہوا۔ دادا نے احمد رضا نام رکھا، جس میں خود مولانا نے عبدالمصطفیٰ کا اضافہ کیا۔ ان کے معتقدین انہیں اعلیٰ حضرت اور "فاضل بریلوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مولانا کا خاندان افغانستان کے قبیلہ بڑیچ سے تعلق رکھتا تھا، جو کئی پشتوں تک حکومت مغلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ مولانا محمد اعظم خاں امور سلطنت سے علیحدہ ہو کر بریلی تشریف لائے اور وہیں اقامت اختیار کی۔ مولانا شاہ رضا علی اپنے دور کے بے مثل عالم اور ولی کامل تھے۔ اسی مذہبی فضا اور پر تقدس ماحول میں اعلیٰ حضرت نے چار پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا۔ اردو فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد میزان منشعب وغیرہ کی تعلیم جناب مرزا غلام قادر بیگ سے حاصل کی، پھر تمام دینیات کی تعلیم اپنے والد ماجد سے مکمل کی۔ ۱۴ رشعبان ۱۲۸۶ھ/۱۹ رنومبر ۱۸۶۹ء میں تمام علوم دینیہ و عقلیہ مثلاً اصول، کلام، تاریخ جغرافیہ، ریاضی، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی سند حاصل کر کے منصب افتاء پر فائز ہوئے۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۷ء میں حضرت شاہ آل رسول مارہروی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، علویہ وغیرہ میں دوسرے مشائخ سے اجازت حاصل کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے شیخ احمد بن زینی، شیخ عبدالرحمان مکی، دحلان مکی، شیخ حسین بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسین احمد النوری سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نے بعض علوم میں معاصرین علماء سے اور بعض میں ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے کمال پیدا کیا۔ خصوصاً علم ریاضی اور علم نجوم و ہیئت میں ذاتی مطالعے سے دسترس حاصل کی۔

۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ قیام مکہ کے دوران میں شافعی عالم شیخ حسین بن صالح ان سے بے حد متاثر ہوئے اور تحسین و تکریم کی۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی کتاب "الجوہرہ" کی شرح صرف دو روز میں "النیرۃ الرضیہ فی النیرہ الوضیہ" کے نام سے لکھ دی۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء میں دوبارہ زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے۔ اس بار وہاں کے علماء کے لیے نوٹ کے ایک مسئلے کا حل "کفل الفقیہ" کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس کے علاوہ ایک اور تالیف "الدولہ المکیہ" بھی لکھی۔ اس میں مسئلہ غیب پر محققانہ بحث ہے۔ انہی تصانیف کی بنا پر بعض علمائے حرمین نے آپ کو "مجدد امت" لکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے تمام عمر فتویٰ نویسی، فقہ، نعت گوئی اور علم ریاضی میں تصنیف و تالیف پر صرف کی۔ آپ کی عمر کے آخری دور میں سیاست نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا تھا۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ عین اسی وقت گاندھی جی نے مسلم ہندو اتحاد کا راگ الاپنا شروع کیا اور ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں تحریک ترکِ موالات کا آغاز کر دیا۔ یہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔ جس نے بروقت مسلمانوں کو ہندو چال سے آگاہ کیا اور اتحاد کے مضرات سے آگاہ کیا۔ بعد کے حالات نے اس بات کا ثبوت مہیا کر دیا کہ ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ دو قومیں بستی ہیں آپ کے معتقدین نے جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ اس کا دوسرا نام جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ رکھا گیا۔ جماعت رضائے مصطفیٰ کے اراکین نے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف دن رات کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بانی نعیم الدین مرادآبادی تھے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی نے بریلی شریف میں "جامعہ منظر الاسلام" کی بنا ڈالی تھی۔ جہاں سے آپ کے خلفاء تربیت پا کر جاتے تھے۔ آپ کے خلفاء دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ صرف حرمین میں آپ کے خلفاء کی تعداد تیس تھی۔ ان میں سید عبدالحی، شیخ حسین جمال مکی، شیخ صالح کمال مکی، سید اسماعیل خلیل مکی، سید مصطفیٰ خلیل مکی، ضیاء الدین احمد مدنی وغیرہ پاک و ہند میں حامد رضا خاں، سید محمد عبدالسلام مولانا محمد ظفر الدین بہاری، محمد امجد علی اعظمی، سید نعیم الدین مرادآبادی، سید احمد اشرف گیلانی، محمد دیدار علی الوری، مولانا مفتی غلام جان ہزاروی، مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری مولانا عبدالعلیم میرٹھی وغیرہ اہم ہیں۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا حسن رضا خاں، مولانا حامد رضا خاں، مولانا محمد رضا خاں، مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا عبدالرشید عظیم آبادی، مولانا شاہ غلام محمد بہاری، مولانا ظفر الدین بہاری، مولوی امجد علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے دو فرزند تھے، حامد رضا خاں اور مصطفیٰ رضا خاں۔ آپ کا مزار بریلی شریف کے محلہ سوداگران میں "دارالعلوم منظر الاسلام" کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ جہاں ہر سال ۲۴، ۲۵ رصفر کو عرس منعقد ہوتا ہے۔

مولانا نے پچاس سے زائد علوم و فنون میں تقریباً ایک ہزار کتابیں لکھیں۔ "تذکرہ علمائے ہند" میں ان کی تصانیف کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان میں سے "فتاویٰ رضویہ" بارہ ضخیم جلدوں میں، "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" قرآن کریم کا سلیس اور رواں ترجمہ اور "جد الممتار" علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب "رد المحتار" کا پانچ مبسوط جلدوں میں عربی حاشیہ نہایت اہم ہیں۔

اعلیٰ حضرت بچپن ہی سے تقویٰ، طہارت، اتباع سنت، پاکیزہ اخلاق اور حسن سیرت کے اوصاف سے مزین ہو چکے تھے۔ صرف تیرہ چودہ برس کی عمر میں آپ جلیل الشان عالم عظیم المرتبت فاضل ہو گئے اور پھر چون برس تک مسلسل دینی اور علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے سب کام حب الٰہی کے ماتحت تھے۔ نہ کسی کی تعریف کرتے، نہ کسی کی ملامت کا خوف کھاتے۔ آپ کے خادم کا بیان ہے کہ اعلیٰ حضرت چوبیس گھنٹے میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے آرام فرماتے اور باقی تمام وقت تصنیف و کتب بینی اور دیگر خدماتِ دینیہ میں صرف فرماتے۔ علامہ اقبال آپ کے ہم عصر تھے اور آپ کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ ان کے فتاویٰ، ان کی ذہانت، فطانت، کمال فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں۔ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں اپنے دور کے امام ابوحنیفہ ہوتے۔

علوم دینیہ کے فاضل ہونے کے ساتھ شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے لیکن ان کا ذوق سلیم حمد و ثنا، اور نعت و منقبت کے علاوہ اور کسی صنفِ سخن کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ان کے کلام میں عالمانہ وقار ہے۔ قرآن و حدیث کی ترجمان ہے۔ سوز و ساز اور کیف و سرور

ہے۔ آپ کے مشہور زمانہ سلام کی گونج پاک و ہند کے کسی بھی گوشے سے سنی جا سکتی ہے

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ان کے بعض مخالفین کا یہ خیال ہے کہ احمد رضا خاں نے دینِ اسلام میں کسی نئے فرقے کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ بات کسی بھی طور حقیقت پر مبنی نہیں۔ انھوں نے صرف مسالک اربعہ کے تحفظ کی کوشش کی تھی۔ البتہ یہ درست ہے کہ علماء کی اس جماعت کو عرف عام میں رضا خاں بریلوی سے عقیدت کی بنا پر بریلوی کہا جاتا ہے اور دوسروں سے بعض مسائل میں اختلاف کی بنا پر ان کا الگ تشخص قائم ہو گیا ہے۔ انہوں نے تحفظ اقدارِ اسلامیہ کے لیے بریلی سے جو تحریک شروع کی، اسے بریلوی تحریک کا نام دیا گیا ہے۔ (نیز دیکھیے۔ "بریلوی تحریک")

فاضل الدین قادری

: سید ابوالفرح محمد، المعروف بہ قطب معظم، پنجاب میں سلسلۂ قادریہ فاضلیہ کے بانی، گیلانی سادات میں سے تھے۔ انہوں نے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں روحانیت کی شمع روشن کی اور سلسلہ قادریہ کی اشاعت کابل و بخارا کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں بھی کی۔ ان کے اجداد کئی پشت سے برصغیر کی اسلامی حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے بٹالے میں انہوں نے علوم دینی کے لیے ایک وسیع مدرسہ قائم کیا، جہاں سے بڑے بڑے عالم فارغ التحصیل ہوئے اور متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ بے شمار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔ انہوں نے ۷، ذوالحج ۱۱۵۱ھ کو بٹالہ میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار ہے۔ اُن کی ایک تصنیف "بیان الاسرار" پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

فاطمہؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی لڑکی تھیں۔ ان سے آنحضرتؐ کو بہت الفت تھی۔ ان کی پیدائش بقول ابن جوزی نبوت سے پانچ برس پہلے ہوئی اور نکاح پندرہ برس پانچ مہینے کی عمر میں حضرت علیؓ سے غزوہ اُحد کے بعد ہوا۔

فاطمہ انھیں اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ قیامت کے دن ان کو اور ان کی اولاد کو آتش دوزخ سے یکسور رکھے گا۔ مدارج النبوۃ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کا دستور تھا کہ جب فاطمہؓ آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ پکڑ کر جبیں مبارک پر بوسہ دیتے اور اپنے مقام پر بٹھلاتے۔ اور اسی طرح جب کبھی آنحضرتؐ فاطمہؓ کے پاس تشریف لاتے تو یہ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں اور استقبال کر کے آنجناب کا ہاتھ پکڑ لیتیں اور اپنی جگہ بٹھاتیں۔ زاکیہ، راضیہ اور بتول حضرت سیدہ کے القاب سے ہیں اور وجہ تلقیب بہ بتول یہ ہے کہ بتل بمعنے قطع ہے۔ سو حضرت سیدہ فضل و کمال و حسن و جمال میں عورات عالم سے منقطع تھیں اور بہ سبب بہجت اور نورانیت دینیہ کے زہرا کہلاتی تھیں۔ آپ کو بتول اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ آپ دنیا سے بکلی منقطع تھیں

ان کے نکاح کا حال یوں ہے کہ جب یہ جوان ہوئیں تو اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اور بعدہٗ عمر فاروقؓ نے نکاح کی خواہش حضرت سیدہ سے ظاہر کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ تب حضرت علیؓ نے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا کہ مرحبًا و اہلاً۔ بعد ازاں حضرتؐ نے فاطمہؓ سے ذکر کیا۔ وہ خاموش ہو رہیں۔ پھر آپؐ نے حضرت علی سے فرمایا کہ تیرے پاس کچھ ہے۔ انھوں نے عرض کی کہ ہاں گھوڑا اور زرہ ہے۔ فرمایا۔ گھوڑا جہاد کے لیے ضروری ہے۔ زرہ کو بیچو۔ انھوں نے ۴۸۰ درہم کے عوض زرہ بیچی۔ حضرت عثمان نے خرید کر قیمت ادا کر کے زرہ بھی واپس کر دی۔ آنحضرتؐ نے دراہم لے کر اپنے پاس رکھے۔ پھر آنجنابؐ نے ایک مٹھی دراہم لے کر بلال کو دیے اور فرمایا کہ اس کی خوشبو لے آؤ۔ اور اہل بیت سے ارشاد کیا کہ فاطمہ کا سامان تیار کرو۔ چنانچہ ایک چارپائی بنائی گئی اور ایک توشک چمڑے کی تیار ہوئی۔ جس میں درخت خرمے کا پوست بھرا گیا۔ امام احمد نے روایت کیا ہے کہ ایک کملی مخطط اور ایک مشک اور ایک تکیہ چرمی بھی جہیز میں تھا۔ غرض کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے نکاح کر دیا۔ اور چار سو مثقال چاندی مہر قرار دیا۔

بروایت صحیحہ ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے تاحیات سیدہ دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔ ایک مرتبہ حارث ابن ہشام برادر ابوجہل نے علی مرتضیٰ سے درخواست کی کہ تم مسماۃ عوراء بنت ابی جہل سے نکاح کرو۔ یہ حال سن کر حضرت سیدہؓ نے حضرت صلعم سے شکایت کی۔ تب حضرتؐ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا خبردار ہو کہ بنی ہشام بن مغیرہ کی اولاد مجھ سے اس کی اجازت مانگتی ہے کہ اپنی بیٹی کو علی مرتضیٰ ابن ابی طالب سے نکاح کریں۔ سو میں ان کو اجازت نہیں دیتا۔ مگر یہ کہ ابوطالب کا بیٹا یہ چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔

حضرت فاطمہؓ کی عمر اٹھائیس برس کی، اور ایک روایت میں انتیس برس کی ہوئی۔ اور وفات بروز سہ شنبہ بتاریخ سوم رمضان ۱۱ھ میں واقع ہوئی اور قبر شریف بروایت صحیحہ جنت البقیع میں ہے۔

ان کا شمار اُن چار خدا پرست خاتونوں میں ہے جو دنیا بھر کی خواتین سے عالیجاہ ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) آسیہ۔ زوجۂ فرعون
(۲) مریمؑ اُمّ عیسیٰ علیہ السلام
(۳) خدیجۃ الکبریٰؓ
(۴) فاطمۃ الزہراءؓ

آنحضرت صلعم کو فاطمہ اپنی تمام صاحبزادیوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ آپؐ نے وفات سے پیشتر حضرت فاطمہؓ کو بشارت دی تھی کہ میری وفات کے بعد سب سے پہلے مجھ سے تم ملوگی۔ اس خوش خبری سے حضرت فاطمہؓ کو خوشی ہوئی اور آپ کی زبان مبارک سے آپ کے قرب انتقال کی خبر سن کر ان کو جو صدمہ ہوا تھا اس کی بہت کچھ تلافی ہو گئی۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات سے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت فاطمہؓ نے انتقال کیا ان کی زندگی میں حضرت علیؓ نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ ان کو شرعًا اس کی اجازت تھی۔

فاطمہؓ بنت اسد

، نام فاطمہؓ، اسد بن ہاشم کی دختر اور رسول کریمؐ کے جدامجد جناب عبدالمطلب کی بھتیجی تھیں۔ آپ کا نکاح عبدالمطلب کے فرزند ابوطالب سے ہوا، جن سے حضرت علیؓ پیدا ہوئے۔ آپ حضرت علیؓ کی والدہ اور اس نسبت سے حضرت فاطمۃ الزہرا کی خوشدامن تھیں۔ اگرچہ آپ کے شوہر ایمان نہیں لائے تھے، لیکن خود آپ اور آپ کی بعض اولاد نے اسلام قبول کیا۔ جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی، تو آپ بھی اُن کے ہمراہ تشریف لے گئیں۔ ان کی وفات رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔

فاطمہؓ بنت خطاب

، فاطمہ نام۔ اُمّ جمیل کنیت۔ حضرت عمر فاروقؓ

کی ہمشیرہ تھیں، جن کا نام نامی اس جلیل القدر شخصیت کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی وجہ سے مشہور اور امر ہوگیا ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ایک روز حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہے تھے کہ انہیں راستے میں نعیم بن عبداللہ نے ٹوکا کہ پہلے گھر کی خبر تو لو۔ تمہاری اپنی ہمشیرہ اور بہنوئی مسلمان ہوگئے ہیں فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن مجید پڑھ رہی تھیں۔ آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بولے، "سنا ہے کہ تم مرتد ہوگئی ہو" یہ کہہ کر بہنوئی سے دست وگریباں ہوگئے پھر ہمشیرہ کو بھی لہولہان کیا۔ اس کے باوجود وہ دونوں کہنے لگے: "عمر! جو جی چاہے کر گزرو۔ ہم اسلام کا دامن نہیں چھوڑ سکتے"۔ ان الفاظ نے عمرؓ کے دل پر بہت اثر کیا اور قرآن سن کر رقت طاری ہوگئی۔ بولے مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ اور یوں عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کیا۔

حضرت فاطمہؓ بنت خطاب کا نکاح حضرت سعیدؓ بن زید سے ہوا اور انہیں کے ساتھ مسلمان ہوئیں۔ آپ کا سن وفات معلوم نہیں۔ آپ کے ہاں ایک لڑکا بھی تولد ہوا، جو بچپن ہی میں فوت ہوگیا۔

فاطمہؓ بنت قیس

فاطمہؓ بنت قیس: رسول اکرمؐ کی صحابیات میں تھیں اور قبیلہ بن کنانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لائیں اور ہجرت اختیار کی۔ پہلا نکاح ابوعمرو حفص بن مغیرہ سے ہوا۔ ۱۰ھ میں ابوعمرو نے طلاق دے دی۔ عدت کی میعاد پوری ہونے کے بعد امیر معاویہؓ، ابوجہمؓ اور اسامہؓ بن زید نے نکاح کا پیغام بھیجا، چنانچہ آنحضورؐ کے ایما پر اسامہؓ سے نکاح کرلیا۔ ۵۴ھ میں اسامہؓ کے انتقال کے بعد پھر شادی نہیں کی اور اپنے بھائی ضحاک کے ساتھ رہیں۔ ۲۴ھ میں جب حضرت عمرؓ نے انتقال فرمایا، تو مجلس شوریٰ کا اجلاس حضرت فاطمہؓ ہی کے مکان پر ہوتا تھا۔ فاطمہؓ بنت قیس بڑی عقلمند اور حسین وجمیل تھیں۔ فاطمہؓ نے آنحضورؐ سے چند احادیث روایت کی ہیں، جو متعدد شخصیتوں کے ذریعے سے مروی ہیں۔ وفات کا سال معلوم نہیں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہیں (اُردو انسائیکلو پیڈیا)

فاطمی خاندان

فاطمی خاندان: ایک حکمران خاندان جس نے شمالی افریقہ اور بعدازاں مصر میں ۹۰۹ء سے ۱۱۷۱ء تک حکومت کی۔ اس خاندان کا نام حضرت فاطمہؓ کے رسم گرامی سے منسوب ہے، کیونکہ خلفائے بنو فاطمہ اپنا نسب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ تک پہنچاتے تھے۔

بنو فاطمہ اپنا سلسلۂ نسب اسماعیل بن جعفر الصادقؓ سے ملاتے ہیں، لیکن انہوں نے کچھ عرصے تک اعلانیہ اور باضابطہ طور پر اپنے نسب نامے کے بارے میں اعلان نہیں کیا اور چونکہ غائب اماموں کے زمانے کے دوران محمد بن اسماعیل اور عبیداللہ المہدی کے درمیان آنے والے تمام اماموں کے نام دانستہ طور پر اخفا میں رکھے گئے تھے اس لیے مختلف انساب رائج ہوگئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی بنو فاطمہ کی اصل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ فاطمیوں کے حریفوں نے اُن کے علوی النسب ہونے سے انکار کیا اور اعلان کیا کہ وہ مدعیان کاذب ہیں۔

اسماعیلی ماخذ میں عبیداللہ سے قبل کے آئمہ کا سلسلہ ہر جگہ یکساں نہیں ملتا اور نہ ان کے ناموں کے بارے میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ بہرصورت بنو عباس نے قدرتی طور پر بنو فاطمہ کے اس سلسلۂ نسب کی شد ومد سے مخالفت کی، کیونکہ اس کی بدولت فاطمیوں کے اثر اور وقار میں بے حد اضافہ ہوا تھا۔ فاطمی خاندان نے طاہری، صفاری اور طولونی وغیرہ حکومتوں کے برعکس اپنے آپ کو خلافت بغداد کی سیادت سے بالکل آزاد کرکے دولت عباسیہ کی مدمقابل بن گئی۔

اہل بیت میں مختلف اماموں کے پیرو فرقوں میں سے ایک فرقہ باطنیہ اسماعیلی تھا جو امام جعفر صادق کے بعد ان کے صاحبزادے اسماعیل کی امامت کو تسلیم کرتا تھا۔ اسی سے عبیدی فرقہ ظہور میں آیا، جو عبیداللہ المہدی بن محمد بن جعفر مصدق بن محمد مکتوم بن جعفر صادق کو امام مانتا تھا۔ اس فرقے کے مبلغین نے یمن، حجاز، بحرین وغیرہ میں اپنی دعوت کی اشاعت کی، لیکن مغرب میں محمد الحبیب کے زمانے میں اس کا آغاز اور عبیداللہ کے ہاتھوں میں تکمیل ہوئی۔ عبیداللہ مہدی نے فاطمی حکومت کے قیام کے بعد سسلی سے مصر تک دولت فاطمیہ کا پرچم لہرانے کی کوشش کی، چنانچہ ۹۱۳ء میں ان کے بیٹے ابوالقاسم نے مصر پر چڑھائی کرکے برقہ، فیوم اور سکندریہ کو زیرنگیں کیا، لیکن عباسی امیر مونس نے انہیں واپس لے لیا اور مہدی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ فاطمی خاندان کے بعض قابل ذکر حکمران یہ ہیں۔

حکمران	دور
عبیداللہ مہدی	۹۰۹ء تا ۹۳۴ء
القائم، ابوقاسم	۹۳۴ء تا ۹۴۶ء
المنصور، ابوطاہر اسماعیل	۹۴۶ء تا ۹۷۵ء
المعز، ابوتمیم صالح	۹۵۳ء تا ۹۷۵ء
العزیز، ابومنصور	۹۷۵ء تا ۹۹۶ء
الحاکم، ابوعلی منصور	۹۹۶ء تا ۱۰۲۱ء
الظاہر، ابوالحسن	۱۰۲۱ء تا ۱۰۳۶ء
المستنصر، ابوتمیم	۱۰۳۶ء تا ۱۰۹۴ء
المستعلی، ابوالقاسم	۱۰۹۴ء تا ۱۱۰۱ء
الآمر، ابوعلی منصور	۱۱۰۱ء تا ۱۱۳۰ء
الحافظ، ابوالمیمون	۱۱۳۰ء تا ۱۱۴۹ء
الظافر، ابوالمنصور	۱۱۴۹ء تا ۱۱۵۴ء
الفائز، ابوالقاسم	۱۱۵۴ء تا ۱۱۶۰ء
العاضد، ابومحمد	۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۱ء

بنو فاطمہ کا نظم ونسق ایک مضبوط مرکزی نظام پر قائم تھا، جس کا حاکم اعلیٰ خلیفہ ہوتا تھا یا اُس کا وزیر جس کی حیثیت یا تو ایک تعمیل کنندہ کی ہوتی تھی یا اسے خلیفۂ وقت کی طرف سے اختیارات تفویض ہوتے تھے۔ ہر شعبہ مرکزی انتظامیہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ صوبائی حکومت کو صحیح معنوں میں حقوق خود مختاری حاصل نہ تھے۔

عہد بنو فاطمہ میں معاشی سرگرمی خاص تیز ہوگئی تھی۔ شہری زندگی کی ترقی کی بدولت شمالی افریقہ میں عبیداللہ المہدی کو خوشحالی اور آسودگی نظر آئی تھی۔ اس خوشحالی کے باعث ابتدائی فاطمی خلفا کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے انتظامی اور مالی نظام کے استحکام، زیادہ محاصل اور واجب الادا رقوم حکومت کی کانوں سے آمدنی، تجارت اور محصول درآمد کی یافت اور جنوبی سوڈان کی کانوں سے بڑی مقدار میں سونے کی برآمد کی بدولت عہد بنو فاطمہ میں شورشوں، بغاوتوں اور فسادات کے باوجود، مصر عام طور سے بڑی خوشحالی سے بہرہ ور رہا۔ صنعت وحرفت کو بھی ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں اولیت پارچہ بافی کو حاصل تھی۔ قاہرہ میں مختلف قسم کے ریشمی کپڑے تیار کیے جاتے تھے، جن کے الگ الگ نام تھے دوسری صنعتوں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔ لکڑی کی صنعت، شیشہ سازی، سفال سازی، کوزہ گری، پچی کاری دھاتوں کا کام، ہاتھی دانت کا کام کاغذ سازی، چینی اور تیل تیار کرنا۔ بنو فاطمہ کے دور میں ذہنی، ادبی اور فنی سرگرمیوں کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ شمالی افریقہ میں درباری شاعروں نے بڑی قدر ومنزلت پائی۔ خلیفہ المنصور اور المعز ان سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ مصر میں ثقافتی سرگرمیاں اس سے بھی زیادہ زوروں پر تھیں۔ خلفاء کو خود بھی شعر و

سخن سے شغف تھا اور ان کے دربار میں غیر اسماعیلی شعراء تک کا بھی خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

عہد بنو فاطمہ میں عروج و عظمت کے کئی ادوار آئے۔ یہ عظمت اس خاندان کو اداری اور مالی تنظیم اس کی معاشی ترقی اور اعلیٰ درجے کی فکری و فنی سرگرمی، دربار و قیصر خلافت کی شان و شوکت اور اس کی پورے آداب و رسوم کے ساتھ منعقد ہونے والی پُرتکلف ضیافتوں کی بدولت نصیب ہوئی، جنہیں دیکھ کر معاً دربار قسطنطنیہ سے مقابلے کا خیال پیدا ہوتا تھا اور بغداد کے بارے میں ماضی کی تمام باتیں محض افسانہ معلوم ہونے لگتی تھیں۔ بایں ہمہ بنو فاطمہ پر ایسے دور بھی آئے، جو قحط و مصائب اور فوجی گروہوں کے درمیان خونریز لڑائی جھگڑوں سے عبارت ہے اور جب متخالف وزرا باہمی سازشوں کے باعث غیر ملکی طاقتوں کو مداخلت کی دعوت دینے لگے تو بالآخر اُسے ایک المناک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تاریخ متضاد باتوں سے معمور ہے۔ مورخ کو اس کے عروج اور زوال دونوں سے بڑا دلکش مواد ملتا ہے، جس کی بنا پر اس خاندان کو تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ (دائرہ المعارف)

فال

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ شگون کوئی چیز نہیں، اور اچھا شگون فال نیک ہے۔ لوگوں نے عرض کیا فال کیا ہے۔ نیک کلمہ ہے جو تم میں سے کوئی سنے۔

مطلب یہ ہے کہ بُرے شگون کی کوئی اصلیت نہیں جیسے کہ ایام جاہلیت میں عام لوگ اور آجکل بھی بعض جُہلا بعض پرندوں کی اڑان سے نحوست و سعادت کے آثار قرار دے لیتے ہیں۔ اور ان کے مقاصد میں اس استلزام بالا میں سے کئی قسم کی رکاوٹیں واقع ہوتی ہیں۔ شریعت نے اس سے قطعی ممانعت کی ہے اور حکم دیا ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں۔

جائز قسم کی فال یہ ہے کہ مثلاً کوئی بیمار ہے اور ایک طرف کسی نے عبدالسلام کا نام پکارا تو سلام کے لفظ سے نیک فال لے کر کہہ سکتے ہیں کہ اللہ اس بیمار کو سلامت رکھے گا۔ اور مثلاً کوئی شخص طلب رزق کی فکر میں جا رہا ہے۔ راستہ میں کسی کے منہ سے سُنا کہ خدا رازق ہے تو اس سے وہ فال لے سکتا ہے کہ خدا مجھے کامیاب کرے گا۔

انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ جب کسی کام کے لیے نکلتے تو آپ کو "اے راشد" (سیدھی راہ پہ چلنے والے) "اے نجیح" (کامیاب) ایسی قسم کی مبارک آوازیں) سننا بہت پسند ہوتا تھا۔

فتاح

اسماء حسنہ سے ہے مشکل کشا۔ یا بندوں میں حکم کرنے والا۔ فتح سے مشتق ہے۔ جس کے معنے کھولنے اور حکم کرنے کے ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحمت کے دروازے کھولتا ہے اور وہ خلائق میں حاکم علی الاطلاق ہے۔

قرآن مجید میں یہ اسم بعینہ موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو کہ ہمارا پروردگار (قیامت کے دن، ہم (دونوں فریقوں) کو (ایک جگہ) جمع کرے گا۔ پھر ہم میں (تم میں) انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے گا۔ اور وہ بڑا ٹھیک فیصلہ کرنے والا اور (سب کے حال سے) واقف ہے۔ (س۔ سبا۔ ع ۲)

فتح

قرآن مجید کی ایک سورۃ کا نام ہے جس میں جنگِ حدیبیہ کی صلح کو اللہ تعالےٰ نے عین فتح قرار دے کر آنحضرت صلعم کو خوشخبری دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ہم نے حکم لگا دیا تیرے لیے فتح غالب کا۔ (س۔ فتح ع ۱)

ابن جریر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہجرت کے چھٹے سال نبی اکرمؐ عمرہ کرنے مکہ چلے اور مشرکوں نے بمقام حدیبیہ آپؐ کو روک دیا اور اس بات پر فیصلہ ٹھہرا کہ اگلے سال آپ عمرہ کریں اور آنحضرتؐ نے وہیں اپنی قربانی ذبح کر دی۔ اس سے صحابہ کی ایک جماعت کو رنج تھا جن میں عمر بن الخطابؓ بھی تھے۔ پھر جب قربانی کر کے مدینے کو واپس چلے تب یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی جس میں اُن شکستہ دل مسلمانوں کو مژدہ ہے کہ یہ صلح تمہارے لیے فتح و ظفر ہے چنانچہ بخاری نے براءؓ سے نقل کیا ہے کہ اے لوگو! تم مکہ فتح ہو جانے کو فتح سمجھتے ہو وہ بھی سہی ہم تو یوم حدیبیہ میں بیعت الرضوان کو فتح سمجھتے ہیں۔ ہم چودہ سو آدمی حضرت کے ساتھ تھے اور حدیبیہ جو ایک کنواں ہے اس میں جس قدر تھوڑا سا پانی تھا سب کھینچ لیا۔ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا۔ آنحضرتؐ نے کسی قدر پانی مانگا۔ وضو کر کے کلّی اس میں ڈال دی۔ [illegible] اس قدر پانی ہو گیا کہ سب آدمیوں اور اونٹوں نے سیر ہو کر پیا۔

فتح مبین میں علماء کے چند اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں فتح مکہ گو اس وقت تک نہ ہوئی تھی مگر یقینی چیز کو بلفظ ماضی تعبیر کرنا قرآن کا محاورہ ہے۔ بعض کہتے ہیں فتح روم وغیرہ جو اہل اسلام کو یکے بعد دیگرے اس سورۃ کے بعد سے ہونی شروع ہوئیں۔ خیبر فتح ہوا اور علاقے عرب کے زیر حکومت ہوئے۔ یمن میں تسلط ہوا۔ خراج بھی آنے۔ بعض کہتے ہیں براہین و حجج اسلامیہ۔ بعض کہتے ہیں صلح حدیبیہ جو مقدمہ ہے جمیع فتوحات کا۔

یہ اقوال باہم متعارض نہیں۔ ہر ایک درست ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صلح حدیبیہ سے مسلمانوں کو ایک رنج تھا کہ کفار قریش نے مکہ کے قریب سے مسلمانوں کو اور حضرتؐ کو مکہ میں آنے نہ دیا۔ اور اگلے سال پر ٹال دیا۔ گویا مسلمان دب گئے آنحضرت صلعم نے اس جگہ فروتنی کو اختیار کیا۔ جنگ و جدال کرنا مناسب نہ [illegible] اس کے صلہ میں اللہ تعالےٰ نے فتوحات کے دروازے حضرت پر [illegible] پیروؤں پر کھول دیے۔ تھوڑے دن نہ گزرے تھے کہ خیبر فتح ہوا جس [illegible] مدینہ کے مسلمانوں کا فقر و فاقہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد مکہ فتح ہوا [illegible] فتوحات ظاہر ہوتے گئے جن کی مفصل کیفیت کتب تواریخ میں [illegible]

فتاوئ جہانداری

[illegible] مشہور مورخ ضیاء الدین برنی [illegible] کتاب فیروز شاہ تغلق کے عہد کے پہلے چھ برسوں کے دوران [illegible] نے غیاث الدین بلبن سے لے فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی عہد [illegible] معاشرتی حالات کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے [illegible] کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتا۔ بلکہ [illegible] دل خواہش تھی کہ [illegible] کے حل کرنے میں قدیم ضابطہ حیات کی طرف رجوع کیا جائے [illegible] ارشادات نبویؐ اور خلفائے راشدین کے عہد کی روشنی میں [illegible] کی ضرورت محسوس کی۔ سلطان محمود غزنوی کو اس نے [illegible] رہنما کے ذریعے اپنے نظریات کو بیان کرنے کا انداز [illegible] بھی یہی انداز اپنایا۔ چنانچہ سیاسی حالات میں اپنے ذاتی [illegible] زبانی بیان کرتا ہے۔ فتاوئ جہانداری کے اہم موضوعات [illegible] حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کا مرتبہ دینی مشورے کی اہمیت [illegible] مساواتِ خاص و مساوات عام۔ عسکری نظام [illegible] کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے علمائے دہلی کے علاوہ سلطنت کے اطراف و اکناف سے ایسے علماء جمع کیے جنہیں علم فقہ میں کامل دستگاہ تھی اور انھیں حکم دیا کہ مختلف کتابوں کی مدد سے ایک ایسی مستند اور جامع کتاب تیار کریں جس میں نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ تمام فقہی مسائل جمع کیے جائیں تاکہ قاضی اور مفتی، نیز دیگر تمام مسلمان علم فقہ کی بہت سی کتابیں جمع کرنے اور اُن کی ورق گردانی کرنے سے بے نیاز ہو جائیں۔

اس جماعت میں شیخ نظام، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپامو، ملا حامد جونپوری، ملا محمد اکرم لاہوری، جلال الدین محمد، سید محمد قنوجی، شیخ رضی الدین بھاگل پوری، محمد جمیل صدیقی، قاضی غلام محمد لاہور، شاہ عبدالرحیم دہلوی، مولانا محمد شفیع سرہندی، قاضی محمد عوض اور دیگر علمائے کبار شامل تھے۔ ان لوگوں نے کم و بیش آٹھ سال کی مدت میں فتاویٰ کی ایک ضخیم کتاب تیار کی جسے شہنشاہ کے نام پر "فتاویٰ عالمگیری" کہا گیا۔ اس کتاب کی تالیف، علماء و فقہا کے وظائف، نیز دیگر اخراجات پر عالمگیری سکّے کے دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔

کتاب کی تالیف پورے انضباط کے ساتھ عمل میں آئی۔ کام کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن میں سے ہر حصّہ ایک عالم کے سپرد ہوا اور عالم کی امداد و اعانت کے لیے دس دس رفیق مقرر کیے گئے۔ صدارت کے فرائض شیخ نظام برہان پوری کے سپرد تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر خود بھی تالیف کے کام میں دلچسپی لیتے تھے اور روزانہ ایک دو صفحے شیخ نظام دو چار صفحے لے کر شہنشاہ کو سنایا کرتے تھے، جو موقع موقع تنقید کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ فروگزاشتوں اور خامیوں کو دُور کرنے کے لیے کتاب کی تکمیل کے بعد پورے مسودے پر نظرِ ثانی بھی کی گئی۔ انھی احتیاطوں کا نتیجہ ہے کہ فتاویٰ عالمگیری ایسی ضخیم کتاب اغلاط اور نقائص سے بڑی حد تک پاک ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ دستیاب ہے۔

فتاویٰ غیاثیہ سلطان غیاث الدین بلبن سے منسوب مخطوطہ۔ اس کو تنقیدی نقطہ نظر سے اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ غیاث الدین بلبن کو فقہی مسائل سے بہت دلچسپی تھی۔ یہ عربی زبان میں ہے اور فقہ حنفی کے نقطہ نظر سے مرتب کیا گیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

فتاوےٰ قاضیخان فقہ حنفی میں نہایت مستند فتاوےٰ ہے مصنف فخر الدین حسن بن منصور اوز جندی فرغانی جو ۵۹۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس فتاوےٰ میں اکثر ایسے مسائل بیان کیے گئے ہیں جو اکثر وقوع میں آتے رہتے ہیں۔ یہ فتاوےٰ چار جلدوں میں ختم ہوا ہے۔ پہلی دو جلدوں میں عبادات اور آخری دو جلدوں میں معاملات کا بیان ہے۔

فتاویٰ قراخانی جلال الدین فیروز تغلق کے عہد کا ایک فقہی مخطوطہ جو فقہ حنفی کے مسائل پر مشتمل ہے۔ فارسی زبان میں ہے اور اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مولانا امام ہمام صدر الملت والدین یعقوب مظفر کرامی کا تصنیف کردہ ہے۔

فترۃ سستی۔ کمزوری۔ رکاوٹ۔ دھیما پڑ جانا۔ وہ مدّت جو ایک پیغمبر کی وفات سے لے کر دوسرے پیغمبر کے مبعوث ہونے تک ہوتی ہے۔

فترۃ کا اطلاق اس سہ سالہ مدت پر بھی کیا جاتا ہے جس میں آنحضرتؐ پر وحی کے نازل ہونے میں توقف پڑ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۝ نازل ہوئی۔ تو پھر تین سال تک وحی نہ آئی جس میں خداوند تعالےٰ کی کوئی حکمت تھی۔ اس توقف و التوا سے آنحضرتؐ اس قدر ملول و تنگدل رہتے تھے کہ کئی مرتبہ آپؐ نے اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر سے گرا دینے کا ارادہ کیا مگر ہر مرتبہ جبریلؑ آپؐ کے سامنے نمودار ہوتے۔ اور کہتے "یا محمدؐ! آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میں آپ کا دوست اور بھائی ہوں الیبانہ کیجئے۔" اس عرصہ میں آنحضرتؐ نے جبرئیل کو آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ اس وقت آپ کے دل پر ایک ہیبت اور بے قراری طاری ہوئی گھر آئے اور فرمایا زَمِّلُوۡنِىۡ زَمِّلُوۡنِىۡ۔ "مجھ پر چادر ڈال دو۔ مجھ پر چادر ڈال دو۔"

پہلی مرتبہ وحی کے نازل ہونے پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غرض جب چادر اوڑھ کر آپ کی طبیعت بحال ہوئی تو وحی نازل ہوئی یٰۤاَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۝ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝ (اے پیغمبر) جو چادر اوڑھے پڑے ہو اٹھو اور لوگوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈراؤ۔ پھر وحی متواتر آتی رہی۔

فتن فتنہ کی جمع۔ مراد فتنہ و فساد۔ باغیانہ شورشیں۔ جنگ و جدل ہنگامے۔ بلوے۔

اس میں جنگ و جدل کے وہ واقعات مراد ہوتے ہیں جن کے متعلق آنحضرتؐ نے اپنے بعد واقع ہونے کی پیش گوئیاں کی ہیں۔ کتب احادیث میں باب الفتن کے نام سے ایک خاص باب درج ہے جس میں ان واقعات کے متعلق آنحضرتؐ کی پیش گوئیاں جمع کی گئی ہیں۔

الفتن۔ جس میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری امّت کی ہلاکت قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھ پر ہوگی۔

سفینہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہؐ نے خلافت تیس سال رہے گی پھر بادشاہی ہو جائے گی۔ سفینہؓ کہتے ہیں۔ گن لو۔ ابوبکرؓ کی خلافت دو سال۔ عمرؓ کی خلافت دس سال۔ عثمانؓ کی خلافت ۱۲ سال۔ اور علیؓ کی خلافت چھ سال۔

ثوبان سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرتؐ نے جب میری امّت میں تلوار رکھی جائے گی تو قیامت تک اس سے نہ اٹھائی جائے گی اور قیامت نہ آئے گی تاوقتیکہ میری امّت کے قبائل بت پرستی نہ کرنے لگ جائیں۔ اور میری امّت میں تیس کذاب پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک اپنے نبی اللہ ہونے کا گمان کرے گا۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اور برابر ایک جماعت میری امّت میں سے برطاحق پر قائم رہے گی۔ کوئی مخالفت اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آئے۔

فتنہ فتنہ سے مراد فساد، عذاب یا وہ آفت ہے جس کے ذریعے مسلمان کو آزمائش میں ڈال کر اس کے ظرف کی پہچان کی جاتی ہے قرآن حکیم میں فتنہ کا لفظ صرف آفت و مصیبت ہی نہیں بلکہ آسائشات کے حوالے سے بھی آزمائش کے لفظوں میں آیا ہے۔ اِنَّمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ

فتنة (التغابن) یعنی تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ ہے ایک دوسری جگہ (البقرہ) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَالفِتنةُ اَشَدُّ مِنَ القَتلِ فساد (دین سے گمراہ کرنے والا) قتل سے بڑا ہے۔
فتنہ و فساد اگر رونما ہونے لگے تو خانہ جنگی، بدامنی اور ابتری کا پھیلنا ناگزیر ہے جس کے نتیجے میں گروہی عصبیت جنم لیتی ہے اور مومن کا ایمان متزلزل ہوجاتا ہے اس لئے فتنہ کو سر اٹھاتے ہی ختم کردینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جنگ صفین دو گروہوں کے مابین پیدا ہونے والے نزاع اور فساد کی منہ بولتی مثال ہے جسے عظیم فتنہ کہا گیا ہے کہ نتیجہ میں امت محمدی میں تفریق کا دروازہ کھل گیا۔ اسی طرح ہر قسم کی بدعت کو بھی فتنہ کہا گیا ہے۔ حضرت امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو فتنے (فساد) بپا کرتے ہیں وہ بدعتی ہیں۔ فتنے کی اصطلاح بذاتِ خود بہت وسیع ہے اور مصنفین نے اس کے استعمال میں لچک رکھی ہے مگر اصولاً لفظ فتنہ سے مراد وہ شورش ہے جو مسلمانوں کے راسخ و صحیح عقائد کے لئے خطرے کا باعث بن سکے۔

فتوحات مکیہ تصوف میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی طائی کی تصنیف ہے جو ۶۳۸ھ میں فوت ہوئے۔ یہ کتاب حضرت شیخؒ کی آخری تصنیف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حج اور عمرہ کرنے کا ارادہ کیا، اور جب مکہ معظمہ میں پہنچا تو خدا نے میرے دل میں اس کتاب کی تالیف کا خیال ڈالا۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جس نہج پر اس کی ترتیب دی گئی ہے اس میں کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ شیخ عبدالوہاب بن احمد شعرانی نے اس کی تلخیص کی اور اس کا نام لواقح الانوار القدسیہ المنتقاۃ من فتوحات المکیہ رکھا۔

فتوہ۔ ایک اصطلاح، جو آٹھویں صدی عیسوی میں "مُروہ" کے مترادف کے طور پر ایجاد کی گئی اور اس سے ایک پختہ سن کے آدمی کی صفات مراد ہوتی ہیں، فتوہ سے اس چیز کا اظہار مقصود تھا جسے "فتیٰ"، یعنی جوان آدمی کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر اس اصطلاح کو ان مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے جو عصر حاضر کے آغاز تک تمام مشرقی ممالک کے شہری حلقوں میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھیں۔

فتویٰ اس سے مراد وہ حکم ہے جو کسی عالم دین نے دیا ہو جسے اصطلاحی زبان میں فقیہہ یا مفتی کہا جاتا ہے۔ لفظ فتویٰ صرف دینی و شرعی مسائل کے حل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے مسائل بھی وہ جن کا حل عام انسان نہ نکال سکے اور مفتی اپنے علم و فقاہت اور قوتِ استدلال سے کام لیتے ہوئے ایک حکم واضح و منضبط کر دے جیسا کہ ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے: "میں نے اس سے فتویٰ دریافت کیا تو اس نے مجھے یہ فتویٰ دیا۔ چنانچہ فتویٰ "مدلل ثبوت والا جواب" ہوا جو کسی عالم وقت نے اپنے اجتہاد و استنباط کی روشنی میں دیا۔
فتویٰ کا سلسلہ حضور اکرم صلعم کی زندگی سے شروع ہوتا ہے جب لوگ رسول مقبول صلعم سے کچھ پوچھتے تو بسا اوقات اس کا جواب بزبان قرآن حکیم ملتا۔ کبھی حضور القادر و وحی کے ذریعے جواب دیتے۔ عہد رسالت ہی میں کچھ صحابہ کرام نے بھی اپنے علم و اجتہاد سے مدد لیتے ہوئے کچھ فتاویٰ صادر فرمائے جن کو حضور اکرمؐ نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ اجر و ثواب کا وعدہ بھی کیا۔ ان خوش نصیبوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت حذیفہ ابن الیمانؓ اور حضرت عمرو بن العاص کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سلسلہ دورِ نبوت کے بعد بھی جاری و ساری رہا۔ زیادہ تر فتاویٰ زبانی ہی ہوتے تھے مگر بسا اوقات ان کو ضابطۂ تحریر میں لایا جاتا تھا۔
خلفائے راشدین کے علاوہ تاریخ اسلامی میں ایک سو تیس کے قریب ایسے جلیل القدر صحابۂ کرام اور امہات المومنین کے نام ملتے ہیں جو وقتاً فوقتاً اور بسا اوقات بیک وقت مسندِ فتویٰ پر فائز رہے اور لوگ ان کی طرف رجوع کرتے رہے (الخضری، ص ۱۰۵) حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کے وصال کے بعد ۱۱ھ سے تبع تابعین کا دور شروع ہوا اور لوگ ان سے فتاویٰ دریافت کرتے رہے ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے صحابۂ کرام سے دینی و اخلاقی تربیت حاصل کی تھی اور ان کی موجودگی میں فتویٰ دیتے تھے جیسے حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ اور سعیدؒ ابن جبیر بھی شامل تھے۔ صحابہ کرام کے دور میں بعض اسلامی مسائل کے بارے میں مجتہدین میں اختلاف رائے ہوا دور تدوین فقہ میں یہ اختلاف اور بڑھ گیا اور دو گروہ پیدا ہوگئے۔ پہلا گروہ اہل حدیث کا تھا جو حدیث کو اتمام حجت سمجھتے تھے اور اس کی بنا پر فتاویٰ دیتے تھے ان میں زیادہ تر اہل حجاز شامل تھے۔ دوسرا گروہ اہل الرائے کا تھا جو اسلامی شریعت کی بنیاد عقل و حکمت اور انسانی فلاح و اصلاح قرار دے کر اور حدیث کو زیر نظر رکھتے ہوئے فتویٰ دیتے تھے یہ گروہ اہل عراق پر مشتمل تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ عراق منبع اسلام سے دور تھا اور وہاں احادیث اس سرعت اور کثرت سے نہ پہنچی تھیں نیز کچھ لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر حدیثیں گھڑ لی تھیں جس کی وجہ سے فقہا کو فتوی دینے میں بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔
ائمہ مجتہدین کے دور کے بعد فتاویٰ کا اجرا اجتہاد کے بجائے تقلید کی بنیاد پر ہونے لگا اور چار مکاتیب فکر وجود میں آگئے۔ ۱۔ حنفی ۲۔ مالکی۔ ۳۔ شافعی اور ۴۔ حنبلی۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فتاویٰ کا کثیر حصہ حنفی مسلک کے فقہا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی زیادہ تر اسی مسلک کے پیروکار ہیں البتہ پاکستان میں پہلی بار مالکی مکتب کی بنیاد پر مفتی محمد شفیع دیوبندی نے مفقود الخبر کی بیوی کے نکاح ثانی کے بارے میں فتویٰ دیا ہے (تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۵۳)

فتی۔ جمع فتیان۔ اصلی معنی "نوجوان"، کے ہیں۔ عربی میں اس کے کئی معنی ہو گئے ہیں۔ ایک مفہوم، جو اندلس میں رائج تھا، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دراصل امیر یا اس کے گھرانے یا کسی صاحب اقتدار صاحب کے ملازم غلام (خواہ وہ خواجہ سرا ہوں یا نہ ہوں) درحقیقت غلمان کہلاتے تھے۔ اور وہ غلام جو شاہی محل میں کسی اعلیٰ منصب پر مامور ہیں فتیٰ کے نام سے مامور ہوتے تھے۔ امراء کے گھرانے کا پورا انتظام دو اعلیٰ ملازموں یا اہلکاروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اندلس کی تاریخ شاہد ہے کہ بعض غلام کو عموماً یورپی اصل کے ہوتے تھے، آزاد کرکے مشرقی نظام میں بڑے سے بڑے مرتبے دیئے جاتے ہیں یہ غلام نمایاں سیاسی کردار ادا کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے لیے خود مختار ریاستیں قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مراتب میں اس ترقی کا نتیجہ لازمی

طور پر عرب امیر گھرانے کے جھگڑوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا اور آپس میں مار دھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔

فتح نامہ۔ فتح و نصرت کا سرکاری اعلان۔ اس تعریف کی حدود سے فتح ناموں کی بیشتر تعداد خارج ہو جاتی ہے جن کے مصنف غیر سرکاری افراد تھے اور جنھوں نے یہ فتح نامے محض ادبی ذوق کی تسکین کے لیے لکھے تھے۔ عام طور پر فتح نامہ پندرہ اجزا میں منقسم ہوتا ہے :-

(۱)۔ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا
(۲)۔ آنحضورؐ پر دُرود و سلام
(۳)۔ ظلم و ستم سے نجات دلانا سلطان کا فرض ہے۔
(۴)۔ ظلم کے استیصال کی وجوہ
(۵)۔ سلطان کی روانگی
(۶)۔ سلطان افواج کی کثرت تعداد
(۷)۔ غنیم کے حالات
(۸)۔ غنیم کی جرأت
(۹)۔ جنگ کا بیان
(۱۰)۔ سلطان کی فتح
(۱۱)۔ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں شکرگزاری۔
(۱۲)۔ دشمن کے علاقے پر قبضہ
(۱۳)۔ بحر و بر کے راستوں سے فتح کا اعلان
(۱۴)۔ ان مقامات کے نام جہاں فتح نامہ بھیجا گیا، اور فتح نامہ بھیجنے والے کا نام۔
(۱۵)۔ فتح پر سلطان کا اظہار مسرت۔ مرسل الیہ کو خوشخبری کی اطلاع اور طلب دُعا۔

فَخّ۔ ایک وادی کا نام جو مکہ معظمہ سے کچھ زیادہ دُور نہیں اور جہاں ۸ ذوالحج ۱۶۹ھ / ۱۱ جون ۷۸۶ء کو حسین بن علی بن الحسن متعدد علویوں کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ یوم کربلا کی طرح شیعہ یوم فخ کو بھی سوگ کا دن مناتے ہیں۔ ان کی شہادت سے کچھ عرصہ قبل اہل مدینہ نے حسین مذکور کی بیعت کر لی تھی اور جب وہ اپنے چند حامیوں کو ساتھ لیے مکے جا رہے تھے تو فخ میں عباسی لشکر کا سامنا ہو گیا، جس نے ان کی مٹھی بھر جماعت کو منتشر کر کے انھیں شہید کر دیا۔ وہ اور ان کے ہمراہی جس مقام پر شہید اور مدفون ہوئے اور جسے اب الشہدا کہتے ہیں، اہل مکہ کے نزدیک متبرک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۴ صفر کو ہر سال ان کا ایک اجتماع ہوتا تھا۔ فخ کے قتل عام سے بچنے والوں میں ایک ادریس بن عبداللہ بن حسن علوی بھی تھے، جو بھاگ کر المغرب چلے گئے اور وہاں انھوں نے بنو ادریس کی بنا رکھی۔

فخر قرآن و حدیث میں فخر کی نہی آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے : لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک (آدم) اور ایک عورت (حوّا) سے پیدا کیا۔ اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ (ورنہ) اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے، بے شک اللہ جاننے والا باخبر ہے۔ (س۔ حجرات۔ ع ۲)

(۱) حمار مجاشعی کے بیٹے عیاض سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا (لوگو!) خدا تعالےٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تم تواضع اور فروتنی (اختیار) کرو حتیٰ کہ ایک دوسرے پر فخر نہ کرے۔ اور ایک ایک پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا جو لوگ اپنے مرے ہوئے آباء و اجداد پر فخر کرتے ہیں انھیں اس سے باز رہنا چاہیے وہ تو دوزخ میں جل بھن کر کوئلے ہو گئے ہیں (پھر ان پر فخر ہی کیا کرنا) اور (اگر یہ لوگ فخر کرنے سے باز نہ آئیں گے تو) خدا کے نزدیک اس کالے کرم سے زیادہ ذلیل ٹھہریں گے جو (پلیدی میں رہتا اور) پلیدی کو اپنی ناک سے الٹ پلٹ کرتا ہے۔ خدا نے جاہلیت کی نخوت اور آباء و اجداد کے ساتھ فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ (آدمی دو حال سے خالی نہیں) مومن پرہیزگار ہے یا بدبخت بدکار۔ آدمی سب کے سب (ایک) آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے (بنائے گئے) ہیں (اور مٹی تعزز و ترفع کے قابل نہیں۔

(۳) ابو عقبہ کے بیٹے عبدالرحمٰن اپنے باپ عقبہ سے روایت کرتے ہیں اور ابو عقبہ (اگرچہ) اہل فارس میں سے ہے (مگر مسلمان ہونے کے بعد انصار کی حمایت و کفالت میں آ گئے تھے (الغرض) ابو عقبہ کہتے ہیں کہ میں جناب پیغمبر خداؐ کے ساتھ معرکہ اُحد میں موجود تھا۔ تو میں نے مشرکوں میں سے ایک شخص کو (تلوار) مارتے ہوئے کہا کہ لے یہ ضرب میری طرف سے، اور میں ہوں جوان فارسی (یہ ایک کلمہ ہے جو دلیر آدمی دشمن کو مارتے وقت کہا کرتے ہیں) رسول خداؐ نے میری طرف مُڑ کے دیکھا اور فرمایا، ابو عقبہ! تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ لے اس ضرب کو میری طرف سے اور میں ہوں جوان انصاری۔

کبر۔ نخوت۔ غرور۔ تعلّی۔ ترفع۔ تفضل۔ حبّ جاہ۔ عجب۔ خود پسندی۔ خودستائی۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ کس نگوید کہ دوغ من ترش است۔ تعظیم طلبی۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام خصلتوں کی جڑ کیا ہے جڑ ہے وہی حفظ نفس جو تمام اخلاق کی جڑ ہے۔ آدمی حفظ نفس پر مجبول ہے اسی لیے ہر شخص کو اپنی جان یعنی اپنا نفس عزیز ہے اور آدمی جب تک اپنے نفس کو متصف بجمیع الکمالات نہ سمجھے وہ اس کو عزیز نہیں رکھ سکتا۔ "ہر کس را عقل خود بکمال و فرزند خود بجمال۔" آدمی غرور کرتا ہے مال پر، جمال پر۔ جاہ پر۔ زور پر۔ نسب پر۔ علم و فضل پر۔ تقوےٰ پر۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے جمال اور نسب تو اتفاقات ہیں۔ جمال سریع الزوال بھی ہے اور لوگوں کے مذاق اس کے بارے میں مختلف ہیں زور کا غرور بھی حسن کی طرح سریع الزوال ہے۔ مال اگر بزرگوں کا کمایا ہوا ہے تو جائے فخر نہیں۔ اور اپنی کمائی ہے تاہم عرضۂ خطرات ہے۔ تقوےٰ طہارت سے مراد ہے اور شاید ہی کوئی متنفس اس غرور سے خالی ہو۔ ایسے لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ۔ نجات کی طرف سے مطمئن۔ خواہ مخواہ اپنے تئیں برگزیدۂ خدا اور مبشر بالجنۃ فرض کر لیتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کی نظر ہمیشہ دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے۔

فخرالدّین رازی (۱۱۴۹ء - ۱۲۰۹ء) ابو عبداللہ محمد بن عمر بن الحسین۔ اسلام کے مشہور ترین علمائے دین و مفسرین میں سے ایک سربرآوردہ عالم۔ بمقام رے پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضیاءالدین ابوالقاسم اپنے شہر کے خطیب تھے، اسی لیے بیٹے کا لقب ابن الخطیب ہو گیا۔

ادب اور دینیات کی تحصیل سے فراغت کے بعد فخرالدین خوارزم چلے گئے۔ جہاں وہ معتزلہ کے خلاف مناظروں میں مسلسل مشغول رہے، انھوں نے انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ماوراالنہر پہنچے تو وہاں بھی ایسی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ رے واپس آکر انھوں نے شہاب الدین غوری سے تعلقات استوار کیے، جس نے ان پر اعزازات اور دولت کی بارش کر دی۔

۱۱۸۴ء میں جب وہ بخارا کے ارادے سے ماوراالنہر جاتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے سرخس میں ٹھہرے تو وہاں کے ایک طبیب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اظہارِ تشکر کے طور پر انھوں نے بوعلی سینا کی "کلیات" کی شرح لکھی بخارا میں انھیں حسبِ توقع سرپرستی نہ ملی تو وہ ہرات چلے گئے، جہاں غزنہ کے غوری سلطان غیاث الدین نے انھیں شاہی محل ہی میں عوام کے لیے ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت دے دی۔

سمرقند اور ہندوستان اور دیگر مقامات کی سیاحت کے بعد وہ ہرات میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور عمر کا بڑا حصّہ وہیں گزارا۔ ہرات میں وہ شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اس زمانے میں ان کی شان و شوکت عروج پر تھی، چنانچہ تین سو سے زائد شاگرد اُن کے ہم رکاب رہتے تھے۔ آغازِ زندگی میں تنگ دست اور آخر عمر میں خوشحال تھے۔

اُن کی ذکاوت، ذہانت، ان کے زبردست حافظے، ضابطہ پسند ذہن اور سلامتِ عقل و فکر نے انھیں ایک ایسا معلّم بنا دیا تھا جسے سارے وسطِ ایشیا میں شہرت حاصل تھی۔ بہترین خطیب تھے، حد درجہ متقی اور متدین تھے، چنانچہ اپنی وصیت میں بھی لکھا "میں نے علمِ کلام کے تمام طریقوں اور فلسفے کی تمام راہوں کو آزمایا، لیکن میں نے ان میں اطمینان نہ پایا، نہ مجھے ان سے سکونِ قلب حاصل ہوا۔ یہ دولت مجھے تلاوتِ قرآن میں ملی۔"

رازی نے فارابی کا غائر مطالعہ کیا تھا اور ابن سینا کی "اشارات" کی شرحیں بھی لکھی تھیں۔ فلسفے کے گہرے علم نے انھیں اس قابل بنا دیا تھا کہ مسائل فلسفہ اور مسائل دین میں تطبیق کر سکیں، لیکن ایسا کرتے وقت انھوں نے اپنی آزادیٔ رائے کو قائم رکھا چنانچہ جہاں کہیں وہ ابن سینا کا تتبع نہیں کرنا چاہتے، وہاں پر وہ ابن سینا پر سختی سے تنقید کرتے ہیں۔

رازی نے مسلکِ اہلِ سنت والجماعت کے دفاع میں غیر معمولی انہماک دکھایا۔ جس کی وجہ سے ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے۔ معتزلہ کے علاوہ انھیں کرامیہ سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ رازی ایک بہت بڑے فلسفی اور علم الکلام کے عالم بے بدل تھے۔ بعد میں آنے والے علماء، جن میں خصوصیت سے امام ابن تیمیہ شامل ہیں، اُن سے متاثر ہوئے۔

رازی کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جن کا تعلق زیادہ تر کلام، فلسفہ، فقہ اور تفسیر سے ہے۔ اہم تصنیفات یہ ہیں:- (۱) اساس التقدیس فی علم الکلام۔ (۲) لوامع البیّنات فی الاسماء والصفات (۳) شرح الاشارات (۴) المعالم فی اصول الدّین۔ (۵) مفاتیح الغیب (۶) المناظرات (۷) المباحث المشرقیہ۔

فدا

فدا۔ منیٰ کے مقام پر جو قربانی دی جاتی ہے، اسے الفدیٰ کہتے ہیں، کیونکہ یہ رسم اس فدیے کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جو حضرت اسماعیل کے لیے مینڈھے کی قربانی کرکے دیا گیا تھا۔ فدیٰ کے معنی ہیں۔ "انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کرکے محفوظ کرنا۔"

فدائی

فدائی۔ وہ شخص جو کسی جذبے کے تحت کسی نیک مقصد کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے اس سے مراد "دلیر نڈر بے باک" "جان نثار" سورما اور جری" بھی لیا جاتا ہے۔ عربی لفظ فداوی سے بگڑ کر فدائی ہو گیا ہے الجزائر میں فداوی اسے کہتے ہیں جو بہادری کے کارناموں کی داستان بیان کرے اور ایسی داستان کو فداویہ کہتے ہیں۔

یہ نام اسمٰعیلیوں اور بالخصوص ان "حشاشین" کو ملتا تھا جو کسی کو راہ سے ہٹانے کے لیے قتل پر مامور کیے جاتے تھے۔ انقلاب ایران کے دوران میں شروع میں فدائی وہ لوگ کہلاتے تھے جو جمہوریت پسند جماعت کے حامی تھے مگر بعد میں عام حریت پسند اور دستور کے حامی بھی فدائی کہلانے لگے۔

شیخ زادہ لاہیجی جسے شاہ اسمٰعیل صفوی نے سفیر بنا کر محمد خان شیبانی کے پاس بھیجا تھا فدائی تخلص کرتا تھا۔ محمد شاہ قاچار کا منظورِ نظر شاعر سید مرزا سعید اردستانی (جو اصفہان کا رہنے والا تھا) بھی فدائی تخلص کرتا تھا۔

فدائیانِ اسلام

فدائیانِ اسلام۔ ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی دہشت پسند جماعت، جس کی سرگرمیوں کا مرکز تہران تھا۔ اور جس پر بارہ سالہ تحریک ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۵ء کے دوران میں متعدد سیاست دانوں کے قتل کی ذمہ داری آئی۔ فدائیان کی تنظیم اگرچہ خفیہ تھی، لیکن ان کے اجتماع سرِعام ہوتے تھے اور وہ اپنے عزائم و مقاصد کا کھلے بندوں اعلان کرتے تھے۔ اُن کا نصب العین شریعت کا مکمل نفاذ اور بے دینی کا استیصال تھا۔

فدائیوں کی بدنامی کا آغاز اس وقت ہوا جب اُن کی جماعت کے بانی سید مجتبیٰ میر لوحی نے، جو آگے چل کر نواب صفوی کے نام سے مشہور ہوئے، ۱۹۴۵ء میں مشہور عالم احمد کسروی پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا اور پھر اگلے سال مقدمے کی کارروائی کے دوران فدائیوں نے کسروی کو قتل کر دیا۔ شہادت نہ ہونے کے باعث وہ رہا کر دیے گئے۔ فدائیوں کے لیے آیت اللہ کاشانی کی حمایت، ان کے شور و شغب و روز افزوں انتقامی کارروائیوں کے خوف نے فدائیوں کی بریت میں اہم کردار ادا کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں فدائیوں نے وزیرِ دربار عبدالحسین ہژیر کو ہلاک کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں نئے وزیرِ اعظم جنرل رزم آرا کو قتل کیا گیا۔ اس کے بعد حسین علاء وزیرِ اعظم مقرر ہوا، لیکن فدائیوں کی دھمکی کے پیشِ نظر اُسے مستعفی ہونا پڑا۔ اور ڈاکٹر مصدق نے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالا۔ ڈاکٹر مصدق کی معزولی کے بعد فدائیوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور وہ کچھ عرصے تک نئی حکومت کے خلاف تیز و تند بیانات شائع کرتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں وزیرِ اعظم حسین علاء پر قاتلانہ حملہ ہوا جو ناکام رہا۔ اس طرح سے حکومت کو فدائیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ فدائیان، نواب صفوی، واحدی اور طہماسپی، ان کے رہنما گرفتار ہو کر تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے اور ان کی جماعت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

فِدک

فِدک شمالی حجاز میں خیبر کے قریب ایک قدیم قصبہ تھا۔ اس نام کی کوئی بستی اب موجود نہیں ہے۔ یہ سرسبز و شاداب بستی کھجور اور اناج کی پیداوار کے لیے مشہور تھی کمبل سازی اور دیگر دستکاریوں میں بھی فدک کے لوگ بہت آگے تھے۔

آنحضورؐ نے فتح خیبر کے بعد محیصہ بن مسعود انصاری کو فدک کے لوگوں کے

پاس تبلیغ کے لئے بھیجا اس زمانے میں ان کا سردار یوشع بن نون یہودی تھا بقول ابن حزم آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھی اہل فدک کی طرف بھیجا تھا اہل فدک نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن انہوں نے اس شرط پر صلح کرلی کہ زمین معہ پیداوار مسلمانوں کے حوالے کریں گے۔ چنانچہ بغیر جنگ وجدل یہ سرزمین اللہ تعالیٰ نے دلبطور فی۔ اپنے رسول کو عطا فرمائی۔ فدک کی زمین اور باغات آنحضورؐ کی زندگی میں آپ کے لئے مخصوص رہے اور آپؐ ان کی آمدنی کو اپنے اہل بیت اور مسافروں کے اخراجات کے لئے استعمال فرماتے رہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے تک فدک میں یہودی موجود تھے مگر حضرت عمرؓ نے بقیہ نصف زمین کی قیمت بھی ان کو ادا کردی اور ان کو وہاں سے نکال کر شام کی طرف روانہ کردیا۔

جب حضورؐ نے دنیا سے پردہ فرمالیا تو حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول کی حیثیت سے امیرالمومنین منتخب ہوئے اس وقت وراثت کا سوال اٹھا۔ امہات المومنین کے علاوہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور حضرت فاطمہؓ اور ان کے ہمراہ ان کے شوہر حضرت علیؓ نے بھی فدک کی وراثت میں حصہ مانگا جسے حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ حضور اکرمؐ کی حدیث کی رو سے ہمارا کوئی ورثہ نہیں ہوگا ہم جو چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔" مگر آپ نے اہل بیت کی ساری مراعات اور اخراجات برقرار رکھے جو حضورؐ کے زمانے میں ان کو حاصل تھے اس بات سے حضرت فاطمہؓ کسی قدر رنجیدہ ہوئیں مگر جب حضرت ابوبکرؓ ان کی بیماری میں مزاج پرسی کو بنفس نفیس تشریف لائے تو انہوں نے دل سے ساری کبیدگی ختم کردی خلفائے راشدین نے سختی سے اس حدیث پر عمل کیا کہ نبی کی میراث نہیں ہوتی یہ قضیہ بعد میں بھی چلتا رہا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنو ہاشم کی طرف داری کی مگر دوسرے افراد بھی اسے اپنے ذاتی استعمال میں لاتے رہے مگر اس کا وہ اصول برقرار نہ رہ سکا جس کی ابتدا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کی تھی اور نبیؐ کی میراث کو ساری قوم کی ملکیت قرار دیا تھا۔

حضورؐ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت پر عمل پیرا رہے۔ البتہ حضرت عمرؓ نے بذریعہ اجتہاد حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو فدک کی تولیت دی مگر فدک مسلمانوں کے لئے صدقہ کی حیثیت میں رہا امیر معاویہؓ نے یہ جاگیر مروان بن حکم کو عطا کردی جس نے اسے اپنے بیٹے عمر بن عبدالعزیز کو دیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی حضرت امام زین العابدین کو یہ جاگیر دے دی۔ یزید بن عبدالملک نے اپنے دور میں یہ جاگیر ان سے واپس لے لی۔

بنو عباس کے پہلے حکمران ابوالعباس السفاح نے یہ زمین واپس اہل بیت کے وارثوں کو دے دی۔ منصور نے اسے پھر ضبط کرلیا المہدی نے پھر اہل بیت کو لوٹا دی۔ جب المامون خلیفہ ہوا تو اس نے فدک بنو ہاشم کو دے دیا آخر میں المتوکل نے خلیفہ ہوتے ہی فدک پر قبضہ کرلیا اور عبداللہ بن البازیار کو جاگیر میں دے دیا اس کے بعد فدک ویران ہوگیا۔

فدیہ

اس کے لغوی معنیٰ ہیں جزا، معاوضہ، قربانی اور بدل۔

اسلامی شریعت میں فدیہ سے مراد ایسا بدل ہے جس کے ذریعے انسان خود کو کسی ایسے نقصان سے محفوظ کرلے جو اس کا مقدر بن چکا ہو۔ عبدالنبی احمد نگری نے دستورالعلماء میں لکھا ہے "وہ مال یا طعام جو خود کو آزاد کرانے کے لئے ادا کیا جائے فدیہ کہلاتا ہے حضرت امام راغبؒ نے اس کی تعریف یوں بیان کی ہے۔ "وہ مال جو انسان اپنی عبادات میں قصور یا کمی کے لئے ادا کرے فدیہ کہلاتا ہے۔

قرآن حکیم میں یہ لفظ بار بار آیا ہے اس کے وسیع تر معانی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے قریب تر دیگر الفاظ کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ ایک تو خود فدیہ جس سے ماخوذ لفظ فدا ہے۔ لفظ کا استعمال اسیرانِ جنگ سے رہائی کے طور پر مستعمل ہے جبکہ فدیہ دینی عبادت میں کمی یا قصور کو پورا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ کفارہ ہے۔ اکثر لوگ فدیہ اور کفارہ میں فرق نہیں کر پاتے۔ شرعی گناہ یا غلطی سرزد ہوجانے پر کفارہ اس گناہ کو ساقط کرنے کا نام ہے جیسے روزہ توڑنے کا کفارہ، حالت احرام میں شکار کرے گا۔ کفارہ۔ قسم میں جھوٹا ہونے کا کفارہ ادا کرنا یہ واجب ہے۔

حالت مجبوری میں روزہ نہ رکھ سکنا، بیماری کے باعث دوران حج سفر منڈوانے سے معذوری کا فدیہ لازم ہوتا ہے۔ یہ فدیہ ایک وقت کا کھانا کسی محتاج مسکین کو کھلانے کا نام ہے جو انسان عام حالات میں خود کھاتا ہو۔

فرات

ف کے ضمہ سے بمعنی آب شیریں اور کوفہ کے پاس ایک دریا کا نام بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ بہشت کی ایک نہر کا نام بھی ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ سورۃ فرقان اور سورۃ فاطر میں آیا ہے۔ سورۃ فرقان میں ہے: "اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے دو دریاؤں کو (آپس میں) ملایا ایک (کا پانی) میٹھا مزے دار اور ایک (کا) کھاری کڑوا۔ اور دونوں میں ایک روک اور اٹل آڑ بنا دی۔"

فرائض

فریضہ کی جمع ہے جو فرض سے مشتق ہے۔ فرمودۂ خدا جیسے نماز روزہ۔ زکوٰۃ وغیرہ۔ علم میراث کا نام ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ متروکہ میت کے ساتھ چار حق متعلق ہوتے ہیں۔ اس ترتیب سے کہ اول تو اس کی تجہیز وتکفین بغیر اسراف لی اور تنگی کے کی جائے۔ بعدہٗ اگر اس کے ذمے قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے۔ پھر جو مال بچے اس کی تہائی سے اس کی وصیت نافذ کی جائے۔ اگر وصیت کی ہو۔ بعد ازاں جو مال بچے وہ اس کے ورثہ میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ پہلے اصحاب فرائض کو دیا جائے۔ اگر نہ ہوں تو عصبات پر تقسیم کیا جائے۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو ذوی الارحام پر تقسیم کریں۔

اصحاب الفروض

وہ جن کے حصے کتاب اللہ میں متعین ہوچکے ہیں اور وہ بارہ ہیں۔

مردوں میں چار۔ باپ۔ دادا۔ اخیافی بھائی (یعنی جن کی ماں ایک ہو اور بھائی مختلف)۔ شوہر۔

عورتوں میں آٹھ۔ زوجہ۔ بیٹی۔ پوتی اور پوتی میں پڑپوتی اور اس کی نسل بھی داخل ہے۔ حقیقی بہن۔ علاتی بہن۔ اخیافی بہن۔ ماں۔ جدہ صحیحہ۔

والدین کا حصہ قرآن مجید میں یوں مذکور ہے: " اور میت کے ماں باپ یعنی دونوں میں ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ اس صورت میں کہ میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث صرف ماں باپ ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی (باقی باپ کا)۔"

توضیح اس کی یہ ہے کہ باپ کی تین حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں تو اسے فرض مطلق یعنی چھٹا حصہ ملتا ہے اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت کا بیٹا موجود ہو۔ یا بیٹا موجود نہ ہو تو پوتا یا پڑپوتا۔ وَاِنْ سَفَلَ۔ کیونکہ والد کا لفظ بیٹے اور پوتے اور پڑپوتے سب کو عام ہے۔ اسی طرح بیٹی اور پوتی اور پڑپوتی کو بھی۔

دوسری حالت میں فرض مطلق اور عصوبت معًا۔ یعنی بحیثیت ذی الفروض ہونے کے چھٹا حصہ لے گا۔ اور بحیثیت عصبہ ہونے کے باقی مال کا مالک قرار پائے گا۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت کے باپ کے ساتھ میت کی بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی یا پڑپوتی (وَاِنْ سَفَلَتْ) موجود ہو۔

تیسری حالت یہ ہے کہ محض عصبہ ہو۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت کا بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی کوئی بھی موجود نہ ہو

دادا باپ کی جگہ ہے یعنی میت کا باپ نہ ہو تو دادا تمام احکام میراث میں باپ کی مانند ہے۔ مگر چار صورتیں ایسی ہیں جن میں دادا باپ کے حکم سے مستثنیٰ ہے اور ان کی تفصیل علم فرائض کی طویل کتابوں میں موجود ہے۔ رہی میت کی ماں۔ اس کی بھی تین حالتیں ہیں۔ (۱) میت کا دادا ہو تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ (۲) میت کے دو یا دو سے زیادہ بھائی بہن موجود ہوں۔ عام ہے کہ سگے ہوں یا سوتیلے اور سوتیلا پن ماں کی طرف سے ہو یا باپ کی طرف سے۔ ماں چھٹے حصے کی مالک ہو گی (۳) میت کے بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی نہ ہو یا دو یا دو سے زیادہ بھائی بہن نہ ہوں تو ماں کو کل متروکہ میت کی تہائی ملے گی۔ لیکن ماں کے بارے میں جو احکام مذکور ہوئے ہیں۔ ان کا اجراء اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ میت کے ماں باپ کے ساتھ احد الزوجین نہ ہوں۔ احد الزوجین ہوں گے تو بعد دینے فرض احد الزوجین کے ماں کو مابقی کا ثلث ملے گا۔ جیسا کہ اس کی تفصیل علم فرائض کی مطول کتابوں میں موجود ہے۔

زوجین کے بارے میں قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا ہے: "اور لوگو! جو ترکہ تمہاری بیبیاں چھوڑ مریں۔ اگر ان کے اولاد نہیں تو اُن کے ترکہ میں تمہارا آدھا اور اگر ان کے اولاد ہے تو ان کے ترکہ میں تمہارا چوتھائی حصہ (مگر) ان کی وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد اور تم کچھ ترکہ چھوڑ مرو اور تمہارے کچھ اولاد نہ ہو تو بیبیوں کا حصہ چوتھائی۔ اور اگر تمہارے اولاد ہو تو تمہارے ترکے میں سے بیبیوں کا آٹھواں حصہ۔ اور یہ حصے بھی تمہاری وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد دیے جائیں۔ (س۔ النساء۔ ع ۲)

خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں وہ نصف متروکہ زوجہ کا مالک ہو گا۔ اگر زوجہ کے اولاد یعنی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی موجود نہ ہوں۔

دوسری حالت میں چوتھائی حصے کا مالک ہو گا۔ اگر بی بی کے بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی موجود ہوں۔

بی بی کی بھی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں چوتھائی مال کی مستحق ہو گی، بشرطیکہ تنہا ہو۔ یعنی میت کی دوسری بی بی نہ ہو۔ اگر ہو گی تو یہ اور وہ سب اسی چوتھائی حصے میں برابر کی شریک ہوں گی۔ غرضیکہ جب شوہر کے اولاد یعنی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی نہ ہو تو بی بی کو چوتھائی حصہ ملے گا۔ دوسری حالت میں آٹھویں حصے کی مالک ہو گی۔ جبکہ شوہر کی اولاد یعنی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی موجود ہوں۔

اخیافی بھائی بہن کے حصوں کی نسبت قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

"اور اگر کسی مرد یا عورت کی میراث ہو اور اس کے باپ بیٹا (یعنی اصل و فروغ) نہ ہو اور (دوسرے باپ سے) اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا (حصہ) اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں (برابر کے) سب شریک۔ یہ حصے بھی میت کی وصیت (کی تعمیل) اور (ادائے) قرض کے بعد دیئے جائیں بشرطیکہ میت نے (کسی کو) نقصان نہ پہنچانا چاہا ہو۔"

(س۔ النساء۔ ع ۲)

میت کے اخیافی بہن بھائی کی تین حالتیں ہیں۔ ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو چھٹا حصہ۔ دو یا زیادہ ہوں تو تہائی کے بالمساواۃ مالک۔ یعنی تہائی میں سب مرد عورتیں برابر کے شریک ہوں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میت کے بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی ہوں تو اس صورت میں اخیافی بھائی بہن خواہ ایک ہوں۔ یا کئی سب ساقط الارث ہوں گی۔ اسی طرح باپ نہ ہو تو دادا کے ہوتے بھی ساقط ہو جائیں گے۔

سگی سوتیلی بہنوں کی نسبت قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا ہے:

"(اے پیغمبر لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں فتوے طلب کرتے ہیں۔ تو (ان لوگوں سے) کہہ دو کہ اللہ کلالہ کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مرد مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ باپ دادا کہ اسی کو کلالہ کہتے ہیں) اور اس کے (صرف ایک) بہن ہو تو بہن کو اس کے ترکے کا آدھا۔ اور بہن (مر جائے اور اس سے) اولاد نہ ہو۔ تو اس (کے سارے مال) کا وارث یہ (بھائی) پھر اگر بہنیں دو ہوں (یا زیادہ) تو ان کو اس کے ترکے میں سے دو تہائی اور اگر بھائی بہن (ملے جلے) ہوں (کچھ) مرد اور (کچھ) عورتیں تو دو عورتوں کے حصے کی قدر ایک مرد کا حصہ۔ تم لوگوں کے بھٹکنے کے خیال سے اللہ (اپنے حکم) تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔" (س۔ النساء۔ ع ۲۴)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میت کی حقیقی بہنوں کی پانچ حالتیں ہیں۔ (۱) اگر تنہا اور اکیلی ہے تو نصف کی مستحق ہو گی۔ (۲) اور دو یا دو سے زیادہ ہیں تو دو ثلث لیں گی۔ (۳) جب بہنیں حقیقی بھائی کے ساتھ جمع ہوں گی تو لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کی رو سے تقسیم ہو گا اور بہنیں بھائی کے ہوتے عصبہ ہو جائیں گی۔ (۴) میت کی بیٹیاں یا پوتیاں بہنوں کے ساتھ جمع ہوں گی۔ تو بیٹیوں یا پوتیوں کے لینے کے بعد جو باقی رہے گا وہ سب بہنوں کا حق ہو گا۔ (۵) میت کی بہنیں اس کے بیٹے یا پوتے یا باپ اور بقول امام اعظمؒ دادا کے ساتھ جمع ہوں تو تمام بہنیں بالاتفاق ساقط الارث ہوں گی۔

میت کی سوتیلی بہنیں سگی بہنوں کی مانند ہیں اور ان کی سات حالتیں ہیں۔

(۱) میت کی سگی بہنیں نہ ہوں تو سوتیلی کو نصف جبکہ وہ تنہا اور اکیلی ہو۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی میں بالمساواۃ شریک ہوں گی۔

(۳) سوتیلی بہنیں اگر ایک سگی بہن کے ساتھ جمع ہوں تو سوتیلیوں کو صرف چھٹا حصہ۔

(۴) جب میت کی دو سگی بہنیں موجود ہوں تو سوتیلی بہنوں کا کچھ حق نہیں۔

(۵) مگر جب ان کے ساتھ سوتیلا بھائی ہو تو اس صورت میں بھائی کی وجہ سے عصبہ ہو جائیں گی۔ اور اب باقی ترکہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کی رُو سے ان میں تقسیم ہو گا۔

(۶) سوتیلی بہنیں میت کی بیٹیوں یا پوتیوں کے ساتھ عصبہ ہو جائیں گی۔

(۷) میت کی سوتیلی بہن اس کے بیٹے یا پوتے یا پڑپوتے یا باپ اور ایک قول میں دادا کے ہوتے سب بالاتفاق ساقط الارث ہوں گی ۔

بیٹی اور پوتی کا حصّہ قرآن مجید میں یوں مذکور ہے :

(مسلمانو) تمہاری اولاد (کے حصّوں کے بارے میں) اللہ تم سے کہے رکھتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصّہ دیا کرو ۔ پھر اگر لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ترکے میں ان کا حصّہ دو تہائی اور اگر اکیلی ہو تو پھر اس کو آدھا'' (س ۔ النساء ۔ ع ۲)

میت کی بیٹی کی تین حالتیں ہیں ۔ (۱) ایک حالت میں نصف متروکہ میت سے گی اگر صرف ایک ہے ۔ (۲) اور دو یا دو سے زیادہ ہیں تو سب دو تہائی کی بالمساواۃ مالک ہیں ۔ (۳) تیسری حالت میں عصبہ ہو جاتی ہیں جبکہ میت کی بیٹیاں اس کے بیٹے کے ساتھ جمع ہوں ۔ اس صورت میں بیٹا دو بیٹیوں کے برابر حصّہ لے گا ۔ اور باقی بیٹیوں میں تقسیم ہوگا ۔ میت کی پوتیاں صلبی بیٹیوں کی مانند ہیں اور ان کا علیحدہ ذکر قرآن میں اس لیے نہیں ہوا کہ بیٹیوں میں پوتیاں بھی داخل ہیں ۔ تو پوتیوں کی چھ حالتیں ہیں ۔

ایک یہ کہ ایک ہے تو نصف کی مستحق ہوگی ۔ دوسرے یا دو سے زیادہ ہیں تو دو تہائی بشرطیکہ میّت کی صلبی بیٹیاں موجود نہ ہوں ۔ تیسری حالت میں میت کی پوتی کو چھٹا حصّہ ملتا ہے جبکہ کوئی ایک صلبی بیٹی موجود ہو ۔ چوتھے میت کی دو صلبی بیٹیاں موجود ہوں تو پوتیاں ساقط الارث ہوں گی ۔ ہاں ان کے درجے میں یا اُن سے نیچے کے درجے میں کوئی مرد ہو تو اس کی وجہ سے عصبہ ہو جائیں گی اور باقی ترکہ میت سب میں لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کے قاعدے سے تقسیم ہوگا ۔ یہ پوتیوں کی پانچویں حالت ہوئی ۔ چھٹی حالت یہ ہے کہ میّت کا بیٹا موجود ہو تو پوتیوں کو کچھ نہیں ملے گا ۔

عصبات

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ میراث کے حصّے جو خدا نے قرآن مجید میں مقرر و معین فرمائے ہیں ۔ اہلِ فرض کو پہنچاؤ اور جو اہل فروض سے باقی رہے وہ اس مرد کا حق ہے جو میت سے قریب تر ہو ۔ (اور اسی کو عصبہ کہتے ہیں)

عصبہ کی دو قسمیں ہیں ۔ عصبہ نسبی اور عصبہ سببی ۔ عصبہ نسبی وہ ہے کہ اس میں اور میت میں من حیث النسب تعلق نہ ہو جیسے آقا جس نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا ہو تو غلام کے مرنے کے بعد آقا اس کے متروکہ کا وارث ہوگا بحقِ عصوبیت ۔ بشرطیکہ غلام کا کوئی عصبہ نسبی نہ ہو ۔ پھر عصبہ نسبی کی تین قسمیں ہیں :۔ عصبہ بنفسہ ۔ عصبہ بغیرہٖ ۔ عصبہ مع غیرہ ۔

عصبہ بنفسہ وہ مذکر ہے جس کی نسبت میت کی طرف بے واسطہ مؤنث ہو ۔ یعنی جب اسے میت کی طرف نسبت کریں تو بیچ میں مؤنث داخل نہ ہو جیسے میت کا بیٹا یا پوتا ۔ اور جو بیچ میں مؤنث کا دخل ہو تو اسے عصبہ نہیں کہتے جیسے میت کے اخیافی بہن بھائی کہ اُن کی نسبت میت کی طرف ماں کے واسطہ سے ہے ۔ اور اسی وجہ سے میت کے اخیافی بہن بھائی اصحاب الفروض ہیں نہ عصبات ۔

عصبہ بنفسہ کی جماعت میں چار طرح کے لوگ ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جو میت کے جزو ہیں ۔ مثلاً بیٹا ۔ پوتا ۔ دوسرے وہ جو میت کی اصل ہیں جیسے باپ ۔ دادا ۔ تیسرے وہ جو میت کے باپ کے جزو ہیں ۔ مثلاً بھائی ۔ بھتیجے ۔ چوتھے وہ جو میت کے دادا کے جزو ہیں ۔ جیسے چچا اور اس کی اولاد ۔ تو تقسیم ترکہ کے وقت ان اصناف میں سے ان لوگوں کو مقدم کیا جائے گا جو قرب درجے کے لحاظ سے ترجیح رکھتے ہیں ۔ پس جزو میّت یعنی میت کا بیٹا یا پوتا احق اور اقدم ہوگا ۔ پھر میت کی اصل یعنی باپ دادا ۔ پھر میت کے باپ کے جزو یعنی بھائی بھتیجے ۔ پھر دادا کی اولاد یعنی سگے چچا ۔ پھر ان کے بیٹے ۔ پھر دو حیثیت سے قرابت رکھنے والا ۔ ایک قرابت رکھنے والے سے مذکر ہو تو اور مونث ہو تو ۔

عصبہ بغیرہٖ چار عورتیں ہیں ۔ بیٹی ۔ پوتی ۔ سگی بہن ۔ سوتیلی بہن ۔ انہیں عصبہ بغیرہٖ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ میں عصبہ ہوتی ہیں ۔

عصبہ مع غیرہ وہ عورت ہے جو دوسری عورت کے ساتھ جمع ہو کر عصبہ بن جاتی ہے ۔ مثلاً میت کی سگی یا سوتیلی بہن ۔ جب میت کی بیٹی یا پوتی کے ساتھ جمع ہو تو عصبہ ہو جائے گی ۔ ایک ہو تو بھی اور ایک سے زیادہ ہو تو بھی ۔

ذوی الارحام

" اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جہاد بھی کیے ۔ تو وہ تم ہی میں داخل ہیں ۔ اور رشتہ دار اللہ کے حکم کے مطابق (غیر آدمیوں کی نسبت) ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حقدار ہیں ۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے (ازانجملہ میراث کی مصلحتوں سے بھی) ۔ (س ۔ انفال ۔ ع ۱۰)

ذورحم کہتے ہیں صاحب قرابت کو اور مراد وہ قرابت والا ہے جو ذی فرض نہ ہو یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جن کے حصّے قرآن مجید یا حدیث شریف یا اجماع امت سے متعین ہو چکے ہیں اور عصبہ بھی نہ ہو ۔

ذوی الارحام کی چار قسمیں ہیں ۔

پہلی قسم وہ ہے جو میت کی طرف منسوب ہو اور وہ میت کی بیٹیوں اور پوتیوں کی اولاد ہے ۔ دوسری قسم وہ ہے جن کی طرف میّت منسوب ہو جیسے میت کا نانا اور نانا کا باپ یا نانا کی ماں یا نانا کی نانی ۔ تیسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو میت کے ماں باپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں ۔ اور وہ ہیں بہنوں کی اولاد ۔ بھائیوں کی بیٹیاں ۔ اخیافی بھائیوں کی اولاد ۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ ہیں جو میت کی دو جد یعنی دادا اور نانا یا دو جدّہ یعنی دادی اور نانی کی طرف منسوب ہوں اور وہ پھوپیاں ہیں ۔ عینی ہوں یا علاتی یا اخیافی ۔ اور اخیافی چچا ہیں ۔ اور ماموں اور خالائیں ۔ پس یہ چاروں قسمیں اور جو ان کے واسطے سے میّت کی طرف منسوب ہوں ۔ سب ذوی الارحام ہیں ۔ ان میں اولیٰ بالمیراث وہ ہے جو میت کی طرف سب سے زیادہ قریب ہو ۔ جیسے نواسے نواسیاں کہ وہ کنواسوں اور کنواسیوں کی نسبت میت سے زیادہ قریب ہیں اور اسی لحاظ سے اولیٰ بالمیراث بھی ۔ باقی رہی اقسام اربعہ کی تفصیل ۔ وہ علم فرائض کی مطوّل کتابوں سے معلوم ہو سکتی ہے ۔

فرائض سراجیہ ۔ علم فرائض میں سراج الدین محمد بن سجاوندی حنفی کی تصنیف ہے ۔ اس مستند کتاب کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں ۔

فرائضی فرقہ یہ بنگال کے مسلمانوں کا ایک فرقہ تھا ۔ حاجی شریعت اللہ اس فرقہ کے بانی تھے ۔ حاجی شریعت اللہ ۱۷۸۲ء میں ضلع فرید پور کے ایک گاؤں بندر کھولہ میں پیدا ہوئے ۔ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور وہاں شیخ طاہر السنبل الشافعی المکی سے وابستہ ہو کر تقریباً بیس برس تک اکتساب علم کرتے رہے ۔

ڈاکٹر ٹیلر (TAILOR) کے بیان کے مطابق حاجی صاحب قیام مکہ کے دوران وہابی تحریک سے کافی متاثر ہوئے ۔ ۱۸۲۰ء میں وطن واپسی پر وہ ایک عالم

اور مناظر کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ مگر واپسی پر راستے میں اُن کے قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار میں حاجی صاحب کی کتب اور تبرکات بھی ضائع ہو گئے۔ حاجی صاحب اس حادثہ سے دل برداشتہ ہو کر ان کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ حاجی صاحب کی دینداری اور بلند کرداری کو دیکھتے ہوئے ڈاکوؤں کا گروہ تائب ہو کر ان کا پیرو ہو گیا۔

بنگال کے مسلمانوں کی حالت انگریز تاجروں اور ہندو زمینداروں کے ہاتھوں ناگفتہ بہ تھی۔ مسلمان ہندو تہذیب کے بیشتر اثرات قبول کر چکے تھے۔ حاجی صاحب نے خاموشی سے دیہات میں تبلیغ شروع کر دی اور مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ غیر اسلامی رسم و رواج ترک کر دیں۔ خدائے واحد کی بندگی کریں۔ آغاز میں حاجی صاحب کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ حاجی صاحب کے عالی کردار اور سادگی تعلیم سے متاثر ہو کر ڈھاکہ، فرید پور اور باریسال کے دیہاتی مسلمان آپ کے ہمنوا بن گئے۔ کیونکہ اس تحریک میں فرائضِ دین کی پابندی پر زور دیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ "تحریک فرائضی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حاجی صاحب نے پیر اور مرید کی اصطلاحوں کو ترک کر کے استاد اور شاگرد کی اصطلاحیں جاری کیں۔ حاجی صاحب نے ہاتھ پر بیعت لینے کی رسم بھی ترک کر دی۔ وہ لوگوں کو گناہوں سے توبہ کی ترغیب دیتے اور نیکوکاری کی تعلیم دیتے تھے۔

اس بنا پر یہ لوگ "توبار" (توبہ کرنے والے) بھی کہلاتے تھے۔ تحریک کی مقبولیت اور لوگوں میں بھائی چارہ ہونے کے باعث ان میں جرأت پیدا ہو گئی اور انھوں نے ہندوانہ عقائد و رسوم سے پہلوتہی شروع کر دی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی طرف سے مقرر کردہ درگا پوجا ٹیکس دینے سے صاف انکار کر دیا اور بیگار دینا بھی بند کر دیا۔ ان کی بہو بیٹیوں نے زمینداروں کے گھروں میں کام کاج چھوڑ دیا۔ اس سے ان میں منافرت اور غصہ پھیلنے لگا۔ انگریزوں کے مسلمانوں پر مظالم کی وجہ سے اسی زمانے میں حاجی شریعت اللہ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں کو عیدین اور جمعہ کی نماز سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی، ہندو اور زمیندار اس تحریک سے بہت خوفزدہ تھے۔ چھوٹے چھوٹے فسادات نے بڑھ کر ۱۸۳۱ء میں باقاعدہ شدت اختیار کر لی۔ مسلمانوں پر مقدمات قائم ہونے لگے۔ خود حاجی صاحب پر مقدمہ چلا مگر عدم ثبوت کی بنا پر سزا سے بچ گئے۔

حاجی صاحب کا کردار بے داغ تھا۔ وہ مخلص اور دیندار تھے۔ اسی لیے لوگ ان کو باپ کا درجہ دیتے تھے۔ بنگالی مسلمانوں خصوصاً کسانوں اور کاشت کاروں کے دلوں پر آپ کا انمٹ اثر تھا جس نے ان میں بیداری اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کی وفات کے بعد اس فرقے کی قیادت ان کے بیٹے محمد محسن نے سنبھالی جو دودھو میاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ملک کے سیاسی اور معاشی بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنا دائرہ کار پورے بنگال میں پھیلا دیا اور باقاعدہ بیعت لینی شروع کر دی۔ انھوں نے بنگال کو متعدد حلقوں میں تقسیم کر کے ان پر خلیفے مقرر کیے جو مقامی مریدوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور دودھو میاں کو ہر وقت حالات سے باخبر رکھا کرتے تھے۔ خلیفہ مریدوں سے بیت المال کے لیے چندہ جمع کرتے جو بالعموم جنس کی شکل میں ہوتا۔ ہر مرید روزانہ ایک چٹکی چاول جمع کر کے رکھتا تھا۔ خلیفہ کے آدمی یہ امداد جمع کرتے تھے جسے ضرورت مندوں اور مسافروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ دودھو میاں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ کوئی زمیندار اُن کے مریدوں پر زیادتی نہ کر سکے۔ لوگ ٹیکسوں سے بچنے کے لیے جوق در جوق اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ اس زمانے کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈیمپر کے بیان کے مطابق ان کے گرد کم از کم اسّی ہزار سرگرم کارکن تھے۔ اس تحریک کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ دودھو میاں پر ۱۸۳۸ء میں لوٹ مار، ۱۸۴۱ء میں قتل اور ۱۸۴۴ء میں اغوا اور لوٹ مار کے مقدمات بنائے گئے مگر کسی نے ان کے خلاف گواہی نہ دی۔ اس لیے وہ ہر مقدمہ سے بری ہو جاتے۔

۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کے دوران اُن کو علی پور اور پھر فرید پور میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں جب وہ رہا ہوئے تو شدید بیمار تھے۔ اور ۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے بعد تحریک کو ان کے تین بیٹوں میں سے کوئی صحیح جانشین نہ مل سکا جس کی بنا پر رفتہ رفتہ یہ تحریک ختم ہونے لگی۔ لیکن فرائضی تحریک نے بنگال کے مسلمانوں میں بیداری، دینی حمیت اور اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کا جو جذبہ پیدا کیا اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فراہی، حمید الدّین - (۱۲۸۰ھ - ۱۳۴۹ھ) برعظیم کے ممتاز عالم دین ضلع اعظم گڑھ (یوپی - بھارت) کے ایک گاؤں پھریہا میں پیدا ہوئے۔

مولانا کا خاندان ضلع کے معزز گھرانوں میں شمار ہوتا تھا اور تعلیم و دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے پہلے ہی سے ممتاز رہا ہے۔ مولانا فراہی، شبلی نعمانیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی زبان کی تحصیل کی۔ حتیٰ کہ اس زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ شعر کہنے لگے۔ شاعری کا مذاق ان میں فطری تھا۔

عربی زبان کی تحصیل زیادہ تر مولانا شبلی نعمانیؒ سے کی۔ مولانا شبلی ان سے چند سال بڑے تھے اور عربی علوم میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا فراہی کو ایک مشفق بھائی کی طرح پوری توجہ سے صرف و نحو، ادب اور معقولات وغیرہ کی تعلیم دی۔ مولانا شبلی سے کسبِ فیض کے بعد مولانا فراہی نے وقت کے مشہور اساتذہ سے مستفید ہونے کا ارادہ کیا۔ فقہ کی تعلیم انھوں نے مولانا ابو الحسنات عبد الحیٔ لکھنوی فرنگی محلی سے حاصل کی۔ لکھنؤ چھوڑنے کے بعد مولانا فراہی نے لاہور کا سفر کیا، لاہور میں مشہور ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جو کہ اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے اور عربی ادب میں پورے ملک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مولانا شبلی بھی ادب میں ان کے شاگرد تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی نے ادب کی تکمیل ان سے کی۔ ان کے استاذ ان کی قابلیت و ذہانت سے کافی متاثر تھے۔ شاگرد کو بھی استاذ سے جو خصوصی تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فراہی نے اپنے استاذ کا عربی دیوان اپنے خرچ اور اہتمام سے شائع کرایا۔ ان کی وفات پر مولانا نے جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک ایک شعر دردِ غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ مولانا فیض الحسن نے اپنے شاگرد کو اپنی شرح سبع معلقہ کا قلمی نسخہ یادگار کے طور پر دیا۔

مولانا فراہی عربی زبان اور دینی تعلیم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں قیام کے دوران سرسید احمد خان نے ان سے امام غزالیؒ کے ایک کرم خوردہ قلمی نسخے کی دوبارہ تدوین و ترتیب کرائی۔ سرسید ان کی اس ذہانت سے کافی متاثر ہوئے اور پوچھا آپ نے کیسے اس نسخہ میں ضائع شدہ مقامات پر مناسب الفاظ لگائے ہیں، تو مولانا فراہی نے جواب دیا۔ میں نے سیاق کلام اور امام غزالی کی زبان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر الفاظ متعین کیے ہیں۔

علی گڑھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ فلسفہ جدیدہ کی تعلیم فلسفہ کے پروفیسر، مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ سے لی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ہی سرسید نے مولانا سے طبقات ابن سعد سے سیرت نبوی کے کچھ حصے فارسی میں ترجمہ

کروائے اور اس کو کالج کے نصاب میں شامل کیا۔

مولانا نے بی اے کی ڈگری الٰہ آباد یونیورسٹی سے لی۔ ایم اے کی بھی تیاری کی۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ مولانا ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعض اسباب کی وجہ سے انھوں نے مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت منظور کی۔ ۱۹۰۰ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کو دورہ سواحل عرب اور خلیج فارس کے لیے ایسے ترجمان کی ضرورت تھی جو عربی اور انگریزی دونوں میں مہارت رکھتا ہو۔ مولانا شبلی کے اصرار پر مولانا نے وائسرائے کے ترجمان کی ذمہ داری سنبھالی۔

اس سفر سے واپسی کے بعد مولانا فراہی علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے وہاں قیام کے دوران عربی کے پروفیسر جرمن مستشرق یوسف ہارویز سے عبرانی زبان کی تعلیم لی۔

چند سال علی گڑھ میں قیام کے بعد مولانا آلہ آباد چلے گئے اور الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد نظام حیدرآباد نے دار العلوم حیدرآباد کے پرنسپل کی حیثیت سے مولانا فراہی کی خدمات حاصل کیں۔ مولانا نے حیدرآباد کے قیام کے دوران ایسی یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ بنایا، جس میں تمام دینی اور عصری علوم کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ مولانا فراہی کا یہی تخیل بالآخر عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں عملی صورت میں ظاہر ہوا۔

مولانا ملازمت سے استعفیٰ دے کر وطن واپس آئے۔ اب ان کو فرصت ملی کہ وہ مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین کی طرف متوجہ ہوں جن کے انتظامی، علمی اور تعلیمی معاملات ابتدا ہی سے مولانا سے متعلق تھے۔ لیکن بیرون وطن ملازمت کے سبب کما حقہٗ ان اداروں کی طرف توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

مولانا فراہی نے ایک بیماری کے لیے متھرا (ہندوستان) میں اپریشن کروایا۔ اپریشن ناکام رہا۔ مولانا فراہی ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ بمطابق ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

مولانا فراہی فلسفی متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے اچھے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان اعلیٰ علمی صفات کے باوجود مولانا کا جو کام اُن کو ایک منفرد شخصیت کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے وہ ان کا اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں قرآن مجید پر تدبر و تفکر کرنا ہے۔ مولانا نے تفسیروں کے واسطہ سے قرآن کو سمجھنے کے عام طریقہ کو چھوڑ کر براہ راست قرآن پر غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ مولانا نے واضح دلائل سے اس بات کو غلط ثابت کیا کہ قرآن ایک غیر منظم کلام کا مجموعہ ہے۔ بلکہ قرآن کی ہر سورت کا دوسری سورت سے ربط و نظم ہے۔ ہر سورت کا ایک خاص عمود (مضمون) ہے جس پر اس سورۃ کی آیات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس لیے قرآن مختلف سورتوں کی حد بندیوں کی شکل میں موجود ہے۔ جن میں سے کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی یعنی نظم قرآن مولانا فراہی کی تحقیقات کا موضوع ہے۔ مولانا فراہی تفسیر قرآن میں اپنے مخصوص اور منفرد انداز کی وجہ سے اس فن کے امام کہے جاسکتے ہیں کیونکہ امام اسی شخص کو کہا جاسکتا ہے جو کسی فن میں اپنے اصول وضع کرے۔ اور یہ اصول قرآن و سنت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں۔

امام فراہی تفسیر قرآن میں مستقل اصولوں اور فن کے بانی ہیں۔ اس بات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ فراہی ہی پہلے شخص ہیں جن پر نظم قرآن کا یہ عقدہ کھلا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں جن میں ابوحیان کے شیخ ابوجعفر بن زبیر، شیخ برہان الدین بقاعی، شیخ ابوبکر نیشاپوری اور امام رازی شامل ہیں۔ مولانا فراہی نے مذکورہ بالا علماء کے ابتدائی کام کو آگے بڑھایا ہے اور تفسیر میں نظم قرآن کے اصول معین کیے ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی کے نظریات و افکار کو پھیلانے کے لیے ہندوستان میں دو ادارے مدرسۃ الاصلاح اور دائرۂ حمیدیہ کام کر رہے ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے موجودہ ناظم مولانا فراہی کے پوتے ہیں۔

دائرہ حمیدیہ کی بنیاد مولانا فراہی کے شاگرد خاص مولانا امین احسن اصلاحی نے رکھی تھی اور آج کل بھی یہ ادارہ کام کر رہا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنے استاذ کے علوم کے صحیح وارث ہیں۔ مولانا فراہی کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ انھوں نے مولانا فراہی کے مسودات میں سے مختلف سورتوں کو ایک مجموعہ کی صورت میں عربی سے اُردو میں منتقل کیا ہے اور "مجموعہ تفاسیر فراہی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنے استاذ کی کئی کتابوں کے مترجم بھی ہیں اور مولانا فراہی کے انداز تفسیر کو مدلل انداز میں اپنی تفسیر تدبر قرآن میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے مختلف شہروں میں کئی اصحاب علم مولانا فراہی کے انداز فکر اور تعلیمات کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی زیر سرپرستی لاہور میں ایک "حلقہ تدبر قرآن" کام کر رہا ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی عام معنوں میں مصنف نہیں تھے وہ لکھنے کے لیے صرف اس وقت قلم اٹھاتے جب غور و فکر سے ان کے سامنے کوئی نئی تحقیق آتی۔ مولانا الگ الگ عنوانات سے اس طرح یادداشتیں لکھتے رہتے۔ اس طرح کی جو بھی یادداشت لکھتے اس پر لکھ دیتے کہ یہ فلاں کتاب سے متعلق ہے۔ مولانا کے اس مخصوص طرز تصنیف کے سبب بیک وقت اُن کے زیر فکر متعدد تصنیفات رہتی تھی جن میں بعض تکمیل کو پہنچ جاتی تھی۔ بعض چلتی رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کی تفسیر بھی مکمل نہ ہو سکی۔

مولانا حمید الدین فراہی کی مطبوعہ کتب یہ ہیں:

۱۔ تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان
۲۔ فاتحۃ نظام القرآن
۳۔ مفردات القرآن۔
۴۔ الامعان فی اقسام القرآن۔
۵۔ الرائ الصحیح فی من ھو الذبیح
۶۔ جمہرۃ البلاغۃ
۷۔ اسباق النحو حصہ اول و دوم
۸۔ مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ "دیوان حمید"
۹۔ امثال سلیمان کا خالص فارسی میں منظوم ترجمہ "خرد نامہ"
۱۰۔ عیسائیوں کے عقیدۂ شفاعت اور کفارہ کی تردید میں ایک رسالہ بزبان انگریزی۔
۱۱۔ دلائل النظام
۱۲۔ اسالیب القرآن
۱۳۔ اصول التاویل
۱۴۔ فی ملکوت اللہ
۱۵۔ القائد الی عیون العقائد

مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف میں تفسیر نظام القرآن کے باقی حصے اور انکے عربی کلام کے دیوان کے علاوہ چند کتب ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مولانا کی مختلف عنوان سے کئی یادداشتیں بھی ہیں جن کی مدد سے ان مخصوص مباحث پر بہت کام کیا جاسکتا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے ایک رکن ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، مولانا حمید الدین فراہی کے حالات زندگی اور اُن کے افکار پر تفصیل کام کر رہے ہیں۔

فرّخ سیر ۔ (۱۶۸۳ء - ۱۷۱۹ء) ابوالمظفر محمد معین الدین بن عظیم الشان بن شاہ عالم بہادر شاہ اوّل بن اورنگ زیب عالمگیر۔ ہندوستان کا مغل شہنشاہ۔ اورنگ آباد (دکن) میں ۱۶۸۳ء میں پیدا ہوا۔ دس برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ آگرہ آیا۔ ۱۶۹۷ء میں بنگالہ کے صوبے دار مقرر ہونے پر شہزادہ عظیم الشان کے ساتھ بنگالہ میں آیا۔

فرخ سیر نے علوم رسمیہ فضلائے عصر سے حاصل کیے۔ قرآن مجید حفظ کیا شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ اپنے والد کی بنگالہ سے واپسی پر بنگالہ میں ان کا نائب نامزد کیا گیا۔

۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ / ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو بہادر شاہ کے لاہور میں انتقال کے بعد فرخ سیر نے اپنے والد عظیم الشان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لاہور میں بہادر شاہ کے بیٹوں جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہاں شاہ کے درمیان بادشاہت کے مسئلہ پر جنگ ہو رہی تھی۔ سپہ سالار ذوالفقار خان کی مدد سے جہاندار شاہ اپنے تینوں بھائیوں کے لڑائی میں مرنے کے بعد بادشاہ بن گیا۔ ادھر فرخ سیر نے دہلی میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بہار اور الٰہ آباد میں فرخ سیر کے والد عظیم الشان کی نیابت کرنے والے بارھہ کے مشہور سید برادران حسن علی اور حسین علی کے ہمراہ فرخ سیر آگرہ پہنچا۔ کھجواعہ کے مقام پر اس کا مقابلہ شہزادہ اعزالدین کی فوج سے ہوا۔ ۲۸ نومبر ۱۷۱۲ء کو اعزالدین کی فوج اپنا سارا سازو سامان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ آگرہ سے باہر دریائے جمنا کے کنارے جہاندار شاہ سے ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء کو مقابلہ ہوا۔ شاہی فوج کی شکست کے بعد جہاندار شاہ بھیس بدل کر دہلی پہنچا۔ وزیر سلطنت اسد خان نے اسے قلعہ میں نظر بند کر کے فرخ سیر سے اپنی اور اپنے بیٹے ذوالفقار خاں کی حمایت اور جان بخشی کی درخواست کی۔ فرخ سیر ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ / ۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء کو تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ۱۱ فروری کو دہلی پہنچ کر حکم دیا کہ جہاندار شاہ کو قید خانہ میں ہلاک کر دیا جائے۔ فرخ سیر نے ۱۳ جنوری کو ذوالفقار خاں کو قتل کروا دیا۔ اس کی اور اس کے والد اسد خاں کی املاک بھی ضبط کر والیں۔

سید برادران سے بعض وجوہات کی بنا پر اختلافات شروع ہوئے۔ اس طرح فرخ سیر کا سارا عہدِ حکومت سید برادران کے ساتھ ایک مسلسل کشاکش میں بسر ہوا۔ بعد میں فرخ سیر نے سید برادران سے صلح کر لی۔ ۱۷۱۴ء میں جودھ پور کے راجہ اجیت سنگھ کی سرکوبی کے لیے فرخ سیر نے حسین علی کو روانہ کیا۔ فرخ سیر نے باغی راجہ کو خفیہ طور پر لکھا کہ اگر وہ حسین کو ختم کر دے تو اُسے شاہانہ اعزاز دیئے جائیں گے۔ حسین علی کے جودھ پور پہنچنے پر اجیت سنگھ نے شکست تسلیم کرتے ہوئے خراج پیش کیا اور اپنی بیٹی بادشاہ سے شادی کے لیے پیش کی۔ ۲۶ ستمبر ۱۷۱۵ء کو راجکماری نے اسلام قبول کیا۔ اگلے دن اس کا بادشاہ فرخ سیر سے نکاح ہوا۔ رخصتی بعد میں ہوئی کیونکہ بادشاہ بیماری کی وجہ سے زیر علاج تھا۔ انگریز ڈاکٹر ولیم ہملٹن کے علاج سے شفایاب ہونے کے بعد بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیگر مراعات کے علاوہ ایک مخصوص رقم کی سالانہ ادائیگی پر بنگالہ، اڑیسہ، بہار، سورت اور مدراس میں سامانِ تجارت پر محصول کی معافی عطا کر دی۔

فرخ سیر کے عہد کا ایک اہم واقعہ سکھوں کے نام نہاد پیشوا بندہ بیراگی کا خاتمہ ہے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمان اس کی لوٹ مار اور ظلم و ستم سے تنگ تھے۔ ۱۷۱۳ء میں اس نے گورداسپور میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اپریل ۱۷۱۵ء میں پنجاب کے صوبیدار نواب عبدالصمد خاں نے اُسے گورداسپور کے قلعے میں گھیر لیا۔ ۱۷ دسمبر کو سکھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ بندہ بیراگی کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔ ۱۹ جون ۱۷۱۶ء کو اسے موت کی سزا دی گئی۔

سید برادران سے بادشاہ کے اختلافات بڑھتے گئے۔ بادشاہ خود ان دونوں بھائیوں کو اپنے راستے کی دیوار سمجھتا تھا اور انھیں قتل کروانے کے منصوبے بناتا رہا۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ سید برادران نے بادشاہ کے خلاف کئی امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ۱۶ فروری ۱۷۱۹ء کو حسین علی اپنی فوج اور بعض دوسرے راجاؤں اور امرا کی افواج کے ہمراہ دہلی کے مضافات میں پہنچ گیا۔

۵ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ / ۲۷ فروری ۱۷۱۹ء کو حسن علی نے محل پر قبضہ کر لیا اور حسین علی اپنی فوج سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ فرخ سیر کو اندھا کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ بہادر شاہ اول کے ایک پوتے رفیع الدرجات بن رفیع الشان کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ فرخ سیر کو دو ماہ بعد قید خانہ میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔

فرّخان ۔ (وفات: ۷۲۲ء)

گیلان شاہ ابن دابویہ، جو ۷۰۹ء سے ۷۲۲ء تک طبرستان کا سپہ سالار رہا، خلیفہ المہدی کے بیٹے المنصور کا نانا تھا۔

فرخان نے مازندان فتح کیا اور سرحدوں پر امن و امان قائم رکھا۔ باغی دیلمیوں سے شکست کھانے کے بعد وہ آمل کی جانب بھاگا۔ فیروز آباد میں کافی عرصہ محصور رہا۔ بالآخر اس نے محاصرے سے نجات پائی۔ یوسف بن حجاج کے ظلم و ستم کے شکار خوارج کو اس نے پناہ دی۔ لیکن جب سفیان بن ابی الابرد الکلبی نے اس کے خلاف لشکر کشی کی تو فرخان نے خوارج کے خلاف اقدام کیا اور ان کے سرداروں کو قتل کر دیا۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں خراسان کے عامل یزید بن المہلب نے طبرستان کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ فرخان کا بیٹا دادبُرزمہر اس کا جانشین ہوا۔

فرّخی ۔ ابوالحسن علی بن جولوغ (وفات ۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء)

ایرانی شاعر۔ سیستان میں پیدا ہوا۔ تذکرۃ الشعرا میں دولت شاہ سمرقندی نے اُسے ترمذ کا بتایا ہے لیکن دراصل فرخی خود کو سیستان کا بتاتا تھا۔

فرخی، عنصری کا شاگرد تھا۔ فرخی کا والد، صفاری خاندان کے [illegible] ملازم تھا۔ فرخی کی ایرانیوں کے نزدیک وہی حیثیت ہے جو عربوں کے بیچ المتنبی کی ہے۔

فرخی بڑے اچھے شعر کہتا تھا اور چنگ بجانے میں ماہر تھا اور اپنے [illegible] کے ساتھ گایا کرتا تھا۔ اس کی موسیقی کا اثر اس کے اشعار میں جھلکتا تھا۔

فرخی کو تشبیب اور غزل کہنے میں کافی دسترس تھی۔ تشبیب کے اشعار [illegible] سادہ ہوتے لیکن ان میں گہرائی نہیں ہوتی تھی۔

فرخی کے کلام اور اس کے استاد عنصری کے کلام کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصری کے کلام میں گہرائی اور متانت ہے اور فرخی کے کلام میں سادگی اور روانی۔

ترجمان البلاغت، فن شاعری پر فرخی کا ایک یادگار رسالہ ہے۔

فرخی نے امیر چغانیاں ابوالمظفر کے دربار میں امیر کی مدح میں قصیدے [illegible] اسی طرح سلطان محمود غزنوی کے دربار سے بھی وابستہ رہا۔ سلطان محمود کے ہمراہ فرخی متعدد جنگوں میں رہا۔ اس نے جنگ کے مناظر کی اپنے کلام میں بہترین عکاسی کی ہے۔ فرخی نے مرثیے بھی کہے ہیں خصوصی طور پر محمود غزنوی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ اس قدر اثر انگیز ہے کہ پتھر دل بھی پسیج اٹھتا ہے۔ اس کا دیوان تہران سے ۱۳۰۵ھ میں [illegible]

فرد ۔ از روئے لغت واحد شے یا شخص، جس کے ساتھ دوسری نہ ملائی

گئی ہو۔ اس کی جمع عربی میں فُرَادَیٰ ہے۔ لہٰذا ناقابلِ تقسیم، یکتا، اس طرح موجود کہ اس کا تشخص علیٰ حالہٖ و علی الدوام قائم رہے۔ کسی بھی علم اور فن میں جب بھی لفظ فرد اصطلاحًا استعمال ہوا تو اس سے مقصود اس کے محمول کی انفرادیت پہ زور دینا ہوتا ہے۔

قواعدِ لغت میں فرد سے مراد مفرد ہے یعنی ایک شخص یا شے۔ ادب میں صرف ایک بیت (چاہے دونوں مصرعے مقفیٰ یا غیر مقفیٰ)، حدیث میں غریب مطلق، وہ حدیث جس کی ایک ہی سند ہو، جیسے بھی روایت کی جائے اس کا راوی ایک ہی ہو۔ متکلمین کے نزدیک وہ نوع جو قیدِ تشخص سے مقید، یعنی منفرد ہے۔ مابعد الطبیعات میں وہ ہستی جو قائم بالذات ہے۔ الٰہیات میں فرد کامل یا فردِ مطلق وہ ہستی جو توالد و تناسل سے پاک ہے، غنی ہے، بے نیاز ہے، کسی کی محتاج نہیں۔ کوئی اس کا ثانی اور ہمسر نہیں۔

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (سورۃ الشوریٰ)

ویسی کوئی شے نہیں۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ (سورۃ اخلاص)۔ اللہ بے نیاز ہے۔

فردوسی۔ (۹۴۱ء/ ۹۴۰ء – ۱۰۲۰ء)

ابو القاسم حسن، فردوسی ایران کے ایک عظیم شاعر۔ علاقہ طوس میں طابران کے قریب ایک گاؤں باژ کا رہنے والا۔ اس کے والد کے نام پہ مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کے آباؤ اجداد باژ میں کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔

فردوسی نے بعض روایات کی رو سے ۲۵ سال اور بعض کی رو سے ۳۵ سال کی محنت شاقہ سے "شاہنامہ" لکھ کر شہرت حاصل کی۔

شاہنامہ پچاس فصلوں پہ مشتمل ہے، ہر فصل ایک بادشاہ کے حالات پہ مشتمل ہے۔ شاہنامہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد عقل و دانش کا بیان ہے۔ پھر نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے۔ پھر شاہنامہ کے لیے مواد حاصل کرنے کے احوال کا ذکر ہے۔ شاہنامہ کی پچاس فصلوں میں مختلف بادشاہوں رستم، اردشیر بابکان، جمشید، فریدون، کیخسرو، نوشیرواں، خسرو پرویز، یزدگرد کا خاص طور پہ ذکر ہے۔ یزدگرد ساسانی حکمرانوں میں آخری تاجدار تھا، جسے عربوں نے شکست دے کر ایران میں اسلامی حکومت قائم کی تھی۔

فردوسی نے شاہنامہ کی تالیف اس لیے شروع کی تھی کہ وہ اپنی تنگ دستی اور پریشاں حالی کی وجہ سے اپنی بیٹی کا جہیز نہیں بنا سکتا تھا۔ شاہنامہ کی تالیف سے معقول رقم حاصل کر کے بیٹی کا جہیز بنانا تھا۔ اس دوران میں اس نے عشقیہ داستان "بیژن و منیژہ" کو نظم کیا۔ اپنے بیٹے کے اچانک انتقال پہ اس نے مرثیہ لکھا۔

۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء میں غزنی میں امیر سبکتگین کی وفات کے بعد سلطان محمود تخت نشین ہوا۔ فردوسی معقول انعام کی امید میں سلطان محمود کے دربار میں آیا اور وہاں چھ سال رہا۔ اس دوران شاہنامہ مرتب کر کے سلطان کو سناتا تھا اور دادِ تحسین حاصل کرتا تھا۔ سلطان نے دربار کے بعض حاسدوں کی بدگوئی سے متاثر ہو کر فردوسی سے ایفائے عہد نہ کیا۔ اور صرف بیس ہزار درہم دے کر ٹال دیا۔ فردوسی اس ناروا سلوک سے کافی رنجیدہ ہوا۔ بیس ہزار درہم وہاں ایک حمام میں غسل کرنے کے بعد حمامی اور عطار میں تقسیم کرنے کے بعد غزنی سے چلا گیا۔ دربدر بھٹکتا رہا۔ بالآخر طوس پہنچ کر سلطان محمود کی ہجو لکھی۔

محمود شیرانی نے جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت کی ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو نہیں لکھی تھی، بلکہ ہجو کے اشعار شاہنامہ میں بعد میں داخل کیے گئے۔

فردوسی۔

سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کے عہد میں بروسہ کا ایک ترکی شاعر۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر فردوسی سے ممیز کرنے کے لیے اسے فردوسی رومی یا فردوسی طویل کہتے ہیں۔ اس کی ضخیم تصنیف کی وجہ سے، جو کہ ۳۶۰ یا ۳۸۰ جلدوں پر مشتمل تھی۔ یہ ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا تھا جس میں فردوسی نے اپنے دور کے فلسفہ، تاریخ، ہیئت، انساب سے متعلق تمام علوم جمع کر دیے تھے۔ تاہم سلطان بایزید ثانی نے اس کی صرف ۸۰ اور بعض روایات کی رو سے ۹۹ جلدیں پسند کر کے باقی جلدیں نذرِ آتش کر دی تھیں۔ فردوسی کو اس حادثہ سے کافی دکھ ہوا اور اس نے بھی فارسی شاعر فردوسی کی طرح سلطان کے لیے ہجویہ اشعار لکھے تھے۔ بعد میں وہ ایران چلا گیا۔ وہاں ہی اس کا انتقال ہوا۔

فَرَزدَق۔ (۲۰ھ/ ۶۴۱ء – ۱۱۴ھ/ ۷۳۲ء – ۷۳۳ء)

ابو فراس ھمام بن غالب بن صَعْصَعَہْ الفرزدق بصرہ میں پیدا ہوا۔ اُموی دورِ خلافت کے تین مشہور ہجو گو عرب شاعروں میں سے ایک شاعر تھا۔ قبیلہ بنو تمیم کے ایک خاندان مجاشع بن دارم سے متعلق تھا۔ فرزدق کے باپ نے اسے جنگ جمل کے بعد حضرت علی کے پاس بھیجا تھا۔

معاصر ہجو گو شاعر جریر سے اکثر مقابلہ ہوتا رہتا۔ اموی دور کے اکثر حکمران اس سے ناراض رہے کیونکہ وہ اُن کی ہجو گوئی کیا کرتا تھا۔ عبد الملک پہلا خلیفہ تھا جس کی اس نے مدح سرائی کی اور اسی طرح خلیفہ سلیمان بھی اس پہ مہربان تھا۔ خلیفہ ہشام نے ایک بار ہجو گوئی کرنے پہ اُسے قید کر دیا تھا۔ فرزدق اہلِ بیعت کا مدح خواں تھا۔ اس لیے بھی اکثر اموی حکمران اُس سے ناراض رہتے تھے۔

الفرزدق نے ۱۱۴ھ/ ۷۳۲ء – ۷۳۳ء میں ذات الجنب کے عارضے سے بصرہ میں وفات پائی اور بنو تمیم کے قبرستان میں دفن ہوا۔

فرس۔

بمعنی گھوڑا۔ فرس عربی کا لفظ ہے۔ اسمِ جمع کے لیے الخیل بولا جاتا ہے۔ اشرف المخلوقات انسان کے بعد گھوڑا اپنی مخصوص صفات کی وجہ سے بہترین مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اسے عام سواری کے لیے کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ جنگوں میں اس کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ عرب مسلمانوں کی فتوحات میں گھوڑے کا بڑا اہم حصہ ہے اسی وجہ سے عربی نثر و کلام میں گھوڑے کا ذکر ملتا ہے۔ ابن الندیم نے کتاب الفرس، کتاب الخیل اور کتاب صفات الخیل میں ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے کی جنگی ضروریات کے پیشِ نظر قرآن مجید نے رباطُ الخیل (س۔ انفال، آیت ۶۰) کی اہمیت پہ زور دیا ہے۔

المسعودی نے مُرُوْجُ الذَّھَب میں گھڑ دوڑ کے متعلق بہت سی معلومات جمع کی ہیں۔ اُردو اور فارسی میں بہت سے "فرس نامے" اور "اسپ نامے" ہیں۔ ان میں رنگین کا فرس نامہ اور مرزا سودا کا گھوڑے پر مشہور قصیدہ خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان میں آج بھی گھوڑے کی سواری ایک محبوب مشغلہ ہے۔ گھڑ دوڑ، چوگان (گاف) کے علاوہ گھوڑے کو فوج اور پولیس کے دستوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ بازی کی جاتی ہے۔ گھوڑوں کو سدھا کر رقص کے کرتب بھی کروائے جاتے ہیں۔

گھوڑا نہایت وفادار اور اطاعت کیش جانور ہے۔ اس کی عادات میں شائستگی کا ثبوت۔ اس امر سے ملتا ہے کہ جب کسی تربیت یافتہ گھوڑے پہ کوئی شخص سوار ہو تو وہ لید اور پیشاب نہیں کرتا۔ اپنے مالک کو بخوبی پہچانتا ہے اور کسی غیر شخص کو سوار نہیں ہونے

دیتا۔ جب کسی دشمن یا درندے کی طرف سے حملے کا خطرہ ہو تو اپنے مالک کی ہر ممکن حفاظت کرتا ہے۔ گھوڑے کی ایک اور قابلِ ذکر عادت یہ ہے کہ وہ صرف میلا اور گدلا پانی پیتا ہے۔ صاف اور ساکن پانی میں اپنے عکس سے ڈرتا ہے اور اسے اپنے سم مار کر جھاگ دار اور گدلا کر کے پانی پیتا ہے۔

فرشتہ ۔ فرشتہ فارسی کا لفظ ہے اور اُردو میں بھی مستعمل ہے۔ عربی میں اس کے لیے مَلَک کا لفظ ہے اور جمع ملائکہ ہے۔ اس کے لغوی معنی پیامبر اور رسول کے ہیں، اسی لیے قرآن مجید میں فرشتوں کے لیے رُسُل (سورۃ ہود آیت ۶۹) کا لفظ بھی آیا ہے۔ فرشتے محض وہ مجرد قوت نہیں جو تشخص نہ رکھتی ہو، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ قرآن مجید میں انسان کی تخلیق کے متعلق تو ذکر ہے کہ یہ مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جنات کے متعلق ذکر ہے کہ وہ آگ سے بنائے گئے ہیں۔ لیکن فرشتوں کے متعلق ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ کس مادہ سے بنائے گئے ہیں۔

لیکن ابنِ ماجہ کی ایک حدیث سے، جس کی روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کی ہے، معلوم ہوتا ہے فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ جو زندگی اور بولنے کی صفات رکھتے ہیں۔ جن، شیطان اور فرشتوں میں نوع کے اعتبار سے فرق ہے۔ فرشتے نفسانی خواہشات اور غصّہ سے پاک ہیں۔ ان میں خداوند کریم کے احکام کی معصیت کی صلاحیت نہیں۔ انھیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی اطاعت کرتے ہیں اُن کی خوراک اللہ تعالےٰ کی تسبیح و تحمید ہے ...."

اللہ تعالےٰ فرشتوں سے اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام کے کام لیتا ہے۔ یعنی یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو اللہ تعالےٰ کی مخلوقات میں جاری اور نافذ کر دیتے ہیں۔ فرشتوں کو اس کے سوا کوئی ذاتی اختیار نہیں۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں۔ دنیا پر رحمت و عتاب کی جیسی بھی صورتیں نازل ہوتی ہیں وہ فرشتوں کے ذریعے ہی ہوتی ہیں اور اللہ تعالےٰ اپنے انبیاء کے لیے جو ہدایات و احکام بھیجتا تھا وہ فرشتوں کے ذریعے ہی بھیجتا تھا۔

فرشتوں کی مختلف ذمہ داریاں ہیں جن میں وہ مصروف رہتے ہیں۔ ان کی تعداد لامحدود ہے، جس کے متعلق قرآن اور نہ ہی سنت سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات کی رو سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے اور فرشتوں کو وجود بخشا گیا ہے، اس وقت سے فرشتے عرش پر اللہ کے گھر "بیت المعمور" کا طواف کرتے ہیں، جس فرشتہ کی ایک بار باری آ گئی ہے اس کی قیامت تک دوبارہ باری نہیں آئے گی۔

اسلام میں ایمانیات میں سے فرشتوں کے وجود پر بھی ایمان لانا ضروری ہے دیگر مذاہب میں بھی فرشتوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے بلکہ عیسائیوں کے اقانیم ثلاثہ میں ایک اقنوم یعنی روح القدس فرشتہ ہی ہے۔ پارسی اور ہندو مذہب کے پیروکار بھی فرشتوں کے وجود کو کسی نہ کسی انداز میں تسلیم کرتے ہیں۔ ان تمام مذاہب میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ رہی ہے۔ کبھی ان کو خالق کا مقام دے دیا جاتا ہے یعنی قابلِ پرستش اور کبھی مخلوق کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اہلِ عرب اسلام سے قبل فرشتوں کو اللہ تعالےٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے یونانی فلسفہ میں ان کو عقلِ اول اور عقول عشرہ، تمام عالم کے خالق کار قرار دیا جاتا ہے۔ اسلام کے ظہور سے فرشتوں کے متعلق تمام غلط قسم کے عقائد ختم ہو گئے۔

اسلامی تعلیمات نے انسانوں کو آگاہ کیا کہ فرشتے اللہ تعالےٰ کی نہایت مطیع و فرمانبردار مخلوق ہے اور ان کے ذمہ اللہ تعالےٰ کی اس کائنات کے مختلف کام ہیں۔ ان فرشتوں میں چار مشہور فرشتوں کے نام روایات کی کتب سے ملتے ہیں۔ جبرائیل، عزرائیل، اسرافیل اور میکائیل۔

جبرائیل، جو اللہ تعالےٰ کے پیغامات اس کے انبیاء اور رسولوں کو پہنچاتے ہیں۔ (سورت الحج، آیت ۷۵)

عزرائیل، جو انسانوں کی ارواح قبض کرتے ہیں۔ عزرائیل کو ملکُ الموت بھی کہتے ہیں۔ (سورۃ السجدہ آیت ۱۱)

اسرافیل۔ قیامت کے دن صور پھونکیں گے تو تمام جاندار مر جائیں گے۔

میکائیل۔ حضرت جبرائیل کے بعد میکائیل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ذمہ داری لوگوں کو رزق پہنچانا اور بارش برسانا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے جو جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے، جب اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو جبرائیل اور میکائیل نے ہی سب سے پہلے سجدہ کیا۔

اسی طرح کراماً کاتبین (سورۃ انفطار آیت ۱۱) دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ مقرر ہیں جو اس کے اعمال کو درج کرتے ہیں۔

اسی طرح فرشتے جنت اور جہنم کے محافظ بھی ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت اور عذاب کو انسانوں پر نازل کرنے کے لیے بھی فرشتے مقرر ہیں۔ روزِ قیامت کو اللہ تعالےٰ کا عرش اٹھانے والے آٹھ فرشتوں کا ذکر سورۃ الحاقہ میں آیا ہے۔ حدیث کی بعض روایات سے قبر میں انسانوں سے سوال کرنے والے منکر نکیر دو فرشتوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ حدیث کی روایات سے جنت کے داروغہ (نگہبان) فرشتہ کا نام رضوان اور جہنم کے نگہبان فرشتہ کا نام مالکؑ معلوم ہوتا ہے۔

فرشتے انسانی شکل میں بھی انبیاء کرام کے پاس آتے رہتے ہیں۔ سورۃ ہود میں ذکر ہے، جب فرشتے انسانی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آیا تھا (سورۃ مریم، آیت ۱۷)

حضرت جبرئیل کے نبی کریمؐ کی خدمت میں انسانی شکل میں آنے کی کئی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔

فرشتہ ۔ محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی المعروف بہ فرشتہ۔ مسلم مؤرخ، طبیّ مصنف اور احمد نگر و بیجا پور کے سلاطین کا ندیم تھا۔ اس کے باپ کا نام غلام علی ہندو شاہ تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نے گردشِ زمانہ سے تنگ آ کر ۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء میں بیجا پور میں پناہ لی تھی۔

فرشتہ کی شہرت اس کی مشہور تاریخ گلشن ابراہیمی کی وجہ سے ہے گلشن ابراہیمی تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں لکھی گئی تھی۔ ۱۷۶۸ء میں اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔

تاریخ فرشتہ ایک مستند تاریخ ہے جو تمام تر قدیم تواریخ، زبانی روایات اور خود فرشتہ کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے اس کا مقصد مسلمانوں کے شاندار دورِ حکومت کو بیان کرنا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں ہندوؤں کے عہد کی تفصیل زیادہ ملتی ہے۔

تاریخ فرشتہ کا آغاز مسلمان بادشاہوں کے واقعات اور مشاغل کے حالات سے ہوتا ہے۔ مقدمۂ تاریخ میں ہندوؤں کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ کتاب کے آخری باب میں ہندوستان کا جغرافیہ، ہندوؤں کی تاریخ شناسی اور ہندو راجاؤں کا ذکر ہے جو فرشتہ

کے زمانے میں باجگزار حاکم تھے۔

اہلِ یورپ اٹھارہویں صدی کے وسط تک فرشتہ کو ہندوستان کے اسلامی دور کا مستند مورخ مانتے تھے، لیکن سنین کی غلطیوں کی وجہ سے اب اُس پہ اعتماد کم ہوگیا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ پہ اب ایسی کتابیں دستیاب ہیں جن میں ہر تاریخی واقعہ کو تحقیق اور تنقید کی کسوٹی سے پرکھ کر درج کیا گیا ہے۔ اس لیے تاریخ فرشتہ جیسی کتاب کو اب مستند تاریخ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ درحقیقت تاریخ فرشتہ تاریخی واقعات کا ایک مجموعہ ہے۔

فرض

۔ یہ اصطلاح دین کے ان کاموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن کے کرنے کا سختی سے حکم دیا گیا ہو اور جن کا کرنا لازمی ہو۔ جن کے ترک کرنے پہ کفر لازم ہوتا ہے اور سزا ملتی ہے اور کرنے پہ جزا ملے گی۔

حنفی فقہا کے مطابق فرض وہ کام ہے جو دلیل قطعیہ یعنی قرآن، سنت، اجماع سے ثابت ہو جس میں شک کی گنجائش نہ ہو۔

فصول المحواشی صفحہ ۲۹۸ پہ فرض کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

"شرع میں فرض وہ کام ہے جو دلیل قطعیہ سے ثابت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں جس طرح اس کا ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح اس پہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ فصول المحواشی کے اسی صفحہ پہ واجب (ضروری) کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے: "شرع میں واجب وہ کام ہے جس کا ثبوت دلیل ظنی سے ہو جو شبہ سے خالی نہیں ہوتی۔

امام شافعی اور دوسرے فقہا کے نزدیک فرض اور واجب دونوں مترادف اور ہم معنی ہیں لیکن امام ابوحنیفہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ بعض اوقات حنفی حضرات بھی فرض اور واجب دونوں کو ایک ہی مفہوم کے ادا کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

دینی فرائض کے علاوہ انسان پہ معاشرتی، ملکی اور اخلاقی فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کی پابندی قانون اور معاشرت کی رو سے لازمی ہے۔ فرض اور واجب میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ فرض کو ضروری نہ ماننا کفر ہے اور واجب کو ضروری نہ ماننے سے کفر تو نہیں لازم ہوتا بلکہ گناہ ہوتا ہے، یہ اعتقادی حیثیت ہے۔ عملی طور پہ دونوں لازمی ہیں۔

فرضِ عین

۔ فقہا نے فرض کی دو قسمیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک فرض عین ہے۔ فرض عین جس کا ادا کرنا ہر مسلمان مرد، عورت کے لیے ضروری ہے سوائے کسی شرعی عذر کے، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔

فرض کفایہ

۔ وہ فرض جس کا ادا کرنا تمام مسلمانوں کے لیے ضروری تو ہے لیکن فرداً فرداً اگر تمام مسلمان اس فرض کو ادا نہ کریں اور صرف مسلمانوں کی جماعت میں سے چند افراد اُسے ادا کریں تو یہ سب کے لیے کافی ہے۔ چند افراد کی طرف سے ادا کرنے کو سب کی طرف سے ادا کرنا سمجھا جائے گا اور اگر کوئی بھی نہ ... تو سب کے لیے اس فرض کا ترک کرنا گناہ ہوگا۔ جیسے نماز جنازہ، رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں اعتکاف کرنا۔

علمائے اسلام نے فرضِ کفایہ میں مزید چند امور بھی بیان کیے ہیں:

(۱) سلام کا جواب دینا۔
۲۔ مریض کی عیادت کرنا اور اس کی ضروریات کے متعلق دریافت کرنا۔
۳۔ جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانا۔
۴۔ کھانے کی دعوت قبول کرنا۔
۵۔ چھینک کا جواب دینا۔
۶۔ کسی کے پوچھنے پہ مناسب مشورہ دینا۔
۷۔ کسی مسلمان کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنے کسی وعدہ کو پورا کرسکے اور اُسے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔

فرضہ

۔ وہ غیر معمولی محصول جو بالعموم کسی خاص مقصد کے لیے لگایا جاتا ہے عثمانی عہد حکومت میں مصر کے کسانوں پہ ۱۷۷۵ء میں محصول عائد کیا گیا۔ ۱۷۹۲ء میں اسے قانونی شکل دے دی گئی۔ اس محصول کی رقم معین نہ تھی۔ یہ محصول مختلف ضروریات کے پیشِ نظر عائد کیا جاتا تھا اور اسے مقامی ضروریات پہ خرچ کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمد علی پاشا نے بھی ایک محصول بلا تفریق مذہب و ملت عائد کیا۔ یہ محصول دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ۵۰۰ قرش تک کی آمدنی والے ہر شخص پہ عائد کیا گیا۔ اس سے آمدنی کا بارھواں حصّہ وصول کیا جاتا تھا۔ جب دفاعی ضروریات کے مصارف پورے ہوگئے تو یہ محصول موقوف کر دیا گیا۔ بعد میں یہ محصول دوبارہ ہر شخص پہ عائد کیا گیا۔ ہر مسلم اور غیر مسلم کے لیے اب اس کی شرح آمدنی کا آٹھ فی صد تھی۔ اس محصول کو فرضۃ الرؤس کہا جاتا تھا۔

فرع

یہ ایامِ جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اور یہ اونٹنی کے اس بچے کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے پیدا ہو۔ جہلائے عرب اس بچے کو اپنے بتوں کی قربانی کے طور پہ ذبح کیا کرتے تھے۔ شریعت نے اس کی مناہی کر دی۔

بعض کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ سے دستور تھا کہ جب کسی کے پاس سو اونٹ ہو جاتے تو وہ ایک اونٹ بتوں کے لیے ذبح کرتا۔ آغازِ اسلام میں بھی خدا کی نذر کے طور پہ یہ رسم جاری رہی مگر پھر منسوخ ہوگئی۔

فرعون

:۔ قدیم زمانہ میں مصر کے بادشاہوں کا لقب، زمخشری نے اپنی تفسیر الکشاف میں لکھا ہے کہ جس طرح روم کے بادشاہ قیصر، ایران کے بادشاہ کسریٰ، حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور ترکی کے بادشاہ خاقان کہلاتے تھے۔ اسی طرح مصر کے بادشاہوں کو فرعون کہا جاتا ہے اہلِ لغت نے فرعون کے مختلف معنی بیان کئے ہیں، لیکن ایک رائے یہ بھی ہے، جسے صاحب تفہیم القرآن نے درج کیا ہے: "لفظ فرعون کے معنی سورج دیوتا کی اولاد، قدیم اہلِ مصر سورج کو، جو اُن کا مہا دیوتا یا ربِ اعلیٰ تھا۔ رَع کہتے تھے اور فرعون اُسی کی طرف منسوب تھا۔ اہلِ مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے یہ معیار تھا کہ وہ رَع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو۔ اسی لیے ہر شاہی خاندان، جو مصر میں برسرِ اقتدار آتا تھا۔ اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا اور ہر فرماں روا فرعون کا لقب اختیار کر کے اہلِ مصر کو یقین دلاتا تھا کہ وہ اُن کا ربِ اعلیٰ یا مہا دیو ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرعون کے ذکر میں اس کا یہ دعویٰ بیان کیا گیا ہے۔ انا ربکم الاعلیٰ۔

تاریخی کتب میں مصر کے بادشاہوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر آیا ہے، جو مختلف ادوار میں رہے اور مختلف خاندانوں کی صورت میں اُن کی بادشاہت رہی، لیکن قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور سے متعلق دو بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے، جو فرعون کہلاتے تھے۔ تفسیر فتح البیان میں سورہ بقرہ کی تفسیر کے ذیل میں درج ہے "بقول اہلِ کتاب حضرت موسیٰ کے عہد کے فرعون کا نام قابوس تھا، مگر بقول وہب اُس کا نام ولید بن مصعب

بن الریان تھا۔ اس کی عمر چار سو برس تھی۔ حضرت موسیٰ کی ۱۴۰ برس۔" بائیبل میں مصر کے گیارہ بادشاہوں کا ذکر ہے۔ فرعونِ ابراہیمؑ، فرعونِ یوسفؑ، فرعونِ موسیٰ وغیرہ۔

امریکن انسائیکلوپیڈیا اور برٹانیکا اور تفسیر حقانی میں فراعنۂ مصر کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ اُس کے مطابق ۵۰۰ ۳ قبل مسیح سے بیکر اسکندر رومی تک مصر کے حکمرانوں کے تیس خاندان تھے، جن کے پھر تین دور کئے گئے ہیں، جو ساڑھے تین ہزار سال تک برسرِ اقتدار رہے اور اُن کی تعداد ۳۰۰ کے قریب تھی۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے واقعات میں جس فرعون کا ذکر ہے وہ انیسویں خاندان اور تیسرے دَور کا فرعون ہے۔ اس خاندان کی حکومت کا آغاز ۱۳۵۰ ق۔م کے بعد رعمسیس اوّل سے ہُوا۔ اس خاندان کا تیسرا بادشاہ رعمسیس ثانی تھا۔ اس کی حکومت کا آغاز ۱۳۰۳ ق۔م سے ہُوا۔ گو وہ باپ کے بڑھاپے کی وجہ سے عملاً پہلے سے ہی حکمران تھا۔ اس کی حکومت ۶۷ برس تک رہی عام خیال ہے کہ جس فرعون کے گھر حضرت موسیٰ نے پرورش پائی تھی اسی کے ساتھ بعد میں مقابلہ کرکے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کرلے گئے، لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ جس فرعون کے گھر حضرت موسیٰ کی پرورش ہُوئی وہ رعمسیس ثانی تھا اور جس کا حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ ہُوا، وہ منفتہ یا منفتاح تھا۔ اس کی تائید بائیبل اور تلمود کے اس متفقہ بیان سے ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانۂ قیام مدین میں وہ فرعون مرچکا تھا، جس کے ہاں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ حضرت موسیٰ اُس کے محل میں چالیس برس رہے تھے۔ جب ایک قبطی آپ کے مُکّے سے ہلاک ہوگیا، تو آپ مدین چلے گئے۔ وہاں حضرت شعیب کے ہاں رہے اور اُن کی ایک بیٹی سے حضرت موسیٰؑ کی شادی ہوئی۔ وہیں آپ نے وادیٔ ایمن میں اللہ تعالےٰ سے کلام کیا اور آپ کو فرعون کے ہاں جانے کا حکم ملا۔

اِذْهَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی

جب حضرت موسیٰ مصر میں داخل ہوئے تو رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح اس کا جانشین بادشاہ تھا اور یہ دوسرا فرعون تھا، جس سے حضرت موسیٰ کو واسطہ پڑا تھا۔ اُسی نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تھا، جب بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ مصر سے نکال کر ساتھ لے جارہے تھے اور اللہ تعالےٰ کے حکم سے سمندر میں اُن کے لیے راستہ بنا تھا۔ جب فرعون اور اُس کا لشکر اُسی راستے پر اُترا تو پانی کے دوبارہ آنے سے وہ بمعہ لشکر کے دریا میں غرق ہوگیا تھا۔ علامہ جوہری طنطاوی مصری نے اپنی تفسیر جواہر القرآن کی جلد ۶ میں مصر کے ایک محقق ومفتش کے حوالے سے اس بات کو درج کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا واسطہ دو فرعونوں سے پڑا تھا اور صاحبِ تفہیم القرآن سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۃ الاعراف کی تفسیر میں بھی دو فرعونوں کا ذکر کیا ہے۔

فراعنہ کے تیرھویں اور چودھویں خاندانوں کی حکمرانی کے دوران مرکزی حکومت کمزور ہوگئی تو بابلی بادشاہ مصر کے حکمران ہوئے۔ اُن کو بھی فراعنۂ مصر میں شمار کیا جاتا ہے۔ انیسویں خاندان کی حکومت کا آغاز رعمسیس اوّل (۱۳۱۵ ق۔م) سے ہُوا جس کی حکومت دو برس تک رہی۔ اس کے بیٹے ساتی اوّل کے دَورِ حکومت کے بعد رعمسیس دوم چھوٹی عمر میں تخت نشین ہُوا۔ اُس نے لبنان کے حطیوں سے جنگ کی اور اُن پر فتح پائی۔ ۱۲۵۰ ق۔م میں حطیوں کے سردار نے اپنی بیٹی کی شادی فرعون سے کی۔ اس کے بیٹے منفتاح نے بھی اپنے دورِ حکومت میں کچھ فتوحات کیں۔ لیکن اُس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہُوا۔ اور بعد کے فراعنۂ مصر کا دورِ حکمرانی مختصر ہُوا۔

فراعنۂ مصر کے اس سلسلہ میں ایک فرعون امیئس دوم تھا جس کا عہدِ حکومت ۵۷۰ تا ۵۲۶ ق۔م تھا۔ دورِ حکومت کے آغاز میں اُس نے شاہ ایران خورس کے دشمنوں سے سازباز شروع کردی، بالآخر یہی سازباز فراعنۂ مصر کے زوال کا سبب بنی۔ امیئس دوم نے ۴۴ سال حکومت کی۔ اُس کے انتقال کے بعد ۵۲۵ ق۔م میں کیقباد کی قیادت میں ایرانیوں نے امیئس دوم کے لڑکے کو تخت سے اتار کر مصر پر اپنی حکومت قائم کرلی ۴۰۵ ق۔م میں فراعنۂ مصر پھر ملک پر قابض ہوگئے اور فرعون امستیس نے داریوس دوم کو شکست دیکر انتیسویں خاندان کی حکومت کا آغاز کیا۔ اس خاندان کا دورِ حکومت مختصر تھا۔ فراعنۂ مصر کے تیسویں خاندان کا آخری بادشاہ نختشب تھا، جسے یونانیوں نے شکست دی اور بعد میں ۳۴۱ ق۔م میں یہی بادشاہ بھاگ کر حبشہ چلا گیا۔ اس پر فراعنۂ مصر کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کے واقعات میں فرعون کے لیے "اِنَّهٗ طَغٰی" یعنی سرکش باغی، "وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ" (سورۃ الفجر آیت ۱۰) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

قرآن مجید میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ہمراہ بحفاظت نکل گئے، لیکن فرعونِ مصر منفتاح، جو اُن کے تعاقب میں تھا، اپنی فوج کے ہمراہ بحیرۂ قلزم میں غرق ہوگیا۔ یہ فرعون اپنے باپ کا تیرھواں بیٹا تھا اور ۲۵ سال تک حکمران رہا۔

قرآن مجید میں فرعون کے غرق ہونے کا نقشہ اس انداز میں بیان ہُوا ہے:۔

"یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا، بولا: میں نے یقین کرلیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اُس کے جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی فرمانبرداروں میں سے ہوں" (سورۃ یُونس آیت ۹۰)

لیکن غرق ہونے کے وقت ایمان لانے کی یہ صورت اُس کے کسی کام نہ آئی۔ البتہ اللہ تعالےٰ نے اُس کے بدن کو ڈوبنے سے بچالیا۔

"سو آج ہم تیرے بدن کو بچائے دیتے ہیں، تاکہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی (عبرت) رہے" (سورۃ یونس آیت ۹۲)

چنانچہ اس کی لاش سطحِ سمندر پر آگئی اور کنارے سے لگ گئی اور اُسے حنوط کرکے مصر کے اہرام میں محفوظ کردیا گیا۔ قاہرہ کے عجائب گھر میں رعمسیس [illegible] دونوں فرعونوں کی لاشیں حنوط شدہ ممیوں کی صورت میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق (مصنف کتب کثیرہ) نے اپنے ایک مضمون [illegible] موسیٰ کی لاش"، مطبوعہ ماہنامہ میثاق لاہور (مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء) [illegible] تفہیم القرآن کے ایک خط (مکتوبہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۰ء) کے حوالے [illegible] کے متعلق حقائق کا انکشاف کرتے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"غرق شدہ فرعون کے بارے میں زیادہ تر معلومات مجھے [illegible] (GOLDING) کے سفرنامے [illegible] THE [illegible] LAW GIVER [illegible] سے حاصل ہوئی ہیں۔ ولیم گولڈنگ [illegible] سفرنامے میں لکھتا ہے کہ رعمسیس دوم وہ فرعون تھا جس کے زمانے میں [illegible] ہوئے اور بنی اسرائیل پر جس کے مظالم مشہور ہیں۔ [illegible] OF PERSECUTION [illegible] فرعونِ عقوبت [illegible] فرعون کے زمانے میں حضرت موسیٰ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اور [illegible] وہ رعمسیس کا بیٹا منفتاح (MINEPTAH) تھا۔

برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے مضمون ممی (MUMMY) [illegible] ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ سر گرافٹن ایلیٹ سمتھ نے ممیوں کو کھول کر [illegible] تحقیق شروع کی تھی اور چوالیس ممیوں کا مشاہدہ کیا تھا گولڈنگ [illegible] ہے کہ ۱۹۰۷ء میں منفتاح کی ممی ملی۔ اس کی پٹیاں کھولی گئیں تو سب [illegible] کر حیران رہ گئے کہ اس کے جسم پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہ پائی گئی۔ گولڈنگ مزید لکھتا ہے کہ فرعون بحیراتِ مُرّہ (یعنی کڑوے پانی کی وہ جھیلیں جو بحیرۂ احمر اور بحیرۂ قلزم کے مابین واقع تھیں۔ اب نہر سویز کا حصہ بن گئی

ہیں -) میں غرق ہوا تھا۔ آگے مزید لکھتا ہے جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی "جبل فرعون" کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں گرم پانی کا ایک چشمہ ہے" جسے حمام فرعون" کہا جاتا ہے اور سینہ بہ سینہ روایات کے مطابق فرعون کی لاش اسی جگہ سے ملی تھی۔

۱۹۷۷ء میں قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑی ممیوں سے ایک کے متعلق انکشاف ہوا کہ خراب ہو رہی ہے، جو اتفاقاً روایت کے مطابق فرعون موسیٰؑ کی ممی تھی۔ اُس ممی کو بڑے اہتمام سے فرانس لے جایا گیا اور وہاں ماہر ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بنایا گیا۔ اُس میڈیکل بورڈ نے ممی کے خراب ہونے کی وجوہات اور آئندہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے اقدامات و تجاویز پر غور کیا۔ قرآن مجید نے فرعون اور موسیٰؑ کے حالات کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے :-

سورۃ البقرہ۔ آیات ۴۹ کے بعد، سورۃ آل عمران آیت ۱۱

سورۃ الاعراف۔ رکوع ۱۳ تا ۲۱ (آیت ۱۰۳ کے بعد) میں موسےٰؑ فرعون اور بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر ہے۔

سورۃ الانفال آیت ۵۲ تا ۵۴، سورۃ یونس آیات ۷۵ تا ۹۲۔

سورۃ ہود۔ آیت ۹۷، سورۃ ابراہیم۔ آیت ۶

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱ تا ۱۰۴، سورۃ طٰہٰ آیت ۲۴ سے ۱۰۹ تک موسیٰؑ فرعون اور بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر ہے۔

سورۃ المومنون آیت ۴۶، سورۃ الشعراء میں آیات ۱۱ تا ۶۶

سورۃ نمل آیت ۱۲، سورۃ القصص۔ آیات ۳ تا ۴۲

سورۃ العنکبوت۔ آیت ۳۹، سورۃ المومن آیات ۲۴ تا ۳۷

قرآن مجید فرعون کی اُس نیک بیوی کا ذکر بھی کرتا ہے، جو اُس کے بُرے کاموں میں شریک نہ تھی" اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کیلئے ایک مثال فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی کہ اُس نے اللہ کی بارگاہ میں گذارش کی: اے میرے رب! میرے لیے جنت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اُسکے اعمال سے نجات عطا کر اور ظالم لوگوں سے مجھے نجات دے (سورۃ تحریم آیت ۱۱)

فرغانہ ۔ تین سو کیلومیٹر لمبی اور ستر کیلومیٹر چوڑی سیر دریا کے وسط میں ایک وادی کا نام ہے۔ خاص طور پر اس علاقے کو فرغانہ کہتے ہیں جو شمال میں سلسلہ ہائے کوہ چتقل، مشرق میں کوہستانِ فرغانہ اور جنوب میں سلسلہ ہائے کوہ الائی سے ملتی ہے۔ دریا کے جنوبی کنارے پر ایک کھلی جگہ کے ذریعے وادیٔ فرغانہ دوسرے علاقوں سے مربوط ہے۔ موجودہ روسی حکومت کے تحت شمالی، شمال مشرقی اور جنوبی کوہستان وادیوں کو، وادیٔ فرغانہ میں شامل کر کے ایک ضلع بنا دیا گیا ہے۔ ضلع فرغانہ کا رقبہ ۴۰۸۰۰ مربع میل ہے جس میں اصل وادی کا رقبہ ۱۲۰۰۰ مربع میل ہے۔ چار ہزار مربع میل رقبہ دریا سے سیراب ہوتا ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد ترک کچھ علاقوں میں آباد ہوئے۔ انیسویں صدی عیسوی میں روسی بھی ان علاقوں میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔

۱۰۴ ق م اور ۱۰۱ ق م میں چینیوں نے فرغانہ پر حملے کیے۔ چینی تاریخ کی کتب سے فرغانہ کے قدیم حالات سے پتہ چلتا ہے۔ ایک چینی تانگ شو کے بیان کے مطابق اس ملک پر ایک ہی خاندان تیسری سے ساتویں صدی عیسوی تک حکمران رہا۔ ۶۲۷ء سے ۶۴۹ء کے درمیان ترک خاندان فرغانہ پر قابض ہو گیا۔

فرغانہ کے بادشاہوں نے عرب فاتحین کا زبردست مقابلہ کیا، مسلمانوں کو اس ملک کو فتح کرنے میں تقریباً ایک سو سال لگ گئے۔ پہلا حملہ قتیبہ بن مسلم کی زیر سرکردگی ۹۴ھ/ ۷۱۲ء۔ ۷۱۳ء میں ہوا۔ بعض روایات کے مطابق قتیبہ کے انتقال کے بعد یہ وادی مسلمانوں سے خالی کرالی گئی۔ نصر بن سیار حاکم خراسان نے ۱۲۱ھ/۷۳۹ء میں فرغانہ میں اپنا عامل مقرر کیا۔ اس بار بھی عرب حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ عباسی خلافت میں خلیفہ منصور، خلیفہ مہدی، ہارون الرشید، مامون الرشید کے زمانے میں بھی فرغانہ کے علاقے پر لشکر کشی کی گئی۔ فرغانہ کے پہاڑوں سے سونا۔ چاندی۔ پارہ۔ نفت (پیٹرولیم) فیروزہ تانبا، سیسہ اور نوشادر حاصل کیے جاتے رہے ہیں۔

فرغانہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں ترکوں کے ہاتھ فتح ہوا۔ مختلف ادوار میں فرغانہ پر مختلف خاندانوں کے بادشاہ حکومت کرتے رہے۔

چینیوں کی بھی اس علاقہ پر ایک طویل عرصہ تک حکومت رہی۔ آج کل اس علاقہ پر روسی حکومت قائم ہے۔

فرغانی دسویں صدی عیسوی کے دو مؤرخوں ابو محمد عبداللہ بن احمد بن جعفر (۲۸۲ھ/۸۹۵ء-۸۹۶ء تا ۳۶۲ھ/ ۹۷۲ء-۹۷۳ء) اور اس کے بیٹے ابو منصور احمد بن عبداللہ (۳۲۷ھ/ ۹۳۹ء تا ۳۹۸ھ/ ۱۰۰۷ء) کے نام۔

عبداللہ کے جدِ اعلیٰ عراق سے فرغانہ آنے پر المعتصم کے عہد میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عبداللہ فرغانی، شہرۂ آفاق مورخ اسلام امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کا شاگرد تھا اور اس نے استاد کی تصانیف کی روایت و اشاعت کی۔ اس نے طبری کی تاریخ کا ایک تتمہ لکھا۔ بعد میں وہ مصر چلا گیا وہاں اس کے ایک بیٹا ہوا۔ اُس نے بھی طبری کی تاریخ پر ایک تتمہ، مزید صِلَۃ الصِّلَۃ کے نام سے لکھا۔

فرقان ۔ بمعنی دلیل۔ برہان۔ حق اور باطل میں امتیاز کرنے والی چیز۔ اس لیے قرآن مجید کو "الفرقان" کہا گیا ہے کہ وہ حق و باطل میں واضح فرق بتاتا ہے۔ (س۔ بقرہ۔ آیت ۱۸۵)

قرآن مجید کی پچیسویں سورۃ کا نام بھی الفرقان ہے۔

سورۃ انفعال کی آیت ۴۱ میں "یوم الفرقان" جنگ بدر کے فیصلہ کن دن کو کہا گیا ہے۔ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ قرآن کو اس معنی میں بھی فرقان کہا گیا ہے کہ یہ متفرق حصوں میں نازل ہوا ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۵۳ میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ "فرقان" ایسے دین کے علم اور فہم کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ مفسرین نے اسے تورات کی ایک صفت بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الانبیا کی آیت ۴۸ میں بھی فرقان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہاں بھی تورات کی صفات میں سے یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ تورات حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب ہے۔

فرقہ ۔ کسی جماعت یا اجتماعیت کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہونا۔ بڑے گروہوں کو فرقہ کہتے ہیں۔ اور چھوٹے گروہوں کو طائفہ کہتے ہیں۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو" اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اُس اختلاف کی مذمت کرتا ہے، جو نفسیاتی خواہشات اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی تک پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اُس رسی کو جو "حبل اللہ المتین" ہے پکڑنے کو کہتا ہے، یعنی اتحاد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

قرآن مجید اُس اختلاف رائے کا مخالف نہیں جو دین میں متفق اور اسلامی نظام جماعت میں متحد رہ کر محض احکام و قوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے۔ یہ اختلاف معاشرہ کی ترقی اور زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس قسم کے اختلاف کی کئی مثالیں نبی کریمؐ کے سامنے پیش

آچکی ہیں۔ آپؐ نے اس قسم کے اختلاف رائے کو پسند فرمایا ہے کیونکہ یہ اختلاف اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اُمت میں غور و فکر، تحقیق اور فہم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس صورت میں جو اختلاف رائے سامنے آتا ہے، وہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت میں رہ کر، قرآن و سنت پر اتفاق رائے کرتے ہوئے دو عالموں یا دو ججوں کے درمیان ہوتا ہے دونوں اپنی اپنی رائے کو مدار دین نہیں بناتے اور نہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والے پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل کے ذریعے کسی مسئلہ پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور دونوں میں سے کسی بھی رائے کو اپنایا جاسکتا ہے۔

حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی مسئلہ پر ایسا صحت مند اختلاف صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی ہوا اور بعض مسائل پر مشورہ کے دوران صحابہ کرامؓ نے نبی کریمؐ کی رائے سے بھی اختلاف کیا ہے۔ صحابہ کرام کے درمیان قرآن مجید کی آیات کی تفسیر میں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے کسی اختلاف کی وجہ سے کسی صحابیؓ نے اُمت مسلمہ سے ہٹ کر اپنا کوئی الگ سا گروہ یا فرقہ نہیں بنایا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے آگاہ تھے کہ دین میں تفرقہ بندی کرنے والے ظالم ہیں اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول کریمؐ نے بھی اتحاد و اتفاق کا حکم دیا ہے اور اختلاف و تفرقہ سے منع فرمایا ہے بایں ہمہ اُمت میں جو اختلاف اور بہت سے فرقے پائے جاتے ہیں اُن سے کافی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اختلاف کو اصولی طور پر رکھا جائے اور اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے دوسروں سے نفرت نہ کی جائے۔

فرقہ بندی کے سلسلہ میں دو انتہا پسند مسلک پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسلک یہ ہے کہ احقاق حق کے لیے تحقیق کی خاطر دیانت دارانہ اختلاف رائے ہونا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی مصلحت اور مفاہمت اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ مصلحت کو مقدم رکھا جائے اور کسی بھی مسئلہ پر اختلاف نہ کیا جائے۔ یہ دونوں قسم کے نقطہ نظر افراط و تفریط پر قائم ہیں۔

درحقیقت تعبیر میں اختلاف ایک قدرتی امر ہے اور یہ فرقہ بندی پیدا نہیں کرتا لیکن یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب اختلاف کی بنیاد حق و دیانت اور اخلاص پر ہو۔ ایسا اختلاف رفع ہو سکتا ہے، لیکن جب اختلاف نفسانی اغراض اور تعصب پر مبنی ہو، تو یہ مستقل فرقہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی واضح مثال اس طرح ہے کہ عہد صحابہؓ میں جو اختلافات ہوئے وہ اخلاص پر مبنی تھے۔ اس لیے جلد ہی ختم ہو گئے۔ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ میں اختلافات ہوئے ان کا ذکر شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں کیا ہے۔

۱۔ رسول کریمؐ کے مرض الموت میں قلم دوات طلب کرنے کا واقعہ۔
۲۔ جیش اسامہؓ کی روانگی کا مسئلہ۔
۳۔ رسول کریمؐ کی وفات، کہ کیا آپ وفات پا سکتے ہیں یا نہیں؟
۴۔ آپ کو دفن کہاں کیا جائے۔
۵۔ خلافت کی منتقلی کا مسئلہ۔
۶۔ باغ فدک کا معاملہ۔
۷۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ۔
۸۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنا۔
۹۔ تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں شوریٰ کا اختلاف۔
۱۰۔ حضرت علیؓ کے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سے اختلافات

چونکہ یہ تمام اختلافات ایک نئی صورت حال میں صحیح تعبیر کی تلاش میں اصولی نوعیت کے تھے۔ اور ان کی بنیاد حق اور اخلاص پر تھی۔ اس لیے ان اختلافات کی وجہ سے مستقل فرقے نہیں بنے۔

بعض حضرات نبی کریمؐ کی اس حدیث کو فرقہ بندی کے حق میں استعمال کرتے ہیں:
"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں: نبی کریمؐ نے فرمایا، میری اُمت بنی اسرائیل کی طرح فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی" (کتاب الفتن ابن ماجہ)

یہ حدیث ہر لحاظ سے واجب الاحترام ہے، لیکن اس کی تعبیر کرتے [illegible] فرقوں کی کثرت کو ناگزیر بنانا زیادتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ نے بنی اسرائیل کی مثال بیان فرما کر مسلمانوں کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی حدود کو چھوڑ کر آپس میں تفرقوں کی صورت نہ پیدا کر لینا، کیونکہ تفرقوں کی وجہ سے بنی اسرائیل تباہ ہو گئے۔ اس حدیث مبارکہ میں فرقوں کے لیے ترغیب نہیں دی گئی اور نہ ہی فرقوں کے لیے اس حدیث سے جواز نکلتا ہے بلکہ وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران ۱۰۳) کی روشنی میں فرقے بازی کے خطرناک انجام سے بنی اسرائیل کی تمثیل کے ذریعے متنبہ کیا ہے۔

اختلاف ایک فطری امر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبائع اور [illegible] ایک دوسرے سے فرق رکھا ہے۔ مسلمانوں میں سیاسی اور عقائد کے معاملات پر اختلافات ہوئے ہیں، لیکن ہر اختلاف سے فرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ دیانت دارانہ اختلاف رائے تو نبی کریمؐ کی حدیث "اختلاف اُمتی رحمۃ" کی رو سے باعث رحمت بن سکتا ہے اس لیے کہ اختلاف رائے کے ذریعے مختلف احکامات کی تعبیر کے لیے اجتہاد کے دروازے کھلتے ہیں اور دین کے حقائق واضح و روشن ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اختلاف رائے نہ ہونے سے اُمت میں جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں میں اختلاف اکثر سیاسی مسائل پر ہوا۔ مسلمانوں کے [illegible] اختلافات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اصولی اختلافات۔ اسلام کے سیاسی نظام یعنی امامت و خلافت کے مسئلہ پر اختلاف جس سے دو گروہ سامنے آئے۔ اہل سنت اور شیعہ۔
۲۔ ہنگامی نوعیت کے اختلافات۔ عقائد کے مسئلہ پر چند متفرق نقطہ نگاہ رکھنے والے مسالک۔ جو اب موجود نہیں ہیں، مثلاً جبریہ، قدریہ، معتزلہ وغیرہ۔
۳۔ فقہی اختلافات۔ فروعی مسائل پر فقہی مسالک۔ مثلاً اہل سنت میں آئمہ اربعہ کے مذاہب اور چند دوسرے مذاہب، جن کا اب وجود نہیں [illegible] شیعہ مذہب کے ذیلی فرقے۔
۴۔ سیاسی اور قبائلی اختلافات۔

جو اصحاب نبی کریمؐ کی مذکورہ حدیث سے مسلمانوں میں ۷۳ فرقوں کے ہونے کی صورت نکال لیتے ہیں وہ جب ان فرقوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں تو فرقوں کی تعداد [illegible] ہو جاتی ہے۔ اختلاف رائے کی شدت کی وجہ سے [illegible] بھی گئے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے [illegible] شیعہ مسالک کے [illegible] اپنی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" میں ذکر کیا ہے۔

ابتدا میں فرقوں کی تعداد کم تھی۔ پھر بعد کے ادوار میں [illegible] چنانچہ معمولی اختلافات کی بنا پر ذیلی مسالک نے مستقل فرقوں کا نام دے دیا۔

الاشعری نے (م ۳۲۴ھ/ ۹۳۶ء) اپنی کتاب مقالات الاسلامیین میں ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جو وجہ اختلاف بنے۔ ان میں مسئلہ امامت کا ذکر سب سے پہلے ہے۔ اس مسئلہ کی حیثیت بنیادی ہے۔ کیونکہ طرز حکومت کے معاملہ میں [illegible] نظر کار فرما ہیں، ایک مؤقف شخصی موروثی طرز حکومت [illegible] امامت کے [illegible] نظریہ، دوسرا مؤقف شورائی نظام یعنی خلافت۔ یہاں تک کہ مسئلہ امامت [illegible] اختلافی معاملات [illegible] نظر آتا ہے۔ شہادت عثمانؓ، جنگ جمل، جنگ صفین اور بعد کے

معاملات میں اصولی وجۂ نزاع امامت تھی جو مختلف احوال مقامات اور اشخاص سے متعلق ہو کر نمائی ذیلی شاخوں میں پھیلتی چلی گئی۔

مقالات اسلامیین میں مذکورہ فرقوں کا اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصولی فرقے تھوڑے ہیں لیکن ذیلی نقطۂ نظر کی وجہ سے فرقوں کی کثرت معلوم ہوتی ہے اصولی فرقوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نظر نہیں آتی۔

۱۔ اہل سنت (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی۔ اصحاب الحدیث و اہل حدیث) وغیرہ۔

۲۔ شیعہ۔ (علویہ، زیدیہ، امامیہ، اسماعیلیہ وغیرہ)

۳۔ خوارج۔ (ریاضیہ، اباضیہ، ازرقیہ وغیرہ)

۴۔ مرجیہ۔ (راجیہ، شاکیہ، تارکیہ وغیرہ)

۵۔ معتزلہ۔

اہل سنت کے عروج کے بعد مرجیہ اور معتزلہ آہستہ آہستہ اصولی فرقوں میں مدغم ہو گئے۔ ابو منصور عبد القاہر بن طاہر بن محمد البغدادی (م ۴۲۹ھ/ ۱۰۳۷ء) نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں اہل سنت کے علاوہ ۷۲ فرقوں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ شیعوں خوارج اور قدریہ کے بیس بیس، مرجیہ کے دس، نجاریہ اور کرامیہ کا ایک ایک فرقہ ہے۔ عبد القاہر البغدادی فرقوں کی مزید تقسیم اس طرح کرتا ہے۔

۱۔ فرق الاہواء الضالۃ، خواہشات نفسانی پر قائم گمراہ فرقے۔

۲۔ الفرقۃ الناجیۃ

شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں بیان کیا ہے کہ اصل فرقے تو چار ہیں اور باقی ان میں سے نکلے ہیں اور ان فرقوں کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

۱۔ قدریہ، ۲۔ صفاتیہ، ۳۔ خوارج، ۴۔ شیعہ۔

بہر حال اُمت مسلمہ کے ان فرقوں میں بڑے فرقے صرف دو ہیں سُنّی اور شیعہ یہ افکار و عقائد میں ایک دوسرے کے نسبتاً قریب ہیں۔

نبی کریمؐ کی مذکورہ حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ۷۳ فرقوں میں ایک فرقہ ناجیہ ہوگا اور باقی ۷۲ فرقے جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرامؓ کے سوال کرنے پر نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ناجی فرقہ وہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقہ پر چلے گا۔ مسلمانوں میں موجود ہر فرقہ خود کو "ناجی" فرقہ کہلاتا ہے۔

اہل سنّت یعنی سنّیوں میں دین کے فروعی مسائل کے نقطۂ نگاہ سے چار مشہور مسلک ہیں جو اپنے اپنے آئمہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کو اصطلاحاً مقلد بھی کہتے ہیں۔

۱۔ حنفی۔ جو امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے پیروکار ہیں۔ امام ابو حنیفہ عراق کے دارالحکومت کوفہ میں ۸۰ھ/ ۷۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے نبی کریمؐ کے چار صحابہ کرامؓ کو پایا ہے۔ وہ فقہ میں امام اعظمؒ تسلیم کئے جاتے ہیں اور اُن کے دو شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد حنفی فقہ کے مدون مانے جاتے ہیں حنفی ترکی، وسطی ایشیا اور شمالی ہند کے علاقے (پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ) میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ شافعی۔ جو امام محمد بن ادریس الشافعی کے پیروکار ہیں۔ امام شافعی فلسطین کے علاقہ عسقلان میں ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ شافعی مصر اور جنوبی ہند کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

۳۔ مالکی۔ امام مالکؒ بن انس کے پیروکار ہیں۔ امام مالک مدینہ میں ۹۵ھ/ ۷۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی امام ابو حنیفہ سے بھی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور وہ اپنے وقت کے نامور عالم تھے مالکی مراکش اور افریقہ کے ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

۴۔ حنبلی۔ جو امام ابو عبداللہ احمدؒ بن محمد بن حنبل کے پیروکار ہیں۔ امام حنبل بغداد میں ۱۶۴ھ/ ۷۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ حنبلی مشرقی عرب اور افریقہ کے بعض ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

"وہابی" نام سے معروف مسلک کے پیروکار بھی حنبلی مسلک سے ہی نکلے ہیں جو بعض مسائل میں محمد بن عبدالوہابؒ کی تقلید کرتے ہیں۔

ان چار اہل سنت کے مسالک میں سے کئی اور فرقے بھی بنے ہیں۔ اکثر علماء اُمّت مسلّمہ میں فرقوں کی تقسیم کو مانتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اسلام میں ۱۵۰ فرقوں کو بیان کرتے ہیں "غیاث اللغات" میں اسلام کے ۷۳ فرقوں کا ذکر ہے، جن میں سے ایک ناجیہ فرقہ اہل سنّت کا ہے باقی چھ گروہوں میں تقسیم ہیں۔

(۱) رافضیہ (۲) خارجیہ (۳) جبریہ (۴) قدریہ (۵) جہمیہ (۶) مرجیہ

پھر ان میں سے ہر ایک کے بارہ بارہ گروہ ہیں۔

رافضیہ فرقے حسب ذیل ہیں (۱) علویہ۔ جو حضرت علیؓ کو نبی کہتے ہیں (۲) ابتریہ۔ حضرت علیؓ کو شریک نبوت سمجھتے ہیں۔ (۳) شیعہ۔ جو کہتے ہیں کہ جو شخص حضرت علی کو تمام صحابہ سے افضل نہ سمجھے وہ کافر ہے۔ (۴) اسحاقیہ کہتے ہیں کہ نبوت ختم نہیں ہوئی۔ (۵) زیدیہ کہتے ہیں کہ نماز کی امامت میں سوائے اولادِ علیؓ کے اور کوئی شخص نہیں چاہیئے۔ (۶) عباسیہ۔ جو عباس بن عبد المطلب کے سوا اور کسی کو امام نہیں سمجھتے۔ (۷) امامیہ جو زمین کو امام غیب سے خالی نہیں جانتے اور نماز صرف بنی ہاشم کے پیچھے ہی پڑھتے ہیں (۸) نادسیہ۔ جو کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسرے پر فاضل جانے وہ کافر ہے۔ (۹) متناسخیہ کہتے ہیں کہ جب جان قالب سے نکل جاتی ہے تو جائز ہے کہ دوسرے قالب میں چلی جائے۔ (۱۰) لاعنیہ جو حضرت طلحہؓ، زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ پر لعنت کرتے ہیں۔ (۱۱) راجعیہ۔ جو کہتے ہیں کہ علیؓ پھر دنیا میں آئیں گے۔ (۱۲) مرتضیہ۔ جو کہتے ہیں کہ مسلمان بادشاہ کے ساتھ جنگ کرنا جائز ہے۔

خارجیہ فرقے حسب ذیل ہیں :- (۱) ازرقیہ۔ جو کہتے ہیں کہ خواب میں کوئی شخص نیکی نہیں دیکھتا کیونکہ وحی منقطع ہو گئی ہے۔ (۲) ریاضیہ۔ جو کہتے ہیں کہ ایمان قول صالح، عمل صالح، نیت اور سنت ہے۔ (۳) ثعلبیہ کہتے ہیں کہ ہمارے کام خدا تعالےٰ کی خواب میں حاصل ہوتے ہیں نہ اس کی قدرت اور خواہش سے۔ (۴) خازمیہ کہتے ہیں کہ فرضیت ایمان معلوم نہیں ہوئی۔ (۵) خلفیہ کہتے ہیں کہ کفار کے مقابلے سے بھاگنا جو دو چند ہوں کفر ہے۔ (۶) کوزیہ جو کہتے ہیں کہ سوا زیادہ منے کے بدن پاک نہیں ہوتا۔ (۷) کنزیہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ فرض نہیں ہے (۸) معتزلہ کہتے ہیں کہ شر تقدیر الٰہی سے نہیں ہے اور نماز امامت فاسق سے جائز نہیں ہوتی اور ایمان کسب بندہ سے ہے اور قرآن مخلوق ہے اور مُردوں کو دُعا اور صدقہ سے نفع نہیں پہنچتا اور معراج بیت المقدس کے آگے ثابت نہیں ہے اور حساب و کتاب و میزان کچھ نہیں ہے۔ اور فرشتے مومنین سے افضل ہیں اور قیامت کے روز دیدار حق نہ ہوگا اور کرامت اولیاء کوئی چیز نہیں اور اہل جنت کے لیے سونا اور مرنا ہے اور مقتول اپنی موت سے نہیں مرتا اور قیامت کی علامات مثل دجال وغیرہ کے کچھ نہیں ہیں۔ (۹) میمونیہ کہتے ہیں کہ ایمان بالغیب باطل ہے۔ (۱۰) محکمیہ کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا خلقت پر کوئی حکم نہیں ہے۔ (۱۱) سراجیہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کے احوال ہمارے لیے حجت نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا انکار کرنا واجب ہے۔ (۱۲) خنسیہ کہتے ہیں کہ بندے کو اعمال کی جزا نہیں ملتی۔

جبریہ فرقے حسب ذیل ہیں :- (۱) مضطربہ کہتے ہیں کہ خیر و شر خدا کی جانب سے ہے اور بندہ کا اس میں اختیار نہیں ہے۔ (۲) افعالیہ کہتے ہیں کہ بندہ فعل تو کرتا ہے مگر اسے قدرت و اختیار نہیں ہے۔ (۳) معیہ کہتے ہیں کہ آدمی کے لیے فعلُ

قدرت ہے لیکن وہ طاقت اور قدرت خدا نے نہیں دی ۔ (۴) تارکیہ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد اور کوئی چیز فرض نہیں ہے ۔ (۵) بخثیہ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنا حصہ کھاتا ہے پس کسی کو کچھ دینا ضروری نہیں ہے (۶) متمنیہ کہتے ہیں کہ خیر وہ خیر ہے جس سے دل تسلی پائے (۷) کستارنیہ کہتے ہیں کہ ثواب و عقاب عمل سے زیادہ نہیں ہوتا ۔ (۸) جیبیہ کہتے ہیں کہ دوست اپنے دوست کو ہرگز عذاب نہیں کرتا ۔ (۹) خوفیہ کہتے ہیں کہ دوست ہرگز نہیں ڈراتا (۱۰) فکریہ کہتے ہیں کہ معرفت حق میں فکر کرنا عبادت سے بہتر ہے ۔ (۱۱) حسبیہ کہتے ہیں کہ عالم میں قسمت نہیں ہے ۔ (۱۲) حجتیہ کہتے ہیں کہ جب کام خدا کی تقدیر سے ہوتے ہیں تو بندے پر کوئی حجت نہیں ہے جس کے سبب وہ گرفتار ہو ۔

قدریہ فرقے حسب ذیل ہیں : (۱) احدیہ کہتے ہیں کہ فرض کا تو ہمیں اقرار ہے مگر سنت سے انکار ہے (۲) ثنویہ کہتے ہیں کہ نیکی یزدان سے ہے اور بدی اہرمن سے ۔ (۳) کیسانیہ کہتے ہیں کہ ہمارے افعال مخلوق ہیں ۔ (۴) شیطانیہ کہتے ہیں کہ شیطان کا وجود نہیں ہے ۔ (۵) شرکیہ کہتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے ۔ کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ۔ (۶) وہمیہ کہتے ہیں کہ ہمارے افعال کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا ۔ (۷) رویدیہ کہتے ہیں کہ امام کے ساتھ لڑنا جائز ہے ۔ (۹) ستبریہ کہتے ہیں کہ گنہگار کی توبہ قبول نہیں ہوتی ۔ (۱۰) قاسطیہ کہتے ہیں کہ علم ، مال ، حکمت اور ریاضت کا حاصل کرنا فرض ہے ۔ (۱۱) نظامیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کو شے کہنا جائز ہے ۔ (۱۲) متوقفیہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ شر مقدر ہے یا نہیں ۔

جہمیہ فرقے حسب ذیل ہیں : (۱) معطلیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی صفات مخلوق ہیں ۔ (۲) متراقبیہ کہتے ہیں کہ علم قدرت اور مشیت مخلوق ہیں مگر خلق غیر مخلوق ہے ۔ (۳) متراقبیہ کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ مکان میں ہے (۴) واردیہ کہتے ہیں جو دوزخ میں جائے گا وہ پھر وہاں سے باہر نہیں آئے گا اور مومن دوزخ میں نہ جائیں گے ۔ (۵) حرقیہ کہتے ہیں کہ اہل دوزخ اس طرح جلیں گے کہ ان کا نشان تک بھی دوزخ میں نہ رہے گا ۔ (۶) مخلوقیہ کہتے ہیں کہ قرآن ، تورات ، انجیل اور زبور مخلوق ہیں ۔ (۷) عبریہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہؐ ایک عاقل و حکیم شخص تھے رسول نہیں تھے ۔ (۸) فانیہ کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ دونوں فنا ہو جائیں گے ۔ (۹) زنادقیہ کہتے ہیں کہ معراج روح سے ہوا تھا نہ کہ بدن سے اور خدا کو دنیا میں دیکھ سکتے ہیں اور عالم قدیم ہے اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے ۔ (۱۰) لفظیہ کہتے ہیں کہ قرآن قاری کی کلام ہے نہ کلام الہٰی ۔ (۱۱) قبریہ عذاب قبر کے منکر ہیں ۔ (۱۲) واقفیہ کہتے ہیں کہ قرآن قاری کے مخلوق ہونے کے بارے میں ہمیں توقف ہے ۔

مرجیہ فرقے حسب ذیل ہیں : (۱) تارکیہ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد اور کوئی چیز فرض نہیں ہے ۔ (۲) شائیہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جو چاہے کرے اس پر کوئی عذاب نہیں ہے ۔ (۳) راجیہ کہتے ہیں کہ بندہ طاعت سے مقبول اور معصیت سے عاصی نہیں ہوتا ۔ (۴) شاکیہ اپنے ایمان میں شک رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح ایمان ہے (۵) نہمیہ کہتے ہیں کہ ایمان علم ہے ۔ جو شخص جمیع اوامر و نواہی کو نہیں جانتا پس وہ کافر ہے ۔ (۶) عملیہ کہتے ہیں کہ ایمان عمل ہے ۔ (۷) منقوصیہ کہتے ہیں کہ ایمان کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ ۔ (۸) مستثنیہ کہتے کہ ہم انشاء اللہ تعالےٰ مومن ہیں ۔ (۹) اشریہ کہتے ہیں کہ قیاس باطل ہے اور صلاحیت دلیل نہیں رکھتا ۔ (۱۰) بدعیہ کہتے ہیں کہ امیر کی اطاعت واجب ہے اگرچہ وہ معصیت کا حکم ہی کرے ۔ (۱۱) مشبہیہ کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے آدمی کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے ۔ (۱۲) حشویہ کہتے ہیں کہ واجب ، سنت اور مستحب سب ایک ہیں ۔

فرمان ۔ فارسی لفظ ہے ۔ بادشاہوں کے احکام کے معنی میں مستعمل ہے جیسے شاہی احکام جن کی رو سے کسی کو منصب ۔ انعام یا جاگیر عطا کی جاتی تھی ۔ کسی خدمت پر تقرری کی جاتی تھی ۔ دور قدیم میں کسی اجنبی کو مملکت میں سفر کے لیے اجازت بھی فرمان شاہی کے ذریعے ہی دی جاتی تھی یعنی سربراہ حکومت کی جانب سے [illegible]

بختیار کاکی کا انتقال ہوا تو آپ ہانسی سے دہلی پہنچے۔ مزار شیخ پر فاتحہ خوانی کی۔ شیخ کی وصیت کے مطابق قاضی حمید الدین ناگوری نے آپ کو خرقہ اور دوسری امانتیں پیش کیں۔ دہلی میں چند روز قیام کے بعد دوبارہ ہانسی چلے گئے۔ اب آپ کی روحانی عظمت کا پھریرا عرفان کی آخری بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ خلق خدا کا ایک ہجوم آپ کے پاس چلا آتا۔ کثرتِ اژدہام کی وجہ سے کسی پُرسکون اور گمنام مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ راستہ میں اپنے آبائی گاؤں میں والدہ سے ملنے کے لیے ٹھہرے۔ مابعد آپ نے اشاعت اسلام، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے لیے دریائے ستلج کے کنارے ایک مقام اجودھن کو منتخب کیا۔ یہی مقام اب پاک پتن کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام شہنشاہ اکبر نے اس قصبہ کے لیے تجویز کیا تھا۔ شہنشاہِ دہلی سلطان ناصر الدین محمود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان ناصرالدین نے نقد نذرانہ اور چار گاؤں کی جاگیر کا فرمان دے کر اپنے سپہ سالار غیاث الدین بلبن کو بھیجا۔ آپ نے نقد رقم مساکین میں تقسیم کر دی اور جاگیر لینے سے معذرت کی۔ غیاث الدین بلبن کی لڑکی بعد میں آپ کے عقد میں رہی۔ آپ کے انتقال کے بعد غیاث الدین بلبن نے حضرت خواجہ نظام الدین کی نگرانی میں آپ کا مزار تعمیر کروایا۔ آپ کی تاریخ وفات صاحب سیرِ اولیا، حضرت خواجہ نظام الدین کی روایت سے، ۵ محرم (سہ شنبہ) ۶۶۴ھ بیان کرتے ہیں۔

حضرت فریدالدین گنج شکر کو اشاعتِ اسلام میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ اضلاع ملتان اور ساہیوال کے گزیٹیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیال راجپوت اور وٹو وغیرہ قبائل آپ ہی کی تبلیغ و دعوت سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت فریدالدین گنج شکر کو خواجہ معین الدین چشتیؒ اور بختیار کاکیؒ نے جس طرح روحانیت، معرفت، طریقت و حقیقت کے بلند مقام پر فائز المرام کیا، تصوف میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، مؤلفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں تحریر ہے کہ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید با صفا اور عظیم خلیفہ تھے لیکن آپ کی نسبت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے بھی تھی۔ آپ کے خلفا میں خواجہ نظام الدین اولیاء اور خواجہ علاؤ الدین علی صابر کلیار شریف، شیخ جمال الدین ہانسوی جیسے مشائخ، اکابر شامل ہیں۔ جنہوں نے تبلیغ دین اور اصلاحِ اخلاق عوام کے لیے بہت کام کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد معین الدین چشتیؒ نے رکھی تھی۔ اس کی تجدید میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے انھیں برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کا آدمِ ثانی کہا جاتا ہے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر کا اکثر وقت مریدوں کی روحانی تربیت اور عباداتؒ و مجاہدات میں گزرا ہے۔ اس لیے وہ اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات اور ارشادات کو مرتب کرنے کے علاوہ کوئی اور کتاب تصنیف نہ کر سکے۔ ان کے ارشادات و اقوال کو ان کے خلیفہ اور جانشین خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے راحۃ القلوب کے نام سے مرتب کیا ہے۔ "سیر الاولیاء" میں بھی آپ کے ارشادات و ملفوظات کو جمع کیا گیا ہے۔

شیخ موصوف نے مجاہدہ و ریاضت میں مشغولیت کے باوجود سنتِ رسول کی اتباع میں متاہل زندگی گزاری۔ ان کی اولاد میں جو بیٹے مشہور ہوئے وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ شیخ نصیرالدین، جنہوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔

۲۔ شیخ شہاب الدین سلیمان؛ جنہوں نے عسکری پیشہ اختیار کیا۔

۳۔ شیخ بدرالدین سلیمان، جو والد کے جانشین مقرر ہوئے۔

۴۔ شیخ نظام الدین۔ یہ بھی عسکری پیشہ میں تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے لشکر میں شامل تھے، ایک معرکہ میں شہید ہوئے۔

۵۔ شیخ یعقوب۔ مجذوب۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں پاکپتن میں فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے۔ اس نے مزار کے سجادہ نشین، شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاؤالدین کا بھی ذکر کیا ہے۔

سلطان فیروز تغلق بھی شیخ علاؤالدین کا مرید تھا اور اس نے اپنے مرشد سے فیض حاصل کرنے کے لیے پاک پتن کا سفر بھی کیا۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر عرس ہر سال ۵ محرم الحرام کو ہوتا ہے ہزاروں زائرین اس موقع پر جمع ہوتے ہیں اور ایک دروازے میں سے گزر کر روضہ تک پہنچنے میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس دروازہ کا نام "بہشتی دروازہ" ہے۔

فریدالدینؒ ناگوری۔ (وفات ۷۵۲ھ)

شیخ محمود بن علی بن حمید سعیدی سوالی ناگوری۔ اپنے لقب شیخ فریدالدین سے ہی مشہور ہوئے۔ ناگور میں پیدا ہوئے۔ وہاں ہی پرورش پائی۔ اپنے والد ماجد سے جو عالم و صوفی تھے، اخذِ علم کیا۔ اپنے والد سے ہی حدیث کی اجازت لی۔ اپنے دور کے جلیل القدر عالم و فقیہہ تھے اور مشائخ میں بھی شمار کیے جاتے تھے۔ ان سے شیخ ضیاالدین نخشبی اور بہت سے حضرات نے علم حاصل کیا۔ ۷۵۲ھ میں دہلی میں وفات پائی اور وہاں ہی دفن ہوئے۔

فریدؒ، خواجہ غلام

(۱۲۶۱ھ۔ ۱۳۱۹ھ) مشہور صوفی شاعر، اور جلیل القدر عالم۔ آپ کے والد کا نام حضرت محبوب الٰہی بخش تھا۔ وہ بھی ایک جید عالم تھے۔ ریاست بہاولپور کے پہلے نواب صادق محمد خاں اوّل کی درخواست پر وہ مٹھن کوٹ سے چاچڑاں شریف آباد ہو گئے یہیں خواجہ فرید کی ولادت ہوئی۔ خواجہ فریدؒ ابتدائی عمر ہی سے بڑے ذہین تھے۔ انہوں نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں دینی علوم سے فارغ ہو گئے۔ خواجہ صاحبؒ آٹھ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی تربیت بڑے بھائی خواجہ غلام فخرالدین کی نگرانی میں ہوئی جو آپ کے ظاہری علوم میں استاد تھے اور باطنی علوم کا بھی انہیں سے اکتساب کیا۔ تکمیل علم کے بعد انہوں نے پیر و مرشد خواجہ فخرالدین کے سامنے دس برس تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں لوگوں نے ان سے کسبِ فیض کیا۔ خواجہ فریدؒ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ مالک بن یحییٰ اس خاندان کے پہلے شخص تھے، جو سندھ میں وارد ہوئے ان کی اولاد میں سے شیخ حسین ٹھٹھہ میں ملازمت کرتے تھے۔ ٹھٹھہ ان دنوں سندھ کا مرکزی شہر تھا۔ شیخ حسین یہیں مقیم تھے۔ آخر عمر میں انہوں نے دولت و امارت چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی اور سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت کی۔ ان کے فرزند مخدوم محمد ذکریا جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں منگلوٹ (علاقہ ملتان) میں آکر مقیم ہوئے۔ مخدوم محمد شریف نے دریائے سندھ کے کنارے سیت پور میں سکونت اختیار کی۔ ان کے ایک مرید مٹھن خان تھا جو دریائے سندھ کے مغربی جانب رہتے تھے۔ ان کی دعوت پر آپ نے مٹھن کوٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ سکھوں کے زمانے میں حکومت میں خواجہ فریدؒ کے والد خواجہ محبوب الٰہی بخش سکھوں کے مظالم سے تنگ آگئے، تو آپ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تحصیل خانپور کے ایک

گاؤں چاچڑاں چلے آئے۔ خواجہ فریدؒ کو سیر و سیاحت اور مناظر قدرت سے بڑی دلچسپی تھی۔ اولیاء کرام کے مزاروں کی زیارت کے سلسلہ میں انہوں نے پورے برصغیر کا سفر اختیار کیا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے مکہ معظمہ گئے تو پورے عرب کی سیاحت کی۔ مناظر قدرت سے اُن دلچسپی کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے چولستان کا علاقہ آپ کو بہت پسند تھا اور اپنی تصانیف میں انہوں نے اس سے اپنی وابستگی کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے۔ انہیں ہفت زبان مانا جاتا ہے۔ اُردو، فارسی اور پنجابی کے علاوہ انہیں سندھی، عربی اور ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ پوربی زبان بھی خوب جانتے تھے اور عروض موسیقی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے انہوں نے نئی بحری اور اوزان ایجاد کیئے اور جس صنف ادب میں بھی قلم اٹھایا۔ اُسے اپنے انفرادی طرز فکر سے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ وہ اہل دل صوفی۔ عالم متبحر اور آتش بیاں شاعر تھے۔ امیر بہاولپور کے خاندان کے لوگ ان کے خاص مریدوں میں سے تھے امیر بہاولپور نے ان کا کلام بڑے اہتمام سے مع ترجمہ و تشریح شائع کرایا تھا۔ ملتانی لہجے میں اُن کے پائے کا کوئی دوسرا شاعر نہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُن کا خیال پڑھے لکھے لوگوں کو ہی متاثر نہیں کرتا، بلکہ اُن کی حیثیت عوامی گیتوں کی سی ہے، جو بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ عشق و محبت اور نفسیاتی و جذباتی رموز اسرار کی ترجمانی ہیں اُن کے ہاں بعض ایسی خصوصیات ہیں، جو انہیں تمام متقدمین اور متاخرین سے ممتاز کرتی ہیں۔

تصوف اُن کا خاص موضوع تھا۔ وہ علمی جستجو اور تحقیق کے میدان میں بہت ماہر تھے۔ تاریخ و تصوف کے مسائل میں روایات کو محققانہ نظر سے پرکھتے تھے۔ ان کے رسالہ "فوائد فریدیہ" اور اُن کے ملفوظات "مقابیس المجالس"، "مناقب فریدی"، اور "ارشاد فریدی"، سے اُن کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ احکام شریعت کے سخت پابند، بدعات و غیر شرعی رسوم کے سخت مخالف تھے۔ سلسلہ چشتیہ سے وابستگی کی بنا پر سماع سے شغف تھا، لیکن اداب سماع کا خاص اہتمام کرتے تھے ——— ان کی محفل سماع میں عورتیں اور بے ہودہ لوگ شرکت نہیں کر سکتے تھے۔

خواجہ غلام فریدؒ نے اپنے پیش رو صوفی شعراء کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اُن سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اُن میں سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ، پنجاب کے بلہے شاہؒ اور شاہ حسینؒ اور سرائیکی علاقہ کے حیدر علی ملتانیؒ اور سیف الملوک کے مصنف مولوی لطف علی شامل ہیں۔

خواجہ صاحب کے کلام میں ہمہ اوست کے تصور کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ شیخ ابن العربی "وحدت الوجود نظریہ"، کے بانی سے بھی متاثر ہیں۔ عشق مجازی بھی ان کے کلام کا اہم حصہ ہیں۔ اُن کے نزدیک عشق کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری میں راہ عشق کی صعوبتوں، وصل کی تڑپ اور جُدائی کے سوز اور درد کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن کے کلام میں مقامی لوک کہانیوں کے کرداروں (سسی پنوں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال) کو خلوص وفا کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ان کے کلام میں خیالات کی نوعیت اور مضامین کی رُوح کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف زبانوں کے الفاظ، استعارات کو استعمال کیا گیا ہے، جس سے اُن کے کلام کی خوبصورتی میں حد درجہ اضافہ ہُوا ہے۔ وہ اپنے کلام میں قرآنی آیات، احادیث رسولؐ فارسی ہندی اُردو، سندھی، سنسکرت زبانوں کی اصلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ جدت پسند اور کثیر اللسان شاعر ہیں۔

خواجہ غلام فرید کافیوں والے کے نام سے مشہور ہیں۔ خواجہ صاحب نے دو شادیاں کی ہیں۔ پہلی بیوی سے اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ دوسری بیوی سے اُن کوئی اولاد نہیں۔ دوسری شادی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

خواجہ صاحب کا انتقال ۲ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ/۲۴ جنوری بروز چہارشنبہ کو ہُوا اور کوٹ مٹھن ہی میں دفن ہوئے۔ ہر سال اُن کے مزار پر باقاعدہ عرس ہوتا ہے۔

فُرَیش ۔ صوبہ اشبیلیہ کا علاقہ۔ قسطنطینہ کے نواح میں، فرلش فحص البلوط کے متصل اور قرطبہ سے شمال مغرب کی طرف دو منزلوں کے فاصلے پر تھا۔ اندلس کے علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے تمام جغرافیہ نویس فریش کا محل وقوع فحص البلوط کے نزدیک بتاتے ہیں، اس کے جنگلات شروع سے شاہ بلوط کے درختوں سے پٹے ہوئے تھے۔ اہم ترین معدنی دولت لوہا تھی جس کے ذخائر بعد میں ختم ہو گئے۔ یہ لوہا عمدہ قسم کا ہوتا تھا اور اندلس بھر میں استعمال میں آتا تھا۔ اسی وجہ سے اس علاقے کا نام "قسطنطینۃ الحدید" مشہور ہو گیا۔

فریق ۔ عربی میں اس کا مطلب، لوگوں کی ایک جماعت، قافلے کا ایک حصّہ۔ ترکی میں فوج کے ایک ڈویژن کے سپہ سالار اور بحری بیڑے کے نائب امیر بحر کو فریق کہا جاتا ہے۔

فزارہ، بنو ۔ شمالی عرب کا ایک قبیلہ جس کے قبضے میں کافی سارے علاقے تھے یہ لوگ نجد کی وادی الرمّہ میں رہتے تھے اور ایام جاہلیت میں [illegible] کی پوجا کرتے تھے

بنو فزارہ کی پانچ شاخیں تھیں: (۱) عدی، (۲) سعد، (۳) شمخ، (۴) مازن، (۵) ظالم۔

زمانہ جاہلیت میں حکومت بدر بن عدی کا خاندان کرتا تھا۔ حذیفہ بن بدر اور عینیہ اسی قبیلے سے تھے۔ عبس اور ذُبیان کے درمیان ربع صدی تک جاری رہنے والی جنگ میں بنو فزارہ نے بھی حصّہ لیا اور اس کی قیادت حذیفہ بن بدر [illegible] بیٹے حصن نے کی۔

غزوۂ خندق (۵ھ/۶۲۷ء) میں بنو فزارہ نے عینیہ بن حصن کی قیادت میں غطفان کے دیگر قبائل اور خیبر کے یہودیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا۔ [illegible] میں بنو فزارہ کے لوگوں نے نبی کریمؐ کے اونٹوں پر مدینہ منورہ [illegible] کے قافلے [illegible] اور ایک قافلے کو لوٹا اور قافلے کے سردار زید بن حارثہ کو زخمی کیا۔

۸ھ/۶۲۹ء میں بھی [illegible] کے ہمراہ نبی کریمؐ کے مقابلے [illegible]

بنو فزارہ کے لوگ ۹ھ/۶۳۰ء میں خارجہ بن [illegible] کی قیادت میں [illegible] لیے مدینہ منورہ آئے۔ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد بنو فزارہ [illegible] دوسرے [illegible] سرکشی اختیار کی، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے [illegible] ہو گئے۔ یزید بن عمر ہبیرہ بھی بنو فزارہ سے متعلق تھے۔

فزاری ۔ آٹھویں صدی ہجری کے کوفہ کے ایک عالم، ابراہیم بن محمد بن ابی حفص فزاری۔ اعمش کے شاگرد اور سفیان ثوری کے استاذ تھے۔ آپ فزارہ، جو کہ قبیلہ غطفان کی ایک شاخ تھی، سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے کتاب فی الاخبار و الاحادیث تصنیف کی۔

فساد ۔ کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانے کو فساد کہتے ہیں [illegible]

ہے اور نفس، بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالتِ استقامت سے نکل چکی ہو۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فساد اور صلاح کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے:
" اور خوب جانتا ہے کہ خرابی پیدا کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔
(سورۃ البقرہ، آیت ۲۲۰)

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷، ۲۰ میں اللہ تعالےٰ نے ایسے لوگوں کے لیے اُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور انہی کے لیے گمراہی کو مقدر ٹھہرایا ہے جو اسلام کے عہد کو توڑتے ہیں اور جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۰۵ میں اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جو زمین میں اقتدار ملنے کے بعد فساد برپا کرتے ہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید کے مختلف مقامات پہ ایسے غلط قسم کے اعمال کا ذکر کیا ہے جن کو فساد کہا جاتا ہے اور ایسے اعمال کرنے والوں کو مفسدین کہا جاتا ہے۔

کم تولنے والوں کو مُفْسِدِین کہا ہے (سورۃ الشعراء آیت ۱۸۳)

حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کرنے والے مفسدین کے انجام کا ذکر کیا ہے۔ (سورۃ النمل آیت ۱۴) جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالےٰ کے طلب کرنے پہ کوہِ سینا کے لیے روانہ ہوئے تو اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ جاتے وقت اپنے بھائی کو اس انداز میں نصیحت کرتے ہیں: "میرے بعد تم میری قوم میں جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور مفسدین (بگاڑ پیدا کرنے والے) کے طریقے پہ نہ چلنا" (الاعراف آیت ۱۴۲)

فسخ - عربی لغت میں فسخ کے معنی زوالُ المفصلِ عَن موضعہٖ (جوڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا) نقضُ الشّیٔ (کسی چیز کو توڑنا)۔

اسلامی فقہ کی اصطلاح میں فسخ سے مراد معاملاتِ نکاح، بیع و شریٰ اور دیگر معاہدوں میں کسی طے شدہ بات کو توڑ دینا، لیکن فریقین میں سے کوئی بھی فسخ عقد کے موقع پر کوئی اضافہ نہ کر سکے گا اور نہ ہی کمی کی، جن احوال و شرائط کے تحت عقد ہوا تھا، انہی شرائط کی بنا پہ عقد کو توڑ دینا فسخ کہلائے گا۔ مثلاً کسی خرید و فروخت کے معاہدہ کو اس بنا پہ توڑے کہ خریدار کو اس چیز میں خریدنے کے بعد کچھ پوشیدہ عیوب نظر آئے تو اسے فسخ کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی سیاسی معاہدے کو دونوں فریق منسوخ کریں تو اسے مفاسخہ کہتے ہیں۔

معاہدہ نکاح اس صورت میں کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے کہ جب معلوم ہو کہ نکاح کے فریقین میں سے ایک بعض شرائط کو پورا نہیں کرتا۔ مثلاً شافعی فقہ کے مطابق "مرد کا اپنی بیوی کے لیے مناسب نان و نفقہ کا انتظام نہ کر سکنا یا حق مہر ادا کرنے کے ناقابل ہونا"

اکثر مذاہب کی فقہ کی رو سے بعض امراض جیسے جنون، برص اور جذام کا ہونا۔ حق زوجیت ادا کرنے کے قابل نہ ہونا بھی فسخ نکاح کے لیے مناسب وجوہ ہو سکتی ہیں۔ فسخ کے متعلق بعض فروعی مسائل کے بارے میں علماء اور فقہا کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۹ میں عورت کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ازدواجی حقوق پورے نہ ہونے کی صورت میں خاوند سے خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اس کے لیے عدالت سے بھی رجوع کر سکتی ہے۔ نبیِ کریمؐ اور خلفائے راشدین کے عہد میں بھی فسخ نکاح کے ایسے کئی معاملات طے کیے گئے ہیں جن میں خاوند بیوی کے حقوق پورے کرنے میں معذور تھا۔ شریعت میں فسخ نکاح کے لیے قانونی حق حاصل ہے۔ ضمنی بحث کے طور پہ اس موضوع کے تحت اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ فسخ نکاح اور طلاق میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(۱)۔ طلاق میں عقد کو ختم کرنا شوہر کا حق ہوتا ہے لیکن فسخ نکاح میں ایسا نہیں۔
(۲)۔ فسخ میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ فسخ کی صورت میں طلاق بائن ہوتی ہے۔

(۳)۔ طلاق میں ایک طلاق کے اعلان کے بعد دو طلاقیں باقی رہتی ہیں اور رجوع کیا جا سکتا ہے۔ جب تین طلاقیں دے دی جائیں تو رجوع کرنے کے لیے دوبارہ عقد اس صورت میں ہو گا کہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے لیکن فسخ میں ایسا نہیں ہے۔ فسخ نکاح سے طلاق کی تعداد کم نہیں ہوتی بلکہ فوری طور پہ علیحدگی ہو جاتی ہے۔ فسخ نکاح کے بارے میں تفصیل کے لیے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی "حقوق الزوجین" دیکھیے۔

فشتالی - (۱۵۴۹ء - ۱۶۲۱ء) مراکش کے ایک مورخ۔
عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم الصنہاجی فشتالی، مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے شرفائے حسینی (مراکش) کی تاریخ "مناہل الصفا فی اخبارِ الملوکِ الشرفا" کے نام سے لکھی۔

فُصِّلَت قرآن کی ایک سورت کا نام ہے جس کا اصل نام حٰمٓ سجدہ ہے۔ چونکہ بتیسویں سورۃ کا نام بھی سجدہ ہے اس لیے اس سے امتیاز رکھنے کے لیے اس کا نام فصّلت قرار دیا گیا ہے اور یہ کلمہ اس سورۃ کی دوسری آیت میں آیا ہے۔

فصوص الحکم علم تصوف میں شیخ محی الدّین بن عربی کی تصنیف ہے جو ۶۳۸ھ میں فوت ہوئے۔ اس کے خطبہ میں شیخ لکھتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرتؐ نے ایک کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ کتاب فصوص الحکم ہے، اس کو لوگوں پہ پیش کرو تاکہ وہ اس سے نفع اٹھائیں۔ متعدد علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں جن میں سے مولانا جامیؒ کی شرح نہایت مقبول اور مستند ہے۔

فصیح الدّین دہلوی۔ شیخ فصیح الدین دہلوی، سلطان غیاث الدین بلبن کے دور کے ایک معروف و نامور عالم اور فقیہہ تھے۔ اصولِ فقہ کی تعلیم شیخ شمس الدین توشجی سے حاصل کی۔ باقی علوم دوسرے علماء سے حاصل کیے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے لڑکوں کے معلم رہے۔ بعد میں تمام امور سے منقطع ہو کر زہد و عبادت کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ تصوّف کی منازل شیخ نظام الدین اولیاء کی زیرِ نگرانی طے کیں اور کافی عرصہ اُن کے ساتھ رہے۔

فصیح الدّین ہروی۔ فصیح الدین ہروی خراسانی، فاضل شخصیت تھے اور ممتاز فقہائے حنفیہ میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ شہر ہرات کے قاضی تھے۔ ہند کے بادشاہ محمد شاہ تغلق نے ان کی علمی قابلیت اور تنظیمی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر لاہری میں بلادِ سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران جب سندھ کے علاقہ میں آیا تو اس کی ملاقات قاضی فصیح الدین ہروی سے ہوئی۔ اُس نے اپنے سفر نامہ میں بندرگاہ لاہری اور قاضی فصیح الدین ہروی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے قاضی فصیح الدین کے ہمراہ لاہری تک کا سفر دریائے سندھ میں کشتیوں کے ذریعے کیا۔

فضالہ بن عبیدؓ۔ (وفات: ۵۳ھ)

نام فضالہ۔ کنیت ابو محمد۔ آپ کے والد عبید بن نافذ قبیلہ اوس سے متعلق تھے اور فن نیزہ بازی اور شہ سواری میں ماہر تھے۔ حضرت فضالہؓ مدینہ میں مسلمان ہوئے اور بیعت رضوان میں بھی شریک ہوئے۔ جنگ بدر کے علاوہ سب غزوات میں شریک ہوئے۔ مصر اور شام کے معرکوں میں بھی شرکت کی۔ حضرت ابو درداؓ کے انتقال کے بعد دمشق کے قاضی رہے۔ امیر معاویہؓ جب حضرت علیؓ کی افواج سے جنگ کے لیے گئے تو فضالہ بن عبیدؓ کو دمشق میں اپنا قائم مقام مقرر کر گئے۔

کتب احادیث میں کئی حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ ۴۹ھ میں روم پر لشکر کشی کے وقت مسلمانوں کے امیر تھے۔ ۵۳ھ میں دمشق میں انتقال کیا۔

فضل

افزونی، زیادتی، بخشش اور کسی پر فضیلت کی وجہ سے غلبہ حاصل کرنا معنی ایک شاعر کا نام ہے اور قرآن مجید میں بھی کئی جگہ آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"یہ پیغمبر (جو) ہم نے (بھیجے) ان میں سے بعض کو بعض پر برتری دی"
(س۔ بقرہ۔ ع ۳۳)

"یہ (پیغمبری) اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عنایت کرے۔ اور اللہ کا فضل (بہت) بڑا ہے" (س۔ جمعہ۔ ع ۱)

"اور یہ تم سے اس لیے کہا جاتا ہے کہ فضل اللہ کے ہاتھ ہے۔ جس کو چاہے عنایت کرے اور اللہ کا فضل (بہت) بڑا ہے" (س۔ حدید۔ ع ۴)

فضل اللہ۔

مملوک عہد میں قاہرہ کا ایک خاندان جس کے افراد سرکاری اہلکار رہے اور اہم مناصب پر فائز ہوئے۔ بعد کے زمانے میں یہ دمشق منتقل ہو گئے وہیں اس خاندان کے ذاتی قبرستان میں ان کے اکثر افراد دفن ہیں۔ اس خاندان کے افراد اپنا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملانے کی نسبت سے العمری بھی کہلاتے تھے۔ بانی خاندان کا نام جمال الدین ابو المآثر فضل اللہ بن عز الدین ہے۔

فضل اللہ۔ (۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء - ۷۹۶ھ/۱۳۹۳ء)

الملقب بہ حروفی۔ حروفی فرقہ کا بانی۔ استر آباد میں پیدا ہوا۔ مذہبی مسائل میں قرامطہ کا ہم خیال تھا۔ اس کا سارا نظام فلسفہ، اسماعیلیہ سے ماخوذ ہے۔ غلط عقائد کی وجہ سے ۷۹۶ھ میں تیمور کے بیٹے میراں شاہ نے اسے موت کی سزا دی۔ فضل اللہ خود کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا۔ اس کا ایک شاگرد بکتاشی خانقاہ (ایشیائے کوچک) میں فضل اللہ کی تعلیمات کا پرچار کرتا رہا۔

مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے "حروفیہ"۔

فضل امام۔ خیر آبادی

سلسلۂ علما کے پہلے نامور بزرگ۔

فضل امام بن محمد ارشد العمری خیر آبادی معقولات کی تدریس و ترویج کے لیے بہت معروف ہوئے۔ ۳۳ واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے کچھ افراد ایران کے ایک علاقہ پر حکومت کرتے رہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شیر الملک کے دو صاحبزادے، بہاؤ الدین اور شمس الدین ہندوستان چلے آئے۔ ان دونوں بھائیوں نے علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان دونوں بھائیوں کی اولاد میں بڑے بڑے اصحاب علم پیدا ہوئے۔ بہاؤ الدین کی نسل سے خیر آبادی سلسلہ کے علما پیدا ہوئے۔ مشہور محدث و عالم شاہ ولی اللہ شمس الدین کی اولاد میں سے تھے۔ فضل امام شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ہمعصر تھے۔ ان کے والد شیخ محمد ارشد بڑے نیک دل اور پرہیزگار انسان تھے۔ فضل امام نے خیر آباد کے ایک نامور عالم سید عبدالواحد کرمانی سے درسیات کی تعلیم لی۔ مولانا فضل امام علوم عقلیہ کا خاص ذوق رکھتے تھے اور فلسفہ و منطق میں اعلیٰ علمی مقام رکھتے تھے۔

پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کے مفتی اور صدر الصدور کا منصب دیا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں اس عہدہ سے الگ ہوئے۔ ان کی جگہ ان کے تلمیذ خاص مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور کے منصب پر فائز ہوئے۔ بعد میں اپنے وطن چلے آئے اور ۵ ذوالقعدہ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء کو انتقال ہوا۔

مولانا فضل امام کی دو بیویوں سے ۵ لڑکے تھے۔ ایک لڑکے فضل حق خیر آبادی نے علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کیا۔ مولانا فضل امام کے کثیر تلامذہ میں، مفتی صدر الدین آزردہ کے علاوہ شاہ غوث علی پانی پتی جیسی معروف شخصیت بھی شامل ہے جن کے ملفوظات "تذکرہ غوثیہ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

فضل با۔

حضر موت کے تریمی مشائخ کا ایک خاندان۔ "فضل با" نام ان کے ایک جد اعلیٰ الفقیہ فضل بن محمد بن عبدالکریم بن محمد سے مشتق ہے۔ تریمی مشائخ کو باعلوی، سادات کے زمانۂ عروج یعنی نویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک مذہبی معاملات میں مکمل اختیارات حاصل تھے۔ اس خاندان میں صوفی، فقیہ اور ماہر قانون لوگ رہے ہیں۔ ان کی ایک شاخ سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں عدن میں رہی ہے جس کا بانی جمال الدین محمد بن احمد بن عبداللہ تھا۔ اس خاندان کی دوسری شاخ جو "بل حاج" کے نام سے مشہور تھی۔ الشحر میں آباد [illegible] شاخ کا بانی عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر، فقہ اور تصوف کے بہت سے درسی رسائل کا مصنف تھا۔

فضل برمکی۔

(ولادت ۱۴۸ھ/۷۶۵ء - وفات ۱۹۳ھ/۸۰۸ء)

فضل بن یحییٰ برمکی، خلیفہ ہارون الرشید العباسی کا رضاعی بھائی تھا۔ [illegible] والد یحییٰ بن خالد کے ساتھ شروع سے ہی امور مملکت میں حصہ لیتا رہا۔ یحییٰ برمکی خلیفہ ہارون الرشید کا مدار المہام تھا۔ امور مملکت کا تمام نظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ [illegible] ۷۹۲ء تا ۱۸۰ھ/۷۹۶ء میں جرجان، طبرستان، ری اور خراسان کا [illegible] اس نے اپنے والد کی عدم موجودگی میں ۱۸۱ھ/۷۹۷ء میں سلطنت کے انتظام کو سنبھالا اور ایک روایت کے مطابق شاہی مہر جو کہ اس کے والد کے پاس تھی اس کو منتقل ہو گئی۔

برامکہ خاندان میں سے علم و فضل اور سیاسی امور کا ماہر فرد تھا۔ اس نے [illegible] میں انتظامی، معاشی اور تمدنی اصلاحات نافذ کیں۔ دنیائے اسلام میں فضل برمکی پہلا شخص [illegible] کیا جاتا ہے۔ جس نے رمضان المبارک میں مساجد میں چراغاں کے سلسلے کو رواج دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے ۱۸۶ھ/۸۰۲ء میں حج سے واپسی کے بعد برامکہ کے رسوخ و اقتدار کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یکم صفر ۱۸۷ھ/۲۹ جنوری ۸۰۳ء کو خلیفہ کے حکم سے اپنے والد اور دوسرے بھائیوں کے ہمراہ گرفتار ہو کر الرقہ کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ محرم ۱۹۳ھ/اکتوبر نومبر ۸۰۸ء میں ۴۵ سال کی عمر میں قید خانے میں ہی انتقال ہو[illegible]

فضل بن احمد۔

سلاطین سامانیہ میں "مرو" کے صاحب البرید کے منصب پر فائز تھا۔ سامانی سلطان نوح بن منصور نے ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں سبکتگین کی درخواست

پر ہسے افواجِ خراسان کے حاکم محمود کا وزیر نیشاپور بھیجا تھا۔ سلطان محمود کے وزیر کی حیثیت سے اس نے امور سلطنت کو ۴۰۴ھ/۱۰۱۳ء تک بڑے احسن انداز میں نبھایا۔ ۴۰۴ھ میں وفات پائی۔

فضل بن ربیع

۔ (ولادت ۱۳۸ھ/۷۵۵ء۔ وفات ۲۰۸ھ/۸۲۴ء)

فضل بن ربیعؒ، کنیت ابو العباس۔ اس کے باپ ربیع بن یونس نے خلیفہ المنصور اور خلیفہ المہدی کے دَور میں وزیر کی حیثیت سے سیاسی واقعات کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ خلیفہ ہارون نے تخت نشین ہونے کے بعد برامکہ خاندان کے افراد کو امورِ مملکت میں ترجیح دینا شروع کی تو فضل بن ربیع نے برامکہ خاندان کے خلاف حاسدانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہارون نے اُسے ۱۷۳ھ/۷۸۹ء۔ ۷۹۰ء میں اپنا وزیر مقرر کیا اور ۱۷۸ھ/۷۹۴ء۔ ۷۹۵ء تک اس منصب کے فرائض انجام دیتا رہا۔

بعد میں برامکہ خاندان امورِ مملکت پہ چھا گئے تو وزارت سے الگ ہوا اور برامکہ خاندان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ خلیفہ ہارون کے ہاتھوں برامکہ خاندان کے زوال کے بعد ہارون کا وزیر مقرر ہوا۔ ہارون کے جانشین الامین کے عہد میں بھی وزارت پہ فائز رہا۔ ہارون کے دونوں بیٹوں مامون اور امین کو لڑانے میں فضل بن ربیع کی سازشوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ کیونکہ یہ بڑا مفسد اور کینہ پرور قسم کا انسان تھا اور مامون کو برسرِ اقتدار نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

مامون اور امین کی جنگ میں امین کو شکست ہوئی اور رجب ۱۹۶ھ/ مارچ اپریل ۸۱۲ء میں امین قید ہوا اور مامون تخت نشین ہوا تو فضل روپوش ہو گیا۔ ۲۰۱ھ/۸۱۶ء۔ ۸۱۷ء میں دار الخلافہ میں بعض باغیوں کی بغاوت کے موقع پہ دوبارہ سامنے آیا۔ باغیوں کی شکست کے بعد دوبارہ روپوش ہو گیا۔ خلیفہ مامون نے خراسان کے عامل طاہر بن حسین کی سفارش پر فضل بن ربیع کو معاف کر دیا۔ ۲۰۸ھ/۸۲۴ء میں وفات پائی۔

فضل بن سہل

- (۱۵۴ھ/۷۷۱ء - ۲۰۲ھ/۸۱۸ء)

ایرانی النسل۔ ۱۹۰ھ/۸۰۶ء میں اسلام قبول کیا۔ ہارون کے پاس اس کے خاندان کی سفارش برامکہ نے کی۔ اس طرح سے اسے مملکت کے امور میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ مامون اور امین کے درمیان کشمکش اور لڑائیوں میں فضل بن سہل کا بھی حصّہ ہے۔ فضل بن ربیع جو کہ برامکہ خاندان سے حسد رکھتا تھا، فضل بن سہل کے بیسے برامکہ خاندان کی ہمدردیوں کی وجہ سے اس کا بھی دشمن بن گیا۔ اس عداوت و دشمنی میں ایک وجہ نسلی تعصب بھی۔ فضل بن ربیع عرب النسل تھا۔ امین اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور مامون پر فضل بن سہل کا اثر تھا۔ فضل بن سہل کی چالاکی اور سازش سے ۱۹۵ھ/۸۱۱ء میں امین نے مامون کی افواج کے خلاف لڑنے کے لیے جو لشکر بھیجا اس کی قیادت علی بن عیسیٰ کے سپرد کر دی۔ علی بن عیسیٰ، مامون کی افواج سے شکست کھا کر جنگ میں مارا گیا۔ مامون نے اس کامیابی پر فضل بن سہل کو مشرقی صوبوں کی حکومت کے علاوہ ذو الریاستین کا خطاب بھی دیا۔ مملکت کے معاملات میں فضل بن سہل نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو سامنے رکھا۔ جب مامون کو معلوم ہوا کہ وہ کبھی بھی اس کے سامنے سچائی سے کام نہیں لیتا تو مامون نے اپنے اس منظورِ نظر وزیر فضل بن سہل کو ۲۰۲ھ/۸۱۸ء یا ۲۰۳ھ/۸۱۹ء میں سرخس کے حمام کے اندر قتل کروا دیا۔

فضل بن عباسؓ، ابو محمد

۔ نبی کریمؐ کے چچا زاد بھائی۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایمان لائے۔ اور فتح مکہ کے بعد اپنے والد کے ہمراہ مدینہ منورہ ہجرت کی۔ اس کے بعد غزوات فتح اور حنین میں حصہ لیا۔ حجۃ الوداع کے دن رسول کریمؐ کے ساتھ ایک ہی اونٹ پر سوار تھے۔ اسی وجہ سے "ردیفِ رسولؐ" کا لقب پایا۔ چوبیس کے قریب احادیث کی روایت آپ نے کی جن میں سے تین متفق علیہ ہیں۔ ام کلثوم بنتِ ... کی بیٹی تھی جو حضرت حسن بن علیؓ کے نکاح میں رہیں۔ شام میں بعارضہ طاعون وفات پائی۔

فضل بن مروان

- (۱۷۰ھ/۷۸۶ء - ۲۵۰ھ/۸۶۴ء)

عباسی خلیفہ المعتصم کا وزیر، حسبٌ نسباً عیسائی تھا۔ معمولی مقام سے ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا ہارون الرشید کے عہد میں ایک محافظ دستہ کے کپتان کے مصاحب سے ترقی کرتا ہوا دیوان الخراج میں دبیر ہو گیا۔ کچھ عرصہ سرکاری کاموں سے الگ رہا۔ مامون کے عہد میں عراق کے علاقہ بردان میں قیام کے دوران آئندہ ہونے والے خلیفہ المعتصم کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ المعتصم نے خلیفہ بننے کے بعد ۲۱۲ھ/۸۲۷ء یا ۲۱۳ھ/۸۲۸ء میں دیوان الخراج کا مہتمم بنا دیا۔ فضل نے المعتصم کی عدم موجودگی میں بغداد میں اس کے لیے حلف وفاداری لیا۔ رمضان ۲۱۸ھ/ستمبر ۸۳۳ء میں وزیر مقرر ہوا۔ وسیع اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے اس نے شاہی خزانہ پہ اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اسی بنا پر بعد میں یعنی ۲۲۱ھ/فروری ۸۳۶ء میں اور ابن کثیر کی روایت کے مطابق ۲۲۰ھ میں المعتصم نے اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور جائیداد ضبط کر لی۔

فضل بن محمد ملتانی

- فضل بن محمد بن زکریا اسدی قرشی ملتانی۔ شیخ فضل اللہ ملتانی کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ فقیہ اور زاہد تھے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ شمس الدین مصری محدّث شامل ہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے زمانے میں نائب وزیر تھے۔

فضل حق، خیرآبادی

- (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء - ۱۷۹۷ء - ۱۸۶۲ء)

برصغیر کے معروف عالم دین۔ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور سپاہی۔ خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ علم حدیث کی تکمیل شاہ عبد القادر دہلوی سے حاصل کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور میں کمشنر دہلی کے سررشتہ دار کی حیثیت سے ملازم رہے۔ کئی ریاستوں میں مختلف عہدوں پہ فائز رہے۔ منطق، فلسفہ و ادب، کلام و اصول، شعر و شاعری اور علوم دینیہ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا قیام اکثر دہلی میں رہا۔ ان کے مکان پہ غالبؔ، مومنؔ، صہبائیؔ، شیفتہؔ جیسے بلند پایہ شعراء اور مولانا مملوک علی، مولوی کریم اللہ، مولوی نصیر الدین شافعی جیسے علماء علمی و ادبی مجالس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ خود مولانا شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے عربی اشعار کی تعداد چار ہزار ابیات سے زائد ہے۔ مرزا غالبؔ ان کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے اُن کے امتناع النظیر کے مسئلہ پر کئی مناظرے ہوئے۔ مولانا نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے نقطہ نگاہ کے رد میں کئی رسائل لکھے۔

اُن کی تصانیف زیادہ تر منطقی مسائل پہ مبنی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ نے نمایاں حصّہ لیا۔ بغاوت کے الزام میں انگریزوں نے عمر قید کی سزا دی۔ جزائر انڈیمان میں دورانِ نظربندی ۱۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔

فضل حق رام پوری

(۱۲۷۸ھ - ۱۳۵۸ھ) حضرت مولانا فضل حق رامپوری بن حافظ عبدالحق ۱۲۷۸ھ میں رامپور میں پیدا ہوئے

والد ماجد سے قرآن حکیم حفظ کیا۔ حکیم احسن رامپوری، مولانا عبدالرحمٰن قندھاری، مولانا عبدالعزیز سہارنپوری، مولانا عبدالکریم رامپوری۔ مولانا لطف اللہ علیگڑھی، مولانا ہدایت علی بریلوی اور مولانا عبدالحق خیرآبادی سے درس نظامی کی تکمیل کی۔

مدرسہ طالبیہ بریلی۔ مدرسہ سلیمانیہ بھوپال، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیں اور مدرسہ عالیہ رام پور کے عرصہ دراز تک پرنسپل رہے۔ بڑی محنت سے پڑھاتے نماز فجر سے لے کر عشاء کے بعد تک تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ تدریس میں انہماک کے باوجود تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ دی اور اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ الظفر الحامدی، حاشیہ حمد اللہ، حاشیہ میر زاہد، حاشیہ تاریخ و توضیح وغیرہ۔ ۱۳۵۸ھ میں انتقال فرمایا۔ رامپور میں دفن ہوئے۔

فضل الحق، مولوی

:- (۱۸۷۳ء — ۱۹۶۲ء) قرار داد پاکستان پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرنے والے مشہور سیاست دان۔ پورا نام ابوالقاسم فضل الحق خطاب شیر بنگال۔

مولوی ابوالقاسم فضل الحق ممتاز پارلیمنٹرین اور قانون دان، بیدار مغز اور درد مند سیاست دان اور تحریک آزادی کے جری رہنما تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی معاشرتی اور تعلیمی بہبود اور ترقی کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بنگال کے مسلمانوں کو پسماندگی سے نجات دلانے کے لئے انہوں نے ناقابل فراموش کام کیا۔

مولوی فضل الحق ۲۶ر اکتوبر ۱۸۷۳ء میں ضلع باریسال کے ایک چھوٹے سے گاؤں ستوریہ میں پیدا ہوئے آپ مشہور قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد پائے کے وکیل تھے۔ مولوی فضل الحق کی ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی بعدازاں انہوں نے کلکتہ کے پریذیڈنسی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ بنگال کے پہلے گریجویٹ تھے۔ ۱۸۹۵ء میں قانون کی تعلیم مکمل کی اور کلکتہ میں وکالت کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے وکالت ترک کردی اور ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۲ء تک اس منصب پر فائز رہے بعدازاں ملازمت چھوڑ دی اور دوبارہ وکالت کرنے لگے۔ مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اسی سال آپ بنگال لیجسلیٹو کونسل کے رکن چنے گئے۔ اس کے بعد ہر انتخاب میں حصہ لیتے اور کامیاب ہوتے رہے۔ انہوں نے بنگالی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں نمایاں کام کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن رہے ۱۹۳۵ء ہی میں کلکتہ کے میئر مقرر ہوئے۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء میں بنگال کے وزیر اعظم بنے اور ۱۹۴۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۴۳ء کے بعد صوبائی اسمبلی میں حزب مخالف کی قیادت سنبھالی اور ۱۹۴۶ء تک کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے بنگال اسمبلی کی کارروائی میں حصہ لیتے رہے ۱۹۴۴ء میں کل ہند مسلم لیگ سے الگ ہوگئے۔ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے انتخابات میں متحدہ محاذ کی کامیابی کے بعد آپ صوبے کے وزیر اعلیٰ بنے۔ انہیں برسر اقتدار آئے ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ صوبہ میں دفعہ ۹۲۔ الف نافذ کردی گئی۔ ان کی کابینہ برطرف ہوگئی۔ مسٹر محمد علی وزیر اعظم بنے تو پارلیمانی حکومت بحال کردی گئی اور مولوی صاحب کے ایما سے مسٹر ابوحسین سرکار نے نئی کابینہ مرتب کی۔ مولوی صاحب خود مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے شریک ہوئے ۱۹۵۶ء میں ملک کے پہلے آئین کی منظوری کے بعد مولوی صاحب مشرقی پاکستان کے پہلے گورنر مقرر ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۸۳ برس کے لگ بھگ تھی۔ چند ماہ بعد صوبے میں ان کے اور عوامی لیگ کابینہ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے جس کے بعد آپ گورنری اور اس کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہوگئے۔ ۲۷ر جنوری ۱۹۶۰ء کو انہیں ہلال پاکستان کا اعزاز دیا گیا۔ زندگی کے آخری چند برس میں ان کی صحت بہت خراب رہی۔ مولوی فضل الحق نے بنگال کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور فروغ تعلیم کے باب میں اہم خدمات انجام دیں۔ انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ بنگال کا قانون زراعت انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس قانون کا مقصد بڑے زمینداروں اور مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ سے کسانوں کو نجات دلانا تھا۔ مولوی فضل الحق نے برصغیر بالخصوص بنگال کے مسلمانوں کو خود نگری اور خود شناسی کے جوہر سے آشنا کرنے کے لئے جو عدیم النظیر خدمات انجام دیں تاریخ انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔

فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

(۱۲۰۸ھ - ۱۳۱۳ھ) حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی بن شاہ اہل اللہ ۲۱ر رمضان ۱۲۰۸ھ کو سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ مشہور وحدۃ الوجودی صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی نے فضل رحمٰن تاریخی نام رکھا۔ مولانا نورالحق فرنگی محل سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔ اور سلسلہ نقشبندی کے مشہور بزرگ شاہ محمد آفاق دہلوی سے بیعت طریقت کی اور خلافت پائی اور مستقل رہائش گنج مراد ضلع اناؤ میں اختیار کرلی۔

جہاد آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت ساٹھ برس کے تھے اس کے باوجود انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ ندوۃ العلماء کے قیام میں آپ کا مشورہ شامل تھا۔ مگر بعد میں اختلاف ہوگیا۔ اور اپنے صاحبزادے احمد میاں کو ندوہ کے جلسوں میں شرکت سے روک دیا اور فرمایا۔ یہ معاملات نفس ہیں۔ آپ کے خلفاء میں جن حضرات نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ان میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ مولانا احمد میاں گنج مرادآبادی مولانا [illegible] گنج مرادآبادی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا وصی احمد محدث سورتی، مولانا [illegible] الوری، پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا ظہور الاسلام فتح پوری۔ ۲۲ر ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو ایک سو پانچ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ گنج مرادآباد میں آپ کا مرقد زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔

فضل شاہ جلالپوری، پیر

(۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۰ھ [illegible] — ۱۷ر شعبان المعظم ۱۳۸۶ھ / یکم دسمبر ۱۹۶۶ء)

ضلع جہلم کے گاؤں جلالپور کے سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد [illegible] شاہ تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے دادا پیر حیدر علی شاہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ درسی کتب صرف و نحو مولوی عبدالرحیم سے۔ منطق، فلسفہ، [illegible] کلام اور علوم نقلیہ کی تعلیم مولوی فیض الحسن سے، صحاح ستہ، فقہ [illegible] مولوی قادر بخش ملتانی، حافظ جلال الدین اور مولوی محمد سعید سے پڑھیں۔ ماہنامہ رسالہ "صوفی" منڈی بہاؤالدین میں مضامین لکھتے رہے۔ ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء [illegible] آپ نے حزب اللہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی [illegible] اصلاح کے ساتھ سیاسی آزادی بھی تھا۔ تحریک مسجد شہید گنج میں حصہ لیا [illegible] میں قائد اعظم کو اپنی جماعت "حزب اللہ" کی طرف سے مکمل حمایت کا یقین [illegible] ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت میں پنجاب کا تفصیلی دورہ کیا [illegible] کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں اور پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ء [illegible] میں جماعتی طور پر حصہ لیا۔ ۲۴ر صفر ۱۳۶۷ھ / ۷ر جنوری ۱۹۴۸ء کو جمعیت مشائخ قائم کی۔ آپ اس کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ جمعیت مشائخ نے آپ کی سرپرستی میں پاکستان میں اسلامی آئین کے نفاذ اور ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں حصہ لیا۔

فضل شاہ، سید

(۱۸۲۹ء - ۱۸۹۰ء) معروف پنجابی شاعر لاہور کی متصل آبادی نواں کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی فطرت میں شاعری رچی بسی ہوئی تھی۔ پنجابی شاعری میں انھوں نے بڑا اہم مقام حاصل کیا۔ پیر وارث شاہ کی طرح ان

کی کتاب "سوہنی مہینوال" کو پنجابی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے لیلےٰ مجنوں، ہیر رانجھا، یوسف زلیخا نامی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

انھوں نے بڑی سادہ زبان میں تحفۂ فضل نامی کتاب میں رسول کریمؐ کے معجزوں کو قلمبند کیا ہے۔

فضل عثمان مجددی، صدر المشائخ

۔ (۱۳۱۹ھ — ۱۳۹۳ھ)

۱۳۱۹ھ شور بازار کابل میں نامور دینی راہنما اور سیاسی راہبر حضرت نور المشائخ فضل عمرؒ کے ہاں پیدا ہوئے آپ بچپن ہی سے متین، عابد اور حساس شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی ابتدائی پرورش آپ کے دادا غلام قیوم قدس سرہ نے کی جو سلسلہ مجددیہ کے برگزیدہ بزرگ اور قطب وقت تھے اور قلیل عرصہ میں علوم معقول، منقول اور فقہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے والد حضرت نور المشائخؒ سے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ معصومیہ قیومیہ میں بیعت ہوئے۔ بہت قلیل عرصہ میں علم سلوک کو مکمل کر کے زینت بخش مسند ارشاد ہوئے۔

جب افغانستان کے بادشاہ غازی امان اللہ خاں نے افغانستان کی مستقل آزادی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو حضرت صدر المشائخ نے اپنے والد کے ساتھ جنوبی افغانستان کے مقام پر انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ تل اور دانا کے فتح کے بعد انگریزوں نے اپنی شکست کا خود اعتراف کر لیا اس دینی و ملی خدمت کے صلے میں امان اللہ خاں نے حضرت کو سونے کا تمغہ پیش کیا۔

جب بچہ سقہ نے امان اللہ خاں کی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور سلطنت پر غاصبانہ قبضہ جمانا چاہا تو اس وقت حضرت صدر المشائخ افغانستان کے شمالی علاقہ ترکستان میں اقامت پذیر تھے۔ آپ نے باغیوں کے خلاف غازی امان اللہ خاں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جنرل غلام نبی خاں کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ ترکستان کے سقوی گورنر عطا محمد نے حضرت صدر المشائخ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تاکہ آپ امان اللہ خاں کی حمایت سے باز آجائیں مگر آپ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ لٹیرے اور غاصب کو مسلمانوں کا بادشاہ تسلیم نہیں کریں گے۔ گورنر نے آپ کے لئے پھانسی کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں جنرل غلام نبی نے بلخ پر پھر بطور حملہ کر کے بچہ سقہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سقوی گورنر کو زندہ گرفتار کیا۔ اس طرح حضرت صدر المشائخ موت کے منہ سے بچ گئے۔ اسی اثنا میں امان اللہ خاں نے سلطنت اور افغانستان کو خیرباد کہا اور اٹلی چلے گئے۔

امان اللہ خاں کی غیر موجودگی میں نادر شاہ اٹھا اور اس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح حضرت صدر المشائخ کابل تشریف لائے تو نادر شاہ نے آپ کو وزارت انصاف یعنی عدلیہ میں امور اصلاح شرعیہ کا رکن نامزد کیا۔ لیکن بہت تھوڑے عرصہ بعد آپ اس رکنیت سے مستعفی ہو کر اپنی دینی خدمات اور فریضہ رشد و ہدایات انجام دینے لگے۔ سب عالم اسلام کے لئے حضرت صدر المشائخ کی خدمات یکساں تھیں۔

اپنے دادا حضرت نور المشائخ کی وفات کے آٹھ ماہ بعد آپ فریضۂ حج بیت اللہ کی ادائیگی کے لئے کابل سے عازم حجازِ مقدس ہوئے۔ ادائیگی حج کے بعد جدہ سے کراچی تشریف لائے۔ یہاں چند دن قیام کرنے کے بعد اپنے جدِ اعلیٰ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لئے سرہند چلے گئے۔ پھر مریدوں کے پیہم اصرار پر آپ کاٹھیاوار بمبئی، کلکتہ اور مشرقی پاکستان وغیرہ تشریف لے گئے۔

اس کے بعد صدر المشائخ تقریباً سترہ برس پاکستان میں مقیم رہے اور لاہور گلبرگ کو اپنا دائمی مسکن قرار دے کر تبلیغ اسلام، اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعت سلوک مجددیہ میں مشغول ہو گئے اور ہزاروں طالبان وحدت کو اپنی فیوضات و رشد و ہدایات سے فیضیاب فرمایا۔

۷۳ برس کی عمر میں عالم اسلام کے مذہبی پیشوا اور حضرت مجدد تحریک کے سرگرم رکن نے ۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء کو وفات پائی اور آپ کی وصیت کے مطابق کابل میں دفن کیا گیا۔

فضولی

۔ محمد بن سلیمان فضولی۔ کرد نسل کا ترکی شاعر۔ بغداد میں پیدا ہوا۔ بعض روایات کے مطابق ۹۶۳ھ/۱۵۹۲ء کو اس کا انتقال ہوا۔

اس کا دیوان ترکی زبان میں آذربیجانی ہے۔ اس نے فارسی میں ایک ساقی نامہ بھی لکھا۔ فضولی نے حسین بن علی الواعظ الکاشفی کی مشہور نظم "روضۃ الشہداء" کا ترجمہ 'حدیقۃ الشہداء' کے نام سے کیا ہے۔ جس میں حضرت علیؓ اور اہل بیعت کی شہادت کے حالات کا بیان ہے۔ فضولی کے کلام میں جدت ہے اور اظہارِ بیان پُر جوش ہے۔

فِطرت

پیدائش۔ آفرینش۔ سرشت۔ فضیلت۔ نیچر۔ دانائی۔ چالاکی۔

فطرۃ الانبیاء سے مراد وہ آداب بدن ہیں جو انبیاء سابقین کے سنن میں سے تھے اور آنحضرتؐ نے ان کو بحال رکھا۔ آپ کی امت کے لیے بھی وہ امور سنت ہیں اور وہ یہ دس ہیں:۔

(۱) لبوں کے بال کٹوانا (۲) ڈاڑھی رکھنا (۳) مسواک کرنا (۴) پانی سے نتھنے صاف رکھنا (۷) بغلوں کے بال اکھیڑنا (۸) موئے زیر ناف مونڈنا (۹) استنجا (۱۰) وضو کے وقت کلی کرنا۔

فطرہ صدقۂ فطر کو بھی کہتے ہیں۔ فطرۃ اللہ سے مراد اللہ کا قانون آفرینش۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "یہ خدا کی (بنائی ہوئی) سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔"

فطرۃ الاسلام۔ اسلام کی خصلت حدیث شریف میں آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ "ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں یا مجوسی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔"

فطرت، عبدالرؤف

۔ ترکستان میں ایک اصلاحی تحریک کا بانی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں بخارا میں پیدا ہوا۔ عملی زندگی کا آغاز معلمی سے کیا۔ زندگی کے باقی اوقات تصنیف و تالیف، شعر و شاعری اور صحافت میں گزارے۔ ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں اس نے بخارا میں تعلیمی اصلاح کے لیے شروع کی گئی ایک تحریک میں حصہ لیا۔ فطرت جلد ہی تحریک کے کارکنوں کے اذہان و افکار پر چھا گیا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک اس نے بخارا اور ترکستان کے نظامِ تعلیم کی اصلاح کی کوششوں میں اہم حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں جمہوریہ بخارا کے قیام کے بعد اس کی حکومت میں وزارتِ تعلیم اور بعد میں وزارتِ خارجہ کے امور کو سنبھالا۔

فطرت کی اہم تصانیف مناظرہ، بیانات سیاح ہندی، رہبر نجات، اور عائلہ ہیں۔ اس کے کئی ناول اور نظموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

فقر

۔ فقر کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے

(۱)۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا۔ اس اعتبار سے تمام انسان فقیر ہیں۔ انتم الفقراء ..... اے انسانو! تم سب اللہ کے فقیر (محتاج) ہو

۲۔ ضروریاتِ زندگی کا کما حقہٗ پورا نہ ہونا

ان فقراء کے لیے جو اللہ کے دین کے کام میں ایسے مصروف ہو گئے ہیں، . . .
امداد کے صحیح مستحق ہیں۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۷۳)

۳۔ فقر النفس یعنی مال کی ہوس۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے فرمایا کہ کَادَ الفقرُ اَن یکونَ کُفراً۔ اندیشہ ہے کہ فقر کفر تک نہ پہنچا دے۔

۴۔ اللہ تعالےٰ کی طرف احتیاج، جس کی عکاسی نبی کریمؐ کی اس دعا سے ہو سکتی ہے۔ ' اے اللہ تعالےٰ! مجھے اپنا فقیر بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا۔ نبی کریمؐ نے ایک اور دعا میں اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں التجا کی۔ "اے میرے اللہ! مجھے فقیری کی حالت میں زندہ رکھ . . . "

فقر، غناء کی ضد میں بولا جاتا ہے۔ "غنی" خدا کا نام ہے اور وہی اس صفت کا سزاوار ہے۔ انسان تو پیدا ہی فقیر اور محتاج ہوا ہے جس کا ذکر اللہ تعالےٰ نے سورۃ فاطر کی آیت ۱۵ میں کیا ہے۔ یہ دنیا ابتلاء اور آزمائش کی جگہ ہے۔ اس لیے اگر یہاں غنا کی حالت ہو یا فقر کی، دونوں میں انسانوں (مسلمانوں) کے لیے آزمائش ہے۔ فقر کی حالت میں ضروری ہے کہ صبر کیا جائے، اور غناء کی حالت میں اللہ تعالےٰ کا شکر یہ ادا کرنا ضروری ہے۔

فقرِ محمدی۔ مشائخ طریقت کے ایک بزرگ شیخ احمد بن ابراہیم واسطیؒ کی "تصوف" کے موضوع پہ ایک کتاب کا نام "فقرِ محمدی" ہے۔ شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں "تحصیل الکمال الابدی باختیار الفقر المحمدی" کے نام سے کیا ہے۔

شیخ احمد واسطی نے اس کتاب میں تصوّف کے معنی، فقیر کی علامات، تصوف کے سلسلے عملی ہدایات اور اس کی شرائط کو بیان کیا ہے۔

فقہ۔ لغوی اعتبار سے لفظ "فقہ" کے معنی فہم و ادراک کے ہیں اور اصطلاح شرع میں فقہ مخصوص فہم سے حاصل کردہ اس علم کو کہتے ہیں جو قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ سے ماخوذ ہو یعنی العلم بالشئ والفہم لہٗ۔ یہی معنی قرآن مجید کے مختلف مقامات پر مذکور ہیں۔ وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوبِھِم فَھُم لَا یَفقَھُونَ (اور اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور وہ نہیں سمجھتے۔ سورۃ توبہ آیت ۸۷) یَفقَھُوا قَولِی۔ سورۃ طٰہٰ آیت ۲۸) کہ سمجھیں میری بات)

یہ لفظ نبی کریمؐ کی احادیثِ مبارکہ میں بھی کئی جگہ آیا ہے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں دعا فرمائی "اللّٰھُمَّ عَلِّمہُ الدِّینَ وَفَقِّھہُ فِی التَّاوِیل"

علامہ زمخشری نے فقہ اور فقیہ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے۔ فقہ کے معنی شق اور فتح کے ہیں اور فقیہ اس عالم کو کہتے ہیں جو احکام میں چھان بین کر کے ان کے حقائق معلوم کرے اور مشکل مقامات کو کھول دے۔

علامہ ابن اثیر نے بھی فقہ کی تعریف تقریباً اسی انداز سے کی ہے۔ کسی شے کو چیرنا اور کھولنا عمومی طور پر اعمالِ شریعہ کے مسائل کے علم کو "علم فقہ" کہتے ہیں۔ الفقہ علم بالمسائل الشرعیۃ فقہاء علم فقہ کی تعریف میں بیان کرتے ہیں۔ ان فروعی احکام شرعیہ کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہو۔

ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں اور مولانا اشرف علی تھانوی نے "کشاف اصطلاحات الفنون" میں امام ابو حنیفہؒ کی نسبت سے فقہ کی تعریف اس طرح بیان ہے۔ "ھُوَ مَعرِفَۃُ النَّفسِ مَا لَھَا وَمَا عَلَیھَا یعنی کل علوم دینیہ کی معرفت۔ شافعی مسلک میں علم الفقہ کی تعریف اس طرح ہے "فقہ شریعت کے ان عملی احکام کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ثابت ہوں"۔

فقہ اسلامی کے لئے چار ماخذ بیان کئے جاتے ہیں۔

۱ کتاب اللہ۔
۲ سنتِ رسول اللہؐ۔
۳ اجماع
۴ قیاس

بعض فقہا قیاس کو ماخذِ فقہ اسلامی تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح مذاہبِ اربعہ میں قیاس کی صورتیں، شرط اور اصول الگ الگ ہیں۔

بعض اہلِ علم فقہ کے لئے دس اصول بیان کرتے ہیں۔

۱ قرآن مجید
۲۔ سنتِ رسول اللہ
۳۔ خلفائے راشدینؓ کا تعامل
۴۔ اجماع
۵۔ قیاس
۶۔ مسلمان حکمرانوں کی طرف سے جاری کردہ ایسے احکام جو قرآن و سنت کے خلاف نہ تھے
۷۔ ثالثوں کے وہ فیصلے جن سے قرآن و سنت اور اجماع کی نفی نہیں ہوتی۔
۸۔ نبی کریمؐ، خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، مسلمان خلفاءؒ کی طرف سے اپنے اعمال و سفراء کے لیئے جاری کردہ ہدایات (بعد کے ادوار کے مسلمان خلفاؒ کی طرف سے جاری کردہ وہ ہدایات جس میں فقہا کا مشورہ بھی شامل ہو)
۹۔ بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قانون سازی جو کہ قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔
۱۰۔ ایسے عرف، عادات، رسوم و رواج و روایات جو قرآن و سنت کے احکام کے خلاف نہ ہوں

فقہ اسلامی کیلئے ماخذ کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ظاہریہ کے نزدیک ماخذ صرف قرآن و سنت اور اجماع ہیں۔

شوافع قرآن، سنت، اجماع، قیاس اور استصحاب پانچ ماخذ مانتے ہیں۔ احناف مذکورہ پانچ میں دو استحسان اور عرف کا اضافہ کرتے ہیں۔

حنابلہ مذکورہ پانچ میں دو مصالح اور سد ذرائع کا اضافہ کرتے ہیں۔

مالکیہ مذکورہ بالا تمام ماخذوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

فقہ اسلامی کو نبی کریمؐ کی بعثت سے لے کر موجودہ وقت تک کئی ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور — عہدِ نبوت
دوسرا دور — عہدِ خلفائے راشدینؓ و اکابر صحابہؓ
تیسرا دور — عہدِ صغار صحابہؓ اور تابعینؒ
چوتھا دور — عہدِ خلافت بنو عباس
پانچواں دور — تقلیدِ خالص اور اختلاط کا دور
چھٹا دور — تقلیدِ محض کا دور
ساتواں دور — موجودہ بیداری کا دور

پہلا دور — عہدِ نبوت

فقہ اسلامی کا یہ پہلا دور ہے جو رسول کریمؐ کی ابتداء رسالت (۶۱۰ء) سے شروع ہوا اور آپ کی وفات (۶۳۲ء) پر ختم ہوا۔ اس دور میں قرآن مجید فقہ اسلامی کا ماخذ اور اصل سرچشمہ تھا۔ اس کے ساتھ نبی کریمؐ کا عمل (سنت) بھی تشریع کی بنیاد بنتا گیا جو آپ کہتے یا کرتے تھے اس کی بنیاد وحی الٰہی ہوتی تھی۔ بعض امور میں نبی کریمؐ نے عرف عرب کے مطابق فیصلے کئے جن کی تائید و تصدیق وحی کے ذریعے ہو گئی۔

دوسرا دور عہد خلفائے راشدینؓ یعنی دور کبار صحابہؓ (۱۱ھ سے ۴۰ھ تک)

نبی کریمؐ کی وفات کے بعد خلفائے راشدینؓ اور دوسرے کبار صحابہؓ جو فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے تھے کسی مسئلہ پر قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ کرتے اور اُن کے بارے میں آپس میں باہم مشورے کرتے تھے اور جب قرآن و سنت میں واضح حکم نہ ملتا تو اجماع و قیاس سے کام لیتے

اسی دور سے قانون سازی کے لئے قرآن وسنت کے ساتھ اجماع اور قیاس بطور دلائل شرعیہ کے پیدا ہوئے۔ فتویٰ دینے اور مقدمات کے فیصلہ میں خلفائے راشدینؓ اور اُن میں سے خصوصی طور پر حضرت عمر فاروقؓ نے اہم حصہ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں مملکتِ اسلامیہ میں فتوحات کے ذریعے کافی توسیع ہوئی۔ انہوں نے شریعتِ اسلامی کی حقیقی روح کو سمجھا اور زمانے کی ضروریات کے مطابق سلطنت اور اس کے متعلقہ اداروں کی تنظیم کی۔ حضرت عمرؓ کے اجتہادات کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔

اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پیش آمدہ مسائل کے بارے میں فیصلے دئے جاتے تھے۔ کبار صحابہؓ اکرامؓ اور خصوصی طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی کریمؐ کی احادیث کے متعلق بڑی احتیاط کیا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں قرآن وسنت کے منشا تک پہنچنے کے لئے آپس میں اختلاف بھی کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کئی مواقع پر دوسرے اکابر صحابہ سے اختلاف کیا جن کی تفصیل کتبِ سیر میں مل سکتی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے مابین جنگِ صفین اور جنگ جمل جیسے اہم نزاعی اور اختلافی امور سے اُمتِ مسلمہ تین گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔

۱: شیعہ جو نبی کریمؐ کے بعد حضرت علیؓ اور اہل بیت کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔

۲: عام مسلمان جو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان کی خلافت کو حق سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت پر متفق ہو گئے تھے۔

۳: خوارج جو انتہا پسند گروہ تھا اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، اور حضرت معاویہؓ کے خلاف تھے اور خلافت کو جمہور کا حق سمجھتے تھے۔

اس دور کے فقہا صحابہؓ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، خلفائے راشدینؓ اور عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابت اور ابی بن کعبؓ شامل ہیں۔ فقہائے کبار کے مختلف مسالک بعد میں جغرافیائی ناموں سے مشہور ہوئے کیونکہ اکثر فقہا صحابہ مختلف مقامات پر مقیم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اصحابِ مدینہ، اصحابِ عراق اور اصحاب شام کا فرق اس دور سے شروع ہوا۔

تیسرا دور عہد صغارِ صحابہؓ اور تابعینؒ

صغار صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا دور حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت ۴۱ھ سے لے کر بنو امیہ کے زوال تک ہے۔ اس دور میں داخلی سیاسی کشمکش میں شدت پیدا ہو گئی۔ شیعہ اور خوارج کے گروہ مضبوط ہوئے اور دوسری طرف مملکتِ اسلامیہ کا دائرہ چین کی سرحدوں سے اندلس تک پھیل گیا۔ ان تمام معاملات سے فقہ پر بھی اثرات مرتب ہوئے۔ صحابہ کرامؓ فتوحات کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں پھیلتے چلے گئے اور غیر اقوام کے داخلے سے حدیث کی روایت میں جو کثرت پیدا ہوئی تھی اُس کی وجہ سے کافی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس زمانے میں فقہی نقطۂ نگاہ سے تین گروہ بن گئے۔ اہلِ حدیث (اہلِ حجاز) اہل الرائے (اہل عراق) اور ظاہریہ (رائے کا انکار کرتے تھے اور داؤد ظاہری اس گروہ کے امام تھے) اس زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث کی حفاظت اور تدوین کا کام شروع کرایا اور ابن شہاب زہری نے اس کام میں اہم کردار ادا کیا۔

اکابر صحابہ کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، عمرو بن العاصؓ، انس بن مالکؓ اور تابعین میں سے شریح بن حارثؒ، ابراہیم بن یزید نخعیؒ، طاؤس بن کیسان جندیؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس دور میں فتاویٰ دیا کرتے تھے۔

شیعی فقہ کی باقاعدہ ترتیب بھی اسی دور سے شروع ہوئی۔

چوتھا دور عہد خلافتِ بنو عباس

دوسری صدی ہجری (مطابق آٹھویں صدی عیسوی) کے اوائل سے لے کر چوتھی صدی ہجری (مطابق دسویں صدی عیسوی) کے وسط تک کا دور فقہ اور احادیث کی تدوین کا دور ہے اس دور سے ہی حدیث اور فقہ کے مشہور آئمہ کرام کی قیادت کو جمہور نے تسلیم کیا۔ اس عہدِ خلافت کا آغاز اُن لوگوں کی کامیابی تھی جو عرصہ طویل سے خلافت کو بنی امیہ سے آل رسولؐ میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اسی دور میں اہل بیعت کے ماننے والوں کے درمیان بھی اختلاف واضح ہو کر سامنے آئے اور امامت وخلافت کے سلسلے میں آئمہ اہل بیعت میں کافی تفریق پیدا ہو گئی اور ان کے دو مذہب مشہور ہوئے اور وہ شیعہ زیدیہ اور شیعہ امامیہ ہیں۔ شیعہ فقہی مسائل میں امام جعفر صادقؒ کی فقہ جعفریہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس دور میں کئی فقہی مذاہب پیدا ہوئے۔ اُن میں چار اپنے مذاہب کے بانیوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ حنفی مسلک کے بانی امام ابوحنیفہؒ، مالکی مسلک کے بانی امام مالک بن انسؒ، شافعی مسلک کے بانی امام شافعیؒ اور حنبلی مسلک کے بانی امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے مشہور شاگردوں نے تدوینِ فقہ میں تاریخی کردار ادا کئے ہیں۔ ان مسالک اربعہ کے علاوہ چند اور مسلک بھی وجود میں آئے لیکن جلد ہی زوال پذیر ہو گئے جن میں ابن شبرمہ (م ۱۴۴ھ)، ابن ابی لیلےٰ (م ۱۴۸ھ) امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ)، سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)، شریک نخعی (م ۱۷۷ھ) لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ)، اسحٰق بن راھویہ (م ۲۳۸ھ)، ابوثور بغدادی (۲۴۶ھ) داؤد ظاہری (۲۷۰ھ)، امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) قابلِ ذکر ہیں۔

اسی دور میں احادیث نبوی جمع ہوئیں اور ان کے مجموعے مرتب ہوئے جن میں سے بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، ابوداؤدؒ، بیہقیؒ، نسائیؒ کے مجموعے مشہور ہیں۔ قرآن مجید کی تفاسیر لکھی گئیں، فقہ کے اصول اور فروع پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ کئی نئے علوم وجود میں آئے مثلاً علم مصطلحات حدیث، علم اصول اور علم فروع۔

پانچواں دور تقلید خالص اور انحطاط کا دور

چوتھی صدی کی ابتدا سے سلطنت عباسیہ کے زوال تک۔

سلطنتِ عباسیہ کے اواخر میں علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ خاص خاص مذاہب کی پابندی پر اکتفا کر لیا گیا اور ان کی تائید کیلئے مناظرہ وجدال میں شدت پیدا ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ہر طرف جمود چھا گیا اور تقلید پھیل گئی، فقہی اجتہاد رک گیا۔ اس دور کو تقلید خالص اور انحطاط کا دور کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی تعصبات کو فروغ حاصل ہوا۔ شیعہ مذہب کی ایک نئی شاخ اسماعیلیہ کے وجود میں آنے سے شیعہ مذہب کے تین گروہ بن گئے، زیدیہ، امامیہ اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ

چھٹا دور، تقلیدِ محض کا دور

بغداد کی فتح نے جو ہلاکو خاں کے ہاتھوں ہوئی تھی اب تک امتِ مسلمہ کی اکثریت تقلید محض پر قائم ودائم ہے۔

ساتواں دور، موجودہ بیداری کا دور

تقلیدِ محض سے امتِ مسلمہ میں بدعات اور خرافات کثرت سے پھیل گئیں۔ جنکی بنیاد وہم اور جہالت پر تھی۔ لوگ شریعت کی اصلی روح کو نظر انداز کر کے بعض متقدمین کے اجتہاد کے پابند ہو گئے۔ اس دوران تقی الدین ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ جیسے مجددین اس اعلان کے ساتھ سامنے آئے کہ تقلید کو ترک کیا جائے اور مذاہب فقہ میں وحدت پیدا کی جائے۔ شریعت کے اصلی مصادر قرآن وسنت کی طرف رجوع کیا جائے اور بدعات و خرافات سے دوری اختیار کی جائے۔ یہ دونوں آٹھویں صدی ہجری (چودہویں صدی عیسوی) کے حنبلی فقہا میں سے تھے۔ بارہویں صدی ہجری میں محمد بن عبدالوہابؒ جو بلادِ عرب میں وہابی تحریک کے بانی کہلاتے ہیں، انہی کے نقشِ قدم پر چلے۔ انیسویں صدی عیسوی میں سید جمال الدین افغانی اور مصر کے شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ یہ دعوت لے کر سامنے آئے کہ فقہائے قدیم نے اسلامی فقہ کی تدوین جن حالات میں کی تھی موجودہ دور کے مسائل اُن سے مختلف ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی فقہ کی تشکیل نو کی جائے اس اندازِ فکر پر کام کرنے والوں میں عرب دنیا سے المحمصانی، علی حسن عبدالقادر، عودہ شہید احمد مصطفیٰ الزرقاء،

سید قطب شہید، استاذ ابوزہرہ، استاذ ذوالیبی جیسے ماہرین قانون و فقہ شامل ہیں ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلامی فقہ کی تشکیل نو کے لئے قرآن و سنت سے ہی رہنما اصول لئے جائیں اور فقہائے قدیم کے فیصلوں سے نظائر (قیاس کے اصول پر) لیکر مسائل جدید کا حل نکالا جا سکے۔

برصغیر ہندو پاک میں علامہ اقبال نے اجتہاد کے ذریعے اسلامی کی تشکیل نو کیلئے اہم تجاویز مدراس کے اپنے مشہور عالم چھ خطبوں میں سے ایک خطبہ

میں پیش کی ہیں۔

پاکستان میں فقہ جدید کی تشکیل کے لئے اساسی خاکے کے طور پر پاکستان کے مشہور و معروف علماء کا بائیس نکاتی متفقہ فارمولا موجود ہے۔ مختلف حکومتوں کے وقت عامۃ المسلمین کے اسلامی نظام شریعت کے نفاذ کے مطالبے پر اسلامی نظریاتی کونسلز تشکیل دی گئی ہیں لیکن وہ کوئی مفید کام نہ کر سکیں نہ ہی اُن کی تجاویز پر برسرِ اقتدار طبقہ نے عمل کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان کے عوام کی طرف سے اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ بڑی شدت سے پیش کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے بعد عبوری حکومت عوام کے مطالبہ کے پیش نظر اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اہم اقدامات کر رہی ہے اور اس میں جدید مسائل کے حل کرنے کے لئے متفقہ فقہی لائحہ عمل ایک اسلامی نظریاتی کونسل کی سرپرستی میں تیار کیا جا رہا ہے۔

برصغیر پاک و ہند، افغانستان، ترکی کے علاقوں میں زیادہ تر فقہ حنفی پر عمل کیا جاتا ہے۔

فقیر - عربی کا یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو ضرورت مند یا حاجت مند ہوں۔ چاہے دنیاوی ضروریات کے نقطہ نظر سے یا روحانی نقطہ نظر سے۔ فقیر اور مسکین میں یہ فرق ہے کہ فقیر تو صرف محتاج ہوتا ہے اور مسکین تباہ حال۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے آپ کو غنی اور اس کے مقابلے میں انسان کو فقیر یعنی حاجت مند کہا ہے۔ (سورۂ فاطر آیت ۱۵)۔ فقیر کو فارسی میں درویش کہتے ہیں۔ فقیر اور درویش، دونوں الفاظ اُردو میں عام مستعمل ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں مانگنے والوں اور سائل کے لیے یہ لفظ مستعمل ہونے سے اس کا اصل مفہوم بدل گیا ہے۔ حالانکہ جس انداز میں یہ لفظ سورہ فاطر میں اللہ نے استعمال کیا ہے کہ انسان تو اللہ سے مانگنے والا ہے اور اللہ تعالےٰ کسی بھی چیز کا محتاج نہیں۔ نوع انسان بہرصورت فقیر ہے چاہے وہ اللہ سے مانگے یا نہ مانگے۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرتے ہیں اور دوسروں سے کچھ طلب نہیں کرتے ان کو متوکل کہتے ہیں۔

نبی کریم نے ارشاد فرمایا الفقر فخری۔ (فقر میرے لیے باعث فخر ہے) فقر کی اصطلاح اہل تصوّف میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ شیخ علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فقر کی تعریف اور اہل فقر کی صفات بیان کی ہیں۔ چنانچہ تصوف کی اصطلاح میں فقیر وہ ہوتا ہے جو متاع دنیا سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس کے پاس خواہ سرے سے کچھ موجود نہ ہو یا اس کے پاس دنیا کے سارے اسباب موجود ہوں دونوں میں سے کسی حالت میں اس کی کسی چیز میں خلل نہ آئے۔ نہ کسی چیز کے نہ ہونے سے اسے کوئی پریشانی لاحق ہو اور نہ سارے اسباب موجود ہونے سے وہ اپنے آپ کو غنی اور دولتمند محسوس کرے۔ گویا دنیا کی کسی متاع کا ہونا اور نہ ہونا اس کے نزدیک یکساں ہو، بلکہ تنگ دستی اور افلاس کی صورت میں وہ زیادہ خوش ہو۔ کیونکہ فقیر جس قدر تنگ دست ہو ٹھیک ہے کہ اس صورت میں اس پر حال کا انکشاف زیادہ ہوگا اور اس پر غفلت کم طاری ہوگی۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں فقیر وہ ہے "جسے اللہ عزوجل کے سوا کسی اور چیز سے چین نہ آسکے"۔ اسی طرح نبی کریمؐ نے فقراء کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ روز قیامت حکم دے گا:

"میرے دوستوں کو میرے پاس لاؤ۔ فرشتے سوال کریں گے کہ آپ کے دوست کون ہیں تو اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ فقراء اور مساکین"۔

فقیر اللہ، جلال آبادی - ایک صاحب کرامت بزرگ۔

قصبہ روناس کے ایک قریشی ہاشمی گھرانے میں عبدالرحمٰن حنفی کے ہاں پیدا ہوئے علم کے حصول اور مراتب سلوک و ریاضت کو طے کرکے حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے گئے۔ حج و زیارت سے واپسی کے بعد نقشبندی سلسلہ میں شیخ محمد مسعود پشاوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شیخ محمد مسعودؒ، شیخ محمد سعید لاہوریؒ کے مرید تھے۔ جو کہ شیخ سعداللہؒ کے مرید تھے، جنہوں نے حضرت آدم بنوریؒ خلیفہ مجدد الف ثانیؒ سے فیض حاصل کیا۔

سلسلہ نقشبندیہ کے علاوہ شاہ فقیر اللہ کو قادریہ سلسلہ میں بھی اجازت تھی۔ احمد شاہ درّانی کے عہد حکومت میں شکارپور سندھ کے علاقہ میں ہر دلعزیز اور معروف عالم دین و زاہد شخص تھے۔

شاہ فقیر اللہ کے مکتوبات میں احمد شاہ درّانی، نصیر خان بلوچ، شاہ ولی خان صدر اعظم، شہزادہ سلیمان ولی عہد اور دوسرے اکابر و مشاہیر کے نام ان کے خطوط موجود ہیں۔ شاہ فقیر اللہ نے شکارپور میں ۱۱۹۵ھ کو انتقال کیا۔ ان کا مزار بھی یہیں ہے۔ آپ کی تصانیف میں معروف کتب درج ذیل ہیں :-

۱۔ فتح الجمیل فی مدامج التکمیل، (تصوّف و سلوک کے موضوع پر) عربی زبان میں۔
۲۔ النجات من مصائب الدنیا والعرصات۔ (فارسی)
۳۔ طریق الارشاد فی تکمیل المومنین والاولاد (عربی)
۴۔ فیوضات الٰہیہ۔ (فارسی)
۵۔ منتخب الاصول در علم اصول فقہ۔
۶۔ وثیقۃ الاکابر۔ (عربی)
۷۔ مدارج عالیہ در فقہ و تصوّف و اسرار و اخلاق
۸۔ فتوحات غیبیہ (صوفیاء کرام کے عقائد کی شرح) فارسی
۹۔ جواہر الاوراد۔ (عربی)
۱۰۔ کتاب الازہار فی ثبوت الآثار۔ (عربی)
۱۱۔ محمود الاوراد۔ (عربی)
۱۲۔ فوائد فقیر اللہ۔ (پشتو)
۱۳۔ مکتوبات مشتمل بر ۳۰۹ صفحات۔ (عربی۔ فارسی)
۱۴۔ قصیدہ مبرورہ (عربی) جو نبی کریمؐ کے روضۂ اقدس پر منظوم کیا

فقیر اللہ شاہ، قادری نوشاہی (وفات ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء)

آپ کے والد کا نام پیر احمد شاہ تھا۔ نوشاہی بازقندری سلسلہ میں اپنے والد سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔ آپ ایک بہت بڑے صوفی اور زاہد انسان تھے۔ آپ کئی بیماریوں کا روحانی طور پر علاج کیا کرتے تھے جن میں جذام اور اثھرا بھی شامل ہیں۔ آپ کا مزار بدوملہی ضلع سیالکوٹ میں ہے۔

فقیر شمس الدّین - (۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء - ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء)

دہلی کے ایک عالم، ادیب اور شاعر۔ علمی، ادبی اور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۴۰ھ میں اورنگ آباد (دکن) چلے گئے۔ جہاں گوشہ نشین رہے۔ پانچ سال بعد دہلی آئے۔ دوبارہ گوشہ نشین ہوکر آگرے میں رہے۔ ۱۱۷۵ھ میں لکھنؤ گئے اور وہاں سے ۱۱۸۰ھ میں نجف و کربلا کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ زیاراتِ مقاماتِ مقدسہ سے واپسی پر کشتی کے ایک حادثہ میں انتقال ہوا۔

شمس الدین فقیر برصغیر پاک و ہند میں معانی، بیان و عروض کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی تصانیف میں حدائق البلاغتہ، خلاصتہ البدیع، الوافیہ فی العروض والقافیہ، مثنوی شمس الضحیٰ، مثنوی درمکنون، مثنوی حسن و عشق شامل ہیں۔ حدائق البلاغتہ دوسو سال سے نصاب میں داخل ہے۔

فقیر نور محمد سروری قادری ۔ (۱۸۰۳ء) - (۱۹۶۰ء)

آپ کی ولادت کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ہوئی۔ خواجہ گیسو دراز" کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد کا نام حاجی گل محمد تھا۔ آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۱۲ء میں بغداد بھی گئے۔ حضرت سلطان باہوؒ کے سجادہ نشین سوئم صالح محمد قادری سے بیعت کی تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ سے عقیدت کی وجہ سے ان کی ایک سو کے قریب کتب کی ترتیب و تدوین کا ارادہ کیا۔ مکتبہ سلطانی کے زیر اہتمام چالیس کتب کو نئے انداز میں مرتب کیا۔ لیکن ان میں سے صرف چند شائع ہو سکیں۔

آپ کے دو صاحبزادے ہیں جن میں سے ایک کا نام فقیر عبدالحمید کامل سروری قادری ہے۔ دوسرے فقیر عبدالرشید خاں ہیں۔ مخزن الاسرار، سلطان الاوراد، عرفان حصہ اوّل۔ حصہ دوئم (انگریزی) اور حضرت سلطان باہو کی فارسی کتاب نور الہدیٰ کا اُردو ترجمہ "حکم نامہ" آپ کی تصانیف ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۷، ۱۸؍اکتوبر ۱۹۶۰ء کو فیصل آباد (لائل پور) میں ہوا۔ بعدازاں آپ کی میت کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں، لے جاکر دفن کی گئی۔

فقیر محمد جہلمی ۔ (برصغیر کے نامور عالم)

مولانا فقیر محمد جہلمی ۱۲۴۰ھ میں جہلم کے موضع چتن میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سفارش علی تھا۔ ابتدائی تعلیم میاں قطب الدین سے حاصل کی۔ باقی علوم میں صرف و نحو مولانا نور محمد سے، منطق مولانا عبدالکریم شاہ پوری سے، معقولات مولوی محمد حسن سے حاصل کیے۔ دہلی میں میاں نذیر حسین محدث کے درس میں شریک رہے۔ میاں نذیر حسین کے مشورہ پر مولوی محمد شاہ صاحب کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ بعد میں مفتی صدر الدین آزردہ کے مدرسہ سے بھی اعلیٰ تعلیم دینی حاصل کی۔ ۱۲۷۸ھ میں جہلم واپس آئے۔ اس کے بعد لاہور آئے۔ مولوی کرم الٰہی صاحب سے علمی استفادہ کے علاوہ لاہور میں قیام کے دوران خوشنولیسی کی تربیت حاصل کی۔ مطبع آفتاب لاہور میں کاتب کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ ۱۲۸۴ھ میں حافظ ولی اللہ لاہوری، پنجاب کے نامور مناظر، امرتسر کے ایک پادری عماد الدین سے تحریری بحث کر رہے تھے۔ مولانا فقیر محمد جہلمی اس تحریری بحث کو لکھتے تھے۔ اس ذریعے سے انھیں عیسائیت کے وسیع مطالعہ کا موقع ملا آپ نے اس مناظرہ کی مکمل روئیداد کو ترتیب دے کر خود چھپوایا۔ فارسی کی کتاب ... "تصدیق المسیح" کا اردو ترجمہ کیا۔ حافظ ولی اللہ کی تصانیف "صیانتہ الانسان" اور "ابحاث ضروری" پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔

۱۱ر محرم ۱۲۹۱ھ میں مولانا جہلمی "آفتاب پنجاب" کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۳۰۱ھ تک یہ فریضۂ ادارت سرانجام دیتے رہے۔ ۱۳۰۲ھ میں اپنے وطن واپس آئے اور "سراج المطابع" کے نام سے ایک پرنٹنگ پریس لگاکر "سراج الاخبار" کے نام سے ایک پرچہ نکالا۔

آپ کی تصانیف میں حدائق الحنفیہ، زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل، اور آفتاب محمدی، بڑی مشہور کتابیں ہیں۔

فقیہہ

۔ نام معنوں میں کسی شے کا علم و فہم رکھنے والے شخص کو کہتے ہیں۔ فقہ کے باقاعدہ علم کی شکل اختیار کرنے سے اس لفظ کا استعمال دین کے عالم، شریعتِ اسلامی کا فہم رکھنے والے افراد کے لئے مخصوص ہوگیا۔

فقیہ با

۔ حضرموت میں تریم کے باعلوی سادات کا ایک خاندان۔ ان کے جد اعلیٰ محمد بن علی تھے جو تریم سے عیدید میں آگئے تھے۔ اسی لیے صاحب عیدید کے نام سے بھی معروف ہوئے

بافقیہوں کے مورث اعلیٰ محمد بن علی صاحب عیدید جو ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کے اخلاف میں کئی فقیہ اور صوفی حضرات گزرے ہیں جو اپنے اپنے مقامات اور زمانے میں بہت مشہور ہوئے۔ (نیز دیکھیے "باعلوی")

فقیہ بل

۔ حضرموت میں تریم قصبہ کے باعلوی سادات کا ایک (دوسرا) خاندان۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ ممتاز عالم، فقیہ محمد بن عبدالرحمٰن المعروف بہ اَسْقَعْ تھے۔ اسقع نے اپنے وطن تریم کے علاوہ عدن، زبید، مکّہ اور مدینہ میں علوم دینی کی تحصیل کی۔ تریم میں ہی ۹۱۷ھ/۱۵۱۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ (نیز دیکھیے "باعلوی")

فکر

۔ جمع افکار۔ بمعنی سوچ بچار۔ بعض ادبا کے خیال میں اس کے معنی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے بارے میں چھان بین کرنا ہے۔ رَجُلٌ فِکِّیرٌ۔ بہت زیادہ غور و فکر کرنے والے شخص کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ فکر سورۃ سبا کی آیت ۴۶ میں (تَتَفَكَّرُوا)، سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۹ میں (تَتَفَكَّرُونَ) سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۴ میں (اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا) آیا ہے۔

اہلِ تصوّف عمومی طور پر فکر کے مقابلے میں ذکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

فکری، عبداللہ پاشا ۔ (۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء - ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء)

مصری سیاست دان اور ادیب۔ مکہ مکرمہ میں پیدائش ہوئی۔ جب فکری کا والد محمد آفندی بلیغ وہاں تعینات تھا۔ مصر پر فرانسیسی قبضہ کے وقت ان کا دادا عبداللہ جامع الازہر میں معلّم تھا۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں والد کا انتقال ہوا۔ جامع ازہر میں تعلیم پائی۔ ترکی زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔

۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء میں سرکاری ملازمت شروع کی۔ اور مختلف دیوانوں میں کام کرتا رہا۔ حتّٰی کہ تھوڑے عرصہ کے لیے وزیر بھی رہا۔ شہزادگان محمد توفیق، حسن اور حسین کا اتالیق بھی رہا۔ عرابی پاشا کی بغاوت کے وقت اسے بھی قید کر دیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں حج بیت اللہ کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں شام کی سیاحت کے لیے گیا۔ حکومت مصر کے نمائندے کی حیثیت سے مؤتمر المستشرقین میں شرکت کے لیے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں سٹاک ہوم گیا۔ ۱۱ر ذوالحج ۱۳۰۷ھ/۲۹ جولائی ۱۸۹۰ء کو انتقال ہوا۔

عبداللہ پاشا فکری نے کئی کتب تصنیف کیں۔ فکری ایک صاحب طرز انشا پرداز تھا۔

فلاح - کامیابی، خوشحالی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ خسران کی ضد ہے جو نقصان، گھاٹے اور نامرادی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے صرف دنیاوی کامیابی کا محدود تصور نہیں بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج نہ ہو۔

اَفۡلَحَ الرَّجُل کے معنی ہیں، فلاں شخص کامیاب ہوا، اپنی مراد کو پہنچا۔ اس کی کوشش بارآور ہوئی۔

قرآن مجید کے مختلف مقامات پر اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو فلاح پائیں گے، جو کامیاب ہوں گے اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ظالم اور مجرم لوگوں کے لیے کوئی فلاح نہیں۔

سورۃ الاعلیٰ کی آیات ۱۴ تا ۱۷ میں ان لوگوں کے لیے فلاح کا ذکر ہے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، آخرت پر یقین رکھتے ہیں، بُرے اخلاق اور غلط باتوں سے اجتناب کرتے ہیں اور پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔

سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ آیات میں ان فلاح پانے والے لوگوں کا ذکر ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، کتب الٰہی اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

فلاسفہ :- فیلسوف کی جمع، مسلمانوں کے ہاں ابتدا میں یہ لفظ یونانی حکماء کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ الشہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں یونان کے حکمائے سبعہ کا ذکر کیا ہے جو یونانی فلسفہ کے بانی کہے جاتے ہیں۔

یونانی زبان میں لفظ فلسفہ دو الفاظ PHELEIN بمعنی محبت کرنا اور SOPHIA بمعنی حکمت سے بنا ہے۔ قرآن مجید میں حکمت کو خیر کثیر کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل وفکر سے کام لینے کی دعوت دی ہے اس لئے ان مسلم فقہا کو بھی فلاسفہ کہا جاسکتا ہے جو کہ عقل وفکر سے کام لے کر دین کے مسائل اخذ کرتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ فلاسفہ کا وہی مفہوم رہا یعنی حکماء اور علماء کے لئے بولا جاتا ہے۔ الجاحظ نے اپنی کتاب الحیوان کے مقدمے میں فلاسفہ کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

فلاسفہ اپنے غور وفکر کی بنا پر بعض ایسی باتیں پیش کرتے ہیں جو عام انسانی ذہن کی عقل سے بالاتر ہوتی ہیں۔ بعض فلاسفہ الٰہیات میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ عجیب وغریب دعوے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلم فلاسفہ ابتدائی دور میں یونانی فلسفہ سے کافی متاثر رہے ہیں۔ جس سے کئی گمراہیوں نے جنم لیا۔ کیونکہ یونانی فلسفہ مسلمانوں کے نظریات اور معتقدات میں رچ بس گیا۔

مسلم فلاسفہ میں امام فخر الدین رازی، نصیر الدین طوسی، ابنِ سینا، امام غزالی، فارابی اور ابنِ رشد معروف ہیں۔

فلپائن :- دو ہزار جزائر پر مشتمل ایک ملک جس کی آبادی پونے چار کروڑ ہے۔ ان جزائر میں تقریباً ہر ایک کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم ہے۔ دارالحکومت منیلا ہے۔ پچاس سے زائد بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سب سے اہم تاگالوگ ہے جو منیلا اور اس کے مضافات میں بولی جاتی ہے۔ جزائر فلپائن کا بیشتر علاقہ ہسپانیہ کے زیرِ اقتدار رہا ہے اس بنا پر اکثریت نے عیسائیت قبول کر لی ہے ۲۰ لاکھ غیر مسیحی آبادی میں سے پندرہ لاکھ مسلمان ہیں۔

منڈاناؤ کا جزیرہ فلپائن کا دوسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ ۳۶۲۵۶ مربع میل ہے۔ سولو جزائر کا سلسلہ جو منڈاناؤ سے ملا جلا ہے تقریباً ۱۵۰ جزائر پر مشتمل ہے اور بورنیو کی سرحد تک پہنچتا ہے۔ بلوان جزیرہ بھی کافی بڑا ہے اور بحیرہ سولو میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ جب ان علاقوں میں ہسپانوی مہم جو اور طالع آزما داخل ہوئے تو انہوں نے ان تمام علاقوں کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ ان علاقوں میں سب سے پہلے ۱۲ مارچ ۱۵۲۱ء کو ایک ہسپانوی ملاح میگلینگس داخل ہوا۔

ملاحوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور ۱۵۶۵ء میں لیگاسی نے ہسپانوی نوآبادیات کی بنیاد ڈالی۔ ۱۵۶۹ء میں بحرالکاہل کے ان دو ہزار کے قریب جزائر کو فلپائن کا نام دے کر ہسپانوی ریاست قرار دے دیا گیا۔ مختلف جزائر میں ہسپانوی اقتدار کی مخالفت شروع ہوئی خصوصاً سولو اور منڈاناؤ کے سینکڑوں جزائر میں بسنے والے مسلمان اپنی آزادی اور حکومت سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے ہسپانوی اقتدار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سولو کے سلاطین تقریباً تین سو سال تک جنگ کرتے رہے۔

فلپائن کے جزائر میں اسلام کی اشاعت سماٹرا اور ملاکا سے ہوئی۔ [illegible] رسوم کی کثرت ہے۔ مسلم علاقوں میں سولو کی تاریخ سب سے قدیم ہے۔ [illegible] مطابق ۱۴۵۷ء میں جو ہور کے ایک شخص ابوبکر نے جزائر سولو میں مسلم حکومت [illegible] آہستہ مضبوط حکومت کی شکل اختیار کر گئی۔ ۱۵۷۸ء میں ہسپانیوں نے [illegible] پھر بحری جہازوں کے ایک بیڑے کے ذریعے حملہ کیا۔ [illegible] مسلمانوں کے درمیان نفرت میں شدت پیدا ہو گئی۔ [illegible] ۹۶۰ [illegible] مسلمانوں کی جدوجہد سے منڈاناؤ پر آپ کو دوبارہ تسلط حاصل ہو گیا [illegible] پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۷۸ء میں سلطان جزائر سولو حکومت [illegible] کو قائم رکھنے میں ان مبنی بر شرائط جس کی رو سے اندرونی علاقہ [illegible] لیکن ہسپانیہ کا حلقہ بگوش ہو کر جانا [illegible] اقتدار اس سے [illegible] ۱۸۹۸ کی بنیاد پر ۱۸۹۷ء میں عہد نامہ پیرس ہوا جس کی رو سے جزائر [illegible] ہوا۔ ۴ جولائی ۱۹۴۶ء کو امریکہ نے جمہوریہ فلپائن کے [illegible] عیسائیوں کے حوالے ہوا۔ اس وقت سے کر اب تک مختلف [illegible] طبقہ ظلم وتشدد کے ہر حربے استعمال کرتے مسلمانوں سے [illegible] ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۳ء میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خونریزی [illegible]

مسلمان عیسائی اقتدار سے اپنی آزادی [illegible] آزادی عیسائیوں کے خلاف گوریلا جنگ میں مصروف [illegible] مسلمانوں کی جدوجہد اور کامیابیوں [illegible] میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کی ان کوششوں میں بھی [illegible] آزادی اور حقوق کے لئے برسرِ پیکار ہیں اور انہیں مسلم ممالک [illegible] سعودی عرب اور لیبیا کی حمایت حاصل ہے۔

فُلُس - جمع فلوس۔ اسلام کے ابتدائی زمانے کے تانبے کے سکّے [illegible] اسلام سے پہلے کے زمانوں میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ ان کے وزن [illegible] کے وقت چند گرام کے رہ گئے تھے۔ مختلف شہروں کے سکّوں کے مختلف [illegible] ہوا کرتے تھے۔

فلسطین :- منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے کا اس علاقے سے گہرا تعلق رہا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں یہودہ اور بن یامین کی اولاد فلسطین کے مرتفع یہودیہ پر حکومت کرتی تھی۔ عہد نامہ عتیق کی روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد جوشوا کی قیادت

ہیں بنی اسرائیل نے فلسطین کو فتح کیا۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی علاقے میں اسرائیلی سلطنت قائم کی ۷۲۱ ق م میں اشوریوں نے اس سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ بخت نصر نے ان علاقوں پر شدید حملے کئے۔ کئی یہودیوں کا قتلِ عام کیا باقی کو قید کرکے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ اس حادثہ کے ساٹھ سال بعد شاہِ فارس سائرس نے دریائے فرات اور بحرِ روم کے درمیانی علاقہ کی فتح کے بعد یہودیوں کو فلسطین جانے کی اجازت دی۔ سکندر یونانی نے ۳۳۲ ق م میں اس علاقے پر حملہ کیا اور فلسطین کے لوگوں کی آزادی سلب کرلی۔ ۳۲۰ ق م بطلیموس نے اور ۶۳ ق م میں پامپی (رومی) نے ان علاقوں کو تاخت و تاراج کیا۔ ۵۱ ق م میں اس علاقے کے تیس ہزار یہودیوں کو ایک یورش کے بعد غلام بنا لیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت یہودیوں کی تنبیہہ کے لئے آخری حجت کی تھی لیکن یہودیوں نے اُن کے ساتھ کافی بدسلوکی کی۔ اب فلسطین کے ان بنی اسرائیلیوں (یہودیوں) کے لئے تباہی و بربادی مقدر بن گئی تھی۔ ۷۰ء میں رومیوں نے اس قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کردی۔ ۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرسن نے یروشلم پر قبضہ کرکے یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ فلسطین پر ایک طویل عرصہ تک مختلف مسلمان خاندانوں کے ذریعے ہی مسلمانوں کی حکومت رہی۔ بارہویں صدی عیسوی میں یہودیوں نے فلسطین کو مسلمانوں کے قبضہ سے حاصل کرنے کے لئے مشہور صلیبی جنگیں لڑیں پھر بھی فلسطین کا علاقہ مسلمانوں کے پاس ہی رہا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں بھی یہ علاقہ مسلمانوں کی زیرِ حکومت تھا۔ ۱۹۱۷ء میں فلسطین پر جنرل ایلن بی کی قیادت میں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر تاریخ کے مختلف ادوار میں فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک یہودیوں کی فلسطین میں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو اعلان بالفور کے ذریعے فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کا اعلان ہوا جوکہ استعماری طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف سازش کا ایک حصہ تھا۔ تمام دنیا سے یہودی آکر فلسطین کے علاقوں میں بسنا شروع ہوگئے اور غریب مقامی آبادی سے زمینیں خرید کر اپنے پاؤں جمانے گئے۔ اب فلسطین کی حکومت انگریزوں کی زیرِ نگرانی آگئی۔ یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو انگریز ہائی کمشنر کے تحت ملکی حکومت کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ اس حکومت کے تحت فلسطین کے اضلاع کی تعداد ابتدا میں تیرہ تھی۔ آہستہ آہستہ کم ہوکر سات ہوگئی۔ بعد میں پورے علاقہ کو دو اضلاع میں تقسیم کردیا جنوبی ضلع (یافہ) اور شمالی ضلع (حیفہ) ۱۹۳۶ء میں یروشلم اور اسکے اردگرد کے علاقے کو یافہ سے الگ کرکے ایک خاص ضلع بنا دیا گیا۔

برطانوی اقتدار کے تحت علاقے کا رقبہ ۲۶۳۰۰۰ مربع کلومیٹر تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اس کی آبادی دس لاکھ تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۲۲ء کے دستورِ سیاسی کے مطابق اور ۴ مئی ۱۹۲۳ء میں دستور میں کی گئی ترامیم کے مطابق برطانوی ہائی کمشنر سب سے اعلیٰ فوجی اور ملکی اقتدار کا حامل تھا۔ وہی مجلسِ عاملہ کا صدر تھا۔ مختلف ممالک سے یہودی چھپ چھپا کر فلسطین میں داخل ہوکر انگریزوں کی مدد سے اپنی آبادیاں بسانے لگے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ۶ لاکھ ہوگئی۔ عام عرب آبادی سے اُن کے تضادات شروع ہوگئے۔ جنہوں نے ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۹ء میں خونریز فسادات کی شکل اختیار کرلی ۱۹۳۹ء میں لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ اہلِ عرب اور یہودیوں میں کوئی مصالحت نہ ہوسکی۔ یہودیوں کی دہشت پسند تنظیموں نے نظامِ حکومت کو معطل کرنے کیلئے تشدد کی کارروائیاں شروع کردیں۔ حکومت نے اس بنا پر ملک میں عرب اور اسرائیل دو ریاستوں کے قیام کا اعلان کردیا۔ فلسطین میں برطانوی اقتدار ۱۹۴۸ء میں ختم ہوگیا۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اپنی ایک آزاد اور خودمختار ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کردیا۔ اسرائیل نے کئی عرب علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے اپنے ہمسایہ عرب ممالک پر بھرپور حملے کرکے اُنکے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مصر کو غزہ کی پٹی اور جزیرہ نمائے سینا، اردن کو دریائے اردن کے کچھ قریبی علاقے اور یروشلم، شام کو قنیطرہ اور جولان کی پہاڑیوں سے محروم ہونا پڑا۔ رمضان ۷۳ء میں عرب ممالک اور اسرائیل میں ایک بار پھر جنگ ہوئی۔ عرب ممالک نے اپنے کئی علاقے اسرائیل سے واپس لے لئے اور مصر کیلئے نہر سویز کو بھی استعمال کرنے کی راہ کھل گئی۔ فلسطینی عوام اپنے علاقوں اور بیت المقدس کے شہر پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ کو ختم کرانے کیلئے تنظیم آزادی فلسطین کے تحت بھرپور جدوجہد کررہے ہیں۔ تنظیم آزادی فلسطین کی قیادت یاسر عرفات کررہے ہیں اُن کو عرب ممالک کی حمایت حاصل ہے۔ تنظیم آزادی فلسطین، یہودیوں کے قبضہ سے اپنے علاقے آزاد کرواکر وہاں آزاد حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔

دنیا کی استعماری طاقتیں یہودیوں (اسرائیل) کی پشت پناہی کررہی ہیں اور فلسطینیوں کو اُن کے جائز حقوق اور ان کے علاقوں سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کو بڑی طاقتوں کی طرف سے اعلیٰ قسم کا اسلحہ دیا جارہا ہے۔ اسرائیل کے ایک ایٹمی طاقت اور مضبوط دفاعی ملک بننے کی وجہ سے عرب ممالک جوکہ منتشر ہیں۔ اُس کا مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر ابھی تک فلسطین کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا۔

فلسفہ: علومِ عقلی، وہ علم جس کے ذریعے قدرت کو سمجھنے اور کائنات کے ساتھ انسانی تعلق کی تہ تک پہنچنے کی سعی و کوشش کی گئی ہو۔ ادب میں سب سے پہلے افلاطون نے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا۔ جس نے اسے اپنے استاد سقراط سے منسوب کیا ہے۔ کئی صدیوں تک علم کا تمام میدان فلسفہ کی حدود میں شمار ہوتا رہا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں فلسفہ اور سائنس کے علوم کی حد بندی شروع ہوئی۔ آجکل وہ تمام علوم جو تجربات سے ثابت ہیں وہ کسی نہ کسی عنوان کے تحت سائنس میں شمار ہوتے ہیں۔ فلسفہ عمومی طور پر ان مضامین کے لئے بولا جاتا ہے جو تجربات یا اکتشافات کی صورت میں نمایاں نہیں ہیں۔ فلسفہ اور اسلامیات (دینیات) کو آسانی سے متمیز کرنا مشکل ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلسفہ انسانی استدلال کے ذریعے وجود میں آتا ہے اور اسلامیات الٰہیاتی نظام اور کلامِ ربانی کے تحت ہے۔

تاریخی اعتبار سے فلسفہ کو کئی شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مابعد الطبیعات، ایسے امور جو حقیقت مطلق سے بحث کرتے ہیں۔

۲۔ نیچرل فلسفہ، ایسے امور جن میں معاملات کی نوعیت، زمان و مکان، حرکت اور دیگر طبیعاتی نظریات زیرِ بحث ہوں اسے طبیعاتی سائنس بھی کہتے ہیں۔

۳۔ علم النفس، ایسے امور جو انسان کے شعور اور تحت الشعور سے اور ان سے متعلق مفروضات پر بحث کرتے ہیں

۴۔ علم منطق، اسے فنِ استدلال بھی کہا جاتا ہے لیکن جدید فلسفہ میں تجزیہ اور تحلیل کی ترقی یافتہ شکل ہے جس سے اکثر اوقات نئی نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔

۵۔ علم الاخلاق، یہ ایک نظریاتی علم ہے جو انسانی اخلاقیات سے بحث کرتا ہے۔

انسانوں کے سوسائٹی اور سیاسی گروہوں سے وابستہ رہنے سے جو محرکات اور استدلال پیدا ہوتے ہیں ان کا علم سیاسیات اور عمرانیات کہلاتا ہے۔ عملاً ان تمام موضوعات نے قدیم یونانیوں کے جذبہ تجسس کو ابھارا جن کے ذریعہ فلسفہ چھ سو سال ق م وجود میں آیا۔ بعض روایات کی رو سے تھیلیس اس کا موسس ہے۔ اس کے بعد اینکسمنڈر، فیثاغورث، ہرکولیس اور پارمینڈیس ایسے مفکر اور فلاسفر پیدا ہوئے۔ ان کے بعد سقراط، افلاطون، ارسطو

عظیم ترین فلاسفر شمار کئے جاتے ہیں۔ جن کی فلسفیانہ موشگافیوں نے بعد کے زمانوں میں عالم، فاضل اور مفکر طبقہ کو متاثر کیا۔ قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کا سرگردہ ٹامس ایکونیاس تھا۔

تحریکِ احیائے علوم کے بعد جدید فلسفہ نے یورپ میں جنم لیا اور دنیا کو ڈیکارٹ، لیبنیز، سپنوزا، ہوبس، لاک، برکلے، ہیوم، کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس، شوپن ہاؤر، ہربرٹ اسپنسر، ولیم جیمس، جان ڈیوی، برگساں، کروچے اور برٹرنڈ رسل جیسے عظیم فلاسفر ملے۔

تاریخِ عالم میں فلسفہ کو چار مشہور ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ یونانی دور، جس کے امتیازی ستون افلاطون اور ارسطو ہیں۔

۲۔ جدید یونانی دور، جس میں افلاطونی خیالات کو شرقی روحانی افکار کے ساتھ مدغم کیا گیا۔

۳۔ ازمنۂ وسطیٰ، جس میں عیسائی مذہبی تصور کے ساتھ عقلی ضروریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی اس دور کے فلسفہ پر یہودیوں اور عربوں کے خیالات کا اثر ہوا۔

۴۔ دورِ جدید، جس کی ابتدا ڈیکارٹ، لیبنیز اور سپنوزا سے ہوئی۔

ان کے علاوہ چینی اور ہندوستانی فلسفہ بھی مغربی فلسفہ سے کسی طرح کم حیثیت نہیں اور ان دونوں ممالک میں بھی عظیم فلاسفر پیدا ہوئے۔

یونانی اثرات کے تحت نشوونما پانے والی اسلامی فکر کو فلسفۂ اسلام کہتے ہیں اس کی ضرورت علمائے اسلام نے اس لئے محسوس کی تھی کہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو ایک بلند ذہنی سطح پر اس وقت کے علمی تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے۔

اسلامی فلسفہ میں یونانی اثرات کے نفوذ کا راستہ حکمائے یونان کی فلسفیانہ تصانیف کے ترجموں سے ہوا۔ ان ترجموں کا آغاز حنین بن اسحٰق اور اس کے بیٹے اسحٰق بن حنین نے کیا۔ الکندی اور فارابی (م ۳۳۹ھ) نے ان علوم کو باقاعدہ طور پر منضبط کیا۔ دونوں جملہ علوم و نقارت پر دسترس رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے زیادہ تر منطق میں شہرت پائی۔ فارابی کے بنیادی نظریات پر ابن سینا (م ۴۲۸ھ) نے اپنا زبردست نظامِ فلسفہ تعمیر کیا۔ سارے اسلامی فلسفہ میں حدوث یا امکانِ وجود کے تصورات جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ فلسفیانِ اسلام نے منطق اور فلسفہ کے مختلف موضوعات پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔

فُلک نوح حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی۔ حضرت نوحؑ نے اپنی امت کو راہِ راست پہ لانے اور کفر و شرک کے چھوڑنے پر کئی سال لگائے۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی جوں جوں حضرت نوحؑ انھیں وعظ و نصیحت یاد کرتے توں توں وہ فسق و فجور کے میدان میں قدم بڑھاتے۔ آخر حضرت نوحؑ نے خدا سے دعا مانگی کہ الٰہی کہ الٰہی ان پہ سخت عذاب نازل کر۔ خدا نے ان کی دعا قبول کی اور ایک کشتی بنانے کا ارشاد فرمایا۔ حضرت نوحؑ نے کشتی بنائی جس کا طول تین سو ہاتھ۔ عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔ اس کے تین درجے بنائے۔ ایک میں مرد۔ ایک میں عورتیں اور ایک میں دیگر حیوانات بٹھائے گئے۔ آخر پانی کا ایک سخت طوفان آیا۔

حضرت نوحؑ نے کشتی میں اپنے ماننے والوں اور ہر جاندار کا جوڑا جوڑا بٹھا دیا اور خدا کے بھروسہ پر کشتی کا لنگر اٹھا دیا۔ کشتی بڑی بڑی موجوں کو چیرتی ہوئی کوہ جودی پہ جا لگی۔ حضرت نوحؑ اتر کر ملک آرمینیہ کے ایک گاؤں میں جس کا نام ازگوری تھا آ بسے۔

قرآن مجید کی آیات ذیل میں اس کا ذکر آیا ہے:

" اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے ایماء کے مطابق ایک کشتی بنا چلو اور نافرمان لوگوں کے بارے میں ہم سے کچھ سفارش نہ کرنا کیونکہ یہ لوگ ضرور غرق ہوں گے۔ چنانچہ نوح نے کشتی بنانی شروع کی اور جب کبھی ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس سے ہو کر گزرتے ان سے تمسخر کرتے۔ نوحؑ (ان کے تمسخر کا یہ) جواب دیتے کہ اگر (آج) تم (ہم پہ) ہنستے ہو (اسی طرح) ہم (ایک دن) تم پہ ہنسیں گے۔"
(س۔ ہود۔ ع ۴) آیت ۳۸،۳۹

(۲) " اس پر ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے زیرِ نظر اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آجائے اور تنور (زمین سے پانی) ابلنے لگے تو اس میں ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا لے کر سوار ہو جاؤ اور (ان کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو (بھی)، مگر ان میں سے جن کی نسبت پہلے سے (غرق ہونے کا) حکم ہو چکا ہے (ان کو نہیں) اور جن لوگوں نے نافرمانیاں کی ہیں ان کے بارے میں ہم سے کچھ عرض نہ کرنا (کیونکہ) ان کو (بہرحال) ڈوبنا ہے۔" (س۔ المومنون۔ ع ۲)

فنا:۔ اہلِ تصوف میں یہ اصطلاح عام مستعمل ہے۔ فنا فی اللہ، فنا فی الرسول، فنا فی الشیخ [illegible]

اہلِ تصوف میں فرقۂ خرازیہ کے بانی حضرت ابوسعید خرازؒ نے فنا اور بقا کی اصطلاحیں جاری کیں اور سمجھنے کیلئے دونوں کے متعلق جاننا ضروری ہے۔ شیخ علی ہجویری نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں بعض صوفیا کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے " فنا سے مراد اپنی ذات اور اپنے وجود کو مٹا دینا ہے اور بقا سے مراد خدا سے متحد ہو کر اس سے پیوستہ ہو [illegible] میں حلول کر جانا۔" فنا کے معنی اس طرح بیان کئے جاتے ہیں کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام اشیاء فانی ہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے" جو کچھ بھی ہے اس کو فنا ہونا ہے یعنی ختم ہو جانا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی" (سورۂ رحمٰن آیت ۲۶) فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کا صحیح معنی یہ ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت و بندگی میں [illegible] کو گزار دے اور اس فانی دنیا کی تمام خواہشات سے منہ موڑ کر آخرت کی [illegible] رہنے والی زندگی کیلئے عمل کرے اور اس طرح فنا فی الرسول کا معنی یہی ہے کہ [illegible] کے احکام کی جو تعبیر اور تشریح نبی کریمؐ نے کی ہے۔ اس کے مطابق اپنی زندگی [illegible] سنتِ رسول کا ہر پہلو مسلمان کی زندگی سے جھلکتا ہو۔

فن ۔ جمع فنون۔ ہنر، آرٹ، صناعت، طریقہ، طرز۔ یہ لفظ [illegible] میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مصوری، سنگ تراشی، شاعری، موسیقی، [illegible] سازی وغیرہ اور بہت سے دوسرے فنون اس میں شامل ہیں۔ عمومی طور پر [illegible] بولا جاتا ہے۔

۱۔ کوئی خاص مدون علم یا اس کی کوئی شاخ۔

۲۔ وہ عمل، جس کے لیے کسی تدبیر کو استعمال کیا گیا ہے۔

۳۔ صنعت یا صناعت۔

۴۔ ہنر (آرٹ)

عربی کے اس لفظ کے مختلف معانی و استعمال اس بات کو واضح کرتے ہیں [illegible] ساختگی و پرداختگی کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ابن الندیم نے ایک کتاب الفہرست لکھی [illegible] مختلف ابواب (علوم کی شاخوں) کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کشاف [illegible] میں بھی فنون کے معنی علوم کے ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں فن کے معنی [illegible] کے نہیں۔ اگرچہ ایک معنی یہ بھی ہیں۔ انگریزی لفظ آرٹ کے لیے عربی میں [illegible] یا صناعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ابن رشیق نے اپنی کتاب " العمدۃ فی صناعۃ الشعر" میں اور چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی میں بھی شاعری کو صناعۃ کہا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں لفظ فن جدید معنوں میں عمارتگری، نقاشی، مصوری

دغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اکثر یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن سے ہماری نگاہیں لطف اندوز ہوتی ہیں۔ جیسے کسی فنکار کی تصویر، کسی مجسّمہ ساز کی تخلیق، کسی ماہرِ تعمیر کی تعمیر کردہ جاذب نظر عمارت۔ یورپی ممالک نے فن میں خاصی ترقی کی ہے۔ قدیم زمانے میں اطالیہ کے باشندے فن میں کمال رکھتے تھے۔ چین، ایران اور روم کے لوگ بھی مخصوص فنون میں بلند مقام رکھتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی مختلف فنون میں بے مثال کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

فن کا مقصد محض حظ و مسرت نہیں بلکہ تسخیر ہے۔ اسلام نے جس طرح زندگی کا تصور بدل دیا، اسی طرح فن کا تصور بھی بدل دیا۔ مسلمانوں کے نزدیک فن، نقل نہیں بلکہ عمل مطلق ہے۔ مسلمانوں کی نظر میں فن کمال کا ایک شعبہ ہے۔ اگرچہ بہت سے مصنفین نے فنون اور صنائع میں فرق نہیں کیا بلکہ عملی فنون پر زیادہ زور دیا ہے۔

زندگی میں ہر عمل ایک معنی کا طلب گار ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی سی بھی کوشش صحیح نہیں۔ معنی کی یہ جستجو مسلم فن کاروں کی اہم غایت رہی ہے۔ مسلم فن کار بے معنی اور بے

۵ - بہزاد : ''ایک صحن کا منظر'' (۸۹۳ھ)؛ از بوستان؛ در کتاب خانۂ مصریہ، قاہرہ

مقصد فن کا حامی نہیں ہو سکتا۔ وہ فطرت پرستوں کی طرح فطرت کا نقال نہیں۔ وہ اپنے فن کو اوّل تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور تقدیس کے لیے وقف کرتا ہے یا پھر مخصوص مگر اعلیٰ اور مفید ضرورت کے لیے جن کی ایک غایت زندگی کے عملی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں بعض فنون کوئی فروغ حاصل نہ کر سکے کیونکہ دنیا میں ہر تہذیب ایک مخصوص مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ مسلمان کا خاص مزاج، ذوق کے بعض میلانات کا تو طالب ہوتا ہے لیکن بعض سے بیزار اور یہ سب کچھ اس تہذیب کے مخصوص عقائد کی اتباع کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بعض تہذیبوں میں بت تراشی اور مجسمہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہے مثلاً ہندوؤں میں۔ بعض میں تعمیر کو افضلیت دی جاتی ہے مثلاً رومی اور اسلامی تہذیب میں۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے بعض فنون سے اجتناب کیا۔ مثلاً جانداروں کی مصوری ہے، شبیہ سازی ہے جو خالقیت کے عقیدہ سے متصادم ہے۔ مسلمانوں کے خصوصی فنون کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فنِ تعمیر
۲۔ فنِ نقاشی، فنونِ آرائش کتاب و تعمیرات۔
۳۔ فنِ خطاطی۔
۴۔ شاعری۔

موسیقی بطور علم اور بطور فن مسلمانوں میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے کبھی ترتیل میں، کبھی نعت و قوالی میں، کبھی سماع میں۔ کئی مسلم اکابرین نے اس فن پہ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ابنِ خلدون نے اسے "صناعت شریف" لکھا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے تمثیل۔ (ڈرامے) سے اجتناب کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس میں اپنی ذات کو کسی کا قائمقام بنا کر پیش کرنا پڑتا ہے اور یہ شرفِ خودی کے تقاضے کے خلاف ہے۔

اسلامی آرٹ بہت سی تہذیبی وراثتوں کے میل ملاپ سے وجود میں آیا ہے ان میں یونانی تہذیب سرِفہرست تھی۔ جس کے زیادہ تر بوزنطی سلطنت کے جنوبی صوبے تھے دوسری ایرانی تہذیب جو اسلام سے پہلے ساسانی حکمرانوں کے زیرِسایہ ایک مقام بنا چکی تھی اوّلین اسلامی آرٹ جامد نہیں رہا کیونکہ یہ مختلف قوموں کے فنون سے اخذ و استفادہ کرتا رہا۔ جذب و تحلیل اور تغیر و تبدل کے یہ مظاہر مشرق قریب کے ان مسلم ممالک میں دیکھے جا سکتے ہیں جو کہ اسلامی دنیا کا مرکز ہیں۔ فن کے مشرقی رجحانات کی مقبولیت بہت پہلے واضح ہو گئی تھی۔ عراقی سنگ تراشی میں ایشیائی آرٹ کی کل کاری نے رواج پایا۔ سلجوقیوں کے زمانے میں ترک فاتحین کا ذوق و فکر، فن کے تمام رجحانات پر چھا گیا۔

اسی طرح ایران میں جنوبی مملکت سے آمدہ چینی آرائشی نقش و نگار نے مصوّری کے تخیلات میں تبدیلی پیدا کی۔ عمارتی نقش و نگار کے اس فن کی تکمیل استنبول کی سی شاہی مساجد کی تعمیر میں ہوئی جو کہ دسویں صدی ہجری سولہویں صدی عیسوی میں بوزنطی مکتب فکر کے فن کاروں کی پیروی کرتے ہوئے بنائی گئیں۔

اسلامی فن کے ادوار اور ان کے خصائص:

اسلامی فن کی تشکیل ان ممالک کے ثقافتی عمل، ردِّعمل اور مشترکہ روایات سے ہوئی جہاں اسلام نے غلبہ حاصل کیا۔ اسلامی فن مغربی ترکستان، افغانستان، شمال مغربی ہندوستان، جنوب مشرقی ہندوستان، بہار، بنگال، انڈونیشیا، ایران، ترکی، عرب، شام، مصر، مراکش، شمالی سوڈان، شمالی افریقہ، نائیجیریا میں پھیلا۔ مسلمانوں کا فن بحرِ ہند کے سواحل کے ساتھ ساتھ اور عربوں کی تجارت کے جلو میں مشرقی افریقہ، سواحل لنکا، سماٹرا، جاوا، بورنیو اور چین میں پہنچا۔ اسلامی فن کے اہم ترین ادوار یہ ہیں:

خلافتِ راشدہ

مکّہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، دمشق، فسطاط اور قیروان کے علاقوں میں قدیم عمارات اور ان کے سامانِ آرائش میں کچھ عرصہ بعد تجدید ہو گئی تھی۔ اس لیے ان کی شہادتیں کتب سے ملتی ہیں۔ جو عموماً بہت اختلافی ہیں۔

اموی فن

پتھر کی عمارات، ستون پر گول محرابیں، چھتیں۔ نیم یونانی طرز کی دیواروں پر تزئین، پارتھیائی شامی طرز کی گچ کا ابھرواں کام جس کی مثالیں دمشق، بیت المقدس، مدینہ منورہ، بصرہ وغیرہ کی مساجد، صحرائے شام کے محلات میں ملتی ہیں۔

عباسی فن

۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک۔ خصوصیات ہیں۔ عمارتیں جن کی بھاری بھرکم دیواریں تھیں چوکور چلیپاتے جن کے کناروں پر پتلے ستون، [illegible] محرابیں [illegible] چند دار مینار [illegible] رومی ساسانی طرز کے محلّات، آرائش کے لیے گٹھڑ کی ستر کاری، دیواری تزئین [illegible] جو بوزنطی اور ساسانی روایت سے ظہور پذیر ہوئی۔ اہم ترین یادگاروں میں منصورہ شہر بغداد، نویں صدی کا پائے تخت سامرا وغیرہ۔

مغربی اموی اور اندلسی فن

اندلس کے اموی خلفاء کے دور (۷۵۶ء – ۱۰۳۱ء) [illegible] نے بعد کے شاہی خانوادوں کے عہد میں مزید ترقی [illegible] صدی تک طے ہوتے رہے۔ اس دور کی اہم خصوصیات میں نقل [illegible] پتلے ستونوں پر پایست چوکور پیلپایوں پر [illegible] گنبد [illegible] دیواروں پر طغرلی نقش و نگار، گچ کی رنگین [illegible] اور پچی کاری وغیرہ۔ اہم ترین یادگاریں قرطبہ کی جامع مسجد [illegible] کے محلات وغیرہ۔

فاطمی فن

[illegible] کا لطیف امتزاج اور مزید ارتقا یافتہ شکل [illegible] اس دور کی اہم خصوصیت میں ستونوں پر [illegible] کھانچے، ابتدائی [illegible] مقرنس تزئین [illegible] قاہرہ میں ہیں، قلعے کے برج، دمشق [illegible] رُقیہ وغیرہ۔

[illegible]

[illegible]

میں تصویر کا جواز ہے یا نہیں جو کہ خالصتاً علمی اور فقہی مسئلہ ہے ہم معلوماتی نقطۂ نظر سے فن مصوری میں مسلم فنکاروں کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور میں عمارات کی دیواروں پر جانداروں کی تصاویر کا مشاہدہ قصیرِ عمرۃ اور سامرا وغیرہ یادگاروں سے کیا جاسکتا ہے۔ ہند اور ایران میں بھی تصویر کے فن نے جلا پائی لیکن حرمت کی وجہ سے تصویر کشی مسلمانوں کے ہاں مذہبی زندگی کا ایک جزو تو نہیں بنی۔ چنانچہ قرآن مجید، مذہبی عمارات مثلاً مساجد اور مقبرے تصویروں سے الگ رکھے گئے۔ ان وجوہ کی بنا پر مسلمانوں میں تصویر کا فن عروج حاصل نہ کرسکا جو اُسے یورپ میں حاصل ہے۔

اسلام سے قبل بعض ممالک میں مصوری کا مقصد صنم پرستی تھا۔ مصور اپنے جذبۂ پرستش کی تسکین الوان اور خطوط کے ذریعے کرلیتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی میں مصوری کے نشو و ارتقا کا آغاز ہوا تو اسلام کے عقیدۂ توحید کی وجہ سے مصوری کی معنویت اور صورت دونوں میں انقلاب آیا کیونکہ اسلام کے عقیدۂ توحید سے ہر قسم کے مشرکانہ اور بت پرستانہ عقائد کی نفی ہوتی ہے۔ مصوری صنم پرستی کی بجائے فکری اور تخلیقی مقاصد کے لئے کی جانے لگی اور یہ روش شروع کے دور سے لے کر اب تک جاری ہے عجمی اقوام کے اسلام میں داخلے سے اس فن کو مزید جلا حاصل ہوئی کیونکہ یہ اقوام اسلام لانے سے قبل اپنی مخصوص تہذیبوں کی وجہ سے فنِ مصوری میں بھی مہارت اور کمال رکھتی تھیں۔

اسلامی فنِ مصوری میں ایران کا اہم حصہ ہے۔ حال ہی میں ایرانی مصوری کی جو قدیم ترین یادگار دستیاب ہوئی ہے وہ قابوس بن وشمگیر کے "اندلغزنامہ" کا مخطوطہ ہے جو ۱۰۹ کتابی تصاویر پر مشتمل ہے۔ ان کتابی تصاویر میں سے بعض ساسانی نوعیت (۴۸۳ھ) کی ہیں اور بہت جاذبِ توجہ ہیں۔ مغلوں کی فتوحات کے بعد وہاں نقاشی کے فن میں ارتقا ہوا اور یہ اسلوب چینی طرز کا سا ہے۔ اس دور کی یادگاروں میں ساتویں صدی کے اواخر کے منافع الحیوان کے مخطوطات جو نیویارک کے کتب خانہ پیرپونٹ مورگن میں موجود ہیں۔ استنبول میں کلیلہ و دمنہ اور معراج نامہ (۷۳۰ھ) کے باقی ماندہ اجزا۔ اس دور میں تصاویر کے خطوط زیادہ لچکدار، رنگ گہرے اور شوخ تھے۔ دسویں صدی کے وسط میں مصوری کی تاریخ لکھی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے باکمال فن کار استاد احمد موسیٰ اور استاد شمس الدین تھے جنہوں نے علی الترتیب ابوسعید ایلخانی (۷۱۶ تا ۷۳۶ھ) اور سلطان اویس جلائری (۷۵۷ تا ۷۷۶ء) کے عہد میں تربیت پائی۔ ۷۵۴ھ میں مظفریوں نے اینجو خاندان کو

منیر الملک ارسطو جاہ، وزیر نظام سکندر جاہ (۱۸۰۳ء تا ۱۸۲۹ء)

شیراز سے نکال دیا۔ ان کے دورِ حکومت کے پندرہ سال بعد متداول و معروف قسم کی ایرانی مصوری کی قدیم ترین مثالیں ملتی ہیں۔

تیموری اور ابتدائی صفوی دربار کے اسلوب مصوری کے نمونے خواجو کرمانی کی تین مثنویوں میں پائے جاتے ہیں جسے ۷۹۸ھ میں میر علی تبریزی نے بغداد میں لکھا اور استاد شمس الدین کے ایک شاگرد جنید نے اسے مصور کیا۔ جنید کے کارنامے نفاست و نزاکت کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے یادگار رہیں گے۔ یہ گویا پائے تخت کی درباری مصوری سے اس اسلوب کا آغاز تھا جو تیموریوں کے ماتحت بغداد سے ہرات تک (۸۲۰ تا ۹۰۷ھ) اور پھر کسی وقفے کے بغیر تبریز (۹۰۷ تا ۹۵۵ھ)، قزوین (۹۵۵ تا ۱۰۰۸ھ) اور اصفہان (۱۰۰۸ تا ۱۱۳۵ھ) کے صفوی پائے تختوں تک ملتا ہے۔ اس تمام زمانے میں ایرانی مصوری کا سلسلہ مسلسل ارتقا میں رہا۔ اس دور کے مصوروں کو بادشاہوں اور سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس زمانے کے معروف مصوروں میں بہزاد، میرزا علی، میر سید علی، مظفر علی، رضائے عباسی، افضل الحسینی، قاسم علی اور محمد یوسف شامل ہیں۔ جن کا طرزِ نقاشی و مصوری طویل عرصہ تک جاری رہا۔ ان کی یادگاروں میں "خسرو شیریں" جو کہ فریئر گیلری واشنگٹن میں ہے، موزۂ گلستان کا شاہ نامہ (۸۳۳ھ)، خمسۂ نظامی کے مخطوطے مختلف ادوار کے شاہنامہ کے مخطوطے، ملک الشعراء فتح علی خاں صبا کاشانی کی رزمیہ مثنوی "شہنشاہ نامہ"، کلیلہ و دمنہ کے مختلف نمونے، مخطوطے شامل ہیں مسلمانوں میں کتابی مصوری کے ارتقاء میں کئی عناصر کا حصہ ہے جب ایران میں ۶۴۲ء میں اسلام مستحکم ہو گیا تو مانی مذہب کے بہت سے پیروکار بھی اسلام میں داخل ہوئے جن میں مانی مذہب کے صحیفوں کو تیار کرنے والے مصور اور خوشنویس بھی تھے۔ اس وجہ سے کتابت اور نقاشی نے اس نہج پر مسلمانوں میں فروغ حاصل کیا۔

دوسرا عنصر بھی غیر ملکی ہے۔ جو اسلامی عہد میں مصوری پر اثر انداز ہوا۔ چین کے ساتھ تعلقات کا آغاز نبی کریمؐ کے دور سے ہو گیا تھا۔ عربوں اور چینیوں میں تجارت کے روابط بڑھنے شروع ہوتے جو تیسری صدی ہجری تک جاری رہے۔ عربوں میں چینی اشیاء خصوصی طور پر چینی منقش برتنوں کا استعمال رائج ہوا۔ اسلامی مصورین نے مخطوطات (جن میں تاریخی، ادبی اور فنی کتابیں شامل ہیں) کو چینی روایات کے مطابق مصور کیا۔ مغلوں کے حملے کے ساتھ ساتھ چینی اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگے کیونکہ ان حملہ آوروں کے ہمراہ چینی ماہرین میں مصور اور کاتب بھی تھے۔

تیسرا عنصر، اسلامی ادب و تاریخ کی ذاتی خصوصیت ہے کہ جن میں واقعات کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ خود بخود ان کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ شاعر، مؤرخ کے علاوہ مصور بھی ان کو اپنی تصاویر میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پاک و ہند میں مسلمانوں کے فنِ مصوری کا آغاز غزنی کے یمینی سلاطین کے عہد (۹۷۶ء) سے ہوتا ہے اسی زمانے کا کلیلہ و دمنہ کا ایک مخطوطہ کتاب خانۂ ملی پیرس میں موجود ہے مغلیہ دورِ حکومت میں فنِ مصوری کو عروج حاصل ہوا۔ مختلف عمارات کی منقش دیواریں اور کتب خانوں میں موجود مخطوطے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ سلطان غیاث الدین (۱۴۶۹ء تا ۱۵۰۰ء) کے "نعمت نامہ" سے اسلوبِ فن کا نمونہ سب سے منفرد معلوم ہوتا ہے۔ سولہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے تمام بادشاہوں کے دربار سلاطین تیموریہ کے اسلوب سے آراستہ تھے۔ دکن میں لکھے ہوئے باتصویر شاہنامہ، خمسۂ نظامی اور مثنویاتِ امیر خسرو کے متعدد مخطوطات میں سلاطین تیموری کے عہد کا ایرانی اسلوب غالب نظر آتا ہے بلکہ ان میں ہندی خد و خال کی آمیزش بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نسخے ہندوستان کے بعض نجی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ شمالی ہندوستان میں مغل شہنشاہ بابر اور ہمایوں نے پہلے تو ہرات کا تیموری اسلوب متعارف کرایا پھر شاہ طہماسپ اول کے دربار کا ایرانی اسلوب اکبر کے عہد میں ایرانی، ہندی، یورپی انتخابی اسلوب وجود میں آیا لیکن ان پر دلستان طہماسپ کا صفوی رنگ غالب رہا شہزادہ سلیم کے دربار میں الٰہ آباد کے مقام پر ۱۶۰۰ء میں ایک ایرانی استاد آقا رضا کے ذریعے ایک نئے اسلوب نے جنم لیا۔ یہ راجپوت اسلوب سولہویں صدی میں مختلف سرچشموں سے ارتقا پذیر ہوا تھا۔ مصوری کا یہ علاقائی عوامی اسلوب ۱۵۸۰ سے ۱۵۸۵ء تک کافی مستحکم اور ۱۶۱۵ء کے قریب مقبولِ عام ہوا۔

اکبر کے عہد میں جن سدھا فارسی مخطوطات کو مصور کیا گیا ان کے موضوع بے شمار تھے۔ لیکن ان میں قصے، وقائع و سوانح، تاریخ، کہانیاں اور افسانے، کتب حکایات فارسی

لڑکیاں اور آتش بازی۔ میناتوری تکنیک

اور سنسکرت شامل ہیں۔ اکبر کے زمانے کا سب سے پرانا مغل مخطوطہ ... کتاب "انوار سہیلی" ہے جو لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں موجود ہے اس پر ۱۵۷۰ء کی تاریخ درج ہے۔

اکبر کے بیٹے اور جانشین جہانگیر کے عہد (۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ء) میں مغل مصوری نے نقطۂ عروج پر تھی اسلوب کا تغیر اگرچہ تدریجی ہے لیکن اکبری اور جہانگیری عہد کی تصاویر میں نمایاں فرق ہے۔ اکبری عہد کی تصاویر میں اضطراب پایا جاتا ہے اور رنگ ہلکے ہیں جہانگیری عہد کی تصاویر میں سکون اور ٹھہراؤ ہے اور بہتر رنگوں کے امتزاج میں لطافت اور

نفاست عیاں ہے۔ عہد شاہجہانی اور عہد جہانگیری کی مصوری میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اورنگ زیب کے عہد (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء) میں مذہبی اصلاحات نے اس فن کا درجہ یہاں تک کم کر دیا کہ تصویریں محض سیاسی واقعات کی دستاویزی تمثیلات ہو کر رہ گئیں۔ اور فن مصوری شاہی سرپرستی سے محروم ہو گیا لیکن بہت سے مصوّر اورنگ زیب کی اولاد کے ہاں اور دوسرے امراء اور سپہ سالاروں کے ہاں ملازم ہو گئے۔ اورنگ زیب، بہادر شاہ ظفر اور فرخ سیر کے دکنی محاربات کے بہت سے مرقعے با آسانی پہچانے جا سکتے ہیں کہ ان میں

مغل شہزادے (شجاع، اورنگ زیب، مراد) بعہد شاہجہانی ۔ نواح سنہ ۱۶۳۷ء

خاکی مائل نیر فوزی درختوں کا غلبہ ہے اور اکثر قدرتی مناظر بھی یکساں نظر آتے ہیں۔

محمد شاہ (۱۷۱۸ تا ۱۷۴۸ء) کے دربار میں مغل مصوری کا دوبارہ احیا ہوا۔ لیکن اس پر رومانیت اور نسائیت کا غلبہ تھا۔ فن میں روایت پرستی آگئی۔ حرم سرا کے مناظر، معاشقے اور رومانوی افسانے مصور کئے جانے لگے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال سے فن مصوری میں بھی انحطاط آنا شروع ہوا کیونکہ اس وقت تک تو فن مصوری کو شاہی سرپرستی حاصل تھی لیکن اب سلطنت کا نظام درہم برہم ہوا تو، مغل دربار مفلسی کی بنا پر مصوروں کی سرپرستی نہ کر سکتا تھا۔ مصور مختلف صوبوں کے نوابوں اور ہندو راجاؤں کے ملازم ہو گئے۔ اس دور میں مصوری کی روح پژمردہ اور نظر تنگ ہو گئی۔

نادر شاہ کے حملے سے پنجاب، ایران اور پھر افغانستان کا حصہ بنا۔ اس دور میں مغلوں کے آخری دور کے اسلوب اور صفوی ایرانی اسلوب کے امتزاج سے ایک نیا اسلوب سامنے آیا۔ اس طرح سے فنِ مصوری کو کچھ زندگی ملی۔ پنجاب پر سکھوں کے تسلط سے مصوری کا فن کشمیر میں داخل ہوا۔ یورپ کے بارونق طرز سے متاثر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز کے ایرانی اسلوب کے اثرات سے کشمیری اسلوب کی شکل برآمد ہوئی۔ اس اسلوب کے متعدد نسخے بالخصوص شاہنامہ، نظامی اور جامی کے مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہیں۔ پاک و ہند کے علاقوں میں ۱۸۴۷ء تک اس فن میں ارتقاء کی بجائے انحطاط و زوال ہوا۔

پاکستان میں فنِ مصوّری

جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔ تخلیقی فنون میں فنِ مصوّری کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ پاکستان میں فنِ مصوّری مختلف قدیم و جدید ثقافتی عناصر کے امتزاج سے ظہور میں آتی ہے۔ پاکستان میں فنِ مصوّری نے جدید اثرات کو بھی جذب و قبول کیا ہے۔ حکومت کی سرپرستی، صنعتی اور کاروباری ضروریات کی بدولت فنِ لطیف (FINE ART) اور کاروباری فن (COMMERCIAL ART) دونوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مصوّری کے فروغ کے لئے حکومت کی طرف سے مختلف شہروں میں آرٹس کونسلز اور دیگر ادارے قائم ہیں۔ لاہور میں پاکستان کا قدیم ترین فنی تربیت کا
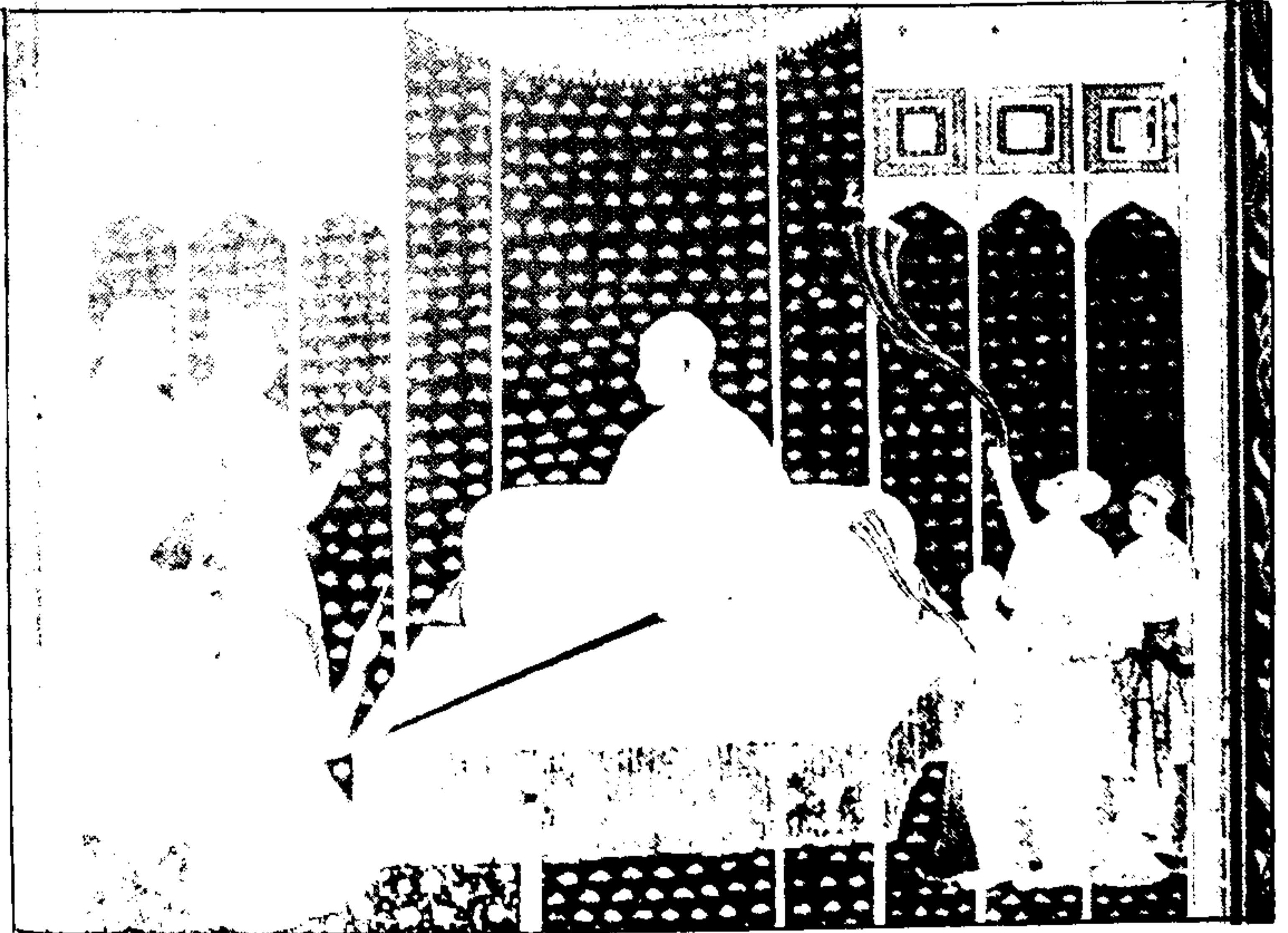
ایک کم سن شہزادہ بیجاپور نواح سنہ ۱۵۸۵ء

عمل صادقین۔

ادارہ نیشنل کالج آف آرٹس، کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ ڈیزائن اور اسلام آباد میں آرٹس اکیڈمی کام کر رہے ہیں۔ مصوروں کے فن پاروں کی نمائش کے لئے راولپنڈی لاہور، کراچی وغیرہ میں آرٹ گیلریاں قائم ہیں۔ قالینوں میں شکارگاہوں اور علاقائی رومانی داستانوں کی تصویر کشی سے بھی مصوری کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور ان کی بیرونِ ممالک کافی مانگ ہے۔

قرآن مجید اور شعری شاہکاروں مثلاً دیوانِ غالب اور کلام اقبال کو مصوّر کرنے کے جذبہ و شوق نے پاکستانی مصوری میں ایک منفرد رنگ پیدا کیا ہے۔ پاکستان میں دو قسم کے دبستانِ فن پائے جاتے ہیں۔ ایک دبستان جسے کلاسیکی دبستان بھی کہا جاتا ہے، مذہبی اقدار کی پاسداری کرتا ہے اور فطرت کے نقوش کو انکے اصل رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اس دبستانِ فن میں عبدالرحمٰن چغتائی، فیضی رحیمن، استاد اللہ بخش اور شیخ احمد جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے فن کار ہیں۔ جو اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور اپنے اسلوب کی انفرادیت میں بھی یدطولیٰ رکھتے ہیں۔

جدید دبستانِ فن کے علمبردار مذہبی اقدار کے قائل نہیں اور نہ ہی فطرت کی پیروی کے قائل ہیں۔ اس دبستانِ فن میں صادقین، زبیدہ آغا، ملک، ناگی، عنایت اللہ آذر جیسے معروف مصور ہیں۔ صادقین نے اپنے منفرد فنِ خطاطی اور تجریدی تصویروں کی وجہ سے تھوڑے عرصہ میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ صادقین نے قرآنی آیات کی بہترین خطاطی کی ہے۔

فنِ شعر و شاعری

بمعنی علم، آگاہی۔ عام مفہوم میں کلام منظوم کیونکہ یہ ایسی آگاہی ہے جس میں قافیہ اور وزن بھی ہوتا ہے۔ اصطلاح میں شعر کے معنی "کلام موزوں و مقفّیٰ بالقصد" ہیں اور شاعر "صاحبِ کلام موزوں و مقفّیٰ" کو کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں شعر اور شاعر کے الفاظ کئی جگہ آئے ہیں۔ بعض مقامات پر منصب نبوت کو شاعری سے نسبت دینے کی مذمت کی گئی ہے۔ علمائے اسلام نے اچھی شاعری اور بری شاعری میں فرق کو واضح کیا ہے۔ بعض علماء اور مفسرین سورۃ الشعراء کی آیت ۲۲۷ سے شاعری کی مخالفت کے لئے استدلال نکالتے ہیں حالانکہ اس آیت میں مشرکین شعراء کی مذمت کی گئی ہے جو کہ نبی کریمؐ کی ہجو کرتے تھے اور اسلام کے مخالف تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ حضرت حسان بن ثابتؓ اور دوسرے کئی صحابۂ کرامؓ کی طرف اشعار منسوب ہیں۔ نبی کریمؐ کے اپنے صحابی حسان بن ثابتؓ سے ان کا کلام سننے کی روایات کتبِ حدیث میں ملتی ہیں۔ ابنِ رشیق نے اپنی کتاب العمدۃ میں نبی کریمؐ کی کئی احادیث درج کی ہیں۔ جو کہ آپؐ نے شاعری کے متعلق بیان فرمائی ہیں . . . .

اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکْمَۃ (الحدیث) ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا "شعر مؤلّف کا کلام ہے جس نے اس کے حق کو پہچانا تو اس کا کلام بہتر ہے اور جس نے اس کے حق کو نہیں پہچانا اس میں کوئی خیر نہیں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "ان الشعر دیوان العرب" اور حضرت علیؓ کا قول بھی قابلِ توجہ ہے۔ "الشعر میزان القوم" یعنی شعر کسی قوم کے حق و کذب اور شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

شاعری میں سچے جذبات کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے خصوصاً عربی شاعری میں۔ شاعری کے مقصد کے سلسلے میں کئی آرا بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ صداقت کی تعلیم دینا۔
۲۔ جذبات اور زندگی کی عکاسی کرنا۔
۳۔ تنقید و تسلیم حیات کرنا۔
۴۔ شخصیت کا اظہار کرنا یا اخفا کرنا۔

ابنِ قتیبہ نے "الشعر و الشعراء" میں اور ابنِ رشیق نے "العمدۃ" میں

محمد چغتائی

شاعروں کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ شاعری کی دو قسمیں ہمیشہ رہی ہیں۔ ایک جو دلی جذبات کی تحریک سے ابھر کر بے تکلف اسلوب اختیار کرتی ہے دوسری جو کسی خارجی مقصد سے شعوری طور پر آراستہ اور پر تکلف اسلوب اختیار کرتی ہے۔

مسلمانوں میں صوفی شعراء کی غزلیات، مثنویات اور رباعیات حقائق و معارف کا خزانہ ہیں اور ان میں سے بعض کو دنیا کے ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے مثلاً حافظؔ اور سعدیؔ کے کلام کو۔

مسلمانوں میں قصیدے کو شعری سرمائے میں ایک صنعت کہا جا سکتا ہے۔ قصیدے کا فن اصلاً عربی شاعری کا ہے۔ اس کے بعد یہ فارسی، ترکی اور اردو میں منتقل ہوا۔ عربوں نے اپنا پورا قدرتِ کلام قصیدے میں پیش کیا اور فخر کے جذبات کو بھی اسی میں ظاہر کیا ہے۔ قصیدہ اختراعی اور مصنوعی شاعری کا سب سے بڑا میدان ہے۔ اس مجلسِ فن میں مخاطب اور مقاصد معین و مقرر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں مخاطب کو متوجہ کرنے کے لئے تکلف اور شان و شوکت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے   کے عمدہ نمونے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح شعری سرمایہ میں غزل نہایت دلکش اور منفرد صنف ہے۔ یہ فارسی شاعری

کا حصہ ہے لیکن غزل کا اندازِ شاعری، نسب یا تشبیب کی صورت میں عربی قصیدوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے اسے خراسان کے فارسی شعرا نے بالکل الگ صورت میں، ایک مخصوص نوع کی صنف بنا کر پیش کیا۔ صناعتی لحاظ سے غزل کی ساخت میں ردیف و قافیے کی وحدت اور مضامین کی کثرت سے جو حسین امتزاج پیدا ہوتا ہے اس کی اثر آفرینی سے انکار ممکن نہیں۔ غزل کا ایک ایک شعر اپنی ذات میں مکمل معنی کا حامل ہوتا ہے اور آسانی سے یاد ہو جاتا ہے اور متاثر کرتا ہے۔ ایجاد و ایجاز کی انتہائی بلاغت غزلیہ شاعری میں ملتی ہے۔ غزل کے ایک ایک شعر کو دانش زندگی کی کتاب کہا جا سکتا ہے اور اخلاق و حکمت کا یہ عنصر اسے لازوال بنا دیتا ہے۔ غزل کے اشعار سے مختلف ادوار میں مختلف نظر آتے ہیں۔ غزل میں عشق و محبت کے علاوہ سیاسی و سماجی احوال کے اشارے، آداب و اخلاق کے اسباق اور حیات و کائنات کے بہت سے حقائق بھی ملتے ہیں۔

فنِ تحریر کی ابتدا سے پہلے شعرا کے دل پسند کلام لوگ حفظ کر کے ایک دوسرے کو سناتے اور غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کی تعلیم کا یہ سلسلہ چلتا تھا۔ شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے مردہ قوموں میں نئی روح پھونکی ہے۔ ایسی کئی مثالیں تاریخ کے ہر دور سے ملتی ہیں۔ برصغیر میں ماضی قریب کے ایام سے علامہ اقبال کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جنہوں نے اپنی مسلسل شاعرانہ تخلیقات سے مسلمانانِ ہند میں بیداری پیدا کی۔ اسلام کی جنگوں کی تاریخ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کے جذبۂ شجاعت و بہادری کو ابھارنے میں شعرا کے کلام کا بھی حصہ ہے جو اپنے شعروں میں ان سپاہیوں کے مردانہ اوصاف بہادری کو تعریف کے انداز میں پیش کرتے . ہر دور میں بڑے بڑے معروف شاعر گزرے ہیں۔ اسلام سے پہلے کے زمانہ کے شعرا کے سبعہ معلقہ کا کلام عربی ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے بعد کے اسلامی زمانوں میں فردوسی، فرزدق، سعدی، حافظ، حالی، اقبال کو معروف شعرا میں مانا جاتا ہے۔

فنِ موسیقی

خوارزمی نے موسیقی کا شمار ریاضیاتی علوم میں کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ یونانی زبان کا لفظ ہے اور لحن یا الحان بالا کی ترتیب و ترکیب کا علم ہے۔ نغموں کے مرتب کو موسیقور یا موسیقار کہتے ہیں۔" رسائل اخوان الصفاء میں موسیقی کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے "موسیقی سے غنا مراد ہے اور موسیقار سے مغنی"۔ عربوں، ایرانیوں کے ہاں بہت پہلے سے موسیقی کا اپنا نظریہ بھی موجود تھا۔

موسیقی کے ایرانی اور عربی نظریوں کا ایک قدیم ترین ماخذ سامی نظریہ تھا اس کے یونانی نظریہ موسیقی پر بہت اثرات پڑے تھے۔ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں عربوں اور یونانیوں کے نظریۂ موسیقی کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں

ابن مسجح (م ۷۱ھ/۷۱۵ء) نے ایرانی موسیقی کے مطابق گانے اور بجانے (غنا اور ضرب) کا فن سیکھا تھا۔ اس نے بوزنطی اور اصولیوں سے اکتساب کر کے ایک نظامِ غنا مدون کیا اور اس نے ایرانی اور بوزنطی طریقوں سے عربی موسیقی کے مغائر کو مسترد کر دیا تھا۔ قدیم عربی نظریہ موسیقی پر یونس الکاتب (م ۱۴۸ھ/۷۶۵ء) الخلیل (م ۱۷۵ھ/۷۹۱ء) عبیداللہ بن عبداللہ بن طاہر (م ۳۰۰ھ/۹۱۲ء) علی بن ہارون بن یحییٰ بن ابی منصور (م ۳۵۲ھ/۹۶۳ء) اور سلمان بن ایوب المدنی نے کتابیں لکھی تھیں لیکن یہ کتابیں ضائع ہو گئیں اور عربی نظریہ موسیقی پر قدماء میں مسعودی کی مروج الذہب، یحییٰ بن ابی منصور کے الرسالۃ فی الموسیقی اور الاغانی کی کتاب سے مسلمانوں میں فنِ موسیقی کی ترویج اور دوسرے متعلقہ امور کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسی دور میں الکندی (م ۲۶۰ھ/۸۷۴ء) نے موسیقی کے نظریہ پر سات رسالے تصنیف کئے۔ الکندی کے بعد ایک صدی کا خلا ہے۔ موسیقی کے نظریات پر لکھنے والوں کے نام تو بکثرت ملتے ہیں لیکن ان کی تصانیف ناپید ہیں۔ الکندی کے دو شاگردوں، احمد بن محمد السرخسی اور منصور بن طلحہ نے نظریۂ موسیقی پر کتابیں لکھی ہیں۔ السرخسی کی چھ کتب کا ذکر ملتا ہے۔ ثابت بن قرہ (م ۲۸۸ھ/۹۰۱ء) کی تین کتابیں، محمد بن زکریا رازی کی تصانیف نظریہ موسیقی پر اہم کتب ہیں۔ لیکن ان میں فارابی (م ۳۳۹ھ/۹۳۰ء) کا مقام سب سے بلند نظر آتا ہے۔ اگرچہ موسیقی پر اس کی دو کتابیں "کلام فی الموسیقی اور کتاب فی احصاء الایقاع" دستیاب نہیں لیکن اس کی مایۂ ناز تصنیف "کتاب الموسیقی الکبیر" محفوظ رہ گئی۔ فارابی عملی طور پر ایک موسیقار بھی تھا۔ جسے موسیقی کے فن اور اس کے علم، دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس کتاب کو مشرقی موسیقی کے اصول کے متعلق اہم ترین تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ فارابی کے اپنے الفاظ کے مطابق اس کتاب کی تصنیف کی وجہ یہ تھی کہ یونانیوں سے جو کچھ ہم تک پہنچا وہ نامکمل تھا۔ موسیقی پر ابوالوفا بوزجانی (م ۳۸۸ھ/۹۹۸ء)، ابن سینا (م ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) اور ابن زیلہ (۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ابن سینا جو یورپ میں AVICENNA کے نام سے مشہور ہے، نے موسیقی پر دو رسالے لکھے۔ رسائل اخوان الصفاء فنِ موسیقی پر اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ان میں صوتیات سے فاضلانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ موسیقی پر کتابیں لکھنے والوں میں مصر کا بھی اہم حصہ ہے۔ ابن الہیثم (۴۳۰ھ/۱۰۳۹ء) اور ابوالصلت امیہ (م ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء) دو ممتاز مصری مصنف تھے۔ ابن الہیثم نے اقلیدس کی تصنیفات کی شرحیں لکھی ہیں

مغرب میں ابنِ باجہ اور ابنِ رشد کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ابنِ باجہ کی موسیقی کی کتاب کو مغرب میں وہی وقعت دی جاتی ہے جو مشرق میں فارابی کی کتاب کو۔ ابنِ رشد نے ارسطاطالیس کی کتاب کی شرح لکھی ہے۔

ابن سینا اور ابن زیلہ کے بعد نظریۂ موسیقی کی مکمل ترین تشریح کے لئے صفی الدین عبدالمومن بن فاخر (م ۶۹۲ھ/۱۲۹۴ء) نے دو کتابیں "رسالۃ الشرفیہ" اور "کتاب الادوار" لکھیں۔ بعد کے ہر مصنف نے زیادہ تر انہیں کتابوں سے استناد کیا ہے۔ عبدالقادر بن غیبی نے صفی الدین کو نظریۂ موسیقی کا اصل سرچشمہ قرار دیا ہے اور زمانہ حال کے ایک مصنف نے اسے مشرق کا ZARLINO قرار دیا ہے۔ عبدالقادر بن غیبی نے فنِ موسیقی پر پانچ کتابیں لکھی ہیں۔ جن کے نام جامع الالحان، مقاصد الالحان، مختصر الالحان، شرح الادوار اور کنز الالحان ہیں۔ ابن غیبی اگرچہ فارابی، ابن سینا اور صفی الدین پر انحصار کرتا ہے لیکن اُن کا جامد متقلد نہیں۔ اُس کے بیٹے اور پوتے نے بھی نظریۂ موسیقی پر کتابیں لکھی ہیں۔ سلاطین ترکیہ کے دور میں نظریۂ موسیقی پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ سلاطین ترکیہ اہل فن کی سرپرستی کیا کرتے تھے بعد کے زمانوں میں بھی اہل فن نے موسیقی پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ فنِ موسیقی میں مسلمانوں کی کوششوں کو مختلف ادوار اور ممالک کی نسبت سے تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ عربوں کی موسیقی
۲۔ شمالی موسیقی
۳۔ مغرب کی موسیقی
۴۔ مصری موسیقی
۵۔ عراقی موسیقی
۶۔ ایرانی موسیقی

۷۔ ترکی موسیقی
۸۔ ترکستانی موسیقی
۹۔ اندلسی موسیقی
۱۰۔ برصغیر پاک و ہند کی موسیقی

عربوں کی موسیقی:۔ طلوعِ اسلام کے بعد عربوں کی موسیقی عمومی طور پر زمانۂ جاہلیت کی تہذیب کے ورثہ کی صورت میں سامنے آئی۔ جزیرہ نمائے عرب اور شمالی عرب کے اُن علاقوں میں جن میں نبطی، غسانی اور لخمی عرب شامل ہیں۔ یہ نظریۂ موسیقی سقوطِ بغداد (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) تک رائج رہا۔ ریاست مدینہ کے قیام کے بعد جب مسلمانوں نے دوسرے ممالک میں فتوحات حاصل کیں تو دوسری اقوام کے ساتھ میل جول کی وجہ سے عربی موسیقی میں بھی تبدیلی آئی۔ پہلی صدی ہجری میں عربی موسیقی ایرانی اور شامی موسیقی سے اثر پذیر ہوئی اور نئی اصطلاحات پیدا ہوئیں۔ ابن عبدربہ (م ۳۲۸ھ) بیان کرتا ہے کہ حجاز قدیم فن کا گہوارہ تھا اور موسیقی بڑی عمر کی گانے والیوں (مغنیہ) اور نوجوان لڑکیوں (قینہ) کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ تہواروں، خوشی کی تقاریب اور جنگ کے میدانوں میں گایا کرتی تھیں۔ ان کے آلاتِ موسیقی مُوَتَّر اور مَعْزَف تھے۔ ان کے ساز مزہر، دَف اور قضیب تھے۔ حیرہ کے لخمی عرب طنبور، عُود اور بربط کا استعمال بھی کرتے تھے۔ شمالی مغربی علاقے کے غسانی عربوں میں ایرانی بربط مقبول تھا اور نبطی عربوں میں سہ تارہ یعنی "کنبرہ" کا رواج تھا۔ عرب مؤرخین نے اسلامی زمانے میں پہلے مرد مغنی طُوَیس (م ۸۸ھ/۷۰۵ء) کا ذکر کیا ہے۔ جو ایرانی طرز پر، ہزج کے سُروں پر اور دَف کی گت پر گانے میں ماہر تھے۔ اس کے معاصر صائب خاثر (م ۶۵ھ/۶۸۳ء) نے قضیب پر گانا شروع کیا، لیکن جلد ہی اُسے چھوڑ کر عُود پر گانے لگا۔ عود کا رواج مکہ مکرمہ میں ۳ھ سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن مدینہ منورہ میں سب سے پہلے اُس نے عود کا استعمال شروع کیا۔ اس دور کے دو مشہور موسیقار، جن میں ایک خاتون عزّت المیلاء (م ۸۶ھ/۷۰۵ء) اور دوسرا مرد نشیط فارسی، مدینہ منورہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ دوسرے مشہور موسیقاروں میں حُنَین الحیری اور احمد نصیبی شامل ہیں۔ اموی دورِ خلافت (۴۰ھ تا ۱۳۲ھ) میں موسیقی نے کافی ترقی کی۔ اموی خلفاء معاویہ اوّل، یزید اوّل، عبدالملک اور ولید اوّل موسیقی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اہلِ فن کی کافی قدر کی۔ اس دور کے مشہور اہلِ فن میں ابنِ سریج، معبد اور ابنِ مسجح تھے۔ یونس الکاتب (م ۹۶ھ/۷۱۵ء) نے اُس دور کے چار مشہور اور بڑے مغنیوں میں معبد اور ابن سریج کو بھی شمار کیا ہے۔

بنو عباس کے دورِ خلافت کی پہلی صدی میں عربوں نے ثقافتی اعتبار سے علم و فن کے ہر میدان میں بے حد ترقی کی۔ ابراہیم موصلی (م ۱۸۸ھ/۸۰۴ء) ہارون رشید کے دربار کا مقبول ترین مغنی تھا اور ایک مجلس میں اسے ڈیڑھ لاکھ دینار کا انعام بھی دیا گیا تھا۔ ابنِ جامع (م ۱۸۷ھ/۸۰۲ء) کی معیت میں اُس نے ایک سو چیدہ گانوں کا انتخاب کیا اور اسی انتخاب کی بنا پر ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی کبیر مرتب کی۔ اُس کے بیٹے اسحٰق (م ۲۳۵ھ/۸۵۰ء) نے اپنے باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی۔ اسحٰق نے قدیم عربی موسیقی کے اسالیب کا احیاء کیا۔ اسی دور میں قدیم عربی موسیقی سے ہٹ کر نیا انداز بھی اختیار کیا گیا۔ ان ترقی پسند اندازِ موسیقی اور نئے خیالات کا حامی ابراہیم کو کہا جاتا ہے۔ جو کہ خلیفہ ہارون رشید کا بھائی تھا۔ وہ موسیقی میں اعلیٰ درجے کا ذوق رکھنے کے علاوہ ایک بہترین مغنی اور موسیقار تھا۔

دوسرے عباسی خلفاء بھی موسیقی کے دلدادہ تھے اُن کے درباروں میں فنِ موسیقی کے ماہروں اور مغنیوں کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ مامون کے عہد میں علم موسیقی کے موضوع پر یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔ کتابوں کے ترجموں اور موسیقی کی حوصلہ افزائی کا کام معتصم اور واثق کے عہد میں بھی ہوا۔ خلفاء کے محل مشہور مغنیوں کے نغموں اور سازوں سے گونجتے رہتے۔ خلیفہ واثق خود فنکار تھا اور اُسے عود نوازی میں کمال حاصل تھا۔

مختلف خلفاء کے درباروں کے مغنیوں میں عمرو بن بانہ (م ۲۷۸ھ/۸۹۱ء)، صاحبِ کتاب مجرّد الاغانی، ابوحشیشہ، اخبار الطنبوریین کا مصنف، جاحظ برکی، جُبّان بن عمرو شامل ہیں۔ اسی دور میں علم موسیقی کے مصنفین میں سے چار کو شہرت حاصل ہوئی۔ یعنی السرخسی (م ۲۸۶ھ/۸۹۹ء)، ثابت بن قرّہ (م ۲۸۸ھ/۹۰۱ء)، ابوبکر رازی (م ۳۱۳ھ/۹۲۵ء) اور فارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰ء)۔ چوتھی صدی ہجری سے نظام حکومت پر بُوَیہی امیروں کے غلبہ سے فنِ موسیقی پر ترکمانی اثر کسی حد تک دب گیا۔ تاہم خلفاء کے محلوں میں راگ و رنگ کی محفلیں قائم رہیں۔ عزالدولہ اور عضدالدولہ دونوں موسیقی کے بے حد شائق تھے۔ مشرف الدولہ کے وزیر ابوالقاسم مغربی نے ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کی تلخیص بھی کی تھی۔ اسی زمانے میں اخوان الصفا ادارہ بھی قائم ہوا۔ اس کے شائع کردہ رسالوں میں موسیقی پر بھی ایک رسالہ ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کی اہم شخصیات میں ابنِ سینا کا شمار کیا جاتا ہے جو شفاء اور نجات نامی دو کتابوں کا مصنف ہے۔ ان کتابوں میں موسیقی پر معرکۃ الآرا بحث کی گئی ہے۔

موسیقی میں ایک اور انقلاب ترکمانی سلاطین کے نظام حکومت سنبھالنے سے ہوا۔ جو تقریباً ڈیڑھ صدی تک برسرِ اقتدار رہے (۴۴۷ھ تا ۵۹۰ھ)۔ یہ سلاطین موسیقی کے شائق تھے۔ بالخصوص آخری سلجوق اعظم، سلطان سنجر، جس کے دربار [illegible] مغنی نے اپنے تمام کمال الزمان کے مطابق عالم گیر شہرت حاصل کی۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں حکمرانوں کی طرف سے اہلِ فن اور علماء کی سرپرستی ہوتی رہی۔ ان میں ابن النقاش (م ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء)، ابوالحکم باہلی (م ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء) [illegible] نے ارغنون سازی میں شہرت حاصل کی، کمال الدین بن منعہ [illegible] معلّم اور علم موسیقی کا ماہر تھا، اس کا شاگرد علم الدین قیصر (م ۶۴۹ھ) [illegible] شامل ہیں۔ بغداد کے آخری خلیفہ معتصم کے عہد حکومت میں صفی الدین [illegible] مغنی تھا۔ نظریہ موسیقی پر اس کی معروف کتاب الادوار بعد کے مصنفین کے لیے چراغ راہ ثابت ہوئی اور اُس کی کئی شروح لکھی گئیں۔ اس زمانے میں عربی موسیقی پر ایرانی اثرات بھی عروج پر تھے۔ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کے بعد علم و فن کا یہ مرکز درس گاہ عبرت کی صورت اختیار کر گیا۔

شامی موسیقی:۔ شام میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے [illegible] کلیسائی موسیقی پر بھی اثرات پڑنے شروع ہوئے۔ شامی کلیساؤں میں دعائیں عربی زبان میں پڑھی جانے لگیں۔ جب ۴۰ھ میں دمشق اموی خلفاء کا دارالحکومت بنا تو ملک شام میں موسیقی اپنے معراج کو پہنچ گئی۔ اموی خلفاء موسیقی کا ذوق رکھتے تھے اور اہلِ فن کی قدر کرتے تھے۔ ابنِ مسجح نے علم موسیقی کی عملی تعلیم شام کے بزنطیوں سے پائی تھی۔ بنو امیہ کی جگہ عباسی خلفاء کے حکمران ہونے سے دارالحکومت عراق منتقل ہو گیا یہاں ایرانی تہذیب کے غلبہ سے موسیقی اور فنونِ لطیفہ بھی متاثر ہوئے تاہم شام میں قدیم حجازی اُستادوں کی موسیقی مقبول رہی۔

پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر صلیبی جنگوں کی وجہ سے

علوم و فنون پر بھی گہرا اثر پڑا۔ البتہ فوجی موسیقی اپنے کمال پر پہنچ گئی۔ چھٹی صدی ہجری میں نظری موسیقی کے جن ماہروں کو شام میں پناہ ملی اُن میں ابوالحکم باہلی، ابن النقاش، محمد بن ابی الحکم شامل ہیں۔ شام پر دسویں صدی ہجری تک مصر کے ایوبی سلاطین اور مملوک بادشاہوں کی حکومت کے دوران فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی کو کافی ترقی ہوئی۔ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں ترکانِ عثمانیہ کے مصر و شام پر قبضے کے بعد ملک میں ترکی موسیقی کو فروغ حاصل ہوا لیکن حلب اور دمشق کے مرکزوں میں قدیم شامی موسیقی بھی مروّج رہی۔ بعد کے ادوار میں شام پر فوجی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے علوم و فنون کو زوال آتا گیا۔

فی زمانہ اس علاقے میں موسیقی کا سب سے بڑا مرکز بیروت ہے۔ دمشق بھی موسیقی کی تعلیم کے لئے ادارے قائم کئے گئے لیکن اب یہ فن یورپی اثرات کے تحت ہے اور جو افراد اس فن سے وابستہ ہیں وہ فرانسیسی اور امریکی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ آج کل شام ریڈیو پروگرام "ھینا دمشق" کے ذریعے اپنی آواز کو دنیا میں متعارف کرانے کی سعی کر رہا ہے۔ شام کے موسیقاروں کی بیرونِ ملک شہرت بیسویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ ان میں سے ایک موسیقی المصریہ اور تاریخ الموسیقی العربیہ کا مصنف ہے۔

مغرب کی موسیقی:۔ مراکش سے طرابلس تک رہنے والوں کی موسیقی میں علاقے کی نسبت سے ایک قدرِ مشترک کے ہوتے ہوئے کچھ علاقائی اختلافات بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں نے ۸۹ھ/۷۰۸ء میں مغرب کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا تو مغرب کے ان علاقوں میں مشرقی موسیقی کے اثرات آتے گئے۔ قیروان میں زیادۃ اللہ کے دربار میں زریاب المغنی کی ۲۰۶ھ/۸۲۱ء میں پذیرائی سے بغداد کی موسیقی مغرب میں متعارف ہوئی۔ اندلسی موسیقی کے عروج کے زمانے میں مغرب کی موسیقی پر بھی اُس کا اثر پڑا۔ ابنِ باجہ اور اُس کی کتاب کو مغرب میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ مغرب نے بہت سے آلاتِ موسیقی بھی اندلس سے لئے۔ چھٹی صدی ہجری/ بارہویں صدی عیسوی میں مغرب کی موسیقی کو کافی ترقی ملی۔ اس ترقی کی وجہ سقوطِ قرطبہ کے بعد اندلس کے تارکینِ وطن کا تلمسان میں آباد ہونا ہے۔ سقوطِ اشبیلہ (۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) اور اندلس میں آخری اسلامی حکومت کے خاتمے (۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء) کے بعد غرناطہ کے پناہ گزینوں کے آنے سے مغرب کی موسیقی کو ترقی ملی۔ یہ لوگ تونس اور طیطاوین میں آکر آباد ہوئے۔ بلنسیہ کی جبری ہجرت ۹۳۰ھ/۱۵۲۲ء سے فاس کا شہر مستفید ہوا۔

۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں اندلس کے علاقوں سے مسلمانوں کے مکمل اخراج کے بعد پانچ لاکھ مسلمان جلاوطن ہو کر مغرب کے علاقوں میں آکر آباد ہوئے اور مغربی موسیقی کو اُس سطح پر لے آئے جس پر یہ اندلس میں تھی۔ مغرب کے مختلف علاقوں کی موسیقی میں اختلاف کی وجہ بھی یہ نووارد تھے۔ قرطبی موسیقی کا اثر الجزائر تلمسان میں ملتا ہے۔ تونس کی موسیقی میں اشبیلی انداز غالب ہے۔ فاس اور طیطاوین میں غرناطہ کی موسیقی کا اثر نمایاں ہے۔ دسویں صدی ہجری میں مغرب کے علاقوں پر ترکوں کے قبضے سے مغرب کی موسیقی پر غیر ملکی اثرات زیادہ نمایاں ہو گئے۔

مغرب کی موسیقی سے متعلق تصانیف میں طبائع والطبوع والاصول، انیس المطرب ملتی ہیں۔ بارہویں صدی ہجری میں مراکش میں حسن بن احمد اور اُس کا بیٹا محمد دو مایۂ ناز موسیقار پیدا ہوئے۔ محمد نے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس کا نام "الحائک" مشہور ہوا۔ اسی دور میں ایک اور مشہور نغمہ ساز علال البطلہ کا ذکر بھی آتا ہے۔

ان علاقوں میں آلاتِ موسیقی میں عود، رباب اور طنبورہ استعمال ہوتے تھے۔ مغرب کی موسیقی پر غیر ملکی اثرات بالخصوص مصری اور ترکی نمایاں ہیں۔ مراکش اور تیونس کے علاقوں میں قدیم کلاسیکی موسیقی کے احیاء کی کوششیں موجودہ دور میں ہو رہی ہیں۔

مصری موسیقی:۔ مصر شروع سے ہی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور اس کی تہذیب قدامت کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے درجے پر آتی تھی۔ اسلام سے قبل بھی یہاں فنِ موسیقی عروج پر تھا۔ مسلمانوں کی افواج نے ۲۰ھ/۶۴۱ء میں مصر فتح کیا۔ اُس کے بعد یہاں اکثر ایسے عامل حکمران رہے جو موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اس دور میں فنِ موسیقی کی اساس حجاز کی عملی موسیقی پر قائم تھی اور اس کی ترتیب و نظام کا ذمہ دار ابنِ مسجح تھا۔ طولونی اور اخشیدی حکمرانوں کے دور میں (۲۵۴ھ/۸۶۸ء تا ۳۵۸ھ/۹۶۹ء) ہر طرف موسیقی کا چرچا تھا۔ فاطمی خلفاء کے عہد میں یہ ملک اسلامی تہذیب کا مرکز رہا۔ امیر تمیم بن المعز بھی الظاہر کی طرح موسیقی کا اعلیٰ درجے کا ذوق رکھنے والا تھا اس کا جانشین مستنصر (م ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) موسیقی کا اُس سے بھی زیادہ مشتاق تھا۔ فاطمی عہد میں عود، طنبور، چنگ، زمر اور تار جیسے آلاتِ موسیقی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان دنوں مشہور ماہرِ موسیقی ابن الہیثم زندہ تھا۔ اُس نے اقلیدس کی تصنیف قانون اقلیدس اور الارمانیقی کی شرح لکھی تھی اُس کے ہمعصر مصنف المسبحی (م ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء) نے کتاب "مختار الاغانی" لکھی۔ ایوبی سلاطین کے عہد میں (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء تا ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء) فنِ موسیقی میں ترکمانی طرز غالب تھی۔ مملوک بادشاہوں کے عہد میں (۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء تا ۹۲۲ھ/۱۵۱۷ء) میں صلیبی جنگوں اور دوسرے جنگی معرکوں کی وجہ سے فنِ موسیقی میں کوئی تنوع پیدا نہ ہو سکا بلکہ مخلوط قسم کی موسیقی کا رواج رہا۔

جب عثمانی ترکوں نے مصر فتح کیا (۹۲۲ھ/۱۵۱۷ء) تو فنِ موسیقی کے نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ کیونکہ پانچ صدیوں سے ترکمانی فن ہی مروّج تھا۔ عمالِ حکومت تو عثمانیہ خلافت کے مرکز سے مقرر ہو کر آتے تھے لیکن اٹھارویں صدی عیسوی تک ملک کا نظام مملوک حکمرانوں کے ہاتھ میں رہا۔ موسیقی پر قدامت پسندی کا غلبہ رہا لیکن عثمانی حکمرانوں (پاشاؤں) کے محلات میں ترکمانی موسیقی کی بہ نسبت اناطولی اور روم ایلی کی موسیقی زیادہ مقبول ہو گئی۔ مصر کے پہلے خدیو محمد علی پاشا کے عہد (۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء تا ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء) سے مصری تمدن پر عثمانی اثرات کا غلبہ رہا اور ساتھ ساتھ یورپی اثرات بھی کارفرما رہے آگے چل کر مصر کے موجودہ موسیقاروں کے خاندان کے بانی مصطفےٰ العقاد نے مصری موسیقی کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ رفتہ رفتہ مقامی موسیقی میں غیر ملکی فن کی پیوند لگنے شروع ہوئے۔ لیکن شاہ فؤاد اول کے آغاز عہد (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۲ء) سے شاہ کے ذوقِ موسیقی اور سرپرستی سے مصری موسیقی کا زریں دور شروع ہوا۔ فنِ موسیقی سے متعلق کئی ادارے قائم کئے گئے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں قاہرہ کے ایک ادارہ .... "معہدالموسیقی الشرقی" میں مراکش، الجزائر، تونس، مصر، ترکی، شام اور دنیا کے دوسرے ممالک کے ماہرینِ موسیقی کا اجلاس ہوا۔ مختلف انجمنیں اور ماہرین مقامی فنِ موسیقی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ موجودہ دور کے مشہور گانے والوں میں اُمِ کلثوم اور عبدالوہاب قابلِ ذکر ہیں۔

عراقی موسیقی:۔ سقوطِ بغداد کے بعد موسیقی کا کلاسیکی دور ختم ہو گیا۔ آخری خلیفہ کے درباری مغنی صفی الدین عبدالمؤمن کو ہلاکو کے وزیر شمس الدین جوینی کی ملازمت قبول کرنا پڑی۔ خاندان جوینی ایرانی النسل تھا اور اُس کے سب افراد علم موسیقی کی سرپرستی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے مغول کے ابتدائی زمانۂ حکومت میں اس فن کو عراق میں ترقی حاصل ہوئی۔ اس دوران کے چند معروف مغنی زین العابدین موصلی (م ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء) عبدالعزیز فصیح (م ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) فخرالدین شہربانا شرف الدین سہروردی (م ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء) اور خطیب اربلی (م ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ یا ۱۳۳۰ء) جو کہ جواہر النظام فی معرفۃ الانغام کا مصنف ہے۔ اس دور میں ایرانی موسیقی جس میں تورانی رنگ غالب تھا، رائج تھی۔ جلائری خاندان کے دورِ حکومت میں بھی تورانی موسیقی کا اثر قائم رہا۔ سلطان حسن بزرگ (م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کے عہد میں علم موسیقی کو بڑا عروج حاصل تھا۔ اس دور کے مشہور اساتذہ فن ابن الحلائی بغدادی، مصنف قرۃ الزّمان فی علم الالحان، محمد بن عیسیٰ، مصنف غایۃ المطلوب فی فن الانغام، خلیل بن ایبک عقدی، مصنف جامع فی الموسیقی اور نظام الدین ابن نورالحکیم، جمال الدین عمر ابن عمر الکندی، مصنف کنز المطلوب فی علم الدّوائر والضروب، جمال الدین ماردینی مصنف مقدمہ فی علم الانغام اور مشہور عود نواز صارم الدین ابراہیم المعروف ابن بابا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ابن بابا کا تعلق ملک مؤید شیخ کے دربار سے تھا۔ حسن بزرگ کے جانشین سلطان حسین (م ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء) کے دورِ حکومت میں رضا الدین رضوان شاہ نامی ایک شخص عراق کا سب سے بڑا موسیقار مانا جاتا تھا۔ اسلامی دنیا کا ایک نامور موسیقار عبدالقادر ابن غیبی بھی بغداد آ گیا تھا اور سلطان حسین کے دربار کا موسیقار رہا۔ ۹۱۴ھ/۱۵۰۷ء میں ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی نے عراق کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن ۹۴۱ھ میں ترکیہ کے سلطان سلیمان اوّل نے اس صوبے کا الحاق اپنی مملکت سے کر لیا۔ ۱۰۳۲ھ کے بعد یہ ملک پھر ایران کے قبضہ میں رہا۔ ۱۰۴۸ھ میں سلطان مراد چہارم نے عراق کو دوبارہ فتح کر لیا اور ۱۹۱۸ء تک یہ علاقہ عثمانیہ خلافت کے زیرِ نگیں رہا۔ مراد بغداد کے مشہور موسیقار شاہ قلی کو اپنا درباری مغنی بنا کر اپنے ساتھ استنبول لے گیا تھا۔ اس وقت سے ترکی تہذیب اور اس کے طور طریقے عراق میں داخل ہو گئے۔ اور موسیقی بھی ترکی طرز پر آ گئی۔

آج کل بغداد میں مکاتیب اور ابتدائی مدارس میں بچوں کو گانا سکھایا جاتا ہے اور ساز نوازی کی تعلیم کے ادارۂ فنونِ لطیفہ میں دو استاد مقرر ہیں۔ بغداد ریڈیو پر جو موسیقی پیش کی جاتی ہے اُس پر یورپی رنگ غالب ہے۔

ایرانی موسیقی:۔ ایرانی تہذیب قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ ساتویں صدی قبل مسیح یعنی آشوری زمانے کی تاریخ سے ایران میں فن موسیقی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ سکندرِ اعظم کی فتوحات (چوتھی صدی قبل مسیح) سے ایران پر یونانی تہذیب و تمدن کے اثرات پڑنا شروع ہو گئے۔ دوسری صدی قبل مسیح کے بعد یونانی زبان و تمدن کو ترک کر کے آرامی زبان و تمدن کو اپنایا گیا۔ مشہور شاعر فردوسی کے شاہنامہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سماجی زندگی میں کسی تقریب کی تکمیل کے لئے گانے بجانے کو لازم سمجھا جاتا تھا۔ محافل رقص و سرود کیلئے چنگ، دف، بربط، رباب اور طنبور کے ساتھ ساتھ قانون، مشتک، نامی اور تنبک بجائے جاتے تھے۔

صبح اسلام کے طلوع ہوتے ہی سارے عالم میں جو تہذیبی و تمدنی انقلاب آیا، اس میں ایرانیوں کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ دربارِ خلافت کی موسیقی کے بعض محققین ایرانی النسل تھے، مثلاً السرخسی، عبیداللہ بن عبداللہ بن طاہر، جو فلسفۂ موسیقی میں بلند مقام پر مانا جاتا ہے، علم موسیقی کا مؤرخ ابن خُرّداذبہ اور مفاتیح العلوم کا مصنف محمد بن احمد خوارزمی۔ ان سب کی تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ سامانی حکمرانوں کے دور (۲۶۱ھ/۸۷۴ء تا ۳۸۹ھ/۹۹۹ء) میں ایران نے علم موسیقی اور ادب میں بڑی ترقی کی۔ اسی دور میں معروف مغنی رودکی نے چنگ و بربط نوازی میں مہارتِ تامہ کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ ابن سینا سامانی بادشاہ نوح ثانی کا منظورِ نظر تھا۔ شاہی درباروں میں مغنیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ فرخی بھی رودکی کی طرح شاعر ہونے کے علاوہ چنگ بجانے میں مہارت رکھتا تھا اور غزنہ کے سلاطین و امراء کے ہاں اُس کا بڑا مقام تھا۔ غزنہ کے سلاطین ایران و ترکستان کے بہت سے علاقوں پر حکمران تھے۔ بعد میں سلجوقی سلاطین کے درباروں سے مشہور عالم مغنی کمال [illegible] نے شہرت حاصل کی۔ خوارزمی بادشاہوں کے عہد میں (۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء تا ۶۲۸ھ/۱۲۳۱ء) لوک رنگ عام ہو گیا۔ قبولِ اسلام کے بعد مغول حکمرانوں نے فن اور مغنیوں کی سرپرستی بڑی فراخ دلی سے کی۔ ہلاکو کے شاہی منجم نصیر الدین طوسی نے فن موسیقی پر ایک رسالہ لکھا۔ طوسی کے شاگردوں میں سے قطب الدین شیرازی نے اپنی تصنیف دُرّۃ التّاج میں موسیقی پر ایک باب لکھا ہے۔ اس کے [illegible] بن محمود الآملی نے نفائس الفنون کے نام سے ایک دائرۃ المعارف مرتب کیا۔ مختلف مغول حکمرانوں کے دورِ حکومت (۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء تا ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء) میں ایران میں موسیقی کو عروج حاصل ہوا۔

اس کے بعد ترکمان خانوادوں، جلائری سلاطین و [illegible] کے دور حکومت میں بھی فن موسیقی اور ماہرِ فن کی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ ایران کے صفوی [illegible] (۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء تا ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء) میں ایرانی موسیقی [illegible] میں آیا۔ بعد کے زمانے میں غیر ملکی سیاحوں اور [illegible] فن موسیقی [illegible] موسیقی اپنے اصل رنگ میں نہ رہی اور بڑے [illegible] موسیقی [illegible] یورپی طرز کے آلاتِ موسیقی رواج پا گئے ہیں۔ [illegible] کے رواج پا جانے کی وجہ سے مغربی طرزِ موسیقی [illegible] طرزِ موسیقی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ایسے دور کے قائم ہو گئے ہیں [illegible] موسیقی کے فروغ میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

ترکی موسیقی:۔ اس کی بنیاد [illegible] عربی [illegible] کی تہہ میں قدیم اور عربی تہذیب بھی [illegible] ہے۔ عثمانی [illegible] کے وارث بنے اور ۸۵۷ھ [illegible] وسیع [illegible] گئے۔ عثمانی ترک ہمیشہ سے جنگی موسیقی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے [illegible] موسیقی ہر دور میں دوسرے ملکوں پر اثر انداز ہوتی رہی۔ [illegible] ترکوں کے آلاتِ موسیقی [illegible] ترکی فوجوں میں مقبول تھے [illegible] ترکوں نے جہاں دوسری تہذیبوں سے استفادہ کیا وہاں [illegible] کی بھی حفاظت کی۔ عثمانی خاندان کے درباروں میں ترکی تہذیب و تمدن [illegible] غالب تھا اور ایرانی و عرب ثقافت و تمدن کا بھی [illegible] ترکی میں پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں [illegible] درویشیہ مکتا مشیہ کے قیام کی وجہ سے مذہبی موسیقی کو بھی کچھ فروغ حاصل ہوا۔ گو یہ موسیقی صوفی جلال الدین رومی کے سلسلۂ درویشیہ جلالیہ سے منسوب کی جاتی ہے۔

سلطان محمد اوّل کے عہد میں (۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) ترکوں کی سلطنت کے [illegible] سے عام ثقافت اور فنونِ لطیفہ نے اناطول میں بے حد ترقی کی۔ اس کے جانشین مراد ثانی کا دربار مغنیوں اور شاعروں سے بھرا رہتا تھا۔ مشہور مغنی ابن غیبی کی

تذنیب جامع الالحان سے ترکوں میں مستعمل آلاتِ موسیقی کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں طنبورۂ ترکی، قوپوز رومی، اوزان، نامی چدور اور بلبان شامل ہیں۔ ابنِ غیبی خود ترکی النسل تھا۔ ادوارِ موسیقی کے نام سے ایک رسالہ ایک اور ترکی مصنف خضر ابن عبداللہ نے لکھا ہے۔ نظری اور عملی موسیقی پر ترکی زبان میں ایک کتاب احمد اوغلو شکر اللہ نے فارسی تصنیف کنز التحف کی طرز پر لکھی ہے۔ سلطان محمد ثانی کے زمانے کو (۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء) فنونِ لطیفہ کی ترقی کے اعتبار سے سلطنتِ عثمانیہ کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ سلطان کے دربار میں ابنِ غیبی کا بیٹا اور نقاوۃ الادوار کا مصنف عبدالعزیز بھی موجود رہتا تھا۔ ابنِ غیبی کے پوتے نورالدین نے سلطان بایزید ثانی کے عہد (۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء) میں مقاصد الادوار نامی ایک کتاب لکھی۔ مراد چہارم کے عہد میں (م ۱۰۴۹ھ/۱۶۴۰ء) عام تہذیب و تمدن کو ترقی حاصل ہوئی۔ سلطان مراد چہارم شعرا اور مغنیوں کو پسند کرتا تھا۔ کچھ اور عثمانی سلاطین بھی موسیقی کے دلدادہ تھے۔

احمد ثانی (م ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء)، محمود اول (م ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء) بذاتِ خود ایک مغنی تھا اور سلیم ثالث (۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) جو ہارون رشید کی طرح موسیقاروں پر زر و جواہر لٹایا کرتا تھا خود بھی ایک موسیقار تھا۔ آلاتی موسیقی ترکوں میں ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ترکی فوجی بینڈ کا نگران غیر ملکی تھا لیکن بعد میں اطالوی اہلِ فن کے بعد دیگرے حکمران طبقے میں اعلٰی مقام پر فائز رہے۔ اس طرح سے یورپی موسیقی نے ترکی موسیقی پر غالب ہونا شروع کیا۔

۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں جب ترکیہ کو جدید سیاسی آئین ملا تو استنبول میں موسیقی کے ایک نئے مدرسے سے جدید ثقافتی دور کا آغاز ہوا جس نے مغربی موسیقی کو مقبول بنانے کے علاوہ مقامی موسیقی کے نہایت قیمتی اور قدیم خزانوں کو محفوظ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

ترکستانی موسیقی:۔ جو علاقے آجکل ازبکستان، قزاقستان اور تاجکستان کہلاتے ہیں اُن کو ۱۹۲۶ء سے پہلے مغربی ترکستان یا ترکمانستان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان علاقوں سے متعلق کئی افراد نے موسیقی میں نام پیدا کیا۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری کے دور کی فارابی، ابوعبداللہ محمد خوارزمی، پانچویں صدی ہجری کے ابن سینا، آٹھویں صدی ہجری کے محمد بن محمود الاملی اور امیر خسرو، نویں صدی ہجری کے سعیدالدین ہروی جس کا رسالہ "چنگ" کے موضوع پر اب بھی تاشقند میں محفوظ ہے، دسویں صدی ہجری کے فخرالدین خجندی جس نے موسیقار اعظم صفی الدین عبدالمومن کے نظریوں پر حواشی لکھے اور علی شیر نوائی اور اس کے چچا محمد علی غرقابی، گیارہویں صدی ہجری میں قاسم بن دوست علی بخاری جس نے علم موسیقی پر ایک رسالہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے لیے لکھا اور اس کا ہم نام درویش علی بخاری جو ایک مشہور گویا اور چنگ نواز تھا۔

ان ممالک کے سب سلاطین بڑی کشادہ دلی سے علم موسیقی اور فن موسیقی کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ مشہور مغنی عبدالقادر بن غیبی تیمور اور شاہ رخ کے درباروں سے منسلک تھا۔ پرانے زمانے میں قدیم ترین اور مقبول ساز دور تھا۔

موجودہ ترکمانستان، ازبکستان، قرغزستان اور تاجکستان کی موسیقی قوس و قزح کی طرح رنگا رنگ ہے۔ یہ تنوع بیرونی ثقافتی تعلقات اور اثرات کی وجہ سے ہوا ہے۔ ترکمانستان اپنے ہمسایہ ملک خراسان کے زیرِ اثر رہنے کی وجہ سے فنِ موسیقی میں بھی خراسانی اثرات نمایاں ہیں۔ اسی طرح تاجکستان میں موسیقی پر ایرانی اثر نمایاں ہے۔ ازبکستان اور قرغزستان میں مقامی موسیقی کا رنگ غالب ہے۔

اندلسی موسیقی:۔ اندلس میں دبستانِ بغداد کی قدیم عربی موسیقی سقوطِ بغداد کے بعد کوئی دو سو برس تک یعنی ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء تک قائم رہی۔ اندلس کی فتح کے بعد پچاس سال بعد ہی اموی حکمران اس علاقہ پر حکومت کرنے لگے۔ ان کے دورِ حکمرانی میں فنِ موسیقی نے کافی فروغ پایا۔ یگانۂ روزگار موسیقار زریاب نے ۲۰۶ھ/۸۲۲ء میں اس طرزِ موسیقی کو پیش کیا جو اس کے استاد اسحٰق موصلی نے منظم کی تھی۔ اس سے قبل اُمرا قدیم طرز کی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ زریاب کی زندگی میں اس سرزمین کی تاریخ میں موسیقی کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔

امیر الحکم اوّل (م ۲۰۶ھ/۸۸۲ء) اور عبدالرحمان ثانی (۲۳۸ھ/۸۵۲ء) نے موسیقی کی سرپرستی کی۔ زریاب کے دبستان کا دوسرے ملکوں میں بھی چرچا ہوا اور اس کی موت کے بعد اس کی اولاد و احفاد نے اس فن کو جاری رکھا۔ عبدالرحمان ثالث (م ۳۵۰ھ/۹۶۱ء) کے شاندار تاریخی عہدِ حکومت میں موسیقی کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اس نے اپنے بچوں کو اس فن کی تعلیم دلائی۔ ان میں سے ایک تو طنبورہ اور قیثارہ بجایا کرتا تھا اور دوسرا بیٹا الوالا صبغ کہا کرتا تھا کہ جب تک اللہ کی جانب سے پرندوں کو گانے کی اجازت ہے میں بھی گاتا رہوں گا۔ بعد کے خلفا حکم ثانی (۳۶۶ھ/۹۷۶ء) محمد ثانی (م ۴۰۰ھ/۱۰۰۰ء) ہشام ثانی (۱۰۱۳ء) اور محمد ثالث (۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء) کے زمانوں میں علوم و فنون کی ترقی میں کوئی انحطاط نہ آیا۔ محمد ثالث کی بیٹی ولّادہ ایک مشہور شاعرہ ہونے کے علاوہ مغنیہ بھی تھی۔ مغربی خلافت کے خاتمے اور مختلف ولایات کے خود مختار ہونے سے سیاسی اقتدار میں انتشار تو ہوا لیکن عام تہذیب و تمدن میں کچھ ترقی ہی ہوئی۔ مختلف ولایات کے حکمرانوں کے دربار علوم و فنون کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں بربر حکمرانوں کے تشدد کے باوجود بہت سے مشہور و معروف فن کار پیدا ہوئے۔ کیونکہ بربر حکمران موسیقی کو بالکل ناجائز سمجھتے تھے۔ رسالہ فی الموسیقی کا مصنف ابوالصلت اُمیہ، دانیہ کا رہنے والا تھا۔ اندلس کے دو موسیقار، جنہوں نے مشرق میں نام پیدا کیا، ابوالحکم باہلی اور ابو زکریا یحیی البیاسی تھے۔ اسی طرح ابنِ باجہ جیسی نامور شخصیت کے علاوہ ایک اور حکیم مشہور و معروف فلسفی ابنِ رشد (م ۵۹۳ھ/۱۱۹۸ء) تھا اُس نے ایک تلخیص فی النفس لارسطا طالیس لکھی تھی۔ اساتذہ موسیقی میں آخری شخص ابنِ الخطیب المعروف بہ ذوالوزارتین (م ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء) تھا جو کتاب فی الموسیقی کا مصنف تھا۔ عیسائیوں کی طرف سے اسپین کی فتح کی کوشش برابر جاری تھیں حتیٰ کہ ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد اندلس کی اس آخری اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسپین میں تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی وجہ سے مسلمانوں کے تہذیبی و تمدنی اثرات کو مٹایا نہ جا سکا اور اندلس کے موروں کی موسیقی نے اسپین بلکہ یورپ تک اپنے اثرات ڈالے۔

پاک و ہند کی موسیقی:۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی غیر مذہبی موسیقی کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ برصغیر میں اسلام کے متعارف ہونے کے بعد ایک طویل عرصہ تک تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ اسلام کے چار بڑے فقہی مذاہب موسیقی کو ایک ممنوع چیز سمجھتے ہیں لیکن اُس کے ساتھ صوفیوں اور درویشوں کے سلسلے، موسیقی اور رقص دونوں کو اپنے ہاں جائز سمجھتے ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنے دورِ حکومت کے آغاز میں فقہا کے دباؤ پر موسیقی کو ممنوع قرار دیا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ دہلی کے چشتی درویشوں کے سماع اور وجد سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے موسیقی پر سے پابندی اُٹھا لی۔ صوفیا کے اس سلسلہ کی بنیاد حضرت معین الدین چشتی نے (۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) رکھی تھی اور یہ ہندوستان بھر میں مقبول تھا۔ صاحبِ تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ سلطان فیروز شاہ اول رکن الدین

(۶۳۲ھ/۱۲۳۹ء) نے فنِ موسیقی کی سرپرستی کی۔ غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ/۱۲۶۵ء) کے دربار میں ایک شام شاعروں اور ادیبوں کے لئے مخصوص تھی اور ایک شام مغنیوں رقاصوں اور داستان گوؤں کے لئے مقرر تھی۔ سلطان کیقباد (۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) کے عہد میں موسیقی کا قریب قریب ہر گھر میں چرچا تھا۔

خلجی سلاطین میں سے پہلے بادشاہ فیروز شاہ ثانی جلال الدین (۶۹۵م/۱۲۹۵ء) نے بھی فنِ موسیقی کی کافی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں امیر خاصہ اور حمید راجا جیسے بلند پایہ مغنی اور محمد شاہ چنگی، نصیر خان اور بہروز جیسے مطرب موجود تھے۔ امیر خسرو کا بھی اسی دربار سے تعلق رہا ہے۔ امیر خسرو سلطان غیاث الدین بلبن اور کیقباد کے درباروں سے بھی متعلق رہے ہیں۔

خاندانِ سادات کے زمانہ میں موسیقی کو دربار شاہی اور عوام کی زندگی میں بدستور اہمیت حاصل رہی۔ تاریخِ مبارک شاہی میں لکھا ہے کہ سلطان مبارک شاہ (م ۸۳۷ھ/۱۴۳۳ء) فنِ موسیقی کا بہت شیدا تھا۔ لودھی خاندان کے عہدِ حکومت میں فقہا کے کہنے پر موسیقی پر کچھ پابندی سی رہی لیکن سلطان سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) نے خصوصی طور پر اپنے لئے چار ایسے غلام رکھے ہوئے تھے جو اس کے ذوقِ موسیقی کی تسکین کرتے تھے۔ ان غلاموں میں سے ایک چنگ، دوسرا قانون، تیسرا طنبور اور چوتھا بین بجانے میں کمال رکھتا تھا۔

سوری خاندان کے بادشاہ (دورِ حکومت ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء تا ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) بھی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اسلام شاہ سوری اور عادل شاہ سوری نے فنِ موسیقی کی خصوصی طور پر سرپرستی کی۔ سلطان عادل شاہ گانے بجانے کے فن میں ایسا ماہر تھا کہ موسیقی کا مشہور اور نامور استاد تان سین بھی اس سلطان کا شاگرد ہونے کا فخر سے اظہار کرتا تھا۔ دوسری ریاستوں کے حکمران بھی فنِ موسیقی کی اور فن کاروں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ تاریخ فرشتہ میں ان درباروں کے احوال تفصیل طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ کشمیر راگوں کے لئے مشہور تھا۔ سلاطینِ کشمیر (۷۳۵ھ/۱۳۴۴ء تا ۹۵۷ھ/۱۵۸۷ء) میں سے ایک بادشاہ زین العابدین کے عہد میں موسیقی پر کافی کتابیں لکھی گئیں۔

دکن میں بہمنی خاندان کے بادشاہوں میں سے تاج الدین فیروز شاہ (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ بہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہوں میں سے احمد شاہ اول (۸۳۸ھ)، علاؤ الدین احمد شاہ ثانی (۸۶۲ھ)، محمد شاہ ثانی (۸۸۷ھ) اور محمود شاہ ثانی (۹۲۴ھ) نے اپنے درباروں میں مستقل معروف مغنیوں اور رقص و موسیقی کی ماہر لڑکیوں کو رکھا ہوا تھا۔ بہمنی خاندان کے زوال کے بعد بیجاپور کی ریاست کے بادشاہ یوسف عادل شاہ (۹۱۶ھ/۱۵۱۱ء) کے متعلق تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ موسیقی میں اس کا ذوق اور کمال اس درجے کا تھا کہ اس دور کے ماہرِ فن اس سے مات کھا جاتے۔ وہ کئی ساز نہایت خوبی سے بجاتا تھا۔ اس کے جانشین اسمٰعیل (۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) نے دکن کی موسیقی کے مقابلہ میں ترکی اور ایرانی موسیقی کو ترجیح دی۔ ابراہیم عادل شاہ اوّل اور ثانی کے زمانوں میں بھی موسیقی کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء) نے فنِ موسیقی پر ایک کتاب نورس لکھی تھی۔

مغلیہ دورِ حکومت میں فنِ موسیقی کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس سلطنت کا بانی اور پہلا شہنشاہ بابر (۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء تا ۹۳۶ھ/۱۵۳۰ء) نے موسیقی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ اس کے تایا سلطان احمد مرزا کے دربار میں فنِ موسیقی کے ماہرین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ قیامِ کابل کے ابتدائی ایام میں بابر کے دربار میں مشہور مطرب علی شیر نوائی کے تربیت یافتہ شاگرد، قل محمد عودی، حسین عودی اور شیخ نائی جیسے موسیقار موجود تھے۔ نصیر الدین ہمایوں (م ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا حامی اور مربی تھا۔ عہدِ ہمایوں میں موسیقی دان اور مغنی "اہل مراد" میں شامل تھے اور ان کے اظہارِ فن کے لئے دربار میں دوشنبہ اور سہ شنبہ کے دن مقرر تھے۔ اس کے دربار میں میر عبداللہ قانونی، مولانا قاسم قانونی، استاد شاہ محمد سرنائی، حافظ دوست محمد خوافی (مغنی) اور استاد یوسف مودود (مغنی) جیسے ماہرِ فن موجود تھے۔

مشہور مغل بادشاہ اکبر (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے زمانے کی موسیقی زمانۂ ماضی کی موسیقی پر کبھی سبقت لے گئی بلکہ اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ابوالفضل نے موسیقی کے نظری اور عملی پہلوؤں پر اپنی کتاب آئینِ اکبری میں سنگیت کے نام سے ایک باب مخصوص کیا ہے۔ آئینِ اکبری میں ہی اس عظیم مغل بادشاہ کے دربار کی موسیقی کے متعلق تفصیلی احوال بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے موسیقار سات طائفوں میں منقسم تھے اور ہر طائفے کے گانے بجانے کے لئے ایک ایک دن مقرر تھا۔ ابوالفضل نے ان میں سے چھتیس مطربوں کے نام لکھے ہیں، جن میں سے بعض گانے والے تھے، بعض ذکر کرنے والے (خوانندہ) تھے اور بعض آلاتِ موسیقی کے ماہر تھے۔ یہ سب موسیقار دنیائے اسلام کے مختلف ممالک سے آئے تھے۔ جہانگیر (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) ہر قسم کی موسیقی کا دلدادہ تھا اور [illegible] گیتوں کا خاص شائق تھا۔ شہاب الدین شاہ جہان (م [illegible]) کے عہد میں موسیقی تمام درباری اور عوامی جشنوں اور تہواروں [illegible] تھی۔ شاہ جہان نے گوالیار کے مشہور شاعر [illegible] مجموعہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ مجموعہ [illegible] چار راگ اور چھتیس راگنیاں شامل تھیں [illegible] سینئیے کے یہ موسیقی کے متعلق [illegible] ہو گئی۔ بادشاہ نے درباری [illegible] لیکن موسیقی کے علم و فن [illegible] ۱۶۲۲ء) میں [illegible] نام کی ایک کتاب [illegible] میں "مرجات سنگیت" نامی کتاب [illegible] میں موسیقی کی [illegible] تھیں۔

مرزا خان محمد بن [illegible] بھی [illegible] نے ایک کتاب "رسالہ [illegible]" قیصر نے "کتاب معرفۃ النغم اور مصباحات [illegible]" زمانے میں نظری اور عملی [illegible] کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اوّل [illegible] اور محمد [illegible] میں دوبارہ مقبول عام بنایا۔ [illegible] بھی تھے۔ اس کے جانشین [illegible] شاہ کے عہد میں [illegible] صاحبانِ منصب ہو گئے۔ فرخ سیر [illegible] اور شاہ عالم ثانی (م ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) کے زمانوں میں [illegible] مغلیہ سلطنت کے روبہ زوال ہونے کے باوجود موسیقی کو فروغ [illegible]

مشہور فرانسیسی فاضل JOANNY GROSSET جو ہندوستانی موسیقی پر ایک مستند مصنف مانا جاتا ہے، لکھتا ہے کہ بارھویں صدی ہجری [illegible]

صدی عیسوی کے آخر سے برطانوی عہد میں ممتاز اور دولت مند خاندانوں کی سرپرستی سے علم موسیقی کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون میں از سرِ نو جان پڑ گئی۔

برصغیر ہند و پاک میں فن موسیقی کے ارتقا میں مسلمان موسیقاروں کا اہم حصہ ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں کلاسیکی موسیقی کے تحفظ کے سلسلے میں عبدالکریم خان، مہربان خان، ولایت خان، امام الدین خان، فیاض خان، عاشق علی خان اور عبدالوحید خان جیسے معروف مسلمان موسیقاروں نے نمایاں حصہ لیا۔ کرانا، پٹیالہ اور شام چوراسی کے گھرانوں نے فنِ موسیقی کے مختلف اسالیب کو بنانے سنوارنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد اکثر مسلمان مغنی اور فن کار پاکستان چلے آئے۔ ان میں روشن آرا بیگم، امانت علی خان، فتح علی خان، نزاکت علی خان، سلامت علی خان، شاہد احمد دہلوی، برکت علی خان، نذر حسین شامی اور فیروز نظامی جیسے نامور ماہرِ فن کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ سازندوں میں بندو خان سارنگی نواز، عبدالعزیز خان بین کار، فتح علی خان ستار نواز، قادر بخش پکھاوجی اور علاقائی ساز بجانے والوں میں منیر سرحدی، مصری خان اور خمیسو خان قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان میں آجکل علاقائی دھنوں کا احیاء ہو رہا ہے۔ مشرقی اور مغربی موسیقی کے امتزاج سے نئی نئی دھنیں بنائی جا رہی ہیں۔ ساز بینوں میں قدیم مشرقی سازوں کے ساتھ ساتھ جدید یورپی آلات موسیقی کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی دھنوں کو بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس ضمن میں اہم حصہ لے رہے ہیں۔ عسکری موسیقی پر بھی کافی توجہ دی جاتی ہے اسی وجہ سے پاکستان آرمی اور پنجاب پولیس کے بینڈ متعدد قومی اور بین الاقوامی مظاہروں میں داد و تحسین پا چکے ہیں۔

پاکستان میں مختلف بزرگوں کے مزاروں پر منعقدہ عرس اور محافلِ میلاد کے ذریعے سے قوالیوں کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ قوال بھی قدیم انداز کے ساتھ ساتھ جدید اندازِ موسیقی کو بھی اپنا رہے ہیں۔ عزیز میاں قوال اور غلام فرید صابری اپنے مخصوص اندازِ قوالی کی وجہ سے عوام میں کافی مقبول ہیں۔ لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں ایسے ادارے قائم ہیں جو فنِ موسیقی کے فروغ میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

فنِ تعمیر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں حجازِ مقدس یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بیت اللہ شریف کے سوا ایسی کوئی قابلِ ذکر عمارت نہ تھی جسے اسلامی فنِ تعمیر کے سیاق میں پیش کیا جا سکے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ شریف بھی ایک چھوٹا سا مستطیل شکل میں بغیر چھت کے اور بغیر گھڑے ہوئے پتھروں کی ایک عمارت تھی۔

فتوحات کے ذریعے مملکتِ اسلامیہ میں توسیع ہوئی تو دوسرے ممالک میں مسلمانوں کو ان کی تہذیب و تمدن سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ مصر اور شام میں فنِ تعمیر کے بہترین نمونے موجود تھے۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں ایسی کوئی عمارت تعمیر نہ ہو سکی جسے تاریخی کہا جائے۔ بنو امیہ کے دور میں مساجد کی عالیشان عمارتوں کے ذریعے ابتدائی اسلامی فنِ تعمیر کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ بیت المقدس کا "قبۃ الصخرہ" جو آج مسلم فنِ تعمیر کی قدیم ترین یادگار ہے۔ خلیفہ عبدالملک نے تعمیر کروایا اور ۷۲ھ/۶۹۱ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ خلیفہ ولید نے دیوانِ عام اور حمام پر مشتمل ایک عمارت بنوائی جو آج کل شرقِ اردن میں قصیرِ عمرۃ کے نام سے مشہور ہے۔

محلات تعمیر کرنے میں خلفائے بنو امیہ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اگرچہ یہ محل سلطنت کے وسط اور قریبی سرحدوں سے دور بنائے جاتے تھے لیکن ان کی بیرونی صورت مستحکم قلعوں کی شکل میں بنائی جاتی تھی۔

بنو امیہ کی تراشیدہ پتھروں سے بنی ہوئی شاندار عمارتوں میں محرابی چھت مرمریں ستونوں پر کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ عمارتیں اندر سے مرمریں چوکوں اور پچی کاری سے حد درجہ مزین کی جاتی تھیں۔ مسجدوں پر عام طور سے کوہانی چھتیں ڈالی جاتی تھیں۔ میناروں کی شکل اونچے مربع برجوں کی سی تھی۔ ان یادگار عمارتوں پر مخلوط اثرات محسوس ہوتے تھے، جن میں ایرانی، مصری اثرات کے ساتھ شامی اثر سب سے نمایاں تھا۔

دمشق کی جامع مسجد کا صحن؛ منظر، مشرقی رواق کی جہت سے

خلافت بنو عباس میں بغداد کو پایۂ تخت بنانے سے یونانی تہذیبی اثرات کی جگہ ساسانی ایرانی اثرات نے لے لی۔ بغداد شہر کی ایک ایک چیز کو یادگار فنِ تعمیر کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مشہور مؤرخین یعقوبی اور خطیب نے تفصیل سے اس شہر کے احوال بیان کیے ہیں۔

اسلامی فنِ تعمیر، شام میں: شام یعنی سوریا کے علاقوں میں فنونِ لطیفہ کے اصل مرکز بُصریٰ، بعلبک، حمص، حماۃ، مغرۃ، دمشق اور حلب رہے ہیں۔ کیونکہ یہ شہر معاشی اور سیاسی طور پر مضبوط تھے۔ سوریا (شام) کے علاقوں پر جب عربوں نے غلبہ حاصل کیا تو اس وقت یہ علاقے دس صدیوں سے یونانی ثقافت کے زیرِ اثر تھے۔ شامیوں میں ہر چیز کو اپنا لینے کی جو قابلِ ذکر خصوصیات پائی جاتی ہے، اس کے باعث وہ جلد ہی ایک نئی ثقافت کو اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنا لیتے ہیں۔

قیصر عمرہ کے حمام میں، جو بحیرہ مردار کے مشرق میں ہے، دیواری تصویروں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ محفوظ ہے، جس میں مناظرِ خصوصی، رموز اور عشق بازی کی ہیلینی روایات کی عکاسی ہوتی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد میں بھی بوزنطینی اثر اس طرح نمایاں ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ اصل میں یہ گرجا کی عمارت ہے۔ بعد کے زمانوں میں، یعنی چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں تعمیر کی گئی عمارت میں بھی ہیلینی روایات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مملوک دور میں شام کے علاقوں میں فنِ تعمیر میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں مغول کے حملوں سے یادگار عمارات تاخت و تاراج ہو گئیں۔

۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں عثمانی ترکوں کی فتح سے، شام (سوریا) ایک عظیم الشان سلطنت کا جزو بن گئے۔ استنبولی فنِ تعمیر کو بہت جلد ہی شامی علاقوں میں اپنا لیا گیا کیونکہ مقامی روایتی اصولِ فن فرسودگی کی حالت کو پہنچ گئے تھے۔ اب سوریا فنِ لطیف کے اعتبار سے ترکیہ کا محض ایک صوبہ ہو کر رہ گیا اور جو عمارتیں تعمیر ہونا شروع ہوئیں ان میں استنبولی اثر نمایاں تھا۔ سابقہ زمانوں کی طرح دمشق نے بیرونی اصولِ تعمیر و آرائش کو من و عن اختیار کر لیا لیکن حلب کا فن ہمیشہ کی طرح اب بھی نسبتاً

جامع الازہر، وسطی دالان اور محراب

انفرادیت کا حامل رہا۔ اگر پاشاؤں کی تعمیر کردہ بڑی بڑی عمارات میں استنبولی طرز نمایاں ہے تو چھوٹی عمارتوں میں مقامی تعمیراتی رنگ باقی رہا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں کی طرح سوریا میں بھی استنبولی فنِ تعمیر کو زوال آگیا۔ تیرھویں صدی ہجری/ انیسویں صدی عیسوی میں یورپی اثرات کے بول بالا سے تمام علاقے متاثر ہوئے اور شام کے علاقوں کی تقسیم در تقسیم سے مقامی فنِ تعمیر پر بیرونی اثرات غالب آگئے۔ اب ان علاقوں میں یورپی فنِ تعمیر کے اثرات نمایاں ہیں۔

اسلامی فنِ تعمیر مصر میں: ابتدائی عہد کی تعمیرات میں قیروان کی جامع کبیر اور قصر سامرا کو یادگار کہا جا سکتا ہے۔ فاطمیوں کے دور میں (۳۵۸ھ تا ۵۶۷ھ) قاہرہ شہر تعمیر کیا گیا۔ فاطمی خلیفہ المعز کے سپہ سالار جوہر، جس نے مصر فتح کیا تھا، نے ایک مسجد جامع الازہر تعمیر کروائی، جو ۳۵۹ھ سے شروع ہو کر ۳۶۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کی دیواریں پختہ اینٹوں کی تھیں اور اس میں پایوں کی جگہ سنگِ مرمر کے ستون استعمال کئے گئے تھے۔ اس مسجد کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیچوں بیچ ایک طویل دالان بنا ہوا ہے جو صحن کو محراب سے ملاتا ہے۔ چند برس بعد شہر کی شمالی فصیل کے باہر خلیفہ حاکم نے اس سے بھی بڑی مسجد تعمیر کرائی، جس کی پیمائش ۱۲۰ x ۱۲۳ میٹر تھی۔

جامع الاقمر سب سے پہلی مسجد ہے۔ جس کی رو کار بڑی محنت سے آراستہ کی گئی۔ یہ ۵۱۹ھ میں تعمیر کی گئی تھی۔ آٹھ برس بعد سیدہ رقیہ کا چھوٹا سا خوبصورت مشہد تعمیر ہوا۔ یہ اپنی اعلیٰ درجے کی گچ کی محراب کے لئے مشہور ہے، جس پر گھونگھٹ بنا ہوا ہے۔ فاطمیوں کی آخری یادگار مسجد صالح طلعی ہے، جو ۵۵۵ھ میں باب زویلہ کے بالمقابل تعمیر کی گئی تھی۔ یہ قاہرہ میں معلقہ مسجد کی پہلی مسجد [illegible] ایسی مسجد جس کے نیچے پست چھتوں والی دکانیں تعمیر ہوں اور مسجد تک پہنچنے [illegible] زینے مہیا کئے جائیں۔ فاطمیوں کا دورِ فنِ تعمیر میں تزئین [illegible] مشہور ہے۔ اس دور کی تعمیر کردہ مساجد کی انفرادیت نمایاں ہے۔ فاطمی [illegible] کے بعد دورِ ایوبی میں (۵۶۷ تا ۶۴۸ھ) سلطان الدین [illegible] کا مقبرہ یادگار ہیں۔ امام شافعیؒ کا مقبرہ مصر کے حسین ترین مقبروں [illegible] ہے۔ دورِ ایوبی کا آغاز صلاح الدین کی عسکری تعمیرات سے ہوا [illegible] اندلسی فنِ تعمیر کا اثر غالب نظر آتا تھا۔ جو امام شافعیؒ کے مقبرے [illegible] ضریح حضرت امام حسینؓ کی گچ کی استرکاری میں نمایاں ہے۔ سلطان نور الدین [illegible] نے اسلامی مدارس کو شام میں رواج دیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے انہیں [illegible] میں رائج کیا۔ ان میں اولین عمارت مدرسہ سلطان صالح کی تھی، جو ۶۴۰ تا ۶۴۱ھ میں تعمیر ہوئی۔ بحری مملوکوں کے دور میں (۶۴۸ تا ۷۹۲ھ) فنِ تعمیر میں کافی ارتقا ہوا۔ اس دور کی پہلی عمارت جامع مسجد تھی جو سلطان بیبرس نے قاہرہ کے شمال میں تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد جمادی الآخر ۶۶۵ھ تا شوال ۶۶۷ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ چوکور شکل کی عمارت تھی اور باہر سے مسجد الحاکم سے مشابہ تھی۔

بحری مملوک کے سلطان قلاوون نے مغربی بین القصرین میں فاطمی محل کے مقام پر ایک لمبی چوڑی عمارت تعمیر کی۔ جو شفاخانہ، شاہی مقبرہ اور مدرسہ پر مشتمل تھی۔ یہ وسیع عمارت تیرہ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل ہوئی۔ بحری مملوکوں کے دور کے نصف اوّل کی خصوصیت یہ ہے کہ علوم و فنون کے دو مختلف دھارے آپس میں ملتے محسوس ہوتے

ہیں یعنی اندلس میں مسلمانوں کے اخراج کے بعد دوسرے مسلم ممالک میں آنے سے وہاں کے تہذیب و تمدن پر اندلسی اثرات کو غالب کرنا اور دوسرے مغول کے حملوں کے بعد اُن کے تہذیبی و تمدنی اثرات۔ قلاوون کا بیٹا ناصر محمد تعمیرات کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں وہ مدرسہ و مقبرہ تعمیر ہوا جس کی تعمیر ۷۰۳ھ میں اختتام کو پہنچی۔ اسی سلطان کے عہد میں چینی پچی کاری کا مصر میں رواج ہوا۔ یہ پچی کاری مسجد اسلام بہائی اور شہزادی طغائی کے مقبرہ کے گنبد کے ڈھولنے پر نظر آتی ہے۔ بحری مملوکوں کے دور کا لفف آخر سلطان حسن کے مدرسہ و مقبرہ کی وجہ سے ممتاز ہے، جو مصر میں اسلامی فنِ تعمیر کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس میں مختلف اثرات کا امتزاج نظر آتا ہے۔ جن میں شامی اور اناطولی اثرات واضح اور نمایاں ہیں۔

چرکسی مملوکوں کے دور (۷۷۲ تا ۹۲۲ھ) میں فن تعمیر میں پہلے زمانوں کی تقلید ہوئی۔ لیکن نشو و ارتقا میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ۸۰۳ سے ۸۱۳ھ تک مکمل ہونے والی وہ طویل اور وسیع عمارت قابلِ ذکر ہے۔ جس میں سلطان برقوق اور اس کے بیٹے فرج کے مقبرے، مسجد، صوفیوں کے لئے خانقاہ، ایک سبیل اور مشی خانہ شامل ہیں۔ گو برلالہ کی چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی اس دور کے وسطی زمانہ کی ایک عمدہ مثال ہے، جو ۸۴۳ھ میں تعمیر ہوئی۔

۹۲۲ھ میں ترکوں کی فتح سے عثمانی ترکوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں فنِ تعمیر کو زوال ہی رہا کیونکہ پہلے بادشاہوں کی طرح ان سلاطین نے یادگار عمارتوں کی تعمیر کے لئے روپیہ کی فراہمی میں کمی کر دی۔ ان کے اثرات قلعۂ شہر کے اندر مسجد سیلای ساریا (۹۳۵ھ)، بولاق میں جامع سینان پاشا (۹۷۹ھ) اور مسجدِ ملکہ صفیہ (۱۰۱۹ھ) میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے آخر میں تعمیر کی جانے والی محمد بے ابو ذھب کی مسجد کو کامیاب نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ جو ازہر کے بالمقابل ۱۱۸۸ھ میں تعمیر ہوئی۔

انیسویں صدی کے آغاز تک مصری اثر نمایاں رہا لیکن اس کے بعد استنبولی اثرات غالب ہو گئے۔ بعد میں یورپی اثرات نے اس علاقے کو بھی متاثر کیا اور موجودہ تعمیرات میں یورپی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

اسلامی فنِ تعمیر، شمالی افریقہ میں: طرابلس سے بحرِ ظلمات تک اور بحرِ روم سے صحرائے اعظم تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کو شمالی افریقہ کہا جاتا ہے۔ تونس، الجزائر اور مراکش، شمالی افریقہ کے ممالک ہیں۔ ان ممالک کو اسلامی فنِ تعمیر میں مستقل دبستانِ فن کی حیثیت حاصل نہیں۔ ہمسایہ ممالک کے ساتھ اس کی فنی ترقی ایک طرح مشترک رہی ہے۔ شمالی افریقہ میں عرب فاتحین کی یادگار عمارات قیروان، موجودہ تونس کے علاقوں میں ملتی ہیں۔ قدیم ترین

قبۃ الصخرۃ، محرابوں والے مثمن دالان کے اندرونی طرف

سے محمد بن قاسم کے ذریعے آشنا ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل تک یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی، مقامی آبادی میں سے اکثر مسلمان ہوئی تھی جنکو وراثت میں قدیم ہندی ثقافت بھی ملی تھی۔ اس وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے فنون نے ایک حد تک جنوب مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی اسلامی تہذیب سے علیحدہ نشوونما پائی۔ آہستہ آہستہ مقامی ہندی فن سے اُن باتوں کو بھی اپنا لیا گیا جو اسلامی ضروریات و تصورات کیلئے موزوں تھیں۔

اسلامی فن تعمیر میں ہندوستان کے باہر جو ترقی ہوئی اس کی قبولیت کا اظہار سیاسی اقتدار پر تھا۔ گو ہندوستانی مسلمان اسلامی برادری کے رکن تھے لیکن اس کے ساتھ انہیں وسط ایشیا اور ایران کی طرف سے متواتر فوجی حملوں اور عربوں ایرانیوں کی ثقافتی نخوت کا مقابلہ کرنا تھا۔ مغول کے حملوں کے بعد جو ٹوٹا پھوٹا رابطہ تھا وہ بھی منقطع ہوگیا۔ پندرھویں اور سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں فنِ تعمیر کی کئی جدید طرزیں ایران اور ترکستان سے دہلی، جونپور اور سلطنت بہمنی میں، ایوبی اور مملوک دور کے مصر سے سلطنت مالوہ، سلطنت بہمنی اور بیجاپور میں، عرب سے گجرات اور بیجاپور میں اور عثمانی ترک سے بیجاپور پہنچیں لیکن جلد ہی ان کا اثر ختم ہوگیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ تعمیر نے سولہویں صدی تک اصولاً سامانی، سلجوق
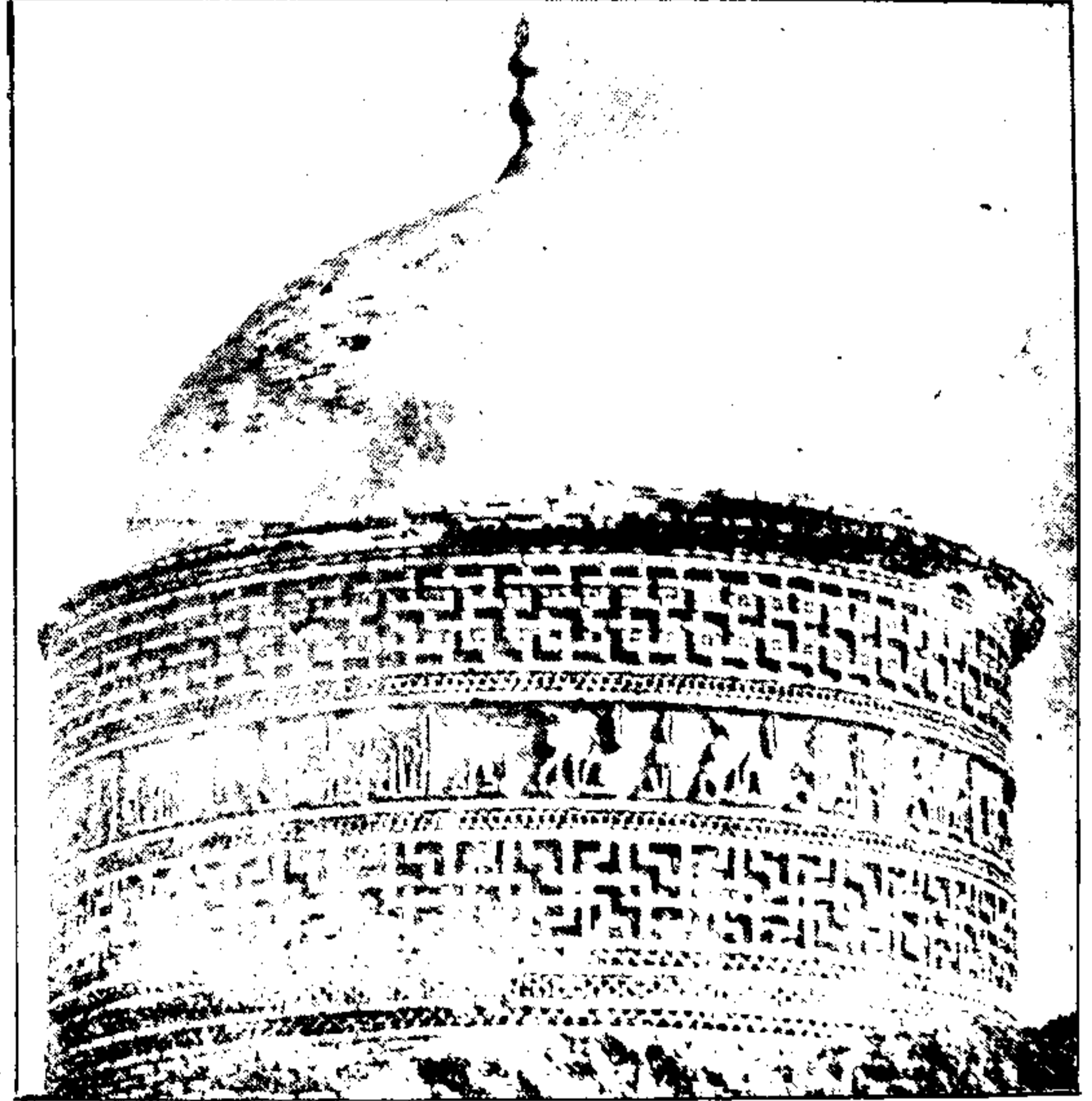
دامغان: مینار کا گنبد، مقبرہ پیر علمدار (۴۱۸ھ ۱۰۲۷ء)

روایت کو جاری رکھا۔ مغل بادشاہوں نے ایران کا خالص صفوی طرزِ تعمیر رائج کیا۔ لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوؤں کے سیاسی اثرات کے مضبوط ہونے سے فنِ تعمیر میں ہندی اثر غالب ہوگیا۔ سلطنتِ دہلی کے باقاعدہ قیام سے قبل مختلف علاقوں میں جو تعمیرات اس دور کے مسلمان حکمرانوں نے کروائیں ان میں غیر مقامی اور خصوصی طور پر ایرانی رنگ غالب تھا۔

دہلی کی پہلی یادگار عمارت لال کوٹ کی مسجد قوت الاسلام ۱۱۹۳ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس میں ہندوانہ طرز کی گلکاری نظر آتی ہے۔ اس کے پاس ہی ایک بہت بڑے مینار اور برج کی تعمیر ۱۱۹۹ء میں شروع ہوئی۔ یہ شہرۂ آفاق قطب مینار تھا۔ سلجوقی مقابر کے میناروں کی طرح چار منزلوں پر مشتمل تھا۔ اس میں اسلامی طرز کی گلکاری اور ہندی طرز کی زیبائش ہے۔

سلطان التمش نے ۱۲۳۰ء میں مسجد قوت الاسلام کو وسیع کیا اور قطب مینار کی بالائی تین منزلوں کو بھی مکمل کیا۔ لیکن اُن میں سے آخری منزل کو ۱۳۶۹ء میں فیروز شاہ نے دوبارہ تعمیر کروایا۔ اس کا بالاترین حصہ ۱۵۰۳ء اور ۱۸۲۸ء میں از سرِ نو درست کیا گیا۔ اس وقت مینار کی اونچائی ۲۳۸ فٹ ہے۔ زمانہ بعد کے مملوک سلاطین کی تعمیر کردہ عمارات میں سے جو اب تک باقی ہیں، ملتان میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور حضرت شمس تبریزیؒ کے مقبرے ہیں۔

خاندان خلجی (۱۲۹۰ تا ۱۳۲۰ء) اور خاندان تغلق (۱۳۲۰ تا ۱۴۱۴ء) کے زمانے میں ہندی مسلم فن کا رشتہ سلجوقی روایات سے بالآخر منقطع ہوگیا۔ مغول کے حملوں سے دفاع اور وسیع پیمانے پر جنگی نظام کے قیام سے فنِ تعمیر میں عسکری خصوصیات کے علاوہ ہندی اثرات بھی روز افزوں نمایاں ہوتے گئے۔ تغلق خاندان کے دور میں کئی نئے شہر تعمیر کئے گئے اُن میں [illegible] عامۃ الناس کے مفاد کے لئے [illegible] تعمیرات کی گئیں۔ غیاث الدین تغلق نے لال کوٹ سے پانچ میل دور تغلق آباد [illegible] کروایا۔ محمد بن تغلق نے دارالحکومت کو دولت آباد (دکن) میں منتقل کر [illegible] شہر کو آباد کیا۔ اس دور کی تعمیرات میں عسکری رنگ غالب ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے کئی یادگار درگاہیں تعمیر کروائیں۔ [illegible] بختیار کاکیؒ کی درگاہ، حضرت روشن چراغ دہلیؒ کی درگاہ [illegible]

خاندانِ سادات (۱۴۱۴ تا ۱۴۵۱ء) اور خاندانِ لودھی [illegible] زمانوں میں تغلقوں کے فنِ تعمیر کی تقلید ترک کردی گئی [illegible] اور مقبرے تعمیر ہونے لگے جنگی دیواریں [illegible] سادات کی عمارتیں دہلی کے قصبہ مبارک پور اور [illegible] دہلی، خیر پور [illegible] سکندرہ، آگرہ [illegible] خاندان سور کے پٹھان بادشاہوں کے عہد [illegible] کے پہلوؤں پر زور دیا جاتا [illegible] یعنی بابر اور ہمایوں کے زمانوں [illegible] عہد (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) [illegible] طرز رائج کیا، لیکن جلد ہی [illegible] مقامی [illegible] عہد کی عمارات میں [illegible] کے قلعہ میں تعمیر کردہ اس کا محل [illegible] مشہور ہے۔ اس کے ابتدائی [illegible] کا مقبرہ تعمیر ہوا جو ۱۵۶۵ء میں شیر شاہ [illegible] سیکری، اکبر کے بنا کردہ نئے شہر میں [illegible] کمال کو پہنچ گیا۔ فتح پور سیکری ۱۵۶۹ء سے [illegible]

فتح پور سیکری میں اکبر نے ایک پنج محل [illegible] اکبری وضع کی بہترین عمارات میں سے فتح پور میں [illegible] خوبصورت ہیں۔ بیربل کی بیٹی کا محل، جہانگیر کی والدہ مریم زمانی کا محل [illegible] بیوی [illegible] سلطانہ رقیہ بیگم کا محل۔ جامع مسجد دکن اس کی فتوحات کی یادگار میں سے ہے۔ یہ ۱۵۷۱ء میں تعمیر ہوئی تھی اور اسی سال اس نے مجتہد العصر ہونے کا اعلان کیا۔ اس مسجد کے کتبے کی رو سے اکبر کے مرشد شیخ سلیم چشتیؒ نے اس کا

نقشہ خانہ کعبہ کے نمونے کے مطابق بنایا تھا۔ اس کے صحن میں شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ ہے۔ یہ مسجد بہت مزیّن ہے لیکن اس میں ہندوستانی اثر کی کوئی علامت نہیں۔ آلہ آباد جہاں اکثر اکبر بادشاہ کا قیام رہتا تھا، اُس نے چالیس ستونوں والا کوشک تعمیر کروایا۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد اکبر کی تعمیر کردہ کئی عمارات کو منہدم کرادیا۔ جہانگیر کے عہد میں فنِ تعمیر پر اکبر کے عہد کی طرح توجہ نہ دی گئی۔ جہانگیر نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنالیا تھا۔ اُس نے قلعہ لاہور میں چند اضافے کروائے۔ انار کلی کا مقبرہ بھی لاہور میں بنوایا۔ کشمیر میں سری نگر کے قریب اس نے اس نے شالامار باغ مع کوشکوں کے بنوایا۔ جہانگیر کے عہد کی سب سے شاندار عمارات ڈھاکہ میں تعمیر ہوئیں۔ ۱۶۰۰ء میں اُس نے لاہور میں موتی مسجد تعمیر کروائی جو ہندوستان میں اپنی نوع کی پہلی مسجد ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانوں میں فنِ تعمیر میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ جہانگیر کے عہد میں اکبر کے عہد کی بہ نسبت پچی کاری کی آرائش پر انحصار کیا گیا۔ جس کی مثالیں اکبر کا مقبرہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ (نورجہاں کا والد) کا مقبرہ ہیں۔ جہانگیر کے وزیر وزیر خان نے لاہور میں جو مسجد تعمیر کروائی وہ محض آرائش ہی کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔ شاہجہان کے عہد (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء) میں مغل فنِ تعمیر اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گیا۔ اس دور کی ابتدائی عمارتوں میں سے ایک بے نظیر عمارت تاج محل ہے جو شاہجہان کی بیگم ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل کی وفات کے ایک سال بعد بننا شروع ہوئی تھی۔

اورنگ زیب کے زمانے میں فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون میں بھی زوال آنا شروع ہو گیا۔ اورنگ زیب کے جانشین بادشاہوں نے اندرونی انتشار اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اورنگ زیب کے عہد (۱۶۵۸ء [illegible]) کی یادگار عمارات میں دہلی میں حیات بخش باغ کی بارہ دریاں اور موتی مسجد، لاہور میں عالمگیر شاہی مسجد اور حضوری باغ، اورنگ آباد میں قلعۂ ارک اور

ملکہ رابعہ درانی کا مقبرہ اور کئی دوسرے شہروں کی مساجد شامل ہیں۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کے عہد کی تعمیر کردہ عمارات میں مہرولی کی سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کردہ موتی مسجد (۱۷۰۹ء)، دہلی کی زینت المساجد (۱۷۱۰ء)، قلعۂ دہلی کا ظفر محل اور ہیرا محل اور مہرولی کا ظفر محل (۱۷۴۷ء) شامل ہیں۔ ظفر محل بہادر شاہ ثانی نے تعمیر کروایا تھا۔

مغلوں کا فنِ عمارت ان کے دوسرے فنون کی طرح بہت سی قوتوں کا مجموعی نتیجہ تھا لیکن ہندو فن پر اس کی فوقیت، اس کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ہے کیونکہ اُس نے غیر ملکی اور ہندی فن کی تکنیک کو بڑے متوازن طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ہندوستان کے ابتدائی مسلمانوں کے فن کی طرح مغل طرزِ تعمیر بھی یکے بعد دیگرے کئی منزلوں سے گزرا۔ ان میں سے پہلی تعمیراتی منزل تھی۔ جسے تیموری، صفوی، ایرانی منزل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا غلبہ ۱۵۲۶ء تا ۱۵۸۰ء تک کے زمانہ میں رہا۔ تاہم یہ سترھویں صدی کے آخر تک دہلی اور آگرہ کے علاقے میں، اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک پنجاب میں اور انیسویں صدی کے آغاز تک سندھ میں رائج رہی۔ سلطنت میں وسعت ہونے کے بعد صفوی طرز میں لودھی، سوری اور مالوہ و گجرات کی اسلامی اور ہندو راجپوتی طرز کے اثرات بڑھتے گئے۔ اسی دور کی اہم یادگار عمارتوں کی فہرست تو کافی طویل ہے۔ جن میں مساجد اور مقابر کی کثرت ہے اور یہ زیادہ تر آگرہ، لاہور اور دہلی کے علاقوں میں ہیں۔ آگرہ کا تاج محل، شاہدرہ لاہور میں آصف خاں کا مقبرہ اور لاہور کا شالامار باغ ان یادگاروں میں سے ہیں۔

دوسری امتزاجی منزل ہے۔ اپنے اسلاف کے برخلاف اکبر بادشاہ نے اپنے عہد میں (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) اپنی تمام رعایا کو ایک مشترک سلطنت، ایک تہذیب بلکہ ایک مذہب تک میں متحد کرنے کی کوشش کی۔ اسی کا ایک جزو یہ مخلوط فن تھا، جس میں تعمیر کے وہ تمام طرز جمع کردیے گئے جو اُس وقت ہندوستان میں رائج تھے۔

جامع مسجد، اسلام آباد

نافع نے ۶۷۰ء میں قیروان کی بنیاد رکھی تھی۔ عقبہ بن نافع نے یہاں ایک مسجد بھی بنوائی تھی جس کا اب کوئی نام و نشان نہیں اسی جگہ پر تیسری صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کی تعمیر کردہ ایک وسیع و عریض مسجد ہے مسجد کی روکار میں تیرہ محرابی دروازے ہیں۔ تونس کی جامع زیتونہ کی تعمیر ۲۵۰ھ/۸۶۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ قیروان کی مسجد سے مشابہت رکھتی ہے۔ سوس کی جامع مسجد ایک اور طرز کی ہے جو ۲۳۶ھ/۸۵۰ء میں مکمل ہوئی۔

شمالی افریقہ کے علاقوں پر تیسری صدی ہجری کے وسط کے قریب فاطمیوں نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا۔ ان کے دور میں، تونس کے ساحل پر ایک چھوٹے سے جزیرہ نما میں قلعہ بند شہر مہدیہ میں ۳۰۲ھ میں ایک مسجد تعمیر ہوئی جو اب تک باقی ہے۔ ایک دوسرے شہر صبرہ منصوریہ میں فاطمی بادشاہوں کا تعمیر کردہ ایک محل پایا جاتا ہے۔ فاطمی دور کے بعد صنہاجی بربروں کے ایک خاندان مرابطون نے سیاسی قوت حاصل کی۔ مرابطون نے شہر مراکش آباد کیا۔ الجزائر اور تلمسان میں مساجد تعمیر کروائیں جو اب تک موجود ہیں۔ بعد کے زمانوں میں صاحب اقتدار حکمرانوں نے جو تعمیرات کروائیں اُن میں اندلسی مراکش فنِ تعمیر نمایاں ہے۔ ترک خلافت کے زمانے میں الجزائر اور تونس پر اُن کے قبضے کے بعد سے استنبولی طرزِ تعمیر غالب آگیا۔
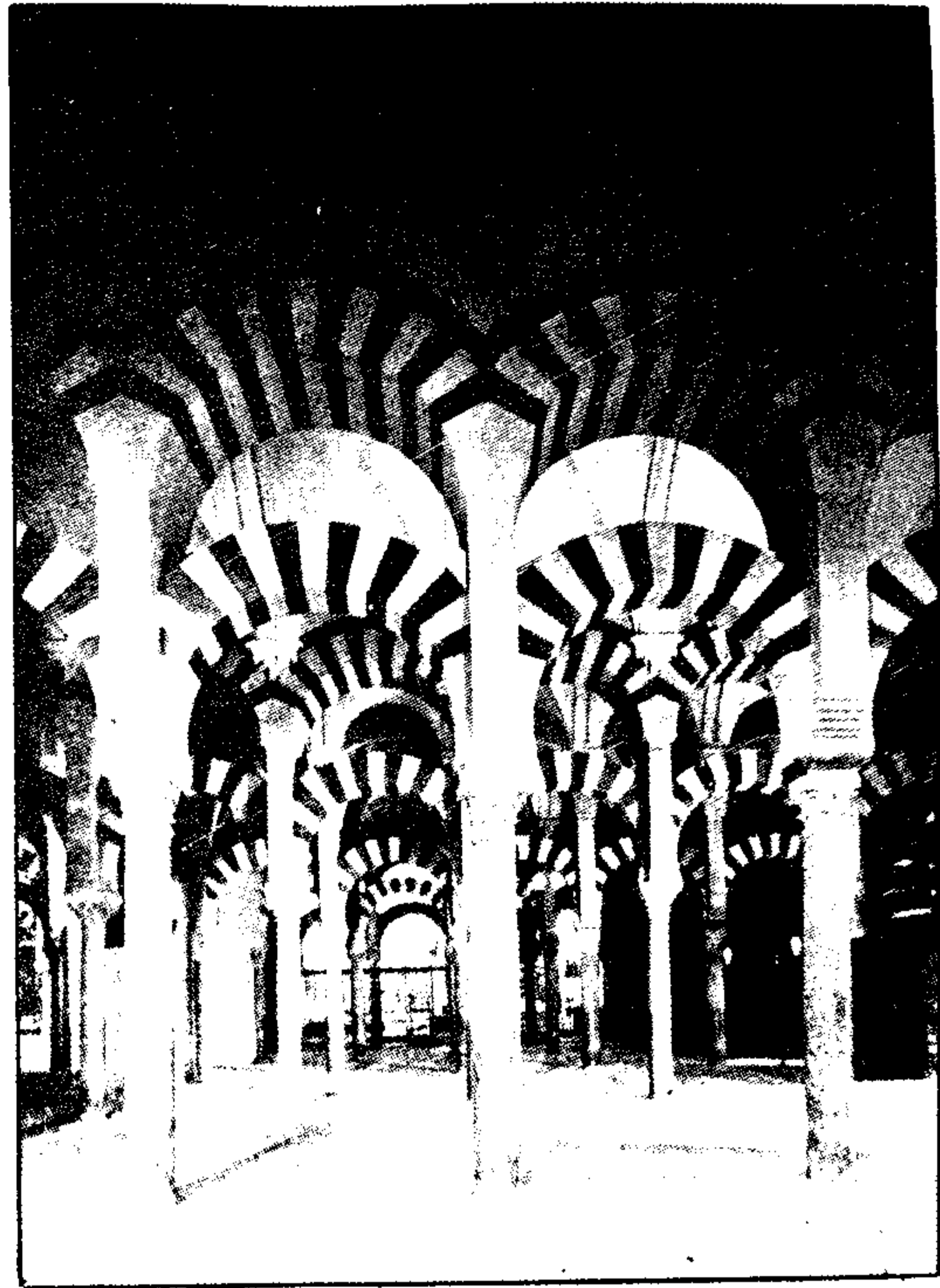
اسلامی فنِ تعمیر، اناطولی (ترکیہ) میں: اس ملک کی ثقافت بہت قدیم تھی۔ جو تین ہزار سال سے چلی آ رہی تھی۔ اس کی حیثیت بوزنطی سلطنت کی ایک مسیحی ریاست کی تھی۔ جب ایران کو مغول نے برباد کیا تو بہت کاریگر اناطولی آگئے جس نے ترکی اسلجوقی، اسلوبِ تعمیر پیدا کیا۔ ابتدائی عہد کی تعمیرات، مدرسوں، مساجد اور کاروان سراؤں میں یہ اسلوب نمایاں ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز سے ترکانِ عثمانیہ کی خلافت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس خاندان کے ۳۷ بادشاہ حکومت کرتے رہے۔ ان کے دور میں ابتدائی تعمیرات ان کے دو پہلے صدر مقامات ازنیق اور برسہ میں ہوئیں۔ ان کی اولین تعمیر کردہ عمارتوں نے قبے دار تعمیرات کے ایک نئے اسلوب کو رواج دیا، جو ارتقا کی منازل سے گزرتا ہوا استنبول اور عثمانی ترکوں کی عظیم الشان مساجد کے اسلوبِ تعمیر تک پہنچ گیا۔ عثمانی سلاطین میں سے اورخان سے محمد ثانی تک چھ سلاطین نے (۱۳۲۶ تا ۱۴۵۳ء تک) ایک ایک مسجد سلسلے کی شکل پر تعمیر کروائی۔ ہر مسجد پر سلطان کا نام ثبت ہے۔ جس کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ یہ مساجد مخصوص قسم کی تھیں جن میں خود سلطان ہی نماز ادا کرتے تھے۔ ان سلطانی مساجد میں سب سے زیادہ عظیم الشان برسہ کی بشیل جامع ہے۔ جسے محمد اول (۱۴۰۳ تا ۱۴۲۱ء) اور مراد ثانی (۱۴۲۱ تا ۱۴۵۱ء) نے تعمیر کیا۔ عثمانی ترکیہ کے ہر بڑے شہر میں عامۃ الناس کے لئے ستون دار تالاروں کی شکل میں جامع مسجد تعمیر کی گئیں۔ استنبول کی پہاڑیوں پر سلطانی مساجد کے گنبدوں کے ساتھ تعمیر کئے گئے مینار شہر کو ایک خصوصی شان بخشتے ہیں۔ فواروں کی تعمیر ہ رواج عثمانی ترکوں کے زمانے میں فروغ پایا۔ گرم اور سرد پانی سے غسل کرنے کے نئے طرز کے حمام بھی اسی زمانے میں معروف ہوئے۔

اسلامی فنِ تعمیر، ایران میں: مسلمانوں نے ایران [illegible] میں بڑا حصہ لیا۔ انہوں نے [illegible] مذہبی قسم کی عمارات تعمیر میں فنِ تعمیر میں نئی جدتیں پیدا کیں۔ ایران کے [illegible] عمارات [illegible] ابتدائی دنوں میں ہی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ [illegible] میں یزید بن عبداللہ نے دریائے اترس پر پل خدا آفرین [illegible] نظر سے کئی اہم مقامات پر قلعے تعمیر کئے گئے مثال کے طور پر [illegible] قلعہ زیاد۔ ۹۳ھ میں قتیبہ بن مسلم نے سمرقند میں ایک [illegible] جس میں بیک وقت چار ہزار آدمی نماز ادا کر سکتے تھے۔ [illegible] حجاج کے ایک عامل نے ایک مسجد اور ایک بہت بلند مینار [illegible] خوبصورت مینار میں چونے گچ کے استعمال سے بنے تھے [illegible] گئے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے [illegible] میں متعدد مساجد، کاروان سرائیں اور [illegible] تعمیر ہوئے [illegible] کے بیان کے مطابق تیسری صدی ہجری تک بلخ میں [illegible] چکی تھیں۔ ابتدائی دور کی تمام عمارت ساسانی طرز پر بنائی [illegible] بنیادی اوضاع آنے والے زمانوں میں ایران کے فنِ تعمیر پر غالب [illegible] وضع گنبد دار [illegible] دوسری وضع بلند ایوان [illegible] مسقف محرابی دالان چوتھی وضع ستون دار عمارات تھیں۔

نیشاپور کی جامع مسجد چوبی ستونوں پر قائم تھی۔ بعد میں [illegible] نے ان کی جگہ اینٹ اور گچ کے ستون بنائے۔ قزوین میں [illegible] میں مسجد ثور کے نام سے بنوائی۔ اس میں بنی امیہ دور کے [illegible] ستونوں کا احیاء کیا گیا۔

کوفے کی مسجد اور کاشان (موازنہ) کی مسجد بھی ستونوں والی عمارات میں بہترین یادگاریں ہیں۔ مرو میں ابومسلم کا دارالامارۃ (۱۳۲ھ/۷۵۰ء تا ۱۳۸ھ/

۵۵۷ء) کو بھی فنِ تعمیر میں یادگار کہا جاسکتا ہے۔ ایران میں چوکور عمارات کا نقشہ بھی بہت مقبول ہوا۔ سامانیوں کے دورِ حکومت (۲۸۰ تا ۳۸۹ھ) میں فنِ تعمیر میں کافی ارتقا ہوا۔ بخارا اور سمرقند جیسے ثقافتی مرکزوں میں اس دور کی کئی یادگار عمارات موجود ہیں۔
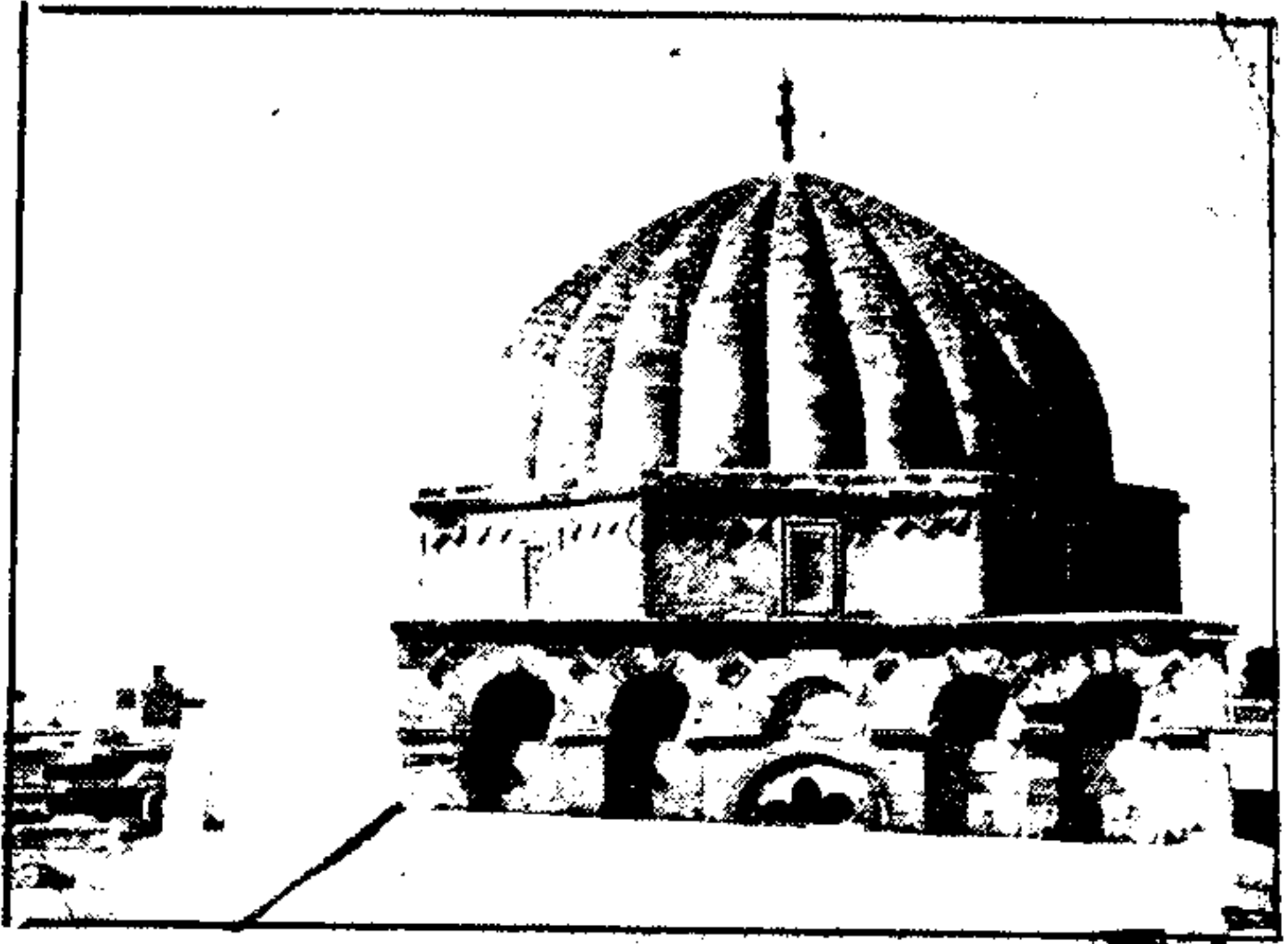
تیروان، جامع کبیر، محراب قبلہ کے سامنے کا گنبد

گنبد قابوس ان یادگار میناروں میں سب سے پرانا اور زیادہ معنویت کا حامل ہے جن کا سلسلہ سات سو برس تک چلا جاتا ہے اور جو تعداد میں پچاس ہیں۔ یہ بلوری قلم جیسی کنگروں والے مینار، ایران کے قریب قریب ہر حصے میں ایک دوسرے سے دور استادہ نظر آتے ہیں اور ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان کی تعمیر کے سلسلے کا آغاز لاجم (مازندران) کے مقام پر ۴۱۳ھ میں ہوا اور آٹھویں صدی ہجری تک چلا گیا۔ ان میں سے بعض مینار ۳۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں اور بعض گنبد قابوس اور اصفہان کے پرشکوہ مینار ساربان کی طرح تقریباً ۱۵۰ فٹ تک بلند ہیں۔ ان میناروں میں انکے زمانے اور مقامی طرز کی جھلک نہایت واضح ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں محمود غزنوی نے اپنی وسیع سلطنت میں ایران، ہندوستان اور مشرق بعید کے تہذیبی اور تمدنی عناصر کے امتزاج سے ایک نئی ثقافت کو متعارف کروایا۔ محمود غزنوی کے بیٹے مسعود نے گوشۂ سعودی کے نام سے ایک طویل عماراتی منصوبے کا آغاز کیا۔ جو بیس سال سے زائد عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ محلات کی بڑی بڑی عمارات کی تعمیر میں چار چار سال لگ گئے۔

ہخامنشی بادشاہوں کے پایۂ تخت اصفہان میں چوتھی صدی ہجری میں تعمیر کی گئی مسجد اصفہان اپنی طرز کی ایک یادگار تعمیر ہے۔ اس کا شمار بلادِ اسلامی کی اہم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ یہ تقریباً بیس جدا جدا عمارات پر مشتمل ہے جو چوتھی صدی ہجری سے اب تک تعمیر ہوتی رہی ہیں۔ قبلے کی سمت اُسکا ایک اونچا مینار ۷۰ ذرع بلند تعمیر کیا گیا تھا۔ اصفہانی طرز کی جو دوسری اہم جامع مسجدیں تعمیر کی گئیں ان میں قزوین کی مسجد (۵۰۷ھ/۱۱۱۳ء تا ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء) بالخصوص بہت وسیع ہے۔

مغول کے حملوں سے کئی شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور تہذیب و تمدن کی کئی یادگار عمارات کا نام و نشان مٹ گیا۔ لیکن مغول کے اسلام قبول کرنے کے بعد فنِ تعمیر اور دوسرے علوم و فنون کے احیاء اور ارتقاء میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے دورِ حکومت کی عمارات میں مساجد، مدارس، مقبرے یادگار تعمیرات میں شمار کئے جاتے ہیں۔

غازان خان نامی ایک بادشاہ نے تبریز شہر کے گرد ۲۵۰۰۰ فٹ موٹی اور ۵۴۰۰۰ قدم طویل ایک فصیل تعمیر کروائی تھی۔ مغول حکمرانوں نے کئی نئے شہر تعمیر کروائے جن کی ایک ایک عمارت فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ ایران میں کثرتِ تعمیر کے اعتبار سے چودھویں صدی عیسوی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مختلف شہروں میں مختلف قسم کی عمارات کے مجموعے تعمیر کئے گئے۔ ان شہروں میں بطام اور وسطی ایران کا ایک قصبہ نظنز شامل ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کا فنِ تعمیر سلجوقی اوضاع اور طریقِ تعمیر پر مبنی تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں بھی وہی اوضاع جاری رہیں۔ تیمور کے دورِ اقتدار میں سمرقند کو دوبارہ شان و شوکت کا مرکز بننے کا موقع ملا۔ تیمور کی بنا کردہ عمارتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں شاندار محلات، مساجد، مدارس اور مقابر شامل ہیں، جو دریائے جیحوں کے خطے کے دوسرے شہروں اور سمرقند میں تعمیر کئے گئے۔ تیمور کے بیٹے شاہ رُخ (۱۳۷۷ تا ۱۴۴۶ء) نے شہر کے شہر دوبارہ آباد کئے اور کئی عالیشان عمارات تعمیر کروائیں۔ اُن یادگار اور ممتاز عمارتوں میں مسجد ملکہ گوہر شاد (۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں تعمیر ہوئی)، مدرسہ دمصلیٰ، ہرات (۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء تا ۸۴۱ھ/۱۴۳۷ء) اور مدرسہ خرگرد شامل ہیں۔ تیمور کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں پرشکوہ عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا۔

مخصوص طرزِ آرائش والی عمارتوں کی تعمیر کے فن نے توران کے علاقوں میں کافی نشوونما پائی۔ اس طرزِ تعمیر میں عمارتوں کی تزئین پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اس روایت کی بنیاد مقبرۂ اسماعیل سے رکھی گئی اور مقبرۂ جلال الدین میں پوری ہوگئی۔

صفوی دورِ حکومت کو فنِ تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے ترقی پذیر زمانہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس زمانے میں بھی یادگار عمارات بنائی گئیں۔

ایران میں مسلمانوں کے ۱۲ سو سالہ عہد میں فنِ تعمیر میں ساخت اور جمالیات دونوں کے اعتبار سے تنوع کا اظہار ملتا ہے۔ اُس نے قدیم روایات اور تجربات سے فائدہ

اصفہانی مسجد نادر شاہ

اٹھاتے ہوئے مسلسل اور بتدریج ترقی کی اور بنیادی طور پر اسلامی اوضاع اور احساسات کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھا۔ عمارات کی تعمیر اور آرائش میں اعلیٰ درجے کا سلیقہ، صناعانہ کمال، لطافت اور نفاست کے اعلیٰ خواص پائے جاتے ہیں۔ ایسی یادگار عمارات کی تعمیر کی گئیں جن کا استفادہ تادیر قائم رہا ہے۔

اسلامی فنِ تعمیر پاک و ہند میں:۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کا باقاعدہ قیام ۷۱۱ھ/۱۳۲۶ء میں کیا۔ اُس سے پہلے متفرق علاقوں پر مسلمان حکمران حکومت کرتے تھے۔ ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے قدم اس خطۂ زمین

خالص مغل طرزِ تعمیر جسے سلطانی منزل کہا جاسکتا ہے۔ جہانگیر کے عہد کے آخری حصے بلکہ زیادہ تر شاہجہان کے عہد (۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸ء) میں اس طرز نے نشوونما پائی۔ مقبروں اور ایک حد تک مسجدوں کو دوبارہ صفوی طرز رائج ہوا۔ شاہ جہاں نے اس طرز کو آگرہ کے قلعہ نما محل میں استعمال کیا۔ اس قلعہ نما محل میں اس نے مینا بازار، موتی مسجد، دیوانِ عام، دیوانِ خاص، نگینہ مسجد، انگوری باغ، خاص محل اور شمن برج تعمیر کروائے۔

پنجاب میں مغل ایرانی طرزِ تعمیر زکریا خان کے زمانے (۱۷۱۷ تا ۱۷۳۸ء) میں عروج پر تھا۔ مغلانی بیگم کے مقرب بھکاری خان کی سنہری مسجد (۱۷۵۳ء) کے ساتھ مغل طرزِ تعمیر یہاں ختم ہو گیا۔ اودھ میں شجاع الدولہ (۱۷۵۴ تا ۱۷۷۵ء) نے فیض آباد کی بنا ڈالی۔ آصف الدولہ (۱۷۷۵ تا ۱۷۹۲ء) نے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا۔ ان شہروں کی تعمیر میں یورپی طرز غالب ہے سوائے مذہبی عمارات کے۔ بنگال میں مرشد علی (۱۷۰۳ تا ۱۷۲۵ء) نے دارالحکومت ڈھاکہ سے مرشد آباد منتقل کیا۔ شروع کے زمانے کی عمارات میں مغل طرزِ تعمیر نمایاں ہیں۔ لیکن بعد کے اُمرا اور حکام نے یورپی طرز کو رواج دیا۔ بھوپال میں اسلام نگر (جو سب سے پہلا دارالحکومت تھا ۱۷۰۹ تا ۱۷۲۲ء) کی تعمیرات یعنی قلعہ فتح گڑھ، جامع مسجد اور عیش باغ (تعمیر قدسیہ بیگم)، بڑا محل اور عظیم الشان تاج المساجد میں مغل طرزِ تعمیر کو اپنایا گیا۔ حیدر آباد کے نظاموں کی عمارات میں ایرانی اور یورپی اثرات نمایاں ہیں۔ کرناٹک کے نوابوں کے دارالحکومت ارکاٹ میں تعمیر کردہ محلوں، مساجد اور مقابر میں مغل طرزِ تعمیر غالب ہے۔

میسور کے سلاطین حیدر علی اور ٹیپو کا سرنگا پٹم کا بڑا محل، دریا دولت باغ کا محل مع باغ، بنگلور میں ٹیپو کے قلعہ نما محل اور حیدر علی کے لال باغ اور مقابر میں بھی مغل طرز عیاں ہے۔

اس کے علاوہ ہندو والیانِ ریاست نے بھی مغل طرزِ تعمیر کو اپنایا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں اورنگ زیب عہد کے مغل طرز کا رواج ہوا۔ اس زمانے میں تمام اوضاع باہم خلط ملط اور مجتمع تھیں۔

آخر کار رجحانات کے الگ الگ طریقے اختیار کرنے کا مرحلہ آگیا۔ ایک طرف نیم یورپی طرز کی طرف میلان تھا تو دوسری طرف مغل روایت پرستی کا رجحان تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ اور حکومت سے یورپی طرزِ تعمیر کے غالب آنے کے مواقع پیدا ہوئے بعد کی تعمیرات میں یورپی رنگ نمایاں ہیں۔ پاکستان میں عام تعمیرات میں تو یورپی رنگ واضح ہے لیکن خاص تعمیرات اور یادگاروں میں اسلامی ممالک کے طرز کو اپنانے کا رُجحان ہے۔

فنِ خطاطی

خطاطی، خط سے مشتق ہے۔ خطاطی، خط کی مصوری کو کہا جاسکتا ہے۔ کتابت ایک عام کاروباری عمل ہے اور خطاطی اس کی جمالیاتی قسم ہے، جس میں مسلمانوں نے کمال حاصل کیا اور اسے ایک برتر فن کے درجے تک لے گئے۔ خطاطی کا سب سے بہترین استعمال قرآن مجید کی کتابت میں ہوا، جس میں مسلمان خوشنویسوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتیں صرف کیں۔ بعض دوسری اقوام کی طرح مسلمانوں میں بھی جمالیاتی فن بالعموم دینی جذبوں اور عقیدت کے زیرِ اثر رہا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید کی خوشنویسی و خوشنمائی اور آرائش و زیبائش کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ یہ فن عام کتابوں، شعر و ادب کی کتابوں، افسانہ و حکایات کی کتابوں میں بھی استعمال ہوا۔ ایسی کتابوں میں بعض اوقات حسنِ خط اور تصاویر دونوں کتاب کی آرائش و زیبائش میں قابلِ قدر اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ خطاطی کا استعمال مسجدوں اور قلعوں کی پیشانی پر اور اندر کی دیواروں پر، روضوں اور مقابر کی دیواروں پر، قالینوں اور فرامین میں بھی ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں بچوں کی ابتدائی تدریس و تعلیم میں خوش خطی کو ایک اہم مضمون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل تک مسلم ممالک میں خوشنویسی پر زور دیا جاتا رہا ہے، مگر اب پرنٹنگ پریس کے فروغ کے بعد اور بعض دوسرے عملی وجوہ کی بنا پر خوشخطی کی اہمیت میں زوال آگیا ہے۔

خطاطی آغازِ اسلام ہی سے اسلامی روح کی آئینہ دار رہی ہے۔ اس کی اصل وجہ قلم اور تحریر کی وہ اہمیت ہے جس کا ذکر قرآن مجید کے مختلف مقامات پر آیا ہے چنانچہ مسلمانوں نے اسلام کی ابتدائی زمانہ ہی سے قرآن مجید کی کتابت ایسے انداز میں شروع کر دی جو اس کے جاودانی حسن کے لئے شایانِ شان تھی۔ اگرچہ اسلوبِ تحریر میں مرورِ ایام کے ساتھ کچھ مقامی خصوصیتیں شامل ہوتی گئیں، لیکن عربی خط میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ عربی خط کے ارتقا کا مطالعہ قدیم کتبوں، مزارات کی الواح اور قدیم سکوں کے تحریری نقوش سے کیا جاسکتا ہے۔ کچھ مختصر سی یادداشتیں اوراق بردی پر بھی محفوظ ہیں۔ سب سے بڑھ کر قرآن مجید کے مختلف مخطوطات ہیں جو خطاطی کے مختلف اسالیب کو ظاہر کرتے ہیں۔

اسلامی دور میں عربی خط کی جس شکل نے سب سے پہلے ترقی کی اسے عرفِ اسلام میں کوفی کہتے ہیں۔ زمانے کے اعتبار سے کوفی قدیم اور کوفی جدید دو قسمیں ہیں۔ عہدِ بنو اُمیہ میں عبدالحمید الکاتب نے دفتری ضروریات کے لئے اس میں مناسب ترامیم کیں۔ جدید کوفی کی ایجاد دورِ ہارون رشید کے نامور فاضل خلیل بن احمد عروضی سے منسوب کی جاتی ہے۔ بنو عباس کے زمانے میں اسحٰق بن حماد (م ۱۵۴ھ) نے زیادہ سے زیادہ عملی، کاروباری اور استعمال کے لئے سہل بنانے کے واسطے اس کی کچھ قسمیں پیدا کیں۔ مثلاً مساجد و عمارات کی پیشانی کے لئے خطِ طومار، دفتری دستاویزات کے لئے سجلات اور فرامین و احکام کے لئے عہدہ۔ بعد میں مختلف مقاصد کے لئے کوفی سے ۲۷ قسمیں (شاخیں) ایجاد ہوئیں۔

ابنِ مقلہ نے اس سے بھی سہل تر خط ایجاد کیا اور اس کا نام محقق رکھا۔ اس سے ریحان اور ثلث نکلے۔ نسخ کی ابتدا بھی ابنِ مقلہ نے کی جسے ابن البواب نے تکمیل تک پہنچا کر ایک ریاضیاتی فن بنا دیا۔ اس کے اندازِ خط کو خط نسب کہتے ہیں۔ کوفی کا ناسخ ثابت ہونے کی وجہ سے اسے نسخ کہتے ہیں۔ کوفی اور نسخ کے بعد خط کی بنیادی اور نمایاں اقسام یہ ہیں۔ تعلیق، نستعلیق، دیوانی، شکستہ، شکستہ آمیز اور شفیعہ۔ ہر قسم کے اندر درجنوں چھوٹی قسمیں بھی ہیں، جنہیں قلم کہا جاتا تھا۔ ابن الندیم کی کتاب الفہرست اور ابن البواب کے ایک معاصر کے "رسالۃ الکتابۃ المنسوبہ" میں ان قسموں کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری کتابوں میں بھی ان قسموں کا ذکر ملتا ہے۔

مشہور خطاط اور مصنف محمد بن حسن بن محمد بن احمد بن عمر الطیبی شافعی کے ایک رسالے "جامع محاسن کتابۃ الکتاب ونزہۃ اولی البصر ذوی الالباب" (۹۰۸ھ ۱۵۰۲ء میں لکھا گیا) میں ۱۶ مختلف قسموں کا ذکر ہے۔ ابوالفضل نے بعد الخط کی مختلف قسموں کے بیان کے بعد لکھا ہے کہ رائج الوقت خطوں میں سے مندرجہ ذیل آٹھ ابن مقلہ نے معقل اور کوفی سے اختراع کئے ہیں: (۱) ثلث (۲) توقیع (۳) محقق (۴) نسخ (۵) ریحان (۶) رقاع (۷) تعلیق (۸) نستعلیق۔

رسالۂ خط و سواد، مصنفہ مجنون بن محمود الرفیقی کے مطابق معقل، کوفی، ثلث، محقق، توقیع، نسخ، ریحان، رقاع، تعلیق اور نستعلیق مروج و معروف خط ہیں۔

شیخ محمد اکرام اپنی کتاب میں ہندوستان کی ایجاد چند قسموں کا ذکر کرتے ہیں۔ (۱) خطِ گلزار (۲) خطِ غبار (۳) خطِ ریحان (۴) خطِ بہار (۵) خطِ ناخن۔

غلام محمد راقم دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے "تذکرۂ خوش نویسان" میں مختلف قسموں کا ذکر کیا ہے۔

خطِ معقلی۔ اس کی شکلی خصوصیات کے بیان میں مجنون بن محمد الرفیق نے لکھا ہے کہ یہ تمام تر سطح تھا یعنی دور سے بالکل خالی۔ صاحبِ "مراۃ العالم" نے لکھا ہے کہ ایامِ سلف میں عربوں میں خطِ معقلی رائج تھا۔ اس کے بعد خطِ معقلی سے خطِ کوفی کا استخراج ہوا اور یہ خط عرب اور غیر عرب ممالک میں متعارف ہوا۔

خطِ کوفی۔ اس کی شکلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک دانگ دور ہے اور باقی سطح۔ خطِ کوفی تقریباً پانچ سو سال تک کتب نویسی اور قرآن نویسی میں مستعمل رہا۔ خطِ کوفی میں مختلف علاقوں کی نسبت سے کئی شکلیں پیدا ہوئیں۔

اوپر مذکور ابنِ مقلہ کے وہ آٹھ خط جو اُس نے ابوالفضل کے مطابق معقلی اور کوفی سے ایجاد کئے تھے۔ ایران، روم، توران اور ہندوستان میں مروج رہے۔ ان میں سے ایک کو خطِ ثلث اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا ⅓ (ثلث) دور تھا۔ ابنِ مقلہ نے اس کی بنیاد نقطے پر رکھی تھی۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں کوفی خط رائج تھا اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ۵۶ھ/ ۶۷۵ء میں نبی کریمؐ نے جو تبلیغی مراسلے مختلف حکمرانوں کو ارسال فرمائے وہ خطِ کوفی میں تھے۔ خطِ کوفی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عراق کے دو مشہور شہر حیرا اور انبار تھے۔ جن کے قریب کوفہ شہر آباد ہوا جہاں سریانی خط سے ایک مخصوص خط ابھرا جو اس شہر کی نسبت سے خطِ کوفی کہلایا۔ حرب بن امیہ اسے کوفہ سے مکہ مکرمہ لے گیا جہاں یہ خطِ کوفی کے نام سے رائج ہوا۔ خطِ کوفی نے ابتدائی زمانہ میں مختلف ارتقائی مراحل طے کئے۔ خطِ کوفی کے حروف جلی اور مدوّر

فن خطاطی کے مختلف نمونے

شکل کے ہیں۔ حروف کے جوڑ زاویہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے چھ میں سے پانچ حصے سطح ہوتی ہے اور ایک حصہ دور۔ اس قدیم خطِ کوفی میں شروع شروع میں نقطوں، اعراب، اعجام، زیادات کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو الاسود الدؤلی (م ۶۹ھ/ ۶۸۸ء) نے اعراب کیلئے نقطے ایجاد کیے۔ بعد میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں حجاج بن یوسف نے رسم الخط میں اصلاح کی کوشش کی اور اعراب، اعجام و زیادات کا اضافہ ہوا۔ مختلف بلادِ اسلامیہ میں خط کوفی میں خطاطوں کے ذاتی جمالیاتی ذوق کی وجہ سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایران، مصر، عراق، اندلس اور شمالی افریقہ کے علاقوں میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں۔ پانچویں صدی ہجری/ گیارھویں صدی عیسوی سے قرآن مجید کی کتابت کے لئے خطِ کوفی کا استعمال کم ہو گیا اور اس کی جگہ خطِ نسخ نے لے لی۔ خطِ نسخ کا موجد خلیفہ الراضی باللہ کا وزیر اور مشہور خطاط ابن مُقلہ (م ۳۲۸ھ) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام خطِ بدیع تھا، لیکن دوسرے تمام رسوم الخط کے ناسخ ہونے کی وجہ سے خطِ نسخ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس خط میں پہلی مرتبہ خطاطی کے اصول و قواعد کے لئے ناپ مقرر کیے گئے تاکہ موزونیت اور تناسب قائم رہے۔ ابنِ مقلہ کے بعد ابو الحسن علی بن ہلال معروف بہ ابن البواب نے خطِ نسخ میں مزید صفائی اور رعنائی پیدا کر کے اسے عروج تک پہنچایا۔ اس خط نے عباسی خلیفہ المقتدر باللہ (م ۳۲۰ھ/ ۹۰۸ء) کے زمانے میں باقاعدہ شکل اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ قرآن مجید کی کتابت میں مزید دلکشی اور رعنائی پیدا ہو گئی۔ ایلخانی عہد (۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء تا ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۶ء) اور عہدِ مملوکیہ (۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء تا ۹۲۲ھ/ ۱۵۱۷ء) میں نقاشی اور رنگ آمیزی کی وجہ سے خطِ نسخ کو کافی عروج حاصل ہوا۔ نقاشی اور رنگ آمیزی قرآن مجید کے علاوہ دوسری کتابوں کے لئے بھی کی جانے لگی۔

صفوی دورِ حکومت (۹۰۷ھ/ ۱۵۰۲ء تا ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۶ء) میں بھی شاہانِ وقت نے فنِ خطاطی کی بہت سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے صاحبِ کمال منظرِ عام پر آئے۔ ان میں مشہور خطاط سلطان نیشاپوری، میر عماد حسنی سیفی قزوینی اور مرزا اسد اللہ شیرازی جیسے نامور ماہرِ فن کے نام آتے ہیں۔ تیموری سلاطین اور شہزادگان نے کاتبوں اور فن کاروں کی بے مثال حوصلہ افزائی کی۔ سلطان علی مشہدی جیسا ماہرِ فن تیموری خاندان کے سلطان حسین مرزا بایقرا (م ۹۱۲ھ) کے دربار ہرات سے وابستہ تھا۔

خطِ نسخ و نستعلیق پاکستان اور ہند میں:- محمد بن قاسم کی فتح کے بعد برصغیر میں عربی رسم الخط کا اجرا ہو گیا اور رفتہ رفتہ اسی خط میں قرآن مجید کی کتابت ہونے لگی۔ پھر ایران سے روابط کی وجہ سے خطِ نسخ یہاں رواج پا گیا۔ مغل سلطنت کا بانی بابر جب برصغیر آیا تو اپنے ساتھ عالم اور خطاطوں کو بھی لایا تھا۔ وہ خطاطی کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے خود ایک خط ایجاد کیا جو خطِ بابری کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نے اس خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ کتابت کر کے مکہ معظمہ بھیجا تھا۔ ہمایوں جب ترکِ وطن کر کے ایران گیا تو وہاں اس کی ملاقات بعض ماہر خطاطوں اور مصوروں سے ہوئی۔ وہ ہندوستان واپسی پر خواجہ عبدالصمد شیریں قلم اور میر سید علی تبریزی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اب ان ماہر خطاطوں نے شاہی سرپرستی میں کام شروع کیا۔ اس دور کا نایاب اور مشہور خطاط خواجہ سلطان تھا جسے اکبر بادشاہ نے اپنے عہد میں افضل خان کا خطاب دیا تھا۔ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں فنِ خطاطی کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ خطاطوں کو جاگیریں اور خطابات سے نوازا اور دفتر انشا میں مختلف عہدوں پر سرفراز کیا۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں عہد اکبر کے اساتذۂ خطِ نستعلیق کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"محمد حسین کشمیری جو خطاب "زریں قلم" سے روشناس آفاق ہے۔ مولانا عبدالعزیز کا شاگرد ہے لیکن وہ اس فن میں اپنے اُستاد سے بھی سبقت لے گیا ...... اس کے علاوہ اور خطاط یہ ہیں۔ مولانا محمد حسین باقر، محمد امین مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبدالحی، مولانا دوری، مولانا عبدالرحیم، میر عبداللہ نظامی قزوینی، علی چمن کشمیری، نور اللہ قاسم ارسلان"۔ زریں رقم نے آئینِ اکبری کا پورا نسخہ لکھا تھا [illegible] مشہور مصوروں نے تصاویر بنائی تھیں۔ اس نسخے پر تین لاکھ روپے خرچ ہوتے تھے۔

مغل بادشاہ اور شہزادے علم و فن کے بڑے قدردان تھے۔ عبدالرحیم ہروی ایک نامور ماہرِ فن اکبر کے دربار سے وابستہ تھا جہانگیر نے اُسے "عنبرین قلم" کا خطاب دیا تھا۔ اکبر نے جو نیا دارالحکومت "فتح پور سیکری" بنوایا تھا اُس کے کتبے سندھ کے نامور مؤرخ اور خطاط میر معصوم بھکری نے لکھے تھے عہد شاہجہان میں امانت علی [illegible] شیرازی نے خطِ ثلث میں جو آیات قرآنی تحریر کیں اور جو طغرے لکھے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ شاہجہان کے عہد میں سید علی تبریزی اورنگ زیب کو خطاطی سکھانے پر مامور ہوا تھا اور اسے "جواہر رقم" کا خطاب ملا۔ اورنگ زیب کو نسخ اور نستعلیق دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس کے عہد میں بھی خطاطی کی بہت سرپرستی ہوئی۔ خاندانِ مغلیہ کا آخری بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ فنِ خطاطی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے زمانے کے کئی خطاطوں نے شاہی سرپرستی کے سبب بھی فنِ خطاطی کو ترقی دی۔

خطاطوں نے مقبروں پر اور قرآن مجید کی جلدوں میں فنِ خطاطی کے [illegible] پیش کیے ہیں۔ خطاطی کے اعلیٰ ذوق کی وجہ سے برتنوں پر بھی خطاطی کے [illegible] ملتے ہیں۔ بعض برتنوں پر تو یہ فن حد کمال کو پہنچ گیا۔ خطاطی [illegible] ترسیل [illegible]۔

[illegible] کی خطاطی کو برصغیر پاک و ہند میں [illegible] ہندی [illegible] کو محفوظ رکھا [illegible] میں موجود [illegible] اور نامور خطاط عبدالمجید پروین رقم [illegible] حافظ محمد یوسف سدیدی، صوفی خورشید عالم اور [illegible] جنہوں نے قدیم خطاطوں کی پیروی کرتے ہوئے فنِ نستعلیق [illegible] اور اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی۔ حال ہی میں مشہور مصور [illegible] آیات قرآنی کو [illegible] پیش کیا [illegible]۔

مسلمانوں نے کئی دوسرے فنون میں اس مہارت [illegible] مختلف [illegible] مساجد [illegible] کے [illegible]۔ وہ فنون یہ ہیں:

(۱) فنِ تجلید یعنی کتابوں کی جلد بندی۔

(۲) فنِ تذہیب یعنی کتابوں کی [illegible]۔

(۳) فنِ تکفیت یعنی [illegible] بیش قیمت دھات [illegible] کے اندر [illegible] جاتا ہے۔

(۴) فنِ نجاری یعنی لکڑی [illegible] سازی و لکڑی [illegible]۔

(۵) فنِ فخارکاری یعنی [illegible] ظروف سازی اور ظروف پر منقش [illegible]۔

(۶) فنِ قالین بافی [illegible] منقش [illegible] کا [illegible]۔

(۷) فنِ سنگ تراشی [illegible]۔

(۸) فنِ سکوکات یعنی سکے بنانا

(۹) شیشے اور بلور کے ظروف بنانے کا فن

(۱۰) لکڑی پر کندہ کاری کا فن

(۱۱) فنِ پارچہ بافی۔

فن اور اس کے مختلف شعبوں کے اس تفصیلی تذکرہ کے بعد اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان فنون میں سے اکثر پر علماء وفقہا کا اتفاق ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں لیکن یہاں اس تفصیلی بیان سے مقصد صرف معلومات سے آگاہی حاصل کرنا ہے کیونکہ مسلمانوں کی طویل تاریخ کے مختلف ادوار میں مذکورہ بالا فنون میں مسلمانوں نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اور کئی ماہرِ فن پیدا ہوئے اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی اصل روح کے مفقود ہونے کے بعد جب اسلامی خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی کی وجہ سے ان فنون کا رواج ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عجمی علاقوں کے تہذیبی وتمدنی اثرات کی وجہ سے مسلمان ان فنون کو اپنانے پر مجبور ہوتے تاکہ غیر مسلم اقوام پر ہر لحاظ سے اپنی برتری ثابت کر سکیں۔

فن کے مضمون کے شروع کے صفحات میں "اسلامی فن کے ادوار اور خصائص" میں اسلامی فن ۱۷۱۱ء تک کا ذکر ہو چکا ہے۔ فن اور اس کے مختلف شعبوں کے تفصیلی تذکرہ کے بعد ۱۷۱۱ء کے بعد سے اب تک کے اسلامی فن کے ادوار کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ایوبی ومملوک فن

۱۱۷۱ء تا ۱۵۱۷ء تک مصر وشام میں، تاہم انیسویں صدی تک بھی مروّج رہا۔ اس دور کی خصوصیات میں مدرسے اور ایوان والی مساجد، مختلف رنگوں کے پتھروں کا جوڑ، سنگِ مرمر میں جڑت اور پچی کاری، پتلے اور بلند طاقچے جو مدوّر یا سہ گوشہ محرابوں پر ختم ہوتے ہیں۔ کئی کئی منزلوں اور جھروکوں والے پتلے پتلے مینار۔ اہم یادگاروں میں بیشتر متعدد مساجد، مدارس، مزارات اور مقبرے جو کہ قاہرہ اور دمشق میں ہیں۔

ساسانی روایات کا احیاء

آل بویہ، سامانیوں، غزنویوں اور غوریوں کے عہد میں نویں سے گیارہویں صدی تک ایران، عراق اور ترکستان میں ہوا اور آخری دور میں عباسی اسلوب میں مدغم ہو گیا۔ اس دور کی خصوصیات میں مقبروں کے مینار، گاؤدم مینار، مخروطی، کروی برجی گنبد اور محرابیں، نئی تجسیمی اور تجریدی تزئین۔ اہم یادگاروں میں بخارا، خوارزم، نیشاپور، گنبد قابوس، سنگ بست، اصفہان، یزد، غزنہ، لشکری بازار، جام۔

سلجوقی فن

ایران، شام، عراق میں ۱۰۳۸ء تا ۱۱۹۴ء تک رہا اور ایشیائے کوچک میں ۱۰۶۴ء تا ۱۳۰۲ء تک۔ ایرانی اسلامی فن کے ارتقاء کے تکمیل یافتہ پہلا مرحلہ کی اہم خصوصیات میں چار ایوانوں کی مسجدیں، بڑے بڑے گنبد، پتلے مینار، خشتی اور گل رنگین روغنی چوکے کی پچی کاری، دیواروں پر ابھرواں تصاویر، چمکیلے روغن کے برتن وغیرہ اہم یادگاروں میں بغداد، مستنصریہ اور باب طلسمان، موصل، دیار بکر، اصفہان کی جامع مسجد، نخجوان میں مقبرہ مومنہ خاتون وغیرہ۔

مغل اور تیموری فن

۱۲۵۲ء تا ۱۵۱۷ء ایرانی فن کے انتہائی عروج کے اس دور کی اہم خصوصیات میں نوکدار اور بصلہ نما گنبد، بلند ڈھولنے اور پشتے کی ڈاٹوں پر چوکوں کی پچی کاری اہم یادگاروں میں اصفہان، ورامین کی مسجد، سلطانیہ، سمرقند، بخارا، ہرات، بلخ، مشہد میں مختلف مساجد اور مقبرے۔

صفوی اور ازبک فن

سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی کے اس دور کی خصوصیات میں منقش چوکے۔ اہم یادگاروں میں قزوین، اصفہان، مشہد اور بخارا کے شہر کی تعمیرات، اردبیل میں شیخ صفی کے روضے کی مسجد وغیرہ۔

ہندی مسلمانوں کا فن

۱۲۹۶ء سے انیسویں صدی کے آغاز تک۔ اس دور کی خصوصیات میں ہندو فنِ تعمیر کی جزئیات کو اپنانا ہے جن میں ستون، دیوار گیریاں، چھجے، منڈیروں والی چھتیں۔ بیشتر یادگاریں دہلی اور آگرہ میں ہیں لیکن بعد میں کئی دوسرے شہروں میں بھی تعمیر ہوئیں۔

عثمانی ترکی فن

چودہویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی تک ایشیائے کوچک میں اسکا ارتقاء سلجوقی فن سے ہوا۔ اہم یادگاروں میں استنبول کی عظیم الشان گنبدوں والی مساجد کا سلسلہ۔

مذکورہ بالا ادوار میں مسلمان فنِ تعمیر میں نمایاں محسوس ہوتے ہیں درحقیقت انہوں نے دوسرے فنون میں بھی ارتقاء کیا۔ اُن کا ذکر مختلف فنون کے ذیل میں آچکا ہے گیارہویں اور سترھویں صدی کے درمیان کا زمانہ مسلمانوں کے فن کا دورِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا فن ساخت کی صفائی، تنوع اور حسن کے اعتبار سے بے مثال رہا۔ مذکورہ بالا مختلف ادوار سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی فن نے مختلف تہذیبوں سے استفادہ کیا۔ اس لئے اسلامی فن کے لئے درج ذیل فنون کو ماخذ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور ان فنون کی جھلکیاں اسلامی فن کی یادگاروں میں محسوس کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ بوزنطی فن

۲۔ ایرانی فن

۳۔ ترکی فن

۴۔ چینی فن

۵۔ ہندوستانی فن

۶۔ یورپی فن

اسلامی فن نے خود ہر دور میں ایک مروّجہ شکل اختیار کر کے دوسرے ممالک کی تہذیبوں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے دور میں دوسری اقوام کے لوگ اسلامی تہذیب اور اسلامی فن کو اپنانے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان کے علاقوں میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور ترک، عرب علاقوں میں خلافت عثمانیہ کے زوال سے انیسویں صدی عیسوی کے بعد مسلمان سیاسی طور پر ختم ہو گئے۔ دوسری اقوام کے غلبہ سے مختلف فنون میں مسلمانوں کی اقدار کو بھی زوال آ گیا۔ مغربی علوم وفنون مسلم علاقوں میں آہستہ آہستہ رواج پا گئے کیونکہ انیسویں صدی کے آغاز سے مغرب علوم وفنون کے عروج پر تھا اور سیاسی طور پر بھی غالب تھا۔

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں مغربی علوم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ فنون کے ہر شعبہ کی تعلیم میں بھی مغربی اثر نمایاں ہو گیا اور آہستہ آہستہ مسلم ممالک میں تعمیر، مصوری، موسیقی وغیرہ میں خالص مغربی انداز اور طرز کو اپنا لیا گیا ہے یعنی موجودہ بیسویں صدی مغربی علوم وفنون کے غلبہ کا دور ہے۔ قدیم اسلامی روایات کو اپنانے کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اقدار کو دوبارہ زندہ کریں۔

فناری عثمانی علماء اور فقہا کا ایک خاندان، جس کا مؤسس اعلیٰ شمس الدین محمد تھا۔ ایک روایت کے مطابق آپ مملکت عثمانیہ کے پہلے شیخ الاسلام تھے۔ آپ کی پیدائش ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء - ۱۳۵۱ء میں برسہ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شیخ حمزہ تھا۔ شمس الدین نے اپنے زمانے کے مشاہیر علماء سے اناطولی اور مصر میں اکتساب علم کیا۔ برسہ کے مناستیر مدرسہ میں بطور استاد تقرر ۷۷۰ھ میں ہوا۔ اگلے سال شہر کے قاضی بنا دیے گئے۔ جبکہ آپ کی عمر صرف بیس سال تھی۔ ملکی سیاست میں آپ کو اہم مقام حاصل تھا۔ آپ کے بیٹوں اور پوتوں کو مراد ثانی اور محمد ثانی نے خصوصی مراعات عطا کی تھیں۔ اپنی وفات یکم رجب ۸۳۴ھ/۱۵ مارچ ۱۴۳۱ء تک مفتی اعظم (شیخ الاسلام) کے منصب پر فائز رہے۔

اس خاندان کا دوسرا فرد جس نے اعلیٰ منصب حاصل کیا، شمس الدین کا پوتا علاؤ الدین علی بن یوسف بالی تھا جو ۸۷۲ھ تا ۸۷۴ھ برسہ کی قضا پر فائز رہا۔ اگلے سال قاضیٔ عسکر مقرر ہوا۔ جہاں ۸۸۱ھ تک کام کرتا رہا۔ ۸۹۴ھ میں اس کا تقرر روم ایلی کے قاضی العسکر کے طور پر ہوا۔ اور وہ ۹۰۰ھ تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد اسے اناطولی کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ اس کا انتقال ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء - ۱۴۹۸ء میں ہوا۔ علاؤ الدین کی اولاد میں سے بھی کئی افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔

فنج ۔ خانہ بدوش لوگ تھے اور ان کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ انھوں نے بتدریج اپنا عمل دخل نیل ازرق کے بہاؤ کی جانب ٹول ضلع سے سنار کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ سنار اس خانوادے کا مستقر امارت بنا۔ اس خاندان کا ظہور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا۔ عمارہ دُنقس نے ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء - ۱۵۰۵ء میں سنار کی تاسیس رکھی تھی۔ سنار کے قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد فنج خاندان کی سلطنت میں توسیع ہوتی چلی گئی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس خاندان کی حکومت کو زوال آیا۔ ۱۸۲۱ء میں ترکوں اور مصریوں کی متحدہ افواج سوڈان پر حملہ آور ہوئیں۔ تو فنج کے آخری حکمران بادی ششم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور ان علاقوں پر فنج خاندان کی حکومت کا اختتام ہو گیا۔

فن لینڈ ۔ فن لینڈ میں مسلمانوں کی حیثیت ایک مذہبی اقلیت کی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مسلمانوں کی تعداد صرف نو سو تھی۔ فن لینڈ کی آبادی چالیس لاکھ ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں روس سے مسلمان ہجرت کر کے فن لینڈ میں آکر آباد ہوئے۔ فن لینڈ کے مسلمان چنگیز خان کی نسل سے ہیں۔ کیونکہ ان کے آباؤ اجداد تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خان کے ہمراہ روس آئے تھے۔ ان مسلمانوں میں سے بیشتر صوبہ نجنی سے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں پورے ملکی حقوق حاصل ہو گئے اور وہ فن لینڈ میں مستقل آباد ہو گئے۔

۱۹۲۵ء حکومت فن لینڈ کی اجازت سے ہیلسنکی میں اسلامی انجمن قائم کی گئی اور ۱۹۴۳ء میں تامپیری میں بھی ایک اسلامی انجمن بنائی گئی۔ فنی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

فواحش - مادہ ف ح ش، فَحُشَ یَفحُشُ فُحشاً، فُحش، فَحَاشہ، فحشا اور فاحشہ بمعنی القبیح من القول والفعل (لسانی)، یعنی قبیح قول و فعل بہت ہی قبیح گناہ، حد سے گزرنے والا قول، اسی سے فَحَّشَ، اَفحَشَ، تَفَحَّشَ اور تفاحُش بمعنی القبیح من القول والفعل، یعنی بری بات کرنا یا کہنا، برائی میں زیادہ ہونا، بدکلامی کرنا اور گالی دینا۔ فواحش جمع کا صیغہ ہے اور اس کا واحد فاحشہ صیغۂ مونث ہے، جس کے معنی کسی چیز کا بدی، برائی میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ نیز بمعنی زنا بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ فاحشہ اکثر زنا کے معنوں میں آتا ہے۔ فاحشہ کے ایک معنی گھر سے خاوند کی اجازت کے بغیر نکلنے والی عورت کے ہیں یا اس عورت کے فعل کے ہیں۔ نیز اقوال و افعال میں ہر قبیح خصلت کو فاحشہ کہتے ہیں۔ فاحشہ کا یہ مطلب بھی ہے کہ وہ چیز جس کی بدی یا برائی کو عقل اور قانون ناپسند کرے۔ اللہ کی منع کردہ اشیاء کو بھی فاحشہ کہتے ہیں۔ ان اقوال سے اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فواحش ان برائیوں کو کہا جاتا ہے جن کا تعلق شہوانیات سے ہے۔

امام رازی نے فواحش کے اس طرح معنی بیان کیے ہیں: "وہ گناہ جن کا تعلق شہوانیات سے ہے۔" اردو اور فارسی میں اسی لیے اس کے معنی بے حیائی کے لیے جاتے ہیں۔

حدیث میں الفُحش، الفاحشہ، الفاحش کے الفاظ کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ فُحش کے معنی گناہ اور معصیت کا حد سے بڑھ جانا کے ہیں۔ فاحش زنا کے معنی حد سے تجاوز کرنے والے کے ہیں۔ فاحشہ اور فُحش ہم معنی ہیں، فاحش و فاحشہ سے مبالغے کا صیغہ فحّاشہ ہے۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر یہ مادہ مختلف انداز میں آیا ہے۔ ان مقامات کے مطالعے سے اس کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۵ میں فاحشہ بمعنی کھلا گناہ۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۲۸ میں فحشاء بے حیائی کے کاموں کے معنی میں آیا ہے۔ اور اسی معنی میں سورۃ نور کی آیت ۱۹ میں الفاحشۃ کا استعمال ہوا۔

سورۃ نساء کی آیت ۱۵ میں زنا کے ذکر کے ساتھ فاحشہ کا لفظ بے حیائی کے کام کے معنی میں آیا ہے۔ سورۃ نمل کی آیت ۵۴ اور سورۃ عنکبوت کی آیت ۲۸ میں قوم لوط کی بدکاری کے معنی میں فاحشہ کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ نساء کی آیت ۲۲ میں فاحشہ کا لفظ بدکاری کے لیے آیا ہے۔ سورۃ احزاب کی آیت ۳۰ میں فاحشۃ مُبَیِّنَۃ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ اس سے مراد بیوی کی کھلی نافرمانی اور حکم عدولی ہے۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ جب قرآن میں الفاحشۃ بطور معرفہ آتا ہے تو اس کا مفہوم زنا اور لواطت ہے، اور جب فاحشہ بطور نکرہ آتا ہے تو اس سے مراد تمام گناہ ہوتے ہیں۔ اور جب مرکب توصیفی کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد میاں بیوی کی کشیدگی، خاوند کی نافرمانی اور حکم عدولی ہوتی ہے (تفسیر ماجدی)

لفظ فواحش جمع کی صورت میں قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ انعام آیت ۱۵۲، سورۃ اعراف آیت ۳۳، سورۃ شوریٰ آیت ۳۷ اور سورۃ نجم آیت ۳۲۔ ان آیات سے فواحش کے مفہوم میں وہ سب گندی باتیں اور بے حیائی کے کام شامل ہیں جو ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ۔ فواحش میں وہ سارے گناہ شامل ہوتے ہیں جن میں حیا، آداب، حدود شرعی اور اخلاق سے تجاوز کیا گیا ہو خواہ یہ قولاً ہوں، فعلاً یا تحریراً۔ اسی طرح چاہے یہ ظاہر ہوں یا خفیہ۔

فحشاء کے بھی وہی معنی ہیں جو فاحشہ یا فواحش کے ہیں لیکن محل استعمال کی وجہ سے مفہوم میں کچھ فرق آجاتا ہے۔ تفسیر ماجدی میں ہے کہ فحشاء ایسی برائی

ہے جو کھلی ہوئی اور صریح ہو۔ تفسیر بیضاوی اور روح المعانی میں اس سے مراد وہ گناہ لیے گئے ہیں جو قوۃ شہوۃ کی افراط سے وجود میں آتے ہیں۔

فحشاء کا لفظ سورۃ النحل کی آیت ۹۰، سورۃ عنکبوت کی آیت ۴۵ اور سورۃ بقرہ کی آیات ۱۶۹ اور ۲۶۸ میں استعمال ہوا ہے۔

اس مادّے کے جتنے الفاظ ہیں اُن میں حد، جائز، معروف و مناسب سے تجاوز کے علاوہ قبح کی کثرت و شدت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

فؤاد اوّل

:۔ (۲۶ مارچ ۱۸۶۸ء ــــ ۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء)

خدیو مصر، احمد فؤاد، قصر جیزہ میں پیدا ہوا۔ اُس نے جنیوا اور تورین میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۵ء میں اطالوی فوجی اکادمی میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۸۷ء کے دوران جب وہ روم کے توپ خانہ میں سیکنڈ لفٹیننٹ تھا تو اس کا اطالوی شاہی خاندان سے کافی رابطہ رہا۔ ترکی کی طرف سے وی آنا میں کچھ عرصہ تک فوجی اتاشی رہا اور پھر استنبول میں مختصر سے قیام کے بعد ۱۸۹۲ء میں مصر چلا آیا۔ شہزادگی کے زمانے میں اُس نے [illegible] جامعۂ قاہرہ کی وائس چانسلری (۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۳ء) قبول کر لی اور اپنے بھائی حسین کی وفات (۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء) پر سلطانِ مصر بنا۔ اُس نے ۱۵ مارچ ۱۹۲۲ء کو بادشاہِ مصر کا لقب اختیار کیا۔ وہ تہذیب، شائستگی اور اسلامی روایات کا بڑا احترام کرتا تھا۔

مصر کی بیداری کی تاریخ میں احمد فؤاد کا عہدِ حکومت بڑی اہمیت رکھتا ہے [illegible] قومی تحریک کے رہنماؤں سعد زغلول اور وفد پارٹی کی قیادت نے مصر پر انگریزوں کے قبضے کے [illegible] تحریک شروع کی۔ احمد فؤاد اس قیادت سے الگ تھا اور خود [illegible] مطلق العنان بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اُس نے دستور کو ایک کھلونا بنا دیا اس وجہ سے [illegible] سیاسی بحرانوں سے دوچار رہا۔ پارلیمنٹ کے انتخابات میں اکثر وفد پارٹی کامیاب ہوتی رہی لیکن احمد فؤاد نے اس کو حکومت کرنے کا موقع نہ دیا۔ بادشاہ [illegible] اور غیر [illegible] سیاستدانوں پر اعتماد کرتا تھا۔ دوسرے سیاسی راہنماؤں [illegible] احمد زیور [illegible] ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۶ء)، محمد محمود (۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء) اور اسمٰعیل صدقی (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء) سے معاونت طلب کرتا رہا۔ اس کے عہدِ حکومت کے آخر میں حبشہ میں جنگ کی وجہ سے اطالوی خطرے کے پیشِ نظر انگریزوں سے معاہدے کی ضرورت واضح ہو گئی اور [illegible] کی وفات کے چار ماہ بعد ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کو ہوا۔

اُس کے دورِ حکومت میں مصر بینک کی تاسیس سے مصر کی معاشی ترقی میں اضافہ ہوا۔ اُس نے ملک کی علمی سرگرمیوں میں بڑے شوق سے حصہ لیا۔ نئے مدارس تعمیر کروائے۔ اُس نے بہت سے ثقافتی ادارے قائم کروائے اور بہت سے علمی اداروں کو [illegible] بدولت نئی زندگی ملی۔ اُس نے جیزہ میں جدید جامعہ کی تاسیس کی حوصلہ افزائی کی اور جامعۃ الازہر میں کئی اصلاحات نافذ کیں۔

فؤاد پاشا

:۔ (۱۸۱۵ء ــــ ۱۸۶۹ء)، ترکیہ کا پانچ دفعہ وزیرِ خارجہ اور دو دفعہ صدرِ اعظم رہا۔

استنبول میں پیدا ہوا۔ شاعر عزت ملّا کا بیٹا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں اپنے والد کی جلاوطنی کے بعد فؤاد نے دینی تعلیم چھوڑ کر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اُس نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اس نے ۱۸۳۴ء تا ۱۸۳۵ء بحیثیت فوجی ڈاکٹر طرابلس میں بسر کیے۔ فؤاد کو فرانسیسی زبان میں درک حاصل تھا۔ اس لیے اس نے اگلے سالوں میں دیوانِ عثمانیہ کے ترجمان اور [illegible] کی حیثیت سے ترقی کی منازل طے کیں اور یورپی معاملات سے بلاواسطہ آگاہی حاصل کرتا رہا۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء میں وہ بابِ عالی کا ترجمان رہا اور ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۴ء تک لندن میں ترکی سفارت خانہ کا فرسٹ سیکرٹری رہا۔ مارچ ۱۸۴۵ء میں اُسے ایک مخصوص تعلیمی کمیشن کا رکن مقرر کیا گیا۔ وہ جون، جولائی ۱۸۴۵ء میں شاہی دیوان کا ترجمان مقرر ہوا۔ اور ۱۸ فروری ۱۸۴۷ء کو اُس نے آمدجی کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں دو خصوصی مشنوں کی کامیابی پر اُسے صدارتِ مستشاری کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ ۱۸۵۱ء میں اُس نے جدید طرز پر ترکی قواعد گرائمر کی ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۵۲ء کے اوائل میں اُس نے جودت کے ساتھ اشتراک سے کشتی رانی کی ایک کمپنی قائم کی۔ ۹ اگست ۱۸۵۲ء کو اُس کا تقرر بطورِ وزیرِ خارجہ ہوا۔ اس سے تین دن پہلے اس کے استاد رشید پاشا کا ایک اور شاگرد علی پاشا صدارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ بعض سیاسی معاملات میں اُلجھاؤ کی وجہ سے اُس نے مارچ ۱۸۵۳ء میں استعفیٰ دے دیا۔ مارچ ۱۸۵۴ء سے ایک سال تک فؤاد نے ایپیرس اور تھسلی میں با اختیار فوجی اختیارات کے حامل خصوصی کمشنر کی حیثیت سے کام کیا۔ مئی ۱۸۵۵ء میں جب محمد امین علی نے رشید پاشا کی جگہ دوسری مرتبہ وزارتِ اعلیٰ کا قلمبندان سنبھالا تو فؤاد بھی وزیرِ خارجہ مقرر ہوا۔

سٹریٹ فورڈ (Stratford) نے بلقانی ریاستوں کے بارے میں دباؤ ڈالا تو نومبر ۱۸۵۶ء میں فؤاد وزارت سے مستعفی ہو گیا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں وہ دوبارہ مجلسِ تنظیمات کا صدر مقرر ہوا۔ مصطفیٰ رشید پاشا کی وفات کے چار دن بعد علی پاشا صدرِ اعظم اور فؤاد پاشا وزیرِ خارجہ بنا۔ اس نے ۲۲ مئی سے لے کر ۱۹ اگست ۱۸۵۸ء تک پیرس میں بلقانی ریاستوں کے متعلق بلائی گئی ایک کانفرنس میں دولتِ عثمانیہ کی نمائندگی کی۔ جب مارونیوں پر دروز کے حملوں سے بڑی طاقتوں کو ترکیہ کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع ملا تو فؤاد کو ہر قسم کے اختیارات دے کر ۱۲ جولائی ۱۸۶۰ء کو بیروت روانہ کیا گیا۔ شام میں قتل و غارت کے واقعات سے مجبور ہو کر اُسے دمشق جانا پڑا وہاں اُس نے دمشق کے والی احمد پاشا سمیت ۱۶۷ افراد کو پھانسی دی۔ اس سختی کی وجہ سے مقامی آبادی میں ابوالجبل (پھانسی کا باپ) کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اس بین الاقوامی کمیشن کا بھی صدر رہا جو دمشق میں قتل و غارت کے واقعات کی تحقیق کے لیے آیا تھا۔ کمیشن کے نتیجہ میں نئے لبنانی نظم و نسق کے قانون کی صورت ظاہر ہوئی جس کا اعلان ۹ جون ۱۸۶۱ء کو ہوا۔

فوائد فیروز شاہی

:۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں علوم و فنون کی بہت حوصلہ افزائی کی اس کے دور میں کئی نامور علماء اور فقہا ہوئے اور بادشاہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس زمانے کے علماء کی تصانیف میں سے ایک اہم کتاب "فوائد فیروز شاہی" ہے یہ کتاب اس دور کے ایک ذی علم بزرگ شرف محمد عطائی کی تصنیف ہے اور متعدد مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ مخطوطہ کی شکل میں اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ دو جلدوں میں مجلد اور محفوظ ہے۔ پہلی جلد مع فہرست کے ۲۰۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد ۲۱۰ سے شروع ہو کر ۴۳۷ اوراق پر ختم ہوتی ہے۔ فہرست کتاب ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ایک سو پندرہ ابواب اور پانچ سو چہتر فصول کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس مخطوطہ میں بعض مقامات پر کتاب کے ابواب و فصول، فہرست کے ابواب و فصول کے مطابق نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فوائد فیروز شاہی کے صرف چار نسخے ہیں۔ دوسرے تین نسخے مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ ترکی میں استنبول کی لائبریری میں ہے

دوسرا نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ تیسرا نسخہ خدابخش لائبریری بانکی پور، انڈیا میں ہے۔ چوتھے نسخہ کا اوپر ذکر ہے۔ جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں ہے۔

فوائد السالکین

:۔ تاریخی روایات میں آتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات ان کے مرید خاص بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے مرتب کئے تھے۔ ان ملفوظات کو "فوائد السالکین" کا نام دیا گیا ہے۔

شیخ محمد اکرام مصنف آبِ کوثر نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۵ کے حاشیہ میں فوائد السالکین کی حیثیت مشتبہ قرار دی ہے اور وضعی کہا ہے۔ اس لئے فوائد السالکین کتاب کے تفصیلی تذکرہ سے اجتناب کیا گیا ہے۔

فوائد الفوائد

:۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات جو اُن کے مرید باختصاص میر حسین علاء سنجری نے مرتب کئے ہیں۔ اکابر خواجگانِ چشت کے سلسلہ کے خاتم حضرت نظام الدینؒ ہیں۔ آپ کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کا آخر اور آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔ آپ کے ملفوظات جمع کرنے کی سعادت ایک سے زائد مریدان با اخلاص کے حصہ میں آئی۔ ان میں ایک مجموعہ فوائد الفوائد ہے جو اہلِ دل کے نزدیک چشتیہ بہشتیہ کے نظام تصوف کا ایک مکمل دستور العمل ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث ایسی رائے کا اظہار اپنی کتاب اخبار الاخبار صفحہ ۳۸ پر کرتے ہیں

"یہ کتاب شیخ نظام الدینؒ کے مجازین و مریدین کے درمیان بطور دستور العمل کے ہے" اسی قسم کی آراء کا اظہار شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، میر خورد دہلویؒ نے بھی کیا ہے۔ امیر خسرو کی بابت منقول ہے کہ فرمایا کرتے تھے "کاش میری تمام تصانیف حسن سجری کے نام سے ہوتیں اور یہ ایک میرے نام سے" (اخبار الاخبار صفحہ ۹۸)

یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اول ۔شعبان ۷۰۷ھ تا ذی الحجہ ۷۰۸ھ کی ۳۴ مجالس کے ذکر پر مشتمل ہے۔

حصہ دوم ۔ شوال ۷۰۹ھ تا شوال ۷۱۲ھ کی ۳۴ مجالس کے ذکر پر مشتمل ہے

حصہ سوم میں ذی قعد ۷۱۲ھ تا ذی الحجہ ۷۱۳ھ کی ۱۵ مجالس کا بیان ہے۔

حصہ چہارم میں محرم ۷۱۴ھ تا رجب ۷۱۹ھ کی ۶۲ مجالس کا بیان ہے اور اسی طرح

حصہ پنجم ۔شعبان ۷۱۹ھ تا رجب ۷۲۲ھ کی ۴۲ مجالس کے ذکر پر مشتمل ہے۔

یہ مجالس اور اُس کی گفتگو میں حضرت۔ نظام الدینؒ کی زندگی کے آخری چند سالوں کی ہیں۔ آپ کا انتقال ربیع الثانی ۷۳۵ھ کو ہوا۔

یہ کتاب حقائق و معارف کا ایک خزانہ ہے اور تشنگانِ حق کے لئے ایک رہنما کتاب ہے۔

فوج

:۔ بمعنی آدمیوں کا گروہ لیکن مجازی معنوں میں ایک تربیت یافتہ گروہ کو کہتے ہیں۔

قدیم زمانوں میں نہ کوئی باقاعدہ فوج تھی اور نہ فوجی تربیت کا نظام۔ دشمن کے مقابلے کے لئے مردوں کی ساری آبادی میدانِ جنگ میں آجاتی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل مصر میں اور بعد میں بابل اور ایران میں [illegible] فوج کا پتہ چلتا ہے۔ سکندر اعظم کی فتوحات کے بعد باقاعدہ فوج کی ضرورت کا احساس ہوا اور بعد میں روم نے بھی مستقل فوج کا نظام قائم کیا لیکن یہ سب ہنگامی نوعیت کے انتظامات تھے۔ نپولین کے وقت سے باقاعدہ اور مستقل فوج کا صحیح نظام قائم ہوا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں بھی کوئی باقاعدہ فوج کا نظام نہ تھا۔ لیکن بوقتِ ضرورت تمام صحت مند مسلمان دشمن کے مقابلے کے لئے نکل آتے۔ بعد میں مسلمان حکمرانوں نے باقاعدہ اور مستقل تنخواہ دار فوج کا انتظام قائم کیا۔

پُرانے وقتوں میں انگریزوں نے فوج کے لئے ایک الگ سا طریقہ اختیار کیا تھا۔ جن اُمراء کو جاگیریں دی جاتی تھیں اُن کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ ایک مقررہ تعداد میں پیدل یا سوار فوج کا مستقل انتظام کریں۔ اس طریقہ کو جاگیرداری طریقہ کہتے تھے اور انگلستان میں اس کو فیوڈل سسٹم کہتے تھے یہی طریقہ خاندانِ مغلیہ کے حکمران یا اُس سے پہلے کئی مسلمان حکمرانوں نے اختیار کیا۔ ایسے اُمرا یا جاگیرداروں کو پنج ہزاری یا دس ہزاری کہا جاتا ہے۔ جو پانچ ہزار یا دس ہزار افراد کو باقاعدہ فوج کی صورت میں ہر وقت تیار رکھتے تھے۔

موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ تنخواہ دار فوج کا نظام قائم ہو گیا ہے اُس میں الگ الگ بری، بحری اور ہوائی فوجیں قائم کی جاتی ہیں۔ بعض ممالک میں ان تینوں افواج کو ایک مشترکہ کمان کنٹرول کرتی ہے اور بعض ممالک میں ہر فوج کے لئے الگ الگ کمان ہوتی ہے اور وہ اپنے اپنے معاملات کے لئے سربراہ حکومت یا مملکت کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ اچھی کارکردگی کے لئے تینوں افواج کے مربوط نظام کو بہتر تسلیم کیا گیا ہے

فوجدار

:۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت میں فوج یا پولیس کے اعلیٰ ترین عہدیدار کا لقب تھا۔ اس کے فرائض میں نظم و نسق قائم کرنا، باغیوں کو گرفتار کرنا اور سزا دلوانا اور بعض اوقات مالیہ جمع کرنے کے فرائض شامل تھے۔ فوجدار صوبائی حاکموں کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ لیکن انہیں دربارِ شاہی سے براہِ راست رابطہ کا اختیار ہوتا تھا۔

تیموریوں کے عہد میں فوجدار کا خطاب فیل خانوں کے ماتحت [illegible] کو بھی دیا جاتا تھا۔

فوری، احمد بن عبداللہ

:۔ سولھویں صدی عیسوی [illegible] کا ایک شاعر اور عالم۔ پیدائشی طور پر عیسائی تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد [illegible] نام عبداللہ رکھا گیا۔ فوری ایک ممتاز عالم اور مدرس تھا اس نے [illegible] سفر کیا تھا۔ ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء میں اس نے سلطان سلیمان کی سرکردگی میں [illegible] کے خلاف مہم میں بھی حصہ لیا۔ دمشق کا قاضی بھی رہا جہاں اُس کا انتقال [illegible] ۹۷۸ھ/اپریل ۱۵۷۱ء میں ہوا۔ ریاضی کے بیان کے مطابق فوری [illegible] نے مخمس اور مسدس لکھے تھے۔ اُس نے سلطان سلیمان کا دیوان بھی مرتب [illegible]

فوق، منشی محمد دین

۔ (فروری ۱۸۷۷ء - ۱۹۴۵ء)

کشمیر کے ایک نامور صحافی اور مؤرخ۔

منشی محمد دین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن (ضلع سیالکوٹ) میں [illegible] پیدا ہوئے اور ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ منشی صاحب ایک نامور صحافی، ادیب، مؤرخ اور شاعر کی حیثیت سے اپنے پیچھے جو کارنامے چھوڑ گئے ہیں کہ دنیا انھیں مدتوں نہیں بھلا سکتی۔ ان کی تصانیف ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

فوق صاحب نہایت سادہ مگر باوقار زندگی بسر کرتے تھے۔ سیر و سیاحت

کے بڑے شوقین تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصّہ سفر میں گزرا۔ کشمیر ان کا وطن تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے وسط ہند، راجپوتانہ اور کانگڑہ کی ریاستوں مثلاً سمتھرا ناگور، میہر، دیوال، سکیت، شملہ، لکھنؤ، دہلی، بھوپال، بنگال اور صوبہ سرحد کے متعدد سفر کیے۔

فوق صاحب بڑے محنتی تھے۔ شعر و شاعری کا شوق انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف خیال بہت کم رہتا تھا چنانچہ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا، سیالکوٹ میں جاکر پٹوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے کسی اور ملازمت کی توقع پر جموں کا رخ کیا اور کئی ماہ کی لگاتار کوششوں سے محکمہ پرمٹ دچونگی میں سردار

منشی محمد دین فوق

ہری سنگھ رئیس و ٹھیکیدار کے پاس ملازمت حاصل کی۔ جہاں قاضی فقیر علی عاقل کی ہم نشینی میسر آ جانے سے جموں میں چند دن خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔ جب چونگی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا تو بیکاری کے چند ماہ گھر تل میں گزار کر ۳۱ جنوری ۱۸۹۷ء کو اپنے بھائی کے پاس لاہور چلے آئے۔ یہاں پیسہ اخبار کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مزید مشق کے لیے اخبار بھارت سیوک جالندھر کی نامہ نگاری بھی کرتے رہے۔ 'اخبار عام' اور 'خالصہ بہادر' میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے مندرجہ ذیل چار اخبار خود مرتب کرتے رہے:۔

(۱) 'کوہ نور' جو پنجاب کا سب سے پہلا اُردو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کے آخری ایڈیٹر فوق تھے۔

(۲) 'گلزارِ ہند' جو اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔

(۳) 'آفتابِ پنجاب' جو ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں بند ہوا۔

(۴) بہاول گزٹ۔ جو منشی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے "شالامار باغ کی سیر" ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ چونکہ ان دنوں ناولوں کی گرم بازاری تھی، آپ نے بھی 'انارکلی' 'عمِ نصیب'، 'عصمت آراء' اور 'اکبر' وغیرہ چند ناول لکھے، جو بہت مقبول ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۰۱ء میں آپ نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کرکے نومبر میں اپنا اخبار اور پریس جاری کیا۔ اس اخبار کا نام "پنجۂ فولاد" تھا۔ یہ اخبار ڈیڑھ ماہ تک پندرہ روزہ ہوگیا۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں ہفتہ وار ہوگیا۔ جولائی ۱۹۰۲ء میں اس کی اشاعت پانچسو تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۴ء میں سات سو اور رفتہ رفتہ اس کی اشاعت دسمبر ۱۹۰۵ء میں بارہ سو سے بڑھ گئی۔ اتنی اشاعت اس زمانے میں غیر معمولی سمجھی جاتی تھی کیونکہ اخبار بینی کا ذوق آجکل کی طرح اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ وسط ستمبر ۱۹۰۶ء میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ اخبار بند ہوگیا۔

محمد دین فوق صاحب لالہ منشی کرم اگروال کے "اردو اخبار" میں بھی بطور مدیر کام کرتے رہے۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں چند ماہ کے لیے آپ نے سنبھالا تھا مگر دوسرے مشاغل کی مصروفیات کی بنا پر بعد میں اس سے علیحدہ ہوگئے۔ ۱۸۹۹ء میں میاں جان محمد گنائی نے 'کشمیر گزٹ' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی رہے۔ آخر گنائی کی وفات کے ساتھ ہی اس رسالے کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد محمد دین فوق نے ۱۹۰۶ء میں اپنا ماہوار 'کشمیری میگزین' جاری کیا جو غالباً پنجاب کا سب سے پہلا رسالہ تھا۔

۱۹۱۲ء میں کشمیری میگزین نے ماہوار سے ہفتہ وار 'اخبار کشمیری' کی شکل اختیار کی اور یہ اخبار عوام کی آواز بنا رہا۔ اخبار کشمیری کے ساتھ ساتھ فوق نے یکے بعد دیگرے 'طریقت'، اور 'نظام' دو ماہانہ رسالے جاری کیے جو تین چار برس تک شائع ہوتے رہے۔

فوق صاحب نے کشمیر کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، خواتین کشمیر، راہنمائے کشمیر، حکایاتِ کشمیر، شبابِ کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر، اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے انھوں نے کشمیریوں کے شاندار کارناموں سے قوم کو روشناس کیا۔

فوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندی وضع کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اگر وہ کشمیر کے چکر سے نکل کر اپنے محدود دائرہ عمل کو وسعت دیتے تو ہندوستان کے بہترین اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں وطنی تاریخ کی تدوین کا کام معرضِ التوا میں پڑ جاتا، کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا نعم البدل دستیاب ہونا مشکل تھا۔ پھر بھی جب ہم ان کی تصانیف "لاہور عہدِ مغلیہ میں" "تذکرہ علمائے لاہور" "یادِ رفتگاں"، (تذکرہ صوفیہ لاہور) 'حیاتِ داتا گنج بخش'، 'تاریخ سیالکوٹ'، 'تذکرۃ الصالحین'، مہاراجہ رنجیت سنگھ'، "شالامار باغ" "ماثرِ لاہور"، اور 'فاتح ملتان'، وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخ کے متعلق بھی ان کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ "تاریخ حریت اسلام" ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ انھوں نے ۹۵ کتابیں تصنیف کیں۔

فوق صاحب محض تخلص ہی کے گنہگار نہ تھے۔ بلکہ فطری شاعر تھے اور غزل نظم، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ تمام اصنافِ سخن پر حاوی، ان کے کلام کے دو مجموعے 'کلام فوق'، اور 'نغمۂ گلزار' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

فُومَنی، عبدالفتاح

:۔ سولہویں۔ سترھویں صدی کا ایک ایرانی مؤرخ۔ گیلان کے قدیم دارالخلافہ فومَن میں سرکاری ملازمت کرتا رہا۔ ۱۰۱۸-۱۰۱۹ھ/ ۱۶۰۹ء-۱۶۱۰ء میں گیلان کے وزیر بہزاد بیگ نے اُسے ناظم حسابات مقرر کیا۔ کئی دیگر وزیروں کے ساتھ بھی کام کرتا رہا۔ بعد میں عادل شاہ کے ہمراہ عراق چلا گیا۔ اُس نے فارسی میں گیلان کی تاریخ لکھی، جس میں ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء سے لے کر ۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۸ء تک کے احوال درج ہیں

فہمی شیخ

:۔ ارزنجان کے نقشبندی خالدی طریقے کے شیخ۔ ارزنجان میں پیر محمد وہبی نقشبندی خالدی سلسلہ کے شیخ طریقت تھے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۸ء میں پیر محمد وہبی کی وفات کے بعد مصطفےٰ فہمی اُنکے خلیفہ بنے۔ مقامی تاجروں اور

عہدے داروں کے علاوہ اعلیٰ فوجی افسروں سے بھی اُن کے تعلقات تھے۔ انہیں پارسائی اور زہد کی نمائش ناپسند تھی۔ ان کے گھر میں ہر روز نے لوازی کے ساتھ محفل ذکر جمتی تھی۔ اپنے تیسرے حج کے موقع پر ۲۱ محرم ۱۲۹۹ھ/ ۱۴ دسمبر ۱۸۸۱ء میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا اور حضرت خدیجہ الکبریٰ کے مزار کی پائنتی دفن ہوئے۔

فہیم پاشا

:- ولادت ۱۸۷۳ء میں استنبول میں ہوئی۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے رضاعی بھائی کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر اُس نے مکتبہ حربیہ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۴ء میں کپتان کے عہدے کے لئے نامزد ہوا۔ دو سال بعد ترقی کر کے "یاورِ شہریاری" بن گیا اور ۱۸۹۸ء میں اسے پاشا کا خطاب ملا۔ فہیم پاشا ایک طویل عرصہ تک سلطان عبدالحمید ثانی کی خفیہ پولیس کا سربراہ رہا۔ بعض وجوہات کی بنا پر ۱۷ فروری ۱۹۰۷ء کو اُسے برطرف کر کے برسہ کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد برسہ کے نزدیک ینی شہر میں عوام کے ایک مشتعل ہجوم نے اُسے قتل کر دیا۔

فہیم سلیمان افندی

:- (۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء ــــ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء)

ایک ترکی شاعر اور عالم' جو خوجہ فہیم کے نام سے بھی مشہور ہے قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ دیوان ہمکسال اور محکمۂ محصول میں ملازمت کرتا رہا اور آخر کار روم ایلی میں قائمقام کے عہدے پر رہا۔ ملازمت کے بعد قسطنطنیہ میں ایک مدرس کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ شاعری میں اُس نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ اُس کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اس نے فارسی شاعر صائب اصفہانی کی منتخب غزلوں کی ایک شرح ..... "صائب شرحی" لکھی اور سفینۃ الشعراء کے نام سے تذکرۂ دولت شاہ کا ترکی میں ترجمہ کیا۔

فیٔ

:- فاءَ یَفِیُٔ سے مصدر جس کے معنی ہیں واپس آنا، رجوع کرنا، پلٹنا اور لوٹنا اسلامی شریعت میں فیٔ اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ مخالفوں سے حاصل ہو خواہ اس طور پر کہ کفار چھوڑ کر چلے جائیں یا جزیہ کے طور پر ادا کریں یا رعب میں آکر جان بچانے کے لیے کچھ رقم یا چیزیں دے دیں۔ یہ سب فیٔ ہے۔ اس کو لغوی معنے کے لحاظ سے فیٔ اس لیے کہتے ہیں کہ کفار سے اللہ نے مسلمانوں کے پاس بھیجا ہے۔

فیٔ کے صرف کی بابت قرآن مجید میں اس طرح حکم آیا ہے : "جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے لے کر دیا ہے سو وہ اللہ اور رسول اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے دولتمندوں میں ہی دائر نہ رہے۔

آیت میں چھ اشخاص ذکر ہوئے ہیں۔ اوّل اللہ جلّ جلالہ یوں تو سب اسی کا ہے مگر یہاں اللہ کا مال کہنے سے یہ غرض ہے کہ یہ اللہ نے مخصوص حاجتوں کے لیے اپنا خزانہ بنا رکھا ہے۔ اس تقدیر پر یہ کہنا کہ لفظ اللہ تبرکاً مذکور ہے بیفائدہ بات ہے۔ دوم رسولؐ۔ سوم قرابت دار۔ چہارم یتامیٰ۔ پنجم مساکین۔ ششم مسافر۔ آیت میں یہ قید نہیں کہ قرابتدار اور آنحضرتؐ کے بعد جو آپ کا جانشین ہوا اس کو بھی اپنے اقارب کے ساتھ حسن سلوک کرنا انسانی خاصہ ہے جس کا بار بقدر ضرورت شاہی خزانہ پر ہونا عین انصاف ہے اور یتیم و مسکین و ابن السبیل قومی ذوحاجت لوگ ہیں بخصوصاً شاہی مہمان جو سلطنت اور اس کے فوائد آئندہ پیدا کرنے میں مؤثر ہوں انکی مدد بھی اس شاہی خزانے سے ہونی چاہیئے۔ آیت میں یہ مذکور نہیں کہ ان چھٹوں کے حصے مساوی ہیں یا کم زیادہ کیونکہ ان چھٹوں کی طرف تقسیم نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ان اشخاص کو دینا مراد ہے جس کی کوئی تعداد معین قبل از وقت ہو نہیں سکتی اور آیت میں یہ چند ذوحاجت اس لیے مذکور ہیں کہ ان کی طرف زیادہ تر توجہ مبذول ہوتی ہے اور یہ اس کے منافی نہیں کہ اور کسی کام پر جو قومی اور سلطنت کے لیے مفید ہو صَرف نہ کیا جائے۔ الحاصل فیٔ شاہی خزانے میں داخل ہو کر اشخاص مذکورہ بالا کے لیے ہے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ بنو نضیر کے اموال جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو بطور مالِ غنیمت عطا کیے تھے اس قسم کے تھے جس پر مسلمانوں نے گھوڑے نہیں دوڑائے تھے۔ پس وہ مال خاص رسول اللہؐ کے لیے تھا۔ آپ اس میں سے سال بھر اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے تھے پھر جو بچتا تھا اس کو اللہ کی راہ میں اسلحہ اور گھوڑے تیار کرنے پر لگاتے تھے۔

فیروز آبادی

: (۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء ــــ ۸۱۷ھ/۱۴۱۵ء)

عربی لغت نویس۔ ابوالطاہر محمد بن یعقوب ابن محمد بن ابراہیم مجد الدین الشیرازی الشافعی۔ شیراز کے قریب ایک گاؤں کازرون میں پیدا ہوا۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ نے شیراز میں پڑھنا شروع کیا اور پھر تحصیل علم کے لیے واسط اور ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء میں بغداد گیا۔ ۱۳۴۹ء میں اس نے دمشق میں تقی الدین السبکی سے تعلیم پائی اور پھر اپنے استاد کے ہمراہ بیت المقدس گیا۔ وہاں دس سال تک درس و تدریس میں مصروف رہا۔ اس کے بعد اُس نے ایشیائے کوچک اور قاہرہ کی سیاحت کی ایک روایت کے مطابق وہ ۷۷۰ھ/ ۱۳۶۸ء میں مکہ مکرمہ گیا اور وہاں تقریباً چودہ سال تک رہا۔ اس کے بعد وہ بغداد اور ایران میں بھی رہا۔ سلطان تیمور نے جب ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء میں شیراز فتح کیا تو ابوالطاہر فیروز آبادی جنوبی عرب کے ملک یمن چلا گیا۔ ربیع الاوّل ۷۹۶ھ/ جنوری ۱۳۹۴ء میں سلطان ملک الاشرف کی دعوت پر تعز گیا وہاں چودہ ماہ تک رہا۔ ۶ ذوالحجہ ۷۹۷ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۳۹۵ء کو یمن کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔ سلطان نے اپنی ایک لڑکی کی شادی اس سے کر دی۔ ۸۰۲ھ/ ۱۴۰۰ء میں اس نے ایک بار پھر حج کا سفر کیا۔ حج کے بعد مکہ مکرمہ میں رہا۔ اسی کے قیام مکہ کے دوران ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۱ء میں اس کے خسر کا انتقال ہو گیا۔ رمضان ۸۰۵ھ/ اپریل ۱۴۰۳ء میں اس نے مکہ کا ایک اور سفر کیا پھر زبید واپس آیا۔ جہاں ۲۰ شوال ۸۱۷ھ/ ۳ جنوری ۱۴۱۵ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی اہم اور مشہور تصنیف اس کی لغت "القاموس" ہے جسے اس نے اپنی کتاب (جو اب ضائع ہو چکی ہے) اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم (از ابن سیدہ) والعباب (از الصغانی) کے اقتباسات سے مرتب کیا تھا یہ لغت تمام عالم اسلام میں مستند مانی جاتی ہے۔ اس میں الفاظ کی کثیر تعداد موجود ہے۔ دوسری تصنیفات میں نزہۃ الاذہان (تاریخ اصفہان) طبقات الحنفیہ، طبقات الشافعیہ، روضۃ الناظر (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سوانح) التحفۃ العنبریۃ (سیرت رسول کریمؐ) البُلغہ (آئمہ نحو و لغت کے سوانح) شامل ہیں۔

فیروز دہلوی

۔ برصغیر کے عالم بے مثل، جو اپنی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے علمائے ہند میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا لقب شیخ شرف الدین ہے۔ انھوں نے شیخ نظام الدین اولیا سے اخذ فیض کیا۔ دیوگیر میں ان کا انتقال ہوا۔

فیروز شاہ بن اسلام شاہ

۔ خاندان سوری کا تیسرا بادشاہ۔

شیر شاہ سوری کا پوتا۔ اپنے باپ اسلام شاہ کی وفات کے بعد امرائے سلطنت کے مشورہ سے دس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اسلام شاہ کی بیگم بی بی بائی کا بھائی مبارز خان بھی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جس کا احساس خود اسلام شاہ کو اپنی زندگی میں بھی ہوا تھا۔ فیروز شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد مبارز خان سازش کے ذریعے اپنے بھانجے فیروز شاہ کو قتل کرواکر خود تخت نشین ہوا۔

فیصل اول

:۔ (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء — ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء) عراق کا بادشاہ۔

شریف حسین بن علی کے تیسرے لڑکے فیصل اوّل کی پیدائش طائف میں ہوئی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں اپنے والد کے ہمراہ استنبول گیا اور وہاں اٹھارہ سال گزارے۔ ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں اپنی چچازاد بہن حزیمہ سے شادی کی۔ اپنے والد کے ساتھ ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں مکہ مکرمہ واپس آیا اور ۱۳۳۱ تا ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۲ تا ۱۹۱۳ء میں العسیر کے ادریسی کے خلاف مہم میں حصہ لیا۔ اُس کے بعد عثمانی پارلیمنٹ کا رکن رہا۔ ترکی حکومت نے ۱۹۱۵ء میں شام کے عرب حریت پسندوں کی تحریک کو سختی سے کچل دیا تو ۱۹۰۶ء میں فیصل بھی ترکی کے خلاف عربوں کی بغاوت میں شریک ہوگیا اور دو سال تک شریف حسین کی باغی عرب افواج کی کمان کرتا رہا۔ ۱۹۱۸ء میں اُس نے شام میں عربوں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن فرانسیسیوں کی مزاحمت سے اُس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔

جولائی ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں فرانسیسیوں نے اُسے شام سے نکال دیا، لیکن اس وقت انگریزوں نے اس کی مدد کی۔ اگست ۱۹۲۱ء میں عراق نمائندگان نے اُسے بغداد کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔ آئندہ بارہ سال میں فیصل نے عراقی مملکت کے قیام اور استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے انگریزوں کے مطالبات اور مقامی آبادی کے درمیان توازن برقرار رکھا اور ملک کے نظم ونسق کو چلانے میں اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ عراق ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء میں مجلس اقوام کا رکن بنا۔

ستمبر ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء میں فیصل کا انتقال سوئٹزرلینڈ میں ہوا تو غازی اُس کا جانشین ہوا۔

فیصل ثانی

:۔ (۱۹۳۵ء — ۱۹۵۸ء)

شاہ غازی کا فرزند اور فیصل اول کا یہ پوتا بغداد میں پیدا ہوا۔ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں اپنے والد کے ایک حادثہ میں انتقال کے وقت امیر عبدالالہ کی سرپرستی میں عراق کے تخت وتاج کا مالک قرار پایا۔ اُس وقت اس کی عمر صرف چار سال تھی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ایک انگریز معلمہ نے کی۔ اعلیٰ تعلیم ہیرو سے حاصل کی۔ مئی ۱۹۵۳ء میں اُس نے باقاعدہ طور پر شاہانہ فرائض کو ادا کرنا شروع کیا۔ اپنے مختصر دورِ حکومت میں اُس نے عراق کے استحکام کیلئے کوششیں جاری رکھیں اس دوران اُسے اپنے سرپرست عبدالالہ اور معروف سیاستدان نوری السعید کی رہنمائی حاصل تھی۔ عوام میں پسند کیا جاتا تھا۔ ایک ترکی نژاد مصری شہزادی سے اس کی منگنی ہو چکی تھی کہ اچانک چند باغیوں نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ خود فیصل اُس کے چچا اور دوسرے اقارب کو ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو قتل کردیا گیا اور اس طرح سے عراق میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔

فیصل شاہ

:۔ (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء — ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء)

فیصل بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن الفیصل آل سعود، اپنے والد کے دوسرے بیٹے تھے، اپنے والد کی روضۃ النہا کے معرکہ میں فتح کے موقع پر صفر ۱۳۲۴ھ/اپریل ۱۹۰۶ء میں ریاض میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام آپ کے دادا فیصل بن ترکی کے نام پر رکھا گیا۔ فیصل بن ترکی سعودی سلطنت کے قیام پر منتج ہونے والی تحریک کے بانی رہنماؤں میں سے تھے۔ والدہ کی طرف سے شاہ فیصل کا سلسلہ نسب شیخ محمد بن عبدالوہاب سے جاملتا ہے۔ آپ کے نانا الشیخ عبداللہ بن عبداللطیف، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے اور نجد کے سب سے بڑے عالم تھے۔

دینی علوم کی تحصیل آپ نے اپنے نانا سے ہی کی۔ آپ کی والدہ امیرہ طرفہ کا انتقال آپ کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد ہوگیا تھا۔ ابتدائی تعلیم ان نامور اساتذہ سے حاصل کی جو علم وادب میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ آپ کی پرورش خالص دینی ماحول میں ہوئی، جس کے ساتھ ساتھ آپ کو سیاسی، جنگی اور معاشرتی تربیت بھی میسر آتی رہی۔ آپ نے ۱۲ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ شہ سواری کے اسرار و رموز سے بھی آگاہی حاصل کی۔ ۱۳۳۶ھ میں ۱۳ کی عمر میں والد کے ہمراہ غزوہ باطب میں شریک ہوئے۔ ۱۳۳۹ھ میں حائل کے معرکہ میں شہزاد فیصل نے اعلیٰ جنگی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ یہ محاصرہ کوئی تین ماہ تک جاری رہا۔ جنگِ عظیم اوّل کے ختم ہو جانے کے بعد ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء میں آپ کے والد نے آپکو یورپ روانہ کیا تاکہ وہاں رہ کر سیاسی تربیت حاصل کریں۔ اسی دوران آپ ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے برطانیہ بھی گئے۔ تاکہ عمائدین برطانیہ سے جنگ میں برطانیہ کی فتح کے بعد استقلالِ عرب کے لئے مذاکرات کریں۔ برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ کرزن کے نامناسب رویہ کی وجہ سے آپ ناراض ہوکر پیرس چلے گئے۔ عمائدین برطانیہ کی معذرت پر پیرس سے دوبارہ برطانیہ آ گئے۔ برطانیہ کے شاہ جارج اور ملکہ میری سے ملاقات کی۔ برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ کرزن سے حجاز اور نجد کے معاملات پر گفتگو کی۔ آپ نے برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں دارالامرا اور دارالعوام کا معائنہ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی بھی گئے۔ لندن کے دورہ کے اختتام پر آپ نے دوبارہ پیرس (فرانس) کا دورہ فرانس کی حکومت کی دعوت پر کیا۔ اس کے بعد بلجیکا کا دورہ کیا۔ یورپ کے دورہ سے واپسی کے بعد نجدی افواج کے عسیر کے معرکہ میں لشکر کے سپہ سالار تھے۔ اس معرکہ میں عظیم الشان کامیابی کے بعد ۲۱ رجادی الثانی ۱۳۴۱ھ میں ریاض واپسی پر عوام نے آپ کو عظیم سپوت کا خطاب دیا۔

۱۳۴۴ھ میں اپنے والد کے ہمراہ جدہ کے محاصرہ میں شریک تھے ۶ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ کو جدہ کی فتح کے بعد آپ کے والد عبدالعزیز کو حجاز، نجد اور ملحقہ علاقوں کا سلطان تسلیم کرلیا گیا اور شہزادہ فیصل کو ۲۸ رجادی الثانی ۱۳۴۴ھ/۱۳ فروری ۱۹۲۶ء کو حجاز کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ ۱۳ اگست ۱۹۲۶ء کو حکومتِ حجاز کا نائب السلطنت اور شوریٰ کا رکن بنایا گیا۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۷ء کو آپ نے برطانیہ کے ساتھ معاہدہ جدّہ کیا۔ اس معاہدہ کے مطابق برطانیہ نے سعودی مملکت کو مکمل طور پر تسلیم کرلیا۔ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں وزیرِ خارجہ مقرر کئے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ہی سعودی مملکت کے دوسرے ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے والے ایک خیرسگالی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے آپ نے اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، روس، ترکی، ایران، عراق اور کویت کا دورہ کیا۔ یہ دورہ تین ماہ تک رہا۔ روس میں سٹالن اور مولوٹوف سے ملاقات کی۔ روس کے ان رہنماؤں سے روس میں مقیم مسلمانوں کے حقوق اور دوسرے مسائل پر گفتگو کی۔

غیر ملکی دورے سے واپسی پر ۱۳۵۳ھ میں عسیر اور تہامہ میں متعین سعودی افواج

کے سالارِ اعلیٰ بنا کر ایک جنگی مہم پر بھیجے گئے۔ سب سے پہلے آپ جیزان پہنچے۔ میدی، حدیدہ، بیت فقیہ، زیارت اور قحیط کو فتح کیا۔ زانیقیوں، لحیہ اور مور قبائل کو اپنا مطیع بنایا۔ ادریسی کے عسیر اور تہامہ پر غارت گری کے اس موقع پر امام یمن نے عسیر اور تہامہ پر حملہ کر کے نجران کو زیر کر لیا۔ شاہ فیصل کا حملہ بھی اسی طرف جاری تھا۔ جب آپ ہدنہ پہنچے تو سردارانِ عرب نے درمیان میں آکر صلح کی بات چیت

شاہ فیصل بن عبدالعزیز

شروع کی۔ ۶ رصفر ۱۳۵۳ھ کو ایک صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے یمن نے عسیر اور تہامہ کو سعودی مملکت کا حصہ تسلیم کر لیا۔ فروری ۱۹۳۹ء میں مؤتمر فلسطین لندن میں سعودی وفد کی قیادت کی۔ ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں شہزادہ فیصل اپنے بھائی خالد بن عبدالعزیز کے ہمراہ امریکی صدر روزویلٹ کی دعوت پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دورہ پر گئے۔ واپسی پر لندن میں جارج ششم سے ملاقات کی۔

۲۵ راپریل ۱۹۴۵ء کو سان فرانسسکو میں اقوام متحدہ کے تاسیسی اجلاس میں سعودی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں اپنے بھائی امیر منصور مرحوم کے ہمراہ شام سے فرانسیسیوں کے انخلاء کے مسئلہ پر ہونے والی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں نیویارک میں اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں سعودی وفد کی قیادت کی۔ ۱۹۴۸ء میں ہی پیرس میں اقوام متحدہ کی جمعیت عامہ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۵۰ء (۱۳۷۰ھ) میں آپ نے انگلستان کے دورہ میں برطانوی وزیر خارجہ سے اپنے ملک، بحرین اور کویت کی سمندری حدود کے تعین کرنے کے مسئلہ پر گفتگو کی۔

۹ رنومبر ۱۹۵۳ء (۲ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ) میں سلطان عبدالعزیز کے انتقال پر سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو فیصل کو ولی عہد مقرر کیا گیا۔ ۱۰ راگست ۱۹۵۴ء (۱۶ رذی الحجہ ۱۳۷۳ھ) کو شاہ سعود نے علماء اور امرا کا متفقہ فیصلہ قبول کرتے ہوئے مجلس وزارت کی قیادت اپنے بھائی فیصل کو سپرد کر دی یعنی آپ سعودی عرب کے وزیر اعظم ہو گئے۔

۱۹۵۵ء (۱۳۷۴ھ) میں بندونگ کانفرنس میں سعودی وفد کی قیادت کی۔ شاہ سعود اکثر بیمار رہتے تھے اور بعض دوسری وجوہات کی وجہ سے امورِ سلطنت کی طرف کم توجہ دیتے تھے۔ اس وجہ سے سعودی خاندان کے افراد اُن کے خلاف ہو گئے۔

۲۲ رمارچ ۱۹۵۸ء کو مملکت کے تمام اختیارات مجلس وزارت نے فیصل بن عبدالعزیز کو منتقل کر دئے۔

اب آپ داخلہ، خارجہ اور مالیات اور دفاع کی وزارتوں کے سربراہ بھی ہو گئے۔ آپ کے بھائی سعود بن عبدالعزیز صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی طویل علالت کی وجہ سے امور مملکت کے ادا کرنے سے معذور ہو گئے تو ۲ رنومبر ۱۹۶۴ء کو مجلس وزراء اور مجلس شوریٰ کی قرارداد، علماء کے شرعی فتویٰ اور افراد خاندان کی تجویز پر آپ یعنی فیصل بن عبدالعزیز کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔ آپ نے اپنے برادرِ اصغر خالد بن عبدالعزیز کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ سابق شاہ سعود نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اب فیصل بن عبدالعزیز سعودی مملکت کے "میسرے با اختیار سربراہ تھے۔ شاہ فیصل نے اپنے دس سالہ دورِ حکومت میں سعودی مملکت کی کایا پلٹ دی اور اپنے "تدبر، اعتدال پسندی، سلامت روی اور محنت و لگن سے ملک کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ آپ نہایت ہی منکسر المزاج شخصیت تھے۔ عام سا لباس پہنتے۔ رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو کر مستقل تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ محل کی مسجد میں باجماعت نماز فجر ادا کرتے۔ اس سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت بھی مستقلاً کرتے تھے۔ دن کی پانچ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرتے۔ روزانہ ایک ترتیب اور "نظام" عمل سے کام کرتے تھے وہ اپنے دفتر میں تین اوقات میں کام کرتے تھے۔ چاشت سے ظہر تک، عصر سے مغرب تک اور عشاء سے رات گئے تک۔ اس دوران وہ ملاقاتیوں، دوسری حکومتوں کے سفراء، سعودی افسران، وزراء اور معاونین سے بھی ملتے تھے۔

شاہ فیصل کا دورِ حکمرانی عرب کی تاریخ میں اہم دور ہے۔ ان کے عہد میں تیل کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ انہوں نے سعودی عرب کو جہاں آج سے تیس چالیس سال پہلے بھوک، افلاس، لوٹ مار اور جہالت کا دور دورہ تھا، خوشحال ملک بنا دیا۔ انہوں نے حاجیوں کی سہولت کے لئے بہترین اور اعلیٰ انتظام کئے۔ حرمین الشریفین کی توسیع و تزئین پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا۔ ملک میں پانی کی قلت کو دور کرنے کے لئے آب رسانی کے متعدد منصوبے بنائے اور سمندری پانی صاف کرنے کے کئی پلانٹ لگوائے۔ زراعت اور باغبانی کے فروغ کے لئے ماڈل فارم قائم کروائے۔ مواصلات کی ترقی کے لئے سڑکوں کے جال بچھا دیے، ہوائی اڈے تعمیر کروائیں۔ جدّہ اور ینبوع کی بندرگاہوں کی توسیع اور اصلاح کے علاوہ مشرقی اور مغربی ساحل پر کئی بندرگاہیں بنانے کے منصوبے تیار کروائے۔ معدنیات کی دریافت اور برآمد کا کام سرگرمی سے شروع ہوا۔ ان کے دور حکومت میں چھوٹی صنعتوں کے علاوہ بھاری صنعتیں بھی قائم کی گئیں۔ انہوں نے ملکی دفاع کے استحکام پر خصوصی توجہ دی۔ سعودی افواج کو نئے سرے سے منظم کیا۔ ہوائی اڈے اور فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں اور نوجوانوں کو فوجی تربیت کے لیے پاکستان، برطانیہ اور امریکہ بھیجا گیا۔ ملک میں مروج قدیم مصری نظام تعلیم کو بدل کر جدید طرز پر سعودی نظام تعلیم اختیار کیا گیا۔ ابتدائی درجے سے کر یونیورسٹی تک تعلیم مفت کر دی گئی۔ دینی تعلیم کے نصاب میں اصلاح کی گئی۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ قائم کی گئی۔ اُن کی تجاویز پر جدہ میں، ریاض میں اعلیٰ دینی اور عصری تعلیم کے لئے جامعات (یونیورسٹیاں) قائم کی گئیں۔ ان یونیورسٹیوں میں غیر ملکی طلبا بھی تعلیم

حاصل کرتے ہیں۔ ان سب طلباء کے قیام، طعام اور تعلیم کے مصارف سعودی حکومت برداشت کرتی ہے۔ ملک میں سائنسی اور فنی تعلیم کے لئے اعلیٰ درس گاہیں قائم کی گئیں۔ ظہران میں پٹرولیم اور معدنیات کی یونیورسٹی بنائی گئی۔ شاہ فیصل کے عہد سے پہلے لڑکیوں کے لئے علیحدہ تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے الگ درس گاہیں تعمیر کروائیں۔ مختلف شہروں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کالج بنائے گئے۔ عوام کو طبی سہولتوں کی فراہمی کے لئے مختلف شہروں اور قصبات میں ہسپتال تعمیر کروائے۔ ٹرانسپورٹ اور ذرائع آمدورفت کیلئے سہولتیں دی گئیں۔

شاہ فیصل شروع سے ہی مسلم ممالک کے اتحاد اور یک جہتی کے داعی تھے اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی میں بھرپور جدوجہد کی۔ مسلم ممالک کے کثرت سے دورے کئے اور غیر مسلم ممالک کے بھی دورے کئے تاکہ مسلم حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ تخت سلطنت سنبھالنے کے بعد وہ کسی لمحہ چین سے نہیں بیٹھے۔ ان کے مختلف ممالک کے دوروں سے اس بات سے بخوبی آگاہی ہو سکتی ہے کہ شاہ فیصل امت مسلمہ کے درد میں ہر وقت تڑپتے رہتے تھے۔

۱۹۶۴ء ۵ ستمبر کو آپ نے اسکندریہ میں ہونے والی عرب سربراہوں کی کانفرنس میں سعودی وفد کی قیادت کی اور ۵ اکتوبر کو قاہرہ میں ہونے والی غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۶۵ء اپریل میں رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت شاہ فیصل نے کی اور اپنے خطبے میں تضامن اسلامی کی دعوت دی۔ اور مسلمانوں کے اسلام کے نام پر اتحاد کرنے پر زور دیا۔

۱۳ ستمبر کو آپ عرب سربراہوں کی کانفرنس میں شریک ہوتے جو دارالبیضا میں منعقد ہوئی۔ عالم اسلام کے باہمی اختلافات ختم کرانے اور اس کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۶۵ء میں شاہ فیصل نے اسلامی ملکوں کا وسیع دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور اس کا آغاز انہوں نے ایران سے کیا۔ چنانچہ وہ ۸ دسمبر کو ایران پہنچے۔ دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے باہمی مذاکرات کے بعد اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت پر زور دیا۔ اور مشترکہ اعلان میں شاہ فیصل نے تضامن اسلامی کی تجویز کی پوری تائید کی۔

۱۹۶۶ء ۱۷ جنوری کو شاہ فیصل اردن پہنچے۔ اردن کے شاہ حسین سے تضامن اسلامی کے بارے میں بات چیت کی۔ اور شاہ حسین نے ان کے اس اتحادِ عالم اسلامی کے منصوبے کی بھرپور حمایت کی۔ ۱۲ فروری کو مرحوم شاہ اس سلسلے میں سوڈان گئے اور سوڈان کے اس وقت کے صدر اسمٰعیل ازہری سے اس موضوع پر بات چیت کی۔ انہوں نے بھی آپ کے اس پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ پھر اسی سلسلے میں آپ ۱۹ اپریل کو پاکستان کے دورے پر گئے اور پاکستان کے صدر ایوب خان سے بات چیت کے بعد مشترکہ اعلان میں دونوں رہنماؤں نے عالم اسلامی کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔

۲۹ اگست کو آپ ترکیہ پہنچے۔ ترک رہنماؤں نے بھی عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ شاہ نے وہاں بھی یہ اعلان کیا کہ ہماری اصلی قوت دین اسلام کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے میں ہے۔ ۴ ستمبر کو مراکش کے دورے پر گئے۔ اور اتحاد عالم اسلامی کے مسئلہ پر شاہ حسن ثانی کی تائید حاصل کی۔ ۹ ستمبر کو تیونس پہنچے اور اس موقع پر صدر حبیب بورقیبہ نے تضامن اسلامی کی تجویز کی حمایت کی۔ ۱۵ ستمبر کو افریقہ کے ایک ملک مالی پہنچے۔ مالی کے صدر سے مذاکرات کے بعد مشترکہ اعلان کے ذریعہ دونوں رہنماؤں نے اتحادِ اسلامی کے لئے متحدہ کوشش کرنے کا اعلان کیا۔

اسی طرح ۱۹۶۶ء کا یہ سال اس کوشش میں گزرا کہ اسلامی ممالک کو زیادہ سے زیادہ قریب کرکے ان کی قوتوں کو یکجا کیا جائے۔ شاہ کے تدبر اور فراست کا اثر تھا کہ جن جن ملکوں کا دورہ کیا وہاں کے سربراہوں نے اتحادِ اسلامی کے لئے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

۱۹۶۷ء کئی یورپی ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد آپ ۴ جون یعنی عرب اسرائیل جنگ سے ایک دن پہلے سعودی عرب پہنچے۔ یورپ کے اسی دورے کے دوران شاہ فیصل نے عرب ملکوں کو آگاہ کیا تھا کہ اسرائیل ان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لئے انہیں اس سے پہلے ہی حملہ کر دینا چاہیئے۔ بعد کے واقعات نے ان کی اس پیشن گوئی کو درست ثابت کیا۔

۱۰ جون کو شاہ نے اسرائیلی جارحیت کی وجہ سے امریکہ اور برطانیہ پر تیل کی بندش کا اعلان کیا۔ ۲۹ اگست کو خرطوم میں ہونے والی عرب سربراہوں کی کانفرنس میں شاہ فیصل نے یہ مجاہدانہ اعلان کیا کہ اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۰ ستمبر کو شاہ صومال کے دورے پر پہنچے اور اس وقت کے صدر عبدالرشید شیرمارکے سے اتحاد عالم اسلامی کے موضوع پر بات چیت کی۔ اور دونوں رہنماؤں نے اس پر مکمل اتفاق کا اظہار کیا۔

۱۹۶۸ء اپریل میں آپ امیر کویت کی دعوت پر کویت گئے اور دونوں رہنماؤں نے باہمی تعاون کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔

۱۹۶۹ء ۲۲ دسمبر کو پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے آپ رباط پہنچے۔ جس سے مسلم ممالک میں باہمی تعاون اور مفاہمت میں بہت اضافہ ہوا ۸ ستمبر کو قاہرہ پہنچے اور جمال عبدالناصر سے پانچویں عرب سربراہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے بات چیت کی۔ ۲۰ دسمبر کو رباط کی پانچویں عرب کانفرنس میں یہ مومنانہ اعلان کیا کہ جب بھی جنگ ہوگی۔ اس کے لئے سعودی عرب کا پورا میزانیہ وقف ہوگا۔ اور رمضان کی جنگ میں انہوں نے ایک سچے مومن کی طرح اپنا یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔

۱۹۷۰ء ۷ جون کو ملائیشیا کے سرکاری دورے پر پہنچے اور اسلامی ملکوں کے جنرل سیکرٹری کے لئے تنکو عبدالرحمٰن کا نام پیش کیا۔ ۱۰ جون کو وہاں سے انڈونیشیا چلے گئے اور صدر سوہارتو سے اسلامی ملکوں کے مابین تعاون کی ضرورت کے بارے میں بات چیت کی ۱۳ جون کو افغانستان کا دورہ کیا۔ اور ۱۵ جون کو الجزائر کے صدر بومدین سے مذاکرات کئے۔ اور ۲۱ جون کو جنیوا میں اقوام متحدہ کے اس وقت کے جنرل سیکرٹری او تھانٹ سے ملاقات کی۔ اور ۲۳ ستمبر کو قاہرہ میں ہونے والی اس عرب سربراہ کانفرنس میں شرکت کی جو اردن اور فدائین کے درمیان اختلافات ختم کرنے کے لئے بلائی گئی تھی۔

۱۹۷۱ء ۱۶ مارچ کو آپ مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہوئے راستے میں تہران تھوڑی دیر کے لئے رکے اور شاہ ایران سے مختصر ملاقات کی۔ ۱۷ مارچ کو تائیوان روانہ ہو گئے۔ ۲۰ مارچ کو جاپان کے دورے پر ٹوکیو روانہ ہوئے۔ ۲۷ مئی کو صدر نکسن کی دعوت پر امریکہ پہنچے۔ ۳۱ مئی کو فرانس کے دورے پر پیرس گئے اور جون میں واپس جدّہ پہنچے۔

۱۹ جون کو صدر سادات کی دعوت پر مصر کا ایک ہفتہ کا دورہ کیا۔ ۲۸ جولائی کو اردن کے شاہ سے ملاقات کی اور اس کے بعد اردن اور فلسطینی فدائین میں اختلافات ختم کرانے کے لئے ثالثی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۲۷ ستمبر کو لبنان کے

صدر کی دعوت پر بیروت گئے۔ اور صدر فرنجی سے کامیاب مذاکرات کئے۔

۵ر دسمبر کو شاہ فیصل مرحوم نے پاکستان کے خلاف بھارتی جارحیت کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ اس جارحیت کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کیا جائے۔ اور اسلامی عقیدے کی بنیادوں کو کمزور کیا جاتے۔

۱۹۷۲ء کے آخر میں آپ نے کئی افریقی ممالک کا دورہ کیا اور انھیں مسلمانوں کے خلاف صہیونی سازشوں سے آگاہ کیا۔ اس دوران آپ نے یوگنڈا، چاڈ، سینی گال موریطانیہ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں آپ نے جہاں اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت پر زور دیا وہاں افریقی ممالک کو اسرائیل سے ہر قسم کے تعلقات پر نظر ثانی کے لئے کہا۔ اس دورے کا نتیجہ چند دنوں کے بعد سامنے آگیا۔ جب اکثر افریقی ممالک نے اسرائیل سے ہر قسم کے تعلقات ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک سعودی عرب افریقی ممالک کی ہر میدان میں مدد کر رہا ہے۔

۱۹۷۴ء فروری میں آپ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور آئے جس میں ۳۷ اسلامی ملکوں نے شرکت کی۔ اکتوبر میں شاہ فیصل نے رباط میں ہونے والی ساتویں عرب سربراہ کانفرنس میں شرکت کی۔ جس میں اسرائیل کے خلاف عربوں کا مشترکہ مؤقف اختیار کیا گیا۔ اس کانفرنس کے بعد آپ الجزائر میں قومی دن کی تقریبات میں شرکت کے لئے وہاں گئے۔ اس کے علاوہ گذشتہ سالوں میں مختلف اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے آپ سے ملاقات کے لئے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ آپ کی شہادت سے چند دن پہلے جن سربراہوں نے آپ سے ملاقات کی ان میں موریطانیہ کے صدر، مالی کے صدر، لیبیا کے صدر قذافی اور فلسطین کی تحریک آزادی کے سربراہ یاسر عرفات شامل ہیں۔

شاہ فیصل اسلام کی حقانیت، اسلامی نظام حیات کی برتری، مسلمانوں میں اتحاد و اخوت کی ضرورت اور اسلامی تہذیب اور اقدار کی پاکیزگی پر شدت سے ایمان رکھتے تھے۔ عربوں کی سیاسی سربلندی کے لئے وہ اسلامی نظریات کے فروغ اور اتحاد بین المسلمین کو ضروری قرار دیتے تھے۔ مسلم ممالک میں اقتصادی تعاون کے فروغ کے لئے اسلامی بنک کا قیام ان کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کی وجہ سے اسلامی دنیا کا مرکز ثقل ریاض میں منتقل ہو گیا تھا اور ہر مشکل وقت میں ان سے مشورہ کرنا، تمام مسلم حکمران ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے فلسطینی فدائین اور اردن کے شاہ حسین میں مصالحت ہوئی عراق اور ایران کے قدیم تنازعات ان کی کوششوں سے ختم ہوئے۔ فلپائن، بھارت، ایتھوپیا اور دوسرے غیر مسلم ممالک بالخصوص مسلم اقلیتوں کو ان کی خصوصی توجہ اور ہمدردی حاصل تھی۔ شاہ فیصل پاکستان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ انہوں نے ہر مصیبت میں اور مشکل وقت میں پاکستان کی بھرپور مدد کی۔ ان کی زر پاشیوں سے عرب و عجم دونوں مستفید ہوتے تھے۔ انہیں اشاعتِ اسلام سے خصوصی دلچسپی تھی۔ یورپ اور افریقہ میں کئی مساجد اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں کی تعمیر اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ شاہ فیصل کی کوششوں سے اسلامی ممالک میں احیائے دین کا جذبہ اور اتحاد بین المسلمین کی ضرورت کا احساس ہوا اور مختلف ممالک میں تحریکی انداز میں کام شروع ہوا۔ ایسی ہر تحریک کو شاہ فیصل کی سرپرستی حاصل تھی۔ شاہ فیصل کی ان تھک محنت سے جزیرہ نمائے عرب کو عالمی سیاست میں اہم مقام حاصل ہوا۔

قومیت، وطنیت اور لادینیت کی تاریکیوں میں روشنی کا یہ مینارۂ نور ۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ/۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو ایک ظالم کے ہاتھوں بجھ دیا گیا۔ اُن کے بھتیجے شہزادہ فیصل بن ساعد نے بھرے دربار میں ان پر کئی گولیاں چلائیں اور خادم الحرمین شاہ فیصل زخموں کی تاب نہ لاکر ریاض ہسپتال میں چل بسے اس حادثہ جانکاہ پر ہر درد مند مسلمان کی آنکھ نم تھی۔ دنیا کے ہر حصے میں اس حادثہ پر سوگ منایا گیا۔ شاہ فیصل شہید کو ریاض میں ہی دفن کیا گیا۔ شاہ فیصل مرحوم کی اولاد میں آٹھ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں کے نام عبداللہ، محمد، خالد، عبدالرحمان، سعود، سعد، بندر اور ترکی ہیں۔ ان میں سے سعود کو موجودہ شاہ خالد نے سعودی عرب کا وزیر مملکت برائے امورِ خارجہ مقرر کیا ہے۔ خالد بن فیصل ایک صوبے کا گورنر ہے اور باقی مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں اور سعودی مملکت کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا عبداللہ سعودی عرب کا معروف تاجر ہے۔ شاہ فیصل شہید کے بھائی خالد بن عبدالعزیز اُن کے جانشین ہوئے۔ وہ سات سال کے بعد حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے۔ ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی شاہ فہد بن عبدالعزیز سعودی عرب کی ترقی و کامرانی کے لئے کوشاں ہیں

فیض ۔ فیض کے معنی کثرت کے ہیں۔ عربی محاورہ کے مطابق اَعْطَاہُ غیضًا من فیضٍ (اُسے زیادہ مال میں سے تھوڑا سا دیا)

سیلان اور صدور کے معنی میں بھی آتا ہے اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم فلاسفہ نے بڑی عجیب بحثیں کی ہیں جن کے مطالعہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور وہ خالص فلسفیانہ نکتہ آرائیاں ہیں۔ جن کو فارابی، ابن سینا، غزالی، ابنِ رشد کی کتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فیض احمد بدایونی، مولانا ۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء۔۱۲۷۴ھ/۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۷-۵۸ء)

فیض احمد بن حافظ غلام احمد بن مولوی شمس الدین بن مولانا محمد علی بدایونی۔ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جملہ علوم نقلیہ وعقلیہ اپنے ماموں مولوی شاہ فضل رسول سے حاصل کئے۔ اپنے نانا شاہ عبدالمجید سے بیعت تھے۔ مولانا رحمت کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان جو مناظرہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں ہوا اس میں مولانا فیض احمد بدایونی کی سرگرمیوں کو کافی دخل تھا۔ مولانا اس زمانہ میں آگرہ میں بورڈ آف ریونیو میں سر رشتہ دار تھے۔ اسی دور میں آپ نے ہدایت نامہ مالگزاری جلد دوم کا اُردو ترجمہ سر ولیم میور کے ہمراہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو ڈاکٹر وزیر خان کے ہمراہ دہلی پہنچے اور بادشاہ دہلی کی طرف سے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ سقوطِ دہلی کے بعد روہیل کھنڈ کا رخ کیا بدایوں و بریلی وغیرہ میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اودھ کی طرف نکل گئے۔ اس کے بعد ان کی موت کا پتہ نہیں کہاں ہوئی۔ اس لیے بعض روایات کے مطابق ان کی شہادت ۱۸۵۸ء اور ۱۸۵۷ء میں ہوگئی اور بعض لوگ اس تاریخ وفات کو نہیں مانتے۔

مولانا کی تصانیف میں ایک رسالہ تعلیم الجہل ہے جو انھوں نے بشیر الدین قنوجی کے رسالہ تفہیم المسائل کے جواب میں لکھا ہے۔ ہدایت حکمت کی شرح صدرا پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ ان کے علاوہ مجموعہ شعر، قصائد عربیہ موسومہ بہ ہدیۃ درویہ ان کے ادبی کمالات کا نمونہ ہے۔ اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ عربی نثر کے فقرے ہیں۔ اسی طرح ایک ہزار ایک سو گیارہ عربی اشعار شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں ہیں ۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے رسوا تخلص رکھتے تھے۔

فیض الحسن، صاحبزادہ، آلومہاروی ۔ (ولادت ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء)

آلو مہار ضلع سیالکوٹ کے گدی نشین جناب سید محمد حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میں قرآن مجید مولانا لطف اللہ اکرنپوری سے، عربی اور فارسی کی کتب مولانا حبیب اللہ سنبھلی سے پڑھیں۔ میٹرک کے بعد مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں بھی تعلیم حاصل کی۔ والد کی وفات پر مسند ارشاد پر بیٹھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قیادت میں احرار کے سٹیج سے قادیانی نبوت کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ اپنے زور خطابت خوش بیانی اور قادرالکلامی کی وجہ سے پنجاب کے علاوہ پورے ہند میں معروف ہوگئے۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۰ء میں گرفتار ہوئے۔ تحریک آزادیٔ ہند میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۸ء تک آلو مہار میں رہے۔ اس کے بعد گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کی۔ قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام سے علیحدگی اختیار کرکے علماء اہلسنت کی تنظیم کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ مولانا ابوالحسنات قادری کی وفات کے بعد جمعیت علمائے پاکستان کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں مجلس عمل کے اہم رکن تھے۔ مارشل لاء حکام نے آپ کو گرفتار کیا۔ بعد میں ایوب خان کے دورِ حکومت میں ان کی کھلم کھلا حمایت کی

فیض الحسن سہارنپوری، مولانا۔ (۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء - ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء)

برصغیر میں عربی ادب کے امام، محلہ ولایت شاہ سہارنپور (یوپی بھارت) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن کھیل کود میں گزرا اور اس دوران ہوائی تیر اندازی کرتے رہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ان تمام مشاغل سے اکتا گئے۔ تحصیل علم کی طرف توجہ کی۔ آپ کے والد خلیفہ علی بخش نے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں آپ کو پڑھائیں۔ آپ کے والد عربی فارسی کے عالم تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ محلہ شاہ ولایت کے ایک معزز گھرانے میں آپ کی شادی ہوئی۔ مزید تحصیل علم کے لیے دہلی گئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور دہلی اور شاہ احمد سعید مجددی سے اکتساب علم کیا۔ آخوند صاحب ولایتی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی سے معقولات، ادب اور فلسفہ کے علوم سیکھے۔ متذکرہ صدر چاروں عالم اپنے وقت کے جلیل القدر استاذ اور فاضل شخصیات میں سے تھے۔ آپ نے مشق سخن مولوی امام بخش صہبائی سے کی۔ برصغیر کے مشہور شعراء شیفتہ، مومن، ذوق اور غالب سے آپ کی کافی صحبت رہی۔ طب کی تعلیم حکیم امام الدین شاہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد رامپور اور لکھنؤ کے معروف علماء اور اساتذہ سے فقہ، اصول، معانی اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ اکیس بائیس سال کی عمر میں واپس دہلی آئے۔ اس دوران ان کی شہرت اس مقام تک پہنچ چکی تھی کہ سرسید احمد خان نے مقامات حریری کے چند حصے اور معلقہ کے چند قصائد مولانا فیض الحسن سے پڑھے۔

۱۸۵۷ء میں دہلی میں فسادات شروع ہونے پر مولانا سہارنپور چلے آئے۔ وہاں کچھ عرصہ حکمت کا کام کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ ۷/اکتوبر ۱۸۷۰ء کو اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

عربی ادب میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اورینٹل کالج کے عربی رسالہ "شفاء الصدور" کے مدیر بھی آپ ہی تھے۔

مولانا فیض الحسن اورینٹل کالج کی تعطیلات کے زمانہ میں اپنے وطن آتے اور وہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ سہارنپور کی جامع مسجد میں قرآن مجید کی تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا عبدالعلی، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، سہارنپور کے اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران مولانا مطب بھی کیا کرتے تھے۔ مولانا نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو بچپن میں ہی انتقال کر گئی۔ پہلی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے، اور اپنے شیخ سے بڑی عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ برصغیر میں مولانا فیض الحسن عربی ادب کے اکابر اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی ان کے اعلیٰ علمی مقام کی شہادت اس طرح دیتے ہیں، "مولانا اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔"

مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ شرح سبعہ معلقہ (عربی، فارسی، اردو)
۲۔ شرح حماسہ۔ ۳۔ رشیدیہ۔
۴۔ فیضیہ (اردو میں علم مناظرہ کی کتاب)
۵۔ دیوان حسان کی ترتیب
۶۔ التعلیقات علی الجلالین۔ ۷۔ تحفہ صدیقیہ
۸۔ عروض المفتاح۔ ۹۔ حل ابیات بیضاوی۔
۱۰۔ شرح مشکوٰۃ المصابیح ۱۱۔ دیوان الفیض
۱۲۔ ریاض الفیض۔

مولانا فیض الحسن کا انتقال اکہتر سال کی عمر میں ۶/فروری ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) کو لاہور میں ہوا۔ آپ کی میت کو آپ کے آبائی وطن سہارنپور کے خاندانی قبرستان درۂ آلی میں سپرد خاک کیا گیا۔

فیض اللہ افندی۔

مفتی ارزروم کا بیٹا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد قسطنطنیہ چلا گیا۔ شیخ الاسلام دانی افندی کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ اپنے خسر کے ذریعے محمد رابع کے دربار سے وابستہ ہوا۔ ۱۰۸۰ھ میں شہزادہ مصطفیٰ اور ۱۰۸۹ھ میں شہزادہ احمد کا اتالیق مقرر ہوا۔ سلطان محمد رابع کی معزولی کے بعد سلیمان ثانی کے عہد میں ۱۲/ربیع الاول ۱۰۹۹ھ/۱۶/جنوری ۱۶۸۸ء کو شیخ الاسلام مقرر ہوا۔ لیکن اسی سال اپریل میں معزول کرکے ارزروم میں جلاوطن کر دیا گیا۔ مصطفیٰ ثانی نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے اتالیق کو بلاکر ۱۱/شوال ۱۱۰۶ھ/۱۵/مئی ۱۶۹۵ء کو شیخ الاسلام بنادیا۔ اس کا سلطان پر کافی اثر تھا اور اس نے سلطان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے بیٹوں کے لیے اعلیٰ عہدے حاصل کیے۔

۱۳/ربیع الاول ۱۱۱۵ھ/۲۷/جولائی ۱۷۰۳ء میں سلطان کے خلاف برپا کی گئی ایک سازش کا شکار ہو کر معزول ہوا۔ باغیوں نے اُسے کئی روز تک اذیتیں دینے کے بعد ۱۰/ربیع الآخر/۲۴/اگست کو قتل کر دیا۔

فیض اللہ تیراہی، خواجہ۔

آپ کی ولادت علاقہ تیراہ کے مقام تیرئی میں ہوئی آپ کے والد خان محمد جو کوہاٹ کے مضافات میں شادی خیل نامی گاؤں میں درس علوم دیا کرتے تھے۔ اپنے والد سے ہی فیض اللہ تیراہی نے تعلیم حاصل کی۔ حضرت شاہ عیسیٰ ولیؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ حافظ سید جمال اللہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ عرصۂ طویل جو کہ بعض روایات کے مطابق ۲۵ یا ۳۰ سال ہے، وطن سے باہر رہے۔ اور اس مدت کا اکثر حصہ اپنے شیخ حافظ جمال اللہ کی خدمت میں گزارا۔ آپ نے دو شادیاں کیں۔ دوسری بیوی قاضی ڈوڈہ شریف کی لڑکی تھی۔ آپ ایک بہت بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔

آپ نے ۱۲۳۵ھ میں اور بعض اقوال کے مطابق ۱۲۴۵ھ میں وفات پائی اور تیرئی میں ہی دفن ہوئے۔

فیض عالم صدیقی: ممتاز محقق، عالم دین، اہل قلم اور تحریک آزادئ کشمیر کے سرگرم راہنما۔ ۱۸؍اپریل ۱۹۱۸ء کو فتح پور کے مضافات راجوری (مقبوضہ کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قاضی محمد دین تھا جو علاقے کی معروف شخصیت تھے۔ ابتدائی تعلیم فتح پور میں حاصل کی۔ مزید تعلیم پنجاب میں حاصل کی۔ قرطاس و قلم سے تعلق بڑی چھوٹی عمر میں ہی ہوگیا تھا۔ چنانچہ اسی دوران آپ نے کشمیر کے جرائد 'چاند'، 'حق'، 'جاوید'، 'پاسبان'، 'ملت'، 'جواہر' اور 'الاصلاح' وغیرہ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ بعد میں یہ سلسلہ آپ کی سیاحت کے باعث منقطع ہوگیا۔ ۱۹۳۶ء میں آپ فوج میں بھی بھرتی ہوئے تھے۔ اس دوران آپ کو مرزائیت اور عیسائیت کا بھرپور مطالعہ کرنے کا موقع مل گیا۔ کچھ عرصہ آپ ضلع کھٹوعہ میں جو ہندوؤں کا مرکز تھا، مدرس تعینات ہوئے وہاں ہندو مذہب کا پورے انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا۔ انہی دنوں مسلم کانفرنس کے احیاء اور مسلم کاز کی تائید میں سینکڑوں مقالات لکھے۔ طب میں بھی آپ نے زبردست مہارت حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد سے ادیب کامل اور ۱۹۴۵ء میں پنجاب سے فاضل فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسی طرح طب میں بھی حکومت کی طرف سے درجہ اول کے سند یافتہ طبیب ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور معروف کشمیری راہنما چوہدری غلام عباس کے معتمد خصوصی کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کے خلوص و انہماک سے چوہدری صاحب بہت متاثر تھے۔ ان سیاسی ہنگاموں کے باوصف دینی خدمت سے غافل نہیں رہے۔ اور محض توکل علی اللہ دھریالہ جالپ ضلع جہلم میں ایک بڑی جامع مسجد اور ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ بعد میں آپ کو یہ قصبہ چھوڑنا پڑا۔ یہاں سے موضع جہلم کے محلہ مستریاں آئے۔ اور وہاں مسجد و مدرسہ تعمیر کرایا۔

مولانا فیض عالم ایک عالم و زاہد ہونے کے علاوہ ادیب بھی ہیں۔ مولانا اتحاد بین المسلمین کے بڑے خواہش مند ہیں۔ لیکن ایک محقق ہونے کے ناطے سے عظمتؑ مقام صحابہ کے شدت سے قائل ہی نہیں زبردست مبلغ ہیں۔ اسی جذبہ کی بنا پر بعض دفعہ ان کی تحریر سلف صالحین کی روش سے ہٹ جاتی ہے لیکن اس کے باوجود مسئلہ کو بڑے مؤثر انداز میں سمجھانے کے ماہر ہیں۔ ان کا طرز تحریر منفرد ہے اور اس میں شدت بھی پائی جاتی ہے۔ تحقیق کے میدان میں انہوں نے بڑے نازک مسائل پر قدم اٹھایا ہے۔ رد رفض و سبائیت ان کا خصوصی موضوع ہے۔ اس پر انھوں نے سینکڑوں مقالات لکھے۔ ان کی باقاعدہ تصنیف "اختلاف امت کا المیہ" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی تو گویا فکر و نظر کے ساکن تالاب میں تموج پیدا ہوگیا اور معلوم ہوا کہ [illegible] صاحب نے جامد تقلید کا جوا اپنی گردن سے اتار دیا ہے۔ ان کی کتاب کا حصہ دوم رفض کے رد میں ہونے کی وجہ سے سابقہ حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ ان کی تصنیفات میں سے تاریخ علیہ کے علاوہ مقام صحابہ، واقعہ کربلا۔ رسولؐ۔ بنات رسولؐ، شہادت ذوالنورین، مشکوٰۃ شریف کے فوائد، تو یہ پہ ایک نظر، خلیفہ مروان بن الحکم، سلطان ٹیپو، افادات بگش، مختصر تاریخ راجوری، حقیقت مذہب شیعہ شامل ہیں۔ "التفقہ فی الدین" نامی کتاب پر ان کا مقدمہ بذاتہٖ ایک تصنیف کا مقام رکھتا ہے۔ آجکل حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرت پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔

فیل: ہاتھی۔ یہ لفظ سورۃ فیل کی پہلی آیت میں آیا ہے، جس میں ابرہہ کی مہم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن عرب اس جانور سے واقف نہ تھے۔ کیونکہ یہ ہندوستان اور افریقہ میں پایا جاتا ہے۔

عربی کتب میں ہاتھی کا ذکر کلیلہ و دمنہ میں آیا ہے۔ ایک اور عرب مصنف جاحظ نے کتاب الحیوان میں اسکا ذکر کیا ہے۔ ہاتھی کو 'زندبیل' بھی کہا جاتا ہے۔ عرب لوگوں کے لئے یہ ایک عجیب الخلقت جانور تھا۔ ہاتھی کی جسمانی ہیئت میں خنزیر سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کی سونڈ اور لمبے لمبے دانت قابل کشش ہوتے ہیں۔ یہ سونڈ سے ناک اور ہاتھ کا کام لیتا ہے اور اسے ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے قول کے مطابق اس کے دانت جڑ سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور وزن میں دو یا تین سو من تک بھی ہو جاتے ہیں۔ حد سے زیادہ کوتاہ گردن، بڑے بڑے کان اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور مجموعی طور پر اس کی بدصورتی جاذب توجہ ہیں۔ اس کی زبان اُلٹی ہوتی ہے۔ یعنی اگلا سرا اندر کی طرف ہوتا ہے۔ یہ تیزی سے دوڑتا ہے اور پھرتی و چابکدستی سے حرکت کر سکتا ہے۔ اس کے جسم میں صرف ران اور کندھے میں جوڑ ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ لیٹ نہیں سکتا اور دیوار یا درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے سوتا ہے۔ یہ تیر بھی سکتا ہے۔ تیرتے وقت سانس لینے کیلئے سونڈ پانی سے باہر رکھتا ہے۔ اس کی پیشانی سے جو رطوبت خارج ہوتی ہے وہ مشک سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ اس کی لید مانع حمل ہے۔ اور اس کے جسم کے بعض اجزاء دواؤں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے دانت نہایت قیمتی مانے جاتے ہیں اور ان سے تزئین و آرائش کی کئی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔

ہاتھی سمجھدار اور صابر جانور ہے اور اُسے سدھایا بھی جا سکتا ہے۔ یہ اپنے آقا کو پہچان لیتا ہے اور پشت پر بیٹھے ہوئے فیل بان کے احکام کو بخوبی سمجھتا ہے۔ عام طور پر یہ خوش طبع ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی کینہ ور بھی ہوتا ہے اور بدلہ لینے کے لئے مناسب وقت کے انتظار میں رہتا ہے [illegible] نقل اتارنے میں حیرت انگیز ملکہ [illegible] ہے۔ ہاتھی پانچ سال کی عمر میں توالد و تناسل کے قابل ہو جاتا ہے۔ مستی کے دنوں میں ہاتھی میں بڑی طاقت آجاتی ہے اور وحشی جانور بن جاتا ہے۔ ہتھنی [illegible] مزاج ہو جاتی ہے۔ ہتھنی ہر سات سال بعد بچہ جنتی ہے۔ جب [illegible] تو ہاتھی سے الگ رہتی ہے۔ ہاتھیوں کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے بعض جنگلی [illegible] عمر چار سو سال سے بھی زائد ہوتی ہے۔ پکڑے ہوئے ہاتھی سو سال تک زندہ [illegible] گینڈے سے اور شیر سے بہت ڈرتا ہے۔ جنگلی ہاتھیوں کی قوت سے [illegible] شیر سے مشابہت کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یوریوں میں بند [illegible] کی آمد پر کھول دی جاتی ہیں۔ ہاتھی ان سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں [illegible] زبرق نامی چھوٹا سا جانور ہے جو ہاتھی پر اپنا پیشاب چھڑک [illegible]

مغربی ایشیا میں جنگی مقاصد کے لئے ہاتھی کثیر الاستعمال [illegible] کی جنگ میں ہاتھیوں سے کام لیا گیا۔ ہخامنشی عہد میں ایران میں [illegible] ۳۳۱ ق م میں سکندر اعظم کے مقابلہ میں داریوش سوم نے ہاتھیوں [illegible] کے یونانی فرمانروا بھی انکو کام میں لاتے تھے۔ سلوکیوں نے [illegible] میں ہاتھیوں کو استعمال کیا تھا۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں قادسیہ کی جنگ ۱۶ھ / ۶۳۶ء [illegible] کے تعلب اور جاجین بن قیس ہاتھیوں کو جنگ میں استعمال کرنے کا ذکر ملتا ہے [illegible] نے ان کے زیر بند کاٹ کر اور ہاتھیوں کی آنکھوں اور سونڈوں پر [illegible] کو روکا تھا۔ اموی اور اوائل عباسی عہد میں ہاتھیوں کا فوجی استعمال [illegible] کے پاس کافی تعداد میں جنگی ہاتھیوں [illegible] کا ذکر ملتا ہے۔ ہاتھی [illegible] میں کابل، مکران اور سندھ سے درآمد کئے جاتے تھے۔ زیادہ تر تاجپوشی کی تقریب میں بادشاہوں کی سواری کے لئے کام میں لائے جاتے تھے۔ پہلی دفعہ غزنوی سلاطین نے

ہاتھیوں کی کثیر تعداد کو جنگی مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ہاتھی کو جنگوں میں استعمال کرنے کا رواج بڑھ گیا اور خاص طور پر ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی جنگوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ سلطان سبکتگین اور محمود غزنوی نے ہندوستانی راجاؤں سے سینکڑوں ہاتھی بطور خمس مالِ غنیمت میں حاصل کئے تھے سلجوقی بادشاہوں اور مغول کے حملوں کے خلاف ہاتھیوں کو جنگ میں استعمال کیا گیا۔ موجودہ دور میں ہاتھی کا جنگی استعمال اور شاہی تقاریب میں استعمال کا رواج بھی متروک ہو چکا ہے۔

ق
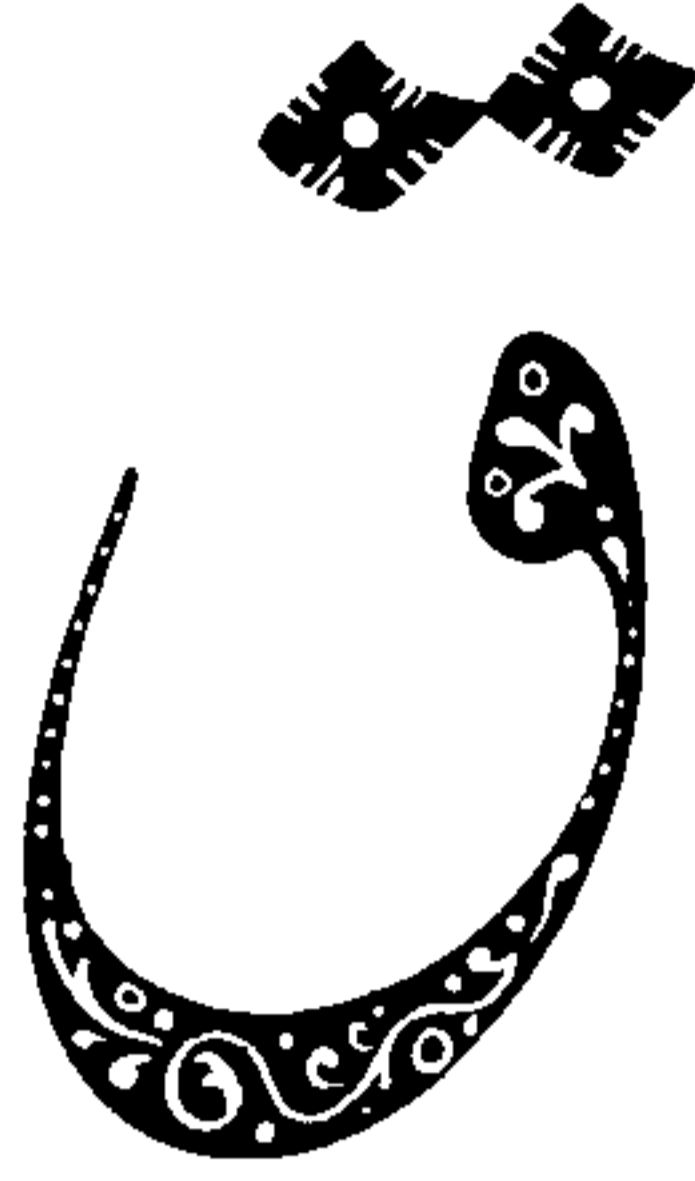
قٓ، سورہ

قٓ، سورہ: تین رکوع اور ۴۵ آیات پر مشتمل ہے۔

زمانۂ نزول۔ کسی معتبر روایت سے اس کا زمانۂ نزول پتہ نہیں چلتا۔ مگر مضامین کے اعتبار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکّہ معظمہ کا دوسرا دور ہے جو نبوت کے تیسرے سال سے شروع ہو کر پانچویں سال تک رہا۔ جب قریشِ مکہ کی طرف سے مخالفت میں شدت پیدا ہو چکی تھی لیکن ابھی ظلم وستم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ پوری سورۃ کا مضمون آخرت ہے۔ رسول کریمؐ نے جب مکہ مکرمہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کو اپنی دنیا کی زندگی میں کئے گئے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ لوگ اس بات کو انہونی کہتے تھے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب ہمارا ذرہ ذرہ منتشر ہو کر زمین میں مل جائے گا تو ہمارے جسم کو دوبارہ زندہ کرنا کیسے ممکن ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے تمہارے تعجب کرنے سے، ماننے یا نہ ماننے سے یہ حقیقت ٹل نہیں سکتی اور اسی طرح اللہ تعالیٰ خود تمہارے ہر قول وفعل کو دیکھ رہا ہے اور اس سے آگاہ ہے اور اس کے ساتھ اس نے اپنے فرشتے بھی مقرر کر رکھے ہیں جو تمہارے اعمال کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔

اس سورۃ کی چھوٹی چھوٹی آیات میں یہ مضامین بڑے اعلیٰ اسلوب سے بیان کئے گئے ہیں۔

قابض

قابض اللہ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کے معنی ہیں بندوں کی روزی محدود یعنی تنگ کرنے والا قبض وبسط دونوں باہم ضد یک دگر ہیں۔ قبض کہتے ہیں تنگی وگرفتگی کو اور بسط فراخی وکشائش کو یعنی خدا جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اور جس کی چاہتا ہے فراخ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا مشتق یوں آیا ہے: "اور اللہ تنگ دست بھی کرتا ہے اور کشایش بھی دیتا ہے" (س۔ بقرہ)۔

قاب قوسین

قاب قوسین تفسیر حقانی میں ہے کہ قاب کے معنے مقدار کے ہیں اور زمخشری کہتے ہیں کہ کمان اور نیزہ اور کوڑے اور گز اور ہاتھ کے ساتھ عرب میں اندازہ بیان کیا جاتا ہے کہ دو کمان کے فاصلہ پر یا تیر یا ہاتھ کے فاصلہ پر ہے۔ قاب کمان کی موٹھ کو بھی کہتے ہیں تو معنے یہ ہوئے کہ وہ دونوں اس قدر قریب ہو گئے کہ جس طرح دونوں کمانوں کو ملا دینے سے ان کی موٹھ باہم مل جاتی ہے اور کچھ فاصلہ نہیں رہتا۔ اور یہ قرب جسمانی کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس طرح آیا ہے: "دو کمان کی قدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم" (سورۃ النجم، آیت ۹)

قابوس

قابوس (۹۷۶ء — ۱۰۱۲ء)۔ طبرستان میں زیاری خاندان کا شاعر علم دوست بادشاہ۔ سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا۔ اس کے عہد میں بوعلی سینا اور البیرونی جیسے فلاسفر اور عالم موجود تھے اور بادشاہ ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ البیرونی نے اپنی کتاب "آثار الباقیہ" قابوس بادشاہ کے نام معنون کی۔ قابوس فارسی اور عربی دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں اس کی تعریف کی ہے۔ اس کے دربار کے امرا اس کے خلاف ہو گئے اور معزول کر دیا گیا۔ قیدخانہ میں اپنے بیٹے کی سازش سے قتل ہوا۔ خراسان جانے والی سڑک پر گورگان قلعہ کے قریب اس کا مقبرہ ہے اور ایران کے اسلامی دور کی قدیم ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ سلطان کے پوتے کیکاؤس ابن سکندر نے ایک مشہور کتاب "قابوس نامہ" لکھی ہے۔

قابیل

قابیل آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام ہے جس نے اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا تھا۔ چنانچہ ان کا حال بالتفصیل قرآن کی حسب ذیل آیتوں میں موجود ہے: "اور (اے نبی) تو ان لوگوں کو آدم کے دونوں بیٹوں کا قصہ ٹھیک طور سے سنا دے جبکہ دونوں نے اللہ کے لیے کچھ نیاز گزرانی سو ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ تب ایک نے دوسرے سے کہا میں تجھے مار ہی ڈالوں گا۔ اس نے کہا اللہ تو صرف پرہیزگاروں کی نذر قبول کیا کرتا ہے اگر تو میرے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تو تیری طرف تیرے قتل کے لیے ہرگز ہاتھ نہ بڑھاؤں گا۔ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو کائنات کا رب ہے، میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹے پھر

دوزخی ہو جاوے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔ پھر رضامند ہوا اس کا دل اپنے بھائی کے قتل پہ۔ پس اس نے مار ڈالا اپنے بھائی کو تب وہ خود برباد ہو گیا۔ پھر اللہ نے کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تاکہ اس کو دکھلائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیونکر چھپانی چاہیے وہ بولا کہ ہائے شامت! کیا میں اس کوے کے برابر بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپاتا پھر تو وہ پچھتانے لگا۔ توراۃ میں ہے کہ حوا نے قائن کو جنا (عربی میں اس کو قابیل کہتے ہیں) پھر اس کے بھائی ہابیل کو جنا اور ہابیل بھیڑ بکری کا چرواہا اور قائن کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے حاصل میں سے خداوند کے لیے ہدیہ لایا اپنی پہلوٹھی اور موٹی بھیڑ بکریوں میں سے لایا اور خداوند نے ہابیل اور اس کے ہدیہ کو قبول کیا، پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو قبول نہ کیا۔ اس لیے قائن نہایت غصہ اور ترش رو ہوا۔ اور خداوند نے قائن سے کہا۔ تجھے کیوں غصہ آیا۔ اگر تو اچھا کرتا تو کیا مقبول نہ ہوتا الخ۔ اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو قائن اپنے بھائی ہابیل پر اٹھا اور مار ڈالا۔ تب خداوند نے کہا تیرا بھائی کہاں ہے۔ اس نے کہا کیا میں اس کا نگہبان ہوں؟ پھر اس نے کہا کہ تو نے کیا کیا۔ تیرے بھائی کا خون زمین سے تجھے پکارتا ہے اور اب تو زمین سے لعنتی ہوا الخ۔ سو قائن خداوند کے حضور سے نکل گیا، اور عدن کے پورب کی طرف نود کی سرزمین پر جا رہا۔ قابیل اپنے بھائی کو قتل کر کے اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا تھا اس سے پہلے کسی کو دفناتے نہ دیکھا تھا جو دفناتا اس لیے خدا نے کوے بھیجے جو باہم لڑے اور ایک نے ایک کو مار کر پنجوں سے زمین کرید کر دبا دیا اس پر قابیل کو دیکھ کر سخت ندامت ہوئی کہ اے افسوس! میں تو اس کوے کے برابر بھی نہ ہو سکا۔ یعنی مجھے دفنانا نہ آیا۔ اور نیز کوے نے جانور ہو کر مرنے کے بعد دوسرے پر رحم کیا جو اس کی لاش کو تہِ خاک کیا۔ میں نے اپنے بھائی کے ساتھ انسان ہو کر کیا کیا۔

قاچار :- (وفات ۱۸۹۶ء) ایران کا ایک بادشاہ۔

قاچار کے دورِ حکمرانی میں اس کی عیاشیوں کی وجہ سے ایران میں کافی انتشار تھا۔

سید جمال الدین افغانی مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کے نام ایک مکتوب میں اس اس بادشاہ کے احوال کے متعلق اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"لاریب بادشاہ کا دل و دماغ کمزور ہے اس کی سیرت نہایت بُری اور دل ناپاک ہے۔ وہ ملک پر حکومت اور رعایا کی اصلاح کرنے کا ہرگز اہل نہیں۔ اس نے فاسق و فاجر اور ظالم و سیاہ باطن افراد کے ہاتھوں میں زمام اقتدار و اختیار دے رکھی ہے۔ وہ رسول کریم کی ذاتِ مبارک کا مضحکہ اڑاتا ہے اور آئینِ شریعت کی توہین کرتا ہے .... علاوہ بریں جب سے وہ کفار کے ملک سے واپس آیا ہے۔ یکسر شتر بے مہار ہو گیا ہے۔ کھلے بندوں شراب پیتا ہے ....

اُس نے ایران کا ایک طویل و عریض علاقہ اُس کے تمام منافع کے ساتھ کفار کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے .... تمباکو کی ساری کاشت مع کھیتوں کے، انگور کے تمام باغ لحاظ موم بتیاں اور شکر سازی کے تمام کارخانے کفار کو دے ڈالے ہیں یہاں تک کہ بنک بھی .... مختصر یہ کہ ساری سلطنت اعدائے اسلام کی تحویل میں دے دی ہے۔ اس کے بعد جو باقی بچا وہ روس کے حوالے کر دیا ہے ...."

قاچار شاہ نے سید جمال الدین افغانی کو گرفتار کر لیا جبکہ وہ سخت بیمار تھے اور انہیں ملک سے جلا وطن کر دیا۔ قاچار شاہ نے ملکی ذرائع آمدن کو ختم کر دیا صرف اپنی عیاشیوں پر اور دوسرے ملکوں سے قرض لے کر اپنی عیاشیوں پر صرف کرتا۔

بادشاہ کی اس نااہلی، ظلم و ستم اور سید جمال الدین افغانی کے ساتھ بادشاہ کی طرف سے کی گئی زیادتیوں پر عوام مشتعل ہو گئے اور ۱۸۹۶ء میں ایک شخص مرزا خان نے شاہ قاچار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

قادر خدا کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنی ہیں قدرت والا۔ قادر اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ اگر چاہے کرے اور اگر چاہے نہ کرے اور یہ بات نہیں کہ ضرور ہی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اس وقت قیامت قائم کرنے پر قادر ہے اگر چاہے۔ لیکن قائم نہیں کرتا۔ کیونکہ چاہتا نہیں اس لیے کہ اس کے سابق علم میں اس کا وقت مقرر ہو چکا ہے اور اس سے قادر ہونے میں کوئی خدشہ نہیں ہو سکتا۔ اور قادر مطلق اسے کہتے ہیں جسے اختراع اشیاء میں کسی دوسرے کی معاونت کی حاجت نہ ہو اور وہ اللہ تعالےٰ ہے۔ بندہ بھی قادر ہے لیکن ناقص ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ بعینہٖ موجود ہے : "کہو کہ وہی خدا اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر کی طرف سے یا تمہارے پیروں کے تلے سے کوئی عذاب تمہارے لیے نکال کھڑا کرے یا تم کو گروہ گروہ کر کے تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھائے۔" (س۔ انعام۔ ع ۸)

قادر باللہ بن المتقی :۔ خاندانِ عباسی کا مشہور فرمانروا۔ ۹۹۱ء تا ۱۰۳۱ء تک حکومت کی۔ سلطان محمود غزنوی نے بھی اس کے اقتدار کو تسلیم کیا اور "یمین الدولہ" کا خطاب حاصل کیا۔ قادر باللہ کے بعد اس کا بیٹا قائم باللہ اُس کا جانشین مقرر ہوا۔

قادریہ : صوفیاء کا ایک سلسلہ جو شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ/ ۱۱۶۶ء) کے نام سے منسوب ہونے کی وجہ سے قادریہ کہلاتا ہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مسلمانوں کے کثیر طبقہ میں پیرانِ پیر دستگیر کے نام سے معروف ہیں۔ خصوصی طور پر برصغیر پاک و ہند میں شیخ موصوف نے بغداد میں ایک رباط (خانقاہ) اور مدرسہ قائم کیا۔ شیخ کے بعد اُن کے بیٹے عبدالوہاب (م ۵۹۳ھ/۱۱۹۶ء) اور عبدالرزاق (۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء) انکے جانشین رہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے معروفِ عالم واعظوں کا مجموعہ الفتح الربانی ہے۔

قادریہ سلسلہ آہستہ آہستہ تمام علاقوں میں پھیل گیا۔ پیر اپنے جس مرید کو کامل سمجھتا تھا اسکو خرقہ دے کر دوسرے ممالک میں مذہب کی نشر و اشاعت کے لئے روانہ کر دیتا تھا۔ قادریہ سلسلہ کے پیروکار نبی کریمؐ کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی پیروی لازم سمجھتے ہیں اور دعا میں شیخ کو واسطہ بناتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ نجات اور حصولِ جنت کے لئے پیر کے ارشادات اور احکامات کی پیروی ضروری ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق ایک روایت بیان کی جاتی ہے جس سے ان کے پیروکاروں کا اُن سے عقیدت

میں غلوّ واضح ہوتا ہے۔

"جب نبی کریمؐ معراج شریف کے لئے آسمانوں پر تشریف لے گئے تو سدرۃ المنتہیٰ کے قریب نبی کریمؐ کا پاؤں پھسل گیا تو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے کندھے کے ذریعے آپؐ کو سہارا دیا۔ نبی کریمؐ کے قدموں کے نشان شیخؒ کی گردن پر بیان کئے جاتے ہیں۔" شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک وعظ میں فرمایا کہ میرے بعد تمام اولیائے کرام کی گردن پر میرے قدموں کے نشان ہونگے۔

پاک و ہند میں طریقت کے دوسرے سلسلوں کے ساتھ ساتھ "قادریہ سلسلہ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ سلسلہ حضرت شیخ محمد الحسنی جیلانیؒ شیخ عبدالقادر ثانیؒ، حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ اور حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہیؒ کے ذریعے پہنچا۔ برصغیر پاک و ہند میں کئی معروف علماء اور صوفی بزرگ اس سلسلہ سے متعلق رہے ہیں۔

قادری، شاہ عنایت۔ (۱۰۵۶ھ / ۱۱۴۱ھ)

آپ کے والد کا نام پیر محمد تھا۔ جو لاہور چھوڑ کر قصور میں آباد ہوئے تھے وہیں شاہ عنایت پیدا ہوئے۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد ظاہری علوم کی تکمیل کی۔ لاہور میں آکر شاہ محمد رضا کے درس میں شریک ہوئے۔ اُن سے بیعت کی اور منازل سلوک طے کیں۔ اپنے مرشد کے حکم پر واپس قصور چلے گئے۔ اور وہاں درس شروع کیا۔ آپ کے درس میں تاریخ کی دو نامور شخصیات وارث شاہ اور بلھے شاہ بھی شریک رہے۔ آپ کے درس و تدریس کے سلسلے کی مقبولیت دیکھ کر حسین خاں والیٔ قصور آپ کو اپنی سیاست کے لیے خطرہ سمجھنے لگا۔ بالآخر آپ دوبارہ لاہور چلے آئے اور یہاں آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کی درس گاہ میں قرآنی علوم و فنون، تفسیر، فقہ کے علاوہ تصوّف کی معروف کتب مثنوی روم، ابن العربی کی فصوص الحکم اور دیوانِ حافظ کو بھی نصابی کتب کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا۔

آپ سلسلۂ قادری شطاری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے محفلِ سماع کا خصوصی اہتمام کرتے تھے جس میں خواجہ حافظ، احمد جام، مُلّا محمد شیریں۔ فخرالدین عراقی، مُلّا شاہ بدخشانی، شمس تبریز اور مولانا روم کا کلام اُس وقت کے نامور قوالوں سے سنا جاتا۔

آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ نے کنز الدقائق کی شرح لکھی۔ غایت الحواشی کے علاوہ کئی دوسری تصانیف بھی ہیں۔

قادری، عبدالسلام بن الطیّب:۔ (۱۰۴۸ھ — ۱۱۱۰ھ)

مغرب کا ایک مؤرخ۔ فاس میں پیدا ہوا۔ ابتدائی دینی تعلیم وہاں ہی حاصل کی دو مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کی تصانیف "العرف العاطر فی من بفاس من ابناء الشیخ عبدالقادرؒ" اور "الدر السنی فی من بفاس من اہل النسب الحسنی" ہیں۔ ۱۱۱۰ھ میں فاس میں ہی انتقال ہوا۔

قادری، محمد بن الطیّب:۔ (۱۱۲۴ھ — ۱۱۸۷ھ / ۱۷۱۲ء — ۱۷۷۳ء) اہل فاس کا ایک

مؤرخ جس نے ابن عساکر کی کتاب "ودحۃ الناشر" کا تکمہ "نشر المثانی فی تراجم اہل القرن الحادی عشر والثانی" کے نام سے لکھا۔

قادسیہ:۔

الحیرہ کے قریب وہ مقام جہاں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے زیرِ فرمان بیس ہزار کے مختصر لشکر کے ساتھ ایرانی فوج کے ڈیڑھ لاکھ کے لشکر کو شکست دی۔ قادسیہ اور مدائین کی فتح کے بعد مملکتِ عراق کی باقاعدہ تسخیر عمل میں آئی۔

قادسیہ جنگ:۔

حضرت عمر فاروقؓ تیسرے خلیفہ راشد کے عہد میں مسلمانوں نے کئی علاقوں کو فتح کیا۔ ایران کے تمام علاقے بھی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مسلمانوں نے فتح کئے اور اسلام کے پرچم کو مجوسیوں کے اس علاقہ فارس میں لہرایا۔

مسلمانوں کے لشکر کی ایرانی فوج سے برتری جنگ کسکر میں ثابت ہو چکی تھی مسلمانوں کے ہاتھ باقشیا کی فتح کے بعد ایرانی بڑے غیض و غضب میں تھے۔ دارالمہام رستم نے امرائے سلطنت کے مشورہ سے ایک لشکر عظیم تیار کیا۔ اس لشکر میں تین سو جنگی ہاتھی بھی تھے۔ دریائے فرات کے کنارے ایرانیوں اور مسلمانوں کا آمنا سامنا ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ابو عبیدؓ سپہ سالار لشکر کی شہادت کے بعد انکے سات جانشین سپہ سالار بھی شہادت پا گئے اور مثنیٰؓ نے لشکر اسلام کی قیادت سنبھالی، لیکن اس جنگ میں مسلمانوں کو عزیمت اٹھانا پڑی۔ جنگ فرات میں چار ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

مسلمانوں نے اس کا بدلہ بویب کے مقام پر ایرانیوں کو عبرتناک شکست دے کر اتارا۔ جنگِ بویب کے بعد سرحد سے دجلہ تک سارے علاقے میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

ایرانی فوجوں کی اس شکست فاش سے ایران بھر میں کہرام مچ گیا۔ امرائے سلطنت نے ملکہ کو تخت سے اتار کر شاہی خاندان کے ۲۱ سالہ یزدگرد کو حکمران بنایا۔ بڑے زور شور سے مسلمانوں سے مقابلہ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے پہلے مثنیٰؓ کے نام حکم بھیجا کہ عراق اور مدینہ کے درمیان آدھے راستے پر ادھر رہنے والے ربیعہ اور مضر کے قبیلوں کو بلا کر ایک زبردست فوج تیار کرو۔ پھر تمام عمّال حکومت کے نام ہر قبیلے سے جہاد کے لئے آدمی دینے کے احکام صادر کئے۔ ملک کے گوشے گوشے سے غازیانِ اسلام جوق در جوق آنے شروع ہوئے اور چند ہی روز کے بعد مدینہ میں ہزارہا فرزندانِ توحید جمع ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے بطریق احسن فوج تیار کی اور سپہ سالاری کی باگ خود ہاتھ میں لے کر روانہ ہونے لگے۔ حضرت علیؓ کو طلب کر کے مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور خود فوج کے ساتھ روانہ ہو کر چشمۂ ضرار پر قیام کیا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا۔ آپ کا خود میدانِ جنگ میں جانا مناسب نہیں۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ کے لئے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا تو کثرتِ رائے امیر المومنینؓ کی طرف تھی لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے آگے بڑھ کر کہا۔ میں اس رائے کے خلاف ہوں۔ اس لئے کہ کسی سردار کو جنگ میں شکست ہو تو امیر المومنینؓ آسانی سے اس کا مداوا کر سکتے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ خود امیر المومنینؓ کو میدانِ کارزار میں کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اس کا تدارک مشکل ہو جائے گا۔ اب تمام اکابر صحابہؓ کو جمع کیا گیا۔ حضرت علیؓ بھی مدینہ سے بلوائے گئے اور بالاتفاق قرار پایا کہ حضرت فاروق اعظمؓ خود تشریف نہ لے جائیں اس کے بعد سپہ سالار کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا تو قرعۂ فال حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام پڑا۔ حضرت عمرؓ نے سعدؓ کو سپہ سالار اعظم بنا کر مناسب ہدایت دینے کے بعد بیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ اس لشکر میں تین سو بیعت الرضوان کے صحابی اور ستر شریک بدر اصحاب تھے۔ حضرت سعدؓ ابھی منزل ثعلبہ میں تھے کہ

قادسیہ جنگ

انہیں حضرت عمرؓ کا یہ فرمان ملا۔ ”قادسیہ کی طرف قدم بڑھاؤ۔ اور وہاں پہنچ کر یوں مورچہ بندی کرو۔ کہ آگے فارس ہو اور پیچھے عرب کے پہاڑ“۔ حضرت سعدؓ حکم کی تعمیل میں قادسیہ پہنچ گئے۔ اور دو مہینے تک ایرانی لشکر کی آمد کا انتظار کیا۔

قادسیہ میں اسلامی لشکر کے قیام کی خبریں پایۂ تخت ایران میں پہنچیں۔ تو یزدگرد شاہِ ایران نے اپنے وزیرِ جنگ رستم کو ایک عظیم الشان لشکر لے کر عازمِ قادسیہ ہونے کا حکم دیا۔ رستم ڈیڑھ لاکھ سرباز بہادروں کی جرّار فوج لے کر روانہ ہوا۔ جو زبردست جنگی سامان سے لیس اور نشۂ انتقام میں چُور تھی۔ حضرت سعدؓ نے ایرانیوں کی بے پناہ جنگی تیاریوں کے متعلق خلیفۂ وقت کو اطلاع دی۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا۔ کہ دشمن کی کثرتِ فوج اور اسلحۂ جنگ کی زیادتی سے ہرگز خوف نہ کھاؤ اور اللہ ہی سے مدد مانگتے رہو اور لڑائی سے پہلے اتمامِ حجّت کے طور پر چند موزوں ترین آدمیوں کی سفارت تبلیغِ اسلام کے لئے دربار ایران میں بھیجو۔

حضرت سعدؓ نے حضرت عاصمؓ بن عمر اور گیارہ دوسرے حضرات کو مدائن کی طرف روانہ کیا۔ دربارِ ایران میں پہنچ کر انہوں نے یزدگرد کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم روئے زمین سے شرک کا نام و نشان مٹانے اور توحید کا کلمہ پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے اس دین میں داخل نہیں ہونا چاہتا۔ تو وہ جزیہ دے اور اگر ان دونوں باتوں کو تسلیم نہیں کرتا تو جنگ کے لئے تیار ہو جائے“۔ یہ سن کر یزدگرد آگ بگولا ہو گیا۔ اور حقارت آمیز لہجے میں بولا ”کہ اگر سفیروں کا قتل کرنا روا ہوتا تو تم میں سے ایک بھی بچ کر نہ جا سکتا“۔

رستم کو مسلمانوں کی غیر معمولی بہادری کا خوب تجربہ تھا۔ اس لئے وہ جنگ شروع کرنے میں لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ مدائن سے قادسیہ تیس چالیس کوس دور تھا لیکن رستم چھ مہینے کے عرصے میں وہاں پہنچا۔ یزدگرد رستم کو پیغام پر پیغام بھیج کر تقاضا کر رہا تھا کہ عربوں کے مقابلے میں صف آرا ہو کر انھیں تہس نہس کرو لیکن رستم پھونک پھونک کر قدم رکھتا اور چاہتا تھا کہ لڑائی کے بغیر ہی کام بن جائے۔ چنانچہ اس نے حضرت سعدؓ کو لکھا کہ اپنے کسی سفیر کو بھیج دو تاکہ اس کے ساتھ صلح کی گفتگو کی جائے حضرت سعدؓ نے حضرت ربعیؓ بن عامر کو روانہ کیا۔ رستم نے نوشیروانی تجمّل و شکوہ کی نمائش کرنے کے لئے تختِ زرّیں بچھوا کر ٹھاٹھ سے دربار منعقد کیا۔ حضرت ربعیؓ تیر کی نوک سے قالینوں کے فرش میں سوراخ کرتے ہوئے بڑی بے تکلفی کے ساتھ رستم کے برابر جا بیٹھے۔ درباریوں نے سخت چیں بہ جبیں ہو کر اسلامی سفیر کو تخت سے اُتارنے کا قصد کیا۔ لیکن رستم نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ پھر حضرت ربعیؓ نے خود ہی تخت سے اُتر کر بیش قیمت فرش کو پھاڑ ڈالا۔ اور خالی زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا یہ قالینوں کا گراں بہا فرش ہماری نظروں میں ہیچ ہے۔ ہمارے لئے زمین کا قدرتی فرش ہی کافی ہے“۔ اس کے بعد رستم نے حضرت ربعیؓ سے دریافت کیا کہ ”آخر اس لڑائی سے تم چاہتے کیا ہو“؟ انھوں نے فرمایا۔ ”ہم ظلم اور کفر کو مٹا کر انصاف اور اسلام کو قائم و درخشاں کرنا چاہتے ہیں۔ جو شخص ہماری بات مان کر اس پر عمل کرے گا۔ اس سے ہم تعرض نہیں کریں گے جو ہم سے متصادم ہو گا تو ہم اسے جہنم رسید کر کے فتح کا جھنڈا لہرائیں گے یا خود شہید ہو کر جنت میں گھر بنائیں گے۔ اگر تم جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو گئے تو ہم تمہاری حفاظت اور مدد کرینگے“۔ یہ سن کر رستم نے کہا۔ ”اچھا ہم ان باتوں پر غور و بحث اور مشورہ کر لیں“۔ حضرت ربعیؓ واپس چلے آئے۔ پھر رستم کے پیغام بھیجنے پر دو سفیر اور یکے بعد دیگرے روانہ کئے گئے۔ تیسرے سفیر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے رستم نے بڑی لمبی چوڑی گفتگو کرنے کے بعد لالچ دلانے کے طور پر کہا۔ ”شاید تم نے بھوک سے تنگ آ کر جنگ کرنے کی ٹھانی ہے۔ ہم تمہارا پیٹ بھرنے اور ضروریات پوری کرنے کے لئے تیار ہیں“۔ حضرت مغیرہؓ نے جواب میں فرمایا ”بے شک ہم مفلس تھے، لیکن اللہ نے ہمیں میں سے اپنا ایک رسولؐ بھیجا جس کی پیروی سے ہماری فلاکت دور ہو کر قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اس نے ہمیں دشمنانِ دین سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے ہم تمہیں ایک اللہ کی عبادت اور رسول خدا صلعم پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر اسے قبول کرتے ہو تو بہتر ورنہ جزیہ ادا کرو۔ اور ہم تمہاری پوری طرح حفاظت کریں گے۔ اگر یہ بھی منظور نہیں، تو ہمارا تمہارا فیصلہ تلوار کرے گی“۔ یہ سنتے ہی رستم آپے سے باہر ہو گیا۔ اور کہنے لگا ”سورج اور چاند کی قسم! اب میں ہرگز صلح نہیں کروں گا اور کل نمودِ سحر سے پہلے تم سب کو خاک و خون میں تڑپا دوں گا“۔

اس کے بعد رستم نے اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اسلامی فوج پہلے ہی سے صف بستہ تھی۔ طرفین کی فوجیں ایک نہر کے آر پار جم گئیں۔ ایرانی لشکر بڑھتے بڑھتے ایک لاکھ اسی ہزار تک پہنچ گیا۔ اور اسلامی فوج کی تعداد صرف تیس ہزار تھی پھر سامانِ جنگ کے اعتبار سے تو مسلمانوں کو ایرانیوں سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ایرانی لشکر اس پُل سے جو انہوں نے رستم کے حکم سے پھُرتی کے ساتھ تیار کیا تھا نہر کو عبور کر کے اس پار چلا آیا اور رستم نے فوج کے ہر حصے کو جنگی ہاتھیوں اور زرہ پوش سواروں سے دیوارِ آہن کی طرح مضبوط کر لیا۔ حضرت سعدؓ عرق النسا کی بیماری کی وجہ سے لشکر کی قیادت سے معذور تھے اور حضرت خالدؓ بن عرفطہ کو سپہ سالار مقرر کیا۔

غرض محرم ۱۴ھ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہوئیں۔ پہلے ایرانیوں کی طرف سے مشہور پہلوان شہزادہ ہرمز میدان میں آیا اور مبارز طلب کیا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت غالبؓ بن عبداللہ اسدی اس کے مقابلے کو نکلے اور جاتے ہی اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد ایرانیوں کی طرف سے دو اور بہادر یکے بعد دیگرے نکلے اور اپنے اپنے مسلم حریف کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ رستم نے یہ رنگ دیکھتے ہی جنگ مغلوبہ شروع کرنے کا حکم دے دیا اور کوہ پیکر ہاتھیوں کو مسلمانوں کی طرف بڑھایا۔ غازیانِ اسلام جان توڑ کر لڑے۔ دو قبیلوں کے بہادروں نے ہاتھیوں کے حملے کو روکا۔ لیکن پوری طرح قابو نہ پا سکے۔ آخر تیسرے قبیلے کے مجاہدوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ ایرانیوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور وہ پسپا ہونے لگے۔ اس پر رستم کے حکم سے ایرانی لشکر یک بارگی مسلمانوں پر پل پڑا۔ دونوں لشکر گتھ گئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ دن بھر جنگ کا بازار گرم رہا۔ آخر رات کی سیاہی نے جنگ کے التوا کا اعلان کر دیا۔

اگلے دن پھر طرفین کی فوجیں معرکہ آرا ہوئیں اور عین وقت پر حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کی سرداری میں تازہ دم فوج کمک کے طور پر آ پہنچی۔ عام حملے کی صورت میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دیو پیکر ہاتھیوں کے جواب میں مسلمانوں نے اونٹوں پر بڑی بڑی جھولیں ڈال لیں۔ اس دن کی خونریز جنگ میں ۱۰ ہزار ایرانی ہلاک ہوئے اور ایک ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ پھر طرفین کی فوجیں مقابلے کے لئے ڈٹ گئیں۔ ایرانیوں نے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا۔ حضرت قعقاعؓ سالارِ مقدمۃ الجیش نے ہاتھیوں کے سردار پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا پھر ایک اور ہاتھی پر وار کر کے اسے میدان سے بھگا دیا۔ دوسرے ہاتھی بھی بھاگ گئے ایرانیوں کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ رات کے حملہ میں مسلمانوں کا دستہ رستم تک پہنچ گیا۔ وہ اپنے زرّیں تخت سے اتر کر جنگ آزما ہوا لیکن زخمی ہو کر بھاگا۔ حضرت ہلالؓ بن علقمہ نے دوڑ کر اس پر برچھے سے حملہ کیا جس سے وہ بے دم ہو کر نہر میں گر پڑا۔ حضرت ہلالؓ نے اسے نہر سے نکال

واصل جہنم کیا۔ ایرانی بے اوسان ہوکر بھاگنے لگے۔ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی مارے گئے اور چھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

قادیانی: مرزا غلام احمد کے پیروکاروں کو قادیانی کہا جاتا ہے، کیونکہ مرزا غلام احمد نے اپنی دعوت اور تحریک کا آغاز اپنے وطن قادیان ضلع گورداسپور، مشرقی پنجاب سے کیا تھا۔ مرزا غلام احمد کے عقائد کے واضح ہونے کے بعد علمائے اسلام نے مرزا غلام احمد اور اس کے پیروکاروں کو اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ یہ مطالبہ کہ حکومت انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے، تقسیم پاکستان سے قبل برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی طرف سے کیا جانے لگا، لیکن اس وقت قادیانیوں کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ کیونکہ انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے مسلمانوں میں انتشار کا یہ پودا خود ہی لگایا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف پاکستان کے مسلمانوں نے تحریک چلائی۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اُس وقت قادیانیوں کو حکومتی سطح پر غیر مسلم قرار دینے کے مطالبہ کو دبا دیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں دوبارہ تحریک چلائی گئی۔ بالآخر، ستمبر ۱۹۷۴ء/۱۹ شعبان ۱۳۹۴ھ کو پارلیمنٹ پاکستان کی ایک خصوصی کمیٹی کے مسلسل اجلاسوں کے بعد حکومت پاکستان نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔

مرزا غلام احمد نے تدریجاً مسلمانوں کے مسلمہ عقیدہ ختم نبوت میں نقب لگائی۔ شروع میں عیسائیوں، سناتن دھرم، آریہ سماج اور برہمو سماج کے خلاف مرزا غلام احمد ایک مناظر کی حیثیت سے مسلمانوں میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اُس کے بعد اس نے الہامات کے دعوے کرنا شروع کر دیئے۔ "براہین احمدیہ" کی چار ابتدائی جلدیں میں جو ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء کے عرصے میں مکمل ہوئیں۔ مرزا غلام احمد نے مجدد، مہدی موعود، مسیح موعود اور ظلی و بروزی نبی ہونے کے دعوے ایک دوسرے کے بعد کئے۔

اسلام میں نبی کریمؐ کے بعد نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت کے قریب نزول نبی کریمؐ کی بعض احادیث سے ثابت ہے۔ مرزا غلام احمد نے بعض پیچیدہ دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت عیسیٰؑ کا انتقال ہو گیا اور ان کی قبر کشمیر میں ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے مثیل کی آمد کا احادیث نبوی میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی لیے مرزا غلام احمد نے مثیل عیسیٰؑ ہونے کا دعویٰ کیا، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ امت مسلمہ میں بحیثیت اُمتی آئیں گے۔ مرزا غلام احمد کا بیٹا مرزا محمود جب تیسرا خلیفہ بنا تو اس نے مرزا غلام احمد کے متعلق بعض ایسے دعوے بھی پیش کئے جو اِس سے قبل سامنے نہیں آئے تھے۔ اس طرح اُس نے یہ اعلان بھی کیا: "کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا۔ وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں"۔ اسی طرح مرزا محمود ایک تقریر میں اس بات کا حکم اپنے پیروکاروں کو دیتے ہیں: "حضرت مسیح موعود کا حکم ہے کہ کوئی احمدی، غیر احمدی کو اپنی لڑکی نہ دے"۔ اسی طرح قادیانیوں کے نزدیک غیر قادیانیوں (مسلمانوں) کا جنازہ پڑھنا حتیٰ کہ کسی مسلمان معصوم بچے کا جنازہ پڑھنا یا جنازہ میں شرکت کرنا درست نہیں ہے۔

مرزا غلام احمد کے انتقال کے بعد ــــــ مولوی محمد علی خود کو اُس کا جانشین اور خلیفہ سمجھتے تھے، لیکن اُس کو اس کا موقع نہ ملا اور قادیانیوں کا دوسرا خلیفہ حکیم نورالدین بن گیا تو اس وقت تو انہوں نے صبر کر لیا لیکن جب ۱۹۱۴ء میں مرزا غلام احمد کا لڑکا مرزا محمود تیسرا خلیفہ بنا تو مولوی محمد علی نے الگ سے ایک گروپ بنا لیا جو لاہوری گروپ کے نام سے معروف ہوا۔ اس وقت مولوی محمد علی نے تشخص مرزا غلام احمد ــــــ اور مرزا کے دعووں کے متعلق اپنا الگ سا نقطۂ نگاہ پیش کیا: "مرزا غلام احمد نے کبھی بھی نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس صدی کے مجدد ہیں اور جہاں مرزا غلام احمد نے ایسی اصطلاحیں استعمال کی ہیں وہ محض صوفیانہ اصطلاحات اور مجازات و استعارات ہیں"۔ مولوی محمد علی نے اپنی تفسیر بیان القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۱۷ میں اور دوسری تصنیفات میں مرزا غلام احمد کو مسیح موعود بھی مانا ہے۔

مسلمانوں اور قادیانیوں میں عمومی طور پر صرف ختم نبوت کے مسئلہ پر اختلاف نظر آتا ہے لیکن درحقیقت انہوں نے کئی دوسرے مسلمہ عقائد اور مسائل پر بھی مسلمانوں سے اختلاف کیا ہے۔

علمائے اسلام میں بعض کی یہ رائے بھی ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکاروں کو "احمدی" کہنا درست نہیں، کیونکہ "احمد" تو نبی کریمؐ کا نام ہے اور اس لحاظ سے مسلمان ہی خود کو "احمدی" یا "محمدی" کہلوانے میں حق بجانب ہیں کوئی اور نہیں۔ مرزا غلام احمد کے پیروکاروں کو قادیان کی نسبت سے، جسے وہ اپنا قبلہ و مرکز مانتے ہیں قادیانی کہنا چاہیئے۔

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے حکومت پاکستان کے فیصلہ کے مطابق پاکستان کے آئین کی بعض ضروری دفعات میں ترامیم کی گئی ہیں جس سے قادیانیوں کے دونوں گروپ، ربوہ کو مرکز ماننے والے اور لاہوری گروپ کو غیر مسلم قرار دے دیا کیونکہ علمائے اسلام کے مطابق ایسے شخص کو جو نبی ہونے کا دعویٰ کرے اُسے مسلمان ماننا و مسلمانوں کے لیے مجدد ماننا بھی دائرہ کفر میں آتا ہے۔ اسی لیے لاہوری گروپ بھی کافر قرار دیا گیا ہے۔

آئین پاکستان کی دفعہ ۲۶۰ شق نمبر ۲ کے بعد ایک نئی شق اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے داخل کی گئی ہے جو اس طرح ہے۔

"جو شخص خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے وہ آئین یا قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے۔"

اس وقت ربوہ کو مرکز ماننے والوں یعنی مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والوں کے گروہ کا سربراہ مرزا غلام احمد کا پوتا مرزا ناصر احمد ہے جو چوتھا خلیفہ ہے اور لاہوری گروپ کا سربراہ صدرالدین ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیئے: تحریک ختم نبوت)

قارن جنگ: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں مسلمانوں کے ایک لشکر نے جنگِ ذات السلاسل میں ایران کی طرف سے عراق میں مقرر صوبہ حفیر کے حاکم ہرمز کی قیادت میں لڑنے والی ایرانی فوج کو شکست دی۔ روم اور ایران مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اپنے اقتدار کی حفاظت کے لئے ہر قل قیصر روم نے شام میں اور اردشیر حکمرانِ ایران نے عراق میں فوجیں جمع کی تھی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے ہرمز کے نام ایک خط میں لکھا تھا "یا تو اسلام قبول کرلو یا جزیہ دو ورنہ تمہیں ایک ایسی سرباز جماعت سے رزم آرا ہونا پڑے گا جو موت کی ایسی ہی دلدادہ ہے جیسے تم زندگی کے"۔

خالد بن ولیدؓ کے اس خط کی اطلاع دربار ایران میں ہوئی تو اردشیر نے ایک مشہور جنگجو سردار قارن کی قیادت میں ایک بھاری لشکر ہرمز کی امداد کیلئے بھیجا۔ قارن کو مذار میں جنگِ ذات السلاسل میں ہرمز کی شکست خوردہ فوج ملی۔ قارن نے مذار میں ڈیرہ ڈال لیا۔ حضرت خالدؓ بھی مذار پہنچ گئے۔ طرفین میں گھمسان کی جنگ کے بعد

ایرانیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ قارن، انوش جان، قباد اور دوسرے بڑے بڑے ایرانی حکام اور سرداروں سمیت ۳۰ ہزار ایرانی مارے گئے۔ ✓

قارون: قارون جس کا نام بائبل اور تلمود میں قورح بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ بائبل کی کتاب خروج باب ۶ آیت ۲۱ میں جو نسب نامہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے حضرت موسیٰؑ اور قارون کے والد باہم سگے بھائی تھے۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہونے کے باوجود فرعون کے ساتھ جا ملا تھا۔ اور اس کا خاص مقرب بن گیا اور حضرت موسیٰ کی دعوت کی مخالفت میں فرعون کے بعد دو بڑے مخالفو میں سے ایک قارون تھا۔

سورۂ المومن آیت ۲۳-۲۴ میں بیان ہوا ہے۔ "ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا، مگر انھوں نے کہا کہ یہ (موسےؑ) ایک جادوگر ہے سخت جھوٹا"۔ اسی طرح سورہ عنکبوت کی آیت ۳۹ میں بھی قارون کی یہی پوزیشن بیان کی گئی ہے کہ حضرت موسےؑ کو فرعون کے علاوہ جن دو اشخاص کے پاس خصوصی طور پر بھیجا گیا تھا۔ ان میں ایک فرعون کا وزیر ہامان اور دوسرا قارون تھا۔

بائبل میں قارون کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں اس شخص کی دولت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر یہودی روایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ شخص غیر معمولی دولت کا مالک تھا۔ حتیٰ کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں اٹھانے کے لیے تین سو خچر مقرر تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا - ۸ جلد ۷ - صفحہ ۵۵۶)

قرآن مجید میں سورۃ القصص میں حضرت موسےؑ کے واقعہ میں قارون کا تفصیلی تذکرہ آیات ۷۶ تا ۸۲ میں اس طرح آیا ہے:

اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

"یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسےؑ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس (قارون) سے کہا "پھول نہ جا، اللہ پھولنے والوں کو (فخر، تکبر کرنے والوں کو) پسند نہیں کرتا۔ جو مال تجھے اللہ نے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین پر فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا"۔ تو اس نے کہا "یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک روز وہ (قارون) اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ "کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑا نصیب والا ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے۔ "افسوس ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس کہ ہمیں یاد نہ رہا کہ اللہ کا انکا

کرنے والے فلاح نہیں پایا کرتے۔"

روایات میں آتا ہے کہ قارون تورات کا عالم تھا اور اسے اپنے علم و دولت کی کثرت پر بڑا اعزور تھا۔

قاری: (پڑھنے والا۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو علم قرأت سے واقفیت رکھتا ہو۔ اس فن کے جاننے والے سات اشخاص ایسے گزرے ہیں کہ دور دراز سے لوگ ان کے پاس آکر قرآن کی حرکات وسکنات، مدّوشدّ بلکہ لب ولہجہ بھی سیکھتے تھے۔ اور اس فن کے مقتدا مانے گئے ہیں انھیں قراء سبعہ کہتے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ نافع۔ آپ نے ستّر تابعین سے یہ علم حاصل کیا تھا اور مدینہ طیبہ میں رہتے تھے۔

۲۔ ابن کثیر مکی۔ یہ عبداللہ بن سائب صحابی کے شاگرد تھے۔

۳۔ ابو عمرو۔ علماء تابعین کے شاگرد تھے اور بصرہ میں رہتے تھے۔

۴۔ عبداللہ بن عامر شامی۔ یہ ابوالدرداءؓ کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔

۵۔ عاصم کوفی۔ یہ بھی تابعین کے شاگرد تھے۔

۶۔ حمزہ۔ یہ عاصم کے شاگرد تھے۔

۷۔ کسائی۔ یہ حمزہ کے شاگرد تھے۔

وہ سات قاری کہ جن کی سات قرأت مشہور ہوئی یہی ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی قرأت کے دو راوی ہیں، کہ جن کے لب ولہجہ میں کسی قدر باہم اختلاف ہے۔ چنانچہ نافع سے ان کے شاگرد قالونؒ اور ورشؒ اور ابن کثیر سے قنبلؒ اور بزّیؒ ایک واسطے سے اور ابو عمرو سے۔ دوریؒ اور سوسیؒ ایک واسطے سے۔ اور ابن عامر سے ہشامؒ اور ذکوانؒ ایک واسطے سے اور عاصم سے ابوبکر بن عیاش اور حفصؒ (حفص کی قرأت ہندوستان (برصغیر) میں مشہور ہے) اور حمزہ سے خلفؒ اور خلادؒ بواسطہ سلیم۔ اور کسائی سے دوریؒ اور ابوالحارث روایت کرتے ہیں۔

قاری ابو محمد جعفر بن احمد: (وفات ۵۰۰ھ)

پانچویں صدی ہجری کے ایک معروف محدث۔ حافظ ابوطاہر سلفی نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔

قاری احمد، مولانا: (۱۹۱۱ء-۱۹۷۶ء) مولانا حکیم قاری احمد بن مولانا عبدالاحد بن مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا عبدالحی پیلی بھیتی، مولانا ضیاء الدین پیلی بھیتی، قاری غلام محمد پشاوری، مولانا محمد غازی خاں گولڑوی مولانا ابوالفضل الحق رامپوری اور مفتی کفایت اللہ دہلوی سے علوم اسلامیہ کی تحصیل کی۔ طبیہ کالج لکھنؤ سے طب کی سند حاصل کی۔ اعلیٰ حضرت مجدد گولڑوی سے بیعت طریقت تھی۔

۱۹۳۶ء کے لگ بھگ سے مسلم لیگ میں کارکن کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ پیلی بھیت کے صدر منتخب ہوئے اور تحریک پاکستان کے لئے کام کیا۔ ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس پیلی بھیت کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں ہونے والی سنی بنارس کانفرنس میں وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے۔ اور جمعیۃ علما پاکستان صوبہ سندھ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ آپ

نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی اور اچھا خاصہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ جن میں مندرجہ ذیل کتابیں کافی مشہور ہیں۔ تاریخ انبیاء، تاریخ مصطفیٰ، تاریخ اسلام، تاریخ خلفاء راشدین، تاریخ بنوامیہ، امور اصحاب رسول، داتا گنج بخش لاہوری، مخدوم صابر کلیری، تاریخ ہند و پاک مشاہدات حرمین، رحمت دو عالم، حیات مرتضیٰ، ترجمہ اکمال فی اسماء الرجال۔ ترجمہ بخاری جلد اوّل شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ مہری تخلص تھا۔ تقریباً بیس برس تک ماہنامہ پیام حق کراچی کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۳ جمادی الاوّل ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) کو انتقال فرمایا۔ اور گورستان سخی حسن کراچی میں دفن ہوئے۔

قاسم برید

:- (۱۴۶۸ء ـــــ ۱۵۱۰ء)

گرجستان کا ترک غلام جسے سلطان محمد شاہی بہمنی نے خریدا، فوجی سردار بنا۔ اُس نے پی ٹن اور جالندھر کے مرہٹوں کو شکست دی۔ مرہٹہ سردار سنبھاجی کے قتل کے بعد اس کی بیٹی سے شادی کی۔ سلطان محمود شاہ کے دور میں کافی عروج حاصل کیا۔ اُس نے بادشاہ کو محض کٹھ پتلی بنا کر حکومت کے تمام اختیارات عملی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا امیر برید جانشین ہوا۔

قاسم بن حسنؓ بن علیؓ

- حضرت حسنؓ کے بیٹے جو واقعۂ کربلا میں اپنے چچا حضرت حسینؓ کے لشکر میں تھے اور دوران جنگ عمرو بن سعد بن مقبل اَسدی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ روایات کے مطابق شہادت کے وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی۔

قاسم بن محمدؐ

:- نبی کریمؐ کے صاحبزادے جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ حضرت خدیجہؓ سے نبی کریمؐ کی چار لڑکیوں کے علاوہ دو لڑکے قاسمؓ اور عبداللہؓ پیدا ہوئے۔ حضرت قاسم کا لقب طاہر تھا۔ ولادت زمانۂ اسلام میں ہوئی اور صغیر سنی میں وفات پائی۔

قاسم بن محمدؓ بن ابی بکرؓ

:- حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے محمدؓ کے فرزند۔ ماں کا نام سورہؓ تھا۔ آپ کے والد محمد بن ابی بکر، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ جس کے صلے میں حضرت علیؓ نے انہیں مصر کا والی مقرر کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے مصر پر حملہ کے دوران محمد بن ابی بکرؓ جنگ میں شہید ہوئے اس وقت قاسم کم عمر تھے۔ باپ کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پرورش کی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی تربیت سے آپ ایک بہت بڑے عالم بنے آپ کا شمار مدینہ المنورہ کے علماء اور فقہا میں ہوتا ہے۔ ۱۰۷ھ میں انتقال ہوا۔

قاسم عبدالرحمٰن بن ابو عبداللہ العتقی

وفات (۱۹۱ھ / ۸۰۶ء)

مصر میں پیدا ہوئے۔ امام مالکؒ کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بیس سال امام مالکؒ کے پاس گزارے۔ مغرب کے علاقوں میں مالکی مذہب کی تبلیغ و توسیع میں آپ نے اہم حصہ لیا۔ آپ نے "المدونۃ الکبریٰ" نامی کتاب میں امام مالکؒ کی روایات کو جمع کیا ہے۔ آپ کا انتقال مصر میں ہوا۔

قاسم کاہی، مولوی

علم تفسیر، ہیئت، کلام اور تصوف میں معروف عالم تھے۔ علم موسیقی پر بھی ایک کتاب انھوں نے لکھی ہے۔ اگرچہ ان کے دور میں مولانا جامیؒ اور دوسرے معروف عالم تھے لیکن آپ کی تمام عمر الحاد و زندقہ میں گزری۔ آپ شاعر بھی تھے اور شاعری میں ان کا دیوان مشہور ہے۔ بوستان سعدی کے جواب میں گل فشاں نامی مثنوی قافیہ بقافیہ لکھی اس کا مطلع یہ ہے

جہاں آفریں، بجاں آفریں
بجاں آفریں صد جہاں آفریں

مغل دور میں ہمایوں (دش ۵) کے زمانہ سے اکبر کے زمانہ تک زندہ رہے۔

قاسمی، جمال الدین

:- (۱۸۶۶ء ـــ ۱۹۱۴ء) دمشق کے معروف عالم۔ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر اور حدیث پر کام کیا۔ اُن کی تصانیف میں "قواعد التحدیث فی فنون مصطلح الحدیث" اور "محاسن التاویل" شامل ہیں۔ محاسن التاویل قرآن مجید کی تفسیر ہے جو ۱۷ جلدوں میں ہے۔

قاضی

:- اُس منصف یا جج کو کہتے ہیں جو اسلامی قوانین کے مطابق ہر قسم کے مقدمات یعنی دیوانی، فوجداری کا فیصلہ کرتا ہے۔ قاضی کا ایک مسلمان عالم ہونا ضروری ہے۔ اُسے قرآن و سنت اور دوسرے اسلامی ماخذِ قوانین پر عبور ہو۔ جن معاملات میں اُسے قرآن و سنت اور دوسرے اسلامی ماخذِ قوانین سے رہنمائی نہ ملے تو اس میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ خود اس مسئلہ پر اجتہاد کر سکے۔

قاضی میں عدل کرنے کی صلاحیت ہو، غیر جانبدار ہو۔ قاضی کا تقرر مسلمانوں میں ایک دینی ذمہ داری رہا ہے۔ ہر علاقہ یا ضلع میں حکام کو مذکورہ بالا صفات رکھنے والے شخص کو قاضی مقرر کرنا چاہیئے۔ اگر اُس علاقے یا شہر میں صرف ایک ہی شخص ایسی صلاحیتوں کا مالک ہو تو وہ قانونی طور پر پابند ہے کہ وہ قاضی کا عہدہ سنبھالے۔

قاضی اسلامی قوانین کے مطابق عدالت کی تشکیل و ترتیب کرتا ہے۔ اس کا کردار و عمل ایسا ہو کہ شکایت کنندہ اور جس کے خلاف شکایت کی گئی ہو دونوں کو مطمئن کرے۔ قاضی کا رویہ دونوں سے ایک جیسا ہو۔ فیصلہ کرنے میں کسی قسم کے دباؤ اور لالچ کو پیشِ نظر نہ رکھے۔ اس لئے قاضی کو عوام سے تحفہ لینے کی سختی سے ممانعت ہے۔ اگر شکایت کنندہ اپنے دعویٰ کے حق میں ایسے شواہد اور ثبوت پیش کردے تو قاضی انہی کی بنا پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ جس کے خلاف شکایت ہو اگر وہ الزامات کو تسلیم نہ کرے اور اپنی صفائی میں شواہد پیش کرنا چاہے تو قاضی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو ایسا کرنے کی اجازت دے۔ اگر ملزم کے کٹہرے میں کوئی حاکم بھی ہو تو قاضی کو فیصلہ کرنے میں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ حاکم اس کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کئی واقعات آتے ہیں جن میں قاضیوں نے اعلیٰ قسم کی روایات کو قائم کیا ہے۔

عمومی طور پر غلط قسم کے افراد کا قاضی کے عہدہ پر تقرر نظامِ حکومت و نظامِ عدل میں خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اس طرح سے صحیح فیصلے نہیں ہو پاتے۔ ایسے قاضی حکام کے دباؤ میں آجاتے ہیں اور سفارشوں و تحائف کے ذریعے ضمیر کے مطابق صحیح فیصلے نہیں کرتے۔ بعض اوقات اچھے قسم کے قاضی کو بھی ظالم حکمرانوں کے دباؤ کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور اس طرح سے صحیح فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ اسی بنا پر نبی کریمؐ نے ایک حدیث میں ایسے قاضی کے متعلق فرمایا ہے کہ جو

صحیح فیصلہ نہیں کرے گا۔ اس کا مقام جہنم ہے۔ نبی کریمؐ کی اس حدیث مبارکہ کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت امام ابو حنیفہؒ نے قاضی القضاۃ کی عہدے کی پیش کش ٹھکرا دی تھی کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ ظالم اور عیاش حکمرانوں کے دباؤ کو مہار نہ سکیں گے۔ اور صحیح فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ انہوں نے خلیفہ وقت کی طرف سے سزا کو قبول کر لیا۔ لیکن قاضی کا عہدہ قبول نہ کیا۔

اسلام کے آغاز کے دور میں نبی کریمؐ خود قاضی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ خلفائے راشدین نے سلطنت میں وسعت کی بنا پر اپنی دوسری ذمہ داریوں میں اضافہ کی وجہ سے دوسرے افراد کو قاضی مقرر کیا۔

قاضی ابو یوسفؒ

۔ (۱۱۳ھ - ۱۸۲ھ) امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید جو تدوین فقہ میں امام ابو حنیفہ کے دائیں بازو کہے جا سکتے ہیں اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے کئی مسائل میں اپنے استاذ سے اختلاف کیا اور اپنی الگ رائے پیش کی تفسیر، مغازی اور ایام العرب کے حافظ تھے۔ حافظ ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام احمدؒ آپ کے شاگرد تھے اور آپ کو منصف فی الحدیث کہا کرتے تھے۔ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ اسلامی قانون کی علمی جزئیات آپ کی تصانیف سے ملتی ہیں دوسری کسی تصنیف سے نہیں ملتیں۔

قاضی خان فخر الدین حسن الفرغانی

:- (وفات ۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء) ابو المحاسن قاضی خان کا اکابر حنفی فقہا میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی مسائل پر اجتہاد کیا ہے۔ اُن کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ قاضی خان" کے نام سے مشہور ہے "شرح ادب القضاء للخصاف" بھی ان کی تصنیف ہے۔

قاضی خان ظفر آبادی

۔ (وفات ۱۵ ر صفر ۹۰۰ھ/۱۵۶۲ء) شیخ حسن بن طاہر جونپوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ علوم ظاہر و باطن کے عالم و فاضل اور قناعت پسند انسان تھے۔ نصیر الدین ہمایوں کا دور پایا۔

قاضی عبدالرحیم بن علی

۔ (وفات ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء) سلطان صلاح الدین ایوبی کے وزراء میں سے ایک معروف وزیر۔ عسقلان (فلسطین) میں پیدا ہوئے۔ جب صلاح الدین ایوبی نے مصر و شام کا سفر کیا تو قاضی عبدالرحیم اس کے ہمراہ تھا۔ ادب، انشا کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔ قاہرہ میں انتقال ہوا۔

قاضی عبدالاحد خانپوری، مولانا

:- (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء ــ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) مسلک اہل حدیث کے ایک معروف عالم۔ آپ ۴ ر جمادی الآخر ۱۲۶۸ھ/ ۴ ر اپریل ۱۸۵۲ء کو مولانا قاضی محمد حسن کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر مولانا سید عبداللہ غزنویؒ سے امرتسر میں استفادہ کیا۔ درس حدیث کی تکمیل مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے کی۔ علم طب کی تحصیل حکیم نور الدین بھیروی سے کی جبکہ وہ جموں کشمیر میں رہتے تھے۔ کچھ عرصہ خانپور میں تدریس کرتے رہے۔ بعد ازاں راولپنڈی میں مطب کے ساتھ ساتھ تدریس بھی کرتے رہے۔ مرزائیوں کے ساتھ کئی مناظرے کئے۔ مرزائیوں کے لٹریچر میں مرزا غلام احمد کے اشد مخالفین میں آپ کا نام بھی آیا ہے۔ ۱۹۱۸ - ۱۹ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔

زندگی درس و تدریس، طبابت اور تصنیف و تالیف میں گزاری۔ ۱۵ ر جمادی الآخر ۱۳۴۷ھ/ ۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو راولپنڈی میں انتقال ہوا اور وہاں ہی دفن ہوئے۔

ان کی تصنیفات یہ ہیں۔

(۱) البیان والاشاعۃ
(۲) اقامۃ البرہان علی بطلان التبیان
(۳) ازالۃ اللبس والاشتباہ
(۴) صمصام الموحدین
(۵) التحقیقات الحقہ
(۶) استفتاء رسائل عشرہ
(۷) سوط اللہ العزیز الحکیم الباری علی متن الحافظ عبدالکریم الآری
(۸) صرصر الحاویۃ علی عباد الجبت والطاغیہ
(۹) السیف المسلول فی نحر شاتم الرسول
(۱۰) اظہار مخادعۃ مسیلمہ قادیانی
(۱۱) اغاثۃ الملہوف المسجون فی معائد القادیانی المجنون
(۱۲) انتصار الصدیق من الملحد الزندیق
(۱۳) سنان الموحدین لدفع مطاعن الملحدین
(۱۴) النقض المتین علی کلام المبین
(۱۵) القول الفاصل الفارق بین الکاذب فی دعوی اہل الحدیث والصادق۔
(۱۶) کتاب التوحید والسنۃ فی رد اہل الحاد والبدعۃ
(۱۷) الفیصلۃ الحجازیہ السلطانیہ
(۱۸) الفوس المصطفویۃ علی روس الجوہریۃ۔

قاضی قاضن بھکری

(وفات ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء) قاضی شاہ ابوسعید کے فرزند تھے۔ ابتدائی تعلیم میں قرآن کا حفظ اور علم قرأت بڑی محنت سے حاصل کئے۔ فقہ، تفسیر، حدیث، تصوف اور عربی ادب میں بہت مہارت رکھتے۔ زیارت حرمین شریفین کے علاوہ کئی ملکوں کی سیاحت کی سید محمد جونپوری مدعی مہدویت کے گروہ میں شامل ہوگئے۔ جس پہ علمائے وقت ان پر طعن کرتے تھے۔ شاہ حسن حاکم سندھ نے انھیں بھکر میں قاضی مقرر کیا۔ آپ کے بعد آپ کے بھائی نصر اللہ قاضی مقرر کئے گئے۔

قالین بافی

: قالین بافی کا خام مال بھیڑ، بکری اور اونٹ کی اون ہے اون جتنی اچھی ہوگی قالین اتنا ہی بہتر ہوگا۔ قالین فرشوں پر بچھانے کے کام آتے ہیں۔ قالین ہاتھ اور مشینوں سے بنائے جاتے ہیں۔ اون کے ریشوں کو مختلف رنگوں میں رنگ کر قالین بنائے جاتے ہیں۔

قالین بافی کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس فن کے آغاز کے بارے میں مختلف آراء سامنے آتی ہیں۔ تاہم جدید ترین تحقیقات کے مطابق اس کا آغاز ۱۵ سال قبل مسیح میں ہوا۔

برصغیر پاک و ہند میں قالین بافی کا فن شہنشاہ اکبر نے متعارف کرایا۔ اس نے ایرانی کاریگروں سے اپنے استعمال کے لئے قالین بنوائے۔ برصغیر میں آہستہ آہستہ اس فن نے کافی ترقی کی۔ تقسیم سے قبل کشمیر اور صوبہ پنجاب قالین کی صنعت میں کافی آگے تھے اور امرتسر اس کا مرکز تھا۔ اور قالین بافی کا زیادہ تر کام

مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمان خاندانوں کی پاکستان ہجرت سے یہ فن لاہور اور کراچی میں منتقل ہو گیا۔ پاکستان میں قالین بافی کا فن اب بہت عروج پر ہے اور پاکستان کے بنے ہوئے قالین دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ ایران اور افغانستان کے قالین بھی اپنی نفاست، خوبصورتی اور حسن کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

قاموس المحیط ۔ فیروز آبادی کی تصنیف کردہ مشہور عربی لغت ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ سب سے زیادہ معروف زبیدی کی "تاج العروس" ہے۔

قانت :۔ مطیع، فرمانبردار، خاموش اور نماز میں دُعا پڑھنے والے کے معنوں میں آتا ہے قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا سورۃ النحل (آیت ۱۲۰) بے شک ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک اُمت تھا اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو . . . . .

قانون :۔ انسانوں کو زندگی گزارنے کے لئے چند احکام، ضوابط کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ ان احکام و ضوابط کو جو حکمران طبقہ کی طرف سے نافذ کئے جاتے ہیں قانون کہتے ہیں۔

قومی یا ملکی قانون کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) پبلک قوانین (۲) پرائیویٹ قوانین۔

(۱) پبلک قانون :۔ ملکی آئین اور نظم و نسق کے ضوابط پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو رعایا اور حکومت کے تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔

(۲) پرائیویٹ قانون :۔ فوجداری (کریمنل) اور دیوانی (سول) قوانین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جہیں افراد کے معاشرتی اور تعزیری معاملات پر بحث کی جاتی ہے۔

قانونِ اسلامی :۔ اسلام میں بھی قانون کی اسی طرح تقسیم کی جاتی ہے لیکن اسلامی قانون میں بنیادی احکام کیلئے قرآن مجید اور سنتِ رسول کو ماخذ مان لیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کے اجمالی پہلوؤں کی وضاحت سنتِ رسول کریمؐ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد علماء کرام کا اجماع اور اجتہاد بھی اسلامی قانون کے ماخذ مانے جاتے ہیں۔ اسلامی قوانین میں بین الاقوامی قانون، معاشرتی زندگی کے قانون، قانونِ جنگ، تعزیراتی قوانین، قانونِ وراثت، فوجداری اور دیوانی قوانین کے اصول و ضوابط مقرر ہیں۔

اسلامی قوانین پر باقاعدہ عملدرآمد نبی کریمؐ کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جوں جوں قرآن مجید کی تعلیمات مکمل ہوتی گئیں مختلف قسم کے مسائل کے لئے بنیادی احکام قوانین کی شکل میں آتے رہے۔ اسلام کے ابتدائی دور کے تقریباً ۱۵۰ سال تک مقدمات کے فیصلے قرآن مجید، سنتِ رسولؐ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں اور صحابہ کرامؓ کے آثار پر کئے جاتے تھے۔ اگر ان بنیادی ماخذوں سے کوئی رہنمائی نہ ملتی تو اجتہاد کیا جاتا تھا۔ لیکن کسی باضابطہ مجموعۂ قوانین کے نہ ہونے سے انفرادی اجتہادات سے احکام میں اختلاف اور بے ضابطگی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ عباسی خلافت کے دور میں ابن المقفع (م ۱۴۴ھ) نے مجموعۂ قوانین کی تدوین کی ضرورت کا احساس دلایا۔ دوسری صدی ہجری کے ربع ثانی میں فقہی احکام کی تدوین کے کام کا آغاز ہوا۔ جس میں خصوصی طور پر امام ابو حنیفہؒ انکے دو معروف شاگردوں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے اہم کردار ادا کیا۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مجموعۂ قوانین بھی جن کو فقہی مسائل کے مجموعے کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے مختلف مسائل کیلئے منضبط مجموعۂ قوانین بن گئے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ اب صرف کتب فقہ ہی ماخذ تصور کی جانے لگی اور اس طرح سے جامد تقلید نے نئے دور کے مسائل کے مطابق قوانین بنانے کے راستہ کو بند کر دیا۔

اسلامی قوانین کی تدوین کی پہلی باضابطہ کوشش گیارہویں صدی ہجری میں مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں ہوئی۔ اورنگزیب کی سرپرستی میں ۸ سال کی مدت میں حنفی مذہب کے مطابق برصغیر کے کثیر التعداد علماء کی کوششوں سے یہ مجموعہ تیار ہوا۔

ترکی میں اسلامی قوانین کی تدوین کی دوسری باضابطہ کوشش اٹھارویں صدی عیسوی میں کی گئی۔ ۱۸۷۶ء میں ترکی سلطان کے حکم سے سعادت پاشا کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے "مجلۃ الاحکام العدلیۃ" کے نام سے اسلامی دیوانی قانون مرتب کیا جو عام طور پر "مجلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ سولہ ابواب اور ۱۸۵۱ دفعات پر مشتمل جدید طرز پر مرتب کردہ یہ قوانین ملک میں نافذ کر دئے گئے لیکن انقلاب کے بعد ۱۹۲۶ء میں ترکی حکومت نے نئے قوانین نافذ کر دیئے۔ البتہ مجلہ ترمیم شدہ شکل میں عراق، شام، لبنان وغیرہ میں بحیثیت دستور العمل نافذ ہے۔ عراق اور شام میں اس کے علاوہ مختلف اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے کوششیں [illegible] اور علماء کے تعاون سے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچے۔

اسلامی قانون سازی کی جدید تحریکوں میں مصر کو اولیت حاصل ہے۔ اسلامی قوانین کے مدون کرنے کے کام کا آغاز ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۹ء [illegible] عائلی قوانین نافذ کئے گئے۔ دیوانی قوانین کی تدوین کے لئے ۱۹۳۶ء اور [illegible] میں کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ۱۹۴۳ء میں قانون میراث، ۱۹۴۶ء میں قوانین وقف اور وصیت نافذ کئے گئے۔

پاکستان کے قیام کے بعد حکمران طبقہ کی طرف سے اسلامی قوانین کے [illegible] سلسلے میں لیت و لعل سے کام لیا جاتا رہا۔ لیکن عوام کے مطالبے پر [illegible] کمیشن بنائے گئے۔ مجموعی طور پر ان کی کارکردگی مناسب نہیں [illegible] عدم استحکام کی وجہ سے بھی اس طرف پوری توجہ دی جا سکی۔ ۱۹۶۲ء میں [illegible] کی طرف سے اسلامی مشاورتی کونسل تشکیل دی گئی۔ جسکی [illegible] برآمد نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۷ء میں ایک بااختیار اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل [illegible] اور اسلامی قوانین کے نفاذ کیلئے عوامی مطالبہ میں شدت [illegible] کر [illegible] پاکستان میں بھی اسلامی قوانین نافذ ہو سکیں گے۔

قانونِ بغاوت :۔ اسلامی نظام حکومت [illegible] میں خرابی پیدا کرنا، امن و امان کو تباہ کرنا، قتل و غارت [illegible] اقدامات اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کے ضمن میں آتے ہیں۔ اسلامی قانون [illegible] ایسے افراد کو قتل کرنا، جلاوطن کرنا اور ان کے ہاتھ پاؤں [illegible] کا حکم ہے (سورۃ المائدۃ۔ آیت ۳۳)

فساد پیدا کرنے والے ایسے افراد اگر مطیع قانون [illegible] رہنے کی یقین دہانی کرا دیں تو ان کو معاف کرنے کا حکم ہے۔ البتہ ان پر انسانی حقوق میں دست درازی

کے جرم میں فوجداری مقدمہ چلایا جائے گا۔ ایسے لوگوں کا حکومت کے خلاف بغاوت کرنا' حکومت کے خلاف خروج کہلاتا ہے۔ عہدِ حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ اور تاریخ اسلام میں بعد کے زمانوں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ جن میں حکومت یا خلیفہ کے خلاف خروج کرنے والوں سے جنگ کی گئی۔ فقہا نے ایسے خروج کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) باغی محض فساد برپا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے اس خروج کیلئے ان کے پاس کوئی شرعی تاویل نہ ہو اور خروج کرنے والے بظاہر ظالم و فاسق معلوم ہوں تو ان کے خلاف حکومت کی جنگ بالاتفاق جائز ہے اور اس کا ساتھ دینا اہلِ ایمان پر واجب ہے' قطع نظر اس کے کہ حکومت عادل ہے یا نہیں۔

(۲) وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے خروج کو شرعی ثابت کرتے ہوں حالانکہ ان کا عقیدہ فاسد ہو مثلاً خوارج تو مسلم حکومت' خواہ عادل ہو یا نہ ہو۔ اس کا ایسے باغیوں کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے اور ایسی حکومت کا ساتھ دینا اہلِ ایمان کیلئے واجب۔

(۳) وہ ایک عادل اور تسلیم شدہ حکومت کے خلاف شرعی تاویل کی موجودگی یا عدم موجودگی' دونوں میں کسی بھی حالت میں خروج کریں تو اسلامی حکومت کا ان کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے اور ایسی حکومت کا ساتھ دینا واجب۔

(۴) آخری ایک صورت میں علماء اور فقہا کے درمیان کافی اختلاف ہے۔ جب ظالم و جابر حکومت کے خلاف ایسے افراد خروج کریں جو بظاہر صالح ہوں اور ارادہ نیک ہو کر عوام کو حکومت کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں۔ تو بعض کے نزدیک خروج کرنے والوں کا ساتھ دینا ضروری ہے اور بعض کے نزدیک ایک قائم حکومت کے خلاف کسی بھی ارادہ اور نیت سے خروج نظم و نسق کو تباہ کرنا ہے اور اس کے خلاف خروج کرنا بھی حرام ہے حتیٰ کہ وہ حکومت کوئی صریحاً کفر کے اقدامات کرے۔

باغیوں سے لڑائی میں جن اصول و ضوابط کو مدِنظر رکھا جائے گا وہ نبی کریمؐ کے ارشاد پر مبنی ہے۔ حضورؐ نے پوچھا "اس امت کے باغیوں کے متعلق اللہ کا کیا حکم ہے"؟ تو مخاطب صحابیؓ نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں" نبی کریمؐ نے فرمایا' "ان کے زخمیوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جائیگا۔ ان کے اسیروں کو قتل نہیں کیا جائے گا' ان کے بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائیگا۔"

فقہا نے باغیوں کے لئے اصول و ضوابط حضرت علیؓ کے اسوہ سے' جو انہوں نے جنگِ جمل میں اختیار کیا' بھی نکالے ہیں۔ بعض فقہا کے نزدیک' باغیوں کے خلاف جنگ' کفار کے خلاف جہاد سے بھی افضل ہے۔

قانونِ بین الاقوامی

قانونِ بین الاقوامی:۔ اسلامی حکومت کیلئے دوسری غیر مسلم حکومتوں اور قوموں سے تعلقات رکھنا ضروری ہیں۔ جب تک کوئی غیر مسلم حکومت اسلامی مملکت کے اندرونی یا بیرونی معاملات میں کھلم کھلا دخل اندازی نہ کرے اور عداوت نہ رکھے تو اس سے تعلقات رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسری حکومتوں اور قوموں سے تعلقات میں تجارتی معاملات اور سفر کے لئے راستوں کا استعمال وغیرہ امور آتے ہیں۔ ان تعلقات کیلئے معاہدے کئے جاتے ہیں۔ اگر دوسری حکومت ان معاہدات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرے تو اسلامی حکومت معاہدہ توڑنے والی حکومت کے ساتھ کسی قسم کے معاہدہ کی پابند نہیں رہتی۔

نبی کریمؐ نے مدینہ میں آمد کے بعد یہودیوں سے امن کا معاہدہ کیا۔ جب یہودیوں نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو نبی کریمؐ نے ان کے خلاف کارروائی کی اور انہیں مدینہ سے نکال دیا۔ اسی طرح اگر مسلمان قوم اپنے کسی دشمن سے جنگ میں مصروف ہے تو اُسے معلوم ہو کہ دشمن کے ساتھ مل کر اس قوم کے افراد بھی جنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے تو مسلمانوں کیلئے جائز ہے کہ اس معاہدہ توڑنے والی قوم کے افراد کو بھی جنگ میں قتل کرے۔

نبی کریمؐ نے بین الاقوامی پالیسی کے لئے یہ مستقل اصول قرار دیا تھا۔ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اُسے چاہیئے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ اسی طرح آپؐ نے یہ اصول بھی قائم کیا تھا۔ "جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر۔" اس کی مثال تاریخِ اسلام میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد سے ملتی ہے کہ جب انہوں نے روم کی سرحد پر اس لئے فوجیں جمع کرنا شروع کر دیں کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی رومی علاقہ پر حملہ کر دیں گے۔ تو ایک صحابیؓ نے نبی کریمؐ کا مذکورہ بالا ارشاد امیر معاویہؓ کو بتا کر معاہدہ کی ایسی خلاف ورزی' یعنی سرحدوں پر فوجوں کے اجتماع سے منع کیا۔

یکطرفہ فسخِ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر کسی دوسری قوم پر حملہ کرنا اسلام کے اصول کے مطابق جائز نہیں اگر دوسری قوم معاہدہ توڑتی ہے تو اُسے پہلے الٹی میٹم دیا جاتے کہ معاہدہ کی پابندی کرے اس کے بعد اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔ الٹی میٹم کی مدت گزرنے سے پہلے کوئی سا بھی جوابی اقدام جائز نہیں۔ اسی طرح دوسری قوم کیطرف سے نقضِ عہد اور غداری کے اندیشہ پر علی الاعلان معاہدہ توڑنے کے اعلان کے بغیر جنگی کارروائی ناجائز ہے۔ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے' جب فریقِ ثانی علی الاعلان معاہدہ توڑ کر معاندانہ کارروائی کیلئے مقابل آگیا ہو۔ فقہائے اسلام نے یہ استثنائی حکم نبی کریمؐ کے اس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپؐ نے انہیں فسخِ معاہدہ کا نوٹس دینے کی ضرورت نہ سمجھی' بلکہ بلا اطلاع ان پر حملہ کر دیا۔

اسی طرح ایک اور استثناء ہے کہ جب دوسرا فریق معاہدہ توڑتے ہوئے حرام مہینوں کا احترام نہ کرے تو مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ اسکے خلاف کارروائی کرے۔

دورانِ جنگ اگر دشمن صلح کی درخواست کرے تو خدا کے بھروسے پر اُسے قبول کر لینا چاہیئے۔ دشمنوں کے قیدیوں سے بہتر سلوک رکھنا چاہیئے۔ تاریخِ اسلام میں اس کی واضح مثال جنگِ بدر کے قیدیوں کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین سلوک کی ملتی ہے۔

اسی طرح اگر دورانِ جنگ دشمن قوم کے افراد یہ درخواست کریں کہ وہ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو انہیں ضرور امان دینی چاہیئے۔

قانونِ شہادت

قانونِ شہادت:۔ اسلام کا قانونِ شہادت اس کے قانونِ ضابطہ کا اہم ترین حصہ ہے۔ جس میں کسی واقعے یا معاملے کے متعلق گواہی دینے (شہادت) کے اصول و ضوابط' گواہی دینے والے (شاہد) کے کردار و صفات اور جس اتھارٹی کے سامنے شہادت دی جا رہی ہے اس کے اختیارات وغیرہ کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ شہادت اُس قطعی اور فیصلہ کن بیان کو کہتے ہیں جسے شاہد (گواہی دینے والے) نے واضح طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

قرآن مجید نے قانونِ شہادت کا یہ اصول مقرر کیا ہے۔ "اے ایمان والو! اگر کوئی ایسا شخص جس کا دینی و اخلاقی کردار درست نہ ہو تمہارے سامنے کوئی بات کرے' تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو (سورۃ الحجرات' آیت ۶)

اسلام کے قانونِ شہادت کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ شہادت
۲۔ اقرار
۳۔ حلف بالیمین

(۱) **شہادت** :۔ ایک مسلمان کے لئے گواہی دینا واجب ہے اور شہادت کو چھپانا حرام ہے "اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لئے سچی گواہی دو خواہ اس میں تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتے داروں کا نقصان ہی ہو" سورۃ نساء آیت ۱۳۵۔ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کو گواہ بنانا صرف اسی حالت میں درست ہے جبکہ کوئی مسلمان گواہ میسر نہ ہو۔ جہاں گواہی اختیاری مسئلہ ہو وہاں مسلمان' مسلمان کو گواہ بنائے۔ البتہ ذمّیوں کے گواہ ذمی ہو سکتے ہیں۔

گواہ قابلِ اعتماد ہو۔ اس سے پہلے کسی معاملہ میں جھوٹا ثابت نہ ہو چکا ہو خائن نہ ہو۔ سزا یافتہ نہ ہو اور ملزم سے دشمنی نہ رکھتا ہو۔ مدعی سے قریبی رشتہ داری کا تعلق نہ ہو۔ جیسے بیٹا' بھائی' باپ' ماں وغیرہ۔ حکومت کے باغی کی گواہی قبول نہیں کی جائیگی۔

معاشرہ میں گواہ کی حیثیت ایک نگہبان کی ہے۔ کسی غیر ذمہ دار آدمی کو شہادت کی ذمہ داری اور معاشرہ کی بہتری کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ذمہ دار اور سنجیدہ شخص کی گواہی لینی چاہیئے۔ اگر گواہ فاسق ہو یا اس کا کردار مشکوک ہو تو قرائن سے تائید حاصل کر کے اس کی گواہی تسلیم کی جا سکتی ہے۔ شہادت بالقرائن معتبر ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں ان کی عصمت شہادت بالقرائن سے ثابت ہوتی تھی۔

گواہوں کی کم از کم تعداد دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہے (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۲) البتہ زنا کیلئے کم سے کم چار عینی گواہوں کا ہونا ضروری ہے (سورۃ نساء آیت ۱۵) زنا کے معاملہ میں گواہوں کو اس بات کی شہادت دینی چاہیئے کہ انہوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے اور گواہوں کا اس امر پر بھی اتفاق ہونا چاہیئے کہ انہوں نے کب' کہاں' کس کو' کس سے زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان بنیادی امور میں معمولی اختلاف ان کی شہادت کو ساقط کر سکتا ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پانا' ثبوتِ زنا کیلئے کافی شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی شہادت ہے اور اس کو مالکی مذہب میں اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر رجم یا کوڑوں کی سخت ترین سزا دی جائے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے شہادت یا اقرار کیونکہ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں شبہ کو سزا کیلئے نہیں بلکہ معاف کرنے کے لئے محرک تسلیم کیا گیا ہے۔ زنا کے اس نازک معاملہ میں اور دوسرے معاملات میں قاضی شہادت کے بغیر محض اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کر سکتا خواہ اس نے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اسی طرح قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر رودادِ مقدمہ کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔

گواہوں کے بیانات میں اختلاف کی وجہ سے اگر مقدمہ جھوٹا ثابت ہو جائے تو گواہوں پر قذف کا مقدمہ چلایا جائے گا (قذف کے بارے میں مزید تفصیلات "قذف" دیکھیے)

(۲) **اقرار** :۔ شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے' وہ مجرم کا صاف اور صریح الفاظ میں فعل زنا کے ارتکاب کا اعتراف و اقرار ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک صرف ایک بار کا اقرار کافی نہیں۔ بلکہ چار بار بہوش و حواس اقرار کرنا ضروری ہے (جرم زنا کے بارے میں مزید تفصیلات "زنا" دیکھیے) تحریری شہادت بھی اقرار کے ضمن میں آتی ہے۔

(۳) **حلف بالیمین** (Oath) اسلامی قانونِ شہادت میں حلف سے بھی ثبوت کی ایک ضرورت پوری ہوتی ہے۔ امام بیہقیؒ اور طبرانیؒ نے نبی کریمؐ کی ایک حدیث روایت کی ہے۔ "شہادت مدعی کے ذمے ہے اور حلف اٹھانا مدعا علیہ کے ذمے" یعنی مدعی شہادت کے ذریعے اپنا دعویٰ ثابت کر سکتا ہے اور مدعا علیہ حلف اٹھا کر اپنے ذمے لگائے گئے الزام سے بری ہو سکتا ہے۔ شہادت میں ایک اور پہلو کا دھیان رکھنا بھی ضروری ہے کہ گواہی کیلئے اس واقعہ کا مکمل علم ضروری ہے کیونکہ اگر اس واقعہ کے متعلق گواہ کو پوری آگاہی نہیں تو اس کی گواہی بے معنی ہو جاتی ہے نبی کریمؐ نے ایک مقدمہ کے فیصلے کے دوران گواہ سے فرمایا تھا "اگر تو نے واقعہ کو خود اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھا ہے جیسے تو سورج کو دیکھ رہا ہے تو گواہی دے ورنہ رہنے دے" (احکام القرآن للجصاص)

قانونِ دیوانی

قانونِ دیوانی :۔ قانون کی وہ شاخ جو مختلف جماعتوں یا افراد کے درمیان تقسیم جائداد' استقرارِ حق' شفع' تنسیخ نکاح' طلاق اور لین دین کے معاملات و مقدمات سے متعلق ہے۔ اس میں اسلام نے ہر معاملہ کے متعلق قواعد و ضوابط مقرر کئے ہیں۔

قانونِ فوجداری

قانونِ فوجداری :۔ قانون کی وہ شاخ جس میں قتل' زنا' لوٹ مار' اغوا' ارتداد جیسے معاملات سے بحث کی جاتی ہے اور ان کے لئے اصول و ضوابط مقرر ہیں۔

قانونِ معاشرت

قانونِ معاشرت :۔ مسلم معاشرہ میں ایک فرد کے لئے اپنے قرابت داروں اور دوسرے افراد کے جو حقوق و فرائض ہیں وہ قانون معاشرت کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں اولاد کے لئے والدین کے حقوق و فرائض کو اولیت دی گئی ہے سورۃ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے معاشرتی قوانین کو بڑے واضح طریقے سے بیان کیا ہے۔ سورۃ حجرات آیت نمبر ۱۳ میں اللہ تعالیٰ انسان کی عظمت کا معیار اس کے ذاتی کردار اور اخلاق کی بلندی کو قرار دیتے ہیں نسل اور قبیلہ کی برتری کو جھٹلایا گیا ہے۔ اسلام نسل' رنگ' زبان' وطن اور قومیت کے تمام بتوں کو توڑتا ہے اور مساوات و اخوت کا درس دیتا ہے۔ کیونکہ تمام انسان ایک مرد اور عورت سے پیدا کئے گئے ہیں۔ قوموں اور برادریوں کا مقصد صرف پہچان کے لئے ہے۔ اسلام میں کوئی انسان دوسرے انسان سے برتر نہیں اور نہ ہی کوئی انسان دوسرے انسان کے لئے ذلیل اور کمتر ہے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور ان میں سے بہتر وہ ہے جو تقویٰ میں بہتر ہے اسلام رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کی تعلیم دیتا ہے اور قطع رحمی قطعی حرام ہے۔ ہر فرد کا جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہے اس کا حق بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ ہر رشتہ دار سے بمطابق استطاعت جتنی نیکی اور صلۂ رحمی کی جا سکتی ہے اس کو ضروری [illegible] گیا ہے۔

مسلمان مرد اور عورت کیلئے جائز نہیں کہ اپنے دوسرے بھائی بہن کو زبان سے تنگ و پریشان کرے یا طعن و تشنیع کرے یا اس کے عیوب کے لئے تجسس کرے۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط سے منع کیا ہے۔ بدکاری اور فحش باتوں کو اسلام میں پسند نہیں کیا جاتا بلکہ ایسے غلط کاموں کے خاتمہ کے لئے سخت تعزیری قوانین نافذ ہیں تاکہ مسلم معاشرہ میں امن و سکون رہے۔

(معاشرت سے متعلق بعض مضامین کیلئے دیکھئے 'حد' 'تعزیر' 'پردہ' 'حقوق العباد')

قانونِ معیشت

قانونِ معیشت :۔ اسلامی معاشرہ میں معیشت کیلئے یہ بنیادی قاعدہ ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہو ایسا نہ ہو کہ دولت صرف مالداروں میں ہی گھومتی رہے اور اس طرح امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ قرآن مجید میں دولت کے جمع کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا اور ایسا فعل کرنے والوں کے لئے دردناک سزاؤں کی وعیدیں ہیں۔ اسی مقصد سے سود ذخیرہ

اندوزی، ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ایسے تمام ذرائع جن کے ذریعے سے دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ جائے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ اموالِ غنیمت میں سے خمس نکالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صدقاتِ نافلہ کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے، مختلف قسم کے کفاروں کی ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جن سے دولت کا بہاؤ معاشرے کے غریب طبقے کی طرف پھیر دیا جائے، میراث کا ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ ہر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائرے میں پھیل جائے۔ قرآن نے واضح اخلاقی تعلیمات میں فیاضی کو بہترین صفت اور بخل کو قابلِ مذمت قرار دیا ہے خوشحال اور مالدار لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اُن کے مال میں سائل اور محروم لوگوں کا حق ہے جسے خیرات سمجھ کر نہیں بلکہ ان کا حق سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے۔ اسلامی حکومت کی آمدنی کے ایک بہت بڑے ذریعے یعنی فے کے متعلق یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ اس کا ایک حصہ لازماً اسلامی معاشرہ کے غریب افراد کو سہارا دینے کے لیے صرف کیا جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ غریبوں کی ضروریات کے پورا کرنے میں اُسے صرف کیا جائے۔ زکوٰۃ اور فے ہی اسلامی حکومت کی آمدنی کے دو بڑے ذرائع ہیں ان تمام احکامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے اسلامی حکومت کو اپنی آمد و خرچ کے نظام کے ساتھ تمام معاشی و مالی معاملات کو اس طرح سے ترتیب دینا چاہیئے کہ دولت کے ذرائع پر چند مالدار اور با اثر افراد کی اجارہ داری قائم نہ ہو سکے اور دولت کی تقسیم اور بہاؤ کا ایسا نظام ہو کہ رہ نہ تو امیروں ہی میں چکر لگاتی رہے اور نہ ہی اس کا بہاؤ غریبوں سے امیروں کی طرف ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی معاش کے لئے اس دنیا میں ایسے ذرائع و وسائل پیدا کئے ہیں جن پر صرف انسان کا ہی حق ہے لیکن ان ذرائع و وسائل کا کسی کو مالک نہیں بنایا گیا بلکہ انسان اللہ تعالیٰ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اُس میں ایک جائز حد تک تصرف کر سکتا ہے

(اسلامی قانون معیشت کے لئے مزید دیکھیئے خمس، زکوٰۃ، سود، صدقہ اور فے)

قانونِ میراث

:۔ اسلام نے دوسرے تمام معاملات کی طرح میراث کیلئے بھی اصول و ضوابط مقرر کئے ہیں اور اُن قوانین کیلئے بنیادی رہنمائی قرآن مجید کی سورۃ نساء سے ملتی ہے۔

میراث حقیقی رشتہ داروں میں ہی منتقل ہو سکتی ہے کوئی شخص اپنے رشتہ داروں کا حق غصب کر کے غیر متعلق شخص کو اپنی میراث منتقل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کوئی مسلمان اپنی میراث اپنے کسی غیر مسلم رشتہ دار کو نہیں دے سکتا اور نہ ہی کوئی مسلمان اپنے کسی غیر مسلم رشتہ دار کا وارث ہو سکتا ہے۔ البتہ بعض فقہا کی رائے میں دو الگ مذہب سے متعلق رشتہ دار اپنی وراثت ایک دوسرے کو منتقل کر سکتے ہیں۔ یعنی ایک عیسائی یہودی کا وارث ہو سکتا ہے۔ ان فقہا میں امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ شامل ہیں لیکن امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام احمدؒ اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت نہیں پا سکتے۔

حنفی مسلک کے ایک مشہور امام شمس الائمہ سرخسی اس سے مختلف رائے کا اظہار کرتے ہیں "کفار آپس میں اُن سب اسباب کی بنا پر بھی ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بعض ایسی صورتوں میں بھی تو وارث ہو سکتے ہیں جن میں مسلمانوں کے درمیان نہیں ہوتا۔"

اسلام میں متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) وراثت کا حقدار نہیں ہوتا۔ رشتہ داروں میں میراث کی تقسیم کی تفصیلات دیکھیئے "فرائض"۔

قانون فی الطب

۔ ابنِ سینا کی طب میں عملی، نظری اور احکامِ ادبیہ کے اعتبار سے مستند اور مشہور کتاب۔ روم سے ۱۵۹۳ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ ۱۵۹۵ء میں لاطینی زبان کے ترجمہ سے شائع ہوئی۔

قانون مسعودی

۔ البیرونی کی ہیئت اور نجوم پر شہرہ آفاق تصنیف البیرونی نے اسے غزنی میں قیام کے دوران لکھا اور سلطان مسعود بن محمود بن سبکتگین کو پیش کی۔ اس میں علومِ فلک، ہندسہ، جغرافیہ، ریاضی اور تاریخِ اُمم کا تفصیلی بیان ہے۔

قانون نامہ

۔ مملکت کے دستوری ماخذ کی حیثیت سے ابوسعود عمادی کی معروف تصنیف ہے جو اس نے سلطان سلیمان قانونی کے لیے لکھی۔

قاہر باللہ بن المعتضد

۔ عباسی دور کا انیسواں خلیفہ۔ دورِ خلافت صرف دو سال۔ یعنی ۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ / ۹۳۲ء تا ۹۳۴ء۔ اس نے اپنے مختصر عہدِ حکومت میں رعایا پر بہت ظلم و ستم کیا۔ اپنی سوتیلی والدہ کو قتل کرایا۔ مملکت میں جاسوسی کا سخت نظام قائم کیا اور رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے۔ بالآخر اقتدار سے محروم ہو کر گیارہ سال تک جیل میں بند رہا اور اس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ جیل سے نکلنے کے بعد جامع المنصور کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ بھیک مانگتے ہوئے یہ آواز لگایا کرتا تھا کہ "مجھ سے عبرت پکڑو کہ میں اس مملکت کا خلیفہ تھا۔"

قاہرہ

:۔ متحدہ عرب جمہوریہ کا دارالحکومت، جس کی آبادی ۴۵ لاکھ سے زائد ہے۔ شمالی مصر میں دریائے نیل کے ڈیلٹا کے سرے پر واقع ہے۔ براعظم افریقہ کا بہت بڑا شہر ہے۔ سویز یہاں سے ۸۰ میل مشرق کی جانب ہے۔ سویز اور قاہرہ ریلوے لائن کے ذریعے ملے ہوئے ہیں۔ قاہرہ دس مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک ہزار برس قبل دوسرے فاطمی خلیفہ معز الدین اللہ کے عہد میں اس کی بنیاد پڑی۔ فاطمی خلیفہ نے شہر بسانے کا کام اپنے غلام جوہر کے سپرد کیا جو اس زمانے کا مشہور سپہ سالار اور فاتح تھا۔ اس نے بغداد کے نقشے پر قاہرہ کی بنیاد ڈالی۔ اسی قسم کے دروازے تھے۔ ویسے ہی گلی کوچے۔ وسط میں خلیفہ کے لئے دو محل بنوائے گئے اور جامعہ ازہر کی عمارت تعمیر کی گئی جوہر اور معز الدین اللہ نجوم کے قائل تھے۔ چنانچہ جس روز قاہرہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا جوہر نے ایک نجومی کو ایک بلند مقام پر کھڑا کر دیا اور سنگِ بنیاد پر رسیاں باندھ کر ان میں گھنٹیاں باندھ دیں تاکہ جب نجومی کی تجویز کی ہوئی نیک ساعت آئے تو وہ رسی ہلا دے اور گھنٹی کی آواز سنتے ہی سنگِ بنیاد رکھ دیا جائے۔ اتفاق سے ایک کوا اڑتا ہوا آیا اور رسی میں اُلجھ گیا، گھنٹیاں بجنے لگیں اور لوگوں نے بنیادیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اس وقت مریخ سیارہ جسے قاہرہ بھی کہتے ہیں سامنے تھا۔ نجومی جو اسطرلاب ہاتھ میں لئے کھڑا تھا دیکھ کر چلّایا "القاہر! القاہر!" یعنی مریخ سامنے ہے، بنیادیں کیوں ڈال رہے ہو۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جب تک نجومی لوگوں کو روکتا، بنیادیں ڈالی جا چکی تھیں، چنانچہ یہ شہر قاہرہ ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۵۲۵ قبل مسیح بابلی تہذیب کے عروج کے زمانے میں

یہاں رومنوں نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا اور ایک بستی بسائی تھی۔ اس کے آثار اب بھی مصر العتیقہ (پرانے قاہرہ) میں موجود ہیں۔ یہ قاہرہ سے ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی جانب ہے ۱۱۷۶ء میں سلطان صلاح الدین نے یہاں نئی عمارات کا اضافہ کیا اور شہر کے گرد فصیل کھنچوائی' مملوک سلطانوں کے دور میں قاہرہ نے بڑی ترقی کی۔ اسی زمانے میں بلاق نامی شہر آباد ہوا۔ جو اب ایک بندرگاہ ہے اور قاہرہ کے مضافات میں ہے۔ ۱۵۱۷ء کو سلطان سلیم نے مملوک خاندان کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور قاہرہ ترکوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ۱۸۹۸ء تک یہ ترکوں کے زیرنگیں رہا۔ اسی سال فرانس نے حملہ کرکے قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔ تین برس بعد ترکوں اور انگریزوں کی فوجوں نے مل کر قاہرہ کو فرانسیسیوں سے واپس لیا اور یہ شہر ایک بار پھر عثمانی ترکوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۱۸۱۱ء میں ترک گورنر محمد علی کو قاہرہ پر اقتدار حاصل ہوا۔ ان کے دور میں اور پھر اسماعیل پاشا کے عہد حکومت میں جس کی ابتدا ۱۸۶۳ء میں ہوئی قاہرہ نے بڑی ترقی کی ۱۸۸۲ء میں انگریز یہاں قابض ہوئے ان کے دور حکمرانی میں یہاں پانی کی بہم رسانی اور نکاس کا نظام قائم ہوا۔ یہاں ہی سے مصر اور فلسطین کی مہموں کی رہنمائی کی جاتی تھی ۱۹۱۹ء میں قاہرہ میں برطانیہ کے خلاف شدید مظاہرے شروع ہو گئے جنہیں ختم کرنے کے لئے فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مصر' مشرق وسطیٰ میں اتحادی فوجوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ ۴ جولائی ۴۶ء کو یہاں سے انگریزی فوجیں نکل گئیں اور قاہرہ حکومت مصر کے براہ راست انتظام میں آگیا۔ قاہرہ خوبصورت شہر ہے اس پر اگرچہ یورپ کا بڑا گہرا اثر ہے تاہم پرانی وضع کی عمارتیں اب بھی بکثرت موجود ہیں اور شہر کے گلی کوچے بغداد کی یاد دلاتے ہیں۔ بغداد اور قاہرہ میں بڑا فرق یہ ہے کہ قدیم بغداد تو تاتاریوں کی غارت گری کی وجہ سے بالکل تباہ ہو گیا اور وہاں پرانی یادگاریں بہت کم رہ گئی ہیں۔ تاتاریوں نے قاہرہ پر بھی حملہ کرنا چاہا تھا لیکن اس وقت کی مصری حکومت آڑے آئی اور تاتاریوں نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصر پر مملوک خاندان برسر اقتدار تھا۔ اسی خاندان نے تاتاریوں سے شام خالی کرالیا تھا

قائداعظمؒ، محمد علی جناح (۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء — ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء)

مسلمانان برعظیم کی جدوجہد آزادی کا قائد، کراچی کے ایک تاجر جناح پونجا بھائی کے ہاں پیدا ہوا۔

۔ آپ کے والد کا تجارتی کاروبار اس زمانے میں خوب چمکا ہوا تھا' روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ اس لئے جب آپ نے ہوش سنبھالا تو ہر طرف آرام و آسائش کی فراوانی تھی۔ اس لئے جب آپ چھ سال کے ہوئے تو آپ کو مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ دس سال کی عمر میں آپ بمبئی پہنچ کر گوکل داس تیج پرائمری سکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ لیکن ایک سال بعد کراچی لوٹ آئے اور سندھ مدرسہ ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ پندرہ سال کی عمر میں اسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۲ء میں آپ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے لندن گئے اور دل و جان سے حصول علم میں منہمک ہو گئے۔ وہیں آپ نے سیاسیات میں دلچسپی لی اور اس زمانے کے مشہور پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے ۱۸۹۶ء میں آپ بیرسٹر بن کر کراچی لوٹے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ والد کا کاروبار بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ آپ نے ہمت نہ ہاری اور بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔ آپ نے حصول معاش کے لئے مشہور وکیل ہرچند رائے وشن داس کے ماتحت کام کرنا چاہا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوتے اور آپ ۱۹۰۲ء میں قسمت آزمائی کے لئے بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی پہنچنے کے بعد آپ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ متواتر تین سال تک یہ حالت رہی کہ آپ ہر روز باقاعدہ اپنے چھوٹے سے دفتر میں جا بیٹھتے اور شام تک بیٹھے رہتے اور پھر گھر لوٹ جاتے۔ اس عرصے میں آپ کو ایک مقدمہ بھی نہ ملا۔ لیکن آپ نے صبر و استقامت کا دامن نہ چھوڑا۔ آپ کے والد کے ایک دوست آپ کو بمبئی کے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر میکفرسن کے پاس لے گئے۔ اس نے خندہ پیشانی سے اس نوجوان بیرسٹر کا استقبال کیا اور اپنی ذاتی لائبریری سے استفادہ کی اجازت دے دی۔ مسٹر میکفرسن نے سفارش کی تو آپ کو پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عارضی ملازمت مل گئی۔ اب لوگوں کو اس جوہر قابل کا پتہ چلا۔ مالی پریشانیاں ختم ہو گئیں اور جب ملازمت کے خاتمے پر آپ نے قانونی پریکٹس شروع کی تو مقدمے پر مقدمے آنے لگے۔ حکومت نے آپ کو ۱۵۰۰ روپے ماہوار کی مستقل ملازمت کی پیش کش کی۔ لیکن آپ نے اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اتنی رقم تو میں روزانہ کما لیا کروں گا اور بعد کے واقعات نے اس قول کی پوری پوری تصدیق کر دی۔

آپ جب عدالت میں بحث کرتے اور دلائل دیتے تو جج اور سامعین دم بخود ہو کر سنتے۔ آپ عدالت سے مرعوب ہوئے بغیر مقدمہ پیش کرتے۔ ایک مرتبہ ایک انگریز جج نے آپ کو ٹوکا "مسٹر جناح یاد رکھیں کہ آپ کسی تھرڈ کلاس مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں۔" آپ نے برجستہ جواب دیا۔ "جناب آپ بھی یہ یاد رکھیں کہ آپ کسی تھرڈ کلاس وکیل سے مخاطب نہیں ہیں۔" جج اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

۱۹۰۶ء میں آپ کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں شریک ہوئے۔ اس کے صدر دادا بھائی نوروجی تھے۔ آپ ان دنوں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اسی اجلاس میں آپ نے پہلی تقریر کی۔ حسن اتفاق سے یہ تقریر مسلمانوں کے قانون وقف الاولاد کے متعلق تھی۔ سامعین آپ کی تقریر سے متاثر ہوئے اور انہیں پتہ چلا کہ برصغیر کے آسمان سیاست پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے۔ اسی سال مسلمانوں نے بھی اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیا اور مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۰ء میں آپ برطانوی ہند کی امپیریل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ [illegible] وقت تک آپ مسلم لیگ سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اس سے الگ رہے [illegible] کانگریس کے سرگرم رکن اور حامی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر اور سید [illegible] نے آپ کو مسلم لیگ میں شمولیت پر آمادہ کر لیا۔ آپ اس میں شامل تو ہو گئے [illegible] دلی رجحان کانگریس کی طرف رہا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ نے کانگریس اور مسلم لیگ کو [illegible] دوسرے کے قریب لانے کی مخلصانہ کوشش کی۔ جس کا نتیجہ میثاق لکھنؤ کی [illegible] میں نمودار ہوا۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور آپ کو [illegible] کا علمبردار سمجھا جاتا تھا۔ کانگریس نے ان کی خدمات کے پیش نظر بمبئی [illegible] ہال تعمیر کیا۔

جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت اپنے وعدوں سے منحرف ہو گئی اس نے رولٹ ایکٹ جیسا متشددانہ قانون نافذ کرکے آزادی تحریر و تقریر اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی سارے برصغیر میں اس کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔ ہر بڑے شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا [illegible] خدا انگریز کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ اسی زمانے میں مسٹر گاندھی جنوبی افریقہ میں ستیا گرہ کی کامیاب تحریک چلا کر برصغیر آئے اور رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کے کرتا دھرتا بن گئے۔ ہندوؤں نے انہیں مہاتما کا لقب دیا۔ اکثر ہندو مسلم لیڈر تحریک ترک موالات میں شریک ہو گئے۔ لیکن قائداعظم اس سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ اس کی وجہ یہ

تھی کہ آپ نے اپنی خدا داد قابلیت سے معلوم کر لیا تھا کہ یہ تحریک آخر کار ناکام ہو کر رہے گی۔ آپ نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن آپ کی شنوائی نہ ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں کانگریس سے الگ ہو گئے۔

قائداعظم ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک خاموشی سے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے رہے ۱۹۳۰ء میں آپ لندن کی دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اسی گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین میں علامہ اقبالؒ بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے قیام کی نشاندہی کی تھی۔ آپ نے قائداعظم سے کئی ملاقاتیں کیں اور ان کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کی۔ لیکن ان دنوں قائداعظم برصغیر کی سیاسیات سے اتنے بیزار ہو چکے تھے کہ آپ نے واپس آنے کے بجائے انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر کے وہیں پریکٹس کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ آپ پریوی کونسل میں پریکٹس کرنے لگے۔
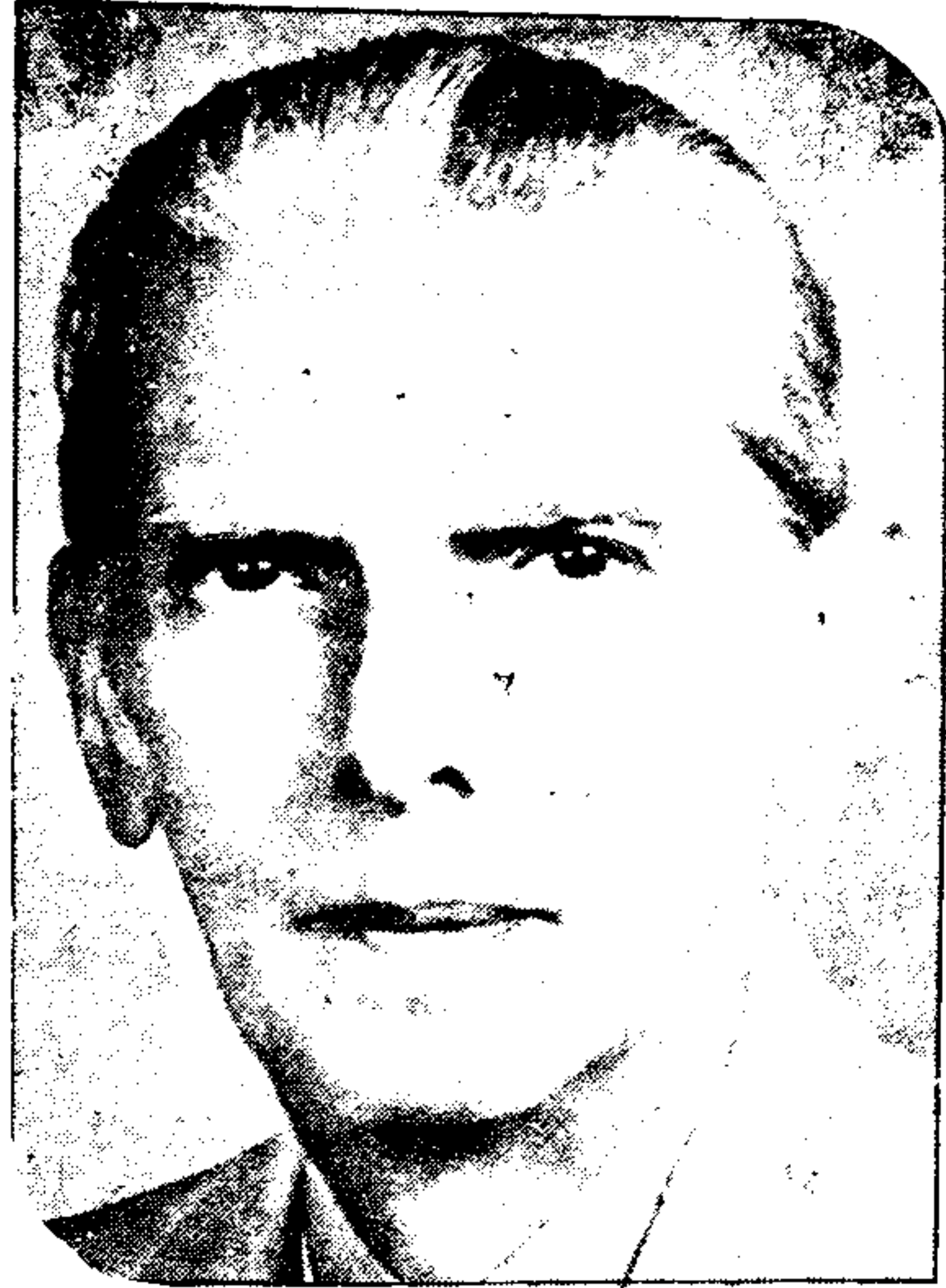
۱۹۳۳ء میں لیاقت علی خاں اپنی بیگم کے ہمراہ لندن گئے۔ جب قائداعظم سے ملے تو ان سے واپس آنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ہمیں ایک ایسے قائد کی ضرورت ہے جو کسی قیمت پر بھی خریدا نہ جا سکے۔ مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے اور آپ ہی ہیں جو مسلم لیگ کو حیاتِ نو بخش سکتے ہیں۔ یہ سن کر قائداعظم نے فرمایا کہ آپ واپس جا کر مسلمانوں کے جذبات کا جائزہ لیں، اگر آپ نے پھر بھی مجھے بلایا تو میں آ جاؤں گا۔ لیاقت علی خاں نے واپس آ کر حالات کا پورا پورا جائزہ لیا اور قائداعظمؒ کو لکھا کہ آپ فوراً چلے آئیں۔

آپ ۱۹۳۴ء میں تشریف لے آئے اور آتے ہی مسلم لیگ کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی مہم شروع کر دی۔ ۱۹۳۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو آپ کو یہ اختیار دیا گیا کہ مسلمانوں کو من حیث القوم منظم کیا جائے تاکہ ہونے والے صوبائی انتخابات جماعتی سطح پر لڑے جائیں۔ آپ نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ آپ نے آسام سے صوبۂ سرحد تک صوبے صوبے کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا جو پیش آنے والے تھے۔ آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ اپنی صفوں میں انتشار نہ پیدا ہونے دیں اور ایک پرچم تلے جمع ہو کر انتخابات لڑیں یہ پرچم مسلم لیگ کا پرچم ہے۔ اس انتخاب میں مسلم اقلیت والے صوبوں میں لیگ ۶۰ سے ۷۰ فیصد نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ مسلم اکثریت والے صوبوں میں لیگ کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنگال مسلمان کرشک پرجا پارٹی کے زیرِ اثر تھے، پنجابیوں پر یونینسٹ پارٹی کا جادو چل چکا تھا اور پٹھانوں کو کانگریس نے مسحور کر رکھا تھا۔ ان انتخابات کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس اور انگریز کے گٹھ جوڑ نے ہندو لیڈروں کے حوصلے بلند کر دیئے اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے نعرہ بلند کیا۔ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں، کانگریس اور حکومتِ برطانیہ۔ قائداعظمؒ نے جو بڑے دل گردے کے انسان تھے۔ بڑے سکون سے جواب دیا۔ "ایک تیسری پارٹی بھی ہے اور وہ ہے مسلم لیگ"۔

دو سال کے اندر ہی آپ نے اپنے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے یہ ثابت کر دکھایا کہ مسلم لیگ ایک ایسی طاقت ہے۔ جس سے انکار ناممکن ہے۔ ۱۹۳۷ء میں جب انتخابات ہوئے تو کانگریس، مسلم لیگ کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کرنے کی جرأت نہ کر سکی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ وہ کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اب مسلمان قوم اپنے قائداعظمؒ کی قیادت میں بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس قوم کی غلامی ہرگز قبول نہ کرینگے جو کم و بیش آٹھ سو سال تک ہماری محکوم رہ چکی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ قائداعظمؒ اس میں شرکت کے لئے بمبئی سے تشریف لائے۔ جب آپ کی ٹرین کانپور کے اسٹیشن پر پہنچی تو مسلمانوں کے جمِ غفیر نے ڈبے کو گھیر لیا اور زور زور سے نعرے لگائے کہ ہم آپ کے اشارۂ ابرو پر اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ دوسرے دن آپ زندگی میں پہلی مرتبہ اُرَیپ پاجامہ شیروانی اور سیاہ استرخانی ٹوپی پہنے سٹیج پر نمودار ہوئے اور معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت دیا۔ جس میں آپ نے فرمایا۔

"کانگریسی خیال کے مسلمان اس بات کی اشاعت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر کانگریس کے حلقے میں آ جانا چاہیئے لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر مسلمان اس فریب کا شکار ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ ان کی قومی ہستی کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہونے والا ہے"۔

اسی زمانے میں قوم نے آپ کو قائداعظمؒ کا خطاب دیا۔ آپ القابات و خطابات کے کبھی بھی محتاج نہیں تھے۔ ایک مرتبہ حکومتِ برطانیہ نے سر کے خطاب سے نواز کر انہیں خریدنا چاہا لیکن آپ نے یکسر انکار کر دیا اور کہا کہ میں مسٹر جناح کہلوانے کو ترجیح دوں گا، لیکن قائداعظمؒ کے خطاب پر جو حکومت کے بجائے ملت نے دیا تھا آپ معترض نہ ہوئے۔ مسٹر جمیل الدین احمد کا خیال ہے کہ یہ خطاب مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان دہلی نے تجویز کیا تھا، لیکن بعض کی یہ رائے ہے کہ اس کا سہرا لاہور کے سرگرم اور پرجوش سیاسی کارکن میاں فیروز الدین احمد کے سر ہے۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے پٹنہ کے اجلاس میں آپ نے خطبۂ صدارت میں فرمایا" میں ہر شخص سے اپیل کرتا ہوں کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے یہ آپ کی جماعت ہے، یہ کسی کی ملکیت نہیں ہے یہ آپ کی اپنی تنظیم ہے اور اسے جس راہ پر چلانا چاہیں چلا سکتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں کافی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ یہ آغاز بلاشبہ عظیم الشان ہے۔ اب اگر آپ اپنی ہمت سے کام لے کر اپنے آپ کو ایک منظم فوج کی طرح آراستہ کر لیں تو یقین کیجئے کہ فتح آپ کے قدم چومے گی"۔

مسلمانوں نے قائداعظمؒ کی اس آواز پر صدقِ دل سے لبیک کہی اور متحد ہو گئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں قائداعظم کی زیرِ صدارت ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کا مطالبہ پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے سرکاری طور پر کیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں آپ نے سرسٹیفورڈ کرپس کی زیرِ صدارت برطانیہ کی حکومت کی طرف سے بھیجے گئے ایک مشن سے تعاون کیا کیونکہ کرپس مشن کی تجاویز مسلم لیگ کے مقصد کے قریب تھیں۔ لیکن کانگریس کی ہٹ دھرمی سے یہ مشن ناکام ہوا۔

مئی ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر لندن سے تین سینئر وزراء پر مشتمل ایک کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ لیکن یہ کانفرنس بھی ناکام رہی۔ قائداعظم اپنی کوششوں میں ہمہ تن مصروف تھے کہ مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن حاصل کیا جائے۔ لارڈ ویول کے بعد ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا۔ انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے بات چیت کے بعد تمام صورتِ حال سے حکومتِ برطانیہ کو آگاہ کر دیا۔

۱۲ مئی ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تمام لیڈروں کو بلا کر برطانوی حکومت کے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ برِصغیر کو ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حکومتِ برطانیہ دستبردار ہو جائے گی۔

۷ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے کراچی پہنچ گئے اور آپ نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔ گورنر جنرل بننے کے بعد آپ نے ایک لمحہ کو بھی آرام نہیں کیا اور اس نئی مسلم مملکت کے استحکام کے لئے ہر وقت کام کرتے رہے۔ کام کی کثرت سے آپ کی صحت پر کافی اثر پڑا۔ ہندوستان سے کثیر تعداد میں مسلمان مہاجرین کی آمد سے نئی مملکت کے لئے ان کی آبادکاری کے لئے کافی مسائل پیدا ہو گئے۔ مہاجرین کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم اور لوٹ مار سے آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ اب آپ کی صحت اکثر خراب رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں آپ ڈاکٹروں کے مشورہ سے زیارت گئے کیونکہ اب کمزوری بھی کافی ہو گئی تھی۔ وہاں مسلسل علاج ہوتا رہا۔ اگست ۱۹۴۸ء کے اواخر میں صحت میں کچھ افاقہ ہوا لیکن ستمبر کے آغاز میں صحت پھر بگڑنے لگی حتیٰ کہ ان کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ ۱۱ ستمبر کی سہ پہر کو قائداعظم کو کراچی لایا گیا۔

رات دس بجکر بیس منٹ پر اس عظیم انسان کی روح پرواز کر گئی عزم و استقلال کا یہ پیکر قوم کو یتیمی کی حالت میں چھوڑ کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

قائداعظم کی وفات حسرتِ آیات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح کراچی کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ ہزاروں مسلمان گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے حزن و ملال میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے آنکھوں سے آنسو بہا رہے تھے۔ اکثر دیواروں سے سر پٹک رہے تھے۔ تمام رات ہزاروں مسلمانوں کا جمِ غفیر بابائے ملت کے ماتم میں سوگوار اور اشکبار رہا۔ سرکاری افسر، وزراء، غیر ملکی سفیر، فوجی جرنیل، بحری اور اعلیٰ افسران سب بچشمِ پُرنم کھڑے تھے۔ ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں ماتم کدہ بن گیا۔ دوسرے دن قائداعظم کا جنازہ فوجی اعزاز سے اٹھایا گیا۔ جنازہ میں چار لاکھ سے زائد مسلمانوں نے شرکت کی اور ۱۲ ستمبر کو عیدگاہ کے میدان میں اسلام کے اس لعلِ جلیل کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

قائمُ بامرِاللہ - (محمد بن عبیداللہ المہدی)۔ (۲۷۸ھ/۸۹۱ء - ۳۳۴ھ/۹۴۶ء) مغرب میں فاطمی خلفاء میں سے دوسرا۔ ۳۲۲ھ/۹۳۴ء میں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کی حکومت کے خلاف مخلد بن کیداد نے شمالی افریقہ میں بغاوت کی۔ اس بغاوت کو فرد کر دیا گیا۔

قائمُ بامرِاللہ ۔ (ابوجعفر عبداللہ بن احمد القادر - ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء - ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء) - ۲۶واں عباسی خلیفہ۔ اس کے دورِ حکومت میں بساسیری فتنہ اٹھا۔ بویہین کی حمایت سے اس فتنہ کی سرکوبی کر دی گئی اور اس فتنہ کے قائد کو بغداد سے نکال دیا گیا۔ خلیفہ کے حکم سے اس کے لیے عراق کی مساجد میں خطبہ دیا جانے لگا۔

قبا مدینہ منورہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک آبادی ہے۔ وہاں [illegible] کے کچھ خاندان آباد تھے۔ نبی کریمؐ نے مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ میں داخل ہونے سے قبل قبا میں قیام کیا۔ آپؐ کا قیام کلثوم بن ہدم کے ہاں تھا جو وہاں کے ممتاز خاندان عمرو بن عوف کا سردار تھا۔ قبا میں آمد کے بعد نبی کریمؐ نے سب سے پہلا کام [illegible] قبا کی تعمیر تھی۔ یہ مسجد کلثوم بن ہدم کی زمین پر قائم کی گئی۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد [illegible] خود اپنے دستِ مبارک سے قبلہ رخ رکھا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ [illegible] عمرؓ نے ایک ایک پتھر رکھا۔ صحابہ کرامؓ نے اس مسجد کی تعمیر [illegible] اور نبی کریمؐ خود بھی تعمیرِ مسجد کے لیے کام کرتے رہے۔ اسلام میں سب سے پہلے [illegible] گئی۔ جو ۸ تا ۱۱ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ / ۲۰ تا ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء کے درمیان [illegible] گئی۔ سورہ توبہ کی آیت ۱۰۸ میں اسی مسجد کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

"البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے ہی دن تقویٰ پر رکھی گئی وہ مسجد اس کی [illegible] کہ آپؐ اس میں کھڑے ہوں ...."

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ ہر ہفتہ کو مسجدِ قبا [illegible] کے لیے کبھی سوار اور کبھی پیدل تشریف لے جاتے اور دو رکعت نماز [illegible] نبی کریمؐ کا ارشاد ہے "جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے مسجدِ قبا میں دو رکعت [illegible] تو اسے ایک عمرہ کا ثواب ملے گا"۔ زائرینِ حرمین شریفین مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

قبر شرع میں قبر عالمِ برزخ کا نام ہے عرف میں قبر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں نعش دفنائی جاتی ہے۔

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قبر کو چونہ گچ کرنے، اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

قبر کا سرہانہ شمال کی طرف رکھا جاتا ہے تاکہ اس میں میت کا رخ قبلہ کی طرف ہو سکے۔ قبر کی گہرائی ایک متوسط آدمی کے سینہ کے برابر رکھی جاتی ہے۔ [illegible] کی سمت لحد بنائی جاتی ہے۔ اور اس میں میت کو لٹا کر لحد کا دہانہ کچی اینٹوں سے بند کر دیا جاتا ہے اور قبر کو مٹی سے بھر کر زمین سے کسی قدر اونچی بنا دیتے ہیں۔

قبروں کی زیارت سے پہلے منع کیا گیا تھا مگر بعد میں آنحضرتؐ نے اجازت دے دی کہ قبروں کی زیارت کر کے عبرت حاصل کیا کریں۔ مگر عورتوں کو کسی صورت میں قبروں میں جانا جائز نہیں۔

نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ قبر کو محض ایک گڑھا نہ سمجھو بلکہ یا تو یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ احادیث

میں قبر کے عذاب کے متعلق کافی ذکر آیا ہے۔ احادیث کے مطابق قبر میں انسان کے دفن کرنے کے بعد دو فرشتے منکر نکیر سوال جواب کرنے کے لئے آئیں گے اور انسان کے دنیاوی اعمال کے مطابق قبر کی کیفیت ہوگی۔ نیک لوگوں کے لئے قبر حدِ نظر تک وسیع ہو جائیگی یعنی عالم برزخ کی اس کیفیت میں وہ آرام سے رہیں گے اور بُرے لوگوں کیلیے ایک سا گڑھا بن جائیگی۔ اسلام میں قبر کے پختہ کرنے کی ممانعت ہے۔

لیکن خلفائے بنو اُمیّہ اور بنو عباس نے عیسائیوں سے متاثر ہو کر اپنے خاندان کی عظمت کی خاطر پختہ مقبروں کی تعمیر شروع کردی۔ اس وقت سے پختہ قبروں کا رواج شروع ہوا۔

قبرستان

:۔ وہ جگہ جہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اجتماعی قبرستان کم ہوا کرتے تھے۔ عام طور پر گھر کے قریب ہی گڑھا کھود کر مُردہ کو دفن کر دیا جاتا۔ آبادی کے بڑھ جانے سے، آبادی سے باہر قبرستان کے لئے ایک مخصوص جگہ کی ضرورت کا احساس ہوا۔ بعض علاقوں میں خاندانی قبرستانوں کا رواج ہے۔

قبرستانوں میں جنت المعلےٰ (مکہ مکرمہ)، جہاں اکثر صحابہ کرامؓ، ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ اور دوسرے اکابرین دفن ہیں اور جنت البقیع (مدینہ منورہ) جہاں ازواج مطہراتؓ، بنات رسول کریمؐ، صحابہ کرامؓ اور دوسرے اکابرین دفن ہیں مشہور قبرستان ہے۔

قبرص

:۔ رقبہ ۳۵۷۲ مربع میل آبادی ۶ ½ لاکھ تقریباً

مشرق بحیرہ روم کا ایک جزیرہ جو ۱۴۵ میل لمبا ہے اور ۶۰ میل چوڑا ہے اس میں دو پہاڑی سلسلے متوازی چلے گئے ہیں۔ جن کے درمیان وسیع زرخیز میدان ہے جس میں کاشتکاری ہوتی ہے۔ انگور، اناج، زیتون اور تمباکو یہاں کی اہم پیداوار ہیں۔ معدنیات بھی پائی جاتی ہیں جس میں اسبسٹوس قابلِ ذکر ہیں۔ بھیڑ بکریاں اور ریشم کے کیڑے بھی پائے جاتے ہیں۔

خلافت حضرت عثمانؓ میں شام کے گورنر حضرت امیر معاویہؓ نے بحری بیڑہ کی تیاری کے بعد اس جزیرہ پر پہلا حملہ کیا۔ اہلِ قبرص نے صلح کی پیش کش کی جو بعض شرائط کے ساتھ طے ہو گئی اور مسلمان اُن سے سات ہزار درہم سالانہ خراج لیتے رہے۔ ۳۲ھ میں اہلِ قبرص نے صلح کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف رومیوں کی مدد کی۔ اس پر حضرت امیر معاویہؓ نے حملہ کر کے قبرص فتح کر لیا۔

۱۵۷۱ء میں ترکوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور ترک بسانے شروع کئے۔ ۱۸۹۸ء میں برلن کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق ترکوں نے یہ جزیرہ سالانہ خراج کی ادائیگی پر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۱۴ء میں یہ جزیرہ انگریزی نوآبادی قرار پایا۔ ملک میں انگریزوں کے خلاف تحریک شروع ہو گئی جس نے بعد میں کافی شدت اختیار کر لی۔ ۱۹۶۰ء میں انگریزوں نے اس جزیرہ کو آزاد قرار دے دیا مگر اقتدارِ اعلیٰ انگریزوں کو حاصل رہا اور یہاں انگریزوں نے فوجی اڈے قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۹ء کے انتخابات میں آرچ بشپ میکراتس سوم قبرص کا صدر اور فاضل کوچک (ترک) نائب صدر مقرر ہوئے۔ پادری میکراتس نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد قبرص کے ترکوں کے خلاف نفرت کی فضا پھیلانی شروع کی تاکہ انہیں وہاں سے نکالا جاسکے۔ اس پر کئی بار ملک کے اندر فسادات ہوئے ترکی قبرصی ترکوں کی حمایت کر رہا ہے اور یونان پادری میکراتس کی حمایت کر رہا ہے۔ قبرصی ترکوں کا جو آبادی میں ۲۰ فی صد کے قریب ہیں اور ایک مخصوص علاقے میں رہتے ہیں، مطالبہ ہے کہ ان کی ایک الگ ریاست بنا دی جائے۔

قبض و بسط

:۔ تصوف میں قلب کی کیفیات کے لئے دو مخصوص اصطلاحیں۔ "قبض" کے معنی سکڑنے اور بند ہونے کے ہیں اور بسط کے معنی کھلنے اور کشادہ و وسیع ہونے کے ہیں۔ قلب پر یہ دونوں کیفیات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے طاری ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو سیدھی راہ دکھاتا ہے" (سورۃ شوریٰ آیت نمبر ۱۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بسط ہی کی کیفیت منسوب کی جا سکتی ہے۔

جس طرح کہ عام طبعی علوم میں ان کے ماہرین پر مختلف کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں، کہ وہ کسی وقت تو دقیق سے دقیق اور مشکل ترین معاملات و مسائل کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور کسی وقت واضح باتوں کی طرف بھی ان کی توجہ نہیں جاتی۔ اسی طرح سے اہلِ تصوف کا بھی کسی وقت یہ حال ہوتا ہے کہ اسرارِ الٰہی ان کے قلب و روح پر بلا کسی کاوش کے منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں اور دل خود ہی اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور کسی وقت خواہش اور کاوش کے باوجود روح و قلب اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اوّل الذکر صورت "بسط" کی حالت ہے اور موخر الذکر "قبض" کی۔ بسط میں دل مسرور اور نفس مغلوب و مقہور ہوتا ہے اور قبض میں اس کے برعکس دل مغلوب و مقہور ہو گا اور نفس مسرور۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: "جب نفس بسط کی حالت میں ہو تو قلب قبض کی حالت میں ہو گا۔"

قبطی

:۔ قدیم مصریوں کی عیسائی اولاد، جس کی تعداد اب بھی مصر کی آبادی میں ۵ سے ۱۰ فیصد ہے۔ یہ لوگ اپنی قدیم زبان فراموش کر چکے ہیں اور اب عربی بولتے ہیں مصر میں عیسائیت کے آنے سے پہلے بھی یہ لوگ قبطی کہلاتے تھے۔ فراعنۂ مصر اسی قوم سے ہوتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل مصر جا کر آباد ہو گئے اور جب حضرت موسےٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو قبطیوں نے بنی اسرائیلیوں کو غلاموں سے بدتر بنا رکھا تھا۔ بنی اسرائیل کے ساتھ ان ظلم و زیادتیوں کا ذکر واقعۂ فرعون و موسےٰ میں قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعثت سے پہلے جب ابھی مصر میں فرعون کے محل میں مقیم تھے تو اُن سے ایک قبطی کا قتل ہو گیا۔ جو ایک کمزور بنی اسرائیل پر ظلم کر رہا تھا۔

جب رومی عیسائیوں نے مصر پر قبضہ کیا تو قبطیوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ نبی کریمؐ کے دور میں جب مسلمانوں کے ساتھ ایک جنگ میں قبطیوں کے کئی افراد قیدی ہوئے تو اُن میں ماریہ قبطیہؓ بھی تھیں جن کو نبی کریمؐ نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ چودہویں صدی عیسوی میں مصر پر مسلمانوں کے مکمل قبضہ کے بعد قبطیوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

قبلہ

: وہ سمت جس کی طرف مسلمان اپنا رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اُسے قبلہ کہا جاتا ہے۔ دینِ ابراہیمی میں بیت الحرام مکہ مکرمہ ہی عبادت کے لئے قبلہ تھا۔ جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تعمیر کیا گیا تھا۔ بیت المقدس (یروشلم) جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ بنی اسرائیل کیلئے قبلہ مقرر ہوا تھا۔ اس کی شہادت خود بائبل سے ملتی ہے۔ بیت المقدس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ۴۸۰ سال بعد حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا (۱۔سلاطین، باب ۶۔ آیت ۱) اور یہ اہلِ توحید کا قبلہ قرار پایا (۱۔سلاطین

باب ۸۔ آیت ۲۹۔۳۰)۔ بعض روایات کے مطابق ہجرت مدینہ سے پہلے اور ہجرت مدینہ کے ۱۶ یا ۱۷ ماہ بعد تک بھی مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ بعض مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ قیام مکہ کے دوران مسلمانوں کا کونسا قبلہ تھا۔ ایک رائے کے مطابق نبی کریمؐ اور اُن پر ایمان لانے والے بیت اللہ مکہ مکرمہ (کعبہ) کو قبلہ مانتے تھے۔ دوسری رائے کے مطابق قبلہ ہمیشہ سے یروشلم (بیت المقدس) رہا ہے اس لئے مکہ میں نبی کریمؐ اور مسلمانوں کے لئے بیت المقدس ہی قبلہ تھا۔ لیکن ایک تیسری رائے کے مطابق نبی کریمؐ اور مسلمان اس طرح نماز ادا کرتے تھے کہ یروشلم (بیت المقدس) اور کعبہ ایک ہی لائن میں ہوں بہرصورت قبلہ کے متعلق جو صورت واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ ہجرت کے بعد کے زمانے کی ہے جب مسلمان مدینہ ریاست میں آزاد تھے۔ مکہ مکرمہ میں تو اُن پر قریش کے ظلم و ستم کی کثرت تھی۔ جب تحویلِ قبلہ کا حکم آیا۔ اس وقت نبی کریمؐ اور مسلمانوں کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا۔ سورۃ البقرہ کی آیات ۱۴۳ تا ۱۴۵ میں تحویلِ قبلہ کا حکم اس طرح سے ہے "پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت مگر ان لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت ثابت نہ ہوا، جو اللہ کی ہدایت سے فیضیاب تھے۔ اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ یقین جانو وہ (اللہ تعالیٰ) لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔ یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اُسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رُخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرو۔"

تحویلِ قبلہ کا یہ حکم رجب یا شعبان ۲ھ میں نازل ہوا۔ ابن سعد کی روایت کہ نبی کریمؐ بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کی نماز کی ادائی جاری تھی۔ دو رکعتوں کی ادائیگی کے بعد تیسری رکعت میں وحی نازل ہوئی اور اسی وقت آپؐ اور آپؐ کی اقتدا میں صحابہ کرامؓ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رُخ پھیر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی عام منادی کر دی گئی۔ براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع کی حالت میں تھے حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف رُخ پھیر گئے۔ انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ بنی سلمہ میں یہ اطلاع دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت ہوئی۔ ایک رکعت ادا ہو چکی تھی۔ منادی سنتے ہی تمام جماعت نے اپنا رُخ بدل دیا۔ بیت المقدس مدینہ سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہوگا اور مقتدیوں کو بھی پچھلی طرف منہ کرکے رُخ کو تبدیل کرنا پڑا ہوگا۔ روایت کے مطابق جس مسجد میں نماز ظہر کے دوران یہ حکم آیا ہے، اُسے مسجد ذوالقبلتین (دو قبلوں کی مسجد) کہتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے قبلہ کی سمت نماز ادا کرنے کا جو حکم ہے، اُس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہو اُسے بالکل ناک کی سیدھ قبلہ (کعبہ) کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسا کرنا بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے کعبے کی طرف منہ کرنے کی طرف حکم دیا گیا ہے، نہ کہ کعبے کی سیدھ میں۔ قرآن کے حکم کے مطابق صحیح

قُبّۃ الصّخرہ

سمتِ قبلہ کی تحقیق ضروری ہے مگر ظنِ غالب کے بعد جو سمت کعبے کی محسوس ہو، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے۔

مسلمان نہ صرف نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرتے ہیں بلکہ قربانی کے وقت بھی جانور کا رخ بھی قبلہ کی طرف کیا جاتا ہے۔ مُردے کو دفن کرنے وقت بھی اُس کا منہ بھی قبلہ کی طرف رکھتے ہیں اور اسی طرح احترامِ قبلہ کی وجہ سے نبی کریمؐ نے اسطرف منہ یا پشت کرکے پاخانہ یا پیشاب کرنے سے منع کیا ہے

اکثر مسلم ممالک میں کعبہ (قبلہ) کی سمت، اطراف کے معلوم کرنے کے پیمانہ میں مقرر ہو چکی ہے۔ جیسے مصر اور فلسطین وغیرہ کے علاقوں کے لئے جنوب، مغربی علاقوں کے لئے شرق اور برصغیر ہندو پاک کے علاقوں کے لئے مغرب کو قبلہ کی سمت رُخ کرنا مانا جاتا ہے، کیونکہ ان ممالک میں انہی مخصوص سمتوں میں قبلہ (کعبہ) واقع ہے۔

قُبّۃ الصّخرہ

قُبّۃ الصّخرہ، خانہ کعبہ اور گنبدِ خضرا کے بعد روئے زمین پر قبۃ الصخرہ مسلمانوں کے لیے مقدس ترین مقام ہے صخرہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی چٹان کے ہیں۔ اس چٹان کے متعلق بہت سی روایات ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے بھی دو ہزار سال پہلے فرشتے اس کا طواف کر چکے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ طوفانِ نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اس چٹان پر آکر رکی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت اسرافیلؑ اسی چٹان پر کھڑے ہو کر صور پھونکیں گے۔ اکثر مفسرین اور محدثین کے مطابق صخرہ جنت سے بھیجی ہوئی ایک چٹان ہے اس لیے اُسے بیت الجنت بھی کہا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نبی کریمؐ تک تمام انبیاؑ نے اس چٹان پر عبادت کی ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ چٹان زمین کا سنگِ بنیاد ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہی وہ چٹان ہے جس پر حضرت داؤدؑ کے زمانے میں یہودی اپنی قربانیاں لاکر رکھ دیا کرتے تھے اور آسمان سے آنے والی آگ کا شعلہ اُسے جلا کر راکھ کر دیتا ہے، جو اُن کی قربانی کی قبولیت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے ابن منصور کی روایت سے یہ لکھا ہے کہ صخرہ بیت المقدس حضرت سلیمان کے عہد میں بارہ ہزار ہاتھ بلند تھا۔ اس پر ایک معبد تھا، جو صندل کی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اس میں لعل و یاقوت سے کام لیا گیا تھا۔ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تاراج کیا تو سب کچھ لوٹ کر ساتھ لے گیا۔

قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے متعلق بھی متضاد روایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہودی اور عیسائی بھی اسے مقدس اور اپنا قبلہ مانتے ہیں، لیکن "عہد نامہ قدیم" میں اس کا ذکر نہیں ہے، البتہ تالمود میں تذکرہ آیا ہے۔

نبی کریمؐ، صحابہ کرامؓ کے ہمراہ ایک طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں اور ۱۶ یا ۱۷ ماہ مدینہ منورہ میں صخرہ کی طرف رُخ کرکے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ بالآخر اللہ کے حکم پر انہوں نے مسجد الحرام کو اپنا قبلہ بنایا۔

روایت کے مطابق نبی کریمؐ شبِ معراج کو یہاں سے ہی براق پر سوار ہو کر آسمانوں کی طرف گئے تھے اور اسی چٹان کے پہلو میں انبیا کرام کی امامت فرمائی تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ جب بیت المقدس کے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے کے بعد یہاں آئے تو انہوں نے صخرہ پر نماز ادا کی اور ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ یہ مسجد تاریخ میں "مسجدِ عمرؓ" کے نام سے مشہور ہے۔ آج کل چٹان پر ایک ہشت پہلو عمارت ہے، جسے اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے تعمیر کرایا تھا۔ مورخ سبط الجوزی اپنی کتاب "مراۃ الزمان" میں بیان کرتا ہے کہ عبدالملک نے سلطنت کے بہترین کاریگروں کے ذریعے اُس کی تعمیر ۶۹ھ/ ۶۸۷ء میں شروع کرائی جو ۷۲ھ/ ۶۹۰ء کو تکمیل کو پہنچی۔ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے لیے مصر کا سات سال کا خراج وقف کر دیا اور حرم کی تعمیر کے بعد تین سو خُدام خدمت کے لیے مقرر کیے۔

خلیفہ عبدالملک کے بعد، عباسی خلیفہ المامون کی ہدایت پر اس کے بھائی ابو اسحاق نے (جو بعد میں معتصم کے نام سے خلیفہ بنا) گنبد کی مرمت و تزئین کی کیونکہ صخرہ کی عمارت کو ایک زلزلہ سے نقصان پہنچا تھا۔ ۴۰۷ھ/ ۱۰۱۶ء میں ایک اور زلزلہ سے قبۃ الصخرہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو فاطمی خلیفہ الظاہر کے حکم سے اس کی مرمت ہوئی۔

۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا تو اس نے حرم مقدس کی تعمیر و تزئینِ نو کا کام کرایا۔ خاندانِ ایوبی کے بعد کے فرمانرواؤں نے اس عمارت کی تجدید، مرمت اور آرائش میں حصہ لیا۔ مملوک سلاطین نے بھی اس مقدس عمارت کی خدمت گزاری اور تزئین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سولہویں صدی کے ربع اوّل میں بیت المقدس عثمانی ترکوں کے قبضہ میں آگیا۔ عثمانی سلاطین نے عمارت کی تزئین و آرائش اور تعمیر و مرمت پر کافی توجہ دی۔ ۱۹۱۹ء میں یہ شہر ترکوں کے ہاتھوں سے نکل کر برطانوی انتداب میں آگیا۔ ۱۹۴۸ء میں یہود نے بیت المقدس پر قبضہ کی کوشش کے دوران قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو شدید نقصان پہنچایا۔ شاہ اردن کی اپیل پر عالمِ اسلام کی مدد سے اس نقصان کی تلافی کے لیے ۱۹۵۸ء میں تعمیر و مرمت کا کام شروع کرایا۔ جو اپریل ۱۹۶۴ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس پر تین لاکھ بیس ہزار پونڈ صرف ہوئے۔ لیکن اس عظیم مرمت کو ابھی تین سال بھی نہ گزر پائے تھے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے در و دیوار ایک بار پھر اسرائیلی یہودیوں کی گولہ باری سے لرز اٹھے اور اس عظیم عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ اب اس مقدس عمارت اور شہر پر یہودیوں کا قبضہ ہے اور وہ مسجد اقصیٰ کے نیچے گہری کھدائی کرکے گنبدِ صخرہ مسجد اقصیٰ کی جگہ تیسرے ہیکل کو تعمیر کرنے کے منصوبہ پر عمل کر رہے ہیں۔

مشہور ماہر فن تعمیر جیمز فرگیسن لکھتا ہے۔ میں نے ہندوستان، یورپ اور دنیا کے دیگر مقامات میں بہت سی شاندار عمارتیں دیکھی ہیں۔ لیکن میں نے قبۃ الصخرہ جیسی شان و شوکت والی عمارت کہیں نہیں دیکھی۔ ایک یہودی مورخ پروفیسر میئر لوکمیس بھی اپنی تالیف "یروشلم کے اماکن مقدسہ" میں قبۃ الصخرہ کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتا ہے "اس میں کوئی شک نہیں کہ گنبد صخرہ دنیا کی حسین ترین عمارت ہے"۔ قبۃ الصخرہ اسلامی فنِ تعمیر کی بے نظیر مثال ہے۔ صخرہ کا صحن شمالاً جنوباً ۳۱۰ ہاتھ، شرقاً غرباً ۲۸۹ ہاتھ ہے۔ صحن مسجد سے سات ہاتھ اُونچا ہے سیڑھیاں چڑھ کر صخرہ کے چبوترے میں داخل ہوتے ہیں۔ صحن میں چاروں طرف سات قبے ہیں۔ جن کے نام قبۃ الارواح، قبۃ الخضر، قبۃ نج نج، قبۃ السلسلہ، قبۃ المریم، قبۃ المعراج، جس کے متعلق مشہور ہے کہ شب معراج نبی کریمؐ اسی قبہ سے آسمان کی طرف گئے تھے اور اس کے پہلو میں قبۃ الصلوٰۃ، جہاں نبی کریمؐ نے تمام انبیا کی امامت فرمائی تھی۔

وسطِ صحن میں قبۃ الصخرہ ہے جو بیش قیمت سنگِ مرمر کے سولہ ستونوں پر قائم ہے۔ اکیاون ہاتھ اُونچا اور رنگ برنگ کے شیشوں سے آراستہ ہے، فرش کا قطر دو سو چالیس ہاتھ ہے اور نیچے دو چھتیں ہیں۔ سقف زیریں لکڑی کی ہے اور طلائی روغن سے نہایت خوش نما آراستہ ہے۔ بالائی چھت سیسہ اور دوسری دھاتوں سے بنی ہوئی ہے۔ چار سمت چار دروازے ہیں شمالی دروازہ کو "باب الجنۃ" کہتے ہیں زائرین اسی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ اس کی ہموار سطح میں قبلہ رُخ سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں میں داہنی جانب ایک مقام لسان الصخرہ ہے جس کے متعلق روایت

ہے کہ شب معراج کو اللہ تعالےٰ نے صخرہ کو قوت گویائی دی اور اس مقام سے نبی کریمؐ کو سلام کی آواز آئی۔ اس لیے اس کا نام لسان صخرہ پڑ گیا۔ یہاں سے سیڑھیاں نیچے غار کو جاتی ہیں۔ سیڑھیوں سے اتر کر داہنے ہاتھ جو محراب ہے وہ حضرت سلیمانؑ سے منسوب ہے۔ اس کے قریب ایک محراب نبی کریمؐ سے منسوب ہے۔ اس سے متصل حضرت خضرؑ کی محراب ہے۔ اس کے قریب مسند حضرت جبرائیلؑ اور محراب حضرت ابراہیمؑ ہے اور ان سے متصل حضرت داؤدؑ کی محراب ہے۔

صخرہ کا خوبصورت گنبد سنگ مرمر کے بارہ ستونوں اور سنگ خاراں کے چار چوکور ستونوں پر قائم ہے۔ پوری عمارت کی چھت جس گنبد پر واقع ہے وہ سنگ مرمر کے آٹھ اور رنگین پتھر کے سولہ ستونوں پر ایستادہ ہے۔

صخرہ کی عمارت، بیت المقدس شہر میں سب سے اونچی ہے اور یہ شہر کے اندرون اور بیرون سے اپنی پوری آب و تاب سے نظر آتا ہے۔ نبی کریمؐ کی حدیث مبارکہ ہے کہ اس مقام پر جو نماز ادا کی جائے گی، اس کا ثواب ۲۵ ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

قابوس بن سعید

(۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء۔۔۔) سلطنت اومان کے سلطان صلالہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اتالیقوں سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں انھیں فوجی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے پہلے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی اور پھر برطانیہ کی سنڈہرسٹ ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے انھوں نے نہایت اعزاز کے ساتھ فوجی تعلیم مکمل کی۔ ازاں بعد کچھ عرصہ برطانوی فوج کے ساتھ رہے۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں اپنے والد سلطان سعید بن تیمور کی معزولی کے بعد تخت نشین ہوئے۔ اقتدار سنبھالتے ہی انھوں نے عوام کو بنیادی انسانی سہولتیں فراہم کرنے کا عزم کیا اور ان تمام پابندیوں کو ختم کیا جو سلطان سعید نے عائد کر رکھی تھیں ان میں ریڈیو کی پابندی سب سے اہم تھی۔ سلطان قبوس کی قیادت میں اومان بتدریج ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ سلطان صلح جو اور خاموش طبع فرمانروا ہیں۔ یہ اسلامی ممالک کے واحد سربراہ تھے جنھوں نے مصر اور اسرائیل کے مابین ڈیوڈ کیمپ معاہدہ ہونے پر صدر سادات کی تائید کی تھی۔
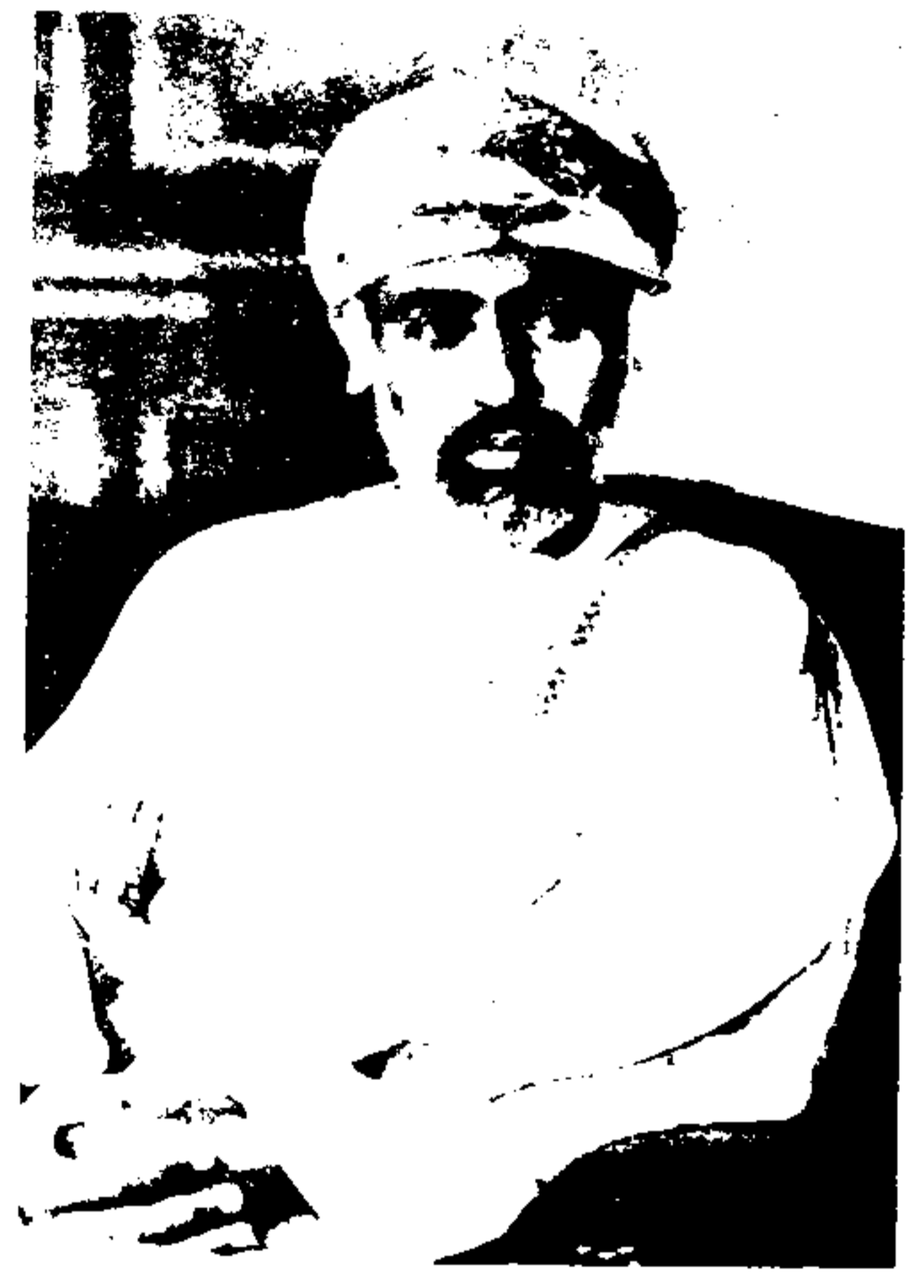
قبیصی عبدالعزیز

دسویں صدی کا منجم جو اپنی کتاب "المدخل الی صناعۃ احکام النجوم" کی وجہ سے مشہور ہے، جسے اس نے حلب (شام) میں سیف الدولہ حمدانی کو پیش کیا۔ یورپی فضلاء نے اپنی لغات میں اس کا ذکر کیا ہے۔

قبیلہ

مختلف خاندانوں کے مجموعہ کو قبیلہ کہا جاتا ہے جو قوم کا ایک جزو ہوتے ہیں جن کا جد اعلیٰ ایک ہی ہو۔ وطن اور آب و ہوا کے اختلافات کی وجہ سے قبیلوں میں باہم رنگ و روپ اور خد و خال کے لحاظ سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض مذہب میں قبیلوں میں باہمی نزاع، کشمکش اور تعصب کو جائز سمجھا جاتا ہے مگر اسلام نے صرف جغرافیائی اور فطری اختلافات کو ہی تسلیم کیا ہے اور ایک دوسرے پر فوقیت جتلانے کو یکسر غلط قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں "یہ قبائل صرف پہچان کے لئے ہیں (سورۃ الحجرات آیت ۱۳) اسلام میں افراد کا تقویٰ ہی معیار برتری ہے۔" اللہ کے نزدیک تم میں سے بہتر وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے (سورۃ الحجرات آیت ۱۳)

اسلام سے پہلے عرب اور دوسرے ممالک میں لوگ قبیلوں میں اس طرح بٹے ہوئے تھے کہ ہر وقت آپس میں برسر پیکار رہتے تھے تاکہ اپنے قبیلہ کی برتری ثابت کی جا سکے۔ لیکن اسلام نے اس قسم کی قبیلہ داری کے طریقہ کو یکسر ختم کر کے مساوات اخوت کا سبق دیا۔

قتّات

سخن چین یعنی وہ شخص جو چھپ کر لوگوں کی باتیں سنے اور دوسروں تک پہنچائے۔ صاحب قاموس نے چھپ کر باتیں سننے والے کو قتات کہا ہے [illegible] یا نہیں دوسروں تک پہنچائے یا نہ پہنچائے۔

نبی کریمؐ کی ایک حدیث میں قتات کو جنت سے محروم قرار دیا ہے [illegible] "حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو فرماتے سنا کہ قتات جنت میں داخل نہیں ہوگا۔"

قتادہؓ بن نعمان

نام قتادہ، کنیت [illegible] متعلق تھے۔ عقبہ ثانیہ کی بیعت میں اسلام قبول کیا۔ بدر [illegible] نمایاں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے دن بنو ظفر کا جھنڈا آپ [illegible] بڑی جانبازی سے شرکت کی۔ اسی غزوہ میں آپ کی آنکھ زخمی ہو [illegible]

آپ گروہ انصار میں سے اکابر صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے [illegible] نبی کریمؐ کی کئی احادیث آپ سے روایت ہیں۔ حضرت عمرؓ [illegible] ۶۵ سال ۲۳ھ میں وفات پائی۔

قتل

قتل کی پانچ قسمیں ہیں (۱) قتل عمد (۲) قتل شبہ عمد (۳) قتل خطا (۴) قتل جاری مجری خطا۔ (۵) قتل بالسبب۔

(۱) قتل عمد تو یہ ہے کہ قصداً ہتھیار سے قتل ہو [illegible]
اس قتل عمد کے سبب قاتل گنہگار ہوگا اور اس پر قصاص واجب ہوگا۔

(۲) قتل شبہ عمد اسے کہتے ہیں کہ قصداً غیر ان چیزوں کے جو قتل عمد میں مذکور ہوئیں یعنی ہتھیار اور دھار دار تیز چیز سے نہ ہو۔ مثلاً لاٹھی یا کوڑے یا بڑے پتھر سے مارنا اسے خطائے عمد بھی کہتے ہیں۔ اس قتل کے سبب قاتل گنہگار ہوگا اور اس پر کفارہ واجب ہوگا اور دیت مغلظہ لازم آئے گی۔ قصاص واجب نہیں ہوگا

چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے: "جو شخص کسی مومن کو خطاً سے قتل کر ڈالے تو اس پر ایک غلام مسلمان کا آزاد کرنا ہے اور دیت مقتول کے گھر والوں کو سپرد کی جاوے"

(۴) قتل جاری مجریٰ خطا یہ ہے کہ مثلاً کوئی سونے والا کروٹ لینے میں کسی پر گر پڑے اور جس پر پڑے اور وہ مر جاوے یا کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ پڑے اور جس پر پڑے وہ اس کے صدمے مر جاوے۔ یا سواری کسی کو روند ڈالے اس قتل جاری مجریٰ خطا میں بھی کفارہ اور دیت مثل قتل خطا واجب ہے۔ قتل خطا اور قتل جاری مجریٰ خطا میں ترک احتیاط کی وجہ سے قاتل گنہگار ہوجاتا ہے اور اسی سبب سے اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔

(۵) قتل بالسبب یہ ہے کہ آدمی اپنی غیر مملوکہ زمین میں بغیر حکم حاکم کنواں کھودے یا پتھر رکھے اور اس کنوئیں میں کوئی گر کر مر جاوے یا پتھروں سے ٹھوکر کھا کر مر جاوے تو اس قتل میں بھی اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہوجاتی ہے مگر کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

اس بات پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا اور قتل سے اگر قاتل توبہ کرے گا تو صحیح ہوگی۔ لیکن ابن عباس اور زید بن ثابت اور ضحاک سے منقول ہے کہ قاتل کی توبہ منظور نہیں کی جائے گی۔

اگر بیٹے نے اپنے باپ یا ماں کو قتل کیا تو بالاتفاق بیٹا عوض میں قتل کیا جائے گا۔ اور اگر باپ نے بیٹے کو قتل کیا تو باپ اس کے عوض میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر ایک جماعت نے مل کر ایک شخص کو قتل کیا تو کل جماعت اس کے عوض میں قتل کی جائے گی۔

جمیع اقسام قتل میں سوائے قتل بالسبب کے قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوجائے گا

سورۃ المائدہ کی آیت ۳۲ میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں" جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے جرم کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی" لہذا قتل انسانی ایک بھیانک جرم ہے اور ایک واقعۂ قتل پوری انسانیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ...... اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ" یعنی انسانی جان جو دراصل اللہ تعالےٰ کی طرف سے حرام ٹھہرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق کے ساتھ قتل کرنا کس طرح جائز ہے تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور دو صورتیں نبی کریمؐ نے بیان فرمائی ہیں۔

(۱) انسان کسی دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق ثابت ہوگیا ہو۔

(۲) دین حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کئے بغیر چارہ نہ ہو۔

(۳) اسلامی معاشرہ میں بدامنی پھیلانے یا اسلامی نظامِ حکومت کے خلاف بغاوت کرے۔

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

(۵) ارتداد اور خروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

ان پانچ صورتوں کے سوا کسی بھی صورت میں انسانی قتل قطعاً حرام ہے خواہ وہ مومن کا ہو یا ذمی یا کافر کا۔

(مزید تفصیلات کیلئے دیکھیے "دیت" اور "قصاص")

قتلِ نفس

:۔ یعنی خودکشی۔ قرآن مجید میں واضح طور پر خودکشی کا ذکر نہیں لیکن نبی کریمؐ کی ایک طویل حدیث سے خودکشی جیسے قبیح فعل کی وضاحت ہوتی ہے۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم (صحابہ کرامؓ) نبی کریمؐ کے ساتھ غزوہ حنین میں تھے۔ آپؐ نے ایک شخص کے متعلق (جو کہ غزوہ میں شریک تھا) فرمایا کہ یہ شخص جہنمی ہے لڑائی کے وقت وہ شخص بڑی جانبازی سے لڑا اور کافی زخم کھائے۔ ایک دوسرے شخص نے نبی کریمؐ کی خدمت میں عرض کی کہ جس شخص کے متعلق آپؐ نے فرمایا تھا کہ وہ جہنمی ہے وہ تو بڑی جانفشانی سے معرکہ میں حصہ لیتا رہا اور کئی زخم کھائے۔ آپؐ نے پھر فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ قریب تھا کہ لوگ اس معاملہ میں تذبذب میں مبتلا ہوتے کہ لوگوں نے دیکھا کہ اس شخص نے اپنے زخموں کی تکلیف برداشت نہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے کو کاٹ کر خود کو ہلاک کر دیا"

یہ کیفیت دیکھ کر چند صحابہ کرامؓ نبی کریمؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ آپؐ کی بات کو اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا، وہ شخص خود اپنا گلا کاٹ کر ہلاک ہوگیا......"

اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ خودکشی اتنا سنگین جرم ہے کہ جہاد جیسا افضل عمل بھی اُس کا کفارہ نہیں ہوسکتا اور اسی لئے اللہ تعالےٰ انسان کے اس عمل کو پسند نہیں فرمائیں گے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جان کی حفاظت نہ کی اور خود اپنے ہاتھوں سے اس جان کو ختم کر دیا۔

قتیبہ بن مسلم

:۔ خاندانِ بنو امیہ کے پانچویں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد کا نامور جرنل۔ جس کی سرکردگی میں وسط ایشیاء اور چین کے علاقے فتح ہوئے۔ ۷۰۴ء میں والیٔ عراق حجاج بن یوسف کی سفارش پر خراسان کا گورنر مقرر ہوا۔ مرو کا شہر اُسکا دارالحکومت تھا۔ بصرہ کے چالیس ہزار کوفہ کے سات ہزار اور سات ہزار موالی قتیبہ بن مسلم کی کمان میں تھے۔ اُس نے طخارستان، بلخ، بخارا، فرغانہ، سمرقند، خوارزم وغیرہ کے علاقے بھی فتح کئے۔ ۷۱۵ء میں کاشغر کو بھی فتح کیا۔ اس طرح سے مسلمانوں نے ۷۱۵ء تک وسطِ ایشیاء میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ خلیفہ ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں بعض بدگمانیوں کی وجہ سے خلیفہ کے خلاف بغاوت کی اور فرغانہ میں ایک لڑائی میں مارا گیا۔

قدامہ بن جعفر، ابوالفرج

:۔ مؤرخ، فلسفی، ریاضی دان۔

قدامہ نے بغداد کے محکمہ مال میں ایک معمولی ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس محکمہ میں ترقی کرتے کرتے سب سے بڑا عہدہ دار بن گیا۔ المکتفی باللہ کے دور میں مسلمان ہوا۔ ریاضی اور منطق کے ساتھ ساتھ عربی ادب اور زبان پر گہری نظر تھی۔ ابن الندیم نے "الفہرست" میں قدامہ کی ادبی تصنیفات کا ذکر بھی کیا ہے۔ تصنیفات میں نقدالشعر، نزہۃ القلوب اور الخراج وصنعۃ الکتابت شامل ہیں۔

قدامہ کو وسیع انتظامی تجربہ تھا۔ جس کا اندازہ الخراج کتاب سے ہوسکتا ہے الخراج کا اردو میں ترجمہ ابوالخیر مودودی نے کیا ہے۔ اس کتاب کی آٹھ فصلیں تھیں لیکن ان میں سے اکثر ناپید ہیں۔ صرف پانچویں اور چھٹی فصل کے چند باب ملتے ہیں۔ جن میں محکمہ ڈاک، جنگلات، خزانہ، عامرۂ شاہراہوں، نہروں، چشموں اور پہاڑوں کے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔ اس کتاب کے دونادر لیکن نامکمل نسخے استنبول کے ایک مدرسہ کوپرلو کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ قدامہ کا انتقال ۳۲۰ھ/۹۳۲ء کو ہوا۔

قدامہؓ بن مظعون

:۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوتے اور نبی کریمؐ کے حکم سے حبشہ کو ہجرت کی۔ بعد ازاں مدینہ کو ہجرت کی۔ رسول کریمؐ کے ساتھ تمام جنگوں میں شریک رہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں بحرین کا گورنر مقرر کیا۔ عہدِ خلافت

حضرت علیؓ میں بعمر ۶۸ سال ۷ ۴ ھ میں وفات پائی۔

قُدرت :۔ اردو میں قدرت کا ہم معنی لفظ "نطرت" بھی ہے بلفظ قدرت سے مراد قادرِ مطلق کی قوت ہے جو ذاتِ باری کے لئے مخصوص ہے۔ موت وحیات، رزق وافلاس، فتح وشکست وغیرہ سب امور میں قدرت (باری تعالےٰ) کا ہاتھ کارفرما ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ کے اسماء الحسنیٰ میں قادر، قدیر اور مقتدر آتے ہیں۔ تقدیر اور مقدر کے مفہوم بھی قدرت کے لفظ سے وابستہ ہیں۔ قدرت کاملہ اور قدرتِ ربی کے تصور نے انسان میں صبر وبرداشت کے اوصاف کو سہل الحصول کر کے رکھ دیا ہے جس سے عقیدۂ ایمان باللہ کو مستقل مقام حاصل ہوتا ہے۔

قدرت کا اثر اور عمل تمام افراد واقوام پر مسلط ہے۔ دہریے اور ملحد لوگ بھی قدرت کے قائل ہیں البتہ وہ اُسے وجودِ باری سے متعلق ماننے میں متامل ہیں۔

قدریہ :۔ معتزلہ اور بعض دوسرے فرقے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد نیکی اور بدی کا اختیار دے دیا ہے اور اُسے افعال پر قدرت دی ہے کہ وہ اس قدرت کے مطابق، اپنی مشیت کے موافق اچھے یا بُرے افعال کرتا ہے اور اپنے اسی اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح وذم اور آخرت میں عذاب وثواب کا مستحق ہوتا ہے، "قدریہ" کہلاتے ہیں۔

اس مذہب کے قواعد سب سے پہلے واصل بن عطا الغزال نے مقرر کئے۔ جس کا قول تھا کہ باری تعالیٰ حکیم، عادل ہے۔ اس کی طرف شر اور ظلم کی اضافت جائز نہیں نہ یہ جائز ہے کہ اللہ نے خود ہی اپنے بندوں کو جن اوامر ونواہی سے مکلف کیا ہے ان کے خلاف اعمال کے صدور کا وہ خود ارادہ کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انہوں نے اس کے حکم ہی سے کیا ہو۔ لہٰذا بندہ ہی خود فاعل خیر وشر ہے۔ وہی ایمان وکفر اور اطاعت ومعصیت کا اختیار رکھتا ہے اور اللہ نے اُسے ان سب کاموں کی قدرت عطا کی ہے۔

اسی نظریہ پر مزید اضافہ ان الفاظ سے ابراہیم بن سیّار النظام نے کیا "اللہ صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے، شر، معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں"۔

معمر بن عباد السلمی اور ہشام بن عمرو الفوطی نے "وَالْقَدْرُ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ" کا اعتقاد رکھنے والوں کو کافر اور گمراہ قرار دیا۔ کیونکہ اس اعتقاد سے اللہ تعالیٰ معاذ اللہ ظالم ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح معتزلہ میں جاحظ، خیاط، کعبی، جبائی، قاضی عبدالجبار وغیرہ اکابر علماء کا اسی بات پر اتفاق ہے۔

"بندوں کے افعال کا خالق خدا نہیں ہے بلکہ بندہ خود اُن اعمال کا خالق ہے اور نہ ہی خدا بندہ کو ان افعال کے کرنے پر مجبور کرتا ہے"۔

ان عقائد کی تائید میں معتزلہ نے قرآن مجید کی اُن آیات سے استدلال کیا ہے جو خالصاً تقدیر کے موضوع پر اُن کے نظریہ کی تائید کرتی تھیں اور اُن آیات کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں جو جبریہ کے نظریہ کو پیش کرتی ہیں۔ جن کو جبریہ نے اپنے نظریہ کی تائید میں استعمال کرلیا اور اسی طرح اُن آیات کی طرف بھی توجہ نہ کی جو تقدیر کے موضوع پر اعتدال کا راستہ دکھاتی ہیں۔ بعد میں معتزلہ نے قدریہ کے بجائے اپنے لئے "عدلیہ" کا لقب اختیار کیا۔

(اس موضوع کی مزید تشریح کیلئے جبر وقدر، جبریہ، قضاء وقدر اور تقدیر کا مطالعہ کیجئے)

قدوری ۔ امام قدوری کی فقہی مسائل پر ایک مختصر تصنیف ہے۔ لیکن اپنے جامع انداز اور بہترین ترتیب کی وجہ سے فقہ حنفی کی معتبر ترین متون میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ ہدایہ جیسی ضخیم اور بلند کتاب اسی "مختصر قدوری" اور امام محمدؒ کی جامع صغیر کی شرح ہے۔ قدوری پر ہر دور میں مختلف حاشیے لکھے گئے اور کئی علماء نے اس کی مستقل شروح لکھیں۔ ان میں سے "جوہرہ نیرہ" بہت مشہور ہے۔

قدوری، امام ۔ آپ کا پورا نام احمد بن محمد بن جعفر اور کنیت ابوالحسن ہے۔ آپ بغداد کے ایک محلہ قدورہ سے تعلق کی وجہ سے قدوری کے نام سے معروف ہوئے۔ قدر عربی میں ہنڈیا کو کہتے ہیں۔ قدور اس کی جمع ہے۔ یہ محلہ کمہاروں کا تھا۔

آپ نے علم فقہ کی تعلیم اپنے وقت کے جلیل القدر فقیہہ محمد بن یحییٰ جرجانی سے حاصل کی۔

آپ ایک روایت کو دوسری روایت پر ماخذ کے لحاظ سے یا اصول درایت کے اعتبار سے ترجیح دینے پر اعلیٰ قدرت رکھتے تھے۔ آپ کا شمار فقہائے احناف میں بہت بلند ہے۔

آپ کی تصنیفات میں مختصر القدوری، کتاب التجرید اور کتاب التقریب مشہور ہیں۔ آپ نے رجب ۴۲۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ پہلے آپ کو محلہ ابی حلفت میں دفن کیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد شارع منصور پر ابوبکر خوارزمی کی قبر کے پاس منتقل کر دیا گیا۔

قدوس خدا کا نام ہے۔ تمام عیبوں سے پاک۔ قرآن مجید میں آیا ہے: وہ ایسا اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ ہے۔ پاک ذات ہے، تمام عیبوں سے بری ہے۔ امن دینے والا ہے۔ نگہبان ہے۔ زبردست ہے۔ بڑائی والا ہے۔ بڑی عظمت رکھتا ہے۔ (سورۃ الحشر ۲۳)

قدیم پرانا، ازلی، ازل سے۔ وہ چیز جس کی ابتداء نہ ہو۔ یہ صفت خاص خدا کی ہے اور کوئی چیز اس میں اس کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتی یعنی خدا کے سوا کوئی چیز قدیم نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ ورنہ اس کی صفت میں نقص لازم آتا ہے۔ تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیرا۔ فرقہ آریہ خدا کے سوا مادہ اور روح کو بھی قدیم مانتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک مادہ اور روح خدا کی قدرت کے اثر سے خارج ہیں جس سے لازم آتا ہے کہ خدا پورا خالق نہیں [illegible]

قذافی محمد معمر : ۱۹۴۱ء کو سرتے میں پیدا ہوئے۔ [illegible] طرابلس کے درمیان ایک اہم شہر ہے۔ قذافی اُن سے خاندان کی عرفیت ہے جو نام ایک نخلستان قذافہ کی وجہ سے ہے، جہاں قذافی کا خاندان رہتا تھا۔ [illegible] والد کاشت کار تھے۔ لیبیا پر اطالوی قبضے کے دوران قذافی کے والد [illegible] کے ہمراہ گرفتار ہوئے۔ آپ اطالوی استعمار کے خلاف برسر پیکار رہے [illegible] تھے۔ اسی لیے قذافی آزادی کی جدوجہد کے ایک مجاہد کے بیٹے اور ایک [illegible] بھتیجے ہیں۔ آپ کے دادا ۱۹۱۱ء میں اطالیہ کے خلاف جنگ [illegible] شہید ہوئے تھے۔ اسی جنگ میں ایک گیارہ سالہ بچی فاطمہ میدان جنگ میں زخمیوں کو پانی

جاتے ہوئے شہید ہوئی۔ اسی پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنی سوزِ شہادت ولولۂ عقیدت میں ڈوبی ہوئی نظم کہی جو بانگِ درا میں موجود ہے۔

آپ کے والد نے اپنے بچے میں غیر معمولی ذہانت کے آثار دیکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے قرض لیا اور مزید تعلیم کے لیے شہر کے مدرسہ میں داخلہ دلایا۔ قذافی جلد ہی طالب علموں کا لیڈر بن گیا۔ ۱۹۷۰ - ۱۹۵۰ء والا عشرہ اس طالب علم لیڈر کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوا۔

ابھی تک یہ طالب علم لیڈر سیکنڈری سکول کا طالب علم تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جنرل نجیب والا انقلاب قذافی کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ گیا اور سیاسی شعور کو مزید اجاگر کر دیا۔ جنرل نجیب کے بعد کرنل جمال عبدالناصر کی آتش بار تقریروں نے اس نوجوان طالب علم کے ذہن کو مسخر کر لیا۔ حافظہ تیز تھا۔ اس لیے قذافی ناصر کی تقاریر کو ازبر یاد کر لیتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں ناصر نے نہر سویز کو قومیانے کا انقلابی اعلان کیا۔ انہی ایام میں لیبیا میں اس نوجوان طالب علم لیڈر معمر قذافی نے ناصر کے حق میں ایک جلوس نکالا اور اس کی قیادت کی۔ عراق اور شام کے انقلابات کی خبریں معمر کے جذبۂ انقلاب کو آئے دن تیز کر رہی تھیں اور الجزائر کی جنگِ آزادی قذافی کو درسِ حریت دے رہی تھی اور اسی دوران لیبیا کے شاہ ادریس کی غلط پالیسیاں عوام کو شاہ ادریس سے مایوس کر رہی تھیں۔

معمر قذافی نے لیبیا یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ملٹری اکادمی میں داخلہ لیا۔ فوج میں کمیشن ملنے کے بعد قذافی نے لیبیا میں انقلاب کے لیے اپنا کام شروع کر دیا اور اسی منصوبہ کو لے کر قذافی اور اس کے کئی ہم جماعت اور ہم مسلک فوج میں آئے تھے۔ ان میں عبدالسلام جلود، بشیر الہوادی، عزالدین بروک اور ابراہیم شامل تھے۔

ان انقلابی نوجوانوں نے فوج میں اپنے ہم خیال افسروں کا ایک خفیہ گروپ "فری آفیسرز" کے نام سے قائم کیا اور انقلاب کی راہیں ہموار کرتے گئے۔ اس دوران فوج میں تین گروہ کام کر رہے تھے۔ لیکن معمر القذافی کی قیادت ——— میں کام کرنے والا نوجوان افسروں کا گروہ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو انقلاب لانے میں کامیاب ہو گیا۔

قذافی نے اپنے انقلابی پروگرام کا اعلان کیا اور لیبیا کی ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس نے ملک سے شراب خانے، جوا خانے اور بدکاری کے ہر قسم کے اڈے ختم کر دیئے اور لیبیا کی معیشت کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ قذافی اور انقلابی کونسل کی قیادت اور رہنمائی میں لیبیا جلد ہی عالمِ اسلام میں ایک اہم مقام بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ قذافی دوسرے اسلامی ممالک سے تعاون و تعلقات کو استوار کرنے میں کافی سرگرم رہتے ہیں اور دنیا کے ہر کونے میں موجود مسلمانوں کی ہر قسم کی مدد کرتے ہیں۔

قذف

قذف زنا کی تہمت لگانا۔ تہمت لگانے والے کو قاذف اور جسے تہمت لگائی جائے مقذوف کہتے ہیں۔

اگر کوئی شخص عاقل بالغ مسلمان اور پاک دامن مرد یا عورت کو زنا کی تہمت صاف لفظوں میں لگائے اور مقذوف اس سے حد لگائے جانے کا دعویٰ کرے تو قاضی اسے اسّی کوڑے حد لگائے گا بشرطیکہ قذف ثابت ہو جائے اور مقذوف حرّ ہو۔ اگر بردہ ہو تو چالیس کوڑے۔ حد کے وقت قاذف کے جسم سے پوستین اور روئی دار کوٹ کے سوا دوسرے کپڑے نہیں اتارے جاتے۔

" اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں کہ اللہ ضرور (ان کے حق میں) غفور و رحیم ہے۔" (سورۃ نور آیت ۴، ۵)۔ امت کے علماء کا اجماع ہے کہ اس آیت میں الزام زنا کا حکم بیان ہوا ہے، جس کے لیے علماء نے قَذْف کی مستقل اصطلاح مقرر کر دی ہے تاکہ دوسری تہمت تراشی مثلاً کسی کو چور، شرابی، سود خوار یا کافر کہہ دینا، اس کی زد میں نہ آئیں۔ ایسی تہمتوں کے لیے سزا قاضی یا مملکت ایک مستقل قانون کی صورت میں مقرر کر سکتی ہے۔

علماء نے اس آیت کے الفاظ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ کو صرف پاک دامن عورتوں پر الزام لگا دینے تک محدود نہیں رکھا بلکہ پاک دامن مردوں کے لیے بھی اسی آیت سے استدلال کیا ہے اور اسی طرح الذین یرمون کو صرف مذکر صیغہ تک محدود نہیں رکھا کہ مرد جو پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں۔ بلکہ وہ عورتیں بھی جو پاک دامن مردوں پر زنا کا الزام لگائیں تو ان کے لیے بھی اسّی کوڑوں کی سزا ہے یعنی قانون قذف کی صورت یہ ہوئی کہ جو مرد یا عورت بھی کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے اس کے لیے اسّی کوڑوں کی سزا کا حکم ہے۔ واضح رہے کہ یہاں محصن یا محصنہ سے مراد شادی شدہ مرد یا عورت نہیں بلکہ غیر شادی شدہ اور پاک دامن مرد یا عورت ہیں۔

اسّی کوڑوں کی حد کا یہ حکم محصن یا محصنات (صرف پاک دامن مرد یا عورت) پر الزام لگانے کے لیے ہے۔ کسی غیر محصن پر الزام لگانے کی صورت میں اس حکم کا اطلاق نہ ہوگا۔ غیر محصن اگر بدکاری میں معروف ہو تو اس پر الزام لگانے کا کیا سوال پیدا ہوگا۔

کسی فعلِ قذف کے مستلزمِ سزا ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی دوسرے پر بدکاری کا بلا ثبوت الزام لگایا ہے، بلکہ اس کے لیے کچھ شرطیں قاذف میں (الزام لگانے والے) کچھ مقذوف میں (جس پر الزام لگایا گیا ہے) اور کچھ فعلِ قذف میں پائی جانی ضروری ہیں۔

قاذف کے لیے یہ شرائط ہیں: اوّل یہ کہ وہ بالغ ہو۔ بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اس پر حد نہیں لگائی جا سکتی بلکہ کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

دوم یہ کہ وہ عاقل ہو۔ مجنون پر حدِ قذف جاری نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح

حرام نشے کے سوا کسی دوسری نوعیت کے نشے کی حالت میں (مثلاً کلوروفارم کے زیرِ اثر) الزام لگانے کو بھی مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

سوم یہ کہ اس نے اپنے آزاد ارادہ سے یہ الزام لگایا ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

چہارم یہ کہ مقذوف کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو کیونکہ اس پر حدِ قذف جاری نہیں کی جا سکتی۔ حنفیہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط بھی ہے کہ قاذف ناطق ہو یعنی گونگا نہ ہو کیونکہ اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ اتنی بڑی حد کا مستوجب نہیں ہو سکتا ہاں اسے سزا دی جا سکتی ہے لیکن شافعی اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ اگر گونگے کا اشارہ اتنا واضح ہو کہ ہر کوئی اس کے اشارے کے مفہوم کو سمجھ لے تو وہ قاذف ہو گا کیونکہ اس کا اشارہ ایک شخص کو بدنام و رسوا کر دینے میں تصریح بالقول سے کسی طرح کم نہیں۔

مقذوف میں جو شرطیں پائی جانی چاہئیں وہ یہ ہیں :

پہلی شرط یہ کہ وہ عاقل ہو، یعنی اس پر بحالتِ عقل زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ مجنون پر الزام لگانے والا حدِ قذف کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ مجنون اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، اور اس پر اگر زنا کی شہادت قائم بھی ہو جائے تو نہ وہ حدِ زنا کا مستحق ہوتا ہے نہ اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ لہذا اس پر الزام لگانے والا بھی حدِ قذف کا مستحق نہ ہونا چاہیئے۔

لیکن امام مالکؒ اور امام لیثؒ بن سعد کہتے ہیں کہ مجنون کا قاذف حد کا مستحق ہے۔ کیونکہ بہرحال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو۔ یعنی اس پر بحالتِ بلوغ زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو۔ بچے پر الزام لگانا، یا جوان پر اس امر کا الزام لگانا کہ وہ بچپن میں اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، حدِ قذف کا موجب نہیں ہے، کیونکہ مجنون کی طرح بچہ بھی اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ نہ وہ حدِ زنا کا مستوجب ہوتا ہے اور نہ اس کی عزت مجروح ہوتی ہے۔ لیکن امام مالکؒ کہتے ہیں کہ سن بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تب تو قاذف حد کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسی عمر کی لڑکی پر زنا کرانے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہو جاتی ہے اور لڑکی کا مستقبل خراب ہو جاتا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، یعنی اس پر بحالتِ اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ کافر پر الزام، یا مسلم پر یہ الزام کہ وہ بحالتِ کفر اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، موجبِ حد نہیں ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ لونڈی یا غلام پر یا آزاد الزام، یا آزاد پر یہ الزام کہ وہ بحالتِ غلامی اس کا مرتکب ہوا تھا، موجبِ حد نہیں ہے، کیونکہ غلام کی بے بسی اور کمزوری یہ امکان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عصمت کا اہتمام نہ کر سکے۔ لیکن داؤد ظاہری اس دلیل کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا قاذف بھی حد کا مستحق ہے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ عفیف ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شبۂ زنا سے پاک ہو۔ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرم زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔ شبۂ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاحِ فاسد، یا خفیہ نکاح، یا مشتبہ ملکیت، یا شبۂ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو، نہ اس کے حالاتِ زندگی ایسے ہوں جن میں اس پر بدچلنی اور آبرو باختگی کا الزام چسپاں ہو سکتا ہو، اور نہ زنا سے کم تر درجہ کی بداخلاقیوں کا الزام اس پر پہلے کبھی ثابت ہو چکا ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں اس کی **عفت مجروح** ہو جاتی ہے۔ اور ایسی مجروح عفت پر الزام لگانے والا ۸۰ کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اگر حدِ قذف جاری ہونے سے پہلے مقذوف کے خلاف کسی جرم زنا کی شہادت قائم ہو جائے، تب بھی قاذف چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ وہ شخص پاک دامن نہ رہا جس پر اس نے الزام لگایا تھا۔

مگر ان پانچوں صورتوں میں حد نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مجنون، یا بچے یا کافر، یا غلام، یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزام زنا لگا دینے والا مستحق تعزیر بھی نہیں ہے۔

خود فعلِ قذف میں پائی جانے والی شرائط یہ ہیں۔ ایک الزام کو دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز قذف بنا سکتی ہے۔ یا تو قاذف نے مقذوف پر ایسی وطی کا الزام لگایا ہو جو اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو مقذوف پر حد واجب ہو جائے یا پھر اس نے مقذوف کو ولد الزنا قرار دیا ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں الزام صاف اور صریح ہونا چاہیئے۔ کنایات کا اعتبار نہیں ہے۔ [illegible] طعن فی النسب مراد ہونے کا انحصار قاذف کی نیت پر ہے [illegible] بدچلنی وغیرہ الفاظ سے یاد کرنا [illegible] اسی طرح جو الفاظ کسی شخص [illegible] ہونے میں مستعمل [illegible] حرامی یا حرامزادہ وغیرہ [illegible] کو بھی [illegible] قذف نہیں [illegible] سکتا۔ البتہ تعریض کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف [illegible] بھی قذف ہے یا نہیں۔ مثلاً کہنے والا کسی کو مخاطب کر کے [illegible] میں تو زانی نہیں ہوں [illegible] [illegible] مالک کہتے ہیں کہ اس طرح کی تعریض [illegible] [illegible] مراد مخاطب [illegible] زانی یا ولد الزنا قرار دینا ہے [illegible] لیکن امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب [illegible] [illegible] حسن بن صالح [illegible] [illegible] گنجائش ہے [illegible] [illegible] اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ تعریض [illegible] [illegible] اور بعض [illegible] میں ہو تو [illegible] نہیں [illegible] علی نے تعریض پر حد جاری کی ہے۔ حضرت عمر [illegible] [illegible] درمیان گالم گلوچ ہوئی [illegible] ایک نے دوسرے سے [illegible] تھا نہ میری ماں زانیہ تھی [illegible] حضرت عمر [illegible] سے پوچھا آپ لوگ اس سے کیا سمجھتے ہیں؟ [illegible] ماں باپ کی تعریف کی ہے [illegible] اس کے ماں [illegible] لوگوں نے کہا اس نے بس اپنے ماں باپ کی [illegible] رہ گئے تھے؟ ان خاص الفاظ [illegible] موقع پر [illegible] یہی ہے کہ اس کے ماں باپ زانی تھے۔ حضرت عمر [illegible] اتفاق کیا اور حد جاری کر دی [illegible] [illegible] خلاف ہے کہ کسی پر عمل قوم لوط کے [illegible] [illegible] امام ابو حنیفہ اس کو قذف نہیں مانتے۔ امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک اور امام شافعی اسے قذف قرار دیتے ہیں اور حد کا حکم لگاتے ہیں۔

جرم قذف کے قابلِ دست اندازی سرکار ہونے میں فقہاء کے درمیان

اختلاف ہے۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ یہ حقُ اللہ ہے اس لیے قاذف پہ بہرحال حد جاری کی جائے گی خواہ مقذوف مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ اس معنی میں تو حق اللہ ضرور ہے کہ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد جاری کرنا واجب ہے، لیکن اس پہ مقدمہ چلانا مقذوف کے مطالبے پر موقوف ہے، اور اس لحاظ سے یہ حق آدمی ہے۔ یہی رائے امام شافعیؒ اور امام اوزاعیؒ کی بھی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔ اگر حاکم کے سامنے قذف کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم قابلِ دست اندازیٔ سرکار ہے، ورنہ اس پہ کارروائی کرنا مقذوف کے مطالبے پر منحصر ہے۔

جرمِ قذف قابلِ راضی نامہ نہیں ہے۔ مقذوف عدالت میں دعویٰ نہ کرے تو یہ دوسری بات ہے۔ لیکن عدالت میں معاملہ آ جانے کے بعد قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے اور اگر وضاحت نہ کر سکے تو اس پہ حد جاری کی جائے گی نہ عدالت اس کو معاف کر سکتی ہے اور نہ خود مقذوف۔ نہ کسی مالی تاوان پہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے اور نہ توبہ کر کے یا معافی مانگ کر وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے "حدود کو آپس ہی میں معاف کر دو، مگر جس حد کا معاملہ میرے پاس پہنچ گیا وہ پھر واجب ہو گئی"۔ حنفیہ کے نزدیک حدِ قذف کا مطالبہ یا تو خود مقذوف کر سکتا ہے یا پھر وہ جس کے نسب پہ اس سے حرف آتا ہو اور مطالبہ کرنے کے لیے خود مقذوف موجود نہ ہو مثلاً باپ، ماں، اولاد اور اولاد کی اولاد۔ مگر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حق قابلِ توریث ہے۔ مقذوف مر جائے تو اس کا ہر شرعی وارث حد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

ایک شخص کے فعلِ قذف کے پایۂ ثبوت تک پہنچنے کے بعد جو چیز اسے حد سے بچا سکتی ہے وہ چار ایسے گواہ لائے جو عدالت میں یہ شہادت دیں کہ انھوں نے مقذوف کو فلاں مرد یا عورت کے ساتھ بالفعل زنا کرتے دیکھا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ چاروں گواہ بیک وقت عدالت میں آنے چاہئیں اور انھیں بیک وقت شہادت دینی چاہیئے۔ کیونکہ اگر وہ ایک دوسرے کے بعد آ کر گواہی دیں گے تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کے لیے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح حنفیہ کے نزدیک ان گواہوں کا عادل ہونا ضروری نہیں۔ اگر قاذف چار فاسق گواہ بھی لے آئے تو حدِ قذف سے بچ جائے اور ساتھ ہی مقذوف بھی حدِ زنا سے بچ جائے گا کیونکہ گواہ عادل نہیں ہیں۔ البتہ کافر یا اندھا یا غلام یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ گواہ پیش کرے تو قاذف سزا سے نہیں بچ سکتا۔ امام شافعیؒ حنفیہ کے ان دونوں نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہیں۔ گواہوں کے بارے میں امام شافعیؒ یہ کہتے ہیں کہ ان کے بیک وقت آنے یا یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسی طرح فاسق گواہ پیش کرنے کے متعلق بھی امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر قاذف فاسق گواہ پیش کرے گا تو وہ اور اس کے گواہ سب حد کے مستحق ہوں گے اور یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے۔

سورۂ نور کی آیت ۵ "سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کریں، کہ اللہ غفور اور رحیم ہے"۔ میں جس توبہ اور اصلاح سے معافی کی جو صورت سامنے آتی ہے اس میں بھی علماء کی مختلف آراء ہیں کہ اس معافی کا تعلق آیت ۴ میں مذکور حد، مردود الشہادت اور فاسق میں سے کس حکم کے لیے ہے۔ لیکن علماء کا اس بات پہ تو اتفاق ہے کہ توبہ اور اصلاح سے حد تو ساقط نہ ہوگی لیکن وہ فاسق نہ رہے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیں گے باقی دونوں احکام مردود الشہادت اور فاسق ہونے کے متعلق بعض فنی اور پیچیدہ بحثیں ہیں جن کے ذکر سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔

تکرارِ قذف کے بارے میں حنفیہ اور جمہورِ فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پہ الزام لگایا گیا ہو، اس پہ ایک ہی حد جاری کی جائے گی۔ اور اگر اجرائے حد کے بعد بھی وہ اپنے سابق الزام کو دہراتا رہا تو لگائی جانے والی حد ہی کافی ہوگی لیکن اگر کوئی نیا الزامِ زنا لگائے تو اس کے لئے الگ سے مقدمہ چلے گا۔

قذفِ جماعت کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص بہت سے لوگوں پہ بھی الزام لگائے، خواہ ایک ہی لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں تو اس پہ ایک ہی حد لگائی جائے گی۔ الّا یہ کہ حد لگنے کے بعد وہ پھر کسی نئے قذف کا ارتکاب کرے۔ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں ان کی اور کئی دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ ایک جماعت پہ الزام لگانے والا، خواہ ایک لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں الزام لگائے۔ اس پہ ہر شخص کے لیے الگ الگ پوری حد لگائی جائے گی۔

ایک عام مرد یا عورت کے فعلِ زنا کو ثابت کرنے کے لیے تو علماء نے "قذف" کی اصطلاح استعمال کی ہے لیکن اگر ایک مرد اپنی بیوی کو کسی ایک غیر مرد سے زنا کرتے دیکھے یا ایک عورت اپنے خاوند کو کسی غیر عورت سے زنا کرتے دیکھے تو اس کے لیے علماء نے الگ اصطلاح "لعان" استعمال کی ہے۔ لعان کے مباحث کے لیے دیکھئے: "لعان"۔

قِران

قِران۔ یہ حج کی ایک قسم ہے جس میں حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھا جاتا ہے اور احرام باندھتے وقت اس کی نیت اس طرح کی جاتی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُرِيْدُ الْعُمْرَةَ وَالْحَجَّ ..... "

(اے اللہ میں عمرہ اور حج کی دونوں کی نیت کرتا/کرتی ہوں۔ آپ دونوں کو میری طرف سے قبول فرمائیے اور دونوں کی ادائیگی میرے لیے آسان فرما دیجئے۔)

حجِ قِران کے ارکان

۱۔ احرامِ عمرہ و حج۔	فرض
۲۔ طوافِ عمرہ۔	رکن (فرض)
۳۔ سعیِ عمرہ۔	واجب
۴۔ طوافِ قدوم۔	سنت
۵۔ سعیِ حج۔	واجب (طوافِ قدوم کے بعد کرنا "قران" میں افضل ہے)
۶۔ وقوفِ عرفہ	رکن (فرض)
۷۔ قیام وقوفِ مزدلفہ۔	واجب
۸۔ رمی جمرۃُ العقبیٰ۔	واجب
۹۔ قربانی واجب	واجب۔
۱۰۔ حلق یا قصر۔	واجب (بال منڈوانا یا کتروانا)
۱۱۔ طوافِ زیارت۔	رکن (فرض)۔ اگر طوافِ قدوم کے بعد

سعی نہ کی ہو تو طوافِ زیارت کے بعد
سعی کرنا چاہیئے ۔

۱۲ ۔ رمی جمار ۔ واجب
۱۳ ۔ طوافِ وداع ۔ واجب

حج قِران کے افعال ادا کرنے کا طریقہ اس طرح ہے ۔
میقات سے پہلے غسل کرکے یا اگر پانی نہ ہو تو وضو کرکے عمرہ و حج کے لیے احرام باندھ کر دو رکعت نماز نفل برائے احرام ادا کی جائے ۔ احرام میں صرف دو چادریں بغیر سلی ہوئی استعمال کی جاتی ہیں ۔
احرام کے نیچے یا اوپر کوئی سلا ہوا کپڑا پہننے کا حکم نہیں ہے ۔ عورتیں اپنے عام لباس کو دھو کر یا نیا لباس استعمال کرسکتی ہیں ۔ عورتوں کے لیے ان کا لباس ہی احرام ہے ۔

دو نفل پڑھنے کے بعد عمرہ اور حج کے لیے نیت کرے اور تلبیہ پڑھنا شروع کردے اور بیت اللہ پہنچنے تک ذکر و اذکار اور عبادات میں مصروف رہے ۔ احرام باندھنے کے بعد ایک بار تلبیہ پڑھنا فرض ہے ۔ اس کے بعد جب تلبیہ پڑھے تو تین بار پڑھیے ۔ بیت اللہ (مکہ مکرمہ) پہنچنے کے بعد عمرہ کا طواف کرے ۔ طواف کے بعد دو رکعت نفل برائے طواف ادا کرے ۔ آبِ زمزم پی کر عمرہ کی سعی کرے سعی کے بعد بال منڈوائے یا کتروائے ۔ اب عمرہ کے احرام سے حلال ہوگیا ہے لیکن احرام کھول نہیں سکتا کیونکہ یہ عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام ہے ۔ ۸ ذی الحج کو حج کے ایام شروع ہوتے ہیں ، حج کے افعال و ارکان کا آغاز ہوتا ہے ۔ سب سے پہلے طوافِ قدوم کرے اور اس کے بعد سعی کرے ۔ حج قران میں طوافِ قدوم کے ساتھ سعی کرنا افضل ہے لیکن اگر رش یا کسی اور وجہ سے سعی نہ کرسکے تو طوافِ زیارت کے بعد یہ سعی کی جاسکتی ہے ۔ طواف اور سعی کے بعد منیٰ کے لیے روانہ ہو ۔ رات منیٰ میں قیام کے بعد ۹ ذی الحج کو ظہر سے پہلے عرفات پہنچ جائے ۔ عرفات کا قیام حج کا اہم رکن ہے ۔ اس قیام کے بغیر حج ادا نہیں ہوسکتا ۔ ظہر اور عصر ایک ہی ساتھ سے ملا کر قصر ادا کرے اور سورج غروب ہونے تک ذکر و اذکار میں مشغول رہے سورج غروب ہوتے ہی ، نماز مغرب ادا کیے بغیر مزدلفہ کے لیے روانہ ہو ۔ مزدلفہ پہنچنے کے بعد مغرب اور عشا اکٹھی ادا کی جائیں اور رات مزدلفہ میں ذکر و اذکار اور تسبیح و تہلیل میں گزاری جائے ۔ مزدلفہ کا قیام واجب ہے ۔ ۱۰ ذی الحجہ کو طلوعِ سحر کے فوراً بعد نمازِ فجر ادا کرکے منیٰ واپس آیا جاتا ہے ۔ ۱۰ ذی الحجہ کو رمی جمرۃ العقبیٰ ، قربانی ، حلق یا قصر کے بعد طوافِ زیارت کیا جاتا ہے ۔ حلق یا قصر کے بعد حج قران کے احرام سے فارغ ہوکر عام لباس میں طوافِ زیارت کیا جاتا ہے ۔ طوافِ زیارت حج کا ایک تیسرا اہم فرض (رکن) ہے ۔ اگر طوافِ قدوم کے بعد سعی نہ کی ہو تو طوافِ زیارت کے بعد سعی کرنا ہوگی ۔ ۱۱ اور ۱۲ ذی الحج کو رمی جمار کے بعد حج کے ارکان سے فارغ ہوگیے ۔ واپسی سے قبل طوافِ وداع کرنا واجب ہے ۔

قرآن ۔ قرآن مجید ۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے آخری الہامی کتاب ہے جسے اللہ تعالےٰ نے بذریعہ وحی (فرشتے کے ذریعے) اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ۔ قرآن کا لفظ خود اس وحی میں بتکرار آیا ہے ۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵ ...... اُنزِلَ فِیہِ القُرآن .... رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اُتارا گیا ۔ اس کے علاوہ سورۃ یونس آیت ۳۷ ، ۶۱ ، سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶ ، سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۴ ، سورۃ فرقان آیت ۳۰ ، ۳۲ ۔ سورہ نحل آیت ۹۸ ، ۱۰۲ ۔ اور سورۃ روم آیت ۵۸ میں لفظ " قرآن " آیا ہے ۔

لفظ قرآن یا تو قرءٌ سے مشتق ہے یا قراءۃٌ سے یا قرن سے ۔ قرءٌ کے معنی جمع کے ہوتے ہیں ۔ اس لیے اس کتاب کو قرآن کہتے ہیں کہ یہ تمام علوم کا مجموعہ ہے خود اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ۔ " ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرنے والی ہے ۔" دوسری جگہ فرمایا ۔ فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ یعنی قرآن مجید میں تمام کتب کے علوم سمو دیے گئے ہیں ۔ نیز تمام بکھری ہوئی انسانیت کو ایک مقام پر جمع کرنے والا ہے ۔

اگر قراءۃٌ سے مشتق ہو تو اس کے معنی ہیں پڑھی ہوئی چیز ۔ ایک مفہوم سے اس لیے قرآن کہا جاتا ہے کہ اسے حضرت جبریلؑ پڑھ کر سناتے تھے ۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ کتاب دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جائے گی ۔ اس بات کی شہادت تو دشمنوں نے بھی دی ہے کہ " قرآن سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے ۔" (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا)

اگر قرن سے مشتق ہو تو قرن کے معنی ہیں ملنا اور ساتھ رہنا ۔ اس مفہوم کی رو سے اس کتاب کو اس لیے قرآن کہتے ہیں کہ حق اور ہدایت اپنے ساتھ رکھتا ہے ۔ نیز اس کی سورتیں اور آیات آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ کہیں بھی ان میں تعارض اور تخالف معلوم نہیں ہوتا اور اسی طرح قرآن مجید کے مضامین ، خواہ وہ عقائد سے متعلق ہوں یا عبادات یا اخلاق و تمدن یا سیاسیات سے یا معاملات سے ، آپس میں اس طرح ایک لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کو جدا نہیں کیا جاسکتا ۔ اس طرح ایک رائے یہ بھی ہے قرآن ، قَرَأَ یَقرَأُ سے مصدر ہے یعنی پڑھنا ۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے " الاتقان " میں قرآن مجید کے ۵۵ ناموں کا اعلان کیا ہے جو خود قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں آئے ہیں ۔

الکتاب	المبین	الکلام
الفرقان	الذکر	القرآن
الکریم	البرہان	النور
التنزیل	احسن الحدیث	الموعظۃ
الحکم	الحکمۃ	الشفاء
الہدیٰ	الرحمۃ	[illegible]
البیان	الرّوح	النعمۃ
الرحمان	المبارک	العلی
الحکیم	المہیمن	المصدق
الحبل	الصراط المستقیم	القیم
القول الفصل	المثانی	المتشابہ
الوحی	العربی	البصیر
العلم	الحق	الہادی
العجب	التذکرۃ	العروۃ الوثقیٰ
الصدق	العدل	الامر
المُنادی	البُشریٰ	المجید
الزبور	البشیر	النذیر
العزیز	الصحف	المکرم

المرفوع المطهّر وغیرہ

قرآن مجید میں ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے پہلی سورۃ الفاتحہ ہے اور آخری والناس ہے۔ موجودہ قرآن توقیفی ترتیب پر ہے جبکہ نزول کے لحاظ سے پہلی سورۃ علق تھی اور آخری توبہ تھی۔ اس میں سات منازل ہیں۔ پہلی منزل سورۃ الفاتحہ سے سورۃ نساء تک ہے۔ دوسری منزل سورۃ مائدہ سے سورۃ توبہ تک ہے۔ تیسری منزل قرآن سورۃ یونس سے سورۃ نحل تک ہے۔ چوتھی منزل سورۃ بنی اسرائیل سے سورۃ فرقان تک ہے۔ پانچویں منزل کا آغاز سورۃ شعراء سے ہوتا ہے اور اختتام سورۃ یٰسین پر ہوتا ہے۔ چھٹی منزل سورۃ والصّٰفّٰت تا سورۃ حجرات پر مشتمل ہے۔ ساتویں منزل سورۃ قٓ سے شروع ہوکر سورۃ النّاس تک جاتی ہے۔ قرآن مجید میں رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہے۔ کل آیات ۶۶۶۶ ہیں۔

(۱) آیاتِ وعدہ۔ ۱۰۰۰ (۲) آیاتِ وعید ۱۰۰۰
(۳)۔ آیاتِ نہی ۱۰۰۰ (۴) آیاتِ امر ۱۰۰۰
(۵)۔ آیاتِ امثال ۱۰۰۰ (۶)۔ آیاتِ قصص ۱۰۰۰
(۷)۔ آیاتِ تحلیل ۲۵۰ (۸)۔ آیاتِ تحریم ۲۵۰
(۹)۔ آیاتِ تسبیح ۱۰۰ (۱۰) آیاتِ متفرقہ ۶۶

قرآن مجید کے کل کلمات کی تعداد ۸۶۴۳۰ ہے۔ قرآن مجید میں کل فتحات یعنی زبر تعداد میں ۵۳۲۲۳ ہیں۔ کسرات یعنی زیر کی کل تعداد ۳۹۵۸۲ ہے ضمّات یعنی پیش ۸۸۰۴ ہیں۔ مدّات (ـــٓ) ۱۷۷۱ ہیں۔ قرآن مجید میں کل تشدید ۱۲۷۴ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن مجید میں کل ۱۰۵۶۸۴ نقاط ہیں۔ قرآن مجید میں پندرہ سجدے ہیں۔ جن میں سے چودہ مقامات متفق علیہ ہیں اور ایک مقام اختلافی ہے۔ قرآن مجید کے کاتبانِ وحی کی تعداد چالیس ہے۔

حروف

(۱) ا - ۴۸۸۷۲ (۲) ب - ۱۱۴۲۸ (۳) ت - ۱۱۹۹
(۴) ث - ۱۲۷۶ (۵) ج - ۳۲۷۳ (۶) ح - ۹۷۳
(۷) خ - ۲۴۱۶ (۸) د - ۵۶۰۲ (۹) ذ - ۴۶۷۷
(۱۰) ر - ۱۱۷۹۳ (۱۱) ز - ۱۵۹۰ (۱۲) س - ۵۹۹۱
(۱۳) ش - ۲۱۱۵ (۱۴) ص - ۲۰۱۲ (۱۵) ض - ۱۳۰۷
(۱۶) ط - ۱۲۷۷ (۱۷) ظ - ۸۴۲ (۱۸) ع - ۹۲۲۰
(۱۹) غ - ۲۲۰۸ (۲۰) ف - ۸۴۹۹ (۲۱) ق - ۶۸۱۳
(۲۲) ک - ۹۵۰۰ (۲۳) ل - ۳۴۳۲ (۲۴) م - ۳۶۵۳۵
(۲۵) ن - ۴۰۱۹۰ (۲۶) و - ۲۵۵۳۶ (۲۷) ہ - ۱۹۰۷۰
(۲۸) لا - ۳۷۲۰ (۲۹) ی - ۴۵۹۱۹

قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ البقرۃ ہے جس کے چالیس رکوع ہیں۔ اسی سورۃ کو سنام القرآن بھی کہا جاتا ہے اور قرآن مجید میں اس کا مرتبہ ایسا فرمایا ہے جیسا کہ اونٹ کی کوہان۔ سب سے چھوٹی سورۃ "الکوثر" ہے جس کی تین آیات ہیں۔ یہ سورۃ حضرت ابراہیمؓ (صاحبزادہ رسولؐ) کی وفات کے موقع پہ نازل کی گئی۔ جب کہ کفّار حضور اکرمؐ کو اولاد نہ ہونے یا اور اولاد کے نہ بچنے کے طعنے دے رہے تھے۔ سورہ الفاتحہ کو ام الکتاب، فاتحۃ الکتاب، سورۃ الصّلوۃ، سورۃ دُعا اور خلاصۃ القرآن کہا جاتا ہے۔ اس کی صرف سات آیات ہیں۔ قرآن مجید میں سترہ مقامات ایسے ہیں۔ جہاں پڑھتے ہوئے ذرا سی بھی غلطی جملہ کفر تصوّر کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے مشہور ناموں کے علاوہ کچھ دوسرے القابی نام بھی ہیں۔ سورۃ الرحمٰن کو زینت القرآن اور عروس القرآن کہتے ہیں۔ سورۃ دھر کو ہل اتیٰ کہتے ہیں۔ سورۃ اخلاص کو سورۃ توحید کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پیغمبروں کے نام سے قرآن مجید میں چھ سورتیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔ یوسف، یونس، ابراہیم، نوح محمدؐ، ہود ۔ حضورؐ اکرم کے معراج کا واقعہ قرآن مجید کی دو سورتوں بنی اسرائیل اور سورۃ النجم میں آیا ہے۔ قرآن مجید میں سب سے لمبا تذکرہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں آیا ہے اور قصص میں سب سے بڑا قصّہ یہی ہے۔ کل پچیس پیغمبروں کے نام اور تجل کوائف قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کے بعض حصّے چونکہ مکہ مکرمہ اور بعض مدینہ منورہ میں نازل ہوئے اس بنا پر سورتوں کی مکی اور مدنی تقسیم معروف ہے۔ روایات کے مطابق مکی دَور ۱۷ رمضان ۱۱ سال قبل ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور ۱۱ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ پر ختم ہوتا ہے یعنی مکی دَور چار ہزار چار سو بیس دنوں پر مشتمل ہے جن میں ہجرت کے گیارہ دن شامل ہیں۔ مدنی دَور ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ سے شروع ہوتا ہے اور تین ہزار چار سو پینتیس (۳۴۳۵) دنوں پر مشتمل ہے پورا زمانۂ نزولِ قرآن تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ اور ۱۴ دن ہوتا ہے۔ مختلف روایات کی بنا پر مدّت کا یہ تعیّن تخمینی ہے، قطعی نہیں۔

مکّی سورتیں:

فاتحہ، انعام، اعراف، یونس، ہود، یوسف، ابراہیم، حجر، نحل، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، مؤمنون، فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سبا، فاطر، یٰسین، صٰفٰت، صٓ، زمر، مومن، حٰم سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، قٓ، ذاریات، طور، نجم، قمر، واقعہ، طلاق، ملک، قلم، حاقّہ، معارج، نوح، جنّ، مزّمل، مدّثر، قیامہ، مرسلات، النباء، نازعات، عبس، تکویر، انفطار، مطففین، انشقاق، بروج، طارق الاعلیٰ، فجر، البلد، الشمس، الیل، الضحیٰ، الم نشرح، التین، علق، قدر، بینہ، قارعہ، تکاثر، عصر، ہمزہ، فیل، قریش، ماعون، کوثر، کافرون، لہب، اخلاص فلق، الناس۔ (تعداد ۸۵)۔

(سورتوں کے تفصیلی کوائف سورتوں کے عنوانات کے تحت دیکھئے)

مدنی سورتیں:

بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، رعد، حج، نور، احزاب محمدؐ، فتح، حجرات، رحمان، حدید، مجادلہ، الحشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون تغابن، تحریم، الدہر، زلزال، نصر۔ (تعداد ۲۶)

(سورتوں کے تفصیلی کوائف ان کے عنوانات میں دیکھئے)

جو سورتیں بالاتفاق مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اُن کی تعداد ۶۵ ہے اور جو بالاتفاق مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں ان کی تعداد ۱۸ ہے اور جن سورتوں کے مقامِ نزول میں اختلاف ہے ان کی تعداد ۳۱ ہے۔ اصولی طور پہ مکی اور مدنی سورتوں کا پس منظر، اسلوب، طرز بیان اور آہنگ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مکہ میں ابتدائی دعوت کے بعد قریش کی مخالفت میں شدّت کا دَور بھی ہے: اسی لیے مکی سورتیں عموماً اصولی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ زیادہ زور عقائد اور اخلاق پر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں توحید، رسالت، آخرت، تقویٰ، فضیلت، اخلاق تبلیغ کے طریقے، صبر و ثبات، فداکاری، انفاق فی سبیل اللہ، راہِ حق سے منہ

موڑنے والوں کا انجام اور اس کی مثالیں، کفار و مشرکین کے الزامات اور ان کے جوابات بڑی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ سورتیں مختصر اور پر جوش خطابات کی صورت میں ہیں جن میں دریا کی روانی، سیلاب کی سی قوت محسوس ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بلیغ فقروں میں مطالب کو ادا کیا گیا ہے۔ خطاب میں عموم پایا جاتا ہے اور اکثر پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

مدینہ میں ہجرت کے بعد وہاں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہوگئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق ہدایات دینی شروع کیں۔ اخلاق، تہذیب، تمدن معاملات اور ریاست کے مسائل کی جزئی اور تفصیلی تعلیمات کے مباحث زیادہ ہیں۔ مدنی سورتیں عموماً طویل ہیں۔ عقائد کا بیان کم ہے۔ خطاب میں بھی عموم کم ہے خصوص زیادہ ہے۔ وضاحت و بلاغت کی وہی شان ہے جو مکی سورتوں میں پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید کی پہلی وحی غار حرا میں نبی کریمؐ پر اتری۔ جب آپؐ وہاں یاد الٰہی میں مصروف تھے۔ اور یہ آپؐ کا معمول تھا۔ ایک فرشتے نے آپؐ سے آکر کہا۔ اقرأ یعنی پڑھو

آپؐ نے فرمایا "ما انا بقاری" میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے آپؐ کو سینے سے لگا کر دبایا اور اس طرح تین بار دبایا اور پھر پڑھنے کی فرمائش کی

اقرأ باسم ربک الذی خلق

پہلی وحی سورۃ علق کی ۵ آیات پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد سلسلۂ وحی برابر کم و بیش تقریباً ۲۳ سال تک جاری رہا۔

تدوین قرآن

قرآن مجید نبی کریمؐ کی زندگی میں احاطۂ تحریر میں آگیا تھا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ اسی وقت کسی ایک کاتب وحی کو بلا کر اس آیت کو لکھوا کر مناسب جگہ پر (حسب ہدایت خداوندی) رکھوا دیتے۔ مناسب جگہ کا مطلب یہ ہے کہ فرشتہ یہ بتا دیتا تھا کہ یہ آیت کس مقام سے متعلق ہے۔ یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ قرآن مجید منتشر صورت میں تھا اور نبی کریمؐ کے وصال کے بعد مرتب کیا گیا، بالکل غلط بات ہے۔ قرآن مجید کے کتاب کی صورت میں تدوین کی شہادتیں خود اندرون کلام سے بھی ملتی ہیں اور وہاں کے ماحول سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ لکھنے کا رواج ان دنوں عام تھا۔ جیسا کہ قصائد سبعہ معلقہ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں خود اس کو کتاب کہا گیا ہے۔

ذالک الکتاب لا ریب فیہ

کتاب انزل الیک

قرآن مجید کے ایک کتابی صورت میں لکھے جانے کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات سورۃ ہود آیت ۱۳، سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹۱ - سورہ بقر آیات ۲۱، ۲۲ پر قرآن مجید نے مقابل ایک کتاب، کہیں دس سورتوں کے بالمقابل دس سورتیں، کہیں قرآن مجید کی ایک سورۃ کے مقابل ایک سورۃ بنانے کا چیلنج کیا گیا ہے یعنی معلوم ہوا کہ قرآن مجید ایک کتاب کی صورت میں موجود تھا۔

کتب احادیث میں ایسی کئی روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو نبی کریمؐ کی حیات میں باقاعدہ کتابی صورت میں مرتب کیا گیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ اسلامی تاریخ میں بھی آیا ہے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ اسلام لانے سے قبل اپنی بہن اور بہنوئی کو اس وجہ سے قتل کرنے کے لیے گئے کہ وہ اسلام لا چکے تھے۔ جب وہ اپنی بہن کے گھر داخل ہوئے تو وہ سورۃ طٰہٰ کی آیات ایک جلد سے تلاوت کر رہی تھیں ......

یہ روایت کہ قرآن مجید نبی کریمؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں تدوین ہونا شروع ہوا یا حضرت عثمانؓ کے دور میں قرآن مجید کی تدوین مکمل ہوئی اور اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو "جامع قرآن" کہا جاتا ہے تو اس میں اصل صورت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں عجمی علاقوں کی فتوحات سے، اسلام عرب سے نکل کر عجم کے علاقوں میں پھیلنا شروع ہوا تو قرات قرآن میں بھی انداز غالب ہونے لگا تو حضرت عثمانؓ نے تمام مسلمانوں کو قرآن مجید کی ایک قرات پر جمع کیا یعنی قرات قریش پر اور باقی تمام قسم کی قراتوں کو ختم کرنے کا حکم دیا۔

نظم قرآن

قرآن مجید کی ہر سورت اور ہر آیت ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی ترتیب، نزولی ترتیب کی بجائے، اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ترتیب توقیفی پر ہوئی ہے۔ کیونکہ جو آیت ایک جگہ پر رکھی گئی ہے وہی اس کا بہترین مقام ہے۔ اگر قرآن مجید کا تدبر سے مطالعہ کیا جائے تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ایک مربوط کلام ہے اور اس میں نظم ہے۔

ضرورت قرآن مجید

جب قرآن مجید نازل کیا گیا اس وقت درج ذیل وجوہ کی بنا پر ایسے ایک ہدایت نامہ کی ضرورت تھی۔

۱۔ تکمیل شریعت۔

۲۔ نسل انسانی سے نفرت و تعصب کو دور کر کے [illegible]

۳۔ مذہبی اختلافات کا خاتمہ۔

۴۔ کتب سابقہ کے برحق ہونے کی تصدیق اور تحریفات اور ان کی غلطیوں کی اصلاح۔

(۵) تکمیل انسانیت۔

۶۔ گمشدہ توحید کو دوبارہ قائم کرنا۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کے ازلی ارادہ، کہ انسانوں کے لیے رہنمائی موجود ہو کی تکمیل کرنا۔

مضامین قرآن

۱۔ اجزائے ایمان کے مباحث

۲۔ عبادات کے مباحث۔

۳۔ حسنات و سیئات کا بیان۔

۴۔ قصص و حکایات کا بیان۔

۵۔ نجات حقیقی اور اس کے حصول کے ذرائع کا بیان

۶۔ رسول کریمؐ کے سوانح اور آپؐ کی نبوت کے لیے دلائل کا [illegible] بیان۔

۷۔ خصائص قرآن کا بیان۔

۸۔ اسلام کی حقیقت اور صداقت پر دلائل قاطعہ کا بیان۔

۹۔ کفر و شرک کے تفصیلی احوال۔

۱۰۔ [illegible] قدرت کا بیان۔

قرآنی تمثیلات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بات کو واضح کرنے کے لیے مثالیں بیان کی ہیں [illegible] ماحول اور ذہن سے

ذریعے تمثیلات سن کر مخاطب بات کو بآسانی سمجھ سکے۔ خود سورۃ الزمر کی آیت ٢٧ میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں :

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں ۔"

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بات بیان فرمائی ہے کہ روزِ قیامت کو سب لوگوں کو مردہ حالت سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا ۔ اعتراض کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارے جسم کا ذرّہ ذرّہ مٹی میں مل جائے گا اور ہڈیاں الگ الگ ہو جائیں تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ ہمارے اجسام دوبارہ زندہ ہو سکیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک مثال سے بات کو اس طرح واضح کیا ، کہ جس طرح ایک انسان کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا کوئی وجود نہ تھا تو ہم نے اسے وجود دیا اسی طرح ہم ان ہڈیوں کو بھی جوڑ سکتے ہیں اور دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح حیات بعد الموت کے لیے زمین کی مثال دی جو کہ سوکھی پڑی تھی لیکن بارش پڑتے ہی اس میں جان پیدا ہو جاتی ہے اور پھل دینے لگتی ہے ۔

کتابیں لاد کر چلنے والے متکبروں کے لیے گدھے کی مثال دی جو کہ ناگوار ہوتی ہے ۔

کلمۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کے ثمرات کے لیے شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی مثال دی ہے ۔

یہ سب اللہ تعالیٰ نے مختلف واقعات کی توضیح کے لیے کثرت سے قرآن مجید میں مثالیں بیان فرمائی ہیں

قرآنی دعائیں

: ترمذی ، ابوداؤد ، نسائی ، ابن ماجہ اور دوسری کتب حدیث میں حضرت نعمان بن بشیر کی یہ روایت نقل ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ دعا عین عبادت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے مانگو میں اسے قبول کروں گا۔ اسی طرح ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا " اللہ کی نگاہ میں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے ۔"

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں دعا کی بڑی اہمیت ہے یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک یعنی قرآن مجید میں اپنے مختلف برگزیدہ بندوں یعنی پیغمبروں کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں کی گئی دعائیں بیان فرمائی ہیں ۔ جو دعائیں قرآن مجید میں ہیں ، وہ قرآنی دعائیں کہلاتی ہیں ۔ علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ان دعاؤں کو یاد کر کے یہی دعائیں مانگنا چاہیئں ۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی دعائیں ہیں اس لیے یہ ضرور قبول ہوں گی ۔ کیونکہ یہی دعائیں انبیاء کرام نے مانگی ہیں ۔

یہ دعائیں قرآن مجید کے جن مقامات پر آتی ہیں اُن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے :

سورت الاعراف (١) آیت ٢٣ ۔ حضرت آدمؑ و حواؑ کی دعائے استغفار ۔
رَبَّنَا ظَلَمْنَا ....

(٢) آیت ٨٩ ۔ حضرت شعیبؑ کی دعا ۔ رَبَّنَا افْتَحْ ....

(٣) آیت ١٥١ ، ١٥٥ ، ١٥٦ ۔ حضرت موسیٰؑ کی دعائے استغفار : رَبِّ اغْفِرْ لِیْ .....

سورۃ ھود ۔ آیت ٤٧ ۔ حضرت نوحؑ کی دعائے استغفار ۔
رَبِّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ ....

سورۃ یوسف : آیت ١٠١ ۔ حضرت یوسفؑ کی دُعا ۔

سورۃ ابراہیم : آیات ٣٥ تا ٤١ ۔ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا اپنی اولاد کو مکّہ میں آباد کرتے وقت ۔

سورۃ الانبیاء (١) آیت ٨٣ ۔ حضرت ایوبؑ کی بیماری کی حالت میں دعا ۔

(٢) آیت ٨٧ ۔ حضرت یونسؑ کی مچھلی کے پیٹ سے نجات کی دُعا ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ....

سورۃ القصص : آیات ١٦ ، ٢٢ اور ٢٤ میں حضرت موسیٰؑ کی دعائیں ۔

قرآنی علوم

: علامہ ابن سیوطی نے قرآنی علوم کی تعداد اسّی سے زائد بتائی ہے ۔ دونِ قرآن مجید کے مطالب کی تشریح و توضیح کے لئے تفسیر میں ہزارہا کتب لکھی گئی ہیں ۔ جن میں تفاسیر کی سوسے زائد جلدیں بھی ہیں ۔ اس کے علاوہ قرآن سے متعلق کئی علوم ہیں ۔ تفصیل کے لئے دیکھیے "علم قرآن" "علم تفسیر" اور "تفسیر" ۔

قرأت

پڑھنا ۔ قرآن مجید کو خاص انداز سے پڑھنے کو کہتے ہیں ۔ یعنی ہر لفظ کو اس کے مخرج سے ادا کر کے پڑھنا ۔ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کو اچھی آواز سے آراستہ کرو ۔ ایک دفعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو حذیفہ کے غلام کو نہایت خوش آوازی سے قرآن پڑھتے سنا تو فرمایا : خدا کا شکر ہے جس نے میری اُمّت میں ایسا شخص پیدا کیا ۔

قراردادِ پاکستان

۔ ٢٣ مارچ ١٩٤٠ء بروز ہفتہ منٹو پارک (اب اقبال پارک) لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا ۔ قائداعظم محمد علی جناح اجلاس کی صدارت کر رہے تھے ۔ منٹو پارک لاکھوں مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا ۔ سٹیج پر مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مسلم اکابرین موجود تھے ۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کی سالانہ روداد پڑھی ۔ اس کے بعد شیرِ بنگال مولوی فضل حق نے انگریزی میں قرارداد پڑھی ۔

قرارداد کا متن یہ ہے :

(١) آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس ، آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلسِ عاملہ کے اقدام کی تائید و توثیق کرتے ہوئے جو ان کی ٢٧ ، اگست ، ١٧ ، ١٨ ، ستمبر ، ٢٢ اکتوبر ١٩٣٩ء اور ٣ فروری ١٩٤٠ء کی قراردادوں سے واضح ہوتا ہے پُرزور اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ جس کا اظہار گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ١٩٣٥ء میں کیا گیا ہے ، قطعاً غیر موزوں ، اس ملک کے خاص حالات کے پیشِ نظر ناقابلِ عمل اور مسلم ہندوستان کے لیے یکسر ناقابلِ قبول ہے

٢ ۔ اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ ١٨ ، اکتوبر ١٩٣٩ء کو جو اعلان وائسرائے ہند نے حکومت ملک معظم کی جانب سے کیا تھا ، وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس مسلک اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ١٩٣٥ء مبنی ہے ۔ اس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں ، مفادات اور فرقوں کے مشوروں سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے ، لیکن مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہ ہوگا جب تک پورے آئینی منصوبے پر ازسرِ نو غور نہ کیا جائے اور کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگا ۔ تاوقتیکہ مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری سے مرتب نہ کیا جائے ۔"

(۳) " قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا، تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو یعنی جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ) کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے، ان کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں۔

نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، معاشی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب، مؤثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔ مزید برآں یہ اجلاس مجلسِ عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ مرتب کرے جس کی رو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کلّی اختیارات مل جائیں۔ مثلاً دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات، محصولات اور دیگر ایسے امور جو ضروری سمجھے جائیں۔"

مولوی فضل حق نے قرار داد کی تائید میں تقریر کی۔ اس کے بعد چودھری خلیق الزمان، ظفر علی خان، اورنگ زیب خان، حاجی سر عبداللہ ہارون، نواب اسماعیل خان، قاضی محمد عیسیٰ، بیگم مولانا محمد علی جوہر، ابراہیم اسماعیل چندریگر، مولانا عبدالحامد بدایونی اور دوسرے بہت سے مسلم اکابرین نے قرار داد کے حق میں مدلّل تقریریں کیں۔ ان تقریروں کے بعد صدرِ اجلاس اور صدرِ مسلم لیگ قائدِ اعظم نے قرار داد پر عمومی رائے طلب کی جو زبردست تالیوں کی گونج میں متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

عرفِ عام میں اس قرار داد کو قرار دادِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء کے اس اجلاس تک جس میں مذکورہ بالا قرار داد منظور ہوئی، مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل آزاد ریاستوں کا تصور تھا جو ایک وفاق کے تحت ہوں۔ اگلے سال مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس اپریل ۱۹۴۱ء میں قرار دادِ لاہور کو مسلم لیگ کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا اور اس کی شق نمبر ۳ میں اس طرح سے

" ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرقی حصوں کی باہمی تشکیل مسلم آزاد قومی اوطان کی حیثیت سے ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں۔"

ایک طویل عرصہ تک اس قرار داد کے متعلق ابہام سا رہا کیونکہ اس میں آزاد ریاستوں کا تصور تھا اور ایک واحد ریاستِ پاکستان کا خیال تک بھی اس قرار داد میں موجود نہ تھا۔ بالآخر ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ارکان کے کنونشن میں بنگال کے معروف مسلم لیگی لیڈر جناب حسین شہید سہروردی کی تجویز پر ایک قرار داد متفقہ طور پر منظور کی گئی جس میں منجملہ دیگر امور متعلقہ کے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ پاکستان ایک واحد مقتدر ریاست ہوگی۔ یہ تاریخی " قرار دادِ دہلی " کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ کی سرکاری دستاویزات یا قرار دادوں میں پہلی مرتبہ لفظ " پاکستان " استعمال کیا گیا۔ اس قرار دادِ دہلی کے الفاظ یہ ہیں:

" ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام، شمال مغرب میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان یعنی پاکستان کے علاقے جہاں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے، وہاں واحد مقتدر آزاد مملکت کی تشکیل کی جائے اور اس امر کا واضح اعلان کیا جائے کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا۔"

" قرار دادِ دہلی " کی منظوری اور اشاعت سے ایک تو اعتراضات ختم ہو گئے اور دوسرے " قرار دادِ لاہور " کی تکمیل ہو گئی۔ قرار دادِ لاہور اور قرار دادِ دہلی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں مل کر قرار دادِ پاکستان کہی جا سکتی ہیں، یعنی:

قرار دادِ پاکستان = قرار دادِ لاہور (۱۹۴۰ء) + قرار دادِ دہلی (۱۹۴۶ء)

قرار دادِ مقاصد

: پاکستان کے عالمِ وجود میں آنے کے بعد مجلسِ دستور ساز ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرار دادِ مقاصد منظور کی۔ اس قرار داد میں پاکستان کے دستور کی بنیادوں کو بیان کیا گیا ہے اور مملکتِ پاکستان کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ قرار دادِ مقاصد کا مسودہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے تیار کیا تھا۔ مجلسِ دستور ساز نے بحث کے بعد اسے منظور کر لیا تھا اور یہ قرار داد ۱۹۴۹ء کے بعد بننے والے ہر دستور کا حصہ رہی ہے۔ قرار دادِ مقاصد کا متن یہ ہے:

" چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کُل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدس امانت ہے، لہٰذا جمہورِ پاکستان کی نمائندہ یہ مجلسِ دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خود مختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے، جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق و اختیاراتِ حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرے۔

جس میں اصولِ جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری و عدلِ عمرانی کو اس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآنِ مجید اور سنتِ رسول میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل یا شامل ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں، ایک وفاق بنائیں جس کے ارکان مقررہ حدود میں [illegible] خود مختار ہوں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق کے ماتحت مساوات، حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی و سیاسی عدل، اظہارِ خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور جماعت سازی کی آزادی شامل ہو۔

جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رو سے نظامِ عدل کی آزادی پوری طرح محفوظ ہو۔

جس کی رو سے وفاق کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا، جن میں اس کے بر و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ

کیا جاسکے۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و خوش حالی کی زندگی بسر کرسکیں اور اقوامِ عالم کی صف میں اپنا جائز ممتاز مقام حاصل کرسکیں اور امنِ عالم کے قیام اور بنی نوعِ انسان کی ترقی و بہبود میں کما حقہٗ اضافہ کرسکیں۔"

قرامطہ: ایک باطنی فرقہ، جس کا بانی حمدان قرمط تھا۔ حمدان عراق کا ایک دیہاتی باشندہ تھا۔ اُسے جب یہ احساس ہوا کہ مسلمانوں کی مملکت ایرانیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جائے گی تو اس نے ایک تحریک شروع کی۔ ۸۹۰ء میں حمدان نے کوفہ کے قریب "دار الہجرہ" کے نام سے ایک قیام گاہ بنائی جو اس تحریک کا مرکز بنی۔ ملک کے عوام خصوصی طور پر دستکاروں اور صناعوں میں اس تحریک نے کافی فروغ پایا۔ اصولاً یہ ایک نزیہ تحریک تھی۔ قرامطہ اپنے انقلابی رجحانات کی بدولت جلد ہی سیاسیاتِ اسلام میں ایک اہم عنصر بن گیا۔ وہ اپنے مخالفین کو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، قتل کرنا جائز سمجھتے تھے۔ بصرہ کی "حبشی جنگ" کی خونریزیوں میں اُن کا کافی حصہ تھا۔ قرامطہ ۸۹۹ء میں خلیج فارس کے مغربی کنارے پر ابوسعید الحسن الجنابی کی زیرِ قیادت ایک خود مختار مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے "الاحساء" کو اپنا دار الحکومت قرار دیا۔ [illegible] مملکت جلد ہی حکومتِ بغداد کیلئے خطرہ بن گئی۔ الجنابی کے لڑکے اور جانشین ابو [illegible] سلیمان نے [illegible] زیریں کے اکثر علاقے کو پامال کیا اور حاجیوں کے راستے منقطع کر [illegible] میں ابو طاہر سلیمان نے مکہ مکرمہ پر حملہ کردیا اور بیت اللہ سے حجرِ اسود اُٹھا لے گیا۔ حجرِ اسود کی واپسی ۹۵۱ء میں فاطمی سلطان المنصور کے حکم سے ہوئی۔

قُربانی۔ قربانی [illegible] میں تقربِ الٰہی حاصل کرنے میں کوشش اور سعی کرنا اور شریعتِ اسلام میں اصطلاحاً عبادت کی نیت سے ایک خاص وقت میں حیوان (ذبیحہ اور حلال) کو ذبح کرنے کو کہتے ہیں اور اس کی شرطیں یہ ہیں کہ قربانی کرنے والا مسلمان ہو (عورت یا مرد)، مقیم ہو سفر میں نہ ہو اور اتنا مالدار ہو کہ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر ادا کرتا ہو۔ اور یہ قربانی ایامِ نحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو فجر سے ۱۲ ذی الحجہ کے دن سورج غروب ہونے سے پہلے دی جاسکتی ہے۔ مگر ۱۰ تاریخ کی قربانی افضل ہے۔ ایامِ نحر میں یہ قربانی حاجی حضرات بھی دیتے ہیں لیکن اگر حاجی کو استطاعت نہ ہو تو قربانی کے بدلے [illegible] روزے رکھ سکتا ہے۔

قربانی جائز اور حلال جانور کی ہوتی ہے۔ لیکن ایسے جنگلی جانور، جو حلال تو ہیں مثلاً ہرن، چیتل، بارہ سنگھا، نیل گائے وغیرہ کی قربانی نہیں ہوتی۔ قربانی کے لیے چند قسم کے جانور مقرر ہیں۔ جن کے سوا کوئی جانور، خواہ وہ گھر پر ہی ... پرورش کیا جائے، قربان نہیں کیا جاسکتا۔ چھ قسم کے جانوروں میں گائے، بھینس اونٹ، بکرا، مینڈھا، دُنبہ۔ ان میں نر اور مادہ کی کوئی پابندی نہیں۔ بکرا مینڈھا یا دُنبہ کو صرف ایک شخص ہی قربان کرسکتا ہے لیکن گائے، بھینس اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں۔ قربانی کے اونٹ کی عمر ۵ سال۔ گائے بھینس دو سال کی عمر کی ہو، اور بکرا، مینڈھا اور دُنبہ ایک سال سے کم عمر کا ہو لیکن قد و قامت میں ایک سال کا معلوم ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔

قربانی کا جانور خوب موٹا تازہ اور تندرست ہونا چاہیئے۔ ایسا جانور جس کے جسم میں کوئی سا بھی معمولی یا زیادہ نقص ہو اس کی قربانی نہیں ہوسکتی۔

نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے احوال میں قربانی کا ثبوت ملتا ہے۔ نبی کریمؐ نے اللہ تعالےٰ کے حکم پر قربانی کی سنت کا احیا کیا۔ آپؐ خود اپنے مبارک ہاتھوں سے جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے اونٹ، گائے اور بکرے ذبح کئے ہیں۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی قربانی کو عبادت کا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو اس کثرت سے قربانی کے تفصیلی احکام بیان کیے گئے ہیں کہ شاید کسی اور عبادت کے متعلق اتنی تفصیل بیان ہوئی ہو۔ اُن کی قربانیوں میں سوختنی قربانیاں، گناہ کی قربانیاں، سلامتی کی قربانیاں، تقصیر کی قربانیاں۔ اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے قربانیاں۔ عہد قدیم کی ان قربانیوں میں عیدِ فصح کے سات دن کی مسلسل قربانی کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے۔ عیسائیوں کے مذہب کی تو بنیاد ہی قربانی پر ہے اور ان کے ہاں قربانی ہی اصل ذریعہ نجات ہے۔ ہندو مذہب کی معتبر کتب میں قربانی کے تفصیلی تذکرے ملتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مذاہب میں بھی قربانی عام رہی ہے۔ حتیٰ کہ دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے نوخیز لڑکیوں، لڑکوں کی قربانی بھی دی جاتی تھی۔

عید الاضحیٰ کی قربانی میں علمار کا اختلاف ہے۔ بعض واجب بتاتے ہیں اور بعض سنت۔ لیکن جمہور علمار سنتِ موکدہ کے قائل ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ اگر کسی کو قربانی کرنے کا مقدور ہے تو اسے قربانی کرنی واجب ہے ورنہ نہیں۔ قرض لے کر قربانی کرے گا تو سنت ادا ہوجائے گی اور ثواب بھی ملے گا۔ لیکن سردی قرض لے کر یا فخر و نمود کے طور پر کرے گا تو قربانی نامقبول ہوگی اور مواخذہ الٰہی الگ۔

عید الاضحیٰ کی قربانی اصل میں اس واقعہ عظیم کی یاد کو تازہ کرتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے واقع ہوا۔ یعنی خواب میں فرزندِ عزیز حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرتے دیکھا تو صبح اُٹھ کر انھیں ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔

بہتر ہے کہ قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کریں۔ قربانی کا گوشت محتاجوں، مسکینوں، پڑوسیوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو تقسیم کریں۔ خود بھی کھائیں اور اہل و عیال کو بھی کھلائیں۔

قربانی کا گوشت یا چمڑا قصاب کی مزدوری میں نہ دیں۔ ہاں قصاب محتاج ہو تو مزدوری کے علاوہ تھوڑا گوشت بہ نیت صدقہ دے دیں۔ قربانی کا چمڑا بیچ کر اپنے صرف میں لانا منع ہے مگر خود چمڑے کو کام میں لانے کا مضائقہ نہیں۔

قربانی کا جانور ذبح کرنے لگیں تو اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ[1] اور اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ[2]، پڑھ کر بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے گلے کے پاس سے ذبح کریں۔ اپنی طرف سے قربانی کریں تو اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ اور دوسرے کی طرف سے کریں تو اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ فُلَانٍ کہیں اور فلاں کی جگہ اس کا نام زبان سے لیں یا

[1] میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رُخ اسی (ذاتِ پاک) کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

[2] بے شک میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں پہلا (فرمانبردار) ہوں۔

میت کی طرف سے بھی قربانی کرنے کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔ بشرطیکہ وہ وصیت کرکے مرا ہو۔ جناب رسولِ خداؐ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے آپ کی

طرف سے قربانی کی۔ جناب پیغمبر خدا اپنی اُمت کی طرف سے بھی قربانی کرتے تھے۔
ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر صلعم اپنی قربانی اپنے دستِ مبارک سے ذبح کرتے اور ذبح سے پیشتر مذکورہ بالا دعا پڑھتے اور فرماتے: "خداوند اس قربانی کو میرے اور میری اس امت کی طرف سے قبول فرما جو قربانی نہیں کر سکتی۔"

قرۃ العین طاہرہ: مشہور ایرانی شاعرہ، اصل نام زریں تاج تھا۔ والد کا نام ملا صالح تھا جو قزوین کے رہنے والے اور علماء میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ علوم متداولہ والد سے ہی سیکھے۔ مجتہد ملا محمد نقی کے بیٹے ملا محمد سے شادی ہوئی۔ اسی دوران علی محمد باب کی تعلیمات کا چرچا ہوا۔ باب سے خط و کتابت کی اور اُس سے متاثر ہو کر اس کے حلقے میں داخل ہو گئی اور باب کے حکم پر مختلف مقامات کربلا، بغداد، کرمان اور ہمدان میں بابی مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ اس وجہ سے اپنے باپ، خسر اور خاوند سے تعلقات خراب ہو گئے۔ قرۃ العین کا خطاب، علی محمد باب نے دیا۔ قرۃ العین فن خطابت میں بے نظیر اور حسن و جمال میں یگانہ روزگار تھی۔ شعر بھی کہتی تھی۔ اس کی غزلیں اور قصیدے چھپ چکے ہیں۔
بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قرۃ العین کے خسر کو بابیوں نے قتل کر دیا تھا۔ جب ناصر الدین شاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو قرۃ العین بھی قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ گرفتار ہوئی۔ اس کے قتل کا حکم جاری ہوا۔ ۱۸۵۲ء میں قتل کی گئی۔

قرض۔ اصطلاحاً کاروباری اور دوسرے معاملات میں ایک فرد کا دوسرے کو رقم دینا تاکہ اس کی ضرورت پوری ہو سکے اور یہ رقم قابلِ واپسی ہے۔
قرآن مجید میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے اس نیکی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، جس کا اللہ تعالیٰ اچھا بدلہ دے گا۔ یا فی سبیل اللہ خرچ کرنے کو اللہ کو قرض دینے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی ایک طویل آیت ۲۸۲ میں قرض کے لین دین کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ "جب اہل ایمان آپس میں قرض کا لین دین کریں تو اُسے لکھ لیا کریں - - - - - - - اور اس کے لیے دو آدمیوں کی گواہی لے لی جائے اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں کی شہادت لی جائے۔"
ہمارے معاشرے میں عمومی طور پر قرض کے لیے تحریر لکھنے اور اس کے لیے گواہ فراہم کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ واضح حکم دیا ہے۔ اس حکم پر عملدرآمد نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے لین دین کے معاملات میں کئی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ نبی کریمؐ کی احادیث مبارکہ میں بھی قرض کے لین دین کے بارے میں کافی ہدایات ہیں۔
نبی کریمؐ نے قرض کی ادائیگی کے لیے سخت تاکید کی ہے۔ اور قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے کو ظالم کہا ہے۔ قرض دینے والا اگر قرض کا مطالبہ سختی سے کرتا ہے تو اس میں وہ حق بجانب ہے لیکن نبی کریمؐ نے مطالبہ میں نرمی و شفقت کی ترغیب دی ہے۔ حتیٰ کہ معاف کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔
عبد اللہ ابن عمرؓ نے نبی کریمؐ کا یہ ارشاد بیان کیا ہے۔ "جو یہ چاہتا ہے کہ اس کی دعائیں قبول ہوں اور اس کی مصیبتیں دور ہوں تو وہ تنگ دست قرضداروں کے لیے آسانی پیدا کرے۔"
اس طرح ایک اور حدیث میں فرمایا۔ "جو تنگ دست و قرضدار کو مہلت دے یا معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اپنے سایۂ رحمت میں لے گا۔ جبکہ اس دن اللہ کے سایہ کے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔"
نبی کریمؐ ایسی میت کا جنازہ نہیں پڑھاتے تھے جو قرض چھوڑ کر مرا ہو یا اس وقت تک جنازہ نہیں پڑھاتے تھے جب تک کہ اس کے قرض کی ادائیگی نہ ہو جائے۔ میت کی میراث کے بارے میں علماء کا اجماع ہے کہ اگر میت کے ذمے قرض ہے تو سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے اس کی ادائیگی کی جائے گی۔ پھر وصیت پوری ہوگی۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص راہ خدا میں مارا جائے پھر زندہ ہو پھر راہ خدا میں مارا جائے پھر زندہ ہو اور اس پر کسی کا قرض آتا ہو تو جب تک اس کا قرضہ نہ ادا کیا جائے گا جنت میں داخل نہ ہوگا۔
مقروض کو بھی قرض دینے والے کا حق ماننا چاہیے۔ اور جب قرض خواہ کی طرف سے کچھ سلوک ظاہر ہو۔ مثلاً وہ اپنے مطالبے میں سے کچھ چھوڑ دے تو مقروض کو چاہیے کہ باقی مطالبہ فوراً ادا کر دے کیونکہ اب مقروض کا ادائے رقم میں تاخیر کرنا حقیقت میں قرض خواہ پر ظلم ہے۔

قرطبہ: قرطبہ ہسپانیہ کے ایک صوبے کا نام ہے جو صوبے کے ایک شہر قرطبہ کے نام کی وجہ سے قرطبہ کہلاتا ہے۔ قرطبہ صوبہ کی آبادی ۱۹۴۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۷۹۸۴۳۲۷ ہے اور اس کا رقبہ ۵۲۹۹ مربع میل ہے۔ [illegible] قرطبہ شہر کی آبادی ۱۹۴۹ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۷،۲۲۹ ہے۔ [illegible] کو ابتدا سے ہی کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مسلمانوں نے جب اسے فتح کیا تو [illegible] بعد سے اس شہر کو بہت ترقی ہوئی۔
خلیفہ ولید بن عبد المالک کے عہد میں طنجہ کے گورنر طارق بن زیاد کی قیادت میں مسلمانوں کا سات ہزار کا لشکر اندلس کے ساحل پر اترا۔ مشہور [illegible] سے متعلق ہے جب طارق بن زیاد نے ساحل پر اترنے کے بعد اپنے جہازوں کو [illegible] لگا دی تھی تاکہ لشکریوں میں واپسی کا خیال نکل جائے اور وہ [illegible] اندلس کو فتح کر سکیں۔
طارق بن زیاد کو بعد میں ۵ ہزار کے لشکر کی کمک بھی پہنچ گئی۔ [illegible] لاکھ لشکر کا سپہ سالار اعظم خود شہنشاہ لرزیق تھا۔ [illegible] کے قریب [illegible] کا آمنا سامنا ہوا۔ ۵ شوال ۹۲ھ / ۷۱۱ء کو مسلمانوں نے عیسائیوں کو شکست [illegible] اور اب طارق بن زیاد نے قرطبہ کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ قرطبہ کا [illegible] گیا۔ طارق بن زیاد نے محاصرہ پر اپنے ایک فوجی افسر مغیث [illegible] خود مزید فتوحات کیلئے آگے بڑھ گیا۔ ربیع الثانی ۹۳ھ میں چند روز کے [illegible] بعد مسلمانوں نے قرطبہ کو فتح کر لیا۔
خلیفہ سلیمان کے عہد میں تقریباً ۹۸ھ کو قرطبہ کو اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ قرطبہ اس وقت یورپ میں سب سے بڑا اور دولت مند شہر تھا۔ بعد میں قرطبہ اسلامی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز بنا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی جس کا شمار دنیا کی بہترین مساجد میں ہوتا ہے۔ عبد الرحمان سوم کے زمانے تک یہ شہر انتہائی عروج پر تھا مگر اس کے بعد اس کا زوال آنا شروع ہوا۔ ۱۲۳۶ء میں عیسائیوں نے فرڈیننڈ کی قیادت میں اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۲۳۸ء میں یہ عالیشان مسجد گرجا گھر میں تبدیل کر دی گئی۔ اس طرح سے اس شہر اور اس علاقے میں اسلامی تہذیب کے نشانات کو مٹا دیا گیا اور مسلمانوں کے ایک قرن تک کے وجود کو ختم کر دیا گیا۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اسپین کے سفر میں قرطبہ کی اس مشہور مسجد کی ویرانی کو دیکھ کر نظم کہی تھی جو مسجد قرطبہ کے نام سے مشہور ہے۔ جسکا مطلع ہے سے

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

اسی طرح انہوں نے مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر ایک اور نظم "دعا" کے نام سے بھی کہی۔ یہ دونوں نظمیں انکے مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" میں ہیں۔

قرعہ اندازی

قرعہ اندازی۔ عربی لغت نویس اسے **مُقْمَعَۃ** کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں تیروں کے ذریعے قرعہ اندازی ہوتی تھی۔ لیکن قرآن مجید نے قرعہ کے تیروں کے ذریعے گوشت کی تقسیم، قمار بازی اور پیشین گوئی کی ممانعت کردی (سورۃ المائدۃ - آیات ۳ اور ۹) اور انہیں شیطانی کام قرار دیا۔

شریعت میں قرعہ کیلئے یہ حکم ہے کہ جن حقوق کے اسباب کسی رائے پر مبنی ہوں ان میں قرعہ اندازی جائز ہے۔ مثلاً مکان مشترکہ کی تقسیم۔ اس کی تائید قرآن مجید سے حضرت مریمؑ کی کفالت کے واقعے سے بھی ہوتی ہے (سورۃ آل عمران۔ آیت ۴۴)۔ اس کے علاوہ امام بخاریؒ نے کتاب الشہادات کے آخری باب میں نبی کریمؐ کے پانچ واقعات بیان کئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعض حالات میں قرعہ اندازی کو جائز سمجھا ہے۔ ان تمام مواقع پر ایسے دو یا دو سے زائد گروہوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے قرعہ اندازی کی گئی جن کا ایک چیز پر برابر کا حق تھا اور وہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ ان میں سے کس کی ملکیت ہے۔

چونکہ قاضی کے فیصلے پر جانبداری کا شبہ ہو سکتا ہے اس لئے فریقین کی تشفی اور نا انصافی کے وہم کو دور کرنے کے لئے قرعہ اندازی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے (الھدایہ)۔ شافعی فقہ کی کتاب منہاج الطالبین میں قرعہ اندازی کو گیارہ ممکن صورتوں میں سے صرف دو صورتوں میں ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

قرعہ اندازی قطعات زمین اور دیگر اشیاء کو ان دو فریقین کے درمیان جن کا برابر کا حق ہو تقسیم کرنے کیلئے پہلے بھی مروج تھی اور اب بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں کاغذ کے چوکس ٹکڑوں پر دعویٰ کرنے والے فریقین کے نام لکھ دئے جاتے ہیں۔ پھر ان ٹکڑوں میں کسی ایک کو کوئی غیر جانبدار شخص اٹھا لیتا ہے۔

قرعہ اندازی کا موجودہ استعمال درحقیقت شرعاً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مستقبل کا علم حاصل کرنے یا غیبی احوال معلوم کرنے کی کوشش ہے۔ اس کی غرض کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بالکل وہی ہے جو زمانۂ جاہلیت میں تیروں کے ذریعے کی جاتی تھی اور جسے قرآن مجید میں ممنوع اور حرام قرار دیا گیا ہے۔

قرمط حمدان

قرمط حمدان۔ قرامطہ (باطنیہ) کا سربراہ تھا۔ اصل وطن خوزستان تھا لیکن زیادہ تر کوفہ میں رہا۔ ۲۵۸ھ / ۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔ اس نے "دارالہجرۃ" کے نام سے اپنا ایک مرکز قائم کیا تھا۔ اس کے معتقدین کافی تعداد میں تھے۔

قرمطی، ابوسعید حسن

قرمطی، ابوسعید حسن۔ مضافات بحرین کے قصبہ قطیف کے شیعہ مہدی آخر زمان کے منتظر تھے۔ انہیں شیعان قطیف کا سرگروہ ابوسعید تھا۔ جو حکومتِ وقت کے خلاف خروج کرنے کے لیے بپھرا ہوا تھا اور کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ ابوسعید اپنی جمعیت کی تیاری میں مصروف تھا۔ بالآخر حصول جمعیت کے بعد ۲۸۶ھ میں خود ہی دعویٰ مہدویت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے قرب و جوار کے دیہات و قصبات کو تاراج کیا۔ پھر تسخیر بصرہ کے عزم سے روانہ ہوا۔ خلیفہ معتضد باللہ کی فوجوں سے آمنا سامنا ہوا۔ ابوسعید نے فتح پائی۔ ابوسعید کی فوج نے شاہی لشکر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سینکڑوں من لکڑی جمع کر کے آگ لگائی گئی۔ اور خلیفہ معتضد باللہ کے ہزاروں فوجیوں کو اس آگ میں جھونک دیا گیا۔ اس کے بعد ہجر کو فتح کیا۔

تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ ابوسعید، حشر و نشر اور معاد و حساب کو نہیں مانتا تھا۔ یہ شخص انتہائی درجہ کا سفاک تھا۔ اس نے بے شمار مسلمانوں کو قتل کروایا۔ بہت سی مسجدیں منہدم کیں اور عازمین حج کے کئی قافلوں کو لوٹا۔

۳۰۱ھ میں اپنے خادم صعلبی کے ہاتھوں مارا گیا۔ ابوسعید نے اپنے بڑے بیٹے سعید کو اپنا جانشین مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن اس کا چھوٹا بیٹا ابوطاہر سلیمان اپنے بڑے بھائی کو مغلوب کر کے باپ کا جانشین بن گیا۔

قرمطی، ابوطاہر

قرمطی، ابوطاہر۔ اپنے باپ ابوسعید کے قتل کے بعد اپنے بڑے بھائی سعید کو مغلوب کر کے ۳۰۱ھ میں باپ کا جانشین بنا۔ ہجر، احسا، قطیف، طائف، بحرین کے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کرلی۔

ابوطاہر خدا کا اوتار ہونے کا مدعی تھا اور کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی روح میرے جسم میں حلول کر گئی ہے۔ یہ شخص اسلام اور اہل ایمان کے لیے تاتاریوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ اور اپنے قرمطی اور باطنی پیش رووں سے بڑھ کر اسلام کے درپے استیصال رہا۔ انہی دنوں خلافت بغداد کافی کمزور تھی۔ اس لیے ابوطاہر قرمطی کو مسلمانوں کے خلاف اقدامات کرنے کے بہترین مواقع ملے۔ ۳۱۱ھ میں اس نے بصرہ پر حملہ کیا اور وہاں کافی تباہی مچائی۔ ۳۱۲ھ میں حاجیوں کے ایک قافلہ کو بھی لوٹا۔ ۳۱۴ھ میں کوفہ پر لشکر کشی کی اور کوفہ فتح کر لیا۔ ۳۱۶ھ میں انبار فتح کرنے کے بعد رحبہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان تمام معرکوں میں اس نے کثیر تعداد میں مسلمان فوجیوں کو قتل کیا اور ہزاروں کو قید کر لیا۔ بعد میں انھیں بھی قتل کر دیا۔

ابوطاہر نے شہر ہجر کو دارالحکومت بنانے کے بعد وہاں ایک نہایت عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کو اس نے 'دارالہجرۃ' کے نام سے موسوم کیا۔

اب اس پر یہ خبط سوار ہوا کہ لوگ خانہ کعبہ کے حج اور طواف کو چھوڑ کر 'دارالہجرت' کا حج کریں۔ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے حجر اسود کو خانہ کعبہ سے 'دارالہجرۃ' پر نصب کرنے کی ترکیب سوچی۔ ۳۱۹ھ میں حج کے موقع پر مکہ مکرمہ پہنچا۔ یوم ترویہ کو ابوطاہر گھوڑے پر سوار ہو کر تیغ برہنہ لیے مسجد حرام میں داخل ہوا۔ مسجد حرام میں بیٹھ کر شراب پی۔ طواف میں مصروف حاجیوں کو قتل کیا اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ مکہ شہر میں بھی قرامطیوں نے کافی قتل و غارت کی۔ حرم شریف میں ایک ہزار سات سو محرم شہید ہوئے۔ چاہِ زمزم اور مکہ شہر کے کئی دوسرے کنوئیں انسانوں کی لاشوں سے پٹ گئے۔ اس کے بعد ابوطاہر نے کعبہ کا دروازہ اکھڑوا دیا اور نعرہ لگایا۔

انا باللہ و باللہ انا - یخلق الخلق و یفنیہم انا

(میں ہی اللہ ہوں اور اللہ میں ہی ہو سکتا ہوں - میں نے مخلوق کو پیدا کیا اور میں نے ہی انھیں موت کے گھاٹ اتارا۔)

۱۴ ذی الحج کے دن ابو طاہر حجر اسود کو اتار کر ہجرۃ کی طرف واپس لوٹا حجر اسود کو 'دارالہجرۃ' کی جامع مسجد کی غربی جانب آویزاں کر دیا۔ حجر اسود تقریباً ۲۲ سال تک ابو طاہر کے قبضہ میں رہا، اور تقریباً دس سال تک خانہ کعبہ کا حج امن کے مفقود ہونے کی وجہ سے موقوف رہا۔ ۳۲۷ھ میں ابو طاہر کی اجازت اور ہر حاجی سے پانچ دینار محصول کی وصولی کی شرط سے دوبارہ حج شروع ہوا۔

۱۰ محرم ۳۳۹ھ کو حجر اسود دوبارہ خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا کیونکہ ابو طاہر لوگوں کو "دارالہجرۃ" کے حج کے لیے حجر اسود کی وجہ سے متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ابو طاہر چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر بری حالت میں مرا۔

اس زمانے میں بد امنی بہت تھی اور کئی لوگ مہدی موعود کے دعوے کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے رہے۔ ان مدعی حالات حضرات میں ذکرویہ بن ماہر قرمطی اور یحییٰ قرمطی شامل ہیں۔

ذکرویہ قرمطی نے خلیفہ معتضد کے عہد میں، خلافت بغداد کے خلاف کئی جنگیں بھی لڑیں۔ وہ حاملِ وحی اور حضرت مہدی کے ایلچی ہونے کا مدعی تھا۔ خلیفہ مکتفی کے عہد میں بھی اس نے اپنے انتشار کے پروگرام کو جاری رکھا۔ مسلمانوں کی فوج سے ایک مقابلہ میں ذکرویہ سخت زخمی ہوا اور انہیں زخموں سے واصل جہنم ہوا۔

اسی طرح خلیفہ مکتفی کے عہد میں ہی یحییٰ قرمطی نے بھی مہدویت کبریٰ کا دعویٰ کیا۔ خلیفہ کی افواج سے مقابلہ میں یحییٰ ۲۸۹ھ کو مارا گیا۔

قریش۔ عرب کا ایک معزز اور ممتاز خاندان، جس میں نبی کریمؐ پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق جس شخص کی وجہ سے اس خاندان کو قریش کہا جانے لگا وہ نضر بن کنانہ ہی تھے۔ یہ خاندان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ہے اور قریش خود کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہونے پر بڑے فخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق نضر کے پڑپوتوں میں ایک شخص بدر تھا جس نے بدر کا کنواں کھدوایا تھا۔ اس کے والد کا نام قریش تھا اور قریش جنگلوں اور صحراؤں کے پیچ و خم سے خوب واقف تھا اور یہ قافلہ کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس قبیلہ کا نام قریش پڑ گیا۔

ایک اور روایت کے مطابق نضر کے پوتے فہر کی وجہ سے اس خاندان کا نام قریش ہوا اور اسی کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے۔ اس طرح قریش کے نام کی کئی اور روایتیں ہیں۔ ان کے تاجر پیشہ ہونے کی وجہ سے بعض مورخ ان کو قریش کہتے ہیں۔ کیونکہ تقرش کے معنی تجارت کے ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق قریش کو جمع کرنے والا قصیّ بن کلاب تھا اسی وجہ سے قصیّ کو مجمّع (جمع کرنے والا) کا لقب دیا گیا۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ فہر اور اس کی اولاد عرب میں سب سے زیادہ طاقتور تھی۔ اور دریل مچھلی کو بھی قریش کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمندر میں سب سے بڑا جانور ہے۔ طاقتور قبیلہ ہونے کی وجہ سے یہ خاندان بھی قریش کہلانے لگا۔

قصیّ بن کلاب نے عرب میں قریش کے اقتدار کو مضبوط کیا اور جملہ اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رسوخ قائم ہو گیا۔ بیت اللہ کی تولیت قصیّ کے وقت میں ہی قریش کو ملی تھی۔ قصیّ کے بعد اس کے بیٹے عبد مناف کو عرب میں کافی ناموری حاصل ہوئی اور عبد مناف کے چار بیٹوں میں سے ہاشم جو کہ عبدالمطلب کے والد اور نبی کریمؐ کے پردادا تھے، نے اپنے تین بھائیوں کی مدد سے بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ تجارتی کاروبار میں فروغ کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات استوار کرنے کے مواقع ملے۔ کچھ عرصہ بعد مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گیا۔ کیونکہ مختلف علاقوں سے لوگ بیت اللہ کے حج کے لیے مکہ آیا کرتے تھے اور اس سفر میں تجارتی سامان یہاں سے لے جایا کرتے تھے اور یہاں کے لوگوں کی ضروریات کے لیے اپنے علاقوں سے سامان لایا کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کی موجودگی اور تجارتی مرکز ہونے کی بنا پر حبشہ کے ابرہہ نے مکہ مکرمہ پر ۶۰ ہزار کے لشکر سے حملہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سے ابرہہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ فیل میں آیا ہے۔

نبی کریمؐ نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا تو قریش کے سرداروں کو اپنی سرداری اور مذہبی اجارہ داری میں دوستی محسوس ہوئی۔ تو انھوں نے نبی کریمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ کو کافی تنگ کرنا شروع کیا اُن پر حد درجہ مظالم کئے۔ قرآن مجید کے اکثر مقامات میں مکی سورتوں کے اندر قریش کے ان مفسد اور مسلمانوں کے کردار اور ان کے استقلال و صبر کا تفصیلی بیان ہوا ہے۔

قریش سے مسلمانوں کی کئی جنگیں ہوئیں۔ بالآخر نبی کریمؐ کی قیادت میں رمضان ۸ھ میں مسلمانوں نے مکہ کو فتح کر لیا اور قریش کو امان دی۔ فتح مکہ کے وقت کئی سرداران قریش نے اسلام قبول کیا۔ فتح مکہ سے قبل بھی قریش کے کئی نامور افراد اسلام لا چکے تھے۔ چاروں خلفائے راشدین بھی قریش سے تھے۔

(نبی کریمؐ کے ساتھ قریش کی مخالفت اور مفسدہ کے تفصیلی واقعات "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں دیکھیے)

قریشی، جلال الدین، سید۔ (ولادت ۹۲۲ھ - وفات [illegible])

صاحب حال درویش اور مجذوب تھے۔ زیادہ تر ننگے سر اور ننگے پاؤں جنگلوں میں پھرا کرتے تھے۔ علوم نقلی و عقلی میں آپ کو عبور حاصل تھا جس وقت علمی گفتگو ہوتی تو تفصیل سے جواب دیتے تھے۔ آپ فصیح خصوصاً عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے باوجود غلبہ حال کے احکام شرعی کے پابند تھے۔ قلندری مشرب رکھتے تھے۔ عبادت میں فرض و سنت ادا کرتے تھے۔ 'فصوص الحکم' اور تصوف کی دوسری کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ کہتے ہیں پانچ سال تک آپ نے بغیر کسی توسط کے کتاب 'علم حقیقت' پڑھی اور اس پانچ سالہ مدت میں آپ نے کسی آدمی کا چہرہ تک نہ دیکھا اور درختوں کے پتے کھا کر زندہ رہے۔

آپ کے مجذوب بننے کا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کسی سے عشق کرتے تھے۔ اس کے شورشِ عشق میں ہی آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی اور آپ مستقل مجذوب ہو گئے۔ اور پھر اجمیر شریف چلے گئے۔

قریشی، شیخ ابوالفتح علائی۔ (ولادت ۱۳۹۳ء - وفات ۱۴۶۴ء)

سید محمد گیسو دراز کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اپنے مرشد سے عوارف المعارف اور تصوف کی دوسری کتابیں پڑھیں۔ آپ کو حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے علم النحو میں "تکمیل" اور علم تصوف میں "مشاہدہ" وغیرہ معروف ہیں۔

قریظہ، بنو: یہودیوں کا ایک قبیلہ جس نے مدینہ کے اطراف میں قلعے بنائے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں ریاستی نظام قائم کرتے وقت یہودیوں کے جن قبائل سے صلح و امن کے معاہدے کیے تھے۔ اُن میں بنو قریظہ بھی شامل تھے۔ اس قبیلے کے سردار کعب بن اسد تھے۔ یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت دوبارہ معاہدہ کیا گیا لیکن جنگِ خندق میں مسلمانوں پر ہر طرف سے کفار کے زور کو دیکھ کر معاہدہ توڑ دیا اور جس قلعے میں مسلمان عورتیں اور بچے محفوظ تھے اس پر حملہ کر دیا۔ جنگ خندق کے بعد نبی کریم ﷺ خود تین ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور بنو قریظہ کا محاصرہ کیا۔ طویل محاصرہ سے تنگ آ کر یہودیوں نے صلح کی پیش کش کی اور حضرت سعد بن معاذؓ کو ثالث بنانے کی تجویز دی۔ حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلے کے بعد بنو قریظہ نے مسلمانوں کی اطاعت اختیار کر لی۔

قزوین: تہران (ایران) کے مغرب میں ایک قدیم شہر۔ یہ شہر تہران سے اشنط، بغداد اور تبریز جانے والی شاہراؤں پر واقع ہے۔ اس شہر کو شاہ پور شاہِ ایران نے تیسری صدی میں بسایا تھا۔ ۲۴ھ/ ۶۴۴ء میں اس پر عرب مسلمانوں نے قبضہ کیا اور اس کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ۱۰۹۰ء میں قزوین کے قریب قلعہ الموت پر حسن بن صباح نے قبضہ کر لیا۔ شاہ طہماسپ اول نے یہاں بہت سی عمارات تعمیر کیں۔ ۱۵۴۸ء تا ۱۵۹۸ء تک یہ دارالحکومت رہا۔ ۱۷۲۲ء میں اس پر افغانوں کا قبضہ ہوا جو تھوڑا عرصہ رہا۔ پہلی جنگِ عظیم میں یہ روس کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں روسی طیاروں نے بمباری کی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس پر روس نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔

قزوین ایک مردم خیز خطہ رہا ہے۔ یہاں کئی نامور شخصیات پیدا ہوئیں۔ جن میں مشہور و معروف محدث اور جامع احادیث اور سنن ابن ماجہ کے مصنف ابن ماجہ شامل ہیں۔

قزوینی، ابوحاتم محمود: ایک شافعی فقیہ اور شیرازی کا اُستاد۔ آمل، طبرستان کا رہنے والا تھا۔ حامد الاسفرائنی (م ۴۰۶ھ) سے تحصیل علم کیا۔ علم الفرائض، ابن اللبان سے اور اصول، ابن الباقلانی سے پڑھے۔ ۴۰۰ھ/ ۹-۱۰۰۸ء میں بغداد اور آمل میں بحیثیت معلم، تدریس شروع کی۔ تصنیفات درج ذیل ہیں۔

(۱) کتاب تجرید التجرید (المحاملی کی فقہ کی کتاب 'التجرید' کا ملخص ہے)
(۲) رونق (المحاملی کی تصنیف 'لباب الفقہ' کا خلاصہ)
(۳) کتاب الحیل فی الفقہ۔

قزوینی، جلال الدین: آپ کے والد کا نام عبدالرحمٰن الشافعی تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ بیس سال کی عمر میں روم کے ایک مقام پر قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے بھائی امام الدین قزوینی دمشق میں قاضی القضاۃ تھے۔ آپ کے ساتھ بحیثیت نائب کام کرتے رہے۔ اپنے بھائی کی وفات (۷۰۲ھ) کے بعد نجم الدین بن سقری کی بھی نیابت کرتے رہے۔ ۷۰۵ھ میں نجم الدین سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہوئے اور مسجد اموی میں خطابت شروع کی اور جلد ہی 'خطیب دمشق' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

۷۲۴ھ میں مصر کے سلطان، ناصر محمد کے بلاوے پر مصر کے لئے روانہ ہوئے۔ مصر میں داخل ہونے والے دن یعنی جمعہ کو شاہی قلعہ کی مسجد میں نماز جمعہ میں خطبہ پڑھا۔ نمازی اور سلطان آپ کے بلیغ خطبہ سے بہت متاثر ہوئے۔ سلطان نے آپ کو شام کی عدالت پر مامور کیا۔ ۷۲۷ھ میں مصر کی عدالتوں کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد کر دی گئی۔ آپ نے قضا کے یہ فرائض نہایت دیانتداری سے انجام دیئے۔

قزوینی، زکریا بن محمد: (ولادت قریباً ۶۰۰ھ/ ۱۲۰۴ء اور وفات ۶۸۲ھ/ ۱۲۸۳ء) 'عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات' کا مصنف۔ خاندانی لحاظ سے عرب تھا لیکن اس کے آباؤ اجداد نے ایران میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۶۴۰ تا ۶۵۹ھ/ ۱۲۴۲ء تا ۱۲۵۸ء کے عرصہ کے دوران واسط اور حلّہ کا قاضی رہا۔ قزوینی کی احوال کائنات سے متعلق مذکورہ بالا کتاب قرونِ وسطیٰ کے عرب مصنفین کی یادگار کتابوں میں سے ایک قابلِ قدر تصنیف مانی جاتی ہے۔ کتاب مذکورہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سماوی اور دوسرے میں ارضی اشیا سے بحث کی گئی ہے۔

دوسری کتاب جغرافیہ سے متعلق علوم پر ایک بہترین تصنیف ہے۔

قزوینی، محمد بن عبدالوہاب: ۱۵ ربیع الاول (م ۱۲۹۴ھ – ۲۹ رجب ۱۳۶۸ھ)۔ آپ کے والد اُن چار مؤلفین میں سے ہیں جنہوں نے چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سات جلدوں پر مشتمل، اہلِ علم و ادب کے سوانح حیات کا مجموعہ "نامۂ دانشوران" مرتب کیا تھا

محمد قزوینی تہران میں پیدا ہوئے۔ وہاں ہی تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے وقت کے معروف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی اور صرف و نحو، فقہ، اصول فقہ، کلام، حکمت وغیرہ علوم کی تعلیم بھی تہران کے اساتذہ سے لی۔

۱۳۲۲ھ میں اپنے بھائی کی دعوت پر لندن گئے اور وہاں کے دو سالہ قیام میں مختلف کتب خانوں سے کتابوں کا مطالعہ کیا اور مستشرقین کی صحبت سے بھی مستفیض ہوئے۔

ربیع الآخر ۱۳۲۴ھ میں تاریخ جہانگشائی کی تصحیح و طباعت کے کام کے سلسلے میں پیرس کا سفر کیا۔ پیرس میں ۱۳۲۹ھ تک رہے۔ ۱۳۲۹ھ میں برلن کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے چار سالہ قیام کے بعد ۱۳۳۸ھ میں دوبارہ پیرس آ گئے۔

حکومت ایران کے وظیفہ پر پیرس کے کتب خانوں میں موجود نادر فارسی قلمی نسخوں کے عکس لینے کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز پر یورپ چھوڑ کر واپس آ گئے۔ آخر وقت تک اشاعتِ علوم اور تالیف و تصنیف میں مصروف رہے۔ مقبرۂ ابوالفتوح رازی (حضرت عبدالعظیم) تہران میں آپ کا مزار ہے۔

قزوینی، نجم الدین عبدالغفار: (وفات محرم ۶۶۵ھ/ ۱۲۶۶ء) قزوین کے نامور شافعی عالم اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ قزوینی کی

"الحاوی الصغیر" شافعی فقہ کی نہایت معتبر اور مستند کتاب تصور کی جاتی ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اس مفید کتاب کی تصنیف کے دوران اس خواہش کا بار بار اظہار کیا کرتے تھے کہ قزدینی اس کتاب کو جلد از جلد مکمل کر لیں۔ اہل قزدین کے ہاں اس کتاب کے بارے مشہور تھا کہ جب قزدینی رات کے وقت اسے لکھتے تھے تو ان کی انگلیوں سے روشنی نمودار ہوتی تھی اور اسی روشنی میں وہ لکھنے کا کام جاری رکھتے تھے۔

علم فقہ میں اعلیٰ مہارت رکھنے کے علاوہ علم حساب میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ علم حساب میں بھی ان کی ایک کتاب مشہور ہے۔ علم فقہ میں ایک اور کتاب 'اللباب' ہے۔ اس کی شرح 'العجاب فی اللباب' بھی خود ہی لکھی۔

قسطلانی، احمد بن محمد

:- (۸۵۱ھ/۱۴۴۸ء — ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء)

آپ کا لقب شہاب الدین اور کنیت ابوالعباس تھی۔ اپنے وقت کے مشہور محدث، فقیہہ، مورخ اور مصنف۔

قاہرہ میں ولادت ہوئی وہاں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ابن حجر عسقلانیؒ ان کے استاد تھے اور سخاویؒ شاگرد تھے۔ امام سیوطیؒ ہم عصر تھے۔

بڑے خوش الحان تھے، نماز پڑھاتے تو حسن قرأت سے مقتدی اس درجہ متاثر ہوتے کہ رو رو کر گر پڑتے، انہوں نے کئی حج کئے۔ حج پر جاتے تو ایک ایک سال مدینہ منورہ میں قیام فرماتے۔ مدینہ ہی کے قیام کے دوران مشہور تصنیف مواہب لدنیہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے فقیہہ اور محدث مانے جاتے ہیں۔ تصوّف کی طرف بھی رجحان تھا۔ کثرت سے ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام بھی اکثر کرتے رہتے۔

تصانیف میں مواہب لدنیہ کے علاوہ صحیح البخاری کی شرح 'ارشاد الساری' مقدمہ فن حدیث تصوف پر مقامات العارفین اور شرح شمائل ترمذی شامل ہیں۔ علم تجوید پر بھی ان کی کئی تصانیف ہیں۔ مواہب لدنیہ کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

آپ کی وفات قاہرہ میں ہوئی اور وہاں مدرسہ عینیہ کے پاس دفن ہوئے۔

قسطنطنیہ

:- بحیرہ مارمورا میں رود باد باسفورس پر واقع ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں قسطنطین (کانسٹنٹائن) کا شہر۔ کیونکہ قسطنطین اول نے اس شہر کو فتح کر کے روما سے اپنا دارالحکومت یہاں منتقل کیا۔ ترکی انقلاب سے پہلے یہ ایک طویل عرصہ تک دارالحکومت رہا ہے۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۰ء کو اس کا نام استنبول رکھ گیا۔ ۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۷۴۲۹۷۸ ہے۔

یہ ایک قدیم شہر ہے۔ قدیم تاریخ کے مطابق ۶۶۷ ق م میں بائی زینتم نامی یہ شہر ایک خانہ بدوش قبیلہ نے آباد کیا۔ اس شہر پر بہت سے حادثے گزرے۔ سکندر یونانی کے باپ فیلقوس نے اس شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے بعد سکندر نے اس شہر کو فتح کیا۔ سکندر کے بعد بائی زینتم اور ملحقہ علاقوں کو ملا کر اس نے ایک نیا شہر بنا کر اسے اپنا دارالحکومت بنایا اور اس کا نام روما جدید رکھا لیکن بانی شہر قسطنطین کی وجہ سے یہ قسطنطنیہ مشہور ہوا۔ قسطنطین نے یہ شہر ۳۲۷ء میں آباد کیا۔ قسطنطین کے آباؤ اجداد بت پرست تھے۔ اس نے عیسائی مذہب اختیار کر کے ۳۳۰ء میں قسطنطنیہ کو حضرت مریمؑ کی نذر کیا۔ لہٰذا مئی ۳۳۰ء سے قسطنطنیہ مخصوص عیسائی شہر بن گیا۔ جب سلطنت روما دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو قسطنطنیہ مشرقی سلطنت کا دارالحکومت قرار پایا۔ مشرقی روم کو عروج قیصر جسٹنین کے عہد حکومت میں حاصل ہوا جس نے ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں قسطنطنیہ کی تعمیر و ترقی کے کئی کام ہوئے۔

قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے مسلمانوں کی کوششیں

مسلمانوں نے اوّل عہد بنو امیہ میں اس شہر پر چڑھائی کی۔ [illegible] روایت یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے اس شہر کے معرکہ میں حصہ لینے والوں کے لئے یا اسے فتح کرنے والوں کے لئے مغفرت کی بشارت دی تھی۔ اس روایت کے مطابق عہد بنو امیہ کے اوائل میں قسطنطنیہ پر معرکہ آرائی کرنے والے لشکر کی سربراہی یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی اور لشکر میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سمیت کئی نامور صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ مرض الموت کی حالت میں نبی کریمؐ کی اس بشارت کو حاصل کرنے کے لئے اس معرکہ میں شریک ہوئے اور آپ کا انتقال اسی سفر میں ہوا آپ کو قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے دفن کیا گیا۔ اس معرکہ میں یہ شہر فتح نہ ہو سکا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد حکومت میں بھی کئی مرتبہ قسطنطنیہ کی فتح کی تیاریاں کی گئیں لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی امر مانع ہوتا رہا۔ ۱۲۰۰ء میں صلیبی جنگوں کی سرگرمیوں کے دوران وینس کی ایک فوج نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے لاطینی سلطنت قائم کی اور ساٹھ سال تک یہ حکومت قائم رہی۔ یہ روما کے پوپ کو مذہبی پیشوا مانتی تھی۔ اس کے بعد ۱۲۶۰ء میں یونانیوں نے پھر قسطنطنیہ کو فتح کر کے اپنی مشرقی حکومت دوبارہ قائم کی [illegible] پرانے عقیدے پر قائم رہی اور پوپ روما کی اطاعت سے آزاد رہی۔

۲۶ ربیع الاوّل ۸۵۷ھ/ ۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو سلطان محمد خان ثانی [illegible] فوجیں لے کر خشکی کی جانب سے قسطنطنیہ کی فصیل پر نمودار ہوا۔ [illegible] عثمانی جب [illegible] نے بحیرہ مارمورا میں سمٹ کر بندرگاہ قسطنطنیہ یعنی گولڈن ہارن کے سامنے بحری [illegible] شروع کیا۔ سلطانی بیڑے کا امیرالبحر بلوط اغلق نامی ایک سردار تھا۔

۱۵ اپریل کو یعنی محاصرہ شروع ہونے سے ۹ دن بعد قسطنطنیہ کے لوگوں کے [illegible] خوردونوش اور دوسری امداد جنیوا سے آئی۔ قسطنطین بادشاہ اور [illegible] کی فوجوں کا خشکی اور بحری دونوں طرف سے زبردست مقابلہ رہا۔ قسطنطنیہ کے لوگ [illegible] محاصرہ سے بہت پریشان ہوئے کیونکہ اب اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔

طویل محاصرہ کے بعد متوقع عثمانی بحری حملہ کے پیش نظر [illegible] نے سلطان کو صلح کا پیغام بھیجا اور خود کو باج گزار بنا کر قسطنطنیہ کو [illegible] کی درخواست کی۔ لیکن سلطان ہر حالت میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے [illegible]

۱۹ جمادی الاول ۸۵۷ھ/ ۲۰ مئی ۱۴۵۳ء کو سلطان نے [illegible] آخری حملے کا اعلان کیا۔ ۲۹ مئی کو سمندر اور خشکی دونوں طرف سے [illegible] سے عیسائیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ عثمانی افواج نے قسطنطنیہ کی فتح کا [illegible] مئی کو مکمل کر لیا۔

اس طویل جنگ میں ۴۰ ہزار عیسائی قتل ہوئے۔ [illegible] کے خاندان کے افراد بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان [illegible] لقب سے مشہور ہوا۔ سلطان نے قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ [illegible] ۱۹۲۲ء تک اسلامی حکومت کا دارالسلطنت رہا۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں ترکی [illegible] کے انقلاب کے بعد دارالحکومت انقرہ منتقل ہو گیا۔

قسم

:- معنی کسی چیز کی تقسیم کرنا اور فیصلہ کرنا۔ لیکن عمومی تو پر حلف اٹھانے کے لیے بولا جاتا ہے [illegible] کسی معاملہ میں فیصلہ [illegible] کرتی ہے اور ایک واضح شہادت کا مقام رکھتی ہے۔

عربوں کی عام زندگی میں "قسم" ہر معاملے میں اپنی پوزیشن صاف کرنے

کے لیے عام طور پر اٹھائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں خود اللہ تعالےٰ نے کسی معاملہ میں واضح شہادت اور گواہی کے طور پر کئی مقامات پر قسم اٹھائی ہے۔ مثلاً " وَالْعَصْرِ "، زمانے کی قسم ہے وغیرہ۔

سورۂ النحل کی آیت ۹۴ میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔" (اور اے مسلمانو) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنا لو۔"

یعنی اگر کسی معاملہ میں قسم اٹھائی ہے تو اس کو ہر حالت میں پورا کرنا چاہیئے لیکن اگر کسی غلط معاملہ میں قسم اٹھائی ہے تو اس کا کفّارہ ادا کرکے اس قسم کو توڑا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی حلال چیز کو خود پر حرام کرنا، بیوی کو خود کے لیے حرام ٹھہرانا وغیرہ۔ اسی طرح ایک بات میں قسم کھانے کے بعد یہ واضح ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے تو اسے اختیار کر لینا چاہیئے اور بہتر معاملہ یا چیز کو اپنانا ہی اس قسم کا کفّارہ ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۸۹ اور نبی کریمؐ کی ایک حدیث میں کسی قسم کے توڑنے کے کفّارہ کے لیے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنے کا حکم ہے۔

بطور تکیہ کلام کے بلا ارادہ قسمیں کھانے پر نہ کفارہ ہے اور نہ مواخذہ۔ اللہ تعالےٰ نے اور نبی کریمؐ نے قسموں کی حفاظت کی سخت تاکید کی ہے۔

قشیری، امام

قشیری، امام۔ (ربیع الاوّل ۳۷۶ھ - ۱۶ ربیع الثانی ۴۶۵ھ)

پورا نام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری تھا۔ لقب زین الاسلام۔ مولد خراسان اور مدفن نیشاپور۔ امام قشیری کے لقب سے معروف ہیں۔ ایک بلند پایہ فقیہہ اور صوفی جو شافعی مسلک سے متعلق تھے۔ فقہ، حدیث، تفسیر، اصول، ادب، شعر اور تصوّف کے بہت بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔

بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم عربی زبان و ادب کے نامور استاد ابوالقاسم رحمانی سے حاصل کی۔ علوم دینی یعنی تفسیر، حدیث کلام، اصول، فقہ، نحو، شعر اور دوسرے متداول علوم کی تکمیل اس وقت کے معروف اساتذہ اور ماہرِ فن فضلاء ابوالحسن بن بشران، ابونعیم اسفرائنی ابوبکر طوسی، ابوبکر فورک، ابواسحٰق اسفرائنی سے کی۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد ابو علی دقاق کی خانقاہ تصوّف و فقر میں قدم رکھا۔ ان سے بیعت کی، ان کی بیٹی سے عقد بھی کیا۔ اپنے استاذ اور خسر کا ذکر بہت عقیدت سے کرتے تھے۔ مختلف فنون پر ان کی کئی فاضلانہ تصانیف ہیں آپ سماع کے بہت مخالف تھے۔

(۱) رسالہ القشیریہ فی التصوّف۔
۲۔ نحو القلب
۳۔ تفسیر القرآن
۴۔ لطائف الاشارات
۵۔ کتاب الجواہر
۶۔ کتاب احکام السماع
۷۔ کتاب آداب الصوفیہ
۸۔ کتاب عیون الاجوبۃ
۹۔ کتاب المناجات
۱۰۔ کتاب المنتہیٰ وغیرہ

قصاری

قصاری۔ قصاری فرقہ ابوصالح بن حمدون بن احمد بن عمارۃ القصارؒ کی طرف منسوب ہے۔ آپ کا طریقہ ملامت کا ظاہر اور نشر کرنا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک تزکیہ نفس کے لیے خلق کی ملامت ضروری چیز ہے۔ ملامت میں شریعت کی خلاف ورزی کیے بغیر ایسی روش اختیار کرنا ہے کہ لوگ ان کو ملامت کریں اور ان کے درپئے آزار ہوں۔ کیونکہ لوگوں کی ملامت کا تختہ مشق بننا آدمی کے مقبول بارگاہ ہونے کی علامت ہے۔ ابوصالح قصار کا مسلک یہ تھا کہ انسان کا اپنے باطن میں خدا کے ساتھ معاملہ، اس معاملہ سے بہت اچھا ہونا چاہیئے جو اس کا مخلوق کے ساتھ ہے۔

قِصاص

قِصاص۔ شرعی اصطلاح میں خون کے بدلے خون لینے کو قصاص کہتے ہیں۔ وسیع تر معنی میں اگر ایک فرد نے کسی دوسرے فرد کو کوئی جانی نقصان پہنچایا ہے تو اس کے لیے ویسے ہی بدلہ کو " قصاص" کہا جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاص ... کے الفاظ اس بات کو واضح کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے قصاص ایک لازمی حکم ہے۔

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہی قتل کی جائے گی ..... " (سورۃ بقرہ آیت ۱۷۸) آیت ۱۷۹ میں فرمایا گیا کہ قصاص میں ہی اسلامی معاشرہ کی زندگی ہے۔

اسلامی تعلیمات نے انسانی جان کے تحفظ اور آزادی کے لیے بہترین قوانین پیش کیے ہیں۔ اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں بھی اور موجودہ تہذیب یافتہ دور میں بھی ایک انسان کے قتل کا بدلہ پورے قبیلہ، خاندان یا قوم سے لیا جاتا ہے اور یہ دشمنی در اصل نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ قتل ایک راضی نامہ جرم ہے یعنی اگر کسی نے ایک فرد کو قتل کیا ہے تو وارث اگر قاتل کو معاف کر دیں تو یہ سب سے بہتر ہے اور قاتل اس کے بدلے میں خون بہا ادا کرے لیکن اگر مقتول کے وارث معاف نہ کریں تو قاتل سے اس کی جان کا قصاص لیا جائے گا۔ اب معاملہ ختم ہوا۔ یہ نہیں کہ قاتل کی جان بھی لی جائے اور اس کے بعد دشمنی ختم نہ ہو اور قاتل کے خاندان کے کسی فرد سے زیادتی کی جائے۔ قرآن مجید میں ایسی زیادتی کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

سورۃ المائدہ کی آیت ۴۵ میں اللہ تعالےٰ اہلِ یہود کے ذکر میں بتاتے ہیں کہ " ہم نے انھیں حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفّارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔" یہی احکام مسلمانوں کے لیے ہیں۔ نبی کریمؐ نے قصّاص کا صدقہ کرنے کی تشریح اس طرح کی ہے کہ قصاص کو معاف کر دے۔ مزید فرمایا۔" جس کے جسم میں کوئی زخم لگائے گیا اور اس نے معاف کر دیا کہ جس درجہ کی یہ معافی ہو گی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔"

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں قصاص کا رواج تھا۔
رسول کریمؐ نے مدنی زندگی میں ایک مسلمان سے قصاص نہیں لیا تھا بلکہ دیت دلوائی تھی جبکہ اس نے ایک کافر کو قتل کیا تھا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد آپؐ

نے ایسا نہیں کیا۔ اسی لیے علمائے اسلام میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی مسلمان کافر کو قتل کر دے تو کیا خون کا بدلہ خون ہوگا یا دیت دلوائی جائے گی؟

قصّاص ۔ قاصّ کی جمع ہے یعنی قصہ گو۔ قدیم عرب میں چند لسّان اور چرب زبان شہر کے گلی کوچوں میں لوگوں کو گزشتہ واقعات، چاشنی پیدا کرنے کے لیے مبالغہ آمیز انداز میں سنایا کرتے تھے۔ اسلام کے بعد بھی یہ رواج بھی تقریباً ہر دور میں رہا۔ قصّاص اپنے بیان کردہ واقعات میں اکثر بے سر و پا باتیں بیان کرتے ہیں۔

قَصر :۔ محل، قلعہ، حویلی، خیمہ نما عمارت۔ قرآن مجید میں یہ لفظ تین بار آیا ہے، ایک بار صیغۂ واحد میں اور دو بار صیغہ جمع (قصور) میں، اس کا اطلاق دو بار ارضی محلات پر اور ایک بار ان جنتی مکانات پر ہوا ہے جہاں مومنین قیام کریں گے۔

دارالحکومت میں بادشاہ کے محل اور صوبے کے صدر مقام میں وہاں کے عامل کے محل کے لئے یہ لفظ عموماً استعمال ہوتا ہے، مثلاً قصرِ فرعون یعنی فرعون کا محل، قصرِ قاجار، قاجاریوں کا محل جو تہران کے قریب واقع ہے۔ قصرِ شیریں، قصر الکبیر قدیم شہر د.ل کے نام ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں شہر مراکش میں واقع تھے۔

قصر (قَصْرُ الصَّلٰوۃ) :۔ لغت میں قصر کے معنی چھوٹا ہونا ہے۔ اصطلاحِ شرعی میں قصر (قصر الصلوٰۃ) اس تخفیف کا نام ہے جو مسافر کی نماز کیلئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں میں قصر کا لفظ، تخفیف نماز کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

"جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں نقصان پہنچائیں گے" (سورۃ النساء۔ آیت ۱۰۱)

دشمن کا خوف یا زمانۂ جنگ نہ ہونے کے باوجود، شریعت نے عمومی نماز کے لئے سفر کی حالت میں قصر کا حکم دیا ہے۔

صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ المسافرین و قصرھا) میں یعلی بن امیہؓ سے روایت کردہ حدیث اس طرح ہے۔" انہوں نے فرمایا، میں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ آیت میں ہے کہ تم پر حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو اگر تمہیں کفار سے اندیشہ ہو، اور اب تو لوگ امن سے ہیں، پھر قصر کیوں؟

حضرت عمرؓ نے جواب دیا، جس بات پر تمہیں تعجب لاحق ہوا مجھے بھی ہوا تھا، چنانچہ میں نے رسولِ کریمؐ سے اس بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا یہ قصر اللہ نے تمہیں ایک عطیہ بخشا ہے۔ پس اُس کا عطیہ قبول کر لو"

فقہا نے مسافر کی تعریف یوں بیان کی ہے جب نماز کے لئے وہ قصر کر سکتا ہے۔

(ا) سفر کا ارادہ ہو، یعنی اگر کوئی شخص بغیر قصدِ سفر کے نکل پڑتا ہے تو وہ شریعت میں مسافر نہیں کہلائے گا۔

(ب) سفر ایک خاص مدت سے کم ہو اور ضروری ہے کہ مدت خاص (جو شریعت میں مقرر ہے) کے ارادہ سے نکلے۔ اگر اس مدت سے کم کا سفر ہے یا ارادۂ سفر اس مدت سے کم کا ہے، تو وہ شرعی مسافر نہ ہوگا۔

(ج) سفر کے احکام، اس وقت شروع ہونگے جب بستی کی حدود سے باہر نکل جائے۔

(د) جب تک اپنی بستی میں واپس نہ آ جائے یا کسی بستی میں پندرہ روز یا اس سے زیادہ کے قیام کی نیت نہ کرے۔ سفر کے شرعی احکام جاری رہیں گے۔

جب مذکورہ بالا امور پائے جائیں تو مسافر چار رکعت والی فرض نماز (ظہر، عصر اور عشاء) کی صرف دو رکعت ادا کرے گا۔

فقہائے احناف کے نزدیک قصر، واجب ہے یعنی مسافر کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار رکعت کی نماز کو دو رکعت ادا کرے، اگر چار رکعت ادا کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ البتہ اگر درمیانی قعدہ ادا کیا ہے تو آخری دو رکعت نفل ہو جائیں گی نماز تو بہرصورت ادا ہو جائیگی اس کے دہرانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

مالکی فقہا نے قصر کو سنتِ مؤکدہ کہا ہے۔

شافعی اور حنبلی فقہا، قصر کو [illegible] سمجھتے ہیں یعنی مسافر کو اختیار ہے کہ قصر پڑھے یا پوری نماز ادا کرے البتہ قصر کرنا بہتر ہے۔

اس مسئلہ میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ اگر مسافر چار رکعت والی نماز، مسجد میں باجماعت ادا کرتا ہے تو مقیم امام کے پیچھے چار رکعت کی نیت کرے گا۔

قصر کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ 'مسافت' کا ہے جہاں سے قصر نماز کا آغاز ہوتا ہے۔ شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ میں، یہ مسافت ۱۶ فرسخ (ایک فرسخ تین میل کے برابر ہے) ہے یعنی ۴۸ میل (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ) فقہ حنفی میں، مسافت سفر کا اندازہ پیمائش کی بجائے وقت سے لگایا گیا ہے جو سال کے سب سے چھوٹے دنوں کے اعتبار سے تین دن کے سفر کے برابر ہے۔ دن سے دن کا اکثر حصہ میں کیا گیا سفر مراد ہے یعنی دو پہر کے آرام، کھانے پینے وغیرہ پر صرف ہونے والے وقت کے علاوہ جو وقت بچے۔

بعض متاخرین فقہا نے [illegible] نے تین دن کے سفر کو تین منزل کی مسافت تصور کرتے ہوئے میلوں کے حساب سے اس کی مقدار ۵۷ میل ۳ فرلانگ کے برابر مقرر کی ہے۔

(بہارِ شریعت از امجد علی، فتاویٰ رضویہ از مولانا احمد رضا خاں بریلوی)

مفتی عزیز الرحمٰن، فتاویٰ دارالعلوم دیو بند میں بیان کرتے ہیں کہ حنفی فقہائے احناف نے فراسخ کا اعتبار کیا ہے ان کے ہاں [illegible] فرسخ [illegible] (برابر ۴۵ انگریزی میل) مراد ہے۔ الفقہ علی مذہب الاربعہ میں [illegible] احناف نے مسافت کا اندازہ فراسخ سے لگایا ہے [illegible] فرسخ (برابر ۵۰،۸/۳ میل) ہے۔

فقہ جعفری میں مسافت آٹھ فرسخ (برابر ۲۴ میل [illegible])

قصر اور سفر کے مسائل کے سلسلے میں ایک اہم مبحث [illegible] وطن وہ ہے جہاں کوئی شخص پیدا ہوا [illegible] سکونت بھی وہیں رکھی، یا جہاں [illegible] شادی ہوئی اور وہیں آباد ہو گیا، یا جہاں بسلسلہ معاش سکونت اختیار کر لی [illegible]

وطن اصلی کے متعلق یہ حکم ہے کہ سفر سے واپسی پر بستی میں داخل ہوتے ہی قصر ترک کر دیا جائے گا۔ چاہے اقامت کی نیت کرے یا نہ کرے یا اصلی وطن میں [illegible] سے کم ٹھہرنے کا بھی ارادہ کیوں نہ ہو۔

وطن اقامت: وہ عارضی مسکن، جہاں پندرہ روز یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ ہو۔ پندرہ روز سے زیادہ قیام کے ارادہ سے وطن اقامت میں پوری نماز ادا کرنا ہوگی۔

قصص القرآن ۔ مراد قرآن مجید میں مذکورہ وہ قصّے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے مخاطبوں کی ہدایت وعبرت کے لیے بیان کیے ہیں ۔ ان میں اکثر قصص انبیاؑ علیہم السلام کے ہیں ۔ اُن کی پیدائش، ان کے دَور کے مسائل ۔ دعوت الی اللہ میں آنے والی مشکلات کا بیان، انبیارکی دعوت کے مخالفوں اور دشمنوں کا ذکر آیا ہے ۔ قرآن مجید کی تقریباً ایک ہزار آیات میں مختلف قصّے بیان کیے گئے ہیں ۔ یعنی قرآن مجید کی ہر سورۃ میں کوئی قصہ بیان ہوا ہے ۔ انبیار کے قصص کے علاوہ ہابیل اور قابیل ۔ قصّہ یاجوج ماجوج اور اصحاب کہف کے قصّے بھی بیان ہوئے ہیں ۔ قصّہ آدم و ابلیس تفصیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ حضرت آدمؑ کا بیان ۲۵ مقامات پر، حضرت نوحؑ کا بیان ۳۴ مقامات پر، حضرت ابراہیمؑ کا بیان ۲۵ مقامات پر ۔ حضرت موسیٰ کا بیان ۔ ۴۰ مقامات پر آیا ہے ۔ حضرت یوسفؑ کا تفصیلی قصّہ سورۃ یوسف میں بیان کیا گیا ہے اور مجموعی طور پر ۲۶ مقامات پر اُن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ۔ حضرت عیسےٰؑ کا بھی بیان کئی مقامات پر ہوا ہے ۔ اُن کا اور اُن کی والدہ حضرت مریمؑ کا تفصیلی بیان " سورہ مریم " میں ہوا ہے ۔

قرآن مجید میں انبیار کے احوال کے بیان میں اُن کے نام سے مستقل سورتیں بھی ہیں ۔ سورۃ یونسؑ ۔ ہودؑ ۔ یوسفؑ ، ابراہیمؑ ۔ نوحؑ اور محمدؐ ۔

مذکورہ بالا انبیار علیہم السلام کے علاوہ درج ذیل انبیار کا بھی بیان قرآن مجید میں ہوا ہے ۔

حضرت ادریسؑ ۔ حضرت صالحؑ ، حضرت شعیبؑ ۔ حضرت اسماعیلؑ حضرت اسحٰقؑ ۔ حضرت لوطؑ ، حضرت یعقوبؑ ، حضرت ہارونؑ ، حضرت یوشعؑ ۔ حضرت الیاسؑ ، حضرت الیسعؑ ، حضرت شموئیلؑ ، حضرت داؤدؑ ، حضرت سلیمانؑ ۔ حضرت ایوبؑ ، حضرت ذوالکفلؑ حضرت عزیرؑ ، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ ۔

بعض مفسرین نے حضرت لقمان اور حضرت ذوالقرنین کو بھی نبی تسلیم کیا ہے ان کا بھی قرآن میں ذکر ہے ۔

قصور ۔ پنجاب کا ایک مشہور شہر، جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں شامل ہوا ۔ یہ شہر لاہور سے جنوب کی طرف ۳۴ میل کے فاصلے پر ہے اس کے جنوب میں دریائے ستلج اور شمال میں دریائے راوی بہتا ہے ۔ ۱۹۷۶ء میں اسے ضلع قصور کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا ۔

قصور کی وجہ تسمیہ اور آبادی کے سلسلے میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں ۔ مشہور روایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس قصبہ میں محل کثرت سے تھے ۔ اسی لیے یہ قصور (جمع قصر، معنی محل) کے نام سے مشہور ہوا ۔ قصور کی ابتدائی تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہے ۔ اس کا ذکر پاک و ہند کے صرف عہد اسلامی کی تاریخ میں ملتا ہے ۔ قدیم زمانے سے اس شہر پر مختلف اقوام کا قبضہ رہا ہے ۔ مسلمانوں سے پہلے ۔ اس پر راجپوتوں کا قبضہ تھا ۔ مغلوں سے پہلے ، قصور کے بارے میں اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے جد بزرگ قاضی شعیبؒ جب کابل سے ہجرت کر کے ۵۵۳ھ / ۱۱۵۷ء میں لاہور پہنچے اور بعد میں لاہور سے قصور منتقل ہو گئے ۔

قصور اپنی مردم خیزی کے اعتبار سے بھی اہم رہا ہے ۔ مختلف کتب تاریخ سے، یہاں کے کئی نامی گرامی علمار ، مشائخ ، مصنفین اور شعرار کا ذکر ملتا ہے ، جو یہاں پیدا ہوئے ۔ مخدومانِ قصور میں سے ایک شخصیت جو عالم اجل، عارف، مصنف اور شاعر تھے ، مولانا غلام محی الدین قصوری ، بہت معروف گزرے ہیں ۔ قریب زمانے کے مشاہیر میں مولوی عبدالقادر ، مولوی محمد شفیع ، اور ڈاکٹر محمد اقبال (اساتذہ ، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور) اور ڈاکٹر احمد بشیر سابق صدر شعبۂ تاریخ سندھ یونیورسٹی قابلِ ذکر ہیں ۔

قصور میں کئی مشائخ کے مزارات ہیں ۔ جن میں شاہ کمال چشتیؒ ، بابا بلھے شاہؒ ، حاجی عبدالمالکؒ ، حاجی اخوند سعیدؒ ، حاجی گگن شوریانیؒ ، شیخ میرکؒ ، محمد ابراہیم عرف پیر بولنا ، حاجی محمد شریفؒ اور پیر دولت عجمیؒ قابلِ ذکر ہیں ۔ مشہور مساجد یہ ہیں : جامع مسجد حسین خان ، مسجد حوض والی، مسجد حلیم خاں ۔ مسجد گنبد والی کوٹ مراد خاں ، مسجد خداداد خان المعروف بہ دھوپ سڑی ۔

قصور ریلوے سٹیشن ہے اور مختلف مقامات کے لیے ریل کی سہولتوں کے علاوہ ٹرانسپورٹ کی دوسری سہولتیں بھی ہیں ۔ خصوصی طور پر لاہور کے لیے بسوں کی آمد و رفت بہت زیادہ ہے ۔ یہ شہر صنعت و تجارت کے لحاظ سے بھی مشہور ہے ۔ سینکڑوں برقی کھڈیاں لگی ہوئی ہیں ۔ لائل پور (فیصل آباد) کے بعد کپڑے کی یہ دوسری اہم تجارتی منڈی ہے ۔ شہر میں تعلیمی سہولتیں یعنی کالج تک موجود ہیں ۔ یہاں کے باشندے اپنے اعلیٰ اخلاق کے لحاظ سے مشہور ہیں ۔ عوام کی زندگی بہت سادہ ہے اور شروع سے ہی یہاں مذہب کا عمل دخل رہا ہے ۔ مذہبی تقریبات زور شور سے منائی جاتی ہیں ۔

قصوریؒ، مولانا عبدالقادر ۔ (وفات ۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء)
تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے ایک نامور سپاہی، معروف عالم دین اور سیاست دان ۔

قصور کے ایک علمی و دینی گھرانے میں پیدائش ہوئی ۔ علمی و دینی گھرانے کی تعلیم و تربیت سے آپ نے مذہبی اور علمی میدان میں بہت جلد ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے اعلیٰ عصری تعلیم بھی حاصل کی ۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد ابتدائی عملی زندگی میں قصور میں وکالت کرتے رہے ۔

مولانا عبدالقادر کا خاندان مسلکِ اہلِ حدیث سے متعلق تھا ۔ اس لیے ان میں اور ان کے گھرانے کے دوسرے افراد میں اتباعِ سنت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ مجاہدین ثمرقند کی ہر قسم کی اعانت کے لیے قصور کا یہ گھرانہ ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا ۔ تحریکِ مجاہدین میں مولانا عبدالقادر نے ہر ممکن تعاون کیا ۔

تحریک خلافت کا آغاز ہوا تو مولانا اس میں بھی بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے ۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر رہے ۔ مرکزی خلافت کمیٹی میں معاملہ فہمی تدبر اور علم و دانش کی وجہ سے آپ کو ایک بلند مقام حاصل تھا ۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ ، مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علی آپ کی علمی وجاہت اور تدبر و حکمت سے کافی متاثر تھے ۔

مولانا عبدالقادر نے تبلیغ اسلام کے لیے بھی مقدور بھر جد و جہد کی آپ نے " جمعیت دعوت و تبلیغ " قائم کی اور اس کی مالیات کی ذمہ داری، آپ کے بیٹے مولوی محمد علی ایم ۔ اے (کیمبرج) پر تھی ۔ جو بمبئی میں تجارت کرتے تھے ۔ مولوی محمد علی (وفات ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء) اپنے باپ کی طرح ایک مجاہد اور

عالم باعمل تھے۔ (ان کے احوال کے لیے دیکھئے "محمد علی قصوری")

جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی، دو جماعتوں کانگرس اور مسلم لیگ میں سمٹ کر رہ گئی اور مجلسِ خلافت، جمعیت علمائے ہند، مجلسِ احرار وغیرہ پس منظر میں چلی گئیں تو آپ نے بھی اپنی سرگرمیوں کا مرکز کانگرس کو بنا لیا۔ آپ آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ بعد میں کانگرس سے وابستہ مسلمان اکابرین میں ایک دوسرے کے لیے حریفانہ جذبات کے نشوونما پانے کی وجہ سے آپ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

مولانا عبدالقادر نے مسلمانانِ ہند کے لیے ہر دشوار مرحلہ میں پیش پیش رہ کر اپنا کردار ادا کیا۔ مسجد شہید گنج کے حصول کے لیے جب مولانا ظفر علی خان نے "مجلسِ اتحادِ ملت" قائم کی تو مولانا عبدالقادر اس کے صدر بنائے گئے۔

زندگی کے آخری ایام میں بیماری کی حالت میں اپنے دوسرے بیٹے میاں محمود علی قصوری بیرسٹر کے ہاں "الفیض" لٹن روڈ لاہور میں رہے۔ وہاں ہی ان کا انتقال ہوا۔ آپ کی میت قصور لے جا کر دفن کی گئی۔
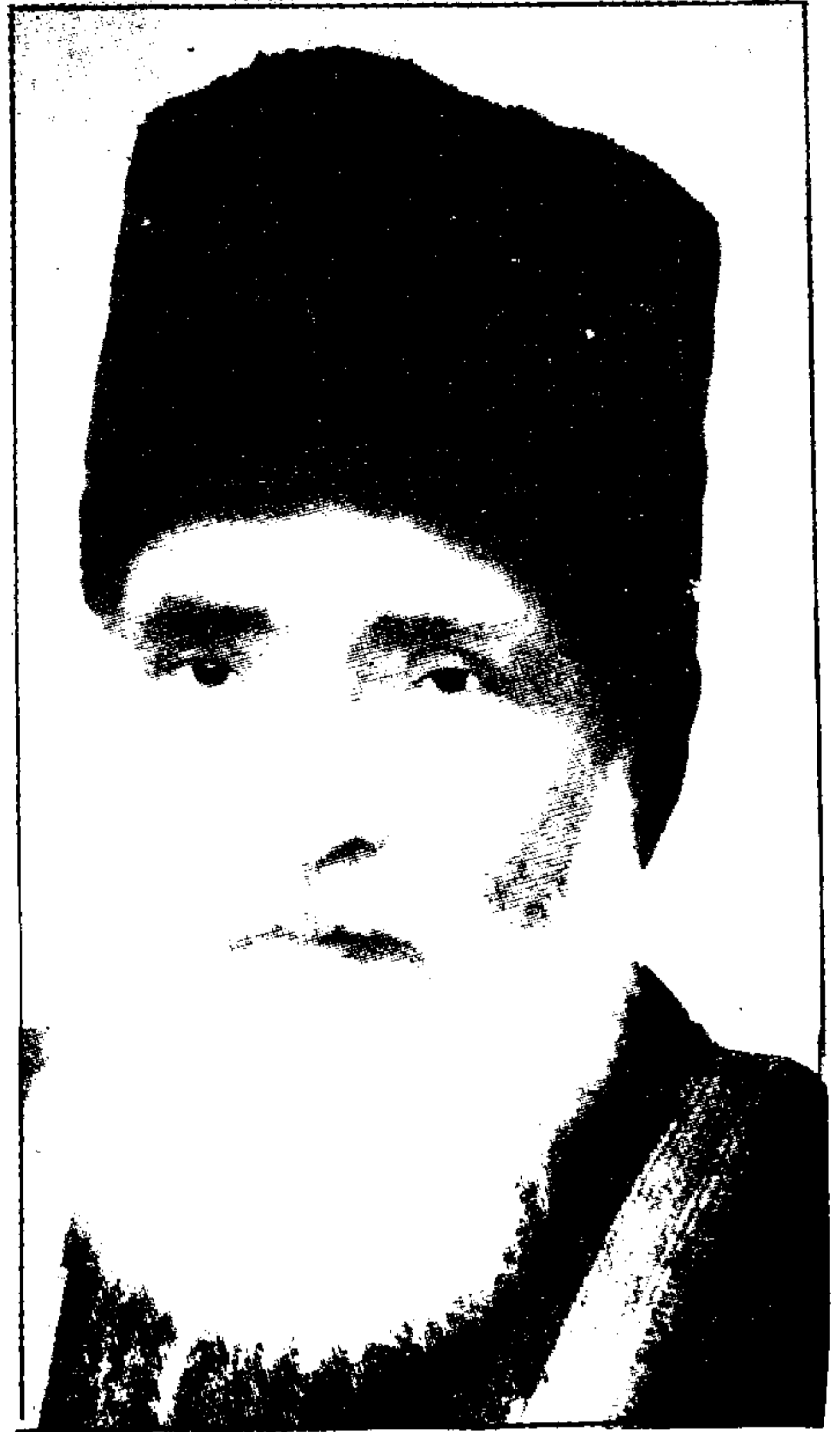
آپ کے دوسرے بیٹے میاں محمود علی قصوری ایک مشہور وکیل ہیں اور پاکستان کی سیاست میں ہر دور میں سرگرم رہے ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی (کالعدم) پیپلز پارٹی اور پھر تحریکِ استقلال میں شامل ہوئے۔ اس وقت تحریکِ استقلال پنجاب کے صدر ہیں۔

قصوری، مولانا غلام اللہ۔ (۱۸۵۰ء — ۱۹۲۲ء)

آپ کے والد کا نام مولانا غلام رسول قصوریؒ تھا۔ ابھی آپ ۶ برس کے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی پرورش آپ کے چچا مولانا غلام علی نے کی جو امرتسر میں رہتے تھے۔ جوان ہونے کے بعد اپنی والدہ کے پاس قصور چلے آئے اور سکول کی ملازمت اختیار کی۔ پھر کچھ عرصہ بعد رسالہ "نور الہدیٰ" شروع کیا۔ جس کے ذریعے آپ کی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کی شہرت اطراف اکناف میں ہوئی۔ مہاراجہ فریدکوٹ نے آپ کو مشیرِ مال مقرر کیا لیکن جلد ہی آپ نے اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور دوبارہ تحصیل و تکمیلِ علوم کے خیال سے لاہور آئے اور خلیفہ حمیدالدینؒ اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے استفادہ کیا۔

خلیفہ حمیدالدین نے ۱۸۸۴ء میں اپنے چند مخلص دوستوں کے تعاون سے انجمن حمایت اسلام کی بنا ڈالی۔ تو مولانا غلام اللہ قصوری نے اس سلسلہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انجمن حمایت اسلام نے ایک مدرسہ، خلیفہ حمیدالدین کے نام کی نسبت سے، مدرسہ حمیدیہ قائم کیا۔ جس کے اول مدرس خلیفہ حمیدالدین اور نائب مدرس مولانا غلام اللہ قصوری مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ مدرسہ رحیمیہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ خان محمد شاہ رئیس اعظم امرتسر کی دعوت پر مدرسہ اسلامیہ امرتسر چلے گئے اور وہاں بطور اوّل مدرس کام کرتے رہے۔ امرتسر کے قیام کے دوران جلد ہی آپ کا شمار صف اوّل کے علماء میں ہونے لگا۔ آپ مناظروں و مباحثوں سے احتراز کرتے تھے لیکن رد نصاریٰ اور ردِّ مرزائیت میں آپ نے بھرپور حصہ لیا۔ امرتسر سے ایک رسالہ [illegible] ۱۸۸۶ء میں جاری کیا جس میں اسلامی مسائل و عقائد کو نہایت عمدہ [illegible] توضیح سے بیان کیا جاتا تھا۔ تقریباً گیارہ سال امرتسر میں گزارنے کے بعد اواخر ۱۸۹۶ء میں فیروزپور چلے گئے۔ اور وہاں فیروزپور ہائی سکول میں [illegible] مدرس کی حیثیت سے ۱۹۰۴ء تک کام کرتے رہے۔ [illegible] ۱۹۰۴ء میں [illegible] کالج لاہور میں دینیات و عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور [illegible] سال تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ ۳ جنوری ۱۹۲۲ء کو رحلت فرما گئے۔ [illegible] جگہ آپ کے بیٹے مولوی حکیم محمد حسین (متوفی ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۴ء) [illegible]

آپ نے کئی اہم موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کو بے پدر بیٹا نہ ماننے والوں کے رد میں ایک کتاب "[illegible] فی ولادت المسیحؑ" لکھی۔ عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں "تائید اسلام" کتاب لکھی۔ دوسری تصانیف میں [illegible] اور حرمتِ سود شامل ہیں۔

قصوریؒ، مولانا غلام دستگیر۔

اندرون موچی دروازہ لاہور میں مقیم حسن بخش صدیقی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ مولانا غلام محی الدین قصوری کی بہن تھیں۔ قرآن ناظرہ اپنے بھائی مولانا [illegible] سے پڑھا۔ ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ دینی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی۔ مولانا غلام محی الدین کے انتقال کے بعد اپنے ماموں زاد بھائی صاحبزادہ غلام رسول قصوری سے دینی علوم کی تکمیل کی۔ صاحبزادہ غلام رسول بھی اپنے وقت کے

نامور عالم تھے۔

اپنے ماموں کی بیٹی سے آپ کی شادی ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علمی حلقوں میں جلد ہی ایک مقام حاصل کر لیا۔ انجمن حمایت اسلام نے جب درسی کتب کی اشاعت شروع کی تو اپنی اعلیٰ ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے شعبہ تصنیف کے انچارج مقرر کیے گئے۔

آپ نے ایک مناظر کی حیثیت سے بھی کافی شہرت پائی اور مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی مباہلہ کی دعوت دی۔ لیکن مرزا آپ کی ذہانت اور قابلیت کے خوف کی وجہ سے سامنا کرنے کے لیے نہ آیا۔ آپ کی تصانیف میں بھی مناظرانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ آپ کو شاعری کا بھی کافی ذوق تھا۔ ۱۳۱۵ھ کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

قصوریؒ، مولانا غلام محیّ الدین۔ (۱۲۰۲ھ / ۱۲۷۰ھ۔)

"مخدوم پنجاب" حافظ غلام مرتضیٰ کے صاحبزادے حافظ غلام مصطفیٰ کے لڑکے غلام محی الدین کی پیدائش قصور میں ہوئی۔ مخدوم پنجاب، وارث شاہ اور بلھے شاہ کے استاد تھے۔ غلام محی الدین ابھی ایک سال کے تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے چچا حافظ محمد نے آپ کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم بھی اپنے چچا سے حاصل کی۔ آپ کے چچا کو قادریہ سلسلہ سے خرقۂ خلافت ملا تھا۔ اسی لیے مولانا غلام محی الدین کی ابتدائی زندگی سلسلۂ قادریہ سے متاثر نظر آتی ہے۔ اپنے چچا کے ساتھ ایک دفعہ بریلی اور دہلی کا سفر کیا۔ دہلی میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے ایک معروف بزرگ شاہ غلام علیؒ سے ملاقات ہوئی۔ چچا کے انتقال کے بعد آپ دہلی چلے گئے اور وہاں حضرت شاہ غلام علیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کے مرشد نے آپ کی روحانی تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ آپ کے مرشد بھی آپ کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ دہلی میں ایک عرصہ قیام کے بعد قصور لوٹ آئے۔ یہاں آپ کے فیضانِ نظر اور خصوصی تربیت سے، روحانیت کے کئی چشمے پھوٹے۔

مولانا غلام محی الدین قصوری کی دینی مصروفیات میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آپ کو شعر و ادب میں بھی بڑا کمال تھا۔ آپ کا کلام فارسی، عربی اور اُردو ادب کا بہترین حصّہ ہے۔ آپ نے "تحفۂ رسولیہ" اور "عربی خطبات" میں جس بلند خیالی کو پیش کیا ہے وہ آپ کے معاصرین کے ہاں بہت کم ملتی ہے ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ کو انتقال فرمایا۔ اور قصور میں ہی دفن ہوئے۔

قُصَیّ بن کلاب۔

قریش خاندان کے مشہور سردار جو نبی کریمؐ کے دادا عبدالمطلب کے پر دادا قصیّ کا اصل نام زید تھا۔ والد کا نام کلاب، والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ زید جب گود میں تھے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے بیوہ ہونے کے بعد شام کے ایک معروف شخص ربیعہ سے شادی کر لی۔ والدہ آپ کو ساتھ ہی شام لے گئیں۔ قصیّ کے معنی ہیں دُور چلا جانا۔ چونکہ وہ عرب سے بہت دُور شام چلے گئے تھے۔ اس لیے ان کا نام قصیّ پڑ گیا۔ وہ ربیعہ کو اپنا باپ سمجھتے تھے۔ جوان ہوئے تو تیر اندازی میں کمال حاصل کیا۔ تیراندازی کے ایک مقابلہ میں نسب کے مسئلہ پر ایک طعن کی وجہ سے مکّہ چلے آئے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ عبد مناف۔ عبداللہ۔ عبدالعزیٰ اور عبد قصیّ۔ عبد مناف کے بیٹوں میں سے ہاشم نے قریش میں شہرت پائی۔ اور نبی کریمؐ بنی ہاشم ہی سے تھے۔

قصیدہ

ق ص د سے مشتق۔ بمعنی ٹھوس اور بھرا ہوا، مغز یا دماغ کشف اللغات، (فرہنگ آصفیہ)، اصطلاحاً ایسی نظم جس میں کسی ممدوح کی مدح ہو، لیکن عملاً قصیدے کا دائرۂ موضوعات وسیع ہے۔ اس میں حسن و عشق، گردشِ دوران، بہار و گلزار، اخلاقیات و عرفانیات اور دعا کا بیان بھی آتا ہے۔

۔ وہ صنفِ شعر جس میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ ہوں اور اشعار کی تعداد پندرہ سے کم نہ ہو۔ موضوع متعین نہیں بلکہ مدح، ذم، فخر، موعظت۔ ہر ایک کی گنجائش ہے۔ عام طور پر اس کے چار ارکان ہوتے ہیں۔ (۱) تشبیب، (۲) گریز، (۳) مدح، (۴) دُعا۔

اسلام سے قبل عرب میں قصیدوں کا بہت رواج تھا۔ اسلام آنے کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ عربی فارسی اور اردو میں قصیدوں کے بہترین مجموعے ہیں۔ ہر دَور میں معروف مسلم شعرا قصیدے بھی کہتے رہے۔

طویل قصیدے بھی لکھے گئے ہیں، چنانچہ بعض قصیدوں کے اشعار کی تعداد سَو سے زیادہ ہے۔ قصیدے کا پہلا شعر جس میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں "مَطْلَع" کہلاتا ہے۔ مطلع کے بعد دوسرا مطلع آئے تو اُسے "مطلعِ ثانی" کہتے ہیں۔

قدیم زمانے میں ایسی نظمیں بھی کہی جاتی تھیں جنہیں یوں تو قصیدے ہی کہا جاتا تھا لیکن ان میں قصیدے کا اہم ترین حصّہ، یعنی مدح یا ہجو نہیں ہوتی تھی۔ ایسی مثالیں عمر بن ابی ربیعہؔ کے کلام اور الطّرماح کے بعض قصائد میں ملتی ہیں۔

دوسری زبان کے قصیدہ نگاروں نے عربی قصیدے کا چربہ اتارا اور فارسی میں انوریؔ اور خاقانیؔ نے اس صنفِ سخن میں شہرت پائی۔ فارسی قصیدہ گوئی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ہر دَور کا اسلوب ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ دورِ سامانی ۲۶۱ھ/۸۷۴ء تا ۳۸۹ھ/ ۹۹۹ء) جسے دورِ متقدمین بھی کہتے ہیں۔ اس دَور میں رودکی نے بہت شہرت حاصل کی۔

دورِ غزنویہ (۳۵۱ھ/۹۶۲ء تا ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء) اس دَور میں عنصریؔ اور فرخیؔ نے سلطان محمود غزنوی کی سرپرستی میں اعلیٰ قصائد لکھے۔ عنصری نے سلطان محمود کی مدح میں، خوارزم کی فتح کے موقع پر ۱۷۲ اشعار کا ایک قصیدہ لکھا۔ فرخی نے اپنے قصائد میں لطیف اور عمدہ تشبیہوں سے کام لیا ہے۔

"قصیدۂ خزانیہ" جو اس نے خزاں کی تعریف میں کہا ہے، لفظی پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس دَور کے قصیدہ نگاروں میں سے منوچہری نے عرب قصیدہ نگاروں کی تقلید کی۔ منوچہری کے یہاں ولولہ زندگی اور نوائے عیش و نشاط غالب ہے۔

دورِ سلاجقہ (۴۲۹ھ/ ۱۰۳۷ء تا ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء)، قصیدہ نگاری کا زریں دور کہلاتا ہے۔ اس دَور میں کئی بلند مرتبہ قصیدہ نگار گزرے ہیں۔ جن میں حکیم ناصر خسرو، مسعود سعد سلمان، قطران تبریزی، ابو منصور امیر معزّی، جمال الدین اصفہانی بہت معروف قصیدہ نگار گزرے ہیں مغل دورِ حکومت میں بھی کئی معروف شاعروں نے فارسی میں قصیدہ نگاری

میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان میں فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی اور کلیم ابو طالب قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کے ایک اور ممتاز شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب نے بھی اپنے منفرد انداز میں قصیدہ نگاری کی ہے۔

عربی قصیدہ نگاری میں شعراء کے ہاں قدیم دور میں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے جن میں سے وصف یا منظر نگاری و تصویر کشی سرفہرست ہے اسلام سے پہلے کے قصیدہ نگاروں میں امرؤ القیس بہت معروف تھا۔ اسلام کے ظہور کے بعد عربی قصیدے کے اوزان و بحور بھی وہی رہیں جو عصر جاہلی میں متداول تھیں۔ اموی عہد میں عربی قصیدے میں بعض تغیرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس دور کے شعراء میں عمر ابن ابی ربیعہ، عزّہ زیادہ مشہور ہیں۔ عباسی عہد میں عربی قصیدے میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے۔ یہ تغیر لفظی اسلوب، معنی و موضوع اور اوزان و بحور کو بھی شامل ہیں۔ اس دور کے شاعروں میں بشار بن برد کو مجدّد کی حیثیت دی گئی ہے۔ ابونواس، ابوالعلاء المعرّی بھی معروف قصیدہ نگاروں میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ طویل قصیدہ لکھنے میں ابن الرومی اور مھیار الدیلمی نے ایک نئی مثال قائم کی۔

اندلسی شعراء نے عربی قصیدے میں، اپنی انفرادیت اور امتیاز سے وصفیہ اور بیانیہ شاعری میں بڑا کمال دکھایا ہے۔

ترکی زبان میں بھی کئی شعراء نے قصیدہ نگاری کی ہے۔ ان قصیدہ گو شاعروں نے فارسی شعراء جامی، عرفی، فیضی اور صائب کا تتبع کیا ہے۔ ان قصیدہ نگاروں میں باقی، نفعی، صبری، فہیم، حوری، نائلی، ثابت، ندیم، سنبل زادہ، وھبی اور عاکف پاشا زیادہ مشہور ہیں۔

اُردو میں قصیدہ اکثر دوسرے اصناف کی طرح فارسی سے آیا اور دیگر اصناف سخن کی طرح اُردو قصیدہ کا آغاز بھی دکن سے ہوا۔ نصرتی ہاشمی، بیجاپوری، ولی، سودا، ذوق، غالب، مومن، داغ اور امیر اُردو قصیدہ نگاروں میں بلند مقام پر فائز رہے۔ منیر شکوہ آبادی، محسن کاکوروی، مولانا ظفر علی خان اور عزیز لکھنوی نے گزشتہ نصف صدی میں قصیدہ نگاری میں کام کیا ہے۔ محسن کاکوروی کا مشہور قصیدہ لامیہ، (سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل) اُردو قصیدے کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی قصیدہ نگاری کی ہے ان کا بھی اس صنف میں منفرد انداز ہے۔

قصیدہ بردہ آنحضرت صلعم کی مدح میں شیخ شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن سعید [illegible] متوفی ۶۹۴ھ کا قصیدہ ہے۔ اس کا اصل نام الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ ہے۔ یہ قصیدہ ۱۶۲ ابیات کا ہے۔ بارہ ابیات تشبیب میں ہیں، سولہ ابیات میں نفس اور اس کی خواہشات کا ذکر ہے۔ تیس میں آنحضرتؐ کی مدح ہے۔ انیس میں آپ کی پیدائش کا ذکر ہے۔ دس میں آپؐ کی دعاؤں کا ذکر ہے۔ سترہ میں قرآن کی مدح ہے۔ تیرہ میں آنحضرتؐ کی معراج کا ذکر ہے۔ بائیس میں آپؐ کے جہاد کا بیان ہے۔ چودہ استغفار میں ہیں اور ۹ مناجات میں۔

روایت ہے کہ اس کے مصنف کو فالج ہو گیا تھا اس لیے اس نے اس قصیدہ میں آنحضرتؐ کی مدح کی اور اس کے ذریعے سے شفاعت مانگی تو اچھا ہو گیا۔ بردہ چادر کو کہتے ہیں اور اس قصیدہ کے بردہ کے نام سے مشہور ہونے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں

قضا و قدر قرآن مجید میں لفظ "قضا" مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے، حکم کرنا، فیصلہ کرنا، مقرر کرنا، اطلاع دینا، بدلے میں کوئی چیز دینا، فرض ادا کرنا وغیرہ۔ (المفردات از امام راغب اور لسان) اصطلاحاً اس کے معنی (الف) قاضی کا عہدہ، ور اس کے فرائض (ب) کسی مذہبی فرض کا وقت پر ادا نہ کرنے کے بعد اسے پورا کرنا مثلاً روزانہ نماز یا رمضان کے روزے علم العقائد کی اصطلاح میں قضا سے مراد اللہ جل جلالہ کا وہ حکم کلی ہے جو موجودات کائنات اور ازل سے تا ابد ان پر طاری ہونے والے احوال و کیفیات کے بارے میں اس نے فرمایا ہے شرح الطوالع للا صفہانی میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی لکھتے ہیں "قضا اصل میں عبارت ہے لوح محفوظ یا کتاب مبین میں موجود اور اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ کے تمام مخلوقات کو اپنی قدرت [illegible] سے وجود میں لانا۔"

قاضی عبد النبی احمد نگری، "دستور العلماء" میں قضا اور قدر کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "قدر کے لفظی معنی اندازہ کرنے [illegible] کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں۔ لیکن اصطلاح قدرت [illegible] کا وہ ارادہ ذاتیہ ہے جو مختلف اشیاء کے تعلق میں مختلف اوقات [illegible] ہوتا رہتا ہے۔ قضا و قدر میں فرق یہ ہے کہ قضا تو [illegible] ہے جبکہ قدر اس حکم کی جزئیات کا نام ہے [illegible] قضا سے مراد اشیاء کے متعلق اس کا ازلی ارادہ ہے [illegible] قدر میں لکھا ہے: "ما یُقَدِّرُہُ اللہ من القضاء [illegible] القدر ھو التقدیر والقضاء الذی یقدرہ اللہ [illegible] قضا میں اس حیثیت سے کہ اللہ نے اسے پہلے سے متعین [illegible]"

لغت میں قدر کے معنی ہیں کسی چیز کی مقدار کو [illegible] کا اندازہ کرنا، اس کا پہچاننا اور شناخت کرنا۔ [illegible] عطا کرنا اور اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص [illegible] وجہ پر بنانا۔ قضا و قدر میں یہ فرق ہے کہ قدر اندازہ کرنا [illegible] پر اجرائے حکم اور اس کا قطعی کر دینا (المفردات [illegible]) یعنی قدر اندازہ ہے اور قضا اس کا نفاذ۔ گویا ہر معاملہ [illegible] قدر میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریمؐ ایک بھاڑے کے پاس سے گزر [illegible] پھٹ کر گرنے کو تھی [illegible] جلدی سے ایک طرف ہو کر [illegible] کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟ تو آپ نے [illegible] سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔"

قضا اور قدر کے معنوی فرق کو [illegible] کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے یعنی جو کچھ قدرت [illegible] بظاہر غیر متوقع طور پر واقع ہوتا ہے اور دنیوی [illegible] کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ برعکس [illegible] اللہ تعالیٰ نے انسان کو شہوانی اور غضبی قوتوں کا حامل بنایا ہے تاکہ وہ عقل اور شریعت کی رہنمائی سے ان قوی کو مسخر کرے۔ اللہ تعالیٰ

کی رضا حاصل کرے۔ بعض افراد ان قوتوں کے زیرِ اثر گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالٰے نے اسباب کے ذریعے ہونے والے گناہ کو بالقصد پیدا نہیں کیا۔ دونوں صورتیں انسان کے ارادہ و اختیار میں ہیں قرآن مجید میں یہ بات وضاحت سے بیان کی گئی ہے کہ جو شخص جس طرح کا ارادہ و فیصلہ کر لیتا ہے۔ قدرت کی دی ہوئی طاقتیں اور صلاحیتیں اسی کے حق میں کام کرنے لگتی ہیں۔ سیدھی راہ پہ چلنے والوں کے لیے اللہ تعالٰے فرماتا ہے "جو ہماری طرف بڑھنے کے لیے سعی و جد و جہد کریں گے ہم ان پہ اپنی راہیں خود آشکارا کرتے جائیں گے"۔ نفس پرستی کو پسند کرنے والے کردار کے متعلق فرمایا۔ "ہم اُسے ادھر ہی لے جائیں گے جدھر کو اپنا رُخ پھیر کر اس نے جانا پسند کر لیا ہے" (نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی)

قطب ۔ صوفیا میں بلند ترین مقام پہ فائز شخص کے لیے "قطب" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ کشف اصطلاحات میں بیان ہوا ہے "قطب ایک شخص کا تصوف میں وہ بلند مقام ہے جب وہ اپنے قلب میں نبی کریمؐ کا عکس دیکھتا ہے"۔ ایک قطب کی روحانی حکومت میں اس کے کئی ماتحت ہوتے ہیں جو "ابدال" کہے جاتے ہیں۔

قطب الدّین شیرازی - (صفر ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء ۔ رمضان ۷۱۰ھ / ۱۳۱۱ء) ۔ ایک مشہور طبیب اور مصنّف ۔

اصل نام محمود بن مسعود تھا۔ شیراز میں طبیبوں کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوا۔ طب کے علاوہ باعتبار اپنی تصنیفات کے ہیئت، فلسفہ اور مسائلِ دینی میں بھی شہرت پائی۔ ابوالفدا نے قطب الدین شیرازی کو "صاحب فنون، کئی علوم کا ماہر" قرار دیا ہے۔

طب کی تعلیم اپنے والد ضیاء الدین مسعود الکازرونی سے حاصل کی۔ چودہ برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد اپنے چچاؤں کمال الدین خیر الکازرونی اور شرف الدین الزکی اور شمس الدین قطبی کی شاگردی اختیار کی۔ پھر نصیر الدین طوسی کا بھی شاگرد ہوا۔ بہت جلد معاصر فضلا سے سبقت لے گیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد خراسان، عراقین، فارس، ایشیائے کوچک اور شام کی سیاحت کی۔ فارس کے تاتاری حکمرانوں سے تعلق پیدا ہو جانے کی وجہ سے سیواس اور ملطیہ (ایشیائے کوچک) کا قاضی مقرر ہوا۔ اس تمام عرصے میں اس نے قانون ابن سینا کے ابتدائی نظری حصہ کلیات پہ کام کیا۔

اواخرِ عمر میں قطب الدین تبریز میں گوشہ نشین ہو گیا اور ان ایام میں حدیث کا سرگرمی سے مطالعہ کیا۔ حتیٰ کہ "جمع الاصول" اور "شرح السنۃ" پہ تنقیدی حاشیے بھی لکھے۔ قطب الدین نے الٰہیات میں بھی نام پیدا کیا۔ اس نے قرآن مجید کی تفسیر "فتح المنان فی تفسیر القرآن" بڑی شرح و بسط سے لکھی ۔ وہ "زمخشری" کی "الکشاف عن حقائق التنزیل" کا شارح بھی ہے۔

علمِ ہیئت پر قطب الدین کی دو تصانیف، فلکیات کے متعلق عربوں کے خیالات کی بہترین ترجمان ہیں: "نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک" اور "التحفۃ الشاھیۃ فی الہیئۃ"۔

قطب الدین کی دوسری تصانیف درج ذیل ہیں :

شرح التذکرۃ النصیریہ

فی حرکات الدحرجۃ والنسبۃ بین المستوی والمنحنی

التبصرۃ فی الہیئۃ

کتاب فعلت فلا تلم فی الہیئۃ

اس کے علاوہ امراضِ چشم پہ ایک مقالہ، ابن سینا کے رسالہ "اُرجوزہ" کی شرح، قواعد میں السکاکی کی تصنیفات اور ابن الحاجب کی ایک تصنیف کی شروح بھی لکھیں۔ تبریز میں، قطب الدین کا انتقال ہوا۔

قطب الدّین مبارک خلجی ۔ سلطان علاؤ الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک کافور، جو حکومت کا ایک عہدے دار تھا، نے علاؤ الدین کے چھ سالہ بیٹے عمر و خان کو شہاب الدین کے لقب سے تخت پہ بٹھایا اور اس کے نائب کی حیثیت سے زمامِ کار خود سنبھال لی اور سلطان علاؤ الدین کے دوسرے بیٹوں اور بیویوں (بیواؤں) کو راستے سے ہٹانے کی کوشش میں لگا رہا۔ تاکہ اس کے اقتدار کے لیے کوئی خطرہ نہ ہو۔ مبارک خان، علاؤ الدین کا تیسرا بیٹا تھا۔ ملک کافور نے کئی بار اپنے آدمی مبارک کی آنکھیں نکلوانے کے لیے بھیجے لیکن وہ ہر بار کسی نہ کسی طرح بچ جاتا۔ ملک کافور کے قتل کے بعد امرائے سلطنت نے مبارک خان کو شہاب الدین کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ کچھ عرصہ وہ اس عہدے پہ کام کرتا رہا۔ بالآخر اس نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین عمر و خان کو قید کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں اس نے شہاب الدین کو اندھا اور اپنے دوسرے بھائیوں خضر خان اور شادی خان کو قتل کرا دیا۔ اور دیول رانی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس نے قطب الدین کا لقب اختیار کیا۔

قطب الدین مبارک خلجی نے تخت نشین ہونے کے بعد عفوِ عام کا اعلان کرتے ہوئے اپنے باپ کے عہد کے سترہ ہزار سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور امراء کے وظائف اور جاگیروں میں اضافہ کیا۔ افواج کو اپنے حق میں کرنے کے لیے اس نے چھ ماہ کی تنخواہ بطور انعام دی۔ اس نے باج و خراج کی رقم میں کمی کی اور قید و بند کی صعوبتوں کو نرم کر دیا۔ اس سے وہ جلد ہی عوام میں مقبول ہو گیا۔ مبارک خلجی نے علاؤ الدین کے نافذ کردہ قوانین و ضوابط اور مالگزاری و اقتصادی نظام منسوخ کر دیا۔ اس سے تاجر پیشہ طبقہ من مانی قیمتوں پہ اشیاء کے فروخت کرنے میں آزاد ہو گیا۔ شراب کی دکانیں از سرِ نو کھل گئیں۔ خمریات، دھاندلیوں، رشوت ستانی اور دھوکہ فریب میں کثرت ہو گئی۔ ہندوؤں پر عائد شدہ ٹیکسوں کی شرح میں کمی سے ہندو بہت خوشی اور آرام سے رہنے لگے۔

عمومی طور پہ سارے ملک میں فسق و فجور اور لہو و لعب کا ماحول پیدا ہو گیا۔ تاہم ہر طرف بادشاہ کی تعریفیں ہونے لگیں۔ قطب الدین مبارک خلجی نے اپنا وقت عیش و عشرت میں گزارنا شروع کر دیا۔ دربار، مسخروں اور بھانڈوں کا اڈا بن گیا جس کی وجہ سے بڑے بڑے علماء، فضلاء اور معزز و مقتدر امراء کی کوئی عزت و توقیر باقی نہ رہی۔ فراوانیٔ دولت اور عیش کوشیوں سے دربار کا اخلاقی معیار بہت گر گیا۔ بادشاہ نے گجرات کے ایک نومسلم کو خسرو خان کا خطاب دے کر اپنے قریب کیا۔ خسرو خان، خلجی خاندان کے لیے دوسرا ملک کافور ثابت ہوا۔ سلطان قطب الدین نے خسرو خان کی معیت

ہیں راجہ ہرپال کی بغاوت کو فرو کیا۔ اسی دوران مہاراشٹر کا علاقہ بھی فتح ہوا۔ ان فتوحات کی خوشی میں سلطان نے خسرو کو چیتر شاہی بخشا اور اسے تمام دکن کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ سلطان علاؤ الدین کے ایک چچازاد بھائی ملک اسد الدین نے قطب الدین کو قتل کر کے خود برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کی۔ سلطان نے اسے اور اس کے ساتھیوں حتیٰ کہ اس کے کمسن بچوں، عزیزوں اور عورتوں کو بھی قتل کرا دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کئی دوسرے امرا کو بھی قتل کرایا۔ قطب الدین نے خسرو کو تمام اختیارات دے دیے اور خود محافل رقص و سرود اور عیش و عشرت میں مشغول رہا۔ بالآخر خسرو نے اپریل ۱۳۲۰ء کی ایک رات کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شاہی محل میں داخل ہو کر سلطان قطب الدین کو قتل کر دیا اور ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے تخت پر قابض ہو گیا۔ سلطان قطب الدین مبارک خلجی کا دورِ حکومت ۱۳۱۶ء تا ۱۳۲۰ء رہا۔

قطب الدین محمد خوارزم شاہ

۔ خوارزم میں ایک حکمران خاندان کا بانی۔ اس کا باپ انوشتگین سلجوق سلاطین کے دربار میں طشت خانہ کا نگران تھا۔ قطب الدین نے میرو میں تعلیم پائی۔ خوارزم شاہ اکینچی کے قتل کے بعد ۴۹۰ھ یا ۴۹۱ھ/۱۰۹۷ء یا ۱۰۹۸ء میں قطب الدین خوارزم شاہ کے لقب سے خوارزم کا حاکم مقرر ہوا، اپنی وفات ۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء یا ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس کا جانشین۔ اس کا بیٹا اتسز ہوا۔

قطب الدین منور ہانسویؒ، شیخ

۔(ولادت ۶۸۲ھ وفات ۷۶۰ھ)

آپ کے والد کا نام شیخ برہان الدین تھا جو معروف بزرگ شیخ جمال الدین ہانسوی کے بیٹے تھے۔ شیخ قطب الدین، محبوب الٰہی کے جلیل القدر خلیفہ تھے۔ جامع کمالات اور مظہر کرامات شخصیت تھے۔ ہر قسم کے تکلف سے بیگانہ اور تنہائی پسند۔ عمر بھر اپنے کمرے سے باہر قدم نہ نکالا۔ پوری زندگی توکل اور قناعت میں گزاری۔ ان کے متعلق ایک حکایت ہے کہ ایک مرتبہ سلطان محمد تغلق نے قاضی کمال الدین صدر جہاں کو شیخ قطب الدین منور ہانسوی کے ہاں ایک جاگیر بطور انعام کے فرمان کے ہمراہ بھیجا۔ سلطان کا مقصد شیخ کو دنیا داری کے فریب میں مبتلا کرنا تھا۔ شیخ ہانسویؒ نے ایسی جاگیر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

آپ کے زیرِ مطالعہ شریعت کی کتابوں میں سے 'ہدایہ' اور 'بزدوی' اور طریقت کی کتابوں میں سے 'قوت القلوب' اور 'احیائے العلوم' رہتی تھیں۔ آپ کے بیٹے شیخ نور الدین ہانسویؒ بھی اپنے وقت کے معروف عالم اور صوفی بزرگ گزرے ہیں۔

قطب شاہی

۔ دکن کے ان پانچ خود مختار خاندانوں میں سے ایک، جو بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر ظہور میں آئے اور جو دوسرے خاندانوں کی طرح لقب قطب الملک سے موسوم ہوا۔ اس خاندان کا بانی سلطان قلی تھا۔ ۱۴۴۳ء میں قطب الملک دکنی کی موت کے بعد یہ لقب سلطان قلی کو مل گیا۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے گولکنڈہ میں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا۔ ۱۵۴۳ء میں اپنے بیٹے جمشید کی سازش سے قتل ہوا۔ اس خاندان کے سات بادشاہوں کے نام اور تخت نشینی کی تاریخیں درج ذیل ہیں :-

سلطان قلی	۱۵۱۲ء
سلطان جمشید	۱۵۴۳ء
سبحان قلی	۱۵۵۰ء
ابراہیم	۱۵۵۰ء
محمد قلی	۱۵۸۰ء
محمد	۱۶۱۲ء
عبد اللہ	۱۶۲۶ء
ابو الحسن تانا شاہ	۱۶۷۲ء

قطبؒ شہید، علامہ

۔ (ولادت ۱۹۰۶ء، وفات ۱۹۶۶ء)

اصل نام سید ہے۔ قطب خاندانی نام ہے۔ سید قطب کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں جزیرہ نمائے عرب سے ہجرت کر کے مصر کے ضلع اسیوط میں جا کر آباد ہو گئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی ابراہیم قطبؒ اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ آپ کی پیدائش اسی ضلع اسیوط کے گاؤں موشا میں ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ سید شہید کے والدین کھیتی باڑی کرتے تھے اور انتہائی متقی اور عبادت گزار تھے۔ انہیں قرآن مجید سے والہانہ محبت تھی۔ ان کی دلی خواہش اور کوشش تھی کہ ان کی اولاد قرآن مجید کی حافظ و عالم بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت اسی انداز میں کی۔ وہ عموماً بہترین قاریوں کو گھر پہ بلاتے اور ان کی قرأت خود بھی سنتے اور اپنے بچوں کو بھی سناتے۔ اسی ماحول کا اثر تھا کہ سید قطب نے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہی مکمل کر لی۔ بعد ازاں آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دار العلوم" سے مزید تعلیم کے بعد ۱۹۲۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۳۳ء میں ایجوکیشن میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ [illegible] قابلیت اور اعلیٰ علمی اور تعلیمی صلاحیتوں کی وجہ سے سید قطب شہید کو اسی کالج میں پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کو وزارتِ تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پہ تعینات کر دیا گیا۔ اسی [illegible] وزارتِ تعلیم کی طرف سے آپ کو جدید طریقہ تعلیم کے مطالعہ [illegible] کے لیے امریکہ بھیجا گیا۔ جہاں آپ نے ولسن ٹیچرس کالج واشنگٹن [illegible] کالج گریلی کولوراڈو اور سٹان فورڈ یونیورسٹی میں دو [illegible] قیام کر کے [illegible] نظامِ تعلیم کا مطالعہ کیا۔ امریکہ کے اس مختصر قیام کے دوران ہی آپ نے امریکہ کے جدید معاشرہ اور جدید تہذیب کی [illegible] حیوانی زندگی کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا۔ اسی مشاہدے کے نتیجے میں آپ اپنے دل میں احیاءِ اسلام کی تڑپ لے کر واپس وطن لوٹے۔

امریکہ سے مراجعت کے بعد سید شہیدؒ اخوان المسلمون کی دعوت و تحریک کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور باقاعدہ مطالعہ و تحقیق کے بعد ۱۹۴۵ء میں اس تحریک (اخوان المسلمون) میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں مصر میں شاہی استبداد اور انگریزی استعمار کے خلاف آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ "الاخوان" ملک میں سیاسی اور دینی شعور کی بیداری میں سرگرم حصہ لے رہی تھی اور عوام میں اس کی مقبولیت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ انگریز

قطب شہید، علامہ

اور شاہ فاروق کی حکومت "الاخوان" کی اس تحریکِ آزادی سے سخت خائف تھے۔ چنانچہ اس تحریک کا راستہ روکنے کے لیے ایک سازش کے تحت ۱۹۴۹ء میں "الاخوان" کے مرشدِ عام استاذ حسن البنّا کو شہید کر دیا گیا۔ جبکہ وہ اپنی جماعت کی ایک میٹنگ سے فارغ ہو کر دفتر سے باہر نکل رہے تھے۔ "الاخوان" کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۲ء تک کا عرصہ اخوان المسلمون کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ اخوان کے ہزاروں کارکن حوالۂ زندان کر دیے گئے۔ ہزاروں حکومت کے جور و ستم کا نشانہ بنے۔ ۱۹۵۲ء میں مصر میں فوجی جنتا نے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ فوجی انقلاب کے بعد اخوان کے ابتلا و امتحان کا ایک دوسرا دور شروع ہو گیا۔ ۱۹۵۲ء میں اخوان المسلمون سے پابندی اٹھا لی گئی۔ ڈاکٹر حسن الہضیبی مرشدِ عام منتخب ہوئے۔ "الاخوان" نے ڈاکٹر حسن کی قیادت میں دوبارہ آغازِ سفر کیا۔ ۱۹۵۴ء میں اخوان کی "مجلسِ دعوتِ اسلامی" نے سید قطب کو ماہنامہ "اخوان المسلمون" کا بحیثیت ایڈیٹر مقرر کیا۔ انہی دنوں جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کو قومی اور ملکی مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے اس رسالہ میں شدید تنقید کی گئی۔ جس پر ستمبر ۱۹۵۴ء کو رسالہ بند کر دیا گیا۔ اس طرح کرنل ناصر اور اخوان کے مابین کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد اخوان پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اخوان کو دوبارہ خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ اس کے رہنماؤں سمیت اخوان کے تقریباً ۵۰ ہزار کارکن گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ ان گرفتار شدگان میں سید قطب بھی شامل تھے۔

سید قطب کو مصر کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ پہلی دفعہ جب آپ کی گرفتاری ہوئی تو آپ شدید بخار کی حالت میں گھر پر صاحبِ فراش تھے فوجی افسر انہیں اسی حالت میں بیڑیاں پہنا کر پاپیادہ گھر سے جیل تک لائے سید شہید سخت تکلیف کی وجہ سے بے ہوشی کی حالت میں بار بار زمین پر گر جاتے۔ جونہی انھیں کچھ ہوش آتا ان کی زبان پر "اللہ اکبر وللہ الحمد" کے الفاظ جاری ہو جاتے۔ جیل میں داخل ہوتے ہی دو گھنٹے تک مسلسل انھیں زدوکوب کیا گیا۔ آگ سے انہیں داغا گیا۔ ان پر پولیس کے کتے چھوڑے گئے۔ جو انہیں کچیلوں میں لے کر گھسیٹتے۔ ان کے سر پر مسلسل کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم پانی ڈالا گیا۔ غلیظ گالیوں اور فحش اشاروں سے ان کی توہین کی گئی۔ غرضیکہ ذہنی اور جسمانی اذیت کی کوئی ایسی صورت نہ تھی جو انھیں نہ پہنچائی گئی ہو لیکن سید قطب ہر وقت "اللہ اکبر وللہ الحمد" کے ایمان پرور ذکر سے رطب اللسان رہتے۔ ۱۹۵۵ء میں مصر کی "عوامی عدالت" کی طرف سے سید قطب کو ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ایک سال بعد جیل میں انھیں رحم کی اپیل کرنے کا کئی بار مشورہ دیا گیا۔ آپ کو معافی مانگنے کی صورت میں وزارتِ تعلیم کی پیش کش بھی کی گئی۔ لیکن آپ نے پورے استقلال کے ساتھ اس پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا۔ جیل میں جب کبھی ان کے سامنے معافی نامہ لکھ دینے کی پیش کش کی جاتی ان کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا۔ "اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو میں حق کے فیصلہ پر راضی ہوں اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" قید کے دوران آپ نے اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" کی تکمیل کی۔

۱۹۶۴ء میں جب آپ کی قید کے دس سال گزر چکے تھے۔ عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی درخواست پر صدر ناصر نے سید قطب کو جیل سے رہا کیا مگر گھر میں نظر بند کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں دوبارہ "اخوان" کے کارکنوں کی گرفتاریاں کی گئیں۔ ڈیلی ٹیلیگراف ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کی رپورٹ کے مطابق بیس ہزار سے زیادہ لوگ گرفتار کیے گئے۔ جن میں سات سو خواتین بھی گرفتار کی گئیں، آپ کے چھوٹے بھائی محمد قطب (عربی زبان کے ایک بلند پایہ انشا پرداز اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں) اور دو بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب بھی شامل تھیں۔ جیلوں میں گرفتار شدگان پر ایسے وحشیانہ مظالم توڑے گئے جن کی دورِ وحشت میں بھی مثال نہیں ملتی۔ کچھ عرصہ بعد فوجی عدالتوں میں ان سب کے خلاف مقدماتِ بغاوت دائر کیے گئے اور ملزموں کو صفائی پیش کرنے کے تمام مواقع سے محروم کر دیا گیا۔ بہرحال فوجی ٹربیونل نے اگست ۱۹۶۶ء میں سید قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو موت کی سزا سنائی جو دنیا بھر کے دینی و سیاسی رہنماؤں، مذہبی اور اصلاحی تنظیموں، اخبارات و رسائل کے ہمہ گیر احتجاج اور درخواستوں کے باوجود ۲۵ر اگست ۱۹۶۶ء کو نافذ کر دی گئی۔

سید قطب شہیدؒ عربی زبان کے نہایت بلند پایہ انشا پرداز اور بہترین شاعر تھے۔ انہوں نے قرآن کا نہایت دقتِ نظر سے مطالعہ کیا۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت، اس کی بے مثال ادبی عکاسی اور بے نظیر اسلوبِ بیان پر انھیں گہرا عبور حاصل تھا۔

انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے لیے تاریخی اور اسلامی لٹریچر کی تصنیف سے کیا۔ وہ خدا کی برگزیدہ شخصیتوں کے واقعات و احوال کے ذریعے سے بچوں کے اندر بلند کرداری اور اخلاقی فضیلت پیدا کرنا چاہتے تھے اسی دور میں انھوں نے بچوں کے لیے اسلامی اور وطنی گیت بھی لکھے۔ "القصص الدینیہ" (انبیاء کے قصے) ان کی پہلی کتابوں میں سے ہے۔ قلم نے جب مزید ترقی کی طرف قدم اٹھائے تو اظہارِ خیال کے زاویے "اشواک" (کانٹے) نامی ایک افسانے کی صورت میں سامنے آئے۔ اس کے بعد افسانوی طرز کی دو اور کتابیں "طفل من القریہ" (گاؤں کا بچہ) اور المدینۃ المسحورۃ (سحر زدہ شہر) لکھیں۔ جس زمانے میں انہوں نے "طفل من القریۃ" لکھی وہ اس وقت مصر کے نامور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے حلقہ سے وابستہ تھے۔ بلکہ ایک وقت میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے۔ طٰہٰ حسین کے طرز سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اپنی یہ کتاب ہو بہو طٰہٰ حسین کی کتاب "الایام" کے رنگ میں لکھی۔ اور اسے ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے منسوب کیا۔

اس دور کی ایک اور بے نظیر تصنیف "الاطیاف الاربعۃ" ہے جو چاروں بہن بھائیوں (سید قطب، محمد قطب، حمیدہ قطب اور امینہ قطب) نے مشترکہ کاوش سے لکھی۔ انھی دنوں انھوں نے ادبی ذوق کی سیرابی اور اسالیبِ بلاغت اور اصول و اعجاز کی جستجو میں قرآن کا مطالعہ کیا اور اسی مطالعہ کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان پر حکمت و ہدایت کے دروازے وا کر دیے۔ اس نئے ذہن و ذوق کے تقاضے میں سید قطب نے درج ذیل معرکۃ الآرا تصانیف سے دنیائے ادب کی زینت میں اضافہ کیا۔

مشاہد القیامۃ فی القرآن۔ اس کتاب میں قرآن کی ۸۰ سورتوں میں

۱۵۰ مواقع پر بیان کردہ قرآن کے مناظر کو دعوتی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ نصر اللہ خازن نے کیا ہے۔ التصویر الفنی فی القرآن ۲۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں قرآن کی ادبی قدر و قیمت کو بڑے احسن طریقہ سے اجاگر کیا گیا ہے۔

النقد الادبی، اصولہٗ و مناھجہٗ۔ تنقید کے اصول و مناہج پر جدید رجحانات کی حامل کتاب۔ مستقبل الثقافۃ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب مستقبل الثقافۃ پر تنقیدی نظر۔ امریکہ جانے سے پہلے کے اس عرصہ میں ان تصانیف کے علاوہ "العالم العربی" رسالے کے مدیر بھی رہے اور پھر "الفکر الجدید" کے نام سے اپنا ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا۔ اس کے بعد امریکہ کا سفر کیا۔ وہاں کے دو سالہ قیام کے دوران مغرب کی مادّی تہذیب اور اس کے مضر اثرات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ ان پر اسلام کی حقانیت مزید واضح ہوئی۔ امریکہ سے واپسی پر انہوں نے اپنے تاثرات "امریکا التی رأیت" (امریکہ جسے میں نے دیکھا) نامی کتاب میں پیش کیا۔

امریکہ کا سفر سید قطب کے لیے زندگی کا زبردست انقلاب بن کر آیا۔ وطن واپسی پر وہ ہمہ تن اسلام کے لیے وقف ہوگئے اور ذہنی انقلاب کا یہ سفر اخوان المسلمون سے عملی وابستگی پر منتج ہوا۔ ان کی مشہور کتاب "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (اسلام کا عدل اجتماعی) اسی دَور کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے سات سے زائد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس کا اردو، فارسی، ترکی، انڈونیشی وغیرہ کئی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ اُردو ترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے کیا ہے۔ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ "سوشل جسٹس ان اسلام" کے نام سے امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔

سید قطب کا سب سے عظیم کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے جو "فی ظلال القرآن" کے نام سے ۸ جلد میں شائع ہوچکی ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ فارسی میں 'درسایۂ قرآن' اور اُردو میں 'قرآن کے سائے میں' کے نام سے ترجمے زیر تدوین ہیں۔ تفسیر کا اُردو ترجمہ ساجد الرحمٰن صدیقی کر رہے ہیں۔ اس تفسیر کا آغاز انہوں نے ۱۹۵۴ء کی اسیری سے پہلے کر دیا تھا اور جیل میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

سید قطب کی طبع رسا نے شعر و سخن کے اندر بھی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ان کے اشعار کے تین مجموعے۔ 'قافلۃ الرقیق'، 'حلم الفجر' اور 'الشاطئ المجہول' شائع ہوچکے ہیں۔ 'معالم فی الطریق' سید قطب کی آخری تصنیف ہے۔ سید قطب پر بغاوت کے الزام میں جو مقدمہ چلا اس کی فردِ جرم میں سید موصوف کے انقلابی نظریات کے ثبوت میں اس کتاب کی عبارتیں پیش کی گئیں۔ یعنی یہ کتاب سید کو تختۂ دار تک لے گئی۔ 'معالم فی الطریق' میں انہوں نے اسلامی نظریہ اور اسلامی تنظیم کے بنیادی خدوخال بیان کیے ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ 'جادہ و منزل' کے نام سے خلیل حامدی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تصنیفات درج ذیل ہیں۔

معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ (اسلام اور سرمایہ داری کی کشمکش۔

الاسلام ومشکلاۃ الحضارۃ (اسلام اور جدید تہذیبی مسائل

السلام العالمی والاسلام (عالمی امن اور اسلام) ان کا بھی اُردو ترجمہ ہوچکا ہے۔

دراسات اسلامیہ (اسلامی مقالات)، کتب و شخصیات (کتابیں اور شخصیات)۔

نحو مجتمع الاسلامی (اسلامی معاشرہ کے خدوخال) اور

مہمۃ الشاعر فی الحیاۃ (زندگی کے اندر شاعر کا اصل وظیفہ)۔

قطب عالمؒ ۔ (ولادت ۸۰۱ھ۔ وفات ۸۵۷ھ) مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری کے پوتے تھے۔ اپنے اصلی وطن سے منتقل ہوکر گجرات آکر مقیم ہوگئے۔ آپ کا پورا نام سید برہان الدین تھا لیکن قطب عالم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ احمد آباد سے چند میل دُور قصبہ بتوہ میں آپ کا مزار ہے۔

قطب مینار ۔ اس مینار کی تعمیر کی ابتدا قطب الدین ایبک کے زمانے میں ہوئی۔ سلطان شمس الدین التمش نے اسے مکمل کیا۔ فیروز شاہ اور سکندر لودھی کے زمانوں میں اس کی مرمت ہوئی۔

یہ مینار مسجد قبۃ الاسلام (نئی دہلی۔ بھارت) کے جنوب مشرقی گوشے میں ہے۔ فرش پر اس کا قطر ۴۸ فٹ ۴ انچ ہے اور بلندی ۲۴۲ فٹ ہے۔ یہ مینار اسلامی فن تعمیر کی ایک عظیم یادگار ہے۔

قطب مینار کی پانچ منزلیں ہیں۔ آخری منزل جو چھتری نما تھی، بجلی گرنے سے تباہ ہو گئی تھی۔ آخری منزل کا قطر ۹ فٹ تھا۔ مینار میں جو سیڑھیاں بنائی گئی ہیں وہ کافی کشادہ ہیں اور دیواروں میں روشنی کے جھروکے ہیں۔

مینار میں چار چھجے بنے ہوئے ہیں۔ جو ۹۷ فٹ، ۱۴۸ فٹ، ۱۸۸ فٹ اور ۲۱۴ فٹ پر ہیں۔

یورپی مورخ اسے 'ٹاور آف وکٹری' کہتے ہیں۔ بعض مورخ اسے فتح دہلی کی یادگار کہتے ہیں۔ عوام اسے قطب الدین ایبک کی نسبت سے قطب مینار یا قطب شاہ کی لاٹ کہتے ہیں۔ سلطان علاؤ الدین خلجی نے بھی قطب مینار کے طرز پر مسجد قبۃ الاسلام (جسے قطب الدین ایبک نے فتح دہلی کے بعد تعمیر کروایا تھا) کے شمال کی جانب ایک مینار تعمیر شروع کروایا تھا۔ ابھی اس مینار کی ایک منزل تعمیر ہوئی تھی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا اور یہ مینار ادھورا رہ گیا۔

قطر ۔ یہ جزیرہ نما ریاست خلیج فارس پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ساڑھے آٹھ ہزار مربع میل ہے۔ آبادی ایک لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ ساری آبادی مسلمان ہے۔ اس وقت یہاں کے سلطان خلیفہ شیخ الثانی ہیں۔ شخصی بادشاہت قائم ہے۔ عدالتی نظام میں اسلامی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت دوحہ ہے۔ یہ ریاست اقوام متحدہ اور عرب لیگ کی رکن ہے۔ یہاں کا سکہ ریال ہے۔ زبان عربی ہے۔ خلیج فارس کی دوسری ریاستوں کی طرح یہ بھی ایک دولت مند ملک ہے۔ ترقی اور تعمیر زوروں پر ہے اور یہاں فلاحی ریاست کی خوبیاں محسوس ہوتی ہیں۔

جب متحدہ عرب امارات کی بنا ڈالنے اور اس خلا کو پر کرنے کے لیے جو کہ انگریزوں نے اس علاقے سے جانے کی صورت میں پیدا ہونے والا تھا، کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی تو قطر نے اعلان آزادی کر دیا۔

یہ ریاست تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ ۱۹۷۴ء سے اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کی رفتار بہت تیز ہے۔ صنعتی میدان میں بھی قدم بڑھانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ رسل و رسائل کو ترقی دینے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

قطر کی پیداوار میں تیل کے علاوہ سمندر سے موتی نکالے جاتے ہیں اور مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ آب و ہوا نہایت گرم اور خشک ہے۔ سارا علاقہ ریگستانی اور پہاڑی ہے۔ سرسبزی اور شادابی ناپید ہے۔ غذائی پیداوار نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمام اشیا بیرونی ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں۔

قعدہ ایک دفعہ بیٹھنا۔

نماز کی دوسری یا تیسری یا چوتھی رکعت کے بعد بیٹھنے کو کہتے ہیں اور پہلی دفعہ کے بیٹھنے کو قعدہ اولیٰ کہتے ہیں۔ اور دوسری بار کے بیٹھنے کو قعدہ اخیرہ کہتے ہیں۔

قفطی، جمال الدین علی بن یوسف ۔ (وفات ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء)

قاہرہ میں پیدا ہوا۔ جوانی کے وقت حلب کی طرف سفر کیا اور ملک عبدالعزیز کے وزیر مقرر ہوئے۔ آپ نے ایک مورخ، ادیب، ریاضیات، نجوم اور ہندسہ کے علوم کے ماہر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ آپ نے ایک مدرسہ قائم کیا جس نے کافی شہرت پائی۔ آپ نے اسے سلطان ناصر کی طرف منسوب کیا۔ حلب (شام) میں وفات پائی۔

آپ کی یہ تصانیف مشہور ہیں: "الاصلاح لما وقع من الخلل فی کتاب الصحاح فی اللغۃ"۔ "الکلام علی الجامع الصحیح"۔ "اخبار العلماء باخبار الحکماء"۔ اور "الدر الثمین"

قلات ۔ برعظیم پاک و ہند کی ایک ریاست، جس کا فرمانروا 'خان' کہلاتا ہے اور جو بلوچستان کے اہم ترین علاقوں، سرواں، جھلاواں، کچھی اور مکران نیز لس بیلہ اور خاران کی باجگزار ریاستوں پر مشتمل تھی۔ آجکل صوبہ بلوچستان کا ایک ڈویژن ہے۔ جس میں قلات، کچھی، خاران، مکران اور لس بیلہ کے اضلاع شامل ہیں۔ ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۱۱ لاکھ سے زائد ہے۔

پندرھویں اور سولہویں صدی ہجری میں اس علاقہ پر براہوئیوں کا قبضہ تھا۔ اور یہاں کا حاکم کمبرانی قبیلے کا ایک سردار تھا۔ جس کی نسل سے خوانین کا سلسلہ چلا۔ خوانین نے نادر شاہ اور احمد شاہ درانی کی سیادت تسلیم کر لی۔ جس سے خوانین کی قوت بتدریج بڑھتی گئی۔ ان میں سے ممتاز نصیر خان تھا۔ جس نے بعد میں درانی خاندان کی سیادت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ احمد شاہ نے اسے ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں شکست دے کر قلات کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن قلات کی تسخیر نہ ہو سکی۔

برعظیم میں برطانوی حکومت کے خاتمے کے بعد جب تقسیم ہند کا مرحلہ مکمل ہوا تو ریاست قلات نے پاکستان سے الحاق کر لیا۔ ریاست کے خان، احمد یار خان نے قائد اعظم محمد علی جناح سے تحریک پاکستان کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کیا۔

۱۹۵۵ء میں وحدت مغربی پاکستان کی تشکیل کے بعد ریاست قلات کا خاتمہ ہوا تاہم خان قلات اپنی اعلیٰ خدمات کی بنا پر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے مارشل لا لگنے کے وقت تک بلوچستان کے گورنر تھے۔ ۱۹۷۷ء میں ہی ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد ان کا بیٹا پرنس محی الدین بلوچ ان کا جانشین مقرر ہوا۔

قلندر فارسی الاصل لفظ ہے جو اصل میں کلندر تھا۔ بمعنے کندہ ناتراشیدہ۔ عرب و عجم کے اختلاط السنہ کے باعث قلندر مشہور ہو گیا۔ بعض اس کو معرب کہتے ہیں مگر پہلا خیال صحیح ہے۔ مراد فقیر، درویش۔ اولیاء اللہ کی ایک خاص جماعت کا نام بھی ہے۔

قلندریہ ۔ درویشوں کا ایک فرقہ، جو ایک جگہ قیام نہیں کرتا۔ یہ لوگ بے گھر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شریعت یا طریقت کے اصولوں کی پیروی نہیں کرتے۔ المقریزی، سعدی اور جامی نے ان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایک عرب یوسف جو دمشقی نے اس فرقہ کی بنیاد رکھی۔ اس فرقہ کے اکابر میں شیخ جمال الدین ساوی (جو کہ ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء کو دمشق پہنچا) اور شیخ حسن ایرانی (متوفی ۷۲۲ھ/۱۳۲۲ء) کا ذکر آتا ہے۔ ان دونوں کا انتقال دمشق میں ہوا۔ انھوں نے ملک العادل کے زمانہ میں قاہرہ کے قریب ایک قلندری خانقاہ قائم کی۔ مصر میں انھیں بہت رسوخ حاصل

ہوا۔ مصری موسیقی انہی لوگوں کی مرتب کردہ ہے اور اس میں ایک قلندری راگ بھی ہے۔ یہ لوگ دنیا کو فانی سمجھتے ہوئے لذات دنیاوی سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ داڑھی اور مونچھوں کے علاوہ بھویں اور پلکیں صاف کرتے ہیں لباس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

قلی قطب شاہ، سلطان۔ قطب شاہی خاندان میں سے دکن کا بادشاہ اور سن ۱۵۸۰ء میں اپنے والد کی وفات کے وقت ۱۲ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ مغل شہنشاہ اکبر اور ایران کا شاہ عباس صفوی ہمعصروں میں سے تھے۔ بھاگ نگر شہر اپنی محبوبہ بھاگ متی کی نسبت سے بنایا۔ اس شہر کا نام بعد میں حیدر آباد رکھ دیا گیا۔ فن تعمیر اور خوشنویسی سے کافی شغف تھا۔ دو مشہور عمارتیں خداداد محل اور بارگاہ خسروی تعمیر کرائیں۔ علماء اور شعراء کا بہت قدردان اور خود بھی کئی زبانوں، اُردو، فارسی، دکھنی، تلنگی وغیرہ کا شاعر تھا۔ فارسی میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص تھا۔ جملہ اوصاف سخن میں طبع آزمائی کی ۔۔۔ پچاس ہزار اشعار کے مجموعے مطبوعہ موجود ہیں۔ جنھیں سلطان کی وفات کے بعد، اس کے جانشین اور بھتیجے سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا۔ ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر محی الدین زور نے جدید ترتیب سے ادارۂ ادبیات اُردو (حیدر آباد دکن) سے شائع کروایا۔ ان کے اُردو کلام میں مثنویاں کثیر تعداد میں ہیں۔

قم۔ ایران کا ایک مشہور شہر۔ ساوہ اور اصفہان کے درمیان واقع ہے۔ اسے ابو موسیٰ اشعریؓ نے فتح کیا تھا۔ یہاں حضرت فاطمہ معصومہؒ کا مزار ہے جو امام رضاؒ کی بہن اور امام موسیٰ کاظمؒ کی دختر تھیں۔ مزار کی تعمیر سلطان ناصر الدین شاہ قاچار نے کروائی تھی۔ قم میں قاچاری سلاطین کے مزار ہیں قم، ایران میں شیعوں کا ایک بہت بڑا علمی مرکز ہے وہاں مذہبی تعلیم کے لیے ایک جامعہ (یونیورسٹی) بھی ہے۔

قمار۔ قمار اور میسر کے معنے جوئے کے ہیں اور اللہ تعالے نے اس کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ اس کی تحریم میں آیات ذیل قرآن کریم میں موجود ہیں:

اے پیغمبر لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (تو ان لوگوں سے) کہہ دو کہ ان دونوں (چیزوں) میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے (کچھ) فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے فائدے سے ان کا گناہ (اور نقصان) بڑھ کر ہے۔ (س۔ بقرہ۔ ع ۲۷)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

مسلمانو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (ان میں ہر ایک کام) تو بس ناپاک شیطانی کام ہے۔ تو اس سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(س۔ مائدہ۔ ع ۱۱)

جب سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا پہلی آیت نازل ہوئی تو قمار کی برائی کا اشارہ پا کر اکثر لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا۔

مگر اس میں حرمت کا صاف صاف حکم نہ تھا اس لیے بعض لوگ اس پر قائم رہے پھر دوسری مذکورہ بالا آیت نازل فرما کر اللہ تعالے نے جوئے بازی کو نہایت تفصیل و توضیح کے ساتھ حرام قرار دے دیا تاکہ لوگوں پر اس کی تحریم کا پورا پورا اثر ہو جائے اور اس فعل شنیع کے کرنے سے قطعی طور پر باز رہیں۔

قمر۔ عربی زبان میں پہلی سے تیسری رات تک کے چاند کو ہلال کہتے ہیں اور پھر تین رات کے بعد آخر ماہ تک کے چاند کو قمر کہتے ہیں۔ قمر کی جمع اقمار ہے۔

قمری مہینے۔ ایک چاند کے طلوع (رویت ہلال) سے دوسرے چاند کے طلوع ہونے تک کا درمیانی وقفہ۔ قمری مہینہ کہلاتا ہے۔ یہ مہینہ کبھی ۲۹ دن کا اور کبھی ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ عرب میں قمری مہینے زمانہ قدیم سے رائج چلے آتے ہیں۔

رسول کریمؐ کی ہجرت کے بعد سے اسلامی یا ہجری سن کا آغاز ہوا اور یہ قمری سال کہلاتا ہے کیونکہ اسلامی سنوں کے مہینوں کی بنیاد ایک چاند کے طلوع ہونے سے دوسرے چاند کے طلوع ہونے والے مہینوں پر ہے قمری مہینے بارہ ہیں:

محرم۔ صفر۔ ربیع الاوّل۔ ربیع الثانی۔ جمادی الاوّل۔ جمادی الثانی رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذی قعدہ۔ ذوالحج۔

مسلمانوں کے تہوار قمری مہینوں کے مطابق آتے ہیں۔ مثلاً روزوں کا آغاز رمضان کا چاند نظر آنے پر یکم رمضان سے، اور عید الفطر یکم شوال کو اور عید الضحیٰ ۱۰ ذوالحج کو ہوتی ہے۔

قمرالدین سیالوی، خواجہ۔ ولادت ۵ [illegible] سیال شریف ضلع سرگودھا میں خواجہ [illegible] ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیال شریف کی خانقاہ کے مدرسہ [illegible] میں اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کی [illegible] مولانا معین الدین سے [illegible] تکمیل درسیات و تحصیل اسناد کے بعد مسند [illegible]

خواجہ صاحب نے مسلمانوں کی روحانی تربیت کے علاوہ [illegible] بھی نمایاں [illegible] تقسیم ہند سے پہلے [illegible] آپ [illegible] پنجاب کی سفارش پر [illegible] کی لیکن آپ نے ان کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔

۱۹۴۶ء میں بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس میں [illegible] کی حمایت میں آپ نے اہم کردار ادا کیا [illegible] کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی مخالفت [illegible] آپ کے ٹوانہ خاندان سے بڑے اچھے تعلقات تھے [illegible] حمایت میں ملک بھر کے کئی مقامات کے دورے کئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ نے ہر اہم موقع پر اسلامی آئین کے نفاذ اور تحریک ختم نبوت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی تحاریک ختم نبوت میں آپ نے ملک بھر کے دورے کیے۔

جون ۱۹۷۰ء میں آل پاکستان سنی کانفرنس منعقدہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آپ کو جمعیت علمائے پاکستان کا مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں [illegible]

ناگزیر وجوہ کی بنا پر صدارت سے مستعفی ہوگئے۔

اس وقت خانقاہ سیال شریف کے سجادہ نشین ہیں۔ پاکستان میں آپ کے لاکھوں مریدین ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں حکومت کی طرف سے اسلامی قوانین کی تیاری کے لیے قائم کردہ 'اسلامی نظریاتی کونسل' کے رکن مقرر کیے گئے۔

قمی، عبدالکریم الحائری۔ (۱۸۵۹ء - ۱۹۳۷ء)

شیعوں کا ایک مشہور فقیہہ اور عالم۔ مہرجرد (ایران) میں پیدا ہوا اور قم (ایران) میں انتقال ہوا۔ قم میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اہل تشیع کے ہاں قرآن کی ایک 'تفسیر قمی' ہے۔ روایت میں ہے کہ وہ عبدالکریم قمی کی لکھی ہوئی ہے۔

قمیص، شاہ۔ ولادت ۸۹۷ھ۔ وفات ۹۹۲ھ)۔

سید ابی الحیوٰۃ کے صاحبزادے تھے۔ آپ کو بھی شیخ عبدالرزاق سے سلسلہ کی نسبت حاصل تھی۔ فقر و تجرد کی حالت میں بنگال سے قصبہ سالورہ نصرآباد میں آکر مقیم ہوئے اور ایک عرصہ تک فقر و تجرید کی زندگی بسر کی۔ ایک مشہور عالم ہاشمی سید نصر اللہ کی بیٹی سے نکاح ہوا اور اسی بنا پر آپ نے سالورہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اس علاقہ اور آس پاس کے اکثر و بیشتر لوگ نہایت عقیدت مندی سے آپ کے مرید ہوئے۔ شاہ قمیص نے بنگال میں وفات پائی کیونکہ بادشاہ وقت نے ایک کام سے ان کو بھیجا تھا۔ جہاں سے ۲۰ ذی القعدہ کو آپ کی میت سالورہ لاکر سپرد خاک کی گئی۔

قندھار۔ افغانستان کا ایک قدیم تاریخی شہر جو ایک صوبے کا بھی نام ہے۔ اس کی آبادی اندازاً ۱۳ ہزار ہے۔ یہ تجارت اور حکومت کا مرکز ہے۔ صوبۂ قندھار، آجکل افغانستان کے مشہور دُرانی قبیلہ کا سب سے بڑا علاقہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے اس کا ذکر ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں آیا ہے۔ اس کے بعد کے زمانے میں تیمور کے ہاتھوں قندھار کی فتح کا ذکر ملتا ہے۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر قندھار، سلطان حسین بایقرہ کی سلطنت کا حصہ تھا۔ اسی زمانے میں قندھار کا نام پہلی بار سکوں پر منقوش ہوا۔ حسین کے عہد میں ارغون سردار ذالنون بیگ نے قندھار کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ شیبانی سے لڑائیوں میں ذالنون بیگ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شاہ بیگ ارغون کو مغل شہنشاہ بابر نے ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء میں قندھار سے نکال دیا۔ لیکن بعد میں شاہ بیگ دوبارہ اس پر قابض ہوا۔ ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں بابر نے اسے دوبارہ فتح کرلیا اور پھر یہ مستقل مغلیہ سلطنت کا حصہ رہا۔

بابر کی وفات کے بعد کابل اور قندھار کی حکومت کامران کو ملی اور وہ اس پر اس زمانے میں بھی قابض رہا۔ جب اس کا بھائی ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن کردیا گیا۔ ایران کے صفوی بادشاہ قندھار کو ہمیشہ خراسان کا حصہ قرار دیتے رہے۔ ہمایوں کی جلاوطنی ختم ہونے کے بعد، ہمایوں نے ایرانی فوج کی مدد سے قندھار کا محاصرہ کیا اور اسے تسخیر کرنے کے بعد ایرانیوں کے حوالے کردیا۔ لیکن بعدازاں ان سے واپس لے لیا۔ اکبر کے عہد کے ابتدائی ایام میں (۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء) طہماسپ شاہ، قندھار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اسے اکبر نے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں واپس حاصل کیا۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء میں ایرانیوں نے پھر جہانگیر سے چھینا۔ لیکن شاہجہان کے عہد میں ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں دوبارہ اس پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں اسے شاہ عباس ثانی نے فتح کیا۔ اور اس کے بعد مغل شہنشاہ اس کو دوبارہ حاصل نہ کرسکے۔ قندھار ایک طویل عرصہ تک صفوی بادشاہوں کے زیرنگیں رہا۔ بعد میں غلزئیوں نے بغاوت کرکے ایرانیوں کو قندھار سے نکال دیا اور ایران پر حملہ کردیا۔ محمود، شاہ ایران بن بیٹھا۔ اس کا بھائی قندھار کا حاکم ہوا۔ نادرشاہ کے عہد میں یہاں ابدالیوں کو دوبارہ بسایا گیا۔ ابدالیوں کے ایک سردار احمد شاہ نے نادرشاہ کے انتقال کے بعد قندھار پر قبضہ کرکے درانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ قندھار کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور انگریز اس پر ۱۸۴۲ء تک قابض رہے۔ اس کے بعد دوست محمد بارک زئی یہاں کا حاکم رہا۔ اس کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو قندھار پر مختلف حکومتوں کا دور گزرا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد اندرونی خانہ جنگیوں کی وجہ سے انگریزوں نے قندھار سمیت پورا ملک عبدالرحمٰن خان کو تفویض کرکے اسے امیر افغانستان تسلیم کرلیا۔ اس طرح قندھار کی الگ ریاست کا خاتمہ ہوا۔ اس وقت سے قندھار، ملک افغانستان کے ایک صوبہ اور شہر کا نام ہے اس پورے ملک میں اب تک عبدالرحمٰن خان کے جانشینوں کی حکومت رہی ہے۔ حال ہی میں اس خاندان کی حکومت ایک کمیونسٹ فوجی انقلاب کے ذریعے ختم کردی گئی۔

قندھار کا محل وقوع کئی بار تبدیل ہوا۔ نادرشاہ نے جس شہر کو فتح کیا تھا وہ پہاڑی زمین پر واقع تھا۔ احمد شاہ کا مزار قندھار میں ہے۔

عرب مؤرخین گندھارا کی ہندوستانی سلطنت کو جو دریائے کابل کی وادی میں واقع تھی اور دریائے کابل اور دریائے سندھ کے سنگم تک پھیلی ہوئی تھی، قندھار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قنوت۔ مادہ ق ن ت، عربی لغت میں اس کے معنی اطاعت، دعا اور قیام کے ہیں۔ ابن سیدہ اور راغب الاصفہانی نے قنوت کے اصلی معنی اطاعت کے بتائے ہیں۔ امام راغب مزید لکھتے ہیں کہ وہ اطاعت جس میں خضوع بھی شامل ہو۔ چنانچہ آیت "وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" کے معنی بعض مفسرین نے طائعین اور خاضعین بیان کیے ہیں۔ اسی طرح اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا میں قانتاً کے معنی مطیعاً للہ کا مفہوم بیان کیا ہے۔

"تاج العروس" میں الزبیدی قنوت کے مختلف معنی بیان کرتے ہیں۔ سکوت، خشوع و خضوع، اطاعت، عبادت، دوام اطاعت، صلوٰۃ، طول قیام اور حالت قیام میں دعا وغیرہ۔ لسان العرب میں بتایا گیا ہے کہ عموماً اہل لغت میں قنوت کے معنی دعا مشہور ہیں۔ نسبتاً وسیع تر معنی میں لفظ قنوت نماز کے لیے، نماز میں طول قیام کے لیے، حالت نماز میں مطلوب سکوت کے لیے اور خشوع کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ان مختلف معانی میں قنوت کا استعمال احادیث میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ احادیث میں قنوت کا اطلاق اس بددعا کے لیے بھی ہوا ہے جو رسول کریمؐ نے مسلسل ایک ماہ تک بحالت نماز، قبائل رعل،

ذکوان کے ان سنگدل افراد کے لیے کی تھی جنہوں نے بئرِ معونہ پہ کئی صحابہ کرامؓ کو شہید کیا تھا۔ اسی طرح کئی دوسری احادیث میں کفار و منافقین کے لیے بددُعا اور اہلِ ایمان کے لیے دعا کے لیے قنوت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

نماز میں بحالت قیام قنوت کے خاص دعائیہ کلمات پڑھنے کا علمائے اسلام میں سے اکثر کا اتفاق ہے لیکن اس امر پہ اختلاف ہے کہ قنوت کس وقت کی نماز میں کس موقع پہ پڑھی جائے۔ اس دُعا کے کلمات بھی باختلاف روایات مختلف منقول ہوئے ہیں۔ اکثر فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ دعائے قنوت وتر میں پڑھی جائے۔ حنفی فقہا کہتے ہیں کہ وتر کی تیسری رکعت میں قرأت سے فارغ ہو کر، ہاتھ اٹھا کر تکبیر (اللہ اکبر) کہی جائے اور اس کے بعد دعائے قنوت ہاتھ باندھ کر پڑھی جائے اور اس کے بعد رکوع کیا جائے۔ قنوت میں ایسے الفاظ پڑھے جائیں جو اللہ تعالےٰ کی ثنا اور حمد سے متعلق ہوں۔ البتہ مسنون دعائے قنوت وہ ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے۔

حنابلہ کا مؤقف یہ ہے کہ وتر کی آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد، دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر، دعائے قنوت پڑھی جائے اور پڑھنے کے بعد دونوں ہاتھ منہ پہ پھیر کر سجدہ میں جانا مسنون ہے۔ شوافع کے نزدیک بھی وتر کی آخری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا مسنون ہے، مگر صرف رمضان کے نصف آخر میں۔ اس کے علاوہ فجر کی دوسری رکعت میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد پڑھی جائے۔ مالکیہ وتر کے بجائے فجر کی نماز میں قنوت پڑھنے کے قائل ہیں۔ دشمن کی طرف سے خطرے یا دیگر خطرات اور مصائب کے مواقع پہ قنوتِ نازلہ پڑھنا مسنون ہے۔

قنوج ۔ شمالی ہند میں اترپردیش کا ایک قدیم تاریخی شہر۔ ساتویں صدی عیسوی میں سلطنت ہرش کا دارالحکومت اور تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز رہا ہے۔ نویں صدی میں یہ حکومت پتھاریہ کا دارالحکومت بنا۔ قنوج کے بادشاہوں کے دور میں یہ علم و ادب کا مرکز رہا۔ یہاں کے کئی عالم اور شاعر معروف ہیں ۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے اسے فتح کیا اور اس کے بعد ۱۱۹۴ء میں محمد غوری نے اس پہ قبضہ کر لیا۔

قنوجی، شیخ جلال

۔ (ولادت ۸۶۱ھ۔ وفات ۹۸۸ھ)

آپ ایک صاحبِ حال و جذب بزرگ تھے۔ آپ اکثر و بیشتر گریہ و زاری کرتے، فریاد کرتے اور نعرے لگاتے تھے۔ جذبہ و حال کی زیادہ شدت میں گدھے پہ سوار ہو کر شہر کی گلیوں میں چکر لگاتے تھے۔ آپ للّٰہ کے نام سے مشہور تھے۔ "سیر الاولیا" میں لکھا ہے کہ آپ جذب کی حالت میں ۱۲۷ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے

قنوجی، مولوی اولادحسن

۔ (۱۲۱۰ھ / ۹۶۔۱۷۹۵ء ۔ ۱۲۵۳ھ / ۳۸۔۱۸۳۷ء)

مولوی آلِ حسن بن اولاد علی۔ شہر قنوج کے حسینی بخاری سید تھے۔ علوم درسیہ کی تحصیل مولوی عبدالباسط قنوجی سے کی۔ لکھنؤ کے علماء سے استفادہ کیا۔

۱۲۳۲ھ / ۱۸۔۱۸۱۷ء میں دہلی گئے۔ شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے تلامذہ میں سے تھے اور ان سے ہی کتب تفسیر اور احادیث کی اجازت لی۔ سید احمد شہید بریلویؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کے ساتھ جہاد میں شریک رہے

اپنے وقت کے یگانہ روزگار علماء اور صلحاء کے فیضِ صحبت سے شیعہ مکتب فکر چھوڑ کر اہلِ سنت کا مکتب اختیار کیا۔ جس کے سبب اپنے والد کے ترکہ کی لاکھوں کی جائداد و دولت سے محروم ہونا پڑا۔

اُردو، فارسی اور عربی میں آپ کی بہت سی تصانیف ہیں :۔

۱۔ راہِ سنت
۲۔ ہدایۃ المومنین
۳۔ نور الوفاء من مراۃ الصفا
۴۔ رسالہ در معنی کلمۂ طیبہ
۵۔ رسالہ ردّ تعزیہ
۶۔ رسالہ آدابِ تذکیر
۷۔ رسالہ آدابِ بیعت
۸۔ رسالہ الاختصاص فی الحدود القصاص۔
۹۔ تقویۃ الیقین فی ردّ عقائد المشرکین

آپ کے بیٹے بھی اپنے وقت کے معروف علما میں سے رہے ہیں۔ ان میں سے مولوی احمد حسن قنوجی اور (نواب) صدیق حسن قنوجی زیادہ مشہور ہوئے [illegible] مولوی احمد حسن، بڑے لڑکے تھے۔ جو ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء میں وفات پائی۔ مولوی احمد حسن قنوجی نے قنوج، کانپور، فرخ آباد، بریلی، علی گڑھ اور دہلی سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔ [illegible] کی اجازت خانوادۂ شاہ ولی اللہؒ کے ایک نامور فرزند شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے حاصل کی۔ آپ ایک قوی حافظہ [illegible] بھی تھے اور [illegible] تھے۔ شاعری میں مولوی احمد حسن قنوجی، غالب کے شاگرد تھے [illegible] میں ایک کتاب شہاب ثاقب ہے۔ تقلید کے ردّ میں [illegible]

قنوجی، نواب صدیق حسنؒ

۔ ولادت [illegible]

علمی و دینی حلقوں میں نواب صدیق حسن کے نام سے مشہور [illegible] اصل وطن قنوج کی نسبت سے قنوجی بھی کہلاتے ہیں۔

آپ کے والد اولاد حسن قنوجی بھی ایک معروف عالم تھے [illegible] بھائی مولانا سید احمد حسن عرشی، قنوجی بھی ایک نامور عالم [illegible] اصل نام صدیق حسن، ابوالطیب، ابوالطیب کنیت [illegible] توفیق تخلص تھا۔ خورشید (۱۲۴۸ھ) تاریخی نام تھا۔ نواب [illegible] جاہ بہادر خطاب تھا۔ آپ کی پیدائش، اپنے ننھیال بانس بریلی میں ہوئی۔

اپنے والد کے انتقال کے وقت آپ کی عمر [illegible] ۵ سال کی تھی [illegible] کی والدہ جو ایک دیندار خاتون تھی۔ نے آپ کی پرورش و تربیت کا [illegible] اہتمام کیا۔ مکتب کی تعلیم کے بعد [illegible] صرف و نحو اور منطق کی ابتدائی کتب اپنے بڑے بھائی مولانا سید احمد حسن عرشی سے پڑھیں۔

نواب صدیق حسن نے عرب و عجم کے متعدد اکابر علماء سے کتب حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کے اساتذہ و سند دینے والوں میں مولوی صدر الدین آزردہ (مفتی اعظم دارالسلطنت دہلی) کا نام بھی آتا ہے۔ اکیس سال کی

عمر میں دینی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ طالب علمی کا زمانہ در اصل ان کے علمی مجاہدے کا زمانہ تھا۔ علم حاصل کرنے میں ہر ریاضت اور مشقت کو برداشت کیا۔ دہلی میں زمانۂ تعلیم کے دوران وہاں کے اکابر علماء اور عمائد سے ملنے کے مواقع انھیں میسّر آئے۔ یہاں تک کہ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر شاہ اور ان کے ولی عہد مرزا فخرو سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ مرزا غالبؔ سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار جب نواب صدیق حسن، مرزا غالبؔ کے ہاں گئے تو مرزا نے اپنی غزل، جس کا مطلع ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نواب صاحب کو سنائی۔ نواب مصطفٰے خان شیفتہ سے بھی نواب صدیق حسن کے تعلقات تھے اور نواب شیفتہ کے مکان پہ دہلی میں دو سال مقیم رہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب شیفتہ کی جائداد انگریزوں نے ضبط کی تو نواب صدیق حسن کی سعی و سفارش سے نواب شیفتہ کی جاگیر بحال ہوئی۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مُراد آبادیؒ، سے بھی نواب صاحب کو نیاز حاصل تھا۔ حضرت مولانا جب قنوج تشریف لے جاتے تو نواب صاحب کے مکان پہ آنا جانا رہتا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد نواب صدیق حسن، دلّی سے اپنے وطن قنوج پہنچے اور وہاں چند ماہ قیام فرمایا۔ لیکن انھیں تلاشِ معاش کے لیے وطن چھوڑنا پڑا۔ آپ بھوپال پہنچے۔ بھوپال ریاست کے مدار المہام، منشی محمد جمال الدین خان کو اپنے مصائب اور پریشانی کے متعلق ایک درخواست دی۔ مدار المہام اہل علم اور شرفا کے قدر شناس تھے۔ وہ نواب صاحب سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے۔

نواب سکندر بیگم ان دنوں ریاست بھوپال کی فرمانروا تھیں، ان کے دربار میں نواب صدیق حسن کی باریابی ہوئی۔ انھیں منشی گیری کی خدمت پہ بمشاہرہ تیس روپیہ ان کا تقرر ہوگیا۔ پھر میری دبیریٔ خالصہ کے عہدہ پہ اُن کی ترقی ہوئی۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا۔ نواب صدیق حسن بھوپال میں خاصی مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے کہ شیخ علی عباس چڑیاکوٹی سے حقّہ کی اباحت اور کراہت پہ مناظرہ ہوگیا۔ نواب صدیق حسن کا مؤقف یہ تھا کہ حقّہ پینا مباح ہے۔ چڑیاکوٹی صاحب اس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ مناظرے میں بات بڑھنے لگی۔ نواب صاحب کے شباب کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اس بحث میں بڑا جوش دکھایا۔ یہاں تک کہ یہ فقہی مناظرہ اور علمی مباحثہ مستقل نزاع بن گیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ نواب صدیق حسن کو ملازمت سے دستکش ہونا پڑا۔ بھوپال میں بیکاری کی حالت میں رہنا مناسب نہ تھا اس لیے نواب صاحب کو بھوپال چھوڑنا پڑا۔ اور وہاں سے کان پور اور پھر بلگرام میں قیام کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان دنوں صدیق حسن صاحب کی مالی حالت بہت خستہ تھی۔ کئی کئی مہینے ایک ہی جوڑا پہنے رہتے اور بعض اوقات تو سوکھی روٹی پانی کے سہارے حلق سے اتار لیتے، دریا پر جاکر میلے کپڑوں کو خود ہی دھوتے دھوبی سے کپڑا دھلانے کے لیے پیسے نہ تھے۔

انہی حالات میں انھوں نے عربی میں ایک "قصیدہ العنبریہ فی مدح خیر البریہ" لکھا۔ اس قصیدے کو مکمل کرنے کے بعد سوتے میں نواب صاحب کا مقدر جاگا اور خواب میں رسولِ کریمؐ کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔

قصبہ بلگرام میں بیکاری سے نواب صاحب نے یہ کام لیا کہ چند مہینوں میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اس طرح ان کی مالی پریشانی، ناداری اور بیروزگاری بہت بڑی سعادت کے حصول کا سبب بن گئی۔

بلگرام سے نواب صاحب اپنے وطن قنوج پہنچے مگر تلاشِ معاش کے لیے وطن چھوڑنا پڑا۔ جب وہ تیرہ دن کے مسلسل سفر کے بعد مرزا پور پہنچے تو وہاں نواب سکندر بیگم کی طرف سے طلبی کا فرمان ملا، برسات کا زمانہ تھا۔ اسی عالم میں نواب صدیق حسن بھوپال کے لیے چل پڑے۔ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد حالات کا رُخ ایسا بدلا کہ ان کی ملازمت اور بھوپال میں قیام کی صورت نہ بن سکی۔ نواب صدیق حسن بھوپال سے روانہ ہو کر جے پور پہنچے۔ نواب وزیرالدولہ ان دنوں ٹونک کے والیٔ ریاست تھے۔ نواب صدیق حسن کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ فرمانروائے ٹونک کے شدید اصرار پہ نواب صدیق حسن نے آٹھ ماہ وہاں قیام کیا اور انھیں سرکار سے پچاس روپیہ کی رقم بطور وظیفہ ملتی رہی۔ اس دوران ایک بار پھر، بیگم بھوپال کا فرمان ملا کہ بھوپال جلد سے جلد چلے آؤ۔ اب کی بار نواب صاحب بھوپال پہنچے تو اپنے لیے وہاں کی فضا انہوں نے ہر طرح سے سازگار پائی۔ بیگم صاحبہ بھوپال بڑے التفات کے ساتھ پیش آئیں۔ یکم صفر ۱۲۷۶ھ کو ریاست کی تاریخ لکھنے پہ ان کا تقرر ہوگیا۔ پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ سے اس ملازمت کا آغاز ہوا۔

منشی جمال الدین، بھوپال کے مدار المہام، نواب صدیق حسن کے علم و فضل خاندانی سیادت و شرافت، دینداری اور حسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوئے۔ مدار المہام کی ایک صاحبزادی، ذکیہ بانو، بیوہ تھیں۔ منشی صاحب نے نواب صدیق حسن سے اپنی بیوہ بیٹی کا نکاح کر دیا اور اس کے بعد ترقی و آسودگی کی راہیں یکایک اُن پہ کھل گئیں۔ ذکیہ بیگم بڑی دیندار خاتون تھیں۔ تلاوتِ قرآن کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ بڑی ہوئیں تو فارسی میں خاصی استعداد پیدا کی۔ تیئیس سال (۱۸۶۱ء - ۱۸۸۴ء) تک نواب صاحب کا ساتھ رہا۔ ۱۸۸۴ء میں ذکیہ بانو کا انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ کے کوئی ایک سال بعد نواب سکندر بیگم کا انتقال ہوگیا۔

نواب شاہ جہان بیگم ۱۶ / نومبر ۱۸۶۸ء کو تختِ سلطنت پہ متمکن ہوئیں اسی زمانے میں نواب صدیق حسن کو حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت میسر آئی۔ مکہ معظمہ میں انھوں نے حدیث و تفسیر اور فقہ و تاریخ اور اخلاق و تصوف کی نادر کتابوں کے دو دو نسخے خریدے اور بعض رسالوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا حرمین شریفین کی زیارت سے واپسی کے بعد بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے نواب صدیق حسن کو تاریخ نگاری کی خدمت سے الگ کر کے سررشتۂ تعلیمات کے مدارس کا افسر مقرر کیا۔

نواب شاہ جہاں بیگم بیوہ تھیں، تختِ حکومت پہ فائز ہونے کے بعد ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ بیوگی کے غم کے سوا بیگم صاحبہ کو دنیا کی ہر عزت دولت اور آسودگی میسر تھی۔ یہ کمی اور ازدواجی تنہائی، شادی سے دُور ہوسکتی تھی۔ نواب صدیق حسن کی نیک زندگی ان کا علم و فضل شرافت اور دوسری خوبیاں بیگم صاحبہ کے علم میں تھیں۔ بھوپال کے عوام و خواص بھی نواب صاحب کے مداح تھے۔ اس لیے نکاحِ ثانی کے لیے بیگم صاحبہ کی نگاہ نواب صاحب پہ پڑی اور حکومتِ ہند کی قانونی منظوری کے بعد صدیق حسن صاحب سے شاہ جہاں بیگم کا عقد ہوگیا۔

نواب صاحب اب والیۂ ریاست اور رئیسہ وقت کے شوہر تھے۔
نواب صاحب کو، نواب والا جاہ امیر الملک، کا خطاب دیا گیا۔ جسے حکومت برطانیہ نے بھی منظور کر لیا۔ رئیسہ عالیہ نے نواب صاحب کے لیے قریباً پچھتر ہزار روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی۔ والیانِ ملک کی طرح نواب صاحب کو قلمرو برطانیہ میں سترہ توپوں کی سلامی دی جانے لگی۔

نواب صدیق حسن کی فراست، دیانت داری، خدا ترسی اور تدبر نے بھوپال کے انتظامی معاملات کو چار چاند لگا دیے۔ ریاست کے ہر محکمہ کو ترقی نصیب ہوئی۔ نواب صاحب نے قرآنِ کریم اور مذہبی علوم کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ اپنے ذاتی مصارف سے قائم کیا۔ انہوں نے ایک مسجد اور مہمان سرائے بھی بنوائی۔ بھوپال میں اپنے اور اہلِ خانہ کے لیے جو مکان (نور محل) تعمیر کرایا۔ اس پر تین لاکھ تیس ہزار کی رقم صرف ہوئی۔

بدخواہوں، حاسدوں اور دشمنوں کی مخالفانہ کارستانیاں اور سازشیں ایک بار پھر نواب صاحب کے لیے پریشانیوں کا دَور لائیں۔ حکومت برطانیہ نے نواب صدیق حسن کو دیا ہوا خطاب واپس لے لیا۔ توپوں کی سلامی موقوف کر دی گئی اور ریاست کے معاملات میں دخل نہ دینے کا حکم ملا۔ نواب صاحب ان حالات کے بعد شاہی حویلی (تاج محل) سے اپنے ذاتی مکان (نور محل) میں منتقل ہو گئے۔ لیکن صرف رات بسر کرنے کے لیے تاج محل میں آیا کرتے آٹھ ماہ کا یہ زمانہ نواب صاحب کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ ہر طرف مخالفتوں کے گہرے سائے تھے لیکن شریکِ زندگی رئیسہ عالیہ بیگم شاہجہان کی رفاقت اور التفات میں کمی نہ آئی۔ بعد میں بیگم شاہجہان کی کوششوں سے ان حالات کا رخ بدلنا شروع ہوا۔ لیکن اس دوران نواب صاحب کو استسقا کا مرض لاحق ہو گیا اور اسی مرض سے ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو انتقال ہوا۔

نواب صدیق حسن کا اصل کارنامہ اُن کی علمی اور دینی خدمات ہیں۔
نواب صاحب اتباعِ سنتِ نبویؐ کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔
انہوں نے لاکھوں روپے خرچ کر کے تفسیر و حدیث کی نایاب کتابیں شائع کیں اور عالمِ اسلام اور دنیا کے دوسرے ممالک کے کتب خانوں اور علماء کو مفت بھیجیں۔ ان کتابوں میں 'تفسیر ابن کثیر'، 'فتح الباری شرح صحیح البخاری' اور امام شوکانی کی 'نیل الاوطار'، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ علمائے دین اور دینی مدارس کی سرپرستی کر کے دین کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ صحاح ستہ کے اوّلین تراجم اور شروح کا سہرا بھی نواب صدیق حسن کے سر ہے۔ علامہ وحید الزمان اور بدیع الزمان دونوں بھائیوں کے وظائف مقرر کر کے صحاح ستہ کے اُردو تراجم کرائے اور پھر ان کی طباعت اور اشاعت پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا۔ دوسری طرف خود بھی سینکڑوں بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ 'مآثر صدیقی' میں آپ کی دو سَو بائیس کتابوں کی فہرست نام بہ نام، موضوع اور مطبع کے ناموں سے درج ہے۔

تفسیر اور متعلقاتِ تفسیر پر چھ کتابیں، حدیث اور اس کے متعلقہ موضوعات پر تنتیس، عقائد اور مسائل پر تمیس۔ فقہ اور اس کے متعلقہ موضوعات پر تئیس۔ سنت کے موضوعات پر گیارہ۔ اصولِ سیاست اور حکمرانی پر چھ۔ تاریخ اور سیر پر بائیس۔ علوم اور ادبیات پر بائیس۔ اخلاقیات پر اڑتیس۔ تصوّف پر سترہ۔ مناقب اور فضائل پر تیرہ۔

ان کتابوں میں سے عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر 'فتح البیان فی مقاصد القرآن' سات جلدوں میں لکھی۔ یہ تفسیر علمی اور تفسیری اعتبار سے اہلِ عرب کے ہاں بھی جامع اور مستند تسلیم کی جاتی ہے۔ اردو زبان میں پندرہ جلدوں پر مشتمل 'ترجمان القرآن' کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔ فارسی زبان میں اصولِ تفسیر پر ایک عمدہ اور جامع کتاب 'اکسیر فی اصول التفسیر' کے نام سے لکھی۔
کتب حدیث میں، 'عون الباری لحل ادلتہ البخاری' (دو جلدیں)، 'السراج الوہاج فی شرح مختصر الصحیح لمسلم بن الحجاج' (دو جلدیں)۔ 'فتح العلوم بشرح بلوغ المرام'، عربی میں لکھیں۔
بلوغ المرام کی فارسی میں ایک مدلل شرح 'مسک الختام' کے نام سے لکھی۔ صحاح ستہ کے احوال و کوائف پر ایک کتاب، عربی زبان میں 'الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ' لکھی۔
'فتح المغیث بفقہ الحدیث' اور 'منہج الوصول الی اصطلاح حدیث الرسول' بھی آپ کی حدیث کی فقہ اور مصطلحاتِ حدیث پر گرانقدر تصانیف ہیں۔
قاضی کے فرائض، واجبات اور آداب وغیرہ پر عربی زبان میں ایک کتاب بعنوان 'ظفر اللاضی بما یجب فی القضا علی القاضی' اور اصولِ سیاست و حکمرانی پر دو کتابیں۔ اردو زبان میں (۱) حسن المساعی الی اصلاح الرعیۃ والراعی' (۲) فلاح البرایا فی اصلاح الراعی والرعایا' بھی آپ کی تصانیف میں ایک گرانقدر اضافہ ہیں۔
اس طرح سیر اور تراجم کے سلسلے میں نواب صدیق حسن قنوجی کی یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔
(۱) اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین (فارسی)
(۲) تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار (فارسی)
(۳) التاج المکلل (عربی)
(۴) ریاض الجنۃ فی تراجم اہل السنۃ (عربی)
عربی لغت نویسی کی تاریخ و ارتقاء کے موضوع پر عربی زبان میں 'البلغۃ فی اصول اللغۃ' لکھی۔ لسانیات پر 'العلم الخفاق من علم الاشتقاق' اور 'لقط اللقاط علی لعض ما استعملہ العامۃ عن المعرب والدخیل' [illegible]
دائرۃ المعارف کی طرز پر عربی زبان میں 'ابجد العلوم' 'تکمیل [illegible] بتعاریف العلوم والفنون' اور 'السحاب المرکوم فی بیان انواع الفنون والعلوم'۔
باقی علوم پر تصنیفات کے نام یہ ہیں: حضرات التجلی، [illegible] ذخر المحتی، روضۃ الندیہ، اکلیل الکرامہ، رسالہ دو زخ، [illegible] بدور الاہلہ، دلیل الطالب، ریاض المرتاض، [illegible] لسان العرفان، معتقد المنتقد، اجوبہ لعض، اربعین [illegible] رسالہ ذم علم الکلام، رسالہ الحتوی، رسالہ ناسخ و منسوخ وغیرہ۔
المختصر، نواب صدیق حسن نے علم و ادب کی بھرپور خدمت کی۔ اسلامی اور عربی علوم کے فروغ اور اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علوم و فنون کا ایسا شعبہ نہیں جس پر ان کی کوئی غیر معمولی تصنیف نہ ہو۔ ان کی کوششوں سے برعظیم میں علوم دینیہ کا احیاء ہوا اور مذہبی حلقوں میں جمود ٹوٹ کر علمی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ (آپ کی کثیر تصانیف کا احاطہ کرنا اس

مضمون میں ممکن نہیں۔ آپ کی کتب کی تفصیلی فہرست "مآثر صدیقی" میں دیکھی جاسکتی ہے)

نواب صدیق حسن نے ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا۔ جس کا ایک حصہ ان کی وفات کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا۔

نواب موصوف کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان میں سے نواب علی حسن خان، (م ۱۳۵۶ھ) علم و ادب میں ایک نامور شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کے شاعر اور صاحب تصنیف تھے۔ ان کی تصانیف میں مآثر صدیقی (چار جلدیں)، خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے اپنے والد کے حالاتِ زندگی اور علمی کارناموں پر تفصیلی انداز میں لکھا ہے۔

قوام الدین، شیخ

(ولادت ۷۲۷ھ - وفات ۸۱۰ھ)

مخدوم جہانیاں سید جلال بخاریؒ کے خاص مریدین میں سے تھے۔ رشد و ہدایت اور تقویٰ کے بلند مقام پر فائز تھے۔ آپ کا مزار لکھنؤ (یوپی، بھارت) میں ہے۔

قوم

جمع اقوام۔ کسی علاقہ یا خطہ میں افراد کا وہ مخصوص گروہ، جو ایک ہی نسل سے متعلق ہو جس کی تہذیبی، تاریخی اور لسانی روایات مشترک ہوں۔ اصلاً یہ اصطلاح اس مفہوم کو ظاہر نہیں کرتی جو انگریزی کے لفظ NATION کا مفہوم ہے۔ مثلاً "لسان" میں کہا گیا ہے کہ قوم سے مراد کسی آدمی کے حامی، طرفدار اور رشتہ دار ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ کتاب الفضائل المدینہ میں صحیح بخاری کی حدیث میں اس طرح آیا ہے۔

جو شخص کسی قوم کے ساتھ اپنے موالی (سرپرستوں) کی اجازت کے بغیر تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت وارد ہوتی ہے۔

قوم اور قومیت کے تشکیلی عناصر کے جدید تصور میں لسانی اشتراک کے ساتھ ساتھ تاریخی روایات اور تہذیبی یکانگت، تمام عناصر کے مقابلے میں زیادہ قوی ہیں۔

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں اور دوسری قوموں سے ایک ایک جداگانہ قوم ہونے کا دعوے کیا اور اپنے دعوی کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی کہ برعظیم کے مسلمان، دین اسلام کے رشتے سے ایک قوم ہیں۔ حالانکہ مختلف علاقوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان میں معاشرتی اور لسانی اختلافات ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برعظیم کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پرچم تلے اسی نظریہ کے تحت پاکستان کی تشکیل کی اور یہ ملک خالصتاً مذہبی وحدت کی بنا پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا۔

اسلام میں قوم کا تصور صرف اور صرف مذہبی یکانگت ہے اور اسلام ناجائز طریقے پر اپنے قبیلہ یا ہم زبان یا ہم قوم کی حمایت کو غلط سمجھتا ہے غرضیکہ اسلام کسی شخص یا قوم کو طاقت یا حسب نسب یا قومیت کی بنا پر خصوصی حقوق نہیں دیتا بلکہ اسلام کا معیار یہ ہے

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

اور اسی مقدس مذہبی رشتہ کی بنا پر مسلمانوں کی ایک قوم بنتی ہے چاہے ان کی زبان مختلف ہو، ان کے رنگ مختلف ہوں۔

قرآن مجید میں 'قوم' کا لفظ لام تعریف (ال) کے بغیر عام لوگوں کے معنی میں اس طرح استعمال ہوتا ہے جس معنی میں انگریزی زبان کا لفظ 'people' استعمال ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (سورۃ المائدہ آیت ۵۸)

اسی طرح قرآن مجید میں یہ اصطلاح عام طور پر ان لوگوں یا گروہوں کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے جو نبی کریمؐ سے پہلے کے انبیاء سے متعلق تھے۔ مثلاً قوم ابراہیمؑ۔ قوم لوطؑ۔ قوم نوحؑ وغیرہ (سورۃ الاعراف آیت ۱۴۸، سورۃ ہود، آیت ۸۹، سورۃ الحج، آیت ۴۳۔ سورۃ الشعرآء آیت ۱۰۵، ۱۶۰، سورۃ ص، آیت ۱۲، ۱۳)

اس سے مراد انبیائے کرامؑ کی دعوت کے مخاطب لوگ ہیں۔ اسی مفہوم میں یہ اصطلاح نبی کریمؐ کے ذکر میں بھی استعمال ہوئی ہے

"تیری قوم نے اس (قرآن) کو جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے"

(سورۃ الانعام آیت ۶۶)

قوی

اللہ تعالٰی کے اسمائے حسنیٰ سے ہے۔ لفظی معنی توانا، تامّ القدرت۔ امام غزالی کہتے ہیں قوت دلالت کرتی ہے قدرت کاملہ بالغہ پر۔ تو اللہ تعالٰی قوی ہے۔ اس لیے کہ قدرت کاملہ بالغہ رکھتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ بعینہٖ موجود ہے: "اللہ اپنے بندوں کے ذرا ذرا حال سے واقف ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑا زور آور اور زبردست ہے۔"

(س۔ الشوریٰ ع ۲)

قہار

باری تعالٰی کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنی ہیں زبردست یا غلبہ رکھنے والا۔ قرآن مجید میں یہ اسم بعینہٖ موجود ہے:

"کہہ دے کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں اور ایک خدا کے سوا جو غالب ہے، اور کوئی معبود نہیں۔" (س۔ صٓ۔ ع ۵)

قیاس

قیاس کے لغوی معنی ناپنا یا کسی چیز سے مقابلہ کر کے موازنہ کرنا ہے۔ فقہ اسلامی کی مخصوص اصطلاح۔ فقہ کی اصطلاح میں دو مسئلوں میں اتحاد و ملت کی وجہ سے ایک کا حکم دوسرے پر لگا دینے کا نام ہے۔

شریعت کے تمام احکام کا دار و مدار مخصوص اغراض اور مصالح پر ہے۔ وہی اغراض اور مصالح ان احکام کی علت ہیں۔ جب ایک حکم کی علت دوسرے حکم میں پائی جائے تو پہلے کا حکم دوسرے پر لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب حرام ہے۔ حرمت کی وجہ نشہ ہے۔ اس لیے تمام نشہ آور اشیا پر شراب کا حکم صادر کر کے حرام قرار دیا جائے گا۔

قیاس کو فقہ اسلامی کا ماخذ ماننے میں مذاہب اسلامی میں اختلاف ہے شیعہ امامیہ، امام داؤد ظاہری اور ان کے پیروکار قیاس کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ جمہور فقہا اور شیعہ زیدیہ کے نزدیک قیاس قابل قبول ہے۔

مخالفین قیاس خصوصی طور پر منکرین حدیث قیاس کی عدم ضرورت پر قرآن مجید سے یہ دلیل نکالتے ہیں: "یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔"

اسی طرح بعض مخالفین قیاس، نبی کریمؐ کی اس حدیث سے قیاس کی مخالفت کا جواز نکالتے ہیں۔ "میری اُمّت کے لیے سب سے بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے جو مسائل کا فیصلہ اپنی رائے سے کریں گے وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیں گے۔"

اس حدیث میں خواہشاتِ نفسی پر مبنی رائے مراد ہے۔ ایسی رائے سب فقہا کے نزدیک فاسد اور باطل ہے۔ لیکن جو قیاس قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے کیا جائے گا وہ قابلِ قبول اور مستحسن ہے۔ ایسا قیاس اسلام کی تعلیمات کے منافی نہیں ہو سکتا۔

قیام ۔ کھڑا ہونا۔ شریعت کی اصطلاح میں نماز کے لیے کھڑا ہونے کو قیام کہتے ہیں۔ نماز قیام سے ہی شروع ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے والا قبلہ رُخ کرکے، نماز کی نیت کرکے تکبیر تحریمہ کہتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ تکبیر تحریمہ کی طرح قیام بھی نماز کا ایک فرض رکن ہے۔ حالتِ قیام میں سورۃ فاتحہ اور قرآن کی کم از کم تین آیات کے برابر قرأت کی جاتی ہے۔ حالتِ قیام میں امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کے پیروکار سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں۔ اہلِ تشیع اور مالکی ہاتھ چھوڑتے ہیں۔

وہ قیام ہے جو مجلس میں آنے والے کے لیے کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس زمانے میں متعارف ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی مجلس میں داخل ہوتا ہے تو اہلِ مجلس اس کے لیے تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ داخلِ مجلس کے لیے اہلِ مجلس کا کھڑا ہونا سنت ہے اور ان کی دلیل ابوسعید خدری کی حدیث ہے جس میں جنابِ پیغمبرِ خداؐ نے سعد بن معاذؓ کے لیے صحابہ سے فرمایا: قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ یعنی اپنے سردار کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ مکروہ اور بدعت ہے اور ان کی دلیل حدیث انسؓ ہے۔ کہ جنابِ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو کھڑا ہونے سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ جس طرح عجمی لوگ تعظیم کے لیے اٹھتے ہیں تم نہ اٹھا کرو۔

قیامت ۔ لفظی معنی موت کے بعد جی اٹھنا یا حشر کے دن قبروں سے اٹھنا۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات میں اسے 'قیام' کی تانیث بتایا ہے اور یہ تانیث زور دینے کے لیے آتی ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کو کئی ناموں سے بیان کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر نام اس کے ایک خاص پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا ایک نام 'یوم الدین' ہے جو سورۃ فاتحہ میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی روزِ جزا و سزا اور اللہ تعالیٰ کی عدالت کا دن۔

سورۃ القیامہ میں انتہائی بلیغ انداز میں قیامت کی ہولناک کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ستر دفعہ لفظ 'قیامت'، 'یوم القیامہ' کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ، آیات ۸۵، ۱۱۳، ۱۷۴، ۲۱۲۔ سورۃ آلِ عمران: آیات ۵۵، ۷۷، ۱۶۱۔ سورۃ قلم: آیت ۳۹، وغیرہ۔

قیامت کے لیے الساعۃ کا لفظ چالیس مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام آیات ۳۱، ۴۰۔ سورۃ الاعراف: آیت ۱۸۷۔ سورۃ یوسف آیت ۱۰۷۔ سورۃ الحجر: آیت ۸۵۔ سورۃ محمد: آیت ۱۸۔ سورۃ القمر: آیات ۱، ۴۶۔ سورۃ النّزعٰت: آیت ۴۲ وغیرہ۔

'احیائے علوم الدین' میں امام غزالیؒ نے قیامت کے مفہوم کو بیان کرنے والے مختلف الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے جو قرآن کی مختلف سورتوں میں کئی دفعہ بیان ہوئے ہیں۔ القارعۃ، الراجفہ، [illegible] الحاقّہ، [illegible] الصّاخّۃ، یوم الفصل، الواقعۃ، یوم الحساب، یوم البعث، یوم [illegible]۔

نبی کریمؐ کی تعلیمات میں مرکزی حیثیت توحید کو حاصل ہے۔ [illegible] بعد الموت، حشر و نشر اور حساب و کتاب کا مسئلہ بھی بہت [illegible] ایک تو خالقیت کا یہ لازمی نتیجہ ہے، دوسرے خالقیت کے [illegible] کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے۔ [illegible] مثالیں ہیں جن سے مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ [illegible] نے اس یقینی امر یعنی قیامت سے ڈرایا ہے اور [illegible] توبہ اور رجوع الی اللہ کی تبلیغ کی ہے۔

قرآن مجید کے جن مقامات پر دوبارہ زندہ کیے جانے [illegible] پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سورۃ یٰسین کی آیات [illegible]

"[illegible] یہ کہتا ہے، کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ [illegible] گی؟ اس سے کہو، انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے [illegible] اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی جس نے [illegible] سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے [illegible] نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ [illegible] سکے؟ کیوں نہیں، جبکہ وہ ماہر خلّاق ہے۔ وہ تو جب [illegible] تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے [illegible]"

سورۃ تغابن کی آیت ۷ میں [illegible]

"یعنی جو لوگ [illegible] انکار کرتے [illegible] جائیں گے۔ ان سے کہو نہیں، میرے رب کی قسم [illegible] گے، پھر تمہیں [illegible] کا ذکر [illegible] ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔"

سورۃ یونس کی آیت ۵۳ میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

"کہو میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے [illegible] رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو۔"

سورۃ سبا آیت ۳ میں اس طرح بیان ہوا ہے [illegible] قیامت ہم پر نہیں آ رہی! کہو، قسم ہے میرے رب کی وہ [illegible]

نبی کریمؐ کی احادیث سے قیامت کے لیے جو معلومات [illegible] وہ مختلف کتبِ حدیث میں کتاب الفتن یا باب الفتن کے تحت [illegible] نبی کریمؐ نے قیامت کے ظہور سے پہلے چند علامات بیان کی ہیں:

(۱) دخان (دھواں)

(۲) دجّال کا ظاہر ہونا۔

(۳) دابّۃ الارض

(۴) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔

(۵) عیسٰیؑ ابنِ مریمؑ کا نزول۔

(۶) یاجوج ماجوج کا ظاہر ہونا۔

(۷) تین بڑے خسف (سورج گرہن) کا ظہور

ا۔ ایک بار مشرق میں

ب۔ ایک بار مغرب میں

ج۔ ایک بار عرب میں

(۸) ایک زبردست آگ جو یمن سے اُٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔

تخلیقِ انسان کے وقت سے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کے ذریعے یہ بات واضح کی ہے کہ دنیا میں اُن کے اعمال کی بازپُرس کے لیے ایک دوسرے جہان کا ہونا ضروری ہے جہاں ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا اور سزا دی جائے گی۔ شروع سے ہی انبیا کرام کی اس بات کا اُن کے مخاطبین میں سے اکثر نے انکار کیا۔ قیامت کی آمد کا جو نقشہ اور احوال شروع سے بیان کیے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کسی بھی وقت آ سکتی ہے اور ایمان لانے والے لوگوں نے ہر وقت اس کی آمد کا انتظار کیا ہے۔ نبی کریمؐ خود بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اس کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔

قیامت کے متعلق جو مزید بتایا گیا ہے وہ اس طرح ہے: نفخِ صور کے بعد کائنات کی ہر چیز دنیا کی اشیا، جاندار اور غیر جاندار کو ختم کر دیا جائے گا اور پھر دوسرے نفخِ صور کے وقت تمام جاندار اشیا کو زندہ کیا جائے گا۔ حشر کے میدان میں تمام انسانوں کو دوبارہ اٹھا کر سب کو حاضر کیا جائے اور ان سب کا حساب کتاب ہوگا اور پھر اعمال کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کے لیے جو فیصلہ کرے گا اس کے مطابق انسانوں کو جہنم یا جنت میں بھیجا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: 'آخرۃ'، 'سورۃ القیامۃ'، 'جہنم (دوزخ)'، 'جنت (بہشت)' اور 'شفاعت'۔

قیروان تیونس کا ایک شہر۔ جو شہر تیونس سے ۱۱۲ میل جنوب میں اور سوسہ سے ۴۰ میل مغرب میں واقع ہے۔ سوسہ سے بذریعہ ریل قیروان کو ملایا گیا ہے۔ اس وقت اس کی آبادی ۸۵ ہزار کے قریب ہے۔

دراصل قیروان، دو شہروں پر مشتمل ہے۔ ایک تو خاص شہر جس کے گرداگرد اینٹوں کی کنگرہ دار فصیل ہے۔ دوسرے شہر کی بیرونی بستی جو شمال اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کی اقتصادیات کا انحصار گھریلو صنعت پر ہے۔ قالین بافی، زین سازی اور جفت سازی۔

گزشتہ زمانے میں قیروان کو جو اہمیت حاصل تھی وہ ان مذہبی عمارتوں کی وجہ سے ہوئی جو آج بھی وہاں موجود ہیں۔ سب سے بلند عمارت، سیدی عقبہ کی جامع مسجد ہے۔ جو شمالی افریقہ کی عظیم ترین عمارتوں میں سے ہے اور جس کی بنیاد شہر قیروان کی بنیاد کے ساتھ ساتھ رکھی گئی تھی۔ دوسری قابلِ ذکر عمارتیں یہ ہیں: مسجد سیدی صاحب (جو تاریخی اعتبار سے پہلی صدی ہجری کی ہے۔ اس کی دوبارہ تعمیر اور توسیع سولھویں صدی میں ہوئی) جامع ثلاثۃ البواب (تین دروازوں کی مسجد۔ یہ بھی بہت ابتدائی دور کی ہے)۔ جامع عمرؑ عبادۃ (۱۸۷۱ء میں تیار ہوئی) اور مدرسہ سیدی علیہ الغریانی (سولھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا)

قیروان کی بنیاد عرب فتوحات کے زمانے میں رکھی گئی۔ ۵۰ھ/۶۷۰ء میں عقبہ بن نافعؓ نے، اپنی فوجوں اور رسد کا مرکز بنانے کے لیے اُسے بنایا تھا۔ نئے شہر کا محل وقوع ساحل سے دو روز کی مسافت پر تھا تاکہ مسلمانوں کو ساحلی شہروں پر قابض بوزنطیوں کے حملہ کا خطرہ نہ رہے۔ سب سے پہلے عقبہ نے ایک مسجد اور قصر تعمیر کرایا اور پھر فوجیوں کے لیے مکانات اور ایک ۷۵۰ ۲ گز لمبی دیوار۔

قیروان اس وقت اسلامی افریقہ کا دارالحکومت اور عرب عاملوں کا صدر مقام رہا۔ اس کی تعمیر سے ایک صدی سے زائد عرصہ میں اس پر بہت سے نشیب و فراز گزرے۔ بربروں اور اس کے بعد وَفر جومتہ اس پر قابض رہے۔ وَفر جومتہ نے اسے خوب تاخت و تاراج کیا۔

۱۵۵ھ/۷۷۲ء کے قریب یزید بن حاتم نے ملحدین پر غلبہ پانے کے بعد قیروان کی دوبارہ تعمیر و توسیع کی اور اسی بدولت وہ شہر کا مؤسس ثانی قرار پایا۔

بنو اغلب کے عہد (۸۰۰ء تا ۹۰۹ء) میں قیروان کی اچھی خاصی توسیع ہوئی اور یہ خوشحالی کی انتہاؤں کو چھونے لگا۔ اس خاندان کے بادشاہوں

قیروان کی جامع مسجد کا ایک منظر

نے شہر میں بیش قیمت یادگار عمارات اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔

اغلبیوں کے زوال کے بعد فاطمیوں اور زیریوں کے عہد میں بھی اس شہر کی خوشحالی قائم رہی۔ زیری خاندان کے ابتدائی فرمانرواؤں کے عہد میں شدید خونریزیوں کی وجہ سے افریقہ پر بنو ہلال کے حملے کے راستے کھل گئے اور اس طرح قیروان غیر آباد ہوگیا۔ پھر افریقہ کا صدر مقام نہ بن سکا۔ ۱۰۶۰ء میں یہ ہوارۃ کے ہاتھوں پھر لوٹا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں یہ شہر تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بھی یہی ویرانی کی صورت تھی۔

اس دوران بیرونی حملوں سے یہ شہر تباہ ہوتا رہا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ ۱۸۷۴ء میں یہ تیونس کے بعد سلطنت کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ اس وقت سے یہ تیونس کا ایک حصہ ہے۔ عقبہ بن نافع کی جامع مسجد علوم دینیہ کی تعلیم کا ایک بڑا مرکز ہے۔

قیس بن الخطیم

قیس بن الخطیم۔ قبل از اسلام کے یثرب (جو بعد میں مدینہ کہلایا) کا ایک ممتاز شاعر، جو حسانؓ بن ثابت کا ہم عصر ہے۔

قیس بنو ظفر میں سے تھا، جو قبیلۂ اوس کے خاندان بنیت سے متعلق تھا۔ قیس اپنے زمانے کے تمام خزرجی شاعروں خصوصاً حسانؓ بن ثابت اور عبداللہؓ بن رواحہ سے بحث و مناظرہ میں الجھا رہتا تھا۔

قیس نے اسلام قبول نہ کیا تھا، حالانکہ وہ نبی کریمؐ کے زمانۂ نبوت کی ابتدا میں زندہ تھا۔ اس کی بہن لیلیٰ بنت الخطیم اور اس کے بیٹے ثابتؓ نے مشرف بہ اسلام ہوکر شرفِ صحبت نبویؐ پایا۔

قیس کا دیوان قسطنطنیہ کے ایک کتب خانے میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔ اسلام سے پہلے کے زمانۂ یثرب کی تاریخ سمجھنے میں قیس کا کلام کسی حد تک ممد و معاون ہوسکتا ہے۔

قیس بن الخطیم کے دیوان کا ترجمہ اور شرح، ۱۹۱۴ء میں لائپزگ سے شائع ہوا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں بغداد اور قاہرہ سے شائع ہوا۔

قیسؓ بن سعدؓ بن عبادہ

قیسؓ بن سعدؓ بن عبادہ۔ قبیلۂ خزرج کا خاندان ساعدہ کے ایک مشہور صحابی سعد بن عبادہ کے بیٹے جو ہجرت نبویؐ سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ اپنے قبیلے کے سردار بھی تھے۔ اصل نام قیس اور کنیت ابوالفضل تھی۔ اسلام کے تمام غزوات میں حصہ لیا۔ غزوۂ تبوک میں آپ نے مجاہدین اسلام کے لیے ۱۰۱ اونٹ قرض لے کر ذبح کیے۔

حضرت علیؓ نے انھیں مصر کا حاکم مقرر کیا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ بن علی آپ سے امورِ سلطنت میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، اس اسلامی لشکر کے امیر تھے جو امیر معاویہؓ کے لشکر کو روکنے کے لیے گیا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

قیصر

قیصر شاہانِ روم کا لقب ہے، یہ لفظ رومی ہے۔ اور اس زبان میں قیصر اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی ماں اس کے جننے سے پہلے فوت ہوجائے اور اس کی ماں کا پیٹ چیر کر اس لڑکے کو نکالیں۔ چونکہ شاہانِ قیاصرہ سے پہلا بادشاہ جس کا نام اغسطوس تھا ایسا ہی پیدا ہوا تھا اس وجہ سے ملقب بایں لقب ہوا۔ بعد ازاں وہاں کے ہر بادشاہ کو قیصر کہنے لگے۔

آنحضرتؐ نے قیصر روم کو دعوت الی الاسلام کے لیے خط لکھا تھا۔

"ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے قیصر روم (ہرقل) کو خط لکھا کہ آپ کو اسے اسلام کی دعوت دینی منظور تھی اور وہ خط دحیہ کلبی صحابی کو دے کر بھیجا اور حکم دیا کہ یہ خط حاکم بصریٰ تک پہنچا دیں تاکہ حاکم بصریٰ قیصر روم (ہرقل) کو پہنچا دے۔ جناب پیغمبر خداؐ کے خط میں یہ عبارت مرقوم تھی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدا کے بندے اور اس کے پیغمبر محمدؐ کا یہ خط ہے بادشاہ روم ہرقل کی طرف جو شخص ہدایت کی پیروی کرے، اسے سلامتی ہو۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ میں تمھیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ تم مسلمان ہو جاؤ۔ دنیا و عقبیٰ کی رسوائی سے سلامت رہو گے۔ اسلام لاؤ۔ خدا تم کو تمہارا اجر دوہرا دے گا اور اگر تم قبول اسلام سے اعراض کرو گے تو تم پہ تمہاری رعایا کا بھی وبال سرکشی پڑے گا۔

قینقاع، بنو

قینقاع، بنو۔ یثرب (مدینہ منورہ) کا ایک یہودی قبیلہ۔

نبی کریمؐ کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے وہاں تین یہودی قبائل [illegible] بنو قریظہ اور بنو قینقاع آباد تھے۔ [illegible] خلدون بیان کرتے [illegible] کی ایک جانب رہتے تھے اور زیادہ تر تجارت کرتے تھے۔ [illegible] بن سلام [illegible] قبیلے سے تھے۔ نبی کریمؐ نے مدینہ [illegible] معاہدہ کیا تھا۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی نے بنو قینقاع [illegible] کے دلوں میں حسد و عداوت کی [illegible] کا دی [illegible] کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگے۔ بنو قینقاع اور دوسرے یہودی [illegible] بندوں اسلام کے خلاف [illegible] سازشوں میں مصروف [illegible] کعب بن اشرف نے مکہ جا کر قریش کو مسلمانوں پر حملہ [illegible] کے شعراء اور خصوصی طور پر کعب نبی کریمؐ [illegible] لگے۔ نبی کریمؐ نے ان تمام [illegible] دیکھتے ہوئے [illegible] اپنی دعوت [illegible] کی اور انھیں تنبیہ کی۔

اسی دوران میں ایک مسلمان خاتون بنو قینقاع [illegible] سے اپنے زیورات بنانے کے لیے گئی۔ [illegible] نازیبا مذاق کیا اور بے حرمتی کی۔ [illegible] مسلمان عورت کی [illegible] مسلمان نے اس یہودی [illegible] کو قتل کر دیا۔ یہودیوں [illegible] اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس پر ہنگامہ کافی بڑھ گیا۔ نبی کریمؐ [illegible] بشیر بن عبدالمنذر انصاریؓ کو اپنا نائب مقرر [illegible] خود [illegible] سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ آپؐ نے مسلمان مجاہدین [illegible] محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن تک جاری رہا۔ یہودیوں نے [illegible] طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ [illegible] قیدی بنا لیا گیا۔

عبداللہ بن ابی کی سفارش پر نبی کریمؐ نے ان کی جاں بخشی اس شرط پر کی کہ وہ ملک شام کی طرف جلاوطن ہوجائیں۔ چنانچہ وہ شام میں اذرعات

کے مقام پر جا آباد ہوئے۔ اس معرکہ کو 'غزوۂ قینقاع' کہا جاتا ہے۔ غزوہ بنو قینقاع کی تاریخ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ یہ بات تو قطعی ہے کہ یہ غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احد سے پہلے پیش آیا۔ لہٰذا اس کی تاریخ ۳ھ متعین کی جا سکتی ہے۔

قیُّوم

خداوند تعالےٰ کے اسماء سے ایک اسم ہے۔ بمعنی کارخانۂ عالم کا سنبھالنے والا۔ قائم بذاتِ خود۔ اور زندہ و قائم رکھنے والا اپنے غیر کو۔ یا یوں کہو کہ قیوّم مبالغہ ہے قیّم کا، اور قیّم کہتے ہیں مصلح امور کو۔ قرآن مجید میں یہ اسم بعینہٖ موجود ہے الٓـمٓ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (س۔ آل عمران۔ ع ۱) یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں زندہ اور کارخانۂ عالم سنبھالنے والا ہے۔

قیوم/قیومیہ

۔ صاحب روضۃ القیومیہ کے مطابق۔ قیومیت کا سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی سے شروع ہوتا ہے۔ مجازی معنوں میں صاحب روضۃ القیومیہ کے مطابق، وہ روحانی منصب جو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو بارگاہِ ایزدی سے ملا۔ ان کے بعد ان کی اولاد میں سے تین افراد کو ملا۔

قیوم اوّل تو حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ قیوم ثانی ان کے فرزند محمد معصومؒ۔ قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند (حضرت محمد معصوم کے فرزند) اور قیوم رابع حضرت خواجہ محمد زبیرؒ (خواجہ محمد نقشبند کے پوتے)۔

شیخ مجددؒ اپنے ایک مکتوب (دفتر دوم، مکتوب ۴۷) میں لکھتے ہیں۔ "قیوم بمنزلہ جوہر کے ہے اور ذاتِ حق کو چھوڑ کر اور باقی جو کچھ ہے سب اس جوہر کا عرض ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کا نائب اتم اور وزیر اعظم ہوتا ہے"۔

غوث، قطب، ابدال وغیرہ سب قیوّم کے نائب اور خادم ہوتے ہیں۔ خواجہ محمد معصوم (قیوم ثانی) اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "قیوم ایک عارفِ کامل، لقائے ذاتی سے مشرف اور علم کے آئینے میں اس کے جمال کا مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے۔ اُس کی ذات کو کلی اور اجمالی طور پر دیکھتا ہے۔ جہاں کی تمام چیزیں اس کی مظاہر تفصیل اور اس کی ذات کی معائن ہوتی ہیں۔"

سیّد محمد ذوقی اپنی کتاب 'سرِّ دلبراں' میں لکھتے ہیں۔

"سلوک مجددیہ میں قیومیت کا ایک خاص الخاص اور منفرد مقام ہے۔ جس کا طریق دوسرے سلسلہ ہائے سلوک سے مختلف ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب عبقات میں، قیومیت کے تصوّر کو اور بھی پھیلا دیا ہے"۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے عبقات میں اسے بڑے تفصیلی انداز سے بیان کیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنے ایک مکتوب میں قیوم کی تشریح کرتے ہیں:

"خداوند تعالےٰ نے اپنے کرم خاص سے کسی شخص کو ایک ذاتِ موصوف عطا فرماتے ہیں۔ اس وقت تمام عالم کا قیام اس شخص کی ذات موہوب کے سپرد ہوتا ہے اور خود اس شخص موہوب کی ذات کا قیام ذاتِ حق سے ہوتا ہے۔ ایسا شخص قیوم کہلاتا ہے۔ (کلماتِ طیبات از ابوالخیر مراد آبادی، صفحات ۱۴۱ تا ۱۴۳)۔

قیوّم کے علاوہ قیّم کی اصطلاح بھی تقریباً انہی معنوں میں شاہ ولی اللہؒ نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے لیے استعمال کی ہے یعنی "قیم طریقۂ احمدیہ"۔

ک

کابل :۔ دریائے کابل پر افغانستان کا دارالحکومت، آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ افغانستان کا سیاسی، فوجی، اقتصادی اور ثقافتی مرکز ہے۔ کابل پاکستان کے ساتھ درۂ خیبر کے راستے ملا ہوا ہے۔ شہر کی دو سمتوں میں پہاڑ ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس پر عربوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس پر غزنویوں اور غوریوں کی حکومت بھی رہی۔ سولہویں صدی عیسوی میں اسے مغل بادشاہ، بابر نے فتح کر کے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ بابر کا مزار بھی کابل میں ہی ہے۔ اس پر ۱۷۳۸ء تک

کابل کی ایک شاہراہ

مغلوں کا قبضہ رہا۔ برعظیم پاک و ہند کے علاقوں کے ساتھ ساتھ یہاں بھی انگریزوں کا قبضہ رہا۔ انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک کا مرکز بھی رہا۔ برعظیم کے نامور عالم دین، شیخ الہند محمود حسن دیو بندی کی تحریک ریشمی رومال کا مرکز بھی رہا۔ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، شیخ الہند کے نمائندے کی حیثیت سے وہاں میں سات سال رہے۔ علماء کے فتویٰ کی وجہ سے برعظیم کے علاقوں سے مسلمانوں نے کابل کو ہجرت کی تھی۔

انگریزوں نے یہاں پر پہلی دفعہ ۱۸۳۹ء میں قبضہ کیا تھا۔ بعد میں افغانوں نے انہیں وہاں سے مار بھگایا۔ لیکن ۱۸۷۹ء میں انگریزوں نے یہاں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد یہاں سردار امان اللہ نے نئی حکومت [illegible] اس کے بعد نادر شاہ کابل کا حکمران بنا۔ اور شاہ کے بعد اس کا بیٹا ظاہر شاہ [illegible] حکمران رہا۔

پرانا کابل تنگ بازاروں اور گلیوں پر مشتمل تھا [illegible] کنارے آباد کیا گیا ہے۔ کابل ایک تعلیمی اور تجارتی مرکز ہے۔ افغانستان [illegible] شہروں کی نسبت کابل میں مغربیت کے زیادہ [illegible] کابل میں ماچس، چمڑہ کی مصنوعات [illegible]

کابل میں بہت سی یادگاریں [illegible] تصویری مینار استقلال، دکشا [illegible] ہیں۔ دارالامان کے سامنے کابل میوزیم [illegible] کے قریب بالا حصار کا قلعہ [illegible] بہت [illegible] کا مقبرہ [illegible] باغ [illegible] کے قریب [illegible]

کاتب الواقدی :۔ ابو عبداللہ [illegible] سے مانا جاتا ہے۔ کاتب الواقدی کے نام سے اس لئے مشہور [illegible] مورخ کے ساتھ بحیثیت کاتب کے کام کرتا [illegible] بن ابی اسامہ التیمی نے کاتب الواقدی [illegible] دئے ہیں۔ تاریخ بغداد کے مصنف خطیب ابو بکر نے [illegible] مستند مورخ تسلیم کیا ہے۔

کاتب الواقدی الحسین ابن عبداللہ ابن عبید اللہ [illegible] کا غلام تھا۔ ابو عبداللہ کاتب الواقدی کا انتقال ۲۰۳ھ [illegible] میں ۶۲ سال کی عمر میں ہوا۔ باب شام (دمشق) کے باہر دفن کیا گیا۔

کاشانی، سید آیات اللہ :۔ (وفات ۱۹۶۵ء) ایران کے

ایک نامور مذہبی رہنما۔

نجف اور عراق میں تعلیم حاصل کی۔۱۹۲۰ء میں برطانیہ کے خلاف ایراقی بغاوت میں حصہ لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران قید کر دئے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں فدایانِ اسلام کی ایک تنظیم بنانے کی کوشش کی اور اسی سال شاہِ ایران پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار ہوتے اور جلا وطن کر دئے گئے۔ جلا وطنی کا زمانہ بیروت میں گذارا۔ جلا وطنی کے دوران ہی تہران سے رکن مجلس منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں تہران واپس آئے۔ ۱۹۵۲ء میں ایراقی مجلس کے سپیکر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر مصدق کی حکومت کے خاتمہ کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

کاشغر:۔ دریائے کاشغر کے کنارے آباد ہے اور جدید مغربی سنکیانگ (چین) میں واقع ہے۔ آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ برعظیم پاک و ہند، افغانستان اور روس کے ساتھ خشکی کے راستے کے ذریعے اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ یہاں کی صنعت سوتی اور اُونی کپڑے کی تیاری اور چاندی کی زیورات ہیں۔

۱۲۷۵ء میں مشہور مغربی سیاح مارکو پولو یہاں آیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اسکو چنگیز خان نے فتح کیا۔ پندرھویں سے سترھویں صدی تک اس پر مسلمان قابض رہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اس شہر کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔

کاظمی احمد سعید (۱۹۱۳ء ۔۔۔) علامہ کاظمی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظمؓ تک پہنچتا ہے۔ اسی نسبت سے آپ کاظمی کہلاتے ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں علوم دینیہ کی تکمیل کی اور حضرت شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی نے اپنے دستِ مبارک سے دستارِ فضیلت باندھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور آگئے اور حضرت سید دیدار علی شاہ سے کسبِ فیض کیا۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور سے پھر امروہہ چلے گئے اور چار سال تک حضرت محمد خلیل صاحب کی سرپرستی میں تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ کئی کامیاب مناظرے بھی کئے۔ ۱۹۲۵ء میں ملتان چلے آئے۔ وہاں مسجد حافظ شیر میں قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔ ملتان میں انوار العلوم کے نام سے دینی درس گاہ قائم کی۔ ۱۹۴۶ء میں دارالاسلام پاکستان کی تحریک کے لئے بنارس میں جو اہم کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں وہ پیش پیش تھے۔ ان کے ایما پر مارچ ۱۹۴۸ء میں جمعیت العلمائے پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۷ء میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شعبۂ حدیث کے سربراہ رہے۔

کافی:۔ مسلمانوں میں ایک معروف فرقہ شیعہ کی کتبِ احادیث میں سے ایک کتاب جس کے مصنف شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی الرازی ہیں۔ شیعہ کی صحاح اربعہ کافی، استبصار، من لایحضرہ الفقیہ اور تہذیب الاحکام میں سے کافی کو مستند اور معیاری تسلیم کیا جاتا ہے۔

کافی میں سولہ ہزار ایک سو ننانوے (۱۶۱۹۹) احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس میں ۳۴ بڑے اور سینکڑوں ذیلی عنوانات ہیں۔ علامہ ابو جعفر محمد الکلینی نے بڑے موضوعات کو 'کتاب' اور ذیلی عنوانات کو 'باب' کے نام سے شروع کیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ (ا) الاصول من الکافی (ب) الفروع من الکافی۔

الاصول من الکافی کے مزید درج ذیل سات حصے ہیں۔

(۱) کتاب العقل والجہل
(۲) کتاب التوحید
(۳) کتاب الحجت
(۴) کتاب الایمان والکفر
(۵) کتاب الدّعا
(۶) کتاب فضل القرآن
(۷) کتاب العشرہ

مذکورہ بالا بڑے عنوانات کے ذیل میں سینکڑوں ذیلی عنوان دئے گئے ہیں۔ علامہ الکلینی نے ۲۰ سال کی مسلسل محنت کے بعد ان احادیث کو جمع کیا ہے۔ وہ حدیث کے بیان میں پورا سلسلہ روایت بیان کرتے ہیں یا ماخذ کا حوالہ دیتے ہیں۔

روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علامہ الکلینی نے شیعوں کے گیارہویں امام حسن عسکری کا زمانہ پایا تھا اور یہ کتاب امام العصر والزمان کی غیبتِ صغریٰ میں لکھی گئی اور جب اس کتاب کو اُنکی خدمت میں پیش کیا گیا تو امام العصر والزمان مہدی نے فرمایا تھا " الکافی کافٍ لشیعتنا"

شیعوں میں اسے نہایت ہی مستند مانا جاتا ہے چند شیعہ علماء کی رائے یہ ہے۔ علامہ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں۔

الکافی ھومن اجل الکتب الشیعہ واکثرھا فائدہ (کافی تمام کتب شیعہ میں اجل وارفع اور سب سے زیادہ مفید ہے)

جلیل ملا محسن فیض کاشانی بیان کرتے ہیں "کتب الاربعہ میں سے اشرف واوثق واتم واجمع "الکافی" ہے۔ کیونکہ یہ علاوہ فروع پر بھی مشتمل ہے اور فضول اور باعث عیب باتوں سے خالی ہے۔

شیعوں میں کافی کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں یہ شیعہ علماء اور فضلاء کا مرکز بنی رہی ہے اور اس کی کئی شروح اور حواشی لکھے گئے۔ فارسی اور اردو میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ جن میں چند درج ذیل ہیں۔

(۱) جامع الاحادیث والاقوال از شیخ قاسم بن محمد الوندی (شرح)
(۲) کتاب الدر المنظوم ومن کلام المعصوم از شیخ علی بن محمد (شرح)
(۳) الرواشح السماویہ فی شرح الاحادیث الامامیہ۔ از سید محمد باقر (شرح)
(۴) شرح از الامین استر آبادی
(۵) شرح از ملا صالح المازندرانی
(۶) شرح از ملا صدر الشیرازی
(۷) الوافی الکافی از ملا محسن کاشانی (شرح)
(۸) کشف الکافی از شیخ محمد بن محمد شیرازی (شرح)
(۹) مراۃ العقول از علامہ مجلسی (شرح)
(۱۰) تحفۃ الاولیا از شیخ محمد الاردکانی (ترجمہ فارسی)
(۱۱) صافی از شیخ جلیل قزوینی (فارسی ترجمہ اور شرح)
(۱۲) ترجمہ اردو بعض اجزائے اصول کافی موصول بالقول الشافی از مولانا سید ظہور حسن لکھنوی۔
(۱۳) الشافی ترجمہ اصول کافی از سید ظفر حسن امروہوی

شیعہ، حدیث کے سلسلے میں اہل سنت والجماعت سے الگ ایک معیار رکھتے ہیں۔ وہ ایسی حدیث کو قبول کرتے ہیں جو اُن کے نزدیک سند اور روایت کے اعتبار سے چودہ معصومین تک پہنچتی ہے۔ نبی کریمؐ کے کسی صحابی کی روایت کو قبول نہیں کرتے۔ اور یہی معیار 'کافی' میں برقرار رکھا گیا ہے۔ ان کے نزدیک حدیث کی درج ذیل قسمیں ہیں۔

(۱) **حدیثِ صحیح**:- جس کا سلسلہ سند معصوم تک منتہی ہوتا ہو اور ہر طبقہ میں اُس کے راوی شیعہ اثنائے عشری اور عادل ہوں۔

(۲) **حدیثِ حسن**:- جس کی سند معصوم تک منتہی ہو اور تمام طبقات میں اس کے راوی شیعہ اثنائے عشری ہوں اور ممدوح ہوں۔ مگر ان کی عدالت کی تصریح نہ کی گئی ہو۔

(۳) **حدیثِ قوی**:- جس کی سند کے تمام راوی شیعہ اثنائے عشری ہوں مگر ان کی مدح و ذم کے متعلق کوئی نص موجود نہ ہو۔

(۴) **حدیثِ موثق**:- جس کا سلسلہ سند معصوم تک ایسے راویوں کے ذریعے منتہی ہو جو اگر صادق اللہجہ اور قابلِ وثوق ہوں مگر فاسق العقیدہ ہوں (اثنائے عشریوں کے علاوہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے متعلق ہوں)

(۵) **حدیثِ ضعیف**:- جو مذکورہ بالا تمام شرائط سے خالی ہو۔

(کافی کے مصنف شیخ ابوجعفر محمد الکلینی کے احوال کیلئے دیکھیئے:- کلینیؒ ابوجعفر محمد)

کافیہ

کافیہ - علامہ شیخ جمال الدین بن حاجبؒ (متوفی ۶۴۶ھ) کی ایک تصنیف ہے۔ جس میں علم نحو کے تمام قواعد اختصار کے ساتھ باضابطہ بیان کئے گئے ہیں، درسِ نظامی میں شامل ہے۔

کاکا صاحبؒ، شیخ رحمکار

کاکا صاحبؒ، شیخ رحمکار:- (ولادت ۹۸۳ھ - وفات ۱۰۶۳ھ) آپ کا اسم گرامی رحمکار لیکن کاکا صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام شیخ بہادر المعروف ایک بابا صاحب

قاضی میر احمد شاہؒ اپنی کتاب تحفۃ الاولیاء میں کاکا صاحب کی پیدائش کے متعلق لکھتے ہیں "ایک رات آپ کے والد نے ایک خواب دیکھا کہ انہوں نے پیشاب کیا ہے اور اُس کا جھاگ اُن کے سر سے اونچا ہو گیا"۔ آپ کے والد نے اخون پنجوؒ کے پاس حاضر ہو کر اپنا خواب بیان کیا۔ اخون پنجوؒ صاحب نے تعبیر میں فرمایا" اللہ تعالیٰ تمہیں ایک فرزند دے گا جو شہرت اور بزرگی میں تجھ سے بڑھ کر ہوگا۔"

آپ کی تعلیم و تربیت، استاد اتو الدین سجوقی نے کی۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد آپ سلسلہ اولیسیہ سے وابستہ ہو گئے اور جلد ہی معارف کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ شرعی امور کی پابندی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔

بروز جمعہ ۲۴ رجب ۱۰۶۳ھ کو انتقال فرمایا اور نوشہرہ سے چھ میل دور دفن ہیں جہاں آپ کا مزار ہے وہ جگہ اب زیارت کا کا صاحب کے نام سے مشہور ہے۔

آپ کے پانچ بیٹوں نے بھی علم و حکمت کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ آپ کے خلفاء بھی صاحبانِ علم و فقر اور صاحب و کرامات گزرے ہیں

کتاب

کتاب:- لکھے ہوئے الفاظ و حروف کا مجموعہ۔ قدیم زمانے میں کتاب درختوں کے پتوں اور چھال، سوتی اور ریشمی کپڑوں، چمڑے، پر لکھی جاتی تھی۔

قدیم بابل اور شام میں کتاب سے مراد وہ اینٹ جیسی فرس یا تختی مراد تھی جس پر کچھ خاص نشان کندہ ہوتی تھیں۔ مصر میں لفظ کتاب نقشہ کی طرح لکڑی پر لپٹے ہوئے اس چرمی کاغذ کیلئے بولا جاتا تھا۔ جس پر عبارت درج ہوتی تھی۔ اور یونان میں بھی اس سے یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔

نبی کریمؐ سے پہلے کے انبیاء کرامؑ کے صحیفوں کو بھی "کتاب" کہا جاتا تھا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ مطبوعہ کتابوں کا آغاز یورپ میں پندرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔

قرآن مجید کو بھی "الکتاب" کہا گیا ہے اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر لفظ کتاب، کتابِ الٰہی یا کتب الٰہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اس طرح قرآن مجید میں کتاب، حکم یا فرمانِ الٰہی، قرآن کی سورۃ، فیصلہ یا نوشتہ تقدیر، لوحِ محفوظ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید کو "کتاب المبین" بھی کہا گیا ہے۔

کتاب الاصنام

کتاب الاصنام:- ابن عثمان عمرو بن بحر الجاحظ (متوفی ۲۰۰ھ) کی تصنیف ہے جس میں جھوٹے معبودوں اور قدیم عربوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

کتاب الامارۃ والسیاسۃ

کتاب الامارۃ والسیاسۃ:- ابوعبداللہ احمد بن سلیمان الزبیری الشافعیؒ (متوفی ۳۱۷ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ عربی زبان میں لکھی گئی تھی اس میں حکمرانی اور سیاست کے امور پر تفصیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب البُلدان

کتاب البُلدان:- شیعہ مصنف ابن الواضح الیعقوبی کی عربی زبان میں تصنیف ہے۔ اس کا پورا نام کتاب فتوح البلدان ہے جو ۸۹۱ء یا ۸۹۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں ملکی اور اقتصادی امور پر تفصیلات درج ہیں۔

کتاب الخراج

کتاب الخراج:- امام ابوحنیفہؒ کے ممتاز شاگرد امام ابو یوسفؒ کی تصنیف۔ اسے خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر امام ابو یوسف نے [illegible] ۱۷۱ھ تا ۱۸۲ھ کے درمیانی عرصہ میں لکھا جب وہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر [illegible] اس کا شمار علم الفقہ کی مستند کتابوں میں ہوتا ہے۔

یہ کتاب امام ابو یوسف کے تفقہ اور اُن کے اجتہاد کی [illegible] کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے اجتماعی اور مالی امور کے متعلق [illegible] ہے۔ اس میں اُس دور کے اقتصادی حالات پر بھی روشنی [illegible] اسلام کے بعض مخصوص ابواب کا بھی اس میں ذکر کیا ہے۔ خلافت [illegible] حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں نظام محاصل کے متعلق تفصیلی [illegible] کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب الخراج کے بہت سے قلمی نسخوں کا ذکر ملتا ہے [illegible] انڈیا آفس لائبریری لندن۔ قومی کتب خانہ پیرس، کتب خانہ [illegible] کتب خانہ آیا صوفیہ، استنبول۔ کتب خانہ [illegible] استنبول [illegible] رام پور تیونس اور برلن کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

یہ کتاب درج ذیل پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب:- وجہ تالیف۔ مقدمہ اور امیر المومنین کے لئے نصیحتیں۔

دوسرا باب:- تقسیم غنائم کے تفصیلی مباحث

تیسرا باب:- فئے اور خراج

چوتھا باب:- علاقہ سواد کا بندوبست

پانچواں باب:- شام اور الجزیرہ کا بندوبست

چھٹا باب :۔ عہدِ فاروقی میں صحابہؓ کے لئے وظائف
ساتواں باب :۔ سودا کیلئے مجوزہ محاصل
آٹھواں باب :۔ محاصلِ زمین
نواں باب :۔ نجران کا بندوبست
دسواں باب :۔ صدقات
گیارہواں باب :۔ پانی اور زمین سے متعلقہ مسائل
بارہواں باب :۔ عمالِ خراج کے لئے ہدایتیں۔
تیرھواں باب :۔ اہلِ ذمّہ اور اُن سے متعلقہ مسائل
چودھواں باب :۔ شرعی حدود اور تعزیرات
پندرہواں باب :۔ قوانینِ جنگ۔

کتاب الخراج کے فرانسیسی، اطالوی، روسی اور ترکی زبان میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں۔
(اسلام کے نظامِ محاصل کے نام سے اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے کیا ہے)
کتاب الخراج نام کی دو اور کتابیں، اُن میں سے ایک قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۲۷ھ) کی ہے۔ جو پہلے عیسائی تھے۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ اس نے اپنی کتاب ۹۲۸ء میں لکھی۔ اس میں صوبائی امور، ضلعی امور اور محکمۂ ڈاک کے نظم کے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔
دوسری کتاب الخراج یحییٰ بن آدم کی ہے۔

کتاب الشفاء :۔ قاضی ابوالفضل عیاضؒ کی عربی تصنیف ہے۔ پورا نام "الشفاء فی حقوق المصطفیٰؐ" ہے۔ اس میں نبی کریمؐ کے حقوق کا ذکر ہے جو ان کے ماننے والوں پر عائد ہوتے ہیں۔
نبی کریمؐ کے محاسن کو قرآن کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد اردو ترجمے ہو چکے ہیں۔ کتاب الشفاء کے نام سے ابنِ سینا کی ایک اور تصنیف ہے۔ جو سائنسی موضوعات کا مجموعہ ہے۔

کتاب العمدة :۔ علامہ ابن رشیق ابی علی الحسن القیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) کی عربی زبان میں تصنیف ہے۔ اس کا پورا نام "عمدة فی صناعة الشعر" ہے۔
الصقلی نے "العمدة" کے نام سے اس کی تلخیص لکھی ہے۔ اسی طرح "الانصاف" کے نام سے موفق الدین بغدادی نے بھی اس کی تلخیص کی ہے۔

کاملیہ شیعوں کا ایک فرقہ ہے جو ابو کامل کے متبع ہیں۔ یہ شخص سب صحابہ کو (نعوذ باللہ) کافر بتاتا تھا۔ کیونکہ انھوں نے حضرت علی سے بیعت نہ کی اور خود حضرت علیؓ کو اس لیے کافر کہتا تھا کہ صحابہ سے کیوں نہیں لڑے۔ یہ شخص تناسخ کا بھی قائل تھا اور کہتا تھا کہ امامت نورِ الٰہی ہے جو ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ نور ایک آدمی میں امامت ہو اور دوسرے میں نبوت ہو جائے۔ نیز کہتا تھا کہ روح الٰہی نے اول آدمؑ میں اور اس کے بعد درجہ بدرجہ تمام انبیاء اور ائمہ میں حلول کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے نزدیک کافر بھی امام ہوتا اور اس میں روح الٰہی کا حلول کرنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ حضرت علیؓ کی تکفیر کرتا ہے۔ اور پھر ان میں روح الٰہی کے حلول کا اور پھر ان کی امامت کا قائل ہے۔ یہی عقائد اس کے پیروکاروں کے ہیں۔

کاہن :۔ عربی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا ہے زمانۂ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا۔
کاہنوں کے متعلق ضعیف الاعتقاد لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ ستارہ شناس ہوتے ہیں یا ارواح و شیاطین اور جن اُنکے تصرف میں ہیں اور ان کی مدد سے وہ غیب کی خبریں معلوم کر لیتے ہیں۔ کسی گمشدہ چیز کے بارے میں بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو کاہن اپنے ان خصوصی اختیارات کی بنا پر بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ لوگ اُن سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔
دراصل کاہن لوگوں کو فریب کے ذریعے اپنا مقصد نکال لیا کرتے تھے اور کمزور عقیدہ کے لوگوں کو لوٹا کرتے تھے کیونکہ لوگ اُن کے پاس احوال معلوم کرنے کیلئے نذر نیاز لایا کرتے تھے۔
قریش نے نبی کریمؐ پر دعوتِ اسلام کے آغاز میں کاہن ہونے کا الزام لگایا کیونکہ اُن کے بقول نبی کریمؐ کاہنوں کی طرح مقفیٰ اور مسجع فقرے بولا کرتے تھے کاہن اکثر اپنی گفتگو میں مقفیٰ الفاظ اس طرح استعمال کرتے تھے تاکہ اُن کا مخاطب اُس میں سے اپنے مطلب کی بات خود بہ آسانی سے منطبق کر سکے۔

کائنات :۔ تمام موجودات کا مجموعہ جن میں جاندار، بے جان، چاند، سورج، ستارے سیارے اور دیگر اجرام فلکی و سماوی شامل ہیں۔
کائنات کی صحیح نوعیت اور اصل ماہیت کے متعلق انسان شروع ہی سے غور کر رہا ہے۔ ۱۶ ویں صدی عیسوی تک مغرب میں زمین کو کائنات کا مرکز اور چاند، سورج اور ستاروں کو اُس کے گرد گردش کرنے والے اجرام فلکی تصور کیا جاتا رہا۔ لیکن ۱۷ ویں صدی عیسوی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ کیپلر اور نیوٹن نے اپنے تجربات سے سیاروں کی گردش اور حرکت کے بارے میں پیش گوئیاں کیں۔ پھر مزید ستاروں کی دریافت اور ان کے بارے میں تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔
ماہرینِ فلکیات کا اندازہ ہے کہ کائنات میں ۳۰ ہزار ملین ستارے موجود ہیں۔ ان میں سے قریب ترین ستارہ زمین سے پچاس ملین میل کے فاصلہ پر ہے اور تقریباً یہی فاصلہ دو ستاروں کے درمیان ہوتا ہے۔ سائنس کے موجودہ مشاہدات کے مطابق اس کی عمر کا اندازہ چار سو کروڑ سال لگایا گیا ہے۔ کائنات کی وسعت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ کہکشاں کا قطر ایک لاکھ روشنی کے سال کے برابر ہے اور سورج، کہکشاں کے مرکز سے ۳۰ ہزار روشنی کے سال کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جبکہ کہکشاں کائنات کا آخری حصہ نہیں بلکہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے (روشنی کا سال، اُس فاصلہ کو کہتے ہیں جو روشنی سال بھر مسلسل سفر کرنے کے بعد طے کرتی ہے۔ روشنی کی رفتار ۱۸۶,۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے)
کائنات کا نظام حد درجہ وسیع ہے اور انسان کی نظریں اس وسعت کو طے نہیں کر سکتیں۔ سائنسی تحقیقات سے کئی ستاروں اور سیاروں کے احوال معلوم ہوئے ہیں۔ جن میں زمین، چاند، سورج، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل، یورے نس، پلوٹو، شہاب اور دمدار ستارے اس وسیع کائنات کے چند حصے ہیں۔
زمین سے لاکھوں گنا عظیم الشان سیارے، کائنات کے اندر گیندوں کی طرح

گردش کر رہے ہیں۔ سورج سے ہزاروں درجہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ پورا نظام شمسی، کائنات کی صرف ایک کہکشاں کے ایک کونے میں پڑا ہے تنہا اسی کہکشاں میں سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے موجود ہیں۔ اب تک انسانی مشاہدہ ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ معلوم کر چکا ہے۔ ان لاکھوں کہکشانوں میں سے قریب ترین کہکشاں اتنے فاصلہ پر واقع ہے کہ اس کی روشنی سفر کر کے دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے جدید زمانے کے ریڈیائی ہئیت دانوں نے ان میں سے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ جسے وہ 295 3C Source کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا اندازہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں ہم تک پہنچ رہی ہیں وہ ۴ ارب سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اس سے روانہ ہوئی تھیں۔

مغربی ذہن اور لادینی افکار کے پیروکار اس عظیم کائنات کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ آہستہ آہستہ حالات کے ذریعے بڑھتا گیا اور یہ سب کچھ آپس میں ایک مخصوص نظام کے تحت مربوط ہو کر خود بخود چل رہا ہے۔

اسلام نے کائنات کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

کائنات، جس میں انسان و حیوان رہتے ہیں، بے خدا نہیں ہے، بلکہ اس کا خالق اور مالک و فرمانروا ایک ایسا قادرِ مطلق خدا ہے جس کے کامل اور بے عیب ہونے کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

کائنات بے مقصد اور بے حکمت نہیں بلکہ اس کے خالق نے اسے سراسر برحق پیدا کیا ہے۔ کسی کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیئے کہ یہ ایک فضول تماشا ہے جو عبث ہی شروع ہوا ہے اور عبث ہی ختم ہو جائیگا۔

کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں ہے اور اس میں موجود اشیاء اور اجرامِ فلکی ایک خصوصی نظام کے تحت چل رہے ہیں اور اُن کے لئے ایک معین وقت مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا واحد و تنہا مالک و حاکم ہے۔ اس میں کوئی اُسکا شریک نہیں۔ سورج اور چاند تارے ایک زبردست اور اٹل ضابطے کے پابند ہیں۔

کائنات ایک ہی دفعہ بن کر مکمل نہیں ہو گئی ہے بلکہ اس میں برابر توسیع ہو رہی ہے اور اللہ کی قدرت کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں۔ اس میں کہیں ٹھیراؤ نہیں بلکہ ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہے۔

کائنات کی ہر چیز اپنے خالق مالک، اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں معروف ہے اور کافر بھی یہ مانتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی ایسی ہستی ہے کہ جو اس وسیع نظام کو کنٹرول کر رہی ہے۔

قرآن میں یہ بات مزید واضح کی گئی کہ کائنات کے نظام کو چلانے کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے مخصوص ذمہ داریوں کو ادا کر رہے ہیں۔

کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ اس کائنات کی ہر شے کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر کیا ہے تاکہ وہ انسان کی خدمت میں مصروف رہے۔

کائنات کی ہر شے، توحید کی گواہ ہے اور اس بات کا واضح اعلان ہے کہ اس نظام کے لئے صرف ایک ہی ہستی ہے جو اس نظامِ کائنات کو کنٹرول کر رہی ہے۔ اگر کوئی دوسرا یا تیسرا شریک ہوتا تو کائنات کے نظام میں حد درجہ بے ترتیبی ہوتی۔

علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو نہ بھیجتا پھر بھی کائنات کے شواہد، انسان کو اللہ کا مسلم اور مطیع بنانے کیلئے کافی تھے۔

کبیرہ

کبیر کی مؤنث ہے۔ بڑی چیز۔ اصطلاح شرع میں اس گناہ کو کہتے ہیں جو حرام محض ہو اور نص قاطع کے ساتھ دنیا اور آخرت میں اس پر عقوبت محض مقرر ہو۔

گناہ کبیرہ کا مفہوم متعین کرنے میں ہمارے علماء نے اختلاف کیا ہے مگر قرآن و حدیث سے جہاں تک اس کا سراغ ملتا ہے کہ شارع نے جس فعل کے ارتکاب پر حد (شرعی سزا) مقرر کر دی ہے یا اس کے بارے میں وعید نازل ہوئی ہے یا دلیل قطعی کے ساتھ اس کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہو یا وہ فعل دین کی ہتکِ حرمت کا موجب ہو گناہ کبیرہ ہے اور جس گناہ میں یہ باتیں نہ پائی جائیں وہ صغیرہ ہے۔ پھر گناہ کبیرہ کے مراتب اگرچہ مختلف ہیں یعنی بعض بعض سے شنیع تر ہیں۔ جیسا کہ متتبع احادیث پر مخفی نہیں۔ مگر پیغمبرِ خدا ؐ کی کسی حدیث سے انکا انحصار و انضباط پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچا۔ اسی لیے علماء نے کبائر گنوانے میں اختلاف کیا ہے۔ مولانا جلال الدین دوانی شرح عقائد عضدیہ میں بعض اصحاب شافعیؒ نقل کرتے ہیں کہ کبائر حسب تفصیل ذیل ہیں :-

(۱) قتل ناحق (۲) زنا (۳) لواطت (۴) چوری (۵) شراب نوشی (۶) ہر نشہ آور چیز کا استعمال۔ (۷) سؤر کا گوشت کھانا (۸) کسی کا مال بجبر چھین لینا (۹) زنا کی تہمت لگانا (۱۰) جھوٹی گواہی دینا (۱۱) سود کھانا (۱۲) رمضان کا روزہ قصداً اور عمداً بے عذر توڑ دینا (۱۳) جھوٹی قسم کھانا (۱۴) قطع رحم کرنا (۱۵) مسلمان [illegible] باپ کو ناحق ستانا۔ (۱۶) مذہبی لڑائی میں مقابلے سے بھاگنا (۱۷) یتیموں کا مال ہضم کرنا (۱۸) ناپ تول میں خیانت کرنا (۱۹) بار بار سمجھ کر وقت سے پہلے نماز پڑھ لینا۔ (۲۰) زکوٰۃ نہ دینا (۲۱) مسلمانوں سے ناحق لڑنا (۲۲) جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا (۲۳) صحابہ کو گالی دینا (۲۴) بے عذر گواہی چھپانا۔ (۲۵) رشوت لینا (۲۶) مرد عورت میں نااتفاقی کرنا (۲۷) بادشاہ سے چغلی جا لگانا (۲۸) باوجود قدرت ہونے کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھنا۔ (۲۹) قرآن یاد کر کے بھلا دینا (۳۰) جانداروں کو جلانا (۳۱) عورت کا بے عذر شرعی اپنے خاوند کی اطاعت نہ کرنا (۳۲) خدا کی رحمت سے مایوس ہونا (۳۳) عذاب الٰہی سے بے خوف و نڈر رہنا (۳۴) اپنی عورت سے ظہار کرنا

کرامیہ

ایک فرقہ ہے جو عبداللہ محمد بن کرام سجستانی کی طرف منسوب ہے یہ شخص ۲۰۰ھ کے بعد گزرا ہے۔ کم علم تھا۔ ہر ایک مذہب سے اس نے کچھ مسائل اخذ کرلئے تھے ان کو ایک کتاب میں جمع کر کے اس کو ممالک غشام، غرجہ، غور و خراسان میں شائع کیا اس سے اس کے مذہب کی بنیاد قائم ہو گئی۔ اس شخص نے خدا تعالےٰ کی صفات کے بیان میں یہاں تک غلو کیا کہ خدا کو مجسم اور مخلوق سے مشابہ قرار دینے پر نوبت پہنچ گئی۔ یہ شخص حج کر کے شام میں آیا مقام زغرہ میں ۲۵۵ھ میں فوت ہوا اور بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔ وہاں اس کے پیروؤں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔

فرقہ کرامیہ کے کئی گروہ ہیں۔ مثلاً عابدیہ۔ اسحاقیہ۔ تونیہ۔ زرینیہ۔ و حدیہ۔ لیکن یہ سب ایک ہی فرقہ گنا جاتا ہے۔ یہ سب کے سب خدا کو مجسم قرار دیتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ ان میں سے بعض کا قول ہے کہ خدا قائم بنفسہ ہے اور بعض اس کو اجزاء سے مؤلف کہتے ہیں اور اس کے لیے جہات اور نہایات ثابت کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں اللہ جسم ہے اور نیچے کی جانب سے متناہی ہے۔ ان کے اعتقاد میں عالم سفلی کے

جسموں سے اس کا ملاقات کرنا جائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا عرش پر ہے اور عرش اوپر کی جانب سے اس سے ملا ہوا ہے اور خدا کا حرکت کرنا اور نیچے کو اترنا جائز ہے۔ ان کا اس امر میں اختلاف ہے کہ وہ تمام عرش پر ہے یا اس کے بعض حصّے پر۔ اس فرقہ کے بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ عرش پر نہیں بلکہ اس کے محاذی ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ خدا تعالےٰ تمام جہات اور اطراف سے متناہی ہے اور بعض کے نزدیک نیچے کی جانب سے متناہی ہے اور بعض اسے ہر طرف سے متناہی قرار دیتے ہیں۔

کرامیہ کا اعتقاد ہے کہ خدا محل حوادث ہے اور جو حوادث اس کی ذات میں حلول کیے ہیں انہی پر قدرت رکھتا ہے اور جو ایسے نہیں بلکہ اس کی ذات سے الگ ہیں۔ ان پر اسے قدرت نہیں۔ ان سب کا خیال ہے کہ اس کے ساتھ حادث اس وقت قائم ہوتا ہے جبکہ اس کو مخلوق کے پیدا کرنے میں اس کی طرف احتیاج پڑتی ہے۔ اس حادث کے بارہ میں ان میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ جس حادث کی طرف اسے احتیاج ہوتی ہے وہ ارادہ ہے اور بعض کہتے ہیں وہ کُنْ ہے۔ جب خدا کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو قدرت جو قدیم ہے اس قول کو یا ارادہ کو ذاتِ الٰہی میں پیدا کر دیتی ہے۔

کرامیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو حادث خدا کی ذات سے قائم ہوتا ہے اس کا نام حادث ہے اور جو اس کی ذات سے قائم نہیں ہو سکتا اسے محدث کہا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ کو بندوں کے پیدا کرنے سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ فلاں آدمی ایمان نہ لائے گا ورنہ اس کا پیدا کرنا عبث ہوگا۔ ان کے اعتقاد میں نبوّت اور رسالت دو صفتیں ہیں جو نبی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ مگر وحی کی تبلیغ اور معجزہ اور عصمت اس کی ذات کے ساتھ مختص نہیں بلکہ اور لوگ بھی ان سے متصف ہو سکتے ہیں جس کسی شخص میں یہ صفتیں موجود ہوں وہ رسول ہے خواہ اسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہو یا نہ۔ اور اللہ تعالےٰ پر ایسے ہی آدمی کا رسول بنانا واجب ہے۔ جس میں یہ اوصاف نہ ہوں اس کا رسول بنانا ناجائز ہے۔ اللہ کے لیے کسی نبی کو عہدۂ نبوّت سے معزول کرنا جائز ہے مگر رسول کو معزول کرنا ناجائز ہے۔ ان کے نزدیک انبیاء پر ایسے گناہ کا ہونا جائز ہے جو موجب حد اور مسقط عدالت نہ ہو۔ خدا پر یہ بھی واجب ہے کہ متواتر رسول بھیجتا رہے۔ ان کے نزدیک ایک وقت میں دو اماموں کا ہونا جائز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں امام برحق تھے مگر اتنی بات ہے کہ حضرت علیؓ سنت پر تھے اور حضرت امیر معاویہؓ سنت پر نہ تھے مگر ان کی فرمانبرداری رعیت پر واجب تھی۔

بعض کرامیہ کا یہ مذہب ہے کہ اللہ کے دو علم ہیں۔ ایک علم سے وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے ۔ ان کے نزدیک ایمان اس اقرار کا نام ہے جو اللہ تعالےٰ نے ازل میں اپنی مخلوق سے کیا تھا۔ یعنی جبکہ فرمایا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو سب نے کہا بَلٰی (ہاں)۔ سو یہ قول یعنی بلیٰ کا کہنا ایمان ہے۔ ان کے نزدیک منافق کا ایمان باوجود اس کے کہ اس کے ساتھ کفر بھی موجود ہے نبی کے ایمان کے برابر ہے کیونکہ اس ایمان یعنی اقرار ازلی میں سب برابر ہیں۔

اس فرقہ کا بانی مبانی یعنی عبداللہ محمد بن کرام کا یہ مذہب ہے کہ مسافر کو ایسے کپڑے میں جو بالکل نجاست میں ڈوبا ہوا ہو نماز پڑھنی جائز ہے اور نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج وغیرہ تمام عبادتیں نیت کے بغیر جائز ہو جاتی ہیں۔

کربلا یہ بغداد سے جنوب و مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ایک آباد شہر ہے جو نجف سے بڑا ہے۔ اور نجف سے شمال و مغرب تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ فرات یہاں سے قریب ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب آبادی ہے عراق کے صوبہ کربلا کا صدر مقام، صحرائے شام کے کنارے پر واقع ہے۔ جہاں رسول کریمؐ کے نواسے حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے مزارات ہیں۔ جو محرم ۶۱ھ/۶۸۰ء میں یزید کی فوجوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ ان مزارات کی وجہ سے یہ جگہ بہت مشہور ہوئی۔ ان مقامات کی زیارت کے لیے عالمِ اسلام کے مختلف ممالک سے مسلمان خصوصاً شیعہ حضرات آتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ صحرا تھا۔

تاریخی روایات میں آتا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر کاٹ کر دمشق بھیج دیا گیا تھا اور کربلا میں ان کے جسم کا باقی حصّہ دفن ہے۔

کربلا کے نام کے متعلق روایت ہے کہ یہ کرب اور بلا سے بنا ہے۔ کرب کے معنی مصیبت کے ہیں۔ خلیفہ المتوکل نے ۲۳۶ھ/۸۵۰-۸۵۱ء میں یہ مزارات اور ان کے قبّے مسمار کر دیے تھے اور اس نے سختی سے یہ حکم نافذ کیا تھا کہ کوئی ان مقامات کی زیارت کے لیے نہ آئے۔

کربلا، سانحہ - ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ میں کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کی شہادت کی نسبت سے یہ واقعہ کربلا کہلاتا ہے۔ یزید نے برسرِ اقتدار آکر حضرت حسینؓ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے بیعت حاصل کرنے کی کوشش شروع کیں۔ کیونکہ ان حضرات نے بیعت نہ کی تھی۔ یزید نے مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو ان اصحاب سے بیعت حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ کیونکہ جب حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے ولی عہد ہونے کی حیثیت سے بیعت لی تو بھی ان حضرات نے بیعت نہ کی تھی۔ امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو وصیت کی تھی کہ ان سے بیعت لینے میں خاصی احتیاط کی جائے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ تو مدینہ سے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ حضرت حسینؓ نے ولید بن عتبہ کے بلاوے کے بعد اپنے اہلِ خاندان کو جمع کر کے مشورہ کیا اور اس کے بعد اُن کو ہمراہ لے کر مکہ روانہ ہو گئے۔

جونہی حضرت حسینؓ مکہ میں داخل ہوئے تو کوفہ سے پیغام آنے لگے کہ وہاں کے لوگ یزید کی جگہ پر حضرت حسینؓ کو خلیفہ بنانے کے لیے تیار ہیں اور وہ اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ حضرت حسین کوفہ آئیں تاکہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔

حضرت حسین نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا کہ وہاں کے لوگوں کے میلانات کو دیکھ کر اطلاع کر دیں۔ کوفہ میں مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر ۱۸ ہزار افراد نے حضرت حسینؓ کے لیے بیعت کی۔ مسلم بن عقیل نے ان تمام احوال سے حضرت حسینؓ کو باخبر کیا۔ اس دوران کوفہ میں عبیداللہ بن زیاد کو حاکم مقرر کر کے بھیج دیا گیا۔ عبیداللہ نے کوفہ میں آمد کے بعد زمام اقتدار سنبھالتے ہی حضرت حسینؓ کے طرفداروں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مسلم بن عقیل کی تلاش میں اپنے جاسوس دوڑائے۔ مسلم بن عقیل نے اپنے حمائتیوں کے ہمراہ عبیداللہ کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابن زیاد نے اپنے آدمی جناب مسلم بن عقیل کی گرفتاری کے لیے بھیجے۔

محمد بن اشعث نے، جو آپ کی گرفتاری کے لیے آیا تھا، امان کا وعدہ دے کر گرفتار کیا۔ وہ آپ کو لے کر ابن زیاد کی طرف لے چلا تو مسلم بن عقیل کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور کہا "مجھے حسینؓ کا خیال آ رہا ہے کہ وہ مکہ سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔" مسلمؓ

نے محمد بن اشعث سے کہا کہ حضرت حسینؓ کو میرے حالات سے مطلع کرو اور یہاں نہ آنے کا پیغام بھیج دو۔ محمد بن اشعث نے اس مضمون کا ایک خط حسینؓ کو روانہ کیا۔

ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی امان کا پاس نہ کرتے ہوئے حضرت مسلم بن عقیل کو قتل کروا دیا۔

حضرت حسینؓ مکہ میں قیام کے بعد مسلم بن عقیل کے پہلے خط کی بنیاد پر رختِ سفر باندھ چکے تھے۔ بہی خواہوں اور ہمدردوں نے روکنا چاہا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے گزارش کی کہ اگر کوفہ والوں نے یزید کے والی کو نکال دیا ہے تب تو آپ بخوشی کوفہ جائیں۔ ورنہ کوفہ کے لوگ ہی آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگر آپ کو مکہ سے ہی جانا ہے تو یمن چلے جایئے۔ وہاں آپ کے والد کے کافی عقیدت مند ہیں۔ حضرت حسینؓ نے جواب دیا۔ "میں کوفہ کے سفر کا عزم کر چکا ہوں" ابن عباسؓ نے کہا: "اگر جانا ہی ہے تو اہل و عیال کو ساتھ نہ لے جائیں۔"

آپ نے ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے سفر کا آغاز کیا۔ آپ کے ساتھ ۷۲ افراد تھے۔ مکہ کے والی نے چند آدمی بھیج کر آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مکہ سے کچھ آگے مشہور شاعر فرزدق ملا۔ جو کوفہ سے آ رہا تھا۔ اس نے حضرت حسینؓ کے استفسار پہ بتایا کہ کوفہ والوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنو امیہ کے ہمراہ۔

ابن زیاد نے حضرت حسین کی روانگی کا علم ہونے کے بعد عراق و عرب کی سرحد پہ قادسیہ کے آس پاس فوجیں پھیلا دیں۔ ثعلبیہ کے مقام پہ حضرت حسینؓ کو مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر ملی۔ آپ کے بعض ہمراہیوں نے واپس چلنے کا مشورہ دیا۔ لیکن آپ کے ساتھیوں میں بنو عقیل کے آدمیوں نے مسلم بن عقیل کے قتل کا انتقام لیے بغیر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اسی دوران آپ کو اپنے ایک قاصد کے قتل کی خبر ملی جسے آپ نے کوفہ کے لوگوں کے پاس بھیجا تھا۔ حضرت حسینؓ نے ان واقعات کے بعد اپنے ساتھیوں کو خطاب کیا کہ اگر وہ ان حالات میں واپس جانا چاہیں تو بخوشی جا سکتے ہیں کیونکہ کوفہ کے لوگوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی اس تقریر کے بعد وہ بدو لوگ جو راستہ میں آپ کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ واپس چلے گئے۔ لیکن مکہ سے ساتھ چلنے والے ساتھی آپ کے ساتھ ہی رہے۔

شراف سے آگے آپ کا سامنا حُر بن یزید تمیمی کے دستہ سے ہوا۔ جو ابن زیاد کے حکم کے مطابق آپ کو کوفہ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ آپ نے اس لشکر سے خطاب کیا۔ "میں آپ لوگوں کے پیغامات کے جواب میں آیا ہوں" حُرؓ اور اس کے ساتھیوں نے اس معاملہ سے لاعلمی ظاہر کی۔ آپ نے کوفہ کے لوگوں کے خطوط ان کے سامنے رکھے، آپ نے انہیں آگاہ کیا "ہم اہل بیت، خلافت کے لیے ان جھوٹے دعوے داروں سے زیادہ حقدار ہیں۔"

اگر آپ لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں تو ہمیں واپس جانے دیں۔

حُر اس میں مانع ہوا اور کہا۔ "مجھے یہ حکم ملا ہے کہ آپ کو ابن زیاد کے سامنے کوفہ میں پیش کروں۔ مجھے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کوفہ یا مدینہ میں سے کوئی راہ اختیار کر لیں تاکہ اللہ تعالیٰ کوئی عافیت کی راہ نکالے اور میں اس آزمائش میں پورا اتروں"۔ حضرت حسینؓ نے قادسیہ کا راستہ چھوڑ دیا۔ حُر آپؓ کے پیچھے چلتا رہا۔ نینوی کے مقام پہ حُرؓ کو ابن زیاد کا یہ پیغام ملا کہ حسینؓ کے قافلہ کو ایسی جگہ اتارو جہاں نہ قلعہ ہو اور نہ پانی۔ حضرت حسینؓ جمعرات کے دن ۲ محرم ۶۱ھ کو کربلا کے میدان میں اترے۔

۳ محرم کو عمر بن سعد بن ابی وقاص، ابن زیاد کی طرف سے چار ہزار کے لشکر کے ہمراہ مقابلے کے لیے آیا۔ حضرت حسینؓ نے عمرؓ سے کہا کہ ہم کوفہ والوں کے بلانے پہ یہاں آئے ہیں۔ اگر کوفہ والے ہمارا یہاں آنا پسند نہیں کرتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ عمرؓ نے ابن زیاد کو اطلاع کی۔ اس نے حضرت حسینؓ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کرنے کا حکم دیا اور مزید کہا کہ حسینؓ کے ساتھیوں پہ دریا کا پانی بند کر دیا جائے۔

اسی دوران حضرت حسینؓ نے عمر بن سعد سے تین چار ملاقاتیں کیں اور اس سے کہا کہ یا تو مجھے واپس جانے دیا جائے یا اپنے حال پر چھوڑ دیں تاکہ کہیں اور چلا جاؤں اور حالات کا مشاہدہ کروں۔ عمرؓ نے دوبارہ ابن زیاد کو آگاہ کیا۔ ابن زیاد یہ باتیں ماننے کو تیار تھا لیکن شمر ذی الجوشن رکاوٹ بنا۔ شمر نے تجویز دی کہ حسینؓ کے ساتھ اس بات پر تصفیہ کرو کہ وہ خود کو تمہارے (ابن زیاد) کے سپرد کر دیں اور تم جو چاہو، کرو۔ ابن زیاد نے عمر کو شمر کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ حسین سے بیعت حاصل کرو ورنہ جنگ کر کے انھیں قتل کر دو، اور اگر تمہیں اس حکم کی تعمیل سے انکار ہو تو کمان شمر کے حوالے کر دو۔

۹ محرم کو عمر بن سعد جنگ کے لیے آگے بڑھا لیکن حضرت حسینؓ کے کہنے پہ اگلے دن کے لیے جنگ ملتوی کر دی گئی۔ رات حضرت حسینؓ نے اپنے ساتھیوں کو خطاب کیا۔ "تمہیں میری طرف سے آزادی ہے کہ واپس چلے جاؤ کیونکہ یہ لوگ میری جان کے درپے ہیں"۔ آپؓ کے ساتھیوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

اگلی صبح نمازِ فجر کے وقت حضرت حسین نے اپنے مختصر ساتھیوں کی صف بندی کی۔ جنگ کے آغاز پر حُر آپؓ کے ساتھ آ ملا۔ فریقین میں سخت مقابلہ ہوا۔ حسینؓ کے ساتھی جو مختصر تھے، نہایت جانبازی سے لڑے۔ رفتہ رفتہ آپؓ کے جانثار قربان ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت حسین تنہا رہ گئے۔ آپ نے تنہا مخالف لشکر کا مقابلہ کیا۔ مخالفین نے بچوں تک کو معاف نہ کیا اور حضرت حسینؓ کا شیر خوار بچہ بھی ایک تیر سے شہید ہوا۔

بالآخر حضرت حسینؓ بھی گر پڑے۔ آپ کا سر کاٹ لیا گیا اور مقتولین کے شہداء کے سر بھی ابن زیاد کے پاس لے جائے گئے اور مستورات کو کوفہ پہنچایا گیا۔ ابن زیاد نے حسینؓ کا سر اور قیدی خواتین کو یزید کے پاس دمشق بھیج دیا۔

ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ جب یزید نے حضرت حسین کا سر دیکھا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا میں نے تو صرف بیعت لینے کے لیے کہا تھا ان کا سر نہیں مانگا تھا۔ اس نے خاندانِ رسولؐ کی خواتین کو نہایت عزت و احترام سے اپنا مہمان ٹھہرایا اور اس کے بعد بحفاظت مدینہ منورہ پہنچا دیا۔

واقعہ کربلا کے متعلق عمومی طور پہ مؤرخین کی یہ رائے ہے کہ حضرت علیؓ خلفائے راشدین میں سے آخری خلیفہ تھے ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اسلامی خلافت کے صحیح حقدار تھے۔ اور حضرت علیؓ کے دور میں حضرت معاویہؓ کے دعوئے خلافت نے اُمتِ مسلمہ کے اتحاد میں انتشار کا پہلا بیج بویا۔ صحابہ کرام بھی ان دونوں عالی مرتبت صحابۂ رسولؐ یعنی حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان نزاعی مسئلہ میں تقسیم ہو گئے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے بیٹے حضرت حسنؓ نے اُمت کو انتشار سے بچانے کے لیے حضرت معاویہؓ سے مفاہمت کر لی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے انتقال سے قبل اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت حاصل کر دی تھی کہ وہ اُن کے بعد خلیفہ بنے۔

اہل بیعت کا ایک گروہ حضرت حسنؓ کی پالیسی پہ خاموش رہا اور حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد وہی گروہ خود کو خلافت کا حقدار سمجھتے ہوئے سامنے آیا اور حضرت حسینؓ اس کی قیادت کرتے تھے۔ یزید کو اس وجہ سے خلافت کا اہل نہ سمجھا گیا کہ وہ ان کے مطابق فاسق و فاجر اور عیاش تھا۔

بعض مؤرخین نے یہ رائے بھی پیش کی ہے کہ یزید سے بیعت حضرت معاویہؓ کی اپنی زندگی میں بیعت لینے کے مسئلہ پہ تو اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یزید پہ بدکاری، عیاشی

اور فسق کا الزام لگانا صحیح نہیں۔ یزید کا رشتہ میں حضرت حسینؓ سے ایک تعلق تھا اور ایک روایت کے مطابق حضرت حسینؓ کی بھانجی، یزید کے نکاح میں تھیں اور جب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کرلی تھی اور حضرت معاویہؓ نے دونوں بھائیوں (حسنؓ اور حسینؓ) کے لیے وظائف مقرر کیے ہوئے تھے۔ دونوں بھائی کئی معرکوں میں ان کی اطاعت میں حصّہ لیتے رہے۔ تو خلافت پر ان حضرات کا دعوےٰ صحیح نہیں کیونکہ حضرت حسنؓ تو خلافت کے دعوے سے دستبردار ہو گئے تھے۔

ایک تاریخی روایت کے مطابق یزید کے کردار کے متعلق یہ بات پیش کی گئی ہے کہ وہ اس لشکر کا سپہ سالار تھا جس میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بھی شریک تھے۔ جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔ نبی کریمؐ کی ایک حدیث مبارکہ کے مطابق قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکر کے لیے مغفرت کی بشارت دی گئی تھی۔ یہی مورخین یزید کو حسینؓ کے قتل کے سانحہ سے بری سمجھتے ہیں کیونکہ اس معاملہ میں شدّت اس کے اہلکاروں ابن زیاد اور شمر نے اختیار کرلی۔ ورنہ یزید کا ارادہ تو صرف بیعت لینے کا تھا۔

المختصر کربلا کے اس حادثہ نے امّت مسلمہ میں دو مستقل گروہ قائم کر دیے جن میں سے ایک گروہ اہلِ بیت سے عقیدت میں شدّت رکھتا ہے اور وہ خود کو شیعانِ علی کہلاتے ہیں۔ عمومی اصطلاح میں شیعہ فرقہ جو محرّم کے دس ابتدائی ایام میں ہر سال خصوصی طور پر سوگ مناتے ہیں۔ دوسرا گروہ اہلِ سنت والجماعت کا ہے جو اہلِ بیت سے عقیدت تو رکھتا ہے اور واقعہ کربلا میں بھی اکابرینِ ملّت کی ایک اجتہادی غلطی تصوّر کرتا ہے۔

کرد، علی محمد۔ (۱۸۷۶ء - ۱۹۵۳ء)

مشہور مؤرخ، ادیب، دمشق کی علمی اکیڈمی کا بانی اور سربراہ ۔ ۱۹۰۸ء میں رسالہ "المقتبس" جاری کیا۔ تصنیفات میں "تاریخ احمد بن طولون" "فلاسفة الاسلام المذاکرات اور "خطط الشام" مشہور ہیں۔

کرمانی، حمیدالدّین احمد۔ (وفات، ۱۰۲۱ء)

فاطمی خلیفہ بامر اللہ کے عہد میں اسماعیلی عقائد کا داعی۔ اس کی تصنیف "راحت العقل" میں دنیا کے فلاسفہ کے نظریات اور "عقولِ عشرہ" کے فلسفیانہ نظریات پر مباحث ہیں۔

کرمانی، شیخ داؤد قادریؒ (وفات ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء)

آپ کرمان کے سادات خاندان سے متعلق تھے۔ والد کا نام سید فتح اللہ خانؒ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؒ سے ملتا ہے۔ آپ کے بزرگ عرب سے ہجرت کرکے ملتان آئے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار ملتان کے قریب ہیبت پور میں مقیم ہوئے پھر وہاں سے چونی والی میں منتقل ہو گئے۔ شیخ داؤد کرمانی نے ابتدائی تعلیم اسی قصبہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آئے اور یہاں کے مشہور شاعر اور عالم مولانا جامی کے ایک مشہور شاگرد مولانا اسماعیل سے ظاہری علوم میں تکمیل کی اور پھر جلد ہی علوم باطنی کی طرف راغب ہو گئے، اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اویسی طریقہ میں فیض حاصل کیا اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں شیخ عبدالقادر ثانیؒ اوچی کے پوتے سید حامد گنج بخش قادری سے بیعت کی۔ بیعت کے بعد آپ نے بڑی بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ مجاہدات کی تکمیل کے بعد آپ نے مستقل طور پر شیر گڑھ ضلع ساہیوال میں اقامت اختیار کی۔

آپ کو شریعتِ محمدیہؐ کا اس قدر احساس و احترام تھا کہ قرآن و حدیث کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ آپ کے خلفاء میں مولانا جمال الدّین معروف بہ شیخ بہلول دہلویؒ، شاہ ابوالمعالی لاہوریؒ اور شاہ ابو اسحاق قادریؒ بہت مشہور ہیں۔

کرم شاہ، پیر (یکم جولائی ۱۹۱۸ء ۔۔۔) عالمِ دین، ادیب، مصنف، مدرس

بھیرہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب شیخ الاسلام بہاءالحق والدین ابومحمد زکریا سہروردی ملتانی سے ملتا ہے۔ تقریباً تین سو سال قبل حضرت شیخ الاسلام کے خاندان ممتاز فرد پیر فتح شاہ بھیرہ میں تشریف لائے۔ ان کا روشن کیا ہوا چراغ ہدایت پیر محمد شاہ اور پھر ان کے فرزند پیر کرم شاہ تک پہنچا۔ آپ کے والد پیر محمد شاہ نے تحریک پاکستان میں گرمجوشی سے حصّہ لیا۔ آزادی کشمیر کی جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

علامہ پیر کرم شاہ نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ میں حاصل کیا۔ دورۂ حدیث کے لئے مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے ۱۹۴۳ء میں دستار فضیلت سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء میں آپ جامعہ ازہر (مصر) تشریف لے گئے۔ وہاں تین سال کے قیام کے بعد جامعہ کی اعلیٰ سندات حاصل کیں۔ جامعہ ازہر سے فراغت کے بعد آپ وطن واپس لوٹے اور دارالعلوم محمدیہ رضویہ، بھیرہ میں تدریس شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ "ضیائے حرم" جاری کیا جو اپنے علمی و تحقیقی مضامین کے باعث خاص و عام میں مقبول ہے۔ پیر کرم شاہ بچپن خواجہ ضیاءالدین سیالوی اور تحصیل علوم سے فراغت کے بعد خواجہ قمرالدین سیالوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور خلافت سے مشرف ہوئے۔

کرمی بن یوسف المقدسی۔ (وفات ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ء)

حنبلی فقہ کا ایک مجتہد اور فقیہہ۔ طول کرم (فلسطین) میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں انتقال ہوا۔

کرمی کی تصانیف میں "دلیل الطالب فی فقہ الحنابلۃ" اور "بدیع الانشاءات والصفات فی المکاتبات والمراسلات" زیادہ معروف ہیں۔

کرُنی، خواجہ مؤیدالدّین۔ (ولادت ۶۶۸ھ وفات ۷۲۶ھ)

ابتدائی زندگی میں دنیاوی کاموں میں مشغول رہے۔ علاؤ الدین خلجی جب کرہ کا حاکم تھا تو اس کے مصاحبین میں سے تھے۔ بعد میں شیخ نظام الدّین اولیاؒ سے بیعت ہوئے اور دنیاوی امور سے الگ ہوکر اپنی زندگی دینی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

جب علاؤ الدین خلجی سریرآرائے سلطنت ہوا تو اس نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ذریعے دوبارہ خواجہ کرنیؒ کو اپنے ساتھ وابستہ رکھنے کی کوشش کی لیکن شیخؒ نے اجازت نہ دی۔ خواجہ کرنیؒ کا مزار، شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مزار (دہلی) کی پائیں میں ہے۔

کسائیؒ، ابوالحسن علی۔ (وفات ۸۰۵ء) کوفہ میں پیدا ہوا۔ مختلف

مقامات پر تعلیم حاصل کی۔ والد کا نام حمزہ ہے۔ سبعہ قرات کے آئمہ میں سے ایک مشہور امام۔ کوفی مذہب کے نحویوں کا بھی امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابتدائی زندگی میں عربی ادب کے ذوق کو پختہ کرنے کے لیے دیہاتی زندگی اختیار کی۔ ہارون الرشید نے اپنے بیٹوں مامون اور امین کا اتالیق مقرر کیا۔ رے کے قریب وفات پائی۔ "فی ما یلحن فیہ العامۃ"، مشہور رسالہ تصنیف کیا۔

کسب

۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاح مختلف مقامات پر کئی معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ اکثر مقامات پر انسانی اعمال و افعال کو "کسب" کہا گیا ہے۔

" انسان نے جو کچھ کمایا ہے اسی کے مطابق اسے بدلہ ملے گا۔" یعنی انسان نے جیسے اعمال کیے ہیں ویسا ہی اسے بدلہ دیا جائے گا۔

ایک مقام پر انسان کی حیرانگی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جبکہ وہ اپنی توقعات کے خلاف نتائج دیکھے گا۔ "یہ جو کچھ بھی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے۔"

کسریٰ۔ فارس کے ساسانی دَور کے بادشاہوں کو "کسریٰ" کہا جاتا تھا جیسے روم کے بادشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔ کسریٰ بادشاہوں کی حکمرانی فارس میں اسلام کی آمد سے پہلے رہی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دَور میں فارس پر مسلمانوں کے مکمل قبضے کے بعد ان حکمرانوں کے دَور کا خاتمہ ہو گیا۔

کسریٰ بادشاہوں میں نوشیرواں اور طہماسپ زیادہ مشہور ہوئے۔

کسکر، جنگ۔ حضرت عمر فاروقؓ کے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی ۱۳ھ میں ایک لشکر ابو عبید ثقفی کی قیادت میں عراق کے لیے روانہ ہوا۔ ادھر ایرانی، مسلمانوں کے خلاف ایک بھرپور کی جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حیرہ میں مسلمانوں کے ایک لشکر سے ایرانی شکست کھانے کے بعد اپنے دوسرے لشکر کے پاس کسکر میں پہنچے جو سپہ سالار فارسی کی قیادت میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ ایرانیوں کے سپہ سالار اعظم رستم نے ایرانیوں کے لیے مزید کمک بھی بھیج دی۔

مسلمانوں کا لشکر ابو عبید کی قیادت میں ایرانیوں کے لشکر سے ٹکرا گیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ایرانیوں کو شکست ہوئی اور اُن کے سپہ سالار نے راہِ فرار اختیار کی۔ اپنے سپہ سالار کو پسپا ہوتے دیکھ کر فوج بھی بھاگ گئی۔ اس طرح سے یہ میدان بھی مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

کسوف وخسوف عرف میں اکثر سورج گرہن کو کسوف اور چاند گرہن کو خسوف کہتے ہیں۔ ان کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ستارے دو قسم کے ہوتے ہیں، ثوابت وسیّار۔ جو ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ثوابت ہیں اور جو حرکت کرتے ہیں وہ سیّار۔

ثوابت میں سے ایک ہمارا آفتاب بھی ہے۔ آفتاب کا طلوع وغروب اس کی حرکت سے نہیں ہے بلکہ زہرہ، مشتری، عطارد، زحل، مریخ اور زمین۔ یہ سیارے اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے گرد گھومتے ہیں۔ زمین بھی ایک سیارہ ہے متحرک اور جس طرح ریل اور کشتی کے سوار کو درخت اور مکانات اور دوسری ٹھہری ہوئی چیزیں نظر کی غلطی سے چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح اصل میں زمین چلتی ہے اور اس کی وجہ سے بنظرِ ظاہر آفتاب چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے حالانکہ آفتاب ساکن ہے۔ پھر جو سیارے آفتاب کے ساتھ وابستہ ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کے ساتھ اور چھوٹے سیارے وابستہ ہیں جو چاند کہلاتے ہیں۔ مثلاً مشتری سیارہ ہے اس کے گرد آٹھ چاند گھوم رہے ہیں۔ زمین سیارہ ہے اس کے گرداگرد ہمارا چاند گردش کرتا ہے۔

آفتاب اپنی ذات سے روشن ہے اور چاند زمین کی طرح تاریک ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں آفتاب کی دھوپ پڑتی ہے اسی طرح چاند پر بھی دھوپ پڑتی ہے اور اسی کا نام نورِ قمر ہے۔

گردش کرتے ہوئے جب چاند زمین اور آفتاب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے تو سورج گرہن ہو جاتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کرۂ قمر نے نورِ آفتاب کو زمین تک پہنچنے سے روک دیا۔ سورج گرہن کے وقت آفتاب سے نور سلب نہیں ہوتا بلکہ چاند کے آڑے آ جانے کی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچ پاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آفتاب تاریک ہو گیا۔ چاند گرہن اس وقت ہوتا ہے جب زمین، آفتاب اور چاند کے درمیان حائل ہو۔ بہرکیف یہ انقلاب جو اجرامِ فلکی کی حالت میں کبھی کبھی واقع ہوتا ہے خدا کی قدرت کی بڑی زبردست نشانی ہے۔ لوگ اسے مقدمۂ آفت سمجھتے ہیں اور یہ نجومیوں کے اوہام ہیں۔

جنابِ رسولِ خداؐ جو گرہن کے وقت خدا کی طرف رجوع کرتے تھے وہ کسی وہم کے سبب سے نہ تھا بلکہ خدا کی عظمت کا خیال کر کے مصروفِ عبادت ہو جاتے تھے

کِسْوَہ پہننے کے کپڑے۔ پوشاک۔

کعبہ کے غلاف کو بھی کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں اور ان کے بعد کعبہ کی دیواریں ویسی ہی دکھائی دیتی تھیں جیسی کہ بنی تھیں۔ مگر سنِ عیسوی سے چھ سو برس پہلے اسعد حمیری نے کعبہ کی پوشاک پر غلاف چڑھایا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کعبہ کو کپڑا پہنا رہا ہے تو اس نے انطاع کا غلاف چڑھایا۔ مگر پھر اس نے وہی خواب دیکھا تب اس نے یمن کے کپڑے کا جو عمدہ ہوتا تھا غلاف چڑھا دیا، اور کعبہ میں چوکھٹ کو کواڑ لگایا۔ تب سے کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم جاری ہو گئی۔ اور جس کے قبضۂ اقتدار میں کعبہ رہتا وہ ہر سال پرانے غلاف پر نیا چڑھاتا اور اس طرح کپڑے کی کئی تہیں چڑھ گئیں جس کے سبب کئی دفعہ آگ لگ کر خانہ کعبہ جل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابن زبیرؓ کے وقت تک پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کا دستور تھا اور اسی سبب سے ان کے عہد میں بھی کعبہ کو آگ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کی رسم جاتی رہی۔ بلکہ ہر سال پرانا غلاف اتار کر نیا چڑھایا جاتا ہے اور کعبہ کے خادم پرانے غلاف کے ٹکڑے بطورِ تبرک تقسیم کرتے ہیں۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ زمانۂ اسلام میں بھی کعبہ پر غلاف چڑھتا رہا [illegible] کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آنحضرتؐ اور ابوبکر صدیقؓ نے یمن کے کپڑے کا [illegible] عمدہ ہوتا ہے کعبہ کو غلاف چڑھایا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ نے [illegible] کپڑے کا پھر دیباج کے کپڑے کا غلاف چڑھایا۔ [illegible] خلفائے بنی امیہ وبنی عباس [illegible] عہد میں [illegible] بڑا اہتمام رہا۔ زمانۂ حال میں [illegible] بہت عمدہ غلاف سیاہ رنگ کا چڑھایا جاتا رہا جس میں [illegible] خوشخط بنی ہوئی ہوتی ہیں اور غلاف کے درمیان [illegible] زرین پٹکا ہوتا ہے اور اس میں بھی آیاتِ قرآنی بنی ہوئی [illegible]

اسلام کی رو سے اس پر جو کچھ بحث ہو سکتی ہے وہ [illegible] کی دو صورتیں ہیں۔ [illegible] تو یہ کعبہ کی پرستش کے لیے [illegible] آرائش کے لیے۔ پہلی صورت میں تو [illegible] اس کا کچھ منشا نہیں کیونکہ [illegible] کعبہ [illegible] مگر چونکہ خانہ کعبہ ایک نہایت قدیم مسجد ہے اور [illegible] ہے جس نے سب سے اوّل یہ کہا [illegible] لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا [illegible] اس لیے [illegible] سب سے پہلے خدا کی پرستش کی نشانی ہے۔

کشّاف۔ ابو القاسم محمود بن عمر [illegible] تفسیرِ قرآن مجید [illegible]

'الکشاف عن حقائق التنزیل' ہے۔ جو زمخشری نے ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء میں مکمل کی۔ اس تفسیر کی چند خصوصیات ہیں۔ اوّل اس میں مفسر نے عقائد کی فلسفیانہ تعبیر کی ہے۔ دوم اس میں خالص نحوی تشریحات کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قرآن کے ادبی محاسن کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ سوم اس میں زمخشری نے لغوی پہلو کا خاص خیال رکھا ہے اور قرأت کی پوری پوری تحقیق کی ہے اور اپنی تشریحات کی تائید میں قدیم عربی شاعری کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔ چہارم، تفسیر قرآن میں احادیث سے کم استفادہ کرتا ہے۔

معتزلہ عقائد کا پیروکار ہونے کے باوجود علماء میں یہ تفسیر اپنے ادبی اور نحوی (گرامر) کے پہلو کی وجہ سے مستند تسلیم کی جاتی ہے۔

کشف ۔ تصوّف کی ایک اصطلاح، یعنی پوشیدہ شے کو دیکھنا یا کسی پوشیدہ شے کا ظاہر ہونا۔ صوفیاء نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) محاضرہ۔ جس میں عقل ایک ذریعہ ہے برہان (ثبوت) کے لیے۔

(۲) مکاشفہ۔ جس میں علم ذریعہ ہے بیان کے لیے۔

(۳) مشاہدہ۔ جس میں ایک شخص معرفت کے ذریعے ذاتی تجربہ حاصل کرتا ہے

پہلی قسم سے اصحاب العقل، علم الیقین حاصل کرتے ہیں۔

دوسری قسم سے اصحاب العلوم، عین الیقین حاصل کرتے ہیں۔

تیسری قسم، مشاہدہ ہے۔ اصحاب المعرفہ، حق الیقین حاصل کرتے ہیں۔

اس حق الیقین کی کیفیت میں اصحاب المعرفہ جو چیزیں بیان کرتے ہیں وہ تصوّف کی اصطلاح میں کشف ہے۔ یہ مرتبہ صرف اصحاب المعرفہ کو ہی حاصل ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اس طرح دیکھتے ہیں گویا انہوں نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہو۔ اس کو معائنہ اور مشاہدہ بھی کہتے ہیں۔

کشف الظنون ۔ علامہ ملا کاتب چلبی (متوفی ۱۰۶۷ھ) کی عربی زبان میں ایک تصنیف۔ اس کا پورا نام 'کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون' ہے۔ اس میں کئی بڑی تصانیف کے متعلق معلومات دی گئی ہیں اور مختلف علوم و فنون کے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

کشف الغمہ عن جمیع الامتہ ۔ امام عبدالوہاب شعرانی کی تصنیف ہے۔ دو جلدوں اور ۲۳۹ فصول پر مشتمل عربی زبان میں نبی کریم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں مختلف فقہی مسائل پر مشتمل یہ فقہ کی کتاب ہے۔ اس کا جو نسخہ مصر سے شائع کیا گیا ہے اس پر امام محمد بن یعقوب الفیروز آبادی صاحب القاموس کی کتاب "سفر السعادۃ" سے حاشیہ دیا گیا ہے۔

کشف المحجوب ۔ شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کی تصنیف ہے۔ اُردو زبان میں اس کتاب کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ مشائخ اور علماء کے ہاں یہ کتاب تصوّف کے موضوع پر مستند اور ماخذ کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے چونتیس باب ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے ذیل میں کئی فصلیں ہیں۔

تیسرے باب میں تصوّف کی تعریف اور اس کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

ساتویں باب میں تصوّف کی نسبت سے خلفائے راشدینؓ کا ذکر ہے۔

آٹھواں باب، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدینؓ، محمد باقرؒ، اور جعفر صادقؒ کے اذکار پر مشتمل ہے۔

نویں باب میں صحابہ کرامؓ میں سے اصحابِ صفہؓ کا ذکر ہے۔

دسواں باب، تابعین میں سے حضرت اویس قرنیؒ، ہرم بن حیانؒ، حسن بصریؒ، اور سعید بن المسیّبؒ کے تفصیلی احوال پر مشتمل ہے۔

گیارہواں باب جو ۴۴ طویل فصلوں پر مشتمل ہے اور تبع تابعین میں سے ۴۴ صوفیا اور اکابر کے احوال پر مشتمل ہے جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ امام عبداللہ ابن مبارکؒ، حضرت فیض بن عباسؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ، حضرت ابراہیم بن ادہمؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت سری سقطیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ جیسے اکابر کا تفصیلی ذکر ہے۔

بارہواں باب صوفیا کے متاخرین کے اماموں اور تیرھواں باب مختلف علاقوں کے متاخرین صوفیاء کرام کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

چودھویں باب میں صوفیا کے مختلف فرقوں کے احوال، اُن کے عقائد و افکار کے احوال پر مشتمل ہے۔

بعد کے ابواب میں تصوّف کی مختلف اصطلاحوں، سلسلہ تصوّف کی اندرونی کیفیات اور ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

شیخ علی ہجویریؒ کا مزار لاہور میں ہے اور عالمِ اسلام میں اپنی کرامات اور دین کے لیے جدّوجہد اور دعوت و تبلیغ کے منفرد انداز کی وجہ سے مشہور ہیں۔

کشمیر ۔ رقبہ تقریباً ۸۴ ہزار مربع میل۔ آبادی ۵۰ لاکھ سے زائد۔ سرکاری نام جموں اور کشمیر۔ اس وقت یہ دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک وہ حصّہ جس پر بھارت کا قبضہ ہے مقبوضہ کشمیر کہلاتا ہے۔ اور اسی حصّہ میں سری نگر اور جموّں کے علاقے ہیں دوسرا حصّہ آزاد کشمیر ہے جو ۱۹۴۸ء میں مجاہدینِ کشمیر نے ہندوستانی فوجوں سے آزاد کرایا، اور اس پر اپنی حکومت قائم کی۔ مقبوضہ کشمیر کا دارالحکومت سرینگر ہے اور اس کا رقبہ ۵۸ ہزار مربع میل ہے۔ آزاد کشمیر کا رقبہ ۲۵ ہزار مربع میل ہے اور اس کا دارالحکومت مظفر آباد ہے۔

یہ متنازعہ ریاست، بھارت کے شمال مغرب اور پاکستان کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ کشمیر کے جنوب اور مغرب کی طرف پاکستان، شمال کی طرف چین اور افغانستان اور مشرق کی طرف تبّت کا علاقہ ہے۔

تقسیم ہند کے وقت معاہدہ کے تحت اس ریاست کا الحاق مسلمانوں کی نئی مملکت پاکستان سے ہونا تھا لیکن ہندوؤں نے وہاں کے راجہ سے مل بھگت کرکے کشمیر کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدینِ کشمیر نے ہندوستان کے اس غاصبانہ قبضہ کے خلاف جہاد کیا اور ایک حصّے کو آزاد کرا لیا۔

کشمیر حسن و خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس میں بلند و بالا پہاڑوں کے کئی سلسلے ہیں جن میں کوہ ہمالیہ اور کوہ قراقرم قابلِ ذکر ہیں۔ دریا جہلم سری نگر سے ہوتا ہوا پاکستان کے علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ دریائے سندھ بھی کشمیر کے راستے پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ حال ہی میں کشمیر کے ایک بلند بالا پہاڑ "قراقرم" میں پاکستان نے چین کی مدد سے ایک تجارتی شاہراہِ قراقرم کی تکمیل کی ہے۔

موسمی لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر کی آب و ہوا بہت تغیر پذیر ہے۔ بعض حصوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور بعض میں سخت گرمی۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ زرخیز ہے۔ یہاں گندم کی اور چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ علاقہ اپنی دستکاریوں کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ یہاں کی شالیں اور گرم کپڑا بہت مشہور ہے۔

رقبے کے لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر، برعظیم پاک و ہند کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے جموں و کشمیر پر تقریبًا چار ہزار سال تک حکومت کی ہے۔

۱۳۱۰ء سے لے کر ۱۵۵۳ء تک علاقائی مسلمان بادشاہ کشمیر کے حکمران رہے۔ ۱۵۱۵ء سے ۱۷۱۸ء تک مغل بادشاہوں نے کشمیر پر حکومت کی جبکہ ۱۷۱۸ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک افغان گورنر یہاں حکمران رہے۔ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء کے دوران سکھوں نے ریاست پر حکومت کی۔ ۱۸۴۶ء میں حکومت برطانیہ نے ریاست کو اپنے دائرۂ اختیار میں شامل کر لیا۔ نومبر ۱۸۴۶ء مہاراجہ گلاب سنگھ نے برطانوی فوج کی مدد سے ریاست پر قبضہ کر لیا۔

کشمیر میں مسلمانوں کی ۵۰۰ سالہ حکمرانی کے عرصے میں کشمیری باشندوں کی اکثریت نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا۔ اس میں سید علی ہمدانی کا منفرد کردار ہے جو شاہ ہمدان کے نام سے کشمیریوں میں مشہور ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت یہاں کے ہندو راجہ ہری سنگھ مسلمان مجاہدین کے حملوں کے خوف سے دہلی چلا گیا۔ اور وہاں اس نے انڈین حکومت کو ریاست پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ ہندو فوجیں طیاروں کے ذریعے سری نگر اتریں۔ مسلمان مجاہدین سے ان کی جنگ ایک طویل عرصہ تک ہوتی رہی۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں اقوام متحدہ کی مداخلت سے جنگ بند ہوئی اور اب تک اس متنازعہ علاقے کی وجہ سے بھارت اور پاکستان میں کافی چپقلش چلی آ رہی ہے اور ۱۹۶۵ء میں کشمیر سے ہی پاکستان اور بھارت کی جنگ کا آغاز ہوا تھا۔

۲۰ جون ۱۹۴۹ء کو مہاراجہ ہری سنگھ تخت سے دستبردار ہو گیا۔ اس کا بیٹا کرن سنگھ مقبوضہ کشمیر کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کے ایک لیڈر نے مسلم مفاد کے خلاف کام کیا اور مختلف مواقع پر بھارت کی حمایت کرتے رہے۔ وہ دو دفعہ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم مقرر کیے گئے۔ اس وقت بھی وہ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم ہیں۔ بھارت نے اپنے آئین میں ترمیم کر کے مقبوضہ کشمیر کو اپنے ایک صوبے کا درجہ دے دیا ہے۔

مسلمان مجاہدین کی کوششوں سے آزاد کردہ علاقہ میں آزاد حکومت قائم کی گئی جس کے پہلے سربراہ سردار محمد ابراہیم مقرر کیے گئے۔ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے چوہدری غلام عباس، سردار عبدالقیوم اور سردار محمد ابراہیم کی قیادت میں آزادئ کشمیر کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ امید ہے جلد ہی مسلمانان کشمیر اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور مقبوضہ علاقے، ہندوستان سے حاصل کر کے تحریک پاکستان کے دوران کیے گئے معاہدے کے مطابق پوری ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر دیا جائے گا۔

کشمیریؒ، محمد انور شاہ، علامہ، محدّث۔

(ولادت ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء، وفات ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)

آپ نے ساڑھے چار برس کی عمر میں اپنے والد کرم سید محمد معظمؒ سے قرآن پاک کی تعلیم شروع کی۔ چودہ سال کی عمر میں حصول علم کی خاطر سرحد کا سفر کیا۔ تین سال تک آپ ہزارہ (سرحد) میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور آپؒ کو جید علماء اور صلحا کی سرپرستی حاصل رہی۔ سترہ سال کی عمر میں آپؒ نے دارالعلوم دیوبند اور مشاہیر علماء اور نامور اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ۱۳۱۲ھ میں جبکہ آپ کی عمر ۲۰ برس کے لگ بھگ تھی سند فراغت حاصل کی۔ آپ کے نامور اساتذہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا محمد اسحاق امرتسریؒ اور مولانا غلام رسول ہزارویؒ۔ دماغی اور ذہنی تربیت کے بعد آپ نے روحانی پیاس کی تسکین کے لیے گنگوہ کا رخ کیا اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے فیض باطنی حاصل کیے۔ بعد ازاں آپ دہلی گئے اور وہاں مدرسہ امینیہ میں بطور مدرس اور صدر مدرس کام کیا۔ دہلی میں چار سال قیام کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر کشمیر جانا پڑا اور وہاں سے بعض احباب کی رفاقت میں زیارت حرمین شریفین کے لیے سفر اختیار کیا۔ سفر حج سے واپسی پر کشمیر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور تین سال تک اس کا انتظام آپ کے ہاتھ میں رہا اور تدریس و تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے لوگوں کی اخلاقی تربیت بھی پورے ذوق و انہماک کے ساتھ کی۔ اسی اثنا میں دارالعلوم دیوبند سے تقاضے آنے شروع ہو گئے اور آپؒ نے دیوبند میں بطور مدرس کام شروع کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ تک آپ دیوبند میں آپ مختلف مناصب پر فائز رہ کر علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد کچھ اختلافات کی بنا پر آپ نے دارالعلوم سے قطع تعلق کر لیا اور مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور دیگر علماء و طلباء کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل منتقل ہو گئے اور ادھر تک جامع میں بطور شیخ الحدیث کام کیا۔

تبحر علمی

آپؒ کو اللہ تعالیٰ نے ان علمی و عملی کمالات سے نوازا۔ علوم شرعیہ و عقلیہ میں کوئی ایک ایسا شعبہ نہیں جس پر آپؒ کو کامل دسترس حاصل نہ ہو۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے آپؒ کی یاد میں منعقدہ تعزیتی جلسہ سے خطاب کے دوران کہا "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین بن عبدالسلامؒ کو دیکھا ہے تو میں استعارۃً کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے۔ کیونکہ زمانے کا تقدم و تاخر ہے ورنہ حضرت شاہ صاحب ان سے کسی صورت کم نہیں۔"

علامہ اقبالؒ نے لاہور میں آپؒ کی وفات کے سلسلہ میں تعزیتی جلسہ میں یوں خراج عقیدت پیش کیا:

"اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔"

آپ نے ۱۳۴۶ھ میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مرتضیٰ حسنؒ، مولانا قاری محمد طیب، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور مولانا محمد ادریسؒ اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات کو ساتھ لے کر پنجاب کا ایک بھرپور دورہ کیا اور مرزائیت کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ اس دورہ کے علاوہ بھی آپ نے متعدد مباحثوں اور مناظروں میں شرکت کی۔

۱۹۲۶ء میں ایک مسلمان عورت نے بہاولپور کی ایک عدالت میں دعویٰ کیا کہ اس کا شوہر مرزائی ہو چکا ہے لہٰذا عدالت اس کا نکاح فسخ کر دے۔ سات سال تک مقدمہ تحصیل عدالتوں میں چلتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں حکومت برطانیہ نے حکم دیا کہ شہادتیں مکمل کر کے دوبارہ مقدمہ کی سماعت کی جائے۔ دوبارہ سماعت شروع ہوئی۔ بہاولپور کے مسلمانوں نے اہمیت کے پیش نظر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور شیخ الجامعہ بہاولپور کی سرپرستی میں متعدد مشاہیر علماء سے رابطہ قائم کیا۔ شاہ صاحبؒ ان دنوں ڈابھیل میں مدرس تھے۔ مگر ضعف و علالت کے باعث دیوبند میں فروکش تھے اور سفر کی مصروفیات کیسر ترک کر رکھی تھیں۔ مگر جب اس مسئلہ کا علم ہوا تو تمام مجبوریوں کو نظر انداز کر کے بہاولپور پہنچے۔ بہاولپور کی عدالت میں آپ کا بیان تین روز تک جاری رہا اور ۱۹۳۵ء میں مقدمہ کا فیصلہ مسلمان عورت کے حق میں ہو گیا۔

آپؒ اگرچہ اصلاً درس و تدریس کے میدان کے کامیاب شاہسوار تھے تاہم آپ نے لکھنے کا کام بھی کیا ہے اور یہ کام معمول کے کام کی طرح نہیں بلکہ جب ضرورت محسوس کی قلم اٹھا لیا اور جس مسئلہ کو لیا اس کا حق ادا کر دیا۔ چند مایہ ناز تصانیف یہ ہیں:

۱۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام ۔ (۲) تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰؑ ۔ (۳) المتصریح بما تواتر فی نزول المسیحؑ ۔ (۴) خاتم النبیینؐ (فارسی) (۵) اکفار الملحدین فی ضروریات الدین (۶) فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب (۷) خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب (فارسی) (۸) نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین (۹) کشف الستر عن صلاۃ الوتر (۱۰) ازالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العینین ۔ (۱۱) ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم ۔ (۱۲) مرقاۃ الطارم لحدوث العالم ۔ (۱۳) سہم الغیب فی کبد اہل الریب ۔

ان کتابوں کے علاوہ وہ تقریریں جو درس کے وقت املا کراتے تھے اور جنہیں آپؒ کے فاضل شاگردوں نے تحریر کیا ہے ۔ ان میں مشہور ترین تقریر "فیض الباری کے نام سے ہے ۔ جسے مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے قلمبند کیا ہے اور چار جلدوں میں شائع ہوئی یہ بخاری کی تقریر ہے ۔ اسی طرح مولانا محمد چراغ بانی جامعہ عربیہ گوجرانوالہ نے ترمذی کی تقریر "العرف الشذی" کے نام سے لکھی ۔ انوار المحمود فی شرح سنن ابوداؤدؒ جسے مولانا محمد صدیق نجیب آبادی نے منضبط کیا ۔ یہ دونوں کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں ۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی مرتبہ مسلم کی املائی شرح اور مولانا محمد ادریس سکروڈوی کا مرتبہ سنن ابوداؤد کا حاشیہ غیر مطبوعہ ہیں ۔

آپؒ کم و بیش ۱۸ سال دارالعلوم میں قیام پذیر رہے اور تقریباً دو ہزار طلبہ آپ سے مستفید ہوئے ۔ ان کی مکمل فہرست تو ناممکن ہے البتہ وہ لوگ جو اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں حیثیت کے مالک بنے اور علم و عمل کا نام روشن کیا ان میں سے چند یہ ہیں :

مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ۔ مولانا قاری محمد طیب، مہتمم دارالعلوم دیوبند ۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (النبی الخاتمؐ اور تدوین حدیث کے مصنف) ۔ مولانا حفظ الرحمٰن سوہارویؒ (قصص القرآن کے مصنف) ۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ (تفسیر معارف القرآن اور سینکڑوں دوسری کتابوں کے مصنف اور دارالعلوم کورنگی کراچی کے بانی) ۔ مولانا محمد ادریس کاندہلویؒ ۔ مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر "الفرقان" لکھنؤ اور مصنف "معارف حدیث") ۔ مولانا عتیق الرحمٰنؒ (بانی و ناظم ندوۃ المصنفین) ۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ (بانی مدرسہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی اور ۱۹۷۴ء میں ختم نبوت کی تحریک میں مجلس عمل کے صدر) ۔ مولانا شمس الحق افغانیؒ (رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان، اور سابق شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور) ۔ مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ (بانی جامعہ اشرفیہ، لاہور) ۔ مولانا مفتی محمد یوسفؒ (میرواعظ کشمیر) ۔ مولانا خواجہ عبدالحیؒ استاذ جامعہ ملیہ ۔ مولانا مفتی محمود صدر پاکستان قومی اتحاد ۔ مولانا محمد چراغ (گوجرانوالہ) غلام غوث ہزاروی ۔ مولانا غلام اللہ خاںؒ (راولپنڈی)

(اس مضمون کی تدوین و ترتیب میں "بیس بڑے مسلمان" از عبدالرشید ارشد سے مدد لی گئی ہے) ۔

کشناوی، محمد بن محمد الفُلّانی ۔ (وفات ۱۱۵۴ھ)

سوڈان میں مالکی مسلک کا فقیہہ ۔ کئی علوم کا متبحر عالم ۔ مکہؔ کے مجاور کی حیثیت سے شہرت پائی ۔ قاہرہ میں انتقال ہوا ۔ مشہور تصانیف "بلوغ الارب من کلام العرب" "بھجۃ الآفاق" و ایضاح اللبس والاغلاق فی علم الحروف والاوفاق" "الدر المنظوم و خلاصۃ السر المکتوم فی علوم الطلاسم والنجوم"

کعب بن الاحبار ۔ (ابو اسحٰق کعب بن مائع ۔ وفات ۳۲ھ)

روایت حدیث میں ممتاز ۔ اسلام لانے سے پہلے یہودیوں کے متبحر عالم تھے ۔ اسلام لانے کے بعد بھی ممتاز حیثیت حاصل کی ۔ حضرت عمرؓ کے دور میں کچھ عرصہ مدینہ میں مقیم رہے ۔ پھر شام کی طرف چلے گئے ۔ امیر معاویہؓ کے دور میں امور مملکت میں مشورے دیتے رہے ۔ حمص میں وفات پائی ۔

کعبؓ بن جماز ۔

کعبؓ بن جماز بن مالک ، انصاری صحابہ میں سے تھے جنگ بدر میں جوانمردی سے لڑتے ہوئے شہادت پائی ۔

کعبؓ بن زہیر ۔

کعب بن زہیر بن ابی سلمیٰ نے صحابۂ رسولؐ میں بحیثیت ایک نامور شاعر کے شہرت پائی ۔ آپ کے بھائی بجیر اور والد زہیر کا شمار بھی ممتاز شعرا میں ہوتا ہے ۔ زہیر اسلام کی طرف رغبت رکھتے تھے ۔ لیکن روایات کے مطابق اسلام قبول نہ کیا ۔

کعب ان شعرا سے تھا جو آنحضرتؐ کی ہجو میں اشعار لکھا کرتے تھے ۔ اس لیے فتح مکہ کے دن وہ بھی واجب القتل لوگوں میں شمار کیا گیا ۔ اس لیے بخوف جان وہ بھی اوروں کی طرح روپوش ہو گیا ۔ کعب کا بھائی بجیر تھا اس نے اپنے باپ زہیر سے سنا تھا کہ زمانہ بعثت پیغمبر آخر الزمان کا قریب ہے ۔ جب رسول اکرمؐ فتح مکہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے تو دونوں بھائی کعب اور بجیر مدینہ کو چلے ۔ جب وہ دونوں مقام البرق العزاف پر پہنچے تو بجیر نے کعب سے کہا تو یہاں ٹھہر ۔ میں اس مرد کو جا کر دیکھوں سنوں کیا کہتا ہے ۔ اور اس کے پاس کیا چیز ہے جس کے سبب سب لوگ اس کے گرویدہ ہوتے جاتے ہیں ۔ بجیر مدینہ منورہ کو آیا اور آنحضرتؐ کا کلام سنتے ہی مسلمان ہو گیا اور کعب کو لکھا کہ محمدؐ کی نبوت سچی ہے میں ان پر ایمان لایا ہوں ۔ تو بھی آ کر اسلام قبول کر ۔ جب کعب نے بجیر کی تحریر پڑھی چند اشعار بجیر کو لکھے جن سے آنحضرتؐ کی مذمت مترشح ہوتی تھی ۔ بجیر نے وہ اشعار نبی اکرمؐ کے حضور پیش کیے ۔ جناب رسالت مآب نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا جس کو کعب بن زہیر کہیں ملے اس کو قتل کر دے ۔ بجیر نے یہ حکم نبویؐ سن کر کعب کو لکھا کہ رسول اللہؐ نے ان شاعروں کو جو آپؐ کی ہجو لکھا کرتے تھے اور ان کو توبہ نصیب نہیں ہوئی تھی قتل کر ڈالا ہے ۔ تیرے لیے بھی ایسا ہی حکم ہوا ہے ۔ اگر تجھے اپنی جان عزیز ہے تو جلد آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کر اور اپنے قصور کی معافی کے لیے ملتجی ہو ۔ آنحضرتؐ توبہ کرنے والوں کو ہرگز قتل نہیں کرتے ۔ اگر تجھ کو یہ بات منظور نہیں تو اپنے بچاؤ کے لیے کوئی تدبیر سوچ کر نکال ۔ بجیر کی تحریر دیکھتے ہی کعب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور زمین اس کے لیے تنگ ہو گئی ۔ بہت کچھ سوچ بچار کیا مگر کوئی صورت بچاؤ کی سوائے اسلام لانے کے نظر نہ آئی ۔ ناچار مدینہ کو روانہ ہوا ۔ وہاں پہنچ کر جہنی کے مکان پر جو اس کا ملاقاتی تھا مقیم ہوا ۔ جب آنحضرتؐ نماز صبح سے فارغ ہو کر بیٹھے ۔ جہنی مذکور کعب کو آنحضرتؐ کے حضور میں لے گیا اور اشارہ سے بتا دیا کہ یہی رسولؐ ہیں ۔ نزدیک جا کر ان سے امان کا خواہاں ہو ۔ کعب فوراً آنحضرتؐ کے روبرو جا بیٹھا اور اپنا ہاتھ آپؐ کے دست مبارک پر رکھ کر عرض کیا ۔ یا رسولؐ کعب ابن زہیر تائب اور مسلمان ہو کر آپ کی خدمت میں امان مانگنے آیا ہے اگر میں اس کو حضورؐ کی خدمت میں لے آؤں تو آپؐ اس کی توبہ قبول فرما دیں گے یا نہیں ۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہاں اس کی توبہ قبول کی جائے گی ۔ پھر تو کعب کھل پڑے ۔ کہنے لگے ۔ یا رسول اللہؐ میں ہی کعب ابن زہیر ہوں ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ ۔ اس کے بعد کعب نے وہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا جو قصیدہ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے ۔ جب کعب نے یہ شعر

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَنُوْرٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ
مُہَنَّدٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ مَسْلُوْلٌ

پڑھا تو آنحضرتؐ نے اپنی ردائے مبارک جسم اطہر سے اتار کر کعب کو اڑھا دی۔ وہی چادر امیر معاویہؓ نے کعب کے مرنے کے بعد ان کے وارثوں سے بیس ہزار درہم دے کر خریدلی جس کو خلفاء بنو امیّہ یکے بعد دیگرے عید کے موقع پر اوڑھا کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ردائے شریف بنی عباس کے قبضہ میں آئی۔ اور اب سلاطین آل عثمان کے توشہ خانہ میں موجود ہے۔ کعب ۹ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

کعبؓ بن عجرہ۔ (وفات ۵۱ھ)۔ کنیت ابومحمد تھی۔ ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ اور تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ عہدِ نبویؐ میں کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ۵۱ھ میں ۵، سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ نبی کریمؐ کے ساتھ کافی عرصہ رہے۔ اس لیے کتب احادیث میں کئی احادیث آپ کی روایت کردہ درج ہیں جن کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے۔

کعبؓ بن مالک ۔(وفات ۵۳ھ/ ۶۷۳ء)
مشہور انصاری صحابی، جن کا پورا نام عبداللہ تھا۔ آپ قبیلہ خزرج کی شاخ بنوسلم سے تعلق رکھتے تھے۔

ہجرت سے قبل ایمان لاچکے تھے اور بیعت عقبہ میں بھی شریک تھے۔ آپ اپنی بہادری کی وجہ سے بھی مشہور تھے۔ اسلام لانے سے پہلے بھی کئی جنگوں میں شریک ہوئے اسلام لانے کے بعد غزوۂ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جب غزوۂ احد میں نبی کریمؐ کے زخمی ہونے کی خبر سنی تو فرطِ محبت میں اپنا چہرہ زخمی کر لیا۔

غزوۂ تبوک میں جن چھ صحابہ کرام کے شریک نہ ہونے کی روایت ملتی ہے اُن میں کعبؓ بن مالک بھی تھے۔ بعد میں اللہ تعالےٰ کی اجازت سے نبی کریمؐ نے ان کو معافی دے دی تھی۔ کیونکہ غزوہ میں شریک نہ ہونے کے لیے ان کے پاس کوئی معقول عذر نہ تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ بنوغسان نے انھیں اسلام چھوڑنے کے لیے کئی بار لالچ و ترغیب دی، لیکن آپ نے ان کی ہر قسم کی پیشکش ٹھکرا دی۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جب ہنگامہ ہوا تو حسانؓ اور زیدؓ بن ثابت کے ہمراہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ایک دردناک مرثیہ لکھا۔ حضرت علیؓ سے انھوں نے بیعت نہیں کی۔ عمر کے آخری ایام میں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئے اور اسی حالت میں انتقال ہُوا۔

کعبہ۔ (بیت اللہ)، مسلمانوں کا قبلہ، مکہ مکرمہ (حجاز مقدس) میں واقع ہے۔ توراۃ میں اسے "بیت ایل" کہا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اسے امن کی جگہ قرار دیا ہے۔ یہ مکعب شکل کی ایک عمارت ہے جو مختلف سائز کے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی لمبائی ۴۰ فٹ اور چوڑائی ۳۳ فٹ اور اونچائی ۵۰ فٹ ہے۔ اس وقت اس پر چھت بھی ہے۔ تعمیر ابراہیمیؑ میں اس پر چھت نہیں ڈالا گیا تھا۔ اس میں ایک دروازہ ہے جو حرم شریف کی عام سطح سے ۶ ½ فٹ بلند ہے۔ دورِ نبویؐ میں اس کے دو دروازے ہوا کرتے تھے۔ ایک دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا تھا اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا راستہ ہوتا تھا۔ موجودہ دروازے کے جنوب مشرقی کونے میں حجرِ اسود نصب ہے۔ یہ پتھر بعض روایات کی رو سے جنت سے لایا گیا تھا اور اس کا رنگ سفید تھا۔ لوگوں کے چومنے سے، ان کے گناہوں سے یہ پتھر سیاہ ہوگیا۔ یہ پتھر ۵ ½ فٹ عمومی سطح سے بلند نصب ہے۔ سات انچ قطر کا یہ پتھر بعد میں ایک حادثہ کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا اور اسے ٹکڑوں کی صورت میں ہی نصب کر دیا گیا۔ کعبہ کے جنوبی کونے کو 'رکن یمانی' کہتے ہیں۔ شمالی رخ پر کعبہ کی چھت پر ایک پرنالہ نصب ہے جسے 'میزابِ رحمت' کہا جاتا ہے۔ میزاب رحمت کی طرف ہی 'حطیم' ہے جو کعبہ کی شمالی دیوار سے ۶ فٹ کے قریب ایک چھوٹی سی دیوار جا کر چاردیواری کی صورت میں بنا ہوا ہے۔ روایت کے مطابق یہ حصّہ خانہ کعبہ کی حدود کے اندر تھا۔ جب قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو رقم کی کمی کی وجہ سے اتنے حصّے کو خانہ کعبہ کی حدود میں شامل نہ کیا۔ جو اب تک کعبہ کی اصل حدود میں تو ہے لیکن کعبہ کی عمارت کا حصّہ نہیں۔ حاجیوں کے لئے یہ حکم ہے کہ جب طواف کریں تو حطیم کے اندر سے نہ گزریں بلکہ حطیم کے باہر سے طواف کریں۔ خانہ کعبہ کے دروازہ کی چوکھٹ کو 'ملتزم' کہا جاتا ہے یعنی چمٹنے کی جگہ۔ حاجی حضرات یہاں چمٹ کر دعائیں مانگتے ہیں۔

کعبہ سے کچھ فاصلے پر 'مقام ابراہیم' ہے۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ اس پتھر پر ان کے قدموں کے نشان ہیں۔ اب اسے شیشے سے ڈھانپ کر ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھا گیا ہے۔ پہلے یہ خانہ کعبہ کے دروازے والے رُخ کی دیوار کے بالکل ساتھ تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ کعبہ سب سے پہلے دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل جنت میں تعمیر کیا گیا اور جسے 'بیت المعمور' کہتے تھے اور یہ اب بھی موجود ہے۔ زمین میں بیت اللہ (کعبہ) کی تعمیر حضرت آدمؑ نے کی اور بیت المعمور کے عین نیچے اسے تعمیر کیا گیا۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں طوفان سے کعبہ کو کافی نقصان پہنچا، اور اسے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالےٰ کے حکم پر، اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی مدد سے تعمیر کیا۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے انتقال کے بعد، کعبہ ایک ہزار سال تک بنوجرہم کی تولیت میں رہا۔ اس کے بعد بنوخزاعہ ۳۰۰ سال تک اس کے متولی رہے۔ اسی دوران کعبہ دوبار بارشوں وغیرہ سے تباہ ہوا اور قصی بن کلاب نے اسے تعمیر کیا۔ اس تعمیر تک اس پر کوئی چھت نہیں تھی۔ قصی سے کعبہ کی تولیت قریش کو منتقل ہوئی اور اس وقت تک کعبہ قریش کے خاندان کی تولیت میں ہے۔

نبی کریمؐ کے دادا، عبدالمطلب ابن ابی ہاشم ایک طویل عرصہ تک کعبہ کے متولی رہے۔ رسول اللہؐ کی بعثت طیبہ سے قبل اس کی از سر نو تعمیر شروع ہوئی جس میں مکہ کے تمام قابلِ ذکر قبائل نے حصّہ لیا۔ جب سنگِ اسود کی تنصیب کا وقت آیا تو ان میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ کیونکہ ہر قبیلہ کی خواہش تھی کہ یہ سعادت اُسے نصیب ہو۔ اختلاف نے شدّت اختیار کر گیا۔ حتیٰ کہ تلواریں نیام سے باہر نکلنے لگیں۔ آخر کار طے پایا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حدود کعبہ میں داخل ہوگا اُسی کا فیصلہ سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔ چنانچہ حسن اتفاق سے دوسرے دن کعبہ میں پہنچنے والے سب سے پہلے شخص نبی کریمؐ تھے۔ سب لوگ پکار اٹھے۔ "بے شک آپ صادق و امین ہیں ہمیں آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔" آپؐ نے اپنی چادر بچھائی۔ اس پر سنگ اسود کو رکھ گیا اور آپؐ نے ہر قبیلہ کے سردار کو حکم دیا کہ وہ چادر کا کونہ پکڑے۔ اس طرح تمام قبیلوں کے سردار تنصیب حجر کی سعادت میں شامل ہوگئے۔ آپؐ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے سنگ اسود کو دیوار میں نصب کیا۔ اور یوں آپؐ کی فراست اور قوتِ فیصلہ نے مکہ کو ایک بہت بڑی قبائلی جنگ سے محفوظ رکھا۔ کعبہ اسلام سے قبل بھی مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے دور میں تو یہ حق و صداقت کے متوالوں کا مرکز رہا۔ اور آپ کے بعد بھی مختلف انبیاء کرام کے دور میں اسے خصوصی حیثیت حاصل رہی۔ مگر ایام جاہلیت

میں بھی اس کی مرکزی حیثیت کو برقرار رکھا گیا۔ قریشِ مکہ کو حجاز میں جو اثر و رسوخ حاصل تھا اس کی وجہ بھی ان کا متولیِ کعبہ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ سالانہ میلوں کے موقع پہ یہاں بڑے بڑے فصحائے عرب اور اعاظم شعراء اکٹھے ہوتے اور علم و ادب کی محفلیں جمتیں۔ مشرکینِ مکہ کی بت پرستی کا مرکز بھی یہی مقام رہا۔ عربی کے سات مشہور قصائد جو ادب جاہلیت کی نمائندگی کرتے ہیں، کعبہ کی دیواروں پہ لٹکائے جاتے تھے۔ یہ قصائد سبعہ معلقات کے نام سے آج بھی ادب میں امتیازی مقام کے حامل ہیں۔

اس کی مرکزی حیثیت سے خائف ہو کر، نبی کریمؐ کی ولادت باسعادت سے قبل یمن کے بادشاہ ابرہہ نے کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ کیا اور اس ارادے سے مکہ پر چڑھائی کر دی۔ جب مکہ کے قریب ابرہہ اور اس کا لشکر خیمہ زن ہوا تو اس کے سپاہیوں نے نبی کریمؐ کے جدِ امجد کے چالیس اونٹ جو مکہ سے باہر نخلستان میں پھر رہے تھے، پکڑ لیے۔ جب جناب عبدالمطلب کو علم ہوا تو آپ ابرہہ کے لشکر میں گئے اور اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اونٹ واپس مل گئے تو آپ خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔ بعض لوگوں نے عبدالمطلب سے کہا کہ آپ متولی کعبہ ہیں۔ آپ کو اپنے اونٹوں کی اس قدر فکر ہے مگر کعبہ کی فکر نہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ جو میری چیز تھی اس کی حفاظت میرا فرض تھا اور جو اللہ تعالیٰ کی چیز ہے۔ اس کی ذمہ داری اور حفاظت اسی پہ (اللہ تعالیٰ) ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتِ کعبہ کا بندوبست یوں ہوا کہ دخولِ مکہ سے قبل ہی ابرہہ کو تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعہ کو قرآن مجید میں عبرت انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اپنی تعمیر اول ہی سے خانہ کعبہ مختلف حادثات کا شکار ہوتا رہا۔ طوفانِ نوحؑ اور دوسرے حادثات (آتشزدگی وغیرہ) سے اس کی شکست و ریخت کے واقعات ملتے ہیں۔

قریش نے جب پہلی بار اسے دوبارہ تعمیر کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک عورت نے کعبہ کو دھونی دی تو ایک شرارہ نے کعبہ کے غلاف کو آگ لگا دی جس سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ قریش نے حلال آمدن کم ہونے کی وجہ سے اسے چھ ہاتھ کے قریب ایک طرف سے چھوٹا کر دیا تھا کہ بعد میں اسے تعمیر کر لیں گے لیکن ایسے حالات ہوئے کہ وہ اسے تعمیر ابراہیمی کی بنیادوں پہ تعمیر نہ کر سکے۔ نبی کریمؐ کی خواہش تھی کہ اسے تعمیر ابراہیمی کے مطابق تعمیر کروائیں۔ لیکن اپنے اس ارادہ پہ بعض وجوہ کی بنا پہ عملدرآمد نہ کروا سکے۔

نویں مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بنایا۔ اس تعمیر کی وجہ یہ ہوئی کہ جب حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ حجاز کے گورنر مقرر ہوئے اور ان کے قبضہ میں سارا حجاز آ گیا تو اُن کے ہلاک کرنے کو یزید کی طرف سے مسجد حرام میں حصین بن نمیر منجنیق سے آگ برسانی شروع کی جس کے دھماکوں سے خانہ کعبہ کی دیوار کا کچھ حصہ گر گیا تھا۔ اور چھت کی کچھ لکڑیاں بھی جل گئی تھیں۔ انھی دنوں یزید مر گیا اور اس کے سب آدمی واپس چلے گئے۔ تب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ ارادہ کیا کہ بقیہ دیواروں کو بھی گرا کر نئی و مستحکم دیواریں بنائی جائیں۔ چنانچہ سب دیواروں کو گرا دینے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کی بنیاد ظاہر ہوئی تو اسی پہ بنیاد کھڑی کی گئی اور جو زمین پہلے باہر رہ گئی تھی اس کو خانہ کعبہ میں داخل کر لیا۔ اور پہلے کی طرح دروازہ زمین کے برابر کر دیا۔ دوسرا دروازہ بھی مقابل میں مثل تعمیر سابق کے پھر بنا دیا اور بلندی میں پہلے سے ۹ گز زیادہ اونچا کیا۔ یہ کام ۱۵ رجمادی الثانی ۶۴ھ کو شروع ہو کر ۲۷ رجب ۶۴ھ کو ختم ہوا۔

دسویں بار عبدالملک بن مروان کے حکم سے ۷۴ھ میں حجاج بن یوسف نے بنایا اس نے ویسے تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہی کی تعمیر کو برقرار رکھا، مگر چھ گز ایک بالشت زمین حطیم کی طرف گرا کر باہر نکال دی اور قریش کی بنیاد پہ دیوار بنا دی، غربی دروازہ کو بند کر دیا اور شرقی دروازہ کو زمین سے چار گز ایک بالشت اونچا کر دیا۔

۱۰۳۰ھ میں مکہ اور اس کے اطراف میں سخت بارش سے سیلاب آ گیا اور خانہ کعبہ کی دیواروں کو نقصان پہنچا تو سلاطین آلِ عثمان میں سے، سلطان مراد رابع نے اسے

تعمیر کروایا اور یہ تعمیر ۱۰۴۰ھ میں مکمل ہوئی۔ ۱۰۴۰ھ تک کعبہ کی ۱۱ بار تعمیر ہوئی۔
(۱) فرشتوں کی تعمیر۔ (۲) حضرت آدمؑ کی تعمیر (۳) حضرت شیثؑ کی تعمیر۔ (۴) حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر (۵) عمالقہ کی تعمیر (۶) جرہم کی تعمیر (۷) قصی بن کلاب کی تعمیر (۸) قریش کی تعمیر (۹) عبد اللہ بن زبیر کی تعمیر (۱۰) حجاج بن یوسف کی تعمیر (۱۱) سلطان مراد رابع ابن سلطان احمد کی تعمیر۔

بعد کے زمانوں میں بھی کعبہ کی مرمت اور حرم شریف کی توسیع کے کاموں میں مختلف مسلمان خلفا اور بادشاہوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

کفّارہ ۔ مذہبِ اسلام میں کسی فرض کے ادا نہ کرنے یا کوئی گناہ کرنے پر ایک مقررہ شے یا ایک کارِ خیر کے ادا کرنے کو کفّارہ کہتے ہیں۔ لغوی معنی چھپانے والی چیز۔ کسی کارِ خیر کو گناہ کا کفارہ قرار دینے کا مطلب ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے۔ جیسے کسی دیوار پہ داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر اس داغ کو مٹا دیا جاتا ہے۔

اس کو جرمانہ نہیں کہا جاتا کیونکہ جرمانہ میں ندامت و شرمساری اور اصلاحِ نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی بلکہ جرمانہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کفّارہ سے اللہ تعالےٰ کا مقصود یہ ہے کہ جس بندے سے کوئی خطا ہوئی ہے تو وہ عبادت اور کارِ خیر کے عمل سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے اور شرمساری اور ندامت کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کرے تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے محفوظ رہے۔ کسی حکمِ شرعی (فرض) کو ادا نہ کرنا بھی ایک گناہ ہے۔

اسلام میں جن امور پہ کفّارہ ادا کیا جاتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:
(ا) قسم توڑنے پر۔
(ب) مومن کو سہواً قتل کرنے پر۔
(ج)۔ حالتِ احرام میں شکار کرنے یا کوئی دوسرا ممنوعہ فعل کرنے پر۔
(د) رمضان کے دوران ایسا کوئی فعل کرنا جس سے روزے کی روح مجروح ہو۔ وغیرہ۔

کفایت اللہ دہلوی، مفتی۔ (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء - ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء)

آپ کے آباؤ اجداد کا اصل وطن سرزمینِ عرب کا جنوبی ساحلی خطہ یمن ہے۔ تجارتی سفر کے ایک حادثہ کی وجہ سے آپ کے مورثِ اعلیٰ میں سے ایک بزرگ شیخ جمیل یمنی، برِعظیم کے ساحل پر واقع بھوپال کے ایک شخص سے ملے۔ بھوپال میں ہی اُن کی شادی ہوئی اور وہاں ہی مقیم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ خاندان شاہجہان پور منتقل ہو گیا۔ مفتی کفایت اللہ کے والد شیخ عنایت اللہ بہت کثیر العیال اور غریب تھے۔

مفتی کفایت اللہ شاہجہان پور (روہیل کھنڈ یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ حفظِ قرآن اور ناظرہ قرآن اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل شاہجہان پور میں کی۔ مزید تعلیم مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں حاصل کی۔ شاہی مدرسہ میں آپ نے کئی معروف اساتذہ سے دینی علوم کی تکمیل کی۔ ان اساتذہ میں مولانا عبد العلی میرٹھیؒ اور مولوی محمود حسن سہسوانی شامل ہیں۔ مولانا عبد العلی میرٹھیؒ بعد میں دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور مفتی کفایت اللہ صاحب نے دیوبند میں ان ہی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب نے دیوبند میں ۱۳۱۲ھ میں آئے تھے اور وہاں کے کئی معروف اساتذہ سے استفادہ کیا۔ دیوبند میں تعلیم کے دوران آپ کے کئی ایسے رفقا تھے جو بعد میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ اُن میں امام العصر علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ اور مولانا امین الدینؒ کے نام آتے ہیں۔

دیوبند سے تدریس سے فارغ ہو کر آپ دہلی سے ہوتے ہوئے اپنے وطن شاہجہان پور آئے تو وہاں آپ کے ابتدائی تعلیم کے اور استاد مولانا عبید الحق ایک نئے مدرسہ 'عین العلم' کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ انھوں نے مفتی کفایت اللہ کو اپنے مدرسہ میں مدرس اور دفتری امور کا ناظم مقرر کیا۔ اسی مدرسہ میں آپ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی سنبھال لیا۔ آپ نے جو پہلا فتویٰ دیا تھا۔ اس کو شاہجہان پور کے کئی علما نے پسند فرمایا۔

مدرسہ 'عین العلم' کی مدرسی کے دوران آپ نے ایک ماہوار رسالہ البرہان فتنہ قادیانیت کی تردید میں نکالنا شروع کر دیا۔ آپ کے شاگردوں میں حافظ اعزاز علی اور مفتی مہدی حسن نے کافی شہرت حاصل کی۔ حافظ اعزاز علی دار العلوم دیوبند میں استاذ الفقہ والادب مقرر ہوئے اور مفتی مہدی حسن دار العلوم دیوبند کے مفتی رہے۔

اسی دوران آپ کی شادی ہوئی لیکن تھوڑے عرصہ بعد بیوی کا انتقال ہو گیا اور پھر آپ نے دوسری شادی کی۔ دونوں بیویوں سے اکثر اولاد کا انتقال ہو گیا۔

شاہجہان پور میں قیام کے دوران آپ نے عیسائیوں سے دو مناظرے کیے۔ اس طرح سے آپ کو بہت شہرت ملی۔

ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں آپ کے ایک رفیق مولانا امین الدین نے دہلی میں مدرسہ امینیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی۔ اس کے پہلے صدر مدرس علامہ انور شاہ کاشمیریؒ مقرر ہوئے۔

ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ میں علامہ انور شاہ کاشمیری کے اپنے وطن کشمیر جانے سے مولانا امین الدین نے بڑی کوششوں سے آپ کو دہلی بلایا اور آپ صدر مدرس مقرر کیے گئے۔ دہلی میں قیام کے دوران وہاں کے لوگ جلد ہی آپ کی علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوتے اور برعظیم کے اس مرکزی شہر میں تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اونچی شہرت حاصل کر لی۔

آپ نے مدرسہ امینیہ کی توسیع و ترقی کے لیے کافی کام کیا اور تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے کافی کوششیں کیں۔

۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں برعظیم میں سیاسی سرگرمیوں نے کافی زور پکڑا۔ جنگ بلقان اور خلافت تحریک میں مفتی کفایت اللہ صاحب کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ آپ نے برعظیم کے مسلمانوں کو مناسب رہنمائی دی۔ آپ علمائے اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے لیے کافی فکرمند رہتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی دہلی کے ایک اجلاس کے بعد ۲۵ علماء کے ایک اجلاس میں جمعیت العلماء ہند کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ مفتی کفایت اللہ کو عارضی صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی کو عارضی ناظم مقرر کیا گیا اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی تجویز پہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا دفتر مدرسہ امینیہ میں قائم کیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی زیرِ صدارت جلسہ میں جمعیت علماء ہند کا آئین اور طریق کار طے کیا گیا۔

آپ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۸ء تک جمعیت کے صدر رہے۔ آپ کی زیرِ قیادت جمعیۃ علماء ہند نے برعظیم پاک و ہند کی آزادی کے مقصد کے لیے بھرپور انداز میں جد و جہد کی۔

مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ رولٹ ایکٹ بل کے خلاف ستیہ گرہ تحریک اور شدھی تحریک کے خلاف مسلمانوں میں تبلیغی تحریکوں میں آپ نے

حکمت عملی سے کام کیا۔

سلطان ابن سعود نے جب حجاز مقدس میں شریف مکہ کی حکومت ختم کی تو دنیائے اسلام کا ایک نمائندہ اجتماع ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء کو منعقد کیا گیا۔ اس میں تمام اسلامی ممالک کے منتخب وفود شرکت کی۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا اس کے صدر مفتی کفایت اللہ تھے۔

شوال ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں، مولانا امین الدین کے انتقال کے بعد، آپ مدرسہ امینیہ کے مہتمم مقرر کئے گئے۔

۱۹۳۰ء میں جب دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی، تو آپ نے ملک و ملت کی آزادی کے لیے عام تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ انگریز حکام نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو آپ کو گرفتار کیا۔ چھ ماہ کی سزا دی گئی۔ کچھ دن دہلی جیل میں رکھا گیا اور بعد میں گجرات جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ دوسری گول میز کانفرنس (دسمبر ۱۹۳۱ء) کی ناکامی کے بعد جب ایک بار پھر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی تو ۱۱ر مارچ ۱۹۳۲ء (بروز جمعہ) جمعیت العلماء ہند نے دہلی کی جامع مسجد سے ایک عظیم الشان جلوس نکالا جس میں ایک لاکھ افراد شامل تھے۔ کئی دوسرے علماء کے ساتھ آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۸ ماہ کی قید آپ نے ملتان اور گجرات جیل میں گزاری۔

آپ کی سیاسی خدمات کے ساتھ علمی خدمات کو بھی تاریخ برعظیم میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ آپ نے پچاس سال کے عرصے میں ایک لاکھ سے زائد فتاویٰ دیے جو جزئیات فقہ اسلامی کا لازوال خزانہ ہے۔

اپنی تدریسی، سیاسی اور فتویٰ نویسی کی مصروفیات اور پھر دہلی جیسے شہر میں مختلف اداروں کی سرپرستی اور رکنیت کی وجہ سے آپ تصانیف اور تالیف کے لیے بہت کم وقت نکال سکتے تھے۔ اس لیے آپ کی تصانیف بہت کم ہیں۔

آپ کی سب سے مشہور تصنیف "تعلیم الاسلام" ہے جو آپ نے بچوں کے نہایت سلیس اور آسان زبان میں، اسلامی عقائد کی تعلیم کے لیے چار حصوں میں لکھی۔ یہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ دوسری تصنیف عربی کا قصیدہ "روض الریاحین" ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں مضامین جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

آخری زمانہ میں معاشرہ کی روز افزوں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور ہندو مسلم فسادات اور مخدوش سیاسی حالات سے بیزار ہو کر عملی سیاست سے بالکل الگ ہو گئے اور تقریباً دس سال تک آپ گوشہ نشین رہے۔ ایک طویل بیماری کے بعد ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء/۱۳ر ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو انتقال ہوا۔ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے احاطہ کے قریب (دہلی) دفن کیا گیا۔

کُفر۔ کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اسی لیے رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشت کار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ کفر، کفران نعمت یعنی نعمت کی ناشکر گزاری کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے احکام اور شریعت کے انکار کو کفر کہا جاتا ہے اور جو شخص اس فعل کا ارتکاب کرے اسے کافر کہا جاتا ہے۔

قرآن کے بیشتر مقامات میں اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو نہ ماننے کو کفر کہا گیا ہے جو وہ اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء اور رسل کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے تاکہ وہ راہ راست اختیار کریں۔

سورۃ محمد کی آیت ۱ میں نبی کریمؐ کی طرف سے پیش کردہ تعلیم و ہدایت کو نہ ماننے کو کفر کہا گیا ہے۔ اسی طرح آیت ۸ میں اللہ کے دین کی مدد نہ کرنے کے فعل کو کفر کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے کسی کو ہمسر بنانا، اللہ کی آیات کو نہ ماننا، قرآن کو نبی کریمؐ کی تصنیف قرار دینا، آخرت کا انکار کرنا، کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کفر کرنے والوں کے لیے مختلف سزائیں بیان کی ہیں۔ کفر کے متعلق یہ بیان ہوا ہے کہ کفر بجائے خود موجب عذاب ہے چاہے اعمال نیک ہوں یا بد۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر روز قیامت کافروں کی وہ عجیب حالت بیان کی گئی ہے جب وہ اپنے اعمال پر پشیمان ہوں گے اور پچھتا رہے ہوں گے۔ قرآن مجید کے بیشتر مقامات پر کافروں کے عقائد اور نظریات کو دلائل سے غلط ثابت کیا گیا ہے

کفر کا لفظ 'ایمان' کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ ایمان کے معنی ہیں ماننا قبول کرنا، تسلیم کرنا۔ اس کے برعکس کفر کے معنی نہ ماننا، رد کرنا، انکار کرنا۔

قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا کو نہ مانے، یا اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا معبود ماننے سے انکار کر دے، یا اسے واحد مالک یا معبود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم نہ کرے۔

تیسرے یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے اُن برگزیدہ بندوں، یعنی پیغمبروں کو تسلیم نہ کرے جنہیں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے واسطہ بناتا ہے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔ نبی کریمؐ کی ختم نبوت کا انکار کرے اور ان کے بعد کسی نبی کے ظہور کو تسلیم کرے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانین حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں ان کو یا ان میں سے کسی ایک کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریے کے طور پر ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور اپنی دنیوی زندگی کو اطاعت الٰہی کی بجائے نافرمانی کی بنا پر گزارے۔

یہ سب مختلف طرز عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر کفر کا لفظ کفران نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔

کفران نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے یا اس محسن کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے یا اس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے۔ عمومی طور پر قرآن میں یہ لفظ خالق کائنات یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے کفران کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

کفن۔ مُردے کا لباس۔ وہ کپڑے جو مُردے کو غسل دینے کے بعد پہنائے جاتے ہیں۔

عیسائی، یہودی بھی اپنے مُردوں کو کفن پہناتے ہیں۔

اسلام میں مُردوں کو پہنانے کے لیے تین کپڑے ہوتے ہیں۔ (۱) ازار، جو گردن سے لے کر گھٹنوں تک یا پاؤں تک استعمال کیا جاتا ہے۔ (۲) قمیص، جو گردن سے لے کر گھٹنوں تک ہوتی ہے۔ (۳) ایک چادر جو پورے جسم کو ڈھانپنے کے لیے ہوتی ہے، عورتوں کے لیے ان تین چادروں کے علاوہ دو اور ٹکڑے چھاتی کو ڈھانپنے (باندھنے) اور سر کے بالوں

کو باندھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کفن کا لباس عموماً سفید لٹھے سے بنایا جاتا ہے۔

کلابازی، ابوبکر محمد بن اسحاق۔ (وفات ۳۸۵ھ/۹۹۵ء)

صوفیاء میں سے ایک مشہور شخصیت۔ کلاباذ، بخارا کے نزدیک ایک مقام کی نسبت سے کلابازی مشہور ہوئے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے انھیں حنفی فقہاء میں شمار کیا ہے۔ تصوف پر اپنی دو کتابوں 'بحار الفوائد' اور 'تعرف' کی وجہ سے معروف ہوئے۔

تعرف کا پورا نام 'کتاب التعرف لمذہب اہل تصوف' ہے جو ۷۵ ابواب پر مشتمل ہے جو تصوف پر ایک مستند کتاب اور عمومی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مختلف صوفیا کے تجربات و مشاہدات کا ذکر ہے۔ اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ فارسی اور اردو زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔

کلام۔

اہلِ لغت نے کلام کی یہ تعریف کی ہے۔ وہ لفظ جو چند حروف کا مرکب ہو اور بامعنی ہو۔ یہ جمع کے صیغہ میں بھی بولا جاتا ہے یعنی تقریر جو مسلسل اور بامعنی ہو۔ یعنی کلام وہ ہے " بِكَلِمَةٍ يُتَكَلَّمُ بِهِ "

قرآن مجید کو اسی لیے کلام اللہ کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی بیان کردہ تقاریر اور خطاب کا مجموعہ ہے۔

کلبی، ہشام بن محمد۔ (وفات ۲۰۴ھ)

علم الانساب اور تاریخ کا متبحر عالم۔ عربوں کے نسب ناموں اور ان کے دورِ جاہلیت کے حقائق پر مستند تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک سو چالیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ اُن میں سے 'کتاب الانساب الکبیر'، 'جمہرۃ الانساب'، 'کتاب الاصنام' و 'نسب فحول الخیل فی جاہلیۃ والاسلام' زیادہ مشہور ہیں۔

کلثوم بن عیاض القشیری۔ (وفات ۱۲۳ھ/۷۴۱ء)

خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی فوج کا سپہ سالار۔ افریقہ کے بربروں کی سرکوبی کے لیے ہشام نے اسے بھیجا تھا۔ بربروں کے معرکے میں کام آیا۔

کلثوم بن ہدم۔

نبی کریمؐ کا میزبان جس کے پاس آپؐ قبا میں ٹھہرے تھے۔ کلثوم بن ہدم ایک قبیلہ کا سردار تھا لیکن اندھا تھا۔ نبی کریمؐ نے قبا میں قیام کے دوران جو مسجد تعمیر کی تھی وہ کلثوم بن ہدم کی عطا کردہ زمین پر بنائی گئی تھی۔ کلثوم بن ہدم کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔

کلثومؓ بنت علیؓ۔

حضرت علیؓ کی صاحبزادی، فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے جن کا نکاح تیسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ بن خطاب سے ہوا۔

ابن کثیر اپنی تفسیر کی جلد ۵ صفحہ ۳۰۹ پر لکھتے ہیں۔ " فاطمہؓ سے آپؐ کے چچا زاد بھائی علیؓ بن ابی طالب نے صفر ۲ھ میں نکاح فرمایا اور آپؓ سے حسنؓ، حسینؓ نیز امِ کلثومؓ اور زینبؓ بھی پیدا ہوئیں اور عمرؓ بن خطاب نے اپنے عہدِ خلافت میں ام کلثوم سے نکاح فرمایا.... حضرت عمرؓ نے ام کلثومؓ کا بڑا احترام کیا اور چالیس ہزار درہم مہر دیا..... ان کے بطن سے زید بن عمرؓ پیدا ہوئے۔"

شیعہ حضرات اس معاملہ میں بھی یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ام کلثومؓ حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھیں۔ اگر تسلیم کرتے بھی ہیں تو حضرت عمرؓ سے نکاح کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے زبردستی ام کلثومؓ سے نکاح کر لیا تھا۔ حالانکہ صحیح تاریخی روایات سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔

جب حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ اپنی لڑکی کو اپنے گھر لے آئے۔ بعد میں امّ کلثومؓ نے اپنے چچا زاد بھائی عون بن جعفرؓ سے پھر محمد بن جعفرؓ سے اور آخر میں عبداللہ بن جعفرؓ سے نکاح کیا۔ (جمہرۃ الانساب لابن حزم)

کلثومؓ بنت محمدؐ۔

نبی کریمؐ کی چار صاحبزادیوں زینبؓ، رقیہؓ، کلثومؓ اور فاطمہؓ میں سے ایک۔ جو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے پیدا ہوئیں (ابن سیرۃ ابن ہشام) بعض روایات کے مطابق ام کلثومؓ کی شادی، نبی کریمؐ کی بعثت کے اعلان سے قبل ابولہب کے بیٹے سے ہوئی۔ جب نبی کریمؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو ابولہب کے دو بیٹوں نے آپؐ کی دونوں صاحبزادیوں کو طلاق دے دی۔ نبی کریمؐ کی دو صاحبزادیوں رقیہؓ اور ام کلثومؓ کی شادی ابولہب کے دو بیٹوں سے ہوئی تھی۔

" بسند معتبر امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ رسول خدا کی حضرت خدیجہؓ سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ یہ ہے۔ طاہرؓ و قاسمؓ و فاطمہؓ و ام کلثومؓ اور رقیہؓ و زینبؓ۔ فاطمہؓ کا نکاح امیر المومنین سے ہوا اور زینب کا نکاح ابوالعاص بن ربیعہ سے ہوا جو بنو امیہ میں سے تھے اور ام کلثومؓ کا نکاح عثمانؓ بن عفان سے ہوا [illegible]

مختلف تاریخی روایات میں اس بات پر تضاد پایا جاتا ہے کہ چاروں [illegible] میں سے بڑی کون تھی لیکن اکثر روایات سے فاطمہؓ کا سب سے چھوٹی ہونا معلوم ہوتا ہے۔

رقیہؓ کا نکاح نبی کریمؐ نے حضرت عثمانؓ سے کیا۔ رقیہؓ کے انتقال کے بعد [illegible] دوسری بیٹی ام کلثومؓ کا نکاح بھی حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ وہ بھی [illegible] کے بعد انتقال کر گئیں تو نبی کریمؐ نے فرمایا۔ " اگر میری [illegible] میں سے [illegible] ایک کے بعد دوسری کا نکاح عثمانؓ سے کر دیتا۔"

عموماً شیعہ حضرات نبی کریمؐ کی چار صاحبزادیوں کو تسلیم [illegible] کی ایک صاحبزادی فاطمہؓ کا ذکر کرتے ہیں۔ شیعہ حضرات [illegible] ان تمام مفسرین اور محدثین [illegible] مانتے ہیں [illegible] کے مختلف مقامات پر اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نبی کریمؐ کی چار [illegible]

کلمات الشعراء۔

[illegible] فارسی کے معروف [illegible] اورنگزیب عالمگیر کے زمانے کے فارسی [illegible] کا مصنف محمد افضل سرخوش (۱۰۵۰ھ [illegible]) [illegible] نے متعدد معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے۔

کلمہ۔

لغوی معنی لفظ۔ عموماً طور پر عقائد [illegible] بولا جاتا ہے۔ [illegible] الا اللہ محمد رسول اللہ [illegible] کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ پورے الفاظ قرآن مجید میں [illegible] ملتے لیکن جزو اوّل یعنی لا الٰہ الا اللہ سورۃ محمد کی آیت ۱۹ [illegible] جزو محمد الرسول اللہ سورۃ فتح کی آیت ۲۹ [illegible] شہادت کی حیثیت سے بولا جاتا ہے [illegible] میں اس کے دو حصے [illegible] جاتی ہے۔

نبی کریمؐ کی احادیث میں کئی مقامات پر کلمہ کا ذکر ہے۔ ایک [illegible]

ے ستر درجے ہیں ان میں سے پہلا کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ . . . ہے ۔ اسے عمومی طور پر کلمۂ توحید کہا جاتا ہے ۔

کلمہ کا اقرار یعنی 'کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں' ۔ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے اور صاحب "فوائد الشریعتہ" کے مطابق ہر مسلمان کو اسے زندگی میں کم از کم ایک بار پڑھنا (اونچی آواز سے) فرض ہے ۔ علماء اسلام کا یہ فتویٰ کہ کوئی شخص صرف زبان سے ہی یہ کلمہ پڑھ لے تب بھی اسے مسلمان سمجھا جائے گا خواہ دل سے اس کا اعتقاد اس کلمہ پر نہ ہو اور اس کے اعمال ظاہری بھی اس کلمہ کے خلاف ہوں ۔

کلمۃ الحضرۃ

۔ اللہ تعالیٰ کا حکم "کُن" یعنی ہو جا ۔ قرآن مجید میں سورۃ یٰسین کی آیت ۸۲ اور تقریباً دوسرے ۱۱ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے ۔

"یہ اسی کا کام ہے کہ جب چاہتا ہے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے" ۔

(سورۃ یٰسین آیت ۸۲)

کلمۃ الشہادۃ

۔ " اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ "

" میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں " ۔

اس لیے اسے کلمہ شہادت کہتے ہیں کیونکہ مسلمان اس بات کی گواہی دیتے ہوئے اقرار کرتا ہے ۔

کلمۂ طیبہ

۔ لفظی معنی تو "پاکیزہ بات" کے ہیں ۔ مگر اس سے مراد وہ قول حق اور عقیدہ صالح ہے جو سراسر حقیقت پر مبنی ہو ۔ یہ قول اور عقیدہ قرآن مجید کی رو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار ، انبیاء اور کتب آسمانی کا اقرار اور آخرت کا اقرار ہو کیونکہ قرآن انہی امور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے ۔

عمومی طور پر کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمد الرسول اللہ " کو کلمۂ طیبہ بھی کہا جاتا ہے ۔

قرآن مجید میں سورۃ ابراہیم کی آیت ۲۴ میں "کَلِمَۃً طَیِّبَۃً" کو کشجرۃٍ طیبۃٍ کہا گیا ہے ۔ " کلمہ طیبہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت ، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں . . . . . "

کلمہ طیبہ کی ضد میں "کلمہ خبیثہ" کا لفظ سورۃ ابراہیم ہی کی آیت ۲۶ میں استعمال ہوا اور اسے کشجرۃ خبیثۃ "کہا گیا ہے ۔ یعنی کلمۂ خبیثہ بر خلاف حقیقت اور مبنی بر غلط قول ہے اور ہر وہ باطل عقیدہ ہے جس کو انسان اپنی زندگی کی بنیاد بنائے ۔

کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ میں یہ فرق ہے کہ آغاز تاریخ سے آج تک کلمۂ طیبہ ایک ہی رہا ہے اور کلمات خبیثہ بے شمار پیدا ہو چکے ہیں ۔ کلمۂ طیبہ کبھی جڑ سے نہ اکھاڑا جا سکا اور کلمات خبیثہ میں سے کسی کا بھی نشان تاریخ میں نہیں ملتا ۔ کلمۂ طیبہ کو جس شخص یا قوم نے صحیح معنوں میں اپنایا اس کے نتیجہ خیز ثمرات نے اسے بہرہ مند کیا اور کلمۂ خبیث نے جب بھی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں جڑ پکڑی اس کے تعفن سے سارا ماحول خراب ہوا ۔

کلیر شریف

۔ بھارت کے ضلع سہارنپور میں پیران کلیر نامی ایک چھوٹے سے قصبے کو کلیر شریف بھی کہتے ہیں ۔ جہاں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے خلیفہ شیخ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری کا مزار ہے ۔ اسی مزار کی وجہ سے اس قصبہ کو شہرت ملی ۔ دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے اس قصبے میں آمد و رفت کی سہولت رہتی تھی ۔ بڑے بڑے بازاروں اور مساجد کی کثرت بھی اس کی شہرت کی ایک وجہ ہے ۔

کلیلہ و دمنہ

۔ اصلاحِ اخلاق کے موضوع پر شہرتِ دوام کی مالک ۔ عبداللہ بن مقفع نے اسے عربی میں منتقل کیا ۔ مختلف حیوانات اور پرندوں کی کیفیات اور احوال کو تصاویر کے ذریعے ان کی زبان میں بیان کیا گیا ہے ۔

کلینی، علامہ ابو جعفر محمد

۔ (۲۵۰ھ/۸۶۴ء - ۳۲۹ھ/۹۴۱ء)

شیعوں کا محدث جو اپنی کتاب "الکافی" کی وجہ سے مشہور ہے ۔ کافی شیعوں کی کتب اربعہ میں سے ایک ہے اور حدیثوں کا مجموعہ ہے ۔

موجودہ تہران (ایران) کے قصبہ کلین میں یعقوب نامی شخص کے ہاں آپ کی پیدائش ہوئی ۔ ابو جعفر محمد کلینی کے نام سے شہرت پائی ۔ کلینی نے امام حسن عسکری ، (شیعوں کے گیارہویں امام) کا زمانہ پایا تھا لیکن امام حسن عسکری کی وفات کے وقت ابھی کم عمر تھے ۔ ہوش سنبھالنے کے بعد دینی علوم کی تکمیل کی ۔ اہل شیعہ کے لیے تعلیماتِ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کو محفوظ کرنے کے ارادہ سے بیس سال کی محنت سے " الکافی" لکھی

کمال پاشا ابن احمد

۔ وفات ۹۴۰ھ/۱۵۳۴ء)

ترکی الاصل ۔ علمائے حدیث میں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ۔ ترکی میں تدریسی خدمات انجام دیں ۔ اپنی وفات تک قسطنطنیہ کا قاضی رہا ۔ "طبقات الفقہا" "مجموعہ رسائل" "تغییر التنقیح" مشہور تصنیفات ہیں ۔

کمال کیتھلی، قادری

۔ (۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء - ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء)

بغداد میں سید حاجی عمر کے گھر پیدا ہوئے ۔ ۱۲ویں پشت سے سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے ۔ آپ نے ظاہری و باطنی علوم میں اس زمانہ کے جید علماء سے استفادہ کیا اور علوم تفسیر، حدیث اور فقہ پر عبور حاصل کیا ۔ اس کے بعد آپ ریاضیات اور مجاہدات کی طرف متوجہ ہوئے اور گھر بار ، اہل و عیال کو چھوڑ کر جنگلوں اور صحراؤں میں منتقل ہو گئے ۔ سمرقند ، بخارا ، روم و ایران ، مصر اور فلسطین ، عراق و حجاز کے صحراؤں اور بیابانوں میں عرصۂ طویل تک پھرتے رہے ۔

آپ نے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں حضرت شاہ فضیل قادریؒ عرف زندہ پیر سے بیعت کی اور انہیں سے خرقۂ خلافت حاصل کیا ۔ اپنے مرشد شاہ فضیل قادریؒ کے ہمراہ دنیا کی سیر و سیاحت کے لیے نکلے ۔ اس دوران مرشد کے ہمراہ کئی بار حج کی سعادت نصیب ہوئی ۔ اسی طویل سفر میں عراق ، ایران کے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے اور یہاں تقریباً دو سال کا عرصہ گزارا لیکن کسی جگہ پر مستقل قیام نہیں کیا ۔ ٹھٹھہ ، ملتان ، لاہور ، سرہند ، دہلی ، آگرہ اور احمد آباد کے علاقوں میں گئے ۔ آخر میں "پائل" گئے وہاں شیخ مجدد الف ثانی کے والد حضرت عبدالاحد کابلی سے ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے آپ سے بیعت کی ۔ پھر وہاں سے کیتھل

سٹریف (مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال کی تحصیل) پہنچے اور وہاں ہی مستقل قیام اختیار کیا۔ ہندوستان میں آپ کی آمد کا زمانہ ۹۷۶ھ / ۱۵۲۰ء کا ہے۔

قیام کیتھل سٹریف میں لاکھوں انسانوں نے آپ سے شرف بیعت کیا اور کئی حضرات نے خلافت حاصل کی۔

کنز العمّال ۔ نبی کریمؐ کی احادیث کا ایک مجموعہ، جو عربی میں جوامع سیوطی سے منتخب کر کے مرتب کیا گیا۔ اس کی تکمیل ۹۵۷ھ میں ہوئی۔

پورا نام "کنز العمّال فی سنن الاقوال والافعال" ہے۔

کنعان ۔ البیضاوی اور جلالین کے مفسرین کے مطابق کنعان نوحؑ کے اس بیٹے کا نام ہے جو اُن کا نافرمان تھا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے کہ جب طوفان آیا تو نوحؑ کا وہ بیٹا ڈوب گیا۔

"نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کی "اے میرے رب! میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے" ..... اللہ تعالےٰ نے فرمایا "اے نوحؑ! وہ تیرے اہل میں سے نہیں کیونکہ اس کے اعمال غیر صالح ہیں ....." سورۃ ہود آیات ۴۵-۴۶ اسی سورۃ کی آیت ۴۲ اور ۴۳ میں حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے (کنعان) کا مکالمہ درج ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے اسے پکارا کہ وہ کشتی میں سوار ہو جائے کیونکہ طوفان آنے والا ہے۔ تو اس نے کہا "میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔"

بعض مؤرخین کنعان کو نمرود کے باپ سے منسوب کرتے ہیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ کنعان سے فلسطین کی زمین کو موسوم کیا گیا ہے۔ (انجیل)

کنیسا ۔ عربی میں اس عبادت گاہ کے لیے مستعمل ہے جو عیسائیوں یا یہودیوں کی ہو۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ عیسائیوں کا چرچ جسے کلیسا کہا جاتا ہے۔

کوثر ۔ یہ لفظ قرآن مجید کی ۱۰۸ ویں سورۃ "الکوثر" میں استعمال ہوا ہے۔

مفسرین کی رائے ہے کہ یہ کثرت سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے لغوی معنی تو بے انتہا کثرت کے ہیں۔ سورۃ الکوثر میں اس سے مراد محض کثرت نہیں بلکہ خیر اور بھلائی اور نعمتوں کی کثرت ہے اور ایسی کثرت جو افراط اور فراوانی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور اس سے مراد کسی ایک خیر یا بھلائی یا نعمت کی نہیں بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔

سورۃ الکوثر کے نزول کے پس منظر میں وہ واقعات ہیں جب نبی کریمؐ ایک دعوت لے کر اٹھے ہیں صرف چند ساتھی ہیں۔ تجارت برباد ہو گئی اور اپنی قوم سے کٹ گئے۔ اولاد نرینہ بھی نہ رہی جس سے ان کا نام آگے چلتا۔ ظاہری طور پر زندگی میں نامرادی و ناکامی ہے اور محسوس ہے کہ جب وفات پا جائیں گے تو کوئی بھی ان کا نام لیوا نہ ہوگا۔ ان حالات میں کفار کے طعنے دے رہے ہیں تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ فرمایا گیا کہ ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا یعنی تمہارے مخالفوں یا دشمنوں کے سب اندیشے غلط ہیں۔ ہم (اللہ) نے تمہیں بے انتہا نعمتیں عطا کی ہیں۔

نبی کریمؐ کی کثیر احادیث سے "کوثر" سے "حوض کوثر" اور "نہر کوثر" کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ حوض کوثر کے متعلق آپ نے فرمایا "اللہ تعالےٰ قیامت کے روز مجھے حوض کوثر عطا کرے گا۔ جب سب لوگ پیاسے ہوں گے اور ہر ایک العطش العطش پکار رہا ہوگا تو میری اُمّت (یعنی میرے ماننے والے) اس حوض سے سیراب ہوں گے۔"

حوض کوثر کی وسعت سے متعلق بھی کثیر احادیث، کتب احادیث میں ملتی ہیں نبی کریمؐ کی بعض دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ جنت میں ایک نہر کا نام بھی کوثر ہے اور جس سے ایک نہر نکال کر حوض کوثر میں پانی ڈالا جائے گا۔

جنت کی نہر کوثر کے متعلق ایک حدیث اس طرح ہے۔ جس کی روایت حضرت انسؓ نے کی ہے: "معراج کے موقع پر نبی کریمؐ کو جنت کی سیر کرائی گئی۔ اس موقع پر آپؐ نے ایک نہر دیکھی ..... نبی کریمؐ نے اُس فرشتے سے (جس نے آپؐ کو سیر کرائی تھی) پوچھا، یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ یہ نہر کوثر ہے جو آپ کو اللہ تعالےٰ نے عطا کی ہے۔ ایک دوسری روایت بھی حضرت انسؓ سے اس طرح ہے "ایک شخص نے کوثر کے متعلق آپؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ کوثر وہ نہر ہے جو اللہ تعالےٰ نے جنت میں مجھے عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مشک کی سی ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔"

کوثر نیازی، مولانا (۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء .....) عالم دین، خطیب، صحافی، سیاست داں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور کچھ عرصے تک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو، عربی اور فارسی میں [illegible] زمانہ [illegible] کے

مولانا کوثر نیازی

فوراً بعد صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ اور [illegible] کے مدیر رہے۔ ابتدا میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی [illegible] اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں اپنا ہفت روزہ [illegible] میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور انھیں پارٹی کا سیکریٹری اطلاعات مقرر کیا گیا۔ یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں انھیں ان کی تقریروں اور تحریروں کی [illegible] سزا دی گئی۔ لیکن اُسی سال دسمبر میں جبکہ وہ جیل میں تھے، پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد پیپلز پارٹی نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو انھیں اطلاعات و نشریات کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو وہ پاکستان میں پہلی مرتبہ قائم ہونے والی وزارت مذہبی امور کے وزیر مقرر ہوئے۔

مولانا کوثر نیازی ایک پُراثر خطیب اور بلند پایہ مصنف ہیں۔ وہ اردو زبان میں دو درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ بعض کتابوں کا فارسی، انگریزی اور عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ چند تصانیف کے نام یہ ہیں۔ دیدہ ور (ذوالفقار علی بھٹو کے سوانح) رہنمائے حج، بنیادی حقیقتیں، آئینۂ تثلیث، اسلام ہمارا رہنما ہے، اسلام ہمارا دین ہے، تخلیقِ آدم، بصیرت، ذکرِ رسولؐ، اسلام کے معاشی تصورات، مسجد کا مقام۔

کوثری، محمد زاہد۔ (وفات ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء) حنفی فقیہہ۔ دارالخلافہ عثمانیہ کے معروف علماء میں سے تھا۔ علوم القرآن اور فقہ کا استاد۔ قاہرہ میں وفات پائی۔ مشہور تصانیف "الاشفاق علی احکام الطلاق" اور "الاستبصار فی تحدث عن الجبر والاختیار۔"

کوفہ۔ عراق کا مشہور تاریخی شہر جو دریائے فرات کے مغربی کنارے پر تھا۔ آج کل یہ ایک معمولی قصبہ کی صورت میں ہے۔ فارس کی فتح کے بعد ۶۳۸ھ میں حضرت عمرؓ کے دور میں اس شہر کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر بابل کے پرانے کھنڈرات کے قریب (مدین کے بالمقابل۔ دریا کی دوسری جانب) کی گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اسے اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ شہادت حسینؓ کے واقعہ میں اس شہر کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ کوفہ کے لوگوں نے ہی آپؓ کو خط لکھ لکھ کر بلایا تھا کہ وہ یزید کے حق میں نہیں اور حضرت حسینؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ کوفہ کے لوگوں کے کہنے پر حضرت حسینؓ حجاز سے روانہ ہوئے اور کربلا کے میدان میں کوفہ کے لوگوں نے آپؓ کا مقابلہ کیا اور آپ نے شہادت پائی۔

تاریخ میں کوفہ کے لوگوں کے متعلق یہ بھی آیا ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ سے بھی وفا نہ کی تھی۔ عباسی خلیفہ ابوالعباس نے ۷۵۰ھ میں اسے اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ اس دوران یہ شہر بہت ہی بارونق تھا اور تجارتی و مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

کوفہ کو علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے بھی شہرت ملی۔ اہلِ نحو (عربی زبان میں) میں کوفی اور بصری دو مکاتبِ فکر ہیں جس میں سے کوفی مکتبِ فکر کے کئی اکابر نے بہت شہرت حاصل کی۔

کوفی رسم الخط (کتابت) نے بھی کافی شہرت پائی اور قرآن کے قدیم نسخے کوفی خط میں ہی لکھے ملتے ہیں۔

کوفی، علی بن حامد بن ابی بکر۔ (ولادت ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) ایک نامور مؤرخ اور مترجم۔ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے کوفی کہلاتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں تنقیح الاسناد، کتاب الانساب اور فتح نامہ سندھ (فارسی ترجمہ)۔ زیادہ شہرت فتح نامہ سندھ کے ترجمے سے ہوئی جو محققین کے خیال کے مطابق المدائنی کی تصانیف فتح المکران اور ثغرالہند سے ماخوذ ہے۔

کویت۔ ایک چھوٹی سی عرب ریاست، خلیج عرب کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں عراق اور جنوب مغرب میں سعودی عرب واقع ہے۔ اس کی سرحد خشکی کے راستے عراق اور سعودی عرب سے بھی ملتی ہے۔ ۱۷۵۶ء میں یہاں عرب قبیلہ صباح نے اپنی عملداری قائم کی۔ کویت کے موجودہ حکمران کا تعلق اسی قبیلے سے ہے اور وہ اپنے خاندان کے بارھویں حکمران ہیں۔

۱۸۹۹ء میں برطانیہ نے خلیج فارس پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے یہاں کے امیر شیخ مبارک سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ برطانیہ کا زیرِ حفاظت علاقہ قرار پایا جس سے ۱۹ جون ۱۹۶۱ء کو نجات ملی اور کویت کو آزادی حاصل ہوئی۔ اس ریاست کا نام دولت کویت رکھا گیا۔ سرکاری زبان عربی ہے۔ رقبہ ۶۲۰۰ مربع میل ہے۔ آبادی ۷ لاکھ کے قریب ہے۔ جو تمام مسلمان ہیں۔ دارالحکومت کویت شہر ہے جس کی آبادی سوا دو لاکھ سے زائد ہے۔

کویت میں تعلیم لازمی ہے۔ کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ کویت کی حکومت دوسری مسلمان حکومتوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتی ہے۔ کویت کے پاکستان کے ساتھ ہمیشہ برادرانہ تعلقات رہے ہیں۔ اس نے ہر مشکل وقت پر پاکستان کی ہر قسم کی مدد کی ہے ۱۹۷۷ء کے اندرونی خلفشار کے موقع پر کویت نے ہر ممکن تعاون کیا اور پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں اتفاق و اتحاد کی فضا ہموار کرانے میں مذاکرات کی راہ کھولنے کے لیے بھرپور سعی کی۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی کویت نے بھارت اور روس سے سفارتی تعلقات توڑ لیے تھے۔ کویت کے عوام کے لیے کویت کے حکمران ہر ممکن سہولتیں فراہم کرنے میں مگن رہتے ہیں۔ تعلیمی سہولتوں کے علاوہ عوام کے علاج کے لیے ۱۵ سرکاری ہسپتال اور ۱۰۰ سے زائد کلینک ہیں

کویت کی واحد برآمد پٹرول ہے۔ پٹرول کی وجہ سے کویت اس وقت فی کس ذرائع آمدن کے نقطۂ نگاہ سے دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ کویت میں پٹرول کی پیداوار ۲½ ارب ٹن سالانہ کے قریب ہے جو مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں پٹرول کی کل پیداوار کے مالکانہ حقوق "کویت آئل کمپنی" کو حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سونے کی کانیں بھی ہیں۔

کویت اقوام متحدہ اور عرب لیگ کا رکن بھی ہے۔ اس کی کرنسی دینار ہے جس میں ۱۰۰۰ فلوس ہوتے ہیں۔ یہاں کا موسم سخت گرم ہے۔ یہاں کے مکین گرمی کی شدت کے ایام میں دوسرے ممالک کے ٹھنڈے علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔

کیسان (محمد بن کیسان)۔ دسویں صدی ہجری میں اہلِ بغداد کا مشہور نحوی۔ بصرہ، کوفہ کے مشہور علماء سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن بصریوں کے اسلوب نحو کو اختیار کیا۔ "تلقیب القوافی و تلقیب حرکاتہا" اور "شرح المعلقات" مشہور تصانیف ہیں۔

کیسانیہ۔ شیعان علیؓ کا یہ فرقہ مختار ثقفی سے منسوب ہے۔ کیسان، مختار کا لقب ہے۔ اس لیے یہ مختاریہ کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے بعد آپ کا بیٹا محمد بن حنفیہ امام ہے اور ابھی تک زندہ ہے (محمد بن حنفیہ، قبیلہ حنفی کی ایک عورت کے بطن سے حضرت علیؓ کا بیٹا ہے)۔

ان میں سے ایک گروہ کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے بعد دیگرے حضرت علیؓ کے بعد امام ہیں اور امام محمد بن حنفیہ، حضرت حسینؓ کے بعد امام ہیں۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اپنی ظاہری امامت کے عرصہ کے دوران دراصل محمد بن حنفیہ کے تحتِ فرمان تھے اور ان ایام میں محمد بن حنفیہ امام غائب تھے۔ ابن حنفیہ کے انتقال کے بعد (۸۱ھ/۷۰۰ء) کیسانی کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک اور گروہ جو "کربیہ" کے نام سے معروف ہے، کا عقیدہ یہ ہے کہ محمد بن حنفیہ ابھی تک زندہ ہے اور ایک پہاڑ میں روپوش ہے، ان کا دوبارہ ظہور ہوگا۔

ایک اور ذیلی گروہ "ہاشمیہ" کا عقیدہ ہے کہ محمد بن حنفیہ فوت ہو چکا ہے اور اس کا

بیٹا ابی ہاشم امام ہے وہ روپوش ہے اور فوت نہیں ہوا۔ دوبارہ آئے گا۔

ایک اور ذیلی گروہ "علویہ" کا عقیدہ ہے کہ ابی ہاشم فوت ہو چکا ہے۔ اس کا بیٹا علی امام ہے اور اس کے بعد اس کی اولاد میں سے حسن اور علی اور حسن امام ہیں۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ کیسان، حضرت علیؓ کا مولیٰ تھا اس نے جو فرقہ قائم کیا وہ کیسانیہ کہلاتا ہے۔ وہ جنگِ صفین میں کام آیا۔ مختار ثقفی نے بعد میں اس کے عقائد کو اختیار کر لیا۔ کیسانیہ کو "خشابیہ" بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ لکڑی کے ڈنڈے بطور ہتھیار ساتھ رکھتے تھے۔ یہی نام بعد میں ابومسلم کے پیروکاروں نے اختیار کیا۔

بعض کیسانی، مختار کو ایک خصوصی درجہ اس کی علمیت کی وجہ سے دیتے تھے حتیٰ کہ بعض اسے پیغمبر بھی کہتے تھے۔

کیسانیوں میں سے بعض کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ حالات کے تغیر سے کائنات کی تخلیق میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور کائنات اس طرح موجود نہیں جس طرح کہ اسے اللہ تعالےٰ نے آغاز میں تخلیق کیا تھا۔

کیفی، عبدالسلام ندوی

کیفی، عبدالسلام ندوی ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن اور مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالحئیؒ کے رفیق کار۔ کیفی تخلص رکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر وقت اسلامیات، تاریخ اسلام اور اردو ادب کی خدمت میں وقف کیا۔ رسالہ 'معارف' میں ان کے مضامین چھپتے رہے۔

سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ، اسوہ صحابیاتؓ، شعر الہند حصہ اوّل و دوم، ابن یمین وغیرہ، ان کی معروف تصانیف ہیں۔ مولانا شبلی کے سوانح حیات بھی مرتب کئے ہیں۔

کیقباد، معزالدّین

کیقباد، معزالدّین ۔ غوری سلاطین میں سے ایک بادشاہ جو تین سال تین ماہ حکمران رہا۔ سلطان غیاث الدّین بلبن نے اپنے پوتے کیخسرو بن محمد سلطان کو اپنے بعد تخت نشین کرنے کی وصیّت کی تھی جو ملتان کا صوبیدار تھا۔ بعض امرا بلبن کے اس تقرر کے خلاف تھے۔ امیرالامرا فخرالدّین نے دوسرے ارکان سلطنت کے مشورے سے ۶۸۶ھ میں معزالدین کیقباد کو جو اٹھارہ سالہ نوجوان تھا، تخت نشین کیا۔ کیقباد، بلبن کے دوسرے بیٹے ناصرالدّین کا لڑکا تھا۔

معزّالدین کیقباد نے سلطنت کے سارے فرائض فخرالدّین کے سپرد کر دیے اور خود عیش و عشرت میں محو ہو گیا۔ دارالسلطنت چھوڑ کر کیلو کھڑی میں چلا گیا۔ دریائے جمنا کے کنارے طرح طرح کی عالیشان عمارتیں تعمیر کروائیں اور نفسانی لذات کی تسکین و تکمیل میں مگن رہتا۔

گانے بجانے کے شوق کے علاوہ کیقباد کو ہر قسم کے لہو و لعب سے رغبت تھی۔ شطرنج اور گنجفہ کا عاشق تھا۔ راگ و رنگ اور لہو و لعب کے ساتھ ساتھ شراب نوشی سے بھی شغل رکھتا تھا۔ شاہی خزانہ کو ان عیاشیوں پر لٹانا شروع کیا۔

انھی دنوں چنگیزی تاتاریوں نے لاہور کے نواح میں خونریزی اور لوٹ مار کی لیکن کیقباد کو اپنی عیاشیوں سے فرصت نہ تھی۔

ایک روز امیرالامرا فخرالدین کو زہر دے کر مروا دیا اور اس کی جگہ ملک جلال الدین کو مدارالمہام بنایا۔

شراب خوری کی کثرت سے لقوے اور فالج میں مبتلا ہوا تو امرا نے مشورہ کر کے اس کے بیٹے کیومرث کو شمس الدین کا خطاب دے تخت نشین کیا۔ ملک جلال الدین نے کچھ عرصہ بعد اس بچے کو قتل کروا دیا اور خود حکومت پر قبضہ کر لیا اور کیقباد کو بھی قتل کروا دیا۔ اس طرح ایک بادشاہ کی عیاشیوں اور کوتاہیوں سے غوری خاندان کی ایک سو سال سے زائد کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

کیمرون

کیمرون ۔ کیمرون میں اسلام بربر مبلغین کے ذریعے پھیلا۔ موحدین کی تحریک کے نتیجے میں کیمرون میں باقاعدہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں کیمرون پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی فوجوں نے جرمنی سے چھین لیا۔ ۱۹۶۰ء میں "جمعیۃ اقوام" کے انتداب کے تحت اسے برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو فرانس نے کیمرون کو آزادی دے دی اور یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو برطانوی کیمرون بھی آزاد ہو کر اس وفاق میں شامل ہو گیا اور وفاقی صدارتی حکومت قائم ہوئی۔ احمدو اہجو، وفاق کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اس مملکت کا نام کیمرون متحدہ جمہوریہ رکھا گیا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو کیمرون اقوام متحدہ کا رکن بنا۔

کیمرون کا رقبہ ۱۸۳،۵۶۹ مربع میل ہے اور آبادی ۵۱ لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور مسلمان آبادی کا ۵۵ فیصد ہیں۔ یعنی ۲۰ لاکھ کے قریب۔ یاؤندے کیمرون کا دارالحکومت ہے جس کی آبادی ۶۰ ہزار کے قریب ہے۔ سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ کیمرون کی خاص صنعت المونیم کے کارخانے ہیں۔ خاص برآمدات میں کوکو کافی، لکڑی اور ربڑ شامل ہیں۔ سرکاری سکّہ فرانک ہے۔

کیمیائے سعادت

کیمیائے سعادت ۔ امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین کا خلاصہ جس میں عبادات، اخلاقیات اور دوسرے اہم مضامین کو بڑے سلیس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں امام غزالیؒ نے مذہب اور فلسفہ کو یکجا بہترین انداز میں پیوست کیا ہے۔ استدلال کی غرض سے قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

گ

گب ۔ ایک مشہور مستشرق اور عالم۔ ایڈنبرا اور لندن یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ پھر لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔ اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم میں اپنی تحقیق کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ عربی ادب اور اسلامی تاریخ کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

گداگری ۔ بھیک مانگنے کو گداگری کہا جاتا ہے۔ اسلام میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ در مختار میں نبی کریمؐ کا ارشاد درج ہے: "آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے جبکہ اس کے پاس ایک رات اور دن کا کھانا ہو۔" نبی کریمؐ نے بھی سختی سے بھیک مانگنے کی ممانعت کی ہے۔

آپ نے فرمایا "آدمی کا سوال کرنا اس کے منہ کے زخمی ہونے کی مانند ہے۔ لہذا یہ آدمی پہ منحصر ہے کہ وہ اپنے چہرے کے زخم کو باقی رکھتا ہے یا نہیں۔" ایک اور جگہ فرمایا "جو شخص بلا ضرورت سوال کرتا ہے تو قیامت کے روز اس کا چہرہ زخمی ہوگا۔" مزید ارشاد فرمایا "جو شخص مال ہوتے ہوئے مانگتا ہے وہ گویا کہ دوزخ کی آگ لے رہا ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔" جو آدمی فاقے کی وجہ سے لوگوں سے بھیک مانگنے لگے تو اس کی حاجت دنیا والے پوری نہیں کر سکتے۔ لیکن جو آدمی اللہ سے مانگے گا تو وہ اس کو اس طرح بے نیاز یا مالدار کر دے گا کہ یا تو اپنے پاس بلا لے گا یا اسے دولت سے نواز دے گا۔"

گرگانیؒ، ابوالقاسم ۔ (وفات ۴۵۰ھ)

سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین میں سے ایک بزرگ۔ خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے ہمعصر تھے۔ شیخ علی ہجویریؒ داتا گنج بخش نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ان کا ذکر کیا ہے۔ صاحب مراۃ الاسرار نے بھی آپ کی کرامات کو بیان کیا ہے۔ اپنے عہد کے ممتاز اہل علم۔ صاحب زہد و ورع میں شمار ہوتے تھے۔

گل بابا ۔ سرحد کے صوفیاء کا یہ گلِ سرسید ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں بمقام انبار علاقہ مندنڑ میں حضرت خانزادہ کے ہاں پیدا ہوا۔

والدین نے محمد افضل نام رکھا لیکن پیار سے گل کہتے تھے جو بعد میں اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ آپ کا اصل نام بھول گئے اور عوام میں "گل بابا" کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے دادا حضرت اللہ داد (بڑلیسی بابا) بھی ایک بزرگ شخصیت تھے۔

حضرت گل بابا نے ظاہری تعلیم کی تکمیل والد ماجد سے کی۔ تحصیل علم کے بعد اپنے والد ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے اور سلوک کے مختلف مدارج طے کیے۔

موضع کھونڈہ کے ایک معزز خاندان میں آپ کی شادی ہوئی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد آپ سجادہ نشین بنے اور رشد و ہدایت، تعلیم و تعلّم میں مصروف ہو گئے۔

دینی علوم کو عام کرنے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا اور خود اس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کسبِ معاش کے لیے آستانہ عالیہ کی ملحقہ زمینوں کو خود کاشت کیا کرتے تھے۔ اتباعِ شریعت کے سخت پابند تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت گل بابا حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر میں بیمار ہوئے اور چند دن علیل رہ کر ملتان میں انتقال ہوا اور وہاں ہی ان کا مزار ہے۔ آپ کے خلفا میں مولوی ذکریا کا نام زیادہ مشہور ہے۔

گلبرگہ، احسن آباد ۔ حضرت گیسو دراز بندہ نوازؒ کی نسبت سے گلبرگہ شریف کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ ریاست حیدرآباد کے ایک ضلع کا صدر مقام۔ یہ شہر بہمنی سلطنت کا صدر مقام رہا ہے۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ۱۵۰۴ء میں اس پر بیجاپوری افواج کا قبضہ ہو گیا اور ۱۶۵۷ء میں سلطنتِ مغلیہ سے اس کا الحاق ہو گیا۔ آخرکار ۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف جاہ اوّل نے اس پر قبضہ کر لیا۔

احسن آباد گلبرگہ میں بہمنی اور عادل شاہی دونوں سلطنتوں کے بے شمار آثار پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قلعہ ہفت گنبد اور حضرت شیخ سراج الدین جنیدیؒ اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے فرزند سید محمد اکبر الحسینی کا مقبرہ بھی گلبرگہ میں ہے۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا مزار بر عظیم کے۔ یہ مرجع خاص و عام ہے اور اسی

نسبت سے گلبرگہ کو کافی شہرت حاصل ہے۔

گلزارِ ابرار پاک و ہند کے ۶۱۲ علماء و مشائخ کا عمومی تذکرہ ہے۔ اس کے مصنف محمد غوثی بن حسن گجراتی ہیں۔ اسے جہانگیر بادشاہ کے نام مسنون کیا گیا۔ نقشِ اوّل ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء میں تیار ہوا۔ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۲ء میں اصلاح و اضافہ سے نقشِ ثانی تیار ہوا۔ اس کے بقیہ میں سے زیادہ تر حصہ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تا ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء لکھا گیا۔

اردو ترجمہ مفتی احمد نے ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں اذکارِ ابرار کے نام سے پیش کیا۔ یہ تذکرہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

گلستان شیخ شرف الدین مصلح سعدی شیرازی (متوفی ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء) کے کلام اور حکایات کا مجموعہ ہے۔ یہ فارسی زبان میں کلاسیکی ادب کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور علمی مدارس کے نصاب میں ایک طویل عرصہ سے شامل ہے۔

گمان کسی چیز یا شخص کی ظاہری علامات سے جو رائے قائم کر لی جاتی ہے اُسے گمان کہا جاتا ہے۔ عربی میں اسے ظن کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ حجرات کی آیت ۱۲ میں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ دوسرے کے بارے میں گمان کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

گمان کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک قسم کا گمان یہ ہے جو اخلاق کی نگاہ میں نہایت پسندیدہ اور دین کی نظر میں مطلوب اور محمود ہے۔ مثلاً اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان سے نیک گمان اور اُن لوگوں کے ساتھ حسنِ ظن جن سے آدمی کے تعلقات ہوں اور ان کے متعلق بدگمانی کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

دوسری قسم کا گمان وہ ہے جس کو عموماً عملی زندگی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عدالت میں جو شہادتیں جج کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اُن کو جانچ کر وہ غالب گمان کی بنا پر فیصلہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ معاملہ کی حقیقت کا براہِ راست اس کو علم نہیں ہوسکتا اور شہادتوں کی بنیاد پر جو رائے قائم ہوتی ہے وہ زیادہ تر یقین پر نہیں بلکہ ظنِ غالب پر مبنی ہوتی ہے۔

گمان کی تیسری قسم وہ ہے جو اگرچہ ہے تو بدگمانی، مگر جائز نوعیت کی ہے اور اس کا شمار گناہ میں نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کی سیرت و کردار میں یا اس کے معاملات اور اطوار میں ایسی واضح ظاہری علامات ہوں جن کی بنا پر وہ حسنِ ظن کا مستحق نہ ہو اور اس سے بدگمانی کے لیے معقول وجوہ ہوں۔

چوتھی قسم کا گمان جو گناہ ہے کہ آدمی کسی شخص سے بلاسبب بدگمانی کرے یا دوسروں کے متعلق رائے قائم کرنے میں ہمیشہ بدگمانی ہی سے ابتدا کرے یا ایسے افراد کے متعلق بدگمانی کرے جن کے ظاہری احوال سے نیکی اور شرافت واضح ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی گناہ ہے کہ ایک شخص کے کسی قول یا فعل میں برائی اور بھلائی کا یکساں احتمال ہو اور محض سوءِ ظن سے کام لے کر اس کو برائی ہی پر محمول کریں۔

اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گمان بجائے خود کوئی ممنوع چیز نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں وہ پسندیدہ ہے اور بعض حالات میں ناگزیر ہے۔ بعض معاملات میں ایک حد تک جائز اور اس حد سے آگے ناجائز اور بعض معاملات میں بالکل ہی ناجائز ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں گمان یا بدگمانی سے مطلقاً پرہیز کے لیے نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ بہت زیادہ گمان کرنے سے پرہیز کرو۔

گمراہی صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط راستہ کو اختیار کرنا، صحیح بات کو چھوڑ کر غلط بات کو تسلیم کرنا، صحیح عقائد کو چھوڑ کر غلط عقائد کو اپنانا، گمراہی ہے۔

کسی شخص یا قوم کی گمراہی کا آغاز اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہیں بلکہ خود اس کی اور شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور جو کوئی گمراہی کا راستہ اختیار کرے اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب اور اس کی توفیق فراہم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ جسے گمراہی میں پھینک دے اُسے کوئی راہِ راست نہیں دکھا سکتا۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بار بار یہ واضح کیا گیا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی صریحاً گمراہی ہے اور دلیل کے بغیر محض دوسروں کی تقلید میں کوئی عقیدہ اختیار کرنا بھی گمراہی ہے۔ علم کے بغیر گمان کی پیروی کرنا بھی گمراہی کے اسباب میں سے ہے۔ قرآن مجید ایسی ہر گمراہی کی ذمہ داری انسان پر ڈالتا ہے اور ایسی گمراہی کو اختیار کرنا انسان کی اپنی ذات کے لیے نقصان دہ ہے۔

قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ اور دلائل کے ذریعے گمراہی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور گمراہ لوگوں کو انجامِ بد سے آگاہ کیا گیا ہے۔

گناہ انسان کا اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا حاصل کرنے میں جان بوجھ کر قصور دکھانا۔ عربی میں اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے لفظ "اِثم" استعمال کیا جاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں گناہ دو قسم کے ہیں۔ گناہِ کبیرہ اور گناہِ صغیرہ۔ ہر وہ فعل گناہِ کبیرہ ہے جسے کتاب و سنت کی کسی نص صریح نے حرام قرار دیا ہو یا وہ گناہ جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے دنیا میں کوئی حد مقرر کی ہو یا اس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہو یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو یا اس کے مرتکبین پر نزولِ عذاب کی خبر دی ہو۔

مذکورہ بالا نوعیت کے گناہوں کے علاوہ جتنے افعال بھی شریعت کی نگاہ میں برے ہیں وہ سب صغائر کی تعریف میں آتے ہیں۔ اسی طرح کبیرہ کی محض خواہش ... کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ ہے۔ حتیٰ کہ کسی بڑے گناہ کے ... گناہِ کبیرہ نہیں ہے جب تک آدمی اس کا ارتکاب نہ کر گزرے۔ البتہ گناہِ صغیرہ بھی ... کبیرہ ہو جاتا ہے جب کہ وہ دین کے استخفاف اور اللہ تعالےٰ کے مقابلے میں ... سے کیا جائے اور اس کا مرتکب شریعت کے احکام کو کسی ... نہ سمجھے ... برائی قرار دیا ہے۔

صغائر کے معاف کیے جانے کا بھی امکان ہے۔ اگر انسان کسی ... ہو کر اللہ تعالےٰ سے توبہ کرتے ہوئے نیکی کی روش اختیار کرے اور نیک کام ... معاف کر دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے بیان کیا ہے ... یذھبن السیئات۔ گناہِ کبیرہ کے متعلق نبیؐ نے فرمایا۔ تین گناہ ایسے ہیں ... ان کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ ایک شرک، دوسرے ... میدانِ جنگ سے فرار۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ایسے سات گناہوں کا ذکر ہے جو ... اور آخرت میں برا انجام لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کفر و اسلام کی جنگ میں کفار کے آگے پیٹھ پھیر کر بھاگے۔

اسی طرح بعض اجتماعی یا قومی گناہ بھی ہیں جس کی سزا پوری قوم یا اجتماع کو دی جائے۔ چاہے ان میں سے چند افراد نے گناہ کا فعل کیا ہو۔ پوری قوم کو چند افراد کے کیے کی سزا دینا اس لیے ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس گناہ کے اثرات پورے معاشرہ پر پڑتے ہیں۔

مثلاً چند افراد دعوتِ حق (نبیؐ کی دعوت) کو ٹھکراتے ہیں اور اس دعوت کے راستے میں کانٹے ڈالتے ہیں اور باقی افرادِ قوم خاموشی سے تماشا دیکھتے ہیں تو جب عذابِ الٰہی آئے گا تو پوری قوم پر آئے گا۔

نادانستہ کیے گئے گناہ پر کوئی گرفت نہیں۔ البتہ ایسے گناہ پر ضرور گرفت کی جائے گی جو دل کے پختہ ارادہ سے کیا گیا ہو۔ اگر ایک شخص زنا کے ارادہ سے جاتا ہے لیکن زنا نہیں کرتا تو اسے کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح ایک شخص ایک مکان میں چوری کے ارادے سے داخل ہوتا ہے لیکن چوری نہیں کرتا اُسے کوئی گناہ نہیں ہے۔

مزید دیکھیے: "کبیرہ"

گنج بخش قادری

(یکم رمضان المبارک ۹۵۹ھ - ۸ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ)

آپ کا نام حاجی محمد، القاب، نوشہ، گنج بخش، تجود اکبرا اور بھورسے والا تھے۔ آپ سادات خاندان میں سے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سید علاؤ الدین تھا جو اپنے وقت کے اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔

حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری نے تعلیم ظاہری مولانا قائم الدین اور حافظ بڈھا صاحب سے حاصل کی۔ قرآن کی تجوید و قرأت و حفظ بھی کیا۔ علوم معقول و منقول سے فراغت کے بعد قادری سلسلہ میں حضرت سخی شاہ سلیمان بھلوالی کے مرید ہوئے۔ آپ کے شیخ نے خلافت سے نواز کر نوشہرہ تارڑاں میں بھیجا جو بعد میں بنام ساہن پال شریف مشہور ہوا۔

آپ نے دُور دراز ممالک کی سیاحت کی۔ سات مرتبہ زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت ملی کئی مرتبہ لاہور بھی آئے اور یہاں کے اکابر مشائخ سے ملاقاتیں رہیں۔

حضرت نوشہ گنج بخش اپنے زمانے کے عظیم مبلغینِ اسلام میں سے تھے۔ دُور دراز ممالک میں اپنے خلفاء اور مریدین کو بھیجا کرتے تھے۔

کثرت فیضان کے باعث گنج بخش کے نام سے مشہور ہوئے آپ کے خلیفہ حافظ رحمٰن الدین کنجاہی کے کلام سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

نوشہ گنج بخش را دیدی
رستم و سازِ و رخش را دیدی

آپ صاحب تصانیف بزرگ تھے اور اس کے علاوہ پنجابی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے آپ کا مزار ساہن پال، تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں دریائے چناب کے شمالی کنارے پر مرجع خلائق ہے۔

گنی

گنی کی آبادی ۴۰ لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور اس کا ۸۵ فیصد مسلمان ہے۔ تقریباً ۴۳ لاکھ اس کا رقبہ ۹۴،۹۲۶ مربع میل ہے۔ اس کا دارالحکومت کوناکری ہے جس کی آبادی سوا لاکھ ہے۔

گنی میں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہنچ گیا تھا۔ بربر مبلغین نے اسے باقاعدہ اسلامی مملکت کا حصّہ بنا لیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یہ گھانا کی عظیم اسلامی مملکت کا حصّہ بن گیا جس کا دارالحکومت ٹمبکٹو تھا جو ایک دور میں افریقہ کا بغداد تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ہی یورپی غاصب گنی پہنچ گئے تھے۔ مگر امام سموری طورہؒ کی زیر قیادت گنی کے مسلمانوں ۱۸۹۸ء تک فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ اگرچہ امام کو شکست ہو گئی لیکن آزادی کی روح ملک میں برقرار رہی اور امام کے پوتے شیخ طورنے ۲؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فرانسیسی استعمار سے اپنے ملک کو آزاد کرا لیا۔ شیخ طورہ افریقی سوشلسٹ بلاک کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد حلیف ہیں۔ شیخ طور ہی اس وقت ملک کے سربراہ ہیں۔ گنی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ گنی میں سونے، ہیرے اور پٹرول کے وسیع ذخائر ہیں۔ یہاں کی زرعی پیداوار میں جو چاول، ناریل، انناس، کافی اور مونگ پھلی ہیں۔

گولڑہ شریف

راولپنڈی شہر سے گیارہ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ جو ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ برعظیم میں اس قصبہ کو مشہور عالم دین اور بزرگ جناب پیر مہر علی شاہؒ کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کا مزار یہاں ہی واقع ہے۔ اب گولڑہ شریف ایک مستقل خانقاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جامعہ غوثیہ کے نام سے ایک وسیع مدرسہ ہے خاندانِ سادات کے گھرانوں کے قریب ایک بہت بڑی عالیشان مسجد بھی یہاں کی یادگار عمارتوں میں سے ہے آستانہ گولڑہ شریف پر زائرین کے لیے مستقل لنگر چلتا رہتا ہے۔ اس وقت یہاں کے سجادہ نشین جناب غلام معین الدین شاہ صاحب ہیں۔

پیر سید مہر علی شاہ

(ولادت یکم رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ / ۱۴؍ اپریل ۱۸۵۹ء)

آپ کا سلسلہ نسب ۲۵ واسطوں سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ المعروف غوث الاعظم اور ۳۶ واسطوں سے حضرت حسنؓ سے ملتا ہے۔

آپ کی پیدائش سے پہلے ہی آپ کے خاندان میں کئی بشارتیں چلی آ رہی تھیں۔ ابھی چار سال کی عمر کو نہ پہنچے تھے کہ عربی کا قاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ قرآن کریم پڑھنے کے لیے آپ کو خانقاہ کی درس گاہ میں اور اردو فارسی کی تعلیم کے لیے مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ حافظ کی یہ حالت تھی کہ قرآن مجید کا روزانہ سبق آپ حفظ کر کے سنا دیا کرتے تھے۔ جب قرآن مجید ناظرہ ختم کیا تو اس وقت آپ کو پورا قرآن مجید حفظ تھا۔ عربی، فارسی اور صرف و نحو کی تعلیم کے لیے مولوی غلام محی الدین آپ کے استاد تھے۔ آپ نے کافیہ تک اپنے استاد سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے حسن ابدال کے نواح میں موضع بھوئی کے مولانا محمد شفیع قریشیؒ کی درسگاہ میں داخل ہوئے۔ دو اڑھائی سال میں رسائل منطق میں سے قطبی تک اور نحو اور اصول کے درمیانہ اسباق تک تعلیم حاصل کی۔

بھوئی کے درس سے فارغ ہو کر گھر آئے۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے موضع انگہ علاقہ سون ضلع شاہ پور کا سفر اختیار کیا اور وہاں مولانا سلطان محمود انگوی سے استفادہ کیا۔ انگہ میں قیام کے دوران اپنے استاد کے ہمراہ سیال شریف، ان کے مرشد خواجہ شمس الدین سیالویؒ کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ حضرت سیالویؒ جناب مہر علی شاہ صاحبؒ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے بعد میں سلسلہ چشتیہ میں خواجہ سیالویؒ ہی سے بیعت کی۔

انگہ میں اڑھائی سال کے قیام کے بعد جب آپ گولڑہ واپس آئے تو درسِ نظامی میں سے صرف فلسفہ، معقول، ریاضی اور فقہ کی آخری کتب اور حدیث شریف میں صحاح ستہ اور تفسیر میں بیضاوی وغیرہ باقی رہ گئی تھیں۔ ان علوم کی تحصیل کے لیے آپ ۱۲۹۰ھ میں کانپور مولانا احمد حسن محدثؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا احمد حسنؒ ان دنوں حج کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اس لیے آپؒ علی گڑھ میں مولانا موصوف کے استاد مولانا لطف اللہؒ کے درس میں داخل ہو گئے۔ علی گڑھ میں دو سال سے زائد قیام میں آپ نے مولانا لطف اللہؒ سے قرآن مجید، کتب احادیث صحاح ستہ اور بعض خصوصی احادیث کی سندات حاصل کیں۔ علی گڑھ سے آپ سہارنپور آئے اور مولانا احمد علیؒ سے حدیث کی کتابوں بخاری اور مسلم کی تعلیم حاصل کی۔

۱۲۹۵ھ/۷۷-۱۸۷۶ء میں فارغ التحصیل ہو کر واپس وطن تشریف لائے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کی شادی اپنے ننھیال میں سید چراغ علی شاہ کی دختر سے حسن ابدال میں

ہوئی۔ وطن پہنچنے کے بعد آپ نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے تو خواجہ عبدالرحمٰن آپ کے ہمراہ تھے۔ مکہ مکرمہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بانی مدرسہ صولتیہ (مکہ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ آپ کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا محمد غازی نائب مدرس مدرسہ صولتیہ آپ کی علمی بصیرت سے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے گولڑہ شریف لے آئے۔ جب مکہ مکرمہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ

پیر مہر علی شاہ صاحبؒ

اس وقت مثنوی رومؒ کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص مثنوی کے ایک شعر کے بارے میں تشفی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب کی اجازت سے پیر مہر علی شاہؒ نے اس شعر کی ایسی عارفانہ تشریح کی کہ حاجی صاحبؒ وجد میں آگئے اور آپؒ کو سلسلہ چشتیہ صابریہ میں اجازت سے نوازا۔ حضرت پیر صاحبؒ حرمین شریفین میں قیام کا ارادہ رکھتے تھے لیکن حاجی صاحبؒ نے بتاکید وطن مراجعت کا حکم دیا۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی پیش گوئی کے مطابق پیر صاحب کی مساعی جمیلہ نے فتنہ قادیانیت کی سازشوں پر پانی پھیر دیا جو اس خطے میں انگریزوں کی سرپرستی میں کی جارہی تھیں۔ ۱۳۱۷ھ/۱۹۰۰-۱۸۹۹ء میں آپ نے شمس الہدایہ لکھ کر حیاتِ مسیح پر بھرپور دلائل پیش کئے۔ کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی حضرت مسیحؑ کے وفات پانے اور ان کی کشمیر میں قبر کے لیے بیہودہ دلائل دے رہا تھا۔ مرزا قادیانی نے پیر صاحب کو مناظرے کا چیلنج کیا۔ ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو پیر صاحب دوسرے علمائے کرام اور احباب کے ہمراہ شاہی مسجد لاہور میں مناظرہ کے لیے آئے لیکن مرزا صاحب نے سامنے آنے کی جرأت نہ کی۔

۱۵ دسمبر ۱۹۰۰ء کو مرزا قادیانی نے تفسیر اعجاز المسیح کے نام سے عربی زبان میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھی اور اس کے متعلق دعویٰ کیا کہ یہ الہامی ہے۔

۱۹۰۲ء میں پیر صاحب نے "سیف چشتیائی" کے نام سے مرزا صاحب کی مزعومہ الہامی تفسیر کا جواب دیا اور مرزا صاحب کی عربی دانی کی قلعی کھولی اور مختلف قدیم عربی کتب سے نقل کردہ عبارات کی نشاندہی کی۔

پیر مہر علی شاہؒ نے زندگی بھر عمومی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ تقسیم ہند سے قبل تحریک خلافت میں آپ نے شرعی نقطہ نظر سے واضح کیا کہ ترکی سلطنت، خلافت اسلامیہ کا درجہ نہیں رکھتی۔ ترکی کے مسلمانوں سے ہمدردی اور محبت کے جذبات کی وجہ سے طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے موقع پر گھر کے زیورات وغیرہ فروخت کرکے چندہ دیا۔

آپ کی ان تجدیدی خدمات جلیلہ کے پیش نظر آپ کو چودھویں صدی کا مجدد کہا جاتا ہے۔

آپ شیخ ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود کے زبردست حامی اور مبلغ تھے۔

حضرت پیر مہر علی شاہؒ نے عمر بھر شریعت و طریقت کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ ابتدائی عمر سے لے کر آخر وقت تک آپ کی زندگی سے منسوب کئی ایسے نادر واقعات اور صوفیانہ اصطلاح میں کرامات کا صدور ہوا کہ انسانی ذہن و عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

تعلیم کے دوران ہی آپ کے معاملات اور واقعات سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی آپ پر خصوصی نظر ہے۔ مولانا فیض احمد نے آپ کی سوانح حیات مہر منیر کے نام سے مرتب کی ہے اس میں ایسے کئی واقعات کا بیان ہے۔

پیر مہر علی شاہؒ نے ضرورت اور تقاضا کے پیش نظر بعض اہم و بلند پایہ کتب لکھی ہے۔

الفتوحات الصمدیہ، تحقیق الحق فی کلمۃ الحق، شمس الہدایۃ فی اثبات حیات المسیحؒ، سیف چشتیائی، اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان ما اہل بہ لغیر اللہ، تصفیہ مابین سنی و شیعہ اور فتاویٰ مہریہ۔

آپ کے افادات و ملفوظات بھی مولانا فیض احمد نے مرتب کیے ہیں۔

پیر غلام محی الدین گولڑویؒ

آپ پیر مہر علی شاہؒ کے فرزند تھے۔ پیر مہر علی شاہؒ کے انتقال کے بعد آپ ہی ان کی جانشین ہوئے۔ پیر صاحب آپ کو پیار سے 'بابوجی' کہا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ 'بابوجی' کے نام سے زیادہ معروف ہوئے۔

حضرت بابوجی کی ولادت دسمبر ۱۸۹۱ء، ۱۳۰۹ھ [illegible] میں ہوئی۔ حضرت بابوجی کی تعلیم و تربیت آپ کے والد محترم کے زیر سایہ علم و فضل کے گہوارے میں ہوئی۔ والد محترم نے بابوجی کو ظاہری و باطنی علوم سے مزین کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ فرمایا۔

حضرت بابوجیؒ نے علم قرأت (تجوید)، قاری عبدالرحمٰن جونپوریؒ سے حاصل فرمایا۔ دیگر علوم دینیہ کی تحصیل مولانا محمد غازی سے کی۔ جب آپ کے والد آپ کی علمی و روحانی تکمیل سے ہر طرح مطمئن ہوگئے تو آپ کو اجازت بیعت عطا فرمائی۔

زمانۂ طفولیت سے آپ کو ریلوے انجن سے خصوصی شغف تھا۔ انجن ڈرائیوروں سے مانوس ہونے کی وجہ سے آپ نے انجن چلانا تک سیکھا تھا۔ ریلوے اور اس کی آواز سے محبت اس حد تک بڑھی کہ اکثر راتیں گولڑہ سٹیشن پر گزار دیتے اور گھر پہ اپنی بیٹھک کی چھت پر ریلوے سگنل کی طرح کا ایک سگنل آویزاں کر دیا تھا۔ گاڑیوں کی سٹیشن پہ آمد اور انجن کی سیٹی کی آواز سن کر آپ اپنے گھر کے چھت والا سگنل گرا دیا کرتے تھے۔
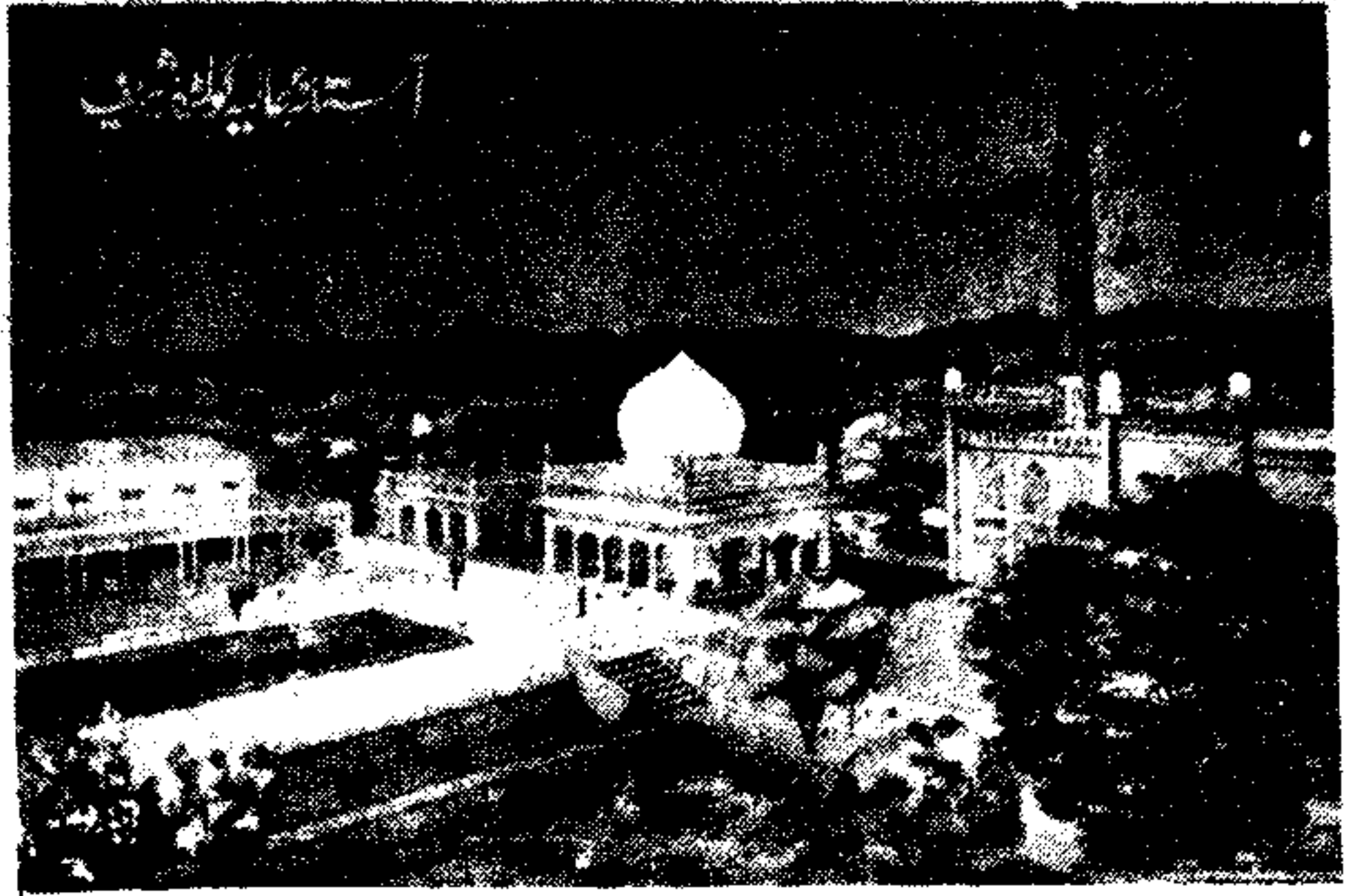
حضرت بابوجی کی شادی ۱۹۰۱ء میں اپنے عزیزوں کے ہاں ہوئی۔ اس تقریب میں ہر طبقہ کے لوگوں نے شرکت کی۔ عوام وخواص کے علاوہ صوفیائے کرام اور علمائے عظام بھی کثرت سے شریک ہوئے۔ جن میں سید محمد صاحب دیوان پاک پتن، صاحبزادہ محمود تونسہ شریف، صاحبزادہ خواجہ ضیاء الدین سیال شریف، میاں شیر محمد شرقپوریؒ اور پیر جماعت علی شاہ خصوصی مہمانوں میں سے تھے۔

۱۹۴۴ء میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی۔

آپ کی دینی و ملی خدمات کے بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے جن میں حجاز مقدس عراق، شام، مصر، ترکی، ایران وغیرہ ممالک اسلامیہ کے متعدد سفر، تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون، جہادِ کشمیر ۴۸-۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء میں آپ کی ملی خدمات، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں تعاون اور سعی و کوشش کے واقعات ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ذاتی طور پہ مجاہدین اور مہاجرین کی ہر قسم کی امداد کے علاوہ اپنے متوسلین کو بھی خاص طور پہ اس جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب اور تاکید فرماتے رہے۔

زندگی بھر عمومی سیاست سے الگ رہتے ہوئے یادِ الٰہی اور مسلمانوں کی روحانی تربیت میں مصروف رہے۔ طویل علالت کے بعد ۲۲ جون ۱۹۷۴ء / یکم جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ کو بروز منگل سی ایم ایچ میں انتقال فرمایا۔ دوسرے دن یعنی ۲۳ جون کو والد محترم کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیے گئے۔ حضرت بابوجیؒ کے بعد آپ کے صاحبزادے غلام معین الدین جانشین مقرر ہوئے۔

(اس مضمون کی ترتیب و تحریر میں "مہر منیر" سے استفادہ کیا گیا۔ امتیاز بخاری)

گیسو درازؒ، سید محمد حسینی۔ (۷۲۱ھ - ۸۲۵ھ)

حضرت خواجہ گیسو درازؒ برعظیم پاک و ہند کے نہایت بلند پایہ شیخ طریقت اور مرشد روحانی گزرے ہیں۔ آپ عام طور پہ خواجۂ بندہ نواز کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ سلسلۂ نسب حضرت سیدنا زید شہید بن علی بن سیدنا حسینؓ سے ملتا ہے۔
آپ کے دادا سید علی الحسینی ہرات سے دہلی تشریف لائے تھے۔ آپ کی ولادت ۴ رجب ۷۲۱ھ کو دہلی میں ہوئی۔

جس زمانے میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دیوگیر یعنی دولت آباد کو پایۂ تخت بنانے کا ارادہ کیا اور اہل دہلی کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا تھا، اس وقت حضرت خواجہ گیسو دراز کی عمر چار سال کی تھی۔ آپ بھی اپنے والدین کے ہمراہ دولت آباد منتقل ہوئے۔ یہاں ایک صاحب کشف و ادراک بزرگ شیخ بابوؒ رہتے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت سید یوسف حسینیؒ ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور آپ کو بھی ساتھ رکھتے۔ شیخ بابوؒ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ انھوں نے بچپن ہی میں آپ کی جبین مبارک پہ آثار ولایت محسوس فرمائے جس کا انھوں نے ایک بار اظہار بھی فرمایا۔

آٹھ سال کی عمر ہی میں آپ سے دینی شغف کا اظہار ہونے لگا۔ وضو اور نماز میں خاص اہتمام فرماتے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے نانا سے پائی۔ پھر ایک اور استاذ سے مصباح اور قدوری پڑھیں۔ نانا بزرگوار اور والد ماجد دونوں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔ ان کی صحبت میں حضرت چراغ دہلیؒ کے فضائل و مناقب سن سن کر غائبانہ عقیدت پیدا ہو گئی۔ آپ کا قلب اُن کی خدمت میں حاضری کے لیے مشتاق و مضطرب رہنے لگا۔

آپ دس سال کے تھے کہ والد بزرگوار نے ۵ شوال ۷۳۱ھ کو وفات پائی۔ دولت آباد میں اُن کا مزار زیارت گاہِ خلائق ہے۔

۷۳۶ھ میں اتفاقاً حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ سفرِ دہلی اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ اپنی والدہ اور بڑے بھائی سید حسین عرف چندن کے ہمراہ دہلی تشریف لے آئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

دہلی پہنچ کر آپ حضرت چراغ دہلی کی زیارت کے لیے بے قرار ہوئے۔ چنانچہ بروز جمعہ آپ سلطان قطب الدین کی جامع مسجد میں گئے جہاں حضرت خواجہ نصیر الدین نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ وہاں حضرت چراغ دہلیؒ کو دور سے دیکھا تو اُن کے چہرۂ مبارک کے انوار و جمال سے مسحور ہو گئے۔ ۱۶ رجب ۷۳۶ھ کو آپ نے حضرت چراغ دہلیؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔

اس کے بعد سے آپ نے اپنے محبوب شیخ کی خدمت گزاری اختیار کی۔ مجاہدہ و ریاضت، ذکر و مراقبہ اور حضرت شیخ کی تلقین و فرمائش کی بجا آوری میں مشغول ہو گئے۔ نیز علوم ظاہری کی تعلیم بھی کچھ سید شرف الدین کیتھلیؒ اور کچھ مولانا تاج الدین بہادرؒ سے حاصل کرتے رہے۔ قاضی عبد المقتدرؒ کی خدمت میں بھی تعلیم کے لیے حاضر ہوتے رہے۔

کبھی کبھی آپ حضرت چراغ دہلیؒ کی خدمت میں عرض کرتے:

"حضور، علم ظاہر تو کسی قدر حاصل ہو چکا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسی پہ بس کروں اور کلی طور پر علم باطن میں مشغول ہو جاؤں۔"

حضرت شیخ فرماتے:

"ہدایہ، بزدوی، رسالۂ شمسیہ، کشاف، مفتاح اور صحائف۔ ان سب کتابوں کو ترتیب سے پڑھ لو۔ مجھے تم سے ایک کام لینا ہے۔"

آپ نے سب کتابیں پوری کر لیں تو حضرت شیخ بے حد خوش ہوئے۔ اس کے بعد آپ ہمہ تن علوم باطن میں لگ گئے۔ اپنے حالات حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کرتے رہتے۔ حضرت چراغ دہلیؒ فرمایا کرتے تھے:

"ستر برس کی عمر میں ایک لڑکے نے مجھ میں پھر سے شوریدگی پیدا کر دی ہے اور مجھے میرے پہلے زمانے کے واقعات یاد دلا دیے ہیں۔"

آپ کا نام نامی بہت بلند ہوا اور طائفۂ صوفیاء میں آپ کی شہرت پھیل گئی۔ یہاں تک کہ صوفیانِ کامل بیک زبان فرماتے تھے کہ اس شخص کو نوجوانی ہی میں مقامِ پیرانِ واصل و مقتدایانِ

کمال حاصل ہو گیا ہے۔

حضرت چراغ دہلیؒ نے اپنے وصال سے تین روز پیشتر ۱۵ رمضان ۷۵۷ھ کو اپنے تمام خلفاء میں آپ کو ممتاز فرما کر اپنا جانشین بنایا۔ آپ سجادۂ ولایت پہ رونق افروز ہوئے اور ہاتھ بیعت کے لیے بڑھا دیا۔

جب آپ کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو گئی تو حضرت مولانا جمال الدین مغربیؒ (معاصر ابن بطوطہ) کی پوتی سے آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کی اولاد میں دو صاحبزادے سیّد محمد اکبر حسینیؒ (م ۸۱۲ھ) سیّد محمد اصغر حسینیؒ اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادے بلند پایہ عالم اور صاحبِ مقام عارف تھے۔

زمانۂ مشیخت میں بہت سے علماء و صلحاء، سلاطین و خوانین اور ہر قسم کی مخلوق آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئی۔ اس دوران میں دو مرتبہ آپ اجودھن (پاکپتن) میں بھی رونق افروز ہوئے۔

جب آپ کی عمر شریف ۸۰ برس کی ہوئی تو ۷ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو حملۂ تیموری کی وجہ سے اپنے تمام کنبے سمیت دہلی کو خیرباد کہا۔

حضرت خواجہ گیسو درازؒ بھیلسہ دروازہ کے راستے شہر دہلی سے باہر نکلے۔ پہلے بہادر پور (میوات) پہنچے، پھر گوالیر، بھاندیر، ایرچہ، چہترہ، چندیری، میانڈھار، بڑودہ اور کھنبایت میں قیام فرماتے گئے۔ دورانِ سفر میں ملوک و خوانین اور علماء و مشائخ کی کثیر تعداد نے جگہ جگہ استقبال کیا۔ خلقِ خدا جوق در جوق بیعت سے مشرف ہوئی۔

کھنبایت سے آپ دوبارہ بڑودہ تشریف لائے۔ پھر وہاں سے سلطان پور ہوتے ہوئے دولت آباد میں اپنے والد بزرگوار حضرت سیّد محمد یوسف حسینیؒ المعروف بہ سیّد راجا کے مزارِ پُر انوار پر حاضر ہوئے۔ یہاں کا حاکم عضد الملک حاضرِ خدمت ہوا اور سلطان فیروز بہمنی بادشاہِ گلبرگہ کی طرف سے نذر پیش کی۔ دولت آباد سے آپ نے گلبرگہ کا قصد فرمایا۔ سلطان فیروز بہمنی (م ۸۲۵ھ) نے اپنے خاندان، امراء دربار کے امراء، علماء و سادات اور شاہی لشکر کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ حضرت کی خدمت میں باصرار عرض کیا کہ گلبرگہ میں مستقل قیام فرمائیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے چند روز کے توقف کے بعد باشارۂ روحانی سلطان کی درخواست قبول فرمائی۔

دکن میں حضرت خواجہ صاحب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خواص و عام اُن کے فیوض و برکات سے سیراب ہوئے۔ آپ کے کثیر التعداد خلفاء نے آپ کا فیضان شرق و غرب اور شمال و جنوب میں پھیلا دیا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی کا بھائی احمد شاہ بہمنی بھی آپ کے حلقۂ عقیدت و ارادت میں داخل ہوا۔ حضرت خواجہ صاحب کی صحبت میں اتباعِ سنت کا رنگ اس پہ ایسا چڑھا کہ اپنی بادشاہت کے زمانے میں اس نے نفاذ شریعتِ محمدیہ کو اپنا شعار بنایا۔ دکن کی تاریخ میں وہ سلطان احمد شاہ ولی کے نام سے مشہور ہے۔

گلبرگہ شریف میں بائیس سال تک آپ کے چشمۂ رشد و ہدایت سے خلقِ خدا فیض یاب ہوتی رہی۔ جب عمر مبارک ایک سو چار سال کی ہوئی تو ۱۶ ذیقعدہ ۸۲۵ھ کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

آپ نے بہت سی کتابیں اور رسائل تصنیف کیے جن میں سے چند معروف یہ ہیں:۔
قرآن پاک کی عربی تفسیر بہ رنگِ سلوک "ملتقط" "کشاف" کی طرز پہ ۵ پاروں کی تفسیر۔ کشاف کے حواشی بھی لکھے۔ رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، فصوص الحکم، قصیدۂ امالی اور آداب المریدین کی شروح لکھیں۔ فقہ اکبر کی فارسی اور عربی میں شرح لکھی۔ تصوف کے موضوع پر کئی رسالوں کی تصنیف۔ آپ کے ملفوظات اور مکتوبات بھی آپ کے عقیدت مندوں نے مرتب کیے ہیں۔

گیلانی، زین العابدین، سیّد

ملتان کے مشہور و معروف گیلانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جب علماء نے انگریزی ملازمت کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا تو آپ اس وقت شجاع آباد میں تحصیل دار تھے۔ ترکوں کی حمایت اور خلافتِ عثمانیہ کی بقاء کے لیے ملازمت کو ترک کر دیا اور تحریک آزادی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

ہندوؤں کی مختلف تنظیموں کے مقابلے میں ایک تنظیم "انجمن فدایانِ اسلام" قائم کی۔ آپ نے تحریکِ کشمیر، مجلس اتحادِ ملت، تحریک مسجد شہید گنج اور تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جب ملتان میں مسلم لیگ کی تنظیم قائم ہوئی تو آپ کو ضلع مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے لاہور کے تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے۔ قائد اعظم آپ کی خدمات سے متاثر ہو کر آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا رکن نامزد کیا۔

جب ملتان میں ۱۹۴۶ء میں خضر وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا، اس لیے گرفتار کر لیے گئے۔ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو خضر وزارت کے خاتمے اور پنجاب میں گورنر راج کے نفاذ کے بعد ملتان میں زین العابدین گیلانی صاحب نے ڈپٹی کمشنر ملتان اور بلدیہ ملتان سے [illegible] سے برطانوی جھنڈا اتار کر پاکستانی پرچم نصب کر دیا۔

۱۴ اگست کو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد آپ کی قیادت میں ملتان کی [illegible] عمارات سے برطانوی پرچم اتار کر پاکستانی پرچم نصب کر دیا گیا۔

آپ کی زندگی تحریکِ آزادی اور مسلم لیگ کے مقصد کی خدمت میں گزری۔ [illegible] ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ ۸ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو انتقال ہوا۔

گیلانی، سیف الدین، سیّد

[illegible] شیخ عبد القادر جیلانیؒ المعروف بہ غوث اعظم کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ [illegible] کے لیے دور دراز کے مقامات کے سفر کیے۔ علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل [illegible] میں جلد ہی دسترس حاصل کر لی۔ والد محترم کے انتقال کے بعد مدرسہ غوثیہ میں [illegible] ہی کے ذمہ تھی۔ بے شمار خلقت خدا نے آپ کے فضل و کمال سے استفادہ کیا۔

آپ کے وعظ میں ظرافت و لطافت کی آمیزش ہوا کرتی تھی۔ مدرسہ غوثیہ میں فتویٰ نویسی کا کام بھی آپ کے ذمہ تھا۔

ایک روایت کے مطابق [illegible] ۵۹۳ھ میں نہیں بلکہ [illegible] میں انتقال [illegible] اور اپنے والد کے جوار میں دفن ہوئے۔

گیمبیا

اس کا رقبہ ۴۳۰۱ مربع میل ہے۔ تین لاکھ ۶۰ ہزار سے زائد [illegible] ہے جس میں ۹۰ فی صد مسلمان آبادی ہے۔ سرکاری زبان انگریزی ہے۔ باتھرسٹ دارالحکومت ہے۔ مونگ پھلی، مچھلی اور پھل کا تیل خاص برآمدات ہیں۔

یہ ملک مغربی افریقہ میں دریائے گیمبیا کے [illegible] ہے۔ انگریزوں نے یہاں کافی عرصہ تک قبضہ جمائے رکھا۔ ۱۸ فروری ۱۹۶۵ء کو آزاد ہوا اور گیمبیا جمہوریہ نام رکھا گیا اور پہلے سربراہ حاجی فرمانگے مقرر ہوئے۔

ل

لا ادریہ - ایک ایسا فرقہ ہے جو خدا کے عدم اور وجود دونوں پر شک و شبہ کرتا ہے اور جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور دوسری غیر مادی اشیاء کی ہستی کے متعلق ہمیں نہ تو کچھ علم ہے اور نہ غالباً کبھی ہوگا۔

لات - دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب کا ایک بت جو مربع شکل کا تھا اور سفید پتھر کا بنا ہوا تھا اور اسے [illegible] خدائی درجہ دیتے تھے۔ اس کی عبادت عرصہ دراز تک ہوتی رہی۔ طائف میں [illegible] رکھا ہوا تھا۔

لاری، مصلح الدّین - (وفات ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء)۔
شافعی فقیہہ۔ لار (ہند) میں پیدا ہوئے اور اسی قصبہ کی نسبت سے لاری مشہور ہوئے۔ تجارت کے سلسلے میں حلب گئے۔ حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ استنبول کا سفر بھی کیا۔ منطق اور فلکیات پر بہت سا کام کیا۔ اُن کی تصنیفات میں 'شرح تہذیب المنطق'، اور 'تذکرہ من علم الہیئت' زیادہ مشہور ہیں۔

لامنس (ہنری)، (۱۸۶۲ء-۱۹۳۷ء) ایک مشہور مستشرق جو عرب جاہلیت اور عہدِ اموی پر اپنے مباحث کی وجہ سے مشہور ہوا۔
تالیفات ہیں 'مہد الاسلام'، 'مکہ قبیل الہجرت (مکہ ہجرت سے قبل)' 'الطائف قبیل الہجرۃ' (طائف ہجرت سے قبل)، 'الجزیرۃ العربیۃ الغربیۃ قبیل الہجرۃ' (عزبی جزائرِ عرب ہجرت سے قبل)' 'الاسلام، خلافتِ معاویہ، خلافتِ یزید'، 'تسریح الأبصار فی ما یحتوی لبنان من الآثار، تاریخ سوریۃ۔ ایک رسالہ "المشرق" کی ادارت بھی کرتا رہا۔

لاہور - پاکستان کا دوسرا بڑا اور قدیم تاریخی شہر۔ آبادی ۲۵ لاکھ سے زائد۔ اس قدیم اور تاریخی شہر نے بے شمار انقلابات دیکھے ہیں اور یہ تہذیب و تمدن اور علم و فن کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر سے کئی تحریکیں اٹھی ہیں۔ تحریکِ پاکستان میں یہاں کے باشندوں نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس لاہور میں منٹو پارک میں ہوا تھا۔ اس جگہ اب پاکستان کے نام سے ایک مینار تعمیر کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ میں یہاں کے مسلمانوں نے ہمت و جوانمردی کے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

لاہور کے متعلق جو قدیم روایت ملتی ہے اس میں رام چندر جی اور ان کی بیوی سیتا سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ رام کے بیٹے 'لا' یا 'لو' نے اپنی ماں کی یاد میں دریائے راوی کے کنارے یہ آبادی قائم کی۔ لہور، لوہارو، لوہور وغیرہ مختلف ناموں سے اب یہ لاہور بن گیا ہے۔ اس شہر کے گرداگرد بعد کے زمانوں میں ایک فصیل اور تیرہ دروازے بنائے گئے۔ ان دروازوں کے نشانات اب بھی ملتے ہیں اور جہاں یہ دروازے بنائے گئے تھے ان کی قریبی آبادیاں اسی نام سے منسوب ہیں جیسے لوہاری دروازہ، شیرانوالہ دروازہ وغیرہ۔ اسلامی عہد کی ایک کتاب 'حدود العالم (مصنف مروزی) میں اس شہر کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۳۷۲ھ میں لکھی گئی تھی اس وقت لاہور ملتان کے حاکم کے ماتحت ہوتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ میں لاہور سمیت شمالی ہند کے بعض علاقوں کو فتح کیا اور اس فتح کی یاد میں یہاں پہلی مسجد تعمیر کرائی۔ سلطان محمود غزنوی کا منظورِ نظر غلام ایاز یہاں کا صوبیدار رہا۔ اس کی قبر چوک رنگ محل میں موجود ہے۔ برعظیم کے مشہور بزرگ شیخ علی ہجویری داتا گنج بخش بھی یہاں کافی عرصہ رشد و ہدایت کی روشنی پھیلاتے رہے۔ ان کا مزار بھی یہاں ہی ہے۔

۱۱۸۶ء تا ۱۲۹۰ء کے عرصہ میں سلاطین غوری لاہور پہ قابض رہے۔ ان میں سے سلطان قطب الدین ایبک کا مزار بھی انارکلی کے قریب ایبک روڈ پر موجود ہے۔ اس کے بعد خلجی اور تغلق سلاطین کا زمانہ آتا ہے جو اڑھائی سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں تاتاریوں کے ہاتھوں لاہور کئی بار تاخت و تاراج ہوا۔ جب سلطان مبارک شاہ لاہور آئے تو یہاں صرف کھنڈر تھے۔ انھوں نے شہر کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ لاہور، لودھیوں کے زمانے میں بھی کافی معروف رہا۔ مغل عہد میں لاہور کو ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ شہنشاہ بابر نے مرزا کامران کو یہاں کا صوبیدار مقرر کیا۔ دریائے راوی کے کنارے کامران کے حکم سے تعمیر کردہ بارہ دری میں ایک باغ کے آثار بھی ملتے ہیں۔ ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں لاہور شورشوں کی آماجگاہ رہا۔ شہنشاہ اکبر نے اپنے زمانے میں لاہور کی از سرِ نو تعمیر کروائی اور لاہور کی آبادی کے گرداگرد فصیل اور مختلف دروازے اسی زمانے میں تعمیر کیے گئے۔ لاہور کا قلعہ تو پہلے سے موجود تھا لیکن اکبر کے زمانے میں اسے دوبارہ پختہ تعمیر کیا گیا۔ اکبر کے عہد کے کئی مشہور افراد عرفی، فیضی

بھی یہاں رہے ۔ طبقات اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین کا انتقال بھی لاہور شہر میں ہوا۔ جہانگیر کے عہد میں مسجد وزیر خان تعمیر کی گئی اور یہ یادگار اب بھی موجود ہے ۔ شاہدرہ کے قریب جہانگیر کا مقبرہ بھی اس دور کی یادگار ہے ۔ اورنگ زیب کو لاہور آنے کا موقع تو بہت کم ملا لیکن اس کی کوششوں سے شاہجہان کے عہد میں تعمیر کردہ بعض یادگاروں کو محفوظ کرنے کا کام ہوا ۔ اسی عہد میں (۱۰۷۲ء) میں تعمیر کردہ بادشاہی مسجد دنیا بھر میں اپنے فن تعمیر کی وجہ سے مشہور ہوئی ۔

مغل دور کے خاتمے کے بعد لاہور اور پنجاب کے دوسرے علاقوں پہ سکھوں کی حکومت قائم ہوئی ۔ سکھوں کے دور میں مغل دور کی بعض یادگاروں کو گرا دیا گیا ۔ انگریزوں کے زمانے میں اور پاکستان کی تشکیل کے بعد لاہور نے ہر شعبہ میں کافی ترقی کی ۔

لاہور آج بھی علم و ادب ، صحافت ، صنعت و حرفت ، تجارت اور سیاست کا اہم ترین مرکز ہے ۔ علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے یہاں کئی یادگار درس گاہیں ، کالج موجود ہیں ۔ تقسیم سے قبل یہاں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی جو اب بھی پنجاب یونیورسٹی کے نام سے موجود ہے ۔

تقسیم سے قبل کئی تحریکوں کے مرکز ہونے کی وجہ سے ان تحریکوں سے وابستہ بعض یادگار عمارتیں اب بھی موجود ہیں ۔ ان میں مسجد شہید گنج زیادہ مشہور ہے ۔ غازی علم الدین شہید بھی یہاں کا ایک مجاہد تھا جس نے رسولِ کریمؐ کی توہین پہ ایک ہندو کو قتل کر دیا تھا اور خود پھانسی کی سزا پائی ۔ مفکرِ پاکستان اور برِعظیم کے مشہور شاعر علامہ اقبال یہاں کافی عرصہ رہے اور انتقال کے بعد بادشاہی مسجد کی حدود میں دفن کیے گئے ۔

لاہور کو عمومی طور پہ ایک مردم خیز خطّہ بھی کہا جاتا ہے ۔ لاہور کے نام سے وابستہ بعض تاریخی شخصیتوں کا ذکر بھی آتا ہے جن میں مشہور عالم دین مولانا احمد علی لاہوری ، زمیندار اخبار کے بانی مولانا ظفر علی خان زیادہ معروف ہیں ۔

لباس ۔ انسان کی ستر پوشی اور زیب و زینت کا سامان ۔ انسانیت کے آغاز سے ہی ستر پوشی اور حیاء کے فطری جذبہ کو پورا کرنے کے لیے انسان اپنے ننگے جسم کو کسی نہ کسی طریقہ سے ڈھانپتا رہا ہے ۔ قدیم دور میں جب ہاتھ کے بنے ہوئے یا مشین کے بنے ہوئے کپڑے کا نام و نشان نہ تھا تو لوگ درختوں کے پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے اپنے جسموں کو ڈھانپا کرتے تھے ۔ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالٰی نے انہیں بنایا اور جنت میں بھیج دیا اور انھیں ایک خاص شجر کے قریب جانے سے منع کیا ۔ جب انھوں نے شیطان کے بہکاوے میں آکر اس شجر کے پھل کو استعمال کرلیا تو ان کے ستر ان پر کھل گئے ۔ وہ فطری جذبۂ حیا کے تحت ایک دوسرے سے چھپنے لگے اور اپنے جسموں کے ستر درختوں کے پتوں سے ڈھانپنے لگے (سورۃ الاعراف : آیات ۱۸ تا ۲۴) ۔

اسلام میں لباس اور جسم کی زیب و زینت کے لیے خاص احکام ہیں ۔ سورۃ الاعراف آیات ۲۶ ، ۲۷ میں لباس کے بارے میں یہ حکم دیا گیا ہے " اے بنی آدم ! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو ، اور بہترین لباس تقویٰ ہے ....."

لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے ۔ اللہ تعالٰی نے انسان کے جسم پہ حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پہ نہیں رکھی بلکہ حیا اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اور انسان اپنے اعضائے صنفی کے اظہار کو قبیح سمجھتا ہے ۔ اللہ تعالٰی نے انسان کو اپنے فطری تقاضا شرم کو پورا کرنے کے لیے کوئی بنا بنایا لباس نہیں دیا ۔ بلکہ اس کی فطرت پہ لباس کا الہام کیا (انزلنا علیکم لباسًا) تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اس تقاضا کو پورا کرنے کے لیے کوئی لباس خود ہی تجویز و اختیار کرے ۔ انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے اور طبعی ضرورت (جسم کی آرائش اور موسمی اثرات سے بدن کی حفاظت) مؤخر ہے ۔ انسان کی ضرورت کے ان دو پہلوؤں کو حیوانات کے لباس کی ضرورت سے بالکل الگ رکھا گیا ہے ۔ اللہ تعالٰی نے حیوانات کو جو پوشش عطا کی ہے وہ ان کی طبعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہے ۔ ان کے لیے ستر کو ڈھانپنے والی اخلاقی ضرورت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ لیکن جب انسان نے فطری تقاضا سے ہٹ کر شیطان کی رہنمائی قبول کر لی تو اس کا معاملہ حیوانوں کا سا ہو گیا ۔ شیطان کی اتباع میں انسان نے یہ سمجھ لیا کہ اس کے لیے لباس کی وہی ضرورت ہے جو حیوانات کے لیے ہے ۔ حالانکہ انسان کے لیے لباس صرف ذریعہ ستر پوشی اور وسیلۂ زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ انسان کا لباس تقویٰ کا لباس ہو ۔ یعنی پوری طرح ساتر ہو ۔ زینت میں بھی اس حد تک نہ بڑھا ہو کہ اس سے تکبّر و ریا کی شان جھلکتی ہو اور لباس میں یہ پہلو بھی مدنظر ہو کہ اس کی بناوٹ ایسی بے ہودہ نہ ہو کہ مرد کے لباس سے زنانہ پن اور عورتوں کے لباس سے مردانہ پن جھلکتا ہو ۔ نبی کریمؐ کی احادیث میں لباس کے بارے میں واضح ہدایات ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا : " روز قیامت اللہ تعالٰی اس شخص کی طرف نہیں دیکھے گا جس نے تکبر سے لباس کو گھسٹتا ہوا بنوایا ۔" (یعنی ایسا لباس ہو جس سے تکبر و نخوت کا اظہار ہوتا ہو) ۔

آپؐ نے فرمایا " عورتوں کے لیے سونے کے زیورات اور ریشمی لباس پہننا جائز ہے لیکن مردوں کے لیے جائز نہیں ۔ عورتوں کے بارے میں مزید فرمایا " ایسا لباس نہ پہنیں جس کے ذریعے مخالف جنس مرد کے لیے دلکشی کا پہلو ہو ۔" نبی کریمؐ کی احادیث میں ایسے مردوں کے لیے لعنت کی وعید بتائی گئی ہے جو عورتوں سے مشابہت والا لباس پہنتے ہیں اور ایسی عورتوں کے لیے بھی لعنت بیان کی گئی ہے جو مردوں جیسا لباس پہنتی ہیں ۔

لباس کے معاملے میں ہر دور میں ہر ملک اور علاقے کے لوگ اپنے مخصوص تہذیبی و تمدنی اثرات کے پہلو کو بھی مدنظر رکھتے جو اسلام کی تعلیمات کے مطابق جائز ہے ۔ کیونکہ اسلام نے کوئی خاص لباس تو مقرر نہیں کیا بلکہ حکم تو یہ ہے کہ ستر ڈھانپا جائے ۔ اس کے لیے کسی بھی بہتر لباس کا لباس بنوایا جا سکتا ہے ۔ اسی لیے مختلف اسلامی ممالک میں وہاں کے لوگوں کے لباس اپنی اپنی مخصوص طرز پہ ہیں ۔

لبنان ۔ عرب وسطیٰ کے نزدیک ایک جمہوری مملکت ۔ اس کے شمال مشرق میں سوریا (شام) جنوب میں فلسطین اور مغرب میں بحر المتوسط ہیں ۔ اس کا دارالخلافہ بیروت ہے ۔ اس کا رقبہ ... مربع کلومیٹر ہے ۔ زرعی ملک ہے ۔ زیتون ، مختلف پھل ، چمڑا یہاں کی مخصوص پیداوار ہے ۔ یہاں کے پھل دنیا بھر میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں ۔ یہ پانچ حصوں میں تقسیم ہے ۔ بیروت ، شمالی جبل لبنان ، جنوبی لبنان اور البقاع ۔ یہاں کے اہم شہر بیروت ، زحلت ، صیدا ، الفطیرہ ، جونیہ اور بعلبک ہیں ۔

۳۲۳ ق م میں سکندرِ اعظم نے اس پہ حملہ کر کے فتح کیا اور اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ۔ اس پر چھ صدیوں تک اہل فارس نے حکومت کی ۔ ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے اسے فتح کیا ۔ اس کے بعد عیسائیوں کا یہاں پہ قبضہ رہا ۔ لبنان شروع سے ہی شام کا ایک اٹوٹ انگ رہا ہے ۔ اس دور میں بھی جبکہ بازنطینی سلطنت قائم تھی لبنان شام کا حصہ ہوتے ہوئے فلسطین اور مصر کی طرح بازنطینی حکمرانوں کے ہی زیر تسلط تھا ۔ یہ علاقہ ایک عرصہ تک تاریخ کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا بالآخر سلطان سلیم اول کے دور میں خلافت عثمانیہ کا حصہ بنا ۔ جنگ عظیم اوّل میں جب خلافت عثمانیہ بکھر گئی اور اس کے زیر اقتدار علاقوں کو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کر کے یورپی ممالک نے ان پہ قبضہ جما لیا تو شام کا شمالی حصہ فرانس کے تسلط میں چلا گیا ۔ شام کا جنوبی حصہ جس میں فلسطین کا علاقہ شامل

تھا برطانیہ نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ کیونکہ وہ بالفور ڈیکلریشن کے تحت یہودیوں سے فلسطین کے علاقے میں ان کی حکومت قائم کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ۱۹۴۳ء تک لبنان کسی مستقل ملک کا نام نہ تھا۔ فرانس نے اپنی نوآبادیاتی مصلحتوں کے تحت شام کے پانچ اضلاع کو ملا کر لبنان کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کر دی۔

۱۹۴۴ء میں فرانس نے جنگ عظیم دوم میں ہزیمت اٹھانے کے بعد شام اور اپنی ساختہ نئی مملکت لبنان کے عوام کو الگ الگ اختیاراتِ حکومت منتقل کر دیے۔ تاہم اس کے فوجی دستے دونوں ملکوں میں ۱۹۴۶ء تک موجود رہے۔

لبنان میں گزشتہ دس پندرہ سال سے جو اندرونی خلفشار اور کشمکش ہے اس کا پس منظر یہی فرانس کا قائم کردہ نظامِ حکومت ہے۔ فرانس کے پیشِ نظر لبنان کی نئی ریاست قائم کرتے وقت یہ منصوبہ تھا کہ کسی مناسب موقع پر شام کی عیسائی آبادی کے لیے ایک الگ ریاست قائم کی جا سکے۔ چنانچہ لبنان میں عیسائی باشندوں کی آبادی کا تناسب غیر منصفانہ طور پر زیادہ رکھا گیا اور مسلمانوں کی آبادی کم ظاہر کی گئی۔ فرانسیسی سازش کے تحت آبادی کا تناسب ۵ مسلمان، ۶ عیسائی کی بنیاد پر طے ہوا۔ حکومت کے تمام با اختیار اداروں میں اسی تناسب کو اب تک ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس تناسب سے مسلمان ایک ایسی اقلیت میں تبدیل ہو گئے ہیں جو عیسائی آبادی اور حکومت کے استحصال کا نشانہ بن رہی ہے حالانکہ مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ اس نظامِ حکومت کے تحت ۹۹ ارکان کی ایک پارلیمنٹ ہے۔ یہی پارلیمنٹ دو تہائی اکثریت سے صدر کا انتخاب کرتی ہے جو بہرحال عیسائی ہوتا ہے اور وہی زیادہ با اختیار ہوتا ہے۔ صدر چھ سال کے لیے چنا جاتا ہے۔ صدر انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے کسی سُنّی مسلمان کو وزیر اعظم کو نامزد کرتا ہے جسے ملک کے تمام مذہبی فرقوں کی نمائندگی کی بنیاد پر کابینہ تشکیل دینا ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کا سپیکر لازمی طور پر شیعہ مسلمان ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ اور حکومت میں اس فرقہ وارانہ نمائندگی سے مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں باہمی اتحاد ناپید رہتا ہے۔ مسلمان شروع سے ہی اس ناانصافی کے ازالہ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف وقتوں میں عیسائی اور مسلمان آبادیوں میں آپس میں خونریز جھڑپیں ہوئی ہیں۔ ۱۹۷۴ء کے بعد سے جھڑپوں کا سلسلہ بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے بیروت جیسا خوبصورت شہر غیر آباد ہو کر رہ گیا ہے۔

عیسائیوں کے علاوہ مسلمانوں کے جو گروہ ہیں ان میں سُنّی، شیعہ اور دروزی نمایاں ہیں۔ ویسے یہ مسلمان گروہ مزید گروہوں میں تقسیم ہیں جن کی تعداد ۲۰ سے زائد ہے۔ اسی وجہ سے عیسائی ان پر غلبہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق اندرونی خانہ جنگیوں سے ۱۰ ہزار سے زائد افراد ہلاک اور ۵۰ ہزار سے زائد زخمی ہو چکے ہیں۔

۱۹۷۵ء کے آخر سے اقوامِ متحدہ، عرب لیگ کے تعاون سے لبنان کے دو مرکزی گروہوں مسلمانوں اور عیسائیوں میں اتفاق و اتحاد اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

لبیدؓ بن ربیعہ ۔ (۵۶۰ء - ۶۶۱ء) قبیلہ بنی عامر کا مشہور شاعر، جن سات مشہور شعراء کے قصائد کعبہ پر لٹکائے جاتے تھے ان میں سے ایک فصیح و بلیغ شاعر اسلام لانے کے بعد کوفہ منتقل ہو گئے۔ ایک روایت ہے کہ اسلام لانے کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیے اور کسی کے استفسار پر جواب دیا: "أبعد القرآن" کیا قرآن کے بعد بھی؟ یعنی انھوں نے قرآن کی فصاحت، بلاغت اور ادب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کا دیوان چھپا ہوا ملتا ہے اور قدیم عربی ادب کا ایک شاہکار نمونہ ہے۔

لسان العرب ۔ عربی زبان کی مشہور لغت۔ ابن منظور نے اسے تالیف کیا۔ مولف نے اسے ازہری کی "تہذیب"، ابن سیدہ کی "المحکم"، جوہری کی "الصحاح" اور ابن اثیر کی "النہایہ" سے استفادہ کرتے ہوئے مرتب کیا۔ یہ اپنے فن کی مستند ترین اور معیاری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

لطف اللہ علی گڑھی (۱۸۲۶ء - ۱۹۱۶ء) حضرت مولانا لطف اللہ بن اسد اللہ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ مولوی غلیم اللہ اور مولوی رونق علی سے فارسی پڑھی۔ مولوی حفیظ اللہ سے خطاطی سیکھی۔ پندرہ برس کی عمر میں مفتی عنایت احمد کاکوروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور علوم دینیہ کی تکمیل کی۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی کی جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں گرفتاری کے بعد علی گڑھ آ گئے اور تدریس کا آغاز کیا۔ مفتی صاحب جب رہا ہو کر واپس آئے تو آپ کو مدرسہ فیض عام کانپور میں نائب مدرس مقرر کیا۔ اور جب مفتی صاحب سفر حج کے دوران حادثہ کی وجہ سے سمندر میں ڈوب گئے تو آپ کو مدرسہ فیض عام کانپور میں صدر المدرسین مقرر کیا گیا یہاں آپ نے تقریباً سات برس تک تدریس کی اور پھر اپنے شاگرد رشید مولانا احمد حسن کانپوری کو یہ عہدہ سونپ کر خود علی گڑھ چلے گئے۔ جہاں بڑے زور و شور سے تدریس جاری رکھی۔ اسی دوران اختلاف عقیدہ کی بنا پر آپ کو زہر دے دیا گیا۔ علالت کے باعث درس و تدریس کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ نواب حیدر آباد دکن کو جب اس صورت حال کی اطلاع ہوئی تو حیدر آباد بلا کر ایک ہزار روپے پر قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ ۱۹۱۰ء میں واپس علی گڑھ آ گئے۔ چنانچہ ۹ ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ / ۱۸ اپریل ۱۹۱۶ء کو انتقال فرمایا اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔ آپ کے بعض مشاہیر تلامذہ کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیری، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا عبدالحق حقانی۔ مولانا عبداللہ ٹونکی، پیر سید محمد مہر علی شاہ گولڑوی۔ مولانا وصی احمد محدث سورتی، مولانا عبدالغنی کانپوری، مولانا فضل حق رامپوری مولانا شبلی نعمانی، مولانا معین الدین اجمیری، نواب حبیب الرحمٰن شیروانی۔

لعان : جب خاوند اپنی بیوی پر کسی غیر مرد سے بدکاری کے واقعہ کو منسوب کرے لیکن گواہوں کے پیش کرنے سے قاصر رہے اور بیوی اس واقعہ کی صحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ اس صورت میں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق خاوند پانچ بار قسم اٹھا کر واقعہ کی صحت کو ثابت کرے۔ اس حالت کو شریعت میں 'لعان' کہا جاتا ہے۔ اگر بیوی واقعہ کی صحت کو تسلیم کرے تو اس پر حدِ زنا اور انکار کر دے تو اس سے بھی مُلا عنت کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان قانونی طور پر تفریق ہو جاتی ہے۔

مدینہ منورہ میں جب بعض ایسے واقعاتِ زنا پیش آئے اور ان میں الزام لگانے والا اپنے الزام کو ثابت نہ کر سکا تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی کے لیے احکام نازل ہوئے۔ پہلے احکام تو قذف کے بارے میں تھے (اُن کا ذکر 'قذف' میں دیکھیے)۔

قذف کے معاملے کی صورت واضح ہونے کے بعد جب لوگوں کو یہ مسئلہ پیش آیا کہ جب کوئی خاوند اپنی بیوی کو زنا کے فعل میں مصروف پائے اگر وہ شرعی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے گواہوں کی تلاش میں جاتا ہے تو مجرم فرار ہو جاتا ہے۔ اگر خود دیکھ کر الزام لگاتا ہے اور اسے ثابت نہیں کر سکتا تو حدِ قذف کا مستحق ہوتا ہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ تو اللہ تعالےٰ نے اس بارے میں احکام نازل فرمائے۔ "اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ اپنے الزام میں سچا ہے اور پانچویں بار کی قسم کو اس طرح کی کھائے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ اپنے الزام میں جھوٹا

ہو۔ عورت اس طرح سزا سے (حدِّ زنا سے) بچ سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اس کا خاوند) اپنے الزام میں جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر (مجھ پر) اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اس کا خاوند) اپنے الزام میں سچا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ (سورۃ نور، آیت ۶ تا ۱۰)

قانونِ لعان کے بعض اہم نکات

شریعت اسلامیہ میں قانون لعان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے نبی کریمؐ کے دور کی بعض مثالوں سے آگاہ ہونا ضروری ہے جب ایسے واقعات عملاً پیش آئے اور نبی کریمؐ نے مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں اپنے فیصلے نافذ فرمائے۔

ان واقعات میں سے ایک مشہور واقعہ ہلالؓ بن امیہ کا ہے جس کا ذکر صحاح ستہ اور دوسری کتب احادیث و تفاسیر میں ہے۔ ان آیات کے نزول سے قبل ہلالؓ بن امیہ اپنی بیوی پر ایسا الزام لگا چکے تھے اور وہ اس یقین کا اظہار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں ضرور احکام نازل کرے گا۔ ان آیات کے نزول کے بعد ہلال اور ان کی بیوی کو عدالتِ نبویؐ میں حاضر کیا گیا۔ نبی کریمؐ نے پہلے انہیں احکام خداوندی سے آگاہ کیا۔ پھر فرمایا:

"خوب سمجھ لو کہ آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے سخت تر چیز ہے۔" ہلال نے عرض کیا۔ میں اس عورت پر صحیح الزام لگاتا ہوں۔ عورت نے کہا یہ بالکل جھوٹ ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا: اچھا، تو ان دونوں میں ملاعنت کرائی جائے۔ چنانچہ پہلے ہلال نے قرآنی احکام کے مطابق پانچ قسمیں بڑے اعتماد سے کھائیں۔ اس دوران نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ ان کو تنبیہ کرتے رہے۔ پھر عورت نے قسمیں کھانی شروع کیں۔ پانچویں قسم کھانے سے پہلے اسے بھی تنبیہ کی گئی کہ تم میں سے ایک تو جھوٹا ہے۔ کچھ دیر کے لیے عورت رُکی لیکن یہ کہتے ہوئے "میں ہمیشہ کے لیے اپنے قبیلے کو رسوا نہ کروں گی۔" پانچویں قسم بھی کھا گئی۔ اس کے بعد نبی کریمؐ نے دونوں میں تفریق کرادی اور حکم دیا کہ پیٹ میں جو بچہ ہے وہ ماں کی طرف منسوب ہے وضع حمل کے بعد جب بچہ کو دیکھا گیا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ اپنے باپ پر نہیں ہے بلکہ جس شخص سے فعل زنا کروانے کا اُس عورت پر الزام لگایا گیا تھا اس کے مطابق ہے تو نبی کریمؐ نے فرمایا "اگر قسمیں نہ ہوتیں (یا دوسری روایت کے مطابق اگر خدا کی کتاب پہلے ہی فیصلہ نہ کر چکی ہوتی) تو میں اس عورت سے بُری طرح پیش آتا۔ ایسے کئی اور واقعات بھی کتب احادیث میں ملتے ہیں۔ جن کی روشنی میں فقہاء نے لعان کا مفصل ضابطہ بنایا ہے۔

(۱) جو شخص بیوی کی بدکاری دیکھے اور لعان کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے زانی کے قتل کا مرتکب ہو تو ایک گروہ کی رائے کے مطابق اسے بھی قتل کے قصاص میں قتل کیا جائے لیکن بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اسے قصاص میں قتل نہ کیا جائے لیکن جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس کو قصاص سے صرف اس صورت میں معاف کیا جائے گا جبکہ وہ زنا کے چار گواہ پیش کرے یا مقتول نے مرنے سے پہلے خود اس کی بیوی سے زنا کے فعل کا اعتراف کر لیا ہو اور مزید یہ کہ مقتول شادی شدہ ہو۔

(۲) لعان گھر بیٹھے آپس ہی میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے۔

(۳) لعان کے مطالبے کا حق صرف مرد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت بھی عدالت میں اس کا مطالبہ کر سکتی ہے جبکہ شوہر اس پر بدکاری کا الزام لگائے یا اس کے بچے کا نسب تسلیم کرنے سے انکار کرے۔

(۴)۔ لعان ہر زوج اور زوجہ کے درمیان ہونے کے بارے میں علماء کرام کی مختلف آراء ہیں۔ امام شافعیؒ کہتے کہ جس کی قسم معتبر ہو اور جس کو طلاق دینے کا اختیار ہو وہ لعان کر سکتا ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی بھی یہی رائے ہے یعنی ان کے نزدیک زوجین خواہ مسلم ہوں یا کافر، غلام ہوں یا آزاد، مقبول الشہادت ہوں یا نہ ہوں یا بیوی ذمّی ہو یا مسلمان۔ ان پر لعان ہو سکتا ہے لیکن حنفی فقہا کی رائے یہ ہے کہ لعان صرف ایسے آزاد مسلمان زوجین میں ہو سکتا ہے جو قذف کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں۔

(۵) لعان محض کنایے اور استعارے یا اظہارِ شک و شبہ پر لازم نہیں آتا، بلکہ صرف اس صورت میں لازم آتا ہے جبکہ شوہر صریح طور پر زنا کا الزام عائد کرے یا صاف الفاظ میں بچے کو اپنا تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

(۶) اگر الزام لگانے کے بعد شوہر قسم کھانے سے پہلو تہی کرے تو امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ اسے قید کر دیا جائے گا اور جب تک وہ لعان نہ کرے یا اپنے الزام کا جھوٹا ہونا نہ مان لے، اسے نہ چھوڑا جائے گا، اور جھوٹ مان لینے کی صورت میں اسے حدِ قذف لگائی جائے گی۔ اس کے برعکس امام مالک، شافعی اور دوسرے علماء کہتے ہیں کہ اس صورت میں اسے رجم کر دیا جائے [illegible] نہیں ہے کیونکہ عورت پر زنا کا الزام کا صحیح ہونا صرف اس کا لعان نہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یا تو چار گواہ ہوں یا عورت خود قسمیں کھائے۔

(۸) اگر لعان کے وقت عورت حاملہ ہو تو امام احمدؒ کے نزدیک لعان بجائے خود اس بات کے لیے کافی ہے کہ مرد اس حمل سے بری الذمہ ہو جائے اور بچہ اس کا [illegible] قطع نظر اس کے کہ مرد نے حمل کو قبول کرنے سے انکار کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مرد کا الزام زنا اور نفیٔ حمل دونوں ایک چیز نہیں ہیں۔ [illegible] حمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے صریح طور پر انکار نہ کرے [illegible] اُسی کا قرار پائے گا۔ کیونکہ عورت کے زانیہ ہونے سے [illegible] کا ہو۔

(۹) امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دوران حمل میں [illegible] اجازت دیتے ہیں اور اس بنیاد پر لعان کو جائز رکھتے ہیں [illegible] امام ابو حنیفہ [illegible] اگر مرد کے الزام کی بنیاد زنا نہ ہو بلکہ صرف یہ ہو کہ [illegible] خیال میں حمل اس کا نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں [illegible] کیونکہ بسا اوقات کوئی بیماری حمل کا شبہ پیدا کر دیتی ہے [illegible] ہے۔

(۱۰) اگر باپ بچے کے نسب سے انکار کرے تو [illegible] تو سب کا اتفاق ہے کہ [illegible] افعال کے ذریعے اگر قبول کر چکا ہے تو [illegible] تو حدِ قذف کا مستحق ہو جاتا ہے [illegible] انکارِ نسب کا حق حاصل ہے [illegible] تھا تو زمانہ حمل سے [illegible] حق نہیں رکھتا۔ البتہ اگر وہ اس [illegible] انکار کر سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک [illegible] اندر نسب سے انکار کرے تو لعان کے ذریعے [illegible] ذمہ داری سے [illegible] لیکن اگر وہ سال، دو سال بعد انکار کرے تو لعان ہو [illegible] بری نہ ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ [illegible] کے وقت سے [illegible] انکار نسب [illegible]

(۱۱) مطلقہ بیوی پر شوہر کا زنا کا الزام امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حدِ قذف کا مجرم ہے کیونکہ اب وہ عورت اس کی بیوی نہیں ہے لیکن امام مالکؒ کے نزدیک یہ قذف [illegible]

اسی صورت میں ہے جبکہ کسی بچے کے نسب یا حمل کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ درمیان میں نہ ہو۔ ورنہ مرد کو طلاق بائن کے بعد بھی لعان کا حق حاصل ہے تاکہ وہ اس بچے سے بری الذمہ ہو جائے جس کو وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ تقریباً یہی رائے امام شافعیؒ کی بھی ہے

(۱۲) لعان کے قانونی نتائج ہیں سے بعض پہ علماء کا اتفاق ہے اور بعض پہ اختلاف۔ متفق علیہ نتائج یہ ہیں :

(ا) لعان کے بعد عورت اور مرد دونوں کسی سزا کے مستحق نہیں رہتے ۔

(ب) مرد اگر بچے کے نسب کا منکر ہو تو بچہ صرف ماں کا قرار پائے گا۔ اور باپ سے منسوب نہ ہونے کی وجہ سے اس کا وارث بھی قرار نہ پائے گا۔ وہ ماں کا وارث ہوگا ۔

(ج) لعان کے ذریعے میاں بیوی میں علیحدگی ہو جانے کے بعد عورت کو زانیہ اور اس کے بچے کو ولد الزنا کہنے کا کسی کو حق نہ ہوگا ۔

(د) عورت کا مہر حق ساقط نہ ہوگا۔ عورت مرد سے نفقہ اور مسکن پانے کی حقدار نہ ہوگی ۔ عورت اس مرد کے لیے حرام ہو جائے گی ۔ جن دو مسئلوں پہ علماء کرام کا اختلاف ہے وہ یہ ہیں : ایک یہ کہ لعان کے بعد عورت اور مرد کی علیحدگی کیسے ہوگی ۔ دوسرے یہ کہ لعان کے ذریعے علیحدہ ہو جانے کے بعد کیا ان دونوں کا دوبارہ ملنا ممکن ہے ؟

پہلے مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ علیحدگی کے لیے عدالت سے رجوع کرنا ہوگا۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ لعان سے فارغ ہوتے ہی علیحدگی واقع ہو جائے گی چاہے عورت جوابی لعان کرے یا نہ کرے ۔ امام مالکؒ وغیرہ کی رائے ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے لعان سے ہی علیحدگی واقع ہو سکتی ہے ۔

لعان کے بعد دوبارہ ملنے کے بارے میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ، سفیان ثوریؒ، امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ لعان سے زوجین ایک دوسرے کے لیے کلی طور پر حرام ہو گئے ۔ جبکہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ لعان کے بعد علیحدہ ہو جانے کی صورت میں اگر خاوند اپنے جھوٹا ہونے کا اقرار کرے اور اس پہ حدِ قذف جاری ہو جائے تو ان میں دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے ۔

لعل شہباز قلندر

لعل شہباز قلندر :- آپ کی پیدائش، والدِ بزرگوار کے نام، سلسلۂ نسب، تاریخ پیدائش اور تاریخ وصال کے بارے میں مؤرخین کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اکثریت کی رائے کے مطابق آپ کی پیدائش مروند صوبہ ہرات، افغانستان میں ہوئی اور علاقے کے مشہور و معروف بزرگ سید کبیر کے صاحبزادے ہیں ۔ سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے ۔ آپ کا وصال ۱۱۲ سال کی عمر میں ۱۸ رشعبان ۶۵۰ھ میں سیہون شریف میں ہوا ۔ آپ کے عقائد کے سلسلہ میں کوئی واضح رائے نہیں ملتی ۔ آپ کا نام سید محمد عثمان مروندی بتایا جاتا ہے ۔

آپ کے نام کے ساتھ لعل، شہباز اور قلندر کے القاب کی وجۂ تسمیہ جدا جدا ہے ۔ لعل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ ہمیشہ گہرے سُرخ رنگ کے جُبے میں ملبوس رہتے تھے ۔

شہباز کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہمعصر اولیاء کرام حضرت جلال الدین بخاریؒ (اوچ شریف)، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ انہیں ایک منظر میں نظر آیا کہ لعل قلندر کے ایک مرید کو بے وجہ پھانسی دی جا رہی ہے ۔ یکایک حضرت عثمان لعل قلندر نے ایک جست لگائی اور اپنے مرید کو اس مقام سے بچا کر لائے ۔ ہم عصر اولیائے کرام نے آپ کو "شاہ باز" کا لقب دیا جو کثرتِ استعمال سے شہباز ہو گیا ۔

قلندر کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ قلندریہ سلسلہ سے وابستگی کی وجہ سے ہے ۔

آپ کے سیہون شریف کے آنے کے متعلق ایک واقعہ مذکور ہے ۔ جب لعل شہباز قلندرؒ کی ملاقات پانی پت میں حضرت بو علی شاہؒ سے ہوئی تو انہوں نے آپ سے سیہون (سندھ) میں دعوت و تبلیغ کے لیے جانے کی فرمائش کی۔ سیہون پر اُن دنوں ہندو راجہ جیر پٹ کی حکومت تھی جو بڑا عیاش اور ظالم تھا۔ کفر و شرک اور فحاشی کا دور دورہ تھا۔ سیہون میں جس مقام پر آپ کا مزار ہے وہاں ایک بڑا بازارِ حسن تھا۔ جس کے عقب میں کچھ فاصلے پر ہندو راجہ کا عظیم الشان محل اور قلعہ تھا۔ ایک روایت ہے کہ جیسے ہی آپ سیہون میں داخل ہوئے بازارِ حسن کے تمام ساز بند ہو گئے ۔ جب راجہ کو اس حقیقت کا علم ہوا تو اُس نے لالچ اور دھمکیوں کے حربے استعمال کر کے آپ کو سندھ سے واپس چلے جانے کو کہا لیکن آپ تبلیغ و رشد میں مصروف رہے ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کفر و شرک کا یہ مرکز، اسلام کا مرکز بن گیا ۔

آپ کا مزار فیروز شاہ تغلق کے دور میں (رجب ۷۷۵ھ) کو سیوستان کے حاکم ملک اختیار الدین نے تعمیر کرایا ۔ بعد میں ۱۳۲۸ھ میں سندھ کے حکمران کلہوڑہ خاندان کے ایک سربراہ غلام شاہ نے از سرِ نو تعمیر کروایا۔ لعل شہباز قلندر کی درگاہ میں ایک عظیم الشان مسجد ہے ۔

ہندوؤں کو بھی قلندر پاک سے کافی محبت و عقیدت ہے، ہندو عرس کے موقع پر حاضر ہو کر خاص رسومات ادا کرتے ہیں ۔

آپ ذات واحد میں فنا کا مقام حاصل کر چکے تھے اور اس مقام فنا پر آپ کو اپنے محبوب کے وصل کی وہ مستی اور سرور نصیب تھا جو کہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ہے آپ وصل خدا میں دلہنوں جیسا لباس پہن کر ایک خاص قسم کا روحانی رقص کیا کرتے تھے جو کہ دھمال کہلاتا ہے دھمال کے دوران قلندر مستی و بے خودی کی حالت میں اللہ ہو اللہ ہو کرتے اور دنیا سے بے نیاز ہو جاتے تھے دنیا کی ہر چیز جو اس عالم میں ان کے قریب ہوتی اس پر بھی وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور چاروں طرف اللہ ہو اللہ ہو کی آوازیں ابھرنے لگتیں ۔

آپ کا عرس ہر سال ۱۸ تا ۲۱ رشعبان کو ہوتا ہے اور عرس کے موقع پر آپ کے عقیدت مند دھمال ڈالتے ہیں ۔

آپ کا کلام زیادہ تر فارسی میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے ۔

لعنت

لعنت ۔ کسی فرد کا اللہ کی رحمت سے دُور ہونا اور عمومی طور پہ پھٹکار کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات پہ ایسے افراد کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ کی رحمت سے دُور ہیں اور لعنت کے مستحق ہیں ۔ مثلاً

اللہ کے راستے سے روکنے والے جو لوگ بُرائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی کے کاموں سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی خیر کا کام نہیں کرتے، اللہ تعالےٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں، انھیں تنگ کرتے ہیں، اللہ کی خدائی میں خود کو شریک ٹھہرانے والے یا ایسے لوگ جو کسی کو اللہ تعالےٰ کی خدائی میں شریک سمجھتے ہیں یعنی مشرک لوگ، زمین میں فساد پھیلانے والے اور حق بات واضح ہونے کے بعد اس سے منہ پھیرنے والے لعنت کے مستحق ہیں

اسی طرح قرآن مجید کے کئی مقامات پہ ایسی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی اور وہ دنیا میں بھی اور آخرۃ میں بھی لعنت کے مستحق ٹھہرائے گئے ۔

لقمانؑ ۔ (۰۰۰ ۳ ق م) یلقان یا حکیم لقمان ۔ اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے حالات اور خاندان و نسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا اور حکیم شخص تھے ۔ ان کے حکیمانہ اقوال 'صحیفہ لقمان' کے نام سے اہل عرب کے درمیان مشہور و معروف تھے ۔ ان سے متعلق امور میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں ۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ عادِ ثانیہ کے دور میں ایک بادشاہ کا نام بھی لقمان ملتا ہے ۔

ابن کثیر، ابن جریر جیسے مفسرین اور مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ مشہور لقمان حکیم افریقی النسل تھا ۔ اللہ تعالےٰ نے ان کو حکمت سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور تھے ۔

حضرت لقمانؑ کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہوا ہے اور ان کے نام کی نسبت سے ایک سورۃ کا نام 'سورۃ لقمان' ہے ۔ قرآن میں دعوت و تبلیغ کے مقصد کے پیش نظر اس سورۃ میں ان کے نسب و خاندان کی بحث نہیں کی گئی تاہم ان کے حکیمانہ اقوال کو بڑے بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے اور سورۃ لقمان کی آیات میں اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو نصائح بیان کئے گئے ہیں وہ حسن اخلاق اور حکمت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ اسی لیے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ نبی تھے ۔

لقمان، سورۃ ۔ یہ مکی سورۃ ہے ۔ ۳۴ آیات اور ۴ رکوع پر مشتمل ہے ۔ اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو کی تھیں ۔ اسی مناسبت سے اس کا نام 'لقمان' رکھا گیا ہے ۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اسلامی دعوت کو دبانے اور روکنے کے لیے جبر و ظلم کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی طوفانِ مخالفت میں پوری شدت پیدا نہ ہوئی تھی ۔ اس کی نشاندہی اس سورۃ کی آیات ۱۴، ۱۵ سے ہوتی ہے جس میں اسلام قبول کرنے والے نوجوانوں کو بتایا گیا ہے کہ والدین کے حقوق تو بے شک خدا کے بعد سب سے بڑھ کر ہیں لیکن اگر وہ تمہیں اسلام قبول کرنے سے روکیں اور شرک کرنے پر مجبور کریں تو ان کی بات ہرگز نہ مانو ۔

سورۃ عنکبوت اور سورۃ لقمان کے مضامین ایک جیسے ہیں لیکن سورۃ لقمان عنکبوت سے پہلے نازل ہوئی ہے ۔

اس سورۃ میں لوگوں کو شرک کی نامعقولیت اور توحید کی صداقت اور معقولیت سمجھائی گئی ہے اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید چھوڑ کر نبی کریمؐ کی اس دعوت پر غور کریں جو وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیش کر رہے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ حق کی آواز کوئی نئی نہیں ہے ۔ پہلے بھی حکمت و دانائی رکھنے والے لوگ ایسی باتیں کہتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں ۔ نبی کریمؐ ان کو بتا رہے ہیں کہ تمہارے اپنے ہی ملک میں لقمان نامی حکیم و دانا شخص گزرے جس کی حکمت و دانش کے واقعات تمہارے ہاں مشہور ہیں اور ایک روایت کے مطابق اُن کے اقوال 'صحیفہ لقمان' کے نام سے موجود ہیں ۔ اس لیے حق و صداقت کی یہ دعوت ایک قدیم دعوت ہے ۔

سورۃ لقمان میں حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح پیش کیے ہیں وہ حسنِ اخلاق اور دعوتِ حق کا ایک بہترین نمونہ ہیں ۔ جو ہر دور میں مخاطبین کے لیے نصائح کے طور پر پیش کرنے کا ایک اعلیٰ معیار ہیں ۔

لقیط ۔ وہ لاوارث بچہ جو راستے میں پڑا ہوا ملے ۔ لقیط آزاد ہوتا ہے اور اس کا خرچ حکومت کے بیت المال سے دیا جاتا ہے ۔ اگر کوئی شخص اس کو اٹھائے تو دوسرے شخص کو اس سے بچہ لینے کا حق نہیں ۔ کوئی شخص اس کے باپ ہونے کا دعوےٰ کرے تو اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے بچہ اس کے حوالے کر دیا جائے گا ۔ بشرطیکہ وہ اس کی نشانیاں بتا دے ۔ اگر یہ بچہ مسلمانوں کی بستی میں ملتا ہے اور کوئی ذمّی اس کے باپ ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے تو بچے کا نسب تو ثابت ہو جائے گا لیکن بچے کا مذہب اسلام تصوّر ہوگا اور اسے حکومت کے خرچ پر پرورش کیا جائے گا ۔ اگر بچہ ذمیوں کی بستی میں کسی مندر یا گرجا سے ملتا ہے تو ذمّی شمار ہوگا ۔ اگر کوئی غلام اس بچے کے باپ ہونے کا دعوےٰ کرے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا اور بچہ آزاد رہے گا ۔ اگر بچے کے ساتھ کوئی مال ملے تو وہ بچے کی ملکیت ہوگا ۔

لودھی خاندان ۔ یہ خاندان برعظیم پاک و ہند پر ۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء حکومت کرتا رہا ۔ خاندان لودھی ہندوستان میں پہلا خالص افغان حکمران خاندان تھا ۔ قدیم وقت سے افغان سلسلۂ کوہ سلیمان سے وادیٔ سندھ میں روزگار اور تجارت کی تلاش میں آتے رہے ہیں ۔

لودھی خاندان کی حکومت کے بانی بہلول کا جدِ امجد بہرام فیروز شاہ تغلق کے عہد کے آغاز میں ملتان آیا ۔ جہاں اس نے ملک مردان دولت کی ملازمت اختیار کی ۔ بہرام کے بیٹے اسلام خان لودھی نے خضر خان لودھی گورنر ملتان کی ملازمت کے دوران بہادری کے کارنامے انجام دے کر اپنا ایک ممتاز مقام بنا لیا جس کے [illegible] سرہند کا گورنر مقرر کیا گیا ۔ بہرام کے دوسرے بیٹے ملک کالا نے بھی [illegible] وجہ سے نمایاں شہرت حاصل کی ۔ بہلول اسی ملک کالا کا بیٹا تھا ۔ [illegible] لودھی کے انتقال کے بعد بہلول سرہند کا گورنر بنا ۔ سادات خاندان کی حکمرانی [illegible] کی انتہا پر تھا ۔ اس لیے بہلول نے تقریباً خود مختار [illegible] گرد و نواح کے علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا ۔ اسی طرح تھوڑے عرصہ بعد خاندان سادات کے [illegible] بادشاہ [illegible] عالم شاہ کے عہد میں اس نے دہلی پر حملہ کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا ۔ [illegible] خاندان کی ذاتی حکومت کا آغاز ۱۴۵۱ء میں ہوا ۔ اس خاندان کے [illegible] بہلول لودھی ۔ دوسرے بادشاہ سکندر لودھی اور آخری بادشاہ [illegible]

۱۵۲۶ء میں خاندان لودھی کی حکومت [illegible] لودھی کی دعوت پر کابل کے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے دہلی پر حملہ [illegible] کو مشہور اور تاریخی پانی پت کی پہلی جنگ ہوئی ۔ سلطان [illegible] لودھی کو شکست [illegible] لودھی خاندان کا اقتدار ختم ہو گیا ۔ [illegible] مغلیہ سلطنت کی بنیاد [illegible]

بہلول لودھی (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۸ء) [illegible] دیکھئے [illegible]

سکندر لودھی (۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۷ء)

بہلول لودھی کے مرنے کے بعد بعض امراء [illegible] بڑے [illegible] کو تخت نشین کرنے کی تھی ۔ بعض امراء بہلول کے پوتے [illegible] کو بادشاہ [illegible] لیکن نظام خان کی والدہ نے بعض امراء اور خصوصی طور پر [illegible] خان [illegible] کی مدد سے اپنے بیٹے کو بادشاہ بنایا ۔ ۱۷ جولائی ۱۴۸۸ء کو شہزادہ نظام خان کو سلطان سکندر شاہ کے خطاب سے قصبہ جلالی میں تخت نشین کیا گیا ۔ خطبہ و سکّہ جاری ہوا ۔

سلطان سکندر کے عہد میں [illegible] [illegible] امان سے اپنے پیشوں میں مشغول تھی ۔ امور شریعت کے [illegible] اور اسلامی احکام کی پابندی کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ معاملہ تعصب کی حد تک پہنچ گیا ۔ اکثر شہروں کے بت خانے ڈھا کر مسجدیں اور مدرسے تعمیر کیے گئے ۔ جونپور میں اپنے بھائی [illegible] شاہ کے خود مختاری کے اعلان اور بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اقدام اٹھایا ۔ والی بہار سلطان

حسین شاہ کی سرکوبی کی اور اسی طرح سلطان علاؤ الدین والیٔ بنگال کو بھی مطیع بنایا۔

بعض امرا کی اس سازش پر بروقت اقدام کیا۔ جو اس کے بھائی فتح خان کو بادشاہ بنانے کے متعلق تھی۔ اسی طرح بعض دوسرے اُمرا کی گرفت کی جو نظم و نسق کو بگاڑتے تھے یا شاہی خزانے میں خرد برد کرتے تھے۔ ١٥٠٢ء میں اس نے دھول پور کے راجہ کے خلاف فوج کشی کی۔ راجہ نے بھاگ کر گوالیار میں پناہ لی۔ سلطان نے دھول پور پر قبضہ کر لیا اور بعد میں گوالیار کو بھی فتح کیا۔ علاوہ ازیں کالپی، بیانہ، چندیری اور مالوہ کے بعض علاقوں کو فتح کر کے سلطنتِ دہلی میں شامل کیا۔

اگرچہ سکندر لودھی بھی بہلول لودھی کی طرح فوجی مہمات میں مصروف رہا لیکن اس کے باوجود اس نے نظمِ سلطنت کی اصلاح کی طرف بھی توجہ مبذول رکھی اور تمام اطراف میں نظم و نسق قائم کر کے امن و امان بحال کیا۔ ذرائع آمد و رفت کو درست اور محفوظ کیا۔ محکمہ پولیس کو ازسرِنو منظم کیا اور شاہراہوں پر جا بجا ڈاک چوکیاں قائم کیں۔ تجارت اور زراعت کی ترقی کے لیے غلہ کی نقل و حمل پر محصول معاف کیا۔ باغیوں اور راہزنوں کا سختی سے محاسبہ کیا۔ باغی امرا کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے جاسوسی کے نظام کو بہتر کیا۔

١٥٠٤ء میں سلطان سکندر لودھی نے شہر آگرہ کی تعمیر شروع کی اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ١٥٠٥ء میں زلزلہ سے اس نوتعمیر شہر کی عمارات کو نقصان پہنچا تاہم سلطان نے اس کی ازسرِنو تعمیر کر کے وہیں سکونت رکھی۔

مذہبی امور میں اس نے سختی رکھی۔ اس پر مؤرخین دوسرے مذاہب کے بارے میں متعصب و تنگ دل ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں سے اس کا سلوک غیر رواداران تھا اور اس نے ان کو مکمل مذہبی آزادی نہ دی۔

سلطان سکندر لودھی کے دورِ حکومت کے آخری چند سال گوالیار، دھولپور، نارور اور راجستھان کی سرحد کے دوسرے باغی سرداروں کی گوشمالی میں گزر گئے۔ ان مہمات سے سلطان کی صحت خراب ہو گئی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ٢١ر نومبر ١٥١٧ء کو وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔

[illegible] دیکھیے ابراہیم لودھی

لوحِ محفوظ۔ اس سے دو مفہوم لیے جاتے ہیں۔ اوّل وہ تختی جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق سے پہلے تمام انسانوں کی تقدیر لکھ دی ہے۔ دوسرے قرآن مجید جو لوح پر لکھا ہوا عرش پر موجود ہے۔ سورۂ بروج میں اس طرح بیان ہے۔ بل ھو قرآن مجید فی لوحِ محفوظ۔ اور روایات کے مطابق اسی سے قرآن مجید تدریجاً نازل کیا گیا۔ اسے لوحِ محفوظ اس لیے بھی کہتے ہیں کہ جو کچھ اس پر لکھا ہے وہ رد و بدل اور مٹنے یا مسخ ہونے سے محفوظ ہے یا وہ ایسی جگہ رکھا ہوا ہے جہاں وہ محفوظ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ لوحِ محفوظ میں ہے یعنی نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اسے بدل سکتا ہے۔

لوح کی جمع الواح بھی قرآن مجید میں مذکور ہے۔ والقی الالواح۔ (جب موسیٰؑ نے تختیاں پھینک دیں۔

لُوط علیہ السلام۔ حضرت ابراہیمؑ کے برادرزادہ ہیں۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام، فلسطین و مصر میں دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے بعد ازیں منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

ان کے والد کا نام ہاران تھا۔ حضرت لوطؑ کی پرورش و تربیت حضرت ابراہیمؑ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ اس لیے وہ اور حضرت سارہؑ ملّتِ ابراہیمیؑ کے پہلے "مسلم" ہیں۔

حضرت لوطؑ کے متعلق اس طرح قرآن مجید میں ذکر ہے۔ "پس ایمان لایا لوطؑ، ابراہیمؑ کے دین پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔"

بحیرہ مُردار کے ساحل پر واقع ایک بستی سدوم میں سکونت پذیر تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بستی اور قرب و جوار کے لوگوں کے لیے نبی مقرر کیے گئے تھے۔

حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کا ذکر قرآن مجید کی سورتوں عنکبوت، شعراء، الاعراف، ہود اور تحریم میں کیا گیا ہے۔

حضرت لوطؑ کی قوم عورتوں کی بجائے اَمرد یعنی لڑکوں سے اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کرتی تھی۔ "اور یاد کرو لوطؑ کا واقعہ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا۔ تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا اور تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو۔ یقیناً تم حد سے گزرنے والے ہو۔" (سورۃ الاعراف۔ آیات ٨٠، ٨١)۔ اگلی آیات میں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے اور حضرت لوطؑ کی بیوی کا ذکر ہے جو اُن منکرین اور بدکاروں کے ساتھ تھی اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دوچار ہوئی۔ سورۂ ہود کی آیات ٧٧ تا ٨٣ میں ان ظالموں کے اس فعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند فرشتے مَردوں (لڑکوں) کی شکل میں حضرت لوطؑ کے پاس گئے تاکہ انھیں مطلع کریں کہ ان کی قوم پر اللہ کا عذاب آنے والا ہے تو لوطؑ کی قوم نے ان لڑکوں (فرشتوں) کے ساتھ شہوت رانی کرنے کے لیے لوطؑ کو مجبور کیا کہ وہ ان مہمانوں کو ان کے حوالے کر دیں ...... اس فعلِ قبیح کی وجہ سے پتھروں کی بارش کا عذاب اس قوم پر نازل ہوا۔

مَردوں سے یہ فعلِ شہوت کرنا لواطت کہلاتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اسے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ لواطت کا فعل کرنے والے شادی شدہ مرد کو سنگسار کرنے کا حکم ہے۔ موجودہ جدید زمانہ میں اسے اخلاقی طور پر جائز سمجھ لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض ممالک مثلاً برطانیہ وغیرہ میں اس کی قانونی اجازت دے دی گئی ہے۔

لوقا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک ساتھی (حواری)۔ طب کے پیشہ سے وابستہ تھا۔ "انجیلِ لوقا" اور "اعمال الرسل" تصنیفات ہیں۔

لیاقت علی خان، نوابزادہ۔ (یکم اکتوبر ١٨٩٥ء – ١٦ر اکتوبر ١٩٥١ء) پاکستان کے پہلے وزیر اعظم۔

کرنال کے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ خان رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب رستم علی خان مرحوم کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ قریباً ٥٠٠ برس پہلے ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب نوشیروان عادل سے ملتا ہے۔ نواب رستم علی خان کی جاگیر کا کچھ حصہ یو۔پی میں تھا اور نواب صاحب اکثر وہیں رہتے تھے۔ اس لیے لیاقت علی خان نے بھی اپنا بچپن یو۔پی ہی میں گزارا۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ ١٩١٨ء میں آپ نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا۔ یہی کالج بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی بنا۔

آپ کے بزرگوں کا خیال تھا کہ انڈین سول سروس میں شامل ہو جائیں مگر لیاقت علی کو یہ بات پسند نہ آئی چنانچہ اپنے بزرگوں کو قائل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ ١٩٢٢ء تک انگلستان میں مقیم رہے اور قانون کی ڈگری حاصل کی۔ انگلستان میں قیام کے دوران ہی آپ نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور انڈین سوسائٹی کے صدر منتخب ہو

گئے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد آپ نے یو۔پی میں رہائش اختیار کی اور تعلیمی، معاشرتی اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ نے یو۔پی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا اور اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ چھ سال تک اسمبلی کے نائب صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان دنوں آپ یو۔پی میں ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنما تھے۔ اس وقت مرکزی اسمبلی میں قائداعظم محمد علی جناح ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر تھے۔ اسی دوران قائداعظم مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور ان کی زیر قیادت مسلم لیگ ہندوستان میں تاریخی کردار ادا کرنے کے لیے مسلسل آگے بڑھنا شروع ہوئی۔ لیاقت علی بھی مسلمانوں کے حقوق کی جنگ

لیاقت علی خان

میں حصہ لینے کے لیے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جلد ہی اپنی صلاحیتوں سے مسلم لیگ میں ایک مقام بنا لیا۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے بھی آپ نے بھرپور محنت کر کے قائداعظم کے اعتماد کو مزید پختہ کیا۔

قائداعظم نے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف اس طرح کیا۔ "لیاقت علی میرا دایاں بازو ہیں۔ انہوں نے فرائض کی انجام دہی میں دن رات ایک کر دیئے ہیں وہ اگرچہ نوابزادہ ہیں، لیکن عام انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں۔"

۱۹۴۰ء میں لیاقت علی خان مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور بہت جلد مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے۔ قیام پاکستان تک آپ اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس طلب کی تو آپ نے مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے ہندوستان کی عارضی حکومت میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا تو خان لیاقت علی خان کو عارضی حکومت میں وزارتِ خزانہ کا قلمدان سپرد کیا گیا۔ آپ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان کا بجٹ پیش کیا۔

تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران آپ نے اعلیٰ قابلیت، سنجیدگی، متانت، تعلیمی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ مہاجرین کی آبادکاری اور دوسرے ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات میں آپ نے ماہرانہ سیاسی بصیرت سے کام لیا۔

۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کی وفات کے بعد آپ نے قوم کی بہترین رہنمائی کی اور اس نئے ملک کی تعمیر میں ہر وقت مصروف رہے۔ ۱۹۵۰ء کے آغاز میں مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کے علاقوں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ان فسادات میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ نوابزادہ لیاقت علی، ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر نئی دہلی تشریف لے گئے اور ۸ر اپریل ۱۹۵۰ء کو دونوں ممالک میں ایک معاہدہ ہوا جو "نہرو، لیاقت پیکٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں ایک جلسۂ عام کو آپ نے خطاب کرنا تھا ابھی آپ نے تقریر کا آغاز ہی کیا تھا کہ ایک شقی القلب کی گولیوں سے آپ شہید ہو گئے۔ آپ کی میت کو کراچی لا کر قائداعظم کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اپنی زندگی میں ہی مسلمانوں میں قائدِ ملت کے نام سے مشہور ہو گئے۔ شہادت کے بعد شہید ملت کے نام سے پکارے جانے لگے۔

لیبان

:- (ولادت ۱۸۱۴ء — وفات ۱۹۰۰ء کے بعد) مورخ، مستشرق۔

اصل نام گستاولی بان تھا، ابتدائی تعلیم پیرس میں حاصل کی۔ روس، پولینڈ، اسپین، مراکو، مصر، فلسطین اور برعظیم پاک و ہند کی سیاحت کی۔ پیشہ طبابت تھا۔ لیکن علم و ادب کی دنیا میں نام پیدا کیا۔

تصانیف میں تمدنِ عرب، تمدنِ ہند، نفسیاتِ اجتماع، انقلاب اہم ہیں۔ ان کتب کے اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دو مزید کتابیں سفرنامہ نیپال اور نفسیات انقلابِ فرانس ہیں۔

لیبیا

۔ اس کا رقبہ چھ لاکھ اسی ہزار مربع میل اور آبادی ۲۰ لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے مشرق میں مصر، مغرب میں الجزائر، جنوب میں نائیجریا اور سوڈان ہیں۔ شمال مغرب میں تیونس واقع ہے۔ اس کا دارالحکومت طرابلس (غربی) ہے۔ یہ افریقی ملک ہے [illegible] صحرا پر مشتمل ہے۔ اس لیے اتنے وسیع رقبہ میں آبادی کا تناسب بہت کم ہے۔

مشہور شہر بن غازی، درنہ، مصراتہ، طبرق، سبہا اور البیضا ہیں۔ تیل اس کی [illegible] مصنوعات میں سے ہے اور پٹرول کی پیداوار کے اعتبار سے لیبیا کا شمار [illegible] ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ انتظامی لحاظ سے مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔

اس کی تاریخ قدیم ہے اور یونان کے دور سے اس کے آثار ملتے ہیں۔ [illegible] لیبیا مختلف اقوام کے زیر نگیں رہا۔ ۶۴۲ء میں عربوں نے [illegible] نے اس پر حکومت کی۔ [illegible] ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کیا [illegible]

اس دوران یہاں کے باشندے اٹلی کی سامراجیت سے آزادی [illegible] میں مصروف رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اٹلی کو کافی نقصان [illegible] ایک عبوری حکومت بنائی۔ اس کے بعد لیبیا کے مستقبل کے متعلق چار قوتوں [illegible] فرانس اور روس میں مذاکرات شروع ہوئے۔

برطانیہ لیبیا کو دو حصوں ترپولینا اور سائرنیکا میں تقسیم کرنے [illegible] اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ دوسری طاقتوں کے بھی ذاتی مفادات [illegible] لیے ان میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس لیے لیبیا کا معاملہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا [illegible] ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ نے لیبیا کو آزاد کرنے کے متعلق قرارداد منظور کی [illegible] ۱۹۵۱ء کو لیبیا آزاد ہو گیا۔ لیبیا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آزاد ہونے [illegible] پہلا افریقی [illegible] تھا۔ آزادی کے بعد لیبیا عرب لیگ کا رکن بن گیا۔ بعد میں اقوام متحدہ کا بھی رکن بنا۔

آزادی کے بعد لیبیا کی مقننہ کونسل نے السید محمد ادریس مہدی السنوسی کو اپنا بادشاہ اور حکمران بنایا منتخب کیا۔ شاہ ادریس، امام سنوسی کے پوتے اور سنوسیوں کے مذہبی رہنما اور امام تھے۔ سنوسی تحریک نے سامراجیت کے خلاف ملک کی آزادی کے لیے

بھرپور جدوجہد کی تھی۔ شاہ ادریس کی حکومت تو کچھ عرصہ بحسن وخوبی چلتی رہی مگر بعد میں سیاسی انتشار کا شکار ہوگئی۔ عوام میں مایوسی پھیل گئی۔ بالآخر فوج کے چند جوان افسروں نے معمر القذافی کی قیادت میں یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو ایک انقلاب کے ذریعے شاہ ادریس کی حکومت کو ختم کر دیا اور ایک انقلابی کونسل نے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا۔

معمر قذافی کی قیادت میں لیبیا نے زندگی کے ہر شعبہ میں بہت ترقی کی ہے اور اس وقت لیبیا فوجی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے بلند مقام پر فائز ہے۔ صدر قذافی نے عوام کی فلاح وبہبود کے لیے مختلف اصلاحات کی ہیں۔ دوسرے مسلم ممالک سے تعلقات کو مزید پختہ کرنے میں بھی صدر قذافی نے بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے ہمسایہ ممالک سے انضمام کے لیے بعض پروگراموں پر عملدرآمد کرنے کی کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ ایسے ممالک میں مصر، شام اور سوڈان شامل ہیں۔

لیبیا کی سرکاری زبان عربی ہے۔

تیل کے علاوہ لیبیا سے جو اشیاء درآمد کی جاتی ہیں ان میں زیادہ تر مونگ پھلی مختلف اقسام کے مویشی، چمڑا اور کھالیں وغیرہ شامل ہیں۔

لین پول:۔ (ولادت ۱۸؍ دسمبر ۱۸۵۴ء — وفات ۲۹؍ دسمبر ۱۹۳۱ء) مشہور مؤرخ اور مستشرق۔ پورا نام اسٹینلے لین پول ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ تصانیف میں مسلمان شاہی خاندان اور ان کے سلسلے، مسلمان اندلس میں، ترکی، اورنگ زیب، سلطان صلاح الدین ایوبی۔ ان میں سے بعض کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے ہوچکے ہیں۔

لیلۃ القدر:۔ قدر کی رات یا شب برات۔ رمضان المبارک کے مہینہ میں ایک رات ایسی ہے جس کو قرآن مجید نے ’لیلۃ القدر‘ کا نام دیا ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا ’لیلۃ القدر‘ اللہ تعالیٰ نے میری ہی امت کے لیے مخصوص فرمائی ہے۔ یہ رات پہلی امتوں کو نہیں ملی۔ ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریمؐ نے ایک بار بنی اسرائیل کے ایک فرد کا ذکر فرمایا کہ ایک ہزار مہینے تک اللہ کی راہ میں جہاد کرتا رہا۔ صحابہ کرامؓ کو اس پر رشک آیا تو سورۃ قدر نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں سورۃ القدر کا بیان اسطرح ہے:۔

”انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر ....“

بے شک ہم نے قرآن مجید کو قدر کی رات میں نازل کیا ہے۔ قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات اپنے رب کے حکم سے فرشتے اور روح القدس نازل ہوتے ہیں، ہر طرح کا امر خیر اور سلامتی لاتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ طلوع فجر تک جاری رہتا ہے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں ”ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ آیا تو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا وہ یقیناً ہر قسم کی بھلائی سے محروم رہ گیا۔

قرآن میں اس رات نزول کے بارے میں سورۃ دخان کی آیت نمبر ۳ میں بھی فرمایا

”ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے ....“

اس رات میں قرآن کے نزول کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ نزول قرآن کا سلسلہ اس رات شروع ہوا اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس میں پورا قرآن ام الکتاب سے منتقل کرکے حاملِ وحی فرشتوں کے حوالہ کردیا گیا اور پھر وہ تدریجاً نازل کیا جاتا رہا۔ مفسرین کا اس بارہ میں تو اتفاق ہے کہ یہ رات جس میں قرآن کے نزول کا ذکر ہے وہ تو لیلۃ القدر ہی ہے کیونکہ اس کی تائید سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۵ کرتی ہے ”رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا“۔

قدر کے معنی بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی وہ رات جس میں اللہ تعالےٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کرتا ہے۔ امام زہریؒ کی رائے ہے کہ قدر کے معنی عظمت وشرف کے ہیں، یعنی عظمت وشرف والی رات، جس کی تائید اسی سورۃ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ ”شبِ قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے“۔

رمضان المبارک میں اس رات کے تعین کے بارے میں بہت اختلافات ہیں۔

حضرت عبادہؓ راوی ہیں ”نبی کریمؐ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تاکہ ہمیں شب قدر سے آگاہ کریں مگر دو مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا میں تم سب کو شبِ قدر سے آگاہ کرنے آیا تھا مگر دو آدمیوں کے لڑنے کی وجہ سے (انتشار ہونے کی وجہ سے) اس رات کا تعین اٹھا لیا گیا ہے“۔

اس رات کے بارے میں ہم مختلف اقوال مختلف روایات کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ لیکن علماء امت میں سے اکثر کا یہ اتفاق ہے کہ یہ رات رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں سے کوئی طاق رات ہے ان میں سے زیادہ تر کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابوذرؓ کی روایت کردہ احادیث میں ستائیسویں رات ہی کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت کردہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ شب قدر رمضان مبارک کے آخری دس دنوں میں کوئی طاق رات ہے۔

غالباً کسی معین رات کا تعین اللہ کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا تاکہ لوگ شب قدر کی فضیلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف ایک ہی رات پر اکتفا نہ کریں۔ مختلف راتوں میں اس کی تلاش جاری رکھیں اور عبادت کرتے رہیں۔

اس رات کے ہزار مہینوں سے افضل ہونے کے بارے میں نبی کریمؐ کی کئی احادیث ہیں بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا ”جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کے لیے کھڑا رہا۔ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہوگئے۔

م

ماتریدی، ابومنصور :۔ (وفات ۳۳۳ھ/۹۴۴ء) ابومنصور محمد سمرقندی ماتریدی، حنفی فقہا میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اور اپنے زمانے کے متکلمین کا امام مانا جاتا ہے۔ سمرقند میں پیدا ہوا اور وہاں ہی وفات پائی۔ اس نے معتزلہ کے مقابلے میں اہلِ سنت کے عقائد کو صحیح ثابت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تصنیفات میں شرح فقہ اکبر، التوحید، ماخذ الشرائع فی علم اصول الفقہ زیادہ مشہور ہیں۔

ماتریدیہ :۔ اہل سنت والجماعت کا ایک فرقہ جو ابومنصور محمد بن محمود الحنفی المتکلم الماتریدی السمرقندی سے منسوب ہے۔ ماترید سمرقند کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ یہ شخص ابوالحسن اشعری اور امام طحاوی کا ہم عصر تھا جو "اشعریہ" عقائد سے وابستہ تھے۔

معتزلہ نے عقل کی بنیاد پر دین کے معاملات کو پرکھنا شروع کیا تو ان کے رد میں اہل سنت والجماعت میں دو قسم کے گروہ بن گئے جو اشعری اور ماتریدی عقائد کے پیروکار تھے۔ ان میں سے ماتریدی عقائد کے لوگوں نے بھی عقل کو استعمال کیا لیکن معتزلہ کی طرح نہیں۔

ابومنصور ماتریدی سمرقند میں ۳۳۰ھ/ ۹۴۱ء کو فوت ہوا۔

مارلطانیہ :۔ بحرِ اوقیانوس پر افریقہ کے شمال مغرب میں ایک مسلمان ملک ہے۔ اس کا رقبہ ۲,۹۷,۹۵۰ مربع میل ہے۔ آبادی ۱۲ لاکھ کے قریب ہے اور خالصتاً مسلمان آبادی ہے۔ اس کا دارالحکومت نواکشٹ ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بعد دنیا کا دوسرا ملک ہے جس کا نام اسلامی جمہوریہ مارلطانیہ ہے۔ سرکاری زبان عربی اور فرانسیسی ہے۔

مارلطانیہ میں مسلمان، مراکش کے حکمران مرابطین کے عہد میں پہنچے اور ان کے توسط سے یہاں کے بربر اور افریقی قبائل مسلمان ہوئے۔ یہ علاقہ مراکش اور مالی کی مسلم حکومتوں کا ایک جزو بنا رہا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہاں مقامی سرداروں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ جن میں خاندان ترارب کی سلطنت بہت مشہور ہے۔

۱۴۴۲ء میں سب سے پہلے پرتگیزیوں نے مارلطانیہ پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد فرانس اور برطانیہ بھی یہاں قابض رہے۔ ۱۸۸۰ء میں فرانس نے پہلے جنوبی حصہ پر قبضہ کیا اور ۸ جنوری ۱۹۰۹ء کو سارے مارلطانیہ پر قابض ہو گیا۔ ۴ دسمبر ۱۹۲۰ء کو باقاعدہ اسے نوآبادی بنالیا۔ مقامی مسلمانوں نے ایک طرح عرصہ تک [illegible] کی جنگ لڑنے کے بعد ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء کو فرانسیسی اقتدار سے نجات پائی [illegible] پہلے صدر مختار الداداہ منتخب ہوئے [illegible] میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے ان کے [illegible] کا خاتمہ ہوا ہے۔

مارلطانیہ کی خاص برآمدات میں خام لوہا، تانبہ، مچھلی [illegible] ملک کا اکثر حصہ صحرا پر مشتمل ہے۔ جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ دریائے سینیگال [illegible] جس کے باعث یہ علاقہ [illegible] ہے۔

ماریہ قبطیہؓ :۔ مصر کے قبطی خاندان کی ایک معزز خاتون جسے مقوقس [illegible] حاکم کو مقوقس کہتے ہیں) نے نبی کریمؐ کی خدمت میں بھیجا۔ آپؐ نے انہیں [illegible] اپنے حرم میں داخل کرلیا۔ کیونکہ وہ [illegible] قبول کر چکی تھیں۔ ان کے متعلق [illegible] کہ نبی کریمؐ نے اُن سے نکاح بھی کیا تھا یا نہیں (مزید دیکھیے ازواج مطہرات)

مالدیپ :۔ سری لنکا سے ۴۰۰ میل جنوب مغرب کی جانب [illegible] پر مشتمل ایک مسلمان مملکت ہے۔ اس کا رقبہ ۱۱۵ مربع میل ہے۔ [illegible] بیس ہزار ہے اس میں ۹۸ فی صد سے زائد مسلمان ہیں۔ [illegible] کا دارالحکومت [illegible] سرکاری زبان انگریزی ہے۔ خاص برآمدات میں ناریل، پھل اور مچھلی [illegible] آبادی کا زیادہ تر حصہ جہاز رانی اور ماہی گیری کرتا ہے۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمان عرب تاجروں کی [illegible] صدی عیسوی میں یہاں کے تقریباً سب لوگ حلقۂ اسلام [illegible] مسلمان مؤرخ ابن بطوطہ بھی یہاں آیا اور یہاں بطور قاضی [illegible] سے اب تک یہاں دیدی خاندان [illegible] حکمران ہیں [illegible] اس پر قبضہ کرلیا۔ لیکن سترہویں صدی میں یہ علاقہ سیلون [illegible] میں آگیا۔ ۱۸۸۷ء میں ایک معاہدہ کے تحت برطانیہ [illegible] کے ساتھ یہاں بھی قابض ہو۔ ۱۹۴۸ء میں حکومت برطانیہ [illegible] سے یہ طے پایا کہ برطانیہ، مالدیپ کے داخلی امور میں مداخلت نہیں کرے گا [illegible] بدلے برطانیہ کو جزیرہ گان میں ایک ہوائی اڈہ قائم کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ

جنوری ۱۹۵۳ء کو مالدیپ کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد ۲۶ جولائی ۱۹۶۵ء کو برطانوی تسلط سے آزاد ہو کر ایک خود مختار سلطنت کی حیثیت اختیار کی۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں عوام کی رائے سے پارلیمنٹ اور صدر کا انتخاب عمل میں آیا۔ پارلیمنٹ ۵۴ ارکان پر مشتمل ہے۔

مالدیپ کے جزائر کو مشہور سیاح واسکوڈے گاما نے دریافت کیا تھا۔

مال غنیمت:- اسلام میں وہ مال و اسباب جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جنگ کی صورت میں ملا ہو، مال غنیمت کہلاتا ہے۔ قرآن نے اس کے بارے میں جو احکام دیئے ہیں اس کے مطابق پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول، رسول کے اقربا، یتیموں، محتاجوں اور ابن السبیل (مسافروں) میں تقسیم ہوتا ہے۔ باقی ۴/۵ ان سپاہیوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے جو جنگ میں شریک ہوئے۔ سواروں کو پیادہ سپاہیوں سے دوگنا حصہ ملتا تھا۔ نبی کریمؐ کے بعد خمس بیت المال میں جمع کرادیا جاتا تھا اور حکومت اسلامیہ کی ملکیت ہوتا ہے اور وہ اسے مسلمانوں کے مفاد میں خرچ کرتی تھی۔ شیعہ علماء کی رائے یہ ہے کہ خمس نبی کریمؐ اور ان کے اہل بیت سے ہی متعلق تھا۔

مال و اسباب کے علاوہ جو مرد، عورت یا بچے گرفتار ہوتے تھے وہ بھی غنیمت کا مال سمجھے جاتے تھے اور انہیں بھی اسی نسبت سے تقسیم کردیا جاتا تھا۔ کسی ملک کی فتح کے بعد جو ملک یا زمین مسلمانوں کے قبضہ میں آتی تھی وہ مال غنیمت میں شمار نہیں ہوتی تھی۔

مزید دیکھئے خمس

مالک بن انسؓ:- پورا نام ابو عبداللہ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر ہے۔ ابی عامر صحابی رسولؐ تھے جو جنگ بدر کے سوا تمام غزوات میں نبی کریمؐ کے ہمراہ رہے۔ امام مالک کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کافی اختلاف ہے۔ اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور وہاں کے معروف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ فقہ کی تعلیم ربیعہ بن فروخ سے حاصل کی۔ نوسو اساتذہ حدیث سے استفادہ حدیث کیا۔ ستر فقہا و علماء نے شہادت دی کہ امام مالک فتویٰ دینے کے اہل ہیں۔ فتویٰ دینا شروع کیا۔ اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ احادیث لکھیں۔ سترہ برس کی عمر میں درس حدیث شروع کیا۔ جب حدیث پڑھانے بیٹھتے غسل کرتے اور خوشبو لگاتے، نئے کپڑے پہن کر بڑے خشوع و خضوع اور وقار سے بیٹھتے۔ بڑے اہتمام اور احتیاط سے راویوں کو بیان کرتے۔ آپ کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار طلباء کو درس حدیث دے رہے تھے کہ آپ کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا، پسینہ آنا شروع ہوگیا اور چہرہ زرد ہوگیا۔ لیکن آپ نے حدیث کے درس کو جاری رکھا۔ درس کے اختتام پر ایک طالب علم سے کہا کہ پشت سے قمیص اٹھا کر دیکھئے۔ وہاں ایک بچھو نے کئی ڈنک لگائے تھے۔ آپ نے احترام حدیث رسولؐ میں درس کو درمیان سے منقطع نہ کیا اور بچھو کے زہر اور ڈنک کو برداشت کرتے رہے۔

آپ کی جرأت اور علمی دیانت کے متعلق کئی اور واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں۔ آپ نے مدینہ منورہ میں آل علیؓ کے ایک بزرگ محمد بن عبداللہ کی بیعت کا فتویٰ دیا۔ ان دنوں منصور عباسی خلیفہ تھا۔ اس نے مدینہ منورہ کے گورنر جعفر بن سلیمان کے ذریعے باز پرس کی اور گورنر مدینہ نے آپ کو ستر کوڑے لگوائے۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں آپ کی عزت مزید بڑھ گئی۔

خلیفہ ہارون رشید کے عہد کے دو واقعات مزید ہیں۔ ایک شرعی مسئلہ کے بارے میں آپ کی رائے خلیفہ سے مختلف تھی۔ خلیفہ ہارون رشید نے کافی اصرار کیا کہ امام مالکؒ اس کی رائے کے مطابق فتویٰ دیں لیکن امام مالکؒ نے فرمایا میں قرآن و سنت کے خلاف کسی بات کو نہیں تسلیم کرتا۔ ہارون رشید کے حکم سے آپ کو گدھے پر بیٹھا کر منہ کالا کرکے بازاروں میں پھرایا گیا۔ آپ بازار سے گزرتے وقت چوک پر کھڑے ہو کر اعلان کرتے 'اے لوگو! مجھے دیکھو اور پہچانو، میں مالک بن انس ہوں اور میری یہ حالت ناموس رسالت کی حفاظت میں ہوئی ہے۔'

خلیفہ ہارون رشید نے ایک بار آپ سے اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم دینے کے لیے کہا۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر انہیں علم حاصل کرنا ہے تو خود چل کر علم کے دروازے پر آئیں، علم کبھی چل کر نہیں جاتا۔ ہارون رشید کے دونوں بیٹے جب پڑھنے کے لیے آئے تو آپ نے انہیں عام طالب علموں کے ساتھ بٹھایا۔ انہوں نے واپس جاکر اپنے والد سے یہ بیان کیا۔ خلیفہ نے آپ کو کہلوا بھیجا کہ میرے بیٹے عام طالب علموں میں نہیں بیٹھیں گے۔ آپ انہیں الگ سے پڑھائیں۔ آپ نے خلیفہ کے بیٹوں کے لیے ایسے کسی خصوصی انتظام تعلیم سے معذوری ظاہر کردی۔

آپ کی علمی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عبدالرحمن بن مہدیؒ نے کہا 'میں کسی کو امام مالک کی صحت حدیث پر مقدم نہیں سمجھتا۔' امام مالکؒ کی فضیلت کے لیے یہ بہت بڑی سند ہے کہ آپ کے شاگرد امام شافعیؒ ہیں جنہوں نے بعد میں شافعی مسلک کی بنیاد رکھی۔ امام شافعیؒ کے شاگرد ایک اور مسلک حنبلی کے بانی احمد بن حنبلؒ ہیں۔ امام اعظمؒ کے شاگرد خاص امام محمدؒ بھی حدیث میں آپ کے شاگرد رہے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اپنے استاد کے بارے میں فرمایا کہ جب عالموں کا ذکر آتا ہے تو ان میں امام مالکؒ ستارہ کی مانند نظر آتے ہیں اور کسی کا احسان مجھ پر علم خدا میں امام مالکؒ سے زیادہ نہیں۔

آپ کی امام ابوحنیفہؒ سے بھی ملاقات کے واقعات کتب تاریخ میں ملتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ بھی آپ کی علمی عظمت اور ثقاہت سے بہت متاثر تھے۔

آپ نے احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا ہے اس کا نام 'موطا' ہے۔ ابن عربیؒ نے کہا ہے کہ موطا اصل اول ہے اور صحیح بخاری اصل ثانی۔ ایک ہزار محدثین نے اس کتاب کو امام مالکؒ سے روایت کیا۔ موطا دس ہزار احادیث سے منتخب کرکے مرتب کی گئی۔ اس میں کل ۱،۷۲۰ احادیث و آثار ہیں۔ ان میں سے ۶۰۰ احادیث مسند، ۲۲۲ مرسل، ۶۱۳ موقوف اور ۲۸۵ تابعین کے اقوال ہیں۔

علماء کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ علم حدیث میں موطا کا مقام بہت بلند ہے۔ برصغیر کے مشہور محدث شاہ ولی اللہؒ نے اسے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔

اسلامی فقہ میں امام مالکؒ کو آئمہ اربعہ میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کے پیروکار 'مالکی' کہلاتے ہیں اور دنیائے اسلام میں ان کی کافی تعداد موجود ہے۔ آپ نے فقہ کی تدوین میں نبی کریمؐ کی سنت اور عمل اہل مدینہ کو کافی اہمیت دی ہے۔ مدینہ کے لوگوں کا عمل نبی کریمؐ سے تواتر سے منتقل ہوا۔ اسی لیے آپ نے فقہی مسائل میں ان کو معیار بنایا۔

ساٹھ سال تک مدینہ منورہ میں علم حدیث کی خدمت کرتے ہوئے ۸۶ سال کی عمر میں ۱۰ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار جنت البقیع میں ہے۔ مکہ مکرمہ کی قربت ہوتے ہوئے بھی آپ نے فرض حج کے علاوہ کوئی دوسرا حج اس لیے نہیں کیا کہ اثنائے راہ ہی انتقال نہ ہو جائے اور نبی کریمؐ کے قرب سے محرومی ہو جائے۔ اس بات سے یہ عکاسی ہوتی ہے کہ آپ کو نبی کریمؐ سے کتنی محبت و عقیدت تھی۔

مالکی:- اہل سنت والجماعت میں فقہی مسائل میں امام مالکؒ کی رائے اور عقیدہ کے

پیروکار مالکی کہلاتے ہیں۔ مؤرخین نے اس بات کو لکھا ہے کہ شروع میں حنفی، مالکی، شافعی وغیرہ قسم کے مسالک کے نام نہ تھے۔ فقہی مسائل میں دو قسم کے مکاتب فکر تھے۔ اہلِ حجاز ـــ امام مالکؒ کی آراء کی پیروی کرتے تھے اور اہلِ عراق امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار تھے۔ جب امام شافعیؒ نے فقہی مسائل میں مذکورہ بالا دو مسالک سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئے مسلک کی بنیاد رکھی اور یہ مسلک "شافعی" کے نام سے معروف ہوا تو مذکورہ بالا دو مسالک کے پیروکاروں نے ان مسالک کے اماموں کے نام کی نسبت سے حنفی اور مالکی مذہب (مسلک) کے نام اختیار کیے۔

مالکی عقائد مغرب کے علاقوں میں پھیلنا شروع ہوئے۔ ان میں "تیونس، الجیریا، مراکش اور اسپین کے علاقے شامل ہیں۔ افریقہ کے باقی علاقے اور مصر کے علاقوں میں بھی مالکی مسلک فروغ پذیر ہوا۔ ان علاقوں میں عبدالمالکؒ بن حبیب سلیمانی (م ۲۳۸ھ/۸۵۳ء) اور اسمٰعیلؒ ابن اسحاق (م ۲۸۲ھ/۸۹۵ء) نے مالکی مسلک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مالی

مالی:۔ اس کا رقبہ ۴۶۴۸۷۵ مربع میل ہے۔ آبادی ۵۰ لاکھ کے قریب ہے جس میں سے ۹۰ فی صد کے قریب یعنی ۴۵ لاکھ مسلمان ہیں۔ دارالحکومت بماکو ہے جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اس کا سابقہ نام فرانسیسی سوڈان تھا۔ اب مالی جمہوریہ کہلاتا ہے۔ سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ خاص برآمدات میں مونگ پھلی، چاول اور مویشی ہیں۔

اس علاقے کے لوگ اسلام سے گیارہویں صدی عیسوی میں متعارف ہوئے۔ ۱۰۴۲ء میں بربر مصلح عبداللہؒ بن یسین نے اس علاقے میں تبلیغ اسلام شروع کی اور یہاں کے بادشاہ نے اُن کی کوششوں سے اسلام قبول کر لیا۔ یہ ملک اس زمانے میں گھانا کی عظیم سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ۱۰۷۶ء میں یوسفؒ بن تاشفین کے چچازاد بھائی ابوبکر بن عمر نے گھانا کے دارالحکومت کو فتح کیا۔ اس علاقے کے بیشتر حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں فولانی مصلح عثمان دان فودیو کی تبلیغ و دعوت سے یہاں کے لوگوں پر مزید اثر پڑا۔ اُن کے پیروکار ایک طویل عرصہ تک فرانسیسیوں کا مقابلہ کرتے رہے جو ان علاقوں پر قابض تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سینیگال، بالائی وولٹا اور گنی کو ملا کر ایک عظیم الشان اسلامی حکومت کے قیام کی کوششیں کی گئیں لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ کیونکہ فرانسیسی مسلح افواج اس مقصد کی راہ میں حائل ہو گئیں۔ ۱۹۰۴ء میں فرانس نے اسے باقاعدہ نوآبادی بنا لیا۔ ۱۹۵۹ء میں مالی اور سینیگال کا وفاق بنا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۰ء

مامون الرشید

مامون الرشید:۔ (۱۷۰ھ/۷۸۶ء ـــ ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) اپنے بھائی امین کے قتل کے بعد عباسی خلیفہ ہارون رشید کا بیٹا اور ساتواں عباسی خلیفہ۔ ۱۹۸ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اصل نام عبداللہ تھا۔

ہارون رشید کے بعد امین تخت پر بیٹھا تو مامون الرشید نے اپنی ماں اُم جعفر کی ترغیب پر اپنے بھائی (جو ماں کی طرف سے سوتیلا تھا) کے خلاف بغاوت کر دی۔ ۵ سال تک امین کی افواج سے مقابلہ کرتا رہا۔ امین کے قتل کے بعد خلیفہ بنا۔ خلافت سنبھالتے ہی علویوں کی بغاوت کی وجہ سے اُسے کافی پریشانیاں اٹھانا پڑیں۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے بعد مامون الرشید نے امن و امان سے حکومت کا آغاز کیا۔ اس کے زمانے میں علوم و فنون کو کافی فروغ حاصل ہوا کیونکہ مامون خود ان میں کافی دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے خراسان میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا۔ بغداد اور دوسرے مقامات پر رصدگاہیں تعمیر کروائیں اور فلکیات کے موضوع پر تحقیقات شروع کروائیں۔ اقلیدس کا پہلا عربی ترجمہ مامون کے ایماء پر ہی کیا گیا۔ مامون الرشید کے زمانے میں جو زیج تیار کی گئی اُسی کے نام کی نسبت سے زیج

مامونی مشہور ہوئی۔ ہیئت کے متعلق مامون کی بعض تفصیلات آج تک درست تسلیم کی جاتی ہیں۔

۸۱۷ء میں مامون الرشید نے معتزلہ عقائد اختیار کر لیے اور ان عقائد کی حمایت میں کئی علمائے اسلام اُس کے ہاتھوں موردِ عتاب ہوئے۔

آخری ایام میں یونانیوں نے ایشیائے کوچک کی مہمات میں خود بھی شریک ہوتا رہا۔ ایسے ہی ایک سفر میں ۸۳۳ء کو طرسوس کے مقام پر وفات پائی۔

ماوردی، ابوالحسن

ماوردی، ابوالحسن:۔ (۳۶۳ھ/۷۴-۹۷۳ء ـــ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء) مشہور فقیہہ اور مؤرخ۔ پورا نام علی بن محمد ماوردی تھا۔ ابوالحسن کنیت تھی۔ کم عمری میں تعلیم کی غرض سے اپنے آبائی وطن بصرے سے بغداد آئے اور پھر یہاں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پہلے درس و تدریس کرتے رہے اس کے بعد مختلف شہروں میں قاضی رہے۔ خلیفہ قائم بامراللہ نے انہیں بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ ۸۶ برس کی عمر میں بغداد ہی میں وفات پائی۔ تصانیف میں الحاوی (فقہ شافعی پر ایک کتاب)، تفسیر القرآن، تسہیل النظر اور احکام السلطانیہ ہیں۔ احکام السلطانیہ فقہ اسلامی اور اصولِ حکمرانی کے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

ماہِ حرام

ماہِ حرام:۔ اہلِ عرب میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے [illegible] ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لیے مخصوص تھے اور رجب کا مہینہ [illegible] کے لیے مخصوص تھا۔ ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارت گری ممنوع تھی تاکہ [illegible] کعبہ امن و امان کے ساتھ [illegible] جا سکیں اور اپنے گھروں کو [illegible] ان مہینوں کو "الشہرالحرام" حرام کے مہینے کہا جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ [illegible] ۱۹۴، ۲۱۷ اور سورۃ مائدہ کی آیت ۲ میں ان مہینوں کا [illegible]

اہلِ عرب نے جنگ و جدال اور لوٹ مار کی خاطر [illegible] کسی حرام مہینے کو حلال قرار دے دیتے اور حلال کو حرام [illegible] لینا ہوتا یا قتل و غارت گری کا کوئی پروگرام ہوتا۔

[illegible] بالا چار مہینوں میں ایسا کوئی سا فعل حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ [illegible] فرما کر مسلمانوں کے لیے پریشانی ختم کر دی "ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام [illegible] لحاظ برابری کے ساتھ ہو گا۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے [illegible] درازی کرو ......

یعنی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ [illegible] حرمت کے مہینوں [illegible] دست درازی کریں اور مسلمانوں کو تنگ کریں تو مسلمانوں کو اجازت [illegible] سکتے ہیں۔

ماہِ صیام

ماہِ صیام:۔ اسلامی مہینوں میں رمضان کے مہینے کو ماہ صیام [illegible] روزہ کو کہتے ہیں اور صیام اس کی جمع ہے۔ یہ مہینہ چاند کے ۲۹ یا ۳۰ دن [illegible] جس میں صبح اٹھ کر طلوع فجر کے بعد سے شام غروب آفتاب تک کچھ کھایا پیا نہیں [illegible]

مزید دیکھیے: "روزہ، رمضان المبارک"

ماہرالقادری

ماہرالقادری:۔ (۱۳۲۴ھ / ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء) کو کیسر کلاں ضلع

بلند شہر یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کا تاریخی نام منظور حسین رکھا گیا۔ انھوں نے تخلص ماہر رکھا اور سلسلہ قادریہ سے نسبت کی بنا پر "القادری" نام و تخلص کا جزو بن گیا۔ ان کے والد محمد معشوق علی اپنے علاقے کے مشہور شاعر، نثر نگار اور انگریزی دان تھے اور ظریف تخلص کرتے تھے۔ گاؤں کے مکتب میں ابتدائی تعلیم اور والد سے فارسی پڑھنے کے بعد جب ماہر انگریزی سکول میں داخل ہوئے تو گلستان ختم کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ سعدی کے شعر و ادب کا ان کے ہاں پر تو نظر آتا ہے۔ ریاضی سے طبعاً مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے ۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کے

ماہر القادری

بعد انھوں نے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی مگر اپنے طور پر مطالعہ جاری رہا۔ فن و علم کی کتب کا اتنی کثرت سے مطالعہ کیا کہ کتابیں ان کی زندگی بن گئیں۔ دو سال تک عربی ادب سبقاً سبقاً پڑھا۔ ماہر صاحب نے ۱۳ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی پہلی غزل گزٹ بلند شہر میں شائع ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

نالہ جو سنے میں نے گلشن میں عنادل کے
پھر زخم ہوئے تازہ ارماں بھرے دل کے

ماہر القادری نے کسی شاعر سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۲۸ء میں ماہر حیدر آباد دکن گئے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بہت عزت افزائی کی۔ انھیں مختلف سرکاری محکموں، باب حکومت، نظامت پٹہ، معتمدی فوج، صدر محاسبی، ہائیکورٹ، دیوانی عہدہ اور نظامت تو جداری میں ملازمتوں کا موقع ملا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ ادبی ذوق کی بھی تسکین کرتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ماہر صاحب دکن چھوڑ کر بجنور (یوپی) میں روزنامہ "مدینہ" کے ادارتی شعبے میں شامل ہو گئے۔ بچوں کے رسالہ "غنچہ" کی ادارت کے چھ ماہ بعد "مدینہ" بند ہو گیا تو ماہر صاحب نے عبدالعزیز بدایونی کی معیت و قیادت میں عراق کا سفر کیا۔ بغداد، نجف اشرف، کربلا، ذی الکفل، مسیب، بصرہ اور مداین کے مقدس آثار اور مقابر کا دورہ کیا۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۳ء تک دس سال انھوں نے حیدر آباد دکن میں قیام کیا۔ ان دنوں مجلس اتحاد المسلمین اپنے شباب پر تھی۔ جس جلسہ میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر ہوتی ماہر صاحب نظم سناتے۔ ماہر صاحب نے حیدر آباد کے اہل علم فضل و کمال سے استفادہ کیا۔ اسی طرح ماہر کی شاعری حیدر آباد کے ماحول میں پروان چڑھی۔ دکن کے شائستہ تمدن نے جو مغلیہ دور کی یادگار تھا ماہر صاحب کو متاثر کیا اور وہ کہا کرتے تھے کہ اگر حیدر آباد میں رہنے کا موقع نہ ملتا تو میری شعر و ادب کی صلاحیتیں پوری طرح اجاگر نہ ہوتیں۔ ماہر صاحب نواب معظم جاہ کے دربار سے بھی چھ ماہ تک وابستہ رہے۔ بمبئی میں ۱۹۴۳ء کے آل انڈیا مشاعرے میں فلمی صنعت کے ارباب کار ماہر صاحب کی جانب متوجہ ہوئے۔ چند ماہ بمبئی میں رہ کر انھوں نے فلموں کے لیے مقبول نغمے تخلیق کیے۔ اپنے دینی مزاج کی بنا پر وہ جلد ہی فلمی دنیا کے ماحول سے کنارہ کش ہو گئے۔ ساڑھے تین سال دہلی میں قیام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت وہ اپنے گاؤں کیسر کلاں میں تھے۔ ہندوؤں کے متوقع حملے کے پیش نظر انھوں نے مسلمانوں کو منظم کر کے پہرے کا انتظام کیا اور تقریروں سے مرد و خواتین کی ہمت بڑھائی۔ اس کے بعد وہ مہاجرین کی سپیشل ٹرین سے ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچے اور آخر تک یہیں مقیم رہے۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں انھوں نے ماہنامہ "فاران" کراچی شروع کیا جو ۲۸ سال تک کسی ناغہ کے بغیر شائع ہوتا رہا۔

ماہر صاحب نے خود اصلاح نہ لینے کے باوجود سینکڑوں شاعروں کو مشورہ سخن دیا۔ دکن کے مشہور شاعر نظر حیدر آبادی نے ماہر صاحب سے اصلاح لی۔ ماہر صاحب زبان و بیان و اظہار کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اپنے رسالہ فاران میں انھوں نے ۲ ہزار سے زائد کتب پر تبصرہ کر کے مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ زبان کے معاملہ میں وہ انتہائی حساس اور محتاط تھے۔ ترقی پسند ادب کے مخالف ماہر نے غزل، رباعی، گیت، اصلاحی اور رومانی نظمیں سب کچھ لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ؎

میں سر افق سے طلوع ہو کر جہاں میں ظاہر ہوا ہوں ماہر
کہیں مرا طرز ناصحانہ کہیں مرا رنگ عاشقانہ

ماہر صاحب کی ایک نعتیہ نظم "سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی" بہت مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں جب یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی تو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے دیباچہ میں لکھا تھا: "میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ یہ سلام کھٹمنڈو سے لے کر راس کماری تک مشہور ہو گا" اور یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ "جمنا کا کنارہ" اور "قرآن کی فریاد" کو بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

تصانیف: مولانا ماہر القادری کے افسانوں کے مجموعوں 'انگڑائی'، 'طلسم حیات'، 'حسن و شباب' اور 'نگینے' کے ناموں سے شائع ہوئے۔ ان کے ناول 'جب میں جوان تھی'، 'کردار' اور 'کافی ہاؤس' شائع ہوئے۔ سیرت اور اسلام کے موضوع پر انھوں نے "آخری رسولﷺ" "خدا اور کائنات"، "دریتیم"، "کاروان حیات"، "نقش توحید"، "قول فیصل" تحریر کیے۔ روزنامچے اور محبت بھرے خطوط کے نام سے دو کتابیں شائع کیں۔ فاران کے اداریے بھی کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس طرح ماہر صاحب کی نثری کتابوں کا مجموعہ بیس ہے۔ ان کے شعری مجموعے "ماہر القادری کے سو شعر (۱۹۳۷ء)، ظہور قدسی (۱۹۳۷ء) محسوسات ماہر (۱۹۴۱ء) نغمات ماہر (۱۹۴۳ء) جذبات ماہر (۱۹۴۴ء) ذکر جمیل (۱۹۴۴ء) اور فردوس (۱۹۵۵ء) کے ناموں سے شائع ہوئے۔

آپ نے علمی ادبی میدان میں ایک ماہر نقاد کی حیثیت سے کافی شہرت پائی۔

سفر آخرت: ۷۲ سال کی عمر میں مقدس سرزمین حجاز میں اپنی زندگی کے آخری مشاعرہ میں شرکت کے لیے جب جدہ پہنچے تو ۱۰ مئی ۱۹۷۸ء کو عمرہ سے فارغ ہوئے۔ طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ ۱۱ مئی کی رات کو دس بجے کے قریب جدہ میں مشاعرہ شروع ہوا۔ مشاعرہ کے پہلے دور میں ماہر صاحب نے اپنی ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا ؎

شیرازۂ حیات پریشان ہو گیا
یہ مرحلہ بھی خیر سے آسان ہو گیا

دوسرے دور میں آپ نے پہلے اپنی دو غزلیں سنائیں، جن میں سے پہلی غزل کا مطلع یہ تھا ؎

کیا یہ بہار بھی نہ مجھے آسکے گی راس
بجلیاں چمک رہی ہیں خرمن کے آس پاس

دوسری غزل کا مطلع یہ تھا ؎

ساقی ہے دور جام ہے، بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

سامعین نے "جمنا کے کنارے" سننے کی فرمائش کی لیکن انھوں نے کہا یہ اس کا محل

نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنا نعتیہ کلام پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ نعتوں کے لیے تیسرا دَور مختص ہے۔ تو انھوں نے اپنی مشہور نظم "کراچی نامہ"، سنائی۔ اپنی دونوں غزلوں اور "کراچی نامہ" پہ سامعین سے بے پناہ داد وصول کر کے ماہر صاحب اپنی نشست پہ آ بیٹھے تو احسان دانش اپنی غزل سنانے تشریف لائے تو ان کی غزل کے اس شعر پہ ماہر صاحب پھڑک اٹھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور حضرتِ دانش کو دل کھول کر داد دی۔ ؎

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں، انہیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے

احسان دانش کے بعد حفیظ جالندھری کی غزل کے اس شعر پہ انہیں مائیک پہ آ کر داد دی ؎

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ الیم
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

اس کے بعد جونہی نشست پہ آ کر بیٹھے کہ دل کی دھڑکن بند ہوگئی۔ روح پرواز کر گئی اور یہ سعادت نصیب ہوئی کہ حرم شریف مکہ مکرمہ میں نمازِ جنازہ ہوا اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ، کئی صحابہ کرامؓ اور دوسرے اکابرِ دین کے جوار میں جنت المعلیٰ (مکہ) ہی دفن ہوئے۔ آپ کا انتقال ١٢ مئی ١٩٧٨ء کو ہوا۔

مباہلہ - ایک دوسرے کے لیے بددعا کرنا کہ اگر کسی حق بات کے تسلیم کرنے میں مخالف فریق ہٹ دھرمی سے کام لے رہا ہے تو یہ کہنا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پہ خدا کی لعنت۔

١٠ھ میں نجران کا ایک عیسائی وفد نبی کریمؐ سے ایک مباحثہ اور مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ منورہ آیا۔ نبی کریمؐ نے اپنی دعوت اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق اسلام کے عقائد ان پر واضح کئے وہ ان باتوں کو تسلیم نہیں کر رہے تھے اور اپنے مروجہ مسیحی عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتبِ مقدسہ سے کوئی دلیل اور سند پیش نہ کرنے پا رہے تھے کہ وہ اس کو حق ثابت کر سکے تو نبی کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو مباہلہ کی دعوت دی۔ سورۃ آل عمران کی آیت ٦١ کو اسی لیے مباہلہ کی آیت کہتے ہیں۔ "حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمدؐ، اس سے کہو کہ "آؤ، ہم اور تم خود بھی آ جائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پہ خدا کی لعنت ہو۔"

روایاتِ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریمؐ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو لے کر آئے اور عیسائیوں کو دعوتِ مباہلہ دی لیکن وہ سامنے نہیں آئے۔ نبی کریمؐ نے بعد میں فرمایا کہ اگر یہ آج مقابل آ جاتے اور مباہلہ کرتے ہیں تو دنیا میں قیامت تک کوئی عیسائی نہ رہتا۔

مبلّغ - اسلام ایک دعوتی اور تبلیغی مذہب ہے۔ نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان ایک مبلّغ ہے۔ اس کے ذمّہ ہے کہ وہ دینِ اسلام کو دوسرے تک پہنچائے اور اگر وہ اس فریضہ میں کوتاہی کرتا ہے تو عند اللہ قابلِ گرفت ہے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

"بلغوا عنی ولو آیۃ" "میری طرف سے پہنچا دو اگرچہ ایک ہی آیت ہو"

مبلّغ اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے لوگوں تک، دوسرے مقامات پہ جا کر دعوتِ حق کو پہنچائے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ایسے مبلغین دوسرے ممالک میں جاتے رہے اور اپنے افعال و کردار اور اخلاق کے ذریعے مخاطبین کو متاثر کرتے تھے اور ان کی تبلیغی کوششوں سے لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ برعظیم پاک و ہند کے علاقوں میں حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ اور حضرت معین الدین چشتیؒ نے اس فریضہ کو ایسے بہترین انداز میں پورا کیا کہ لاکھوں غیر مسلم، اسلام قبول کر گئے۔ موجودہ دور میں ایسے فریضہ کی ادائیگی کے لیے باقاعدہ جماعتیں ہیں جن کی طرف سے دوسرے ممالک میں مبلّغین بھیجے جاتے ہیں۔ ایسی ایک جماعت کی بنیاد ہندوستان میں مولانا محمد الیاسؒ نے رکھی تھی۔ اس جماعت کو تبلیغی جماعت کہتے ہیں۔ اس جماعت سے منسلک افراد ہر سال ہزاروں کی تعداد میں دوسرے ممالک میں تبلیغِ دین کے لیے جاتے ہیں۔ ایک مبلّغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس چیز کی دعوت پیش کر رہا ہے اس کے متعلق کافی معلومات رکھتا ہو۔

متحدہ عرب امارات - خلیج عرب کی نو مسلم ریاستوں کا وفاق ١٨ جولائی ١٩٧١ء کو قائم ہوا اور اس کا نام متحدہ عرب امارات رکھا گیا۔ اس وفاق کے پہلے صدر ابوظہبی کے امیر شیخ زید بن سلطان النہیان اور نائب صدر دوبئی کے امیر شیخ راشد بن سعید المکتوم ہیں۔ اس وفاق کا دارالحکومت ابوظہبی مقرر کیا گیا۔ اس وفاق میں درج ذیل ٩ ریاستیں شامل ہیں: (١) بحرین۔ (٢) قطر۔ (٣) ابوظہبی۔ (٤) دوبئی۔ (٥) شارجہ۔ (٦) عجمان۔ (٧) ام القوین۔ (٨) راس الخیمہ (٩) فجیرہ۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں کی ملاقات دوبئی میں ہوئی تھی اور اس میں حسبِ ذیل امور پہ اتفاق ہوا۔

(١) تمام ریاستیں اندرونی طور پہ خود مختار رہیں گی لیکن مجموعی طور پہ ایک وفاق کی صورت میں اکٹھی ہوں گی۔

٢۔ وفاقی حکومت کا انتظام ایک کونسل کے ذمّہ ہوگا جس میں نو ریاستوں کے حکمران برابر حیثیت رکھیں گے۔

٣۔ کونسل اپنے ارکان میں سے ایک کو وفاق کا سربراہ مقرر کرے گی۔ ہر رکن باری باری سربراہ بنے گا۔

٤۔ رکن ریاستوں کا مشترکہ دفاعی نظام ہوگا جو عرب لیگ اور اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ہوگا۔

٥۔ کونسل کا ایک مستقل اور مکمل دستور ہوگا اور سیاسی، دفاعی، معاشی، ثقافتی اور بین الاقوامی مسائل پہ ایک متفقہ پالیسی مرتب کرے گی۔

ان ریاستوں کا مجموعی رقبہ ٣٢ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ٥ لاکھ سے زائد ہے اور سب آبادی خالصتاً مسلمانوں کی ہے، ان ریاستوں کی سرکاری زبان عربی ہے۔

خلیج عرب کی یہ ریاستیں انیسویں صدی عیسوی میں ایک متحدہ صورت میں تھیں۔ لیکن انگریزوں نے عربوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طویل عرصہ تک الگ الگ رہنے کے بعد یہاں کے عوام اور حکمرانوں نے تدبّر سے کام لیتے ہوئے دوبارہ وفاق کی صورت اختیار کی۔ ان ریاستوں میں سے ہر ریاست کا حاکم انفرادی طور پہ بھی اور وفاق کے زیرِ انتظام اپنی ریاست کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اقدامات میں مصروف ہے۔

ان ریاستوں کی خاص بہ آمدات میں پٹرول اور مچھلی ہے۔

متشابہات - وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہو۔

متشابہات کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی آیت ٧ میں اس طرح بیان کیا ہے۔ "اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیا ہیں اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو عجیب معنی پہنانے کی کوشش

کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" یعنی اہل ایمان آیات متشابہات کا جو سیدھا سادہ مفہوم ملتا ہے اسے قبول کر لیتے ہیں اور اس کی مزید ٹوہ اور تحقیق میں نہیں لگ جاتے لیکن ٹیڑھ رکھنے والے ان کی مختلف تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔

متعہ ۔ لغوی معنی کسی چیز سے متمتع کرنا۔ اصطلاحِ مذہب میں ایک مقررہ میعاد کے لیے عارضی نکاح کو کہتے ہیں۔ (بخاری، کتاب النکاح - ترمذی، کتاب النکاح)

عرب میں اسلام سے پہلے اس قسم کے عارضی نکاحوں کا عام رواج تھا اور روایات کے مطابق آغازِ اسلام کے عہد میں بھی اس کی اجازت رہی۔ لیکن نکاح کے واضح احکام نازل ہونے کے بعد اس کی ممانعت کر دی گئی۔ لیکن مسلمانوں کا ایک فرقہ "شیعہ" اب بھی اس کا قائل ہے اور اس کے لیے قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت ۲۴، استمتعتم الیٰ اجل مسمّٰی سے استدلال کرتے ہیں۔

اہل سنت کے ہاں اس کی ممانعت کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ اسے حضرت عمر فاروق نے بند کیا تھا اور ان کا یہ فعل ٹھیک نہ تھا کیونکہ اس کی اجازت نبی کریم کے دور میں رہی ہے۔

شیعہ مذہبی طور پر تو اس کے قائل ہیں اور ایران میں اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے اور باقاعدہ "متعہ ہاؤس" بنے ہوئے ہیں لیکن پاک و ہند کے علاقوں میں اس کا کوئی رواج نہیں۔ متعہ کرنے والا مرد عورت کو کچھ مہر دیتا ہے اور ایک خاص مدت مقرر کر لی جاتی ہے اس وقت تک اس عورت سے تمتع کرتا ہے اور اس مدتِ معینہ کے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے۔ اس مدتِ معینہ کے اختتام کے بعد ان کا یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے اور نکاح کی طرح اس میں علیحدگی کے لیے طلاق وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ متعہ کے لیے باقاعدہ نکاح کی طرح کسی عالم سے 'صیغۂ متعہ' پڑھوایا جاتا ہے جو مثل نکاح کے ہوتا ہے۔ اس مدتِ مقررہ میں تمتع کے دوران عزل کی اجازت ہے لیکن اگر بوجوہ حمل ٹھہر جائے تو وہ اولاد مرد کی تصور کی جائے گی۔ اگر مرد اسے اپنی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو اس پر گرفت بھی کوئی نہیں۔ متعہ کے لیے کوئی پابندی نہیں کہ عورت مسلمان ہی ہو۔ عیسائی، یہودی اور مجوسی بھی ہو سکتی ہے۔

شہنشاہ اکبر نے متعہ کو ایک اہم مسئلہ کی صورت میں اپنے دور کے علماء کے سامنے پیش کیا کیونکہ وہ اسے 'آئینِ اکبری' کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔

شہنشاہ کے استفسار پر علماء نے بتایا کہ چار شادیوں کی تو اجازت ہے۔ اب شہنشاہ کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اس نے تو شعور کی زندگی کے وقت سے بیسیوں آزاد عورتوں سے نکاح کیا تھا اور کئی لونڈیاں بنا کر رکھی تھیں۔ اس نے شیخ عبدالغنی کے ایک قول کا حوالہ دیا کہ وہ کہتے تھے کہ ایک مجتہد نے ۹ سے زائد بیویاں رکھی ہوئی تھیں۔ اب درباری علماء ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے مختلف آراء پیش کرنے لگے۔

ایک عالم نے یہ رائے پیش کی کہ امام مالکؒ اور شیعہ فقہا ایک خاص مدت کے لیے متعہ کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ متعہ کو رد کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص چار سے زائد بیویاں رکھنا چاہے اور مالکی مسلک کا قاضی متعہ کی اجازت دے دے تو وہ ایسا کر سکتا ہے چاہے وہ حنفی یا شافعی مسلک کا پیروکار کیوں نہ ہو۔ شہنشاہ اکبر نے مالکی مسلک کے ایک قاضی کو مقرر کیا۔ اس نے اکبر کی ۴ سے زائد بیویوں کے متعلق فتویٰ دے دیا کہ وہ متعہ کے ذیل میں رکھی جا سکتی ہیں۔

متقی ۔ پرہیزگار، اللہ سے ڈرنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن مجید کی ابتدائی سورۃ البقرہ کے آغاز میں ہی فرمایا:

"یہ کتاب ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگار ہیں اور غیب پر ایمان لاتے ہیں ....." پرہیزگار وہ شخص ہے جو بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکتا ہو، برائی سے بچنا چاہتا ہو۔ بھلائی کا طالب ہو اور خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرنے والا ہو۔

اسی طرح سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۲ تا ۱۳۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ اُن متقی لوگوں کے لیے ہے جو ہر حال میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ....."

یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں متقی لوگوں کے لیے ہیں۔

اسی سورۃ کی آیت ۱۳۸ میں فرمایا: "یہ کتاب ہدایت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو متقی ہیں"۔ (مزید دیکھیے "تقویٰ")

متنبّی، ابوطیب، احمد۔ (۹۱۵ء - ۹۶۵ء)

کوفہ کے ایک محلہ کِندہ کے ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا۔ نام احمد تھا۔ کنیت ابوطیب اور لقب متنبّی تھا۔ متنبّی کا لغوی معنی نبوت کے دعوے دار کے ہیں۔ پندرہ سال کی عمر میں خلافت کا دعویدار بن کر اٹھا اور شام اور عراق کے علاقوں میں کچھ عرصہ تک حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت برپا کی جس کے باعث گرفتار ہوا۔ پھر اپنے ایک قصیدہ کی وجہ سے رہائی پائی۔ خود ایک غیور اور جاہ طلب شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان عربی ادب کا قیمتی سرمایہ ہے اور عربی ادب میں پڑھایا جاتا ہے۔

آخری عمر میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ حمص کے گورنر نے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ توبہ کے بعد معافی ملی اور رہا ہوا۔ اسی وجہ سے متنبّی لقب مشہور ہوا۔ ایران سے بغداد آ رہا تھا کہ راستے میں قتل کر دیا گیا۔

متوکل علی اللہ ۔ (ولادت ۲۰۷ھ - ۲۴۷ھ)۔ عباسی دور کا دسواں خلیفہ۔ جعفر نام۔ ابوالفضل کنیت۔ متوکل علی اللہ لقب۔ دورِ خلافت ۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ رہا۔ ۲۴ ذی الحجہ ۲۳۲ھ کو واثق باللہ کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا۔ خلافت سنبھالتے ہی فوج کے نظم و نسق کو درست کیا۔ اپنے بیٹے منتصر کو حجاز، یمن اور طائف کا حکمران مقرر کیا۔

پہلے اقدام کے طور پر اپنے ایک پرانے بدخواہ ابن زیات کو قید کر دیا اور بعد میں قتل کروا دیا۔ آذربائیجان کے رئیس محمد بن بعیث نے علم بغاوت بلند کیا تھا۔ متوکل کے عہد میں ایک بار گرفتار ہو کر سامرا میں قید ہوا۔ لیکن وہاں سے بھاگ گیا۔ ۲۳۴ھ میں دوبارہ گرفتار کر کے سامرا ہی میں قید کر دیا گیا۔ وہاں ہی اس کا انتقال ہوا۔

متوکل کے عہد میں ۲۳۵ھ میں محمود بن فرج نیشاپوری نے سامرا میں پیغمبری کا دعویٰ کیا اور اپنی ایک تصنیف کو الہامی کتاب قرار دیا۔ متوکل نے اسے گرفتار کرا کے قتل کروا دیا اور اس کے چند پیروکاروں کو بھی قید کر لیا۔ ۲۳۷ھ میں آرمینیہ کے باوریوں نے خروج کیا۔ فوج کشی کے ذریعے باغیوں کو اطاعت پر مجبور کیا گیا۔ متوکل کے عہد میں ۲۳۹ھ میں رومیوں کے دمیاط پر حملے کو ناکام بنایا گیا۔

۲۴۰ھ میں اہلِ حمص کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔ اسی طرح اپنے عہد میں کئی دوسری شورشوں کا قلع قمع کیا اور باغیوں کی سرکوبی کی۔ متوکل نے فتنۂ خلق قرآن کے بانی قاضی احمد بن ابی داؤد اور اس کے ایک قریبی ساتھی یحییٰ بن اکثم کو زیرِ عتاب رکھا اور

ان دونوں کی جائداد ضبط کر لی۔

متوکل کے عہد میں فتوحات اور زبردست جاہ و جلال کے باوجود داخلی انتشار رہا۔ مختلف علاقوں میں بغاوتیں ہوتی رہیں۔

متوکل علویوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس نے حضرت حسینؓ کے مشہد مبارک اور اس کے آس پاس کے مکانات کو مسمار کروا کے اس زمین پر ہل چلا دیا اور زائرین کے وہاں آنے پر پابندی لگا دی۔

متوکل نے تلخ ذاتی تجربوں کی بنا پر اپنی زندگی میں ہی اپنے تینوں بیٹوں محمد، طلحہ اور ابراہیم کو علی الترتیب منتصر باللہ، معتز باللہ اور موید باللہ کے القاب دے کر ولی عہدی کے لیے نامزد کر دیا اور حکومت کے تین حصے کر کے ان تینوں کو ہر حصے کا خود مختار حکمران مقرر کر دیا۔ بعد میں معتز کی ماں کے مجبور کرنے پر منتصر کو زیر عتاب رکھا اور معتز پر اعزاز و اکرام شروع کیا۔ جس کی وجہ سے منتصر اپنے باپ کے قتل کے درپے ہو گیا۔ ۳ شوال ۲۴۷ھ کو منتصر کے آدمیوں نے متوکل کو قتل کر دیا۔

متوکل اپنی نرمی اور شفقت کی وجہ سے رعایا میں بہت مقبول تھا۔ اس کے زمانے میں عوام نہایت آسودہ تھے۔ متوکل حدیث نبویؐ سے خصوصی دلبستگی کی وجہ سے علماء و فضلا کی سرپرستی کرتا رہتا تھا۔ متوکل کو امام شافعیؒ سے کافی عقیدت تھی اس لیے اس نے شافعی مسلک اختیار کیا۔ سنت نبویؐ کا احیاء اور احادیث رسولؐ کی نشر و اشاعت اس کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ محدث ابوبکر بن ابی شیبہ اور ان کے بھائی نے متوکل کے عہد میں جامع رصافہ اور جامع منصور میں حلقہ ہائے درس حدیث قائم کئے متوکل کو اولیاء اللہ سے کافی عقیدت تھی۔

متوالی ۔ حضرت علی سے محبت کرنے والے متوالی کہلاتے ہیں اور ۱۸ ویں صدی عیسوی سے لبنان میں ایسے لوگوں کو سنی عقیدہ رکھنے والوں سے متشخص کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ لبنان میں یہ اپنی شیعہ لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جنہوں نے تین مخصوص خاندانوں سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا۔ یہ تین خاندان جبل کے النصر، الحرفش اور بعلبک کے عمیل اور شمالی لبنان کے الحماد ہیں۔ آجکل متوالی شام کے مختلف علاقوں میں رہنے والے امامیوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جن کی تعداد ۱۵ ہزار کے قریب ہے لبنان میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے اور لبنان کی پارلیمنٹ میں ان کو نمائندگی حاصل ہے۔ متوالی لبنان کے جنوبی علاقوں میں بھی رہتے ہیں اور تجارت کے پیشہ سے منسلک ہیں۔

متی بن یوسف ۔ (وفات ۹۴۰ء) مشہور فلسفی اور طبیب حاذق۔ ابوبشر کنیت، المنطقی کے نام سے مشہور ہوا۔ بغداد کے قصبہ قُنّی میں پیدا ہوا اور وفات بھی بغداد میں ہوئی۔ فارابی اور یحییٰ بن عدی کا استاد تھا۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اپنے دور میں اہل منطق کی آخری شخصیت تھی۔ پہلی یونانی کتاب "پوئیٹیکا" کو اس نے عربی میں منتقل کیا۔ "کتاب الشعر الارسطو" اور سریانی زبان میں سے کتاب البرہان کا عربی میں ترجمہ کیا۔

مثنوی ۔ فن شاعری میں ایک خاص صنف جو ادب فارسی، اردو اور ترکی میں مستعمل ہے۔ مثنوی مولانا جلال الدین رومیؒ کے دیوان کا شہرت یافتہ نام بھی ہے۔ اس میں صوفیاء کی تعلیمات کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مختلف مثالوں اور استعارات سے مدد لے کر اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔

مثنیٰ بن حارثہ شیبانیؓ ۔ صحابیٔ رسول اللہؐ۔ مسلمان افواج کے سپہ سالار۔ اپنے قبیلے کے ممتاز رؤسا میں سے تھے۔ مدینہ منورہ میں نبی کریمؐ کی خدمت میں اپنے قبیلے کے ہمراہ آکر ایمان سے سرفراز ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں جب مسلمانوں کی طرف سے فتوحات کے رستے کھلے تو ایرانیوں کے خلاف بھی اقدام اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا تو حضرت مثنیٰؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خط لکھا اور پھر خود مدینہ آکر انہیں عراق پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہدایت پر حضرت خالدؓ بن ولید نے عراق پر لشکر کشی کی۔ مثنیٰؓ عراق کی سب مہموں میں حضرت خالدؓ کے معاون رہے اور ایک دو معرکوں میں افواج کی قیادت بھی کی۔ ایران کی فتح میں آپ نے مناسب رہنمائی کی۔ آپ نے صرہ، سورا، برہیما، ہدراہ، سیب، عین التمر وغیرہ کے علاقے فتح کیے۔ بعد میں سوق بغداد کو بھی فتح کیا۔

مجالس المومنین ۔ شیعہ علماء، فقہاء، باد[illegible]ہوں، شاعروں اور صوفیاء کا ایک تذکرہ جسے قاضی نور اللہ شوستری اکبر اعظم نے لکھا۔ شوستری ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ اکبر نے اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر لاہور کا قاضی مقرر کیا۔ لاہور کے قیام کے دوران ہی ۱۵۸۵ء میں مجالس المومنین کی تصنیف کا آغاز کیا جو ۱۶۰۱ء میں مکمل ہوئی۔

مجاہد ۔ جد و جہد کرنے والا۔ اصطلاحاً اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کو مجاہد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ اس جہاد میں یا تو وہ اپنی جان بھی اللہ کے راستے میں قربان کر کے شہید ہوتا ہے یا فتح پاکر غازی کہلاتا ہے۔

مجاہدؒ ۔ (وفات ۳۲۴ھ/۹۳۶ء) مشہور محدث، نحوی، امام۔ اپنے زمانے میں بغداد کا امام القراء تسلیم کیا جاتا تھا۔ تصنیفات میں "قراۃ النبی"، "القراۃ الکبیر" اور "الشواذ فی القراءت" مشہور ہیں۔

مجاہدہ ۔ تصوف کی اصطلاح ہے۔ اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف کوشش کرنا کہ وہ اللہ کی اطاعت میں آجائے۔ مجاہدہ کہلاتا ہے۔

صوفیاء اس کے لیے قرآن پاک کی ایک آیت والذین جاھدوا فینا۔ جس نے ہمارے راستے کے لیے کوشش کی ہم اسے ضرور بالضرور اپنا راستہ دکھاتے ہیں۔ اور نبی کریمؐ کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: "مجاہد وہ ہے جس نے اپنے نفس کے خلاف جہاد کیا۔"

ایک بار جہاد سے آرہے تھے تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: "ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہیں۔" صحابہ کرامؓ نے پوچھا: "یہ بڑا جہاد کیا ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا: "اپنے نفس کے خلاف جہاد۔"

صوفیاء اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنے کے لیے کافی ریاضتیں اور مشقتیں کرتے ہیں اور ان تمام ریاضتوں اور مشقتوں کو وہ "مجاہدہ لنفس" کہتے ہیں۔

مجتہد ۔ دینی مسائل میں اجتہاد کرنے والے شخص کو مجتہد کہتے ہیں۔ بعض اوقات بلکہ شخص کی دینی بصارت اور علم کی وجہ سے مسلمان اُسے اس مرتبہ پر فائز کرتے ہیں اور بعض اوقات حکومت ایک شخص کو مقرر کرتی ہے۔ اہل سنت میں آئمہ اربعہ کو مجتہد مانا جاتا ہے کہ انہوں نے فقہی مسائل میں اجتہاد کیا تھا۔ شیعہ حضرات ہر زمانے میں اپنے سے

ایک مجتہد کو مقرر کرتے ہیں اور اس کی رائے اہلِ شیعہ کے لیے حتمی ہوتی ہے۔ ایران میں باقاعدہ اس کا ایک مستقل نظام ہے۔ اعلیٰ علمی صلاحیتیں رکھنے والے حضرات کو مجتہد مقرر کیا جاتا ہے۔

مجدد الف ثانیؒ۔ (۲۶ رجون ۱۵۶۴ء — ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء)

شیخ عبدالاحد کے ہاں سرہند میں پیدا ہوئے۔ والد نے احمد نام رکھا۔ لقب بدرالدین مشہور ہوا اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ حفظِ قرآن کے بعد ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد سیالکوٹ جاکر مولانا کمال کشمیری سے معقولات کی بعض کتابیں پڑھیں۔ حدیث میں آپ کے استاد مولانا یعقوب کشمیری تھے۔ سترہ برس کی عمر میں جملہ علوم ظاہریہ سے فارغ مسندِ افادہ پر بیٹھے اور مدت تک درس و تدریس کے سلسلے کے ساتھ ساتھ طالبانِ حق کو فیوض و برکات سے نوازتے رہے۔ اس کے بعد اکبر آباد (آگرہ کا پرانا نام) تشریف لے گئے۔

جن ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے۔ اُن دنوں برعظیم پاک و ہند کے علاقوں میں مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دینِ الٰہی کا زور و زورہ تھا۔ جس کا بنیادی مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنانا تھا جس کا مرکز و محور بادشاہ کی ذات تھی۔ چنانچہ زر پرست علماء نے اکبر کو مہدی، صاحبِ زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک نے تو اسے "خدا کا عکس" ٹھہرا دیا۔ تمام مذاہب کے مختلف عقائد کا یہ ایک مجموعہ تھا۔ اس میں تناسخ، سجدہ تحیتہ، قشقہ لگانا، آفتاب کی پوجا کرنا، گائے کی حرمت اور ہون کی رسم وغیرہ شامل کی گئیں۔ ہندو تہواروں کو بڑے اہتمام سے منایا جاتا۔ پارسیوں کی آتش پرستی، عیسائیوں کی تثلیث اور ناقوس نوازی بھی اس نام نہاد دینِ اکبری میں شامل تھیں۔

اکبر آباد کے قیام کے دوران میں آپ کو اکبر کے نورتنوں میں سے ابوالفضل اور فیضی سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا اور بعض اختلافات کے باوجود دونوں بھائی آپ کے علم و فضل کے بڑے معترف ہوگئے۔ چونکہ ابوالفضل اہلِ علم کی قدر کرتا تھا۔ اس لیے کئی بار حضرت مجدد اس کی مجلس میں شریک ہوئے۔

ایک روز حضرت مجدد، ابوالفضل کے بھائی فیضی کے مکان پر گئے۔ وہ تفسیرِ بے نقط لکھنے میں مصروف تھا جب آپ کو دیکھا تو بہت خوش ہوا اور کہا آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے ایک مقام کے لیے غیر منقوط الفاظ کے لیے سوچ رہا تھا۔ آپ نے فیضی کو اس مقام کے متعلق الفاظ بتادیے۔ وہ اس سے مزید متاثر ہوا۔

جب آپ کو اکبر آباد میں رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا تو آپ کے والد ماجد آپ کو بلا کر سرہند لے گئے۔ راستے میں تھانیسر کے رئیس شیخ سلطان کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا۔ اس شادی میں آپ کو کثیر مال و دولت ملا۔ وطن پہنچنے کے بعد ایک حویلی بنوائی اور ایک مسجد تعمیر کروائی۔

علومِ ظاہریہ سے تو آپ مکمل طور پر واقف تھے۔ علومِ طریقت میں والد ماجد سے چشتیہ سلسلہ میں بیعت کی اور ان سے خرقۂ خلافت بھی لیا۔ طریقۂ چشتیہ کے علاوہ طریقۂ سہروردیہ اور طریقۂ قادریہ بھی والد بزرگوار سے حاصل کیے لیکن ابھی طبیعت کو پورا اطمینان حاصل نہ ہوا۔ یہ اطمینان خواجہ باقی باللہ کی بیعت سے میسر ہوا جو دہلی میں مقیم تھے۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ سے بیعت ۱۰۰۸ھ میں کی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی یہ عادت نہ تھی کہ اپنی کسی خواہش کا اظہار فرماتے۔ البتہ آپ سے خلافِ عادت خانقاہ میں چند یوم قیام کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ نے ایک ہفتہ کا وعدہ کیا لیکن رفتہ رفتہ ۶ ہفتے کی نوبت پہنچ گئی۔ ابھی دو روز بھی نہ گزرے تھے کہ آثارِ تصوف و کشش سے آپ پر شوقِ انابت کا غلبہ ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ آپ نے حضرت خواجہؒ سے بیعت کی گزارش کی۔ خلافِ عادت، بلا استخارہ آپ کو خلوت میں طلب کرکے مرید کیا۔ خواجہ صاحب کی توجہ سے آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں مثلاً مقامِ حیرت، مقامِ فنائے حقیقی، شرحِ صدر اور مقامِ حق الیقین تھوڑے ہی عرصہ میں طے کرلیں۔ خواجہ صاحب نے کئی بار آپ کی علمی قابلیت اور روحانی استعداد کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"حال ہی میں سرہند سے ایک شخص احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے، بڑی علمی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز ہی فقیر کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوئی ہے اس دوران میں اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا ہے اس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کرے گا۔"

حضرت خواجہ کی مذکورہ بالا پیشن گوئی پوری ہوئی اور اس طرح کفر و الحاد کی فضا میں حضرت شیخ احمد سرہندی نے شریعتِ محمدیؐ اور احیائے دین کا پرچم بلند کیا۔

تعلیم و تلقین کے بعد مرشد کی اجازت سے سرہند واپس آگئے۔ اس کے بعد دو بار مزید مرشد کے پاس دہلی تشریف لے گئے۔

مرشد سے تیسری ملاقات کے بعد جب سرہند واپس تشریف لائے ہیں تو چند روز ہی کے بعد مرشد کے ایماء پر لاہور کا قصد کیا۔ اور یہاں بڑی کامیابی حاصل کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور پر حضرت مجددؒ کی خاص نگہ التفات تھی کیونکہ برعظیم کے بعض دوسرے بڑے بڑے شہروں کے مقابلہ میں یہاں اسلامی اثرات زیادہ زوروں پر تھے اور قلیج خاں یہاں برسرِ اقتدار تھا جس نے اپنے زمانے میں تقویتِ دین اور ترویجِ علومِ اسلامی کے سلسلہ میں بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لاہور کے متعلق رقمطراز ہیں کہ :

"ہندوستان کے تمام دوسرے شہروں کی بہ نسبت یہ شہر فقیر کے نزدیک قطبِ ارشاد کی مانند ہے۔ اس شہر کی خیر و برکت ہندوستان کے تمام شہروں میں جاری و ساری ہے۔۔۔
۔۔۔ حق سبحانہ تعالےٰ ان کا موید و ناصر ہو۔"

آپ اس وقت لاہور میں تشریف فرما تھے کہ مرشد نے وصال پایا۔ اور یہ سن کر فوراً دہلی پہنچے اور مرشد کے مزارِ پُر انوار کی زیارت کی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کے قریباً دو سال بعد اکبر بھی انتقال کرگیا اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں ابتدا میں آپ کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ پیدا ہوئی کہ دربارِ جہانگیری میں آپ کے مخالف امراء برسرِ اقتدار آگئے۔ آپ نے اس کا حل یہ سوچا کہ عوام سے رشتہ جوڑا اور اپنے روحانی کمالات اور انتظامی قابلیت سے نقشبندیہ سلسلہ کو ملک میں بے انتہا وسعت دی۔ اس کے بعد ایک تازہ آزمائش سے دوچار ہوئے۔ اس زمانہ میں طاعون زوروں پر تھی اور آپ کا خاندان اس سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ تین چار روز میں آپ کے گھر سے کئی جنازے نکلے جن میں آپ کے ۲۴، ۲۵ سالہ بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق، دو کم عمر صاحبزادوں (محمد فرخ، محمد عیسیٰ)، ایک صاحبزادی (ام کلثوم) اور دوسرے افرادِ خاندان کی میتیں تھیں۔ ان اندوہناک اور ہمت شکن حالات میں آپ نے جس کردار کا مظاہرہ کیا اور جس عالی حوصلگی سے سب کچھ برداشت کیا۔ وہ آپ جیسا بزرگ اور خدا رسیدہ شخص ہی کرسکتا ہے۔

ان خانگی حالات نے آپ کی تبلیغ و ارشاد اور اصلاحی کام میں ذرا ضعف نہ آنے دیا اور حسبِ سابق بلکہ پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ مصروفِ عمل رہے۔ اس کے بعد آپ دربارِ جہانگیری میں مدعو کیے گئے اور سنتِ یوسفی ادا کی یعنی تقریباً ایک سال تک

گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ قید سے رہائی کے بعد تقریباً چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ تزک جہانگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چار سال میں جہانگیر کو خود ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا اور اس کے دل میں دین کا بڑا جوش تھا۔ یقیناً اس میں حضرت مجدد کی تعلیمات کا بھی دخل تھا۔

اب آپ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی اور پھر حوادث نے ضعف جسمانی کا غلبہ کر دیا تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ رحلت کا وقت قریب آ رہا ہے چنانچہ بادشاہ سے اجازت لی تو سرہند تشریف لے گئے اور یہاں خلوت اختیار فرمائی۔ ان ایام میں کئی دوستوں کے نام خطوط لکھے جن میں "استغفیٰ دے چلنے" کا فقرا لکھا۔ اس دوران میں آپ پر دمے کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ پھر طبیعت بحال ہو گئی۔ ایک روز آپ نے ہندی کا یہ مصرعہ پڑھا اور لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ ع

آج ملاد ا کنت سوں، سکھی سب جگ دیواں وار

(آج وصال کا دن ہے، سکھی میں اس خوشی میں تمام دنیا کو نثار کر دوں)۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد روز وصال آ پہنچا اور ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ یعنی کم و بیش ۶۳ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

غیر منقسم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں حضرت مجدد کا نام نامی سرفہرست ہے۔ آپ نے اس خطۂ ارضی میں جو اہم اسلامی خدمات انجام دی ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ آپ اس سرزمین میں پہلے شیخ طریقت تھے جن کو نہ صرف غیر مسلموں کے جارحانہ مذہبی حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور آپ نے پوری قوت اور کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بعض نئے فرقوں کے پیدا کردہ مقاصد کا طلسم بھی آپ نے توڑا اور دین خالص کی اشاعت کی۔ آپ برعظیم پاک و بھارت میں ان علماء و مفکرین اسلام کے اولین نمائندہ تھے جنہوں نے فکر و عقیدہ قسم کی ہر چیز کو پہلے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اگر وہ شرعی معیار پر پوری اتری تو اسے لے لیا ورنہ رد کر دیا۔ کیونکہ آپ کو اس کا اذعان ہو چکا تھا کہ اگر ہر رطب و یابس بلکہ ملحدانہ اور مضر خیالات قبول کر لیے گئے تو قوم کا نہ صرف شرعی بلکہ فکری اور روحانی نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ اکبر کے عہد کی پیدا کردہ خرابیوں کا آپ کے دل پر بڑا اثر تھا اور جب یہ دیکھتے تھے کہ مسلمان ایک مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت میں احکام اسلامی جاری کرنے سے عاجز ہیں تو وا ویلا، وا مصیبتا، وا حسرتا اور وا حزنا پکار اٹھتے تھے۔ آپ ان کوششوں کے سخت مخالف تھے جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان پسند کرتے تھے جس طرح آج کے بعض پنجابی اور سندھی ملحد پسند کرتے ہیں۔ حضرت مجددؒ کو ایک ہندو ہردے رام نے دو خط لکھے جن میں فقراء اور صوفیہ سے محبت کا اظہار کیا اور لکھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں حضرت مجددؒ کو اس غلط استدلال پر سخت غصہ آیا اور آپ نے ایک پُرزور خط میں اس کی تردید فرمائی اور لکھا کہ رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا، اور بےچوں بےچوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا۔ ہرچند حضرت مجددؒ کا رویہ غیر مسلموں کے ساتھ دوسرے عام صوفیاء سے مختلف تھا اور اس ضمن میں آپ نے بعض مقامات پر بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن ہندو مسلم مسئلہ کا حل بھی آپ نے پیش کیا۔

حضرت مجددؒ نے اس سرزمین میں ہندو مسلم مسئلہ کا حل یہ پیش فرمایا تھا کہ "مسلماناں بر دین خود باشند و کفار بر کیش خود (مسلمانوں کے لیے ان کا دین اور کفار کے لیے ان کا طریقہ) یعنی امتزاج یا اتحاد نہیں بلکہ ہمسایانہ رواداری ہے۔

حضرت مجددؒ کو اللہ تعالیٰ نے متعدد اوصاف سے نواز تھا۔ آپ علوم عقلیہ و نقلیہ میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ آپ کی روحانی فضیلت مسلمہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ ایک صاحب طرز ادیب اور محاسن و معائب انشاء کے بھی پورے ماہر تھے۔ آپ نے اپنے عہد کے حالات کے پیش نظر متعدد رسالے لکھے اور کتابیں تالیف فرمائیں جن میں رسالہ اثبات النبوت، رسالہ تہلیلیہ اور رسالہ ردِ روافض، معارف الدینیہ اور بعض دوسرے رسائل کے علاوہ مکتوبات امام ربانی کی وہ تین جلدیں ہیں جن کو اس میدان میں آپ کا شاہکار کہنا چاہیئے۔ یہ مکتوبات آپ کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے اور اسی زمانہ میں ان کی مقبولیت کی بہت سی وجوہ شارحین مکتوبات اور حضرت مجددؒ کے تذکرہ نگاروں نے لکھی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے ان مکتوبات میں حضرت مجددؒ نے جن مسائل کو چھیڑا ہے اور جن گتھیوں کو سلجھایا ہے ان کی بدولت بہت سے مخلص مسلمانوں کا بھلا ہوا ہے۔ اور ان مکتوبات کے مطالعہ سے انھیں عقائد و اعمال میں متعین راہ ملی ہے گویا ان مکتوبات نے ان کو شمع ہدایت کا کام دیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مجددؒ کے طرز تحریر کو بھی ان کے اثر میں بڑا دخل ہے۔ آپ کے طرز تحریر میں خطیبانہ اور پُر تاثیر شور ہے۔ مکتوبات میں کہیں کہیں انشائی خوبیوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جو ایک صاحب علم و فضل قاری کو مزا دے جاتا ہے۔ ایک خط میں شیخ ابن العربی کی مشہور کتابوں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کے خلاف اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ما را بہ نص کار است نہ بہ فص۔ ما را فتوحات مدینہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است۔"

آپ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ کے دو خوارق تھے ایک تو مکتوبات اور دوسرے آپ کے فرزندان گرامی۔ مکتوبات سے آپ کی علمیت، ذہنی جرأت، سلیم بخیالی، حمیت دینی، غیرت اسلامی اور سلیقۂ تحریر کا پتہ چلتا ہے اور آپ کے فرزندان گرامی کے حالات [illegible] واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تربیت یافتگان ایک مشن [illegible] کے افراد تھے جنہوں نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے مشن کو بڑی ترقی دی [illegible] سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کو بڑی وسعت ملی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق تو عین جوانی میں طاعون کے عارضہ میں وفات پا گئے تھے۔ دوسرے صاحبزادے خواجہ محمد سعید تھے جو علوم عقلیہ و نقلیہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ تیسرے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم تھے جن کی بدولت سلسلہ مجددیہ کو ہیرون ملک بڑی وسعت ملی اور خود برعظیم میں بھی کئی [illegible] اکابر آپ کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے شیخ محمد یحییٰ [illegible] تھے جنہوں نے اشاعت دین کے سلسلہ میں بڑا کام کیا اور دینی علوم میں کئی کتابیں لکھیں۔ آپ کے خلفاء میں صاحبزادگان کے بعد سب سے بزرگ میر محمد نعمان اور خواجہ [illegible] کو سمجھا جاتا ہے لیکن شیخ آدم بنوریؒ نے اس ضمن میں جو کام انجام دیا [illegible] اور تاریخ کے صفحات گواہی دیتے ہیں کہ حضرت مجددؒ کے خلفاء میں [illegible] کی وجہ سے ان کا ہم پایہ کوئی دوسرا نہ تھا۔

حضرت مجددؒ کے خطبات اور مکتوبات علم و حکمت کا [illegible]

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

"ہم فقراء پر جو لازم ہے وہ یہ ہے کہ ہمیشہ عاجز و گریاں رہیں [illegible] رکھیں۔ اپنے باطنوں کو [illegible] (یعنی ہر کام میں نیت [illegible] کی خوشنودی [illegible]) کو (پابندی شریعت سے [illegible] کریں۔ اپنے عیبوں کو دیکھتے رہیں [illegible] کے غلبہ کا مشاہدہ کرتے رہیں اور علام الغیوب سے [illegible] ڈرتے رہیں۔ [illegible] کو تھوڑا سمجھیں اگرچہ بہت ہوں اور اپنی برائیوں کو بہت خیال کریں۔ [illegible] تھوڑی [illegible] شہرت سے ڈرتے رہیں۔ دنیا [illegible] کی محبت [illegible] سے بچتے رہیں [illegible] جناب رسول پاکؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ [illegible] لازم ہے کہ فقیر دنیاداروں کی صحبت اور ان کی محبت سے بچے۔"

"آدمی کو جب [illegible] لذیذ کھانوں کے لیے نفیس و عجیب کپڑے پہننے کے لیے دنیا [illegible] نہیں [illegible] نہ اسے عیش و عشرت اور کھیل کود کے لیے پیدا کیا ہے بلکہ [illegible] پیدا کرنے

سے مقصود اس میں انکساری و عاجزی پیدا کرنا ہے، جو بندگی (عبدیت) کی حقیقت ہے۔"

"اے فرزند! دنیادار اور دولت مند بڑی بلاؤں اور ابتلائے عظیم میں گرفتار ہیں کیونکہ دنیا پر اللہ تعالٰی کا غضب ہے اور یہ مردار ہے۔ مگر ان لوگوں کی نظروں میں یہ آراستہ و پیراستہ ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے زہر شکر میں ملا ہو۔ غفلت کی روئی کانوں سے نکالو ورنہ روزِ حشر سوائے حسرت و ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

"نیک بخت وہ ہے جو عمر کو غنیمت جان کر اسے یادِ خدا میں صرف کرے۔"

"جو شخص احکامِ شرعیہ کو اپنی عقل کے مطابق ادا کرنا چاہے، وہ شانِ نبوت کا منکر ہے۔ اس کے ساتھ کلام کرنا بے وقوفی ہے۔"

"آخرت کی نجات حضرت سیدالاولین و آخرین کی متابعت سے وابستہ ہے۔ آنجناب کی متابعت سے تجلیٔ ذات سے مشرف ہوتے ہیں اور آپ ہی کی متابعت عبدیت کے مرتبہ کمال تک پہنچاتی ہے۔"

"جو کچھ کسی کو ملا ہے، اتباعِ سنتِ رسولِ مقبول سے ملا ہے اور ملے گا اور ولی، نبی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرات انبیاء اصل ہیں اور اولیاء ان کے ظل ہیں۔"

مجذرؓ بن زیاد

صحابیٔ رسولؐ۔ قبیلہ بلی سے متعلق تھے۔ نام عبداللہ۔ مجذر لقب تھا۔ ہجرت کے بعد ایمان لائے اور غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔

ایامِ جاہلیت میں انہوں نے سوید بن صامت کو قتل کر دیا تھا جس سے جنگِ بعاث چھڑ گئی تھی۔ فریقین کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن بعد میں سوید کے بیٹے حارث نے حضرت مجذرؓ کو قتل کر دیا اور مرتد ہو کر واپس مکہ چلا گیا۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد دوبارہ اسلام قبول کیا تو نبی کریمؐ نے مجذرؓ کے قتل کے قصاص میں حارث کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

مجذوب

صوفیاء کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو فنا فی اللہ اور فنا فی الرسولؐ ہو کر دنیاوی امور سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے ہوش و حواس بھی باقی نہیں رہتے۔

مجلسی، محمد باقر

(۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء — ۱۱۱۰ھ/۱۷۰۰ء) اصفہان میں پیدا ہوا اور یہاں ہی وفات پائی۔ شہرت اصفہان کے شیخ الاسلام کی حیثیت سے پائی۔ شیعہ مکتبِ فکر کی توسیع و تبلیغ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ شاہ حسین صفوی کے حامیوں میں سے تھا۔ کتاب "بحار الانوار" مشہور تصنیف ہے۔

مجمعؓ بن جاریہ

صحابیٔ رسولؐ۔ قبیلہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے متعلق تھے۔ ہجرت کے وقت کم عمری کی حالت میں ایمان لائے۔ غزوۂ حدیبیہ میں شرکت کی۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت کے آخری ایام میں انتقال کیا۔ نبی کریمؐ کے دور میں جن صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید جمع کرنا شروع کیا تھا ان میں حضرت مجمعؓ بن جاریہ انصاری بھی شامل تھے۔ مسند احمد بن حنبلؒ میں ہے کہ آپ ان قاریوں میں سے تھے جنہوں نے ابتدا میں قرآن مجید پڑھا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عہدِ خلافت میں قرآن کی تعلیم دینے کے لیے کوفہ بھیجے گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے تھے کہ انہوں نے بھی حضرت مجمعؓ سے قرآن مجید پڑھا تھا۔ آپ نے کئی احادیث بھی روایت کی ہیں جو ترمذی شریف میں موجود ہیں۔

زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ کم عمری میں ہی اپنی قوم کے امام تھے۔ حضرت مجمعؓ کے والد نے ہی مسجدِ ضرار تعمیر کی تھی اور آپؓ اسی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ مسجد ضرار تو بعد میں گرا دی گئی۔

مجنون

دیوانہ، نادان۔ اگر پانچ نمازوں کے عرصہ تک یا اس سے کم عرصہ تک دیوانہ رہا ہے تو اسے فوت شدہ نمازوں کی قضا کرنا ہو گی۔ اگر اس سے زیادہ عرصہ دیوانہ رہا ہو تو اس پر قضا واجب نہیں۔ مجنون پر زکوٰۃ اور حج فرض نہیں اسی طرح رمضان کے روزے بھی فرض نہیں۔ شریعت نے مجنون کو ہر قسم کے فرائض دینی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے حتیٰ کہ مجنون کا اقرارِ نکاح اور طلاق بھی قابلِ قبول نہیں۔

مجوسی

ایران کے قدیم زرتشتی مذہب کے پیروکار، یہ لوگ آتش پرست اور ستارہ پرست تھے۔ بعض علماء ان کو اہلِ کتاب مانتے ہیں۔ اس کے لیے وہ قرآن مجید کی ایک آیت سے دلیل نکالتے ہیں جس میں مجوسیوں کا ذکر دوسرے اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی طرح بحرین کے مجوسیوں کو جزیہ دینے کا حکم دیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقام اہلِ کتاب کے برابر تسلیم کر لیا گیا تھا۔

مسلمانوں نے ان کے ساتھ نہایت روادارانہ سلوک کیا لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں یہ لوگ ہندوستان کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ کیونکہ ایران کے مسلمان حکمرانوں نے ان پر جزیہ عائد کر دیا۔ اب بھی ایران میں ان کی کافی تعداد موجود ہے اور ان کو گبر بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ لوگ پارسی کہلاتے ہیں۔ ان کی تاریخ بہت پرانی ہے ۶۰۰ ق۔م میں زرتشت نے اس مذہب کی بنیاد رکھی۔ بعض قدیم تاریخوں میں پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ فلسفیانہ عقائد رکھتے تھے۔ ایران میں اس وقت یہ قومی مذہب کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

مجوسی، ابوالحسن علی

(وفات ۱۰۱۰ء) مشہور طبیب۔ اہواز میں پیدا ہوا۔ موسیٰ بن سیار سے اکتسابِ علم کیا۔ اس کی کتاب "کامل الصناعۃ الطبیہ" "الملکی" کے نام سے مشہور ہے جسے عضد الدولہ کے لیے لکھا گیا۔ قانونِ ابنِ سینا سے پہلے یہ کتاب نصابِ مدارس میں شامل تھی۔ ۰۸۱۱ء میں قسطنطین الافریقی نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

محادثہ

صوفیاء کی ایک اصطلاح ہے۔ محادثہ سے صوفیاء راہِ حق کے احوال میں سے ایک حال مراد لیتے ہیں۔ محادثہ دن کے اوقات میں سے ایک وقت ہے جس میں بندہ، خدا کے ساتھ ظاہری و باطنی سوال و جواب میں مشغول ہوتا ہے۔ اسی لیے صوفیاء دن کی مناجات کو بھی محادثہ کہتے ہیں۔

محاسبی، ابوعبداللہ

(۱۶۵ھ/۷۸۱ء — ۲۴۳ھ/۸۵۷ء)۔ شافعی فقیہہ اور متکلم۔ بصرہ میں اسدالانازی کے گھر پیدا ہوا۔ اپنے نفس اور ضمیر کے محاسبہ کرنے کی وجہ سے "محاسبی" کے نام سے شہرت پائی۔ معتزلہ کے عقائد کے مقابلے میں اس نے عقل کے استعمال کے لیے مناسب دلائل وضع کیے۔ محاسبی کی تصانیف عقل و دانش کے استعمال کے بارے میں ایک مکمل سکول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان میں "الرعایۃ لحقوق اللہ"، "وصایا"، "رسالۃ العظمۃ"، "فہم الصلوٰۃ" وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ بعد کے علماء اور متکلمین نے ان تصانیف سے استفادہ کیا۔ امام غزالی نے اپنی کتاب "احیائے علوم الدین" کی تدوین و ترتیب میں "رعایہ" سے مدد لی۔ بغداد میں انتقال ہوا۔

محاضرہ ۔ تصوّف کی ایک اصطلاح ۔صوفیا اسے دل کے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے پر بولتے ہیں ۔ محاضرہ کی علامت اللہ تعالےٰ کی کسی نشانی میں دائمی تفکّر ہے ۔ اسی لیے آیاتِ الٰہی کے شواہد کو بھی محاضرہ کہا جاتا ہے ۔

محب اللہ الٰہ آبادی ، مولانا (صفر ۹۹۶ھ ۔ رجب ۱۰۵۸ھ)

آپ کا شمار گیارہویں صدی ہجری کے علمائے کبار اور مشائخ چشتیہ میں ہوتا ہے ۔

علاقہ خیر آباد کے ایک گاؤں صدر پور میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم وہاں ہی حاصل کی ۔ مزید تعلیم کے لیے لاہور آئے اور یہاں مفتی عبدالسلام لاہوری سے مزید تحصیل علم کیا ۔ اس زمانے میں شیخ محمد میر سیوستانی اور مغل شہنشاہ شاہجہان کے وزیر سعد اللہ خان آپ کے ہم درس تھے ۔ سعد اللہ خان نے اپنی وزارت کے دور میں اپنے ان دوہم درسوں کو دہلی آنے کی دعوت دی ۔ شیخ محمد میر نے چونکہ زہد و قناعت کی زندگی اختیار کر لی تھی ۔ اس لیے یہ دعوت قبول نہ کی ۔ لیکن شیخ محب اللہ دہلی چلے گئے ۔ سعد اللہ خان نے انہیں الہ آباد میں نظامت کے عہدے پہ فائز کیا ۔ کچھ عرصہ بعد ان کی کیفیات قلبی اس طرح بدلیں اور طبیعت نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ تمام دنیاوی علائق سے الگ ہو کر زہد و قناعت کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ۔ الہ آباد سے گنگوہ تشریف لے گئے اور شیخ ابو سعید بن نور حنفی گنگوہی سے سلسلہ چشتیہ میں منسلک ہوئے ۔ طویل عرصہ تک گنگوہ میں ہی رہے ۔ جلد ہی منازل سلوک کی بلندیوں تک پہنچ گئے ۔ اپنے آبائی گاؤں صدر پور آئے لیکن کچھ عرصہ بعد دوبارہ الہ آباد چلے گئے ۔ بقیہ عمر درویشی کی حالت میں وہاں ہی گزری ۔ الہ آباد میں ہی انتقال ہوا ۔ کئی کتابیں تصنیف کیں ۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں کے شارح بھی تھے ۔

محبوب عالم ، مولوی ۔ (۲۱ فروری ۱۸۶۲ء ۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۷ء)

گوجرانوالہ کے ایک غریب گھرانے کا یہ فرد اپنی محنت وجدوجہد سے صحافتی و علمی میدان میں ایک بلند مقام تک پہنچا ۔

والدین بہت غریب تھے اس لیے اپنے اس بچے کو تعلیم نہ دلوا سکتے تھے ۔ محبوب عالم نے اپنے طور پر تعلیم حاصل کرنے کی کوششیں جاری رکھیں ۔ ۱۲ سال کی عمر میں اپنے چچا مولوی احمد دین کے ہمراہ لاہور چلے آئے ۔

منشی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا ۔ اس پہ آپ کو یونیورسٹی کی طرف سے نقد انعام کے علاوہ کتابیں بھی انعام میں دی گئیں ۔

بچپن ہی سے والد کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی تھا ۔ گوجرانوالہ میں اپنے چچا کے پریس میں کام کرتے رہے ۔ چچا نے کچھ عرصہ بعد وہی پریس محبوب عالم کو دے دیا ۔ مولوی محبوب عالم نے 'پیسہ اخبار' شائع کرنا شروع کیا ۔ تھوڑے عرصہ بعد پریس کو لاہور لے آئے اور یہاں سے اخبار کی اشاعت ہوتی رہی ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پیسہ اخبار برعظیم پاک و ہند میں بہت مقبول ہوا ۔ اس کی قیمت ایک پیسہ ہی تھی ۔

لاہور آنے کے بعد آپ نے اشاعت کے کاموں کی طرف زیادہ توجہ دی ۔ کئی کتابیں شائع کیں ۔ پیسہ اخبار کے علاوہ انتخاب لاجواب ، بچوں کا اخبار ، اور شریف بی بی نام کے رسائل آپ کی ادارت میں شائع ہوتے رہے ۔ آپ نے علم و ادب اور صحافت کے میدان میں کافی شہرت حاصل کی ۔ اپنے وقت کے جید انشا پرداز اور ایک بہترین مقرر تھے ۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی آپ نے بہت خدمات انجام دیں ۔

یورپ کی سیاحت کو " سفر نامۂ یورپ " کے نام سے لکھ کر شائع کیا ۔ ۱۹۱۲ء میں حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی ۔ آپ نے اپنے ادارہ سے " اسلامی انسائیکلوپیڈیا " کی اشاعت کا بھی انتظام کیا اور اسے شائع کیا ۔

محدّث ۔ علمِ حدیث کا ماہر ۔ مسلمانوں میں حدیث کے علم کا ایک بہت بڑا درجہ ہے ۔ نبی کریمؐ کی احادیث کی ترتیب و تدوین کے کام کا باقاعدہ آغاز تیسری صدی ہجری میں ہوا ۔

محدثین نے بڑی چھان پھٹک اور تحقیق کے بعد کئی مجموعۂ احادیث مرتب کیے ان مشہور محدثین میں امام بخاریؒ ، امام مسلمؒ ، امام ترمذیؒ ، امام ابوداؤدؒ ، امام نسائیؒ ، امام مالکؒ ، امام ابن ماجہؒ وغیرہ مشہور ہوئے ۔

برعظیم میں بھی کئی محدثین معروف ہوئے جن میں شاہ ولی اللہؒ ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ۔ میاں نذیر حسین محدثؒ ، محدث روپڑیؒ ، محدث علی پوریؒ ، محدث کچھوچھوی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں ۔

محدّث کچھوچھوی ، سیّد محمد ۔ (۱۵ ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ ۔ ۱۶ رجب مرجب ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء)

موضع جائس ، ضلع رائے بریلی میں حکیم سید نذر اشرف کے گھر پیدا ہوئے ۔ تربیت و پرورش آپ کے نانا سید علی حسین اشرفی کچھوچھویؒ نے کی ۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ سے علوم عربیہ کی تحصیل کی ۔ بعد ازاں آٹھ سال تک مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ سے شرح تجدید اور افق المبین کا درس لیا ۔ مفتی صاحب نے سندِ فراغت کے ساتھ علاّمہ کا لفظ لکھا ۔ پیلی بھیت میں مولانا شاہ عبد الاحد بدایونیؒ سے حدیث شریف کی سند حاصل کی ۔ آپ نے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ سے بھی تلمذ حاصل کیا تھا ۔ تمام علوم سے فراغت کے بعد دلی میں مدرسہ حدیث قائم کر کے حدیث کی تعلیم دینا شروع کی ۔

اپنے نانا سید علی حسین اشرفی سے بیعت کی اور خلق خدا کی روحانی تربیت بھی فرماتے تھے ۔ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ نے بھی آپ کو اجازت و خلافت سے نوازا تھا ۔ آپ کو بھی مولانا احمد رضا خان سے کافی عقیدت تھی ۔ عرس رضوی بریلی شریف میں ہر سال حاضر ہوتے تھے ۔ مولانا موصوف کی قائم کردہ جماعت رضائے مصطفےٰ کے تاحیات صدر رہے ۔

آپ بیک وقت عالم ، ادیب ، خطیب ، صوفی ، شاعر ، محدّث اور پیر طریقت تھے ۔ تمام سال تبلیغی دوروں میں مصروف رہتے ۔ پانچ ہزار سے زائد غیر مسلموں نے آپ کے ہاتھ پہ اسلام قبول کیا تھا اور کئی لاکھ مسلمان شرف بیعت سے مشرف ہوئے تھے ۔ عشق رسولؐ آپ کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا ۔ آپ کا مجموعہ کلام فرش پر عرش اس کا واضح ثبوت ہے ۔

مذہبی ، تبلیغی اور سماجی کاموں کے علاوہ آپ نے سیاسی تحریکوں میں بھی بھرپور حصہ لیا ۔ تحریک پاکستان میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت میں ملک بھر کے دورے کیے ۔ بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس اور اجمیر سنی کانفرنس میں آپ کے خطبے تحریک پاکستان کی حمایت میں یادگار حیثیت رکھتے ہیں ۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ قرآن پاک کا اُردو میں ترجمہ اور تفسیر لکھی ۔ تفسیر ابھی تین پارے کے قریب لکھی تھی کہ انتقال ہو گیا ۔ سید شرف جہانگیر سمنانی کے سوانح حیات " حیات غوث العالم " کے نام سے لکھے ۔ " اتمام حجت " اور " تقوی القلوب "

آپ کی مناظرانہ قسم کی تصانیف ہیں۔
لکھنؤ میں وفات پائی اور کچھوچھہ شریف میں دفن ہوئے۔

مُحَرَّم ۔ اسلامی سال کا پہلا مہینہ۔ لغوی معنی وہ چیز جو ممنوع ہو۔ اسلام سے پہلے ان مقدس مہینوں میں شمار ہوتا تھا جن میں جنگ و جدل بند کر دی جاتی تھی اور لڑنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے لغوی معنوں کے اعتبار سے اس مہینہ کا نام ہی محرّم ہو گیا۔ عام الفیل کا مشہور واقعہ، جس میں ابرہہ ہاتھیوں کے لشکر کے ذریعے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے آرہا تھا اسی مہینہ میں ہوا۔ نبی کریمؐ کی ایک حدیث کے مطابق اسی مہینہ کی ۱۰ تاریخ کو اسلام سے پہلے کے مذاہب میں بھی مقدس مانا جاتا تھا۔ بعض ابنیاء سے وابستہ تاریخی واقعات اس مہینہ کی دس تاریخ کو واقع ہوئے۔ مثلاً حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کی مغفرت، حضرت نوحؑ کا طوفان، حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ سے نجات پانا وغیرہ۔ یہودی دس محرم کو باقاعدہ روزے کا اہتمام کیا کرتے تھے کیونکہ بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات اسی دن ملی تھی۔ نبی کریمؐ بھی رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے دس محرم کے روزے کا اہتمام کرتے تھے۔ نبی کریمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے بعد محرم کا مہینہ مسلمانوں میں ایک تاریخی حادثہ 'کربلا' کی وجہ سے معروف ہو گیا۔ حضرت حسینؓ کی شہادت میدانِ کربلا میں تاریخی روایات کے مطابق ۱۰ محرم ۶۱ھ کو ہوئی تھی۔

مُحَرَّمات ۔ وہ عورتیں جن سے شریعتِ اسلام نے نکاح حرام ٹھہرایا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے ایسی چودہ عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا ہے۔ ان میں سے سات تو نسب کی جہت سے ہیں یعنی ماں بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی۔

سات غیر نسب کی ہیں: رضاعی ماں (جس کا دودھ پیا ہو)۔ رضاعی بہن (دودھ شریک بہن)۔ بیوی کی ماں (ساس)، بیوی کی بیٹی (اگر بیوی سے مباشرت کی ہو)، بیٹے کی بیوی۔ (بہو)، بیوی کی بہن (سالی، بیوی کی زندگی میں) اور سوتیلی ماں (باپ کی بیوی)۔

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں، اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ ...... تم پر حرام کی گئیں، تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔ اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہارے ہاں پرورش پائی ہو۔ ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر صرف نکاح ہوا ہو اور تعلق زن و شو نہ ہوا ہو تو انھیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے (پہلے خاوند کے ذریعے) نکاح کرنے میں تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے —— اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صُلب سے ہوں اور تم پر یہ بھی حرام کیا گیا کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو۔ .... اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں، (مُحصَنَات) البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم ہے — ان کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا (حقِ مہر ادا کر کے) تمہارے لیے حلال کر دیا گیا۔"

(سورۃ نساء: آیات ۲۲ تا ۲۴)

مذکورہ بالا آیات میں واضح طور پر ایسی عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جن سے مسلمان کو نکاح کرنا حرام ہے۔ ان آیات سے جو مزید مسائل ملتے ہیں ان میں ماں کی ماں اور باپ کی ماں یعنی نانی اور دادی سے بھی نکاح حرام ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق رہا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ علمائے سلف میں سے بعض اس کی حرمت کے قائل ہیں اور بعض اس کی حرمت کے قائل نہیں۔ اسی طرح سلف میں اس امر پر بھی اختلاف ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقیہانہ بحثیں تو بہت طویل ہیں لیکن یہ بات صاف ہے کہ خاندانی زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے یا ایک مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتی۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے "جس شخص نے کسی عورت کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالی ہو اس کی ماں اور بیٹی دونوں اس پر حرام ہیں"۔ ایک اور ارشاد ہے

"خدا اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالے"

بیٹی کے ضمن میں یہ بات بھی واضح رہے کہ بیٹے کی بیٹی یعنی پوتی اور بیٹی کی بیٹی یعنی نواسی اور اسی طرح پڑپوتی اور پڑنواسی سے نکاح بھی حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلقات سے جو لڑکی پیدا ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک وہ بھی جائز بیٹی کی طرح محرمات میں سے ہے۔

بہن سے نکاح حرام ہے اسی طرح ماں شریک بہن یا باپ شریک بہن سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ان سب رشتوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن خواہ سگی ہو یا سوتیلی، یا باپ شریک، بہرحال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک، ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

رضاعی رشتوں کے بارے میں علمائے اُمت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے ماں کے حکم میں ہے اس عورت (رضاعی ماں) کا شوہر باپ کے حکم میں ہے اور وہ تمام رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ نبی کریمؐ کا اس بارے ارشاد ہے: "جو رشتے نسب سے حرام ٹھہرتے ہیں وہی رشتے رضاع سے بھی حرام ٹھہرتے ہیں"۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حرمتِ رضاعت کس قدر دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے۔ اتنی ہی مقدار میں اگر کسی بچہ نے دودھ پیا ہے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فقہا کے درمیان حرمتِ رضاعت کے لیے عمر کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر کی رائے یہ ہے کہ اگر دو سال کی عمر کے اندر اندر جو بھی دودھ پیا گیا صرف اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی۔

ایک اور مسئلے کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہوا ہو اُس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ، احمدؒ اور شافعیؒ اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ مگر حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ جب تک کسی عورت سے خلوت نہ ہوئی ہو اس کی ماں حرام نہیں ہوئی۔ سوتیلی بیٹی کے بارے میں علماء کا تقریباً اجماع ہے کہ وہ آدمی کے لیے حرام ہے ...

بیٹے کی بیوی یعنی بہو کی طرح، اس طرح بیٹی کے خاوند یعنی داماد کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی دادا اور نانا پر حرام ہے اور نواسی اور پوتی کے خاوند سے نانی اور دادی کا نکاح حرام ہے۔

نبی کریمؐ کی ان مسائل کے بارے میں مزید ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اس سلسلہ میں یہ اصول ہے کہ ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا حرام ہے جن میں سے اگر ایک مرد ہوتی تو اس کا نکاح دوسری سے حرام ہوتا۔

جنگ میں ہاتھ آنے والی عورتوں کے بارے میں حرمت کا کوئی حکم نہیں بلکہ وہ حلال ہیں۔ ایسی عورتوں کو شریعت میں لونڈی کہا جاتا ہے۔ ابتدائے اسلام میں تو یہ صورت مروج تھی۔ لیکن عرصہ طویل سے لونڈی کا تصور مروج نہیں۔

لونڈیوں کے بارے اسلام کے درج ذیل قوانین ہے :۔

جو عورتیں جنگ میں پکڑی جائیں اگر ان کے شوہر دار الحرب میں ہی ہیں تو ان کا نکاح ٹوٹ گیا۔ ان عورتوں سے نکاح بھی کیا جا سکتا ہے اور جس کی ملک یمین میں ہو وہ ان سے تمتع کر سکتا ہے۔ البتہ فقہا کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر میاں بیوی بیک وقت گرفتار ہوں تو ان کے متعلق کیا حکم ہے؟۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا۔ امام شافعیؒ اور مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح باقی نہیں رہے گا۔

تمتع کے مسائل کے بارے میں اس سے قبل ذکر نہیں کیا جا سکا۔ اب موضوع کی مناسبت سے لونڈیوں سے تمتع کے مسائل کو بھی واضح کیا جاتا ہے۔

(۱) ایک فرد (سپاہی) اس صورت میں جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں میں سے کسی ایک سے تمتع کر سکتا ہے۔ جب وہ باقاعدہ حکومتی نظم کے ذریعے تقسیم کی گئی ہو۔

(۲) ملک یمین میں آنے والی عورت سے ایک ماہ تک یعنی ایام ماہواری آنے تک مباشرت نہیں کی جا سکتی تاکہ مباشرت سے پہلے اس کے حاملہ یا حاملہ نہ ہونے کا پتہ چل جائے۔ اگر حاملہ ہو تو وضع حمل سے پہلے مباشرت ناجائز ہے۔

(۳) ملک یمین میں آنے والی عورت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اہل کتاب سے ہو وہ کسی بھی مذہب سے ہو سکتی ہے۔

(۴) جو عورت جس شخص کے حصہ میں دی گئی ہے صرف وہی اس سے تمتع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں۔ اس عورت سے جو اولاد ہوگی وہ جائز اولاد تصور ہوگی، اور اس کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو شریعت میں صلبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ صاحب اولاد ہونے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جا سکے گی۔ مالک کے مرتے ہی وہ خود بخود آزاد ہو جائے گی۔

(۵)۔ لونڈیوں کی تعداد پر کوئی حد نہیں۔

(۶) ملک یمین میں آنے والی عورت کو کسی دوسرے کے نکاح میں تو دیا جا سکتا ہے لیکن دوسرے سے نکاح کے بعد اس سے پہلا مالک شہوانی تعلق باقی نہیں رکھ سکتا۔

محرزؓ بن نضلہ

۔ صحابی رسولؐ۔ لقب اخرم اسدی تھا۔

آغاز اسلام میں ہی مکہ مکرمہ آ کر اسلام قبول کیا اور مہاجرین کے ہمراہ مدینہ کو ہجرت کی۔ مدینہ منورہ میں آ کر تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ [illegible] بنو فزارہ نے مدینہ کی چراگاہ سے نبی کریمؐ کے ۱۹ اونٹوں کو پکڑ لیا اور گلہ بان کو قتل کر گئے تھے۔ محرز بن نضلہ چند سواروں کو لے کر بنو فزارہ پر حملہ آور ہوئے اور اسی مقابلہ میں شہید ہو گئے۔

محسن الملک

۔ (۹ دسمبر ۱۸۳۷ء - ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء)

آپ کا پورا نام نواب سید مہدی علی خان تھا۔ اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دینی مدارس سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دس روپے ماہوار پر ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے تحصیلدار کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۸۶۷ء میں ڈپٹی کلکٹر کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور حیدرآباد چلے آئے۔ وہاں [illegible] آف ریونیو مقرر ہوئے

حیدرآباد سے [illegible]

کے خلاف [illegible]

سرسید احمد خان کی [illegible] مدد کی۔ [illegible]

کافی اثر تھے۔ سرسید کی وفات کے بعد [illegible]

سونپا گیا۔ آپ نے [illegible]

علی گڑھ کالج کے معتمد ہونے [illegible] سرسید [illegible]

تھا۔ آپ نے [illegible]

[illegible]

بھی رہے۔

[illegible]

محلی۔ جلال الدین محمد

[illegible]

[illegible] وفات [illegible]

تحاتہ [illegible] نسبت سے محلی مشہور [illegible]

[illegible] تفسیر [illegible]

کی [illegible] تفسیر جلالین [illegible]

شامل ہے۔

محمدؐ

[illegible]

سید المرسلین، خاتم النبیین، شفیع المذنبین [illegible]

[illegible] وقت طلوع ہوئے [illegible]

[illegible]

کا ننگا طواف ہوتا تھا۔ خود اللہ کے گھر میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے جن کو اہلِ عرب اپنے معبود تسلیم کرتے تھے اور اُن سے اپنی مختلف حاجات کو پورا کرنے کے لیے نذر و نیاز دیتے۔

انسانیت پر حجت کے اتمام اور اکمال کے لیے ایک رہبر کامل کی ضرورت تھی اور جس کے لیے [illegible] ایسا وقت مقرر کر رکھا تھا جب انسانیت ایسے ایک راہنما کی منتظر ہوگی۔

عام الفیل سے کچھ عرصہ قبل قریش کے معزز سردار اور متولی خانہ کعبہ جناب عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی قریش کے ایک اور معزز گھرانے کی ایک خاتون آمنہ بنت وہب سے کی تھی۔ اس وقت جناب عبداللہ کی عمر ۲۴ برس تھی۔ اسی موقع پر عبدالمطلب نے ہالہ بنت وہب سے، جو آمنہ کی رشتہ دار تھیں، اپنی شادی کی تھی۔ اس بیوی سے عبدالمطلب کے بیٹے حضرت حمزہؓ (نبی کریمؐ کے چچا) پیدا ہوئے تھے۔ شادی کے چند روز بعد جناب عبداللہ بغرضِ تجارت ملکِ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ شام سے واپسی پر بیماری کی وجہ سے مدینہ میں اپنے عزیزوں کے ہاں ٹھہرے وہاں بیماری کی شدت

گنبدِ خضرا کے مکین صلی اللہ علیہ وسلم

سے انتقال ہوا۔ مدینہ منورہ میں ہی دفن ہوئے۔ نبی کریمؐ ابھی شکمِ مادر میں تھے کہ یتیم ہوگئے۔

واقعۂ اصحاب الفیل کے ۵۲ یا ۵۵ روز بعد اور محققین کے مطابق ۹ ربیع الاول سنہ عام الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء بعد از صبحِ صادق اور قبل از طلوعِ شمس، نبی کریمؐ اس دنیا میں تشریف لائے۔

آپؐ کی والدہ نے ایامِ حمل میں ایک خواب دیکھا تھا جس میں انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ بچے کا نام احمدؐ رکھنا۔ اسی لیے والدہ نے آپؐ کا نام احمدؐ رکھا۔ دادا عبدالمطلب نے محمدؐ رکھا۔ ابوالفدا کی روایت کے مطابق جب لوگوں نے تعجب سے عبدالمطلب سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا ہے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا "اس لیے کہ میرا پوتا دنیا بھر کی ستائش و تعریف کا شایانِ شان قرار پائے۔" مورخین نے یہ روایت بیان کہ جب آپؐ پیدا ہوئے۔ ٹھیک اسی وقت فارس کے بادشاہ نوشیروان کے محل میں سخت زلزلہ آیا اور محل کے چودہ کنگرے گر گئے۔ اصطخر کا مشہور آتش کدہ، نورِ توحید کے روشن ہوتے ہی بجھ گیا آپؐ کے دادا نے پیدائش کے ساتویں روز اس خوشی میں قربانی کی اور تمام قریش کی دعوت کی۔

ولادت کے سات روز تک ثوبیہ نے آپؐ کو دودھ پلایا جو ابولہب بن عبدالمطلب کی لونڈی تھیں۔ حضرت حمزہؓ نے بھی ثوبیہ کا دودھ پیا۔ اس لحاظ سے وہ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔

آٹھویں روز شرفائے عرب کے دستور کے مطابق آپؐ قوم ہوازن کے قبیلہ بنی سعد کی ایک خاتون حلیمہ کے سپرد کیے گئے تاکہ وہ آپ کی پرورش کریں اور دودھ پلائیں۔ شرفائے عرب اس لیے اپنے بچوں کو ان بدوی عورتوں کے سپرد کرتے تھے کہ کھلی اور آزاد آب و ہوا میں بچے تندرست رہیں اور ان کی زبان زیادہ فصیح و بلیغ ہو جائے کیونکہ بدوؤں کی زبان کافی شستہ اور فصیح ہوتی تھی۔ حلیمہ سعدیہ آپؐ کو سال میں دو مرتبہ ہر چھٹے ماہ مکہ مکرمہ لاتیں تاکہ آپ کی والدہ اور دادا کو دکھا سکیں۔ آپؐ چار برس کی عمر تک بنی سعد میں رہے۔

حلیمہ آپؐ کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ جب میں نے آمنہ کی گود سے بچہ لیا تو میری چھاتیوں میں اتنا دودھ نہ تھا کہ میں اپنے بچے کو اور اُن کو بیک وقت دودھ پلا سکوں۔ جونہی یہ مبارک بچہ میری گود میں آیا میری چھاتیوں میں دودھ بڑھ گیا۔ جب میں ان کو گھر لائی تو ہمارے دودھ دینے والے جانوروں کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ بنی سعد میں قیام کے دوران جب آپؐ اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ہمراہ گھر کے پچھواڑے کھیل رہے تھے تو دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے۔ انہوں نے آپ کو لٹا کر سینہ چاک کیا اور سونے کے طشت میں لایا ہوا دل تبدیل کر دیا۔ اور پیٹ کے اندرونی حصوں کو اچھی طرح دھویا۔ چار برس کی عمر میں جب حلیمہ، محمدؐ کو مکہ لائیں تو والدہ نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ قبیلہ بنی سعد میں پانچ برس کی عمر تک رہے۔ چھ برس کی عمر میں والدہ کے ہمراہ مدینہ منورہ کی طرف گئے جہاں وہ آپؐ کو اپنے اعزہ و اقارب سے ملانے لے گئی تھیں۔ وہاں سے واپسی کے سفر میں ابوا کے مقام پر حضرت آمنہ کا انتقال ہوگیا اور وہاں ہی ان کو دفن کیا گیا۔ اس کے بعد اس یتیم بچے کی پرورش دادا نے کی۔

دو برس تک جناب عبدالمطلب کی سرپرستی و نگرانی میں پرورش پاکر ۸ سال کی عمر تک پہنچے تھے کہ عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری آپؐ کے چچا ابوطالب نے اٹھائی۔ ابوطالب نے آپ کو اپنے بچوں سے بڑھ کر عزیز رکھا۔ آپؐ کی طفولیت کا زمانہ عرب کے دوسرے بچوں کی نسبت بہت ہی عجیب گزرا۔ آپؐ کو عام بچوں میں کھیلنے وغیرہ کا شوق نہ تھا۔

بارہ سال کی عمر میں چچا ابوطالب کے ہمراہ ایک تجارتی سفر میں شام گئے۔ ملک شام میں ایک عیسائی راہب بحیرہ نے آپؐ کو دیکھا اور ابوطالب کو آگاہ کیا کہ یہ بچہ آئندہ مبعوث ہونے والا نبی ہے۔ اس کے اندر وہ علامات ہیں جو نبیؐ آخرالزماں کے متعلق تورات اور انجیل

میں لکھی ہوئی ہیں۔ بحیرا نے ابوطالب کو بتایا کہ اس بچہ کو یہودیوں کے علاقے میں نہ لے کر جاؤ کیونکہ ہو سکتا ہے اسے کوئی گزند پہنچ جائے۔ ابوطالب بحیرا کی یہ باتیں سن کر جلد ہی مکہ مکرمہ لوٹ آئے۔

پندرہ سال کی عمر میں آپؐ نے قریش اور ہوازن کے درمیان ہونے والی ایک جنگ میں حصہ لیا۔ اس جنگ کو حرب فجار کہتے ہیں جو عکاظ کے ایک میلہ میں دونوں قبیلوں کے افراد کے درمیان معمولی جھگڑے سے بڑھتے بڑھتے جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔

جب آپ ذرا جوان ہوئے تو چچا ابوطالب کی تجارت میں مدد کرنے لگے حتیٰ کہ آپؐ نے تجارت کے پیشہ کو مستقل اپنا لیا۔ جلد ہی اپنی دیانت اور صداقت کی وجہ سے عام لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔

قبیلہ بنو اسد کی ایک معزز اور مالدار خاتون خدیجہؓ بنت خویلد، آپؐ کی دیانت اور امانت کی شہرت سے بہت متاثر ہوئیں اور آئندہ سے اپنے تجارتی کاروبار کو سنبھالنے کی خواہش کا آپؐ سے اظہار کیا۔ آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب کے مشورہ سے اس پیشکش کو منظور کر لیا۔ آپؐ حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر شام کو روانہ ہوتے۔ اس تجارتی سفر میں آپؐ کو بہت نفع ہوا۔ اس کے بعد بھی حضرت خدیجہؓ کا سامان لے کر کئی بار شام کے سفر کیے۔ ہر تجارتی سفر میں آپؐ کو بہت نفع ہوتا۔

حضرت خدیجہؓ آپؐ کی دیانت داری، خوش اخلاقی، پاکیزگی سے متاثر ہو کر نکاح کا پیغام بھیجا۔ ۲۵ سال کی عمر میں آپؐ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہو گیا۔ اس وقت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔

ابن اسحاق اور ابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؓ کے سوا آپ کی سب اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق جن کی تعداد ۷ تھی۔ جن میں تین لڑکے قاسمؓ، طاہرؓ، طیبؓ اور چار لڑکیاں زینبؓ، رقیہؓ، کلثومؓ اور فاطمہؓ ہیں۔ لڑکے تو سب بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے لڑکیاں زندہ رہیں (آلِ رسولؐ کے ذیل میں تفصیلی احوال ملاحظہ کیجیے۔ اس کے علاوہ فاطمہؓ، کلثومؓ بنت محمدؐ کے عنوانات کے تحت بھی دیکھیں)۔

ابن اسحاق اور ابن ہشام کی روایت کے مطابق جب آپ کی عمر ۳۵ سال تھی تو قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ اس تعمیر کے دوران مشہور عالم واقعہ پیش آیا۔ جب حجرِ اسود کی تنصیب کے سلسلے میں سردارانِ قریش آپس میں لڑ پڑے کیونکہ ان میں سے ہر کوئی حجرِ اسود کو نصب کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا جب جھگڑا زیادہ بڑھا تو یہ طے ہوا کہ اگلے دن سب سے پہلے جو شخص حرم شریف میں داخل ہوگا، وہی حجرِ اسود کو نصب کرے گا۔ حسنِ اتفاق سے محمدؐ علی الصبح سب سے پہلے حرم میں داخل ہوئے تو سب آپؐ کو دیکھ کر پکار اٹھے "الامین والصادق" یہ امین ہے اور صادق ہے، ہم سب راضی ہیں۔ آپؐ نے ایک کپڑے (چادر) میں حجرِ اسود کو رکھ اور چادر کے کونے مختلف سرداروں کو پکڑنے کے لیے کہا۔ آپؐ کی حکمت عملی و فراست سے یہ جھگڑا طے ہوا۔

نبی کریمؐ کے نامہ مبارک کا عکس۔ جس پر آپؐ کی مہر بھی ثبت ہے

بھی عام میں آپؐ ... اور خلوت ... میں مروجہ مشرکانہ کاموں سے ہمیشہ مجتنب رہتے۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ ... خلوت نشینی بڑھتی گئی۔ آپؐ گھر سے کھانے پینے کا سامان ... کے فاصلہ پر کوہ حرا میں (جسے آج کل جبل نور کہتے ہیں) ... وقت تک مسلسل غور و فکر اور عبادت رہتے۔ جب تک آپؐ کے پاس ... کا سامان رہتا۔

آغاز نبوت اور دعوت

۴۰ سال کی عمر میں جب آپ غارِ حرا میں مصروف عبادت تھے کہ ایک فرشتہ انسانی شکل میں آیا اور آپؐ سے مخاطب ہو کر کہا اقرأ (پڑھ) آپؐ نے ...

انا بقاریٍ (میں تو نہیں پڑھ سکتا)۔ دوبارہ فرشتہ نے آپؐ کو سینہ سے لگایا اور زور سے بھینچا اور کہا "اِقرا"۔ آپؐ نے پھر کہا ۔ مَا انا بقاریٍ ۔ فرشتہ نے تیسری مرتبہ آپؐ کو زور سے بھینچا اور پھر آزاد چھوڑ کر کہا ۔ اقرا باسم ربک الذی خلق ..... (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے ہر شئے کو پیدا کیا اور انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ۔ ....) سورۃ علق کی پانچ آیات کے متعلق مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ پہلی وحی تھی جو غارِ حرا میں اس موقع پر نازل ہوئی ۔ چند روز تک آپ پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی ۔ پھر اچانک سورہ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں ۔ یاایھا المدثر.... ان آیات میں آپ کو دعوتِ حق کے لیے کمربستہ ہونے کا حکم تھا ۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرک سے باز رہنے اور رب کی طرف پکارنے کا فریضہ شروع کیا ۔ آپؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ابوبکر صدیقؓ بن ابی قحافہ ، آپ کی اہلیہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰ ، حضرت زیدؓ بن حارث ، حضرت علیؓ بن ابو طالب شامل تھے ۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی دعوت اور نبی کریمؐ کی تگ و دو اور محنت سے مزید لوگ دعوتِ اسلام کو قبول کرتے گئے ۔ یہ دعوت آپؐ نے خاموشی سے اور قریبی لوگوں تک محدود رکھی ۔ اس اولین گروہ میں عثمانؓ بن عفان ، سعدؓ بن ابی وقاص ، طلحہؓ بن عبید اللہ ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف ، ابو عبیدہؓ بن الجراح ، زبیرؓ بن العوام ، عثمانؓ بن مظعون ، قدامہؓ بن مظعون ، سعیدؓ بن زید ، ابوسلمہؓ ، عبدالاسدؓ بن ہلال ، فاطمہؓ بنت خطاب ، [illegible] عبداللہؓ ابن مسعود اور جعفر بن ابو طالب شامل ہیں ۔

[illegible] کے خوف سے اہلِ ایمان کا گروہ پہاڑ کی گھاٹی میں نمازیں ادا کیا کرتے [illegible] یہی کیفیت رہی ۔ پھر حکمِ ربانی پر ایک دن نبی کریمؐ نے کوہِ صفا پر [illegible] قریش کو پکارا اور انھیں آگاہ کیا اور دعوتِ اسلام دی ۔ اس موقع پر آپؐ [illegible] نے آپ کی مخالفت کی اور آپؐ کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے ۔ [illegible] اللہ تعالےٰ نے سورۃ لہب نازل کی ۔

نبی کریمؐ کی اس علانیہ دعوت سے قریش کی طرف سے مخالفت شروع ہوگئی ۔ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے مصائب کا دروازہ کھل گیا ۔ قریش اہلِ ایمان کو [illegible] طریقوں سے ایذائیں دیتے ۔ حضرت بلالؓ حبشی ، حضرت عثمانؓ بن عفان ، زبیرؓ بن العوام ، ابوذرؓ غفاری ان باہمت اہلِ ایمان میں سے تھے ۔ جنہوں نے ہر ظلم و ستم کو خوشی خوشی سہا اور کسی بھی حربہ سے خوفزدہ ہوکر ایمان کی دولت کو ضائع نہ ہونے دیا ۔ حضرت بلالؓ حبشی قریش کے سخت ترین مظالم کے باوجود "احد، احد" پکارتے رہے ۔ ان دنوں اہلِ ایمان کے لیے دارِ ارقم (حضرت ارقمؓ کی قیام گاہ جو کوہِ صفا کے دامن میں تھی) ایک تربیت گاہ اور درس گاہ تھی، وہ نبی کریمؐ کی خدمت میں آکر دین کی باتیں معلوم کرتے ۔

نبی کریمؐ کو بھی پریشان کیا جانے لگا ۔ خانہ کعبہ کے صحن میں ابوجہل کی ترغیب پر دو نوجوانوں نے آپ کی گردن پر سجدہ کی حالت میں اونٹ کی اوجھری رکھ دی ۔

قریش ، نبی کریمؐ اور ابو طالب کے پاس وفود کی شکل میں آئے کہ نبی کریمؐ اس دعوت کو چھوڑ دیں ۔ اور آپ کو ہر قسم کا لالچ دیا ۔ لیکن آپؐ نے فرمایا "چاہے یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی لاکر رکھ دیں میں دعوتِ حق سے باز نہ آؤں گا۔"

نبی کریمؐ کی مکّی زندگی جو کہ تیرہ سال ہے ۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

(۱) اوپر مذکور تین سالہ دَور ۔ جس میں آپ نے خاموشی سے دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا ۔

(۲) ۔ دوسرا دَور جب قریش کی طرف سے مخالفت میں شدت پیدا ہوتی گئی ۔ اس میں آپؐ کے ساتھیوں کو اور خود آپؐ کو کافی مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ۔ یہ عرصہ تقریباً ۷ سال کا ہے ۔

(۳) تیسرا دَور ۔ ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد سے لے کر ہجرت تک تقریباً ۳ سال کا عرصہ ہے جسے آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر انتہائی سختی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے ۔ جس میں شعب ابی طالب کی اسیری بھی ہے ۔

دوسرے دَور کے آغاز میں قرآن مجید کی جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں آپؐ کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے برابر ہدایات دی جارہی تھیں ، اور صبر و استقامت کی تلقین تھی ۔

مکّی دَور کے ان نو دس سالوں میں دعوتِ اسلام آہستہ آہستہ مکہ کے باہر بھی متعارف ہوتی گئی ۔ رجب ۵ نبوی میں قریش کے مظالم سے تنگ آکر آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ ہجرت کا حکم دیا ۔ پہلی بار گیارہ مرد اور چار عورتیں ہجرت کر گئیں ۔ قریش نے نجاشی (شاہِ حبشہ) کے دربار تک جاکر ان مسلمانوں کو واپس لانے کی کوششیں کیں لیکن کامیابی نہ ہوئی جب حبشہ میں مسلمانوں کو آرام و سکون سے رہنے کی صورت محسوس ہوئی تو کئی اور لوگ بھی ہجرت کر گئے ۔ حتیٰ کہ ہجرت کرنے والوں کی تعداد ۸۳ ہوگئی ۔

[illegible] میں ایک طرف قریش کے مظالم تھے اور دوسری طرف آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے صبر و استقامت کے مظاہرے تھے ۔ ۶ نبوی میں قریش کے دو اہم فرد جناب حمزہؓ جو نبی کریمؐ کے چچا اور دودھ شریک بھائی بھی تھے اور حضرت عمرؓ بن خطاب ایمان لے آئے ان دو اہم شخصیتوں کے ایمان لانے میں دو اہم واقعات تاریخ میں بیان کیے جاتے ہیں ۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوگیا ۔ اب مسلمان اپنے دینی فرائض علی الاعلان خانہ کعبہ میں جاکر ادا کرنے لگے ۔ اس کی ابتدا خود حضرت عمرؓ نے کی ۔ جس سے کافی ہنگامہ ہوا ۔ لیکن بالآخر قریش کو ہزیمت اٹھانی پڑی ۔

جوں جوں اسلام کی دعوت میں وسعت ہوتی چلی گئی قریش کی مخالفت بڑھتی گئی حتیٰ کہ ایک منصوبے کے تحت نبی کریمؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کا مکمل معاشی بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا گیا ۔ اس فیصلہ کی وجہ سے نبی کریمؐ اور خاندانِ بنی ہاشم کو پہاڑ کے ایک درہ میں مقیم ہونا پڑا ۔ یہ محصوری ۳ سال تک رہی ۔ اس عرصہ میں بچے بھوک و پیاس سے بلک بلک کر مرگئے ۔ گھاس اور درختوں کے پتے تک کھانے کی نوبت آگئی ۔ ۱۰ نبوی میں یہ محصوری ختم ہوئی ۔ اس دوران دعوتِ اسلام سے مدینے کے کچھ لوگ متعارف ہوئے ۔ ۱۱ نبوی میں مدینہ سے ۱۲ آدمی نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی ۔ ان کی خواہش پر اسلام کی تعلیم کے لیے مصعبؓ بن عمیر کو ان کے ساتھ مدینہ بھیج دیا گیا ۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کی کوششوں سے اگلے سال یعنی ۱۲ نبوی کو ۷۲ آدمی حج کے زمانہ میں مکہ آئے ۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ۔

مدینہ منورہ ہجرت سے قبل ، مکہ مکرّمہ کے آخری سالوں کے قیام میں دو اہم واقعات پیش آئے ۔ اللہ تعالےٰ نے نبی کریمؐ کی تائید اور ان کی دعوتِ سچائی کو ثابت کرنے کے لیے دو معجزوں کا ظہور کیا ۔ ایک تو شق القمر کا معجزہ ہے ۔ دوسرے نبی کریمؐ کی معراج شریف کی سیر ۔ معراج کے واقعہ کا بیان سورۃ اسریٰ میں کیا گیا ہے ۔

(مزید دیکھئے "شق القمر" اور "معراج")

ہجرتِ مدینہ

جب نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا تو ارشادِ ربانی کے مطابق آپؐ نے مسلمانوں کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا حکم دیا ۔ کیونکہ ایک تو مکہ مکرّمہ میں اب رہنا بہت مشکل ہوگیا تھا ۔ دوسرے دعوتِ اسلام کے قبول کرنے اور پھیلنے کے آثار تھے ۔ جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان تو مدینہ میں جاکر طاقت پکڑتے جارہے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جارہا ہے

شجرہ مبارک

قصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر (قریش)

عبدالدار — عبدالعزیٰ — عبدالمناف المغیرہ — عبدالقصی

(عاتکہ کبریٰ بنت مرہ سے) — (واقدہ بنت العمری سے) — (ثقفیہ سے)

مطلب — ہاشم (عمرو) — عبدالشمس — تماضر — حنہ — قلابہ — نوفل — ابوعمرو — ابوعبیدا — رابطہ

(سلمیٰ بنت عمرو بن زید سے) — (ہند بنت عمرو بن ثعلبہ سے) — (قیلہ سے) — (امیہ بنت عدی سے) — (ام عبداللہ واقدہ بنت ابی عدی سے) — (عدی بنت حبیب سے)

رقیہ — عبدالمطلب (شیبہ) — صفی — عمرو ابوصیفی — اسد — نضلہ — شفاء — رقیہ — صیفتہ — خالدہ — حنہ

فاطمہ

(ممنعہ سے) — (ہالہ بنت وہیب سے) — (فاطمہ بنت عمرو سے) — (نتیلہ بنت خباب بنت کلب سے) — (صفیہ سے) — (لبنیٰ بنت ہاجر سے)

الغیداق — حجل مغیرہ — صفیہ — المقوم — حمزہ — ہما — ام حکیم بیضاء — ابوطالب — عاتکہ — اروی — عبداللہ — امیمہ — زبیر — ضرار — عباس — قثم — حارث — ابولہب

سائب — عبدالکعبہ — زبیر — عمارہ — یعلی — اروی — عامر — زبیر — عبداللہ — طلیب — ام حبیبہ — زینب — حمنہ — عبداللہ — ام حبیبہ — عبداللہ — عبیداللہ — قثم — معبد — فضل — عتبہ — عتیبہ — درہ

حضرت علی — جعفر — عاقل — عقیل — طالب — رجانہ — ام ہیثم — ام ہانی — حضرت محمد صلعم — حجل — قو — طاہر — عبداللہ — صفیہ — ام زبیر — ضباعہ — الحکم — عبداللہ — ربیعہ — نوفل — ابوسفیان — مغیرہ — عبیدہ

عبداللہ — (بی بی خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی سے) — (ماریہ سے) — حارث

(حضرت زینب بنت علی سے) — (موصابنت حفصہ سے) — زینب — رقیہ — قاسم — عبداللہ طاہر — ام کلثوم — فاطمہ — ابراہیم — (درہ بنت ابولہب سے)

عون — محمد — علی — امامہ — عبداللہ — حسن — حسین — محسن — زینب — ام کلثوم — رقیہ — عتبہ — ولید — ابوالسم

(ام البنین بنت حزام سے) — (لیلیٰ بنت مسعود سے) — (اسماء بنت عمیس سے) — (صہبا بنت ربیعہ سے) — (امامہ بنت ابوالعاص سے) — (خولہ بنت جعفر سے) — ام سعید بنت عروہ سے — (لیلیٰ سے) — (رباب سے) — زین العابدین — فاطمہ کبریٰ

عباس — جعفر — عبداللہ — عثمان — عبیداللہ — ابوبکر — یحییٰ — محمد اصغر — عمر — رقیہ — محمد الاوسط — محمد بن حنفیہ — ام الحسن — رملہ — اکبر — علی اصغر — سکینہ

فضل — قاسم — طلحہ — عبدالرحمٰن — حسن — زید — قاسم — عبداللہ — ابوبکر

تلاش: عبدالواحد خان دُرّانی

سیرتِ نبویؐ ماہ و سال کے آئینے میں

ولادت نبی صلعم	۹ ربیع الاوّل سنہ ۱ عام الفیل	مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء	بروز دو شنبہ
بعثتِ نبویؐ	۹ ربیع الاوّل سنہ ۴۱ ولادتِ نبویؐ	مطابق ۱۲ فروری ۶۱۰ء	بروز دو شنبہ
معراج	۲۷ رجب سنہ ۱۲ نبوت	مطابق ۲۲ مارچ ۶۲۷ء	بروز دو شنبہ
ہجرت	۲۷ صفر سنہ ۱۳ نبوت	مطابق [illegible] ستمبر ۶۲۲ء	بروز چہار شنبہ
غارِ ثور سے روانگی	یکم ربیع الاوّل سنہ ۱۳ نبوت	مطابق ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء	بروز دو شنبہ
مدینے میں آمد	۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ	مطابق ۲۷ ستمبر ۶۲۲ء	بروز جمعہ
غزوۂ بدر	۱۷ رمضان سنہ ۲ھ	مطابق ۱۶ [illegible] ۶۲۴ء	بروز سہ شنبہ
غزوۂ احد	۷ شوال سنہ ۳ھ	مطابق ۲۱ [illegible] ۶۲۵ء	بروز شنبہ
غزوۂ احزاب	۲۸ شوال سنہ ۵ھ	مطابق ۱۲ مارچ ۶۲۷ء	
صلح حدیبیہ	ذی قعدہ سنہ ۶ھ	مطابق [illegible] ۶۲۸ء	
سلاطین کے نام خطوط	یکم محرم سنہ ۷ھ	مطابق ۱۴ مئی ۶۲۸ء	بروز چہار شنبہ
غزوۂ خیبر	آخر محرم سنہ ۷ھ	مطابق جون ۶۲۸ء	
عمرۃ القضاء	ذی قعدہ سنہ ۷ھ	مطابق اپریل ۶۲۹ء	
فتح مکہ	۲۰ رمضان سنہ ۸ھ	مطابق ۱۰ جنوری ۶۳۰ء	بروز پنجشنبہ
غزوۂ حنین	۱۱ شوال سنہ ۸ھ	مطابق یکم فروری ۶۳۰ء	بروز چہار شنبہ
غزوۂ طائف	۱۳ شوال سنہ ۸ھ	مطابق ۳ فروری ۶۳۰ء	بروز جمعہ
غزوۂ تبوک	رجب تا رمضان سنہ ۹ھ	مطابق اکتوبر تا دسمبر ۶۳۰ء	
حجۃ الوداع	۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ	مطابق ۹ مارچ ۶۳۱ء	بروز جمعہ
وفاتِ نبویؐ	۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱۱ھ	مطابق [illegible] جون ۶۳۲ء	بروز دو شنبہ

تو انہیں بڑی تشویش ہوئی۔ انہوں نے آخری وار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشورے کے بعد نبی کریمؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو کفار کے اس منصوبہ سے آگاہ کیا اور آپؐ کو مدینہ منورہ ہجرت کا حکم دیا۔ آپؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ اس رات کو گھر سے نکلے جب باہر کفار آپؐ کے قتل کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ غارِ ثور میں تین دن قیام کیا۔ جب کفار کا خطرہ کچھ ٹل گیا تو وہاں سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچے۔ مدینہ سے ۳ میل اس طرف قبا کی بستی میں آپؐ نے قیام کیا۔ قبا میں آپؐ کی تشریف آوری نبوت کے تیرھویں سال ۸ ربیع الاول (۳۰ ستمبر ۶۲۲ء) کو ہوئی۔ انصار کے ممتاز خاندان عمرو ابن عوف کے سردار کلثوم بن الہدم کے ہاں آپؐ ٹھہرے، وہاں آپؐ نے ایک مسجد تعمیر کی۔ قبا میں چند روز قیام کے بعد آپؐ مدینہ کی بستی میں داخل ہوئے مدینہ میں آپؐ نے [illegible] حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں قیام فرمایا۔ وہاں آپؐ نے [illegible] ایک مسجد کی تعمیر کی، جسے اب مسجد نبوی کہا جاتا ہے۔ مسجد کے قریب آپؐ کے رہنے کے لیے حجرہ تعمیر کیا گیا۔ آپؐ نے مدینہ کے انصار اور مکہ کے مہاجرین میں مواخات [illegible] قائم کر دیا۔ مدینہ ہجرت سے سالِ ہجرت کا آغاز ہوا۔ مدینہ کے یہودیوں سے آپؐ نے [illegible] رہنے کا معاہدہ کیا۔ اس طرح سے مدینہ منورہ میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد [illegible] ۲ھ میں بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ [illegible] کا حکم [illegible] ریاست کے قیام سے اور اسلام کی دعوت [illegible] انہوں نے مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ [illegible] اور مدینہ میں بھی بعض منافقین کی مدد سے مسلمانوں کی قوت کو [illegible] نبی کریمؐ مدینہ کی اسلامی ریاست کے استحکام اور اسلامی تحریک [illegible] اسلامی تحریک کے مخالفین کے خلاف [illegible] کے ہمراہ شریک ہوتے رہتے۔ قرآن مجید [illegible] مدنی دور میں [illegible]

ہجرت کے دسویں سال نبی کریمؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ حج سے مدینہ منورہ واپسی کے [illegible] کو آپؐ کی طبیعت ناساز ہوئی۔ آہستہ آہستہ تکلیف بڑھتی [illegible] آپؐ [illegible] کی شدت کی وجہ سے مسجد نبوی میں آنے سے معذور ہو [illegible] تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؐ کے حکم سے نمازوں کی امامت کرائی۔ مرض میں کبھی زیادتی ہو جاتی اور کبھی کمی جس دن وفات ہوئی یعنی دوشنبہ کے دن۔ اس دن بظاہر طبیعت [illegible] سکون تھی لیکن جیسے دن چڑھتا گیا آپؐ پر غشی طاری ہو گئی۔

مع الذین انعم اللہ علیہم۔

بالرفیق فی الرفیق الاعلیٰ۔

بل الرفیق الاعلیٰ۔ کہتے کہتے روح پاک عالم قدس کی طرف پرواز کر گئی۔

اللھم صل علیٰ محمد وبارک وسلم۔

۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو آپؐ کا یوم وفات ہے۔ دوسرے دن تجہیز و تکفین کی تکمیل ہوئی اور جسدِ مبارک اسی حجرے میں جہاں آپؐ نے انتقال فرمایا تھا سپردِ خاک کر دیا گیا۔

تعلیمات: ایک خدا کا آفاقی تصور جو تمام انبیاء کی تعلیم کا مرکزی نقطہ رہا ہے۔ آپؐ نے بھی پیش کیا۔

رسالت کے باب میں آپؐ کی تعلیمات اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ آپؐ نے اپنے پیروؤں کو تمام انبیاء اور مصلحین کی عزت و احترام کی تعلیم دی۔ آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ وہ تمام لوگ جو پیغامِ خداوندی پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے قابلِ صد احترام ہیں۔

آخرت کا تصور جس انداز میں پیش کیا گیا اس نے انسانوں کو محاسبۂ نفس، برائی سے نفرت اور اچھائی کی ترغیب دی اور جو انسانوں کو راہِ راست کی طرف موڑنے کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ آپؐ کی تعلیمات مجرد نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ آپؐ نے عملی طور پر ان تعلیمات کی بنیاد پر ایک حکومت قائم فرمائی جو حجاز میں باقاعدہ طور پر ایک پہلی حکومت تھی۔

آپؐ کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبہ میں روزِ قیامت تک ہدایت و رہنمائی کا آخری ذریعہ اور سرچشمہ ہیں۔ زندگی کا وہ کونسا شعبہ ہے جس میں آپؐ نے اپنی بلند اور مقدس زندگی سے نمونہ پیش نہ کیا ہو۔

ایک خاوند کے لیے آپؐ کی زندگی نمونہ ہے۔ ایک باپ کی مثالی محبت آپؐ کی زندگی سے ملتی ہے، ایک مہربان دوست کی زندگی، ایک مشفق سرپرست کا نمونہ آپؐ ہی کی ذات سے ملتا ہے، ایک مدبر حکمران، ایک ماہر سیاست دان، ایک بہترین سپہ سالار، ایک دردمند دل رکھنے والا داعی و نذیر صرف اور صرف آپؐ کی ہی ذات میں ہمیں نظر آتا ہے۔ آپؐ کے دشمنوں تک نے اور اس مادی دور کے ملحد لوگوں نے اور غیر مسلم مفکرین نے آپؐ کی ان اعلیٰ صفات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

یہ ان تعلیمات کا ہی نتیجہ تھا کہ چند برسوں میں عرب کے بے آب و گیاہ خطے میں آپؐ کے لاکھوں عقیدت مند اور پیروکار ہو گئے۔ جن کی اپنی زندگیاں آئندہ آنے والے انسانوں کے لیے ایک نمونہ بنیں۔

انفرادیت۔ آپؐ کی تعلیمات دوسرے انبیاء کرام اور مصلحین سے منفرد ہیں۔ جملہ انبیاء کرام جو تعلیمات لے کر آئے وہ ایک خاص مدت اور خاص ماحول کے لیے تھیں، جونہی تقاضے بدلے یہ تعلیمات بھی غیر موثر ہو گئیں اس کے علاوہ ان کے پیرو ان کی تعلیمات کی حفاظت میں ناکام رہے۔

آپؐ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو امام الانبیاء اور خاتم المرسلین کا اعزاز بخشا اس لیے آپؐ کی تعلیمات رہتی دنیا تک کے لیے ہیں اور آپؐ کی تعلیمات کا بہت بڑا ماخذ قرآن مجید ایک حرف اور نقطے کی تبدیلی کے بغیر موجود ہے۔

آپؐ کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر اس مقالہ میں نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وہ پہلو مختلف عنوانات کے ذیل میں اس سے قبل انسائیکلوپیڈیا میں دیے جا چکے ہیں۔ ان کے لیے دیکھئے: آل رسولؐ۔ ازواج مطہراتؓ۔ حدیبیہ، صلح۔ ختم نبوت۔ غزوات اور معراج۔

محمد اوّل، سلطان

(دورِ حکومت: ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء - ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء)

عثمانیہ سلطنت کا سلطان۔ سلطان بایزید کا سب سے چھوٹا بیٹا۔

سلطان بایزید کے انتقال کے وقت سلطنتِ عثمانیہ بظاہر منتشر ہو چکی تھی۔ سلطنت کے کئی حصوں میں بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ بایزید کے لڑکوں میں بھی اقتدار کی جنگ جاری تھی۔ سب سے بڑے لڑکے سلیمان نے وزیر اعظم علی پاشا کی حمایت سے ادرنہ میں سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصہ پر بایزید کے جانشین ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوسرے لڑکے عیسیٰ نے بروصہ میں بایزید کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ محمد، ایشیائے کوچک کے شمال مشرق میں اماسیا کے چھوٹے سے علاقہ پر قابض ہو گیا۔ اسی دوران بایزید کا ایک اور لڑکا موسیٰ تیمور کی قید سے رہائی کے بعد تاج و تخت کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگا۔ ان چاروں بھائیوں میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی اور آپس میں ان کی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ عیسیٰ ایک جنگ میں شکست کے بعد غائب ہو گیا۔ سلیمان کی فوج نے سلیمان کو قتل کر دیا تو موسیٰ نے ادرنہ کے تخت کو سنبھالا۔ اس کے بعد موسیٰ نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری شروع کی۔ محمد، شہنشاہ کی درخواست پر اس کی مدد کے لیے پہنچا۔ موسیٰ اور

محمد کی فوجوں میں مقابلہ ہونے کو تھا کہ موسیٰ کی فوج نے بغاوت کر دی اور اس دوران وہ مارا گیا۔

اب سلطنت کے لیے محمد کا کوئی حریف نہ رہا تھا۔ اس نے باقاعدہ سلطان ہونے کا اعلان کیا۔ ایشیا اور یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کے علاقوں کے عوام نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے ۸ سال حکومت کی۔ اس دوران اس نے غیر معمولی اہلیت کا ثبوت دیتے ہوئے سلطنت عثمانیہ کے انتشار کو ختم کیا اور اسے مستحکم بنایا۔

کرمانیہ، کرمیان اور دوسری ترک ریاستوں کو دوبارہ عثمانی فرمان روائی قبول کرنے اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ریاستیں تیمور کے حملے کے وقت سلطنتِ عثمانیہ سے الگ ہو گئی تھیں۔

اس کے مختصر عہدِ حکومت میں ہر طرف امن و امان اور عدل کی حکمرانی تھی۔

۴۱ برس کی عمر میں ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں وفات پائی۔ اور بروصہ میں مسجد خضرا سے متصل دفن ہوا۔

محمد ابراہیم علی چشتی

(۱۶ اگست ۱۹۱۷ء/ ۲۷ شوال ۱۳۳۵ھ — ۱۱ جولائی ۱۹۶۸ء/ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ)

لاہور میں مولانا محرم علی چشتی کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایک نامور وکیل، سیاست دان اور صحافی تھے۔ ان کی ایک کتاب 'اسلامی زندگی کا دینوی پہلو' کافی مشہور ہے۔

ابراہیم علی کی تعلیم سکول سے شروع ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں جب آپ کالج میں گیارہویں جماعت (فرسٹ ایئر) کے طالب علم تھے تو والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی تمام ذمہ داری کندھوں پر ہونے کے باوجود سلسلہ تعلیم منقطع نہ کیا۔

۱۹۳۵ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا اور مسلم ہیرالڈ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کالج میں مثنوی رومی کا درس بڑے ذوق و شوق سے دیتے رہے۔ ۱۹۳۹ء میں مجوزہ ریاست پاکستان کے متعلق ایک پمفلٹ "خلافتِ پاکستان" لکھا۔ نامساعد حالات کے باوجود بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور صحافت کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔

۱۹۳۸ء میں جب مولانا عبدالستار نیازی نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت سنبھالی تو ابراہیم علی چشتی اس کے سیکرٹری جنرل تھے۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ اسی سال بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس میں شرکت کی۔

نظریہ پاکستان کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد محکمہ اسلامیات کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی زندگی سادگی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء میں بھرپور حصہ لیا۔ انکوائری رپورٹ میں آپ کے خلاف مقدمہ کی رپورٹ سے آپ کے عزم و استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ مجموعی طور پر دس سال قید و بند میں رہے۔

اپنے چند احباب کے ہمراہ یہ عہد کیا تھا کہ اس وقت تک شادی نہیں کریں گے جب تک پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہو جائے۔ مولانا ابراہیم علی چشتی اس عہد کو نبھاتے ہوئے ۱۱ جولائی ۱۹۶۸ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

مفتی ابوالبرکات نے آپ کا جنازہ پڑھایا اور شاہی مسجد کے قریب اپنے والد کی تعمیر کردہ مسجد صابر شاہ ولی شہید کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔ آپ نے جن احباب کے ساتھ یہ عہد کیا تھا ان میں مولانا عبدالستار نیازی اور محمد شفیع (م ش) مشہور صحافی شامل ہیں۔ آپ نے اردو اور انگریزی زبان میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔

محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، ڈاکٹر

(اپریل ۱۸۷۴ء — جنوری ۱۹۵۶ء)

مفسرِ قرآن، مشہور مناظر اور خطیب۔ آپ کے والد غلام قادر سیالکوٹ کے ایک متمول فرد تھے۔

سکول کی تعلیم کے دوران، دینی تعلیم مولانا غلام حسن سے حاصل کی۔ کالج میں آپ کے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن تھے جو علامہ اقبال کے بھی استاد تھے۔ مولانا عبدالمنان وزیرآبادی کی فرمائش پر اسی دوران قرآن مجید حفظ کیا۔ انہی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ حدیث میں مزید تعلیم کے لیے سید نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ مدرسہ رحمانیہ میں مدرس بھی رہے۔

۱۹۰۵ء میں دہلی سے واپس سیالکوٹ آ گئے اور ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالمجید سوہدروی نے یہیں سے تعلیم حاصل کی۔

مولانا سیالکوٹی نے ایک ماہنامہ "الہادی" بھی نکالا جس میں مسیحیت [illegible] کا رد لکھا کرتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے رسالہ "اہل حدیث" کی [illegible] کرتے رہے۔

آپ نے کئی مناظرے بھی کیے۔ حد درجہ مالدار ہونے کے [illegible] گریزاں رہے۔ مولانا سیالکوٹی نے تحریکِ پاکستان [illegible] کردار ادا کیا۔

بے شمار علمی مقالوں کے علاوہ چالیس کے قریب [illegible] واضح البیان فی تفسیر فاتحۃ الکتاب، تفسیر [illegible] سیرت رسولؐ، تاریخ نبویہ وغیرہ [illegible] مشہور ہیں۔

محمد اجمل خاں، حکیم

[illegible]

برعظیم پاک و ہند کی ہمہ گیر شخصیت [illegible] آپ کے والد حکیم محمود خاں [illegible] نے بیٹے محمد اجمل کو ناظرہ قرآن مجید پڑھایا [illegible] پندرہ سولہ سال کی عمر میں قرآن کے حافظ ہو چکے تھے [illegible] کتابیں مولانا [illegible] اور حکیم [illegible] مروجہ رسمی امتحان پاس نہیں کیا [illegible] حاصل کریں۔ ابتدا ہی سے [illegible] مسلم [illegible] استاذ [illegible] میں وہ مہارت حاصل کی [illegible] کا اعتراف کیا۔ آپ کے کتب خانہ [illegible] ہندوستان [illegible] کی سینکڑوں قلمی کتابیں [illegible] موجود تھیں [illegible]

۱۸۹۶ء میں [illegible] رامپور [illegible] کتب خانہ [illegible] برس کی قلیل مدت میں آپ نے [illegible] کتب خانہ میں کئی نادر کتب [illegible] ۱۹۰۲ء میں خاندانی مطب اور مدرسہ طبیہ کے [illegible] میں دہلی واپس آئے [illegible] کی تبدیلی کی غرض سے [illegible] چلے گئے۔ وہاں سے [illegible] آخر مارچ ۱۹۰۵ء میں چند عرصے [illegible] میں عراق سے واپس آئے تو طبیعت سنبھل چکی تھی [illegible] مشاغل میں پھر سے منہمک ہو گئے۔

حکیم محمد اجمل خاں ایک بے مثل طبیب ہی نہ تھے [illegible] ادیب، شاعر اور عالم دین بھی تھے۔ طبیہ کالج دہلی اور ہندوستانی دواخانہ کے [illegible]

طب کے علم کو قوم کی ملکیت بنا گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی ملک کی آزادی، بھائی چارے کی تعلیم، طبِ یونانی کی تعلیم کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے اور قومی تعلیمی اداروں کی حالت بہتر بنانے میں گزاری۔ تحریک آزادیٔ ہند میں بھرپور حصہ لیا۔ طبیہ کالج کے قیام کے ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ کو چلانے کی ذمہ داری بھی سنبھالی اور سات سال تک اس کے چانسلر رہے۔

تحریک عدم تعاون کے ناکام ہونے کے بعد جب ہندو اور مسلمان آپس میں لڑنے لگے تو حکیم صاحب نے دونوں قوموں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کے لیے بہت جد و جہد کی۔

محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا۔ (۱۲ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ — ۸رجب ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء)

ضلع مظفر نگر (یو. پی) کے ایک قصبہ کاندھلہ کے ایک عالم دین حافظ محمد اسمٰعیل کے ہاں پیدا ہوئے۔ اس گھرانے میں کئی علمی شخصیات گزری ہیں۔ ان میں مفتی الٰہی بخش ہیں جنہوں نے مثنویٔ روم کا تکملہ لکھا ہے۔ آپ کے والد حافظ محمد اسمٰعیل بھوپال میں محکمہ جنگلات کے مہتمم تھے۔ وہیں پر دوران قیام مولانا محمد ادریس پیدا ہوئے۔ خاندان کی مذہبی روایات کے مطابق تعلیم کی ابتدا حفظِ قرآن سے کرائی گئی۔ ۹ برس کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد انھیں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاں تھون میں چھوڑ دیا گیا۔ حضرت تھانویؒ ایک تو حافظ محمد اسمٰعیلؒ کے پیر بھائی تھے اور دوسرے ان سے گہرے تعلقات تھے۔ مدرسہ اشرفیہ تھون میں صرف و نحو کی پہلی کتاب حضرت تھانویؒ نے ہی پڑھائی۔ مولوی عبد اللہ صاحب تیسیر المنطق سے بھی ابتدائی تعلیم میں استفادہ کیا۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے حضرت تھانویؒ خود مدرسہ عربی مظاہر العلوم سہارنپور لے گئے۔ حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر مروجہ علوم کی تکمیل مظاہر العلوم سے ہی کی۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حافظ عبد اللطیف اور مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا۔ ۱۹ برس کی عمر میں سندِ فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں دوبارہ دورۂ حدیث پڑھا۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، میاں اصغر حسین اور مفتی عزیز الرحمٰن جیسے مایۂ ناز اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

۱۳۳۸ھ/۱۹۲۱ء سے تدریسی زندگی کا آغاز مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے مدرسہ امینیہ، دہلی سے کیا۔ یہاں تقریباً ایک سال قیام رہا۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اپنے اساتذہ کے پہلو بہ پہلو مسندِ درس پر فائز ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ تعلق ۹ برس قائم رہا۔ ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم کے شیخ التفسیر کے منصب پر فائز ہوئے۔

اس تمام عرصہ میں بعد از نمازِ فجر نودرہ میں قرآن حکیم کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے۔ حیدر آباد میں قیام کم و بیش دس برس رہا۔ وہیں قیام کے دوران آپ نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ جن میں مشکوٰۃ کی عربی زبان میں شرح "التعلیق الصبیح" کی ابتدائی چار جلدیں بھی شامل ہیں۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں آپ کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت سے وہاں آنے کی دعوت آئی لیکن آپ نے قبول نہ کی۔ جب علامہ شبیر احمد عثمانیؒ دوبارہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوئے اور صدر مہتمم بنے تو ان کے اصرار پر ۱۹۳۹ء میں بحیثیت "شیخ التفسیر" دارالعلوم دیوبند چلے آئے اور دس سال تک تدریس کی خدمت بجا لاتے رہے۔ اس دوران تفسیر بیضاوی، ابن کثیر کے علاوہ ابوداؤد اور طحاوی بھی پڑھائی۔ جب آپ حیدر آباد دکن میں تھے تو آپ کو ۲۵۰ روپے ماہانہ سے زیادہ مشاہرہ مل رہا تھا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کے ۷۰ روپے ماہانہ قبول کئے آپ دارالعلوم دیوبند کے اس گروپ سے وابستہ تھے۔ جس نے بڑی سرگرمی سے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد فوری طور پر تو منتقل نہ ہوئے حالانکہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بارہا اصرار کیا اور حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔

مئی ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے کر اپنے آبائی وطن کاندھلہ چلے گئے۔ دارالعلوم دیوبند چھوڑنے کے بعد آپ کو ہندوستان کے کئی علمی اداروں نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی لیکن آپ ہندوستان سے منتقل ہونے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں وزارتِ تعلیم ریاست بہاولپور نے آپ کو شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ بہاولپور میں آنے کی دعوت دی۔ آپ اپنے خاندان کے ہمراہ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی پہنچے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اپنے فرائض سنبھالے۔ ۱۹۵۱ء تک وہاں رہے۔ اس کے بعد مفتی محمد حسن بانی جامعہ اشرفیہ لاہور کے اصرار پر لاہور تشریف لے آئے۔ ۱۹۵۱ء سے لے کر اپنی وفات یعنی ۱۹۷۴ء تک جامعہ اشرفیہ سے وابستہ رہے۔ پاکستان آنے کے بعد آپ نے یہاں اسلامی نظام کے نفاذ اور آئین پاکستان کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے دوسرے علماء کے ساتھ مل کر بھرپور جد و جہد کی۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کا جو اجتماع ہوا تھا۔ اس میں آپ بھی شریک تھے۔ اس اجتماع نے اسلامی آئین کے لیے مشترکہ نکات حکومت کو پیش کیے۔ ۱۹۷۴ء میں قائم کی گئی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہے۔ ایک طویل بیماری کے بعد ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔

زندگی میں چار مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہؐ کی سعادت حاصل ہوئی۔ پہلی بار ۱۹۳۲ء میں اپنی اہلیہ محترمہ اور دو بچوں کے ہمراہ حج کیا۔ دوسری بار ۱۹۳۴ء میں زیارت حرمین شریفین کے بعد شام، لبنان اور فلسطین وغیرہ کی سیاحت کی اور چھ ماہ دمشق میں قیام کیا۔

پاکستان بننے کے بعد دو مرتبہ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۵ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ تدریسی خدمات کے علاوہ آپ اکثر اوقات تصنیف و تالیف میں مصروف

رہتے۔ ان کی تعداد ۶۰ کے قریب ہے۔

عربی زبان میں ۲۲ جلدوں پر مشتمل غیر مطبوعہ تفسیر بیضاوی کی شرح ہے۔ ۲۳ پاروں پر مشتمل اردو میں مطبوعہ تفسیر معارف القرآن کے علاوہ دلائل القرآن علیٰ مذہب النعمان (عربی)، شرائط مفسر و مترجم (اردو)، اعجاز القرآن، مشکوٰۃ شریف کی ۸ جلدوں پر مشتمل عربی زبان میں شرح، مقدمۃ الحدیث، کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ، القول والحکم، لطائف الحکم فی اسرار نزول عیسیٰ بن مریم، اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف، نبی کریمؐ کی سیرت جو چار جلدوں میں اردو میں مطبوعہ ہے "سیرۃ المصطفیٰ"، خلافت راشدہ، حدیث، عقائد و علوم کلام کے علاوہ کئی متفرق کتابیں۔ عربی میں قصائد کے کئی مجموعے ہیں۔

آپ کی اولاد میں سے چھ لڑکے بھی علمی اور دینی میدان میں معروف ہیں سب سے زیادہ شہرت شیخ الحدیث جناب مولانا محمد مالک نے پائی۔ سب سے بڑے لڑکے حافظ محمد نعمان نیلا گنبد مسجد کے نائب خطیب ہیں۔ ایک صاحبزادے جناب محمد میاں صدیقی صاحب وزارت مذہبی امور میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔

محمد اسحاق لودھیؒ، مولانا۔ (۱۸۹۰ء - ۱۹۷۱ء)

تحریک آزادیٔ ہند اور تحریک پاکستان کے ایک نامور سیاسی، مشہور عالم دین، خطیب و مفتی ہزارہ (صوبہ سرحد)۔

ہزارہ ڈویژن کے علاقہ اپر تناول کے لساں نامی گاؤں میں مولانا احمد گل کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے علماء سے پانے کے بعد علم و عرفان کی لگن میں حضرت پیر مہر علی شاہؒ کی خدمت میں گولڑہ شریف پہنچے۔ حضرت پیر صاحبؒ سے علم کے ساتھ ساتھ علمی بصیرت بھی پائی۔ یہاں (گولڑہ) سے عربی صرف و نحو، منطق، فلسفہ، ریاضی، ماہیت، کلام، معانی اور میراث کے علوم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کے لیے رخت سفر باندھا۔ دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا غلام رسول، مولانا رسول خاں مولانا محمد ابراہیم اور مولانا عزیز الرحمٰن جیسے اکابر علماء سے فیضان حاصل کیا۔ تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہاں بطور نائب مدرس کام کرتے رہے۔ اس کے بعد برعظیم پاک و ہند کے کئی اور مدارس میں بحیثیت صدر مدرس کام کرتے رہے۔

۱۹۲۲ء میں ایبٹ آباد تشریف لے آئے یہ مرکزی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دینا شروع کیے اور متواتر ۴۹ برس تک (اپنی وفات تک) علم و عرفان کے چراغ جلاتے رہے۔ جامع مسجد ایبٹ آباد میں آپ نے ایک معیاری دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔ آپ ایک جید عالم دین ہی نہیں، آتش نوا مقرر بھی تھے۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا بدر عالم میرٹھیؒ (مصنف ترجمان السنۃ) اور سابق سینیٹر اور رکن قومی اسمبلی مولانا عبدالحکیم شامل ہیں۔

مولانا محمد اسحاق نے تحریک آزادیٔ ہند اور تحریک حصول پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جہاد کشمیر ۱۹۴۸ء میں بطور ایک رضا کار شریک ہوئے۔ سرحد مسلم لیگ نے ۱۹۴۷ء کے اوائل میں جو تحریک سول نافرمانی شروع کی تھی اس کے باقاعدہ آغاز سے قبل مسلم لیگ کے جن اکابر کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں مولانا محمد اسحاق بھی شامل تھے۔

آپ نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے ایک "پردہ" کے موضوع پر ایک بہترین رسالہ ہے۔

۱۳ر اگست ۱۹۷۱ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے اور وصیت کے مطابق ایبٹ آباد کے جنوبی حصہ "پنج پیر" کی زیارت کے احاطہ میں سپرد خاک کیے گئے۔

محمد اسحاق، مہاجر مکیؒ۔ (۱۱۹۲ھ - ۱۲۶۲ھ)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکیؒ دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد افضل فاروقی تھا۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین آپ کے استاد تھے۔ ان سے جملہ علوم معقول و منقولات سبقاً سبقاً پڑھے۔ ۱۲۴۰ھ میں پہلی مرتبہ حج کے لیے گئے تو شیخ عمر بن عبدالکریم مکی (متوفی ۱۲۴۷ھ) سے سند و اجازت حدیث حاصل کی۔

آپ کے زہد کے متعلق شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے۔ "میری تقریر اسمٰعیل شہید نے، تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے لے لیا۔" شاہ عبدالعزیز نے اپنی زندگی میں اپنا پیش امام آپ کو مقرر کر رکھا تھا۔ اپنے نانا کی زندگی ہی میں تدریس شروع کی اور ان کے انتقال کے بعد ان کی مسند کو مکمل طور پر زینت بخشی۔ ۱۲۵۸ھ میں حج کے لیے قصد کیا۔ اب ارادہ وہاں مستقل قیام کا تھا۔ مکہ مکرمہ میں قیام رہا اور وہاں مسند تدریس شروع کیا۔ آپ کے بھائی شاہ محمد یعقوب بھی ساتھ تھے۔ مکہ مکرمہ میں ہی انتقال ہوا۔

آپ کے شاگردوں میں سے آپ کے بھائی شاہ محمد یعقوب، محمد اسمٰعیل شہید کے لڑکے شاہ محمد عمر، میاں نذیر حسین محدث دہلوی، شاہ عبدالغنی مجددی، شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی زیادہ معروف ہوئے۔

آپ کے بھائی شاہ محمد یعقوب بھی علم و فضل میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان کا انتقال بھی مکہ مکرمہ میں ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ / ۳ اپریل ۱۸۶۷ء کو ہوا۔

محمد اسد، علامہ

نامور مصنف، ممتاز عالم دین اور مبلغ و مصلح ... پولینڈ کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے ... نام رکھا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور محمد اسد نام پایا۔ ...

علامہ - محمد اسد

مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں مقیم رہے۔ اس دوران میں سلطان ابن سعود کا تقرب حاصل رہا۔ کچھ عرصہ افغانستان میں بھی رہے۔ پھر برصغیر میں آگئے۔ ...

علامہ اقبال کے قریب رہنے کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہمراہ دارالسلام (پٹھان کوٹ) میں گزارا۔ قیام پاکستان کے بعد انھیں حکومت کے زیرِ سرپرستی ایک نئے محکمے "اسلامی تعمیرِ نو" کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا۔ ازاں بعد ان کی خدمات وزارتِ خارجہ کو منتقل کردی گئیں۔ ان کا تقرر وزارتِ خارجہ میں شعبۂ مشرقِ وسطیٰ کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفود میں بھی شریک رہے۔ آج کل ان کا قیام مراکش میں ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو دینی تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ علامہ صاحب بہت سی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ علامہ صاحب پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی دعوت پر ملک کے آئین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں ۱۹۸۳ء میں پاکستان تشریف لائے۔ اُن کی تصانیف اسلام فہمی کے ضمن میں عالمگیر شہرت رکھتی ہیں "روڈ ٹو مکہ" ان کی مشہور ترین کتاب ہے جس میں علامہ صاحب نے مشرق و مغرب کی ذہنی و ثقافتی زندگی کا موازنہ کرکے اپنے قبولِ اسلام کی داستان انتہائی دلچسپ اور دلنشین انداز میں لکھی ہے۔ قرآن مجید اور صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ (مع تفسیر و حواشی) بھی بہت معیاری ہے۔ "اسلام میں ریاست و حکومت کے اصول" ان کی ایک اور معروف انگریزی کتاب کا عنوان ہے۔ آج کل علامہ اسد احادیث شریف کے مختلف مجموعوں کو انگریزی میں منتقل کرنے میں مصروف ہیں۔

محمد اسمٰعیل سلفیؒ، مولانا۔ (۱۹۰۰ء - فروری ۱۹۶۸ء)

اہلِ حدیث مسلک کے ممتاز عالمِ دین اور محدّث۔ وزیر آباد کے نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا محمد ابراہیم سے حاصل کی۔ مبادیٔ صرف و نحو میں آپ کے اساتذہ مولانا عمر الدین اور مولانا تاج الدین ہیں۔ دیگر کتب اور صحاح ستہ، مولانا عبد المنان وزیر آبادی سے پڑھیں۔ اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ مدرسہ امینیہ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد مدرسہ دارالکتاب والسنۃ میں داخل ہوئے۔ معقولات کی کتابیں مولانا عبد الرحمٰن تلمیذ شیخ الکل نذیر حسینؒ سے پڑھیں۔ محدث غازی پوری سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد مدرسہ غزنویہ امرتسر آئے اور مفتی محمد حسن و دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت ہند میں تحریک آزادی اور تحریک خلافت پورے زور شور سے شروع تھی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا ابراہیم سیالکوٹیؒ کی ہدایت پر گوجرانوالہ میں مقیم ہوئے۔ جامعہ محمدیہ کی بنیاد رکھی۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں آل انڈیا اہلِ حدیث کانگرس کی حمایت کرتی رہی آپ بھی کانگرس کے ہمنوا تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں جمعیت اہلِ حدیث قائم ہوگئی۔ مولانا داؤد غزنویؒ اس کے امیر تھے۔ ۱۹۶۲ء تک مولانا سلفیؒ اس کے ناظمِ اعلیٰ رہے۔ مولانا غزنویؒ کے انتقال کے بعد جمعیت کے امیر مقرر ہوئے۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد (لائل پور) کے بانی ارکان میں سے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں مشکوٰۃ شریف کی شرح بھی لکھنی شروع کی تھی لیکن مکمل نہ ہو سکی۔

محمد اسماعیل، مولانا۔ (وفات ۲۶ فروری ۱۸۹۸ء / ۴ شوال ۱۳۱۵ھ)

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس کے والد مکرم۔ اپنے وقت کے مشہور عالمِ دین۔ اپنے آبائی وطن جھنجھانہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد علومِ دینیہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۵۵ء میں بہادر شاہ ظفر کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کے بچوں کو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مرزا کچھ پریشانیوں میں مبتلا ہوئے۔

امن قائم ہونے کے بعد مرزا الٰہی بخش نے دہلی چھوڑ کر بستی نظام الدین میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہاں اپنا مکان تعمیر کرایا۔ اس کے بعد مولانا محمد اسمٰعیل کے لیے ایک مکان اور مسجد تعمیر کروائی۔ مرزا الٰہی بخش نے مولانا سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ایک دن مولانا مسجد کے لیے چند نمازیوں کی تلاش کے لیے باہر نکلے۔ چند میواتی مزدوروں کو مزدوری کے عوض مسجد میں لائے۔ اُن کو نماز اور قرآن کی تعلیم دینا شروع کی۔ اس طرح مولانا نے میواتیوں میں کام کرنا شروع کیا۔ میوات اُن دنوں جہالت و ظلمت کے اندھیروں میں گھرا ہوا تھا۔ آبادی تو مسلمانوں کی تھی لیکن انہیں اسلام کے بنیادی عقائد تک کا علم نہ تھا۔

۱۲۸۵ھ میں کاندھلہ میں اپنی دوسری شادی کی وجہ سے کاندھلہ سے ایسے وابستہ ہوئے کہ محمد اسمٰعیل کاندھلویؒ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ آپ کی اولاد میں مولانا محمد صاحب، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے آپ کے مشن کو پورا کرنے کی کوششیں کیں۔ مولانا محمد الیاس نے زیادہ شہرت پائی اور میوات کے علاقے سے دینی تبلیغ کے لیے اٹھائی گئی تحریک بعد میں دنیا بھر میں متعارف ہوئی۔

آپ کے لڑکے مولانا محمد یحییٰ ۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ مولانا محمد یحییٰ کی اولاد میں مولانا محمد ذکریا، شیخ الحدیث نے کافی شہرت پائی۔

محمد امجد علی اعظمی

(۱۸۷۸ء - ۱۹۴۸ء) عالمِ دین گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ شاہ فضلِ حق خیرآبادی آپ کے دادا استاد ہیں۔ فنِ حدیث و رجال آپ نے مولانا وصی احمد محدث سورتی سے حاصل کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر آپ نے آبائی پیشہ طبابت شروع کیا۔ مگر بعد میں محدث سورتی کے کہنے پر آپ بریلی میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مدرسے میں مدرس ہوکر چلے گئے۔ انھی سے بیعت کی۔ اور اعلیٰ حضرت کی وفات تک وہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء کو دارالعلوم معینیہ عثمانیہ کے صدر مدرس ہوکر اجمیر چلے گئے۔ آپ کے تلامذہ میں دور حاضر کے بڑے بڑے علما کے نام آتے ہیں۔ ۲ ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ بمطابق ۶ ستمبر ۱۹۴۸ء کو آپ بقصدِ حج و زیارت حرمین الشریفین بمبئی پہنچے تو آپ کا انتقال ہوگیا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ بہارِ شریعت ہے جو سترہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں آپ نے تمام فقہی مسائل کو سمو دیا ہے۔ وہ تمام مسائل جو ایک عام مسلمان کو اپنی زندگی میں پیش آسکتے ہیں ان میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ ہر باب میں آیاتِ مبارکہ پھر احادیثِ قدسی اور پھر مسائلِ فقہ بیان کئے گئے ہیں۔

محمدؓ بن ابوبکر صدیق۔

(وفات ۳۸ھ)۔ صحابیٔ رسولؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے۔ جنگ جمل اور صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے شریک ہوئے۔ حضرت قیسؓ بن سعد کی سفارش اور رائے سے حضرت علیؓ نے آپ کو مصر کا حاکم مقرر کیا۔ عمرو بن العاص کے گروہ کے ایک فرد معاویہ بن حدیج کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

محمد بن اسحاق۔

(وفات ۱۵۶ھ)۔ ممتاز تابعی اور مشہور محدّث اور مورّخ کنیت ابوعبداللہ تھی۔ شیعہ حضرات آپ کو 'امیر المومنین فی الحدیث' کے نام سے پکارتے ہیں۔ ابتدا میں مدینہ منورہ رہتے تھے۔ بعد میں کوفہ، جزیرہ اور رے میں رہے۔ آخر میں بغداد چلے آئے اور وہاں ہی وفات پائی۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سیرۃ ابنِ اسحاق، زیادہ مشہور ہے۔ بعد میں آنے والے مؤرخین نے سیرۃ ابنِ اسحاق سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ کی کتابیں تصنیف کیں۔

محمد بن اسحاق (وفات ١٥١ھ) فنِ مغازی کے امام، مشہور محدث۔ امام زہری کے شاگرد تھے۔ محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا۔ یہ شیخ سعدیؒ کا زمانہ تھا۔ آپ روایت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال اور حوالے بھی پیش کرتے ہیں۔ اس لیے بعض علماء ان کو ثقہ تسلیم نہیں کرتے۔

محمدؒ بن حسن، ابوعبداللہ۔ (١٣٢ھ - ١٨٩ھ) امام محمد کے نام سے معروف ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے اکابر شاگردوں میں سے ہیں اور خود بھی ایک مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے بعض مسائل میں اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کیا ہے۔ امام مالکؒ سے تین سال تک حدیث کی تعلیم حاصل کی۔
عراق کے ایک شہر واسط میں پیدا ہوئے اور خراسان کے ایک قصبے رے میں انتقال ہوا۔ وہاں ہی آپ کا مزار ہے۔

محمد بن حنفیہ۔ (٦٦٧ - ٧٠٠ء) حضرت علیؓ کے بیٹے اور آپ کی دوسری بیوی حنفیہ سے تھے۔ جنگِ جمل میں حضرت علیؓ نے آپ کو ہی عَلَم دیا تھا۔ بنو امیہ کے ابتدائی دَور میں مختار ثقفی نے اپنے اقتدار کی خاطر، محمد بن حنفیہ کو امام کی حیثیت سے مسلمانوں میں متعارف کرایا اور ان کے نام کی بیعت لی۔ شیعوں کا یہ فرقہ کیسانیہ کہلاتا ہے۔
(مزید دیکھیے: "کیسانیہ")

محمد بن سیرین، ابوبکر۔ (٣٣ھ - ١١٠ھ) مشہور تابعی، محدث، فقیہہ اور امام۔ بزایا (عراق) کے باشندے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت میں اپنے والد کے ہمراہ گرفتار ہو کر آئے اور حضرت انسؓ بن مالک کے خادم کی حیثیت سے ان کے پاس رہے۔ ان سے استفادہ کیا۔ مشہور صحابیِ رسول حضرت ابوہریرہؓ اور امام حسن بصریؒ سے علمی استفادہ حاصل کیا۔ مذہبی علوم میں کمال شہرت پائی۔ احادیث کے بارے میں کافی تحقیق و جستجو کی۔

محمد بن طلحہؓ۔ کنیت ابوالقاسم تھی۔ لقب سجّاد تھا۔ یہ لقب زیادہ عبادت گزاری کی وجہ سے عوام میں پکارا جاتا تھا۔ مشہور صحابیِ رسولؐ حضرت طلحہؓ کے فرزند تھے اور نبی کریمؐ کے بھانجے تھے۔ آپ کی کنیت نبی کریمؐ نے ہی تجویز کی تھی۔ نبی کریمؐ کے انتقال کے وقت ابھی بچے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی کشمکش میں جوانی کی عمر کو پہنچے۔ جنگِ جمل میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ لیکن کھل کر اس لیے حمایت نہ کی کیونکہ حضرت طلحہؓ (آپ کے والد) حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہمراہ تھے۔ انھیں خانہ جنگی کے ایام میں حضرت علیؓ کے حامیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

محمد بن عبداللہ حسنی۔ ابن تومرت کے نام سے مشہور ہوئے۔ امام مہدی ہونے کا دعوٰی کیا۔ مزید احوال کے لیے دیکھیے: "ابن تومرت"

محمدؒ بن عبدالوہاب۔ (١١١٥ھ/١٧٠٣ء - ١٢٠٦ھ/١٧٩٢ء) عالمِ اسلام کے ماضی قریب کے وہ عظیم مصلح جو حجاز اور نجد کے علاقوں میں اپنے بعض اصلاحی و اخلاقی اقدامات کی وجہ سے مسلمانوں کے عمومی حلقوں میں بدنام ہیں۔ بعض مفاد پرست علماء نے محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کو عوام کے سامنے بڑے غلط انداز میں پیش کیا ہے۔
بارہویں صدی ہجری میں جب توحید و رسالت کے ان مرکزی علاقوں میں شرک و ظلم کا دَور دورہ تھا۔ سب کچھ دین اور مذہب کے نام پر ہوتا تھا۔ سیاسی حالات بھی بہت منتشر تھے۔ بدعات کو دین سمجھ کر کیا جاتا تھا تو عیینہ کے ایک علمی گھرانے میں محمد (ابن عبدالوہاب) نے آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد عبدالوہاب ابن سلیمان (متوفی ١١٥٣ھ) عُیَینہ اور حریملا میں عہدہ قضا پر مامور رہے۔ آپ کے جد امجد سلیمان بن علی بن مشرف (متوفی ١٠٧٩ھ) بھی اپنے زمانے کے مشہور عالمِ دین تھے۔ حنابلہ کے ہاں اُن کی مناسک کی کتاب بہت مشہور ہے۔
محمد بن عبدالوہاب آغازِ طفولیت ہی سے ذہانت اور قوتِ حافظہ میں ممتاز تھے۔ دس برس کی عمر سے پہلے قرآن مجید کے حفظ سے فارغ ہو گئے۔ اپنے والد سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھیں اور بچپن ہی میں حدیث و تفسیر کی کتابیں کثرت سے مطالعہ کیں۔ ان کے والد عبدالوہاب اپنے ہونہار بیٹے کی قابلیت و ذہانت سے اس قدر متاثر تھے کہ نوعمری کے باوجود نماز میں امامت کے لیے آگے بڑھا دیتے۔ کم سنی ہی میں شادی ہوئی اور فریضۂ حج سے مشرف ہوئے۔
مدینہ منورہ میں دو ماہ قیام کے بعد وطن واپس آئے اور اپنے والد سے مزید علمی استفادہ کیا۔ یادداشتیں اور علمی کتابیں نقل کرنے میں اتنی محویت ہوتی کہ ایک نشست میں بیس بیس صفحے لکھ جاتے۔
مزید تحصیلِ علم کے لیے ١١٣٥ھ میں حجاز کا رخ کیا۔ حج بیت اللہ و مسجد نبوی کی زیارت سے فارغ ہو کر علماء کی خدمت میں حاضری دی و تحصیلِ علم میں منہمک ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں مقیم نجد کے مقام مجمعہ کے ایک مشہور عالمِ دین عبداللہ ابن ابراہیم سے استفادہ کیا۔
شیخ عبداللہ ہی کے توسط سے شیخ محمد حیات سندھیؒ (متوفی [illegible]) کے مخصوص شاگردوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ شیخ سندھی [illegible] میں حدیث کے مسلّم استاد مانے جاتے تھے۔
مدینہ منورہ سے شیخ ابن عبدالوہاب نے بصرہ کا قصد کیا [illegible] مجموعی سے حدیث و لغت کی مزید تعلیم حاصل کی۔ [illegible] جہاں ان کے والد عبدالوہاب ١١٣٩ھ / ١٧٢٦ء میں منتقل ہو چکے تھے۔
ابن عبدالوہاب بچپن ہی سے [illegible] مائل تھے۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی حساس دل دیا تھا۔ ردگرد کی [illegible] اخلاقی اور مذہبی انحطاط کے احوال دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوتے۔ مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھیؒ سے استفادہ کے بعد حدیث پر گہری نظر ہوئی تو انہیں [illegible] اور بدعات کا ایک سیلاب نظر آیا۔ رسول کریمؐ کے حجرۂ مبارک کے [illegible] شرک و بدعات والی حرکات کی وجہ سے کافی تکلیف اور ذہنی اذیت سے دوچار ہوتے۔ حریملا واپسی کے بعد بدعات کے استیصال اور توحیدِ خالص کے عام کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔
ابن عبدالوہابؒ نے اپنی دعوت اور تحریک کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی۔ ہر قسم کی عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کو مخصوص کرنے پر زور دیتے۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا بول بالا، ان کا شعار تھا۔ آپ بدوؤں سے چوری، رہزنی، مار دھاڑ کی بری عادتوں کو چھڑا کر ان میں راست بازی، نیکی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جاہلوں کے غلط عقیدوں کی اصلاح، معبودانِ باطلہ، قبروں

سے ہٹا کر پھر معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں لا کھڑا کرنا ان کا مقصود تھا۔

آپ نے بلا کسی خوف و جھجک کے توحید کی کھلے عام دعوت دی۔ غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے، قبروں اور ولیوں سے مدد مانگنے، نیکوکار بندوں کو معبود بنانے سے روکنے کی کوشش کی۔ قبروں کی زیارت میں مسنون طریقہ کے خلاف جو بدعتیں رائج ہو گئی تھیں ان کو مٹانے کے لیے اقدامات اٹھانے شروع کیے تو مخالفت کا ایک طوفان امڈ آیا۔ اعزہ و اقارب درپے آزار ہو گئے۔ خود ان کے والد کو بھی بیٹے کی یہ ادا پسند نہ آئی لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور عارض کے تمام قصبات حریملا، عُیَینہ، درعیہ، ریاض وغیرہ میں آپ کی دعوت و تحریک متعارف ہونا شروع ہوئی۔ والد ماجد کی سرد مہری کے باعث اس دعوت کی رفتار سست رہی۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں والد کے انتقال کے بعد دعوت و تبلیغ میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ اب آپ علی الاعلان اتباعِ سنت اور ترکِ بدعات کا وعظ کرنے لگے۔ حریملا کے کچھ لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر پرجوش معاون بن گئے۔ شیخ ابن عبدالوہابؒ کی مشہور تالیف "کتاب التوحید" اسی زمانے میں لکھی گئی۔

آپ نے اس دوران محسوس کیا کہ سیاسی انتشار دعوت میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ کیونکہ ناحیۃ (سب ڈویژن) تک کے اقتدار کے لیے سردار آپس میں دست و گریباں ہیں۔ آپ نے پورے نجد کو ایک امیر اور جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ امیر عُیَینہ عثمان بن معمر نے آپ کی دعوت کو قبول کیا تو آپ عُیَینہ منتقل ہو گئے۔ وہاں عثمان کی بھتیجی جوہرہ بنت عبداللہ سے آپ کی شادی ہوئی جس کے ذریعے امیر عُیَینہ سے تعلقات مزید مستحکم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اہلِ عُیَینہ کے دل آپ کی دعوت کی طرف مائل ہونے لگے۔

شیخ نے اس اثنا میں بدعات کے لعض اڈوں کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس علاقے میں لعض درختوں کی توقیر ہوتی تھی۔ آپ نے ان درختوں کو جڑوں سے کٹوا دیا۔ زید بن خطاب (جو جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے نام سے جبیلہ میں ایک قبر پر قبہ بنا ہوا تھا۔ آپ نے اس قبہ کو ختم کیا۔ قیامِ عُیَینہ کے دوران نمازِ جماعت کے احیاء اور ناجائز ٹیکسوں کی جگہ زکوٰۃ کے نظام کا احیاء آپ کی کوششوں سے ہوا۔ اس دوران درعیہ کے لوگ بھی آپ کے حلقۂ دعوت میں شریک ہوتے گئے۔ عُیَینہ میں ایک زانیہ عورت کو سنگسار کرنے کی حد کے نفاذ سے لعض دشمنوں کو آپ کے خلاف منظم تحریک چلانے کی سبیل ملی۔ اسی مخالفت نے آپ کو عُیَینہ چھوڑ کر درعیہ منتقل ہونے پر مجبور کیا۔ کیونکہ امیر عثمان آپ کے دشمنوں کے دباؤ اور لالچ میں آ گیا تھا۔

درعیہ میں آپ اپنے ایک شاگرد احمد بن سویلم کے ہاں ٹھہرے۔ درعیہ کے امیر محمد بن سعود سے رابطہ قائم ہوا۔ امیر آپ کی دعوت سے بہت متاثر ہوا۔ امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ دونوں کے درمیان آئندہ اقدامات کے بارے میں ایک معاہدہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۱۵۷ھ یا ۱۱۵۸ھ کا ہے۔ درعیہ کے قیام اور امیر محمد بن سعود کی نیک نامی نے دعوت کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کر دی۔ درعیہ کی کئی معزز شخصیات نے شیخ کی دعوت قبول کی۔ دعوت کی روز افزوں مقبولیت سے ابن معمر اپنے رویّہ پر پشیمان ہوا اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کی۔ شیخ نے درعیہ میں وعظ و درس کے حلقے قائم کیے۔ قیامِ درعیہ کے دوسرے سال امیر عُیَینہ نے آ کر بیعت کی اور اپنے علاقہ میں حدودِ شرعیہ کے نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اہلِ حریملا نے بھی بیعت کی۔

امیر محمد بن سعود اور ان کے جانشین عبدالعزیز بن محمد بن سعود (م ۱۱۷۹ھ

۱۷۶۵ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد منصب امارت پر متمکن ہوئے) شیخ کی ہدایات پر مکمل طور پر عمل کرتے تھے۔ درعیہ میں زکوٰۃ اور خمس کا نظام نافذ تھا۔ امیر عبدالعزیز نے ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ریاض کو فتح کیا۔ ریاض کی فتح کے بعد شیخ نے اپنی تمام تر توجہ تعلیم و تدریس پر مرکوز کر دی۔ کیونکہ شیخ کو امیر عبدالعزیز پر کافی اعتماد تھا اور وہ بھی شیخ کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔

عیَینہ، حریملا، درعیہ اور عارض کے دوسرے قصبوں میں دعوت کی قبولیت کے بعد شیخ نے دُور دراز شہروں کے علماء، امراء اور قضاۃ کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے۔ دعوت پر لبیک کہنے والوں اور اس کی حمایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز صنعاء (یمن) کے مجتہد المنظر عالم امیر محمد بن اسماعیل (متوفی ۱۱۸۲ھ) تھے۔ شیخ کی دعوت پا کر اپنا مشہور وجد آفرین قصیدہ لکھا جو اہلِ علم میں بہت مقبول ہوئے۔ شیخ کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب (متوفی ۱۲۰۸ھ) جو والد کے انتقال کے بعد حریملا کے قاضی تھے، اوّل اوّل اپنے بھائی کی دعوت کے خلاف تھے۔ انھوں نے شیخ کی دعوت کے رَدّ میں رسالے لکھے۔ جن میں "الصواعق الالٰہیۃ فی الردّ علی الوہابیۃ" کو اب بھی محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک کے مخالف استعمال کرتے ہیں۔ ۱۱۹۰ھ میں سلیمان نے اپنے بھائی سے گزشتہ رویّہ اور مخالفت کی معذرت کر لی۔

تمام مزاحمتوں کے باوجود آپ اپنی دعوت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ خاندانِ سعود کی سیاسی ہمدردیاں اور تعاون ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت، بہت تھوڑے عرصہ میں کافی حد تک دوسرے علاقوں میں متعارف ہوتی چلی گئی۔

خاندانِ سعود سے آپ کا جو تعلق قائم ہوا تھا وہ آپ کے بعد آپ کی اولاد اور خاندانِ سعود کی اولاد میں مستقل چلتا آ رہا ہے۔ سعودی عرب کی حکومت میں آلِ سعود اور آلِ شیخ مشترکہ طور پر حکومت کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ آلِ شیخ (محمد بن عبدالوہاب کی اولاد) مذہبی امور کی مکمل نگران ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وفات شوال یا ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ/جون یا جولائی ۱۷۹۲ء میں ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کی دعوت کو آپ کی اولاد نے بڑے احسن طریق سے حجاز اور نجد کے علاقوں تک پہنچایا۔ آپ کے چار بیٹے حسین، عبداللہ، علی اور ابراہیم تھے۔ ان میں حسین (متوفی ۱۲۲۴ھ) بڑے تھے اور شیخ کے بعد ان کے جانشین تھے۔ درعیہ کی قضا پر مامور رہے۔ حسین کے بیٹوں میں سے علی (متوفی ۱۲۸۰ھ۔ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے) نے علم و فضل کے میدان میں کافی شہرت پائی اور سعود بن عبدالعزیز، عبداللہ بن سعود، ترکی اور فیصل بن ترکی، مختلف امیروں کے عہد میں عہدۂ قضا پر مامور رہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے دوسرے بیٹے عبداللہ بھی ایک بہت بڑے عالم اور صاحبِ تصنیف شخصیت تھے۔ المختصر شیخ کی اولاد اور شاگردوں میں سے ہر ایک علم کے میدان میں بہت بلند رہے اور ہر دَور میں دینی اور علمی خدمات میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ ان میں سے کئی حضرات نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تصانیف میں، کتاب التوحید، الاصول الثلاثۃ و ادلتہا، کشف الشبہات من التوحید، شروط الصلوٰۃ و ارکانہا، اربع قواعد، اصول الایمان، کتاب فضل الاسلام، کتاب الکبائر، نصیحۃ المسلمین۔

اس کے علاوہ آپ نے سورۃ فاتحہ اور قرآن کی لعض دوسری صورتوں کی تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ سیرت النبیؐ پر ایک ذاتی تصنیف کے علاوہ سیرت ابن ہشام اور ابن القیم کی زاد المعاد کی تلخیص بھی لکھی تھی۔ کتاب التوحید کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں فتح المجید زیادہ مشہور ہے۔ کتاب التوحید اور اس کی شرح فتح المجید کا اُردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سعودی حکومت اس کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کروا رہی ہے۔

محمد بن علی بن حسینؓ

۔ (وفات ۱۱۴ھ) امام محمد باقر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ شیعوں کے آئمہ اثنا عشریہ میں پانچویں امام ہیں۔ نام محمد تھا، کنیت ابوجعفر اور لقب باقر تھا۔ امام زین العابدینؒ کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ امّ محمد، امام حسنؓ کی صاحبزادی تھیں۔ امام حسینؓ کی شہادت کے وقت ۴ سال کی عمر تھی۔ اس وقت آپ کے والد سخت بیمار تھے۔ اپنے والد کی صحبت میں رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ علم و فضل میں ممتاز مقام پایا۔ مدینہ کے آئمہ اور فقہا میں شمار ہوتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ ۱۱۴ھ میں بمقام حمیمہ انتقال فرمایا اور جنت البقیع مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے لڑکے جعفر صادق، امام ہوئے۔

محمد بن قاسم

۔ (وفات ۹۸ھ/ ۷۱۴ء)

ہندوستان کو فتح کرنے والا پہلا نوجوان سپہ سالار۔ اس نے پہلی بار برعظیم پاک و ہند کے علاقہ سندھ پر قدم رکھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی جرأت، بہادری، نرم دلی، حسن سلوک اور دانش و حکمت سے غیر مسلموں کو متاثر کیا۔ کئی ہندو اس کے ان اخلاق اوصاف سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس زمانے عرب تاجر خلیج فارس اور بحیرہ عرب کے راستے دُور دُور تک مالِ تجارت لے جاتے تھے۔ ان تاجروں میں سے بہت سے ان ہی ممالک میں آباد ہو گئے تھے۔ جزیرہ سراندیپ میں مقیم بعض عرب تاجروں کا انتقال ہو گیا۔ وہاں کا راجہ مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے ان عرب تاجروں کے اہل و عیال کو ایک جہاز کے ذریعے واپس کیا اور ولید کے دربار میں پیش کرنے کے لیے قیمتی تحائف بھی بھیجے۔

دیبل کے قریب راجہ داہر، حاکم سندھ کے سپاہیوں نے جہاز کو لوٹ لیا اور عرب عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ جب اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے گورنر حجاج بن یوسف کو یہ خبر ملی تو اس نے سندھ کے راجہ داہر کو خط لکھا کہ ڈاکوؤں کو سزا دے کر ہمارے قیدیوں کو رہا کر دو اور ان کا مال و اسباب واپس کر دو۔ داہر نے جواب دیا۔ "یہ کام سمندری ڈاکوؤں کا ہے۔ میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔"

تاریخی روایات میں آتا ہے کہ ان گرفتار شدگان میں سے ایک عورت نے حجاج کو اطلاع کی تھی اور لکھا تھا کہ ہم مظلوموں کی مدد کرو۔ حجاج نے داہر کا جواب ملنے کے بعد خلیفہ سے اجازت لے کر سندھ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ عبداللہ اسلمی ۶ ہزار کے لشکر سے سندھ پر حملہ آور ہوئے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ عبداللہ شہید ہو گئے۔ اس کے بعد بدیل بن طہفہ کو بھیجا لیکن اسے بھی اپنے ۶ ہزار کے لشکر سمیت شکست ہوئی تو حجاج نے اپنے نوجوان اور بہادر بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم، والیٔ فارس کو چھ ہزار شامی فوج کے ساتھ سندھ کی مہم پر بھیجا۔

محمد بن قاسم پہلے مکران آیا۔ چند روز وہاں قیام کر کے قنز پور (پنج گور) کی طرف پیش قدمی کی اور اسے فتح کر کے ارمابیل (ارمن بیلہ) کو مسخر کیا۔

ارمن بیلہ کے بعد دیبل پہنچ گیا اور جاتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اپنی فوج کے آگے خندق کھود کر صف آرائی کی اور منجنیق بھی نصب کر دیے۔ ان میں وہ مشہور تاریخی قلعہ شکن منجنیق (عروس) بھی تھا جسے پانچسو آدمی کھینچتے تھے۔ مسلمانوں نے مدت تک محاصرہ جاری رکھا۔ لیکن اہل شہر برابر مدافعت کرتے رہے اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

حجاج کو ان مایوس کن حالات کی اطلاع ہوئی۔ تو اس نے منجنیق سے سنگباری کرنے کے متعلق ہدایت لکھ کر بھیجی۔ جونہی اس کی تعمیل کی گئی۔ دیبل کا گنبد ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ساتھ ہی اہلِ شہر کی کمرِ ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ چند سرفروش مسلمان کمند لگا کر فصیل پر چڑھ گئے۔ حاکم نے راہ فرار اختیار کی اور مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔

محمد بن قاسم نے دیبل میں چار ہزار مسلمانوں کو آباد کیا اور ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔

دیبل سے محمد بن قاسم نے نیرون کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں کے راجہ نے صلح کر لی۔ گراں بہا تحائف پیش کیے اور مسلمانوں کی بہت خاطر مدارات کی۔

نیرون کے بعد محمد بن قاسم یلغار پر یلغار کرتا ہوا آگے بڑھتا اور راستے کے مقامات کو مسخر کرتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک دریا کو عبور کر کے سربیدس (شری ویدس) پر چڑھائی کی۔ وہاں کے حاکم نے خراج ادا کر کے صلح کر لی۔

اب محمد بن قاسم دریائے سندھ کی طرف بڑھا اور تھوڑی سی فوج سیوستان (سہوان) کو فتح کرنے کے لیے روانہ کی۔ وہاں کے باشندوں نے خراج پر اطاعت قبول کر لی۔ دریائے سندھ کو عبور کر کے محمد بن قاسم راجہ راسل کے علاقے میں پہنچ گیا۔

راجہ داہر ۴۰ ہزار سپاہیوں کی فوج کے ہمراہ، جس میں جنگی ہاتھی بھی تھے، مقابلے کے لیے موجود تھا۔ طرفین میں خونریز معرکہ ہوا جس میں راجہ داہر مارا گیا اور ۲۰ جون ۷۱۲ء/ ۹۳ھ کو محمد بن قاسم نے فتح کا پرچم لہرایا۔

اس کے بعد محمد بن قاسم شہر پر شہر فتح کرتا چلا گیا اور راور، برہمن آباد، ساوندری بسمند اور رور کو زیرنگیں کیا۔ اس مہم میں بہت سے کفار و مشرکین نے اسلام قبول کیا۔ فاتح مسلمانوں نے انتہائی رواداری سے کام لیتے ہوئے بت خانوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا۔ رور میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی۔

رور سے چل کر محمد بن قاسم نے سکہ پر قبضہ کیا۔ پھر ملتان پہنچا۔ وہاں کے راجہ گور سنگھ نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر قلعہ بند ہو گیا۔ مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے مقابلہ میں شکست کھائی۔

ملتان بدھوں کا مشہور تیرتھ تھا۔ اس لیے یہاں کے مندر میں سونے چاندی کا ڈھیر رہتا تھا۔ یہ ساری دولت مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ بلاذری کا قول ہے کہ ۸ گز لمبا اور ۱۰ گز چوڑا کمرہ سونے سے بھرا ہوا تھا۔ اسی لیے عرب ملتان کو "سونے کی کان" کہنے لگے۔ اس دوران اطلاع ملی کہ حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا ہے (۹۵ھ/ ۷۱۴ء)۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے بیلمان، سرشت اور کیرج کو یکے بعد دیگرے فتح کیا۔ اس دوران میں ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔

ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ اس نے محمد بن قاسم کو معزول کر دیا اور یزید بن ابی کبشہ کو عامل سندھ مقرر کیا۔ عراق کے والی صالح بن عبدالرحمن کے حکم پر محمد بن قاسم کو زنجیروں میں جکڑ کر واسط بھیجا گیا۔ حجاج نے صالح کے بھائی آدم خارجی کو قتل کیا تھا۔ صالح نے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ محمد بن قاسم سے لیا۔ جیل میں قید کر دیا اور وہاں ہی تکالیف و مصائب کی سختیوں سے اس کا انتقال ہوا۔

محمد بن مسلم

۔ (وفات ۱۲۴ھ) ابوبکر کنیت تھی اور دادا کے نام شہاب بن حارث کی نسبت سے ابن شہاب کے نام سے شہرت پائی۔ مدینہ منورہ کی مجلس فتاء کے مسند نشین تھے۔ قرآن کے حافظ اور دینی علوم میں ماہر تھے۔ فقہ اور حدیث پر کافی عبور تھا۔ احادیث کو حفظ کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہزارہا احادیث زبانی یاد تھیں۔ آپ کے فتاویٰ تین ضخیم جلدوں میں جمع کیے گئے ہیں۔ ۱۰۰ھ میں خلیفہ عبدالملک

نے دمشق کا قاضی مقرر کیا۔ کچھ عرصہ خلیفہ عبدالملک کے بیٹے ہشام کے اتالیق بھی رہے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی آپ کی کافی قدر و منزلت کی۔ دمشق میں وفات پائی۔

محمدؓ بن مسلمہ انصاری۔ (وفات صفر ۴۲ھ)۔

کنیت عبدالرحمٰن تھی۔ قبیلہ اوس سے متعلق تھے۔ سنِ شعور میں قبیلہ عبدالاشہل کے حلیف ہوئے۔ حضرت مصعبؓ کے ہاتھ پہ اسلام قبول کیا تھا۔ نبی کریمؐ کی مدینہ منورہ ہجرت کے بعد مہاجرین میں سے ابوعبیدہؓ بن الجراح سے رشتہ مواخاۃ قائم ہوا۔ غزوۂ بدر، غزوہ احد اور قینقاع میں شریک ہوئے۔ غزوۂ قینقاع میں کعب بن اشرف مشہور یہودی شاعر کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھیر کر آپ نے ہی قتل کیا تھا۔ کعب بن اشرف نبی کریمؐ کی اشعار میں ہجو کیا کرتا تھا۔ ایک دن نبی کریمؐ نے مسلمانوں کے ایک مجمع میں فرمایا: " من الکعب ابن الاشرف فانہ قد اذی اللہ ورسولہ "۔ "کعب بن اشرف کے لیے کون ہے؟ اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو کافی اذیت پہنچائی ہے۔" اس پر محمدؓ بن مسلمہ اٹھے اور عرض کی۔ "میں اس یہودی کا سر اتاروں گا۔" اپنے اسی عہد کو پورا کرنے کے لیے آپ نے کعب کا سر اتار کر نبی کریمؐ کے قدموں میں لاکر رکھ دیا۔

جنگ جمل اور جنگ صفین میں شریک نہیں ہوئے اور اس دوران گوشہ نشین رہے۔ آپ کی کافی اولاد تھی۔ دس لڑکے اور چھ بیٹیاں۔ نبی کریمؐ سے کئی احادیث سنی تھیں۔ لیکن کتب احادیث میں صرف چھ ملتی ہیں۔ شامیوں کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے ایک شامی نے گھر پہ آکر قتل کیا۔ شہادت کے وقت ۷۷ سال کی عمر تھی۔ جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں دفن ہوئے۔

محمد حسنؒ، مفتی۔ (وفات یکم جون ۱۹۶۱ء / ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)۔

حضرت مفتی محمد حسن قصبہ واہ (پاکستان) کے قریبی گاؤں مل پور میں ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں تاریخی مقام حسن ابدال سے ۷ میل کے فاصلہ پہ ہے۔ آپ کے والد ماجد مولانا اللہ دادؒ بھی اپنے وقت کے ایک معروف محدّث اور عالمِ دین تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے ہی میں حاصل کی۔ قرآن پاک اور ابتدائی فارسی تعلیم موضع سنگ جانی میں قاضی محمد نور سے پائی۔ عربی صرف و نحو موضع کھوڑی اور بکھڈ شریف ضلع اٹک کے عربی مدارس سے اور فلسفہ اور منطق کی تعلیم ڈھینڈہ ضلع ہزارہ کے معروف عالم دین مولانا محمد معصوم سے پائی۔ مولانا محمد معصوم امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں مدرس مقرر ہوئے تو محمد حسن کو بھی اپنے پاس ہی بلا لیا۔ یہاں پہ آپ نے بقیہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور فلسفہ وغیرہ کی تکمیل کی۔ دورۂ حدیث کی تکمیل کی طبعیت شروع سے ہی مائل بہ تصوّف تھی۔ امرتسر میں مولانا عبدالجبار غزنویؒ، مولانا نور احمدؒ اور مفتی غلام مصطفٰے قاسمیؒ جیسے اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا جو خود تصوّف و سلوک کے بھی استاد مانے جاتے تھے۔

امرتسر میں ہی مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے دو نکاح کیے۔ ان میں سے ایک بڑے بھائی کی بیوہ سے کیا تھا۔

مدرسہ غزنویہ امرتسر سے دورۂ حدیث کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ سے بھی دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ فنِ قرأۃ میں مولانا قاری کریم بخشؒ سے سند حاصل کی۔ تربیتِ باطن کے لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا تھانویؒ کی رہبری اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اور آپ کو ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ کو طریقت کے چاروں سلسلوں میں بیعت فرمایا۔ تین سال میں آپ کی محنت و ریاضت کو دیکھتے ہوئے حضرت تھانوی نے آپ کو خلعتِ خلافت عطا فرمائی۔

امرتسر میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور قیام پاکستان تک تقریباً ۴۸ سال تک جامعہ نعمانیہ میں درس و تدریس کرتے رہے۔ اس دوران باقاعدگی سے مسجد میں درس قرآن کا بھی اہتمام تھا۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور منتقل ہوئے اور نیلا گنبد کے قریب جامعہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کا نام مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام کی نسبت سے جامعہ اشرفیہ رکھا گیا۔ اور اس کا سنگِ بنیاد ۸ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ کو رکھا گیا۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے شہر کی اندرونی حدود سے ہٹ کر جامعہ اشرفیہ کی نئی عمارت کا فیروز پور روڈ پہ ۱۴ شعبان ۱۳۷۴ھ کو سنگِ بنیاد رکھا۔ اس وقت مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا عبیداللہ صاحب جامعہ اشرفیہ کے مہتمم ہیں۔ دینی تعلیم کے حصول کا اعلیٰ انتظام ہے۔ پاکستان میں جو چند دارالعلوم معیاری مانے جاتے ہیں ان میں جامعہ اشرفیہ بھی ہے۔

خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے عہد میں دستورِ مملکت کی تیاری کے لیے اسلامی بنیاد فراہم کرنے کے لیے علمائے کرام کا جو اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اس میں مفتی محمد حسن بھی شریک تھے۔

عمر بھر دین کی خدمت کرتے رہے اور یکم جون ۱۹۶۱ء کو لاہور میں وفات پائی۔

محمد حسن جان سرہندی، پیر۔ (۱۲۷۸ھ - ۱۳۶۵ھ)

قندھار (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام خواجہ عبدالرحمٰن تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجدد الف ثانیؒ تک پہنچتا ہے۔ ۱۲۹۷ھ میں آپ کے والد افغانستان سے ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہو گئے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ والد ماجد سے حاصل کیے۔ کئی دوسرے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ والد کے ہمراہ حج کے لیے گئے تو وہاں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ شیخ احمد دحلان اور شیخ الحدیث محمد ابو نصر دمشقی سے اسنادِ حدیث حاصل کیا۔

تحریکِ آزادیٔ ہند میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۲۹۶ھ میں جب افغانستان کے عوام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تو والد کے ہمراہ اس میں حصہ لیا۔ جنگِ طرابلس میں مجاہدین کی مالی امداد کی۔ تحریکِ خلافت میں بھی شریک رہے لیکن ہندوؤں سے اتحاد کے مخالف تھے۔ تحریکِ ہجرت کے بھی مخالف تھے۔

تحریکِ پاکستان کے زمانے میں صوبہ سندھ میں مسلم لیگ کے لیے کافی کام کیا۔

آپ کی تصانیف: انیس المریدین۔ انساب الانجاب۔ الاصول الاربعہ فی تردید الوہابیہ۔ طریق النجاۃ، العقائد الصحیحہ۔ لغات القرآن اور کئی دوسری۔

ٹنڈو سائیں داد (سندھ) میں آپ کا مزار ہے۔

محمد حسین آزاد، مولانا۔ (۱۸۳۲ء - ۱۹۱۰ء)

اردو زبان کے مایہ ناز انشاپرداز۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ جنہوں نے دہلی سے سب سے پہلا اردو اخبار "۱۸۳۶ء" میں جاری کیا یہ ہفت روزہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ اس جنگ میں مولوی محمد باقر گرفتار ہوئے اور بعد میں شہید کر دیے گئے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ ابراہیم ذوق کی سرپرستی میں تربیت حاصل کی۔ اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں گھر کے افراد کے ہمراہ دہلی سے نکلے۔ سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے مگر وہاں بھی ٹھکانہ نہ بن سکا کیونکہ اودھ شاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مولانا آزاد کافی عرصہ اِدھر اُدھر پھرتے رہے

۱۸۶۴ء میں لکھنؤ سے مشرقی پنجاب کے قصبہ جگراؤں میں آ گئے۔

مولوی رجب علی کی کوششوں سے ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب کے دفتر میں ایک معمولی سی اسامی پہ ۱۵ روپے ماہوار تنخواہ پہ ملازم ہوئے۔ بعد میں ماسٹر پیارے لال کی سفارش پہ اخبار "اتالیق" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

۱۸۶۵ء میں ایک سرکاری سفارت کے سلسلے میں کابل گئے وہاں سے بخارا اور ایران کا سفر بھی کیا۔ اس سفر میں فارسی زبان کے سلسلے میں قیمتی معلومات حاصل کیں۔ ان کو بعد میں 'سخندانِ فارس' کے نام سے مرتب کیا۔ درسیات فارسی کے متعلق بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۸۳ء میں "آبِ حیات" لکھی۔ اس کتاب نے بہت شہرت حاصل کی۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں مولانا آزاد کو اختلالِ دماغ کا مرض شروع ہوا۔ ۲۰ برس تک اس مرض میں مبتلا رہے اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال فرمایا۔

آپ کی درج ذیل تصانیف ہیں :۔ اُردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب قصص الہند، آبِ حیات، نیرنگِ خیال (دو حصے)، سخندانِ فارس، نگارستان (فارسی)، دربارِ اکبری، جانورستان، مجموعۂ نظمِ آزاد، نصیحت کی کرن، پھول فندپارسی، فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب، جامع القواعد، قواعد اُردو اور سپاک و نماک۔

محمد ذاکرؒ، مولانا۔ (ولادت ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۴ء - وفات

ضلع جھنگ کے معروف قصبہ محمدی شریف میں پیدا ہوئے۔ والدگرامی کا نام مولانا عبدالغفور تھا جو اپنے علاقے کے پیرانِ طریقت میں شمار ہوتے تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند گئے، وہاں سے دینی علوم میں فارغ التحصیل ہوئے۔ پیر ضیاء الدین سیالوی سے بیعت کی۔

۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۲ء میں اپنے قصبہ میں جامعہ محمدی شریف کی بنیاد رکھی۔ اس ادارہ کے ذریعہ دینی علوم کے فروغ میں مصروف ہو گئے۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں اپنے شیخ کے ہمراہ بھرپور حصہ لیا۔ انگریز حکومت کے خلاف ہر تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ اس کی پاداش میں آپ کو قید بھی ہونا پڑا۔

جب مسلم لیگ نے تحریکِ پاکستان کے بارے میں اپنے دستیر پروگرام کا اعلان کیا تو آپ اس میں ہمہ تن کام کرنے لگے۔ قیامِ پاکستان کے بعد دارالعلوم محمدی شریف پر مکمل توجہ مرکوز کر دی۔ جمعیت علمائے پاکستان سے آپ کا شروع سے تعلق رہا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اسمبلی کے اندر آپ نے نظام اسلامی کے لیے بہت جد و جہد کی۔

محمد زکریا، مولانا (۱۱ رمضان ۱۳۱۵ھ / ۱۹۰۴ء - ۱۹۸۲ء)

اس دور کے مشہور شیخ الحدیث اور تبلیغی جماعت کے سرپرست۔ کاندھلہ میں مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے چند روز بعد رمضان ہی میں آپ کے دادا مولانا محمد اسمٰعیل کا انتقال ہوا۔ آپ کے والد زیادہ تر گنگوہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاں رہا کرتے تھے۔ اڑھائی سال کی عمر میں والد کے ہمراہ گنگوہ چلے گئے۔

تعلیم کا آغاز قرآن مجید کے حفظ سے ہوا۔ ۱۳۲۸ھ تک گنگوہ میں رہے۔ اس عرصہ میں فارسی اور اُردو کی ابتدائی کتابیں وہاں ہی پڑھیں۔ اس دوران آپ کے استاذ آپ کے چچا مولانا محمد الیاس (بانی تبلیغی جماعت) تھے۔ عربی تعلیم کا سلسلہ سہارنپور آ کر شروع ہوا۔ حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد آپ کے والد مولانا محمد یحییٰ ... میں مظاہر العلوم سہارنپور کے سرپرست مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے تقاضے پر سہارنپور منتقل ہو گئے تھے۔

عربی تعلیم کے علاوہ معقولات کی کتابیں حافظ عبداللطیف، مولانا عبدالوحید سنبھلی سے پڑھیں۔ حدیث کی تعلیم کا آغاز اپنے والد سے مشکوٰۃ شریف سے کیا۔ ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث کی ابتدا ہوئی۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد اپنے والد سے ہی پڑھیں۔

شوال ۱۳۳۲ھ میں حضرت خلیل احمد سہارنپوری طویل قیام کے ... کا قصد فرما رہے تھے۔ آپ نے دوسرے اکابر و معتقدین کے ہمراہ حضرت ... سے بیعت کی۔

ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں ... وفات پائی ... حضرت سہارنپوری ... وطن پہنچ گئے۔ آپ نے بخاری، ترمذی کا درس ان سے لیا ... شروع کیا ... دوران ابوداؤد کی شرح بھی لکھنی شروع کی۔

یکم محرم ۱۳۳۵ھ کو بحیثیت مدرس مظاہر العلوم میں آ گئے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ ۱۳۳۵ھ میں مولانا عبدالرؤف کی صاحبزادی سے نکاح ہوا۔ مولانا عبدالرؤف کی دوسری صاحبزادی آپ کے چچا مولانا محمد الیاس کے نکاح میں تھیں۔ جن سے مولانا محمد یوسف پیدا ہوئے۔ اس رشتہ سے مولانا الیاس آپ کے ہم زلف بھی تھے۔ ۲۷ رمضان ۱۳۳۵ھ کو آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تدریسی زندگی کا آغاز چھوٹی کتابوں سے کیا۔ ۳۶ھ میں مقاماتِ حریری، معلقہ کی تدریس بھی شروع کر دی۔ ۳۷ھ میں ہدایہ اولین، حماسہ وغیرہ کی تعلیم

بھی دینے لگے۔ ۱۳۴۱ھ میں حضرت سہارنپوری کے حکم سے بخاری شریف کے تین پارے بھی پڑھانے شروع کیے۔ اس کے بعد مشکوٰۃ بھی پڑھانا شروع کی۔ ۱۳۴۴ھ تک مشکوٰۃ شریف پڑھاتے رہے۔ تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ ابوداؤد کی شرح بذل المجہود کی تالیف میں بھی مصروف رہے۔ ۱۳۴۳ھ اور ۱۳۴۴ھ میں بھی یہ شرح پہلی بار چھپی۔

۱۳۳۸ھ میں حضرت سہارنپوری کے ہمراہ پہلی مرتبہ حج بھی کیا۔ دوسری بار حضرت کے ہمراہ ۱۳۴۴ھ میں حج کیا۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں انھوں نے امام دار الہجرۃ امام مالکؒ کی مشہور و مقبول کتاب موطا کی شرح بھی لکھنی شروع کی۔ جو بعد میں ۶ جلدوں میں مکمل ہوئی۔

حضرت سہارن پوری اس بار مدینہ منورہ میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتے تھے انہوں نے مولانا محمد زکریا کو مدرسہ مظاہر العلوم کا شیخ الحدیث اور نائب ناظم مقرر کیا۔ اور اس کا تقرر نامہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ مدینہ منورہ سے رخصت ہونے سے قبل حضرت سہارن پوری نے چاروں سلسلوں میں بیعت و ارشاد کی عام اجازت دی۔

حجاز سے واپسی پر آپ ہمہ تن تدریس و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ ۱۳۸۳ھ میں تیسری بار حج کی سعادت ملی۔ ۱۳۸۶ھ میں چوتھی بار حج کا موقع ملا۔ ان دونوں مواقع پر آپ نے تبلیغی اجتماعات سے بھی خطاب کیا۔ تیسرے حج کے موقع پر امیر تبلیغی جماعت مولانا محمد یوسف آپ کے ہمراہ تھے۔ چوتھے حج میں مولانا محمد یوسف کے جانشین مولانا انعام الحسن کے ہمراہ حج کا اور تبلیغی سفر کیا۔ اس وقت آپ کا شمار تبلیغی جماعت کے اکابرین اور سرپرستوں میں ہوتا ہے۔ کئی تبلیغی اجتماعات سے خطاب کرنے کے لیے آپ پاکستان بھی آئے۔ اس وقت مدینہ منورہ میں مستقل قیام ہے۔

تصانیف: آپ کی تصانیف دو قسم کی ہیں۔ خالصتًا علمی و تحقیقی، دوسری عام دعوتی و اصلاحی۔

۱۔ اوجز المسالک (موطا کی شرح، ۶ جلدوں میں)

۲۔ لامع الدراری۔	۳۔ بذل المجہود
۴۔ حکایات صحابہؓ	۵۔ فضائل نماز
۶۔ فضائل رمضان	۷۔ فضائل حج
۸۔ فضائل زکوٰۃ	۹۔ فضائل تبلیغ
۱۱۔ فضائل ذکر	۱۰۔ فضائل قرآن

فضائل پر آپ کی کتابوں کا دوسری زبانوں میں خصوصی طور پر انگریزی، جاپانی اور ہندوستانی کی مقامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور دعوت و تذکیر کے لیے بہترین مجموعے تصور کیے جاتے ہیں۔

محمد سعید، حکیم (۹ جنوری ۱۹۲۰ء۔۔۔۔) طبیب، ادیب، مصنف، سیاح، ناشر، منتظم۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں آپ نے حفظ قرآن کے بعد تراویح میں قرآن سنایا۔ ۱۹۳۹ء میں آپ نے مسیح الملک حکیم اجمل خان کے قائم کردہ طبیہ کالج دہلی سے طب کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ اسی سال اپنے والد مرحوم کے قائم کردہ ہمدرد دواخانہ میں اپنے برادر بزرگ حکیم حاجی عبدالحمید کا ہاتھ بٹانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد دونوں بھائیوں نے اپنی والدہ کے تعاون سے ہمدرد دواخانے کو ایک "وقف" کی شکل دے دی۔ قیام پاکستان کے بعد حکیم محمد سعید کراچی تشریف لے آئے۔ اور یہاں ہمدرد دواخانے کو انتہائی سعی و کاوش کے بعد ایک عظیم قومی ادارہ بنایا جس کی نظیر دنیائے اسلام میں شاید ہی مل سکے۔ حکیم صاحب کو ان کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں ۱۹۶۶ء میں "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز ملا۔ ۱۹۸۳ء میں کویت فاؤنڈیشن برائے ترقی سائنس نے کویت انعام برائے طب اسلامی حکیم صاحب کو عطا کیا۔ آپ نے کچھ عرصہ صدر مملکت پاکستان کے مشیر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ کی ذاتی نگرانی میں ہمدرد دواخانہ (وقف) ہمدرد فاؤنڈیشن، طبیہ کالج، ہمدرد مطب اور ہمدرد لائبریری

حکیم حافظ محمد سعید

جیسے فعال ادارے مصروف عمل ہیں۔ "مدینۃ الحکمت" ایسا رفیع الشان منصوبہ زیر تکمیل ہے۔

آپ کے زیر ادارت جو متعدد رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ہمدرد صحت، ہمدرد نونہال، اخبار الطب، یونیسکو پیامی، ہمدرد میڈیکس، ہمدرد اسلامیکس اور میڈیکل ٹائمز بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حکیم صاحب نے ادبی سفر کی ابتدا پہلے افسانے تسبیح سے کی جو ۱۹۳۳ء میں اخبار وطن دہلی شائع ہوا۔ آپ کی تصانیف اور سفرناموں کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔ زیادہ مشہور یہ ہیں۔ یورپ نامہ، جرمنی نامہ، شب و روز، ماہ و روز، ایک مسافر چار ملک، کوریا کہانی۔ اخلاقیات نبویؐ میڈیسن ان چائنا (انگریزی)

محمد، سورۃ

مدنی سورۃ جو ۳۸ آیات اور ۴ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ نام آیت ۲ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ، سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور مشہور نام قتال ہے جو آیت ۲۰ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ سے ماخوذ ہے۔

اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اس وقت نازل ہوئی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا حکم تو دیا جا چکا تھا۔ لیکن ابھی کفار سے جنگ نہ ہوئی تھی یعنی غزوہ بدر سے پہلے نازل ہوئی۔ قریش مدینہ میں سمٹ آنے والے مسلمانوں کو چین سے بیٹھے دیکھنا کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے چاروں طرف سے معاشی مقاطعہ کی صورت پیدا کر دی تھی۔

اس سورۃ کا موضوع اہل ایمان کو جنگ کے لیے تیار کرنا اور ان کو اس سلسلہ میں مناسب ہدایات دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنی مدد اور رہنمائی کا یقین دلایا اور ان کو اللہ کی راہ میں قربانیاں پیش کرنے پر بہترین اجر کی امید دلائی گئی۔

کفار کے متعلق مسلمانوں کو بتایا کہ وہ اللہ کی تائید سے محروم ہیں۔ ان کی کوئی تدبیر مسلمانوں کے مقابلے میں کارگر نہ ہوگی۔

اس سورۃ میں منافقین کے متعلق بھی ذکر کیا گیا ہے جو جنگ کا حکم آنے سے پہلے

توبڑے مسلمان بنے پھرتے تھے مگر جنگ کا حکم آنے کے بعد کفار سے ساز باز کرکے اپنی عافیت کی فکر میں لگ گئے۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ اللہ اور دین کے سلسلہ میں منافقت کرنے والوں کا کوئی بھی عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں۔ اس سورۃ کی آیات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی قلت تعداد و بے سروسامانی اور کفار کی کثرت اور ان کے سروسامان کی فراوانی پر ہمت نہ ہاریں بلکہ اللہ کے بھروسے پر ان سے ٹکرا جائیں۔

آخر میں مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی۔

اس سورۃ میں اہل ایمان کے لیے جنت اور جنت کی نعمتوں کی بشارتیں بھی دی گئی ہیں۔ اللہ کی طرف سے نصرت کے لیے آیت ۷ میں یہ شرط لگا دی گئی: "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔"

محمد شاہ ۔ تغلق خاندان کا چھٹا فرمانروا۔ تیسرے فرمانروا محمد فیروز شاہ کے بعد تغلق خاندان کی حکومت میں انتشار بڑھتا گیا۔ اقتدار کی ہوس نے ملک کے نظم و نسق کو بھی تباہ کر دیا تھا۔

۷۸۹ھ میں سلطان فیروز خاں نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد خان کو سلطان ناصر الدین والدنیا محمد شاہ کا خطاب دے کر عنانِ سلطنت سپرد کر دی۔ خود عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد گجرات کے گورنر فرحت الملک نے بغاوت کر دی۔ سلطان محمد شاہ خود باغی گورنر کو سزا دینے کے لیے روانہ ہوا۔ اس افراتفری اور انتشار سے دارالسلطنت کا نظام بگڑ گیا۔ فوج بھی سلطان محمد شاہ کے خلاف ہو گئی۔ اور دارالسلطنت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ سلطان فیروز شاہ بھی میدانِ جنگ میں آیا۔ محمد شاہ معرکہ سے فرار ہو کر کوہِ سرمور میں روپوش ہو گیا۔ فیروز شاہ نے ناراض ہو کر عنانِ حکومت اپنے دوسرے لڑکے کے بیٹے یعنی اپنے پوتے شہزادہ تغلق شاہ بن فتح خان کے حوالے کر دی۔ یہ واقعہ ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء کا ہے۔ تغلق شاہ نے اپنے چچا محمد شاہ کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کی لیکن محمد شاہ وہاں سے نگر کوٹ چلا گیا۔ اس دوران شہزادہ ابوبکر کے حمایتیوں نے سلطان تغلق شاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ شہزادہ ابوبکر، تغلق شاہ کا حقیقی بھتیجا تھا اور اسے تغلق شاہ نے قید کیا ہوا تھا۔ اس خانہ جنگی میں تغلق شاہ مارا گیا۔ ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء میں شہزادہ ابوبکر نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس دوران محمد شاہ نے سامانہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔ زمینداروں اور اُمرا نے اس کی بیعت کی۔ فوج جمع کر کے محمد شاہ نے دہلی کی طرف سفر کیا۔ ابوبکر کی فوجوں سے مقابلہ ہوا لیکن محمد شاہ کو شکست ہوئی۔ دوسری بار حاکم قنوج اور کنپلہ کی اعانت سے شاہی فوج کا مقابلہ کیا لیکن وہاں شکست کھا کر جالیسر میں آ کر پناہ لی۔

محمد شاہ نے ملتان، لاہور اور دوسرے علاقوں کے حکمرانوں کو ساتھ ملایا۔ بعد میں ایک حملے کے ذریعے اس نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ سلطان ابوبکر مجبوراً دہلی سے نکل کر کوٹلہ میوات کی طرف چلا گیا۔ اس طرح ابوبکر کی ڈیڑھ سالہ حکومت کا اختتام ہوا اور محمد شاہ ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء کو دوبارہ تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔ کچھ دنوں بعد فیروز شاہی غلام جنہیں ہنگامے کھڑے کرنے کی عادت تھی سلطان محمد شاہ سے ناراض ہو کر کوٹلہ میوات میں معزول سلطان ابوبکر کے پاس چلے گئے۔

سلطان محمد شاہ کے بیٹے شہزادہ ہمایوں خان ایک بڑا لشکر لے کر معزول سلطان ابوبکر کی سرکوبی کے لیے کوٹلہ میوات گیا۔ مختصر جنگ کے بعد ابوبکر کو گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ میرٹھ میں قید کر دیا گیا۔ وہیں قضائے الٰہی سے وفات پائی۔

کچھ عرصے بعد سلطان محمد شاہ نے قنوج اور دلمؤ پر فوج کشی کی۔ اس کے بعد جالیسر پہنچا اور وہاں محمد آباد کے نام سے ایک قلعہ بنوا کر دہلی واپس آیا۔

۷۹۶ھ میں شیخا کھوکھر نے لاہور میں بغاوت کر دی۔ شہزادہ ہمایوں اس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی شہزادہ راستہ ہی میں تھا کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ سلطان محمد شاہ نے چھ سال سات ماہ حکومت کی۔

باپ کے انتقال کی خبر سن کر شہزادہ اس مہم کو ملتوی کر کے واپس دہلی آیا۔ سریرِ سلطنت سنبھالی، علاؤالدین سکندر شاہ کا لقب پایا لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ایک ماہ سولہ روز کی مختصر حکومت کے بعد وفات پائی۔ شہزادہ ہمایوں (علاؤالدین سکندر شاہ) کے بعد اس کا بھائی سلطان ناصر الدین محمود شاہ تختِ حکومت پر بیٹھا۔

محمد شاہ ۔ خاندانِ تغلق کا گیارھواں حکمران۔ سلطان مبارک شاہ [illegible] شہزادہ فرید بن خضر خان کا بیٹا تھا۔ لیکن مبارک شاہ نے اسے [illegible] کے قتل ہونے پر ۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء میں مبارک آباد میں تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ [illegible] سلطان مبارک کا وزیر تھا۔ سلطان مبارک شاہ نے اپنی حکومت کے آخری دنوں میں ملک سرور کی بعض کوتاہیوں کی بنا پر اسے معزول کر کے [illegible] ملک سرور، سلطان کے خلاف ہو گیا۔ بعض امرا کو ساتھ ملا کر سلطان کو جامع مسجد مبارک آباد میں قتل کروا دیا۔ محمد شاہ کے حکومت سنبھالنے کے باوجود بھی [illegible] کا کنٹرول ابھی قائم تھا۔ کیونکہ سلطنت کا سازوسامان [illegible] وغیرہ ابھی اس کے قبضہ میں تھے۔ جب ملک سرور کے [illegible] تنخواہ کے مطالبے پر کمال الدین نے ملک سرور کی سرکوبی کا فیصلہ کیا۔ [illegible] کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا۔ تین ماہ کے طویل محاصرے کے بعد [illegible] ملک سرور مارا گیا۔ اس کے کئی ساتھی قتل ہوئے اور کچھ قید کر دیے گئے۔ [illegible] سلطان محمد شاہ نے اپنے چچا مبارک شاہ کے قتل [illegible]

۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء میں محمد شاہ ملتان پہنچا [illegible] کی زیارت کی۔ انہی دنوں ملتان میں لنگاہ قبیلے نے بغاوت کر [illegible] محمود خلجی فوج لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد شاہ [illegible] لودھی کے ہمراہ اس کے مقابلے کے لیے بھیجی۔

سلطان کے بیٹے نے [illegible] محمود سے [illegible] لودھی [illegible] صلح پسند [illegible] محمود کا تعاقب [illegible] کر واپس آیا۔ سلطان محمد شاہ [illegible] فرزند کے لقب اور خان خاناں کے خطاب سے سرفراز [illegible] عطا کی اور ملک جسرتھ کی سرکوبی پر متعین کیا۔

ملک جسرتھ نے [illegible] سے صلح کر [illegible] محمد شاہ [illegible] کی سلطنت پر قبضہ کر [illegible] کی کوششیں شروع کر دیں اور فوج اکٹھی کر [illegible] ناکام رہا۔ اس دوران میں دہلی کا نظم حکومت بھی [illegible] دہلی کے [illegible] سلطان محمد شاہ کے خلاف ہو گئے۔ سلطنت کی [illegible] ایک بارہ سال کے قریب حکومت کرنے کے بعد [illegible] میں سلطان محمد شاہ [illegible] ہو گیا۔

محمد شاہ، پیر ۔ [illegible]

آپ بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیر امیر شاہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا سہروردیؒ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے ممتاز فرد حضرت دیوان فتح شاہؒ تین سو سال قبل بھیرہ میں تشریف لائے۔ انہی کی اولاد میں سے پیر محمد شاہ نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح اس علاقے میں رشد و ہدایت کے فرائض کو بڑے احسن طریقہ سے سرانجام دیا۔ حفظِ قرآن کے بعد ضروری دینی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔ آپ کی تعلیم و تربیت میں آپ کے والد کا بہت حصہ ہے۔ حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالویؒ سے بیعت ہوئے۔ حضرت خواجہؒ نے آپ کی محنت و ریاضت سے متاثر ہو کر اجازت و خلافت سے نوازا۔

علوم دینیہ کی ترویج سے آپ کو فطری لگاؤ تھا۔ آپ نے مدرسہ تدریس القرآن اور ایک پرائمری سکول قائم کیا ۱۹۲۵ء میں ایک بڑی درسگاہ "دارالعلوم محمدیہ غوثیہ" کے نام سے جاری کی۔ اس درسگاہ میں مختلف اوقات میں کئی فاضل اساتذہ تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں آپ نے بڑی گرم جوشی سے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد آزادیٔ کشمیر کی جنگ میں اپنے پچاس مریدین کے ہمراہ شرکت کی۔ آپ کی اولاد میں سے دو صاحبزادے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ نے ان کی تربیت میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دی۔ ان میں سے ایک جناب پیر کرم شاہ صاحب ہیں دوسرے ڈاکٹر غلام حمید شاہ ہیں۔ پیر کرم شاہ نے جامعہ ازہر سے دینی علوم کی تکمیل کی ہے۔ اس وقت وہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کو جدید طریقے سے چلا رہے ہیں اور سینکڑوں طلباء اس دارالعلوم سے علوم دینیہ کی تکمیل کر چکے ہیں۔ پیر کرم شاہ، ایک دینی رسالہ "ضیائے حرم" کے مدیرِ اعلیٰ بھی ہیں۔ آپ نے 'ضیاء القرآن' کے نام سے ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔

پیر محمد شاہ کا انتقال ۴ شعبان ۱۳۷۶ھ / ۲۶ مارچ ۱۹۵۷ء کو ہوا۔ آپ کا مزار بھیرہ میں ہے وہاں ہر سال باقاعدہ عرس ہوتا ہے۔

محمد شریف قادری، مولانا۔ (وفات ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء)

کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام مولانا عبدالرحمٰن تھا۔ جو خود ایک بہت بڑے عالم تھے۔ دینی علوم کی تکمیل اپنے والد سے ہی کی۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے اور حضرت بریلویؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ آپ کو فقیہہ اعظم کہا جاتا تھا۔ آپ کے بھائی محمد امام الدین قادریؒ بھی حضرت بریلوی سے بیعت تھے اور اُن کے خلیفہ تھے۔ مولانا محمد بشیر آپ کے بیٹے ہیں اور ایک نامور عالم دین ہیں۔

امرتسر سے آپ نے الفقیہہ کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ جاری کیا۔

اُردو، فارسی، عربی میں عمدہ شعر کہتے تھے۔

تصانیف: اربعین نبویہ۔ اخلاق العالمین۔ حنفی نماز مدلل۔ اربعین حنفیہ کتاب التراویح۔

محمد شفیع اوکاڑوی (۱۹۳۰ء ...) خطیب۔ مبلغ۔ کھیم کرن کے تجارت پیشہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک حافظ کرم الٰہی سے حفظ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے اوکاڑہ میں سکونت اختیار کی۔ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم میں منہمک ہو گئے۔ درسِ نظامی کی بعض کتب مولانا عبدالحق کیمبل پوری سے پڑھیں۔ مولانا غلام علی اوکاڑی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور سند حاصل کی۔ علامہ سید احمد سعید کاظمی سے درس حدیث لیا۔ کچھ عرصہ جامع مسجد ساہیوال میں خطیب رہے پھر کراچی آ گئے۔ کئی بار حج کر چکے ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ ہیں۔ شرقپور شریف سے فیض یافتہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں علامہ عبدالحامد بدایونی کی رفاقت میں مختلف محاذوں پر تشریف لے گئے اور مہاجرین و متاثرین کی مدد کی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کراچی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ بہت اچھے ذہین اور پُراثر خطیب ہونے کے علاوہ کامیاب مبلغ اور باصلاحیت مصنف بھی ہیں۔

محمد شفیعؒ، مفتی۔ (۲۰-۲۱ شعبان ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء — ۹-۱۰ شوال ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء)

دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ خاندانی اعتبار سے عثمانی تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا محمد یٰسین، چچا مولانا منظور احمد اور حافظ محمد عظیم سے حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں اکابر علماء، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا سید اصغر حسین سے استفادہ کیا اور علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ۱۳۳۵ھ میں بیس سال کی عمر میں تمام علوم و فنون سے فارغ ہو کر دارالعلوم دیوبند میں مدرس اور نائب مفتی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جلد ہی آپ دارالافتاء دیوبند کے نگران ہو گئے۔ ۱۳۶۲ھ تک یعنی ۲۵/۲۶ سال دارالعلوم دیوبند جیسے شہرہ آفاق دینی مرکز کے مفتی رہے۔ اس طویل مدت کے دوران آپ نے مختلف مسائل پر بڑے اہم فتاوے دیے جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کا انتخاب کئی ضخیم جلدوں میں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، عزیز الفتاویٰ اور دوسرے ناموں سے شائع ہو چکا ہے اور کچھ حصہ غیر مطبوعہ ہے۔

مفتی محمد شفیع

ابتداء میں باطنی تعلق شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے قائم رہا۔ ان کی وفات کے بعد ۱۳۴۶ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے ۱۳۴۹ھ میں مجازِ بیعت قرار پائے۔ مفتی محمد شفیعؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علمی، روحانی اور سیاسی جانشین تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں ایک عظیم دینی درسگاہ 'دارالعلوم' کی بنیاد رکھی۔ جہاں سے اب تک ہزاروں طالب علم کسبِ فیض حاصل کرنے کے بعد اندرون و بیرونِ ملک دینی اور علمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

درس و تدریس اور خدمتِ افتاء کے علاوہ قرآن و حدیث، فقہی مسائل اور تصوف و اصلاح کے اہم موضوعات پر بے شمار علمی اور دینی تصانیف مرتب

فرمائیں جن کی تعداد ۲۰۰ سے زائد ہے۔ آپ کی تصانیف میں "معارف القرآن" کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر ۸ جلدوں پر مشتمل ہے۔

حضرت مفتیؒ صاحب نے تحریکِ پاکستان میں اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے تحریکِ قیامِ پاکستان میں اپنے شیخ، مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایما پر حصولِ پاکستان کی تاریخی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی معیت میں مسلم لیگ کی حمایت میں پورے ہندوستان کے دورے کیے۔ مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں کانگرس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی حیثیت میں فتویٰ دیا، جس میں کانگرس میں شمولیت کو کفر کی حمایت قرار دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی طلبی پر دیوبند سے کراچی منتقل ہوئے اور یہاں آ کر ملک میں اسلامی دستور اور دینی تعلیم کے فروغ میں مصروف ہو گئے۔ قراردادِ مقاصد کی ترتیب و تدوین اور اس کی منظوری میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۴۹ء میں اسلامی مشاورتی بورڈ کے رکن نامزد ہوئے۔ جس کے صدر علامہ سید سلیمان ندویؒ تھے۔ علامہ سید ندویؒ اور شیخ الاسلام عثمانیؒ کے انتقال کے بعد اسلامی مشاورتی بورڈ کے صدر اور مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

۱۹۵۰ء میں لاء کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں منعقدہ جید علماء کرام کے اجتماع میں ۲۲ نکات پر مشتمل دستوری تجاویز کی ترتیب و تدوین میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں بھی عوام کے جذبات کی صحیح رہنمائی کی۔ غرضیکہ دینی اور سیاسی محاذوں پر آپ کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا رفیع عثمانی صاحب دارالعلوم کراچی کے مفتی ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مولانا تقی عثمانی دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے علاوہ دارالعلوم کے رسالہ "البلاغ" کے مدیر ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۷ء میں قائم شدہ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن ہیں۔ اُن کا شمار اس دور کے ذہین علماء میں ہوتا ہے۔

محمد شفیع، مولوی۔ (۶ راگست ۱۸۸۳ء - ۱۳/۱۴ رمارچ ۱۹۶۳ء)

پروفیسر مولوی محمد شفیعؒ قصور کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ قصور سے میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۰۴ء میں بی اے کیا۔ بی اے کے اس امتحان میں وہ پورے صوبے میں عربی اور فارسی میں اول رہے۔ انہیں کئی تمغے بھی ملے اور یونیورسٹی کا وظیفہ بھی ملا۔ اس کے بعد ایف سی کالج لاہور سے انگلش میں ایم اے کیا اور کچھ مدت سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت شروع کی۔ ۱۹۱۳ء میں ایم اے عربی کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اول رہے اور میکلوڈ عربک ریسرچ سکالرشپ پایا۔ ۱۹۱۵ء میں حکومتِ ہند سے وظیفہ لے کر انگلستان گئے اور ۱۹۱۹ء تک کیمبرج یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس دوران آپ وہاں تقریباً ایک سال استاد بھی رہے۔ ۱۹۱۹ء میں وہاں سے ایم اے عربی (بذریعہ تحقیق) کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال لاہور واپس آئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اورینٹل کالج میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک وائس پرنسپل اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۲ء تک پرنسپل رہے۔

پروفیسر مولوی محمد شفیع ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۶ء تک پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ اور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۲ء تک اور پھر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۳ء تک سنڈیکیٹ کے رکن رہے۔ اس عرصے میں آپ تقریباً سترہ سال تک اورینٹل فیکلٹی کے ڈین کے عہدہ پر بھی فائز رہے اور یونیورسٹی کے مختلف انتظامی اداروں کے سربراہ بھی رہے۔

۱۹۴۲ء میں ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رہیں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کمیٹی کے رکن رہے اور اسلامیہ کالج برائے خواتین کے اعزازی معتمد اور عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ اسلامیہ کالج کمیٹی اور انجمن حمایتِ اسلام کی جنرل کونسل کے کئی برس تک رکن رہے۔ ۱۹۵۰ء سے آپ مرکزی بزمِ اقبال کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۵۰ء - ۱۹۵۷ء میں آپ نے الندوۃ العالمیۃ الاسلامیہ منعقدہ لاہور کے ڈائریکٹر کے فرائض انجام دیے۔ آپ لائیڈن انسائیکلوپیڈیا کی مجلسِ ادارت کے رکن بھی تھے اور اس کے مختلف اجلاس میں شرکت کے لیے یورپ گئے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان کے ثقافتی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ایران گئے۔

دسمبر ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایک بار پھر آپ کی خدمات حاصل کیں اور آپ اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کی تدوین میں مصروف ہو گئے اور آخری دم تک پورے انہماک سے اس عظیم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں لگے رہے۔

۱۹۴۲ء میں برطانوی حکومت نے آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کو سراہتے ہوئے [illegible] بہادر کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۵۲ء میں آپ کو ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری دی۔ ۱۹۵۳ء میں حکومت ایران نے آپ کو نشانِ علمی (درجہ اول) دیا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کو ایک ارمغانِ علمی پیش کیا گیا جو مشرق و مغرب کے ممتاز علماء و فضلاء کے [illegible] تحقیقی مقالات پر مشتمل تھا۔ ۱۹۵۹ء میں حکومت پاکستان نے آپ کو [illegible] پاکستان [illegible] آپ اس دور کے ایک ماہر عالم تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی علمی خدمات میں [illegible] مولانا غلام رسول مہر آپ کی خدمات کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں

"پروفیسر محمد شفیع ہمارے دیرینہ کاروانِ فضل کے آخری فرد تھے جن پہ مجمعِ علوم کا لقب زیبا تھا۔ ان کے تبحرِ علمی، موزوں ذوقِ تحقیق و تنقید، جزئیات پر گہری نظر، شہرت اور ناموری سے بے نیازی، کام کی سچی لگن، غیر معمولی محنت و ریاضت اور نظم و ضبط سے ہماری قدیم علمی روایات زندہ تھیں۔ ..."

تصانیف:

(۱) نہارس العقد الفرید لابن عبد اللہ
(۲) میخانۂ عبد النبی فخر الزمانی قزوینی، فارسی متن مع حواشی و فہارس۔
(۳) تتمہ صوان الحکمۃ لعلی زید البیہقی، متن عربی مع حواشی و فہارس۔
(۴) تتمۂ صوان الحکمہ کا فارسی ترجمہ۔
(۵) مطلع سعدین پہ حواشی و فرہنگ۔
(۶) مکاتبات رشیدی۔
(۷) وولنز کومیموریشن وولیوم کی انگریزی زبان میں تصحیح و ترتیب کی۔
(۸) ایک سو سے زائد دینی و علمی مقالات اور نشری تقاریر۔

(نوٹ: یہ مضمون دائرۂ معارف اسلامیہ کی جلد اوّل سے لیا گیا ہے۔ مضمون کے ساتھ تصویر بھی وہاں سے لی گئی ہے۔ امتیاز بخاری)

محمد صدیق، مولانا۔ (۲۹ محرم ۱۱۲۸ھ - ۱۱۹۳ھ)

آپ کے والد مولانا محمد حنیف کابل سے وارد پنجاب ہوئے اور لاہور میں مستقل قیام پذیر ہوئے۔ آپ کے والد ایک عرصہ تک مسجد وزیر خاں کے امام رہے۔ محمد صدیق لاہور ہی میں پیدا ہوئے۔

پانچ سال کی عمر میں قرآن پاک کی تعلیم کا آغاز کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں قرآن حفظ کر لیا۔ وقت کے اکابر علما سے دینی علوم کی تحصیل کی۔ فقہ اور حدیث کی سند لی اور علوم معقول و منقول کا دقت نظر سے مطالعہ کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۱۷۵ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے وہاں سے شیخ یحییٰ بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سے اجازت حدیث و تفسیر لی۔ لاہور واپسی کے بعد والد مرحوم کی جگہ مسجد وزیر خان کی امامت و خطابت کے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ آپ کی کوششوں سے مسجد وزیر خاں سے منسلکہ دینی مدرسہ تھوڑے عرصہ میں ایک علمی مرکز بن گیا۔ انہی ایام میں آپ نے نبی کریمؐ کی سیرت پر "مسلک الدرر الاکمل رسل اطہر" لکھی۔ یہ کتاب موارد الکلم فیضی کی طرح بالکل بے نقط تھی۔ آپ نے اس کی تالیف و تصنیف میں صرف اٹھارہ دن صرف کیے۔

اس کے علاوہ آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف اہل علم کے لیے مشعل راہ ہیں:۔
مدار الاسلام فی علم الکلام، شروط الایمان، القول الحق فی ترک الشعر و حلق، ہدم الطاغوت فی قصۃ ہاروت و ماروت، نور صدقۃ الثقلین فی تمثال النعلین، شرح القصائد الباہرہ فی الجواز القول الخمسۃ، الظاہرہ المسمّٰی بنوع السنۃ فی التفضیح البدعۃ، ازالۃ الفسادات فی الشرح مناقب السادات، تبیض البرق فی تبیین الحق، جامع الوظائف، ہدایۃ الامام وغیرہ۔

محمد ضیاء الحق، جنرل اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے صدر۔ آپ ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ حصول تعلیم کے بعد انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے اور متعدد تربیتی کورس کامیابی سے مکمل کیے۔ قیام پاکستان کے بعد اردن میں فوجی مشن پر مامور رہے۔ یکم مارچ ۱۹۷۶ء کو جنرل ٹکا خان کے بعد پاکستان کے چیف آف اسٹاف مقرر ہوئے۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان پیپلز پارٹی اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو معزول کر کے مارشل لا نافذ کیا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں چودھری فضل الٰہی عہدۂ صدارت سے علیحدہ ہوئے تو ان کی جگہ پاکستان کے صدر بنے۔

جنرل صاحب کے دور اقتدار میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو پر نواب محمد احمد خاں قصوری کو قتل کرانے کے سلسلے میں مقدمہ چلا اور ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے عدالتی فیصلے کے مطابق ان کو پھانسی دی گئی۔ پندرہ سال کے بعد پہلی مرتبہ ۱۹۷۹ء میں اور پھر ۱۹۸۲ء میں بلدیاتی انتخابات کرائے گئے۔ جنرل صاحب کا سب سے بڑا اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ نفاذِ اسلام کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ مثلاً سرقہ، ڈکیتی، زنا، امتناع شراب، تہمت زنا اور تازیانے کی سزاؤں سے متعلق قانونِ حدود ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو نافذ کیا گیا۔

جنرل محمد ضیا الحق

۲۰ جون ۱۹۸۰ء کو ملک میں زکوٰۃ کا آرڈیننس نافذ کر کے پہلی مرتبہ زکوٰۃ کی وصولی کا نظام رائج کیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء کو وفاقی شرعی عدالت قائم کی۔ قاضی عدالتوں کا اجرا ہوا۔ معاشی نظام سے سود کی لعنت ختم کرنے کے لئے بلا سود بنک کاری کی سہولتیں پیدا کی گئیں۔ سود کی بجائے نفع و نقصان کی بنیاد پر سرمایہ کاری کا اہتمام کیا گیا۔ علاوہ ازیں جنرل صاحب نے قومی لباس اور قومی زبان کی ترویج پر بھی خصوصی طور توجہ دی اور معاشرے کو اسلامی مزاج اور تشخص دینے کی بھرپور ہمہ گیر ہمہ جہتی ناقابل کوشش کی ہے۔

محمد طیّب، قاری (۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء / ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) ممتاز عالم دین اور خطیب۔ قاری صاحب دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے اور مولانا حافظ محمد احمد کے صاحبزادے تھے۔ دیوبند میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں درس نظامی سے فارغ ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب سے خصوصی تربیت حاصل کی اور پہلے طریقت میں ان سے بیعت ہوئے۔ بعد میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے خلافت پائی۔ ۱۹۴۵ء میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے استعفیٰ کے بعد صدر مہتمم جامعہ قاسمیہ دیوبند مقرر ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند اور اس سلسلے کے برصغیر پاک و ہند کے تمام مدارس کی سرپرستی کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے خصوصی تعلق رہا۔ وہاں بارہا سائنس اور اسلام پر خطبات پڑھے۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے لیے اندرون اور بیرون ملک متعدد دورے کئے۔ آپ برصغیر کے نامور مقررین میں سے تھے۔ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔ سعودی عرب میں کئی مرتبہ عربی میں خطاب کیا۔ افغانستان میں شستہ اور شیریں فارسی میں تقریریں کیں۔ اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں کے شاعر بھی تھے اور آپ کا ایک مجموعۂ کلام "عرفانِ عارف" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

محمد عبداللہ، ٹونکی، مفتی ۔ (وفات : ۱۹۲۰ء)

ٹونک میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے انتقال کے بعد عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ عربی ادب اور اسلامی فقہ کے ایک بہت بڑے عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں آپ کا فتویٰ سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۴۴ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد وطن واپس چلے گئے۔ آپ کو شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا۔ لاہور سے واپس ہونے کے بعد کچھ عرصہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی کام کرتے رہے۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔

شرع محمدی پر چار جلدوں پر مشتمل آپ کی تصنیف اردو زبان میں ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔

محمد عبدہٗ، الشیخ ۔ (۱۸۴۹ء ۔ ۱۹۰۵ء)

مصر کے ایک نامور عالم دین۔ آپ کو مصر میں جدید فکر کا بانی کہا جاتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی کی رفاقت اور شاگردی کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔

مصر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے کیا۔ حفظ قرآن کے بعد تنتہ کے ایک مدرسہ میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اپنے چچا کے اصرار اور دباؤ سے دینی تعلیم کا یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد جامعہ ازہر میں داخل ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جامعہ ازہر کو بھی چھوڑ دیا اور اپنے طور پر مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۸۷۲ء میں سید جمال الدین افغانی مصر آئے تو محمد عبدہٗ کا ان سے رابطہ ہوا۔ سید جمال الدین افغانی کی رفاقت سے آپ کی صلاحیتوں کو جلا ملی۔ جب افغانی کو مصر سے جلاوطن کر کے پیرس بھیج دیا گیا تو شیخ عبدہٗ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ۱۸۷۶ء میں جمال الدین افغانی کے اصرار پر صحافت کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں دارالعلوم ازہر میں استاد مقرر ہوئے لیکن اسی سال اس ملازمت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ ۱۸۸۰ء میں مصر کی حکومت نے آپ کو ایک سرکاری اخبار کا مدیر اعلیٰ مقرر کیا۔ ۱۸۸۲ء میں مصر سے نکالے جانے کے بعد بیروت سے ہوتے ہوئے سید جمال الدین افغانی کے پاس قاہرہ پہنچے۔ وہاں ان دونوں نے ایک تنظیم "العروۃ الوثقیٰ" قائم کی اور اسی نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس اخبار میں جمال الدین افغانی کے افکار پیش کیے جاتے تھے۔ پیرس میں قیام کے دوران میں فرانسیسی زبان سیکھی۔ ۱۸۸۵ء میں شیخ محمد عبدہٗ بیروت جا کر آباد ہوئے۔ وہاں سے ۱۸۸۹ء میں مصر واپس آنے کی اجازت پر قاہرہ پہنچے۔ وہاں انہیں فوراً عدالت کا قاضی مقرر کر دیا گیا ۱۸۹۹ء تک آپ نے مصر میں ایک صاحب الرائے عالم دین کا مقام حاصل کیا۔

۱۸۹۹ء میں مصر کے مفتی اعظم مقرر ہوئے اور وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ آپ کے ایک فتوے نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی اور اس کی دوسرے علمائے دین کی طرف سے مخالفت بھی کی گئی۔ آپ نے عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھوں ذبح کیے گئے جانوروں کے گوشت کو حلال قرار دیا۔

۱۸۹۹ء کے بعد سے مصر میں کئی اہم اداروں کے رکن اور سربراہ بھی رہے۔ اس دوران آپ نے قرآن کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی لیکن وہ وفات تک مکمل نہ ہو سکی۔ آپ کے بعد اس تفسیر کو آپ کے قابل اعتماد شاگرد علامہ رشید رضا نے مکمل کیا۔ تفسیر کا نام "المنار" ہے۔ علامہ رشید رضا نے اپنے استاد کے انتقال کے بعد ان کے افکار کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ شیخ محمد عبدہٗ نے عوام کو اپنے افکار سے آگاہ کرنے کے لیے ۱۸۹۷ء میں "المنار" ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ علامہ رشید رضا اس کے مدیر بھی تھے۔

شیخ محمد عبدہٗ کا مشن تھا کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق ایک انقلابی شکل میں پیش کیا جائے۔ لیکن اس کی بنیاد قرآن و سنت ہی ہو۔ عربی ادب و زبان کی توسیع اور نشر و اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ شیخ عبدہٗ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ اور امام غزالیؒ کے افکار سے متاثر تھے۔ تقلید کے سخت خلاف تھے۔ ایک نئے اجتہاد کے قائل تھے اور انہی بنیادوں پر کام کرتے تھے۔ وہ قدیم فقہ کو رد کر کے نئی فقہ بنانا چاہتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں رسالۃ التوحید، الاسلام والنصرانیہ زیادہ مشہور ہیں۔

محمد علی قصوریؒ ۔ (۱۸۹۱ء ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء)

برعظیم پاک و ہند کے نامور عالم دین، سیاست دان اور وکیل مولانا عبدالقادر قصوریؒ کے صاحبزادے محمد علی قصوریؒ نے بھی اپنے والد کی طرح برعظیم میں مذہبی اور سیاسی میدان میں کافی شہرت حاصل کی۔ محمد علی قصوری، پاکستان کے نامور سیاستدان اور وکیل میاں محمود علی قصوری کے بھائی ہیں۔ محمد علی قصوری کے ایک اور بھائی مولانا محی الدین قصوریؒ نے بھی اپنے والد اور بھائی کی طرح سیاست، مذہب، اور وکالت میں نمایاں کردار ادا کیا۔

محمد علی قصوری نے قصور میں ہی میٹرک تک تعلیم پائی۔ ان دنوں آپ کے والد مولانا عبدالقادر قصوری وہاں وکالت کرتے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد سیالکوٹ سے قصور آ کر آباد ہو گئے تھے۔

میٹرک کے بعد بی اے کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے ۱۹۱۱ء میں انگلستان گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ قیام انگلستان کے دوران ہی آپ نے اپنی زندگی دینی اور ملی کاموں کے لیے وقف کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں عالم اسلام استعمار کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی مسلمان انگریزوں کے خلاف ملک کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

جولائی ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آنے کے بعد آپ نے بھی اپنے والد، بھائی اور دوسرے اکابرین ملت کے ہمراہ تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔

بعض اکابرین ملت کا خیال تھا کہ انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کر کے ہی ملک کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ انہی دنوں یہ اطلاع ملی کہ انگریز افغانستان پر بھی قبضہ کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں۔ انگریزوں کے اس منصوبے پر عملدرآمد کرنے سے پہلے ہی ہندوستان سے اکابرین نے کابل کو تحریک آزادی کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مولانا [illegible] حکیم اجمل خان، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور دوسرے لیڈروں کے مشورہ سے مولانا محمد علی قصوری نے افغانستان جانے کا فیصلہ کیا۔ کابل کے امیر عبدالرحمٰن نے آپ کو حبیبیہ کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ ان دنوں حبیبیہ کالج کی حالت نہایت ابتر تھی۔ آپ نے یہ ذمہ داری سنبھالتے ہی اصلاحی اقدامات اٹھائے اور فارسی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ امیر عبدالرحمٰن آپ کی قابلیت سے بہت متاثر تھے۔ دوسرے حکام کے مشورے سے آپ نے تعلیمی اصلاحات کا ایک خاکہ بنایا اس کے مطابق ایک نصاب تعلیم تیار کیا۔ اس منصوبے میں ایک اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ بھی تھا۔ افغانستان میں قیام کے دوران ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے لیڈروں نے کابل میں ہندوستان کی عارضی حکومت قائم کی۔ اس عارضی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، وزیر اعظم مولانا عبیداللہ سندھی اور وزیر خارجہ مولانا محمد علی قصوریؒ تھے۔ امیر عبدالرحمٰن کے بعض حواری مولانا محمد علی قصوری کے اثر و رسوخ سے بہت خائف تھے۔ انھوں نے مولانا کے خلاف امیر عبدالرحمٰن کے کان

ٹھہرے۔ کابل میں رہنا مشکل ہوگیا کیونکہ بعض سازشی لوگوں نے مجاہدین کے گروپ میں بھی انتشار پیدا کر دیا تھا۔

آپ جون ۱۹۱۶ء میں یاغستان منتقل ہوگئے۔ یاغستان سے آپ ہندوستان آنا چاہتے تھے لیکن کابل کے امیر عبدالرحمٰن کے حواریوں نے آپ کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ کیا تھا کہ ہندوستان میں بھی کئی لوگ آپ کے مخالف ہوگئے۔ سرحد کے وزیر اعلیٰ صاحبزادہ عبدالقیوم کی کوششوں سے آپ پشاور پہنچے۔

مولانا محمد علی قصوری، اُن کے والد مولانا عبدالقادر قصوری اور کسی دوسرے اکابر علماء دراصل مجاہدین بالاکوٹ جناب شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، سید احمد بریلویؒ کی تحریک کو زندہ کرنے والوں میں سے تھے۔ ان لوگوں کا شمار تحریک مجاہدین کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان کی آزادی کے لیے عسکری بنیادوں پر کام کرنا چاہتے تھے۔ انہی حالات کی وجہ سے ان کی ہمدردیاں کانگرس سے تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جب تحریک پاکستان کا غلغلہ بلند ہوا تو کانگرس سے ہمدردیاں رکھنے والے علماء اور اکابر کے لیے کام کرنے میں دشواریاں پیش آنا شروع ہوئیں۔

قیام پاکستان کے بعد ان لوگوں کے لیے عوام میں کام کرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ اپنے آبائی وطن قصور میں مقیم رہے اور زندگی کے باقی دن بھی اصلاحی اور علمی میدان میں بسر کئے۔

مولانا محمد علی قصوری انگریزی، اُردو، عربی اور فارسی کے ماہر ادیب تھے۔ امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کی تصنیفات سے خصوصی شغف تھا۔ جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آپ کی زندگی سنتِ رسولؐ کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔

۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو قصور میں وفات پائی۔

محمد علی لاہوری، مولوی۔ (دسمبر ۱۸۷۴ء — ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

احمدیوں (قادیانیوں) کے لاہوری گروپ کے بانی اور سربراہ۔

آپ کے آباؤ اجداد میں سے ایک فرد ہندو مذہب سے مسلمان ہوا تھا اور ضلع جہلم سے تارکِ وطن ہو کر موضع کھدلہ کنگرہ (ضلع جالندھر) آ کر آباد ہوگیا تھا۔ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ مولوی محمد علی کے دادا کھدلہ کنگرہ سے موضع مراد ریاست کپورتھلہ آ کر مقیم ہوئے۔ حافظ فتح الدین آپ کے والد کا نام تھا۔

مولوی محمد علی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اینگلو ورنیکلر سکول سے ہوا۔ اس کے بعد کپورتھلہ کے ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ میٹرک کا امتحان ۱۸۹۰ء میں اپنے بھائی کے ہمراہ پاس کیا۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۴ء میں بی اے کرنے کے بعد ایم اے میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی اسلامیہ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۹۶ء میں ایم اے (انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۷ء میں اسلامیہ کالج اور اورینٹل میں آ کر ملازمت اختیار کی۔

انہی سالوں میں پنجاب میں مرزا غلام احمد کی کافی شہرت تھی جو انھوں نے عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے رہنماؤں سے مناظروں کے ذریعے حاصل کی تھی۔

مولوی محمد علی نے ۱۸۹۰ء کے قریب مرزا غلام احمد کی کتاب "ازالۂ اوہام" پڑھی۔ ۱۸۹۲ء میں مرزا سے لاہور میں ملاقات کی۔ جن دنوں مولوی محمد علی اسلامیہ کالج میں پروفیسر تھے خواجہ کمال الدین بھی وہاں پڑھاتے تھے وہ مرزا غلام احمد کی تعلیمات اور دعوت سے متاثر ہو کر قادیانی (احمدی) بن چکے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں خواجہ کمال الدین کے ہمراہ قادیان گئے اور مرزا صاحب کی بیعت کی۔

۱۸۹۹ء میں وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج کی ملازمت چھوڑ کر وکالت کی پریکٹس کے لیے گورداسپور کا انتخاب کیا تاکہ قادیان کے قریب ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب سے زیادہ استفادہ کا موقع مل سکے۔ گورداسپور منتقل ہونے سے پہلے قادیان میں مرزا صاحب کے پاس ٹھہرے۔ یہ عارضی قیام طویل ہوگیا اور بالآخر مرزا صاحب کی خواہش پر قادیان میں رسالہ "ریویو آف ریلیجنز" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تاکہ مرزا کے پروگرام کو اس رسالے کے ذریعے پیش کیا جا سکے۔

انگریزی کے اس رسالہ میں آپ نے بڑے معرکۃ الآرا مضامین لکھے۔ حکیم نورالدین قادیانی (خلیفۂ اوّل) کی وفات یعنی ۱۹۱۴ء تک اس کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۰۶ء میں مرزا غلام احمد نے اپنے بعد تحریک احمدیہ کے انتظام کے لیے ایک انجمن قائم کی جس کے صدر حکیم نورالدین اور سیکرٹری مولوی محمد علی تھے۔

۱۹۰۸ء میں مرزا غلام احمد کے انتقال کے بعد احمدیہ تحریک کی قیادت حکیم نورالدین کے ہاتھ میں آئی جو اپنی وفات ۱۹۱۴ء تک مرزا صاحب کی تعلیمات کے فروغ میں بڑے سرگرم رہے اسی دوران اندرونی طور پر بعض ایسے اختلافات سامنے آنے شروع ہوئے جو حکیم نورالدین کے انتقال کے بعد زیادہ بڑھ گئے۔ نومبر ۱۹۰۸ء میں آپ کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۰۹ء میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن کا آغاز کیا۔ ستمبر ۱۹۰۹ء میں مولوی نورالدین کی تحریک پر دوسری شادی ڈاکٹر بشارت احمد کی لڑکی سے کی۔ ۱۹۱۱ء میں مرزا غلام احمد کے مشہور مضمون "اسلامی اصول کی فلاسفی" کا انگریزی ترجمہ "ٹیچنگز آف اسلام" کے نام سے کیا۔

مولوی محمد علی لاہوری

اپریل ۱۹۱۴ء میں جب مرزا محمود نے حکیم نورالدین کے بعد احمدیہ جماعت کا دوسرا خلیفہ بننے کا اعلان کیا تو آپ لاہور منتقل ہوگئے۔ آپ کے ہمراہ کئی دوسرے افراد بھی تھے جن میں خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ اور ڈاکٹر مرزا محمد یعقوب بھی شامل تھے۔ یہاں آنے کے بعد ۳۰ مئی ۱۹۱۴ء کو "احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام" کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے لاہور سے ہی جولائی ۱۹۱۳ء میں اخبار "پیغامِ صلح" کا اجراء ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں قرآن کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک کئی اور کتابیں بھی لکھیں جن میں "النبوۃ فی الاسلام" زیادہ مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں کتاب "مسیح موعود" شائع کی۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں انجمن احمدیہ نے انگریزی پرچہ "لائٹ" کا آغاز کیا۔

دوسری کئی تصانیف کے علاوہ صحیح بخاری کا اُردو ترجمہ اور شرح "فضل الباری" اور "ریلجن آف اسلام" (انگریزی) سیرت خیر البشر (اُردو) اور اس کا انگریزی ترجمہ "محمد دی پرافٹ" زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ اور میانی صاحب قبرستان میں دفن کئے گئے۔

تصانیف کی کثرت اور خصوصی طور پر قرآن مجید کا انگریزی زبان میں ترجمہ و تفسیر کی وجہ سے بھی آپ نے اپنے حلقے کے علاوہ مسلمانوں کے اہل علم طبقہ میں کافی شہرت پائی۔

مسلمانوں میں سے بعض علمار لاہوری گروپ کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں مانتے تھے۔ لیکن ۷ستمبر ۱۹۷۴ء کو حکومت پاکستان کے واضح فیصلہ کے بعد لاہوری گروپ کے لوگ بھی غیر مسلم قرار پائے۔

مولوی محمد علی اور اس کے پیروکار مرزا غلام احمد کو مسیح موعود تو مانتے ہیں لیکن ان کے دعویٰ نبوت کے متعلق یہ دلائل دیتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا تھا اور اس قسم کی باتیں مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا محمود نے ان کی طرف منسوب کی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی کتابیں جو اس کی وفات ۱۹۰۸ء سے پہلے شائع ہو چکی تھیں، میں مرزا کے نبوت کے دعوے اور اس کے لیے دلائل اور براہین کا انبار ملتا ہے جو کسی بھی ہوش مند انسان سے پوشیدہ نہیں۔ شاید محمد علی لاہوری اور اس کے پیروکاروں نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ انداز اختیار کیا تھا۔

محمدّ علی لکھوی

برعظیم پاک و ہند میں اہل حدیث مسلک کے ایک مشہور عالم دین۔ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں لکھوی خاندان کی رفیع الشان خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ لکھوی بزرگوں نے یکے بعد دیگرے ہند کے ظلمت کدوں میں غلغلہ توحید بلند کیا۔ تقریر، تدریس اور تصنیف غرضیکہ ہر ذریعہ سے دعوتِ توحید و سنت کو عام کیا۔ اسی خاندان کے چشم و چراغ مولانا محمد علی لکھوی ثم مدنی جو حافظ محمد لکھوی صاحب تفسیر محمدی، احوال الآخرت، کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن مدفون مدینہ منورہ، جنت البقیع، کے صاحبزادے تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی ضلع فیروزپور کے موضع لکھوکے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالجبار غزنوی سے حاصل کی اور جناب حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے تکمیل علوم کے بعد ۱۶ برس کی عمر میں ہی درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ برعظیم پاک و ہند اور افریقہ میں آپ کے سینکڑوں نامور تلامذہ ہیں۔

آپ علمی لحاظ سے بلند پایہ عالم دین تھے۔ زہد و تقویٰ میں اونچے درجہ پر فائز تھے۔ عبادت و ریاضت میں ان کا ذوق سلف کا نمونہ تھا۔ مولانا مرحوم نے ہند میں ہر ایسی تحریک کا ساتھ دیا جس کا بنیادی مقصد احیاءِ اسلام اور انگریز کو اس ملک سے نکالنا تھا۔ تحریک مجاہدین جس کے بانی سید اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ تھے۔ اس میں آپ نے کٹھن سے کٹھن منازل میں مجاہدین اسلام کی اعانت کی۔ تحریکِ خلافت اور تحریک کشمیر میں آپ نے بھرپور حصہ لیا۔ مولانا داؤد غزنوی کے ایام اسیری میں کافی عرصہ چینیاں والی مسجد لاہور میں خطابت اور دورۂ حدیث پڑھانے کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے موضع لکھوکے میں مدرسہ مرکز اسلام کی بنیاد رکھی جو آج بھی اوکاڑہ ضلع ساہیوال میں شان و شوکت سے جاری ہے۔ بعد ازاں ترکِ وطن کر کے مدینہ منورہ چلے گئے وہاں ۴۴ برس رسول اللہؐ کی مقدس مسجد میں قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں ایک دینی ادارہ مدرسہ سلفیہ کا وہاں اجرا فرمایا اور ۸۸ برس کی عمر میں آپ نے اس پاکیزہ شہر میں انتقال فرمایا۔

محمد عمر اچھروی، مولانا

(۱۹۰۲ء - ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۱ء)

قصور میں مولانا محمد امین کے گھر پیدا ہوئے۔ قرآن مجید والد سے پڑھا۔ علوم دینیہ مولانا صلاح الدین، مولوی محمد حسین لکھوی، مولوی عطاء اللہ لکھوی، مولوی محمد عالم سنبھل سے پڑھے۔ مدرسہ رحمانیہ دہلی میں درس حدیث کی تحصیل کی اور سند مولانا عبداللہ محدث روپڑی سے حاصل کی۔ مولانا احمد علی سہارنپوری کے تلمیذ رشید مولانا احمد علی میرٹھی سے دوبارہ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے زندگی بھر مسلک احناف کی بھرپور حمایت کی اور مسلک اہل سنت والجماعت کے تحفظ کے لیے تحریری و تقریری کوششوں میں مصروف رہے۔ آپ اہل سنت کے حق میں ایک مناظر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔

آپ نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

مقیاس حنفیت، مقیاس المناظرة، مقیاس النور، مقیاس الخلافة مقیاس الصلوٰة، مقیاس النبوة وغیرہ۔

آپ کی اولاد میں سے تینوں لڑکے بھی دینی میدان میں مصروف خدمت ہیں۔

محمد غوث (شاہ) قادری

(وفات: ۱۱۵۳ھ)

لاہور میں دہلی دروازہ اور اکبری دروازہ کے باہر لب سڑک آپ کا مزار ہے۔ آپ نے پنجاب میں سلسلۂ عالیہ قادریہ کو بہت فروغ دیا اور ہزاروں تشنگان معرفت کو رشد و ہدایت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت شاہ محمد غوث پشاور کے ایک جید عالم اور بزرگ سید حسین کے فرزند تھے۔ سید حسن کا تعلق قادری سلسلے سے تھا۔ قادریہ سلسلہ میں بیٹے و [illegible] بیعت کی اور خلافت بھی لی۔

آپ کے جد امجد سید عبداللہ، گیلان سے ہندوستان آئے تھے اور [illegible] سکونت اختیار کی تھی

دینی علوم کی تکمیل والد محترم ہی سے کی۔ ظاہری و باطنی علوم کی [illegible] علاقوں کے بزرگان دین اور مشائخ سے ملاقات کے [illegible] حضرت شاہ دولہؒ، سید بھیکہ چشتی اور عبدالغفور نقشبندی وغیرہ کئی بزرگان دین [illegible] سے استفادہ کیا۔ سلسلہ نقشبندیہ اور چشتیہ میں بھی اجازت سے سرفراز [illegible] آپ نے رسالہ غوثیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اپنے حالات [illegible] میں لکھتے ہیں: "میں تلاش حق میں لاہور پہنچا تو رات حضرت میاں میرؒ [illegible] خانقاہ میں [illegible] خواب میں حضرت میاں میرؒ نے ایک [illegible] پر عمل کرنے کو بتایا [illegible] مزید لکھتے ہیں [illegible] کا ذکر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پوتے شیخ حامدؒ سے کیا جو [illegible] دنوں لاہور میں [illegible] انھوں نے فرمایا کہ میاں میرؒ نے جو کچھ تمہیں دیا وہی تمہارے عمل کے لیے کافی ہے۔"

نادر شاہ جب ہندوستان پر چڑھائی کے لیے آیا تو [illegible] بلایا۔ آپ نے اس سے معذرت کی جس سے وہ ناراض ہوا۔ لیکن بعد [illegible] کی عظمت و بزرگی کا قائل ہو کر آپ کا عقیدت مند ہو گیا۔

محمدّ غوث گوالیاری، شیخ

(وفات ۹۷۰ھ / ۷۳-۱۵۷۲ء)

شطاریہ سلسلہ میں حاجی حمید کے مرید تھے۔ شروع میں بارہ سال تک کوہ چنار کے دامن میں سخت ریاضت کی، غاروں میں رہتے اور درختوں کے پتوں پر گزارہ

کرتے۔ ہمایوں بادشاہ ان کا بہت عقیدت مند تھا۔ ہمایوں کی شکست کے بعد شیر شاہ شیخ گوالیاری کے درپے آزار ہوا۔ شیخ نے دکن کا سفر اختیار کیا۔ اس علاقے کے سلاطین ان کے معتقد ہو گئے۔ وہاں کے ایک نامور عالم دین شیخ وجیہ الدین آپ کے پیروکار بن گئے۔ ۹۶۶ھ/۵۹-۱۵۵۸ء میں شیخ گجرات سے آگرہ چلے گئے۔ اکبر بادشاہ ان کے حلقہ میں شامل ہوا۔ لیکن بعد میں منحرف ہو گیا۔ وہاں سے شیخ محمد غوث گوالیار چلے گئے۔ وہاں ایک خانقاہ بنائی اور مستقل قیام اختیار کیا۔ آپ کی تصانیف میں رسالہ معراج نامہ، جواہر خمسہ، اوراد غوثیہ اور بحر الحیات، کلید مخازن، کنز الوحدۃ اور ضمائر و بصائر مشہور ہیں۔

محمد فاتح، سلطان۔ سلطنت عثمانیہ کا حکمران۔ سلطان مراد ثانی کے بعد تخت نشین ہوا۔ دور حکومت ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء تا ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء رہا۔

زمام سلطنت سنبھالنے کے بعد محمد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شیر خوار بھائی کو جو سردیا کی شہزادی کے بطن سے تھا آئندہ فتنہ کے خوف سے قتل کروا دیا۔

عثمانی حکمران شروع سے ہی قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے لیے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ ادھر قسطنطنیہ کا حکمران قسطنطین بھی متوقع حملہ کے پیش نظر تیاریوں میں مصروف رہا۔

۲۶ ربیع الاول ۸۵۷ھ/۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہوا۔ ایک طویل محاصرہ اور جنگ کے باوجود فتح کی کوئی صورت واضح نہ ہو رہی تھی۔ ۲۹ مئی کو محمد فاتح کی افواج نے آخری حملہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ قسطنطین مارا گیا۔ ترکی افواج نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ اس طرح سے محمد فاتح کے ذریعے مسلمانوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح کا پیمانہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ نبی کریمؐ نے ایک حدیث میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے والے کی مغفرت کا ارشاد فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومتوں میں ایسی کوششیں کی جاتی رہیں۔ ایک لشکر یزید بن معاویہؓ کی قیادت میں قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے گیا تھا۔ اس لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ بھی شامل تھے۔

سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کے قریب ایک مسجد تعمیر کروائی۔ اس مسجد کا نام جامع ایوبؓ رکھا گیا۔ قسطنطنیہ کے اس عظیم الشان معرکہ کی وجہ سے محمد فاتح کے نام سے شہرت پائی۔

۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء نے سلطان نے یونان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن قسطنطین کے دو بھائی جو وہاں باج گزار حکمران تھے انھوں نے سلطان کی فرمانبرداری قبول کر لی۔ ۸۵۸ھ میں سرویا کو زیر نگیں کیا۔ سرویا کے حکمران نے اطاعت قبول کر کے سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ ۸۶۳ھ/۱۴۵۹ء میں باقاعدہ طور پر سرویا سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔ ۸۶۴ھ میں موریا بھی فتح ہو کر عثمانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اسی طرح محمد فاتح نے بوسینا، طرابزون اور سینوپ کے علاوہ کئی یونانی جزائر کو فتح کیا۔ قسطنطنیہ کے بعد محمد فاتح کا ایک اور بڑا کارنامہ کریمیا کی فتح ہے۔ ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء میں کریمیا کی فتح ہوئی۔ کئی دوسرے علاقوں کو بھی محمد فاتح نے فتح کیا۔ اس لیے تاریخ میں ایک عظیم سلطان محمد فاتح کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ محمد فاتح کا دور حکومت فتوحات کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سلطان نے اپنے زمانے میں علوم و فنون کی بہت سرپرستی کی۔ سلطان خود مادری عربی زبان کے علاوہ فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی پر قدرت رکھتا تھا۔ خود ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔

اوٹرانٹو کی فتح کے بعد ۶ ربیع الاول ۸۸۶ھ/۳ مئی ۱۴۸۱ء کو اکیاون سال کی عمر میں وفات پائی۔ قسطنطنیہ کی تعمیر کردہ مسجد میں دفن ہوا۔

محمد فاخر الہ آبادی۔ (وفات ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء)

شاہ خوب اللہ آبادی کے بیٹے محمد فاخر علوم ظاہر و باطن کے جامع تھے۔ علوم ظاہری کی تحصیل اپنے بڑے بھائی محمد طاہر سے کی۔ ۲۱ سال کی عمر میں والد کے جانشین ہوئے ۲۸ سال کی عمر میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مدینہ منورہ میں سند حدیث شیخ محمد حیات سندھی سے حاصل کی۔ آپ کا مزار برہان پور میں شاہ عبداللطیف برہان پوری کے پہلو میں ہے۔

آپ کی مشہور تصانیف قرۃ العینین فی رفیع الدین، نور السنۃ اور درۃ التحقیق ہیں۔

محمد فاروق چڑیاکوٹی، مولوی۔ (وفات ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء)

برعظیم پاک و ہند میں عربی کے مایۂ ناز عالم۔

قاضی علی اکبر کے صاحبزادے تھے۔ علم و فضل میں اپنے معاصرین میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کو بڑے شوق سے حاصل کیا۔ فارسی کی درسی کتابیں، عربی صرف و نحو وغیرہ اپنے بھائی مولوی عنایت رسول سے پڑھیں۔ علم ہیئت مولوی رحمت اللہ فرنگی محلی سے، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے پڑھیں غرض مشہور علماء سے تحصیل علم کر کے حجاز کا سفر اختیار کیا۔ اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

عربی اور فارسی علوم ادبیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

لاہور اورینٹل کالج کے شعبہ عربی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی آپ کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔

محمد فاروق رحمانی (۱۹۰۲ء - ۱۹۸۳ء) صوفی بزرگ۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد نذیر کا بھی تعلق تصوف سے تھا۔ شاہ محمد فاروق نے اوائل عمر میں مختلف علوم میں دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ نجوم، جوتش اور علم قیافہ کے اتنے ماہر تھے کہ دہلی والوں نے ان کو "پنڈت" کے لقب سے نوازا تھا۔ آپ نے ۱۹۲۸ء میں شاہ محمد انعام الرحمٰن قدوسی، قادری، چشتی، صابری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے کراچی میں تبلیغ پذیر ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں آپ کو منصب خلافت عطا ہوا۔ تب سے کراچی ہی میں بندگان خدا کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ نے چار حج ادا کیے۔ آپ کے مرید اور خلفاء پاکستان کے علاوہ دمشق، جدہ، دہلی، ڈھاکہ اور دوسرے اہم مقامات پر خدمت خلق انجام دے رہے ہیں۔ ۱۰ اگست ۱۹۸۳ء کو کراچی میں وفات پائی۔

محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا۔ (ولادت ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۱ء - وفات ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء)

مولانا محمد قاسمؒ بچپن سے ذہین، طباع، محنتی اور سعادت مند تھے۔ تعلیم کے دوران ہمیشہ اپنے ساتھیوں میں نمایاں رہے۔ بہت چھوٹی عمر میں قرآن مجید پڑھ لیا تھا۔ آپ نے قصبہ دیوبند میں فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا مملوک علیؒ کے ہمراہ ۱۲۶۰ھ میں دہلی پہنچے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور عالم دین شاہ عبدالغنیؒ سے علوم حدیث کی تکمیل کی۔ یہی وہ دور ہے جس میں آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور اپنے آپ کو روحانی سلسلہ سے بھی منسلک کیا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ننھیالی رشتہ میں آپ کے خاندان

سے متعلق ہیں ۔ قیام دہلی کے دوران آپ کچھ عرصہ دہلی کالج میں ریاضی کا علم حاصل کرتے رہے اگرچہ آپ امتحان دیے بغیر کالج سے علیحدہ ہو گئے تھے تاہم آپ نے ریاضی میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔

آپ نے جوانی ہی میں اپنے آپ کو نیکی اور تقویٰ کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور اپنی زندگی کو ایک خاص نہج پر استوار کیا۔ آپ کے مرشد حضرت مہاجر مکیؒ کا کہنا ہے کہ "ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے"۔ ایک مرید کے لیے مرشد کا یہ خراجِ تحسین کچھ کم نہیں ۔ آپ خوش مزاج اور عمدہ اخلاق کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ سادہ اور منکسر المزاج بھی تھے ، شہرت سے گریزاں ، بڑائی سے نفور اور ریا سے کوسوں دُور تھے ۔ مسئلہ خود کبھی نہ بتاتے ، کسی کے حوالے سے بیان کرتے ۔ فتوی پہ نام لکھنا اور مہر لگانا آپ کو ناپسند تھا ، امامت سے گھبراتے اور ہمیشہ مقتدی بن کر نماز ادا کرتے ، الّا کہ ایسا کرنا ضروری ہو جائے ، مجلس میں نصیحت اور تلقین کر دیتے ورنہ باقاعدہ تقریر نہیں کرتے تھے ۔

جہادِ آزادی کا آغاز اور آپ کا حصّہ

جب سے انگریز نے ہندوستان میں قدم جمائے مختلف ہتھکنڈوں سے دوسرے مذاہب کو پامال کرنے اور عیسائیت کو پھیلانے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئیں ، اس کی مدافعت اور مزاحمت کے لیے ایک انقلابی جماعت تیار کی گئی ۔ اس جماعت میں باقاعدہ امامت کا نظام تھا ، تیسرے امام شاہ عبدالغنیؒ مقرر ہوئے ، آپ نے ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا تو آپ کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ امام مقرر ہوئے ۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتدا ہوئی تو انقلابی جماعت بھی حرکت میں آ گئی ۔ حاجی صاحب کے رفقائے کار میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ شامل تھے ۔ جہاد و حریت کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوا ۔ تو شیخ محمد تھانویؒ نے بے سرو سامانی کا ذکر کر کے جنگِ آزادی میں بھرپور حصّہ لینے سے گریز کی تجویز پیش کی ۔ مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ بے سرو سامان ہیں " حاجی صاحبؒ نے یہ فقرہ سُنا تو تڑپ اٹھے اور فرمایا کہ " الحمد للہ انشراح ہو گیا " اور جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی ۔ حاجی امداد اللہؒ امیر ، مولانا نانوتویؒ سپہ سالار ، مولانا گنگوہیؒ قاضی مقرر ہوئے ۔ اور قصبہ تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا ۔

میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ چھڑ چکی تھی ، آپؒ نے اپنے امیر کی قیادت میں جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔ تھانہ بھون بھی اس شدید جنگ کی لپیٹ میں تھا ۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا ۔ مکانات پہ مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی ۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے تھانہ بھون کا قصبہ خاکستر کا ڈھیر بن گیا ۔

آپؒ اور آپ کے رفقائے کار پہ الزام تھا کہ تھانہ بھون کے فساد میں آپؒ اور آپ کے رفقاء پیش پیش تھے ، اس بنا پہ آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے گئے ۔ اسی طرح آپ نے راہِ حق میں سنتِ یوسفیؑ کو زندہ کیا ۔

اس دَور میں مسلمانوں پہ جو جو مظالم توڑے گئے ان کا تصوّر آج بھی لرزہ طاری کر دیتا ہے ۔ علماء کو تختۂ دار پہ لٹکوانا ، بدن پر گرم استریاں پھیرنا ، سرگرم کارکنوں کی جبری جلاوطنی ، عورتوں کی عصمت دری ، بچوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک اور بوڑھوں پہ جگر پاش تشدّد ۔ یہ سب کچھ آج بھی تاریخ کا حصّہ ہے اور ناقابلِ تردید ہے ۔ ظلم و ستم کا ایک نمونہ ۔ رسّل کے الفاظ میں " مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے ان کے بدن پہ خنزیر کی چربی مَلی گئی اور پھر انہیں

جلا یا گیا ۔ "

ان شدائد و مصائب کا مقصد مسلمانوں کا خاتمہ اور انہیں بزورِ عیسائیت میں داخل کرنا تھا ۔ لیکن نتیجہ صفر رہا ، اور کسی بھی طرح انگریز مسلمانوں کی حمیّتِ دینی پست نہ کر سکا اور نہ ہی ان کے ایمان و عقیدہ کے [illegible] ایوان میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر سکا ۔ جب یہ چال بڑی طرح ناکام ہو گئی تو پھر دوسرے طریقے آزمانے شروع کر دیے ، ذہنوں کی تبدیلی ، سوچ اور فکر کی تبدیلی اور اس کے لیے علمی اور ثقافتی حربے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے حربے اکثر مؤثر اور بیشتر کارگر ثابت ہوئے ہیں ۔ اس خطرے کا احساس کرتے ہوئے انتہائی نازک دَور اور نامساعد حالات میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نتیجہ رس دماغ اور سیماب کی طرح بے قرار دل نے فیصلہ کیا اس حربے کا توڑ بھی ایسا ہونا چاہیے ۔ چنانچہ یہ احساس متحرک بنا اور دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا ، جو اسلام کا محفوظ قلعہ اور مسلمانوں کا ناقابلِ شکست حصار ثابت ہوا ۔ دارالعلوم دیوبند آپؒ کا وہ زندہ جاوید کارنامہ اور صدقہ جاریہ ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا اور جس نے آپؒ کی شخصیت کو بھی لازوال بنا دیا ۔ جب مدرسہ کے افتتاح کی خبر حاجی امداد اللہؒ کو مکہ مکرمہ میں پہنچی اور کہا گیا کہ حضرت ! ہم نے ایک مدرسہ قائم کیا ہے تو آپؒ نے فرمایا :

" سبحان اللہ ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے ۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی ہیں کہ خداوندا ! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر ، یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے ۔ " بلاشبہ دیوبند اسلام کا حصار اور بقائے اسلام کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ۔ دارالعلوم دیوبند نے جو خدمات اسلام اور تحفظ اسلام ، علوم قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت ، مسلمانوں کی نظری اور عملی تربیت کے سلسلے میں سر انجام دی ہیں وہ تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جو آئندہ نسلوں کے لیے باعثِ تقلید ہے اور اس سے علم و عمل کی دنیا میں روشنی نظر آتی ہے ۔ دارالعلوم سے منسلک [illegible] اپنے دَور کے یگانۂ روزگار عالم اور متقی ہیں ۔

سرپرستوں میں آپؒ کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ، اور مولانا [illegible] رائے پوریؒ شامل ہیں ۔ دارالعلوم کے مدرسین میں سید [illegible] محمود حسنؒ ، سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ [illegible] شخصیات شامل ہیں اور ان میں سے [illegible] یافتہ ہیں ۔

دارالعلوم سے استفادہ [illegible] تھانوی ، مولانا مفتی عزیز الرحمن ، سید مرتضیٰ حسن چاند پوری [illegible] کشمیریؒ ، مفتی کفایت اللہ دہلوی ، مولانا عبید اللہ سندھی [illegible] مدنیؒ ، مولانا مناظر احسن گیلانی ، مولانا شبیر احمد عثمانی [illegible] مہتمم دارالعلوم دیوبند) ، مولانا مفتی محمد شفیع ، مولانا محمد یوسف بنوری [illegible] تاجور نجیب آبادی ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا مفتی محمود [illegible] قومی اتحاد) جیسے ممتاز و منفرد علماء [illegible]

یوں تو مسلمان کے لیے عشقِ رسولؐ قیمتی سرمایہ ہے اور کوئی مسلمان ایسا نہیں چاہے وہ جس درجہ کا ہو جس کا دل اس نعمت سے محروم ہو ۔ آپ کی پاکیزہ زندگی ہی آپ کے عاشقِ رسولؐ ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔ تاہم [illegible] ملتے ہیں جن سے آپ کی شیفتگی اور وارفتگی کا اظہار ہوتا ہے ۔

آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو آپ کے تبحّر کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔ مولانا [illegible]

تھانوی" کہا کرتے تھے کہ اگر ان تصانیف کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے اور مصنف کا نام نہ لکھا جائے تو علماء انہیں امام رازیؒ اور امام غزالیؒ کی تصانیف سمجھیں گے متعدد موضوعات پر آپ کی کچھ تصنیفات یہ ہیں :-

۱۔ تقریر دلپذیر ـــــ اسلام کے اصولِ کلیہ پر جامع تقریر۔ (۲) تحذیر الناس۔ ختم نبوت کے موضوع پر منفرد تحقیقی شاہکار۔ (۳)۔ انتصار الاسلام ـــــ آریوں کے مقابلہ میں اسلامی فلسفہ۔ (۴) حجۃ الاسلام ـــ عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلامی اصولوں کی تشریح و توضیح۔ (۵) تحفۂ لحمیہ ـــ آریوں کے شبہات کا جواب۔ (۶) ہدایۃ الشیعہ ـــ شیعہ عقائد پر مفصل بحث، (۷) تصفیۃ العقائد ـ سر سید احمد خاں سے خط و کتابت۔ (۸) قبلہ نما ـــ نماز میں جہتِ کعبہ سے شرک کا ابہام اور اس کا شافی جواب۔

محمد مالک کاندھلوی، مولانا۔ صوبہ یوپی کے قصبہ کاندھلہ میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کے والد مولانا محمد ادریس کاندھلوی کا شمار برعظیم پاک و ہند کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا۔ والد صاحب چونکہ حیدرآباد دکن میں مقیم تھے۔ اس لیے وہاں کے زمانۂ قیام میں دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ باضابطہ تعلیم تھانہ بھون میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سرپرستی میں شروع کی۔ تھانہ بھون سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کی نسبت سے ایک خاص تعلق تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ننھیال میں آپ کے رشتہ میں تھے تھانہ بھون میں ابتدائی فارسی اور اُردو کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کاندھلہ چلے آئے اور والد کی سرپرستی میں قائم کردہ مدرسہ نصرت الاسلام میں مزید تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ ۴ سال تک اس مدرسہ میں تعلیم پائی۔ آپ کے اساتذہ میں حافظ عبدالمجید شامل تھے جو کہ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں آئندہ نصاب کی تکمیل کے لیے داخلہ لیا۔ اپنے نانا مولانا ذکریا نانوتوی کے ہمراہ اس کمرے میں قیام رہا جو مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔ حافظ عبداللطیف مہتمم مظاہر العلوم کی خصوصی شفقت اور سرپرستی میں حدیث و تفسیر کے علوم کی تکمیل کی۔ ۱۳۵۸ھ میں والد صاحب کے حکم پر دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے گئے۔ والد محترم محمد ادریس کاندھلوی اُن دنوں دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے حدیث و تفسیر اور معقولات فلسفہ علم کلام کی تکمیل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں قیام تقریباً ۳ سال رہا۔ دورۂ حدیث کے سال مولانا حسین احمد مدنیؒ تحریک آزادی کے سلسلہ میں نظر بند تھے۔ اس لیے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ سے خصوصی شفقت کی بنا پر بخاری شریف کا درس شروع کیا۔ اس کے علاوہ دارالعلوم میں حدیث کے دوسرے اسباق میں مولانا اعزاز علی صاحبؒ مولانا عبدالسمیع دیوبندی اور مولانا نافع گل سے استفادہ کیا۔ بعض سیاسی اختلافات کی بنا پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ دیوبند سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل منتقل ہوئے تو دورۂ حدیث کے چالیس سے زائد طالبعلم بھی وہاں منتقل ہو گئے۔ جامع اسلامیہ ڈابھیل کو دارالعلوم دیوبند کی طرز پر علامہ انورشاہ کاشمیریؒ نے قائم کیا تھا۔

۱۳۶۲ھ میں جامع اسلامیہ ہی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ بھی شامل تھے۔ سندِ فراغت کے بعد اس خیال سے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے کہ وہاں کچھ عرصہ تصنیف و تالیف میں گزاریں گے لیکن انہی ایام میں بہاول نگر کے ایک مدرسہ جامعۃ العلوم کے مہتمم، دیوبند آئے ہوئے تھے ان کے اصرار پر والد صاحب کی رائے سے بہاول نگر چلے گئے اور اس مدرسہ میں تدریس کا آغاز کیا۔ بعد میں اسی مدرسہ کے لیے وہاں کے لوگوں کے تقاضا پر آپ کی کوششوں سے مولانا بدر عالم بھی تشریف لے آئے۔ جامع العلوم میں تدریسی زندگی کا آغاز صحیح مسلم، ابوداؤد، تفسیر جلالین اور ہدایہ سے کیا۔ اس کے علاوہ معقولات میں قاضی مبارک اور میر زاہد جیسی کتابیں بھی پہلے سال پڑھائیں۔

۱۳۶۵ھ میں جامع العلوم کے دو سال قیام کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ارشاد پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل منتقل ہوئے اور وہاں استاذ حدیث کی حیثیت سے کام شروع کیا جہاں سے تھوڑا عرصہ قبل دورۂ حدیث کی تکمیل کی تھی۔ اس زمانے میں جامعہ اسلامیہ میں علامہ شمس الحق افغانی (سابق وزیر معارف ریاست قلات اور سابق شیخ الحدیث جامعہ بہاولپور) شیخ الحدیث تھے۔ اس دوران قیام پاکستان کی وجہ سے علامہ شمس الحق افغانی پاکستان سے ہندوستان واپس نہ جا سکے تو جامعہ اسلامیہ میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے ہمراہ دورۂ حدیث کی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے پاکستان سے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے اصرار پر آپ کے والدِ محترم خاندان کے دوسرے افراد کے ہمراہ پاکستان جا چکے تھے۔ علامہ مرحوم نے دارالعلوم دیوبند کی طرز پر پاکستان میں ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز پر کام کیا تھا۔ جسے بعد میں مولانا احتشام الحق تھانوی نے مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کی ہمراہی میں ٹنڈو الہ یار میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ۶۷ھ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہمراہ دہلی سے لاہور کا سفر کیا۔ مولانا خیر محمد جالندھریؒ، خیر المدارس ملتان میں آپ کو استاد مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی خواہش کے احترام میں آپ نے ٹنڈو الہ یار میں تدریسی ذمہ داریوں کا آغاز کیا۔ دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں زندگی کے ۲۵ سال تدریسی خدمات میں گزارے۔ والدِ محترم کے انتقال کے بعد ۱۹۷۴ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں تشریف لے آئے کیونکہ آپ کے والد جامعہ اشرفیہ میں شیخ التفسیر تھے۔ کیونکہ ایک تو جامعہ اشرفیہ کے مہتمم اور جملہ اراکین شوریٰ کا اصرار تھا دوسرے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اہلیہ محترمہ نے حکماً جامعہ اشرفیہ منتقل ہونے کو کہا تھا۔ ۱۹۷۴ء سے جامعہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

آپ کا شمار اس دَور کے نامور اور محقق علماء میں ہوتا ہے۔

تدریسی خدمات کے علاوہ آپ نے کئی کتابیں اور رسالے تصنیف کئے ہیں۔

اُردو زبان میں دو جلدوں پر مشتمل تجرید صحیح مسلم۔ اصولِ تفسیر، منازل العرفان فی علوم القرآن، پیغامِ مسیح، تاریخ حرمین، الہدایہ کی جلد ثالث اور رابع کا اُردو زبان میں ترجمہ۔

اس کے علاوہ مختلف تبلیغی رسائل بھی لکھے ہیں، ان میں اسلامی معاشرت، پردہ اور مسلمان خاتون، اور امت مسلمہ میں عظیم تفرقہ (ردّ قادیانیت میں) زیادہ اہم ہیں۔

محمد مظہر اللہ، مفتی۔ (۵ رجب ۱۳۰۳ھ/ ۲۱ اپریل ۱۸۸۶ء ـ ۱۴ شعبان ۱۳۸۶ھ/ ۲۸ نومبر ۱۹۶۶ء) دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام مولانا محمد سعید تھا۔ ۴ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو دادا محترم نے پرورش اور تربیت کی ذمہ داری سنبھالی قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد معروف علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔ مشرقی پنجاب کے معروف روحانی رہنما سید امام علی شاہؒ (متوفی ۱۲۸۲ھ

۱۸۶۵ء) کے صاحبزادے سید صادق علی شاہؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی۔ بیعت کے ایک سال بعد مرشد کا انتقال ہوگیا تو آپ کی روحانی تربیت حضرت شاہ رکن الدین (متوفی ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء) مصنف "رکن دین" نے فرمائی اور تمام سلاسل میں اجازت و خلافت سے نوازا۔

شریعت و طریقت کی منازل طے کرنے کے بعد جامع مسجد فتح پوری دہلی میں امامت و خطابت کا سلسلہ شروع کیا جو زندگی کے آخری وقت تک جاری رہا۔

آپ نے تحریکِ خلافت میں بھی حصہ لیا اور چھ ماہ تک تحریک کے سیکرٹری بھی رہے۔ تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا اور مسلم لیگ کے مؤقف کی مکمل حمایت کی۔

تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظم اور لیاقت علی خان آپ کے بہت قریب رہے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی ہی میں رہنا پسند فرمایا۔ اس فیصلہ میں جامع مسجد فتح پوری کے ذریعے ہندوستان میں دینِ اسلام کو بلند رکھنے کا عزم تھا۔

انتقال کے بعد جامع مسجد فتح پوری کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔

محمد معصوم، شیخ
(۱۰۰۹ھ - ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ)

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے صاحبزادے جو حضرت مجدد کے دوسرے خلیفہ بھی تھے۔ علوم دینیہ کی تحصیل والد سے ہی کی۔ سولہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مقام قطبیت اور منصب قیومیت کی بشارت اپنے والد بزرگوار سے ہی پائی۔ اسی لیے آپ کو قیوم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

آپ کی نسبت مشہور ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا معتقد تھا۔ آپ نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں رشد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ اورنگ زیب نے ان کے ارشادات کو بڑی توجہ سے سنا۔ آپ کا ایک اور مشہور معتقد نواب مکرم خان تھا جو پہلے لاہور کا گورنر تھا۔ پھر سب کچھ ترک کر کے شیخ کی خدمت میں رہنے لگا۔ خواجہ محمد معصوم کا ایک اور مشہور مرید فارسی شاعر ناصر علی سرہندی تھا۔ آپ کا مزار سرہند میں ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے شاہجہان کی بیٹی روشن آرا نے تعمیر کرایا تھا۔

محمد مہدی، امام
اہلِ شیعہ کے بارہویں امام جن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بچپن میں ہی ناسازگار حالات کی وجہ سے غائب ہوگئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ امام مہدی کے دوبارہ ظہور کی وجہ سے امتِ مسلمہ میں بیسیوں افراد نے مختلف زمانوں میں مہدی ہونے کا دعوےٰ کیا اور خود بھی گمراہ ہوئے اور امت میں بھی گمراہی پھیلائی۔ نیز دیکھیے: "مہدی"۔

محمد یوسف بلگرامی، سیّد
(یکم شوال ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۵ء - ۲ جمادی الآخر ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء)

آپ کے والد کا نام سید محمد اشرف بلگرامی تھا۔ سید عبدالجلیل کے نواسے اور حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ علوم دینیہ کے نامور عالم دین تھے۔

ابتدائی درسی کتابیں سید علی محمد بلگرامی سے پڑھیں۔ لغت اور سیرتِ رسولِ کریمؐ اپنے نانا سے پڑھیں۔ علوم ریاضیہ کی تکمیل دہلی کے اساتذہ سے کی۔ سید لطف اللہ بلگرامی سے بیعت ہوئے۔ عربی اور فارسی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں "الفرع الثابت من الاصل الثابت" توحید کے موضوع پر اہم کتاب ہے۔

محمد یوسف، سیّد
عربی زبان کے نامور استاذ۔

۲۱ مئی ۱۹۱۶ء کو بھوپال کے ایک معزز اور ممتاز علمی و دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا احسان حسنین بھی علم دین و دنیا و ادب کا ایک خزانہ تھے۔

محمد یوسف صاحب نے علی گڑھ سے عربی و فارسی میں امتیاز کے ساتھ ایم اے کیا۔ پھر یگانہ روزگار استاد علامہ عبدالعزیز المیمنی کی زیرنگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اردو عربی اور انگریزی میں بیک وقت تحریر و تقریر میں اپنی مثال آپ تھے۔ شعر و شاعری میں بھی بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کے پسندیدہ شعراء میں دورِ جاہلیت اور اسلام کے زمانے کے مشہور عرب شعراء شامل ہیں۔ اردو کے شعراء میں میر، غالب، مومن، خواجہ درد، اصغر اور جگر کے بڑے قائل تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد علامہ عبدالعزیز المیمنی نے اپنے اس نامور شاگرد کو کراچی بلایا اور وہ یہاں جامعہ کراچی کے شعبہ عربی کے تقریباً سولہ سال استاذ اور سربراہ رہے۔ پاکستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی آپ کے مقام کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ مشرق وسطیٰ میں آپ کو امام اللغۃ العربیہ [illegible]

محمد یوسف فرنگی محلی، مفتی
(وفات ۱ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۷۰ء)

اپنے وقت کے ممتاز اور فاضل علماء میں سے تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد شہر لکھنؤ کی عدالت دیوانی میں عہدۂ افتاء پر فائز ہوئے اور [illegible] سے اپنے فرائض کو لکھنؤ کی حکومت کے خاتمہ تک انجام دیا۔ اس کے بعد جونپور کے مدرسہ میں تدریس کی خدمات شروع کیں۔ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے [illegible] علیل ہوگئے اور وہاں ہی انتقال فرمایا اور حضرت حسنؓ کے قبہ کے قریب دفن ہوئے۔ آپ کے ممتاز شاگردوں میں عربی کے نامور استاد مولوی محمد فاروق چریاکوٹی [illegible]

آپ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علمائے فرنگی محل میں سے مفتی محمد یوسف [illegible] نے ہنومان گڑھی کے جہاد میں مولوی امیر الدین کی تحریک پر حکومت [illegible] پر سخت نقصان پہنچایا اور مولوی عبدالرزاق فرنگی محلی کو جہاد سے باز رکھنے [illegible] خلاف فتویٰ دیا۔

محمد یوسف، مولانا
(۵ جمادی الاوّل ۱۳۳۵ھ [illegible] - ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ/ [illegible] ۱۹۶۵ء)

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاسؒ کے فرزند جو اپنے والد کے انتقال کے بعد تبلیغی جماعت کے امیر بنے۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز خاندان کے معمول کے مطابق قرآن [illegible] سے ہوا۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ تجوید قرآن قاری معین [illegible] گیارہ سال کی عمر میں اپنے والد سے مدرسہ کاشف العلوم بستی نظام الدین میں عربی [illegible] شروع کی۔ صرف و نحو کی کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم [illegible] کر دیے گئے۔ اس وقت آپ کے والد حج کے لیے جا رہے تھے۔ مظاہر العلوم میں مولانا ذکریا گنگوہی اور مولانا جمیل احمد تھانوی آپ کے استاد تھے۔ ان سے [illegible] والد صاحب کی حج سے واپسی کے بعد بستی نظام الدین [illegible] مسلم شریف پڑھی۔ جلالین مولانا احتشام الحسن کاندھلوی سے پڑھی [illegible] مولانا محمد یوسف نے رواۃ صحابہ و تابعین کی تحقیقات کا کام شروع کیا۔

۱۳۵۴ھ میں دوبارہ مظاہر العلوم میں داخل ہوئے اور صحاح اربعہ وہاں پڑھیں صحیح بخاری مولانا عبداللطیف سے، صحیح مسلم مولانا منظور احمد خاں سے، جامع ترمذی مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری سے، سنن ابی داؤد، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سے پڑھیں۔ آپ کے بعد تبلیغی جماعت میں آپ کے جانشین مولانا انعام الحسن بھی آپ کے ساتھ شریکِ درس تھے۔ تعلیمی سال کے اختتام سے پہلے علالت کی وجہ سے نظام الدین آنا پڑا۔ صحاح اربعہ کا بقایا حصہ، صحاح ستہ کی باقی دو کتابیں ابنِ ماجہ اور نسائی اور شرح معانی الآثار، طحاوی اور مستدرک بھی مولانا انعام الحسن کے ہمراہ اپنے والد مولانا الیاس سے پڑھیں۔

۲ محرم ۱۳۵۴ھ کو مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر آپ کا نکاح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی بڑی صاحبزادی سے ہوا۔ نکاح مولانا حسین احمد مدنیؒ نے پڑھایا۔ رخصتی تقریباً ایک سال بعد ہوئی۔

مولانا محمد الیاس تبلیغ و دعوت کے کام کو غیر ممالک میں متعارف کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی خیال سے ۱۳۵۶ھ میں سفرِ حج کا ارادہ کیا۔ مولانا محمد یوسف بھی والد کے ہمراہ تھے۔ اس سفر میں مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، مولانا انعام الحسن اور کئی دوسرے حضرت بھی ساتھ گئے۔ حجاز میں تبلیغی کام میں اپنے والد کے ہمراہ آپ نے بھی بھرپور حصہ [illegible] ایک اجتماع میں آپ نے عربی میں تقریر کی جس سے سامعین پر بہت [illegible] مولانا محمد یوسف کو شروع میں تبلیغ و دعوت کے کام کی نسبت مطالعہ کتب [illegible] تصنیف و تالیف کا زیادہ شغف تھا۔ ۱۳۵۵ھ میں امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی شرح امانی الاحبار کے نام سے لکھنی شروع کی۔ یہ تین جلدوں میں تھی، دو جلدیں مکمل ہو کر طبع ہو گئیں۔ تیسری جلد زیرِ تالیف تھی کہ وقت موعود آ گیا۔ اس لیے [illegible] آپ کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا یوسف بھی اسی درد اور تڑپ سے [illegible] سرگرمیوں میں حصہ لے جس درد اور تڑپ سے وہ خود تبلیغ و دعوت [illegible] تھے۔ والد محترم کی موجودگی میں آپ نے تبلیغی جماعتوں کے ساتھ کئی سفر کیے [illegible] دعوت سنائی، کئی اجتماعات سے خطاب کیا۔ اس کے باوجود آپ کا تبلیغی کاموں سے [illegible] نہ ہو سکا جو آپ کے والد چاہتے تھے۔

رجب ۱۳۶۳ھ میں آپ کے والد سخت بیمار پڑ گئے اور بیماری میں شدت [illegible] تو ان کی جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد زکریا، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور نعمانی اور کئی دوسرے اکابر علماء اور تبلیغی جماعت کے بزرگوں کے مشورے سے مولانا محمد یوسف کو جانشین مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا۔

۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ کو اپنے والد کے انتقال کے بعد آپ نے تبلیغی کاموں کو بڑے احسن طریقہ سے سنبھالا۔ زندگی بھر اندرون ہندوستان، پاکستان اور حجازِ مقدس میں مختلف تبلیغی سفر کیے، اور کئی اجتماعات سے خطاب کیا۔ پاکستان میں تبلیغی جماعت کے مرکز رائے ونڈ بھی کئی بار تشریف لائے۔ آپ کی بھرپور جدوجہد سے تبلیغی جماعت کا کام مسلم ممالک سے نکل کر غیر مسلم ممالک انگلینڈ، جاپان، فرانس، جرمنی اور دوسرے ممالک میں متعارف ہونا شروع ہوا۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے دورے پر تشریف لائے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے کئی شہروں کے دورے کے بعد ۲۱، ۲۲، اور ۲۳ مارچ کو رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لیے پہنچے۔ اجتماع کے خاتمہ کے بعد کچھ دن رائے ونڈ میں قیام رہا۔ اس کے بعد لاہور تشریف لائے اور لاہور میں آ کر علیل ہو گئے۔ تکلیف کافی بڑھ گئی۔ آخر جمعہ کے روز ۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو لاہور ہی میں انتقال فرمایا۔ آپ کی میت نظام الدین (دہلی) لے جا کر دفن کی گئی۔ آپ کے بعد مولانا انعام الحسن تبلیغی جماعت کے امیر مقرر ہوئے۔

آپ کی زندگی اتباعِ سنت کا مکمل نمونہ تھی۔ عجز و انکسار آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ والد کے جانشین ہونے کے وقت سے لے کر انتقال کے وقت تک آپ نے تبلیغ و دعوت کے لیے جو جہدِ مسلسل کی اس کے بیان کے لیے ہزارہا صفحات کی ضرورت ہے۔ تبلیغی کاموں میں حد درجہ مصروفیت کی وجہ سے اپنے ابتدائی شوق یعنی تصنیف و تالیفِ کتب میں بہت کمی آ گئی۔ پھر بھی آپ نے عربی زبان میں حیاۃ الصحابہؓ کے نام سے ایک بہترین تصنیف مکمل کی۔ اس تصنیف میں دعوتی رنگ نمایاں ہے۔ اس کتاب کا اردو اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

محمّدیہ۔ مسلمانوں میں سے چند گروہوں نے اس نام کو اختیار کیا۔ شیعہ مسلک سے متعلق گروہ خصوصی طور پر اس نام کو اپنے لیے استعمال کرتے رہے۔ کیسانیہ (مختاریہ) کے ایک گروہ نے اس وجہ سے خود کو کیسانیہ سے الگ کر لیا کہ وہ امامت و خلافت کے لیے اولادِ علیؓ (حضرت فاطمہؓ کے سوا دوسری ازواج سے) کو بھی قبول کر لیا۔ ان میں سے ایک گروہ منصوریہ کا سرکردہ ابو منصور عجلی تھا جسے خلیفہ ہشام کے دور میں (۱۲۵ھ / ۷۴۳ء) عراق کے گورنر یوسف بن عمر نے معزول کر دیا تھا۔

ابو منصور کو امام جعفر صادقؒ نے بھی اس کے عقائد اور نظریات کی وجہ سے رد کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ محمدؐ کا خاندان جنت ہے اور شیعہ زمین ہیں۔ خود کو جنت میں سے زمین پر آنے والا ایک حصہ قرار دیتا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے خصوصی کرم و عنایات سے جنت کی طرف ایک سفر کے دوران بعض چیزیں سکھائی تھیں۔ ابو منصور کے بعد یہ گروہ بھی مختلف حصوں میں بٹ گیا۔

انڈونیشیا میں انقلابی "مسلم آرگنائزیشن" کے پیروکار بھی خود کو محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اس تحریک کی بنیاد مصر اور برصغیر میں اسلامی تحریکوں کی طرز پر جکارتہ میں حاجی احمد دہلان نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو رکھی تھی۔

محمود احمد رضوی (۱۹۲۴ء ...) عالمِ دین آگرہ میں پیدا ہوئے۔ علامہ ابوالبرکات کے فرزند ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم رضا تک پہنچتا ہے۔ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف آپ کے جدِ امجد علامہ سید دیدار علی شاہ نے قائم کیا تھا۔ علامہ محمود احمد رضوی نے بھی تمام علوم کی تکمیل اور دورۂ حدیث اسی دارالعلوم سے کیا۔ اسی ادارے میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ دارالعلوم کے جملہ انتظامی امور کی نگرانی آپ کے سپرد ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوت میں اپنی ذاتی مشین پر پمفلٹ چھاپ کر فوج اور پولیس کے نوجوانوں کو تحریک کی افادیت سے آگاہ کیا۔ اسی طرح ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ سیاسی طور پر جمعیت علمائے پاکستان سے متعلق ہیں۔ آپ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ ماہنامہ رضوان آپ کے زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے۔ آپ نے بہت سی کتب بھی لکھی ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہیں۔ فیوض الباری (شرح صحیح بخاری)، برکاتِ شریعت۔ جامع الصفات۔ شانِ مصطفےٰ۔ دینِ مصطفےٰ، رزقِ حلال۔ روحِ ایمان۔

محمود اوّل۔ (وفات ۲۷ صفر ۱۱۶۸ھ / ۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء) مملکتِ عثمانیہ کا سلطان جس کا دورِ حکومت ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء تا ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء تک رہا۔

سلطان احمد ثالث کے تخت سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد باغیوں اور اعیانِ سلطنت نے سلطان مصطفےٰ ثانی کے لڑکے اور سلطان احمد ثالث کے بھتیجے محمود کو تخت

بر بیٹھا یا۔ چند ہفتوں تک محمود نام کا سلطان رہا اور نظام سلطنت پر کنٹرول سلطان احمد ثالث کے خلاف بغاوت کرنے والے باغیوں کے ہاتھ میں رہا۔ سلطان محمود نے تھوڑے عرصہ میں دارالحکومت میں پائے جانے والی اندرونی شورش کو ختم کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کیا۔

اس دوران ایران سے جنگ شروع ہوگئی۔ ایران کے شاہ طہماسپ نے عثمانی فوج کی فتوحات کی وسعت سے خوفزدہ ہو کر صلح کی درخواست کی۔ ۱۰ جنوری ۱۷۳۲ء کو ان دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس کی رُو سے کچھ مفتوح علاقے ایران کو واپس ہوئے اور کچھ پر عثمانی فوجوں کا قبضہ رہا۔ شاہ طہماسپ کی طرف سے سیستان، آذربائیجان، مازندان اور خراسان کے حاکم نادر خان نے اس معاہدہ کی مخالفت کی اور طہماسپ کو معزول کر کے اس کے لڑکے عباس کو تخت پر بٹھایا اور خود مدارالمہام بن گیا۔ اس نے صلح کے معاہدہ کو منسوخ کر کے بغداد پر حملہ کیا اور بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ نادر خان زخمی ہوا۔ بعد میں بھی ایرانی اور عثمانی فوجوں میں کئی معرکے ہوئے، اور ان میں عثمانی فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس دوران یکم دسمبر ۱۷۳۵ء کو نادر خان خود ایران کا بادشاہ بن بیٹھا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۷۴۶ء کو دونوں حکومتوں کے درمیان قسطنطنیہ میں صلحنامہ کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ سلطان محمود کو اس کے بعد کے عرصہ میں کئی اندرونی شورشوں اور بیرونی معرکہ آرائیوں سے واسطہ پڑا۔

۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء کو سلطان محمود کے انتقال کے بعد اس کا بھائی عثمان تخت نشین ہوا۔ سلطان محمود نے اپنے دورِ حکومت میں قسطنطنیہ اور کئی دوسرے صوبوں میں شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جامعہ نورِ عثمانی بھی سلطان محمود نے شروع کرائی تھی۔

محمود شاہ بیگڑہ۔ (۱۴۵۸ء - ۱۵۱۱ء)

اصل نام فتح خان۔ احمد شاہ بادشاہِ گجرات کا پوتا۔ شاہ داؤد کا بیٹا۔

امراء نے شاہ داؤد کو معزول کر کے فتح خان کو "محمود شاہ" کے لقب سے گجرات کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۴۶۱ء میں مالوہ کے سلطان محمود خلجی نے نظام شاہ بہمنی کے علاقے پر حملہ کیا تو محمود بیگڑہ نے محمود خلجی کو مار بھگایا۔ ۱۴۶۷ء میں جونا گڑھ کے راجا منڈلک پر حملہ کیا۔ اگلے دو سالوں میں سوات پر قبضہ کر لیا۔ ۱۴۷۰ء میں کچھ کے ہندو راجا کو شکست دی۔ ۱۴۷۳ء میں کاٹھیا واڑ کے ساحل پر دوارکا کے سامنے بحری لڑائی میں بحری قزاقوں کو تباہ کر دیا۔ دوارکا کے راجا بھیم کو گرفتار کر لیا اور احمد آباد لے جا کر قتل کر دیا۔ ۱۴۸۲ء میں چمپا نیر پر حملہ کیا۔ ۱۵۰۷ء میں ترکی کے سلطان نے پرتگیزوں کی سرکوبی کے لیے زبردست بحری بیڑہ بھیجا تو محمود بیگڑہ نے سلطان کے بیڑے کی مدد کی۔ اس مشترکہ حملہ سے بمبئی کے جنوب کول میں پرتگیزوں کو شکست ہوئی۔ مگر ۱۵۰۹ء میں انھیں کمک پہنچ گئی۔ پرتگیزیوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے جہاز جلا دیے اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ یہ تجارت مکمل طور پر اب پرتگیزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

سلطان محمود بیگڑہ ایک رحم دل، عادل اور علم پرور بادشاہ تھا۔ اس کا شمار گجرات کے نامور بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مظفر شاہ ثانی کے لقب سے اس کا جانشین ہوا۔

محمود حسن دیوبندیؒ۔ (۱۲۶۰ھ/۱۸۵۱ء - ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء)

بریلی کے ایک نامور عالمِ دین مولانا ذوالفقار علی کے ہاں پیدا ہوئے۔ مولانا ذوالفقار علی کو عربی ادب سے خصوصی شغف تھا۔ دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کی شرح "تسہیل الدراسۃ" اور "تسہیل البیان" ان کی بہترین علمی تصانیف ہیں۔

محمود حسن کی تعلیم کا آغاز چھ سال کی عمر میں ہوا۔ قرآن مجید کا کچھ حصہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی عبداللطیف سے پڑھیں۔ فارسی کی باقی کتابیں اور ابتدائی عربی کتب اپنے چچا مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔ ابھی آپ قدوری، تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں ایک مدرسہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو قائم کیا۔ اس مدرسہ کا آغاز دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں ہوا۔ محمود حسن اس مدرسہ کے پہلے طالب علم تھے۔ ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز، میبذی، مختصر معانی کا امتحان دیا۔ آئندہ سال مشکوٰۃ، ہدایہ، مقامات پڑھیں۔ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستّہ اور دیگر کتب مولانا قاسم نانوتوی سے پڑھیں۔

۱۲۸۹ھ میں آپ نے اسی مدرسہ میں بطور معین مدرس خدمات انجام دینا شروع کیں۔ پہلے ابتدائی کتابیں پڑھانے کی ذمہ داری تھی لیکن رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور ذہانت ظاہر ہونے لگی۔ اور اوپر کی کتابیں بھی پڑھانے پر مامور کیے گئے۔ ۱۲۹۳ھ میں آپ نے ترمذی شریف، مشکوٰۃ اور ہدایہ وغیرہ کی تدریس دینا شروع کی۔ ۱۲۹۵ھ میں صحیح بخاری بھی پڑھانے لگے۔

۱۲۹۴ھ میں دوسرے اکابرین کے ہمراہ جن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شامل تھے۔ حج بیت اللہ کے لیے سفر کیا۔

شاہ عبدالغنی دہلوی ان دنوں مدینہ منورہ میں مقیم تھے ان سے اجازت حاصل کی۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ واپس آنے پر حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت حاصل کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا نانوتوی کا انتقال ہوا اور اس سانحہ کے تیسرے دن مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ نے بھی وفات پائی۔

مخدوم استاد کی وفات کے حادثہ نے مولانا محمود حسن کو بالکل [illegible]۔ ۱۳۰۵ھ میں آپ مدرسہ میں صدر مدرس کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔ یہ مدرسہ برعظیم پاک و ہند میں قرآن و سنت کے علوم کا ایک مرکز بن گیا تھا اور دارالعلوم دیوبند کے نام سے معروف تھا۔ اس کا صدر مدرس ہونا ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ ۳۴ سال یعنی اپنی وفات تک (۱۳۳۹ھ) صدر مدرس رہے۔ گویا کہ طور پر آپ نے اس دارالعلوم میں ۴۴ سال تدریسی خدمات انجام دیں۔

آپ کے شاگردوں میں سے ہر فرد شہرت و عظمت کی بلندیوں تک پہنچا جن میں سے چند مشہور شخصیات یہ ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔

آپ کی علمی خدمات کے علاوہ سیاسی خدمات بھی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں شروع کی گئی تحریک آزادی نے آپ کے [illegible] بڑھایا۔ آپ نے تحریک کا مرکز کابل کو بنایا اور آپ کی تحریک ریشمی رومال تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ آپ بھی کئی دوسرے مسلم اکابرین کی طرح عسکری بنیادوں پر مسلمانوں کو منظم کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انگریزوں کی سازشوں [illegible] یہ تحریک بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی نئی روح پھونک دی۔ اس سلسلے میں آپ نے ۱۳۳۳ھ میں حجاز مقدس کا سفر کیا۔ ۱۳۳۴ھ تک وہاں رہے۔ ۱۳۳۵ھ کے آغاز میں یعنی ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو آپ کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ ۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو وہاں سے رہا ہو کر ہندوستان واپس پہنچے۔ ان دنوں ہندوستان میں تحریک خلافت کا زور تھا۔ آپ نے عمر کی زیادتی، نقاہت اور بیماری کے باوجود اس میں بھرپور حصہ لیا۔ مالٹا کی اسیری کے دوران ہی آپ زیادہ بیمار ہو گئے۔ وطن واپسی پر بیماری میں افاقہ نہ ہوا۔ بیماری کے باوجود

تحریکِ خلافت میں آپ کی بھرپور جدوجہد اور مشقت سے صحت پہ کافی اثر پڑا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ/ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا۔

آپ کو قوم اور ملت کی طرف سے "شیخ الہند" کا خطاب ملا تھا۔ اسی وجہ سے "شیخ الہند" کے نام سے معروف ہوئے۔

حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ نے درس و تدریس اور سیاسی مشاغل کے باوجود کئی کتب تصانیف فرمائی ہیں۔ مالٹا کی اسیری کے دوران آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کیا اور حواشی سورۃ النساء تک لکھے تھے۔ باقی حواشی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل کیے۔ اس ترجمہ و حواشی کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ترجمہ و حواشی فارسی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بخاری، ترمذی اور ابوداؤد پہ بھی آپ نے حواشی لکھے ہیں۔

محمودیہ

۶۰۰ھ۔ ایران کے علاقہ مسجوان جو گیلان کا موضع ہے، میں ۶۰۰ھ میں ایک شخص محمود احمد گیلانی نے ایک نیا فرقہ منظم کیا جسے مؤرخین نے واحدانیہ اور محمودیہ کے نام سے قلمبند کیا۔ یہ شخص حلول و تناسخ کا مبلغ تھا اور عرب و عجم پہ سابقہ آویزش کی بنا پر عجم کو عرب پہ بالا و برتر سمجھتا تھا۔ اس نے دعوے کیا کہ محمدؐ صرف عرب کے لیے رسول تھے اور میں عجم کے لیے ہوں۔ میرا درجہ محمدؐ سے افضل بلکہ تمام انبیاء سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس نے دعوے کیا کہ محمدؐ سمیت تمام انبیاء کی روحیں اس کے جسم میں حلول کر چکی ہیں اور قرآن مجید میں یہ آیت "عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا" کا مصداق میں ہوں۔ اس نے جو فرقہ مرتب کیا اس کے بعض عقائد یہ ہیں۔

- آدم سے قیامت تک کا ایک دور ۸ ہزار سال کا ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو گی تو قیامت آئے گی اور اس کے بعد پھر نیا آدم آئے گا۔
- پہلی پیدائش میں امام حسینؓ حضرت موسیٰؑ کے روپ میں تھے اور یزید فرعون کی صورت میں۔ اور دوسری پیدائش میں موسیٰؑ امام حسینؓ بن گئے اور فرعون یزید بنا۔
- کعبہ و قبلہ کی کوئی اہمیت نہیں عبادت صرف سورج کی کرنی چاہیے اور سورج کی پرستش کے وقت مخصوص دعائیں جو محمود پہ نازل ہوئیں پڑھی جائیں۔

یہ فرقہ اب بھی موجود ہے اس کے سرکردہ علماء کو امین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ایران کا شاہی خاندان جس میں شاہ عباس کا نام خاص طور پہ لیا جاتا ہے اس فرقہ کا امین مشہور رہے۔ درویش صفا اور درویش بقا بھی اس فرقہ کے روحانی مدارج ہیں۔ کچھ مورخین نے خواجہ حافظ شیرازی کو بھی اس فرقہ کا مقلد لکھا ہے، لیکن حافظ کی تعلیمات عملاً اس کی نفی کرتی ہیں۔

- مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں میر شریف نامی ایک شخص کی طرف سے قائم کردہ ایک مذہبی گروہ۔ میر شریف بنگال میں ایک اعلیٰ فوجی عہدہ پہ فائز تھا۔ میر شریف خود کو محمود بوساخوان کا متبع اور جانشین کہلاتا تھا۔ محمود نے تیمور کے زمانے میں "امام مہدی" ہونے کا اعلان کیا۔ محمود اپنے بارے میں یہ الفاظ بھی کہتا تھا کہ وہ قرآن کی اس آیت کی رو سے مقامِ محمود پہ فائز ہونے والا شخص ہے۔

"قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پہ فائز کرے" (سورہ بنی اسرآئیل آیت ۷۹)

محمودیہ کے عقائد یہ تھے: انسان اپنے وقتِ تخلیق سے ہی بہتری کی طرف ارتقاء کرتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ ایک "مقامِ محمود" پہ پہنچ جاتا ہے۔

ایران کے بادشاہ شاہ عباس نے محمود اور اس کے پیروکاروں کو اپنے علاقوں سے نکال دیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے ان کو اپنی مملکت کے نظام میں اعلیٰ عہدوں پہ فائز کیا۔

مختار ثقفی

شیعان علیؓ کا ایک سردار جس نے بعد میں ایک فرقہ کی بنیاد رکھی۔

یہ فرقہ مختاریہ یا کیسانیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مختار ثقفی نے کربلا کے میدان امام حسینؓ کی شہادت کے بعد دشمنانِ اہل بیت کے خلاف کوفہ اور قرب و جوار کے لوگوں کو منظم کیا۔ اس نے شمر، عمرو بن سعد اور اس کے دو بیٹوں کو قتل کروایا۔ بالستان پر قبضہ کر لیا اور خود خلافت کا مدعی بن بیٹھا۔ اس وقت دمشق میں عبدالملک بن مروان حاکم تھا اور مکہ میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ حکومت کرتے تھے۔

مختار ثقفی نے مکہ پہ حملہ کیا لیکن امام زین العابدین کی مداخلت سے اس کے لشکر کو واپس جانا پڑا۔ پھر اس نے عبدالملک کے ایک سپہ سالار عبید اللہ بن زیاد کے لشکر کو کوفہ کے قریب شکست دی۔ اور کوفہ پہ قبضہ کر لیا۔ اس نے ابن زبیر کو قتل کروا دیا۔ حاکم بصرہ معصب بن زبیر (حضرت عبداللہ بن زبیر کے بھائی) نے فارس کے حاکم مہلب کو کوفہ پہ حملہ کرنے کے لیے کہا۔ گھمسان کے معرکہ میں مختار ثقفی کے لشکر کو شکست ہوئی۔ گرفتار ہو کر مارا گیا۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

(۷۰۰ھ/ ۱۳۰۰ء - ۷۸۵ھ/ ۱۳۸۴ء)

ہندوستان میں خانوادہ سادات بخاری کے ایک نامور بزرگ۔ آپ کا مزار اُچ شریف میں ہے۔ آپ سید احمد کبیر کے فرزند تھے۔ آپ کے دادا سید جلال الدین سرخ بخارا سے ہجرت کر کے ملتان پہنچے اور بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے مرید اور خلیفہ ہوئے اور اپنے شیخ کی اجازت سے اُچ شریف (ضلع بہاولپور) میں سکونت اختیار کی۔ ان کے تین بیٹے ہوئے۔ ایک سید احمد کبیر، دوسرے سید بہاؤ الدین اور تیسرے سید محمد۔

مخدوم جہانیاں کی پیدائش بروز جمعرات ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ/ ۱۹ جنوری ۱۳۰۸ء کو ہوئی۔ آپ کے بھائی سید صدرالدین راجو قتال نے بھی کافی شہرت پائی۔

آپ کا بہت سا زمانہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ اس لیے آپ کو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کہتے ہیں۔ آپ نے عرب، مصر، شام، عراقین، بلخ و بخارا کی سیر کی اور اس دوران میں ۳۶ حج کیے اور متعدد بزرگوں سے فیض پایا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا شیخ صدرالدین سے خرقہ حاصل کیا۔ پھر ملتان جا کر شیخ الاسلام رکن الدین ابوالفتح کے پاس علومِ ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ حضرت چراغ دہلی کے بھی مرید تھے۔ مکہ معظمہ میں آپ نے بہت سا وقت امام عبداللہ یافعی کی صحبت میں گزارا اور مدینہ منورہ میں دو سال قیام کر کے سید المحدثین شیخ عفیف الدین عبداللہ المطری سے عوارف المعارف اور سلوک کی دوسری کتابیں پڑھیں اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔ مشہور ہے کہ آپ کو چودہ خانوادوں میں بیعت کی اجازت تھی اور آپ جس کسی سے معانقہ کرتے اس سے فیض اخذ کر لیتے۔ یعنی جس سالکِ راہ سے سابقہ پڑتا۔ اس پر اتنی توجہ کرتے اور اس کی اس طرح خدمت کرتے کہ وہ بے اختیار ہو کر اپنی نعمتیں آپ کے سپرد کر دیتا۔

اپنے زمانے میں آپ کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ سلطان محمد تغلق نے آپ کو شیخ الاسلام کا منصب اور علاقہ سیلوستان میں خانقاہ محمدی اور مضافات کی سند عطا کی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آپ نے سب کچھ ترک کر دیا اور حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ فیروز تغلق بھی آپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے ٹھٹھہ کا محاصرہ کیا تو اگرچہ وہ اس سے پہلے سندھیوں کے ہاتھ سے سخت تکلیف اٹھا چکا تھا اور اس کا دل ان کے خلاف غصے اور جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا اس نے مخدوم جہانیاں کی سفارش پر انہیں بالکل معاف کر دیا اور کوئی سزا نہ دی۔

حضرت مخدوم جہانیاں جس ہمت و استقلال کے ساتھ دوسرے سہروردی بزرگوں کی طرح اپنے اثر و رسوخ کو حاجت مندوں کی مطلب براری کے لیے صرف کرتے تھے۔ اس کی سیر العارفین میں ایک دلچسپ مثال درج ہے۔ شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ فیروز تغلق کا وزیر خان جہان تلنگی شروع شروع میں حضرت کا مخالف تھا۔ اس دفعہ اس نے ایک نولیندہ کے بیٹے کو کسی بات پہ قید کر لیا اس کا باپ حضرت مخدوم جہانیاں کے پاس پہنچا اور آپ خان جہان کے پاس سفارش کے لیے گئے۔ لیکن اس نے اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ نہ میں شیخ سے ملوں گا اور نہ اس کی سفارش مانوں گا۔ اس کو کہہ دو کہ میرے دروازے پر نہ آئے۔ کہتے ہیں کہ شیخ ۱۹ مرتبہ خان جہان کے دروازے پر گئے اور ہر دفعہ یہی جواب سنا۔ انیسویں مرتبہ خان نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ اے سید کیا تم میں ذرا بھر بھی غیرت نہیں کہ میں نے اتنی مرتبہ جواب دیا ہے اور تم پھر بھی چلے آتے ہو۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے جواب دیا کہ اے عزیز میں جتنی مرتبہ آتا ہوں اس کا ثواب مجھے مل جاتا ہے لیکن ایک مظلوم کا مقصد پورا نہ ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مظلوم کو تمہاری قید سے رہائی دلواؤں تاکہ اس کا نیک اجر تمہیں ملے۔ یہ سن خان جہان کا دل نرم ہوا وہ باہر آیا حضرت شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا۔ اور ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔ آپ کے حالات میں کئی کتب تصنیف ہوئیں۔ مثلاً خزانہ جلالی، تاریخ محمدی، مناقب قطبی۔ آپ کے ملفوظات کی دو جلدیں الدرر المنظوم فی ملفوظ مخدوم کے نام سے اردو ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہیں۔

آپ کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پہ شدت سے عامل تھے اور دوسرے سہروردی بزرگوں کی طرح غیر شرعی امور پہ سختی سے ملامت کرتے۔ الدرر المنظوم میں بعض جگہ حضرت مخدوم کے ہاتھ پہ ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے۔ ایک جگہ گجرات کے ایک راجپوت کا ذکر ہے جو حضرت کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور جسے آپ نے تعلیم دے کر گجرات اس لیے بھیجا کہ "اپنے گھر والوں اور قوم کو مسلمان کرے۔

مغربی پنجاب کے جن قبیلوں نے آپ کے ہاتھ پہ اسلام قبول کیا۔ بہاول پور کے سرکاری گزٹیئر میں ان کی فہرست ہے۔ ان قبیلوں کی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے۔ اور ان میں کھرل راجپوتوں کا مشہور اور بڑا قبیلہ بھی شامل ہے۔ آپ کا فیض ہندوستان کے سب علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کے خلفاء میں سے آپ کے بھائی راجو قتال کے علاوہ لکھنؤ کے شیخ قوام الدین، ایرج کے شیخ یوسف بدھ اور دہلی کے کئی بزرگوں کے نام لیے جاتے ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ/ ۳ فروری ۱۳۸۴ء کو ہوا۔

مداریہ (۸۴۰ھ)۔ صوفیا کے اس گروہ کا بانی شاہ مدار تھا۔ جو ۱۳۱۵ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۳۶ء میں ایک سو اکیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ قصبہ مکن پور (یوپی) میں ان کا مزار موجود ہے۔ دیگر صوفیا نے اس گروہ کو غیر شرعی حرکات کی وجہ سے ناپسند کیا ہے۔ بلکہ شاہ مدار کے پیروکاروں کی حوصلہ شکنی کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ صوفیا کے اس گروہ کا زیادہ تر اثر بنگال میں رہا۔ جہاں انہی کے نام پہ بڑے بڑے قصبے اب بھی آباد ہیں مثلاً مدار گنج، مداری پور، مدار کا دائرہ اور مدار جھنڈا کلی وغیرہ مشہور ہیں۔ شاہ مدار کے ایک خلیفہ شیخ الّا اپنے عہد میں بڑے مشہور تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے شریعت کے ظاہری احکامات پر عمل ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا تھا۔ ہندوؤں کے یوگ کی طرح تصوف میں برہنگی کا نیا تصور پیش کیا اور ہمیشہ ننگے رہتے۔ ستر پوشی کے لیے صرف ایک لنگوٹی باندھتے تھے۔ جسم کے بال کٹوانا ان کے ہاں معیوب تھا۔ یہ لوگ جہاں بھی جاتے جلوس کی شکل میں جاتے اور جہاں قیام کرتے وہاں کے باشندوں سے جبراً اپنی خوراک حاصل کرتے۔ اگر بستی کے لوگ ان کی ضروریات فراہم کرنے سے انکاری ہوتے تو یہ لوگ بستی کو لوٹ لیتے اور آگ لگا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا کمپنی نے ان کو تحریری مراعات دے دی تھیں اور لوگوں کو ان کی ضروریات پوری کرنے کا پابند بنایا تھا۔

مدائن۔ مدینہ کی جمع۔ لغوی معنی شہر۔ عربوں نے قدیم ایران کے دارالسلطنت کو مدائن کا نام دیا۔ کیونکہ یہ شہر کئی شہروں کا مجموعہ دکھائی دیتا تھا۔ مدائن دریائے دجلہ کے کنارے آباد شہر تھا اور ساسانیوں کا سرمائی دارالحکومت تھا۔ اس کا قدیم نام طیسفون تھا اور سلوکیہ کا شہر بھی اس میں شامل تھا۔ ایک مسلمان مصنف نے اسے سات شہروں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ یہاں ساسانیوں کا معروف محل "ایوانِ مدائن" یا "طاقِ کسریٰ" موجود تھا جس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ ان کا شمار عجائباتِ روزگار میں ہوتا ہے۔

مدائنِ صالحؑ۔ مدائن کا وہ تاریخی کنواں، جہاں اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو "ناقۃ اللہ" کہہ کر اپنا نشان قرار دیا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر اس طرح ہے: "یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور اب اس کے پانی پینے کی باری ہے"۔

مدثریہ ۱۰۳ھ۔ ایک فرقہ جس کا بانی حسین تھا۔ اس نے اپنا نام تبدیل کر کے احمد رکھ لیا۔ اس کے باپ نے بھی مہدی ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ احمد کے منہ پہ ایک داغ تھا۔ اس داغ کو وہ اپنے حامیوں کے سامنے دکھاتا اور کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ میری امامت کا نشان مقرر کیا ہے اس کے متبعین اسے صاحب الشامہ کہتے تھے وہ خود کو مہدی امیر المومنین کہلواتا تھا۔ اس کی تائید و حمایت میں اس کا چچیرا بھائی عیسیٰ بن مہدی بھی آملا۔ اس نے اپنا نام عبد اللہ بن احمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادق مشہور کر دیا۔ اور یہ عقیدہ پھیلایا کہ عبد اللہ کی روح اس میں حلول کر چکی ہے اور وہ امام منتظر ہے۔ دعوے دونوں کے مختلف تھے۔ لہٰذا صاحب الشامہ اس کے حق میں دستبردار ہو گیا اور اس نے اعلان کیا کہ میری امامت اس کے آنے تک مشروط تھی۔ عبد اللہ کے آنے پہ میں اس کا داعی ہوں۔

عبد اللہ نے دعوےٰ کیا کہ قرآن مجید میں مدثر کا جو لفظ آیا ہے اس کا مخاطب میں ہوں کیونکہ امام اپنے عہد کا رسول ہوتا ہے جس طرح محمدؐ اپنے زمانے کے مدثر تھے ان کے بعد اس کے مخاطب علیؓ ہوئے۔ پھر ان کی اولاد مخاطب رہی۔ اس وقت میں ہوں۔ چنانچہ اس کے گرد بھی جمعیت فراہم ہو گئی۔ مدثر نے اپنا لشکر فراہم کر کے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ اہل دمشق نے اس سے صلح کر لی۔ پھر اس کی فوجوں نے حمص و حماۃ فتح کر کے وہاں اپنا خطبہ پڑھا۔ یہاں سے وہ سلمیہ پہنچا اور سلمیہ میں آباد ہاشم کو جو دعوت اسماعیلیہ میں مصروف تھے قتل کرا دیا۔ اس خونریزی کے بعد عباسی خلیفہ مکتفی نے لشکر بھیج کر اس کا قصہ تمام کر دیا۔ زکرویہ خاندان اس جنگ میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ مگر اس کے عقائد بعد تک قابل قبول رہے۔

مدرسہ۔ وہ ادارہ جہاں مذہبی یا دنیوی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ کی مختلف قسمیں ہیں۔ (۱) بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے۔ ان کو مکتب بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ دینی تعلیم کے لیے۔ جو عموماً مسجد سے منسلک ہوتے ہیں۔ ان میں قرآن مجید کے حفظ و ناظرہ، قرأت اور حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے

٣ - دارالعلوم یا یونیورسٹیاں جن میں ہر مضمون کے ماہر صرف اپنے مضمون پہ ماہرانہ تعلیم دیتے ہیں۔ یعنی یہاں تخصص کی تعلیم دی جاتی ہے۔

٤ - رباط اور خانقاہیں جن میں صوفیائے کرام تصوف کی تعلیم دیتے ہیں۔

مدین ۔ حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی کا نام قنتورا تھا۔ قنتورا سے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ اور مدین خلیج عقبہ کے دائیں ساحل پہ اقامت پذیر ہوا۔ اور اس کی اولاد بائیں ساحل پہ کوہ طور تک پھیل گئی۔ یہ سارا علاقہ مدین کہلاتا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ ایک قبطی کو قتل کرنے کے بعد مصر سے روپوش ہوئے تو عقبہ کے بائیں ساحل پہ حضرت شعیبؑ کے گھر چالیس برس تک رہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے

"اور جب وہ (موسیٰؑ) مدین کے کنویں پہ پہنچے تو وہاں لوگوں کی ایک جماعت کو جانوروں کو پانی پلاتے دیکھا اور دو عورتوں کو دیکھا جو ایک طرف اپنی بکریاں روکے کھڑی تھیں۔" (سورۃ القصص آیت ٢٢) "تم اے موسیٰؑ! اہل مدین میں برسوں رہے" (سورۃ طٰہٰ - آیت ٤٠)

شمال میں اہل مدین کی بستیاں کنعان کی سرحدات تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اہل مدین بدوی عرب تھے جو مدین سے مواب (بحیرۂ مردار کے دائیں ساحل پہ ایک علاقہ) تک مقیم تھے اور تجارت کے لیے یمن، بابل اور مصر تک جاتے تھے۔

مدینہ منوّرہ ۔ دنیائے اسلام کا ایک مقدس ترین شہر جو حجاز (سعودی عرب) میں واقع ہے جہاں ختم المرتبت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ مبارک ہے اور مسلمانوں کے لیے ایک زیارت گاہ ہے۔ ہزارہا مسلمان اس مقام کی زیارت کے لیے ہمیشہ وہاں جاتے رہتے ہیں۔ خصوصی طور پہ حج سے پہلے یا بعد حاجی حضرات مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ یہ شہر مکہ معظمہ سے تقریباً ٢٧٥ میل کے فاصلہ پہ شمال میں واقع ہے۔ مدینے کا پرانا نام یثرب تھا۔ یثرب حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے ایک سردار تھا جو وہاں آباد ہوگیا تھا۔ یثرب کے پہلے آباد کار عمالقہ تھے۔ (یعنی بنو عملاق بن ارفخشد بن سام بن نوحؑ) عمالیق ٢٠٠٠ ق م میں مصر کے حکمران تھے اور ١٦٠٠ ق م میں وہاں سے نکالے گئے۔ اس بنا پہ اس شہر کی تعمیر ١٦٠٠ ق م اور ٢٢٠٠ ق م کے درمیان ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد مدینہ میں حضرت ہارون کی اولاد آباد ہوگئی۔ پھر بنو قریظہ و بنو نضیر آئے۔ یہ لوگ شام میں آباد تھے۔ رومی بادشاہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ انہی کی اولاد میں سے اوس و خزرج بھی تھے۔ ستمبر ٦٢٢ء میں نبی کریمؐ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے یہاں تشریف لائے تو یثرب کا نام بدل کر مدینہ رکھ دیا گیا۔ نبی کریمؐ نے اسے طابہ اور طیبہ کا نام دیا۔

مدینہ عرب کی سطح مرتفع پہ واقع ہے۔ اس کے تین طرف کھیت اور نخلستان ہیں۔ یہاں کافی تعداد میں کنوئیں ہیں شہر میں ایک زمین دوز نہر ہے۔ اس وقت اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔

مدینہ کو نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی حضرت عثمانؓ تک مدینہ ہی دارالخلافہ رہا۔ اب بھی اس کی یہی حیثیت مسلّم ہے۔ یہاں آجکل ایک مشہور اسلامی علوم کی یونیورسٹی ہے جسے جامعہ اسلامیہ کہتے ہیں۔ مدینہ منورہ کو مسجد نبویؐ، صحابہ کرامؓ کی قبروں، جبل اُحد اور بعض دوسرے تاریخی مقامات کی وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے۔

مسجد قبا، مسجد قبلتین، مسجد غمامہ، بیر اریس، بیر غرس، بیر البقعہ، بیر رومہ سمیت ابیار سبعہ (سات کنوئیں) جنت البقیع، جہاں دس ہزار صحابہ کرامؓ اور دوسرے اکابر دین کی قبور ہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ، امام حسنؓ، اُمّہات المومنین، عبداللہ ابن سعودؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، دختران رسولؐ، امام مالکؒ کی قبریں بھی جنت البقیع میں ہیں۔

مدینہ منورہ روضۂ رسول کریمؐ اور مسجد نبویؐ کی وجہ سے مسلمانان عالم میں عقیدت و احترام کا مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ علمائے اسلام کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ مدینہ منورہ کو دنیا کے تمام شہروں پر فضیلت حاصل ہے۔ مکہ مکرمہ کو خانہ کعبہ کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے لیکن مدینہ منورہ میں صاحب قرآن اور داعیٔ اسلام محوِ استراحت ہیں جو امام الانبیاء کے عظیم منصب پہ فائز اور باعثِ تکوینِ عالم ہیں اور اسی شہر کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کی اقامت و سکونت کے لیے پسند فرمایا تھا۔

نبی کریمؐ کو بھی اس شہر سے کافی محبت تھی۔ جب آپ اسفار سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ طیبہ کے قریب پہنچتے تو سواری کو تیز کر دیتے تاکہ جلد از جلد مدینہ طیبہ سے جدائی کی گھڑیاں ختم ہوں۔

مدینہ منورہ کے فضائل میں نبی کریمؐ کی کئی احادیث بیان ہوتی ہیں۔ "قیامت کے قریب دجّال دنیا کے تمام شہروں پہ غلبہ حاصل کرے گا لیکن مدینہ منورہ کی حفاظت اللہ تعالیٰ کریں گے۔" حضرت علیؓ سے روایت کردہ حدیث میں بیان ہے۔ "شیاطین شہر مدینہ میں اپنی عبادت سے مایوس ہوگئے ہیں۔"

نبی کریمؐ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ "اے اللہ! مجھے مدینہ میں موت نصیب فرمانا۔" (جذب القلوب) ایک اور جگہ فرمایا: "ساری روئے زمین پہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں مجھے اپنی قبر بنانا پسند ہو سوائے مدینہ کے۔" (مشکوٰۃ شریف)

فضائل مدینہ میں مزید احادیث :-

"مدینہ میری ہجرت کی جگہ ہے۔ اسی میں میری قیام گاہ ہوگی اور یہیں سے میں قیامت کے دن اٹھوں گا۔ لہٰذا میری امت کا حق ہے کہ وہ میری ہمسائیگی اختیار کرے۔"

"مدینہ کی مثال بھٹی کی مانند ہے جو بُرے کو نکال دیتی ہے اور اچھے کو مزید نکھارتی ہے۔"

"قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک مدینہ طیبہ سے بُرے اور بدکار آدمی نہ نکل جائیں۔"

امام مالکؒ کو مدینہ منورہ سے اس حد تک محبت تھی کہ وہ کوئی سا بھی لمحہ یہاں سے دُور گزارنا پسند نہ کرتے تھے سوائے ایک بار فرض حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ گئے ورنہ وہ کبھی بھی مدینہ سے باہر تشریف نہیں لے گئے۔ مدینہ کی گلیوں میں کبھی سوار ہو کر نہ نکلے۔

مذہب ۔ انسانیت کی طرح قدیم ہے اور انسان ہی کے ساتھ وجود میں آیا ہے انسانوں کا اپنے خالق کے ساتھ ایک تعلق ہے جو بعض مخصوص حدود کے اندر مقید کیا جا سکتا ہے۔ یہ حدود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی معین کی جاتی ہیں۔

اب تک جتنے بھی مذاہب باقاعدہ طور پہ رہے ہیں ان میں ایک خالق کا تصور تو بہرصورت موجود رہا ہے۔ بعض موجودہ ماہرین دینیات کے خیال میں مذہب کی اصل وہ خوف اور رجا ہے جو اس غیبی طاقت کے لیے مخصوص ہو جو انسانی پاکیزگی اور تقدس کی رہنمائی کرتی ہو۔

اسلام کو عمومی طور پہ مذہب نہیں دین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے ہر گوشہ کے لیے رہنمائی فراہم کی ہے۔ اسلام انسان کے ہر عمل سے خدا کی رضا کا طلب گار ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب نے انسانی زندگی کو دنیاوی اور اخروی زندگی کے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ انسان کی دنیاوی زندگی کو ان مذاہب نے مذہبی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ اسی لیے مجموعی طور پہ ان مذاہب کے پیروکاروں میں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزگی کا تصور تک نہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب یہ ہیں : اسلام، ہندومت، بدھ مت، جین مت، سکھ، پارسی، کنفیوشزم، شنٹومت (جاپان) یہودیت اور عیسائیت۔

مزید دیکھیے : اسلام، دین، بدھ مت اور عیسائی۔

مراد (رابع)۔ سلطنتِ عثمانیہ کا سولہواں سال حکمران۔ جو صرف بارہ سال کی عمر میں ۱۰ ستمبر ۱۶۲۳ء/۱۰۳۲ھ کو تخت نشین ہوا۔

اس کا دورِ حکومت ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء تک رہا۔ اس نے نوعمری میں بھی جس قوتِ ارادی کا مظاہرہ کیا تو اس سے حکام سلطنت کو اندازہ ہوگیا کہ عنانِ حکومت ایک ایسے فرمانروا کے ہاتھ میں آئی ہے جو سلطنت کی تمام بدنظمیوں کو دُور کر دے گا۔ مراد کی نوعمری کے باعث سلطنت کا انتظام ابتدا میں اس کی والدہ کے ہاتھ میں رہا۔ جو نہایت دانش مند اور مدبر خاتون تھی۔

ایران کے شاہ عباس صفوی کو مراد کی نوعمری کی وجہ سے سلطنتِ عثمانیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کے مواقع مل گئے۔ اس نے سلطنتِ عثمانیہ کے بغداد کے ایک والی کے ساتھ مل بھگت کرکے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ مراد رابع کے عہد میں سلطنت کا اندرونی نظم و نسق کافی انتشار کا شکار رہا۔ سلطنت میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔

۱۶۳۸ء میں مراد اپنے عہد کی آخری اور سب سے بڑی مہم پر روانہ ہوا۔ بغداد پندرہ سال سے ایرانیوں کے قبضہ میں تھا۔ ترکوں نے اس سے پہلے بھی کئی بار کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۵ نومبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی فوجوں نے بغداد شہر کا محاصرہ کر لیا۔ گھمسان کی لڑائی کے بعد جس میں فصیل توڑنے کے لیے توپوں کا استعمال بھی ہوا ۲۵ دسمبر ۱۶۳۸ء کو شہر فتح ہوگیا۔

اس کے بعد ۱۵ ستمبر ۱۶۳۹ء کو ایران کے ساتھ ایک صلحنامہ ہوا۔

۹ فروری ۱۶۴۰ء کو مراد نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم سلطنتِ عثمانیہ کا وارث ہوا۔

مراکش۔ آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے۔ آبادی کا ۹۵ فی صد مسلمان ہیں۔ دارالحکومت رباط ہے۔ جس کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ بادشاہت کا نظام نافذ ہے۔ شاہ حسن دوم بادشاہ ہیں۔ سرکاری زبان عربی ہے۔

۶۶۰ء میں عقبہ بن نافع کے زیرکمان مسلمانوں نے مراکش پر فوج کشی کی اور بربر قوم کی مدد سے بہت جلد پورے علاقے پر وحدانیت کا سکہ جما دیا۔ بنوامیہ کے عہد سے عباسی حکمران ہارون الرشید کے زمانہ تک مراکش وسیع اسلامی سلطنت کا ایک صوبہ چلا آتا رہا۔ جس کو اس وقت مغربِ اقصیٰ کہا جاتا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں ادارسہ کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۰۷۱ء میں مرابطین نے اس پر قبضہ کرلیا اور ان کے امیر یوسف بن تاشقین نے مراکش کا شہر آباد کیا۔

۱۱۴۹ میں موحدین کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے بعد بنی مرین نے تین سو سال تک حکومت کی۔ پھر دولت وطاسیہ اور اس کے بعد دولتِ سعدیہ کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اس کے بعد علی الحسنی نے اپنی حکومت قائم کی اور آج تک مراکش میں اسی خاندان کی حکومت ہے۔ اور موجودہ شاہ حسن اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

۱۹۱۲ء تک مراکش ایک آزاد مسلم ملک تھا کہ فرانس اور سپین نے اسے اپنی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنایا۔ ۱۹۲۱ء میں ایک حریت پسند امیر عبدالکریم نے سامراجی طاقتوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کو قید کر لیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں استقلال پارٹی قائم ہوئی یہاں کے عوام نے استقلال پارٹی کی قیادت میں آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو فرانس اور سپین کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔

مراکش کی زرعی پیداوار گندم، جَو، روئی، پھل اور زیتون ہے۔ معدنیات میں فاسفیٹ، میگنیز، لوہا، سیسہ، جست اور جپسم ہیں۔

مُرتد ۔ دینِ اسلام سے پھرنے والا شخص مرتد کہلاتا ہے۔ اسلام نے ایسے شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ سورۃ توبہ میں مرتد کے قتل کا واضح حکم ہے ....

.... لیکن اگر وہ عہد (یعنی قبولِ اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن دراز کریں تو پھر جنگ کرو .... (آیت ۲)

کئی احادیث میں بھی ارتداد کرنے والے افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ من بدل دینہ فاقتلوہ ۔ جو شخص (یعنی مسلمان) اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو۔ ایک اور حدیث میں حضرت عثمانؓ روایت کرتے ہیں : "میں نے رسول کریمؐ کو فرماتے سنا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے۔ بجز تین صورتوں کے۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اسلام لانے کے بعد کافر ہوگیا ہو ....."

اوّل خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک عورت ام قرفہ کو قتل کرد یا تھا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہوگئی تھی۔ اسی طرح خلافت راشدہ کے دَور میں [illegible] ایسے واقعات کا تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب مرتدین کو قتل کر دیا گیا۔

فقہا کا بھی اس باب میں اتفاق ہے کہ اسلام سے پھرنے والے شخص کو قتل کیا جائے لیکن اس کے لیے بھی ایک شرط ہے۔ پہلے اس شخص کو توبہ کرنے کی مہلت دی جائے اگر وہ توبہ نہ کرے تو پھر اسے قتل کر دیا جائے۔ مزید دیکھیے : "ارتداد"

مرتضیٰ احمد میکش، مولانا ۔ (وفات ۲۰ جولائی ۱۹۵۹ء)

نامور صحافی، عالم دین اور سیاست دان۔

آپ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ [illegible] ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا احمد خان تھا۔ آپ کے جد امجد [illegible] کا تعلق [illegible] قوم کے قبیلے محمد زئی درانی سے تھا۔ وہ افغانستان سے ہجرت کرکے [illegible] کے ایک قصبہ میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ یہیں سے اس خاندان نے [illegible]

مرتضیٰ احمد میکش نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی [illegible] کیا۔ ۱۹۱۹ء میں لاہور آکر ایف اے میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ہجرت کے [illegible] تعلیم کو خیرباد کہہ کر کابل چلے گئے اس وقت دوسرے سال میں پڑھ رہے تھے۔ کابل میں [illegible] برس بڑی تکلیفوں میں گزارا۔ لاہور واپسی کے بعد ۱۹۲۲ء سے [illegible] صنعت میں قدم رکھا۔ ۱۹۵۵ء تک زمیندار، احسان، انقلاب، شہباز، نوائے پاکستان، مغربی پاکستان وغیرہ روزناموں میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ زمیندار اور انقلاب میں [illegible] کرنے کے بعد اپنا ذاتی اخبار ہفت روزہ افغانستان نکالا جو فارسی زبان میں شائع [illegible] تھا۔ اس میں انگریز حکومت کے خلاف مضامین لکھنے پر ۱۹۲۱ء میں [illegible] قید ہوئے۔

قید سے رہائی کے بعد احسان اور شہباز جیسے مؤقر روزناموں میں کام کیا۔ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کا خیال آپ نے سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں [illegible] کے ذریعے کیا تھا۔ اس کے بعد روزنامہ "انصاف" نکالا۔ پھر اسے بند کرکے نوائے پاکستان [illegible] اور مغربی پاکستان میں رئیس التحریر کی حیثیت سے کام کیا۔ صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ آپ علمی، ادبی اور آزادی کی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اپنے زمانے میں [illegible] صحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ صحافتی فرائض کی ادائیگی کے لیے [illegible] برما کا سفر بھی کیا۔

تحریکِ پاکستان علمائے اہلِ سنت کے ساتھ مل کر خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۴۶ء
میں بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے
کے بعد جب جمعیت علمائے پاکستان کی تشکیل ہوئی تو آپ کو جمعیت کا قانونی مشیر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء
کو تحریکِ ختم نبوت میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔
زندگی کے آخری ایام میں اُردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن تھے
اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں لیکچرار بھی تھے۔ صحافی ہونے کے ساتھ آپ قادر الکلام
شاعر اور ادیب بھی تھے۔
آپ کی کئی تصانیف ہیں :۔ اسلام اور معاشی اصلاحات، تاریخ اسلام (چار جلدیں)
تاریخ اقوام عالم (دو جلدیں)، اخراجِ اسلام از ہند، مرزائی نامہ۔ مجموعہ اُردو کلام اور فارسی
کلام وغیرہ۔

مرتضیٰ حسین زبیدی۔ (۱۱۴۵ھ / ۱۲۰۵ھ)

ایک مشہور محدث، فقیہہ، ادیب، علوم عقلیہ و نقلیہ اور لغت کے ماہر عالم۔
قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے اور وہاں
ہی تحصیل علوم میں مشغول ہو گئے۔ زبید، مصر اور حجاز کے نامور علماء اور مشائخ سے استفادہ
کیا۔ حدیث اور فقہ کی اجازت حاصل کی۔ چونکہ وہ تحصیل علم کے بعد مدتوں زبید میں مقیم رہے
اس لیے زبیدی مشہور ہوئے۔ یہاں تک کہ کوئی ان کو ہندی نہیں سمجھتا تھا۔ زبید سے مصر آئے۔
آپ سے استفادہ کرنے والوں میں سلطان عبدالحمید محمد پاشا صدر اناطولیہ بھی
شامل ہیں۔ تلامذہ کی کثرت اور تصانیف کی شہرت کی وجہ سے آپ نے عالمِ اسلام میں
ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور طاعون کی بیماری
سے انتقال ہوا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو کے قریب ہے جو عربی زبان میں ہیں ان
میں اکثر حدیث پر تحقیقی کتابیں ہیں۔

مرتضیٰ شاہی۔ (۱۲۷۵ھ)

بنگال میں اس فرقہ کے بانی شاہ مرتضیٰ
مجذوب تھے۔ یہ بزرگ قریباً ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۲ء میں وفات پائی۔ یہ
شاہ نعمت اللہ ولی قادری فیروز آبادی کے ہمعصر تھے۔ سید مرتضیٰ مجذوب نے اسلامی
تصوف اور ہندو یوگ کی آمیزش سے ایک نیا فلسفہ پیش کیا ہے یہ خود عموماً نشہ میں
رہتے۔ سماع اور موسیقی ان کا خاص مسلک تھا۔ مسلمانوں کا یہ پہلا فرقہ ہے جس نے
بنگال میں ہندووانہ رسم و رواج کی حمایت کی۔ ہندووانہ عقائد کو اپنے عقائد کا جزو
بنایا۔ یہاں تک کہ اپنے نام بھی ہندووانہ تجویز کر لیے۔ خود بانیٔ فرقہ سید مرتضیٰ
آنند مشہور ہوئے۔
ان کے ہاں نکاح صرف بیوہ کے لیے مخصوص ہے۔ کنواری کے لیے نکاح کی شرط
نہیں محض پسند و ناپسند کافی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کنواری عورت اپنے
شوہر سے مطمئن نہ ہو تو وہ بغیر طلاق لیے اس سے الگ ہو جاتی ہے اور پھر باقاعدہ کسی
اور مرد سے نکاح کرتی ہے۔ مگر یہ نکاح بھی کوئی مولوی یا قاضی نہیں پڑھاتا بلکہ دلہن اور
دولہا کی طرف سے آئے ہوئے اصحاب میں سے کوئی شخص اٹھ کر اس شادی کا اعلان
کرتا ہے۔ اس کا یہی اعلان نکاح ہے۔ یہ لوگ مباشرت فاحشہ کے قائل ہیں۔
مرتضیٰ شاہی فرقہ کا اب بھی راج شاہی، جیسور، سندربن وغیرہ میں بڑا
اثر ہے۔

مرتضیٰ شیرازی، سید۔ (وفات : ۹۷۴ھ / ۱۵۶۷ء)

اہلِ تشیع کے نامور عالم دین اور شاعر۔
شیراز (ایران) کے رہنے والے تھے۔ میر سید شریف جرجانی کے پوتے تھے۔ اشعار میں
شریفی تخلص رکھتے تھے۔ علوم ریاضی، حکمت، منطق اور کلام میں اپنے ہمعصروں میں کافی ممتاز
رہے۔ شیراز سے مکہ مکرمہ جا کر ابنِ حجر مکیؒ سے علم حدیث پڑھا۔ اور تدریس کی اجازت لی۔ وہاں
سے دکن (انڈیا) آئے۔ ۹۷۲ھ میں اکبر آباد آنے کے بعد شہنشاہ اکبر کے دربار میں آئے۔
انتقال کے بعد امیر خسروؒ کے جوار میں دفن کیے گئے لیکن بعض لوگوں کے کہنے پر شاہی حکم کے
ذریعے ان کی میت نکال کر مشہد لے جا کر دفن کی گئی۔

مرثدؓ غنوی

صحابیٔ رسولؐ۔ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے۔ ہجرت کر کے مدینہ
منورہ چلے گئے۔ آپ نہایت بہادر تھے اس لیے نبی کریمؐ نے مکہ مکرمہ سے قیدیوں کو
مدینہ لے جانے کا کام آپ کے سپرد کیا تھا۔
اسلام لانے سے پہلے مکہ کی ایک طوائف عناق سے مرثد کا تعلق تھا۔ اسلام لانے
کے بعد نبی کریمؐ سے اس کے ساتھ نکاح کی اجازت چاہی لیکن آپؐ نے اجازت
نہ دی۔
کتبِ احادیث میں آپ کی روایت کردہ کئی احادیث ہیں۔ نبی کریمؐ کے حکم پر اشاعت
دین کے لیے خالدؓ اور عاصمؓ کے ہمراہ بنو عضل اور قارہ کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ
میں بنو ہذیل نے حملہ کر کے تینوں صحابہ کرامؓ کو شہید کر دیا۔

مرثیہ

۔ نظم کی وہ قسم جس میں کسی کے انتقال پر اظہارِ غم کیا گیا ہو اور اس میں
اس کی خوبیوں کا بیان ہو۔ اصطلاحاً شہدائے کربلا کے ذکر کے لیے بھی مخصوص کر دیا گیا۔
منظوم مرثیہ کا رواج قدیم یونان اور عرب میں بھی تھا۔ فارسی میں مرثیہ عربی سے
ہی آیا۔ مشہور فارسی شاعر فردوسیؔ نے اپنے "شاہنامہ" میں سہراب کی موت پر
ایک مرثیہ کہا۔ سعدیؔ نے زوالِ بغداد اور امیر خسروؔ نے شہزادہ محمد کی وفات پر
درد انگیز مرثیے لکھے۔
ایران میں شاہ عباس صفوی کے عہد سے واقعاتِ کربلا پر مرثیے لکھے جانے
لگے۔ اس بارے میں محتشم کاشی، دعبل، مقبل کے نام قابلِ ذکر ہیں
اُردو میں مرثیے میر عاصیؔ، میر آلِ علی اور درخشاں نے شروع میں کہے۔ میر دردؔ
اور سوداؔ نے بھی مرثیے کہے۔ آخری شاہانِ اودھ کے زمانے میں میر انیس اور مرزا دبیر
نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ زوالِ اودھ کے ساتھ مرثیہ گوئی پر
بھی زوال آگیا۔

مرجیئہ (۶۲ھ)

۔ مسلمانوں کا مشہور فرقہ ہے جو کئی شاخوں پر مشتمل ہے اور یہ لوگ
اسلام میں فلسفہ کے در آنے سے متاثر ہوئے تھے۔ مرجیئہ، قدریہ ایک دوسرے سے
قریب تر ہیں۔ کیونکہ یونانی، رومی اور ایرانی فلسفوں نے ان کے خیالات پر براہِ راست
اثر ڈالا، بعض علماء نے قدریہ، جبریہ، مرجیئہ اور مرجیئہ خوارج کو ایک ہی صف
میں شمار کیا ہے۔ لفظ مرجیئہ "ارجا" سے مشتق ہے جو عربی میں تاخیر کے معنوں
میں بولا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اس فرقہ کو خوارج کا ہی حصہ قرار دیا ہے۔ ممکن ہے
ابتدا میں خوارج نے ہی یہ فلسفہ اپنایا ہو مگر بعد میں ان کے بیشتر علماء نے حضرت امام اعظم
ابو حنیفہؒ کی تقلید کی۔ اس بنا پر کچھ مؤرخین ان کو مرجیئۂ حنفیہ بھی لکھتے ہیں۔
یہ فرقہ یزید بن معاویہ کے عہد ۶۲ھ میں منظم ہوا۔ ان کے عقائد یہ ہیں :۔
ایمان کا تعلق عمل سے نہیں صرف دل سے ہے۔

حکمران، زانی، شرابی، فاسق و فاجر کیوں نہ ہو اس کی اطاعت فرض ہے ۔
جس شخص نے ایک مرتبہ زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لیا وہ مسلمان ہے ۔
فرشتوں، جنوں، پیغمبروں، رسولوں اور عام انسانوں کا ایمان ایک ہی نوعیت کا ہے ۔
گناہ کا کوئی علیحدہ وجود نہیں، یہ انسانی افعال ہیں جن پر سزا و جزا نہیں ہو سکتی ۔
آخرت کا تصور جزا و سزا سے قطعی خالی ہے ۔

مرزا محمود، بشیر الدین (۱۸۸۹ء - ۱۹۶۵ء)

قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد کا بڑا لڑکا جو قادیانیوں کا دوسرا خلیفہ بھی تھا ۔ قادیان (ضلع گورداسپور) میں پیدائش ہوئی ۔ ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین کی صاحبزادی سے پہلی شادی کی ۔ اس نے بعد کئی اور شادیاں بھی کیں ۔ اولاد میں تیرہ لڑکے اور نو لڑکیاں ہوئیں ۔ قادیانیوں کا موجودہ خلیفہ مرزا ناصر، مرزا بشیر الدین محمود کا لڑکا ہے ۔

مرزا محمود نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی ۔ والد مرزا غلام احمد کی سرپرستی حاصل تھی ہی اس لیے قادیانیوں کی جماعت میں بڑا اہم مقام حاصل تھا ۔ اوائل عمر میں ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس کا مقصد مذہبی افکار و نظریات اور دیگر اعتقادات کی عقلی بنیاد پر اشاعت کرنا تھا ۔ ۱۹۱۳ء میں سہ روزہ "الفضل" جاری کیا جو بعد میں روزنامہ ہو گیا ۔ الفضل کو قادیانیوں کا سرکاری اخبار کہا جاتا ہے ۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد سے ہی قادیانی جماعت کا سربراہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا ۔ لیکن مرزا غلام احمد نے اپنے انتقال کے بعد نظم و نسق چلانے کے لیے ایک انجمن اپنی زندگی کے آخری ایام میں بنا دی تھی ۔ اس انجمن میں سرکردہ حیثیت حکیم نور الدین بھیروی کو حاصل تھی ۔ مرزا محمود اس وقت سے ہی اپنے اقتدار کی راہ ہموار کرتا رہا ۔ ۱۹۱۴ء میں حکیم نور الدین کے انتقال کے بعد قادیانی جماعت کا خلیفہ بنا ۔

۱۹۳۴ء میں تحریک جدید کے نام سے ایک نئی تحریک چلائی جس کا مقصد ساری دنیا میں اپنی جماعت کے خیالات کی ترویج تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا محمود کے زمانے میں قادیانی جماعت (احمدیہ جماعت) کو دنیا بھر میں فروغ حاصل ہوا ۔ چنانچہ یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک میں بے شمار تبلیغی مرکز قائم کیے ۔ لندن، واشنگٹن، ہیگ، گھانا وغیرہ میں کئی مساجد تعمیر کروائیں اور کئی مدارس تعمیر کروائے ۔

مرزا محمود قیام پاکستان کی تحریک سے خوش نہ تھا ۔ اندرونی طور پر مسلمانوں کی اس علیحدہ مملکت کے قیام کے خلاف کام کرتا رہا ۔ کیونکہ پاکستان بننے سے ان کے خیالات کی ترویج اور اشاعت کے لیے ایک نئے مرکز کی ضرورت لازمی ہو جاتی ۔ پاکستان کے قیام کے بعد ربوہ (ضلع جھنگ) میں قادیانی جماعت کا مرکز بنایا گیا ۔ فوراً بعد ہی مرزا محمود پاکستان میں انتشار پھیلا کر صوبہ بلوچستان میں قادیانی ریاست کے قیام کے خواب دیکھنے لگا ۔ مرزا محمود کے دور میں ہی قادیانیوں کو پاکستان کی اعلیٰ سروسوں میں بلند مقامات تک پہنچنے کے مواقع ملے ۔

مرزا محمود نے اپنے والد سے بھی زیادہ سخت مذہبی رویہ اختیار کیا ۔

خلیفہ بننے کے بعد اس نے اعلان کیا: "دنیا کا کوئی سا بھی شخص اگر مسیح موعود مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لاتا وہ کافر ہے چاہے اس نے مرزا کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو ۔ اس کے پیغام سے آشنا ہو یا نہ ہو ۔"

اس نے کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں مرزا غلام احمد کے دعوئے نبوت کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ اس نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی ۔

ربوہ میں ہی ۱۹۶۵ء کو انتقال ہوا اور وہاں ہی دفن کیا گیا ۔ اس کی قبر پر خلیفہ ثانی مسیح موعود کا کتبہ لگا ہے جس پر درج ہے کہ میت بطور امانت دفن ہے اور میت کو قادیان منتقل کیا جانا ہے ۔

مرزا مظہر جانجاناں (۱۲ رمضان ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰ء - ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) ۔

آپ کے والد مرزا جان، اورنگ زیب عالمگیر کے منصب دار تھے ۔ دکن سے مع اہل و عیال اکبر آباد جا رہے تھے کہ راستے میں مظہر جانجاناں پیدا ہوئے ۔ اورنگ زیب نے آپ کا نام جان جاناں رکھا تھا ۔ مظہر تخلص تھا ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد علمائے وقت سے تحصیل علوم کیا ۔ حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی ۔ مولانا سید نور محمد بدایونی سے بھی استفادہ کیا ۔ سلسلہ نقشبندیہ میں ان سے بیعت تھے ۔

ایک مدت تک درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا ۔ آپ کا شمار سلسلہ نقشبندیہ کے مشائخ میں ہوتا ہے ۔ اس زمانہ میں سیاسی ابتری حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی ۔ مرہٹوں اور جاٹوں نے طوفان مچا رکھا تھا ۔ مرزا صاحب نے روہیل کھنڈ مراد آباد [illegible] بریلی اور شاہجہان پور کے اکثر دورے کیے ۔ اہالیان روہیل کھنڈ آپ سے سلسلہ بیعت [illegible] میں منسلک تھے ۔ یہاں کے لوگوں کو مرہٹوں کے خلاف تیار کیا ۔ اسی دوران ۷ محرم [illegible] کو ایک شیعہ نے خنجر مار کر آپ کو زخمی کر دیا ۔ ۱۰ محرم کو اسی زخم سے انتقال ہو گیا ۔

مروان بن الحکم ۔ (وفات: ۶۵ھ) [illegible]

مروان بن الحکم کی [illegible] بنو العاص سے تھا ۔ حکم بن العاص حضرت عثمان کا حقیقی چچا تھا ۔ [illegible] بظاہر مسلمان ہو گیا لیکن حقیقتاً مسلمانوں کا مخالف رہا ۔ اسی بنا پر نبی کریم [illegible] میں جلاوطن کر دیا ۔ مروان بھی بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ طائف [illegible] نے خلیفہ بننے کے بعد ان باپ بیٹے کی جلاوطنی کو ختم کیا اور [illegible] کیا ۔ اسی نے حضرت عثمان کی [illegible] کے سرغنہ کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے ۔ اس [illegible] کا نتیجہ شہادت [illegible] کا سانحہ پیش آیا ۔ بعض علمائے اسلام حضرت [illegible] میں سے ایک مروان بن الحکم کو بھی قرار دیتے ہیں ۔

مروان نے جنگ جمل میں حضرت عائشہ صدیقہ [illegible] معاویہ کی واضح حمایت کی تھی ۔ امیر معاویہ نے اپنے دور [illegible] مقرر کیا تھا ۔ عبداللہ ابن زبیر کے دعوئے خلافت تک [illegible]

یزید بن معاویہ کے انتقال کے بعد عبداللہ ابن زبیر [illegible] قرب و جوار کے علاقوں میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تو [illegible] تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن ابن زبیر کو بنو امیہ سے [illegible] مروان اور اس کے بیٹے عبد الملک اور بنو امیہ کے دوسرے [illegible] وہاں سے شام پہنچا ۔ ابن زیاد بھی وہاں پہنچ گیا ۔ ابن زیاد نے مروان [illegible] اسے عبداللہ ابن زبیر کے خلاف تیار کیا ۔ شام میں عبداللہ ابن زبیر [illegible] اور خالد بن یزید کے حامیوں کے درمیان ہنگامہ آرائی ہوئی ۔ [illegible] کے حامیوں کی ایک مشاورت میں مروان بن الحکم کو خلیفہ بنانے پر اتفاق ہوا ۔ خالد بن یزید اور عمرو بن سعید العاص کو اس کے ولی عہد مقرر کرنے پر [illegible] رمضان ۶۵ھ میں ایک روایت کے مطابق مروان کو ام خالد نے [illegible]

کر ہلاک کر دیا کیونکہ مروان نے ایک بار خالد بن یزید اور اس کی ماں کے خلاف (جس سے اس نے بعد میں شادی کر لی تھی) نازیبا کلمات کہے تھے۔ مروان کی مدتِ خلافت اموی دَور کے انتشار والے دَور کی ۹ ماہ کی خلافت ہے۔

مروان بن محمدؒ ۔ بنواُمیّہ خاندان کا آخری خلیفہ، جس کے عہد میں شامیوں اور خارجیوں نے بغاوت کی۔ عہد حکومت ۷۴۴ء تا ۷۵۰ء تھا۔ مروان ایک قابل جرنیل تھا لیکن طویل عرصہ سے فروغ پذیر سیاسی انتشار پر قابو نہ پا سکا۔

خراسان کے دارالحکومت مرو کی تسخیر کے بعد عراق کا مشہور مرکز کوفہ بھی عباسیوں کے ہاتھ آگیا۔ چنانچہ اکتوبر ۷۴۹ء میں ابو العباس سفّاح خاندانِ عباسی کا بانی سریر آرائے خلافت ہوا۔ اور اس طرح بنو امیہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

مروہ ۔ کعبہ سے چند قدموں کے فاصلے پر مشرق کی طرف دو پہاڑیاں صفا اور مروہ کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کے درمیان عمرہ اور حج کرنے والے سعی کرتے ہیں۔ یہ عمل یادگار ہے حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ہاجرہؓ کے اس عمل کا جب وہ اپنے بیٹے کے لیے پانی کی تلاش میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ دوڑی تھیں۔ آج کل اس جگہ کو بھی پختہ فرش کی شکل دے دی گئی ہے اور حرم شریف کی حدود میں شامل ہے۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان دو فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ مزید دیکھئے: "صفا"۔

مرلیسیہ ۔ یہ فرقہ یوں تو مرجیہ کی شاخ ہے مگر یونانی فلسفہ اور ویدک فلسفہ سے اس قدر متاثر ہے کہ غیر خدا کی عبادت بھی اس کے ہاں جائز ہے۔ ان کا سب سے بڑا عقیدہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کو نفع پہنچائے اسے سجدہ کرنا کوئی گناہ نہیں، اسی لیے انسان، انسان کے سامنے سجدہ کر سکتا ہے۔

اس فرقہ کے لوگ سورج، چاند کو بھی سجدہ کرتے ہیں کیونکہ دونوں چیزیں انسان کو نفع پہنچاتی ہیں۔ اس فرقہ کے بانی کا نام مرلیسی تھا اور اسی نسبت سے مرلیسیہ مشہور ہے۔ اس گروہ کے لوگ خراسان، سمرقند، تاشقند اور ایرانی علاقوں میں موجود ہیں۔ ان کے نزدیک زبان سے ایمان کا اقرار انسان کے لیے کافی ہے۔

غریب کا دولت مند کے سامنے یا کمزور کا طاقتور کے سامنے سجدہ کرنا عین فطرت سمجھتے ہیں۔

مریم علیہا السّلام ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ۔ عیسائیوں نے تو حضرت عیسیٰؑ کی طرح مریمؑ کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بنائی ہیں۔ قرآن مجید نے حضرت مریمؑ کے بارے میں سورۃ آلِ عمران، سورۃ مائدہ، سورۃ النساء، سورہ مریم، اور سورۃ مومنون میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔

سورۃ آل عمران کی آیات ۳۵، ۳۶ اور ۳۷ میں حضرت مریمؑ کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ جب ان کی والدہ نے کہا: "جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں اسے تیری (اللہ) نذر کرتی ہوں۔"

جب یہ بچی ذرا شعور کو پہنچی تو زکریاؑ اس بچی کے سرپرست ہوئے۔ حضرت زکریاؑ رشتے میں غالباً ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔ جب حضرت مریمؑ سن رشد کو پہنچ گئیں تو بیت المقدس کی عبادت گاہ میں داخل کر دی گئیں اور ذکر الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔ سورۃ مریم کی آیات ۱۷ تا ۲۱ میں حضرت مریمؑ کے بارے میں مزید اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"جب وہ محراب میں مصروف عبادت تھیں تو ایک فرشتہ انسانی شکل میں ان کے پاس آیا اور انہیں لڑکے کی بشارت دی۔"

فرشتے کی اس بات پر مریمؑ نے جواب دیا۔ "میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔"

فرشتے نے مزید کہا کہ اللہ تعالیٰ ایسا کر سکتے ہیں اور وہ اس لڑکے کو نشانی بنائیں گے۔

اس سے اگلی آیات (۲۲ تا ۳۴) میں اس بچے کی پیدائش اور ان کی قوم کا رویّہ بیان ہوا ہے۔

قرآن نے تو اس بچے (عیسیٰ ابن مریمؑ) کی پیدائش کے بارے میں واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تھا۔ لیکن انجیل متی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے خاوند کا نام یوسف نجار تھا جو مریمؑ کا عمزاد تھا۔ بعض علمائے اسلام بھی حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ ولادت کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کے لیے وہ دوسرے دلائل کے علاوہ انجیل وغیرہ کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

مسیحی روایات کے مطابق حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔ پہلے ہیرودیس بادشاہ کے عہد میں مصر چلی گئیں۔ اس کی موت کے بعد ارخلاؤس کے عہد حکومت میں ان کو گلیل کے شہر میں پناہ لینی پڑی۔ (متی ۲: ۱۳ تا ۲۳)

حضرت عیسیٰؑ نے جب تیس سال کی عمر میں نبوت کے کام کا آغاز کیا تو ان کی مخاطب یہودی قوم نے آپ پر اور آپ کی والدہ پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور اپنے اقتدار کے لیے حضرت عیسیٰؑ کو خطرہ سمجھتے ہوئے انہیں ایک عدالت سے پھانسی کی سزا دلوائی۔

حضرت مریمؑ کے بارے میں سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا۔" (آیت ۹۱)۔ اسی طرح سورۃ تحریم کی آیات ۱۰-۱۱ میں بھی ایمان والی عورتوں میں سے زوجہ فرعون اور حضرت مریمؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ نبی کریمؐ کی احادیث میں بھی حضرت مریمؑ کی عظمت کا ذکر ملتا ہے۔

البتہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی طرح ان کی والدہ کو بھی خدائی میں شریک ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ ایک دَور میں "مادرِ خدا" کے نام سے انہیں یاد کیا جاتا تھا اور ان کے مجسمے بنائے جانے لگے۔ اب بھی عیسائیوں کی عبادت گاہوں میں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ساتھ حضرت مریمؑ کے مجسمے بھی ہوتے ہیں۔

مریم زادے (۹۸۲ھ)۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں مریم زادے کا اہم فرقہ گزرا ہے۔ جس کے بانی نے مسلمانوں کے ہاں عام مروجہ عقائد و خیالات کے ایک بنیادی جزو میں عجیب و غریب تبدیلی پیدا کی۔ اس فرقہ کے بانی حضرت سید محمد گیسو دراز گلبرگہ کی اولاد میں ایک شخص حضرت اللہ تھے۔ اکثر مورخین نے حضرت اللہ کے خیالات اور عقائد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے پیروکار کافی تعداد میں موجود تھے۔ بعد میں مغل حکومت نے ان کے خلاف سخت قدم اٹھایا۔ نوبت قتل و خونریزی تک پہنچی۔ حضرت اللہ نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ حضرت مریمؑ والدہ حضرت عیسیٰؑ جب آسمان پر گئیں تو ان کا نکاح حضرت سید محمد گیسو دراز سے اللہ تعالیٰ نے کیا اور آسمان پر ہی ان کی پہلی اولاد ہوئی اور میں" یعنی حضرت اللہ" اسی اولاد میں سے ہوں۔ بعد میں حضرت مریمؑ سے خود اللہ تعالیٰ نے نکاح کیا جس سے حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ یہ فرقہ اکبر کے عہد میں ابھرا اور شاہ جہان کے عہد تک اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ بعد کے مورخین نے اس فرقہ کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں کیا۔

مُزدَلفہ۔ مکہ مکرمہ سے تقریباً ۶ میل کے فاصلے پر ایک مقام جہاں حاجی ۹ ذوالحج کو غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح طلوعِ فجر تک ٹھہرتے ہیں۔ حاجی میدانِ عرفات سے سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے نکل پڑتے ہیں۔ عرفات، مزدلفہ سے ۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ ۱۰ ذوالحجہ کو آفتاب طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے نکل کر منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک مسجد ہے۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں اس مسجد کے قریب ایک منارہ پر روشنی کی جاتی تھی۔ یہاں کے قیام کے بارے میں قرآن مجید میں بھی ذکر آتا ہے سورۃ بقرہ آیت ۱۹۸ میں اسے "مشعر الحرام" کہا گیا ہے۔ رمیٔ جمار کے لیے کنکریاں یہاں سے اکٹھی کی جاتی ہیں۔ عرفات سے مزدلفہ پہنچنے کے بعد حاجی مغرب اور عشا کی نماز ایک جماعت اور دو الگ الگ اقامتوں سے ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ عرفات میں مغرب کی نماز ادا کرنے کا حکم نہیں ہے۔ رات کا قیام اللہ کی یاد و تسبیح و تذکیر کے لیے ہے۔ حاجی یہاں رات بھر عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔

مُزَّمِّل، سورۃ۔ پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْمُزَّمِّلُ کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔ اس سورۃ کے دو رکوع الگ الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔ پہلا رکوع بالاتفاق مکّی ہے۔ اس کے مضامین اور احادیث کی روایات دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مکّی زندگی کے کس دور میں نازل ہوا۔ اس کا جواب ہمیں روایات سے تو نہیں ملتا لیکن اس رکوع کے مضامین کی داخلی شہادتیں اس کا زمانہ متعین کرنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔

اولاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ آپؐ راتوں کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کیا کریں تاکہ آپؐ کے اندر نبوّت کے بارِ عظیم کو اٹھانے اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم حضورؐ کی نبوت کے ابتدائی دور ہی میں نازل ہوا ہوگا۔ جبکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس منصب کے لیے آپ کی تربیت کی جا رہی تھی۔

ثانیاً، اس میں حکم دیا گیا ہے کہ نمازِ تہجد میں آدھی آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش قرآن مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ اس وقت قرآن مجید کا کم از کم حصّہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قرأت کی جا سکے۔

ثالثاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کفارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رکوع اس زمانے میں نازل ہوا جب رسول کریمؐ اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے۔ اور مکہ میں آپؐ کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسرّین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکہ ہی میں نازل ہوا ہے لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور اس رکوع کے مضامین سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ مکہ میں اس کا کوئی سوال پیدا نہ تھا اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی۔

ابتدائی آیات کے مضمون کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد آیات ۱۵ سے ۱۹ میں مکہ کے ان لوگوں کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے، متنبہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اسی طرح تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف بھیجا تھا، پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر فرض کر لو تم پر کوئی عذاب نہ آیا تو قیامت کے روز تم کفر کی سزا سے کیسے بچ نکلوگے؟

دوسرا رکوع حضرت سعیدؓ بن جبیر کی روایت کے مطابق اس کے دس سال بعد نازل ہوا۔ اور اس میں نماز تہجد کے متعلق اس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی ہے جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز کا تعلق ہے وہ تو جتنی بآسانی پڑھی جا سکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اصل اہتمام جس چیز کا کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ پانچ وقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں۔ فریضۂ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خلوص نیت کے ساتھ صرف کریں۔ آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جو بھلائی کے کام تم دنیا میں انجام دوگے وہ ضائع نہیں جائیں گے بلکہ ان کی حیثیت اس سامان کی سی ہے جو ایک مسافر اپنی مستقل قیام گاہ پر پہلے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر تم وہ سب کچھ موجود پاؤگے جو دنیا میں تم نے آگے روانہ کیا ہے اور یہ پیشگی سامان نہ صرف یہ کہ اس سامان سے بہت بہتر ہے جو تمہیں دنیا میں ہی چھوڑ جانا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں تمہیں اپنے بھیجے ہوئے اصل مال سے بڑھ کر بڑا اجر بھی ملے گا۔

مسالک الممالک۔ ابو اسحاق ابراہیم الاصطخری (متوفی ۳۴۰ھ) کی جغرافیہ پر تصنیف کا نام ہے۔ یہ عربی زبان میں جغرافیہ کے علوم پر پہلی تصنیف ہے۔ اس میں نقشے بھی بنائے گئے ہیں۔ جرمنی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مستحب۔ اصطلاحِ فقہ میں مستحب اس عمل کے لیے کہا جاتا ہے جس کے کرنے سے تو ثواب ہوتا ہے اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ غیر موکدہ سنتیں اور نفل مستحب کے ذیل میں آتے ہیں۔

مستضی بامراللہ۔ (وفات۔ ذی قعد ۵۷۵ھ)

عباسیوں کا ۳۲ واں خلیفہ۔ حسن نام۔ ابو محمد کنیت تھی۔ ۵۳۶ھ میں ایک ارمنی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور ربیع الآخر ۵۶۶ھ میں تختِ خلافت کی زینت بنا۔ مستضی کے عہدِ حکومت کے پہلے ہی سال مصر سے عبیدیوں کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایوبی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

۵۶۶ھ کے اواخر میں نور الدین محمود زنگی والی شام نے سلطان صلاح الدین کو مصر میں خلیفہ مستضی کے نام کا خطبہ جاری کرنے کا حکم دیا۔ محرم ۵۶۷ھ میں سلطان نے مستضی کے نام کا خطبہ پڑھا۔ ۱۰ محرم ۵۶۷ کو عاضد دین اللہ والی مصر کا انتقال ہو گیا اور اگلے جمعہ کو مصر کے گوشے گوشے میں خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

جس طرح صلاح الدین وفاداری کی بنا پر نور الدین کی قوتِ بازو تھا اسی طرح نور الدین اچھے تعلقات کے باعث خلیفہ مستضی کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ سب بڑے بڑے بادشاہ خلیفہ بغداد کی شمشیرِ ہیبت و سطوت کا لوہا مان کر اس سے لرزہ براندام رہنے لگے۔ اور اطراف و اکناف میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

۵۷۰ھ میں قطب الدین قایماز کمان دار عساکر نے بغداد میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ رعایا اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتی تھی۔ اس لیے لوگوں نے خلیفہ کے اس حکم پر قطب الدین قایماز کے مال و متاع سے متعلق تم سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی اس کے مکان پر ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا۔

ذی قعدہ ۵۷۵ھ میں مستضی نے نو سال سات مہینے کی خلافت کے بعد ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

مستضی بامر اللہ نہایت شریف النفس اور کامیاب خلیفہ تھا۔ خلیفہ مستضی کے متعلق حافظ ذہبی رقم طراز ہیں:۔

"مستضی بڑا سخی اور شریعت کا حامی تھا۔ اس کے عہد میں ملک بھر میں امن و امان رہا۔ خدا نے اس کے عہد کو سعادت سے لبریز کر دیا تھا۔ یمن سے مصر و مغرب تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اور تمام حاکم اس کے فرمانبردار تھے۔"

مستعین باللہ (اوّل) (۲۲۱ھ - ۲۵۲ھ)

ایک کنیز مخارق کے بطن سے پیدا ہوا۔ منتصر کے بعد اس کے دونوں بھائی معتز اور موٴید موجود تھے۔ لیکن وہ ولی عہدی سے خارج ہو چکے تھے۔ منتصر نے کسی کو ولی عہد نامزد نہ کیا تھا۔ اس لیے اس باب میں سخت کش مکش پیدا ہوئی۔ چونکہ متوکل کے ان بیٹوں کو ترکوں ہی نے معزول کرایا تھا۔ اس لیے ترکوں کو ان کی طرف سے خطرہ تھا۔ لہذا ۴ ربیع الآخر ۲۴۸ھ کو معتصم کے پوتے احمد کو تختِ خلافت پر متمکن کیا گیا اور مستعین باللہ اس کا لقب تجویز ہوا۔

معتز کے ہوتے ہوئے مستعین کی تخت نشینی اکثر لوگوں کو ناپسند تھی۔ چنانچہ ایک گروہ نے علمِ مخالفت بلند کرتے ہوئے ترکوں پر دھاوا بول دیا۔ اور یہ ہنگامہ نہایت نازک صورت اختیار کر گیا۔ بہت سے باغی قتل ہو گئے اور بہت سے جان بچا کر چلے گئے۔ آخر بغا کبیر نے بڑی مشکل سے بغاوت کے شعلوں کو ٹھنڈا کیا۔

مستعین نے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی حکام کے نظام میں از سرِ نو تبدیلیاں کیں۔ غرض تمام مناصب جلیلہ پر ترک ہی ترک نظر آنے لگے۔

ترکوں کا خیال تھا کہ مستعین کے خلاف بغاوت و شورش کی جو آگ بھڑکائی گئی ہے وہ معتز اور موٴید کی سازش کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے ان شہزادوں کا حق غصب کر لیا تھا۔ چنانچہ ترکوں نے انہیں فنا کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن احمد بن خصیب نے ترکوں کو ان کی بے گناہی کا یقین دلا کر ان پر آنچ نہ آنے دی۔ اس طرح وہ تہ تیغ ہونے سے تو بچ گئے لیکن ان کی جائداد اور سامان وغیرہ ضبط کر کے ان کے پاس تھوڑی سی جاگیر چھوڑتے ہوئے انہیں نظر بند کر دیا گیا۔

مستعین کے عہدِ حکومت میں سلطنت کے اندر کافی شورشیں برپا ہوئیں۔ ۲۴۹ھ میں بغداد میں ہونے والی شورش کو ختم کیا۔ ۲۵۰ھ میں یحییٰ بن عمر و نے خروج کیا۔ اس کے لشکر کے ساتھ مستعین کے مقرر کردہ حاکم عراق کے لشکر نے مقابلہ کر کے یحییٰ کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔

طبرستان، اردن اور حمص میں ہونے والی شورشوں کا بھی قلع قمع کیا۔

تین ترک افسر باغر، بغا اور وصیف دربار میں بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے لیکن باغر باقی دونوں سے حسد کرتا تھا کیونکہ ان کو زیادہ مرتبہ حاصل تھا۔ بغا اور وصیف نے موقع پا کر باغر کو قتل کرا دیا۔ ترک باغر کے قتل میں مستعین کو شریک سازش سمجھتے تھے۔ انہوں نے محل کا گھیراؤ کر لیا۔ مستعین اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر سامرا سے بغداد چلا گیا۔ ترکوں نے معتز کو قید سے نکال کر خلیفہ مقرر کر دیا۔ مستعین کے باقی حامی بھی سامرا سے بغداد چلے گئے۔ اس طرح اب بغداد اور سامرا میں دو الگ الگ خلافتیں قائم ہو گئیں اور تقریباً ایک سال تک یہ کیفیت رہی۔ یہ ایک سال مستعین اور معتز کی فوجوں میں خونریز جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ترکوں نے ذی قعد ۲۵۱ھ میں بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ شکست کے آثار واضح ہونے کے بعد ایک معاہدہ کے تحت مستعین کو معزول کر دیا گیا۔ محرم ۲۵۲ھ میں مستعین خلافت سے دستبردار ہو گیا۔ معتز نے مستعین کو معاہدے کے خلاف بغداد میں رکھا۔ بعد میں نظر بند کر دیا۔ جہاں اس کا انتقال ہوا۔

مستعین باللہ (دوم)۔ (وفات ۸۳۳ھ)

اصل نام ابو الفضل عباس تھا۔ مصر میں عباسی خلفاء میں سے گیارہواں خلیفہ جس کا دورِ حکومت ۸۰۸ھ سے ۸۱۶ھ تک رہا۔ اپنے باپ متوکل کے بعد تخت نشین ہوا۔ ان دنوں ظاہر برقوق کے بیٹے ملک الناصر کا حکومت میں بہت عمل دخل تھا۔ ۸۱۵ھ میں ملک الناصر کے دو ساتھیوں نے بغاوت کر دی۔ ان میں سے ایک شیخ محمودی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مستعین کو ناصر کے خلاف اقدام اٹھانے کے لیے قائل کیا۔ اس طرح مستعین سلطانِ مصر بھی قرار پایا۔ اسی شیخ محمودی نے بعد میں قاضی جلال سے مستعین کی معزولی کا فتویٰ حاصل کر کے ۸۱۶ھ میں مستعین کو معزول کر کے سکندریہ بھیج دیا۔ وہاں سن ۸۳۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

مستعین باللہ۔ (ثالث) (وفات:۔ ۸۵۴ھ)

مصر میں ۱۳واں عباسی خلیفہ۔ جس کا دورِ حکومت ۸۴۵ھ میں سے ۸۵۴ھ تک رہا۔ اپنے باپ معتضد کے بعد تختِ خلافت سنبھالا۔ اس کا اصل نام ابو الربیع سلیمان تھا۔ اس کا دورِ حکومت اپنے پیشروؤں کی بہ نسبت بہت پر امن رہا۔

مستعین نے اپنے زمانے میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کئی اقدامات کیے۔ وہ خود ذاتی طور پر عابد و زاہد اور انصاف پسند حکمران تھا۔

مسترشد باللہ۔ (ربیع الاوّل ۴۸۵ھ - ۵۲۹ھ)

۲۸واں عباسی خلیفہ جس کا دورِ حکومت ۵۱۲ھ سے ۵۲۹ تک رہا۔ اس کا نام فضل اور ابو منصور کنیت تھی۔ ۱۵ ربیع الاول ۵۱۲ھ کو ۲۷ سال کی عمر میں تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ مسترشد کے ایک بھائی نے بیعت نہ کی۔ اور بغداد سے واسط چلا گیا۔ ایک سال بعد گرفتار ہو کر آیا۔ خلیفہ مسترشد نے اسے معاف کر دیا۔ مسترشد کے عہد میں کئی عاملوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔

ذی الحجہ ۵۱۳ھ میں خلیفہ مسترشد نے دبیس بن صدقہ کو مغلوب کرنے کے لیے فوج کشی کی۔ بارکہ میں دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا جس میں مسترشد کو فتح ہوئی۔

سلطان مسعود کی فوجوں سے ایک معرکہ آرائی میں باطنیوں کے ہاتھوں ۱۷ ذی قعدہ ۵۲۹ھ کو مراغہ میں قتل ہوا۔

مستعصم باللہ۔ (۵۹۰ھ - ۶۵۵ھ)۔ ۳۶واں عباسی خلیفہ۔

عبداللہ نام۔ ابو احمد کنیت تھی۔ ۵۹۰ھ میں ایک کنیز ہاجر کے بطن سے پیدا ہوا اور جمادی الآخر ۶۴۰ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔

اگرچہ مستعصم ذاتی طور پر شریف النفس، خوش اخلاق اور پاکباز تھا لیکن اسے حکمرانی کے اوصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ علم و فن کی طرف چنداں راغب نہ تھا۔ البتہ اس نے موٴید الدین محمد بن علقمی کو جو بڑا دانش مند اور بالغ نظر تھا، اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ لیکن وہ نہایت بدطینت اور شر انگیز تھا۔ اس نے منصب وزارت پر فائز ہوتے ہی خلیفہ کو عضوِ معطل بنا کر الگ کر دیا اور خود سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔

اس نے خلیفہ کو لہو و لعب میں مصروف کر کے من مانی کارروائیاں شروع کر

دیں۔ اس دوران خلیفہ کے بیٹے ابوبکر نے بغداد کے محلہ کرخ پر جس میں شیعہ آباد تھے حملہ کیا اور ابن علقمی کو برا بھلا کہا۔ اس سے ابن علقمی آگ بگولا ہو گیا اور خلیفہ سے شکایت کی لیکن اس نے چنداں پرواہ نہ کی۔ ابن علقمی نے غیظ و غضب سے دیوانہ ہو کر چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خان سے مراسلت شروع کی۔ ابن علقمی کی ترغیب اور کوششوں سے ذی الحجہ ۶۵۵ھ میں ہلاکو خان نے نہایت زور شور سے بغداد پہ حملہ کر دیا۔ ہلاکو خان نے اپنے لشکر کو قتل عام کا حکم دے دیا اور تاتاری درندوں نے سولہ لاکھ اور دوسری روایت کے مطابق ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ خون کی اس قدر ندیاں بہائی گئیں کہ دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہو گیا اور خاندان عباسیہ کا کوئی بھی فرد جو مغلوں کے ہتھے چڑھ گیا زندہ نہ بچ سکا۔ ابن علقمی نے اپنے آقا مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر ایک ستون سے باندھ کر اس کا خاتمہ کرا دیا۔

اب ہلاکو خاں نے شاہی کتب خانے کو برباد کرنے کی ٹھانی اور تمام بے شمار و نایاب کتابیں دریائے دجلہ میں بہا دی گئیں۔ دجلہ کا پانی جو مقتولوں کے خون سے سرخ ہو رہا تھا اب ان کتابوں کی روشنائی سے سیاہ ہو گیا۔ اس خونریزی اور تباہی و بربادی کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

سقوط بغداد کے بعد عراق کے گوشے گوشے میں تاتاریوں کا پرچم اقتدار لہرانے لگا اور عباسی خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت نے بھی دم توڑ دیا۔

مستعصم کے نام سے عباسیوں کا ایک اور خلیفہ بھی رہا جس کا دور حکومت ۷۸۸ھ سے ۷۹۱ھ تک رہا۔

مستکفی باللہ۔

۲۲واں عباسی خلیفہ جو صفر ۳۳۳ھ میں اکتالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ صرف ایک سال چار ماہ حکومت کی۔

مستکفی کا نام عبداللہ اور ابوالقاسم کنیت تھی۔ املح الناس کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔

اس کا مختصر دور حکومت بھی اپنے پیشرؤں کی طرح انتشار کا شکار رہا۔

معز الدولہ دیلمی حکومت پر قبضے کی اپنی دیرینہ کوششوں میں مصروف تھا۔ ۳۳۴ھ کے اوائل میں اس نے مستکفی کے ہاتھ پر بیعت کر کے نظام سلطنت میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ موقع ملتے ہی معز الدولہ نے مستکفی کو نظام سلطنت سے بے دخل کر کے اس کے گزارے کے لیے ماہانہ وظیفہ اور کچھ جاگیر مقرر کر دی۔ تھوڑے عرصے بعد اسے قید کر دیا۔ اور اب بنی بویہ خلافت عباسیہ کے سیاہ و سپید کے مالک بن گئے۔

مستکفی باللہ۔

مصر میں تیسرا عباسی خلیفہ جس کا دور حکومت ۷۰۱ھ سے ۷۴۰ھ تک رہا۔ حاکم بامر اللہ کی وفات کے وقت ناصر محمد بن قلاؤن دوسری دفعہ مصر میں حکومت کر رہا تھا۔ اس نے حاکم کے بیٹے ابوالربیع سلیمان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ناصر اور مستکفی میں مدت تک گہرے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ اتفاق و اتحاد اور محبت و احترام کے ان تعلقات میں ۳۲ سال تک کوئی فرق نہ آیا۔ پھر بعض مفسدہ پردازوں کی کوششوں نے ناصر کے دل میں مستکفی کے بارے میں غلط خیالات کو پرورش دی۔ چنانچہ ۷۳۶ھ میں ناصر نے مستکفی کو قصر کبش میں واپس بھیج دیا۔ ۷۳۷ھ میں قولی روانہ کر دیا۔ یہ آخری چار پانچ سال مستکفی صرف نام کا خلیفہ رہا۔

مستمسک باللہ۔ (وفات: ۹۲۰ھ)

مصر میں خلافت عباسیہ کے آخری خلفاء میں سے تھا۔ جس کا دور حکومت ۹۰۳ھ سے ۹۲۰ھ تک رہا۔ اس کے عہد میں پانچ بادشاہ مصر کے اورنگ سلطنت پہ بیٹھے۔ (۱) ناصر محمد۔ (۲) ظاہر قانصوہ اشرفی۔ (۳) ملک الاشرف جان بلاط۔ (۴) ملک العادل طومان بائی۔ (۵) ملک قانصوہ غوری۔

مستمسک نے سترہ سال تک امن و عافیت سے فریضۂ خلافت انجام دیا۔ اور اس دوران میں کوئی قابل ذکر واقعہ صورت پذیر نہ ہوا۔

مستنجد باللہ۔ (وفات ۵۶۶ھ)

۳۲واں عباسی خلیفہ جس کا دور حکومت ۵۵۵ھ سے ۵۶۶ھ تک رہا۔

یوسف نام۔ ابومظفر کنیت تھی۔ ربیع الآخر ۵۱۰ھ میں ایک گرجستانی کنیز طاؤس کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۵۴۶ھ میں ولی عہد مقرر کیا گیا اور ربیع الاول ۵۵۵ھ میں تخت خلافت پر متمکن ہوا۔

۵۵۶ھ میں ترکمانوں، کردوں اور عربوں نے علم بغاوت بلند کیا لیکن خلیفہ نے ان سب کو مغلوب کر کے بغاوت کا استیصال کیا۔ حلہ کے بنی اسد نے سرکشی پہ کمر باندھی اور ۵۵۸ھ میں خلیفہ نے فوج کشی کر کے انھیں عراق سے نکال دیا۔ باقی دور حکومت بھی مختلف جنگوں میں گزارا۔

ربیع الآخر ۵۶۶ھ میں مستنجد سخت بیمار ہو گیا۔ اسی بیماری کی حالت میں علاج کے بہانے امرا اور طبیب کی سازش پر حمام میں بند کر دیا اور وہیں اس کا دم گھٹ گیا۔

مستنجد انصاف پسند، رعایا پرور اور شفیق و بامروت تھا۔ اس نے ہر قسم کا محصول بند کر دیا۔ فسادیوں کا قلع قمع کر کے فتنہ و شر کی بنیاد اکھاڑ دی۔

بغداد کا ایک جابر قاضی ابن مرخم بڑا دولت مند تھا مستنجد نے اسے قید کر کے ساری دولت ضبط کرنے کے بعد اس کے مستحق ساتھیوں میں تقسیم کر دی۔ ابن جوزی لکھتا ہے:۔

"مستنجد صاحب فہم و ذکا، عالم و فاضل اور صاحب الرائے خلیفہ تھا۔ اسے اصطرلاب اور فلکی آلات بنانے میں دسترس تھی وہ ایک فصیح شاعر بھی تھا۔"

اس لقب سے ایک دوسرا خلیفہ مصر میں بھی رہا جس کا دور حکومت ۸۵۹ھ سے ۸۸۴ھ تک رہا۔ اس کے عہد میں چھ بادشاہ مصر میں تاج پوش سلطنت ہوئے:

۱۔ اشرف اینال۔ ۲۔ احمد بن اینال۔ ۳۔ ملک ظاہر خوش قدم۔ ۴۔ ملک الظاہر بلبائی۔ ۵۔ ملک الظاہر تمربغا۔ ۶۔ ملک الاشرف قایتبائی۔

مستنصر باللہ۔

۳۶واں عباسی خلیفہ۔ دور حکومت ۶۲۳ تا ۶۴۰ھ۔ اس کی ماں ترک النسل تھی۔ تاتاریوں سے جنگ کے لیے مستنصر نے ایک بڑا لشکر تیار کر کے تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔ اس کے نام کا خطبہ اندلس میں پڑھا جاتا تھا۔ مستنصر نے بغداد میں "مدرسہ مستنصریہ" قائم کیا۔ جس کے آثار آج کل بھی موجود ہیں۔

بغداد سے خلافت عباسیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد مصر میں روشن ہوا۔ مستعصم باللہ کے قتل کے وقت اس کا چچا ابوالقاسم احمد تاتاریوں کی قید سے نکل بھاگا تھا اور ۶۵۹ھ میں عرب سرداروں کے ساتھ مصر پہنچا، مصر کے بادشاہ الظاہر بیبرس کی مدد سے اس نے بیعت خلافت کی اور مستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے نام کا خطبہ اور سکہ چلنے لگا۔ اب مستنصر نے بغداد کو تاتاریوں کے قبضے سے چھڑانا چاہا۔ تو ظاہر بیبرس نے اس کے لیے ایک لشکر جرار مہیا کر دیا۔ تاتاریوں سے گھمسان کا

رن پڑا۔ اور مستنصر کو شکست ہوئی اور شکست سے بد دل ہو کر وہ کہیں غائب ہو گیا۔

مسجد۔ سجدہ کرنے کی جگہ۔ اصطلاحاً مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو کہا جاتا ہے جہاں پانچوں وقت نماز ادا کی جاتی ہے۔ ویسے اسلام میں کسی خاص معین جگہ پہ مسجد کے لیے پابندی نہیں ہے بلکہ اسلام میں تو اللہ تعالیٰ نے تمام زمین کو مسجد کے طور پہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ مسجد مدینہ کی نواحی بستی قبا میں نبی کریمؐ نے خود بنوائی تھی۔ جب آپ مدینہ منورہ کی آبادی میں داخل ہوئے تو وہاں بھی آپؐ نے مسجد قائم کروائی۔ یہ مسجد اب مسجد نبویؐ کے نام سے مشہور ہے۔ ابتدا میں مسجدیں کچی بنائی جاتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مسجد کی تعمیر مسلمانوں کے لیے ایک فن بن گئی۔ اس طرح ایک خاص طرز تعمیر کا ارتقا ہوا۔ جس میں محراب، منبر، گنبد، ایوان، صحن اور میناروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کے ہر دور کے حکمرانوں نے مسجدوں کی تعمیر کی طرف خصوصی توجہ دی۔ مشہور مساجد میں بیت اللہ مکہ مکرمہ کی مسجد، مدینہ منورہ میں مسجد نبوی، بیت المقدس کی مسجد، قرطبہ، قاہرہ، دمشق، بغداد، سامرہ، استنبول اور قیروان کی مسجدیں ہیں۔ برعظیم پاک و ہند کے علاقوں میں مغل بادشاہوں نے مساجد کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شاہجہان، اورنگ زیب کے عہد میں آگرہ، دہلی اور لاہور میں مساجد تعمیر ہوئیں اورنگ زیب کے عہد کی قائم کردہ مسجد جو لاہور میں شاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے اپنی وسعت کی وجہ سے دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے اور اپنے فن تعمیر کا بے مثال شاہکار ہے۔ ٹھٹھہ میں شاہجہان کی تعمیر کردہ مسجد بھی کافی وسیع اور شاہکار نمونہ ہے۔

مسجد اقصیٰ۔ قبلہ اول اور دنیائے اسلام اور دوسرے مذاہب کی مقدس ترین جگہ۔ نبی کریمؐ نے ایک حدیث میں مسجد اقصیٰ کی فضیلت اس طرح بیان کی ہے "مسجد حرام (مکہ مکرمہ)، مسجد نبوی (مدینہ منورہ) کے بعد اگر کوئی تیسرا سفر جائز ہے تو وہ مسجد اقصیٰ کا ہے" (او کما قال علیہ السلام)۔ اس طرح اس مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب ۲۵ ہزار نمازوں کے برابر قرار دیا۔ (او کما قال علیہ السلام)۔

مسجد اقصیٰ وہی مسجد ہے جسے سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے بنایا تھا۔ مسجد اقصیٰ کا سات لاکھ مربع گز کا محیط پورا حرم شریف کہلاتا ہے۔ مسجد اقصیٰ کی اصل عمارت حرم احاطہ کے جنوبی حصے میں ہے اور اس کا رقبہ تقریباً ۱۵ ہزار مربع گز ہے۔ حرم کے صحن کے باقی حصے میں مختلف یادگاریں ہیں۔ حرم کے دروازوں میں دو دروازے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے نام سے منسوب ہیں۔ ایک دروازہ باب حطہ اور ایک دروازہ باب توبہ کہلاتا ہے۔ جہاں داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ ان دروازوں کے علاوہ بنی اسرائیل کے بارہ دروازے ہیں۔ محراب مریم بھی حرم کے اندر واقع ہے۔ جہاں فرشتے حضرت مریمؑ کے لیے گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے تھے۔ اس میں حضرت زکریا علیہ السلام کی محراب بھی ہے جہاں فرشتوں نے انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری سنائی تھی۔ ایک محراب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اور ایک کرسی حضرت سلیمان کی بھی موجود ہے جہاں وہ بیٹھ کر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا مینار بھی موجود ہے جہاں آپؑ اعتکاف کیا کرتے تھے۔

مسجد اقصیٰ ہی وہی جگہ ہے جہاں سے نبی کریمؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) لے گئی ......"

(سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۱)

حدیث شریف میں بھی معراج کے تفصیلی ذکر کے دوران مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کرام کی نماز میں نبی کریمؐ کی امامت کا ذکر کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے قبضے کے بعد مسجد اقصیٰ کی تعمیر و توسیع اور مرمت کا اعزاز اموی خلیفہ عبدالمالک کو حاصل ہوا۔ اس نے مصر کی سات سال کی پوری آمدنی اس کی تعمیر و تکمیل کے لیے وقف کر دی تھی۔

صلیبی جنگوں کے زمانے کے ایک طویل عرصہ کے علاوہ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے پاس رہی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ پہ یہودیوں (اسرائیل) نے قبضہ کر لیا۔ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا ایک منصوبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کئی بار مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کی۔ ایک سازش کے تحت ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجد اقصیٰ کو آگ بھی لگائی گئی۔ تاکہ اس آگ سے مسجد کی عمارت ضائع ہو جائے اور پھر اس جگہ وہ اپنے صیہونی منصوبے کی تکمیل کر سکیں۔ اس وقت بھی عربوں اور اسرائیل میں وجہ نزاع دوسرے مقبوضہ علاقوں کے ساتھ ساتھ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی واگزاری بھی ہے۔

(نیز دیکھیے: بیت المقدس۔ قبۃ الصخرہ)

مسجد امیر حمزہؓ۔ مدینہ منورہ سے تقریباً ۳ میل کے فاصلہ پہ دامن کوہ میں شہدائے احد کی قبروں اور حضرت امیر حمزہؓ کی قبر کے قریب یہ مسجد ہے۔ جہاں روایات کے مطابق غزوۂ احد میں مسلمانوں کو جو عزیمت اٹھانا پڑی، اس کی بابت سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۴۰ یہاں اتری تھی۔

مسجد بنو امیہ۔ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ۷۰۵ء میں دمشق میں یہ عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کی تعمیر میں ایرانی، ہندوستانی اور یونانی دستکار اور صناع بھی لگائے۔ اور مصر سے بھی کئی فنکار بلائے۔ اس مسجد کی دیواریں سنگِ مرمر اور سنگِ خارا سے آراستہ ہیں۔ محراب پہلی بار باضابطہ طور پر اسی مسجد میں بنایا گیا۔ ۱۰۶۹ء اور پھر ۱۴۰۵ء میں تیمور لنگ کے ہاتھوں نذرِ آتش ہوئی اور آخری دفعہ ۱۸۹۳ء میں اسے جلایا گیا۔ لیکن اب بھی اس کے آثار باقی ہیں اور مقاماتِ مقدسہ اور عجائباتِ عالم میں اب بھی اسے اہم مقام حاصل ہے۔

مسجد جنّ۔ قرآن مجید کی سورۂ جنّ جس مقام پر نازل ہوئی وہاں اب (مکہ مکرمہ سے منیٰ کے راستے میں) مسجد تعمیر کر دی گئی ہے اسے مسجد جنّ کہتے ہیں۔

مسجد حرام۔ مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کے چاروں طرف کی مسجد کو مسجد حرام کہا جاتا ہے۔ اس چار دیواری میں چاہِ زمزم اور مقام ابراہیمی بھی ہیں۔ نبی کریمؐ کی زندگی میں کعبہ کے گرد جگہ بہت کم تھی اور مسجد کی کوئی حد بندی نہ تھی۔ فتح مکہ ۸ھ/ ۶۲۹ء کے بعد مسلمانوں نے اس میں باقاعدہ نماز کی ادائیگی شروع کی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ارد گرد کے متعدد گھر خرید کر مسجد میں شامل کر دیے۔

حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے ۲۶ھ میں اسے مزید وسعت دی۔ عبداللہ بن زبیر (۷۳ھ)، جو امیر معاویہؓ کے آخری زمانے میں حرمین کے خود مختار فرمانروا تھے، نے اسے ۶۴ھ میں مزید وسیع کیا۔ بعد کی تعمیرات اور اضافے درج ذیل ہیں۔

ولید بن عبدالملک (۸۶ھ - ۹۶ھ) نے مسجد کو ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ منصور عباسی (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) نے اردگرد کے گھروں کو مسجد میں شامل کر دیا۔ مہدی عباسی (۱۵۸ھ - ۱۶۹ھ) نے کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان گھر خرید کر مسجد میں شامل کر دیئے۔ مقتدر عباسی (۲۹۵ھ - ۳۲۰ھ) نے مسجد کو مزید وسعت دی۔

۸۰۳ میں مسجد کو سیلاب سے نقصان پہنچا۔ تو مصر کے والی نے اس کی مرمت کرائی اس کے بعد مصری حکمران مسجد کی تعمیر و توسیع کی طرف خصوصی توجہ دیتے رہے۔ عثمانی خلافت کے دور میں کئی حکمرانوں نے بھی مسجد حرام کی تزئین اور تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

حجاز مقدس میں سعودی خاندان نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حرم مکہ اور حرم مدینہ کی تعمیر و توسیع اور آرائش کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کیا۔ خصوصی طور پر شاہ فیصل شہید کے دَور میں قرب و جوار کی دکانیں اور مکانات خرید کر انہیں گرا کر مسجد میں اضافہ کیا گیا۔ کیونکہ زائرین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ خصوصی طور پر حج کے زمانے میں لاکھوں انسانوں کے سامنے مسجد کی وسعت کم محسوس ہوتی تھی۔ اب موجودہ سعودی حکومت بھی مسجد میں مزید توسیع کر رہی ہے۔

مسجد میں چاروں طرف ستون ہیں۔ ان کی تعداد ۵۸۹ بتائی جاتی ہے۔

سعودی حکومت سے پہلے مسجد میں آئمہ اربعہ کے پیروکاروں کی وجہ سے چار مصلّے قائم تھے اور اس طرح چار جگہ الگ الگ نمازیں ادا ہوتی تھیں۔ خاندان سعود نے اقتدار سنبھالنے کے بعد چاروں آئمہ کے مصلّے ختم کرا دیے ہیں۔ اب صرف ایک ہی امام کی اقتدا میں نماز ہوتی ہے۔

مسجد حرام میں داخل ہونے کے کئی دروازے ہیں۔

بابُ السلام۔ بابُ النبیؐ، بابُ العباس، بابِ علی۔ بابُ العشرہ، باب الصفا بابُ الرحمتہ۔ باب الشریف۔ باب ابراہیم۔ بابُ العمرہ۔ بابُ العتیق۔ بابُ الندوہ۔ بابُ البغلہ۔ بابُ الاجیاد، بابِ عجلان، بابُ الوداع، بابُ العجلہ۔ بابُ المدرسہ۔ باب اُم ہانی۔

مسجد شہید گنج۔ ایک روایت کے مطابق ۱۷۲۲ء میں ایک مغل درباری فلک بیگ نے موجودہ نولکھا بازار کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی جس کے ساتھ ایک باغیچہ اور ایک کنواں تھا۔ مسجد کا متولی ایک شخص دین محمد مقرر کیا گیا۔ دوسری روایت کے مطابق شاہجہان کے عہد میں ایک شخص عبداللہ خان نے یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ شخص دارا شکوہ کا خانساماں تھا۔ سکھوں کے عہد تک اس مسجد میں باقاعدہ نماز ادا ہوتی رہی تھی۔ بعد میں مسجد سے ملحق ایک گوردوارہ بھی تعمیر کیا جانا بیان ہوتا ہے۔ اس علاقہ کو گنج شہیداں یا شہید گنج کا نام دیا گیا۔ مسجد اور گوردوارہ نام کی نسبت سے مسجد شہید گنج اور گوردوارہ شہید گنج پکارے جاتے تھے۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں شاہی مسجد لاہور میں گھوڑوں کا اصطبل بنایا گیا اور مسجد شہید گنج میں کوڑا کرکٹ بھر دیا گیا۔ سکھوں کی عملداری ۷۰ سال تک رہی۔

۱۸۸۰ء میں دین محمد متولی کی اولاد میں سے نور محمد نے مسجد کی واگزاری کے لیے جدوجہد کی اور اس نے گوردوارہ کے گرنتھی کے خلاف دعوےٰ کیا جو ناکام رہا۔ پھر بندوبست کے محکمے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ تو ۲۵ جون ۱۸۸۵ء کو اس نے ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں درخواست دی۔ یہاں بھی ناکام ہونے کے بعد اس نے جوڈیشنل کمشنر کی عدالت میں رجوع کیا مگر جوڈیشنل کمشنر نے بھی ڈپٹی کمشنر کے فیصلے کو بحال رکھا۔ اب نور محمد کے پاس خاموشی کے بغیر کیا چارہ تھا۔ اس کے بعد ۵۰ سال تک مسجد شہید گنج تاریخ کا فراموش شدہ ورق بنی رہی۔

۱۹۲۲ء میں پنجاب کے مٹھی بھر سکھوں نے گوردوارہ ایکٹ پاس کرایا جس کے تحت گوردواروں اور ان کی املاک کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک ٹریبونل مقرر کیا گیا۔ اس ٹریبونل کے روبرو جب مسجد شہید گنج کی املاک کا مسئلہ پیش ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے انجمن اسلامیہ اور دوسری طرف سے ایک سکھ ہرنام سنگھ نے انفرادی طور پر املاک کے دعویدار ہونے کا دعوےٰ کیا۔ دونوں مقدمات خارج ہو گئے۔ انجمن اسلامیہ تو یہیں خاموش ہو گئی۔ لیکن ہرنام سنگھ ہائیکورٹ تک گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ہائیکورٹ لاہور نے فیصلہ دے دیا کہ مسجد شہید گنج کی تمام املاک کی مالک شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر ہے۔ جب اس فیصلے کا اعلان ہوا تو پنجاب میں انتخابات کا ہنگامہ گرم تھا۔ چنانچہ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے مسجد شہید گنج کو باقاعدہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ انتخابات ختم ہوتے تو مسلمانانِ پنجاب جاگے۔ چنانچہ مسجد شہید گنج کا مسئلہ پھر اُبھرا اور مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اس معاملہ میں ان سے انصاف نہیں کیا گیا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ یکم جولائی ۱۹۳۵ء کو اچانک لاہور میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سکھ مسجد کو شہید کر کے اس پر گوردوارہ تعمیر کرنے والے ہیں۔ سکھ جتھے بدستور لاہور پہنچ رہے تھے سکھوں کے ایک خفیہ اجلاس میں لاہور کے سردار مہتاب سنگھ نے اپنی طرف سے ایک لاکھ روپیہ ایک ہزار سیوہ دار، اور ایک ہزار بوری آٹا کی پیش کش کی تاکہ لاہور میں سکھ باقاعدہ ایک مورچہ لگا سکیں۔ کہتے ہیں کہ اسی شام مسلمانوں کا ایک جلوس دہلی دروازہ کی طرف سے شہید گنج کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ نرندر سنگھ سٹی مجسٹریٹ نے [illegible] مگر مسلمان بڑھتے گئے۔ آخر سٹی مجسٹریٹ کو لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ [illegible] کی کوششوں سے سکھوں اور مسلمانوں کے قائدین کی مشترکہ میٹنگ ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے مولانا ظفر علی خانؒ، سید حبیبؒ ایڈیٹر سیاست، مولانا داؤد غزنوی [illegible] امیرالدین۔ سکھوں کی طرف سے ماسٹر تارا سنگھ، [illegible] مسافر اور سردار منگل سنگھ ایم ایل اے شامل ہوئے۔ [illegible] اور سکھوں نے مسلمانوں کو اپنے کم از کم مطالبات پیش کرنے کے لیے [illegible]۔

اسی شام برکت علی محمڈن ہال میں زیرِ صدارت میاں [illegible] مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہاں مطالبہ کیا گیا کہ مسجد کو [illegible] اور مسجد کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ چھوڑ دیا جائے۔ [illegible] جلوس مسجد شہید گنج سے تقریباً ۱۰۰ گز کے فاصلے تک پہنچ گیا جس کو [illegible] کیا گیا۔ اس روز سکھوں کا ایک جتھہ چار ہزار افراد پر مشتمل [illegible] بھی شامل تھیں۔

موچی دروازہ کے باہر ۲۵ ہزار مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں [illegible] مقررین نے خوب زوردار تقریریں کیں۔ ۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو گورنر پنجاب [illegible] لاہور پہنچا۔ آتے ہی دونوں فریقوں کے نمائندگان سے مذاکرات شروع کر دیے [illegible] نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

۸ جولائی ۱۹۳۵ء کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سکھوں کے ایک خفیہ جلسہ کے فیصلے کے مطابق سکھوں نے رات کے وقت مسجد شہید گنج کو گرانا شروع کر دیا تھا جس کے لیے پہلے سے ہی سامان اکٹھا کیا جا چکا تھا۔ حکومت نے مسجد کو جانے والے تمام راستوں پر فوج بٹھا دی اور فضا میں فوجی طیارے اڑتے رہے جس کے سائے تلے سکھ نہایت اطمینان سے مسجد گراتے رہے۔ اس دن [illegible] مسلمانوں کا ایک جلوس مسجد شہید گنج کی طرف بڑھا جس کو لاٹھی چارج کے ذریعے منتشر کر دیا گیا۔

جہاں تک مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کا تعلق تھا، مجلس احرار ان دنوں عوام میں زیادہ مقبول تھی۔ لیکن احرار نے اس تحریک سے اس لیے علیحدگی اختیار کرلی کہ اس کی قیادت احرار کی بجائے مولانا ظفر علی خان کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کا انجام جو ہوا سو ہوا لیکن اس نے مجلس احرار کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔

اب ایک نئی سیاسی جماعت اُبھری نیلی پوش۔ جس کی قیادت مولانا ظفر علی اور سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" کے ہاتھوں میں تھی۔ ہزاروں نیلی پوش نوجوان دن بھر مسجد شہید گنج کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے اور پٹتے مرتے۔ انہی دنوں مسلمانوں کے تالیف قلوب کے لیے حکومت نے مسجد شاہ چراغ (واقع ہائی کورٹ) واگزار کرکے مسلمانوں کو دے دی۔ ۱۴ جولائی کو مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، ملک لال خان، ملک لال دین قیصر، میاں فیروز دین احمد کو لاہور بدر کردیا۔ ۱۶ جولائی کو لاہور میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ ۱۹ جولائی کو شاہی مسجد میں عظیم الشان اجتماع ہوا۔ چند دن بعد مسلمانوں نے ہر قیمت پر شہید گنج مسجد تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر گورا فوج نے گولی چلا دی۔ حالات اور بگڑ گئے اور گولیاں چلتی رہیں۔ مسلمان گولیوں کی بارش میں "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے، سینے تانے بڑھتے۔ گولی کھا کر گرتے پھر اٹھتے بڑھتے تا آنکہ شہید ہوجاتے۔ عوامی لیڈر لاہور سے جا چکے تھے۔ پنجاب کے مسلمان وزراء اپنی قوم کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ مسجد شہید گنج کی خونی تحریک بغیر کسی لیڈر کے غیر منظم تحریک پر چلتی رہی اور مسلمان نوجوان جان کی قربانی دیتے رہے۔

اس مرحلے پر ضلع سیالکوٹ کے مشہور دینی پیشوا پیر جماعت علی شاہ نے تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہی دنوں حکومت نے سکھوں کی کرپان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو بغیر لائسنس تلوار رکھنے کی اجازت دے دی۔ جب کرپانوں اور تلواروں کی نمائش ہوئی تو خونریزی قدرتی امر تھا۔ پیر جماعت علی شاہ کے پاس بھی مسجد شہید گنج کی واگزاری کا کوئی واضح پروگرام نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی قیادت بھی تحریک کو منظم نہ بنا سکی۔ لہٰذا کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا۔ مسلمان بیک وقت دو طاقتوں سے نبرد آزما تھے۔ ایک حکومت دوسری سکھ۔ جو خاصہ مشکل کام تھا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لاہور کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مسٹر سیل کی عدالت میں مسجد شہید گنج بطور دعویدار پیش ہوئی۔ مقدمہ چلا۔ شہادتیں اور وکلاء کی بحثیں ہوئیں۔ ۴ مارچ ۱۹۳۷ء کو سیشن جج نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ مسلمان ایک مرتبہ پھر شکست کھا گئے۔ پیر جماعت علی شاہ حج پر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد یہ تحریک نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جنہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر شاہی مسجد بنا کر سول نافرمانی جاری رکھی۔ اس مرحلے پر قائد اعظم لاہور تشریف لائے۔ مذاکرات ہوئے۔ مسلمان قیدی رہا کر دیے گئے۔ قائد اعظم نے ایک مصالحتی بورڈ کی تشکیل کی جو یوں تھی۔

علامہ اقبالؒ، مولوی عبدالقادر قصوریؒ، میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء، راجہ نرندر ناتھ، پنڈت نانک چند ناز، سردار بوٹا سنگھ ایڈووکیٹ، سردار اجل سنگھ، سردار سورن سنگھ۔ میاں احمد یار دولتانہ کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ ۳۷-۱۹۳۶ء کے انتخابات میں مسجد شہید گنج کے مسئلہ کو بے حد اہمیت حاصل رہی۔ یونینسٹ پارٹی کے کئی ممبروں نے مسجد کی واپسی کے وعدے پر مسلمانوں سے ووٹ حاصل کیے۔ ڈسٹرکٹ جج کے فیصلہ کے خلاف مسلمانوں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کردی۔ چنانچہ ۹ نومبر ۱۹۳۷ء کو مسجد شہید گنج کا مقدمہ ہائی کورٹ کے فل بنچ کے روبرو پیش ہوا۔ جس میں چیف جسٹس ینگ (انگریز)، جسٹس بھڈے (ہندو) اور جسٹس دین محمد (مسلمان) شامل تھے۔ کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سکھوں کی طرف سے رائے بہادر بدری داس اور سردار ہرنام سنگھ پیروی کر رہے تھے۔ جبکہ مسلمانوں کی طرف سے ملک برکت علی اور ڈاکٹر عالم پیش ہوئے۔ بعد میں اکثر مدعیان نے اپنے وکالت نامے بحق ڈاکٹر عالم منسوخ کر دیے تھے۔

بحث ختم ہونے کے بعد عدالت نے فیصلہ محفوظ رکھا جو چند دنوں بعد سنا دیا گیا۔ تینوں ججوں نے علیحدہ علیحدہ فیصلے لکھے تھے۔

مسلمان مقدمہ ہار چکے تھے۔ اس فیصلہ نے پنجاب کے مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ صورتِ حال پھر بگڑ گئی۔ اس پر ۲۰ جنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ کہ ہائیکورٹ لاہور کے فیصلہ سے جو تشویشناک صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی اس پر غور کیا گیا۔ چوہدری خلیق الزمان اور راجہ محمود آباد کی رائے تھی کہ سکندر حیات وزیر اعلیٰ کو مستعفی ہوجانا چاہیئے۔ مگر نواب زادہ لیاقت علی خان اور احمد یار خان اس رائے کے خلاف تھے۔

یونینسٹ پارٹی کے کئی مسلمان ممبران ہائیکورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کے ردِ عمل سے ہراساں تھے۔ مسجد شہید گنج کے مسئلے پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبران عام مسلمانوں کے ہم خیال تھے وہ چاہتے تھے کہ سر سکندر حیات اس معاملہ میں مسلمانوں کی امداد کریں۔ چنانچہ سر سکندر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ گورنر سے مسجدوں کے تحفظ کے لیے کوئی قانون بنانے کے لیے کہیں گے۔ اور اگر گورنر نہ مانا تو وہ اور تمام مسلمان ممبر کونسل سے استعفیٰ دے دیں گے۔

سر سکندر نے اس غرض کے لیے تمام مسلمان ممبرانِ کونسل سے ان کے استعفے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ ملک برکت علی کے بل کی حمایت میں بھی یونینسٹ پارٹی کے تقریباً ۴۱ ممبران تھے اور پھر ہائیکورٹ کے فیصلے پر عام مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی جس سے سر سکندر خائف تھے۔ آہستہ آہستہ سر سکندر نے کونسل کے مسلمان ممبران کو کچھ تحریص ترغیب کے ذریعے اور کچھ گورنر کے دبدبے سے اپنا ہم خیال بنا لیا۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ پنجاب سر سکندر حیات نے جو خود کو مسلمان کہتا تھا بڑی ڈھٹائی سے صوبائی کونسل قانون ساز میں تقریر کرتے ہوئے ملک برکت علی کے پیش کردہ بل کے متعلق کہا "..... ملک برکت علی کا بل مسجد کو واگزار تو نہیں کراسکے گا لیکن اس سے تلخی بڑھے گی۔ اور کسی مصالحانہ فیصلے کے تمام امکانات ختم ہوجائیں گے۔ یہ صورتِ حال صوبہ پنجاب کے کسی بھی خیر خواہ کے لیے خوش کن نہ ہوگی.....

سر سکندر کی تقریر ختم ہوئی تو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ایک مسلمان ممبر نے فوراً سر سکندر حیات کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی۔ ملک برکت علی چلاتے رہے کہ ایسی تحریک پیش کرنے کا وہ وقت نہ تھا مگر اکثریت نے اس تحریک کو رد کرتے ہوئے سر سکندر حیات اور اس کی حکومت پر مکمل اعتماد کا ووٹ منظور کر دیا۔

سکھ خوشیاں منا رہے تھے کہ مسجد شہید گنج گوردوارہ بن گئی۔ ہندو مسرور تھے کہ ان کے سیاسی رقیبوں یعنی مسلمانوں کو ایک زبردست شکست ہو گئی۔ سر سکندر مطمئن تھے کہ ان کی وزارت بچ گئی۔ لیکن مسلم عوام حیران ششدر تھے یہ کیا ہوگیا۔ وزیر اعلیٰ مسلمان اور صوبائی کونسل میں مسلمان ممبران کی غالب اکثریت کے باوجود ایک مسجد کو گوردوارہ بنا دیا گیا۔

مسجد ضرار۔ ضرار کا لفظ ضرر سے ہے۔ یعنی نقصان۔ مسجد ضرار اصطلاحاً اس مسجد کو کہتے ہیں جو کسی مسجد کے مقابلے میں اُس مسجد کی ضرر رسانی کے لیے بنائی جائے۔ منافقین نے نبی کریمؐ کے زمانے میں مسجد قبا کے مقابلے میں ایک مسجد کی تعمیر کی تھی تاکہ مسلمانوں

میں پھوٹ ڈالی جائے۔ منافقین نے نبی کریمؐ کو بھی اس مسجد میں آنے کی دعوت دی تھی لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کی نیتوں سے نبی کریمؐ کو آگاہ کر دیا تھا۔ آپؐ نے چند صحابہ کرامؓ کو مقرر فرمایا کہ وہ اس مسجد کو گرادیں۔ یہ واقعہ ماہ رمضان ۹ ھ/ ۶۳۰ء کا ہے جب آپؐ تبوک سے واپس آ رہے تھے۔

مسجدِ فتح ۔ یہ مدینہ منورہ کے نواح میں غزوۂ خندق والے مقام پر ہے۔
غزوۂ خندق کے موقع پر کفار کا محاصرہ بیس دن جاری رہا۔ یہ طویل عرصہ صحابہ کرامؓ نے شب و روز کفار کے متوقع حملہ اور خندق کی حفاظت میں گزارا۔ اس دوران جہاں جہاں نمازیں ادا کی گئیں وہاں خندق کے ساتھ ساتھ مساجد بن گئیں جو "مساجدِ فتح" کے نام سے مشہور ہیں۔

مسجد قبا ۔ مسلمانوں کی پہلی مسجد جس کی بنیاد نبی کریمؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے رکھی۔ جس کی تعمیر میں آپؐ نے بہ نفسِ نفیس حصّہ لیا۔ مستند روایات کے مطابق جب نبی کریمؐ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مدینہ سے کچھ فاصلے پر قبا بستی میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے اس مسجد کی بنیاد رکھی۔ مفسرین کے بیان کے مطابق وہ آیت اسی مسجد کی بابت نازل ہوئی تھی جس میں فرمایا گیا تھا۔ "اس مسجد کی بنیاد روزِ اوّل سے ہی تقویٰ اور پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے۔"
یہ مسجد وضع قطع کے لحاظ سے مربع ہے اور اس کا ایک ضلع ۴۰ میٹر ہے اس میں ۹۴ ستون، ایک محراب، سنگِ مرمر کا ایک قدیم منبر، اذان دینے کی جگہ اور ایک کنواں ہے۔ اس کا صحن کافی وسیع ہے۔ مسجد میں ایک گنبد بنا ہوا ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں نبی کریمؐ کی اونٹنی بیٹھی تھی۔

مسجدِ قبلتین ۔ مکی زندگی میں ۱۳ سال بعد مدینہ منورہ میں ۱۴ ماہ تک مسجدِ اقصیٰ قبلۂ اوّل کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی جاتی تھی۔ رجب ۲ ھ میں ایک دن نبی کریمؐ مدینہ منورہ کی ایک نواحی بستی میں نمازِ ظہر ادا کر رہے تھے۔ نماز کے وقت اللہ تعالےٰ نے وحی کے ذریعے قبلہ کی تبدیلی کا حکم دیا۔ نبی کریمؐ نے حکم کی تعمیل میں اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف موڑ لیا۔ اسی مسجد کو مسجدِ قبلتین کہتے ہیں۔

مسجدِ نبویؐ ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدومِ میمنت لزوم سے جب مدینہ منورہ مشرف ہوا تو آپؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان پر فروکش ہوئے اور سات ماہ تک یہیں قیام فرمایا۔ آپؐ نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مسلمانوں کی عبادت اور دوسرے معمولات کے لیے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے دو یتیم بچوں کی ملکیت ایک زمین کا قطعہ تھا۔ زمین کا ٹکڑا خریدنے کے بعد اس پر تعمیر شروع کر دی گئی۔ صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپؐ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ کچی اینٹوں اور پتھروں سے یہ مسجد بنائی گئی۔ کھجور کے تنے بطور ستون استعمال کیے گئے۔ برگِ خرما کا چھپر بنایا گیا۔ فرش بھی کچا ہی تھا۔ اس کے تین دروازے اور صحن تھا۔ مشرق کے دروازے سے آپؐ آیا کرتے تھے۔ اس کا نام باب آلِ عثمانؓ تھا جس کو اب بابِ جبرائیلؑ کہتے ہیں۔ ایک دروازہ مغرب کی طرف تھا۔ جسے باب العاتکہ یا باب الرحمۃ کہتے تھے۔ ابتداً قبلہ شمال کی جانب بیت المقدس کی طرف تھا۔ جب تحویلِ قبلہ کا حکم آیا تو قبلہ خانہ کعبہ کی طرف یعنی جنوب کی طرف کر دیا گیا۔
۷ ھ میں نبی کریمؐ جب غزوۂ خیبر سے کامیاب لوٹے تو آپ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر مسجد کی تجدید اور توسیع کا پروگرام بنایا۔ مسجد کے قریب ایک انصاریؓ کا مکان خرید کر مسجد کی توسیع کر دی گئی۔ اس توسیع اور تعمیر کے بعد مسجد کا رقبہ ۱۵۰×۱۵۰ فٹ ہو گیا۔
حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں کوئی توسیع نہ کی گئی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے ۱۷ ھ میں مسجد کے قرب و جوار کے مکانات خرید کر مسجد میں کافی توسیع کی۔ آپؓ نے مسجد کے دروازوں میں بھی اضافہ کیا۔ اور چھ دروازے بنوائے۔
حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی مسجد میں کافی توسیع کی گئی۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور جعفر طیارؓ کا مکان خرید کر انہیں مسجد کی حدود میں شامل کیا۔ یہ تعمیر یکم محرم ۳۰ ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ پانچویں مرتبہ مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع ولید بن عبد الملک کے زمانے میں ہوئی۔ اس وقت عمر بن عبد العزیزؓ مدینہ کے گورنر تھے۔ انہوں نے ازواجِ مطہرات کے حجرے اور قرب و جوار کے کئی دوسرے مکانات کی جگہ خرید کر مسجد میں اضافہ کیا۔
اس تعمیر کا آغاز صفر ۸۸ ھ/ ۷۰۶ء میں ہوا۔ اور تکمیل ۹۱ ھ/ ۷۰۹ء میں ہوئی۔ اس تعمیر سے مسجد کا طول و عرض تین سو مربع فٹ ہو گیا۔
۱۶۰ ھ میں خلیفہ مہدی عباسی نے مسجد میں کئی اضافے کروائے یہ تعمیر و توسیع ۱۶۵ ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک مسجد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔
۶۵۴ ھ میں مسجد نبویؐ میں آگ لگ جانے سے کافی نقصان ہوا۔ خلیفہ معتصم باللہ عباسی نے ۶۵۵ ھ میں اس کی از سرِ نو تعمیر شروع کروائی۔ یہ تعمیر ۶۸۵ ھ کو پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ ۷۰۵ ھ سے ۸۸۶ ھ تک ملوکِ مصر مسجدِ نبوی کی تعمیر و توسیع کی طرف [illegible] توجہ دیتے رہے۔ جب آلِ عثمان کی خلافت کا دور آیا تو انہوں نے بھی مسجدِ نبوی کی [illegible] کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۹۸۰ ھ میں سلطان سلیم ثانی نے حجرۂ انور کے گنبد کو خوبصورت بنوایا۔ ۱۲۳۳ ھ میں سلطان محمود نے گنبدِ نبوی کو از سرِ نو تعمیر کروایا اور [illegible] ھ میں اس گنبد پر سبز رنگ کروایا۔ جس کی وجہ سے اب یہ گنبدِ خضریٰ کہلاتا ہے۔ عثمانی سلاطین کے دور میں سلطان عبد الحمید اور سلطان عبد المجید کے دور کی تعمیر و توسیع [illegible] میں ایک یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔ سلطان عبد المجید نے ۱۲۶۵ ھ میں مسجدِ نبویؐ کی [illegible] تعمیر شروع کرائی۔ یہ تعمیر ۱۲۷۷ ھ میں مکمل ہوئی۔
سعودی خاندان کی حکومت میں اب تک مسجد کی حدود میں کافی توسیع کی گئی ہے۔ شاہ عبد العزیز بن سعود نے ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۷۲ ھ میں توسیع کے کام کا آغاز کروایا تھا۔ جو شاہ فیصلؒ کے زمانے میں بھی ہوتا رہا۔ اب موجودہ سعودی حکومت مسجدِ نبوی میں مزید توسیع کے ایک منصوبہ پر تعمیر شروع کر رہی ہے۔

مسعود سعد سلمان ۔ (۱۰۴۸ء - ۱۱۲۰ء)
ایک مشہور فارسی شاعر جو غزنوی دور میں [illegible] میں ابراہیم بن مسعود غزنوی (۱۰۵۸ء تا ۱۰۹۸ء) کے دربار سے منسلک ہو گیا [illegible] ابراہیم نے ہندوستان کی باگ اپنے بیٹے سیف الدولہ محمود کو سونپی تو مسعود سعد بھی اس کی معیت میں لاہور آ گیا مگر سلطان ابراہیم بیٹے سے خفا ہو گیا تو اس [illegible] ساتھیوں کو قید کر دیا۔ مسعود سعد بھی دس سال تک [illegible] میں محبوس رہا۔ رہا ہو کر لاہور آیا اور اپنی جاگیر کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ جالندھر کا حاکم مقرر کیا گیا۔ مگر پھر معتوب ہو کر قلعہ مرنج میں ۸ سال تک قید رہا۔ اس کے تین زبانوں ہندی، عربی اور فارسی میں دیوان تھے۔ اس کی حبسیات [illegible] مشہور ہیں۔

مسعودی ۔ (وفات جمادی الثانی ۳۴۶ھ/اگست ۹۵۷ء)
نامور مورخ ۔ نام علی بن حسین بن علی المسعودی تھا۔ کنیت ابوالحسن تھی۔ المسعودی کے نام سے شہرت پائی۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد سیاحت کے لیے نکلے۔ مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ منصورہ (سندھ میں بسایا ہوا مسلمانوں کا شہر) اور ملتان۔ حیدرآباد دکن کی بھی سیاحت کی۔
تاریخ اسلام کے مستند مؤرخوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔
تصانیف میں معادن الجواہر۔ الاخبار المسعودیات۔ تنبیہ و اشراف (عہد رسالت سے بنو عباس کے خاتمے تک مختصر اور مستند تاریخ)۔ مروج الذہب کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

مسقط و عمان ۔ مسقط، سلطنت عمان کا دارالحکومت ہے۔ مسقط کی آبادی دس ہزار کے قریب ہے اور رقبہ ۸۱ ہزار مربع میل ہے۔ سرکاری زبان عربی ہے ریاست عمان کی آبادی ۶ لاکھ کے قریب ہے۔ ساری آبادی مسلمان ہے۔ خاص برآمدات ہیں کھجور۔ مچھلیاں۔ موتی اور پھل ہیں۔ سلطنت عمان کے موجودہ سلطان قابوس کے ایک بزرگ سلطان امام احمد بن سعید نے ۱۷۴۹ء میں اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ خاندان آل ابوسعید کے نام سے مشہور ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ سلطنت صومالیہ اور زنجبار تک وسیع ہو چکی تھی۔ سامراجیوں نے جب صومالیہ پر قبضہ کر لیا تو امام کے ایک بیٹے کی حکومت مسقط و عمان میں اور دوسرے کی صرف جزائر زنجبار میں محدود ہو کر رہ گئی۔
زنجبار پر اب دنوں تنزانیہ قابض ہے۔ سلطنت عمان پر برطانیہ کی سیادت ۱۸۹۱ء کے معاہدہ کی رو سے قائم ہوئی جس سے ۱۹۶۷ء میں نجات ملی۔

مسلم ۔ اسلام کو قبول کرنے والے شخص کو مسلم کہا جاتا ہے۔ وسیع تر مفہوم میں اللہ کی اطاعت اختیار کرنے والا بھی "مسلم" کہلاتا ہے۔ نبی اکرمؐ سے قبل جو انبیاء مبعوث ہوئے ہیں ان کے پیروکار بھی مسلم کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر اس کا ذکر ہوا ہے۔
اس نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا۔ (الحج آیت ۷۸)
ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یکسو مسلم تھا۔ (آل عمران آیت ۶۷)
حضرت یعقوبؑ جب اپنے لڑکوں کو وصیت کر رہے تھے تو انہوں نے فرمایا "اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے۔ پس تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"
(البقرہ آیت ۱۳۲)
پہلے انبیاء نوحؑ، موسےٰؑ، ابراہیمؑ، عیسیٰؑ کے ماننے والوں کو نوحی، موسوی، ابراہیمی یا مسیحی نہیں کہا جاتا بلکہ "مسلم" کہا جاتا ہے۔

مسلم، امام ۔ (۲۰۱ھ/۸۱۷ء ۔ ۲۵ رجب ۲۶۱ھ/ اپریل ۸۷۵ء)
مشہور محدث اور فقیہہ۔ صحاح ستہ میں سے حدیث کی دوسری مشہور کتاب صحیح مسلم کے مصنف کی وجہ سے کافی شہرت پائی۔ پورا نام مسلم بن حجاج ابوالحسن قشیری تھا نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ عرب کے مشہور قبیلے قشیر سے تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم نیشاپور میں پائی۔ محمد بن یحییٰ اور یحییٰ بن یحییٰ سے احادیث کا درس لیا۔ امام بخاری نے بھی ان اساتذہ سے پڑھا تھا۔ احادیث کی تلاش میں عراق۔ حجاز، مصر، شام اور بغداد کے سفر کیے۔ امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راحیہ اور امام شافعیؒ کے جانشین حرملہ اور امام بخاریؒ سے بھی استفادہ کیا۔ لیکن بعض مسائل میں امام بخاریؒ سے اختلاف کا اظہار اپنی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔ تین لاکھ احادیث کی چھان بین کے بعد امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں بارہ ہزار احادیث کو شامل کیا۔ پندرہ برس کی لگاتار محنت کے بعد یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس میں اتنی حدیثیں ایسی ہیں جو صرف چار واسطوں سے نبی کریمؐ تک پہنچتی ہیں۔ اسناد کے بیان میں خاص اہتمام فرمایا۔ اپنی تصنیف میں ایک سیر حاصل دیباچہ علم الحدیث کے بارے میں لکھا اور آخر میں کتاب التفسیر کے ساتھ کتاب الایمان کا بھی اضافہ کیا۔ آپ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔

مسلم شریف ۔ امام الحدیث مسلم بن حجاج نیشاپوری کی حدیث پر مستند تصنیف۔ علمائے اسلام احادیث کی جن چھ کتابوں کو مستند مانتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ بعض علماء بعض وجوہات کی بنا پر صحیح مسلم کو بخاری پر فوقیت دیتے ہیں۔
امام مسلم نے تین لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے ایک طویل جدوجہد اور محنت سے صحیح مسلم مرتب کی تھی۔ اس میں ۷۲۷۴ احادیث ہیں۔ علماء کرام نے صحیح مسلم کی کئی شرحیں لکھی ہیں جن کی تعداد تیس سے متجاوز ہے۔ ان میں سب سے زیادہ بہتر اور معروف شرح منہاج، شیخ ابوذکریا نوویؒ کی ہے۔ ابن جوزیؒ، ابوالفرحؒ، شیخ جلال الدین سیوطیؒ، شیخ عماد الدینؒ، علامہ قسطلانیؒ نے بھی "صحیح مسلم" کی شرحیں لکھی ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے چار جلدوں میں شرح لکھی۔ برعظیم میں قریبی زمانے کے اندر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی شرح "فتح الملہم" بھی ایک بہترین شرح ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ "مسلم" کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ عابد الرحمٰن صدیقی نے کیا ہے۔ حال ہی میں جماعت اسلامی کے ایک رہنما مرحوم عبدالحمید صدیقی نے انگریزی زبان میں "مسلم" کا ترجمہ کیا ہے۔

مسلمہ بن مخلّد ۔ (وفات ۶۳ھ)
نام مسلمہ کنیت ابومعن قبیلہ خزرج سے۔ ۱ھ میں پیدا ہوئے اور صغیر سنی میں ہی مسلمان ہوئے۔ فتح مصر کے زمانے میں جب حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی مدد کے لیے مدینہ سے چار افسران کی ماتحتی میں چار ہزار کی کمک روانہ کی تو ان افسروں میں ایک حضرت مسلمہ بھی تھے۔ جنگ صفین میں جب کہ سب انصار حضرت علیؓ کے طرفدار تھے۔ صرف حضرت نعمانؓ بن بشیر اور حضرت مسلمہؓ امیر معاویہؓ کی حمایت پر تھے۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت میں مصر کے آخری والی حضرت مسلمہؓ تھے۔ بعد میں مصر اور افریقہ دونوں صوبوں کے حاکم بنے۔ ۵۳ھ میں رومی لشکر نے برلس پر چڑھائی کی جسے حضرت مسلمہؓ نے شکست دی۔ ۲۵ رجب ۶۳ھ میں بعمر ۶۲ سال انتقال فرمایا۔ احادیث نبوی اس قدر یاد تھیں کہ صحابہؓ ان سے احادیث سننے مدینہ سے مصر جاتے تھے۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں کئی روایات آپ سے بھی منسوب کی گئی ہیں۔

مسند احمدؒ ۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مجموعۂ احادیث جو اٹھائیس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔ امام موصوف ۸۵۵ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔ مسند احمد بن حنبلؒ کا ایک نستعلیق خط کا ایڈیشن ۱۳۱۳ھ میں قاہرہ (مصر) میں چھپا تھا۔

مسوّدؓ ابن مخرمہ ۔ (وفات ۶۴ھ)
نام مسوّدؓ۔ کنیت ابوعبدالرحمٰن۔ مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے بھانجے تھے۔ ۲ھ میں مکے پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ عاتکہؓ دعوت اسلام کے

ابتدائی زمانے میں مسلمان ہو چکی تھیں۔ اور فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔ اس وقت آپ کی عمر چار سال تھی۔ اسی صغیر سنی میں حجۃ الوداع میں شرکت کی۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں شباب کی عمر کو پہنچے۔ یزید اور عبداللہ ابن زبیرؓ کے اختلافات میں عبداللہ ابنِ زبیرؓ کے حامی تھے۔ ۶۴ھ میں جب شامی افواج نے حرم کا محاصرہ کیا تو عبداللہ ابنِ زبیرؓ کے ساتھ آپ بھی محصور ہو گئے۔ اور ایک پتھر لگنے سے زخمی بھی ہوئے اور پانچ دن کی علالت کے بعد فوت ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۸ سال تھی۔ آپ نے رسول اکرمؐ کی چند احادیث بھی روایت کی ہیں جن میں دو متفق علیہ ہیں۔ یعنی ان پہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ متفق ہیں۔

مسوفہ۔ سوڈان کے علاقہ بولان میں مسلمانوں کا ایک ایسا فرقہ آباد ہے جسے مسوفہ کہتے ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ نماز، روزہ کے انتہائی پابند اور شرعی احکامات کے عامل ہیں مگر عورتوں کے معاملہ میں آزاد خیال بلکہ "بے غیرت" واقع ہوئے ہیں۔

ان کے ہاں ماں باپ کی وراثت کا مالک اس کا بیٹا نہیں ہوتا بلکہ ماموں کا بھانجا وارث ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حشر کے دن خدا انسانوں کو باپ کے نام سے نہیں پکارے گا، بلکہ ماں کے نام سے پکارے گا۔ فضیلت ماں کو حاصل ہے لہذا ماموں کی وراثت کا حقیقی مالک صرف بھانجا ہو سکتا ہے۔ اس فرقہ کے ہاں ایک تو یہ چیز دنیا کے مسلمان کہلانے والے فرقوں سے مختلف اور منفرد ہے اور دوسری امتیازی خصوصیت ان میں یہ ہے کہ انہوں نے عورتوں کو کھلی اجازت دے رکھی ہے۔ ایک مرد اصل بیوی کے علاوہ سالی، بہن، بیٹی، بھانجی، پھوپھی، خالہ تک سے بھی جنسی تعلقات قائم رکھ سکتا ہے اور غیر رشتہ دار عورتیں بھی ایسا کرتی ہیں۔ ایک مرد بیک وقت آٹھ آٹھ دس دس عورتوں سے اپنی بیوی کی موجودگی میں مباشرت کرنے کا مجاز ہے بلکہ اس فرقہ کے لوگ اپنے مہمانوں کو بھی عورتیں پیش کرتے ہیں اور اس پہ فخر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان دو غلط رسموں کے علاوہ دیگر معاملات میں انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ان کا جو آدمی نماز نہ پڑھے اسے قتل کر دیتے ہیں۔ روزہ نہ رکھے تو اسے سنگسار کرتے ہیں اور جھوٹ بولنے والوں کو شہر بدر کر دیتے ہیں۔

مسیح۔ یعنی نجات دہندہ۔ عربی میں پاک یا بابرکات کے معنی میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ قرآن پاک میں بھی مسیح ابن مریم آتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک وہ ایک برگزیدہ پیغمبر ہیں اور ان پہ آسمانی کتاب انجیل نازل ہوئی تھی۔ لیکن عیسائی ان کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ مسلمان اس کے قائل ہیں کہ ان کو صلیب نہیں دی گئی بلکہ ان کے مشبہ میں کوئی اور شخص مصلوب ہو گیا اور ان کو خدا نے آسمان پہ اٹھا لیا۔ بخلاف اس کے عیسائی مانتے ہیں کہ انہی کو صلیب دی گئی اور تین روز تک ان کی لاش قبر کے اندر محفوظ رہی اور پھر وہ خدا کے پاس چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خود مصلوب ہو کر آپ نے اپنے خون سے اُمت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ ان کے معجزات میں مُردوں کو زندہ کرنا بہت اہم ہے اور اسی وجہ سے عیسائیوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ مُردہ زندہ کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے اس لیے ان کو خدائی درجہ حاصل ہے اور پھر وہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے، اس لیے بھی وہ خدا کے بیٹے ہو سکتے ہیں۔ نیز دیکھئے: عیسیٰ ابنِ مریم۔

مسیحی (عیسائی)۔ عیسائی مذہب کے پیرو۔ وہ لوگ جو حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا اور نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کو نصاریٰ بھی کہتے ہیں۔ ان کی کتاب مقدس بائبل ہے جس کے دو حصے ہیں۔ "عہدِ عتیق" اور "عہدِ جدید"۔ عہدِ جدید کو انجیل کہتے ہیں۔ یہ نصاریٰ کی خاص کتاب ہے۔ یہ اسلام کی طرح عالمگیر مذہب ہے اس وقت دنیا میں عیسائیوں کی تعداد آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے اس کی اصطلاحات مختلف ملکوں میں مختلف ہیں۔ بائبل کے تراجم دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مزید دیکھئے: عیسائی۔

مُسیلمہ کذّاب۔ خانہ ساز مدعیانِ نبوت میں سے وہ پہلا شخص جس نے نبی کریمؐ کے زمانے ہی میں نبوّت کا دعوےٰ کیا۔ جب نبی کریمؐ کی رسالت کا غلغلہ اقصائے عالم میں بلند ہوا تو مُسیلمہ بھی وفد بنی حنیفہ کی معیت میں [illegible] کاشانۂ نبویؐ میں حاضر ہو کر آپؐ کے ہاتھ پہ بیعت کی مگر ساتھ ہی یہ [illegible] حضورؐ اسے اپنا جانشین مقرر فرمائیں۔ اس وقت نبی کریمؐ کے سامنے کھجور کی ایک ٹہنی رکھی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: "اے مسیلمہ اگر تم امرِ خلافت میں مجھ سے یہ شاخِ خرما بھی طلب کرو تو میں دینے کو تیار نہیں۔"

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ اس نے بیعت تو نہ کی تھی لیکن بیعت کو مشروط رکھا تھا کہ اگر نبی کریمؐ اسے نبوت میں شریک کریں تو وہ بیعت کرے گا۔

مسیلمہ جب ادھر سے مایوس ہوا تو اس نے از خود نبوت کا دعوے کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے یمامہ پہنچنے کے بعد اعلان کیا کہ محمدؐ نے اسے اپنی نبوت میں شریک کر لیا ہے۔ اس نے اہلِ یمامہ کو من گھڑت "کلامِ وحی" بھی سنانا شروع کیا اور اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک شخص کو پیش کیا جس نے اہلِ یمامہ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ محمدؐ نے میرے سامنے مسیلمہ کو نبوت میں شریک ٹھہرایا تھا۔

مسیلمہ اس دعویٰ نبوّت سے پہلے بھی کذاب یمامہ کے لقب سے مشہور تھا جب اس نے یہ دعوےٰ کیا اس وقت مسیلمہ کی عمر سو سال سے بھی متجاوز تھی۔ مسیلمہ نے [illegible] وحی کے نام سے خانہ ساز کتاب بھی مرتب کی جس کا نام فاروق اول اور فاروق ثانی رکھا گیا۔ مسیلمہ اور اس کے پیروکاروں میں فحش نگاری اور فسق و فجور کو کافی فروغ حاصل [illegible] کیونکہ مسیلمہ نے حرمتِ خمر اور حرمتِ زنا سے انکار کیا تھا اور تو [illegible] انسان کو آزاد قرار دیا تھا۔ مسیلمہ نے اپنے پیروکاروں کے لیے تین نمازیں ظہر، عشاء [illegible] مغرب مقرر کی تھیں اور رمضان کے دن کے روزوں کی جگہ رات کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا۔

نبی کریمؐ کی زندگی کے آخری ایام میں مسیلمہ کے عقائد کو کافی ترویج حاصل ہوئی لیکن نبی کریمؐ کو اس کے استیصال کا موقع نہ ملا کیونکہ آپؐ کی صحت [illegible] تھی۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب سے پہلا کام ہی مسیلمہ [illegible] کو ختم کرنے کا کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عکرمہؓ بن ابوجہل کو لشکر دے کر [illegible] لیکن انھیں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ کیونکہ انہوں نے کمک کا انتظار نہ کیا۔

مسیلمہ کے خلاف معرکۃ الآرا جنگ حضرت خالدؓ بن ولید نے کی [illegible] یمامہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے ہزاروں افراد مارے گئے۔ مسیلمہ قتل ہوا۔ اور اس طرح اس فتنہ کا خاتمہ ہوا۔

مسیلمہ کے ساتھ شریکِ نبوت سجاح بنت حارث تمیمیہ تائب ہو کر [illegible] میں داخل ہوئی۔ سجاح نے وصالِ نبی کریمؐ کے وقت دعوے نبوت کیا تھا۔ مسیلمہ سے ملاقات کے بعد دونوں نے نبوت میں شراکت کا سلسلہ بنایا۔ مسیلمہ نے سجاح کو اپنے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر لیا تھا۔

مشبہ (۱۰۷ھ)۔ یہ فرقہ معتزلہ کی ایک شاخ ہے۔ اس کا بانی ہشام بن حکم

تھا۔ یہ شخص اپنے دور کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے خدا کے جسم کے ثبوت پر کئی کتابیں لکھیں۔ ہشام بن حکم نے اپنے موقف کے لیے یہ دلیل پیش کی کہ اگر خدا موجود ہے تو اس کا وجود ماننا پڑے گا اور جب وجود مانا جائے گا تو اس وجود کے اعضا اور ڈھانچہ کی بات بھی سامنے آئے گی۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔

اس طرح ایک فرقہ مقاتلیہ جس کا بانی مقاتل بن سلیمان تھا، خدا کے وجود کا قائل ہے۔ مقاتل بن سلیمان کا موقف ہے کہ خدا کا وجود گو انسان کے وجود کی طرح ہے لیکن خدا کے وجود یا خدا کے اعضاء کو کسی مخلوق کے اعضاء سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔

مشعرالحرام - یہ مزدلفہ کی وادی میں ہے۔ جو منیٰ اور عرفات کے درمیان واقع ہے مکہ مکرمہ سے تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مقاماتِ حج میں سرفروشانِ وادئ عشق کی ایک مختصر منزل۔ جہاں احرام میں لپٹے ہوئے پرستارانِ حق میدانِ عرفات سے واپسی پر ۹ ، ۱۰ ذی الحجہ کی درمیان والی رات قیام کرتے ہیں اور اللہ کی یاد میں مصروف رہتے ہیں۔ نمازِ مغرب اور نمازِ عشا ایک ہی اذان سے اور دو اقامتوں یہاں ہی ملا کر ادا کی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۸ میں مشعرالحرام کا یوں ذکر ہے: "پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو یاد کرو، "مشعرالحرام" کے نزدیک۔ اور اللہ کو یاد کر جیسے کہ تمہیں سکھایا۔"

مشکوٰۃ شریف - احادیث کا ایک مجموعہ جو چھ ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے۔ جو بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور کئی دیگر کتبِ احادیث سے لی گئی ہیں۔ اس کے مصنف محمد بن عبداللہ الخطیب ہیں۔ مشکوٰۃ، کتاب المصابیح جو ابو محمد حسین بن مسعود فرا البغوی کی تالیف تھی، پر مزید اضافے کر کے مرتب کی گئی ہے۔ کتاب المصابیح میں احادیث کے بیان میں اسناد کو حذف کر دیا گیا تھا۔ علامہ الخطیب نے اسناد کو بیان کیا۔ اس کے علاوہ مشکوٰۃ میں انھوں نے مختلف اہم عنوان قائم کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز کتاب الایمان سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے ہر کتاب کے اندر انہوں نے تین فصلیں قائم کی ہیں۔ فصل اول میں صحیح بخاری اور مسلم کی احادیث بیان کی ہیں۔ فصل دوم میں دوسری کتبِ احادیث سے اس کتاب کے ذیل میں بیان کی گئی احادیث بیان کی ہیں۔ فصل سوم میں اسی کتاب کے ضمن میں آنے والی دوسری احادیث و روایات کا بیان ہے جن میں شرائط کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہو۔

مشہد - ایران کا تیسرا بڑا اور مشہور شہر۔ شمال مشرقی صوبہ خراسان کا دارالحکومت اور سیاحتی مرکز۔ اندازاً آبادی ۵ لاکھ سے زائد ہے۔

سطح سمندر سے ایک ہزار میٹر بلند اس مقام کی آب و ہوا بڑی خوشگوار ہوتی ہے موسم گرما میں درجہ حرارت ۲۵-۳۰ سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے اور سردیوں میں صفر سے بھی دس پندرہ درجے نیچے گر جاتا ہے۔ سردیوں میں مشہد اور گرد و نواح کے برف پوش مناظر سیاحوں کے لیے خاص کشش رکھتے ہیں۔

شہر کا شمال مشرقی حصہ نوقان نامی قصبہ پر واقع ہے جو بعد میں طوس کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض قدیم روایتوں کے مطابق طوس کی بنیاد جمشید شاہ نے ڈالی جس کے جانشین کیخسرو نے اس شہر کی حکومت اپنے ایک سردار طوسا کو واگزار کر دی اور اس کے نام کی نسبت سے یہ علاقہ طوس کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۹۷۰ء تک مشہد صرف اسی چھوٹے سے گاؤں پر مشتمل تھا۔ جو بعد ازاں تباہ ہونے کے بعد دوبارہ تعمیر کیا گیا اور حضرت امام رضا کے نام پر مشہد رضوی کہلایا جانے لگا۔ امام رضا کا مزار یہاں ہی ہے۔ موجودہ صدی کے اوائل سے لے کر اب تک مشہد کی تعمیر و ترقی پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ کیونکہ شیعہ حضرات کے لیے امام رضا کا مزار ہونے کی وجہ سے یہ جائے عقیدت ہے۔

مشہد کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہاں کی زمین کسی کی ملکیت نہیں۔ تمام زمین حضرت امام رضا کے نام وقف ہے۔ یہاں کے ہوٹلوں، مسافر خانوں اور کرایہ والے مکانوں کی آمدنی امام رضا کے حساب میں جمع کرا دی جاتی ہے۔

سبزہ اور باغات کے لحاظ سے مشہد ایران کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ قابلِ دید مقامات میں ایشیا کے آخری فاتح نادر شاہ کا مقبرہ، باغ ملی، کوہ سنگی، پارک آریہ مہر مشہور ہیں۔ مشہد سے ۲۹ کلومیٹر دور مشہور شاعر فردوسی کی آرام گاہ ہے۔ شہر کے قرب و جوار میں خواجہ ربیع، خواجہ اباصلت اور خواجہ مراد کے مزار بھی ہیں۔ مشہد سے دو گھنٹے کے سفر پر نیشا پور میں، عمر خیام کا مقبرہ ہے اور نیشا پور فیروزہ کی پیداوار کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

مصر - رقبہ ۳۸۶۱۹۸ مربع میل۔ آبادی ۳ کروڑ کے قریب ہے۔ سرکاری نام متحدہ عرب جمہوریہ، دارالحکومت قاہرہ ہے۔ یہ ملک براعظم افریقہ کے شمالی کونے اور جنوب مشرقی ایشیا میں جزیرہ نمائے سینائی پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال میں بحیرہ روم، مشرق میں بحیرہ قلزم اور خلیج سویز اور خلیج عقبہ کے دو بازو ہیں۔ جنوب میں سوڈان اور مغرب میں لیبیا کے ملک ہیں۔ ۱۹۴۹ء کے ایک معاہدے کی رو سے فلسطین کے جنوب مغرب میں غزہ کی ۲۸ میل چوڑی ساحلی پٹی مصر کو دی گئی۔ مصر دراصل ایک صحرائی علاقہ ہے جسے دریائے نیل دو حصوں مشرقی اور مغربی صحرا میں تقسیم کرتا ہے۔ مصر کی زراعت کا تمام تر انحصار اسی دریا پر ہے۔ ڈیلٹا کا علاقہ بہت زرخیز اور شاداب ہے۔ صحرا میں آبادی بہت کم ہے۔ لوگ خانہ بدوش چرواہے ہیں۔ شہر بڑے بارونق ہیں۔ تیل مصر کی اہم معدنی دولت ہے جس کا بیشتر حصہ صحرائے سینا سے نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئلہ، فاسفیٹ، میگنیشیا اور سونا نکلتا ہے۔ زرعی اجناس میں غلہ، کپاس، سبزیاں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ تمباکو یہاں کی نقد جنس ہے۔

اسوان ہائی ڈیم ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا تھا۔ ابتدا میں امریکہ اور انگریزوں نے امداد دینے کا وعدہ کیا مگر جب مصر نے نہر سویز کو قومیا لیا تو انھوں نے امداد دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مصر کی حکومت نے روس کی مدد سے اس ڈیم کو مکمل کر لیا۔ اس سے لاکھوں ایکڑ زمین کی آبپاشی کی جائے گی اور پن بجلی بھی حاصل کی جا رہی ہے۔

گزشتہ سالوں میں مصر نے صنعت و حرفت میں بڑی ترقی کی ہے

قاہرہ ایک بڑا صنعتی اور ثقافتی شہر ہے۔ سکندریہ اہم برآمدی بندرگاہ ہے۔ دارالحکومت قاہرہ کے علاوہ پورٹ سعید، الآمین اور المینیہ مشہور مقامات ہیں۔ قاہرہ دارالحکومت ہونے کے علاوہ عظیم الشان تاریخی شہر ہے جس میں ہزاروں سال پرانے تاریخی کھنڈرات ہیں۔ مصری بادشاہوں کے پتھروں کے مجسموں کے علاوہ "اہرامِ مصر" قابلِ دید ہیں جنہیں دنیا بھر کے سیاح دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

قاہرہ دریائے نیل کے کنارے پر واقع ہے جو جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے اس دریا میں فرعون کا لشکر غرق ہوا تھا۔ جس کے بارے میں قرآن پاک میں بھی ذکر

آیا تھا۔

مصر دنیا کی قدیم ترین تہذیب و تمدن کا نمائندہ ہے۔ یونان و ہند کے فلسفیوں نے مصری فلسفیوں سے ہی درس لیا تھا۔ اہرام مصر جن کی ساخت سات ہزار سال پرانی ہے۔ اقلیدس و ہندسہ، انجینئری اور سائنس کے مشترکہ کمال کا نمونہ ہے۔ مصریوں کا لاشوں کو حنوط کرکے ممیاں بنا دینا۔ ان سب چیزوں کا جواب ابھی تک سائنس جدیدہ کے ترقی یافتہ دور میں ناپید ہے۔

مصر کو حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے ۲۰ھ/ ۶۴۱ء میں فتح کیا۔ خلفائے راشدین اور امویوں کے بعد ۳۵۸ھ تک یہ ملک عباسیوں کی عملداری میں ایک صوبے کی حیثیت سے رہا۔ اس کے بعد تیرھویں صدی عیسوی تک یہاں عبیدی (فاطمی) اور ایوبی قابض رہے۔ ۱۵۱۰ء تک مملوک سلاطین کی حکومت رہی۔ ۱۹۱۴ء تک عثمانی سلاطین کی سیادت محمد علی پاشا اور اس کے جانشینوں کی نگرانی میں قائم رہی۔ جنگ عظیم اول میں برطانیہ کی سیادت قائم ہوگئی۔ ۱۹۳۶ء میں مصر نے برطانیہ کے استعمار سے نجات حاصل کی اور مصر میں شاہی حکومت قائم ہوگئی۔

۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء میں جنرل نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر کی قیادت میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ پہلے جنرل نجیب اور پھر جمال ناصر برسر اقتدار آئے ۱۹۵۶ء میں صدر ناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ۱۹۵۸ء میں مصر نے شام اور یمن سے الحاق کیا۔ لیکن بعد میں اختلاف ہونے کی وجہ سے یہ الحاق توڑ دیا گیا۔

مصر میں ۹۲ فی صد مسلمان۔ دس لاکھ عیسائی اور ڈھائی ہزار یہودی ہیں۔ سرکاری زبان عربی ہے۔ یہاں پہلی جماعت سے یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے۔ ملک میں چھ یونیورسٹیاں ہیں۔ دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی جامعہ ازہر قاہرہ میں ہے جس کی بنیاد ایک ہزار سال قبل ۳۵۸ھ میں رکھی گئی تھی۔

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل سے مصر اور دوسرے عرب ممالک کی جنگ ہوئی جس میں اسرائیل نے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا حتیٰ کہ بیت المقدس بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ ۱۹۷۰ء میں صدر ناصر کا انتقال ہوا۔ صدر ناصر نے اپنے دور حکومت میں سوشلزم کا نظام نافذ کرنے کے اقدامات کیے۔ اسلام میں ہمدردی رکھنے والے علماء کو کافی تکالیف اٹھانا پڑیں۔ اخوان المسلمون پر بھی صدر ناصر نے کافی تشدد کروایا اور پابندی بھی لگا دی۔ اخوان المسلمون کے بانی حسن البنا شہید اور دوسرے اہم عہدیداروں سید قطب شہید وغیرہ کو شہید کروایا۔

صدر ناصر کے بعد انور سادات صدر بنے۔ وہ کچھ معتدل ذہن کے مالک ہیں۔ رمضان ۱۹۷۳ء میں پھر اسرائیل سے جنگ ہوئی۔ اس بار مصر نے اسرائیل کو عبرتناک شکست دی۔ صدر سادات کی قیادت میں مصر سے سوشلزم اور روس کی طرف جھکاؤ ختم ہو رہا ہے۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کا عمل جاری ہے۔ صدر سادات آجکل امریکہ کی حمایت سے اسرائیل سے اپنے مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ دراصل صدر سادات مصر کو جنگ کے مصائب سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔

حال ہی میں مصر اور اسرائیل کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے ڈیوڈ کانفرنس میں طویل مذاکرات ہوئے ہیں۔ اور دوسرے عرب سربراہ صدر سادات کی امن کی کوششوں کے مخالف ہیں۔ ان عرب سربراہوں نے بغداد میں ایک کانفرنس منعقد کی ہے۔ یہ کانفرنس اکتوبر ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتے میں شروع ہوئی تھی تاکہ صدر سادات اور اسرائیل کے خلاف ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کیا جا سکے۔

مصطفےٰ (اوّل) سلطنت عثمانیہ کا پندرھواں حکمران۔

سلطان احمد اوّل نے اپنی وفات کے وقت سات لڑکے چھوڑے جن میں سے تین تخت نشین ہوئے لیکن اس کا جانشین اس کا بھائی مصطفےٰ تھا۔ اب تک چودہ پشتوں سے سلطنت عثمانیہ کی وراثت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوئی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ بیٹے کی بجائے بھائی وارث تخت ہوا۔

مصطفےٰ کی نااہلیت کے واضح ہو جانے کے بعد ارکین سلطنت نے ۱۶ فروری ۱۶۱۸ء کو اسے معزول کرکے سلطان احمد کے ۱۴ سالہ بڑے لڑکے عثمان کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور مصطفےٰ کو قید کر دیا۔ عثمان اپنی کم عمری کی وجہ سے اندرونی شورشوں اور بیرونی حملوں پر قابو نہ پا سکا۔ اندرونی بغاوت جب زیادہ بڑھ گئی تو باغیوں نے عثمان کو قید کر دیا۔ اور مصطفےٰ کو رہا کرکے دوبارہ تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ داؤد پاشا جس کا بغاوت میں بہت زیادہ دخل تھا، صدر اعظم کے عہدہ پر متمکن ہوا۔ اس نے جیل میں عثمان کو قتل کروا دیا۔ مصطفےٰ تو نااہل ہی تھا۔ اصل حکمرانی اس کی والدہ کرتی تھی اور ادنیٰ شورشیں بڑھتی گئیں۔ مصطفےٰ کی نااہلی نے حالات کو مزید خراب کر دیا۔ اگست ۱۶۲۳ء میں مصطفےٰ کو دوسری مرتبہ معزول کرکے سلطان عثمان کے بھائی شہزادہ مراد (رابع) کو بارہ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا۔

مصطفےٰ (ثانی)۔ سلطنت عثمانیہ کا اکیسواں حکمران۔ جو سلطان احمد ثانی کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ مصطفےٰ سلطان محمد رابع کا لڑکا تھا۔ اس نے زمام سلطنت سنبھالنے کے فوراً بعد سلطنت کی اندرونی شورشوں کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ عثمانی فوجوں کی آسٹریا، روس، وینس اور پولینڈ سے جنگ زمانی پہلے ہی جاری تھی۔ آسٹریا سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے ۱۶۹۵ء کے موسم گرما میں سلطان خود لشکر لے کر روانہ ہوا اور ۲۲ ستمبر ۱۶۹۵ء کو آسٹریا کی فوج سے [illegible] کے قریب مقابلہ میں سلطان کو فتح ہوئی۔ آسٹریا فوج اس شکست کے بعد دوبارہ تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ ۱۶۹۶ء میں سلطان [illegible] مقابلہ کے لیے [illegible] مدافعانہ جنگ طویل عرصے تک جاری رہی۔ لیکن عثمانی فوجیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔

اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں نے سلطان مصطفیٰ کو زیادہ [illegible] کے امور پر توجہ دینے کا موقع نہ دیا۔ دار حکومت میں [illegible] بڑھتا گیا [illegible] سلطان کی [illegible] کا [illegible] باغیوں نے [illegible] سلطان [illegible] کا لقب لے لیا۔ مصطفےٰ یہ حالات دیکھ کر ۲ ربیع الاول ۱۱۱۵ھ [illegible] ۱۷۰۳ء کو تخت سے دستبردار ہو گیا۔ باغیوں نے اس کے بھائی [illegible] کو تخت پر بٹھایا [illegible] ۳۱ دسمبر ۱۷۰۳ء کو مصطفےٰ کا انتقال ہوا۔ اس کا دور حکومت ۱۱۰۶ھ/ ۱۶۹۵ء سے ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء تک رہا۔

مصطفےٰ (ثالث)۔ سلطنت عثمانیہ کا چھبیسواں حکمران جس کا دور حکومت ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء سے ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء تک رہا۔ عثمان ثالث کے بعد تخت نشین ہوا۔ سلطان احمد ثالث کا لڑکا تھا۔ تخت نشینی کے وقت عمر [illegible] سال تھی۔ یہ طویل مدت امور سلطنت سے علیحدہ محل کے ایک حصہ میں بسر ہوئی۔

مصطفےٰ نام کے اب تک جتنے سلطان ہوئے عجیب اتفاق ہے ان سب کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ یورپ کی طاقتیں ایک طویل عرصہ سے سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے لیے کوششوں میں مصروف تھیں۔ مصطفےٰ ثالث کے عہد کے ابتدائی چھ سال، جب کہ انصرام حکومت صدر اعظم راغب پاشا کے ہاتھ میں تھا،

خوشحالی اور ترقی کے سال تھے۔ راغب پاشا کی وفات کے بعد سلطان نے انتظامِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطان ایک نہایت جفاکش اور لائق فرمانروا تھا۔ سلطنت کی فلاح و بہبود کا دل سے خواہاں تھا۔ لیکن اعیانِ سلطنت کے انتخاب میں اکثر غلطی کر جاتے جو مجموعی طور پر سلطنت کے لیے مضر ثابت ہوتی۔ اتفاق سے اس کے ہم عصر فرمانروا غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کے مالک تھے۔

روس کی طرف سے سلطنت کے اندر شورش برپا کرنے کی کوششوں کے ساتھ بیرونی حملے بھی ہوتے رہتے۔ بالآخر مجبور ہو کر سلطان نے ۶؍اکتوبر ۱۷۶۸ء کو روس سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ادھر روس نے بھی بھرپور تیاریاں کیں۔ ایک دو ابتدائی معرکوں میں عثمانی فوجوں کو خاصی کامیابی ہوتی رہی۔ لیکن اس کے بعد پے در پے شکستوں نے عثمانی فوجوں کے حوصلے پست کر دیے۔ بحری جنگ میں بھی عثمانی بیڑے کو شکست ہوئی۔

ادھر فرانس اور انگلستان کی دشمنی بھی واضح تھی۔ انہوں نے بھی درپردہ روس کے مفادات کی نگہداشت کی۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کے کئی علاقوں پر روس نے قبضہ کر لیا۔

روس کے ساتھ مسلسل جنگوں میں شکست کے بعد سلطان صلح کا خواہش مند تھا۔ لیکن روس اس سے پہلے بھی صلح کے کئی معاہدے کر کے ان سے انحراف کر چکا تھا۔ صلح کے لیے بخارسٹ میں ہونے والی کانفرنسیں ناکام ہو گئیں۔

سلطان مصطفیٰ ثالث کو بیرونی جارحیت کے مقابلوں سے فرصت بہت کم ملی کہ وہ سلطنت کے اندرونی معاملات کو درست کرتا پھر بھی اس نے بعض اصلاحات نافذ کیں۔ اس نے علم کے فروغ کے لیے کئی اقدامات اٹھائے کیونکہ وہ بھی اپنے اکثر پیشروؤں کی طرح ایک بلند علمی ذوق رکھتا تھا۔

۲۵؍دسمبر ۱۷۷۳ء کو سلطان مصطفیٰ ثالث کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کے بھائی عبدالحمید تخت نشین ہوا۔

مصطفیٰ (رابع) دولتِ عثمانیہ کا اٹھائیسواں سلطان جس کی حکومت صرف تیرہ ماہ تک رہی اور وہ بھی نام کی حکومت تھی۔ اصل اقتدار ان باغیوں کو حاصل تھا جنہوں نے سلطان سلیم کو معزول کر کے اسے تخت پر بٹھایا تھا۔ سلطان مصطفیٰ کی تخت نشینی کے بعد بھی سلیم کے حامیوں کی ایک جماعت اسے دوبارہ تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ مصطفیٰ نے موقع ملنے پر سلیم کو قتل کروا دیا۔ دارالسلطنت میں انتشار بہت زیادہ تھا۔ اندرونی شورشوں نے اور باغیوں کے زیادہ عمل دخل کی وجہ سے مصطفیٰ امورِ سلطنت پر توجہ نہ دے سکا۔ باغیوں نے ۲۸؍جولائی ۱۸۰۸ء/۶؍جمادی الاول ۱۲۲۳ھ کو مصطفیٰ کو معزول کر کے شہزادہ محمود کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ چند دنوں کے بعد مصطفیٰ کو قتل کر دیا گیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ میں یہ بات مزید پختہ ہو گئی کہ مصطفیٰ نام کے سلطان سلطنت کے امور چلانے میں اور بیرونی حملہ آوروں سے نبٹنے میں نااہل ثابت ہوئے۔

مصعبؓ بن عمیر۔ مشہور صحابی قریش کے قبیلہ بنو عبدالدار سے تھے۔ ان کے والد بہت امیر تھے۔ لیکن حضورؐ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ والدین نے عاق کر دیا اور ان کو سخت اذیتیں دیتے رہے مگر آپ غربت میں بھی مطمئن اور خوش رہے۔ جب حضورؐ نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت دی تو آپ بھی ہجرت کر کے وہاں چلے گئے۔ عقبہ اول کے بعد حضورؐ نے ان کو مدینہ بھیجا تاکہ وہاں اسلام کی تبلیغ کریں۔ چنانچہ وہاں آپ نے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا اور سب سے پہلے جمعہ کی نماز پڑھائی۔ غزوات احد اور بدر میں آپ ہی علمبردار تھے۔ جنگ احد میں کفار نے حضورؐ پر حملہ کیا تو انہوں نے سخت مدافعت کی اور اس میں شرفِ شہادت حاصل کیا۔ آپ حسنِ سیرت کے علاوہ حسنِ صورت میں بھی بہت ممتاز تھے اور حضورؐ سے آپ کی شکل و شباہت بہت ملتی جلتی تھی۔ چنانچہ آپ کی شہادت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ حضورؐ ہی کی شہادت ہو گئی۔ ان کی شادی حمنہ بنت جحش سے ہوئی تھی۔ جو بنو اسد قبیلے سے تھیں۔

مصیخ، جنگ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان مختلف مقامات پر گھمسان کی لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ لشکرانِ اسلام کی قیادت فرما رہے تھے اور مختلف جنگوں میں اپنے نائب مقرر کر کے بھیجتے رہے۔ دومۃ الجندل اور حصید کے مقام پر شکست کھانے کے بعد ایرانی بھاگ کر خنافس پہنچے۔ وہاں ایک نامور ایرانی سپہ سالار بہبوذان بھاری فوج لیے ہوئے خیمہ زن تھا۔ ابولیلیٰؓ نے ان بھگوڑوں کا تعاقب کیا تو بہبوذان نے خوفزدہ ہو کر مصیخ کی راہ لی۔ وہاں ہذیل عربوں کا لشکرِ جرار لیے ہوئے پڑا تھا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے قعقاعؓ اور ابولیلیٰؓ کو فرمان بھیجا کہ الگ الگ راستوں سے اپنی اپنی فوج لے کر مصیخ پہنچ جاؤ اور خود بھی ایک اور راستے سے وہاں پہنچ گئے۔ گھمسان کی جنگ میں غازیانِ اسلام نے کفار کی بڑی بھاری جمعیت کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالا۔ ہذیل اور ربیعہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ حضرت خالدؓ نے ربیعہ کے تعاقب میں تو قعقاعؓ اور ابولیلیٰؓ کو بھیجا اور خود ہذیل کی گوشمالی کے لیے روانہ ہوئے۔ ان بھگوڑوں میں مقابلے کی تاب کہاں تھی۔ آخر یہ دونوں مع کثیر التعداد ہمراہیوں کے مارے گئے۔

مطعم بن عدی۔ مکہ کا ایک شخص جس کے بارے میں آتا ہے کہ مسلمان تو نہیں ہوا تھا لیکن اس نے نبی کریمؐ کو قریشِ مکہ کی مخالفت کے انتہائی زمانوں میں پناہ دی تھی۔

آلِ بنی ہاشم جس معاہدہ کی بنا پر شعب ابی طالب میں محصور رہے تھے اسے مطعم بن عدی نے ہی خانہ کعبہ سے اتار کر پھاڑ دیا تھا۔ بنو ہاشم کو درہ کی محصوری سے آزاد کرا کے واپس مکہ کی آبادی میں لانے والوں میں مطعم بھی شامل تھے۔

نبی کریمؐ جب طائف سے واپس مکہ تشریف لائے تو مطعم کے پاس پیغام بھیجا کہ کیا تم مجھے پناہ دے سکتے ہو؟ مطعم نے حرم میں جا کر اعلان کیا کہ محمدؐ میری پناہ میں ہیں۔ آپؐ نے حرم میں نماز ادا کی۔ اس کے بعد مطعم اور ان کا بیٹا نبی کریمؐ کو آپؐ کے دولت کدہ پر چھوڑ کر آئے۔ جنگِ بدر سے پہلے مکہ میں مطعم بن عدی کا انتقال ہوا۔ شاعرِ دربارِ رسالتؐ حسانؓ بن ثابت نے مطعم کا مرثیہ بھی کہا۔

مظفر الدّین قاچار۔ ایران کا بادشاہ جس کا دورِ حکومت ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۷ء تک رہا۔ اپنے باپ کے قتل ہونے پر تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں انگریزی حکومت اور زارِ روس کا اثر ایران میں زیادہ بڑھ گیا۔ مظفر الدّین قاچار نے برطانیہ سے قرض لے کر خلیج فارس کے درآمدی برآمدی محاصل برطانیہ کو رہن رکھ دیے۔ پھر شاہ نے روس سے قرضہ لیا اور بقیہ ملک کے محاصل زارِ روس کو رہن رکھ دیے۔

۱۹۰۶ء میں ایران کے عوام نے مظفر الدین کی حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ شاہ کی طرف سے عوام پر کافی تشدد کیا گیا لیکن عوام کے مطالبوں میں کمی نہ آئی۔ بالآخر شاہ مظفر الدین قاچار کو آئین کے مسودے پر دستخط کرنے پڑے اور اس طرح مجلس

(پارلیمنٹ) قائم ہوئی۔

معاذؓ بن جبل ۔ (وفات ۱۸ھ) مشہور صحابئ رسولؐ۔ انصاری تھے نبی کریمؐ نے آپ کو یمن میں دعوتِ دین کے لیے معلّم بنا کر بھیجا۔ جنگ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں حصّہ لیا۔ اجنادین اور یرموک کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ جنگ عمواس میں وفات پائی۔

نبی کریمؐ کو آپ کے ساتھ ایک خصوصی شغف تھا۔ اکثر معاذ کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھاتے۔ دین کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے۔ نبی کریمؐ سے خصوصی قربت کی وجہ سے آپ نے کئی احادیث روایت کی ہیں۔ ۹ھ میں نبی کریمؐ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا وہاں سے ۱۱ھ میں واپس آئے جب مدینہ منورہ پہنچے تو نبی کریمؐ کا وصال ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کے بعد ملک شام میں مستقل سکونت اختیار کی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں شام کا عامل مقرر کیا۔

علم قرآن اور حدیث اور دین کے فقہی امور میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

معاویہؓ بن ابوسفیان۔

(ولادت ۱۷ قبل ہجرت۔ وفات ۲۲ رجب ۶۰ھ)

صحابئ رسولؐ اور بنو امیہ کے پہلے خلیفہ۔

دورِ حکومت ۴۱ھ سے ۵۹ھ تک رہا۔

حضرت امیر معاویہؓ ابو سفیان بن حرب کے بیٹے تھے۔ آپ کا نسب پانچویں پشت میں آنحضرتؐ سے ملتا ہے۔ فتح مکہ کے دن ۲۵ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ آکر مسلمان ہوئے اور وصال نبویؐ تک حضورؐ کے ساتھ رہے۔ حنین اور طائف کی جنگوں میں بھی شرکت کی۔ مدینہ میں آنحضرتؐ نے کتابتِ وحی کی خدمت آپ کے سپرد کی۔ اس کے علاوہ وفود کی خاطر مدارات اور قیام و طعام کا انتظام بھی آپ کے ہی ذمے تھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ملک شام کے وقت انہیں نائب فوج بنایا۔ کارنی کی فتح میں امیر معاویہؓ کا نمایاں حصّہ تھا۔ قیسارئیہ کی مہم سر کرنے کا سہرا بھی جس میں اسّی ہزار رومی کھیت رہے تھے، انہیں کے سر رہا۔ ۱۸ھ میں حضرت فاروق اعظمؓ نے امیر معاویہؓ کو ان کے بھائی یزید کے انتقال پر دمشق کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے سارے شام کی عنانِ حکومت انہیں کے ہاتھ میں دے دی۔ انہوں نے ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیے جو تاریخ کے اوراق پہ زریں حروف میں ثبت رہیں گے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو ان سے مقابلہ ہوا۔ آخر مصالحت کی رو سے حضرت امام حسنؓ صلاح امّت اور مسلمانوں کی خونریزی سے بچنے کے لیے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس طرح ۴۱ھ میں امیر معاویہؓ عالم اسلام کے خلیفہ تسلیم کر لیے گئے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے جب تختِ خلافت سنبھالا تو مسلمان تین سیاسی جماعتوں میں منقسم تھے۔

۱۔ **شیعیان علیؓ** ۔ یہ جماعت صرف اہل بیعت کو منصب خلافت کا حقدار تسلیم کرتی تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر عراق، ایران اور مصر میں آباد تھے۔ لیکن امام حسنؓ کے ترک خلافت کے بعد ان لوگوں کی تعداد کم اور ہمتیں پست ہو گئی تھیں۔

۲۔ **شیعیان معاویہؓ یا بنی اُمیّہ** ۔ یہ جماعت امیر معاویہؓ اور بنی امیہ ہی کو خلافت کا حقدار سمجھتی تھی۔

۳۔ **خوارج** ۔ یہ جماعت شیعیان علیؓ اور شیعیان معاویہؓ دونوں کو گمراہ اور کافر قرار دے کر انہیں واجب القتل سمجھتی تھی۔ یہ لوگ تعداد میں تو قلیل تھے مگر عقاید کے سخت تھے۔

ایسی جماعتوں پر مشتمل ملک کو زیر نگیں رکھنے اور قیام امن کے لیے جس مدبرانہ سیاست کی ضرورت تھی اس سے امیر معاویہؓ کا دامن خرد مالا مال تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان جماعتوں کے سرداروں کے ساتھ نہایت تحمّل، نرمی، شفقت اور رواداری کا سلوک کیا لیکن خارجیوں کی فطری شرانگیزی آخر رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ گروہ ہمیشہ امن پسند طبقے کے لیے خطرہ بنا رہا۔ اور نظام ملت کو پارہ پارہ کرنے میں مصروف رہا۔ اس لیے امیر معاویہؓ نے سب سے پہلے انہیں کا شیرازہ درہم برہم کرنے کے لیے میدان میں نکلنا پڑا۔ امیر معاویہؓ نے خارجیوں کا زور توڑنے کے لیے ایک تجربہ کار اور ممتاز مدبر مغیرہ بن شعبہ کو کوفے کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ اور مغیرہ نے ایک ہی سال کے دوران میں بظاہر خارجیوں کا شیرازہ قوت منتشر کر دیا۔

زیاد کے سوا عرب کے تمام مدبرین امیر معاویہؓ کے ہم نوا تھے۔ زیاد حضرت علیؓ کا حامی اور امیر معاویہؓ کا مخالف تھا اور خلافت علویؓ کے زمانے سے فارس کا حاکم چلا آتا تھا۔ زیاد اپنے آپ کو ابو سفیان کا بیٹا کہتا تھا۔ چنانچہ ۴۴ھ میں امیر معاویہؓ نے بعض شہادتوں کی بنا پر کہ ابوسفیان نے زمانہ جاہلیت میں زیاد کی ماں [illegible] کے ساتھ نکاح کیا تھا زیاد کو اپنا سوتیلا بھائی مان لیا۔ ۴۵ھ میں بصرہ کی فتنہ و شورش فرو کرنے کے لیے اسے بصرہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ زیاد کی کوششوں سے بصرہ [illegible] فسادات دور ہو کر امن و امان قائم ہو گیا۔

۵۰ھ میں کوفہ کے حاکم مغیرہ بن شعبہ کا انتقال [illegible] کوفہ بھی زیاد کی تحویل میں دے دیا۔ اس طرح زیاد دو [illegible] کچھ عرصے رہا۔

حجرؓ بن عدی ایک مشہور صحابیؓ اور فدائیِ علیؓ [illegible] کے زمانے میں حضرت علیؓ کی مذمت کی جاتی تو حجرؓ [illegible] برسکتی۔ مغیرہ کے بعد زیاد کے عہد میں [illegible] کی غیر حاضری میں اس کے تمام متعدد عمرو بن حریث [illegible] سنگسار کیا تو حجرؓ [illegible] زیاد کو بھیجی۔ اس نے [illegible] روانہ کر دیا۔ امیرؓ نے [illegible] تہ تیغ کر دیا۔

[illegible] اثرات رونما ہوئے۔ حضرت عائشہؓ نے [illegible] کی سفارش نامہ بھیجا [illegible] حضرت عائشہؓ کو سخت صدمہ ہوا [illegible] امیر معاویہؓ [illegible] میں انہیں سخت ندامت ہوئی۔

امیر معاویہؓ کے عہد میں ہر طرف سے شورشوں اور بغاوتوں [illegible] چنانچہ امیر معاویہؓ کی ہدایت پر قیس بن ہیثم نے بلخ کی بغاوت کا [illegible] بن حازم نے ہرات، بادغیس اور پوشنج کی شورش رفع کر کے [illegible] لیا۔

۴۳ھ میں کابل کی سرزمین بغاوت اور شورش کی جولان گاہ [illegible] بیخ کنی کے لیے عبدالرحمٰن بن سمرہ سیستان سے روانہ ہوئے [illegible] پر بے پناہ سنگ باری کی۔ [illegible] مقابلہ کیا [illegible] آگے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ اور وہ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس

کے بعد بہادرانِ اسلام نے بست، رزان، طخارستان، سرخج اور غزنہ میں بغاوت کی آگ ٹھنڈی کرکے سارے باغی علاقے کو ازسرِ نو زیرِ نگیں کیا۔ ۴۳ھ میں حکم بن عمرو غفاری نے غور کی بغاوت فرو کی۔

فتوحات

اگرچہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں مشرقی سرحدوں پہ کچھ زیادہ فتوحات نہ ہوئیں۔ پھر بھی فتوحات میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔

۴۴ھ میں مہلب بن ابی سفرہ نے خیبر کی راہ سے حملہ کیا اور کابل کو طے کرتے ہوئے ہندوستان آئے۔ سرحدی علاقے کے باشندوں نے کسی قدر مقابلہ کیا لیکن مہلب نے انہیں مغلوب کرتے ہوئے قیقان کی جانب پیش قدمی کی۔ وہاں بارہ ترک سواروں نے انہیں نرغے میں لے لیا۔ مگر مہلب نے ان سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ زیاد کے بیٹے نے عباد ان کی حکومت سنبھالی۔ پھر سیستان کی راہ سے لمبا سفر طے کرکے قندھار پر چڑھائی کی۔ اور فتح کرکے اسے زیرِ نگیں کیا۔ اس کے بعد منذر بن جارود حاکمِ سندھ نے بوقان اور قیقان کے علاقے میں فوجوں کا جال بچھا دیا اور قسدار کی بغاوت فرو کی۔ پھر ان کے جانشین ابن حری باہلی نے بہت سے علاقے فتح کیے۔

۴۵ھ میں خراسان کی عنانِ حکومت عبید اللہ بن زیاد کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے ترکستان کے علاقے سغد پہ حملہ کیا اور بخارا کا پہاڑی علاقہ طے کرکے رامنی، بیکند، اور نسف پہ فتح کا جھنڈا گاڑا۔ اس کے بعد بخارا پہ بھی قبضہ کر لیا۔ شمالی افریقہ کا بہت سا حصہ تو خلفائے راشدینؓ ہی کے عہد میں زیرِ نگیں ہو چکا تھا۔ لیکن امیر معاویہؓ کے زمانے میں اس کی حدود اور بھی وسیع ہو گئیں۔

۴۹ھ میں امیر معاویہؓ نے نہایت اہتمام سے مشرقی رومی سلطنت کے پایۂ تخت قسطنطنیہ پہ سفیان بن عوف ازدی کی سپہ سالاری میں زبردست لشکر بھیجا۔ چونکہ اس سے پہلے مکہ و مدینہ میں بھی اس مہتم بالشان تاریخی حملے کا اعلان کروا دیا گیا تھا۔ لہذا صحابہ کرامؓ میں سے حضرات عبد اللہ بن زبیرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، حسینؓ بن علیؓ، ابو ایوب انصاریؓ وغیرہم رسول کریمؐ کی اس مشہور حدیث کے پیشِ نظر کہ:

"میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پہ حملہ کرے گا وہ مغفرت یافتہ ہے۔"

شوقِ شہادت میں سر کے بل آکر شریکِ جہاد ہوئے۔ امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو بھی اس فوج کا سردار بنا کر روانہ کیا۔

رسولِ کریمؐ کے میزبانِ مدینہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ دورانِ محاصرہ ہی میں شہنشاہِ حقیقی سے جا ملے۔ اور آپؓ کی وصیت کے مطابق آپ کو قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

جمادی الآخر ۶۰ھ میں امیر معاویہؓ بیمار ہوئے۔ اس بیماری سے ہی یکم اور بروایت دیگر ۲۲ رجب ۶۰ھ کو آپ کا انتقال ہو گیا اور حسبِ وصیت تجہیز و تکفین عمل میں لائی گئی۔ ضحاک بن قیس نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ یزید وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس لیے اس نے قبر پہ نماز ادا کی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۸ سال تھی اور مدتِ خلافت انیس سال تین مہینے ستائیس دن تھی۔ امیر معاویہؓ نے چار شادیاں کیں:

۱۔ میسون بنت بحدل: اس کے بطن سے یزید اور ایک بچی پیدا ہوئی۔

۲۔ فاختہ بنت قرظہ نوفلی: اس کے بطن سے دو لڑکے عبد اللہ اور عبد الرحمٰن پیدا ہوئے۔ مؤخر الذکر نے بچپن ہی میں انتقال کیا۔

۳۔ فاطمہ بنت عمارہ کلابیہ: اسے طلاق دے دی گئی۔

۴۔ کنوہ بنت قرظہ: غزوۂ قبرص میں آپ کے ہمراہ تھیں۔ وہیں وفات پائی۔

نظامِ خلافت

امیر معاویہؓ کے عہد میں خلافتِ راشدہ نے شخصی حکومت کا قالب اختیار کر لیا اور لاریب اس حکومت کو کامیاب حکومت کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے زمانۂ سلطنت میں کسی جگہ بغاوت نے سر نہیں اٹھایا۔ کوئی علاقہ اسلامی قبضہ و اقتدار سے علیحدہ نہیں ہوا۔ ڈاکہ اور شورش کا قلع قمع ہو گیا۔ فتنہ و فساد رفع ہو کر امن و امان قائم ہو گیا۔ متعدد علاقے مفتوح ہوئے۔ جس سے اسلامی سلطنت کو چاروں طرف سے وسعت حاصل ہوئی۔ تمدنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کثرت سے نئے صیغے قائم کیے گئے۔

اگرچہ اس زمانے میں خلفائے راشدین کے عہد جیسی مجلس شوریٰ قائم نہیں رہی تھی لیکن امیر معاویہؓ نے عمرو بن العاصؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور زیاد بن ابوسفیانؓ جیسے بڑے بڑے ماہرینِ سیاست کو اپنا صلاح کار بنا رکھا تھا جن کا مشورہ ہر اہم کام میں ضروری سمجھا جاتا تھا۔ امیر معاویہؓ نے صوبوں کا نظم و نسق اس طرح قائم رکھا جس طرح حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں تھا۔ مغرب کے جدید مقبوضات مصر اور مشرق کے خراسان کے زیرِ اقتدار رکھے۔

بحری فوج میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اس کا قیام تو عہدِ عثمانیؓ ہی میں امیر معاویہ کے ہاتھوں عمل میں آ گیا تھا۔ لیکن خود ان کے اپنے دورِ حکومت میں بحری بیڑے نے حد سے زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی۔ بحری فوج کی کمانداری کا جدید منصب قائم کیا گیا اور عبد اللہ بن قیس، حارثی اور جنادہ بن ابی اُمیہ اس منصب پہ فائز کیے گئے۔ جہاز سازی کے متعدد کارخانے قائم کیے گئے۔ جو بروایت بلاذری سب کے سب ساحلی مقامات پہ تھے۔

فوج کے دو حصے کیے گئے۔ شاتیہ یعنی سرمائی اور صائفہ یعنی گرمائی۔ یہ فوجیں موسم کے مطابق جگہ جگہ مصروفِ کار رہتی تھیں۔ پرانے قلعوں کی مرمت کرائی گئی اور متعدد نئے قلعوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ چنانچہ رومیوں کے قدیم قلعہ جبلہ کو دوبارہ تعمیر کرایا گیا اور بلنیارس، انطرطوس اور مرقیہ میں جدید قلعے بنوائے گئے۔ علاوہ بریں روڈس اور مدینہ میں قلعے تعمیر کیے گئے اور قبرص اور اردواڈ میں چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ شہر قیروان کی بنیاد فوجی ضروریات ہی کے باعث ڈالی گئی تھی۔ ضبط و نظم اور امن و امان قائم کرنے کے لیے پولیس کے محکمے کو ترقی دے کر وسیع کیا گیا۔ عراق میں جہاں کی مٹی کا خمیر ہی فتنہ و شر سے اٹھا، پولیس کی چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ پہلے سرکاری ڈاک کا کوئی باضابطہ نظام نہ تھا۔ امیر معاویہؓ نے ایک مستقل محکمہ قائم کرکے گھڑ سوار ہرکاروں کے ذریعے سے ڈاک کے لانے اور لے جانے کا انتظام قائم کیا۔ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے مفید کام کیے گئے۔

بہت سی نہریں جاری کی گئیں جو کسانوں کی فصلوں کے لیے ابرِ رحمت ثابت ہوئیں۔ زراعت کو بہت حد تک ترقی ہوئی۔ جس سے خشک سالی کی شکایت جاتی رہی۔ اس سلسلے میں مدینہ کے آس پاس ازرق، کظامہ، شہدار وغیرہ بہت سی نہریں کھدوائی گئیں۔ ان نہروں کی بدولت پیداوار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ امیر معاویہؓ نے بہت سے پرانے غیر آباد شہر آباد کیے اور نئے شہر بھی بسائے۔ مثلاً مرعش (شام) کی ویرانی آبادی سے بدل دی گئی۔ افریقہ میں ایک نیا شہر قیروان آباد کرکے وہاں فوجی چھاؤنی قائم کی گئی۔ تاکہ باغی بربریوں کو مطیع کیا جا سکے۔

مختلف مقامات پہ اسلامی نو آبادیاں قائم کی گئیں۔ مثلاً ۴۳ھ میں انطاکیہ میں ایک نو آبادی قائم کی۔ اردواڈ کے جزیروں روڈس اور اکثر سرحدی مقامات میں

مسلمان آباد کیے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے مجاہدین کے بچوں کے جو وظیفے مقرر فرمائے تھے۔ امیر معاویہؓ نے انھیں قائم رکھتے ہوئے اتنی ترمیم کر دی کہ بچہ دودھ چھوڑنے کے بعد وظیفے کا حقدار ہوتا تھا۔

امیر معاویہؓ نے خلفائے راشدینؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ذمیوں کے حقوق و مفاد کی پوری پوری حفاظت کی۔ صوبوں کے عمال بھی امیرؓ کے احکام کی کما حقہ تعمیل کرتے تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے غیر مسلموں کو فوج میں تو بھرتی کر لیا لیکن عدمِ اعتماد کے باعث انہیں بڑے بڑے عہدے تفویض نہ کیے۔ امیر معاویہؓ نے جب دیکھا کہ غیر مسلموں نے حسنِ کارکردگی سے کافی اعتماد پیدا کر لیا ہے تو انہیں ذمہ دار عہدوں پر مقرر کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ابن آثال عیسائی کو حمص کی کلکٹری کا منصب عطا کیا اور سرجون بن منصور رومی کو پرائیویٹ سیکرٹری بنا دیا۔

امیر معاویہؓ کے زمانے میں اسلام دُور دُور تک پھیل گیا۔ شمالی افریقہ کے باغی اور مرتد بربریوں کی بغاوت فرو کرنے کے علاوہ ان کے ارتداد کا بھی انسداد کیا گیا۔ کثیر التعداد رومی بھی اسلام کی آغوشِ عاطفت میں آ گئے۔ ہر خلیفہ اپنے عہد میں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھاتا رہا۔ لیکن امیر معاویہؓ نے اسے مزید زینت دی اور اس کی خدمت کے لیے خادموں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ بہت سی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ جامع مسجد بصرہ کی تعمیر نئے سرے سے عمل میں لا کر اسے زیادہ وسیع اور مضبوط کر دیا گیا قبرص میں مساجد کا جال بچھا دیا گیا۔ قیروان میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی گئی۔ بصرہ میں کابلی طرز کی ایک مسجد بنوائی گئی۔ مصر کی تمام مسجدوں کے میناروں کو زینت دی گئی۔

امیر معاویہؓ عدل گستری اور رعایا کی دادرسی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا روزانہ معمول تھا کہ دربار سے پہلے مسجد میں بیٹھ کر غریبوں، لاوارثوں اور کمزوروں کی شکایتیں سن کر ان کے ازالے کا حکم دیتے۔ پھر دربار میں جا کر اشراف سے کہتے۔ تمہارا فرض ہے کہ ادنیٰ لوگوں کی ضروریات مجھ سے بیان کرو۔ امیر معاویہؓ نوشت و خواند میں خوب دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ کتابتِ وحی کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی۔ مذہبی علوم میں درک وافر حاصل تھا۔ قرآن کی تفسیر پر عبور تھا۔ ۱۶۳ حدیثیں ان سے روایت کی جاتی ہیں۔ شعر و ادب میں قابلِ قدر شغف و انہماک تھا۔ اشعار کو اخلاق آموزی اور تعمیرِ کردار کا بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ تقریر میں فصاحت و بلاغت بھری ہوئی تھی۔ غرض اپنے زمانے کے تمام رائج علوم میں حسبِ ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔

امیر معاویہؓ سب سے پہلے شخص تھے جنہوں نے تاریخ اسلام کو کتابی صورت میں مدون کرایا۔ اور قدیم تاریخی روایات شاہانِ عجم کا تذکرہ اور زبانوں کے آغاز و نشر و اشاعت کے حالات لکھوائے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے خلافت سنبھالنے سے قبل کے زمانے کے بارے میں تاریخی روایات نے ان کی شخصیت کو کافی مسخ کر دیا ہے۔ ان کے اس دور کے اقدامات کو اگر سیاسی امور میں اجتہاد کی ایک غلطی گردانا جائے تو معاملہ زیادہ نہیں بگڑتا۔

تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے بعد امتِ مسلمہ کی اکثریت حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کے حق میں والیٔ شام امیر معاویہؓ، حضرت عثمانؓ کا فوری طور پر قصاص لینے کے حق میں تھے اور شام کے اکثریت بھی یہی رائے رکھتی تھی، مدینہ اور مکہ میں بھی عمومی طور پر انتشار کی سی کیفیت تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے قصاصِ عثمان لیے جانے سے قبل حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی دوران حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھی حضرتِ عثمانؓ کے قتل ہونے کی اطلاع ملی۔ ام المومنینؓ حج کے بعد مکہ سے مدینہ منورہ آ رہی تھیں۔ وہ فوراً مکہ واپس لوٹیں اور لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قصاص اور اصلاحِ فتنہ و فساد کے لیے تیار کیا۔ حضرت علیؓ اندرونی انتشار کے پیشِ نظر کچھ عرصہ کے لیے باغیوں کے خلاف قصاصِ عثمانؓ کے اقدام کو مؤخر کرنا چاہتے تھے۔ انہی حالات میں حضرت علیؓ اور عائشہ صدیقہؓ کے لشکر میں جھڑپیں بھی ہوئیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یہ لشکر باغیوں کے استیصال کے لیے تیار کیا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی کہ بعض سازشیوں کی سازشوں سے امتِ مسلمہ کے ان دو اکابر میں جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس دوران حضرت علیؓ نے دارالخلافہ کو مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا۔

ادھر دوسری طرف امیر معاویہؓ بھی ان حالات میں حضرت علیؓ کی بیعت کے حق میں نہ تھے۔ اپنے بعض ساتھیوں کے مشورے پر انہوں نے حضرت علیؓ سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے حق میں شام اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں خلافت کی بیعت لینی شروع کر دی۔ صفین کے مقام پر فریقین کے لشکروں میں کئی جنگیں ہوئیں۔ صلح کی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ بالآخر صلح ہو گئی اور ایک معاہدہ پر اتفاق ہو گیا۔ لیکن بعض سازشیوں کی ریشہ دوانیوں سے اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے شام اور مصر کے علاقوں میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ خونریزی اور بدنظمی کی اس کیفیت میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ نے ۴۰ھ میں باہم صلح کر لی جس کی رو سے مصر، شام اور مغرب کا حصہ امیر معاویہؓ کے پاس رہا اور حجاز، عراق اور مشرق کا سارا علاقہ حضرت علیؓ کے حصہ میں آیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت امام حسنؓ کی دستبرداری کے بعد امیر معاویہؓ مملکتِ اسلامیہ کے خلیفہ بن گئے۔

ان کی خلافت کا زمانہ مجموعی طور پر امن و امان سے گزرا۔ انہوں نے عقل و تدبر اور مہارت سے حالات کو کنٹرول کر لیا۔

زندگی کے آخری ایام میں اپنے بعض حاشیہ برداروں کے کہنے پر انہوں نے اپنے لڑکے یزید کے لیے جانشین خلیفہ کی حیثیت سے بیعت لینی شروع کر دی جس سے امت میں ایک بار پھر انتشار کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حجاز مقدس میں تو بزرگ صحابہ کرام اور خصوصی طور پر اولادِ علیؓ نے اس اقدام کی مخالفت کی۔ عمومی طور پر امیر معاویہؓ کے کنٹرول سے وقتی طور پر تو کوئی ہنگامہ نہ ہو سکا اور کھلی مخالفت نہ ہوئی۔ کیونکہ دارالخلافہ اور قرب و جوار کے علاقوں میں امیر معاویہؓ و یزید کو مکمل حمایت حاصل تھی۔ امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد اس معاملے نے کافی شدت پیدا کر دی۔ یہی کشیدگی بالآخر واقعہ کربلا کی دردناک شکل اختیار کر گئی۔ اس طرح خاندانِ امیہ اور خاندانِ علیؓ میں کافی بعد پیدا ہو گیا۔ آلِ علیؓ کے اہم افراد خصوصی طور پر حضرت حسینؓ کی کربلا میں شہادت سے تاریخ اسلام میں جو نمایاں دھبہ آیا اس نے حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے یزید کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے اقدام کو غلط ثابت کیا اور مسلمانانِ عالم کی ہمدردیاں ان سے ہٹ کر خاندانِ علیؓ کی طرف منتقل ہو گئیں اور اسی زمانے سے امت نے دو مستقل فرقوں کی شکل اختیار کر لی۔ خاندانِ علیؓ سے غلوِ عقیدت رکھنے والے شیعہ کہلائے۔

معاویہ ثانی۔ (وفات ۶۴ھ)

یزید کے بعد اس کا نوجوان بیٹا معاویہ تقریباً ۲۱ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا وہ بڑا پرہیزگار اور صالح تھا۔ یزید کے عہد میں ناخوشگوار اور خونچکاں واقعات کے پیشِ نظر وہ حکومت سے متنفر ہو گیا۔ کچھ علیل بھی تھا۔ اس لیے وہ باختلاف روایات چالیس دن دو مہینے یا تین مہینے کے بعد خلافت سے دستبردار ہونے کے بعد خانہ نشین ہو گیا۔ اور چند ماہ کے بعد انتقال کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے زہر دے دیا گیا۔

معتزلہ ۔ اسلام کی تاریخ میں معتزلہ طرزِ فکر کے علماء و حکمار کا تاریخ سازی میں اہم کردار رہا ہے ۔ ان اکابرین نے سیاسی مصلحتوں سے کنارہ کش رہ کر قرآنی تعلیمات پرکھنے کے لیے " عقلیات " کو معیار مقرر کیا ۔ اسلام کے ہر حکم پر عقلی دلیل طلب کی جاتی اور جو لوگ دین کے معاملات میں عقلی دلائل دینا پسند نہ کرتے ان سے مناظرے کیے ۔ اس طرح ایک نئے طرزِ فکر نے جنم لیا ۔ شروع شروع میں یہ طبقہ پختہ مسلمان علمار کی تائید سے ابھرا مگر رفتہ رفتہ اس کے اندر بھی اختلافی بحثیں پیدا ہوئیں اور کئی گروہ بن گئے ۔

معتزلہ تاریخ میں سخت کوش اور سخت جاں ثابت ہوئے ۔ ان کے اعتقادات نے بڑے بڑے دانشوروں کو فلسفیانہ دلائل و مباحث میں الجھایا ۔ حکومت وقت کو متاثر کیا ۔ آئمہ فقہا حضرات امام ابوحنیفہؒ ، امام مالکؒ ، امام شافعیؒ ، امام احمد حنبلؒ کے لیے نہ صرف مشکلات پیدا کیں بلکہ حضرت امام حنبلؒ کو مسئلہ خلق قرآن تسلیم نہ کرنے کے جرم میں المناک سزائیں دلوائیں ۔ انسان کے " مختار مطلق یا مجبور محض " کے عنوان پر بحثیں شروع ہوئیں قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ؟ اگر مخلوق ہے تو اس کا درجہ مخلوقات میں کیا ہے ۔ خدا عادل ہے تو سزائیں کیسی ؟ اگر عادل نہیں تو خدائی صفات میں اس صفت کا اضافہ کیوں ؟ وغیرہ وغیرہ ایسے ہی سوالات اس وقت کے مسلمانوں میں ابھرے ۔ عین اسی عہد میں فلسفہ یونان نے مسلمانوں کو گہرے تاثرات دیئے ۔ فلسفہ یونان مشرف بہ اسلام کیا گیا لیکن اسلام کی سادہ تعلیمات کی حقیقی حیثیت قائم نہ رہ سکی ۔ معتزلہ کے کئی گروہ تھے ۔ بصرہ ، بغداد ، مراکش اور ایران وغیرہ میں ان کی بڑی بڑی درس گاہیں تھیں ۔ لیکن ان مدارس کے درمیان بھی خاصا اختلاف ہوا ۔ اور مزید نئے فرقے فروغ پذیر ہوئے ۔

معتزلہ کے بانی واصل بن عطا تھے ۔ یہ بزرگ ایرانی الاصل تھے اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ (م ۱۱۰ھ) کے ممتاز رشد تلامذہ میں شامل تھے ۔ واصل بن عطا نے بہت سے مذہبی اعتقادات میں عقلی میلانات کی طرف رجوع کیا ۔ انہوں نے ابدیت قرآن کی دلیل ماننے سے انکار کر دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ خدا کی صفات میں ایک صفت حکمت بھی ہے ۔ مگر یہ حکمت خدا نے پیدا نہیں کی ۔ بلکہ خدا کے ساتھ مشروط ہے مگر یہ حکمت حد بھی نہیں کہا سکتی ۔

واصل بن عطا نے چونکہ فلسفہ " الہیات " کی ایک نئی شاخ سے مسلمانوں کو متعارف کرانے کی کوشش کی تھی اور ان کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے قدرے مختلف ہو گئے تھے ۔ واصل بن عطا اور خواجہ حسن بصریؒ کے درمیان " عقلیات " کے موضوع پر مباحث بھی ہوتے رہتے تھے ۔ خواجہ حسن بصریؒ نے ان کو فلسفیانہ موشگافیوں پر گریزاں رہنے کے لیے کہا مگر اس نے تسلیم نہ کیا تو خواجہ صاحب نے ان کو اپنے درس سے نکال دیا اور کہا کہ وہ اعتزال کا شکار ہو گیا ہے یعنی صحیح معیار سے الگ ہو کر عقل کو دین کے معاملہ میں معیار مقرر کرتا ہے ، جو دین کے منافی ہے ۔ اس وقت سے واصل بن عطا کے ساتھ معتزلہ کے لفظ کا اضافہ ہوا اور ایک نیا فرقہ وجود میں آ گیا ۔ ابتدا میں واصل بن عطا نے جن عقائد کی تبلیغ کی وہ کچھ اس طرح کے تھے ۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں مومن ہے ۔

جو شخص زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرے اس کا ایمان بغیر عمل کے مکمل ہے ۔

ایمان کا تعلق عمل سے نہیں قلب سے ہے ۔

انسان اپنے اعمال و افعال کے لیے آخرت میں جوابدہ نہیں ۔ کیونکہ انسان اپنے افعال پر مختار مطلق نہیں جو مختار ہو صرف اسی کی جوابدہی ہو سکتی ہے ۔

اسلام کے لیے جبر کی نسبت ذاتی اطمینان و اختیار کا ہونا ضروری ہے ۔

فلسفہ اسلام کے مصنف کے مطابق واصل بن عطا پہلے قدری تھے ۔ مگر جب جبریہ کے خلاف زبردست مہم شروع ہوئی تو ان کی طرف سے دفاع کرتے رہے ۔ معتزلہ میں کئی گروہ بندیاں بھی ہوئیں ۔ ان میں اکثر مستقل فرقے کی حیثیت اختیار کر گئے ۔ ان فرقوں کے نام یہ ہیں ۔

قدریہ ، ہذلیہ ، عشبہ ، مقاتلیہ ، واسمیہ ، جبائیہ ، کعبیہ ، نظامیہ ، معمریہ ، معتمریہ ، ثمامیہ ، حائبہ ، سلاحیہ ، ہاشمیہ ، حلولیہ ، الجاحظ ، کرامیہ ، نجاریہ ، اشاعرہ ، ماتریدیہ ، کلابیہ ، ضراریہ ، جبرولیہ ، مزداریہ ، حائطیہ ، اسکافیہ ، سواریہ ، جعفریہ ، حماریہ ، جاحظیہ ۔

معتصم باللہ ۔ (وفات ۲ ربیع الاوّل ۲۲۷ھ)

ہارون الرشید کا منجھلا بیٹا ابو اسحاق محمد معتصم ۱۸۰ھ میں بمقام زبطرہ واقع سرحد روم ایک کنیز ماردہ کے بطن سے پیدا ہوا ۔ مامون نے اپنے اسلاف کے برعکس محض نظام سلطنت کے استحکام کے پیش نظر اپنے بیٹے عباس کی جگہ اپنے بھائی معتصم کو اپنا ولیعہد مقرر کیا تھا ۔ مامون کی وفات کے دوسرے دن مقام طرطوس میں معتصم باللہ تختِ خلافت پر متمکن ہوا ۔ عباس نے والد کی وصیت کے پیش نظر اپنے چچا کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔ معتصم کا دور حکومت ۲۱۸ھ سے ۲۲۷ھ تک رہا ۔

معتصم کا دور مجموعی طور پر ہنگامہ آرائی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے ۔ ملک کے اندر کافی شورشیں پیدا ہو چکی تھیں ۔ معتصم کو خود خصوصی توجہ سے ان شورشوں کی سرکوبی کرنا پڑی بابک خرمی کی شورش مامون کے عہد سے ہی شروع تھی ۔ معتصم نے ابوسعید محمد بن یوسف کو بابک کے استیصال پر مقرر کیا ۔ اس نے بڑی تیاری کر کے بابک کے حواریوں کا مقابلہ کیا اور خرمیوں کی کثیر تعداد کو قتل کیا اور اسیر مسلمانوں کو رہا کرایا ۔ معتصم نے ترکی افسر افشین کو بھی اس مہم پر مامور کیا تھا ۔ اس نے بابک کے مستقر بذ کی جانب پیش قدمی کی ۔ خونریز جنگ کے بعد ۷۰۰ مسلمانوں کو رہا کرایا ۔ صفر ۲۲۳ھ میں افشین ، بابک کو گرفتار کر کے معتصم کے پاس سر من رائے لایا ۔ وہاں اسے پھانسی دے دی گئی ۔

آرمینیہ ، طبرستان اور کردستان میں بدنظمی اور انتشار کو فرو کیا ۔

قیصر روم کے حملے کو معتصم کی قیادت میں مسلمانوں کے ایک بڑے لشکر نے روکا ۔ آرمینیہ کے نواح میں طرفین میں شدید معرکہ آرائی ہوئی ۔ مسلمانوں نے رومیوں سے انگورہ اور عموریہ چھین لیے ۔ عموریہ کی تاریخی فتح کے بعد معتصم تسخیرِ قسطنطنیہ کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ بغداد میں عباس بن مامون نے ایک گروہ سے بیعت لے کر قیصر روم سے سازباز شروع کر دی ہے ۔ اس پر معتصم فوراً بغداد پہنچا اور عباس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا قید ہی میں عباس کا انتقال ہو گیا ۔

معتصم کے عہد میں ترکوں کا نظم سلطنت میں عمل دخل بڑھ گیا ۔ ترکوں کا یہ اثر و رسوخ بعد کے حکمرانوں کے زمانوں میں انہیں سیاہ و سپید کا مالک بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوا ۔

اپنے بھائی مامون کی طرح معتصم نے بھی خلقِ قرآن کے حق میں علمار سے فتوے حاصل کیے اور خلق قرآن کے نظریہ کی مخالفت کرنے والے علمار کو تشدد کا نشانہ بنایا ۔

معتمد علی اللہ ۔ (وفات ۱۰۹۵ء)

اندلس کے مشہور اور ممتاز خلیفہ کا نام ۔ المعتضد کا بیٹا تھا ۔ عہدِ حکومت ۱۰۶۸ء سے ۱۰۹۱ء تک ۔ اندلس میں ایک ہر دلعزیز اور طاقتور حکمران تھا ۔ قرطبہ اپنی مملکت میں ضم کیا ۔ المعتمد جذباتی اور شاعرانہ طبیعت کا مالک تھا ۔ بیشمار قصے اس کی عیش و عشرت

رنگا رنگ ضیافتوں اور رومانی مشاغل کے بارے میں مشہور ہیں۔ ممتاز شاعر ابن عمار المرابشی کو وزیر بنا لیا۔ اس کی ملکہ اعتماد نہایت مدبر اور حسین خاتون تھیں۔ کہتے ہیں کہ اسی نسبت سے خلیفہ نے اپنے بیٹے المعتمد کا خطاب تجویز کیا تھا۔ اس کی خلافت کے آخری دن ابتدائی ایام کے برعکس خفت و ذلت کا مجموعہ تھے۔ چنانچہ یوسف بن تاشفین اور مسیحی حریفوں نے اس پر زندگی اجیرن بنا دی۔ المعتمد کو گرفتار کر کے مراکو بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے زندگی کے آخری ایام حراست میں گزارے۔ ملکہ اعتماد اور خلیفہ کی بیٹیاں بقول مؤرخین اپنی معاشی ضروریات سوت کات کر پیدا کرتی تھیں۔ المعتمد نے ۱۰۹۵ء میں اغمات کے مقام پر بڑے اندوہناک حالات میں وفات پائی۔

معجزہ ۔ کسی نبی یا رسول سے ایسے واقعہ کا ظہور پذیر ہونا جو انسانی عقل وفکر سے بالاتر ہو۔ یہ خصوصی واقعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تاکہ اس کے نبی یا رسول کی صداقت عام لوگوں پر واضح ہو۔ عمومی طور پر معجزے اس مخصوص زمانے اور حالات کے مطابق ہوتے ہیں جس میں وہ نبی یا رسول اپنی دعوت پیش کر رہا ہو۔ قرآن مجید میں انہیں آیات (نشانیاں) قرار دیا گیا ہے۔ مختلف پیغمبروں کو مختلف معجزے عطا ہوئے تھے تاکہ وہ ان کے ذریعے سے خدا کی قدرت کا لوگوں پر اظہار کر سکیں۔

احادیث کی روایات کے مطابق نبی کریمؐ کے معجزات میں واقعہ معراج اور واقعۂ شق القمر زیادہ مشہور ہیں۔

معجم البلدان ۔ دورِ عباسی کے خاتمے پر دنیائے اسلام کے سب سے بڑے جغرافیہ دان یاقوت بن عبداللہ الحموی نے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ یاقوتؒ کا زمانہ ۱۱۷۹ء سے ۱۲۲۹ء تک کا ہے معجم البلدان (جغرافیائی ڈکشنری) انہی کی تصنیف ہے نیز معجم الادباء نام کی علمی ڈکشنری اور علماء اور ادباء کی لغت بھی انہی کی تصنیف ہے پیدائش ایشیائے کوچک میں ہوئی۔ والدین یونانی النسل تھے۔ بغداد میں حماۃ کے ایک تاجر نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔ اسی لئے حموی کے نام سے مشہور ہوئے۔ معجم البلدان کا مسودہ موصل میں ۱۲۲۴ء میں مکمل ہوا اور آخری تدوین ۱۲۲۸ء میں حلب میں ہوئی۔ وفات بھی اسی سال واقع ہوئی۔ معجم البلدان میں مقامات کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں جغرافیائی واقفیت کے علاوہ یہ ڈکشنری نیچرل سائنس اور انسانی نسلوں کے علم کا بھی بے نظیر ماخذ ہے۔

معراج (واقعہ معراج) ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا مشہور و معروف واقعہ جو قرآن مجید میں ان الفاظ سے مذکور ہوا۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ ... الخ ۔ (پاک ہے وہ ذات (اللہ تعالیٰ) جس نے اپنے بندہ برگزیدہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔ مسجد اقصیٰ جس کا ماحول برکتوں سے مالامال ہے)۔ اس واقعہ کو مختلف محدثین نے مختلف انداز میں پیش کیا۔ تاریخی شہادتیں بھی اس واقعہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ امتِ مسلمہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس واقعہ کی صحت سے انکار کرتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ واقعہ ہے بھی تو خواب کی حد تک۔ حالانکہ یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ خواب کے عالم میں کسی غیر معمولی واقع کا ظہور اس قابل نہیں کہ اُسے اس محتشم بالشان طریقے سے بیان کیا جائے کیونکہ اس طرح کے خواب تو ہر آدمی کو آ سکتے ہیں اس واقع کی اہمیت ہی یہ ہے کہ رات کے مختصر عرصے میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان اس واقعے کی صحت اور عدم صحت پر مباحث بھی اسی غیر معمولی

واقعے کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو خلاف عقل ٹھہرا کر اسے تسلیم نہ کرنے والوں کی تشفی کے لیے حضرت ابو بکرؓ کا وہ جواب جو انہوں نے ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کو دیا تھا، کافی ہے۔ ابوجہل نے ابو بکرؓ کو یہ بتایا کہ تمہارے نبی اب یہ بھی کہنے لگے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا میں تو جب ان پر نزول وحی کو تسلیم کر لیا ہے جو اس سے زیادہ خلاف عقل بات ہے تو یہ واقعہ تسلیم کیوں نہ کروں۔ اگر میرے پیارے رسولؐ نے اس واقعہ کا اظہار فرمایا ہے تو ابو بکرؓ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

تاریخی کتب اور کتب روایات میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت سے ایک سال قبل اور بعض روایات کے مطابق تین سال قبل اپنی پھوپھی زاد ام ہانی کے گھر محو استراحت تھے جب جبرئیل امین حاضر ہوئے اور آپؐ کو بیدار کیا۔ وہاں سے مسجد الحرام کے قریب آپ کو ایک سواری پیش کی گئی جسے براق کہا جاتا ہے۔ آپؐ براق پر سوار ہو کر جبرائیل امین کی معیت میں اس سفر پر روانہ ہوئے جسے اسراء اور معراج کہا جاتا ہے۔ آپؐ کا گزر طیبہ (مدینہ طیبہ) اور طور سینا سے ہوا۔ بیت المقدس میں آپؐ کا استقبال حضرات انبیاء کرام نے کیا۔ جبرائیل امین نے ایک ایک نبی سے آپؐ کا تعارف کرایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ قریش مکہ اور دوسرے لوگ انبیاء سابقہ کے متعلق جو مشرکانہ اور جاہلانہ عقائد رکھتے تھے مجھے خیال گزرا کہ ان انبیاء کرام کی وہ تعلیمات جو قریش پیش کرتے ہیں سراسر خلاف اسلام ہیں۔ ان انبیاء کرام کا اپنی تعلیمات کے متعلق کیا خیال ہے۔ یہی خیال ابھی دل میں ہی تھا کہ جبرئیلؑ بول پڑے "یہ موسیٰ [illegible] یہ عیسیٰؑ ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ وہ خدا کے بیٹے یا ساتھی ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی تردید کر دی۔ اور کہا کہ یہ عقائد میرے بعد گھڑے گئے ہیں۔

جبرائیل امین نے مجھے امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء نے میرے پیچھے نماز ادا کی۔

نماز ادا کرنے کے بعد جبرائیل مجھے مقام صخرہ پر لے گئے۔ وہاں سے [illegible] طرف چلے۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم سے میری ملاقات ہوئی۔ [illegible] دائیں طرف دیکھتے تو ان کے چہرے پر بشاشت آ جاتی اور بائیں طرف دیکھتے تو [illegible] میں نے جبرئیل سے پوچھا۔ یہ کیا ماجرا ہے [illegible] جنت [illegible] ہیں وہ اپنی اولاد کے صالحین کو جنت میں دیکھتے ہیں تو انہیں خوشی ملتی ہے [illegible] دوزخ کے مناظر [illegible] ہو جاتے ہیں۔

دوسرے آسمان پر میری ملاقات عیسیٰ بن مریم اور یحییٰ بن زکریا سے ہوئی۔ [illegible] آسمان پر یوسف علیہ السلام کے حسن کا نظارہ [illegible] پانچویں پر ہارون علیہ السلام۔ چھٹے پر موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں پر [illegible] حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹھے۔

اس سفر میں جبرئیل نے [illegible] جنت اور دوزخ کی حقیقت [illegible] تعالیٰ کی طرف سے شمار عظمتیں رفعتیں عطا ہوئیں آپ کو [illegible] کا تحفہ ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایک رات کے کچھ حصے میں [illegible] میں نے عالم بیداری میں ایک نئے عالم کا مشاہدہ کیا اور [illegible]

صبح آپ مسجد حرام میں بیٹھے [illegible] ابوجہل [illegible] پوچھا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی نئی [illegible] فرمایا ہاں۔ اور واقعہ معراج بلاکم و کاست [illegible] سامنے [illegible] موقع ملا [illegible] اگر اس واقعے کی تشہیر کی جائے تو لوگ [illegible] ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔

بعد میں نے کئی لوگوں کو جمع کیا اور یہ واقعہ بیان کیا ۔ بعض لوگ اس واقعے کو جھٹلانے لگے اور بعض اسے تسلیم کرتے ۔ بعض لوگ جو غور وفکر کے عادی اور حقیقت شناس تھے۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ کی نشانیاں پوچھنا شروع کر دیں ۔ اُن کا خیال تھا کہ آپؐ نے اس سے پہلے مسجد اقصیٰ کو نہیں دیکھا تھا اگر واقعہ صحیح ہے تو یہ نشانیاں تبلادیں گے ۔ اگر واقعہ غلط ہوا تو مسجد اقصیٰ کے بارہ میں تبلا نہیں سکیں گے ۔

احادیث کے مطابق مسجد اقصیٰ آپؐ کے سامنے پیش کی گئی ۔ آپؐ نے مسجد اقصیٰ کے بارہ میں پوری جزئیات کے ساتھ لوگوں کو تبلایا اور مطمئن کیا ۔

ان لوگوں نے جب یہ حربہ بھی ناکام ہوتے دیکھا تو ایک اور داؤ آزمایا ۔ قریش کے دو تجارتی قافلے یروشلم کی طرف گئے ہوئے تھے ، انھوں نے آپس میں مشورہ کے بعد حضورؐ سے سوال کیا ہمارا ایک قافلہ شام کی طرف گیا ہوا ہے اس کے متعلق بتلایئے وہ کس حال میں ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ قافلہ مقام روحاء کے پاس سے گزر رہا ہے ۔ میرے گزر قافلے والوں کے پاس سے ہوا تو وہ اپنے ایک کھوئے ہوئے اونٹ کی تلاش میں تھے ۔ ایک جگہ پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ رکھا تھا ۔ میں نے وہ اٹھایا اور کچھ پانی لیا بھی ۔ اب اپنے اہل قافلہ سے پوچھو کہ اس میں یہاں تک صداقت ہے ۔

اس کے علاوہ تمہارا ایک اور قافلہ بھی آرہا ہے اُسے میں نے مقام ذی مرّ میں دیکھا ۔ کچھ لوگ سوار تھے کچھ پیدل اور بعض لوگ زمین پر بیٹھے تھے ۔ ایک چتکبری والی اونٹنی ان کے درمیان چل رہی تھی ۔ میں قریب سے گزرا تو وہ اونٹنی بھاگی اور اس کا سوار گر گیا ۔ سوار کا ہاتھ بھی ٹوٹ گیا ۔ آپؐ نے اس کے علاوہ کہا کہ تمہارا قافلہ مقام تنعیم کے پاس ہے ۔ جس کے آگے آگے بھورے رنگ کا ایک اونٹ چل رہا ہے ۔ کل صبح جونہی سورج طلوع ہوگا قافلہ فلاں پہاڑی سے نمودار ہوگا ۔ لوگوں نے اسے غنیمت جانا کہ آزما لیا جائے ۔ وہ لوگ پورے اہتمام کے ساتھ قافلوں کا انتظار کرنے لگے ۔ صبح کے وقت آدھے لوگ کی نظریں سورج کی طرف لگی تھیں اور آدھے لوگ قافلے کی آمد کے منتظر تھے ۔ جونہی سورج طلوع ہوا ایک شخص چلّا اٹھا ۔ 'وہ سورج نکل آیا ۔ اسی وقت ایک دوسرا شخص چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا " واللہ! وہ قافلہ پہنچ گیا ۔ اور اس کے آگے بھورا اونٹ ہے ۔ ان لوگوں نے ہر طرح سے مایوس ہو کر کہا یہ تو کھلا جادو ہے ۔"

اس واقعہ کے جسمانی یا روحانی ہونے کے متعلق مختلف مباحث کی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بھی کچھ لوگ اس واقعہ کو روحانی مانتے تھے ۔ جمہور مسلمین اس واقعہ کے جسمانی ہونے کے بارے میں جو دلائل رکھتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱ ۔ قرآن کا کلمہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ ۔ پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ، الخ ۔ بندہ یا عبد کے لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ روح مع الجسد سیر کرائی گئی ۔ صرف روح پر عبد کا اطلاق نہیں ہوتا ۔

۲ ۔ واقعات معراج میں سواری وغیرہ ایسے افعال جسمانی سفر پر دلالت کرتے ہیں ۔

۳ ۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کو معیار اور آزمائش کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اگر خواب ہو تو اس کی تصدیق کیا مشکل ہے ۔

جو لوگ اس کو روحانی مانتے ہیں ان کا نکتہ نظر علامہ ابن القیمؒ نے زاد المعاد کی جلد اول میں یوں بیان کیا ہے :

" ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا ، معراج میں آپؐ کی روح لے جائی گئی اور جسم نہیں گیا ۔ حسن بصریؒ سے بھی اس قسم کی روایت ہے لیکن جاننا چاہیئے کہ حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ نے یہ نہیں کہا کہ وہ خواب تھا ۔ بلکہ انھوں نے کہا کہ معراج میں آپؐ کی روح کو لے جایا گیا اور آپؐ کا جسم نہیں گیا ، اس میں بڑا فرق ہے ۔ معراج روحانی کے ماننے والے اس بات کے قائل ہیں کہ حضور اکرمؐ کی خود بذاتہ روح کو معراج ہوئی اور درحقیقت وہی آسمان پر گئی اور ظاہر ہے کہ یہ ایک کیفیت خواب سے مختلف ہے ۔"

اس واقعہ کی تائید میں جو آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں اُن سے اللہ تعالےٰ کے ان فیصلوں کا علم ہوتا ہے ۔

۱ ۔ یہودی جواب تک بیت المقدس کے نگہبان اور کلید بردار تھے اب وہ نہیں رہے ۔

۲ ۔ کفارِ مکہ پر اتمام حجت ہوگئی ، تبلیغ کا دور ان معنوں میں ختم ہوا کہ اب اگر کفار ظلم وتشدد سے باز نہیں آئیں گے تو نبی کریمؐ ہجرت کریں گے اور اس کے بعد کھلی جنگ ہوگی ۔

۳ ۔ مسلمانوں کے لیے احکام کا اجراء ہوا ۔ نماز پنجگانہ فرض ہوئی ۔ کتب احادیث میں آپؐ کے ان مشاہدات معراج کا ذکر ہے ۔

ا ۔ آپؐ نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کا گوشت کاٹ کاٹ کر انہیں کھلایا جارہا ہے یہ لوگ چغلخور تھے ۔

ب ۔ کچھ لوگ ایسے تھے جن کی زبانیں اور ہونٹ کاٹے جارہے تھے ۔ جب کٹ چکتے تو پھر ویسے ہو جاتے ۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ آپؐ کی اُمت کے وہ واعظ اور خطیب ہیں جو دوسروں کو لمبی چوڑی نصیحتیں کرتے تھے مگر خود عمل پیرا نہیں ہوتے تھے ۔

ج ۔ رسول اللہؐ نے کچھ لوگوں کو دیکھا ، سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں ۔ یہ وہ مالدار لوگ ہیں جو سرمایہ پرستی کی ہوس میں مبتلا ہیں اور حقوق العباد سے پہلو تہی کرتے ہیں ۔

د ۔ سود خوروں کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے شکم سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں ۔ ایک اور روایت کے مطابق ایک سود خور خون کی ندی میں تیر رہا ہے اور باہر نکل نہیں سکتا ۔ نکلنا چاہتا ہے تو لوگ اسے پتھر مارتے ہیں اور وہ پھر اندر چلا جاتا ہے ۔

واقعہ معراج آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا اہم ترین واقعہ ہے ، اس میں آپؐ کو کائنات کے حقائق اور اسرار و رموز سے آگاہ کیا گیا ۔ آپؐ ذاتِ خداوندی کے اس قدر قریب گئے کہ ابن آدمؑ کو وہ قرب آج تک حاصل نہیں ہوا ۔

معرفت ۔ بمعنی پہچان ، شناخت ۔ اصطلاح میں علمِ الٰہی ، خداشناسی ، فیضِ روحانی کا ادراک ۔ عوامی زبان میں ذریعہ وساطت ، مابینی واسطہ ، معرفت تصوف کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم خداشناسی اور معرفت الٰہی ہے اور یہ معرفت الٰہی سالکین راہِ سلوک کی اپنی اپنی استعداد اور سعادت پر منحصر ہے ۔ اس معرفت الٰہی کی کوئی حد و حصر نہیں ، سوائے اعترافِ عجز کے جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا کہ " پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت کی طرف سوائے اعتراف عجز کے اور کوئی راہ تجویز نہیں فرمائی "

معروف کرخیؒ ، شیخ ۔ اسمِ گرامی معروف اور کنیت ابومحفوظ تھی ۔ والد ماجد کا نام فیروزان تھا ۔ پہلے آپ اپنے آبائی دین آتش پرستی پر قائم تھے متقدمین مشائخ میں سے تھے اور حضرت شیخ سری سقطیؒ کے استاد تھے ۔ کرخ کی حکومت آپ کے ناناکے زیرِ نگیں تھی جو آتش پرست تھے ۔ آپ نے حضرت علی بن موسیٰ رضاؒ کے دستِ راست پر اسلام قبول فرمایا اور پھر اپنے والدین کو بھی اسلام سے مشرف فرمایا ۔

آپ عبادات و ریاضیات اور مجاہدات میں ثانی نہیں رکھتے تھے ۔ نیز کشف و کرامات وخوارق عادات آپ کی بے حد و بے پایاں ہیں ۔

وفات بغداد شریف میں ۲۰۰ھ یا ۲۰۶ھ میں پائی جو کہ معتصم عباسی کا زمانہ

تھا۔ مزار بغداد شریف میں مرجع خاص و عام ہے۔

میعلومیہ (۶۶ھ م)۔ یہ فرقہ حازمیہ کی ایک شاخ ہے، مگر اپنے عقائد میں انتہاپسند واقع ہوا ہے۔ دیگر خارجیوں جیسے ان کے عقائد ہیں۔ مگر اس فرقہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے صفاتی اسماء کو جاننا، سمجھنا اور تسلیم کرنا ان کے نزدیک علم کی آخری حد ہے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ کے صفاتی نام جانتا ہو اسے قرآن مجید حدیث یا فقہ کے دیگر مسائل میں الجھنے یا ان کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ باقی چیزیں ان کے ہاں قطعی غیر ضروری اور ثانوی نوعیت کی ہیں۔ اصل علم اللہ تعالےٰ کے صفاتی اسماء کو جاننا اور سمجھنا ہے۔

اس کے علاوہ اس فرقہ کے لوگ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ انسانوں سے اعمال کی صورت میں کسی برائی یا بھلائی کا صدور ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ انسانی افعال مخلوق نہیں بلکہ خالق شمار کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں قتل، زنا، شراب، جھوٹ وغیرہ گناہ میں شمار نہیں کیے جاتے۔

معنؓ بن عدی۔ صحابیٔ رسولؐ۔ نام معنؓ۔ قبیلہ باہل۔ عقبۂ ثانیہ میں مسلمان ہوئے اور حضرت عمرؓ کے بھائی حضرت زیدؓ سے مواخات ہوئی۔ جملہ غزوات میں نبی کریمؐ کے ہمرکاب رہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمرؓ سے جن دو نیک بندوں کے ملنے کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے ایک آپ تھے۔ انہوں نے ہی حضرت عمرؓ کو خلافت کے بارے میں انصار کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں حضرت خالدؓ کے ہمراہ مرتدین کی مہم میں بھی گئے تھے اور دو سو (۲۰۰) سواروں کو لے کر یمامہ آئے تھے مسیلمہ کذاب کی جنگ (جنگِ یمامہ) میں شہید ہوئے۔

معیقیبؓ بن ابی فاطمہ۔ نام معیقیبؓ۔ قبیلہ ازد (جو بنو عبد شمس کا حلیف تھا) آپ دعوت اسلام کے ابتدائی دنوں میں مسلمان ہوئے اور کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کو ہجرت کی۔ جہاں سے جنگِ خیبر کے ایام میں مدینہ چلے آئے اور تمام غزوات میں حصہ لیا۔ حضور کی زندگی میں نبوت کی مہر انہی کے قبضہ میں رہتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آپ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں خلفاء کے زمانے میں مہر نبوت اور صیغہ مالیات بھی انہی کے پاس رہا۔ اور بیت المال کے خزانچی بھی رہے انہیں جذام کا مرض تھا اس لیے لوگ ان سے پرہیز کرتے تھے۔ مگر حضرت عمرؓ ان کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ جناب فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دور دور سے اطباء کو بلا کر علاج کروایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا آخر میں دو یمنی طبیبوں سے علاج کرایا۔ جس سے مرض تو زائل نہ ہوا مگر مرض کے اور بڑھنے کا خطرہ ٹل گیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں بھی مہر نبوت آپ ہی کے پاس رہتی تھی۔ اور آپ کے ہاتھ ہی سے کنویں میں ایسی گری کہ پھر نہ ملی اور اسی عہد خلافت میں آپ کا انتقال بھی ہوا۔ اولاد میں صرف محمد بن معیقیبؓ کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے آپ سے روایت بھی کی ہے۔ آپ لکھنا پڑھنا بخوبی جانتے تھے۔ حضور سے اکثر احادیث بھی آپ نے روایت کی ہیں۔

مغازی۔ عربی لفظ بمعنی جنگیں، خصوصاً وہ جن میں حضور پاکؐ خود شریک ہوئے۔ قدیم عرب میں علم و فنون نہ تھے۔ قبائل میں صرف جنگ و جدل کے واقعات ہی محفوظ کیے جاتے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ سب سے پہلے مغازی ہی کی روائتیں پھیلیں اس فن کی بنیاد سب سے پہلے پڑی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا۔ وہ افراد جو مغازی کو فن بنائے ہوئے تھے، عوام میں تو مقبول ہو جاتے تھے مگر خواص میں نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے: "تین قسم کی کتابیں ہیں جن کا کوئی اصل نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر"۔ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے اس فن کی طرف خاص توجہ دی اور غزواتِ نبوی کا الگ حلقہ درس قائم کرنے کا حکم دیا۔ اس زمانے میں امام زہریؒ نے، امام سہیل کے مطابق پہلی، مغازی پر پہلی مفصل کتاب تخلیق کی ان کے بعد محمد بن اسحاق، یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح، عبدالرحمن بن عبد العزیز وغیرہ نے فن مغازی میں منفرد مقام حاصل کیا۔ یہ افراد صاحب المغازی کے نام سے مشہور ہیں۔ محمد بن اسحاق "امام فن مغازی" کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔

مغازی نمازیوں کے اوصاف کے بیان میں بھی آتا ہے۔ دیکھئے: "غازی"

مغلظات۔ گالی۔ فحش بات۔ بات جس میں غیر اخلاقی عنصر پایا جاتا ہو، اسلام میں لائق سزا ہے اور گناہ کے درجے میں جانا جاتا ہے۔ ابوحنیفہؒ کے مطابق اس کی انتہائی سزا ۳۹ کوڑے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گالیاں دینے والوں کے منہ میں بعد موت کیڑے پڑیں گے۔

مغلیہ خاندان۔ خاندانِ مغلیہ میں امیر تیمور کی اولاد کابل، سمرقند اور ترکستان کے علاقوں پر حکمران تھی۔ لودھی خاندان کی حکومت کے خاتمے سے ان کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ ابراہیم لودھی نے کابل جا کر ظہیر الدین بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس لیے بابر کو ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا بانی کہا جاتا ہے۔ مغلیہ خاندان کے حکمرانوں میں بابر کے بعد ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر زیادہ مشہور رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں مغلیہ خاندان کو زوال آیا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیے اور مغلیہ خاندان دہلی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ بہادر شاہ ظفر اس خاندان کی آخری نشانی تھا۔

ہمایوں کے دورِ حکومت کے شروع ایام میں ہندوستان سے کچھ عرصہ کے لیے مغل خاندان کی حکومت کا سلسلہ شیر شاہ سوری نے منقطع کر دیا اور ہمایوں ایران بھاگ گیا۔ وہاں سے فوج لے کر دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اور مغلیہ خاندان کی حکومت کو بحال کیا۔

(ہندوستان میں مغلیہ خاندان اور مغل خاندان کے مؤسس تیمور کے حالات اس سے پہلے آچکے ہیں۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے حالات میں خاندانِ مغلیہ کے زوال کا ذکر بھی آچکا ہے)۔

مزید دیکھئے: بابر، تیمور اور بہادر شاہ ظفر کے حالات ہیں۔ اس کے علاوہ اکبر، اورنگ زیب، جہانگیر، شاہجہان اور ہمایوں بھی دیکھئے۔

مغفرت۔ عربی لفظ بمعنی بخشش، نجات، رہائی، چھٹکارا، درگزر، عفو۔ اس کے حصول کی کوشش کو استغفار کہتے ہیں۔ سورہ احزاب، عقد اور فاطر میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ مغفرت مانگنے کے لیے گناہوں پر پشیمانی پر قرآن مجید میں توبہ کا لفظ آیا ہے۔ ایک سورہ کا نام بھی اس کی اصطلاح پر رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے کہ وہ کسی شخص کی توبہ کسی بھی وقت قبول کر کے اسے مغفرت دے سکتا ہے۔ یہ اسی کی

دین ہے۔ اس کے لیے توبہ پر خلوص ہونا چاہیئے۔ بار بار توبہ و استغفار کرکے پھرنے والے کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ اے فرزندِ آدم، جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امید خبر رکھے گا، میں تیرے گناہوں کی پوشش کرتا رہوں گا خواہ وہ کوئی سا گناہ بھی ہو۔ اے بنیٔ آدم خواہ تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک ہی کیوں نہ پہنچ جائیں۔ مغفرت کے بنے ہیں اللہ ان لوگوں کو بھی قبول نہیں کرتا، جو بڑے پرہیزگار ہوں اگر وہ نہی عن المنکر میں خلل پیدا کرتا ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اسرائیل میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک تو بڑا عبادت گزار اور دوسرا گناہ گار۔ پہلا ہمیشہ دوسرے کو عبادت کی طرف کھینچا کرتا اور کہتا باز آجا۔ اس نے گناہوں میں مبتلا دیکھ کر پھر کہا کہ باز آجا۔ اس نے کہا کہ میرے معاملے کو رب کے سپرد رہنے دو، تم مجھ پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ وہ بولا کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ تیری مغفرت نہیں کرے گا۔ یا یوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کی روح قبض کی اور جب دونوں رب العالمین کے سامنے حاضر ہوئے تو عابد سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ جو کچھ میرے قبضے کی بات ہے کیا تو اس پر قدرت رکھتا ہے؟ اور پھر گناہگار سے کہا۔ تو جا اور میری رحمت کے صدقے جنت میں داخل ہو جا۔ اور پھر عابد کے لیے فرمایا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ۔ اس کے بعد ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ بخدا اس نے زبان سے ایسا لفظ نکالا جس نے اس کی دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد کر دیں۔ نیز دیکھیے "نجات"۔

مغفور القادری، سیّد۔ (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء — ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء)

ضلع رحیم یار خان کے مردم خیز قصبے گڑھی اختیار خان میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی سید سردار احمدؒ پورے علاقے میں اپنے علم و تقویٰ کی بنا پر احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ مولانا مفتی محمد حیات، مولانا عبدالکریم ہزاروی، اور مرجع الفقہا مفتی سراج احمد سے مختلف دینی علوم کی تکمیل کی، ۲۲ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو کر حافظ محمد عبداللہ بھرچونڈوی سے بیعت ہوئے۔ مرشد نے طریقت و سلوک کی راہیں طے کرائیں۔ اور انہی کے حکم پر بھرچونڈی کے دارالعلوم میں مسندِ درس و افتا سنبھالی۔

سندھ اور پنجاب کے تشنگان علوم نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

تحریک پاکستان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ پیر عبدالرحمن سجادہ نشین بھرچونڈی شریف کی معیت میں جماعت "احیاء اسلام" قائم کی جس نے سندھ میں کانگرس کا طلسم توڑ دیا۔ اس جماعت کا مسلم لیگ میں ادغام ہوا تو شاہ مغفور القادری نے معاہدے پر دستخط کیے۔ ۱۹۴۶ء میں بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ عشق مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے معمور رہا۔

آپ ایک صاحب تقویٰ شیخ طریقت، سحر بیان خطیب اور متبحر عالم کے علاوہ سرائیکی اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی یادگار ہیں:

۱۔ عباد الرحمٰن (تذکرہ مشائخ بھرچونڈی) مطبوعہ۔
۲۔ الرسولؐ (مقام و منصب رسالت کی عالمانہ تشریح)
۳۔ کلام مغفور (اردو، فارسی، سرائیکی)۔

آپ کے مریدین اور شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔

۵ صفر المظفر ۱۳۹۰ھ/ ۱۲ اپریل ۱۹۷۰ء کو خان پور ضلع رحیم یار خان میں وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادے سید محمدؐ فاروق القادری ایم اے (جو خود ایک صاحب طرز ادیب ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں) سجادہ نشین بنے۔

مغیرہ بن سعید عجلی۔ (وفات ۱۱۹ھ)

فرقہ مغیریہ کا بانی۔ اس فرقہ کو روافض میں انتہائی مانا جاتا ہے۔

مغیرہ، خالد بن عبداللہ قسری والی کوفہ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ مغیرہ نے امام محمد باقرؒ کی وفات کے بعد پہلے امامت کا اور پھر نبوت کا دعوےٰ کیا۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ وہ اسم اعظم جانتا ہے اور اس کی مدد سے مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں قوم عاد، ثمود کے عہد کے لوگوں کو زندہ کرنا چاہوں تو کرسکتا ہوں۔ یہ شخص قبرستان میں جاکر بعض ساحرانہ کلمات پڑھتا تھا تو ٹڈیوں کی شکل کے چھوٹے چھوٹے جانور قبروں پر اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ مغیرہ، حضرت علیؓ اور ان کی رفاقت اختیار کرنے والوں کے علاوہ باقی سب صحابہ کرامؓ کی تکفیر کرتا تھا۔

مغیرہ کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ کے بعد امامت جناب محمد بن عبداللہ حسنی کو منتقل ہو گئی۔ اس کے لیے وہ نبی کریمؐ کی امام مہدی کی حدیث کو بطور استدلال استعمال کرتا تھا جس میں آپؐ نے فرمایا کہ امام مہدیؑ کا نام اور ان کے والد کا نام میرے اور میرے والد کے نام کے موافق ہوگا۔ یہ وہی محمد بن عبداللہ حسنی ہیں جو نفسِ زکیہ کے نام سے شہرت پائی۔ اور عباسی خلیفہ منصور کے عہدِ حکومت میں خروج کرنے کے بعد منصور کی افواج سے ایک معرکہ میں مارے گئے۔

۱۱۹ھ میں جب خالد بن عبداللہ قسری خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی طرف سے عراق کا امیر مقرر ہوا تو اُس نے مغیرہ اور اس کے پیروکاروں کو گرفتار کرکے آگ میں جلوا دیا۔

مغیرہؓ بن شعبہ۔

مشہور صحابی۔ قبیلہ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر غزوات میں شرکت فرمائی اور صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ بڑے سیاست دان اور دانا بزرگ تھے۔ ایران میں جنگ قادسیہ سے قبل دعوتِ اسلام کے لیے جو لوگ بھیجے گئے تھے آپ انہی لوگوں میں شامل تھے۔ شہر بصرہ آباد ہونے پر وہاں کے پہلے گورنر مقرر ہوئے۔ خوزستان پر حملہ کیا تھا لیکن آسان شرائط پر صلح کرلی۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے ۲۴ھ میں خلیفہ ہوتے ہی انہیں ہمدان کی فتح کے لیے روانہ کیا اور چند ہی روز میں انہوں نے اس علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ امیر معاویہؓ کے دستِ راست اور مشیرِ خاص بنے۔ کوفہ جیسے شہر کے والی مقرر ہوئے جہاں انھوں نے تمام لوگوں کو امیر معاویہؓ کی موافقت پر آمادہ کیا اور پھر اس علاقے میں بہت اثر و رسوخ حاصل کرلیا۔ انہوں نے ہی امیر معاویہؓ کو یزید کی جانشینی کا مشورہ دیا اور اس کے واسطے عملی کوشش بھی کی۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت میں ہی انتقال ہوا۔

مغیریہ (۹۷ھ)

بنان بن سمعان تمیمی کے قتل کے بعد فرقہ بنانہ کے مشہور عالم مغیرہ بن عجلی نے امامت کا دعوےٰ کر دیا اور بنانیہ کے بیشتر لوگوں میں کو اپنے ساتھ ملا کر خروج و بغاوت کا فیصلہ کیا۔ مگر خروج سے قبل اس نے محسوس کیا کہ بنانیہ کے لوگوں میں اس کی امامت پر مکمل اتفاق نہیں چنانچہ اس نے اپنے متبعین کا اجتماع کیا اور نئے عقائد کی بنیاد رکھی نئے عقائد کی وجہ سے لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس نے علمائے وقت امام جعفر صادقؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے مناظرے کیے۔ جب اس کے عقائد مقبولِ عام ہوئے تو اس نے خروج کیا اور گورنر عراق خالد قسری کے محل پر

حملہ کر دیا۔ خالد کئی روز تک محصور رہا۔ لیکن بعد میں کمک آنے پر مغیرہ کو جنگ میں شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے ماننے والوں نے مغیرہ کے قتل کا انکار کر دیا اور کہا کہ وہ آسمان پر زندہ اٹھا لیا گیا ہے۔ دوبارہ دنیا میں آئے گا۔

مغیرہ کے عقائد یہ ہیں :-

اللہ تعالےٰ انسانی جسم و قامت رکھتا ہے۔

حضرت علیؓ آدمؑ سے پہلے دنیا میں موجود ہیں۔

حضرت علیؓ کی سفارش پر حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک کو نبوتیں عطا ہوئیں۔

حضرت محمد الرسول اللہؐ چونکہ آخری نبی تھے۔ ان کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہے لہٰذا خدا نے حضرت علیؓ کو دنیا میں بھیجا کہ وہ نبوت کے باقی فرائض بطور امام انجام دیں۔

حضرت علیؓ اور حسینؓ کے بعد ان کا صحیح اتباع کرنے والوں کو امامت کا اعزاز حاصل ہوگا اور اس میں کسی خاص خاندان کو ترجیح نہیں ہوگی۔

چنانچہ اس فرقہ کے لوگ خراسان، مازندران وغیرہ میں اب تک موجود ہیں۔

مفتاح الجنّت ۔ "جنت کی چابی"۔ ایک اصطلاح جو حضور پاکؐ نے نماز کے لیے استعمال کی۔ یہ اصطلاح اسلام میں نماز کی قدر و مقام کی غماز ہے۔ نیز دیکھیے : "نماز"

مفتی ۔ شریعت اسلام میں وہ عالم جو کسی پیچیدہ مسئلے یا متنازعہ امر پر شریعت کی روشنی میں فتوےٰ دے۔ مفتی صرف حکم بیان کرتا ہے۔ قاضی کی طرح فیصلے کا نافذ کرنا ان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے علیحدہ علیحدہ مفتی ہیں۔ جن کے بتائے ہوئے احکام ان کی جماعت کے نزدیک واجب العمل ہوتے ہیں۔

مفتی احمد یار خان (۱۹۰۶ء - ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء) آپ اوجھیانی (ضلع بدایوں) میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اپنے والد مولانا محمد خان اور مولانا قدیر بخش (مدرسہ شمس العلوم بدایوں) سے حاصل کی۔ بریلی بھی گئے۔ اور مولانا احمد رضا خان بریلوی سے اکتساب فیض کیا۔ کچھ عرصہ مدرسہ اسلامیہ منظر حق علی گڑھ میں بھی تعلیم حاصل کی۔ پھر مراد آباد چلے گئے۔ جہاں مدرسہ نعیمیہ میں داخلہ لیا۔ حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے جوہر قابل کو پہچان لیا۔ اور خود تعلیم دینے لگے۔ بیس سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل پر جامعہ نعیمیہ ہی میں مدرس کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ تدریسی فرائض کے علاوہ فتوےٰ بھی جاری کرتے تھے۔ تین سال تک کچھوچھہ شریف میں بھی قیام رہا۔ مولانا سید ابوالبرکات کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے۔ دو بارہ تیرہ سال دارالعلوم خدام الصوفیہ اور دس برس انجمن خدام الرسول میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے لیے بھی کام کیا۔ تفسیر نعیمی۔ نعیم الباری فی انشراح البخاری، مراۃ شرح مشکوٰۃ اردو (آٹھ جلدیں)، نور العرفان فی حاشیہ قرآن، جاء الحق (دو جلدیں)، علم المیراث، شان حبیب الرحمٰن من آیات القرآن، اسلامی زندگی، دیوان وغیرہ مفتی صاحب کی مشہور تصانیف ہیں۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو وصال فرمایا۔

مفتی اعجاز ولی (۱۹۱۴ء - ۱۹۷۳ء) عالم دین۔ بریلی میں پیدا ہوئے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی اور حافظ عبد الکریم قادری بریلوی سے قرآن پاک پڑھا۔ درسی کتب مولانا نقدس علی خان، مولانا مختار احمد سلطان پوری اور مولانا محمد حسین رضا سے پڑھیں اور تفسیر جلالین مولانا سردار علی خان سے پڑھی۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا مصطفےٰ رضا بریلوی سے سند حدیث حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے مولانا محمد امجد علی اعظمی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسب فیض کیا۔ اور اعلیٰحضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بریلی، پانی پت، جامعہ محمدیہ جھنگ اور جامعہ نعیمیہ لاہور میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو انھوں نے اس کی حمایت میں دارالافتاء رضویہ بریلی سے فتویٰ جاری کیا۔ تحریک ختم نبوت (۱۹۵۳ء) میں بھی حصہ لیا اور قید ہوئے۔ جمعیت علماء پاکستان صوبہ پنجاب کے صدر بھی رہے ۱۹۷۱ء متعدد دینی مدارس قائم کیے۔ لاہور میں وصال ہوا وہیں دفن ہوئے۔

مفتی محمود (جنوری ۱۹۱۹ء - ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء) عالم دین، فقیہ، مفتی، سیاسی رہنما۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک گاؤں پنیالہ میں ایک معزز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم پنیالہ کے گورنمنٹ مڈل سکول سے حاصل کی۔ اپنے بہنوئی مولوی شیر محمد قندھاری اور مولوی غلام رسول سے شرح جامی، ہدایہ اولین، حسامی اور مسلم العلوم تک کتابیں پڑھیں۔ کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ چھ سال مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں [illegible] مراد آباد سے واپسی پر مدرسہ معین الاسلام [illegible]

کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد مدرسہ قاسم العلوم ملتان سے وابستہ [illegible] صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ [illegible] عثمانی کی دعوت پر جمعیت علمائے اسلام میں شامل ہوئے [illegible]

مفتی محمود [illegible]

[illegible] نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر [illegible] مفتی محمود صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے۔ [illegible] مفتی صاحب نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۷۷ء [illegible] قومی اتحاد کے صدر منتخب ہوئے [illegible] حزب اختلاف کے [illegible] حیثیت [illegible] اسمبلی سے باہر کامیاب سیاسی سرگرمیوں [illegible] میں دو حلقوں سے منتخب ہوئے [illegible] صوبائی اسمبلی کا بائیکاٹ کیا اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف [illegible]

چلائی۔ جس کے نتیجے میں ملک میں جنرل محمد ضیاءالحق نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ مفتی محمود نے مارشل لا سے تعاون کیا۔

مفتی محمود کی دینی خدمات بھی بہت ہیں۔ سیرت و کردار میں تقویٰ اور سادگی ان کا وصف خاص ہے۔ شیخ الحدیث مدرسہ قاسم العلوم ملتان کی حیثیت سے انھوں نے کئی بار ملک گیر دورے کئے۔ بیرونی ممالک میں بھی کئی مرتبہ سفر اختیار کیا۔ عمر کے آخری حصے میں کئی عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ بالآخر ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو فوت ہوئے۔

مفضلیہ (۰۰ھ)۔ اس فرقہ کے بانی کا نام مفضل تھا۔ یہ بھی شیعوں کا ایک گروہ ہے۔ اس کی ابتدا کسی سیاسی گروہ بندی سے نہیں بلکہ محض حضرت علیؓ سے غلو کی حد تک محبت کی وجہ سے ہوئی۔ عراق اور ایران میں اب بھی اس گروہ کے لوگ کثیر تعداد میں موجود ہیں جو اپنی تبلیغ جاری رکھتے ہیں۔

اس فرقہ کے علماء نے عیسائیوں کے لٹریچر اور یونانی فلسفہ سے زیادہ استفادہ کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات عیسائیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ خدا کو انسانی جسم و قالب میں سمجھتے ہیں اور خدائی اولاد کا تصور بھی رکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں نبوت و امامت دونوں ہمت کی حامل ہیں۔ ان کے عقائد یہ ہیں:۔

حضرت علیؓ اللہ تعالےٰ کے فرزند ہیں۔

خدا نے ابی طالب کے جسم میں حلول کیا تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت علیؓ کا درجہ برابر ہے۔

علیؓ فرزند خدا ہونے کی وجہ سے آنحضرتؐ سے بلند مقام کے حامل ہیں۔

آنحضرتؐ کو نبوت ملنے کی وجہ سے جو درجہ ملا وہ حضرت علیؓ کا رہین منت ہے۔

محمدؐ کی پیدائش محض علیؓ کی وجہ سے ہوئی۔

قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالےٰ کے بارے میں آیات ہیں کہ اس کی کوئی اولاد نہیں وہ آیات آنحضرتؐ نے شامل کی ہیں۔ وہ وحی الٰہی کا حصہ نہیں۔

سورۃ اخلاص قرآن مجید کا جزو نہیں ہے۔

(ماخوذ تاریخ و طمین مصر۔ تحفہ اثنا عشریہ)

مقام۔ عربی لفظ ہے۔ اللہ کے نزدیک بندے کا مقام۔ مُقام میم کی پیش کے ساتھ قائم ہونے اور قائم ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں اور مَقام میم کے زبر کے قیام کرنے یا کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ لیکن تصوف میں مقام میم کی زبر کے ساتھ بندۂ خدا کے منزل بہ منزل قیام کرنے، اس کے حق کو ادا کرنے اور اس کی رعایت ملحوظ رکھنے کو کہتے ہیں۔ اس کے لیے نیت صاف ہونا چاہیئے۔ تصوف کے مقامات میں سب سے پہلا مقام توبہ ہے۔ بعض کی رائے میں پہلا مقام انتباہ ہے۔ پھر بالترتیب انابت، زہد، توکل اور ایسے ہی دوسرے مقامات۔

پہلی منزل سے گزرے بغیر کوئی بندۂ خدا دوسری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی سچی توبہ کے بغیر دعوئے انابت درست نہ ہوگا۔ قرآن میں ہے، وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔ (اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے معین ایک مقام ہوتا ہے)۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کا مقام توبہ تھا، حضرت موسیٰؑ کا انابت۔ حضرت نوحؑ کا زہد، حضرت ابراہیمؑ کا تسلیم، حضرت داؤدؑ کا غم، حضرت عیسیٰؑ کا امید، حضرت یحییٰؑ کا خوف اور نبی کریمؐ کا ذکر۔

مقامِ ابراہیم۔ حرم شریف مکہ مکرمہ میں کعبہ کے مطاف کے کچھ باہر ایک جنگلے میں محفوظ ایک پتھر ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ اس وقت یہ پتھر نرم تھا اور اس پر حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان پڑ گئے۔ اس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے کہ جب تم طواف سے فارغ ہو جاؤ تو مقام ابراہیمؑ پر اللہ کو یاد کرو۔ اس حکم کو پورا کرنے کے لیے عمرہ یا حج کے لیے جانے والے زائرین طواف کعبہ کے بعد یہاں دو نفل ادا کرتے ہیں۔ پہلے یہ دیوار کعبہ کے ساتھ باب کعبہ کے رُخ پر نصب تھا لیکن مطاف کی جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے نوافل کی ادائیگی میں دقت پیش آتی تھی تو اس پتھر کو اٹھا کر مطاف سے ذرا ہٹ کر نصب کر دیا گیا۔

مقاماتِ حریری۔ عربی نثر کی کتاب۔ مقامات بدیع الزمان الہمدانی، مقامات حریری کے تالیف کے لیے نمونہ ثابت ہوئے۔ حریری بصرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے مقامات مسجع اور مقفیٰ نثر کی ایک بے نظیر تصنیف ہے اور علمی زبان کا ایک نادر نمونہ پیش کرتی ہے۔ مقامات حریری کا عربی نثر میں سات سو سال تک جواب نہیں بن سکا۔ مسجع اور مقفیٰ عبارت کے علاوہ مقامات کی کہانیاں بھی معنی خیز ہیں اور اس زمانے کے تمدن اور اخلاق پر پُر زور تبصرہ ہیں۔ ابتدائی ہسپانوی اور اطالوی حکایات، عرب کے ان مقامات سے علمی اور ادبی حیثیت میں بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ الحریری کا زمانہ ۱۰۵۴ء سے ۱۱۲۲ء تک کا ہے۔ جب کہ بدیع الزمان الہمدانی کی ولادت ۹۶۹ء اور وفات ۱۰۰۸ء کی ہے۔

مقامِ محمود۔ جنت میں ایک مقدس مقام۔ کہا جاتا ہے کہ حضور پاکؐ یوم الحشر یہاں امت کے لیے شفاعت کے لیے کھڑے ہوں گے۔ اس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں یوں آیا ہے: ".... امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود (بڑی تقویت کے مقام) پر کھڑا کرے گا۔" (آیت ۷۹)۔

مقتدر باللہ۔ دورِ حکومت ۲۹۵ھ سے ۳۲۰ھ تک رہا۔

جعفر نام۔ ابوالفضل کنیت تھی۔ رمضان ۲۸۲ھ میں ایک کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اگرچہ مکتفی خود اسے اپنا ولی عہد مقرر کر گیا تھا لیکن وہ ابھی تیرہ سال کا تھا۔ اس لیے اکثر امرائے حکومت اس کی بیعت پر رضامند نہ تھے مگر عباس بن حسن وزیر سلطنت نے اپنے مفاد کی خاطر مکتفی کی حسب وصیت بیعت کی رسم ادا کر دی اور ذی قعدہ ۲۹۵ھ میں وہ سریر آرائے خلافت ہوا۔

بیعت کے بعد بھی اکثر امرائے حکومت نے مخالفت ترک نہ کی اور مقتدر کو معزول کر کے عبداللہ کو تختِ خلافت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بعد میں مقتدر ہی کو خلیفہ مان لیا گیا تھا۔

صفر ۳۲۰ھ میں مونس نے موصل پر قبضہ کر لیا اور چند روز کے بعد بغداد پر حملہ کرنے کی غرض سے فوجوں کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ ادھر مقتدر نے بھی لشکر روانہ کیا اور باب شماسیہ پر طرفین میں جنگ شروع ہو گئی۔ مقتدر کو شکست ہوئی اور واپس چلا۔ راستے میں بربریوں کے دستہ فوج نے اسے گھیر لیا اور ایک بربری نے اس کا سر قلم کر دیا۔ ان لوگوں نے مقتدر کے کپڑے اتار کر برہنہ لاش وہیں چھوڑ دی۔ اور سر کو نیزے پر رکھ کر مونس کے پاس لے گئے۔

مقتفی لامر اللہ

مقتفی لامر اللہ - محمد نام۔ ابوعبداللہ کنیت تھی۔ ۱۲ ربیع الاول ۴۸۹ھ میں ایک حبشی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۲۲ ذی الحجہ ۵۳۰ھ کو عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ دورِ حکومت ۵۳۰ھ سے ۵۵۵ھ تک رہا۔ خلیفہ کے تخت نشین ہوتے ہی حرب و ضرب کا ہنگامہ گرم ہوگیا۔ کئی سلطانوں نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔

۲ ربیع الاول ۵۵۵ھ کو مقتفی نے ۶۶ سال کی عمر میں ۲۴ سال ۳ ماہ خلافت کرنے کے بعد انتقال کیا۔

مقتدی بامر اللہ

مقتدی بامر اللہ - عبداللہ نام، ابوالقاسم کنیت تھی۔ ارغوان نامی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور شعبان ۴۶۷ھ میں ۱۹ سال ۳ ماہ کی عمر میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ دورِ حکومت ۴۶۷ھ سے ۴۸۷ھ تک رہا۔ اس کا دورِ حکومت انتشار کا شکار رہا۔

۵ محرم ۴۸۷ھ کو ایک کنیز شمس النہار نے اسے زہر دے دیا۔ انتقال کے بعد فوراً ہی اس کے بیٹے مستظہر باللہ کی بیعت لی گئی اور تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی گئی۔ مقتدی نے انیس سال آٹھ مہینے خلافت کی اور ۳۹ سال کی عمر پائی۔

مقدمۃ الجیش

مقدمۃ الجیش - فوج کے آگے آگے چلنے والا حفاظتی دستہ، جو راہ کی مشکلات، دشمن کے محاذوں اور دوسری باتوں سے باخبر رہتا ہے۔ یہ دستہ انہی معلومات کے لیے فوج کی رہنمائی کرتا ہے۔

مقدمۃ الجیش کا دستور و طریق ماضی قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اس ہراول دستے کا وجود ضروری ہے۔ اس کی معمولی سی کوتاہی فوج کو خطرات سے دوچار کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس فوج کے عقب میں بھی ایسا ہی ایک حفاظتی دستہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں (Rear guard) اور عربی میں " " کہتے ہیں۔

مقریزی، علامہ

مُقریزی، علامہ - (۱۳۶۴ء / ۱۴۴۲ء) مشہور اسلامی مؤرخ۔ بعلبک کی ایک بستی "المقارزہ" میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بڑا حصہ مصر کے شہر قاہرہ میں گزارا جہاں وظائف کے محکمہ پہ مامور رہے۔ چند برس مکہ معظمہ میں بھی رہے۔ "الخطط المقریزیہ" آپ کی اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب مصر کے حالات و واقعات اور اس کی مدنی تاریخ کی عکاسی کرتی ہے۔

مقطعات

مقطعات - قرآنی حروف جو بظاہر بے معنی نظر آتے ہیں مگر انسان کی عقلِ محدود ان کی عمیق گہرائی تک نہ پہنچ سکی ہے اور نہ پہنچ سکے گی۔ یہ حروف اپنے اندر رمز و معنی سموئے ہوئے ہیں اور لاتعداد مقامات پہ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ بعض سورتوں اور پاروں کے نام بھی انہی پہ مشتمل ہیں۔

ان کے معنی پہ اسلامی مفکرین میں شدید اختلاف ہے۔ کسی کی رائے میں صرف خالقِ کائنات ہی جانتا ہے۔ ایک دوسری رائے میں رسولِ خدا بھی ان کے معنوں سے بے خبر تھے۔ اور تیسری رائے کی رُو سے رسولِ خدا نے یہ معنی اپنے ان صحابہ کرامؓ کو بتائے بھی تھے، جن میں انھیں سمجھنے کی بصیرت تھی۔ اس طرح علمِ تصوف کی طرح اس کے حقیقی معنی بھی بنی نوعِ آدم سے مخفی رہے۔ اس لیے ان کی تعبیر بطرزِ اجمالی سے ہی کی جا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ جو الفاظ یکساں یا ہم معنی الفاظ سے مل کر بنتے ہیں، وہ قریب قریب ہم معنی ہوتے ہیں۔ مثلاً "ن" اور "ف" یکجا آئیں، ان کے معنی میں خروج کا مفہوم ہوتا ہے، جیسے نفر، نفث، نفث، نفع وغیرہ۔

اسی طرح قرآن پاک میں مختلف مقامات پہ جو حروفِ مقطعات آئے ہیں وہ تعداد میں ۱۴ ہیں۔ ان کے نام یوں ہیں۔ ا، ل، م، ص، ر، ک، ہ، ی، ع، ط، س، ح، ق، ن۔ قرآن مجید میں یہ اپنے طور پہ بھی اور ان کی صورت میں باہم مل کر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً الٓمٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ، الٓمٓصٓ وغیرہ۔ ان حروف میں کل ۷۰ ہزار، ۱۷ کروڑ، ۸۲ لاکھ ۹۱ ہزار اور دو سو عبارتیں بنتی ہیں۔ جن میں صرف ایک کا مفہوم عقلِ آدم کی زد میں آتا ہے۔ باقیوں کے بھید و اسرار سے خدائے واحد ہی واقف ہے۔ لیکن انسان ان کی مختلف توضیحات بھی بیان کرتا ہے۔

قرآنِ کریم میں ۲۹ سورتوں کی ابتدا انہی حروفِ مقطعات سے ہوتی ہے یہ الفاظ کے قائم مقام ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک مقام پہ ان کے جو معنی آئے ہیں دوسرے مقام پر بھی وہی ہوں تاہم ان کے مجموعے کے معنی ہر مقام پہ ایک ہی رہتے ہیں۔ یعنی "ن" کے معنی ہر مقام پہ مختلف ہو سکتے ہیں۔ مگر جب یہ دوسرے حروفِ مقطعات سے مل کر ایک مجموعہ تشکیل دیتا ہے تو اس کے معنی ہر مقام پہ یکساں رہتے ہیں مثلاً الٓمٓ، جو سورۂ بقرہ کے علاوہ بھی پانچ سورتوں کی ابتدا میں آیا ہے۔ ان کے معنی ہر مقام پہ ایک ہی ہیں۔ ابنِ عباس سے اس کے معنی "انا اللہ اعلم" (میں اللہ بہت جاننے والا ہوں) مروی ہیں۔

مقلدین

مقلدین - مسلمانوں کا وہ گروہ جو سمجھتا ہے کہ چاروں اماموں کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور اس کے بعد جو علما بھی ہوں ان کے لیے ان چاروں [illegible] امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنا واجب ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے بعد یہ خیال اس وجہ سے زیادہ [illegible] ہر شخص کافی علم و دانش کے بغیر اپنی رائے فقہ میں داخل کرنے لگا۔ [illegible] پھیلنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے یہ لوگ ائمہ فقہ کی رائے کو حرفِ آخر [illegible] حرتِ ان آئمہ اربعہ کے اجتہاد کو اسلامی فقہ میں بڑی اہمیت [illegible] میں دوسرا گروہ غیر مقلدین کا ہے جو ائمہ اربعہ کی فقہ اور اجتہاد کو تسلیم نہیں [illegible] راست احادیث سے مسائل کا استنباط کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

مقنع خراسانی

مقنع خراسانی - مہدی کے زمانے میں ایک شخص [illegible] کے فساد برپا کیا۔ بقول اس کے "خدا کبھی کبھی انسانوں کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے آدمؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں میں خدا بحیثیت نور موجود تھا۔ آخری زمانے میں [illegible] ابومسلم بن کرمانی خود اس میں جلوہ گر ہوا۔" یہ بڑا بدصورت شخص تھا، جسے پوشیدہ رکھنے کے لیے سنہری نقاب چہرے پہ ڈالے رکھتا تھا۔ اس لیے مقنع یعنی نقاب پوش کہلانے لگا۔ چونکہ خراسان کا رہنے والا تھا، وہیں اس نے ہزاروں سادہ لوحوں کو بہکا کر گمراہ کیا اور شورشیں برپا کیں اس لیے مقنع خراسانی کہلانے لگا۔ خراسان کے علاوہ شام، عراق اور ایران وغیرہ بھی فساد کی لپیٹ میں آئے مگر مہدی نے کمال ہوشیاری سے سب کچھ کچل کر رکھ دیا۔ (نیز دیکھئے۔ مہدی بن منصور)

مقوقس

مقوقس - مصر کا رومی وائسرائے۔ "المقوقس" اس کا سرکاری لقب تھا۔ ۷ھ / ۶۲۸ء میں محسنِ انسانیتؐ نے اس عیسائی بادشاہ کو پیغام اسلام بھیجا۔ بادشاہ نے قاصد کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اسلام سے [illegible]

ہوا۔ اسی وقت اس نے ایک جوابی خط بھی آپ کی خدمت میں گزارا جو آج بھی مسجدوں میں لٹکا نظر آتا ہے۔ اس نے آپؐ کی نبوت کی گواہی دی۔ پوشاک، دو غلامائیں، سواری کے لیے ایک خچر اور درہم بھیجے۔ خود بوجوہ عیسائی پادریوں کے دباؤ کے، اسلام قبول نہ کرسکا۔

مکتب ۔ درس گاہ۔ مدرسہ، سکول۔ جمع مکاتب۔

وہ جگہ جہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ زمانہ قدیم میں عام طور پر مسجدوں سے درسگاہ کا کام لیا جاتا ہے۔ یہاں بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ جن میں قرآن پاک حفظ کرنا، تلاوت کرنا، اور دوسری نوشت وخواندگی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسجد کا خطیب جو اذانِ حق دیتا تھا۔ وہی درس و تدریس کا کام بھی کیا کرتا تھا جس کی مدد بچوں کے والدین حسبِ توفیق روپیہ، پیسہ، کپڑا اور ایسی ہی دوسری اشیا دیے کیا کرتے تھے اکثر حالتوں میں معلم گھر یا مسجد میں درس دیتا، مگر اس کا کام صلہ (اجر) نہیں لینا تھا۔ کیونکہ یہ فریضہ سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کی رو سے مذہبی بھی ہے۔ صاحب ثروت اپنے اور محلے بھر کے بچوں کو پڑھوانے کے لیے کسی مدرس کو مقرر کر لیا کرتے تھے۔ تقسیم ہند سے قبل وہاں مکتب کا رواج تھا مگر انگریزی تعلیم دینے کی غرض سے فرنگیوں نے سکول کالج کھولنے کے بعد ان کے خاتمے پر زور دیا۔

تدریس کے یہ ابتدائی مراکز آج بھی مختلف اسلامی ممالک میں قائم ہیں۔

مکتفی باللہ ۔ عباسی دور کا ۱۷واں خلیفہ۔ نام علی۔ ابو محمد کنیت اور مکتفی باللہ لقب تھا۔ تاریخ میں لقب ہی یاد کیا جاتا ہے۔ ۲۶۲ یا ۲۶۳ میں ایک ترکی کنیز جیجک کے بطن سے پیدا ہوا۔ جمادی الاول ۲۸۹ھ میں معتضد کی وفات کے بعد وزیر سلطنت ابو الحسن نے حلف لیا۔ یہ اس وقت رقہ میں تھا جہاں سے خلافت کے لیے بلوایا گیا۔ بغداد واپسی پر لوگوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے بھی رعایا کو خوش کیا اور بہت سی مسجدیں تعمیر کرائیں۔ انطاکیہ سمیت کئی فتوحات اس کے عہد میں ہوئیں۔

ان دنوں شام میں فرقہ قرامطہ نے جو شورش کھڑی کر رکھی تھی۔ اس کے خاتمے کے لیے ۲۹۰ھ میں یہ خود رقہ گیا اور محمد بن سلیمان کی نگرانی میں قرامطہ فرقہ کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کی۔ اس گروہ کا سردار ذکرویہ گرفتار ہو کر مکتفی کے ہاتھوں تہ تیغ ہوا۔ ۲۹۵ھ میں ذی قعدہ کی ۲۲ تاریخ کو اس نے ترکِ دنیائے فانی کی۔ رسم تدفین امیر محمد بن طاہر کے مکان پر ہوئی۔

اس کا عہد ساڑھے چھ سال رہا۔ وفات سے قبل اس نے اپنے تیرہ سالہ بھائی جعفر کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ جسے کم عمری کے باوجود وزیر سلطنت عباس بن حسن کی کوششوں نے وصیت کے مطابق خلیفہ بنا دیا۔

مکتوباتِ امام ربانیؒ ۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات کا مجموعہ جو تصوف میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت مجدد کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے ملکوں میں پھیل گئیں۔ یہ مکتوبات حضرت کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے۔

مکتوبات کی تین جلدیں ہیں۔ دفتر اول جسے دُرّ المعرفت بھی کہتے ہیں ۳۱۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ اسے خواجہ یار محمد جشتی نے ترتیب دیا۔ یہ سب سے مفصل مجموعہ ہے۔ اس میں کئی سالوں کے خطوط جمع ہیں۔ پہلے بیس خطوط وہ ہیں جو حضرت مجدد نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ پھر متعدد خطوط شیخ فرید اور دوسرے امرائے جہانگیری کے نام ہیں کہ وہ ترویج دین کی کوششیں کرتے رہیں۔ باقی خطوط میں سوالوں کے جوابات ہیں یا علمی اور مذہبی مسائل کی توضیح ہے۔ مکتوب بازدہم پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات جلد کے آخری خطوط میں ہیں۔ چالیس صفحے کا خط اپنے مرشد زادوں کے نام ہے جس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد بیان کیے ہیں۔

دفتر دوم ۔ جس کا تاریخی نام دُرّ الخلائق ہے۔ ۱۰۱۹ھ میں خواجہ عبدالحیٔ نے خواجہ محمد معصوم کے ایما پر مرتب کیا۔ اس میں ننانوے خطوط ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض بڑے طویل اور مفصل ہیں۔ بیس صفحے کا ایک خط جو خواجہ محمد تقی کے نام ہے جس میں اہل سنت اور شیعوں کے عقائد پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ اور اپنے ذاتی نقطۂ نظر کی توضیح کی گئی ہے۔ پندرہ صفحے کے ایک اور خط میں اسلامی عقائد کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ خط خان جہان کے نام ہے۔ چند خطوط اپنے مرشد زادوں سے متعلق ہیں۔ باقی خطوط میں بیشتر مسائل صوفیہ کی توضیح ہے۔

دفتر سوم کا نام معرفت الحقائق ہے۔ جسے خواجہ محمد ہاشم نے ۱۰۳۱ھ میں یعنی حضرت مجدد کی وفات سے ۳ سال قبل ترتیب دیا۔ پہلے اس میں ۱۱۵ خطوط تھے۔ آخری ۹ خط بعد میں اضافہ کیے گئے۔ اس مجموعہ کے بہت سے خطوط اس وقت لکھے گئے جب حضرت مجدد قلعہ گوالیار میں محبوس تھے۔ کئی خطوط اپنے مرشد زادوں کے نام ہیں۔ ایک خط میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو حضرت مجدد نے ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ کی مجلس میں کی تھی۔ ایک خط جہانگیر کے نام ہے جس میں دعائے اسرار اور علمائے صلحی کی تعریف کی گئی ہے۔ ایک نہایت دلچسپ خط ۴۱ ایک صالحہ عورت کے نام ہے جس میں ان شرطوں کا بیان ہے جن پر عورتوں کی بیعت ہونی چاہیے اس میں ان تمام بدعتوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جن میں ہندوستانی عورتیں مبتلا تھیں۔

مکاتیب میں مضامین کا تنوع اور صاحب مکتوبات کی علمیت اور روحانی فضیلت نمایاں ہے۔ اس میں حضرت کے طرز تحریر کو بڑا دخل ہے۔ بیشتر علمی اور دینی مسائل کی توضیح کے لیے نہایت آسان زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان مکاتیب میں حضرت کثرت سے ارباب تصوف کی مروجہ اصطلاحیں استعمال کرتے تھے۔

مکاتیب امام ربانی کا ایک اہم جزو معاصرانہ امراء کے نام ہے جس میں انھیں شریعت کے نفاذ اور احیاء کی تلقین کی گئی۔ حضرت اپنے مکاتیب میں خطیبانہ انداز بھی اختیار کرتے تھے اور مناسب مواقع پر دلچسپ شعر یا مصرعہ بھی درج کر دیتے۔

مکران ۔ پاکستان کا مشہور شہر اور بلوچستان کا ساحلی علاقہ۔

۲۹ھ میں جب بصرہ کے گورنر عبداللہ بن عامر نے فارس کے مشہور شہر اصطخر اور پھر خراسان اور جیحون کو فتح کیا تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے مکران بھی اس کے تصرف میں چلا گیا۔ اس کی فتح کا سہرا محمد بن قاسم کے سر رہا۔ آب وہوا اور دوسری جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے مکران کے باشندے دوسرے ملکی باشندوں سے شکل وشباہت اور جسامت میں بالکل منفرد ہیں۔

مکروہ ۔ کراہت کیا گیا۔ گھناؤنا، نفرت انگیز۔ ایک اصطلاح جو مذہبی، سماجی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ افعال جو اگرچہ قابلِ سزا نہیں مگر قابلِ نفرت ضرور ہیں۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غیر قانونی بھی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں مختلف آراء ہمارے سامنے آتی ہیں۔ امام محمد کا کہنا ہے کہ مکروہ غیر شرعی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کی رائے میں یہ غیر شرعی افعال کے قریب پہنچتی ہے۔

مکروہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ "مکروہ تحریمی" اور "مکروہ تنزیہی"۔ ابتدائی قسم تقریباً غیر شرعی ہے اور مؤخر الذکر شرعی۔ اسلامی ماہرین مکروہ اور غیر مکروہ چیزوں اور افعال پر تحقیق کر رہے ہیں۔

مکس:۔ کسٹم ڈیوٹی، اسے مکس بھی کہتے ہیں۔ مشہور مورخ بیکر نے ملک کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لفظ عربی میں زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔ اور پہلی صدی ہجری کے آخر سے اور مصر میں مکس کے آثار ملتے ہیں۔ پرانی قانونی کتابوں نے مکس کو عشر کے طور پر استعمال کیا ہے، جو آمدنی کے دسویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اسلام میں کسٹم ڈیوٹی کی وصولی کے ادارے اُموی کے عہد میں، یا اس سے کچھ قبل قائم ہو گئے تھے۔ مصر، شام، وغیرہ کے کسٹم کے لئے الگ الگ علاقے تھے۔ اسلام میں مکس کسی شے کے مالک کی انفرادی پوزیشن کا بالکل خیال نہیں کرتا تھا۔ صرف اشیاء کی قدر کو ماپتے ہوئے لاگو کیا جاتا تھا۔

مکّہ مکرّمہ ۔ دنیا کا مقدس ترین اور قدیم ترین شہر۔ مسلمانوں کو اس شہر سے ایک خصوصی وابستگی ہے۔ یہاں بیت اللہ (خانہ کعبہ) ہے جہاں ہر سال لاکھوں مسلمان اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن حج کی ادائیگی کے لیے جاتے ہیں۔ اسی مقدس شہر میں ختم الرسل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔

اس وقت اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔ یہ شہر سعودی عرب کی مشہور بندرگاہ جدہ سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کے مشرق میں طائف، مغرب میں جدہ، شمال کی طرف مدینہ منورہ اور جنوب کی طرف عسیر اور اس سے ذرا آگے یمن ہے۔

قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بیت اللہ کی عمارت اس مقام پر سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کی۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں خانہ کعبہ رحمت خدا کی تعمیر ہوتی رہی۔ آبادی کے آثار کا حضرت ابراہیم کے زمانہ سے پتہ چلتا ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم پر اپنی زوجہ محترمہ ہاجرہ اور شیر خوار بچے اسمٰعیلؑ کو چھوڑ گئے۔ بنو جرہم انہی دنوں یہاں آکر آباد ہوا۔ اسی طرح یہاں آبادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسمٰعیلؑ کے شعور سنبھالنے کے بعد مشہور عالم قربانی کا واقعہ بھی مکہ کے نواح میں بعض روایات کے مطابق منیٰ کے مقام پر ہوا۔ جب حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالےٰ کے حکم پر اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بیت اللہ کو بھی اللہ کے حکم کے مطابق اپنے بیٹے اسمٰعیل کے ہمراہ تعمیر کیا۔ بنو اسمٰعیل کا خاندان بیت اللہ کا متولی رہا۔ اور دین ابراہیمی کے پیروکار مختلف مقامات سے زیارت خانہ کعبہ کے لیے مکہ آتے تھے۔ اس لیے نبی کریمؐ کی بعثت تک تقریباً اڑھائی ہزار سال کا عرصہ مکہ مکرمہ کو خانہ کعبہ کی وجہ سے عزت و تکریم کا مرتبہ حاصل رہا۔ بنی اسرائیل میں تمام آنے والے انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں بیت اللہ کے حج کے لیے آتے رہے۔

قریش خاندان جو بنی اسماعیل میں سے ہے کو خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے نبیؐ کی ولادت سے بہت طویل زمانہ قبل جزیرۃ العرب کے علاقوں میں کافی عزت حاصل تھی۔

پھر اس شہر کی قسمت کو نبی کریمؐ کی ولادت اور بعثت نے چار چاند لگا دیے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے اس آخری نبی پر جو کلام اتارا۔ اس میں بھی اس شہر کا ذکر مختلف انداز سے کئی مقامات پر آیا ہے۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے فہر بن مالک نے قریش کا لقب اختیار کر کے خاندانِ قریش کی بنیاد ڈالی۔ کچھ مدت تک یمن سے آئے ہوئے قبیلہ بنو خزاعہ نے مکہ پر اقتدار و تسلط قائم کر لیا۔ لیکن قریش کے ایک باہمت سردار قصی بن کلاب نے بنو خزاعہ کو مکے سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی قبیلہ قریش کے خاندان بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ رسول اللہؐ کی ولادت سے کچھ عرصہ پیشتر ۵۷۰ء میں یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا۔ اس کے پاس جنگی ہاتھی بھی تھے۔ مگر قرآن کے مطابق ابابیلوں نے کنکریاں مار مار کر ابرہہ کی فوج کو ہلاک کر دیا۔ مغربی مستشرقین کا کہنا ہے کہ ابرہہ کی فوج میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ جس سے اس کی فوج بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ خانہ کعبہ کے باعث زمانۂ قدیم سے مکہ کی عظمت عربوں میں مسلّم تھی۔ یہ لوگ بت پرست تھے۔ خانہ کعبہ میں بت رکھے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی اس مقدس مقام کا بہت احترام تھا۔ یہاں خونریزی اور دنگا فساد کی ممانعت تھی۔ لوگ اس وقت بھی ہر سال حج کے لیے آتے تھے۔ مکہ کا پرانا نام بکہ تھا۔ قرآن میں یہی نام آیا ہے۔ ۶۲۹ء تک یہ شہر کفر و بت پرستی کا مرکز رہا۔ ۸ھ/ ۶۳۰ء میں مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کر کے بتوں سے پاک کر دیا۔

وسط شہر کو بطحا کہتے ہیں۔ اس کو ام القریٰ بھی کہتے ہیں۔ رسول اللہؐ یہیں پیدا ہوئے۔ اور چالیس سال انہی لوگوں میں بسر کی۔ اور بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ ہی میں رہے۔ مگر قریش مکہ آپؐ کے دشمن ہو گئے کہ آپ بتوں کی پرستش کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کی تلقین کیوں کرتے ہیں؟ آخر آپ ۶۲۲ء میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

۶۲۸ء میں حدیبیہ کے مقام پر قریش اور مسلمانوں کے مابین جو سمجھوتہ ہوا اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائل عرب جس سے چاہیں دوستی کا رشتہ استوار کریں۔ اس طرح بنو خزاعہ مسلمانوں کے اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔ ان کا آپس میں قدیم تنازعہ چلا آتا تھا۔ بنو بکر نے قریش کی شہ پر بنو خزاعہ پر حملہ کر کے ان کو حرم کعبہ میں ہلاک کر دیا۔

رسول اللہؐ کو جب ان واقعات کا علم ہوا چونکہ قریش نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی لہذا آپ دس ہزار مسلمانوں کا لشکر لے کر مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے۔ مکہ سے ایک منزل کی مسافت پر آپ نے قیام فرمایا۔ قریش کو پتہ چلا تو سردار ابوسفیان تحقیقات کے لیے بھیجا مگر وہ گرفتار کر لیے گئے۔ اور رسول اللہ کے سامنے پیش ہوئے۔ لیکن حضرت عباسؓ کی سفارش پر ان کو معاف کر دیا گیا۔ اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ۲۰ رمضان مبارک ۸ھ / ۶۳۰ء کو لشکر اسلام فاتحانہ مکہ میں داخل ہوا۔ اور بغیر کسی خونریزی کے مسلمانوں نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ فتح مکہ تاریخ عالم میں اس حیثیت سے بہت ممتاز ہے کہ فتح مکہ کے بعد ان سب مکہ والوں کو جنہوں نے مسلمانوں کو اذیتیں دی تھیں، رسول اللہؐ نے معاف کر دیا۔ یزید اول کے عہد میں جب عبد اللہ ابن زبیرؓ نے مکہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا تو اموی افواج نے شہر کا محاصرہ کر لیا، اور جنگ کے دوران میں کعبہ کو آگ لگ گئی۔ آخر حجاج بن یوسف نے بغاوت کو سختی سے کچل دیا اور کعبہ کی از سر نو تعمیر کی۔

عباسیوں کے دور زوال میں مکہ میں حکومت اموی کا خاتمہ ہوا۔ ... نے شہر والوں پر بڑے مظالم ڈھائے اور جب مصر ... خاندان کو عروج ہوا تو مکہ میں سادیوں کا زور بڑھ گیا۔ چنانچہ ۹۶۰ء میں جعفر ... مکہ کا حاکم (شریف) بن گیا۔ مگر موسوی خاندان کے شریف کبھی بغداد کی ... کا دم بھرتے کبھی صلاح الدین ایوبی اور اس کے جانشینوں کا اور کبھی مصر ... کا۔ البتہ زوال بغداد کے بعد ۱۲۵۸ء سے ۱۵۱۷ء تک مکہ مصر کے ماتحت رہا۔ اور جب ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم نے مصر کو فتح کر لیا تو مکہ عثمانی ترکوں کے ماتحت ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء تک ترکوں کے ماتحت رہا۔ مکہ کا آخری شریف حسین ۱۹۰۸ء میں مقرر ہوا۔ مگر پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کے اشارے پر اس نے ۱۹۱۶ء میں اپنے

آپ کو حجاز کا آزاد بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اسی زمانے میں عرب میں محمد بن عبد الوہاب کی تحریک کو فروغ ہوا۔ اور ۱۹۲۴ء میں سلطان ابن سعود نے مکہ فتح کر لیا۔ شریف حسین قبرس بھاگ گیا۔

مُلّا ۔ عالم و فاضل ۔ مسجد میں نماز پڑھانے والا، بچوں کو دینی تعلیم سکھانے والا۔ جمع مُلّایاں۔

مذہب اسلام میں ایک طبقہ، ابتدا میں اسلام میں ایسا کوئی گروہ نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس طبقہ نے وجود حاصل کیا۔ آج تقریباً ہر ملک میں موجود ہیں۔ کہیں کم طاقتور اور کہیں زیادہ۔ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں یہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ ہر فرقے نے خلیفہ کو اپنے زیر اثر لانا چاہا، جس سے مذہب اور سلطنت میں تفرقہ پھیلا۔ یہ طبقہ مذہبی اور علمی مسائل سے واقفیت رکھتا ہے اور جب انسان بدی کی طرف بڑھنے لگے تو یہی انہیں سنبھالنے والوں میں بھی شامل ہوتا ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی ۔ (وفات ۱۵۱۵ء)

انوار سہیلی اور اخلاق محسنی کا مصنف۔

اوائل عمر ہی میں واعظ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ معلم اخلاق ہونے کے باعث آخری تیموری بادشاہ سلطان حسین مرزا کے دربار میں بڑی وقعت حاصل ہوئی۔ سلطان کا وزیر میر علی شیر نوائی بہت قدر کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہرات کا واعظ مقرر کیا۔ وہیں وفات پائی۔ "اخلاق محسنی" (۹۰۷ھ) علم اخلاق کے مسائل سے متعلق ہے۔ اس سے پیشتر اخلاقیات کے موضوع پر دو اور کتابیں اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی موجود تھیں۔ ان کی زبان مشکل اور انشاء عالمانہ ہے۔ مولانا حسین واعظ نے وہی اخلاقی مسائل سادہ، شستہ اور عام فہم زبان میں ادا کیے۔ ایک دیباچہ اور چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ انوار سہیلی کی اصل کلیلہ و دمنہ ہے۔ ان دو کے علاوہ آٹھ کتابیں لکھیں جن میں جواہر التفسیر (تفسیر القرآن) روضہ، استبدار اور لب لباب (مثنوی مولانا روم کا خلاصہ) شامل ہیں۔

ملاحیہ (۲۲۰ھ) ۔ تیسری صدی ہجری میں ابن الراوندی معتزلہ کا مشہور امام اور صاحب تصنیف گزرا ہے۔ حکمائے اسلام نے اسے ابو العلا المعری کا پیرو اور متبع لکھا ہے۔ ابن الراوندی نے جن عقائد و نظریات کا پرچار کیا ہے ان میں بعض ایسے ہیں جن کی وجہ سے ان دونوں کو زنادقہ میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کے مقابلہ میں اپنی ایک کتاب مقدس لکھی جس میں انبیاء کرام کے قصائد کی تردید کی۔ ابن الراوندی نے اپنی کتاب "الدامغ" میں لکھا کہ انبیاء لوگوں کو شعبدے دکھا کر دھوکہ دیا کرتے تھے۔ (نعوذ باللہ) اس کتاب میں یہاں تک لکھا گیا ہے کہ "خدا کے پاس جب قتل و غارت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تو اسے رسول اور کتابیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی اس شخص نے نظریات کو پھیلایا وہ مختصراً یوں ہیں:۔

خدا عالم الغیب نہیں۔

انبیاء کے واقعات عقلی اعتبار سے غلط ہیں۔

قرآن الہامی کتاب نہیں۔

دنیا میں چاند ستارے وغیرہ جو کچھ نظر آتے ہیں وہ سب قدیم ہیں اور ان کا پیدا کرنے والا خدا نہیں بلکہ یہ خدا کے تصور سے بھی قدیم ہیں۔

جنت اور دوزخ محض مذاق ہے۔

مُلّا علی قاری ۔ (وفات ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۶-۱۶۰۵ء)

برعظیم پاک و ہند کے نامور محدث اور فقیہہ۔ جن کی کتب درس نظامیہ میں شامل ہیں۔ حنفی مسلک کے متبحر علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

برعظیم کے ایک اور ممتاز محدث میر کلاں اکبر آبادی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ ہرات میں پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ علمائے وقت سے حاصل کرنے کے بعد مکہ معظمہ گئے اور وہاں ہی مستقل اختیار کیا۔ وہاں کے علماء ابو الحسن بکری، سید ذکریا حسینی، شیخ عبد اللہ مکی اور قطب الدین مکی سے مزید تحصیل علم کیا۔

آپ سنت نبی کے اتباع کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس لیے کئی کتابیں تصنیف کیں:۔

(۱) تفسیر قرآن مجید۔ (۲) نور القاری شرح صحیح البخاری۔ (۳) شرح صحیح المسلم۔ (۴) شرح فقہ اکبر۔ (۵) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ۔ (۶) شرح الشمائل۔ (۷) شرح النخبہ۔ (۸) شرح الشاطبیہ۔ (۹) شرح الجزریہ۔ (۱۰) ناموس مختص قاموس۔ (۱۱) الثمار الجنیبہ فی اسمار الحنفیہ۔ (۱۲) شرح ثلاثیات بخاری۔ (۱۳) نزہۃ الخاطر الفاطر فی ترجمہ شیخ عبد القادر۔ (۱۴) شرح الشفاء۔ (۱۵) شرح عقائد نسفی۔ (۱۶) شرح قصیدہ امالی۔ (۱۷) شرح قصیدہ بردہ۔ (۱۸) شرح شفائے قاضی عیاض۔ (۱۹) شرح جامع الصغیر۔ (۲۰) شرح اربعین نووی۔ (۲۱) شرح حصن حصین۔ (۲۲) شرح موطا امام محمد۔ (۲۳) شرح الوتر الجزریۃ۔ (۲۴) سند الانام فی شرح سند الانام۔ (۲۵) شرح مناسک الحج۔ (۲۶) شرح الشرح علی نخبۃ الفکر۔ (۲۷) احادیث۔ (۲۸) حاشیہ تفسیر جلالین۔ (۲۹) حاشیہ مواہب لدنیہ۔ (۳۰) شرح عین العلم۔ (۳۱) تذکرۃ الموضوعات فی الاحادیث۔ ان کے علاوہ بیسیوں مزید رسائل و کتب مختلف عنوانات پر لکھے۔

ملامت ۔ لغظ و اصطلاح بمعنی دھتکار، فضیحت، لعن طعن، برا بھلا، ڈانٹ ڈپٹ۔ ایک زمانہ میں آپ صادق و امین اور نیک نام تھے۔ مگر جونہی اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو نبوت دی۔ کفار نے آپؐ کو شاعر، دیوانہ، جھوٹا اور ایسے ہی دوسرے الفاظ بد سے پکارا۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر یوں آیا ہے: "اور وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔" یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے۔ ملامت بھی رحمت ہے تاکہ فرد اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر تکبر نہ کریں۔ غرور نہ کرے۔ اس لیے ان پر ایسی خلقت نازل کی گئی ہے جو ملامت کرتی تھی تاکہ وہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھیں۔ نفس لوامہ کی بھی یہی حقیقت ہے۔ یہ ضمیر کی وہ قوت ہے جو غیر شرعی اور ناجائز فعل پر ملامت کرتا ہے۔ انسان اسی کی بدولت "مزید اچھا" بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی غلطی کرتا ہے تو نفس لوامہ ملامت کرتا ہے۔ یہ تفریق و مدح کا الٹ ہے۔ یہ چیزیں عزور پیدا کرتی ہیں۔ اسلامی فقہ میں اسباب ملامت یہی ہوسکتے ہیں۔

راست روی:

دین حق کی پاسداری پر گمراہوں کی جانب سے ملامت۔

خلاف ورزی کا ارادہ:

جب کوئی اعلیٰ رتبہ پر پہنچنے کے بعد احکام شرعی کی جانب رغبت کرے اور ایسا کام کرے جو شریعت کے خلاف تو نہ ہو مگر لوگ اسے پسند نہ کریں اور اس پر ملامت کا راستہ اختیار کریں۔

ترکِ شریعت :
اس پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ کفر و ضلالت کی راہ پسند آ جائے اور اسی کی خاطر وہ شریعت اور اس کی تابعت ترک کر دے اور سمجھے کہ یہ تو ملامت کا ایک طریقہ ہے جس کو میں نے اختیار کیا ہے اور یہ بھی اس کی طرف سے اپنے حق میں ملامت کا طریق ہے۔ مگر اس کے الٹ جو نیک روی اختیار کرتا ہے وہ کسی کی کسی قسم کی ملامت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مخلوقِ خدا کے نزدیک ملامت دوستانِ حق کی علامت ہے۔ اس میں قربِ حق کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ جس طرح عام لوگ اپنی مقبولیت پر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے سچے بندے رد ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔

ملائیشیا ۔ اس کی آبادی سوا کروڑ کے قریب ہے۔ آبادی میں سے ۵۱ فیصد مسلمان ہیں۔ رقبہ ۱۲۸۴۳۰ مربع میل ہے۔ کوالالمپور دارالحکومت ہے جس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ سرکاری زبان انگریزی ہے۔ ملائی اور چینی مقامی زبانیں ہیں۔ خاص برآمدات میں ربڑ، ٹین، لوہا، بکسائیٹ شامل ہیں۔

وفاق ملائیشیا کا علاقہ ہلالی شکل میں آبنائے ملاکا سے بحیرہ سولو تک پھیلا ہوا ہے اس میں ملایا کی ۱۱ ریاستوں (۱۔ فرلیس۔ ۲۔ قیدح۔ ۳۔ پٹیاگ۔ ۴۔ پیرک۔ ۵۔ سلاغور۔ ۶۔ ملاکا۔ ۷۔ نیگری سمبیلن۔ ۸۔ کلنتن۔ ۹۔ ترغانو۔ ۱۰۔ انحی ٹنگ۔ ۱۱۔ جوہر) کے علاوہ سراواک اور سابہ کے علاقے بھی شامل ہیں۔ جو جزیرہ بورنیو میں واقع ہیں۔

ملائیشیا اپنی ٹین اور ربڑ کی دولت کے لیے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کی کانوں سے ہر سال تقریباً پندرہ لاکھ ٹن ٹین جو دنیا کی کل پیداوار کا ایک تہائی ہے۔ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لوہا اور بکسائیٹ بھی کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

ملائیشیا کو زمانہ قدیم ہی سے مختلف تہذیبوں اور قوموں کا سنگم بننے کا موقع ملا ہے۔ بحیرہ عرب اور بحیرہ چین کے درمیان جتنی بھی تجارت ہوتی رہی ہے۔ وہ سب آبنائے ملاکا کے ہی راستے ہوتی رہی ہے اور ملاکا کا شہر ایک ایسا دروازہ بن گیا جس کے ذریعے عرب فارس، ہند، سماٹرا، فلپائن اور چین کی تہذیبی اور ثقافتی اثرات اندرون ملک پھیلتے گئے۔ اسی بندرگاہ سے ہو کر ۱۲۹۲ء میں پہلے یورپی سیاح مارکوپولو کی بادبانی کشتی گزری۔ اسی شہر میں ۱۵۱۱ء میں پرتگالی فتنہ باز البوقرق ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں بائبل لے کر اترا تھا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ۱۶۴۱ء میں ولندیزیوں نے پرتگالیوں کو ہٹا کر اپنے ڈیرے جمائے تھے اور یہاں سے ہی انگریزوں نے اپنے تسلط کا آغاز کیا جو تقریباً سو سال کے بعد "مردیکا ملایا" کے انقلاب آفرین نعروں میں ختم ہوا۔

ملائیشیا تیرہ ریاستوں پر مشتمل ایک ایسا آئینی وفاق ہے، جس کا سربراہ آئینی شہنشاہ کہلاتا ہے۔ اس وفاق میں شامل تیرہ ریاستوں میں سے ۹ تو چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ہیں جن کا ایک الگ سلطان ہوتا ہے اور باقی چار ریاستیں پنانگ، ملاکا، سابہ اور سراواک ہیں جن کے حاکم گورنر کہلاتا ہے۔ فیڈریشن کے آئینی شہنشاہ کا انتخاب ۹ چھوٹی سلطنتوں کے سلطانوں میں سے پانچ سال کے عرصہ کے لیے کیا جاتا ہے۔

یومِ وفاقِ ملائیشیا ۱۶ ستمبر ۱۹۶۳ء سے ہر سال منایا جاتا ہے۔

ملّت ۔ ایک نظریہ پر جمع ہونے والی افراد کو ملّت کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ جگہ جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ ملّت ابراہیمی کا ذکر ہے۔ اسی طرح بت پرستوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی ملّت کا بھی ذکر موجود ہے۔ جو قوم پیغمبر کی پیروی کرتی یا جس شریعت پر چلتی ہے اسی کے نام سے منسوب ہوتی ہے مسلمان اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ یا ملّت محمدی کہتے ہیں۔ دین، مذہب اور ملّت عموماً ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ دین کا تعلق خدا سے ہے۔ ملّت کا پیغمبر سے اور مذہب کا اس مجتہد سے جس کے اجتہاد پر کوئی جماعت عمل کرتی ہے۔ مثلاً چاروں ائمہ فقہ۔ اُردو زبان میں مذہب اور دین ہم معنی سمجھے جاتے ہیں اور ملّت سے مطلب مسلمانوں کی قوم ہے جو ملک، معاشرہ اور معاشرہ وغیرہ سے بالاتر ہو کر ایک خدائے واحد کی پرستار اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت گزار ہے۔

ملتان ۔ پاکستان کا ایک قدیم شہر جو دریائے چناب کے کنارے آباد ہے۔ اس کے مشرق میں ضلع ساہیوال، شمال میں ضلع جھنگ اور مغرب میں ضلع مظفر گڑھ ہے۔ زراعت، قالین سازی، ریشم، چمڑے، ظروف سازی اور روئی کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔

البیرونی کتاب الہند میں لکھتے ہیں کہ اس کا قدیم اور اصل نام کشپ پورہ تھا۔ چونکہ یہ شہر بار بار اجڑتا رہا ہے اس لیے اس کا نام کبھی ہنس پورہ، بھاگپور، سنب پور، مولستھان پور، پربلاپور، مولتارن وغیرہ پڑتے رہے۔

توطلمی جو ۱۵۰ء میں سکندریہ کا مشہور جغرافیہ دان ہو گزرا ہے اپنے نقشے میں اس کا نام "کسپیریا" بتاتا ہے۔ جبکہ ہرینانہ [illegible] کا قول ہے کہ انہوں نے اس کا نام "ملی تھان" سنا ہے۔ ممکن ہے انہی میں سے کوئی نام بگڑ کر ملتان ہو گیا ہو۔

ضلع ملتان کا رقبہ ۵۷۱۹ مربع میل ہے۔ یہاں کی گرمی اور گرد و غبار تو دور دور تک مشہور ہے مگر راتیں عموماً ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

۳۲۵ ق م میں سکندر اعظم نے یہاں ملوئی قوم کو تباہ و برباد کیا۔ ۴۷۰ء سے ۵۰۰ء تک وائٹ ہنز برسرِ اقتدار رہے۔ ۵۴۴ء میں مہاراجہ ہرشا جیت نے اس قوم سے چھین لیا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں راجہ سہبی رائے کی حکومت تھی۔ ۶۳۱ء میں برہمن چچ نامی نے قبضہ کر لیا۔

بعد کے حکمرانوں میں محمد بن قاسم، ناصحی اور میتی، خاندان غلامان، سادات، لنگاہ و مغلیہ خاندان، درانی، درا سکھ اور انگریزوں کے نام آتے ہیں۔ خلافتِ منصور (۷۵۴ - ۷۷۴ء) اور خلافت معتصم باللہ کے زمانے میں ملتان پر کئی حملے ہوئے۔

دسویں صدی عیسوی میں یہاں لودھی خاندان برسرِ اقتدار تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں فرقہ اسمٰعیلیہ بہت طاقتور ہوا۔ اور اس کے اہم [illegible] عبداللہ قرامطی مختلف مقامات کو فتح کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ لودھی خاندان نے بھی ان کے مذہب کی اطاعت قبول کی۔ ان کی لوٹ مار نے [illegible] شہر کو طوائف الملوکی کا شکار کر دیا۔ جس کے اثرات صدیوں باقی رہے۔

لودھی خاندان کے پہلے حاکم کے ہی دور میں جنرل [illegible] صوبہ پر بار بار حملہ آور ہوتا اور ہزار ہا قیدی بطور غلام لے جاتا۔ بعد میں ۹۷۲ء [illegible] کے انتقال کے بعد سبکتگین کے بادشاہ بننے کے بعد حامد لودھی نے اس سے صلح کر لی۔ ۹۸۰ء میں اسے فرقہ قرامطی کے سردار جلیم بن شیبان نے فتح کیا۔

۱۰۴۲ء میں اقتدار محمود غزنوی کے ہاتھوں میں چلا گیا اور اس کا نو سدان مقرر ہوا۔

۱۲۰۶ - ۱۵۲۸ء میں یہ مغلوں کے شدید حملوں کا سامنا کرتا رہا۔ اس دوران میں یہاں کوئی مستقل نظامِ حکومت قائم نہ ہو سکا۔ البتہ چیدہ چیدہ سرداروں نے

خود مختار حکومتیں قائم کی تھیں۔

۱۵۲۸ء میں ظہیر الدین بابر نے میدانِ پانی پت میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر یہاں ایک مضبوط حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ ترقی و امن و امان کا یہ دور ۱۷۷۰ء تک قائم رہا۔ اس دوران صوبے کی زراعت، تجارت اور دوسرے کاروبار کو فروغ حاصل ہوا۔

۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۹ء تک یہاں بھنگی سکھوں کے ظلم و تشدد کا دور دورہ رہا۔ ان کے سردار جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ تھے۔ لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ شجاع نے افواجِ بہاولپور کی مدد سے اسے فتح کر لیا۔ ۱۷۷۶ء میں وفات کے بعد اس کی جگہ مظفر خان نے لے لی۔

۱۷۷۹ء تا ۱۸۱۸ء یہاں مظفر خان سدوزئی حکمران رہا۔

آزادی کے بعد یہ شہر پاکستان کا اہم ضلع بنا۔ جس میں بڑے بڑے مرشد تھے، جن میں زکریا ملتانیؒ، پیر بسانؒ، شیخ صدر الدین عارفؒ، شاہ گردیز ملتانیؒ، خلاربؒ ولیدؒ وغیرہ شامل ہیں، شمعِ اسلام روشن کی۔

قدرتی طور پر یہ ضلع تین بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔ دریائی علاقہ کو "مہٹھار" مرتفع بنجر علاقوں کو "راوہ" اور ان دونوں کے درمیانی حصے کو "اتار" کہتے ہیں۔ ضلعے کا تمام رقبہ ایک نشیب کی صورت میں ہے جو شمال مشرق سے جنوب مشرق کی جانب جاتا ہے۔ ایک اور نشیب شمال مغرب کی جانب سے جنوب مشرق کی طرف ہے۔ یہ دریا کے بہاؤ میں تبدیلیوں کا غماز ہے۔

مَلَک ۔ فرشتہ، بندگی، تابعداری، سردار، کسی چیز کا مالک ہونا، اختیار رکھنا۔ عربی میں جن الفاظ میں یہ تین حروف م ل ک پائے جائیں اس میں قوت، زور اور قبضہ کے معنی بھی ملحوظ ہوتے ہیں۔ آسمانی ملائک میں روحانی قوت ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ عرش علیٰ پر روحانی سردار ہیں۔ زمینی ملائکوں کے قبضہ میں مادی قوتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ زمینی سردار کہلاتے ہیں۔ سرداروں کے علاوہ یا شاہ وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن حکیم سورۂ بقرہ کے رکوع ۳۲ میں یہ بادشاہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مفسرین کے خیال میں یہ نمرود کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ قرآن حکیم میں بارہ مقام پر آیا ہے۔ وہاں اس کا مفہوم فرشتہ ہے۔ مثلاً سورہ انعام ۵۰، ۹، ۸۔ سورۂ ہود ۱۲، ۳۱ وغیرہ میں۔ خدا کے لیے ملک العرش اور مالک الملک بھی استعمال میں آتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران اور بقرہ میں خدائے واحد کے لیے ایسے ہی الفاظ آئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں یوں ارشاد ہے: "کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور تمہارے اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں نہ ہی مددگار ہے۔" (آیت ۱۰۷)

ملک شاہ ۔ خاندانِ سلجوق کا سب سے مشہور فرمانروا۔ ابوالفتح جلال الدین ملک شاہ کا دورِ حکومت ۱۰۷۲ء سے ۱۰۹۲ء تک رہا۔ سلطان الپ ارسلان کی اچانک ہلاکت پر سترہ سال کی عمر میں ایران کے تخت پر بیٹھا اور باپ کے دانا وزیر نظام الملک کے تعاون سے تخت کے متعدد دعویداروں کو راہ سے ہٹایا۔ داخلی جھگڑوں سے فارغ ہو کر غرب کا رخ کیا اور شام و مصر کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پھر مشرق کی طرف متوجہ ہوا۔ اور بخارا اور سمرقند پر قبضہ کر لیا اور امیر کاشغر کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ علم و ادب کا بڑا قدردان تھا۔ نیشاپور میں ایک رصدگاہ بنوائی جس میں حکیم عمر خیام اور دوسرے ماہرین علم نجوم ملازم رکھے۔ سن جلالی کی ابتدا اسی کے عہد سے ہوئی۔ پولو اور شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا اور عمارتیں بنوانے اور باغ لگوانے میں اپنی محبوب ملکہ ترکان خاتون کی بڑی ہمت افزائی کرتا تھا، چنانچہ اصفہان کی متعدد پرانی عمارتیں اسی سلطان کی خوش مزاجی سے منسوب ہیں۔ اس کا زمانہ خاندان کا سنہری زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔

ملک کافور ۔ گجرات کا ایک ہندو تھا۔ گرفتار ہو کر دہلی لایا گیا اور مسلمان ہو کر ملک کافور کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۳۰۷ء میں علاؤ الدین میں خلجی نے اسے دکن کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ اس نے پہلے مہاراشٹر کو اور پھر دیوگری کو دوبارہ فتح کیا۔ اس کے بعد وارنگل کو فتح کیا۔ اور بڑھتے بڑھتے میسور کی حد تک جا پہنچا۔ جنوبی ہند سے ملک کافور بے شمار دولت اور تحائف بادشاہ کے لیے لایا۔ ملک کافور کی واپسی پر دکن میں پھر بغاوتیں ہو گئیں لہٰذا اسے پھر دکن جانا پڑا۔ اس نے دیوگری اور وارنگل کے علاقوں کو فتح کر کے ان کے راجاؤں سے خراج وصول کیا۔

علاؤ الدین کے آخری وقت میں ملک کافور کی نیت بدل گئی۔ بادشاہ بننے کی ہوس میں بادشاہ کو زہر دے دیا۔ بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کے چھوٹے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا اور خود اس کا اتالیق و سرپرست بن بیٹھا۔ دونوں بڑے شہزادوں خضر خان اور شادی خان کی آنکھیں نکلوا دیں۔ تیسرے شہزادے مبارک کی جان لینے کی فکر میں تھا کہ امرا اس کی چال سمجھ گئے۔ آخر کار بادشاہ کے افغان سپاہیوں نے اسے قتل کر دیا۔

ملکوت ۔ فرشتہ، بادشاہی، سلطنت، حکومت، حکمرانی، فرشتوں کا عالم، فرشتوں کے رہنے کا مقام، عالمِ ارواح، اصطلاحِ صوفیا۔

مقام دنیاوی اور فانی اشیاء سے جو حدِ نظر میں ہیں۔ ماورا بلند مقام جو حدِ نظر میں نہیں ہے۔

اصطلاح کے معنی بلحاظ فقرے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی نظر میں یہ عالم ارواح کے معنوں میں آتا ہے ان کی نظر میں یہ جبروت کے نیچے کے عالم تھے۔

ملکیّت ۔ تصرّف، قبضہ، جائداد، زمینداری، مال و اسباب۔ جمع املاک۔ انسان کی جائز محنت مادی شکل میں۔ یہ کئی طرح کی ہوتی ہے۔ ایک قومی ملکیت، جس سے حاصل شدہ سرمایہ کلی طور پر ملک و قوم کا ہوتا ہے۔ دوسری نجی ملکیّت، یہ فرد کے تصرف میں ہوتی ہے اشتراکیّت میں نجی ملکیّت کی اجازت نہیں۔ فرد کا تصرف تمام پیداواری اور ایسی تمام اشیاء پر سے ختم کر دیا گیا ہے جو مزید پیداواری مراحل سے نہیں گزرتی۔ یعنی خام اشیاء انسان کے تصرف میں نہیں رہ سکتیں۔ مگر میز کرسی یا برتن یا ایسی ہی تمام استعمال کی اشیاء نجی ہاتھ میں رہ سکتی ہیں۔

اسلام اس سے مختلف نقطۂ نظر پیش کرتا ہے، اس میں نجی ملکیت کا تصوّر ہے۔ مگر غلاموں کو رکھنے کی اجازت نہیں۔ نجی ملکیت فرد کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ اسلام کے قانونِ وراثت سے بھی نجی ملکیت کے تصوّر کا ثبوت ملتا ہے۔ تاہم مشہور اسلامی مفکر حضرت ابو ذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ قانونِ وراثت کا مطلب ملکیت کی تقریباً نفی ہے کیونکہ اس کی رو سے چند ہی نسلوں میں ملکیت بٹ بٹا کر ختم ہو جائے گی۔ اس سے متعلق احکامِ اسلامی کی روح سرمایہ کو خرچ کرنا، تقسیم کرنا اور پھیلانا ہے۔ سرمائے یا اشیائے قیمتی کا جامد ہو

جانا گناہ کے زمرے میں جاتا ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ توبہ میں واضح ہدایت موجود ہے:

• اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور نہیں خرچ کرتے خود کے رستے میں۔ ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خوش خبری سنا دو، جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں تاپ کر اس سے۔ ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔ اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے جمع کیا۔ اور جو تم جمع کرتے تھے اب (اس کا مزا) چکھو۔"

متعدد سورتوں میں بڑے واضح طور پر کہا گیا ہے کہ سرمایہ وغیرہ اللہ کی دین ہے اور اسی کی راہ میں اس کا خرچ جائز ہے ورنہ اصراف ہوگا جو قابل سزا ہے۔

صاحب ثروت بننے کے لیے، حصول ملکیت کے لیے ناجائز ذرائع کا استعمال بھی قرآنی آیات میں سزاوار ٹھہرایا گیا ہے۔ تاہم بیع، اجارہ اور قرض وغیرہ جائز رکھے ہیں جو ملکیت پہ حاصل ہوتے ہیں۔

ممانیہ

ممانیہ۔ افریقی ریاستوں کے علاوہ سوڈان اور مصر میں بھی فرقہ ممانیہ کے کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔ اس فرقہ کی قدیم تاریخ کا سراغ نہیں مل سکا تاہم اس کی نشاۃ ثانیہ کے قائد اور محرک مشہور مہدی سوڈانی تھے جن کے نام سے آج بھی انگریز کانپتے ہیں۔

اس فرقہ کے لوگ چار بڑے فقہی سلسلوں کو برابر تسلیم کرتے ہیں یعنی شافعی، حنفی، حنبلی، مالکی۔ فقہ کے ماننے والے بھی اس میں شامل ہیں۔ شرعی احکامات کے لیے چاروں سلسلوں سے جواز لیتے ہیں اور چاروں فقہا کو امام برحق تسلیم کرتے ہیں۔ اس فرقہ کی زیادہ شہرت محمد احمد مہدی سوڈانی کی انگریزوں کے خلاف تحریک کے دوران ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک نے اہل سوڈان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

ممتاز علی سید

ممتاز علی سید۔ (۱۸۶۰ء۔ ۱۹۳۵ء)

دیوبند (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب سے حاصل کی۔ انگریزی کچھ سکولوں میں اور کچھ پرائیویٹ پڑھی۔ ۱۸۷۶ء میں لاہور آ گئے ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۱ء تک پنجاب ہائی کورٹ میں مترجم کے طور پہ کام کرتے رہے۔ پھر رفاہ عام پریس قائم کیا اور بلند پایہ کتابیں، بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیں۔ عورتوں کے لیے "تہذیب نسواں" اور بچوں کے لیے "پھول" کے نام سے ہفتہ وار رسالے جاری کیے۔ جو تقسیم سے قبل تک نکلتے چلے رہے۔ گورنمنٹ نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر شمس العلماء کا خطاب دیا۔ ۵ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج انہی کے فرزند ارجمند تھے۔

ممطوریہ

ممطوریہ (۱۸۶ھ)۔ شیعوں کا ایک فرقہ اس نام سے مشہور ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موسیٰ کاظم پر امامت ختم ہے اور وہ زندہ آسمان پہ اٹھا لیے گئے ہیں اور ان امت کے نزدیک امام موسیٰ کاظم ہی دنیا میں دوبارہ آئیں گے۔

اس گروہ نے فرقہ قطعیہ کے علماء سے اس مسئلہ پر کئی بار مناظرے کیے کہ آیا موسیٰ کاظم دنیا میں رسول اللہ کی نسل میں آئیں گے؟

قطعیہ کا یہی عقیدہ ہے۔ قطعیہ نے ممطوریہ کے علماء کو ایک مناظرے میں یہ سخت جملہ کہا کہ تم لوگ ہمارے نزدیک بھیگے ہوئے کتے کی مانند ہو، چونکہ بھیگے ہوئے کتے کو عربی میں "ممطور" کہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ گروہ ممطوریہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ممشاد علو دینوری

ممشاد علو دینوری۔ (وفات ۲۹۹ھ)

سلسلہ عالیہ چشتیہ کے جلیل القدر بزرگ، غوث اور قطب تھے۔ موضع دینور (واقع کرمان شاہ، مغربی کوہستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش بغداد میں ہوئی۔ اصل نام علو اور لقب کریم الدین تھا۔ ممشاد علو دینوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ خواجہ جنید بغدادی کے احباب میں سے تھے۔ خواجہ سری سقطی اور کئی دوسرے بزرگوں سے بھی فیض حاصل کیا۔ ابتدا میں بہت دولت مند تھے۔ جب حُبّ الٰہی کا جذبہ اٹھا تو سب دولت راہِ خدا میں لٹا دی اور مکہ معظمہ میں آ کر عبادتِ الٰہی اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے لگے۔ ارادت سے قبل بیس سال تک اسی طرح عبادت اور مجاہدے کرتے رہے۔ بعد ازاں حضرت ہبیرۃ البصری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ نے آپ کو اپنی بیعت میں لیا۔ اور خلوت میں بٹھا کر آپ کو تعلیم دی۔ آپ بہت کم سوتے تھے۔ لباس بہت بوسیدہ اور پیوند لگا ہوتا تھا۔ ہمیشہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے یا عبادت میں مصروف رہتے۔ بعض اوقات کثرت گریہ کے باعث بے ہوش ہو جاتے۔ آپ کا مشہور قول ہے۔ "ہمت سب کاموں کی پیش رو ہے جس کی ہمت درست ہے اور جو اس میں سچا ہے۔ اس کے باقی اعمال خود بخود درست ہو گئے۔"

مملکت اسلامی

مملکت اسلامی۔ اسلام جغرافیائی حدود، نسلی، لسانی تصورات کی سختی سے نفی کرتا ہے۔ اسلام میں ریاست کی بنیاد ڈالنے کا مقصد اخوت قائم کرنا ہے تاکہ حقوق و فرائض کا ایک سلسلہ چل سکے۔ فرد اپنے نظریات اور انہیں پنپنے کا موقع ملے۔ اس طرح یہاں سیاست کا بنیادی تصور ... قائم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی ریاست کے بہت سے اساسی اصولوں میں بھی اختلاف بھی شدید بہم رہے دور کرنے کے لیے ۱۹۵۳ء میں ... مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور کی تحریک پر مختلف مکتب فکر کے علماء کرام کا ایک جلسہ کراچی میں بلایا گیا۔ اس میں سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی، مولانا احتشام الحق تھانوی، محترم شمس الحق، پیر مانکی شریف، مفتی محمد شریف سمیت ۳۱ عالموں نے اسلامی مملکت کے ۲۲ اساسی اصول بتائے جو یوں ہیں:

۱۔ حاکمیت کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے

۲۔ قانون کا منبع قرآن و سنت ہوگا اور کوئی قانون یا حکم ان کے خلاف نہ بنے گا۔ تاہم اگر پہلے سے ایسا کوئی حکم موجود ہے تو اسے بتدریج اسلامی دائرے میں لانا ہوگا، یا سرے سے منسوخ کرنا ہوگا۔

۳۔ مملکت کا تصور جغرافیائی، نسلی یا لسانی نہیں ہوگا۔

۴۔ اسلامی مملکت کو قرآن و سنت کی بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرنا، منکرات مٹانا، شعائر اسلامی کا احیا، اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔

۵۔ رشتہ اخوت کو فروغ اور عصبیت جاہلہ، علاقائی و دیگر مادی امتیازات کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

۶۔ مملکت امتیاز سے بالاتر رکھتے ہوئے تمام باشندگان کی غذا، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج کی سہولتوں کی ذمہ دار ہوگی۔

۷۔ شہریوں کو شریعت اسلامی کے مقرر کردہ تمام حقوق مثلاً جان و مال کا تحفظ، نقل و حمل، آزادی تقریر و تحریر، اکتساب رزق، ترقی کے مواقع، رفاہی سب حاصل ہوں گے۔

۸ - متذکرہ بالا حقوق میں سے کوئی بلا جواز قانونی تقاضے پورے کیے بغیر سلب نہیں کیا جائے گا۔ صفائی کا موقع دیئے بغیر سزا نہ دی جائے گی، عدالت آزاد ہوگی۔

۹ - اسلامی فرقوں کو قانون کی حدود میں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق ہوگا۔ خیالات کی تشہیر کی آزادی ہوگی۔ ان کے نجی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے، ایسا انتظام مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰ - غیر مسلموں کو قانونی حدود کے اندر مذہبی و ثقافتی اور تعلیمی آزادی ہوگی انہیں اپنے نجی معاملات کا فیصلہ اپنے فقہی مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کروانے کی آزادی ہوگی۔

۱۱ - دفعہ نمبر ۷ کا اطلاق غیر مسلموں پر بھی ہوگا۔ غیر مسلموں سے حدودِ شریعت کے اندر جو معاہدات ہوتے ہیں ان کی پابندی فرض ہے۔

۱۲ - رئیس مملکت مسلمان ہو، جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندگان کو اعتماد ہو۔

۱۳ - رئیس مملکت، نظم مملکت کا ذمہ دار ہوتا ہے، تاہم اگر چاہے تو اپنے اختیارات کا جزو کسی دوسرے فرد یا جماعت کو بھی دے سکتا ہے۔

۱۴ - رئیس مملکت کی حکومت بجائے مستبدانہ کے، شورائی کی ہوگی۔ وہ حکومت اور منتخب نمائندگان سے مشورہ لے کر اپنے فرائض سرانجام دے گا۔

۱۵ - تاہم اسے حق نہ ہوگا کہ وہ دستور کلی یا جزوی طور پر معطل کرکے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶ - جو جماعت سربراہ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہ کثرت رائے سے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی

۱۷ - رئیس مملکت قانونی مواخذہ سے بالا نہ ہوگا اور باعتبار حقوق عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا۔

۱۸ - شہریوں اور حکومت کے لیے قانون ایک ہی ہوگا۔ عام عدالتیں اس قانون کو نافذ کریں گی۔

۱۹ - عدلیہ انتظامیہ سے الگ اور کلی طور پر آزاد ہوگی۔

۲۰ - اسلامی ریاست کے اساسی اصولوں کے خلاف کسی طرزِ فکر کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی۔

۲۱ - مملکت کے مختلف چھوٹے بڑے حصے مملکت واحدہ کے حصے متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جماعت کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی۔ جنہیں، انتظامی اختیار کے پیش نظر سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا ہوگا۔ مگر مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲ - کتاب و سنت کے خلاف دستور کی کوئی تعبیر معتبر نہ ہوگی۔

نیز دیکھیں - "ریاست"۔

مملوک - تیرھویں صدی عیسوی میں ترک غلاموں کا ایک جتھا بطور محافظ فوج کے سلاطین مصر کی ملازمت میں تھا۔ بعد میں یہی لوگ مملوک کہلاتے۔ ہوتے ہوتے ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ ۱۲۵۰ء میں انہوں نے تخت پر قبضہ کرکے خود اپنا بادشاہ مقرر کر دیا۔ چنانچہ یہ مملوک حکمران ۱۵۱۷ء تک مصر پر حکمران رہے۔ جب ترکوں نے مصر پر قبضہ کر لیا تو مملوک حکمران ترکی سلطنت کے ملازم شمار ہونے لگے۔ جب نپولین نے مصر فتح کیا تو یہ لوگ پھر ایک دفعہ اٹھے اور کچھ مدت حکومت کرتے رہے لیکن ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا نے ان سب کو قاہرہ کے قلعے میں بلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مملوک سرداروں کے دو گروہوں میں شدید جھگڑے کی کیفیت تھی۔ ایک لڑائی میں توران شاہ ہلاک ہوا، جو ملک صالح کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد ملک صالح کی بیوہ، جو حقیقتاً شامی کنیز تھی، تخت نشین ہوئی۔ اس کا نام شجرۃ الدر تھا۔ اس سے ایک مملوک سردار معز الدین ایبک نے حکومت چھین لی اور شاہِ مصر بنا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے مملوک حکومت میں آئے۔ سلطان بیبرس، جو ملک الظاہر کے لقب سے مشہور تھا، ان کا ایک اہم حکمران تھا۔ یہ ۱۲۶۰ء سے ۱۲۷۷ء تک حکمران رہا۔ یہ مملوک سلطنت کا بانی کہلاتا ہے جو تقریباً اڑھائی سو برس حاکم رہے۔

انہوں نے نہریں بنوائیں، مدرسے کھولے، مسجدیں تعمیر کیں اور اوقاف قائم کیے۔ ایک شفاخانہ جو مارستان المنصور کہلاتا ہے، قابلِ ذکر ہے۔

مصر پر مملوکوں کے دو گروہوں نے حکومت کی۔ ایک گروہ کوہ قاف اور دشتِ قبچاق سے آیا تھا اور دوسرا بیکال جھیل کے آس پاس کے علاقے سے۔ بیبرس اور سلطان قلاموں کا تعلق پہلے گروہ سے تھا۔ دوسرے گروہ میں قانت بائے ہے۔ قریزی، ابن خلکان، ابوا ، ابن حجر عسقلانی، ابن ابی ان کے زمانے کے اہم عالم ہیں۔ جنہوں نے طب، فلسفہ اور تاریخ کے لیے گرانقدر کام کیا۔

منا - مکہ معظمہ اور عرفات کے درمیان وہ مقام جہاں حج کے بعد قربانی دی جاتی ہے اور رمی جمرہ کی جاتی ہے۔ یہ مقام مکہ سے عرفات جانے والی سڑک پر مکہ کی مشرقی پہاڑیوں میں واقع ہے جو مکہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ایک تنگ وادی میں ہے۔ یہی جگہ عقبہ بھی کہلاتی ہے۔ قصبہ میں پتھر کے مکانات ہیں اور ہر طرف کنکریاں بکھری ہوئی ہیں۔ اس جگہ تین جمرے ہیں جن پر حاجی کنکریاں مارتے ہیں۔ اسی مقام پر مسجد الخیف ہے جسے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بنوایا تھا۔ تمام سال تو یہ جگہ سنسان پڑی رہتی ہے لیکن حج کے زمانے میں یہاں کی رونق اور مجمع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے یہ جگہ مقدس سمجھی جاتی ہے۔ حج کے موقع پر ۸ ذی الحجہ کو ظہر کی نماز یہیں ہوتی ہے۔ اور اگلی صبح تک یہیں قیام رہتا ہے۔ یہاں سے حاجی عرفات کو جاتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر پھر منیٰ کو لوٹتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے، بال ترشوائے جاتے ہیں۔ آخر میں طوافِ کعبہ کے بعد تین روز پھر یہاں قیام رہتا ہے اور گویا حج اس مقام پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ گو ایک اور طواف باقی رہتا ہے جسے طوافِ وداع کہا جاتا ہے۔ اور یہ طواف مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت کیا جاتا ہے۔

منات - ایک بت۔ عرب جس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ یہ تقدیر بناتا ہے۔ بقول ان کے زندگی و موت (نعوذ باللہ) اسی کے ہاتھ میں ہے۔ مکہ اور شہلال کی پہاڑیوں کے قریب ہی مدینہ کو جانے والی سڑک پر ایک مندر میں یہ نصب تھا۔ اس کا اور اور دوسرے دو بتوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

فتح مکہ کے بعد اس کو توڑنے کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ ابوسفیانؓ، حضرت علیؓ، ابن سعدؓ، سعد بن زیدؓ وغیرہ کے نام منات شکن کے طور پر لیے جاتے ہیں۔

منافق۔ وہ لوگ جو ظاہر میں دوست اور باطن میں دشمن ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینے پہنچے تو جہاں انصار نے آپ کو سر آنکھوں پہ بٹھایا وہاں بعض لوگوں نے در پردہ آپ کی مخالفت بھی شروع کر دی۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی تھا جس کی سرداری آپ کی تشریف آوری سے ختم ہوگئی تھی۔

یہ لوگ بظاہر مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ نماز بھی پڑھتے اور زکوٰۃ بھی دیتے تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں بغض تھا۔ فرائض میں سستی کرنے کے علاوہ جنگ کے موقع پہ بد دلی پھیلاتے اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جنگِ اُحد کے شروع ہونے سے پہلے ہی عبداللہ بن ابی اپنے تین سَو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا غزوہ خندق اور تبوک کے موقع پہ بھی کچھ ایسی ہی حرکتیں کیں۔ مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک غیر شریفانہ تھا۔ غرض ان لوگوں کی اسی قسم کی حرکات پہ خدا نے وحی کے ذریعے مسلمانوں کو ہوشیار کر دیا۔ اب انہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ایک مسجد ضرار بنائی۔ جس کا علم بھی حضورؐ کو وحی کے ذریعے ہو گیا، چنانچہ وہ مسجد مسمار کر دی گئی۔ قرآن میں ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم بتلایا گیا ہے۔

منبر۔ مسجد میں وہ جگہ جہاں سے امام مسجد خطبہ دیتے ہیں۔ یہ تین سیڑھیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اینٹوں سے دیوار کے ساتھ اور دوسرا لکڑی کا بنا ہوا۔ موخر الذکر منبر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔

خطبہ دیتے وقت نبیٔ انسانیتؐ منبر کی بلند ترین یعنی تیسری سیڑھی پہ تشریف رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ دوسری پہ اور حضرت عمرؓ تیسری یعنی آخری پہ۔

اس کا استعمال سب سے پہلے مدینہ میں شروع ہوا۔ ابتدائی منبر لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

قاہرہ کی مسجدوں میں منبر ڈھلوان کی شکل میں ہوتے ہیں مگر ایشیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ شیعہ حضرات منبر میں چار سیڑھیاں لگاتے ہیں۔

منتخب التواریخ۔ ہندوستان کی تاریخ جس کے مؤلف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔ اس میں غزنوی دَور سے لے کر اکبر کی حکومت کے پندرھویں سال تک کے حالات تحریر ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں اکبری عہد کے صوفیاء، فلاسفہ، اطبّا اور شعراء کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ بدایونی اپنے زمانے کے جیّد عالم تھے۔ مذہب سے متعلق ان کے احساسات بڑے نازک تھے۔ اکبر کی آزاد خیالی ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کیا ہے۔ حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔

منتصر باللہ۔ جس کی سرکوبی کے لیے ترکی کو بھیجا جس نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن خلیفہ نے عہدِ اطاعت لے کر رہا کر دیا۔

عین تخت نشین ہوتے وقت اس نے اپنے دونوں بھائیوں معتز اور مؤید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ ورنہ اسے خطرہ تھا کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔

بعض مؤرخین آراء دیتے ہیں کہ ترکوں نے ہی اسے زہر دے کر مارا ہے۔ مرتے وقت اس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ "مجھ سے دین و دنیا دونوں چیزیں جاتی رہیں، میں اپنے باپ کی موت کا باعث ہوا تھا، لوگ میری موت کا باعث ہوگئے۔" ۵ ربیع الاول ۲۴۸ھ کو اس کی وفات کے ساتھ چھ ماہ بعد اس کے عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ منتصر کے دَور میں مسلمانوں نے بہت سی فتوحات حاصل کیں۔

منجنیق۔ پتھر کے گولے پھینکنے کی مشین۔ عرب جنگ میں کثرت سے استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک قسم کی توپ جو پتھر کے گولے پھینکتی تھی۔ رومی لوگ اس کو "لیڈر" کہتے تھے۔ گو کہ اس کی شکل و صورت بھدی ہوتی تھی مگر نشانہ کم ہی خطا جاتا تھا۔ اس مشین کو محمد بن قاسم نے حملۂ ملتان کے دوران راجہ داہر کے قلعہ وغیرہ کو مسمار کرنے کے لیے بڑی کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ اس منجنیق کا نام عروس تھا۔ یہ حجاج بن یوسف کی خاص مشین تھی۔ دیبل کا مندر بھی اسی سے گرایا گیا تھا۔ صرف تین نشانوں میں یہ مندر نیست و نابود ہو گیا تھا۔

منطق۔ علمِ فلسفہ کی ایک شاخ، استدلالی بحث کی سائنس۔ اسے مختلف طریقوں سے واضح کیا جاتا ہے۔ مثلاً "خیالات کی سائنس"۔ "خیالات کے ضابطوں کی سائنس"۔ "استدلال کے اصولوں کی سائنس" وغیرہ۔

اخلاق جلالی کا مصنف لکھتا ہے کہ ابتداً مسلمانوں کے مرشد اپنے پیروؤں کو پہلے اخلاق اور علمِ منطق کی تعلیم دیتے تھے اور اس کے بعد ریاضی طبیعات وغیرہ۔ مگر حکیم ابو العلی (ع۔ ۰) اس سے نااتفاقی کرتے ہوئے ریاضی کو منطق پر فوقیت دے کر دوسرے نمبر پہ رکھتا ہے۔ فلاطون بھی اسی نظریہ کا حامی تھا۔ یعنی، "وہ جو جیومیٹری نہیں جانتا اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں۔"

حنیفہ جو منطق کے ماہر مانے جاتے ہیں، امام ملک بیان فرماتے ہیں کہ اگر وہ یہ کہہ دیں کہ لکڑی کا ٹکڑا لکڑی نہیں بلکہ سونے کا بنا ہے تو وہ منطق کی مدد سے ثابت بھی کر دیں گے۔

علم المنطق کی تحصیل مسلمانوں میں سب سے پہلے سا ٹھ سن ہجری میں خالد ابن یزید نے کی۔ اس نے یونانی منطق کو عربی میں منتقل کرنے کے احکامات دیئے۔ اس کے بعد خلیفہ مامون الرشید (۲۰۹ھ) نے قسطنطنیہ کی لائبریری سے منطق کی بہت سی کتب منگوا کر ترجمہ کروائیں۔ خلیفہ کے حکم سے فلاطون کی کتب کا ترجمہ ابن یحییٰ نے عربی میں کیا۔ اسی طرح ملا ثابت، بطریق، تمادم بن ناعمہ، عبدالسمیع، حسن ابن سہل، وغیرہ نے بھی فارسی سے منطق کو ترجمہ کیا۔

خالد کے دو بیٹے موسیٰ اور یوسف وغیرہ نے ہندی سے کتب عربی میں منتقل کیں۔ اس کے علاوہ علم المنطق کے بہت سے نامور ماہرین نے کتب کا نہ صرف ترجمہ کیا۔ بلکہ ان میں اپنی تحقیق بھی شامل کی۔ ان میں فارابی (افلاطون کی کتب پہ تشریحی کتب بھی لکھی ہیں) ابن سینا، ابوالحسن، یعقوب ابن اسحاق القندی، وغیرہ اہم ہیں۔

منطق الطیر۔ شیخ فریدالدین عطار کی تمثیلی مثنوی جو ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں عارفانہ مطالب کو حقیقت کے پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک روز سب پرندے یکجا ہو کر کہنے لگے کہ کوئی ایسا ملک نہیں جہاں بادشاہ نہ ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم

اپنے بادشاہ کو تلاش کریں۔ ہدہد بولا کہ ہمارے بادشاہ کا نام سیمرغ ہے۔ تمام ہدہد کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں تاکہ سیمرغ کی تلاش ہو سکے۔ ہدہد کہتا ہے کہ وہ انہیں سیمرغ تک پہنچا دے گا بشرطیکہ تمام راستے کی سختیاں برداشت کریں۔ اکثر پرندے وہیں معذرت کرتے ہیں۔ کچھ مسافرت میں تھک کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال تیس پرندے (سیمرغ) سات ہولناک وادیوں میں سے گزرتے ہوئے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیمرغ اور تیس پرندے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ گویا وہ جس حقیقت کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آئے تھے وہ خود ان کے باطن میں موجود تھی۔ اسی تمثیل مثنوی میں تیس پرندے تیس سالک ہیں۔ سیمرغ ان کا محبوب ہے۔ سالکوں نے جو تکالیف برداشت کی ہیں وہ درحقیقت عارفوں کی ریاضتیں اور مجاہدے ہیں۔ سالکوں نے ذیل کی سات وادیاں عبور کی ہیں۔ یہی تصوّف کے منازل و مقامات ہیں:

۱۔ طلب و جستجو۔ ۲۔ عشق۔ ۳۔ معرفت۔ ۴۔ استغنا۔ ۵۔ توحید۔ ۶۔ حیرت۔ ۷۔ فنا۔

مندریس، عدنان۔ (۱۸۹۹ء - ۱۹۶۱ء)

ترکی سابق وزیر اعظم۔ امریکن کالج ازمیر اور انقرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں نیشنل اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور اتاترک کی ری پبلکن پارٹی کے مقابلے میں ڈیموکریٹک پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک حزب اختلاف کے لیڈر رہے۔

۱۹۵۰ء میں ڈیموکریٹک پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی اور مندریس نے وزارت بنائی۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں بھی ڈیموکریٹک پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو مندریس ہی نے وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ مئی ۱۹۶۰ء میں جنرل گرسل نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اور عدنان مندریس کو گرفتار کر لیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۶۱ء کو طول طویل مقدمے کے بعد انہیں غداری، قتل اور غبن وغیرہ کے الزامات میں پھانسی دی گئی۔

منسوخ۔

وہ قرآنی آیات جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بعد کی آیات سے تبدیل کر دی گئی ہیں یا ان کا مفہوم کالعدم قرار پایا ہے۔ جن آیات سے انہیں تبدیل کیا گیا ہے وہ ناسخ کہلاتی ہیں یعنی جگہ لینے یا ختم کرنے والی آیات۔ ناسخ و منسوخ ایک متنازعہ فیہ اہم مسئلہ ہے جس کے بارے میں حضور پاک کا کوئی واضح ارشاد موجود نہیں ہے۔ بڑے بڑے اسلامی مفکرین نے اس ناسخ و منسوخ کی تشہیر کو سرے سے مسترد کر دیا ہے۔ مولانا جلال الدین بھی ناسخ و منسوخ پہ یقین رکھتے تھے۔ مگر مولانا

منسوخ شدہ آیات	ناسخ آیات	تبدیل شدہ موضوع
سورۂ بقرہ ۱۱۹	سورہ بقرہ ۱۴۵	قبلہ
〃 〃 ۱۷۸	〃 مائدہ ۱۱۹ + سورہ مائدہ اسرائیل ۳۵	QISĀS (قصاص)
〃 〃 ۱۸۳	〃 بقرہ ۱۸۷	روزہ
〃 〃 ۱۸۴	〃 〃 ۱۸۵	فدیہ
〃 آل عمران ۱۰۲	〃 تغابن ۱۶	خوفِ خدا
〃 نساء ۸۸	〃 نساء ۸۹ + سورۂ توبہ ۵	جہاد
〃 بقرہ ۲۱۷	〃 توبہ ۳۶	مقدس مہینوں میں جہاد
〃 〃 ۲۴۰	〃 بقرہ ۲۳۴	
〃 〃 ۱۹۱	〃 توبہ ۵	مسجدوں میں دشمنوں کا قتل
〃 نساء ۱۴	〃 نور ۲	فاحشہ کی قید
〃 مائدہ ۱۰۵	〃 سورہ طلاق ۲	گواہی
〃 انفال ۶۶	〃 انفال ۶۷	جہاد
〃 نور ۳	〃 نور ۳۲	شادی
〃 احزاب ۵۲	〃 احزاب ۴۹	رسولؐ کی زوجہ
〃 مجادلہ ۱۲ (ابتدائی حصّہ)	〃 مجادلہ ۱۳ (بعد کا حصّہ)	اجتماع سے خطاب سے قبل عطیہ
〃 ممتحنہ ۱۱	〃 توبہ ۱	شادی کے لیے کفار کو رقم دینا
〃 توبہ ۳۹	〃 توبہ ۹۲	جہاد
〃 مزمل ۲	〃 مزمل ۲۰	رات کی نمازیں
〃 نور ۵۷	〃 نور ۵۸	بچوں کو گھروں میں داخلے کی اجازت
〃 نساء ۷	〃 نساء ۱۱	میراث کی تقسیم۔ نیز دیکھئے "ناسخ"

مودودی بالکل مخالفت پہ یقین رکھتے ہیں۔ یعنی قرآنی آیات میں ناسخ و منسوخ کا کوئی قصہ نہیں۔ مولانا جلال الدین نے اس کی تعداد پانچ سے پانچ سو تک بتائی ہے۔

اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم یقین کر سکتے ہیں کہ پرانے آسمانی صحیفوں کی بعض باتیں نئے آسمانی صحیفوں سے بدل دی گئیں۔

اس کے حامی جو ناسخ و منسوخ کا خاکہ پیش کرتے ہیں، وہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔ مولانا جلال الدین کی تصنیف ''اطفان'' سے لیا گیا ہے۔

منکر و نکیر ۔ دو فرشتے۔ جن کے متعلق حضور اکرمؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ موت کے بعد قبر میں مُردے سے سوال و جواب کریں گے۔ انؐ کے مطابق ان کی آنکھیں نیلی اور بلب کی مانند روشن ہوں گی۔ قبروں میں مُردوں کو سیدھا کھڑا کیا جائے گا۔ یہ ان سے محمدؐ کے بارے میں پوچھیں گے۔ دین اور دنیا کے بارے میں سوال کریں گے۔ راستباز جواب دیں گے کہ محمدؐ اللہ کے نبی ہیں۔ اس کے بعد وہ یوم الحشر تک قبر میں رہیں گے۔ اس کے برعکس گمراہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکیں گے۔ یہ ان کو قبر ہی میں سزا دیں گے۔ سزا کی مدت کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ اللہ کی رضامندی تک مار پڑے گی۔ بعض کی رائے میں تا قیامت مار پڑے گی۔ تاہم جمعہ کے دن انہیں بخشش ہوگی۔ ''کاش تم اس وقت (کی کیفیت) دیکھو جب فرشتے کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔ ان کے مونہوں اور پیٹھوں پہ (کوڑے اور ہتھوڑے وغیرہ) مارتے (ہیں اور کہتے) ہیں کہ اب عذاب آتش (کا مزہ) چکھو'' (سورۃ انفال: ۵۰)

منگنی ۔ شادی سے قبل کی ایک رسم۔ نسبت کا طے ہونا۔ لڑکا اور لڑکی کے درمیان نکاح سے قبل کا تعلق کہ لڑکی اس سے بیاہی جائے گی۔ اس کے لیے وقت اور عمر کی کوئی قید نہیں۔ بعض گھرانے بہت بچپن میں بھی منگنی کر دیتے ہیں۔ شادی کے لیے ضروری بھی نہیں۔

وقتِ منگنی مولوی یا قاضی کا موجود رہنا ضروری ہوتا ہے جو اس خوشی کے موقع پہ دعا مانگتا ہے۔

اگر منگنی کرنے والا ولی سے کہے کہ فلاں عورت سے میرا نکاح کر دے اور ولی کہے کہ بحق اتنے مہر کے میں نے اس کا نکاح جائز کر دیا ہے، اگرچہ شوہر سے نہ پوچھے کہ تو راضی ہے۔ کیونکہ جب اس نے کہا تو وہ راضی تھا۔

اسلام میں منگنی پہ منگنی کی اجازت نہیں ہے جب تک کہ پہلی منگنی کا معاملہ صاف نہیں ہو جاتا۔ ابن عمر فرماتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ایک مرد دوسرے مرد کی منگنی پہ منگنی نہ بھیجے جب تک کہ پہلا منگیتر اپنی منگنی نہ چھوڑ دے یا دوسرے کو اجازت دے دے۔

من و سلویٰ ۔ عربی لفظ ہیں۔ مَن کے معنی ترنجبین، شبنم۔ اور سلویٰ کے معنی شہد نیز ایک پرندے کا نام بھی ہے جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے اور جسے لوا کہتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر وادیٔ سینا میں آئے تو اللہ تعالےٰ نے یہی دو چیزیں ان کو بطور غذا مرحمت فرمائی تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مَن ایک میٹھا گوند ہوتا ہے جو ایک جنگلی درخت سے نکلتا ہے بنی اسرائیل یہی گوند کھاتے تھے۔ سلویٰ سے وہ پرندے مراد ہیں جنہیں سیلانی پرندے کہا جاتا ہے اور جو موسم سرما میں گرم خطوں اور موسم گرما میں سرد خطوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ پرندے بحر الکاہل کے کنارے کنارے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہیں اور بہت سے تھک کر زمین پہ گر پڑتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھے۔

مواخاة ۔ ہجرت کے موقع پہ تمام مہاجرین مکہ معظمہ سے خالی ہاتھ آئے تھے۔ اکثر کو چھپ چھپا کر ہی آنا پڑا۔ اس لیے ان کا اپنے ساتھ مال و اسباب لانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد حضورؐ کو ان کے اور انصار کے درمیان رشتۂ اخوت قائم کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ آپؐ نے انصار کو حضرت انس بن مالکؓ کے گھر پہ جمع کیا۔ مہاجرین کی تعداد ۴۵ تھی۔ حضورؐ مہاجرین اور انصار میں سے دو دو اشخاص کو بلا کر فرماتے گئے کہ ''تم اب بھائی بھائی ہو''۔ چنانچہ یہی تعلق مواخاة یا ''بھائی بندی'' کہلاتا ہے۔

انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا اور کہا ''آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے''۔ جنگ بدر سے پہلے تو مواخاتی بھائیوں کو ان کے انصار بھائیوں کے ترکہ میں سے بھی حصہ ملتا رہا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ انصار جلد ہی اسلامی رنگ میں رنگے گئے۔

موت ۔ طبعی زندگی کا ختم ہو جانا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے دنیاوی زندگی جب ختم ہو جاتی ہے تو دراصل ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس میں دکھ یا سکھ کا انحصار دنیا کے اندر گزاری ہوئی زندگی پہ ہوتا ہے۔ اگر دنیا کے اندر نیکی، راستی اور پاکیزگی کی زندگی رہی ہو تو آخرت کی زندگی بھی پاکیزہ اور فرحت بخش ہوگی اور یہاں گناہ اور ظلم کی زندگی رہی ہوگی تو وہاں دکھ ہی دکھ ہوں گے اور چین نہ ملے گا۔ موجودہ زندگی تو محدود ہے مگر موت کے بعد شروع ہونے والی زندگی غیر محدود ہے۔ چونکہ موت کے بعد دوسری زندگی کا آغاز تصور کیا جاتا ہے، اس لیے مذہبی زبان میں موت کو انتقال بھی کہا جاتا ہے۔ ہر شے کا وقت قدرت کی طرف سے مقرر ہے کر دیا گیا ہے اور یہ ٹل نہیں سکتا۔ جب موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس میں ایک سیکنڈ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ ہر ذی روح کے لیے موت ہے اور موت کا وقت کسی کو پہلے سے معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کس سرزمین پہ کس حالت میں واقع ہوگی۔ وہی شمار ہوگی جو خدا کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے واقع ہو بلکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کی راہ میں مرنے والے کبھی مرتے ہی نہیں، وہ زندہ رہتے ہیں۔ اچھے یا برے جو بھی کام کیے جاتے ہیں، ان کا بدلہ مرنے کے بعد ملتا ہے۔ قیامت کا دن یا روزِ حشر کہا جاتا ہے۔ موت اور قیامت کے دن کا درمیانی وقت عالم برزخ کہلاتا ہے۔

مرنے کے ساتھ صرف جسم ہی کو موت آتی ہے روح نہیں مرتی۔ روح جسم کے اندر داخل رہتی ہے تو وہ زندہ ہو جاتا ہے اور روح نکل جاتی ہے تو بے جان رہ جاتا ہے۔ اور یہ کہ روح کیا ہے؟ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مذہب کی رو سے کہا جاتا ہے کہ روح اللہ تعالےٰ کا امر ہے۔

سائنس کی روشنی میں کسی جاندار کے مرنے سے دنیا کے مادے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ قانون بقائے مادہ کی رو سے دنیا کے اندر مادہ جس قدر ہے اسے کم یا زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کی ظاہری شکل بدلی جا سکتی۔

موتفکات ۔ جمع۔ واحد موتفکہ

الٹی ہوئی بستیاں، مراد امت لوط کے وہ شہر ہیں جو عذاب کے تحت الٹ دیے گئے تھے کہ یہ گمراہ تھے۔ ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ''ایک ان کو خبر نہیں پہنچی تھی قوم ابراہیم کی اور اہل مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ دوسرے

جگہ قرآن اور اس کے تیل والوں نے اور الٹی ہوئی بستیوں نے (بڑے بڑے) قصور کیے تھے۔ سورۃ النجم میں آیا ہے۔ "اور اس نے الٹی ہوئی بستیوں کو دے ٹپکا۔"

یہ دو شہر سدوم اور عمورہ ہیں جو بحیرہ مردار کے جنوب میں واقع ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بعد انہی کی جگہ یہ بحر پیدا ہوا۔ ان کا موجودہ نام مشرق یردن ہے اور دریائے یردن کے کنارے ہیں۔ تورات میں آیا ہے کہ یہ علاقے ایک زمانے میں خوب سرسبز و شاداب تھے۔ "یردن کی ساری ترائی ۔ ۔ ۔ ۔ خداوند کے باغ اور مصر کے ملک کی مانند خوب سیراب تھی۔
(پیدائش ۱۳ : ۱۰)

موتمر عالم اسلامی

(دراصل مسلم کانگرس (مسلمانانِ عالم کی عالمگیر تنظیم۔ دنیا کی) تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں مسلمانانِ عالم کی موتمر (کانگرس) سلطان عبدالعزیز ابن مسعود کی دعوت پر مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی۔ انڈونیشیا سے عمر تسو کرو مینو تو۔ ہندوستان سے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ، علامہ سید سلیمان ندوی، فلسطین سے مفتی اعظم سید محمد امین الحسینی، لبنان سے علامہ رشید رضا، الحاج شیخ محمد عبس، وفد مصر سے شیخ ازہر محمد الظواہری، ترکی سے جناب ثروت بے جیسے اہم قائدین نے شرکت کی اور مسلمانانِ عالم کے مسائل پر غور و خوض کیا۔

دوسری موتمر ۱۹۳۱ء میں مفتی اعظم سید محمد امین الحسینی کی دعوت پر بیت المقدس میں منعقد ہوئی۔ اس موتمر میں عراق سے شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء، ایران سے ضیاء الدین طباطبائی، شام سے شکری القوتلی، لبنان سے ریاض الصلح، مصر سے عبدہ پاشا، جار جیا سے سعید شامل، ترکستان سے بازے خان، ہندوستان سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، مولانا ... اور مولانا ... جیسے اکابرین نے شرکت کی۔ اس موتمر کے بعد ... موتمر عالم اسلامی کا ... سیکرٹریٹ بیت المقدس میں قائم ہوا ... سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔

۱۱ فروری ۱۹۴۹ء کو تیسری موتمر کراچی میں منعقد ہوئی۔ مدعوین میں علامہ شبیر احمد عثمانی، پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، خواجہ شہاب الدین اور عبداللطیف بادانی کے نام سر فہرست ہیں۔ افتتاح گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کو مکہ شریف والی پہلی موتمر عالم اسلامی کے نام پر "موتمر العالم الاسلامی" کے نام سے موسوم کیا جائے۔
دو سال بعد فروری ۱۹۵۱ء میں چوتھی موتمر بھی کراچی ہی میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح شہید ملت لیاقت علی خاں نے کیا۔ عالم اسلام کے زعمانے شرکت کی۔ موتمر کے اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کی قیادت میں ایک دستوری کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں موتمر کا پانچواں اجلاس بغداد میں منعقد ہوا۔ اس کا دستور اجلاس عام میں منظور ہوا۔ اب تک موتمر ایک طاقت ور تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ منظور شدہ دستور کے مطابق باقاعدہ سیکرٹریٹ قائم کیا گیا۔ عالمی مرکزی دفتر کراچی ہی میں رہا۔ بیروت میں صدارتی دفتر اور مشرق وسطی کا علاقائی دفتر رہا۔ اقوام متحدہ سے رابطہ رکھنے کے لئے ایک دفتر رابطہ نیویارک میں بھی قائم کر دیا گیا۔

موتمر کا چھٹا اجلاس صومالیہ کے دارالسلطنت موگادیشو میں ۲۴ دسمبر ۱۹۶۴ء سے ۲ جنوری ۱۹۶۵ء تک جاری رہا۔ براعظم افریقہ میں یہ پہلا عالمی اجلاس تھا۔ اس موتمر میں پہلی بار یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ افریقہ مسلمانوں کا براعظم ہے؛ کیونکہ افریقہ ہی دنیا کا واحد براعظم ہے جہاں کی ۶۲ ٪ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

موتمر کا ساتواں اجلاس ستمبر ۱۹۶۷ء اس وقت کے حالات کے مطابق بیت المقدس کے قریب ترین شہر عمان میں منعقد ہوا۔ یہ موتمر عربوں پر اسرائیلی جارحیت کے خلاف منعقد ہوئی تھی۔ اسی سال موتمر عالم اسلامی کو ادارۂ اقوام متحدہ میں مشاورتی درجہ دیا گیا۔

موتمر عالم اسلامی نے اسلامیانِ عالم کے بنیادی سیاسی، ثقافتی، تمدنی، اقتصادی، قانونی غرض ہر نوعیت کے مسائل کے ضمن میں خاصی پیش رفت کی ہے۔ موتمر کے موجودہ صدر ڈاکٹر معروف الدوالیبی ہیں جو اسلامیات کے فاضل ہیں۔ موتمر کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر انعام اللہ خان ہیں۔ جن کی فعال قیادت میں موتمر کامیابی سے ہمکنار ہے۔ ڈاکٹر صاحب پرانے صحافی اور اعلیٰ پایے کے منتظم ہیں۔ انھوں نے برما میں آل برما مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی تھی اور مطالبہ پاکستان کی حمایت میں وہاں تحریک چلائی تھی۔ اپنا روزنامہ "برما مسلم ٹریبیون" اس مقصد کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ آل برما مسلم چیمبر آف کامرس بھی ڈاکٹر صاحب نے قائم کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے۔ اپنی زندگی اسلامیانِ عالم کے اتحاد اور بالخصوص موتمر کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں ان کی ذاتی کاوش سے موتمر نے کوئی ایک میل لمبا خریطہ کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو پیش کیا گیا تھا جس پر تقریباً دس لاکھ دستخط ثبت تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی توجہ خلوص محنت اور ثابت قدمی کی وجہ سے موتمر ایک موثر عالمی آواز بن گیا ہے۔

موتہ

موتہ ۔ غزوہ، مقام موتہ پہ لڑی گئی ۔
جب آپؐ زیارت کعبہ سے واپس آئے تو آپؐ کو خبر ملی کہ شام کی سرحد پر عیسائی، عرب قبائل، یہودیوں اور کفار کے اکسانے پر بغرض جنگ جمع ہو رہے ہیں تاکہ مدینہ پر حملہ کیا جا سکے۔ تحقیقات کی غرض سے آپؐ نے پندرہ افراد کی پارٹی روانہ کی۔ جنہوں نے دیکھا کہ واقعی لشکر جمع ہو رہا ہے۔ اسلام دوستی اور خدا پرستی کی بدولت انہوں نے واپس آنے سے قبل تبلیغ اسلام مناسب سمجھا۔ اسلام کی دعوت پہ وہ مشغول ہو گئے۔ آناً فاناً ان پہ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو گئی۔ بھاگنے کی بجائے وہ بھی ڈٹے رہے اور لڑتے لڑتے جام شہادت نوش فرما گئے۔

ایک شکایت نامہ آپؐ نے ایک صحابی حرثؓ کے ہاتھوں غسان قبیلہ کے رئیس سرجیل کو بھیجا۔ یہ بصرہ کا حاکم بھی تھا۔ موتہ نامی مقام پہ صحابیؓ نے ان کو پیغام رسولؐ پہنچایا۔ مگر اس نے رسیوں سے باندھ کر انہیں شہید کر ڈالا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ان کو اس لیے شہید کیا کہ کہیں آپؐ کا پیغام بادشاہ تک نہ پہنچ جائے۔

عسرتؓ کی شہادت کی خبر ملنے پر آپؐ نے تین ہزار کا لشکر زید بن حارثہ کی کمان میں بھیجا۔ متبادل کمانڈروں کے طور پر آپؐ نے جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ مقرر کیے۔ اس وقت وہاں ایک یہودی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تینوں آپؐ ضرور شہید ہوں گے۔ کیونکہ اللہ نبیؐ کی ہر بات پوری کرتا ہے۔

دوسرے دن صبح کے وقت یہ لشکر روانہ ہوا۔ اس سے پہلے اتنا بڑا لشکر آپؐ کی موجودگی کے بغیر کسی مسلمان جرنیل کی قیادت میں نہیں گیا تھا۔ آپؐ لشکر کے ساتھ ساتھ مدینہ باہر اس مقام تک گئے جہاں سے مدینہ والے اپنے ساتھیوں کو رخصت کیا کرتے تھے۔ وہاں پہنچ کر آپؐ نے انہیں نصیحت کی کہ مسلمان کے ساتھ نیک سلوک کرنا، دشمن کی کسی عورت کو قتل نہ کرنا، بچوں، اندھوں اور بوڑھوں کو بھی قتل نہ کرنا۔ نہ درخت کاٹنا اور نہ مکان گرانا۔ یہ نصیحت کر کے آپؐ واپس لوٹے اور لشکر شام روانہ ہوا۔

آگے پہنچ کر رومی لشکر کو بڑھتا دیکھ کر مسلمانوں نے موتہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ رومی تعداد میں تین لاکھ کے قریب تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی مسلمانوں کے کمانڈر زید بن حارثہ شہید ہو گئے تب فوج کا جھنڈا آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابو طالبؓ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب آپ نے دشمن فوج کے ریلے کو آگے بڑھتے دیکھا تو اپنے گھوڑے سے کود کر اس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں واپس جانے کے لیے تیار نہیں۔ جلد ہی آپؓ کا دایاں ہاتھ کٹ گیا۔ تب آپؓ نے بائیں ہاتھ سے جھنڈا اٹھایا۔ جب دشمنوں نے بایاں ہاتھ بھی کاٹ ڈالا تو آپ دونوں ہاتھوں کے ٹنڈوں کے سہارے جھنڈا سنبھالے رہے اور اسی حالت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی شہادت کے بعد کمان عبداللہ بن رواحہ نے اپنے ہاتھ میں لی۔ مگر وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے پاس کوئی قائد نہ تھا۔ قریب تھا کہ وہ میدان چھوڑ جاتے، خالد بن ولید آگے بڑھے اور جھنڈا اٹھا لیا۔ انہوں نے لشکر کے پچھلے تازہ دم حصے کو آگے کر دیا اور دائیں بائیں نعرے لگاتے ہوئے سرعت سے آگے بڑھے۔ دشمن سمجھا کہ کمک پہنچ گئی ہے۔ وہ پیچھے ہٹا اور آپ اپنی فوج نکال لائے۔

رسول کریمؐ کو اس واقعہ کی خبر خدا تعالےٰ نے وحی کے ذریعہ دی جس کے بعد آپ نے مسلمانوں کو مسجد میں یکجا کر کے شہید ہونے والوں کے لیے دعا کرنے کی نصیحت کی۔ اس موقع پر کچھ افراد نے انہیں بھگوڑہ کہا مگر آپؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ یہ بار بار لڑنے والے اللہ کے سپاہی ہیں۔ اس طرح آپؐ نے بعد کی جنگوں کی بلا واسطہ پیشین گوئی کی۔

موحدین ۔ وہ لوگ جو بت پرستی چھوڑ کر خدا پر ایمان لائے تھے اور اپنی سمجھ و فہم کے مطابق عبادت خدا کرتے تھے۔ ان میں سے مشہور اشخاص یہ ہیں: قیس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، اور زید بن عمرو بن نفیل۔ موحد کا اطلاق ایسے مسلمان پر بھی ہوتا ہے جو توحید کا قائل ہو اور سوائے اللہ کے اپنی حاجت کے لیے کسی اور سے رجوع نہ کرتا ہو۔

یہ اصطلاح مسلمانوں کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ حید پر ایمان رکھتے ہیں مگر وہابی طبقہ کے لوگ اپنے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے باقیوں کو مشرک تصور کرتے ہیں۔

موحدین ۔ بربریوں کا خاندان "موحدین" کہلاتا تھا۔ یعنی ایک خدا کو ماننے والے۔ یہ مرابطین کے بعد ۱۱۴۷ء میں ہسپانیہ کے حکمران بنے۔ ۱۲۱۲ء تک حکمران رہے۔ اس خاندان کا بانی محمد ابن تومرت تھا۔ یہ مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ کچھ اس کے بھی تھے، یہ بھی موحدین کہلاتے۔ اس کے ایک جانشین عبدالمومن نے ۱۱۴۷ء میں ہی مراکش پر قابض ہو کر وہاں بھی مرابطین کی حکومت ختم کر دی۔ تین برس کے اندر اندر اندلس میں بھی اس نے اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد الجزائر، تونس اور طرابلس فتح کرتے ہوئے اپنی حکومت بحراوقیانوس کے ساحل سے لے کر مصر تک وسیع کر دی۔ اس نے یہاں ۱۱۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے جانشینوں میں ابو یوسف یعقوب (۱۱۸۴ء-۱۱۹۹ء) کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ یہ منصور کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے کشتائل کے حکمران الفانسو ہشتم کو شکست دے کر ہسپانیہ اور پرتگال کے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ یہ شہر مرابطین کی حکومت کے آخری دور میں مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئے تھے۔ اس نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی مدد کے لئے ۱۸۰ جہاز شام بھیجے۔ اس کی وفات کے بعد اسلامی حکومت کو زوال آیا۔ ایک بربری قبیلے نے ان کی حکومت ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ موحدین عباسی خلیفہ کو نہیں مانتے تھے۔ اس لئے خطبہ سے اس کا نام نکال دیا گیا۔

مودود چشتی ۔ (۴۳۰ھ/ ۵۲۷ھ) خاندان چشت کے اکابر [illegible] آپ [illegible] اور زاہد [illegible] اور علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ خواجہ ابو یوسف چشتی [illegible] تھے۔ طفولیت ہی میں آپ سے کرامات سرزد ہونے لگی تھیں۔ سات سال [illegible] قرآن حفظ کر لیا اور دوسرے علوم کی تحصیل میں [illegible] وفات پر مسند نشین ہوئے۔ والد سے جب بیعت ہوئے تو [illegible] کی زندگی گزاری۔ تعلیم کے سلسلے میں بخارا بھی تشریف [illegible] خواجہ نجم الدین عمر سے [illegible] تعلیم [illegible] کی شیخ [illegible] پایا تھا۔ خواجہ مودود کا ہر قول اور فعل شریعت [illegible] مبارک سے فرماتے [illegible] انتیس سال [illegible] [illegible] چشت میں ہے۔

موذن :۔ نماز کے لئے بلانے والا [illegible] میں شامل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام ۔ [illegible] بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر [illegible] بنی اسرائیل میں [illegible] وہ بنی اسرائیل [illegible] کو قتل [illegible] [illegible] فرعون کی [illegible] نظر [illegible] کے پاس [illegible] انہوں نے ایک قبطی [illegible] قبطی مارا گیا۔ اس پر آپ مصر سے بھاگ کر [illegible] حضرت شعیب [illegible] رکھا اور اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر دی۔ بارہ برس کے بعد جب وہ [illegible] رہے تھے تو وادی طویٰ میں اللہ تعالےٰ نے ان سے [illegible] ہوئی [illegible] فرعون کی ہدایت کے واسطے متعین کر دیا گیا۔ اور عصا اور ید بیضا کے معجزے عطا ہوئے۔ فرعون اپنے جادوگروں کو ان کے مقابلے میں [illegible] کے مقابلے سے عاجز پا کر ایمان لے آئے۔

بعد ازاں آپ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ راستے میں دریائے نیل پڑتا تھا حکم ربّی کے تحت آپ نے اس پر عصا مارا وہ دو حصوں میں بٹ گیا اور دریا میں ایک راستہ سا بن گیا۔ فرعون بھی ان کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ جب وہ دریا پہ پہنچا اور ایک راستہ بنا پایا تو وہ بلا جھجک آپ کے پیچھے ہی اپنے لاؤ لشکر سمیت دریا میں اتر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے ساتھیوں سمیت پار اتر گئے مگر فرعون اپنے تمام ساتھیوں سمیت دریا میں غرق ہو گیا۔ پھر آپؑ کوہِ طور پہ گئے اور آپؑ پہ توراۃ نازل ہوئی لیکن آپ کی غیر موجودگی میں سامری نام کے جادوگر نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت کرنے پہ آمادہ کر لیا تھا۔ واپسی پر آپ نے بچھڑے کو تو آگ میں ڈال کر گلا دیا۔ لیکن بنی اسرائیل کو بجائے شہروں میں بسانے کے ایک بیابان میں لے گئے۔ جہاں چالیس سال کا عرصہ ان کے غلامانہ عادتوں کی اصلاح میں گزارا۔

قرآن مجید میں آپ کا ذکر ۱۲۹ مرتبہ ہوا ہے۔ آپ کے ذکر کے ساتھ اکثر مقامات پہ آپؑ کے بھائی ہارونؑ کا ذکر بھی آیا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں فرعون کے ڈوبنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فرعون نے ڈوبتے وقت نہایت عاجزی سے اپنی عبودیت کا اقرار کر کے معافی مانگی۔ مگر اب معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ اس کو جو خداوندی جواب ملا تھا وہ صرف اتنا تھا کہ ہم تیرے جسم کو محفوظ رکھیں گے تاکہ آنے والی نسلیں تیری لاش کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے اسی فرعون کی لاش اہرام کی کھدائی سے ملی اور جس کے بعض آثار اور علامات دیکھ کر طبقات الارض کے بڑے بڑے ماہروں اور سائنسدانوں نے متفقہ طور پہ فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ وہی فرعون ہے جو جناب موسیٰؑ کے زمانے میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے غرق ہوا تھا۔ چنانچہ آج بھی اس کی ممیائی ہوئی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا نسب نامہ

ابراہیمؑ
- اسمٰعیل
- اسحاقؑ
  - یعقوب
    - لاوی
      - جحر
      - مراری
      - قہات
      - جحرشون
        - عمران
          - موسیٰ علیہ السلام
          - ہارونؑ

حیاتِ موسیٰؑ ماہ و سال کے آئینے میں

سالِ ولادت	۱۵۷۱ ق م
مصر میں قیام	۱۵۳۱ ق م تک
مدین میں قیام	۱۴۹۱ ق م تک
مصر سے بنی اسرائیل کا خروج	۱۴۹۱ ق م
صحرائے تیہہ میں قیام	۱۴۹۱ - ۱۴۵۴ ق م
سفر از تیہہ تا کوہِ نیبو	۱۴۵۴ - ۱۴۵۱ ق م
وفات =	۱۴۵۱ ق م
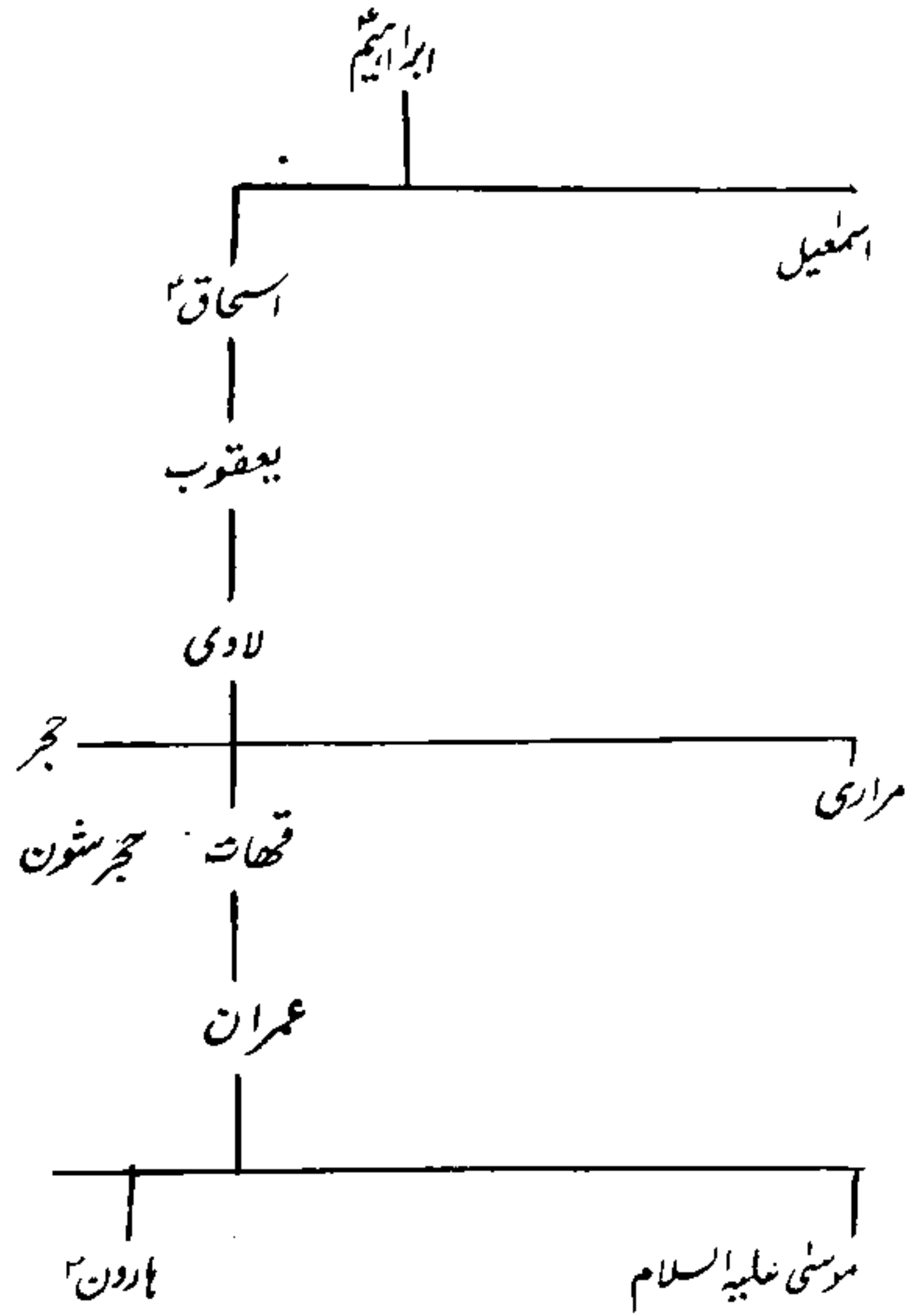
موسیٰ بن عقبہؒ ۔ امام زہری کے شاگرد تھے۔ فنِ مغازی میں کافی شہرت حاصل کی۔ خاندان زبیر کے غلام تھے۔ فن حدیث میں امام مالکؒ ان کے شاگرد تھے۔
فن مغازی میں ان کی تصنیف کی خصوصیات یہ ہیں :۔
۱۔ ان سے پہلے مصنفین روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے صحت روایات کا خاص اہتمام کیا۔
۲۔ دیگر مصنفین زیادہ سے زیادہ واقعات نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے جس سے ہر قسم کی رطب و یابس روایات آجاتی تھیں اور مضمون الجھ جاتا تھا۔ انھوں نے احتیاط سے صرف وہی روایات لیں جو درست اور مضمون سے متعلق ہوتی تھیں۔
۳۔ اکثر لوگ چھوٹی عمر یا آغازِ شباب میں درس حدیث میں شامل ہو جاتے تھے۔ اور پھر حدیثیں روایت کرنا شروع کر دیتے تھے اور چونکہ اس عمر میں واقعات کا صحیح طور پر سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا اس لیے ان کی روایات میں تغیر اور اسقاط ہو جاتا تھا۔ موسیٰ نے پختہ عمر میں یہ فن سیکھا تھا۔ اس لیے ان کی روایات ان خامیوں سے پاک تھیں۔

آجکل ان کی کتاب نایاب ہے۔ مگر سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں ان کے حوالے کثرت سے آتے ہیں۔ ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

موسیٰ بن نصیر ۔ (۶۴۰ء - ۷۱۶ء) مشہور عرب سپہ سالار اور فاتح۔
افریقہ اور اندلس کو اسلامی لشکر نے انہی کی قیادت میں فتح کیا۔ خلیفہ عبد الملک نے موسیٰ بن نصیر کو افریقہ کے قبائل کی مہم پہ روانہ کیا جنہوں نے اس مہم کو بڑی کامیابی کے ساتھ سر کیا اور اپنے نائب طارق بن زیاد کو آبنائے جبل الطارق کے راستے سپین کی فتح کی مہم پہ روانہ کیا۔ طارق بن زیاد جب سپین میں داخل ہو گیا تو موسیٰ بن نصیر بھی اس کے پیچھے پیچھے سرزمین اندلس میں وارد ہوئے۔ اس کے شمالی حصوں کو فتح کرنے کے بعد افریقہ کے راستے شام واپس آگئے۔ ان کے زمانہ میں پورا مفتوحہ افریقہ حلقہ بگوش اسلام ہوا۔
موسیٰ بن نصیر کا انتقال سلیمان بن عبد الملک کے عہد میں ہوا۔ بعض مورخین کا خیال تھا کہ خلیفہ نے انھیں قتل کرا دیا تھا۔

موسیٰ کاظمؒ ۔ (۷ صفر ۱۲۸ھ - ۲۵ رجب ۱۸۳ھ)
اہلِ شیعہ کے ساتویں امام۔ ولادت مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک قصبہ ابوا میں ہوئی۔ والدہ کا نام حمیدہ بربریہ تھا۔ جن کو ان کے والد امام جعفر صادق نے اندلس سے خریدا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اثنا عشریہ کے امام ہوئے۔ ہارون الرشید نے انہیں گرفتار کر کے بصرہ اور پھر بغداد بھیجا۔ بغداد میں وفات پائی۔ مزار

شریف کاظمین میں ہے۔

مؤطا حدیث کی ایک مستند کتاب جو امام مالک بن انسؒ الحمیری (۹۳ھ ۔ ۱۷۹ھ) نے مرتب کی تھی۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ مؤطا اصل اول ہے اور صحیح البخاری اصل ثانی۔ اسی قسم کی رائے قاضی ابوبکر المتوفی (۵۴۳ھ) نے دی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ حدیث میں اس سے مستند اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ مشہور محدث شاہ ولی اللہ نے اسے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔

یہ دس ہزار احادیث سے منتخب کر کے تیار کی گئی اس میں کل ۱۰۲۷ احادیث و آثار ہیں۔ ان میں ۶۰۰ احادیث مسند، ۲۲۲ مرسل، ۶۱۳ موقوف اور ۲۸۵ تابعین کے اقوال ہیں۔ حدیث کی دنیا میں اسے اتنی شہرت و عظمت ملی کہ بعض بعد کے آنے والے محدثین نے بھی اپنی تصانیف انہی کے نام پر رکھیں، جیسے "مؤطا امام محمدؒ" وغیرہ۔

مولفۃ القلوب ۔ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کا ایک گروہ۔

جنگ حنین کے بعد مال غنیمت کی تقسیم پر عجیب واقعہ رونما ہوا۔ آپؐ نے [illegible] دیگر قبائل کو مال غنیمت تقسیم کر دیا جس پر انصار ملال ہوئے اس پر آپؐ نے سعد بن عبادہ کو طلب کیا اور روح پرور ملاقات کی جس پر سب کے دل صاف ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے کہا کہ اب جو کفار مغلوب ہو کر در اسلام میں داخل ہوئے ہیں ابھی ان کے دلوں کا اعتبار نہیں، لہٰذا تالیف قلوب کے لیے میں نے ان کو یہ رعایت بخشی تاکہ ان کے سخت دل ہمیشہ کے لیے نرم پڑ جائیں۔ اور سچے دل سے حامیٔ اسلام رہیں۔ اس کے بعد حضور پرنورؐ نے اُن شرفائے مکہ کا، جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ مولفۃ القلوب نام رکھا۔

حلیہ میں درج ہے کہ ان کی تین قسمیں تھیں۔ ایک وہ جنہیں آپؐ نے محض اسلام میں داخل ہونے پر خوش کیا جیسے صفوان بن امیہ وغیرہ۔ دوم وہ جو اسلام پر ثابت قدم رہے، جیسے حضرت ابوسفیان۔ تیسری وہ جو فساد و شر پھیلاتے تھے۔ انہیں مال غنیمت میں سے خاص حصہ دیا جاتا تھا۔ تاکہ اپنی عادت بد سے باز رہیں۔ اسے مسلمان خود بھی سمجھتے تھے۔

مولیٰ مختلف معنی مثلاً بچانے والا، مددگار، اُستاد، اسلامی طور پر خدائے عزوجل کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مختلف آیات قرآنی میں آیا ہے۔ دیکھیں (سورہ آل عمران ۱۵۰) ——— "یہ تمہارے مددگار نہیں ہیں بلکہ خدا تمہارا مولیٰ ہے اور سب سے بہتر مولا ہے" سورہ بقرہ کی آخری آیت میں بھی ایسا ہی ارشاد ہے ملاحظہ ہو سورہ الانعام ۶۲ ——— "پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مولیٰ برحق خدائے تعالیٰ کے روبرو واپس بلائے جائیں گے سن لو کہ حکم اس کا ہے اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے"۔

یہ اصطلاح غلاموں کے آقا کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے مگر اس سے مراد خدائے واحد ہی ہوتا ہے۔ ایک مشہور حدیث بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے "تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر ملے گا۔ . . . تیسرے وہ غلام جس نے اللہ اور اپنے مالک دونوں کے احکامات پورے کیے" ——— یعنی وہ ان پر خصوصی مہربانی کرے گا۔ بعض روایتوں میں مولیٰ ولی کے مفہوم میں بھی آتا ہے مثلاً "غدیر الخم" یعنی میںؐ جس کا مولیٰ ہوں علیؑ اس کا مولا ہے، یہ بات نبی آخر الزمانؐ نے ایک بار کہی۔

مومن عربی لفظ جمع مومنین معنیٰ "ایمان والے" خدائے واحد، اس کے فرشتوں، رسولوں اور نبیوں اور کتابوں پر ایمان رکھنے والا۔ اہل تشیع مسلمانوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بار بار مومنین کی خصوصیات بتائی ہیں۔ اور انہیں خبردار کیا ہے کہ اگر وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہ تھام سکے، تو عبرتناک مقام تک پہنچیں گے۔ ورنہ ان کے لئے دنیا و عاقبت دونوں میں عافیت و مغفرت ہے۔

مومنین کے بارے میں سورۃ النساء ۶۰ اور سورہ اعراف ۴۰ میں واضح ہدایت درج ہے، کہ مومن جنت میں جائیں گے، اور ایک مومن بھی دوزخ میں نہیں جائے گا، اور مسلم ۵ میں درج ہے: کہ ایک خوشگوار ہوا آئے گی، جو تمام مومنین کی روحیں قبض کرے گی، اور کوئی مومن دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ مگر یہ علامت قیامت ہو گی۔ اس کے بعد صور پھونکا جائے گا۔ اور لوگ اللہ کے حضور اعمالوں کی جواب دہی کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اسلام میں قرآن و احادیث نے مومنین کی بہت سی صفات مقرر کر دی ہیں یہ ایک کڑی منزل ہے، جس کا پہنچنا آسان نہیں۔ یہ کسی کا حق نہیں مارتا۔ جھوٹ نہیں بولتا، امانت میں خیانت نہیں کرتا، جنگ میں پہل نہیں کرتے، کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، یتیموں کا مال نہیں کھاتے۔ کمزوروں پر ظلم نہیں کرتے۔ اللہ اور اس کی تمام باتوں پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی بہت سی صفات کا تعین اللہ تعالیٰ نے سورہ مومنون کی شروع کی آیات اور اسی سورۃ کی ۵۵ تا ۶۰ کی آیات میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن عزیز کی دوسری بہت سی آیات میں ان کی صفات ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں۔ (آل عمران ۳۹) اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس نے نبی آخر الزمان کو مومنین میں سے ہی اٹھایا ہے۔ اس طرح وہ ان کے مقام اعلیٰ کی نشاندہی کرتا ہے۔ (دیکھیں آیت [illegible]) اللہ کے نزدیک مومن کے اتنے اونچے مقام کی وجہ سے ان کے قصداً قتل پر دوزخ مقرر کیا گیا ہے۔ اس بارے میں سورۃ النسا ۹۳ میں واضح طور پر ہدایت [illegible] مومن کے قاتل کو کوئی معافی نہیں، اور وہ زندگی بھر دوزخ [illegible] (دیکھیں آیت نمبر ۹۳/۱) اسی سورۃ میں ایک آیت چھوڑ کر [illegible] کا قتل بھی قابل تعزیر پایا ہے۔ اور اگر کوئی مومن بھول کر کسی [illegible] تو اسے بھی معافی نہیں ہے، جب تک کہ وہ آیت کی تعمیل [illegible]

مومنہ جماعت ۔ اثنا عشریہ شیعوں کا ایک معروف [illegible]

اسماعیلیوں میں ایک فرقہ مومنہ جماعت کے نام سے مشہور ہے [illegible] امام الدین تھے جن کو عرف عام میں امام شاہ کہا جاتا ہے [illegible] فرقہ نے بہت سی [illegible] اقوام سے اخذ کیں اور ان کا سلسلہ پیر منتقی یا نائب منتقی ختم ہوا ہے یعنی ہندو [illegible] تمیز کے بغیر تعلقات و رسم رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت سی رسمیں [illegible] ہیں۔ دوسری طرف مشائخ سے بھی محبت رکھتے ہیں۔

امام شاہ بغرض تبلیغ عراق سے ہندوستان آئے تھے [illegible]

امام الدین شاہ ۱۵۱۲ء میں فوت ہوئے اور ان کا مزار گجرات [illegible] کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہوا۔

مومنہ جماعت نزاریوں یا مستعلیوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ [illegible] معمولات بھی دیگر اسماعیلیوں سے مختلف ہیں۔

مہاجر ہجرت کرنے والا، ترک وطن کرنے والا، وہ شخص جس نے [illegible] کے زمانہ میں مکہ سے مدینہ یا حبشہ یا کسی اور مقام پر ہجرت کی [illegible] سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ضروری نہیں، بلکہ نئی روایت پیدا کرنے کی [illegible]

سے دوسرے مقام پر جانا ہے۔ یہ اصطلاح رسول مقبول ؐ کے لئے استعمال نہیں ہوتی، بلکہ ان افراد پر ہوتی ہے، جو ان کے ساتھ یا ان سے قبل یا ان کے بعد ہجرت کرنے، ان کے بارے میں کلام اللہ میں یوں آیا ہے ـــ جو لوگ ایمان لائے، اور خدا کے لئے وطن چھوڑ گئے۔ اور (کفار) سے جنگ کرتے رہے۔ وہی خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا (اور) رحمت کرنے والا ہے۔ (البقرہ ۲۱۸) اسی طرح سورہ النساء آیت ۱۰۰ میں آیا ہے:

"اور جو خدا کی راہ میں ہجرت کرے، وہ زمین میں بہتری اور کشائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف ہجرت کرتا ہوا اپنے گھر سے نکلے، اور پھر اس کو موت آ جائے، تو اس کا اجر خدا کے ذمے ضرور ہو چکا، اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ جو لوگ مکہ سے مدینہ گئے، وہ مہاجر کہلوائے، اور وہاں کے حقیقی باشندے انصار۔ ان میں بھائی چارے اور اخوت کی فضا پیدا کرتے ہوئے رسول پاک ؐ کے کہنے پر حقیقی باشندوں نے انہیں بہت سے حقوق دیئے۔ اس طرح مہاجر اسلام پھیلانے میں معاون ثابت ہوئے۔ انہی لوگوں، مہاجر و انصار کو اللہ تعالیٰ نے سچا مسلمان قرار دیا ہے ملاحظہ ہو۔ سورۃ الانفال، آیت نمبر ۷۴۔

سورۃ التوبہ کی انیسویں آیت میں قرار آیا ہے کہ وہ لوگ جو اس کی خاطر ملک چھوڑ کر گئے، اور ایمان لائے۔ اور اس کے لئے مال و جان سے جہاد کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کے بہت بڑے درجے ہیں، اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

اس سے اگلی آیت میں ان کو جنتوں اور بخششوں کی بشارت دی گئی ہے۔ اگرچہ مہاجر وہ لوگ کہلاتے ہیں، جو حضور پاک ؐ کے ساتھ مکہ سے مدینہ گئے۔ مگر اس کے علاوہ بھی وہ لوگ جو گاہے بگاہے ہجرت کرتے رہے، اسلامی تاریخ میں مہاجر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی گھر بار چھوڑنے والوں کو ہجرت کرنے والا ہی کہا گیا ہے۔

مہاجرین نے مدینہ منورہ اور مختلف دوسرے مقام پر جا کر تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا۔ اس طرح ہجرت کی اسلام میں زبردست اور جامع حیثیت ہے۔ کیونکہ اس سے مدینہ قلعہ اسلام بن گیا، نئے روابط پیدا ہوئے۔ مدینہ کے ساتھ ساتھ حبشہ میں بھی مہاجرین نے اسلام کی حمایت میں بڑا کام کیا۔ جس کا وہاں کے اس وقت کے بادشاہ پر بھی بڑا اثر ہوا۔

مہاجرین کو ہجرت کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ جو اس بات کی بھی علامت ہے کہ اللہ کی زمین تنگ نہیں، اور مومن و اسلام کا سپاہی ایک مقام پر قید نہیں ہو سکتا۔ جو مہاجر نہ بنا، اور ہجرت نہ کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ خود پر ظلم کرتا ہے، کیونکہ اللہ کی زمین فراغ ہے، وہ کہیں بھی جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جہنمی قرار دیا گیا ہے۔ دیکھیں سورۃ النساء آیت ۹۷۔ مہاجر براہ راست طور پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ مقام کی قید میں نہیں اور زمین جو نعمت ہے اس کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔

مہتدی باللہ عباسی عہد حکومت کا چودھواں خلیفہ ابو عبداللہ محمد المہتدی باللہ (۲۱۸ء ــــ ۲۵۶ء) اپنے بھائی معتز باللہ اور ترکوں کے درمیان صلح نہ ہونے پر فسخ بیعت کی اجازت لے کر رجب ۲۵۵ میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ اہل بغداد نے بیعت نہ کی، اور ہنگامہ آرائی کی فضا پیدا ہوئی۔ اس فتنۂ شور و شر کو اس نے روپے دے کر ٹھنڈا کیا۔ شعبان ۲۵۵ میں خلیفہ کو بغداد سے بھی بیعت ہو گئی۔ اس کے عہد خلافت میں منتعر کے اہل دربار اور معمولی آدمی علی بن عبدالرحیم سلطنت کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کے لئے کبھی علوی اور کبھی عباسی بن کر شورش کی آگ پھیلاتا رہا۔ لاکھوں حبشی غلاموں کو آزادی کا لالچ دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اس کے بعد بغاوت پسند انسانوں کو اپنے ساتھ ملا کر عراق میں قیامت صغریٰ بپا کر دی۔ جسے بہت مشکل سے سرد کیا گیا۔

امیر لقا کا بیٹا موسیٰ صالح بن ولید کا بانی دشمن تھا۔ اس نے موقعہ پا کر صالح کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کو سن کر مہتدی کو بہت افسوس ہوا۔ اور اس لئے اسی وقت موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس بات کی خبر موسیٰ کو ہو گئی۔ لڑائی کے لئے وہ بھی فوج لے کر سلمر پہنچ گیا۔ یہ اس وقت دربار میں فریاد کی دادرسی کر رہا تھا۔ موسیٰ بھی حاضر ہو گیا۔ بحث کے بعد فریقین میں محرم ۲۵۶ میں معاہدہ کیا گیا، جو چند دن بعد ناکام ہو گیا، اور دونوں میں جنگ ہو گئی۔ قبل از جنگ مہتدی نے ترکوں کو خطاب کرتے ہوئے روح پرور تقریر کی۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ خلیفہ کی طرف سے فرغانہ نے موسیٰ کا مقابلہ کیا۔ اور ایک دن میں چار ہزار ترک قتل کئے۔ لیکن خلیفہ شکست کھا گیا۔ اور اس جنگ میں لڑتا ہوا ماہ رجب ۲۵۶ میں راہی ملک عدم ہوا۔

مہدویہ ـــ ہندوستان میں بابر کے عہد سے لے کر اورنگ زیب کے زمانہ حکومت تک احیائے دین کے نام سے اٹھنے والی اس تحریک کا مسلمانوں کی حکومت و سیاست، دین و فلسفہ، تصوف و کلام پر گہرا اثر قائم رہا۔ اس تحریک کے بانی سید محمد جونپوری تھے۔ جنہوں نے مہدی موعود کا دعوے کیا۔

سید محمد جونپوری ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ باطنی علوم کی منازل شیخ دانیال چشتی جونپوری کے پاس طے کیں۔ اس وقت جونپور کے حسین شرقی نے محمد مہدی کو اسد العلماء کا خطاب عطا کیا۔ محمد مہدی نے ایک فوج بنائی جو ان کے دعووں کے مطابق کفار سے جنگ کیا کرتی تھی۔ اس فوج کی قوت اس قدر بڑھی کہ اس وقت کی حکومتیں خوف زدہ ہو گئیں اور مہدی کے متبعین کو سرکار و دربار میں سیاسی اعزاز و وقار حاصل ہو گیا۔ بہت سے نواب اور ریاستی حکمران ان کے مرید ہوئے۔ ان کی تحریک کا زیادہ اثر حیدرآباد اور میسور کے علاقوں میں قائم رہا۔ سید محمد مہدی نے اپنی تحریک کے دوران حجاز کا بھی دورہ کیا اور حج کے دنوں میں مکہ معظمہ میں اپنے مہدی ہونے کا دعوے کیا۔ اور واپس ہندوستان پہنچ کر مختلف نوابوں، حکمرانوں کو تبلیغی خطوط لکھے۔ ۲۳ اپریل ۱۵۰۴ء کو خراسان جاتے ہوئے قندھار کے قریب ایک قصبہ فرہ میں بیمار ہوئے اور اسی روز وفات پائی۔ اسی جگہ ان کا مزار ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ تپدق کے مریض تھے۔

سید محمد جونپوری نے جس قسم کے دعوے کیے اور جو نئے اعتقادات مسلمانوں میں پھیلائے ان سے اہل سنت میں ایک مستقل نئے فرقہ و تنظیم ظہور میں آئی اور ان کے شارحین نے بعض نئے الفاظ پیدا کیے جو ان کے ہاں اب بھی مروج ہیں۔ محمد مہدی نے جن نئے عقائد کی بنیاد رکھی ان کا ملخص یہ ہے:۔

- فرائض و واجبات قرآنی کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم کا تعلق نبوت اور شریعت سے ہے ان احکامات کو رسول اللہ ؐ نے خود مفصل بیان فرمایا ہے البتہ واجبات اور فرائض قرآنی کی دوسری قسم کی شرح و تفصیل مہدی وقت کی تابع فرمان ہے۔
- دوسری قسم کے احکامات ولایت محمدیہ کے لیے مخصوص ہیں۔
- محمد مہدی جونپوری مشیت الٰہی کے مطابق اس دنیا میں آئے اور ان کا آنا حجت ہے۔

محمد مہدی جونپوری کا قائم کردہ فرقہ آج بھی موجود ہے۔ عصر حاضر کی مشہور سیاسی شخصیت نواب بہادر یار جنگ جو حیدرآباد کے تھے جنہوں نے مسلم لیگ کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ احادیث میں جس مہدی کی آمد کا تذکرہ ملتا ہے وہ سید محمد جونپوری تھے۔ اب کوئی اور مہدی نہیں نہیں آئے گا۔

مہدی امام

آخری امام جن کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی وقت جہاز میں آئیں گے۔ یہ بارعیش پرکشش انسان ہوں گے۔ جو گمراہ انسانوں کو صراطِ مستقیم پر لائیں گے۔

نبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا، لیکن انسان بدستور کم و بیش ہر جگہ گمراہی پر ہے۔ سو ان کی راہبری کے فرائض میں مہدی دین کے امام مہدی کی متوقع آمد کے پیشِ نظر مختلف وقفوں کے بعد مختلف افراد نے مہدی ہونے کا دعوی بھی لیا۔ اور بہت سے لوح افراد کو بھٹکانے کی کوشش میں پس دیوارِ زنداں ہوئے۔

مہدی بن منصور عباسیہ عہد سلطنت کا ایک خلیفہ ۱۲۶ ھ میں ایدج کے مقام پر پیدا ہوا۔ صرف پندرہ برس کی عمر میں باپ نے جنگ کے لئے خراسان بھیجا۔ یہ اس کی تربیت کا حصہ تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۴۴ ھ میں اس کی شادی ہوئی۔ ۱۴۷ھ میں ولی عہد اول نامزد ہوا۔ ۱۵۳ھ میں امیرالحج اور ۱۵۸ میں تخت نشین ہوا۔ بیعت کے لئے منبر پر چڑھ کر اپنی عاجزی، انکساری، رحم و انصاف پروری اور خوف خدا سے متعلق خطبہ دیا۔

۱۵۹ ھ میں اپنے دو بیٹوں ہادی ولی عہد اول اور ہارون الرشید کو ولی عہد دوم نامزد کیا۔ اپنے عہد دور میں اس نے ۱۶۰ ھ میں ہند میں اسلامی حکومت کی شاداغ بیل ڈالی ۱۶۱ ھ میں مکہ شریف کی سڑک، سرائیں اور پانی کے حوض بنوائے۔ ۱۶۲ھ میں روم کا بڑا حصہ فتح کیا۔ ۱۶۶ ھ میں مکہ شریف، مدینہ شریف، یمن کے مابین سلسلہ ڈاک قائم کیا۔

اس کے دور کا ایک اہم واقعہ مقنع نامی ملحد کا دعوی خدائی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا تعالٰی بہت سے انسانی جسموں میں حلول کرتے ہوئے اب مجھ میں جلوہ نما ہوا ہے اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے اس نے ایک چاند بنوایا تھا۔ جو چاہ نخشب سے طلوع ہو کر دو ماہ تک غروب نہ ہوتا تھا۔ جلد ہی بہت سے سادہ لوح اور حکومت کے دشمن اس کے گروہ میں شامل ہو گئے۔

۱۶۱ ھ میں معاذ بن مسلمؓ اور سعد حرشی اس کی گرفتاری کے لئے بھیجے گئے۔ جنہوں نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ جب اسے موت نظر آنے لگی، تو آگ کے الاؤ میں کود کر خود سپردِ جہنم کر دیا۔ مسلمانوں نے فوراً ہی آگ میں کود کر اس کی نعش نکالی، اور سر کاٹ کر مہدی کو بھیج دیا۔ اس طرح ایک بہت بڑے فتنے کا خاتمہ ہوا۔

خلیفہ کی تاریخ وفات میں تضاد ہے۔ بعض کے نزدیک روزِ وصال ۱۲ تاریخ تھی۔ اور بعض کے نزدیک ۲۲۔

مہدی سوڈانی۔ (۱۸۰۹ء - ۱۸۸۵ء)۔ محمد احمد مہدی سوڈانی کے والد کا نام عبداللہ، والدہ کا نام آمنہ تھا۔ وطن، شمالی سوڈان کا شہر دنقولا تھا۔ ابھی چار برس کا تھا کہ اس کے والدین ترک سکونت کر کے جزیرہ آبا میں آباد ہو گئے۔ اسی جگہ مہدی نے سات برس کی عمر میں اپنی والدہ سے قرآن حفظ کیا۔ اور پھر خرطوم کے مدرسہ خوجلی میں اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد والد کی ہدایت پر فرقہ سمانیہ کے مشہور بزرگ حضرت علی قاسم کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور مرشد کے حکم پر خود کو ریاضت و مجاہدہ کی مروجہ شدید مشکلات میں ڈال دیا۔ ایک عرصہ کے بعد مہدی کو اپنے مرشد سے اس بنا پر اختلاف ہو گیا کہ سوڈان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریزوں نے دینی مدارس بند کرا دیئے تھے بلکہ دینی تعلیم سے مسلمانوں کو روک کر جدید انگریزی تعلیم کی ترغیب دینے کے لیے کئی جال پھیلا رکھے تھے۔ ان حالات میں مہدی سوڈانی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو صرف محرابِ منبر کی زینت نہیں بننا چاہیئے، میدان میں نکل کر انگریز کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔ مگر ان کے مرشد خانقاہ سے باہر نکلنے کے مخالف تھے۔ یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ مہدی نے مرشد سے قطع تعلق کر لیا اور اپنے وطن واپس آ کر کچھ عرصہ ایک غار میں قیام کیا۔ طبیعت میں بے نیازی پہلے سے موجود تھی۔ ریاضت و مجاہدہ نے ان کا مزاج اور نکھار دیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے ہمنواؤں کی جماعت پیدا کر لی اور ان کی شہرت سارے ملک میں ہو گئی۔ بڑے بڑے شیوخ اپنی لڑکیاں ان کو نکاح میں دینے پر تیار ہو گئے مگر مہدی کے پاس جو شخص بھی آیا اس نے بیعت لیتے وقت انگریز کے خلاف جہاد کی شرط پہلے منوائی۔ چنانچہ پچاس ہزار مریدوں کو مہدی نے مسلح کیا۔ اور عَلَم بغاوت لہرایا۔ مختلف محاذوں پر مہدی نے انگریز کے خلاف تیرہ جنگیں لڑیں اور ہر لڑائی میں انگریزی فوج کو عبرتناک شکست ہوئی۔ برطانوی قوم کا نامور جرنیل گورڈن بھی شکست کھا گیا اور جب اس کا سر کاٹ کر مہدی کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا کہ اسے عزت و احترام کے ساتھ دفن کر دو۔

۱۸۸۰ء میں مہدی سوڈانی بلاشرکت غیر سوڈان کا حکمران بن گیا اور ۲۲ جون ۱۸۸۵ء کو یہ عظیم انسان دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چالیس ہزار مسلمان اس کے جنازہ میں شامل ہوئے۔ نمازِ جنازہ اس کے جانشین اور داماد خلیفہ عبداللہی نے پڑھائی۔

مہدی کی وفات کے بعد انگریزوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے سوڈان پر پھر فوج کشی کی۔ اس حملہ کا کمانڈر مشہور لارڈ کچنر تھا۔ خلیفہ عبداللہی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر مسلمان اندرونی خلفشار اور جامع ازہر کے علماء کے فتوی کی بنا پر پسپا ہو گئے۔ جامع ازہر کے علماء نے مہدی سوڈانی کی تحریک کو [illegible] اور مہدی کو کافر قرار دے دیا تھا اور انگریز نے اس فتویٰ کو گھر گھر پہنچایا اور [illegible] مولویوں کے ذریعے مہدی کی تحریک کو ناکام بنا دیا۔ یہاں [illegible] کچنر سوڈان پر دوبارہ قابض ہوا تو اس نے مہدی کی قبر کھدوا کر اس کی نعش [illegible] سر [illegible] اور سر کی نمائش کرائی۔ اور اس کے مقبرے کو توپوں کی گولہ باری سے تباہ کر دیا۔ [illegible] جنرل گورڈن کے بھتیجے کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ مزید انتقام لے سکے۔

مہدی نے اپنے دورِ حکومت میں اسلامی شعائر کی تعمیل پر [illegible] تھی۔ [illegible] نماز ادا نہ کرنے والوں کو کوڑے مارے جاتے۔ بلا شرعی عذر کے روزہ نہ رکھنے والوں کو [illegible] دیا جاتا تھا۔ عورتوں کا بازاروں میں پھرنا ممنوع تھا۔ شادی بیاہ کی رسمیں سادہ ترین کر دی گئی تھیں۔ تین سو سوڈانی سکہ سے زائد جہیز دینا بند کر دیا تھا اور حق مہر کی شرح تیس سوڈانی سکہ مقرر کر دی تھی۔ قرآن مجید حفظ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا۔ بڑی بڑی جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ غربا کو بیت المال سے وظیفے ملتے تھے۔

مورخین کا کہنا ہے کہ مہدی کے دورِ حکومت سیدنا فاروق اعظمؓ اور عمر بن عبدالعزیز کے مشابہ تھا لیکن انگریزوں اور ان کے زرخرید ملاؤں نے ان تمام اصلاحات کو ختم کر دیا جو مہدی کے دور میں جاری ہوئی تھیں۔

عبداللہی کی موت کے بعد اس تحریک کا سالار خلیفہ [illegible] مہدی [illegible] تک زندہ ہے لیکن اس تحریک کے ساتھ مسلمانوں نے بعض ایسے عقائد مخصوص کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے مہدی کی تحریک اب خالص مذہبی فرقہ بن چکی ہے۔

چونکہ مہدی کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسن عسکری سے ملتا ہے۔ اس لیے لوگوں نے اسے وہی مہدی سمجھا جس کا تصور کتبِ قدیم میں موجود ہے۔ مہدی کو رہنما و پیشوا ماننے والوں کو درویش کہا جاتا ہے۔ درویشوں کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی یہی ہے جس کا وعدہ الہامی ہے چونکہ مہدی کے والد کا نام عبداللہ، والدہ کا نام آمنہ اور اس کا اپنا نام محمد احمد تھا۔

مہدی کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اب اور کوئی مہدی نہیں آئے گا البتہ اس مہدی کی جاری کردہ تحریک کامیاب ہوگی اور ساری دنیا اس کی ہمنوا ہوجائے گی۔

مہر عرب میں شادی کے لیے رقم پر شوہر دلہن کے والد کو رقم دیا کرتا تھا۔ اس کے بغیر شادی ممکن نہ تھی۔ اس کا کچھ حصہ دلہن کو بھی ملتا تھا۔ آگے چل کر اس نے مہر کی شکل اختیار کی اور اسلام میں یہ لازمی قرار پایا۔ اس کے بغیر نکاح ممکن نہیں اسلام نے مہر کی کم از کم رقم دس درہم مقرر کی۔ زیادہ پر قید نہیں۔ بخاری شریف میں آیا ہے کہ مہر لوہے کی انگوٹھی کو دینے ہوئے بھی نکاح جائز ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے ام سلیم کو پیغام نکاح بھیجا۔ ام سلیم نے انہیں اسلام لانے کو کہا اور کہا کہ یہ "اسلام" ہی میرا مہر ہوگا۔ حضرت ثابت کہتے ہیں کہ میں نے اس سے بہتر مہر نہیں دیکھا۔ مہر کی ادائیگی لازمی ہے۔ نہ دینے والا سزاوار ہوگا حدیث پاک میں اس کا ذکر یوں آیا ہے کہ جو شخص کسی سے مہر پر نکاح کرے اور دل میں اس کی ادائیگی کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ وہ یوم الحشر کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک زانی کی حیثیت سے پیش ہوگا تاہم سورہ النساء میں ہدایت آئی ہے کہ مہر میں باہمی رضامندی کمی بیشی جائز ہے۔ اسی سورہ میں مہر کے بارے میں وسیع ہدایات ملتی ہیں۔ یعنی یہ خوشی سے دینا چاہیے اور ضرور دینا چاہیے۔ اس طرح سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۶ میں آیا ہے کہ اگر ——— تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے قبل طلاق دے دو۔ لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا۔ ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں۔ یا مرد جن کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے اپنا حق چھوڑ دیں اور پورا مہر دیں تو ان کو اختیار ہے۔

مہر کی دو قسمیں ہیں، ایک مہر مسمیٰ اور دوسرا مہر مثل، مہر مسمیٰ کی رقم متعین ہوتی ہے۔ مہر مثل کی رقم حیثیت کے مطابق کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی بھی چیز مثلاً مکان، زمین وغیرہ دی جاسکتی ہے جو بیوی کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔ یہ مہر بسا اوقات شادی کے وقت ہی دے دیا جاتا ہے اور بسا اوقات شادی کے بعد وقت طے ہوتا ہے۔ بسا اوقات منگنی کی روایات میں شامل ہے۔ اسے دو حصوں میں بھی بانٹا جاسکتا ہے۔ یہ معجل اور غیر معجل، مہر معجل کی ادائیگی وقت نکاح ہوتی ہے اور غیر معجل میں وقت کی مہلت دے دی جاتی ہے۔ اسے مؤجل بھی کہتے ہیں۔

اسلام کی رو سے بیوی کا شوہر پر قرضہ ہوتا ہے اور اس کے وصال کے وقت جائیداد کے اخراجات نکالنے کے بعد سب سے پہلے مہر نکالا جاتا ہے اور پھر اور ورثے تا زوجہ وراثت اور ایک تقسیم ہوتی ہے۔

مہر۔ غلام رسول، مولانا (۱۵ راپریل ۱۸۹۵ء - ۱۶ رنومبر ۱۹۷۱ء)

اردو کے بلند پایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز اور فارسی کے اچھے شاعر، عظیم صحافی صاحب نظر مورخ اور صاحب نظر اور نکتہ رس نقاد تھے۔ ترجمے، تصنیف و تالیف اور ترتیب و تدوین میں انہیں کمال حاصل تھا۔

ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد چند سال تک ریاست حیدرآباد (دکن) میں انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

مہر صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۲۱ء میں روزنامہ زمیندار لاہور سے ہوا۔ زمیندار سے ۶ سال تک مدیر کی حیثیت سے ان کا تعلق رہا۔ ۲۰ راپریل ۱۹۲۷ء میں انہوں نے عبدالمجید سالک مرحوم کے ساتھ مل کر اپنا اخبار "انقلاب" نکالا۔ جو ۱۰ راپریل ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے صحافت کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا۔ انشائیہ مقالہ نگاری کا ایک ایسا انداز اختیار کیا جس کی پہلے سے کوئی مثال اردو صحافت میں موجود نہ تھی۔ ان کی صحافت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مسائل کے بارے میں عوام کو معلومات دیں، مسائل کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کی اہمیت اور زندگی پر اس کے اثرات سے آگاہ کیا اور اس طرح اپنے قارئین کو مجرد ایک رائے دینے اور اسے اختیار کرلینے کا مشورہ دینے کی بجائے ان کی ذہنی تربیت کی تاکہ وہ خود رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے کے قابل ہوسکیں۔

۱۹۴۹ء میں انہوں نے صحافتی زندگی کو خیرباد کہا۔ اس کے بعد انہوں نے غالباً کسی اخبار یا رسالے کی ادارتی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اس کے باوجود صحافت سے ان کا قریبی تعلق رہا اور وہ اپنے فکر انگیز مقالات سے قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۱۹۷۰ء جو پاکستان کی قومی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا تھا مولانا نے ایک اخبار میں مستقل طور پر کالم لکھنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ اور ایک مدت تک ملکی، قومی اور عالم اسلام کے مسائل پر ان کی شگفتہ نگاری اور عطر بیز افکار کا سلسلہ جاری رہا، اور تاریخ و سیاست ملی کے سرائر و خفا سے پردے اٹھاتے رہے۔

ادیب، محقق اور مورخ کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ مذہب، سیاست، تہذیب، تمدن، معلومات، علمی، ادبی، مذہبی اور قومی شخصیات، سیرت نبویؐ وغیرہ موضوعات پر ان کی بہت سی اور نہایت بلند پایہ تصنیفات و تالیفات ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمی، ادبی، تہذیبی، تاریخی موضوعات اور وقتی حالات و مسائل پر بے شمار محققانہ اور فکر انگیز مقالات لکھے اور یہ سلسلہ زندگی کی آخری شام تک جاری رہا۔

سو سے زائد مختلف موضوعات پر تصنیفات و تالیفات یا متراجم ان سے یادگار ہیں۔ تاریخ اسلامیانِ ہند پر ان سے بڑا محقق کوئی دوسرا نہیں تھا۔ بیسویں صدی کے سیاسی، علمی، تہذیبی نشیب و فراز کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ نصف صدی تک وہ اس قلزم حوادث و انقلابات کے شناور رہے تھے۔ تاریخ اسلام پر ان کی نظر و عبور کا یہ عالم تھا کہ کسی واقعے کی تفصیلات و جزئیات تک کے لیے انہیں کتاب کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جو کچھ انہوں نے پڑھا تھا یا جو چیز ایک مرتبہ نظر سے گزری تھی وہ حافظے میں محفوظ ہوگئی تھی اور جو کچھ حافظے میں موجود تھا وہ جب اور جس وقت چاہتے زبان یا قلم پر جاری ہوجاتا تھا۔

تاریخ دعوتِ اسلامی اور عزیمت دعوت کے سلسلے میں سیرت امام ابن تیمیہ، سیرت سید احمد شہیدؒ، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین وہ بلند پایہ محققانہ تصانیف ہیں جن کی کوئی مثال اردو ادب میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ کلام اقبال و غالب کی شرحیں نہ صرف تشریحی لحاظ سے بلکہ تنقیدی و ادبی لحاظ سے بھی نہایت اعلیٰ درجے کی کتابیں ہیں۔ مولانا مہر صاحب نے متعدد شخصیات پر کتابوں میں سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے زندگی کے ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ ان کے معیار علم و تحقیق اور ترتیب و تدوین کا پیمانہ ہر جگہ بلند ہے لیکن وہ زیادہ حسن فکر اور حسن سیرت کے عاشق ہیں۔ جہاں انھوں نے فکر و سیرت کو موضوع بنایا وہاں ان کا حسن بیان اور انداز نگارش کمال دلفریبی و دل آویزی کی انتہائی بلندیوں پر ہے۔

شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت زیادہ نہیں اور آخر میں تو ایک مدت سے تصنیف و تالیف اور ترجمے کے مشغولیت میں یہ شوق چھوٹ چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ جس زمانے میں انھیں شعر و شاعری کا شوق تھا ان کا کلام بلند پایہ ادبی رسائل میں چھپتا رہتا تھا۔ شعر گوئی کی خوبی کے علاوہ فارسی اور اردو شعر و ادب کا وہ نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ قدیم اساتذہ کے اردو اور فارسی کے ہزارہا شعر ان کے حافظے میں موجود تھے اور بغیر کسی تامل کے وہ اپنی تحریر اور گفتگو کو دلچسپ اور پُر زور بنانے میں ان سے کام لیتے تھے۔ اردو اور فارسی

کے علم و ادب کے علاوہ عربی اور انگریزی کے ادب و تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ علامہ اقبال مرحوم سے مہر صاحب کو بڑی عقیدت تھی۔ ان سے دوستانہ تعلقات اور ہم مجلسی کا شرف حاصل تھا۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں اور موتمر عالم اسلامی کے اجلاس بیت المقدس میں انھیں علامہ اقبال کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔

مہر صاحب اس سفر کے لیے یکم ستمبر کو لاہور سے نکلے۔ روم، میلان اور پیرس میں ٹھہرتے ہوئے یکم اکتوبر کو لندن پہنچے۔ وہاں علامہ مرحوم کا ساتھ ہو گیا۔ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد مہر صاحب اور علامہ مرحوم روم، نیپلز، سکندریہ اور قاہرہ ہوتے ہوئے بیت المقدس پہنچے جہاں مفتی اعظم فلسطین علامہ امین الحسینی کی صدارت میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اجلاس میں دونوں حضرات نے شرکت کی۔ اس سے فارغ ہو کر ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو دونوں حضرات لاہور واپس پہنچ گئے۔ مہر صاحب مرحوم نے اس سفر کی نہایت دلچسپ، معلومات سے پر اور مفید روداد بھی لکھی جو اسی زمانے میں "انقلاب" میں شائع ہوتی رہی تھی۔

علامہ اقبال کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے کمالات، ان کے افکار، ان کی شاعری، ان کی ادبی و سیاسی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالات اور ان کے کلام کے مجموعوں کی شرحیں انھوں نے لکھی تھیں۔ مولانا مہر صاحب کو غالب سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کی سیرت کی دلربائیوں اور فکر کی دلآویزیوں کے بڑے مداح تھے۔ انھیں غالب کا اردو اور فارسی کا بیشتر کلام حفظ تھا۔ غالب پر ان کی سوانح [illegible] "غالب" کو غالبیات میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ندرت غالب کی [illegible] خصوصاً خطوط کو بنیاد بنا کر لکھی اور اپنی مؤشگافانہ کاوش کا ایک ناقابل فراموش نقش دنیائے ادب میں چھوڑ گئے۔ خطوط غالب اور دیوان غالب کی ترتیب ان کی گراں قدر ادبی کاوشیں ہیں۔ ان کے قلم گہر بار سے دیوان غالب کی ایک شرح "نوائے سروش" لکھی ہے۔ یہ شرح ان کے ادبی ذوق، شعر فہمی، ژرف نگاہی، باریک بینی اور تنقیدی شعور کی یادگار ہے۔ غالب اور اقبال کے علاوہ مہر صاحب مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھے۔ مولانا آزاد سے ان کا پہلا باقاعدہ تعارف ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ جب وہ "حزب اللہ" کے ممبر بنے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب وہ بی اے کے آخری سال میں تھے، مولانا آزاد نے ان کے بارے میں پیش گوئی کی تھی۔

"اگر غفلت طاری نہ ہوئی تو آپ میں اندر عظیم الشان مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب تحریک نظم جماعت کی تو پنجاب میں [illegible] میدان ہموار تھا۔ پنجاب سے جن اکابر علماء اور دیگر شخصیتوں نے اس پر لبیک کہا [illegible] میں مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد ابراہیم سلفی، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا محی الدین قصوری، صوفی غلام مصطفی تبسم وغیرہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مولانا مہر صاحب بھی ان اصحاب نظر و بصیرت میں سے تھے جنھوں نے تنظیم جماعت کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے لیے اپنی زندگی کو پیش کر دیا۔ بیعت کی سعادت انھیں ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوئی تھی۔ مولانا آزاد سے ابتدائے تعارف سے ان کے انتقال تک تقریباً ۴۵ سال رشتہ ارادت و عقیدت قائم رہا۔ اس مدت میں ایسے مواقع بھی پیش آئے جب ملکی اور سیاسی معاملات میں مہر صاحب نے مولانا آزاد کی رائے سے اختلاف کیا لیکن مولانا مرحوم سے ان کے رشتۂ ارادت اور تعلق عقیدت میں کبھی فرق نہیں آیا۔

مولانا آزاد مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک درجن سے زیادہ بلند پایہ اور نہایت لاجواب مقالات لکھے۔ اپنے نام مولانا مرحوم کے مکاتیب کا مجموعہ "نقش آزاد" اور چند مشاہیر کے نام مکاتیب اور مولانا کی بعض تاریخی تحریروں کا مجموعہ "تبرکات آزاد" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ نیز ترجمان القرآن کی تیسری جلد سے متعلق بعض سورتوں و آیات کے تراجم و تشریحات جو مولانا مرحوم کی مختلف تصانیف و تحریرات میں آ گئی تھیں، انھوں نے نہایت محنت اور کاوش سے "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے ترتیب دی تھیں۔

اس کے علاوہ پچھلے کئی سال سے وہ مولانا کے افادات کی ترتیب کا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے سیرت نبوی پر مولانا کی تحریریں ترتیب دی تھیں لیکن اس کی اشاعت سے پہلے وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ یہ کتاب "رسول رحمت" کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔

مولانا مہر مرحوم نے بیرون ملک کے کئی سفر کیے۔

۱۔ ۱۹۲۵ء میں وفد خلافت کے ساتھ جس میں مولانا ظفر علی خان، شعیب [illegible] مولانا عرفان مرحومین اور ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب تھے، حجاز کا سفر کیا۔

۲۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن گئے۔ اسی سفر پر جاتے ہوئے اور واپسی پر یورپ اور افریقہ کے کئی ممالک کی سیاحت کی۔

۳۔ ۱۹۳۴ء میں کابل، غزنی، ورقندھار کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی سفر کے موقع پر خصوصاً مولانا محمد بشیر شہید امیر جماعت مجاہدین سے تحریک جہاد اور سید احمد شہید کی سیرت اور ان کی خدمات پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا جس کے نتیجے میں سیرت سید احمد شہید، جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین ظہور میں آئیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے [illegible] سوات، خدو خیل وغیرہ متعدد مقامات دیکھے جن کا تذکرہ سید احمد شہید کی [illegible] کے سلسلے میں کثرت سے آتا ہے۔

مہمان:- مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں [illegible] اس مہمان کو خوش رکھنے کی تلقین کرے۔ ایک حدیث [illegible] مہمان سے بھی مہمان نوازی کرے۔

اسلام میں بڑے سے بڑے [illegible] جنھیں نظر انداز کرنا کسی کے بس میں نہیں [illegible] باندھ کر مہمان نوازی کی۔

ایک حدیث میں ہے [illegible] اور ایک [illegible] مہمان کی [illegible] جو کچھ توضیع ہوگی وہ صدقہ ہوگی [illegible] ہے وہاں مہمان پر بھی فرض عائد ہوتے ہیں [illegible]

مہینے، قمری: ایک چاند کے طلوع [illegible] تک درمیانی وقفہ کبھی ۲۹ دن اور کبھی ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ یہ وقفہ قمری [illegible] چونکہ ان کا آغاز آپ کی مکہ معظمہ کو ہجرت سے ہوا [illegible] انھیں ہجری مہینے بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقفے میں چاند زمین کے گرد اپنا [illegible] پورا کرتا ہے۔ اپنی گردش کے اٹھائیسویں دن چاند پس منظر میں چلا جاتا [illegible] کبھی دو دن کے وقفے سے ظاہر ہو کر نئے قمری مہینے کا آغاز کرتا ہے [illegible] چاند کو جاں لینے میں سال میں بارہ قمری مہینے ہوتے ہیں [illegible] سال کہلاتا ہے۔ ایک ہجری سال عیسوی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے [illegible] قمری یہ ہیں: محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذی القعدہ اور ذوالحجہ [illegible] سے چلے آتے ہیں۔ کسی اہم واقعے کی بنا پر سال کے نام [illegible]

عیسوی سال کی نسبت سے پہلا قمری دن ۱۶ جولائی ۶۲۲ء کو تھا۔

ان میں چار ماہ محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحج بہت مقدس ہیں۔ قرآن مجید کی سورہ توبہ میں اللہ نے ان ماہ میں لڑائی کی سخت ممانعت فرمائی ہے صرف جہاد کو جائز قرار دیا ہے۔ تمام تہوار قمری مہینوں اور دنوں میں ہی آتے ہیں۔

میاں میر، قادری۔ (وفات ۱۰۴۵ھ/ ۳۶-۱۶۳۵ء)

اصل نام میر محمد تھا۔ سندھ کے قدیم شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے جس میں علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ علوم دینیہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ سے سلسلۂ قادریہ کی تعلیم پائی اس کے بعد علائق دنیوی سے منہ موڑ کر شیخ خضر سیوستانی کے مرید ہوئے۔

۲۵ سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں تلقین و ہدایت شروع کی۔

آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے جو فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ آپ عبادات و ریاضت میں اس قدر منہمک رہتے کہ چالیس سال تک اہل لاہور کو بھی آپ کے لاہور میں قیام کا پتہ تک نہ چلا۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے ہم عصر تھے۔ آپ کے ذریعے ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ شہزادہ دارا شکوہ جس نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفاء کے تفصیلی حالات سفینۃ الاولیاء میں لکھے ہیں، آپ کا بڑا معتقد تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے بھی آپ کا ذکر تزک جہانگیری میں کیا ہے۔ شہنشاہ شاہجہان بھی حضرت میاں میر سے کافی عقیدت رکھتا تھا۔

آپ کا مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ہے جو اس گاؤں کی وجہ سے میاں میر کہلاتا ہے دارا شکوہ نے آپ کا مزار تعمیر کرانا چاہا لیکن اسے مہلت نہ ملی۔ بعد میں اورنگ زیب نے مزار کی تعمیر و تکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب بارہ دری ہے جس میں دارا شکوہ کی رفیق حیات نادرہ کی قبر ہے۔

میّت۔ موت دنیا میں محرک قوت ہے جس نے عمل و فعل کو برقرار رکھا ہے لیکن جب دنیا سے جانے لگے تب بھی اس پر اور قریب موجود افراد پر بہت سے فرائض نافذ ہوتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ کشمکش حیات و موت میں مبتلا فرد کے قریب بیٹھ کر کلمہ طیبہ پڑھو تا کہ وہ بھی پڑھے۔ لیکن اسے کہا نہ جائے کہ کلمہ پڑھے۔ ایک صحابی ابو سلمہؓ کے انتقال کے وقت آپؐ ان کے گھر تشریف لے گئے ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آپ نے بند کرتے ہوئے فرمایا: "جب روح انسان پرواز کرتی ہے تو آنکھیں اسے دیکھتی ہیں۔ اس لیے بعد میں بند کر دینا چاہئیں۔ موت کے وقت آپؐ نے فرمایا، کہ رونا پیٹنا اپنے لیے بد دعا کرنے کے برابر ہے۔ اس وقت خدا سے نیک دعا مانگنا چاہیئے۔ کیونکہ فرشتے موجود ہوتے ہیں اور وہ بھی آمین کہتے ہیں۔

وقت وصال سیدھا لٹا کر منہ قبلے کی جانب کر دینا چاہیئے۔ وقفہ کے بعد کلمہ پڑھنا چاہیئے۔ سورۂ یٰسین بھی موت کی سختی میں کمی کرتی ہے۔ اس کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہیئے جس سے اسے دکھ ہو۔

مرنے کے بعد ہاتھ پاؤں سیدھے کر دینا چاہئیں۔ اگر آنکھیں کھلی ہوں تو بند کر دی جائیں۔ کپڑا ٹھوڑی سے نکالتے ہوئے سر پر باندھ دینا چاہیئے۔ تاکہ منہ کھلنے نہ پائے۔ منہ وغیرہ بند کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (ترجمہ: اللہ کے نام سے اور رسول اللہ کے دین پر) پڑھنا چاہیئے۔ مرنے کے بعد آس پاس خوشبو جلا دی جائے۔

اس کے بعد لمبا تختہ ایسی جگہ بچھایا جائے جہاں سے پانی بہہ کر نکل جائے۔ اس تختہ کے چاروں طرف لوبان وغیرہ کی دھونی دی جائے۔ پھر اس پر مردے کو لٹا کر ناک کان میں روئی رکھ دی جائے۔ تاکہ پانی اندر نہ جانے پائے۔ پھر وضو کرایا جائے۔ بعد از وضو بیری کے پتوں کے ساتھ (اگر بیری کے پتے نہ مل سکیں تو سادہ پانی بھی گرم کیا جا سکتا ہے) پکایا ہوا نیم گرم پانی سے نہانا چاہیئے۔ پہلے مردے کو بائیں کروٹ لٹا کر پھر بائیں کروٹ (تین تین مرتبہ) سر سے پاؤں تک۔ پھر اس کو ذرا بٹھا کر پیٹ آہستہ آہستہ ملا جائے۔ اگر رطوبت نکلے تو دھوئی جائے۔ پھر کافور ملا پانی پورے بدن پر تین مرتبہ ڈالا جائے۔ اب پونچھ کر کفنا دیا جائے۔ کفنانے سے قبل نہ تو ناخن اور بال کاٹے جائیں نہ ہی کنگھی کی جائے۔ کفن میں عورت کے لیے پانچ اور مرد کے لیے تین کپڑے ہیں جن کی ترتیب یوں ہے:

کرتا۔ گلے تا پاؤں۔ ازار (ایک قسم کا تہبند) سر تا پاؤں، چادر اندر سے ایک ہاتھ لمبی۔ سربند، تین ہاتھ لمبا۔ بند، چھاتی تا ران تک۔ مردوں کے لیے صرف کرتا، ازار اور چادر ہے۔ تاہم اگر کوئی بوجوہ پانچ کپڑے نہ دے سکے تو ازار، چادر اور سربند میں کفنانا ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے کرتا، پھر ازار اور پھر چادر بنائی جاتی ہے۔ اس کے دونوں سروں کو ـــ سے باندھ دیا جاتا ہے۔ مرد میّت کے لیے چادر اور افراد میں کفنانا بھی درست ہے۔

میّت کے ساتھ چلنا اور اسے کندھا دینا کارِ ثواب ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے کہ۔ ..."جو شخص جنازے کے ساتھ جائے اور نماز جنازہ بھی پڑھے اور دفن کر کے واپس آئے اسے ثواب کے دو قیراط ملتے ہیں اور جو صرف نماز پڑھ کے واپس آئے اسے ایک۔" (ایک قیراط) اُحد پہاڑ کے برابر ہے)

جہاں سے میّت گزرے، چلنے والوں کو کھڑے ہو جانا چاہیئے اور سواریوں کو سواری سے اتر جانا چاہیئے۔ کیونکہ میت کے ساتھ دو فرشتے پیدل چل رہے ہوتے ہیں۔ میت رکھنے سے قبل جنازے کے منتظر کا رکو بیٹھنا نہیں چاہیئے۔

میتہ لفظ میت کا مونث، وہ جانور جو کھانے کے قابل نہ ہوں، جن میں بلا ذبح مر جانے والے جانور، حرام، یا خدا کے سوا کسی اور کے نام پر حلال کئے گئے، شامل ہیں۔ لیکن مچھلی اور بعض کے نزدیک ٹڈی دل بھی بغیر ذبح کے جائز ہیں، بشرطیکہ زندہ پکڑی گئی ہو۔ مردار جانور کا گوشت صرف اس صورت میں کھایا جا سکتا ہے، اگر تین یوم کا فاقہ ہو لیکن مقدار اتنی ہو کہ صرف جان بچ جائے۔ وہ جانور جو شکار کی نیت سے مارا گیا ہے اور گولی لگ کر پھر کلمہ پڑھنے سے قبل مر جائے۔ تو وہ بھی حلال ہے۔ بشرطیکہ شکاری کے ہتھیار سے مرنے سے قبل اس کا خون نکل گیا ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور اس نے تم پر مردار، لہو اور سور کا گوشت حرام کر دیا ہے۔ اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے (اس کو بھی) ہاں اگر کوئی ناچار ہو جائے، بشرطیکہ گناہ کرنے والا نہ ہو، اور نہ حد سے نکلنے والا، تو خدا بخشنے والا مہربان ہے" (سورۃ النحل ۱۱۵) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہے: "اور یہ کہتے ہیں کہ جو بچہ چارپایوں کے رحم میں ہے، وہ خاص مردوں کے لئے ہے۔ اور ہماری عورتوں کو (اس کو کھانا) حرام ہے۔ اور اگر یہ بچہ مرا ہوا ہے، تو سب اس میں شریک ہیں (یعنی اسے مرد اور عورت سب کھائیں۔) عنقریب خدا ان کو ان کے ڈھکوسلوں کی سزا دے گا۔ بے شک وہ حکومت والا خبردار ہے" (سورۃ الانعام ۱۳۹)

اس کے بعد کہا گیا کہ سمندر کے تمام جانور بغیر حلال کئے کھائے جا سکتے ہیں۔ جبکہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے مطابق صرف وہ جو پانی کی سطح پر رہتے ہیں، قرآنی آیات میتہ کی مزید تشریح یوں کرتی ہیں:

"تم پر مرا ہوا جانور اور بہتا ہوا لہو، اور سور کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کوئی اور نام پکارا جائے، اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے، اور جو چوٹ لگ کر مر جائے، اور جو گر کر مر جائے، اور جو سینگ لگ کر مر جائے، یہ سب حرام ہیں۔ اور وہ جانور جس کو درندے پھاڑ دیں، مگر جس کو تم مرنے سے پہلے ذبح کر لو۔ اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے، اور یہ بھی کہ پاسوں سے قسمت معلوم کرلو، تو یہ سب گناہ کے کام ہیں۔" (سورۃ المائدہ ۳)

میثاق قول وقرار، معاہدہ، وعدہ۔ جمع مواثیق۔ بالعموم ایسے معاہدوں کے لئے استعمال ہوتی ہے، جو سیاسی نوعیت کے ہوں۔ اسلام میں میثاق ہوتے رہے ہیں، جن میں نبی اکرمؐ بھی شریک رہے ہیں۔ رسول مقبولؐ نے اس کے بہت سے اصول بھی فرمائے ہیں۔ مثلاً دوران معاہدہ دوسرے پر برداشت سے زائد بوجھ ڈالنا، یا معاہدے سے پھرنا، یا اس کی خوش دلی کے بغیر اس سے کچھ لینا، ان تمام باتوں سے منع فرمایا ہے، اور کہا ہے کہ معاہدہ میں ایسے فعل کرنے والوں کے خلاف بروز قیامت میں وکیل ہوں گا۔ یہی بات اسلامی تاریخ کے تمام مواثیق میں ملتی ہے۔ آپؐ نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہ تو خود کی، اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان کو کرنے کی تلقین فرمائی، بلکہ غزوہ نضیر ایک میثاق کو پورا کرنے کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے "وعدہ خلافی کی، وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں۔" اسی طرح ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو قوم عہد شکنی کرتی ہے، اس پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔

میثاق و وعدہ کا ذکر سورہ اعراف کی آیت ۱۷۲ میں بھی آیا ہے۔ جس میں اللہ تعالٰی نے کہا ہے "اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدمؑ سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی، تو ان سے خود ان کے بارے میں اقرار لیا۔ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں وہ کہنے لگے، کیوں نہیں۔ ہم گواہ ہیں (کہ تو ہمارا پروردگار ہے) یہ اقرار اس نے کرایا تھا کہ قیامت کے دن کہیں یوں نہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی بھی خبر نہیں"۔ یعنی اللہ تعالٰی نے اس بارے میں کل کائنات کے انسانوں سے وعدہ و میثاق لیا تھا۔ اس کی مزید وضاحت سورۃ الاحزاب میں کی گئی ہے۔ "اور جب ہم نے پیغمبروں سے میثاق لیا، اور تم سے۔ اور نوحؑ سے اور ابراہیمؑ سے اور موسٰیؑ سے، اور مریم کے بیٹے عیسٰیؑ سے اور میثاق بھی ان سے پکا لیا۔"

نظریۂ میثاق سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کچھ نہیں تھا۔ تو خدا تھا، اور ایک عابد اپنے آپ میں دفن ہو کر ذات حق تعالٰی میں اپنا وجود پا سکتا ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے کہ "میرا بندہ اعمال نافلہ کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ میرا محبوب بن جاتا ہے۔ پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں۔ جس سے کہ وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ جس سے کہ وہ دیکھتا ہے" یعنی جب مومن حقیقی توحید پا لیتا ہے، تو وہ وجدانی حالت میں چلا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالٰی اسے انسانی صفات سے عاری کر دیتا ہے۔

نظریۂ میثاق پر فلاطین کا قول ہے کہ دنیا میں موجودگی سے قبل ہمارا اک وجود تھا۔ جہاں ہم موجودہ حالت سے الگ کوئی چیز تھے۔ ہم خالص روح تھے۔ ہماری عقل و فہم اس کے ساتھ بندھی تھی، جو حقیقی حقیقت" ہے۔ اور اس وجود کلی سے جڑی تھی، اور ہماری موجودہ حیثیت "اصل" وجود کا عکس ہے۔ اور یہ نو فلاطونی افکار حضرت جنیدؒ کے افکار سے ملتے ہیں۔

میر ابراہیم سیالکوٹیؒ (۱۸۷۴ء۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء) اہل حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے خلاف مناظروں میں حصہ لیتے رہے۔ وعظ بہت پر تاثیر ہوتا تھا اور تحریر بھی بڑی پختہ اور مدلل تھی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں انہیں بطور خاص تقریر کے لیے بلایا جاتا تھا۔ متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ خصوصاً تفسیر سورۃ فاتحہ، تفسیر سورۃ کہف۔ نیز بعض دوسری سورتوں کی تفسیر۔

میراث وراثت، جائداد۔

قانون وراثت علم المیراث کہلاتا ہے۔ قرآن کریم کی وہ آیات جن پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے "آیات المواریث" کہلاتی ہے۔

وراثت کے لئے کسی قانونی اور مخصوص رشتے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ غلام میراث کا وارث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلامی فقہ کی رو سے مسلمان کسی منکر کو بھی وارث مقرر نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میراث میں سے پہلے جنازے کے اخراجات، پھر قرضے منہا کر لئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچے، اس کے ایک تہائی میراث بمطابق وصیت تقسیم کر دی جائے۔ کوئی وصیت نہ ہونے کی صورت میں اصحاب الفرائض کو مال کی تقسیم میں فوقیت دی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہوں تو عصبات میں تقسیم ہو گا۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو ذوی الارحام میں تقسیم ہو گی۔ نیز دیکھیں اصحاب الفرائض۔

میرانیس (۱۸۰۱ء۔ ۱۸۷۴ء) اردو کے مرثیہ گو شاعر۔ ببر علی نام۔ انیس تخلص تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے، میر حسن دہلوی (صاحب مثنوی سحر البیان) کے پوتے تھے۔ جد [illegible] دہلی سے [illegible] آئے۔ لیکن زمانے کی ناسازگاری نے [illegible] ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ پہلے فیض آباد گئے پھر لکھنؤ آ کر بود و باش اختیار کی۔ میر انیس کی [illegible] فیض آباد میں ہوئی۔ مولوی حیدر علی اور مفتی میر عباس سے عربی فارسی کی [illegible] تعلیم بھی اسلاف سے حاصل کی۔ [illegible]

[illegible] لیتے تھے۔ [illegible] اٹھارہ سال کی عمر میں والد کے ارشاد پر مرثیہ گوئی کی طرف توجہ دی [illegible] چار چاند لگا دیے۔ اپنے بیٹے میر نفیس کی ولادت کے [illegible] لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اور جب تک لکھنؤ آباد رہا کہیں باہر نہیں گئے۔ [illegible] مرثیہ پڑھنے عظیم آباد گئے اور پھر ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ کے اصرار پر [illegible]

حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔

میر انیس نے آلِ رسولؐ کے مدّاح کی حیثیت سے اردو شاعری میں وہ ناموری حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے اردو زبان میں منظر نگاری کو درجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ فارسی تراکیب کی دل نشینی، زبان کی صفائی، بیان کی سادگی اور خیالات کی نفاست و نزاکت ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ وہ اپنے کلام میں تازہ تشبیہات و استعارات بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں رزمیہ شاعری کی کمی پوری کی۔ سلام اور رباعیوں کا شمار نہیں۔ مرثیوں کی پانچ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء لکھنؤ میں انتقال ہوا اور اپنے سکونتی مکان واقع محلہ سبزی منڈی میں دفن ہوئے۔

میزان ایک اصطلاح جو اسلام میں روزِ محشر کو اعمال کی جانچ کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ پیمانہ جس پر اعمالِ انسان کو تولا جائے گا۔ اور اس کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دی جائے گی۔ مفسرین اس بارے میں اختلافی رائے دیتے ہیں، یعنی آیا کہ واقعی ترازو گی، یا یہ محض استعارۃً استعمال ہوا ہے۔ اور اس کا مفہوم جانچ ہے۔ سورہ الانبیاء (۴۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہو گا۔ تو ہم اس کو وہ موجود کریں گے۔ اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔" عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ یوم القیامت تمام انسانوں کی موجودگی میں مسلمانوں کے سامنے ایسی ۹۰ بھاری کتب لائے گا۔ ہر کتاب اتنی طویل ہو گی کہ حدِ نظر تک نظر آئیں گی۔ پھر خدا کہے گا، کیا تم ان میں کسی بات سے انکار کرتے ہو۔ کیا میری طرف سے لکھنے والوں نے تمہیں نقصان پہنچایا؟ مسلمان جواب دے گا: "اے میرے خدا۔ میں ان میں کسی بات سے انکار نہیں کرتا، تو خدا پوچھے گا، کیا تمہیں کوئی شکایت ہے۔ تو وہ کہے گا: نہیں میرے رب۔ خدا جواب دے گا کہ میرے پاس تمہارے لئے نیک چیزیں ہیں۔ اور اس دن کوئی امتحان نہیں ہو گا۔ اس کے بعد خدا اپنے سامنے کاغذ کا ایک ٹکڑا لائے گا جس پر لکھا ہو گا: کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا میں تیرے سوا کوئی رب نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ تیرے بندے اور رسول ہیں۔ پھر خدا کہے گا۔ جاؤ اپنے اعمال تولو۔ انسان جواب دے گا کہ اتنی بڑی بڑی کتابوں کے سامنے اس کی کیا وقعت ہے۔ پھر خدا کہے گا، یہ بھاری ہے، اسے تولو۔ پھر کتابیں اور پرچہ دو اطراف میں میزان کے ڈالے جائیں گے، اور کتابیں ہلکی ہوں گی۔ مفسر کہتے ہیں کہ میزان جبرئیلؑ تھامے ہو گا، اور یہ بہت بڑی ہو گی۔ اس کا ایک پلڑا جنت پر اور دوسرا جہنم پر ہو گا۔ جس کے اچھے اعمال بھاری ہوں گے، وہ بچا لیا جائے گا، اور بُرے اعمال والا سزا دار ہو گا۔

میسر جوا، قمار، پیسے یا کوئی چیز لگا کر شطرنج، تاش وغیرہ کھیل یا کوئی اور ایسا ہی کام جیسے گھوڑ دوڑ پر روپیہ لگانا، لاٹریاں، قرعہ یا فعال نکلوانا۔ اس سے ایمان خراب ہوتا ہے، پیسہ برباد ہوتا ہے، اسلام میں ایسے کام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

اس نام کی ایک کھیل ہوتی تھی جو اسلام سے قبل عرب میں رائج تھی جس میں ایک مویشی کے دس یا اٹھائیس حصے کر کے تیروں کے ذریعے تین آدمیوں میں بانٹا جاتا تھا۔ دس میں سے آخری تین کو کچھ نہیں ملتا تھا۔

قرآن مجید (دو بنی انسانیت) نے شراب، بت پرستی جیسے بڑے گناہوں کے ساتھ اسے بھی حرام قرار دے کر سخت قابلِ سزا کہا ہے۔

میسرہ حضرت خدیجہؓ کا آزاد کردہ غلام اور انہی کی تجارت کا مہتمم، جب حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ پُرنور کو غرضِ تجارت سے شام بھیجا تو یہ آپؐ کا ہمسفر رہا۔ راستے میں نسطورا نامی عیسائی نے میسرہ سے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں۔ میسرہ نے جواب دیا۔ اہلِ قریش اور ہمارے سردار اس پر عیسائی پادری نے کہا: "بے شک، یہ سارے جہان کے سردار ہوں گے۔ اس نے کہا بے شک یہی وہ ہیں جو نبیؐ آخر الزمانؐ ہوں گے، کیونکہ ان کی آنکھوں میں عجیب سرخی ہے اور سوائے نبی کے، اس درخت کے نیچے اور کوئی نہیں بیٹھا۔ اس نے تاکید کی کہ میسرہ انؐ کے ساتھ رہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق یہ دورانِ سفر ہر دم آپؐ کے ساتھ رہا۔

میسور جنوب مغربی بھارت کی ایک ریاست بنگلور اس کا دارالحکومت ہے۔ رقبہ ۷۴۱۲۲ مربع میل آبادی تقریباً ڈھائی کروڑ۔

اس نام کا ایک علاقہ مدارس پریذیڈنسی اور بمبئی پریذیڈنسی کے درمیان میں واقع ہے مغرب میں کوہستانی علاقہ ہے۔

زیادہ حصہ میدانوں اور وسیع وادیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں بڑے پیمانے پر آبپاشی کی جاتی ہے۔ بالخصوص دریائے کاویرد کے ذریعے یہاں سونے کی کانیں اور ہیڈرو الیکٹرک ورکس ہے پہلی میسور یونیورسٹی ۱۹۱۶ء میں قائم ہوئی۔

آبادی کی اکثریت کا گزارا گنا، چاول، باجرہ وغیرہ کی کاشت پر ہے۔ انگریزوں کی جابرانہ حکمتِ عملی سے قبل یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے اسے بڑی ترقی دی۔ ۱۷۹۹ء میں یہ ٹیپو سلطان سے انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کا الحاق بھارت سے ہو گیا۔ مگر ۱۹۵۶ء میں دوبارہ یہاں کا الگ وطن بنا دیا گیا۔ یہاں کے قلعے بہت مشہور ہیں۔

انگریزوں نے مسلمانوں سے چھیننے کے لیے متعدد بار حملے اور دوسری حکمت عملیاں استعمال کیں۔ اس دور میں مختصر سے وقفے کے بعد مسلمانوں پر چار جنگیں مسلط کی گئیں ابتدائی دو جنگیں سلطان حیدر علی اور آخری دو جنگیں، ۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو باپ کے انتقال کے بعد ٹیپو سلطان شہید نے لڑیں۔

میسور کی پہلی لڑائی والیٔ میسور سلطان حیدر علی کے خلاف انگریزوں اور مرہٹوں اور نظام نے قائم کر کے ۱۷۶۵ء کو میسور پر حملہ کر دیا۔ اسی دوران سلطان مرہٹوں کو روپیہ دے کر انگریزوں سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر انگریز اور نظام جو ان خرابے پر تلے ہوئے تھے۔ اپریل ۱۷۶۷ء میں نظام نے انگریز جرنل جوزف سمتھ کے ساتھ میسور پر ایک بار پھر حملہ کیا۔ سمتھ نے درۂ چنگلہ اور ترنولی کے مقام پر سلطان کو شکست دی لیکن حیدر علی نے جنگ جاری رکھی۔ بمبئی کی فوج کو شکست دے کر منگلور واپس لے لیا۔ مدراس اس کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے قدموں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر رہ گیا تو ۴ اپریل ۱۷۶۹ء میں انگریزوں نے سلطان کے ساتھ معاہدہ کر لیا جس کے تحت طے پایا کہ میسور پر حملے کی صورت میں انگریز سلطان کی مدد کرے گا۔ اور طرفین ایک دوسرے کے علاقے مع جنگی قیدی وغیرہ واپس کر دیں گے۔

میسو کی دوسری لڑائی مرہٹوں نے ۱۷۷۱ء میں ایک بار پھر میسور پر حملہ کیا۔ خلاف معاہدہ انگریز سلطان کی مدد کو نہ آئے۔ اس کا بدلہ وہ کسی مناسب وقت پہ لینا چاہتا تھا۔ یہ موقع اسے اس وقت ملا جب بمبئی کی بندرگاہ فرانسیسیوں کے تصرف سے انگریزوں نے ۱۷۷۹ء میں اپنے قبضے میں لے لی۔ اس واقع کے ایک سال بعد ۱۷۸۰ء میں سلطان نے مزا چکھانے کے لیے اعلان جنگ کر دیا۔ اس کی اسّی ہزار فوج اور سو توپوں نے ناٹک کو نیست و نابود کر دیا۔ کرنل بیلی شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ وائسرائے ہند وارن ہیسٹنگز کمانڈر انچیف سر آئر کوٹ کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ اس نے سازشانہ چال چلتے ہوئے راجہ برار اور نظام کو سلطان کے خلاف کر لیا اور ۱۷۸۱ء میں پورٹو نووو (PORTONOVO)

کے مقام پر حیدر علی کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ نومبر ۱۷۸۱ء میں ناگا پٹم پر بھی قابض ہو گیا۔

۱۷۸۲ء کے آغاز میں فرانسیسی فوج کا آبی دستہ امیر البحر سفرن کی زیر کمان سلطان میسور کی مدد کو آ گیا۔ اسی سال سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے تخت سنبھالتے ہوئے جنگ جاری رکھی۔ آخر مارچ ۱۷۸۴ء میں معاہدہ بنگلور طے پایا جس کی رو سے مفتوحہ علاقے اور قیدی واپس کر دیئے۔

میسور کی تیسری لڑائی

۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء کو ٹیپو سلطان نے ٹراونکور پر حملہ کر دیا۔ معاہدہ بنگلور کی رو سے راجہ ٹراونکور نے گورنر مدارس جان ہالینڈ سے امداد طلب کی، جو بر وقت امداد نہ دے سکا۔ اس دوران لارڈ کارنوالس LDKCORNWASS ۴ جولائی ۱۷۹۰ء کو مرہٹوں اور نظام سے ساز باز کر کے سلطان ٹیپو سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب ٹیپو سلطان نے جنرل میڈوز کو شکست دی تو کارنوالس نے دسمبر ۱۷۹۰ء میں فوج کی کمان خود سنبھالتے ہوئے ۲۱ مارچ ۱۷۹۱ء کو بنگلور پر قابض ہو گیا۔ وہ ٹیپو کے پایۂ تخت سرنگا پٹم سے صرف نو میل دور وادی کرہ کے مقام تک پہنچ گیا۔ بعد میں موسم برسات کی بنا پر واپس چلا گیا۔ ۵ فروری ۱۷۹۲ء میں دوبارہ سرنگا پٹم پر حملہ آور ہوا۔ ٹیپو، انگریزوں، نظام اور مرہٹوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چنانچہ صلح کی پیش کش کی۔ اس کے نتیجے میں اس سال مارچ میں ایک عہد نامہ طے پایا۔ عہد نامہ سرنگا پٹم کی رو سے سلطان نے مالابار، بارہ محل اور ڈنڈیگل کے علاقے انگریزوں کو دریائے کرشنا سے دریائے پناسکی کے علاقے نظام کو، اور کچھ علاقے مرہٹوں کو تاوان کے طور پر۔ ۳۰ لاکھ پونڈ بھی سلطان کو ادا کرنا پڑے۔

میسور کی چوتھی لڑائی

ٹیپو سلطان اپنے مقبوضہ علاقے واپس لینا چاہتا تھا۔ حصول مقصد کے لیے اس نے فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کیا۔ اپریل ۱۷۹۸ء میں کچھ فرانسیسی اس کی مدد کو آئے۔ لارڈ ولزلی موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ مرہٹوں اور نظام کو ایک بار پھر اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۷۹۹ء کے مارچ میں ٹیپو سلطان سدہ سیر کے مقام پر جنرل سٹارٹ اور ملاولی کے مقام پر جنرل ہیرس سے شکست کھا کر قلعہ سرنگا پٹم میں محصور ہو گیا۔ انگریزوں نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کی تقسیم شروع کر دی۔ انہوں نے شمال مشرقی حصہ نظام کے حوالے کر دیا۔ کوئمبٹور، کنارا، ورٹناورا اور سرنگا پٹم اپنے پاس رکھے اور باقی علاقہ ریاست میسور کے پرانے ہندو خاندان کے ایک راجکمار کے حوالے کر دیا۔

ٹیپو سلطان جنگ میں لڑتے لڑتے راہی ملک عدم ہوا۔ انگریزوں نے اس کی لاش دیکھ کر کہا ”آج ہندوستان ہمارا ہے۔“

میسین، لوئیس مشہور فرانسیسی مؤرخ اور مستشرق بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ کوپن ہیگن، تہران، ایمسٹرڈم، ہیلسنکی، کابل اور تہران کی رائل اکادمیوں کے ممبر ہیں۔ علاوہ رائل ایشیا، لندن، امریکہ اور نیشنل سوسائٹی اور ایشیا کی سوسائٹی کے ممبر بھی ہیں۔ آپ کی اکثر تصنیفات اسلام پر ہیں۔ اسلام کا صوفی شہید الحلاج، دیوان حلاج، مباہلہ وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیکسٹ آرگین کی مشہور تصنیف مستقبل اسلام میں مشرق وسطیٰ سے متعلق ایک باب بھی آپ کا لکھا ہوا ہے۔

میقات حرم کعبہ کے وہ مقامات جہاں سے ہر حاجی کے لئے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ حضرت محمدؐ کے زمانے میں یہ پانچ تھے۔ بعد میں سہولت کے لئے ایک کا اضافہ کر دیا گیا۔

یمن کی طرف سے حج کو جانے والے یلملم کے مقام پر احرام باندھتے ہیں۔ مدینہ سے آنے والوں کے لئے ذوالحلیفہ۔ نجد سے آنے والوں کے لئے قرن۔ شام اور مصر سے آنے والوں کے لئے جحفہ اور عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے اور مشرق کی طرف سے حاجیوں کے لئے ابراہیم المرثیہ مقامات میقات ہیں۔ یہ حدود ایام حج یعنی دو مہینے دس دن کے لئے ہے۔ شوال سے ذوالحج کے ابتدائی دس دن تک ان حدود کے باہر جو لوگ آتے ہیں، وہ آفاقی کہلاتے ہیں۔ جو حدود میقات اور حرم شریف کے درمیان رہنے والے اہل حل کہلاتے ہیں۔ ان کو بھی احرام باندھنا پڑتا ہے۔ یعنی اہل حل اور اہل میقات کے لئے حل کی ساری زمین میقات ہے۔ مکہ کے لئے حرم کی ساری زمین میقات ہے۔ احرام کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے نے ایک روایت کے مطابق فرمایا: جو کوئی بھی حج وغیرہ کی غرض سے مسجد اقصیٰ سے مسجد الحرام تک احرام باندھے گا، اس کے ماضی و مستقبل کے گناہ بخشے جائیں گے۔

میقات مقررہ ”درست وقت“ اس معنی میں یہ اصطلاح سورۂ اعراف ۱۴۲، ۵۵ سورۂ شعراء ۳۸ میں آئی ہے۔

اسلامی فقہ اور قرآن عظیم میں نمازوں کے اوقات کے معنوں میں ہی آئی ہے۔ سورہ البقرہ ۲۳۸، سورہ ہود ۱۱۴، سورۃ النور ۵۸ وغیرہ مختلف نمازوں کے

اوقات ولوازمات کا تعین کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی نمازوں کے اوقات حتمی طور پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پہلے دس برس میں مکمل ہو سکے۔
پہلے ظہر کی نماز دوپہر کے وقت پڑھی جاتی تھی۔ عصر کی ظہر کے کچھ دیر بعد۔
۳۔ مغرب کی نماز، سورج غروب ہونے کے فوراً بعد۔
۴۔ نماز عشاء کی روشنی غائب ہونے کے بعد۔
۵۔ فجر، سورج نکلتے وقت۔
بعد میں ان کے اوقات بدل گئے، اور
۱۔ ظہر، دوپہر کے وقت۔
۲۔ عصر، تقریباً تیسرے پہر۔
۳۔ مغرب، سورج کے دھندلکے خاتمے کے بعد۔
۴۔ عشاء، رات کے پہلے پہر کے گزرنے کے بعد۔
۵۔ فجر، تقریباً سورج نکلتے وقت۔
اب فقہ نے جو اوقات مقرر کئے ہیں، وہ یوں ہیں:
ظہر: جب سورج غروب ہونا شروع کرتا ہے، سے لے کر اس وقت تک، جب تک اشیاء کے سائے اپنی اشیاء کے برابر بنتے ہیں۔
عصر: ظہر کے آخری وقت سے سورج غروب ہونے تک۔
مغرب: سورج کے غروب ہونے کے بعد سے آسمان کی سرخی و پھیلاہٹ ختم ہونے تک۔
عشاء: مغرب کی نماز کے آخری وقت سے آدھی رات، صبح صادق تک بھی پڑھی جا سکتی ہے۔
فجر: صبح صادق سے دن چڑھنے تک۔

میکائیلؑ ۔ چار بڑے فرشتوں میں سے ایک۔ حضرت جبرائیلؑ کے بعد حضرت میکائیلؑ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ لوگوں کو رزق پہنچاتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جو اس کے نبی کا، فرشتوں کا، جبرائیل کا، میکائیلؑ کا، دشمن ہے اللہ اس کا دشمن ہے۔ سورہ بقرہ اس سورہ میں اس کا نام میکال آیا ہے۔ اس کی تشریح میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک میں بتایا گیا ہے کہ ایک یہودی نے آپؐ کی سچائی دیکھنے کے لیے متعدد سوال کئے۔ جن کے درست جوابات ملے۔ آخر میں اس نے پوچھا کہ یہ آپؐ تک کس نے پہنچائے۔ آپؐ نے کہا: حضرت جبرائیل نے۔ یہودی یہ سن کر ناراض ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یہ جبرائیل ہمارا دشمن ہے۔ اگر میکائیل جو ہمارا دوست و مونس ہے پہنچاتے تو ہم آپ کی صداقت پہ ایمان لے آتے۔ دوسرے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ مدینہ میں ایک یہودی سے جبرائیلؑ اور میکائیلؑ کی اہمیت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ جبرائیل اللہ کے دائیں ہاتھ اور میکائیل بائیں ہاتھ بیٹھتا ہے۔ دونوں میں سخت عداوت ہے۔ مگر ان باتوں کے برعکس عیسائیت میں بھی میکائیلؑ اور جبرائیل دونوں کو برگزیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ ڈینیل میں جبرائیل کو عظیم شہزادہ اور اسلام کے محافظ کے طور پہ یاد کیا گیا ہے۔ انجیل کی روایت کے مطابق یہ بنی نوع انسان کے محافظ ہیں۔ جب اللہ نے انسان بنانے کے بعد فرشتوں کو سجدوں کا حکم دیا تو سب سے پہلے حضرت جبرائیل اور پھر حضرت میکائیل نے ہی سجدہ کیا۔

میلاد النبی: ۔ نبی کی پیدائش کا دن، بارہ ربیع الاوّل۔ خوشی کا یہ دن خصوصی اجتماعات اور دینی محفلوں کے انعقاد کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ان میں نعتیں پڑھی جاتی ہیں اور حضور پاکؐ کی مداح سرائی کی جاتی ہے۔ جن کی شخصیت اللہ تعالیٰ کے تمام کاموں کو پھیلانے اور اُن کی ترویج و ترقی کے لئے بڑی پُرکشش تھی۔
قدیم تاریخوں میں یہ دن مصر و ترکی میں منایا جاتا تھا۔ وہاں سے اس کا آغاز ہندوستان کے چند علاقوں میں، سنٹرل ایشیاء کو چھوڑ کر ہوا۔
یہ ذکر خطیبوں، محفلوں کے انعقاد کے ساتھ ہندوستان آیا۔ مسٹر لین اپنی تصنیف "جدید مصر" میں ذکر کی محفلوں میں پڑھا جانے والا ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔
"اے خدا، آنے والی نسلوں میں بھی محمدؐ کو سرخرو کر، اُن پہ رحمتیں نازل کر، ہر زمانے اور ہر دور میں، اور انہیں شدید ... تنور ... بادشاہوں میں بھی سرخرو کر، یوم الحشر کو۔ اور تمام زمین اور آسمان پہ تمام نبیوں اور رسولوں کو اپنی رحمت میں داخل کر (جن کے ناموں پہ رحم مانگا جائے گا۔) ہمارے ماسٹر اور ہمارے آقا محمدؐ سے تو خوش رہ۔ اور وہ چار جو متاثر کن شخصیت کے مالک تھے، ابوبکر، عمر، عثمان، علی اُس کے پیارے انسان تھے۔
خدا ہماری، تو ہماری سرپرستی کو کافی ہے۔ اور تجھ سے بڑی طاقت کوئی قوت نہیں۔
اے خدا ہمارے مالک، رحم کر۔ رحم پروردں سے بھی زیادہ رحم پرور، آمین"
قیام پاکستان کے بعد سے عید میلاد النبی پورے پاکستان بھر میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں قرآت اور نعت خوانی ہوتی ہے۔ مسجدوں میں خصوصی اجتماع اور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔
مسلمانوں میں یہ عید کے طور پہ منائی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش مناتے ہیں۔ اس روز جشن ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں، چراغاں ہوتے ہیں اور لوگ اسوۂ حسنہ پہ عمل کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اس روز ملک بھر میں عام تعطیل ہوتی ہے۔

میلین اخضر یہ صفا و مروہ کے درمیان دو ستون ہیں۔ جو قدرے فاصلے پر ہیں۔ یہاں پہنچ کر حاجی ایک ستون سے دوسرے ستون تک عام رفتار سے قدرے دوڑ کر گزرتے ہیں۔

میمن جماعت: ۔ اہل سنت کی تبلیغی جماعت، جس نے زیادہ تر کاٹھیاواڑ میں کام کیا۔ اہل میمن کا بیان ہے کہ حضرت عبدالقادر شاہ جیلانی نے اپنے بیٹے تاج الدین کو سندھ جا کر تبلیغ کرنے کو کہا۔ وہ خود ایسا نہ کر سکے۔ اُن کی نسلوں نے یہ فرائض پورے کیے۔ اور ایک بزرگ سید یوسف الدین قادری ۱۴۲۱ء میں عراق سے سندھ آئے۔ اور ٹھٹھہ کو، جو اُن دنوں صدر مقام تھا۔ اپنا مسکن بنایا۔ جلد ہی لوہانہ خاندان کو اسلام کی جانب مائل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کو آج بھی لوہانہ ذاتوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سندھ کے ہندو تجارت پیشہ افراد بھی اسلام پہ ایمان لائے۔ میمن انہی کی نسلوں سے ہے۔
سید یوسف الدین کے واپس عراق چلے جانے پہ اُن کے جانشینوں نے [illegible] بنایا۔ یہ پیش کش انہیں کاٹھیاواڑ کے راجہ نے کی تھی۔

میواڑ راجپوت ریاستوں کا اہم شہر ۷۲۸ میں بپا راول نے آباد کیا۔ مسلمان فاتح اس پر شدت سے حملہ آور ہوتے رہے۔ ان کے حملوں کو روکنے کے لئے وہاں کے راجوں مہاراجوں نے بھی بندوقوں کا ساتھ دیا۔ بعد میں علاء الدین کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت یہاں سلطان ہمیر کی حکومت تھی۔ اس کے بعد حکومت اس کے خاندان کے دوسرے افراد میں منتقل ہوتی رہی۔ ایک حکمران لکش رانا، دوسرے راجپوتوں کو شکست دیتا ہوا "بگھیا" تک اپنی سلطنت بڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔

بعد کے اہم حکمرانوں میں رانا کیباہ یا کمبھ کرنا (۱۴۶۸-۱۴۳۳ء) کا نام آتا ہے۔ جس نے مالوہ اور گجرات کے حکمرانوں کو شکست دی، اور گرفتار کر کے CHITOR لے آیا۔ اس فتح کی خوشی میں اس مقام پر اس نے "مینار فتح" تعمیر کرایا۔

۱۵۲۷ تا ۱۵۰۸ تک اس پر رانا سنگھ کی حکومت رہی۔ جس کی زندگی جنگ و جدل میں گزری۔ بابر اور لودھی کی جنگ میں اس نے بابر کی حمایت کی۔ کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ ملکی علاقوں پر قوم ہی کی بادشاہت رہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ بابر لودھی سے جنگ جیت کر خود بھی یہاں سے چلا جائے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ بابر کا ملک چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں، تو اسی ہزار گھوڑوں، پانچ سو ہاتھیوں اور پٹھان اور میواتی راجپوتوں پر مشتمل کثیر فوج کے ساتھ بابر کو چیلنج کر دیا۔ فتح پور سیکری کے قریب "خانوہ" کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ بابر جنگ جیت گیا۔ اور ان کو فرار ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ جنگ کے بعد وہ جلد ہی چل بسا۔

تاہم یہاں کے راجوں نے شکست تسلیم نہ کی۔ راجہ پرتاپ چند (۱۵۷۲-۱۵۹۷) اور راجہ امر سنگھ (۱۵۴۷-۱۶۲۰) مغلوں کے خلاف رہے۔ لیکن ۱۶۱۵ میں ان کا جہانگیر سے معاہدہ ہو گیا۔

مالوہ حکومت کے انتشار کے بعد میواڑ کی مصوری بہت مشہور ہوئی۔ جس میں مالوہ مصوری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

میمون بن مہران

میمون بن مہران (۴۰ھ – ۱۱۷ھ) کوفہ کی ایک ازدی عورت کے غلام تھے، بعد میں اس نے آپ کو آزاد کر دیا۔ عرصہ تک کوفہ میں رہے مگر ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن اشعث کی شورشوں سے تنگ آکر جزیرہ چلے گئے اور وہیں رہائش اختیار کی۔

محمد بن مروان کے زمانے میں خراسان کے بیت المال کے نگران تھے۔ بعد میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں جزیرہ کے خراج کا عامل بنا دیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات پر انہوں نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ حدیث کے حافظ تھے، فقہ اور عمل و فعل میں بھی بہت ممتاز تھے۔

میمونہ :- نبی کریمؐ کی زوجہ محترمہ۔ آپ قبیلۂ ہوازن کے الحارث کی صاحبزادی اور حضرت عباس کے رشتے کی بہن تھیں۔ آپ اپنے شوہر ابو رہم کی وفات کے بعد مکہ میں رہنے لگیں جہاں سرورِ مقبولؐ سے آپ کی ملاقات ہوئی۔

رسول کریمؐ سے آپ کی شادی مکہ کے شمال مغربی گاؤں سیرف میں ہوئی۔ یہاں ولی کے طور پر آپ کے بھائی حضرت عباس پیش ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ۵۰۰ درہم شادی کا تحفہ تھے۔

آپ نے ۶۱ھ — ۶۸۱ء میں سیرف ہی میں انتقال فرمایا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کا مدفن عین اس جگہ ہے جہاں آپ کی شادی ہوئی۔

میمونیہ (۱۶۶ھ) - اس فرقہ کا بانی اہواز کا باشندہ عبدالرحمٰن بن میمون تھا۔ اس نے تلاش امام کے لیے سفر اختیار کیا۔ ان دنوں اسماعیلیوں کے درمیان یہ بحث چل رہی تھی کہ جعفر صادقؒ کے بعد امام کون ہے؟ کچھ لوگ جعفر صادق کے بعد امامت ختم سمجھتے تھے۔ کچھ ان کے لڑکے اسماعیل کو امام تسلیم کرتے تھے۔ بعض موسیٰ کاظمؒ کی امامت کے قائل تھے اور ایسے بھی لوگ موجود تھے جو محمد بن اسماعیل کی امامت تسلیم کرتے تھے۔ عبداللہ نے ان حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد امام جعفر صادقؒ کے ایک غلام مبارک سے ملاقات کی۔ مبارک اپنے عہد کا بہترین خوشنویس، نقاش اور ماہر دستکار تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی ہو گئی۔ دونوں نے باطنی مذہب کی تبلیغ کا فیصلہ کیا۔ عبداللہ بن میمون عراق و طبرستان کی طرف چلا گیا اور مبارک نے بصرہ و کوفہ کو مرکز بنا لیا۔ عبداللہ کچھ عرصہ تک دعوتِ اسماعیلی میں مصروف رہا۔ اس نے قرآن مجید کے حروف مقطعات سے مشابہ عربی فقرے تحریر کیے اور ان کے ذریعے جادو اور سحر کا سلسلہ چلایا۔ جب ایک گروہ اس کے ارد گرد منظم ہو گیا تو اس نے اپنی امامت کا اعلان کر دیا اور شریعت کے تمام احکام منسوخ کر کے ہر قسم کے لہو و لعب کی اجازت دے دی۔ عبداللہ بن میمون اہل سنت کے ہاتھوں قتل ہو گیا مگر قتل سے پہلے اپنے لڑکے کو قائم مقام اور غیاث نامی شخص کو نائب مامور کیا۔ موت کے بعد اس کے لڑکے احمد نے اس کی شریعت منسوخ کر کے نئے عقائد کا اعلان کر دیا۔

عبداللہ بن میمون نے "کتاب المیزان" لکھی جو دعوتِ اسمٰعیلیہ کے تمام اسرار و رموز پر حاوی ہے اور آج بھی اسماعیلی اسے مقدس سمجھتے ہیں۔

مینار مخروطی شکل کا بلند ستون یا عمارت۔ شکل میں مخروطی بلند اور کم چوڑائی کی ہوتی ہے۔ مؤذن کے اذان کہنے کے لیے ہر مسجد کے ساتھ بنائے جاتے ہیں [illegible] اور کبھی چاروں سمت میں۔ ابتداً مسجد کے ساتھ بلند عمارت یا ستون نہیں ہوتا [illegible] حضرت بلالؓ جو ابتدائی مؤذنوں میں سے ہیں، مسجد نبویؐ کے قریب سب سے اونچے مکان پر چڑھ کر اذان کہا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن انہوںؓ نے خانہ کعبہ کی چھت [illegible] اذان کہی۔ مینار سازی کا رواج بنو امیہ کے زمانے سے شروع ہوا۔ خلفاء [illegible] مقامات پر مینار تعمیر کروائے۔ پہلے ان کی تعداد دو یا تین ہوتی تھی۔ بعد میں مسجد کی [illegible] دلکشی کے باعث چاروں کونوں پر میناروں کی روایت پڑ گئی۔ ابتدائی میناروں [illegible] زینہ باہر کی طرف ہوتا تھا۔ مگر اب اندر کی طرف تعمیر ہوتا ہے۔ مسجد کے [illegible] اور بہت سے قدیم میناروں کی باقیات ملتی ہیں۔ دہلی کا قطب مینار [illegible] ہرن مینار، مقبرۂ جہانگیر کے مینار، فن تعمیر اور اسلامی تاریخ کا اہم باب [illegible] دروازہ کے باہر مسجد پر ایک بلند مینار تعمیر کیا گیا ہے جو اس نسبت سے [illegible] کہلواتا ہے۔ یادگاروں اور مقبروں پر میناروں کی تعمیر کو مغل تعمیرات نے [illegible] پہنچائی تھی۔ قراردادِ پاکستان کی یاد میں "مینار پاکستان" تعمیر کیا گیا۔ اس طرح [illegible] سے بڑی اسلامی کانفرنس، دوسری اسلامی کانفرنس کے بعد اس کی شان [illegible] کے سامنے ایک بلند مینار تعمیر کیا گیا۔ اس کے ارد گرد قرآنی آیات کندہ ہیں یہ [illegible] کہلاتا ہے اور اس کی تعمیر نیم سرکاری کمپنی نے کی۔

مینار بابل تہذیب بابل کی قدیم ترین یادگار، آج تباہ شدہ تہذیب کے [illegible] آثار قدیمہ کے لئے باعث تقویت ہے۔ توریت کی کتاب پیدائش کے مطابق اس کی تعمیر "شینار" موجودہ عراق کے میدانی علاقے میں ہوئی تھی۔ مخروطی شکل کی یہ عمارت ۳۰۰ فٹ اونچی تھی۔ اس میں پتھر کے بجائے پختہ اینٹیں استعمال کی گئی تھیں جس کی حفاظت کے لئے ایک راہبہ مقرر تھی۔ بعض روایات کے مطابق یہ حضرت نوحؑ کی نسلوں نے بنوایا تھا۔ اور اس زمانے کا بادشاہ اس کے ذریعہ خدا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بادشاہ نمرود تھا۔ اور اس کی تعمیر اس کے عہد میں ہوں

بعض کے خیال میں اس کی تعمیر سمیری تہذیب کے دوران ہوئی۔ جس کا زمانہ ۵۰۰۰ ہزار سال قبل از مسیح کا ہے۔ اور بعض کے تصور میں حضرت موسیٰؑ کے عہد میں جس کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م کا ہے۔ اس مینار کی بنیادیں سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں ایک انگریز نے دریافت کی تھیں۔

مینار پاکستان:۔ آج سے تقریباً ۴۰ برس قبل بابائے قوم کی صدارت میں ۱جلاس نے تاریخی قرارداد منظور کی۔ آزادی کی قرارداد۔ تحریک سیاست کی قرارداد۔ اس کی یاد میں یہاں ایک مینار تعمیر کیا گیا' جو مینارِ پاکستان کہلاتا ہے اس کی لمبائی ½ ۱۹۶ فٹ اور مختلف مقامات پر قرآنی آیات اور اشعار درج ہیں۔ جنکی خطاطی خورشید عالم' خورشید رقم' حافظ یوسف لاہوری' الماس رقم' ابنِ پروین رقم' محمد اقبال اور محمد صدیق نے کی۔

مینار کا نقشہ روسی نژاد مسلمان مرات خان نے تیار کیا اور میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی نے اس کی تعمیر کی۔

اس کی تعمیر میں بڑی تکنیکی مہارت سموئی گئی اور کچھ اس قسم کا سازوسامان استعمال کیا گیا جس سے مختلف مقامات پر پیش آنے والی مشکلات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً اس کے مختلف چبوترے ہیں ایک چبوترا بڑا کھردرا اور ناتراشیدہ ہے یہ اس بات کا غماز ہے کہ آزادی کے وقت پاکستان کی حالت کس قدر دگرگوں تھی۔

دوسرے تختہ میں پتھروں کو ترتیب و تراش دے دی گئی ہے مگر ان میں کھردرا پن موجود ہے یعنی پاکستان اب سنور گیا ہے۔

تیسرے تختہ میں سب کچھ ختم کر کے ملائمت پیدا کر دی گئی۔ مینار کی بنیاد اسی پر قائم ہے یہ ½ ۱۲ فٹ اونچے پشتے پر ہے۔

چوتھے چبوترے پر سنگِ مرمر مشتمل ہے یوں لوگ خوشحال ہو گئے ہیں۔

مینار کی آخری ٹوپی پاکستان کی عالمی دنیا میں سربلندی کی علامت ہے۔ اس مقصد سے اس میں اسٹین لیس سٹیل استعمال ہوا ہے جس پر سورج کی شعاعیں پڑتے ہی منعکس ہو کر ماحول کو منور کر دیتی ہیں۔

مارچ ۱۹۴۰ء اور ۱۹، اپریل ۱۹۴۶ء ـــــ دونوں قرارداد اس مینار پر رقم ہیں۔ یہ اُردو' انگریزی اور بنگالی زبان میں درج ہیں۔ آزادی کی تحریکوں کا بھی مختصر ذکر ہے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران، سورۂ مائدہ، سورۃ الرعد کی قرآنی آیات بھی درج ہیں۔

مینار کے صدر دروازے پر ـــ اللہ اکبر ـــ، اور ایک ہل پر "مینارِ پاکستان"، اور اس کے نیچے ـــ "اللہ المشرق والمغرب۔" لکھا ہے۔

مینارِ خاموش پارسی اور زرتشتی مذہب کے ماننے والے اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے، بلکہ ایک اونچے مینار پر رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ گدھ وغیرہ کی خوراک بن جائیں۔ یہ مینار "مینار خاموش" "TOWER OF SILENCE" کہلاتے ہیں۔

میور۔ (۲۷ر اپریل ۱۸۱۹ء ــ ۱۱ر اپریل ۱۹۰۵ء)

مشہور ماہرِ تعلیم اور مستشرق۔ پورا نام سر ولیم میور تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس سے منسلک تھے۔ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۷۶ء تک ہندوستان میں قیام رہا۔ ہندوستان میں قیام کے آخری دنوں میں یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر بھی مقرر ہوئے۔ عربی کا ذوق اور تاریخ اسلام کے مطالعے کی طرف میلان ہندوستان کے قیام اور مسلمانوں سے قربت کا نتیجہ ہے سرسید احمد خان اور مولوی نذیر احمد سے خصوصی روابط تھے۔ جامعہ الہ آباد کے قیام کے لیے ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ وطن واپس جانے کے بعد ایڈنبرا یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ ایڈنبرا میں ہی وفات پائی۔

تصانیف میں حیاتِ محمدؐ۔ خلافت کا عروج و زوال۔ تاریخ اسلام (چار جلدیں) قرآن اور اس کی تعلیمات شامل ہیں۔

ن

"ن" ایک حرفِ مقطعات، یہ سورہ القلم کی ابتدا میں آیا ہے۔ مفسرین اس کی مختلف تشریحات بتلاتے ہیں مثلاً سیاہی کا دھبہ، مچھلی، نور کا مخفف وغیرہ حتمی معنی انسان سے مخفی ہیں۔

ناصرالدین اللہ عباسی عہد سلطنت کا چونتیسواں خلیفہ احمد نام، ابوالعباس نسبت ناصرالدین اللہ لقب۔ ۱۰ رجب ۵۵۳ھ کو ایک ترکی کنیز زمرد کے بطن سے پیدا ہوا۔ المستضی بامراللہ کا بیٹا۔ باپ کی وفات کے بعد ۱۰ ذلیقعد ۵۷۵ھ کو تخت پر بیٹھا اس کے عہد خلافت کے تیسرے دن یعنی ۵۷۵ھ بمطابق ۱۱۷۹ء غوری خاندان کے شہاب الدین ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت یہ بغداد میں تھا۔

۵۷۵ھ میں والی تکریت امیر عیسیٰ کی وفات پر اس نے اپنے بھائیوں کے خلاف اقدام اٹھاتے ہوئے اس پر خود قبضہ کر کے امیر عیسیٰ کے بھائیوں کو جاگیریں دیں۔ اس کے ایک سال بعد عانہ پر قابض ہو کر وہاں کے امراء کو جاگیریں بخشیں ۵۹۱ھ میں خوزستان کو زیرنگیں کر کے مجیرالدین کو وہاں کا حکمران نامزد کیا۔ ابن خوارزم کو شکست دینے کے لئے اس نے سیف الدین طغرل کی قیادت میں لشکر اصفہان بھیجا، جو کامیاب رہا۔ اصفہان کے بعد ہمدان، زنجان اور قزوین وغیرہ بھی اس کے مفتوحہ علاقے بنے۔

۶۰۲ھ میں مجیرالدین کی وفات کے بعد اس نے اسی کے داماد سنجر کو امیر نامزد کیا، مگر ۶۰۶ھ میں اس سے ناراض ہو گیا۔ اس کی راست روی کے لئے اپنے نائب وزیر کو بھیجا۔ یہ محرم ۶۰۸ھ میں اسے گرفتار کر کے بغداد لایا۔ اس وقت خلیفہ کی ناراضگی ختم ہو چکی تھی۔ سو اسے خلعت دے کر چھوڑ دیا۔ محرم ۶۱۲ھ میں اپنے پوتے کو لشکر کی امارت دی۔

رمضان ۶۲۲ھ میں اس کی وفات کے ساتھ اس کا تقریباً سینتالیس سالہ عہد خلافت بھی ختم ہو گیا۔ کسی عباسی خلیفہ نے اتنے عرصہ میں ختم نہیں کی۔ عمر کے آخری ۲۰ ایام میں یہ بیمار رہا، جو موت کا سبب بنی۔

باعتبار طبیعت وصلاحیت یہ عالم وفاضل، ذہین، حاضر دماغ، تیز طبع، جرأت مند اور باہمت انسان تھا۔ یہ علم حدیث کا ماہر تھا۔ ۷۰ احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

اس نے بڑے جاہ وجلال سے حکومت کی مخالفین ابھرے جنہیں اس نے مغلوب کیا۔ یہ شطرنج سیاست کا چابک دست کھلاڑی تھا۔ اسی طرح تاریخ خلفاء میں درج ہے: کہ عالم اسلام کے تمام حکمران اس کے اطاعت گزار وتابع فرمان تھے۔ اور خلافت بغداد کے تمام قدیم باغیوں نے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اس نے بڑے بڑے ملک مسخر کئے۔ اندلس سے چین تک اس کی دعوت پہنچی تھی۔ اس کی ایک صفت کے بارے میں فخری لکھتے ہیں کہ: [illegible] رات کے وقت کی وضع میں پیدل پھرا کرتا تھا۔ ابن طقطقی کا بیان ہے: ناصر کے خیر [illegible] لاتعداد ہیں۔ اس نے بہت سے مسافر خانے، خانقاہیں اور [illegible]

ناسِٹک

اس شخص کو کہتے ہیں جو نہ خدا کی ہستی کا قائل ہو [illegible] دہریہ ہوتا ہے اور نہ کسی توحید کا پرستار [illegible] دہریہ ہستی خدا کی نفی [illegible] مادہ ہی کو سب کچھ تصور کرتے ہیں مگر یہ خدا سے [illegible] دہریوں سے ذرا بلند مقام پر ہیں۔

نافع بن ازرق ایک شخصیت۔ یونانی نسل کے ایک آزاد کردہ [illegible] کے ہمراہ مکہ میں رہے وہاں سے یہ بصرہ چلے گئے۔ مہلب نے [illegible] کی طرف پہنچا دیا۔ یہ لوگ پارس سے اہواز چلے گئے۔ [illegible] شروع کی۔ اس کے عقائد یوں تھے: [illegible]
۲۔ جو اس سے ہجرت نہ کریں، انہیں کفار میں شامل کیا جائے۔ [illegible] ہونا چاہیں، ان کا امتحان لیا جائے۔
سن ۶۸۳ یا ۶۸۴ میں مسلمانوں کے خلاف [illegible] ۴۰ برس کی عمر پائی۔ اس کی آنے والی نسلیں اس نسبت سے ازرقی کہلوائیں۔

نافع بن کاؤس

حضرت عبداللہ بن عمر کے [illegible] ۱۱۷ھ۔ آپ نے انہی کی ۳۰ برس خدمت کر کے حدیث کا علم [illegible] امام اوزاعیؒ اور امام مالک آپ کے شاگردوں میں آتے تھے۔ بڑے بڑے فضلا آپ کی شاگردی پر فخر کرتے۔ سارا مدینہ آپ کی عزت واحترام کی نگاہ [illegible]

سے دیکھنا۔

ناقوس لکڑی کا گول ٹکڑا جسے ماضی قدیم میں ایک لچکیلے ڈنڈے سے پیٹ کر لوگوں کو عبادت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ یہ ڈنڈا دبل کہلاتا تھا۔ یہ آج کل بھی مشرق اور یونان کے بعض علاقوں میں رائج ہے۔ اسلام میں اس کے برعکس اذان کا تصور ہے۔

ناکحہ نکاح کے بندھنوں میں بندھے مرد کے لیے قانونی اصطلاح۔ ایسی عورت کے لیے "منکوحہ" مقرر ہے۔ غیر شادی شدہ فرد کے لیے "عزب" کی اصطلاح ہے۔

نام ہر چیز ایک انفرادیت رکھتی ہے، جسے ظاہر کرنے کے لئے اس کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں، تاکہ اسی سے پکاری جائے۔ سمندر نسل آدم میں بے پناہ نفوس آباد ہیں نام ان میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں الفاظ نہ ہونے کے سبب کوئی نام نہ تھے۔ یہاں تک کہ اشیاء ضرورت کو مختلف اشکال و اشاروں سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہی شکلیں اور اشارے بگڑ کر "نام" بن گئے۔ انسانی سطح پر ناموں کے رواج کی کوئی واضح تاریخ نہیں ملتی۔ نام غیر واضح طور پر پوری شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لئے نام اچھے رکھنے چاہئیں۔ اس بارے میں روایت ہے کہ انسان روزِ حساب کو اپنے اور اپنے آباؤ کے نام سے بلائے جائیں گے، اس لئے فرد اپنے نام اچھے رکھیں۔ اسی طرح ترمذی میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل ترین نام جو کوئی رکھ سکتا ہے وہ ملک الاملاک ہے (شہنشاہ) ہے۔ کیونکہ بادشاہ ماسوائے اللہ کے، اور کوئی نہیں۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ بُرے نام پسند نہ فرماتے ہوئے انہیں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ مسیب کے والد ایک بار حضورؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے نام پوچھا۔ اس نے کہا حزن (سخت زمین) فرمایا، نہیں تم نرم زمین) ہو۔ اس نے کہا کہ میں اپنے والد کا رکھا ہوا نام نہیں بدل سکتا۔ ایک دوسری روایت میں مسیب کے الفاظ یہ ہیں کہ "نتیجہ یہ رہا کہ اس کے بعد ہمارے ہاں سختیاں ہی رہیں"۔

اللہ تعالیٰ کے بھی بہت سے پاک نام ہیں، جو اس کے اوصاف ظاہر کرتے ہیں۔ انسان اس کو کسی بھی نام سے پکار سکتا ہے۔ جو اچھا ہو، اس کے نام تم بھی رکھ سکتے ہو مگر بگاڑنے والے کو سزا ملے گی۔

ناموں کے بارے میں سورہ اعراف آیت ۱۸۰ میں واضح ہدایت آئی ہے: "اور اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں، ان کے ساتھ اسے پکارو، بلاؤ۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے ناموں میں برائی کرتے ہیں۔ انہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا، جو یہ عمل کرتے ہیں۔ قرآن عظیم میں بھی اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام ہیں۔ لیکن چونکہ ہر قوم کی زبان فرق ہے اس لئے ہر قوم خدائے واحد کو مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہر قوم کے اندر جتنے کے جتنے بھی نام ہیں، ان کا ادب کرنا چاہیئے۔ ورنہ سزا ملے گی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آیات ۱۳۵ تا ۱۴۱ تک ہدایت فرمائی کہ ہر پیغمبر اور اس کی امت کا نام مسلمان رکھا۔ ہر پیغمبر کے زمانہ میں اس کی امت مسلمان کہلائی۔ لیکن بعد میں تفرقہ کی غرض سے امتوں کو مختلف ناموں سے پکارا جانے لگا۔ یہودی، عیسائی اور ایسے ہی دوسرے نام پڑ گئے۔ خود حضرت ابراہیمؑ نے پوری کتاب میں کہیں بھی اپنے لئے کوئی اور نام نہ استعمال کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے اپنے آپ کو مسلمان کہا۔

نامۂ اعمال انسان کے فعلوں کا تحریری مجموعہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ ہر شخص کے دو فرشتے مقرر ہیں۔ ایک داہنے ہاتھ پر اور دوسرا بائیں ہاتھ پر۔ یہ تمام فعل درج کرتے ہیں۔ داہنے ہاتھ والا اچھے فعل اور بائیں ہاتھ والا بُرے۔ روز محشر کو جب میزان لگے گی تو اس میں یہی اعمال تولے جائیں گے، اور انہی کے سہارے دوزخ یا جنت ملے گی۔ پس اعمال اچھے رکھو۔

قرآن کریم میں اس کے بارے میں یوں ارشاد ہے: "قیامت کے دن ہم ان کے منہ بند کر دیں گے۔ اور ان کے اعمال کی داستان ان کے دست و پا سنائیں گے۔ (یٰسین ۶۵) یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں: انسان جب کوئی بات منہ سے نکالتا ہے تو ایک بے باک نگران فوراً اسے ضبطِ تحریر میں لے آتا ہے (ق۔ ۱۸)

کلام اللہ میں واضح ہدایت ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔ اور جب حساب ہوگا، تو دیکھا جائے گا، کہ کس کے اعمال بھاری ہیں، اور کس کے برے، اور جو کچھ نامۂ اعمال میں لکھا ہوگا، ویسا ہی اسے ملے گا۔ جیسے سورہ بنی اسرائیل میں کہنا ہے: اور انسان کے ہر عمل کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا، اور ہم اس کے لئے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھلا پائے گا۔ اپنی کتاب پڑھ کر آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لئے کافی ہے (۱۴ ۱۳) جب عمل انسان کر دیتا ہے تو اس کا نتیجہ لازمی ہو جاتا ہے۔ انسان عمل کرتے وقت سمجھتا ہے کہ سب کچھ اس کی قدرت میں ہے، اور کچھ ایسے ہیں، جو کہتے ہیں کہ بعد میں توبہ کر لیں گے۔ مگر ایسے لوگوں کی توبہ بھی بار بار قبول نہیں ہو گی۔

بنی اسرائیل کی انہی مندرجہ بالا آیتوں میں نامۂ اعمال کو کتاب منشور کہا گیا ہے بعض نے اس کی یوں تفسیر بیان کی ہے کہ اس کے اثرات نفس پر ہوں گے، کیونکہ ہر فعل کا اثر بھی روح پر ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ہے کہ اس میں اعمال محفوظ ہیں۔ اور منشور اس اعتبار سے کہ ان اعمال کے نتائج صاف ظاہر ہیں۔ اسی لئے خدا نے رسول بھیجے کہ وہ راست بازی کا تصور دیں۔ اس لئے کہ خدا یونہی انسان کو نامۂ اعمال کی بدولت سزا نہ دینا چاہتا تھا۔ اب بھی لوگ نہیں سمجھتے انہیں مضافات کے دن معلوم ہوگا، جو بُرا اور اچھا عمل انسان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے، وہ "طاہر" بھی کہلاتا ہے۔ قرآن میں کسی ایک جگہ یہ لفظ آیا ہے، دیکھئے (سورہ یٰسین ۱۹)

نانوتویؒ، محمدؐ قاسم

شیخ اسد علی کے بیٹے، اسلام کی نامور شخصیت تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ تاریخ پیدائش اور مہینے کے بارے میں مختلف افراد مختلف رائے دیتے ہیں مثلاً ۵ ارشعبان ۱۹ رمضان ۲۷ محرم وغیرہ۔ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے بچپن ہی سے ذہین، بلند ہمت، جری و چست تھے، مکتب میں اپنے ساتھیوں سے آگے رہتے۔ قرآن مجید بہت جلد ختم کر لیا۔ حضرت کی بہن نانوتہ میں بیاہی گئی تھیں اپنی بہن سے ملنے اکثر نانوتہ جاتے۔ وہیں مولوی محمد نواز سہارنپوری سے عربی فارسی پڑھی۔ اس کے بعد مولانا مملوک علی کے ہمراہ ۲ محرم ۱۲۶۰ھ میں دہلی پہنچے، وہاں کافیہ اور حدیث شروع کی۔ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی سے سیکھی۔

حضرت امداد اللہؒ سے بیعت کی۔ اس کے بعد مدرسۂ عربی یعنی دینی کالج میں داخل ہوگئے۔ وہاں جلد ہی ریاضی کے ماہر ہو گئے۔ مشکل سے مشکل سوال حل کر دیتے۔ ان دنوں مولانا احمد علی نے تحشیہ بخاری کا کام شروع کر رکھا تھا۔ آخر کے پانچ چھ سپارے انہوں نے نانوتوی صاحب سے کروائے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی طرف سے مذہب میں ملاوٹ کے خلاف جب حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈالی تو اس میں شانہ بشانہ لڑے۔ مولانا امیر امداد اللہؒ نے آپؒ کی امامت قبول کی اور آپ سپہ سالار مقرر ہوئے۔ قصبہ تھانہ بھون میں مورچہ لگایا۔ زبردست جنگ ہوئی۔ کئی علماء کرام اس مورچے میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا نانوتوی بھی سخت زخمی ہوئے۔ بہت سوں کے وارنٹ جاری ہوئے۔ جن میں نانوتوی بھی شامل تھے۔ احباب کے کہنے پر آپؒ تین یوم غائب رہے۔ چونکہ نبی اکرمؐ بھی غارِ ثور میں تین دن

رہے تھے اس لیے آپ بھی تین دن سے زائد روپوش رہنا غیر سنتی جان کر ظاہر ہو گئے۔ وہاں سے آپ میرٹھ چلے گئے اور مختلف غیر اسلامی مضامین کے خلاف مضامین لکھے۔

چوتھی جمادی الاول ۱۲۹۷ھ جمعرات کو بعد نماز ظہر دم رخصت ہوا۔ آپ کی زندگی حد درجہ سادہ تھی۔ تنہائی پسند، اعلیٰ اخلاق، نڈر، جذبہ ایثار و زہانی سے معمور انسان تھے۔ اپنی زندگی میں تین حج کیے۔ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ بہت سی کتب کے مصنف ہیں۔ جن میں مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔ آب حیات (حضورؐ کی حیات برزخی کا بیان)، قبلہ نما، جمال قاسمی، توثیق الکلام، ہدایت الشیعہ، تحفۃ اللحمیہ، انتظار الاسلام، مباحثہ شاہجہاں پور وغیرہ۔

ناوسیہ (۱۴۰ھ) ۔ امام جعفر صادقؒ کے متبعین کا ایک گروہ تاریخ میں اس نام سے مشہور ہے۔ اس کا بانی عبداللہ بن ناوس بصری ہے جو کافی عرصہ امام صاحب کی مجلس میں رہا۔ ناوسیہ اور شمیطیہ کے عقائد میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے تاہم ناوسیہ شمیطیوں کے اس نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں کہ محشر میں امام جعفر صادقؒ رسول اللہؐ کے جسم و قالب میں ظاہر ہو کر رسول اللہؐ کی طرف سے امت کی شفاعت کریں گے بلکہ جعفر صادقؒ اپنی اصلی شکل و صورت میں اس روز موجود ہوں گے اور وہ رسول اللہؐ کے قائم مقام کی حیثیت سے اُمت کی شفاعت کریں گے۔ گویا کہ شمیطیہ رسول اللہؐ کی شکل و صورت میں حشر کے روز جعفر صادقؒ کی شفاعت اور موجودگی کے قائل ہیں مگر ناوسیہ صرف شفاعت کا عقیدہ مانتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی شکل و صورت میں آنے سے انکاری ہیں۔ ناوسیہ امام جعفر صادقؒ کو زندہ غائب مانتے ہیں اور "وہو المہدی الموعود القائم المنتظر" تسلیم کرتے ہوئے ان کی دوبارہ آمد کے منتظر ہیں اور ان کے خیال میں وہی آخری امام اور موعود ہیں۔

اُن کا عقیدہ ہے کہ جو شخص اہل بیت رسولؐ کی محبت سے محروم رہے گا دنیا میں وہ کافر اور آخرت میں دوزخی ہو گا۔ اور اس کی بخشش کا کوئی وسیلہ نہیں۔

عبداللہ بن ناوس بصری نے اپنے عقاید کو خوب پھیلایا اور مضافات بصرہ میں اس کا مستقل فرقہ قائم ہو گیا جو آج بھی موجود ہے۔

نائیجر افریقہ کی نو آباد مسلم جمہوریہ ۳ اگست ۱۹۶۰ء کی آزادی سے قبل فرانسیسی نو آبادی نظام کا حصہ تھی۔ ملک کا کل رقبہ ۴۸۹۱۹۰ مربع میل ہے۔ جس کا پچاس فیصد صحرائے اعظم پر مشتمل ہے۔ اس کی کل آبادی ۴۹۰۹۰۰۰ ہے جو ۲.۷ فیصد سالانہ کے اعتبار سے بڑھ رہی ہے۔ مرکزی مقام نیامی ہے جس کی کل آبادی ایک لاکھ ہے۔ نائیجر میں مسلم اکثریت ہے جو تعداد میں ۸۵ فیصد ہیں۔ عیسائیوں کی آبادی ۴۵ ہزار ہے اور مظاہر پرست ۱۴۰۵ ہزار ہیں۔

اس کے شمال میں الجیریا اور لیبیا ہیں۔ مالی اور اپر وولٹا مغرب میں، جنوب میں ڈاہومے اور نائیجیریا اور چاڈ مغرب میں ہے۔ اس کے جنوب مغربی حصے پر دریائے نائیجر بہتا ہے۔ یہیں مرکزی دارالحکومت بھی ہے۔ اس حصے میں بارشیں بھی دوسروں کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ حکومتی مجموعی سالانہ بارش کی اوسط ۱ اِنچ ہے موسم سارا سال گرم اور خشک رہتا ہے جو افریقی علاقوں کا خاصہ ہے۔

یوروبا، ابوہوزا اور جرما سنگھائی کے قبائل آباد ہیں جن کا پیشہ کاشتکاری ہے کپاس، کھجوریں، چاول، گندم، سبزیاں، مونگ پھلی اہم زراعت میں شامل ہیں۔ معدنیات میں نمکیات، ٹین، ٹنگسٹن اور دھاتیں، ملک کی زیادہ آمدن بھی انہی برآمدات سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مویشی بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں سالانہ ساڑھے تین لاکھ اونٹ اور اتنے ہی گائے بیل، چار لاکھ گھوڑے اور گدھے اور سات لاکھ بھیڑ بکریاں افزائش پاتی ہیں۔

آبادی زیادہ پڑھی لکھی نہیں، صرف ۲۰۰ پرائمری سکول ہیں جن میں ۲۵۰۰۰ طالب علم علم حاصل کرتے ہیں۔ آٹھ سیکنڈری سکول ہیں اور صرف ایک ٹیکنیکل ادارہ ہے، کم تعلیمی ترقی کی وجہ سے ملک ابھی پسماندہ علاقوں میں شامل ہے اس کی صنعت ابھی مضبوطی حاصل نہیں کر سکی۔ سڑکیں اور دوسرے ذرائع مواصلات بھی ابھی کمزور ہیں۔ ملک میں ہزار کے لگ بھگ کاریں [illegible] ہزار [illegible] ریڈیو سیٹ ہیں۔ صرف ایک روزنامہ شائع ہوتا ہے جن کی اشاعت بھی پندرہ ہزار سے بڑھنے نہیں پاتی۔

باور کیا جاتا ہے کہ سوا سو سال قبل یہاں [illegible] آباد تھے۔ جن [illegible] اجاڑ یہ کا گاؤں تھا۔ یہیں غلاموں کی خرید و فروخت کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی۔ ۱۵۱۵ء میں سونگائی کے سلطان عقیقید محمد اول نے ہاؤسا قبائل پر لشکر کشی [illegible] آغادیس کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ جس سے تمام علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت [illegible] آہستہ آہستہ یہ قبائل سر اٹھانے لگے۔ ان کا سا [illegible] فرانسیسیوں نے دیا۔ جو انیسویں صدی کے آغاز ہی سے یہاں [illegible] ۱۸۰۵ء [illegible] فولانی خاندان کے مسلمان حاکم سے ہاؤسا قبائل نے حکومت [illegible] پھر فولانی خاندان کے رہنما عثمان نے انہیں اپنی حکومت میں شامل کر [illegible] وقت کے ساتھ فرانسیسی بھی مضبوطی حاصل کرتے رہے۔ بیسویں صدی کے [illegible] انہوں نے [illegible] پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۲ء میں اسے باقاعدہ نو آبادی بنا [illegible] ۱۹۵۸ء میں فرانسیسی بلاک کی خود مختار جمہوریہ بنا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی [illegible] اب بھی فرانسیسی ہے۔ اس کے دو سال بعد اسے آزادی مل گئی۔ یہاں [illegible] ہے جو امریکی ڈالر کے مقابلے میں ۲۴۵ کا کی قدر رکھتا ہے۔

نائیجریا مغربی افریقہ کی مسلمان جمہوریہ تقریباً ۵۰ فیصد [illegible] کی ہے۔ یہاں جمہوری طرز حکومت ہے اور ملک کا سربراہ صدر [illegible] دارالحکومت لاگوس ہے۔ ملک کا مکمل رقبہ ۳۵۶۶۶۹ مربع [illegible] ۶۲۸۷۰۰۰ ہے۔ اس کے ساحلی علاقے خلیج گنی کے ساتھ [illegible] کے مغرب میں ڈاہومے۔ شمال اور شمال مغرب میں نائیجر [illegible] چھڈ جھیل اور مشرق میں کیمرون [illegible] مرکزی حصہ [illegible] دریائے نائیجر اور اس کی ایک شاخ [illegible] سیراب کرتی ہے۔ شمال میں اونچی سطح مرتفع اور جنگلات [illegible] کے نیچے ہیں۔

یہ ملک چار حصوں کی فیڈریشن ہے جو مغربی، مشرقی، شمالی اور [illegible] پر مشتمل ہیں انہیں بارہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا [illegible] اکثریت [illegible] طرح [illegible] زبانیں بولتے ہیں مگر سرکاری زبان انگریزی ہے۔

پندرھویں صدی میں یہاں یورپی [illegible] عورتوں کی خرید و فروخت [illegible]

انیسویں صدی میں یہاں انگریزوں نے [illegible] یورپ اور ۱۹۰۳ء میں پورے ملک پر [illegible] حاصل کر [illegible] ۱۹۱۴ء میں انہوں نے [illegible] برطانوی [illegible] ۱۹۶۰ء تک یہاں برطانیہ [illegible] طرز حکومت [illegible] کہیں جو آزادی کی تحریکوں [illegible] کی وجہ سے [illegible] اسے آزادی نصیب ہوئی۔ آزادی کے بعد [illegible] سیاسی [illegible] کا شکار رہا۔ اس کشمکش کے دوران ۱۹۶۰ء میں مشرقی صوبے میں بالآخر جمہوریہ [illegible]

قیام کا اعلان کر دیا جس سے یہاں زبردست سول جنگ شروع ہو گئی۔ بہ نہیں دن کی خونریزی کے بعد جنوری ۱۹۷۰ء میں ختم ہوئی۔ بالآخر فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

یہاں کی ۲۵ فیصدی آبادی پڑھی لکھی ہے، ستر ہزار پرائمری اور چھ سو ثانوی سکول ہیں۔ تین سو ستر ٹیکنیکل ادارے اور پانچ یونیورسٹیاں ہیں۔ ملک کی سالانہ کل آمدنی ....۳ ڈالر ہے۔ اس طرح فی کس سالانہ آمدنی نوے ڈالر ہے۔ یہاں کا سکہ نائیجیرین پونڈ ہے۔ ایک نائیجیرین پونڈ ۲.۸ ڈالر کے برابر ہے۔

ملک کی زیادہ آمدنی قدرتی وسائل سے ہوتی ہے جن میں تیل اور گیس کے ذخائر سرفہرست ہیں۔ دوسری معدنیات میں سونا، لوہے، سیسہ، زنک، ٹین اور کوئلہ شامل ہیں۔

زراعت میں کپاس، گنا، جوار، پھلیاں، کوکا وغیرہ بڑے پیمانے پر کاشت ہوتی ہیں۔ زراعت کے لیے ملک کا تقریباً ۲۳ فیصد حصہ مخصوص ہے۔ ملک میں سالانہ چودہ کروڑ بھیڑ بکریوں اور ہزارہا دوسرے مویشیوں کی افزائش نسل ہوتی ہے۔

مواصلات میں تقریباً چار ہزار میل لمبی سڑکیں۔ پچاس ہزار ٹیلیفون اور ہزارہا ریڈیو ٹی وی کے علاوہ تقریباً ۱۱ بڑے روزنامے نکلتے ہیں۔

ملک دولتِ مشترکہ، اقوامِ متحدہ اور ایسی ہی بہت سی تنظیموں کا رکن ہے۔ آج کل تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

نبوّت

نبوّت ۔ اللہ کا اپنے بندے پر ظاہر ہونا، وحی کا نزول ہونا۔ نبوّت کی ایک قسم میں معجزہ کا کمال نہیں ہوتا یعنی بہت سے نبیوں سے کوئی معجزہ سرزد نہیں ہوا۔ دوسری قسم میں معجزہ ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی نبوّت معجزوں سے بھرپور ہے۔ نبوّت انہی کو ملتی ہے جن میں اس کا حوصلہ و کردار ہوتا ہے جب بنی نوعِ آدم گمراہی میں پڑ جاتی ہے، ایسے فعل اس میں گھر کر جاتے ہیں جو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کسی بندے کو چن لیتا ہے اور اسے راہِ حق بتاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ میرے بندوں کی رہنمائی کرو۔ یہ توحید کے پیغام کی حامل ہوتی ہے اور دنیا کے تمام اسرار و رموز کو ظاہر کرتے ہوئے اسے فانی قرار دے دیا جاتا ہے کہ نبوّت کی رو سے حقیقی و لابدی دنیا عرش بریں پر ہے اور یہاں صرف امتحان مقصود ہے۔ جب کسی کو نبوت ملتی ہے تو قومیں جو بگڑی ہوتی ہیں، ان کی راست روی کی وجہ سے دشمن ہو جاتی ہیں، مگر اللہ کارساز ہے وہ دشمنی کے منجدھار میں اپنے نبیوں اور رسولوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جو کسی کی نبوّت پہ ایمان نہیں لاتا اس کے لیے کڑی سزا کی بشارت ہے۔

نبی

نبی شریعتِ اسلامی میں نبی اس ہستی کو کہتے ہیں جسے خدا نے راہِ راست اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چنا ہے یا جس پر وحی آتی ہو۔ خدا نبی سے براہِ راست ہمکلام ہوتا ہے۔ بعض نبیوں پر کتب اور نئی شریعت بھی خدا نے دی یہ نبی رسول کہلوائے ہیں۔

جب کسی فرد کو نبوت کے لیے چن لیا جاتا ہے تو وہ نیکی و خیر میں خدا کا نائب ہوتا ہے اور معصیت کے شر سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے مدخل و ارادہ میں ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن بنا دیا گیا ہے اور ہر حال میں پیغامِ توحید درراستی اپنی اقوام کو سناتا ہے۔ اقوام اس کی نافرمانی کرتی ہیں مگر وہ ثابت قدم رہتا ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے نبی بھیجے، پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اور آخری نبی حضرت محمدؐ ہیں۔ ان پر نبوت ختم ہو جاتی ہے۔ نبی کی نبوت سے انکار گناہ میں شمار کی جاتی ہے۔ نبیوں کے بھیجنے کی وجہ خود خدائے واحد نے قرآنِ عظیم کی آیات میں فرمایا ہے کہ:۔ ۱

"اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تھی اور بنی اسرائیل کے لیے رہنما مقرر کیا تھا کہ میرے سوا کسی اور کو کارساز نہ ٹھہرانا" (بنی اسرائیل ۲) اسی طرح کا ایک ارشاد سورۂ بقرہ ۷۶ اور ۱۱۰ میں بھی ہے۔" اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ـــــــ جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہو (تو اللہ دان) کافروں کا دشمن ہے"۔ (۱۲۴)

سورہ ال عمران میں نبیوں کے بارے میں ارشاد ہے۔ "اللہ نے آدم اور نوح اور ابراہیم کے گھرانے اور عمران کے خاندانوں کو قوموں پر چن لیا۔ ۲۳" اسی سورہ میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان تمام نبیوں پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور ان کی مدد کرنا ہوگی۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والے نبیوں سے سابقہ نبیوں کے بارے میں لیا۔

اسی طرح اس نے بعد کے نبیوں کو پرانے نبیوں اور گواہ مقرر کیا۔ اس گواہی کے ساتھ ساتھ اس نے تمام نبیوں کو اپنی قوم پر گواہ مقرر کیا کہ یہ روزِ محشر کو قوموں کے خیر و شر کی گواہی دیں گے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی مگر انہیں ان پر پیشرو مقرر کیا گیا ہے۔ یہیں قوموں کو چاہیئے کہ رسولوں اور نبیوں کی پیروی کریں کہ اس میں عافیت ہے اور وہ لوگ جو رسولوں کی پیروی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ دوسروں سے الگ کر دیئے جائیں گے (سورہ بقرہ ۱۸۰)

تاکہ یہ لوگ بھی پراگندہ نہ ہوں اور یہ جو رسول کی اطاعت کریں گے وہ اللہ کی اطاعت کریں گے۔ اس بارے میں ہدایت سورۂ انساء کی ۸۰ ویں آیت میں مذکور ہے۔

مگر تاریخ شاہد ہے کہ دنیا نے اپنی گمراہی اور سخت گیری کے باعث بہت سے نبیوں کو خاک اور خون میں نہلا دیا۔ ان پر ظلم و ستم ہوئے۔ بعض کو اللہ نے بڑے بڑے معجزوں سے گذار کر منکروں پر حکومت دی اور جو خونم ہوتے اللہ اس کا حساب یوم الحشر کرے گا۔ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ناحق قتل کے بارے میں سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۱۲ اور اس کے علاوہ اور بہت سی سورہ میں صاف طور پر پوچھتا ہے کہ ان کے خون سے ناحق ہاتھ کیوں رنگے گئے جب کہ وہ قوموں میں تفرقہ ختم کرنے اور رہنمائی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس کے ان بندوں پر ظلم و جور کرنے والے بعض تو اس جہانِ فانی ہی میں گھٹ گھٹ کر، سسک سسک کر مرے اور باقیوں سے روزِ مکافات کو سمجھے گا۔

چند نبیوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں بھی اتاریں، ان میں حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور نبی آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شامل ہیں۔ ان پہ بالترتیب زبور، انجیل، تورات اور قرآن کا نزول ہوا۔

مسلمانوں کے لیے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں، مفسرین اور علمائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم عام عقیدہ یہ ہے کہ کل ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر وقتاً فوقتاً آئے۔

بعض کا ذکر قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ہے اور بعض کے صرف نام یا مختصر حالات ہی درج ہیں۔

نبی بخش، مولانا

نبی بخش، مولانا - (۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء - ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۵ء)

لاہور کے ایک متوسط ارائیں گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے ممتاز علماء سے اکتسابِ فیض کیا جن میں سے مولانا معوان حسین رامپوری خطیب بادشاہی مسجد، مولانا محمد ذاکر بگوی، پیر عبدالغفار شاہ کشمیری، مولانا غلام قادر بھیروی اور مولانا غلام دستگیر قصوری کے اسماء خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے معاش کے لیے مٹھائی بنانے اور دودھ بیچنے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اسی لیے آپ کو حلوائی کہا جاتا ہے۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری کے دستِ اقدس پہ بیعت ہوئے اور پھر حضرت پیر سید جماعت علی شاہؒ

لاثانی علی پوری سے بیعت ہو کر مجاز ہوئے۔
آپ نے مسلک اہل سنت والجماعت کی ترویج کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں
آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ بعض کے نام یہ ہیں :-
۱۔ تفسیر نبوی، پنجابی شعروں میں ۱۵ جلد۔ ۲۔ اطلاع الناس فی طلاق الثلاث۔
۳۔ الامتیاز بین الحقیقۃ والمجاز۔ ۴۔ احسان الاموات فی الصدقات والاسقاط۔
۵۔ جامع الشواہد۔ ۶۔ سبیل الرشاد فی حق الاستاد۔ ۷۔ اظہار انکار المنکرین۔
۸۔ تحقیق الزمان فی آداب المشائخ والاخوان۔ ۹۔ النار الی مطعن ذم المعاویہ وغیرہ۔
آپ نے قریباً ایک سو برس کی عمر میں ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۵ء میں وفات پائی اور اپنی تعمیر کردہ مسجد سٹی کوتوالی دہلی دروازہ لاہور میں دفن ہوئے
مولانا باغ علی نسیم اور اقبال احمد فاروقی ایم۔ اے آپ کے مشہور شاگرد ہیں۔
مولانا باغ علی نسیم نے آپ کی یاد میں مکتبہ نبویہ قائم کیا جو دورِ جدید کے طباعت و اشاعت کے تقاضوں کے مطابق مسلکِ اہلِ سنت والجماعت کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

نجات

:- عربی لفظ، قرآنِ عزیز میں کئی مقام پر آیا ہے۔
اسلام میں نجات صرف اللہ ہی سے مانگی جا سکتی ہے۔ وہ واحدہٗ لاشریک ہی عذاب سے اور مشکلات سے بچا سکتا ہے۔ اسلام کے مطابق جو کوئی بھی کلمہ اور دوسرے ارکانِ دین پر عمل کرنے سے نجات مل جاتی ہے، نجات کے متلاشی اور نیک بندوں کو ہی نجات ملے گی۔ کچھ کو گناہوں کے کفارے کی سزا ملے گی اور بعض جو منکر ہوں گے اور اللہ سے غافل رہے ہوں گے اور ایسے لوگ ہوں گے جو گناہِ کبیرہ کرتے رہے ہوں گے انہیں نجات کی بجائے جہنم کی آگ ملے گی۔

نجات طفلان

:- فارسی الفاظ معنی بچوں کی نجات - متنازعہ فیہ مسئلہ کہ بچوں کو نجات ملے گی یا نہیں۔ ابوحنیفہ سے اس قسم کا سوال کیا گیا یعنی مشرکین کے بچوں کو نجات ملے گی یا وہ بھی واصلِ دوزخ ہوں گے مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ جہنم میں جائیں گے۔ بعض کی رائے ہے کہ جنت میں اور بعض کوئی رائے نہیں دیتے۔ مگر یہ امر مسلم ہے کہ بچے پاک صاف اور مرضیٔ خدائے تعالیٰ کے مطابق جنم پاتے ہیں۔ قرآن اور نبیٔ اکرمؐ کی اس بارے میں منفرد احادیث سے نجات طفلان کے حقائق اخذ کیے جا سکتے ہیں۔
دورِ حاضر میں اسلامی مفکرین اور علمائے کرام میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ بچے پاک صاف دنیا میں آتے ہیں، انھیں نجات ملے گی۔ اسی لیے مشہور ہے کہ جو جتنی جلدی دنیا سے جائے گا۔ اتنا ہی اس پر گناہوں کا بار کم ہوگا۔

نجار

مامون الرشید کے زمانے میں اسلام کی نامور شخصیت، نام نجار، حسین بن محمد ابو عبداللہ۔ ابتدا میں بمقام بام رہائش رکھتے تھے، پیشۂ زندگی پارچہ بافی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کی دید صرف مقدس کاموں کی بجا آوری سے ہی ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں زندگی حوادث ہی سے تکمیل پاتی ہے۔ اہم کیا ہے ــــ حوادث یہ سب بڑھتے بڑھتے خدا تک جا پہنچتے ہیں اور وہیں آخر ہے اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ یہی تصور ابن سینا کا تھا اور یہی نظریے بڑے بڑے دوسرے مفکرین نے پیش کیے کہ ہر چیز ناحق ہے اور خدا تے واحد کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ وہ حسنِ ازل ہے اور ہر چیز ناحق ہے، نجار کے مطابق وہ خیر کے تمام فعل کو اپنی مدد سے نوازتا ہے اور تمام فعلِ شر اس کی لعنت کا سامنا کرتے ہیں۔

ایمان خدا، رسول اور آسمانی کتب و صحیفہ کو دل سے ماننے اور ایسی ہی دوسری باتوں پر مشتمل ہے۔ یہ بڑی پراسرار شے ہے۔ یہ بہت سی خصوصیتوں کا مالک ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ مگر پھلتا ہے، اس کا ہر عمل تابع داری و انکساری کو سموتے ہوتا ہے۔ مگر انکاری، منکر اسے مکمل طور پر تباہ کر دیتی ہے۔
نجار کے اس علم نے پورے علوم کے گرد احاطہ کیا اور ان پر اثر ڈالا۔ یہ بشیر المریسی کے شاگرد تھے۔

نجار، بنو

قدیم عرب کا مشہور قبیلہ، جو اپنی سرگرم خیزی کی بدولت مشہور ہے۔ اس قبیلے میں نامور شاعر اور بڑے سپاہی پیدا ہوئے۔ اسلام آنے پر اس قبیلے کے بہت سے افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔

نجاریہ (۲۵۱ھ)

- فرقہ معتزلہ کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بانی کا نام حسین ابن محمد نجار ہے۔ ابن حون اور ابی یوسف اس فرقہ کے بہت بڑے عالم اور محقق گزرے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے فرقہ کے بنیادی عقائد کی تشریح و توضیح پر کئی کتابیں لکھیں، دوسرے فرقوں کے علماء سے خدا تعالیٰ کی صفات پر بڑے بڑے مناظرے کیے اور ان مناظروں میں کامیابی حاصل کی۔ عباسی خلفاء کو بھی ان لوگوں نے کافی حد تک متاثر کیا۔ ایک دور ایسا بھی آیا جبکہ اس فرقہ کے علماء نے حکومتِ وقت کو دوسرے فرقوں کے علماء کو قتل کرنے کے فعل پر اکسایا اور قتل کروایا۔ یہ گروہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا قطعی منکر ہے اور دیگر فرقوں کے ہاں مروجہ صفاتی علم غیر ضروری سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کے عقائد یہ ہیں :-
- خدا قدیم ہے اور بولنے کی طاقت رکھتا ہے۔ محض یہی ایک صفت اس میں موجود ہے۔
- قرآن مجید مخلوق ہے۔

نجاست

پاکیزگی و طہارت کا الٹ، گندگی، ناپاکی، غلاظت، جمع نجاسات
اسلام پاکیزگی، طہارت و صفائی کا درس دیتا ہے، نجاست جیسی عادتوں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے، نماز پڑھنے سے پہلے صفائی ضروری ہے۔ نہ صرف کھانا کھانے کے بعد بھی صفائی رکھنا ضروری ہے۔
اسی لیے مسواک کرنا سنت قرار دیا ہے۔ سگ سے بچنا چاہیے۔ جب کسی برتن کو چھو لے تو سات بار دھو کر پاک کرو یہ بات ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ [illegible] ابن عباس سے روایت ہے [illegible] علی کرم اللہ سے روایت ہے [illegible] عادت سے پرہیز کیا جانا ضروری ہے۔
جب کسی صورت آدمی ناپاک ہو جائے تو اسے چاہیے کہ غسل کرے، رگڑ رگڑ کر پانی سے اچھی طرح دھوئے۔

نجاشی

لفظ نجوش بنا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں یہ لقب حبشہ کے بادشاہوں کا رہا ہے جو ہزار ہا سالوں سے وہاں حکومت کرتے چلے آتے ہیں۔ ابتدا میں نجاشی اور اس کی قوم عیسائی تھی، یہاں مسلمان تاجر تجارت وغیرہ کی غرض سے آیا جایا کرتے تھے۔ ایک جنگ میں اٹلی نے اس ملک پر قبضہ کر کے یہاں کے بادشاہ ہیل سلاسی کو نکال باہر کیا تھا۔ مگر جنگِ عظیم دوم کے بعد اسے اپنا ملک واپس مل گیا۔

نجاشی، نیگوش

نجاشی بادشاہوں میں سے ایک شاہ حبشہ متوفی ۶ھ

بمطابق ۶۳۱ء اس کا اصل نام اصحمہ تھا۔ نبوت کے پانچویں برس جب قریش کے ظلم و جور سے تنگ آ کر مسلمانوں نے ہجرت حبشہ کی تو اس نے پناہ دی۔ اس کے بارے میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ——— "نجاشی کے مرنے کے بعد ہم لوگ باہم گفتگو کرتے تھے۔ اس کی قبر پر ہمیشہ نور دکھائی دیتا ہے۔"

نجد

عرب کا کوہستانی علاقہ، وہاں کا مرکزی صوبہ، ایک اہم شہر ریاض بھی اسی میں شامل ہے۔

نجران

نجد اور یمن کے درمیان کی ایک بستی، یہاں ایک زمانے میں عیسائی قبائل آباد تھے۔ عیسائی راہبوں کے علاوہ بنو حارث بھی آباد تھے۔

۱۰ھ میں آپؐ نے خالد بن ولیدؓ کو تبلیغ اسلام کی غرض سے بھیجا کہ تین مرتبہ بلند آواز سے اسلام پیش کرنا جو قبول کر لیں، صرف انہیں ہی سکھانا اور جو نہ مانیں ان سے مقابلہ کرنا بہت سے افراد اس تبلیغ پر اسلام لے آئے۔

نجس

گندہ، ناپاک، پلید، مکروہ تحریمی، ناقابل استعمال، جو اشیا۔ ان کے میں آتی ہوں۔ نجس العین کہلاتی ہیں۔ شریعتاً ان کا استعمال جائز نہیں۔

مثلاً شراب اور ایسے ہی دوسرے مشروبات، خون اور جسمانی فضلے، اُن جانوروں کا دودھ جن کا گوشت نہ کھایا جاتا ہو۔ اسی طرح کتے بھی نجس العین ہیں۔ انہیں چھونا ناپاکی کی علامت ہے جس گھر میں یہ ہوں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں جاتے۔ اس طرح سور، مردار وغیرہ خدا نے حرام قرار دے دیئے ہیں۔ ان کے بارہ میں سورۃ بقرہ ۱۷۳، سورہ انعام ۱۴۶، سورۂ مائدہ ۳ اور سورۂ نحل میں واضح طور پر ارشادِ باری تعالیٰ درج ہے۔ شراب اور ایسے مشروبات کے بارہ میں متعدد احادیث سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

نیز دیکھیں "طہنۃ" اور "نجاست"

نجف اشرف

عراق میں کوفہ سے چھ میل مغرب کی جانب ایک گاؤں اور عبادت گاہ کوفہ کے قریب امام علی بن ابوطالب مدفن ہیں۔ یہ دریائے فرات کے قریب ہی ہے یہیں بمطابق روایات نجف کا گاؤں آباد ہوا۔ اسلئے اسے نجف الکوفہ بھی کہا جاتا ہے۔ ماہر ارضیات کے مطابق غارِ حرا بھی اس کے ٹیلے پر ہے۔ ابن بطوطہ ۲۶ ھ میں یہاں آیا تھا، یعقوبی کے مطابق ایک زمانے میں النجف کی جگہ ساحلِ سمندر ہوا کرتا تھا۔ ابنِ بطوطہ کے مطابق یہ عراق کا ایک اہم شہر ہے اور یہاں کی آبادی بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ جن میں ایرانی اور عربی شامل ہیں۔ ابنِ بطوطہ کے مطابق یہاں حضرت نوحؑ اور حضرت آدمؑ کے مقابر بھی دکھائے گئے ہیں۔ حضرت علیؓ کا مزار مبارک بھی یہیں ہے۔ جس کی زیارت کو بہت سے لوگ آتے رہتے ہیں۔ یہاں بہت نہریں اور جھیلیں بنائیں ہیں جو بعد میں خشک ہو گئیں۔ پرانے نقشوں میں اب بھی ان کے آثار ملتے ہیں۔

نجم الدین کبریٰ

خاندانِ کبرویہ کے سردار۔ حیات رواں ۵۴۰ھ تا ۶۱۸ رہی۔ نام احمد، کنیت ابوالجناب اور کبریٰ لقب تھا۔ والد کا نام عمر بن محمد بن عبداللہ خیوقی تھا۔ سلطان سنجر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

لوگ آپ کو شیخ ولی تراش بھی کہتے ہیں۔ لقب کی وجہ تحصیلِ علم و مناظرہ کا شوق بتایا جاتا ہے اور دوسرے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غلبات وجد میں جس کسی پر آپ کی نظر جس کسی پر پڑتی وہ درجہ ولایت کو پہنچ جاتا۔ مولانا رومؒ کا یہ شعر بھی انہی کے بارے میں ہے۔

> یک نظر فرما کر مستغنی شوم زا بنائے جنس
> سگ کہ شد منظور نجم الدین سگاں را سرور است

شیخ صاحب نے ابتدا میں کتاب شرح السنۃ پڑھی۔ بعد ازاں خوزستان پہنچے اور وہاں شیخ اسماعیل کے مرید ہو گئے۔ یہ سماع کے قائل تھے اس لیے آپ بھی بوجوہ یہاں کے محفلِ سماع میں شریک رہتے۔ وہیں شیخ عمارؒ سے بھی فیض حاصل کیا۔ بعد میں انہی کے حکم پر مصر چلے گئے۔ وہاں شیخ روزبہان کی خانقاہ میں ٹھہرے یہیں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ بہت سے افراد آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ آپ کے نامور مریدوں میں شیخ مجدالدین بغدادی، باباکمال حموی، شیخ جمال الدین گیلیؒ، شیخ نجم الدین رازی، شیخ سعدالدین حموی وغیرہ شامل ہیں۔

شیخ مجدالدین بغدادی نے "تحفۃ البررہ" نامی کتاب میں آپ کی ملفوظات محفوظ کر دی ہیں۔

جب تاتاری شاہ محمد خوارزم کی تلاش میں آپ تک پہنچے تو آپ تیر سے تمام کر لڑے مگر ایک تیر آپ کے سینے میں لگا۔ جس سے جانبر نہ ہو سکے اور شہید ہوئے۔

نجوم

نجم کی جمع، وسیع و عریض آسمان پر ان گنت ستارے، جن کا آپس میں فاصلہ بھی بے پناہ ہے۔ ۸۰ ہزار کے لگ بھگ انسانی آنکھیں دیکھ سکی ہیں۔ قرآنِ پاک میں زمین و آسمان کے علاوہ ان کا ذکر بھی موجود ہے۔ جن میں ان کی تخلیق تین واضح مقصد بتائے گئے ہیں۔

(i) حسنِ آسمان میں اضافہ (ii) شیطان کے لیے پتھر (سورہ ۵-۱۱ ×۷)

(iii) رات کے وقت قافلوں کی راہبری۔

قطب ستاروں اور ایسے ہی بہت سے ستاروں کی مدد سے انسان ماضی میں راہبری حاصل کرتا رہا ہے۔

نجوم، علوم

سیاروں کے اثرات سے موسمی و جغرافیائی حالات کا پتہ لگانا اس کا ماہر منجم کہلواتا ہے جو ایک قسم کا کاہن ہے اور کاہن ساحر ہے اور ساحر کافر۔ اسلام میں اس علم کی کوئی گنجائش نہیں۔ ستاروں سے جب وہ مستقبل کا پتہ کرتا ہے تو بالواسطہ وہ غیب بتلاتا ہے، جو اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ ان کی طرف سے بتائی ان باتوں کے بارے میں جو بعض اوقات سچی نکل جاتی ہیں۔ حدیث نبوی ہے کہ ایک آدھی سچی بات شیطان، ڈاکو، سو جھوٹ ملا کر اپنے دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے، ان کے بارے میں ایک ایک مقام پر فرمان ہے کہ یہ قوم میں گمراہی پیدا کرتا ہے۔

سائنس اس بات پر اعتقاد رکھتی ہے کہ مختلف قسم کے نجوم مختلف اعضائے انسانی کو متاثر کرتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کے انسانی مستقبل و ماضی کی تشہیر کی جاتی ہے اس کے لیے فرضی طور پر جو زائچہ بناتے ہیں۔ وہ فرضی زائچہ کہلواتا ہے۔ اسی طرح زندگی کا زائچہ، ولادت کا زائچہ وغیرہ بھی بنتے ہیں۔ یہ اسلام میں یہ کسے مقام پر اس لیے رہے کہ زندگی ستاروں کے اثر سے نہیں بنتی، بلکہ خدا، کوششِ انسان اور ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے دیتا ہے۔ نیز دیکھیں "جادو"۔

نسائی، امام جو معروف غوث نقیہ۔ نام احمد بن شعیب بن علی بن سان کنیت ابوعبدالرحمٰن ۲۱۵ھ/ ۸۳۰ء نسا میں پیدا ہوئے جو خراسان میں مرو کے پاس ایک جگہ ہے۔ ایک عرصے تک مصر میں رہے بمقصد حدیثیں جمع کرنا تھا یہاں خاصا

چرچارہا۔ پھر دمشق چلے گئے جہاں بنو امیہ سے ناراض رہتے، یہاں جب مار پیٹا گیا تو مکہ چلے گئے کہا جاتا ہے کہ اس مار پیٹ کی وجہ سے مکہ میں ۳۰۳ھ ۲۱۵ھ ۲۰ اگست ۹۱۵ء میں وفات پائی اور صفا و مروہ کے ستونوں کے درمیان مدفون ہوئے۔ حدیث پر آپ کی چھ مستند کتب موجود ہیں جو "نسائی" کہلاتی ہیں۔ بدغاۃ المسلم کے بعد سب سے زیادہ مستند ہیں۔ ان میں کچھ ابواب احادیث کے علاوہ بھی ہیں یہ "سنن کبریٰ" بھی کہلاتی ہیں۔ لکھنے کے بعد ان میں سے غیر مستند باتیں حذف کر کے ہی طباعت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان میں "سنن صغریٰ"، "سنن نسائی"، "خصائص امیرالمومنین علی ابن ابی طالب" وغیرہ شامل ہیں۔

نخلہ مکہ اور طائف کے درمیان مکہ معظمہ سے یک شبانہ روز کی مسافت پر ایک مقام۔ ۱۰ھ میں طائف سے واپسی پر آنحضورؐ اسی مقام پر ٹھہرے تھے۔ نینوا سے آنے والی جنات کی جماعت سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے قبل ۲ھ میں یہاں ایک تاریخی واقعہ پیش آیا جو "واقعۂ نخلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ہوا یوں کہ اس سن ہجری میں حضور پاکؐ نے عبداللہ بن جحش کی قیادت میں بارہ رکنی وفد بھیجا تاکہ وہ دشمنوں کی حرکات کا جائزہ لے۔ اس سلسلے میں انہوںؐ نے ایک بند خط دیا تھا جسے دو روز بعد کھولنے کی ہدایت کی تھی۔ نخلہ پہنچ کر یہ خط کھولا گیا۔ اس میں قریش کی نقل و حمل پر نگاہ رکھنے کی ہدایت درج تھی جس کی باقاعدہ رپورٹ دینا تھی۔ مگر ان لوگوں پر ہدایت کے برخلاف لڑائی مسلط ہو گئی اور قریش کا سردار حضرمی مارا گیا۔ اس کے انتقامی جذبے نے بعد میں جنگِ بدر کو پیدا کیا۔ آنحضرتؐ نے اس کو خون بہا ادا کیا۔

یہ ایک زمانے میں سرسبز و شاداب مقام تھا۔ اور یہاں کھجوروں کے باغات بکثرت تھے۔

نذر! تحفہ، راہِ خدا میں پیش کی جانے والی چیز، جس کا کوئی خاص مقصد بھی ہو۔ یا آدھا کسی کا خرچ اپنے اوپر لازم کرے۔ قدیم زمانوں میں یہ طریقہ بڑے پیمانے پر رائج تھا کہ کسی بات کے حصول کے لئے منت مانا کرتے تھے۔ اور پھر پورا ہونے پر جو کچھ انہوں نے منت میں نذر مانی ہو، اور جس کے نام کی مانی ہو، میں نذر، اسی کے نام پر قربان کر دیتے تھے۔

حضرت عمرانؑ نے اپنا بیٹا یا بیٹی نذر کرنے کی منت مانی تھی۔ اسی طرح حضرت عبدالمطلب نے اپنا بیٹا قربان کرنے کی منت مانی تھی۔

اہلِ اسلام نے منت، نذر و قسم کو ایک ہی درجہ دیا ہے۔ اور جب منت مانی جائے، تو اسے پورا کرنا لازم ہے۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ اگر منت پوری نہ کی جائے تو اللہ کی جانب سے سخت مصیبت نازل ہوتی ہے۔

منت اور نذریں اپنے حقیقی مفہوم میں صرف خدا ہی کے لئے ہیں۔ اسلامی مفکرین کے ایک بڑے طبقے کی رائے میں منت ماسوا خدا کے کسی دوسرے نام کی ماننا شرک ہے۔ اور اس کا انہیں گناہ ملے گا۔ مگر جو راہ خدا میں ہو، اور اس کا امر بھی جائز ہو، یعنی جس چیز کے لئے منت مانی جا رہی ہے وہ حلال ہو تو اللہ اس کے پورا کرنے پر ثواب دے گا۔

اس بارے میں سورہ بقرہ (آیت ۲۷۰-۲۷۱) میں واضح ہدایت آئی ہے۔

"تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اس کا علم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے۔ لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ حق میں بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال اس کی خبر ہے۔" احادیث میں بیان آیا ہے کہ حضور پاک نے فرمایا کہ ہر بات پر منت ماننا ٹھیک نہیں۔ مگر مان لینے کی صورت میں پورا کرنا لازم آتا ہے۔

نسخ جو آیت کسی آیت کی جگہ بہتر طور پر لے وہ ناسخ کہلاتی ہے۔

قرآن مجید میں اس بارے میں یوں ارشاد آیا ہے ——— "ہم اپنی کوئی آیت نہیں کرتے منسوخ، اگر ہم اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (۲:۱۰۶) ——— اور "جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں اللہ ہی اس کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، جو نازل فرماتا ہے۔۔۔۔"

ان سے مراد لیا گیا ہے کہ خدائے واحد نے قرآنِ کریم میں بعض آیتیں منسوخ کی ہیں۔ ابن عمر سے بخاری میں روایتیں منسوخ کی ہیں۔ مگر ابن جریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر منسوخی کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح ابن عباس کے بارے میں ہے کہ وہ منسوخی کے قائل تھے اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ نہیں تھے۔ تاہم معلوم یوں ہوتا ہے کہ قرآنِ مقدس میں نسخ و ناسخ کی جو بات کی گئی ہے۔ وہ مجازی معنوں میں آئی ہے اور اس لیے مراد یہ ہے کہ بعد کی آیتیں سابقہ آیتوں کے معنی واضح کرتی ہیں۔ بعض اس سے مراد لیتے ہیں کہ پہلی آسمانی کتب سے متعلق ہیں جن سے بہتر آیتیں قرآن مجید میں آئیں کیونکہ اس وقت انسان [illegible] اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے وحشیانہ زندگی کا عادی ہو چکا تھا اور اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ ایک دم پاکیزہ زندگی حاصل کرے۔ اس لیے کلام اللہ نے آہستہ آہستہ انسان کی تہذیبی صلاحیتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ترقی کی۔

علامہ طبری کے مطابق نسخ کی تمام [illegible] ضعیف ہیں۔ اسی طرح کی رائے ابو مسلم اصفہانی دیتے ہیں یعنی ———" اور یہ روایات خبرِ احاد ہیں اور بعض تو موقوف یا خفیف ہیں ——— اگر ناسخ یا منسوخ کا قرآنِ عظیم میں وا[illegible] کوئی منسوخ [illegible] تو آپ ضرور کوئی ہدایت فرماتے، مگر ایسا نہیں ہے۔

تاہم علمائے کرام میں سے بعض جو نسخ و ناسخ کے قائل ہیں اسے تین صورتیں [illegible] دیتے ہیں، ایک وہ جس کی تلاوت منسوخ ہوئی۔ دوم جس کی تلاوت منسوخ [illegible] البتہ حکم منسوخ ہے اور سوئم میں حکم و تلاوت دونوں منسوخ ہیں۔ [illegible]

نسفی اہم شخصیات کا گروہ جن میں ان خواص کا ذکر [illegible]

ابوالمعین المیمون الحنفی المکی، ابو حفص عمر نجم الدین، حافظ الدین یہ سب [illegible] مفکر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی کتب قانون، نظریاتِ اسلام [illegible] ارکان وغیرہ شامل ہیں۔

نسی: قدیم زمانے میں اہلِ عرب کا قاعدہ

نسی کے قاعدے کے مطابق اگر وہ کسی سے انتقام لینے کے لیے یا غارت گری کے لیے جنگ چھیڑنا چاہتے تو کسی حرام مہینے میں اس [illegible] دیتے پھر اس مہینے کی جگہ کسی اور دوسرے حلال مہینے کو حرام قرار دے دیتے کہ اس حرام مہینے کی جگہ کسی اور کو حرام قرار دے دیتے پھر اس ماہ میں جنگ [illegible] مسلمان [illegible] کے تقدس کے پیش نظر کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے سورہ [illegible] فرمائی کہ مسلمان بھی ماہ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔ (آیت ۱۹۴)

نشست: [illegible]

سلام میں نشست لینے یا محفلوں میں جانے اور اٹھنے کے بھی آداب مقرر ہیں۔ راستوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں محفل میں یا کہیں بھی جماہی آنے کی صورت میں منہ پر ہاتھ رکھ لیا جائے چھینک آنے کی صورت میں الحمدللہ کہنا چاہیے اور سننے والوں کو یرحمک اللہ کہنا چاہیے محفل سے کسی آدمی کو اٹھانا بھی جائز نہیں اگر کوئی شخص مجلس سے اٹھ کر چلا جائے تو واپسی پر وہی اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے بڑے بوڑھوں، برگزیدہ شخصیتوں وغیرہ کے لئے جگہ خالی کر دینا کار ثواب ہے

دو آدمیوں کے درمیان بلا اجازت نہیں بیٹھنا چاہیے ایک حدیث میں آیا ہے جو شخص بیچ حلقے میں جا کر بیٹھے حضور نے اس پر لعنت فرمائی ہے دوران مجلس آپس میں گفتگو یا ادھر ادھر تکتے رہنا بھی بدتمیزی میں شمار ہوتا ہے۔

نشہ: مستی سرور شراب کی کیفیت وغیرہ دین کامل اسلام میں شراب سختی سے ممنوع ہے۔ اس کی سزا دُرّوں میں مقرر ہے۔ قرآن پاک میں بھی نشہ کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ ضحا میں نشہ کے عالم میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ نشہ و شراب خوشی کو تمام جرائم و معاشرتی گندگی کا "بانی" قرار دیا ہے اک حدیث شریف میں آیا ہے کہ نہ صرف اس کا پینے والا مجرم ہے بلکہ تیار کرنے والا ہے، کروانے والا "پینے والا" پلانے والا اٹھا کر لیجانے والا، منگوانے والا بیچنے والا منفعت دینے والا' اور دام لے کر نکاح والا بھی مجرموں کی فہرست میں آگئے ہیں۔

رسول پاکؐ نے بوجہ شراب نوشی وہ نشہ کرنے سے منع فرمایا ہے ہر شراب کہ جس کی کثیر مقدار بھی نشہ منتزہ بھی نشہ کرے گا۔ اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔

نص: آشکارا کھول کھول کر بیان کرنا۔ وہ قرآنی آیات جو بالکل ظاہر ہیں۔ جمع نصوص۔ اس کا اطلاق قرآن و حدیث دونوں پر ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ احکام جو قرآن یا حدیثی ہیں۔ نص کہلاتے ہیں۔ فقہ کی بنیاد انہی پر قائم کر کے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

نصاریٰ عربی لفظ

نصرانی کی جمع۔ حضرت عیسیٰ کو ماننے والے خاص طور پر اُن کو کہا جاتا ہے جو مشرقی ممالک میں آباد مسلمان حکومتوں کے ماتحت آباد تھے۔ قرآن پاک میں عیسائیوں کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اسی لیے مسلمان بھی اکثر و بیشتر انہیں اسی نام سے پکارتے ہیں۔ نبی آخرالزماںؐ کے زمانہ میں عیسائی منتشر طور پر مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ مدینے سے کوفہ کے درمیان مختلف قبائل میں ——— آباد تھے۔ اسی طرح بنو تغلب، نجران میں بنو عبدالقیس اور بنو حارث وغیرہ۔ ان مسلم ریاستوں میں نصرانی ذمیوں کے طور پر رہتے تھے اور خراج ادا کرتے تھے۔ ان کو حضور اکرمؐ نے بہت سے حقوق دے رکھے تھے۔ انہیں گرجا گھروں کی حرمت اور عبادات اور تمام رسومات کی ادائیگی کی اجازت تھی تاہم انہیں مسلمانوں جیسے لباس پہننے کی اجازت نہ تھی۔ سڑکوں اور بازاروں میں بھی ان عورتوں کو مسلمان عورتوں سے الگ رکھا جاتا تھا۔ آخری کلام اللہ میں عیسائی برادری کو اسی لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔

نصطور عربی لفظ۔

ایک عیسائی راہب جس نے شام کو مسکن بنایا۔ جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ محمدؐ کی قدم بوسی کرے گا۔ اس کے بارے میں "حیات القلوب" میں حضرت ابو طالبؑ کے حوالے سے درج ہے ———" جب ہم شام پہنچے، ہم نے وہاں مسلمانوں میں ہل چل دیکھی۔ نبی پاک کو دیکھنے کے لیے ایک شہر تھا جو اُمڈا آیا تھا اور اس مکان سے، یوں لگتا تھا کہ سورج پھوٹ پڑا ہے۔ روح پرور صدائیں پورے شام پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر راہب اور دانا آدمی انہیں دیکھنے آیا۔ آسمانی کتب کے بارے میں معمر ترین فرد، نصطور بھی انہیں دیکھنے آیا۔ وہ تین یوم تک اپنے گرد میں رہے۔ بالکل خاموش، بے سدھ، جب وہ جذبات سے بھرپور تھا، آپؐ کے قریب گیا اور چکر لگانے لگا۔ تو میںؑ (ابو طالبؑ) نے کہا کہ "اے راہب" تم اس بچے کے بارے میں کیا چاہتے ہو؟" اس نے جواب دیا ——— "اس کا نام معلوم کرنے کی خواہش رکھتا ہوں" اس پر میں نے اسے بتایا کہ انؐ کا نام محمدؐ بن عبداللہؑ ہے، یہ سن کر اس کا رنگ بدل گیا۔ اور ان کے کندھے دیکھنے کی اپیل کی اور اس نے نبوت کی مہر دیکھی اور گواہی دی۔ نیچے جھکا اُن کا چہرہ چوما، مگر آنسو اُمڈ پڑے۔ اپنی سسکیوں اور آہوں کے درمیان اس نے کہا ———" عہدِ نبوت کے اس سورج کو جلا اس کی آبائی سرزمین لے جاؤ، ورنہ اگر آپؐ کو معلوم ہو تا کہ یہاں اس کے کتنے دشمن ہوں گے تو شاید آپؑ نہ لاتے۔

اس کے بعد وہ فرد بار بار آتا رہا اور اس کا رویہ بڑا پرشفقت تھا۔ ایک روز نے ازراہِ تحفہ و نشانی ایک قمیض دی اور جب ہم وہاں سے مکہ گئے تو قرب و جوار سے بہت سے لوگ آئے ماسوا ابوجہل کے۔

دوسری روایتیں اس سے ذرا مختلف ہیں۔ ایک کے مطابق جب قافلہ بصرہ کے بازار پہنچا، تو ایسی اسے راہب کا ایک گروہ ملا۔ قافلہ کو دیکھتے ہی ان کا رنگ سرخ ہو گیا جیسے کسی پر کھردری شے سے رگڑا گیا ہو۔ انہوں نے اپنے جسموں کو عجیب ملتجانہ انداز میں حرکت دی اور چرچ میں اپنے جیسیت تک چلنے کی اپیل کی۔ قافلے والوں نے کہا: "تمہیں ہم سے کیا کام؟" انہوں نے کہا ———" ہماری عبادت گاہ تک چلنے میں تمہیں کیا نقصان ہے؟" اس پر وہ لوگ ان کے کلیسا تک چلے گئے۔ وہاں ایک عظیم معصوم اپنے شاگردوں کے ساتھ ہاتھ میں اللہ کی کتاب تھامے بیٹھا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا "تم کون ہو؟" ——— قافلہ والوں نے کہا کہ ہم قریش ہیں۔ اس پر اس نے قبیلے کا نام پوچھا، ہم نے کہا" بنی ہاشم" ——— اس نے پھر پوچھا کہ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ جو یہاں موجود نہیں۔ یقیناً قافلے والوں نے کہا: " ابوطالب کا یتیم پوتا" بنی ہاشم کا ایک فرد" یہ سنتے ہی وہ کراہ اُٹھے اور تقریباً چیختے ہوئے بولے ———" صدحیف، صدحیف" نصرانی مذہب تباہ ہو چکا"۔ اس کے بعد وہ ہمارے ساتھ نبیؐ کو دیکھنے بازار تک آیا جس کے گرد لوگوں کا مجمع جمع ہو گیا۔ اس کے چہرے سے سورج کی طرح روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس نے آپؐ کی نبوت کی گواہی دی اور چہرہ چوما پھر کہا ———" آپ مقدس ہیں"۔

نضیر، بنو مدینے کے جنوب کی جانب تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ایک یہودی بستی، بنو نضیر اور بنو عامر آپس میں حلیف تھے۔ بنو نضیر کا تعلق خیبر کے یہود سے تھا یہ اگرچہ عربی نام رکھتے تھے۔ مگر عربوں سے جداگانہ رہتے تھے۔ ان کی سماجی حیثیت بہت مضبوط تھی بے پناہ سرمایہ، مال و متاع سے بھرپور تھے۔ ذریعہ معاش کسی حد تک زراعت بھی تھا۔ ان کا اہم رہنما حیی بن اخطب تھا۔ صفیہؓ اسی کی بیٹی تھی جو بعد میں آپؐ کی زوجہ بنیں۔

ان کی رہائش گاہیں تمام شہر میں ہونے کی بجائے صرف جنوب کی جانب تھیں۔ ان قلعے مدینے سے آدھے دن کے سفر کے فاصلے پر تھے۔ سورۃ حشر اللہ تعالیٰ نے انہی کے لیے نازل کی تھی۔ نیز دیکھیں "نضیر غزوہ"۔

نضر بن حارث کفار قریش کا ایک فرد جو آپؐ جیسی باتیں کہنے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ کفار بھی آپؐ کے مقابلے میں نضر کی باتیں نقل کرتے۔ یہ آپؐ کا درس سنتا مگر بعد میں کہتا کہ آپؐ کی باتوں اور میری باتوں میں کیا

ستر ق ہے۔

جنگِ بدر کے موقع پر عقبہ بن ابی معیط کے ساتھ گرفتار ہوا۔ اسے مقدادؓ نے گرفتار کیا۔ راستے میں اسے خوف تھا کہ قتل ہوگا۔ اس لیے اپنے قریبی عزیز سے کہا کہ وہ حضور اکرمؐ کو کہیں کہ اسے بھی معاف فرما کر اپنے اصحاب میں شامل کر لیں۔ یہ عزیز مصعب بن عمیرؓ تھے۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ اس موقع پر مقدادؓ نے پکار کر کہا کہ اسے میں نے اسیر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اس کے مقتل کا حکم دیا اور مقدادؓ کے حق میں دعا کرتے ہوئے کہا ــــ "اے اللہ! مقدادؓ کو اپنے فضل و کرم سے غنی کر دے" ــــ آپؐ کے حکم کے ساتھ ہی حضرت علیؓ نے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا دی۔

نضیر، غزوہ یہ جنگ ۴ھ میں جنگِ احد کے چھ ماہ بعد بنو نضیر کے یہود سے لڑی گئی جنگ کے پس منظر میں یہ ہے کہ عمرو بن امیہ نے بنی عامر کے دو افراد کو قتل کر دیا۔ خراج دینے کے لیے حضرت علیؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ہمراہ گئے تاکہ خون بہا دیا جا سکے۔ نضیر نے آپؐ کو سایۂ دیوار میں بٹھایا۔ بعد میں انہوں نے پتھر پھینک کر آپؐ کے قتل کا قصد کیا۔ وحیِ الٰہی نے آگاہی دی اور آپؐ خاموشی سے اٹھ کر چلے آئے۔ بعد میں تینوں صحابۂ کرام بھی کافی دیر انتظار کر کے واپس آ گئے۔

بعد میں محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ وعدہ خلافی اور دغا بازی کے الزام میں دس دنوں میں شہر خالی کر دیں۔ بنو نضیر مایوس ہو کر شہر سے جانے والے تھے کہ منافقین نے ورغلایا اور ۲۰۰۰ ہزار افراد کی امداد کا یقین دلایا۔ جس پر بنو نضیر نے شہر خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے ایک اور معاہدہ کی پیش کش کی وہ نہ مانے۔ آپؐ نے عبداللہ بن ام مکتومؓ کو مدینہ کا امیر بنا کر خود جنگ کے لیے نکلے۔ یہود قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ یوم تک محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران آپؐ نے تمام وہ درخت جو ان کے کھیل رہنے تھے کاٹ دینے کا حکم دیا۔ ان پر رعب پڑا اور شہر چھوڑ دینے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے بلا شرط ہونے کی درخواست منظور کر لی اور انہیں اجازت دے دی کہ جتنا مال اپنے اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں لے جائیں سوائے ہتھیاروں کے اسلحہ ساتھ لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ یہودی خیبر اور حیرا میں منتقل ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے تمام مکانات جلا دیے کہ وہ ان مکانوں پر مسلمانوں کی رہائش برداشت نہیں کر سکتے۔ سورۂ حشر اسی واقعہ سے متعلق ہے اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کا کردار، درخت کاٹنے کا حکم، مالِ غنیمت کا مصرف اور اسی طرح بہت سی ہدایات درج ہیں۔

نظام النظام ابراہیم بن سیار بن ہانی بن اشکب بصرہ کا ایک نامور معتزلی کی زندگی کے آخری سال بغداد میں گزرے اور وہیں وفات پائی۔ مؤرخین نے اس کا سن وفات ۲۲۰ھ سے ۲۳۰ھ تک بتایا ہے۔ عباسی دور کی ایک اہم شخصیت تھا۔ فلسفہ و اسلام کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھا اور اسلامی نظریہ ہمہ ازلی میں بلند مقام رکھتا ہے۔ دہریہ اور ایسی ہی تمام تحریکوں کے خلاف اس نے ایک زبردست تحریک چلائی جس کا ذکر الغزالی کی تہافت میں بھی ملتا ہے۔ اس نے توحید اور قرآن پر وسیع تحقیق کی۔ اصل التوحید میں یہ دہریہ مذہب کے خلاف قرآن کی آیات کی تشریح کرتا ہے۔

اس میں دنیا کی تشکیل اور بنانے پر وسیع بحث کرتا ہے جو نو ماطون افکار کے تابع معلوم ہوتی ہے۔ اپنی دوسری تصنیف "اصل العدل" میں انسانی آزادیوں پر بحث کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام فعل انسانی اس حیثیت کے رہتے ہیں جو خدا نے جسمِ انسان میں پوشیدہ کر رکھی ہیں اور نہ دو ہے۔ انسان بس کا اور اک نہیں کر سکتا۔

اس کی تصنیف کتاب فقہ یہ ہے یہ اصل الرد والالویہ کہلاتی ہے۔

نظام الدین اولیاؒ :۔ (۶۳۶ھ ــــ ۷۲۵ھ) سلطان المشائخ اولیائے کرام میں سے ہیں۔ اکثر "محبوبِ الٰہی" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ کا ایک اور لقب "شمس الملک" ہے جو غیاث الدین بلبن نے دیا تھا۔ اسم مبارک محمد ہے اور سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کا خاندان بخارا سے ہجرت کر کے لاہور آیا پھر آپ کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب اپنے اہل و عیال سمیت بدایوں تشریف لے گئے۔ وہیں آپ کی پیدائشِ مبارک ۲۷ صفر ۶۳۶ھ کو ہوئی۔ پانچ برس کے ہوئے تو شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ پرورش والدہ ماجدہ کے ہاتھوں میں ہوئی۔ اسی دوران مولانا علاؤ الدین اصولی سے قدوری پڑھی۔ اس کے بعد قرآن [illegible] ختم کیا اور کتب متداولہ پڑھنا شروع کیں بچہ ہم تحت میں مشق [illegible] علم کے شوق میں سولہ برس کی عمر میں والدہ ماجدہ کے ہمراہ دہلی پہنچے۔ یہاں مولانا شمس الدین کی شاگردی میں چلے گئے۔ یہاں ان سے حریری کے چالیس مقامات [illegible] دہلی ہی کے ایک اور متقی بزرگ مولانا کمال الدین سے حدیث پڑھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے حدیث مولانا کمال کے علاوہ مولانا احمد تبریزی سے بھی حدیث سیکھی جنہوں نے سند دی۔ تحصیل حدیث کے بعد مختلف شاہد سے فقہ اصل [illegible] ہیئت وغیرہ پڑھے

بابا فرید گنج شکرؒ سے [illegible]

وقت آپ کی عمر بیس برس کی تھی۔ [illegible]

آپ ان کے پاس [illegible] رجب [illegible] پہنچے [illegible]

آپ کی زندگی [illegible]

کر دی تھی [illegible] آپ کے ہاتھ [illegible]

[illegible] سلطان وقت [illegible]

ہوئے [illegible]

تھی

آپ کے بہت سے شاگردوں میں [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ کی [illegible]

فوائد الفواد آپ کے خلیفہ خواجہ حسن سنجری نے مرتب کی جس میں سماع کا بار بار ذکر آیا تھا۔

نظام الملک بحری دورِ اقتدار ۱۴۸۱ء - ۱۴۹۰ء بہمنی سلطنت کے مرکز بیدر کے نامور سیاست دان محمود گاوان کے مقتل کے بعد اس کی جگہ سلطان محمد ثالث کا وزیر مقرر ہوا اور اپنے بیٹے منیر احمد کو جنیر کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۴۹۰ء میں ملک ... نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور ۱۴۹۹ء میں احمد نگر فتح کر لیا اور وہاں "نظام شاہی سلطنت" کی بنیاد رکھی۔

نظام الملک بیجاپور کے برہمن کا بیٹا تھا اور اس کا اصل نام بھیما بھٹا تھا۔ سلطان احمد شاہ بہمن کے زمانے میں گرفتار ہو کر اسلام لایا۔ شہزادہ محمد شاہ کا ملازم ... اسلامی نام ملک حسین رکھا گیا۔ اس کے بعد عوام میں ملک حسین بھیرو کے نام سے مشہور ہوا۔

"بحری" اسمی "بھیرو" سے نکلا ہے کیونکہ شہزادہ بھیرو کی ادائیگی درست طور پر نہ کرتے ہوئے "بحری" کہتا تھا۔ اس طرح اس کا خطاب والقاب "نظام الملک بحری" نامور ہوا۔ خواجہ محمود گاوان نے تلینگانہ کا حاکم مقرر کیا۔ بعد میں اس کے [illegible] کے بعد وہ اس کے منصب پر فائز ہوا۔ نو سال بعد اسی منصب پر ... کر قتل ہوا۔

نظام الملک طوسی ایران کے سلجوقی فرمانروا کا مشہور وزیر (۱۰۱۷ء - ۱۰۹۲ء) مشہد سے ۵۰ میل شمال کی جانب نوقان کے مقام پر پیدا ہوا۔ چاکر بیگ کے مشورے سے سلطان الپ ارسلان کا وزیر مقرر کرایا۔ ۱۰۶۷ء میں بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا جو اسلامی درسگاہ کے طور پر حامل شہرت ہوا۔ ملک شاہ کے بیس عہد حکومت میں سطروی طاقت اس کے ہاتھ رہتی۔ اس کی تجویز پر ۱۰۷۴ء - ۱۰۷۵ء میں ہیئت دانوں کی کانفرنس طلب کی گئی اور انہیں ایرانی کیلنڈروں کی اصلاح کی دعوت دی گئی اور جلالی کیلنڈر رائج کیا جو اسی کے ایک بادشاہ جلال الدین ابو الفتوح ملک شاہ کے نام پر تھا۔ عمر کے آخری حصے میں وزارت سے برطرف ہوا ۱۰۹۲ء میں حسن بن جام کے ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

نظام دکن نام میر عثمان علی خان، ان کی ریاست حیدر آباد دکن پر مشتمل تھی ... کے تخت پر ... آپ کے عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ... دارالسلام قائم کیا ... بہت سی کتب ترجمہ کی گئیں۔
ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب بھارت نے ریاست کو اپنی حکومت میں مدغم کرنے کے لیے جارحانہ اقدام کیا تو آپ نے اور آپ کے شہریوں نے مخالفت کی نتیجۃً حکومت ہندوستان نے امداد بند کر دی جس سے اشیائے صرف کی قیمتیں گراں ہو گئیں۔ بالآخر وہ ریاست ... کو ... ضم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور آپ کی حکومت ختم ہو گئی۔
آپ نے ۸۰ برس کی عمر میں ۱۹۶۷ء میں وفات پائی۔
ایک دیوان کے مصنف ہیں۔ طبیعت میں سادگی و بے تکلفی تھی۔

نظامی گنجوی (۱۱۴۰ء - ۱۲۱۰ء) فارسی شاعر، حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف ذکی بن موید۔ ولادت شہر گنجہ (سمرقند) میں ہوئی۔ جلد ہی ماں باپ کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم و تربیت ماموں کی زیر نگرانی ہوئی۔ مختلف بادشاہ و وزراء نے انعام و کرام سے نوازا۔ لیکن براہ راست کسی دربار سے بھی منسلک نہ رہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ تاریخ، ادب، ہیئت اور نجوم سے بھی شغف رہا۔ باعث شہرت پانچ مثنویاں (مخزن اسرار، خسرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، سکندر نامہ، ہفت پیکر) ہیں۔ تعداد میں پانچ ہونے کی وجہ سے یہ تصانیف پنج گنج اور خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں۔
آپ کا مقبرہ باکو اور گنجہ کے درمیان ویران سے مقام پر ہے۔ ۱۹۱۲ء میں روسیوں نے ان کے جسدِ خاکی کو لے جانے کی کوشش کی۔ وہاں دو قبریں دستیاب ہوئیں۔ گمان ہوا کہ ایک آفاق کی ہو گی، چنانچہ دونوں کو یکجا کر کے دفن کر دیا گیا۔ یہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔

نظامیہ درس مولوی ابوالحسنات کی روایت کے مطابق ملا نظام الدین نے اس درس کی بنیاد ڈالی۔ یہ درس نظامیہ کہلاتا ہے اس میں صرف: میزان۔ صرف میر، پنج گنج، زبدہ۔ فصول اکبری شامل ہیں۔
نحو: نحو میر۔ شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی۔ **منطق:** صغریٰ کبریٰ۔ ایساغوجی، تہذیب۔ شرح تہذیب۔ قطبی مع میر۔ سلم العلوم۔
حکمت: میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔
ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ شرح چغمینی باب اوّل۔ **بلاغت:** مختصر معانی۔ مطول تا ما انا قلت۔ **فقہ:** نور الانوار توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت۔
کلام: شرح عقائد، نسفی۔ شرح عقائد جلالی۔ میر زاہد۔ شرح مواقف۔
تفسیر: جلالین، بیضاوی، حدیث، مشکوٰۃ شریف کی تعلیم دی جاتی ہے۔
اس درس سے شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے مطابق درس کی بنیاد ملا فتح اللہ شیرازی نے رکھی تھی۔ شاہ سلیمان کو اس درس پر شدید اختلاف ہے، کیونکہ اس میں تصوف و اخلاق کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مولوی طبقے میں وہابیوں اور غیر مقلدین حضرات کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ شاہ لکھتے ہیں کہ ان میں پڑھائی جانے والی اکثر کتب حضرت نظام الدین کے عہد میں تحریر نہیں پائی تھیں۔ نظامیہ درس پر وسیع پیمانے پر تنقید ہوتی رہی ہے۔ کیونکہ اس میں بقول ان کے ایسی کتب شامل تھیں، جو نہ دنیا بتاتی تھیں، نہ ہی عاقبت۔ اس کے علاوہ حرف وغیرہ ہزیمت وقت ضائع کیا جاتا ہے۔
اس درس کی تدریس میں ملا نظام الدین کے بیٹے بھی شامل تھے، جن میں ملا عبدالعلی نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ انہیں کرناٹک کے رئیس نواب محمد علی خاں نے "بحر العلوم" کا خطاب دیا۔

نظریۂ مقتدر
ریاست کے وجود میں آنے کے بعد یہ بات بحث میں آئی ہے کہ طرز حکومت کیا ہو؟ اس ضمن میں تین نظام سامنے آتے ہیں۔ صدارتی، پارلیمانی اور تیسرا نظام اشتراکی طرز حکومت ہے جہاں انقلابی پارٹی کا سربراہ ملک کے اختیارات کا زبردست مرکز ہوتا ہے ــــ صدارتی طرز آمرانہ ہوتا ہے جس میں شخصی حکومت ہوتی ہے۔ روسی نظام میں اظہار رائے کچلا جاتا ہے۔ پارلیمانی طرز حکومت میں خامی یہ ہے کہ نا اہل افراد اسمبلیوں میں جا بیٹھتے ہیں۔ چونکہ موجودہ طرز انتخاب میں صرف رئیس ہی کھڑے ہو سکتے ہیں اس لئے یہ لوگ ایسے قوانین بناتے ہیں جو صرف ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ امراء کے مفادات کا تحفظ غریبوں کی موت ہوتا ہے۔ دوسری جانب ان پر کروڑہا روپیہ اور لاتعداد انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حال ہی میں اسلامی فقہ کے ماہرین

کی جانب سے اسے اسلام کی ضد کہا جا رہا ہے۔ لیکن یہ ماہرین [illegible] میں کوئی ایسا طریقہ نہیں بتلاتے کہ جس کے مطابق کسی کے بعد آنے والے کا چناؤ کیسے ہو؟ ان تمام باتوں کے ساتھ حال ہی میں ایک اسلامی نظریہ، نظریہ مقتدر — پاک فضائیہ کے ریٹائرڈ افسر نے پیش کر دیا۔

مندرجہ ذیل باتوں کے ساتھ وہ یوں آگے بڑھتے ہیں۔

تمام دستاویز کو دفن کر دیا جائے۔ (کیونکہ آئینی طریقے پر حسب ضرورت ترامیم کر کے بھی ان کا حلیہ بگاڑا جا سکتا ہے۔ فوج کے چیف آف دی آرمی شاف کے عہدہ کی میعاد پانچ سال تک ہو اس کے بعد وہ از خود ریٹائرڈ ہو کر سربراہ مملکت کی مسند سنبھال لے۔ یہ مدت بھی پانچ برس ہے۔ یہ اس کے بعد یہ بھی ریٹائرڈ ہو جائے اسی طرح تنظیم کے بعد پانچ پانچ برس بعد حکومت تبدیل ہوتی رہے۔

یہ قوم کے اعلیٰ دماغوں کو مشیر اور قانون سازی پر تعینات کرے۔ لیکن ان کے عہدے کی میعاد صدر کے عہدے کی میعاد سے مشروط ہو۔ صدر کے جانے کے بعد یہ حکومت میں رہ سکتے ہیں۔ ریٹائرڈ ججوں میں گورنر تعینات کئے جائیں۔ گورنر خود اپنی کابینہ تشکیل کرے۔ فوجی افراد کو حکومت سے دور رکھتے ہوئے حکومت کا "شہری ڈھانچہ" قائم کیا جائے، جو عوامی مشکلات کو حل کرے۔

نعت

نعت رسولؐ کی شان میں نظم، موسیقی کی اجازت نہیں۔ اس بارے میں خدا نے سورۃ الاحزاب میں واضح ہدایت فرمائی ہے — خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو! تم بھی پیغمبر پر درود و سلام بھیجا کرو۔ (آیت ۵۶) اس آیت سے نعت کی قدر و قیمت واضح ہو جاتی ہے۔ نعت میں صداقت ضروری ہے ہنگامہ و شور کی بجائے جوشِ ایمان و آشفتگی اور ایقان نعت کے یہ اصول صحابہ کرام نے واضح کیے ہیں۔ ہجرت مدینہ کے وقت انصار مدینہ بھی نعت پڑھ رہے تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن زبیر، حضرت عبداللہ بن رواحہ سمیت بڑے بڑے صحابہ کرامؓ نعت گوئی کرتے رہے ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت نے ایک بار آپ کے سامنے یہ نعت پڑھی (ترجمہ)

"اس دنیا میں آنے سے پہلے آپ سایۂ خاص میں تھے اور اس دنیا میں جہاں پتوں سے تن ڈھانپے گئے۔ پھر آپؐ اس جنت سے اترے اور زمین میں پہنچے حالانکہ ابھی آپؐ نہ تو بشر تھے نہ مضغہ گوشت — نہ ہو کی بوند بلکہ وہ — مارِ مقطر جو کشتیوں پر سوار تھا، پانی کی مد میں پہاڑوں کی چوٹیاں چوم رہی تھیں۔ باشندگانِ زمین ڈوب چکے تھے۔ یہ مارِ مقطر صلب سے رحم کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ ایک عالم گزر جانے کے بعد سطح زمین ابھری اور وہ احوال پیدا ہوئے جن میں جماعتوں نے ظہور پایا۔ آپؐ نارِ خلیل میں بھی اترے نہاں نہاں، ان کے صلب میں آپؐ ہی تو تھے، پھر آگ سے وہ بھلا کس طرح جلتے۔ آپ کی حفاظت آپ کے محافظ گھرانے نے کی، جو خندق جیسی بلند مرتبہ خاتون کا ہے۔ وہ بلند مرتبہ خاتون کہ دامن اس کا قدموں میں لوٹتا تھا۔ اس کی یہ شان تھی شوکت تھی، وہ قبیلۂ خندق تمام قبائل میں اشرف تھا۔ (خندق آپؐ کی دادی کا لقب ہے) تو اب ہم سب اسی روشنی اور نور میں ہیں، اور رشد و ہدایت و استقامت کی راہیں نکال رہے ہیں۔"

عہدِ عباس میں ملک شاہ سلجوقی ۵۰۸ھ میں بغداد میں مجلس مولود منعقد کرائی۔ نعت کے فن کو یہیں سے تقویت ملی۔ وہ شب معراج، شبِ قدر، میلاد النبیؐ، آخری چہار شنبہ وغیرہ کے موقع پر نعت کی محفلوں کا انعقاد اس کے بعد مولوی خدا بخش خان وکیل اور مولانا سلیمان پھلواریؒ (۱۲۰۶ھ) میں پھلواری بستی میں محفلِ میلاد کے انعقاد کے انتظامات کیے جو باقاعدگی سے ہوتیں۔

نعت میں آپ کی میلاد و سیرت، ذات و صفات و تصوف وغیرہ پر اظہار ملتا ہے، یہ شاعری کی صنف دوسری اصناف سے بڑی مختلف ہے۔

عربی، اردو اور فارسی میں بڑے بڑے نعت گو شاعر پیدا ہوتے ہیں جن کے دم سے معاشرہ زندہ ہے۔

نعمانؓ بن بشیر

نعمانؓ بن بشیر صحابی بشیر بن سعد کے بیٹے۔ نام نعمان، کنیت ابو عبداللہ، قبیلہ خزرج۔ والدہ صحابی عبداللہ بن رواحہ کی ہمشیرہ تھیں۔ ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے چھ ماہ بعد عبداللہؓ بن زبیر پیدا ہوئے۔ ماں کو اتنی محبت تھی کہ باقی اولاد کو چھوڑ کر ساری جائداد ان کے نام کر دی۔ امیر معاویہ کی طرف سے حضرت علی کے خلاف جنگ کی۔ معاویہؓ نے انہیں پہلے دمشق کا قاضی اور پھر حاکم یمن بنایا۔ اپنے آخری ایام ۵۹ھ میں معاویہؓ نے انہیں کوفہ کا والی مقرر کیا۔ تقریباً نو ماہ اس عہدے پہ کام کرتے رہے۔ یزید نے معزول کر دیا، وہاں سے شام چلے گئے۔ بعد ازاں یزید نے حمص کا امیر مقرر کیا۔ وفات تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ خلیفہ مروان کے عہد میں عبداللہ بن زبیر کی طرفداری کے جرم میں قتل ہوئے۔ آپ کی زوجہ و دیگر اہل و عیال گرفتار ہوئے۔ [illegible] احادیث [illegible] دسترس رکھتے تھے۔ آپؓ کے حوالے سے ۱۲۴ احادیث محفوظ ہو [illegible]

نعمان بن عجلان

نعمان بن عجلان خاندانِ زریق کے ایک فرد [illegible] ہیں جنہوں نے مدینے میں اسلام قبول کیا۔ حضرت علیؓ کے زمانے [illegible] کے عامل بنے۔ ان کی اہلیہ خولہ بنت قیس پہلے حضرت [illegible] مگر آپؐ کی شہادت کے بعد آپؐ کے عقد میں [illegible] معاویہؓ کے عہد میں انتقال کیا۔ عرب کے اچھے شاعروں میں [illegible] کی تاریخ در انعات ملتے ہیں۔

نعمت

نعمت جو کچھ انسان کو عطا ہوا خدا کی طرف سے [illegible] نعمت ہے۔ خدا نے انسان کو متعدد سورتوں میں کہا کہ اس کی نعمتوں [illegible] بجا لاؤ۔ جو فطری حق ہے۔ مگر ایسا نہ ہو۔ انسان نے ہمیشہ [illegible] سراب کو پو چلے کہ حقیقت اس کے نزدیک کچھ نہیں [illegible] سمیت بعض دوسری سورتوں میں اللہ تعالےٰ نے انسان کو ناشکر [illegible] بدبختی کی تنبیہ کی ہے۔ مگر انسان پھر بھی نہ مانا۔ سورۃ [illegible] میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں بھائی چارے و اتفاق کو نعمت [illegible] جس سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے علاوہ سورۃ [illegible] (آیت [illegible]) ۸، ۴۰، آلِ عمران (آیت ۱۰۳) میں اللہ تعالیٰ نے [illegible] نعمتوں [illegible] ذکر کیا ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ ان کا شکر بجا لائے۔ [illegible] کی بشارت دی ہے۔

نعمت اللہ بت شکن

نعمت اللہ بت شکن بنگال کے قدیم ترین صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں نام شاہ نعمت اللہ، بت شکن کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لقب کے پس منظر میں ایک کہانی ہے، کہا جاتا ہے کہ بوڑھی گنگا کے کنارے کھل گاؤں تک ایک بڑی

بستی تھی۔ یہ پانڈو ندی کے کنارے تھی۔ جب منددہاں کے ہندو اپنے بتوں کو بوڑھی گنگا میں "دھونے" کے لیے جاتے تو ان کو ان کی قیام گاہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ آپ کے اشارے سے بت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اسی وجہ سے آپ بت شکن مشہور ہوئے۔ آپ کے بارے میں تاریخ مزید کچھ بتانے سے قاصر ہے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مزار مبارک ڈھاکہ میں "باغ دلکشا" کے متصل احاطے میں دکنی صاحب کی مسجد کے جانب شمال میں ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔ آپ کے دائیں بائیں آپ کے دو خلفا کے مزارات ہیں۔

نعمت اللہ ولی سلطان غیاث الدین کے عہد کے مشہور سید میر عطا اللہ کے بیٹے بزرگ آپ کی پیدائش سے قبل والد وفات پا چکے تھے۔ ان کی پرورش راجو خان کی اہلیہ نے کی۔ جلد ہی پڑھ گئے اور شمشیر زنی و فنونِ سپہ گری میں طاق ہو گئے۔ آہستہ آہستہ شوقِ عبادت دل میں گھر کرتا گیا اور اسی فکر میں دنیا ترک کر دی۔ یہ اس قرآنِ پاک کا اثر تھا جو آپ نے چار برس اور ۴ ماہ کی عمر میں ختم کیا۔

آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں، مشہور ہے کہ ایک روز آپ جنگل کو جا رہے تھے کہ سامنے ایک شیر دکھائی دیا۔ آپ ٹھہر گئے اور فرمایا "یار عزیز! اگر مشیت خداوندی یہی ہے تو فقیر حاضر ہے۔ حکم کے مطابق عمل کر اور اگر ابھی حکم نہیں تو اپنی راہ لے، اور مجھ کو راستہ دے"۔ شیر یہ سن کر ایک طرف کو چلا گیا۔ فیروز پور میں آپ نے خانقاہ بنوائی اور خدمتِ اسلام میں مصروف ہو گئے۔ اللہ کا یہ خوش اخلاق، انسان دوست، اسلام دوست ۸۲۴ھ میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

نعیم النحام رضی اللہ عنہ نعیم نام، لقب نحام، ہجرت سے قبل نویں یا دسویں مسلمان تھے۔ ۶ ہجری میں کعبہ کے چالیس افراد کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آئے آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جنت میں نعیم کی نحمہ (آواز) سنی ہے۔ اس مناسبت سے نحام لقب پڑا۔ مدینے کی تمام غزوات میں حصہ لیا۔ خلیفہ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد کی جنگِ اجنادین میں شہادت پائی۔ یہ جنگ جمادی الاول ۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ آپ نہایت حلیم، رحم پرور انسان تھے۔ یتیموں، مسکینوں اور ایسے ہی طبقات کی اعانت کیا کرتے تھے۔

نعیم الدین مراد آبادی فلسفہ، اقلیدس، منطق و حدیث کے ماہر معروف عالمِ دین اور اسلامی شاعر۔ اسمِ گرامی سعید محمد نعیم الدین لقب صدر الافاضل مولانا معین الدین کے بیٹے ۲۱ صفر ۱۳۰۰ھ / یکم جنوری ۱۸۸۷ء میں مراد آباد پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کیا اردو اور فارسی کی کتب اپنے والد بزرگوار سے اور درسِ نظامیہ شاہ فضل احمد سے لیا۔ سید شاہ محمد گل سے ۱۳۱۸ھ میں افتاد نویسی میں سند لی، انہی کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔

آپ کے آبا و اجداد مشہد کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے اورنگ زیب کے زمانے میں بھارت گئے۔ بادشاہ نے عزت افزائی کی اور جاگیر عطا کی۔ وہاں مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے لاہور تشریف لائے اور ابوالحسنات کے پاس قیام کیا۔ مختلف اسلامی تحاریک میں زبردست حصہ لیا۔ سلطنتِ ترکی کے لیے بننے والی خلافت کمیٹی کے آپ بھی رکن تھے اور اس موقع پر زبردست تقاریر کیں۔ شدھی تحریک جو اسلام کو مسخ کرنے چلی تھی۔ اس کے خلاف آپ نے آگرہ، جے پور، کشن گڑھ، گوبند گڑھ، حوالیِ اجمیر، مظفر اور بھرت پور کے خود بھی طوفانی دورے کیے اور اپنے وفد بھی بھیجے۔

۱۳۴۳ھ - ۱۹۲۴ء میں مراد آباد سے ماہنامہ "السواد الاعظم" جاری کر کے دو قومی نظریہ کی زبردست حمایت کی۔ حصولِ پاکستان کے لیے ۱۸ ستمبر ۱۹۲۸ء میں ہونے والی "آل انڈیا سنی کانفرنس" میں شاہکار خطبۂ صدارت دیا۔ منٹو پارک میں پاس ہونے والی قرار دادِ پاکستان میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۳۶۵ھ - ۱۹۴۲ء میں بنارس کانفرنس کے آپ ہی ناظمِ اعلیٰ تھے۔ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے دوران آپ علیل پڑ گئے۔ زندگی نے مہلت نہ دی۔ ۱۸ ذوالحج ۱۳۶۷ھ - ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء بروز جمعہ دنیا ان سے محروم ہو گئی۔ آپ کا مزار مبارک مسجد مراد آباد کے بائیں گوشے میں ہے۔

آپ نے چودہ تصانیف اور بہت سے مضامین چھوڑے ہیں۔ تصانیف میں کشف المحجوب، تفسیر خزائن العرفان، دیوانِ اردو، کتاب العقائد، سیرتِ صحابہ، سوانح کربلا، آداب الاخیار بہت مشہور ہیں۔

نعیم رضی اللہ عنہ بن مسعود الثقفی کفار کے فرد جو ۵ھ میں جنگِ احزاب کے موقع پر اسلام کے حوصلے پست کرنے کی تدابیر کیں، لیکن جنگ کی نوبت بھی نہ پہنچی۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے اور کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ باہمی جنگ کے دوران آپ رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ سے کئی احادیث روایت کی ہیں۔

نعیمی، محمد حسین، مفتی، بانی جامعہ نعیمیہ لاہور، شیخ الحدیث اور مہتمم۔ رکن اسلامی نظریاتی کونسل اور ممتاز سنی عالمِ دین۔ ۱۹۲۳ء میں سنبھل ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ والد ملا تفضل حسین اپنے دور کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ۱۹۳۳ء میں والد نے انہیں مبلغِ اسلام بنانے کی غرض سے دہلی کی جامعہ نعیمیہ میں داخل کرایا۔ وہاں دو سال فارسی کتب اور سات سال درسِ نظامیہ پر عبور حاصل کیا۔ ۱۹۴۲ء میں وہاں سے فارغ ہوئے تو اسی سال علامہ ابوالبرکات کی ہدایت پر دار العلوم حزب الاحناف میں مدرس مقرر ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۴۸ء میں دار العلوم نعمانیہ چلے گئے۔ یہاں ۱۹۵۳ء تک مدرس رہے۔

انہی دنوں تحریکِ ختمِ نبوت شروع ہونے پر اندرون دہلی دروازہ میں حزب الاحناف کے ساتھ مل کر مرکز قائم کیا۔ جہاں پولیس، فوج اور جوانوں کو اس کی اہمیت پر ذاتی مشن پر پمفلٹ تقسیم کرتے۔ چنانچہ مارشل لا کے تحت دو مقدمات میں گرفتار ہوئے۔ ایک میں فوجی عدالت نے بری کر دیا۔ دوسرے کی سماعت جاری تھی کہ مارشل لا نے بری کر دیا۔ رہا ہو کر نعمانیہ سے استعفا دے دیا اور اپنی مسجد چوک دال گراں میں ایک دینی دار العلوم کی بنیاد رکھی۔

جامعہ نعیمیہ میں بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ۱۹۵۶ء میں اسے چوک دالگراں سے عید گاہ گڑھی شاہو میں منتقل کر دیا گیا اور مفتی صاحب نے آٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے شاندار دار العلوم قائم کر دیا۔ ۱۹۶۷ء میں سنیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے زبردست کام کیا۔ صدر ایوب کے عہد میں عید کی تاریخ کے جھگڑے پر مچھ جیل بلوچستان میں پابندِ سلاسل ہوئے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔

قاضی عیاض کی الشفا، مولانا ابوالحسنات کی اوراقِ غم اور الخیرات الحسان اس وقت طبع کرائی جب کوئی اور ناشر انہیں چھاپنے کے لیے تیار نہ تھا۔

آپ کے نامور شاگردوں میں مولانا الٰہی بخش، مولانا محمد سعید نقشبندی (خطیب داتا گنج بخش) صاحبزادہ حبیب اللہ (خطیب سرائے عالم گیر) محمد اشرف کاظمی (مفتی کشمیر) اور قاری غلام رسول سرِفہرست آتے ہیں۔

نعیمیہ (۱۲۳ھ)

- یہ زیدی شیعوں کا ایک فرقہ ہے۔ اس کا سرگروہ نعیم بن الیمان تھا۔ یہ شخص خراسان کا باشندہ تھا اور یحییٰ بن زید کی امامت پہ اس نے اختلاف کیا۔ اس کا خیال ہے کہ زید شہید زندہ ہیں اور اللہ تعالےٰ نے ان کو زندہ آسمان پہ اٹھا لیا ہے وہ پھر دنیا میں آئیں گے۔ ان کی غیبت میں کسی کو امام تسلیم کر لینا ان کی امامت کی نفی ہے اور جو شخص امام برحق کی نفی کا مرتکب ہو، اس کا ایمان مشکوک ہے۔

اس شخص نے خود کو نیابت زید کا مستحق ٹھہرایا اور ان کے نام پہ دین کے احکامات میں تبدیلیاں کیں۔ اس فرقہ نے حضرت عثمانؓ کو صریحاً کافر کہا کیونکہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں آئے اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی رشتہ داری کی وجہ سے خلافت پہ قبضہ کر لیا۔ جو شخص امام معصوم کا مقابلہ کرے وہ کافر ہے۔

زیدیوں میں یہ گروہ آج بھی یمن میں بااثر ہے۔

نفاق

:- پھوٹ' نااتفاقی 'ظاہر دوستی'

بعض مفادات کے لیے بعض لوگ حقیقت میں کچھ اور ظاہر میں کچھ اور ہو جاتے ہیں اور پھر سادہ لوحی کا جائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انگریزوں نے بھی نفاق ڈال کر حکومت کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی۔ دینِ کامل میں اس کی سخت سزا مقرر ہے۔ سورۂ بقرہ کی پہلی چھٹی آیات کے بعد سے نفاق اور منافقت پر تفصیلی بحث ہے۔ جس میں منافق کو بے شعور' گمراہی پر' اور سرکش کہا گیا ہے۔ نیز دیکھئے "منافق"

نفث

ان الہامی باتوں کے مفہوم میں آتا ہے جو حضور پاکؐ کو جبرائیل سے ملا کرتی تھیں۔

نفخ

صورہ

جو روزِ محشر کو حضرت اسرافیل پھونکیں گے۔ قرآن میں اس کے بارے میں ارشاد ہے کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے اور ہر چیز ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔

نفس

سانس، گھڑی، جمع انفاس، ساعت، جمع نفوس، اس کے لغوی معنی کسی چیز کے وجود، اس کی حقیقت اور ذات کے ہیں، لیکن مختلف معنوں یعنی روح، مروت، ضمیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کسی کے نزدیک یہ مادی ہے اور کسی کے نزدیک روحانی، نفس اپنے دعویٰ میں اللہ تعالیٰ کی ضد ہوتا ہے، کیونکہ اس میں اپنے وجود کا ذکر کرتا ہے اور یہ اپنے مطالبہ میں اللہ تعالیٰ کا ہمسر، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ صرف اس کی حمد و ثنا کی جائے۔ مگر یہ خود اپنی کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ سورہ البقرہ میں نفس کشی کا احکام دیتا ہے یعنی ــــــــ "اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے۔ یہیں اپنے پیدا کرنے والے کی طرف آؤ۔ اور اپنے نفسوں کو مار ڈالو۔ یہ تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے حضور بہتر ہے۔ پس وہ تم پر رحمت سے متوجہ ہوا۔ . . ." (آیت ۵۴) اصطلاح میں نفس کو مارنا "نفس کش" کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اصطلاحوں میں اسے سانپ قرار دیا گیا ہے جو وجود کو ڈستا رہتا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے آپ نے دعا فرمائی ــــــــ "اے حقیقی زندہ' اے حقیقی سنبھالنے والے: میری ہر حالت کو درست کر دیجیے اور مجھے پلک جھپکنے تک کی میرے نفس کے حوالے نہ کیجیے"۔ جب انسان اپنے عارفانہ مقام کو پہنچتا ہے۔ جب نفس کے خفیہ مکاید کا ادراک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت داؤدؑ کی طرف وحی کرتے ہوئے انہیں کہا گیا کہ ــــــــ "اے داؤدؑ اپنے نفس سے عداوت رکھ کیونکہ میری محبت اس کی عداوت میں ہے" ــــــــ اسی طرح نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کا بھلا چاہتا ہے تو اسے عیوبِ نفس دکھلا دیتا ہے۔ ایک اور مقام پر آپؐ نے فرمایا کہ مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کیا۔

قرآنِ کریم میں اس کی پانچ اقسام بتائی گئی ہیں۔

نفسِ لوامہ، یہ گناہ سرزد ہونے کے بعد انسان کو لعنت ملامت کرتا ہے یعنی ضمیر۔ سورہ القیمۃ کی پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسی کی قسم کھا کر انسان کو دوبارہ زندہ کرنے کا ذکر کیا ہے، نفس امارہ، برائی کی طرف مائل کرنے والا نفس۔ سورۂ یوسف میں آیا ہے۔ "اور میں اپنے تئیں پاک صاف نہیں کہتا کیونکہ نفسِ امارہ انسان کو برائی سکھلاتا رہتا ہے"۔ (آیت ۵۳)

نفس مطمئنہ

احکامِ اللہ کے تابع نفس مطمئن نفس بری باتوں سے پاک، اس کا ذکر سورۂ فجر کی آخری آیتوں میں یوں آیا ہے ــــــــ "اے اطمینان پانے والی روح (نفس مطمئنہ) اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی" باقی دو کوئی خاص نہیں یہ نفسِ مرضیہ اور راضیہ ہیں۔

ابتدائی طور پر اس سے مراد شخصیت لی جاتی تھی جبکہ روح سے مراد سانس و زندگی وغیرہ تھی۔ قرآن پاک میں اس سے مراد روح ہے۔ اس سے مراد سانس بھی ہے یعنی ــــــــ "لوگوں کو دیکھو اس وقت جب موت کی سختیوں میں (مبتلا) ہوں اور فرشتے ان کی طرف عذاب کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں"۔ (الانعام آیت ۹۳)

بعض نے نفس کو پندرہ بیس معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس کے معنی کو خون، جسم، روح، نگاہِ بد، خواہش، مخصوص حقیقت، مقصد، سب لب وغیرہ وغیرہ۔

نزولِ قرآن سے قبل عیسائیت میں یہ روح وغیرہ کے معنوں میں آتا تھا۔ افلاطون کا بھی یہی نظریہ تھا۔ قرآن و افلاطون و عیسائیت کے مطابق روح ایک ابدی چیز ہے جسے فنا نہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے بعد ان میں روح پھونکی۔ نیز مرنے کے بعد روح آسمان کی جانب پرواز کر جاتی ہے۔

نفس ذکیہ

نام محمد بن عبداللہ المہدی۔ نفس ذکیہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ امام حسینؓ کے پڑپوتے تھے۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر بن منصور کے زمانے میں علوی اور عباسی علوی کا مسئلہ بہت زور پکڑ گیا۔ منصور کے زمانے میں ان سے جان بچانے والوں میں نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم نے خفیہ طور پر کام شروع کیا۔ بہت سے افراد نے خفیہ طور پر انہیں مہدی موعود سمجھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ منصور جب انہیں گرفتار نہ کر سکا تو اس نے تمام اولادِ حسن کو پابندِ سلاسل کر کے ایذا دیے جانے کا حکم دے دیا۔ بہت سے افراد ان مصائب و مشکلات کے پہاڑ تلے جان بحق ہو گئے۔ اس موقع پر نفس ذکیہ کو ان کے جانثاروں نے میدان جنگ میں آنے پہ مجبور کیا۔ چنانچہ رجب ۱۴۵ھ میں ایک جمعیت کے ساتھ میدان میں آکر آپ نے والیٔ مدینہ رباح

کو گرفتار کر کے شہر پہ قبضہ کر لیا۔ مدینہ سے مکہ پہنچے۔ وہاں کے لوگوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ اس سے منصور کو بہت تشویش لاحق ہوئی۔ نفسِ ذکیہ کو اس نے دو خطوط لکھے جن میں قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے منصور نے اسے اپنی خلافت میں آجانے کو کہا۔ جواب میں انہوں نے بھی قرآنی آیات کے حوالے دیئے اور کہا کہ اصلی خلیفہ میں ہوں۔

خط و کتابت ناکام ہونے پہ عباسی خلیفہ نے علیٰی بن موسیٰ اور محمد بن قحطبہ کی سرکردگی میں فوج کے دو گروہ بھیجے۔ علیٰی بن موسیٰ کی نگرانی میں چھ ہزار فوج تھی۔ جنگ سے قبل علیٰی بن موسےٰ نے آخری بار مطیع ہو جانے کو کہا۔ مگر آپ نہ مانے۔ پھر اس نے ذیل مدینہ سے ہٹ جانے کو کہا۔ مگر پھر بھی ذکیہ کے ساتھ رہے۔ اس پہ جنگ شروع ہو گئی۔ نفسِ ذکیہ بڑی بہادری سے لڑے۔ دو تیر کمر اور سینے میں پہلے لگے۔ جن سے وہ زمین پہ گر پڑے۔ محمد بن قحطبہ نے آگے بڑھ کر ان کا سر قلم کر کے منصور کو بھیج دیا۔ یہ واقعہ دسمبر ۷۶۲ء میں پیش آیا۔

نفقہ عربی لفظ مطلب، وہ اشیاء جو زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ قانون نفقہ کی تین بنیادیں بتاتا ہے۔ شادی، رشتہ داری اور جائداد۔ ان تینوں کی وجہ سے مرد یا عورت مختلف فرائض لاگو ہوتے ہیں۔ ماں باپ پر بیٹوں کی طرف سے۔ کچھ باپ کے بیوی پر اور بیوی کے باپ پر حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی اشیاء جو زندگی میں بنیادی نوعیت کی ہیں، نفقہ کہلاتی ہیں۔

اگر شوہر بوجوہ بیوی کو نفقہ فراہم نہ کر سکے، تو بیوی کا فرض ہوتا ہے کہ اپنے نفقہ کے لئے خود کوشش کرے۔ اور اگر بچے کا باپ مر جائے، تو دودھ پلانے کی اجرت ماں پر نہیں، بلکہ مرد کے وارثوں پر عائد ہو گی۔ اگر صورت یہ ہو کہ شوہر زندہ ہو، اور نفقہ نہ دے۔ تو جائز ہے، کہ بیوی بلا اجازت اس کے مال میں سے بقدر ضرورت اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے خرچ کرے۔ اسی طرح غریب شخص کا نفقہ اس کے رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کوئی شخص غریب کیوں ہے۔ تساہل کی وجہ سے تو نہیں۔

ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی الانسانیتؐ فرماتے ہیں کہ بہترین صدقہ وہ ہے جس سے دینے والا غریب نہ ہو جائے۔ دینے والا ہاتھ، لینے والے ہاتھ سے اونچا (بہتر) ہوتا ہے اور پہلے انہیں دے، جو تیری عیال داری میں ہوں۔ یعنی رشتہ دار۔ عورت شوہر سے کہتی ہے کہ مجھے نفقہ دے، یا طلاق۔ اور غلام کہتا ہے کہ مجھے نفقہ دے، اور کام لے۔ اور بیٹا کہتا ہے کہ مجھے نفقہ دے، جب تک میری برادری چھوڑ دے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ خود پلائیں۔ اور اگر رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہیں۔ تو دو سال تک پلائیں، ورنہ دوسری عورت سے باپ اجرت دے کر پلائے۔

یونسؒ زہریؒ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی ماں بچے کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہے، تو باپ اس کی بات تسلیم کر لے، نہ کہ اس کی بات مسترد کر کے زک پہنچائے۔

دوسروں کو نان نفقہ فراہم کرنے والوں کو روز محشر کو ثواب ملے گا، اجر [illegible] دیں حضرت ام سلمہؓ ام المومنین سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا، کہ میں ابوسلمہؓ کے بچوں کو نان نفقہ دوں، جبکہ وہ محتاج ہیں، اور میری اولاد ہیں، آیا اس کا مجھے ثواب ملے گا۔ فرمایا، جو ان پہ خرچ کرے گی، اس کا تجھے ثواب ملے گا، لیکن یہ حدیث صرف اس صورت میں ہے کہ انسان پر نفقہ فرض نہ ہو۔

نفقہ کی فضیلت پر قرآنی آیت کا بیان ہے: وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ یعنی اے محمدؐ: تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا نفقہ دیں۔ کہہ دو، جو تم آسانی سے دے سکو۔ اور حسنؒ نے کہا کہ عفو سے مراد اپنے حاجت سے زائد ہے۔ ابو مسعود انصاریؒ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ نفقہ اپنے اہل و عیال کو دے کر نیت راہِ خدا کی کرے، تو اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی نورؐ نے فرمایا کہ بیوہ عورت اور مسکین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، یا رات کو عبادت کرنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا۔ انہیؓ سے ایک اور روایت ہے کہ نبی پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے اولادِ آدم، میں تم کو نفقہ دوں گا۔

نفل جمع نوافل عربی اصطلاح، شرع میں وہ نیک کام جو بندہ اپنی مرضی و منشا سے کرے۔ یہ فرض نہیں ہوتا۔ نہ کرنا گناہ نہیں مگر کرنے سے ثواب ضرور ملتا ہے اگر کوئی شخص رمضان کے علاوہ روزہ رکھ لے، کسی وقت نماز زائد پڑھ تو یہ نفل کے روزے یا نماز کہلائیں گے۔ قرآنِ مجید میں نافلہ کا لفظ دو مقام پر آیا ہے۔ حدیث شریف میں بھی یہ لفظ متعدد مقام پر آتے ہیں مستحب اور مندوب بھی انہی معنوں میں آتے ہیں۔

نفی و اثبات اصطلاحاتِ صوفیاء کرام نفی سے مراد "خود" کی نفی اور اثبات سے مراد صفاتِ باری تعالیٰ کا "ثبوت" کل میں اس کے معنی یوں ہے کہ صفاتِ بشریت کی نفی کرتے ہوئے حقیقت مطلق کا اثبات کرنا۔ نفی ذاتِ بشریت کی بقا کی حالت میں ممکن نہیں۔ پس لازم ہے کہ ابتداً دعویٰ کی نفی کی جائے جو نفس کی سرکشیوں میں سے ایک ہے۔ محبت میں کمزوری بھی اپنے اختیار کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے حق اللہ تعالیٰ کا اختیار ازلی ہے جس کی نفی ممکن نہیں۔ اس کی کسی صفت کو فنا نہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان میں نفی و اثبات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ صوفیاء کرام میں کلمۂ شریف کا ابتدائی حصہ جو اللہ کی توحید سے متعلق ہے بھی "نفی و اثبات" کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ یہ قرآنِ مجید میں کئی مقام پہ آیا ہے کہ "نہیں کچھ ماسوا اللہ کے" یہ بھی نفی و اثبات کے سلسلے میں آیا ہے۔ یہ فلسفہ وحدت الوجود کے قریب تر ہو جاتا ہے، مشرق میں اس کے بہت بڑے قائل اور رومی اقبال تھے۔ مغرب میں افلاطون اور برگساں، برگساں اپنے غیر اسلامی نظریات کے باعث "وحدت" کے طور پر "خدا" کا مبہم طور پہ اظہار کرتا تھا۔ علاوہ اقبال نے نعرہ "انا الحق" کو اس کی ایک اعلیٰ مثال قرار دیا ہے۔ ایک حدیث شریف اس کی تشریح یوں کرتی ہے۔
"اللہ ایک مخفی خزانہ تھا۔ جب اس نے چاہا کہ دنیا اس سے آگاہ ہو تو اس نے انسان پیدا کر دیا۔"

نقشبند، خواجہ بہاؤالدین ایک ولی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی، اصل نام محمد بن محمد البخاری تھا۔ آپ کے بیٹے محرم ۷۱۸ھ میں بخارا کے قریب قصرِ عارفاں میں ولادت پائی۔ آپ کی دینی و اخلاقی تربیت خواجہ بابا سماسی عبدالخالق اور سید امیر کلاں نے کی۔ مگر آپ اویسی تھے۔

اٹھارہ برس کی عمر میں والد نے شادی کا ارادہ کیا، آپ اس دن مسجد میں چلے گئے۔ اور اللہ سے رحمت کی دعا کی۔ جو کچھ کریں، اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ بعد میں اس وقت شادی نہ ہو سکی۔ آپ سمرقند چلے گئے۔ وہاں اولیاء میں فیض حاصل کیا۔ دل کو تسکین نہ ہوئی، تو بخارا چلے گئے۔ وہیں شادی کی، اور قصر عارفاں میں رہائش اختیار کی۔ اسی دوران سید میر کلالؒ کی آمد پر بیعت کر کے تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ ان کے بعد ان کی اجازت پر شیخ قثم اور خلیل سے فیض حاصل کیا۔ آپ حضرت خلیلؒ کی تربیت میں بارہ سال رہے۔ انہی کے ساتھ دو مرتبہ سفر حجاز کیا۔ جب وہاں کی سلطنت درہم برہم ہوئی، تو بخارا چلے گئے۔ اور قصبہ زیور تون میں سکونت اختیار کی۔

آپ بیان فرماتے ہیں کہ دو بار وہاں مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں حضرت حسین بن منصور کا نعرہ ماروں۔ دونوں بار میں بخارا کے قریب ایک سولی کے پاس گیا۔ اور کہا کہ میرا سر اس کے لئے ہے۔ بفضل اللہ سے جلد ہی یہ حالت ختم ہو گئی۔
یہاں سے عمر کے آخری برس میں اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہیں ۷۹۱ھ میں وفات پائی، اور وہیں مدفن ہوئے۔ مقبرہ کی زیارت کے لئے قرب وجوار سے بہت سے لوگ آتے ہیں۔
آپ کا قول ہے کہ کلام یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ میں اشارہ ہے کہ اس طبی وجود کی نفی کرو، اور معبود حقیقی کا اثبات کرو، نیز دیکھیں نقشبندیہ۔

نقشبندیہ معنی "مصور" روح اسلام کا عکاس کرنے والا صوفی درویشوں کا ایک سلسلہ۔ یہ لوگ حضرت اویس قرنیؒ کی طریقت سے زیادہ مشابہ ہیں۔
محمد بہاؤالدین بخاریؒ نقشبند کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں ان کے مریدوں کے لئے بھی یہی لقب استعمال ہوا۔ ان کے اہم بزرگوں میں حضرت علاؤالدین عطارؒ۔ حضرت مجدد الف ثانی، حضرت محمد معصوم، حضرت نقشبند ثانی، شاہ قطب الدین، شاہ عیسیٰ ولی، حضرت بابا نور محمد نیرہی، خواجہ محمد زبیر، حضرت یعقوب چرخی وغیرہ شامل ہیں۔
ابتداً اس سلسلے نے وسط ایشیا، ترکستان اور بخارا میں بہت ترقی کی، اس کے بعد پاک و ہند اور دوسرے مقامات میں پھیل گیا۔ پاکستان کے مختلف مقامات پر نقشبندیوں کے مراکز موجود ہیں۔

نقشِ رستم پرسی پولس کے مغرب میں ایران کے ساسانی فرمانرواؤں کے مقابر۔ یہ چٹانوں کو تراش کر ابھارے گئے ہیں۔ کئی مناظر بھی اسی طرح بنائے گئے ہیں۔ سب سے اہم منظر وہ ہے جس میں شہنشاہ شاہ پور گھوڑے پر بیٹھا ہے۔ اس کے روبرو قیصرِ روم ولیرین قیدی کی صورت کھڑا ہے۔ یہ منظر ۳۵ فٹ لمبا اور سولہ فٹ چوڑا ہے۔ مقدس آگ کا چبوترہ بھی وہیں مطلع پر ہے۔

نکاح ۔جس کے ہونے پر مرد و عورت ازدواجی زندگی میں بندھ جاتے ہیں بموقع نکاح دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں علاوہ نکاح پڑھانے والے کے بطور گواہ موجود ہونا لازمی ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کے بھی نابالغ ہونے کی صورت اس کے ولی کی موجودگی لازمی ہو جاتی ہے۔ مہر کا تعین لازمی ہے۔ اکثر ممالک میں بوقت نکاح دلہا و دلہن اکٹھے نہیں بیٹھتے۔ بلکہ وکیل کی مدد سے عورت کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین کے ذریعے نابالغ کے نکاح کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔ شرعاً ایک بیوی کی موجودگی کو دوسری بیویاں بھی ہوتی ہیں قرآن مجید میں سورۃ الاحزاب سورہ بقرہ اور سورہ النساء میں واضح طور پر نکاح کے بارے میں بہت بحث کی گئی ہے۔
عربی زبان میں نکاح کے اصل معنی پر اختلاف ہے اک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے، دوسری رائے میں یہ معناً مشترک ہے، تیسری رائے میں اس کے اصل معنی عقدِ تزویج کے ہیں اور ادا وطی کے لئے یہ مجازاً مستعمل ہے راغب اصفہانی نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کے اصل معنی عقد ہیں
مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں۔ قرآن و سنت میں نکاح اک اصطلاحی لفظ ہے۔ جس سے مراد یا تو مجرد عقد ہے یا وطی بعد عقد۔ لیکن وطی بلا عقد کے لئے اس کو کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس طرح کی وطی کو تو قرآن و سنت زنا و سفاح کہتے ہیں نہ کہ نکاح ــــــــ سورۂ بقرہ میں مشرک عورتوں سے نکاح اور عدت کی مدت گزرنے سے قبل نکاح کا فیصلہ اور ماں بہن بھائی بیٹا بیٹی پھوپھی خالہ بھتیجی اور بھائی سے نکاح حرام ہے چار سے زائد نکاح بھی حرام ہیں۔ قرآن پاک میں بیواؤں۔ غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرانے کا حکم ہے

نمارق، معرکہ حضرت عمرؓ کے ابتدائی عہدِ خلافت میں عراق میں مقام نمارق پر جنگ لڑی گئی۔ حضرت مثنیٰ خود مدد لینے کے لیے مدینہ آئے تھے۔ ان دنوں صدیق اکبرؓ بیمار تھے۔ انہوں نے مدد کے لیے وصیت کی۔ جسے حضرت عمرؓ نے پورا کرتے ہوئے حضرت ابو عبیدؓ بن مسعودؓ کی قیادت میں لشکر روانہ کیا۔ عراق میں ایرانیوں نے نمارق کا اطراف سے گھیراؤ کیا اور یہیں جنگ کرنے کا قصد کیا۔ ان کی قیادت رستم کے ہاتھ میں تھی۔ تاہم اس نے مختلف سردار مقرر کر رکھے تھے۔ نمارق کے مقام پر جابان سردار تھا۔ حضرت ابو عبیدؓ نے اس پر حملہ کیا۔ خونریز جنگ ہوئی۔ جابان اپنی فوج کے ساتھ فرار ہو گیا۔ اسلامی لشکر کے ایک سپاہی نے گرفتار کیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ جابان ہے۔ بس دو غلاموں کی پیش کش پر اس نے اسے رہا کر دیا۔ بعد میں ایک [illegible] کیا۔ مگر مسلمان کے وعدے تقریر پر مکبر ہوتے ہیں۔ اس بنا پر اسے رہا کرتے [illegible] جنگ سے چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

نماز دین اسلام کے پانچ بنیادی ستونوں میں ایک۔ لغوی معنے [illegible] کے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے [illegible] اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ گیا اور جتنی نمازیں نہ پڑھیں [illegible] پڑھتے گئے۔ قرآن کریم میں کثیر تعداد میں نماز قائم کرنے کا حکم [illegible] معراج نبوی ہے۔ بوقت معراج پچاس نمازوں کا تحفہ ملتے [illegible] رہ گئیں۔ یہ فرضی نمازیں ہیں ان کے علاوہ دو نمازیں فجر اور [illegible] میں پڑھی جاتی ہیں۔ مگر یہ فرض نہیں۔ طہارت یعنی وضو [illegible] سے قبل دل بھی صاف رکھنا چاہیئے اور دوران نماز [illegible] مڑ مڑ کر ادھر ادھر دیکھیں، کان یا ناک کھجانا [illegible] کپڑے بھی بالکل پاک اور حلال کی کمائی کے ہونا چاہئیں۔ جس جگہ [illegible] بھی پاک ہو۔ رخ قبلہ کی جانب ہو۔ نماز کے آخر میں سلام [illegible] جانب پھیرا جائے۔
نیز دیکھئے میقات، اوقات نماز، وضو، طہارت [illegible]

نمرود ... قوم میں بابل کا بادشاہ، باپ کا نام کوش بن حام [illegible] کا نام قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا ہم عصر تھا۔ [illegible] کے مطابق خدائی کا دعویٰ دار تھا۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے تبلیغ دین کا آغاز کیا تو اس نے بہت بڑے مقام پر لکڑیاں ڈھیر کر کے آگ جلائی۔ دوسرے الفاظ میں یہ آتش نمرود کہلاتی ہے۔ کوئی شخص اس کے قریب جانے کی جرات نہ کرتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس آگ میں جلانا مقصود تھا۔ مگر خدا نے [illegible] (دیکھیں آتش نمرود)
اس سخت گیر و ستمگر بادشاہ نے ایک اونچا مینار تعمیر کرایا جو مینار بابل کہلواتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ خدا تک پہنچے، کافی اونچائی کے بعد خدا نے آناً فاناً محل کو مسمار کر دیا۔ (دیکھیں مینارِ بابل)

عمر کے آخری ایام میں بڑی تکلیف و ایذا میں مبتلا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کیڑا اس کی ناک میں گھس گیا اور دماغ تک پہنچ گیا۔ اس سے بڑی اذیت ملتی۔ دن رات تڑپتے تڑپتے خدائی کا یہ دعویٰ دار ننھے سے کیڑے کے ہاتھوں مرگیا۔ شامی کیلنڈروں میں تاریخ موت جولائی ملتی ہے۔

نمرہ میدانِ عرفات کے قریب ایک مسجد، یہاں ہر سال حج کے موقعہ پر ۹ ذوالحجہ کو ظہر اور عصر کی نمازیں یکجا پڑھی جاتی ہیں۔ اس کی نسبت سے یہ نمازیں بین الصلواتین کہلاتی ہیں۔

نواب صفوی ایران کی مذہبی جماعت "فدائیانِ اسلام" کا لیڈر۔ اسے ایک سابق وزیرِ اعظم حسین اعلیٰ پر قاتلانہ حملہ کے زیرِ الزام پھانسی دے دی گئی۔

نواوی اسمِ گرامی محی الدین ابو ذکریا یحییٰ بزامی الدمشقی، محرم ۶۲۱ھ مطابق اکتوبر ۱۲۳۳ء میں دمشق کے جنوب میں نوا کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے بہت ذہین ثابت ہوئے۔ ۶۱۹ھ میں مدرسہ الرواحیہ میں داخل ہوئے۔ جہاں پہلے طب اور پھر اسلامیات پڑھی۔ ۶۵۱ھ میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گئے۔ ۶۵۵ھ میں ابو شمع کے ساتھ جامعہ اشرفیہ کے لیے خدمات پیش کرتے رہے۔ وہاں خرابی صحت اور کم معاوضے کے باوجود کام کیا۔ بعد میں جب انہوں نے   کی مرضی کے مطابق فتویٰ دینے سے انکار کیا تو اس نے ملازمت سے بنا دیا۔ صحیح المسلم پر وسیع تحقیق کی اور نوٹ لکھے جو ۱۲۸۳ء میں شائع ہوئے اور پانچ جلدوں پر مشتمل ہیں۔

نواہی اوامر اللہ تعالیٰ کے وہ احکام و ہدایات جن کی تعمیل سے سکھ اور خلاف ورزی سے دکھ ہوتا ہے، خلاف ورزی پر اس کا ضمیر اسے اندر ہی اندر ملامت کرتا ہے اور ان کی نظر میں انسان کمتر اور ندامت و شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ یہ ہدایات بنی اسرائیل ۲۳ تا ۲۶، ۳۴ تا ۳۷، الفرقان ۶۳ تا ۶۸، نسا ۸۶ وغیرہ میں ہے ہیں۔ مثلاً والدین سے شفقت، اسراف سے بچنا، افواہوں سے پرہیز، وقار سے چلنا، راتیں قیام و سجدہ میں گذارنا، سلام کا اس سے بہتر یا ویسا ہی جواب دینا، چال درست و آواز دھیمی رکھنا وغیرہ شامل ہیں۔ سورہ حم سجدہ میں اس کی اعلیٰ مثال یوں ملتی ہے۔

"اپنا بچاؤ اس عمدہ طریقے سے کرو کہ تمہارا دشمن بھی تمہارا مخلص دوست بن جائے۔"

نوحؑ مشہور نبی، جب حضرت آدمؑ کے ہبوط کو چھ سو برس ہوئے تو لامخ کے گھر پیدا ہوئے جب آپ پانسو برس کے ہوئے تو آپ کے بیٹے سام، حام، یافث اور کنعان پیدا ہوئے۔ قرآنِ مجید کے مطابق ۹۵۰ برس کی عمر میں آپ کے کنبے پر "طوفانِ نوح" آیا۔ جس میں تمام دنیا غرق ہوگئی۔ ان میں آپ کا نافرمان بیٹا کنعان بھی شامل تھا۔ اس کا ذکر سورۂ ہود کی درمیانی آیات میں آیا ہے۔ یہ تمام واقعہ سورۂ ہود کی درمیانی آیات میں مذکور ہے۔ اس طوفان کے بعد آپ ۵۰ برس زندہ رہے۔ اس طرح کل عمر ہزار برس ہوئی۔ ابوالحاتم اپنی کتاب المعمرین میں ان کی عمر ۱۴۵۰ برس بتاتا ہے جو غالباً درست ہے۔

آپ کی بیوی کا نام والیہ تھا۔ آپ کا نسب نامہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔ نوح بن لامخ بن متوشالح بن اخنوخ بن یارد بن مہلیل بن قینان بن انوش بن شعیثؑ بن حضرت آدمؑ کے بعد آپ پہلے نبی ہیں جس کو رسالت سے نوازا گیا۔ آپ سے قبل تو اقوام کفر والحاد میں گھری ہوئی تھیں کوئی اللہ کا نام نہ لیتا تھا۔ بتوں کی پوجا جاری تھی، آپ نے انہیں دینِ حق پر ایمان لانے کی ہدایت کی۔ مگر وہ نہ مانے۔ ان کی نافرمانی پر ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے "طوفانِ نوح" آیا تھا۔ اس طوفان میں ساری دنیا غرقاب ہوگئی اور آپ کی کشتی جس میں ہر جانور کا ایک ایک جوڑا موجود تھا کوہ ارارات سے جا لگی۔ یہ طوفان ہفتہ بھر جاری رہا اور انجیل کے مطابق زمین سے ساٹھ ہاتھ اونچا پانی ہوگیا تھا۔ جب طوفان ہٹا تو لوگ نیچے آئے۔ اور نئی نسل شروع ہوئی   سام سے، سامی النسل، حام سے حامی یعنی حبشی اور یافث سے آریائی وغیرہ۔

آپ کا ذکر قرآنِ پاک کی ۲۸ سورتوں میں آیا ہے اور ایک سورت آپ کے نام سے موسوم ہے۔ جن میں سورہ عنکبوت ع۲ ۔ دو میں آپ کی عمر درج ہے یعنی پچاس کم ایک ہزار سال (نیز دیکھیں طوفانِ نوح)۔

نوح انتیسویں پارہ کی مکی سورہ کا نام قرآن مجید اور بلحاظ ترتیبِ نزول ۷۱ ویں۔ اس میں ۲۸ آیات اور دو رکوع ہیں۔ چونکہ سورہ میں حضرت نوحؑ کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کا نام انہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ کا ایک عرصہ دراز تک لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلانے سے یہ سمجھانا مقصود تھا کہ قوم بگڑ چکی ہے اور اس کی اصلاح زمانوں میں ممکن ہے۔ جو لوگ کفر و بدی پر اصرار کریں گے اور نبی آخر الزمان سے منکر ہوں گے۔ ان کی حکومت یقینی ہے۔

واقعہ نوحؑ کے تفصیلی ذکر کے ساتھ بیان آیا ہے حضرت نوحؑ نے گمراہوں کی ہلاکت کی دعا کی کہ یہ آنے والی نسلوں کو گمراہ نہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا۔ ہمیں توحید رسالت اور قانونِ مجازات کا بیان آیا ہے۔

نورالحق والدین پندرھویں صدی کے آخر میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرہ خالد بن ولید تک پہنچتا ہے۔ بنگال کے غیر معمولی اولیاء کرام میں سے ہیں حضرت شیخ علاؤ الدین علا الحق بنگال کے بڑے بیٹے تھے۔ شیخ نور قطب عالم کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے منصب خلافت اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کر کے حاصل کیا جو خود بہت بڑے بزرگ تھے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو غیر معمولی ترقی و فروغ دیا۔ بہت سی کشف و کرامات کیں۔ اپنے مریدوں اور ملاقاتیوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے، کوئی درویش بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کرتے۔ اپنے والد کی ہدایت پر چار سال تک پانی بھر بھر کے دیتے رہے۔ خود اپنے کاندھوں پر گٹھریاں رکھ کر اپنے والد کی خانقاہ لاتے، انہیں اس حال میں جب چچا نے دیکھا جو ... سلطنت تھے تو انہیں مال و متاع کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے اسے دنیاوی ... ہوتے ٹھکرا دیا۔ التمش کی وفات کے بعد جب راجہ کنس نے بنگال کے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کیے تو آپ نے خدمتِ اسلام کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ نے والی جونپور سلطان ابراہیم شرقی نے ان مظالم کے بارے میں خط لکھا۔ جواباً وہ امداد کے لیے ایک فوج لے کر بنگال روانہ ہوا۔ اس کے خوف سے راجہ کنس اسلام لے آیا، لیکن سلطان ابراہیم کی وفات کے بعد پھر مسلمانوں پر مظالم ڈھانا شروع کر دیئے اور آپ کا اثاثہ لوٹ لیا۔ شیخ انور اور شیخ زاہد کو قید کر لیا۔ جو آپ کے مریدوں میں تھے۔ جس دن شیخ انور کو اس نے شہید کیا۔ اسی دن یہ بھی ہلاک ہوا۔ یعنی کہ آرام میں اسے اس کے مسلمان بیٹے جلال الدین نے جو اس وقت مقید تھا جیل کے ملازموں کو ملا کر ہلاک کیا۔

آپ بے حد منکسر المزاج انسان تھے، آپ کی ملفوظات اخبار الاخیار کی اشاعت میں محفوظ ہیں۔

علاوہ ساٹھ کے قریب صفحات پر مشتمل ایک رسالہ "انیس الغربا" آپ کی تصنیف میں شامل ہے۔

آپ کی سنِ وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سلطان نصیرالدین محمود کے زمانے کے کتبے کے مطابق آپ کی وفات ۸۰۸ھ میں ہوئی اور اخبارالاخیار کی اشاعت کے مطابق ۸۱۳ھ میں خزینۃ الاصفیا کی رُو سے ۸۵۱ھ آئینِ اکبری کی رُو سے بھی آپ کا سنِ وفات ۸۰۸ھ ہے۔ تاہم آپ کی خانقاہ کے ایک خادم کے پاس موجود کتاب کی رُو سے ۸۱۸ھ نکلتا ہے۔ اسی کو مستند و صحیح تصور کیا گیا ہے۔

نورالدین زنگی عمادالدین کے بیٹے۔ ان کے وفات کے بعد شام کے حاکم بنے۔ حلب کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ انگریزوں سے کئی جنگیں لڑیں۔ ۱۰۴۰ میں دمشق فتح کیا۔ اور زنگی علاقے اور بیت المقدس کی درمیانی رکاوٹ دور کی۔ اس کے بعد انطاکیہ اور رہا کے علاقے فتح کیے۔ اس کی وفات ۱۱۷۴ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل ۱۱ برس کی عمر میں تخت کا وارث بنا۔

نور محمد تیراہی بابا نام نور محمد اور بابا صاحب القاب تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑا کام کیا۔ تیراہی علاقہ تیراہ میں ۱۱۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت خواجہ محمد فیض اللہؒ کے فرزند و خلیفہ تھے۔ خود نوشی معیوب سمجھتے۔ زندگی سادہ و فقیرانہ و درویشانہ رکھی تھی۔ آپ کے سارے برتن مٹی کے تھے۔ ان میں کئی کئی لوگ مل کر کھاتے۔ جو کچھ میسر آتا صبر و شکر کرتے۔ ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے۔ جو عملی ملاقاتی آتا۔ شفقت و محبت سے پیش آتے اور بیعت لیتے۔ ظہر و عصر کے قریب چار رکعت سنت ضرور پڑھتے۔ رات گئے عبادت میں مصروف رہتے۔ اکثر بارہ رکعت تہجد ادا کرتے۔ عمر کے آخری حصے میں وفات سے ڈیڑھ برس قبل چورہ شریف (ضلع کیمبل پور) تشریف لائے اور ۱۲۶۹ھ میں یہیں وفات پائی۔ یہیں دفن ہوئے۔ یہ مقام جنڈ ریلوے سٹیشن سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں آپ کا عرس مبارک ہر سال بڑی شان سے منایا جاتا ہے۔

نور محمد مہاروی اصل نام بابل بابل تھا۔ مہار شریف سے چار کوس کے فاصلے پر بستی چوٹالا میں ۱۴ رمضان ۱۱۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ہندوال یا ہندال تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب نوشیروان عادل تک پہنچتا ہے۔ مہار شریف میں قرآن پاک حفظ کیا۔ ڈیرہ غازی خان میں درسی کتب پڑھیں۔ پھر لاہور آکر نواب غازی الدین کے مدرسۃ العلوم میں پڑھتے رہے، یہاں سے دہلی چلے گئے اور وہاں کے مشہور بزرگ فخرالدین فخر کے ہاتھ پر بیعت کی اور سولہ سال ان کی شاگردی میں رہے۔ انہوں نے انہیں خلیفۂ اعظم کا درجہ دے رکھا تھا، وہاں سے پاک پتن گئے اور حضرت گنج شکر کے مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ پاک پتن گئے۔ ۳ ذوالحج ۱۲۰۵ھ میں مہار شریف ہی میں وفات پائی اس وقت آپ کی عمر مبارک ۶۳ برس تھی۔ اولاد میں آپ نے تین صاحبزادے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

نوروز ایرانیوں کا قومی تہوار ہر سال ۲۱ مارچ کو جشن کی صورت میں منایا جاتا ہے۔ اس دن سورج حوت حمل سے برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔ عباسیوں، ساسانیوں اور غزنویوں کے عہد میں یہ جشن سرکاری طور پر منایا جاتا رہا۔ صفویوں کے دور میں اسے پرانی عظمت ملی۔ ان دنوں ایران میں یہ جشن تیرہ روز تک منایا جاتا تھا۔ ویسے عموماً یہ ایک ہفتے تک جاری رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جشن کا بانی ایران کا مشہور بادشاہ جمشید تھا۔

نوری پیر محمد معصوم شاہ نوری، معروف عالم دین چک سادہ ضلع گجرات کے سجادہ نشین سید فضل شاہ کے بیٹے۔ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا امام دین سے حاصل کی۔ تجوید قرآنِ پاک پڑھا اور مؤذن دربار حضرت داتا گنج بابا فضل نور کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس وجہ سے آپ نوری کہلواتے ہیں۔ بعد میں یہیں رہائش اختیار کی۔ کئی کئی راتیں دربار پر گذار دیتے۔ ان کی تصنیف کشف المحجوب کا درس دیتے جو ہفت یوم جاری رہتا۔ ۱۹۴۵ء میں نوری کتب خانہ کی بنیاد رکھی اور سینکڑوں نایاب رسالے طبع کروائے۔ لاہور ریلوے سٹیشن کے سامنے نوری مسجد سمیت لاہور میں بیس شاندار مساجد تعمیر کروائیں۔ آپ ۱۸ جنوری ۱۹۶۹ء بروز شنبہ بوقتِ نمازِ عشاء خالقِ حقیقی سے جا ملے اور آبائی علاقے چک سادہ ضلع گجرات میں دفن ہوئے۔ آپ کے مریدوں کا سلسلہ ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔

گلدستۂ ہدایت، گلدستۂ شریعت، سحری رد لٹ پنجابی رقعہ، مواعظ القرآن و حدیث، ہدایت نامہ بے نمازاں، معصوم ہدایت اور خطبۂ نوری، راہبر تصانیف چھوڑی ہیں۔

نوشہ قادری: نام حاجی محمد لقب نوشہ، گنج بخش، مجدد اکبر — سید علاؤالدین بن سید شمس کے بیٹے۔ تاریخ ولادت یکم رمضان ۹۵۹ھ، والدہ ماجدہ کا نام حضرت بی بی جیونی۔ آپ سلسلہ اہل بیت کرام، خلاصہ سادات و حافظ قرآن تھے۔ حضرت قائم الدین قاری اور حافظ بڈھا شاہ قاری سے حاصل کی یعنی نوشہ بھلوال کے مرید ہوئے۔ جنہوں نے آپ کو خلافت دے کر نوشہرہ تارڑان بھیجا۔ جنگل میں ایک کنوئیں کے نزدیک ۱۲ روز خلوت میں رہے ... ریاضت و مجاہدات استغراق و محویت میں رہتے۔

پہلی مرتبہ لاہور آنے پر مخدوم علی ہجویری کے مزار پر حاضری دی ... مسجد فرید بخاری میں قیام رکھتے۔

آپ نے تبلیغ کے لئے دور دراز ممالک کے دورے کئے۔ مستشرقین نے بھی اعتراف کیا کہ ان دوروں سے لاکھوں افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

۸ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ کو وصال فرمایا۔ آپ کا روضہ ... تحصیل پھالیہ میں دریائے چناب کے کنارے موجود ہے۔

نوشیرواں ساسانی خاندان کا مشہور بادشاہ۔ جسے عرب مورخ کسریٰ اور ... والے خسر کہتے ہیں ایک کسان عورت کے بطن سے پیدا ہوا۔ ... تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے تمام بھائیوں، بھتیجوں اور مزدک ... ایک لاکھ پیروکاروں کو قتل کروا دیا۔ روم، ساسانیوں اور ترکوں سے اس کی ... ہوئی۔ سماجی طور پر اس نے لگان گھٹایا۔ زرعی پیداوار پر محصول کم کیا ... کو زیر کاشت لانے کے لئے بیج، مویشی اور آلات زراعت مفت تقسیم کئے ... کا نظام بہتر کیا۔

قیصر روم کے ملک بدر مفکروں کو خوش آمدید کہا۔ اس سے وہاں علم کو فروغ حاصل ہوا۔ افلاطون کی تحریروں کا خاص کر ترجمہ کروایا۔ طب و فلسفہ کی تعلیم کا ... قائم کر کے خاص انتظام کیا۔ اردشیر کے قوانین کو ازسرنو ملک کا آئین قرار دیا۔

نوفلؓ بن حارث حضور اکرمؐ کے چچازاد ... اسلام لانے سے قبل بھی آپ کا رویہ اپنے بھتیجے کے بارے میں ...

تھا۔ جنگ بدر میں مشرکین کے مجبور کرنے پر شامل ہو گئے مگر گرفتاری پر آپؐ نے زرِ فدیہ کے طور پر انہیں رہا کر دیا۔ اس پر آپ اسلام لے آئے۔ بعد میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں سے فتح مکہ کے بعد آپؐ کے ہمراہ مدینہ آ گئے۔ طائف اور حنین کی جنگوں میں حصہ لیا۔ حضرت عمرؓ کے خلیفہ بننے کے تین ماہ بعد یہیں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے۔ ایک عبداللہؓ جو حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں مکہ کے قاضی تھے اور دوسرے حضرت سعید فقیہ تھے۔

نہاوند

شاہِ ایران اور گرد کے ساتھ ۶۴۲ء میں لڑی جانے والی ایک جنگ۔ اہواز، خورستان اور عراق پر مسلمان قابض ہو چکے تھے۔ اسی دوران اس کا دستِ راست ہرمزان بھی گرفتار ہو چکا تھا۔ اس پر وہ پیخ پا تھا۔ مردان شاہ کی زیرِ نگرانی ۱½ لاکھ کا لشکر نہاوند روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ خود اس کے مقابلے پر آنا چاہتے تھے مگر حضرت علیؓ اور طلحہؓ کے کہنے پر آپ نے نعمان بن نمرن کو سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ اسلامی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی۔ پہلے دونوں سپہ سالاروں نے سفیروں کو مصالحت کے لیے بھیجا۔ اسلامی لشکر کی طرف مغیرہ بن شعبہ اور دوسری طرف سے مردان خود آیا تھا۔ مگر بات چیت ناکام ہو گئی۔ نتیجتاً گھمسان کا رن پڑا۔ ایرانی فوج فصیل شہر کے گوکھرو بچھا کر کھڑے رہے۔ مسلمانوں نے اس پریشان کن صورتِ حال کے لیے مجلس مشاورت کا اجلاس بلا کر فیصلہ کیا کہ حضرت قعقاعؓ ایک لشکرِ قلیل لے کر آگے بڑھیں گے اور جب دشمن حملہ آور ہو تو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹیں۔ جب دشمن فصیل سے دور آ جائے تب دوسری فوج حملہ کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دشمن جونہی حضرت قعقاعؓ کے پیچھے مورچوں سے دور نکل آئے تو پوری فوج حملہ آور ہوئی۔ حضرت نعمان مہلک زخم کھا کر گر پڑے۔ ان کی شہادت کے فوراً بعد نیادت نعیم (ان کے بھائی) نے سنبھالی آخری دم تک فوج کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا۔ اس دم ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ جب مسلمان جنگ جیتے تو آپ کے آخری لمحات تھے۔ آپ نے فوراً حذیفہ بن الیمان کو سپہ سالار مقرر کیا ——— مالِ غنیمت تقسیم کر کے انمول جواہرات حضرت عمرؓ کو روانہ کر دیئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

نہروان: ۹ صفر ۳۸ھ / ۱۷ جولائی ۶۵۸ء کو نہروان کے مقام پر حضرت علی اور خوارج کے درمیان کی ایک جنگ۔ یہ علاقہ واسط اور بغداد کے درمیان ہے۔ جنگ صفین میں شامی فوج نے نیزوں پر قرآن مجید لگائے تھے۔ بعض اس صورت میں ان سے جنگ کے حق میں تھے۔ اشعث بن راس نے ثالثی اور ہر فیصلہ رد کرتے ہوئے حروراء کے مقام پر نئی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ لوگ خوارج کہلائے۔ جنگ نہروان انہی سے لڑی گئی۔ حضرت علی نے عبداللہ بن وہب کے نام مصالحتی خط لکھا، لیکن وہ نہ مانے۔ انہوں نے بے شمار بے گناہ عورتوں اور بچوں کو ناک وخون میں نہلا دیا۔ لوگوں نے شام کو جنگ ملتوی کر کے خارجیوں کا خاتمہ کرنے کی اپیل کی۔ چنانچہ آپ نے ان سے خون بہا طلب کیا۔ انہوں نے انکار کیا۔ خوارج نے عبداللہ بن الکواد کو بات چیت کے لئے بھیجا، جو ناکام ہو گئی۔ اس پر حضرت علیؓ میدان جنگ میں کود پڑے۔ تاہم امان کا ایک جھنڈا حضرت ابو ایوب انصاری کو دیا گیا تھا، کہ جو اس کے نیچے آئے، امان پائے۔ بہت سے لوگ جنگ سے قبل ہی مسلمان فوج سے آ ملے۔ کچھ کوفہ اور مدائن چلے گئے۔ اس طرح خوارج کا لشکر قلیل رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خوارج ہلاک ہو گئے، صرف نو بچ سکے۔ اس کے بعد شام سے جنگ لڑی گئی

نہی عن المنکر

عربی الفاظ کا مجموعہ بمعنی "جن سے انکار کیا گیا ان سے انکار کرو"۔ دعوت الی الاسلام دنیا کے مسلمان جو پہلے کاموں کی طرف سے غافل رہے اور برائی میں رہتے وہ اب دین کامل کی طرف آ جائیں اللہ کے لئے اللہ کی آخری کتاب کو رہنما کریں۔ اس طرح منکر معروف کے برعکس وہ کام ہوئے جن سے فطرت انکار کرتی ہے۔ وہ قوم بے قرین اور قابل تباہی ہوتی ہے جو آپس میں لوگوں کو برائی کرتے دیکھیں مگر روکیں نہیں یہ تمام انسانوں اور مسلمانوں کا فرائض میں شامل ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے روایت ہے کہ امر المعروف نہی عن المنکر افضل الجہاد ہے اک اور روایت میں بیان ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اس پر عمل کرنے والا زمین پر خدا اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے۔ اور اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے چھوٹے بڑے لوگ حسب عقل ودانش لوگوں کی راہبری کرتے رہتے ہیں اور لوگوں نے بلکہ خود بھی کہا کہ اگر ہم گمراہی پر جائیں تو ہمیں روکو ان میں سربرآوردہ شخصیات حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی ہیں اور سورۂ آلِ عمران میں ہدایت ہے اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔ اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوداؤد سے اک روایت ہے کہ جب لوگ ظالم کے ظلم کو دیکھ کر منع نہ کریں تو عنقریب خداوند تعالیٰ ان پر عذاب نازل کرے گا۔ شاید اسی لئے افلاک کو چھوتی مسلمان قوم آج اس حال میں ہے کہ اس نہی عن المنکر کا درس مٹ گیا ہے۔

نیت

قلبی کیفیت، کہ کسی کے ذہن میں کسی کے بارے میں کیا ہے۔ روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجے کے اعتبار سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا، جتنا کہ نیت کے اعتبار سے۔ اس لئے حدیث ہے کہ "اعمالوں کا دار ومدار نیتوں پر ہے"۔

اب یہاں فرض کیجیئے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو بوجہ دشمنی یا ذاتی غرض رات کے اندھیرے میں اپنے گھر بلایا کہ راستے میں ڈاکو وغیرہ نقصان پہنچا دیں گے، مگر وہ راستہ بھٹک گیا اور وہ راہ میں اُسے روپوں کی تھیلی مل گئی۔ حقیقتاً اس کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ جس کا حساب ہو گا۔ ایک اور بات ——— معاملہ یوں ہوا کہ ایک شخص کا بٹوہ سڑک پر گر گیا۔ واپسی میں اسے سڑک پر وہی بٹوہ نظر آیا۔ اس نے غیر کا جان کر چپکے سے اٹھا لیا۔ سو اگرچہ تھا تو اس کا ہی، مگر برائی کر چکا کہ اس کے قلب میں برائی تھی۔ اسلام نے نیت میں اخلاص اور بے غرضی کی تعلیم دی ہے۔ ریاکاری، نفع نقصان اور ایسی ہی تمام دوسری باتیں نیک عمل کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

سورۂ بقرہ کی ۲۶۴ ویں آیت میں صاف طور پر آیا ہے کہ ——— اے ایمان والو! خیراتوں کو احسان دھر کر، اور ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے۔ جو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے۔ اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

نیند

اسلام میں دیر تک سونا روا نہیں۔ نبی کریمؐ سے روایت ہے کہ جو شخص دیر تک سوتا رہے تو سمجھو، شیطان نے اسکے کان میں پیشاب کر دیا ہے۔

اگر لوگوں میں بیٹھے ہو اور نیند آئے تو سونا نہیں، نہ ہی بزرگوں کی محفل میں اونگھنے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں انسان کھڑا ہو جائے یا کسی اور طریقے سے نیند دور کرے۔ نیند کی راحت میں جو شخص خراٹے لینے کا عادی ہے اُسے کم سونا چاہیئے۔ چت سونے کی بھی عادت جائز نہیں۔ ہمیشہ پہلو پر سونا چاہیئے خصوصاً سیدھے پہلو پر۔ اسلام میں اوندھے منہ سونا ممنوع ہے۔ اللہ کے نزدیک نیند اس شخص کی ہوتی ہے جو سمجھے کہ یہ فرائض و نوافل کی ادائیگی کے لیے ہے۔ یہ خصوصی طور پر رات کے آخری حصہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اس وقت کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے

کہ اللہ اسوقت بہت مغفرت کرتا ہے اللہ سے غافل رہ کر سونے والا مردہ ہے کہ جس کے بارے میں حضرت داؤدؑ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ وہ شخص میری محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے جو رات آتے ہی مجھ سے غافل ہو جاتا ہے۔ سوتے وقت یہ دُعا پڑھنی چاہئیے۔

"اے اللہ میں اپنے پہلو پر لیٹا ہوں اور تیرے نام سے اسکو اٹھاؤں گا' اے اللہ اگر تو میری جان روک لے تو اس پر رحم کر اور اگر چھوڑ دے تو اس کی حفاظت فرما جیسا کر تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اے اللہ مجھ کو بچا اپنے عذاب سے جبکہ تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا قیامت کے دن۔"

نینوا - اِک قدیم سلطنت، جو شمال میں ارمنی کے پہاڑی سلسلے تک اور جنوب میں بابل تک ۲۸۰ میل طویل اور ۱۵۰ میل عریض تھی۔ یہ علاقہ انتہائی زرخیز تھا۔ یہاں کے لوگ جاہل تھے۔ ان کی راہبری کے لیئے یہاں حضرت یونسؑ پیغمبر بھیجے گئے۔

و

واثق باللہ ۔ صحت مند، حسین و جمیل انسان ۔
عباسیہ عہد کا خلیفہ ۔ نام، ابو جعفر ہارون ۔ لقب واثق باللہ ۔ ایک صاحب عقل انسان، صاحبِ ذوق شاعر ۔
۲۰ شعبان ۱۹۶ ھ کو قراطیس نامی رومی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا ۔ اپنے باپ معتصم باللہ کے عہد خلافت ہی میں ولی عہد مقرر ہو گیا تھا ۔ ربیع الاول ۲۲۷ ھ میں والد کی وفات کے بعد عنانِ حکومت سنبھالی ۔ خلافِ معمول ترکوں کی مخالفت مول لینے کی بجائے اس نے ان پر لطف و کرم کی بارش کر دی ۔ ان کو بڑے بڑے مناصب دیئے ۔ مرادِ اشناس نامی ترکی کو نائب السلطنت کا عہدہ جلیلہ دیا ۔ اس سے قبل کسی خلیفہ نے اپنا نائب مقرر نہ کیا تھا ۔
اس کے عہد کی ابتدا میں قیسیوں نے فتنہ و شر کی آگ پھیلائی ۔ اس نے رجا بن ایوب کو فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا جس نے ڈیڑھ ہزار قیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر امن قائم کیا ۔ اسی دوران مبرقع نامی تخریب پسند کو گرفتار کر لیا ۔
۲۳۰ ھ میں بنی سلیم نے شورش پیدا کرنا چاہی جو کچل دی گئی ۔ ۲۳۲

واجب ایک عربی اصطلاح، فقہ میں وہ کام جس کا کرنا ضروری ہو، یہ فرض اور نفل کی درمیانی شکل ہے ۔ نفل کے برعکس اس کے نہ کرنے پر گناہ ہوتا ہے ۔ مگر فرض کاموں سے کم، نمازِ وتر واجب ہے ۔ عید الضحیٰ پر قربانی بھی واجب ہے ۔ فرض سے انکار کفر والحاد ہوتا ہے لیکن واجب سے انکار میں ایسا درجہ نہیں ۔ "واجب" مختلف دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر مختلف معنی دیتا ہے مثلاً واجب الوجود یعنی" وجودِ مطلق" یعنی" خدا" واجب الادا یعنی وہ چیز جو ادا کرنی ہو مثلاً "قرضہ وغیرہ" واجب الاطباع" وہ جس کی تقلید کی جائے ۔ یعنی "نبی" ۔

واجد علی شاہ ۱۸۲۲ء ـــــ ۱۸۸۷ء آخری تاجدار اودھ والی اودھ امجد علی شاہ کے بیٹے فنِ تعمیر میں عمیق دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ تخت نشین ہوتے ہی باغات و عمارات کی تعمیر شروع کی ۔ ساتھ اس کے فنِ موسیقی رقص و شعر و سخن میں بھی اکثر کھوئے رہتے بیش بہا ٹھمریاں اور دادرے تخلیق کئے ۔ جانوروں کے شوقین و دلدادہ اور انہیں زیور گل پارسا، مثبت صورت، دردِ جگر، صدائے ملک، فلکِ آشیاں جیسے خطابات سے نوازتے تھے ۔
۱۸۴۷ء میں بعد از وفاتِ والد، نو عمری میں تخت نشین ہوئے، فوج اور انتظامیہ کو منظم کیا مگر جلد ہی زرق جمالیات کا باعث بدنظمی پھیلا دی اور ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو انگریزوں نے بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کو اپنی غاصبانہ سلطنت میں شامل کر لیا ۔ معزولی کے بعد دو سال تک فورٹ ولیم کلکتہ میں نظر بند رہے نظر بندی کے بعد کلکتہ میں رہائش رکھی اور وہیں وفات پائی ۔ نامی گرامی مصنف نے "ٹھٹ بند" میں بہت ہی کتب تصنیف کیں ۔ جن میں چند ایک بیان کی جاتی ہیں ـــــ دستور واجدی، ہیئت حیدری صوت المبارک صحیفۂ سلطانی جوہر عروض وغیرہ ۔ اکثر کتب نایاب ہیں ۔

وادیٔ القریٰ ملک کے وسط شہر کوہ بطحا کہتے ہیں ۔ وادیٔ القریٰ اسی کا دوسرا نام ہے ۔

وارث :۔ زمین و آسمانوں کا حقیقی اور مقتدر مطلق وارث ذاتِ خداوندی ہے اور اس نے میاں انسان کو مختار بنا کر بھیجا کہ جس طرح چاہئے اور پھر اس نے وعدہ کے مطابق اشرف مخلوق کو زمین کا وارث بنا دیا ـــــ شکر اس خدا کا جس ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور ہمیں زمین کا وارث بنا دیا (الزمر ۷۵) اسی طرح سورۃ بنیا میں بھی وارث کے بارے میں ہدایت آئی ہے جو کچھ وارث کو ملکیت میں جاتے ۔ بمطابق وصیت یا اسلامی احکامات وہ وراثت سکھائے گی ۔
(نیز دیکھئے میراث وراثت)
وصیت و اصحاب الفرائض)

وارث شاہ مشائخ قادریہ، سید قطب شاہ کے بیٹے اور "ہیر رانجھا کے مصنف" ۱۱۳۵ یا ۱۱۴۰ء میں ضلع شیخوپورہ میں جنڈیالہ شیر خان میں پیدا ہوئے ۔ ذرا بڑے ہوئے تو تحصیلِ علم کی خاطر قصور گئے اور مسجد کوٹ قصور میں مولانا غلام محی الدین سے فیض حاصل کیا ۔ ان کے بعد حضرت بھلے شاہؒ کے ساتھ مولانا غلام مرتضیٰ قصوری کے شاگرد ہوئے ۔ یہاں سے پاک پتن شریف میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دی ۔ یہاں سے ٹھٹھہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا یہیں وارث شاہ اور بھاگ بھری کی متنازعہ داستانیں لکھیں ۔ یہاں سے پاک پتن

کے قریبی گاؤں ملکہ ہانس چلے گئے، قصہ ہیر رانجھا بھی یہیں کی تحریر ہے۔ یہاں سے لاہور اور قصور سے ہوتے ہوئے واپس جنڈیالہ شیر خان چلے گئے۔ یہیں وفات پائی۔ آپ کی قبر ایک چار پانچ فٹ اونچے احاطہ میں گاؤں کے باہر ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے والد اور بھائی کے مقابر ہیں۔

پنجابی کے بلند پایہ شاعر ہیں جنہیں "ہیر رانجھا" کے لازوال شہرت دی ہے جو کلاسیکی ادب میں اہم مقام رکھتی ہے۔

واصل بن عطا

نام واصل بن عطا، لقب الغزل۔ مدینہ میں ۸۰ھ ۔ ۷۰۰ ۔ ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے بصرہ چلے گئے اور حسن البصری کے اصحاب میں شامل ہوئے۔ ان کی زوجہ عمر بن عبید ابوعثمان کی بہن تھیں۔

آپ نے کہا کہ جو مسلمان گناہ کرتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ کفر کے قریب تر چلا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں صحابی کا قتل بھی کفر ہوگا۔ آپ علمِ کلام کے موجد تھے۔ احکامِ شرعیہ کی بھی تقسیم کی۔ اور کہا کہ حقِ برحق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآنِ ناطق، حدیث متفق علیہ، اجماعِ امت اور قیاس۔ آپ نے کہا کہ نسخ صرف اوامر و نواہی میں ہی ہو سکتا ہے۔ اصولِ فقہ میں اسی لیے آپ اولیت کے مستحق ہیں۔

واقدی

نامور مؤرخ، مدبر حدیث، فقہ اور احکام۔ نام محمد بن عمر واقدی کنیت عبداللہ، مدینے میں ۱۳۰ھ بمطابق ۷۴۵ء میں مدینے میں پیدا ہوئے۔ ذاتی کتب خانہ کھول رکھا تھا اور کتابوں کی کرنے کے لیے دو ملازم مستقلاً رکھے ہوئے تھے۔ دو ہزار کتابیں انہوں نے مرنے سے قبل ہی بیچ دیں۔ باقی چھ سو صندوقوں میں بھری تھیں۔ کتابوں کی کل تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر صندوق کو کم از کم دو آدمی اٹھا سکتے تھے۔ اٹھتر برس کی عمر میں ۱۱ ذوالحج ۲۰۷ھ ۲۳ اپریل ۸۲۳ء میں انتقال فرمایا اور قبرستان خیزران میں دفن ہوئے۔ مؤرخ کی حیثیت سے آپ کی کتب مستند نہیں جانی جاتیں۔ تاہم مغازی پر خاصی معلومات مہیا کیں ہیں۔ آپ کی کتب میں کتاب التاریخ والمغازی والمبعث فتوح الشام، فتوح المصر، کتاب الزواج النبیؐ وغیرہ ہیں۔

واقع

صوفیاء کرام کی ایک اصطلاح، معنی دل میں ظہور پذیر ہونے والے معنی اس کو دور کرنے کی قدرت طالب میں نہیں ہوئی۔ یہ صرف اس دل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جو کلی طور پر حقِ تعالیٰ سے معمور رہو۔

وتر

عشاء کی نماز کے ساتھ کے آخری حصے میں پڑھی جانے والی نماز فرض نہیں، نہ ہی قرآن مجید میں ذکر موجود ہے اس کے صحیح میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک حدیث نبوی ہے کہ ـــــ "اللہ نے تم پر اک اور نماز واجب کر دی ہے کہ وتر ہے اسے نمازِ عشا اور نمازِ فجر کے درمیانی عرصے میں پڑھیں"

امام شافعی کے لیئے اس میں ایک، حنفی فقہ میں تین اور دوسروں میں پانچ سے نو تک رکعت پڑھے جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دعائے قنوت بھی پڑھی جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ واجب نماز ہے جب کہ دوسرے ماہرین فقہ اسے سنت قرار دیتے ہیں۔

وحشی بن حرب

نام وحشی کنیت ابودسمہ، نسلاً حبشی، حضرت جبیر بن مطعم کے غلام۔ جنگِ اُحد میں جب ان کے آقا کے بھائی کو حضرت حمزہ نے قتل کیا۔ تو اس کا بدلہ لینے کے لیے انہوں نے انہیں مامور کیا اور اس کام کے عوض آزادی کی پیش کش کی۔ چنانچہ اس نے چھپ کر وار کر کے آپؓ کو شہید کیا۔ فتح مکہ کے وقت طائف میں پناہ لی اور انہی کے وفد کے ساتھ اسلام لے آیا۔ اس لیے آپؐ نے اسے معزانہ دی مگر اس سے کہا کہ نظروں کے سامنے نہ آئے۔ اس نے حضرت حمزہ کی شہادت کا بدلہ اس نے جنگِ یمامہ کے وقت اسلام کے سب سے بڑے مسیلمہ کو قتل کر کے چکانے کی کوشش کی۔

وحی

عربی میں وحی کے معنی "مخفی" یا "اشارہ" کے ہیں۔

خدا کی طرف سے اشارہ فرمان یا ہدایت۔ اس کی قسمیں ایک ظاہر اور دوسری باطنی۔ ظاہری وحی کی آگے مزید تین اقسام ہیں۔ اولاً اشارتاً یا القا اس میں الفاظ نہیں ہوتے۔ دوئم میں پس پردہ آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا۔ یہ وحی الملک کہلاتی ہے۔ سوئم جب جبرائیلؑ خود سامنے آتے اور الفاظ وحی بیان کرے۔ یہ وحی کی سب سے اعلیٰ قسم ہے اور وحی القرآن کہلاتی ہے۔ جو وحی قلب پر نازل کی جاتی ہے وہ وحی خفی کہلاتی ہے یعنی وحی پوشیدہ وہ پہلے قسم کی وحی ہے۔ باطنی وحی کے بارے میں سورہ نجم کی آیت دو میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ وہؐ اپنے آپ سے کچھ نہیں بولتے تھے یعنی اس قسم میں نفسِ انسان میں القاً باتیں آجاتی ہیں۔ اس کی باطنی قسم اولیا کرام اور دوسرے بندۂ خدا جو اس کی محبت سے سرشار ہوں پر بھی آسکتی ہے مگر سوئم قسم صرف پیغمبروں پر آتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مردوں کے علاوہ عورتوں سے بھی ہمکلام ہوا۔ جن میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ، فرعون کی بیوی حضرت آسیہؑ اور حضرت مریمؑ کا بھت ذکر آتا ہے۔ آنحضرتؐ کا کہنا ہے کہ انہیں وحی کے لیے بسا اوقات صرف آواز سنائی دیتی جو گھنٹی کی مانند ہوتی اور بسا اوقات انسانی شکل میں حضرت جبرائیل آتے اور الفاظِ وحی دیتے۔ یہودیوں کے نزدیک بھی وحی حضرت جبرائیل لاتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے مطابق بھی وحی وہی لاتے تھے۔ انہیں فرشتہ آسمانی ناحنہ کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ تمام آسمانی صحیفے و کتب بشمول قرآنِ مجید بذریعہ الہام انسان تک پہنچے ہیں۔ خدا ماضی میں اسی طریقے سے نبیوں سے مخاطب ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ تمام حیوانی جانور بھی بذریعہ وحی تربیت کیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ سورہ نحل ۶۸ ۔ ۶۹ ـــــ اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں جو لوگ ان کے لیے جگہ بناتے ہیں، ـــــ اور ہر قسم کے میوے کھا اور پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا۔ . . ۶۹" اس طرح خدا نے اپنے نیک ترین بندوں کے لیے جانوروں کو بھی بذریعہ تربیت دی ہے۔

وحی علم الیقین کی اعلیٰ شکل ہے۔ اس کی اشکال کے بارے میں خدا نے قرآنِ عزیز میں یوں بیان فرمایا ہے ـــــ "اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے دا س دنیا میں گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعے یا پس پردہ یا بھیج دے فرشتہ کو، پس وہ اس کی (خدا کی) اجازت سے اس پر وحی لاتا ہے جو اس کی (خدا کی) مرضی ہو۔ بلاشبہ وہ (خدا) جاننے والا حکمت والا ہے" (نیز دیکھیں "الہام")۔

ودیعت

ودیعت کا مالک مودع اور جسے دی جائے وہ مودع کہلاتا ہے جو چیز جمع کرائی جائے وہ ودیعت کہلاتی ہے جس کا لغوی معنی شے کے کسی

دوسرے کے پاس چھوڑتا ہے، یہ کسی ایسے شخص کے پاس ہی جمع کرائی جاسکتی ہے جو امین ہو، قابلِ اعتبار ہو، ایسے فرد کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے ـــــ "ایمان دار امین، امانت کی گمشدگی کا ذمہ دار نہیں"۔ یہ اسی کو واپس کی جاسکتی ہے۔ جو جمع کرانے۔ اس کے علاوہ کسی غیر کو واپسی کی صورت میں، اگر امانت گم ہو جائے تو اسے پورا کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی ودیعت کو اپنی شئے کے ساتھ مثلاً کسی کے اناج یا تیل کو اپنے اناج یا تیل سے ملا دیتا ہے اور اس کا زیادہ ہے تو اس صورت میں آدھا حصہ دینا پڑے گا اور اگر ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا گیا تو مناسب حصہ دیا جائے گا۔ اگر ودیعت جمع کرانے والے دو فرد ہیں تو یہ دونوں کی موجودگی ہی میں دی جاسکتی ہے۔

وراثت

ورثہ، میراث، ترکہ

کسی متوفی کے ورثا میں اس کے ترکہ کی تقسیم کی جانے والی چیز کو وراثت کہتے ہیں جس میں تقسیم کی جائے وہ وارث یا ورثا کہلاتے ہیں۔ تقسیم کا اصول اصولِ وراثت کہلاتا ہے۔

جن دنوں وراثت کی تقسیم کے لیے کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا ان دنوں اس کی تقسیم وصیت کی بدولت ہوا کرتی تھی۔ مگر اب بغیر کسی معقول وجہ کے وصیت کی بدولت اسلام میں مقرر کردہ حصوں میں کمی بیشی کا کوئی جواز موجود نہیں وراثت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اس کا تقسیم ہونا ضروری ہے تاہم اگر ایک وارث چاہے تو دوسرے کو اپنا حصہ بیچ سکتا ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا۔

"میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا۔ لہٰذا میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو بچے گا وہ صدقہ ہوگا"۔ یعنی بہترین وراثت وہ ہے جو انسانیت کے لئے وقف ہو جائے۔

(نیز دیکھئے اصحاب الفرائض،
وارث، میراث)

ورقہ بن نوفل:- رشتے میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے چچیرے بھائی، بعض آرا میں راہب و عیسائی مبلغ، ایک اور خیال کے مطابق انہوں نے انجیلِ مقدس کا ترجمہ کیا۔

اکثر اوقات لوگوں سے الگ رہ کر ذکر و عبادت میں مصروف رہتے۔ جب حضرت محمدؐ پر حضرت جبرائیلؑ بطریق خدا منصبِ نبوت، ودرجۂ رسالت لے کر آئے اور آپؐ خوفِ الٰہی میں لرزاں گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی نبوت کی گواہی دیتے ہوئے انہیں ورقہ بن نوفل کے پاس چلے جانے کا ارادہ کرلیا۔

ورقہ بن نوفل علمائے یہود و نصاریٰ سے معلوم کر چکے تھے کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جو اللہ کی توحید کو دنیا پر پھیلائے گا۔

جب آپؐ نے ان سے حضرت جبرائیلؑ کی گفتگو بیان کی تو اس وقت ورقہ نہایت ضعیف و نابینا ہو چکے تھے، ایک دم چلا اٹھے۔

"یہی ہے وہ ناموس جو حضرت موسیٰؑ پر اترا تھا"۔ انہوں نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا ـــــ "اے نبی ـــــ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب آپؐ کی قوم آپؐ کو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دے گی۔ اور میں اس وقت آپؐ کی کچھ مدد کر سکتا۔ میں نے آپؐ کی ہجرت کا واقعہ مسیعیاہ کے بیالیسویں باب میں پڑھا ہے"۔

رسولؐ نے پوچھا ـــــ "اے ورقہ آخر میری قوم مجھے مکہ سے کیوں نکالے گی؟"

ورقہ نے کہا ـــــ "تمام انبیاءؑ کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے کہ آغازِ رسالت میں انہوں نے عداوت، بغاوت اور مخالفت پر کمر باندھی اور اس وقت ان پر ایمان لے آئے جب قہرِ خداوندی نزول ہوا اور آثارِ فطرت و قدرت نے اپنے بیٹوں کی مدد کی"۔
ورقہ بن نوفل اس واقعہ سے چند دن بعد انتقال کر گئے۔

وصیّت عربی میں بعد از مرت تقسیم میراث سے متعلق مالک جائیداد کی ہدایات جس شخص کے حق میں وصیت کی جائے سے وصی کہتے ہیں وصیّت کی رو تقسیم ہونے والی جائیداد میراث کہلاتی ہے۔ بسا اوقات اصل مالک کے نابالغ ہونے کی صورت میں مرنے والا کسی شخص کو وصی مقرر کر کے جاتا ہے۔ جج بھی کسی کو وصی مقرر نہ درست کام کرنے پر برطرف کر سکتا ہے اسلام میں وصیت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ تحریری طور پر موجود ہو بلکہ اس کی تصدیق کے لئے دو مرد یا ایک مرد جمع دو عورتیں بھی اس کی تصدیق کر سکتی ہیں غریب وارثوں کی موجودگی میں کسی اور کو وصیت کرنا روا نہیں۔ سورۃ بقرہ کے پانچویں رکوع میں اور سورۃ النسا کے دسویں رکوع میں تقسیم میراث اور وصیّت کے بارے میں واضح احکامات موجود ہیں۔
(نیز دیکھئے میراث دوارث، اصحاب انفراق، وراثت)

وصی احمد محدّث سواتی (۱۸۳۵ء - ۱۹۱۶ء) عالمِ دین۔ ریاندیر سوات میں پیدا ہوئے۔ جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء میں اپنے والد کے ہمراہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ قامت گزیں ہو گئے۔ تین برس بعد وطن واپس آئے اور دہلی کے مدرسہ حسین بخش میں تعلیم کا آغاز کیا۔ مدرسہ فیض عام کانپور میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے علوم و فنون کی تکمیل کی۔ دورۂ حدیث مولانا احمد علی سہارنپوری سے پڑھا۔ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت کی اور خلافت سے نوازے گئے۔ فیضِ عام کانپور میں دو برس علوم دینیہ کی تدریس کی۔ اور پھر پندرہ برس تک مدرسہ حافظ الحلوم پیلی بھیت میں علوم اسلامیہ کی تدریس کرنے کے بعد مدرسہ الحدیث کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی جہاں زندگی کے آخری لمحات تک تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے رہے۔

آپ بیک وقت کئی علوم و فنون پر عبور کامل رکھتے تھے۔ اور درس نظامی کے تمام فنون کی تعلیم دیتے مگر زیادہ توجہ فقہ اور حدیث میں تھی۔ آپ کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں۔ حاشیہ تفسیر مدارک، تعلیقات سنن نسائی۔ تعلیقات شرح معانی الآثار، تعلیقات شروح اربعہ ترمذی، افادات حصن حصین، تعلیق المجلی شرح منیۃ المصلی، الدرہ فی عقد الایدی تحت السُرہ کشف الغمامہ، اظہار شریعت، انفع الشواہد، جامع الشواہد، حاشیہ مقامات حریری، حاشیہ تسافیہ، حاشیہ میبذی۔ اس کے علاوہ کئی قلمی کتابیں ہیں جن کا ذکر خواجہ رضی حیدر نے اپنی تالیف تذکرہ محدث سواتی میں کیا ہے۔ آپ نے عمر کا اکثر حصہ علوم دینیہ کی تدریس میں بسر کیا۔ اور بے شمار افراد نے آپ سے اکتساب فیض کیا ہے

وضو؛ قبل از نماز عمل پاکیزگی۔ امام ابو حنیفہ کے مطابق وضو میں چار فرض ہیں اور شافعی چھ بتلاتے ہوئے نیت اور ترتیب کا اضافہ کرتے ہیں۔ امام ان سے اختلافی نقطۂ نظر رکھتے ہوئے موالات "کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل کے مطابق وضو سے قبل بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔ مولانا محمد آصف درج کرتے ہیں کہ برائے وضو قبلہ شریف کی جانب رخ کرنا ضروری ہے۔ اگر قصداً بسم اللہ نہ کہی جائے تو وضو بالکل باطل ہے۔
وضو کے لئے بسم اللہ پڑھ کر پہلے دایاں پھر بایاں ہاتھ دھو ڈالئے۔ اس کے بعد اگر ممکن ہو تو مسواک ورنہ انگلی شہادت سے دانتوں کو صاف کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد

تین مرتبہ منہ میں پانی ڈال کر کلی کریں۔ پھر تین مرتبہ بائیں ہاتھ سے ناک میں اسی طرح پانی ڈالنا ضروری ہے کہ ناک کے نتھنے بھی صاف ہو جائیں۔ پھر تین مرتبہ چہرے پہ پانی اس طرح ڈال جائے کہ پیشانی کے بالوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور کانوں کی کنپٹیوں تک پہنچ جائے۔ اگر بال برابر بھی جگہ خشک رہ گئی تو وضو باطل ہے۔ پھر دائیں ہاتھ پہلے دھوتے ہوئے، دونوں ہاتھ تین مرتبہ کہنیوں تک دھونا چاہیئے۔ پھر سر اور کانوں کا مسح کریں۔ آخر میں دونوں پاؤں ٹخنوں تک، تاہم سنت یہ ہے کہ پہلے داہنا پھر بایاں دوران وضو دنیادی باتیں نامناسب ہیں۔

اس طرح وضو کے چار فرض یہ ہیں۔
ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا، چہرہ دھونا، چوتھے حصۂ سر کا مسح اور پاؤں کا ٹخنے سمیت دھونا۔

اگر ایک بھی فرض رہ جاتا ہے تو لازمی ہے کہ وضو دوبارہ کیا جائے۔ دوران وضو شائستگی سے پانی استعمال کیا جائے۔ اس کے لئے بعد از وضو یہ دعا پڑھنا بھی سنت ہے۔ "اے اللہ، مجھے رجوع کرنے والوں (توبہ کرنے والوں) اور پاک افراد میں لے لیتا اور مجھے ان لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرما جن کے لئے کوئی خوف اور غم نہیں۔"

وضو کے فرضوں کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ بقرہ میں یوں آیا ہے۔ "اے ایمان والو جب تم نماز کے لئے وضو کرو، تو منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو اور سر کا مسح کرو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لو۔ اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو اچھی طرح پاکیزگی (غسل) حاصل کرو۔

نخش بکنے یا کھانے پینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یا نہیں۔ بقول امام شافعی کے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی حمایت میں اس قرآنی آیت کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ "اگر تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص غائط (یعنی نشیب مراد بیت الخلاء) سے آئے یا تم نے عورت کو چھوا ہو اور اگر تم کو پانی نہ ملے تو تیمم کر لو۔"

بہر خلاف اس کے امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

وعدہ

قول قرار، عہد، موت کا وقت، مرنے کا دن۔ عہد و پیمان کی اسلام میں بڑی قدر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ "جس نے وعدہ خلافی کی وہ ہم (مسلمانوں میں سے نہیں"۔ سورۂ توبہ (آیت ۴) میں اللہ تعالےٰ نے یہ ہدایت فرمائی کہ عہد و پیمان مقررہ مدت کی بہرصورت پورا کرو یہی مضمون سورۂ انفال میں مزید وضاحت پاتا ہے کہ اللہ دغا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (آیت ۵۸) مسلمان کے میثاق پتھر پرے کر ہوتے ہیں وہ مرتے دم تک ان پر رہتا ہے۔

قرآن عظیم میں یہ لفظ روز محشر و قیامت و بدلے کے دن کے طور پہ بھی ہے یعنی ..."... جب اس دن کا انکار کرتے ہوئے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔ آسمان ایک دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔" (سورۂ مزمل) خدا کی جانب سے بھی تو انسان کے لئے جزاء و سزا والے دن کا وعدہ ہے۔

وقف

عربی مصدر معنی بچانا، قائم رکھنا، جب فرد اپنا وجود ختم کر کے مشترکہ سرمائے سے ادارہ قائم کر لیں تو وہ بھی وقف ہی کہلاتا ہے۔ اسلام میں اس سے۔ اور تیسرے فرد سے کسی چیز کو جاتا ہے مثلاً وہ ممالک جو مسلمانوں نے فتح کیے مگر بعد میں خروج لے کر واپس کر دیئے گئے اب پرانے حاکم انہیں کسی کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے علاوہ اس کے ایک اور معنی بھی ہیں۔ عام حالت ... میں آتا ہے یعنی ادارہ قائم کرنا جو فلاح و بہبود میں آئے۔ جب کوئی فرد وقف قائم کرتا ہے۔ اس کے لیے جائداد ادا کرتا ہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اب اس کا جائداد پہ کوئی قبضہ نہیں رہتا اور اسے واپس لینے کا کوئی اختیار نہیں۔ تاہم فقہ میں کہا جاتا ہے کہ اگر وقف دیا گیا ہے اور دینے والا خود غریب ہو گیا ہے۔ ذریعۂ روزگار اور کوئی نہیں تو وہ وقف کی واپسی کی اپیل کر سکتا ہے اور یہ اسے واپس بھی مل سکتا ہے بشرطیکہ مسجد کا نہ ہو امسجد کے لیے وقف کسی صورت میں مالک کے پاس دوبارہ نہیں جا سکتا۔ یہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی کنواں یا مسافروں کے لیے کوئی سرائے یا ایسی ہی کوئی چیز تعمیر کرتا ہے۔ تو آثار میں تعمیر کنندہ یعنی واقف کا اس پر حق ملکیت قائم رہتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ میں نے یہ چیز اس کام کے لیے پائی ہے۔ یہ مکتب فکر امام محمد کا ہے۔

اسلامی تاریخ میں وقف سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔
وقف کے دوسرے معنی کھڑے ہونا بھی ہیں۔ دیکھئے "وقوف"

وقوف

عربی لفظ معنی قیام کرنا ٹھہرنا، رکنا، حج کے دوران مختلف مقامات پر قیام کرنا ان کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ یہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ جہاں بندہ خدا کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔

جب ۹ ذوالحج کو حاجی منا سے میدان عرفات میں آتے ہیں تو ان کے لیے دوپہر سے غروب آفتاب تک میدان میں قیام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسے وقوف عرفہ کہتے ہیں۔ اس وقت امام ایک طویل خطبہ پڑھتا ہے۔ یہاں سے مزدلفہ کی طرف کوچ ہوتا ہے۔ جہاں ظہر و عصر کی نماز یکجا ادا کی جاتی ہے۔

اس موقع پر حاجی استغفار پڑھتے، دعا مانگتے اور تکبیر و تہلیل کہتے ہیں۔ دوسرا وقوف دس ذوالحج کی صبح کو مزدلفہ میں ہوتا ہے۔ منا جانے سے قبل حاجی مشعر الحرام پر نماز فجر پڑھنے سے قبل آجاتے ہیں اور ایک پہر تک ٹھہرتے ہیں۔ اسی طرح جمرہ مارنے کے بعد ۱۱۔۱۲۔ اور ۱۳ ذوالحج کو بھی منا میں وقوف کی بدولت ... صفا مروہ کے درمیان جب حاجی تقریباً دوڑتے ہوئے گذرتے ہیں تو یہ بھی وقوف ہی کہلاتا ہے۔

وکیل

عربی لفظ معنی ایجنٹ۔ نمائندہ

وہ شخص جسے کوئی اپنے کاموں کے لیے مقرر کرے ... شخص مقرر کرنے والے کی مرضی و منشا اور اس کے سہارے اس کے کاموں کو سمیٹتا ہے ... کاروباری بھی ہو سکتے ہیں اور شادی بیاہ کے بھی۔ اس بارے میں حضرت ... کا قول ہے کہ وہ عورتیں جو بوجوہ عدالت میں نہیں جا سکتیں اپنی ... بھیج سکتی ہیں جو ان کی نمائندگی کرے۔ اس کے طور پر غلاموں ... کیا جا سکتا ہے۔

وکیل اخبار

ایک اسلامی اخبار، شیخ غلام محمد نے انیسویں صدی کے اواخر میں امرتسر سے جاری کیا۔ پہلے ہفت روزہ تھا۔ بعد میں سہ روزہ ... اس کے بعد روزنامہ بھی رہا۔ اس اخبار کے ادارۂ تحریر سے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا عبداللہ العمادی جیسی سربرآوردہ شخصیتیں وابستہ تھیں۔ اخبار نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے زبردست جنگ کی۔ اسی ادارے کے زیر انتظام اسلامی تاریخ اور ادب پر کتب شائع ہوئیں۔ یہ اخبار برعکس دوسرے اخباروں کے شام کو چھپا کرتا تھا۔

ولدالحلال جائز اولاد، قانونی اولاد، ولدالزنا کا اُلٹ اور اولاد جن کے والدین آپس میں ازدواجی رشتہ رکھتے ہیں۔ اسلام میں کم از کم زمانۂ حمل چھ ماہ ہے۔ یعنی شادی کے چھ ماہ بعد اولاد جائز ہوگی۔ شیعہ مکتبِ فکر کی رُو سے اگر کوئی فرد بیوہ عورت سے شادی کرے جو ایک بچے کی ماں ہو اور شادی کے چھ ماہ بعد حمل پیدا ہو تو اولاد جائز نہیں ہوگی۔ وہ حضرت علی کے تصور پر اپنے قوانین کی بنیاد کھڑی کرتے ہیں جس کی رُو سے زیادہ سے زیادہ زمانۂ حمل چاند کے دس ماہ ہونا چاہئیں۔ حضرت ابوحنیفہ اور ان کے دو پیروکار حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ عرصۂ حمل دو سال ہے، امام شفیع اسے چار سال بتاتے ہیں جبکہ امام مالک کے خیال میں یہ مدت پانچ سے سات سال ہے۔ قدیم یونان زمانے میں یہ مدت دس ماہ تھی۔ "کوڈ نپولین" میں یہ ... میں یہ مدت ۳۰۰ دن درج ہے۔

ولدالزنا غیر شرعی اولاد، ناجائز اولاد، حرامی، غیر مستند، وہ اولاد جس کے والدین شرعی قوانین کے مطابق میاں بیوی قرار نہ پائے ہوں، ایسی اولاد اور ایسے والدین کے بارے میں سخت تعزیرات مقرر ہیں۔ باپ ولدالزنا کو کسی صورت اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں رکھتا حتیٰ کہ تعلیم کی غرض سے بھی نہیں۔ ایسی اولاد کو والد تو وارث بھی نہیں بنا سکتا تاہم یہ ماں کی جائیداد کا وارث بن سکتا ہے۔

ولایت: ولی ہونا۔ سرپرست ہونا۔ اللہ کی قربت رکھنا۔ روحانی و باطنی برکات حاصل کرنا۔

(دیکھیے "ولی")

ولی: اللہ کی قربت رکھنا، جمع اولیاء۔

ابوعلی جرجانی کے نزدیک ولی وہ ہوتا ہے جو اپنے حال میں فانی ہو اور خدا کے مشاہدہ میں باقی ہو۔ اور اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے باطنی احوال کے متعلق خدا کو باخبر کرے۔ یا اُس کے سوا کسی اور شے کے ساتھ سکون پائے۔ معنی یہ ہوئے کہ سچا ولی ماسوا اللہ کے اور کسی سے لگاؤ نہیں رکھتا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے نزدیک بھی ولی کسی بھی شے سے، اللہ کے سوا، خوف نہیں کھاتا۔ اور اُسے خوف ان چیزوں سے ہوتا ہے جن سے انسانی توقعات وابستہ ہوں۔ یا پھر اُن محبوب پسندیدہ اشیاء کے متعلق خوف و خدشہ ہوتا۔ جن کے ضائع ہونے کا ڈر ہو۔ ولی ہر حال میں اللہ سے راضی رہتا ہے۔ اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔

ابوعثمان مغربیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کا ولی مخلوقات سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور غیر اللہ کے ساتھ قلب و دماغ وابستہ نہیں کرتا۔

سچا ولی نفس کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ صبر و تحمل، اوامر و نواہی کی تعمیل کرتا ہے۔ بایزیدؒ نے ایک ولی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے مسجد میں تھوک پھینکتے دیکھی۔ اس لئے وہ ہرگز ولی نہیں۔ اگر ولی ہوتا تو اللہ کے گھر کا احترام کرتا۔ چنانچہ میں نے اُسی رات خواب میں دیکھا کہ حضور فرماتے ہیں کہ "اے ابو یزید تو نے جو کام کیا اور اُس سے جو نتائج اخذ کئے، اس کی روحانی اور باطنی برکات تجھے حاصل ہوئیں اور میں اس کے بعد ولی ہوا۔ یعنی انہوں نے ولایت پائی۔

ولی کی ہر معمولی سے معمولی باتوں سے بھی تعظیم الٰہی ظاہر ہوتی ہے۔

ولی اللہ حافظ لاہور کے ایک نابینا حافظ اور زبردست مناظر تھے عیسائی پادری اُن کا نام سُن کر ہی شہر چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔ سکھ دور میں اُن کے والد اپنے بچے کو لے کر پنجاب میں وارد ہوتے اور لاہور میں قیام کیا۔ پانچ سال کی عمر میں چیچک کی بیماری نے انہیں ہمیشہ کے لیے بصارت سے محروم کر دیا۔ مولوی غلام رسول صاحب نے انہیں قرآن حفظ کروانے کے بعد دیگر دینی علوم سے روشناس کروایا حافظ ولی اللہ حیرت انگیز قوت حافظہ کے مالک تھے۔ جس کتاب کو ایک بار سن لیتے وہ حفظ ہو جاتی تھی عربی زبان میں بے حد مہارت تھی۔ عرب سیاح لاہور آتے تو آپ سے بلا تکلف عربی میں گفتگو کرتے۔ آپ انجیل کے بھی عالم تھے۔ مناظروں میں قرآن کریم کے علاوہ انجیل کے صفحات تک کے بھی حوالے دیتے تھے مباحثہ دینی۔ صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان اور الحاث اُن کی تصانیف ہیں آپ بادشاہی مسجد کے نائب خطیب بھی رہے۔ وزیر خاں کی مسجد میں بھی خطابت کی۔ آپ نے ۲ ربیع جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ کو وفات پائی۔ احاطہ شاہ ابوالمعالی میں دفن ہوئے یہ سارا قبرستان اب مکانات کی نظر ہو گیا ہے، آپ کا مزار فلیمنگ روڈ کے کنارے ایک مختصر سے احاطے میں ہے جہاں بعض صاحبِ دل حضرات ہر سال عرس کروا دیتے ہیں۔

ولی اللہ شاہ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) عظیم محدث، جید عالم، مولانا شاہ عبدالرحیم کے بیٹے، اصلی نام عظیم الدین شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہ زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب پیدا ہوئے، سلسلہ نسب حضرت عمرؓ تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ زندگی کے ساتویں برس سے روزہ و نماز پابندی سے ادا کرنا شروع کی۔ شعور آگہی حاصل ہونے پر سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک ہو گئے۔ والد کی وفات پر سترہ برس کی عمر میں ان کی مسند سنبھالی، دو مرتبہ حج کو گئے مدینہ شریف میں علم حدیث حاصل کیا۔ ۱۷۳۲ء میں دہلی واپس تشریف لا کر اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بعنوان "مثع القرآن"

۱۷۲۷ء میں قرآن پاک کو فارسی میں بعنوان "فتح القرآن" منتقل کیا۔ پھر روحانی ترقی کے لئے جتنی بھی علمی و ادبی تحریکوں نے جنم پایا۔ اُن میں آپ کا بھی گرانقدر حصہ لیتے، اور مسلمانوں کی توجہ فقہی اختلافات سے دور کرنے کے لئے جدوجہد کی۔

اس دوران موطا (امام مالکؒ) کی دو شرحیں عربی و فارسی میں بنام المسوّیٰ اور المصفیٰ گیا۔ آپ نے فقہ اور تصوف کا علم بھی حاصل کیا اور خامہ فرسائی کی آپ کی عربی میں مشہور تصنیف الفوز الکبیر (تفسیر پر) اور تصنیف پر حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ اس میں اسلامی شریعت پر بصیرت افروز بحث ہے۔

قرآن پاک کے فارسی ترجمے بعنوان "فتح القرآن" پر دیباچہ لکھنے پر اختلاف رکھنے والے برہم ہوئے اور جان کے درپے ہوئے۔ مگر بحکم اللہ آپ طبعی طور پر خالق حقیقی سے جا ملے اور دہلی میں دفن ہوئے۔ عمر کے آخری ایام میں رحیمیہ میں مدرس تھے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا رفیع الدین، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ عبدالغنی وغیرہ آپ کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔

ولیدبن عبدالمالک جانثار اسلام اپنے والد عبدالمالک کی وفات کے بعد ۸۶ھ ماہ شوال میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۸ برس تھی، نہایت بارعب اور سخت گیر انسان تھا۔ یہ عادتیں خلیفہ بننے کے بعد بھی برقرار رہیں۔ قدر دان اسلام تھا

تلاوت باقاعدگی سے کرتا تھا۔ یتیموں، عاجزوں، درویشوں اور دوسرے بے کسوں کی سنا کرتا تھا۔ خوب خبرگیری کرتا تھا۔ علم وہنر سے اسکی خاص رغبت تھی۔ فن تعمیرات کا بھی دلدادہ تھا۔ اکثر وقت عمارات فوج وجدیہ کی تعمیر میں صرف کرتا تھا۔ قاہرہ کی عظیم مسجد کو بھی اس نے اپنی طرز کے مطابق از سر نو تعمیر کرایا۔ اور مرمت کیا۔ سادگی پسند نہ تھا۔ میلان یونان وفارس کی نفاست کی طرف تھا۔ مگر حق وجہاد کا دیوانہ تھا۔ اپنے نو سالہ عہد حکومت میں متعدد گمراہ حکومتوں کے تختے الٹ دیئے، اور علم اسلام بلند کیا۔ اس کے عہد میں طیانہ، ترکستان کے دارالخلافہ بخارا اور اس کے مفصلات۔ سمرقند جس کا نام پہلے اندلس، مارکنڈا تھا۔ اور روم وقسطنطنیہ کے متعدد علاقے فتح ہوئے۔

ولید بن یزید :۔ گیارھواں اموی خلیفہ (جلوس ۷۴۳ء - ۷۴۴ء) عیش و عشرت کا دلدادہ تھا فوج پر نظر کرم رکھتا تھا قتل ہو کر مرا وجہ قتل یہ تھی کہ یہ اپنے دو بیٹوں کو ایک کنیز کے بطن سے تھے تخت کا والی وارث بنانا چاہتا تھا شاہی خاندان و درباریوں کو یہ سخت ناگوار گزرا۔

ولید خارجی حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے جنگ صفین کے نتیجے میں پیدا ہونے والے "خوارج" فرقے کے مشہور سردار ولید تھے جو فرقے کی نسبت سے خارجی کہلاتے تھے۔ یہ عباسی عہد حکومت کی ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کی ہمشیر بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ شوہر کی موت پر انہوں نے عربی مرثیہ لکھا جو شاعری میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

ولیمہ :۔ شادی کی ضیافت بیاہ کی دعوت نکاح کے بعد طلباً کی طرف سے دی جانے والی دعوت عموماً شادی کے ایک دن بعد دی جاتی ہے کھانا عموماً دوپہر کو دیا جاتا ہے تاہم وقت کی قید کوئی نہیں روایات کے مطابق ولیمہ سادہ ہونا چاہیے اور اس میں مساکین وغیرہ کو بھی شریک کرنا چاہیے حدیث شریف کے مطابق وہ ولیمہ جس میں صرف اغنیاً بلائے جائیں اور غرباً ومساکین کو نہ پوچھا جائے اور جو شخص بلایا جائے اور شریک نہ ہو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرتا ہے اس طرح بن بلائے ولیمے میں جانے والے کو داخل ہوتے وقت چور اور نکلتے وقت ڈاکو قرار دیا گیا ہے ہو جاتا ہے کہ ہمارے آخری نبیؐ نے حضرت صفیہؓ سے شادی کے ایک دن کھجوروں اور کھانے کی دعوت دی تھی اور ولیمہ کی بنیاد اس طرح کی گئی ہے۔

وہابی عبدالوہاب کے بیٹے محمد عبداللہ وہاب کا قائم کردہ فرقہ۔ بانی فرقہ ۱۷۹۱ء میں نجد میں پیدا ہوا۔ فرقے کو یہ نام یورپیوں نے محمد بن عبدالوہاب کی زندگی میں دے دیا تھا۔ اور اس فرقہ کے اکثر لوگ استعمال میں کرتے تھے کہ یہ خود کو موحدین یعنی کہ خدا کے پیروکار کہتے تھے اور محمد کے سچے لوگ کہتے تھے۔ ان کے نزدیک باقی کوئی مسلمان نہیں۔ یہ خود کو سنی کہتے ہیں۔

ان کے عقائد خاص خاص یوں ہیں۔ (۱) عبادت میں کسی بزرگ نبی یا فرشتے کو وسیلہ بنانا شرک ہے۔ وحدت پرستی کے قائل مشرک ہیں (۲) خدا کے سوا کسی سے شفاعت مانگنا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے آگے التجا کرنا کسی ایسی تعلیم کی نزدیک جو قرآن وسنت پہ مبنی نہ ہو۔ کفر ہے۔ (۴) تمام افعال سے قدر سے انکار کفر الحاد کے برابر ہے۔

ابتداً اس فرقے کو ماننے والے صرف چار افراد تھے۔ انہوں نے داریہ کے مقام پر مسجد کی بنیاد رکھی اور کتاب التوحید کی تعلیم شروع کی جو مستقلاً نہ آنا اسے سزا دیتے۔

جلد ہی (۱۷۴۳ء) اس فرقے نے ریاض کے شیخ دھامن بن۔ دواس سے جنگ لے لی۔ ابن مسعود اور ان کے بیٹے عبدالعزیز بہت اچھے جنرل ثابت ہوئے جلد ہی انہوں نے طاقت حاصل کرلی۔ وہابیوں کی طاقت مرکز اور مشرقی عرب میں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں بھی ان کے ماننے والے قلیل اقلیت میں آباد ہیں۔

ویمبرے آرمینیں ویمبرے، مشہور مورخ ومستشرق۔ ہنگری کا باشندہ تھا اور جامعہ پر تھ میں استاد تھا۔ مصنف ... [illegible] ... ہے۔ اس نے اپنی کتاب "تاریخ بخارا" لکھنے کے لیے خاص طور پر ترکی زبان سیکھی اور سارے علاقے کا جائزہ لیا۔ اس کتاب میں جیحون اور سیحون کے درمیانی ممالک کے علاوہ خراسان، ایران، افغانستان اور کوہ قاف کی سرحدوں کا ذکر ہے۔ اس میں بخارا کی تاریخ ۱۸۴۶ء تک بیان کی گئی ہے۔ ... [illegible] ... ۱۸۶۳ء میں منظر عام پر آئی۔

وید ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتب جن میں بار بار تحریف ہوئی ان کا زمانہ ترتیب ۲۰۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ ق م تک بتایا جاتا ہے۔ یہ کل چار کتب ہیں جن کے نام رگ وید، اتھروید، سام وید اور یجروید ہیں۔ یہ قدیم ترین زبان سنسکرت میں لکھی ہیں۔

کئی مرتبہ ویدوں کا مضمون تبدیل ہوا۔ ان کے بارے میں [illegible] کہتا ہے کہ وید پرتوں میں علیحدہ ہوتا ہے ———— [illegible] ان میں نقل اور نیا سب باتیں بھر دی گئیں ———— [illegible] ہیں کہ اپنیشد، نرسنگھ اور تاپنی وغیرہ ان میں بعد میں شامل کیے گئے [illegible] ماننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

ہ

ہابیل

ہابیل حضرت آدمؑ کا چھوٹا بیٹا جس کا ذکر قرآن پاک کی سورہ مائدہ کے رکوع پانچ میں تفصیل آیا ہے۔ بائبل میں اس کا نام ہابل بیان ہوا ہے۔ ان کے بارے میں مشہور محدث عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں سُدی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے۔ جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور جس روہ صحابہ کرام سے نقل ہے۔

ابتدائے انسانیت میں انسانوں کے لیے حضرت آدمؑ کا دستور تھا کہ حوا سے توام بچہ پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے جوڑے کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ درپیش تھا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا۔ اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ خوبرو تھی۔ اس تا قابیل کو یہ منظور نہ تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی شادی ہو اور ہابیل اس کی ہمشیر سے، معاملہ کو ختم کرنے کے لئے حضرت آدمؑ نے فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ کے حضور پیش کریں۔ جس کی منظور ہو جائے۔ وہی اپنے ارادے پر عمل کرے۔

اس کے بعد کا واقعہ تورات اور قرآن عزیز میں (سورہ مائدہ) میں آیا ہے اس زمانے میں قربانی کا یہ طریقہ تھا کہ نذر ایک اونچے مقام پر رکھ دی جاتی تھی۔ جس کی نذر قبول ہو وہ جل جاتی تھی۔ پس ہابیل اپنے ریوڑ میں سے اعلیٰ دنبے کا گوشت لے کر گیا اور قابیل اپنے کھیت سے غلہ۔ ہابیل کی نذر قبول ہوئی پس قابیل کو اس پر غصہ ہوا اور اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھے قتل کروں گا بغیر اس کے کہ ہابیل نے کہا میں اپنے بھائی کو بدلہ نہ دوں گا۔ اس طرح تو میرے گناہ بھی اپنے سر لے گا۔ پس اسے اشتعال آیا اور اس کا خون کیا۔ اس طرح ہابیل اپنے بڑے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کی نعش کو دفنانے کے لیے کوے نے زمین کھودنا شروع کی تاکہ اسے معلوم ہو کہ نعش کیسے دفنائے (دیکھیں سورہ مائدہ رکوع ۵) پس وہ دفن ہوا۔ اس دنیا میں پہلا مقتول ہابیل ہوا۔ قاتل اس کا بھائی قابیل کا۔

ہاجرہ

ہاجرہ :- یہ اصل میں عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے لغوی معنی "بیگانہ اور اجنبی" کے ہیں۔ عربی میں معنی ہاجرہ کے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بیوی اور حضرت اسمٰعیل کی والدہ محترمہ۔ یہ مصری غلام تھیں جنہیں سارہ نے حضرت ابراہیم کو ہبہ کیا کیونکہ ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی تھی۔ یہ حاران سے ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے اس وقت آپ کی عمر ۷۵ برس سے زائد تھی۔ جس پر حضرت سارہ نے اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہوئے ہاجرہ کے ساتھ بدسلوکی کی۔ چنانچہ آپ وہاں سے جنگل میں چلی گئیں۔ جہاں اللہ کے فرشتے نے آپ کو حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کی بشارت دی۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد آپ حضرت ابراہیم کے ساتھ ہجرت کر گئیں وہ آپ کو راہ میں چھوڑ کر شام کی طرف چلے گئے۔ وہاں چند دن ہی گزرے ہوئے ہونگے کہ پانی ختم ہو گیا۔ بچہ پیاس سے بلک رہا ہے اور آپ صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر پانی کی تلاش میں چکر لگا رہی ہیں ساتویں بار واپسی پر معلوم ہوا کہ جس جگہ حضرت اسماعیلؑ تھے اسی جگہ اللہ تعالیٰ نے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ یوں پیاس بجھی۔ اس کے بعد آپ وہیں رہنے لگیں۔ حضرت اسماعیل بھی بڑے ہوتے گئے۔ آپ حطیم کعبہ میں مدفون ہیں۔

ہادی، موسیٰ

ہادی، موسیٰ خلیفہ محرم ۱۶۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ بارعب اور عیاش آدمی تھا صرف ڈیڑھ ماہ حکومت کرنے کے بعد ماہ ربیع الاول ۱۷۰ھ میں خالق حقیقی سے جا ملا۔ کسی کی نظر میں اس کی موت جنگل میں گرنے سے ہوئی، تو کوئی مؤرخ وجہ ہلاکت بیماری قرار دیتا ہے، چونکہ باعث موت اس کا عرصہ حکومت بہت مختصر تھی۔ ۱۴½ مہینوں پر محیط ہے، اس لئے تاریخ اس کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہے۔

ہاروت و ماروت

ہاروت و ماروت دو فرشتے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بابل کے ایک کوئیں میں مقید ہیں۔ یہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے مگر سکھلانے سے قبل بتا دیتے تھے کہ اس سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ یہ انسان کی بے بسی پر پریشان تھے اور انہوں نے خدا سے کہا کہ اگر ہم دنیا میں ہوں تو راست باز رہتے۔ خدا نے کہا کہ اگر انسان کی جگہ تم بھی ہوتے تو اس سے بہتر فعل نہ کرتے۔ مگر یہ نہ مانے، پس ان کو بہ غرض آزمائش دنیا میں اتارا گیا۔ جلد ہی یہ ایک خوب صورت فاحشہ عورت کے دام میں آ گئے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں اس کی سزا دنیا ہی میں دی جائے یا آسمان پر۔ بعد میں انہوں نے دنیا ہی میں سزا قبول کر لی۔ سو اللہ تعالیٰ نے بابل کے کنوئیں میں مقید کیا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے فرشتوں نے کہا تھا کہ ہم گناہ نہیں کر سکتے اور ان کے

دو نمائندوں کے طور پر ہاروت و ماروت زمین پر اتارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس سے قبل روزانہ آسمان پر جایا کرتے تھے۔ مگر دنیاوی کاموں سے ان کے پَر کمزور پڑ گئے اور پرواز کے قابل نہ رہے۔ ان کا ذکر قرآن عزیز کی سورۂ بقر آیت ۱۰۲ میں بھی آیا ہے۔

ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی اور پیغمبر خدا دربار فرعون میں وکالت موسیٰ کی۔ جب حضرت موسیٰ جبل طور پر تشریف لے گئے بنو اسرائیل کا نگران آپ ہی کو مقرر کر گئے تھے۔ اس وقت بچھڑے اور سامری کا واقعہ پیش آیا تھا جس پر واپسی پر آپ حضرت ہارونؑ سے ناراض ہوئے اور بنو اسرائیل کو لعنت ملامت کی۔ آپ کا نسب ولادت چند واسطوں سے حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے جو یوں ہے ـــــ عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوبؑ۔ قرآن پاک میں سورۂ بقرہ نساء انعام طٰہٰ، انبیاء مومنون، فرقان، شعراء قصص میں ۱۳ مقامات پر آپ کا نام مبارک مذکور ہوا ہے۔ آپ کے والد کے نام عمران اور والدہ یوکا بد تھا۔ جب بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو اطلاع دی کہ انہیں چالیس برس اسی سرزمین میں بھٹکنا پڑے گا۔ دونوں پیغمبر بھی وہیں موجود رہیں گے۔ سو آپ وہیں رہے ایک روز حکم خدا سے آپ اپنے بھائی کے ساتھ میدان و تیہ میں "ہور" نامی پہاڑ پر چڑھے۔ ما ما چند روز عبادت کے حضرت ہارونؑ نے انتقال فرمایا۔ حضرت موسیٰ نے وہیں تجہیز و تکفین کی اور اس کے بعد بنو اسرائیل کو آپ کی وفات سے آگاہ کیا۔

توراۃ میں یہ واقعہ مذکور ہے "اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پہ پہنچی اور خدا نے کوہ ہور پہ جو ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا۔ ہارونؑ اپنے لوگوں میں جا ملے گا، کیونکہ اس ملک میں وہ جا نہیں سکے گا جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے ..... جب ہارونؑ نے وفات پائی تو سارے اسرائیل کے گھرانے کے لوگ تیس دن تک ماتم کرتے رہے۔"

ہارون الرشید
ہارون الرشید عباسی (۷۶۶ - ۸۰۹ء) پانچواں عباسی خلیفہ ایک سال حج کرتا اور دوسرے سال جہاد۔ عباسیوں میں سب سے بڑا صاحب السلطنت۔ صاحب ذوق صاحب علم شخصیت۔ مختلف علوم و فنون کی نادر و نایاب تصانیف کے ترجمے کروائے اور نئی تحاریر پر بھی توجہ دی۔ شافعی امام مالک، امام موسیٰ کاظم اور امام محمد، امام یوسف قاضی اس دور کے ماہر فقہ تھے

شیر دل سپاہی، زندہ دل شخصیت، زاہد شب بیدار اور صحیح مدبر عوام کو امن و سکون میسر تھا۔ ابتدائی چند عرصے میں اندرونی بغاوتوں نے سر اٹھایا جو کچل دی گئیں اس کا عزیز بھی باغیوں میں تھا جو معاف ہوا۔ روم کو ہر بار زیر کیا اور [illegible] وصول کیا۔ سنہرہ دور کا مالک ہارون الرشید بروز شنبہ ۴ جمادی الثانی ۱۹۳ھ میں راہی ملک عدم ہوا۔

ہاشم ہاشم عبد مناف کے بیٹے اور حضرت عبد المطلب کے والد تھے۔ انہی کے نام پر ان کی اولاد ہاشمی کہلائی۔ انہوں نے مدینہ کے سفر میں بنو نجار کے ایک خاندان میں کی۔ کعبہ کی سرداری پہلے انہی کے بھائی عبد الشمس کے سپرد تھی۔ جنہوں نے کچھ ہی عرصے بعد آپ کے سپرد کر دی۔

ہاشم، بنو سرزمین حجاز میں قبیلہ قریش کا اہم خاندان، یہ لوگ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔ جب یہ قبیلوں میں بٹی تو قریش ایک اہم قبیلہ بنا، یہ مکہ میں تھا اور کعبہ کا متولی تھا۔ اس قبیلے میں ایک معزز و متمول خاندان آباد تھا جو حضرت ہاشم کی اولاد سے تھا۔ انہی کی اولاد بنو ہاشم کہلائی۔ حضرت علی اور ان کی اولاد اور خلفائے بنی عباس بھی بنو ہاشم ہی کے تھے۔ پہلی جنگ عظیم تک بنی ہاشم ہی کا ایک فرد شریف حسین مکہ کا حاکم رہا۔ ۱۹۲۵ء میں اس سے عنان اقتدار ابن سعود کے ہاتھ میں چلی گئی۔ انگریزوں نے اس کے ایک بیٹے امیر فیصل خان کو عراق اور امیر عبد اللہ کو اردن کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ اردن میں اس وقت اسی خاندان کا فرد شاہ حسین حکمران ہے۔ یہ لوگ تجارت پسند تھے اور مکہ بھر میں معزز تھے، پینے کے لیے چمڑوں کے حوضوں میں پانی بھرواتے۔ مہاجروں کو دل کھول کر امداد دیتے۔ ایک حرم کے مکہ کے امیر تھے۔

انہوں نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور مصر و شام کے بادشاہ قیصر سے ان کے ملکوں میں بے روک ٹوک تجارت کے لیے فرمان لکھوایا۔ پھر وہاں کے باشندوں سے عہد لیا کہ وہ قریش کے قافلوں کو نہیں لوٹیں گے۔ اس طرح عرب کی تجارت میں درخشاں ترقی ہوئی۔

ہاشم بن عتبہ کنیت ابو عمرو، لقب مرقال۔ مشہور صحابی اور فاتح ایران سعد بن ابی وقاصؓ کے بھتیجے۔ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے بعد میں ہونے والی تمام اسلامی جنگوں میں حصہ لیا۔ فتوحات شام میں خالد بن ولید کے ہمراہ تھے۔ جنگ یرموک میں ایک آنکھ سے محروم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے جنگ قادسیہ کے وقت آپ کو چھ ہزار فوج دے کر سعد بن ابی وقاص کی مدد کے لیے بھیجا۔ آپ جنگ کے دوسرے روز فوج لے کر پہنچے جس سے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے [illegible] فاتح بن کر آگے بڑھی۔ سعد بن ابی وقاص نے انہیں [illegible] فوج [illegible] یہاں بادشاہ یزدگرد کو شکست دے کر جلولا فتح کرتے ہوئے [illegible] کرنے کے بعد جلال فتح کیا جس میں دس لاکھ روپے کا مال غنیمت مسلمانوں کے [illegible] آیا۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑے۔ جنگ صفین [illegible] اور معاویہؓ مابین ۳۶ھ کے اواخر میں لڑی گئی اور صفر ۳۷ھ کے [illegible] جاری رہی۔ اسی جنگ میں ہاشم بن عتبہ حضرت علیؓ کی حمایت [illegible] شہید ہوئے۔

ہامان حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون مصر کا وزیر [illegible] کے لڑکوں کے متقل کا مشورہ بھی فرعون کو اسی نے دیا تھا [illegible] پیش تھا۔ اسی لیے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس کا ذکر آیا ہے کیونکہ [illegible] خاص آدمی تھا ـــــ تو فرعون کے لوگوں نے اس کو [illegible] نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ان کا واحد دشمن اور ان کے لیے [illegible] فرعون، ہامان اور ان کے لشکر چوک گئے (سورۃ القصص ۸)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت توحید دی تو [illegible] بگڑ کر، مغرور ہو کر اسے ٹھکرا دیا اور ہامان کو ایک اونچا مینار بنانے کو کہا تاکہ یہ چڑھ کر وہ خدا کو دیکھ سکے۔ اس واقعہ کا ذکر سورہ ۲۸ آیت ۳۸ میں آیا ہے۔ اس کے بعد ہامان کا کہیں ذکر نہیں ملتا اس لیے گمان کیا جاتا ہے کہ فرعون کے ساتھ یہ بھی دریا برد ہو گیا ہوگا۔ اس کی تباہی کا ذکر بھی فرعون کے ساتھ ہی سورہ العنکبوت میں یوں آیا ہے ـــــ "اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا ان

کے پاس موسیٰؑ کی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ملک میں مغرور ہوگئے اور وہ ہمارے قابو سے نکل جانے والے نہ تھے" (آیت ۳۸) اس کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت نبیٔ آخر الزماںؐ نے کہا ہے کہ جو نمازوں سے غافل ہے وہ قارون، فرعون اور ابو ابن خلفا (جو جنگِ احد میں حضورؐ کے ہاتھوں مرا) کے ساتھ جہنم میں ہوگا۔

ہبل یہاں عرب کا دورِ جہالت میں سب سے بڑا بت جو کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت رسول مقبولؐ نے اسے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا اور شکل شباہت میں انسان کے جیسا تھا۔

ہبہ عربی لفظ بمعنی بخشش، تحفہ، عطیہ۔

وہ چیز یا جائیداد جو بلا قیمت کسی کو دے دی جائے۔ اس میں ادل بدل نہیں ہوتا اس کا مادہ وہب ہے۔ اسم مبالغہ وہاب ہے۔ جو خدائے تعالیٰ کا صفاتی نام ہے یعنی وہ سب سے بڑا بخشش کرنے والا ہے۔

جو چیز بطور ہبہ دی جائے مثلاً مکان، زمین یا نقد، موہوب کہلاتی ہے اور جس کو دی جائے وہ موہوب الیہ اور جس کے ذریعے یہ دیا جائے، ہبہ نامہ کہلاتا ہے۔ ہبہ ایک بار دے کر واپس لینا فعل بد ہے اس بارے فرمانِ نبویؐ ہے ———— ہبہ واپس لینا ایسا ہے جیسے تھوک کا ہوا چاٹنا ایک اور مقام پر ابن عباسؓ و ابنِ عمرؓ سے روایت ہے ———— کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی شخص کو بطور عطیہ یا ہبہ دے کر واپس لے، ہاں صرف باپ اپنے بیٹے سے واپس لے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو ایسا کرتا ہے، اس کی مثال ایسے کتے کی سی ہے جو خوب کھا کر قے کر دے اور پھر اسی قے میں منہ ڈالے"۔

ہبیرہ بصری نامور اولیائے، مقتدائے دین و ناج، خواجہ المرعشی کے مرید و خلیفہ۔ سترہ برس کی عمر میں قرآنِ عظیم حفظ کرنے کے بعد عبادت و ریاضت میں مشغول ہوئے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ پیر و مرشد سے ایک سال بعد خلافت ملی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کے باعث جو بھی آپ کے پاس آتا، متاثر ہو کر بیعت کرتا اور فیض حاصل کر کے جاتا۔

آپ خاموش طبع اور قناعت پسند انسان تھے، ہمیشہ حجرہ کے اندر رہتے قناعت کرتے۔ روزہ رکھتے اور رزقِ حلال کھاتے۔ ہمیشہ باوضو رہتے۔ اکثر راتوں کو جاگتے اور عبادتِ باری تعالیٰ میں مصروف ہو جاتے۔

آپ کے مرید بھی آپ کی طرح ہر وقت باوضو رہتے۔ یہ لوگ ان مجلسوں میں اللہ کے سوا کسی کا ذکر نہ کرتے۔ روزہ رکھتے جو سبزیوں یا جنگلی میوے سے افطار کرتے۔

انہیں آپ کی نسبت ہبیریاں کہا جاتا ہے۔

آپ کا ابتدائی ذریعہ معاش کتابت تھا۔

شوال ۲۸۷ھ میں بصرہ میں وفات پائی اور وہیں مدفن ہوئے۔

ہجرت راہ خدا میں ترک وطن کرنا، حضور پاکؐ کا مکہ سے مدینہ جانا۔ اللہ تعالیٰ کی زمین فراخ ہے۔ اگر ایک مقام پر تنگی ہو، تو دوسرے مقام پر چلے جانا چاہیے۔ یہی حضور پاکؐ نے کہا تھا۔ اور قرآن عظیم کی سورۂ بقرہ آیت ۱۸، آل عمران ۹۵ اور سورۃ النساء میں ہجرت کے واضح احکامات موجود ہیں۔ راہ خدا میں ہجرت نہ کرنے والوں کو دوزخ کے قابل ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت (فراخ زمین) کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔ ملاحظہ ہو، ان کو جن کی فرشتے جان قبض کرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ تم کس حال میں تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہم ملک میں بے بس تھے (فرشتے) کہیں گے کہ کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی، کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے (النساء، آیت ۹) نیز ہجرت کا فائدہ یہ تھا کہ مسلمان جہاں جاتا، وہاں اسلام پھیلتا۔ نیز دیکھئے "مہاجر"۔

ہجرت حبشہ جب مکہ میں کفار کے ظلم و ستم حد برداشت سے گزر گئے، تو آپؐ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کی قیادت میں اسی مرد اور عورتوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ تاریخ میں ہجرت حبشہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ واقعہ ۵ھ ماہ رجب میں پیش آئے۔ یہ یک بیک نہیں ہوئی، بلکہ دو بار ہوئی۔ پہلی بار کی ہجرت کرنے والوں کی تعداد پر اختلاف ہے۔ ایک رائے میں یہ گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل ہے۔ تاہم ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ اسی طرح ہجرت اولیٰ میں دس مرد شامل تھے۔ اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان، ان کی زوجہ محترمہ رقیہؓ (صاحبزادی رسول کریمؐ) حضرت ابو حذیفہؓ ان کی زوجہ سہلاؓ بنت سہیل۔ مصعب بن عمیر، عبدالرحمان بن عوف وغیرہ شامل تھے۔ یہ دو تجارتی جہازوں کے ذریعے حبش پہنچے۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے انہیں پناہ دی۔ کفار بھی ان کے پیچھے گئے، اور واپسی کا مطالبہ کیا۔ نجاشی نے وفد کے قائد حضرت جعفر بن ابی طالب کو طلب کیا، اور معاملہ پوچھا، آپ نے کہا: اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، کمزوروں کے ساتھ برا سلوک کرتے، ان کا حق مارتے۔ خدا نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے حسب و نسب سے واقف ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا، اور سکھایا کہ اللہ ایک ہے، ایمان لاؤ، عبادت کرو اور بتوں کو چھوڑ دو۔ اس نے ہمیں نمازوں کا حکم دیا۔ سچ بولیں، دیانت دار رہیں، اقارب و ہمسایوں سے اچھا سلوک کریں، خونریزی سے بچیں ہم اس پیغمبر پر ایمان لائے۔ اس سے یہ ہمارے دشمن ہوئے۔ یہ ہمیں واپس بتوں کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم بری باتوں کو جائز سمجھیں۔ نجاشی نے کہا کہ وہ شخص جو پیغام وحی لایا ہے، اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے۔ اس پر آپ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔ اس پر پادری رو پڑے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور کلام موسیٰؑ دونوں ایک ہی چشمۂ نور سے نکلے ہیں، وہ متاثر ہوا۔ قریش کے دونوں سفیروں عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو کہا کہ میں تمہیں واپس نہیں کر سکتا، تم جاؤ۔ پھر مسلمانوں کو کہا کہ تم میری زمین پر امن سے رہو۔ پھر تین بار کہا کہ جو کوئی تمہیں گالی دے گا، اسے تاوان لگے گا۔ دوسرے دن قریش کے سفیروں نے کہا کہ یہ آپ (نجاشی) اور عیسائی مذہب کے خلاف ہیں۔ اس پر انہوں نے سورہ مریم کی آیات سنائیں، اور نجاشی نے آپؐ کی نبوت کی گواہی دی: "تنکا اٹھا کر، جو تم نے کہا۔ عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔

اس واقعہ کے بعد کفار نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، اس پر مہاجرین نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ حضرت زبیرؓ جو اس وقت کمسن تھے، انہوں نے بھی خود کو پیش کیا۔ اللہ نے نجاشی کو فتح دی۔

ہجرت مدینہ: کفار کے ظلم و جبر سے گزرنے پر آپ نے اہل اسلام کو آہستہ آہستہ مکہ سے جانے کی اجازت دے دی۔ لوگ خاموشی کے ساتھ مدینہ جانے لگے۔ وقت گزرنے کے بعد مکہ میں صرف چند مسلمان رہ گئے، جس میں آپؐ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ شامل تھے۔ مدینہ میں پھیلتے ہوئے اسلام کے پیش نظر کفار نے آپؐ کے قتل کا ناپاک قصد کیا۔ یہ نبوت کے تیرھویں سال ۸ ربیع بمطابق ۲۰ جون ۲۲ء کا ہے۔ اس دن آپ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ مدینہ جانے کا ارادہ کیا۔ اسے ہجرت مدینہ اور یا ہجرت نبوی بھی کہتے ہیں۔ ہجری سال اسی دن سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے سرکاری حیثیت دی تھی۔ اور یکم محرم ۱ھ بمطابق ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سے شروع کیا۔

ہجرت سے قبل آپؐ نے خواب دیکھا تھا کہ دارالہجرۃ ایک دلکش مقام ہے۔ عام خیال تھا کہ وہ یمامہ یا شہر ہجر ہوتا، مگر حالات سے معلوم ہوا کہ یہ مدینہ تھا۔ مدینہ جانے سے قبل آپ نے حضرت علیؓ کو ہدایت کی کہ وہ آپؐ کے بستر مبارک پر لیٹیں، اور امانتیں واپس کر کے دوسرے دن وہ بھی مدینہ کو چلے جائیں۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیا۔ حضرت اسماء نے دو تین دن کا کھانا تیار کر کے ساتھ دیا۔ یہاں سے آپؐ غار ثور میں چلے گئے۔ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بھی تھے، جو شب بھر رہتے اور صبح کو دشمن کی خبر لینے چلے جاتے۔ پہلی صبح کو جب دشمن نے حضرت علیؓ کو آپؐ کی جگہ پایا، تو بڑے پریشان ہوئے۔ تین دن حضرت علیؓ کو حرم میں محبوس رکھا۔ جب ناکام ہوئے، تو آپ کی تلاش میں فوج لے کر نکلے، اور غار ثور کے کنارے پہنچے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر دشمن نے جھک کر دیکھا، تو ہم نظر آ جائیں گے۔ آپؐ نے کہا کہ اے ابوبکرؓ، ان دو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ جن کے ساتھ تیسرا وجود اللہ کا ہے۔

آپ تین دن اور تین راتیں اس غار میں رہے کہ یہی غذا آپ کی خوراک رہی۔ تاہم ابن ہشام اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کھانا روزانہ حضرت اسماء کے گھر سے آتا تھا۔

چوتھے روز دو تیز رفتار اونٹنیوں پر آپ اور آپ کے ساتھی سوار ہوئے۔ آگے آگے ایک قابلِ اعتماد شخص عامر بن فہیرہ تھا جو راستہ بتاتا تھا۔

جب کفار نے آپ کو نہ پایا، تو اعلان کیا کہ جو آپؐ کو یا حضرت ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، تو اس کو ایک خون بہا (برابر سو درہم) انعام دیا جائے گا۔ یہ سن کر سراقہ بن جعشم آپ کے تعاقب میں آیا۔ مگر ٹھوکر کھا کر گرا۔ یہ پہلا واقعہ خود بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دوبارہ گرا، اس پر اس نے سوچا کہ یہ لوگ حفاظت خدا میں ہیں، اور اسلام لایا۔

ایک رات برابر چلتے رہے۔ دوسرے دن دھوپ کے وقت ایک سایہ دار چٹان کے نیچے آرام کیا۔ پاس ہی چرواہے سے دودھ لے کر پیا۔ شام کے وقت یہاں سے چلے، اور مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر قبائی بستی میں پہنچے۔ اہل مدینہ نے آپؐ کا زبردست استقبال کیا۔ اس دن آٹھ ربیع الاول ۱۳ ھ (۲۰ ستمبر ۶۲۲) تھی۔ مورخین کے مطابق آپ نے یہاں چار یوم قیام کیا۔ تاہم صحیح البخاری کے مطابق چودہ یوم۔ اور بھی زیادہ قرین و قیاس ہے۔ یہاں آپ نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی، اور خود بھی کام کیا۔

چودہ دن بعد جمعہ کو آپ شہر کی طرف چلے۔ نماز جمعہ یہیں ادا کی، اور خطبہ دیا۔

ہر کسی کی خواہش تھی کہ شرفِ میزبانی اسے حاصل ہو۔ اس لئے قرعہ ڈالا گیا، جو حضرت ابوایوب انصاریؓ کے نام پڑا۔ جن کا دو منزلہ مکان مسجد نبوی سے متصل ہے۔ سو آپ نے انہی کے گھر قیام کیا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ آپؐ نے کہا کہ جہاں میری اونٹنی بیٹھے گی، وہیں میں قیام کروں گا۔ اونٹنی حضرت ابوایوب انصاری کے مکان کے سامنے بیٹھی۔

ہدایت شیخ برہان الدین کی شہرۂ آفاق تصنیف، یہ سن قوانین پر ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں ہوکر لندن میں ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا۔

شیخ برہان الدین ۵۳۰ھ میں مارغینیہ میں پیدا ہوئے۔ ہدایت کے لغوی معنی "راہنمائی" کے ہیں۔ اور یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد سورتوں مثلاً بقرہ ۱۴۲ نمل ۳۰۰ وغیرہ میں آیا ہے۔ ہدایت حاصل کرنے کے لئے انسان کو صاحب الہدایت سے رجوع کرنا چاہیئے۔ اسی لئے آل عمران کی بہتر دیں آیت میں کہا گیا ہے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔ پیغمبر، آسمانی صحیفے وکتب انسانی ہدایت کے لئے ہی بھیجے گئے۔

ہُدہُد ایک پرندہ، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کا پیغام لے کر ملکہ سبا کے پاس گیا تھا۔ اسی پرندے کے بارے میں ایک اور روایت ہے کہ جب حضرت سلیمان ہیکل سلیمانی کی تعمیر مکمل کرانے کے بعد مکہ گئے وہاں سے یمن جاتے ہوئے ایک مقام پر ٹھہرے وہاں آپؑ کو پانی کی شدید ضرورت پڑی تو آپؑ نے ہدہد کی جانب دیکھا، جس کا کام پانی ڈھونڈنا تھا۔ پل بھر میں ہدہد نے زیر زمین پانی کے ذخیرے کا پتہ دیا۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔ "اور جب انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا تو کہنے لگے کیا سبب ہے کہ ہدہد نظر نہیں آتا، کیا کہیں غائب ہوگیا ہے"۔ اس کے بعد کی آیت میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ (سورۃ النمل ۲۰)

ہرقل شاہانِ روم کا لقب تھا۔ نیز زمانۂ قدیم میں اسی نام کا ایک معبد بھی تھا۔ اس کے ایک بادشاہ کو سرورِ کائنات نے ۷ھ میں خط لکھا تھا کہ اسلام لے آئے۔ یہ دل سے چاہتا تھا مگر عیسائی پادریوں نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ ہرقلہ کا شہر اس نے آباد کیا تھا۔

ایک زمانے میں عرب کے عیسائیوں نے اسے کہا کہ آپ کا رسول جو لیا ہے چنانچہ مدینۂ منورہ پر فوج کشی کرے۔ یہ چالیس ہزار کی فوج لے کر آیا اور خود حمیص کے مقام پر ٹھہرا۔ معرکۂ تبوک و یرموک اسی سے لڑی گئیں۔ یرموک میں شکست کھا کر یہ انطاکیہ چھوڑ گیا۔ چونکہ ذاتی طور پر اس نے ملک میں رائج کئے۔ جن کے ایک طرف اس کی مورت تھی اور دوسری طرف کلمہ لکھا تھا۔ جب خسرو پرویز نے عیسائیوں سے سلطنتِ شام چھین لی تو یہی ان کی مدد کو پہنچا اور حکومت چھین کر انہیں واپس دی۔

ہشام بن عاصؓ نام ہشام، کنیت ابومعیار۔

مشہور صحابی اور فاتح مصر حضرت عمروؓ بن عاص کے برادر خورد [illegible] قبل اسلام لائے اور حبشہ کو ہجرت کرنے والے گروہ میں شامل تھے [illegible] اور پھر مدینہ چلے گئے۔ تمام غزوات میں رسول مقبولؐ کے [illegible] بہادری میں آپؓ کا خاندان نہایت ممتاز جانا جاتا تھا۔ آپ نے [illegible] رکھا۔ غزوات نبویؐ کے بعد بھی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے [illegible] میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۳ھ میں معرکۂ اجنادین میں بے جگری [illegible] خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہشام بن عبدالمالک دسواں اموی خلیفہ۔ یزید بن عبدالملک [illegible] انتقال کے بعد ۱۰۵ھ میں خلیفہ ہوا۔ اپنے خاندان میں یہ آخری خلیفہ [illegible] کو بڑا سمجھا تھا۔ یہ اہلِ حق کو پورا پورا حق دیتا تھا۔ ۱۰۷ھ میں قیصرِ روم [illegible] میں شکست دے لیا۔ ۱۱۰ھ میں ترکی سے جنگ لڑی اور خاقان کو شکست [illegible] فتح کیا۔ ۱۱۲ھ میں خراسان فتح کیا۔ ۱۲۱ھ میں زید بن علی زین العابدین [illegible] سے لڑائی کا عزم کیا اور کوفہ کے چالیس ہزار آدمیوں نے [illegible] کی۔ یہ بالآخر جنگ ہار گیا۔ اس کے عہد میں بازنطینیوں بحر روم [illegible] اور اس کی فوجیں فتوحات کرتی ہوئی۔ بحر خزر دین تک پہنچ گئیں۔ اس [illegible] عربوں اور فرنگیوں کے درمیان فرانس میں سخت جنگ ہوئی اور اس نے [illegible] فرانس پر پانچ حملے ہوئے جو کامیاب نہ ہوسکے۔ ۱۰۷ھ کے بعد سندھ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ وہاں اس نے جنید بن عبدالرحمن کو سربراہ مقرر کیا۔ اس نے جے سنگھ کی فوجوں کو شکست دیتے ہوئے مارواڑ، مالوہ، بھیلمان، گجرات سمیت بہت سے علاقے فتح کیے۔ ۱۱۱ھ میں اس نے خوارج کے فتنے کو ختم کیا۔

یہ ۷۲ھ میں عائشہ بنت ہشام کے بطن سے پیدا ہوا۔ باپ نے منصور اور ماں نے ہشام نام رکھا جو مشہور ہوا۔ یزید کی وفات کے وقت یہ رصافہ میں

تھا۔ وہاں سے دمشق پہنچ کر خلافت سنبھالی۔ اس کا عہدِ خلافت انیس سال نو ماہ ہے جو ۶ ربیع الاول ۱۲۵ھ میں اس کی وفات کے ساتھ ختم ہوا۔ اس نے ناق کے … کی وجہ سے رصافہ میں وفات پائی۔ کردار و سیرت کے اعتبار سے وسیع النظر روشن دماغ، حلیم الفطرت صالح اور باتدبیر انسان تھا۔

ہشام بن عمروہ کنیت ابوعبداللہ۔ مشہور صحابی زبیر بن العوام کے پوتے۔ ان کے والد عروہ جلیل القدر بزرگ اور مدینے کے سات فقہا میں تھے۔ آپ بھی علمِ حدیث میں ممتاز مانے جاتے تھے۔ اسی لیے امام حدیث بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۴۶ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

ہلال نئے چاند یا گھٹتے ہوئے چاند کے لیے ایک اصطلاح۔ صدیوں سے ترک اپنے جھنڈوں پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ پاکستانی جھنڈے پر بھی ہلال اور ستارے کا نشان ہے۔ ترکوں سے قبل رومن بھی اسے استعمال کرتے رہے تھے۔ جو ان کے تمغوں پر بنا ہوتا تھا۔ اسلامی دنیا میں اس کا استعمال پہلی بار اس وقت ہوا جب مسلمانوں نے رومی سلطنت کو ختم کر کے وہاں اقتدار قائم کیا۔ … ترک اپنے تمغوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر استعمال کرتے ہیں۔ … کا استعمال پاکستانی تمغوں اور فوجی بیجوں پر بھی … جاتا ہے۔

ہلال بن امیہ قبیلہ اوس کے خاندان واقف میں پیدا ہوئے۔ والدہ … بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد اسلام لائے۔ غزوہ تبوک کے علاوہ … کے بعد کی تمام جنگوں میں شرکت کی۔ اس جنگ میں شرکت نہ کرنے … آپ سے ترکِ کلام کیا۔ اپنی غلطی پر پشیمان … آخر آپ نے معافی دے دی۔ تبوک کے واقعہ … کے خلاف سچی گواہی دی۔ جس سے دونوں پر ان کی حق گوئی کا سکہ بیٹھ … کاری اور راست روی میں بھی ممتاز تھے۔ امیر … دورِ سلطنت میں وفات پائی۔

ہمایوں نام نصیر الدین (۱۵۰۸ء - ۱۵۵۶ء) بابر کا بیٹا سولہ مارچ کو کابل میں پیدا ہوا۔ خاندان مغلیہ کا دوسرا بادشاہ۔ ۱۵۲۶ء میں باپ کے ساتھ ہندوستان کا … حصہ فتح کیا۔ ۹۳۷ھ - ۱۵۳۰ء میں بابر کے وزیر اعظم امیر نظام الدین کی مخالفت کے باوجود بادشاہ بنا۔ بادشاہ بننے سے پہلے بدخشاں اور ۱۵۲۹ء میں سنبھل کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چوبیس برس تھی۔ اس نے مختلف صوبوں کی حکومتیں اپنے بھائیوں کو منتقل کرتے ہوئے کالنجر کی فتح پر توجہ دی۔ اس کا محاصرہ کیا۔ مزید دباؤ ڈالنے کے لیے جون پور اور چنار گڑھ کا محاصرہ کیا۔ جہاں اس نے شیر شاہ کو شکست دی۔ ۱۵۳۲ء میں والی گجرات بہادر شاہ سے جنگ اور اس کے تعاقب میں چپانیر فتح کرتا ہوا آگے تک پہنچا کیونکہ اس نے ایک خبر کے مطابق باغی قلعوں کو پناہ دی تھی۔ اسی دوران اسے بہار میں شیر شاہ کے باغی ہونے کی خبر ملی۔ یہ دبانے گیا۔ مگر وہ اس کے آنے کی خبر پاکر فرار ہوگیا۔ شیر شاہ جون پور گیا۔ یہ بھی پہنچ گیا۔ جس کو گنگا کے گھاٹ پر آکر پتہ چلا کہ شیر شاہ نے واپس لوٹ کر ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ یہ بھی پلٹا۔ لیکن وہ ایک دم پلٹا اور غفلت میں انہیں زبردست شکست دی۔ ہمایوں بڑی مشکل سے ساحل پر پہنچا۔ ۱۵۳۴ء میں اس نے دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ نظام سقہ نے جان بچائی جس کو اس نے ایک یوم کے لیے بادشاہی دی۔ اس نے جنگ چوسہ میں شکست رہنے کے بعد بلگرام میں دوسری بار ہمایوں کو شکست دی۔ اس کے بعد آگرہ سے دہلی جاتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوا۔ مگر سب بھائی دغا دے گئے۔ یہ تنہا رہ گیا۔ اس لیے یہ راجپوتانہ کے راستے سندھ گیا۔ ابھی امرکوٹ میں پناہ گزین تھا کہ اکبر پیدا ہوا۔ سندھ سے قندھار گیا۔ وہاں خوب استقبال ہوا۔ ۱۵۴۵ء میں ایران سے ۱۴ ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر قندھار آیا۔ تقریباً دس سال کے دوران کابل، سیستان اور بدخشاں کو زیرنگیں کیا۔ ۱۵۵۴ء میں چند ہزار افواج کے ساتھ قلعہ لاہور فتح کیا۔ اور سرہند کے قریب سکندر سوری کے چھکے چھڑا دیئے۔ یہ شکست کھا کر شوالک کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔ بعد میں جب اسے معلوم ہوا کہ اس میں دم خم باقی ہے تو اکبر کو اس کے اتالیق بیرم خان کے ساتھ جنگ کے لیے روانہ کیا۔ ۱۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو مغرب کی اذان سن کر اترتے ہوئے کتب خانہ کی چھت سے گر کر زخمی ہوا اور چوبیس جنوری ۱۵۵۶ء کو وفات پائی۔ اس کا مقبرہ دہلی میں موجود ہے۔ اس کا دورِ حکومت دو ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلی مرتبہ دس سال اور دوسری مرتبہ دو ماہ حکومت میں رہا۔ پہلا دور ۱۵۴۰ء تک ہے۔ جب لاہور سے ہوتا ہوا سندھ پہنچا۔ اس کے بعد شیر شاہ سوری فرمانروا بنا۔ دوسری جولائی ۱۵۵۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب یہ دہلی سے آکر آگرہ پر قابض ہوا۔

مقبرہ نصیر الدین ہمایوں

ہمدان قرمط فرقہ قرامطہ کا بانی۔ عراق میں کوفہ کا ایک دیہاتی باشندہ تھا۔ قرمط اس کا لقب تھا جس کے معنی ہیں "سرخ آنکھوں والا آدمی"۔ ۸۹۰ء میں اس نے کوفہ کے قریب کلوذہ میں ٹھہرا۔ وہیں اس نے "دارالہجرہ" کے نام سے موسوم کیا۔ بعد میں یہی تحریک قرامطہ کا مرکزی مقام بنا۔ اس کی اشاعت و تبلیغ روز بروز بڑھتی رہی۔ یہ ایک خفیہ تنظیم تھی۔ بعض لوگ اس کے ارکان کو اسلام کے بالشویک قرار دیتے ہیں۔ یہ اپنے تمام مخالفین کا، قطع نظر کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں، قتل جائز سمجھتے ہیں۔ بصرہ کی حبشی جنگ کی خونریزیوں میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ اس فرقے کا ایک بڑا ابوطاہر سلیمان عراق میں خونریزی کرتے کے بعد ۹۳۰ء میں حجراسود اٹھا لے گیا تھا۔ جس کی واپسی ۹۵۱ء میں فاطمی حکمران سلطان المنصور کے حکم سے عمل میں آئی۔

عمر کے آخری حصے میں یہ شام چلا گیا اور ۲۵۸ھ میں وہیں وفات پائی۔

نیز دیکھیں "قرمط ہمدان"

ہمہ اسلامیان

اسلام جغرافیائی حد بندیاں قائم نہیں کرتا۔ اس میں چھوٹی مملکتوں اور ریاستوں

کے بجائے ایک ہمہ گیر عالی شان اسلامی وفاق کا تصور ہے۔ یہ نظریہ ہمہ اسلامیان کہلاتا ہے۔ اس کے لیے قدیم عہد میں کوششیں ہوتی رہیں۔ سرورِ کائنات کے زمانے اور ان کے بعد آنے والے خلفائے راشدین، اموی اور عباسی عہد میں اتحادِ ملت کے لیے ہی فتوحات ہوتی رہیں۔

دورِ جدید میں اس نظریے کے سب سے بڑے مفکر سید جمال الدین افغانیؒ تھے۔ ترکیہ کے مسلمان عبدالحمید دوم نے بھی عرب ممالک میں سامراجی طاقتوں کے خلاف ہمہ اسلامیان کی تشہیر کی تھی۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ پاکستان بھی اسی نظریے کی غماز ہیں کیونکہ ان کی رُو سے مسلمان ایک الگ مقام حاصل کر کے اسلامی وحدت میں گم ہو جانا چاہتے تھے۔

۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ اور ۱۹۳۱ء یروشلم میں ہمہ اسلامیان اجتماعات ہوئے جو قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

آر، سی، ڈی کا قیام اور شاہ فیصل مرحوم کی جانب سے رابطۂ عالمِ اسلامی کی مہم کا آغاز بھی اس سلسلے کی کڑی تھی۔ گاہے گاہے وزرائے خارجہ کی سطح پر ہونے والی کانفرنسیں اور اب تک ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنسیں ایک مسلم وحدت کے قیام کے لیے کسی قدر کامیاب رہی ہیں۔ جن سے اتحاد و روابط کو مزید استحکام اور سوچ کو مثبت و نئے زاویے ملے ہیں۔

ہمسائیگی :۔ اسلامی فقہ میں ہمسایوں کا بڑا درجہ ہے۔ حدیثِ نبوی میں ہے کہ حقوق ہمسایوں کے بھی ہیں۔ ان کی خبر گیری کرو۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر ہمسایہ بھوکا ہے تو تم پر کھانا حرام ہے۔ مکان کی خرید و فروخت میں بھی اس کا حق ہے۔ قرآن پاک میں ہمسایوں کے ساتھ اچھے سلوک کی آیت آئی ہے۔ ہمسائیگی کے بارے میں ابو ہریرہ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم سے کہا کہ ایک عورت ایسی جو خدا کی عبادت کرتی ہے مگر ہمسائے اس کی بدفعلی سے محفوظ نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ وہ جہنمی ہے۔

ہوازن، بنو قدیم عرب کا ایک مشہور قبیلہ، قریش اور ان کے اتحادی قبیلہ بنو کنانہ اور ہوازن کے مابین چار جنگیں ہوئیں۔ جن میں ایک میں سرورِ کونینؐ (بعثت سے قبل) بھی شریک رہے۔

ہودؑ ایک پیغمبر ارم بن سام کی اولاد پر جو قوم عاد کے نام سے مشہور ہے پر رسول کیے گئے۔ آپ نوحؑ کے بعد اور حضرت ابراہیمؑ سے قبل ہوتے ہیں اس قوم کا ذکر کئی جگہ قرآنِ عزیز میں آیا ہے، اس کے پہلے بادشاہ کا نام عاد تھا۔ ان کا زمانہ دو ہزار برس ق م مانا جاتا ہے۔ اس طرح آپ کا زمانہ بھی تقریباً یہی ہوا۔ یمن ان کا دارالحکومت تھا۔ ان کی آبادی حضر موت اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ عاد کے بعد شدید نام بادشاہ ہوا۔ یہ پانچ سو برس کی عمر میں تو اس کا بھائی عاد کا چھوٹا لڑکا شداد بادشاہ ہوا۔ آپ بھی اسی کے عہد میں پیغمبر ہوئے۔ آپ نے قوم کو وعظ کیا انہوں نے انکار کیا۔ اس کے تیرہ قبیلے تھے سب منکر ہوتے نتیجتہً اللہ تعالیٰ نے "طوفانِ نوح" کی طرح ایک اور عذاب بھیجا۔ آٹھ دن اور سات راتیں سخت ہوا چلتی رہی۔ آسمان آگ اگلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے سرخ و سیاہ اور سفید بادل بھیجے آپ نے سیاہ بادل چنے جس سے سارا آسمان سیاہ پڑ گیا۔ یہ سب لوگ تباہ ہو گئے آپ اور آپ کے ساتھ چھ اور ساتھی تھے جو بچے رہے۔ یہ واقعہ قرآن مجید کی گیارھویں سورہ جو آپ ہی کے نام پر ہے، میں آیا ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں نے نبی بھیجا یعنی ہود، اس کی بات مانو، توحید پر ایمان لاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجا لاؤ۔ اس قوم کا ذکر سورہ المومنون میں بھی ہے۔ سورہ اعراف ۶۵ اور شعراء ۱۲۴ میں بھی حضرت ہودؑ کا ذکر آیا ہے اور ان کی نبوت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

آپ دورانِ تبلیغ بار بار کہتے کہ میں کسی اجر کا خواہاں نہیں۔ مال و دولت کا طالب مگر ان کی قوم نے کہا ــــ "اے ہودؑ تو ہمارے پاس ایک بھی دلیل نہ لایا۔ اور تیرے کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں (ہود ع ۵) آپ نے انہیں طوفانِ نوح کا حوالا دیا اور کہا کہ ایسا ہی عذاب پھر آ سکتا ہے۔ مگر وہ بدستور کفر و الحاد سے چمٹے رہے پھر آپ نے کہا ــــ میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب کے آنے سے ڈراتا ہوں۔ (کہ کہیں تم اس کے مستحق نہ ٹھہرائے جاؤ۔ الشعراء) مگر ان کی ہر نصیحت و درس ان کے لیے اجنبی تھا سو آپ نے کہا ــــ بلاشبہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پہ عذاب پہنچا۔ (اعراف ع ۹)۔

آپ کی عمر ۱۵۰ برس کی ہوئی۔ آپ کے مزار مبارک کے بارے میں ابن بطوطہ کہتا ہے کہ دمشق میں ہے۔ بعض آراء کے مطابق یمن میں حضر موت کے مقام پر فلسطینی کہتے ہیں کہ وہ فلسطین میں مدفون ہیں۔

مگر آپ طوفان کے بعد مکہ چلے گئے تھے اور چونکہ قوم عاد ہی آپ کی قوم تھی۔ اس لیے آپ وہاں سے حضر موت چلے گئے ہوں گے۔ [illegible] دیتے ہیں۔

ہود گیارھویں اور بارھویں پارے کی سورہ [illegible] اور ۱۲۳ آیات ہیں۔ مکہ میں نزول ہوا۔ قرآن [illegible] نزول ۵۲ نمبر پر ہے۔ زمانہ وہی ہے جو سورہ یونس [illegible] نوحؑ اور دیگر انبیاء کرام کا ذکر ہے۔ ہود [illegible]

ہودؑ وہ پہلے نبی تھے جو عرب میں پیدا ہوئے سابقہ [illegible] رکھتے ہوئے اس میں گذشتہ انبیاء کرام اور ان کے [illegible] ساتھ سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ [illegible] ہے۔ دوسرے میں دنیا پرست اور [illegible] لوگوں کا ذکر [illegible] چوتھے رکوع میں حضرت نوحؑ اور پانچویں میں حضرت [illegible] اور آٹھویں رکوع میں بالترتیب حضرت صالحؑ [illegible] اور حضرت شعیب کا ذکر ہے۔ نویں رکوع میں [illegible] الگ الگ بحث ہے اور انجام بتایا گیا ہے۔ آخری رکوع [illegible] الوالعزم رہنے کی ہدایت ہے۔ با اعتبار وحشت [illegible] سے بڑی سورہ ہے۔ اس میں منکرین حق سے [illegible]

ہندومت ہندوؤں کے عقائد۔ آریوں کا مذہب [illegible] مذہبی کتب ہیں۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے [illegible] تشکیل کے بارے میں ہندوستان اور [illegible] آراء کے مطابق یہ ازل سے چلی آ رہی ہیں [illegible] مرتب ہوئیں۔ ان کا مذہب آریائی مذہب سے [illegible] ہوئی۔ اور ہندوستان کے مشرق میں شمال تا جنوب مغربی ساحلوں [illegible] مؤرخین کی رائے میں ہندو مذہب بابلی اور مصری عقائد سے بھی متاثر ہوا تھا اس کا جواز یہ ہے کہ اس زمانے میں آریائی مذہب کے مقابلے میں یہ تہذیب بڑی عروج پر تھی۔

شمس بھی پوجا کی جاتی تھی۔ اس شمس کی بدولت آگ اور روشنی وغیرہ کو بھی پوجا کے لئے مقدس جانا گیا۔ اس کے علاوہ دیوتاؤں اور مغربی قوتوں کے مظاہر کی تمثیل پرستی، تناسخ، وحدت الوجود، بت پرستی اس کے دوسرے اہم عناصر ہیں۔ ہر کام کے لئے ان کے الگ الگ "دیوتا" مقرر تھے ایک بارش کا جو اندر کہلواتا تھا، اس کے معنی بھی وہ "بارش" لیتے تھے۔

بتوں کے ساتھ جانوروں کی بھی پرستش کرتے، اسلاف کی بھی پوجا کرتے، زندوں کو مذہبی طور سے دیکھتے، کہ ان کا "بھگوان" اس میں حلول کر گیا ہے۔ تناسخ کے طور پر جانتے کہ انسان سات بار جنم پالیتا ہے۔ کہیں جانا جاتا کہ دریا پار کرنا خلاف مذہب ہے۔ اسی لئے ان کی ابتدائی بستیاں دریاؤں کے کنارے آباد تھیں۔ بیوہ عورت مرد شوہر کے ساتھ زندہ گاڑ دیتے کہ ہندومت اس کو زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گائے ایک مقدس ہستی ہے، جس کے قتل پر خونریز فسادات کھڑے ہوتے ہیں، اور انسان کا خون پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے۔ گائے کے ساتھ بندر بھی زبردست مذہبی حیثیت کا حامل ہے۔ ہنومان جو رامائن کا اہم کردار ہے، ایک بندر ہی ہے۔

گوتم بدھ سے قبل ہندو پجاری پُرخوف گیت گاتے۔ ان میں کائناتی نظام سے تشکیل سے قبل عدم کا تخیل نمایاں ہوتا، مثلاً: "اس وقت پائے جانے والے یا نہ پائے جانے والے کچھ بھی نہ تھے، اور نہ کوئی قوت اس ہستی کو وجود یا نفی کرنے والی تھی"، نہ فضا سے اوپر آسمان تھا، نہ فضا تھی۔

گوتم بدھ سے قبل برہمن وجودِ کائنات اور وجود انسانیت کے دو ادوار پر ایمان رکھتے تھے۔ اسی کے حوالے سے وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح کائنات ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان ایک جسم سے دوسرے میں چلا جاتا ہے۔

ہندہ قبیلہ قریش کی معزز عورت اس کا باپ عتبہ بن ربیعہ تھا۔ اس کا پہلا نکاح ناکر بن مغیرہ سے ہوا۔ اس سے جھگڑا ہونے کے بعد ابوسفیان ابن حرب سے نکاح ہوا۔ یہ قبیلہ امیہ نامی گرامی سردار تھا۔ جنگِ اُحد میں کفارِ مکہ کی جانب سے بڑی اولو الحوصلے بڑھانے کے لیے جذبہ اور رزمیہ اشعار گاتی رہی۔ تاہم فتح مکہ کے بعد اسلام لے آئی اور معززینِ اسلام میں شامل ہوئی۔ عزتِ نفس، عیرت، دانشمندی، تدبر غرضیکہ بہت سی صفات تھیں جو ان میں یکجا ہوئیں۔ ان کی وفات کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے۔ بعض عہدِ فاروقی اور بعض عہدِ عثمانی بتاتی ہیں۔

ہیرود حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں فلسطین کے شاہی خاندان کا لقب۔ اس خاندان کا مشہور حکمران ہیرودِ اعظم تھا۔ (۴۰، ق م۔ ۴ ق م) یہ اپنے باپ اینٹی پیٹر کے قتل کے بعد رومن سینٹ کی جانب سے یہودیوں پر بادشاہ مقرر ہوا۔ بائبل کی روایات کے مطابق ہی وہ بادشاہ تھا جس نے یوحنا کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت پر تمام نوزائیدہ بچوں کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ لاکھوں کا قتل ہوا۔

ہیکل ڈاکٹر محمد حسین، مصر کے سابق وزیر تعلیم، عظیم مؤرخ، زبردست سوانح نگار و نقاد ان کی سب سے مشہور تصنیف "حیاتِ محمدؐ" ہے جو مختلف نادر و نایاب تصانیف سے معلومات لے کر رکھی گئیں۔ اس کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سوانح حیات لکھیں۔

۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ کے مدرسۃ الحقوق المصریہ سے ۱۹۰۹ء میں ایم اے پاس کیا اور بعد میں الدین المصری کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کئی سال مدرسۃ الحقوق میں بطور پروفیسر کام کرتے رہے۔ قاہرہ کے مشہور اخبارات "المجریہ" اور السیاست" کی ادارت کی۔ مصری انقلاب سے قبل لبرل پارٹی کی قیادت کی۔ پارلیمنٹ کے صدر بھی رہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مصری وفد کی قیادت کی۔ وزیر تعلیم بھی رہے۔ ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا۔ آپ کی یادگار کتب میں الدین المصری "زینب، جان جاک روسو" حیاتِ محمدؐ، الصدیق ابوبکرؓ، الفاروق عمرؓ (دو جلدوں میں) ولدی، نی تراجم فی اوقات الفراغ، ثورت الادب اور عشرۃ ایام السودان شامل ہیں۔

ہیل سلاسی (۱۸۹۱ء ـــــــ) حبشہ کا بادشاہ ایک روایت کے مطابق اس کا شجرۂ نسب حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں انہیں ملکہ زادوتو کا وارث مقرر کیا گیا۔ اس وقت وہاں لج یاسو کا طوطی بولتا تھا جو برطانوی حکومت کا پٹھو تھا۔ یہ برطانوی صومالیہ کے بعض سرداروں سے مل کر اری ٹیریا پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ تخت کے وارث کی حیثیت سے پہلے انہوں نے لج یاسو کو اقتدار سے محروم کیا۔ پھر ملکہ زادوتو کے خاوند داس کو گیا کو راستے سے ہٹا کر نومبر ۱۹۳۰ء میں تخت نشین ہوئے۔ رسم تاجپوشی میں برطانیہ کی نمائندگی ڈیوک آف گلاسٹر نے کی۔ اقتدار سنبھالنے کے تین سال بعد ۱۹۳۳ء میں اہم اصلاحات نافذ کرتے ہوئے غلاموں کو رکھنا اور ان کی تجارت غیر قانونی قرار دے دی۔ اپنے عہد میں انجیلِ مقدس کی وسیع تشہیر کرائی اور اسی سلسلے میں اس کے بعض ابواب کا ترجمہ مقامی زبانوں میں کروایا۔ ۱۹۳۵ء میں اطالیہ ان کے ملک پر قابض ہوگیا۔ اس کے خلاف انہوں نے "انجمنِ اقوام عالم" میں زبردست تقریریں کیں اور چھوٹے ملکوں کی آزادی و بقا کی حمایت میں بات کی۔ لیکن یہ انجمن کوئی قابلِ ذکر اقدام اٹھانے سے معذور رہی۔ نتیجتاً شہنشاہ کو فرار ہونا پڑا۔ وہ پہلے فلسطین اور وہاں سے انگلستان چلے گئے اور جلاوطنی کی زندگی گزارنے لگے۔ اسی اثناء میں ان کے ملک میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ اور ان کے حامیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ اس لیے یہ ۱۹۴۱ء میں واپس وطن چلے گئے اور ان کی قیادت سنبھال لی۔ بالآخر حبشہ دوبارہ آزاد ہوگیا اور انہوں نے دوبارہ عنانِ حکومت سنبھالی ابھی انہیں چند برس ہی گزرے تھے کہ ملک میں ایک بار پھر بغاوت ہوگئی۔ اس وقت وہ جنوبی امریکہ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ فوج کے ایک حصے نے ان کے خلاف اقدام اٹھاتے ہوئے ولی عہد کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن ان کی وطن واپسی پر یہ بغاوت سرد ہوگئی۔ اس کے مجرم برسرِعام پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

ی

یاجوج ماجوج عجیب وغریب طرز معاشرت رکھنے والے مرکزی ایشیا میں جنگلی قبائل کا مجموعہ۔ ان کے بارے میں ایک عجیب وغریب روایت ہے یعنی ان کی جسمانی صورت بھی عجیب وناقابل یقین تھی مثلاً جو چھوٹے تھے۔ وہ بالشت ڈیڑھ بالشت سے لمبے نہیں اور بعض غیر معمولی حد تک لمبے، کان اس قدر بڑے کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام آگیا۔ چہرے چوڑے چکلے غرضیکہ جسمانی طور پر ہر لحاظ سے غیر متناسب۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے صلب سے تو ہیں مگر حوّا کے بطن سے نہیں۔ عبدالرزاق نے اپنی کتاب التفسیر میں لکھا ہے کہ یہ دو قبائل ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں۔ اسی قسم کی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے بھی ہے۔ اس سے ذرا مختلف رائے کی رُو سے یاجوج کا تعلق ترک سے اور ماجوج کا جلز سے۔ یاقوت نے ان کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ درست نہیں۔ یہ عجیب وغریب طرزِ معاشرت ضرور رکھتے تھے، وحشی ضرور تھے مگر جسمانی طور [illegible] حضرت آدمؑ کی طرح ہی کے تھے۔ ان کا ذکر سورہ کہف میں یوں آیا ہے:

"ان لوگوں نے کہا کہ ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج زمین پر فساد کرتے ہیں۔ بھلا ہم آپ کے لئے خرچ کا انتظام کر دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان دیوار کھینچ دیں۔ (ذوالقرنین نے) کہا کہ خرچ کا جو مقدور خدا نے مجھے بخشا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ تم مجھے قوتِ (بازو) سے مدد دو۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط اوٹ بنا دوں گا تو تم لوہے کے بڑے بڑے تختے لاؤ۔ (چنانچہ کام جاری کر دیا گیا) یہاں تک کہ جب اس نے ان دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کر دیا۔ (اور) کہا کہ (اب اسے) دھونکو۔ یہاں تک کہ جب اسے (دھونک دھونک کر) آگ کر دیا گیا تو کہا کہ (اب) میرے پاس تانبہ لاؤ۔ اس پر پگھلا کر ڈال دوں۔ پھر ان میں قدرت نہ رہی کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ یہ طاقت رہی کہ اس میں نقب لگا سکیں۔" آیت (۹۳ تا ۹۷)

اسی طرح سورہ انبیاء اور بہت سی دوسری سورتوں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ انہوں نے ذوالقرنین کے دور میں پورے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ ان کا ذکر قرآنِ پاک کے علاوہ تورات میں بھی آیا ہے۔ یہ خرقیلؑ کی انجیل میں درج ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ منگولیا (تاتار) قوم کے وحشی قبائل ہیں ان کے نام، اور ریوچی ہیں جسے یونانیوں نے میگ یا میگاگ اور جوگاگ کہا اور عبرانی عربی زبان میں وہ آگے یہ لفظ "یاجوج ماجوج" بن گئے۔ منگول منگولیا اور کاکیشیا سے لے کر دور مغرب تک پھیلے ہوئے تھے۔

یہاں کے کیانی خاندان کے پہلے شاہ سائرس اول (خسرو) نے قوم کی پریشانی دور کرنے کے لیے بحیرہ خزر کے مغربی کنارے کے پہاڑ کے درے کو [illegible] کی دیوار سے بند کرا دیا۔ اس دروازے کا نام دربند رکھا۔ یہ دیوار بہت اونچی اور دہری تھی۔ یہ دیوار مکمل کرنے کے بعد اس میں گھیر کر [illegible] نے ان قبائل کو فنا کر دیا۔

یاسر عرفات (۱۹۲۹ء - ۲۰۰۰ء) آزاد فلسطین کے انقلابی [illegible] میں پیدا ہوئے۔ [illegible] ساتھ مل کر یہودی دہشت پسندوں کی تنظیموں کے خلاف برسرپیکار [illegible] میں اسرائیل کی حکومت قائم ہونے پر وہ غزہ چلے گئے۔ وہاں سے [illegible] کرنے قاہرہ چلے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ مصر میں فلسطینی طلبہ کی [illegible] ۱۹۵۶ء میں گریجویشن کیا۔ اس سے ایک سال قبل ۱۹۵۵ء میں وہ مصری [illegible] مل کر نہر سویز کی جنگ میں حصہ لے چکے تھے۔

حصول تعلیم کے بعد وہ کویت چلے گئے۔ جہاں ایک سکول ٹیچر [illegible] ساتھ مل کر ۱۹۵۹ء میں "الفتح" کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۶۴ء میں الجیریا [illegible] نے اپنے ملک میں الفتح کا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ [illegible] میں الفتح کی ایک شاخ العاصفہ نے اسرائیل کے خلاف گوریلا جنگ [illegible] کارروائیوں سے جلد ہی انقلابی لیڈر جسے اس کے ساتھی ابو عمار کہتے ہیں۔ [illegible] مشکلات میں پھنس گیا میزبان ملکوں نے ان کی موجودگی کو [illegible] ایک دفعہ انھیں لبنان میں گرفتار کیا گیا۔ دو مرتبہ شام میں گرفتار ہوئے۔ [illegible] تک دمشق کی خطرناک جیل مزی میں گزارنے پڑے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یاسر عرفات نے مقبوضہ علاقے میں خفیہ [illegible] قائم کئے۔ یہ گوریلے کسی نہ کسی طرح اسرائیلی سیکورٹی سے بچ کر کام کرتے رہے اور اسرائیل نے ان کو اپنا دشمن نمبر ایک قرار دیا۔ ۱۹۷۰ء میں یاسر عرفات اور ان کی تنظیم پر کڑا وقت آیا۔ جب فلسطینی گوریلوں کو اردن میں ان کے اڈوں سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ عرفات نے فلسطینی جدوجہد کا ہیڈکوارٹر لبنان منتقل کر دیا۔ یہاں

فلسطینی کمانڈوز اور دائیں بازو کی ملیشیا میں اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۷۵ء میں لبنان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ شام کی فوجوں نے خانہ جنگی ختم کرانے کے لئے مداخلت کی۔

فلسطین کے انقلابی رہنما یاسر عرفات

یاسر عرفات کی زندگی کا نقطہ عروج نومبر ۱۹۷۴ء میں آیا جب انھوں نے تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں خطاب کیا اور یہ مشہور اعلان کیا: "میرے ایک ہاتھ میں زیتون کی شاخ ہے اور دوسرے میں بندوق ہے۔" ۱۹۸۲ء ان کی زندگی کا سب سے خراب سال تھا۔ کیونکہ اسرائیل نے لبنان میں فلسطینی حریت پسندوں اور مہاجرین کے کیمپوں کو فضائی و بری حملوں سے برباد کردیا اور یاسر عرفات کو بیروت چھوڑ کر جلا وطن ہونا پڑا۔ ان کے جاں نثار حریت پسند مختلف اسلامی ملکوں میں منتشر ہو کر رہ گئے۔ گویا آزادیٔ فلسطین کا خواب طویل سے طویل تر ہو گیا۔ تاہم یاسر عرفات نے ہر طرح کی قربانی کا عزم رکھا ہے۔ کنوارا رہنے کی قسم کھائی ہے۔ ان کی ذاتی شجاعت کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ اب بھی وہ ایک انقلابی لیڈر کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔

یافث حضرت نوحؑ کے تیسرے بیٹے کا نام۔ عورتیں کے خیال میں یہ آریائی نسل کا جدِ امجد ہے۔ اس کی نسل نے حام کے خاندان میں شادیاں کیں۔ اس کی نسل سے ... کے لوگ پیدا ہوئے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یاجوج ماجوج اور ترک بھی اسی کی اولاد سے ہیں مگر انہیں سامی النسل قرار دیا جاتا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس وقت کی بہتر زبانوں میں ۳۶ یافث کی اور اٹھارہ اٹھارہ حام اور سام کی ملیں۔

یاقوت دورِ عباس کے خاتمے سے قبل مشرق میں جغرافیہ دانوں کی سب سے بڑی شخصیت اہم جغرافیائی ڈکشنری "معجم البلدان" اور اہم ادبی ڈکشنری "معجم الودبا" کا مصنف۔ ایشیائے کوچک کے ایک یونانی نژاد گھرانے میں ۵۷۵ھ میں پیدا ہوا۔ نام شہاب الدین، کنیت ابو عبداللہ الحموی، بچپن میں غلام کی حیثیت سے فروخت کیے گئے۔ ایک بغدادی تاجر عسکر نے خرید کر تعلیم و تربیت کی۔ کاروبار کے سلسلے میں مصر و شام سمیت کئی ملکوں کو بھیجا۔ بعد میں انھوں نے آزاد کر دیا۔ تب معاش کے سلسلے میں قلمی نسخے نقل کر کے فروخت کرتے رہتے۔ جغرافیائی ڈکشنری کا اولین مسودہ تقریباً ۴۴ برس کی عمر میں تیار کیا۔ اس کی تکمیل چار برس بعد حلب میں ہوئی۔ دوسری تصانیف میں کتاب الدول، اخبار الشعرا اور ارشاد الادیب شامل ہیں۔

یتیم وہ بچہ جس کا باپ مرچکا ہو۔ ایسے بچوں کو کمزور جانتے ہوئے غنی ہیں ان کی جائداد خود برد کر لی جاتی تھی۔ ان کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے مطابق یتیم عمر بھر یتیم رہتا ہے اور کچھ را‌ئے ایسی ہیں کہ سوجھ بوجھ قائم ہو جانے تو یہ یتیم نہیں رہتا۔ ان کے بارے میں قرآن مجید اور اسلامی شریعت میں بڑے سخت احکامات ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یتیموں سے پر ظلم کرنے والوں کو دوزخ تک کی تنبیہ کی ہے ــــ "اور یتیموں کو ان کا مال دو اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو۔ اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں سے ملا کر نہ کھاؤ یہ بڑا سخت گناہ ہے ــــ" (سورہ النسار، آیت ۲)

"اور یتیموں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں پھر (بالغ ہونے پر) اگر ان کی عقل کی پختگی دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔۔۔۔" (النسار آیت ۶) اس سے ہدایت ملتی ہے کہ یتیم کے بالغ ہونے تک اس کی پرورش و دیکھ بھال وارث کے سر ہوتی ہے ــــ اسی سورہ کی دسویں آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ــــ "اور جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے"۔ یہ احکامات یتیم لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لیے ہیں۔ یتیم لڑکیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ مزید ہدایت فرماتا ہے کہ ان کو ان کا مہر فوراً ادا کر دیا جاتے۔ سورۃ النساء کے شروع ہی میں درج ہے کہ یتیم بچوں کے ساتھ نکاح وغیرہ کے سلسلے میں انصاف کیا جائے۔ ایک حدیث میں تو دلی کراس یتیم سے شادی کی ممانعت کردی گئی ہے جو اس کی توجیہ میں ہو۔ کیونکہ اس میں بے انصافی کا شائبہ موجود ہے ایک اور حدیث میں ہے ــــ "مسلمانوں میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جاتا ہو اور سب سے بدترین مسلمان گھر وہ ہے جہاں یتیم ہو اور اس سے برا سلوک کیا جاتا ہو"۔ ایک اور موقع پر آپ نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا دونوں جنت میں اسی طرح ہوں گے"۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں یتیموں کا بڑا درجہ ہے اور ان کی مدد کرنے کا ثواب ملے گا۔ ان پر ظلم روا نہیں، ان کی امداد زکوٰۃ اور بیت المال وغیرہ سے کی جاتی تھی۔ ان کے لیے وقف بھی قائم ہوتے رہے ہیں۔

یثرب مدینہ منورہ کا اصلی اور قدیم نام، مکہ معظمہ سے ۲۷۵ میل دور شمال میں واقع ہے۔ یہ سام بن نوحؑ کی نسل سے ہیں۔ ماضی بعید میں یہاں یہودی آباد تھے۔ انہوں نے اس کے اردگرد قلعے بنا لیے تھے۔ یمن میں زبردست سیلاب کے بعد وہاں کے لوگ جو قحطان خاندان سے تعلق رکھتے تھے یہاں آگئے۔ ان کے سردار دو بھائی اوس اور خزرج تھے۔ انہی سرداروں کے نام دو قبیلوں کے نام پڑے۔ یہ قبیلے وحشی اور بت پرست تھے۔ ان کا خاندان وقت کے ساتھ پھیلتا رہا۔

ان دنوں یہاں فطیون نامی یہودی کا طوطی بولتا تھا۔ جو بڑا عیاش تھا۔ اور اس کا حکم تھا کہ ہر لڑکی بیاہی جانے سے قبل اس کے پاس آئے۔ مگر اوس اور خزرج نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ اس وقت ان کا سردار مالک بن عجلان تھا۔ جب اس کی بہن فطیون کے محل میں پہنچی تو بوجوہ غیرت اس نے فطیون کو قتل کیا اور وہاں سے شام چلا گیا۔ یہاں ان دونوں غسانیوں کی حکومت تھی۔ اس نے یہود اور اوس و خزرج دونوں طرف سے رئیس بلا کر یہود کا قتل کروایا جس سے ان کا زور ٹوٹ گیا اور قوت کا توازن اوس

وخزرج کی طرف گیا۔ دعوتِ اسلام کے وقت بھی دو بڑے قبائل یہاں آباد تھے۔

یحییٰؑ حضرت زکریاؑ کے بیٹے، انہی کے بعد بنی اسرائیل پر نبی کیے گئے۔ والدہ کا نام الیشباع جو حضرت مریمؑ کی بہن تھیں۔ قرآنِ مجید میں ان کا ذکر اپنے باپ کے ساتھ آیا ہے، آلِ عمران، انعام، مریم اور انبیا، ان چار سورۂ قرآنِ عظیم میں کا ذکر ہے سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو ایک بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ جو اس سے قبل کسی کا نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس طرح ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ ہے۔ (سورۂ مریم)

یہ حضرت عیسیٰؑ سے چھ ماہ بڑے تھے اور ان کے بارہ سا تھیوں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ ان کو یوحنا بھی کہا جاتا ہے جو عبرانی زبان میں یحییٰ کا تلفظ ہے۔

انہوں نے زندگی بھر شادی نہ کی نہ ہی نکاح کیا۔ زندگی بھر کوئی گناہ سرزد نہ ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے لیے حضرت زکریاؑ نے دعا کی تھی کوئی گناہ ان سے سرزد نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول کرتے ہوئے سورۂ آلِ عمران میں بشارت دی کہ ——— "پس زکریاؑ جس وقت حجرے میں نماز ادا کر رہا تھا۔ فرشتے نے اس کو پکارا۔ اے زکریاؑ، اللہ تعالیٰ تجھ کو (ایک فرزند) یحییٰؑ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ، عیسیٰؑ کی بشارت دے گا اور وہ اللہ کے اور اس کے بندوں کی نظروں میں برگزیدہ اور گناہوں سے بے لوث ہوگا، اور نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔"

کہا جاتا ہے کہ جس وقت انہیں نبی بنایا گیا، ان کی عمر تیس برس نہ تھی۔ نبوت کے بعد انہوں نے بیت المقدس کی مسجد میں بنی اسرائیل کو جمع کیا اور مسجد کے بھرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم دیا یعنی توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور پانچواں حکم اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، جو دن رات کرنا چاہیئے۔

ان کی زندگی کا بڑا حصہ صحرا اور جنگلوں میں بسر ہوا۔ جہاں یہ پتے وغیرہ کھا کر دن گزارتے اور اللہ کی عبادت میں روتے رہتے۔ یہیں ان پر کلام اللہ نازل ہوا۔ تب انہوں نے دریائے یردن کے نواح میں تبلیغ شروع کر دی۔ اس کے بارے میں لوقائی انجیل کے باب دوئم آیت ایک میں آیا ہے کہ ——— "اس وقت بیابان میں اللہ کا کلام زکریاؑ کے بیٹے یوحنا (یحییٰ) پر اترا اور وہ یردن کے کنارے گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کرنے لگا۔"

آپ جنگل و بیابانوں اور آہ و زاریوں میں اس قدر مصروف رہتے کہ ایک بار زکریاؑ نے انہیں دشت میں پا کر کہا کہ تو یہاں، ہم تیری تلاش میں مضطرب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جنت و دوزخ کے درمیان لق و دق میدان ہے جو خدا کی مشیت میں آنسو بہائے بغیر ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ سن کر وہ بھی رو دیئے۔

ان کی موت کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں یہودیوں نے پا کر شہید کیا۔ دوئم یہ کہ وہاں کے بادشاہ ہیرودس نے، جو اپنے سگے بھائی کی بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا، نے قتل کیا۔ اس بارے میں لوقائی انجیل کے نویں باب کی آیات ۷ تا ۹ میں بیان آیا ہے۔ اور سوئم یہ کہ دمشق کے بادشاہ ہیرودس حداد نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی۔ پھر چاہتا تھا کہ اس کو بیوی بنا لے۔ آپؑ نے اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ ملکہ ناراض ہوئی۔ عین اس وقت جب آپ مسجد جبرون میں نماز میں مصروف تھے۔ اس نے سر کاٹ لیا۔ کٹا سر بھی یہی کہتا رہا کہ بادشاہ کے لیے حلال نہیں۔ جب تک کہ دوسرے سے شادی نہ کر لے۔ اسی حالت میں عذابِ الٰہی آیا اور عورت زمین میں دھنس گئی، سر بھی وہیں دفن ہو گیا۔ تاریخ میں ہے کہ ان کے سر سے برابر خون رستا رہا۔ یہاں تک کہ بخت نصر نے دمشق فتح کر کے اس پر ستر ہزار اسرائیلیوں کا خون بہا دیا۔ تب حضرت ارمیاؑ نے خون سے مخاطب ہو کر کہا ——— "اے خون کیا تو اب کبھی ساکن نہ ہوگا؟ کتنی مخلوقِ خدا فنا ہو چکی، اب ساکن ہو جا" چنانچہ خون بند ہو گیا۔

بخاریؒ نے ان کے بارے میں ایک حدیث کے ٹکڑے کو بیان کیا ہے یعنی روایت میں ہے ——— "پس جب میں پہنچا تو دیکھا کہ یحییٰؑ اور عیسیٰؑ موجود ہیں اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبرائیلؑ نے کہا۔ یہ عیسیٰؑ اور یحییٰؑ ہیں ان کو سلام کیجئے۔ میں نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب [illegible] نے کہا۔ آپ کا آنا مبارک ہو، اے ہمارے نیک بھائی اور نیک پیغمبر۔"

یحییٰ برمکی (ـــــ ۸۰۵ھ) خالد برمکی کے بیٹے، عباسی خلیفہ نے اپنے بیٹے خلیفہ ہارون الرشید کی تعلیم و تربیت ان سے کروائی۔ جب ہارون الرشید خلیفہ مقرر ہوئے تو ان کو اپنے والد کے مقام پہ سمجھتے تھے۔ اس سبب غیر محدود اختیارات دے کر وزیر مقرر کر دیا۔ ان کے بیٹے فضل و جعفر بھی [illegible] عہد میں ۸۶ھ تا ۸۰۳ھ تک وزارت و حکمرانی کے منصب پر فائز رہے۔

یحییٰ بن زکریہ مشہور محدث، حافظ حدیث [illegible] میں بہت سی احادیث ان کی روایت سے ہیں۔ فقہ میں بھی [illegible] ابو حنیفہ کے رشید میں تھے۔ ایک مدت ان کے ساتھ رہے [illegible] نے تذکرۃ الحفاظ میں انہیں صاحب ابو حنیفہ [illegible]

یہ تدوینِ فقہ میں امام صاحب کے ساتھ رہے [illegible] تیس برس گو کہ یہ مدت درست نہیں لیکن [illegible] شریک رہے۔

مدائن میں ۶۳ برس کی عمر میں ۱۸۲ھ [illegible]

یحییٰ بن سعید القطان مشہور محدث [illegible] کے حلقۂ درس کا یہ عالم [illegible] امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی وغیرہ [illegible] کہ ان سے حدیث کی تحقیق کرتے [illegible] جو ان کے درس کا وقت تھا [illegible] یحییٰ بن معین اور خثیمہ شامل تھے [illegible] آپ [illegible] ہم بھی [illegible] آپ کے [illegible] حنبل کا قول بھی آپ [illegible] نہیں دیکھا۔ ۱۹۸ھ میں [illegible]

یحییٰ بن عبداللہ [illegible] کے زمانے [illegible] خلیفہ ابو جعفر نے نفس ذکیہ [illegible] کر دیا۔ عمر کے آخر [illegible] حالت میں وفات پائی۔

یحییٰ بن یحییٰ [illegible] سے ۲ [illegible] جا کر امام مالک بن انس سے [illegible]

نمایاں کردار ادا کیا اور اسے اتنی وسعت دی کہ مسلمانوں نے اپنا مطالعہ صرف قرآن پاک اور مؤطا تک محدود کر دیا۔

یحییٰ بن یعمر حافظ قرآن اور دوسرے علوم میں یکتائے روزگار کنیت ابو سلیمان اور قبیلہ بنیثہ سے تعلق رکھتے تھے، زبان کے ماہر، صرف و نحو کے عالم اور مشہور محدث، آپ سے قبل قرآن پاک میں نقطے نہیں ہوتے تھے جس سے قرأت میں دقت ہوتی تھی، آپ نے نقطے لگائے۔ ۱۲۹ھ میں وفات پائی۔

یحییٰ خان انہیں ۱۹۳۸ء میں فوج میں کمیشن ملا، ابتدا میں ایک برس تک ورسٹر رجمنٹ کی دوسری بٹالین سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد بلوچ رجمنٹ میں تعینات ہوئے۔ اسی عہدے پر آپ کو سرحدی صوبے میں فوجی کارروائی کرنا پڑی۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ نمایاں کام سرانجام دیئے۔ وہاں سے ۱۹۴۵ء میں وطن پہنچے۔ یہاں پہنچ کر سٹاف کالج کوئٹہ سے ایک کورس کیا۔ اس کے بعد مختلف سٹاف عہدوں پر متعین رہے۔ بعد میں اسی کالج میں انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ اس کالج میں واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے۔ آزادی کے بعد ڈویژنل ہیڈ کوارٹر اور جنرل ہیڈ کوارٹرز میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۵۷ء میجر جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر چیف آف دی آرمی سٹاف مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں مشرقی پاکستان کے ڈویژن آفیسر کمانڈنگ مقرر ہوئے۔ مرکزی دارالحکومت کی تعمیر کے لیے اسی دور میں ایوب خان نے کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ اس کے اولین چیئرمین بھی آپ ہی مقرر ہوئے۔ اس طرح اس کی تعمیر کے ماسٹر پلان کی ترتیب اور اس پر عمل میں شریک ہوئے۔

ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں چھمب میں اعلیٰ کارکردگی پر ہلالِ جرأت کا فوجی اعزاز دیا گیا۔

مارچ ۱۹۶۶ء میں ڈپٹی کمانڈر انچیف اور جنرل موسیٰ کے جانشین مقرر ہوتے ہی ماہ بعد ۱۹ ستمبر کو جنرل موسیٰ کے ریٹائر ہونے پر بری فوج کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں صدر ایوب کے مستعفی ہونے کے بعد صدرِ مملکت بنے اور دسمبر ۱۹۷۱ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ بعد کی حکومت نے انہیں نظربند کر دیا۔ جو مارشل لاء حکومت نے ختم کی۔

یداللہ عربی الفاظ بمعنی "اللہ کا ہاتھ" الفاظ قرآنِ عظیم میں متعدد مقام پر آئے ہیں مسلمانوں کے لیے پاکیزگی و طہارت کی ہدایت ہے۔ جن کاموں میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر فوقیت حاصل ہے، اسے اچھے کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور بائیں ہاتھ کو خصوصاً ایسے کاموں کے لیے جو جسمانی صفائی سے متعلق ہوں۔ اسی طرح نماز سے قبل ہاتھ وغیرہ کی صفائی ضروری ہے۔ نیز دیکھیں "وضو"

یداللہ کی تشریح کے سلسلے میں عام تشریح یہی ہے کہ یہ خدائی قوت کے اظہار کے لیے استعارہ استعمال ہوا ہے۔ چونکہ خدا سراپا نور ہے۔ اور نہ کہ مجسم حالت میں، اس لیے "یداللہ" کی لغوی تشریح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یردن شام میں ایک دریا بحرِ جلیل اور بحرِ طبریہ سے گذرتا ہوا۔ بحرِ مردہ میں جا گرتا ہے۔ اس کا براہِ راست طول ۶۵ میل ہے لیکن پیچ و خم کی وجہ سے ۲۰۰ میل بنتا ہے۔ عرض دو میل سے پندرہ میل ہے۔ سطح سمندر سے ۱۲۰۰ فٹ نیچے ہے۔ شمال سے جنوب کی جانب بہتا ہے اور فلسطین کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ شریف کی سورۂ بقرہ کے ۳۳ ویں رکوع میں آیا ہے جب طالوت فوج لے کر بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے اس دریا کے ذریعے امتحان لینا چاہا۔ متی (۳ : ۱۳) اور مرقس (۱ : ۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ اسی دریا سے بپتسمہ دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ذکر زبور، یوشع، سلاطین وغیرہ میں بھی آیا ہے۔

یرموک ایک جنگ جو ۱۳ھ میں دریائے یرموک کے کنارے ہرقل سے لڑی گئی۔ دمشق، اردن اور حمص کی فتوحات کے بعد حضرت خالد دریائے یرموک کے کنارے پہنچے۔ دوسرے سرداروں کے ماتحت دوسری فوجیں بھی جمع ہو چکی تھیں۔ عیسائی فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی مسلمان فوج کے چار گروہ تھے جن کی سپہ سالاری عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان، حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور شرجیل بن حسنہ تھے۔ ان کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر حضرت خالدؓ کو سپہ سالارِ اعظم بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ دس ہزار فوج بھی تھی۔

حضرت خالد نے تمام فوج کو اڑتیس دستوں میں تقسیم کرتے ہوئے۔ ۱۸ دستے حضرت ابو عبیدہ کی زیرِ قیادت درمیان میں رکھے۔ دس دستے دائیں طرف حضرت شرجیل بن حسنہ کی قیادت میں بائیں جانب دس دستے حضرت یزید بن ابی سفیان کی قیادت میں رکھے۔ رومیوں نے بھی صفیں جما لیں۔ رومیوں نے بھی خوب صورتی سے صفیں جمائیں۔ مگر جنگ چھڑنے پر مسلمان تیر اندازوں نے انہیں زبردست شکست دی۔ چونکہ بھاگنے کے راستے مسدود تھے۔ ایک طرف پہاڑ، ایک جانب دریا اور سامنے مسلمان فوج تھی، اس لیے انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔ جنگ میں ایک لاکھ رومی اور تین ہزار مسلمان ہلاک ہوئے۔ یرموک کی شکست سے ان کے حوصلے پست ہوئے۔ ہرقل شام سے مستقلاً روم چلا گیا اور مختصر سی مدت میں شام مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

یروشلم بیت المقدس فلسطینیوں کا گھر تھا کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں لفظ کا مطلب "امن" تھا۔ بعد میں خیال کیا گیا کہ "شلم" (خدا) کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی مقدس حیثیت سے کسی کو انکار نہیں یہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے مقدس حیثیت کا حامل ہے اس کی اسی حیثیت نے سینے پر متعدد جنگوں کے نشان رقم کیے۔

قدیم شہر کے گرد ۲½ میل لمبی دیوار تھی۔ تاریخی اعتبار سے شہر قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے جو پتھروں کے زمانے میں بھی قبل انسانی زندگی کے آغاز کے مراحل تک پہنچتی ہے ۱۴۰۰ ق۔م میں جوشا کی فتح سے قبل یہ شہر مصر کا تھا جب یہودیوں نے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لیا تو یہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا، یہودہ اور نجمن ۷۹۰ ق۔م میں اسرائیل کے بادشاہ نے یروشلم پر قبضہ جمایا اور دیواروں کو گرا ڈالا۔ جنہیں بعد میں اما ذیہ کے بیٹے آزمیہ نے ازسرِ نو تعمیر کیا۔

۵۸۶ ق۔م میں یروشلم بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ فاتح نے یہودیوں کو ملک بدر کیا۔ جنہیں بعد میں پارسا کے بادشاہ سائرس نے ۵۳۸ ق۔م میں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔

یروشلم کی تمام تر حیثیت اس کی عسکری حیثیت کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ مشرق وسطیٰ میں مرکزی مقام رکھتا ہے۔

دیکھیے "بیت المقدس"

یزید اوّل: (۶۴۲ء-۶۸۳ء) امیر معاویہ کا بیٹا اور خاندانِ اموی کا دوسرا خلیفہ۔ قسطنطنیہ کا اولین بار محاصرہ کرنے والے لشکر کا سپہ سالار۔ اسی کے عہد میں شہادتِ امام حسینؓ کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت امام حسنؓ نے اپنے عقیدت مندوں کے اصرار پہ خلیفہ بننا منظور کر لیا۔ جب کہ یزید بن معاویہ نے خلافت وراثت سنبھالی۔ اور حضرت امام حسینؓ کو دبانے کے لیے طاقت استعمال کی۔ اور کربلا پر اس نے اُن کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے حوارین کے مقام پہ جان دی۔

۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ میں کربلا کے میدان میں حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ زبیرؓ سے بیعت حاصل کرنے کی کوشش شروع کیں، کیونکہ ان حضرات نے بیعت نہ کی تھی۔ یزید نے مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو ان اصحاب سے بیعت حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ کیونکہ جب حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے ولی عہد ہونے کی حیثیت سے بیعت لی تو بھی ان حضرات نے بیعت نہ کی تھی۔ امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو وصیت کی تھی کہ ان سے بیعت لینے میں خاص احتیاط کی جائے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ تو مدینہ سے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ حضرت حسینؓ نے ولید بن عتبہ کے بلاوے کے بعد اپنے اہلِ خاندان کو جمع کر کے مشورہ کیا اور اس کے بعد ان کو ہمراہ لے کر مکہ روانہ ہو گئے۔

جونہی حضرت حسینؓ مکہ میں داخل ہوئے تو کوفہ سے پیغام آنے لگے کہ وہاں کے لوگ یزید کی جگہ پر حضرت حسینؓ کو خلیفہ بنانے کے لیے تیار ہیں اور وہ اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ حضرت حسین کوفہ آئیں تاکہ ان کے ہاتھ پہ بیعت کی جائے مگر یزید جنگ پر تیار رہا جس پر یہ سانحہ ہوا۔

یزید بن مہلب: (۶۷۲ء-۷۲۰ء) بنو امیہ کے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا ممتاز فوجی جرنیل۔ خراسان کا گورنر رہا۔ امویوں کے خلاف بغاوت میں شورش پیدا کیں۔ واسط پہ چڑھائی کر کے قابض ہوا۔ مسلمہ بن عبدالملک سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔

یزید دوم: (۶۹۱ء-۷۲۵ء) عمر بن عبدالعزیز کے بعد عبدالملک کا تیسرا بیٹا یزید تخت پر بیٹھا۔ آرام طلب اور عیاش انسان تھا۔ ملکی انتظام خراب ہو گیا۔ ہسپانیہ، شمالی افریقہ اور بعض دوسرے صوبوں میں جو مرکز حکومت سے بڑے فاصلے پہ واقع تھے، انارکی پھیل گئی۔ مختلف فتنوں نے سر اٹھایا۔

یزید بن ہارونؒ: امام بن حنبل، علی بن المدینی، یحییٰ بن معین، وغیرہ کے استاد۔ فنِ حدیث کے عظیم امام ۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ ان کے تلامذہ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ جب درس دیتے تو حاضرین کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ جاتی۔ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ ان سے زائد احادیث کسی کو یاد نہیں۔ خود ہارونؒ کا بیان ہے کہ انہیں ۲۰ ہزار احادیث ازبر ہیں۔ ۲۰۶ھ میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

یزیدیہ: یزیدیہ یا یزیدی کردستانی قبائل کا نام ——— یہ قبائل شمالی عراق کے ضلع ——— یہاں سے ۴۰ میل شمال میں ان کا امیر رہتا ہے یہیں سے شمال کی جانب تین گھنٹے کے سفر پر ان کے سابق چیف شیخ عدی کا مزار ہے۔ یہ لالیش کے مقام پر ہے۔ عراق کے علاوہ یہ شام میں بھی رہتے ہیں۔ اب یزید بن معاویہ یا اموی خلفاء سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فارس کے ایک شہر اور عربی لفظ یزد سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خدا کا عبادت گذار۔ اگرچہ یہ آپس کے قبائل میں کوئی ربط نہیں رکھتے۔ لیکن پھر بھی سب کا رہن سہن ایک سا ہے۔ شام کے کرد لمبی داڑھی اور گھنے بال رکھتے ہیں۔ یہ بال آنکھ کے اوپر اور ہونٹوں تک بڑھ آتے ہیں۔ وہیں ان کی ایک اور نسل رہتی ہے۔ یہ جرمنی ہے۔ ان کی کچھ خصوصیات آرمینیہ کے باشندوں سے ملتی جلتی ہیں۔

بعض حصے کرد اور بعض قبائلی عربی زبان بولتے ہیں۔ اور ان کی کتب بھی اسی زبان میں ہیں۔ مذہبی طور پر یہ دوزخ پر یقین نہیں رکھتے۔ ایک روایت کے مطابق دوزخ کی آگ کو آنسوؤں سے دھو دیا گیا ہے۔ یہ روزانہ صبح کو عبادت کرتے ہیں۔ ماہِ دسمبر میں تین یوم کا روزہ رکھتے ہیں اور اسے شراب سے کھولتے ہیں۔ ان کے مطابق بدھ کا دن مقدس دن ہے اور ہفتہ کا دن آرام کا ہے۔ ان کی عبادت گاہوں میں افریقی طرز کی آرائش بھی نمایاں رہتی ہے جہاں سانپ خنجر اور اس قسم کی دوسری اشیاء دیواروں میں کندہ ہوتی ہیں۔ ۱۵ سے ۲۰ ستمبر تک شیخ عدی کے مقبرے پہ حاضری دیتے ہیں جو ان کی اہم مذہبی رسم ہے۔ اپریل کا پہلا بدھ بھی بڑے زور و شور سے مناتے ہیں۔

یٰسٓ کلام اللہ میں ۲۲ اور ۲۳ پارے کی مکی سورہ کا نام۔ قرآن مجید میں ۳۶ نمبر پر اور بلحاظ ترتیب نزول ۴۱ ویں ہے۔ اس کو سورۂ یٰسٓ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مضمون سورہ الزمر سے ملتا ہے۔ دونوں کا زمانہ نزول بھی ایک سا جیسا ہے۔

اس کا نام یٰسٓ پہلی آیت سے لیا گیا ہے جس [illegible] تک آپ نے پہنچایا۔ اس لیے آپ انسان کو معرفت تک [illegible] کے ساتھ تعلق ضروری ہے چونکہ قرآن کی اصل [illegible] ہے۔ [illegible] یہ سورہ کو زبانِ مبارک سے قلب قرآن [illegible] فضائل بھی احادیث میں بہت سے آئے ہیں۔

سورہ مذکورہ میں سب سے پہلے قرآن پاک کو آنحضورؐ کی صداقت پر شہادت پیش کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آپؐ کا معجزہ قرآن کریم ہے کیونکہ آپ کے دعوے پر کلام اللہ بحث کرے گا۔ دوسرے رکوع میں [illegible] دی گئی وہ اس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ کوئی مذہب [illegible] عملی طور پر تمام ابتدائی مذاہب ناکام ہو چکے تھے۔ تیسرے رکوع میں [illegible] کی کچھ نشانیاں درج ہیں۔ اس کے بعد کے رکوع میں [illegible] کرنے والوں کو جزا اور مخالفین کے لیے سزا [illegible] جو عروج پر پہنچ کر مخالفت کرتی ہیں [illegible] وقت ضرور آئے گا اور اللہ تعالیٰ جو قدرت والا ہے [illegible]
دیکھیے المؤمن۔

یعسوب بادشاہ، شہزادہ، چیف، بڑا حضور پاک کے ایک گھوڑے کا نام۔

یعقوبؑ حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے۔ بنی اسرائیل پر حضرت اسحٰقؑ کے بعد پیغمبر کیے گئے۔ آپ کی والدہ کا نام رفقہ تھا

ربیقہ تھا۔ آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ کے بھائی عیص کو بادشاہی، آپ تین ہزار چار سو تراسی ۳۴۸۳ ہبوط میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو "اسرائیل" بھی کہا جاتا ہے۔

آپ اپنی والدہ کے کہنے پر فدان آرام چلے گئے وہاں ماموں جان لابان نے کہا کہ دس برس ان کی بکریاں چرائیں تو اس کو مہر کہہ کر وہ اپنی بیٹی کی شادی ان سے کردیں گے۔ آپ نے منظور کیا اور اتنی مدت بکریاں چرائیں۔ اس پر لابان نے آپ کا نکاح بڑی بیٹی امیّہ سے کرنا چاہا مگر آپ نے رجحان چھوٹی بیٹی راحیل کی جانب ظاہر کیا۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ بڑی بیٹی کے ہوتے ہوئے چھوٹی کا نکاح رواجاً چنانچہ آپ نے منظور کیا اور راحیل و امیّہ دونوں سے شادی ہوئی۔ اس کے لیے کی خانہ زاد زلفا اور راحیل کی خانہ بلہا بھی آپ کی زوجیت میں آئیں (اس زمانے میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) ان سب سے اولاد بھی وہیں پیدا ہوئی۔ تاہم بنیامین ان کے وطن میں آنے کے بعد وہیں پیدا ہوئے۔ وہاں بیس سال گذارنے کے بعد آپؑ اپنے وطن فلسطین میں آ آباد ہوئے۔

آپ کے بارہ بیٹے ہوئے جن میں لیڈ سے رادبین، شمعون، لاوی، یہودا، یساغر اور زبولون ——— راحیل سے یوسف، بنیامین ——— بلہا جاریہ راحیل سے دان اور نفتالی اور زلفا جاریہ راحیل سے کاذ دجاذ اور الشار پیدا ہوئے۔

قرآن حکیم میں آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے حضرت یوسفؑ کا بہت آیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے ساتھ بھی آپ کا ذکر موجود ہے۔ نام کے علاوہ بہ حیثیت خاندان اوصاف کے حوالے سے آپ کا ذکر آیا ہے مثلاً سورۂ مومنون میں اوصاف کے حوالے سے ذکر آیا ہے۔ بقرہ (آیت ۱۴۰، ۱۳۳ اور ۱۳۶) انسار (آیت ۸۵) مریم آیت ۶۔ انبیاء (آیت ۲)، نساء (آیت ۱۶۳) یوسف (آیت ۳۸ و ۶) ص (آیت ۴۵) اس طرح دس مقامات پر آپ کا ذکر آیا ہے۔ آپ کے معجزوں سے پہاڑ پھٹ جایا کرتے تھے۔

یعقوبی اسلامی دنیا کا اولین جغرافیہ نویس، اصلی نام احمد بن ابی یعقوب، جعفر بن وہب کا بیٹا۔ اس کا وطن ایران کے مشرقی حصے میں واقع خراسان تھا۔ جہاں ۲۲۲ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے بہت سے ممالک کی سیاحت کی۔ جوانی کا وقت آرمینیا میں گذارا پھر وہاں سے مصر، شام اور وہاں سے عرب کے مختلف صوبوں سے ہوتا ہوا مراکش اور پھر اسپین پہنچا۔ مشرق میں ہندوستان تک سیر کی۔ یہ ہر ملک میں لوگوں سے ملتا اور ان کے تمدنی و تہذیبی حالات معلوم کرتا اپنے سفر کے آخر میں یہ مصر گیا اور وہیں ۲۹۷ھ میں رحلت فرمائی۔

اس کی تصنیف "اسماء البلدان" اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں جغرافیے کے نصاب میں شامل رہی۔ اس کی دوسری تصنیف تاریخی نوعیت کی تھی جس کا نام "کتاب التاریخ کبیر" تھا۔ یہ "تاریخ یعقوبی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے حصے میں تخلیقِ کائنات سے حیثیتِ نبوی تک کے حالات اور دوسرے حصے میں مسلمانوں کی مختصر تاریخ ملتی ہے۔ اس کی ایک تصنیف "کتاب مشاکلات الناس بزمانہم" گم ہو چکی ہے۔ اس کی ایک اور تصنیف "کتاب اخبار الامم السالفہ صغیر" تاریخ یعقوبی کا جزو معلوم ہوتی ہے۔

یعوق بنو مراد کا ایک بت جو گھوڑے کی شکل کا تھا۔ اس کا نام بھی ماضی میں ہیرو ہو گذرا تھا۔ جس کی بت کی صورت میں پرستش کی جانے لگی۔ قرآنِ عظیم میں اس کا ذکر بھی یغوث کے ساتھ سورۂ نوح میں آیا ہے۔

یغوث ایک بت، سورۂ نوحؑ کی تئیسویں آیت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ پروفیسر پامر کے مطابق یہ شیر کی شکل کا تھا۔ البیزدی کے مطابق اس کا نام حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی درمیانی مدت میں ایک ہیرو گذرا تھا۔ وہی بعد میں بہ شکل بت پوجا جانے لگا۔

یقطین کدو کا درخت جس کے نیچے حضرت یونسؑ نے بیماری کی حالت میں اس درخت پر پرورش پائی، جب مچھلی نے پیٹ سے اگلا۔ سورۂ صافات کی ۱۴۵۔۱۴۶ ویں آیات میں اس کا ذکر آیا ہے۔

یقین قرآنِ پاک میں "موت" کے معنوں میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ الحجر کی آخری آیت ——— "اور اپنے پروردگار کی عبادت کیے جا یہاں تک کہ تمہاری موت (کا وقت) آجائے"۔ اسی معنوں میں سورہ المدثر آیت ۴۷ میں بھی آیا ہے۔ صوفیاء کرام نے اس کی تین حالتیں تجویز کی ہیں۔ علم الیقین جسے انسان ذہن سے سمجھے، عین الیقین، علم جو آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہو۔

حق الیقین دونوں سے اعلیٰ ترین مشکل ہے۔ دل دماغ اور روحانی ہر طور سے ہوتا ہے۔ یہ خاص طور پر خدا کی توحید کے لیے ہوتا ہے۔ صوفیاء کی نظر میں عین الیقین وحدتِ حق کے متعلق پورا پورا علم ہے۔ اور یہ علم محال ہے اس سے مراد حالتِ نزع اور دنیا سے جانے کا بھی ہے۔ اس طرح حق الیقین سے مراد بہشت میں رویتِ حق کے ظہور سے ہے۔ جب انسان سب کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور دل سے معمور ہوگا۔ عین الیقین عارفوں کا مقام ہے۔ کیونکہ وہ موت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور حق الیقین ون بندگانِ خدا کے فنا کا جو دنیا سے قطعی کنارا رکھتے ہیں۔

یم سمندر، دریا جس کا ذکر قرآنِ پاک میں سورہ اعراف ع۱۶، طٰہٰ ع۲ و ۴، القصص ع۱ و ۴ اور سورہ والذاریات ع۲ میں آیا ہے۔

پہلی آیت میں فرعونوں کا قصہ ہے کہ ہم نے انہیں سزا دی اور سمندر میں ڈبو دیا۔ اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے۔ دوسری میں ام موسیٰؑ کو وحی کی گئی ہے کہ انہیں صندوق میں رکھ کر دریا میں چھوڑ دیں۔ اللہ پھر کنارے پر لے آئے گا۔ تیسری میں اسرائیلیوں کا ذکر ہے۔ جب فرعون ان کے پیچھے حملہ آور ہوا تو ان پر دریا آبلا۔ چوتھی آیت گوسالہ سامری سے متعلق ہے کہ اسے جلا کر اس کی راکھ کو دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پانچویں آیت پھر ام موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ انہیں دودھ پلایا جائے اور اگر اندیشہ ہو تو پھر دریا میں ڈال دیئے جائیں۔ چھٹی اور ساتویں آیت میں فرعون اور اس کے لشکر کا دریا برد ہونے کا ذکر ہے۔

پہلی، تیسری، چھٹی اور ساتویں آیت میں "یم" سے مراد بحرِ احمر کے شمالی حصہ کا مغربی مثلث ہے، جہاں فرعون حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ یہ مقام نہر سویز کے قریب ہے۔ دوسری اور پانچویں آیت میں اشارہ دریائے نیل کی طرف ہے۔ اس کے کنارے پر حضرت موسیٰؑ کے والد کا مکان تھا۔ چوتھی آیت ذرا متنازعہ ہے۔ اس سے اشارہ ذخیرہ آب کی جانب ہے، یہ بحرِ احمر کا شمالی حصہ ہے، خلیجِ سویز یا خلیجِ عقبہ ہو سکتا ہے۔

یمامہ جنگ ایک جنگ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں ۱۲ھ میں یمامہ کے مقام پر لڑی گئی۔ ابھی حضرت ابو بکرؓ کو مسندِ خلافت پر فائز ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ مسیلمہ کی شورش حد سے بڑھ گئی۔ یہ شخص آپؐ کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کر چکا تھا۔ آپ نے اس کی سرکوبی کے لیے پہلے عکرمہ بن ابوجہل، ان کے پیچھے شرجیل بن حسنہ اور آخر میں حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں لشکر روانہ کیا۔ حضرت عکرمہؓ میدان نہ جیت سکے۔ اس پر ان کو خلیفہ کی طرف یمن حضرموت کے مہاجرین سے ملنے کا حکم دے دیا اور شرجیل کی مدد کے لیے خالد بن ولید کو ۱۲ ہزار مجاہدین کے ساتھ بھیجا۔ حضرت خالد کے لشکر میں مہاجرین کے سردار حضرت عمرؓ کے بھائی زید بن الخطاب تھے اور انصار کے ثابت بن قیس بن شماس۔ دوسری طرف مسیلمہ کے پاس بنی حنیفہ کا بھاری لشکر تھا۔ یہ تعداد میں کم از کم چالیس ہزار تھے۔ حضرت شرجیل حضرت خالدؓ کی آمد کا سن کر اس پر حملہ آور ہو گئے۔ اس پر حضرت خالد نے انہیں سرزنش کی۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس کا یہ انتظام کیا کہ فوری طور پر ایک اور لشکر حضرت سلیط کی قیادت میں روانہ کر دیا۔

حضرت خالد نے عقربا کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ آپ کے مقابلے کے لیے مسیلمہ نے نامور سردار مجاعہ بن مرارہ کو بھیجا مگر ان کی تمام فوج گرفتار کر لی گئی۔ اس کے بعد مسیلمہ خود مقابلے پر آیا۔ مسیلمہ کے بیٹے کے آگے آنے پر زبردست جنگ شروع ہو گئی۔ بنی حنیفہ کی طرف سے سب سے پہلے نہار الرجال میدان میں آیا۔ حضرت زید بن الخطاب نے اس کا کام کر دیا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت خالدؓ کی فوج سنبھل نہ سکی۔ عبداللہ بن حفص شہید ہو گئے۔ ان کے بعد جھنڈا ابو حذیفہ کے غلام سالم نے بڑھ کر اٹھایا۔ مسلمانوں میں سے ابو حذیفہ، زید بن الخطاب شہید ہو چکے تھے۔ اس پر خالدؓ بھڑک اٹھے اور کفار کو کاٹتے ہوئے مسیلمہ تک پہنچے اور اس کا کام تمام کرنا چاہا مگر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی فوج بھاگ کر قریبی باغ میں چھپ گئی اور پھاٹک بند کر لیا۔ اور حضرت براء بن مالک حسبت لگا کر اندر چلے گئے۔ ان کی پیروی چند اور لوگوں نے کی۔ انہوں نے جاتے ہی پھاٹک کھول دیا۔ جنگ ایک بار پھر شروع ہوئی۔ یکایک مسیلمہ کو جبیر بن مطعم کا نیزہ پڑا اور وہ لقمۂ اجل بنا۔ اس کے مرتے ہی دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور یوں جنگِ یمامہ ختم ہوئی۔ اس میں تیرہ ہزار مرتدین ہلاک ہوئے۔

یمن ایشیا و عرب کے جنوب مغرب کی ایک سابق مسلمان سلطنت۔ ایک زمانے میں ان کی تہذیب عروج پر تھی۔ یہاں کی قدیم حکومت معینی تھی جنوبی عربستان میں تھی۔ اس کے صدر مقام قرن اور معین تھے۔ قبائل آفتاب کو پوجتے تھے۔ یہاں پے در پے مسلمان آتے اور اسلام پھیلتا رہا۔ حضرت سلیمانؑ کی زوجہ ملکۂ سبا یہیں حکمران تھیں۔ جن کا ذکر قرآنِ مقدس و انجیل میں آیا ہے۔ بعد میں یہ ملک دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک جنوبی یمن جس کا سرکاری نام "یمن عوامی جمہوریہ" ہے اور دوسرا شمالی یمن جس کا سرکاری نام "یمن عرب جمہوریہ" ہے۔ اول الذکر کا یومِ آزادی ۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء اور موخر الذکر کا ۲۹ ستمبر ۱۹۶۲ء ہے۔

ان دونوں کی قدیم تاریخ یوں ہے۔

۳۰۲ھ میں محمد بن ابراہیم بن عبیداللہ بن زیاد یمن کا بادشاہ ہوا۔ ان کے وصال کے بعد ابراہیم بن محمد پھر اس کا بیٹا زیاد، پھر اس کا بھائی ابو الجیش اسحٰق ۳۷۱ھ میں اس کے وصال کے بعد اس کا بیٹا زیاد رہا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے وصال کے بعد یہ سلطنت اسی خاندان کے دوسرے فرد ابراہیم کے ہاتھ میں چلی گئی مگر جلد ہی یہ بھی جنگ میں مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ ۲۶۴ برس حکومت کرنے کے بعد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا ایک غلام نجاح کے ہاتھ میں بادشاہت چلی گئی۔ اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ ۴۵۲ھ میں یہ بھی وفات پا گیا۔ پھر اس کا بیٹا سعید سلطنت میں آیا۔ اس پر ابو الحسن صلیحی علی بن محمد حملہ آور ہوا اور ملک پر قابض ہو گیا۔ اس کا باپ یمن کا قاضی تھا۔ انہوں نے سترہ برس حکومت کی ہو گی کہ سعید پھر واپس آیا۔ ابو الحسن کا سر کاٹ لیا۔ ۵۰۰ برس میں فاتک نام تخت پر بیٹھا۔ پھر منصور بن فاتک اور اس کے بعد اس کا بیٹا فاتک ثانی۔ اس کے بعد ابن عم بن فاتک تخت پر بیٹھا۔ اس کے دور کے ختم ہونے کے ساتھ ہی بنو نجاح کی حکومت ختم ہو گئی۔ یہ سو برس سے کچھ زائد حکومت میں رہے۔ ان کے بعد علی بن مہدی حمیری کے خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مہدی پھر پوتا عبدالنبی حاکم ہوا۔ عبدالنبی کے دور میں اس کے بھائی عبداللہ کے ہاتھ بھی حکومت رہی۔ ۵۶۹ھ میں توران شاہ بن ایوب نے اسے قید کر کے حکومت اپنے قبضے میں کر لی۔ اس کے ساتھ ہی حمیری سلطنت ختم ہو گئی۔ توران کے بعد امام مہدی احمد یحییٰ بن رسول الدین اللہ بادشاہ ہوا۔ یہ حضرت فاطمہ کی اولاد سے تھے۔ اس کے بعد امام [illegible] [illegible] سے اقتدار [illegible] ۹۶۴ھ میں ترکوں کے پاس [illegible]

یمن جنوبی اس کا رقبہ ۰۰۰ ،۳۰ [illegible] اور آبادی [illegible] نفوس ہے۔ مرکزی دارالحکومت مدینۃ الشعب و عدن [illegible] کپاس، مچھلی، کافی [illegible] کو یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ [illegible] عرب کے حکمرانوں نے ایک وفاق کی بنیاد رکھی۔ [illegible] ریاستیں اس وفاق میں شامل ہو گئیں۔ [illegible] میں عوام کی قربانیوں سے یہ ملک ۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو آزاد ہوا۔

یمن شمالی اس کا سرکاری نام یمن عرب [illegible] ۵۰۰۰ ہزار میں ۹۹٪ مسلمان ہیں۔ [illegible] دارالحکومت ہے۔ یہاں کا کل رقبہ [illegible] اور خاص پیداوار کافی ہے۔ اس کا بولا [illegible] عرب میں اس کی آب و ہوا [illegible] مجموعی [illegible] گرمیوں میں عموماً ۱۰۰° F [illegible]

آنحضرتؐ کے عہدِ حکومت میں یہاں [illegible] ابو بکرؓ کے عہد میں یہاں جنگ یمامہ لڑی گئی [illegible] حضرت عمرؓ کے عہد [illegible] ہو گئیں۔ اموی، عباسی وغیرہ کی یہاں عمل داری رہی [illegible] ۱۸۴۹ تا ۱۹۱۸ء یہ ترکوں کی عثمانی حکومت میں شامل رہا [illegible] بعد یہاں زیدیوں کی حکومت [illegible] ذریعے کرنل عبداللہ نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ [illegible] نومبر ۱۹۶۷ء میں آیا۔ جس کے ذریعے [illegible] صدر عبدالرحمٰن الاریانی ہیں۔ یہاں جمہوری طرز حکومت [illegible] ریپبلکن کونسل کا چیئرمین [illegible] خاص [illegible] کھالیں، کھجوریں وغیرہ بھی اہم پیداوار ہیں۔

یمین: عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں دایاں ہاتھ۔ مجازی معنوں میں [illegible] طاقت کے طور پر آتا ہے۔ [illegible] کو بھی یمین کہتے ہیں [illegible] لوگوں کو

انہی نام کے خطابات والقاب سے مثلاً محمود غزنوی کو "یمین الملتہ والدولہ" اور مہاراجہ سرکشن پرشاد سابق وزیراعظم حیدر آباد دکن کو "یمین الدولہ" کا خطاب ملا۔ دایاں ہاتھ سے کھانا چاہیئے، ہاتھ بھی اسی سے ملانا چاہیئے۔ یہ لفظ حلف یا اسی قسم کے معنوں میں قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۲۵، سورہ مائدہ ۱۰ شامل ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اپنے عدوں اور حلف پر قائم رہ کر جو کرے انہیں اچھا اجر ملے گا اور جو نہ کرے انہیں سزا۔ یمین کا توڑنا گناہ میں آتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) یمین الغوس:۔ ماضی میں کی گئی کسی بات پر حلف اٹھانا پشیمان ہو کر۔ اس کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے جس نے یہ جھوٹا حلف اٹھایا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

(۲) یمین المنعقد:۔ سامنے درپیش بات پر حلف اٹھانا کہ وہ یہ نہیں کرے گا یا کرے گا۔ اگر اس پر عمل نہ کر سکے تو سزاوار ہے۔ جو ایک مسلمان غلام کی رہائی یا دس مسکینوں کو کھانا کھانا یا کپڑے دینا ہے۔

(۳) یمین اللغو:۔ ماضی کے کسی واقعہ پر حلف اٹھانا۔

یوسفؑ ایک پیغمبر حضرت یعقوب کے بیٹے۔ آپ کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان تھا۔ آپ کا شجرۂ نسب یوں ہے ——— یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم۔ قرآنِ عزیز کی بارھویں سورہ آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں آپ کا نام ۲۴ مرتبہ آیا ہے۔ اس میں آپ کو کنوئیں میں ڈالنے کا پورا واقعہ درج ہے۔ اس کے علاوہ سورہ انعام ۸۴ اور سورہ غافر ۳۴ میں بھی آپ کا نام آیا ہے۔ سورہ یوسف میں آپ کے واقعہ کو "حسنِ قصص" کہا گیا ہے۔

ایک روز آپ نے خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور ایک چاند انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ جب آپؑ نے یہ خواب اپنے باپ یعنی یعقوب کو سنایا تو انہوں نے دوسرے گیارہ بھائیوں کو سنانے سے منع فرمایا، کیونکہ وہ ان سے بڑا حسد کرتے تھے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو آپ بے حد حسین تھے۔ دوسرے والدین ان کے مقابلے میں آپ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اس خواب کا ذکر قرآنِ عزیز کی سورہ یوسفؑ میں یوں آیا ہے ——— "جب یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جی میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔ نہیں تو تمہارے حق میں کوئی فریب کی چال چلیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔" (آیت ۵-۴) مگر جب آپ کی عمر اٹھارہ برس کی ہوئی تو آپ کے بھائیوں نے آپ کو مارے حسد کے جدا کر دیا۔ وہ ان کو جنگل کی سیر کرانے لے گئے تھے اور خشک کنوئیں میں ڈال دیا۔ واپسی میں ان کی قمیض کو کسی جانور کے خون سے رنگ کر روتے ہوئے والد سے کہا کہ ان کو بھیڑیا اٹھا لے گیا۔

مگر آپ صحیح وسالم قمیض دیکھ کر تاڑ گئے اور کہا ——— "(حضرت یعقوب نے) کہا یہ ہرگز نہیں، بلکہ بناوٹی ہے تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات۔ اب صبر ہی بہتر ہے اور جو بات تم ظاہر کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں" (سورہ یوسف ع ۲)

اسی دوران ایک قافلہ جو شام سے مصر جا رہا تھا اس نے پانی نکالنے کے لیے ڈول ڈالا تو آپ باہر آ گئے۔ وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوئے کہ ایک غلام ہاتھ آیا۔ یہ قافلہ اسمٰعیلیوں کا تھا۔

یہاں مفسرینِ قرآن اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں انہی کے بڑے بھائی راوبین نے نکالا تھا مگر اس کی قرآنِ پاک یا توریت سے تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ یہ دونوں قافلے والی بات ہی کو تقویت دیتے ہیں۔

یہ قافلے والے آپ کو غلام بنا کر مصر لے گئے۔ اس وقت یہاں کے حکمران عمالقہ تھے۔ ان تاجروں نے آپ کو عزیز کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کی بیوی زلیخا آپ پر جان نثار کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ آپ اس کے ساتھ رہیں مگر اللہ کے رسول مقبول نے ایسا کرنے سے انکار کیا اس نے مکر و فریب کر کے آپ کو قید کروا دیا۔ جس میں آپ سات برس رہے۔ "یوسف نے کہا اے میرے خدا جس بات کی طرف یہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے اس کے مقابلے میں قید ناپسند ہے۔ اگر تو مجھ سے اس کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا تو خدا نے ان کی دعا قبول کر لی اور عورتوں کا مکر و فریب ان سے دفع کر دیا۔ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" (یوسف آیت ۳۴،۳۳)

زنداں میں آپ کے ساتھ ساقی اور داروغہ آئے ان پر الزام تھا کہ کھانے میں زہر ملایا۔ داروغہ پر الزام ثابت ہوا اور ساقی بری ہوا۔ آپ نے ساقی سے کہا کہ سارا واقعہ بادشاہ سے بیان کرے مگر وہ فراموش کر گیا۔ انہی دنوں اس وقت کے فرعون نے خواب دیکھا کہ سات موٹی اور سات دبلی گائیں ہیں۔ دبلی گائیں موٹی کو نگل گئی ہیں۔ سات سرسبز و شاداب بالوں نے سات خشک بالوں کو نگل لیا ہے اس نے مشیروں سے اس کی تعبیر چاہی مگر نہ مل سکی۔ اس بات پر ساقی کو آپؑ کا خواب یاد آیا۔ اس نے بادشاہ کو تعبیر بتلانے کی اجازت چاہی۔ آپ نے خواب کی تعبیر بتائی جو قرآنِ پاک کی سورہ یوسف کے چھٹے رکوع میں درج ہے۔ بادشاہ نے آپ کی تعبیر سن کر آپ کو آزاد کرنا چاہا مگر آپ نے زلیخا کے معاملے کو معاف کرنے کی شرط لگائی اس نے عورتوں کو بلوایا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے انہوں نے کہا۔ "بے شک ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی۔" تب آپ سات برس زنداں میں کاٹنے کے بعد آزاد ہوئے۔ بادشاہ نے آپ کو نائب وزیر لگایا تو انہیں معاف فرمایا اور پیرہن دیا کہ آپ کے والد کی آنکھوں پر ڈالیں جو آپ کے فراق میں روتے روتے اندھے ہو چکے تھے۔ جیسے ہی پیرہن ڈالا گیا۔ ان کی بینائی لوٹ آئی۔

اس کی وفات کے بعد آپ بادشاہ بن گئے۔ اس کے بعد آپ کے بھائی آپ کو ملے۔ آپ نے اپنی زندگی کا طویل حصہ مصر ہی میں گذارا ہے۔ ۱۱۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ مرتے وقت آپ نے وصیت کی کہ آپ کو مصر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین یعنی فلسطین میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی لاش حنوط کر لی گئی۔ جب موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے واپس اسرائیل گئے تو ممی کو بھی ساتھ لے گئے حموی کہتے ہیں کہ آپ کی قبر فلسطین کے علاقے نابلس کے ایک گاؤں بلاطہ میں ہے۔ یہ قبر ایک درخت کے نیچے ہے یہ واقعہ توریت میں بھی درج ہے۔ (پیدائش باب ۵ آیات ۲۲ تا ۲۶ اور خروج باب ۱۳ آیت ۱۹) نیز دیکھیے: "یوسف سورہ"۔

یوسف قرآنِ پاک میں بارھویں اور تیرھویں پارے کی مکی سورہ کا نام اس کی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں۔ کلام اللہ میں بارھویں نمبر پر اور باعتبار نزول ۵۳ نمبر پر ہے۔ اس کا نام حضرت یوسفؑ کے تذکرہ سے مستعار لیا گیا ہے جو اس کا واحد مضمون ہے۔ پہلے رکوع میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کو علیم الانسان بنا دیا جائے گا۔ آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے رکوع میں حضرت

یوسفؑ کے ساتھ ان کے بھائیوں کے ناروا رویوں کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ ایسے ہی منصوبے نبی آخرالزمان ﷺ کے خلاف بھی بنے پائے۔ تیسرے رکوع میں دونوں نبیوں کی استقامت کا ذکر ہے۔ چوتھے رکوع سے واضح ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے گو قید و بند سے محفوظ رکھا مگر شعیب ابی طالب کے واقعہ سے مشابہت ملتی ہے۔ چوتھے اور پانچویں رکوع میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے قید میں اور آنحضرت ﷺ نے گھاٹی میں کس طرح وعظ نہ کیا اور آنحضرت نے ہجرت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔ چھٹے رکوع میں شاہِ مصر کے خواب کا ذکر ہے جو مکہ میں آنے والے سات سال کے قحط سے عبارت ہے۔ ساتویں رکوع میں دونوں انبیائے کرام کی برتریت کا ذکر آیا ہے۔ آٹھویں اور نویں رکوع میں یوسفؑ اور آپ کے بھائیوں کے باہمی معاملات کا ذکر ہے۔ عرب میں قحط کے وقت جب ابوسفیان نے ہلاک ہونے والوں کا آٹھویں اور نویں رکوع میں حضرت یوسفؑ اور ان کے برادران کے باہمی تعلقات اور آنحضرت کی دعا پر قحط کے خاتمے کا ذکر ہے دسویں رکوع میں برادران یوسفؑ کی صفائی کا ذکر ہے آخری رکوع میں ان کا حکومت میں شرکت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

یوشع یشع بن نونؑ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ مورخین نے ان کا شجرۂ نسب یوں تیار کیا ہے۔ یوشعؑ بن نونؑ بن فراہیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم۔ حضرت موسیٰؑ کے خاص آدمی تھے۔ سفرِ خضری اور سفرِ شام میں آپ کے ساتھ رہے۔ انہی کے بعد نبی ہوئے اور بنی اسرائیل میں ۱۸ برس رہے۔ کفار سے کئی بار جہاد کیا۔ ایک دفعہ لڑتے لڑتے شام پڑ گئی تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جس سے آفتاب ڈوبتے ڈوبتے تھم گیا۔ اسی روز آپؑ نے تمام شام فتح کر لیا مکمل انتظام کے لیے اپنے نائب مقرر کر دیئے۔

کنعان میں مشرک قوموں کی معلومات حاصل کرنے کے لیے جو وفد گیا تھا۔ اس کے رکن بھی تھے اور جب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو ان قوموں سے جنگ کی دعوت دی تو اس نے قبول نہ کیا۔ حضرت یوشع ہی وہ پہلے فرد تھے، جنہوں نے بات تسلیم کی اور اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کو بھی قائل کیا۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب آپ نبی مقرر ہوئے تو آپ نے شہر اریحا فتح کیا۔ تورات میں ہے کہ دورانِ جنگ آپ کے ساتھ عصائے موسیٰؑ، پیرہن ہارونؑ اور من کا مرتبان بھی تھا۔ یہ سب ایک صندوق میں (تابوتِ سکینہ) دوسری اشیائے مقدس کے ساتھ محفوظ تھے۔ یہ اللہ کی ہدایت کے مطابق محفوظ کی گئی تھیں۔

ابنِ اثیر کی روایات کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے انہیں اپنی زندگی میں امیرِ جیش نامزد کر دیا تھا۔ تورات میں آیا ہے کہ یہ بات حضرت موسیٰؑ پر ان کی زندگی میں ظاہر کر دی گئی تھی ـــــ "خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ نونؑ کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ، کیوں کہ اس شخص میں روح ہے اور اسے العیزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر، ان کی آنکھوں کے سامنے اسے وصیت کر اور اپنے رعب داب سے بہرہ ور کر دے، تاکہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرمانبرداری کرے۔ (گنتی باب ۲۷ آیات ۱۹-۲۰)

"اور نونؑ کا بیٹا یشوع (یوشع) دانائی کی روح سے معمور تھا۔ کیونکہ موسیٰؑ نے ان پر ہاتھ رکھے تھے اور بنی اسرائیل ان کی بات مانتے رہے" (استثنا باب ۳۴ آیت ۹) چنانچہ ان ہی کی قیادت میں چالیس برس بعد کنعان، شام اور شرق اردن سے جابر قوموں کا صفایا کیا گیا۔

اس کے علاوہ، صفات یشوع کا ذکر بغیر نام کے قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ سورہ کہف میں وہ جگہ حضرت موسیٰؑ کے نوجوانِ رفیقِ کار کا ذکر ہے۔ جب وہ حضرت خضر سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کا بیان سورہ کہف کی آیت ۶۰ اور اس کے بعد کی آیتوں میں آیا ہے، وہاں ان کے لیے "شاگرد" کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ حضرت موسیٰؑ سے فیض حاصل کرتے تھے۔

۱۱۰ برس کی عمر میں کفر حارس کے شہر میں انہوں نے ترک دنیا کی۔

یوگنڈا افریقہ کی ایک ریاست۔ مرکزی دارالحکومت کمپالا ہے اور صدرِ مملکت جنرل عدی امین ہیں۔ رقبہ ۹۱۰۹۷ مربع میل۔ کل آبادی (۹۴۲۰۰۰۰) میں ۲۵ فیصد مسلمان ہیں۔ برطانوی تسلط سے ۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا۔ سرکاری زبان انگریزی ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سوڈان اور مصر کی طرف سے دو قبائل ہیما اور سیما یوگنڈا میں داخل ہوتے ہوئے مقامی مفتوح قبائل پر اپنی بالادستی قائم کی۔ تقریباً ۱۸۵۰ء میں مسلمانوں کا ایک تجارتی قافلہ یہاں سے گزرتے ہوئے اس وقت کے بادشاہ "سونا" کے دربار میں بھی گیا۔ جو ان سے متاثر ہو کر اسلام لے آیا۔

۱۹ جون ۱۸۹۴ء کو اس پر برطانیہ نے قبضہ کیا۔ جس کے لیے عیسائی مبلغوں نے حالات کو ابتدائی طور پر ہی قابو میں لے رکھا تھا۔ نتیجتہً یہاں زبردست تحریک چلی جو ۱۹۴۴ء میں عدم تعاون کی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ انگریزوں نے تقریباً اٹھارہ برس تحریک کو دبائے رکھا بالآخر ۹ اکتوبر کو آزادی دینا پڑی۔ اوبوٹے کیبا کہ یہاں کے اولین صدر کے طور پر اقتدار لیا۔ ۲۵ جنوری کو یہاں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے جنرل عدی امین برسراقتدار آئے جو اب ہجرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کپاس، ہاتھی دانت، تمباکو، کافی وغیرہ یہاں کی خاص برآمدات ہیں۔ گنا بھی یہاں بہت پیدا ہوتا ہے۔ معدنی ذخیروں میں تانبہ، لوہا اور جست بڑی مقدار میں ملتے ہیں۔ دنیا کی دوسری بڑی جھیل "وکٹوریہ" بھی یہیں ہے۔

یونسؑ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت بنیامین کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد کا نام متی اور قرآن مذکور ہے۔ موصل اور دجلہ کے قریب نینوا پر نبی ہوئے۔ آپؑ نے انہیں وعظ کیا مگر وہ [illegible] کہا کہ تم پر فلاں دن عذاب آئے گا۔ عین اس دن جب عذاب آیا تو لوگوں کو آپ کی نبوت کا یقین ہوا۔ اس وقت رونے پیٹنے کہ عذاب ٹلے اور آپ کی نبوت پر ایمان لائے۔ اس سے عذاب ٹل گیا۔ آپ کو معلوم نہ تھا کہ قوم ایمان لا چکی ہے۔ سوچ کر ہم دن بعد وہاں گئے کہ وہ تباہ ہو چکے ہوں گے مگر [illegible] ترک کرنے کا قصد کیا اور کشتی میں بیٹھ کر ترسیس جانے لگے۔ دریائے فرات پر کشتی میں سوار ہوئے عین دریا کے وسط میں کشتی رک گئی۔ لوگوں نے کہا کہ اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ پس تین مرتبہ قرعہ ڈالا گیا جو ہر مرتبہ آپ کے نام پڑا۔ آپ نے کہا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔ پس آپ کو اسی وقت دریا میں پھینک دیا گیا۔ جہاں آپ کو مچھلی نے نگل لیا۔ مگر اللہ کا کچھ اور ہی حکم تھا۔ اس کے حکم کے مطابق مچھلی نے آپ کو ۳ یوم پیٹ میں رکھنے کے بعد دریا کے کنارے پر چھوڑ دیا۔ آپ اس کے پیٹ میں یہ آیت پڑھتے رہے ـــــ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ یعنی الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے میں تیری ثنا بیان کرتا ہوں بے شک میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔ ساحلِ سمندر پر [illegible] کے حکم کے مطابق حضرت کے لیے ایک کدو کا پیڑ اگا، اور ہرنی کو اس نے حکم دیا کہ آپؑ کو دودھ پلایا کرے۔ جس سے آپ بھی تندرست ہو گئے۔ یہ قرآن پاک کی سورہ الصافات کی آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸ میں درج ہے۔ اسی واقعے کی نسبت سے سورہ قلم میں ہے۔ (مچھلی والے) سے منسوب کیا ہے (آیت ۴۸ - ۵۰)

اس کے علاوہ ان کا ذکر قرآنِ عظیم کی دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے۔

جن میں النساء ۱۶۳، انعام ۸۶ اور یونس ۹۸۔ سورۂ انبیا میں انہیں "ذوالنون" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

اس واقعے کے بعد حضرت یونسؑ کو پشیمانی ہوئی کہ وہ اپنے آقا یعنی خدائے واحد کی مرضی و منشا کے خلاف اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آئے جب کہ وہ انہیں ڈھونڈتی رہی کہ بیعت کرے۔ اس لیے انہیں دوبارہ حکم ہوا کہ اب نینوا جائیں اور راہبری کریں۔ اس لیے وہ نینوا واپس ہوئے اور قوم ایمان لائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ اس کا ذکر سورۂ الصافات کی آیات میں مذکور ہے اور سورۂ یونسؑ (آیات ۹۸) میں یوں ذکر آیا ہے ———— "پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونسؑ کی بستی کے سوا کوئی بستی ایسی نہ ملی کہ نزول عذاب سے پہلے ایمان لاتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی۔ یونسؑ کی قوم جب ایمان لائی تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب ان پر سے اتار دیا۔ جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا۔ اور ایک خاص مدت تک سروسامانِ زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دے دی۔"

آپ کو یونسؑ کے علاوہ یوناہ بھی کہتے ہیں جو یونس کا عبرانی تلفظ ہے۔ تورات میں ان کا نام یوناہ اور ایک صحیفہ "یوناہ نبی کی کتاب" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ چار مختصر ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں انؑ کا ناراض ہو کر نینوا سے چلے جانا، مچھلی کا واقعہ اور نینوا واپسی کی ہدایات درج ہیں۔ یہ صحیفہ اس عبارت پر ختم ہوتا ہے۔ "اور خدا نے یوناہ (یونس) کو کہا تو اس رینڈی کے درخت کے سبب شدت سے رنجیدہ ہے۔ اس نے کہا کہ میں یہاں تک رنجیدہ ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں۔ تب خدا نے فرمایا کہ مجھے اس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لیے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اسے اگایا جو ایک ہی رات میں اُگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا اور کیا مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے بڑے شہر نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دائیں بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں، شفقت نہ کروں؟" یہی واقعہ قرآنِ کریم سورہ الصافات میں مذکور ہے۔

آپ اہلِ نینوا پر اٹھائیس برس کی عمر میں نبی ہوئے۔ اس وقت آپ یروشلم میں تھے۔ آپ کی نبوت کے زمانہ کا درست تعین نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی میں ایسا کرنا مشکل ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ یہ دور طوائف الملوکی کا دور تھا جو ساسانی عہدِ حکومت سے قبل اور یرطفوسی حکومت کے بعد کا دور ہے۔ یہ ۲۷۲ ق م سے ۱۵۰ ق م تک ہے۔ حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ آپ کا دور ۲۷۲ ق م سے حضرت عیسٰی کی ولادت کے درمیان ہے۔ مورخین کے تیسرے گروہ کی رائے میں آپ کا زمانہ ۶۱۲ ق سے قبل کا ہے۔ اس کے برعکس بعض آپ کو حضرت حزقیلؑ کے زمانے کا ہی بتاتے ہیں ان میں شیخ عبدالقادر بھی شامل ہیں اور یہی آپ کا درست زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ اکتیس برس اپنی قوم میں رہے اور وہیں وفات پائی۔

یونس

گیارھویں پارے کی مکی سورہ کا نام، قرآنِ پاک میں دسویں سورت بلحاظ ترتیب نزول ۵۱ اس میں ۱۰۹ آیات اور گیارہ رکوع ہیں۔ اس کا نام یونس اس طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ جس طرح ایک زمانے میں حضرت یونسؑ کی قوم تباہی سے بچ گئی تھی۔ اس کی وجہ ان کا ایمان لانا تھا۔ اسی طرح نبی آخرالزماں کی قوم بھی بچ جائے گی۔

یہودہ

عبرانی لفظ لغوی معنی "خدا کی تعریف کرو" حضرت یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائی کا نام۔ وہ تم اس زرد رنگ کے کپڑے کو بھی کہتے ہیں جو بوجوہ امتیاز یہودی لوگ اپنے کپڑوں پر سی لیا کرتے ہیں۔

یہودی

سامی النسل لوگ جو خود کو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد بتاتے ہیں انہیں بنی اسرائیل بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تاریخ کا آغاز حضرت یعقوب کے خاندان سے ہوتا ہے جب وہ فلسطین سے مصر چلے گئے تھے۔ فرعون مصر دوم رعمیس ۱۲۲۵ ——— ۱۳۰۰ ق م کے عہد میں ان پر مظالم ڈھائے جانے لگے۔ جب یہ مصر سے دوبارہ اپنے وطن کی جانب چلے تو انہوں نے فلسطین فتح کرنا چاہا مگر اہلِ کنعان نے سخت مقابلہ کیا۔ انہیں کہیں کامیابی اور کہیں ناکامی ہوئی۔ اس سے یہ مختلف گروہوں کی صورت میں بٹ گئے۔ چونکہ یہ مصر میں قدیم عرصہ رہے تھے۔ اس لیے ان میں مصری عقائد داخل ہو گئے جسم و روح پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کی طرح ان کا بھی یہی تصور تھا کہ جسم فنا ہو جاتا ہے اور روح رہ جاتی ہے۔

ایک عرصے بعد ان میں ایک رہنما ساول پیدا ہوا جس نے اتحاد و تنظیم پیدا کی۔ حضرت موسیٰؑ انہی کی تعلیم کے لیے پیغمبر کیے گئے تھے۔ جنہوں نے ان کی اخلاقی تربیت کی۔ حضرت داؤدؑ کے عہد میں انہیں باقاعدہ ایک سلطنت ملی۔ ۹۷۵ ق م میں یہ ان میں پھر نفاق نہیں پیدا ہوئی۔ اس کے تقریباً اڑھائی سو سال بعد اشور کے حملے شروع ہوئے۔ اور ۵۸۸ ق م میں یہ بخت نصر کی غلامی میں چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے فلسطین میں آزاد حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ——— ۱۴۔۱۵ مئی ۱۹۴۸ء میں "اسرائیل" کے نام سے معرضِ وجود میں آیا۔ دوسری بڑی جنگ سے قبل ان کی آبادی ½ ۱ کروڑ کے قریب تھی۔ اسی عہد میں نازیوں کے ہاتھوں ۶۰ لاکھ یہودی ہلاک ہوئے۔ اب امریکہ میں ان کی آبادی برابر بڑھتی جا رہی ہے اور ان کی حکومت پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ نیز دیکھیں اسرائیل، اسرائیل نبو اسرائیل، حکومتِ صیہونیت، بنی اسرائیل سورہ۔ یہودیت،

یہودیت

فلسفۂ یہود، جس کو ترقی اسکندریہ میں حاصل ہوئی۔ رومی مذہب سے بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ یہ توحید، فرشتوں، شادی بیاہ، غلامی اور عبادات سے متعلق الگ تصورات رکھتے ہیں۔ ہر فلسطینی جو ماضی قدیم میں اسپینوزا کو یک کا سب سے بڑا فلسفی ہو گذرا ہے۔ ایک عرصہ یہودیوں میں نام لکھتا ہے کہ وہ "اللہ" کی جگہ لفظ "ممرا" ——— اور حضور و قربِ الٰہی کے بجائے "شکینہ" بولتے۔ جس کا مطلب تسکین ہوتا۔ ان کے تصور میں اسلاف کے عقائد کی عمل داری اور زمانہ سے اتحاد و مصالحت ضروری ہے۔ اس طرح یہودیت پہلا دین ہے جس نے بیک وقت دنیاوی فلسفہ اور دین کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مشہور مفکر فیلون (۲۰ ق م) تمام یہودی فلسفہ میں اللہ کی ذات ایک ہے مگر فلسفۂ وحدت الوجود میں کائنات ایک وحدت کی صورت میں نظر آتی ہے۔

یہوواہ

خدائے واحد کا یہ توصیفی نام قدیم اسرائیل میں رائج تھا۔ اس کے معنی ہیں، قادرِ مطلق، ہمیشہ قائم رہنے والا، مسلمان مفکرین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وہی معنی ہیں جو عربی میں "یاہو" کے ہیں۔ سورہ بقرہ (آیت ۲۵۶) اور سورۂ طٰہٰ (آیت ۱۱۰) میں اسی لفظ کے معنی استعمال ہوئے ہیں

اشاریہ

"اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کے مضامین پہلے ہی ردیف وار ترتیب میں ہیں۔ اس لئے ہمارے خیال میں طویل اشاریہ سازی کی ضرورت نہیں ۔ البتہ بعض نام کئی مقامات پہ درج ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً "محمد علی جوہر" کا مضمون "جوہر، محمد علی" کے تحت بھی شامل کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں ایسے چیلیپائی ناموں کی فہرست دی جا رہی ہے ۔

(مدیر)

تمت بالخیر

ارشادِ ربّانی

"اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور تمہارے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو۔ اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے"

(سورۃ الاعراف۔۲۶)

بلدیہ کراچی

بلدیہ کراچی

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا

مُدیر

سیّد قاسم محمود

شاہکار

بُک فاؤنڈیشن